جدید نظر ثانی شدہ کمپیوٹر ایڈیشن

زبان و بیان کے نئے اسلوب میں

مظاہرِ حق جدید

شرح

مشکوٰۃ شریف اردو

1

از افادات

علامہ نواب محمد قطب الدین خان دہلوی رحمہ اللہ

ترتیب و ترتیب جدید

مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری (فاضل دیوبند)

دار الاشاعت

اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی
طباعت : مارچ ۲۰۰۹ء شکیل پریس کراچی۔
ضخامت : صفحات ۹۵۲

مصححین : مولانا محمد شفیق صاحب فاضل جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن
مولانا محمد اصغر مغل صاحب فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی
مولانا دلشاد صاحب مدرس دارالعلوم حسینیہ شہداد پور

﴿........ملنے کے پتے........﴾

ادارۃ المعارف کورنگی کراچی نمبر ۱۴
ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور
ادارۃ القرآن 437/D گارڈن ایسٹ لسبیلہ کراچی
مکتبہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴
کشمیر بک ڈپو، چنیوٹ بازار فیصل آباد
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور
مکتبہ رحمانیہ ۱۸ اردو بازار لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور
مکتبہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ، راجہ بازار راولپنڈی
الفیصل تاجران کتب اردو بازار لاہور
ادارہ اسلامیات اردو بازار کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ اَمَّا بَعْدُ

محدث کبیر امام ولی الدین محمد عبداللہ الخطیب التبریزی کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث "مشکوٰۃ المصابیح" تمام کتب احادیث میں ایک خاص امتیاز کا حامل ہے اور یہ اپنی تالیف کے وقت سے آج تک خواص و عوام میں مقبول و مشہور اور علم حدیث کے ہر مدرسہ و یونیورسٹی میں ہمیشہ داخل درس رہا ہے۔ اور ہر زمانے کے علماء نے اس کی متعدد مختصر مبسوط شرحیں مختلف زبانوں میں تحریر کی ہیں۔ جیسے ملا علی قاریؒ کی "مرقاۃ المفاتیح" شیخ عبدالحق محدثؒ کی عربی شرح "لمعات" اور فارسی شرح "اشعۃ اللمعات" مولانا ادریس کاندھلوی کی "تعلیق الصبیح" وغیرہ۔

اردو زبان میں بھی مشکوٰۃ کے متعدد تراجم ہوئے لیکن جو خداداد مقبولیت و شہرت "مظاہر حق" کو حاصل ہوئی وہ اور کسی اردو شرح کو نصیب نہیں ہوئی، اور اردو زبان میں صرف یہی شرح مستند اور قابل اعتماد سمجھی گئی ہے۔

"مظاہر حق شرح مشکوٰۃ" حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسے اور جانشین شاہ محمد اسحٰقؒ کے خاص شاگرد نواب محمد قطب الدین خان دہلویؒ کی مشہور و مقبول تالیف ہے۔ جو اپنی تالیف کے وقت سے اب تک علماء طلباء اور عوام و خواص سب ہی کی نگاہوں کا مرکز بنی رہی ہے۔ لیکن تمام تالیف آج سے ایک سو سال پہلے کی اردو زبان میں لکھی ہوئی ہیں، یہ زبان اور انداز تالیف اب سو سال بعد تقریباً نامانوس اور ناقابل فہم ہونے کی وجہ سے اس کتاب سے استفادہ سخت مشکل ہو گیا تھا۔

اور گزشتہ پچیس تیس برسوں سے شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھے اور اس شرح کی زبان اور ترتیب کو موجودہ زمانہ کے مطابق سہل اور آسان کردے تو یہ حدیث کی بڑی خدمت اور ایک کارنامہ ہوگا۔

خدا کا شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک فرزند مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری نے اس ضرورت کو محسوس کر کے کمر ہمت باندھی اور کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد "مظاہر حق" کو زبان و بیان اور ترتیب کا نیا اسلوب اور نیا لباس عطا فرمایا اور اس کو "مظاہر حق جدید" کے نام سے دیوبند "انڈیا" سے ستر قسطوں میں شائع کرایا، جس کو تمام حلقوں نے بے حد پسند کیا اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اللہ تعالیٰ مؤلف کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔

لیکن افسوس ہے کہ ایسی عمدہ کتاب کی کتابت و طباعت انتہائی خراب اور کاغذ بالکل گھٹیا لگایا گیا جس کی وجہ سے اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھایا جاسکا۔

اب ضرورت تھی "مظاہر حق جدید" کو جدید تقاضوں کے مطابق کتابت، طباعت، کاغذ و جلد بندی کے اعلیٰ معیار پر اس کے شایان شان طریقے پر شائع کیا جائے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب ہم "مظاہر حق جدید" کا مکمل سیٹ پانچ ضخیم جلدوں میں کتابت و طباعت کے اعلیٰ معیار پر دارالاشاعت کراچی سے شائع کر رہے ہیں، اس عکسی اشاعت کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں۔

ترتیبی خصوصیات:۔

❶ مظاہر حق قدیم میں صرف لفظی ترجمہ تھا جس کو اب سلیس و بامحاورہ کر دیا گیا ہے۔
❷ مظاہر حق قدیم میں بہت سی احادیث کی شرح نہ تھی اب احادیث کی بھی مستند شروح کی مدد سے توضیح و تشریح کر دی گئی ہے۔

طباعتی خصوصیات:۔

❸ ہر باب کی حدیث پر نمبر شمار اور حدیث کے مناسب عنوان قائم کیا گیا ہے۔
❹ اس عکسی اشاعت میں ہر حدیث پر پہلے نمبر شمار اور عنوان لکھا گیا ہے۔
❺ پہلے عربی حدیث نیچے ترجمہ اور پھر تشریح دی گئی ہے تاکہ طلباء کو مطالعہ میں سہولت ہو۔
❻ اور پھر نیچے پورے صفحے کی چوڑائی میں حدیث کی شرح کتابت کرائی گئی ہے جس کی وجہ سے ظاہری حسن میں اضافہ اور استفادہ آسان تر ہو گیا ہے۔
❼ ہر جلد کے شروع میں تمام احادیث و مضامین کی مفصّل فہرست بقید صفحات شامل کی ہے۔
❽ پوری کتاب کو کمپیوٹر کتابت پر پیش کیا گیا ہے اور تصحیح کا خاص اہتمام کیا ہے۔
❾ عمدہ سفید کاغذ پر عکسی طباعت اور جلدیں نہایت حسین اور مضبوط بنوائی جارہی ہیں۔

ان خصوصیات کی وجہ سے بلاخوف تردید لکھا جاتا ہے کہ یہ کتاب "مظاہر حق" اپنی تصنیف اول کے وقت سے آج تک ایسی شان و شوکت سے شائع نہیں ہوئی تھی جیسی یہ عکسی اشاعت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اللہ تعالیٰ ہماری اس خدمت حدیث کو قبول فرمائے اور لوگوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے اور اللہ تعالیٰ صاحب مشکوٰۃ و صاحب مظاہر حق اور اس کے ناشرین اور کاتب و تصحیح و طباعت کرنے والے اصحاب کو اجر عظیم عطا فرمائے اور آخرت میں صاحب حدیث نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

فقط — ناشر
محمد رضی عثمانی
مدیر — دارالاشاعت کراچی ۱
۲۲ رجب ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۹۸۲ء

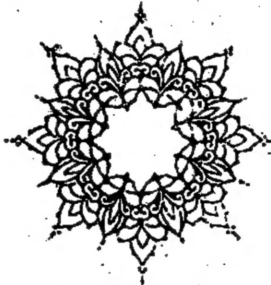

حرف آغاز

یہ ۱۳۷۷ھ کی بات ہے جب میں مادر علمی "دار العلوم دیوبند" کی مقدس آغوش میں "مشکوٰۃ شریف" کے خرمن درس کا خوشہ چین تھا۔ اور غالباً سہ ماہی امتحان کے موقع پر مشکوٰۃ شریف کے بعض مواقع کے حل کرنے کے سلسلہ میں "مظاہر حق" دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی یہ پہلا موقع تھا جب "مظاہر حق" کی زبان و بیان اور قدیم طرز تحریر کو دیکھ کر اس خواہش نے جنم لیا کہ اگر اس عظیم کتاب کی ادق زبان اور قدیم اسلوب و بیان کو موجودہ دور کی مہذب اور شگفتہ و سلیس زبان میں تبدیل کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ حدیث کے ان طلبہ کو اس سے بڑی آسانیاں ہو جائیں گی جو حل مشکلات کے سلسلہ میں اس سے مدد لیتے ہیں بلکہ عوام کا وہ طبقہ بھی اس اردو ترجمہ و شرح کے ذریعہ اس مقدس ذخیرہ "مشکوٰۃ شریف" سے اکتساب فیض کر سکتا ہے جو کہ احادیث نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے علوم و معارف کو اپنی روحانی تشنگی کی سیرابی کا باعث اور اخروی فلاح و نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

اس مقدس جذبہ اور تمنا کی یہ پہلی چنگاری تھی جس نے عزم و ارادہ میں ایک ہلکی سی رمق پیدا کی دن گزرتے رہے اور یہ تمنا بھی ارادوں کے سہارے پروان چڑھتی رہی۔ تا آنکہ گزشتہ سال دار العلوم کی تعلیمی زندگی سے فراغت کے بعد جب کچھ سکون قلب و دماغ اور وقت میسر آیا تو اس ارادہ نے عملی شکل اختیار کر لی۔

اور آخر کار اپنی قلمی کم مائیگی اور علم سے تہی دامنی کے احساس کے باوجود محض خدا کے فضل و کرم اور اس کی مدد کی امید کے سہارے اس عظیم اور اہم کام کی ابتدا کر دی گئی، جس کا پہلا نتیجہ اس وقت حاضر ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ خلف الرشید حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نواسہ اور ان کے جانشین حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ دہلوی کا ترجمہ مشکوٰۃ "مظاہر حق" کی اصل بنیاد ہے۔ شاہ اسحٰق کے تلمیذ رشید حضرت علامہ نواب محمد قطب الدین دہلویؒ نے اسی ترجمہ کو مزید اضافوں اور شروح کے ساتھ "مظاہر حق" کی آخری شکل دی تھی اور اب اس کا انتساب ان ہی کی ذات گرامی کی طرف ہوتا ہے۔

اب جبکہ "مظاہر حق" کی جدید ترتیب و تزئین کی گئی تو سب سے پہلا سوال اس کی اشاعت کا تھا اس لئے کہ یہ کتاب مشکوٰۃ شریف کے اصل متن کے ساتھ بڑے سائز کے سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی تھی پھر اس پر مزید شرح و حواشی کے اضافوں کی وجہ سے ضخامت نے اور زیادہ وسعت اختیار کر لی، چنانچہ نہ تو حالات کی مساعدت کہ اتنی ضخیم کتاب یکبارگی اشاعت پذیر ہو سکے اور نہ اس دور کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور ان کے مصروف اوقات اس کے مقتضی کہ ایسی عظیم کتاب بیک وقت خریدی جا سکے۔

اس لیے بسیار غور و فکر کے بعد یہ سہل اور سود مند طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس کتاب کو بالاقساط شائع کیا جائے۔ چنانچہ ہر دو مہینہ کے بعد اس کی ایک قسط "ادارۂ اسلامیات دیوبند" کی طرف سے شائع کی گئی ہے اور مستقل ممبران کی خدمت میں بہت کم قیمت سے ہدیہ کی جاتی رہی[1] اور یہ طریقہ کافی سود مند ثابت ہوا۔

ترتیب و تزئین کے سلسلہ میں اتنی بات عرض کر دینی ضروری سمجھتا ہوں کہ مصنف "مظاہر حق" نے احادیث کا ترجمہ بالکل لفظی کیا تھا اور اس کے ساتھ احادیث کی تشریح میں بہت زیادہ اختصار کے ساتھ کام لیا تھا، اسی طرح اکثر احادیث کو بغیر تشریح کے بھی چھوڑ دیا تھا، چنانچہ احقر نے نہ صرف یہ کہ ترجمہ بامحاورہ اور سلیس کیا ہے بلکہ تشریحات کو مزید صاف اور واضح کرتے ہوئے جدید ذہنوں کا خاص خیال رکھا ہے اور جہاں ضرورت سمجھی ان احادیث کی تشریح بھی کر دی ہے جن کے صرف ترجمہ ہی پر صاحب مظاہر حق نے اکتفاء کیا تھا، اس سلسلے میں مشکوٰۃ شریف کی دیگر شروح و تراجم اور حدیث کی دوسری اہم و مستند تصانیف کو سامنے رکھا گیا ہے اور ان سے مدد لی گئی لیکن پھر

---

[1] خدا کا شکر ہے کہ اب پاکستان میں مکمل کتاب پانچ جلدوں میں بیک وقت کتابت، طباعت، کاغذ و جلد بندی کے اعلیٰ معیار پر دار الاشاعت کراچی سے شائع ہو رہی ہے۔ (ناشر)

بھی اگر اس کی تشریحات و ترجمہ میں کسی قسم کی کوتاہی یا غلطی نظر آئے تو اس کا انتساب میری حقیر ذات کی طرف کیا جائے، اس بارہ میں اہل علم سے بطور خاص گزارش ہے کہ میرا قلم اگر حدیث کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکا ہو، یا صاحب مظاہر حق کے مطالب کو پورے حقوق کے ساتھ ادا نہ کر سکا ہو تو متنبہ فرمائیں اور اپنی گرانقدر رہنمائی سے مجھے معزز و مشرف فرمائیں۔

نظر ثانی: ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۰) کے شروع میں "مظاہر حق جدید" کی ترتیب و تسوید کا آغاز ہوا تھا اور یہ پہلی قسط منصۂ شہود پر آئی تھی، اب انیس سال کے بعد جب کہ یہ عظیم کتاب قسط وار ترتیب و اشاعت کی تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اس قسط کا نظر ثانی شدہ اڈیشن پیش کیا جارہا ہے، یہ ناکارہ اوائے مفہوم اور انداز بیان کی ان خامیوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہے جو پوری کتاب میں اور بالخصوص ابتدائی قسطوں میں کثرت سے موجود ہیں، ان شاء اللہ اب نظر ثانی کے ذریعہ اپنی فہم و لیاقت کی بساط بھر کوشش ان خامیوں اور غلطیوں کو دور کرنے میں صرف کی جائے گی۔

ذات بے نیاز نے اپنی رحمت بے حساب سے اس ناکارہ علم و عمل کو اپنی نصرت فرمائی، نوازش اور دستگیری سے جس طرح نوازا، اور "مظاہر حق جدید" کو شہرت و مقبولیت کی جو عظیم سرفرازی عطا فرمائی، اس کا کما حقہ، شکر ادا کرنے کی طاقت یہ بے مایہ قلم کہاں سے لائے، رب کریم اپنی رحمت بے حساب ہی سے اس ناکارہ و بے مایہ کی کوشش کو خلعت قبول سے سرفراز فرمائے اور حشر میں رسول عربی ؐ کے غلاموں کے غلاموں کی صف میں اٹھائے۔

عبداللہ جاوید

۳ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ جمعۃ المبارک

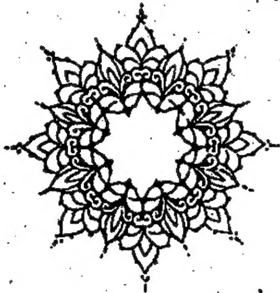

فہرست —— مظاہرحق جدید (جلد اوّل)

فہرست ـــــ مظاہر حق جدید (جلد دوم)

عنوان	صفحہ
ایمان کے بعد عافیت سے بہتر کوئی دولت نہیں	۶۰۶
سب سے بہتر دعا طلب عافیت ہے	۶۰۷
محبت الٰہی کی طلب کے لئے دعا، ایک عمدہ دعا	۶۰۷
علم و عمل کی دعا، نعمت و عزت کی دعا	۶۰۹
بینائی کے لئے دعا	۶۱۰
داؤد علیہ السلام کی دعا، ایک جامع دعا	۶۱۱
علم نافع و عمل مقبول و حلال رزق کی دعا	۶۱۳
شکر گزار ہونے کی دعا، صحت وغیرہ کی دعا	۶۱۳
خصائل بد سے بچنے کی دعا	۶۱۴
دنیا و آخرت کی عافیت اور عذاب سے نجات کی دعا مانگو	۶۱۴
غیر متحمل چیزوں کی دعا نہ مانگو	۶۱۵
باطن کی ظاہر سے بہتری اور ظاہر کی شائستگی کی دعا	۶۱۵

کتاب المناسک

افعال حج کا بیان

عنوان	صفحہ
	۶۱۶
حج کب فرض ہوا؟ حج کے احکام	۶۱۶
حج کے فرض ہونے کی شرطیں، حج کے فرائض	۶۱۷
حج کے واجبات	۶۱۸
حج عمر بھر میں ایک مرتبہ فرض ہے، کونسا عمل بہتر ہے؟	۶۱۸
صرف اللہ تعالیٰ کے لئے حج کرنے والے کی سعادت	۶۱۹
حج کا ثمرہ جنت ہے	۶۲۰
رمضان میں عمرہ کا ثواب	۶۲۰
نابالغ کو بھی حج کا ثواب ملتا ہے	۶۲۰
دوسرے کی طرف سے حج کرنے کا مسئلہ	۶۲۰
عورت، خاوند یا محرم کے بغیر حج کو نہیں جاسکتی	۶۲۲
عورتوں کا جہاد حج ہے	۶۲۲
خاوند یا محرم کے بغیر عورت کے سفر کی حد	۶۲۲
مواقیت حج، آنحضرتؐ کے حج و عمرہ کی تعداد	۶۲۶
حج و عمرہ کا فرق	۶۲۷
حج سے پہلے آپؐ نے دو عمرے کئے یا تین؟	۶۲۷
حج صرف ایک مرتبہ فرض ہے	۶۲۷
باوجود قدرت کے حج نہ کرنے والے کے لئے وعید	۶۲۸
حج علی الفور واجب ہے یا علی التراخی	۶۲۹
حج و عمرہ ساتھ کرنے کا حکم، حج کی شرائط	۶۳۰
حاجی کی صفت و کیفیت	۶۳۰
باپ کی طرف سے حج کرنے کی اجازت	۶۳۱
دوسرے کی طرف سے حج کرنے سے پہلے کیا اپنا حج کئے ہونا ضروری ہے؟	۶۳۱
مشرق والوں کی میقات	۶۳۲
میقات سے پہلے احرام باندھنا افضل ہے	۶۳۲
حج میں لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے اجتناب کرو	۶۳۳
عورتوں کا جہاد حج و عمرہ ہے	۶۳۳
بغیر عذر فرض حج نہ کرنے والے کے لئے وعید	۶۳۴
حج و عمرہ کرنے والے اللہ کے مہمان ہوتے ہیں	۶۳۴
حج کر کے واپس آنے والے سے سلام و مصافحہ کرو	۶۳۵
حج و عمرہ کی راہ میں مرجانے والے کو پورا ثواب ملتا ہے	۶۳۵
مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ	۶۳۵

احرام باندھنے اور لبیک کہنے کا بیان

عنوان	صفحہ
	۶۳۷
احرام میں خوشبو لگانے کا مسئلہ	۶۳۸
تلبید و تلبیہ	۶۳۸
تلبیہ کب کیا جائے؟	۶۳۹
تلبیہ کا ذکر اور حج کی قسمیں	۶۴۰
آنحضرتؐ کا حج احرام کے کپڑے، تلبید کا ذکر	۶۴۱
تلبیہ میں آواز بلند کرنے کا حکم	۶۴۲
لبیک کہنے والے کی فضیلت و عظمت	۶۴۲
احرام کے لئے دو رکعت نماز پڑھنا مسنون ہے	۶۴۳
تلبیہ کے بعد درود و دعا	۶۴۳

فہرست ـــــ مظاہر حق جدید (جلد سوم)

عنوان	صفحہ

کتاب الحدود

حدود کا بیان

چور کے ہاتھ کاٹنے کا بیان

فہرست ـــــ مظاہر حق جدید (جلد چہارم)

فہرست —— مظاہر حق جدید (جلد پنجم)

عنوان	صفحہ

مقدمہ

از

حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علم حدیث کی باضابطہ تدوین عہد نبوی ﷺ میں نہیں ہوئی حالانکہ اس کے برخلاف قرآن کریم کی باضابطہ تدوین وکتابت عہد نبوت میں خود آنحضرت ﷺ کے حکم سے ہوتی رہی ہے۔ جس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ قرآن کریم اپنے الفاظ ومعانی ہر دو کے اعتبار سے حق تعالیٰ جل شانہ کا نازل فرمودہ ہے، آپ کے اس کی کتابت پر بطور خاص توجہ فرمانے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے اعجازی الفاظ کا متبادل یا مترادف لانا طاقت بشری سے خارج ہے۔ ارشاد ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ۔ (الشعراء ۲۶: ۱۹۳، ۱۹۴)

"اس (قرآن کو) امانت دار فرشتہ "جبرئیل" لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔"

یا ارشاد فرمایا گیا:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۔ (القیامۃ ۷۵: ۱۷ تا ۱۹)

"ہمارے ذمہ (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کر دینا اور آپ کی زبان سے اس کا پڑھوا دینا (جب یہ ہمارے ذمہ ہے) تو جب ہم اسے پڑھنے لگا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے پھر اس کا بیان کروا دینا بھی ہمارا ذمہ ہے۔"

اور حدیث کلام رسول ہے اگرچہ معانی کے اعتبار سے وہ بھی ملہم من اللہ ہیں جیسا کہ خود نص صریح اس پر شاہد ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى ۔ (النجم ۵۳: ۳، ۴)

"اور نہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں۔ ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔"

یا حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ میں نبوت کے لب گویا سے جو چیز بھی سنتا تھا اس کو فوراً لکھ لیا کرتا تھا اور یہ لکھنا پڑھنے ہی کے لئے ہوتا تھا۔ لیکن مجھے بعض قریشیوں نے اس سے روکا اور کہا رسول اللہ ﷺ بشر ہیں، آپ بہت سی باتیں بحالت رضا، اور بہت سی باتیں بحالت غضب بھی فرماتے ہیں لیکن کل یہ سب کچھ دین شمار ہونے لگے گا اس لئے لکھنا مناسب نہیں، ابن عمرو فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے لکھنا بند کر دیا اور اس بات کا ذکر بارگاہ نبوت میں کیا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے دہان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، کہ "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اس منہ سے کوئی بات کسی حال میں خلاف حق نہیں نکل سکتی"۔

دوسری چیز یہ بھی تھی کہ عرب قوم اپنی ذکاوت ذہانت کے لحاظ سے جس عالمگیر امتیاز کی حامل تھی اس میں ان کی برابری کی کوئی قوم دعویدار بھی پیدا نہیں ہوئی۔ ہر چیز سن کر بجنسہ محفوظ کر لینا چونکہ نسلوں سے چلا آ رہا تھا اس لیے قوت حفظ، فصاحت وبلاغت اور انتقال ذہنی غیر معمولی بڑھ گیا تھا اس لئے اگر اس دور کے لحاظ سے قوت حافظہ پر اعتماد کو آج کے حفظ کی بے اعتمادی پر قیاس کیا جائے تو یہ قرین دانش نہیں کہلا سکتا۔

اسی وجہ سے قرون اولیٰ میں جناب رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال کی تا حد نہایت تحقیق وتجسس علم مجلسی کا رکن اساسی بن گیا تھا نیز

رواۃ حدیث کا حال عہد صحابہ وتابعین میں جس قدر خود رواۃ کے اہل شہر کو معلوم ہوتا تھا، دوسروں کو اس درجہ واقفیت کے وسائل فراہم نہیں تھے۔ پھر راویوں میں حجازی بھی تھے، شامی بھی تھے، عراقی بھی تھے اور مصری بھی تھے لیکن اختلاف مساکن کے باوجود ان میں سے ہر ایک کا شمار اعیان میں ہی ہوتا تھا۔

اس باب میں محدثین کے یہاں حجازی اسناد کو جس اہمیت اور اعتماد کا حامل سمجھا گیا ہے وہ بہر لحاظ دوسری اسناد سے ممتاز ہے امام مالکؒ نے جو سب سے پہلے حجازی اسناد کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے احکام شرعیہ پر مشتمل احادیث کو تدوین و ترتیب کے ساتھ جمع فرمایا جو "موطا امام مالک" کے نام سے معروف ومتداول ہے۔

پھر امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل بخاری کا دور آیا تو انہوں نے اپنی کڑی شرائط کی کسوٹی پر پرکھ کر نہ صرف حجازی عراقی اور شامی اسناد کی تمام روایات ہی کو لے کر علم حدیث کے دامن کو غیر معمولی وسعت بخشی بلکہ اخلاقیات، عقائد، عبادات، معاملات، عقوبات، تعبیر خواب تفسیر، قرأت وغیرہ کے ہر موضوع پر فراہم شدہ روایات کو اپنی جامع کے لئے وجہ امتیاز بنایا اور تمام عنوانات کے لئے مستقل ابواب قائم فرمائے اور آج یہ ہی کتاب اصح الکتب بعد کتاب اللہ بجا طور پر کہلاتی ہے۔

امام مسلمؒ بھی امام بخاریؒ کے نقش قدم پر چلے، البتہ شرائط قبول میں امام بخاریؒ کے مقابلے پر فی الجملہ تسہیل اور تکرار احادیث کو حذف کر کے مختلف اسناد کو یکجا جمع کر دیا، یہ حسن ترتیب اس درجہ مقبول ہوئی کہ بعض حضرات نے اس حسن ترتیب ہی کی وجہ سے مسلم کو بخاری پر ترجیح دی ہے لیکن واقعہ یہی ہے کہ صحت اسناد اور متنوع عنوانات وجامعیت کے لحاظ سے بخاری مسلم پر فائق تر ہے۔

تیسرے دور میں علم حدیث کے ممتاز حاملین میں ابوداؤد سجستانیؒ، ابوعیسیٰ ترمذیؒ اور ابوعبدالرحمٰن نسائیؒ صف اوّل میں نظر آتے ہیں البتہ ان حضرات کے یہاں بخاری و مسلم کی نسبت تنقید و اسناد میں تشدد بہت کم ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی نے کسی متروک العمل حدیث کو اپنی مصنفات میں ہرگز نہیں لیا۔

یہ چھ کتب ہیں یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد، مؤطا امام مالک اور نسائی کہ جو علم حدیث کی بنیادی اور اصل کتب میں شمار ہوتی ہیں اور طبقات اہل علم میں "صحاح ستہ" کے نام سے معروف ہیں۔

صاحب مشکوٰۃ علامہ ولی الدین ابوعبداللہ محمد ابن عبداللہ الخطیب التبریزی نے ۷۳۷ھ میں صحاح ستہ اور دیگر مشہور کتب حدیث میں جو احادیث قابل استناد اور قابل اعتماد سمجھی گئی ہیں ان کو اپنی کتاب میں جمع فرماکر امت کو ایک بہترین ہدیہ علمی سے استفادہ کا موقع دیا، "مشکوٰۃ المصابیح" کا ابتدائے عہد سے لے کر آج تک مقبول اور متداول رہنا مصنف علام کے حسن اخلاص پر ایک بین دلیل ہے۔ حدود ہند میں ایک طویل وقت وہ بھی گزرا ہے کہ یہاں مدار علم حدیث صرف مشکوٰۃ المصابیح اور مشارق الانوار سمجھی جاتی رہی ہیں۔ حجۃ الاسلام مولانا شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جب علم حدیث کی اشاعت پر توجہ صرف فرمائی اور ارباب علم کو دیگر عظیم کتب حدیث پر اطلاع ہوئی تب سے صحاح ستہ کے بعد مشکوٰۃ کا ثانوی مقام پیدا ہوا لیکن اس کے باوجود اس کی درسی اہمیت سے کبھی صرف نظر نہیں کیا گیا، آج بھی جب کہ صحاح ستہ اور دیگر لاتعداد علم حدیث کی کتابیں سرزمین وطن پر عام ہیں، مشکوٰۃ کی افادیت ناقابل انکار ہے اسی افادۂ عامہ نے ہر دور کے ارباب علم کو اس کتاب کی خدمت پر مجبور کیا۔ چنانچہ ملا علی قاری نے "مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح" شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "شرح مشکوٰۃ فارسی" اور "لمعات شرح مشکوٰۃ عربی" علامہ حسین ابن محمد بن عبداللہ الطیبی نے "طیبی شرح مشکوٰۃ" اور "مظاہر حق شرح مشکوٰۃ" (اردو) کے مؤلف نواب قطب الدین خان دہلوی تلمیذ شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلویؒ نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے متن مشکوٰۃ مع ترجمہ لکھ کر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی شرح مشکوٰۃ کا خلاصہ اردو زبان میں تحریر فرمایا جس کی اردو خواں حضرات کے لئے افادیت اس وقت سے آج تک ناقابل انکار رہی ہے، زبان وبیان کی قدامت بھی بسا اوقات افادیت کو مضمحل بنا دیتی ہے اور آج جبکہ دین اور علم دین سے برگشتگی کے دواعی اپنی قہرمانی قوتوں کے ساتھ مسلط ہیں، تو اہل نظر کی نظر میں ایسی خدمتوں کی اہمیت دو چند ہو جایا

کرتی ہے اور وہ اس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ حقائق دین کو وقت کے ان وسائل کے ذریعہ امت کے ذہن سے قریب تر کر دیں کہ جن کو کسی درجہ بھی عوامی ذہن نے اپنا رکھا ہے اور حقیقتاً خدام دین کے اسی جذبے نے حالات وقت کے برخلاف ان سے ناقابل انکار اور قابل صد ہزار تعجب عظیم خدمات انجام دلا دی ہیں۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ نوجوان عزیز مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری فاضل دیوبند نے ایک بڑی اور عوامی علمی اور دینی خدمت کے احساس کے تحت "مظاہر حق" ترجمہ وشرح مشکوٰۃ کو وقت کی صاف وسلیس زبان میں پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزم و ہمت میں برکت عطا فرمائے اور ان کی اس خدمت کو قبول ومقبول فرمائے۔ آمین!

احقر

محمد سالم

مدرس دار العلوم و ناظم ادارۂ تاج المعارف دیوبند

مؤرخہ

۸ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ مطابق یکم ستمبر ۱۹۶۰ء یوم پنجشنبہ

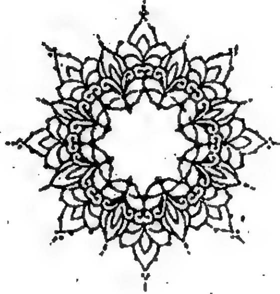

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(مصنف مظاہر حق کا دیباچہ حصول برکت کے لئے ان ہی کی زبان میں پیش کیا جارہا ہے)

الحمدللّٰہ الذی ارسل رسولہ الکریم لیھدینا الی الصراط المستقیم
وصلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی اٰلہٖ واصحٰبہ اجمعین ط

بعد اس کے مسکین محمد قطب الدین شاہ جہاں آبادی عرض کرتا ہے کہ کتاب مشکوٰۃ شریف علم حدیث میں عجب نافع کتاب ہے، کہ ہر مضمون کی حدیثیں اس میں مندرج ہیں اس کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاذ بزرگوار مولانا مخدومنا مکرمنا حضرت حاجی محمد اسحٰق نواسہ حضرت شیخ عبدالعزیزؒ کے نے بیچ زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا۔ مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جاوے بہتر ہے اس لئے اس ہیچمدان نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علیحدہ کرکر لکھا اور فائدے مختصر مناسب مقام کے شروح مشکوٰۃ وغیرہ سے مثل مرقاۃ شرح ملا علی قاری اور ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق اور حاشیہ جمال الدینؒ کے اور سوائے ان کے سے زیادہ کرکرکے خدمت عالی میں عرض کی اور جناب ممدوح نے بھی کچھ فائدے لکھے تھے تبرکا اس میں درج کیے اور نام اس کا "مظاہر حق" رکھا گیا کہ اس میں تاریخ اس کی نکلتی ہے۔ یا اللہ اس کو قبول فرما اور ہم سب کو اس سے دارین میں فائدہ مندکر اور سند اس کتاب مستطاب کی یہ ہے کہ کتاب اضعف العباد محمد قطب الدین بن محی الدین احراری الدہلوی غفراللہ لہمانے حضرت مخدومی معظمی مکرمی مولوی محمد اسحٰقؒ سے، اور انہوں نے پڑھی حضرت شیخ عبدالعزیزؒ سے اور ان کو اجازت ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے اور ان کو شیخ ابوطاھرہ مدنی رحمہ اللہ سے اور ان کو شیخ ابراہیم کردیؒ سے اور ان کو شیخ احمد قشاشیؒ سے اور ان کو شیخ احمد بن عبدالقدوس شناویؒ سے اور ان کو سید غضنفر بن سید جعفر نہروانیؒ سے اور ان کو شیخ محمد سعید معروف بمیر کلاںؒ سے کہ اپنے وقت میں شیخ مکہ کے تھے اور ان کو سید نسیم الدین میرک شاہؒ سے اور ان کو اپنے والد بزرگوار سید جمال الدین عطاء اللہ بن سید غیاث الدین فضل اللہ بن سید عبدالرحمٰن سے اور ان کو اپنے عم عالی مقدار سید اصیل الدین عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عبداللطیف بن جلال الدین یحیٰی شیرازی الحسنی سے اور ان کو مسند وقت اور محدث عصر شرف الدین عبدالرحیم الجرہمی الصدیقیؒ سے اور ان کو علامہ عصر امام الدین مبارک شاہ سادجی صدیقیؒ سے اور ان کو مؤلف کتاب ولی الدین محمد عبداللہ الخطیب التبریزیؒ سے۔

(یا اللہ مجھ کو اور ان سب کو بخش اور خطائیں ہماری معاف فرما)۔

حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل علی اللّٰہ توکلنا لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم ط اللھم صل علی سیدنا محمد واٰلہٖ واصحابہ صلوۃ تنجینا بھا من جمیع الاھوال والاٰفات و تقضی لنا بھا من جمیع الحاجات و تطھرنا بھا من جمیع السیئات و ترفعنا بھا عندک اعلی الدرجات و تبلغنا بھا اقصی الغایات من جمیع الخیرات فی الحیٰوۃ وبعد الممات ط انک علٰی کل شیئ قدیر ط

حدیث کی دینی و تشریعی حیثیت و اہمیت

نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے آخری پیغمبر اور رسول ہیں جنہوں نے خدائے تعالیٰ کے حکم سے دنیا والوں کو توحید، خدا پرستی اور ایمان و ایقان کی راہ سے روشناس کرایا۔ آپ کی بعثت مبارک ایسے وقت میں ہوئی جب کہ دنیا سے خدا پرستی اٹھ چکی تھی اور بت پرستی کا بول بالا تھا، خدائے وحدہ لاشریک کی پرستش کے بجائے پتھروں کے تراشے ہوئے فانی بتوں کے آگے انسان کی باعظمت پیشانی جھک رہی تھی، اچھی باتوں کو چھوڑ کر لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ حسن اخلاق اور بھلائی کی جگہ ظلم و تشدد اور فتنہ و فساد کا دور دورہ تھا، سلوک و احسان بہیمیت و بربریت کے آگے گھٹنے ٹیک چکے تھے۔

ایسے نازک اور سخت وقت میں خدا تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنی کتاب "قرآن مجید" دے کر دنیا والوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا، آپ ﷺ نے قرآن کی لافانی روشنی سے دنیا کو صحیح راستہ دکھایا۔ اس کی ابدی تعلیمات سے کفر و شرک کی اکڑی ہوئی گردنوں کو خدائے واحد کے سامنے لا جھکایا فسق و فجور میں گم انسانوں کو اخلاق و احسان کے شعور سے نوازا۔ ظلم و تشدد کے عادی حیوان نما انسانوں کو لازوال امن و آشتی اور محبت و موانست کے لالہ زار میں لا کھڑا کیا۔

اسی طرح آپ ﷺ نے اس دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا۔ ایسا انقلاب جو تمام عالم کے لئے باعث رحمت و راحت تھا اور ایک عالمگیر دین اس سرزمین پر پھیلایا۔ ایسا دین جو پوری انسانی برادری کے عین فطرت اور عین مزاج تھا۔

وہ دین کیا تھا؟ قرآن کریم اور اس کی عظیم ہدایت! اور وہ "عظیم انقلاب" تھا۔ آپ کی پاک تعلیمات اور آپ ﷺ کا مقدس اسوہ! جس کو "حدیث" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پوری اُمت اس پر متفق ہے کہ قرآن ایک جامع اور کامل ہدایت ہے جس میں اسلامی احکام و ہدایات اور شریعت اصولی و اساسی طور پر مذکور ہیں، نیز جس طرح "قرآن" اسلام کا اصولی رہنما اور دین کا دستور اساسی ہے اسی طرح وہ ظاہرًا اور معنیً ایک معجزہ بھی ہے۔

مطلب یہ کہ جس طرح ظاہرًا قرآن کی فصاحت و بلاغت و زبان و بیان کا اعجاز، الفاظ کی نشست و برخاست، جملوں کی ترکیب و ساخت نے قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ کے چیلنج کے سامنے دنیا والوں کی عقل و فہم کی جولانیوں کو ناکارہ اور فصحائے عرب کی فصاحت و بلاغت کو نکما کر دیا کہ قرآن کی ایک سورت یا ایک جملہ کی بھی کوئی مثال پیش نہ کر سکا اور نہ رہتی دنیا تک کوئی پیش کر سکتا ہے، اسی طرح اس کی معنوی وسعتوں اور ہمہ گیر گہرائیوں کے سامنے بھی انسانی ذہن و فکر عاجز ہے کہ قرآن جیسی جامع علوم و معارف اور حاوی احکام و اصول کتاب یا اس کے کسی جز جیسا کوئی جز بھی نہ کوئی پیش کر سکا اور نہ کوئی پیش کر سکتا ہے۔

یہ قرآن کا اعجاز ہی ہے کہ اس کی ایک ایک آیت اور ایک ایک حرف میں علوم و معارف کے بیکراں دریا کھنچے ہوئے ہیں جن کی وسعتوں اور گہرائیوں کا یہ عالم ہے کہ مسلسل چودہ صدی سے علوم و معارف اور حکمات و نکات کے بے پناہ ذخیرے مسلسل نکلتے چلے آرہے ہیں اور ہنوز ان کی تہ اور گہرائی کا کوئی پتہ نہیں۔ جس کی جامعیت کا یہ حال ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ لفظ سے بے شمار مسائل و احکام کا استنباط ہر دور میں کیا جاتا ہے پھر بھی اس کی ہمہ گیری شان، مزید چھان بین اور تحقیق و تدقیق کی متقاضی رہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اتنے بے شمار اور لفظ لفظ میں سموئے ہوئے علوم و معارف کا نکال لانا، آیتوں کے اجمال کی تفصیل کرنا، عموم میں تقیید کرنا، مراد کو واضح کرنا اور ابہام کو دور کرنا، ارکان و شرائط اور اسباب و موانع کی تفصیلات بیان کرنا، ہر باب کے غیر متناہی جزئیات کا تعین کرنا، فرائض و واجبات اور مستحبات و سنن کی تمام تفصیلات اور ان کے احکام بیان کرنا یہ تمام امور جو قرآن کی تفصیل و تشریح اور اس کی توضیح کے لئے ضروری تھے، عوام الناس کے ناقص فہم سے بلند و بالا تھے جہاں تک ان کی رسائی ناممکن تھی۔

اگر تمام دنیا کے انسان قل فاتوا بسورة من مثله کا چیلنج کا جواب اس لئے نہیں دے سکے اور قرآن جیسا کلام یا اس کے علوم جیسے

معارف اس لئے مثال کے طور پر بھی پیش نہیں کر سکے کہ ان کے محدود ذہن وذکاء اور علم و عقل میں وہ وسعت و گہرائی اور ہمہ گیری نہیں کہ قرآن جیسے معجزانہ کلام کا ان سے صدور ہو سکے، تو ان کی تنگیٔ فہم اور ذہن و فکر کی محدودیت اس قابل بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ قرآن کے معجزانہ بنیادی اور اصولی جملوں سے نکلتے ہوئے حقائق و معارف کا ادراک اور وجوہ معانی میں سے مراد و غیر مراد کا تعین محض اپنے فہم کے بل بوتہ پر کر سکیں۔

معلوم ہوا کہ جب قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اصول کی تشریح عام انسان کی عقل و فہم سے بعید ہے تو لامحالہ قرآن کے معنی و مطالب اور اس کی مراد حاصل کرنے کے لئے رسول ﷺ کی توضیح و تشریح اور آپ کے ارشادات کا محتاج ہونا نیز انہیں اپنے لئے قرآنی فہم کے لئے رہبر ماننا ضروری ہوگا کیونکہ اگر قرآن کی حیثیت اس درجہ کی ہوتی کہ ہر کس و ناکس اس کے معنی و مقصود کو بغیر کسی رہنمائی اور روشنی کے حاصل کر سکتا تو رسول ﷺ کی بعثت نعوذ باللہ ایک حد تک غیر ضروری قرار پا جاتی، بلکہ یہ ہوتا کہ قرآن کریم سرچشمہ ہدایت براہ راست دنیا میں اتار دیا جاتا اور ہدایت چاہنے والے اس سے خود استفادہ کر لیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہدایت کے لئے رسول کی بعثت ایک لازمی اور ضروری چیز ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ بغیر رسول کی رہنمائی اور واسطہ کے کتاب اللہ سمجھی جا سکے اور ہدایت کا مقصد حاصل ہو سکے، اسی لئے خداوند قدوس جب اپنی کتاب کو رسول پر نازل کرتا ہے تو پہلے اس کے مقاصد و مطالب فرشتہ کے ذریعے اس پر واضح کر دیتا ہے اور اس کے رموز و کنایات اور حکمات کو بذریعہ وحی منکشف کر دیتا ہے۔ پھر رسول اس پر مامور کیا جاتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق کو کتاب کی تعلیم دے اور اس کی تشریح و توضیح کر کے ہدایت کو عام کرے، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسان بن عطیہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ:

کان الوحی ینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویحضرہ جبریل بالسنۃ التی تفسر ذلک۔

(ترجمان السنۃ ۱/ ۱۲۳)

"آنحضرت ﷺ پر وحی آیا کرتی تھی اور جبریل آپ کے پاس وہ سُنت لے کر آیا کرتے تھے جو اس کی تفسیر کر دیتی تھی۔"

خود قرآن کریم سے ثابت ہے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت کا بڑا مقصد یہ ہے کہ کلام اللہ کی پہلے خود تلاوت کریں پھر اس کی تعلیمات سے دنیا والوں کو روشناس کرائیں اور اس کے معنی و مطالب دنیا پر واضح کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (آل عمران آیت ۱۶۴)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر بڑا احسان و کرم کیا جب کہ ان میں انہیں میں سے پیغمبر بھیج دیا جو ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و عقل کی باتیں سکھاتا ہے۔"

گویا آپ ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں کلام اللہ کی تلاوت اور اس کی تعلیم و تعلّم ہی ایک عظیم مقصد ہے۔ نہ صرف یہ مقصد ہے بلکہ حاصل نبوت ہے اس لئے کہ نبی اُمت کی ہدایت کتاب کی تعلیم کی روشنی ہی میں کر سکتا ہے۔ بارگاہ الوہیت سے جو فرمان اور جو احکام بذریعہ وحی کتاب کی شکل میں آتے ہیں اسی کو اُمت تک پہنچانا اور اس پر پہلے خود عمل کر کے دنیا والوں کو عمل کرانا ہی دراصل نبی کا فریضہ ہے۔ مصلح اور ہادی کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ قوم کی ہدایت کرے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے اس تعلیم پر خود عمل کرے جس کے ذریعہ وہ اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے پھر دوسروں کو عمل کرنے کی دعوت دے۔ اسی کو باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی یہ شان ہے کہ ہماری جانب سے جب کوئی حکم یا فرمان پہنچتا ہے تو حضور ﷺ پہلے اس کو پڑھتے ہیں، اس کو سمجھتے ہیں، مرادات خداوندی کو حاصل کرتے ہیں اور اس پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے ہیں، پھر اس تعلیم کو اُمت کے سامنے رکھتے ہیں۔ خدا کی جانب سے آئے ہوئے احکام کو

پہنچاتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ پہنچاتے ہیں بلکہ تشریح و توضیح، اور اس کی تفصیل اپنے عمل سے اپنے فعل سے، اپنے قول سے کرتے ہیں تاکہ قوم کو اس پر عمل کرنا آسان و سہل ہو جائے۔

اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ رسول قرآن کی تشریح کرے اور اس کے مطالب و مفہوم کو بیان کر کے مراد و مقصد کا تعیّن کرے بلکہ صرف عام انسانی عقل و فہم پر اسے چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً وہ لوگ جن کی ہدایت کے لئے قرآن نازل کیا گیا تھا زندگی بھر اس کی مراد کو نہ پاسکتے اور نہ اس کے مطالب و مقاصد حاصل کر سکتے اور قرآن کریم جو سرچشمہ ہدایت ہے اور صرف عمل کے لئے نازل کیا گیا تھا محدود انسانی ذہن و فکر کے لئے دماغی کد و کاوش کا مشغلہ بن کر رہ جاتا جس کے نتیجہ میں نسل انسانی ان مدارج اور ترقیات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی جو قرآن کی ہدایت کے ذریعہ ان کے لئے مقدر ہو چکی تھیں۔

چنانچہ آیت بالا سے یہی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ایمان والوں پر یہ احسان کیا کہ ایمان جیسی دولت اور قرآن جیسی ہدایت سے نوازا، وہیں یہ بھی انعام فرمایا کہ خود انہیں اپنی منزل کی راہ تلاش کرنے کی ذمہ داری نہیں سونپی بلکہ ان میں سے ایک رسول بھیج دیا، جس نے منزل تک ان کی رہنمائی کی اور پھر قرآن نازل کر کے اس کے مراد کے تعیّن اور اس کے مقاصد کی وضاحت کا بار بھی انسان کے ضعیف عقل و فہم پر نہیں ڈالا بلکہ عالم کے سب سے بڑے معلّم کو ان کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ قرآن کی تعلیم دے۔ اور اس کے معنی و مطالب اور مقاصد سے دنیا والوں کو آگاہ کرے۔ حدیث کا قرآن کی شرح اور اس کا بیان ہونا قرآن اور زیادہ وضاحت سے ثابت کر رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل ۱۶: ۴۴)

''ہم نے قرآن آپ پر اس لئے اتارا کہ آپ لوگوں کے لئے اس کتاب کے معنی و مطالب بیان فرمائیں کہ جو ان کی ہدایت کے لئے اتاری گئی تاکہ لوگ اس میں غور و فکر کر سکیں۔''

یعنی اے محمد ﷺ! ہم نے یہ کتاب جو آپ پر اتاری ہے وہ جس طرح تمام انبیاء کرام کے صحیفوں کی اجمالی یادداشت ہے اسی طرح وہ شریعت اسلامی کا دستور اساسی ہے جس میں دین و شریعت کے احکام و مسائل اور علوم و معارف اعجازی شان سے اس کے ایک ایک لفظ اور سطر میں سموئے ہوئے ہیں چونکہ ہر شخص ان کی گہرائی اور حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے اس کے بیان و تفصیل اور تشریح کی ذمہ داری بھی آپ ﷺ ہی کو سونپی جا رہی ہے اس لئے کہ آپ پر اس کے تمام رموز و نکات اور اسرار و حکم بذریعہ وحی منکشف کر دیئے جاتے ہیں اور ہم نے آپ ﷺ کو حقیقت شناسی اور جزرسی کی وہی طاقت و قوت دی ہے جو اس کے شارح کو ملنی چاہئے، نیز چونکہ آپ کے ذہن و فکر اور عقل و فہم کی تربیت ہم نے بطور خاص اسی لئے کی ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ اس کے مشکلات کی شرح اس کے علوم کی تفسیر اس کے مرادات کا تعیّن، اس کے مسائل و احکام کا استنباط کیجئے اور مرادات خداوندی کا اظہار فرما کر عمل کی راہ پیدا کیجئے۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن عرب میں نازل کیا گیا تھا جہاں کی مادری زبان ہی عربی تھی لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ''جب قرآن کے اصل مخاطب عرب تھے اور قرآن جن کے سامنے اپنی دعوت پہلے پیش کر رہا تھا وہ باعتبار زبان و لسان کے فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر تھے تو ان کو قرآن کی تشریح و توضیح یا اس کی تفصیل کرنے کے لئے کسی دوسرے کی ضرورت نہیں تھی'' ناسمجھی کی بات ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی ناسمجھ شخص یہ کہہ دے کہ جب آئین سازوں نے اصولی طور پر ایک دستور اساسی مرتب و منظور کر کے ملک پر لاگو کر دیا ہے تو پھر اس دستور کے ہوتے ہوئے قانون ساز اداروں کے ان ذیلی قوانین اور سربراہ مملکت کے جاری کردہ ان فرامین و ہدایات کی کوئی ضرورت نہیں ہے جن سے حکومت کی مشینری چل رہی ہے اور جو مستقل الگ کوئی قانون نہیں ہوتے۔ بلکہ اسی دستور اساسی کی تشریح و توضیح اور اس کی تفصیل ہوتے ہیں، ظاہر ہے اس طرح کی بات اس شخص کے دماغ میں آسکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ علم و عقل سے کوسوں دور، بلکہ ماحول اور حالات سے قطعًا نا آشنا بھی ہو اور پھر یہ تو مادی اور انسانی قانون ہے جو انسانی دماغ کا اختراع ہوتے ہیں

لیکن یہ آسمانی دستور اساسی یعنی قرآن تو خدائے تعالیٰ کا براہ راست اتارا ہوا نظام حیات اور قانون ہے جس کے بارے میں پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ کتاب نہ صرف الفاظ کے اعتبار سے اعجازی حیثیت رکھتی ہے بلکہ معنوی حیثیت سے بھی معجزہ ہی معجزہ ہے جس کے ایک ایک لفظ کی گہرائی میں علوم و معارف اور احکام و مسائل کے وہ گراں بہا خزانے پوشیدہ ہیں جن تک انسانی ذہن و فہم کی رسائی ناممکن ہے۔

حدیث کی اسی صفت بیان و توضیح کے پیش نظر امام مکحول کا قول امام اوزاعی سے منقول ہے کہ:

الکتاب احوج الی السنة من السنة الی الکتاب۔ (ترجمان السنة ۱/۱۳۲)

"کتاب اللہ سُنّت کی طرف زیادہ محتاج ہے بہ نسبت سُنّت کے کتاب اللہ کی طرف۔"

حافظ ابو عمرؒ اس مقولہ کی یہ تشریح کرتے ہیں کہ:

یرید انها تقضی علیه و تبین المراد منه۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ سُنّت قرآن کی مراد بیان کرتی ہے۔"

امام شاطبیؒ بھی اس قول کی توضیح کرتے ہوئے آخر میں یہی لکھتے ہیں کہ:

فکان السنة بمنزلة التفسیر و الشرح لمعانی احکام الکتاب۔ (ترجمان السنة ۱/۱۳۴)

"گویا سُنّت کتاب اللہ کے احکام کے لئے بمنزلہ تفسیر اور شرح کے ہے۔"

اس تفصیل نے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن کی تفصیل و تشریح جو حدیث و سُنّت کی صورت میں ہے، وہ منجانب اللہ ایک فریضہ تھا جس پر آنحضور ﷺ کو مامور کیا گیا تھا جس سے آپ ﷺ ذمہ دارانہ طور پر عہدہ برآ ہوئے، لہٰذا نبی کریم ﷺ کی اسی تفصیل و تشریح کا نام خواہ بصورت قولی یا فعلی، یا بصورت تقریر، قرآن کی اصطلاح میں "بیان" ہے جو لتبیین للناس مانزل الیھم سے مستنبط ہوتا ہے اور خود آنحضرت ﷺ کی اصطلاح میں "حدیث" اور "سنت" ہے جو آنحضور کے ارشاد حدثوا عنی الخ اور علیکم بسنتی الخ سے مفہوم ہوتا ہے۔

نیز قرآن اور مذکورہ بالا اقوال سے یہ ثابت ہوگیا کہ حدیث دراصل قرآن کی شارح ہے کیونکہ قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کی شرح قرآن اگر اصول ہے تو حدیث اس کی تفصیل، لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ حدیث مبہمات قرآنی کے لئے ایضاح ہے، مجملات قرآنی کے لئے تفصیل ہے مشکلات قرآنی کے لئے تفسیر ہے اور مخفیات قرآنی کے لئے اظہار ہے۔

گویا حدیث کے بغیر یہ ناممکن ہے کہ عام ذہن و فکر کی رسائی قرآن حکیم کے مضمرات، مرادات اور رموز و کنایات تک ہو جائے، اس لئے ہمارا عقیدہ ہے کہ:

"جس طرح نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس تمام دنیا کے لئے مینارۂ نور اور آپ ﷺ کا وجود پورے عالم کے لئے رحمت ہے اسی طرح آپ ﷺ کی حدیث، آپ ﷺ کی سنت، آپ ﷺ کا مقدس اسوہ، اُمت کے لئے مشعل ہدایت ہے اور آپ ﷺ کے اقوال و ارشادات پر عمل، آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی باعث سعادت اور کلید جنّت ہے۔"

حدیث کی حجیت: "ایمان باللہ" اور "ایمان بالرسول" شریعت اسلامی کی بنیاد کے یہ دو ستون ہیں یعنی مؤمن و مسلمان بننے کے لئے جس طرح خدا کی وحدانیت اور اس کی الوہیت پر یقین کامل اور اس کی تمام صفات پر اعتقاد راسخ ضروری ہے اسی طرح رسول پر ایمان لانا اور اس کی رسالت و نبوت کی صدق دل سے تصدیق کرنا بھی لازم ہے۔

رسول پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد و یقین ہو کہ رسول خدا کا برگزیدہ اور سب سے محبوب بندہ ہے جس کو خدا نے

انسانوں کی ہدایت کے لئے اپنی کتاب دے کر اس دنیا میں مبعوث کیا ہے۔ نیز تکمیل ایمان کے لیئے اس اعتقاد ویقین کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ رسول کی پوری پوری اطاعت وفرمانبرداری کی جائے۔ وہ جو حکم دے اس کو بلا چون وچرا مانا جائے۔ وہ جو فیصلہ کرے اس پر سر تسلیم خم کر دیا جائے اور اس کی بتائی ہوئی تعلیمات اور اس کے لائے ہوئے اسوہ پر بلا شک وشبہ عمل کرنا مدار نجات جانا جائے۔

مَآ اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ (الحشر ۵۹:۷)

"رسول (ﷺ) نے جو کچھ تمہیں دیا ہے، پکڑے رہو اور جس سے انہوں نے روکا ہے رک جاؤ۔"

قرآن میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، وہیں رسالت پر ایمان لانے کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتَابِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتَابِ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ط وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔ (النسآء ۴:۱۳۶)

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ (یعنی اپنے ایمان پر مضبوطی سے قائم رہو) اللہ اور اس رسول (ﷺ) پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری (اور یاد رکھو کہ) جو انکار کرے گا اللہ تعالیٰ کا اور ملائکہ کا اور اس کی کتابوں کا اور اس رسولوں کا اور یوم آخرت کا تو وہ دور کی گمراہی میں پڑے گا۔"

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ ط۔ (النسآء ۴:۱۵۲)

"اور جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر اور ان میں کوئی تفریق نہ کی، وہی لوگ ہیں کہ عنقریب اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اجر دے گا۔"

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ (الحجرات ۴۹:۱۵)

"مؤمن بس وہی ہیں جو یقین رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر۔"

وَمَنْ لَّمْ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَعِیْرًا۔ (الفتح ۴۸:۱۳)

"اور جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے تو ہم نے ان منکروں کے لئے دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔"

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّکُمْ۔ (النسآء ۴:۱۷۰)

"اے لوگو! بے شک تمہارے پاس حق کے ساتھ رسول آیا، پس اس پر ایمان لاؤ (کیونکہ) اسی میں تمہارے لئے بھلائی ہے۔"

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جس طرح خدا تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اس کے رسول اور اس کی بھیجی ہوئی کتاب پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا بھی لازم ہے اور جو لوگ خدا اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتے یا رسول کی تصدیق نہیں کرتے وہ کافر ومنکر ہیں جن کے لئے خدا کی جانب سے سخت عذاب اور دائمی خسران ونقصان کی وعید ہے۔

نیز جس طرح آنحضرت ﷺ کی رسالت کی تصدیق اور آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کی قرآن نے پرزور دعوت دی ہے اسی طرح آنحضور ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کی بھی تاکید کی ہے اور آپ ﷺ کے ہر فیصلہ وحکم کو ماننا ایمان کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ۔ (محمد ۴۷:۳۳)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا حکم مانو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔"

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (الانفال ۸:۱)

"اور اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول کا حکم مانو، اگر تم ایمان والے ہو۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ (الانفال ۸:۲۰)

"اے ایمان والو! حکم مانو اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول کا اور منہ نہ پھیرو اس سے درانحالیکہ تم سنتے ہو۔"

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء ۴:۸۰)

"جس نے رسول کا حکم مانا تو بلاشبہ اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ (النساء ۴:۵۹)

"اے ایمان والو! حکم مانو اللہ تعالیٰ کا اور حکم مانو رسول کا اور اپنے میں سے حاکموں کا پس اگر جھگڑو تم کسی بات میں تو رجوع کرو اللہ (تعالیٰ) اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف۔"

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء ۴:۶۵)

"پس قسم ہے آپ کے پروردگار کی کہ وہ مؤمن نہیں ہوسکتے تاوقتیکہ وہ اپنے آپس کے نزاع میں آپ کو حکم نہ بنائیں (اگر وہ آپ کو حکم بنالیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) وہ آپ کے فیصلہ سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں گے اور اس کو پورا پورا تسلیم کرلیں گے۔"

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب ۳۳:۳۶)

"کسی ایمان والے مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کوئی حکم دے دیں تو ان کو اپنے معاملہ کا اختیار باقی رہے اور جو نافرمانی کرے گا اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی تو وہ بلاشبہ کھلا ہوا گمراہ ہوگیا۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ ایمان کے بارے میں تین چیزوں کو ضروری قرار دے رہے ہیں۔

❶ خدا کی ذات اور اس کے ملائکہ اور کتاب پر ایمان لانے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے رسول کی رسالت اور نبوت پر پورا پورا ایمان لایا جائے۔ اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ پر ایمان نہیں لاتا یا آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق نہیں کرتا تو وہ مؤمن نہیں ہے۔

❷ خدائے تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری ضروری ہے اگر کوئی شخص نبی کریم ﷺ کے احکام مان رہا ہے یا آپ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے تو گویا وہ خدا تعالیٰ کی بھی اطاعت وفرمانبرداری کررہا ہے اگر کوئی آنحضور ﷺ کی اطاعت نہیں کرتا اور آپ ﷺ کے احکام سے روگردانی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا تعالیٰ کی اطاعت نہیں کررہا ہے اور خدائے تعالیٰ کے احکام سے روگردانی کررہا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے احکام کو نہیں مانتا یا اس کی اطاعت نہیں کرتا وہ ضلالت وگمراہی میں پڑا ہوا ہے۔

❸ اگر آپس میں جھگڑا ہو یا باہمی نزاع کی شکل ہو تو مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ اور خدا تعالیٰ کے رسول کی طرف رجوع کریں، خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی روشنی میں اپنے جھگڑوں کا تصفیہ کریں، رسول کی طرف رجوع کے یہ معنی ہوں گے

کہ رسول کو اپنا حکم بنائیں اور رسول جو کچھ فیصلہ کرے اس کو تسلیم کریں اور رسول کے فیصلہ کے بعد کسی کو چوں وچرا کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ایمان کی علامت یہی ہے کہ اپنے جملہ نزاعات اور اپنے اختلاف میں نبی کریم ﷺ کو ایسا حکم اور فیصلہ کن قرار دے کہ آپ ﷺ کے فیصلہ کے بعد کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے اور اس فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے۔

لہٰذا اس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ تکمیل ایمان کے لئے خدا کی ذات اور اس کے ملائکہ و کتاب پر ایمان لانے کے ساتھ رسول کی رسالت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے وہیں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جس طرح کتب الٰہیہ جو خدا کی جانب سے بندوں کی ہدایت کے لئے رسول پر نازل کی جاتی ہیں، اور ملائکۃ اللہ کی وحی جو خدا کا پیغام پیغمبروں تک پہنچاتی ہے شریعت میں حجت ہے اسی طرح انبیائے کرام کے ارشادات بھی قطعاً حجت ہیں۔ کیونکہ جس شے پر ایمان لانا ضروری اور لازم قرار دیا جا رہا ہو وہ حجت ہوگی، اسی طرح نبی کے فیصلے اور احکام بھی حجت ہوں گے کیونکہ خدائے تعالیٰ کا بندوں کو بار بار حکم دینا کہ تم اپنے تمام نزاعات اور اختلافات میں رسول کو حکم بناؤ اور ان کے فیصلوں کو تسلیم کرو اور وہ جو حکم دیں ان پر عمل کرو خود ان کی حجیت کو ثابت کر رہا ہے۔

اگر آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال اور احکام حجت نہ ہوتے تو نہ تو رسول کی رسالت پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا جاتا اور نہ ان کے احکام کی پیروی کو ایمان کی علامت بتایا جاتا اور یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ ایمان اسی شے پر لایا جا سکتا ہے جو حجت قاطعہ ہو اور اطاعت و فرمانبرداری اسی چیز کی کی جا سکتی ہے جو واجب التسلیم ہو، اگر وہ شے جس پر ایمان لایا جا رہا ہے یا جس کی پیروی کی جارہی ہے حجت قاطعہ اور واجب التسلیم نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس پر ایمان لانے یا اس کی پیروی کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہوتے۔

نیز اگر یہ مان لیا جائے کہ نبی کا افعال واقوال جن کے مجموعہ کا نام "حدیث" ہے شریعت اسلام میں حجت نہیں ہیں تو وہ لوگ جو نبی کو نہیں مانتے یا نبی کے اقوال و افعال کی پیروی نہیں کرتے ان کو کافر نہیں کہنا چاہئے اس لئے کہ جو چیز حجت نہیں ہے اور جس کا واجب التسلیم ہونا یقینی نہیں ہے، ان کے انکار کو کفر کیسے مستلزم ہو سکتا ہے حالانکہ آیات قرآنی میں ان لوگوں کو صفائی کے ساتھ کافر اور گمراہ کہا جا رہا ہے جو نبی کے احکام کی پیروی نہیں کرتے یا اس کے فیصلوں کو جو اقوال کی شکل میں ہوتے ہیں واجب التسلیم نہیں مانتے۔

پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے ساتھ نبی کے بتائے ہوئے احکام، ان کی تعلیمات وہدایات اور ان کے ارشادات جن کو "حدیث" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے شریعت میں مستقل حجت ہے، لہٰذا اس کو ماننا اور اس کو واجب التسلیم جان کر اس پر عمل کرنا جزو ایمان ہے اور اس سے اعراض کرنا یا اس کی حجیت سے انکار کرنا یا اس کو قابل رد جاننا کفر و نفاق اور ضلالت کو مستلزم ہے جس کے بارے میں خداوند کریم اعلان کر رہا ہے۔

فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا۔ (القرآن الحکیم)

"ہم نے ان منکروں کے لئے دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔"

حدیث کی تدوین وکتابت: اگر تاریخ و سیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حدیث کی کتابت اور اس کی تدوین وترتیب نبی کریم ﷺ کی حیات مبارک ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ آپ ﷺ کے اقوال و ارشادات صحابہ قلمبند کیا کرتے تھے اور احادیث مبارکہ کو لکھ کر ان کو حفاظت سے اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ جو درس گاہ نبوت کے جلیل القدر طالبعلم اور بارگاہ رسالت میں ہمہ وقت کے حاضر باش خادم تھے آنحضرت ﷺ کی احادیث کثرت سے روایت کرتے ہیں ان کے پاس احادیث نبوی کا سرمایہ سب سے زیادہ تھا اور وہ خود بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ میں عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس مجھ سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی احادیث محفوظ نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ حضرت ابوہریرہؓ یہی بیان کرتے ہیں کہ۔

فانه کان یکتب ولا اکتب۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۲)

وہ احادیث کو لکھا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ ہی کے بارہ میں حضرت ابوہریرہؓ کا ایک دوسرا بیان ہے کہ:

فانی کنت اعی بقلبی و کان یعی بقلبه و یکتب بیده۔ (طحاوی ج ۲ ص ۳۸۴)

عبداللہ بن عمروؓ (آنحضرت ﷺ کی احادیث) لکھا بھی کرتے تھے اور ان کو حفظ بھی کیا کرتے تھے اور میں صرف یاد ہی کر لیا کرتا تھا، لکھتا نہ تھا۔

پھر روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ کا حدیث کی کتابت کرنا ازخود نہ تھا بلکہ آنحضرت ﷺ سے انہوں نے باقاعدہ کتابت حدیث کی اجازت لی تھی جب بارگاہ رسالت سے اجازت مل گئی اور آپ ﷺ کا ایماء ہوا تو آپ ﷺ کے ارشادات کو صحابہ لکھنے لگے چنانچہ ابوہریرہؓ کی اسی روایت کے آخری الفاظ یہ ہیں:

استاذن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فی ذلک فاذن له۔

انہوں نے (یعنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے) کتابت حدیث کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی تھی۔

اسی طرح خود عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قید العلم قلت وما تقییده؟ قال الکتابة۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۶۰)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ علم کو مقید کرو۔ میں نے عرض کیا کہ علم کو مقید کس طرح کیا جاسکتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو لکھ کر (محفوظ کر لیا جائے)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کتابت حدیث کے سلسلہ میں خود اپنا واقعہ بیان فرما رہے ہیں کہ:

کنت اکتب کل شئی اسمعه من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ارید حفظه فنهتنی قریش وقالوا اتکتب کل شیئ تسمعه ورسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بشر یتکلم فی الغضب والرضاء فامسکت من الکتابة۔ فذکرت ذلک الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فاوما باصبعه الی فیه فقال اکتب فوالذی نفسی بیده ما یخرج منه الا الحق۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۵۷)

"میں جتنی باتیں آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سنتا تھا یاد رکھنے کے لئے ان کو لکھ لیا کرتا تھا میرے اس طرز عمل کی جب قریش کو خبر ہوئی تو انہوں نے مجھے منع کیا اور کہا کہ تم ہر چیز کو جو رسول اللہ ﷺ سے سنتے ہو لکھ لیا کرتے ہو۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ آدمی ہیں، آپ ﷺ غصہ کی حالت میں بھی ہوتے ہیں اور خوشی کی حالت میں بھی، لہٰذا میں لکھنے سے رک گیا اور اس کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ لکھو اور اپنے دہان مبارک کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا "خدا کی قسم اس سے کسی حالت میں بھی ناحق اور غلط بات نہیں نکل سکتی"۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے علاوہ دوسرے صحابہؓ نے بھی جب آنحضرت ﷺ سے کتابت حدیث کی اجازت لی تو آپ ﷺ نے ان کو اجازت مرحمت فرمائی چنانچہ ایک صحابی حضرت رافع بن خدیجؓ کا بیان ہے کہ ہم نے بارگاہ نبوت میں درخواست پیش کی کہ یارسول اللہ! ہم آپ ﷺ کی زبان مقدس سے بہت سی چیزیں سنتے ہیں اور اس کو قلمبند کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے اس عمل کے بارہ میں آپ ﷺ کی کیا رائے ہے؟ یعنی ہم آپ ﷺ کے ارشادات کو لکھتے رہیں یا نہیں؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اکتبوا ولا حرج۔ (کنز العمال ج ۵ ص ۲۲۳)

"لکھتے رہو اس میں کوئی حرج نہیں۔"

نیز حضرت انس ؓ سے منقول ہے کہ:

ایک شخص دربار رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے آپ ﷺ کی احادیث یاد نہیں رہتیں تو آنحضرت ﷺ نے اس کو حکم دیا:

استعن بیمینک۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۶۰)

"اپنے ہاتھ سے مدد لو یعنی لکھ لیا کرو۔"

بہر حال ان منقولات کی روشنی میں یہ بات صاف ہوگئی کہ آنحضرت ﷺ کی حیات ہی میں حدیث کی کتابت شروع ہوگئی تھی اور آپ ﷺ کے ارشادات مبارکہ و احادیث مقدسہ کی حفاظت کے لئے متعدد صحابہ نے ان کو قلمبند کرنا شروع کر دیا تھا اور آپ ﷺ جو کچھ فرماتے یا جو احکام دیتے صحابہ ان کو لکھ کر محفوظ کر لیا کرتے تھے۔

یہ تو خیر صحابہ کا عمل اور ان کا طریقہ تھا، خود نبی کریم ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے مسائل و احکام پر مشتمل کچھ مجموعے تیار کرا کر اپنے عمال کو اور دوسری جگہوں پر بھیجنے کا حکم فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے ترمذی میں روایت ہے کہ "آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے عاملوں کے پاس بھیجنے کے لئے ایک کتاب الصدقۃ لکھوائی تھی جس میں جانوروں کی زکوٰۃ سے متعلق احادیث تھیں لیکن ابھی عاملوں کے پاس پہنچنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ آپ ﷺ کی وفات کا سانحہ پیش آگیا۔ جب حضرت ابوبکر ؓ آپ ﷺ کے جانشین ہوئے تو انہوں نے اس پر عمل کیا"۔ (ج ۱ ص ۹۹)

نیز حضرت عبداللہ بن عکیم ؓ سے منقول ہے کہ:

اتانا کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تنتفعوا من المیتۃ باھاب ولا عصب۔ (ترمذی ج ۱ ص ۲۰۶)

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں آپ کا ایک نوشتہ مبارک ہمارے (قبیلہ کے) پاس پہنچا جس میں یہ حدیث بھی تھی کہ مردار جانوروں کی (بے پکائی ہوئی) کھال اور پٹھے کو کام میں مت لاؤ۔

طحاوی شریف کی ایک روایت ہے کہ:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتب الی اھل الیمن بکتاب فیہ الفرائض والسنن والدیات وبعث بہ مع عمرو بن حزم۔ (۲/۴۱۷)

آنحضرت ﷺ نے ایک صحیفہ لکھوا کر عمرو بن حزم ؓ کے ہاتھ اہل یمن کے پاس بھیجا تھا، اس نوشتہ میں فرائض و سنن اور خون بہا کے مسائل تھے۔

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد جب صحابہ کا دور آیا تو اس وقت حدیث کی کتاب اور تدوین کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا چنانچہ صحابہ ؓ نے آپ ﷺ کے ارشادات کو جمع کرنے اور ان کی حفاظت کرنے میں پورے انہماک کا ثبوت دیا۔ حضرت ابوہریرہ ؓ کے بارہ میں معلوم ہو چکا ہے کہ انہوں نے آنحضور ﷺ کی زندگی میں حدیث کی کتابت نہیں کی لیکن آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کے تمام ارشادات اور احادیث کی حفاظت کے لئے ان کو انہوں نے لکھ کر یا دوسرے سے لکھوا کر ایک نوشتہ میں محفوظ کر لیا تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ کا بیان ہے کہ:

تحدث عندابی ھریرة بحدیث فاخذ بیدی الی بیته فارانا کتبا من حدیث للنبی صلی اللّٰہ علیه وسلم وقال ھذا ھو مکتوب عندی۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۱۴۸)

"ابوہریرہؓ سے حدیث کے بارے میں گفتگو ہوئی تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور حدیث نبوی کی کئی کتابیں دکھا کر فرمایا کہ دیکھو یہ میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہیں۔"

حضرت ابوہریرہؓ کی جمع کی ہوئی احادیث کی کتابوں کے بارے میں بشیر ابن نہیک کی بھی شہادت ہے کہ:

کنت اٰخذ الکتب من ابی ھریرة فاکتبھا فاذا فرغت قرأتھا علیه فاقول الذی قراته علیک اسمعتهٗ من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فیقول نعم۔ (طحاوی ج ۲ ص ۳۸۵)

"میں حضرت ابوہریرہؓ سے احادیث کی کتاب عاریتًا لے کے نقل کرتا تھا۔ نقل سے فارغ ہو کر ابوہریرہ کو سب سناتا تھا اور عرض کیا کرتا تھا کہ میں نے آپؓ کو جو کچھ سنایا ہے وہ سب آپؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ ہاں۔"

حضرت ابن عباسؓ کے بارہ میں بھی منقول ہے کہ ان کے پاس چند صحیفے تھے جن میں آنحضور ﷺ کی احادیث لکھی ہوئی تھیں چنانچہ حضرت عکرمہؒ سے ایک روایت ترمذی میں ہے کہ:

ان نفرًا قدموا علی ابن عباس من اھل الطائف بکتاب من کتبه فجعل یقرأعلیھم فیقدم و یؤخر فقال انی بلیت لھذہ المصیبة فاقرأوا علی فان قراءتی به کقراءتی علیکم۔ (طحاوی ج ۲ ص ۳۳۸)

"طائف کے کچھ لوگ حضرت ابن عباسؓ کے پاس ان کے چند صحیفے لے کر حاضر ہوئے (جن میں حدیثیں لکھی ہوئی تھیں اور کہا کہ آپ ہمیں سنا دیں) حضرت ابن عباسؓ نے پڑھنا شروع کیا لیکن (ان کی نگاہ کمزور ہو چکی تھی) اس لئے وہ پڑھ نہ سکے اور فرمایا کہ تم لوگ خود سنا دو، تمہارا سنانا اور میرا پڑھنا جواز روایت کے حق میں دونوں برابر ہیں۔"

حضرت عبداللہ بن محمد عقیل راوی ہیں کہ:

کنا ناتی جابر بن عبداللّٰہ فنساله عن سنن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فنکتبھا۔ (طحاوی ۳۸۴/۲)

ہم لوگ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے تھے اور ان سے آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کو پوچھ پوچھ کر لکھا کرتے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی روایتیں منقول ہیں جن سے متعدد صحابہ کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات احادیث نبوی کی کتابت کیا کرتے تھے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے براہ راست اکتساب فیض فرما کر علوم و معارف کے جوگراں بہا موتی ارشادات و احادیث کی شکل میں حاصل کئے تھے، آنحضور ﷺ کی وفات کے بعد اس سرمایہ کو اپنے سینہ سے سفینہ میں منتقل کرتے رہے۔

صحابہؓ کے بعد جب حضرات تابعین کا دور آیا تو حدیث کی کتابت و تدوین اور زیادہ اہتمام و انصرام سے کی جانے لگی، حضرات تابعین رحمہم اللہ نے احادیث نبوی کے ذخیرہ کو جمع کرنے اور ان کی تدوین و کتابت میں بہت زیادہ دل جمعی سے کام لے کر اس سلسلہ کو اعلیٰ پیمانہ پر انجام دیا۔ تذکرۃ الحفاظ میں ابوالزناد (تابعی) سے منقول ہے کہ:

کنا نطوف مع الزھری علی العلماء و معه الالواح والصحف یکتب کلما سمع۔ (ج ۱ ص ۱۰۳)

"ہم زہریؒ کے ساتھ علماء کے پاس حدیثیں سننے کے لئے جایا کرتے تھے۔ زہریؒ اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ رکھتے تھے جو کچھ سنتے تھے، سب

لکھ لیا کرتے تھے۔"

امام زہریؒ کے بارہ میں صالح بن کیسان (تابعی) کا بیان ہے کہ:

اجتمعت انا والزھری ونحن نطلب العلم فقال لی تعال حتی نکتب السنن فکتبنا ماجاء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (کنزالعمال ج۵ ص۲۳۸)

"زمانۂ طالب علمی میں میرا اور زہریؒ کا ساتھ تھا، زہریؒ نے مجھ سے کہا کہ آؤ احادیث لکھیں۔ چنانچہ ہم نے نبی کریم ﷺ کی احادیث لکھیں۔"

ترمذی کی ایک روایت ہے کہ:

قال رجل للحسن عندی بعض حدیثک اوریہ عنک فقال نعم۔ (ج۲ ص۲۳۹)

ایک شخص حسن بصریؒ کے پاس آیا اور کہا کہ میرے پاس آپ کی بیان کردہ کچھ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں، میں ان کی روایت آپ سے کر سکتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ ہاں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حدیث کی ترتیب و تدوین اور اس کی کتابت کے سلسلہ میں ایک مستقل لائحہ عمل تیار کیا اور حدود خلافت میں تمام گورنروں اور قاضیوں کے نام ایک فرمان بھیجا جس میں حدیث کی ترتیب و تدوین اور ان کو جمع کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ فتح الباری کی روایت ہے کہ:

کتب عمر بن عبدالعزیز الی الافاق انظر واحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوہ۔ (ج۱ ص۱۴۰)

"حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام اطراف سلطنت میں یہ فرمان بھیجا کہ نبی کریم ﷺ کی تمام احادیث تلاش و جستجو کے بعد جمع کر لی جائیں۔"

چنانچہ ابوبکر بن حزمؒ (جو اس وقت خلافت کی جانب سے مدینہ کے امیر و قاضی تھے) کے پاس یہ فرمان پہنچا، تو انہوں نے احادیث کو جمع کرنا شروع کیا اس طرح ترتیب و تدوین کے بعد ان احادیث کے کئی مجموعے ان کے پاس تیار ہو گئے مگر ابھی دربار خلافت میں ان کو بھیجنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا انتقال ہو گیا۔

تابعین کے زمانہ کے بعد تبع تابعین کے دور کو دیکھئے یہ وہ دور ہے کہ حدیث کی ترتیب و تدوین اور اس کی کتابت کا سلسلہ اپنے عروج پر تھا اور محدثین کثرت سے کتابت حدیث کے مقدس فریضہ میں مشغول تھے اور آنحضور ﷺ کے ارشادات و احادیث کو جمع کرنے کا کام بڑے انہماک سے جاری تھا اور ان حضرات کے پاس احادیث کا ایک بہت بڑا سرمایہ جمع ہو گیا۔

عبدالرزاق کا بیان ہے کہ:

کتبت من معمر عشرۃ الاف حدیث۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۱۷۵)

"میں نے معمر سے دس ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں۔"

تذکرۃ الحفاظ ہی میں حضرت ابن المبارکؒ کے متعلق منقول ہے کہ:

وکانت کتبہ التی حدث بھا نحوا من عشرین الف حدیث۔ (ج۱ ص۲۵۱)

"انہوں نے اپنی لکھی ہوئی جن حدیثوں کی روایت کی اور لوگوں کو سنایا ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔"

عبدالسلام بن حرب کے بارہ میں ابوحاتم رازی کا بیان ہے کہ:

كتب عنه ابو نعيم الوفامن الحديث۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۴۶)

"ابو نعیم نے ان سے کئی ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں۔"

اس دور میں کتابت حدیث کا اہتمام کس قدر تھا؟ اس کا اندازہ ذیل کی روایت سے ہوتا ہے:

قال ابراهيم بن موسٰى قدم النوری الى اليمن فقال اطلبونی كتاباسريع الخط۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۷ ۳)

ابراہیم بن موسیٰ راوی ہیں کہ امام ثوریؒ جب یمن گئے تو (حدیث کی کتابت کے لئے انہیں ایک کاتب کی ضرورت تھی) انہوں نے وہاں کہا کہ میرے لئے ایک زود نویس کاتب کو تلاش کرو۔

چنانچہ اسی وقت ہشام بن یوسف سریع الخط اور زود نویس تھے ان کا بیان ہے کہ لوگوں نے مجھے امام ثوریؒ کی خدمت میں پیش کیا تو میں نے ان کی جمع کردہ احادیث کو قلمبند کیا۔

ایسے ہی تذکرۃ الحفاظ میں ابوداؤد کی روایت ہے کہ:

لم يكن لحماد بن سلمة كتاب الا كتاب قيس بن سعد۔ (ج ا ص ۱۸۳)

حماد بن سلمہ کے پاس قیس بن سعد کی کتاب تھی (جس میں ان کی جمع کی ہوئی احادیث تھیں)۔

بہر حال ان روایات سے معلوم ہوا کہ کتابت حدیث اور اس کی ترتیب و تدوین کا وہ سلسلہ جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ مبارک سے شروع ہوا تھا، بتدریج تبع تابعین کے دور میں اپنی تکمیل کو پہنچ گیا تھا اور کثرت سے علماء و محدثین کام میں مصروف تھے۔ چنانچہ احادیث کی کتابوں کی تصنیف و تالیف بھی اسی دور میں باقاعدہ شروع ہوئی اور مختلف علماء نے آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے متفرق گوشوں پر کتابیں تصنیف کیں۔

چنانچہ موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق کے بارہ میں منقول ہے کہ ان بزرگوں نے اسی دور میں غزوات اور سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر اپنی کتابیں تصنیف کیں، ان کے بعد ۱۵۷ھ اور ۱۸۸ھ کے درمیانی عرصہ میں امام اوزاعی، امام ابن المبارک، امام سفیان ثوری، حماد بن سلمہ اور جریر بن عبدالحمید نے احادیث کی عظیم الشان کتابیں تصنیف کیں۔

اور تقریباً یہی زمانہ ہے جب کہ امام مالکؒ نے اپنی شہرۂ آفاق اور فن حدیث کی عظیم کتاب "مؤطا" کی تالیف کی۔ تذکرۃ الحفاظ ہی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں معافی ابن عمران موصلی نے اپنی مہتم بالشان تصانیف کتاب السنن کتاب الزہد، کتاب الادب، کتاب الفتن وغیرہ لکھیں۔

اور امام یوسفؒ کی تصانیف کتاب الآثار، کتاب الحج، کتاب الخراج اور امام محمدؒ کی تصانیف کتاب الآثار مؤطا، کتاب الحج وغیرہ اسی وقت معرض وجود میں آئیں۔

اس کے بعد پھر بتدریج احادیث کی کتابوں کی تصنیف جاری رہی اور محدثین نے جانفشانی اور محنت سے احادیث نبوی کو جمع کیا اور ان کی ترتیب و تدوین کر کے وہ اہم اور عظیم الشان کتب تصنیف کیں جو آج ہمارے درمیان علم و عرفان کا منارۂ نور بنی ہوئی ہیں جن سے طالبان حدیث اکتساب فیض کرتے ہیں اور اپنے دامن علم کو احادیث نبوی ﷺ کے گراں قدر موتیوں سے مالامال کرتے ہیں۔

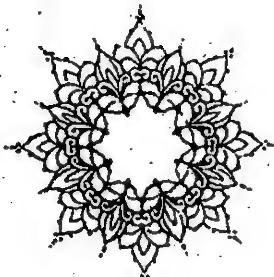

مشکوٰۃ شریف

کی خصوصیت واہمیت

مشکوٰۃ المصابیح کے نام سے احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا جو مجموعہ اب سے صدیوں پیشتر مرتب ہوا تھا اس کی شادابی و تازگی میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا۔

یوں تو خود "حدیث" ایک ایسا مقدس فن ہے اور اس کی نسبت ایک ایسی زندۂ جاوید شخصیت کی طرف ہے کہ جب تک اس کرۂ ارضی پر انسان نامی ایک مخلوق موجود ہے اور اس میں زندگی کا اثر اور شعور و احسان کا نشو ونما پایا جاتا ہے اس وقت یہ فن اسی تابندگی و شادابی کے ساتھ باقی رہے گا، پھر احایث میں جیسا کہ معلوم ہے، مصنفات اور کتابوں کے درجات میں ہر محدث نے اپنے مخصوص نقطہ نظر کے لحاظ سے کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ مثلاً امام بخاریؒ حدیث کی روایت کے پہلو بہ پہلو اپنی قوت فکری کا مجتہدانہ مظاہرہ کرتے ہیں۔ امام مسلمؒ ایک حدیث کے متعدد طرق کو جمع کر دیتے ہیں۔ امام احمد اپنی مسند میں ایک باب میں جس قدر بھی احادیث مروی ہیں ان سب کو جمع فرمادیتے ہیں اسی طرح بقیہ کتب احادیث کی امتیازی خصوصیات ہیں اور ہر ایک کے کچھ انفرادی فوائد ہیں۔

لیکن "مشکوٰۃ المصابیح" کے نام سے احادیث کا جو گلدستہ ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ نہ صرف صحاح ستہ بلکہ دیگر موثوق بہا کتب احادیث مثلاً شعب الایمان بیہقیؒ، مسند رزینؒ وغیرہ وغیرہ کا وافر ذخیرہ اس میں موجود ہے۔

پھر دوسری خوبی جو بیک نظر سامنے آجاتی ہے یہ ہے کہ اس کتاب میں ان احادیث کو جمع کرنے کا التزام نہیں کیا گیا کہ جن کے سمجھنے میں ایک عام قاری کو دشواری ہو بلکہ بعض لوگ تو اس طرف گئے ہیں کہ یہ مجموعہ ابتدائی تعارف یا ایک مشغول زندگی کے لئے احادیث نبویہ سے علمی و عملی تعلق پیدا کرنے کی غرض سے معرض وجود میں لایا گیا تھا۔ چنانچہ آج بھی عربی مدارس میں اس کو صحاح ستہ سے مقدم کر کے پڑھایا جاتا ہے اور اس کا یہی سبب ہے کہ تعارف کا ابتدائی اور اولین مرحلہ ایک ایسی کتاب کے ذریعہ طے پائے کہ جس میں نہ اتنا اطناب ہو کہ جس سے صرف منتہی ہی فائدہ اٹھا سکیں اور نہ اتنا ایجاز ہو کہ جس سے عام ذہن مکدر ہو کر رہ جائے۔

ایک دوسری حیثیت سے بھی اس پر نظر ڈالئے۔ اگر صحیح بخاریؒ کو یہ فخر حاصل ہے کہ مشکلات میں اس کا ختم کرایا جاتا ہے تو مشکوٰۃ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ صوفیہ کے حلقہ میں زیر درس رہی ہے۔ اکابر صوفیہ نے اپنی اذکار و اشغال سے معمور زندگی میں حدیث کے اس مجموعہ کو اس وجہ سے سامنے رکھا ہے کہ اس میں فن کی دوسری کتابوں کی طرح ایجاز و اطناب نہیں ہے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں، ہندوستان کے شمال میں آزادی کی جو اولین کوشش کی گئی ہے اور جس کی سربراہی خانوادۂ محمدی کے ایک گل سرسید حضرت سید احمد بریلوی برد اللہ مضجعہ کر رہے تھے ان کا اپنے مجاہدین کے سلسلہ میں یہ معمول تھا کہ مشکوٰۃ شریف کا التزاماً درس ہوا کرتا تھا۔ درس کی حقیقی ذمہ داری تو شاہ اسمٰعیل شہید کے سر تھی لیکن نکات و حکمات کا اظہار خود سید مرحوم بھی فرمایا کرتے تھے۔

حجۃ اللہ البالغہ جو علوم اسرار الہیہ اور حکمات شرعیہ کے موضوع پر عدیم النظیر کتاب ہے اس کے متعلق اہل نظر کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ دراصل مشکوٰۃ کی شرح ہے۔ جن لوگوں نے ترتیب کتاب سے ہٹ کر استخراج حدیث کے انداز پر گہری نظر رکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ شاہ صاحب بالعموم مشکوٰۃ شریف ہی کی احادیث کو سامنے رکھ کر اپنے جواہر ریزے اُمت کے سامنے رکھتے ہیں۔

پھر اس کتاب پر حواشی تقریباً بخاری و مسلم کے بعد سب سے زیادہ لکھے گئے ہیں۔ بعض شارحین نے تو صرف اس لئے مشکوٰۃ کو اختیار کیا کہ اس میں وہ جامعیت ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔

مشکوٰۃ شریف کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ حلقے جو بظاہر اس کے مرتب اور مدون کے مسلک کے خلاف مسلک رکھتے ہیں اس کتاب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور آج سے نہیں بلکہ جب سے یہ کتاب منصۂ شہود پر آئی تھی اس کی خوبی کا یہی عالم رہا ہے۔

مشکوٰۃ کا کتاب الفتن کے نام سے جو حصّہ ہے وہ تو برابر اہل نظر کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا رہا ہے اگر لوگوں نے خالص اس موضوع پر کچھ لکھا ہے تو غالب گمان یہ ہے کہ مشکوٰۃ کی کتاب الفتن کو سامنے رکھ کر لکھا ہے چنانچہ اس باب میں کثرت کے ساتھ آثار صحابہ وتابعین منقول ہیں۔

عوامی یعنی عملی زندگی کے سلسلہ میں آپ دیکھیں گے کہ وہ باب نہایت تفصیلی ہیں جن کی ہمیشہ شبانہ روز ضرورت پیش آتی رہتی ہیں مثلاً دعا واستغفار، اعتصام بالکتاب والسنۃ اسماء اللہ اور اس قسم کے دوسرے ابواب۔

مشکوٰۃ شریف دراصل ''مصابیح السنۃ'' کی مکمل ومدون شکل ہے جس میں امام محی السنۃ، قامع البدعۃ ابو محمد حسن بن مسعود الفراء، البغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کتب فقہ کے ابواب کی ترتیب پر اہم اور عظیم الشان احادیث کا ذخیرہ جمع کیا تھا۔

امام بغویؒ نے مصابیح کی ترتیب دو فصلوں پر قائم کی تھی۔ پہلی فصل میں انہوں نے شیخین یعنی بخاری ومسلم رحمہما اللہ کی روایت کردہ احادیث کو نقل کیا تھا اور دوسری فصل میں دیگر ائمہ ومحدّثین مثلاً امام ابوداؤدؒ وامام ترمذیؒ سے مروی احادیث کو جمع کیا تھا۔ نیز انہوں نے صرف احادیث کے نقل پر اکتفا کیا، نہ تو کتاب کے حوالے دیئے تھے اور نہ راوی کے نام ذکر کیئے۔

لہٰذا آٹھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت محدّث ولی الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب العمری التبریزیؒ نے اس کتاب کو از سر نو ترتیب وتدوین کے لئے اختیار کیا۔

آپ نے سب سے پہلے تو اس کتاب میں ایک تیسری فصل کا اضافہ کیا اور اس میں نہ صرف یہ کہ دوسرے ائمہ اور محدّثین کی احادیث کو نقل کیا بلکہ خود شیخین یعنی بخاریؒ ومسلمؒ کی ان احادیث کا بھی اضافہ فرمایا جنہیں اصل کتاب مصابیح میں امام محی السنۃؒ نے چھوڑ دیا تھا۔

دوسرے آپ نے ہر حدیث کے بعد اس کتاب یا محدّث کا حوالہ دیا جن سے وہ حدیث نقل کی گئی تھی۔

تیسرے حدیث سے پہلے راوی کا نام ذکر کیا جن سے وہ حدیث روایت کی گئی تھی۔

اس طرح کتاب کی اہمیت زمین سے آسمان پر پہنچ گئی۔

مشکوٰۃ شریف کو جو عظمت ورفعت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس وقت سے یہ معرض وجود میں آئی ہے جب سے اور آج تک عربی مدارس، اسلامی درس گاہیں اپنے نصاب درس میں اس کو شامل کرنا ضروری سمجھتی رہی ہیں چنانچہ آج بھی تمام عربی مدارس میں یہ کتاب صحاح ستہ سے مقدم کر کے پڑھائی جاتی ہے۔

اصل کتاب ''مصابیح السنۃ'' میں چار ہزار چار سو چونتیس (۴۴۳۴) حدیثیں نقل کی گئی تھیں۔ بعد میں علامہ خطیب تبریزیؒ نے جن احادیث کا اضافہ کیا ہے ان کی تعداد ایک ہزار پانچ سو گیارہ (۱۵۱۱) ہے اس طرح مشکوٰۃ شریف کی تمام احادیث کی تعداد ۵۹۴۵ ہوئی۔

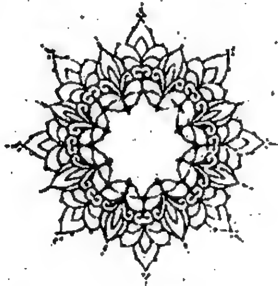

صاحب مظاہر حق اور ان کا سلسلۂ تلمذ

"خاندان ولی اللہی" اسلامیان ہند کی علمی تاریخ کا وہ تابناک باب ہے جس کی شعاعوں نے صحیح معنوں میں سب سے پہلے ہندوستان کی سرزمین پر "علم حدیث" کی جوت جگائی اور جس کے افراد آسمان علم و معرفت پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ جن کی ذات گرامی ہندوستان کے محدثین کے لئے مدار سند ہے اور آپ کے قابل صد فخر صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے "خاندان ولی اللہ" کی علمی عظمت کو چار چاند لگائے۔ اور حضرت شاہ اسحٰقؒ جو شاہ عبدالعزیزؒ کی مسند درس کے صدر نشین اور ان کے جانشین قرار پائے۔ اس عظیم خاندان کی وہ ہستیاں ہیں جن کے تذکرے ہندوستان میں "خدمت حدیث" کے ہر سلسلہ کا جلی عنوان بنتے ہیں۔ نیز "مظاہر حق" کے مؤلف مولانا نواب محمد قطب الدین خان دہلوی کا سلسلۂ تلمذ بھی یہی ہے۔ اس مناسبت سے ان عظیم ہستیوں کے مختصر احوال پیش کئے جا رہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

آپ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ چہار شنبہ کو صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم حضرت شیخ عبدالرحیمؒ نے جو اپنے وقت کے ایک جلیل القدر عالم اور زبردست صوفی تھے، آپ کی تربیت اپنے مخصوص انداز میں فرمائی۔ سب سے پہلے آپ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل کیے گئے جہاں آپ نے قرآن شریف کی تعلیم شروع کی۔ چونکہ آپ فطری طور پر علم سے دلچسپی رکھتے تھے اور روز ازل سے آپ کے فطری جوہر ربانی قابلیتوں سے آراستہ و درخشاں ہو چکے تھے اس لئے آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا۔ ادھر والد محترم کی مخصوص تربیت نے یہ جوہر دکھایا کہ آپ نے اس چھوٹی سی عمر میں آداب اخلاق کی منزلیں طے کر لیں جہاں تک بڑی بڑی عمریں بھی نہیں پہنچتیں، رہن، سہن، نشست و برخاست اور گفتگو کے آداب و طریقے کم سنی ہی کی حالت میں حاصل ہو گئے تھے۔ آپ کا عام قاعدہ تھا کہ اس عمر میں بھی جب کسی بڑے سے بات کرتے خواہ وہ کسی مرتبہ و درجہ کا آدمی کیوں نہ ہوتا احساس ادب سے نگاہیں نیچے جھکی ہوئی ہوتیں۔ سوالات کا جواب نہایت باوقار اور متین لہجہ میں دیتے۔ دوستوں اور ساتھیوں سے بھی گفتگو تہذیب و شائستگی کے حدود سے تجاوز نہ کرتی تھی۔

عمر کی ساتویں منزل میں پہنچے تو فارسی کی درسی کتابیں شروع کرائی گئیں اور چند ہی روز میں تمام کتابیں ختم کر ڈالیں، ایک سال کے قلیل عرصہ میں فارسی کے علوم میں رسوخ حاصل کر لیا۔ فارسی کی درسی کتب سے فراغت کے بعد صرف و نحو کی ابتدائی کتابوں پر عبور حاصل کیا دس سال کی عمر میں آپ شرح ملا پڑھنے لگے تھے۔

آپ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ دس سال کی عمر میں آپ صرف و نحو کے علوم پر اس طرح حاوی ہو گئے تھے کہ بڑے بڑے صرفی اور نحوی جو اپنے علم و فضل کی بناء پر عظمت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے آپ سے ان فنون کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔ اس کے بعد معقولات کی کتابیں شروع کیں۔ یہاں پہلے ہی طبیعت خداداد پائی تھی۔ چنانچہ جودت ذہن اور ذکاوت طبع نے اس مرحلہ کو بھی تھوڑے ہی عرصہ میں طے کرا دیا۔

چودہ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہو گئی لیکن اس کے باوجود تحصیل علم کا سلسلہ اسی شغف سے جاری رہا۔ چنانچہ شادی ہی کے سال آپ نے تفسیر بیضاوی اپنے والد محترم سے پڑھی اور اس کے ساتھ ان علوم میں بھی کامل دستگاہ حاصل کی جو ان دنوں ہندوستان میں مقبول اور علماء دہلی کے زیر درس تھے اسی سال والد بزرگوار سے بیعت بھی ہو گئے اور مشائخ نقشبندیہ کے سلسلۂ وظائف میں مشغول

ہوئے۔ علم تصوف پر آپ نے باقاعدہ تحقیق کی اور اس میں بھی مہارت تامہ کے بعد وہ رموز و نکات اور حکمات پیدا کیں کہ بڑے بڑے مشائخ، صلحاء، اور علماء اس کمسن صوفی کے سامنے اپنی جبین عقیدت جھکانے لگے۔

جب چودہ سال کی عمر میں تمام علوم متعارفہ و متداولہ سے فراغت حاصل کر لی۔ ادھر سلوک و طریقت کی منزلوں کے بھی مراحل طے کر لئے تو والد بزرگوار حضرت شیخ عبدالرحیمؒ نے ایک دعوت عام کی جس میں اہل شہر اور بڑے بڑے علماء فضلاء اور قضاۃ بطور خاص مدعو کئے گئے اور اسی دعوت میں والد بزرگوار نے اپنے اس ہونہار اور لائق بیٹے کے سر پر دستار فضیلت باندھی اور درس کی عام اجازت مرحمت فرمائی۔

والد محترمؒ کے انتقال کے بعد آپ ان کی مسند درس کے صدر نشین قرار پائے اور دینیات و معقولات کی کتب کا درس دینا شروع کیا تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے درس کا شہرہ ہو گیا اور دور دور سے طالبان علم آپ کے پاس آکر علم کی دولت سے اپنا دامن بھرنے لگے۔

ہندوستان میں علم حدیث کی بنیاد اگرچہ شیخ عبدالحق دہلویؒ نے ڈالی اور اسی لئے مؤرخین اولیت کا سہرا بھی انہیں کے سر باندھتے ہیں مگر برصغیر میں علم حدیث کی ترویج و اشاعت کا اصل سہرا خاندان ولی اللہ کے سر ہے اگر ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور اس وقت کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت پورے ہندوستان پر جہالت و ضلالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے علم نبوی کو بالکل ترک کر دیا تھا یہاں تک کہ اسلام بھی ان میں برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شیخ عبدالحقؒ نے اس ماحول میں حدیث و قرآن کے علوم کی ترویج کی تا بحد انتہا جدوجہد کی۔ لیکن حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ شیخؒ اس خرابی و تاریکی کو دور نہ کر سکے جو صدیوں سے مسلمانوں کے دلوں میں جم گئی تھی اور انجام کار وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن چونکہ ہندوستان کی سرزمین کو علم حدیث کی مقدس شعاعوں سے منور ہونا تھا اس لئے ان کے انتقال کے بعد خدا نے اس عمارت کا معمار ایک اور کھڑا کر دیا جس کی بنیاد حضرت شیخ عبدالحقؒ نے ڈالی تھی۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ کے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے پرانی دہلی میں اس مقام پر جو آج کل "مہندیوں" کے نام سے مشہور ہے ایک مدرسہ کی بنیاد "مدرسہ رحیمیہ" کے نام سے ڈالی جس میں علم حدیث کی باضابطہ تعلیم شروع ہوئی۔ طلبہ اچھی خاصی تعداد میں حدیث پڑھنے کے لئے آنے لگے۔ اور لوگوں میں علم حدیث سے کافی دلچسپی بھی پیدا ہو گئی مگر حضرت شاہ عبدالرحیم نے "حدیث" کو پھیلانے کی جتنی زیادہ سعی و کوشش کی اتنی کامیابی ان کو نصیب نہیں ہوئی۔

آخر کار شاہ ولی اللہؒ نے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں جس کی بنیاد خود ان کے والد ماجد شیخ عبدالرحیمؒ ڈال گئے تھے، طلبہ کو درس دینا شروع کیا اور بارہ سال تک پورے انہماک اور ذوق و شوق کے ساتھ علم نبوی کے چشمۂ فیوض سے نہ صرف یہ کہ ہندوستان بلکہ عرب و عجم کے طلبہ کو سیراب فرمایا۔

اگرچہ بارہ سال کے اس طویل عرصہ میں آپ کا علمی کمال عروج کو پہنچ چکا تھا اور دینی و عقلی علوم میں حیرتناک حد تک ملکہ پیدا ہو گیا تھا جس کے سامنے وقت کے بڑے بڑے علماء عقیدت سے سر جھکاتے تھے لیکن علم کی جویا طبیعت نے بس نہیں کی اور علم حدیث کی مزید تحصیل کے لئے دیار مقدس کے لئے رخت سفر باندھا اور مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

۱۱۴۳ھ میں آپ حرمین شریفین کی زیارت سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد کامل ایک سال تک حرم محترم اور حرم نبوی کی مجاورت کر کے روحانی فیوض و برکات حاصل کرتے رہے اور پھر تحصیل علم کے لئے علماء و صلحاء کی طرف متوجہ ہوئے، سب سے پہلے آپ شیخ محمد وفداللہ ابن شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اپنے وقت کے جلیل القدر محدث اور حرمین میں استاذ العلماء مانے جاتے تھے۔ استاذ نے بڑی عزت و احترام کے ساتھ خوش آمدید کہا اور شیخ صاحبؒ نے مؤطا یحییٰ بن یحییٰ پوری سنا کر اس کی اور شیخ محمد بن محمد ابن سلیمان کی تمام روایت کی اجازت حاصل کی۔

اس کے بعد آپ شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ، فصاحت و بلاغت

جیسی صفات کی بنا پر اہل عرب میں بڑی عظمت کے مالک مانے جاتے تھے اور علم حدیث میں اپنا امتیازی مقام رکھتے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ان سے نہ صرف یہ کہ علم حدیث حاصل کیا اور علمی مذاکرے کر کے مزید اکتساب فیض کیا بلکہ تصوف و سلوک کے اعلیٰ منازل بھی طے کئے۔ چنانچہ وہاں سے فراغت کے بعد جب آپ رخصت ہونے لگے تو استادؒ نے احادیث کی اجازت دی اور خرقۂ خلافت اپنے ہاتھ سے پہنا کر پرنم آنکھوں سے گرانقدر نصائح کے ساتھ رخصت کیا۔

اسی سلسلہ میں آپ شیخ تاج الدین قلعی حنفی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بخاری شریف کے علاوہ احادیث کی دیگر موثوق بہا کتب کی بھی اجازت لی۔

حرمین کے جلیل القدر محدثین اور علماء کے فیوض روحانی سے بہرہ ور ہو کر ان کے چشمۂ علم سے پوری طرح فیض یاب ہو کر آپ ۱۱۴۴ھ میں دوبارہ حج کی نعمت سے مشرف ہوئے۔ اور ۱۱۴۵ھ کے ابتداء میں وطن کی مراجعت فرما ہوئے اور ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ یوم جمعہ کو دہلی رونق افروز ہوئے۔

حرمین سے واپسی کے بعد آپ کے درس حدیث نے ایک نئی شکل اختیار کر لی یا یوں کہا جائے کہ علم حدیث کی جس روشنی سے آپ کا قلب و دماغ پوری تابانی کے ساتھ منور ہو چکا تھا اس کی شعاعیں دہلی کے مدرسہ رحیمیہ سے پھوٹ پھوٹ کر اطراف عالم کو منور کرنے لگیں۔ اس طرح شاہ صاحب نے پوری شان و شوکت اور عزت و عظمت کے ساتھ حدیث کے مسند درس پر بیٹھ کر حدیث نبوی کے علوم و معارف کو پورے ہندوستان میں پھیلایا اور باقاعدہ اس کی اشاعت کی جس کی تنویریں آج تک ہندوستان کو پر نور بنا رہی ہیں۔

کل نفس ذائقة الموت کے تحت جب آپ کا بھی پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا تو بعمر ۶۳ سال ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی اور دہلی میں سپرد خاک کئے گئے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے چار مشہور اور جلیل القدر صاحبزادے تھے شاہ عبدالعزیزؒ شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالغنیؒ۔ اگرچہ یہ چاروں حضرات علم و فضل، فہم و فراست، قوت تقریر، فصاحت تقریر، تقویٰ و تقدس، امانت و دیانت میں یکتا اور لاثانی سمجھے جاتے ہیں لیکن ان سب میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ عظمت و منزلت اور علم و فضل کے لحاظ سے سب سے ممتاز ہیں۔ اور یہی وہ ذات گرامی ہے جس نے اپنے خاندان کو تمام علمی دنیا میں روشناس کرایا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر اس عظیم خاندان میں شاہ عبدالعزیز کا وجود نہ ہوتا تو یہ خاندان گمنامی کے دائرہ سے نکل کر عزت و عظمت اور شہرت و ناموری کے اس مرتبہ کو کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا اور جو تاریخی شہرت آج اسے حاصل ہے کبھی حاصل نہ ہوتی۔

آپ کی مبارک پیدائش ۱۱۵۹ھ میں ہوئی اور شاہ ولی اللہ جیسے عظیم باپ اور مقدس ہستی کے زیر سایہ نشو و نما کے ابتدائی مراحل طے ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل کئے گئے اور قرآن شریف کی تعلیم شروع ہوئی چونکہ آپ نہ صرف نسبی طور پر بلکہ فطری طور پر نہایت ذہین، سلیم الطبع، خوش فہم اور بے حد طباع تھے اس لئے بہت ہی کم سنی میں قرآن کریم کی تعلیم پوری کر لی۔ قرآن کی تعلیم کے بعد فارسی کی ابتدائی تعلیم مکمل کی اور اس کے بعد دو تین سال کے مختصر عرصہ میں صرف و نحو کی کتابیں ختم کر ڈالیں۔ اس کے بعد آپ کی باقاعدہ تعلیم شاہ ولی اللہ کے ایک قابل خلیفہ کے زیر نگرانی شروع ہوئی۔ تقریباً دو سال کے عرصہ میں آپ نے عربی کے مختلف فنون میں حیرت انگیز ترقی اور کامیابی حاصل کر لی۔

تیرہ سال کی عمر میں آپ معمولی درسی تعلیم کے علاوہ صرف و نحو، فقہ، اصول، منطق، کلام، عقائد، ہندسہ، ہیئت، ریاضی جیسے عظیم الشان فنون سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ ان علوم سے فراغت کے بعد آپ اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو

گئے اور حدیث کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ دو سال کے عرصہ میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے تمام حدیث کی کتابیں اپنے والد بزرگوار سے پڑھ لیں، آپ کی عمر مشکل سے پندرہ سال کی ہوگی کہ تمام علوم وفنون کی تکمیل کر ڈالی۔

چونکہ آپ کے خاندان میں علوم نقلیہ کے علاوہ علوم عقلیہ کا بھی رواج تھا اور شاہ ولی اللہؒ کی درس گاہ میں جہاں حدیث و تفسیر کے علوم پورے شغف و انہماک سے پڑھائے جاتے تھے وہاں منطق، ریاضی کی تعلیم بھی اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی تھی اس لئے شاہ عبدالعزیزؒ اس چھوٹی سی عمر میں ایک لائق ریاضی دان اور قابل منطقی بھی بن گئے تھے اور تاریخ و جغرافیہ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔

شاہ عبدالعزیزؒ علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل اور باطنی کمالات کی تکمیل سے فارغ ہوئے تو والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہؒ دار البقاء کو سدھار گئے۔ شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کی مسند درس کے جانشین شاہ عبدالعزیز صاحبؒ قرار پائے۔ گو شاہ ولی اللہؒ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر صرف سترہ برس تھی لیکن آپ علمی تبحر، علمی کمالات اور باطنی رسوخ کی بناء پر بڑے بڑے علماء آپ کے در دولت کی جبیں سائی کیا کرتے تھے اور کثرت سے طلبہ اطراف عالم سے آکر آپ کے چشمۂ علوم سے اپنی علمی تشنگی کی سیرابی کیا کرتے تھے۔

آپ کے بارہ میں صاحب اتحاف النبلاء کی شہادت ہے کہ درحقیقت علم حدیث کا بیج ہندوستان کی بنجر اور سخت زمین میں آپ کے والد بزرگوار جناب شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بویا اور آپ نے اس کی اپنے خون جگر سے آبیاری کر کے اسے نہایت خوشنما اور نونہال پودا بنا دیا جو چند دنوں میں سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگا اور پھر تھوڑے ہی عرصہ میں دور دور کے لوگ اس کے پھول و پھل سے دامن لبریز کر کے جانے لگے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اپنے دوسرے علمی کمالات کے علاوہ فن خطابت میں خداداد ملکہ رکھتے تھے، آپ کی سحر آمیز خطابت موافق و مخالف دونوں کے قلوب کو مسخر کر لیا کرتی تھی، اس کے ساتھ ہی آپ کا حافظہ گویا لوح تقدیر کا انمٹ نسخہ تھا کہ جو کتاب پڑھ لی یا جو بات سن لی، جوں کی توں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئی۔

بہرحال آپ کی ذات والا صفات خاندان ولی اللہ کے معدن علم کا وہ گوہر آبدار تھی جس کی تنویریں آج تک اسلامیان ہند کے قلوب کو ضیاپاش کر رہی ہیں اور اس کے ساتھ ہی آپ کی بیش بہا تصانیف علم و فضل کے ان گرانبہا موتیوں سے مزین ہیں جن کی آب و تاب تمام عالم کی نظروں کو خیرہ کر رہی ہیں۔

علم و فضل، زہد و تقویٰ، شان و شوکت، عزت و عظمت سے بھرپور آپ کی زندگی نے اپنے ایام حیات بڑی شان سے پورے کئے اور سات شوال ۱۲۴۸ھ یوم یکشنبہ کو صبح کے وقت اپنی شاندار علمی تاریخ کے ساتھ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ آپ کے تین صاحبزادیاں تھیں، دوسری صاحبزادی کا عقد شیخ محمد افضل صاحبؒ سے ہوا تھا ان ہی کے بطن سے حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحب پیدا ہوئے۔

مولانا محمد اسحٰق صاحبؒ کی تاریخ ولادت ۶ ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ ہے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے چونکہ کوئی لڑکا نہیں تھا اس لئے آپ کی تمام تر توجہات مولانا محمد اسحٰقؒ پر صرف ہوتی تھیں اور ان کی تربیت بھی آپ نے اپنے اسی انداز سے کی جس طرح خاندان ولی اللہ کے دوسرے افراد کی کی گئی۔

آپ ابتدائی تعلیم کے بعد علم حدیث کی تعلیم کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے، تعلیم سے مکمل فراغت کے بعد مسند درس کو اپنی تمکین سے اعزاز بخشا اور مسلسل بیس برس تک شاہ صاحبؒ کے سامنے ہی جدید ذہن و فکر کے حامل طلبہ کو حدیث

کا درس اپنے مخصوص انداز میں دیتے رہے۔

سُنّت نبوی کا اتباع اور رسول اللہ ﷺ سے کمال محبّت آپ کی زندگی کا مابہ الامتیاز مقام تھا۔ چنانچہ آپ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ آپ سے نادانستہ بھی کبھی خلاف سُنّت کاموں کا صدور نہیں ہوا کرتا تھا، چونکہ فیاضی قدرت نے حسن سیرت کے علاوہ حسن صورت کی دولت سے بھی مالامال کیا تھا اس لئے چہرہ کی شگفتگی آپ کی نجابت اور شرافت کی غمازی کیا کرتی تھیں۔ اور آپ کا چہرہ دیکھ کر لوگوں کو یقین ہوا کرتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی صحبت کا فیض جن مقدس ہستیوں نے پایا ہے وہ یقیناً اسی صورت و سیرت کے ہوں گے۔

جب حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے سفر آخرت قبول فرمایا تو مخلوق خدا نے خاندان ولی اللہی کی سیادت کا عمامہ آپ کے سر پر رکھا اور شاہ صاحبؒ کے جانشین قرار دیے گئے۔ تمام معتقدین اور شاگردوں نے آپ کی طرف رجوع کیا اور آپ کے چشمۂ علوم سے اکتساب فیض کرنے لگے۔

حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے جانشین ہونے کی وجہ سے آپ کو وہی عزّت و عظمت حاصل ہوئی جو اس عظیم خاندان کے دوسرے پیشواؤں کو حاصل تھی لیکن اس شان و شوکت، ثروت و رفعت اور جاہ و جلال کی موجودگی کے باوجود محض خدائے تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضاجوئی کے لئے آپ نے دیارِ مقدس کی طرف سفر ہجرت کا ارادہ فرمایا اور مع اہل و عیال حجاز تشریف لے گئے وہاں آپ نے فرائض حج ادا کئے مگر کچھ دنوں کے بعد ہندوستان تشریف لے آئے۔

یہاں پہنچتے ہی مخلوق خدا نے گھیر لیا اور آپ اپنے وعظ و نصائح کے ذریعہ ان کی روحانی تربیت فرماتے رہے لیکن جب ہندوستان کی پوری فضا پر رسوم و بدعات اور ضلالت و گمراہی کی تاریکی چھا گئی اور اسلامی شعار بے دینی و بدکرداری کی بھینٹ چڑھنے لگے تو آپ بالکل ہی دل برداشتہ ہو گئے اور یہاں سے ہجرت کا مصمم ارادہ فرمایا۔ گو شہر کے تمام باشندے اور خود سلطان وقت نے بہ منت و سماجت کوشش کی کہ آپ ہندوستان سے تشریف نہ لے جائیں مگر آپ نہ مانے اور تمام اہل و عیال اور لواحقین کے پورے قافلہ کے ساتھ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہیں اقامت اختیار فرمائی اور وہیں ۱۲۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔

مظاہر حق کے مؤلف حضرت علّامہ نواب محمد قطب الدین خاں دہلوی رحمہ اللہ

آپ دہلی کے ایک صاحب حیثیت اور باوجاہت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے اجداد ہمیشہ سے بارگاہ سلطان کے مقرب رہے اور اپنی خدمات جلیلہ کے صلہ میں بڑے بڑے مناصب اور عہدے حاصل کئے۔ مولانا بھی دربار دہلی میں بڑی عزّت و عظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور بادشاہ وقت کی نظروں میں آپ کی بڑی وقعت تھی۔

آپ کی پیدائش ۱۲۱۹ھ کی ہے ابتدائی تربیت کے بعد حصول علم کے لئے حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰقؒ محدث دہلوی کی خدمت میں دئے گئے اور ان سے اکتساب فیض کیا اور علم حدیث میں کمال حاصل کیا، ان کے علاوہ حرمین شریفین کے علماء کے چشمہ علوم سے بھی مستفیض ہوئے۔

شریعت کا اتباع آپ کی زندگی کا امتیازی مقام تھا وضع قطع میں اپنے استاد کے سچے پیرو تھے اور ان سے اتنے مشابہ کہ جس نے حضرت مولانا اسحٰقؒ کو نہیں دیکھا تھا آپ کو دیکھ کر سکون حاصل کرتا تھا۔ علم و فضل کے اعلیٰ مرتبہ پر ہونے کے علاوہ تواضع و انکسار، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت اور اخلاق و علم کے اعلیٰ اوصاف کے حامل تھے۔

آپ کی علمی زندگی کا سب سے شاندار کارنامہ مشکوٰۃ شریف کا اردو ترجمہ اور شرح "مظاہر حق" ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے جو آپ کے علم و فضل کی شاہکار ہیں۔ آخر میں آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہیں ۱۲۸۹ھ میں وفات پائی۔

صاحب مصابیح السنۃ

امام محی السنۃ قامع البدعۃ حضرت ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی رحمۃ اللہ علیہ

آپ بغشور کے رہنے والے تھے جو خراسان میں ہرات و مرد کے درمیان ایک گاؤں ہے اسی بنا پر آپ بغوی کی نسبت سے مشہور ہیں امام محی السنۃ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے زمانہ کے ایک جلیل القدر عالم، فقید المثال محدث اور رفیع الشان مفسر تھے، فقہ، حدیث اور تفسیر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، اسی بنا پر اس وقت کے تمام محدثین و مفسرین اور علماء آپ کو اپنا پیشوا اور امام سمجھتے تھے۔ نیز اس وقت "مفتی اعظم" کے عظیم منصب پر بھی آپ ہی فائز تھے۔

ان علوم کے علاوہ فن قرأت میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے اور ایک باکمال و صاحب فن مجود و قاری تسلیم کیے جاتے تھے۔ آپ کے علم و فضل کے اس عظیم منصب پر فائز ہونے کے باوجود اور اپنے تمام تر دینی و دنیاوی جاہ و جلال کے باوصف، مزاج میں انتہا درجہ کی سادگی بے تکلفی اور انکسار رکھتے تھے۔

زہد و تقویٰ کے اعلیٰ مراتب کے حامل تھے۔ قلب میں خشیت الٰہی اور خوف آخرت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ عشق نبوی سے زندگی کا ہر گوشہ منور تھا۔ دنیا کے عیش و راحت سے کوسوں دور رہتے تھے۔ حالانکہ دنیاوی طور پر بھی جاہ و حشمت کا جو مقام آپ کو حاصل تھا اس کی بنا پر اگر آپ چاہتے تو دنیا کی تمام نعمتیں اور راحتیں آپ کے قدموں میں ہوتیں لیکن زہد و استغناء کا یہ عالم تھا کہ آپ نے ہمیشہ خشک روٹی کھا کر زندگی کے ایام پورے کئے، آپ کے کمال زہد و استغناء کی اس کیفیت کو دیکھ کر جب شاگردوں نے عرض کیا کہ آپ خشک روٹی کھاتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے آپ کے قلب و دماغ اور اعصاب پر ضعف کا غلبہ ہو جائے اور دین و اسلام کی جو خدمت آپ انجام دے رہے ہیں اس میں عدم قوت اور ضعف کی وجہ سے اضمحلال پیدا ہو جائے تو اس کے بعد آپ نے صرف اتنی تبدیلی کی کہ خشک روٹی روغن زیتون سے لگا کر کھا لیا کرتے تھے۔

"محی السنۃ" کا عظیم لقب آپ کو براہ راست بارگاہ رسالت سے ملا تھا۔ مؤرخین و محدثین لکھتے ہیں کہ آپ جب اپنی مشہور کتاب "شرح السنۃ" کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو ایک روز خواب میں سرکار دو عالم نبی کریم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس وقت حضور ﷺ نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ دعائیہ جملہ ارشاد فرمایا "جس طرح تم نے میری سُنّت کو اپنی تصنیف کے ذریعہ زندہ کیا اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہیں زندہ رکھے"۔ جب ہی سے آپ "محی السنۃ" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

آپ کی زندگی کا سب سے مشہور کارنامہ آپ کی مشہور تصنیف "مصابیح السنۃ" ہے جو مشکوٰۃ شریف کی بنیاد اور متن ہے۔ آپ نے صحاح ستہ اور دیگر مستند و معتبر کتابوں سے احادیث کے اس ذخیرہ کو جمع کر کے کتب فقہ کے ابواب پر مرتب فرمایا، آپ کی دوسری عظیم تصنیف تفسیر معالم التنزیل ہے جو قرآن کی تفاسیر میں ایک وقیع درجہ رکھتی ہے۔ آپ کی وفات ۵۱۶ھ میں ہوئی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

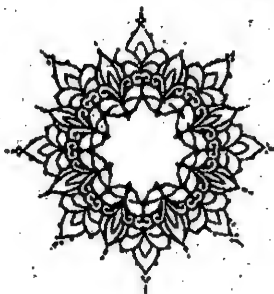

صاحبِ مشکوٰۃ المصابیح

علامہ ولی الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب العمری التبریزیؒ

آپ کا نام نامی "محمد" ہے۔ بعض حضرات نے "محمود" لکھا ہے لیکن زیادہ صحیح اور مشہور "محمد" ہی ہے، کنیت ابو عبداللہ اور لقب "ولی الدین" ہے۔ والد ماجد کا نام عبداللہ ہے۔ نسباً "عمری" ہیں اور "خطیب تبریزی" سے مشہور ہیں۔

آپ اپنے وقت کے جلیل القدر عالم، بلند پایہ محدث، فصاحت وبلاغت کے امام، زہد وتقویٰ سے متصف اور اعلیٰ اخلاق وعادات کے حامل تھے۔ اپنے زمانہ کے یگانۂ روزگار شیوخ اور اساتذہ سے اکتساب علم کیا اور جن بے شمار لائق وفائق تلامذہ کو اپنے علم وعرفان سے مستفید کیا ان میں مبارک شاہ سادیؒ سرفہرست ہیں۔

آپ کے علم وفضل کا سب سے بڑا شاہکار "مشکوٰۃ المصابیح" ہے جو مشکوٰۃ کے نام سے مشہور ہے اور حدیث کی بنیادی کتاب مانی جاتی ہے۔ آپ کی اس عظیم کتاب کو دنیائے اسلام میں اعتبار وقبولیت کا جو مقام نصیب ہوا اس کا ایک اندازہ مشکوٰۃ کے تراجم، شروح اور حواشی کی اس طویل فہرست سے لگایا جاسکتا ہے: مثلاً ① الکاشف عن حقائق السنن "از علامہ حسن بن محمد الطیبیؒ۔" ② "شرح مشکوٰۃ" از ابوالحسن علی بن محمد علم الدین بخاریؒ۔ ③ "منہاج المشکوٰۃ" از شیخ عبدالعزیز ابہریؒ۔ ④ "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ" از شیخ نور الدین علی بن سلطان محمد ہروی معروف بہ ملا علی قاریؒ۔ ⑤ "شرح مشکوٰۃ" از شیخ شہاب الدین ابوالعباس احمد بن محمد بن علی بن جو ہیثمیؒ۔ ⑥ "حاشیہ مشکوٰۃ" از سید شریف علی بن محمد جرجانیؒ۔ ⑦ "حاشیہ مشکوٰۃ" از شیخ محمد سعید بن المجید الف ثانیؒ۔ ⑧ "ہدایۃ الرواۃ الی تخریج المصابیح والمشکوٰۃ" از شیخ ابوالفضل احمد بن علی معروف بہ ابن حجر عسقلانیؒ۔ ⑨ "لمعات التنقیح" (عربی) اور ⑩ "اشعۃ اللمعات" (فارسی) از شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ۔ ⑪ "التعلیق الصبیح" از مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ۔ ⑫ "مرعاۃ المفاتیح" از مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری۔ ⑬ "ازیقۃ النجاۃ شرح مشکوٰۃ" از شیخ عبدالنبی عماد الدین محمد شطاریؒ۔ ⑭ "زنیۃ النکاۃ فی شرح المشکوٰۃ" از سید محمد ابوالمجد محبوب عالم احمد آبادی۔ ⑮ "مظاہر حق" (اردو) از علامہ نواب محمد قطب الدین خاں دہلویؒ۔ ⑯ "ترجمہ مشکوٰۃ" (جلد اول) از مولانا کرامت علی جونپوریؒ۔

صاحب مشکوٰۃ خطیب تبریزی کا سال وفات تحقیق سے معلوم نہ ہوسکا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ آپ کی وفات ۷۳۷ھ کے بعد ہوئی ہے کیونکہ بروز جمعہ ماہ رمضان ۷۳۷ھ اس کتاب کی تألیف سے فراغت ہوئی۔ لہٰذا اس کے بعد ہی کسی سال آپ کی وفات ہوئی ہوگی۔ بعض حضرات نے اندازہ سے ۷۴۸ھ سال وفات ذکر کیا ہے اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ۷۴۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

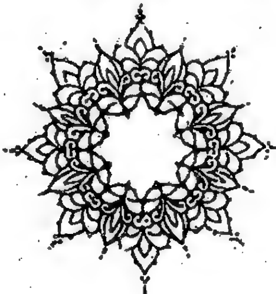

ائمۂ حدیث

مشکوۃ شریف میں جن ائمۂ حدیث کی کتابوں کی منتخب احادیث جمع کی گئی ہیں وہ خصوصیت سے تیرہ ہیں۔ یعنی: امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ترمذیؒ، امام ابوداؤدؒ، امام نسائیؒ، امام ابن ماجہؒ، امام دارمیؒ، امام دار قطنیؒ، امام بیہقیؒ، امام رزین ابن معاویہؒ، ان کے علاوہ امام نوویؒ اور امام ابن جوزیؒ کا ذکر بھی اس فہرست میں آتا ہے۔ ان تمام ائمہ حدیث کے احوال مختصر طور پر نقل کئے جارہے ہیں۔

مصابیح السنۃ یا مشکوۃ شریف کی کسی حدیث کی روایت یا نقل کا کوئی تعلق اگرچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے نہیں ہے اور اس لئے مذکورہ بالا فہرست میں ان کا نام شامل نہیں ہے لیکن ائمہ دین اور محدثین عظام کے ذکر جمیل کا کوئی بھی سلسلہ ہمارے نزدیک اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تذکرہ اس میں شامل نہ ہو اس لئے ائمۂ حدیث کی اس فہرست کے آخر میں ان کا اجمالی تذکرہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ

امام بخاریؒ کا اصل نام محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ ہے اور باختلاف روایت ۱۳ / یا ۱۶ / شوال ۱۹۴ھ جمعہ کے روز بعد نماز عصر پیدا ہوئے۔ آپ جعفی قوم سے مشہور ہیں کیونکہ آپ کے پردادا مغیرہ جن بزرگ کے ہاتھ پر اسلام کی دولت سے مشرف ہوئے تھے وہ جعفی قوم میں سے تھے اور ان کا نام یمان جعفی تھا، یمان جعفی اس زمانہ میں بخارا کے سردار تھے اس لئے جو کوئی ان کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا انہی کی قوم کی طرف اپنا انتساب کرتا تھا اس لئے حضرت امام بخاریؒ بھی جعفی مشہور ہوئے۔

حضرت امام بخاریؒ کی بینائی بچپن ہی میں جاتی رہی تھی جس سے ان کی والدہ بہت زیادہ غمگین اور پریشان رہا کرتی تھیں۔ ایک دن اسی حالت حزن وملال میں ان کی والدہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں "خوش ہو کہ خدا نے تیری آہ وزاری اور گریہ وبکار پر رحم کیا اور تیری دعا قبول ہوئی یعنی تیرے بیٹے کی بینائی واپس کر دی"۔ ان کی والدہ صبح اٹھیں تو ان کو اپنے لاڈلے کی آنکھیں روشن ملیں۔ دس برس کی عمر میں جب کہ آپ مکتب میں پڑھتے تھے اسی وقت سے یہ کیفیت تھی کہ جہاں حدیث سنتے اسے فوراً یاد کر لیتے۔ چنانچہ اسی وقت سے انہوں نے حدیثیں یاد کرنی شروع کر دی تھیں۔

جب مکتب کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو معلوم ہوا کہ بخارا میں ایک محدث اور عالم داخلیؒ بہت شہرت رکھتے ہیں، امام بخاریؒ ان کے پاس جانے لگے، ان ہی دنوں داخلیؒ اپنی کتاب جو حدیث کے فن میں تھی اور جس میں حدیثیں لکھی ہوئی تھیں لوگوں کے سامنے پڑھا کرتے تھے ایک دن داخلیؒ لوگوں کے درمیان بیٹھے احادیث رسول اللہ ﷺ سنا رہے تھے اور حدیث کا بیان کرتے وقت جب انہوں نے سند شروع کی تو کہا: سفیان عن ابی الزبیر عن ابراھیم فوراً امام بخاریؒ نے ٹوکا اور بولے کہ ابوزبیر، ابراہیم سے روایت نہیں کرتے۔ داخلیؒ اس نوعمر بچہ کی زبان سے یہ سن کر شش وپنج میں پڑ گئے پھر گھر میں گئے اور کتاب اٹھا کر لائے اور کہا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اب تم بتاؤ کہ یہ سند کس طرح ہے؟ امام بخاریؒ نے کہا کہ اصل اس طرح ہے، سفیان عن ابی الزبیر عن عدی عن ابراھیم داخلیؒ نے کتاب دیکھی اور کہا کہ واقعی تم سچ کہتے ہو۔ یہ سند اسی طرح ہے۔ اس وقت حضرت امام بخاریؒ کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی، داخلیؒ کی حیرت کی انتہا نہیں تھی کہ یہ چھوٹی سی عمر کا لڑکا کس قدر قوی الحافظہ اور ذہین ہے تاہم وہ خوش بھی بہت ہوئے اور امام بخاریؒ کی بہت تعریف وتحسین بھی کی۔

سولہ برس کی عمر میں ابن مبارکؒ اور وکیع کی کتابیں یاد کر ڈالیں اور اپنی والدہ اور اپنے بھائی احمد کے ہمراہ حج کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ حج سے فراغت کے بعد والدہ اور بھائی تو واپس آگئے لیکن آپ حصول حدیث کے سلسلہ میں حجاز ٹھہر گئے، اٹھارہ برس کی عمر میں آپ نے کتابیں تصنیف کرنی شروع کر دی تھیں۔ جب ہی آپ نے ایک کتاب صحابہؓ و تابعینؒ کے عظیم کارناموں اور واقعات اور ان کے اقوال و احوال پر مشتمل تصنیف کی جس کا نام کتاب التاریخ رکھا، آپ نے اس کتاب کا مسودہ تیار کیا پھر اس کو مدینہ منورہ میں نبی کریم ﷺ کے روضۂ مبارک کے قریب چاندنی راتوں میں صاف کیا۔

حامد بن اسمٰعیلؒ جو اپنے زمانہ کے رفیع المرتبت محدث تھے ان کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں امام بخاریؒ حدیث حاصل کرنے کے لئے اپنے اساتذہ کے پاس جایا کرتے تھے میں بھی ان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ امام بخاریؒ کا دستور تھا کہ وہ اپنے ہمراہ قلم دوات نہیں رکھتے تھے، میں نے ان سے کہا کہ تم حدیث حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کے پاس اس وقت ذوق و شوق سے جاتے ہو لیکن قلم دوات اپنے پاس نہیں رکھتے ہو تو اس سے فائدہ کیا ہوگا کیونکہ جب تک حدیثیں تم لکھو گے نہیں، یاد نہیں ہوں گی۔ اگر تم حدیثوں کو یاد رکھنا چاہتے ہو تو ان کو لکھنا چاہئے۔ حامد بن اسمٰعیل کا بیان ہے کہ سولہ روز کے بعد امام بخاریؒ نے مجھ سے کہا کہ اس عرصہ میں تم نے جتنی حدیثیں لکھ لی ہیں، سب میرے پاس لاؤ اور پھر اپنی لکھی ہوئی حدیثوں کا میرے ذہن میں محفوظ حدیثوں سے مقابلہ کرو۔ حامدؒ نے اس عرصہ پندرہ ہزار حدیثیں لکھ لی تھیں، بخاری نے وہ سب حدیثیں اپنے حافظے میں پڑھنی شروع کیں، حامد بن اسمٰعیلؒ کہتے ہیں: ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ امام بخاریؒ اپنی یاد کی ہوئی احادیث کو ہماری لکھی ہوئی حدیثوں سے درست کرتے لیکن ہوا یہ کہ ہم نے اپنی لکھی ہوئی حدیثیں ان کے حافظے اور یادداشت کی حدیثوں سے صحیح کیں۔ اور وہ پندرہ ہزار حدیثیں بغیر ایک لفظ کے فرق کے سنا گئے۔ حدیثیں سنانے کے بعد امام بخاریؒ فرمانے لگے کہ تم لوگ سمجھتے تھے کہ میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں اور خواہ مخواہ اتنی محنت کرتا ہوں۔ احمد بن اسمٰعیلؒ کہتے ہیں کہ مجھے اسی دن یقین ہو گیا تھا کہ یہ شیخ بہت ہونہار اور بافضیلت ہے اس کی برابری کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

"بخاری شریف" جو امام بخاریؒ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور جو کتاب اللہ (قرآن شریف) کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب مانی گئی ہے اس کی تالیف کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن امام بخاریؒ اپنے استاد اسحٰق بن راہویہؒ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسحٰق بن راہویہؒ کے شاگردوں نے آپس میں کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کی توفیق دیدے کہ جس میں مختصر طریقہ پر حدیثیں جمع کر دی گئی ہوں اور حدیثیں باعتبار اپنی صحت و اعتماد کے اعلیٰ درجہ کی ہوں تو کیا ہی اچھا ہو۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ تمام صحیح اور معتبر و مستند حدیثیں ایک جگہ جمع ہو جائیں گی۔ دوسرے طالب حدیث بلا کسی شبہ اور کھٹک کے ان کو حاصل کر سکتا ہے۔ اور ان پر عمل کر سکتا ہے۔ نیز اسے کسی حدیث کے بارہ میں کسی عالم یا محدث سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟

مجلس تو برخاست ہو گئی، سب لوگ چلے گئے لیکن بخاریؒ کے دل میں خواہش مچلنے لگی اور انہوں نے اس اہم اور عظیم کام کو کرنے کا ارادہ کر لیا اور کتاب کی تصنیف شروع کر دی۔

اس وقت آپ کے پاس محفوظ احادیث کا سرمایہ تقریباً چھ لاکھ کی تعداد میں تھا چنانچہ ان میں سے ان احادیث کو جو باعتبار صحت و سند کے اعلیٰ درجہ کی تھیں، آپ نے اپنی کتاب میں جمع کیا اور جو احادیث آپ کے معیار صحت پر پوری نہ اتر سکیں ان کو ترک کر دیا۔ اس طرح ابن راہویہؒ کی مجلس میں امام بخاریؒ کے ساتھیوں کی مقدس خواہش کا نتیجہ "جامع بخاری" کی شکل میں معرض وجود میں آیا۔

حضرت امام بخاریؒ کا اس کتاب کی تالیف کے وقت یہ معمول تھا کہ آپ پہلے غسل کرتے پھر دو رکعت نفل پڑھتے پھر اس کے بعد ایک حدیث کو نقل کرتے۔ اس طرح بخاری شریف میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جس کو نقل کرنے سے پہلے امام بخاریؒ نے غسل نہ کیا ہو اور دو رکعت نفل نماز نہ پڑھی ہو۔ سولہ سال کی مدت میں آپ اس عظیم تصنیف سے فارغ ہوئے۔ آپ کی زندگی میں تقریباً نوے ہزار لوگوں نے بلا واسطہ آپ سے حدیثیں حاصل کرنے کا شرف پایا۔

اُس زمانہ میں بخارا کا حاکم خالد بن احمد ذہلی تھا اس نے حضرت امام بخاریؒ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ میرے گھر تشریف لا کر میرے لڑکوں کو اپنی کتاب بخاری اور دیگر تصانیف مثلاً کتاب التاریخ وغیرہ پڑھایا کریں۔ امام بخاریؒ نے فرمایا کہ یہ علم حدیث ہے۔ میں یہ چیز حدیث کی عظمت کے خلاف سمجھتا ہوں کہ تمہارے گھر حدیث پڑھانے آؤں۔ اگر تمہیں ایسا ہی شوق ہے تو اپنے لڑکوں کو میری مجلس میں بھیجا کرو تاکہ وہ دوسروں کی طرح وہاں بیٹھ کر حدیث کا درس حاصل کریں۔ حاکم بخارا کے لئے امام بخاریؒ کا یہ جواب تازیانہ سے کم نہیں تھا، تاہم اس نے کہلا بھیجا کہ میں اس پر تیار ہوں لیکن یہ خیال رہے کہ جس وقت میرے لڑکے آپ کے پاس حاضر ہوں اس وقت کوئی دوسرا آپ کے پاس نہ آسکے۔ بلکہ دروازہ پر باقاعدہ سنتری کا پہرہ ہو کہ وہ دوسروں کو اس وقت درس میں آنے سے روکے۔ یہ بات میرے لئے بالکل ناقابل برداشت ہے کہ جس مجلس میں میرے لڑکے ہوں، اسی مجلس میں عوام اور دوسرے کم حیثیت لوگ آکر ان کے برابر بیٹھیں۔ امام بخاریؒ نے حاکم مذکور کی یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ اور یہ فرمایا کہ یہ علم پیغمبر ﷺ کی میراث ہے اس میں پوری اُمّت برابر کی شریک ہے اس کو حاصل کرنے میں کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ حاکم بخارا امام بخاریؒ کا یہ جواب پاکر سخت مشتعل ہوا اور اس نے طے کر لیا کہ جس طرح بھی ہو اس "خود سر" عالم کو مزہ چکھا کر چھوڑنا ہے۔

ایسے علماء کی کسی زمانہ میں کمی نہیں رہی ہے جو دولت و جاہ اور شہرت حاصل کرنے کے لئے اپنے ضمیر کو حکومت وقت کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور محض اپنے ذاتی فائدہ اور نفسانی اغراض کی خاطر نہ صرف یہ کہ اپنی جبیں علم کو حکومت کی ذلیل چوکھٹ پر ٹیک دیتے ہیں بلکہ اپنے مقصد میں کامیابی کے لئے دوسرے علماء حق کی پگڑیاں اچھالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہی حال امام بخاریؒ کے ساتھ بھی ہوا۔ ایسے علماء جو بظاہر امام کے رفیق کار اور ہمدرد تھے لیکن سردار بخارا کی دولت کی جھنکار پر سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھے اور ان کو سردار نے اپنے ساتھ لے کر امام بخاریؒ کے علم و فضل پر طعن و تشنیع شروع کی اور امام بخاریؒ کے مسلک اور اجتہاد پر تنقیدیں کرنے لگا آخر کار ان ہی علماء کی مدد سے ایک فہرست الزام تیار کی گئی جس کی بناء پر امام بخاریؒ کو بخارا سے شہر بدر کر دیا گیا۔

امام بخاری جس وقت شہر سے باہر ہو رہے تھے تو آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ "خداوندا! میں یہ معاملہ تیرے سپرد کرتا ہوں" چنانچہ ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہی سردار خالد بن احمد خلیفۂ وقت کے حکم سے معزول کر دیا گیا، نہ صرف یہ بلکہ خلیفہ کا حکم ہوا کہ اس کو گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں اس کو تشہیر کرو۔ چنانچہ اس کا انجام یہ ہوا۔

اسی طرح ایک عالم حریث بن ورقہ جو امام بخاریؒ کے خلاف سازش میں حاکم کا ساتھی تھا وہ بہت بری طرح ذلیل و خوار ہوا۔ ایک اور دوسرا عالم بھی اس سازش میں شریک تھا اس کا انجام بھی یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کے قہر نے بشکل آفت وبلا اس کو اپنی گرفت میں لے لیا، اور اس کے تمام بچے مر گئے۔

امام بخاریؒ بخارا سے نکل کر نیشاپور پہنچے، آپ کی خودداری اور استغناء نے نیشاپور کے حاکم کو بھی ناراض کر دیا اس لئے نیشاپور بھی چھوڑنا پڑا اور آخر کار آپ نے سمرقند سے چھ کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں خرتنگ میں اقامت اختیار کی، اسی جگہ آپ کا پیمانۂ حیات بھی لبریز ہو گیا۔ اور رمضان کی آخری تاریخ عید کی رات ۲۵۶ھ میں بعمر ۶۲ سال آپ واصل بحق ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کے اساتذہ کی تعداد کثیر ہے، بڑے اور جلیل القدر اساتذہ میں خصوصیت کے ساتھ اسحٰق بن راہویہؒ، علی بن مدینی، احمد بن حنبل، اور یحییٰ بن معین رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اسماء ذکر کئے جاتے ہیں۔

خطیب ابوبکر بغدادی نے اپنی مسند کے حوالے سے عبدالواحد طراوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں نے سلام عرض کیا۔ آنحضرت ﷺ نے جواب دیا۔ میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ! آپ یہاں کس کے انتظار میں کھڑے ہیں؟ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم محمد بن اسمٰعیل کا انتظار کر رہے ہیں، عبدالواحد کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد امام بخاریؒ کے وصال کی خبر مجھے ملی اور جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا

کہ عین اسی وقت امام بخاریؒ کا انتقال ہوا تھا جب کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں امام بخاریؒ کا منتظر پایا تھا۔
حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اپنے ترجمہ میں اس خواب کو لکھتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ جس وقت امام بخاریؒ کو دفن کیا گیا تو ان کی قبر سے مشک کی خوشبو آتی تھی اور وہی خوشبو بہت عرصہ تک قبر مبارک کی مٹی سے آتی رہی۔
بہت سے حضرات نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے بخاری شریف کو اپنی جانب منسوب فرمایا ہے چنانچہ محمد بن احمد مروزی ایک روز رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان سو رہے تھے۔ خواب میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ فرما رہے ہیں "اے ابوزید! تو کتاب شافعی کا درس کب تک دے گا، آخر میری کتاب کا درس کیوں نہیں دیتا" یہ ڈرے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں آپ پر قربان! آپ کی کون سی کتاب ہے کہ جس کا درس مجھے دینا چاہئے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا "جامع محمد بن اسمٰعیل (یعنی بخاری شریف)" امام الحرمین سے بھی اسی قسم کا خواب نقل کیا جاتا ہے۔
امام بخاریؒ کی تصنیفات کئی ہیں ان میں سب سے عظیم اور جلیل القدر تصنیف تو صحیح بخاری شریف ہے جس کو تمام دنیائے اسلام میں شہرت دوام حاصل ہے دوسری کتاب التاریخ ہے۔ تیسری کتاب الادب ہے، چوتھی کتاب رفع یدین، اسی طرح اور بھی بہت سی کتابیں امام بخاریؒ کی تصنیف کی ہوئی ہیں جو آپ کے علم و فضل کا شاہکار ہیں۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا اسم گرامی مسلم بن حجاج ہے اور کنیت ابوالحسین ہے، قشیری قوم سے ہیں اور نیشاپور آپ کا وطن ہے آپ ۲۰۴ھ یا ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ بھی جلیل القدر محدث تھے اور فن حدیث کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں، ابوحاتم رازی، ترمذی اور ابوبکر بن خزیمہ آپ کے مایۂ ناز شاگردوں میں ہیں۔ ابوحاتم رازی نے امام مسلمؒ کو انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور ان سے ان کے حالات دریافت کئے امام مسلمؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نواز رکھا ہے، مجھ پر جنّت کے دروازے کھول دیے گئے ہیں اور جنّت کی وسعتیں میرے لئے وقف ہیں جہاں چاہتا ہوں رہتا ہوں۔
ابوعلی زاغنی نے امام مسلمؒ کی وفات کے بعد ایک معتبر اور متقی شخص کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ تمہاری نجات کس چیز کی بنا پر ہوئی انہوں نے اپنے ہاتھ میں کچھ اوراق لے رکھے تھے اسے آگے کرتے ہوئے اور دکھاتے ہوئے کہا کہ اس چیز کی وجہ سے یہ صحیح مسلم شریف کے اجزاء تھے۔
کتاب تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک دن امام مسلمؒ کی مجلس میں ایک حدیث کا ذکر ہوا لوگوں نے امام مسلمؒ سے اس حدیث کے بارہ میں دریافت کیا۔ امام مسلمؒ کو اس وقت وہ حدیث یاد نہیں تھی وہاں سے اٹھ کر مکان میں تشریف لائے۔ ایک ٹوکرا کھجوروں کا بھر کر اپنے پاس رکھ لیا اور حدیث تلاش کرنے لگے۔ اس میں سے آپ ایک ایک کھجور کھاتے رہے اور حدیث تلاش کرتے رہے آخر کار وہ حدیث مل گئی لیکن اس اثناء میں پورا ٹوکرا کھجوروں کا ختم کر گئے۔ تلاش حدیث میں اتنا مستغرق ہوئے کہ اس کا بھی دھیان نہ رہا کہ اتنی کھجوریں کہاں ہضم ہوں گی۔ آخر کار آپ کے انتقال کا یہی سبب ہوا۔ چنانچہ ۲۴ رجب ۲۶۱ھ بروز اتوار اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور واصل بحق ہوئے اناللہ وانا الیہ راجعون۔
امام مسلمؒ کا سب سے اہم اور عظیم کارنامہ جامع صحیح مسلم شریف ہے جو حدیث کی ایک عظیم اور بخاری کی طرح سب سے صحیح کتاب ہے اس کے علاوہ بھی آپ کی تصنیفات بہت زیادہ ہیں مثلاً مسند کبیر، جامع کبیر، کتاب العلل، کتاب اوہام محدثین، کتاب تمیز، کتاب من لیس لہ الا راو واحد، کتاب طبقات مخضرمین، کتاب الاسماء والکنی، کتاب الوحدان، کتاب حدیث عمرو بن شعیب، کتاب مشائخ مالک، کتاب مشائخ ثوری وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں ہیں جو آپ نے تصنیف کی ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا اسم گرامی مالکؒ ہے۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے مالک بن انس بن مالک بن ابوعامر بن عامر بن الحارث بن غیمان بن خیثل الخ آپ کے پردادا ابوعامر کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل تھا لیکن محدّث ذہبی نے تجرید الصحابہ میں ان کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ میں نے یہ کہیں منقول نہیں پایا کہ ابوعامر صحابی تھے مگر اتنا ثابت ہے کہ ان کی پیدائش آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔

ابوعامر کے لڑکے مالک تابعی ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہ سے ان کی منقول روایتیں آتی ہیں، شیخ محمد ابراہیم بن خلیل نے شرح مختصر خلیل میں ابوعامر کے بارے میں لکھا ہے کہ امام مالک کے پردادا ابوعامر صحابی ہیں اور بدر کے علاوہ تمام غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک رہے۔ حضرت امام مالکؒ اصبحی قوم میں سے ہیں، آپ کی پیدائش ۹۳ھ میں ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام مالکؒ دو یا تین برس حالت حمل میں رہے ہیں۔

امام مالکؒ علم حدیث کے حاصل کرنے میں بہت حریص تھے اور اتباع سُنّت پیغمبر ﷺ ان کی زندگی کا مابہ الامتیاز مقام تھا۔ شروع میں جب علم حدیث کے طلب کا شوق بہت زیادہ تھا اور گھر میں اتنی وسعت نہیں تھی کہ باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکیں تو امام مالکؒ نے اپنے گھر کی کڑیاں بیچ دیں اور ان کے پیسوں سے کتابیں خریدیں، بعد میں حضرت امام مالکؒ کا ستارۂ شہرت جب عروج پر پہنچا اور مخلوق خدا نے ان کو اپنا مرجع بنایا تو زندگی کی ہر آسائش و راحت قدموں میں نچھاور ہونے لگی۔ حضرت امام موصوفؒ کا حافظہ بہت تیز اور قوی تھا۔ خود فرماتے تھے کہ جس چیز کو میں ایک مرتبہ یاد کر لیتا ہوں پھر زندگی بھر اسے نہیں بھولتا۔

حضرت امام مالکؒ نے صرف سترہ برس کی عمر میں حدیث کا درس دینا شروع فرما دیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام موصوف کے درس حدیث کے ابتدائی ایام میں ہی مدینہ کی ایک شریف و نیک اور معزز عورت کا انتقال ہوا۔ میت کو غسل دیا جانے لگا اور دوران غسل جب غسالہ کا ہاتھ میت کی شرمگاہ پر پہنچا تو اس کم بخت نے کہا کہ یہ عورت زانیہ تھی اور اپنی زندگی میں حرامکاری کیا کرتی تھی، جوں ہی اس نے یہ کہا اس کا وہ ہاتھ میت کی شرمگاہ پر چپک کر رہ گیا۔ غسالہ بہت پریشان ہوئی۔ اس نے لاکھ چاہا کہ ہاتھ ہٹائے لیکن اس کا ہاتھ وہاں سے علیحدہ نہیں ہوا۔ یہ بڑا عجیب واقعہ تھا لوگوں نے علماء وقت سے رجوع کیا اور تدبیر دریافت کی۔ لیکن کوئی بھی کچھ نہیں بتا سکا۔ آخر کار امام مالکؒ کی خدمت میں لوگ حاضر ہوئے اور صورت حال بیان کی۔ امام مالکؒ کی ذہانت نے فوراً علاج تجویز کیا۔ آپ نے فرمایا کہ چونکہ اس غسالہ نے ایک نیک اور پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگائی ہے جس پر عذاب خداوندی اس شکل میں ظاہر ہوا۔ اب اس کا علاج یہی ہے کہ اس پر حد تہمت جاری کی جائے۔

چنانچہ جب حد تہمت کے طور پر اس کو اسی کوڑے مارے گئے تو اس کا ہاتھ وہاں سے علیحدہ ہوا۔ اس وقت سے لوگ حضرت امام کے علم و فضل کے قائل ہو گئے اور آپ کے کمال و فضل کا ڈنکا چاروں طرف بجنے لگا۔

حضرت امام مالکؒ نے اپنے ہاتھ سے ایک ہزار حدیثیں لکھی تھیں جو تمام محدثین میں صرف آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ کمال ادب کی بناء پر حضرت امام موصوف نے حرم مدینہ میں کبھی استنجاء نہیں کیا۔ قضاء حاجت کے لئے ہمیشہ باہر تشریف لے جاتے تھے، البتہ حالت بیماری میں جب بہت مجبور ہوتے تھے تو وہیں استنجاء فرما لیا کرتے تھے۔

حدیث میں آپ کی مایۂ ناز کتاب "مؤطا" کو تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے آپ سے سنا ہے اور حدیث میں آپ سے سند لی ہے آپ کے وصال کے بعد بھی اس کتاب کو دنیائے اسلام میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اہل علم اس سے فیض یاب ہوئے، اور ہو رہے ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا اسم گرامی محمد اور کنیت ابوعبداللہ ہے، شافعی کے نام سے مشہور ہیں، آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے محمد بن ادریس بن عباس ابن عثمان شافع بن سائب بن عبید بن عبدیزید بن ہاشم بن مطلب بن عبد مناف القریشی المطلبی۔ شافع کو مطلبی کہتے ہیں کیونکہ ان کے جد اعلیٰ کا نام مطلب تھا جو ہاشم بن عبد مناف کے بھائی تھے۔ چنانچہ وہ ہاشم جو مطلب کے لڑکے ہیں ان کی اولاد میں حضرت امام شافعیؒ ہیں اور وہ ہاشم جو عبد مناف کے لڑکے اور مطلب کے بھائی ہیں نبی کریم ﷺ کے جد اعلیٰ ہیں۔ اس طرح نبی کریم ﷺ اور حضرت امام شافعیؒ کے سلسلۂ نسب عبد مناف پر جا کر مل جاتے ہیں۔

شافع نے جو امام شافعیؒ کے جد اعلیٰ ہیں حضرت رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا تھا اور ان کے باپ سائب بھی نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے بلکہ بدر میں جب حق و باطل کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہوا تو قریش (کفار) کی جانب سے بنی ہاشم کے علم بردار یہی سائب تھے جنگ بدر میں جب کفار کو شکست ہوئی اور بے شمار لوگ اسیر بنائے گئے تو ان قیدیوں میں سائب بھی تھے پھر بعد میں فدیہ ادا کر کے رہا ہوئے اور اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔

حضرت امام شافعیؒ کی پیدائش مبارک ۱۵۰ھ میں غزہ کے مقام پر ہوئی۔ بعض کے نزدیک آپ کی پیدائش عسقلان میں ہوئی ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ منی میں آپ کی پیدائش کے قائل ہیں پھر مکہ لے جائے گئے جہاں آپ کی پرورش ہوئی اور یہاں کے مقدس ماحول میں آپ کا نشو و نما ہوا۔ سات برس کی عمر میں آپ نے پورا قرآن مجید حفظ کیا اور دس برس کی عمر میں مؤطا امام مالک کو یاد کر لیا۔ فقہ کی تعلیم آپ نے مسلم بن خالد سے حاصل کی جو اس زمانہ میں مفتی تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں آپ کو وقت کے مشاہیر علماء اور مشائخ سے فتوی نویسی کی اجازت حاصل ہوگئی تھی۔ بعد میں تحصیل علم کے شوق میں مدینہ منورہ کی طرف اختیار فرمایا اور وہاں امام مالکؒ کی خدمت میں علم کے حصول میں منہمک ہوگئے۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ابتداء عمر میں مجھے شعر و شاعری کا بہت شوق تھا اور بہت زیادہ اشعار ذہن میں محفوظ ہوگئے تھے جن کو ہر وقت پڑھا کرتا تھا اسی زمانہ میں ایک دن کعبہ مکرمہ کے سایہ میں بالکل تنہا بیٹھا تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک ندا آئی، امام صاحبؒ فرماتے ہیں۔ میں نے بہت غور سے سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے:

یا محمد علیک بالثقة ودع الشعر۔

"اے محمد! اس چیز کو اختیار کرو جو سچی و مستحکم ہے، شعر و شاعری چھوڑو۔"

اسی طرح امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بالغ ہونے سے پہلے میں نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ نبی کریم ﷺ مجھے آواز دے رہے ہیں۔ میں نے کہا لبیک یا رسول اللہ! حضور ﷺ نے سوال فرمایا کہ تم کس قبیلہ سے ہو؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ﷺ ہی کے قبیلہ سے ہوں۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے نزدیک آؤ اور اپنا منہ کھولو۔ میں فوراً آنحضرت ﷺ کے پاس گیا اور اپنے منہ کھول دیا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے دہن مبارک کا لعاب مقدس میرے منہ میں ڈالا اور فرمایا کہ جاؤ اللہ تعالیٰ تمہیں برکت و سعادت سے نوازے۔ حضرت امام شافعیؒ اس مبارک خواب کا اثر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کے بعد پھر مجھ سے علم حدیث اور عربی ادب میں کبھی کوئی غلطی واقع نہیں ہوئی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب میں امام مالکؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو امام مالکؒ نے میری گفتگو اور قیافے سے شناخت کرنے کے بعد سوال فرمایا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میرا نام محمد ہے۔ اس کے بعد امام مالکؒ نے ارشاد فرمایا کہ اے محمد تقویٰ اختیار کرو۔ خدا سے ڈرتے رہو اور گناہوں سے بچو کیونکہ اللہ تعالیٰ اُمت محمدیہ میں تمہیں بڑی شان و عظمت کا مالک بنائے گا،

بہر حال میں امام مالکؒ کی خدمت میں بہت عرصہ تک تحصیل علم میں مشغول رہا، حصول علم سے فراغت کے بعد جب واپس ہونے لگا اور امام مالکؒ سے واپسی کی اجازت چاہی تو امام موصوف نے رخصت کے وقت مجھ کو نصیحت فرمائی کہ:

"اے نوجوانو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں نور ڈالا ہے لہٰذا تم پر واجب ہے کہ اس نور کی حفاظت کرو، دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ گناہ کی تاریکی اس نور کو ڈھانک لے اور وہ جاتا رہے۔"

امام مالکؒ سے رخصت ہو کر آپ بغداد پہنچے اور وہاں کے عالموں سے حدیث وفقہ کی مزید تعلیم حاصل کی، وہاں سے مکہ آئے اور مکہ سے پھر دوبارہ بغداد تشریف لے گئے، کچھ عرصہ کے بعد مصر چلے گئے، جہاں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور وہاں آپ نے مہتم بالشان تصانیف کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ آپ نے اصول دین پر چودہ کتابیں تصنیف فرمائیں اور فروع دین کے مبحث میں تقریباً ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ امام احمد بن حنبلؒ سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: کہ میں حدیث میں ناسخ و منسوخ، خاص و عام اور مفصل و مجمل کا علم نہ رکھتا تھا مگر جب امام شافعیؒ کی صحبت اختیار کی تو مجھے ان چیزوں کا پتہ چلا۔

حضرت امام اعظمؒ کے شاگرد رشید حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے مجھ سے حضرت امام اعظم کی تصنیف "کتاب اوسط" عاریتاً لی اور پوری کتاب کو ایک رات اور ایک دن میں یاد کر لیا۔ حضرت امام شافعیؒ کی وفات آخر رجب ۲۰۴ھ جمعہ کے دن مصر میں ہوئی اور اسی دن سپرد خاک کئے گئے، ان کی ۱۱۴ تصانیف میں سے "کتاب الام" خاص اہمیت رکھتی ہے۔

آپ کے جلیل القدر اساتذہ میں حضرت امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں ان کے علاوہ اور بھی اساتذہ ہیں جن سے امام موصوف نے حدیث کا علم حاصل کیا ہے۔ شاگردوں میں امام احمد بن حنبلؒ، ابوسفیان ثوریؒ اور مزنیؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ تلامذہ کی ایک بہت بڑی تعداد نے امام صاحب سے اکتساب فیض کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوعبداللہ اور اسم مبارک "احمد" ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن حنبل بن حلال بن اسد ادریس بن عبداللہ ابن حبان اسد بن ربیعہ بن نزار بن سعد بن عدنان الخ۔

آپ کے علم و فضل کے بارہ میں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے وقت میں حدیث وفقہ کے پیشوا اور مقتدا تسلیم کئے جاتے تھے بے حد عابد و زاہد اور متقی و پرہیز گار تھے۔ آپ کی عبادت میں خشوع و خضوع بہت ہوتا تھا، بغداد میں آپ کی پرورش ہوئی اور وہیں طلب علم اور تحصیل حدیث کے مراحل طے کئے اس کے بعد حدیث کی سماعت اور ان کے حاصل کرنے کی غرض سے کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن اور شام و دیگر جزائر کا طویل سفر اختیار فرمایا اور ہر جگہ کے مشہور علماء و محدثین سے احادیث کی سند حاصل فرمائی۔

آپ کے اساتذہ میں یزید بن ہارون، یحییٰ بن سعید قطان، سفیان بن عیینہ اور امام شافعی ہیں جن سے آپ نے احادیث روایت فرمائی امام احمد بن حنبل کے مخصوص تلامذہ امام بخاری، مسلم بن حجاج قشیری، ابوزرعہ اور ابوداؤد سجستانی ہیں، ان حضرات نے آپ سے احادیث نقل کی ہیں۔

حضرت اسحٰق بن راہویہؒ کی آپ کے بارے میں رائے تھی کہ امام احمد بن حنبلؒ خدا اور بندوں کے درمیان حجت یعنی دلیل ہیں۔ امام شافعیؒ کی شہادت تھی کہ میں نے بغداد میں پرہیز گاری، تقویٰ اور علم میں احمد بن حنبلؒ سے زیادہ کسی دوسرے کو نہیں پایا۔

احمد بن سعید دارمی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے پیغمبر خدا ﷺ کی احادیث کو زیادہ یاد رکھنے والا امام احمد بن حنبلؒ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو نہیں دیکھا۔

حضرت ابوداؤد سجستانیؒ سے منقول ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ امام احمد بن حنبلؒ کی صحبت میں بیٹھنا آخرت کی صحبت اختیار کرنے کے مترادف ہے کیونکہ ان کی مجلس میں سوائے امور دین کے ذکر اور گفتگو کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے کمال فقر اختیار کیا اور ستر برس تک استغناء و توکل کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے باوجود اپنی جلالت شان اور عظمت کے کبھی عیش و آرام کی تمنا نہیں کی اور نہ کبھی کسی سے کچھ قبول کیا۔

محمد بن موسیٰ ناقل ہیں کہ اہل مصر نے حسن بن عبدالعزیز کے واسطے ایک لاکھ اشرفیاں سونے کی بطور میراث کے کئی جانوروں پر لاد کر بغداد بھیجیں حسن بن عبدالعزیز نے ان میں سے کئی تھیلیاں ایک ایک ہزار اشرفی کی امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں بھیجیں اور عرض کیا کہ یہ مال مجھ کو حلال طریقہ پر میراث میں ملا ہے اس میں کچھ حصہ آپ بھی قبول فرمایئے اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات میں صرف فرمایئے امام احمد بن حنبلؒ نے انکار فرمادیا اور ان میں سے ایک اشرفی بھی قبول نہیں کی اور فرمایا کہ مجھے اس کی قطعاً حاجت نہیں ہے۔ اسی طرح بہت سے واقعات نقل کئے گئے ہیں جن سے آپ کے صبر و توکل، استغناء و تقویٰ اور پرہیزگاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش مبارک ۱۶۴ھ میں بغداد میں ہوئی۔ اور ۲۴۱ھ میں جمعہ کے روز بغداد ہی میں وصال فرمایا اور اسی روز عصر کے بعد سپرد خاک کر دیے گئے۔

آپ کی تصانیف میں مشہور کتاب "مسند" ہے جو محدثین کے نزدیک ایک بہت اہم تصنیف ہے جس میں آپ نے تیس ہزار سے زائد احادیث نقل کی ہیں۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوعیسیٰ اور اسم گرامی محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ ضحاک ترمذی ہے۔ شہر ترمذ کی طرف نسبت کی وجہ سے ترمذی کے نام سے مشہور ہیں۔ امام ترمذیؒ بڑے پایہ کے محدث ہیں۔ آپ کی جلالت اور رفعت شان کا اندازہ حدیث کی مشہور و مستند کتاب ترمذی شریف سے لگایا جاسکتا ہے جس کے آپ مصنف ہیں۔ ترمذی شریف محدثین کے نزدیک حدیث کی ایک اہم اور باعظمت کتاب ہے اور مندرجہ ذیل خصوصیات کی بنا پر صحاح ستہ کی دیگر کتب پر فوقیت رکھتی ہے۔

اوّل تو یہ کہ آپ نے احادیث کو نقل کرتے ہوئے ان راویوں کے نام ضرور لکھے ہیں جن سے وہ احادیث ان کو حاصل ہوئی ہیں، تاکہ احادیث کی حیثیت باعتبار مشہور متواتر اور احاد کے روشن ہو جاوے۔

دوسرے یہ کہ حدیث کو نقل کرنے کے ساتھ اس سے اخذ شدہ مسئلہ میں علماء کا اختلاف اور ان کے مذاہب بھی نقل کئے ہیں۔

تیسرے یہ کہ ہر موقع پر راوی کے احوال بھی لکھے ہیں کہ یہ راوی ضعیف ہے اور یہ قوی ہے، اسی طرح حدیث کا حال بھی بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا حسن ہے، اور غریب ہے یا منکر ہے، روایت حدیث کے سلسلے میں امام موصوف اور نبی کریم ﷺ کے درمیان جو واسطے ہیں وہ کم سے کم تین ہیں اور زیادہ سے زیادہ دس ہیں، چنانچہ ایک حدیث ایسی ہے جس میں صرف تین واسطے ہیں۔ جس حدیث کو روایت کرتے وقت نبی کریم ﷺ تک درمیان میں تین واسطے ہوں اس حدیث کو ثلاثی کہتے ہیں۔

جن محدثین سے آپ نے احادیث روایت فرمائی ہیں ان میں قتیبہ بن سعید، محمود بن غیلان، محمد بن بشار، احمد بن منیع اور محمد بن مثنی بطور خاص ذکر کئے جاتے ہیں ان کے علاوہ دوسرے علماء اور محدثین بھی ہیں جن سے آپ نے احادیث نقل کی ہیں۔

آپ کے تلامذہ کی تعداد بھی کافی ہے جن میں سے محمد بن احمد اور حیثم بن کلیب خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ آپ نے اپنی "جامع ترمذی شریف" تصنیف فرما کر حجاز، عراق اور خراسان کے علماء کی خدمت میں بھجوائی جہاں وقعت و احترام اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔

آپ کی ایک تصنیف شمائل نبوی ﷺ بھی ہے جس میں نبی کریم ﷺ کی سیرت مقدسہ اور حلیہ مبارکہ بیان کیا گیا ہے آپ کی پیدائش مبارک ۲۰۹ھ میں ہوئی اور ۲۷۹ھ میں وصال فرمایا۔

امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوداؤد اور اسم مبارک سلیمان بن اشعث بن اسحٰق بن بشیر ہے۔ چونکہ آپ علاقہ سجستان کے رہنے والے تھے اس لئے اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے، آپ نے طلب علم اور حصول حدیث کے شوق میں وطن سے نکل کر بہت سے ممالک کا سفر کیا۔ عراق، خراسان، شام، مصر اور حجاز کے علماء و محدثین کے ہاں حاضر ہوئے اور احادیث سن کر ان سے روایت کی اجازت لی۔ آپ نے بڑے جلیل القدر علماء اور محدثین سے احادیث روایت کی ہیں جیسے مسلم بن ابراہیم، سلیمان بن حرب، یحیٰی بن معین اور امام احمد بن حنبلؒ، آپ سے روایت کرنے والے حضرات میں ابوعبدالرحمٰن نسائی اور احمد بن محمد کا نام خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے۔

امام ابوداؤد کا اصل وطن بصرہ ہے، بعد میں بغداد بھی تشریف لے گئے اور وہیں اپنی عظیم کتاب "سنن ابوداؤد" تصنیف فرمائی، وہاں کے لوگوں نے جب سنن ابوداؤد کو امام موصوف کی سند کے ساتھ امام احمد بن حنبلؒ کو سنایا تو انہوں نے بہت زیادہ پسندیدگی کا اظہار فرمایا، خود امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ کی پانچ لاکھ احادیث میں نے علماء و محدثین سے نقل کی ہیں، ان میں سے وہ ایک ہزار چھ سو احادیث جو اپنی صحت کے اعتبار سے سب سے معتبر اور مستند تھیں اپنی کتاب میں جمع کیں اور ان میں سے بھی چار احادیث ایسی ہیں جو تمام احادیث کے برابر ہیں یعنی دین و شریعت کی تمام باتیں اور حکمتیں مجملاً ان چار حدیثوں میں آگئی ہیں۔

❶ انما الاعمال بالنیات۔

❷ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ۔

❸ لا یکون المؤمن مؤمنا حتی رضی لاخیہ مایرضی لنفسہ۔

❹ ان الحلال بین وان الحرام بین وبینھما مشتبھات۔

ابوبکر خلالؒ کی شہادت آپ کے بارے میں یہ تھی کہ امام ابوداؤد اپنے زمانہ میں پیشوا تھے اور نہایت ہی منصف مزاج و پرہیزگار تھے۔ نیز فن حدیث میں بہت زیادہ بصیرت اور کمال و مہارت رکھتے تھے اور فن حدیث میں ان کی کتاب بہت جلیل القدر مرتبہ کی ہے یہاں تک کہ بخاری و مسلم کے بعد ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ امام ابوداؤد کی پیدائش ۲۰۲ھ کی ہے اور آپ کا وصال ۱۶ شوال ۲۷۵ھ کو ہوا۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوعبدالرحمٰن اور اسم گرامی احمد بن شعیب بن علی بن بحر بن سنان ہے چونکہ آپ خراسان کے ایک شہر "نسا" کے رہنے والے تھے اس لئے نسائیؒ کے نام سے مشہور ہیں آپ کی پیدائش ۲۱۴ھ یا ۲۱۵ھ میں ہوئی۔

آپ نے بھی حصول علم کی خاطر بہت ممالک کا سفر اختیار فرمایا اور اپنے وقت کے مشہور اور جلیل القدر علماء و محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر علم حدیث کی دولت سے مالا مال ہوئے اس سلسلہ میں آپ خراسان، حجاز، عراق، جزیرہ شام اور مصر گئے اور وہاں کے علماء سے تحصیل علم کیا۔

جب سب سے پہلے آپ طلب علم اور حصول حدیث کے لئے قتیبہ بن سعید کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اس وقت آپ کی عمر

صرف پندرہ برس کی تھی۔ قتیبہ بن سعید کے یہاں ایک برس دو مہینے رہ کر ان سے اکتساب فض کیا۔ امام نسائیؒ رحمہ اللہ شافعی المذہب تھے جیسا کہ ان کی تصنیف مناسک الحج سے معلوم ہوتا ہے۔

آپ ہمیشہ صوم داؤدی رکھتے تھے صوم داؤد اس کو کہتے ہیں کہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن نہ رکھے، باوجود اتنے زیادہ روزے رکھنے کے آپ بے انتہا قوت کے مالک تھے چنانچہ چار عورتیں آپ کے نکاح میں تھیں اور ہر عورت کے پاس ایک رات رہا کرتے تھے، ان کے علاوہ باندیاں بھی تھیں۔

امام نسائیؒ جب اپنی تصنیف سنن کبریٰ سے فارغ ہوئے تو ایک دن ان کے یہاں کے ایک امیر نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے جو یہ کتاب تصنیف کی ہے اس میں تمام احادیث صحیح ہیں؟ امام موصوف نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ بعض صحیح ہیں اور بعض حسن۔ اس امیر نے آپ سے درخواست کی کہ ان تمام احادیث میں جو حدیثیں نہایت اعلیٰ درجہ کی صحیح ہوں ان کو آپ میرے لئے الگ نقل کر دیجئے چنانچہ آپ نے اسی سلسلہ میں سنن مجتبیٰ تصنیف فرمائی۔

آپ کی وفات بڑے مظلومانہ اور درد انگیز طریقہ پر ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے آپ کے زمانہ میں بنی امیہ کی سلطنت تھی جو حضرت علیؓ کے خلاف تھے آپ نے ایک کتاب تصنیف فرمائی جس میں حضرت علیؓ کے اوصاف و مناقب اور ان کے مبارک احوال بیان کیے گئے تھے کتاب کی تصنیف سے فراغت کے بعد آپ نے جمعہ کے روز جامع دمشق میں وہاں کے لوگوں کے سامنے اس کتاب کو پڑھنے کا ارادہ کیا، تاکہ اس سے عوام کے ذہن و فکر کی اصلاح ہو سکے اور حضرت علیؓ کے متعلق جو غلط اور گمراہ کن خیالات لوگوں کے ذہن میں سلطنت بنی امیہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے، وہ دور ہو سکیں۔

چنانچہ ایک دن مسجد میں مجمع کے سامنے آپ نے وہ کتاب پڑھنی شروع کی۔ ابھی تھوڑی ہی سی پڑھ پائے تھے کہ ایک آدمی درمیان مجمع سے اٹھا اور سوال کیا کہ آپ نے علیؓ کے اوصاف و مناقب تو اس کتاب میں لکھ دیے مگر یہ تو بتائیے کہ حضرت معاویہؓ کے مناقب بھی لکھے ہیں یا نہیں؟۔

امام نسائی نے جواب دیا کہ مجھے امام معاویہؓ کی عظمت و فضیلت بھی تسلیم ہے اور ان کی نجات سے انکار نہیں لیکن ان کے مناقب حضرت علیؓ کے مقابلہ میں اتنی اہمیت نہیں رکھتے کہ میں ان کو لکھوں، بعض حضرات نے امام نسائیؒ کا جواب اس طرح بھی نقل کیا ہے کہ امام موصوف نے فرمایا: حضرت معاویہؓ کے فضائل و مناقب میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔

امام نسائیؒ کا یہ کہنا تھا کہ پورا مجمع برافروختہ اور شعلہ بداماں ہو گیا اور آپ پر ٹوٹ پڑا۔ اور آپ کو اتنا زدوکوب کیا کہ اٹھنے کی بھی سکت باقی نہ رہی آخر کار ان کے خدام اٹھا کر مکان پر لائے۔ مکان پر پہنچتے ہی آپ نے کہا کہ مجھے اسی وقت مکہ لے چلو تاکہ میری موت اسی دیار مقدس میں یا اس کے راستہ میں ہو۔ چنانچہ آپ کو مکہ لے جایا گیا اور وہیں ۱۳ صفر ۳۰۳ھ بروز دوشنبہ شہادت کا مرتبہ پا کر وصال فرمایا اور صفا و مروہ کے درمیان سپرد خاک کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوعبداللہ اور اسم گرامی محمد بن یزید بن ماجہ ہے آپ قزوین کے رہنے والے تھے جو عراق و فارس کے درمیان ایک شہر ہے اور ربعی قبیلہ سے تھے جو ربیعہ بالولاکی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے آپ فن حدیث کے مقتدا اور پیشوا مانے جاتے تھے اور حافظ حدیث تسلیم کئے جاتے ہیں۔ امام مالکؒ کے تلامذہ سے آپ نے حدیث کا علم حاصل کیا اور اس سلسلہ میں بہت سے ممالک کا سفر اختیار فرمایا۔

آپ کی مایۂ ناز تصنیف "ابن ماجہ" نصاب حدیث کی ایک اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ ابن ماجہ شریف کو بھی بعض محدثین و علماء نے

صحاح ستہ میں شمار کیا ہے اس کتاب میں آپ سے ثلاثی احادیث بھی کافی تعداد میں منقول ہیں۔ چونکہ ابن ماجہ میں ایک حدیث منکر بلکہ موضوع نقل کی گئی ہے اس لئے بعض حضرات اس کو صحاح ستہ میں شمار نہیں کرتے۔

آپ کے وطن قزوین کی فضیلت میں بعض لوگوں نے بہت زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں لیکن محققین و محدثین کے نزدیک وہ سب موضوع ہیں آپ کی پیدائش ۲۰۹ھ میں ہوئی اور ۲۷ رمضان ۲۷۳ھ بروز دوشنبہ انتقال فرمایا۔ واللہ اعلم۔

امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابو محمد اور اسم گرامی عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن فضل سمرقندی الدارمی ہے۔ سمرقندی نسبت ہے شہر سمرقند کی طرف جہاں کے آپ رہنے والے تھے اور دارمی قبیلہ کی نسبت ہے۔

آپ بھی ایک جلیل القدر محدث اور عالم تھے۔ تقویٰ و تقدس اور زہد و قناعت کے اوصاف جمیلہ سے مزین تھے، آپ تصنیف کی بھی احادیث کی کتابوں میں ایک ممتاز مقام کی مالک ہے۔

آپ کے اساتذہ میں ابن ماجہؒ، حبان بن ہلالؒ، نضر بن شمیلؒ اور حیوۃ بن شریح ہیں، آپ کے تلامذہ کی تعداد بھی کافی ہے جن میں امام مسلمؒ امام ترمذیؒ جیسے جلیل القدر محدثین بھی ہیں، آپ کی پیدائش ۱۸۱ھ کی ہے اور وفات ۲۵۵ھ نبوی میں ہوئی۔

اسحٰق بن احمد بن خلیفہ سے منقول ہے کہ میں حضرت امام بخاریؒ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی کے انتقال کی خبر پہنچی۔ امام بخاری نے غم و اندوہ سے سر نیچے جھکا لیا اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ امام بخاریؒ پر اتنا اثر تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر رخسار پر بہنے لگے۔

امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوالحسن اور اسم گرامی علی بن عمر دار قطنی ہے۔ آپ بھی علم حدیث میں جلیل القدر شخصیت اور صاحب فضل و کمال شمار کئے جاتے ہیں۔ خصوصیت سے حدیث کی علت اور راویوں کے احوال کی معرفت میں یکتا تھے آپ کی مشہور تصنیف "دار قطنی" ہے جو فن حدیث کی معتبر و مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ آپ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ اپنی تصنیف میں ایک حدیث کو کئی کئی سندوں سے بیان کرتے ہیں۔

آپ نے بھی طلب علم کے سلسلہ میں دور دراز جگہوں کا سفر اختیار فرمایا چنانچہ کوفہ، بصرہ، شام، واسط، مصر اور اسلام کے دیگر شہروں میں تشریف لے گئے جہاں کے مشہور علماء سے احادیث حاصل کیں۔

دار قطن بغداد کے ایک محلہ کا نام ہے جس کے آپ باشندہ تھے اسی لئے دار قطنی سے مشہور ہیں، عربی میں قطن روئی کو کہتے ہیں چونکہ یہ محلہ روئی کی منڈی تھا اس لئے دار قطن کہلاتا تھا۔

آپ کے تلامذہ میں ابونعیم، ابوبکر، برقانی، جوہری، قاضی ابوالطیب طبری، حاکم ابوعبداللہ نیشاپوری وغیرہ مشہور حضرات ہیں آپ کی پیدائش بغداد میں ۳۰۵ھ یا ۳۰۶ھ میں ہوئی ہے اور وفات بھی بغداد ہی میں ۲۲ ذیقعدہ ۳۵۰ھ کو ہوئی، بعض روایت میں آپ کی تاریخ وفات ۸ ذیقعدہ یوم جمعرات ہے۔ واللہ اعلم۔

امام احمد بن حسین بیہقی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوبکر ہے اور اسم شریف احمد بن حسین بیہقی ہے آپ بھی علماء و محدثین کے نزدیک ایک امام و مقتدا کی حیثیت رکھتے ہیں

آپ کا علمی مرتبہ اور فضل و کمال اہل علم کے یہاں مسلم ہے۔
آپ کی تصانیف کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہے۔ چنانچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا کہ آپ نے سات ہزار رسالے دین و شریعت کے مختلف گوشوں پر تحریر فرمائے ہیں جن سے آپ کی وسعت علمی، تبحر فن اور فضل کمال کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کی مشہور تصانیف میں خاص کتابیں یہ ہیں: کتاب مبسوط، کتاب السنن، کتاب دلائل النبوۃ، کتاب معرفت علوم حدیث، کتاب بعث والنشور، کتاب آداب، کتاب فضائل صحابہ، کتاب فضائل اوقات، کتاب شعب الایمان اور کتاب اخلاقیات وغیرہ۔
آپ کی پیدائش مبارک ماہ شعبان ۳۸۴ھ میں ہوئی اور وفات ۴۵۶ھ میں بمقام نیشاپور ہوئی۔

امام رزین بن معاویہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوالحسین اور نام رزین بن معاویہ العبدری ہے۔ قریش کا ایک مشہور قبیلہ عبدالدار تھا۔ رزین چونکہ اسی قبیلہ سے تھے، اس لئے اس کی طرف نسبت کی وجہ سے عبدری کہے جاتے تھے۔
یہ بھی ایک جلیل القدر محدث اور صاحب فضل و کمال عالم تھے ان کی وفات ۵۳۰ھ میں ہوئی ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوزکریا اور اسم گرامی یحییٰ بن اشرف حزامی ہے۔ آپ کا لقب محی الدین ہے، حزام آپ کے اجداد میں سے کسی کا نام تھا۔ اسی نسبت سے آپ کے خاندان والے حزامی کہلاتے تھے "نوو" دمشق کے قریب شام میں ایک مقام ہے جہاں کے آپ رہنے والے تھے۔ اس نسبت سے آپ کو نووی کہا جاتا ہے۔
آپ اپنے وطن نوو میں اول عشرہ محرم ۶۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴ رجب ۶۷۷ھ یوم چہار شنبہ میں وصال فرمایا۔

امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کنیت ابوالفرج، اسم گرامی عبدالرحمٰن بن علی حنبلی صدیقی ہے اور ابن جوزی کے نام سے مشہور ہیں جو ایک مقام فرضۃ الجوز کی طرف منسوب ہے۔
آپ ایک جلیل القدر عالم، صاحب فضل فقیہ اور باکمال محدث تھے، آپ کے فضل و کمال اور وسعت علم پر علماء کا اتفاق ہے، حدیث تفسیر فقہ، سیر، اخبار مواعظ میں بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں اور ان تمام علوم و فنون میں اپنے وقت کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں، نیز اہل علم کے نزدیک آپ کی فصاحت و بلاغت مسلم ہے۔
"موضوعات حدیث" پر آپ نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں آپ نے موضوع احادیث جمع کی ہیں، اسی طرح آپ کی ایک تصنیف "تلبیس ابلیس" ہے جس میں بدعت اور خلاف سُنّت اعمال پر بحث کی گئی ہے اور ان کا رد کیا گیا ہے نیز اس کتاب میں "اقوام شیطانی" کا دلچسپ بیان بھی ہے اور صوفیاء کے منکرین، مبتدعین اور ضالین کا زبردست رد کیا گیا ہے۔
امام ابن جوزیؒ بے حد ذہین اور ذکی تھے آپ کی ذہانت و ذکاوت کے واقعات سے سیر و تواریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، آپ ذہانت کا ایک واقعہ سیر کی کتابوں میں منقول ہے کہ ایک دن ایک سنی اور شیعہ میں جھگڑا ہوا، سنی کا دعوی تھا کہ حضرت ابوبکرؓ زیادہ افضل تھے، شیعہ حضرت علیؓ کی تفضیل ثابت کر رہا تھا، معاملہ بحث و مباحثہ اور اختلاف رائے سے گزر کر مخاصمت کی شکل اختیار کر گیا۔ آخر کار فریقین اس

پر تیار ہوگئے کہ ابن جوزی کو حکم بنایا جائے اور وہ جو فیصلہ کریں، اس کو حق تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ ایک دن جب کہ ابن جوزیؒ منبر وعظ پر پند ونصائح فرمارہے تھے درمیان سے فریقین میں کا ایک شخص کھڑا ہوا اور ان سے دریافت کیا کہ: من افضل الصحابة؟ (یعنی صحابہ میں زیادہ فضیلت والا کون ہے؟)۔

ابن جوزی کا معاملہ شناس ذہن سوال کی نزاکت سمجھ گیا، چونکہ اس وقت حکومت شیعوں کی تھی اس لئے ابن جوزیؒ نے جواب اس انداز سے دیا کہ نہ تو سنی کے خلاف ہو کہ حق کی مخالفت لازم آئے اور نہ شیعہ سمجھے کہ جواب میرے خلاف ہے اور اس کے نتیجے میں ایزا رسانی یا فتنہ وفساد کی نوبت آجائے۔ ابن جوزیؒ نے نہایت حکیمانہ اور مدبرانہ جواب دیا ارشاد فرمایا کہ:

افضل صحابة رسول اللّٰه الذی بنته فی بیته۔

"یعنی صحابہ رسول اللہ ﷺ میں زیادہ افضلیت والا وہ ہے کہ اس کی بیٹی اس کے گھر میں تھی۔"

امام ابن جوزیؒ صرف یہ کہہ کہ فوراً چلے گئے تاکہ اس جملہ کی تشریح نہ کرنی پڑے، ادھر ہر فریق اپنی جگہ خوش اور مطمئن، کہ فیصلہ میرے عقیدہ کے موافق ہوا۔ یعنی سنی یہ سمجھا کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ افضل وہ ہے جس کی بیٹی نبی کریم ﷺ کے گھر میں تھی، چونکہ حضرت ابوبکرؓ کی دختر حضرت عائشہ صدیقہؓ نبی کریم ﷺ کے گھر میں تھیں۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ افضل ہیں، شیعہ نے اس جملہ سے یہ مطلب اخذ کیا کہ زیادہ افضل وہ ہے جس کے گھر میں نبی کریم ﷺ کی دختر تھیں اور چونکہ آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ کے نکاح میں تھیں اس لئے حضرت علیؓ زیادہ افضل ہوئے۔

بہر حال ابن جوزیؒ کے ذکی ذہن نے اس جملہ میں ضمائر سے کام لے کر اس سوال کا بلیغانہ جواب دیا جس سے فتنہ وفساد تک پہنچنے والی یہ بحث خوشگوار نتیجہ پر ختم ہوگئی اور خطرناک نتیجہ پر پہنچنے والا یہ شروہیں رفع ہوگیا، آپ کی پیدائش ۵۱۷ھ میں ہوئی، اور وفات ۵۹۷ھ میں ہوئی۔"۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا نام "نعمان" ہے، "ابوحنیفہ" کنیت ہے اور "امام اعظم" لقب ہے۔ والد کا نام "ثابت" اور دادا کا نام "زوطی" ہے۔

زوطی ملک فارس (ایران) کے رہنے والے تھے اور مذہباً پارسی تھے۔ اسلام کی روشنی جب عرب کی حدود سے نکل کر عجم پہنچی، اور اس کی کرنوں نے سرزمین فارس کو منور کیا، تو دوسرے، بہت سے اہل فارس کے ساتھ زوطی نے بھی اسلام قبول کرلیا، اسلام لانے کے بعد جب خاندان کے کچھ افراد نے پریشان وہراساں کیا اور دین پر عمل کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگے تو زوطی نے ہجرت کی نیت سے ترک وطن کیا اور اپنا ملک فارس چھوڑ کر بیوی اور کچھ نقد اسانہ کے ساتھ مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کا زمانہ تھا اور کوفہ شہر دار الخلافہ کی حیثیت سے اسلام کی عظمت وجلالت کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ زوطی اپنے سفر ہجرت کے دوران کوفہ پہنچے، تو مکہ معظمہ کا ارادہ موقوف کر کے یہیں کی مستقل سکونت اختیار کرلی اور گزر اوقات کے لئے کپڑے کی تجارت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

۴۰ھ کے اوائل میں زوطی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام باپ نے ثابت رکھا۔ ثابت کے عنفوان شباب میں زوطی انتقال کر گئے اور پھر ثابت کے یہاں ۸۰ھ میں ایک فرزند پیدا ہوا جس کا نام والدین نے "نعمان" رکھا، آگے چل کر اس بچہ نے، ابوحنیفہ کے کنیت اختیار کی۔ اور "امام اعظم" کے لقب سے مشہور ہوا۔ امام ابوحنیفہؒ جب اس دنیا میں تشریف لائے تو آنحضرت ﷺ کو اس دنیا سے تشریف لے گئے ہوئے ستر سال کے قریب ہوچکے تھے اور اگرچہ اکثر صحابہ کرامؓ بھی اس دنیا سے رخت سفر باندھ چکے تھے مگر تین صحابی

(۱) حضرت انس بن مالکؓ خادم رسول اللہ ﷺ، (۲) حضرت سہل بن سعد انصاریؓ، (۳) حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہؓ حیات تھے۔ حضرت امام اعظمؒ نے ان میں سے دو صحابیوں حضرت انسؓ اور حضرت ابو طفیل عامرؓ سے ملاقات کی اور ان کی صحبت کا شرف حاصل کر کے مرتبۂ تابعیت سے سرفراز ہوئے جو ائمہ اربعہ میں تنہا آپ کا امتیاز ہے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی۔ جب کچھ ہوشیار ہوئے تو والد نے تجارت کے مشغلہ میں لگا دیا، ابھی سولہ سال کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا اور تمام تجارتی کاروبار سنبھالنے کی ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر آگئی۔ چونکہ طبیعت کے بہت ذہین اور محنتی تھے اس لئے بہت جلد کاروبار میں نمایاں ترقی کی، دکان کے ساتھ کپڑے کا ایک کارخانہ بھی قائم کر لیا اور زندگی بڑے آرام و ترفہ کے ساتھ گزرنے لگی۔

بیس سال کی عمر کے بعد باضابطہ تحصیل علم کا شوق ابھرا اور جب کہ آپ کسی کام کو جا رہے تھے، راستہ میں کوفہ کے مشہور عالم اور قاضی علامہ شعبیؒ سے ملاقات ہوگئی۔ علامہ نے پوچھا: میاں صاحبزادے! تم کس سے پڑھتے ہو؟ ابو حنیفہؒ نے افسوس کے ساتھ جواب دیا کہ میں کسی سے نہیں پڑھتا ہوں۔ علامہ شعبیؒ نے محبت آمیز لہجہ میں فرمایا، مجھ کو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو، اس نصیحت نے امام ابو حنیفہ کے دل پر گہرا اثر کیا، گھر آئے، والدہ سے تمام ماجرا بیان کیا اور تحصیل علم کے لئے کسی مدرسہ میں جانے کی اجازت مانگی، والدہ پہلے سے ہی علم اور اہل علم کی دلدادہ تھیں۔ یہ سن کر بہت خوش ہوئیں اور اجازت دے دی۔ امام صاحب جو ابتداء مذہبی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کر چکے تھے، حدیث و فقہ کا علم حاصل کرنے کے لئے استاد کی تلاش میں لگ گئے۔ اور بخت و وقت نے ان کو کوفہ کے سب سے مشہور عالم اور استاد وقت حضرت حمادؒ کے حلقہ شاگردی میں داخل کر دیا۔ قابل استاد نے لائق شاگرد کے فطری جوہر پہچان کر خصوصی توجہ مبذول کی اور امام ابو حنیفہؒ نے کامل دو برس تک حضرت حمادؒ کے درس میں شامل رہ کر فقہ کی مکمل تعلیم حاصل کی۔ اس مختصر سے زمانہ میں امام صاحبؒ نے اپنی غیر معمولی ذہانت طبع کے باعث نہ صرف یہ کہ فقہ میں کامل درک حاصل کر لیا بلکہ اپنی اجتہادی قابلیت کا مظاہرہ بھی شروع کر دیا تھا۔ آپ نے فقہ کی تعلیم کے ساتھ حدیث پڑھنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا کیونکہ آپ خوب جانتے تھے کہ مسائل فقہ کی مجتہدانہ تحقیق حدیث کی تکمیل کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ آپ کوفہ کے محدثین کی طرف متوجہ ہوئے اور علم نبوت کے اس عظیم مرکز کا کوئی محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے آپ نے زانوائے شاگردی تہ نہ کیا ہو۔ محدثین کوفہ میں خصوصیت سے امام شعبیؒ، سلمہ بن کہیلؒ، محارب بن دثارؒ، ابو اسحٰق سبیعیؒ، عون بن عبداللہ، سماک بن حربؒ، ابراہیم ابن محمدؒ، عدی بن ثابتؒ، اور موسیٰ بن ابی عائشہؒ کے نام بہت مشہور ہیں جن سے امام ابو حنیفہؒ نے علم حدیث حاصل کیا۔ کوفہ کے بعد آپ بصرہ تشریف لے گئے جہاں مشہور امام حدیث اور تابعی حضرت قتادہؒ اور امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت شعبہؒ کے درس میں شامل ہو کر ان کے فیض صحبت سے بہت بڑا فائدہ اٹھایا، بصرہ کے محدثین میں ان دونوں حضرات کے علاوہ آپ کے استادوں میں عبدالکریم بن امیہ اور عاصم بن سلیمانؒ کے نام بھی پائے جاتے ہیں۔ کوفہ اور بصرہ سے فارغ ہو کر امام ابو حنیفہؒ نے حرمین کے لئے رخت سفر باندھا اس وقت آپ کی عمر ۲۴ سال کے لگ بھگ تھی۔ پہلے آپ مکہ مکرمہ پہنچے اور حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کے درس میں شریک ہوئے، مکہ مکرمہ میں حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کا حلقۂ درس بہت وسیع اور مشہور تھا اور ان کی خصوصی عظمت و شہرت اس اعتبار سے تھی کہ ان کو دو سو حضرات صحابہؓ کے علاوہ مکہ مکرمہ میں اور بھی حضرات محدثین سے حدیث کی سند حاصل کی۔ جن میں حضرت عکرمہؒ کا نام بہت نمایاں ہے۔ مکہ مکرمہ سے فارغ ہو کر آپ نے مدینہ طیبہ کا رخ کیا اور جناب رسالت مآب ﷺ کی بارگاہ میں شرف حاضری سے بہرہ ور ہو کر مدینہ کے علماء و شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بالخصوص حضرت امام باقرؒ اور ان کے صاحبزادے حضرت امام جعفر صادقؒ کے درس و مجالس سے آپ نے زیادہ اکتساب علم و فیض کیا۔ اور حضرت سالم بن عبداللہؒ اور حضرت سلیمانؒ سے روایت حدیث کا شرف حاصل کیا۔ حدیث میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اساتذہ و شیوخ کی فہرست بہت وسیع ہے اور بعض حضرات نے چار ہزار تک تعداد بیان کی ہے۔

بعض طبقوں میں یہ بات مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی فن حدیث میں کوئی تصنیف نہیں ہے اور یہ کہ وہ "اہل الرائے" تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث سے ان کو تعلق کم تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شہرت بے بنیاد ہے اور دانستہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ فی الواقع امام اعظم ابوحنیفہؒ کو علم حدیث میں جو رتبہ حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس کثرت سے ان کی مسندیں لکھی گئی ہیں کسی کی نہیں لکھی گئیں، اور ان ائمہ وقت اور حفاظ حدیث نے لکھیں جو خود اس قابل تھے کہ ان کی مسندیں لکھی جاتیں۔ اس خصوصیت میں اگر کوئی شخص امام ابوحنیفہؒ کا ہمسر ہو سکتا ہے تو صرف امام مالکؒ ہیں۔ یہ سب مسندیں کتاب الآثار کے علاوہ ہیں جو علم حدیث میں امام اعظمؒ کی مشہور اور نہایت پایہ کی تصنیف ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ "مجتہد وہی شخص ہو سکتا ہے جو قرآن، حدیث، آثار، تاریخ لغت اور قیاس ان پانچ چیزوں پر کامل عبور رکھتا ہو" ظاہر ہے کہ امام اعظمؒ کا مجتہد مطلق ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس پر اُمت کا اجماع ہے۔ ایسی صورت میں ان پر قلت حدیث کا طعن نادانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حافظ ذہبیؒ نے امام اعظم کے رفیق درس مسعر بن کرام کا قول نقل کیا ہے کہ "میں نے اور امام ابوحنیفہؒ نے ساتھ ساتھ علم حدیث حاصل کیا، وہ ہم پر غالب رہے اور زہد میں بھی وہ ہم پر فائق رہے" امام جرح و تعدیل حضرت یحییٰ بن سعید قطانؒ فرماتے ہیں۔ خدا کی قسم! امام ابوحنیفہؒ اس اُمت میں اس علم کے سب سے بڑے عالم ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول سے وارد ہوا ہے۔ "مکی بن ابراہیمؒ نے امام ابوحنیفہؒ کو اعلم اہل زمانہ بتایا ہے" ابوالمحاسن شافعیؒ نے اپنی کتاب کے ایک باب میں امام صاحبؒ کی روایت حدیث کی کثرت اور ان کا اعیان حفاظ حدیث میں ہونا بیان کیا ہے۔ یہ چند ائمہ حدیث کے اقوال ہیں جن سے حدیث میں حضرت امام اعظمؒ کی بلند پایہ حیثیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت امام صاحبؒ ۱۴۲ھ میں بغداد تشریف لائے اور تیسرے عباسی خلیفہ منصور نے آپ کی خدمت میں عہدۂ قضا پیش کیا۔ ابتدا میں آپ نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر منصور کی طرف سے زیادہ جبر کیے جانے پر آپ نے اس جلیل القدر عہدہ کو قبول کر لیا اور پھر پہلے ہی دن دار القضاء سے اٹھ کر سیدھے منصور کے پاس آئے اور اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھ سے یہ کام نہیں ہو گا۔ منصور کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اس نے اسی وقت آپ کو قید خانہ بھجوا دیا۔ مسلسل چار سال آپ قید خانہ میں رہے۔ اور اس قید کے دوران منصور نے رجب ۱۵۰ھ میں آپ کو زہر دلوا دیا۔ جب آپ نے زہر کا اثر محسوس کر لیا تو فوراً سجدہ میں گر گئے، اور اسی حالت میں انتقال فرما گئے۔

تاریخ انتقال ۱۵/ رجب ۱۵۰ھ ہے۔ مزار مبارک آج بھی بغداد میں مرجع خلائق ہے۔

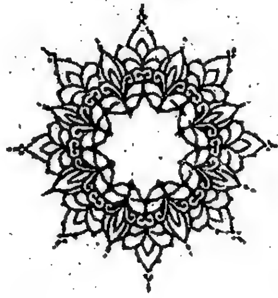

اصطلاحات حدیث اور ان کی تعریفات

حدیث کی تعریف

سب سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ حدیث کی تعریف کیا ہے یعنی علماء کے نزدیک "حدیث" کسے کہتے ہیں؟ علماء و محدثین کی اصطلاح میں نبی کریم ﷺ کے قول، فعل، سیرت احوال اور تقریر کو حدیث کہتے ہیں۔

قول و فعل کے معنی ظاہر ہیں یعنی نبی کریم ﷺ کے ارشادات مبارکہ اور آپ کے افعال مقدسہ۔

سیرت یعنی نبی کریم ﷺ کے خصائل اور عادتیں یا آپ کی شکل وصورت کی تفاصیل۔

احوال یعنی آنحضور ﷺ کی زندگی کے حالات وواقعات۔

تقریر اسے کہتے ہیں کہ کسی صحابی نے آنحضرت ﷺ کے سامنے کوئی کام کیا یا کوئی بات کہی تو نبی کریم ﷺ نے اس پر سکوت فرمایا یعنی آپ ﷺ نے نہ تو صحابی کے اس قول و فعل کی تردید فرمائی اور نہ اس کی توثیق فرمائی، اصطلاح محدثین میں اسی کو "تقریر" کہا جاتا ہے۔ ان تمام چیزوں کے مجموعہ کو "حدیث" کہا جاتا ہے اور حدیث کی تمام کتابوں میں انہیں چیزوں پر مشتمل روایتیں ہوتی ہیں بعض علماء و محدثین کے نزدیک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے قول و فعل اور تقریر کو بھی حدیث کہتے ہیں۔

صحابی: اس خوش نصیب انسان کو صحابی کہتے ہیں جس نے ایمان کی حالت میں نبی کریم ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہو اور ایمان ہی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا ہو۔

تابعی: اس خوش قسمت شخص کو تابعی کہتے ہیں جس کو بحالت ایمان کسی صحابی سے شرف ملاقات حاصل ہوا ہو اور ایمان ہی پر خاتمہ ہوا ہو۔

تبع تابعی: ان حضرات کو کہتے ہیں جنہوں نے بحالت ایمان کسی تابعی سے ملاقات کی ہو اور ایمان ہی پر فوت ہوئے ہوں۔

حدیث باعتبار الفاظ کے دو چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ سند یا اسناد اور متن۔

سند یا اسناد: متن حدیث کے سلسلۂ روات یعنی نبی کریم ﷺ سے لے کر صاحب کتاب تک حدیث کو روایت کرنے والوں کے سلسلہ کو سند یا اسناد کہتے ہیں۔

متن: حدیث کے ان الفاظ کو متن کہتے ہیں جو نبی کریم ﷺ سے اب تک بجنسہ نقل ہوتے چلے آئے ہیں مثلاً:

حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب قال حدثنا ابو الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال والذی نفسی بیدہ لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ۔

اس حدیث میں "حدثنا" سے "ابی ہریرة" تک اسناد ہے اور اس کے بعد سے آخر تک کے حصّہ کو متن کہیں گے۔

بلحاظ اسناد حدیث کی تین قسمیں ہیں۔ مرفوع، موقوف، مقطوع۔

مرفوع: جس حدیث کی روایت کا سلسلہ نبی کریم ﷺ تک پہنچتا ہے اسے حدیث مرفوع کہتے ہیں جیسے کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، نبی کریم ﷺ نے یہ کام کیا، نبی کریم ﷺ نے اس قول و فعل پر تقریر فرمائی۔ یعنی سکوت فرمایا۔ یا یہ کہا جائے "کہ یہ حدیث نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً ثابت ہے، یا حضرت ابن عباسؓ نے اس حدیث کو رفع کیا" تو اس حدیث کو جس کی سند نبی کریم ﷺ پر جاکر

ختم ہوتی ہو. حدیث مرفوع کہا جائے گا۔
موقوف: جس حدیث کی روایت کا سلسلہ صحابی پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اسے حدیث موقوف کہتے ہیں مثلاً اس طرح کہیں کہ "ابن عباسؓ نے فرمایا، ابن عباسؓ نے اس طرح کیا"۔ یا ایسے ہی کہا جائے کہ "یہ حدیث ابن عباسؓ پر موقوف ہے"۔
مقطوع: اسی طرح جس حدیث کی سند تابعی تک پہنچ کر ختم ہو جائے اسے حدیث مقطوع کہتے ہیں، بعض حضرات کے نزدیک "موقوف اور مقطوع" کو اثر بھی کہتے ہیں یعنی اس طرح "حدیث" کا اطلاق تو صرف نبی کریم ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریر پر ہوگا اور صحابی و تابعی کے اقوال، افعال اور تقریر کو "اثر" کہا جائے گا۔
رواۃ کے اعتبار سے حدیث کی پانچ قسمیں ہیں: ① متصل، ② منقطع، ③ معضل، ④ معلق، ⑤ مرسل۔
حدیث متصل: اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کے راوی شروع سے آخر تک پورے ہوں اور درمیان میں سے کوئی راوی چھوٹ نہ گیا ہو۔
حدیث منقطع: اس حدیث کو کہیں گے جس کی اسناد سے ایک یا متعدد راوی متفرق مقام سے ساقط ہو گئے ہوں۔
حدیث معضل: اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی اسناد سے دو یا دو سے زائد راوی ایک ہی مقام سے بتصرف یا بلا تصرف مصنف ساقط ہوں۔
حدیث معلق: وہ حدیث ہے جس کی اوائل سند سے بتصرف مصنف ایک یا متعدد راوی ساقط ہوں۔
حدیث مرسل: اس حدیث کو کہیں گے جس کی اخیر سند سے تابعی کے بعد کوئی راوی ساقط ہو جیسے کوئی تابعی حدیث روایت کرتے ہوئے کہے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ۔
مرتبہ اور درجہ کے اعتبار سے حدیث کی تین قسمیں ہیں:
❶ صحیح، جو اعلیٰ مرتبہ کی حدیث ہوتی ہے۔
❷ حسن، جو اوسط مرتبہ کی ہوتی ہے۔
❸ ضعیف، جو ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔
حدیث صحیح: وہ حدیث ہے جس کے تمام راوی مصنف کتاب سے لے کر آنحضرت ﷺ تک سب کے سب صاحب عدالت اور صاحب ضبط ہوں، نیز حدیث کی روایت کے وقت مسلمان عاقل بالغ ہوں۔
"صاحب عدالت" کا مطلب یہ ہے کہ وہ صاحب تقویٰ و تقدس ہو، جھوٹ نہ بولتا ہو، گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ ہو اور اگر بتقاضائے بشریت کبھی گناہ کبیرہ صادر ہو گیا ہو تو اس سے توبہ کر لی ہو، گناہ صغیرہ سے حتی الامکان اجتناب کرتا ہو اور ان پر دوام نہ کرتا ہو، اسباب فسق و فجور سے پرہیز کرتا ہو، صاحب مروت ہو یعنی ایسے کام نہ کرتا ہو جو اسلامی معاشرہ میں معیوب سمجھے جاتے ہوں۔ مثلاً بازار میں ننگے سر گھومنا، سرِ راہ سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کرنا، راستہ چلتے ہوئے یا بر سرِ بازار کھڑے ہو کر کھانا پینا وغیرہ۔
"صاحب ضبط" کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہایت ہوشیار و سمجھدار ہو، قوی حافظہ رکھتا ہو تاکہ حدیث کے الفاظ بجنسہ یاد رکھ سکے۔ اور روایت حدیث کے وقت کسی قسم کی بھول چوک اور شک و شبہ کی گنجائش نہ رہ سکے۔
مصنف کتاب سے لے کر آنحضرت ﷺ تک جتنے راوی ہیں اگر ان صفات و خصوصیات کے معیار پر پورے اترتے ہوں تو ان کی روایت کردہ حدیث "صحیح" کہلائے گی۔
اب اگر یہ تمام صفتیں راوی میں پوری پوری پائی جائیں گی تو اس کی روایت کردہ حدیث کو "صحیح لذاتہ" کہیں گے لیکن راوی میں اگر ان صفات میں سے کسی شق سے کوئی کمی یا قصور ہو اور وہ کمی اور قصور کثرت طرق سے پوری ہو جاتی ہو تو اس کی روایت کردہ حدیث کو "صحیح

لغیرہ" کہیں گے۔

حدیث حسن: مصنف کتاب سے لے کر آنحضرت ﷺ تک راویوں میں سے کسی ایک راوی میں ان مذکورہ بالا صفات میں سے کوئی کمی یا قصور ہو اور وہ کثرت طرق سے پوری بھی نہ ہوتی ہو تو اس کی روایت کردہ حدیث کو "حدیث حسن" کہا جاتا ہے۔

حدیث ضعیف: حدیث صحیح اور حدیث حسن کی مذکورہ بالا شرائط میں سے ایک یا زیادہ شرائط اگر راوی میں مفقود ہوں مثلاً حدیث کا راوی صاحب عدالت نہیں ہے یا صاحب ضبط نہیں ہے تو اس کی روایت کردہ حدیث "ضعیف" کہلائے گی۔

باایں حیثیت کہ ہم تک پہنچی، حدیث کی چار قسمیں ہیں۔ متواتر، مشہور، عزیز، غریب۔

متواتر: وہ حدیث ہے جس کو ابتداء سے انتہا تک یکساں بلا تعین عدد اسانید کثیرہ سے اتنے راویوں نے روایت کیا ہو کہ جن کا جھوٹ پر متفق ہونا یا ان سے اتفاقیہ بھی جھوٹ کا صادر ہونا عقلاً محال ہو۔

مشہور: وہ حدیث غیر متواتر جس کے راوی ہر طبقہ میں کم از کم تین یا تین سے زیادہ ہوں، بعض محدثین کے نزدیک "مشہور" کو مستفیض بھی کہتے ہیں۔

عزیز: وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر طبقہ میں کم از کم دو ضرور ہوں۔

غریب: وہ حدیث ہے جس کی اسناد میں کسی جگہ صرف ایک ہی راوی ہو جس کا کوئی شریک نہ ہو، غریب کو "فرد" بھی کہتے ہیں۔

باعتبار اختلاف کے حدیث کی چار قسمیں ہیں، شاذ، محفوظ، منکر، معروف۔

شاذ: وہ حدیث ہے جس کا راوی تو ثقہ ہو مگر وہ کسی ایسے ثقہ راوی کی حدیث کے خلاف ہو جو ضبط و غیرہ وجوہ ترجیح میں بڑھا ہوا ہو۔

محفوظ: وہ حدیث ہے جس کا راوی اوثق ہو مگر وہ ایسے راوی کی حدیث کے خلاف ہو جو ضبط و غیرہ وجوہ ترجیح میں اس سے کم تر ہو۔

منکر: وہ حدیث ہے جس کا راوی ضعیف ہو اور وہ ایسے راوی کی حدیث کے خلاف ہو جو قوی راوی ہے۔

معروف: وہ حدیث ہے جس کا راوی قوی ہو اور وہ ایسے راوی کی حدیث کے خلاف ہو جو ضعیف ہے۔

اصطلاحات حدیث کا یہ اجمالی تعارف ہے، یوں تو حدیث کی اصطلاحات بہت زیادہ ہیں جو حدیث کی مختلف تقسیم پر مبنی ہیں لیکن ان سب کا یہاں ذکر کرنا طوالت کا باعث ہوگا اور دوسرے یہ کہ صرف ان ہی اصطلاحات پر اکتفا کر لیا جائے تو اس کتاب کے سمجھنے اور حدیث کی حقیقت کو جاننے کے لئے کافی ہوگا نیز دوسری تمام اصطلاحات کا سمجھنا بھی عوام کے لئے بہت مشکل ہوگا اس لئے یہاں ان ہی اصطلاحات کی تعریف پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

صحاح ستہ: فن حدیث کی وہ چھ کتابیں جو باعتبار نقل حدیث کے اعلیٰ درجہ کی ہیں اور جن کی نقل کردہ احادیث محدثین کی تحقیق اور نقد و نظر کی کسوٹی پر سب سے اعلیٰ اور صحیح مرتبہ کی ثابت ہوئی ہیں "صحاح ستہ" کہلاتی ہیں، بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، ابوداؤد شریف، نسائی شریف اور ابن ماجہ شریف صحاح ستہ میں شامل ہیں۔

بعض حضرات بجائے ابن ماجہ شریف کے مؤطا امام مالکؒ کو صحاح ستہ میں شمار کرتے ہیں، بخاری اور مسلم کے علاوہ صحاح ستہ کی دیگر کتب میں صحیح حسن، ضعیف تینوں درجے کی احادیث ہیں جن کی تشریح و توضیح ہر ایک صاحب کتاب نے اپنی اپنی جگہ کر دی ہے۔

دیباچہ مشکوٰۃ شریف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ۔

"تمام تعریفیں اللہ ہی کو زیبا ہیں ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں اور اسی سے مدد کے طالب اور بخشش کے خواستگار ہیں۔"

تشریح: خداوند قدوس کی تعریف اور اس کی توصیف جیسی کہ اس کی شان کے مناسب اور لائق ہے کسی بندہ سے ادا نہیں ہو سکتی اسی لئے مصنف خداوند تعالیٰ سے مدد کا طالب ہے کہ اس کی زبان و بیان کو اتنی طاقت و قوت ملے جس سے وہ اپنے پروردگار کی حقیقی تعریف و توصیف کر سکے۔ نیز اگر بتقاضائے بشریت اس کی تعریف و توصیف میں کچھ کوتاہی و لغزش ہو جائے جو شان الوہیت کے منافی ہو تو اس سے مصنف بخشش اور معافی کا خواستگار ہے۔

وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔

"اور ہم اپنے نفس کی برائیوں اور اپنی بد اعمالیوں سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔"

تشریح: یعنی یہ کہ ہماری یہ حمد و تعریف جو محض خالصۃً للہ اور حصول سعادت کے لئے ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں نفس کی شرارت سے ریا کا دخل ہو جائے۔ اسی طرح وہ برے اعمال جو بتقاضائے بشریت صادر ہوتے رہتے ہیں، جیسے کلام باطل، بری باتیں، اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت، طاعات و عبادات میں سستی، حرام و مکروہ افعال کا صدور، تو ان تمام چیزوں سے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔

"جس کو اللہ نے سیدھا راستہ دکھا دیا اس کو کوئی بھٹکانے والا نہیں ہے۔ اور جس کو اللہ نے بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا اس کو سیدھا راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے۔"

وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ شَھَادَۃً تَکُوْنُ لِلنَّجَاۃِ وَسِیْلَۃً وَلِرَفْعِ الدَّرَجَاتِ کَفِیْلَۃً وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ الَّذِیْ بَعَثَہٗ وَطُرُقُ الْاِیْمَانِ قَدْ عَفَتْ اٰثَارُھَا وَخَبَتْ اَنْوَارُھَا وَوَھَنَتْ اَرْکَانُھَا وَجُھِلَ مَکَانُھَا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ گواہی جو نجات کے لئے وسیلہ اور بلندی درجات کی ضامن ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنا رسول بنا کر بھیجا جب ایمان کی راہوں کے نشان مٹ چکے تھے، اس کی روشنیاں بجھ چکی تھیں، اس کے آثار ہلکے پڑ گئے تھے اور اس کی بتائی ہوئی منزل نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔"

تشریح: "ایمان کے راستہ سے مراد انبیاء کرام اور ان کے متبعین و پیروکار یعنی علماء و صلحاء ہیں۔ اس کی روشنیاں بجھ جانے" اور "اس کے آثار ہلکے پڑ جانے" سے مراد یہ ہے کہ ایمان و دین کی روشنی پھیلانے والی وہ تمام تعلیمات و ہدایات جو انبیاء کرام اس دنیا میں لے کر آئے تھے، فراموش کر دی گئی تھیں، ان سچی تعلیمات و ہدایات کے حامل علماء و صلحاء کا وجود ناپید سا ہو گیا تھا، جو کوئی گنا چنا عالم و نیک انسان کہیں پایا جاتا تو سماج و معاشرہ میں اس کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی، وہ لوگوں کو نیکی و بھلائی کی جو تلقین کرتا اور اچھے کام اور اچھی باتوں کی جو تعلیم دیتا اس کو کوئی سننے تک کا روادار نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح دین و ایمان سے تنفر، گناہ و معصیت کی کثرت اور ظلم و جہالت کا اندھیرا

پوری کائنات انسانی پر اس طرح پھیل گیا تھا کہ دنیاوی فلاح و سعادت اور اخروی نجات و سرفرازی کی وہ منزل ہی عام نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئی تھی جو تخلیق بنی نوع انسان کا مقصد اور دین و ایمان کا منتہائے مقصود ہے۔

فَشَيَّدَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ مِنْ مَعَالِمِهَا مَا عَفَا وَشَفٰى مِنَ الْعَلِيْلِ فِيْ تَايِيْدِ كَلِمَةِ التَّوْحِيْدِ مَنْ كَانَ عَلٰى شَفَا۔

"پس نبی کریم ﷺ نے ان مٹے ہوئے نشانوں کو از سرِ نو نمایاں کیا اور کلمۂ توحید سے اس بیمار کو شفاء پہنچائی جو ہلاکت کے کنارے پہنچ چکا تھا۔"

تشریح: یعنی پوری انسانیت کفر و شرک کی معصیت اور بداعمالیوں کے گناہ میں مبتلا ہو کر روحانی طور پر بیمار ہو چکی تھی اور قریب تھی کہ ہلاکت کی کھائی "دوزخ" میں چلی جائے کہ نبی کریم ﷺ نے ایمان و توحید کی تعلیم کے ذریعہ اس کو مکمل تباہی سے بچا لیا اور فلاح و نجات کے راستہ پر لگا دیا۔

وَاَوْضَحَ سُبُلَ الْهِدَايَةِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّسْلُكَهَا وَاَظْهَرَ كُنُوْزَ السَّعَادَةِ لِمَنْ قَصَدَ اَنْ يَّمْلِكَهَا۔

"اور اس شخص کے لئے ہدایت کے راستہ کو روشن کیا جو اس پر چلنے کا ارادہ کرے اور اس شخص کے واسطے نیک بختی کے خزانے ظاہر کرے جو اس کے مالک ہونے کا قصد کرے۔"

تشریح: "نیک بختی کے خزانے" سے مراد ایمان نیک اعمال، عبادات اور معارف ہیں جو آخرت کے لئے گنج گراں مایہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ جو کوئی اس خزانہ کو حاصل کر لیتا ہے وہ اس کی دولت سے سرفراز ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے میں آخرت کی ابدی سعادت یعنی رضائے مولیٰ اور جنت کا حقدار ہوتا ہے۔

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ التَّمَسُّكَ بِهَدْيِهٖ لَا يَسْتَتِبُّ اِلَّا بِالْاِقْتِفَاءِ لِمَا صَدَرَ مِنْ مِّشْكٰوتِهٖ وَالْاِعْتِصَامَ بِحَبْلِ اللّٰهِ لَا يَتِمُّ اِلَّا بِبَيَانِ كَشْفِهٖ۔

بعد ازاں جاننا چاہیے کہ نبی کریم ﷺ کے اسوہ کو اختیار کرنا اسی وقت معتبر ہو سکتا ہے کہ اس چیز کا کامل اتباع کیا جائے جو آپ ﷺ کے سینہ مبارک سے ظاہر ہوئی تھی یعنی آپ ﷺ کے ارشادات و احکام، اسی طرح خدا کی رسی یعنی قرآن کریم پر اعتماد اور اس پر عمل جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کی تشریح و توضیح احادیث نبوی سے ہو۔

تشریح: نبی کریم ﷺ کی سُنّت اور آپ کے راستہ پر لگنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ آپ ﷺ کے احکام و ہدایات کی پیروی نہ کی جائے اور آپ ﷺ کی احادیث پر پوری طرح عمل نہ ہو اس لئے کہ جب آپ ﷺ کے احکام کی پیروی نہ ہوگی، آپ ﷺ کے ارشادات پر عمل نہ ہوگا، آپ ﷺ کے نقش قدم کو اختیار نہیں کیا جائے گا تو آپ ﷺ کے راستہ پر چلنا کیسے نصیب ہوگا اور جو شخص آپ ﷺ کے راستہ پر چل ہی نہیں پائے گا اس کو سُنّت نبوی ﷺ اور اسوۂ رسول ﷺ کے اتباع کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا اسی طرح قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے احکام و فرمان پر عمل اور ان کا سمجھنا جب ہی ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے احکام و فرمان کی جو تشریح و توضیح اپنے اقوال و افعال اور کردار سے فرمائی ہے پہلے اس کو سمجھا اور جانا جائے۔ چونکہ قرآن کریم میں احکامات اجمالی اور اصولی طریقہ پر بیان کیے گئے ہیں اور اس اجمال کی تفصیل اور اصول کی تشریح یا مرادات خداوندی کا بیان نبی کریم ﷺ ہی کر سکتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ پہلے حدیث کا علم حاصل کیا جائے اور پھر اس کے ذریعہ قرآن کی تعلیمات سے استفادہ اور ان پر عمل کیا جائے۔

وَكَانَ كِتَابُ الْمَصَابِيْحِ الَّذِيْ صَنَّفَهُ الْاِمَامُ مُحْيِ السُّنَّةِ قَامِعُ الْبِدْعَةِ اَبُوْ مُحَمَّدِ الْحُسَيْنُ ابْنُ مَسْعُوْدِ الْفَرَّاءُ الْبَغْوِيُّ رَفَعَ اللّٰهُ دَرَجَتَهٗ اَجْمَعَ كِتَابٍ صُنِّفَ فِيْ بَابِهٖ وَاَضْبَطَ لِشَوَارِدِ الْاَحَادِيْثِ وَاَوَابِدِهَا۔

"امام محی السنۃ (سُنّت کو زندہ کرنے والے) قامع البدعۃ (بدعت کو دور کرنے والے) ابو محمد حسین الفراء بغوی (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے) نے جو کتاب (مصابیح) تالیف فرمائی تھی وہ اپنے فن کی ایک جامع کتاب تھی جس میں امام موصوف نے نہایت حسن وخوبی کے ساتھ منتشر اور متفرق احادیث کو جمع فرمایا تھا۔"

تشریح: شوارد شارد کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں بھاگنے والا اونٹ، ایسے ہی اوابد کے معنی وحشی جانور کے ہیں یہاں ان الفاظ کو بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ شوارد سے مراد وہ احادیث ہیں جو اصول کی کتابوں میں نقل تھیں۔ چونکہ ان کتابوں تک ہر ایک طالب علم حدیث کی رسائی مشکل ہوتی تھی اس لئے کسی حدیث کے بارہ میں یہ معلوم کرنا کہ کس کتاب میں اور کس جگہ نقل ہے، بڑا دشوار تھا۔ گویا وہ احادیث طالب حدیث کی نظر سے بھاگی ہوئی یعنی پوشیدہ تھیں، اس لئے انکو "شوادر" کے لفظ سے تعبیر کیا ایسے ہی "اوابد" سے مراد وہ احادیث ہیں جن کے معنی و مقصود طالب حدیث کے فہم سے بہت بالا تھے اور جن کا سمجھنا طالب علم کے لئے مشکل تھا، اس لئے ان احادث کو "اوابد" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

یہ مشکلات طالب حدیث کے لئے بہت دقت طلب اور پریشان کن تھیں اور ان کی وجہ سے حدیث کو حاصل کر لینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں تھی اس لئے امام محی السنۃ نے ان متفرق احادیث کو جمع کیا اور اپنی کتاب مصابیح میں جس باب کے مناسب جو حدیث تھی وہاں نقل کر دیا، تاکہ ایک طالب علم حدیث کو کسی حدیث کی تلاش میں اصول کی بڑی بڑی کتابوں میں سرگرداں نہ ہونا پڑے اور ان کے معنی و مطالب سمجھنے میں اس کو آسانی ہو جائے۔

وَلَمَّا سَلَكَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ طَرِيْقَ الْاِخْتِصَارِ وَ حَذَفَ الْاَسَانِيْدَ تَكَلَّمَ فِيْهِ بَعْضُ النُّقَّادِ۔

"اور جب مصنفؒ نے (نقل حدیث کے وقت) اختصار کے طریقہ کو اختیار کیا اور اسناد کو حذف کر دیا تو اس پر بعض محدثین وناقدین نے اعتراض کیا۔"

تشریح: اسناد سے مراد یہ ہے کہ جب حدیث بیان کی جاتی ہے یا نقل کی جاتی ہے تو حدیث سے پہلے اس صحابی کا نام ذکر کیا جاتا ہے جس نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، اسی طرح صحابی سے لے کر مصنف کتاب تک جتنے روایت کرنے والے ہوتے ہیں ان کے سلسلہ کو بھی سند واسناد کہا جاتا ہے چونکہ مصنف مصابیح نے اپنی تالیف میں حدیث جمع کرتے وقت اختصار سے کام لیا تھا اور صرف نقل حدیث پر اکتفا کرتے ہوئے سند کے ذکر کو ترک کر دیا تھا اس لئے محدثین کی جانب سے اعتراض ہوا، کیونکہ کسی حدیث کی حیثیت کو جاننے اور پہچاننے کا مدار صرف سند پر ہوتا ہے جب تک یہ سند نہ دیکھ لی جائے کہ یہ حدیث کس راوی نے روایت کی ہے اس وقت تک حدیث کے بارہ میں یہ حکم لگانا کہ یہ صحیح ہے یا حسن یا ضعیف بہت مشکل ہے۔

وَاِنْ كَانَ نَقْلُهٗ وَاِنَّهٗ مِنَ الثِّقَاتِ كَالْاَسْنَادِ لٰكِنْ لَيْسَ مَافِيْهِ اِعْلَامٌ كَالْاَغْفَالِ فَاسْتَخَرْتُ اللّٰهَ تَعَالٰى وَاسْتَوْفَقْتُ مِنْهُ فَاَوْدَعْتُ كُلَّ حَدِيْثٍ مِنْهُ فِيْ مَقَرِّهٖ فَاَعْلَمْتُ مَا اَغْفَلَهٗ كَمَا رَوَاهُ الْاَئِمَّةُ الْمُتْقِنُوْنَ وَالثِّقَاتُ الرَّاسِخُوْنَ مِثْلُ اَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْمَاعِيْلَ الْبُخَارِيِّ وَاَبِي الْحُسَيْنِ مُسْلِمِ بْنِ الْحَجَّاجِ الْقُشَيْرِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مَالِكِ بْنِ اَنَسٍ الْاَصْبَحِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ اِدْرِيْسَ الشَّافِعِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ اَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلِ الشَّيْبَانِيِّ وَاَبِيْ عِيْسٰى مُحَمَّدِ بْنِ عِيْسٰى التِّرْمِذِيِّ وَاَبِيْ دَاؤُدَ سُلَيْمَانَ بْنِ الْاَشْعَثِ السِّجِسْتَانِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَحْمَدَ بْنِ شُعَيْبِ النَّسَائِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ يَزِيْدَ ابْنِ مَاجَةَ الْقَزْوِيْنِيِّ وَاَبِيْ مُحَمَّدٍ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الدَّارِمِيِّ وَاَبِي الْحَسَنِ عَلِيِّ بْنِ عُمَرَ الدَّارَقُطْنِيِّ وَاَبِيْ بَكْرٍ اَحْمَدَ بْنِ الْحُسَيْنِ الْبَيْهَقِيِّ وَاَبِي الْحَسَنِ رَزِيْنِ بْنِ مُعَاوِيَةَ الْعَبْدَرِيِّ وَغَيْرِهِمْ وَقَلِيْلٌ مَّا هُوَ۔

"اگرچہ مصنف کا حدیث کو بغیر سند کے نقل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ سند کے ساتھ نقل کیا ہو، کیونکہ وہ نقل حدیث کے معاملہ میں ثقہ اور معتمد محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن پھر بھی جو چیز بے نشان ہو وہ نشان والی چیز کے درجہ میں نہیں ہوسکتی۔ اس لئے میں نے اللہ تعالیٰ سے مدد چاہی اور اس کی توفیق کا طلبگار ہوا۔ میں نے ہر حدیث کو جس باب سے اس کا تعلق تھا اسی باب میں نقل کیا اور علماء و محدثین نے جس طرح اس کو روایت کیا اسی طرح میں نے بھی مع سند اور حوالۂ کتاب کے اس کو ذکر کیا، مثلاً امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی، امام دارقطنی، امام بیہقی، امام رزین بن معاویہ عبدری۔ ان ائمہ اور محدثین نے جس طرح اپنی کتابوں میں حدیث کو نقل کیا ہے اسی طرح میں نے ان کی کتابوں سے حدیث کو لے کر اس کتاب میں جمع کر دیا۔ ان ائمہ اور محدثین کے علاوہ کچھ دوسرے محدثین بھی ہیں جن کی کتابوں سے احادیث نقل کی گئی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔"

تشریح: جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ صاحب مصابیح نے جب اپنی کتاب میں حدیث کو جمع کرتے وقت ان کی سند اور حوالۂ کتاب کے ذکر کو چھوڑ دیا تو اس پر محقق محدثین اور ناقدین نے اعتراض کیا اس لئے صاحب مشکوٰۃ نے جب مصابیح میں دیگر حدیثوں کا اضافہ کیا تو انہوں نے ساتھ ہی یہ التزام بھی رکھا کہ ہر حدیث کی سند ضرور لکھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کتاب کا حوالہ بھی دیا جس سے حدیث لی گئی تھی اور طریق وہی اختیار کیا جو ان کتابوں کے مصنفین مثلاً امام بخاری، امام مسلم وغیرہ نے اختیار کیا تھا، اس طرح نئی ترغیب و تدوین کے ساتھ یہ کتاب معرض وجود میں آئی جو مشکوٰۃ کی موجودہ شکل میں موجود ہے۔

وَاِنِّیْ اِذَا نَسَبْتُ الْحَدِیْثَ اِلَیْھِمْ کَاَنِّیْ اَسْنَدْتُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاَنَّھُمْ قَدْ فَرَغُوْا مِنْہُ وَاَغْنَوْنَا عَنْہُ۔

"اور حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے نسبت کر دی ان احادیث کی ان ائمہ و محدثین کی طرف تو گویا اس کی سند پہنچا دی نبی کریم ﷺ تک، کیونکہ ان ائمہ نے (اپنی کتابوں میں) سند ذکر کر کے ہم کو اس سے مستغنی کر دیا ہے۔"

تشریح: یہاں شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ محدثین و ناقدین نے صاحب مصابیح پر اعتراض ہی یہ کیا تھا کہ انہوں نے نقل حدیث کے وقت تمام سند کے ذکر کا التزام نہیں کیا۔ تو اب بھی وہ بات باقی رہ گئی کیونکہ صاحب مشکوٰۃ نے بھی صرف صحابی اور کتاب کے حوالہ کے ذکر کو کافی جانا تمام سند نہیں ذکر کی، اسی کا جواب مصنف نے دیا ہے کہ جن ائمہ و محدثین سے یہ احادیث لی گئی ہیں انہوں نے خود ہی سند کے سلسلہ میں تلاش و جستجو اور نقد و نظر کے بعد اس مرحلہ کو طے کر لیا تھا اور ان حضرات نے اپنی کتابوں میں چونکہ اسناد ذکر کر دی ہیں اس لئے ان کی ذکر کردہ سند کو کافی سمجھتے ہوئے اب ہمیں تمام اسناد ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

وَسَرَدْتُ الْکُتُبَ وَالْاَبْوَابَ کَمَا سَرَدَھَا وَاقْتَفَیْتُ اَثَرَہٗ فِیْھَا۔

"اور میں نے اس کتاب کی ترتیب وہی رکھی جو صاحب مصابیح نے رکھی تھی اور اس سلسلہ میں ان ہی کے نقش قدم کی پیروی کی ہے۔"

تشریح: عام طریقہ یہ ہے کہ جس کتاب میں مختلف موضوعات و مباحث سے متعلق مضامین ہوتے ہیں ان کو ان موضوعات و مباحث کے اعتبار سے کتاب و ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ لفظ "کتاب" کے ذریعہ جو عنوان قائم کیا جاتا ہے، اس کے تحت وہ مختلف ابواب ہوتے ہیں جو اگرچہ ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے مضامین و مباحث کی نوعیت و تفصیل الگ الگ ہوتی ہے۔ مثلاً "طہارت" ایک موضوع ہے اور اس موضوع سے متعلق مختلف النوع صورتیں اور ان کے احکام و مسائل ہیں جیسے وضو، غسل، تیمم وغیرہ، تو سب سے پہلے "کتاب الطہارۃ" کا عنوان قائم ہوتا ہے اور پھر اس کے تحت ان مختلف النوع صورتوں اور ان کے احکام و مسائل پر مشتمل مضامین کو نقل کرنے کے لئے ابواب قائم کیے جاتے ہیں جیسے "باب الوضو" باب الغسل اور باب التیمم وغیرہ۔

لہٰذا صاحب مصابیح نے اپنی تصنیف میں جس ترتیب کے ساتھ کتاب اور ابواب کے عنوان قائم کیے تھے اسی ترتیب سے صاحب

مشکوٰۃ نے بھی کتاب اور ابواب کے عنوان قائم کیے ہیں۔

وَقَسَمْتُ كُلَّ بَابٍ غَالِبًا عَلٰى فُصُوْلٍ ثَلَاثَةٍ اَوَّلُهَا مَا اَخْرَجَهُ الشَّيْخَانِ اَوْ اَحَدُهُمَا وَاكْتَفَيْتُ بِهِمَا وَاِنِ اشْتَرَكَ فِيْهِ الْغَيْرُ لِعُلُوِّ دَرَجَتِهِمَا فِي الرِّوَايَةِ۔

"اور میں نے ہر باب کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل میں ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جن کو شیخین یعنی بخاریؒ اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے یا ان دونوں میں سے کسی ایک نے روایت کیا ہے اگرچہ ان حدیثوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن کو دوسرے محدثوں نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس فصل میں میں نے صرف شیخین کے ذکر پر اکتفا کیا ہے کیونکہ شیخین کا درجہ تمام محدثین سے بلند ہے۔"

تشریح: مشکوٰۃ میں "متفق علیہ" کی اصطلاح اس حدیث کے لئے ہے جو ایک ہی صحابی سے بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے۔ اگر صحابی کا اختلاف ہو یعنی بخاری میں تو ایک صحابی سے منقول ہے اور مسلم میں دوسرے صحابی سے تو اس روایت کو متفق علیہ نہیں کہیں گے، اگرچہ حدیث ایک ہی ہو۔

وَثَانِيْهَا مَا اَوْرَدَهُ غَيْرُهُمَا مِنَ الْاَئِمَّةِ الْمَذْكُوْرِيْنَ وَثَالِثُهُمَا مَا اشْتَمَلَ عَلٰى مَعْنَى الْبَابِ مِنْ مُلْحَقَاتٍ مُنَاسِبَةٍ مَعَ مُحَافَظَةٍ عَلَى الشَّرِيْطَةِ وَاِنْ كَانَ مَا ثُوْرًا عَنِ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ۔

اور دوسری فصل میں وہ احادیث نقل کی ہیں جن کو شیخین یعنی بخاریؒ و مسلمؒ کے علاوہ دوسرے مذکورہ ائمہ میں سے کسی اور نے روایت کیا ہے اور تیسری فصل میں احادیث کے علاوہ صحابہ و تابعین کے ان اقوال و آثار کو بھی جمع کیا گیا ہے جو باب کے مناسب اور لائق تھے لیکن آثار و خبر کو شامل کرتے ہوئے شرائط حدیث کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

تشریح: مصابیح میں دو ہی فصلیں تھیں لیکن تیسری فصل صاحب مشکوٰۃ نے بڑھائی ہے۔ صاحب مصابیح نے احادیث جمع کرتے وقت یہ ترتیب اختیار کی تھی کہ پہلی فصل میں انہوں نے صحاح کی احادیث جمع کی تھیں۔ اور "صحاح" ان کے نزدیک وہ حدیث ہے جو بخاری و مسلم میں مذکور ہو۔ دوسری فصل میں انہوں نے حسان احادیث نقل کی ہیں، ان کی اصطلاح میں "حسان" وہ احادیث ہیں جن کو بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر مستند اور معتبر اور ثقہ ائمہ نے روایت کیا ہو جیسے ترمذی، ابوداؤد اور نسائی وغیرہ۔ احادیث کی یہ اصطلاح صرف صاحب مصابیح کے یہاں ہیں۔ دیگر محدثین اور علماء کے یہاں یہ اصطلاح نہیں پائی جاتیں۔

تیسری فصل صاحب مشکوٰۃ نے بڑھائی ہے اس فصل میں صاحب مشکوٰۃ نے اس کا التزام نہیں کیا ہے کہ حدیث مرفوع حضرت ﷺ ہی نقل کی جائیں، بلکہ صحابہ اور تابعین کے ایسے اقوال و افعال اور تقریر بھی اس فصل میں نقل کی ہیں جو باب کے مناسب ہیں لیکن صاحب مشکوٰۃ نے اس فصل میں بھی یہ التزام کیا ہے کہ پہلے راوی کا نام ضرور لکھا ہے خواہ صحابی ہو یا تابعی، اسی طرح آخر میں کتاب کا حوالہ دیا ہے، کہ کس کتاب سے یہ حدیث لی گئی ہے۔

ثُمَّ اِنَّكَ اِنْ فَقَدْتَ حَدِيْثًا فِيْ بَابٍ فَذٰلِكَ عَنْ تَكْرِيْرٍ اُسْقِطُهُ۔

"پھر تحقیق اگر کسی باب میں کوئی حدیث نہ پائی جائے تو سمجھا جائے کہ اسے میں نے تکرار کی وجہ سے نقل نہیں کیا ہے۔"

تشریح: یعنی اگر ایسا ہو کہ ایک حدیث مصابیح کے ایک باب میں تو موجود ہے لیکن مشکوٰۃ کے اسی باب میں نہیں ہے تو یہ اس لئے، کہ صاحب مشکوٰۃ نے وہ حدیث کسی دوسرے باب میں ہونے کی وجہ سے یہاں نقل نہیں کی۔

وَاِنْ وَجَدْتَ اٰخَرَ بَعْضُهُ مَتْرُوْكًا عَلٰى اخْتِصَارِهٖ اَوْ مَضْمُوْمًا اِلَيْهِ تَمَامُهُ فَعَنْ دَاعِيْ اِهْتِمَامٍ اَتْرُكُهُ وَاُلْحِقُهُ۔

"اور اگر پاؤ تم ایک حدیث کہ اس کا بعض حصہ اختصار کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے یا اس میں بقیہ حصہ اس حدیث کا ملا دیا گیا ہے تو یہ

حذف کرنا اور ملانا خاص مقصد کے تحت ہے۔"

تشریح: مطلب یہ کہ کسی خاص مقصد کے تحت اگر کسی جگہ حذف و الحاق ضروری سمجھا گیا تو وہاں ایسا کیا گیا۔ مثلاً ایک بڑی حدیث ہے جس کا کچھ حصہ تو ایسا ہے جو باب کے مناسب ہے تو اسے وہاں نقل کر دیا گیا اور بعض حصہ ایسا ہے جو مناسب باب نہیں ہے تو اسے ترک کر دیا گیا ہے۔ یا حدیث کا ایک ٹکڑا اس باب کے مناسب ہے اور دوسرا ٹکڑا کسی دوسرے باب سے متعلق ہے تو ایسی شکل میں وہاں حدیث کو اختصار کے ساتھ جو باب سے متعلق تھی بیان کیا گیا ہے۔ اس حالت میں بھی پیروی صاحب مصابیح کی گئی ہے لیکن جہاں ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہیں۔ ہے تو پوری حدیث نقل کر دی گئی ہے اگرچہ وہاں صاحب مصابیح نے اختصار سے کام لیا ہو۔

وَاِنْ عَثَرْتَ عَلٰی اخْتِلَافٍ فِی الْفَصْلَیْنِ مِنْ ذِکْرِ غَیْرِ الشَّیْخَیْنِ فِی الْاَوَّلِ وَذِکْرِھِمَا فِی الثَّانِیْ فَاعْلَمْ اَنِّیْ بَعْدَ تَتَبُّعِیْ کِتَابَیِ الْجَمْعِ بَیْنَ الصَّحِیْحَیْنِ لِلْحُمَیْدِیِّ وَجَامِعِ الْاُصُوْلِ اعْتَمَدْتُّ عَلٰی صَحِیْحَیِ الشَّیْخَیْنِ وَمَتْنَیْھِمَا۔

"اور اگر دونوں فصلوں میں اختلاف نظر آئے یعنی غیر شیخین کی احادیث تو فصل اوّل میں ذکر کی گئی ہوں اور شیخین کی احادیث کو فصل ثانی میں نقل کیا گیا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ یہ اختلاف غلطی یا غفلت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ یہ میں نے حمیدی کی کتاب جمع بین الصحیحین اور کتاب جامع الاصول میں بسیار تلاش و تحقیق اور تتبع کے بعد کیا ہے اور اس سلسلہ میں میں نے بخاری و مسلم کے اصل نسخوں اور ان کے متن پر اعتماد کیا ہے۔"

تشریح: صاحب مصابیح نے تو یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ فصل اوّل میں ان احادیث کو جمع کیا ہے جو شیخین یعنی امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ سے ان کی کتابیں روایت کی گئی ہیں اور فصل ثانی میں ان احادیث کو جمع کیا ہے جو شیخین ــــــــــ کے علاوہ دوسرے ائمہ سے مذکور ہیں لیکن مشکوٰۃ میں بعض جگہ ایسا بھی ہے کہ فصل اوّل میں وہ احادیث جن کو صاحب مصابیح نے شیخین کی طرف نسبت کرتے ہوئے نقل کیا ہے صاحب مشکوٰۃ نے ان کو دوسرے ائمہ کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے جیسے باب سنن وضو کی فصل اوّل میں یا باب فضائل قرآن میں، اسی طرح بعض جگہ فصل ثانی کی احادیث کو شیخین کی طرف منسوب کیا ہے جیسے باب مالیقرأبعد التکبیر یا باب الموقف وغیرہ میں، تو اس ردوبدل اور فرق کے بارہ میں صاحب مشکوٰۃ کہتے ہیں کہ یہ میری غلطی یا سہو کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ میں نے کتاب جمع بین الصحیحین اور کتاب جامع الاصول نیز بخاری و مسلم کے اصل نسخوں اور ان کے متنوں میں کافی تلاش و تحقیق کی، چنانچہ ان کتابوں میں جن احادیث کو شیخین کی طرف منسوب نہیں کیا گیا ہے اور انہیں صاحب مصابیح نے فصل اوّل میں شیخین کی طرف منسوب کیا ہے تو میں نے ان احادیث کو مشکوٰۃ میں شیخین کی طرف منسوب کرنے کے بجائے ان کے اصل راوی و ناقل کی طرف منسوب کیا ہے۔ ایسے ہی جن احادیث کو صاحب مصابیح نے شیخین کے علاوہ دوسرے ائمہ کی طرف منسوب کر کے فصل ثانی میں نقل کیا تھا اور وہ حدیث مجھے ان کتب مذکورہ میں شیخین کی طرف منسوب ملیں تو میں نے ان کو شیخین کی طرف منسوب کر دیا اور چونکہ مجھے اپنی تحقیق و جستجو پر اعتماد تھا اس لئے میں نے یہ سوچ کر مصابیح کی نقل کے خلاف ایسا کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ صاحب مصابیح سے نقل حدیث کے وقت سہو ہو گیا ہو۔

وَاِنْ رَاَیْتَ اخْتِلَافًا فِیْ نَفْسِ الْحَدِیْثِ فَذٰلِکَ مِنْ تَشَعُّبِ طُرُقِ الْاَحَادِیْثِ۔

"اور اگر اختلاف اصل حدیث میں نظر آئے تو یہ احادیث کی اسناد میں اختلاف کی وجہ سے ہوگا۔"

تشریح: یعنی صاحب مصابیح نے ایک حدیث روایت کی اور وہی حدیث جب صاحب مشکوٰۃ نے نقل کی تو دونوں کے الفاظ میں فرق نکلا یعنی صاحب مصابیح کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ کچھ اور ہیں اور صاحب مشکوٰۃ کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ دوسرے ہیں تو اس بارہ میں صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ یہ فرق دراصل سندوں کے اختلاف کی بنا پر ہوا ہے، یعنی صاحب مصابیح کو وہ روایت جس سند سے پہنچی ہے اس میں وہ الفاظ ہیں جن کو انہوں نے نقل کیا ہے اور مجھے اس سند سے یہ روایت پہنچی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں، جو میں نقل کر رہا ہوں۔

وَلَعَلِّیْ مَا اطَّلَعْتُ عَلٰی تِلْكَ الرِّوَايَةِ الَّتِیْ سَلَكَهَا الشَّيْخُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَقَلِيْلًا مَا تَجِدُ اَقُوْلُ مَا وَجَدْتُّ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِیْ كُتُبِ الْاُصُوْلِ اَوْ وَجَدْتُّ خِلَافَهَا فَاِذَا وَقَفْتَ عَلَيْهِ فَانْسِبِ الْقُصُوْرَ اِلَیَّ لِقِلَّةِ الدِّرَايَةِ لَآ اِلٰی جَنَابِ الشَّيْخِ رَفَعَ اللّٰهُ قَدْرَهٗ فِی الدَّارَيْنِ حَاشَا لِلّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔

"اور ہوسکتا ہے کہ جس روایت کو شیخؒ نے نقل کیا ہے وہ مجھے نہ ملی ہو مگر ایسا کم ہوگا کہ وہ روایت مجھے نہ ملی ہو یا مجھے اصول کی کتابوں میں شیخ کی نقل کردہ روایت کے خلاف وہ روایت ملی ہو لیکن یہ اختلاف اگر معلوم ہو تو خطاو قصور کی نسبت میری کوتاہی علم کی بنا پر میری طرف کی جائے اور شیخؒ کو غلطی سے منزہ سمجھا جائے اس سے خدا تعالیٰ کے لئے پاکی ہے۔"

تشریح: اصول کی کتابوں سے مراد وہی مذکورہ کتب یعنی بخاری و مسلم ہیں یعنی اگر ایسا ہو کہ جس روایت کو صاحب مصابیح نے نقل کیا ہے، مجھے وہ روایت نہ ملی ہو یا ان کی نقل کردہ وہ روایت اور میری نقل کردہ روایت میں کوئی اختلاف نظر آئے تو اس میں غلطی اور قصور کی نسبت میری ہی جانب کی جائے۔ صاحب مصابیح کو غلطی اور خطا کا مرتکب قرار نہ دیا جائے اور صاحب مشکوٰۃ کا یہ کہنا کہ غلطی اور قصور کی نسبت میری جانب کی جائے، خلوص نیت اور اعتراف حقیقت کی بنا پر ہے اس میں ریا و غیرہ کا دخل نہیں ہے جیسا کہ حَاشَا لِلّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ سے اشارہ کر دیا ہے۔

رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ اِذَا وَقَفَ عَلٰی ذٰلِكَ نَبَّهَنَا عَلَيْهِ وَاَرْشَدَنَا طَرِيْقَ الصَّوَابِ۔

"خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جسے وہ روایت معلوم ہو اور ہمیں مطلع کر کے راہ حق بتائے۔"

تشریح: یعنی اگر کسی شخص کو وہ روایت معلوم ہو جو صاحب مصابیح نے نقل کی ہے اور مجھے نہیں معلوم ہوئی ہے تو اس کو چاہیے کہ اگر ہماری زندگی میں اسے معلوم ہو تو ہمیں بتادے اور مرنے کے بعد ہماری کتاب میں اس کا اضافہ کر دے۔

وَلَمْ اٰلُ جُهْدًا فِی التَّنْقِيْرِ وَالتَّفْتِيْشِ بِقَدْرِ الْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ وَنَقَلْتُ ذٰلِكَ الْاِخْتِلَافَ كَمَا وَجَدْتُّ۔

"میں نے اپنی تحقیق و تدقیق اور تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اپنی وسعت و طاقت کے مطابق پوری چھان بین کی اور یہ اختلاف میں نے جیسا پایا ویسا ہی نقل کر دیا۔"

تشریح: یعنی میں نے اصول کی کتابوں میں جیسا پایا اور جس طرح نقل دیکھا، شیخؒ کی تقلید محض سے ہٹ کر ویسا ہی یہاں ذکر کر دیا، اگر کوئی یہ اعتراض کر بیٹھے کہ اگر صاحب مشکوٰۃ زیادہ تتبع کرتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان کو وہ روایتیں نہ ملتیں، تو اس کا جواب خود صاحب مشکوٰۃ نے دے دیا کہ جہاں تک میری رسائی اور ہمت و طاقت تھی میں نے اس سے بڑھ کر تحقیق و تلاش کی، اور اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔

وَمَا اَشَارَ اِلَيْهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ مِنْ غَرِيْبٍ اَوْ ضَعِيْفٍ اَوْ غَيْرِهِمَا بَيَّنْتُ وَجْهَهٗ غَالِبًا وَمَا لَمْ يُشِرْ اِلَيْهِ مِمَّا فِی الْاُصُوْلِ فَقَدْ قَفَّيْتُهٗ فِیْ تَرْكِهٖ اِلَّا فِیْ مَوَاضِعَ لِغَرَضٍ۔

"اور جن احادیث پر شیخؒ نے ضعیف یا غریب وغیرہ کا حکم لگایا ہے میں نے ان کا سبب بیان کر دیا ہے اور جن احادیث و اصولی امور کی جانب شیخ نے کوئی اشارہ نہیں کیا تو میں نے بھی شیخ کی پیروی کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا ہے مگر بعض مقامات پر مجبوری کی بنا پر میں نے توضیح کر دی ہے۔"

تشریح: یعنی صاحب مصابیح نے بعض احادیث کے بارہ میں نقل کیا تھا کہ فلاں غریب ہے اور فلاں ضعیف ہے یا شاذ و منکر کا حکم لگا دیا تھا تو صاحب مشکوٰۃ نے مشکوٰۃ میں اس کی توضیح کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ حدیث غریب کیوں ہے یا ضعیف کیوں ہے اور ان احادیث کو شاذ و

منکر کیوں کہا گیا اور کچھ ایسی احادیث بھی تھیں جن کو صاحب مصابیح نے نہ تو ضعیف و غریب کہا تھا اور نہ ہی شاذ و منکر، بلکہ انہیں ایسا ہی چھوڑ دیا تھا تو صاحب مشکوٰۃ نے بھی ان کی اتباع کرتے ہوئے ان کی کوئی توضیح نہیں کی بلکہ انہیں اسی طرح نقل کر دیا۔ البتہ بعض مجبوریوں کی بنا پر کچھ ایسے مقامات پر بھی صاحب مشکوٰۃ نے توضیح کر دی ہے جہاں صاحب مصابیح نے سکوت اختیار کیا ہے مثلاً بعض لوگوں نے طعن و کلام کیا کہ فلاں حدیث موضوع ہے یا باطل ہے تو مجبوراً صاحب مشکوٰۃ نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے ان کی تشریح و توضیح ترمذی وغیرہ کے حوالہ سے کی کہ یہ حدیث صحیح یا حسن ہے اور یہ ضعیف یا غریب ہے۔

وَرُبَمَا تَجِدُ مَوَاضِعَ مُهْمَلَةً وَذٰلِكَ حَيْثُ لَمْ اَطَّلِعْ عَلٰى رَاوِيْهِ فَتَرَكْتُ الْبَيَاضَ فَاِنْ عَثَرْتَ عَلَيْهِ فَاَلْحِقْهُ بِهٖ اَحْسَنَ اللّٰهُ جَزَآءَكَ۔

"اور کچھ ایسے مقام بھی ملیں گے کہ وہاں حدیث کے بعد میں نے کتاب کا حوالہ نہیں دیا کیونکہ باوجود تحقیق و تلاش کے میں راوی کے نام سے واقف نہیں ہو سکا لہٰذا وہ جگہ میں نے چھوڑ دی ہے پس اگر تمہیں راوی کے نام کا علم ہو تو اس جگہ اس کا حوالہ دے دینا اس کے لئے اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائیں گے۔"

وَسَمَّيْتُ الْكِتٰبَ بِمِشْكٰوةِ الْمَصَابِيْحِ۔

"اور اس کتاب کا نام میں نے مشکوٰۃ المصابیح رکھا ہے۔"

تشریح: مصابیح مصباح کی جمع ہے جس کے معنی چراغ کے ہیں اور مشکوٰۃ کے معنی طاقچہ ہے۔ جس طرح طاقچہ میں چراغ رکھا جاتا ہے اسی طرح کتاب مصابیح، مشکوٰۃ میں رکھی ہوئی ہے۔

وَاَسْاَ لُ اللّٰهَ التَّوْفِيْقَ وَالْاِعَانَةَ وَالْهِدَايَةَ وَالصِّيَانَةَ وَتَيْسِيْرَ مَا اَقْصِدُهٗ۔

"اس کتاب کی تصنیف کے لئے میں اللہ تعالیٰ سے نیک توفیق، اس کی مدد اور ہدایت کا طلبگار ہوں اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے خطا و قصور سے حفاظت اور مشکلات کی آسانیوں کے لئے دعا کرتا ہوں۔"

وَاَنْ يَّنْفَعَنِيْ فِي الْحَيٰوةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ وَجَمِيْعَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔

"اور دعا کرتا ہوں کہ خداوند قدوس اس زندگی میں اور مرنے کے بعد مجھے بھی اور ہر مسلمان مرد و عورت کو نفع پہنچائے اور اللہ تعالیٰ میرے لئے کافی اور بہتر کارساز ہے اور برائی سے بچنے کی طاقت اور نیک کام کرنے کی قوت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو تمام امور پر غالب اور حکمت والا ہے۔"

تشریح: زندگی میں نفع تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کتاب کے مطالعہ اور اس سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے اور ان احادیث پر عمل کرنے کی توفیق دے اور مرنے کے بعد کا نفع یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی برکت سے مغفرت و بخشش اور جنت کی نعمت سے نوازے اور اپنے بے پایاں رحمت کے دروازے کھول دے۔

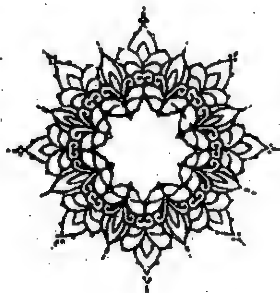

مشکوٰۃ شریف کی پہلی حدیث

(۱) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَأَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَاھَاجَرَ اِلَیْہِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عمرؓ بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے (یعنی عمل کا ثمرہ نیت پر مرتب ہوتا ہے) لہٰذا جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کے لئے (بہ نسبت خالص) ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول ہی کے لئے ہوگی اور جس شخص نے دنیا حاصل کرنے کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لئے ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مشکوٰۃ شریف کے مصنفؒ اس حدیث کو باب سے پہلے لائے ہیں جس سے ان کا مقصد اس کی طرف اشارہ ہے کہ طالب کو چاہئے کہ اس علم (حدیث شریف) کو حاصل کرنے کے لئے اپنی نیت کو پہلے خالصۃً للہ کرے پھر اس کے حصول میں منہمک ہو، اس حدیث کی فضیلت و اہمیت پر محدّثین کا اتفاق ہے بلکہ بعض علماء نے تو اس حدیث کو نصف علم کا درجہ دیا ہے۔

ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لئے دار الکفر کے اپنے وطن کو ترک کر کے دار الاسلام کو اپنا وطن بنالے اور وہاں جا کر بس جائے، پس اگرچہ ہجرت کرنے والا شخص اپنی نیت میں مخلص ہے اور اس کی ہجرت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے تو ثواب پائے گا اور اس کا یہ عمل عند اللہ مقبول ہوگا لیکن اگر نیت میں کھوٹ ہے اور ہجرت (یعنی ترک وطن) سے اس کا مقصد طلب دنیا یا حصول جاہ و زر ہے تو یقیناً وہ ثواب سے محروم رہے گا، لیکن اگر طلب دنیا اور خواہش نفس کے ساتھ رضائے حق کی نیت بھی کر لیتا ہے تو ثواب ملے گا۔

اس حدیث میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، ایک شخص مدینہ میں ایک عورت سے نکاح کرنے کی غرض سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ اس عورت کا نام اُمّ قیس تھا۔ اسی مناسبت سے وہ شخص مہاجر امّ قیس کہا جاتا تھا، جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اُمّ قیس نامی عورت کے پاس شادی کا پیغام بھیجا۔ اُمّ قیس نے اس شرط پر منظور کیا کہ وہ مدینہ ہجرت کر کے آجائے، تب شادی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آگیا اور اُمّ قیس سے شادی کی، اس کے بعد سے وہ شخص مہاجر اُمّ قیس کے نام سے مشہور ہوگیا۔

اس حدیث میں لفظی اختلاف ہیں جو متعدد نسخوں میں کئی طرح سے وارد ہیں۔ بعض جگہ انما الاعمال بالنیات ہے اور انما الاعمال بالنیۃ اور العمل بالنیۃ بھی مروی ہے۔ بہرحال یہ اختلاف لفظی ہے جس کا اثر معنی اور مفہوم پر کچھ نہیں پڑتا۔

حدیث کے پہلے دونوں جملوں کا ایک ہی مطلب ہے دراصل انما لامرئ مانوی سے تاکید کی جارہی ہے، پہلے جملہ کی کہ عمل بغیر نیت کے معتبر نہیں ہوگا یعنی جو شخص جیسی نیت کرے گا ویسا ہی اس کا اجر پاوے گا، چنانچہ ایک عمل میں جتنی نیت کرے گا، اتنے ہی ثواب اسے حاصل ہوں گے۔ مثلاً:

۱؎ آپ کا اسم مبارک عمر، کنیت ابوحفص اور لقب فاروق اعظم ہے۔ آپ قریش کی شاخ عدی کے قبیلے سے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر فاروق کے سلسلۂ نسب کعب بن لوئی پر جا کر ملتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد آپ کو متفقہ طور پر دوسرا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ ہجرت کے تیئسویں سال ۲۷ ذی الحجہ کو بدھ کے دن آپ مسجد نبوی میں فجر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک بدبخت نصرانی ابولؤلؤ نے آپ پر خنجر سے حملہ کیا اور آپ نے شہادت پائی۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر ۶۳ برس تھی۔

❶ ایک شخص کا کوئی عزیز قرابتی غریب و مفلس ہے اس غریب کی وہ مدد اس نیت سے کرتا ہے کہ ایک غریب کی لوجہ اللہ مدد کرنا کار ثواب ہے تو اس کو اسی کا ثواب ملے گا لیکن اگر وہ اس کے ساتھ ہی صلہ رحمی کی بھی نیت کرتا ہے کہ اس کی لوجہ اللہ مدد کرنا کار ثواب ہے ہی مگر اس سے میرے ایک عزیز کی پریشانیاں بھی دور ہو جائیں گی تو اب محض یہ نیت کرنے سے اس کو دو ثواب ملیں گے۔

❷ اسی طرح مسجد میں جانے کی کئی نیتیں ہو سکتی ہیں اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ ثواب ملتا ہے مثلاً ایک شخص مسجد میں جاتا ہے تو وہ نیت کرے کہ چونکہ فرمایا گیا ہے کہ مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، جہاں آنے والا گویا اللہ تعالیٰ کی زیارت کو آتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے اور کریم کے لئے مہمان کی ضیافت ضروری ہوتی ہے لہٰذا میں بھی اس کا امیدوار ہوں تو اس کو یہ ثواب حاصل ہو جائے گا۔

اور نیت کرے جماعت کے انتظار کا، چونکہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جماعت کا انتظار کر رہا ہے وہ گویا حالت نماز میں ہے، پس اس نیت سے اس کا ثواب مل جائے گا۔

اور نیت کرے کہ کان و آنکھ اور تمام اعضاء بازار و سڑک میں گناہ میں گرفتار ہوتے اور یہاں مسجد میں آکر محفوظ ہو جائیں گے، مسجد میں آتے ہی اعتکاف کی نیت کرلے کیونکہ علماء نے لکھا ہے کہ جب مسجد میں داخل ہو تو چاہئے کہ اعتکاف کی نیت کرلیا کرے اور جن علماء کے نزدیک اعتکاف کی مدت کم سے کم ایک ساعت ہے ان کے یہاں وہ اعتکاف معتبر ہوگا تو یہ ثواب بھی کہیں نہیں گیا (مسجد میں دخول کے وقت اعتکاف کی نیت کرنا اور پھر اس پر ثواب ملنا درحقیقت خداوند قدوس کی جانب سے مسلمانوں کے لئے ایک نعمت ہے کہ جو بغیر محنت کئے ہوئے حاصل ہوتی ہے مگر افسوس کہ مسلمان اس سے غافل ہیں) یا اسی طرح جانتا ہے کہ مسجد میں آتے وقت اور مسجد سے نکلتے وقت مسنون دعائیں پڑھنا یا نبی کریم ﷺ پر صلوۃ و سلام بھیجنا سعادت کا باعث ہے تو اگر دخول مسجد کے وقت اس کی بھی نیت کرلے تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔

اور نیت کرے کہ مسجد میں تنہائی اور سکون نصیب ہوتا ہے جہاں ذکر اللہ، تلاوت قرآن یا وعظ و نصیحت باطمینان کیا جا سکتا ہے تو اس کا ثواب بھی ملے گا کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص صبح مسجد میں ذکر و وعظ کے لئے جاتا ہے تو گویا وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے مرتبہ کا ہوتا ہے یا کوئی جماعت مسجد میں بیٹھ کر تلاوت قرآن میں مشغول ہو اور آپس میں تذکیر و نصیحت کرتے رہیں تو اس جماعت کو ملائکہ ڈھانک لیتے ہیں اور رحمت خداوندی کا ان پر سایہ ہوتا ہے۔

اسی طرح نیت کرے کہ وضو کر کے مسجد میں نماز کے لئے جانے سے حج اور عمرہ کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اور نیت کرے کہ مسجد میں لوگوں کے اجتماع سے افادہ و استفادہ بالعلم اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مواقع میسر آتے ہیں، نیت کرے وہاں مسلمان بھائیوں سے ملاقات کی اور ان پر سلام و رحمت پہنچانے کی۔

اور نیت کرے محاسبۂ نفس اور تفکر فی الآخرات اور اپنے گناہوں سے استغفار کی کیونکہ مسجد میں سکون اور دل جمعی سے یہ کام ہو سکتا ہے جو دوسری جگہ مشکل ہے۔

بہر حال مسجد میں آنے کا عمل ایک ہے لیکن چونکہ نیتیں الگ الگ ہو کر بہت زیادہ ہیں اس لئے ثواب ان سب نیتوں کا ملے گا گویا عمل ایک اور بہ سبب نیت ثواب اتنے زیادہ۔

اور پھر مسجد تو عبادت کی جگہ ہے اور ان امور کا تعلق بھی عبادت اور آخرت سے ہے لہٰذا ان پر ثواب تو ملتا ہی ہے لیکن اگر ان چیزوں میں بھی نیک نیت کرلے جن کا تعلق زینت جسمانی یا دنیاوی امور سے ہے تو خدا کی بے پایاں رحمت سے وہاں بھی ثواب ملتا ہے۔

مثلاً جمعہ کو یا عام طور پر خوشبو لگائے گا اور اس کے ساتھ یہ بھی نیت کرلے کہ چونکہ نبی کریم ﷺ خوشبو کو بہت پسند فرماتے تھے اس لئے میں بھی خوشبو لگاتا ہوں۔

اور نیت کرے اس خوشبو کے لگانے سے کہ اس سے مسجد کی تعظیم بھی ہوگی۔

اور نیت کرے کہ جو شخص میرے پاس بیٹھے گا خوشبو پا کر خوش ہو گا۔
اور نیت کرے کہ کوئی شخص محض میرے خوشبو لگانے کے سبب بدبو کی وجہ سے میری غیبت کرے گا اور میں خوشبو لگا کر اس کو غیبت کے گناہ سے باز رکھتا ہوں۔
اور نیت کرے کہ تازہ خوشبو سے دماغ کے معالجہ کی کہ خوشبو سے میرا دماغ تر و تازہ ہو گا اور میں جس مجلس وعظ نصیحت میں بیٹھوں گا اس کی وجہ سے کام کی باتیں اچھی ذہن نشین ہوں گی۔
یہاں بھی خوشبو لگانے کا عمل ایک ہی ہے اور جس کا تعلق محض انسانی جذبہ و خواہش اور دنیاوی امور سے ہے لیکن اگر اس کے ساتھ یہ تمام نیک نیتیں کرلی جائیں تو ان پر بھی الگ الگ ثواب کا مستحق ہو گا، اسی طرح ہر عمل میں مختلف نیتیں ہو سکتی ہیں جن پر بے شمار ثواب کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔
اور اگر کوئی عمل محض لذت جسمانی اور خواہش نفسانی کے لئے کرتا ہے تو ثواب کی دولت سے تو محروم رہے ہی گا بلکہ مستحق ملامت و عتاب بھی ہو گا۔
پس معلوم ہوا کہ عمل کا مدار یعنی اس پر ثواب ملنا صرف نیت کے اوپر ہے جیسی نیت کرے گا ویسا ہی اس پر ثمرہ مرتب ہو گا۔

نیت کے مسائل

مسئلہ: اس حدیث میں جن اعمال کے بارے میں نیت کو ضروری قرار دیا گیا ہے ان سے اعمال مقصودہ مراد ہیں یعنی ایسے عمل جن کا کرنا شریعت میں مطلوب اور مقصود ہے جیسے نماز، روزہ، زکوۃ، حج۔ پس اس قسم کے عمل بغیر نیت کے معتبر نہیں ہوں گے اور نہ خدا کے نزدیک مقبول و صحیح ہوں گے۔ مثلاً اگر کوئی شخص نماز بغیر نیت کے پڑھتا ہے تو نہ تو اس کی نماز صحیح ہوگی اور نہ عند اللہ مقبول ہوگی اور اسی طرح نہ بغیر نیت کے زکوۃ ادا ہوگی اور نہ بغیر نیت کے روزہ و حج صحیح ہو گا اس سے معلوم ہوا کہ نیت کی ضرورت اور احتیاج اعمال مقصودہ میں ہوگی کیونکہ بغیر نیت کے اعمال کا کوئی اعتبار نہ ہو گا۔
اعمال مقصودہ کے مقابلہ میں اعمال غیر مقصودہ ہیں یعنی ایسے اعمال جن کا کرنا مقصد نہ ہو بلکہ ان کا کرنا کسی خارجی امر کی بنا پر ضروری ہے جیسے غسل اور وضو کہ یہ فی نفسہ اور بذاتہ مقصود نہیں ہوتے بلکہ غسل کی ضرورت پاکی کے لئے ہوتی ہے اور وضو کی ضرورت نماز کے لئے۔
اب علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ان اعمال غیر مقصودہ یعنی غسل اور وضو میں نیت کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ امام شافعیؒ کے نزدیک وضو اور غسل میں نیت ضروری ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ فرض ہے لہٰذا اگر غسل یا وضو بغیر نیت کے ہوا تو وہ قابل اعتبار نہیں ہو گا۔ امام اعظمؒ کے نزدیک غسل اور وضو بغیر نیت کے معتبر ہوں گے کیونکہ ان کے نزدیک نیت فرض نہیں ہے بلکہ سُنّت اور مستحب ہے لہٰذا اگر وضو یا غسل بغیر نیت کے کیا گیا تو ادا ہو جائے گا۔
شریعت میں نیت سے مراد تقرب الی اللہ کا قصد کرنا ہے یعنی جو کام کرے صرف اللہ کے لئے کرے اور اس کے حکم کی بجا آوری اور اس کی رضا کی طلب کے لئے کرے۔
نیت کے معنی دل سے قصد کرنے کے ہیں، نیت میں صرف دل سے قصد کرنا کافی ہوتا ہے زبان سے کہنا شرط نہیں، عبادات میں اگر محض زبان سے کہا اور دل میں نیت کی تو عبادت معتبر نہ ہوگی چنانچہ کتاب مجمع میں لکھا ہے کہ صرف زبان سے کہنے کا اعتبار نہیں ہو گا، اب علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ دل سے قصد اور نیت کرنے کے ساتھ زبان سے کہنا سُنّت ہے یا مستحب یا مکروہ ہے۔
چنانچہ اس میں تین قول ہیں، فتح القدیر میں ہے کہ نیت کا زبان سے کہنا نہ تو نبی ﷺ سے منقول ہے اور نہ صحابہ کرام سے، اور اس کا

ذکر نہ کسی حدیث صحیح سے ثابت ہے اور نہ حدیث ضعیف سے اور نہ چاروں امام اس کا قائل ہیں۔

کتاب مفید نے نقل کیا ہے کہ بعض مشائخ نے اس کو مکروہ کہا ہے اور بعض نے مستحب، سو جنہوں نے مستحب کہا ہے ان کے نزدیک بھی صرف اسی قدر کہنا مستحب ہے کہ اللھم انی ارید صلوۃ کذا فیسر ھالی و تقلبھا منی مگر اس قسم کی عبارت بھی حدیث شریف میں صرف حج کی نیت کے لئے منقول ہے، دیگر عبادات کے ثابت اور منقول نہیں ہے۔

بہر حال نیت کا یہ مقدمہ اور بیان کتاب اشباہ میں مفصل لکھا ہے، اس سلسلہ میں مترجم کی تحقیق یہ ہے کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ عظام رضوان اللہ علیہم اور ائمہ کرام رحمہم للہ تعالیٰ سے نماز یا روزہ میں نیت یا زبان سے کہنا منقول نہیں ہے اور بعد میں علماء کا اس میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا یہ سُنت ہے یا مستحب اور یا مکروہ اور یا بدعت ہے تو فقہ کا قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کے سُنت یا بدعت ہونے میں علماء کا اختلاف ہو یعنی بعض یہ کہیں کہ یہ بدعت ہے اور بعض کہیں کہ سُنت ہے تو احتیاط اس جگہ یہ ہے کہ ایسی چیز کو ترک کر دینا ہی مناسب ہے۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری میں بھی ایسا ہی نقل کیا گیا ہے اسی طرح اگر سُنت و مستحب ہونے میں بھی اختلاف ہو تو ترک کر دینا ہی اولیٰ ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنے ترجمہ مشکوٰۃ میں فرمایا ہے کہ علماء اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ نماز میں نیت کا پکار کر کہنا مشروع نہیں ہے۔ نیز حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ محدثین نے کہا ہے کہ حدیث کی کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت ﷺ نے نیت زبان سے کہی ہو۔

لہٰذا آنحضرت ﷺ کی سُنت کا اتباع اسی میں ہے کہ نیت دل سے کرے اور اسی پر اکتفا کرے کیونکہ جس طرح رسول خدا ﷺ کے کیے ہوئے فعل کا اتباع کرنا اطاعت رسول ہے اسی طرح یہ بھی نبی کریم ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے کہ جس فعل کو نبی کریم ﷺ نے کبھی نہ کیا ہو اس پر عمل نہ کیا جاوے اور چاہئے کہ اس پر دوام اصرار نہ کیا جاوے جو شارع سے ثابت نہیں ہے۔

مسئلہ: نیت کا اثر عبادات میں مرتب ہوتا ہے، حرام کام میں نیت کا اعتبار نہیں ہوتا اور نہ اس کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔ اگر کسی مباح چیز میں عبادت کی نیت کر لے یا اس چیز میں نیت کر لے جو عبادت کے لئے وسیلہ ہوتی ہے اور اس پر نیت کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے اور ثواب ملتا ہے۔

مسئلہ: وضو میں نیت کرنا سُنت ہے اب اس میں اختلاف ہے کہ وضو کے لئے نیت کب کرے چنانچہ بعض علماء کے نزدیک منہ کے دھونے کے وقت نیت کرنی چاہئے لیکن بہتر یہ ہے کہ شروع وضو میں ہاتھ دھونے کے وقت نیت کر لی جائے تاکہ منہ دھونے سے پہلے بھی سُنت کا ثواب حاصل ہو جائے۔ غسل میں بھی نیت سُنت ہے مناسب یہ ہے کہ وضو شروع کرنے کے وقت غسل میں نیت کرے، تیمم میں نیت کرنا فرض ہے۔ جس وقت تیمم کے لئے ہاتھ مٹی پر رکھے اس وقت نیت کر لینی چاہیے اس کے بعد ہاتھ کو منہ اور ہاتھوں پر پھیر لے۔

مسئلہ: نیت کے لئے کئی چیزیں شرط ہیں۔ ① اسلام۔ کیونکہ مسلمانوں کی عبادت مقبول ہوتی ہے، کافر کی عبادت نہ تو صحیح ہوتی ہے اور نہ مقبول ہوتی ہے۔ ② تمیز۔ یعنی اتنی عقل رکھتا ہو کہ عبادت اور غیر عبادت میں فرق سمجھتا ہو اسی لئے دیوانے اور تمیز نہ کرنے والے لڑکے کی عبادت معتبر نہیں ہوتی۔ ③ علم۔ یعنی جس چیز کو کر رہا ہے اس کی حقیقت اور اہمیت جانتا ہو چنانچہ ایک شخص نماز کی اہمیت اور اس کی فرضیت سے لاعلم ہے اگرچہ نیت کرتا ہے لیکن اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی اور ④ چوتھی چیز یہ کہ نیت کے منافی کوئی چیز نہ کرے۔ مثلاً کوئی اسلام لائے اور عبادت کرنے کے بعد معاذ اللہ مرتد ہو گیا تو اس کا سب علم اور عبادت ضائع ہو جائے گا اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی نے نماز شروع کی یا روزہ رکھا لیکن درمیان میں توڑ ڈالا تو نماز اور روزہ دونوں باطل ہو جائیں گے، کیونکہ عبادت کے درمیان سے بغیر مکمل کیے ہوئے ختم کر دینا نیت کے منافی ہے۔

مسئلہ: فرض نماز میں نیت چار چیزوں کی ہوتی ہے، ایک نماز پڑھنے کی، دوسرے فرض نماز پڑھنے کی، تیسری تعین وقت مثلاً ظہر کی یا عصر یا مغرب کی، چوتھے اگر مقتدی ہو تو اقتدا کی، ان چار چیزوں کو نماز شروع کرنے کے وقت دل میں رکھے اور نیت کرے، اگر ان چاروں میں سے کسی ایک کا بھی دھیان دل میں نہ رہا تو نماز نہیں ہوگی۔

مسئلہ: عبادت واجبہ میں نیت کا حکم فرض کی طرح ہے یعنی واجب کا متعین کرنا ضروری ہے جیسے فرض کا تعین کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: سُنّت مطلق نماز کی نیت سے اور نفل کی نیت سے صحیح ہو جاتی ہے خواہ سُنّت مؤکدہ ہو یا غیر مؤکدہ، اس میں دونوں برابر ہیں۔

مسئلہ: رمضان کے روزہ میں خواہ نیت نفل کی کی گئی ہو یا واجب کی یا مطلقاً نیت نہیں کی۔ ہر حال میں روزہ رمضان ہی کا ادا ہو گا یعنی ایک تو یہ کہ رمضان کا روزہ ہے اور نیت بھی رمضان ہی کے روزہ کی ہے اس میں تو ادائے روزہ میں کوئی اشکال ہی نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے کہ روزہ تو رمضان کے مہینہ میں رکھ رہا ہے لیکن نیت اس نے نفل روزہ کی کر لی یا کسی واجب جیسے نذر وغیرہ کی نیت کی، یا یہ کہ مطلقاً نیت ہی نہیں کی تو ایسی شکل میں بھی فقہاء لکھتے ہیں کہ روزہ رمضان ہی کا مانا جائے گا اور رمضان کا روزہ ادا ہو جائے گا۔

مسئلہ: رمضان کے روزہ کی نیت بھی رات میں بھی کر سکتا ہے اور صبح بھی دوپہر تک یعنی نصف النہار سے پہلے پہلے نیت کی جا سکتی ہے۔ شرع میں دن کی ابتدا طلوع صبح صادق سے اور انتہاء غروب آفتاب پر ہوتی ہے لہٰذا نیت دن کے پہلے نصف حصہ میں کر سکتا ہے، اسی طرح نفل اور نذر معین کے روزے کی نیت بھی رات میں اور دن میں نصف النہار سے پہلے پہلے کی جا سکتی ہے۔ لیکن رمضان کے قضاء نذر مطلق اور کفارے کے روزوں کی نیت صرف رات میں کرنی چاہئے ان روزوں کی نیت دن میں معتبر نہ ہوگی۔

نذر معین کی شکل یہ ہے کہ کوئی شخص کسی خاص دن کو روزے کے لیے متعین کرے یعنی یہ ارادہ کرے کہ فلاں جمعہ کو یا فلاں پیر، اور فلاں تاریخ کو میں روزہ رکھوں گا گویا اس نے ایک دن تعین کر کے روزے کو اپنے اوپر لازم اور واجب کر لیا ہے تو یہ صورت نذر معین کہلاتی ہے۔

نذر مطلق کی صورت یہ ہے کہ کسی شخص پر ایک یا کئی روزے واجب ہوں، یا یہ کہے کہ اگر میرا فلاں عزیز اچھا ہو گیا تو میں روزہ رکھوں گا تو اس شکل میں وہ جب چاہے روزہ رکھ سکتا ہے۔ چونکہ اس میں کسی دن کا تعین نہیں ہوتا لہٰذا اسے نذر مطلق کہتے ہیں۔

مسئلہ: زکوٰۃ کی نیت کی دو شکلیں ہیں ایک تو یہ کہ جب زکوٰۃ کی رقم دینے لگے تو اس وقت ادائے زکوٰۃ کی نیت کرے دوسری شکل یہ ہے کہ اپنے مال میں سے زکوٰۃ کے لئے ایک حصہ الگ نکالتا ہے کہ اس میں سے زکوٰۃ دیتا رہوں گا تو اس صورت میں مال کو الگ نکالتے وقت ادائے زکوٰۃ کی نیت کرنی چاہئے، زکوٰۃ کا مال دیتے وقت نیت ضروری نہیں ہے۔

مسئلہ: کسی نے ایک مستحق کو زکوٰۃ کا مال دیا لیکن دیتے وقت اس نے زکوٰۃ کی نیت نہیں کی تھی تو اب بعد میں اگر وہ زکوٰۃ کی نیت کرتا ہے تو وہ نیت اسی وقت معتبر ہوگی جب کہ اس مستحق کے پاس وہ مال موجود ہو اور اس نے اسے صرف نہ کیا ہو لیکن اگر مستحق کے پاس صرف ہو گیا ہے اور اس کے پاس موجود نہیں ہے تو پھر بعد میں زکوٰۃ کی نیت معتبر نہ ہوگی اور زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

مسئلہ: صدقہ فطر باعتبار مصرف اور نیت کے زکوٰۃ ہی کی طرح ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ صدقہ ذمی[1] یا کافر کو دیا جا سکتا ہے مگر زکوٰۃ ذمی کافر کو دینا درست نہیں ہے۔

مسئلہ: ایک عبادت کے درمیان دوسری عبادت کی نیت کرنا درست ہے مثلاً ایک شخص فرض یا نفل پڑھ رہا ہے اور نماز پڑھنے کے دوران اس نے روزہ کی نیت بھی کر لی تو یہ نیت معتبر ہوگی اور نماز فاسد نہیں ہوگی۔

---

[1] ذمی اس کافر کو کہتے ہیں جو جزیہ (ٹیکس) ادا کرے اور اسلامی ریاست کا وفادار شہری ہو۔

مسئلہ: عبادت مثل نماز وغیرہ میں صرف شروع نیت کرنی چاہیے اس کے ہر ہر جز اور رکن کے لئے نیت ضروری نہیں کیونکہ اس سے نماز میں خلل پڑ سکتا ہے۔

مسئلہ: ایک شخص نے فرض نماز شروع کی، درمیان میں اسے خیال ہوا کہ یہ نفل ہے اور پھر نیت کر کے نفل نماز پوری کی، تو اس صورت میں اس کی نماز فرض ادا ہو گی کیونکہ درمیان نماز میں شبہ کا واقع ہونا معتبر نہیں ہوتا ہے چنانچہ اس کے بارے میں کتاب اشباہ میں نہایہ سے ایسا ہی منقول ہے۔

مسئلہ: بعضی عبادتیں ایسی ہیں کہ ان میں صرف دل سے نیت کرنا کافی نہیں ہوتا جب تک زبان سے بھی نہ کہے مثلاً نذر ہے کہ اگر ایک شخص نذر کی نماز پڑھتا ہے یا روزہ رکھتا ہے اور نیت صرف دل سے کرتا ہے تو اس طرح نذر ادا نہیں ہوتی جب کہ زبان سے نہ کہے کہ اتنی نمازیں نذر کی میرے ذمہ ہیں یا اتنے روزے نذر کے مجھے رکھنے ہیں یا اتنے نمازیوں کو کھانا کھلانا ہے یا مثلاً اسی طرح وقف ہے کوئی شخص بھی اپنی کسی ملکیت کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کرتا ہے تو اگر وہ صرف دل میں نیت کرے کہ میں نے فلاں چیز خدا کی راہ میں وقف کی تو یہ وقف معتبر نہ ہو گا جب تک کہ وہ زبان سے ادا نہ کرے کہ میں یہ چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر رہا ہوں۔

عبادت کے علاوہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں دل سے نیت کرنے کا سرے سے اعتبار ہی نہیں ہوتا بلکہ ان میں زبان سے کہنا ہی ضروری اور کافی ہوتا ہے مثلاً طلاق اور عتاق۔ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے لیکن زبان سے نہیں کہتا صرف دل میں نیت کر لیتا ہے کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کرتا ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہتا صرف دل میں عتاق کی نیت کرتا ہے تو اس طرح نہ طلاق واقع ہو گی اور نہ عتاق جب تک زبان سے یہ نہ کہے کہ میں نے تجھے طلاق دی یا میں نے تجھے آزاد کیا تو اس طرح یہاں صرف زبان سے کہنے کا اعتبار کیا جاوے گا اور محض زبان سے کہنا کافی ضروری ہو گا۔

مسئلہ: اگر کسی شخص نے کوئی چیز اپنے استعمال کے لئے خریدی مثلاً لونڈی اپنی خدمت کے لئے خریدی یا کپڑا اپنے پہننے کے واسطے خریدا یا اپنے پڑھنے کے لئے کتاب خریدی یا اسی طرح جانور خریدا اپنی سواری کے لئے تو ان چیزوں کو اپنے استعمال کے لئے خریدتا ہے اور دل میں یہ بھی خیال ہے کہ اگر ان چیزوں کی قیمت زیادہ ملی اور نفع ہوا تو میں اس کو بیچ دوں گا تو ایسی صورت میں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔

مسئلہ: ایک شخص کو رمضان کے چاند ہونے کی تحقیق نہیں ہو سکی، صبح ہونے پر اسے تردد ہوا کہ خبر نہیں آج رمضان کا دن ہے یا نہیں، اب وہ نیت کرتا ہے کہ اگر آج رمضان کا پہلا دن ہو تو میرا روزہ ہے اور اگر شعبان کا آخری دن ہو تو روزہ نہیں ہے تو روزہ کے لئے اس کی یہ نیت درست نہیں ہو گی ہاں اگر اسے روزہ کے وصف میں شک ہو یعنی وہ اس طرح نیت کرے کہ اگر آج شعبان کا دن ہے تو نفل کے روزہ کی نیت کرتا ہوں اور اگر رمضان کا دن ہے تو فرض روزہ کی نیت کرتا ہوں تو اس طرح کی نیت معتبر اور درست ہو گی، اگر وہ دن رمضان کا ہوا تو اس کا فرض روزہ ادا ہو جائے گا۔

مسئلہ: کسی امر مباح کا وصف باعتبار نیت اور قصد کے مختلف ہوتا ہے اگر کسی مباح کو اطاعت کی نیت سے کیا جائے تو وہ مباح بھی اطاعت میں شامل ہے۔ مثلاً، کھانا، سونا، حلال مال کی کمائی، یا اپنی بیوی سے صحبت، اگر ان امور میں جو امر مباح ہیں ان کے کرنے کے وقت عبادت اور خدا تعالیٰ کی اطاعت و رضا کی نیت کر لی جائے تو یہی مباح چیزیں عبادت ہو جاتی ہیں اور ان پر ثواب ملتا ہے لیکن اگر امر مباح میں اطاعت و رضائے الٰہی کی نیت نہیں کرتا تو پھر اس پر کوئی ثواب نہیں ملتا۔

مسئلہ: ایک شخص اپنی بیوی کو کنایہ کے الفاظ کے ذریعہ طلاق دیتا ہے تو اس میں نیت کا اعتبار کیا جائے گا یعنی اگر اس کی نیت طلاق کی تھی تو طلاق پڑ جائے گی اور اگر طلاق کی نیت نہیں تھی تو طلاق واقع نہیں ہو گی اور اگر بصراحت طلاق کے الفاظ ادا کر رہا ہے تو پھر اس میں

نیت کی ضرورت نہیں ہوگی اور طلاق بغیر نیت کے واقع ہو جائے گی۔

مسئلہ : حالت جنابت میں قرآن شریف کا قرأت کے ارادہ کے بغیر صرف ذکر کی نیت سے پڑھنا درست ہے لیکن بارادۂ قرأت بغیر نیت ذکر پڑھنا درست نہیں ہے بلکہ یہ حرام ہے۔

مسئلہ : اگر تجارت کی نیت ایسے ماحول میں کی ہو جو زمین کی پیداوار ہے خواہ وہ زمین عشری ہو یا خراجی اور یا کرایہ کی ہو، یا عاریۃً ہو تو ایسے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

مسئلہ : تجارت کی نیت اگر کوئی شخص ایسی جنس میں کرتا ہے جو اسے کسی ماحول کے عوض کے بغیر ملی ہو مثلاً کسی نے اسے ہبہ کیا ہو یا صدقہ دیا ہو یا اسے خُلع اور مہر کے ذریعے حاصل ہوا ہو یا ایسے ہی کسی وصیت کے سلسلہ میں اسے کچھ مال ملا ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اگرچہ اس پر ایک سال کیوں نہ گزر جائے مگر جب وہ مال فروخت ہوگا اور اس کے عوض میں جو چیز حاصل ہوگی، خواہ وہ بصورت نقد ہو یا بصورت جنس تو اس پر ایک سال گزر جانے کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

مسئلہ : ایک شخص کی ملکیت میں کچھ ایسے جانور ہیں جو سال کے اکثر حصے جنگل میں چرتے ہیں، اگر ان جانوروں سے اس کا مقصد دودھ یا بچے حاصل کرنا ہے تو اس میں جانوروں کی زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر اس نے ان سے تجارت کی نیت کی ہو تو اس میں تجارت کی زکوٰۃ ہوگی۔ بشرطیکہ جب اس نے ان جانوروں کو خریدا تھا تو اس وقت بھی اس کی نیت تجارت ہی کی رہی ہو کیونکہ اگر ان جانوروں کے خریدنے کے وقت اس کی نیت سواری یا بار برداری کی رہی ہو تو پھر ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص خوشی سے زکوٰۃ نہیں دیتا ہے تو زکوٰۃ وصول کرنے والے کو جو امام وقت کی طرف سے مقرر ہے اس سے زبردستی زکوٰۃ حاصل کرنے کا حق حاصل نہیں ہے اگر اس نے زبردستی زکوٰۃ وصول کرلی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ میں اختیار شرط ہے۔ ہاں اس شخص کو جو خود سے زکوٰۃ نہیں دیتا ہے زکوٰۃ وصول کرنے والا قید کر سکتا ہے تاکہ وہ زکوٰۃ دینے پر راضی ہو جائے اور زکوٰۃ خود بخود ادا کرے۔

بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حاکم زبردستی زکوٰۃ وصول کرے اور اس کو زکوٰۃ کے مصرف میں خرچ کر دے تو زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے لیکن ایسی روایتیں ضعیف ہیں۔ معتمد اور معتبر روایت یہی ہے کہ زبردستی زکوٰۃ وصول کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

مسئلہ : جمعہ کے خطبہ کے لئے نیت ضروری ہے۔ اگر ایک شخص خطبہ کے لئے منبر پر کھڑا ہو اور کھڑے ہونے کے بعد اسے چھینک آئی۔ اس نے الحمد اللہ کہا، تو چونکہ یہ الحمد للہ اس نے چھینک کے لئے کہا ہے اور خطبہ کی نیت نہیں کی ہے۔ اس لئے اس کا خطبہ میں شمار نہیں ہوگا۔

اسی طرح عیدین کے خطبہ میں بھی نیت ضروری ہے۔ اگر عیدین میں منبر پر کھڑے ہو کر بغیر نیت کے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی تو خطبہ ادا نہیں ہوگا جب تک کہ خطبہ کی نیت نہ کرے۔

مسئلہ : ایک شخص انگور کے رس کی تجارت کرتا ہے جس سے شراب بنائی جاتی ہے۔ اگر اس کی نیت محض تجارت کی ہے اور اس کا مقصد اس تجارت سے یہ نہیں ہے کہ اس سے شراب بنائی جائے تو یہ تجارت صحیح ہوگی اور اگر اس کی تجارت ہی یہ ہے کہ اس سے شراب بنائی جائے تو یہ تجارت حرام ہوگی۔

اسی طرح اگر ایک شخص انگور کا درخت لگاتا ہے اور اس کی نیت یہ ہے کہ لوگ انگور کھائیں گے یا انگور کی تجارت کروں گا تو یہ صحیح ہے اور اگر وہ انگور کا درخت اس نیت سے لگاتا ہے کہ اس سے شراب بنائی جائے گی تو یہ حرام ہوگا۔

ایسے ہی انگور کا شیرہ سرکہ بنانے کی نیت سے نکالتا ہے تو صحیح ہے اور اگر شراب بنانے کی غرض سے انگور کا شیرہ نکالا جائے گا تو یہ حرام ہو گا۔

ایک شخص کسی مسلمان سے کسی ناراضگی یا لڑائی کی بنا پر ملاقات نہ کرے تو یہ اس کے حق میں حرام ہے ہاں اگر اس کا ملاقات نہ کرنا اس بنا پر نہ ہو تو اگر بہت عرصہ تک بھی ملاقات نہ کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

مسئلہ: ایک عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسری میت کے موقع پر اگر تین دن سے زیادہ بناؤ سنگار اور زیب وزینت محض سوگ منانے یا ماتم داری کے لئے چھوڑتی ہے تو یہ حرام ہے۔ ہاں اگر یہ مقصد نہیں ہے بلکہ ایسے ہی اضطراراً زیب وزینت ترک کیے ہوئے ہے تو کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ: کسی میت کے موقع پر مباح چیزیں ترک کر دینا مثلاً اچار نہ ڈالنا، چرخہ نہ کاتنا، دال نہ دھونی، چارپائی پر نہ سونا، سویاں نہ بنانی پکانی اور نہ بھونی یا اسی طرح چہلم یا ششماہی تک شادی، نکاح، عقیقہ، ختنہ نہ کرنا، یہ سب رسم محض ہیں جو حرام ہیں۔

البتہ ان کے ترک کرنے میں اگر یہ نیت نہیں ہے بلکہ کسی امر خارجی کی بنا پر یا یونہی ان سے اجتناب کیا جائے تو حرج نہیں ہے لیکن شادی و نکاح میں کسی طرح بھی تاخیر مناسب نہیں کیونکہ یہ سُنّت ہے اور سُنّت جتنی جلدی ادا ہو اتنا ہی اچھا ہے اور باعث ثواب ہے۔

مسئلہ: نماز جنازہ کی نیت اس طرح ہوتی ہے "میں نماز جنازہ پڑھتا ہوں اللہ تعالیٰ کے واسطے اور دعا اس میت کے واسطے"۔

مسئلہ: سجدہ تلاوت میں تعیّن کرنا کہ فلاں تلاوت کا سجدہ ہے ضروری نہیں ہے۔

مسئلہ: مقتدی کی نماز امام کی اقتداء کی نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتی لیکن امامت بغیر نیت امامت کے صحیح ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ امام کی اقتداء کی نیت کرے اس کے بغیر اس کی نماز صحیح نہیں ہو گی لیکن امام کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ مقتدی کی امامت کی نیت کرے۔ ہاں اگر امام کو معلوم ہے کہ پیچھے عورتیں بھی میری اقتداء میں نماز پڑھیں گی تو جب اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ عورتوں کی امامت کی نیت کرے۔ اگر امام نے عورتوں کی امامت کی نیت نہیں کی، تو عورتوں کی نماز نہیں ہو گی۔

بعض علماء نے جمعہ اور عیدین کی نماز کو اس حکم سے مستثنیٰ رکھا ہے یعنی اگر امام جمعہ و عیدین کی نماز میں عورتوں کی امامت کی نیت نہ کرے تو عورتوں کی اقتداء درست ہے اور ان کی نماز ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں کسی کی امامت نہیں کروں گا اس نے نماز شروع کی پیچھے سے ایک شخص آکر اس کی اقتداء میں نماز پڑھنے لگا تو اس کی یہ اقتداء ٹھیک ہے اور نماز ہو جائے گی، اب رہا سوال قسم کا کہ وہ ٹوٹی یا نہیں؟ تو اس کی قسم قضاء تو ٹوٹ گئی لیکن دیانۃً نہیں ٹوٹی، یعنی قاضی اس کی قسم کے ٹوٹ جانے کا حکم لگا دے گا لیکن عند اللہ وہ گنہگار نہیں ہو گا اور اگر اس شخص نے نماز سے پہلے کسی کو اپنی قسم کا گواہ بنا لیا تو پھر قضاء بھی نہیں ٹوٹے گی۔

اگر وہ قسم کھانے والا شخص جمعہ کی نماز میں لوگوں کا امام بنا تو نماز صحیح ہو جائے گی لیکن قضاء اس کی قسم ٹوٹ جائے گی اگر ایسے شخص نے جنازہ کی نماز کی امامت کی تو قسم بالکل نہیں ٹوٹے گی اسی طرح سجدۂ تلاوت میں بھی نہیں ٹوٹے گی۔

ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں فلاں شخص کا امام نہیں بنوں گا، نماز میں دوسرے لوگوں کی امامت کی اور نیت یہی ہے کہ اس شخص کا امام نہیں ہوں بلکہ دوسرے لوگوں کا امام ہوں لیکن اس شخص نے اس کی لاعلمی میں آکر اس کے اقتداء کر لی تو اس امام کی قسم ٹوٹ جائے گی اگرچہ اس نے اقتداء اس کی لاعلمی ہی میں کی ہو۔

مسئلہ: ہبہ کے لئے نیت شرط نہیں ہے اگر ایک شخص نے کسی کو کوئی چیز ازراہ مذاق بخش دی تو وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی اور ہبہ صحیح

ہو گا۔

کسی نے ایک لاعلم شخص کو بخشش کے الفاظ سکھلا دیے اس کو معلوم نہیں تھا کہ ان الفاظ سے ہبہ ہو جاتا ہے پس اگر وہ شخص ان الفاظ کا تلفظ کرتا ہے تو اس طرح ہبہ نہیں ہو گا لیکن یہ ہبہ کا صحیح نہ ہونا اس لئے نہیں ہے کہ یہاں نیت نہیں پائی گئی بلکہ اس لئے کہ یہاں ہبہ کی شرط مفقود ہے اور جب شرط نہیں پائی گئی تو ہبہ بھی صحیح نہیں ہو گا اور ہبہ کی شرط رضامندی اور خوشی ہے۔

اگر کوئی شخص کسی سے زبردستی کر رہا ہے کہ فلاں چیز مجھے دے دے اور زبردستی اس سے لے بھی لی تو یہ ہبہ صحیح نہیں ہو گا بخلاف طلاق اور عتاق کے کہ حالت زبردستی میں بھی طلاق اور عتاق واقع ہو جاتے ہیں یعنی اگر کسی سے زبردستی طلاق لی جائے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

مسئلہ: نماز جنازہ میں اگر مقتدی ذکر کی نیت سے سورۂ فاتحہ بارادۂ قرأت پڑھتا ہے تو یہ حرام نہیں اگرچہ امام اعظمؒ کے نزدیک امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت کرنا حرام ہے لیکن چونکہ یہاں وہ سورۂ فاتحہ بارادۂ قرأت نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ بہ نیت ذکر پڑھ رہا ہے اس لئے اس کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اسی پر یہ مسئلہ بھی مبنی ہے کہ اگر جنبی مرد یا عورت یا حیض و نفاس والی عورت قرآن کی آیت بارادۂ ذکر اور دعا کے لئے پڑھے تو درست ہے اور اگر بارادہ قرأت قرآن کے پڑھے تو یہ درست نہیں ہے۔

مسئلہ: ایک شخص کوئی چیز خریدنے کسی دکان پر آیا۔ دکاندار نے اپنا سامان مثلاً کپڑے کا تھان یا غلہ کی بوری وغیرہ اس کے سامنے کھولی اور گاہک کو رغبت دلانے کی خاطر اپنے سامان کو دیکھ دیکھ کر سبحان اللہ کہنے لگا یا درود سلام پڑھنے لگا تو یہ مکروہ ہے۔

مسئلہ: ایک شخص معمول کی خوراک سے بھی زیادہ کھانا کھاتا ہے اگر اس زیادتی کی وجہ محض خواہش نفسانی ہے تو یہ مناسب نہیں ہے۔ ہاں اگر اس سے اس کی نیت یہ ہے کہ کل روزہ رکھوں گا یا اس کا مقصد یہ ہے کہ میرے ساتھ جو مہمان کھانا کھا رہا ہے وہ بھی میری طرح زیادہ کھائے اور بھوکا نہ رہے تو یہ مستحب ہے۔

مسئلہ: ایک مسلمان کو کسی کافر نے اپنی ڈھال بنا کر آگے کھڑا کر لیا، کوئی دوسرا مسلمان جو کافر کے مدمقابل ہے ادھر تیر چلاتا ہے تو اس سے اگر اس کا ارادہ مسلمان کا قتل ہے تو یہ حرام ہے اور اگر اس کا مقصد اس تیر کے چلانے سے کافر کو ہلاک کرنا ہے تو یہ حرام نہیں ہے۔

مسئلہ: ایک شخص کو کوئی چیز راستہ میں پڑی ہوئی ملی اگر وہ شخص اس چیز کو اس نیت سے اٹھاتا ہے کہ اس کے مالک کو ڈھونڈ کر یہ چیز اس کے حوالہ کر دوں گا تو یہ جائز ہے اور اگر اس نیت سے اٹھاتا ہے کہ اس کے مالک کو نہیں دوں گا بلکہ اپنے پاس رکھوں گا تو یہ ناجائز ہے اور یہ شخص وہ چیز اٹھا کر غاصب اور گنہگار ہو گا۔

مسئلہ: اگر کتاب کو حفاظت کی نیت سے تکیہ بناتا ہے تو یہ مکروہ نہیں ہے اور اگر حفاظت کی نیت نہیں ہے تو یہ مکروہ ہے۔

مسئلہ: ایک شخص خرجی[1] پر بیٹھ گیا جس میں قرآن شریف تھا اگر وہ قرآن شریف کی حفاظت کی غرض سے اس پر بیٹھا ہے تو مکروہ نہیں ہے اور اگر حفاظت کی نیت سے نہیں بیٹھا تو یہ مکروہ ہے۔

مسئلہ: ایک شخص کھانا چھوڑ دیتا ہے اس کا یہ کھانا چھوڑنا اگر پرہیز اور دوا کی وجہ سے ہے، یا یہ کہ اس کو خواہش اور بھوک نہیں اس لئے کھانا چھوڑے ہوئے ہے تو ان صورتوں میں مستحق ثواب نہیں ہو گا۔ ہاں اگر وہ بارادۂ روزہ کھانا ترک کیے ہوئے ہے تو اس پر ثواب ملے گا۔

---

[1] خرجی اس تھیلے کو کہتے ہیں جس میں غلہ وغیرہ ڈال کر گھوڑے اور ٹٹو وغیرہ پر لادتے ہیں

مسئلہ: کوئی شخص مسجد میں محض آرام کرنے کے لئے بیٹھا ہے تو اس پر کوئی ثواب نہیں اور اگر نماز کے انتظار کی نیت یا اعتکاف کی نیت سے بیٹھا ہے تو اس پر ثواب کا مستحق ہوگا۔

مسئلہ: کسی جانور کو ایک تو محض کھانے کی نیت سے ذبح کیا جائے تو یہ مباح ہوگا لیکن اسی جانور کو ذبح کرنا عبادت کی غرض سے ہو مثلاً قربانی تو یہی ثواب کا باعث ہوگا۔ یا جانور ذبح کرے کسی مردہ یا زندہ شخص کی تعظیم اور چڑھاوے کی غرض سے تو یہ حرام بلکہ ایک قول کے مطابق کفر ہوگا۔

مسئلہ: نماز میں رکعت کی تعداد اور سجدوں کی تعداد کی نیت ضروری نہیں ہے اور نہ اس نیت کا اعتبار ہوگا۔ مثلاً ایک شخص ظہر کی نماز پڑھتا ہے اور نیت کرتا ہے کہ "میں نماز پڑھتا ہوں ظہر کی تین رکعت" تو اس کی نماز ظہر کی صحیح ہو جائے گی اور تین رکعت کی نیت لغو ہو جائے گی۔

مسئلہ: ایک شخص نے کسی متعیّن امام کے اقتداء کی نیت کی لیکن بعد میں اسے معلوم ہوا کہ جس امام کی نیت کی تھی یہ وہ امام نہیں ہے بلکہ دوسرا امام ہے تو نماز صحیح ہو جائے گی اس میں کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ: اگر کسی شخص نے امام کو دیکھا اور اقتداء کی نیت کی کہ میں اس امام کے پیچھے کہ اس کا نام زید ہے نماز پڑھتا ہوں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ زید نہیں ہے تو جب بھی نماز درست ہو جائے گی۔

اسی طرح مقتدی امام سے بہت دور ہے کہ امام کو نہیں دیکھ سکتا اور نیت اسی طرح کی کہ امام کے پیچھے کہ اس کا نام زید ہے نماز پڑھتا ہوں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ زید نہیں ہے تو جب بھی نماز درست ہو جائے گی۔

کسی شخص نے نیت کی کہ میں نماز پڑھتا ہوں پیچھے اس شاب یعنی جوان کے لیکن اتفاق سے وہ شیخ یعنی بوڑھا نکلا تو نماز درست نہیں ہوگی۔ البتہ اگر اس کا عکس ہو کہ نیت تو کرے شیخ یعنی بوڑھے کی اور ہو شاب یعنی جوان تو نماز درست ہو جائے گی کیونکہ شاب کو بھی باعتبار اس کے علم اور فضل اور بزرگی کے شیخ کہا جاتا ہے بخلاف شیخ کے کہ اس کے لئے شاب کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔

مسئلہ: ایک شخص نے خالصۃً للہ نماز شروع کی درمیان میں ریا کا خیال پیدا ہو گیا تو نماز اس کی پہلی نیت کی معتبر ہوگی۔ ریا یہ ہے کہ اگر تنہا ہو تو نماز نہ پڑھے اور اگر لوگوں کے ساتھ ہو تو نماز پڑھے۔

یا اسی طرح اگر تنہا نماز پڑھتا ہے تو اچھی طرح نہیں پڑھتا اور اگر چند آدمیوں کے ساتھ پڑھتا ہے تو اچھی طرح پڑھتا ہے۔ بہر حال اس کو اصل نماز کا ثواب ملے گا ہاں حسن نماز کا ثواب نہ ملے گا۔

مسئلہ: اگر کسی کو نماز کے بارے میں شک ہوا کہ نماز پڑھی ہے یا نہیں تو اس کو وقت کے اندر دوبارہ نماز پڑھنی چاہئے اور اگر شک واقع ہوا کہ رکوع یا سجدہ کیا یا نہیں؟ اور وہ حالت نماز ہی میں ہے تو اس کو چاہیے کہ رکوع یا سجدہ دوبارہ کرلے اور اگر یہ شک نماز کے بعد واقع ہوا تو دوبارہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

یا اسی طرح شک ہوا کہ خبر نہیں تکبیر تحریمہ کہی یا نہیں یا وضو ہوا ہے یا نہیں یا شک ہوا کہ کپڑے پر نجاست لگی ہے یا نہیں یا ایسے ہی تردد ہوا کہ سر پر مسح کیا ہے یا نہیں؟ تو ان سب صورتوں میں یہ دیکھا جائے گا کہ یہ شک کا واقع ہونا پہلی مرتبہ ہے یا بار بار ایسا ہی شک واقع ہوتا رہتا ہے۔ اگر پہلی مرتبہ یہ شک واقع ہوا ہے تو نماز از سر نو پڑھے اور اگر اکثر ایسا ہی شک برابر ہوتا رہتا ہے تو دوبارہ از سر نو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مسئلہ: کسی معصیت اور گناہ کا محض قلب میں خیال آنے کے پانچ درجے ہیں:

اوّل ہاجس۔ یعنی دل میں کسی گناہ کے خیال کا اضطراراً آجانا۔

دوم خاطر۔ یعنی دل میں کسی گناہ کا خیال (قصداً) لانا۔

سوم حدیث نفس۔ یعنی کسی گناہ کے بارے میں تردد ہونا کہ آیا یہ گناہ کیا جائے یا نہیں۔
چہارم "ہم"۔ یعنی اس تردد میں کسی ایک جانب کو ترجیح دینا۔
پنجم۔ عزم۔ یعنی قصد گناہ کو تقویت دینا۔

تو شریعت میں ہاجس، خاطر، حدیث نفس، ان تینوں پر کوئی مواخذہ نہیں ہے اور نہ ان پر کوئی عذاب ملے گا۔ ہاجس پر تو مواخذہ اس لئے نہیں ہوتا کہ دل میں خیال کا آنا یا قلب میں وسوسہ کا پیدا ہونا کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں انسان مجبور ہے لہٰذا اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

"خاطر اور حدیث نفس" پر مواخذہ نہ ہونا اُمت محمدیہ ﷺ کے خصائص میں سے ہے یعنی اس اُمت پر جہاں خدا تعالیٰ کے اور بہت سے فضل و کرم ہیں وہیں یہ بھی ایک بڑا فضل ہے کہ اس اُمت سے ان دونوں پر مواخذہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔

"ہم" میں فرق ہوگا یعنی اگر جانب خیر کو ترجیح دے رہا ہے تو اس پر ایک نیکی لکھی جائے گی۔ اگر برائی کو ترجیح دے رہا ہے تو اس پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ یہ بھی اس اُمت پر خدا تعالیٰ کا احسان ہے البتہ عزم کے بارے میں محققین علماء کا قول ہے کہ اس پر مواخذہ ہوتا ہے۔

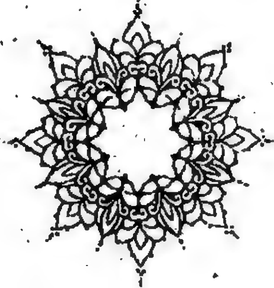

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الایمان

ایمان کے ابواب

ایمان کا مطلب: "ایمان" کے معنی ہیں، یقین کرنا، تصدیق کرنا، مان لینا۔ اصطلاح شریعت میں "ایمان" کا مطلب ہوتا ہے، اس حقیقت کو تسلیم کرنا اور ماننا کہ اللہ ایک ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود اور پروردگار نہیں، اس کے تمام ذاتی وصفاتی کمالات برحق ہیں۔ محمد (ﷺ) اللہ کے آخری رسول اور نبی ہیں، ان کی ذات صادق و مصدوق ہے اور یہ کہ آپ ﷺ کتاب و سُنّت کی صورت میں اللہ کا جو آخری دین و شریعت لے کر اس دنیا میں آئے اس کی حقانیت و صداقت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

تکمیل ایمان: محدثین کے نزدیک "ایمان" کے تین اجزاء ہیں: "تصدیق بالقلب" یعنی اللہ کی وحدانیت، رسول ﷺ کی رسالت اور دین کی حقانیت میں دل سے یقین رکھنا اور اس یقین و اعتماد پر دل و دماغ کا مطمئن رہنا۔ "اقرار باللسان" یعنی اس دلی یقین و اعتقاد کا زبان سے اظہار، اعتراف اور اقرار کرنا۔ "اعمال بالجوارح" یعنی دین و شریعت کے احکام وہدایات کی جسمانی بجا آوری کے ذریعہ اس دلی یقین و اعتقاد کا عملی مظاہرہ کرنا۔ ان تینوں اجزاء سے مل کر "ایمان" کی تکمیل ہوتی ہے اور جو شخص اس ایمان کا حامل ہوتا ہے اس کو "مؤمن و مسلمان" کہا جاتا ہے۔

ایمان اور اسلام: کیا ایمان اور اسلام میں کوئی فرق ہے یا یہ دونوں لفظ یکساں مفہوم کو ادا کرتے ہیں؟ اس سوال کا تفصیلی جواب، تفصیلی بحث کا متقاضی ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ خلاصہ کے طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ظاہری مفہوم و مصداق کے اعتبار سے تو یہ دونوں لفظ تقریباً یکساں مفہوم کے لئے استعمال ہوتے ہیں لیکن اس اعتبار سے ان دونوں کے درمیان فرق ہے کہ "ایمان" سے عام طور پر تصدیق قلبی اور احوال باطنی مراد ہوتے ہیں جب کہ "اسلام" سے اکثر و بیشتر ظاہری اطاعت و فرمانبرداری مراد لی جاتی ہے اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ "وحدانیت، رسالت اور شریعت کو ماننے اور تسلیم کرنے" کا جو باطنی تعلق دل و دماغ سے قائم ہوتا ہے اس کو "ایمان" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس باطنی تعلق کا جو اظہار عمل جوارح کے ذریعہ ظاہری احوال سے ہوتا ہے اس کو "اسلام" سے تعبیر کرتے ہیں، ایک محقق کا قول ہے تصدیق قلبی جب پھوٹ کر جوارح "اعضاء" پر نمودار ہو جائے تو اس کا نام "اسلام" ہے اور اسلام جب دل میں اتر جائے تو "ایمان" کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ حقیقت ایک ہے مواطن کے اعتبار سے اس کو کبھی "ایمان" کہا جاتا ہے اور کبھی "اسلام" اسی لئے ایمان اور اسلام ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں، نہ تو ایمان کے بغیر اسلام معتبر ہوگا اور نہ اسلام کے بغیر ایمان کی تکمیل ہوگی۔ مثلاً کوئی شخص پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھے، ہر سال زکوٰۃ بھی ادا کرے، استطاعت ہو تو حج بھی کر ڈالے اور اسی طرح دوسرے نیک کام کر کے اپنی ظاہری زندگی کو "اسلام" کا مظہر بنائے ہوئے ہو مگر اس کا باطن "قلبی تصدیق و انقیاد" سے یکسر خالی ہو اور کفر و انکار سے بھرا ہوا ہو تو اس کے یہ سارے اعمال بیکار محض قرار پائیں گے اسی طرح اگر کوئی شخص ایمان یعنی قلبی تصدیق و انقیاد تو رکھتا ہے مگر عملی زندگی میں اسلام کا مظہر ہونے کے بجائے سرکشی و نافرمانی کا پیکر اور کافرانہ و مشرکانہ اعمال کا مجسمہ بنا ہوا ہے تو اس کا ایمان بار

آور نہیں ہو گا۔

بعض اہل نظر نے "ایمان اور اسلام" کی مثال "شہادتین" سے دی ہے یعنی جیسے کلمۂ شہادت میں دیکھا جائے تو شہادت وحدانیت الگ ہے اور شہادت رسالت الگ ہے۔ لیکن ان دونوں کا ارتباط و اتحاد اس درجہ کا ہے کہ شہادت رسالت کے بغیر شہادت وحدانیت کار آمد نہیں، اور شہادت وحدانیت کے بغیر شہادت رسالت کا اعتبار نہیں۔ ٹھیک اسی طرح "ایمان" اور "اسلام" کے درمیان دیکھا جائے تو بعض اعتبار سے فرق محسوس ہوتا ہے لیکن ان دونوں کا ارتباط و اتحاد اس درجہ کا ہے کہ اعتقاد باطنی (یعنی ایمان) کے بغیر صرف اعمال ظاہرہ (اسلام) کھلا ہوا نفاق ہیں اور اعمال ظاہرہ کے بغیر اعتقاد باطن کفر کی ایک صورت ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایمان اور اسلام دونوں کے مجموعہ کا نام "دین" ہے۔

ایمان کا مدار "جاننے" پر نہیں "ماننے" پر ہے: ایمان کے بارے میں اس اہم حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تصدیق یعنی ماننے کا نام ایمان ہے نہ کہ محض علم یا معرفت یعنی جاننے کا۔ مطلب یہ کہ ایک شخص جانتا ہے کہ "اللہ" ہے اور یکتا ہے وہی پروردگار اور معبود ہے، محمد (ﷺ) اللہ کے سچے بندے اور اس کے رسول ہیں، آپ ﷺ نے جس دین و شریعت اور تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، وہ مبنی بر حقیقت و صداقت ہے۔ مگر وہ شخص دل سے ان باتوں کو نہیں مانتا، ان پر اعتقاد نہیں رکھتا، اس کا قلب ان باتوں کے اذعان و قبول سے خالی ہے تو اس شخص میں "ایمان" کا وجود نہیں مانا جائے گا اس کو مؤمن نہیں کہا جائے گا۔ مؤمن تو وہی شخص ہو سکتا ہے جو ان باتوں کو سچ اور حق بھی جانے اور دل سے مانے اور تسلیم بھی کرے۔ جب داعی حق ﷺ نے اسلام کی دعوت پیش کی تو تمام اہل عرب بالخصوص اہل کتاب (یہود و نصاری) الوہیت کے بھی قائل تھے اور یہ بات بھی خوب جانتے تھے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے سچے اور آخری رسول ہیں اور جو دین و شریعت پیش کر رہے ہیں وہ حق اور سچ ہے۔ مگر ان میں سے جو لوگ حسد و عناد رکھنے کے سبب ان حقائق کو مانتے اور تسلیم نہیں کرتے تھے ان کے دل و دماغ میں ایمان کا نور داخل نہیں ہو سکا اور وہ کافر کے کافر ہی رہے، ان حقائق کا "جاننا" ان کے کوئی کام نہ آیا۔

بعض صورتوں میں "اقرار باللسان" کی قید ضروری ہے: جن حقائق کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے ان کا زبان سے اقرار کرنا گو وجود ایمان کے لئے ضروری ہے لیکن بعض حالتوں میں یہ زبانی اقرار (اقرار باللسان) ضروری نہیں رہتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص گونگا ہے اور اس کے قلب میں تصدیق تو موجود ہے لیکن زبان سے کوئی لفظ ادا کرنے پر قادر نہیں ہے تو ایسے شخص کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اس کا ایمان زبانی اقرار کے بغیر بھی معتبر مانا جائے گا، اسی طرح کوئی شخص جانی خوف یا کسی واقعی مجبوری کی بنا پر زبان سے اپنے ایمان کا اقرار نہیں کر سکتا تو اس کا ایمان بھی زبانی اقرار کے بغیر معتبر ہو گا۔

"اعمال" کی حیثیت: وجود ایمان کی تکمیل کے لئے "اعمال" بھی لازمی شرط ہیں کیونکہ تصدیق قلب اور زبانی اقرار کی واقعیت و صداقت کا ثبوت "اعمال" ہی ہیں۔ یہی عملی ثبوت ظاہری زندگی میں اس فیصلہ کی بنیاد بنتا ہے کہ اس کو مؤمن و مسلمان کہا جائے اسی بنا پر یہ حکم ہے کہ اگر کوئی شخص دعوائے ایمان و اسلام کے باوجود ایسے اعمال کرتا ہے جو خالصۃً کفر کی علامت اور ایمان و اسلام کے منافی ہیں، یا جن کو اختیار کرنے والے پر کافر ہونے کا یقین ہوتا ہے تو وہ شخص کافر ہی شمار ہو گا اور ایمان و اسلام کا دعوی غیر معتبر مانا جائے گا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حدیث جبرئیل

① عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ اِذْ طَلَعَ

عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرٰى عَلَيْهِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا يَعْرِفُهٗ مِنَّا اَحَدٌ حَتّٰى جَلَسَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ قَالَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ صَدَقْتَ فَعَجِبْنَا لَهٗ يَسْاَلُهٗ وَيُصَدِّقُهٗ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنْ اَمَارَتِهَا قَالَ اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِيْ يَا عُمَرُ اَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَرَوَاهُ اَبُوْهُرَيْرَةَ مَعَ اخْتِلَافٍ وَفِيْهِ وَاِذَا رَاَيْتَ الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الصُّمَّ الْبُكْمَ مُلُوْكَ الْاَرْضِ فِيْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ قَرَاَ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ الْاٰيَةَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عمر بن الخطابؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن (ہم صحابہ) رسول خدا ﷺ کی مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص ہمارے درمیان آیا جس کا لباس نہایت صاف ستھرے اور سفید کپڑوں پر مشتمل تھا اور جس کے بال نہایت سیاہ (اور چمکدار) تھے، اس شخص پر نہ تو سفر کی کوئی علامت تھی (کہ اس کو کہیں سے سفر کر کے آیا ہوا کوئی اجنبی شخص سمجھا جاتا) اور نہ ہم سے کوئی اس کو پہچانتا تھا (جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کوئی مقامی شخص یا کسی کا مہمان بھی نہیں تھا) بہر حال وہ شخص نبی کریم ﷺ کے اتنے قریب آکر بیٹھا کہ آپ ﷺ کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا لئے اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی[1] دونوں رانوں پر رکھ لئے (جیسے ایک سعادت مند شاگرد اپنے جلیل القدر استاد کے سامنے باادب بیٹھتا ہے اور استاد کی باتیں سننے کے لئے ہمہ تن متوجہ ہو جاتا ہے) اس کے بعد اس نے عرض کیا اے محمد (ﷺ)! مجھ کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ فرمائیے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم اس حقیقت کا اعتراف کرو اور گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور پھر تم پابندی سے نماز پڑھو (اگر صاحب نصاب ہو تو) زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور زاد راہ میسر ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔ اس شخص نے یہ سن کر کہا آپ ﷺ نے سچ فرمایا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس (تضاد) پر ہمیں تعجب ہوا کہ یہ شخص (ایک لاعلم آدمی کی طرح پہلے تو) آپ ﷺ سے دریافت کرتا ہے اور پھر آپ ﷺ کے جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے (جیسے اس کو ان باتوں کا پہلے سے علم ہو) پھر وہ شخص بولا اے محمد (ﷺ)! اب ایمان کی حقیقت بیان فرمائیے، آپ ﷺ نے فرمایا (ایمان یہ ہے کہ) تم اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو اور قیامت کے دن کو دل سے مانو اور اس بات میں یقین رکھو کہ برا بھلا جو کچھ پیش آتا ہے وہ نوشتہ تقدیر کے مطابق ہے۔ اس شخص نے (یہ سن کر) کہا آپ (ﷺ) نے سچ فرمایا۔ پھر بولا اچھا اب مجھے یہ بتائیے کہ احسان کیا ہے آنحضرت نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو (یعنی اتنا حضور قلب میسر نہ ہو سکے) تو پھر (یہ دھیان میں رکھو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ پھر اس شخص نے عرض کیا قیامت کے بارے میں مجھے بتائیے (کہ کب آئے گی) آپ ﷺ نے فرمایا اس بارے میں جواب دینے والا، سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا (یعنی قیامت کے متعلق کہ کب آئے گی، میرا علم تم سے زیادہ نہیں جتنا تم جانتے ہو اتنا ہی مجھ کو معلوم ہے) اس کے بعد اس شخص نے کہا اچھا اس (قیامت) کی کچھ نشانیاں ہی مجھے بتا دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا لونڈی اپنے آقا یا مالک کو جنے گی اور برہنہ پا، برہنہ جسم مفلس و فقیر اور بکریاں چرانے والوں کو تم عالیشان مکانات و عمارت میں فخر و غرور کی زندگی بسر کرتے دیکھو گے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ شخص چلا گیا اور میں نے (اس کے بارہ میں آپ سے فوراً دریافت نہیں کیا بلکہ) کچھ دیر توقف کیا، پھر آپ ﷺ نے خود ہی مجھ سے پوچھا عمرؓ!

---

[1] نسائی کی روایت ہے کہ پھر اس نے اپنے ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زانوائے مبارک پر رکھے۔

جانتے ہو سوالات کرنے والا شخص کون تھا؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) ہی بہتر جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا یہ جبرئیل علیہ السلام تھے جو (اس طریقہ سے) تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ (مسلمؒ) اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ نے چند الفاظ کے اختلاف و فرق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی روایت کے آخری الفاظ یوں ہیں۔ (آنحضرت ﷺ نے قیامت کی نشانیوں کے بارے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ) جب تم برہنہ پا برہنہ جسم اور بہرے گونگے لوگوں کو زمین پر حکمرانی کرتے دیکھو (تو سمجھ لینا کی قیامت قریب ہے) اور قیامت تو ان پانچ چیزوں میں سے ایک ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔ اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ آخر تک پڑھی (جس کا ترجمہ یہ ہے: اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے اور بارش کا کب برسائے گا اور وہی (حاملہ) کے پیٹ کی چیزوں کو جانتا ہے (کہ لڑکا ہے یا لڑکی) اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا اور کسی شخص کو نہیں معلوم کہ کس زمین میں اسے موت آئے گی۔ بیشک اللہ ہی جاننے والا اور خبردار ہے)۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: یہ حدیث حدیث جبرئیل کہلاتی ہے کیونکہ یہ حدیث اس سوال و جواب (انٹرویو) پر مشتمل ہے جس کے ذریعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بڑی خوبی کے ساتھ اسلام و ایمان کی حقیقت اور دین کی اساسی باتوں کا تعارفی خاکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان مبارک سے دنیا والوں کے سامنے پیش کرایا ہے۔

حدیث میں سب سے پہلے ایمان اور اسلام کی حقیقت بیان ہوئی ہے جس سے ایمان اور اسلام کے درمیان یہ فرق بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ایمان کا تعلق تو باطن یعنی قلبی تصدیق و اعتقاد سے ہے اور اسلام کا تعلق ظاہر یعنی اعمال اور جسمانی اطاعت و فرمانبرداری سے ہے۔

"اللہ کو ماننے" کا مطلب اس بات میں یقین و اعتقاد رکھنا ہے کہ اس کی ذات اور اس کی صفات برحق ہیں، عبادت و پرستش کی سزاوار صرف اسی کی ذات ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی اس کا ہمسرو شریک نہیں۔

"فرشتوں کو ماننے" کا مطلب اس بات میں یقین و اعتقاد رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق "فرشتوں" کے نام سے موجود ہے یہ فرشتے لطیف اور نورانی اجسام ہیں، ان کا کام ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔

"کتابوں کو ماننے" کا مطلب اس بات میں یقین و اعتقاد رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں اور وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبروں پر جو کتابیں نازل فرمائی ہیں اور جن کی تعداد ایک سو چار ہے۔ وہ سب کلام خداوندی اور احکام و فرامین الٰہی کا مجموعہ ہیں اور ان میں چار کتابیں تورات، انجیل، زبور، اور قرآن مجید سب سے اعلیٰ و افضل ہیں اور پھر ان چاروں میں سب سے اعلیٰ و افضل "قرآن مجید" ہے۔

"رسولوں کو ماننے" کا مطلب اس بات میں یقین و اعتقاد رکھنا ہے کہ اول الانبیاء حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ تک تمام نبی اور رسول اللہ تعالیٰ کے سب سے سچے، سب سے پیارے اور سب سے افضل بندے ہیں جن کو اس نے اپنے احکام و ہدایات دے کر مختلف زمانوں، مختلف علاقوں اور مختلف قوموں میں مبعوث کیا اور انہوں نے ان خدائی احکام و ہدایات کے تحت دنیا والوں کو ابدی صداقت و نجات کا راستہ دکھانے اور نیکی و بھلائی پھیلانے کا اپنا فریضہ پورے طور پر ادا کیا اور یہ کہ ان تمام نبیوں اور رسولوں کے سردار پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ ہیں جو کسی خاص زمانہ، کسی خاص علاقہ اور کسی خاص قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ اللہ کا ابدی دین "اسلام" لے کر تمام دنیا اور پوری کائنات کی طرف مبعوث ہوئے اور تاقیامت ان ہی کی نبوت اور انہی کی شریعت جاری و نافذ رہے گی۔

"یوم آخرت یعنی قیامت کے دن" سے مراد وہ عرصہ ہے جو مرنے کے بعد سے قیامت قائم ہونے اور پھر جنت میں داخل ہونے تک پر مشتمل ہے۔ "قیامت کے دن کو ماننے" کا مطلب اس بات میں یقین و اعتقاد رکھنا ہے کہ شریعت اور شارع نے مابعد الموت اور آخرت کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے یعنی موت کے بعد پیش آنے والے احوال مثلاً قبر اور برزخ کے احوال، نفخ صور، قیامت، حشر و نشر، حساب و کتاب اور پھر جزاء و سزا کا فیصلہ اور جنت و دوزخ یہ سب اٹل حقائق ہیں اور جن کا واقع پذیر ہونا اور پیش آنا لازمی امر ہے۔ اس میں شک

اور شبہ نہیں۔

"تقدیر میں یقین رکھنے" کا مطلب اس حقیقت کو دل سے تسلیم کرنا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب نوشتۂ تقدیر کے مطابق اپنے اپنے وقت پر وقوع پذیر ہوتا ہے، آج جو بھی عمل سرزد ہوتا ہے خواہ وہ نیکی کا ہو یا بدی کا، خالق کائنات کے علم اور تقدیر میں وہ ازل سے موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بندہ مجبور و مضطر ہے۔ کاتب تقدیر نے انسان کو "مختار" بنایا ہے۔ یعنی اس کے سامنے نیکی و بدی کے دونوں راستے کھول کر اس کو اختیار دے دیا ہے کہ چاہے وہ نیکی کے راستہ پر چلے، چاہے بدی کے راستہ پر، اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ نیکی کے راستہ پر چلو گے تو جزاء و انعام سے نوازے جاؤ گے جو اللہ کا فضل و کرم ہوگا اور اگر بدی کے راستہ پر چلو گے تو سزا اور عذاب کے مستوجب بنو گے اور دوزخ میں ڈالے جاؤ گے جو عدل خداوندی کے عین مطابق ہوگا۔

"احسان" سے مراد وہ جوہر (اخلاص) ہے جس سے ایمان و اسلام کی ظاہری صورت یعنی عبادت الٰہی کا صحیح معیار اور حسن قائم ہوتا ہے اور عبادت کا یہی صحیح معیار اور حسن در حقیقت بندہ کو معبود کا کامل تقرب اور عبدیت کا حقیقی مقام عطا کرتا ہے۔ بندہ اپنی عبادتوں کو اس جوہر سے کس طرح آراستہ و مزین کر سکتا ہے؟ اس کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو تو اس طرح کرو جس طرح کوئی نوکر یا غلام اپنے آقا اور مالک کی خدمت اس کو اپنے سامنے دیکھ کر کرتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ اگر شفیق آقا نظر کے سامنے ہو اور غلام اس کو دیکھ رہا ہے تو اس کے فرض کی انجام دہی کی کیفیت ہی دوسری ہوتی ہے اس وقت غلام نہ صرف یہ کہ پوری طرح چاق و چوبند مؤدب اور پابند ہوتا ہے بلکہ کام کرنے کا اس کا انداز بھی پوری طرح والہانہ اور مخلصانہ ہوتا ہے اس کے برخلاف اگر آقا نظر کے سامنے نہ ہو تو غلام اگرچہ موفوضہ خدمت انجام ضرور دیتا ہے مگر اس صورت میں نہ تو وہ اتنا چاق و چوبند، مؤدب اور پابند ہوتا ہے اور نہ اس کے کام کرنے کے انداز میں اس قدر والہانہ اور مخلصانہ کیفیت ہوتی ہے۔ پس اسی نکتہ کے پیش نظر اگر بندہ عبادت کے وقت ایسی کیفیت و حالات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ تو خشوع و خضوع اور تضرع کی تمام تر کیفیات خود بخود اس کی عبادت میں پیدا ہو جائیں گی اور اس طرح اس کی عبادت حقیقی عبادت کا درجہ پائے گی اور اس عبادت کا بنیادی مقصد بھی حاصل ہوگا۔ عبادت کے اس مرتبہ کو "حقیقی احسان" کہا گیا ہے جس کو ارباب تصوف "مشاہدہ و استغراق" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عبادت کا یہ سب سے اونچا مرتبہ و مقام ہے جہاں تک رسائی اتنی آسان نہیں ہے اس لئے نسبتاً آسان طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب تم عبادت کرو تو یہ دھیان میں رکھو کہ جس ذات کی عبادت تم کر رہے ہو اس کے سامنے تم کھڑے ہو اور اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھ سکتے مگر وہ تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے تمہاری ایک ایک بات پر اس کی نظر ہے اور تمہاری تمام حرکات و سکنات میں سے کچھ بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے، اس یقین و اعتقاد سے بھی تمہاری عبادت میں خشوع و خضوع اور تضرع بڑی حد تک پیدا ہو جائے گا اور عبادت کا حق ادا ہوگا۔ حدیث میں عبادت کی اسی کیفیت کو "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے جو حقیقی احسان یعنی مشاہدہ و استغراق کا ثانوی درجہ ہے۔

حدیث میں ان چاروں فرائض کا بھی ذکر ہے جو ہر مسلمان و مؤمن پر اس تفصیل کے ساتھ عائد ہوتا ہے کہ نماز اور روزہ تو وہ دو بدنی فرض عبادتیں ہیں جن کا تعلق ہر عاقل و بالغ مسلمان سے ہے جو بھی شخص ایمان اور اسلام سے متصف ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس پر فرض ہے کہ وہ پانچوں وقت کی نمازیں پابندی کے ساتھ ادا کرے اور جب رمضان آئے تو اس مہینے کے پورے روزے رکھے۔ باقی دو فرض عبادتیں یعنی زکوٰۃ اور حج وہ مالی عبادتیں ہیں جن کا تعلق صرف اس مؤمن و مسلمان سے ہے جو ان کے بقدر مالی استطاعت و حیثیت رکھتا ہو۔ مثلاً زکوٰۃ اس مسلمان پر فرض ہوگی جو صاحب نصاب ہو۔ اور حج اس مسلمان پر فرض ہوگا جو صاحب نصاب ہی نہیں بلکہ اپنی تمام ضروریات زندگی سے فراغت کے بعد اتنا سرمایہ رکھتا ہو کہ بغیر کسی تنگی و پریشانی کے آمد و رفت اور سفر کے دوسرے تمام اخراجات برداشت کر سکتا ہو۔ علاوہ ازیں سفر حج کی پوری مدت کے لئے اپنے اہل و عیال اور لواحقین کے تمام ضروری اخراجات کے بقدر رقم یا سامان و اسباب ان کو دے کر جا سکتا ہو۔ زاد راہ اور فرضیت حج کی اس طرح کی دوسری شرائط پوری ہو جائیں تو باقی دشواریاں جیسے سفر کا طویل اور پر

صعوبت ہونا، درمیان میں سمندر یا دریا کا حائل ہونا وغیرہ، حج کی فرضیت کو ساقط نہیں کر سکتیں۔

قیامت کی کچھ اہم نشانیاں بتائی گئی ہیں کہ جب یہ آثار ظاہر ہونے لگیں اور یہ علامتیں دیکھ لی جائیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس عالم کے خاتمہ کا وقت قریب آگیا ہے اور یہ دنیا اپنے وجود کے آخری دور سے گزر رہی ہے۔ پہلی علامت یا نشانی تو یہ بتائی گئی ہے کہ "لونڈی اپنے آقا یا مالک کو جنے گی" اس کا ایک مطلب تو غلامی کے زمانہ اور رواج کے سیاق میں لیا جاسکتا ہے کہ لوگ کثرت سے باندیاں رکھیں گے اور ان باندیوں سے اولاد بھی بہت جنوائیں گے، پھر انہی اولاد میں سے جو لوگ بڑے ہو کر مال و جائداد اور حکومت و طاقت کے مالک بنیں گے وہ لاعلمی میں اپنی انہی ماؤں کو جنہوں نے ان کو جنم دیا ہوگا، باندیوں کے طور پر خریدیں گے۔ اور اپنی خدمت میں رکھیں گے۔ اس جملہ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب معاشرہ میں جنسی بے راہ روی عام ہو جائے، مرد وزن تمام اخلاقی اور انسانی پابندیوں کو توڑ کر بے محابہ ناجائز تعلقات پیدا کریں اور اس کے نتیجہ میں ایسے ناجائز بچے کثرت سے پیدا ہونے لگیں جن کو نہ اپنے باپ کی خبر ہو اور نہ اپنی ماں کو جانتے ہوں اور پھر وہی بچے بڑے ہو کر لاعلمی میں اپنی انہی ماؤں کو ملازمہ اور نوکرانی بنائیں جن کو انہوں نے جنا تھا تو سمجھو کہ قیامت قریب آگئی ہے۔ دوسری علامت "برہنہ پا، برہنہ جسم، مفلس و فقیر اور بکریاں چرانے والوں کا ایوان حکومت اور عالیشان مکانات و محلات کا مالک ہونا" بتایا گیا ہے۔ اس کے مطلب یہ ہے کہ جب تم دیکھو کہ شریف النسل، عالی خاندان اور مہذب و معزز لوگ انقلاب عالم کا شکار ہو کر غربت و افلاس اور بے روزگاری و پریشانی حالی کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں، اپنی حیثیت و وقعت کھو چکے ہیں اور معاشرتی و سماجی سطح پر کسی اثر و رسوخ کے حامل نہیں رہ گئے ہیں اور ان کے مقابلہ پر وہ لوگ کہ جو کل تک حسب و نسب، شرافت و نجابت، نسل و خاندان اور تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے نہایت بے حیثیت و بے وقعت تھے، تعلیمی و اخلاقی طور پر کم تر و پسماندہ سمجھے جاتے تھے۔ غیر منصفانہ سیاست و انقلاب کی بدولت حکومت و اقتدار کے مالک بن بیٹھیں۔ دغا و فریب کے ذریعہ مال و دولت اور بڑی بڑی جائدادوں پر قابض اور عالی شان مکانات و محلات کے مکین ہو گئے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ طاقت و حکومت، مال و دولت اور پر عیش زندگی نے ان کو گھمنڈی شیخی خوار بنا دیا ہے، حقیقی شرافت و نجابت رکھنے والے غریب و مفلس لوگوں کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کو ذلیل کرتے ہیں اور ان کی تباہی و رسوائی کے بد سے بدتر حالات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو سمجھنا کہ اب اس دنیا کے خاتمہ کا وقت قریب آگیا ہے۔ اسی تفصیل کو علامہ طیبیؒ نے چند جملوں میں اس طرح بیان کیا ہے کہ قیامت کی علامتیں بتانے والے حدیث کے یہ دونوں جملے دراصل انقلاب حالات سے کنایہ ہیں یعنی جب اتنا انقلاب رونما ہو جائے کہ اپنی اولاد اپنا آقا اور حاکم بن جائے۔ اور شرفاء کی جگہ کمتر و ذلیل لے لیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب تمام عالم پر ایک عظیم انقلاب کا وقت قریب آگیا ہے جسے قیامت کہا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ: اس حدیث میں شریعت محمدی ﷺ کی اساس اور دین کی بنیادی باتوں کو بتایا گیا ہے یعنی "ایمان" کی تعریف بیان کی گئی کہ یہ ان عقائد و نظریات سے تعبیر ہے جن کو جاننے اور ماننے کے بعد کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے اور مؤمن بنتا ہے "اسلام" کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس سے وہ عملی ذمہ داریاں (فرائض) مراد ہیں جو مؤمن پر عائد ہوتے ہیں اور ان عملی ذمہ داریوں یعنی فرائض کی انجام دہی ہی پیرو اسلام یعنی مسلمان بناتی ہے۔ اس کے بعد "احسان" کی وضاحت کی گئی جس کو "اخلاص" سے (یا تصوف سے بھی) تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس کیفیت کا نام ہے جو صحیح عقائد و نظریات سے وابستگی اور شریعت کی اتباع و فرمانبرداری کے بعد توجہ الی اللہ کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ اور بندہ کو اپنے معبود کا تقرب عطا کرتی ہے۔ درحقیقت یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی خوشنودی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک اللہ اور اللہ کے رسول کے جاری و نافذ کئے ہوئے احکام و ہدایات پر پوری طرح عمل نہ کیا جائے اور "عمل" اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک اس وقت تک "حسن قبول" کا درجہ نہیں پا سکتے جب تک اللہ کی طرف کامل توجہ نہ ہو اور پورے داخلی و خارجی وجود پر خوف و خشیت الٰہی اور حضور قلب کی کیفیت طاری نہ ہو اور ان دونوں کا اس وقت تک کوئی اعتبار نہیں ہوگا جب تک فکر و عقیدہ صحیح نہ ہو۔ اور دل و دماغ ایمان و یقین سے روشن نہ ہوں۔ پس

کامل مؤمن یا کامل مسلمان وہی شخص مانا جائے گا جس کے دل ودماغ میں ایمان یعنی صحیح اسلامی عقائد و نظریات کا نور موجود ہو، پھر وہ ان فرائض کو پوری طرح ادا کرے اور ان احکام وہدایات کی کامل اطاعت کرے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ جاری و نافذ کئے ہیں اور پھر ریاضت ومجاہدہ یعنی ذکر وشغل اور اوراد وظائف کے ذریعہ اخلاص، توجہ الی اللہ اور رضاء مولی کے حصول کی جدوجہد کرے جس سے ایمان واسلام میں حسن وکمال اور بلند قدری ملتی ہے۔

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے

(۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ[۱] بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اول اس بات کا دل سے اقرار کرنا اور گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، دوم پابندی کے ساتھ نماز پڑھنا، سوم زکوٰۃ دینا، چہارم حج کرنا، پنجم رمضان کے روزے رکھنا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اسلام" کی تشبیہ "عمارت" سے دی جاسکتی ہے کہ جس طرح کوئی بلند وبالا اور خوشنما عمارت اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کے نیچے بنیادی ستون نہ ہوں، اسی طرح اسلام کے بھی پانچ بنیادی ستون ہیں جن کے بغیر کوئی شخص اپنے اسلام کو وجود و بقا نہیں دے سکتا، ان ہی پانچ ستونوں کو اس حدیث میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور وہ ہیں: عقیدۂ توحید ورسالت، نماز، زکوٰۃ، حج اور روزہ۔ جو شخص خود کو مؤمن ومسلمان بنانا اور قائم رکھنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی اعتقادی و فکری اور عملی و اخلاقی زندگی کی اساس ان پانچوں ستونوں کو قرار دے۔ پھر جس طرح کسی عمارت کی شان وشوکت اور دیدہ زیبی وخوشنمائی درودیوار کے نقش ونگار اور طاق و محراب کی آرائش وزیبائش پر منحصر ہوتی ہے اسی طرح اسلام کے حسن وکمال کا انحصار بھی ان اعمال پر ہے جن کو واجبات ومستحبات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں حدیث میں چونکہ اسلام کی بنیادی چیزوں کا ذکر مقصود تھا اس لے اس موقع پر ان واجبات ومستحبات کا ذکر نہیں کیا گیا۔

ایمان کی شاخیں

(۳) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَۃً فَاَفْضَلُھَا قَوْلُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَدْنَاھَا اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ[۲] کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ایمان کی شاخیں ستر سے کچھ اوپر ہیں ان میں سب سے اعلیٰ درجہ کی شاخ زبان ودل سے اس بات کا اقرار واعتراف ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور سب سے کم درجہ کی شاخ کسی تکلیف دینے والی چیز کا راستہ سے ہٹادینا ہے نیز شرم وحیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس حدیث میں ایمان کے شعبوں اور شاخوں کی تعداد بتائی گئی ہے یعنی وہ چیزیں مل کر کسی کو ایمان واسلام کا مکمل پیکر اور خوشنما مظہر بناتی ہیں۔ یہاں تو صرف ان شعبوں اور شاخوں کی تعداد بتلائی گئی ہے لیکن بعض احادیث میں ان کی تفصیل بھی منقول ہے اور وہ اس

۱؎ آپ اسلام کے دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں آپ کی پیدائش سال نبوت سے ایک سال پہلے مکہ معظمہ میں ہوئی تھی ۷۳ یا ۷۴ میں وصال فرمایا

۲؎ آپ کا اصل نام عبدالرحمٰن بن صخر ہے کنیت ابوہریرہؓ ہے۔ ۵۷ھ یا ۵۸ھ میں آپ نے مدینہ میں وصال فرمایا۔

طرح ہے:

پہلی چیز تو بنیادی ہے یعنی اس حقیقت کا دل و دماغ میں اعتقاد و یقین اور زبان سے اقرار و اظہار کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اس کی ذات و صفات برحق ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، بقاء اور دوام صرف اسی کی ذات کے لئے ہے جب کہ کائنات کی تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں، ایسے ہی اللہ کے رسولوں، اس کی کتابوں اور فرشتوں کے بارے میں اچھا اعتقاد اور حسن یقین رکھنا اور ان کو برحق جاننا، آخرت کا عقیدہ رکھنا کہ مرنے کے بعد قبر میں برے اور گنہگار لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اور اچھے اور نیک بندوں پر اس کا انعام و اکرام ہوتا ہے۔ قیامت آئے گی اور اس کے بعد حساب و کتاب کا مرحلہ ضرور آئے گا، اس وقت ہر ایک کے اعمال ترازو میں تولے جائیں گے جن کے زیادہ اعمال اچھے اور نیک ہوں گے ان کو پروانہ جنت داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، جن کے زیادہ اعمال برے ہوں گے، ان کی فرد جرم ان کے بائیں ہاتھ میں تھمادی جائے گی۔ تمام لوگ پل صراط پر سے گزریں گے۔ مؤمنین صالحین ذات باری تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔ نیک اور اچھے لوگ بہشت میں پہنچائے جائیں گے اور گنہگاروں کو دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا۔ جس طرح جنتی (مؤمن) بندے جنت میں ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام اور اس کی خوشنودی سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے اسی طرح دوزخی لوگ (کفار) ہمیشہ ہمیشہ اللہ کے مسلط کئے ہوئے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

ایمان کے شعبوں اور شاخوں میں سے یہ ہے کہ اللہ سے ہر وقت لو لگائے رہے اور اس سے محبت رکھے اگر کسی غیر اللہ سے محبت کرے تو اللہ کے لئے کرے یا کسی سے دشمنی رکھے تو اللہ کے لئے رکھے۔ نبی کریم ﷺ سے کامل محبت اور آپ ﷺ کی عظمت و برتری، اور افضلیت میں پورا یقین رکھے۔ آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرنا، آپ کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنا اور آپ ﷺ کے ارشادات، آپ ﷺ کی تعلیمات کو رواج دینا اور پھیلانا بھی آپ ﷺ سے محبت رکھنے کی دلیل ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی علامت اس طرح رچ بس جائے کہ اس محبت کے مقابلہ میں دنیا کی کسی بھی چیز اور کسی بھی رشتہ کی محبت کوئی اہمیت نہ رکھے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی علامت اتباع شریعت ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کی تعمیل کرتا ہے اور شریعت کے احکام پر عمل کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اللہ، اور رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے لیکن جو شخص اللہ اور رسول کے احکام و فرمان کی تابعداری نہ کرتا ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ اس کا دل اللہ و رسول کی پاک محبت سے بالکل خالی ہے۔

یہ بھی ایمان کی ایک شاخ ہے کہ جو بھی عمل کیا جائے خواہ وہ بدنی ہو یا مالی، قولی ہو یا فعلی اور یا اخلاقی وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے ہو، نام و نمود یا کسی دنیاوی غرض سے نہ ہو بس جہاں تک ہو سکے اعمال میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ نفاق اور ریا کا اثر عمل کے حسن و کمال اور تاثیر کو ختم کر دے گا۔

مؤمن کا دل ہمہ وقت خوف خدا اور خشیت الٰہی سے بھرا ہوا ہو اور اس کے فضل و کرم اور رحمت کی امیدوں سے معمور رہنا چاہیے، اگر بتقاضائے بشریت کوئی بری بات یا گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر فوراً خلوص دل سے توبہ کے بعد آئندہ کے لئے گناہوں سے اجتناب کا عہد کرے اور اللہ کے عذاب سے ڈرتا رہے اور اپنے اچھے عمل اور نیک کام میں اللہ کی رحمت اور اس کے انعام و اکرام سے آس لگائے رہے۔ درحقیقت یہ ایمان کا ایک بڑا تقاضہ ہے کہ جب کبھی کوئی گناہ دانستہ یا نادانستہ سرزد ہو جائے تو فوراً احساس ندامت و شرمندگی کے ساتھ خدا کے حضور اپنے گناہ سے توبہ کرے اور معافی و بخشش کا طلبگار ہو، اس لئے کہ ارتکاب گناہ کے بعد توبہ کرنا شرعاً ضروری اور لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہے اگر اللہ نے اولاد عنایت فرمائی تو فوراً عقیقہ کرے، اگر نکاح کیا تو ولیمہ کرے، اگر قرآن مجید حفظ یا ناظرہ ختم کیا تو خوشی و مسرت کا اظہار کرے، اللہ نے اگر مال دیا ہے تو زکوٰۃ ادا کرے۔ عید کی تقریب میں صدقۃ الفطر

دے اور بقر عید میں قربانی کرے۔

یہ بھی ایمان کا تقاضہ ہے کہ وعدہ کرے تو اسے پورا کرے، مصیبت پر صبر کرے، اطاعت و فرمانبرداری کے لئے ہر مشقت برداشت کرے، گناہوں سے بچتا رہے۔ تقدیر اور اللہ کی مرضی پر راضی رہے، اللہ پر توکل کرے، بڑوں اور بزرگوں کی تعظیم و احترام، چھوٹوں اور بچوں سے شفقت و محبت کا معاملہ کرے اور کبر و غرور، نخوت و تکبر کو چھوڑ کر کسر نفسی و تواضع اور حلم و بردباری اختیار کرے۔

"حسن اسلام" اور "تکمیل ایمان" کے مدارج میں سے یہ بھی ہے کہ برابر کلمۂ توحید و شہات کا ورد رکھے۔ قرآن شریف پڑھے اگر جاہل ہو تو عالم سے علم کی دولت حاصل کرے اگر عالم ہو تو جاہلوں کو تعلیم دے، اپنے مقاصد میں کامیابی کے لئے خدا سے مدد کا طلب گار ہو اور دعا مانگے اور اس کا ذکر کرتا رہے، اپنے گناہوں سے استغفار اور فحش باتوں سے بچتا رہے، ہر وقت ظاہری و باطنی گندگیوں سے پاک رہے۔

نمازوں کا پڑھنا خواہ فرض ہوں یا نفل، اور وقت پر ادا کرنا، روزہ رکھنا، چاہے نفل ہو یا فرض، ستر کا چھپانا، صدقہ دینا خواہ نفلی ہو یا لازمی، غلاموں کو آزاد کرنا، سخاوت و ضیافت کرنا، اعتکاف میں بیٹھنا، شب قدر اور شب برات میں عبادت کرنا، حج و عمرہ کرنا، طواف کرنا۔ دارالحرب یا ایسے ملک سے جہاں فسق و فجور، فحش و بے حیائی اور منکرات و بدعات کا زور ہو، دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جانا، بدعتوں سے بچنا اپنے دین کو بری باتوں سے محفوظ رکھنا: نذروں کا پورا کرنا، کفاروں کا ادا کرنا، حرام کاری سے بچنے کے لئے نکاح کرنا۔ اہل و عیال کے حقوق پورے طور پر ادا کرنا، والدین کی خدمت کرنا، اور ہر طرح ان کی مدد کرنا اور خبر گیری رکھنا، اپنی اولاد کی شریعت کے مطابق تربیت کرنا، اپنے ماتحتوں سے حسن سلوک کرنا، اپنے حاکموں، افسروں اور مسلمان سرداروں کی تابعداری کرنا اور بشرطیکہ خلاف شرع چیزوں کا وہ حکم نہ دیں۔ غلام اور باندی سے نرمی اور بھلائی سے پیش آنا، اگر صاحب اقتدار اور حاکم و جج ہو تو انصاف کرنا، لوگوں میں باہم صلح صفائی کرانا، اسلام سے بغاوت کرنے والوں اور دین سے پھرنے والوں سے قتل و قتال کرنا، اچھی باتوں کی تبلیغ کرنا، بری باتوں سے لوگوں کو روکنا، اللہ کی جانب سے مقرر کی ہوئی سزاؤں کا جاری کرنا، دین و اسلام میں غلط باتیں پیدا کرنے والوں اور اللہ و رسول کا انکار کرنے والوں سے حسب قوت و استطاعت خواہ ہتھیار سے خواہ قلم و زبان سے جہاد کرنا، اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا، امانت کا ادا کرنا، مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کرنا، وعدہ کا مطابق فرض پورا کرنا، پڑوسی کی دیکھ بھال کرنا اور اس کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آنا، لوگوں کے سات بہترین معاملہ کرنا، حلال طریقہ سے مال کمانا اور اس کی حفاظت کرنا، مال و دولت کو بہترین مصرف میں اور اچھی جگہ خرچ کرنا۔ فضول خرچی نہ کرنا، سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا، جب کسی کو چھینک آئے تو "یرحمک اللہ" کہنا، خلاف تہذیب کھیل کود اور برے تماشوں سے اجتناب کرنا، لوگوں کو تکلیف نہ پہنچانا اور راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کا ہٹا دینا تاکہ راہ گیروں کو تکلیف و نقصان نہ پہنچے، یہ سب ایمان کے شعبوں اور اس کی شاخیں ہیں۔

راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کے ہٹانے کا یہ مطلب ہے کہ اگر راستہ میں پتھر یا کانٹے پڑے ہوں جس سے راہ گیر کو تکلیف پہنچتی ہو یا نجاست و غلاظت پڑی ہو یا ایسی کوئی بھی چیز پڑی ہو جس سے راستہ چلنے والوں کو نقصان پہنچے تو مؤمن کا یہ فرض ہے کہ انسانی و اخلاقی ہمدردی کے ناتے اس کو ہٹا دے اور راستہ صاف کر دے۔ اور اسی طرح خود بھی ایسی کوئی چیز راستہ میں نہ ڈالے جو راستہ چلنے والوں کے لئے تکلیف کا باعث ہو اور عارفین کی رمز شناس نگاہوں نے تو اس سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ انسان اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے صاف کرلے جو توجہ الی اللہ اور معرفت کے راستہ کی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں اور اپنے قلب سے برائی و معصیت کے خیال تک کو کھرچ کر پھینک دے۔

بہر حال یہ تمام باتیں ایمان کے شعبے ہیں جن پر مؤمن کو عمل کرنا نہایت ضروری ہے اس لئے کہ ایمان کی تکمیل اور اسلام کا حسن انہی چیزوں سے پیدا ہوتا ہے اگر کوئی شخص ان باتوں سے خالی ہے اور اس کی زندگی ان کی شعاعوں سے منور نہیں ہے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوئی اس کو چاہیے کہ اللہ کی مدد اور اس کی توفیق چاہ کر ان اہم باتوں کو اختیار کرے۔

مؤمن اور مسلم کا مفہوم

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَلِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ؟ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا "کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان (کی ایذا) سے مسلمان محفوظ رہیں اور اصل مہاجر وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے"۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم نے اس روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ (کے ضرر) سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جزء میں اس طرف اشارہ ہے کہ "مؤمن اور مسلمان" محض اس کا نام نہیں ہے کہ کوئی شخص محض کلمہ پڑھ لے اور کچھ متعین اعمال و ارکان ادا کر لے بلکہ اسلامی شریعت اپنے پیروؤں سے ایک ایسی بھرپور زندگی کا تقاضا کرتی ہے جس کا حامل ایک طرف عقائد و اعمال کے لحاظ سے اللہ کا "حقیقی بندہ" کہلانے کا مستحق ہو تو دوسری طرف وہ انسانیت کے تعلق سے پوری طرح امن و آشتی کا نمونہ اور محبت و مروت کا مظہر ہو، امن و امانت، اخلاق و رواداری، ہمدردی و خیر سگالی کا اپنی عملی زندگی میں اس طرح اظہار کرے کہ دنیا کا ہر انسان اس سے خوف زدہ رہنے کے بجائے اس کو اپنا ہمدرد، بہی خواہ اور مشفق سمجھے، اور کیا مال کیا جان و آبرو، ہر معاملہ میں اس کو پورا اعتماد اور اطمینان رکھے۔

اس حدیث میں ہاتھ اور زبان کی تخصیص اس لئے ہے کہ عام طور پر ایذا رسانی کے یہی دو ذریعے ہیں ورنہ یہاں ہر وہ چیز مراد ہے جس سے تکلیف پہنچ سکتی ہے خواہ وہ ہاتھ ہوں یا زبان یا کوئی دوسری چیز۔

حدیث کے دوسرے جزء میں "حقیقی مہاجر" کی تعریف کی گئی ہے یوں تو مہاجر ہر اس شخص کو کہیں گے جس نے خدا کی راہ میں اپنا وطن، اپنا گھر اور اپنا ملک چھوڑ کر دارالاسلام کو اپنا وطن بنا لیا ہو، یہ قربانی اسلام عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کے لئے بے شمار جزاء و انعام کا حقدار مانتا ہے لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس ہجرت کے علاوہ ایک ہجرت اور ہے جس کا زندگی کے ساتھ دوامی تعلق رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے مؤمن ان سے پرہیز کرتا رہے اور اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نفسانی خواہشات کو بالکل ترک کر کے پاکیزہ نفسی اختیار کرے ایسا شخص حقیقی مہاجر کہلانے کا مستحق ہوگا۔

درجات محبت

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مؤمن نہیں بن سکتا جب

۱؎ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جلیل القدر صحابی، رفیع المرتبت عالم، بلند پایہ مجاہد اور بڑے مرتبہ کے متقی و عابد تھے آپ مہاجر ہیں۔ آپ کے سن وفات میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ تذکرۃ الحفاظ کی روایت کے مطابق مصر میں ۷۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

۲؎ حضرت انس بن مالک بن نضرؓ انصاری ہیں اور مدینہ کے اصل باشندہ تھے۔ آپ کی عمر جب دس سال کی تھی تو آپ کی والدہ ام سلیم بنت ملحان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ ۹۶ھ میں انتقال فرمایا۔

تک کہ میں اس کو اس کے باپ، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "محبت" ایک تو طبعی ہوتی ہے جیسے اولاد کو باپ کی یا باپ کو اولاد کی محبت۔ اس محبت کی بنیاد طبعی وابستگی و پسند اور فطری تقاضہ ہوتا ہے۔ اس میں عقلی یا خارجی ضرورت اور دباؤ کا دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف ایک محبت عقلی ہوتی ہے جو کسی طبعی و فطری وابستگی اور تقاضے کے تحت نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی عقلی ضرورت و مناسبت اور خارجی وابستگی کے تحت کی جاتی ہے۔ اس کی مثال مریض اور دوا ہے یعنی بیمار شخص دوا کو اس لئے پسند نہیں کرتا کہ دوا لینا اس کا طبعی اور فطری تقاضہ ہے بلکہ یہ دراصل عقل کا تقاضا ہوتا ہے کہ اگر بیماری ختم کرنا ہے اور صحت عزیز ہے تو دوا استعمال کرنی ہوگی خواہ اس دوا کی تلخی اور کڑواہٹ طبیعت پر کتنا ہی بار کیوں نہ ہو، اسی طرح اگر کسی شخص کے جسم کا کوئی حصہ پھوڑے پھنسی کے فاسد مادہ سے بھر گیا ہو تو وہ آپریشن کے لئے اپنے آپ کو کسی ماہر جراح اور سرجن کے حوالہ اس لئے نہیں کرتا کہ اس کی نظر میں آلات جراحی کی چمک دمک اچھی لگتی ہے یا اس کی طبیعت اپنے جسم کے اس حصہ پر نشتر زنی کو پسند کرتی ہے بلکہ یہ عقل و دانائی کا تقاضا ہوتا ہے کہ اگر جسم کو فاسد مادہ سے صاف کرنا ہے تو خود کو اس جراح یا سرجن کے حوالہ کر دینا ضروری ہے کسی چیز کو عقلی طور پر چاہنے اور پسند کرنے کی وہ کیفیت جس کو "عقلی محبت" سے تعبیر کرتے ہیں، بعض حالات میں اتنی شدید، اتنی گہری اور اتنی اہم بن جاتی ہے کہ بڑی سے بڑی طبعی محبت اور بڑے سے بڑے فطری تقاضے پر بھی غالب آ جاتی ہے۔ پس یہ حدیث ذات رسالت سے جس محبت اور وابستگی کا مطالبہ کر رہی ہے وہ علماء و محدثین کے نزدیک یہی "عقلی محبت" ہے لیکن کمال ایمان و یقین کی بنا پر یہ "عقلی محبت" اتنی پر اثر، اتنی بھرپور اور اس کی قدر جذباتی وابستگی کے ساتھ ہو کہ "طبعی محبت" پر غالب آ جائے۔ اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کی کسی ہدایت اور کسی شرعی حکم کی تعمیل میں کوئی خونی رشتہ جیسے باپ کی محبت، اولاد کا پیار یا کوئی بھی اور طبعی تعلق رکاوٹ ڈالے تو اس ہدایت رسول اور شرعی حکم کو پورا کرنے کے لئے اس خون کے رشتے اور طبعی تقاضا و محبت کو یکسر نظر انداز کر دینا چاہیے، ایمانیات اور شریعت کے نقطہ نظر سے یہ بہت بڑا مقام ہے اور یہ مقام اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب ایمان و اسلام اور حب رسول ﷺ کا دعوی کرنے والا اپنے نفس کو احکام شریعت اور ذات رسالت میں فنا کر دے، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی رضا و خوشنودی کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد حیات نہ ہو۔ مثال کے طور پر نبی کریم ﷺ کا فرمان جاری ہوتا ہے کہ اہل ایمان جہاد کے لئے نکلیں، اس حکم کی تعمیل میں اہل ایمان، دشمنان دین سے لڑنے کے لئے میدان جنگ میں پہنچتے ہیں۔ جب دونوں طرف سے صف آرائی ہوتی ہے اور حریف فوجیں آمنے سامنے آتی ہیں تو کسی مسلمان کو اپنا لڑکا دشمن کی صف میں نظر آتا ہے اور کسی کو اپنا باپ۔ اب ایک طرف تو وہ طبعی محبت ہے، جو کیسے گوارا کر لے کہ اپنی تلوار اپنے باپ یا اپنی ہی اولاد کے خون سے رنگ جائے، دوسری طرف حکم رسول ہے کہ دشمن کا کوئی بھی فرد تلوار کی زد سے امان نہ پائے چاہے وہ اپنا باپ یا بیٹا کیوں نہ ہو، تاریخ کی ناقابل تردید صداقت گواہی دیتی ہے کہ ایسے نازک موقع پر اہل ایمان پل بھر کے لئے بھی ذہنی کشمکش میں مبتلا نہیں ہوتے، ان کو یہ فیصلہ کر لینے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہوتی کہ حکم رسول ﷺ کے سامنے نہ باپ کی محبت کوئی معنی رکھتی ہے نہ اولاد کی۔ اور پھر میدان جنگ میں باپ کی تلوار بے دریغ اپنی اولاد کا خون بہاتی نظر آتی ہے اور بیٹا اپنے باپ کو موقع نہیں دیتا کہ بچ کر نکل جائے۔

بہرحال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تکمیل ایمان کا مدار حب رسول پر ہے جس شخص میں ذات رسالت سے اس درجہ کی محبت نہ ہو کہ اس کے مقابلہ پر دنیا کے بڑے سے بڑے رشتے، بڑے سے بڑے تعلق اور بڑی سے بڑی چیز کی محبت و چاہت بھی بے معنی ہو، وہ کامل مسلمان نہیں ہو سکتا، اگرچہ زبان اور قول سے وہ اپنے ایمان و اسلام کا کتنا ہی بڑا دعوی کرے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے جب یہ حدیث سنی تو عرض کیا "یا رسول اللہ! دنیا میں صرف اپنی جان کا علاوہ آپ ﷺ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں" یعنی دنیا کے اور تمام رشتوں اور چیزوں سے زیادہ میں آپ ﷺ کی محبت رکھتا ہوں مگر اپنی جان سے زیادہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم اب بھی کامل مؤمن نہیں ہوئے

اس لئے کہ یہ مرتبہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ میں تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا ہو جاؤں"۔ ان الفاظ نبوت نے جیسے آن واحد میں حضرت عمرؓ کے دل و دماغ کی دنیا اتھل پتھل کر دی ہو، وہ بے اختیار بولے۔ "یارسول اللہ! آپ ﷺ پر میری جان قربان آپ ﷺ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے ہیں، نبی کریم ﷺ نے پھر ان کو بشارت سنائی کہ اے عمرؓ! اب تمہارا ایمان کامل ہوا اور تم پکے مؤمن ہو گئے۔"

اور صرف عمر فاروقؓ ہی نہیں، تمام صحابہؓ اسی کیفیت سے معمور اور حب رسول سے سرشار تھے، ان کی زندگیوں کا مقصد ہی آپ ﷺ کے ایک اشارۂ ابرو پر اپنی جانوں کو نچھاور کر دینا تھا، بلاشبہ دنیا کا کوئی مذہب اپنے راہنما اور پیروؤں کے باہمی تعلق اور محبت کی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس بلاشک صحابہؓ کے لئے شمع کی سی تھی جس پر وہ پروانہ وار نچھاور ہونا ہی اپنی سعادت و خوش بختی تصور کیا کرتے تھے۔ اسلام کے اس دور کی شاندار تاریخ اپنے دامن میں بے شمار ایسے واقعات چھپائے ہوئے ہے جو رسول اکرم ﷺ سے صحابہ کرامؓ اجمعین کی جذباتی وابستگی اور والہانہ محبّت و تعلق کی شاندار غمازی کرتے ہیں۔

غزوۂ احد کا واقعہ ہے۔ میدان جنگ میں جب معرکۂ کارزار گرم ہوا اور حق کی مٹھی بھر جماعت پر باطل کے لشکر جرار نے پوری قہرمانی طاقت سے حملہ کیا تو دیکھا گیا ہے کہ ایک انصاری عورت کے شوہر، باپ اور بھائی تینوں نے جام شہادت پیا اور رسول اکرم ﷺ کی ذات پر دیوانہ وار فدا ہو گئے، یہ دل گداز خبر اس عورت کو بھی پہنچائی گئی مگر اللہ رے ایمان کی پختگی اور رسول اکرم ﷺ کی محبت کا اثر کہ بجائے اس کہ وہ عورت اپنے لواحقین کی شہادت پر نالہ و شیون اور ماتم و فریاد کرتی اس نے سب سے پہلے یہ سوال کیا:

"خدارا مجھے یہ بتاؤ کہ میرے آقا اور سردار رسول اللہ ﷺ (آپ ﷺ پر میری جان قربان) تو بخیر ہیں؟"۔

لوگوں نے کہا۔ ہاں "آپ ﷺ سلامت ہیں" مگر اس سے اسکی تسکین نہ ہوئی اور بے تابانہ کہنے لگی:

"اچھا چلو! میں اپنی آنکھوں سے دیدار کر لوں تو یقین ہو گا" اور جب اس نے اپنی آنکھوں سے چہرۂ انور کی زیارت کر لی تو بولی:

کل مصیبة بعدك جلل۔ —— "جب آپ زندہ سلامت ہیں تو ہر مصیبت آسان ہے۔"

ایک مرتبہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یارسول اللہ! آپ ﷺ مجھے اپنے اہل و عیال اور مال سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ مجھے آپ ﷺ کی یاد آتی ہے تو صبر نہیں آتا جب تک کہ یہاں آکر آپ ﷺ کے روئے انور کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈی نہیں کر لیتا۔ مگر اب تو یہی غم کھائے جاتا ہے کہ وفات کے بعد آپ ﷺ تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوں گے، وہاں میری آنکھیں آپ ﷺ کا دیدار کیسے کر سکیں گی۔ جب ہی یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (النساء ۶۹)

"جو لوگ اللہ و رسول کا کہنا مانتے ہیں وہ (آخرت میں) ان لوگوں ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام ہیں یعنی نبی، صدیق، شہید اور نیک لوگ اور ان لوگوں کی صحبت بڑی غنیمت ہے۔"

آپ ﷺ نے ان صحابی کو یہ بشارت سنادی۔

عبداللہ بن زید بن عبدربہؓ جو صاحب اذان کے لقب سے مشہور تھے اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ اسی حالت میں ان کے صاحبزادہ نے آکر یہ اندوہ ناک خبر سنائی کہ سرور دو عالم ﷺ وصال فرما گئے۔ عشق نبوی سے سرشار اور محبت رسول سے سرمست، یہ صحابی اس جان گداز خبر کی تاب ضبط نہ لا سکے، بے تابانہ ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور زبان سے یہ حسرت ناک الفاظ نکلے: خداوندا اب مجھے

بینائی کی دولت سے محروم کر دے تاکہ یہ آنکھیں جو سرکار دو عالم ﷺ کے دیدار سے مشرف و منور ہوا کرتی تھیں اب کسی دوسرے کو نہ دیکھ سکیں (ترجمہ السنۃ)۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نبی کریم ﷺ سے محبّت و تعلق کا وہی مقام حاصل تھا جو اس حدیث کا منشاء ہے اس لئے ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ ایمان کی سلامتی اور اپنے اسلام میں مضبوطی پیدا کرنا چاہتا ہے تو نبی کریم ﷺ کی محبت و عقیدت سے اپنے دل کو معمور کرے اور آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے ہی کو مدار نجات جانے کہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا معیار اتباع شریعت اور اتباع رسول ہے جو شخص شریعت پر عمل نہیں کرتا اور آپ ﷺ کی تعلیمات پر نہیں چلتا، وہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ نعوذ باللہ اسے حضور ﷺ سے محبت نہیں ہے۔

ایمان کی لذت

(۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهُ اِلَّا لِلّٰهِ وَمَنْ يَكْرَهُ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ اَنْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُلْقٰى فِي النَّارِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انس راوی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس شخص میں یہ تین چیزیں ہوں گی وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حقیقی لذت سے لطف اندوز ہو گا، اول یہ کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کی محبت دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ کسی بندہ سے اس کی محبّت محض اللہ (کی خوشنودی) کے لئے ہو۔ تیسرے یہ کہ جب اسے اللہ نے کفر کے اندھیرے سے نکال کر ایمان و اسلام کی روشنی سے نواز دیا تو اب وہ اسلام سے پھر جانے کو اتنا ہی برا جانے جتنا آگ میں ڈالے جانے کو"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: کمال ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مؤمن کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ رچ بس جائے کہ ان کے ماسوا تمام دنیا اس کے سامنے ہیچ ہو۔

اسی طرح یہ شان بھی مؤمن کامل ہی کی ہو سکتی ہے کہ اگر وہ کسی سے محبت کرتا ہے تو محض اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے اور اگر کسی سے بغض و عداوت رکھتا ہے تو وہ بھی اللہ کی راہ میں غرض کہ اس کا جو بھی عمل ہو صرف اللہ کے لئے ہو اور اس کے حکم کی تکمیل میں ہو۔

ایسے ہی ایمان کا پختگی کے ساتھ دل میں بیٹھ جانا اور اسلام پر پختگی کے ساتھ قائم رہنا اور کفر و شرک سے اس درجہ بیزاری و نفرت رکھنا کہ اس کے تصور و خیال کی گندگی سے بھی دل پاک و صاف رہے، ایمان کے کامل ہونے کی دلیل ہے۔

اسی لئے اس حدیث میں فرمایا گیا کہ ایمان کی حقیقی دولت کا مالک اور اس پر جزاء و انعام کا مستحق تو وہی شخص ہے جو ان تینوں اوصاف سے پوری طرح متصف ہو اور ایمان کی حقیقی لذت کا ذائقہ وہی چکھ سکتا ہے جس کا دل ان چیزوں کی روشنی سے منور ہو۔

ایمان کا لطف

(۷) وَعَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَّضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عباس[1] بن عبدالمطلب کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو اپنے پروردگار، اسلام کو اپنا دین اور

[1] آپ حضرت عبدالمطلب کے صاحبزادے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا تھے۔ بارہ رجب ۳۲ھ جمعہ کے دن آپ کا انتقال ہوا۔

محمد (ﷺ) کو اپنا رسول خوشی سے مان لیا تو (سمجھو کہ) اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔" (مسلم)

تشریح: اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی ذات و صفات پر ایمان محمد عربی ﷺ کی رسالت و نبوت میں یقین و اعتقاد، دین و شریعت کی حقانیت و صداقت پر کامل اعتماد اور اسلامی تعلیمات و احکام کی پیروی، اس کیفیت کے ساتھ ہونی چاہیے کہ دل و دماغ کے کسی گوشہ میں کوئی دباؤ، کوئی گھٹن، کوئی تکدر اور کوئی ناگواری ذرہ برابر محسوس نہ ہوتی ہو۔ رضا و رغبت، اطمینان خاطر اور دماغی و ذہنی سکون کی وہ لہر پورے داخلی و خارجی وجود میں سرایت کئے ہوئے ہو، جو کسی انمول چیز کے حاصل ہو جانے پر دل و دماغ اور جسم کے پورے وجود کو مسرت و شادمانی اور احساس سرفرازی سے سرشار کر دیتی ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے اس کو ہر حالت میں مدنظر رکھنا چاہئے۔ اس ایمان و یقین اور عمل آوری میں اگر کسی طرح کا کوئی انقباض اور تکدر پیدا ہوا تو سمجھو کہ ایمان کی روح رخصت ہوئی، ایسے شخص پر اگرچہ ظاہری طور سے ایمان و اسلام کے احکام نافذ ہوں گے مگر "اخلاص" سے خالی ہونے کے سبب نہ اس کا ایمان کامل سمجھا جائے گا اور نہ اس کو "حسن اسلام" نصیب ہوگا اور نہ ایمان و یقین کی حقیقی لذت سے وہ لطف اندوز ہو سکے گا۔

اسلام ہی مدار نجات ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ یَهُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس اُمت میں سے جو شخص بھی خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی، میری نبوت کی خبر پائے اور میری لائی ہوئی شریعت پر ایمان لائے بغیر مر جائے، وہ دوزخی ہے۔" (مسلم)

تشریح: اسلام ایک آفاقی مذہب ہے جس کے دائرہ اطاعت میں آنا تمام کائنات کے لئے ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجا ہوا ایک ایسا بین الاقوامی قانون ہے جس کی پیروی دنیا کے ہر شخص پر لازم ہے، اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت اور آپ ﷺ کی نبوت بھی چونکہ عالمگیر اور بین الاقوامی ہے۔ ہر دور کے لئے، ہر قوم کے لئے اور ہر طبقہ کے لئے، اس میں کسی کا استثناء نہیں ہے اس لئے آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت پر عمل کرنا سب پر یکساں فرض ہے، خواہ کوئی کسی قوم کسی ملک اور کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو۔

اس حدیث میں یہودی اور نصرانی یعنی عیسائی کا ذکر اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں خود اپنا ایک دین اور ایک شریعت رکھتی تھیں ان کی اپنی اپنی آسمانی کتابیں تھیں جن کو مدار عمل و نجات ماننے کا ان کو خدائی حکم تھا، اس لئے ان کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ قومیں جو خود اپنے پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت اور اللہ کی جانب سے بھیجی ہوئی کتابوں کی تابع ہیں اور جن کا دین بھی آسمانی دین ہے، جو اللہ تعالیٰ ہی کا اتارا ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کے آخری دین اسلام کے نفاذ اور خاتم النبیین ﷺ کی ہمہ گیر بعثت کے بعد جب ان قوموں کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں اور شریعت اسلام کے دائرہ میں آئے بغیر ان کی نجات ممکن نہیں تو پھر وہ قومیں پیغمبر اسلام اور شریعت اسلام پر ایمان و عمل کے بغیر ابدی نجات کیسے پا سکتی ہیں جو کسی آسمانی دین کی پابند بھی نہیں ہیں جن کے پاس کسی پیغمبر کی لائی ہوئی کوئی کتاب بھی نہیں ہے اور جو اللہ کے بھیجے ہوئے کسی نبی و رسول کی پیرو بھی نہیں ہیں۔

ایک بات اور بھی ہے۔ یہودی اور عیسائی کہا کرتے تھے کہ اللہ برگزیدہ پیغمبر موسیٰ اور عیسیٰ کے پیروکار اور اللہ کی اتاری ہوئی کتاب شریعت تورات و انجیل کے متبع ہونے کی وجہ سے ہم تو خود "نجات یافتہ" ہیں۔ جنت تو ہمارا پیدائشی حق ہے، ہمیں کیا ضرورت ہے کہ محمد ﷺ کو اپنا رسول مانیں اور اسلام کو اپنا دین، اس حدیث کے ذریعہ ان کے اس غلط عقیدہ و خیال کی بھی تردید کی گئی ہے اور ان پر

واضح کر دیا گیا کہ پیغمبر اسلام کی بعثت کے بعد تو نجات ان ہی لوگوں کی ہوگی جو دین اسلام کو مانیں گے اور اس پر عمل کریں گے کیونکہ محمد عربی ﷺ کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ سابقہ شریعتیں منسوخ ہو جائیں، تمام مذاہب کالعدم ہو جائیں اور تمام کائنات کو صرف ایک مذہب "دین اسلام" کے دائرہ میں لایا جائے جو اللہ کا سب سے آخری اور سب سے جامع و مکمل دین ہے۔

دوہرا اجر پانے والے

⑨ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَۃٌ لَھُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اٰمَنَ بِنَبِیِّہٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْکُ اِذَا اَدّٰی حَقَّ اللّٰہِ وَحَقَّ مَوَالِیْہِ وَرَجُلٌ کَانَتْ عِنْدَہٗ اَمَۃٌ یَطَاُھَا فَاَدَّبَھَا فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبَھَا وَعَلَّمَھَا فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَھَا ثُمَّ اَعْتَقَھَا فَتَزَوَّجَھَا فَلَہٗ اَجْرَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰ[1] اشعریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جن کو دو دو اجر ملیں گے۔ اس اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) کو جو (پہلے) اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا پھر محمد (ﷺ) پر ایمان لایا۔ اس غلام کو جو اللہ کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے آقاؤں کے حق کو بھی ادا کرتا رہے۔ اس شخص کو جسکی کوئی باندی تھی اور وہ اس سے صحبت کرتا تھا۔ پہلے اس کو اچھا ہنر مند بنایا پھر اس کو خوب اچھی طرح تعلیم دی اور پھر اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا تو یہ بھی دوہرے اجر کا حقدار ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مقصد ان تین طرح کے لوگوں کو بشارت دینا ہے جن کو اوروں کے مقابلہ پر نیک عمل کا دوہرا اجر ملتا ہے۔ ان میں پہلی قسم کے لوگ وہ اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) ہیں جو پہلے تو اپنے دین میں تھے اور پھر دعوت اسلام پا کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے ان کو دوہرے اجر کی بشارت اس بنا پر دی گئی ہے کہ ان کا پہلے اپنے نبی کو پختہ دل سے ماننا، اس نبی کی لائی ہوئی کتاب و شریعت پر عمل کرنا اور اس نبی سے اعتقادی وابستگی و تعلق رکھنا اور پھر خاتم النبیین ﷺ کی رسالت و نبوت اور اللہ کے آخری دین اسلام کی دعوت پا کر صدق دل سے اس کا حلقہ بگوش ہو جانا، نہ صرف یہ کہ ان کے کمال انقیاد و اطاعت اور ان کی فکری و ذہنی سلامت روی کی علامت ہے بلکہ اس معنی میں ان کے قلبی و عملی ایثار کا غماز بھی ہے کہ اپنے سابقہ نبی اور سابقہ دین سے عقیدت و تعلق اور زبردست جذباتی لگاؤ کے باوجود انہوں نے دعوت اسلام پا کر اور اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنی زندگی کا دھارا کدم موڑ دیا اور اب اپنے اعتقاد کی باگ ڈور دین اسلام کے سپرد کر دی، جب تک ان کے سامنے اسلام کی دعوت نہیں آئی تھی وہ اپنے دین ہی کو اللہ کا دین سمجھ کر اس کے حلقہ بگوش رہے اور جب اسلام کی دعوت ان کے سامنے آئی تو انہوں نے اس کو اللہ کا آخری دین جان کر اپنے پچھلے دین کو چھوڑنے میں کسی ضد، ہٹ دھرمی اور تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ فطرت سلیم کی آوز پر لبیک کہہ کر محمد ﷺ عربی کے غلاموں میں شامل ہو گئے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعام کے طور پر ان کو ہر نیک عمل پر دوہرے اجر کا مستحق قرار دیا، ایک اجر تو اپنے پہلے نبی پر ایمان رکھنے کے سبب اور دوسرا اجر پیغمبر آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں یہ خصوصیت اور امتیاز صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنے تصورات و اعتقادات اور اپنی تعلیمات کی بنیاد "انکار" پر نہیں "اقرار" پر رکھتا ہے یعنی وہ آسمانی دینوں میں کسی رقابت یا رسولوں میں کسی تفریق کی خلیج حائل نہیں کرتا وہ تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق پر زور دیتا ہے اور اللہ کی جانب سے بھیجے گئے تمام رسولوں کی رسالت پر ایمان لانے کی تاکید کرتا ہے، اسلام کے برخلاف دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے اعتقادات و نظریات کو دیکھا جائے تو یہ بات جاننے میں دیر نہیں لگتی کہ ان کے یہاں کوئی شخص اسوقت تک مذہب کا سچا پیرو اور حقیقی تابعدار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس کے ماسوا دوسرے مذاہب کے اعتقاد و تصورات کی بنیادوں کو بالکل ہی مسمار نہ کر دے اور دوسرے رسولوں و پیغمبروں کی رسالت کا سرے سے انکار نہ

---

[1] آپ جلیل القدر صحابی ہیں، پہلی ہجرت حبشہ میں شریک تھے۔ ذی الحجہ ۴۴ھ میں مکہ میں انتقال ہوا۔

کر دے، اسلام تو ایمان و اعتقاد کے پہلے ہی مرحلہ میں اپنے پیروؤں سے اس بات کا اقرار کراتا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی رسول ﷺ، اللہ کی جانب سے مخلوق کی ہدایت کے لئے آئے ان میں کسی قسم کی تفرق نہ کی جائے گی، ان کی لائی ہوئی شریعتوں کو اپنے اپنے زمانہ کے لئے حق اور واجب التسلیم مانا جائے گا، وہ اپنے متبعین کو احساس صداقت کا یہ شعور بخشتا ہے کہ آسمانی مذاہب میں کوئی پارٹی بندی نہیں ہے سب ایک ہی صداقت کی کڑیاں ہیں نیز وہ اپنے ماننے والوں کو واضح طور پر آگاہ کر دیتا ہے کہ ایمان کی تکمیل جب ہی ہو گی کہ دوسرے آسمانی مذاہب کی تصدیق بھی کی جائے اور سابقہ تمام انبیاء کی صداقت کو مانا جائے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اگر کوئی یہودی یا عیسائی ایمان لائے اور رسول اکرم ﷺ کی رسالت کا صدق دل سے اقرار کرے۔ تو اپنے نبی پر لایا ہوا اس کا پہلا ایمان رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ وہ اس پر اجر و ثواب کا مستحق قرار دیا جائے گا لیکن وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کی اگر تصدیق نہیں کرتا اور آپ کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان نہیں لاتا تو نہ صرف یہ کہ وہ کفر و انکار کی بنا پر دائمی عذاب کا مستوجب گردانا جائے گا بلکہ اس کا اپنے نبی پر لایا ہوا ایمان بھی رائیگاں اور بیکار سمجھا جائے گا اور اس پر کسی قسم کے اجر و ثواب کا استحقاق پیدا نہیں ہو گا کیونکہ جس طرح تمام انبیاء پر ایمان لانا اور ان کی رسالت کی تصدیق کرنا لازم ہے اسی طرح عمل اور پیروی پیغمبر اسلام ﷺ کی شریعت پر ضروری ہے اور مدار نجات صرف اسلام کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔

دوسرے شخص کے لئے دوہرے اجر کی بشارت کا سبب بھی واضح ہے یعنی یہ کہ ایک غلام کے لئے نہ صرف سماجی روایتی اور دنیاوی حیثیت سے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مالک و آقا کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اور اس کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرے بلکہ اسلامی تعلیم کا تقاضا بھی یہ ہے کہ وہ مالک و آقا کے عائد شدہ حقوق کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی یا سستی نہ کرے، لہٰذا ایک غلام جب اپنے آقا کے حقوق کی پوری نگہداشت کرتا ہے اور حقوق کی ادائیگی کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے حقیقی مالک اور پروردگار اللہ رب العالمین کے احکام کی بجا آوری بھی پورے حقوق کے ساتھ کرتا ہے اور اس کے عائد کئے ہوئے تمام فرائض کی تکمیل میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا تو وہ دوہرے اجر کا استحقاق پیدا کر لیتا ہے۔

اب رہ گیا تیسرا شخص تو اس کو بھی دوہرے اجر کا مستحق اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ اول تو اس نے ایک باندی کو آزاد کیا جو نہ صرف یہ کہ انسانیت اور فطرت کے اعتبار کے تقاضا کو پورا کرنا ہے بلکہ اسلامی اخلاق کے اعلیٰ اصول و قواعد پر عمل کرنا بھی ہے، دوسرے یہ کہ اس باندی کو آزاد کر کے اور پھر اس سے شادی کر کے اس نے انسانی ہمدردی، اسلامی مساوات، اور بلند اخلاق کا اس طرح اعلیٰ ثبوت دیا کہ ایسی عورت کو جو سماجی حیثیت سے ایک کمتر، بے وقعت اور ذلیل بن کر رہ گئی تھی، اچھی تربیت، اعلیٰ تعلیم اور پھر آزادی و شادی کی گرانقدر دولت سے نواز کر دنیا کی باعزت اور سوسائٹی و معاشرہ کی شریف و معزز عورتوں کے برابر بھی لا کھڑا کیا، اس طرح اس نے اگر ایک طرف انسانیت اور اخلاق کے تقاضے کو پورا کیا، تو دوسری طرف اسلامی تعلیم کی روح کو بھی اجاگر کیا پس اس کے اس ایثار کی بناء پر شریعت نے اس کو بھی دوہرے اجر کا استحقاق عطا کیا۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے دوہرے اجر کے بارے میں لکھا ہے کہ ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں جزاء اور ثواب کی یہ دوگنی اضافت اس طرح ہو گی کہ ان کو ہر عمل پر دوسروں کے مقابلہ میں دوہرا ثواب ملے گا، مثلاً اگر کوئی دوسرا شخص نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے یا کوئی اور نیک کام کرتا ہے تو اس کو عمومی بشارت کے تحت دس ثواب ملیں گے لیکن یہی عمل تینوں کریں گے تو ان کو ہر ایک عمل پر بیس بیس ثواب ملیں گے۔

کفار سے جنگ کا حکم

(۱۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّىْ دِمَآءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ

الاسلام وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ اِلاَّ اَنَّ مُسْلِمًا لَمْ یَذْکُرْ اِلاَّ بِحَقِّ الْاِسْلاَمِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا ہے کہ میں (دین دشمن) لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ اس بات کی گواہی نہ دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے (بھیجے ہوئے) رسول ہیں نیز نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور پھر جب وہ ایسا کرنے لگیں تو انہوں نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچا لیا، ہاں جو باز پرس اسلامی ضابطہ کے تحت ہوگی وہ اب بھی باقی رہے گی اس کے بعد ان کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے (وہ جانے کہ ان کا اسلام صدق دل سے تھا یا محض اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے دکھلاوے کا تھا) (بخاری و مسلم) مسلم کی روایت میں "الا بحق الاسلام" کے الفاظ نہیں ہیں۔"

تشریح: یہ دنیا اللہ کی حقیقی ملکیت ہے وہی اس زمین کا شہنشاہ اور تمام کائنات کا حاکم مطلق ہے اس کی زمین پر رہنے کا حق اسی کو حاصل ہے جو اس کی حاکمیت کو تسلیم کرکے اس کے قوانین کی پیروی کرتا ہے اس کے احکام کی تابعداری کرتا ہے، اس کے اتارے ہوئے نظام و شریعت کے تحت زندگی گزارتا ہے اور اس کے بھیجے ہوئے رسول اور پیغمبر کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے۔ اس دنیا میں پیغمبروں کی بعثت کا اصل مقصد روئے زمین پر حقیقی شہنشاہ اور حاکم مطلق (اللہ تعالیٰ) کی حاکمیت کا نفاذ کرنا ہوتا ہے، پیغمبر کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ دین و شریعت کی صورت میں حاکمیت الہ کا جو مشن لے کر آیا ہے اس کو ہر ممکن جدوجہد کے ذریعہ پھیلائے لوگوں کو اپنے دین دائرہ میں لانے کی پوری پوری سعی کرے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ اس کی اس جدوجہد اور سعی کے نتیجہ میں جو معاشرہ بن گیا ہے اس پر دنیا کے کسی غیر دینی روایت و قانون اور کسی شخصی و گروہی بالادستی کی حکمرانی قائم نہ ہونے پائے بلکہ صرف خدائی حکمرانی یعنی دین و شریعت کی حکومت قائم ہو اور پھر کسی کو اس بات کی اجازت نہ ہو کہ وہ دین و شریعت کا دشمن و معاند بن کر اس معاشرہ (اسلامی ریاست) میں رہ سکے جو لوگ تمرد و سرکشی اختیار کریں اور خدائی حکمرانوں کے تحت آنے سے منکر ہوں ان کے خلاف وہی کاروائی کی جائے جو کسی بھی معاشرہ میں آئین و حکومت کے باغیوں کے خلاف ہوتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں خدائی حکمرانی باغیوں اور دین و شریعت کے دشمنوں کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھوں جب تک وہ اپنی سرکشی اور دشمنی کو ترک کرکے ہمارے معاشرہ یعنی (اسلامی ریاست) میں رہنے کے حقوق حاصل نہ کرلیں اور انہیں یہ حقوق ملنے کی ایک تو یہی صورت ہے کہ وہ کفر و عناد کے بجائے ایمان و اسلام اختیار کرلیں یعنی صدق دل سے اس بات کا اقرار اور زبان سے اظہار کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، پھر اپنے عمل سے ثابت کریں کہ ان کا یہ اقرار اور زبان سے اظہار مخلصانہ ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول کے تمام احکام کی پیروی کریں، خصوصاً پابندی سے نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں، اور دوسرے فرائض پر عمل کریں۔ دوسری صورت (جس کا ذکر اس حدیث میں تو نہیں ہے لیکن دوسرے مواقع پر ثابت ہے) یہ ہے کہ اگر وہ لوگ ایمان و اسلام کے دائرہ میں نہیں آنا چاہتے مگر اسلامی ریاست میں اپنی وطنیت اور بود و باش کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دینی و مذہبی طور پر نہ سہی مگر سماجی و معاشرتی طور پر اسلامی ریاست کے تابعدار اور امن پسند باشندہ رہنے کا اقرار کریں جس کی علامت اس ٹیکس کی پابندی سے ادائیگی ہے جس کو اصطلاح میں "جزیہ" کہا جاتا ہے اس ٹیکس کی ادائیگی اسلامی ریاست میں کسی غیر مسلم کے تمام انسانی، سماجی اور شہری حقوق کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اگر کوئی شخص جزیہ نہ دینا چاہے تو اس کا متبادل یہ ہے کہ وہ اپنی محکومیت و مغلوبیت کا اقرار کرکے کسی خاص معاہدہ کے تحت سربراہ ریاست (رسول) سے صلح کرلے اور پناہ لے کر اسلامی ریاست میں رہے، اسلامی قانون اپنے مخصوص رحم و کرم کی بناء پر اس کے جان و مال اور عزّت کے تحفظ کی ذمہ داری لے لے گا۔

بہر حال حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص ایمان و اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائے یا جزیہ ادا کرکے اور پناہ لے کر اسلامی ریاست کا باشندہ ہو اس کے جان و مال اور عزّت کے تحفظ کی ذمہ داری ریاست کے اوپر ہوگی۔ اور ریاست اپنے اسلامی قانون کے تحت

اس کے تمام انسانی، سماجی اور شہری حقوق کی نگہداشت کرے گی لیکن جہاں تک قانونی جرائم، سماجی بے اعتدالیوں اور بشری خطاؤں کا تعلق ہے ان پر ہر حال میں مواخذہ ہو گا خواہ ان کا مرتکب کوئی مسلمان ہو یا ذمی کافر، اس معاملہ میں کسی کے ساتھ رعایت و چشم پوشی نہیں ہوگی، مثلاً اگر کوئی مسلمان یا ذمی کسی کو ناحق قتل کر دیتا ہے تو اس کو قصاص (سزا) میں قتل کر دیا جائے گا یا ایسے ہی کوئی زنا کرے گا تو اس پر حد جاری کی جائے گی اور اس کو پوری سزا دی جائے گی یا کسی نے کسی کا مال زبردستی ہڑپ کر لیا تو اس سے اس کا مال مالک کو واپس دلایا جائے گا، گویا قانون کی عملداری ہر حال میں قائم کی جائے گی جو شخص بھی خلاف ورزی کرے گا اس کو ضرور سزا دی جائے گی اسلامی حقوق اور قوانین کے نفاذ کے معاملہ میں کسی تخصیص اور رعایت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔

حدیث کے آخر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ شریعت اپنے قانون کے نفاذ میں ظاہری حیثیت پر حکم لگاتی ہے، اور باطنی حالت کو اللہ کے سپرد کر دیتی ہے یعنی اگر کوئی شخص جان و مال کی حفاظت یا کسی غرض کے تحت بظاہر مسلمان بن جاتا ہے اور دل میں کفر و نفاق ہے تو اسلامی قانون اس کو مسلمان ہی تسلیم کرے گا، دل کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا، اگر واقعی اس کے دل میں کھوٹ ہو گا تو آخرت میں اس کو نفاق کی سزا یقیناً ملے گی، وہاں مواخذۂ خداوندی سے نہ بچ سکے گا۔

یہ حدیث اس مسئلہ کی بھی دلیل ہے کہ ملحدوں اور زندیقوں کی توبہ قبول کی جا سکتی ہے یعنی اگر کوئی ملحد و زندیق آکر یہ کہے کہ میں الحاد و زندقہ سے توبہ کرتا ہوں تو اس کی توبہ قبول کر کے اس کی جان لینے سے اجتناب کیا جائے گا۔

ویسے اس مسئلہ میں متعدد اقوال ہیں، ان میں سے ظاہر تر قول یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے الحاد کا اظہار کیا اور اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالے جن سے اس کا منکر خدا اور منکر دین ہونا معلوم ہوتا ہو پھر جلد ہی اس نے الحاد و زندیقی سے برأت کی اور برضا و رغبت توبہ کر لی تو اس کی توبہ قبول ہوگی اور اگر اس کی توبہ محض جان بچانے کے لئے اور اسلامی قانون کی سزا سے بچنے کے لئے ہو تو پھر اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

مسلمان کون ہے؟

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰهَ فِيْ ذِمَّتِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارے ذبیحوں کو کھائے وہ مسلمان ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول کے عہد و امان میں ہے۔ پس جو شخص اللہ کے عہدہ و امان میں ہے تم اس کے ساتھ عہد شکنی مت کرو۔" (بخاری)

تشریح: اصل ایمان اگرچہ "تصدیق قلبی" کا نام ہے لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت اور قلبی صفت ہے جس کا تعلق باطن سے ہے، اسی طرح "اقرار" اگرچہ زبان سے متعلق ہے مگر وہ بھی ایک قیمتی چیز ہے لہٰذا دونوں میں کھلا ہوا امتیاز ان کے علیحدہ علیحدہ شعار ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اسلامی معاشرہ میں نماز پڑھنا اور بیت اللہ کی طرف منہ کر کے عبادت کرنا اہل کتاب کے مقابلہ پر سب سے زیادہ امتیازی عمل ہے، اسی طرح معاشرتی لحاظ سے جس عمل اور طریقہ میں اہل کتاب مسلمانوں سے کھلا ہوا احتراز کرتے تھے وہ ان کا ذبیحہ تھا کہ مسلمانوں کا ذبحہ کیا ہوا گوشت اہل کتاب نہیں کھاتے تھے لہٰذا اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اگر عبادات میں وہ ہماری طرح قبلہ کی طرف رخ کرنے لگیں اور معاشرتی لحاظ سے وہ ہم سے اتنا قریب آ جائیں کہ ہمارے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے لگیں تو یہ اس بات کی کھلی ہوئی شہادت ہوگی کہ وہ ہمارا دین پورے یقین کے ساتھ قبول کر چکے ہیں اور ایمان ان کے قلب کی گہرائیوں تک پہنچ گیا ہے جس کا اظہار نہ صرف یہ کہ زبان سے بلکہ ان کے عمل سے بھی ہو رہا ہے تو اب مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دائرہ اسلام میں پوری طرح داخل ہو گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور

اللہ کے رسول کے ساتھ ان کا عہد و اقرار ہو گیا ہے ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا ذمہ اللہ اور اللہ کے رسول نے لے لیا ہے اس لئے مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی بد معاملگی یا برا سلوک نہ کریں، نہ ان کو ستائیں نہ تکلیف دیں اور نہ ان کے ساتھ ایسا طور طریقہ رکھیں جس سے ان میں کسی قسم کا خوف و ہراس یا دل شکستگی پیدا ہو، ان کے ساتھ کسی بھی طرح کی بد معاملگی اور بد سلوکی درحقیقت اللہ کے عہد کو توڑنے اور اس عہد شکنی کا الزام اللہ پر عائد کرنے کے مترادف ہوگی۔

جنّت لے جانے والے اعمال

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اَتٰی اَعْرَابِیٌّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُهٗ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَقَالَ تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَیْئًا وَتُقِیْمُ الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ وَتُؤَدِّی الزَّكٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا اَزِیْدُ عَلٰی هٰذَا شَیْئًا وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُ فَلَمَّا وَلّٰی قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی هٰذَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک دیہاتی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے کہ جس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز پڑھو فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو" یہ سن کر دیہاتی نے کہا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نہ تو اس پر کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں سے کچھ کم کروں گا، جب وہ دیہاتی چلا گیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی جنّتی آدمی کو دیکھنے کی سعادت اور مسرت حاصل کرنا چاہے وہ اس شخص کو دیکھ لے"۔ (بخاری)

تشریح: یہاں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس دیہاتی کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ فرمایا مگر شہادتین کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ بغیر شہادتین کے جنت میں داخل ہونا ناممکن ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو وہ دیہاتی یقیناً مسلمان ہو گا جو ایمان لانے کے بعد جنت میں داخل کرنے والے عمل کے بارے میں سوال کر رہا تھا دوسرے یہ کہ سب ہی جانتے ہیں کہ بغیر شہادتین کے تمام اعمال بیکار ہیں اور اس کے بغیر جنت میں دخول ہی ممکن نہیں اس لئے شہادتین کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

یہاں صرف تین فرائض ذکر کئے گئے ہیں، بقیہ فرائض کا ذکر نہیں کیا گیا؟ تو ہو سکتا ہے کہ جس وقت اس دیہاتی نے سوال کیا تھا اس وقت تک یہی تین چیزیں فرض ہوئی ہوں گی اور بقیہ فرائض بعد میں مشروع ہوئے ہوں گے، زیادتی اور کمی نہ کرنے کا عہد درحقیقت اس دیہاتی کے اعتقاد کی پختگی اور قلبی تصدیق کے مضبوط ہونے کی دلیل تھا گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے دل میں ایمان و اسلام کی لذت اور اس کی حقانیت و صداقت کی کیفیت اور آپ ﷺ کے احکام و فرمان کی بجا آوری کا داعیہ اس مضبوطی اور پختگی کے ساتھ ہے کہ نہ تو اس سوال پر کسی قسم کی زیادتی کی حاجت ہے اور نہ جواب کی مانعیت و جامعیت اور اس کی اہمیت کسی قسم کی کمی کی روادار ہے! چنانچہ اس دیہاتی کے یقین کی اسی کیفیت اور اس کی اسی شیفتگی و گرویدگی اور احکام و شریعت کے تئیں اس کے اسی جذبۂ اطاعت کو دیکھ کر لسان نبوت نے اس مخلص انسان کے جنّتی ہونے کی بشارت سنائی اور اعلان فرمایا کہ اگر کسی شخص کو تمنا ہو کہ جنّتی آدمی کو دیکھے اور کسی جنّتی کو دیکھنے کی مسرت اور سعادت حاصل کرنا چاہے تو اس شخص کو دیکھ لے۔

ایمان کامل

(۱۳) وَعَنْ سُفْیَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِیِّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْ لِیْ فِی الْاِسْلَامِ قَوْلًا لَا اَسْئَلُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ وَفِیْ رِوَایَةٍ غَیْرَكَ قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سفیان[1] بن عبداللہ الثقفیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا یارسول اللہ! مجھ کو اسلام کی کوئی ایسی بات بتا دیجئے کہ آپ کے بعد پھر مجھ کو کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے اور ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ "آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے سے پوچھنے کی حاجت نہ رہے" آپ ﷺ نے فرمایا "زبان و دل سے اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس اعتراف و اقرار پر قائم رہو۔" (مسلم)

تشریح: یعنی سب سے پہلے مرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی الوہیت کی گواہی دو اور اس کی ذات اور تمام صفات پر صدق دل سے اعتراف و اعتقاد کے ساتھ ایمان لاؤ، یہ ایمان باللہ کی اعتقادی صورت ہے اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ جو شریعت اتاری ہے اس کی صداقت و حقانیت میں کامل یقین رکھو اور اس کو قبول کرکے احکام رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کرو، اللہ اور اللہ کا رسول جس چیز کے کرنے کا حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ پھر یہ کہ اعتقاد و اطاعت کوئی وقتی و عارضی چیز نہ ہو بلکہ ان پر پختگی کے ساتھ قائم و دائم رہو اور زندگی کے کسی بھی لمحہ میں ان سے انحراف نہ کرو۔

فرائض اسلام

(۱۴) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرَ الرَّاْسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهٖ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُوْلُ حَتّٰى دَنَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا هُوَ يَسْاَلُ عَنِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهٗ قَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكٰوةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَاَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ لَا اَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت طلحہ[2] بن عبید اللہ فرماتے ہیں اہل نجد میں سے ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا جس کے سر کے بال پریشان تھے، ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ تو سن رہے تھے لیکن (فاصلہ پر ہونے کی وجہ سے) یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آپ ﷺ سے کیا کہہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بالکل قریب پہنچ گیا تو ہم نے سنا کہ وہ اسلام کے (فرائض) کے بارہ میں سوالات کر رہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے (اس کے جواب میں) فرمایا "رات دن کی پانچ نمازیں (فرض) ہیں"۔ (یہ سن کر) اس شخص نے کہا "کیا ان نمازوں کے سوا مجھ پر کچھ اور نمازیں بھی فرض ہیں" آپ نے فرمایا نہیں! "مگر نفل نمازیں تمہیں پڑھنے کا اختیار ہے" پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اور ماہ رمضان کے روزے (فرض) ہیں"۔ اس شخص نے کہا "کیا ان روزوں کے سوا کچھ اور روزے مجھ پر فرض ہیں" آپ نے فرمایا "نہیں! مگر نفل روزے کا تمہیں اختیار ہے" راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد زکوٰۃ کا ذکر فرمایا، اس نے عرض کیا، "اس کے علاوہ بھی مجھ پر کوئی صدقہ فرض ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! مگر نفل صدقہ کا تمہیں اختیار ہے" اس کے بعد وہ شخص یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ خدا کی قسم! میں نہ تو اس پر کچھ زیادتی کروں گا اور نہ اس میں سے کچھ کمی کروں گا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "اگر اس شخص نے سچ کہا ہے تو نجات پا گیا ہے اور کامیاب ہو گیا"۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: جیسا کہ پہلے ایک حدیث کی تشریح میں گزرا، یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ جس وقت اس شخص نے سوال کیا تھا اس وقت تک اتنے ہی فرائض مشروع ہوئے ہوں گے اسی طرح نماز وتر و عیدین وغیرہ بھی واجب نہ ہوئی ہوں گی اسی واسطے اس شخص نے اس میں

---

[1] آپ کی کنیت ابو عمر ہے۔
[2] آپ کی کنیت ابو محمد قریشی تیمی اور لقب طلحۃ الخیر ہے۔ ۶۴ سال کی عمر میں ۳۶ھ میں وفات پائی۔

زیادتی اور کمی نہ کرنے کا وعدہ کیا یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ شخص کسی قوم کا نمائندہ اور ایلچی بن کر اسلام کی حقیقت اور فرائض جاننے آیا تھا تاکہ واپس جاکر اپنی قوم کو بھی اسلامی تعلیمات اور فرائض سے آگاہ کرے اسی لئے اس نے واپسی کے وقت کہا کہ نہ تو میں اس میں زیادتی کروں گا اور نہ کمی کروں گا، یعنی آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے یا جو احکام و فرمان دیے ہیں وہ اسی طرح اپنی قوم تک پہنچادوں گا، ان میں نہ تو اپنی طرف سے کوئی زیادتی کروں گا اور نہ کوئی کمی۔

اسلام میں مبلغ کا مقام

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا اَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ الْقَوْمُ اَوْ مَنِ الْوَفْدُ قَالُوْا رَبِيْعَةُ قَالَ مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ اَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامٰى قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا لَا نَسْتَطِيْعُ اَنْ نَّاْتِيَكَ اِلَّا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ فَمُرْنَا بِاَمْرٍ فَصْلٍ نُخْبِرْ بِهٖ مَنْ وَّرَآءَنَا وَنَدْخُلْ بِهِ الْجَنَّةَ وَسَاَلُوْهُ عَنِ الْاَشْرِبَةِ فَاَمَرَهُمْ بِاَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ اَمَرَهُمْ بِالْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَ صِيَامُ رَمَضَانَ وَاَنْ تُعْطُوْا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ عَنِ الْحَنْتَمِ وَالدُّبَّآءِ وَالنَّقِيْرِ وَالْمُزَفَّتِ وَقَالَ احْفَظُوْهُنَّ وَاَخْبِرُوْا بِهِنَّ مَنْ وَّرَآءَكُمْ۔ (متفق علیہ ولفظہ للبخاری)

"اور حضرت ابن عباس[1] بیان کرتے ہیں کہ جب وفد عبدالقیس نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں مدینہ پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں یا یوں پوچھا کہ یہ کس قبیلہ کا وفد ہے؟ (راوی کو شک ہوا کہ آپ ﷺ نے یہاں، قوم کا لفظ فرمایا یا وفد کا) لوگوں نے جواب دیا کہ "قبیلہ ربیعہ کے افراد ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا خوش آمدید اور (چونکہ تم لوگ خوشی سے مسلمان ہو کر آئے اس لئے) نہ دنیا میں تمہارے لئے رسوائی ہے اور نہ آخرت کی شرمندگی، اہل وفد نے عرض کیا: یا رسول اللہ! چونکہ ہمارے اور آپ ﷺ کے درمیان "کفار مضر" کا (مشہور جنگ جو) قبیلہ پڑتا ہے اس لئے ہم آپ کی خدمت میں جلد جلد حاضر نہیں ہوسکتے صرف ان مہینوں میں آسکتے ہیں جن میں لڑنا حرام ہے لہٰذا آپ ﷺ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے ایسے احکام ہمیں عطا فرمادیجئے جن پر ہم خود بھی عمل کریں اور ان لوگوں کو (بھی) ہم اس سے آگاہ کردیں جن کو اپنے پیچھے (وطن و قوم میں) چھوڑ آئے ہیں اور اس پر عمل کرنے سے ہم جنت میں داخل ہو جائیں (اور اسی کے ساتھ) انہوں نے (ان) برتنوں کی بابت بھی پوچھا (جن میں نبیذ بنائی جاتی تھی کہ کون سے استعمال میں لائے جاسکتے ہیں، اور کون سے نہیں) آپ ﷺ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے منع کیا اول اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا حکم دیا اور فرمایا جانتے ہو اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کے مطلب کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: (اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانا) اس حقیقت کی شہادت دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، پابندی سے نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا (ان چار باتوں کے علاوہ بعد میں آپ ﷺ نے) مال غنیمت میں سے پانچویں حصے کے دینے کا حکم بھی فرمایا۔ اور ان چار برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا: لاکھ کئے ہوئے برتنوں سے، کدو کے تونبوں سے درخت کی کھوکھلی جڑوں سے بنائے ہوئے برتنوں سے، رال کئے ہوئے برتنوں سے، اور فرمایا: ان باتوں کو اچھی طرح یاد کرلو اور جن مسلمانوں کو اپنے پیچھے (وطن میں) چھوڑ آئے ہو ان کو بھی ان باتوں سے آگاہ کردو۔" (بخاری و مسلم، الفاظ بخاری کے ہیں)

تشریح: اسلام کی آواز جب مکہ اور مدینہ کی چہار دیواریوں سے نکل کر دوسرے علاقوں میں پہنچی تو مختلف مقامات کے قبیلوں اور قوموں کے افراد وفد کی شکل میں اسلامی تعلیمات کی حقیقت اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کی صداقت کو جاننے اور سمجھنے کے لئے دربار رسالت

---

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا حضرت عباس[رض] کے صاحبزادے ہیں جو خیرالامت کے لقب سے مشہور ہیں، ستر برس کی عمر میں بمقام طائف وفات پائی۔

میں حاضر ہونے لگے۔ یہ وفود دینی تعلیمات اور اسلامی فرائض کو نبی کریم ﷺ سے حاصل کرتے اور اپنے علاقوں اور قبیلوں میں واپس جا کر اسلام کی تبلیغ کرتے۔

احادیث میں ایسے بہت سے وفود کا ذکر آتا ہے جو اس سلسلہ میں دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور اسلام کی آواز کو دور دراز کے علاقوں اور قبیلوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے، ایسا ہی ایک وفد عبدالقیس ہے جس کا تذکرہ اس حدیث میں کیا جارہا ہے۔ عبدالقیس دراصل سربراہ وفد کا نام تھا انہی کی نسبت سے یہ وفد مشہور ہوا۔ یہ لوگ بحرین کے باشندہ تھے۔ اور آپ ﷺ کی خدمت میں دو مرتبہ حاضر ہوئے پہلی مرتبہ فتح مکہ سے پہلے ۵ھ میں، اس وقت ان کی تعداد ۱۳ یا ۱۴، تھی۔ دوسری مرتبہ ۸ھ یا ۹ھ میں جب ان کی تعداد چالیس تھی یہی وہ وفد ہے جس کے قبیلہ کی مسجد میں اسلام میں مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے جمعہ قائم ہوا ہے چنانچہ بخاری کی روایت ہے:

اول جمعة جمعت بعد جمعة فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد عبدالقیس بجواثی من البحرین۔

"مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ بحرین کے مقام جواثی میں عبدالقیس کی مسجد میں قائم ہوا ہے۔"

اس وفد کی آمد کے سلسلہ میں یہ منقول ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا تھا کہ تمہارے پاس ابھی ایک ایسا قافلہ آنے والا ہے جو اہل مشرق میں سب سے بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ ان کو دیکھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو انہیں تیرہ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑا، جب قافلہ قریب آگیا تو حضرت عمرؓ نے ان کو آنحضرت ﷺ کی بشارت سنائی اور قافلہ کے ساتھ ساتھ دربار رسالت میں حاضر ہوئے، اہل قافلہ کی نظر جوں ہی روئے انور ﷺ پر پڑی سب کے سب بے تابانہ آپ ﷺ کی طرف دوڑ پڑے اور فرط اشتیاق سے اپنا سامان اسی طرح چھوڑ کر دیوانہ وار آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کے دست مبارک چومنے لگے، حضرت عبدالقیس جو امیر قافلہ تھے اگرچہ نو عمر تھے لیکن سب سے پیچھے رہ گئے تھے۔ انہوں نے پہلے سب کے اونٹ باندھے پھر اپنا بکس کھولا، سفر کے کپڑے اتارے اور دوسرا لباس تبدیل کیا پھر سکون و وقار کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے دست مبارک کو بوسہ دیا آدمی بدشکل تھے۔ جب آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آدمی کی محبت صرف اس کے ڈھانچہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی قدر و قیمت اس کے دو چھوٹے اعضاء بتاتے ہیں اور وہ "زبان و دل" ہیں، "آپ ﷺ نے فرمایا" تم میں دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ و رسول پسند کرتے ہیں یعنی دانائی اور بردباری۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ خصلتیں مجھ میں پیدائشی ہیں یا کسبی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "پیدائشی۔"

اس قبیلہ کے افراد کو اپنے وطن سے مدینہ آنے کے لئے "کفار مضر" کے قبیلے کے پاس سے گزرنا پڑتا تھا اس قبیلہ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ بہت زیادہ جنگ جو تھا۔ ان کی آبادی کے قریب سے جو بھی گزرتا تھا ان سے جنگ ہونی ضرور تھی اسی لئے اس وفد نے کہا چونکہ ہمارے لئے عام دنوں میں آنا بہت مشکل ہے، اس لئے بار بار نہیں آسکتے، صرف ان ہی مہینوں میں آسکتے ہیں جو عرب میں اشہر حرام سمجھے جاتے ہیں۔ اہل وفد کو جن چیزوں کی تعلیم دی گئی وہ چار ہیں:

① اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ ② نماز۔ ③ روزہ۔ ④ زکوۃ۔ حج کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن بعض محدثین نے اس حدیث میں "حج البیت" کے الفاظ ذکر کئے ہیں جس کو حافظ ابن حجرؒ نے شاذ قرار دیا ہے۔

ان لوگوں کو ایک حکم بعد میں جو بطور خاص دیا گیا وہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ ادا کرنے کا تھا اور ان کو یہ حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ یہ لوگ اکثر جہاد کیا کرتے تھے اور کفار سے مقابلہ آرائی کے نتیجہ میں مال غنیمت حاصل کرتے تھے۔

جن چار چیزوں سے ان لوگوں کو منع کیا گیا وہ چار برتن تھے جن کے استعمال کی ان دنوں ممانعت تھی اصل میں یہ مخصوص قسم کے برتن ہوتے تھے جو اہل عرب کے ہاں شراب بنانے اور شراب رکھنے کے کام میں آتے تھے۔ چونکہ شراب حرام ہو چکی تھی اس لئے ان برتنوں

کے استعمال سے بھی منع فرمادیا گیا تاکہ اس سے شراب کی موجودگی یا شراب کے استعمال کا شبہ نہ ہو سکے مگر جب بعد میں شراب کی حرمت مسلمانوں کے دلوں میں پختگی کے ساتھ بیٹھ گئی اور ان برتنوں کے بارہ میں بھی یہ احتمال نہ رہا کہ یہ برتن خاص طور پر شراب ہی کے لئے بنائے جاتے ہیں تو ان کا استعمال مباح قرار دیا گیا، لہٰذا اب یہ حکم منسوخ مانا جائے گا۔

احکاماتِ اسلام

(۱۶) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ بَايِعُوْنِيْ عَلٰى اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَآءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَاءَ عَاقَبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبادہ بن صامت[1] کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی اس جماعت کو جو آپ ﷺ کے گرد بیٹھی ہوئی تھی (مخاطب کر کے) فرمایا۔ مجھ سے ان باتوں پر بیعت (عہد و اقرار) کرو کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے (افلاس کے ڈر سے) اپنے بچوں کو قتل نہ کرو گے، جان بوجھ کر کسی پر بہتان تراشی نہ کرو گے اور شریعت کے مطابق تمہیں جو احکام دوں گا اس کی نافرمانی نہیں کرو گے پس تم میں سے جو شخص اس عہد و اقرار کو پورا کرے گا اس کا اجر خدا کے ذمہ ہے (کہ آخرت میں اپنے انعامات سے نوازے گا) اور جو شخص (سوائے شرک کے) ان میں سے کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے اور پھر دنیا میں اس کو اس گناہ کی سزا بھی مل جائے (جیسے حد وغیرہ جاری ہو) تو یہ سزا اس کے (گناہ) کے لئے کفارہ ہو جائے گی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کرنے والے کے گناہ کی پردہ پوشی فرمائی (اور دنیا میں اسے سزا نہ ملی) تو اب یہ خدا کی مرضی پر منحصر ہوگا کہ چاہے تو وہ (از راہ کرم) آخرت میں بھی درگزر فرمائے اور چاہے اسے عذاب دے (راوی کہتے ہیں کہ ہم نے ان سب شرطوں پر) آپ ﷺ سے بیعت کی۔" (بخاری و مسلم)

عورتوں کے لئے آپ ﷺ کا فرمان

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اَضْحٰى اَوْ فِطْرٍ اِلَى الْمُصَلّٰى فَمَرَّ عَلَى النِّسَآءِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ تَصَدَّقْنَ فَاِنِّيْ اُرِيْتُكُنَّ اَكْثَرَ اَهْلِ النَّارِ فَقُلْنَ وَبِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ مَا رَاَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِيْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدَاكُنَّ قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِيْنِنَا وَعَقْلِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْاَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلٰى قَالَ فَذٰلِكِ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا قَالَ اَلَيْسَ اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلٰى قَالَ فَذٰلِكِ مِنْ نُقْصَانِ دِيْنِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور ابوسعید خدری[2] راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (ایک مرتبہ) عید یا بقرعید کی نماز کے لئے عید گاہ تشریف لائے تو عورتوں کی ایک جماعت کے پاس بھی تشریف لے گئے۔ (جو نماز کے لئے ایک الگ گوشہ میں جمع تھیں) اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا "اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ و خیرات کرو کیونکہ میں نے تم سے اکثر کو دوزخ میں دیکھا ہے" (یہ سن کر) ان عورتوں نے کہا، یا رسول اللہ! اس کا سبب؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تم لعن و طعن بہت کرتی ہو اور اپنے شوہروں کو نافرمانی و ناشکری کرتی رہتی ہو اور میں نے عقل و دین میں

---

[1] مشہور انصاری صحابہ میں سے ہیں جو بیعت عقبہ اولی و ثانیہ میں شریک تھے اہل صفہ کے معلم تھے، آپ نے ۷۲ سال کی عمر پا کر ۳۴ھ میں وفات پائی۔
[2] آپ کا اصل نام سعد بن مالک بن شیبان ہے، ابوسعید آپ کی کنیت ہے اور خدری کی نسبت سے مشہور ہیں۔ ۷۴ھ میں جمعہ کے روز ۸۴ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔

کمزور ہونے کے باوجود ہوشیار مرد کو بے وقوف بنا دینے میں تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا" (یہ سن کر) ان عورتوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہماری عقل اور ہمارے دین میں کیا کمی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، کیا ایک عورت کی گواہی آدھے مرد کی گواہی کے برابر نہیں ہے (یعنی کیا ایسا نہیں ہے کہ شریعت میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر سمجھی جاتی ہے) انہوں نے کہا، جی ہاں ایسا ہی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا۔ اس کی وجہ عورت کی عقل کی کمزوری ہے اور کیا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت عورت حیض کی حالت میں ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے، انہوں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے آپ ﷺ نے فرمایا۔ یہ اس کے دین میں نقصان کی وجہ ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اسلام کے ابتدائی زمانہ میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ہی مسجد میں نماز ادا کرتی تھیں اس لئے عید یا بقر عید کی نماز کے لئے بھی عورتیں عید گاہ آئی تھیں اور چونکہ وہ الگ ایک کونہ میں بیٹھی ہوئی تھیں اور خطبہ کی آواز ان تک نہیں پہنچی تھی، اس لئے ضروری ہوا کہ احکام اور دینی ضروریات کی باتیں ان تک پہنچائی جائیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو وعظ و نصیحت سے مشرف فرمایا۔

اکثر عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں ایک دو مل کر بیٹھیں، کسی تقریب یا عورتوں کے مجمع میں پہنچیں بس ایک دوسرے کی غیبت کرنا، دنیا بھر کی برائی و بھلائی بیان کرنا اور لعن وطعن کی بوچھاڑ کرنا شروع کر دیتی ہیں اور پھر ان کا زیادہ تر وقت ان خرافاتی باتوں میں گزرتا ہے۔ اسی طرح یہ بڑا روگ بھی ان عورتوں میں پایا جاتا ہے کہ ان کا شوہر ان کی آسائش اور ان کے راحت و آرام کے لئے کتنے ہی پاپڑ بیلے، کتنی ہی مشقت و محنت کر کے ان کی ضروریات کی تکمیل کرے۔ اور ان کو خوش رکھنے کے لئے کتنی ہی مصیبتیں اٹھائے مگر ان کی زبان سے کبھی بھی شوہروں کا شکر ادا نہیں ہوتا، ہمیشہ ناشکری ہی کے الفاظ ان کی زبان سے نکلتے ہیں، رہی شوہروں کی نافرمانی کی بات تو یہ برائی بھی عورتوں میں کچھ کم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں عورتوں کے ایک بہت بڑے عیب کی غمازی کرتی ہیں۔ جس سے ان کی آخرت تباہ ہوتی ہے اور جو ان کو اللہ کے عذاب کا مستوجب بناتا ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ان کے اس خاص عیب کی نشان دہی فرمائی اور ان سے فرمایا کہ تمہارے اندر اس قسم کی جو باتیں ہیں ان کو ہلکا مت جانو، بلکہ یہ وہ گناہ ہیں جن کی وجہ سے اللہ کا عذاب تم پر ہوگا اور تم قہر خداوندی میں گرفتار ہو کر دوزخ میں دھکیل دی جاؤ گی اور تمہاری ان ہی باتوں کے سبب دوزخ میں تم عورتوں کی تعداد مردوں کی بنسبت زیادہ ہوگی، لہٰذا تم صدقہ و خیرات کرتی رہا کرو تاکہ ایک طرف تو اس کی برکت سے تمہارے اندر ان باتوں کی کمی آئے اور یہ عیب جاتا رہے دوسری طرف اللہ کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہو اور تمہارے گناہوں کی بخشش ہو۔

لعن (طعن) کے معنی ہیں، اللہ کی رحمت سے دور کرنا۔ حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی کو لعن طعن کرنا انتہائی بری حرکت ہے چنانچہ شریعت کا حکم ہے کہ کسی شخص کو متعین کر کے اس پر لعنت نہ بھیجی جائے چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ کسی متعین کافر پر بھی لعنت بھیجنے کی ممانعت اس بنا پر ہے کہ نہیں کہا سکتا کہ کب اس کو ایمان و اسلام کی توفیق ہو جائے اور وہ کفر و شرک کی لعنت سے نکل کر اللہ کی رحمت کے سایہ میں آجائے۔ ہاں جو شخص کفر کی حالت میں مر گیا ہو اور اس کا کفر پر مرنا یقینی طور پر معلوم ہو تو اس پر لعنت بھیجی جا سکتی ہے اسی طرح نفس برائی پر لعنت بھیجی جا سکتی ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ کفر پر اللہ کی لعنت یا یہ کہ کافروں پر اللہ کی لعنت۔

عورتوں میں "عقل کی کمی" یا ان کے "دینی نقصان" کا اظہار عورتوں کی تحقیر کے لئے ہرگز نہیں ہے بلکہ قدرت کے اس تخلیقی توازن کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے جو مردوں اور عورتوں کے درمیان جسمانی و طبعی فرق صنفیت کی بنیاد ہے اور یہ فرق صنفیت دراصل فطرت کا تقاضا ہے جس کے بغیر نوع انسانی کا ذاتی و معاشرتی نظام زندگی برسر اعتدال نہیں رہ سکتا، خالق کائنات نے جسمانی، طبعی، عقلی اور دینی طور پر مرد کو عورت کی بہ نسبت جو برتر درجہ دیا ہے اور جس کا ثبوت اس حدیث سے واضح ہے وہ انسانی معاشرہ کے اعتدال و توازن کی برقراری کے لئے ہے نہ کہ شرف انسانیت میں کسی فرق کے اظہار کے لئے، اس شرف میں مرد و عورت دونوں کی یکساں حیثیت ہے اور دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

انسان کو سرکشی زیب نہیں دیتی

⑱ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى كَذَّبَنِیْ ابْنُ اٰدَمَ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ ذٰلِكَ وَشَتَمَنِیْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ ذٰلِكَ فَاَمَّا تَكْذِیْبُهٗ اِیَّایَ فَقَوْلُهٗ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ كَمَا بَدَأَنِیْ وَلَیْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَهْوَنَ عَلَیَّ مِنْ اِعَادَتِهٖ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِیَّایَ فَقَوْلُهٗ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا .... وَاَنَا الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لِّیْ كُفُوًا اَحَدٌ وَفِیْ رِوَایَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِیَّایَ فَقَوْلُهٗ لِیْ وَلَدٌ وَسُبْحَانِیْ اَنْ اَتَّخِذَ صَاحِبَةً اَوْ وَلَدًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم (انسان مجھ کو جھٹلاتا ہے اور یہ بات اس کے شایان نہیں اور میرے بارے میں بدگوئی کرتا ہے حالانکہ یہ اس کے مناسب نہیں ہے، اس کا مجھ کو جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے جس طرح اللہ نے مجھ کو (اس دنیا میں) پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اسی طرح وہ (آخرت میں) مجھ کو دوبارہ ہرگز پیدا نہیں کر سکتا حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے کے مقابلہ میں مشکل نہیں ہے۔ اور اس کا میرے بارے میں بدگوئی کرنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے، اللہ نے اپنا بیٹا بنایا ہے حالانکہ میں تنہا اور بے نیاز ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ مجھ کو کسی نے جنا اور نہ کوئی میرا ہمسر ہے اور ابن عباس کی روایت میں اس طرح ہے "اور اس (انسان) کا مجھے برا بھلا کہنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کا بیٹا ہے حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو بیوی یا بیٹا بناؤں۔" (بخاری)

تشریح: جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مرتبہ پیدا ہو کر مرجانے والوں اور اس دنیا سے اپنا وجود ختم کر دینے والوں کو دوبارہ حیات ملے اور نئی دنیا (آخرت) کے لئے ان کا وجود پھر عمل میں آئے یا اسی طرح جو لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے "بیٹا" ثابت کرتے ہیں اور اس کا عقیدہ رکھتے ہیں جیسے عیسائیوں کا کہنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، یا یہودیوں کا کہنا کہ عزیر علیہ السلام اللہ کی اولاد ہیں، درحقیقت فکر و عقیدہ کی بے راہ روی ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنا اور اس کی ذات پر بہتان باندھنا ہے۔ جھوٹ کی نسبت تو اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سچی کتابوں اور اپنے سچے پیغمبروں کے ذریعہ قیامت کی واضح خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ ہر ذی روح کو مرنا ہے اور پھر آخرت میں دوبارہ زندہ ہو کر ایک نئی حیات پانا ہے جو ابدی ہوگی، اب اگر کوئی شخص قیامت کا انکار کرتا ہے یا حیات بعد الموت کو ناممکن سمجھتا ہے تو دراصل وہ ظاہر کرتا ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ جھوٹا ہے جس نے یہ غلط باتوں کی ہمیں خبر دی ہے اسی طرح یہ تصور قائم کرنا اور کہنا کہ جو شخص ایک مرتبہ پیدا ہو کر نیست و نابود ہو چکا ہے وہ دوبارہ وجود نہیں پا سکتا، درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت قادریت و خالقیت کا انکار کرنا ہے۔ ان نادانوں کی عقل میں یہ موٹی بات نہیں آتی کہ جو خالق کسی چیز کو عدم سے نکال کر وجود کا لباس پہنا سکتا ہے وہ اسی چیز کو جبکہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر اپنا قلب کھو چکی ہو، دوبارہ قالب اور وجود عطا کیوں نہیں کر سکتا، محدود قدرت رکھنے والا انسان بھی کسی چیز کی تخلیق میں اگر کوئی دقت اور مشکل محسوس کرتا ہے تو پہلی مرتبہ کی تخلیق میں محسوس کرتا ہے جب کہ اسی چیز کو دوبارہ بنانا اس کے لئے چنداں مشکل نہیں ہوتا، پھر لامحدود طاقت و قدرت رکھنے والے خلاق عالم کو اپنی کسی تخلیق کے دوبارہ وجود دینے میں بھلا کیا دقت ہو سکتی ہے۔ واضح ہو کہ "پہلی مرتبہ" اور "دوسری مرتبہ" کی یہ تفصیل انسان کے اعتبار سے اور محض سمجھانے کے لئے ہے اس کا تعلق حق تعالیٰ کی ذات سے ہرگز نہیں ہے وہ تو قادر مطلق ہے، کسی چیز کو پیدا کرنا نہ اس کے لئے پہلی مرتبہ مشکل ہے اور نہ دوسری مرتبہ۔

اللہ کے بارے میں بدگوئی کے ذریعہ اس کی ذات پر بہتان باندھنا اس اعتبار سے ہے کہ جب اس نے واضح طور پر بتایا ہے کہ وہ تنہا، بے نیاز اور بے کفو ہے اور یہ کہ نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ اس نے کسی کو جنا تو پھر کسی کو اس کا بیٹا بنانا یا اس کو کسی کا باپ بتانا اس کی ذات پر بہتان تراشی نہیں تو اور کیا ہے، یہ انسان کی ذہنی پستی اور فکر و خیال کی گراوٹ کی بات ہے کہ وہ اپنے خالق اور اپنے پروردگار کی طرف

ایسی چیزوں کی نسبت کرے جس سے اس کی ذات پاک ہے، بے نیاز ہے۔

زمانہ کو بُرامت کہو

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ يُؤْذِيْنِي ابْنُ اٰدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ بِيَدِيَ الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ابن آدم (انسان) مجھے تکلیف دیتا ہے (اس طرح کہ) کہ وہ زمانہ کو برا کہتا ہے حالانکہ زمانہ (کچھ نہیں وہ) تو میں ہی ہوں، سب تصرفات میرے قبضہ میں ہیں اور شب و روز کی گردش میرے ہی حکم سے ہوتی ہے"۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: جاہلوں کی عادت ہے کہ وہ انسانوں کی اپنی پیدا کی ہوئی پریشانیوں اور مصیبتوں کو برائی کی صورت میں زمانہ اور وقت کے سر تھوپ دیتے ہیں اور اپنی زبان سے اس طرح کے الفاظ نکالتے ہیں "زمانہ خراب ہے، بہت برا وقت ہے" اس طرح وقت اور زمانہ کو برا کہنا نہایت غلط ہے کیونکہ زمانہ اور وقت تو کچھ بھی نہیں ہے، اصل متصرف حق تعالیٰ کی ذات ہے جس کے قبضہ میں لیل و نہار کی گردش ہے اور اسی گردش لیل و نہار کا نام زمانہ اور وقت ہے، اگر زمانہ اور وقت کو متصرف سمجھ کر برا کہا جاتا ہے تو متصرف چونکہ حق تعالیٰ ہے اس لئے وہ برائی حق تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا صبر و تحمل

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰى أَذًى يَسْمَعُهٗ مِنَ اللّٰهِ يَدْعُوْنَ لَهُ الْوَلَدَ ثُمَّ يُعَافِيْهِمْ وَيَرْزُقُهُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا تکلیف دہ کلمات سن کر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر و تحمل کرنے والا کوئی نہیں، لوگ اس کے لئے بیٹا تجویز کرتے ہیں وہ اس پر بھی (ان سے انتقام نہیں لیتا بلکہ) ان کو عافیت بخشتا ہے اور روزی پہنچاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: خداوند قدوس کی ذات اس سے پاک اور بالاتر ہے کہ کوئی انسان اگر اپنے قول و فعل سے اس کو تکلیف پہنچانا چاہے، تو وہ کامیاب ہو جائے یا کوئی شخص اس کو نقصان پہنچانا چاہے تو اسے نقصان پہنچ جائے اس لئے یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ واقعی اس کو انسان کے قول فعل سے تکلیف پہنچتی ہے اور وہ صبر و تحمل کرتا ہے اور نہ اس حدیث کا مقصد اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ اصل منشاء انسانی دل و دماغ کو جھنجھوڑنا اور عقل و شعور کو بیدار کرنا ہے کہ جب اللہ کی اپنی بنائی ہوئی مخلوق اسی کے پیدا کئے ہوئے انسان اسی کے خزانۂ قدرت سے مستفید ہونے والے لوگ اپنے قول و فعل سے اللہ کو ایذا پہنچانے کے سامان تیار کرتے ہیں اس کو تکلیف دینے کا ارادہ کرتے ہیں جیسے اس کی نافرمانی کرنا اس کے احکام و ہدایات اور اس کے دین کا مذاق اڑانا اور اس کی طرف ان چیزوں کی نسبت کرنا جن سے اس کی ذات بالکل پاک اور منزہ ہے مثلاً کسی کو اس کا بیٹا بتانا، کسی کو اس کا جوڑا قرار دینا تو یہ ایسی باتیں ہیں کہ جن پر اس کا غضب اگر بھڑک اٹھے تو نہ صرف ان لوگوں کا تمام نظام زندگی تہ و بالا کر کے رکھ دے بلکہ پوری کائنات کو پل بھر میں نیست و نابود کر ڈالے۔ مگر اس کے برداشت و تحمل کو دیکھو کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے کے بجائے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرتا، کسی کی روٹی روزی بند نہیں کرتا، کسی کو زندگی کے وسائل و ذرائع سے محروم نہیں کرتا، جس طرح اس کے نیک اور اطاعت گزار بندے اس کے فضل و کرم کے سایہ میں ہیں اسی طرح بدکار اور سرکش بندے بھی اس کے خزانۂ رحمت سے پل رہے ہیں اس کی نعمتوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

توحید کی اہمیت

(۲۱) وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حِمَارٍ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ اِلَّا مُؤْخِرَةُ الرَّحْلِ فَقَالَ يَا مُعَاذُ هَلْ تَدْرِيْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَّا يُعَذِّبَ مَنْ لَّا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ قَالَ لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت معاذؓ[1] کہتے ہیں کہ (ایک سفر کے دوران سواری کے) گدھے پر میں آنحضرت ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، میرے اور آنحضرت ﷺ کے درمیان کجاوے کا پچھلا حصہ حائل تھا، آنحضور ﷺ نے (مجھ سے) فرمایا معاذؓ! جانتے ہو بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) ہی بہتر جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا۔ بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ پر بندوں کا یہ حق ہے کہ جس نے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا، اسے عذاب نہ دے (یہ سن کر) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں یہ خوشخبری لوگوں کو سنا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤ کیونکہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے)۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: عرب کے گدھے ہماری طرف کے گھوڑوں سے بھی زیادہ تیز اور طاقتور ہوتے ہیں اس لئے وہاں سواری کے لئے گدھے بھی استعمال کئے جاتے تھے اور ان پر سواری کی جاتی تھی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس نے اللہ کو ایک مان لیا اس کی الوہیت و ربوبیت اور اس کی بھیجی ہوئی رسالت پر ایمان لے آیا اور اس کی عبادت و پرستش میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا تو اس پر اللہ کا عذاب نہیں ہوگا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی شخص اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لے آیا اور شرک کا مرتکب نہیں ہوا تو اس پر دوزخ کی آگ بالکل حرام ہو جائے گی۔ اگرچہ وہ کتنا ہی بدعمل اور بدکار ہو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین اور کفار کی طرح اس پر ہمیشہ کے لئے عذاب مسلط نہیں کیا جائے گا اور نہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر آخر کار جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

دوزخ سے رہائی

(۲۲) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمُعَاذٌ رَدِيْفُهٗ عَلَى الرَّحْلِ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ ثَلَاثًا قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صِدْقًا مِّنْ قَلْبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْا قَالَ اِذًا يَّتَّكِلُوْا فَاَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهٖ تَاَثُّمًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے اس وقت جب کہ (سفر کے دوران) سواری پر تھے اور آپ ﷺ کے پیچھے معاذؓ بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمایا "اے معاذ" انہوں نے کہا "حاضر ہوں یا رسول اللہ" آنحضور ﷺ نے پھر فرمایا "اے معاذ" معاذ نے عرض کیا "یا رسول اللہ حاضر ہوں" آپ ﷺ نے پھر تیسری مرتبہ مخاطب فرمایا "اے معاذ" معاذ نے پھر کہا "یا رسول اللہ حاضر ہوں" آنحضور ﷺ نے اسی طرح تین مرتبہ معاذؓ کو مخاطب کرنے کے بعد فرمایا "اللہ کا جو بندہ سچے دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے" (یہ سن کر) معاذؓ نے عرض کیا

[1] آپ کی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے لیکن معاذ بن جبل کے نام سے معروف ہیں انصاری صحابی ہیں۔ ۴۸ سال کی عمر میں ۱۸ھ میں وفات پائی۔

"یا رسول اللہ! (ﷺ) کیا میں اس (خوشخبری) سے لوگوں کو آگاہ کر دوں تاکہ وہ اس بشارت کو سن کر خوش ہو جائیں، آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے" (حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آخر کار معاذؓ نے اس خوف سے کہ حدیث چھپانے کا) گناہ نہ ہو اپنی وفات کے وقت اس حدیث کو بیان کر دیا تھا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: آنحضور ﷺ نے معاذ کو بار بار اس لئے مخاطب فرمایا تاکہ ان کے دل و دماغ میں مضمون کی اہمیت و عظمت بیٹھ جائے اور وہ جان لیں کہ جو بات کہی جانے والی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ سرسری طور پر سن لی جائے بلکہ اس کی عظمت کا تقاضا ہے کہ اس کو پوری توجہ سے سنا جائے اور دل و دماغ کی گہرائیوں تک اس کو پہنچایا جائے۔

فرمایا گیا کہ جس نے اللہ کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار صدق دل سے کر لیا اور اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جائے گی لیکن محض یہ تصدیق و اقرار ہی حرمت نار کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس شہادت و تصدیق کے ساتھ ساتھ اس کے جو تقاضے ہیں ان کو بھی پورا کیا جائے یعنی دین و شریعت کی پوری پیروی کی جائے اور احکام خداوندی و فرمان رسول کی فرمانبرداری کی جائے اور یہ شہادت و تصدیق جن فرائض کو عائد کرتے ہیں ان پر عمل کیا جائے، اس طرح خدا کا فضل و کرم دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے گا، اسی لئے جب حضرت معاذؓ نے آنحضرت ﷺ سے اس بشارت کو عام لوگوں تک پہنچانے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے یہ کہہ کر منع فرمایا کہ لوگ اس خوشخبری کو سن کر اسی پر بھروسہ کر لیں گے اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے جس کا نتیجہ عذاب خداوندی ہے یا پھر وہی تاویل کی جائے گی جو پہلے کی گئی کہ عقیدۂ توحید و رسالت دوزخ کے ابدی عذاب سے نجات کا ضامن ہے یعنی جس طرح کفار و مشرکین دوزخ کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ جلائے جائیں گے اس طرح توحید و رسالت پر ایمان رکھنے والوں کو دوزخ کی آگ میں ہمیشہ کے لئے نہیں ڈالا جائے گا، ان میں سے جس شخص نے شریعت پر عمل نہیں کیا ہو گا اور فرائض و واجبات کو پورا نہیں کیا ہو گا اس کو اس عرصہ کے لئے جو اللہ چاہے گا دوزخ میں ڈالا جائے گا اور جب وہ اپنی سزا پوری کر لے گا تو پھر اس کو ہمیشہ کے لئے جنّت میں بھیج دیا جائے گا۔

خاتمہ بالایمان جنّت کی ضمانت ہے

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْہِ ثَوْبٌ اَبْیَضُ وَھُوَ نَائِمٌ ثُمَّ اَتَیْتُہٗ وَقَدِ اسْتَیْقَظَ فَقَالَ مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ وَکَانَ اَبُوْذَرٍّ اِذَا حَدَّثَ بِھٰذَا قَالَ وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوذر غفاریؓ[1] کہتے ہیں کہ میں (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ ایک سفید کپڑا اوڑھے سو رہے تھے (اس وقت تو میں واپس چلا آیا) پھر دوبارہ آپ ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب آپ ﷺ بیدار ہو چکے تھے آپ ﷺ نے (مجھ کو دیکھ کر) فرمایا جس شخص نے صدق دل سے لا الہ الا اللہ (یعنی اللہ کی وحدانیت کا سچے دل سے اعتراف و اقرار کیا) اور اسی عقیدہ پر اس کا انتقال ہو گیا تو وہ ضرور جنّت میں داخل کیا جائے گا" میں نے عرض کیا" اگرچہ اس نے چوری اور زنا (جیسے بڑے گناہوں) کا ارتکاب کیا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں، خواہ وہ چوری اور زنا کے جرم کا مرتکب کیوں نہ ہو۔ میں نے پھر (تعجب سے) سوال کیا، اگرچہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب ہی کیوں نہ کیا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں خواہ وہ چوری اور زنا کے جرم کا مرتکب کیوں نہ ہو؟ میں نے (پھر سہ بارہ بہت حیرت سے) عرض کیا، اگرچہ اس نے چوری اور زنا کے جرم کا ارتکاب کیا ہو؟ (تیسری مرتبہ بھی) آپ ﷺ نے یہی فرمایا "ہاں خواہ وہ

---

[1] اصل نام جندب بن جنادہ ہے اور ابوذر غفاری کی کنیت سے مشہور ہیں، آپ مکہ میں بالکل ابتداء اسلام میں ایمان سے بہرہ ور ہو گئے تھے۔ آپ کا انتقال ۳۲ھ میں ہوا ہے۔

چوری اور زنا کے مرتکب کیوں نہ ہوا ہو اور خواہ ابوذرؓ کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔ (راوی کہتے ہیں کہ) جب بھی حضرت ابوذرؓ یہ حدیث بیان کرتے (بطور فخر) اس آخری فقرہ "خواہ ابوذرؓ کو کتنا ہی ناگوار گزرے" ضرور نقل کرتے تھے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے اور اس کی رحمت بے پایاں ہے۔ اس کے فضل وکرم سے کوئی بعید نہیں کہ وہ اس شخص کو جنت میں داخل کر دے جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا تھا مگر مرتے وقت اس کا دل ایمان ویقین کی روشنی سے منور تھا، تاہم محدثین اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اس کی بخشش ومغفرت اس کے ایمان کی بنا پر تو ہر حال میں ہوگی یعنی اس کو ابدی نجات سے سرفراز کیا جائے گا مگر دنیا میں اس نے جو گناہ کئے ہوں گے اور جن بداعمالیوں کا مرتکب ہوا ہوگا پہلے ان کی سزا اس کو بھگتنی ہوگی۔ چنانچہ ابوذر غفاریؓ کو اسی لئے تعجب ہو رہا تھا اور وہ بار بار پوچھ رہے تھے کہ کیا کوئی شخص محض اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت پر ایمان و اقرار کے بعد جنت میں داخل کر دیا جائے گا خواہ اس نے شریعت کی اطاعت نہ کی ہو اور بڑے بڑے گناہوں کا مرتکب رہا ہو؟ مگر حقیقت میں نگاہ نبوت اللہ کی وسیع وبیکراں رحمت کو دیکھ رہی تھی کہ بڑے بڑے سرکش اور بدکار انسان جنہوں نے پوری زندگی اللہ ورسول کے احکام سے سرکشی میں گزاری، جن کی عمر کا کوئی حصہ شریعت کی اطاعت میں نہیں گزرا انہوں نے جب آخر میں ندامت وشرمندگی اور خلوص دل سے توبہ کر لی اور مرتے وقت ان کا دل ایمان ویقین کے نور سے منور ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت نے اس توبہ و انابت اور ایمان و یقین کی بدولت جس نے سچائی اور اخلاص کے ساتھ ان کے اندر کی دنیا میں اکدم انقلاب برپا کر دیا تھا ان کی پوری زندگی کی سرکشی اور بدکاریوں کو معاف کر دیا اور اپنے فضل و احسان کے سایہ میں لے کر ان کو ابدی نجات سے سرفراز کر دیا۔

نجات کا دارومدار کس پر ہے

(۲۴) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَابْنُ اَمَتِهٖ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ۔ (متفق علیہ)

"اور عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اس بات کی گواہی دے (یعنی زبان سے اقرار کرے اور دل سے سچ جانے) کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی اس کا شریک نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) بلاشبہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور (اس بات کی بھی شہادت دے کہ) عیسیٰ علیہ السلام (بھی) اللہ کے بندے اور رسول اور اللہ کی لونڈی (مریم) کے بیٹے اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی جانب ڈالا تھا اور اللہ کی بھیجی ہوئی روح ہیں اور یہ کہ جنت ودوزخ حق (اور واقعی چیزیں) ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں ضرور داخل کرے گا خواہ اس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس حدیث کا حاصل یہی ہے کہ ابدی نجات کا دارومدار ایمان وعقائد کی اصلاح پر ہے اس میں کسی قسم کی کوتاہی قابل معافی نہیں ہو سکتی، ہاں اعمال کی کمزوریاں رحمت خداوندی سے معاف ہو سکتی ہیں۔

ایمان کی بنیاد چونکہ توحید کو ماننا اور اس کی شہادت دینا اس لئے سب سے پہلے اسے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی الوہیت وربوبیت پر صدق دل سے اعتقاد رکھا جائے پھر اس کے بعد رسالت کا درجہ ہے تو ضروری ہے کہ رسول کی رسالت پر ایمان لایا جائے اسی طرح تمام رسولوں کی رسالت پر ایمان رکھنا بھی نجات کے لئے ضروری ہے۔ یہاں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر علامت کے طور پر بھی ہے اور ایک خاص وجہ سے بھی دراصل ان کے بارے میں ایک گروہ (یعنی عیسائیوں) کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰ ابن اللہ ہیں۔ اس باطل عقیدہ کی تردید کے لئے ان کا ذکر کیا گیا اور وضاحت کر دی گئی کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو اللہ کے بیٹے ہیں اور نہ اللہ ان کے اندر حلول کئے ہوئے ہے بلکہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں جسے اس نے اپنی ایک باندی مریم علیہا السلام کے پیٹ سے پیدا کیا

اسی لئے ان کو "کلمۃ اللہ" کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے صرف اللہ کے حکم "کلمہ کن" سے ہوئی۔ "روح اللہ" ان کو اس لئے نہیں کہا گیا کہ ان کے اندر اللہ کا کوئی جزو یا اللہ کی روح شامل ہے بلکہ "روح اللہ" آپ کا لقب اس لئے قرار دیا گیا کہ آپ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور مٹی کی چڑیاں بنا کر اور ان میں جان ڈال کر اڑا دیا کرتے تھے۔ عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد تصور آخرت کا عقیدہ بھی بنیادی ہے یعنی اس بات پر ایمان و یقین رکھنا کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا برحق ہے اور جنت و دوزخ واقعی چیزیں ہیں، یہ وہ عقائد ہیں جن کو ماننا، صدق دل سے ان پر ایمان رکھنا اور خلوص نیت سے ان کو تسلیم کرنا ابدی نجات کا ضامن ہے۔ ان عقائد کو مانتے ہوئے اگر اعمال کی کوتاہیاں بھی ہوں تو اس صورت میں بھی اس حدیث نے جنت کی بشارت دی ہے۔ لیکن جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے یہ بات طے ہے کہ جو عملی کوتاہیاں اور بداعمالیاں رحمت خداوندی سے معاف نہیں ہوں گی ان پر سزا ضرور ملے گی مگر سزا پوری ہونے کے بعد اس کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ لہٰذا اس حدیث کو اس مفہوم میں لینا چاہیے کہ اگر ان عقائد کے ماننے کے بعد کسی نے اعمال بھی اچھے کئے، شریعت کی پیروی کرتے ہوئے تمام احکام بجالایا اور خلاف شرع کوئی کام نہیں کیا تو بغیر کسی عذاب و سزا کے اسے جنت میں داخل کیا جائے گا اور اگر کسی نے ان عقائد کو ماننے کے بعد اعمال اچھے نہ کئے شریعت کی پابندی نہیں کی، اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کی فرمانبرداری نہیں کی تو وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتے گا مگر آخر کار اسے بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

قبول اسلام سے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں

(۲۵) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اُبْسُطْ یَمِیْنَكَ فَلْاُبَایِعْكَ فَبَسَطَ یَمِیْنَهٗ فَقَبَضْتُ یَدِیْ فَقَالَ مَالَكَ یَا عَمْرُو قُلْتُ اَرَدْتُّ اَنْ اَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ مَاذَا؟ قُلْتُ اَنْ یُّغْفَرَ لِیْ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ یَا عَمْرُو اَنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ وَاَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهَا وَاَنَّ الْحَجَّ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالْحَدِیْثَانِ الْمَرْوِیَّانِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْكِ وَالْاٰخَرُ الْکِبْرِیَاءُ رِدَآئِیْ سَنَذْکُرُهُمَا فِیْ بَابِ الرِّیَاءِ وَالْکِبْرِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت عمرو بن العاص[1] کہتے ہیں کہ (جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی روشنی سے میرے قلب و دماغ کو منور کیا تو) میں نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا "یا رسول اللہ! لائیے اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ (ﷺ) سے اسلام کی بیعت کرتا ہوں۔ آپ نے (یہ سن کر) اپنا ہاتھ (جب) بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، آپ ﷺ نے (حیرت سے) فرمایا عمرو یہ کیا؟ میں نے عرض کیا! "یا رسول اللہ (ﷺ)! میں کچھ شرط کرنا چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کیا شرط ہے؟ میں نے عرض کیا (میں چاہتا ہوں) کہ میرے (ان) تمام گناہوں کو معاف کر دیا جائے (جو میں نے اسلام سے پہلے کئے تھے) آپ ﷺ نے فرمایا اے عمرو! کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام ان تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے جو قبول اسلام سے قبل کئے گئے ہوں، ہجرت ان تمام گناہوں کو دور کر دیتی ہے جو اس (ہجرت) سے پہلے کئے گئے ہوں اور حج ان تمام گناہوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے جو اس حج سے پہلے کئے گئے ہوں (مسلم) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ دونوں حدیثیں یعنی "قال اللہ تعالیٰ ان اغنی الشرکاء عن الشرک الخ" اور "الکبریاء ردائی الخ" ریاء اور کبر کے باب میں نقل کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔"

تشریح: ایک شخص اگر اپنی زندگی کا ایک اچھا خاصا حصہ کفر و شرک میں گزار کر بعد میں اسلام کی دولت سے بہرور ہوتا ہے، تو کیا اس کے زمانۂ اسلام سے پہلے کے اعمال پر مواخذہ ہوگا؟ یعنی کفر و شرک اور گناہ و معصیت جو اس سے پہلے صادر ہوتے رہے ہیں ان پر عذاب ہوگا یا نہیں؟ اس حدیث نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ اسلام کی روشنی پہلی تمام تاریکی کو خواہ وہ کفر و شرک کا اندھیرا ہو یا گناہ و معصیت کی

[1] آپ مشہور و معروف قریشی صحابی ہیں آپ کی کنیت ابوعبداللہ یا ابومحمد بیان کی گئی ہے آپ کا سن وفات ۴۳ھ بیان کیا جاتا ہے۔

ظلمت، آن واحد میں ختم کر ڈالتی ہے اور صرف ایک کلمہ کی بدولت جو خلوص دل سے نکلا ہو، انسان کا قلب و دماغ بالکل مجلّی ہو جاتا ہے، نہ وہاں شرک کی ظلمتوں کا کوئی نشان رہ جاتا ہے اور نہ گناہ و معصیت پر عذاب کا کوئی خدشہ، لیکن اتنی بات جان لینی چاہیے کہ بخشش اور مغفرت کا تعلق ذنوب اور گناہوں سے ہے، ان حقوق کے ساتھ نہیں ہے جو قرض، امانت، عاریت اور خرید و فروخت کے سلسلے میں اس کے ذمہ ابھی باقی ہیں کیونکہ اسلام ان مطالبات کی ادائیگی کو معطل نہیں کرتا جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے بلکہ اسلام لانے کے بعد بھی اس پر لازم رہے گا کہ وہ ان مطالبات کی ادائیگی کرے جو اس کے اوپر اسلام لانے سے پہلے واجب ہوئے تھے، البتہ اس حدیث کے تحت ایسے حقوق العباد آسکتے ہیں جو زنا، چوری اور قتل و غارتگری کی صورت میں زمانۂ اسلام سے قبل ناحق ضائع کر دیئے گئے تھے، اسلام کے بعد ان پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

اسلام کی دولت سے مستفیض ہونے کے بعد بھی چونکہ ایک مسلمان سے بتقاضائے بشریت گناہ سرزد ہو سکتے ہیں اس لئے ان کے کفارہ کے لئے اس حدیث نے حج اور ہجرت دو ایسے عمل بتا دیے کہ اگر یہ دونوں کام اپنی تمام شرائط کے ساتھ پورے کئے جائیں تو یہ حقوق اللہ کے لئے کفارہ بن جائیں گے بلکہ حج کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے یہ حقوق العباد کے لئے بھی کفارہ بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اپنے خزانۂ قدرت سے صاحب حقوق کو اس کے حقوق دے کر اس بندہ کو ان حقوق سے دستبرداری دلا دے اور اسے معاف کر دے۔ (ترجمان السنۃ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ارکانِ دین

(۲۶) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ یُّدْخِلُنِیَ الْجَنَّۃَ وَیُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ قَالَ لَقَدْ سَاَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِیْمٍ وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ عَلٰی مَنْ یَسَّرَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ تَعْبُدُ اللّٰہَ وَلَا تُشْرِكُ بِہٖ شَیْئًا وَتُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ وَتُؤْتِی الزَّکٰوۃَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَیْتَ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰی اَبْوَابِ الْخَیْرِ اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ وَالصَّدَقَۃُ تُطْفِئُ الْخَطِیْئَۃَ کَمَا یُطْفِئُ الْمَآءُ النَّارَ وَصَلٰوۃُ الرَّجُلِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ ثُمَّ تَلَا (تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ) حَتّٰی بَلَغَ یَعْمَلُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعَمُوْدِہٖ وَذِرْوَۃِ سَنَامِہٖ قُلْتُ بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَمُوْدُہُ الصَّلٰوۃُ وَذِرْوَۃُ سَنَامِہِ الْجِھَادُ ثُمَّ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ ذٰلِكَ کُلِّہٖ قُلْتُ بَلٰی یَا نَبِیَّ اللّٰہِ فَاَخَذَ بِلِسَانِہٖ وَقَالَ کُفَّ عَلَیْكَ ھٰذَا فَقُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَکَلَّمُ بِہٖ قَالَ ثَکِلَتْكَ اُمُّكَ یَا مُعَاذُ وَھَلْ یَکُبُّ النَّاسَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ اَوْ عَلٰی مَنَاخِرِھِمْ اِلَّا حَصَآئِدُ اَلْسِنَتِھِمْ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی عمل ایسا بتا دیجئے جو مجھ کو جنت میں لے جائے اور دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے، آپ ﷺ نے فرمایا "حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے ایک بہت بڑی چیز کا سوال کیا ہے لیکن جس پر اللہ تعالیٰ آسان کر دے اس کے لئے یہ بہت آسان بھی ہے "پھر فرمایا" اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور خانہ کعبہ کا حج کرو، پھر اس کے بعد فرمایا اے معاذ! کیا تمہیں خیر و بھلائی کے دروازوں تک نہ پہنچا دوں (تو سنو) روزہ (ایک ایسی) ڈھال ہے (جو گناہ سے بچاتی ہے اور دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھتی ہے) اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا گناہ کو اس طرح مٹا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے (اور اسی طرح) رات (تہجد) میں مؤمن کا نماز پڑھنا (گناہ کو ختم کر دیتا ہے) پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (جس میں تہجد گزار لوگوں اور رات میں اللہ کی عبادت کرنے والوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس پوری آیت کا ترجمہ ہے): ان

(مؤمنین صالحین) کے پہلو (رات میں) بستروں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف و امید سے پکارتے اور جو (مال) ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے وہ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان (مؤمنین صالحین) کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے یہ ان کے اعمال کا صلہ (انعام) ہے جو وہ کرتے تھے، پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں اس چیز (یعنی دین) کا سر اور اس کے ستون اور اس کے کوہان کی بلندی نہ بتادوں؟ میں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ! ضرور بتایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس چیز (دین) کا سر اسلام ہے، اس کے ستون نماز ہے اور اس کوہان کی بلندی جہاد ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا۔ کیا تمہیں ان تمام چیزوں کی جڑ نہ بتادوں؟ میں نے عرض کیا ہاں اللہ کے نبی ضرور بتایئے آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک پکڑی اور (اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا، اس کو بند رکھو۔ میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی ہم اپنی زبان سے جو بھی لفظ نکالتے ہیں ان سب پر مواخذہ ہوگا، آپ نے فرمایا معاذ! ثکلتک امک[1] (تمہاری ماں تمہیں گم کردے اچھی طرح جان لو کہ) لوگوں کو ان کے منہ کے بل یا پیشانی کے بل دوزخ میں گرانی والی اسی زبان کی (بری) باتیں ہوں گی۔" (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث میں "دین" کی تصویر بڑے نفسیاتی انداز میں اجاگر کی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح کسی جسمانی وجود کا مدار "سر" پر ہوتا ہے کہ اگر سر کو اڑا دیا جائے تو جسمانی وجود بھی باقی نہیں رہے گا، اسی طرح "ایمان و اسلام" یعنی عقیدۂ توحید و رسالت دین کے لئے بمنزلہ سر کے ہیں کہ اگر توحید و رسالت کے اعتقاد کو ہٹا دیا جائے تو دین کا وجود بھی باقی نہیں رہے گا، پھر جس طرح کسی جسمانی وجود کو برقرار رکھنے اور کارآمد بنانے کے لئے "ستون" اولین اہمیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح دین کا ستون نماز ہے۔ نماز ہی وہ بنیادی طاقت ہے جو دین کے وجود کو وابستہ اور قائم رکھتی ہے اگر نماز کو ہٹا دیا جائے تو دین کا وجود اپنی اصلی حالت کی برقراری سے محروم ہو جائے۔ اور پھر جس طرح کسی جسمانی وجود کو باعظمت بنانے اور اس کی شوکت بڑھانے کے کسی امتیازی اور منفرد وصف و خصوصیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح جہاد وہ ضرورت ہے جس پر دین کی عظمت و شوکت اور ترقی و وسعت کا انحصار ہے اگر جہاد کو (خواہ وہ قلم سے ہو یا زبان سے اور خواہ تلوار سے ہو یا تبلیغی جدوجہد سے) اہل اسلام کے ملی وصف سے خارج کر دیا جائے تو دین ایک بے شکوہ اور بے اثر ڈھانچہ بن کر رہ جائے۔

حدیث کا آخری حصہ "زبان" سے متعلق اس ہدایت پر مشتمل ہے جو دین کو اضمحلال اور دینی گندگی کو گھن سے بچانے کے لئے ایک بڑے نفسیاتی نکتہ کی غماز ہے۔ مطلب یہ کہ دین کے وجود، دین کے بقا اور دین کی عظمت و شوکت کو پہنچانے کی جڑ زبان ہے زبان کو قابو میں رکھنا دین و دنیا کی فلاح و نجات کا پیش خیمہ ہے اور زبان کو بے قابو چھوڑ دینا خود کو دین و دنیا کی تباہی کی طرف دھکیل دینا ہے لہٰذا لازم ہے کہ زبان بند رکھی جائے یعنی منہ سے ایسے الفاظ نہ نکالے جائیں جو برائی، فحاشی اور بد کلامی کے حامل ہوں، وہ برے کلام جو کفر آمیز یا گناہ اور فحاشی کے ہوں، یا کسی کی غیبت کرنا، جھوٹ بولنا اور یا الزام تراشی کرنا ایسی برائیاں ہیں جن سے زبان و ذہن کی حفاظت نہ کی گئی تو سمجھ لو دوزخ کا عذاب سامنے ہے۔ دین و دنیا کی بھلائی چاہنے والے اور ابدی نجات و سعادت کے طلب گار اسی لئے اپنی زبان پر قابو رکھتے ہیں کہ نہ معلوم کب اس سے کوئی ایسا لفظ و کلام نکل جائے جس سے کفر بکنا یا گناہ و معصیت کی بات کہنا لازم آجائے اور پھر اس کی پاداش میں اللہ کا عذاب بھگتنا پڑے۔ درحقیقت "زبان" بہت بڑی وجہ سعادت بنتی ہے جب اس سے نیک کلام اچھی باتیں، خیر و بھلائی کے الفاظ اور وعظ و نصیحت کے جملے نکلتے ہیں، دنیا و آخرت میں اسی انسان کا رتبہ بلند مانا جاتا ہے جو "زبان" کی عظمت و تقدیس کو ہر حال میں ملحوظ رکھے۔ بد کلامی اور بری باتوں سے بہر صورت اجتناب کرتا ہو۔

ایمان کامل کیا ہے؟

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ

---

[1] یہ ایک محاورہ ہے جو عربی زبان میں اظہار تعجب کے لئے بولا جاتا ہے۔

اِستَکمَلَ الْاِیْمَانَ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ مَعَ تَقْدِیْمٍ وَّتَاخِیْرٍ وَفِیْہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَہٗ۔

"اور حضرت ابی امامہ[1] کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ ہی کے لئے محبت کرے اور اللہ ہی کے لئے بغض وعداوت رکھے اور اللہ ہی کے لئے خرچ کرے اور اللہ ہی کے لئے خرچ نہ کرے تو یقیناً اس نے ایمان کو کامل کیا" (ابوداؤد) اور ترمذی نے اس روایت کو معاذ بن انسؓ سے کسی قدر تقدیم وتاخیر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جس کے آخری الفاظ یہ ہیں "تو یقیناً اس نے اپنے ایمان کو کامل کیا۔"

تشریح: مطلب یہ کہ بندہ جو کام بھی کرے محض اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے کرے، اس کا کوئی بھی فعل وعمل کسی غرض فاسد، جذبۂ نام ونمود اور نمائش وریا کے تحت نہ ہو۔ مثلاً اگر وہ کسی سے محبت وتعلق رکھتا ہے یا کسی سے دشمنی وعداوت رکھتا ہے تو اس کی بنیاد محض نفس کی خواہش یا کسی دنیاوی مقصد وغرض پر نہ ہو بلکہ یہ دیکھے کہ کس شخص سے محبت رکھنا اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے اور کس سے نفرت ودشمنی رکھنا اللہ کو مطلوب ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے نیک وصالح اور فرمانبردار بندوں سے محبت کرنا چونکہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے اس لئے وہ اس شخص سے محبت وتعلق رکھے جو نیک، صالح، اطاعت گزار اور مخلص مؤمن ومسلمان ہو اور چونکہ ایسے شخص سے بغض وعداوت رکھنا ہی اللہ کو مطلوب ہے جو سرکش ونافرمانبردار ہو اس لئے اس سے بغض وعداوت رکھے اور اس سے محبت کا تعلق قائم نہ کرے۔ اسی طرح اپنا مال خرچ کرنے اور خرچ نہ کرنے کے بارہ میں بھی اللہ ہی کی رضا وخوشنودی کو سامنے رکھے یعنی اگر خرچ کرے تو ایسی جگہ اور ایسے مصارف میں خرچ کرے جہاں خرچ کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے اور جن مصارف میں خرچ کرنا اللہ کو مطلوب وپسندیدہ ہے، جہاں خرچ کرنا نہ صرف یہ کہ کوئی ثواب کا کام نہیں ہے بلکہ گناہ کو لازم کرتا ہے وہاں خرچ کرنے سے اجتناب کرے اور کسی ایسے شخص یا جماعت کے ساتھ مالی امداد ومعاونت نہ کرے جو اللہ کی نظر میں مقبول وپسندیدہ نہ ہو یہی وہ چیز ہے جس کو تکمیل ایمان کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

سب سے افضل عمل کیا ہے

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ الْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "(باطنی) اعمال میں سب سے افضل مرتبہ اس عمل کا ہے کہ اللہ ہی کے لئے (کسی سے) محبت ہو اور اللہ ہی کے لئے (کسی سے) بغض وعداوت رکھی جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اگر بندہ کا احساس اتنا لطیف اور اس کا جذبہ اتنا پاکیزہ ہو جائے تو ظاہر ہے کہ قدم قدم پر یہی روشنی اس کی راہنمائی کرتی رہے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بری باتوں اور گناہوں سے بچتا رہے گا اور اچھی باتیں اور نیک کام کرتا رہے گا اسی لئے اس جذبہ کو بہترین عمل قرار دیا گیا ہے۔

سچا مؤمن کون ہے

(۲۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَہُ النَّاسُ عَلٰی دِمَآئِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَزَادَ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ بِرِوَایَةِ فُضَالَةَ وَالْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَہٗ فِیْ طَاعَةِ اللّٰہِ وَالْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ الْخَطَایَا وَالذُّنُوْبَ۔

---

[1] اصل نام صدی بن عجلان بن حارث ہے مگر اپنی کنیت ابوامامہ سے مشہور ہیں، آپ قبیلہ باہلہ کی ایک شاخ سہم سے تعلق رکھتے تھے اس لئے آپ "باہلی سہمی" کہلاتے تھے آپ کی وفات ۸۱ھ میں بیان کی گئی ہے۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" (کامل اور سچا) مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان (کی ایذا سے) مسلمان محفوظ رہیں اور (پکا و صادق) مؤمن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان و اپنے مال کو مامون سمجھیں" (ترمذی و نسائی) اور شعب الایمان میں بیہقی نے فضالہؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں اور (حقیقی) مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت و عبادت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور (اصل) مہاجر وہ ہے جس نے تمام چھوٹے اور بڑے گناہوں کو ترک کر دیا۔"

تشریح: صحیح معنی میں مؤمن وہی ہے جس کا وجود مخلوق خدا کے لئے باعث اطمینان و راحت ہو، لوگوں کو اس پر پورا پورا اعتماد بھروسہ ہو۔ اس کی امانت و دیانت، عدالت و صداقت اور اخلاق و پاکیزگی اس طرح نمایاں ہو کہ نہ تو کسی کو اپنے مال کے ہڑپ کر لئے جانے کا خوف ہو اور نہ کسی کو اس کی طرف سے اپنی جان و آبرو کے نقصان کا خدشہ، اور نہ کسی کے دل میں اس کی جانب سے کسی اور طرح کا خوف و ہراس ہو۔

حقیقی مجاہد بھی وہ نہیں ہے جو دشمنوں سے جنگ کرتا ہے بلکہ مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس امارہ سے جہاد کرتا ہے اور اللہ کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے لئے اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی خاطر نفس کی تمام خواہشات کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

ایسے ہی حقیقی مہاجر بھی وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو ترک کر دیا ہے جن سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے منع کر رکھا ہو اس لئے کہ ہجرت کی حکمت یہی ہے کہ مؤمن طاعت الٰہی میں بغیر کسی رکاوٹ کے مصروف رہے اور اللہ نے جن چیزوں سے منع کر دیا ہے ان سے بچتا رہے۔ مہاجر کی حقیقی شان یہی ہے۔

امانت اور ایفاء عہد کی اہمیت

(۳۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ۔ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا خطبہ کم دیا ہو گا جس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ جس شخص میں امانت نہیں اس کا ایمان بھی کچھ نہیں اور جس میں ایفاء عہد نہیں اس کا دین بھی کچھ نہیں۔" (شعب الایمان)

تشریح: امانت و دیانت اور ایفاء عہد وہ اعلیٰ اوصاف ہیں جن کا ہر مسلمان و مؤمن میں ہونا ضروری ہے ان اوصاف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بھی وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے یا خطبہ دیا کرتے تھے، تو امانت و دیانت اور ایفائے عہد کے بارہ میں ضرور تاکید فرمایا کرتے تھے اس لئے مؤمن کی فطرت ہی امانت و دیانت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے اندر ان اوصاف کے جوہر فطری طور پر ہوتے ہیں جو زندگی کے ہر موڑ پر نیکی و بھلائی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ اسی طرح ایفاء عہد بھی فطرت سلیم اور ایمان کا خاصہ ہے اسی لئے فرمایا گیا کہ جس شخص کے اندر یہ اوصاف نہیں ہوں گے وہ دین و ایمان کی حقیقی لذت سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکے گا، تاہم اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا ایمان بالکل ہی ختم ہو جائے گا بلکہ ان اوصاف کی اہمیت و عظمت کی بنا پر مبالغہ سے کام لیا گیا اور تاکیداً اس طرح فرمایا گیا تاکہ ان کی اہمیت دلوں میں بیٹھ جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ابدی نجات کی ضمانت

(۳۱) عَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ شَھِدَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ

مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جس شخص نے (سچے دل سے) اس بات کی گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ (اپنے فضل وکرم سے) اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دے گا۔" (مسلم)

توحید کی اہمیت

(۳۲) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَّاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عثمانؓ[1] بن عفانؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے اس (پختہ) اعتقاد پر وفات پائی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو وہ جنتی ہے۔" (مسلم)

جنّت اور دوزخ کو واجب کرنے والی باتیں

(۳۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْمُوْجِبَتَانِ قَالَ مَنْ مَّاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ وَمَنْ مَّاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ[2] کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا "دو باتیں (جنت اور دوزخ کو) واجب کرنے والی ہیں،" "ایک صحابیؓ نے عرض کیا" یارسول اللہ (جنّت ودوزخ کو) واجب کرنے والی وہ دو باتیں کونسی ہیں؟" آپ نے فرمایا "پہلی بات تو یہ کہ جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا تھا تو وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا (اور دوسری بات یہ کہ) جس شخص کی وفات اس حال میں ہوئی کہ اس نے کسی کو اللہ کا شریک نہ کیا تھا تو وہ جنت میں جائے گا۔" (مسلم)

تشریح: ان احادیث کا مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان لایا اور اللہ کی وحدانیت اور اس کے ساتھ ساتھ رسول کی رسالت کا عہد و اقرار کیا اور پھر اس عہد و اقرار کے تمام تقاضوں کو پورا کیا یعنی شریعت و دین کی پوری پوری پیروی کی اور پھر اسی اعتقاد و اطاعت پر اس کی موت آئی تو یہ یقیناً جنّتی ہے۔ اس کی نجات میں بظاہر کوئی شبہ نہیں ہوگا لیکن اگر ایمان و اسلام کے بعد اس سے عمل کی کوتاہیاں سرزد ہوئیں یا شریعت پر عمل نہیں کیا مگر خاتمہ اس کا بھی ایمان پر ہوا تو اس کی بھی ابدی نجات تو یقیناً ہوگی لیکن اس سے دنیا میں جو کچھ بد اعمالیاں ہوئیں یا گناہ سرزد ہوئے ان پر اس کو آخرت کی سزا بھگتنی ہوگی، سزا کے بعد پھر ہمیشہ کے لئے جنّت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابدی نجات کا دارومدار ایمان پر ہے اگر ایمان صحیح ہے اور اسی حالت میں موت واقع ہوئی ہے تو ابدی نجات میں کوئی شک نہیں۔ اور اگر کسی نے شریعت پر عمل نہیں کیا، احکام خداوندی و احکام رسول کی پیروی نہیں کی تو اس پر سزا کا ہونا بھی یقینی ہے مگر اس سزا کا تعلق بھی ایک محدود مدت سے ہوگا، سزا پوری کرنے کے بعد وہ بھی ابدی نجات کی سعادت سے نوازا جائے گا۔

عقیدۂ توحید پر قائم رہنے والوں کے لئے جنّت کی بشارت

(۳۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كُنَّا قُعُوْدًا حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَنَا اَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرُ فِيْ نَفَرٍ فَقَامَ رَسُوْلُ

---

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تیسرے خلیفہ اور مشہور و معروف صحابی ہیں، حضورؐ کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے آپ کے عقد میں آئیں اسی وجہ سے آپ کا لقب ذوالنورین ہے۔ واقدی کے بیان کے مطابق ۸ ذی الحجہ ۳۵ھ میں بروز جمعہ آپ کو باغیوں نے مدینہ منورہ میں شہید کیا۔

[2] معروف انصاری صحابی ہیں آپ کے والد کا نام عبداللہ اور آپ کی کنیت ابوعبداللہ بیان کی گئی ہے۔ ۹۴ سال کی عمر میں ۶۲ھ میں وفات پائی۔

اللہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ بَیْنِ اَظْھُرِنَا فَاَبْطَأَ عَلَیْنَا وَخَشِیْنَا اَنْ یُّقْتَطَعَ دُوْنَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا فَکُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَخَرَجْتُ اَبْتَغِیْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی اَتَیْتُ حَائِطًا لِلْاَنْصَارِ لِبَنِی النَّجَّارِ فَدُرْتُ بِہٖ ھَلْ اَجِدُ لَہٗ بَابًا فَلَمْ اَجِدْ فَاِذَا رَبِیْعٌ یَدْخُلُ فِیْ جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَۃٍ۔ وَالرَّبِیْعُ الْجَدْوَلُ قَالَ فَاحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَبُوْھُرَیْرَۃَ؟ فَقُلْتُ نَعَمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ مَاشَأْنُکَ قُلْتُ کُنْتَ بَیْنَ اَظْھُرِنَا فَقُمْتَ فَاَبْطَأْتَ عَلَیْنَا فَخَشِیْنَا اَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا فَکُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَاَتَیْتُ ھٰذَا الْحَائِطَ فَاحْتَفَزْتُ کَمَا یَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ وَھٰؤُلَآءِ النَّاسُ وَرَآئِیْ فَقَالَ یَا اَبَاھُرَیْرَۃَ وَاَعْطَانِیْ نَعْلَیْہِ فَقَالَ اِذْھَبْ بِنَعْلَیَّ ھَاتَیْنِ فَمَنْ لَقِیْکَ مِنْ وَرَآءِ ھٰذَا الْحَائِطِ یَشْھَدُ اَنْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُسْتَیْقِنًا بِھَا قَلْبُہٗ فَبَشِّرْہُ بِالْجَنَّۃِ فَکَانَ اَوَّلَ مَنْ لَقِیْتُ عُمَرَ فَقَالَ مَا ھَاتَانِ النَّعْلَانِ یَآ اَبَاھُرَیْرَۃَ فَقُلْتُ ھَاتَانِ نَعْلَا رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِیْ بِھِمَا مَنْ لَقِیْتُ یَشْھَدُ اَنْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُسْتَیْقِنًا بِھَا قَلْبُہٗ بَشَّرْتُہٗ بِالْجَنَّۃِ فَضَرَبَ عُمَرُ بَیْنَ ثَدْیَیَّ فَخَرَرْتُ لِاسْتِیْ فَقَالَ ارْجِعْ یَا اَبَا ھُرَیْرَۃَ فَرَجَعْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَجْھَشْتُ بِالْبُکَاءِ وَرَکِبَنِیْ عُمَرُ وَاِذَا ھُوَ عَلٰی اَثَرِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَالَکَ یَا اَبَاھُرَیْرَۃَ قُلْتُ لَقِیْتُ عُمَرَ فَاَخْبَرْتُہٗ بِالَّذِیْ بَعَثْتَنِیْ بِہٖ فَضَرَبَ بَیْنَ ثَدْیَیَّ ضَرْبَۃً خَرَرْتُ لِاسْتِیْ فَقَالَ ارْجِعْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عُمَرُ مَا حَمَلَکَ عَلٰی مَا فَعَلْتَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ اَبَعَثْتَ اَبَاھُرَیْرَۃَ بِنَعْلَیْکَ مَنْ لَقِیَ یَشْھَدُ اَنْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُسْتَیْقِنًا بِھَا قَلْبُہٗ بَشَّرَہٗ بِالْجَنَّۃِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یَّتَّکِلَ النَّاسُ عَلَیْھَا فَخَلِّھِمْ یَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَخَلِّھِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) چند صحابہ رسول اللہ ﷺ کے گرد بیٹھے تھے اور ہمارے ساتھ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ بھی تھے کہ رسول اللہ ﷺ اچانک ہمارے درمیان سے اٹھے اور کہیں باہر تشریف لے گئے۔ جب آپ ﷺ کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی (اور واپس تشریف نہیں لائے) تو ہمیں سخت تشویش ہوئی کہ کہیں ہماری غیر موجودگی میں کسی دشمن کی جانب سے آپ (ﷺ) کو کوئی ایذا نہ پہنچ جائے (اس خیال سے) ہم گھبرائے اور اٹھ کھڑے ہوئے، چونکہ سب سے پہلا شخص میں تھا جو گھبرا اٹھا اس لئے (سب سے پہلے) میں رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں باہر نکلا اور ڈھونڈتا ہوا قبیلہ بنی نجار کے ایک انصاری کے باغ کے قریب پہنچ گیا (اس خیال سے کہ شاید آپ ﷺ اس باغ کے اندر ہوں) میں نے (اندر جانے کے لئے) چاروں طرف دروازہ تلاش کیا مگر (اضطراب اور گھبراہٹ میں) دروازہ نظر نہیں آیا۔ اچانک ایک نالی نظر آئی جو باہر کے کنوئیں سے باغ کے اندر جا رہی تھی لہٰذا میں سمٹ سکڑ کر اس نالی میں داخل ہوا اور اس کے ذریعہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں پہنچ گیا۔ آپ ﷺ نے (اس طرح اچانک اپنے سامنے مجھے دیکھ کر حیرت سے) فرمایا، ابوہریرہ تم؟ میں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ (ﷺ) ہمارے درمیان تشریف فرما تھے پھر آپ (ﷺ) اٹھے اور چل دیے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور واپس نہیں ہوئے تو ہم گھبرا گئے کہ کہیں ہماری عدم موجودگی میں (خدانخواستہ) آپ (ﷺ) کسی حادثہ سے دوچار نہ ہو جائیں اور سب سے پہلے گھبراہٹ مجھ پر طاری ہوئی چنانچہ آپ (ﷺ) کو ڈھونڈھتا ہوا اس باغ تک آنکلا (یہاں دروازہ نظر نہیں آیا) تو لومڑی کی طرح سکڑ کر (نالی کے راستہ سے) اندر گھس آیا، بقیہ لوگ بھی میرے پیچھے آرہے ہوں گے (یہ سن کر) آپ ﷺ نے اپنی دونوں جوتیاں نکال کر مجھے دیں اور فرمایا "اے ابوہریرہ! جاؤ اور ان جوتیوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ (تاکہ لوگ جان لیں کہ تم میرے پاس سے آئے ہو) اور باغ کے باہر جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد سے یہ گواہی دیتا ہوا تمہیں ملے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس کو جنت کی بشارت دے دو۔" (حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اس پیغام کو لے کر میں باہر نکلا تو) سب سے پہلے حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا ابوہریرہ! یہ جوتیاں کیسی ہیں؟ میں نے کہا یہ جوتیاں رسول اللہ ﷺ کی ہیں آپ نے مجھے یہ جوتیاں (نشانی کے طور پر) دے کر اس لئے بھیجا ہے کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ

یہ گواہی دیتا ہوا ملے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو میں اس کو جنت کی بشارت دے دوں (یہ سنتے ہی) عمرؓ نے میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل نیچے گر پڑا اور پھر انہوں نے کہا ابوہریرہ جاؤ واپس جاؤ۔ چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس لوٹ آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ادھر عمرؓ کا خوف مجھ پر سوار ہی تھا اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ پہنچے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے (یہ حالت دیکھ کر) فرمایا۔ "ابوہریرہ! کیا ہوا!" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! (میں آپ (ﷺ) کا پیغام لے کر باہر نکلا تو) سب سے پہلے میری ملاقات عمرؓ سے ہوئی۔ میں نے آپ (ﷺ) کا وہ پیغام ان تک پہنچایا (انہوں نے اس کو سنتے ہی) میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ میں سیرین کے بل زمین پر آ پڑا اور پھر انہوں نے کہا کہ واپس چلے جاؤ، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے (حضرت عمرؓ سے) پوچھا "عمرؓ تم نے ایسا کیوں کیا؟" انہوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) پر میرے ماں باپ قربان، کیا واقعی آپ (ﷺ) نے ابوہریرہ کو اپنی جوتیاں دے کر اس لئے بھیجا تھا کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوا ملے اس کو یہ جنت کی بشارت دے دیں؟ آنحضرت نے فرمایا، ہاں! عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایسا نہ کیجئے، مجھے ڈر ہے کہ لوگ کہیں اسی بشارت پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں (اور عمل کرنا ہی چھوڑ دیں) اس لئے آپ (ﷺ) انہیں (زیادہ سے زیادہ) عمل میں لگا رہنے دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (اگر تمہارا یہی مشورہ ہے) تو پھر لوگوں کو عمل میں لگا رہنے دو۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت نے جنت کی جو بشارت حضرت ابوہریرہ کے ذریعہ لوگوں تک پہنچانا چاہی تھی اس کا تعلق عقیدۂ توحید اور ایمان باللہ میں اخلاص اور پختگی کے ساتھ تھا، مطلب یہ کہ جس شخص نے اس کیفیت کے ساتھ اللہ کو ایک اور اپنا معبود پروردگار مان لیا اور اسی عقیدہ پر آخر تک قائم رہا کہ نہ تو وہ اپنے دل و دماغ میں کسی قسم کی کوئی گرانی، تنگی اور دباؤ محسوس کرتا ہے اور نہ اس عقیدہ کے تئیں کسی شک و شبہ کا شکار ہوتا ہے بلکہ اس کے قلب و ذہن اور احساس و فکر کی دنیا اعتماد اور اطمینان و مسرت سے سرشار رہتی ہے، کسی دنیاوی غرض و مفاد و ریاء، و نمائش اور نفاق کے بجائے خلوص و للّٰہیت اور رضائے الٰہی کا جذبہ اور تقاضا ہی اس کے ایمان اور عقیدہ کی بنیاد ہے تو ایسا شخص یقیناً جنت کی ابدی سعادتوں کا حقدار ہوگا۔

رہا سوال حضرت عمر فاروقؓ کے رویہ کا کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے قاصد حضرت ابوہریرہؓ کو اس بشارت کی اشاعت سے کیوں روک دیا اور یہ کہ ان کا رویہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں رکاوٹ ڈالنے اور ذات رسالت پناہ کی عظمت و حرمت کے منافی طرز عمل اختیار کرنے کے مترادف تھا یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس بشارت کا تعلق دین و شریعت کے کسی حکم و مسئلہ کے نفاذ و اشاعت سے تھا یا کسی خاص جذبہ و احساس کے اظہار سے۔ ظاہر ہے وہ کسی مسئلہ کی مشروعیت کی بات نہیں تھی کسی حلال یا حرام کا حکم بیان کرنا نہیں تھا، کسی فرض یا واجب کو نافذ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ تو محض رحمت دو عالم ﷺ کی نہایت شفقت و محبت کا ایک جذبہ تھا جو اہل ایمان کے تئیں بے اختیار امنڈ آیا تھا اور اس (بشارت) کی صورت میں ایک ایک صاحب ایمان تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ بشارت جب حضرت عمرؓ تک پہنچی اور انہوں نے فوری طور پر محسوس کیا کہ گو یہ بشارت اپنی جگہ ایک اہم حقیقت ہے لیکن مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اس ابتدائی مرحلہ میں اس کو عام مسلمانوں تک نہ پہنچنے دیا جائے اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر اس مصلحت و حکمت کا اظہار کر دیا جائے جس پر رحمت عالم ﷺ کی نہایت محبت و شفقت کا شدید جذبہ غالب آ گیا ہے، لہٰذا انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ابوہریرہؓ کو واپس کر دیا اور پھر فوراً آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، صورت حال کی تحقیق کے بعد جب یہ اطمینان ہو گیا کہ ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مامور تھے اور آپ ﷺ ہی نے یہ بشارت عطا فرمائی تھی تو انہوں نے اپنے محسن اور رسول کے مشن کی کامیابی اور مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک مخلص اور بیدار مغز خادم کی حیثیت سے اپنا مشورہ بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا۔ پھر یہ ہوا کہ جوں ہی حضرت عمرؓ نے اپنے مشورے میں اس مصلحت کی طرف توجہ دلائی خود آنحضرت ﷺ کا ذہن بھی ادھر منتقل ہو گیا اور آپ ﷺ خود بھی فرما ہی چکے تھے کہ اگر اس طرح کی بشارت عام مسلمانوں تک پہنچ گئی تو وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے اور عمل

کرنا چھوڑ دیں گے (دیکھئے اسی باب کی حدیث ۲۱) لہٰذا آپ ﷺ نے اپنے ایک صائب الرائے مشیر اور مخلص خادم کے مشورے کی قدر دانی فرمائی اور اس بشارت کی اشاعت کا حکم واپس لے لیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر اس بشارت کی جگہ کسی شرعی حکم کی اشاعت کا معاملہ ہوتا یا کسی فرض وواجب چیز کے نفاذ کی بات ہوتی تو خود حضرت عمرؓ کو اس میں رکاوٹ ڈالنے کی نہ جرأت ہوتی۔ اور نہ وہ حضرت ابوہریرہؓ کو واپس کر کے اس اشاعت کو روک دیتے بلکہ ایک سچے ومخلص مؤمن اور فرمانبردار خادم کی حیثیت سے سب سے پہلے اس کو قبول کرتے اور اس فرمان رسالت کی اشاعت میں خود لگ جاتے اور بفرض محال حضرت عمرؓ اگر ایسے معاملہ میں بھی وہی رویہ اختیار کرتے تو پھر بارگاہ رسالت میں نہ ان کے اس رویہ سے چشم پوشی ہوتی، اور نہ ان کے کسی مشورے اور رائے کو اہمیت اور قبولیت کا درجہ ملتا۔ کیونکہ دینی احکام اور شرعی ہدایات میں نہ کسی مشورے اور رائے کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ کسی کی رائے اور مشورہ کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔ پس یہ بات کہ بارگاہ رسالت میں حضرت عمر کی رائے کو اہمیت دی گئی اور ان کا مشورہ قبول ہوا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے مذکورہ رویہ سے نہ ان کی شان صحابیت پر کوئی فرق پڑا اور نہ رسول اللہ کی حکم عدولی ہوئی لہٰذا اس حدیث سے اگر کوئی شخص اس طرح کی بات ثابت کرتا ہے تو اس کی اپنی نادانی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس حدیث سے اگر ایک طرف اللہ کی بے پایاں رحمت اور اُمت کے تئیں رسول اللہ ﷺ کی انتہائی محبت وشفقت کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف حضرت عمرؓ کی اصابت رائے، فہم وفراست، بصیرت ودانائی اور امر حق میں ان کی صاف گوئی اور اظہار خیال کی جرأت پر بھی روشنی پڑتی ہے جو ان کا خصوصی وصف کمال ہے۔

جنّت کی کنجی

(۳۵) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَفَاتِیْحُ الْجَنَّةِ شَھَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

(رواہ احمد)

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے مجھ سے فرمایا (سچے دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جنّت کی کنجیاں (حاصل کرنا) ہے۔" (احمدؒ)

کلمہ توحید نجات کا ذریعہ

(۳۶) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ اِنَّ رِجَالًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ تُوُفِّیَ حَزِنُوْا عَلَیْہِ حَتّٰی کَادَ بَعْضُھُمْ یُوَسْوِسُ قَالَ عُثْمَانُ وَکُنْتُ بَعْضَھُمْ فَبَیْنَا اَنَا جَالِسٌ مَرَّ عَلَیَّ عُمَرُ وَسَلَّمَ فَلَمْ اَشْعُرْ بِہٖ فَاشْتَکٰی عُمَرُ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ ثُمَّ اَقْبَلَا حَتّٰی سَلَّمَا عَلَیَّ جَمِیْعًا فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ مَا حَمَلَکَ عَلٰی اَنْ لَّا تَرُدَّ عَلٰی اَخِیْکَ عُمَرَ سَلَامَہٗ قُلْتُ مَا فَعَلْتُ فَقَالَ عُمَرُ بَلٰی وَاللّٰہِ لَقَدْ فَعَلْتَ قَالَ قُلْتُ وَاللّٰہِ مَا شَعَرْتُ اَنَّکَ مَرَرْتَ وَلَا سَلَّمْتَ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ صَدَقَ عُثْمَانُ قَدْ شَغَلَکَ عَنْ ذٰلِکَ اَمْرٌ فَقُلْتُ اَجَلْ قَالَ مَا ھُوَ قُلْتُ تَوَفَّی اللّٰہُ تَعَالٰی نَبِیَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ نَّسْاَلَہٗ عَنْ نَّجَاةِ ھٰذَا الْاَمْرِ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ قَدْ سَاَلْتُہٗ عَنْ ذٰلِکَ فَقُمْتُ اِلَیْہِ وَقُلْتُ لَہٗ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ اَنْتَ اَحَقُّ بِھَا قَالَ اَبُوْبَکْرٍ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا نَجَاةُ ھٰذَا الْاَمْرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَبِلَ مِنِّی الْکَلِمَةَ الَّتِیْ عَرَضْتُ عَلٰی عَمِّیْ فَرَدَّھَا فَھِیَ لَہٗ نَجَاةٌ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عثمانؓ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی تو صحابہؓ کی ایک جماعت پر رنج وحزن کا اتنا غلبہ تھا کہ ان میں بعض لوگوں کے بارہ میں تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں شک وشبہ میں گرفتار نہ ہو جائیں (یعنی اس واہمہ کا شکار ہو جائیں کہ جب رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو دین وشریعت کا قصہ بھی تمام ہو گیا) حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں سے ایک میں بھی

تھا۔ چنانچہ (اس عظیم حادثہ سے سخت پریشان خیال اور غم و اندوہ کا بت بنا) میں بیٹھا تھا کہ (اسی حالت میں) حضرت عمر میرے پاس سے گزرے اور مجھ کو سلام کیا، (حواس باختہ ہونے کی وجہ سے) مجھے پتہ نہیں چلا (کہ وہ کب میرے پاس سے گزرے اور کب سلام کیا) حضرت عمرؓ نے اس بات کی شکایت حضرت ابوبکرؓ سے کی، حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کے ساتھ میرے پاس آئے اور دونوں نے مجھے سلام کیا، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے پوچھا، تم نے اپنے بھائی عمرؓ کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے کہا! ایسا نہیں ہوا۔ (یعنی مجھے اس کا علم نہیں کہ عمرؓ نے آکر مجھے سلام کیا ہو اور میں نے جواب نہ دیا ہو) حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا! بخدا مجھے قطعًا اس کا احساس نہیں کہ آپ میرے پاس آئے تھے اور نہ ہی آپ نے سلام کیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا عثمانؓ سچ کہتے ہیں، (لیکن معلوم ہوتا ہے کہ) کسی خاص وجہ نے تمہیں اس سے باز رکھا (کہ نہ تو عمرؓ کے آنے کی تمہیں خبر ہوئی اور نہ تم ان کے سلام کا جواب دے سکے) میں نے کہا! ہاں ہو سکتا ہے، انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ میں نے کہا (سرکار دو عالم ﷺ کی وفات ہی کیا کم صبر آزما تھی کہ اب یہ غم بھی کھائے لیتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن ہم آپ ﷺ سے یہ دریافت نہ کر سکے کہ اس معاملہ یعنی عبادت میں وسوسوں کا پیدا ہونا، شیطان کا بہکانا، یا دوزخ کی آگ) سے نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ ابوبکرؓ نے فرمایا! (تم غم نہ کھاؤ) میں اس بارہ میں آں حضور ﷺ سے پہلے پوچھ چکا ہوں، حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ) میں (بے اختیار) کھڑا ہو گیا اور بولا: آپ پر میرے ماں باپ قربان، واقعی آپ ہی (آنحضور سے کمال رکھنے اور حصول علم کے غلبۂ شوق کی وجہ سے) اس بارہ میں سوال کرنے کے لئے لائق تر تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا! میں نے عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ! اس معاملہ میں نجات کی کیا صورت ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جس شخص نے (خلوص دل کے ساتھ) ہم سے وہ کلمۂ توحید قبول کر لیا جسے میں نے چچا ابوطالب کے سامنے پیش کیا تھا اور انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا تھا تو وہ کلمہ اس شخص کی نجات کا ضامن ہوگا۔" (احمد)

تشریح: گویا کلمۂ توحید کے یہ فضائل و برکات ہیں کہ جس شخص نے اس کلمہ کو صدق دل سے اور پختہ اعتقاد کے ساتھ قبول کر لیا اور اس کے تقاضوں کو پورا کر کے دین کے فرائض پر عمل کیا تو وہ کلمۂ آخرت میں اس کی نجات کا ضامن ہوگا اور کلمہ گو اس کی برکتوں سے وہاں کی سعادتوں سے نوازا جائے گا اور اگر اس کلمہ کا ورد رکھا جائے اور اس کو اکثر پڑھا جاتا رہے اور اللہ کا ذکر پابندی سے رہے تو دنیا میں بھی اس کی برکت اس طرح ظاہر ہوگی کہ اس کلمہ کی بدولت فکر و خیال اور عمل پر شیطان کو تسلط حاصل نہیں ہو پائے گا کہ نہ واہمے اور وسوسے پیدا ہوں گے، نہ نماز و عبادت کے دوران خیالات بھٹکتے پھریں گے اور نہ دل و دماغ شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنیں گے بلکہ اس مبارک ورد و ذکر سے ذات الٰہی کی معرفت حاصل ہوگی، آخرت سے لگاؤ ہوگا اور رسول برحق ﷺ سے محبت و تعلق کی خاص کیفیت پیدا ہوگی۔

پوری دنیا میں کلمہ توحید پہنچنے کی پیشگوئی

(۳۷) وَعَنِ الْمِقْدَادِ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَّذُلِّ ذَلِيْلٍ اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا قُلْتُ فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (رواه احمد)

"اور حضرت مقدادؓ [1] سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا! زمین کے اوپر کوئی گھر، خواہ وہ مٹی کا ہو یا خیمہ کا، ایسا باقی نہ رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو معزز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی رسوائی کے ساتھ داخل نہ کرے (چنانچہ جو لوگ اس کلمہ کو بخوشی اور صدق دل سے قبول کر لیں گے) ان کو اللہ تعالیٰ معزز مفتخر بنائے گا اور اس کلمہ کا اہل قرار دے گا اور (جو لوگ بخوشی قبول

---

[1] آپ مقداد بن اسود کندی کے نام سے مشہور ہیں اور قدیم الاسلام ہیں، مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر مقام جرف میں بعمر ۷۰ سال انتقال ہوا نعش مبارک وہاں سے مدینہ منورہ لائی گئی اور جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔

نہیں کریں گے) ان کو اللہ تعالیٰ ذلیل کرے گا اور وہ لوگ اس کلمہ کے مطیع و فرمانبردار ہونے پر مجبور ہوں گے (بایں طور کہ وہ جزیہ ادا کر کے ہی اسلامی ریاست میں رہ سکیں گے) میں نے (یہ سن کر) کہا: پھر تو چاروں طرف اللہ ہی کا دین ہو گا۔" (احمدؒ)

تشریح: "زمین" سے مراد "جزیرۃ العرب" ہے، اسی طرح مٹی اور خیمہ کے گھر سے مراد جزیرۃ العرب کے شہر اور گاؤں ہیں یعنی پورے عرب میں صرف ایک دین "اسلام" کا بول بالا ہو گا اور صرف اسی کے پیرو متبعین سرزمین عرب پر ہوں گے کوئی مکان خواہ اس شہر کا ہو یا دیہات کا ایسا باقی نہ رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کا کلمہ نہ پہنچادے گا اگر کوئی بخوشی اور برغبت ایمان لے آئے گا اور اسلام قبول کر لے گا تو اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس کا مرتبہ بلند ہو جائے گا اور خدائے تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں جگہ اس کو عزت و سرفرازی سے نوازیں گے، لیکن جو لوگ غرور و سرکشی اختیار کریں گے یعنی اس کلمہ کو قبول کر کے دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوں گے اور رضا و رغبت کے ساتھ دین کے تابعدار نہیں ہوں ہوں گے وہ ذلت کا طوق خود اپنے گلے میں ڈالیں گے بایں طور پر کہ جب تمام جزیرۃ العرب پر دین اسلام کی عملداری ہو جائے گی تو وہ کافر و سرکش لوگ جزیہ کی ادائیگی کی صورت میں اسلامی نظام حکومت کا تابعدار بننے پر مجبور ہوں گے اور اس طرح نہ صرف اس دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کو بے وقعت اور کم تر بنادے گا بلکہ آخرت میں بھی ان کو اپنی رحمت سے دور رکھے گا اور سخت عذاب میں مبتلا کر کے ذلیل و رسوا کرے گا۔

جنّت کی کنجی

(۳۸) وَعَنْ وَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ قِيلَ لَهُ اَلَيْسَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لَيْسَ مِفْتَاحٌ اِلَّا وَلَهُ اَسْنَانٌ فَاِنْ جِئْتَ بِمِفْتَاحٍ لَهُ اَسْنَانٌ فُتِحَ لَكَ وَاِلَّا لَمْ يُفْتَحْ لَكَ۔ (رواہ البخاری فی ترجمۃ باب)

"اور حضرت وہبؒ[1] بن منبہؒ سے روایت ہے کہ کسی نے ان سے سوال کیا، کیا لا الہ الا اللہ جنت کی کنجی نہیں ہے؟ وہبؒ نے کہا بے شک، لیکن کنجی میں دندانے بھی ضروری ہیں پس اگر تم ایسی کنجی لے کر آئے جس میں دندانے موجود ہیں تو (یقیناً) اس سے جنت کے دروازے کھل جائیں گے ورنہ تمہارے جنّت کے دروازے نہیں کھلیں گے۔" (بخاری ترجمۃ الباب)

تشریح: حضرت وہب بن منبہ اپنی مجلس وعظ و نصیحت میں لوگوں کو عمل کی اہمیت بتا رہے تھے اور اس کے ترک پر تنبیہ کر رہے تھے کسی نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مبارک (حدیث ۳۵) کا سہارا لے کر کہا کہ آپ تو عمل کے بارے میں اس شدومد کے ساتھ متنبّہ فرما رہے ہیں حالانکہ لا الہ الا اللہ جنت کی کنجی ہے یعنی جس نے صدق دل سے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کر لیا وہ جنّت کا حقدار ہو گیا خواہ اس کی عملی زندگی دوسری نیکیوں اور صالح اعمال سے بھرپور ہو یا نہ ہو۔

اس پر وہب بن منبہؒ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ لا الہ الا اللہ جنّت کی کنجی ہے، لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کنجی اس وقت کام کرتی ہے جب کہ اس میں دندانے بھی ہوں۔ اگر کسی کنجی میں دندانے نہیں ہیں تو ظاہر ہے اس سے قفل نہیں کھل سکتا، اسی طرح لا الہ الا اللہ اگر جنّت کی کنجی ہے تو اس کنجی کے دندانے شریعت کے احکام و فرائض ہیں۔ پس جو شخص شریعت کے احکام و قوانین پر عمل نہیں کرے گا تو گویا وہ آخرت میں ایسی کنجی لے کر آئے گا جس میں داندانے نہیں ہوں گے اور جب اس کی کنجی میں دندانے نہیں ہوں گے تو وہ جنّت کا دروازہ کھول نہیں پائے گا۔ جنّت کا دروازہ اسی صورت میں کھلے گا جب کلمۂ توحید کی صداقت کا ایمان موجود ہو، زبان سے اس ایمان کا اقرار ہو اور عملی زندگی اس ایمان کی مظہر ہو بایں طور کہ دین و شریعت کی اتباع اور فرمانبرداری ایک ایک عمل سے ظاہر ہو۔

یا پھر دندانوں سے مراد نیک اعمال ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جب تک اعمال نیک نہ ہوں گے، جنّت کے دروازے ابتداء نہیں کھل سکتے، ہاں بعد میں جب بداعمالیوں کی سزا مل جائے گی اور گناہ و معصیت کے دھبے دھل جائیں گے تو جنّت کے دروازے

[1] وہب بن منبہ تابعی ہیں کنیت ابو عبداللہ ہے۔ ۱۱۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

کھول دیے جائیں گے۔

نیکی کا اجر

(۳۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُكُمْ اِسْلَامَهٗ فَكُلُّ حَسَنَةٍ یَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰی سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ وَكُلُّ سَیِّئَةٍ یَعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا حَتّٰی لَقِیَ اللّٰهَ۔ (متفق علیه)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص (صدق دل اور اخلاص نیت کی بنا پر) اپنے ایمان کو اچھا بنالیتا ہے تو وہ بھی جو نیک عمل کرتا ہے اس پر اس کے اعمالنامہ میں اس جیسی دس سے لے کر سات سو تک نیکیوں کا زائد اجر لکھا جاتا ہے اور وہ جو برا عمل کرتا ہے اس پر اس کے نامۂ اعمال میں اس ایک ہی عمل کا گناہ لکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ سے ملاقات کرے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس اُمت کو اللہ نے اپنے فضل وکرم اور خصوصی احسان کے تحت جن خاص انعامات سے نوازا ہے ان میں سے ایک بہت بڑا انعام یہ بھی دیا ہے کہ جب کوئی شخص مخلص اور صادق مؤمن نیک عمل کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کی رحمت بے حساب اس کا اجر صرف اسی ایک عمل کے برابر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس جیسے دس عمل کا ثواب اس کو دیا جاتا ہے اور اس پر بھی بس نہیں ہوتا بلکہ جوں جوں ایمان میں صدق واستقامت اور عمل میں خلوص ونیک نیتی بڑھتی جاتی ہے اسی قدر اجر وانعامات بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی نیک عمل پر سات سو تک بلکہ اس سے بھی زیادہ اجر عنایت فرمائے جاتے ہیں، بلکہ بعض حالات میں تو یہ اضافہ سینکڑوں اور ہزاروں کی حد سے بھی تجاوز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر حرم پاک میں کوئی نیک عمل کیا جائے تو اس مقدس جگہ کی عظمت وفضیلت کے طفیل میں اس پر ایک لاکھ اجر لکھے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر مؤمن سے بتقضائے بشریت کوئی برائی سرزد ہو جاتی ہے تو اس کا گناہ اضافہ کے ساتھ نہیں لکھا جاتا بلکہ جیسی برائی سرزد ہوتی ہے ویسا ہی یا اتنا ہی گناہ لکھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس احسان کرم کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

ایمان کی عظمت

(۴۰) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَیِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَمَا الْاِثْمُ قَالَ اِذَا حَاكَ فِیْ نَفْسِكَ شَیْءٌ فَدَعْهُ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: (یا رسول اللہ) ایمان کی سلامتی کی علامت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا! جب تمہاری نیکی تمہیں بھلی لگے۔ اور تمہاری برائی تمہیں بُری لگے تو (سمجھو کہ) تم (پکے) مؤمن ہو، پھر اس شخص نے پوچھا، یا رسول اللہ! گناہ (کی علامت) کیا ہے؟ آنحضور نے فرمایا! جب کوئی بات تمہارے دل میں کھٹک اور تردد پیدا کرے (تو سمجھو کہ وہ گناہ ہے) لہٰذا اس کو چھوڑ دو۔" (احمدؒ)

تشریح: سوال کا مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسی واضح علامت بتادی جائے جس کے ذریعہ ایمان کی سلامتی واستقامت کا اندازہ کیا جاسکے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اپنے اندر یہ کیفیت پاؤ کہ جب کوئی اچھا کام کرتے ہو تو تمہارا قلب ودماغ اس کام کی بھلائی کو خود محسوس کرتا ہے اور ایک خاص قسم کی طمانیت اور آسودگی پاتا ہے۔ احساس وشعور کی دنیا اللہ کی طرف سے نیکی کی توفیق اور مدد پانے پر فرحاں وشاداں اور رب کریم کی خوشنودی وقربت کی طلب گاری وامیدواری سے معمور ہو جاتی ہے۔ یا یہ کہ جب بتقضائے بشریت تم سے کوئی ایسا فعل صادر ہو جاتا ہے جو واضح طور پر گناہ ومعصیت کا کام سمجھا جاتا ہے تو فوراً تمہارا دل اللہ کے خوف سے بھر جاتا ہے اور

پروردگار کی ناراضگی کا احساس کر کے شرمسار و نادم ہو جانا تو سمجھ لو کہ ایمان تمہارے دل و دماغ میں رچ بس گیا ہے اور تم پکے مؤمن ہو گئے ہو۔ کیونکہ اور بدی کے درمیان امتیاز کرنا اور ثواب اور گناہ کا احساس و شعور پیدا کرنا صرف ایمان کے خاصہ ہے۔ اخروی جزا اور سزا کا اعتقاد جو قلب مؤمن میں ہوتا ہے، وہ غیر مؤمن کے قلب میں نہیں ہوتا۔

دوسرے سوال کا مطلب دراصل یہ تھا کہ مؤمن کو اپنی روزمرہ زندگی میں بعض ایسی چیزوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے جن کے بارہ میں واضح طور پر علم نہیں ہوتا کہ آیا یہ چیز شرعی نقطہ نظر سے برائی کے حکم میں ہے اور اس سے کوئی گناہ لازم آتا ہے یا اس کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے تو ایسے مشتبہ عمل کی برائی یا بھلائی کو پہچاننے کی علامت کیا ہے؟ اس کے جواب میں سرکار دو عالم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ سچے اور پاکباز مؤمن کا قلب دراصل فطرت کی ایسی پاکیزہ لوح ہے جس پر صرف اسلامی اطاعت و فرمانبرداری اور نیکی و بھلائی ہی کے نقوش ابھر سکتے ہیں، اگر گناہ و معصیت کا ہلکا سا دھبہ بھی وہاں پہنچتا ہے تو اس کو کوئی جگہ نہیں ملتی اور وہ کھٹک و تردد کی صورت میں منڈلاتا پھرتا ہے پس کسی بھی عمل اور چیز کے بارے میں اگر یہ کیفیت ظاہر ہو کہ فطرت سلیم اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتی، قلب اس کا بوجھ محسوس کرتا ہے اور دماغ میں خلش و تردد پیدا ہو گیا ہے تو جانو کہ وہ عمل برائی کا حامل ہے اور گناہ و معصیت کو لازم کرنے والا ہے، اور نجات و فلاح اسی میں ہے کہ اس چیز کو فوراً چھوڑ دیا جائے یہی وجہ ہے کہ ارباب باطن اور اولیاء اللہ قلب و دماغ کی صفائی اور پاکیزگی کی بنا پر کسی عمل کی پوشیدہ ترین برائی کو بھی پہچان لیتے ہیں اور کسی بھی ایسی چیز کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے جو گناہ و معصیت کا ہلکا سا شائبہ بھی رکھتا ہو۔ ان کے ہاں "مشتبہ عمل" سے بھی اسی درجہ کا اجتناب برتا جاتا ہے، جتنا اجتناب وہ کھلے ہوئے برے اعمال سے کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا دل و دماغ برائی کے شائبہ کو بھی بھانپ لیتا ہے اور ان کو اطمینان قلب اور عمل کا سرور صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب ان کا کوئی قدم راہِ مستقیم سے ہٹا ہوا نہیں ہوتا اور ان کا کوئی کام دین و شریعت کی روح کے منافی نہیں ہوتا۔

ایمان و اسلام کی باتیں

(۴۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ مَّعَکَ عَلٰی ھٰذَا الْاَمْرِ قَالَ حُرٌّ وَ عَبْدٌ قُلْتُ مَا الْاِسْلَامُ قَالَ طِیْبُ الْکَلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ قُلْتُ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ الصَّبْرُ وَ السَّمَاحَۃُ قَالَ قُلْتُ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ قَالَ قُلْتُ اَیُّ الْاِیْمَانِ اَفْضَلُ قَالَ خُلُقٌ حَسَنٌ قَالَ قُلْتُ اَیُّ الصَّلٰوۃِ اَفْضَلُ قَالَ طُوْلُ الْقُنُوْتِ قَالَ قُلْتُ اَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ قَالَ اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ قَالَ قُلْتُ فَاَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ عُقِرَ جَوَادُہٗ وَاُھْرِیْقَ دَمُہٗ قَالَ قُلْتُ اَیُّ السَّاعَاتِ اَفْضَلُ قَالَ جَوْفُ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عمرو بن عبسہؓ راوی ہیں کہ میں سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! دعوت اسلام کے آغاز میں، اس دین (اسلام) پر آپ ﷺ کے ساتھ کون تھا؟ آپ نے فرمایا ایک آزاد (ابوبکرؓ) اور ایک غلام (بلالؓ)۔ میں نے عرض کیا اسلام کی علامت کیا ہے؟ فرمایا پاکیزہ کلامی اور (مساکین کو) کھانا کھلانا، میں نے عرض کیا ایمان کی باتیں کیا ہیں؟ فرمایا! "صبر اور سخاوت" (یعنی بری باتوں سے باز رہنا اور طاعت فرمانبرداری پر مستعد ہونا) میں نے کہا کون سا مسلمان بہتر ہے؟ فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ (کی ایذاء) سے مسلمان محفوظ رہیں، میں نے کہا: ایمان میں بہتر چیز کیا ہے؟ فرمایا "اچھے اخلاق" میں نے کہا "نماز میں کون سی چیز بہتر ہے؟ فرمایا دیر تک کھڑے رہنا، میں نے کہا کون سی ہجرت بہتر ہے؟ فرمایا "یہ کہ تم اس چیز کو چھوڑ دو جس سے تمہارا پروردگار ناخوش ہوتا ہے میں نے کہا جہاد میں افضل کون ہے! فرمایا وہ شخص افضل ہے جس کا گھوڑا مارا جائے اور خود بھی شہید ہو جائے۔ میں نے کہا: سب سے افضل کون سا وقت ہے! آپ ﷺ نے فرمایا نصف شب کا آخری حصہ۔" (احمدؒ)

ؔ آپ کا نام عمرو ہے عنبسہ کے بیٹے ہیں اور ابونجیح آپ کی کنیت ہے۔ اور حضرت علی کے دور خلافت میں انتقال فرمایا۔

ایمان اور اسلام پر مرنے والا جنّتی ہے

(۴۴) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ لَقِیَ اللّٰہَ لَا یُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا وَ یُصَلِّی الْخَمْسَ وَیَصُوْمُ رَمَضَانَ غُفِرَ لَہٗ قُلْتُ اَفَلَا اُبَشِّرُھُمْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ دَعْھُمْ یَعْمَلُوْا۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا! جس شخص نے اللہ کی طرف اس حال میں کوچ کیا کہ اس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھہرا رکھا تھا۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا تھا اور رمضان کے روزے رکھتا تھا تو وہ بخش دیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں لوگوں کو خوش خبری سنا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا! ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور عمل میں لگا رہنے دو۔" (احمدؒ)

تشریح: اس بخشش کا تعلق گناہ صغیرہ سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے اس کی بھی امید ہے کہ اگر وہ چاہے گا تو کبیرہ گناہ بھی بخش دے گا۔ ویسے گناہ کبیرہ کی سزا بھگتنے کے بعد ہی بخشش اور جنت کا استحقاق ملے گا۔ اسی لئے جب حضرت معاذ ابن جبلؓ نے اس بشارت کو عام کرنے کی اجازت چاہی تو آنحضرت ﷺ نے منع فرما دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اسی بشارت پر بھروسہ کر بیٹھیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں یا بد اعمالی میں مبتلا ہو جائیں اور گناہ و معصیت کا ارتکاب کرنے لگیں اور پھر عذاب کے مستوجب بن جائیں۔

اس حدیث میں حج اور زکوٰۃ کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ ان فرائض کا تعلق خاص طور پر صاحب استطاعت اور مالدار لوگوں سے ہے چونکہ عمومی طور پر ہر شخص زکوٰۃ و حج کی ادائیگی کی استطاعت نہیں رکھتا اس لئے صرف ان فرائض کو ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق بلا تخصیص امیر و غریب ہر شخص سے ہے جیسے نماز روزہ کہ اس میں امیر و غریب کسی کی تخصیص نہیں ہے یہ سب پر فرض ہیں۔

(۴۳) وَعَنْہُ اَنَّہٗ سَاَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ اَفْضَلِ الْاِیْمَانِ قَالَ اَنْ تُحِبَّ لِلّٰہِ وَتُبْغِضَ لِلّٰہِ وَ تُعْمِلَ لِسَانَکَ فِیْ ذِکْرِ اللّٰہِ قَالَ وَمَاذَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ وَ اَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ وَ تَکْرَہُ لَھُمْ مَا تَکْرَہُ لِنَفْسِکَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ ایمان کی اعلیٰ باتیں کیا ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (کسی سے) تمہاری محبت بھی اللہ کے لئے ہو اور بغض و عداوت بھی اللہ ہی کے لئے ہو اور تم اپنی زبان کو (خلوص دل سے) خدا کے ذکر میں مشغول رکھو، انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اس کے علاوہ اور کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا دوسروں کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ اور جس چیز کو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو اس کو دوسروں کیلئے بھی ناپسند کرو۔" (احمدؒ)

تشریح: ایمان کی بہترین باتیں یہی ہیں کہ ہر حالت میں اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا کا حصول مد نظر ہو۔ یعنی جو کام کیا جائے خواہ وہ مالی ہو یا بدنی اور یا اخلاقی۔ محض خدا کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔ علاوہ ازیں مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اخلاق و انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہو بایں طور کہ ہر ایک کا خیر خواہ بنے اور پوری برادری کی بھلائی و بہتری کو ایسا ہی اچھا جانے جیسا کہ اپنی ذات کی بھلائی کو اور دوسروں کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اسی طرح جس چیز کو اپنے لئے مضر سمجھتا ہو اور اسے ناپسند کرتا ہو دوسروں کے لئے بھی اس کو ناپسند کرے اور ان کے لئے مضر جانے۔

باب الکبائر و علامات النفاق

گناہ کبیرہ اور نفاق کی علامتوں کا بیان

"گناہ کبیرہ" کے معنی ہیں۔ بڑے گناہ! چنانچہ اصطلاح شریعت میں "گناہ کبیرہ" اس بڑے فعل کو کہتے ہیں جس کا ارتکاب کرنے والا

حد یعنی شریعت کی متعین کردہ سزا کا مستوجب ہوتا ہے، یا جس کے ارتکاب پر قرآن وحدیث میں سخت وعید وتنبیہ مذکور ہو، یا جس کے ارتکاب کو شریعت نے بطور مبالغہ ارتکاب کفر سے تعبیر کیا ہو (جیسے قصداً نماز ترک کرنے پر حدیث میں یہ وعید آئی ہے مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ یعنی جس شخص نے نماز قصداً ترک کردی وہ کافر ہو گیا) یا جس کا فساد ونقصان گناہ کبیرہ کے فساد ونقصان کے برابر یا اس سے زیادہ ہو، یا جس کی ممانعت دلیل قطعی کے ساتھ ثابت ہو اور جس کا اختیار کرنا حرمت دین کی ہتک کا موجب ہو پس جس فعل اور بات میں ان میں سے کوئی بھی چیز پائی جائے گی اس کو گناہ کبیرہ یعنی بڑا گناہ کہیں گے اور جس فعل یا بات میں ان میں سے کوئی چیز نہیں پائی جائے گی اور وہ اسلامی تعلیمات اور دینی تقاضا کے خلاف ہوگی اس کو گناہ صغیرہ یعنی چھوٹا گناہ کہا جائے گا یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بعض اعتبار سے اگرچہ گناہ کبیرہ کے مختلف درجات ہیں کہ بعض کبیرہ گناہ تو بہت ہی برے اور نہایت ہی قابل نفرت ہیں اور بعض گناہ نسبۃً کچھ ہلکے درجہ کے ہیں لیکن شریعت کی نظر میں قابل مواخذہ وگرفت اور موجب عذاب ہونے کے اعتبار سے سب یکساں نوعیت رکھتے ہیں۔

احادیث میں ایک جگہ تمام کبیرہ گناہوں کا تعین اور تفصیل کے ساتھ ذکر موجود نہیں ہے، بلکہ موقع محل کی مناسبت یا کسی سائل کو جواب میں آنحضور کی طرف سے بیان کردہ کبیرہ گناہ کچھ تو جابجا احادیث وروایت میں منقول ہیں اور کچھ دوسرے مواقع پر مذکور ہیں۔ بعض علماء مثلاً مولانا جلال الدین دوانی نے کبیرہ گناہوں کی جو فہرست مرتب کی ہے وہ مختصراً یوں ہے۔

① اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا یعنی کسی کو اس کی عبادت یا اس کی صفات میں شریک کرنا مثلاً استعانت (مدد چاہنے) میں، علم میں، قدرت میں، تصرف میں، تخلیق میں، پکارنے میں، نام رکھنے میں، ذبح کرنے میں، نذر ماننے میں اور لوگوں سے امور سونپنے میں کسی کو بھی وہ درجہ اور حیثیت دینا جو صرف اللہ تعالیٰ کی سزاوار ہے۔ ② گناہ پر اصرار ودوام کی نیت رکھنا۔ ③ ناحق کسی کو قتل کرنا ④ زنا کرنا۔ ⑤ لواطت کرنا۔ ⑥ چوری کرنا۔ ⑦ جادو سیکھنا اور جادو کرنا۔ ⑧ شراب پینا اور نشہ آور اشیاء کا استعمال کرنا۔ ⑨ محارم یعنی ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، نانی اور خالہ وغیرہ سے نکاح کرنا۔ ⑩ جوا سیکھنا اور جوا کھیلنا۔ ⑪ دار الحرب سے ہجرت نہ کرنا۔ ⑫ دشمنان دین سے ناروا دوستی اور تعلق رکھنا۔ ⑬ طاقت وقوت اور غالب حیثیت رکھنے کے باوجود دشمنان دین سے جہاد نہ کرنا۔ ⑭ سود کھانا۔ ⑮ خنزیر اور مردار کے گوشت کا استعمال کرنا۔ ⑯ نجومی اور کاہن کی تصدیق کرنا۔ ⑰ ناحق کسی کا مال ہڑپ کر لینا۔ ⑱ پاکباز مرد یا پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت دھرنا۔ ⑲ جھوٹی گواہی دینا۔ ⑳ کسی عذر شرعی کے بغیر قصداً رمضان کا روزہ نہ رکھنا یا روزہ توڑنا۔ ㉑ جھوٹی قسم کھانا۔ ㉒ قطع تعلق کرنا۔ ㉓ ماں باپ کو ستانا اور ان کی نافرمانی کرنا۔ ㉔ جنگ کے موقع پر دشمنان دین کے مقابلہ سے فرار اختیار کرنا۔ ㉕ یتیموں کا مال ناحق کھانا۔ ㉖ ناپ تول میں خیانت کرنا۔ ㉗ نماز کو وقت پر نہ پڑھنا۔ ㉘ مسلمانوں سے ناحق لڑنا جھگڑنا۔ ㉙ ذات رسالت مآب ﷺ پر جھوٹا الزام لگانا۔ ㉚ رسول، کتاب اللہ اور فرشتوں کا انکار کرنا یا ان کا مذاق اڑانا۔ ㉛ احکام دین اور مسائل شریعت کا انکار کرنا۔ ㉜ فرائض پر عمل نہ کرنا یعنی نماز نہ پڑھنا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، رمضان کے روزے نہ رکھنا اور استطاعت کا باوجود حج نہ کرنا۔ ㉝ صحابہؓ یا کسی صحابیؓ کو برا کہنا۔ ㉞ بلاعذر کتمان شہادت کرنا۔ ㉟ رشوت لینا۔ ㊱ میاں بیوی کے درمیان نفاق ڈالوانا۔ ㊲ حاکم کے سامنے کسی کی چغل خوری کرنا۔ ㊳ غیبت کرنا۔ ㊴ اسراف میں مبتلا ہونا۔ ㊵ رہزنی کا ارتکاب کرنا۔ ㊶ دین کے نام پر یا کسی دنیوی غرض کے تحت روئے زمین پر فتنہ وفساد پھیلانا۔ ㊷ گناہ صغیرہ پر اصرار ودوام اختیار کرنا۔ ㊸ کسی کو گناہ کی طرف راغب کرنا یا گناہ کے ارتکاب میں مدد دینا۔ ㊹ ہارمونیم، طبلہ، اور دوسرے ممنوع باجوں کے ساتھ گانا۔ ㊺ نہاتے وقت دوسروں کے سامنے ستر کھولنا۔ ㊻ مالی مطالبات وواجبات کی ادائیگی میں بخل کرنا۔ ㊼ خودکشی کرنا۔ ㊽ اپنے اعضاء بدن میں سے کسی عضو کو ضائع کرنا اور تلف کر دینا۔ ㊾ منی اور پیشاب کی گندگی سے صفائی اور پاکی حاصل نہ کرنا۔ ㊿ تقدیر کو جھٹلانا۔ (۵۱) اپنے سردار اور حاکم سے عہد شکنی کرنا۔ (۵۲) کسی کی ذات اور نسب میں طعنہ زنی کرنا۔ (۵۳) غرور اور تکبر کے تحت پائینچے لٹکانا۔ (۵۴) لوگوں کو گمراہی کی طرف بلانا۔ (۵۵) میت پر نوحہ کرنا۔ (۵۶) برے طریقے اور بیہودہ رسمیں رائج کرنا۔ (۵۷) دھار دار آلہ سے کسی مسلمان کی طرف اشارہ کرنا۔ (۵۸) کسی کو خصی کر دینا۔

(۵۹) اپنے بدن کے کسی حصہ کو کاٹنا۔ مثلاً داڑھی منڈانا یا ناک وغیرہ تھوڑی سی کاٹ ڈالنا۔ (۶۰) اپنے محسن سے احسان فراموشی کرنا۔ (۶۱) حدود حرم میں ان کاموں کو کرنا جن کی ممانعت ہے۔ (۶۲) حدود حرم میں جاسوسی کرنا۔ (۶۳) نرد کھیلنا یا ایسا کوئی بھی کھیل کھیلنا جو بالاتفاق حرام ہو۔ (۶۴) کسی مسلمان کو کافر کہنا یا اس کو کسی ایسے الفاظ سے مخاطب کرنا جو صرف کافر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (۶۵) اگر ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان کے درمیان باری میں عدل نہ کرنا۔ (۶۶) جلق کرنا (مشت زنی کرنا)۔ (۶۷) غلہ وغیرہ کی گرانی سے خوش ہونا۔ (۶۸) جانوروں کے ساتھ بدفعلی کرنا۔ (۶۹) عالم کا اپنے علم پر عمل نہ کرنا۔ (۷۰) دنیا کی محبت میں مبتلا ہونا۔ (۷۱) امرد پر بری نظر رکھنا۔ (۷۲) دوسروں کے گھر میں جھانکنا۔ (۷۳) صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر اس کے گھر کے اندر داخل ہونا۔ (۷۴) دیوثی اور قرم ساقی کرنا۔ (۷۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی اچھے کاموں کی تبلیغ و تلقین اور برے کاموں سے روکنے) کا فریضہ باوجود قدرت کے انجام نہ دینا۔ (۷۶) پڑھنے کے بعد قرآن مجید کو بھلا دینا۔ (۷۷) جانوروں کو آگ میں جلانا۔ (۷۸) عورت کا بغیر عذر شرعی اپنے شوہر کی نافرمانی کرنا۔ (۷۹) مرد کا عورت پر ظلم کرنا۔ (۸۰) اللہ کی رحمت و مغفرت سے ناامید ہونا۔ (۸۱) اللہ کے عذاب سے بے خوف ہونا۔ (۸۲) علماء اور حفاظ کی توہین و تحقیر کرنا۔ (۸۳) بیوی سے ظہار کرنا، بعض علمانے کبائر کی فہرست میں کچھ اور گناہوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہاں اختصار کے پیش نظر اسی فہرست پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

سب سے بڑے گناہ

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَّا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الذَّنْبِ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ قَالَ اَنْ تَدْعُوَ لِلّٰہِ نِدًّا وَّھُوَ خَلَقَکَ قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ خَشْیَۃَ اَنْ یَّطْعَمَ مَعَکَ قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ اَنْ تُزَانِیَ حَلِیْلَۃَ جَارِکَ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَصْدِیْقَھَا (وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ الْاٰیَۃَ)

(الفرقان ۶۸، متفق علیہ)

"حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے سوال کیا، یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا! یہ کہ جس اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تم کسی کو اس کا شریک ٹھہراؤ پھر اس شخص نے پوچھا! اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آنحضرت نے فرمایا! یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس خیال سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔ پھر اس نے پوچھا، اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا! یہ کہ تم اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرو (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ) سرکار ﷺ کے اسی ارشاد کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی (جس کا ترجمہ ہے) وہی بندگان خاص ہیں جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہیں ٹھہراتے، اور جس جاندار کو قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں (اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ گناہ کے وبال میں پڑے گا)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں چند ایسی باتوں کی نشان دہی کی گئی جو اخلاق و انسانیت کے اعتبار سے بھی نہایت پستی اور گراوٹ کی علامت ہیں اور شریعت نے بھی ان کو سب سے بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے اور جن کا ارتکاب کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ سب سے بڑا گناہ جس بات کو بتایا گیا ہے وہ کسی کو اپنے خالق اور پروردگار کا شریک ٹھہرانا ہے اور ان تدعو للہ ندا کی تشریح

[1] اسم گرامی عبداللہ بن مسعود اور کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے، آپ کو حضورؐ نے جنت کی بشارت دی ہے آپ نے ۳۲ھ بعمر کچھ اوپر ساٹھ سال بمقام مدینہ میں انتقال فرمایا۔

میں علماء نے لکھا ہے کہ شریک ٹھہرانے کا مطلب ذات وصفات اور عبادت میں کسی کو اللہ کا ہمسر وہم تاب بنانا ہے مثلاً عبادت وبندگی اور اظہار عبدیت کے جو طریقے اور جو افعال صرف ذات باری تعالیٰ کی عبادت کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ طریقے اور افعال اللہ کے سوا کسی اور کے لئے بھی اختیار کرنا یا جس طرح اللہ کو "یا اللہ" کہہ کر یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح کسی غیر اللہ کو پکارنا اور یاد کرنا، اور یا جس طرح اللہ تعالیٰ حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے اسی طرح کسی اور کو بھی حاجت روا مان کر یوں فریاد رسی کرنا کہ اے فلاں میری یہ حاجت پوری کر، میری مدد کر دو وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا بڑا گناہ یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی شخص اپنی اولاد کو اس خوف سے موت کے گھاٹ اتار دے کہ وہ میرے سر کا بوجھ بنے گی، اس کو کھلانا پلانا پڑے گا، اور اس کی پرورش وتربیت کی معاشی ذمہ داریاں برداشت کرنا پڑیں گی، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ظالمانہ طریقہ رائج تھا کہ لوگ افلاس کے خوف سے اپنی اولاد کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔

تیسرا بڑا گناہ یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی شخص اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرے۔ یوں تو مطلقاً زنا ایک بڑا گناہ ہے اور اس پر سخت سزا مقرر ہے۔ لیکن پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا تو بہت ہی بڑا گناہ ہے جس طرح کہ مطلقاً ناحق قتل کرنا ایک بڑا گناہ ہے، لیکن اپنی اولاد کو قتل کر دینا نہایت ہی بڑا گناہ ہے۔

والدین کی نافرمانی اور جھوٹی قسم کھانا

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْکَبَائِرُ اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْیَمِیْنُ الْغَمُوْسُ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَنَسٍ وَشَہَادَۃُ الزُّوْرِ بَدَلَ الْیَمِیْنِ الْغَمُوْسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، ناحق کسی کو مار ڈالنا اور جھوٹی قسم کھانا بڑے گناہ ہیں (بخاری) اور حضرت انسؓ کی روایت میں "جھوٹی قسم کھانا" کے بجائے "جھوٹی گواہی دینا" کے الفاظ ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "عقوق" کے ایک معنی ایذا دینے کے بھی آتے ہیں۔ لہٰذا شریعت نے نہ صرف یہ کہ والدین کی نافرمانی کو بڑا گناہ قرار دیا ہے بلکہ یہ بھی حکم ہے کہ مسلمان ماں باپ کو نہ کوئی اذیت پہنچائی جائے اور نہ ان کو ناحق ستایا جائے، ویسے کافر ماں باپ کو بھی اذیت پہنچانے سے روکا گیا ہے، لیکن ان کو کفر کی لعنت سے نکالنے اور قبول اسلام پر آمادہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ تھوڑے بہت سخت برتاؤ کی اجازت ہے، بشرطیکہ وہ سخت برتاؤ قطعی طور پر ناگزیر ہو اور اخلاق وانسانیت سے گرا ہوا نہ ہو۔

تفسیر عزیزی میں ارشاد ربانی وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا حکم بطور خاص تین باتوں کو شامل ہے، اور یہ کہ ان کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائے خواہ ہاتھ سے ہو یا زبان وغیرہ سے، یعنی نہ تو ان کو مار پیٹ کر تکلیف پہنچائے اور نہ ان کے ساتھ بدزبانی وبدکلامی کرے، دوسرے یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے جان ومال دونوں طرح سے ان کی خدمت کرے، اور تیسرے یہ کہ ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرے اور وہ جس وقت اور جس ضرورت سے بلائیں فوراً ان کے پاس حاضر ہو جائے۔ تاہم علماء نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ والدین کی خدمت کا حکم اس شرط کے ساتھ ہے کہ اگر ماں باپ اولاد کے محتاج ہوں اور اولاد اتنی قوت واستطاعت رکھتی ہو کہ ان کی ہر طرح کی خدمت کر سکے تو ان کی خدمت کرنا اس پر واجب ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ نہ تو والدین اس کے محتاج ہوں اور نہ اولاد اس پر قادر ہے تو اس پر ان کی خدمت واجب نہیں ہے اسی طرح والدین کی حکم برداری کا مسئلہ بھی اس وضاحت کے ساتھ ہے کہ اگر وہ اچھے کام کا حکم دیں یا خلاف شرع چیزوں سے روکیں یا شرع کے خلاف حکم نہ دیں تو ان کی اطاعت کرنا ضروری ہے لیکن اگر وہ خلاف شرع چیزوں کا حکم دیں مثلاً واجبات کو ترک کرنے کے لئے کہیں یا فرض حج کرنے سے روک

دیں اور منع کریں تو ان چیزوں میں ان کی اطاعت نہ کرنی چاہیے اگر سنّت مؤکدہ کو چھوڑنے کے لئے کہیں مثلاً نماز کی جماعت میں شریک ہونے سے روکیں، یا عرفہ کے روزہ کو منع کریں تو اس میں زیادہ صحیح قول یہ ہے اس طرح کا حکم دو ایک مرتبہ مان لینے اور ان کی اطاعت میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ان چیزوں کی اگر وہ عادت ہی ڈالوا دیں یا ہمیشہ منع کرتے رہیں تو ان کا حکم نہ مانے۔ ہاں اگر وہ کسی نفلی عبادت سے روکیں اور کہیں کہ اس کی بجائے ہماری خدمت میں رہو تو ان کی حکم برداری کرنی چاہئے۔

"یمین غموس" اس جھوٹی قسم کو کہتے ہیں جس کا تعلق گزشتہ چیز سے ہو، مثلاً کوئی شخص کسی فعل کے بارہ میں اس طرح قسم کھائے کہ خدا کی قسم میں نے فلاں کام نہیں کیا ہے۔ درآنحالیکہ واقع میں اس نے وہ کام کیا ہے تو یہ "یمین غموس" کہلائے گی اس کی سخت ممانعت ہے کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے اسی طرح جھوٹی گواہی دینا بھی ایک بہت بڑا گناہ ہے جو اللہ کے سخت عذاب کا مستوجب بناتا ہے۔

ہلاک کر دینے والی باتوں سے بچو

(۴۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَاهُنَّ قَالَ اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَكْلُ الرِّبَا وَاَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ وَالتَّوَلِّیْ يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (لوگو) سات ہلاک کر دینے والی باتوں سے بچو، پوچھا گیا یا رسول اللہ! وہ سات ہلاک کرنے والی باتیں کون سی ہیں؟ فرمایا کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا۔ (۲) جادو کرنا۔ (۳) جس جان کو مار ڈالنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا۔ (۴) یتیم کا مال کھانا۔ (۵) جہاد کے دن دشمن کو پیٹھ دکھانا۔ (۶) پاکدامن ایمان والی اور بے خبر عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اسلامی اعتقادات و نظریات اور بدیہی مسلمات کو دل سے ماننا، زبان سے اقرار کرنا اور عائد شدہ فرائض پر عمل کرنا ایمان ہے اور ان پر بدیہی مسلمات میں سے کسی ایک بات کا انکار کرنا کفر ہے اب اگر اس کلیہ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایمان کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ دین کے بدیہی مسلمات زبان و دل سے مان لئے جائیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائے۔ برخلاف اس کے کہ کفر کی صورتیں کئی ہیں اور دین کی بدیہیات میں سے اگر کسی ایک بات کا بھی انکار کر دیا جائے خواہ بقیہ سب کا اقرار موجود ہے تو بھی کفر عائد ہو جاتا ہے پھر علماء کی تصریح ہے کہ کفر صرف قول ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بعض افعال بھی موجب کفر ہو سکتے ہیں، چنانچہ فقہاء ایسے افعال پر بھی کفر کا حکم لگا دیتے ہیں جو قلبی و اعتقادی کفر کے صحیح ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

یوں تو کفر کی ہر قسم انسانیت کے دامن پر سب سے بدنما داغ ہے لیکن اس کی جو قسم سب سے بدتر ہے وہ شرک ہے یعنی خدا تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کی عبادات اور اس کی حدود عظمت میں کسی کو شریک بنا لینا نہ صرف اعتقادی حیثیت سے ایمان و اسلام سے صریح بیزاری کا اظہار ہے، بلکہ فطرت پر ایک بہت بڑا ظلم اور عقل و دانش سے سب سے بڑی بغاوت بھی ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کر کے اس کی فطرت کو کفر و شرک کی ہر قسم کی آلودگی سے پاک و صاف رکھا ہے، اب اگر انسان اپنی فطرت کو شرک کی نجاست سے ملوث کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی فطرت اور اپنے ضمیر کی صداقت آمیز آواز کا گلا گھونٹ کر مذہب و انسانیت دونوں حیثیت سے تباہی و بربادی کے غار میں گرتا ہے۔

اس لئے پروردگار عالم کا اٹل فیصلہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں ہر کوتاہی و لغزش قابل معافی ہو سکتی ہے۔ مگر شرک کا جرم ہرگز معافی نہیں ہوگا جس کی سخت سزا مشرک کو بھگتنی ہوگی۔ اور خدا تعالیٰ کی پاک جنّت میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (القرآن الحکیم، النساء ۱۱۶)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس جرم کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے وہاں اس کے سوا اور جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا۔"

چونکہ شرک انسانی فطرت سے سعادت و نیک بختی کا تخم جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور انسان کی روحانی ترقی کی تمام استعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے نیز خود قرآن کی نظر میں شرک خدا تعالیٰ پر سب سے بڑا افتراء اور سب سے بڑھ کر بے دلیل اور خلاف ضمیریات اور نفس انسان کے لئے ابدی موت ہے اس لئے حدیث میں جن ہلاکت خیز باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں شرک کا جرم سرفہرست ہے۔

شرک کی تعریف اور اقسام

اس موقعہ پر مناسب ہے کہ شرک کی تعریف اور اس کی اقسام کی کچھ تفصیل بیان کر دی جائے، شرح عقائد میں ہے کہ اصطلاح شریعت میں شرک، اسے کہتے ہیں کہ خدائی اختیارات میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرائے جیسا کہ مجوسی اہرمن و یزداں کو مانتے ہیں یا خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی پرستش و عبادت کے لائق جانے جیسا کہ بت پرست عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ شرک کفر کی ایک قسم ہے اور اسی لئے شریعت میں شرک کفر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے اپنے ترجمہ مشکوٰۃ میں شرح عقائد کی بیان کردہ شرک کی ان دونوں قسموں کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں شرک سے مراد کفر ہے، خیالی میں بھی اس کی تصریح ہے اور مولانا عصمۃ اللہ ؒ سے بھی یہی منقول ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ فرماتے ہیں کہ شریعت کی اصطلاح میں "شرک" اسے کہتے ہیں کہ جو صفات خاص باری تعالیٰ عزاسمہ کے ساتھ مختص ہیں ان کو خدا کے علاوہ کسی دوسرے میں بھی ثابت کرے، جیسے خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی عالم الغیب جانے۔ یا جس طرح دنیا کی ہر شے پر خدا کو قادر مانتا ہے کسی دوسرے کو بھی قادر جانے، یا جیسے خدا تعالیٰ کو اپنے ارادہ کے ساتھ دنیا کی تمام چیزوں پر متصرف جانتا ہے، ایسے ہی کسی دوسرے کو بھی متصرف جانے۔ مثلاً کسی کے بارہ میں یہ عقیدہ رکھے کہ فلاں نے نظر کرم کے ساتھ مجھ سے برتاؤ کیا اس لئے مجھ کو مال و زر کی وسعت اور خوشی حاصل ہوگئی یا فلاں نے مجھ کو پھٹکار دیا تھا تو اس کے سبب میں بیمار ہو گیا یا میرا مقدر پھوٹ گیا، وغیرہ وغیرہ۔

خدا کی ذات اور صفات اور خدائی اختیارات میں شرک کے علاوہ تفسیر عزیزی میں شرک کی اور جو اقسام ذکر کی گئی ہیں۔ ان میں ایک تو یہی ہے کہ عبادت میں کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرایا جائے، یا کسی کا نام تقرب و فضیلت کے طریقہ پر خدا کے نام کی طرح لیا جائے اور اس کو خدا کا ہمسر قرار دیا جائے۔ مثلاً کسی کو اٹھتے بیٹھتے و مصائب و مشکلات میں اس کا نام لے کر اسے یاد کرے ایسے ہی کسی کا نام بجائے عبداللہ یا عبدالرحمن کے بندہ فلاں یا عبد فلاں رکھا جائے اس کو "شرک فی التسمیہ" کہتے ہیں یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے اور اس کی نذر مانی جائے، یا بلا وجہ شر کے دفعیہ اور حصول منفعت کے لئے خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو پکارا جائے اور ان کی طرف رجوع کیا جائے۔ یا علم و قدرت میں خدا کے نام کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا جائے جیسے کوئی کہے مَاشَآءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ یعنی جو خدا چاہے اور تم چاہو وہی ہوگا۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ کسی ناواقف نے آنحضرت ﷺ کے سامنے اسی طرح کے الفاظ کہے تو آپ ﷺ بہت افروختہ ہوئے اور فرمایا کہ تم نے مجھے خدا کا شریک ٹھہرا دیا اور فرمایا کہ اس طرح کہو:

مَاشَآءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ۔

"یعنی جو صرف خدا چاہے گا وہی ہوگا۔"

بعض کبیرہ گناہوں کو بھی شرک کہا گیا ہے، جیسے حدیث میں وارد ہے کہ جس شخص نے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی قسم کھائی اس نے یقیناً شرک کیا، یا کہا جاتا ہے کہ بد شگونی لینا شرک ہے یا منقول ہے کہ ریاکاری شرک ہے، یا اسی طرح منقول ہے کہ جو عورت اپنے خاوند

کی محبت کے لئے ٹوٹکہ کرے شرک ہے گویا یہ گناہ اپنے مہلک اثرات کی بنا پر شرک کی طرح ہیں اس لئے ان سے اجتناب بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا شرک سے۔

اسی طرح وہ افعال جو اگرچہ شرک حقیقی یعنی کفر کے دائرے میں تو نہ آتے ہوں لیکن مشرکین اور بت پرستوں کے افعال و اعمال کے مشابہ اور ان کے ہم مثل سمجھے جاتے ہیں تو ان سے بھی شرک ہی کی طرح پرہیز ضروری ہے، جیسے علماء اور بادشاہ کے آگے جبین سائی کرنا یا ان کے سامنے آکر زمین کو چوسنا یا ان کو سجدہ تعظیم کرنا۔ چونکہ یہ افعال حرام اور گناہ کبیرہ ہیں اس لئے ان کا ارتقاب کرنے والا بھی گناہ گار اور مستوجب عذاب ہوگا، اور جو لوگ اس طرح کے افعال سے خوش ہوں گے اور قدرت کے باوجود ان افعال کے ارتکاب کو روکنے کی کوشش نہیں کریں گے وہ بھی گناہ گار ہوں گے، یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر علماء یا بادشاہ پیروں کے آگے جبین سائی کرنا اور زمین کو بوسہ دینا عبادت و تعظیم کی نیت سے ہوگا تو اس کو صریحا کفر کہا جائے گا اگر عبادت و تعظیم کی نیت سے نہیں بلکہ محض اظہار ادب کے لئے ہوگا تو اس پر کفر کا اطلاق نہیں ہوگا لیکن گناہ کبیرہ ضرور کہلائے گا۔

اس حدیث میں دوسرا ہلاکت خیز فعل سحر بتایا گیا ہے۔ سحر کے بارہ میں علماء کہتے ہیں کہ جس طرح سحر اور جادو کرنا حرام اور ہلاکت خیز چیز ہے اسی طرح جادو سیکھنا اور سحر کا علم حاصل کرنا بھی حرام ہے، جو آخرت میں ہلاکت کا موجب بنے گا، شرح عقائد کے حاشیہ "خیالی" میں لکھا ہے کہ سحر کرنا کفر ہے، اور صحابہؓ وغیرہ کی ایک جماعت تو اس پر متفق ہے کہ ساحر کو فوراً مار ڈالنا چاہیے۔ جب کہ بعض کی رائے یہ ہے کہ اگر ساحر اس طرح کا ہو جس سے کفر لازم آتا ہو اور ساحر اس سے توبہ نہ کرے تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہئے۔ اسی طرح نجوم، کہانت رمل اور شعبدہ بازی کی تعلیم حاصل کرنا، ان چیزوں کو اختیار کرنا اور ان سے روزی اور پیسہ کمانا اور نجومی و کاہن وغیرہ سے سوالات کرنا اور ان کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتقاد رکھنا بھی حرام ہے۔

حدیث میں دشمن کے مقابلہ سے راہ فرار اختیار کرنے کے مذموم فعل کو بھی ہلاکت کا موجب بتایا گیا ہے اس لئے کہ جس شخص نے اتنی بزدلی اور پست ہمتی دکھائی کہ عین اس موقع پر جب کہ اس کو ایمانی شجاعت و دلیری کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا، دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑا ہوا وہ دراصل اپنی اس مذموم حرکت کے ذریعہ اہل اسلام کی رسوائی کا سبب بنا لہٰذا اس کو آخرت کے عذاب اور ہلاکت کا مستوجب گردانا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جہاں تک تفصیلی مسئلہ کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان کے مقابلہ میں دو کافر ہوں تو اس کو ان کے مقابلے سے راہ فرار اختیار کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ ہاں اگر مقابلہ پر دشمن دو سے زیادہ کی تعداد میں ہوں تو پھر بھاگنا حرام نہیں ہے بلکہ جائز ہے مگر اس میں اولیٰ اور بہتر یہی ہے کہ وہ اس صورت میں بھی پیٹھ نہ دکھلائے بلکہ مقابلہ کرے خواہ جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

وہ بدترین گناہ جن کے ارتکاب کے وقت ایمان باقی نہیں رہتا

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَنْتَهِبُ نُهْبَةً يَرْفَعُ النَّاسُ اِلَيْهِ فِيْهَا اَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَغُلُّ اَحَدُكُمْ حِيْنَ يَغُلُّ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاِيَّاكُمْ اِيَّاكُمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَلَا يَقْتُلُ حِيْنَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ قَالَ عِكْرِمَةُ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ كَيْفَ يُنْزَعُ الْاِيْمَانُ مِنْهُ قَالَ هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهِ ثُمَّ اَخْرَجَهَا فَاِنْ تَابَ عَادَ اِلَيْهِ هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهِ وَقَالَ اَبُوْعَبْدِاللّٰهِ لَا يَكُوْنُ هٰذَا مُؤْمِنًا تَامًّا وَلَا يَكُوْنُ لَهُ نُوْرُ الْاِيْمَانِ۔ (هذا لفظ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، شراب پینے والا جب شراب پیتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، اور چھینا جھپٹی کرتا ہے اور لوگ اس کو (کھلم کھلا) چھینا جھپٹی کرتے

ہوئے دیکھتے ہیں (لیکن خوف و دہشت کے مارے بے بس ہو جاتے ہیں اور چیخ و پکار کے علاوہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے) تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا پس تم (ان گناہوں سے) بچو۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ! قتل کرنے والا جب ناحق قتل کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔ عکرمہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے (یہ حدیث سن کر) پوچھا کہ اس سے ایمان علیحدہ کس طرح کر لیا جاتا ہے، تو انہوں نے کہا اس طرح (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں اور پھر ان انگلیوں کو ایک دوسری سے علیحدہ کر لیا اس کے بعد انہوں نے فرمایا! اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو ایمان اس طرح واپس آجاتا ہے، اور (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنی انگلیوں کو پھر ایک دوسری میں داخل کر لیا۔ نیز ابو عبد اللہ (یعنی امام بخاریؒ) نے کہا ہے کہ (اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ) وہ شخص ارتکاب معصیت کے وقت مؤمن کامل نہیں رہتا اور اس میں سے ایمان کا نور نکل جاتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا، مؤمن کا قلب ایک ایسے حساس اور پاکیزہ ظرف کی مانند ہے جس میں صرف ایمان کا نور ٹھہر سکتا ہے، ایمان کے منافی کوئی بھی چیز دراندار ہونے کی کوشش کرتی ہے تو نہ قلب مؤمن اس کا روادار ہوتا ہے اور نہ نور ایمان اس کو برداشت کرتا ہے، چنانچہ وہ بدترین اور سنگین گناہ جس کا حدیث بالا میں ذکر ہوا، ایسی منافی ایمان باتیں ہیں جن کا تحمل نور ایمان کسی حالت میں نہیں کر سکتا، ادھر انسان ان میں سے کسی گناہ کا ارتکاب شروع کرتا ہے کہ ادھر نور ایمان اس کے قلب سے رخصت ہو جاتا ہے اور پھر جب تک کہ اس گناہ پر نادم و شرمندہ ہو کر آئندہ کے لئے خلوص دل سے توبہ نہیں کر لیتا ایمان کی وہ نورانی کیفیت جو ارتکاب گناہ سے قبل اس کو حاصل تھی، اس کے قلب میں واپس نہیں آتی۔ اسی صورت حال کو حضرت ابن عباسؓ نے اپنی انگلیوں کی مثال کے ذریعہ واضح کیا، انہوں نے پہلے اپنے ایک ہاتھ کے پنجہ کو دوسرے ہاتھ کے پنجہ میں داخل کیا اور دکھایا کہ یہ گویا ارتکاب معصیت سے قبل کی حالت ہے کہ نور ایمان مؤمن کے قلب میں جاگزیں ہے پھر انہوں نے دونوں پنجوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے بتایا کہ جس طرح یہ پنجہ دوسرے پنجہ سے الگ ہو گیا ہے، اسی طرح ارتکاب معصیت کے وقت نور ایمان مؤمن کے قلب سے علیحدہ ہو جاتا ہے، اور پھر انہوں نے دوسرے پنجوں کو ایک دوسرے میں داخل کر دیا اور کہا کہ جس طرح یہ پنجے پھر ایک دوسرے میں داخل ہو گئے ہیں اسی طرح اگر مؤمن ارتکاب معصیت کے بعد توبہ کر لیتا ہے تو اس کا نور ایمان پہلے کی طرح اپنی جگہ واپس آجاتا ہے۔

امام ابن ابی شیبہؒ نے لکھا ہے کہ ارتکاب معصیت کے وقت ایمان کے باقی نہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ مرتکب معصیت کامل مؤمن نہیں رہ جاتا اس کا ایمان ناقص ہو جاتا ہے (ترجمان السنۃ) اور یہی حاصل امام بخاریؒ کے قول کا ہے جو روایت کے آخری فقرہ سے معلوم ہوا۔

منافق کی علامتیں

⑤ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ زَادَ مُسْلِمٌ وَإِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ ثُمَّ اتَّفَقَا إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا! منافق کی تین علامتیں ہیں، اس کے بعد مسلمؒ نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ کیا "اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے" اس کے بعد بخاریؒ و مسلمؒ دونوں متفق ہیں (وہ تین علامتیں یہ ہیں) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔" (متفق علیہ)

تشریح: جب بھی کوئی اصلاحی تحریک انقلابی رفتار سے آگے بڑھنے لگتی ہے اور معاشرہ پر اس کا تسلط پھیلتا جاتا ہے تو اس کے متفقین اور مخالفین کے درمیان ایک تیسرا طبقہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، یعنی ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس تحریک کے مکمل ہمنوا بن جاتے ہیں اور کامل ذہنی و جسمانی وابستگی کے ساتھ اس کے دائرہ اثر و اطاعت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے مقابلہ پر دوسرا طبقہ مخالفین کا ہوتا ہے جو

تحریک کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے اور اپنی پوری طاقت اور تمام تر وسائل کے ساتھ علانیہ طور پر تحریک کے داعیوں اور حامیوں کے مدمقابل رہتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان جو تیسرا طبقہ پیدا ہوتا ہے وہ ان دو باصفت لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو نہ اس تحریک کے دل سے حامی بنتے ہیں اور نہ کھلم کھلا مخالفت پر خود کو قادر پاتے ہیں اس طرح کے لوگ اپنی ذہنی و قلبی وابستگی اپنے سابقہ عقائد و نظریات ہی کے تئیں رکھتے ہیں لیکن جسمانی طور پر حامیان تحریک کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں، یہی صورت حال اسلام کو بھی پیش آئی پیغمبر اسلام کی مکی زندگی کے بعد جب مدنی زندگی ———— کا آغاز ہوا اور اسی کے ساتھ دعوت اسلام کی تحریک انقلابی رفتار سے آگے بڑھنے لگی اور اہل اسلام کو بھی طاقت و شوکت میسر آنے لگی تو یہ تیسرا طبقہ پیدا ہو گیا۔ پہلے مکہ میں ایک طرف تو وہ خوش نصیب لوگ تھے جنہوں نے کامل صدق و اخلاص کے ساتھ دعوت اسلام کو قبول کیا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے فداکار خادم بنے۔ یہ خوش نصیب تعداد میں بھی کم تھے اور مادی وسائل و ذرائع سے محروم بھی تھے، ان کے مقابلہ پر اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے دعوت اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور اس پر بس نہ کر کے دعوت اسلام کی بھرپور مخالفت پر کمربستہ تھے، ان لوگوں کو طاقت و شوکت بھی حاصل تھی اور تمام تر مادی وسائل و ذرائع کی پشت پناہی بھی۔ چنانچہ یہاں ان کو اسلام کی کھلم کھلا دشمنی سے کوئی امر مانع نہیں تھا اور اہل اسلام کی مخالفت سماجی طور پر کسی خطرہ یا نقصان کا باعث بھی نہیں تھی۔ لیکن اب مدینہ آنے کے بعد دعوت اسلام کا ماحول دوسرا ہو گیا، تحریک کامیابی سے آگے بڑھتی رہی، متفقین اور ہمنواؤں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ طاقت و شوکت بھی بڑھنے لگی اور سماجی طور پر اہل اسلام کو غلبہ بھی ملنے لگا۔ لہٰذا اب اسلام کے مخالفین اور معاندین کو بھی عداوت کی شکل بدل دینی پڑی۔ انہوں نے یہ مستقل پالیسی بنالی کہ بظاہر تو اسلام کے نام لیوا بن جاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے لگو۔ مگر اندرونی طور پر مخالفین اسلام یعنی کافروں کے ہمنوا رہو اور خفیہ معاندانہ کارروائیوں کے ذریعہ دعوت اسلام کی راہ میں کانٹے بچھاتے رہو، چنانچہ یہی سے "نفاق" کی بنیاد قائم ہوئی اور اس طرح کے لوگوں کو اسلام میں "منافق" کہا گیا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح کسی بھی تحریک کے لئے "نفاق" سب سے بڑا گھن ثابت ہوتا ہے اسی طرح اسلام کے حق میں یہ طبقۂ منافقین سب سے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوا، ابتداء میں تو ان منافقین کا مکروہ چہرہ مسلمانوں کے سامنے چھپا رہا، جب ان کی منافقانہ پالیسی اور عیارانہ کاروائیوں نے اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچانا شروع کیا اور اسلام کے خلاف ان کی خفیہ نقل و حرکت کا علم ہونے لگا تو ان کی شخصیتیں سامنے آنے لگیں اور پھر تو اس طبقہ کی اتنی اہمیت محسوس کی گئی کہ ان کے نام پر مستقل ایک سورت "المنافقین" نازل کی گئی، اس کے علاوہ بھی قرآن کریم میں جابجا منافقوں سے خبردار کیا گیا اور ان کی ریشہ دوانیوں اور تباہ کاریوں سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا۔

نفاق کی قسمیں

جس طرح ایمان اور کفر کی مختلف قسمیں اور صورتیں ہیں اسی طرح "نفاق" کی بھی کئی قسمیں ہیں ایک تو اعتقادی نفاق ہے اور یہی حقیقی نفاق ہے یعنی بظاہر اللہ کی توحید، رسالت، فرشتے، اور حشر و نشر کے اعتقاد رکھنے کا دعوی کرنا مگر اندر ان تمام اعتقادی مسلمات کا پورا پورا انکار و انحراف مضمر ہونا۔ یہی وہ نفاق ہے جو آنحضرت ﷺ کے دور میں تھا۔ اسی نفاق کو قرآن مجید نے کفر بھی کہا ہے اور اسی نفاق کے بارہ میں یہ وعید آئی ہے کہ دوزخ میں منافقین کا ٹھکانا کافروں سے بھی نیچے ہوگا، پھر یہ ہوا کہ ان منافقین کے جو عادات و خصائل اور طور طریقے تھے ان پر بھی نفاق کا اطلاق کیا جانے لگا۔ کیونکہ ان میں سے اکثر باتیں وہی ہیں جو انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی کو عیب دار بنا دیتی ہیں جو اسلام کی تعلیمات، اعلی انسانی اقدار اور امانت و دیانت کے صریح منافی ہونے کے سبب ایمان و اسلام سے ذرا بھی میل نہیں کھاتیں۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی دینی زندگی میں انحطاط کا دور آیا اور انہوں نے ان باتوں کو اختیار کرنا شروع کر دیا جو منافقین اسلام کا خاصہ تھیں تو ارباب اصطلاح نے نفاق کی ایک اور قسم متعین کی اور اس کا نام "عملی نفاق" رکھا۔

پس حدیث بالا میں جس چیز کے خلاف تنبیہ کرنا مقصود ہے اس سے یہی "عملی نفاق" مراد ہے۔ مطلب یہ کہ بات چیت میں دروغ

گوئی اختیار کرنا، وعدہ کا پورا کرنا، اور امانتوں میں خیانت کرنا ان بری عادتوں میں سے ہیں جو ایک منافق میں تو پائی جاتی ہیں لیکن کسی مؤمن میں ان کا پایا جانا عجوبہ سے کم نہیں۔ لہٰذا اگر مسلمان دانستہ یا نادانستہ طور پر ان میں سے کسی بری عادت کا شکار ہے تو اس کو فوراً اپنا احتساب کرنا چاہیے اور اس بری عادت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے ورنہ آخرت میں سخت عذاب بھگتنا ہوگا۔

منافق بنانے والی چار باتیں

⑥ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ پورا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات بھی پائی جائے گی (تو سمجھ لو) اس میں نفاق کی ایک خصلت پیدا ہوئی تاوقتیکہ اس کو چھوڑ نہ دے (اور وہ چار باتیں یہ ہیں) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب قول و اقرار کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب جھگڑے تو گالیاں بکے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہاں بھی نفاق سے مراد "عملی نفاق" ہے یعنی اگر کوئی مؤمن و مسلمان ان چار بری باتوں کا شکار ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ پورے طور پر عملی نفاق میں مبتلا ہے اور عملاً منافق بن گیا ہے اور اگر ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت و عادت اس کے اندر پیدا ہو جائے تو جانو کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت پیدا ہو گئی ہے، لہٰذا متنبہ کیا جاتا ہے کہ جس کے اندر خواہ یہ تمام خصلتیں جمع ہو گئی ہوں یا ایک خصلت ہو وہ جان لے کہ اب اس کا نقشہ زندگی منافق کے مطابق ہوتا جا رہا ہے۔ اگر وہ ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے اندر ان خصلتوں کا ہونا مناسب نہیں ہے اور اگر وہ اپنی دنیا و آخرت کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان باتوں کو فوراً چھوڑ دے۔

منافق کی مثال

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَعِيْرُ اِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً وَاِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان (ماری ماری) پھرتی ہے کہ (اپنے نر کی تلاش میں) کبھی اس طرف مائل ہو جاتی ہے اور کبھی اس طرف۔" (مسلمؒ)

تشریح: منافق کی مثال اس بکری سے دی گئی ہے جو اپنے نر کی تلاش میں ادھر ادھر ماری ماری پھرتی ہے اسی طرح منافق کی حالت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے چونکہ صرف دنیا کا لالچ اور مال و جاں کی حفاظت کا مقصد ہوتا ہے اس لئے وہ مادہ صفت بن کر کبھی تو مسلمانوں کی آغوش میں آکر پناہ لیتا ہے اور کبھی کافروں کے گروہ میں جا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے، نفاق سے نفرت پیدا کرنے کے لئے ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ بہت مؤثر ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

⑧ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ يَهُوْدِيٌّ لِصَاحِبِهٖ اذْهَبْ بِنَا اِلٰى هٰذَا النَّبِيِّ فَقَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ لَا تَقُلْ نَبِيٌّ اِنَّهٗ لَوْ سَمِعَكَ لَكَانَ لَهٗ اَرْبَعُ اَعْيُنٍ فَاَتَيَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَاهُ عَنْ تِسْعِ اٰيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا تَمْشُوْا اِلٰى ذِيْ سُلْطَانٍ لِيَقْتُلَهٗ وَلَا تَسْحَرُوْا وَلَا تَاْكُلُوا الرِّبَا وَلَا تَقْذِفُوْا مُحْصَنَةً وَلَا تُوَلُّوْا لِلْفِرَارِ يَوْمَ الزَّحْفِ وَعَلَيْكُمْ خَاصَّةً الْيَهُوْدَ اَنْ لَا تَعْتَدُوْا فِي السَّبْتِ قَالَ فَقَبَّلَا يَدَيْهِ وَرِجْلَيْهِ وَقَالَا نَشْهَدُ اَنَّكَ نَبِيٌّ قَالَ فَمَا يَمْنَعُكُمْ اَنْ تَتَّبِعُوْنِيْ؟ قَالَ اِنَّ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ دَعَا رَبَّهٗ اَنْ لَا يَزَالَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ نَبِيٌّ وَاِنَّا نَخَافُ اِنْ تَبِعْنَاكَ اَنْ يَقْتُلَنَا الْيَهُوْدُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"حضرت صفوان[1] بن عسال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک یہودی نے اپنے ایک (یہودی) ساتھی سے کہا کہ آؤ اس نبی ﷺ کے پاس چلیں! اس کے ساتھی نے کہا! انہیں نبی نہ کہو، کیونکہ اگر انہوں نے سن لیا (کہ یہودی بھی مجھے نبی کہتے ہیں) تو ان کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے)۔ بہر حال وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ ﷺ سے نو واضح احکام کے بارہ میں سوال کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، جس جان کو مار ڈالنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل کرانے کے لئے (اس پر غلط الزام عائد کر کے) حاکم کے پاس مت لے جاؤ، جادو نہ کرو، سود نہ کھاؤ، پاک دامن عورت کو (زنا کی) تہمت نہ لگاؤ، میدان جنگ میں دشمن کو پیٹھ نہ دکھاؤ اور اے یہودیو! تمہارے لئے خاص طور پر واجب ہے کہ یوم شنبہ کے معاملہ میں (حکم الٰہی سے) تجاوز نہ کرو، راوی کہتے ہیں کہ (یہ سن کر) دونوں یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پیر چوم لئے اور بولے ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ واقعی نبی ہیں۔ سرکار ﷺ نے فرمایا، (جب تمہیں میری رسالت پر یقین ہے تو) میری اتباع سے تم کو کون سا امر مانع ہے؟ انہوں نے کہا: حقیقت یہ ہے کہ داؤد نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ نبی ہوا کرے لہٰذا ہم ڈرتے ہیں اگر آپ ﷺ کی پیروی کریں تو یہودی ہمیں مار ڈالیں گے۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے اللہ کی جانب سے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ نبوت کی دلیل کے طور پر ان کو جو دو بڑے معجزے عطا کئے گئے تھے ان میں ایک عصاء تھا "عصا" حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا معجزہ تھا جس کے ذریعہ وہ بڑے بڑے کام انجام دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب فرعون کی جانب سے ان کے اور اس زمانہ کے مشہور ساحروں اور جادوگروں کے درمیان مقابلہ ہوا تو خدا نے ان کو عصا ہی کے ذریعے اس طرح کامیابی عنایت فرمائی کہ ان جادوگروں نے جب اپنے سحر و جادو کے بل بوتہ پر رسیوں کو سانپ بنا کر زمین پر ڈالا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم سے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا جس نے دیکھتے دیکھتے ایک عظیم اور ہیبت ناک اژدہے کا روپ دھار کر تمام سانپوں کو نگل لیا۔ اس طرح ان کا دوسرا بڑا معجزہ "ید بیضا" تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا دست مبارک بغل میں ڈال کر باہر نکالتے تو وہ آفتاب کی مانند شعاعیں بکھیرنے لگتا تھا۔ اتنے بڑے معجزوں کے باوجود جب ان کی قوم راہ راست پر نہیں آئی تو خدا نے ان کو بلائے عام میں اس طرح مبتلا کر دیا کہ ان پر قحط مسلط کر دیا، اور ان کے پھلوں کی پیداوار میں کمی کر دی پھر بعد میں جب ان کی سرکشی اور نافرمانیاں اور زیادہ بڑھیں تو ان پر مختلف قسم کے عذاب بھیجے جانے لگے۔ مثلاً بارش اتنی کثرت سے برسا دی گئی کہ طوفان نے ان کو آگھیرا، ان کے کھیتوں پر ٹڈیاں بھیج دی گئیں جس کی وجہ سے ان کی تیار فصل تباہ و برباد ہونے لگی، یا ان کے غلوں میں گھن کا کیڑا لگا دیا جس نے ان کے غلوں کے انبار کو ختم کرنا شروع کر دیا، ان پر مینڈک کا عذاب بھیج دیا گیا کہ ان کی ہر چیز میں خواہ کھانے کی ہو یا پینے کی مینڈک ہی میڈک ہو گئے اور پھر ان کا پانی خون کر دیا گیا کہ جب بھی وہ پانی پیتے وہ خون کی شکل اختیار کر لیتا۔ بہر حال یہ نو چیزیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے اور ان کی نبوت کی خاص نشانیاں تھیں۔

اس حدیث میں ان دونوں یہودیوں نے جن نو واضح احکام کے بارے میں سوال کیا، ان سے یا تو وہی احکام مراد تھے جو آنحضرت ﷺ نے ان سے ارشاد فرمائے یا پھر ان کی مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انہی نو معجزات اور نشانیوں کے بارہ میں سرکار دو

[1] صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ مرادی کی نسبت سے مشہور ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آپ کا انتقال ہوا۔

عالم ﷺ کی زبان مقدس سے آگاہی اور توثیق حاصل کرنا تھی اس صورت میں کہا جائے گا کہ یا تو خود آنحضرت ﷺ نے ان کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ یہ قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں اور جو ضروری احکام تھے ان کا حکم ان کو بتا دیا، یا یہ کہ ان کے سوال کے جواب میں ان نو چیزوں کا ذکر فرما کر پھر ان کو اپنی طرف سے یہ احکام دیئے اور راوی نے ان کے مشہور ہونے کی وجہ سے ان کا ذکر نہیں کیا۔ رہی اس خاص حکم کی بات جو آنحضرت نے مذکورہ نو احکام کے علاوہ خاص طور پر یہودیوں کو دیا تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح تمام قوموں کے لئے ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص تھا اسی طرح یہودیوں کے لئے بھی شنبہ کا دن عبادت کے لئے متعین کر دیا گیا تھا اور ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس دن خدا کی عبادت میں مشغول رہا کریں چونکہ یہ قوم شکار کا خاص ذوق اور شغف رکھتی تھی اس لئے ان کو اس دن شکار سے بھی منع کر دیا گیا، لیکن اس قوم نے اس حکم کو کوئی اہمیت نہیں دی اور سخت ممانعت کے باوجود اس دن مچھلی وغیرہ کا شکار کرنے لگے، خدا کی جانب سے ان کو بار بار متنبہ کیا گیا لیکن جب نہیں مانے تو آخر کار ان کو سخت عذاب میں مبتلا کیا گیا! اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان یہودیوں کو اس کے بارہ میں بطور خاص تاکید کی کہ تم اس معاملہ میں خدا کی قائم کی ہوئی حد سے تجاوز نہ کرو اور چونکہ تمہیں اس دن شکار کھیلنے سے منع کر دیا گیا ہے اس لئے اس ممانعت پر عمل کرو اور اس حکم کی نافرمانی مت کرو۔

ان یہودیوں کا آنحضرت ﷺ سے احکام سن کر آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینا بطور قبول ہو رصدق دل سے نہیں تھا بلکہ اپنے علم کے اظہار اور اعتراف کے طور پر تھا۔ مطلب یہ کہ یہودیوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کا نبی مرسل ہونا پڑھ لیا تھا اور وہ خوب جانتے تھے کہ محمد واقعۃً اللہ کے بھیجے ہوئے نبی اور رسول ہیں۔ مگر یہ ان کی بدبختی تھی کہ اس صحیح علم کے باوجود ان کو قبول اسلام کی توفیق نہیں ہوتی تھی اور تعصب و ہٹ دھرمی نے ان کو اتنا اندھا کر دیا تھا کہ ان کو بالکل سامنے کی راہ حق نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں یہودیوں نے بھی اس موقع پر بس اتنا ہی کیا کہ اپنے علم کا اعتراف کر لیا اور گواہی دی کہ آپ ﷺ واقعۃً اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ ظاہر ہے کہ محض علم ہونا یا اپنے علم کا اعتراف کرنا وجود ایمان کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ رہا ان دونوں یہودیوں کا یہ کہنا کہ حضرت داؤد نے یہ دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ ایک نبی ہوا کرے اور ان کی یہ دعا چونکہ یقیناً قبول ہوئی ہوگی اس لئے ان کی اولاد میں سے کسی کا نبی ہونا بھی یقینی ہے اور جب وہ نبی ظاہر ہوگا اور تمام یہودی اس نبی کے تابع و مطیع ہو کر شوکت و غلبہ پائیں گے تو پھر ہماری شامت آ جائے گی۔ یعنی تمام یہودی ہمیں اس جرم میں مار ڈالیں گے کہ ہم نے آپ کا دین کیوں قبول کیا۔ اس خوف سے ہم آپ ﷺ پر ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ان دونوں یہودیوں کا حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف ایک غلط بات کی نسبت کرنا اور یقینی طور پر کہ ایک مفروضہ اور واہمہ تھا۔ حضرت داؤد نے ہرگز یہ دعا نہیں کی تھی اور وہ اس طرح کی دعا کرتے بھی کیسے، انہوں نے تو خود تورات اور زبور میں پڑھ رکھا تھا کہ محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں اور ان کا دین تمام دینوں کا ناسخ ہے۔

وہ تین باتیں جو ایمان کی جڑ ہیں

⑨ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ مِنْ اَصْلِ الْاِيْمَانِ الْكَفُّ عَمَّنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا تُكَفِّرْهُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجْهُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُذْ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِلٰى اَنْ يُقَاتِلَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدَّجَّالَ لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ وَالْاِيْمَانُ بِالْاَقْدَارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں ① جو شخص لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لے اس سے جنگ و مخاصمت ختم کر دینا، اب کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر مت کہو اور نہ کسی عمل کی وجہ سے اس پر اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ لگاؤ ② جب سے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے جہاد ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ اس اُمت کے آخر میں ایک شخص آ کر دجال سے جنگ کرے گا۔ کسی عادل (بادشاہ) کے عدل یا کسی ظالم کے ظلم کا بہانہ لے کر جہاد ختم نہیں کیا جا سکتا ③ اور تقدیر پر ایمان

لانا۔" (ابوداؤد)

تشریح: کسی مسلمان کو کافر کہنے کی ممانعت اس حدیث نے واضح طور پر ثابت کر دی ہے، مطلب یہ کہ جس طرح اچھے کام کرنے والے کافر کو مسلمان کہنا منع ہے تاوقتیکہ وہ توحید و رسالت کا اقرار نہ کرے اسی طرح کسی مسلمان کو صرف اس کی بداعمالیوں کی بنا پر کافر کہنا بھی سخت جرم ہے جب تک کہ وہ عقیدہ کفریہ کا اعلان نہ کرے پس لَا تُکَفِّرْهُ بِذَنْبٍ (کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر مت کہو) کے الفاظ میں تو "خارجیوں" کی تردید ہے۔ جن کا کہنا ہے کہ مؤمن اگر گناہ کا مرتکب ہو جائے خواہ وہ گناہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہو تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور وَلَا تُخْرِجْهُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ (اور نہ کسی عمل کی وجہ سے اسے خارج اسلام قرار دو) کے الفاظ میں (معتزلہ) کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ بندہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے خارج از اسلام ہو جاتا ہے اگرچہ کافر نہیں ہوتا۔ مرتکب گناہ کبیرہ کے لئے وہ ایک درمیانی درجہ مانتے ہیں، یعنی نہ تو اس کو مسلمان کہتے ہیں اور نہ کافر۔ بہرحال خارجیوں اور معتزلہ سے قطع نظر موجودہ دور کے ان مسلمانوں کو بھی اس حدیث کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہیے جو کفر سازی کے کارخانے چلاتے ہیں اور اپنے مکتب فکر کے علاوہ دوسرے تمام مسلمانوں کو بے دریغ کافر قرار دیتے ہیں۔ یہ شقی القلب محض ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات کے تحت نہ صرف عام مسلمانوں کو بلکہ علماء حق اور اولیاء اللہ تک کو کافر کہنے سے ذار نہیں جھجکتے۔ ان لوگوں کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا چاہئے کہ جب لسان نبوت نے عاصی مسلمان کو بھی کافر کہنے سے سخت منع فرمایا ہے تو پھر ان بزرگان دین اور پیشوا اسلام کا کافر کہنا کہ جن کی زندگیوں کا تمام حصہ مذہب کی خدمت و اشاعت میں گزرتا ہے اور جو ان کو کافر نہ کہے اس کو بھی کافر کہنا احکام شریعت اور فرمان رسالت سے کتنا مضحکہ خیز معاملہ ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ عذاب خداوندی اور خسران آخرت کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا۔

حدیث میں جن باتوں کو ایمان کی جڑ فرمایا گیا ہے ان میں سے پہلی بات تو وہی ہے جس کی وضاحت اوپر ہوئی۔ دوسری بات "جہاد" ہے، اس بارہ میں ارشاد نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اب روئے زمین پر دین حق (جو اللہ کا آخری اور کامل دین ہے) کے ظاہر ہو جانے اور رسول خدا کی رسالت کا اعلان ہو جانے کے بعد سے اس وقت تک کہ آخر میں قیامت کے قریب دجال مارا نہ جائے، یاجوج ماجوج ظاہر ہو کر فنا کے گھاٹ نہ اتر جائیں اور یہ روئے زمین دین کے ایک ایک دشمن اور منکر سے پاک نہ ہو جائے، جہاد برابر جاری رہے گا۔ جہاد کی فرضیت اور اہمیت اس صورت میں بھی ختم نہیں ہوگی جب کہ کوئی اسلامی سربراہ مملکت ظالم و جابر ہو۔ اگر دشمنان دین کے خلاف وہ جہاد کا اعلان کر دے تو اس کو ماننا اور اس کے ساتھ جہاد میں شریک ہونا شرعی طور پر ضروری ہوگا۔ یہ نہیں کہ اس کے ظلم و جبر کا بہانہ لے کر جہاد میں شریک اور مددگار بننے سے انکار کر دیا جائے اسی طرح اگر کسی دشمن دین قوم کا سربراہ اور بادشاہ اتفاق سے عادل اور منصف مزاج ہو تو ہر چند کہ بادشاہ کا عدل امن و انصاف کا باعث ہوتا ہے، لیکن اسلام کی شوکت بڑھانے اور دین کا بول بالا کرنے کے لئے اس عادل بادشاہ کی قوم کے خلاف بھی جہاد کو غیر ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تیسری بات تقدیر پر اعتقاد و یقین رکھنا ہے یعنی ایمان کی سلامتی کے لئے یہ یقین رکھنا اشد ضروری ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو بھی حادثات و واقعات پیش آتے ہیں وہ سب قضا و قدر الٰہی کے تحت ہے۔

ارتکاب زنا کے وقت ایمان باہر آجاتا ہے

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا زَنَى الْعَبْدُ خَرَجَ مِنْهُ الْاِیْمَانُ فَكَانَ فَوْقَ رَأْسِهٖ كَالظُّلَّةِ فَاِذَا خَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْعَمَلِ رَجَعَ اِلَیْهِ الْاِیْمَانُ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! جب بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان اس سے نکل جاتا ہے اور اس کے سر پر سائبان کی طرح معلق ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ اس معصیت سے فارغ ہو جاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: حافظ ابن تیمیہؒ نے اس موقع پر بڑی اچھی مثال دی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک گناہ گار کی مثال ایسی ہے۔ جیسی آنکھیں بند کرنے کے بعد ایک بینا شخص اپنی آنکھیں بند کرے تو اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اور اس لحاظ سے یہ بینا اور ایک نابینا دونوں برابر ہو جاتے ہیں، نہ یہ دیکھتا ہے نہ وہ، لیکن فرق یہ ہے کہ نابینا آنکھوں کی روشنی ہی نہیں رکھتا اور بینا اگرچہ روشنی تو رکھتا ہے مگر غلاف چشم کی وجہ سے وہ روشنی کام نہیں کرتی اسی طرح ایک مؤمن کے نور بصیرت پر جب بہیمیت وضلالت کا حجاب پڑ جاتا ہے تو وہ بھی کافر کی طرح معصیت اور طاعت کا فرق نہیں پہنچانتا۔

اس لئے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مؤمن جس حالت میں زنا کرتا ہے اس کا نور ایمانی بہیمیت و معصیت کی تاریکی سے ایسا مدہم پڑ جاتا ہے کہ اسے بھی معصیت کرنے میں کوئی باک نہیں رہتا اور جب بندہ اس معصیت کے بعد صدق دل سے توبہ کر لیتا ہے تو یہ حجاب بہیمیت پر چاک ہو جاتا ہے، اور نور ایمانی پھر جگمگانے لگتا ہے۔ (ترجمان السنۃ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت معاذؓ کو دس باتوں کی وصیت

(۱۱) عَنْ مُعَاذٍ قَالَ اَوْصَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَشْرِ كَلِمَاتٍ قَالَ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَاِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ وَلَا تَعُقَّنَّ وَالِدَيْكَ وَاِنْ اَمَرَاكَ اَنْ تَخْرُجَ مِنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ وَلَا تَتْرُكَنَّ صَلَاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّدًا فَاِنَّ مَنْ تَرَكَ صَلَاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِاَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَلَا تَشْرَبَنَّ خَمْرًا فَاِنَّهٗ رَأْسُ كُلِّ فَاحِشَةٍ وَاِيَّاكَ وَالْمَعْصِيَةَ فَاِنَّ بِالْمَعْصِيَةِ حَلَّ سَخَطُ اللّٰهِ وَاِيَّاكَ وَالْفِرَارَ مِنَ الزَّحْفِ وَاِنْ هَلَكَ النَّاسُ وَاِذَا اَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ وَاَنْتَ فِيْهِمْ فَاثْبُتْ وَاَنْفِقْ عَلٰی عِيَالِكَ مِنْ طَوْلِكَ وَلَا تَرْفَعْ عَنْهُمْ عَصَاكَ اَدَبًا وَاَخِفْهُمْ فِی اللّٰهِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتوں کی وصیت فرمائی، چنانچہ فرمایا: (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اگرچہ تمہیں جان سے مار ڈالا جائے اور جلا دیا جائے (۲) اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو اگرچہ وہ تمہیں اپنے اہل اور مال چھوڑ دینے کا حکم دیں (۳) جان بوجھ کر کوئی فرض نماز نہ چھوڑو کیونکہ جو شخص عمداً نماز چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں (۴) شراب مت پیو کیونکہ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے (۵) اللہ کی نافرمانی اور گناہ سے بچو کیونکہ نافرمانی کرنے سے اللہ کا غصہ اتر آتا ہے۔ (۶) جہاد میں دشمنوں کو ہرگز پیٹھ نہ دکھلاؤ اگرچہ تمہارے ساتھ کے تمام لوگ ہلاک ہو جائیں۔ (۷) جب لوگوں میں موت (وباء کی صورت میں) پھیل جائے اور تم ان میں موجود ہو تو ثابت قدم رہو یعنی ان کے درمیان سے بھاگو مت۔ (۸) اپنے اہل و عیال پر اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرتے رہو۔ (۹) تادیباً اپنا ڈنڈا ان سے نہ ہٹاؤ۔ (۱۰) اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں انہیں ڈراتے رہو یعنی اہل و عیال میں سے کسی کو سزاءً یا تادیباً کچھ مارنا پیٹنا ضروری ہو تو اس سے پہلو تہی نہ کرو اور ان کو اچھی اچھی باتوں کی نصیحت و تلقین کرتے رہا کرو اور دین کے احکام و مسائل کی تعلیم دیا کرو اور ان کو بری باتوں سے بچانے کی کوشش کرو۔" (احمدؒ)

تشریح: شرک اپنی برائی کے اعتبار سے کس قدر خطرناک ہے اور اخروی حیثیت سے کتنی ہلاکت خیزی رکھتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو وصیت فرمائی کہ اگر تمہیں جان سے مار ڈالے جانے کا بھی خطرہ ہو یا تمہیں آگ میں ڈالا جا رہا ہو تو بھی تم توحید کے معاملہ میں اپنے عقیدہ سے ایک انچ نیچے مت اترنا بلکہ موت کی پروا کئے بغیر اپنے اعتقاد پر پختگی کے ساتھ قائم رہنا، تاہم جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے تو کہا جاتا ہے کہ حضرت معاذؓ چونکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے شریعت کی پیروی میں انتہائی سخت تھے اور کسی بھی مسئلہ کے اسی پہلو کو اختیار کرتے تھے جو اولیٰ ہوتا تھا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کے مزاج اور ذوق کے

مطابق اس قدر اہمیت کے ساتھ ان کو حکم دیا، ورنہ ایسے موقع پر جب کہ اپنے ایمان و اسلام کا اظہار اپنی موت کو دعوت دینے والا اور کفر و شرک کا کلمہ زبان سے ادا کئے بغیر جان نہ بچتی ہو تو اس کی اجازت ہے کہ کفر و شرک کا کوئی کلمہ زبان سے ادا کرے بشرطیکہ دل میں ایمان پوری طرح موجود رہے۔ "والدین کی اطاعت و فرمانبرداری" کی بھی اہمیت و تاکید ہی کو ظاہر کرنے کے لئے بطور مبالغہ فرمایا گیا کہ اگر ماں باپ تمہیں تمہارے اہل و عیال سے الگ ہو جانے یا تمہیں تمہارے مال و اسباب اور املاک و جائداد سے دستبردار ہو جانے کا بھی حکم دیں تو اس حکم کی اطاعت کرو، اس بارے میں بھی اصل مسئلہ یہ ہے کہ ماں باپ کا یہ حکم ماننا واجب نہیں ہے تاکہ حرج و نقصان میں مبتلا ہونا لازم نہ آئے۔ "فرض نماز" کی اہمیت جتلانے کے لئے فرمایا گیا کہ اگر تم جان بوجھ کر فرض نماز چھوڑ دو گے تو پھر اپنے آپ کو دنیا اور آخرت میں خدا کی ذمہ داری سے باہر سمجھو، دنیا میں تم اس اعتبار سے کہ اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے قانون کے تحت جس تعزیر کے مستوجب قرار پاؤ گے اس میں اللہ کی طرف سے کوئی امن و عافیت تمہیں نہیں ملے گی اور آخرت میں اس اعتبار سے کہ وہاں ترک نماز کے سبب خود اللہ تمہیں عذاب میں گرفتار کرے گا۔ "دشمن کو پیٹھ دکھانے" کے بارے میں "جیسا کہ پہلے بھی گزرا" یہ مسئلہ ہے کہ اگر دشمن دو تہائی تک بھی زائد ہوں یعنی ایک مسلمان کے مقابلہ پر دو دشمن دین ہوں تو اس صورت میں مقابلہ سے ہٹ جانا اور راہ فرار اختیار کرنا کسی مسلمان کو ہرگز جائز نہیں ہے ہاں اگر ایک کے مقابلہ میں دو سے زائد ہوں تو پھر تباہی کا خطرہ دیکھ کر مقابلہ سے ہٹ جانا اور جان بچانے کے لئے راہ فرار اختیار کر لینا جائز ہو گا۔ پس آنحضرت ﷺ نے معاذؓ کو یہ حکم مبالغہ کے طور پر دیا کہ تم کسی بھی صورت میں اپنے دشمن کو پیٹھ مت دکھانا خواہ تمہارے تمام ساتھی شہید ہو جائیں اور دشمن کے مقابلہ پر تم تنہا ہی کیوں نہ رہ جاؤ اس حدیث میں ایک اعتقادی کمزوری کی بھی نشان دہی کی گئی ہے اور اس کے خلاف حضرت معاذؓ کو متنبہ کیا گیا۔ یعنی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی آبادی میں کوئی وبا پھیل جاتی ہے اور موتیں کثرت سے واقع ہونے لگتی ہیں تو عوام دہشت زدہ ہو کر اپنے گھربار چھوڑ دیتے ہیں اور اس آبادی سے نکل بھاگتے ہیں۔ اس بارے میں بھی اصل مسئلہ یوں ہے کہ جو لوگ اس آبادی میں پہلے سے مقیم نہ ہوں بلکہ دوسری جگہوں پر ہوں تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ اس آبادی سے دور رہیں اور وہاں نہ آئیں لیکن جو لوگ پہلے ہی سے آبادی میں مقیم ہوں ان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ موت کے خوف سے اس آبادی کو چھوڑ دیں اور وہاں سے نکل بھاگیں، کیونکہ وبازدہ آبادی سے نکل بھاگنا ایسا ہی گناہ ہے جیسا دشمن کے مقابلہ سے بھاگ کھڑا ہونے کا بلکہ جو شخص اس اعتقاد سے بھاگے گا کہ اگر یہاں رہا تو مر جاؤں گا اور یہاں سے نکل بھاگنے پر موت سے بچ جاؤں گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

اب کفر ہے یا ایمان

(۱۴) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ اِنَّمَا النِّفَاقُ كَانَ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَّا الْيَوْمَ فَاِنَّمَا هُوَ الْكُفْرُ وَالْاِيْمَانُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت حذیفہؓ[1] کہتے ہیں کہ نفاق کا حکم آنحضرت ﷺ کے عہد پر ختم ہو گیا لہٰذا اب تو (دو ہی صورتیں ہوں گی کہ) کفر ہو گا یا ایمان۔" (بخاریؒ)

تشریح: عہد رسالت میں بعض مصلحتوں کی بنا پر منافقین کو مسلمانوں ہی کے حکم میں رکھا جاتا تھا اور ان کی ریشہ دوانیوں و سازشوں سے چشم پوشی کی جایا کرتی تھی، لیکن اب یہ حکم باقی نہیں رہا، فرض کرو اگر کسی مسلمان کے بارے میں یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ شخص مؤمن نہیں ہے، بلکہ حقیقی منافق ہے تو اس پر کفر و ارتداد کا حکم لاگو ہو گا اور اسلامی حکومت اس کو سزائے موت دے دے گی۔

---

[1] آپ کا اسم گرامی حذیفہ بن یمان ہے اور کنیت ابو عبداللہ عبسی ہے۔ آپ کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد چالیسویں دن ۳۶ھ میں ہوئی۔

بَابٌ فِی الْوَسْوَسَۃِ

یہ باب وسوسہ کے بیان میں ہے

"وسوسہ" گناہ یا کفر سے متعلق اس خیال کو کہتے ہیں جو دل میں گزرے یا شیطان دل و دماغ میں ڈالے اس کے مقابلہ پر "الہام" اس اچھے اور نیک خیال کو کہتے ہیں جو اللہ کی طرف سے دل و دماغ میں ڈالا جاتا ہے۔

وسوسہ کی قسمیں

وسوسہ کی مختلف صورتیں اور نوعیتیں ہوتی ہیں اور اسی اعتبار سے علماء نے اس کی الگ الگ قسمیں متعین کی ہیں چنانچہ وسوسہ کی ایک قسم تو "ضروری یعنی اضطراری" ہے اور دوسری قسم "اختیاری" ہے۔ ضروری یا اضطراری وسوسہ اس کو کہتے ہیں کہ کسی گناہ کا یا ایمان و یقین کے منافی کسی بات کا خیال اچانک اور بے اختیار دل و دماغ میں گزر جائے اس کو اصطلاحی طور پر "ہاجس" سے تعبیر کیا جاتا ہے اس (ہاجس) کی معافی گزشتہ امتوں میں بھی رہی ہے اور اس اُمت میں بھی ہے اور اگر وہی برا خیال دل و دماغ میں ٹھہر جائے اور خلجانی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کو "خاطر" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ (خاطر) بھی اُمت سے معاف ہے۔ "اختیاری وسوسہ" اس کو کہتے ہیں کہ کسی گناہ یا ایمان و یقین کے منافی کسی بات کا خیال دل و دماغ میں پیدا ہو، ٹھہرا رہے، لگاتار رہے۔ مستقل خلجان کرتا رہے، طبیعت کی خواہش بھی اس کے کرنے کی ہو اور ایک گونہ لذت و محبت بھی اس کے تئیں محسوس ہو۔ اختیاری وسوسہ کی یہ صورت "ہم" کہلاتی ہے اور یہ بھی صرف اس اُمت سے معاف ہے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں اور جب تک یہ عملی صورت اختیار نہ کرے اس پر کوئی گناہ نامۂ اعمال میں نہیں لکھا جاتا۔ بلکہ اگر عمل کا قصد ہو جائے اور پھر اپنے آپ کو عمل سے باز رکھے تو اس کے عوض نیکی لکھی جاتی ہے۔ "ہم" کے مقابلہ پر اختیاری وسوسہ کی دوسری صورت کا نام عزم ہے یعنی انسانی طبیعت اور نفس کا کسی برے خیال اور بری بات کو اپنے اندر کرنا اور جما لینا اور نہ صرف یہ کہ اس خیال سے نفرت و کراہیت نہ ہو بلکہ اس پر عمل کرنے کا ایسا پختہ ارادہ کر لینا کہ اگر کوئی خارجی مانع نہ ہو اور اسباب و ذرائع مہیا ہوں تو وہ یقینی طور پر عملی صورت اختیار کر لے وسوسہ کی یہ صورت ایسی ہے جو قابل مواخذہ ہے لیکن اس مواخذہ کی نوعیت عملی طور پر ہونے والے مواخذہ سے ہلکی ہوگی، مطلب یہ کہ وسوسہ جب تک اندر رہے گا اس پر کم گناہ ہوگا اور جب اندر سے نکل کر عملی صورت اختیار کرے گا تو گناہ زیادہ ہوگا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ وسوسہ کی مذکورہ بالا تقسیم ان افعال و اعمال کی نسبت سے ہے جن کے وقوع اور صدور کا تعلق ظاہری اعضاء جسم سے ہے جیسے زنا اور چوری وغیرہ وغیرہ جو باتیں دل و دماغ کا فعل کہلاتی ہیں جیسے برا عقیدہ اور حسد وغیرہ وغیرہ تو وہ اس تقسیم میں داخل نہیں ہیں ان کے ہمیشہ استمرار پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

وسوسوں کی معافی

① وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَاوَسْوَسَتْ بِہٖ صُدُوْرُھَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِہٖ اَوْ تَتَکَلَّمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے لوگوں کے ان وسوسوں کو

معاف کر دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں جب تک کہ وہ ان وسوسوں پر عمل نہ کریں اور ان کو زبان پر نہ لائیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

وسوسہ کو برا سمجھنا ایمان کی علامت ہے

(۲) وَعَنْهُ قَالَ جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِيْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَوَقَدْ وَجَدْتُمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذَاكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کے چند صحابی بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں (یعنی وسوسے) پاتے ہیں جس کا زبان پر لانا بھی ہم برا سمجھتے ہیں۔ سرکار نے پوچھا! کیا تم واقعی ایسا پاتے ہو۔ (کہ جب کوئی ایسا وسوسہ تمہارے اندر پیدا ہوتا ہے تو خود تمہارا دل اس کو ناپسند کرتا ہے اور اس کا زبان پر لانا بھی تم برا جانتے ہو؟) صحابہؓ نے عرض کیا! جی ہاں تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "کھلا ہوا ایمان ہے۔" (مسلمؒ)

شیطان وسوسے پیدا کرے تو اللہ کی پناہ مانگو

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِي الشَّيْطَانُ اَحَدَكُمْ فَيَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ حَتّٰى يَقُوْلَ مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ؟ فَاِذَا بَلَغَهٗ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! تم میں سے بعض آدمیوں کے پاس شیطان آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا اور اس چیز کو کس نے پیدا کیا؟ تا آنکہ پھر وہ یوں کہتا ہے کہ تیرے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب نوبت یہاں تک آجائے تو اس کو چاہیے کہ اللہ سے پناہ مانگے اور اس سلسلہ کو ختم کر دے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: شیطان انسان کے روحانی ارتقاء کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس کا بنیادی نصب العین ہی یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو، جو اللہ کی ذات و صفات پر ایمان و یقین رکھتے ہیں، ورغلانے اور بہکانے میں لگا رہے، یہی نہیں کہ وہ فریب کاری کے ذریعہ انسان کے نیک عمل اور اچھے کاموں میں رکاوٹ اور تعطل پیدا کرنے کی سعی کرتا رہے بلکہ اس زبردست قدرت کے بل پر کہ جو حق تعالیٰ نے تکوینی مصلحت کے تحت اس کو دی ہے۔ وسوسہ اندازی کے ذریعہ انسان کی سوچ' فکر اور خیالات کی دنیا میں مختلف انداز کے شبہات اور برائی بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جن لوگوں کی سوچ' فکر اور خیالات کے سرچشموں پر ایمان و یقین کی مضبوط گرفت ہوتی ہے وہ اپنے ایمان کی فکری اور شعوری طاقت سے شیطان کے وسوسوں کو ناکارہ بنا دیتے ہیں، چنانچہ اس حدیث میں جہاں بعض شیطانی وسوسوں کی نشان دہی کی گئی ہے وہیں اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو ان وسوسوں کو غیر مؤثر اور ناکارہ بنانے سے تعلق رکھتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ پہلے تو شیطان اللہ کی مخلوقات اور موجودات کے بارہ میں وسوسہ اندازی کرتا ہے، مثلاً فکر و خیال میں یہ بات ڈالتا ہے کہ انسان کا وجود کس نے بنایا، یہ زمین و آسمان کی تخلیق کس کا کارنامہ ہے، چونکہ اللہ کی ذات و صفات پر ایمان رکھنے والوں کی عقل سلیم کائنات کی تمام مخلوقات و موجودات کی تخلیقی و تکوینی نوعیت کا بدیہی شعور و ادراک رکھتی ہے اس لئے مخلوقات کی حد تک شیطان کی وسوسہ اندازی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن معاملہ وہاں نازک ہو جاتا ہے جب یہ سلسلہ نازک ہو کر ذات باری تعالیٰ تک پہنچ جائے اور وسوسہ شیطانی دل و دماغ سے سوال کرے جب یہ زمین و آسمان اور ساری مخلوقات اللہ کی پیدا کردہ ہیں تو پھر خود اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا گیا کہ جوں ہی یہ وسوسہ پیدا ہو اپنے اللہ سے پناہ مانگو اور اپنے ذہن سے اس فاسد خیال کو فوراً جھٹک دو تاکہ وسوسۂ شیطانی کا سلسلہ منقطع ہو جائے اللہ کی پناہ چاہنے کا مطلب محض زبان سے چند الفاظ ادا کر لینا نہیں ہے بلکہ یہ کہ ایک طرف تو اپنے فکر و خیال کو یکسو کر کے اس عقیدہ و یقین کی گرفت میں دے دو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے، وہ واجب الوجود ہے اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور

دوسری طرف ریاضت و مجاہدہ اور ذات باری تعالیٰ کے ذکر و استغراق کے ذریعہ اپنے نفس کے تزکیہ اور ذہن و فکر کے تحفظ اور سلامتی کی طرف متوجہ رہو۔ وسوسہ کی راہ روکنے کا ایک فوری مؤثر طریقہ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجلس بدل دی جائے۔ یعنی جس جگہ بیٹھے یا لیٹے ہوئے اس طرح کا وسوسہ پیدا ہو وہاں سے فوراً ہٹ جائے اور کسی دوسری جگہ جا کر کسی کام اور مشغلہ میں لگ جائے اس طرح دھیان فوری طور پر ہٹ جائے گا اور وسوسہ کی راہ ماری جائے گی۔

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُوْنَ حَتّٰى يُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! لوگ ہمیشہ اپنے دل میں مخلوقات وغیرہ کے بارے میں خیالات پکارتے رہیں گے، یہاں تک کہ کہا جائے گا (یعنی دماغ میں یہ وسوسہ آئے گا) کہ اس تمام مخلوق کو خدا نے پیدا کیا ہے (تو) خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس شخص کے دل و دماغ میں اس قسم کا کوئی خیال اور وسوسہ پیدا ہو تو وہ یہ کہے کہ میں خدا تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: شیطان کی وسوسہ اندازی اور گمراہ کن خیالات کی یورش سے بچنے کے لئے ایک طریقہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسے موقع پر (میں اللہ پر اس کے رسول پر ایمان لایا) پڑھنا چاہیے، اس کلمہ کے ورد کے ذریعہ زبان یہ اقرار و اعتراف کرے گی کہ میں اللہ کی ذات پر اور اس کے سچے رسول پر ایمان رکھتا ہوں جس نے ہمیں آگاہ کیا ہے کہ اس کی ذات واجب الوجود ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا بلکہ تمام جہاں کا اور تمام چیزوں کا وہی خالق ہے وہی دل و دماغ میں ان باتوں کی صحت و صداقت کا یقین راسخ ہو گا اور ذہن و فکر کو برے خیالات سے تحفظ و سلامتی حاصل ہو گی جس کے سبب شیطان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان اور ایک فرشتہ مقرر کیا گیا ہے

⑤ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِيْنُهٗ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ قَالُوْا وَاِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاِيَّايَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا يَاْمُرُنِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ ایک ہمزاد جنوں (شیطان میں سے اور ایک ہمزاد فرشتوں میں سے مقرر نہ کیا گیا ہو، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی لیکن خدا نے مجھ کو اس (جن مؤکل) سے مقابلہ کرنے میں مدد دے رکھی ہے اس لئے میں اس (کے مکر و فریب اور اس کی گمراہی) سے محفوظ رہتا ہوں، بلکہ یہاں تک کہ) وہ بھی مجھے بھلائی کا مشورہ دیتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ موکل ہوتے ہیں ان میں سے ایک تو فرشتہ ہے جو نیکی و بھلائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور انسان کو اچھی باتیں و نیک کام سکھاتا ہے اور اس کے قلب میں خیر و بھلائی کی چیزیں ڈالا رہتا ہے، اس کو "ملہم" کہتے ہیں، دوسرا ایک جن (شیطان) ہوتا ہے، جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو برائی کے راستہ پر ڈالتا ہے۔ چنانچہ وہ گناہ و معصیت کی باتیں بتاتا ہے اور دل میں برے خیالات و غلط وسوسے پیدا کرتا رہتا ہے اس کا نام "وسواس" ہے۔

شیطان انسان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کے اندر شیطان اس طرح دوڑتا پھرتا ہے جیسے رگوں میں خون گردش کرتا

رہتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ شیطان انسان کو بہکانے کی کامل قدرت رکھتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ مختلف ظاہری صورتوں میں اچھے انسانوں اور نیک بندوں کو نیکی و بھلائی کے راستہ پر چلنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے بلکہ انسان کی داخلی کائنات میں گھس کر اس کے ذہن و فکر اور اس کے قلب و دماغ کو پراگندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ولادت کے وقت بچہ کا رونا شیطانی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے

⑦ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ بَنِیْ آدَمَ مَوْلُوْدٌ اِلَّا یَمَسُّهُ الشَّیْطَانُ حِیْنَ یُوْلَدُ فَیَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّیْطَانِ غَیْرَ مَرْیَمَ وَابْنِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی آدم کے یہاں جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو چھوتا ہے جس کی وجہ سے بچہ چیخ اٹھتا ہے لیکن ابن مریم (حضرت عیسی علیہ السلام) اور ان کی ماں کو شیطان نے نہیں چھوا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: شیطان کے چھونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ولادت کے وقت بچہ کی کوکھ میں اپنی انگلیاں اس طرح مارتا ہے کہ بچہ تکلیف محسوس کرتا ہے اور چلا چلا کر رونے لگتا ہے۔ اس شیطانی ایذا کا شکار ہر بچہ ہوتا ہے۔ صرف حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے حضرت عیسی علیہ السلام اس شیطانی عمل سے محفوظ رہے تھے ان دونوں کا محفوظ رہنا بظاہر اس دعا کی مقبولیت کا نتیجہ تھا جو حضرت مریمؑ کی والدہ نے کی تھی اور جس کو قرآن نے یوں نقل کیا ہے۔

اِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ (آل عمران ۳۶)

"(اے خدا) میں اس مریمؑ کو اس کی اولاد کو شیطان مردود سے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں۔"

حدیث میں مریمؑ اور عیسی علیہ السلام کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کی والدہ سے صراحۃً دعا منقول ہے اس لئے حضور ﷺ نے بھی صراحۃً اس کے قبول ہونے کو ظاہر فرما دیا ہے۔ لہٰذا یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے انبیاء کو شیطان نے بوقت ولادت چھوا ہو اور ان کو تکلیف پہنچائی ہو۔

یہاں یہ اشکال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر شیطان کو اتنی قدرت ہو تو وہ سب کو ہلاک کر دے۔ کیونکہ شیطان کو صرف اتنی ہی قدرت دی گئی ہے وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا اور نہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ کسی کو اس سے زیادہ تکلیف پہنچا کر ہلاک کر دے، دوسرے شیطان کے مقابلہ میں ملائکہ بھی تو ہوتے ہیں جو نگہبانی کرتے ہیں اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کو جتنی قدرت دی گئی ہے اس سے تجاوز کر جائے اور اپنے کسی مہلک ارادہ میں کامیاب ہو جائے۔

⑧ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صِیَاحُ الْمَوْلُوْدِ حِیْنَ یَقَعُ نَزْغَةٌ مِنَ الشَّیْطَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! ولادت کے وقت بچہ اس لئے چلاتا ہے کہ شیطان اس کو کچوکے لگاتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

میاں بیوی کے درمیان شیطان کا پسندیدہ کام

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اِبْلِیْسَ یَضَعُ عَرْشَهُ عَلَی الْمَاءِ ثُمَّ یَبْعَثُ سَرَایَاهُ یَفْتِنُوْنَ النَّاسَ فَاَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً اَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً یَجِیْءُ اَحَدُهُمْ فَیَقُوْلُ فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا فَیَقُوْلُ مَا صَنَعْتَ شَیْئًا قَالَ ثُمَّ یَجِیْءُ اَحَدُهُمْ فَیَقُوْلُ مَا تَرَكْتُهُ حَتّٰی فَرَّقْتُ بَیْنَهُ وَبَیْنَ امْرَاَتِهِ قَالَ فَیُدْنِیْهِ مِنْهُ وَیَقُوْلُ نِعْمَ اَنْتَ قَالَ الْاَعْمَشُ اَرَاهُ قَالَ

فَیَلْتَزِمُهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابلیس اپنا تخت حکومت پانی (یعنی سمندر) پر رکھتا ہے۔ پھر وہاں سے اپنی فوجوں کو روانہ کرتا ہے تاکہ لوگوں کو فتنہ اور گمراہی میں مبتلا کریں۔ اس کی فوجوں میں ابلیس کا سب سے بڑا مقرب وہ ہے جو سب سے بڑا فتنہ انداز ہو۔ ان میں سے ایک واپس آکر کہتا ہے۔ میں نے فلاں فلاں فتنے پیدا کئے ہیں، ابلیس اس کے جواب میں کہتا ہے: تو نے کچھ نہیں کیا، آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے! میں نے (ایک بندہ کو گمراہ کرنا شروع کیا اور) اس وقت تک اس شخص کا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہ ڈلوادی۔ آنحضرت فرماتے ہیں کہ ابلیس (یہ سن کر) اس کو اپنے قریب بٹھالیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے اچھا کام کیا (حدیث کے ایک راوی) اعمش" کہتے ہیں میرا خیال ہے جابرؓ نے بجائے (فیدنیہ کے) فیلتذمہ (پس ابلیس اس کو گلے لگالیتا ہے) کے الفاظ نقل کیے تھے۔" (مسلم)

تشریح: جدائی ڈلوانے سے مراد لڑائی جھگڑے کے ذریعہ مرد کی زبان سے ناسمجھی میں ایسے الفاظ ادا کر دینا ہے جن سے اس کی بیوی پر طلاق بائن پڑ جائے۔ طلاق بائن میں عورت اپنے خاوند پر حرام ہو جاتی ہے، اس سے شیطان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنی جہالت کے سبب اس عورت کو اپنے نکاح میں داخل سمجھتے ہوئے اس سے صحبت کرتا رہے جو در اصل حرام کاری ہوتی ہے اور اس طرح کے لوگوں کی حرام کاری کے نتیجہ میں ناجائز اولاد پیدا ہوتی رہے، جس سے روئے زمین پر ناجائز اولاد کی تعداد بڑھتی رہے اور وہ ناجائز پیدا ہونے والے لوگ دنیا میں فسق و فجور اور گناہ و معصیت زیادہ سے زیادہ پھیلاتے رہیں۔

جزیرۃ العرب میں توحید کی مضبوط بنیاد سے شیطان مایوسی کا شکار!

(۱۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ اَیِسَ مِنْ اَنْ یَّعْبُدَهُ الْمُصَلُّوْنَ فِیْ جَزِیْرَةِ الْعَرَبِ وَلٰکِنْ فِی التَّحْرِیْشِ بَیْنَهُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ جزیرہ عرب میں مصلی (یعنی مسلمان) اس کی پرستش کریں لیکن ان کے درمیان فتنہ و فساد پھیلانے سے مایوس نہیں ہوا ہے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ کہ جزیرۃ العرب میں ایمان و اسلام کی جڑیں اتنی مضبوط ہو گئیں ہیں اور توحید کا کلمہ یہاں کے لوگوں کے دل و دماغ میں اس طرح جم گیا ہے کہ اب اس خطہ ارض میں بت پرستی جیسی لعنت کبھی نظر نہیں آئے گی چنانچہ اس بارہ میں شیطان نے بھی اپنی شکست تسلیم کرلی ہے اور وہ اس بات سے قطعاً مایوس ہو گیا ہے کہ یہاں کے مؤمن و مسلمان اس کے بہکاوے میں آکر بت پرستی اور دوسری کھلی ہوئی مشرکانہ حرکتوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں، لیکن بہر صورت بہکانا اور ورغلانا چونکہ شیطان کی فطرت ہے اس لئے اس نے جزیرۃ العرب کے لوگوں میں اپنا مشن ختم نہیں کیا ہے اور اس بات میں پر امید ہے کہ ان کے درمیان طرح طرح جذبات ابھار کر ان کو آپس میں لڑایا جا سکتا ہے۔ ان کو افتراق و انتشار کے فتنوں میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔

اس حدیث کے پس منظر میں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ زمانہ رسالت سے لے کر آج تک کبھی بھی جزیرۃ العرب میں بت پرستی نہیں ہوئی۔ کھلے ہوئے مشرکانہ اعمال کا کبھی مظاہرہ نہیں ہوا۔ یہ دوسری بات ہے کہ شیطان کمزور عقیدہ لوگوں کو ایمان و اسلام سے منحرف کرنے میں کامیاب ہو گیا، کچھ لوگ مرتد ہو گئے ہوں لیکن ان میں سے بھی کوئی بت پرست ہو گیا ہو ایسا ہر گز نہیں ہوا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

شیطانی وسوسہ سے محفوظ رہنے پر اللہ کا شکر ادا کرو

⑪ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَآءَہٗ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّیْ اُحَدِّثُ نَفْسِیْ بِالشَّیْءِ لَاَنْ اَکُوْنَ حُمَمَۃً اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَتَکَلَّمَ بِہٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَہٗ اِلَی الْوَسْوَسَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابیؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا (یارسول اللہ) میں اپنے اندر ایسا (برا) خیال پاتا ہوں کہ زبان سے اس کے اظہار کے بجائے جل کر کوئلہ ہو جانا مجھ کو زیادہ پسند ہے۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا! اللہ کا شکر ادا کرو جس نے اس خیال کو وسوسہ کی حد تک رکھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: شیطان نے ان صحابیؓ کے اندر کوئی برا خیال ڈال دیا ہوگا جس سے ان کے ایمان کی حسیاتی کیفیت بے چین ہو گئی ہوگی اور وہ بھاگتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے، آنحضرت ﷺ نے ان کو تسلی دی کہ اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تو اللہ کا بڑا فضل ہے کہ تمہارا ایمانی احساس و شعور پوری طرح بیدار ہے اور اس برے خیال کو خود تمہارے دل و دماغ نے قبول نہیں کیا اور وہ "وسوسہ" کی حد سے آگے بڑھنے نہیں پایا۔ اس طرح کے وسوسہ پر نہ کوئی مواخذہ ہے اور نہ کسی نقصان کا خدشہ، اس کو تو اللہ تعالیٰ نے معاف قرار دیا ہے، ہاں اگر وہ برا خیال وسوسہ کی حد سے آگے بڑھ کر تمہاری زبان یا عمل سے ظاہر ہو جاتا تو پھر تمہارے لئے خطرہ کی بات تھی۔

اپنے اندر نیکی کی تحریک پر اللہ کا شکر ادا کرو اور شیطان کی وسوسہ اندازی کے وقت اللہ کی پناہ چاہو

⑫ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلشَّیْطَانِ لَمَّۃً بِابْنِ اٰدَمَ وَلِلْمَلَكِ لَمَّۃً فَاَمَّا لَمَّۃُ الشَّیْطَانِ فَاِیْعَادٌ بِالشَّرِّ وَتَکْذِیْبٌ بِالْحَقِّ وَاَمَّا لَمَّۃُ الْمَلَكِ فَاِیْعَادٌ بِالْخَیْرِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْحَقِّ فَمَنْ وَجَدَ ذٰلِكَ فَلْیَعْلَمْ اَنَّہٗ مِنَ اللّٰہِ فَلْیَحْمَدِ اللّٰہَ وَمَنْ وَجَدَ الْاُخْرٰی فَلْیَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ثُمَّ قَرَأَ اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ (البقرۃ ۲۶۸) رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان پر ایک تصرف تو شیطان کا ہوا کرتا ہے اور ایک تصرف فرشتہ کا شیطان کا تصرف تو یہ ہے کہ وہ برائی پر ابھارتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے اور فرشتہ کا تصرف یہ ہے کہ وہ نیکی پر ابھارتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے لہٰذا جو شخص (نیکی پر فرشتہ کے ابھارنے کی) یہ کیفیت اپنے اندر پائے تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے (ہدایت) ہے اس پر اس کو اللہ کا شکر بجالانا چاہیے اور جو شخص دوسری کیفیت (یعنی شیطان کی وسوسہ اندازی) اپنے اندر پائے تو اس کو چاہیے کہ شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرے پھر آپ ﷺ نے یہ قرآنی آیت پڑھی (جس کا ترجمہ ہے) شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور گناہ کے لئے اکساتا ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: فرشتہ کے ابھارنے کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ نیکی کی اہمیت اور نیکی پر ملنے والے اجر و انعام کی کشش ظاہر کرتا ہے اور انسان کے احساس و شعور میں یہ بات ڈالتا ہے کہ اللہ کا سچا دین ہی انسانیت کی بقاو ترقی کا ضامن ہے اللہ کے رسول جو شریعت لے کر آئے ہیں اسی میں بنی آدم کی دنیاوی اور آخروی نجات پوشیدہ ہے۔ اگر اپنی فلاح و نجات چاہتے ہو تو برائی کے راستہ سے بچو اور نیکی کے راستہ کو اختیار کرو۔ شیطان کا ابھارنا یہ ہوتا ہے کہ وہ راہ حق کو تاریک کر کے دکھاتا ہے وسوسہ اندازی کے ذریعہ دین کی بنیادی باتوں مثلاً توحید، نبوت

آخرت اور دوسرے معتقدات میں تردد و تشکیک پیدا کرتا ہے۔ نیکی کو بدنما صورت میں اور بدی کو اچھی شکل و صورت میں پیش کرتا ہے، انسانی دماغ میں یہ بات بٹھانے کی سعی کرتا ہے کہ اگر ان چیزوں کو اختیار کرو گے جو نیکی سے تعبیر کی جاتی ہیں تو پریشانیاں اٹھاؤ گے، تکلیفیں، برداشت کرو گے، مثلاً توکل و قناعت کی زندگی اختیار کرو گے اور اپنے اوقات کو دنیا سازی میں صرف کرنے کی بجائے اللہ کی عبادت اور دین کی خدمت میں لگاؤ گے تو تم نہ مال و دولت حاصل کر پاؤ گے اور نہ دنیا کی کوئی آسائش و راحت اٹھا پاؤ گے، الٹے فقر و محتاجگی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

وسوسے پیدا ہوں تو شیطان کو تھتکار دو اور اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو

⑬ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَزَالُ النَّاسُ یَتَسَآءَلُوْنَ حَتّٰى یُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ فَاِذَا قَالُوْا ذٰلِكَ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ثُمَّ لِیَتْفُلْ عَنْ یَسَارِهٖ ثَلَاثًا وَلْیَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَسَنَذْكُرُ حَدِیْثَ عَمْرِو بْنِ الْاَحْوَصِ فِیْ بَابِ خُطْبَةِ یَوْمِ النَّحْرِ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا! لوگ (پہلے تو مخلوقات وغیرہ کے بارے میں) پوچھا پوچھی کریں گے۔ اور پھر آخر میں یہ سوال کھڑا کیا جائے گا کہ ساری مخلوقات کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو خود اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ جب یہ سوال کھڑا کیا جائے تو تم کہو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہے۔ اور کوئی اس کا ہمسر (یعنی جوڑا نہیں ہے) پھر اپنی بائیں طرف تین بار تھتکار دو۔ اور شیطانِ مردود سے اللہ کی پناہ مانگو۔ (ابوداؤد) اور (صاحب مشکوٰۃ کہتے ہیں) کہ عمرو ابن احوص کی روایت (جس کو صاحب مصابیح نے یہاں نقل کیا تھا) ہم اس کو (خطبہ یوم النحر) کے باب میں نقل کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ (کیونکہ وہ روایت اسی باب کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے)۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

شیطانی وسوسوں سے چوکنا رہو

⑭ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَنْ یَبْرَحَ النَّاسُ یَتَسَآءَلُوْنَ حَتّٰى یَقُوْلُوْا هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَلِمُسْلِمٍ قَالَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا یَزَالُوْنَ یَقُوْلُوْنَ مَا كَذَا مَا كَذَا حَتّٰى یَقُوْلُوْا هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! لوگ آپس میں پوچھا پوچھی کرتے رہیں گے (یعنی شیطانی وسوسوں کی صورت میں ان کے اندر اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہیں گے) کہ جب ہر چیز کو خدا نے پیدا کیا (تو) خدائے بزرگ و برتر کو کس نے پیدا کیا؟ (بخاریؒ و مسلمؒ کی روایت میں یوں ہے! انسؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ ﷺ کی اُمت کے لوگ (اگر شیطان کے وسوسہ اندازی سے چوکنا نہ رہے تو پہلے) یوں کہیں گے کہ یہ کیا ہے؟ اور یہ کیسے ہوا؟ (یعنی مخلوقات کے بارے میں تحقیق و تجسس کریں گے) اور پھر آخر میں یہ کہیں گے کہ تمام چیزوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو خدائے بزرگ و برتر کو کس نے پیدا کیا ہے؟۔"

نماز کے دوران شیطان کی خلل اندازی

⑮ وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ حَالَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ صَلَاتِیْ وَبَیْنَ قِرَآءَتِیْ

يُلَبِّسُهَا عَلَيَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ شَيْطَانٌ يُقَالُ لَهٗ خِنْزَبٌ فَإِذَا اَحْسَسْتَهٗ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْهُ وَاتْفُلْ عَلٰى يَسَارِكَ ثَلَاثًا فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ فَاَذْهَبَهُ اللّٰهُ عَنِّيْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عثمانؓ ابن ابی العاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے اور میری نماز اور میری قرأت کے درمیان شیطان حائل ہو جاتا ہے اور ان چیزوں میں شبہ ڈالتا رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ شیطان ہے جس کو خنزب کہا جاتا ہے۔ پس جب تمہیں اس کا احساس ہو (کہ شیطان وسواس و شبہات میں مبتلا کرے گا) تو تم اس (شیطان مردود) سے خدا کی پناہ مانگو اور بائیں طرف تین دفعہ تھتکار دو۔ حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ (رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق) میں نے اسی طرح کیا تو خدا تعالیٰ نے مجھے اس کے وسواس و شبہات سے محفوظ رکھا۔" (مسلمؒ)

وہم اور وسوسہ کو نظر انداز کر کے اپنی نماز جاری رکھو

(۱۶) وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَهٗ فَقَالَ اِنِّيْ اَهِمُ فِيْ صَلَاتِيْ فَيَكْثُرُ ذٰلِكَ عَلَيَّ فَقَالَ لَهٗ اِمْضِ فِيْ صَلَاتِكَ فَاِنَّهٗ لَنْ يَذْهَبَ ذٰلِكَ عَنْكَ حَتّٰى تَنْصَرِفَ وَاَنْتَ تَقُوْلُ مَا اَتْمَمْتُ صَلَاتِيْ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت قاسمؒ بن محمدؒ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے اپنی نماز میں وہم ہوتا رہتا ہے (یعنی کبھی تو یہ شک ہوتا ہے کہ میری نماز درست ادا نہیں ہوئی کبھی یہ وہم ہو جاتا ہے کہ ایک رکعت پڑھنے سے رہ گئی ہے) اس کی وجہ سے مجھے گرانی ہوتی ہے؟ انہوں نے فرمایا (تم اس طرح کے خیال پر دھیان نہ دو اور) اپنی نماز پوری کرو، اس لئے کہ وہ (شیطان) تم سے جب ہی دور ہوگا کہ تم اپنی نماز پوری کر لو اور کہو کہ ہاں میں نے اپنی نماز پوری نہیں کی۔" (مالکؒ)

تشریح: نماز ہی وہ سب سے اہم عبادت ہے جس میں اللہ کے نیک بندوں کو بہکانے اور ورغلانے کے لئے شیطان اپنی سعی و کوشش سب سے زیادہ صرف کرتا ہے یہ شیطان کی تخریب کاری ہوتی ہے۔ جو عام لوگوں کو نماز کے دوران پوری ذہنی یکسوئی سے محروم رکھتی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز کی نیت باندھتے ہی دل و دماغ میں دنیا بھر کے خیالات کا اجتماع ہونا شروع ہو جاتا ہے، وہ باتیں جو کبھی یاد نہیں آتیں نماز ہی کے دوران ذہن میں کلبلانے لگتی ہیں۔ شیطان طرح طرح کے وسوسے اور خیالات پیدا کرتا رہتا ہے، کبھی تو یہ پھونک دیتا ہے کہ نماز مکمل نہیں ہوئی ہے بلکہ ایک رکعت یا دو رکعت چھوٹ گئی ہے، کبھی یہ وہم گزار دیتا ہے کہ نماز صحیح نہیں ہوئی ہے۔ فلاں رکن ترک ہو گیا ہے۔ قرأت میں فلاں آیت چھوٹ گئی ہے۔ اس وسوسہ اندازی سے شیطان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نمازی اپنی نماز کا سلسلہ منقطع کر دے اور نیت توڑ دے۔ شیطان کی اس تخریب کاری سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب شیطانی اثر سے اس طرح کے واہمے اور شکوک پیدا ہوں تو اپنی نماز کا سلسلہ منقطع نہ کرو، نیت نہ توڑو، بلکہ نماز پوری کرو اور شیطان سے کہو کہ ہاں میں غلطی کر رہا ہوں، نماز میری درست نہیں ہو رہی ہے لیکن میں نماز پڑھوں گا اور تیرے کہنے پر عمل نہیں کروں گا۔ علماء لکھتے ہیں کہ یہ طریقہ شیطانی اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے بہت ہی کارگر ہے۔ اس لئے کہ اس طرح شیطان نمازی سے مایوس ہو جاتا ہے اور جب وہ یہ جان لیتا ہے کہ یہ میرے قبضے

۱؎ عثمان بن ابی العاص کی کنیت ابو عبداللہ ہے قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتے ہیں اسی لئے ثقفی کہلاتے ہیں آپ اپنے قبیلہ ثقیف کے وفد کے ہمراہ دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام قبول کر کے ہدایت سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد آنحضرت نے ان کو اپنے قبیلہ کا امیر مقرر کر دیا تھا وفات نبوی کے بعد جب اہل طائف ارتداد کی طرف مائل ہونے لگے تو عثمان بن ابی العاص ہی کی ذات تھی جس نے ان کو ارتداد سے باز رکھا آپ نے بصرہ میں ۵۱ھ میں وفات پائی۔

۲؎ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے اور محمد بن ابوبکرؓ کے صاحب زادے ہیں، مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں سے ایک آپ بھی ہیں اکابر اور جلیل القدر تابعین میں آپ کا شمار ہوتا ہے یحییٰ بن سعیدؒ کا قول ہے کہ ہم نے مدینہ میں قاسم بن محمدؒ سے زیادہ افضل کسی کو نہیں پایا بعمر ۷۰ سال ۱۰۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

میں آنے والا نہیں ہے تو اس کے پاس سے ہٹ جاتا ہے۔

لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب کہ نمازی کو یقین ہے کہ میں نماز ٹھیک پڑھ رہا ہوں، نماز کے ارکان و افعال اور قرأت میں کوئی کوتاہی یا غلطی واقع نہیں ہو رہی ہے اور اگر واقعی اس کی نماز میں کوئی کوتاہی واقع ہو رہی ہے یا ارکان کی ادائیگی میں غلطی ہو رہی ہے اور اس کا احساس ہو رہا ہے تو اس غلطی و کوتاہی کو دور کرنا اور نماز کی صحت و درستی کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔

دراصل اس حکم (کہ شیطانی خلل اندازی سے صرف نظر کر کے اپنی نماز پوری کرو) کا بنیادی مقصد اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ شیطان سے چوکنا رہو، اس کو اثر انداز ہونے کا موقع نہ دو، اپنے دل و دماغ کو اتنا پاکیزہ اور مجلّی رکھو کہ شیطانی وسوسوں اور واہموں کو راہ نہ ملے۔ نماز اس قدر ذہنی یکسوئی توجہ اور حضور قلب کے ساتھ پڑھو کہ شیطان تمہارے پاس آنے کا ارادہ ہی نہ کرے۔ اس حکم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غیر درست عمل کو درست نہ کرو اور سہل انگاری دکھاؤ۔

بَابُ الْاِیْمَانِ بِالْقَدْرِ

تقدیر پر ایمان لانے کا بیان

تقدیر پر ایمان لانا فرض اور لازم ہے یعنی وجود ایمان کے لئے یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ بندوں کے تمام اعمال خواہ وہ نیک ہوں یا بد، ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لوح محفوظ میں لکھ دیے گئے ہیں، بندہ سے جو عمل بھی سرزد ہوتا ہے وہ خدا کے علم و اندازہ کے مطابق ہوتا ہے، لیکن خدا نے انسان کو عقل و دانش کی دولت سے نواز کر اس کے سامنے نیکی اور بدی دونوں راستے واضح کر دیے ہیں اور ان پر چلنے کا اختیار دے دیا اور بتا دیا کہ اگر نیکی کے (راستہ کو) اختیار کرو گے تو خدا تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوگا جس پر جزاء و انعام سے نوازے جاؤ گے اور اگر بدی کے راستہ کو اختیار کرو گے تو یہ خدا کے غضب اور اس کی ناراضگی کا باعث ہوگا جس کی وجہ سے سزا اور عذاب کے مستحق گردانے جاؤ گے۔

اب اس واضح اور صاف ہدایت کے بعد جو شخص نیکی و بھلائی کے راستہ کو اختیار کرتا ہے تو وہ ازراہ فضل و کرم خدا کی رحمت سے نوازا جائے گا اور اس پر خدا کی جانب سے فلاح و سعادت کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اگر کوئی عقل کا اندھا اپنے کسب و اختیار سے برائی کے راستہ کو اختیار کرتا ہے تو وہ از راہِ عدل سزا کا مستوجب ہوگا اور اسے عذاب و تباہی کے غار دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ تقدیر کا مسئلہ عقل و فکر کی رسائی سے باہر ہے کیونکہ یہ خدا کا ایسا ایک راز ہے جس کا انسانی عقل میں آنا تو درکنار اسے نہ تو کسی مقرب فرشتہ پر ظاہر کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کا بھید کسی پیغمبر اور رسول کو معلوم ہے۔ اس لئے اس مسئلہ میں زیادہ غور و فکر کرنا اور اس میدان میں عقل کے گھوڑے دوڑانا جائز نہیں ہے بلکہ تحقیق و جستجو کے تمام راستوں سے ہٹ کر صرف یہ اعتقاد رکھنا ہی فلاح و سعادت کا ضامن ہے کہ خدا نے یہ مخلوق پیدا کر کے ان کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک گروہ وہ ہے جو اچھے اعمال اور نیک کام کرنے کی بنا پر خدا کی جنت اور اس کی نعمتوں کا مستحق ہوگا جو محض اس کا فضل و کرم ہوگا۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جو برے اعمال کے کرنے کی وجہ سے دوزخ میں ڈالا جائے گا جو عین عدل ہوگا۔

منقول ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے قضا و قدر کے بارہ میں سوال کیا، حضرت علیؓ نے فرمایا "یہ ایک بڑا راستہ ہے اس پر نہ چلو" اس شخص نے "پھر یہی سوال کیا" "انہوں نے فرمایا" یہ ایک گہرا دریا ہے، اس میں نہ اترو وہ شخص نہ مانا اور اس نے پھر سوال کیا۔ آخر میں حضرت علیؓ نے فرمایا، "یہ خدا کا ایک راز ہے جو تم سے پوشیدہ ہے اس لئے اس کی تفتیش و تحقیق میں مت پڑو"۔

لہٰذا اخروی سعادت اسی میں ہے کہ اس مسئلہ کے بارہ میں خدا اور خدا کے رسول نے جو کچھ بتایا ہے اور جن اعتقادات کو ماننے کے

لئے کہا ہے اس پر عمل پیرا ہو جائے، ورنہ اپنی عقل کے تیر چلانا در حقیقت گمراہی کا راستہ اختیار کرنا اور تباہی و بربادی کی راہ پر لگنا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِخَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے۔ اور "فرمایا" (اس وقت) اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: ظاہر ہے کہ اللہ کی ذات اجسام ظاہری اور مادیات کی ثقاوت سے پاک ہے اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خدا نے خود اپنے ہاتھ سے تقدیریں لکھ دی تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا نے تمام مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے ہی ان کی تقدیریں قلم کو جاری ہونے کا حکم دے کر اس کے ذریعہ لوح محفوظ میں ثبت کر دی تھیں، یا یہ کہ فرشتوں کو حکم دے کر ان سے تقدیریں لکھوا دی تھیں۔

یہاں پچاس ہزار برس کی مدت تحدید کے لئے نہیں ہے بلکہ اس سے کثرت مدت مراد ہے کہ مخلوق کی پیدائش سے بہت پہلے ان سب کی تقدیریں لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہیں۔

منقول ہے کہ زمین و آسمان اور تمام مخلوق کے پیدا ہونے سے پہلے تمام پانی ہی پانی تھا اور کہا جاتا ہے کہ پانی کا استقرار ہوا پر تھا اور ہوا خدا کی قدرت پر قائم تھی۔ اس لئے فرمایا گیا کہ اس عالم میں ازل سے لے کر ابد تک ہونے والے تمام واقعات و اعمال اسی وقت خدا کے علم میں تھے۔ جب کہ یہ زمین و آسمان بھی پیدا نہیں ہوئے تھے اور اس کا عرش پانی پر تھا جس کے درمیان کوئی دوسری چیز حائل نہیں تھی۔

② وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر چیز تقدیر سے ہوتی ہے، یہاں تک کہ دانائی اور نادانی۔" (مسلمؒ)

③ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَّ اٰدَمُ وَمُوْسٰى عِنْدَ رَبِّهِمَا فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰى قَالَ مُوْسٰى اَنْتَ اٰدَمُ الَّذِيْ خَلَقَكَ اللّٰهُ بِيَدِهٖ وَنَفَخَ فِيْكَ مِنْ رُّوْحِهٖ وَاَسْجَدَ لَكَ مَلٰٓئِكَتَهٗ وَاَسْكَنَكَ فِيْ جَنَّتِهٖ ثُمَّ اَهْبَطْتَ النَّاسَ بِخَطِيْئَتِكَ اِلَى الْاَرْضِ قَالَ اٰدَمُ اَنْتَ مُوْسَى الَّذِي اصْطَفَاكَ اللّٰهُ بِرِسَالَاتِهٖ وَبِكَلَامِهٖ وَاَعْطَاكَ الْاَلْوَاحَ فِيْهَا تِبْيَانُ كُلِّ شَيْءٍ وَّقَرَّبَكَ نَجِيًّا فَبِكَمْ وَجَدْتَّ اللّٰهَ كَتَبَ التَّوْرَاةَ قَبْلَ اَنْ اُخْلَقَ قَالَ مُوْسٰى بِاَرْبَعِيْنَ عَامًا قَالَ اٰدَمُ فَهَلْ وَجَدْتَّ فِيْهَا وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى قَالَ نَعَمْ قَالَ اَفَتَلُوْمُنِيْ عَلٰى اَنْ عَمِلْتُ عَمَلًا كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيَّ اَنْ اَعْمَلَهٗ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَنِيْ بِاَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (عالم ارواح میں) آدم و موسیٰ علیہما السلام نے اپنے پروردگار کے سامنے مناظرہ کیا اور حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ وہی آدم ہیں جن کو خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا آپ میں اپنی روح پھونکی تھی، فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا تھا، اور اپنی جنت میں آپ کو رکھا تھا اور پھر آپ نے اپنی خطاء سے لوگوں کو زمین پر اتروا دیا تھا (یعنی اگر آپ خطا نہ کرتے تو یہاں زمین پر نہ اتارے جاتے اور آپ کی اولاد اس دنیا میں نہ پھیلتی بلکہ جنت میں رہتی) آدم علیہ السلام نے کہا تم وہی موسیٰ تو ہو جن کو خدا نے اپنے منصب رسالت سے نواز کر برگزیدہ کیا

اور ہم کلامی کے شرف سے مشرف فرمایا تھا اور تم کو وہ تختیاں دی تھیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا اور پھر تم کو سرگوشی کے لئے تقرب کی عزت بخشی تھی، اور کیا تم جانتے ہو خدا نے میری پیدائش سے کتنے عرصہ پہلے تورات کو لکھ دیا تھا؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا" چالیس سال پہلے! آدم علیہ السلام نے پوچھا" کیا تم نے تورات میں یہ لکھے ہوئے الفاظ نہیں پائے وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی (یعنی آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور گمراہ ہوگیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہاں۔ آدم ———— علیہ السلام نے کہا پھر تم مجھ کو میرے اس عمل پر کیوں ملامت کرتے ہو جس کو خدا نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے میرے لئے لکھ دیا تھا،" آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا" اس دلیل سے) آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔" (مسلم)

تشریح: حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جو دلیل پیش کی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے چونکہ میری پیدائش سے بھی چالیس سال پہلے یہ لکھ دیا تھا کہ میں شیطان کے گمراہ کرنے کی وجہ سے بہک جاؤں گا اور خدا کے حکم کی نافرمانی کر کے شجر ممنوع کا استعمال کر لونگا۔ لہٰذا اس میں میرے کسب و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ گمراہی میرے مقدر میں لکھی گئی تھی اس لئے اس کا مجھ سے صادر ہونا لازم و ضروری تھا لہٰذا میں مورد الزام نہیں ٹھہر سکتا۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس گمراہی کو میری پیدائش سے بھی پہلے میرے لئے لوح محفوظ میں مقدر فرمادیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ضرور بروقت وقوع پذیر ہوگی، لہٰذا جب وقت مقدر آپہنچا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ امر مقدر اور اللہ تعالیٰ کے علم کے خلاف وہ عمل ممنوع سرزد نہ ہوتا چنانچہ تم مجھ پر یہ الزام تو ڈال رہے ہو اور تمہیں سبب ظاہری یعنی میرا کسب و اختیار تو یاد رہا لیکن اصل چیز یعنی مقدر سے تم صرف نظر کر گئے۔

حضرت آدم و موسیٰ علیہما السلام کا مناظرہ اس عالم دنیا میں نہیں ہوا جہاں اسباب سے قطع نظر درست نہیں ہے بلکہ یہ مناظرہ عالم بالا میں ان دونوں کی روحوں کے درمیان ہوا تھا۔ اسی لئے یہاں یہ بات بطور خاص ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر کوئی عاصی و گناہ گار اس قسم کی دلیل کا سہارا لینے لگے تو وہ اس کے لئے کار آمد نہیں ہوگی، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ اس جہاں میں تھا جہاں وہ اسباب کے مکلف نہیں تھے اور پھر ان کی یہ خطاء بارگاہ الوہیت سے معاف بھی کر دی گئی تھی، لہٰذا یہاں تو کسب و اختیار اور الواب کی بنا پر مواخذہ ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو تختیاں اتری تھیں وہ زمرد کی تھیں اور ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ستر اونٹوں پر لادی جاتی تھیں، ان تختیوں میں ان کی قوم کے لئے خدا کی جانب سے احکام و مسائل لکھے ہوئے تھے، ان تختیوں میں جو مضامین مذکور تھے وہ قدیم ہیں لہٰذا چالیس سال کی تحدید ان مضامین کے بارہ میں نہیں ہوگی بلکہ یہ کہا جائے گا کہ وہ مضامین جو ان تختیوں پر لکھے گئے تھے ان کے لکھنے کی مدت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے چالیس سال قبل ہے۔

(۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَا الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ اِنَّ خَلْقَ اَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ اِلَيْهِ مَلَكًا بِاَرْبَعِ كَلِمَاتٍ فَيَكْتُبُ عَمَلَهٗ وَاَجَلَهٗ وَرِزْقَهٗ وَشَقِيٌّ اَوْسَعِيْدٌ ثُمَّ يَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ فَوَالَّذِيْ لَآ اِلٰهَ غَيْرُهٗ اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ صادق و مصدوق سرکار دو عالم ﷺ نے ہم سے فرمایا۔ تم میں سے ہر شخص کی تخلیق اس طرح ہوتی ہے کہ (پہلے) اس کا نطفہ ماں کے پیٹ میں چالیس دن جمع رہتا ہے، پھر اتنے ہی دنوں یعنی چالیس دن کے بعد وہ جما ہوا خون بنتا ہے۔ پھر اتنے ہی دنوں کے بعد وہ لوتھڑا ہو جاتا ہے، پھر خداوند تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ کو چار باتوں کے لکھنے کے لئے بھیجتا ہے، چنانچہ وہ فرشتہ

اس کے عمل اس کی موت (کا وقت) اس کے رزق (کی مقدار) اور اس کا بدبخت و نیک بخت ہونا خدا کے حکم سے اس کی تقدیر میں لکھ دیتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تم میں سے ایک آدمی جنتیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا آگے آتا ہے۔ اور وہ دوزخیوں کے سے کام کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے، اور تم میں ایک آدمی دوزخیوں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ہاتھ بھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا سامنے آتا ہے اور وہ جنتیوں کے سے کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ایسا کم ہوتا ہے کہ لوگ بھلائی کے راستہ کو چھوڑ کر برائی کا راستہ اختیار کرتے ہوں لیکن خدا کی رحمت کاملہ کے صدقے اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو لوگ بدبختی و برائی کے راستہ کو اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھلائی کی طرف آجاتے ہیں اور نیکی کے راستہ کو اختیار کر لیتے ہیں۔

اس حدیث نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ ابدی نجات و عذاب کا دارومدار خاتمہ پر ہے، اگر کسی کی پوری زندگی گناہ و معصیت یا کفر و شرک میں گزری لیکن اس نے آخر وقت میں صدق دل سے اپنی بداعمالیوں اور گمراہی پر نادم و شرمسار ہو کر نیک بختی و سعادت کے راستہ کو اختیار کر لیا تو وہ نجات پا جائے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص تمام عمر نیکی و بھلائی کرتا رہا اور اس کی تمام زندگی خدا اور خدا کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری میں گزری لیکن آخر وقت میں وہ شیطان کی گمراہی یا اپنے نفس کی شرارت سے گمراہ ہو گیا اور اس نے اپنی حیات کے آخری لمحوں کو برائی و بدبختی کی بھینٹ چڑھا دیا تو وہ اپنی زندگی بھر کی نیکیوں کے باوجود عذاب خداوندی میں مبتلا کیا جائے گا۔

لہٰذا اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ بھلائی و بہتری اور اخروی نجات اسی میں ہے کہ بندہ ہمیشہ اطاعت الٰہی اور فرمان نبوی ﷺ کی بجا آوری میں مصروف رہے، اس کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی حدود شریعت سے تجاوز کرنے نہ پائے اور ہر آنے والے لمحہ کو یہ سوچ کر کہ شاید میری زندگی کا یہ آخری لمحہ ہو نیکی و بھلائی میں صرف کرتا رہے تا کہ خاتمہ بالخیر کی سعادت سے نوازا جائے۔

اس موقع پر اتنی بات اور بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جو لوگ قضا و قدر کے مسئلوں کو دیکھ کر یہ نظریہ قائم کر بیٹھے ہیں کہ جب نجات و عذاب، نیک بختی و بدبختی اور جنت و دوزخ کا ملنا تقدیری چیز ہے تو عمل کی کیا ضرورت ہے؟ وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہیں چنانچہ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی جو اس مسئلہ کی حقیقت کو نہیں سمجھ پائے تھے سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے اس قسم کی بات کہی تو آنحضرت نے فرمایا کہ تم عمل کئے جاؤ کیونکہ جس کے مقدر میں جو کچھ لکھا ہے اس پر اس کو اختیار بھی دیا گیا ہے۔

یعنی قضا و قدر پر بھروسہ کر کے تمہارا عمل میں توقف کرنا یا عمل سے انکار کرنا کوئی کارآمد نہیں ہوگا اس لئے کہ احکام شارع کی جانب سے وارد ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی تم کو سوچنے سمجھنے کی قابلیت اور نیکی و بدی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت بھی دی گئی ہے، نیز تمہارے اندر قصد و جہد کا مادہ بھی پیدا کیا گیا ہے تا کہ تم ان اسباب کے ذریعہ عمل کر سکو، لہٰذا اب اگر تم قضا و قدر کا سہارا لے کر اسباب سے قطع نظر کر دو گے اور اعمال کو چھوڑ دو گے تو تباہی و بربادی کے غار میں جا گرو گے۔ ہاں یہ خدا کی یقیناً کوئی مصلحت ہوگی جس کی حقیقت و حکمت کو تو وہی جانتا ہے کہ ایک طرف تو اس نے قضا و قدر کے مسئلہ کو سامنے کر دیا دوسری طرف اعمال و افعال کے کرنے کا حکم دیا اور پھر اس مسئلہ میں تحقیق و تفتیش کرنے سے بھی منع فرما دیا، اور پھر قضا و قدر کے سہارے اعمال کی ضرورت سے انکار کر دیا جائے تو اس کا کیا جواب ہوگا کہ خدا کی جانب سے شریعت کا اتارنا، احکام بھیجنا اور رسولوں کی بعثت جن کا مقصد احکام خداوندی پر عمل کرنے کی ترغیب دینا ہوتا تھا بلاوجہ ہوئی کیونکہ جب محض تقدیر پر بھروسہ ہوگا کہ جس کے مقدر میں جنت میں جانا لکھا ہوگا وہ جنت میں یقیناً جائے گا اور جس کے مقدر میں دوزخ لکھی ہوگی اور دوزخ میں یقیناً جائے گا تو ان رسولوں کی بعثت اور احکام و اعمال کی بجا آوری کی تاکید کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے

گی، لہٰذا اس حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو یہ خیال غلط ثابت ہوگا۔

بہر حال جس طرح اور بہت سے اسرار الٰہی ہیں کہ ان کی بندوں کو خبر نہیں ہے اسی طرح یہ بھی ایک راز ہے جو بندوں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے، اس لئے کسی کے ظاہری عمل کو دیکھ کر اس کے جنتی یا دوزخی ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے کہ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَرْحَمُ مَنْ یَّشَاءُ (یعنی وہ جس کو چاہے (بد اعمالیوں کی بنا پر) عذاب میں مبتلا کر دے اور جس کو چاہے اپنے فضل و کرم سے بخش دے)۔

⑤ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل[1] بن سعدؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا، بندہ دوزخیوں کے سے کام کرتا رہتا ہے لیکن وہ جنتی ہوتا ہے اور جنتیوں کے سے کام کرتا ہے لیکن وہ دوزخی ہوتا ہے کیونکہ (نجات و عذاب کا) دارومدار خاتمہ کے عمل پر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث نے پہلی حدیث کی توثیق کر دی ہے کہ اعمال سابق کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ ان اعمال کا اعتبار ہوگا جس پر خاتمہ ہوا ہے اس لئے کسی کی نجات و عذاب کا دارومدار اس کے خاتمہ پر ہوگا، خاتمہ بالخیر ہوگا تو خدا کی نعمتوں اور اس کی جنت کی سعادت سے نوازا جائے گا اور اگر خدانخواستہ خاتمہ خیر پر نہیں ہوا تو پھر عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

چنانچہ اس حدیث نے صراحۃً یہ بات واضح کر دی کہ بندہ کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اطاعت الٰہی میں مصروف رہے اور ہر وقت معاصی و گناہ سے بچتا رہے اس لئے کہ نامعلوم اس کا وقت آخر کب آ جائے، اور وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو کہ اچانک موت کا زبردست پنجہ اس کا گلا دبوچ لے اور اسے توبہ کی بھی مہلت نہ ملے جس کے نتیجہ میں وہاں کے دائمی خسران و عذاب میں گرفتار ہو جائے۔

⑥ وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ دُعِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى جَنَازَةِ صَبِيٍّ مِّنَ الْاَنْصَارِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ طُوْبٰى لِهٰذَا عُصْفُوْرٌ مِّنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ لَمْ يَعْمَلِ السُّوْٓءَ وَلَمْ يُدْرِكْهُ فَقَالَ اَوَغَيْرُ ذٰلِكِ يَا عَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ لِلْجَنَّةِ اَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْٓ اَصْلَابِ اٰبَآئِهِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ اَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْٓ اَصْلَابِ اٰبَآئِهِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہ[2] فرماتی ہیں کہ ایک انصاری بچہ کے جنازہ پر سرکار دو عالم ﷺ کو بلایا گیا، میں نے کہا، یا رسول اللہ! اس بچہ کو خوشخبری ہو، یہ تو جنت کی چڑیوں میں کی ایک چڑیا ہے، جس نے کوئی برا کام نہیں کیا اور نہ برائی کی حد تک پہنچا۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا" عائشہ! کیا اس کے سوا کچھ اور ہوگا؟ یعنی اس کے جنتی ہونے کا جزم و یقین نہ کرو کیونکہ خدا نے جنت کے لئے مستحق لوگوں کو پیدا کیا ہے جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے اور دوزخ کے لئے بھی مستحق لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: بظاہر تو اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جنت اور دوزخ میں داخل ہونا نیک و بد عمل پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ تقدیری معاملہ ہے خدا نے ایک جماعت کے لئے ازل ہی سے جنت لکھ دی ہے اس لئے وہ جنت میں جائے گی خواہ وہ نیک اعمال کریں یا نہ کریں، اسی طرح ایک گروہ دوزخ کے لئے پیدا کیا گیا ہے جو دوزخ میں یقیناً جائے گا خواہ اس کے اعمال بد ہوں یا نہ ہوں۔ لہٰذا یہ لڑکا اگر دوزخ کے

---

[1] سہل بن سعد بن مالکؓ کا پہلا نام حزن تھا لیکن بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل رکھا، کنیت ابوالعباس اور بعض نے ابویحییٰ بھی لکھی ہے مدینہ میں ۸۸ھ میں بعمر ۹۶ سال آپ کا انتقال ہوا ہے۔

[2] ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذی شان صاحبزادی اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چہیتی اور محبوب زوجہ مطہرہ ہیں جن کا لقب صدیقہ ہے۔ آپؐ کی وفات کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ ۵۷ھ، ۵۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے اور جنت البقیع میں مدفون ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

لئے پیدا کیا گیا تھا تو وہ دوزخ میں یقیناً جائے گا اگرچہ اس سے اب تک اعمال بد صادر نہیں ہوئے ہیں۔

لیکن اس کے برخلاف اکثر آیات و احادیث اور علماء کے متفق علیہ اقوال ایسے ہیں جن سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مسلمان بچہ اگر کمسنی کی حالت میں انتقال کر جائے تو وہ یقیناً جنتی ہے بلکہ کفار و مشرکین کے کمسن بچوں کے بارہ میں بھی صحیح یہی مسئلہ ہے کہ وہ بھی جنت میں داخل کئے جائیں گے۔

لہٰذا اب اس حدیث کی توجیح یہی کی جائے گی کہ چونکہ حضرت عائشہؓ نے اس کے جنتی ہونے پر اس عزم و یقین کے ساتھ حکم لگایا تھا کہ گویا انہیں غیب کا علم ہے اور خدا کی مصلحت و مرضی کی رازداں ہیں، اس لئے سرکار دوعالم ﷺ نے ان کے اس جزم و یقین پر یہ تنبیہ فرمائی کہ تم اپنے اس وثوق کی بنیاد پر گویا غیب دانی کا اقرار کر رہی ہو، جو کسی بندہ کے لئے مناسب نہیں ہے یا زیادہ صحیح توجیہ اس حدیث کی یہ ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد اس وقت تک ہو گا جب تک بچوں کے جنتی ہونے کا حکم وحی کے ذریعہ معلوم نہیں ہوا تھا (اللہ اعلم)

(۷) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهٗ مِنَ الْجَنَّةِ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ قَالَ اعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُّيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ اَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَأَ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى الْاٰيَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے ہر شخص کی جگہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ میں لکھ دی ہے۔ (یعنی یہ معین ہو گیا کہ کون لوگ جنتی ہیں اور کون لوگ دوزخی ہیں) صحابہؓ نے عرض کیا" یارسول اللہ! کیا ہم اپنے نوشتہ تقدیر پر بھروسہ کر بیٹھیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "تم عمل کرو اس لئے کہ جو شخص جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس پر اسے آسانی اور توفیق دی جاتی ہے لہٰذا جو شخص نیک بختی کا اہل ہوتا ہے خدا اس کو نیک بختی کے اعمال کی توفیق دیتا ہے اور جو شخص بدبختی کا اہل ہوتا ہے اس کو بدبختی کے اعمال کا موقع دیا جاتا ہے اس کے بعد آنحضور ﷺ نے یہ آیت پڑھی (ترجمہ)" جس نے خدا کی راہ میں دیا، پرہیزگاری کی اور اچھی بات (دین و اسلام) کو سچ مانا، اس کے لئے ہم آسانی کی جگہ (جنت) آسان کر دیں گے لیکن جس نے بخل کیا اور (خواہشات نفسانی و دنیاوی چمک دمک میں پھنس کر) آخرت کی نعمتوں سے بے پروائی کی، نیز عمدہ بات (دین و اسلام) کو جھٹلایا تو اس کے لئے ہم مشکل جگہ (دوزخ کی راہ) آسان کر دیں گے۔" الخ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے جواب کا منشاء یہ تھا کہ تم لوگ تقدیر پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑنے کو جو کہتے ہو وہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ جنت و دوزخ کا پہلے مقدر میں لکھا جانا اور ہر ایک کے بارہ میں معین ہو جانا کہ کون نیک بخت ہے اور کون بدبخت، اعمال کو ترک کرنے کا باعث نہیں ہے اس لئے کہ خدا نے اپنی ربوبیت والوہیت کے اظہار کے طور پر جو کچھ احکام دیئے ہیں اور جو فرائض بندوں پر عائد کئے ہیں اس پر عمل کرنا اور احکام کی پیروی کرنا بمقتضائے عبودیت بندوں پر لازم و ضروری ہے کیونکہ عمل ہی کو نیک بختی و بدبختی کا نشان قرار دیا گیا ہے کہ جو کوئی عمل کرے گا اس کو نیک بخت سمجھا جائے گا اور جو عمل نہیں کرے گا اس کو بدبخت سمجھا جائے گا اور پھر یہ بھی تقدیری معاملہ ہے کہ خدا نے جس کے مقدر میں نیک بخت ہونا لکھ دیا ہے وہ یقیناً اعمال کو پورا کرے گا اور جس کے مقدر میں بدبخت ہونا لکھا گیا ہے وہ اعمال کو چھوڑ کر گمراہی میں جا پڑے گا۔

جہاں تک ثواب و عذاب کا معاملہ ہے وہ خدا کی مرضی اور اس کی مصلحت پر موقوف ہے وہ جو بھی معاملہ کرے گا اس پر اسے اختیار

---

[1] امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی، آپ کی سب سے لاڈلی صاحب زادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر اور چوتھے خلیفہ راشد ہیں ان کی کنیت ابوالحسن اور ابوتراب ہے آخر عشرہ رمضان ۴۰ھ میں آپ نے انتقال فرمایا اور شہادت کا درجہ پایا، اس وقت آپ کی عمر واقدی کی تحقیق کے مطابق ۶۳ برس کی تھی تین دن کم پانچ سال تک آپ خلیفہ رہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ہو گا اس میں کسی کے جبر و اکراہ کو دخل نہیں ہو گا۔

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ حَظَّهٗ مِنَ الزِّنَا اَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مُحَالَةَ فَزِنَا الْعَیْنِ النَّظَرُ وَزِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنّٰى وَتَشْتَهِیْ وَالْفَرْجُ یُصَدِّقُ ذٰلِكَ وَیُكَذِّبُهٗ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ كُتِبَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ نَصِیْبُهٗ مِنَ الزِّنَا مُدْرِكٌ ذٰلِكَ لَا مُحَالَةَ الْعَیْنَانِ زِنَاهُمَا النَّظَرُ وَالْاُذُنَانِ زِنَاهُمَا الْاِسْتِمَاعُ وَاللِّسَانُ زِنَاهُ الْكَلَامُ وَالْیَدُ زِنَاهَا الْبَطْشُ وَالرِّجْلُ زِنَاهَا الْخُطَا وَالْقَلْبُ یَهْوٰى وَیَتَمَنّٰى وَیُصَدِّقُ ذٰلِكَ الْفَرْجُ وَیُكَذِّبُهٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "خدا نے انسان کی تقدیر میں جتنا حصہ زنا کا لکھ دیا ہے وہ ضرور اس سے عمل میں آئے گا، آنکھوں کا زنا تو نامحرم کی طرف دیکھنا ہے اور زبان کا زنا نامحرم عورتوں سے شہوت انگیز باتیں کرنا، اور نفس آرزو و خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس آرزو کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) کی ایک روایت ہے کہ: "آدمی کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا گیا ہے اس کو وہ ضرور عمل میں لائے گا۔ آنکھوں کا زنا (نامحرم کی طرف) دیکھنا ہے، کانوں کا زنا (نامحرم عورت سے شہوت انگیز باتیں سننا ہے اور زبان کا زنا نامحرم عورت سے شہوت انگیز) باتیں کرنا ہے اور ہاتھوں کا زنا (نامحرم عورت کو برے ارادہ سے) چھونا ہے اور پاؤں کا زنا (بدکاری کی طرف) جانا ہے اور دل خواہش و آرزو کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔"

تشریح: اصل زنا تو یہی ہے کہ کسی نامحرم عورت سے بدکاری میں مبتلا ہو، لیکن اصطلاح شریعت میں ان حرکات و اعمال کو بھی مجازاً زنا کہا جاتا ہے جو حقیقی زنا کے لئے اسباب کا درجہ رکھتے ہیں یا جو اس تک پہنچاتے ہیں، مثلاً کسی نامحرم عورت سے شہوت انگیز باتیں کرنا، یا بری نظر سے اس کی طرف دیکھنا، یا گندے خیال کے ساتھ اس کی باتیں سننا، یا برے ارادہ سے اس کا ہاتھ چھونا، یا اسی طرح گندے خیالات کے ساتھ کسی نامحرم عورت کے پاس جانا، یہ سب چیزیں چونکہ حقیقی زنا کی محرک بنتی ہیں جو آگے چل کر بدکاری میں مبتلا کرا دیتی ہیں اس لئے ان کو بھی مجازاً زنا کہا جاتا ہے، تاکہ ان حرکات و اسباب کی نفرت و کراہت دلوں میں بیٹھ جائے اور لوگ ان سے بھی بچتے رہیں۔

بہر حال حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے مقدر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا جاتا ہے وہ اسے عمل میں لاتا ہے، اب چاہے تو اس کے مقدر میں محض مجازی زنا لکھا ہو یا حقیقی زنا، لیکن خدا جن کو ان قبیح افعال سے محفوظ رکھتا ہے وہ ان سے باز رہتے ہیں اور وہ ان چیزوں سے بھی پرہیز کرتے رہتے ہیں جن کی موجودگی میں کسی معصیت و گناہ کے خیال کا بھی شائبہ پایا جاتا ہو جو گناہ و معصیت کی طرف لے جانے کا سبب بنتے ہوں۔

"شرم گاہ کی تصدیق و تکذیب" کا مطلب یہ ہے کہ جب نفس انسانی ہوا و ہوس کا غلام بن جاتا ہے اور وہ غلط و حرام فعل کی خواہش کرتا ہے تو اگر شرم گاہ اس کے اس غلط و ناجائز خواہش پر عمل کرتی ہے اور زنا میں مبتلا ہو جاتی ہے تو یہی اس کی تصدیق ہوتی ہے، یا اگر کسی احساس و شعور اور ضمیر خدا کے عذاب سے لرزاں اور اس کے خوف سے بھرا ہوا ہوتا ہے تو شرمگاہ نفس کی خواہش کی تکمیل سے انکار کر دیتی ہے اور وہ بدکاری میں مبتلا نہیں ہوتا یہ اس کی تکذیب ہوتی ہے۔

⑨ وَعَنْ عِمْرَانَ ابْنِ الْحُصَیْنِ اَنَّ رَجُلَیْنِ مِنْ مُزَیْنَةَ قَالَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَیْتَ مَا یَعْمَلُ النَّاسُ الْیَوْمَ وَیَكْدَحُوْنَ فِیْهِ اَشَیْءٌ قُضِیَ عَلَیْهِمْ وَمَضٰى فِیْهِمْ مِنْ قَدَرٍ سَبَقَ اَوْ فِیْمَا یَسْتَقْبِلُوْنَ بِهٖ مِمَّا اَتَاهُمْ بِهٖ نَبِیُّهُمْ وَثَبَتَتِ الْحُجَّةُ عَلَیْهِمْ فَقَالَ لَا بَلْ شَیْءٌ قُضِیَ عَلَیْهِمْ وَمَضٰى فِیْهِمْ وَتَصْدِیْقُ ذٰلِكَ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ (الشمس ۷، ۸۔ رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرانؓ[1] بن حصینؓ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ قبیلہ مزینہ کے دو شخص بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ!

[1] آپ کا اسم گرامی عمران ابن حصین اور کنیت ابونجید ہے آپ فتح خیبر کے سال اسلام کی نعمت سے مشرف ہوئے تھے بمقام بصرہ ۵۱ھ میں وفات پائی۔

ہمیں یہ بتائیے کہ آج (دنیا میں) لوگ عمل کرتے ہیں اور اعمال کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کیا یہ وہی شئے ہے جس کا حکم ہو چکا ہے اور نوشتہ تقدیر بن چکا ہے یا یہ عمل ان احکام کے موافق ہیں جو آئندہ ہونے والے ہیں جن کو اس کا نبی ﷺ لایا ہے اور جن پر دلیل قائم ہو چکی ہے " آنحضرت ﷺ نے فرمایا" نہیں یہ وہی شے ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور نوشتہ تقدیر بن چکا ہے اور اس کی تصدیق کتاب اللہ کی اس آیت سے ہوتی ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (القرآن الحکیم)۔ (ترجمہ) قسم ہے (انسان کی) جان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں کا) القاء کیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: سوال یہ تھا کہ یا رسول اللہ ہمیں یہ بتلا دیجئے کہ دنیا میں لوگ جتنے اعمال کرتے ہیں خواہ وہ اعمال خیر ہوں یا اعمال بد کیا یہ وہی ہیں جو ان کے لئے ازل ہی میں مقدر ہو چکے تھے اور اب وقت پر وقوع پذیر ہوتے ہیں یا یہ وہ چیزیں ہیں جو ازل میں تو ان کے لئے نوشتہ تقدیر نہیں بنی تھیں بلکہ اب جب رسول آئے اور انہوں نے خدا کی جانب سے دیئے گئے معجزات کے ذریعہ اپنی صداقت کا اعلان اور ان احکام و اعمال کے کرنے کا حکم دیا تو یہ اعمال وقوع پذیر ہونے لگے تو ایسی شکل میں کیا یہ کہا جائے گا کہ یہ اعمال بندوں کے مقدر میں پہلے سے نہیں لکھے ہوئے تھے بلکہ اپنے اختیار سے یہ اعمال کرتے ہیں چاہے وہ اچھے اعمال ہوں یا برے اعمال؟۔
بارگاہ رسالت سے جواب دیا گیا کہ یہ اعمال وہی ہیں جو ازل ہی سے بندوں کے مقدر میں لکھ دیئے گئے ہیں اور اب اسی نوشتہ تقدیر کے مطابق اپنے اپنے وقت پر صادر ہوتے رہتے ہیں۔

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ رَجُلٌ شَابٌّ وَاَنَا اَخَافُ عَلٰی نَفْسِی الْعَنَتَ وَلَا اَجِدُ مَا اَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَآءَ كَاَنَّهٗ يَسْتَاْذِنُهٗ فِی الْاِخْتِصَاءِ قَالَ فَسَكَتَ عَنِّیْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّیْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّیْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ فَاخْتَصِ عَلٰی ذٰلِكَ اَوْ ذَرْ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا، "یا رسول اللہ میں ایک جوان مرد ہوں اور میں اپنے نفس سے ڈرتا ہوں کہ بدکاری کی طرف مائل نہ ہو جائے اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں ہے کہ کسی عورت سے شادی کر لوں" گویا ابوہریرہؓ اپنے اندر سے قوت مردمی ختم کر دینے کی اجازت مانگتے تھے ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے یہ سن کر سکوت فرمایا، میں نے دوبارہ یہی کہا تو آپ ﷺ پھر خاموش رہے، میں نے پھر عرض کیا اس مرتبہ بھی آپ ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا میں نے پھر اسی طرح عرض کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ابوہریرہ! جو کچھ ہونا ہے (اسے تمہارے مقدر میں لکھ کر) قلم خشک ہو چکا ہے لہٰذا تمہیں اختیار ہے کہ قوت مردمی ختم کر دو یا نہ کرو۔" (بخاریؒ)

تشریح: سرکار دو عالم ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ تمہارے مقدر میں جو کچھ ہونا لکھا ہے وہ پورا ہوگا، اگر خدا نخواستہ کسی بدکاری میں مبتلا ہونا تمہارے لئے نوشتہ تقدیر بن چکا ہے تو یہ قبیح فعل تم سے ضرور صادر ہوگا، اور اگر قضا و قدر نے تمہاری پاکدامنی اور معصیت سے حفاظت لی ہے تو چاہے تم اپنی قوت مردمی ختم کر کے نامرد بن جاؤ، یا اس فعل سے باز رہو، تمہارا نفس تمہیں نہیں بہکا سکتا اور تم پاک دامن رہو گے اسی طرف جف القلم کہہ کر اشارہ فرمایا گیا۔
اس حدیث میں اصل میں اس طرف تنبیہ اور تہدید مقصود ہے کہ اسباب و تدبیر کو تقدیر کے مقابلہ پر لانا اور نوشتہ تقدیر سے لاپرواہ ہو کر اس سے بھاگنا جائز نہیں ہے۔

(۱۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَّاحِدٍ يُصَرِّفُهٗ كَيْفَ يَشَآءُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِكَ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "تمام انسانوں کے دل خدا کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان اس طرح ہیں جیسے ایک انسان کا دل ہے اور وہ (اپنی انگلیوں سے) جس طرح چاہتا ہے قلوب کو گردش میں لاتا ہے" اس کے بعد آں حضور ﷺ نے دعا کے طور پر یہ فرمایا۔ "اے دلوں کو گردش میں لانے والے خدا! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔"

(مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے خدا کے کمال قدرت کا اظہار مقصود ہے کہ وہ تمام چیزوں پر قادر ہے اور سب پر متصرف ہے یہاں تک کہ قلوب کے رخ اور دل کی دھڑکنیں تک بھی اسی کے اختیار میں ہیں۔ خداوند تعالیٰ کے لئے انگلیوں کا استعمال یہاں مجازاً ہوا ہے کیونکہ اس کی پاک وصاف ذات مادیات اور اجسام کی ثقالت سے پاک ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام قلوب خدا کے قبضہ و تصرف میں ہیں، وہ جس طرف چاہتا ہے دلوں کو پھیر دیتا ہے کسی قلب کو گناہ و معصیت اور بدکاری کی طرف مائل کر دینا بھی اسی کی صفت ہے اور کسی قلب کو عصیان و سرکشی کے جال سے نکال کر اطاعت و فرمانبرداری اور نیکوکاری کے راستہ پر بھی اسی کا کام ہے وہ جس طرح چاہتا ہے گمراہی و ضلالت کے اندھیرے میں پھینک دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، ہدایت و راستی کے مرغزاروں میں چھوڑ دیتا ہے۔

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِیْمَةُ بَهِیْمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِیْهَا مِنْ جَدْعَاءَ ثُمَّ یَقُوْلُ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ (الروم ۳۰۔ متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے (یعنی امر حق کو قبول کرنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جس طرح ایک چارپایہ جانور پورا چارپایہ بچہ دیتا ہے، کیا تم اس میں کوئی کمی پاتے ہو" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (ترجمہ) یہ اللہ تعالیٰ کی اس بنائی کے موافق ہے جس پر اللہ نے آدمیوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی خلقت میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا یہ دین مستحکم ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: خدا تعالیٰ نے انسان کی تخلیق فطرت پر کی ہے اور فطرت صرف امر حق یعنی ایمان و اسلام کو قبول کر سکتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس فطرت پر ہوتا ہے لیکن خارجی اثر سے وہ فطرت کے تقاضوں سے دور ہو جاتا ہے اور خلاف اصول و فطرت طریقوں پر چلنے لگتا ہے یعنی اگر اس کے ماں باپ مجوسی ہوتے ہیں تو وہ بھی ان کے مذہب میں رنگ جاتا ہے۔

چنانچہ مثال کے طور پر فرمایا کہ جس طرح کسی جانور کے کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی اصلی حالت میں پیدا ہوتا ہے اس کے اندر کسی قسم کی کوئی کمی یا کوئی نقصان نہیں ہوتا، ہاں اگر خارجی طور پر کوئی اس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے یا اس کے جسم میں کوئی عیب پیدا کر دے تو وہ اپنی اصلی اور تخلیقی حالت کھو دیتا ہے، اسی طرح انسان پیدائش کے وقت اپنی اصلی فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا ماحول، اس کی سوسائٹی یعنی ماں باپ وغیرہ اس کے احساسات و شعور اور اس کے عقائد پر اپنے مذہب کا رنگ چڑھا کر اس کے ذہن و فکر اور قلب و دماغ کو غلط راستہ پر موڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی اصلی اور تخلیقی فطرت پر قائم نہیں رہتا بلکہ کافر ہو جاتا ہے، ہاں اگر ایسا نہیں ہوتا اور اس کے ماں باپ مسلمان ہوتے ہیں تو وہ بھی مسلمان رہتا ہے۔

⑬ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنَامُ وَلَا یَنْبَغِیْ لَهٗ اَنْ یَّنَامَ یَخْفِضُ الْقِسْطَ وَیَرْفَعُهٗ یُرْفَعُ اِلَیْهِ عَمَلُ اللَّیْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّیْلِ حِجَابُهُ النُّوْرُ لَوْ كَشَفَهٗ لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَا انْتَهٰی اِلَیْهِ بَصَرُهٗ مِنْ خَلْقِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ نے خطبہ دیا اور پانچ باتیں ارشاد فرمائیں۔ خدا تعالیٰ سوتا نہیں ہے، اور سونا اس کی شان کے مناسب نہیں ہے۔ وہ ترازو کو بلند و پست کرتا ہے، دن کے عمل سے پہلے رات کے عمل اور رات کے عمل سے پہلے دن کے عمل اس کے پاس پہنچا دیے جاتے ہیں اور اس کا حجاب نور ہے جسے اگر وہ اٹھا دے تو اس کی ذات پاک کا نور مخلوقات کی تا حد نگاہ تمام چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: ترازو کو بلند و پست کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خداوند قدوس کسی بندہ پر رزق کی وسعت کرتا ہے اور اسے مال و زر کی فراوانی سے نوازتا ہے اور کسی پر اسباب معیشت اور رزق کے دروازے تنگ کر کے اسے محتاجی و تنگدستی میں مبتلا کر دیتا ہے، اسی طرح کسی بندہ کو وہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری اور نیکوکاری کی بدولت عزت و عظمت اور شرف و فضیلت سے نوازتا ہے اور کسی گناہ گار بندہ کو اس کی سرکشی و نافرمانی اور بدکاری کی بنا پر اسے ذلیل و خوار کر دیتا ہے اور اسے تباہی و بربادی کے غار میں ڈال دیتا ہے۔

ایسے ہی "دن کے عمل سے پہلے رات کے عمل سے پہلے دن کے عمل اس کے پاس پہنچا دیئے جانے" کا مطلب یہ ہے کہ بندہ سے جو کوئی عمل سرزد ہوتا ہے وہ فوراً بلا تاخیر بارگاہ الوہیت تک پہنچ جاتا ہے یعنی ابھی سورج بھی نہیں نکلتا اور کوئی عمل صادر ہونے بھی نہیں پاتا کہ رات کے عمل جو بندہ سے سرزد ہوئے ہیں اوپر پہنچ چکے ہوتے ہیں، اسی طرح رات شروع بھی نہیں ہوتی کہ دن کے عمل وہاں پہنچ جاتے ہیں، اب جو نیک عمل اور اچھا ہوتا ہے اسے قبولیت کے شرف سے نواز کر اس پر جزاء و انعام کا پروانہ صادر کر دیا جاتا ہے اور اس پر عذاب و سزا کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدُاللّٰهِ مَلاٰی لَا تَغِیْضُهَا نَفَقَةٌ سَحَّاءُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ اَرَاَیْتُمْ مَا اَنْفَقَ مُذْ خَلَقَ السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ فَاِنَّهٗ لَمْ یَغِضْ مَا فِیْ یَدِهٖ وَکَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ وَبِیَدِهِ الْمِیْزَانُ یَخْفِضُ وَیَرْفَعُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ یَمِیْنُ اللّٰهِ مَلاٰی وَقَالَ ابْنُ نُمَیْرٍ مَلْاٰنُ سَحَّآءٌ لَا یَغِیْضُهَا شَیْءٌ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ (یعنی اس کا خزانہ) بھرا ہوا ہے، دن اور رات ہر وقت خرچ کرنا بھی اس میں کمی پیدا نہیں کرتا، کیا تم نہیں دیکھتے؟ کہ جب سے کہ اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور جب کہ اس کا عرش (بھی) پانی پر تھا، کتنا خرچ کیا ہے، لیکن (اتنا زیادہ) خرچ کرنے کے باوجود جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے (یعنی اس کا خزانہ) اس میں کمی نہیں ہوئی ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں ترازو ہے جسے وہ بلند و پست کرتا ہے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلمؒ کی روایت ہے "خدا کا داہنا ہاتھ بھرا ہوا ہے"۔ اور ابن نمیرؒ کی روایت میں ہے (خدا کا ہاتھ بھرا ہوا، اور ہمیشہ دینے والا ہے، رات اور دن خرچ کرنے کے باوجود) اس میں کوئی چیز کمی نہیں کرتی۔"

تشریح: ابن نمیرؒ حضرت امام مسلمؒ کے استاد ہیں، ان کی سند سے جو حدیث ہے اس میں بجائے مَلاٰی کے مَلْآن کا لفظ ہے اور ان الفاظ میں کچھ تقدیم و تاخیر بھی ہے ویسے ازروئے لغت مَلاٰی ہی صحیح ہے اور یہی الفاظ مناسب ہے۔

⑮ وَعَنْهُ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَرَارِی الْمُشْرِکِیْنَ قَالَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکوں کی اولاد کے بارہ میں پوچھا گیا (کہ مرنے کے بعد دوزخ میں جائیں گے یا جنت میں) آپ ﷺ نے فرمایا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے (اگر زندہ رہتے تو وہ کیا عمل کرتے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یعنی یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ اگر وہ اس صغرسنی کی حالت میں نہ مرتے اور زندہ رہتے تو بڑے ہو کر کیا عمل کرتے، لہٰذا اب ان

کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اسی کے مطابق ہوگا اور یہ کہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ آیا وہ جنّت میں جاتے ہیں یا دوزخ میں، وہاں کی حالت کسی بندہ کو کیا معلوم!۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے یہ اس وقت فرمایا ہوگا جب کہ ابھی تک مشرکوں کی اولاد کے بارہ میں وحی کے ذریعہ کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔

اس مسئلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں لیکن صحیح اور اولیٰ یہی ہے کہ اس بارہ میں توقف کرنا چاہیے یعنی نہ تو ان کو دوزخی کہا جائے اور نہ جنتی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

(۱۶) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ اُكْتُبْ قَالَ مَآ اَكْتُبُ قَالَ اُكْتُبِ الْقَدَرَ فَكَتَبَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى الْاَبَدِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادًا۔

"حضرت عبادہ بن صامتؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا خدا نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا وہ قلم تھا، پھر اس (قلم) کو لکھنے کا حکم دیا۔ قلم نے کہا، "الٰہ العالمین! کیا لکھوں" بارگاہ الوہیت سے جواب ملا "تقدیر لکھو!" لہٰذا اس قلم نے ان چیزوں کو لکھا جو (اب تک) ہو چکی ہیں اور ان چیزوں کو لکھا جو آئندہ ہونے والی ہیں۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہے۔"

(۱۷) وَعَنْ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ الْاٰيَةَ قَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْئَلُ عَنْهَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰٓؤُلَآءِ لِلْجَنَّةِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ بِيَدِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰٓؤُلَآءِ لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَجُلٌ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ اَعْمَالِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلَهٗ بِهِ الْجَنَّةَ وَاِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ اَعْمَالِ اَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلَهٗ بِهِ النَّارَ۔ (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد، الاعراف ۱۷۲)

"اور حضرت مسلم بن یسارؒ راوی ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ سے اس آیت (وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ (الاعراف ۱۷۲) "ترجمہ" اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور (سب کچھ سمجھ عطا کر کے) ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں! ہم سب (اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں۔ تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس (توحید سے محض بے خبر تھے) کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ جب اس آیت کے بارے میں سرکار دو عالم ﷺ سے سوال کیا گیا تو میں نے آپ ﷺ کو فرماتے سنا کہ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا پھر ان کی پیٹھ پر داہنا ہاتھ پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو جنّت کے لئے اور جنتیوں کے سے اعمال کرنے کے لئے جو وہ کریں گے پیدا کیا ہے۔ پھر اپنا ہاتھ آدم علیہ السلام کی پشت پر پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو دوزخ کے لئے اور دوزخیوں کے سے کام کرنے کے لئے جو وہ کریں گے پیدا کیا ہے۔ یہ سن کر ایک شخص نے کہا "یا رسول اللہ! پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو جنّت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتیوں ہی کے سے عمل کراتا ہے یہاں تک کہ اس (بندہ) کی وفات

جنتیوں جیسے اعمال پر ہو جاتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کی بنا پر اسے جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب کسی بندہ کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے سے اعمال صادر کراتا ہے یہاں تک کہ وہ اہل دوزخ جیسے اعمال پر مرجاتا ہے لہٰذا اسے ان اعمال کی بناء پر دوزخ میں ڈال دیتا ہے۔" (مؤطا مالک، ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: یہ عہد میثاق عالم ارواح میں ہوا تھا جیسا کہ دیگر احادیث میں آتا ہے کہ خداوند قدوس نے تمام روحوں کو جو ازل سے لے کر ابد تک دنیا میں آنے والی تھیں ننھی ننھی چیونٹیوں کی شکل میں جمع کیا اور پھر ان کو عقل و دانائی بھی عنایت فرمائی اور اپنی ربوبیت والوہیت کا سب سے اقرار کرایا۔

اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ ازل سے ابد تک دنیا میں جتنے بھی انسان پیدا ہوں گے سب کی پشت سے ان کی اولاد نکالی گئی تھی مثلاً آنحضرت ﷺ کی پشت سے ان کی اولاد نکالی گئی اور ان کی پشت سے ان کی اولاد اسی طرح قیامت تک جتنے انسان پیدا کئے جائیں گے سب کی پشت سے ان کی اولاد نکالی گئی۔

داہنے ہاتھ کے پھیرنے کے معنی یہ ہیں کہ خداوند قدوس نے فرشتہ کو داہنا ہاتھ پھیرنے کا حکم دیا تھا ورنہ خدا تعالیٰ کی نورانی ذات ہاتھ پیر کی ظاہری ثقالت سے پاک و صاف ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے کہ اس سے اپنی قوت و قدرت کا اظہار مقصود ہے۔

(۱۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْ يَدَيْهِ كِتَابَانِ فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا هٰذَانِ الْكِتَابَانِ قُلْنَا لَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِلَّا اَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهَا اَسْمَاءُ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاَسْمَاءُ اٰبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰى اٰخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا ثُمَّ قَالَ لِلَّذِيْ فِيْ شِمَالِهٖ هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ اَسْمَاءُ اَهْلِ النَّارِ وَاَسْمَاءُ اٰبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰى اٰخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا فَقَالَ اَصْحَابُهٗ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كَانَ اَمْرٌ قَدْ فُرِغَ مِنْهُ فَقَالَ سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا فَاِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنْ عَمِلَ اَيَّ عَمَلٍ وَاِنَّ صَاحِبَ النَّارِ يُخْتَمُ لَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ وَاِنْ عَمِلَ اَيَّ عَمَلٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدَيْهِ فَنَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ باہر تشریف لائے آپ ﷺ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں اور (صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے) فرمایا جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیا ہیں "ہم نے عرض کیا" یارسول اللہ! ہمیں کیا معلوم آپ ﷺ ہی بتا دیجئے (یہ کتابیں کیا ہیں) آپ ﷺ نے اس کتاب کے بارہ میں فرمایا جو داہنے ہاتھ میں تھی کہ یہ خدا کی جانب سے ہے جس میں اہل جنت ان کے باپ اور ان کے قبیلوں کے نام لکھے ہوئے ہیں پھر آخر میں جمع بندی کر دی گئی ہے لہٰذا اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی، اس کے بعد بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا کہ یہ خدا کی جانب سے ایک ایسی کتاب ہے جس پر اہل دوزخ ان کے باپ اور ان کے قبیلوں کے نام لکھے ہیں پھر آخر میں جمع بندی کر دی گئی ہے۔ لہٰذا اب نہ تو اس میں کمی ہوتی ہے اور نہ زیادتی۔ یہ (سن کر) صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! اگرچہ یہ چیز پہلے سے ہی طے ہو چکی ہے (کہ جنت و دوزخ کا مدار نوشتہ تقدیر پر ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا (دین و شریعت کے مطابق اپنے اعمال کو) اچھی طرح مضبوط کرو اور (حق تعالیٰ کا) تقرب حاصل کرو، اس لئے کہ جنتی کا خاتمہ اہل جنت کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ (زندگی میں) اس نے کیسے ہی (نیک یا بد) عمل کئے ہوں اور دوزخی کا خاتمہ اہل دوزخ کے عمل پر ہوتا ہے خواہ اس کے اعمال جیسے بھی رہے ہوں، پھر آنحضرت ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور کتابوں کو رکھ دیا یعنی پیچھے ڈال دیں اور فرمایا "تمہارا پروردگار بندوں کے بارے میں یہ پہلے سے طے کر چکا ہے کہ ایک جماعت جنتی ہے اور ایک جماعت دوزخی ہے۔" (ترمذی)

تشریح: کتابوں کو پیچھے ڈال دینا اہانت کے طور پر نہیں تھا بلکہ اس طرف اشارہ مقصود تھا کہ بارگاہ الوہیت سے اس معاملہ میں کہ دوزخ

و جنتی کون کون لوگ ہیں ازل ہی میں حکم ہو چکا ہے اور جو نوشتہ تقدیر بن چکا ہے۔

ظاہری طور پر تو اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سرکار دو عالم ﷺ کے دست مبارک میں واقعی کتابیں تھیں جن کو آپ ﷺ نے صحابہ کو دکھلا بھی دیا تھا۔ لیکن ان کے اندر جو مضمون لکھے ہوتے تھے وہ نہیں دکھلائے تھے، لیکن بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حقیقت میں کتابیں نہیں تھیں بلکہ آپ ﷺ نے مثال کے طور پر اس انداز سے فرمایا تاکہ یہ مسئلہ صحابہؓ کے ذہن نشین ہو جائے۔

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ خِزَامَۃَ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَاَیْتَ رُقًی نَسْتَرْقِیْھَا وَدَوَآءً نَتَدَاوٰی بِہٖ وَتُقَاۃً نَتَّقِیْھَا ھَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ شَیْئًا قَالَ ھِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور ابی خزامہؓ[1] اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ عملیات جن کو ہم (شفاء کے لئے) پڑھواتے ہیں اور وہ دوائیں جن کو ہم (حصول صحت کے لئے) استعمال کرتے ہیں اور وہ ہر چیزیں جن سے ہم حفاظت حاصل کرتے ہیں (مثلاً ڈھال اور زرہ وغیرہ ان کے بارے میں مجھے بتائیے کہ کیا یہ سب چیزیں نوشتہ تقدیر میں کچھ اثر انداز ہو جاتی ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ یہ چیزیں بھی نوشتہ تقدیر ہی کے مطابق ہیں)۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: جواب کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بیماری وغیرہ امر مقدر ہیں، اسی طرح ان کا علاج اور ان سے حفاظت کے اسباب بھی نوشتہ تقدیر ہی کے مطابق ہوتے ہیں یعنی جس طرح کسی شخص کے مقدر میں کوئی بیماری لکھ دی گئی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نوشتہ تقدیر بن چکا ہے کہ یہ بیمار فلاں وقت میں اپنی بیماری کا علاج کرے گا اور یہ بھی طے ہو چکا ہے کہ اس علاج و معالجہ سے اسے فائدہ ہو گا یا نہیں، اگر فائدہ ہونا لکھا ہے تو فائدہ ہو جائے گا اور فائدہ ہونا نہیں لکھا ہے تو نہیں ہو گا، اس لئے اگر کسی بیمار نے اپنی بیماری کا علاج کیا اور اسے فائدہ نہیں ہوا تو اسے سمجھنا چاہیے کہ تقدیر میں شفا نہیں لکھی تھی! لہٰذا معلوم ہوا کہ بیماری میں علاج کرنا، یا اپنی حفاظت کے لئے خارجی اسباب کا سہارا لینا نوشتہ تقدیر کے خلاف نہیں ہے۔

تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کا مسئلہ یہ ہے کہ تعویذ گناہ ہے اگر قرآن کی آیتوں اور احادیث کی دعاؤں کے مطابق ہوں یا جھاڑنا، پھونکنا اور دم کرنا اگر اسماء و صفات الٰہی اور قرآن و حدیث کے مطابق ہو۔ نیز ان کو مؤثر حقیقی سمجھنے کا عقیدہ بھی نہ ہو یعنی یہ یقین نہ رکھتا ہو کہ ان چیزوں سے یقیناً فائدہ ہو گا خواہ مرضی الٰہی ہو یا نہ ہو بلکہ یہ عقیدہ ہو کہ شفا و صحت کا عطا کرنے والا تو خدا ہے یہ صرف اسباب و تبرک کے درجہ میں ہیں تو ایسی شکل میں یہ چیزیں جائز ہوں گی، اگر اس کے برخلاف ہو کہ جھاڑنا پھونکنا اور تعویذ گنڈے غیر شرعی ہوں یعنی اس میں غیر اللہ کی مدد لی جاتی ہو تو یہ حرام ہو گا۔

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِی الْقَدْرِ فَغَضِبَ حَتّٰی اِحْمَرَّ وَجْھُہٗ حَتّٰی کَاَنَّمَا فُقِیَ فِیْ وَجْنَتَیْہِ حَبُّ الرُّمَّانِ فَقَالَ اَبِھٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِھٰذَا اُرْسِلْتُ اِلَیْکُمْ اِنَّمَا ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ حِیْنَ تَنَازَعُوْا فِیْ ھٰذَا الْاَمْرِ عَزَمْتُ عَلَیْکُمْ عَزَمْتُ عَلَیْکُمْ اَنْ لَّا تَنَازَعُوْا فِیْہِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَی ابْنُ مَاجَۃَ نَحْوَہٗ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ (ایک دن) ہم قضا و قدر کے مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ سرکار دو عالم ﷺ تشریف لے آئے (ہمیں اس مسئلہ میں الجھا ہوا دیکھ کر) آپ ﷺ کا چہرۂ انور غصہ کی وجہ سے سرخ ہو گا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا انار کے دانے آپ ﷺ کے رخسار مبارک پر نچوڑ دیے گئے ہیں (اسی حالت میں) آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں اس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور میں اسی لئے تمہارے پاس (رسول بنا کر) بھیجا گیا ہوں؟ جان لو تم سے پہلے کے لوگ اس لئے ہلاکت کی وادی میں پھینک دیئے گئے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں الجھنا اپنا مشغلہ بنا لیا تھا، لہٰذا میں تمہیں اس بات کی قسم دیتا ہوں (اور پھر دوبارہ) قسم دیتا ہوں کہ تم اس مسئلہ پر بحث نہ کیا کرو (ترمذیؒ) اور ابن

---

[1] ابی خزامہ تابعی ہیں ان کے والد کا نام عمیر ہے جو صحابی ہیں اور جن سے ابوخزامہ روایت کرتے ہیں ابی خزامہ سے زہریؒ روایت کرتے ہیں۔

ماجہ نے اسی طرح کی روایت عمرو بن شعیب سے نقل کی ہے جو انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے۔"

تشریح: صحابہ آپس میں تقدیر کے مسئلہ پر بحث کر رہے تھے بعض صحابہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے نوشتہ تقدیر کے مطابق ہیں تو پھر ثواب و عذاب کا ترتب کیوں ہوتا ہے؟ جیسا کہ معتزلہ کا مذہب ہے اور کچھ حضرات یہ کہہ رہے تھے کہ اس میں خدا کی کیا مصلحت و حکمت ہے کہ بعض انسانوں کو تو جنت کے لئے پیدا کیا اور بعض انسانوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے؟ کچھ صحابہؓ نے اس کا جواب دیا کہ یہ اس لئے ہے کہ انسانوں کو کچھ اختیارات بھی اعمال کے کرنے اور نہ کرنے کا دے دیا ہے، کچھ نے کہا یہ اختیار کس نے دیا؟۔

بہر حال اس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی اور اپنی عقل و دانش کے بل بوتہ پر خدا کے اس راز و مصلحت کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ سرکار دو عالم ﷺ نے جب ان کو اس بحث مباحثہ میں مشغول پایا تو غصہ و غضب سے چہرہ مقدس سرخ ہو گیا اس لئے صحابہ کو بتلا دیا گیا کہ یہ تقدیر کا مسئلہ خدا کا ایک راز و بھید ہے جو کسی پر ظاہر نہیں کیا گیا ہے لہٰذا اس میں اپنی عقل لڑانا اور غور و تحقیق گمراہی کی راہ اختیار کرنا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس لئے دنیا میں نہیں بھیجا گیا ہوں کہ تقدیر کے بارہ میں بتاؤں اور تم اس میں بحث و مباحثہ کرو، میری بعثت کا مقصد صرف یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے احکام تم لوگوں تک پہنچا دوں اور اطاعت فرمانبرداری کی راہ پر تمہیں لگاؤں۔ دین و شریعت کے فرائض و اعمال کے کرنے کا تمہیں حکم دوں، لہٰذا ایک سچے و مخلص ہونے کے ناطے پر صرف اتنا ہی فرض ہے کہ تم ان احکام و فرائض پر عمل کرو اور جن اعمال کے کرنے کا تمہیں حکم دوں اس کی بجا آوری میں لگے رہو، تم اس تقدیر کے مسئلہ میں مت پڑو پس اتنا ہی اعتقاد تمہارے لئے کافی ہے کہ یہ خدا کا ایک راز ہے جس کی حقیقت و مصلحت وہی جانتا ہے، اس کو اسی کی مرضی پر چھوڑ دو۔

آخر حدیث میں صاحب مشکوۃ نے ابن ماجہ کی اسی طرح کی روایت کردہ حدیث کی سند کا ذکر کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حدیث شعیب نے اپنے دادا سے نقل کی ہے جو عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں اور شعیب سے ان کے صاحبزادے عمرو روایت کرتے ہیں اس طرح "عن ابیہ" کی ضمیر عمرو بن شعیب کی طرف راجع ہو گی اور "عن جدہ" کی ضمیر شعیب کی طرف راجع ہو گی اس لئے کہ عمر اپنے دادا سے روایت نہیں کرتے ہیں کیونکہ ان کے دادا محمد بن عبداللہ سے وہ روایت منقول نہیں ہے، یہ سلسلہ نسب اس طرح ہے عمر بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ۔

اس کی تشریح اس لئے یہاں ضروری ہے کہ دوسری احادیث میں اس طرح کی عبارات میں "عن جدہ" کی ضمیر عمرو ابن شعیب کی طرف راجع ہوتی ہے لیکن یہاں اس کے برخلاف ہے۔

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ قَبْضَۃٍ قَبَضَھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَرْضِ فَجَآءَ بَنُوْٓا اٰدَمَ عَلٰی قَدْرِ الْاَرْضِ مِنْھُمُ الْاَحْمَرُ وَالْاَبْیَضُ وَالْاَسْوَدُ وَبَیْنَ ذٰلِکَ وَالسَّھْلُ وَالْحَزْنُ وَالْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابو موسیٰؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ایک مٹھی (مٹی) سے کی جو ہر جگہ کی زمین سے لی گئی تھی لہٰذا آدم کی اولاد (انہیں) زمین کے موافق پیدا ہوئی چنانچہ (انسانوں میں) بعض سرخ، بعض سفید، بعض کالے، بعض درمیانہ رنگ کے، بعض نرم مزاج، بعض تند مزاج بعض پاک اور بعض ناپاک ہیں۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت آدم کی تخلیق کے وقت ایک فرشتہ حضرت عزرائیل علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ ایک مٹھی بھر کے مٹی لے آئیں چنانچہ وہ تمام روئے زمین سے ہر خطہ و ہر جگہ کی تھوڑی تھوڑی مٹی اپنی مٹھی میں بھر لائے اسی سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی گئی اسی لئے آدم

کی اولاد میں مختلف رنگ ونسل اور مختلف طبائع کے انسان پیدا ہوتے ہیں کوئی کالا ہوتا ہے تو کوئی گورا اور کسی کا رنگ گندمی ہوتا ہے اسی طرح کچھ انسان اپنی طبیعت و مزاج کے اعتبار سے نرم خو، خوش اخلاق اور میٹھی زبان کے ہوتے ہیں کچھ لوگوں کی طبیعت سخت و تیز اور غیر معتدل ہوتی ہے، بعض انسان فطرتاً پاک و صاف ہوتے ہیں اور بعض گندگی و نجاست سے ملوث رہتے ہیں اور یہ فرق و اختلاف اسی بنیادی مادہ کی وجہ سے ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی گئی تھی۔

(۲۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ خَلْقَهٗ فِيْ ظُلْمَةٍ فَاَلْقٰى عَلَيْهِمْ مِنْ نُّوْرِهٖ فَمَنْ اَصَابَهٗ مِنْ ذٰلِكَ النُّوْرِ اهْتَدٰى وَمَنْ اَخْطَاَهٗ ضَلَّ فَلِذٰلِكَ اَقُوْلُ جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰى عِلْمِ اللّٰهِ۔

(رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق (جن و انس) کو اندھیرے میں پیدا کیا اور پھر ان پر اپنے نور کا پرتو ڈالا، لہٰذا جس کو اس نور کی روشنی میسر آگئی وہ راہ راست پر لگ گیا اور جو اس کی مقدس شعاعوں سے محروم رہا وہ گمراہی میں پڑا رہا، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ تقدیر الٰہی پر قلم خشک ہو چکا ہے (کہ اب تقدیر میں تغیر و تبدل ممکن نہیں)۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: اندھیرے سے مراد نفس امارہ کی ظلمت ہے کہ انسان کی جبلت میں خواہشات نفسانی اور غفلت کا مادہ رکھا تھا لہٰذا جس کا قلب و دماغ ایمان و احسان کی روشنی سے منور ہو گیا اور اس نے طاعت الٰہی سے خدا کی ذات کا عرفان حاصل کر لیا تو وہ نفس امارہ کے مکر و فریب اور اس کی ظلمت سے نکل کر خدا پرستی و نیکوکاری کے لالہ زار میں آگیا اور جو اپنے نفس کے مکر و فریب میں پھنس کر طاعت الٰہی کے نور سے محروم رہا وہ گمراہی میں پڑا رہ گیا۔

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ اَنْ يَّقُوْلَ يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِكَ وَبِمَا جِئْتَ بِهٖ فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا قَالَ نَعَمْ اِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَآءُ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ اکثر و بیشتر بطور دعا کے یہ فرمایا کرتے تھے۔ اے قلوب کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ! میں نے کہا یا رسول اللہ! ہم آپ (ﷺ) پر ایمان لائے اور آپ (ﷺ) کے لائے ہوئے دین و شریعت پر بھی ایمان لائے تو کیا اب بھی ہمارے بارہ میں آپ (ﷺ) ڈرتے ہیں (کہ کہیں ہم گمراہ نہ ہو جائیں) آپ ﷺ نے فرمایا بے شک قلوب اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں (یعنی اس کے تصرف و اختیار میں ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو گردش میں لاتا رہتا ہے)۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حضرت انسؓ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ ﷺ تو بالکل معصوم اور محفوظ ہیں۔ نعوذ باللہ کسی گمراہی کا شائبہ بھی آپ ﷺ کے اندر نہیں آسکتا ظاہر ہے کہ یہ دعا آپ ﷺ ہمارے لئے ہی کرتے ہوں گے کہ کہیں ہم دنیا کی چمک دمک میں پھنس کر اپنے دین و ایمان سے گمراہ نہ ہو جائیں تو کیا ایسی شکل میں جب کہ آپ ﷺ ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہم آپ ﷺ کی رسالت اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی صداقت کا اعتقاد رکھتے ہیں، نیز ہمارے قلوب ایمان و ایقان کی حقیقی کیفیت سے سرشار ہیں ہمارے گمراہ ہونے کا کیا خدشہ ہو سکتا ہے اس پر سرکار دو عالم ﷺ نے جواب دیا کہ قلوب کے رخ خدا کے ہاتھ میں ہیں اور جس طرح چاہتا ہے ان کو پھیرتا رہتا ہے، نہ معلوم کس کے قلب کا رخ گمراہی کی طرف کب ہو جائے اس لئے دعا مانگنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ دل کو ہمیشہ سلامتی کی راہ پر لگائے رہے اور گمراہی کی طرف نہ مڑنے دے۔

(۲۴) وَعَنْ اَبِی مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْقَلْبِ کَرِیْشَۃٍ بِاَرْضٍ فَلَاۃٍ یُقَلِّبُھَا الرِّیَاحُ ظَھْرًا لِبَطْنٍ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، دل کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی پَر کسی میدان میں پڑا ہو اور ہوائیں اس کی پیٹھ سے پیٹ اور پیٹ سے پیٹھ کی طرف پھرتی رہتی ہیں۔" (احمدؒ)

تشریح: اسی طرح دلوں کا حال ہے کہ کبھی وہ برائی سے بھلائی کی طرف رخ کر لیتے ہیں اور کبھی بھلائی سے برائی کے راستہ پر جا لگتے ہیں۔

(۲۵) وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُؤْمِنَ بِاَرْبَعٍ یَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ بَعَثَنِیْ بِالْحَقِّ وَیُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَیُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے۔ (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ (۲) اور میں بلاشبہ خدا کی جانب سے بھیجا ہوا رسول ہوں اور حق (دین اسلام) لے کر اس دنیا میں آیا ہوں۔ (۳) موت اور مرنے کے بعد (میدان حشر میں) اٹھنے پر ایمان لانا۔ (۴) اور تقدیر پر ایمان لانا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: موت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کو یقینی جانے کہ اس دنیا کی تمام زندگی عارضی اور فانی ہے جو اپنے وقت پر ختم ہو جائے گی۔ اور اس دنیا میں جو کچھ ہے سب ایک دن فنا کے گھاٹ اتر جائے گا یا اس سے یہ مراد ہے کہ اس بات پر صدق دل سے یقین و اعتقاد رکھا جائے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے اور وہ خداوند کے حکم سے آتی ہے کوئی بیماری، حادثہ یا تکلیف موت کا حقیقی سبب نہیں ہے بلکہ یہ چیزیں بادی النظر میں ظاہری اسباب ہوتے ہیں کسی انسان کی زندگی اور موت کلیۃً خدا کے ہاتھ میں ہے جب تک اس کا حکم ہوتا ہے زندگی رہتی ہے اور جب وہ چاہتا ہے موت بھیج کر زندگی ختم کر دیتا ہے۔

(۲٦) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صِنْفَانِ مِنْ اُمَّتِیْ لَیْسَ لَھُمَا فِی الْاِسْلَامِ نَصِیْبٌ اَلْمُرْجِئَۃُ وَالْقَدَرِیَّۃُ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میری اُمّت میں دو فرقے ایسے ہیں جن کو اسلام کا کچھ بھی حصہ نصیب نہیں ہے اور وہ "مرجیہ و قدریہ" ہیں، ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: اسلام میں ایک گروہ "مرجیہ" کے نام سے مشہور ہے، یہ فرقہ اعمال کے سلسلہ میں اسباب کا قائل نہیں ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ کسی عمل اور فعل کی نسبت بندہ کی جانب ایسی ہی ہے جیسے کسی فعل کی نسبت جمادات کی طرف کر دی جائے یعنی جس طرح ایک لکڑی پتھر، روڑہ ہے کہ اس کو جس طرف پھینک دیجئے یا جدھر کو لڑھکا دیجئے وہ لڑھکتا چلا جائے گا اس کو اپنے پھینکے جانے اور لڑھکائے جانے میں کوئی دخل و اختیار نہیں ہے، بلکہ وہ پھینکنے والے اور لڑھکانے والے کے قبضہ و قدرت میں ہے، اسی طرح ایک بندہ ہے کہ اس کو اپنے کسی عمل اور فعل میں کوئی دخل اور اختیار نہیں ہے بلکہ وہ محض اور بے اختیار ہے، قدرت اس سے جیسے عمل صادر کراتی ہے وہ کرتا ہے وہ نہ کسی عمل کے ازخود کرنے پر قادر ہے اور نہ کسی عمل سے باز رہنا اس کے اختیار میں ہے۔

اس کے مدِّمقابل ایک دوسرا فرقہ "قدریہ" ہے جو سرے سے تقدیر ہی کا منکر ہے، اس جماعت کا مسلک یہ ہے کہ بندہ کے اعمال میں تقدیر الٰہی کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ بندہ خود اپنے اعمال کا خالق اور اپنے افعال میں مختار و قادر ہے۔ وہ جو کچھ عمل کرتا ہے اپنی قدرت و اختیار کی بنا پر کرتا ہے۔ یہی مسلک "معتزلہ اور روافض" کا بھی ہے۔

یہ دونوں فرقے اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے اپنے مسلک میں راہ اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں اس لئے کہ اگر مرجیہ کے اعتقادات کو

مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب بندہ سے اختیار و قدرت اور ارادہ و مشیت کی نفی کر کے اسے اینٹ پتھر اور لکڑی اور غیر ذی ارادہ مخلوق کی طرح مان لیا گیا اور بندہ کے ہر فعل میں اختیار و قدرت کلیۃً خدا کا مانا گیا یا صاف لفظوں میں یہ کہا جائے کہ گویا صفات خالق کو سامنے رکھ کر صفات عبد سے انکار کر دیا گیا تو قدرتی طور پر یہ بات ماننی پڑے گی کہ بندہ سے سرزد شدہ افعال خود بندہ کے نہیں کہلائے جائیں گے بلکہ ان کو خدا کے افعال کہا جائے گا خواہ وہ فعل کسی قسم کا ہو اور کسی بھی عضو سے صادر ہوا ہو لہٰذا جب بندہ دیکھے گا تو کہا جائے گا کہ وہ نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ خدا دیکھ رہا ہے جب بندہ کھائے گا تو ماننا پڑے گا کہ وہ نہیں کھا رہا ہے، بندہ جب سنے گا تو تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ نہیں سن رہا ہے بلکہ خدا سن رہا ہے، بندہ جب سوئے گا تو یہی کہا جائے گا کہ وہ نہیں سو رہا ہے بلکہ خدا سو رہا ہے تو گویا بندہ سے کوئی فعل بھی جب سرزد ہوگا تو یہی کہنا ہوگا کہ وہ اس بندہ سے نہیں بلکہ در حقیقت خدا سے سرزد ہو رہا ہے۔ اور چونکہ یہ سب وجود کے آثار ہیں جن سے غافل کے موجود ہونے کا پتہ چلتا ہے تو خلاصہ یہ نکلے گا کہ بندہ اگرچہ موجود ہے لیکن حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے، بلکہ وہ خالق اور افعال کے درمیان ایک ایسا ذریعہ ہے جو ان افعال کے اظہار کے لئے واسطہ بن رہا ہے بلکہ موجود تو صرف خدا کی ذات ہے ورنہ تمام کا تمام کالعدم ہے۔

لہٰذا یہ ساری حجت وحدۃ الوجود اور کثرت موجودات کی نفی پر آکر ختم ہو جائے گی جس کو بعض جاہل صوفیاء کی اصطلاح میں "ہمہ اوست" کہتے ہیں جس کا حاصل کثرت موجودات اور اعیان ثابت کا برملا انکار اور ساری کثرتوں کو ایک فرضی اور وقتی کارخانہ تصور کر لینا نکل آتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ گویا اس کائنات میں ہر چیز موجود ہو کر بھی کالعدم اور معدوم ہی ہے، موجود صرف ذات واحد ہی ہے اور کوئی نہیں اس کا نتیجہ اصطلاحی الفاظ میں یہ ہے کہ دائرہ وجود میں وجود کی صرف ایک ہی نوع رہ جائے جسے واجب الوجود کہتے ہیں اور ممکن الوجود کا کوئی نشان و پتہ ہی نہ رہے بلکہ وہ ہمیشہ کے لئے معدوم محض ہو کر رہ جائے۔

اب ظاہر ہے کہ ایجاد خداوندی یا فیضان وجود جسے تخلیق کہتے ہیں ممکن ہی پر ہو سکتا ہے اس لئے کہ اسی میں قبول وجود کی صلاحیت ہے لیکن چونکہ وہ معنی معدوم محض ہو گیا ہے جس پر آثار وجود اور آثار زندگی ظاہر نہیں ہو سکتے، تو اب ایجاد کس پر واقع ہو اور تخلیق کس چیز کی عمل میں آئے؟ نیز ایجاد کے بعد ابقاء خداوندی یعنی تدبیر و تصرف اور ربوبیت وغیرہ ایسی وہ تمام صفات حق جن کا تعلق مخلوق سے تھا کس پر واقع ہوں گی؟ اور کہاں اپنی تجلیات دکھلائیں گی؟ جب کہ ذات خداوندی کے سوا کسی غیر کا پتہ نہیں کہ وہ ان صفات کا مورد و مظہر بن سکے، لہٰذا اس شکل میں ماننا پڑے گا کہ ایجاد و ابقاء کی تمام صفات معاذ اللہ معطل و بیکار ثابت ہو گئیں ہیں اور تعطل اگر عدم نہیں تو کالعدم ضرور ہے، یا بالفاظ دیگر افعال باری کا عدم ہے جو انتہائی نقص ہے۔

اور جب کہ یہ تمام فعلی کمالات صفات وجود کے آثار تھے جو ذات حق سے منتفی ہو گئے تو بلاشبہ وجود خداوندی ان کی نفی سے ناقص ٹھہرا اور خدا کی بے عیب ذات کتنے ہی کمالات مثلاً ظہور صفات اور افعال سے کوری رہ گئی جن پر معبودیت کا کارخانہ قائم تھا اور ظاہر ہے کہ نقص صفات اور نقص افعال کے ساتھ خدائی جمع نہیں ہو سکتی، تو ایسی ناقص ذات کو خدا نہیں کہہ سکتے، نتیجہ یہ نکلا کہ نہ خالق رہا اور نہ مخلوق رہی۔

غور کیجئے کہ مرجیہ کے نظریات نے بندہ کو مجبور محض اور بے اختیار تصور کیا اور اس کے تمام افعال و اعمال کی ذمہ داری تقدیر الٰہی کے سر ڈال دی، نتیجہ یہ نکلا کہ اگر انہوں نے بندہ کے اختیار و قدرت کا انکار کیا تھا تو انجام کار خدا کی صفات افعال ایجاد، ترزیق اور قیومیت و تدبیر وغیرہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔

اب ذرا "قدریہ" کے مسلک کی تنقیح بھی کر لیجئے اس جماعت نے مرجیہ کا رد عمل کرتے ہوئے اس سلسلہ میں محض صفات عبد کو سامنے رکھا، اور صفات معبود سے صرف نظر کر لیا، یعنی بندہ کے اختیارات و قدرت، ارادہ مشیت اور فعل و عمل کو اس درجہ میں مستقل اور آزاد بتلایا کہ اس میں خدا کے ارادہ و قدرت اور اختیار و فعل کو دخل ہی نہیں حتی کہ بعض غالی قدریہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خدا کو بندہ

کے افعال کا علم بھی اس وقت ہوتا ہے جب بندہ اسے کر لیتا ہے، گویا بندہ کے استعمال اختیار کی حد تک نہ خدا میں ارادہ ہے، نہ قدرت کو اختیار ہے نہ مشیت، حتیٰ کہ نہ سابق علم نہ خبر۔

لہٰذا مرجیہ نے تو تقدیر سے مثلاً صفات خالق ارادہ، علم، قدرت، اختیار وغیرہ کو خدا سے وابستہ کر کے بندے کو ان سے کورا مان لیا اور قدریہ نے ان صفات کو بندہ سے مستقلاً وابستہ کر کے خدا کو ان سے خالی مان لیا۔

غور کیجئے! اس کا بھی نتیجہ وہی (نعوذ باللہ) عدم محض، تعطل خالص، اور خدائی ذات میں زبردست نقصان اور اس کی صفات میں کوتاہی نکلا۔ اس لئے کہ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ بندہ منٹ بھر میں سینکڑوں اچھے برے افعال اور حرکات و سکنات مختلف اندازوں سے کر گزرتا ہے جس کے عمر بھر کے افعال و حرکات کی گنتی ناممکن ہے، پھر انسانی تصرفات کی حدود اسی عالم تک نہیں ہیں، اس لئے کہ بعض ایسے متعدی افعال بھی ہیں جن میں انسان دوسری اشیاء کائنات کو مفعول بناتا ہے ظاہر ہے ان اشیاء عالم میں جو اس کے تسخیر و تصرف میں آتی ہیں، زمین سے لے کر آسمان تک ساری ہی مخلوقات داخل ہیں۔

لہٰذا سارے انسانوں کے یہ تمام افعال جو سارے ہی عالموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور بقول قدریہ یہ انسانوں کی ایسی مخلوقات ہیں جن کی ایجاد و تخلیق میں خدا کا دخل تو کیا ہوتا ان پر اس کا نہ زور چل سکتا ہے اور نہ ہی اسے ان کی پیدائش سے پہلے ان کا علم ہی ہوتا ہے گویا انسان جو خود اپنی تخلیق میں بے بس ہے اسے تو ان کی تخلیق کا ارادہ کرتے وقت علم ہو جاتا ہے کہ اسے کیا اور کب پیدا کرنا ہے، مگر نعوذ باللہ خدا اتنا بے خبر اور لاعلم کہ اسے یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سی چیز کب پیدا ہوئی اور کون سا فعل کب صادر ہوا۔

اس صورت میں یقیناً انسان کی تخلیق کا شمار خدا کی مخلوقات کے شمار سے بڑھ جائے گا، اس لئے کہ خدا تو انسان کا خالق ہے اور انسان تمام افعال و اشیاء کا خالق ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کی نسبت سے ان کا افعال بلاشبہ کروڑوں گنا زیادہ ہیں، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انسانی مخلوقات خدا کی مخلوقات سے زیادہ نہ ہو جائے اور پھر مخلوقات بھی ایسی کہ خدائی سرحد سے بالکل خارج جس پر اس کا کوئی بس نہ ہو بلکہ علم قدیم بھی نہ ہو پس اس معاملہ میں کہنا پڑے گا کہ خدا تو بے بس ہو گیا اور انسان مختار کل ہو گیا، بندہ تو خدائی حدود میں آگیا اور خدا بندوں کی صف میں جا بیٹھا، یعنی بندہ کا زور تو خدا کی خدائی پر چل گیا کہ اس نے افعال و اشیاء کی تخلیقات کر ڈالیں اور خدا کا بس اپنی خدائی پر بھی نہ رہا کہ اسے ان مخلوقات کے وجود میں آنے کا علم بھی نہ ہو سکا اور اس مقام پر آکر اس کا ارادہ، قدرت، مشیت اور اختیار وغیرہ سب بے کار اور معطل ہو کر رہ گئے۔ (ماخوذ از مسئلہ تقدیر مصنفہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ)

یہ ہے ان دونوں فرقوں کے مسلک کی حقیقت اور اس کا انجام ظاہر ہے کہ یہ دونوں نظریے اپنی اپنی جگہ اسلامی نقطۂ نظر سے نہ صرف یہ کہ حد اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں بلکہ گمراہی کی طرف بڑھے ہوئے بھی ہیں جس کا نتیجہ عذاب خداوندی اور خسران آخرت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔

ان دونوں کے مقابلے میں اہل سنت و الجماعت کا مسلک بالکل صاف اور صحیح ہے علماء حق کہتے ہیں کہ تمام افعال و اعمال کا خالق خداوند قدوس ہے اور کاسب بندہ ہے یعنی دنیا میں جتنی چیزیں وقوع پذیر ہوتی ہیں یا ہونے والی ہیں وہ سب خدا کے حکم اور اس کے ارادہ و علم سے ہوتی ہیں، اسی طرح بندوں سے جو کچھ افعال سرزد ہوتے ہیں خواہ وہ افعال نیک ہوں یا افعال بد سب نوشتہ تقدیر کے مطابق بروقت وقوع پذیر ہوتے ہیں لیکن بندہ کو عقل و دانش، فہم و فراست اور نیک و بد میں امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت عطا فرما کر اس کے سامنے دونوں راستے واضح کر دیئے ہیں اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ اگر نیکی و بھلائی کے راستے کو اختیار کرو گے تو سعادت و نیک بختی سے نوازے جاؤ گے اور اگر کوئی برائی و بدی کے راستے کو اختیار کرو گے تو عذاب خداوندی میں گرفتار کئے جاؤ گے لہٰذا بندہ اسباب کسب کے اعتبار سے اپنے ہر عمل و فعل میں مختار ہے۔

گویا اہل سنت و الجماعت بندہ کو بیک وقت مختار بھی کہتے ہیں اور مجبور بھی مگر اس درمیانی انداز سے کہ اسے نہ مختار مطلق جانتے ہیں نہ

مجبور محض یعنی ایک طرف سے اسے مختار مان کر زنجیر تقدیر سے پابستہ بھی کہتے ہیں اور دوسری طرف اسے مجبور کہہ کر اینٹ و پتھر کی طرح بے حس بھی تسلیم نہیں کرتے۔

بہرحال اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فرقے یعنی مرجیہ اور قدریہ کافر ہیں لیکن حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تحقیق کے مطابق علماء کا قول مختار یہ ہے کہ یہ دونوں فرقے کافر نہیں ہیں البتہ فاسق ہیں کیوں کہ یہ فرقے بھی قرآن و حدیث ہی سے تمسک کرتے ہیں اور اپنے نظریات میں تاویل و توضیح کر کے کفر کے دائرہ سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ لہٰذا اس حدیث کے بارہ میں کہا جائے گا کہ اس سے ان فرقوں کی زجر و ملامت مقصود ہے اور ان کے غلط عقائد کی گمراہی کو واضح کرنا ہے جس میں اس شدت و سختی کے ساتھ ان کے مذہب کا رد کیا جا رہا ہے۔ بعض حضرات نے اس حدیث کی صحت میں بھی کلام کیا ہے۔

حضرت شاہ اسحٰقؒ کی تحقیق اس کے برخلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ علماء محققین ان فرقوں پر کفر کا حکم لگاتے ہیں اور ان کو خارج الاسلام مانتے ہیں لیکن اس میں اختلاف ہے کہ ان کا کفر آیا تاویلی ہے یا ارتدادی۔

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَكُوْنُ فِيْ أُمَّتِيْ خَسْفٌ وَّمَسْخٌ وَذٰلِكَ فِي الْمُكَذِّبِيْنَ بِالْقَدْرِ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَہٗ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے سرور کائنات ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے، کہ میری اُمت میں (خدا کے دردناک عذاب) زمین میں دھنس جانا اور صورتوں کا مسخ ہو جانا بھی ہوگا اور یہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو تقدیر کے منکر ہیں (ابوداؤد) امام ترمذی نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: زمین میں دھنس جانا اور صورتوں کا مسخ ہو جانا خدا تعالیٰ کی جانب سے بہت سخت عذاب ہیں جو اس اُمت سے پہلے دوسری امتوں پر ان کی سرکشی اور حد سے زیادہ نافرمانی کی بنا پر ہو چکے ہیں، اس اُمت میں بھی آخر زمانہ میں خدا سے تمرد و سرکشی اور بغاوت و نافرمانی حد سے زیادہ بڑھ جائے گی تو ان فرقوں پر یہ عذاب ہو سکتا ہے۔

لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسخ و خسف جیسے دردناک عذاب میری اُمت پر ہوئے تو ان دونوں فرقوں پر ہوں گے۔

(۲۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ اِنْ مَرِضُوْا فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَاِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، فرقہ قدریہ اس اُمت کے مجوس ہیں لہٰذا اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت کے لئے نہ جاؤ اور اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازہ میں شریک مت ہونا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث سے قدریہ کی صریح گمراہی اور ان کی ضلالت واضح ہے کہ ان کو اس اُمت کا مجوس قرار دیا گیا مجوس ایک آتش پرست قوم ہے جو دو خدا مانتی ہے ایک وہ خدا جو نیکی و بھلائی کا پیدا کرنے والا ہے، اس کو یزداں کہتے ہیں۔ دوسرا وہ خدا جو برائی و بدی کا پیدا کرنے والا ہے، اس کو اہرمن یعنی شیطان کہتے ہیں۔

لہٰذا جس طرح مجوسی تعدد اللہ کے قائل ہیں اسی طرح قدریہ بھی بے انتہا خالقوں کے قائل ہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک ہر بندہ اپنے افعال کا خالق ہے اسی طرح جتنے بندے ہوں گے اتنے ہی خالق ہی ہوں گے، نیز جس طرح قدریہ خالق خیر الگ اور خالق شر الگ مانتے ہیں اسی طرح قدریہ بھی کہتے ہیں کہ خیر و بھلائی کا پیدا کرنے والا تو خدا ہے اور شر و برائی کا پیدا کرنے والا شیطان اور انسانی نفس ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس فرقہ سے کلیۃً اجتناب کرنا ضروری ہے اگر وہ بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت کے لئے

نہیں جانا چاہیے اگر وہ مرجائیں تو ان کے جنازہ میں شریک نہ ہونا چاہیے گویا غمی خوشی کسی موقع پر بھی ان کے ساتھ نہ رہنا چاہیے اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا معاشرتی میل جول رکھنا جائز ہے۔

چنانچہ وہ حضرات جو اس جماعت کو کافروں کے زمرہ میں داخل کرتے ہیں اس حدیث کو اپنے ظاہری معنی پر محمول کرتے ہیں یعنی مسلمانوں کو ان کے ساتھ میل جول رکھنے سے منع کرتے ہیں۔

اور جو حضرات ان کو کافر نہیں بلکہ فاسق کہتے ہیں وہ اس حدیث کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ اس حدیث کا مقصد اس جماعت کی گمراہی و ضلالت کو بیان کرنا اور ان کی زجر وملامت میں شدت کا اظہار کرنا ہے۔

لیکن حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ فرماتے ہیں کہ محققین کا قول یہی ہے کہ نہ تو ان کی عیادت میں جائے اور نہ ان کے جنازہ میں شریک ہو اور جہاں تک ہو سکے ان سے قطع تعلق رکھے۔

(۲۹) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُجَالِسُوْا اَهْلَ الْقَدْرِ وَلَا تُفَاتِحُوْهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ قدریہ کی ہم نشینی اختیار نہ کرو اور نہ ان کو اپنا حکم (ثالث) بناؤ۔"

(ابوداؤد)

تشریح: قدریہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ان سے مجالست کرنا اور ان کی ہم نشینی اختیار کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ان کی مجلسوں میں شریک ہونے سے یہ ظاہر ہوگا کہ ان سے محبت و موانست ہے اور یہ مسلمانوں کے لئے مناسب نہیں ہے کہ کسی گمراہ جماعت سے تعلق قائم کریں اور ان سے انس و محبت کا برتاؤ کریں۔

اس لئے کہ جب ان کے ساتھ رہنا سہنا ہوگا اور ان کی ہم نشینی اختیار کی جائے گی تو ان کے غلط نظریات اور گمراہ اعتقادات کا اثر ان پاس بیٹھنے والوں پر بھی ہوگا اور ان کی گمراہی اہل مجلس کے اعتقاد و اعمال پر بھی اثر انداز ہوگی۔ اور ہو سکتا ہے کوئی شیطانی مکر و فریب میں آکر ان کے اعتقادات کو تسلیم کرے، اس لئے بنیادی طور پر ان کی مجالست و موانست سے بھی منع فرمادیا گیا ہے۔

اسی طرح حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے کسی تنازعہ میں اہل قدر کو حاکم نہ بنائیں اور نہ ان کو اپنا ثالث مقرر کریں لاتفاتحوھم کے معنی بعض حضرات یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو نہ پہلے سلام کرو اور نہ از خود ان سے بات چیت شروع کرو۔ واللہ اعلم۔

(۳۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ يُجَابُ الزَّائِدُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدَرِ اللّٰهِ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوْتِ لِيُعِزَّ مَنْ اَذَلَّهُ اللّٰهُ وَيُذِلَّ مَنْ اَعَزَّهُ اللّٰهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحُرُمِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِيْ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِيْ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الْمَدْخَلِ وَرَزِيْنٌ فِيْ كِتَابِهٖ۔ (بیہقی، رزین)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ چھ شخص ایسے ہیں جن پر میں لعنت بھیجتا ہوں اور خدا نے بھی ان کو ملعون قرار دیا ہے اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے۔ (پہلا) کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والا (دوسرا) تقدیر الٰہی کو جھٹلانے والا۔ (تیسرا) وہ شخص جو زبردستی غلبہ پانے کی بنا پر ایسے شخص کو معزز بنائے جس کو اللہ نے ذلیل کر رکھا ہو اور اس شخص کو ذلیل کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے عزت و عظمت کی دولت سے نواز رکھا ہو۔ (چوتھا) وہ شخص جو (حدود اللہ سے تجاوز کر کے اس چیز کو حلال جانے جسے اللہ نے حرام کیا ہو۔ (پانچواں) وہ جو میری اولاد سے وہ چیز (قتل) حلال جانے جو اللہ نے حرام کی ہے۔ اور (چھٹا) وہ شخص جو میری سنّت کو چھوڑ دے۔"

(بیہقی، رزینؒ)

تشریح: حدیث میں جن اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنے ان غلط عقائد اور گمراہ کن اعمال کی بنا پر شریعت کی نظر میں اتنے مجرم ہیں کہ سرکار دو

عالم ﷺ نے ان پر لعنت فرمائی ہے اور نہ صرف یہ کہ دربار رسالت سے ان پر پھٹکار برسائی گئی ہے بلکہ وہ بارگاہ الوہیت سے بھی راندہ درگاہ کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ کسی شخص نے آپ ﷺ سے سوال کیا ہوگا کہ آپ ﷺ ان لوگوں پر لعنت کیوں بھیجتے ہیں؟ تو اس پر آپ ﷺ نے یہ جواب دیا کہ چونکہ خداوند قدوس نے ان کو اپنے اعمال کی بنا پر ملعون قرار دیا ہے اس لئے یہ اسی کے مستحق ہیں کہ رسول بھی ان کو ملعون قرار دے اور ظاہر ہے نبی کے لسان مقدس سے نکلی ہوئی ہر دعا اور ہر بددعا باب قبولیت تک پہنچ کر رہتی ہے اس لئے جس پر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم لعنت بھیجیں اس کی دنیا بھی برباد ہوگی اور دین بھی تباہ ہو جائے گا اسی طرف کل نبی یجاب کہہ کر اشارہ فرمایا گیا ہے۔

ویسے تو اس حدیث میں جس ترکیب کے اعتبار سے یہ جملہ معترضہ واقع ہو رہا ہے اور اس کے مقصد لعنت میں شدت ہے۔ پہلا شخص جسے ملعون قرار دیا جا رہا ہے وہ قرآن میں زیادتی کرنے والا ہے، خواہ وہ قرآن میں الفاظ کی زیادتی کرے یا قرآن کی آیتوں کے ایسے معنی بیان کرے جو کتاب اللہ کے مفہوم کے خلاف اور منشاء الٰہی کے برعکس ہوں۔

تیسرا شخص وہ ہے جو زبردستی غلبہ حاصل کرے اور اپنی ظاہری شان و شوکت کے بل بوتہ پر ان لوگوں کو معزز کرے جو خدا کی نظروں میں ذلیل ہیں اور ان لوگوں کو ذلیل کرے جو خدا کے یہاں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں اور اس تیسرے شخص سے مراد ایسے بادشاہ اور ظالم حاکم ہیں جو اپنے اغراض و مقاصد کی بنا پر حکومت و دولت کے نشہ میں خدا کے ان صالح و نیک بندوں اور مسلمانوں کو ذلیل خوار کرتے ہیں جو خدا کے نزدیک بڑی عزت و عظمت کے مالک ہوتے ہیں اور ایسے کافروں، جاہلوں اور بدکار لوگوں کو عزیز رکھتے ہیں جو خدا کی نظر میں سخت ذلیل ہوتے ہیں۔

چوتھا شخص وہ ہے جو خدا کی قائم کی ہوئی حدود سے تجاوز کرتا ہے یعنی ان چیزوں کو حلال سمجھتا ہے جو خدا کی جانب سے حرام کر دی گئی ہیں مثلاً بیت اللہ مکہ میں جن باتوں کو خدا نے ممنوع قرار دیا ہے جیسے کسی جانور کا شکار کرنا، درخت وغیرہ کاٹنا، یا بغیر احرام کے مکہ میں داخل ہونا، ان کو وہ حلال سمجھتا ہو، ایسے ہی سرکار دوعالم ﷺ کی اولاد کے بارہ میں جن چیزوں کو خدا نے حرام کیا ہے ان کو حلال کرتا ہو یعنی آنحضرت کی اولاد کی عزت و تعظیم کرنا ضروری ہے لیکن کوئی شخص نہ کرنے کو جائز سمجھے یا ان کو تکلیف پہنچانا حرام قرار دیا گیا ہے ان کو تکلیف پہنچانا حلال جانے تو اس پر بھی لعنت فرمائی گئی۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص میری اولاد میں سے ہونے کے باوجود ان افعال کو حلال جان کر کرتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس طرح اس کا مقصد سیدوں کو تنبیہ کرنا ہے کہ یہ لوگ سرکار دوعالم ﷺ کی اولاد میں ہونے کے ناطے گناہ و معصیت سے بچتے رہیں، اس لئے کہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس قوم کو گناہ و معصیت زیادہ برائی و تباہی کا باعث ہیں کیونکہ ان کا نسبی تعلق براہ راست آنحضرت ﷺ سے ہے۔

اسی طرح پانچواں ملعون وہ شخص قرار دیا گیا ہے جو ان چیزوں کو حرام سمجھتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو۔

چھٹا ملعون اس شخص کو قرار دیا گیا ہے جو سُنّت نبوی کو ترک کرتا ہو۔

اس کا مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص سستی اور کسل کی بنا پر سُنّت کو ترک کرتا ہو وہ گناہ گار ہے اور جو شخص سُنّت کو نعوذ باللہ ناقابل اعتناء سمجھ کر چھوڑتا ہو تو وہ کافر ہے لیکن اس لعنت میں دونوں شریک ہیں۔ مگر یہ کہا جائے گا کہ جو شخص ازراہ کسل و سستی سُنّت چھوڑتا ہے اس پر لعنت کرنا زجر و توبیخ کے لئے ہے اور جو شخص ناقابل اعتناء سمجھ کر سُنّت کو ترک کرتا ہے اس پر حقیقۃً لعنت ہوگی ہاں اگر کوئی شخص کسی وجہ سے کسی وقت سُنّت کو ترک کر دے تو اس پر گناہ نہیں ہوگا لیکن یہ بھی مناسب نہیں ہے۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہ وعید سُنّت مؤکدہ کے ترک کرنے پر ہے۔

(۳۱) وَعَنْ مَطَرِ بْنِ عُكَامِسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَضَى اللّٰهُ لِعَبْدٍ أَنْ يَمُوْتَ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ

اِلَيْهَا حَاجَةً۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت مطرؓ بن عکامس[1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی موت کو کسی زمین میں مقدر کر دیتا ہے تو اس زمین کی طرف اس کی حاجت کو بھی پورا کر دیتا ہے تاکہ وہاں جانے پر مجبور ہو اور وہاں جا کر موت کا شکار ہو۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

(۳۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ذَرَارِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ؟ قَالَ مِنْ اٰبَائِهِمْ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بِلَا عَمَلٍ قَالَ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ قُلْتُ فَذَرَارِيُّ الْمُشْرِكِيْنَ؟ قَالَ مِنْ اٰبَائِهِمْ قُلْتُ بِلَا عَمَلٍ قَالَ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا، یا رسول اللہ (جنّت و دوزخ کے سلسلہ میں) مسلمان بچوں کا کیا حکم ہے؟ "آپ نے فرمایا وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں یعنی وہ اپنے باپوں کے ساتھ جنّت میں ہیں" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ بغیر کسی عمل کے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ بچے جو کچھ کرنے والے تھے، میں نے پھر پوچھا اچھا مشرکوں کی اولاد کے بارہ میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ بھی اپنے باپوں کے تابع ہیں۔ میں نے (تعجب سے) پوچھا، بغیر کسی عمل کے؟ آپ نے فرمایا خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ بچے جو کچھ کرنے والے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حضرت عائشہ صدیقہؓ کا منشاء ان مؤمنین اور مشرک بچوں کے بارہ میں معلوم کرنا تھا جو حالت کمسنی میں اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے اور جن سے کوئی عمل خیر یا عمل بد صادر نہیں ہوا تھا۔

سرکار دو عالم ﷺ کے جواب کے بعد حضرت عائشہؓ کو تعجب ہوا کہ مسلمان بچے بغیر کسی عمل کے بہشت میں کس طرح داخل ہو جائیں گے تو اس پر آنحضرت ﷺ نے واللّٰہ اعلم بما کانو اعاملین (یعنی خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرنے والے تھے) کہہ کر قضا و قدر کی طرف اشارہ فرما دیا کہ وہ جو کچھ عمل کرنے والے تھے وہ نوشتہ تقدیر میں محفوظ ہو چکا ہے، گو اس وقت بالفعل ان سے عمل سرزد نہیں ہوئے ہیں لیکن جو کچھ عمل وہ زندگی کی حالت میں کرتے وہ خدا کے علم میں ہوں گے اس لئے ان کے جنتی ہونے پر تعجب نہ کرو۔

مشرک بچوں کے بارے میں علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں سرکار دو عالم ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے باپوں کے تابع ہیں، آخرت کا معاملہ خدا کے سپرد ہے اور وہی جانتا ہے کہ وہاں ان کے ساتھ کیسا برتاؤ ہوگا اس لئے ان کے بارہ میں کوئی حکم یقین کے ساتھ نہیں لگایا جا سکتا۔

(۳۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْءُوْدَةُ فِي النَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ زندہ بچہ کو گاڑنے والی (عورت) اور وہ جس کو گاڑا گیا دونوں دوزخ میں ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: زمانہ جاہلیت میں زندہ بچوں کو دفن کر دینے کا دردناک طریقہ جاری تھا، خصوصاً لڑکی کو تو پیدا ہوتے ہی منوں مٹی کے نیچے اندوہ ناک طریقہ پر دبا دیا جاتا تھا جب اسلام کی مقدس روشنی نے ظلم و جہل کی تمام تاریکیوں کو دور کیا تو یہ غیر انسانی طریقہ بھی ختم کر دیا گیا، اس کے بارے میں یہ حدیث وعید ہے اور زندہ بچوں کو دفن کر دینے والوں کو دوزخی قرار دے رہی ہے۔

"گاڑنے والی" سے مراد وہ عورت ہے جس نے بچہ کو زمین میں دفن کیا مثلاً دائی یا نوکرانی وغیرہ اور موؤدہ، جس کو گاڑا گیا، سے مراد وہ عورت ہے جس نے اسے جنا ہے یعنی اس بچہ کی ماں جس کے حکم سے اس کو زمین میں دفن کیا گیا ہو۔

یا اس سے مراد وہی بچی ہے جس کو گاڑ دیا گیا ہے کہ جس طرح اس کے والدین دوزخی ہیں اسی طرح جب وہ بھی کمسنی کی حالت میں اس

[1] مطر ابن عکامس السلمی کا شمار کوفیوں میں ہوتا ہے ان سے صرف یہی ایک حدیث منقول ہے، ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔

دنیا سے ختم کردی گئی تو اپنے باپ کی طرح دوزخی ہوئی جیسا کہ اس سے پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ حالت کمسنی میں جو بچہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے وہ اپنے باپ کے تابع ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۳۴) عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ فَرَغَ اِلٰی كُلِّ عَبْدٍ مِنْ خَلْقِهٖ مِنْ خَمْسٍ مِنْ اَجَلِهٖ وَعَمَلِهٖ وَمَضْجَعِهٖ وَاَثَرِهٖ وَرِزْقِهٖ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابو درداءؓ[1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے (تقدیر لکھ کر) فارغ ہو گیا۔ (۱) اس کی موت (کہ کب آئے گی)۔ (۲) اس کے (نیک و بد) اعمال۔ (۳) اس کے رہنے کی جگہ۔ (۴) اس کی واپسی کی جگہ۔ (۵) اور اس کا رزق۔" (احمدؒ)

تشریح: ہر انسان کی پیدائش سے بھی بہت پہلے ازل ہی میں اس کے مقدر میں پانچ چیزیں لکھ دی گئی ہیں جن میں اب نہ کمی بیشی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی تغیر و تبدل ممکن ہے چنانچہ ہر انسان کی تقدیر میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ اس کی عمر کتنی ہے اور موت کب آئے گی اب جو وقت اور جو لمحہ موت کا لکھ دیا ہے اس میں ایک سیکنڈ اور ایک پل بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی، اسی طرح انسان کے نیک و بد اعمال بھی اس کی پیدائش سے پہلے ہی نوشتہ تقدیر ہو چکے ہوتے ہیں، کہ اس سے اعمال کیسے صادر ہوں گے، جتنے نیک اعمال لکھ دیئے گئے ہیں وہ یقیناً صادر ہوں گے اور جتنے بد اعمال لکھ دیے گئے ہیں وہ بھی اپنے وقت پر وقوع پذیر ہوں گے۔

ہر انسان کے قیام کی جگہ اور اس کے حرکات و سکنات کا مقام بھی پہلے سے متعین ہو چکا ہوتا ہے کہ کس زمین اور کس خطہ میں اس کا وجود و قیام ہوگا اور کس روئے زمین پر اس کی زندگی کے اعمال و افعال صادر ہوں گے، انسان کا رزق بھی اس کی نوشتہ تقدیر کے مطابق ہی حصہ میں آتا ہے جس کے مقدر میں جتنا اور جس قسم کا رزق لکھ دیا گیا ہے وہ ضرور اس تک پہنچے گا اگر تھوڑا ہی رزق لکھا ہے تو کم ہی ملے گا اور زیادہ لکھ دیا گیا ہے تو زیادہ ملے گا اسی طرح اگر کسی کے مقدر میں حلال رزق لکھا گیا ہے تو وہ حلال رزق ہی کھائے گا اور اگر حرام رزق لکھ دیا گیا ہے تو وہ حرام رزق کھائے گا۔ یا رزق سے مراد یہ ہے کہ بندہ کو اس کی زندگی میں جو کچھ منافع و آسانیاں اور راحت و آرام سے پہنچنے والے ہیں سب اس کی تقدیر میں پہلے ہی لکھ دیے گئے ہیں۔

(۳۵) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَكَلَّمَ فِیْ شَیْءٍ مِنَ الْقَدَرِ يُسْئَلُ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَّمْ يَتَكَلَّمْ فِيْهِ لَمْ يُسْئَلْ عَنْهُ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ جو شخص تقدیر کے مسئلہ میں بحث و مباحثہ کرے گا قیامت میں اس سے باز پرس ہوگی اور جو (شخص اس پر ایمان لا کر) خاموشی اختیار کرے گا وہ اس مواخذہ سے بچ جائے گا۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث کا مقصد تقدیر کے مسئلہ میں غور و فکر اور تحقیق و تجسس سے منع کرنا ہے کہ خدا کے اس راز میں جو بندوں پر ظاہر نہ کرنا ہی مصلحت خداوندی ہے زیادہ بحث و مباحثہ کرنا یا اپنی عقل کی پیروی کرنا آخرت کے لئے کوئی کار آمد نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ میں کسی قسم کا غور و فکر یا تحقیق و تجسس خسران آخرت اور قیامت میں باز پرس کا باعث ہے اس لئے فلاح و سعادت اسی میں ہے کہ تقدیر پر ایمان لایا جائے اور خاموشی اختیار کر کے عمل میں مصروف رہے۔

---

[1] آپ کا نام عویمر ہے لیکن اس میں بہت اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے اصل نام عامر ابن مالک ہے اور عویمر لقب ہے لیکن یہ اپنی کنیت ابو داؤد سے مشہور ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت سے دو سال قبل دمشق میں آپ کی وفات ہوئی ہے۔

(۳۶) وَعَنِ ابْنِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ اَتَيْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ لَهُ قَدْ وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْءٌ مِّنَ الْقَدْرِ فَحَدِّثْنِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّذْهِبَهُ مِنْ قَلْبِيْ فَقَالَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهْلَ سَمٰوَاتِهِ وَاَهْلَ اَرْضِهِ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْ اَعْمَالِهِمْ وَلَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا قَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَاَنَّ مَا اَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ وَلَوْ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ اَتَيْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِيْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ (رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن دیلمی[1] رحمہ اللہ (تابعی) فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابی بن کعب[2] (صحابی) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے دل میں تقدیر کے بارہ میں کچھ شبہات پیدا ہو رہے ہیں (کہ جب تمام چیزیں نوشتہ تقدیر کے مطابق ہیں تو پھر یہ ثواب یا عذاب کیسا؟) اس لئے آپ کوئی حدیث بیان کیجئے تاکہ (اس کی وجہ سے) شاید اللہ تعالیٰ میرے دل کو اس شبہ (کی گندگی) سے پاک کر دے۔ (یہ سن کر) انہوں نے فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب میں مبتلا کرے تو وہ ان پر کسی طرح کا ظلم کرنے والا نہیں ہے (یعنی وہ اہل زمین اور اہل آسمان کو کتنا ہی عذاب دے اسے ظالم نہیں کہا جائے گا) اور اگر وہ ان کو اپنی رحمت سے نواز دے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے یقیناً بہتر ہوگی، اور اگر تم خدا کی راہ میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو تو تمہارا یہ عمل خیر خدا کے نزدیک اس وقت تک قبول نہیں ہوگا جب تک کہ تم تقدیر پر کامل اعتقاد و ایمان نہ رکھو اور یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تم کو پہنچا ہے وہ (رکنے) اور خطا کرنے والا نہ تھا اور جو چیز رک گئی اور تمہیں نہیں پہنچی تو (سمجھو کہ) وہ تمہارے مقدر میں نہیں تھی، اور اگر تم اس حالت میں مر جاؤ کہ اس کے خلاف عقیدہ ہو (یعنی تقدیر پر کامل ایمان نہ ہو) تو یقیناً دوزخ میں جاؤ گے، ابن دیلمی کہتے ہیں کہ ابی بن کعب کا یہ بیان سن کر میں عبد اللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہوں نے بھی یہی بیان کیا پھر حذیفہ بن یمان کے پاس گیا تو انہوں نے بھی یہی کہا اور پھر میں زید بن ثابت کے پاس پہنچا انہوں نے اس قسم کی حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا۔" (احمدؒ، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: حدیث کے الفاظ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ الخ کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں جو کچھ حاصل ہو اس کے بارے میں یہ نہ کہو کہ اسے میں نے اپنی سعی و کوشش سے حاصل کیا ہے اور اگر کوئی چیز تمہیں نہ ملے تو یہ مت کہو کہ اگر یہ کوشش اور جدوجہد کرتا تو ضرور اسے حاصل کر لیتا اس لئے کہ جو کچھ تم تک پہنچا ہے اس میں تمہاری سعی و کوشش کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ نوشتہ تقدیر کے مطابق پہنچتا ہے اور جو چیز تمہیں نہیں ملی وہ چونکہ ہمارے تمہارے مقدر میں نہیں تھی اس لئے وہ تمہاری کوشش سے بھی نہیں ملتی اس لئے یہ جان لینا چاہیے کہ کسی چیز کا حاصل ہونا اور نہ ملنا سب تقدیر الٰہی کے مطابق ہے۔

(۳۷) وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ رَجُلًا اَتَى ابْنَ عُمَرَ فَقَالَ اِنَّ فُلَانًا يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ فَقَالَ اِنَّهُ بَلَغَنِيْ اَنَّهُ قَدْ اَحْدَثَ فَاِنْ كَانَ قَدْ اَحْدَثَ فَلَا تُقْرِئْهُ مِنِّي السَّلَامَ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ اَوْ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ خَسْفٌ وَّمَسْخٌ اَوْ قَذْفٌ فِيْ اَهْلِ الْقَدْرِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت نافعؒ[3] کی روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس شخص نے دین میں (کوئی) نئی بات نکالی ہے اگر واقعی اس نے دین میں (کوئی) نئی بات پیدا

---

[1] حضرت ابن دیلمی رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں اسم گرامی ضحاک بن فیروز دیلمی ہے آپ کا شمار یمن کے تابعین میں ہوتا ہے۔
[2] حضرت ابی بن کعب انصاری و خزرجی ہیں کنیت ابوالمنذر ہے جو سرکار دو عالم ﷺ نے رکھی تھی آپ کی وفات حضرت عثمان کے دور خلافت میں ہوئی۔
[3] حضرت نافع کا شمار جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے ۱۱۷ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

کی ہے۔ تو میری طرف سے (جواب میں) اسے سلام نہ پہنچاؤ، اس لئے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری اُمت میں سے یا یہ فرمایا کہ اس اُمت میں سے (خدا کے دردناک عذاب زمین میں دھنس جانا، اور صورت کا مسخ ہو جانا یا سنگساری اہل قدر) (یعنی تقدیر کا انکار کرنے والوں) پر ہوگا۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)، اور امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح و غریب ہے۔"

تشریح: آنے والے نے حضرت ابن عمرؓ تک جس شخص کا سلام پہنچایا تھا اس کے بارہ میں حضرت ابن عمرؓ کو معلوم ہوا ہو گا کہ اس نے اپنی طرف سے دین میں نئی باتیں پیدا کی ہیں یعنی وہ تقدیر کا انکار کرتا ہے۔ لہٰذا حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اس کے سلام کے جواب میں میرا سلام اس تک نہ پہنچانا کیونکہ ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم ایسے لوگوں سے سلام کلام نہ کریں اور نہ ان سے تعلقات قائم کریں جو بدعتی ہوں اور خدا، خدا کے رسول کی قائم کی ہوئی حدود سے تجاوز کرتے ہوں۔

چنانچہ علماء اسی حدیث کی بنا پر اس بات کا حکم لگاتے ہیں کہ فاسق و فاجر و اہل بدعت کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے بلکہ سُنّت بھی نہیں ہے اور چونکہ ان کے ساتھ یہ معاملہ ان کی تنبیہ کے لئے ہے اس لئے ان سے ترک ملاقات بھی جائز ہے۔

(۳۸) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلَتْ خَدِيْجَةُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَلَدَيْنِ مَاتَالَهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُمَا فِي النَّارِ قَالَ فَلَمَّا رَأَى الْكَرَاهَةَ فِيْ وَجْهِهَا قَالَ لَوْ رَأَيْتِ مَكَانَهُمَا لَأَبْغَضْتِهِمَا قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَلَدِيْ مِنْكَ قَالَ فِي الْجَنَّةِ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ وَإِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي النَّارِ ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ۔

(رواہ احمد)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ حضرت خدیجہؓ[1] نے سرکار دو عالم ﷺ سے اپنے دونوں بچوں کے بارہ میں پوچھا جو زمانہ جاہلیت میں (اسلام سے پہلے) مر گئے تھے (کہ وہ جنتی ہیں یا دوزخی) سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ وہ دونوں (بچے) دوزخ میں ہیں، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے چہرہ کا رنگ (اپنے بچوں کے بارہ میں یہ سن کر) بدلا ہوا (یعنی ان کو رنجیدہ) دیکھا تو فرمایا، اگر تم ان (بچوں) کے ٹھکانے اور ان کا حال دیکھو کہ وہ کس طرح خدا کی رحمت سے دور ہیں تو تم کو ان (بچوں) سے نفرت ہو جائے، پھر حضرت خدیجہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اچھا میری وہ اولاد جو آپ ﷺ سے پیدا ہوئی ہے (قاسم اور عبداللہ) "آپ نے فرمایا" وہ جنت میں ہیں، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ مؤمنین اور ان کی اولاد جنت میں ہیں اور مشرکین کی اولاد دوزخ میں ہیں، اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (القرآن) "ترجمہ" جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ان کی اطاعت کی (تو) ہم ان کی اولاد کو (جنت میں) انہیں کے ساتھ رکھیں گے۔" (احمدؒ)

(۳۹) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَسَقَطَ مِنْ ظَهْرِهٖ كُلُّ نَسَمَةٍ هُوَ خَالِقُهَا مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَجَعَلَ بَيْنَ عَيْنَيْ كُلِّ إِنْسَانٍ مِنْهُمْ وَبِيْصًا مِّنْ نُّوْرٍ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلٰى اٰدَمَ فَقَالَ أَيْ رَبِّ مَنْ هٰؤُلَاءِ فَقَالَ ذُرِّيَّتُكَ فَرَأٰى رَجُلًا مِّنْهُمْ فَأَعْجَبَهُ وَبِيْصُ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ قَالَ أَيْ رَبِّ مَنْ هٰذَا قَالَ دَاوٗدُ فَقَالَ أَيْ رَبِّ كَمْ جَعَلْتَ عُمْرَهُ قَالَ سِتِّيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمْرِيْ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا انْقَضٰى عُمْرُ اٰدَمَ إِلَّا أَرْبَعِيْنَ جَاءَهُ مَلَكُ الْمَوْتِ فَقَالَ اٰدَمُ أَوَلَمْ يَبْقَ مِنْ عُمْرِيْ أَرْبَعُوْنَ سَنَةً قَالَ أَوَلَمْ تُعْطِهَا ابْنَكَ دَاوٗدَ فَجَحَدَ اٰدَمُ فَجَحَدَتْ ذُرِّيَّتُهُ وَنَسِيَ اٰدَمُ فَأَكَلَ مِنَ الشَّجَرَةِ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهُ وَخَطَأَ اٰدَمُ وَخَطَأَتْ

[1] ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خدیجہ بنت خویلد قریشیہ اور اسدیہ ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی زوجہ مطہرہ ہیں، حضرت خدیجہؓ کا سب سے بڑا امتیازی شرف یہ ہے کہ آپ تمام مردوں اور عورتوں میں سب سے پہلے اسلام لائی ہیں۔ آپ کا انتقال ہجرت سے تین سال پہلے مکہ مکرمہ رمضان کے مہینہ میں ۶۵ سال کی عمر میں ہوا۔

ذُرِّيَّتَهٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا (تو) ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا (یعنی فرشتہ کو ہاتھ پھیرنے کا حکم دیا) چنانچہ اس کی پشت سے وہ تمام جانیں نکل پڑیں جن کو آدم علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالیٰ قیامت تک پیدا کرنے والا تھا اور ان میں سے ہر ایک شخص کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھی، پھر ان سب کو آدم علیہ السلام کے روبرو کھڑا کیا (ان سب کو دیکھ کر) آدم علیہ السلام نے پوچھا، پروردگار! یہ کون ہیں؟ پروردگار نے فرمایا، یہ سب تمہاری اولاد ہیں۔ آدم علیہ السلام نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جس کی آنکھوں کے درمیان غیر معمولی چمک ان کو بہت بھلی لگ رہی تھی، پوچھا پروردگار! یہ کون ہے؟ فرمایا "یہ داؤد علیہ السلام" ہیں۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا، میرے پروردگار! تو نے ان کی عمر کتنی مقرر کی ہے؟ فرمایا "ساٹھ برس" حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا، میرے پروردگار! اس کی عمر میں میری عمر سے چالیس سال زیادہ کر دے راوی کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر میں چالیس سال باقی رہ گئے تو موت کا فرشتہ ان کے پاس آیا، حضرت آدم نے اس سے کہا، کیا ابھی میری عمر میں چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ ملک الموت نے کہا، کیا آپ (ﷺ) نے اپنی عمر میں سے چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دیے تھے؟ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے انکار کیا اور ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے اور آدم علیہ السلام (اپنے عہد کو) بھول گئے اور انہوں نے شجر ممنوعہ کو کھالیا اور ان کی اولاد بھی بھولتی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نے خطاء کی تھی اور ان کی اولاد بھی خطاء کرتی ہے۔" (ترمذی)

(۴۰) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ حِيْنَ خَلَقَهٗ فَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُمْنٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّيَّةً بَيْضَآءَ كَاَنَّهُمُ الذَّرُّ وَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُسْرٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّيَّةً سَوْدَآءَ كَاَنَّهُمُ الْحُمَمُ فَقَالَ لِلَّذِیْ فِیْ يَمِيْنِهٖ اِلَی الْجَنَّةِ وَلَا اُبَالِیْ وَقَالَ لِلَّذِیْ فِیْ كَتِفِهِ الْيُسْرٰی اِلَی النَّارِ وَلَا اُبَالِیْ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابودرداءؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے داہنے مونڈھے پر ہاتھ (دست قدرت) مارا (مارنے کا حکم دیا) اور اس سے سفید اولاد نکالی جیسے کہ وہ چیونٹیاں تھیں، پھر بائیں مونڈھے پر ہاتھ مارا اور اس سے سیاہ اولاد نکالی جیسے کہ وہ کوئلہ تھے، پھر خدا نے دائیں طرف والی اولاد کے بارہ میں فرمایا کہ جنتی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے اور ان (آدم علیہ السلام) کے بائیں مونڈھے والی اولاد کے بارہ میں فرمایا کہ یہ دوزخی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔" (احمدؒ)

(۴۱) وَعَنْ اَبِیْ نَضْرَةَ اَنَّ رَجُلًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَالُ لَهٗ اَبُوْعَبْدِاللّٰهِ دَخَلَ عَلَيْهِ اَصْحَابُهٗ يَعُوْدُوْنَهٗ وَهُوَ يَبْكِیْ فَقَالُوْا لَهٗ مَا يُبْكِيْكَ اَلَمْ يَقُلْ لَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذْ مِنْ شَارِبِكَ ثُمَّ اَقِرَّهٗ حَتّٰی تَلْقَانِیْ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَبَضَ بِيَمِيْنِهٖ قَبْضَةً وَّاُخْرٰی بِالْيَدِ الْاُخْرٰی وَقَالَ هٰذِهٖ لِهٰذِهٖ وَهٰذِهٖ لِهٰذِهٖ وَلَا اُبَالِیْ وَلَا اَدْرِیْ فِیْ اَیِّ الْقَبْضَتَيْنِ اَنَا۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابونضرہؒ[1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص جن کا نام عبداللہ تھا، کے پاس ان کے دوست ان کی عیادت کے لئے گئے (تو انہوں نے دیکھا) کہ وہ (ابو عبداللہؓ) رو رہے تھے۔ انہوں نے کہا، کہ آپ کو کس چیز نے رونے پر مجبور کیا (کیونکہ) آپ سے سرکار دو عالم ﷺ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ تم اپنے لب (مونچھوں) کے بال پست کرو اور اسی پر قائم رہو یہاں تک کہ تم مجھ سے (جنت میں) ملاقات کرو۔ ابو عبداللہؓ نے کہا، ہاں! لیکن میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ (بھی) فرماتے سنا ہے کہ اللہ بزرگ و برتر نے

[1] حضرت ابونضرہ بن منذر بن مالک العبدی کا شمار بصرہ کے جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے آپ کا انتقال حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ دنوں پہلے ہوا ہے۔

اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں ایک جماعت لی اور فرمایا کہ یہ (داہنے ہاتھ کی جماعت) جنّت کے لئے ہے اور بائیں ہاتھ کی جماعت دوزخ کے لئے ہے اور مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے، یہ کہہ کر ابوعبداللہ نے فرمایا، میں نہیں جانتا کہ میں کس مٹھی میں ہوں (یعنی داہنی مٹھی میں ہوں یا بائیں مٹھی میں ہوں)۔" (احمدؒ)

تشریح: حضرت ابوعبداللہ صحابیؓ بیمار ہوئے ان کے کچھ دوست و احباب مزاج پرسی کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں، ان لوگوں نے یہ کیفیت دیکھ کر کہا کہ آپ کو تو سرکار دو عالم ﷺ کی صحابیت کا شرف حاصل ہے اور پھر مزید یہ کہ آنحضرت ﷺ نے آپ سے یہ فرمایا تھا کہ تم اپنی مونچھوں کو پست ہلکی کراتے رہنا اور اسی پر قائم رہنا یہاں تک کہ حوض کوثر پر یا جنّت میں مجھ سے تم ملاقات کرو تو گویا آپ کو جنّت میں سرکار دو عالم ﷺ سے ملاقات کی بشارت دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ جنّت میں داخل ہونا اور اس عظیم سعادت سے بہرہ ور ہونا بغیر اسلام کے ہو نہیں سکتا، تو معلوم ہوا کہ آپ کا خاتمہ بالخیر ہوگا اور آپ ایمان و اسلام کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کریں گے، لہٰذا پھر رونا کیوں؟ اور یہ فکر و غم کیسا؟ اس کا جواب مرد حق آگاہ نے یہ دیا کہ صحیح اور بجا ہے اور اس بشارت کی صداقت کا اعتقاد بھی ہے لیکن پروردگار عالم بے نیاز ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں ہے اور پھر خدا تعالیٰ نے خود یہ فرمایا ہے کہ میں جس کو چاہوں جنّت کی سعادت سے نوازدوں اور جس کو چاہوں دوزخ کے حوالہ کردوں اور مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ تو مجھے بھی یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ نامعلوم میرا کیا حشر ہو؟ اور دل اس خوف سے لرزاں اور آنکھیں ڈر سے اشکبار ہیں کہ نہ جانے خدا نے میرے مقدر میں کیا لکھ رکھا ہے۔

یہ ان کے جواب کا حاصل تھا، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے تصور اور خوف خدا کے غلبہ سے اس بشارت کو بھول گئے ہوں اور انہیں اس کا احساس نہ رہا ہو کہ لسان نبوت نے مجھے اس بشارت جیسی عظیم سعادت سے بھی نواز رکھا ہے۔

علامہ طیبی علیہ الرحمۃ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ مونچھیں ہلکی کرانا سُنّت موکدہ ہے اور اس عمل پر قائم رہنا اور ہمیشہ اس کو کرتے رہنا جنّت میں دخول اور وہاں سرکار دو عالم ﷺ کے زیر سایہ ہونے کا ذریعہ ہے۔

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اس ایک سُنّت کو ترک کرنے سے یعنی مونچھیں پست و ہلکی نہ کرانے سے ایسی عظیم سعادت اور اتنی بڑی فلاح ہاتھ سے جاتی ہے چہ جائیکہ سُنّت کو ہمیشہ ترک کرتا رہے، اس لئے کہ ترک سُنّت پر اصرار، الحاد و زندقہ تک پہنچاتا ہے۔ (نعوذ باللہ)۔

(۴۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَخَذَ اللّٰهُ الْمِيْثَاقَ مِنْ ظَهْرِ اٰدَمَ بِنَعْمَانَ يَعْنِيْ عَرَفَةَ فَاَخْرَجَ مِنْ صُلْبِهٖ كُلَّ ذُرِّيَّةٍ ذَرَاَهَا فَنَثَرَهُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ كَالذَّرِّ ثُمَّ كَلَّمَهُمْ قُبُلًا قَالَ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ اَوْ تَقُوْلُوْا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ۔ (رواہ احمد، الاعراف ۱۷۲)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے میدان عرفہ کے قریب مقام نعمان میں آدم علیہ السلام کی اس اولاد سے جو ان کی پشت سے نکلی تھی عہد لیا چنانچہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا جن کو (ازل سے ابد تک) پیدا کرنا تھا اور ان سب کو چیونٹیوں کی طرح آدم علیہ السلام کے سامنے پھیلا دیا پھر خدا نے ان سے روبرو گفتگو کی، فرمایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ آدم کی اولاد نے کہا، بے شک آپ ہمارے رب ہیں پھر خدا نے فرمایا، یہ شہادت میں نے تم سے اس لئے لی ہے کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے غافل و ناواقف تھے یا تم یہ نہ کہو کہ ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے شرک کیا تھا اور ہم ان کی اولاد تھے ہم نے ان کی اطاعت کی تھی، کیا تو باطل پرستوں کے اعمال کے سبب ہلاک کرتا ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: خدائے تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم قیامت میں یہ دلیل نہیں دے سکتے کہ چونکہ ہمارے باپ دادا نے شرک کیا تھا

اس لئے ہم بھی انہیں کے ساتھ رہے، یا ہم تو اپنے باپ دادا کے پیروکار اور ان کے تابع ہیں انہوں نے جو راستہ اختیار کیا ہوا تھا ہم بھی اسی پر چل رہے تھے لہٰذا اس کفر و شرک کے اصل ذمہ دار ہمارے باپ دادا ہیں جنہوں نے ہمیں اس راستہ پر ڈالا اس اعتبار سے مورد الزام وہ ٹھہر سکتے ہیں، ہم ان کی وجہ سے عذاب و دوزخ کے مستحق نہیں ہو سکتے اس لئے کہ عذاب کے حقیقی مستحق تو وہی لوگ ہیں جو اس راہ کے پیش رو تھے۔

پس اے شرک و کفر کرنے والو! جان لو کہ قیامت کے دن یہ حجت تمہارے لئے کار آمد نہیں ہو سکے گی کیونکہ اسی لئے ہم نے تم سے اپنی توحید کا اقرار پہلے ہی کرا لیا ہے اور تم اس پر شہادت دے چکے ہو، نیز اسی عہد و اقرار کی توثیق اور اس کی یاد دہانی کے لئے ہر دور میں دنیا کے تمام حصوں اور تمام طبقوں میں انبیاء علیہم السلام تشریف لائے تاکہ وہ بنی نوع انسان کو اس کا اپنا عہد و اقرار یاد دلائیں اور ان کو صحیح راستہ پر لگائیں۔

(۴۳) وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ فِيْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ قَالَ جَمَعَهُمْ فَجَعَلَهُمْ اَزْوَاجًا ثُمَّ صَوَّرَهُمْ فَاسْتَنْطَقَهُمْ فَتَكَلَّمُوْا ثُمَّ اَخَذَ عَلَيْهِمُ الْعَهْدَ وَالْمِيْثَاقَ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ((اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى)) قَالَ فَاِنِّيْٓ اُشْهِدُ عَلَيْكُمُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَالْاَرَضِيْنَ السَّبْعَ وَاُشْهِدُ عَلَيْكُمْ اَبَاكُمْ اٰدَمَ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَمْ نَعْلَمْ بِهٰذَا اِعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ غَيْرِيْ وَلَا رَبَّ غَيْرِيْ وَلَا تُشْرِكُوْا بِيْ شَيْئًا اِنِّيْ سَاُرْسِلُ اِلَيْكُمْ رُسُلِيْ يُذَكِّرُوْنَكُمْ عَهْدِيْ وَمِيْثَاقِيْ وَاُنْزِلُ عَلَيْكُمْ كُتُبِيْ قَالُوْا شَهِدْنَا بِاَنَّكَ رَبُّنَا وَاِلٰهُنَا لَا رَبَّ لَنَا غَيْرُكَ وَلَآ اِلٰهَ لَنَا غَيْرُكَ فَاَقَرُّوْا بِذٰلِكَ وَرُفِعَ عَلَيْهِمْ اٰدَمُ يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ فَرَاَى الْغَنِيَّ وَالْفَقِيْرَ وَحَسَنَ الصُّوْرَةِ وَدُوْنَ ذٰلِكَ فَقَالَ رَبِّ لَوْلَا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ قَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ اَنْ اُشْكَرَ وَرَاَى الْاَنْبِيَآءَ فِيْهِمْ مِثْلَ السُّرُجِ عَلَيْهِمُ النُّوْرُ خُصُّوْا بِمِيْثَاقٍ اٰخَرَ فِي الرِّسَالَةِ وَالنُّبُوَّةِ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ اِلٰى قَوْلِهٖ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ كَانَ فِيْ تِلْكَ الْاَرْوَاحِ فَاَرْسَلَهٗ اِلٰى مَرْيَمَ عَلَيْهَا السَّلَامُ فَحُدِّثَ عَنْ اُبَيٍّ اَنَّهٗ دَخَلَ مِنْ فِيْهَا۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابی بن کعبؓ اس آیت: وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ترجمہ: (جب تمہارے پروردگار نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد نکالی)۔ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ خدا نے (اولاد آدم کو) جمع کیا اور ان کو طرح طرح کا قرار دیا (یعنی کسی کو مالدار کسی کو غریب کرنے کا ارادہ کیا پھر ان کو شکل و صورت عطا کی اور پھر گویائی بخشی، اور انہوں نے باتیں کیں پھر ان سے عہد و پیمان کیا اور پھر ان کو اپنے اوپر گواہ قرار دے کر پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اولاد آدم نے کہا، بے شک! (آپ ہمارے رب ہیں) خدائے تعالیٰ نے فرمایا، میں سات آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو تمہارے سامنے گواہ بناتا ہوں اور تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو بھی شاہد قرار دیتا ہوں اس لئے کہ قیامت کے دن کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے ناواقف تھے (اس وقت) تم اچھی طرح جان لو کہ نہ تو میرے سوا کوئی معبود ہے اور نہ میرے سوا کوئی پروردگار ہے، (اور خبردار) کسی کو میرا شریک قرار نہ دینا، میں تمہارے پاس عنقریب اپنے رسول بھیجوں گا، جو تمہیں میرا عہد و پیماں یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں نازل کروں گا (یہ سن کر) اولاد آدم نے کہا، ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب ہے اور تو ہی ہمارا معبود ہے، تیرے سوا نہ تو ہمارا کوئی پروردگار ہے اور نہ تیرے علاوہ ہمارا کوئی معبود ہے، چنانچہ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد نے اس کا اقرار کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے اوپر بلند کر دیا گیا وہ (اپنی نگاہیں بلند کئے ہوئے) اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ آدم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کی اولاد امیر بھی ہیں اور فقیر بھی اور خوبصورت بھی ہیں اور بدصورت بھی (یہ دیکھ کر انہوں نے عرض کیا، پروردگار اپنے تمام بندوں کو تو نے یکساں کیوں نہیں بنایا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "میں اسے پسند کرتا ہوں کہ میرے بندے میرا شکر ادا کرتے رہیں" پھر آدم علیہ السلام نے انبیاء کو دیکھا جو چراغوں کی مانند روشن تھے اور نور ان کے اوپر جلوہ گر تھا ان سے خصوصیت کے ساتھ رسالت و نبوت کے لئے عہد و پیماں لئے گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ

وَمُوْسٰی وَعِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ (قرآن حکیم) ترجمہ: اور جب ہم نے پیغمبروں سے ان کا عہد و پیمان لیا اور آپ محمد (ﷺ) سے اور نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام سے اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بن مریم سے (بھی) عہد و پیمان لیا، ان روحوں کے درمیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے چنانچہ ان کی روح کو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھیج دیا، حضرت ابی بیان کرتے ہیں کہ یہ روح حضرت مریم علیہا السلام کے منہ کی طرف سے ان کے جسم میں داخل ہوگئی۔" (احمدؒ)

تشریح: حضرت آدم علیہ السلام نے جب ان ارواح میں فرق دیکھا کہ انہیں کی اولاد میں سے کوئی تو سرمایہ دار اور صاحب دولت ہے اور کوئی غریب و مفلس تو انہیں حیرت ہوئی اور انہوں نے بارگاہ الوہیت میں عرض کیا کہ الٰہ العٰلمین! سب میری اولاد میں سے ہیں اور یہ سبھی تیرے بندے ہیں پھر ان میں یہ فرق کیوں؟ کوئی صاحب حیثیت ہے اور کوئی لاچار، کسی کو عزت و دولت دے رکھی ہے اور کسی کو غربت و مفلسی!۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ان میں فرق پیدا کرنے کی ایک حکمت ہے اور اس میں ایک مصلحت ہے اور وہ یہ کہ اگر میں سب کو یکساں پیدا کر دیتا تو یہ شکر ادا نہ کرتے اور جب ایک انسان میں وہ صفات و خصائل پیدا کر دیے جائیں گے جو دوسرے انسانوں میں نہیں ہوں گے تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر شکر ادا کیا کریں گے مثلاً تنگدست اور مفلس میں تقویٰ، اطاعت الٰہی کا مادہ، سکون قلب و دماغ اور دنیا سے بے فکری ہوتی ہے، جو کسی غنی اور مالدار میں نہیں ہوتی اسی طرح غنی و مالدار کو دولت کی فراوانی اور اسباب معیشت کی آسانیاں حاصل ہوتی ہیں جو غریب و محتاج کو میسر نہیں۔

لہٰذا! جس کے اندر جو خصائل ہوں گے اور وہ ان کی لذت سے ناآشنا ہوگا، دوسرے کے اندر اس کا فقدان دیکھ کر اس نعمت پر شکر گزار ہوگا جس کی بناء پر خدا کی رحمت کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

(۴۴) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَتَذَاکَرُ مَا یَکُوْنُ اِذْقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَکَانِہٖ فَصَدِّقُوْہُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَیَّرَ عَنْ خُلُقِہٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا بِہٖ فَاِنَّہٗ یَصِیْرُ اِلٰی مَا جُبِلَ عَلَیْہِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے آئندہ وقوع پذیر ہونے والی باتوں پر گفتگو کر رہے تھے رسول اللہ ﷺ نے (ہماری باتوں کو سن کر) فرمایا۔ جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا ہے تو اسے سچ مان لو لیکن جب تم یہ سنو کہ کسی شخص کی خلقت بدل گئی ہے تو اس کا اعتبار نہ کرو اس لئے کہ انسان اسی چیز کی طرف جاتا ہے جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: صحابہ آپس میں بیٹھے ہوئے یہ بحث کر رہے تھے کہ جو چیز آئندہ پیدا ہونے والی یا جو باتیں وقوع پذیر ہونے والی ہیں، کیا وہ نوشتہ تقدیر کے مطابق ہوتی ہیں یا از خود بغیر قضاء قدر کے واقع ہوتی ہیں، سرکار دو عالم ﷺ بھی اس مجلس میں تشریف فرما تھے آپ ﷺ نے ان کی بحث سن کر فرمایا کہ ہر چیز نوشتہ تقدیر کے مطابق بروقت وقوع پذیر ہوتی ہے اور مثال کے طور پر فرمایا کہ ایک انسان اپنی جس جبلت اور خلقت پر پیدا ہوتا ہے اسی پر ہمیشہ قائم رہتا ہے اور اسی کی طرف اس کا حقیقی میلان رہتا ہے۔ مثلاً جس کو خدا نے عقلمند و دانا پیدا کیا اور اس کی سرشت و فطرت میں عقل و دانش کا مادہ ودیعت فرمایا اور اس کی تقدیر میں فہم و فراست کے جوہر رکھ دیئے گئے تو وہ کبھی بے وقوف و احمق نہیں ہو سکتا، اسی طرح جس شخص کی جبلت و حماقت کے سانچے میں ڈھلی ہو اور جس کو فطرتاً بیوقوف و بلید پیدا کیا گیا ہو وہ عقل مند و دانشور نہیں ہو سکتا۔

ہاں ایسے افراد جو اپنی ریاضت و مشقت اور ذاتی محنت و کوشش کی بنا پر عقل کی دولت حاصل کر لیتے ہیں یا اصحاب عقل و دانش کی صحبت اختیار کر کے ان اوصاف کے حامل ہو جاتے ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، اس لئے کہ یہاں بحث جبلت اور خلقت کی ہے کہ جس انسان کو جس خصلت و فطرت پر پیدا کر دیا گیا وہ اس سے الگ نہیں رہ سکتا اور نہ اس جبلت و خصلت میں تغیر و تبدل ممکن ہے۔ رہا اپنی ذاتی محنت و

کوشش یا اصحاب عقل وفہم کی صحبت، تو یہ ایک دوسری چیز ہے کیونکہ یہ بھی نوشتہ تقدیر کے مطابق ہی ہے یعنی جس شخص کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے کہ یہ اپنی محنت و کوشش یا کسی عقل مند ودانشور کی صحبت و قربت کی بنا پر صاحب عقل بنے گا وہ یقیناً اس وصف کو حاصل کرلے گا لیکن جس کی تقدیر میں بے وقوف رہنا ہی لکھ دیا گیا ہے یا جس کی جبلت میں حماقت رکھ دی گئی ہے اس میں نہ اپنی محنت وکوشش کام کرتی ہے اور نہ کسی عقل مند کی قربت وصحبت۔

(۴۵) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَا يَزَالُ يُصِيْبُكَ فِىْ كُلِّ عَامٍ وَجَعٌ مِنَ الشَّاةِ الْمَسْمُوْمَةِ الَّتِىْ اَكَلْتَ قَالَ مَآاَصَابَنِىْ شَىْءٌ مِّنْهَا اِلَّا وَهُوَ مَكْتُوْبٌ عَلَىَّ وَاٰدَمُ فِىْ طِيْنَتِهِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ام سلمہ[1] سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ (ﷺ) نے جو زہر آلود بکری کھائی تھی (جو خیبر میں ایک یہودیہ نے کھلائی تھی) ہر سال اس کی وجہ سے آپ (ﷺ) کو تکلیف ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا جو چیز (یعنی اذیت و تکلیف یا بیماری) مجھ کو پہنچتی ہے وہ میرے لئے اسی وقت لکھی گئی تھی جب کہ آدم مٹی کے اندر تھے (یعنی میری تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا)۔" (ابن ماجہ)

بَابُ اِثْبَاتِ عَذَابِ الْقَبْرِ
عذاب قبر کے ثبوت کا بیان

عذاب قبر قرآن و احادیث سے ثابت ہے اس میں کوئی شبہ اور کلام نہیں، یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ یہاں قبر سے مراد محض ڈیڑھ دو گز کا گڑھا نہیں ہے بلکہ قبر کا مطلب عالم برزخ ہے جو آخرت اور دنیا کے درمیان ایک عالم ہے اور یہ عالم ہر جگہ ہو سکتا ہے جیسے بعض لوگ ڈوب جاتے ہیں، جلا دیے جاتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو ان پر بھی عذاب مسلط کیا جاتا ہے یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کو زمین میں دفن کیا جاتا ہے صرف ان پر ہی عذاب ہوتا ہے اور جو لوگ دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں وہ عذاب سے بچ جاتے ہیں۔

عذاب قبر کی تصدیق کے درجات میں صحیح اور اولی مرتبہ اس بات کا اعتقاد و یقین رکھنا ضروری ہے کہ قبر میں دفن کرنے کے بعد خدا کے نیک بندوں پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور جو لوگ بدکار و گناہ گار ہوتے ہیں ان پر خدا کا سخت عذاب نازل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں منکر نکیر، عذاب دینے والے فرشتے اور سانپ و بچھو جو بدکردار لوگوں پر مسلّط کئے جاتے ہیں اور جن کا وجود احادیث سے ثابت ہے۔ یہ سب صحیح اور واقعی چیزیں ہیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

یہ جان لینا چاہئے کہ کسی چیز کو دیکھ لینا اور اس کا مشاہدہ میں آجانا ہی اس کی صداقت کی دلیل نہیں ہوتا، اس لئے ان چیزوں کے بارہ میں یہ بات دل میں جاگزیں کرلینا کہ جب ان چیزوں کو آنکھ سے دیکھا نہیں جاتا اور یہ مشاہدہ میں نہیں آتیں تو ان کا اعتبار کیسے کیا جائے؟ بالکل غلط اور خلاف عقل ہے، اس لئے کہ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ عالم بالا کی چیزوں کا مشاہدہ کرلینا، عالم ملکوت کو بچشم دیکھ لینا ان ظاہری آنکھوں کے بس کی بات نہیں ہے، ان کو مشاہدہ کرنے کے لئے چشم حقیقت کی ضرورت ہے ہاں یہ بات بھی ناممکن نہیں ہے کہ اگر خدا چاہے تو ان دونوں ظاہری آنکھوں سے بھی عالم ملکوت کو دکھلا سکتا ہے۔

پھر دوسرے یہ کہ اسی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہم بظاہر دیکھ نہیں پاتے اور نہ آنکھیں ان کا مشاہدہ کرتی ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کا ادراک بھی ہوتا ہے اور اس کی حقیقت بھی تسلیم ہوتی ہے مثلاً ایک شخص عالم خواب میں دنیا بھر کی چیزیں دیکھ اور سن لیتا ہے، ہر طرح کے غم و مصیبت اور لذت و آرام محسوس کرتا ہے لیکن دوسرا اسے نہیں دیکھ سکتا، یا اسی طرح کسی شخص کو کوئی

[1] ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قریشیہ اور مخزومیہ ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ہیں، ۵۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔

تکلیف پہنچتی ہے یا اسے لذت حاصل ہوتی ہے یا وہ کسی غم وچین کا احساس کرتا ہے لیکن اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا ایک دوسرا شخص اس سے بے خبر رہتا ہے اور وہ اس کا ادراک و احساس نہیں کر سکتا۔

نیز زمانۂ نبوت میں سرکار دو عالم ﷺ کے پاس وحی آتی تھی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے لیکن وہیں مجلس میں بیٹھے ہوئے صحابہ نہیں دیکھتے تھے اور نہ ان کی ظاہری آنکھیں حضرت جبرئیل کا مشاہدہ کرتی تھیں، لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام ان پر ایمان لاتے تھے۔

ٹھیک اسی طرح عذاب قبر کا معاملہ ہے، وہاں جو کچھ بندے کے ساتھ ہوتا ہے اس دنیا میں اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور نہ ان آنکھوں سے اسے دیکھا جا سکتا ہے، بس یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ عذاب قبر کے بارہ میں خدا اور خدا کے رسول نے جو کچھ بتایا ہے وہ سب مبنی بر حقیقت اور یقینی چیزیں ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ إِذَا سُئِلَ فِي الْقَبْرِ يَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ نَزَلَتْ فِيْ عَذَابِ الْقَبْرِ يُقَالُ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ وَنَبِيِّ مُحَمَّدٌ۔ (متفق علیہ)

"حضرت براءؓ بن عازبؓ راوی ہیں کہ سرکار کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس وقت قبر میں مسلمان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور یہی مطلب ہے اس ارشاد ربانی کا یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (القرآن) ترجمہ: اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ثابت وقائم رکھتا ہے جو ایمان لاتے ہیں مضبوط و محکم طریقہ پر ثابت رکھنا دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں، اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ آیت یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ عذاب قبر کے بیان میں نازل ہوئی ہے (چنانچہ قبر میں مردہ سے) سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد ﷺ ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آیت مذکورہ میں بالقول الثابت سے مراد کلمۂ شہادت ہے یعنی جب مؤمن سے قبر میں سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا پروردگار کون ہے، اور تیرا پیغمبر کون ہے اور تیرا دین کیا تو ان تینوں سوالوں کا جواب اسی کلمۂ شہادت میں ہے۔

آیت کے دوسرے جز کا مطلب یہ ہے جو لوگ ایمان ویقین کی روشنی سے اپنے قلوب کو منور کر لیتے ہیں اور جن کے دل میں ایمان و اسلام کی حقانیت راسخ اور پختہ ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دونوں جگہ ان پر رحمت خداوندی کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

دنیاوی زندگی میں اس کا فضل تو یہ ہے کہ وہ اپنے ان نیک بندوں کو کلمۂ اسلام کی حقانیت کے اعتقاد پر قائم رکھتا ہے اور ان کے دل میں ایمان واسلام کی وہ روح اور طاقت بھر دیتا ہے کہ دنیاوی امتحان وآزمائش کے سخت سے سخت موقع پر بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی وہ اپنی جانوں کو قربان کر دینا اور آگ میں ڈالے جانا پسند کرتے ہیں لیکن اپنے ایمان واعتقاد میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ کرنا گوارہ نہیں کرتے۔

لہ اسم گرامی براء بن عازب اور کنیت ابوعمارہ ہے مدینہ کے باشندہ اور انصاری ہیں جنگ بدر میں آپ شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صغرسنی کی وجہ سے روک دیا تھا سب سے پہلے غزوہ احد میں شریک ہوئے ہیں۔

اخروی زندگی میں اس کی رحمت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ خدا کی بے شمار نعمتوں سے نوازے جاتے ہیں اور عالم برزخ میں جب قبر کے اندر ان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ ٹھیک ٹھیک جواب دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ کی نجات اور اکرام خداوندی کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں۔

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَتَوَلّٰى عَنْهُ اَصْحَابُهٗ وَاِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ اَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟ لِمُحَمَّدٍ فَاَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنَّهٗ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ فَيُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْ اِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ اَبْدَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا جَمِيْعًا وَاَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيُقَالُ لَهٗ مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ فَيَقُوْلُ لَآ اَدْرِيْ كُنْتُ اَقُوْلُ مَايَقُوْلُ النَّاسُ فَيُقَالُ لَهٗ لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ وَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيْهِ غَيْرُ الثَّقَلَيْنِ۔ (متفق علیه ولفظه للبخاری)

"اور حضرت انس راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جب بندہ قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اعزا و احباب واپس آتے ہیں تو وہ (مردہ) ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے اور اس کے پاس (قبر میں) دو فرشتے آتے ہیں اور ان کو بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص محمد ﷺ کے بارہ میں کیا کہتے تھے؟ اس کے جواب میں بندہ مؤمن کہتا ہے، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ (محمد ﷺ) بلاشبہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پھر اس بندہ سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھو جس کو خدا نے بدل دیا ہے اور اس کے بدلے میں تمہیں جنت میں جگہ دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ مردہ دونوں مقامات (جنت و دوزخ) کو دیکھتا ہے۔ اور جو مردہ منافق یا کافر ہوتا ہے اس سے بھی یہی سوال کیا جاتا ہے کہ اس شخص (یعنی محمد ﷺ) کے بارہ میں تو کیا کہتا تھا؟ وہ اس کے جواب میں کہتا کہ میں کچھ نہیں جانتا، جو لوگ (مؤمن) کہتے تھے وہی میں بھی کہہ دیتا تھا اس سے کہا جاتا ہے نہ تو نے عقل سے پہچانا اور نہ تو نے قرآن شریف پڑھا؟ یہ کہہ کر اس کو لوہے کے گرزوں سے مارا جاتا ہے کہ اس کے چیخنے اور چلانے کی آواز سوائے جنوں اور انسانوں کے قریب کی تمام چیزیں سنتی ہیں۔" (بخاری و مسلم، الفاظ بخاری کے ہیں)

تشریح: جب انسان اس دنیا کی عارضی زندگی ختم کر کے دوسری دنیا میں پہنچتا ہے تو اس کی سب سے پہلی منزل قبر ہوتی ہے، جسے علم برزخ بھی کہا جاتا ہے، مردہ کو قبر میں اتارنے کے بعد جب اس کے عزیز و اقارب واپس لوٹتے ہیں تو اس میں خدا کی جانب سے وہ قوت سماعت دیدی جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ ان لوٹنے والوں کے جوتوں کی آواز سنتا رہتا ہے اس کے بعد منکر نکیر قبر میں آتے ہیں اور اس سے دوسرے سوالات کے علاوہ سرکار دو عالم ﷺ کے بارہ میں پوچھتے ہیں کہ ان کے متعلق تمہارا اعتقاد کیا ہے، اگر مرد مؤمن صادق ہوتا ہے تو وہ صحیح جواب دے دیتا ہے اور اگر وہ کافر ہے تو جواب نہیں دے پاتا بعد میں نتیجہ سنا دیا جاتا ہے کہ صحیح جواب دینے والا خدا کی رحمت اور اس کی نعمتوں کا مستحق قرار دے دیا گیا ہے چنانچہ اس کی آخری منزل جنت کی طرف اس کی راہنمائی کر دی جاتی ہے، غلط جواب دینے والا خدا کے غضب کا مستحق قرار دے دیا جاتا ہے اور اسے اس کی آخری منزل دوزخ کی راہ دکھا دی جاتی ہے۔

حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ مردہ سے پوچھتے ہیں کہ "تم اس شخص محمد ﷺ کے بارہ میں کیا کہتے تھے" تو اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی شہرت کی وجہ سے آپ ﷺ کی طرف معنوی اشارہ ہوتا ہے یا پھر یہ اس وقت سرکار دو عالم ﷺ کو مثالی صورت میں مردہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ ایک مؤمن کے لئے موت کی آرزو سب سے بڑی نعمت ہوگی اس لئے کہ وہ اس کی وجہ سے اس عظیم سعادت سے بہرہ ور ہوگا اور سرکار دو عالم ﷺ کے دیدار سے منور و مشرف ہوگا اور حقیقت تو یہ ہے کہ عاشقان رسول کے بے تاب و بے چین قلوب کے لئے اس کے اندر ایک زبردست بشارت ہے۔ بقول شاعر ؎

شب عاشقان بیدل چہ قدر دراز باشد ‏ ‏ ‏ تو بیا کہ اول شب در صبح باز باشد

"ترجمہ "عشاق کی شب ہجر کس قدر طویل ہوتی ہے۔ تو جلدی آ۔ یہ اول شب ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح ہو جائے۔
اس سوال و جواب کے بعد کامیاب مردہ یعنی مسلمانوں کو دونوں جگہیں یعنی جنت و دوزخ دکھلائی جاتی ہیں اور وہ دونوں مقامات دیکھتا ہے تاکہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اگر خدا کی رحمت اس کے شامل حال نہ ہوتی اور وہ اہل دوزخ میں سے ہوتا تو اس دوزخ میں ڈال دیا جاتا جہاں خدا کے دردناک عذاب میں مبتلا ہوتا لیکن اس نے دنیا میں چونکہ نیک کام کئے اور سچا مخلص مؤمن بن کر رہا اس کے نتیجے میں خدا کے فضل و کرم سے اسے جنّت کی نعمت عظمٰی سے نوازا جارہا ہے نیز ایک طرف تو وہ دوزخ اور اس کے ہیبت ناک منظر کی طرف دیکھے گا دوسری طرف جنّت اور اس کی خوشگوار و مسرور کن فضا کی طرف نظر اٹھائے گا تاکہ اس کے دل میں جنّت کی نعمت کی قدر ہو۔
اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب قبر میں معذب مردہ پر عذاب نازل کیا جاتا ہے یعنی فرشتے لوہے کے گرزوں سے اس کو مارتے ہیں تو اس کے چیخنے چلانے کی آواز انسان نہیں سن پاتے، اس کی حکمت یہ ہے کہ جن و انس غیب کی چیزوں پر ایمان لانے کے مکلف ہیں اگر ان کو آواز سنائی دے، یا وہاں کے حالات کا علم اس دنیا میں ہو جائے تو پھر ایمان بالغیب جاتا رہے گا۔ نیز اگر قبر کے حالات کا احساس انسانوں کو ہونے لگے تو خوف و ہیبت ناکی کی وجہ سے دنیا کے کاروبار میں ہلچل مچی رہے گی اور سلسلہ معیشت منقطع ہو جائے گا۔
صحیح احادیث میں مؤمنین کی نجات اور کافروں و منافقین کے عذاب کے بارہ میں ہی ذکر کیا جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس نجات کا تعلّق مؤمنین صالحین سے ہے لیکن فاسق و گناہ گار مؤمنین کے بارہ میں احادیث میں کچھ مذکور نہیں ہے کہ آیا ان پر عذاب کیا جاتا یا ان کی بھی نجات ہو جاتی ہے، البتہ علماء کہتے ہیں کہ فاسق مؤمن جواب میں تو مؤمن صالحین کا شریک ہے لیکن نعمتوں کی بشارت، جنّت کے دروازے کھلنے وغیرہ میں ان کا شریک نہیں ہے یا اگر ان چیزوں میں بھی ان کا شریک ہو تو پھر مرتبہ و درجہ میں ان سے کم تر ہو گا بلکہ اس پر تھوڑا بہت عذاب بھی ہو سکتا ہے۔ ہاں جس فاسق و گناہ گار کو اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے بخش دے اور اس کی مغفرت کر دے۔

(۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَیْہِ مَقْعَدُہٗ بِالْغَدَاۃِ وَالْعَشِیِّ اِنْ کَانَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَمِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاِنْ کَانَ مِنْ اَھْلِ النَّارِ فَمِنْ اَھْلِ النَّارِ فَیُقَالُ ھٰذَا مَقْعَدُکَ حَتّٰی یَبْعَثَکَ اللّٰہُ اِلَیْہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (متفق علیہ)

"اور عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی مرتا ہے تو (قبر کے اندر) صبح اور شام اس کا ٹھکانہ اس کے سامنے لایا جاتا ہے اگر وہ جنتی ہوتا ہے تو جنّت میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا ٹھکانہ اس کا انتظار کر، یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تجھے اٹھا کر وہاں بھیجے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۴) وَعَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ یَھُوْدِیَّۃً دَخَلَتْ عَلَیْھَا فَذَکَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ فَقَالَتْ لَھَا اَعَاذَکِ اللّٰہُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَسَأَلَتْ عَائِشَۃُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَقَالَ نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ قَالَتْ عَائِشَۃُ فَمَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعْدُ صَلّٰی صَلَاۃً اِلَّا تَعَوَّذَ بِاللّٰہِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ ایک یہودی عورت ان کے پاس آئی اور اس نے قبر کے عذاب کا ذکر کیا اور پھر اس نے حضرت عائشہؓ سے کہا "عائشہ! اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب قبر سے محفوظ رکھے!" حضرت عائشہؓ نے سرکار دو عالم ﷺ سے عذاب قبر کا حال پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں قبر کا عذاب حق ہے! حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ نے کوئی نماز پڑھی ہو اور قبر کے عذاب سے پناہ نہ مانگی ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عائشہ صدیقہؓ کو عذاب قبر کا حال معلوم نہیں ہو گا چنانچہ جب اس یہودی عورت نے ان سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ بڑی حیران ہوئیں اور سرکار دو عالم ﷺ سے اس کے بارہ میں سوال کیا جس کا جواب دیا گیا کہ قبر کا عذاب حق اور یقینی ہے، یعنی اس بات کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ قبر میں گناہ گار لوگوں پر خدا کی جانب سے طرح طرح کے عذاب مسلّط کئے جاتے ہیں اور اس کا احساس و ادراک

اس دنیا میں نہیں کیا جاسکتا۔ سرکار دو عالم ﷺ کے پناہ مانگنے کے بارے میں احتمال ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کو بھی پہلے سے قبر کے عذاب کا حال معلوم نہ ہوا ہو، اس کے بعد بذریعہ وحی آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا ہو جس کے بعد سے آپ ﷺ نے پناہ مانگنی شروع کر دی اور ظاہر ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تو قبر میں اس قسم کا کوئی معاملہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس لئے کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کا پناہ مانگنا محض اُمت کی تعلیم کے لئے تھا کہ جب خدا کا محبوب و برگزیدہ بندہ اور اس کا پیارا رسول بھی عذاب قبر سے پناہ مانگ رہا ہے تو اُمت کے تمام لوگوں کو چاہئے کہ عذاب قبر سے پناہ مانگتے رہیں۔

یا پھر یہ کہا جائے گا کہ عذاب قبر کا حال آنحضرت ﷺ کو پہلے سے معلوم تھا اور پوشیدہ طور پر اس سے پناہ بھی مانگتے ہوں گے جس کی حضرت عائشہؓ کو خبر نہیں ہوگی، بعد میں حضرت عائشہؓ کے سوال کے بعد آپ ﷺ نے کھلے طور پر پناہ مانگنی شروع کر دی ہو تاکہ دوسرے بھی متنبہ ہوں اور عذاب قبر سے پناہ مانگتے رہیں۔

⑤ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ بَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلٰى بَغْلَةٍ لَهُ وَنَحْنُ مَعَهُ اِذْ حَادَتْ بِهِ وَكَادَتْ تُلْقِيْهِ وَاِذَا اَقْبُرٌ سِتَّةٌ اَوْ خَمْسَةٌ فَقَالَ مَنْ يَّعْرِفُ اَصْحَابَ هٰذِهِ الْاَقْبُرِ قَالَ رَجُلٌ اَنَا قَالَ فَمَتٰى مَاتُوْا قَالَ فِي الشِّرْكِ فَقَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ تُبْتَلٰى فِيْ قُبُوْرِهَا فَلَوْلَا اَنْ لَّا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ اَنْ يُّسْمِعَكُمْ مِّنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِيْ اَسْمَعُ مِنْهُ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت زیدؒ[1] بن ثابتؓ راوی ہیں کہ (ایک روز) جب کہ آنحضرت ﷺ بنی نجار کے باغ میں اپنے خچر پر سوار تھے اور ہم بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے کہ اچانک خچر بدک گیا اور قریب تھا کہ آپ ﷺ کو گرادے، ناگہاں پانچ چھ قبریں نظر آئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ان قبر والوں کو کوئی جانتا ہے؟ ایک شخص نے کہا، "میں جانتا ہوں!" آپ ﷺ نے فرمایا۔ یہ کب مرے ہیں؟ (یعنی حالت کفر میں مرے ہیں یا ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں) اس شخص نے عرض کیا۔ یہ تو شرک کی حالت میں مرے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا، یہ اُمت اپنی قبروں میں آزمائی جاتی ہے (یعنی ان لوگوں پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے) اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ تم (مردوں کو) دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں ضرور اللہ سے یہ دعا کرتا کہ وہ تم کو بھی عذاب قبر (کی اس آواز) کو سنا دے جس کو میں سن رہا ہوں، اس کے بعد آپ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا آگ کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگو، صحابہ نے عرض کیا، ہم آگ کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا، قبر کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے عرض کیا۔ عذاب قبر سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا، ظاہری اور باطنی فتنوں سے خدا کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے عرض کیا۔ ہم دجال کے فتنہ سے خدائے تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: نبی کا احساس و شعور اور اس کی قوت ادراک دنیا کے تمام لوگوں سے بہت زیادہ قوی ہوتی ہے چونکہ اس کے احساس ظاہری و باطنی میں وہ قدرتی طاقت ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ اس دنیا سے بھی آگے عالم غیب کی چیزوں کا ادراک کر لیتا ہے اس لئے اس کی ظاہری آنکھوں کے ساتھ ساتھ باطنی آنکھیں بھی اتنی طاقت ور ہوتی ہیں کہ وہ غیب کی ان چیزوں کو بھی دیکھ لیتا ہے جسے خدا تعالیٰ اسے دکھانا چاہتا ہے۔

چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ کہیں سفر میں جا رہے تھے جب آپ ﷺ کا گزر ایک قبرستان پر ہوا تو وہاں آپ کی چشم بصیرت نے ادراک کر لیا کہ ان قبروں میں مردوں پر عذاب ہو رہا ہے اور پھر آپ ﷺ نے صحابہؓ کو تلقین کی کہ وہ عذاب قبر سے پناہ مانگتے رہیں۔

[1] زید بن ثابت انصاری خزرجی ہیں آپ کاتب وحی ہیں۔ آپ کی وفات ۴۲ھ یا ۴۵ھ میں ہوئی۔

عذاب قبر کی شدت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تمہاری آنکھیں اس کا مشاہدہ کرلیں اور تمہارے کان اس کو سن لیں تو تم اپنی عقل و دماغ سے ہاتھ دھو بیٹھو اور تم اس کی شدت و سختی کا محض احساس ہی کر کے بے ہوش ہو جاؤ گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اس خوف و ہراس کی وجہ سے مردوں کو دفن کرنا بھی چھوڑ دو گے اگر مجھے اس کا خدشہ نہ ہوتا تو میں یقیناً تمہیں اس عذاب کا مشاہدہ بھی کرادیتا اور تمہیں سنوا بھی دیتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَآ اُقْبِرَ الْمَیِّتُ اَتَاهُ مَلَکَانِ اَسْوَدَانِ اَزْرَقَانِ یُقَالُ لِاَحَدِهِمَا الْمُنْکَرُ وَلِلْاٰخَرِ النَّکِیْرُ فَیَقُوْلَانِ مَاکُنْتَ تَقُوْلُ فِیْ هٰذَا الرَّجُلِ؟ فَاِنْ کَانَ مُؤْمِنًا فَیَقُوْلُ هُوَ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ فَیَقُوْلَانِ قَدْ کُنَّا نَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْلُ هٰذَا ثُمَّ یُفْسَحُ لَهٗ فِیْ قَبْرِهٖ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فِیْ سَبْعِیْنَ ثُمَّ یُنَوَّرُ لَهٗ فِیْهِ ثُمَّ یُقَالُ لَهٗ نَمْ فَیَقُوْلُ اَرْجِعُ اِلٰی اَهْلِیْ فَاُخْبِرُهُمْ فَیَقُوْلَانِ نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّذِیْ لَایُوْقِظُهٗ اِلَّا اَحَبُّ اَهْلِهٖ اِلَیْهِ حَتّٰی یَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ وَاِنْ کَانَ مُنَافِقًا قَالَ سَمِعْتُ النَّاسَ یَقُوْلُوْنَ قَوْلًا فَقُلْتُ مِثْلَهٗ لَآ اَدْرِیْ فَیَقُوْلَانِ قَدْ کُنَّا نَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْلُ ذٰلِكَ فَیُقَالُ لِلْاَرْضِ الْتَئِمِیْ عَلَیْهِ فَتَلْتَئِمُ عَلَیْهِ فَتَخْتَلِفُ اَضْلَاعُهٗ فَلَا یَزَالُ فِیْهَا مُعَذَّبًا حَتّٰی یَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جب مردہ کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے پاس کالی کیری آنکھوں والے دو فرشتے آتے ہیں جن میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں وہ دونوں اس مردہ سے پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص یعنی محمد ﷺ کی نسبت کیا کہتے تھے؟ اگر وہ شخص مؤمن ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور اس کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بلاشبہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، (یہ سن کر) وہ دونوں فرشتے کہتے ہیں۔ ہم جانتے تھے کہ تو یقیناً یہی کہے گا، اس کے بعد اس کی قبر کی لمبائی اور چوڑائی میں ستر ستر گز کشادہ کردی جاتی ہے اور اس مردہ سے کہا جاتا ہے کہ (سو جاؤ) مردہ کہتا ہے (میں چاہتا ہوں) کہ اپنے اہل و عیال میں واپس چلا جاؤں تاکہ ان کو (اپنے اس حال سے) باخبر کردوں۔ فرشتے اس سے کہتے ہیں تو اس دولہا کی طرح سو جا جس کو صرف وہی شخص جگا سکتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے محبوب ہو یعنی ہر کسی کا جگانا اچھا نہیں لگتا کیونکہ اس سے وحشت ہوتی ہے البتہ جب محبوب جگاتا ہے تو اچھا لگتا ہے، یہاں تک کہ خدا تعالیٰ اس کو اس جگہ سے اٹھائے۔ اور اگر وہ مردہ منافق ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو جو کچھ کہتے سنا تھا وہی میں کہتا تھا لیکن میں (اس کی حقیقت کو) نہیں جانتا (منافق کا یہ جواب سن کر) فرشتے کہتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ یقیناً تو یہی کہے گا، (اس کے بعد) زمین کو مل جانے کا حکم دیا جاتا ہے، چنانچہ زمین اس مردہ کو اس طرح دباتی ہے کہ اس کی دائیں پسلیاں بائیں اور بائیں پسلیاں دائیں نکل آتی ہیں اور اسی طرح ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس جگہ سے اٹھائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: قبر میں فرشتے ہیبت ناک اور خوفناک شکل میں آتے ہیں تاکہ ان کے خوف اور شکل کی وجہ سے کافروں پر ہیبت طاری ہو جائے اور وہ جواب دینے میں بدحواس ہو جائیں لیکن یہ مؤمنوں کے لئے آزمائش و امتحان ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ ان کو ثابت قدم رکھتا ہے اور وہ نڈر ہو کر صحیح جواب دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کامیاب ہو جاتے ہیں اس لئے کہ وہ دنیا میں خدا سے ڈرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قبر میں ہر قسم کے خوف و ہراس سے نڈر ہو جاتے ہیں۔

مردہ کے جواب میں فرشتوں کا یہ کہنا کہ "ہم جانتے ہیں کہ تو یقیناً یہی کہے گا" یا تو اس بناء پر ہوگا کہ پروردگار عالم کی جانب سے ان کو خبر دی جاتی ہوگی کہ فلاں مردہ یہ جواب دے گا اور فلاں مردہ وہ جواب دے گا، یا وہ مردہ کی پیشانی اور اس کے آثار سے یہ معلوم کرلیتے ہیں

کہ مؤمن کی پیشانی پر نور ایمانی کی چمک اور سعادت و نیک بختی کا نشان ہوتا ہے اور کافر و منافق کے چہرہ پر پھٹکار برستی ہے۔

مؤمن جب صحیح جواب دے دیتا ہے اور اس پر خدا کی رحمت اور اس کی نعمتوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کو اس اچھے معاملہ اور عظیم نعمت کی خبر دے دے جیسا کہ جب کوئی مسافر کسی جگہ راحت و سکون پاتا ہے اور وہاں عیش و آرام کے سامان اسے ملتے ہیں تو اس کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ کاش اس وقت میں اپنے اہل و عیال اور اعزاو اقرباء کے پاس جاتا تاکہ انہیں اپنے اس آرام و راحت سے اور چین و سکون سے مطلع کر دیتا۔ اس لئے مؤمن مردہ اپنے اہل و عیال کے پاس واپس جانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

(۷) وَعَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَأْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَادِيْنُكَ فَيَقُوْلُ دِيْنِيَ الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَاهٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ وَمَا يُدْرِيْكَ فَيَقُوْلُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَاٰمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ الْاٰيَةَ قَالَ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَآءِ اَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ فَافْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى الْجَنَّةِ فَيُفْتَحُ لَهٗ قَالَ فَيَاْتِيْهِ مِنْ رَّوْحِهَا وَطِيْبِهَا وَيُفْسَحُ لَهٗ فِيْهَا مَدَّ بَصَرِهٖ وَاَمَّا الْكَافِرُ فَذَكَرَ مَوْتَهٗ قَالَ وَيُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ وَيَاْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَادِيْنُكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَاهٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَآءِ اَنْ كَذَبَ فَافْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى النَّارِ قَالَ فَيَاْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُوْمِهَا قَالَ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهٗ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ اَضْلَاعُهٗ ثُمَّ يُقَيَّضُ لَهٗ اَعْمٰى اَصَمُّ مَعَهٗ مِرْزَبَّةٌ مِّنْ حَدِيْدٍ لَوْ ضُرِبَ بِهَا جَبَلٌ لَّصَارَ تُرَابًا فَيَضْرِبُهٗ بِهَا ضَرْبَةً يَّسْمَعُهَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اِلَّا الثَّقَلَيْنِ فَيَصِيْرُ تُرَابًا ثُمَّ يُعَادُ فِيْهِ الرُّوْحُ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت براء بن عازبؓ راوی ہیں آنحضرت ﷺ سے نقل کرتے ہیں، کہ آپ ﷺ نے فرمایا (قبر میں) مردے کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ "تیرا رب کون ہے؟" وہ جواب دیتا ہے "میرا رب اللہ ہے!" پھر فرشتے پوچھتے ہیں "تیرا دین کیا ہے؟" وہ جواب میں کہتا ہے، "میرا دین اسلام ہے" پھر فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں، جو شخص (خدا کی طرف سے) تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ کون ہے؟ وہ کہتا ہے "وہ خدا کے رسول ہیں" پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں یہ تجھے کس نے بتایا وہ کہتا ہے میں نے خدا کی کتاب پڑھی اور اس پر ایمان لایا اور اس کو سچ جانا، (یعنی جو کلام اللہ پر ایمان لائے گا وہ رسول اللہ ﷺ پر پہلے ایمان لائے گا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا۔ یثبت اللّٰہ الذین امنوا بالقول الثابت (الآیۃ) یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھتا ہے جو ثابت بات پر ایمان لائے (اخیر آیت تک) آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ آسمان سے پکارنے والا (یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم سے فرشتہ) پکار کر کہتا ہے میرے بندے نے سچ کہا لہٰذا اس کے لئے جنّت کا فرش بچھاؤ اور اس کو جنّت کی پوشاک پہناؤ، اور اس کے واسطے جنّت کی طرف ایک دروازہ کھول دو، چنانچہ جنّت کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا (اس جنّت کے دروازہ سے) اس کے پاس جنّت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں اور حد نظر تک اس قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے اب رہا کافر! تو آنحضرت ﷺ نے اس کی موت کا ذکر کیا اور اس کے بعد فرمایا کہ، پھر اس کی روح اس کے جسم میں ڈالی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں، "تیرا رب کون ہے؟" وہ کہتا ہے، ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا، پھر وہ پوچھتے ہیں "تیرا دین کیا ہے؟" وہ کہتا ہے، ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا، پھر وہ پوچھتے ہیں، یہ شخص کون ہے (جو خدا کی جانب سے) تم میں بھیجا گیا تھا، وہ کہتا ہے "ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا" پھر آسمان سے ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا، یہ جھوٹا ہے اس کے لئے آگ کا فرش بچھاؤ، آگ کا لباس اسے پہناؤ اور اس کے واسطے ایک دروازہ دوزخ کی طرف کھول دو آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ

دوزخ سے اس کے پاس گرم ہوائیں اور لوئیں آتی ہیں، اور فرمایا اور اس کی قبر اس کے لئے تنگ کردی جاتی ہے، یہاں تک کہ ادھر کی پسلیاں ادھر اور ادھر کی پسلیاں ادھر نکل آتی ہیں، پھر اس پر ایک اندھا اور بہرا فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جس کے پاس لوہے کا ایسا گرز ہوتا ہے کہ اس کو اگر پہاڑ پر مارا جائے تو وہ پہاڑ مٹی ہو جائے اور وہ فرشتہ اس کو اس گرز سے اس طرح مارتا ہے کہ (اس کے چیخنے چلانے کی آواز) مشرق سے مغرب تک تمام مخلوقات سنتی ہے مگر جن و انسان نہیں سنتے اور اس مارنے سے وہ مردہ مٹی ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر اس کے اندر روح ڈالی جاتی ہے۔" (احمدؒ و ابوداؤد)

تشریح: ہاہ ہاہ ایک لفظ ہے جو عربی میں دہشت زدہ اور متحیر شخص بولتا ہے جیسے اردو میں حیرت و دہشت کے وقت آہ، ہائے اور وائے وائے بولا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس وقت کافر اتنا خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ اس کی زبان سے ہیبت ناکی سے خوف و حسرت کے الفاظ نکلتے ہیں اور وہ صحیح جواب نہیں دے پاتا اور وہ کہتا ہے کہ "میں نہیں جانتا" اس کے اس جواب پر ندائے غیب سے اس کو جھوٹا قرار دیا جاتا ہے، اس لئے کہ دین اسلام کی آواز مشرق سے لے کر مغرب تک پہنچی اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنا مشن چار دانگ عالم میں پھیلایا اور تمام دنیا اس آفاقی و آسمانی مذہب سے باخبر تھی، اسکے باوجود اس کا یہ کہنا کہ میں کچھ نہیں جانتا یا مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا، سراسر کذب اور جھوٹ ہے۔

قبر میں عذاب کے جو فرشتے مقرر کئے جاتے ہیں وہ اندھے اور بہرے ہوتے ہیں، اس کی حکمت یہ ہے کہ وہ نہ تو مردہ کے چیخنے چلانے کی آواز سن سکیں اور نہ اس کے حال کو دیکھ سکیں تاکہ رحم نہ آسکے۔

نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معذب مردہ کے جسم میں بار بار روح ڈالی جاتی ہے تاکہ اس پر عذاب شدید سے شدید ہو سکے اور یہ اس چیز کا انجام ہے کہ وہ دنیا میں عذاب قبر کا انکار کیا کرتا تھا اور اس کو جھٹلایا کرتا تھا۔ (نعوذ باللہ)۔

⑧ وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ کَانَ اِذَا وَقَفَ عَلٰی قَبْرٍ بَکٰی حَتّٰی یَبُلَّ لِحْیَتَہٗ فَقِیْلَ لَہٗ تَذْکُرُ الْجَنَّۃَ وَالنَّارَ فَلَا تَبْکِیْ وَتَبْکِیْ مِنْ ھٰذَا فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْقَبْرَ اَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْاٰخِرَۃِ فَاِنْ نَجَا مِنْہُ فَمَا بَعْدَہٗ اَیْسَرُ مِنْہُ وَاِنْ لَّمْ یَنْجُ مِنْہُ فَمَا بَعْدَہٗ اَشَدُّ مِنْہُ قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا رَاَیْتُ مَنْظَرًا قَطُّ اِلَّا وَالْقَبْرُ اَفْظَعُ مِنْہُ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت عثمانؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ جب وہ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو (خوف خدا سے) اس قدر روتے کہ ان کی ڈاڑھی (آنسوؤں) سے تر ہو جاتی، ان سے کہا گیا کہ آپ جب جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں روتے اور اس جگہ کھڑے ہو کر روتے ہیں (اس کے جواب میں) انہوں نے کہا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے، آخرت کی منزلوں میں سے قبر پہلی منزل ہے لہٰذا جس نے اس منزل سے نجات پائی اس کو اس کے بعد آسانی ہے اور جس نے اس منزل سے نجات نہیں پائی اس کو اس کے بعد سخت دشواری ہے "حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا" کہ میں نے کبھی کوئی منظر قبر سے زیادہ سخت نہیں دیکھا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، اور ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔)

تشریح: یعنی قبر پر کھڑے ہو کر انسان عیش و عشرت کو بھول جاتا ہے اور دنیا کی بے ثباتی پر اس کا ایمان مضبوط ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوف خدا سے اپنے قلب کو لرزاں پاتا ہے اور آخرت سے لگاؤ محسوس کرتا ہے نیز قبر عیش و عشرت سے متنفر کرتی ہے اور محنت و مشقت اور یاد الٰہی میں مصروف رکھتی ہے۔ اسی کو فرمایا گیا ہے سب سے زیادہ سخت جگہ قبر ہے۔

⑨ وَعَنْہُ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَیِّتِ وَقَفَ عَلَیْہِ فَقَالَ اسْتَغْفِرُوْا لِاَخِیْکُمْ ثُمَّ سَلُوْا لَہٗ بِالتَّثْبِیْتِ فَاِنَّہُ الْاٰنَ یُسْاَلُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر (لوگوں سے) فرماتے

اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے ثابت قدم رہنے کی دعا مانگو، یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت اس کو ثابت قدم رکھے اس لئے کہ اس وقت اس سے سوال کیا جاتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زندوں کی طرف سے مردہ کے لئے دعائے استغفار کار آمد اور مفید ہے چنانچہ اہل سُنّت و الجماعت کا یہی مسلک ہے۔

یہ دعا نیز مردہ کی استقامت و اثبات کے لئے دعا، تلقین میت کے علاوہ ہیں جو دفن کرنے کے بعد کرتے ہیں تلقین میت کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ تلقین اکثر حنفیہ کے یہاں ثابت نہیں ہے لیکن اکثر شافعیہ اور حنفیہ کے نزدیک مستحب ہے، چنانچہ دفن کرنے کے بعد تلقین میت کے سلسلے میں ایک حدیث ابوامامہ صحابیؓ سے وارد ہوئی ہے جسے علامہ سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں طبرانی سے ذکر کیا ہے اور ابن نجار، ابن عساکر اور دیلمی نے بھی ذکر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی انتقال کر جائے اور اسے دفن کر چکو تو ایک شخص قبر کے سرہانے کھڑا ہو اور کہے "اے فلاں ابن فلاں" مردہ یہ الفاظ سنتا ہے لیکن جواب نہیں دیتا، وہ شخص پھر کہے "اے فلاں ابن فلاں" اس مرتبہ مردہ کہتا ہے خدا آپ پر رحم کرے، ارشاد فرمائیے، لیکن تم اسے نہیں سنتے۔ اس کے بعد اس شخص کو کہنا چاہئے، اے فلاں! اس کلمہ کو یاد کرو جس پر تم اس دنیا سے سدھارے اور وہ لا الہ الا اللّٰہ وان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ کی شہادت ہے نیز تم اس پر راضی ہوئے کہ خدا تمہارا پروردگار ہے محمد ﷺ تمہارے ساتھی پیغمبر ہیں، اسلام تمہارا دین ہے اور قرآن تمہارا راہبر امام ہے جب یہ کہا جاتا ہے تو منکر و نکیر میں سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے کہ چلو اس بندہ کے سامنے سے باہر نکلو! اس سے ہمیں کیا سروکار کیونکہ حق تعالیٰ کی جانب سے اس کو تلقین کی جا رہی ہے۔

ایک صحابیؓ نے عرض کیا! یا رسول اللہ! اگر ہم میت کی ماں کا نام نہ جانتے ہوں تو کیا کہیں اور اس کی نسبت کس طرف کریں؟ آنحضرت نے فرمایا، حوا کی طرف نسبت کرو اس لئے کہ وہ سب کی ماں ہیں۔

نیز تلقین میت کے سلسلہ میں اس کے علاوہ قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر سورہ بقرہ کا "مفلحون" اور آمن الرسول سے آخر سورت تک پڑھنا بھی منقول ہے اور اگر قرآن شریف پورا پڑھا جائے تو یہ سب سے افضل و بہتر ہے بعض علماء نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر وہاں کسی بھی مسئلہ کا ذکر کیا جائے تو یہ بھی فضیلت کا باعث اور رحمت خداوندی کے نزول کا سبب ہو گا۔

⑩ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُسَلَّطُ عَلَى الْكَافِرِ فِیْ قَبْرِهٖ تِسْعَةٌ وَّتِسْعُوْنَ تِنِّيْنًا تَنْهَسُهٗ وَتَلْدَغُهٗ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ لَوْ اَنَّ تِنِّيْنًا مِنْهَا نَفَخَ فِي الْاَرْضِ مَا اَنْبَتَتْ خَضِرًا۔ رَوَاهُ الدَّارِمِیُّ وَرَوَى التِّرْمِذِیُّ نَحْوَهٗ وَقَالَ سَبْعُوْنَ بَدَلَ تِسْعَةٌ وَّتِسْعُوْنَ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، کافر کے اوپر اس کی قبر میں ننانوے اژدہاء مسلط کئے جاتے ہیں جو اس کو قیامت تک کاٹتے اور ڈستے ہیں اور وہ اژدہاء ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک اژدہا زمین پر پھنکار مارے تو زمین سبزہ اگانے سے محروم ہو جائے، دارمیؒ اور ترمذیؒ سے بھی اسی قسم کی روایت منقول ہے لیکن اس میں بجائے ننانوے کے ستر کا عدد ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑪ عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ حِيْنَ تُوُفِّیَ فَلَمَّا صَلّٰى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوُضِعَ فِیْ قَبْرِهٖ وَسُوِّیَ عَلَيْهِ سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَبَّحْنَا طَوِيْلًا ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ كَبَّرْتَ فَقَالَ لَقَدْ تَضَايَقَ عَلٰى هٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهٗ حَتّٰى فَرَّجَهُ اللّٰهُ عَنْهُ۔

(رواہ احمد)

"حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ حضرت سعد بن معاذؓ کی وفات کے بعد ہم آنحضرت ﷺ کے ہمراہ ان کے جنازہ پر گئے، جب آنحضرت ﷺ جنازہ کی نماز پڑھ چکے اور حضرت سعدؓ کو قبر میں اتار کر قبر کی مٹی برابر کر دی گئی تو سرکار دو عالم ﷺ تسبیح (یعنی سبحان اللہ) پڑھتے رہے پھر آپ ﷺ نے تکبیر (یعنی اللہ اکبر) کہی ہم نے بھی تکبیر کہی، پھر آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ آپ (ﷺ) نے تسبیح کیوں پڑھی اور پھر تکبیر کیوں کہی؟ فرمایا اس بندۂ صالح پر اس کی قبر تنگ ہو گئی تھی پھر خدا نے ہماری تسبیح و تکبیر کی وجہ سے اسے کشادہ کر دیا۔" (احمدؒ)

تشریح: تسبیح و تکبیر سے خدا کا غضب رحمت میں اور اس کا غصہ شفقت میں بدل جاتا ہے اور وہاں مقدس کلموں کی بدولت اپنی رحمت و نعمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

چنانچہ اسی لئے خوف و دہشت کے موقع پر یا کسی خوفناک چیز کو دیکھ کر تکبیر کہنی مستحب ہے۔ تسبیح و تکبیر کا جتنا ورد رکھا جائے گا اتنا ہی خدا کی رحمت سے قریب ہوتا جائے گا اور دنیاوی آفات و بلا نیز غضب خداوندی سے دور ہوتا جائے گا۔

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا الَّذِيْ تَحَرَّكَ لَهُ الْعَرْشُ وَفُتِحَتْ لَهُ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَشَهِدَهُ سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنَ الْمَلَائِكَةِ لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّةً ثُمَّ فُرِّجَ عَنْهُ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ (یعنی سعد ابن معاذؓ) وہ شخص ہیں جن کے لئے عرش نے حرکت کی (یعنی اس کی جب پاک روح آسمان پر پہنچی تو اہل عرش نے خوشی و مسرت کا اظہار کیا) اور ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے اور ان کے جنازے پر ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے اور ان کی قبر تنگ کی گئی۔ پھر یہ تنگی دور ہوئی اور آنحضرت ﷺ کی برکت سے ان کی قبر کشادہ ہو گئی۔"

(۱۳) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ قَالَتْ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطِيْبًا فَذَكَرَ فِتْنَةَ الْقَبْرِ الَّتِيْ يُفْتَنُ فِيْهَا الْمَرْءُ فَلَمَّا ذَكَرَ ذٰلِكَ ضَجَّ الْمُسْلِمُوْنَ ضَجَّةً رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ هٰكَذَا وَزَادَ النَّسَآئِيُّ حَالَتْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اَنْ اَفْهَمَ كَلَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سَكَنَتْ ضَجَّتُهُمْ قُلْتُ لِرَجُلٍ قَرِيْبٍ مِّنِّيْ اَيْ بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ مَاذَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اٰخِرِ قَوْلِهٖ قَالَ قَالَ قَدْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِي الْقُبُوْرِ قَرِيْبًا مِّنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ۔

"اور حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ[1] راوی ہیں کہ ایک دن سرکار دو عالم ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور قبر کے فتنہ کا ذکر فرمایا جس میں انسانوں کو مبتلا کیا جاتا ہے چنانچہ اس ذکر سے مسلمان (خوف زدہ ہو کر روتے) اور چلاتے رہے، یہ روایت بخاری کی ہے اور نسائی نے اتنا اور زیادہ بیان کیا ہے کہ (خوف و دہشت کی وجہ سے) مسلمانوں کے چیخنے اور چلانے کے سبب میں آنحضرت ﷺ کے الفاظ کو نہ سن سکی، جب یہ چیخنا چلانا بند ہوا تو میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا، خدا تمہیں برکت عطا فرمائے (یعنی تمہارے علم و حلم میں زیادتی ہو، آخر میں آنحضرت ﷺ نے کیا فرمایا؟) اس شخص نے کہا آپ ﷺ نے فرمایا، مجھ پر یہ وحی آئی ہے کہ تم قبروں کے اندر فتنہ میں ڈالے جاؤ گے یعنی تم کو آزمایا جائے گا اور یہ آزمائش و امتحان فتنہ دجال کے قریب قریب ہوگا۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح فتنہ دجال اپنی تباہی و بربادی اور نقصان و خسران کی بناء پر سخت ہلاکت آفریں اور تباہ کن ہوگا، اسی طرح فتنہ قبر بھی ہول و دہشت اور اپنی شدت و سختی کی بنا پر بہت زیادہ خوفناک ہوگا، لہٰذا خدا تعالیٰ سے دعا مانگنی چاہئے کہ وہ ایسے سخت و نازک وقت میں اپنی رحمت کے دروازے کھول دے اور اس امتحان و آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔

(۱۴) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اُدْخِلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ مُثِّلَتْ لَهُ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوْبِهَا فَيَجْلِسُ

---

[1] آپ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی ذی شان صاحبزادی حضرت زبیر بن عوام کی زوجہ مطہرہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کی والدہ محترمہ ہیں آپ اپنی بہن عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دس سال بڑی تھیں۔ مکہ معظمہ میں آپ اسلام لائیں تھیں۔ آپ نے مکہ میں بعمر ۱۰۰ سال انتقال فرمایا۔

يَمْسَحُ عَيْنَيْهِ وَيَقُوْلُ دَعُوْنِيْ اُصَلِّيْ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جب مردہ (مؤمن) کو قبر کے اندر دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے سامنے غروب آفتاب کا وقت پیش کیا جاتا ہے، چنانچہ وہ مردہ ہاتھوں سے آنکھوں کو ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے مجھے چھوڑ دو تاکہ میں نماز پڑھ لوں۔" (ابن ماجہ)

تشریح: باعمل مؤمن مردہ جس وقت قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو وہ جس طرح دنیا میں ایمان و اسلام پر قائم رہا اور فرائض اسلام کی ادائیگی سے کبھی غافل نہ رہا، اسی طرح قبر میں بھی اسے سب سے پہلے نماز ہی یاد آتی ہے چنانچہ جب منکر و نکیر اس کے پاس قبر میں حاضر ہوتے ہیں تو وہ سوال و جواب سے پہلے نماز ادا کرنے کے لئے کہتا ہے کہ پہلے میں نماز پڑھ لوں اس کے بعد تمہیں جو کچھ کہنا سننا ہو کہو سنو یا سوال و جواب کے بعد وہ یہ الفاظ کہتا ہے اور وہ یہ خیال کرتا ... کہ میں اپنے گھر والوں کے درمیان بیٹھا ہوں، اس کے شعور و احساس میں سب سے پہلے نماز ہی آتی ہے۔ یہ حالت اس کی رعایت حال پر دلالت کرتی ہے کہ گویا وہ ہنوز دنیا میں ہی ہے اور سو کر ابھی اٹھا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو بندہ دنیا میں پکا نمازی ہوگا، اور جس کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی ہوگی، قبر میں بھی حسب عادت اسے پہلے نماز ہی یاد آئے گی۔

دفن کے بعد مردہ کے سامنے غروب آفتاب کا وقت پیش کرنا اس کی حالت مسافر اور تنہائی کی مناسبت کی وجہ سے ہے چنانچہ جب کوئی مسافر کسی شہر میں شام کو پہنچتا ہے تو وہ حیرانی و پریشانی کے عالم میں چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ جیسا کہ شام غریباں مشہور ہے ؎

تو زلف راکشادی و تاریک شد جہاں ۔۔۔ اکنوں فتاد شام غریباں کجا روند

اور ؎

نماز شام غریباں چو گریہ آغازم ۔۔۔ بہائے ہائے غریبانہ گر بہ پردازم

⑮ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْمَيِّتَ يَصِيْرُ اِلَى الْقَبْرِ فَيُجْلَسُ الرَّجُلُ فِيْ قَبْرِهٖ مِنْ غَيْرِ فَزَعٍ وَلَا مَشْغُوْبٍ ثُمَّ يُقَالُ لَهٗ فِيْمَ كُنْتَ فَيَقُوْلُ كُنْتُ فِي الْاِسْلَامِ فَيُقَالُ مَاهٰذَا الرَّجُلُ فَيَقُوْلُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ جَآءَ نَا بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَصَدَّقْنَاهُ فَيُقَالُ لَهٗ هَلْ رَاَيْتَ اللّٰهَ فَيَقُوْلُ مَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ اَنْ يَّرَى اللّٰهَ فَيُفْرَجُ لَهٗ فُرْجَةٌ قِبَلَ النَّارِ فَيَنْظُرُ اِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا فَيُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْ اِلٰى مَا وَقٰكَ اللّٰهُ ثُمَّ يُفْرَجُ لَهٗ فُرْجَةٌ قِبَلَ الْجَنَّةِ فَيَنْظُرُ اِلٰى زَهْرَتِهَا وَمَا فِيْهَا فَيُقَالُ لَهٗ هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَى الْيَقِيْنِ كُنْتَ وَعَلَيْهِ مُتَّ وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَيُجْلَسُ الرَّجُلُ السُّوْٓءُ فِيْ قَبْرِهٖ فَزِعًا مَشْغُوْبًا فَيُقَالُ لَهٗ فِيْمَ كُنْتَ فَيَقُوْلُ لَآ اَدْرِيْ فَيُقَالُ لَهٗ مَاهٰذَا الرَّجُلُ فَيَقُوْلُ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ قَوْلًا فَقُلْتُهٗ فَيُفْرَجُ لَهٗ فُرْجَةٌ قِبَلَ الْجَنَّةِ فَيَنْظُرُ اِلٰى زَهْرَتِهَا وَمَا فِيْهَا فَيُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْ اِلٰى مَا صَرَفَ اللّٰهُ عَنْكَ ثُمَّ يُفْرَجُ لَهٗ فُرْجَةٌ اِلَى النَّارِ فَيَنْظُرُ اِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا فَيُقَالُ هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَى الشَّكِّ كُنْتَ وَعَلَيْهِ مُتَّ وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ (رواہ ابن ماجہ)

"حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، جب مردہ قبر کے اندر پہنچتا ہے (یعنی اسے دفن کر دیا جاتا ہے) تو (نیک) بندہ قبر کے اندر اس طرح اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے کہ نہ تو وہ لحہ بھر خوفزدہ ہوتا اور نہ گھبرایا ہوا، پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ "تم کس دین میں تھے؟" وہ کہتا ہے میں دین اسلام میں تھا! پھر اس سے پوچھا جاتا ہے "یہ شخص محمد ﷺ کون ہیں؟" وہ کہتا ہے محمد (ﷺ) خدا کے رسول ہیں جو خدا کے پاس سے ہمارے لئے کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے اور ہم نے ان کی تصدیق کی۔ پھر اس سے سوال کیا جاتا

ہے کہ کیا تم نے اللہ کو دیکھا ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ، خدا تعالیٰ کو تو کوئی نہیں دیکھ سکتا! اس کے بعد اس کے لئے ایک روشن دان دوزخ کی طرف کھولا جاتا ہے اور وہ ادھر دیکھتا ہے اور آگ کے شعلوں کو اس طرح بھڑکتا ہوا پاتا ہے گویا اس کی لپیٹیں ایک دوسرے کو کھا رہی ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے، اس چیز کو دیکھو جس سے اللہ نے تجھے بچایا ہے، پھر اس کے لئے ایک کھڑکی جنت کی طرف کھول دی جاتی ہے، وہ جنت کی تروتازگی اور اس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھر اس سے کہا جاتا ہے، یہ تمہارا ٹھکانہ ہے کیونکہ (تمہارا اعتقاد مضبوط اور اس پر) تمہیں کامل یقین تھا اور اسی (یقین و اعتماد) کی حالت میں تمہاری وفات ہوئی اور اسی حالت میں تمہیں (قیامت کے دن) اٹھایا جائے گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اور بدکار بندہ اپنی قبر میں خوف زدہ اور گھبرایا ہوا اٹھ کر بیٹھتا ہے پس اس سے پوچھا جاتا ہے تو کس دین میں تھا؟ وہ کہتا ہے میں نہیں جانتا، پھر اس سے پوچھا جاتا ہے "یہ شخص (محمد ﷺ) کون تھے" وہ کہتا ہے، میں لوگوں کو جو کچھ کہتے سنتا تھا وہی میں کہتا تھا، اس کے بعد اس کے لئے بہشت کی طرف ایک روشن دان کھولا جاتا ہے جس سے وہ بہشت کی تروتازگی اور اس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھر اس سے کہا جاتا ہے، اس چیز کی طرف دیکھ جسے خدا نے تجھ سے پھر لیا ہے پھر اس کے لئے دوزخ کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ آگ کے تیز شعلے ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں۔ اور اس سے کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے اس شک کے سبب جس میں تو مبتلا تھا اور جس پر تو مرا اور اسی پر تو اٹھایا جائے گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔" (ابن ماجہؒ)

بَابُ الْاِعْتِصَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ

کتاب و سُنّت پر اعتماد کرنے کا بیان

کتاب سے مراد کتاب اللہ یعنی قرآن مجید ہے اور سُنّت سے مراد آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال ہیں جن کے مجموعہ کا نام حدیث ہے ان کو شریعت، طریقت، حقیقت کہتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مؤمن و مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اعتقاد و ایمان پختہ اور کامل ہو کہ قرآن و سُنّت نے جو راستہ بتا دیا ہے اس پر پورے یقین کے ساتھ چلنا اور شریعت نے جو حدود قائم کر دی ہیں ان کے اندر پورے اعتقاد کے ساتھ رہنا ہی عین فلاح و سعادت سمجھے، اپنی طرف سے ایسے راستے پیدا کرنا جو سراسر منشاء شریعت کے خلاف ہوں، یا ایسے طریقے اختیار کرنا جو قرآن و سُنّت کے صحیح راستے سے الگ ہوں نہ صرف یہ کہ ایمان و اعتقاد کی سب سے بڑی کمزوری ہے بلکہ دعوی اسلام کے برخلاف بھی ہے۔

چنانچہ اس حدیث میں ان لوگوں کو مردود قرار دیا جا رہا ہے جو محض اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض کی بنا پر دین و شریعت میں نئے نئے طریقے رائج کرتے ہیں اور ایسی غلط باتوں کا انتساب شریعت کی طرف کرتے ہیں جن کا اسلام میں سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا۔

مثلاً کوئی شخص اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور اپنی فہم کے مطابق اسلام میں ایسی نئی چیزیں پیدا کرتا ہے جس کا ثبوت نہ تو قرآن و سُنّت سے ظاہراً ہے اور نہ معناً اور نہ اس کی سند کسی اسلامی نظریہ سے مستنبط ہے تو اسے مردود قرار دیا جائے گا۔ ہاں حدیث کے الفاظ مالیس منہ نے

اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ ایسی چیزیں پیدا کرنا، یا ایسے نظریے قائم کرنا جو کتاب سُنّت کی منشاء کے خلاف اور ان کے برعکس نہ ہوں ان پر کوئی مواخذہ نہیں ہے اور نہ ان پر کوئی نکیر قائم کی جاسکتی ہے۔

② وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ بعد ازاں جاننا چاہئے کہ بے شک سب سے بہتر بات خدا کی کتاب ہے، سب سے بہترین راستہ محمد (ﷺ) کا راستہ ہے اور سب سے بدترین چیز وہ ہے جس کو (دین میں) نیا نکالا گیا ہو اور ہر بدعت (اپنی طرف سے دین میں پیدا کی ہوئی نئی بات) گمراہی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ خطبہ ارشاد فرمارہے ہوں گے، چنانچہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے خدا کی حمد و تعریف کی ہوگی پھر امابعد یعنی بعد ازاں کہہ کر یہ حدیث اس طرح ارشاد فرمائی۔

بدعت ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کا وجود آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں نہ رہا بلکہ آپ ﷺ کے بعد مختلف زمانوں میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ بدعت کی دو قسمیں ہیں "بدعت حسنہ" اور "بدعت سیئہ" یعنی اگر ایسی چیزیں نکالی گئی ہیں جو اسلامی اصول و قوائد کے مطابق ہوں اور قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہوں تو ان کو بدعت حسنہ کہتے ہیں، اور جو چیزیں منشاء شریعت کے برعکس اور قرآن و حدیث کے برخلاف ہوں ان کو بدعت سیئہ کہتے ہیں اور یہی بدعت گمراہی و ضلالت اور خداوند کے رسول کی ناراضگی کا باعث ہے، چنانچہ حدیث میں کل بدعۃ ضلالۃ سے مراد یہی بدعت سیئہ ہے ایسی بدعت سے اجتناب ضروری ہے۔

جاننا چاہئے کہ بعض بدعت ایسی ہیں جو واجب بھی ہیں مثلاً علم نحو کی تعلیم کہ اس کے بغیر کلام اللہ سمجھنا ناممکن ہے اس لئے قرآنی علوم و معارف کو سمجھنے کے لئے علم نحو حاصل کرنا ضروری ہے۔

اس کے برخلاف بعض بدعات حرام ہیں مثلاً قدریہ و جبریہ کے مذاہب اور ان کے افکار و نظریات جو قرآن و سُنّت کے بالکل برخلاف ہیں بلکہ ان کے مذاہب کا رد کرنا بدعت واجبہ ہے۔

بعض بدعات مستحب ہیں جیسے خانقاہیں قائم کرنا اور وہاں معرفت الی اللہ کے لئے لوگوں کے قلوب کو راہ حق پر لگانا، یا مدرسے قائم کرنا جہاں مسلمان بچوں کو دینی تعلیم و تربیت دینا، یا اسی طرح ایسے تمام کار خیر اور اچھی چیزیں جن کی فی الوقت ضرورت مسلم ہو اور وہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں موجود نہ رہی ہوں۔

کچھ بدعت مکروہ بھی ہیں مثلاً کلام اللہ اور مساجد پر نقش و نگار بنانا اور ان کی تزئین و آرائش کے لئے غیر مسنون طریقے اختیار کرنا، بعض بدعت مباح بھی ہیں، جیسے صبح کے بعد مصافحہ کرنا لیکن یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے حنفیہ کے یہاں صبح کے بعد کا مصافحہ کرنا مکروہ ہے۔

بدعت کے سلسلہ میں امام شافعیؒ نے بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں جو نئی بات پیدا کی جائے یعنی بدعت اگر وہ کتاب کے مخالف صحابہ کے اقوال کے منافی اور اجماع اُمّت کے برعکس ہو تو وہ ضلالت و گمراہی ہے اور جو چیزیں ایسی نہ ہوں ان میں کوئی حرج نہیں ہے۔

③ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْغَضُ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ ثَلَاثَةٌ مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ وَمُبْتَغٍ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَمُطَّلِبُ دَمِ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لِيُهْرِيْقَ دَمَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالمؐ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب (وہ لوگ جن سے خدا سخت ناراض ہے) تین ہیں۔ ① حرم میں کجروی کرنے والا۔ ② اسلام میں ایام جاہلیت کے طریقوں کو ڈھونڈھنے والا۔ ③ کسی مسلمان کے خون ناحق کا طلب گار تاکہ اس کے خون کو بہائے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں تین آدمیوں کو خدا کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مغضوب قرار دیا جارہا ہے، پہلا شخص تو وہ ہے جسے خدا نے اپنے گھر یعنی بیت اللہ میں حاضری کی سعادت بخشی مگر وہ بیت اللہ کی نہ تو عظمت کرتا ہے اور نہ حدود حرم میں ممنوع چیزوں سے پرہیز کرتا ہے بلکہ وہ حرم میں کجروی کرتا ہے یعنی ایسی چیزیں اختیار کرتا ہے جو ایک طرف تو اس مقدس جگہ کی شان عظمت کے منافی ہیں اور دوسری طرف احکام شریعت کی کھلی خلاف ورزی کے مترادف ہیں مثلاً وہاں لڑائی جھگڑا کرنا، شکار کرنا، یا کوئی بھی مطلق گناہ اور قانون شریعت کی خلاف ورزی کرنا۔

دوسرا شخص وہ ہے جس کو خدا نے ایمان و اسلام کی دولت سے نوازا اور اس کے قلب کو یقین و اعتقاد کی روشنی سے منور کیا مگر وہ اسلام میں ان چیزوں کو اختیار کرتا ہے جو خالص زمانہ جاہلیت کا طریقہ اور غیر اسلامی رسمیں تھیں جیسے نوحہ کرنا، یا مصائب و تکالیف کے وقت چاک گریبان ہونا، برے شگون لینا، اور نوروز کرنا، یا ایسی رسمیں کرنا جو خالص کفر کی علامت ہوں (جیسے اولیاء اللہ کے مزار پر عرس کرنا، وہاں چراغاں کرنا، قبروں پر روشنی کا انتظام کرنا، غیر اللہ کے نام پر نذر و نیاز کرنا محرم و شب برات میں غلط رسمیں ادا کرنا۔ وغیرہ وغیرہ)۔

تیسرا شخص وہ ہے جو کسی مسلمان کا ناحق خون بہانے کا طلب گار ہو یعنی کسی مسلمان کو قتل کرنے کا مقصد محض خون ریزی ہو اور کوئی دوسرا مقصد نہ ہو، اگرچہ محض قتل ہی کوئی چھوٹا جرم نہیں ہے اس پر بھی بڑی وعید ہے مگر جب مقصد صرف خون ریزی ہو تو یہ جرم شریعت کی نظر میں اور زیادہ قابل نفریں ہو جاتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب محض خون ریزی کی خواہش اور طلب ہی اتنا بڑا جرم ہے تو اس جرم کو کر گزرنا یعنی واقعۃً کسی کا ناحق خون بہا دینا کتنا بڑا جرم ہوگا اور اس کی کتنی سخت سزا ہوگی؟۔

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی قِیْلَ وَمَنْ اَبٰی قَالَ مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، میری اُمت جنت میں داخل ہوگی مگر وہ شخص جس نے انکار کیا اور سرکشی کی وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، پھر پوچھا گیا "وہ کون شخص ہے جس نے انکار کیا اور سرکشی کی" آپ ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے میری اطاعت و فرمانبرداری کی وہ جنت میں داخل ہوا۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا اور سرکشی کی۔" (بخاریؒ)

تشریح: صحابہؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ قبول کرنے والا اور سرکشی اختیار کرنے والا کون ہے؟ آنحضرت ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ جس نے میری اطاعت نہیں کی اور میرے احکام و فرمان سے روگردانی کی وہ سرکش ہے جو جنت کا مستحق نہیں ہوگا بلکہ اپنی سرکشی اور نافرمانی کی بناء پر خدا کے عذاب کا مستوجب گردانا جائے گا۔

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَتْ مَلَائِكَةٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَائِمٌ فَقَالُوْا اِنَّ لِصَاحِبِكُمْ هٰذَا مَثَلًا فَاضْرِبُوْا لَهٗ مَثَلًا قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ الْعَیْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ یَقْظَانُ فَقَالُوْا مَثَلُهٗ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی دَارًا وَّجَعَلَ فِیْهَا مَاْدُبَةً وَّبَعَثَ دَاعِیًا فَمَنْ اَجَابَ الدَّاعِیَ دَخَلَ الدَّارَ وَاَكَلَ مِنَ الْمَاْدُبَةِ وَمَنْ لَّمْ یُجِبِ الدَّاعِیَ لَمْ یَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ یَاْكُلْ مِنَ الْمَاْدُبَةِ فَقَالُوْا اَوِّلُوْهَا لَهٗ یَفْقَهْهَا قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ الْعَیْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ یَقْظَانُ فَقَالُوْا الدَّارُ الْجَنَّةُ وَالدَّاعِیْ مُحَمَّدٌ فَمَنْ اَطَاعَ مُحَمَّدًا فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصٰی مُحَمَّدًا فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ وَمُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَیْنَ النَّاسِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ (کچھ) فرشتے آنحضرت ﷺ کے پاس اس وقت آئے جب کہ آپ ﷺ سو رہے تھے فرشتوں نے آپس میں کہا۔ تمہارے اس دوست یعنی آنحضرت ﷺ کے متعلق ایک مثال ہے اس کو ان کے سامنے بیان کرو، دوسرے فرشتوں نے کہا، وہ سوئے ہوئے ہیں (لہٰذا بیان کرنے سے کیا فائدہ) ان میں سے بعض نے کہا، بے شک آنکھیں سو رہی ہیں لیکن دل تو جاگتا ہے، پھر اس نے

کہا، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے گھر بنایا اور لوگوں کے کھانا کھانے کے لئے دسترخوان چنا اور پھر لوگوں کو بلانے کے لئے آدمی بھیجا لہٰذا جس نے بلانے والے کی بات کو مان لیا وہ گھر میں داخل ہوگا اور کھانا کھائے گا اور جس نے بلانے والے کی بات کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوگا اور نہ کھانا کھائے گا یہ سن کر فرشتوں نے آپس میں کہا، اس کو (وضاحت کے ساتھ) بیان کرو تاکہ یہ اسے سمجھ لیں، بعض فرشتوں نے کہا بیان کرنے سے کیا فائدہ کیونکہ وہ تو سوئے ہوئے ہیں۔ دوسروں نے کہا، بے شک آنکھیں سو رہی ہیں لیکن دل تو جاگتا ہے اور پھر کہا، گھر سے مراد تو جنت ہے اور بلانے والے سے مراد محمد ﷺ ہیں جس نے محمد ﷺ کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور محمد ﷺ لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔"

(بخاریؒ)

تشریح: اس شخص سے مراد جس نے گھر بنایا اور دسترخوان چنا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اسی طرح دسترخوان اور کھانے سے مراد بہشت کی نعمتیں ہیں چونکہ یہ ظاہری طور پر مفہوم ہو رہے ہیں اس لئے ان کی وضاحت نہیں کی گئی آخر میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی لوگوں کے درمیان فرق کرنے والی ہے یعنی کافر و مؤمن حق و باطل اور صالح و فاسق میں آپ ﷺ فرق کرنے والے ہیں۔

(۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَآءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ اِلٰی اَزْوَاجِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اُخْبِرُوْا بِهَا کَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا اَیْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ فَقَالَ اَحَدُهُمْ اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّی اللَّیْلَ اَبَدًا وَقَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَصُوْمُ النَّهَارَ اَبَدًا وَلَا اُفْطِرُ وَقَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَآءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا فَجَآءَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَیْهِمْ فَقَالَ اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَکَذَا اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاکُمْ لَهٗ لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔

(متفق علیہ)

"حضرت انسؓ راوی ہیں کہ تین شخص آنحضرت ﷺ کی بیویوں کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ ان سے آنحضرت ﷺ کی عبادت کا حال دریافت کریں، جب ان لوگوں کو آپ ﷺ کی عبادت کا حال بتلایا گیا تو انہوں نے آپ کی عبادت کو کم خیال کر کے آپس میں کہا۔ آنحضرت ﷺ کے مقابلہ میں ہم کیا چیز ہیں اللہ تعالیٰ نے تو ان کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیے ہیں، ان میں سے ایک نے کہا، اب میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا، اور میں دن کو ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا، ان میں آپس میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا، تم لوگوں نے ایسا ویسا کہا ہے، خبردار! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، اور تم سے زیادہ تقویٰ اختیار کرتا ہوں (لیکن اس کے باوجود) میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں میں (رات میں) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میرا طریقہ ہے لہٰذا) جو شخص میرے طریقہ سے انحراف کرے گا وہ مجھ سے نہیں (یعنی میری جماعت سے خارج ہے)۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: تین صحابی یعنی حضرت علی، حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ ازواج مطہرات کی خدمت میں آنحضرت ﷺ کی عبادت کا حال معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوئے جب ان لوگوں کو آپ ﷺ کی عبادت کا حال معلوم ہوا تو اسے انہوں نے کم خیال کرتے ہوئے کہا کہ کہاں ہم اور کہاں رسول اللہ ﷺ؟ یعنی عبادت کے مقابلہ میں ہمیں سرکار دوعالم ﷺ کی ذات اقدس سے کیا نسبت؟ اس لئے کہ آپ ﷺ کو تو اتنی بھی عبادت کی حاجت نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ سراپا معصوم اور مغفور ہیں آپ ﷺ کے اگلے پچھلے تمام گناہ بارگاہ الوہیت میں سے پہلے ہی بخش دیے گئے ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔

"تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے پچھلے تمام گناہ بخش دے۔"

چنانچہ ان تینوں نے حسب طبیعت ایک ایک چیز کو اپنے اوپر لازم کر لیا اور یہ خیال کیا کہ عبادت میں اتنی زیادتی عرفان حق کا باعث اور تقرب الی اللہ کا واحد ذریعہ ہے لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں اس سے منع فرمادیا اس لئے کہ عبادت وہی معتبر اور قابل تحسین ہوگی جو خدا اور خدا کے رسول کی قائم کردہ حدود کے اندر ہو اور جتنی عبادت کے لئے بندہ کو مکلف کیا گیا ہے اتنی عبادت ہی تقرب الی اللہ کا باعث ہوگی، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سے زیادہ ڈرتا ہوں، تقوی تم سے زیادہ اختیار کئے ہوئے ہوں، خوف خدا میرے دل میں تم سے زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود بھی میری عبادت اور میری ریاضت ان ہی حدود کے اندر ہے جو خدا نے قائم کر دی ہے، اسی لئے میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سونے کے وقت سوتا بھی ہوں اور بقضائے فطرت عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔

چنانچہ کمال انسانیت یہی ہے کہ بندہ علائق سے تعلق رکھے، عورتوں سے نکاح بھی کرے لیکن اس شان کے ساتھ کہ ایک طرف تو ان کے حقوق میں ذرہ برابر بھی کمی نہ ہو اور دوسری طرف حقوق اللہ میں بھی فرق نہ آئے اور نہ توکل کا دامن ہاتھ سے چھوٹے، اسی چیز کو آنحضرت ﷺ نے پورے کمال کے ساتھ عملی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کر دیا تاکہ اُمت بھی اسی طریقہ پر چلتی رہے۔

اور پھر آخر میں آپ ﷺ نے صاف طور پر اعلان فرمادیا کہ یہ میرا طریقہ ہے اور یہی میری سنت، اب جو شخص میری سُنت سے انحراف کرتا ہے، میری بتائی ہوئی حدود سے تجاوز کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ میری سُنت اور میرے طریقہ سے بیزاری و بے رغبتی کر رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسا شخص میری جماعت سے خارج ہے اسے مجھ سے اور میری جماعت سے کوئی نسبت نہیں۔

اس ارشاد نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ علائق دنیا سے بالکل منہ موڑ لینا اور رہبانیت کا طریق اختیار کر لینا جائز نہیں ہے اس لئے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی کوتاہی ہوگی اور عبادت کا جو اصلی حق ہے وہ ادا نہیں ہوگا۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ نے فرمایا کہ اس حدیث سے بعض علماء نے یہ استنباط کیا ہے کہ اس حدیث میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو بدعت حسنہ کے قائل ہیں۔ اس لئے کہ تینوں صحابہؓ نے جن چیزوں کو اپنے اوپر لازم کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ عبادت ہی کی قسم سے تھیں لیکن چونکہ یہ سُنت کے طریقہ کے خلاف اور اس سے زیادہ تھیں اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو پسند نہیں فرمایا اور اس سے منع فرمادیا، لہٰذا اولیٰ یہی ہے کہ جو عبادت آں حضرت ﷺ سے منقول ہو، اور جس طرح ثابت ہو اسی طرح ادا کرے اس میں اپنی طرف سے کمی زیادتی نہ کرے۔

(۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَ صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَرَخَّصَ فِيْهِ فَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَطَبَ فَحَمِدَ اللّٰهَ ثُمَّ قَالَ مَابَالُ اَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُوْنَ عَنِ الشَّيْءِ اَصْنَعُهُ فَوَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَاَشَدُّهُمْ لَهٗ خَشْيَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک کام کیا اور اس کی اجازت دے دی لیکن کچھ لوگوں نے اس سے پرہیز کیا جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ملی تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور خدا کی حمد و تعریف کے بعد فرمایا۔ لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ اس چیز سے پرہیز کرتے ہیں جسے میں کرتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں اللہ تعالیٰ کی مرضی و نامرضی کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: روزہ میں آنحضرت ﷺ نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا ہوگا یا سفر میں روزہ نہ رکھا ہوگا چونکہ ان چیزوں کی اجازت ہے اور شریعت نے اس کی رخصت دی ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے خود بھی اس پر عمل فرمایا اور لوگوں کو بھی اس کی اجازت دے دی کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں لیکن کچھ لوگوں نے از راہ احتیاط ان کو جائز نہ سمجھا ہوگا جب آنحضرت ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ اس کے باوجود کہ میں لوگوں سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں اور کمال اخلاق میرے اندر موجود ہے لیکن میں شریعت کی طرف سے دی گئی آسانی اور رخصت پر عمل کرتا ہوں تو وہ لوگ کون ہوئے ہیں جو اس رخصت و اجازت پر عمل نہ کریں۔

اگر معنوی حیثیت سے ان آسانیوں اور رخصت کی حقیقت پر غور کیا جائے جو شریعت نے ایسے مواقع پر دے رکھی ہیں تو اس میں بڑی عجیب حکمتیں نظر آئیں گی۔ مثلاً یہ کہ ایسے مواقع پر دراصل بندہ کے عجز و ناچارگی اور ضعف بشریت نیز فاہیت نفس کا اظہار ہوتا ہے جو خدا کے نزدیک بہت محبوب شے ہے اسی لئے سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ اسے پسند کرتا ہے کہ رخصتوں یعنی آسانیوں پر عمل کیا جائے جیسا کہ وہ عزیمتوں یعنی اولی چیزوں پر عمل کئے جانے کو پسند کرتا ہے۔

(۸) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قَدِمَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يُؤَبِّرُوْنَ النَّخْلَ فَقَالَ مَا تَصْنَعُوْنَ قَالُوْا كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ لَعَلَّكُمْ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا كَانَ خَيْرًا فَتَرَكُوْهُ فَنَقَصَتْ قَالَ فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ اَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ رَّأْيِيْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت رافع[1] بن خدیج بیان کرتے ہیں کہ (جب) سرکار دو عالم ﷺ مدینہ تشریف لائے اس وقت مدینہ کے لوگ کھجور کے درختوں میں تابیر کیا کرتے تھے آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا، تم یہ کیا کرتے ہو؟ اہل مدینہ نے عرض کیا، ہم ایسا ہی کرتے رہے ہیں، آں حضرت ﷺ نے فرمایا، اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید بہتر ہو، چنانچہ لوگوں نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد سن کر اسے چھوڑ دیا اور اس سال پھل کم آیا، راوی کہتے ہیں کہ اس کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا، میں بھی ایک آدمی ہوں لہٰذا جب میں تمہیں کسی ایسی چیز کا حکم دوں جو تمہارے دین کی ہو تو اسے قبول کرلو، اور جب میں کوئی بات اپنی عقل سے تمہیں بتاؤں تو سمجھ لو کہ میں بھی انسان ہوں۔"

(مسلمؒ)

تشریح: کھجور کے درختوں میں ایک درخت نر ہوتا ہے اور دوسرے مادہ ہوتے ہیں۔ مدینہ والے یہ کیا کرتے تھے کہ نر درخت کا پھول مادہ درختوں پر جھاڑتے یا ان میں لگا دیتے تھے اس سے ان کا خیال تھا کہ پھل زیادہ آتے ہیں اسی کو تابیر کرنا کہا جاتا ہے، آخر حدیث میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے معنی یہ ہیں کہ میں بھی ایک انسان ہوں دنیاوی اسباب کے سلسلہ میں مجھ سے خطا بھی واقع ہو سکتی ہے اور صواب بھی، مگر میں کسی دنیاوی معاملہ میں اپنی کسی ایسی اجتہادی رائے کا اظہار کروں جو وحی کے زیر حکم نہ ہو تو اس پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے چنانچہ اس معاملہ میں آپ ﷺ نے جب دیکھا کہ یہ چیز امور جاہلیت میں سے ہے اور اس کی تاثیر پھلوں کی کمی و زیادتی میں کچھ معقول نظر نہیں آتی اور اس کا خیال نہیں فرمایا کہ شاید اس کی تاثیر کچھ منجانب اللہ ہی سے ہوتی ہو اس لئے آپ ﷺ نے اس کو ترک کر دینے کے لئے فرمایا لیکن حکم نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ اگر یہ عمل نہ کرو تو بہتر ہوگا۔

جب تجربہ کے بعد آپ ﷺ نے یہ دیکھ لیا کہ یہ تو ایک قدرتی چیز ہے کہ جب نر درخت کے پھلوں کو مادہ درخت میں لگا دیتے ہیں تو اس سے پھل کثرت سے آتے ہیں اور اس عمل کے خلاف خدا کی جانب سے کوئی وعید نہیں آئی ہے تو آپ ﷺ نے سکوت فرمایا۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دنیا کی طرف التفات نہ تھا اور نہ آپ کی غرض دنیا تھی بلکہ امور آخرت کے مسائل و احکام اور دینی معاملات میں آپ ﷺ کو زیادہ اہتمام تھا۔

---

[1] حضرت رافع بن خدیجؓ انصاری اوسی ہیں جس وقت حق و باطل کے درمیان جنگ بدر ہوئی اس وقت یہ بہت کم سن تھے ۷۴ھ میں بعمر ۸۶ سال انتقال فرمایا۔ (اسد الغابہ)

بعض دوسری احادیث میں اس واقع کے بیان کے سلسلہ میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا انتم اعلم بامور دنیاکم یعنی تم اپنی دنیا کے امور کو خوب جانتے ہو! اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ دنیاوی امور کی طرف مجھے التفات نہیں ہے ورنہ جہاں تک رائے و عقل کا معاملہ ہے اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے آنحضرت ﷺ دینی اور دنیاوی دونوں معاملات میں سب سے زیادہ عقل مند و صائب الرائے تھے۔

⑨ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا مَثَلِیْ وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ کَمَثَلِ رَجُلٍ اَتٰی قَوْمًا فَقَالَ یَا قَوْمِ اِنِّیْ رَاَیْتُ الْجَیْشَ بِعَیْنَیَّ وَاِنِّیْ اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَانُ فَالنَّجَآءَ النَّجَآءَ فَاَطَاعَہٗ طَآئِفَۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ فَاَدْلَجُوْا فَانْطَلَقُوْا عَلٰی مَھَلِھِمْ فَنَجَوْا وَکَذَّبَتْ طَآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ فَاَصْبَحُوْا مَکَانَھُمْ فَصَبَّحَھُمُ الْجَیْشُ فَاَھْلَکَھُمْ وَاجْتَاحَھُمْ فَذٰلِکَ مَثَلُ مَنْ اَطَاعَنِیْ فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِہٖ وَمَثَلُ مَنْ عَصَانِیْ وَکَذَّبَ مَا جِئْتُ بِہٖ مِنَ الْحَقِّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری اور اس چیز کی مثال جسے دے کر خدا نے مجھے بھیجا ہے (یعنی دین و شریعت) اس شخص کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہا، اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر دیکھا ہے اور میں ننگا (یعنی بے غرض) ڈرانے والا ہوں، لہٰذا تم اپنی نجات کو تلاش کرو، چنانچہ اس کی قوم کی ایک جماعت نے اس کی فرمانبرداری کی اور راتوں رات آہستہ آہستہ نکل گئی اور نجات پالی ان میں سے ایک گروہ نے اس کو جھٹلایا اور صبح تک اپنے گھروں میں رہا صبح کو لشکر نے آکر ان کو پکڑ لیا اور ہلاک کر ڈالا (یہاں تک کہ) ان کی جڑیں کھود ڈالیں یعنی ان کی نسل تک کا خاتمہ کر دیا، چنانچہ یہی مثال ہے اس شخص کی جس نے میری فرمانبرداری کی اور جو (احکام) میں لایا ہوں ان کی پیروی کی، اور اس شخص کی بھی یہی مثال ہے جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق بات (یعنی دین و شریعت) میں لے کر آیا ہوں اس کی تکذیب کی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ننگا ڈرانے والے کی اصل یہ ہے کہ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی لشکر کو اپنی قوم پر حملہ کے لئے آتا ہوا دیکھتا تو کپڑے اتار کر سر پر رکھ لیتا اور بالکل ننگا ہو کر چلاتا ہوا اپنی قوم کی طرف آتا تاکہ لوگ خبردار ہو جائیں اور دشمن کی اچانک آمد سے بچاؤ کی شکل پیدا کر سکیں۔ اسی کو ننگا ڈرانے والا کہا جاتا تھا، اس کے بعد سے یہ کسی ناگہانی اور خوفناک حادثہ کے پیش آنے میں صرف ایک ضرب المثل بن گیا۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ پر یہ مثال بالکل صحیح و صادق تھی کہ آپ ﷺ فرمانبردار اور اطاعت گزار کو جنت اور رضاء مولیٰ کی بشارت اور نافرمانبردار و سرکش جماعت کو خدا کے عذاب و غضب کی خبر دینے میں بالکل سچے تھے۔

⑩ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَاحَوْلَھَا جَعَلَ الْفَرَاشُ وَھٰذِہِ الدَّوَآبُّ الَّتِیْ تَقَعُ فِی النَّارِ یَقَعْنَ فِیْھَا وَجَعَلَ یَحْجُزُھُنَّ وَیَغْلِبْنَہٗ فَیَتَقَحَّمْنَ فِیْھَا فَاَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِکُمْ عَنِ النَّارِ وَاَنْتُمْ تَقَحَّمُوْنَ فِیْھَا (ھٰذِہٖ رِوَایَۃُ الْبُخَارِیِّ وَلِمُسْلِمٍ نَحْوُھَا وَقَالَ فِیْ اٰخِرِھَا قَالَ فَذٰلِکَ مَثَلِیْ وَمَثَلُکُمْ اَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِکُمْ عَنِ النَّارِ ھَلُمَّ عَنِ النَّارِ ھَلُمَّ عَنِ النَّارِ فَتَغْلِبُوْنِیْ تَقَحَّمُوْنَ فِیْھَا)۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، میری مثال اس شخص کی مانند ہے جس نے آگ روشن کی چنانچہ جب آگ نے چاروں طرف روشنی پھیلا دی تو پروانے اور دوسرے وہ جانور جو آگ میں گرتے ہیں آکر آگ میں گرنے لگے آگ روشن کرنے والے شخص نے ان کو روکنا شروع کیا لیکن وہ (نہیں رکتے بلکہ اس کی کوششوں پر) غالب رہتے ہیں اور آگ میں گر پڑتے ہیں اسی طرح میں بھی تمہاری کمریں پکڑ کر تمہیں آگ میں گرنے سے روکتا ہوں اور تم آگ میں گرتے ہو۔

یہ روایت بخاری کی ہے اور مسلم میں بھی ایسی ہی روایت ہے البتہ مسلم کی روایت کے آخری الفاظ یہ ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بالکل ایسی ہی مثال میری اور تمہاری ہے میں تمہاری کمریں پکڑے ہوں کہ تمہیں آگ سے بچاؤں اور یہ کہتا ہوں کہ دوزخ سے بچو میری

طرف آؤ، دوزخ سے بچو میری طرف آؤ لیکن مجھ پر تم غالب آتے ہو اور آگ میں گر پڑتے ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں نے حرام اور ممنوع چیزوں کو تمہارے سامنے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے لیکن جس طرح کوئی شخص آگ جلائے اور اس شخص کے روکنے کے باوجود پروانے آگ میں گرتے ہیں وغیرہ۔ اسی طرح باوجودیکہ میں تمہیں برے راستہ سے ہٹاتا ہوں اور برے کام سے روکتا ہوں لیکن تم اسی ممنوع اور غیر پسندیدہ چیزوں کو کرتے ہو! اسی طرح دوزخ کی آگ میں گرنے کی کوشش کرتے ہو۔

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ مَابَعَثَنِی اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَیْثِ الْكَثِیْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَآئِفَةٌ طَیِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَآءَ فَاَنْبَتَتِ الْكَلَاَ وَالْعُشْبَ الْكَثِیْرَ وَكَانَتْ مِنْهَا اَجَادِبُ اَمْسَكَتِ الْمَآءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَاَصَابَ مِنْهَا طَآئِفَةً اُخْرٰی اِنَّمَا هِیَ قِیْعَانٌ لَّا تُمْسِكُ مَآءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَاً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهٗ مَابَعَثَنِی اللّٰهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ یَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَاْسًا وَلَمْ یَقْبَلْ هُدَی اللّٰهِ الَّذِیْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، اس چیز کی مثال جسے خدا نے مجھے دے کر بھیجا ہے یعنی علم اور ہدایت کثیر بارش کی مانند ہے جو زمین پر ہوئی چنانچہ زمین کے اچھے ٹکڑے نے اسے قبول کر لیا یعنی اپنے اندر جذب کر لیا، اور اس سے بہت زیادہ خشک و ہری گھاس پیدا ہوئی اور زمین کا ایک ٹکڑا ایسا سخت تھا کہ اس کے اوپر پانی جمع ہو گیا اللہ نے اس سے بھی لوگوں کو نفع پہنچایا اور لوگوں نے اسے پیا اور پلایا اور کھیتی کو سیراب کیا اور یہ (بارش کا پانی) زمین کے ایسے ٹکڑے پر بھی (پہنچا) جو چٹیل سخت میدان تھا نہ تو اس نے پانی کو روکا اور نہ گھاس کو اگایا لہٰذا یہ سب (مذکورہ مثالیں) اس شخص کی مثال ہے جس نے خدا کے دین کو سمجھا اور جو چیز خدا تعالیٰ نے میری وساطت سے بھیجی تھی اس نے اس سے نفع اٹھایا پس اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو سکھایا، اور اس شخص کی مثال ہے جس نے خدا کے دین کو سمجھنے کے لئے تکبر کی وجہ سے سر نہیں اٹھایا اور خدا تعالیٰ کی ہدایت کو جو میرے ذریعہ بھیجی گئی تھی قبول نہیں کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس میں دو قسم کے آدمی ذکر کئے گئے ہیں ایک تو دین سے فائدہ اٹھانے والے اور دوسرے دین سے فائدہ نہ اٹھانے والے، اسی طرح مثال مذکورہ میں زمین دو قسم کی بیان کی گئی ہے، زمین کی ایک قسم تو وہ ہے جو پانی سے فائدہ اٹھاتی ہے، دوسرے وہ جو پانی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی پھر فائدہ اٹھانے والی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک اگانے والی اور دوسری نہ اگانے والی۔

ٹھیک اسی طرح علم دین سے بھی فائدہ اٹھانے والے دو طرح کے ہوتے ہیں، پہلا وہ شخص جو عالم بھی ہو اور عابد و فقیہ اور معلّم بھی۔ اس پر زمین کے اس ٹکڑے کی مثال صادق آتی ہے جس نے پانی کو اپنے اندر جذب کر لیا، خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا نیز گھاس بھی اگائی۔ اسی طرح اس شخص نے بھی علم [illegible] سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی اپنے علم سے مستفیض کیا۔ دوسرا وہ شخص ہے جو عالم و معلّم ہو مگر عابد و فقیہ نہ ہو، نہ تو وہ نوافل وغیرہ میں مشغول ہوا اور نہ اس نے اپنے علم میں تفقہ یعنی سمجھ بوجھ پیدا کی، اس کی مثال زمین کے اس حصہ کی مانند ہے جس میں پانی جمع ہو گیا اور لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ یا پھر زمین کا وہ حصہ جس نے پانی کو جذب بھی کیا اور گھاس بھی اگائی وہ مجتہدین کی مثال ہے کہ جنہوں نے علم حاصل کیا، پھر بہت سے مسائل کا استنباط کیا اس سے خود بھی منتفع ہوئے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا۔

اور زمین کے اس حصہ کی مثال جس میں پانی جمع ہوا، محدثین ہیں کہ انہوں نے علم حدیث حاصل کیا اور اس علم کو بعینہ دوسرے لوگوں تک پہنچا دیا، ان دونوں کے مقابلہ میں تیسرا شخص وہ ہے جس نے از راہ غرور و تکبر خدا کے دین کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکائی، نہ اس نے علم دین کی طرف کوئی توجہ و التفات کی اور نہ اس نے خدا و خدا کے رسول کے پیغام کو سنا اور نہ اس پر عمل کیا اور نہ علم کی روشنی دوسروں تک پہنچائی، اب چاہے یہ دینِ محمدی میں داخل ہو یا نہ ہو اور یا کافر ہو، اس کی مثال زمین شور کی ہے کہ جس نے نہ پانی کو قبول کر کے

اپنے اندر جذب کیا، نہ پانی کو جمع کیا اور نہ کچھ اگایا۔

⑫ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ اٰيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ" وَقَرَأَ اِلٰى "وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ" قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا رَاَيْتِ۔ وَعِنْدَ مُسْلِمٍ رَاَيْتُمُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ سَمَّاهُمُ اللّٰهُ فَاحْذَرُوْهُمْ۔ (متفق علیہ، ال عمران ۷)

"اور حضرت عائشہؓ فرمائی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ ترجمہ: یہ وہ (خدا) ہے جس نے آپ ﷺ پر کتاب نازل کی کہ جس کی بعض آیات محکم ہیں۔ اور آخر آیت وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ال عمران ۷) اور نہیں نصیحت پکڑتے مگر صاحب عقل، تک پڑھی، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ یہ آیت پڑھ کر، آنحضرت ﷺ نے فرمایا، جس وقت تو دیکھے اور مسلم کی روایت میں ہے "جب تم دیکھو" کہ لوگ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہیں تو (تم سمجھو کہ یہ) وہ لوگ ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے (کجرو یا گمراہ) رکھا ہے لہٰذا ان لوگوں سے بچتے رہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آیت کا بقیہ حصہ یہ ہے:

هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (ال عمران ۳:۷)

"اور وہی (آیات محکمات) اصل کتاب ہیں اور بعض آیات متشابہ ہیں۔ ایسے لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور مراد اصلی کا پتہ لگائیں، حالانکہ مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقلمند ہی قبول کرتے ہیں۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ آیات متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں اور ان کی اصل مراد کو پانے کے لئے اپنی عقل کے تیر چلاتے ہیں ان کو خدا نے کجرو یعنی گمراہ کہا ہے جیسا کہ آیت بالا فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ سے معلوم ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم میں دو طرح کی آیتیں ہیں اول "آیات محکمات" یہ وہ آیتیں ہیں جس کے معنی و مطلب ظاہر ہوتے ہیں ان میں اخفاء و ابہام نہیں ہوتا، دوسری آیات متشابہات ہیں یعنی جن کے معنی ظاہر نہیں ہوتے بلکہ ان کی حقیقی مراد کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے جیسے يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ وغیرہ۔

لہٰذا جو لوگ نیک اور صالح ہوتے ہیں اور جن کے قلوب ایمان و ایقان کی روشنی سے پوری طرح منور ہوتے ہیں وہ آیات محکمات کے معنی و مطالب کو سمجھتے بھی ہیں اور ان پر ایمان بھی لاتے ہیں اور آیات متشابہات پر پوری رسوخ و ایقان کے ساتھ ایمان لا کر ان کے معنی و مطالب اور حقیقی مراد کا علم اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ وہی بہتر جاننے والا ہے۔

لیکن جن لوگوں کے قلوب میں کجی ہوتی ہے اور جن کے ذہن گمراہ ہوتے ہیں وہ آیات متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور ان میں اپنی طرف سے غلط تاویلیں کر کے خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اس حدیث اور مذکورہ بالا آیات شریفہ کا یہی خلاصہ اور مطلب ہے۔

⑬ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ هَجَّرْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا قَالَ فَسَمِعَ اَصْوَاتَ رَجُلَيْنِ اخْتَلَفَا فِيْ اٰيَةٍ فَخَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَفُ فِيْ وَجْهِهِ الْغَضَبُ فَقَالَ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِاخْتِلَافِهِمْ فِي الْكِتَابِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں جو ایک (متشابہ) آیت میں اختلاف کر رہے تھے یعنی اس کے معنی میں جھگڑ رہے تھے، آں حضرت ﷺ ہمارے درمیان تشریف لائے (اس وقت) آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر غصہ کے آثار نمایاں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، تم سے پہلے کے لوگ کتاب (الٰہی) میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس سے مراد وہ اختلاف ہے جس کی وجہ سے قلوب شک میں گرفتار ہوں، یا ایمان میں کمزوری پیدا ہو اور آپس میں فتنہ و فساد اور دشمنی کا سبب نیز کفر و بدعت کا باعث ہو، جیسے نفس قرآن میں اختلاف کرنا، اس کے معنی و مطالب میں فرق پیدا کرنا، ظاہر ہے کہ ان چیزوں میں نہ تو اجتہاد جائز ہے اور نہ اختلاف کرنا صحیح ہے، ہاں علمائے مجتہدین کے اختلاف صحیح ہیں جو خدا کی رحمت کا باعث اور دین و شریعت میں وسعت کا ذریعہ ہیں، چنانچہ صحابہؓ سے اس طرح کا اجتہادی اختلاف جو فائدہ مند ہے، منقول ہے جو جائز تھا اور جس کی وجہ سے بے شمار مسائل کا استنباط ہوا اور اُمت ان سے منتفع ہوئی۔

(۱۴) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَعْظَمَ الْمُسْلِمِیْنَ فِی الْمُسْلِمِیْنَ جُرْمًا مَنْ سَأَلَ عَنْ شَیْءٍ لَمْ یُحَرَّمْ عَلَی النَّاسِ فَحُرِّمَ مِنْ اَجْلِ مَسْأَلَتِہٖ۔ (متفق علیہ)

"اور سعد بن ابی وقاصؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، مسلمانوں میں سب سے بڑا گناہ گار وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کا سوال کیا جو حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کرنے سے وہ حرام ہو گئی ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ وعید آپ ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمائی جو آپ ﷺ سے ازراہ سرکشی سوالات کرتے تھے یا ان کا سوال کرنا محض تصنع کی وجہ سے ہوتا تھا جیسا کہ بنی اسرائیل نے بقرہ کے بارے میں حضرت موسیٰ سے سوال کیا تھا۔ ہاں جن لوگوں کا سوال کرنا واقعۃً علم حاصل کرنے یا کسی ضرورت کی بنا پر ہوتا تھا وہ اس میں داخل نہیں ہیں کیونکہ ان کو تو اپنے صحیح سوالات کی بنا پر ثواب ملتا تھا۔

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَکُوْنُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ کَذَّابُوْنَ یَاْتُوْنَکُمْ مِنَ الْاَحَادِیْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا اَنْتُمْ وَلَا اٰبَاؤُکُمْ فَاِیَّاکُمْ وَاِیَّاھُمْ لَا یُضِلُّوْنَکُمْ وَلَا یَفْتِنُوْنَکُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ آخری زمانہ میں ایسے فریب دینے والے اور جھوٹے لوگ ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے جنہیں نہ تم نے سنا ہو گا اور نہ تمہارے باپوں نے سنا ہو گا لہٰذا ان سے بچو اور ان کو اپنے آپ سے بچاؤ تاکہ وہ تمہیں نہ گمراہ کریں اور نہ فتنہ میں ڈالیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آخر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زہد و تقدس کا پُر فریب لبادہ اوڑھ کر لوگوں کو بہکائیں گے، عوام سے کہیں گے کہ ہم علماء اور مشائخ میں سے ہیں اور ہمیں خدا کے دین کی طرف بلاتے ہیں، نیز جھوٹی حدیث اپنی طرف سے وضع کر کے لوگوں کے سامنے بیان کریں گے، یا پچھلے بزرگوں کی طرف غلط باتیں منسوب کر کے لوگوں کو دھوکا دیں گے، باطل احکام بتلائیں گے اور غلط عقیدوں کا بیج لوگوں میں بوئیں گے۔

لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اگر وہ ایسے لوگوں کو پائیں تو ان سے بچیں، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے مکر و فریب سے نیک لوگوں کو فتنہ میں ڈال دیں یعنی شرک و بدعت میں مبتلا کر دیں۔

اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ دین کے حاصل کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے، نیز بدعتی اور ایسے لوگوں کی صحبت سے بچنا چاہئے جو ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات کی بنا پر دین و مذہب کے نام پر لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور ان سے ربط و ضبط نہ رکھنا چاہئے ؎

چوں بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست

(۱۶) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ اَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَأُوْنَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ وَيُفَسِّرُوْنَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَقُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا الْاٰيَةَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھا کرتے تھے (جو یہودیوں کی زبان ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کی تفسیر عربی زبان میں کیا کرتے تھے سرکار دو عالم ﷺ نے ان کا یہ عمل دیکھ کر صحابہ سے فرمایا)۔ تم اہل کتاب کو نہ تو سچا جانو اور نہ ان کو جھٹلاؤ (صرف) یہ کہو کہ ہم اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم پر نازل کی گئی، ایمان لائے (آخر آیت تک)۔" (بخاریؒ)

تشریح: پوری آیت یہ ہے:

قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (سورۂ بقرہ ۲: ۱۳۶)

"(مسلمانو!) کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو کتابیں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو عطا ہوئی ان پر اور جو اور پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں ان (سب پر ایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (خدائے واحد) کے فرمانبردار ہیں۔"

آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے سامنے اہل کتاب (یعنی یہودی) تورات کی کسی عبارت کا ترجمہ و تفسیر کریں تو ان کو نہ جھٹلاؤ اور نہ ان کو سچ جانو بلکہ یہ آیت کریمہ پڑھو اور ان کو سچا اس لئے نہ جانو کہ یہ لوگ کتاب الٰہی میں تحریف کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ تمہارے سامنے جس عبارت کا ترجمہ و تفسیر کر رہے ہیں، اس کو انہوں نے بدل دیا ہو، اور ان کو جھٹلاؤ اس لئے نہیں کہ اگرچہ انہوں نے تورات میں تغیر و تبدل کر رکھا ہے لیکن پھر بھی وہ کتاب الٰہی ہے اور حق ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ شاید وہ سچ اور صحیح عبارت نقل کر رہے ہوں۔

(۱۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، انسان کے جھوٹ بولنے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جس بات کو سنے (بغیر تحقیق کے) اسے نقل کر دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی جھوٹ نہ بولتا ہو لیکن اس کی عادت یہ ہے کہ جو کچھ سنے بغیر تحقیق و تفتیش کے اسے نقل کر دیتا ہے اور لوگوں میں اسے مشہور کر دیتا ہے تو جھوٹ بولنے کے لئے یہی بہت ہے، کیونکہ سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر لینا اور بغیر تحقیق کے اس کو پھیلا دینا جھوٹ کا پہلا زینہ ہے، جو شخص ایسی عادت میں مبتلا ہو گا وہ یقیناً جھوٹ کی لعنت میں بھی گرفتار ہو گا کیونکہ وہ جو کچھ سنتا ہے اس میں سب سچ نہیں ہوتا کچھ جھوٹ بھی ہوتا ہے اور جب وہ سچ کے ساتھ جھوٹ کو نقل کرتا ہے تو وہ بھی جھوٹ ہوتا ہے۔

دراصل اس کا مقصد اس بات سے منع کرنا ہے کہ جس چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو اور اس کی صداقت کا علم نہ ہو تو اسے بیان کرنا یا اس کی تشہیر کرنا نہیں چاہئے۔

(۱۸) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ نَّبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّتِهٖ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ يَّأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ مجھ سے پہلے کسی قوم میں خدا نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے مددگار اور دوست اسی قوم سے نہ ہوں جو اس (نبی) کے طریقہ کو اختیار کرتے اور اس کے احکام کی پیروی کرتے پھر ان (دوست و مددگار) کے بعد ایسے ناخلف (نالائق) لوگ پیدا ہوتے جو لوگوں سے ایسی بات کہتے جس کو خود نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا انہیں حکم نہیں ملا تھا (جیسا کہ علماء سوء اور امراء و سرداروں کا طریقہ ہے) لہٰذ (تم سے)۔ جو خاص ان لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنے دل سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور اس کے علاوہ (جو شخص ان کے خلاف اتنا بھی نہ کر سکے اس) میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: ہاتھ سے جہاد کا مطلب تو ظاہر ہے، زبان سے جہاد کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے غلط عقائد و اعمال کی بنا پر ان کو تنبیہ کرے اور ان کو اس سے منع کرے اور ان کی برائی بیان کرتا رہے اسی طرح دل سے جہاد کے معنی یہ ہیں کہ ایسی غلط چیزوں کو برا جانے جو دین و شریعت کے خلاف ہوں اور دل میں ان کے کرنے والوں سے بغض و نفرت رکھے۔

آخر میں فرمایا گیا کہ جس شخص کا احساس اتنا مردہ ہو جائے کہ وہ غلط چیزوں کو دل سے بھی برا نہ جانے تو اس کا صاف مطلب یہ ہو گا کہ اس کے دل میں ایمان کی ہلکی سی روشنی بھی موجود نہیں ہے اس لئے کہ کسی غلط عقیدہ و عمل کو برا نہ جاننا گویا اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ وہ اس بری بات سے راضی اور خوش ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کفر کا خاصہ ہے۔

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ دَعَا اِلٰی هُدًی كَانَ لَهٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ اُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهٗ لَا یَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَیْئًا وَمَنْ دَعَآ اِلٰی ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَیْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلَ اٰثَامِ مَنْ تَبِعَهٗ لَا یَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اٰثَامِهِمْ شَیْئًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس شخص نے (کسی کو) ہدایت کی طرف بلایا اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس کو جو اس کی پیروی اختیار کرے، اور اس (پیروی کرنے والے) کے ثواب میں کچھ بھی کم نہ ہو گا۔ اور جو (کسی کو) گمراہی کی طرف بلائے اس کو اتنا ہی گناہ ہو گا جتنا کہ اس کو جو اس کی اطاعت کریں اور ان کے گناہ میں کچھ بھی کم نہ ہو گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: یعنی جو شخص کسی بھلائی کا باعث اور ذریعہ ہو گا اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس بھلائی پر عمل کرنے والے کو، لیکن ہدایت و راستی کی طرف بلانے والے کو جو ثواب ملے گا اس کی وجہ سے اس کی پیروی کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، کیونکہ اطاعت کرنے والوں کو جو ثواب ملے گا اور ان کے عمل صالح کی بنا پر ہو گا اور جو ثواب و بھلائی کی طرف بلانے والے کو ہو گا وہ اس کی دعوت و تبلیغ کی بنا پر ہو گا۔ یہی حال ان لوگوں کے گناہ کا ہے جو لوگوں کو غلط عقائد و اعمال کی طرف بلاتے ہیں اور خلاف شرع طریقہ پر عوام کو چلاتے ہیں۔

(۲۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَدَاَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَّسَیَعُوْدُ كَمَا بَدَاَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَآءِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، اسلام غربت میں شروع ہوا اور آخر میں بھی ایسا ہی ہو جائے گا۔ لہٰذا غرباء کے لئے خوشخبری ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اسلام کی ابتداء غریبوں سے ہوئی اور آخر میں بھی اسلام غریبوں میں ہی رہ جائے گا۔ یعنی ابتداء اسلام میں مسلمان غریب اور کم تھے جس کی وجہ سے انہیں اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں کی طرف ہجرت کرنی پڑی، اسی طرح آخر میں بھی ایسا ہی ہو گا کہ اسلام غریبوں ہی کی طرف لوٹ آئے گا، لہٰذا ان غرباء کے لئے جن کے قلوب ایمان و اسلام کی روشنی نے پوری طرح منور ہوں گے خوش بختی و سعادت ہے۔ اس لئے کہ آخر زمانہ میں یہی بے چارے اسلام پر ثابت قدم رہیں گے اور کتاب و سُنّت کے علوم و معارف

سے اپنی زندگیوں کو منور کریں گے۔

(۲۱) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْاِيْمَانَ لَيَأْرِزُ اِلَى الْمَدِيْنَةِ كَمَا يَأْرِزُ الْحَيَّةُ اِلٰى جُحْرِهَا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ اَبِىْ هُرَيْرَةَ ((ذَرُوْنِىْ مَا تَرَكْتُكُمْ)) فِىْ كِتَابِ الْمَنَاسِكِ وَحَدِيْثَىْ مُعَاوِيَةَ وَجَابِرٍ ((لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِىْ)) فِىْ بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِنْشَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ایمان مدینہ کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح سانپ بل کی طرف سمٹتا ہے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ذرونی ماترکتکم ہم کتاب مناسک (حج) میں ذکر کریں گے، نیز حضرت معاویہؓ و جابرؓ کی دونوں حدیثیں لایزال من امتی الخ اور لایزال طائفۃ من امتی۔ بھی اس اُمّت کے ثواب کے باب میں ذکر کریں گے انشاء اللہ: یعنی یہ حدیثیں صاحب مصابیح نے اسی باب میں ذکر کی تھیں لیکن ہم نے ان کو ان بابوں میں ذکر کیا ہے۔"

تشریح: دشمنان اسلام کے مصائب اور مظالم سے اہل ایمان کے بھاگنے اور ایمان پر ثابت قدم رہنے کی مثال آنحضرت ﷺ نے سانپ سے دی ہے اس لئے کہ دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں سانپ تیز بھاگتا ہے اور بہت سمٹ کر بل میں جاتا ہے اور پھر مشکل ہی سے وہ بل سے نکالا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی یہ پیش گوئی یا تو ابتدائے ہجرت کے وقت کے لئے تھی یا پھر آخر زمانہ کے بارہ میں جب مسلمان بہت کم رہ جائیں گے اور سب سمٹ سمٹا کر مدینہ چلے جائیں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

(۲۲) وَعَنْ رَبِيْعَةَ الْجُرَشِىِّ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اُتِىَ نَبِىُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ لَهُ لِتَنَمْ عَيْنُكَ وَلْتَسْمَعْ اُذُنُكَ وَلْيَعْقِلْ قَلْبُكَ قَالَ فَنَامَتْ عَيْنَاىَ وَسَمِعَتْ اُذُنَاىَ وَعَقَلَ قَلْبِىْ قَالَ فَقِيْلَ لِىْ سَيِّدٌ بَنٰى دَارًا فَصَنَعَ فِيْهَا مَأْدُبَةً وَّاَرْسَلَ دَاعِيًا فَمَنْ اَجَابَ الدَّاعِىَ دَخَلَ الدَّارَ وَاَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَرَضِىَ عَنْهُ السَّيِّدُ وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِىَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَاْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَسَخِطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ قَالَ فَاللّٰهُ السَّيِّدُ. وَمُحَمَّدٌ الدَّاعِىْ وَالدَّارُ الْاِسْلَامُ. وَالْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ۔

(رواہ الدارمی)

"حضرت ربیعہ[1] الجرشیؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو خواب میں فرشتے دکھلائے گئے اور آپ ﷺ سے کہا گیا (یعنی فرشتوں نے کہا) چاہئے کہ آپ کی آنکھیں سوئیں، آپ (ﷺ) کے کان سنیں اور آپ (ﷺ) کا دل سمجھے، آپ (ﷺ) نے فرمایا، تو میری آنکھیں سوئیں، میرے کانوں نے سنا اور میرے دل نے سمجھا، پھر آپ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا (یعنی مثال کے طور پر فرشتوں نے میرے سامنے بیان کیا) کہ ایک سردار نے گھر بنایا اور کھانا تیار کیا پھر ایک بلانے والے کو بھیجا (تاکہ وہ لوگوں کو بلائے) لہٰذا جس نے بلانے والے کی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں داخل ہوا اور کھانے میں سے کھایا اور سردار اس سے خوش ہوا، اور جس نے بلانے والے کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوا اور نہ کھانے میں سے کھایا اور نہ ہی اس سے سردار خوش ہوا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا، اس مثال میں سردار سے مراد خدا ہے، بلانے والے سے مراد محمد (ﷺ) ہیں، گھر سے مراد اسلام ہے اور کھانے سے مراد جنّت ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: چاہئے کہ آپ (ﷺ) کی آنکھیں سوئیں یعنی اپنی آنکھوں سے اور کچھ نہ دیکھئے، نہ کسی بات پر کان رکھئے اور نہ دل میں کوئی دوسرا سوال جمائیے فرشتوں کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ خوب غور و خوض اور حضور دل کے ساتھ اس مثال کو سنیئے جو ہم بیان کرنے والے ہیں تاکہ یہ خوب اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے، اس پر آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ فنامت عینای یعنی میری آنکھیں سوئیں الخ، اسی

---

[1] آپ کا اسم گرامی ربیعۃ بن الغاز ہے کچھ لوگوں نے انہیں ربیعہ بن عمرو بھی لکھا ہے ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے خرج راہط کے دن انتقال ہوا تھا۔

مضمون کی وہ حدیث جو پہلی فصل میں گزری اس کی مذکورہ مثال میں گھر سے جنّت اور کھانے سے بہشت کی نعمتیں مراد لی گئی تھیں، اس حدیث میں گھر سے مراد اسلام لیا گیا ہے اور کھانے سے جنّت مراد لی گئی ہے اس لئے کہ مکان بہشت میں داخل ہونے کا سبب اور ذریعہ ہے اس لئے اسے گھر کی تمثیل دی گئی ہے مادبہ کے معنی مہمان کے کھانے کے ہیں، دونوں حدیث میں اس سے مراد جنّت کی نعمتیں ہیں۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَکُمْ مُتَّکِئًا عَلٰی اَرِیْکَتِهٖ یَاْتِیْهِ الْاَمْرُ مِنْ اَمْرِیْ مِمَّا اَمَرْتُ بِهٖ اَوْ نَهَیْتُ عَنْهُ فَیَقُوْلُ لَا اَدْرِیْ مَا وَجَدْنَا فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ۔

(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ والبیہقی فی دلائل النبوۃ)

"اور حضرت ابورافع[1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے چھپر کھٹ (مسہری) پر تکیہ لگائے ہوئے ہو اور میرے ان احکام میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے کوئی حکم اس کے پاس پہنچے اور وہ (اسے سن کر) یہ کہہ دے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جو کچھ ہمیں خدا کی کتاب میں ملا ہم نے اس کی اطاعت کی۔"

(احمدؒ، ابوداؤد، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: چھپر کھٹ پر لگائے ہوئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ازراہ غرور و تکبر بے فکر ہو کر بیٹھا نہ رہے اور نہ طلب علم و حصول حدیث میں کوتاہی کرے اور نہ دینی علوم کو ترک کرے اور ازراہ جہالت و نادانی میرے کسی ایسے حکم کے بارے میں جو قرآن میں صراحت کے ساتھ موجود نہ ہو یہ نہ کہنے لگے کہ کتاب اللہ کے علاوہ میں اور کچھ نہیں جانتا اور نہ اس کے سوا کسی دوسری چیز کی پیروی کرتا ہوں اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ان جاہل اور متکبر و بے فکرے لوگوں کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی ہے جو ان احکام پر عمل کرنے میں شک و شبہ کا اظہار کریں گے یا ان کی اطاعت میں کسل و سستی کا اظہار کریں گے جو صراحت کے ساتھ قرآن میں موجود نہ ہوں گے اور ان کی ظاہر بین نظریں قرآنی علوم کے اسرار و معانی کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہیں گی۔

چنانچہ وہ لوگ یہ خیال کریں گے کہ دین و شریعت کے احکام و مسائل صرف قرآن ہی میں منحصر و مذکور ہیں حالانکہ وہ عقل کے اندھے یہ نہیں جانتے کہ بہت سے مسائل و احکام قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں وہ صرف حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں، اسی لئے علماء اہل سُنّت و الجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح احکام شرائع کے لئے قرآن دلیل و حجت ہے اسی طرح حدیث بھی دلیل و حجت ہے کیونکہ جس طرح قرآن آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا ہے، اسی طرح احادیث کے علوم و معارف بھی بارگاہ الوہیت ہی سے نازل ہوئے ہیں اور دونوں وحی ہیں۔

(۲۴) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیْکَرِبَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ، اَلَا یُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی اَرِیْکَتِهٖ یَقُوْلُ: عَلَیْکُمْ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ، فَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ، وَاِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ اَلَا لَا یَحِلُّ لَکُمُ الْحِمَارُ الْاَهْلِیُّ وَلَا کُلُّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَلَا لُقَطَةُ مُعَاهِدٍ اِلَّا اَنْ یَّسْتَغْنِیَ عَنْهَا صَاحِبُهَا، وَمَنْ نَزَلَ بِقَوْمٍ، فَعَلَیْهِمْ اَنْ یَّقْرُوْهُ فَاِنْ لَّمْ یَقْرُوْهُ فَلَهٗ اَنْ یُّعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَاهُ)) رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَرَوَی الدَّارِمِیُّ نَحْوَهٗ، وَکَذَا ابْنُ مَاجَةَ اِلٰی قَوْلِهٖ ((کَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ))۔

"اور حضرت مقدامؓ بن معدیکربؓ[2] راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، آگاہ رہو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا مثل، خبردار، عنقریب اپنے چھپر کھٹ پر پڑا ایک پیٹ بھرا شخص کہے گا کہ بس اس قرآن کو اپنے اوپر لازم جانو (یعنی فقط قرآن ہی کو سمجھو اور اس پر

[1] آپ کا اسم گرامی اسلم ہے ابورافع کنیت ہے یہ جنگ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے علامہ سیوطیؒ کے قول کے مطابق حضرت علیؓ کے دور خلافت میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

[2] اسم گرامی مقدام بن معدیکرب ہے اور کنیت بھی معدیکرب ہے، آپ صحابی ہیں شام میں ۸۷ھ میں بعمر ۹۱ سال آپ کا انتقال ہوا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عمل کرو) اور جو چیز تم قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال جانو اور جس چیز کو تم قرآن میں حرام پاؤ اسے حرام جانو حالانکہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے حرام فرمایا ہے وہ اس کے مانند ہے جسے خدا نے حرام کیا، خبردار! تمہارے لئے نہ اہلی (گھریلو) گدھا حلال کیا اور نہ کچلی رکھنے والے درندے، اور نہ تمہارے لئے معاہد یعنی وہ قوم جس سے معاہدہ کیا گیا ہو کا لقطہ حلال کیا ہے مگر وہ لقطہ حلال ہے جس کی پرواہ اس کے مالک کو نہ ہو، اور جو شخص کسی قوم کا مہمان ہو اس قوم پر لازم ہے کہ اس کی مہمانی کریں۔ اگر وہ مہمانی نہ کریں تو اس شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ مہمانی کے مانند ان سے حاصل کرے۔ (ابوداؤد) دارمی نے بھی ایسی روایت نقل کی ہے اور اسی طرح حدیث بھی مجھے بارگاہ الوہیت سے عطا ہوئی ہے۔"

تشریح: "قرآن کا مثل" حدیث ہے یعنی جس طرح قرآن مجید مجھ پر نازل کیا گیا ہے اسی طرح حدیث بھی مجھے بارگاہ الوہیت ہی سے عطا ہوئی ہے لیکن فرق یہی ہے کہ قرآن وحی ظاہر ہے اور حدیث وحی پوشیدہ۔ لہٰذا واجب العمل دونوں ہیں الالا یحل سے بطور مثال کے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان چیزوں کی حرمت قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہے میں نے ہی ان کی حرمت بیان کی ہے جس پر عمل کرنا واجب و ضروری ہے۔

اہلی گدھا اسے کہتے ہیں جو گھر میں رہتا ہے یہ حرام ہے گدھا وحشی جسے گودخر کہتے ہیں۔ ان سب کی حرمت احادیث ہی سے ثابت ہے معاہد اس کافر کو کہتے ہیں جس کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدۂ صلح و امان ہوا ہو، خواہ وہ کافر ذمی ہو یا غیر ذمی، اس کے بارہ میں فرمایا کہ اس کا لقطہ حلال نہیں ہے، ہاں اگر لقطہ ایسی چیز ہے جس سے اس کا مالک بے نیاز و بے پرواہ ہو جیسے گٹھلی، چھلکے، گاجر، مولی یا ایسی ہی کوئی حقیر چیز تو اس کے لے لینا جائز ہے لقطہ اس چیز کو کہتے ہیں جو راستہ میں گری پڑی پائی جائے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص کسی کے یہاں مہمان جائے تو میزبان پر اس کی مہمانداری لازم ہے علماء کہتے ہیں کہ یہ حکم فرض نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا مستحب و اولیٰ ہے، اسی طرح یہ حکم دینا کہ اگر میزبان مہمان نوازی نہ کر سکے تو میزبان کے لئے جائز ہے کہ وہ اس میزبان سے مہمانداری کا عوض وصول کرلے یعنی اس سے روپیہ پیسہ لے لے۔

اس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ یا تو ایسی شکل میں جائز ہوگا جب کہ مہمان ایسا مضطر و لاچار ہو کہ اگر میزبان سے وہ کچھ نہ لے تو اس کے ہلاک ہو جانے کا خطرہ ہو۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ جواز کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا لیکن اب منسوخ ہے۔

(۲۵) وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ((اَيَحْسَبُ اَحَدُكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَظُنُّ اَنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحَرِّمْ شَيْئًا اِلَّا مَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ؟ اَلَا وَاِنِّيْ وَاللّٰهِ قَدْ اَمَرْتُ وَوَعَظْتُ وَنَهَيْتُ عَنْ اَشْيَآءَ اِنَّهَا لَمِثْلُ الْقُرْاٰنِ اَوْ اَكْثَرُ، وَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحِلَّ لَكُمْ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا بِاِذْنٍ وَلَا ضَرْبَ نِسَآءِ هِمْ وَلَا اَكْلَ ثِمَارِهِمْ اِذَا اَعْطَوْكُمُ الَّذِيْ عَلَيْهِمْ)) رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَفِيْ اِسْنَادِهٖ اَشْعَثُ بْنُ شُعْبَةَ الْمَصِيْصِيُّ قَدْ تُكُلِّمَ فِيْهِ۔

"اور حضرت عرباضؓ بن ساریہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ (خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے یہ خیال رکھتا ہے کہ خدا نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جو قرآن میں ذکر کی گئی ہیں، خبردار! خدا کی قسم! بلاشک میں نے حکم دیا، میں نے نصیحت کی اور میں نے منع کیا چند چیزوں سے جو مثل قرآن کے ہیں بلکہ زیادہ ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے یہ حلال نہیں کیا کہ تم اہل کتاب کے گھروں میں اجازت حاصل کئے بغیر چلے جاؤ اور نہ تمہارے لئے ان عورتوں کو مارنا حلال ہے اور نہ تمہارے لئے ان کے پھلوں کا کھانا جائز کیا ہے جب کہ وہ اپنا مطالبہ ادا کر دیں جو ان کے ذمہ تھا۔ (ابوداؤد) اور ان کی سند میں اشعث بن شعبہ مصیصی ہیں جن کے بارے میں کلام کیا گیا ہے کہ وہ ثقہ ہیں یا نہیں؟۔"

---

[۱] حضرت عرباض ابن ساریہ کی کنیت ابونجیح ہے اور سلمی ہیں آپ اہل صفہ سے تھے۔ ان سے تابعین کی ایک بڑی جماعت روایت حدیث کرتی ہے ۷۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

تشریح: ان اللہ لم یحل سے آخر تک آنحضرت ﷺ نے چند احکام دیے ہیں وہ یہ کہ اہل کتاب کے گھروں میں ان کی اجازت کے بغیر داخل ہو کر ان کو نہ ستاؤ اور نہ ان کو پریشان کرو اور نہ ان کے گھر والوں کو ستاؤ اور نہ تکلیف پہنچاؤ اسی طرح ان کے مال کو نہ لو جب کہ وہ جزیہ ادا کریں۔

ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ یہ احکام قرآن میں مذکور نہیں ہیں بلکہ میں نے دیے ہیں اور ان چیزوں سے میں نے منع کیا ہے اور ان پر عمل کرنا واجب و ضروری ہے۔ ان احکام سے یہ کہہ کر اعراض نہیں کیا جاسکتا کہ یہ قرآن میں چونکہ موجود نہیں ہیں اس لئے واجب العمل بھی نہیں ہیں۔

آخر روایت میں لفظ رواہ کے بعد مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں جگہ خالی ہے اس لئے کہ صاحب مشکوٰۃ کو اس حدیث کے راوی کا علم نہ ہوا ہوگا۔ لیکن بعد میں میرک شاہ نے مذکورہ عبارت لکھ دی ہے۔

(۲۶) وَعَنْهُ قَالَ: صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً، ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ، وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَأَنَّ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا فَقَالَ: ((أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا فَإِنَّهٗ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ إِلَّا أَنَّهُمَا لَمْ يَذْكُرَا الصَّلَاةَ۔

"اور حضرت عرباض بن ساریہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی ہماری طرف متوجہ ہو کر بیٹھ گئے اور ہم کو نہایت موثر انداز میں نصیحت کی کہ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور دلوں میں خوف پیدا ہوگیا، ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) گویا نصیحت کرنے والے کی یہ (آخری نصیحت ہے) لہٰذا ہم کو وصیت فرمادیجئے آپ ﷺ نے فرمایا، میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرتے رہو، اور تم کو مسلمان سردار جو کہے سننے اور بجالانے کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ وہ (سردار) حبشی غلام ہو تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ اختلاف بھی دیکھے گا ایسی حالت میں تم پر لازم ہے کہ میرے اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقہ کو لازم جانو اور اسی طریقہ پر بھروسہ رکھو اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو اور تم (دین میں) نئی نئی باتیں پیدا کرنے سے بچو اس لئے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) مگر اس روایت میں ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں کیا ہے یعنی ان کی روایت میں حدیث کے الفاظ صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مذکور نہیں ہیں بلکہ حدیث وعظنا موعظۃ سے شروع ہوتی ہے۔"

تشریح: راوی کے قول کَأَنَّ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ (گویا کہ رخصت کرنے والے کی آخری نصیحت ہے) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص کوچ کرنے والا ہوتا ہے تو بروقت رخصت وعظ و نصیحت کے بیان میں کمال کوشش کرتا ہے تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بھی اس وقت اس انداز سے وعظ و نصیحت بیان فرمائی ہے گویا آپ کا وقت رحلت قریب ہے لہٰذا اس سے پہلے کہ آپ اس دنیا سے تشریف لے جائیں ہمیں ایسی وصیتیں فرمادیجئے جو دین و دنیا دونوں جگہ ہمارے لئے رہبر ہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمان سردار و حاکم کی اطاعت و فرمانبرداری ہر حال میں ضروری ہے، الا یہ کہ خلاف شریعت باتوں کا حکم نہ دے چنانچہ بطور مبالغہ فرمایا کہ اگرچہ مسلمان سردار حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو اس کی اطاعت و فرمانبرداری ضروری ہے۔ دانتوں سے پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو پورے عزم و یقین اور پختگی کے ساتھ اپنے اوپر لازم کرلیا جائے۔

(۲۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا ثُمَّ قَالَ: ((هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ)) ثُمَّ خَطَّ

خُطُوْطًا عَنْ یَمِیْنِہٖ وَعَنْ شِمَالِہٖ وَقَالَ ((ھٰذِہٖ سُبُلٌ عَلٰی کُلِّ سَبِیْلٍ مِّنْھَا شَیْطَانٌ یَدْعُوْ اِلَیْہِ)) وَقَرَأَ: ((وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ)) اَلْآیَۃَ۔ (رواہ احمد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (ہمیں سمجھانے کے لئے) ایک (سیدھا) خط کھینچا اور فرمایا۔ یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر آپ ﷺ نے اس خط کے دائیں اور بائیں کئی (چھوٹے اور ٹیڑھے) خطوط کھینچے اور فرمایا۔ یہ بھی راستے ہیں جن میں سے ہر ایک راستہ پر شیطان (بیٹھا ہوا) ہے جو اپنے راستہ کی طرف بلاتا ہے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ترجمہ: اور بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا اس کی پیروی کرو اور (دوسرے) راستے کی پیروی نہ کرو تاکہ اس میں کے راستے تمہیں منتشر نہ کریں۔" (احمدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: خط مستقیم جو آنحضرت ﷺ نے پہلے کھینچا تھا وہ راہ خدا کی مثال ہے جس سے صحیح عقائد اور نیک و صالح، اعمال مراد ہیں اور دوسرے چھوٹے و ٹیڑھے خطوط راہ شیطان کی مثال ہیں جن سے گمراہی و ضلالت کے راستے مراد ہیں۔

(۲۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ)) رَوَاہُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ قَالَ النَّوَوِیُّ فِیْ ((اَرْبَعِیْنِہٖ)) ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ رَوَیْنَاہُ فِیْ ((کِتَابِ الْحُجَّۃِ)) بِاِسْنَادٍ صَحِیْحٍ۔

"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس چیز (دین و شریعت) کی تابع نہیں ہوتیں جس کو میں (خدا کی جانب سے لایا ہوں یہ حدیث شرح السنۃ میں روایت کی گئی ہے اور امام نوویؒ نے اپنی "چہل حدیث" میں لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے جس کو ہم نے کتاب الحجۃ میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے)۔"

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کامل اس شخص کا ہوتا ہے جو دین و شریعت کا پوری طرح پیرو اور ان کی صداقت و حقانیت کا ایقان و اعتقاد پورے رسوخ کے ساتھ رکھتا ہو، نیز اس کی زندگی کے ہر پہلو میں خواہ اعتقادات و عبادات ہوں یا اعمال و عادات سب میں کمال رضا و رغبت اور بخوشی دین و شریعت [illegible]رفرما ہوں اور ظاہر ہے کہ روحانی پاکیزگی و لطافت اور عرفانی عروج کا یہ مرتبہ اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس کا قلب و دماغ خواہشات نفسانی کی تمام گندگی و ثقالت سے پاک و صاف ہو کر نور الٰہی کی مقدس روشنی سے جگمگا اٹھے، چنانچہ اولیاء اللہ اور صالحین حقیقت و معرفت کے اسی عظیم مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔

(۲۹) وَعَنْ بِلَالِ بْنِ حَارِثٍ الْمُزَنِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((مَنْ اَحْیَا سُنَّۃً مِّنْ سُنَّتِیْ قَدْ اُمِیْتَتْ بَعْدِیْ فَاِنَّ لَہٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ اُجُوْرِ مَنْ عَمِلَ بِھَا مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِھِمْ شَیْئًا وَّمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَۃً ضَلَالَۃً لَا یَرْضَاھَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ کَانَ عَلَیْہِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلُ اٰثَامِ مَنْ عَمِلَ بِھَا لَا یَنْقُصُ مِنْ اَوْزَارِھِمْ شَیْئًا)) رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنْ کَثِیْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ۔

"اور حضرت بلالؓ[1] بن حارث مزنیؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص نے میری کسی ایسی سُنّت کو زندہ کیا (یعنی رائج کیا) جو میرے بعد چھوڑ دی گئی تھی تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس سُنت پر عمل کرنے والوں کو ملے گا بغیر اس کے کہ اس (سُنت پر عمل کرنے والوں) کے ثواب میں کچھ کمی کی جائے۔ اور جس شخص نے گمراہی کی کوئی ایسی نئی بات (بدعت) نکالی جس سے اللہ اور اس کا

[1] اسم گرامی بلال بن حارث اور کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے، آخر میں آپ نے بصرہ میں سکونت اختیار فرمائی تھی حضرت معاویہؓ کے آخر زمانہ میں ۹۰ھ بعمر اسی سال [illegible] کا انتقال ہوا۔

رسول خوش نہیں ہوتا تو اس کو اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا کہ اس بدعت پر عمل کرنے والوں کو گناہ ہوگا بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی کی جائے۔(ترمذیؒ) اور اس روایت کو ابن ماجہؒ نے کثیر بن عبداللہ بن عمر سے اور عمر نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ سُنّت پر عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور سُنّت کو رائج کرنے والے کو بھی اس کے برابر ثواب ملتا ہے، اسی طرح بدعت پر عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کچھ کمی نہیں ہوتی اور بدعت پیدا کرنے والے کے نامہ اعمال میں اس کے برابر گناہ لکھا جاتا ہے۔

یہاں سُنّت سے مراد مطلق دین کی بات ہے خواہ وہ فرض ہو یا واجب وغیرہ جیسے کہ نماز جمعہ کہ لوگوں نے اسے چھوڑ رکھا ہو اور اسے تبلیغ و ارشاد کے ذریعہ قائم کیا جائے یا ایسے ہی مصافحہ اور دیگر مسنون چیزیں جو متروک العمل ہو چکی ہوں، ان سب کو رائج کرنا بے شمار حسنات کا موجب ہے۔

(۳۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اِنَّ الدِّيْنَ لَيَأْرِزُ اِلَى الْحِجَازِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ اِلٰى جُحْرِهَا وَلَيَعْقِلَنَّ الدِّيْنُ مِنَ الْحِجَازِ مَعْقِلَ الْاُرْوِيَّةِ مِنْ رَاْسِ الْجَبَلِ اِنَّ الدِّيْنَ بَدَاَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَاَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَآءِ، وَهُمُ الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَآ اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِيْ مِنْ سُنَّتِيْ)) (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمر بن عوفؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ بلاشبہ دین (اسلام) حجاز (مکہ و مدینہ اور اس کے متعلقات) کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح کہ سانپ اپنے بل کی طرف سمٹ آتا ہے، اور دین حجاز میں اس طرح جگہ پکڑ لے گا جیسے کہ بکری پہاڑ کی چوٹی پر جگہ پکڑ لیتی ہے اور دین ابتداء میں غریب پیدا ہوا تھا اور آخر میں ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ابتداء میں تھا، چنانچہ خوشخبری ہو غریبوں کو وہی اس چیز (یعنی میری سنت) کو درست کر دیں گے جس کو میرے بعد لوگوں نے خراب کر دیا ہوگا۔" (ترمذیؒ)

(۳۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَآ اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ، حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّصْنَعُ ذٰلِكَ وَاِنَّ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ اُمَّتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً) قَالُوْا مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ ((مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِيْ رِوَايَةِ اَحْمَدَ وَاَبِيْ دَاوٗدَ عَنْ مُعَاوِيَةَ ثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِي النَّارِ وَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَهِيَ الْجَمَاعَةُ وَاِنَّهٗ سَيَخْرُجُ فِيْ اُمَّتِيْ اَقْوَامٌ تَتَجَارٰى بِهِمْ تِلْكَ الْاَهْوَآءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلْبُ بِصَاحِبِهٖ لَا يَبْقٰى مِنْهُ عِرْقٌ وَّلَا مَفْصِلٌ اِلَّا دَخَلَهٗ))

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ بلاشبہ میری اُمّت پر (ایک ایسا زمانہ آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا اور دونوں میں ایسی مماثلت ہوگی) جیسا کہ دونوں جوتے بالکل برابر اور ٹھیک ہوتے ہیں یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے اگر کسی نے اپنی ماں کے ساتھ علانیہ بدفعلی کی ہوگی تو میری اُمّت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو ایسا ہی کریں گے اور بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے میری اُمّت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور وہ تمام فرقے دوزخی ہوں گے ان میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا۔ صحابہؓ نے عرض کیا! یا رسول اللہ (ﷺ) جنتی فرقہ کون سا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جس میں میں اور میرے اصحاب ہوں گے۔ (ترمذیؒ) اور احمد و ابوداؤد نے جو روایت معاویہؓ سے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ بہتر گروہ دوزخ میں جائیں گے اور ایک گروہ جنّت میں جائے گا اور وہ جنتی گروہ "جماعت" ہے اور میری اُمّت میں کئی قومیں پیدا ہوں گی جن میں خواہشات یعنی عقائد و اعمال میں بدعات اسی طرح سرائیت کر جائیں گی جس طرح ہڑک والے میں ہڑک سرایت کر جاتی ہے کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ اس سے باقی نہیں رہتا۔"

تشریح: بنی اسرائیل اور اس اُمت کی مماثلت کو جوتوں کی برابری سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح بنی اسرائیل کے لوگ اپنے زمانہ میں بداعمالیوں میں مبتلا تھے اسی طرح ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ جب اس اُمت کے لوگ بھی بالکل بنی اسرائیل کی طرح ہو جائیں گے اور ان کے عقائد و اعمال میں ان سے بالکل مطابقت ہو جائے گی۔

یہاں ماں سے حقیقی ماں مراد نہیں بلکہ باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں مراد ہے اس لئے کہ حقیقی ماں سے اس قسم کا معاملہ بالکل بعید ہے کیونکہ اس میں شرعی رکاوٹ کے ساتھ طبعی رکاوٹ بھی ہوتی ہے۔

اسی طرح "امتی" سے مراد اہل قبلہ ہیں یعنی جو مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔ اس شکل میں کُلُّهُمْ فِي النَّارِ یعنی وہ تمام فرقے دوزخ میں ہوں گے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ سب اپنے غلط عقائد اور بداعمالیوں کی بنا پر دوزخ میں داخل کئے جائیں گے، لہٰذا جس کے عقائد و اعمال اس حد تک مفسد نہ ہوں گے کہ وہ دائرہ کفر میں آتے ہوں تو اللہ کی رحمت سے وہ اپنی مدت سزا کے بعد دوزخ سے نکال لئے جائیں گے۔

آخر حدیث میں جنتی گروہ کو "جماعت" کہا گیا ہے اور اس سے مراد اہل علم و معرفت اور صاحب فقہ حضرات ہیں ان کو "جماعت" کے نام سے اس لئے موسوم کیا گیا ہے کہ یہ حضرات کلمہ حق پر جمع ہیں اور دین و شریعت پر متفق ہیں، اس موقع پر مناسب ہے کہ حدیث میں مذکورہ تہتر فرقوں کی تفصیل کر دی جائے۔

اہل اسلام میں بڑے گروہ آٹھ ہیں۔ ① معتزلہ۔ ② شیعہ۔ ③ خوارج۔ ④ مرجیہ۔ ⑤ بخاریہ۔ ⑥ جبریہ۔ ⑦ مشبہہ۔ ⑧ ناجیہ، پھر یہ آٹھوں گروہ چھوٹے چھوٹے فرقوں پر اس طرح منقسم ہیں۔

① معتزلہ کے بیس فرقے ہیں۔ ② شیعہ کے بائیس فرقے ہیں۔ ③ خوارج کے بیس فرقے ہیں۔ ④ مرجیہ کے پانچ فرقے ہیں۔ ⑤ بخاریہ کے تین فرقے ہیں اور۔ ⑥ جبریہ۔ ⑦ مشبہہ صرف ایک ایک ہی فرقے ہیں ان میں کئی فرقے نہیں ہیں اور آٹھواں فرقہ ناجیہ بھی صرف ایک ہے اور وہ اہل سُنّت و الجماعت ہیں جو جنتی ہیں۔ اس موقع پر ان فرقوں کے عقائد بھی اجمالی طور پر سن لیجئے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے تمام اعمال کا خالق ہے کاسب نہیں ہے نیز ان کا عقیدہ ہے کہ بندہ صالح کو ثواب دینا اور بدکار بندہ کو عذاب دینا خدا پر واجب اور ضروری ہے اسی طرح اس فرقہ کے لوگ باری تعالیٰ کے دیدار کا انکار کرتے ہیں، مرجیہ کا عقیدہ ہے کہ جس طرح کافر کے لئے اس کے صالح اور نیک اعمال کارآمد نہیں ہیں اسی طرح مؤمن کو اس کے اعمال بد کچھ نقصان و ضرر نہیں پہنچاتے اور نہ اس کے ایمان میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے، بخاریہ اللہ تعالیٰ کے تمام صفات کمال کا انکار کرتے ہیں اور کلام الٰہی کو حادثات مانتے ہیں۔ جبریہ کا عقیدہ ہے کہ بندہ مجبور محض ہے اسے اپنے کسی عمل پر کوئی اختیار نہیں ہے، مشبہہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو مخلوق کے مشابہ کرتے ہیں اور ذات باری تعالیٰ کی جسمیت کے قائل ہیں، نیز ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق میں حلول کرتا ہے، اور شیعہ اور خوارج کے عقائد مشہور ہی ہیں، یعنی شیعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تفضیل کے قائل ہیں، اب ان میں بھی کئی فرقے ہیں، شیعہ کے بعض فرقے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو شیخین یعنی حضرت ابوبکر و عمرؓ پر فضیلت و فوقیت دیتے ہیں لیکن شیخین کی تکفیر نہیں کرتے مگر دوسرے فرقے حضرت ابوبکر و عمرؓ کی تکفیر کے بھی قائل ہیں۔ (نعوذ باللہ) نیز بعض شیعہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ قرآن اپنی مکمل صورت میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کی بعض وہ آیتیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں تھیں، حذف کر دی گئی ہیں، خوارج حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دشمن جماعت کو کہتے ہیں یہ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تکفیر کے قائل ہیں (نعوذ باللہ)۔

اس موقع پر ایک خاص اشکال کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے:

ایک ایسا شخص جو جاہل تھا اسلام کی دولت سے مشرف ہوا، اس کے سامنے اہل سُنّت والجماعت بھی ہیں اور شیعہ کی جماعت بھی ہے دونوں اس کے سامنے اپنے حق پر ہونے کے دلائل قرآن و سُنّت سے پیش کرتے ہیں، وہ نو مسلم حیران ہے کہ وہ دونوں میں سے کسے حق جانے اور کس کے دلائل کی تصدیق کرے جب کہ وہ علم سے بالکل بے بہرہ ہے، اس کا سیدھا حل یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جو

صراحت کے ساتھ اہل سُنّت و الجماعت کے حق ہونے کی دلیلیں پیش کرتی ہیں اور وہ چیزیں ایسی صاف اور ظاہر ہیں کہ ان کا مشاہدہ عام لوگوں کو بھی ہوا کرتا ہے لہٰذا وہ ان میں غور کرے تو اس کے سامنے اہل سُنّت کی حقانیت آشکارا ہو جائے گی۔

مثلاً ایک سب سے بڑی کھلی نشانی جو آج سب کے سامنے مشاہد ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے اور وہ اہل سُنّت والجماعت ہی کے حصہ میں ہے یعنی قرآن کریم کے جتنے بھی حافظ ہوتے ہیں وہ سنی ہوتے ہیں آج تک کسی شیعہ کو حافظ نہیں دیکھا گیا اس لئے کہ ان کی قسمت میں اس عظیم نعمت سے محرومی لکھی ہوئی ہے، ہو سکتا ہے کہ لاکھوں میں کوئی ایک شیعہ حافظ نکل آئے تو یہ نادر ہے جس کا اثر کلیہ پر نہیں پڑتا کیونکہ النادر کالمعدم نادر نہ ہونے کے درجہ میں ہے۔

دوسرے یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات ہیں کہ دین محمدی اور شریعت مصطفوی کے ائمہ اور رکن دین جتنے علماء اور اولیاء تھے وہ سب سنی تھے اور ان میں سے بعض ائمہ و علماء کے شیعہ بھی معتقد ہیں۔ اگر مسلک اہل سُنّت والجماعت میں کوئی کجی یا نقص ہوتو وہ حضرات یقیناً اس مسلک کو اختیار کئے ہوئے نہ ہوتے۔

تیسرے اسلامی شعار مثلاً جمعہ، جماعت عیدین وغیرہ علی الاعلان اور کھلے بندوں صرف سنی ہی ادا کرتے ہیں اور شیعہ ان نعمتوں سے محروم و بے نصیب ہیں۔

چوتھے مکہ و مدینہ جو دین اسلام کا مبداء اور مرکز ہے اور وہاں کے باشندے اپنی بزرگی و عظمت کے لحاظ سے ضرب المثل ہیں وہاں کے لوگ بھی اسی مسلک کے پابند ہیں اگر شیعہ مسلک اچھا ہوتا تو وہ لوگ یقیناً سنی نہ ہوتے بلکہ شیعہ مسلک کے پابند ہوتے۔

اسی طرح دوسرے فرقے بھی اپنی حقانیت کے دعوے کرتے ہیں لیکن ان کا جواب یہی ہے کہ کسی کی حقانیت و بطلان پر محض دعوی کوئی حقیقت نہیں رکھتا جب تک اس دعوی کی قوی دلیل نہ ہو۔

اہل سُنّت و الجماعت کی حقانیت کی دلیل یہ ہے کہ یہ دین اسلام جو ہم تک پہنچا ہے وہ نقل کے ساتھ پہنچا ہے اس میں محض عقل کافی نہیں ہے لہٰذا تواتر اخبار اور احادیث و آثار میں تلاش و جستجو اور تنقیع کے بعد یہ بات متیقن ہو گئی ہے کہ صحابہ ؓ اکرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ اسی مسلک و اعتقاد پر تھے، دوسرے باطل فرقے سب بعد میں پیدا ہوئے، نہ تو صحابہ ان باطل فرقوں کے مسلک کے پابند تھے اور نہ دیگر نیک و صالح لوگ ان فرقوں کے ساتھ تھے اگر صحابہ ؓ اور تابعین کے زمانوں میں ان میں سے بعض باطل فرقے پیدا ہوئے تو ان لوگوں نے ان سے اپنی انتہائی نفرت و بیزاری کا اظہار کیا یہاں تک کہ ایسے غلط عقائد و مسلک کے لوگوں سے ان حضرات نے تمام تعلق و رابطے منقطع کر ڈالے، نیز صحاح ستہ کے حضرات مصنفین و دیگر محدثین علمائے ربانین اور اولیائے کاملین تمام کے تمام اہل سُنّت و الجماعت کے عقائد و مسلک کے پابند تھے۔

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اگر اہل سُنّت و الجماعت کا مسلک حق نہ ہوتا اور ان کے عقیدے صحیح نہ ہوتے تو کروڑ ہا پدم ہا پدم لوگ اس مسلک حق کے پابند نہ ہوتے جن میں صحابہ ؓ بھی تھے اور تابعین بھی، بڑے بڑے اولیاء اللہ بھی تھے اور علمائے محدثین بھی، عقلاء و دانش مند بھی تھے اور عوام بھی۔

بہر حال مسلک اہل سُنّت و الجماعت کے حق ہونے کی چند مثالیں ہیں ان کے علاوہ بھی بے شمار مثالیں ہیں جو اہل سُنّت و الجماعت کی حقانیت پر شاہد عادل ہیں، اگر نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض سے الگ ہٹ کر تلاش حق کے حقیقی جذبہ سے اہل حق کی اس جماعت کے عقائد کو دیکھا جائے تو ان کی حقانیت عیاں ہو جائے گی ورنہ بقول شاعر ۔

ہشیار کو اک حرف نصیحت ہے کافی ۔۔۔ ناداں کو کافی نہیں دفتر نہ رسالہ

اس حدیث کے ان تمام فرق باطلہ کے لوگوں کو ہڑک والوں سے مشابہت دی گئی ہے اس لئے کہ جس طرح ہڑک والے پر ہڑک غالب ہوتی ہے اور پانی سے بھاگتا ہے نتیجہ میں وہ پیاسا ہو جاتا ہے اسی طرح جھوٹے مذاہب اور باطل مسلک والوں پر بھی خواہشات

نفسانی کا غلبہ ہوتا ہے وہ علم و معرفت کے لالہ زاروں سے بھاگ کر جہل و گمرائی کی وادیوں میں جاگرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی روحانی موت واقع ہو جاتی ہے اور وہ دین و دنیا دونوں جگہ خدا کی رحمت سے محروم رہتے ہیں۔

(۳۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ اُمَّتِيْ - اَوْ قَالَ ((اُمَّةَ مُحَمَّدٍ عَلٰى ضَلَالَةٍ، وَيَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ)) (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ میری اُمت کو یا (بجائے میری اُمت کے) یہ فرمایا کہ اُمت محمدیہ کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو شخص جماعت پر ہے اور جو شخص جماعت سے الگ ہے وہ جنتیوں کی جماعت سے الگ کر کے تنہا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اللہ کے ہاتھ" سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی جانب سے توفیق و تائید اور حفاظت و مدد جماعت پر ہوتی ہے اس امت مرحومہ پر خدا کی جانب سے جہاں بہت سے احسانات ہیں وہیں اس کا یہ بھی بڑا کرم ہے کہ اُمت کے تمام لوگ کبھی ناحق اور غلط باتوں پر جمع نہیں ہوتے یہ جب بھی کسی چیز پر اتفاق کرتے ہیں وہ حق بات ہوتی ہے۔

(۳۳) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ مِنْ حَدِيْثِ اَنَسٍ وَابْنُ عَاصِمٍ فِيْ كِتَبِ السُّنَّةِ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ بڑی جماعت کی پیروی کرو! اس لئے کہ جو جماعت سے الگ ہوا وہ تنہا آگ میں ڈالا جائے گا ابن ماجہ نے یہ حدیث کتاب السنۃ سے حدیث انس و ابن عاصم سے روایت کی ہے۔"

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ انہی اعتقادات کی پیروی کرنی چاہیے جو اکثر علماء کے نزدیک حق ہوں اسی طرح ایسے اقوال و افعال کو قبول کرنا چاہیے جو جمہور علماء سے ثابت ہوں۔ اس حدیث میں لفظ رواہ کے بعد اصل مشکوۃ میں جگہ خالی تھی اس لئے کہ صاحب مشکوۃ کو اس کتاب کا نام معلوم نہیں ہوا تھا جس سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے بعد میں میرک شاہ نے مذکورہ عبارت نقل کی ہے۔

(۳۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((يَابُنَيَّ اِنْ قَدَرْتَ اَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ وَلَيْسَ فِيْ قَلْبِكَ غِشٌّ لِاَحَدٍ فَافْعَلْ)) ثُمَّ قَالَ ((يَابُنَيَّ وَذٰلِكَ مِنْ سُنَّتِيْ وَمَنْ اَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ اَحَبَّنِيْ وَمَنْ اَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ))

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ اے میرے بیٹے! اگر تم اس پر قدرت رکھتے ہو کہ صبح سے لے کر شام تک اس حال میں بسر کرو کہ تمہارے دل میں کسی سے کینہ نہ ہو تو ایسا ہی کرو! پھر فرمایا، اے میرے بیٹے! یہی میری سُنّت ہے لہٰذا جس شخص نے میری سُنّت کو محبوب رکھا اس نے مجھ کو محبوب رکھا اور جس نے مجھ کو محبوب رکھا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سُنّت اور آپ ﷺ کے طریقہ کو پسند کرنا اور اسے محبوب رکھنا آنحضرت ﷺ سے محبت رکھنے کا سبب اور جنّت میں آپ ﷺ کی رفاقت جیسی نعمت عظیم کے حصول کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا یہ سوچنے کی بات ہے کہ جب آپ ﷺ کی سُنّت کو پسند کرنے پر یہ خوشخبری ہے تو سُنّت نبوی ﷺ پر عمل کرنا کتنی بڑی سعادت و خوش بختی کی بات ہوگی۔ ذرا غور کرنا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کی سُنّت کو پسند کرنے والوں کا کتنا بڑا مرتبہ ہے وہ یہ ہے کہ انہیں جنّت میں آنحضرت ﷺ کی رفاقت و معیت کا شرف حاصل ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ دونوں جہان کی تمام نعمتیں اگر ایک طرف ہوں اور دوسری طرف یہ نعمت ہو تو یقیناً سعادت و خوشی کے اعتبار سے یہ نعمت بڑھ جائے گی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپ ﷺ کی مقدس سُنّت کو محبوب رکھنے اور اس پر عمل

کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم سب اس نعمت سے بہرہ ور ہو سکیں۔ (آمین)۔

(۳۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِیْدٍ)) رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ كِتٰبِ الزُّهْدِ لَهٗ مِنْ حَدِیْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری اُمت کے بگڑنے کے وقت جس شخص نے میری سُنّت کو دلیل بنایا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ تو بیہقی نے یہ روایت اپنی کتاب زہد میں ابن عباس سے نقل کی ہے۔"

تشریح: ایسے عظیم اجر کے ملنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ایک شہید دین اسلام کو زندہ رکھنے اور اس کی شان و شوکت کو بڑھانے کی خاطر دنیا کی تمام مصیبتیں جھیلتا ہے یہاں تک کہ اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے، اسی طرح جب کہ دین میں رخنہ اندازی ہونے لگے اور فتنہ فساد کا دور دورہ ہو تو سُنّت کو رائج کرنے اور علوم نبوی کو پھیلانے میں بے شمار مصائب و تکالیف کا سامنا ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں اس لئے اس عظیم اجر کی بشارت دی جا رہی ہے اس حدیث میں بھی لفظ رواہ کے بعد مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں جگہ خالی ہے مگر مذکورہ عبارت میرک شاہؒ نے بڑھا دی ہے۔

(۳۶) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حِیْنَ اَتَاهُ عُمَرُ فَقَالَ: اِنَّا نَسْمَعُ اَحَادِیْثَ مِنْ یَهُوْدَ تُعْجِبُنَا اَفَتَرٰی اَنْ نَّكْتُبَ بَعْضَهَا؟ فَقَالَ: اَمُتَهَوِّكُوْنَ اَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْیَهُوْدُ وَالنَّصَارٰی؟ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَیْضَآءَ نَقِیَّةً وَلَوْ كَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ كتاب شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت جابرؓ، آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں حضرت عمرؓ دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم یہود کی حدیثیں سنتے ہیں اور وہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتی ہیں کیا آپ ﷺ اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کو لکھ لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، کیا تم بھی اسی طرح حیران ہو جس طرح یہود اور نصاریٰ حیران ہیں۔ (جان لو کہ) بلاشبہ میں تمہارے پاس صاف و روشن شریعت لایا ہوں، اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو وہ بھی میری پیروی پر مجبور ہوتے۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہود و انصاری حیران ہیں کہ انہوں نے خدا کی کتاب کو اور اپنے پیغمبر کی حقیقی تعلیم کو چھوڑ دیا ہے اور اپنے خود غرض و لالچی علماء کی خواہشات کے مطیع ہو گئے ہیں، کیا اسی طرح تم بھی متحیر ہو کہ اپنے دین کو ناقص و نامکمل سمجھ کر دوسروں کے دین و شریعت کے محتاج ہو رہے ہو، حالانکہ میری لائی ہوئی شریعت اتنی مکمل اور واضح ہے کہ اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو وہ بھی میری شریعت کے پابند اور میرے احکام کے مطیع ہوتے۔

(۳۷) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ اَكَلَ طَیِّبًا وَعَمِلَ فِیْ سُنَّةٍ وَاَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَهٗ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) فَقَالَ رَجُلٌ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ هٰذَا الْیَوْمَ لَكَثِیْرٌ فِی النَّاسِ؟ قَالَ: وَسَیَكُوْنُ فِیْ قُرُوْنٍ بَعْدِیْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس شخص نے حلال (رزق) کھایا، سُنّت کے طریقہ پر عمل کیا اور اس کی زیادتیوں سے لوگ امن میں رہے تو وہ جنّت میں داخل ہوگا ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایسے لوگ تو آج کل بہت ہیں! آپ نے فرمایا، اور میرے بعد بھی ایسے لوگ ہوں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حلال رزق کا مطلب یہ ہے کہ خواہ تجارت ہو یا ملازمت یا کوئی دوسرا ذریعہ معاش، ہر جگہ ایماندار و دیانت کے دامن کو پکڑے رہے، اور حدود شریعت سے تجاوز نہ کرے نیز ایسی کوئی صورت اختیار نہ کرے جس سے اس کی کمائی حرام ہو جائے۔ جیسے اگر کوئی شخص تجارت میں خرید و فروخت کے وقت میں ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جو شریعت کی نظر میں جائز نہیں ہیں تو اس کا کمایا ہوا مال پاک و حلال

نہیں رہے گا۔ ہاں اگر اس کا طرز عمل خلاف شریعت نہیں ہوتا تو اس کی کمائی حلال ہوگی۔

شرعی نقطۂ نظر سے تجارت میں حلال کمائی کے لئے یہ شرط ہے کہ کسی مال کو فروخت کرتے وقت نہ تو عقد بیع سے پہلے نہ عقد بیع کے وقت اور عقد بیع کے بعد کوئی ایسی شکل اختیار کرے جو شرعی طور پر مفسد بیع ہو تو اس کا کمایا ہوا مال حلال وطیب ہوگا اور اگر اس کے برخلاف عمل کیا تو اس کی کمائی حلال نہیں ہوگی۔ مثلاً کسی تاجر نے کسی چیز کو فروخت کرنے کا ارادہ کیا اور عقد بیع سے پہلے دھوکہ اور فریب دینے کا خیال کیا۔ جیسے جس چیز کو فروخت کر رہا ہے اس میں کوئی عیب ہے لیکن اس نے اس کو نہ ظاہر کرنے کا ارادہ کیا تو اگرچہ عقد بیع کے وقت ایجاب وقبول شرعی طور پر ہوا ہو مگر اس کی اس فاسد نیت کی وجہ سے اس کا کمایا ہوا مال حلال نہیں ہوگا۔ یا اسی طرح فروخت کے وقت جب کہ عقد بیع واقع ہو رہا تھا یا عقد بیع کے بعد تاجر نے کوئی فاسد شرط لگادی جو جائز نہیں ہے تو اس صورت میں بھی اس کا کمایا ہوا مال حلال نہیں ہوگا جیسے دکاندار نے کسی چیز کو فروخت کیا اور خریدار سے کہا کہ بیع ہوگی لیکن شرط یہ ہے کہ ایک بوتل شراب مجھے دیا کرنا تو چونکہ یہ شرعی طور پر جائز نہیں ہے اس لئے اس کا حاصل کیا ہوا مال حلال نہیں ہوگا۔

بہرحال مطلب یہ ہے کہ خرید وفروخت کے سلسلہ میں ان تینوں اوقات میں ایسا طریقہ اختیار نہ کرنا چاہئے جو خلاف شریعت ہو تاکہ اس کا کمایا ہوا مال حلال رہے۔ پھر یہ تجارت ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اسی طرح ملازمت اور زراعت وغیرہ کا معاملہ بھی ہے کہ وہاں ایسے طریقے اختیار نہ کئے جائیں جو حلال رزق کے حصول میں رکاوٹ بنیں۔

حدیث میں دخول بہشت کے لئے دوسرا وصف یہ قرار دیا گیا ہے کہ سُنّت کی پوری پوری پیروی ہو یعنی جو بھی کام کیا جائے یا جو بھی بات کہی جائے وہ سُنّت نبوی کے مطابق ہو۔ گویا انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو خواہ وہ عبادات کا ہو یا معاملات یا معاشرت کا، سب میں سُنّت نبوی کی جھلک اور اتباع رسول کا جذبہ موجود ہو۔

چنانچہ جن اعمال کے بارہ میں احادیث وارد ہوئی ہیں ان کے مطابق ہی عمل کیا جائے یہاں تک کہ بیت الخلاء جانے اور راستہ کو کسی تکلیف دہ چیز سے صاف کرنے کے بارہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں یا جو سُنّت منقول ہے اس پر عمل کرے اور ان کے احکام کو بجا لائے۔

آخر حدیث میں صحابی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں تو ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں جو مذکورہ اوصاف سے متصف ہونے کی وجہ سے اس بشارت کے مستحق ہیں لیکن ہمارے بعد ایسے لوگ پائے جائیں گے یا نہیں؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے بعد بھی ایسے لوگ ہوں گے یعنی اس اُمت سے خیر و بھلائی بالکل ختم نہیں ہو جائے گی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آخر زمانہ میں جب کہ فتنہ فساد کا دور دورہ ہوگا، ایسے لوگوں کی کمی ہو جائے گی لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ ایسے اللہ والے لوگ اس دنیا میں رہیں گے جو حدیث وسُنّت کے طریقہ پر اپنی زندگی گزاریں گے اور ایمان ودین پر پورے یقین کے ساتھ قائم و دائم رہیں گے۔

(۳۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((اِنَّکُمْ فِیْ زَمَانٍ مَنْ تَرَكَ مِنْکُمْ عُشْرَ مَا اُمِرَ بِهٖ هَلَكَ ثُمَّ یَاْتِیْ زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا اُمِرَ بِهٖ نَجَا)) (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، تم ایسے زمانہ میں ہو کہ اگر تم میں سے کوئی شخص ان احکام کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دے جو دیئے گئے ہیں تو وہ ہلاک ہو جائے گا لیکن ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی شخص ان احکام کے دسویں حصہ پر بھی عمل کرے گا تو نجات پا جائے گا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے عہد رسالت اور مابعد کے فرق کا پتہ چلتا ہے، عہد نبوی ﷺ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا چرچا اتنی شدت اور کثرت کے ساتھ تھا کہ ذرا سی لغزش بھی ہلاکت وتباہی کا باعث بن سکتی تھی لیکن زمانہ آخر میں جب کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں

اضمحلال پیدا ہو جائے گا تو اس وقت اتنا فرق ہو جائے گا کہ اگر کوئی شخص احکام کے دسویں حصہ پر بھی عمل کرے تو یہ اس کی نجات کے لئے کافی ہو گا۔

(۳۹) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَاضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدَلَ)) ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ ((مَاضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ))

(رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، ہدایت پانے اور ہدایت پر قائم رہنے کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی مگر اس وقت جب کہ اس میں جھگڑا پیدا ہوا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے یہ آیت پڑھی مَاضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (قرآن) ترجمہ: وہ تمہارے لئے نہیں بیان کرتے مثال مگر جھگڑنے کے لئے بلکہ وہ جھگڑالو قوم ہی ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دینی معاملات اور شرعی مسائل میں جھگڑنا نہیں چاہئے اور نہ ہر کس و ناکس کو ان میں اپنی عقل کے تیر چلانے چاہیں کیونکہ زمانہ ماسبق میں ہدایت یافتہ اقوام کی گمراہی کا بیشتر سبب یہی ہوتا تھا کہ لوگ دینی معاملات میں جھگڑتے رہتے تھے اور یہ حرکت علماء سوء اور نفسانی خواہشات کے تابع لوگ کیا کرتے تھے اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دینی معاملات میں تفرقہ پیدا ہو اور لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں تاکہ غلط عقائد اور باطل مذاہب کو فروغ دیں اور حق کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکیں۔

آپ ﷺ نے جو آیت تلاوت فرمائی اس کا شان نزول یہ ہے کہ جب آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ یعنی (اے مشرکین) تم اور وہ غیر اللہ جنہیں تم پوجتے ہو دوزخ کے ایندھن ہیں، نازل ہوئی تو مشرکین بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جتنے غیر اللہ معبود ہیں وہ سب دوزخ میں جائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی نصاریٰ کے معبود ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں لہٰذا وہ بھی اس آیت کے مطابق دوزخ میں جائیں گے اور ہمارے بت حضرت عیسیٰ سے بہر حال بہتر نہیں ہیں اس لئے ہم اس پر راضی ہیں کہ ہمارے بت بھی حضرت عیسیٰ کے ساتھ دوزخ میں جائیں۔

مشرکین کے اس غلط نظریہ کے رد میں آیت مذکورہ مَاضَرَبُوْهُ لَكَ الایة نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد ﷺ یہ مشرک لوگ اس آیت کو سن کر تم سے جو بحث کرتے ہیں اور اپنی طرف سے غلط معنی مراد لے رہے ہیں وہ محض ان کی ہٹ دھرمی اور ضد ہے اور یہ مخاصمت و مجادلت کے طور پر ایسی غلط بات کہہ رہے ہیں حالانکہ یہ صاحب زبان ہیں اور عربی زبان کے اصول و قواعد انہیں معلوم ہیں اور وہ بھی جانتے ہیں کہ ماتعبدون سے پتھر وغیرہ کے بت مراد ہیں اس لئے کہ لفظ ماخود اس پر دال ہے کہ یہ حکم غیر ذوی العقول معبودوں یعنی پتھروں وغیرہ کے بتوں کے بارہ میں ہے نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خدا کے دیگر نیک بندے اس میں شامل ہیں۔

(۴۰) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَيُشَدِّدُ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ ((رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ)) (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ فرمایا کرتے تھے، تم اپنے نفس پر سختی نہ کرو اس لئے کہ پھر خدا بھی تم پر سختی کرے گا، ایک قوم (یعنی بنی اسرائیل) نے اپنے نفس پر سختی کی تھی چنانچہ اللہ نے بھی اس پر سختی کی۔ پس آج جو لوگ صومعوں اور دیار میں پائے جاتے ہیں یہ انہیں لوگوں نے پیدا کیا ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اپنی جانوں کو خواہ مخواہ زیادہ محنت و مشقت میں مبتلا نہ کرو یعنی ریاضت و مجاہدہ میں ایسے طریقے اختیار نہ کرو جن کو تمہارے قویٰ برداشت کرنے کے اہل نہ ہوں اور نہ تمہارا نفس اتنی محنت و مشقت برداشت کر سکتا ہو اور اسی طرح ایسی چیزوں کو

اپنے اوپر حرام نہ کرو جو خدا نے تمہارے لئے مباح قرار دی ہیں اس لئے کہ اگر تم اپنی طرف سے اپنی جانوں پر سختی کرو گے اور زیادہ محنت و مشقت میں پڑو گے تو خدا انہیں چیزوں کو تمہارے اوپر فرض کرے گا لیکن تمہارے اندر اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ تم ان کے حقوق ادا کر سکو، نتیجہ میں آخرت کی تباہی وہلاکت اپنے ذمہ لے لو گے۔

صومہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں عیسائی عبادت کیا کرتے ہیں جسے گرجا کہا جاتا ہے اور دیار یہود کے عبادت کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں اسی طرح رہبانیت اسے کہتے ہیں کہ عبادت و ریاضت بہت زیادہ کی جائے اپنے نفس کو مشقتوں اور تکلیفوں میں ڈالا جائے دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جائے تمام لوگوں سے اپنے کو منقطع کر لے ٹاٹ کے پیراہن استعمال کرے، گردن میں زنجیر باندھ لے قوت مردانگی کو ختم کرنے کے لئے نفسانی خواہشات کو مار ڈالنے کے لئے بالکل غیر فطری طور پر جنسی محرکات کو منقطع کر ڈالے اور دنیاوی زندگی کو یکسر چھوڑ کر جنگل و پہاڑ پر جا کر بسیرا ڈال لے، جیسا کہ رہبانیت اہل کتاب نے اپنے اوپر ضروری کر رکھی تھی اور ان کے عابد و زاہد لوگ ایسا کیا کرتے تھے لیکن چونکہ رہبانیت اسلام کے فطری اصولوں سے بالکل جدا اور الگ ہے اس لئے شریعت نے کبھی اس کو جائز قرار نہیں دیا۔

لہٰذا آنحضرت ﷺ نے رہبانیت اسلام میں ناجائز قرار دی ہے اور فرمایا ہے لا رھبانیة فی الاسلام یعنی اسلام میں رہبانیت جائز نہیں ہے، بلکہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رہبانیت کسی بھی آسمانی دین میں ضروری نہیں تھی بلکہ خود اس دین کے ماننے والے رہبانیت کو اپنی دینی و دنیاوی فلاح و کامیابی کا ذریعہ سمجھتے تھے، چنانچہ یہود و نصاریٰ میں بھی لوگوں نے خود ہی ان چیزوں کا اختراع کیا تھا اور ایسی مشقتیں و تکلیفیں اپنے اوپر لازم کر لی تھیں جو شریعت کی جانب سے ان پر فرض نہ کی گئی تھیں لیکن یہ قومیں چونکہ فطرتاً غیر مستقل مزاج، خواہشات نفسانی کی پابند اور آزاد طبع واقع ہوئی ہیں اس لئے وہ اپنے اوپر خود فرض کی ہوئی چیزوں کو بھی پورا نہ کر سکیں ان کے ذہن و قوی نہ ان کے حقوق ادا کر سکے اور نہ وہ ان پر مستقل مزاجی سے قائم رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنے دین سے بھی ہاتھ دھونا پڑا چنانچہ اکثر عیسائی اپنے دین سے منحرف ہو گئے اور انہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا بہت سے یہودی رہبانیت کو چھوڑ چھاڑ کر نصرانیت کی طرف مائل ہو گئے کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے دین پر قائم رہے یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کا زمانہ پایا اور آپ ﷺ پر ایمان لائے۔

بہر حال آنحضور کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح تم رہبانیت کو اختیار نہ کرو اور نہ غیر شرعی فطری مشقتوں میں اپنی جانوں کو مبتلا کرو بلکہ شریعت نے جو حدود متعین کر دی ہیں انہیں کے اندر اپنی زندگی گزارو اور خداوند کے رسول نے جو فرائض بتائے ہیں وہی ادا کرتے رہو۔

(۴۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((نَزَلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی خَمْسَةِ اَوْجُهٍ حَلَالٍ وَّحَرَامٍ وَّمُحْکَمٍ وَّمُتَشَابِهٍ وَّاَمْثَالٍ فَاَحِلُّوا الْحَلَالَ وَحَرِّمُوا الْحَرَامَ وَاعْمَلُوْا بِالْمُحْکَمِ وَاٰمِنُوْا بِالْمُتَشَابِهِ وَاعْتَبِرُوْا بِالْاَمْثَالِ)) هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِیْحِ وَرَوَی الْبَیْهَقِیُّ فِیْ ((شُعَبِ الْاِیْمَانِ)) وَلَفْظُهٗ: فَاعْمَلُوْا بِالْحَلَالِ وَاجْتَنِبُوا الْحَرَامَ وَاتَّبِعُوا الْمُحْکَمَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، قرآن کریم پانچ صورتوں پر نازل ہوا ہے۔ (۱) حلال۔ (۲) حرام۔ (۳) محکم۔ (۴) متشابہ۔ (۵) امثال۔ لہٰذا تم حلال کو حلال جانو، حرام کو حرام جانو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ، اور امثال (قصوں) سے عبرت حاصل کرو، یہ الفاظ مصابیح کے ہیں اور بیہقی نے جو روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ لہٰذا حلال پر عمل کرو، حرام سے بچو اور محکم کی پیروی کرو۔"

تشریح: قرآن شریف اپنے اسلوب و بیان کے اعتبار سے پانچ طرح کی آیتوں پر مشتمل ہے۔ (۱) ایسی آیتیں جن میں حلال کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے احکام بتائے گئے ہیں۔ (۲) ایسی آیتیں جن میں حرام کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے احکام بتائے گئے ہیں۔ (۳) ایسی آیتیں جن کے معنی و مطالب میں کوئی ابہام و اشتباہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے مقصد و مراد کو صاف واضح کرتی ہیں جیسے اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ (یعنی

نماز پڑھو اور زکوٰۃ ادا کرو) اس حدیث میں ایسی ہی آیتوں کو محکم کہا گیا ہے۔ ④ ایسی آیتیں جن کی مراد واضح نہیں ہے اور نہ ان کے معنی و مطالب کسی پر ظاہر کئے گئے ہیں جیسے یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (یعنی اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) حدیث میں ایسی ہی آیتوں کو متشابہ کہا گیا ہے ان کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ ایسی آیتوں کے معنی و مطالب کے کھوج کرید میں نہ لگو بلکہ ان پر صرف ایمان لاؤ اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے جو معنی مراد ہیں وہی حق اور صحیح ہیں اگرچہ ہماری رسائی ان تک نہیں ہے۔ ⑤ ایسی آیتیں جن میں پچھلی آیتوں کے حالات و واقعات کا ذکر کیا گیا ہے یعنی نیک اقوام کی فلاح و کامرانی اور بد اقوام کی تباہی و بربادی کے واقعات بتائے گئے ہیں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان واقعات سے تم عبرت پکڑو اور دیکھو کہ خدا نے اپنے نیک و صالح بندوں پر اپنی رحمتوں و نعمتوں کی کیسی بارش کی اور بدکار و سرکش قوموں کو تباہی و بربادی اور ہلاکت کی وادیوں میں کس عبرت ناک طریقہ سے پھینک دیا۔

(۴۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((اَلْاَمْرُ ثَلَاثَةٌ اَمْرٌ بَیِّنٌ رُشْدُہٗ فَاتَّبِعْہُ وَاَمْرٌ بَیِّنٌ غَیُّہٗ فَاجْتَنِبْہُ وَاَمْرٌ اُخْتُلِفَ فِیْہِ فَکِلْہُ اِلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ)) (رواہ احمد)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، امر تین طرح کے ہیں۔ ① وہ امر جس کی ہدایت ظاہر ہے اس کی پیروی کرو۔ ② وہ امر جس کی گمراہی ظاہر ہے اس سے بچو۔ ③ وہ امر جو مختلف فیہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔" (احمدؒ)

تشریح: وہ امر جس کی ہدایت ظاہر ہے ایسی چیزیں ہیں جن کا حق و صحیح ہونا واضح طور پر آیات و احادیث سے ثابت ہو جیسے نماز روزہ، زکوٰۃ و حج، وغیرہ کا فرض و واجب ہونا، ان کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی پیروی کرو، اسی طرح وہ امر جس کی گمراہی ظاہر ہے ایسی چیزیں ہیں جن کا باطل و فاسد ہونا واضح طور پر معلوم ہو جیسے کفار کی رسموں اور ان کے طور طریقوں پر عمل کرنا، ان سے بچنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

تیسرا امر مختلف فیہ ہے یعنی ایسی چیزیں جن کا حکم واضح طور پر کچھ ثابت نہ ہو بلکہ پوشیدہ اور مشتبہ ہو، بعض لوگوں نے اس کی تعریف یہ کی ہے امر مختلف فیہ وہ چیزیں ہیں جن کے احکام خدا اور خدا کے رسول نے نہ بتائے ہوں بلکہ لوگ اس کے تعیین میں اختلاف کرتے ہوں جیسے آیات متشابہات یا وقت قیامت کا تعین وغیرہ، اس کے بارہ میں حکم دیا گیا ہے کہ ایسی چیزوں میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہو بلکہ ان کے حقیقی مراد و مفہوم کا تعین خدا کے سپرد کرو وہی بہتر جاننے والا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۴۳) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((اِنَّ الشَّیْطَانَ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ کَذِئْبِ الْغَنَمِ یَاْخُذُ الشَّاذَّةَ وَالْقَاصِیَةَ وَالنَّاحِیَةَ وَاِیَّاکُمْ وَالشِّعَابَ وَعَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالْعَامَّةِ)) (رواہ احمد)

"حضرت معاذ بن جبلؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، شیطان آدمی کا بھیڑیا ہے جس طرح بکری کا بھیڑیا ہوتا ہے کہ وہ اس بکری کو اٹھا کر لے جاتا ہے جو ریوڑ سے بھاگ نکلی ہو یا ریوڑ سے دور چلی گئی ہو یا ریوڑ کے کنارے پر ہو اور تم پہاڑ کی گھاٹیوں (یعنی گمراہی) سے بچو نیز جماعت اور مجمع کا ساتھ پکڑے رہو۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح بھیڑیا جب کسی ایسی اکیلی بکری کو پالیتا ہے جو ریوڑ سے الگ ہو گئی ہو تو وہ اس پر بہت دلیر ہو جاتا ہے اور اسے اٹھا کر لے جاتا ہے اسی طرح جب کوئی شخص علماء دین کی جماعت اور ان کے گروہ سے انحراف کر کے الگ ہو جاتا ہے اور اپنی عقل و فہم کے بل بوتے پر نئے نئے مذاہب نکالتا ہے اور نت نئے مسلک پیدا کرتا ہے تو اس پر شیطان کو پوری طرح اختیار و تسلط ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص شیطان کے چنگل میں پوری طرح آکر گمراہی کی انتہائی گہری گھاٹیوں پر جا گرتا ہے۔

اس لئے آخر حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ پہاڑ کی گھاٹیوں سے بچو یعنی اسلام کی صاف و سیدھی راہ کو چھوڑ کر ایسی گھاٹیوں میں نہ جا بیٹھو جو

ضلالت و گمراہی سے بھری ہوئی ہوں۔

(۴۴) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِہٖ)) (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی (یعنی ایک ساعت کے لئے بھی) جدا ہوا، اس نے اسلام کا پٹہ اپنی گردن سے نکال دیا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: یعنی جو شخص کسی مرحلہ پر بھی جماعت سے الگ ہوا ہوگا تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ وہ اب اسلام کی قیود اور احکام کی پابندی سے بھی آزاد ہو جائے گا اور اپنی ذہنی و فکری اور عملی طاقتوں کو ایسے رخ پر موڑ دے گا جہاں نہ کوئی قید ہوگی اور نہ کسی کی پابندی بلکہ وہ خود رو، آزاد اور دین شریعت کا غیر پابند بن جائے گا۔

(۴۵) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ اَنَسٍ، مُرْسَلًا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((تَرَكْتُ فِیْكُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِھِمَا: كِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِہٖ)) (رواہ فی الموطا)

"اور حضرت مالک بن انسؒ مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہوسکتے۔ وہ کتاب اللہ (قرآن مجید) اور سُنّت رسول اللہ (احادیث) ہیں۔" (مؤطا)

(۴۶) وَعَنْ غُضَیْفِ بْنِ الْحَارِثِ الثُّمَالِیِّ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُھَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَیْرٌ مِنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ)) (رواہ احمد)

"اور حضرت غضیف[1] بن حارث ثمالی راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، جب کوئی قوم (دین میں) نئی بات نکالتی ہے (یعنی ایسی بدعت جو سُنّت کے مزاحم ہو) تو اس کے مثل ایک سُنّت اٹھالی جاتی ہے۔ لہٰذا سُنّت کو مضبوط پکڑنا نئی بات نکالنے (بدعت) سے بہتر ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: سُنّت پر عمل کرنا اگرچہ وہ معمولی درجہ کی ہو بدعت پیدا کرنے اور بدعت پر عمل کرنے سے بہتر ہے اگرچہ وہ بدعت حسنہ ہو اس لئے کہ سُنّت نبوی کے اتباع و پیروی سے روح میں جلا پیدا ہوتا ہے جس کے نور سے قلب و دماغ منور ہوتے ہیں اس کے برخلاف بدعت ظلمت و گمراہی کا سبب ہے مثلاً بیت الخلاء میں آداب سُنّت و شرع کے مطابق جانا، سرائیں بنانے اور مدرسے قائم کرنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص ان آداب کی رعایت کرتا ہوا بیت الخلاء جاتا ہے جو حدیث سے منقول ہیں تو وہ سُنّت پر عمل کرنے والا کہلائے گا۔ برخلاف اس کے کہ اگرچہ مدرسے قائم کرنا اور خانقاہیں بنانا بہت بڑا کام ہے۔ لیکن چونکہ وہ بدعت حسنہ ہے، اس لئے اس معمولی سی سُنّت پر عمل کرنے والا اتنے بڑے کام کرنے والے سے افضل ہوگا اس لئے کہ آداب سُنّت کا خیال کرنے والا اور سُنّت کی پیروی کرنے والا مقام عروج اور قرب الٰہی کی طرف ترقی کرتا ہے مگر سُنّت کو ترک کرنے والا مقام علیا سے نیچے گرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں جو افضل و اعلیٰ ہوتی ہیں وہ انہیں ترک کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک مقام آجاتا ہے کہ وہ قساوت قلبی کے مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے جسے رائن اور طبع کہتے ہیں۔

سید جمال الدینؒ سے بھی یہی منقول ہے نیز وہ لکھتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ جس نے آداب سُنّت کی رعایت کی مثلاً اس کا بیت الخلاء جانا بھی آداب سُنّت کے مطابق ہے تو خدا کی جانب سے یہ توفیق دی جاتی ہے کہ وہ اس سے اعلیٰ سُنّت پر عمل کرے۔ چنانچہ توفیق الٰہی کا وہی نور اعلیٰ مقامات کی طرف اس کی راہ نمائی کرتا رہتا ہے آخر کار وہ منزل مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ اور جو شخص کسی معمولی سُنّت کو بھی

---

[1] اسم گرامی غضیف ابن حارث ثمالی ہے اور کنیت ابواسماء ہے آپ صحابی ہیں اور انصار سے ہیں۔

ترک کرتا ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر یہ خامی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دوسری اعلیٰ و افضل چیزوں کو بھی ترک کرتا رہتا ہے اور اس کی سلامتی قلب ترک سُنّت کی ظلمت میں پھنس کر تنزل کرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ مقام رین وطبع تک جا گرتا ہے۔

مُلّا علی قاریؒ نے اس موقع پر بڑی اچھی بات کہی ہے کہ کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ کسل و سستی کی وجہ سے سُنّت کو ترک کرنا ملامت و عتاب کا باعث ہے اور سُنّت کو ناقابل اعتناء سمجھ کر اس پر عمل کرنا معصیت اور عذاب خداوندی کا سبب ہے اور سُنّت کا انکار بدعتی ہونے کا اظہار ہے لیکن اگر کسی بدعت کو خواہ وہ بدعت حسنہ کیوں نہ ہو ترک کر دیا جائے تو یہ تمام باتیں لازم نہیں آتیں۔

گویا سُنّت کو ترک کرنا بے شمار نقصان و فساد کا باعث ہے مگر بدعت کو ترک کرنا کوئی اثر نہیں ڈالتا اس لئے اس سے معلوم ہوا کہ سُنّت پر عمل کرنا خواہ وہ کتنی ہی معمولی ہو، فلاح و سعادت اور بہتری کا باعث ہے اور بدعت پر عمل کرنا خواہ وہ حسنہ ہو اس کے مقابلہ میں بہتر نہیں ہے۔

(۴۷) وَعَنْ حَسَّانَ، قَالَ: مَا ابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةً فِيْ دِيْنِهِمْ اِلَّا نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا ثُمَّ لَا يُعِيْدُهَا اِلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت حسانؓ[1] فرماتے ہیں، کہ جب کوئی قوم اپنے دین میں نئی بات (یعنی ایسی بدعت سیئہ جو سُنّت کے مزاحم ہو) نکالتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سُنّت میں سے اس کا مثل نکال لیتا ہے (یعنی جب کوئی بدعت سیئہ پیدا ہوتی ہے تو اس کے مثل سُنّت دینا سے اٹھالی جاتی ہے) اور پھر وہ سُنّت قیامت تک اس کی طرف واپس نہیں کی جاتی۔" (دارمیؒ)

(۴۸) وَعَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ مَيْسَرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ)) رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا۔ (رواہ البیہقی)

"اور حضرت ابراہیم بن میسرہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص نے بدعتی کی تعظیم کی اس نے اسلام کے ستون کو گرا دینے میں مدد کی۔" (بیہقیؒ)

تشریح: اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی بدعتی کی توقیر و عزت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں اسے سُنّت کی عزت و احترام کا کوئی خیال نہیں ہے اس طرح وہ سُنّت کی تحقیر کا باعث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ سُنّت کی تحقیر اسلام کی عمارت کو اجاڑنا ہے اسی پر اہل سُنّت کی تحقیر کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پابند شرع و سُنّت کی توہین کرتا ہے تو وہ دین و سُنّت کی عمارت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص بدعتی کی تحقیر و تذلیل کرے تو یہ اس بات کا اظہار ہوگا کہ اسے سُنّت سے محبت ہے جو دین اسلام کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا سبب ہے جس پر اسے بے شمار حسنات کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

(۴۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: مَنْ تَعَلَّمَ كِتَابَ اللّٰهِ ثُمَّ اتَّبَعَ مَا فِيْهِ هَدَاهُ اللّٰهُ مِنَ الضَّلَالَةِ فِي الدُّنْيَا وَوَقَاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُوْٓءَ الْحِسَابِ وَفِيْ رِوَايَةٍ، قَالَ: مَنِ اقْتَدٰى بِكِتَابِ اللّٰهِ لَا يَضِلُّ فِي الدُّنْيَا وَلَا يَشْقٰى فِي الْاٰخِرَةِ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ ((فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى)) (رواہ رزین)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کتاب اللہ کا علم حاصل کیا اور پھر اس چیز کی پیروی کی جو اس (کتاب اللہ) کے اندر ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں گمراہی سے ہٹا کر راہ ہدایت پر لگائے گا (یعنی اس کو ہدایت کے راستہ پر ثابت قدم رکھے گا اور گمراہی سے بچائے گا) اور قیامت کے دن اس کو برے حساب سے بچائے گا (یعنی اس سے مواخذہ نہیں ہوگا) اور ایک روایت میں ہے جس شخص نے کتاب اللہ کی

---

[1] اسم گرامی حسان ابن ثابت ہے اور کنیت ابوالولید ہے انصاری اور خزرجی ہیں بعض حضرات نے کہا ہے کہ کنیت ابوالحسام ہے حضرت حسانؓ کی وفات حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں ۴۰ھ میں ہوئی ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ وفات پچاس ہجری میں ہوئی ہے۔

پیروی کی تو نہ وہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں بدبخت ہوگا (یعنی اسے عذاب نہیں دیا جائے گا) اس کے بعد ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی ترجمہ: جس شخص نے میری ہدایت (یعنی قرآن) کی پیروی کی نہ وہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) بدبخت ہوگا۔" (رزین)

تشریح: چونکہ قرآن کریم کا پڑھنا باعث سعادت اور اس پر عمل کرنا ذریعۂ نجات ہے اس لئے جو شخص قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھے اور قرآن کو سمجھنے کی جو شرائط ہیں ان کے مطابق اس کے علوم و معارف کو حاصل کرے اور پھر قرآن کریم نے جو احکام بتائے ہیں ان پر عمل کرے اور ہدایت کا جو راستہ متعین کر دیا ہے اس پر چلتا رہے تو اس کے لئے دین و دنیا دونوں جگہ سعادت و رحمت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ دنیا میں اس پر خدا کی جانب سے رحمت ہوگی کہ وہ چونکہ قرآن کو اپنا راہبر بنا رکھے گا اس لئے گناہ و معصیت سے بچتا رہے گا برائی کے راستے کو چھوڑ دے گا جس کا نتیجہ آخرت میں یہ ہوگا کہ وہاں اس پر خدا کی بے شمار رحمتوں کا سایہ ہوگا نہ تو حساب و کتاب کی سختی ہوگی اور نہ عذاب میں مبتلا ہوگا اور یہی بندہ کے حق میں سب سے بڑی فلاح و سعادت ہے۔

⑤⓪ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا وَعَنْ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُوْرَانِ فِيْهِمَا اَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ وَعَلَى الْاَبْوَابِ سُتُوْرٌ مُرْخَاةٌ وَعِنْدَ رَأْسِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُوْلُ اِسْتَقِيْمُوْا عَلَى الصِّرَاطِ وَلَا تَعْوَجُّوْا وَفَوْقَ ذٰلِكَ دَاعٍ يَدْعُوْ كُلَّمَاهَمَّ عَبْدٌ اَنْ يَفْتَحَ شَيْئًا مِنْ تِلْكَ الْاَبْوَابِ قَالَ: وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ فَاِنَّكَ اِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ)) ثُمَّ فَسَّرَهُ فَاَخْبَرَ ((اَنَّ الصِّرَاطَ هُوَ الْاِسْلَامُ وَاَنَّ الْاَبْوَابَ الْمُفَتَّحَةَ مَحَارِمُ اللّٰهِ وَاَنَّ السُّتُوْرَ الْمُرْخَاةَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَاَنَّ الدَّاعِيَ عَلٰى رَأْسِ الصِّرَاطِ هُوَ الْقُرْاٰنُ وَاَنَّ الدَّاعِيَ مِنْ فَوْقِهٖ هُوَ وَاعِظُ اللّٰهِ فِيْ قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ)) رَوَاهُ رَزِيْنٌ وَاَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ وَكَذَا التِّرْمِذِيُّ عَنْهُ اِلَّا اَنَّهٗ ذَكَرَ اَخْصَرَ مِنْهُ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے (وہ یہ کہ) ایک سیدھا راستہ ہے اور اس کے دونوں طرف دیواریں ہیں۔ ان دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور راستہ کے سر پر پکارنے والا کھڑا ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے، سیدھے راستہ پر چلے آؤ، غلط راستے پر نہ لگو! اس پکارنے والے کے اوپر (یعنی اس کے آگے کھڑا ہوا) ایک دوسرا پکارنے والا ہے، جب کوئی بندہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے تو وہ (دوسرا پکارنے والا) پکار کر کہتا ہے، تجھ پر افسوس ہے! اس کو نہ کھول اگر تو اسے کھولے گا تو اس کے اندر داخل ہو جائے گا (اور وہاں سخت تکلیف میں ہوگا) پھر آنحضرت ﷺ نے اس مثال کی وضاحت کی اور فرمایا، سیدھا راستہ سے مراد اسلام ہے (جس کو اختیار کر کے جنت میں پہنچتے ہیں) اور کھلے ہوئے دروازوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے (جس کو اختیار کرنا تکمیل اسلام کے منافی ہے) اور (دروازوں پر) پڑے ہوئے پردوں سے مراد اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر جو پکارنے والا کھڑا ہے اس سے مراد قرآن کریم ہے اور وہ دوسرا پکارنے والا جو پہلے پکارنے والے کے آگے کھڑا ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت کرنے والا فرشتہ ہے جو ہر مؤمن کے دل میں ہے۔ زرینؒ، احمدؒ اور بیہقیؒ نے اس روایت کو شعب الایمان میں نواس بن سمعان سے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے بھی انہیں سے روایت کی ہے مگر ترمذیؒ نے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔"

تشریح: شرعی احکام زیادہ تر دو ہی قسموں سے متعلق ہیں یعنی حلال و حرام اور ان دونوں کو شریعت نے وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے جو چیزیں حلال ہیں ان کے بارہ میں بھی اعلان کر دیا گیا ہے اور جو چیزیں حرام ہیں ان کی بھی تصریح کر دی گئی ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ جس طرح حلال چیزوں پر عمل کر کے خدا کی خوشنودی و رضا کے مستحق ہو گے اسی طرح حرام چیزوں کو اختیار کر کے سزا کے مستوجب گردانے جاؤ گے جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں ان کے اور بندوں کے درمیان خدا نے اپنے احکام سے حدیں قائم کر دی ہیں تاکہ بندے اس سے تجاوز

کر کے محرمات کے ارتکاب کے مجرم نہ ہوں، انہی حرام چیزوں اور حدود کو جو احکام الٰہی ہیں اس مثال میں دروازوں اور پردوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اسی طرح مثال مذکورہ میں فرمایا گیا ہے کہ ہر مؤمن کے دل پر ایک فرشتہ ہوتا ہے جو قلب کا محافظ ہوتا ہے جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ بندہ کو نیکی کے راستہ پر لگانے کی سعی کرے اس کو تائید الٰہی اور توفیق خداوندی کہتے ہیں اگر کسی بندے کے ساتھ تائید الٰہی و توفیق خداوندی نہ ہو تو انسان کتنا بھی چاہے ہدایت کے راستہ پر نہیں لگ سکتا۔ چنانچہ مثال میں قرآن کو راہبر بتایا گیا ہے مگر اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ قرآن کی ہدایت بھی اسی وقت کارآمد ہوتی ہے جب کہ بندہ کے ساتھ تائید الٰہی اور توفیق خداوندی بھی شامل ہو۔ قرآن تو راستہ بتا دیتا ہے اور سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے مگر اس سے نصیحت حاصل کرنا اور اس راہ پر چل کر منزل مقصود تک پہنچنا اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب بندہ کے دل میں خدا کی جانب سے ہدایت ڈال دی جائے۔

(۵۱) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْمَاتَ فَاِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ اُولٰئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْآ اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرَّهَا قُلُوْبًا وَّاَعْمَقَهَا عِلْمًا وَّاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا اخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى اٰثَارِهِمْ وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ اَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَاِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيْمِ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی طریقہ کی پیروی کرنا چاہے تو اس کو چاہئے کہ ان لوگوں کی راہ اختیار کرے جو مر گئے ہیں کیونکہ زندہ آدمی (دین میں) فتنہ سے محفوظ نہیں ہوتا اور وہ لوگ جو مر گئے ہیں (اور جن کی پیروی کرنی چاہئے) آنحضرت ﷺ کے اصحاب ہیں، جو اس اُمّت کے بہترین لوگ تھے، دلوں کے اعتبار سے انتہا درجہ کے نیک، علم کے اعتبار سے انتہائی کامل اور بہت کم تکلّف کرنے والے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے منتخب کیا تھا لہٰذا تم ان کی بزرگی کو پہچانو اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرو اور جہاں تک ہو سکے ان کے آداب و اخلاق کو اختیار کرتے رہو (اس لئے کہ) وہی لوگ ہدایت کے سیدھے راستہ پر تھے۔" (رزینؒ)

تشریح: مرے ہوئے لوگوں سے مراد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں اور زندوں سے ابن مسعودؓ کے زمانہ کے لوگ اور تابعین مراد ہیں حضرت ابن مسعودؓ نے یہ ارشاد تابعین کے سامنے ازراہ نصیحت فرمایا تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس دور میں چونکہ باطل فرقے جنم لینے لگے تھے جو صحابہ کرام کی ذات اقدس کے پاک دامن پر گندگی و غلاظت کے چھینٹے ڈالتے تھے جیسا کہ رافضی اور ملحدین کے گروہ اس ناپاک مشغلہ میں لگے ہوئے تھے اس لئے ابن مسعودؓ نے ان کے غلط الزامات اور صحابہؓ پر باندھے گئے، بہتان کی رد میں صحابہؓ کی عظمت و بزرگی اور ان کی فضیلت کا اظہار فرمایا۔

چنانچہ ابن مسعودؓ شہادت دے رہے ہیں کہ صحابہؓ اُمّت کے بہترین اور انتہا درجہ کے نیک لوگ تھے۔ یعنی ان کے قلوب ایمان و اسلام کی روشنی سے پوری طرح منور تھے خلوص و استقامت کے اوصاف سے متصف تھے ایمان کامل کی دولت سے مشرف تھے اور زہد و تقدس و خشیت الٰہی سے ان کی زندگیاں معمور تھیں۔

پھر دوسری بات یہ کہ یہی وہ مقدس جماعت تھی جس نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہا اور خدا کے دین کو پھیلانے میں معین و مددگار رہے، جس کے نتیجہ میں انہیں جن جانکاہیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ ظلم و ستم اور تشدد و بربریت کے جس دور سے گزرے اور انہوں نے اسلام کی اشاعت و بقاء کے سلسلہ میں جو قربانیاں دیں وہ اسلامی تاریخ کا سب سے تابناک باب ہے۔

چنانچہ اسلامی تاریخ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان مقدس حضرات کو رسول خدا ﷺ کی معاونت اور رفاقت اور دین و اسلام

کی تبلیغ و اشاعت کے صلہ میں کتنی سختیوں اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، زندگی کی کوئی ایسی تکلیف نہ تھی جس میں یہ مبتلا نہ کئے گئے ہوں، کوئی ایسی آزمائش نہ تھی جس سے انہیں سابقہ نہ پڑا ہو اور یہ سب خدا کی جانب سے محض اس لئے تھا کہ ان کے قلوب کو خوب جانچ، پرکھ لیا جائے اور دیکھ لیا جائے کہ جس عظیم مشن کے چلانے کے لئے ان کو منتخب کیا جارہا ہے اور جس رسول کی رفاقت جیسے عظیم منصب کے لئے ان کو پسند کیا جارہا ہے ان کے ذہن و فکر اور دل و دماغ اس کے اہل ہیں یا نہیں، ان کے قلوب سختیوں کو برداشت کرنے کے قابل اور مشکلات پر صبر و شکر کرنے والے ہیں یا نہیں، چنانچہ ان کو امتحان میں ڈالا گیا ہے، آزمائش کی گئی اور وہ حضرات امتحان و آزمائش کے ہر مرحلہ سے کامیاب گزرے اور مصیبت و سختی کی ہر بھٹی سے کندن ہو کر نکلے، ان کے صبر و رضا کا جب امتحان لیا گیا تو ایسے صابر و شاکر نکلے کہ بڑی سے بڑی سختی اور سخت سے سخت مصیبت پر بھی ان کے قدم میں لغزش آنے کی بجائے اور استقامت پیدا ہوئی اور وہ اپنے ایمان و اسلام پر پورے ایقان و اعتماد کے ساتھ قائم و مضبوط رہے ان کے اسی عظیم وصف کی شہادت قرآن نے اس طرح دی ہے کہ:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى۔ (الحجرات ۳)

"یہ صحابہؓ وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے ادب کے واسطے جانچ لیا ہے۔"

اگر علم و فضل کی کسوٹی پر ان سختیوں کو پرکھا جائے تو بلا مبالغہ نتیجہ یہی قائم کرنا پڑے گا کہ ہر صحابی علم و معرفت، فہم و فراست، تدبر و تفکر، عقل و دانش کا مینارۂ نور تھا جن سے دنیا نے ظلم و جہل کے اس ماحول میں تعلیم و ترقی و تہذیب و شرافت اور انسانیت کی روشنی حاصل کی۔ چنانچہ کوئی حدیث و تفسیر میں یکتا تھا تو کوئی فقہ و قرأت کا امام کسی کے اندر تصوف و فرائض کا علم پورے کمال کے ساتھ تھا تو کسی کے اندر معانی و ادب کا بحر بیکراں موجزن تھا، غرض کہ ہر ایک اپنی جگہ علمی حیثیت سے بھی کامل و اکمل تھا۔ اور پھر یہ آنحضرت ﷺ کے شرف و صحبت کا اثر اور آپ ﷺ کی نگاہ کرشمہ ساز کا کمال تھا کہ نہ صرف مرد صحابی بلکہ عورت صحابیہ بھی اپنی اپنی جگہ علم و معرفت کے آفتاب ہدایت تھے جن سے بڑے بڑے صحابی روشنی حاصل کرتے تھے۔

روحانی و اخروی عظمت و سعادت کے اس عظیم مرتبہ پر ہوتے ہوئے ان مقدس حضرات کی بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ عملی دنیا میں بھی دولت و ثروت، اقتدار و حکمرانی اور ملک و وجاہت کے باوجود انہیں ننگے پاؤں پھرنے میں عار تھا اور نہ زمین و فرش پر نماز پڑھنے، لیٹنے بیٹھنے میں کوئی شرم محسوس ہوتی تھی۔ سادگی کی حد تھی کہ مٹی لکڑی کے برتن و باسن میں انہیں کھانے پینے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا، دوسرے لوگوں کا جھوٹا کھانا اور پینا ان کے نزدیک کوئی معیوب چیز نہ تھی، آداب گفتگو کی یہ کیفیت تھی کہ ہر ایک کی نجی بات چیت نے بھی کبھی شرافت و تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا، بیکار گفتگو، لایعنی باتیں، لغو باتوں سے کوسوں دور رہتے کلام و گفتگو وہی کرتے جو ضروری اور بامقصد ہو صاف گوئی اس درجہ کی تھی کہ جو مسئلہ انہیں معلوم نہ ہوتا نہایت صفائی سے کہہ دیتے کہ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے آج کل کی طرح خواہ مخواہ تکلف کر کے لچھے دار تقریریں کر کے مسئلے کو غلط سلط بیان نہیں کرتے تھے بلکہ وہ جسے اپنے سے افضل سمجھتے تھے نہایت خلوص کے ساتھ سائل کو ان کے پاس بھیج دیتے کہ ان سے دریافت کر لو، حصول علم کا اتنا شوق تھا کہ جس کو وہ علم میں اپنے سے بڑا سمجھتے، خواہ وہ عمر میں کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، استفادہ کے لئے اس کے پاس جانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ان کے یہاں زندگی کے کسی بھی شعبہ میں تصنع و بناوٹ نام کو بھی نہیں ہوتی تھی یہاں تک کہ وہ لوگ اگر قرآن پڑھتے تو وہ بھی کسی تصنع و بناوٹ کے بغیر اس کے پورے حقوق و آداب کو ملحوظ رکھ کر خالص عربی لہجہ میں پڑھتے تھے یہ نہیں تھا کہ خواہ مخواہ آواز بنا کر راگ و سر کے ساتھ پڑھتے ہوں۔

یہی حال ان کے باطن کا تھا چونکہ انہیں براہ راست سرکار دو عالم ﷺ سے قرب و صحبت کا شرف حاصل تھا اس لئے ان کے قلوب چاندی کی طرح مجلی و مصفا ہو کر ہمہ وقت یاد الٰہی اور ذکر اللہ میں مصروف رہتے تھے، ان کے افکار عرفان و حقیقت کی انتہائی بلندیوں پر تھے،

آج کل کے جاہل صوفیاء اور پیروں کی طرح وہ دکھلانے کے لئے حال میں آکر رقص نہ کرتے تھے نہ ہو ہا کا شور و شغب کرتے تھے اور نہ وہ اپنے قلوب کی صفائی کے لئے ہارمونیم کے ساز پر، طبلہ کی تھاپ پر اور قوالی کی تان پر حصول معرفت کا دعویٰ کرتے تھے جیسا کہ آج کے دور میں اہل اللہ کے مزارات پر ان لغویات سے تصوف و طریقت کے نام پر سرور کیف حاصل کیا جاتا ہے اور نہ وہ کسی اسکیم و تنظیم کے باعث حلقہ وغیرہ بنا کر مسجد و گھر میں ذکر جہر کرتے تھے بلکہ نہایت سادگی کے ساتھ جسے جہاں موقع مل جاتا وہیں یاد الٰہی میں نہایت صبرو سکون کے ساتھ مشغول ہو جانا ان کی اسی سادگی اور خلوص کی وجہ سے بظاہر تو ان کے اجسام فرش پر نظر آتے مگر ان کی روحیں عرش پر سیر کرتی ہوتیں، ان کے ظاہری بدن لوگوں کے ساتھ ہوتے مگر ان کے قلوب مقام قرب کی انتہائی بلندیوں پر ہوتے۔

صحابہؓ کا طرز معاشرت بھی تصنع و بناوٹ اور تکلف سے بالکل پاک و صاف تھا، انہیں جو میسر آتا وہی کھا لیتے جو مل جاتا وہی پہن لیتے، موٹا چھوٹا کپڑا ہو وہ پہن لیا، عمدہ ملا اسے استعمال کر لیا، یہ نہیں تھا کہ دنیا کو دکھلانے کے لئے یا اپنے زہد و تقدس کا رعب جمانے کے لئے حرقہ، گڑری یا ایسے ہی لباس اپنے اوپر لازم کر رکھے ہوں، ہاں جیسے بھی لباس میسر ہوتا وہ اسے بھی استعمال کرتا، کھانے پینے میں یہ تامل تھا کہ حلال رزق جیسا بھی ہوتا تھا کھاتے تھے، مزیدار اور لذیذ چیزیں مثلاً گوشت دودھ اور میوہ وغیرہ خدا کی نعمتیں اگر میسر ہوتیں تو انہیں بھی نہایت ذوق و شوق سے کھاتے اور اگر روکھا سوکھا دال دلیا ہی خدا دے دیتا تو اسے بھی نہایت صبر و شکر سے کھا لیتے۔

بہر حال عبادات ہوں یا معاملات، اخلاق و عادات ہوں، یا معیشت و معاشرت، زندگی کے ہر پہلو میں ان کے یہاں خلوص اور بے تکلفی و سادگی تھی اور انہوں نے اپنے نظام حیات کو ایسے سانچے میں ڈھال رکھا تھا جو خالص اسلامی دینی اور اخلاقی تھا اور یہ سب نگاہ نبوت کی کرشمہ سازی اور اس ذات اقدس کی صحبت کا اثر تھا جو خود اپنے قول ادبنی ربی فاحسن تادیبی (یعنی خداوند تعالیٰ نے مجھے ادب سکھایا اور ادب کے انتہائی درجہ پر پہنچایا) کے مطابق ادب و اخلاق اور تہذیب و شرافت کے تمام جواہر ازل ہی سے اپنے اندر سموئے ہوئے تھے کہ جو قوم دنیا کی سب سے زیادہ غیر مہذب، غیر متمدن، اور غیر ترقی یافتہ تھی، اصلاح و تربیت کے ذریعہ اسے تہذیب و تمدن اور اخلاق و احسان کے اس مقام رفیع تک پہنچا دیا جہاں نہ صرف یہ کہ وہ خود ایک کامل اور عظیم قوم ثابت ہوئی بلکہ دنیا کی دوسری قوموں نے اس کے نقش قدم کو اپنے لئے جادۂ منزل بنا کر تہذیب و تمدن کی انتہائی بلندیوں پر بسیرا کیا۔

چنانچہ اس حدیث میں ابن مسعودؓ لوگوں کو یہی ہدایت فرما رہے ہیں کہ اگر تم ہدایت کا راستہ چاہتے ہو، فلاح کی منزل کے خواہش مند ہو، عرفان الٰہی اور حب رسول کے انتہائی مقام پر پہنچنا چاہتے ہو تو تمہارے لئے ضروری ہے کہ اسی مقدس جماعت کے راستہ کو اختیار کرو، انہی کے اخلاق و عادات کو اپنے لئے جادۂ منزل جانو، انہی کی متابعت و پیروی کو کامیابی و کامرانی کا ذریعہ سمجھو اور ان کی عقیدت و محبت سے زندگی کے ہر گوشہ کو منور کرو۔

اس جگہ اتنی بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے ارشاد سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو صحابہؓ انتقال فرما گئے ہیں انہیں کی پیروی و اطاعت کرنی چاہئے۔ حالانکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ پیروی کے لائق صحابہؓ کی جماعت ہے خواہ وہ زندہ ہوں یا اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں مردوں کی تخصیص صرف اس لئے کی گئی ہے کہ اکثر صحابہؓ اس وقت انتقال فرما چکے تھے ورنہ یہاں زندہ اور مردہ دونوں مراد ہیں۔

اس حدیث سے صحابہؓ کی انتہائی عظمت اور فضل و کمال کا اظہار ہوتا ہے چونکہ تمام مخلوق اور تمام انسانوں میں یہ سب سے افضل تھے اور حق و صداقت کے قبول کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم ان میں موجود تھی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی کی رفاقت کے لئے منتخب فرمایا اور قرآن میں بایں طور پر ان کے فضل و کمال کی شہادت دی کہ:

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا۔ (الفتح ۲۶)

"اور ان (صحابہؓ) کو پرہیزگاری کی بات پر قائم رکھا اور وہ اس کے مستحق اور اہل تھے۔"

بعض آثار میں آیا ہے کہ پروردگار عالم نے تمام بندوں کے قلوب پر نظر فرمائی چنانچہ آنحضرت ﷺ کا قلب مبارک سب سے زیاد منور روشن اور پاک وصاف تھا تو نور نبوت اس میں ودیعت فرمایا اور صحابہ کے قلوب بھی بہت زیادہ پاک وصاف اور اہل ولائق تھے تو ان کو اپنے نبی کی رفاقت کے لئے پسند فرمایا۔

اور اتنی بات تو ہم آج خود جانتے ہیں کہ ایک شخص جب کسی پیر برحق کا مرید ہوتا ہے تو باوجودیکہ وہ پہلے سے بالکل خالی اور کورا ہوتا ہے مگر پیر کی صحبت اور اس کی خدمت و اطاعت گزاری کی وجہ سے وہ کتنے اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ صحابہؓ کرام اپنی زندگیاں آنحضرت ﷺ کی محبت میں اور اپنی عمریں آپ ﷺ کی خدمت میں صرف کر دیں اور فضل و کمال حاصل نہ کریں۔

(۵۲) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنُسْخَةٍ مِنَ التَّوْرَاةِ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! هٰذِهٖ نُسْخَةٌ مِّنَ التَّوْرَاةِ فَسَكَتَ فَجَعَلَ يَقْرَأُ وَوَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَغَيَّرُ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ مَا تَرٰى مَا بِوَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَنَظَرَ عُمَرُ اِلٰى وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُوْلِهٖ رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ بَدَا لَكُمْ مُوْسٰى فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِيْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَّاَدْرَكَ نُبُوَّتِيْ لَاتَّبَعَنِيْ)) (رواہ الدارمی)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت عمر ابن خطابؓ سرکار دو عالم ﷺ کے پاس تورات کا ایک نسخہ لائے اور عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ تورات کا نسخہ ہے، آنحضرت ﷺ خاموش رہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے (تورات کو) پڑھنا شروع کر دیا۔ ادھر غصہ سے آنحضرت ﷺ کا چہرۂ مبارک متغیر ہونے لگا (یہ دیکھ کر) حضرت ابوبکرؓ نے کہا عمر! گم کرنے والیاں تمہیں گم کریں۔ کیا تم آنحضرت ﷺ کے چہرۂ اقدس (کے تغیر) کو نہیں دیکھتے۔ حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کے چہرۂ منور کی طرف نظر ڈالی اور (غصہ کے آثار دیکھ کر کہا) میں اللہ کے غضب اور اس کے رسول کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر، اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا، قسم ہے ذات پاک کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر موسیٰ تمہارے درمیان ظاہر ہوتے تو تم ان کی پیروی کرتے اور مجھے چھوڑ دیتے (جس کے نتیجہ میں) تم سیدھے راستہ سے بھٹک کر گمراہ ہو جاتے اور (حالانکہ) اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میرا زمانۂ نبوت پاتے تو وہ (بھی) یقیناً میری (ہی) پیروی کرتے۔" (دارمیؒ)

تشریح: جملہ ثکلتک الثواکل (گم کرنے والیاں تمہیں گم کریں) اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے موت کے لئے بددعا ہے لیکن یہ ایک اہل عرب کا محاورہ ہے جو اپنے اصل معنی و مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جب اپنے کسی بے تکلف دوست سے کسی کو تعجب کا اظہار مقصود ہوتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے بے تکلف مخاطب سے ایسے موقع پر جب کہ وہ کسی ظاہری بات کو بھی نہیں سمجھ رہا ہوتا یہ کہے کہ مجھے بڑا تعجب ہے کہ یہ کھلی ہوئی بات بھی تم نہیں سمجھ رہے ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کتاب و سنّت کو چھوڑ کر یہود و نصاریٰ اور حکماء اور فلاسفہ کی کتابوں کی طرف بے ضرورت رجوع کرنا اور ان کی طرف التفات کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ یہ گمراہی کی بات ہے۔

(۵۳) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((كَلَامِيْ لَا يَنْسَخُ كَلَامَ اللّٰهِ وَكَلَامُ اللّٰهِ يَنْسَخُ كَلَامِيْ وَكَلَامُ اللّٰهِ يَنْسَخُ بَعْضُهٗ بَعْضًا))

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، میرا کلام، کلام اللہ کو منسوخ نہیں کرتا اور کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کر دیتا ہے اور کلام اللہ کا بعض حصہ بعض کو منسوخ کرتا ہے۔"

تشریح: نسخ کے منی لغت میں کسی شے کو مٹانے یا نقل و تحویل کے آتے ہیں جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ نسخت الریح اثار القوم۔ کہ ہوا نے لوگوں کے پاؤں کے نشان مٹا دیے یا اسی طرح بولتے ہیں نسخ الکتاب الی کتاب کہ ایک جگہ سے کتاب کو دوسری طرف نقل کیا۔ علماء کی اصطلاح میں نسخ اسے کہتے ہیں کہ کسی حکم شرعی کا اصلاح دین کی خاطر کسی دوسرے حکم کے ذریعہ تغیر و تبدل کیا جائے۔ یا کسی حکم کو نافذ کرنا کہ جس کے اور اس سے پیشتر کا حکم جو مقدم تھا اٹھ جائے اول حکم کو منسوخ اور دوسرے حکم کو ناسخ کہتے ہیں۔

نسخ کی چار قسمیں ہیں۔ ① کتاب اللہ کا نسخ کتاب اللہ کے ساتھ۔ ② حدیث کا نسخ حدیث کے ساتھ۔ ③ کتاب اللہ کا نسخ حدیث کے ساتھ۔ ④ حدیث کا نسخ کتاب اللہ کے ساتھ۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ مثلاً پہلے کوئی حکم قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتارا گیا لیکن بعد میں کسی خاص مصلحت کی وجہ سے قرآن کی کسی دوسری آیت نے آکر اس حکم کو منسوخ کر دیا، اب اس کی بھی دو شکلیں ہوں گی، یا تو وہ آیت قرآن میں باقی رہے اور صرف تلاوت کی جاتی رہے مگر اس کا حکم کالعدم قرار دیا گیا۔ یا یہ کہ حکم کے ساتھ آیت بھی منسوخ کر دی گئی اور اسی طرح نسخ کی دوسری شکل یہ ہے کہ حدیث کے کسی حکم کو حدیث ہی کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا ہو، تیسری شکل نسخ کی یہ ہے کہ قرآن کے کسی حکم کو حدیث کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے منسوخ فرمایا ہو، لیکن اس میں کسی قسم کا یہ اشکال پیدا نہیں ہو سکتا کہ حکم الٰہی کو رسول جو ایک انسان ہوتا ہے کس طرح کالعدم قرار دے سکتا ہے یہ اشکال وہیں رفع ہو گیا ہے جہاں یہ بتلا دیا گیا ہے کہ حدیث بظاہر تو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے مجموعہ کا نام ہے لیکن حقیقت میں حدیث بھی وحی من اللہ ہے فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن ایسی وحی ہے جس کی تلاوت نہیں کی جاتی اور جس کا مضمون براہ راست بارگاہ الوہیت سے اترتا ہے لیکن الفاظ رسول کے ہوتے ہیں اس صورت میں یہ حدیث متعارض نظر آئے گی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث قرآن کے حکم کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اس کا جواب یہی ہوگا کہ حدیث میں لفظ کلامی سے مراد آنحضرت ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو خود آنحضرت کی ذاتی رائے اور اجتہاد کے طریقہ پر وارد ہو، نہ کہ وہ ارشاد جو بطور وحی آپ ﷺ کے قلب پر القاء فرمایا گیا ہے اس تاویل کے بعد یہ تعارض رفع ہو جائے گا۔ یا پھر یہ تاویل کی جائے گی کہ یہ حدیث خود منسوخ ہے لہٰذا اس سے اس کلیہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

چوتھی شکل نسخ کی یہ ہے کہ حدیث کے کسی حکم کو کتاب اللہ کے ذریعہ منسوخ قرار دے دیا گیا ہو، یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ کسی قانون میں تبدیلی یا کسی حکم کی منسوخی دو وجہ سے ہوتی ہے اول تو یہ کہ قانون بناتے وقت بانی قانون سے کوئی فروگزاشت یا غلطی ہو گئی جس کی وجہ سے بعد میں اس قانون میں تبدیلی اور منسوخی ضروری قرار دی گئی۔

ظاہر ہے کہ کلام اللہ میں یہ محال ہے اس لئے کہ خدا کی علیم و خبیر ذات کسی قسم کی غلطی، بھول چوک یا فروگزاشت سے بالکل منزّٰی و پاک و صاف ہے اس لئے جو بھی قانون بنائے گا یا جو بھی حکم دے گا وہ بالکل صحیح و کامل ہوگا اس میں کسی غلطی کا امکان بھی نہیں ہو سکتا اسی طرح رسول کے بتائے ہوئے احکام میں بھی یہ چیز نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسے احکام جن کا تعلق دینی امور سے ہوتا ہے وہ براہ راست بارگاہ الوہیت سے نازل ہوئے ہیں اور دربار رسالت سے ان کا انعقاد عمل میں آتا ہے گویا وہ خود بھی احکام اللہ کے مرتبہ کے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن کے احکام پر عمل کرنا فرض ہے اسی طرح حدیث کے احکام کی پیروی کرنا بھی ضروری اور لازم ہے لہٰذا حدیث کے احکام میں بھی کسی حکم کی تبدیلی کا سبب یہ نہیں ہو سکتا کسی قانون و حکم کی تبدیلی و منسوخی کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ محکوم کی حالت بدلنے سے مصلحت بھی بدل گئی اس لئے قانون بھی بدل گیا جیسے کہ مریض کی حالت بدل جانے پر نسخہ بھی بدل دیا جاتا ہے۔

مثلاً ایک قانون بنایا گیا یا کوئی حکم دیا گیا اس وقت ماحول اس قسم کے قانون کا متقاضی تھا، یا محکوم کے ذہن مزاج اسی حکم کے لائق تھے مگر بعد میں جب ماحول میں تبدیلی آگئی، محکوم کے ذہن و مزاج بھی دوسرا رخ اختیار کر گئے تو اب بانی قانون کی مصلحت بھی بدل گئی لہٰذا اس نے محکوم اور ماحول کی بھلائی اور اصلاح کی خاطر اس سے پہلے قانون کو بدل دیا اور اس جگہ کسی دوسرے قانون کو لاگو کر دیا ظاہر ہے کہ ایسا

نسخ صحیح اور جائز ہوگا اس میں کسی قسم کا کوئی عقلی و نقلی اشکال پیدا نہیں ہو سکتا اور یہی تبدیلی و تفسیر اور نسخ قرآن و احادیث کے احکام میں ہوتے ہیں لہٰذا ان میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

(۵۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اِنَّ اَحَادِيْثَنَا يَنْسَخُ بَعْضُهَا بَعْضًا كَنَسْخِ الْقُرْاٰنِ))

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، ہماری (بعض) احادیث بعض کو اس طرح منسوخ کرتی ہیں جیسا کہ (قرآن کے بعض حصّہ کو) قرآن منسوخ کرتا ہے۔"

(۵۵) وَعَنْ اَبِيْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَآئِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَآءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا)) رَوَى الْاَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ الدَّارَقُطْنِيُّ۔

"اور حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ[1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے چند فرائض کو فرض کیا ہے لہٰذا تم ان کو ضائع نہ کرو (یعنی ان کو نہ چھوڑو یا ان کے شرائط و ارکان کو ترک نہ کرو، یا یہ کہ ان فرائض میں نمائش و ریا، شک و شبہ اور غرور و تکبر نہ کرو) اور چند چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں (یعنی ان کو اختیار کرنا گناہ قرار دیا ہے) لہٰذا تم ان کے نزدیک بھی مت جاؤ، اور چند حدود مقرر کی ہیں (مثلاً قصاص وغیرہ) لہٰذا تم ان سے تجاوز نہ کرو (یعنی ان میں اپنی طرف سے کمی و زیادتی نہ کرو) اور چند چیزوں کے بارہ میں بھول کر نہیں (بلکہ دانستہ) اختیار کیا ہے (یعنی کتنی چیزیں ایسی ہیں جن کے بارہ میں وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ حرام ہیں یا حلال اور یا واجب ہیں، لہٰذا ان چیزوں میں تم اپنی طرف سے) بحث نہ کرو۔ مذکورہ تینوں حدیثیں دارقطنی نے روایت کی ہیں۔"

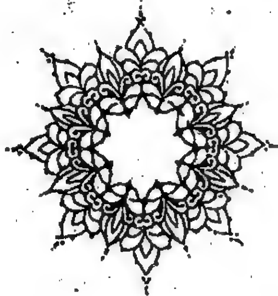

[1] آپ کے نام میں بہت زیادہ اختلاف ہے بعض نے جرہم بن ثابت کہا ہے اور بعض نے جرثوم بن ثابت اور عمر ابن جرثوم لکھا ہے بہرحال یہ اپنی کنیت ابوثعلبہ سے مشہور ہیں، ۷۵ھ میں بعہد عبدالملک بن مروان ان کا انتقال ہوا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب العلم

علم اور اس کی فضیلت کا بیان

علم کیا ہے؟ یہ وہ عظیم وصف ہے جو انسان کو نہ صرف یہ کہ شرافت و تہذیب کا سرمایہ بخشتا ہے عزت و عظمت کی دولت سے نوازتا ہے، اخلاق و عادات میں جلا پیدا کرتا ہے اور انسانیت کو انتہائی بلندیوں پر پہنچاتا ہے، بلکہ قلب انسانی کو عرفان الٰہی کی مقدس روشنی سے منور کرتا ہے، ذہن و فکر کو صحیح عقیدے کی معراج بخشتا ہے اور دل و دماغ کو خدا پرستی و اطاعت گزاری کی راہ مستقیم پر لگاتا ہے۔

اسلام! جو انسان کے لئے ترقی و عظمت کی راہ میں سب سے عظیم مینارہ نور ہے، وہ اس عظیم وصف کو انسانی برادری کے لئے ضروری قرار دیتا ہے اور اس کے حصول کو دینی و دنیوی ترقی و کامیابی کا زینہ بناتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اسلام ہر اس علم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اسلامی عقیدہ و عمل سے مزاحم ہوئے بغیر انسانی معراج کا ضامن ہو، اسلام کسی بھی علم کے حصول کو منع نہیں کرتا۔ لیکن ایسے علم سے وہ بیزاری کا اظہار بھی کرتا ہے جو ذہن و فکر کو گمراہی کی طرف موڑ دے یا انسان کو خدا کے رسول سے ناآشنا رکھ کر دہریت کے راستہ پر لگا دے۔

یہاں (کتاب العلم) کا عنوان قائم کر کے جس علم کی ضرورت و فضیلت پر مشتمل، احادیث بیان کی جا رہی ہیں وہ "علم دین ہے" جو شریعت کی نظر میں بنیادی اور ضروری حیثیت رکھتا ہے۔ دینی علم دوسرے علوم کے مقابلے میں اسلام کی نظر میں سب سے مقدم اور ضروری ہے جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد منقول ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ۔

"علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

ظاہر ہے کہ اسلام جس زندگی کا تقاضا کرتا ہے اور انسان کو عبودیت کی معراج پر دیکھنا چاہتا ہے وہ علم دین ہی پر موقوف ہے علم دین ہی کی بنا پر انسان، انسان بنتا ہے اور بندہ اپنی حقیقت کو پہچان کر ذات حق کا عرفان حاصل کرتا ہے، نیز عقیدہ و عمل کی تمام راہیں اسی سے نکلتی ہیں جس پر چل کر بندہ اپنے پروردگار کا حقیقی اطاعت گزار، رسول کا فرماں بردار اور دین و شریعت کا پابند بنتا ہے۔

(علم دین) جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر مشتمل ہے۔ اس کی دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ اول (مبادی) یعنی وسائل، دوم (مقاصد) مبادی۔ اس علم کو کہتے ہیں جس کے حصول پر کتاب و سنت کی معرفت موقوف ہے، یعنی جب تک یہ علم حاصل نہ کیا جائے قرآن و حدیث کے علوم و معارف کا عرفان حاصل نہیں ہو سکتا مثلاً لغت، صرف و نحو وغیرہ کے علوم کہ جب تک ان کو حاصل نہ کیا جائے اور ان پر نظر نہ ہو کتاب و سنت کا علم صحیح طور پر نہیں آسکتا اور نہ ان کے حقیقی منشا، و مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مقاصد۔ وہ علم ہے جو عقائد، اعمال اور اخلاق سے متعلق ہے۔ یعنی یہی وہ علم ہے جو مقصود بالذات اور فی نفسہ ضروری ہے اور اسی کو حاصل کر کے دین و شریعت کی پابندی کا سیدھا راستہ سامنے آتا ہے۔ "ان سب کو علم معاملات" بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک "علم مکاشفہ" بھی ہوتا ہے۔ یہ دراصل وہ نور ہوتا ہے جو علم پر عمل کرنے سے قلب میں پیدا ہوتا ہے جس کی مقدس روشنی سے ہر چیز کی حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور احوال کی معرفت پیدا ہوتی ہے اس علم مکاشفہ کو علم حقیقت اور علم وراثت بھی کہتے ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ مَالَمْ يَعْلَمْ۔

"جو شخص علم پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس چیز کا علم نصیب کرتا ہے جو نہ جانا جاتا ہے اور نہ پڑھا جاتا ہے۔"

بہرحال، علم ظاہر و علم باطن کی جو اقسام مشہور ہیں وہ یہی ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور ان دونوں میں بدن و روح اور پوست و مغز کی نسبت ہے۔ نیز علم کی فضیلت میں جو آیتیں وارد ہیں، یا جو احادیث منقول ہیں وہ ان تمام اقسام کو مراتب درجات کے تفاوت کے ساتھ شامل ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً وَحَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)) (رواہ البخاری)

"حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔ اور بنی اسرائیل سے جو قصے سنو لوگوں کے سامنے بیان کرو یہ گناہ نہیں ہے اور جو شخص قصداً میری طرف جھوٹ بات منسوب کرے اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں ڈھونڈ لے۔" (بخاری)

تشریح: آیت سے مراد وہ حدیث ہے جو بظاہر چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن افادیت کے اعتبار سے علوم و معارف کے بحر بیکراں اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتی ہیں جیسے ایک چھوٹی سی حدیث ہے کہ مَنْ صَمَتَ نَجَا یعنی جو خاموش رہا وہ نجات پا گیا۔ یا اسی طرح دوسری مختصر مگر جامع احادیث گویا اس جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ تم میری کسی ایسی حدیث کو پاؤ جو باعتبار الفاظ کے بہت چھوٹی اور مختصر ہو مگر اس کو دوسروں تک ضرور پہنچاؤ اور اس کی افادیت سے دوسروں کو روشناس کراؤ۔ علماء لکھتے ہیں اس حدیث کا اصل مقصد علم کو پھیلانے اور دوسروں کو علم کی روشنی سے منور کرنے کی ترغیب دلانا ہے کہ جہاں تک ہو سکے علم کے پھیلانے اور دین کی بات کو پہنچانے میں سعی و کوشش کرنی چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ تم جس بات کو دوسروں تک پہنچا رہے ہو اگرچہ وہ بہت مختصر ہے مگر کیا تعجب کہ اسی سے اس کی دنیا بھی سنور جائے اور دین بھی بن جائے اور وہ راہ ہدایت کو پالے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ایک شخص کی ہدایت ہوگی اور وہ راہ راست پر لگ جائے گا بلکہ اس کی وجہ سے تمہیں بھی اجر ملے گا اور بے شمار حسنات سے نوازے جاؤ گے۔

حدیث میں دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ اگر بنی اسرائیل سے کوئی قصہ سنو یا تمہیں ان سے کوئی واقعہ معلوم ہو تو تم اس کو لوگوں سے بیان کر سکتے ہو مگر ان کے احکام وغیرہ کو نقل کرنے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ گذشتہ احادیث میں گزر چکا ہے۔ اس لئے کہ کسی واقعہ یا قصہ کو محض خبر کے طور پر بیان کر دینا شرعی امور میں کوئی نقصان پیدا نہیں کرتا مگر ان کے احکام کو نقل کرنا یا ان کی تبلیغ کرنا شریعت محمدی کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ جب اس دنیا میں شریعت محمدی کا نفاذ ہو گیا ہے تو اب تمام دوسری شریعتیں منسوخ اور کالعدم قرار دے دی گئی ہیں۔ لہٰذا شریعت محمدی کو چھوڑ کر دوسری شریعت کے احکام و اعمال کی تبلیغ کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ آخر حدیث میں

آنحضرت ﷺ کی طرف کسی غلط بات کو منسوب کرنے پر نہایت سخت الفاظ میں زجر و توبیخ فرمائی گئی ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص میری طرف کسی غلط بات کا انتساب کرتا ہے اور مجھ پر بہتان باندھتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ جہنم کی آگ میں جلنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس لئے کہ ایسا بدبخت جو دنیا کی سب سے بڑے صادق و مصدوق ہستی پر بہتان باندھتا ہے وہ اسی سزا کا مستحق ہے کہ اسے جہنم کے شعلوں کے حوالے کر دیا جائے۔

اس بارہ میں جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے علماء متفقہ طور پر یہ لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس کی طرف کسی ایسی بات یا ایسے عمل کی نسبت کرنا جو واقعہ میں آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور ایسا کاذب انسان خدا کے سخت عذاب میں گرفتار کیا جائے گا اور بعض علماء مثلاً امام محمد جوینیؒ نے تو اس جرم کو اتنا قابل نفرت اور سخت خیال کیا ہے کہ وہ ایسے شخص کے بارے میں کفر کا حکم لگاتے ہیں۔

حدیث "من کذب علی متعمدًا فلیتبو أمقعده من النار" یعنی جو شخص قصدًا میری طرف جھوٹ بات کی نسبت کرے اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے۔" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے پایہ اور اونچے درجہ کی حدیث ہے اور اس کا شمار متواترات میں ہوتا ہے بلکہ دوسری متواتر حدیثیں اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچتی ہیں۔ اس لئے کہ اس حدیث کو صحابہؓ کی ایک بہت بڑی جماعت نقل کرتی ہے چنانچہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو باسٹھ صحابہؓ نے روایت کیا ہے جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

(۲) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ وَالْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (مَنْ حَدَّثَ عَنِّىْ بِحَدِيْثٍ يُرٰى اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ)۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سمرہؓ[1] بن جندب اور مغیرہؓ[2] بن شعبہ رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص میری (طرف منسوب کر کے کوئی ایسی) حدیث بیان کرے جس کے بارے میں اس کا یہ خیال ہو کہ وہ جھوٹی ہے تو وہ جھوٹے آدمیوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی حدیث کو لوگوں کے سامنے بیان کرے اور اس کی اشاعت کرے جو واقعۃً میری حدیث نہیں ہے اور پھر اس کو یہ معلوم بھی ہو کہ میں جو حدیث بیان کر رہا ہوں وہ حقیقت میں آنحضرت ﷺ کی حدیث نہیں ہے بلکہ وضع کی گئی ہے تو وہ شخص جس نے یہ جھوٹی حدیث وضع کی ہے اس لئے جھوٹا ہے کہ اس نے ذات رسالت کی طرف غلط اور جھوٹ بات کی نسبت کی ہے تو یہ شخص بھی جو اس حدیث کو بیان کر رہا ہے اس لئے جھوٹا اور کذاب ہے کہ وہ اشاعت کر کے اور یہ جان کر بھی کہ یہ غلط حدیث ہے دوسروں تک پہنچا کر اس شخص کی مدد کر رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس طرح جھوٹی حدیث بنانے والا خدا کے عذاب میں گرفتار ہو گا اسی طرح اس کو بیان کرنے والے سے بھی آخرت میں مواخذہ کیا جائے گا اور اسے سخت سزا دی جائے گی۔

(۳) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِى الدِّيْنِ وَاِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِىْ)) (متفق علیہ)

"اور حضرت معاویہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص کے لئے خدا تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے اور میں (علم کو) تقسیم کرنے والا ہوں عطا کرنے والا تو خدا ہی ہے۔" (بخاری و مسلم)

---

[1] اسم گرامی سمرہ ابن جندب اور کنیت ابوسعد ہے ۵۸ھ، ۵۹ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ (اسد الغابہ)

[2] اسم گرامی مغیرہ بن شعبہ ہے کنیت ابوعبداللہ اور بعض حضرات کے قول کے مطابق ابوعیسیٰ ہے ۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔ (اسد الغابہ)

تشریح: اس حدیث سے علم اور عالم کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے کہ جس شخص کو خداوند تعالیٰ خیر و بھلائی کے راستہ پر لگانا چاہتا ہے اسے علم کی دولت عنایت فرماتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے کہ وہ کسی شخص کو دینی امور یعنی احکام شریعت اور راہ طریقت و حقیقت کی سمجھ عنایت فرمادے جو ہدایت و راستی اور خیر و بھلائی کی سب سے بڑی شاہراہ ہے۔

حدیث کے دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ علم کا مبداء حقیقی تو باری تعالیٰ کی ذات ہے میرا کام تو صرف یہ ہے کہ میں دینی مسائل اور شرعی احکام لوگوں تک پہنچادوں اور حدیث بیان کردوں۔ اب آگے خدا تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ جسے جتنا چاہے ان پر عمل کرنے کی توفیق اور غور و فکر کی صلاحیت عنایت فرمائے۔

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((النَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا)) (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ آدمی کان ہیں جس طرح سونے اور چاندی کی کان ہوتی ہے جو لوگ ایام جاہلیت میں بہتر تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی بہتر ہیں اگر وہ سمجھیں۔" (مسلم)

تشریح: انسان کو معدن یعنی کان سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ تشبیہ نیک اخلاق و عادات اور صفات و کمالات کی استعداد و صلاحیت کے تفاوت میں دی گئی ہے کہ جس طرح ایک کان میں لعل و یاقوت پیدا ہوتے ہیں تو دوسری کان میں سونا، چاندی اور بعض کان میں چونا، سرمہ، پتھر وغیرہ ہی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی ذات ہے کہ بعض تو اپنے اخلاق و عادات اور صفات و کمالات کی بنا پر باعظمت اور باشوکت ہوتے ہیں بعض ان سے کچھ کم درجہ کے ہوتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان صفات میں انتہائی کمتر و بے وقعت ہوتے ہیں۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لانے سے پہلے حالت کفر میں بہترین خصائل و عادات کے مالک تھے مثلاً سخاوت و شجاعت، اخلاق و دیانتداری اور محبت و مروت کی بہترین صفات سے متصف تھے تو وہ اسلام لانے کے بعد بھی ان صفات کی بناء پر بہترین قرار دیئے گئے ہیں۔

ٹھیک ایسے ہی جیسے کہ سونا اور چاندی جب تک کان میں پڑے رہتے ہیں کہ وہ خاک میں پڑے رہنے کی وجہ سے اپنی اصلی حالت میں نہیں ہوتے جب انہیں کان سے نکال لیا جاتا ہے اور بھٹی میں ڈال کر تپایا جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنی اصلی صورت میں آجاتے ہیں بلکہ ان کی آب و تاب میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب تک کوئی شخص کفر کی ظلمت میں چھپا رہتا ہے تو خواہ وہ کتنا ہی باوقار ہو اور اس کے اندر کتنی ہی سخاوت ہو، کتنی ہی شجاعت ہو اسے برتری حاصل نہیں ہوتی، مگر جب کفر کے تمام پردوں کو چاک کر کے ظلم سے باہر نکلتا ہے اور ایمان و اسلام کو قبول کر کے علم دین میں کمال حاصل کر لیتا ہے اور پھر اپنے آپ کو ریاضت و مجاہدہ اور دینی محنت و مشقت کی بھٹیوں کے حوالہ کر دیتا ہے تو اس کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ اپنی اصل حالت میں آجاتا ہے بلکہ علم و معرفت کی روشنی سے اس کا قلب و دماغ منور ہو جاتا ہے اور وہ عزت کی انتہائی بلندیوں پر جا پہنچتا ہے۔

⑤ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهٗ عَلٰى هَلَكَتِهٖ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا)) (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ دو شخصوں کے بارے میں حسد کرنا ٹھیک ہے ایک تو وہ شخص جسے خدا نے مال دیا اور پھر اسے راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق عنایت فرمائی۔ دوسرا وہ شخص جسے خدا نے علم دیا چنانچہ وہ اس علم کے مطابق حکم کرتا اور دوسروں کو سکھاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حسد اسے کہتے ہیں کہ "کسی دوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر یہ آرزو کی جائے کہ یہ نعمت میرے پاس آجائے اور اس کے پاس سے ختم ہو جائے۔" ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بری خصلت اور انتہائی ذلت نفس کی بات ہے۔ اسلام جو اخلاق، پاکیزگی کا سب سے بڑا علمبردار ہے اس غیر اخلاقی اور ذلیل خصلت کو پسند نہیں کرتا اور اس سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ حسد کے مقابلہ میں غبطہ ہے۔ غبطہ اسے کہتے ہیں کہ کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر یہ آرزو کی جائے کہ جیسی نعمت اس کے پاس ہے خدا اس نعمت سے مجھے بھی سرفراز فرمائے۔ شریعت اس کو جائز قرار دیتی ہے مگر یہ بھی اچھی باتوں مثلاً نیک اخلاق و عادات، بہترین خصائل اور فضل و کمال کے بارے میں جائز ہے چنانچہ اس حدیث میں جس حسد کے بارے میں فرمایا گیا ہے وہ غبطہ ہے۔

⑥ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْہُ عَمَلُہٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَۃِ اَشْیَآءٍ: صَدَقَۃٍ جَارِیَۃٍ اَوْ عِلْمٍ یُّنْتَفَعُ بِہٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَّدْعُوْلَہٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کے ثواب کا سلسلہ اس سے منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کے ثواب کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔ ① صدقہ جاریہ ② علم جس سے نفع حاصل کیا جائے ③ صالح اولاد جو مرنے کے بعد اس کے لئے دعا کرے۔" (مسلم)

تشریح: ایسے اعمال جن کا تعلق دنیاوی زندگی سے ہوتا ہے ان کے اثرات مرنے کے بعد دنیا ہی میں ختم ہو جاتے ہیں مثلاً نماز، روزہ وغیرہ ایسے اعمال ہیں جو انسان کی زندگی میں ادا ہوتے تھے گو کہ ان کا ثواب بایں طور باقی رہتا ہے کہ وہ ذخیرہ آخرت ہو جاتے ہیں اور مرنے کے بعد اس پر جزاء ملتی ہے مگر ان کا سلسلہ مرنے کے بعد آئندہ جاری نہیں رہتا۔ کیونکہ زندگی میں جب تک یہ اعمال ہوتے تھے اس کا ثواب ملتا رہتا تھا جب زندگی ختم ہو گئی تو یہ اعمال بھی ختم ہو گئے اور جب یہ اعمال ختم ہو گئے تو اس پر جزاء سزا کا ترتب بھی ختم ہو گیا۔

لیکن کچھ اعمال ایسے بھی ہیں جن کے ثواب کا سلسلہ نہ صرف یہ کہ زندگی میں ملتا ہے بلکہ مرنے کے بعد باقی و جاری رہتا ہے۔ ایسے ہی اعمال کے بارے میں اس حدیث میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ تین اعمال ایسے ہیں کہ زندگی ختم ہو جانے کے بعد بھی ان کے ثواب کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور مرنے والا برابر اس سے منتفع ہوتا رہتا ہے۔

پہلی چیز صدقہ جاریہ ہے، یعنی اگر کوئی شخص خدا کی راہ میں زمین وقف کر گیا ہے یا کنواں و تالاب بنوا گیا ہے یا ایسے ہی مخلوق خدا کے فائدہ کی خاطر کوئی دوسری چیز اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے تو جب تک یہ چیزیں قائم رہیں گی اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اس کو برابر ثواب ملتا رہے گا۔

دوسری چیز علم نافع ہے یعنی کسی ایسے عالم نے وفات پائی جو اپنی زندگی میں لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ پہنچاتا رہا اور پھر اپنے علوم و معارف کو کسی کتاب کے ذریعہ محفوظ کر گیا جو ہمیشہ لوگوں کے لئے فائدہ مند اور رشد و ہدایت کا سبب بنی ہے یا کسی ایسے شخص کو اپنا شاگرد بنا گیا جو اس کے علم کا صحیح وارث ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو زندگی ختم ہونے کے بعد اس کے لئے سرمایہ و سعادت ثابت ہوں گی اور جن کا ثواب اسے وہاں برابر ملتا رہے گا۔

تیسری چیز اولاد صالح، ہے ظاہر ہے کہ کسی انسان کے لئے سب سے بڑی سعادت اور وجہ افتخار اس کی اولاد صالح ہی ہوتی ہے اس لئے کہ صالح اولاد نہ صرف یہ کہ ماں باپ کے لئے دنیا میں سکون و راحت کا باعث بنتی ہے بلکہ ان کے مرنے کے بعد ان کے لئے وسیلہ نجات اور ذریعہ فلاح بھی بنتی ہے اور وہ اس طرح سے کہ لائق و نیک لڑکا اپنے والدین کی قبروں پر جاتا ہے وہاں فاتحہ پڑھتا ہے دعائے مغفرت کرتا ہے، قرآن پڑھ کر ان کو بخشتا ہے اور ان کی طرف سے خیرات و صدقات کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں مردہ کے لئے ثواب کا باعث ہیں جن سے وہ اخروی زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔

⑦ وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُّؤْمِنٍ کُرْبَۃً مِّنْ کُرَبِ الدُّنْیَا نَفَّسَ اللّٰہُ عَنْہُ کُرْبَۃً

مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهٗ بَيْنَهُمْ اِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَآئِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ وَمَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ)) (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص دنیا کی سختیوں میں سے کسی مسلمان کی کوئی سختی اور تنگی دور کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن وہاں کی سختیاں اس سے دور کرے گا اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندوں کی مدد کرتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی مسلمان کی مدد کرتا رہتا ہے اور جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستہ پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کے راستہ کو آسان کر دیتا ہے اور جب کوئی جماعت خدا کے گھر (مسجد یا مدرسہ) میں قرآن پڑھتی پڑھاتی ہے تو اس پر (خدا کی جانب سے) تسکین نازل ہوتی ہے۔ رحمت خداوندی اس کو اپنے اندر چھپالیتی ہے اور فرشتے اس کو گھیر لیتے ہیں، نیز اللہ تعالیٰ اس جماعت کا ذکر ان (فرشتوں) میں کرتا ہے جو اس کے پاس رہتے ہیں اور جس نے عمل میں تاخیر کی آخرت میں اس کا نسب کام نہیں آئے گا۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی عظمت و برتری کا پتہ چلتا ہے، اسلام اپنی تعلیمات کے ذریعہ پوری انسانی برادری کے درمیان محبت و مروت، انسانی ہمدردی و رواداری، امداد و معاونت اور حسن سلوک کی اعلیٰ روح پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ انسان اخلاق و محبت کی ایک کڑی میں منسلک ہو کر پورے امن و سکون اور چین و راحت کے ساتھ حقوق عبدیت ادا کر سکیں۔

چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم قیامت کے دن کی سختی سے بچنا چاہتے ہو تو تم اپنے اس بھائی کی خبر گیری کرو جو دنیا کی سختی میں پھنسا ہوا ہے، اگر اس پر کوئی سخت وقت آپڑا ہے تو اس کی مدد کرو۔ اگر وہ زندگی کی کسی الجھن میں پھنسا ہوا ہے تو اسے چھٹکارا دلاؤ۔ اگر وہ مصائب و تکلیف میں مبتلا ہے تو ان کو اس سے دور کرو۔ اس لئے کہ حسن سلوک کا یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر تم آخرت کی سختیوں سے نہایت آسانی کے ساتھ گزر جاؤ گے۔

اعلان کیا جا رہا ہے کہ اگر تم دین و دنیا دونوں جگہ کی آسانیاں چاہتے ہو، اگر تم اس کے متمنی ہو کہ دنیا کی کامیابی و کامرانی تمہارے قدم چومے اور آخرت کی فلاح و سعادت تمہارے حصہ میں آئے تو اپنے اس بھائی کی مدد کرو جو تنگدست ہے۔ مفلسی و قلاشی کے جال میں پھنسا ہوا ہے، بے روزگاری و تباہ حالی کی چکی میں پس رہا ہے، مثلاً اگر وہ مقروض ہے اور خدا نے تمہیں وسعت دی ہے تو اس کا قرض ادا کر دو۔ اگر کوئی خود تمہارا مقروض ہے اور تم جانتے ہو کہ وہ قرض ادا کرنے پر قادر نہیں ہے تو تم اس کا قرض معاف کر دو، اگر کوئی انتہائی تباہ حال و پریشان ہے تو اس کی مدد کر کے تنگدستی سے اسے چھٹکارا دلاؤ۔ اگر کوئی اپنی ناداری و مفلسی کی بناء پر اپنی کسی سخت ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا تو تم اس کی اس ضرورت کو پورا کر دو اور پھر دیکھو خدا کی رحمت کس طرح بڑھ کر تمہیں اپنے دامن میں چھپاتی ہے۔ دنیا کی عزت و عظمت تمہارے قدموں میں کھیلتی نظر آئے گی اور زندگی کی ہر آسانی تمہارے لئے مہیا ہوگی اور نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی خدا کی رحمت تمہارے ساتھ ہوگی، وہاں کی ہر سختی اور ہر آزمائش میں تمہارا ہی حسن سلوک مددگار و معاون ہوگا اور تم وہاں کے ہر امتحان میں کامیاب رہو گے۔ اسی طرح فرمایا گیا ہے کہ اگر تم دنیا و آخرت میں اپنے عیوب کی پردہ پوشی چاہتے ہو تو تم دنیا میں اپنے بھائی کی پردہ پوشی کرو۔ یعنی کسی کے عیب کو لوگوں کے سامنے بیان کر کے اسے رسوا اور ذلیل نہ کرو۔ یا اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو اسے لوگوں کے سامنے ظاہر کر کے اور بر سر عام اچھال کر اسے شرمندہ نہ کرو کیونکہ یہ خدا کا معاملہ ہے وہ اگر چاہے گا تو اسے دنیا ہی میں یا آخرت میں سزا دے گا ورنہ اپنی رحمت سے اسے معاف کر دے گا۔

یا پردہ پوشی کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی ناداری و مفلسی کی بنا پر لباس کی نعمت سے محروم ہے اور اتنا تنگدست و غریب ہے کہ اپنے

ستر کو بھی نہیں چھپا سکتا تو چاہئے کہ اپنے اس نادار بھائی کی ستر پوشی کرے اس لئے کہ جو اپنے بھائی کی ستر پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا میں اور قیامت میں اس کے عیوب اور گناہوں کی پردہ پوشی فرمائے گا اور آخر میں عمومی طور پر یہ کلیہ بتادیا گیا ہے کہ جب تک کوئی بندہ اپنے کسی بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے اور خدا کی مخلوق کی خبر گیری میں مصروف رہتا ہے تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت رہتی ہے۔

حدیث میں طلب علم اور طالب علم کی فضیلت بھی ظاہر فرمائی جارہی ہے، چنانچہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جو شخص علم دین کے حصول کے لئے اپنے وطن و شہر کو چھوڑ کر عزیز و اقارب سے جدا ہو کر اور عیش و آرام پر لات مار کر حصول علم کے جذبہ سے باہر نکلتا ہے اور تلاش علم کے لئے راہ مسافرت پر گامزن ہوتا ہے تو خداوند قدوس اس کی ریاضت و مشقت اور جان کاہی و پریشانی کی وجہ سے اس پر بہشت کی راہ آسان کر دیتا ہے یعنی طالب علم کی کوششوں کے صلہ میں اسے جنّت میں داخل کیا جائے گا یا یہ کہ اسے خداوند کی جانب سے اس عظیم سعادت کی توفیق ہوگی کہ اس نے جس علم کی تلاش میں اتنی مصیبتوں اور پریشانیوں کو برداشت کیا اس پر وہ نیک عمل بھی کرے جو جنّت میں داخل ہونے کا سبب اور باعث ہے۔

اسی طرح جو لوگ مساجد و مدارس میں حصول علم میں منہمک ہوتے ہیں اور قرآن کے علوم و معارف سے استفادہ کرنے اور دوسروں کو پڑھانے میں مشغول ہوتے ہیں ان پر خدا کی جانب سے بے پایاں رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان پر خدا کی جانب سے تسکین کا نزول ہوتا ہے یعنی طلب علم کے سلسلہ میں ان کے اندر خاطر جمعی اور دل بستگی ودیعت فرمائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے قلوب دنیا کے عیش و عشرت، راحت و آرام اور غیر اللہ کے خوف و ڈر سے پاک و صاف ہو کر ہر وقت خدا کی طرف لو لگائے رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل نور الٰہی کی مقدس روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں نیز فرشتے ان کی عزّت و توقیر کرتے ہیں اور فرط عقیدت سے ان لوگوں کو گھیرے رہتے ہیں اور پھر خداوند قدوس اس مقدس جماعت کا تذکرہ جو درس و تدریس میں مشغول ہوتی ہے اپنے ان فرشتوں کے درمیان کرتا ہے جو اس کے پاس ہوتے ہیں، یہ اس جماعت کی انتہائی عظمت و فضیلت کی دلیل ہے۔

آخر حدیث میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ آخرت کی کامیابی و کامرانی اور فلاح و سعادت کا دارو مدار عمل پر ہے۔ اگر دنیا میں عمل خیر میں کوتاہی نہیں تو آخرت میں عزّت و عظمت کا حقدار ہوگا اور دنیا میں کسی نے عمل میں کوتاہی کی اگرچہ وہ دنیا میں کتنا ہی باقبال و باعظمت کیوں نہ رہا ہو اور کتنا ہی بڑا حسب و نسب والا کیوں نہ ہو آخرت میں اس سے باز پرس ہوگی اور وہاں دنیا کی عالی نسبی اور وجاہت کچھ کام نہیں دے گی ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی — کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

(یعنی اے جامی) جب تم اسیر عشق ہوگئے تو حسب و نسب کے چکر میں نہ پڑو کیونکہ اس راہ میں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں ہے۔

(۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اُسْتُشْهِدَ فَأُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَالَ قَاتَلْتُ فِيْكَ حَتّٰى اُسْتُشْهِدْتُ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِاَنْ يُّقَالَ جَرِيْءٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهٗ وَقَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهٗ وَقَرَأْتُ فِيْكَ الْقُرْاٰنَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ اِنَّكَ عَالِمٌ وَقَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ لِيُقَالَ اِنَّكَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَعْطَاهُ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهٖ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ مَاتَرَكْتُ مِنْ سَبِيْلٍ تُحِبُّ اَنْ يُّنْفَقَ فِيْهَا اِلَّا اَنْفَقْتُ فِيْهَا لَكَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ثُمَّ اُلْقِيَ فِي النَّارِ)) (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ قیامت کے دن پہلا شخص جس پر (خلوص نیت کو ترک کر دینے کا)

حکم لگایا جائے گا وہ ہوگا جسے (دنیا میں) شہید کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ (میدان حشر میں) وہ پیش کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی (دی ہوئی) نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا کام کیا؟ یعنی اللہ اسے اپنی نعمتیں جتا کر الزاماً فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکرانہ میں کیا اعمال کئے؟ وہ کہے گا میں تیری راہ میں لڑا یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے کیونکہ تو اس لئے لڑا تھا تاکہ تجھے بہادر کہا جائے چنانچہ تجھے (بہادر کہا گیا) اور تیرا اصل مقصد مخلوق سے حاصل ہوا اب مجھ سے کیا چاہتا ہے، پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل کھینچا جائے، یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا، پھر (دوسرا) وہ شخص ہوگا جس نے علم حاصل کیا، دوسروں کو تعلیم دی اور قرآن کو پڑھا چنانچہ اسے بھی (خدا کے حضور میں) لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی عطا کی ہوئی) نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی پھر خدا پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا اعمال کئے؟ وہ کہے گا میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا اور تیرے ہی لئے قرآن پڑھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو نے تو علم محض اس لئے حاصل کیا تھا تاکہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لئے پڑھا تھا تاکہ تجھے لوگ قاری کہیں، چنانچہ تجھے (عالم وقاری) کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر (تیسرا) وہ شخص ہوگا جس کو اللہ نے (معیشت میں) وسعت دی اور ہر قسم کا مال عطا فرمایا۔ اس کو بھی خدا کے حضور میں لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی عطا کی ہوئی) نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا اعمال کئے؟ وہ کہے گا میں نے کوئی ایسی راہ نہیں چھوڑی جس میں تو خرچ کرنا پسند کرتا ہو اور تیری خوشنودی کے لئے میں نے اس میں خرچ نہ کیا ہو، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، تو نے خرچ اس لئے کیا تاکہ تجھے (سخی) کہا جائے اور تجھے (سخی) کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔" (مسلم)

تشریح: اعمال میں نیت کا کیا درجہ ہے؟ اور خلوص کی کتنی ضرورت ہے؟ اس حدیث سے بخوبی واضح ہوتا ہے بندہ کتنے بڑے سے بڑا عمل خیر کرے، بڑی سے بڑی نیکی کر ڈالے لیکن اگر اس کی نیت بخیر نہیں ہے تو اس کا وہ عمل اور نیکی کسی کام نہیں آئے گی خدا کو وہی عمل پسند ہے جس میں محض اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا کی نیت ہو اور جذبہ اطاعت خلوص سے بھرپور ہو، ورنہ جو بھی عمل بغیر اخلاص اور بغیر نیت خیر کیا جائے گا چاہے وہ کتنا ہی عظیم عمل کیوں نہ ہو بارگاہ الوہیت سے ٹھکرا دیا جائے گا اور اس پر کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوگا بلکہ الٹا عذاب خداوندی میں گرفتار کیا جائے گا جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا۔

(۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَآءِ حَتّٰى اِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اِتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا)) (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ علم کو (آخری زمانہ میں) اس طرح نہیں اٹھالے گا کہ لوگوں (کے دل ودماغ) سے اسے نکال لے بلکہ علم کو اس طرح اٹھائے گا کہ علماء کو (اس دنیا سے) اٹھالے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے ان سے مسئلے پوچھے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے لہٰذا وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔" (بخاری ومسلم)

(۱۰) وَعَنْ شَقِيْقٍ قَالَ: كَانَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِيْ كُلِّ خَمِيْسٍ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ يَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ! لَوَدِدْتُ اَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَالَ اَمَا اِنَّهٗ يَمْنَعُنِيْ مِنْ ذٰلِكَ اِنِّيْ اَكْرَهُ اَنْ اُمِلَّكُمْ وَاِنِّيْ اَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّاٰمَةِ عَلَيْنَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت شقیقؒ[1] راوی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کے روز لوگوں کے سامنے وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے (ایک روز) ایک شخص نے عرض کیا۔ اے ابو عبدالرحمن! میری خواہش ہے کہ آپ ہمارے درمیان روزانہ وعظ و نصیحت کیا کریں۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں ایسا اس لئے نہیں کرتا کہ اس سے تم لوگ تنگ ہو جاؤ گے، میں نصیحت کے معاملہ میں تمہاری خبر گیری اس طرح کرتا ہوں جیسا کہ ہماری نصیحت کے معاملہ میں آنحضرت ﷺ ہماری خبر گیری کیا کرتے تھے اور ہمارے اکتا جانے کا خیال رکھتے تھے۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث سے یہ بات واضح ہے کہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ کے معاملہ میں اعتدال سے کام لینا چاہئے۔ ہر وقت اور ہر موقعہ پر وعظ و نصیحت نہیں کرنی چاہئے اس لئے کہ اس سے لوگوں کے دل اچاٹ ہو جاتے ہیں اور وہ اکتا جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی بات دل جمعی و سکون خاطر سے نہیں سنتے اس لئے ان پر کوئی اچھا اثر بھی مرتب نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس معاملہ میں ڈانٹ ڈپٹ، لعنت پھٹکار اور بد مزاجی و بد اخلاقی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس سے مخاطب کے ذہن پر برا اثر پڑتا ہے جس سے بجائے اس کے کہ وہ اس کا کوئی نیک اثر قبول کرے اور زیادہ منحرف ہو جاتا ہے۔

جو نصیحت اپنے وقت پر اور نہایت اخلاق و متانت اور انتہائی محبت و شفقت سے کی جاتی ہے درا صل وہی مخاطب کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا بہترین ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ وَإِذَا اَتٰى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب کوئی بات کہتے تو اس کو تین مرتبہ فرماتے یہاں تک کہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھ لیتے اور جب آپ ﷺ کسی جماعت کے پاس آتے اور سلام کرنے کا ارادہ فرماتے تو تین مرتبہ سلام کرتے۔" (بخاری)

تشریح: اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ ہر گفتگو کے موقع پر ایسا عمل اختیار فرماتے ہوں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کوئی بہت اہم بات فرماتے ہوں گے یا کسی خاص مسئلہ کی وضاحت مقصود ہوتی ہوگی، یا کوئی دینی حکم بیان کرنا ہوتا ہوگا اور یہ ارادہ ہوتا ہو کہ اس بات کو بطور خاص بیان کرنا ہے یا یہ خیال گزرتا ہو کہ لوگوں نے بات اچھی طرح سنی نہ ہوگی تو آپ ﷺ تین مرتبہ اعادہ فرماتے اور اس بات کو بار بار کہتے تا کہ لوگ خوب سن لیں اور اچھی طرح سمجھ لیں۔

ایسے ہی تین مرتبہ سلام اس طرح کرتے تھے کہ ایک سلام تو آپ ﷺ اس وقت کرتے تھے جب مکان میں اندر جانے کی اجازت طلب فرماتے تھے، دوسرا سلام تحیۃ کرتے تھے (یہ سلام ملاقات کے وقت کیا جاتا ہے) اور تیسرا سلام رخصت کے وقت کرتے تھے۔

(۱۲) وَعَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّهٗ اُبْدِعَ بِيْ فَاحْمِلْنِيْ فَقَالَ مَا عِنْدِيْ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَا اَدُلُّهٗ عَلٰى مَنْ يَّحْمِلُهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ)) (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ[2] راوی ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری سواری چلنے سے عاجز ہو گئی ہے آپ ﷺ مجھے سواری عنایت فرما دیجئے! آنحضرت ﷺ نے فرمایا میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے (کہ تمہیں دے دوں) ایک

---

[1] شقیق ابن مسلمہ نام اور کنیت ابووائل ہے۔ آپ تابعی ہیں حجاج کے زمانہ میں وفات ہوئی بعض کہتے ہیں کہ ۹۹ھ میں وفات پائی ہے۔

[2] آپ کا اسم گرامی عقبہ ابن عمرہ ہے مگر یہ بھی کنیت ابو مسعود انصاری سے مشہور ہیں۔ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال ہوا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی وفات ۴۱ھ یا ۴۲ھ میں ہوئی ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اسے ایسا شخص بتلاتا ہوں جو اسے سواری دے دے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی بھلائی کی طرف راہ نمائی کرے تو اسے بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس بھلائی پر عمل کرنے والے کو۔" (مسلم)

(۱۳) وَعَنْ جَرِيْرٍ قَالَ كُنَّا فِيْ صَدْرِ النَّهَارِ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَآءَ قَوْمٌ عُرَاةٌ مُجْتَابِي النِّمَارِ اَوِ الْعَبَآءِ مُتَقَلِّدِي السُّيُوْفِ عَامَّتُهُمْ مِنْ مُضَرَ بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ فَتَمَعَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا رَاٰى بِهِمْ مِنَ الْفَاقَةِ فَدَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ فَاَمَرَ بِلَالًا فَاَذَّنَ وَاَقَامَ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ فَقَالَ (يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ) اِلٰى اٰخِرِ الْاٰيَةِ (اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا) وَالْاٰيَةِ الَّتِيْ فِي الْحَشْرِ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ) تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِّنْ دِيْنَارِهٖ، مِنْ دِرْهَمِهٖ، مِنْ ثَوْبِهٖ، مِنْ صَاعِ بُرِّهٖ، مِنْ صَاعِ تَمْرِهٖ حَتّٰى قَالَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ قَالَ فَجَآءَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ بِصُرَّةٍ كَادَتْ كَفُّهٗ تَعْجِزُ عَنْهَا بَلْ قَدْ عَجَزَتْ ثُمَّ تَتَابَعَ النَّاسُ حَتّٰى رَاَيْتُ كَوْمَيْنِ مِنْ طَعَامٍ وَثِيَابٍ حَتّٰى رَاَيْتُ وَجْهَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَلَّلُ كَاَنَّهٗ مُذْهَبَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ۔
(رواہ مسلم)

"اور حضرت جریرؓ[1] راوی ہیں کہ (ایک روز) ہم دن کے ابتدائی حصہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک قوم آپ ﷺ کی خدمت میں آئی جو ننگے بدن تھی اور عبا یا کمبل لپیٹے ہوئے تھی اور گلے میں تلواریں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے اکثر بلکہ سب کے سب قبیلہ مضر کے لوگ تھے۔ ان پر فاقہ کا اثر دیکھ کر آنحضرت ﷺ کا چہرہ متغیر ہو گیا آپ ﷺ (ان کے لئے کھانے کی تلاش میں) گھر میں تشریف لے گئے اور (جب گھر میں کچھ نہ ملا) تو واپس تشریف لائے اور حضرت بلالؓ کو (اذان کہنے کا) حکم دیا، حضرت بلالؓ نے آذان کہی اور تکبیر پڑھی اور جمعہ کی یا ظہر کی نماز پڑھی گئی۔ پھر آنحضرت ﷺ نے خطبہ دیا اور یہ آیت پڑھی یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ، الاٰیة ترجمہ! "اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا ہے۔" پوری آیت تلاوت کی جس کا آخری حصہ یہ ہے۔ "البتہ اللہ تعالیٰ تمہارا نگہبان ہے۔" اور پھر یہ آیت آپ ﷺ نے پڑھی جو سورۂ حشر میں ہے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ الاٰیة ترجمہ! "(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بھیجا ہے۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا۔ "خیرات کرے آدمی اپنے دینار میں سے، اپنے درہم میں سے، اپنے کپڑے میں سے، اپنے گیہوں کے پیمانے میں سے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ خیرات کرے اگرچہ کھجور کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ راوی کہتے ہیں کہ ایک انصاری شخص دینار یا درہم سے بھری ہوئی ایک تھیلی لایا جس کے وزن سے اس کا ہاتھ تھکنے کے قریب تھا بلکہ تھک گیا تھا۔ پھر لوگوں نے پے در پے چیزوں کا لانا شروع کر دیا یہاں تک کہ میں نے دو تودے غلہ اور کپڑے کے (جمع شدہ) دیکھے پھر میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کا چہرہ اقدس (خوشی کی وجہ سے) کندن کی طرح چمک رہا تھا، پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو شخص اسلام میں کسی نیک طریقہ کو رائج کرے تو اسے اس کا بھی ثواب ملے گا اور اس کا ثواب بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے لیکن عمل کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی اور جس شخص نے اسلام میں کسی برے طریقہ کو رائج کیا تو اسے اس کا بھی گناہ ہوگا اور اس شخص کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے گا۔ لیکن عمل کرنے والے کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے جو پہلی آیت تلاوت فرمائی وہ سورۂ نسا میں ہے، اس آیت میں خیرات کرنے اور قرابت داروں سے حسن

[1] آپ کا اسم گرامی جریر بن عبداللہ ہے اور کنیت ابوعمرو یا ابوعبداللہ ہے قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چالیس دن قبل اسلام کی نعمت سے مشرف ہوئے تھے اور مقام قرقیسیا میں ۵۱ھ یا ۵۴ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سلوک اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے جس سے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو خیرات کرنے اور آنے والی جماعت کی امداد و اعانت پر ترغیب دلائی۔

شروع حدیث میں راوی کا بیان ہے کہ آنے والی جماعت کمبل یا عبا لپیٹے ہوئے تھی۔ راوی کا اشتباہ ہے کہ یا تو حدیث میں لفظ النمار ہے یا العباء ہے۔ بہرحال دونوں کمبل کی قسمیں ہیں اور دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔

(۱۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا کَانَ عَلَی ابْنِ اٰدَمَ الْاَوَّلِ کِفْلٌ مِّنْ دَمِھَا لِاَنَّہٗ اَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ مُعَاوِیَۃَ لَا یَزَالُ طَآئِفَۃٌ مِّنْ اُمَّتِیْ فِیْ بَابِ ثَوَابِ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص ظلم کے طریقہ پر قتل کیا جاتا ہے تو اس کے خون کا ایک حصّہ آدم کے پہلے بیٹے قابیل پر ہوتا ہے اس لئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ نکالا۔ (بخاری و مسلم) (اور معاویہؓ کی وہ حدیث جس کی ابتداء یہ ہے "لایزال امتی" ہم انشاء اللہ "باب ثواب ھذہ الامۃ" میں بیان کریں گے۔"

تشریح: انسانی ظلم و ستم کی تاریخ حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے قابیل کی زندگی سے شروع ہوتی ہے جس نے اپنی ایک انتہائی معمولی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لئے اپنے حقیقی بھائی ہابیل کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور انسانی تاریخ کا یہ سب سے پہلا خونی واقعہ تھا جس نے ناحق خون بہانے کی بنیاد ڈالی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جب کوئی نیک طریقہ رائج کرتا ہے تو اسے اس نیک کام کا ثواب بھی ملتا ہے، اسی طرح برا طریقہ رائج کرنے والے کو خود اس عمل کا اور اس طریقہ پر عمل کرنے والے کا بھی گناہ ملتا ہے۔

اسی لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جب بھی کوئی شخص ظلم کے طریقہ پر قتل کر دیا جاتا ہے تو اس کے خون کا ایک حصّہ قابیل پر بھی ہوتا ہے اس لئے کہ ناحق خون بہانے اور ظلم و ستم کے ساتھ قتل کا اول موجد وہی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۱۵) عَنْ کَثِیْرِ بْنِ قَیْسٍ قَالَ: کُنْتُ جَالِسًا مَعَ اَبِی الدَّرْدَآءِ فِیْ مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَجَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ یَا اَبَا الدَّرْدَآءِ اِنِّیْ جِئْتُکَ مِنْ مَدِیْنَۃِ الرَّسُوْلِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِحَدِیْثٍ بَلَغَنِیْ اَنَّکَ تُحَدِّثُہٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا جِئْتُ لِحَاجَۃٍ قَالَ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَطْلُبُ فِیْہِ عِلْمًا سَلَکَ اللّٰہُ بِہٖ طَرِیْقًا مِّنْ طُرُقِ الْجَنَّۃِ وَاِنَّ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَھَا رِضًی لِّطَالِبِ الْعِلْمِ وَاِنَّ الْعَالِمَ لَیَسْتَغْفِرُلَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالْحِیْتَانُ فِیْ جَوْفِ الْمَآءِ وَاِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِ الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ عَلٰی سَآئِرِ الْکَوَاکِبِ وَاِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ وَاِنَّ الْاَنْبِیَآءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَارًا وَّلَا دِرْھَمًا وَاِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَہٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَابْنُ مَاجَۃَ وَالدَّارِمِیُّ وَسَمَّاہُ التِّرْمِذِیُّ قَیْسَ بْنَ کَثِیْرٍ۔

"حضرت کثیر ابن قیس کہتے ہیں کہ میں (ایک صحابی) حضرت ابو درداؓ کے پاس دمشق (شام) کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میں سرکار دو عالم ﷺ کے شہر سے آپ کے پاس ایک حدیث کے لئے آیا ہوں جس کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسے آپ سرکار دو عالم ﷺ سے نقل کرتے ہیں۔ آپ کے پاس میرے آنے کی اس کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں ہے (یہ سن کر) حضرت ابو درداؓ نے فرمایا۔ میں نے آنحضرت ﷺ کو فرماتے ہوئے یہ سنا کہ جو شخص کسی راستہ کو (خواہ وہ لمبا ہو یا مختصر) علم دین حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بہشت کے راستہ پر چلاتا ہے اور فرشتے طالب علم کی رضامندی کے لئے اپنے پروں کو بچھاتے ہیں اور

عالم کے لئے ہر وہ چیز جو آسمانوں کے اندر ہے (یعنی فرشتے) اور جو زمین کے اوپر ہے (یعنی جن وانس) اور مچھلیاں جو پانی کے اندر ہیں دعائے مغفرت کرتی ہیں اور عابد پر عالم کو ایسی ہی فضیلت ہے جیسے کہ چودہویں کا چاند تمام ستاروں پر فضیلت رکھتا ہے اور عالم انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء وراثت میں دینار و درہم نہیں چھوڑ گئے ہیں، ان کا ورثہ علم ہے لہٰذا جس نے علم حاصل کیا اس نے کامل حصّہ پایا۔ احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ اور ترمذیؒ نے راوی کا نام قیس ابن کثیرؒ ذکر کیا ہے (لیکن صحیح کثیر بن قیس ہی ہے جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: صحابی کی خدمت میں آنے والے کی علمی طلب اور حصول دین کے حقیقی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے کہ اس نے آتے ہی سب سے پہلے یہی کہا تھا کہ آپ کے پاس آنے سے میری غرض کوئی دینوی منفعت یا محض ملاقات نہیں ہے بلکہ میں تو علم دین کے حصول کا حقیقی اور پر خلوص جذبہ لے کر آیا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ کی زبان سے سرکار دو عالم ﷺ کی مقدس حدیث سن کر اپنے قلب و دماغ کو علوم نبوی کی ایک روشنی سے منور کروں۔

ہوسکتا ہے کہ طالب مذکور نے جس حدیث کے سننے کی طلب کی تھی وہ حدیث انھوں نے اجمالی طور پر سنی ہو اب ان کی خواہش یہ تھی کہ اس کو تفصیلی طور پر سن لیں یا یہ کہ وہ حدیث انھوں نے تفصیل کے ساتھ ہی (کسی دوسرے سے) سن رکھی ہو مگر اس جذبہ کے ساتھ حضرت ابودرداء کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حدیث کو بلاواسطہ صحابیؓ سے سنیں۔

ابودرداء نے سائل کے جواب میں جو حدیث بیان فرمائی ہوسکتا ہے کہ وہ یہی حدیث ہو اور یہی حدیث اس کا مطلوب ہو، لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حدیث جو یہاں نقل کی گئی ہے وہ طالب کا مطلوب نہ ہو بلکہ چونکہ طالب نہایت مشقت و پریشانی برداشت کر کے اور دور دراز کا سفر طے کر کے طلب علم اور حصول حدیث کی خاطر آیا تھا۔ اس لئے اس کی سعادت و خوش بختی کے اظہار کے طور پر اس کا ثواب بیان کیا اور اس کی مطلوبہ حدیث انھوں نے بیان کی وہ چونکہ اس باب کے مناسب نہیں تھی اس لئے مصنف کتاب نے اسے یہاں نقل نہیں کیا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب طالب علم، علم کی خاطر اپنے گھر سے نکلتا ہے اور راہ مسافرت اختیار کرتا ہے تو فرشتے اس کی رضامندی کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ اس کی تشریح میں کہا جاتا ہے کہ یا تو واقعی طالب علم کے شرف و عزت کی خاطر فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں یا پھر طالب علم کی عظمت اور اس کی طرف رحمت خداوندی کے نزول کے لئے یہ کنایہ ہے۔

نیز فرمایا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں خدا کی جتنی بھی مخلوق ہے سب کی سب عالم کی مغفرت کے لئے دعا کرتی ہے۔ اس کے بعد پھر صراحت کی گئی کہ پانی کے اندر رہنے والی مچھلیاں بھی اس کے لئے استغفار کرتی ہیں ظاہر ہے کہ زمین کی مخلوق میں مچھلیاں بھی شامل ہیں ان کو بظاہر الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس سے دراصل عالم کی انتہائی فضیلت و عظمت کا اظہار مقصود ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ پانی کا برسنا جو رحمت خداوندی کی نشانی اور نعمت الٰہی کی علامت ہے اور دنیا کی اکثر آسانیاں و راحتیں جو اسی سے حاصل ہوتی ہیں اور تمام خیر و بھلائی جو اس کے علاوہ ہیں سب کی سب عالم ہی کی برکت سے ہیں یہاں تک کہ مچھلیوں کا پانی کے اندر زندہ رہنا جو خود قدرت خداوندی کی ایک نشانی ہے، علماء ہی کی برکت کی بنا پر ہے۔

اس حدیث میں عالم اور عابد کے فرق کو بھی ظاہر کرتے ہوئے عابد پر عالم کو فوقیت اور برتری دی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم کا فائدہ متعدی ہے یعنی اس کا فیضان صرف اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہے اسی لئے عالم اور عابد کو چاند ستاروں سے مشابہت دی گئی ہے کہ جس طرح چودہویں کا چاند جب اپنی پوری تابانی اور جلوہ ریزی کے ساتھ آسمان پر نمودار ہوتا ہے تو دنیا کی تمام مخلوق اس سے مستنیر ہوتی ہے اور اس کی روشنی تمام جگہ پہنچتی ہے جس سے دنیا فائدہ اٹھاتی ہے مگر ستارہ خود اپنی جگہ تو روشن و منور ہوتا ہے مگر اس کا فیضان اتنا عام نہیں ہوتا کہ اس کی روشنی تمام جگہ پھیل سکے اور سب کو فائدہ پہنچا سکے۔

اگر کوئی یہ اشکال کر بیٹھے کہ عالم اور عابد میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیونکہ اگر کوئی عالم محض علم پر بھروسہ کر بیٹھے اور علم پر نہ عمل کرے تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اسی طرح عابد بغیر علم کے عابد نہیں ہو سکتا کیونکہ عبادت کی حقیقی اور اصلی روح علم ہی میں پوشیدہ ہے اس لئے عبادت بغیر علم کے صحیح طور پر ادا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جو عالم بالکل باعمل ہوگا وہی عابد بھی ہوگا اور جو عابد ہوگا وہی عالم باعمل بھی ہوگا۔ اس لئے دونوں میں فرق کیا ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عالم سے مراد وہ شخص ہے جو تحصیل علم کے بعد عبادات ضروریہ مثلاً فرائض واجبات اور سنن و مستحبات پر اکتفا کر کے اپنے اوقات کا بقیہ حصہ درس و تدریس میں مشغول رکھتا ہے یعنی اس کا کام درس و تدریس، دعوت و تبلیغ اور دین کی ترویج و اشاعت ہوتا ہے۔ اور عابد سے مراد وہ شخص ہے جو تحصیل علم کے بعد اپنی زندگی کا تمام حصہ صرف عبادت ہی عبادت میں صرف کرتا ہے، نہ اسے علم کی اشاعت سے دلچسپی ہوتی ہے اور نہ تعلیم و تعلّم اس کا مقصد ہوتا ہے بلکہ وہ ہمہ وقت عبادت ہی میں مشغول رہتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اگر علم کی اشاعت اور تعلیم و تعلّم کی فضیلت کا گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ عمل افادیت کے اعتبار سے سب سے بلند مقام رکھتا ہے اور جو ہر حال میں عبادت پر افضل ہے جیسا کہ اکثر احادیث سے بھی ثابت ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عالم اور عابد میں اس اعتبار سے فرق ہے اور عابد پر عالم کو فوقیت حاصل ہے۔

شرح السنۃ میں حضرت سفیان ثوریؒ کا قول منقول ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں آج طالب علم سے افضل کوئی دوسری چیز نہیں جانتا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ کیا لوگوں کے خلوص نیت میں فضیلت نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا طلب علم خود نیت کا سبب ہے یعنی نیت اس سے اپنے آپ ہی سنور جاتی ہے۔

چنانچہ بعض علماء کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کہا ہم نے علم غیر اللہ کے لئے حاصل کیا مگر بعد میں وہ اللہ ہی کے لئے ہو گیا، یعنی ہماری نیت پہلے مخلص اور صاف نہیں تھی مگر جب طلب علم کا حقیقی جذبہ پیدا ہوا اور علم کی روشنی نے قلب کو منور کیا تو نیت مخلص اور صحیح ہو گئی۔

علم کی فضیلت کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں علم کا طلب کرنا نماز نفل سے افضل ہے کیونکہ وہ علم جسے طلب کیا جا رہا ہے یا تو وہ فرض عین ہوگا یا فرض کفایہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں نفل سے، بہرحال افضل ہیں۔

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ الْبَاهِلِیِّ قَالَ ذُكِرَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ: اَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَالْاٰخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِيْ عَلٰى اَدْنَاكُمْ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ وَاَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِيْ جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ مَكْحُوْلٍ مُرْسَلًا وَلَمْ يَذْكُرْ رَجُلَانِ وَقَالَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِيْ عَلٰى اَدْنَاكُمْ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ (اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا) وَسَرَدَ الْحَدِيْثَ اِلٰى اٰخِرِهٖ۔ (ترمذی)

"اور حضرت ابی امامہ باہلیؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا جس میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا عالم (یعنی آپ سے پوچھا گیا کہ ان دونوں میں افضل کون ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ میری فضیلت اس شخص پر جو تم میں سے ادنیٰ درجہ کا ہو۔ پھر اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے اور آسمانوں و زمین کی تمام مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں اس شخص کے لئے دعائے خیر کرتی ہیں جو لوگوں کو بھلائی (یعنی علم دین) سکھاتا ہے ترمذی اور دارمی نے اس روایت کو مکحول سے مرسل طریقہ پر نقل کیا ہے جس میں لفظ رجلان کا ذکر نہیں ہے اور کہا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ عابد پر عالم کو ایسی ہی فضیلت ہے جیسی مجھے تمہارے میں سے ادنیٰ آدمی پر ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ترجمہ: "خدا کے بندوں میں علماء ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔" اور پھر پوری حدیث آخر تک اسی

طرح بیان کی ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عالم کو بہت زیادہ عظمت وفضیلت حاصل ہوتی ہے اور اسے عابد پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ آنحضرت ﷺ نے عابد اور عالم دونوں میں یہ فرق ظاہر کیا ہے کہ جس طرح میں تم میں سے اس شخص پر فضیلت رکھتا ہوں جو تم میں سے سب سے ادنیٰ درجہ کا ہو اسی طرح ایک عالم بھی عابد پر فضیلت رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ایک ادنیٰ شخص پر جو فضیلت حاصل ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اب اس کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ایک عالم کو عابد پر فضیلت کس مرتبہ اور درجہ کی ہوگی۔

آخر حدیث میں کہا گیا ہے کہ اسی حدیث کو دارمیؒ نے مکحول سے بطریق مرسل نقل کیا ہے اور اس میں اس حدیث کے ابتدائی الفاظ رجلان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے یعنی ان کی روایت میں یہ الفاظ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا جس میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا عالم بلکہ ان کی روایت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوتی ہے۔

(۱۷) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ النَّاسَ لَكُمْ تَبَعٌ وَاِنَّ رِجَالًا يَّاْتُوْنَكُمْ مِنْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ يَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ فَاِذَا اَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَيْرًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ لوگ تمہارے (یعنی صحابہؓ کے) تابع ہیں اور بہت سے لوگ علم دین سیکھنے اطراف عالم سے تمہارے پاس آئیں گے۔ لہٰذا جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا۔" (ترمذی)

تشریح: اس ارشاد کا مقصد صحابہؓ کو یہ بتانا ہے کہ میرے بعد چونکہ تمہاری ہی ذات دنیا کے لئے راہبر و راہنما ہوگی اور تم ہی لوگوں کے پیشوا و امام بنو گے اس لئے تمام دنیا کے لوگ تمہارے پاس علم دین طلب کرنے اور میری احادیث حاصل کرنے آئیں گے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ وہ آئیں تو تم ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو، ان کی نگہداشت اور تربیت میں کوتاہی نہ کرو، اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کرو، نیز ان کے قلوب کو علم دین کی اس مقدس روشنی سے جس سے تمہارے قلوب براہ راست فیضیاب ہو چکے ہیں منور کرو۔

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِيْمِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَاِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْفَضْلِ الرَّاوِيْ يُضَعَّفُ فِي الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ (دین میں) فائدہ دینے والی بات دانش مند آدمی کا مطلوب ہے لہٰذا وہ جہاں اسے پائے اس کا مستحق ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس حدیث میں ایک راوی ابراہیم ابن فضل ہیں جن کو (روایت حدیث میں) ضعیف خیال کیا جاتا ہے۔" (ترمذی وابن ماجہؒ)

تشریح: یہ حدیث دانشمندی اور صاحب فہم انسان کو یہ احساس و شعور بخش رہی ہے کہ جب کسی سے دین کی کوئی فائدہ مند بات سنی جائے تو عقل کا یہ تقاضہ ہونا چاہئے کہ فوراً اسے قبول کر کے اس پر عمل کیا جائے اس لئے کہ عقل و خرد کا یہی تقاضا انسان کی معراج کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ انتہائی بے وقوفی اور کم ظرفی کی بات ہے کہ اگر کوئی مفید اور بہتر بات کسی ایسے شخص سے سنی جائے جو اپنے سے کمتر و کم رتبہ ہو تو اس کو اس لئے ناقابل اعتناء اور ناقابل عمل قرار دے دیا جائے کہ وہ بڑی بات اور چھوٹا منہ ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اس بہتر و حق بات کو تو قابل قبول عمل جانے جو حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے صاحب عقل و تقدس ہستی سے منقول ہو۔ مگر جب وہی بات اپنی کسی کنیز اور لونڈی سے سنے تو اسے ناقابل اعتناء سمجھے تو وہ شخص مغرور و متکبر کہلائے گا۔

مرد باید کہ گیرد اندر گوش گر نوشت ست پند بر دیوار

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ۔
(رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ایک فقیہ (یعنی عالم دین) شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔" (ترمذیؒ وابن ماجہؒ)

تشریح: مقابلہ کا یہ مسلم اصول ہے کہ کامیابی اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جو اپنے مدمقابل کے داؤ پیچ سے بخوبی واقف ہو اور اس کا توڑ جانتا ہو۔

چنانچہ ہم خود دیکھتے ہیں کہ مقابلہ کے اکھاڑہ میں وہ شخص جو اپنے ظاہری قویٰ اور جسم کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اپنے اس مقابل کو پچھاڑ دیتا ہے جو جسم وبدن کے اعتبار سے اس سے کئی گنا زیادہ طاقت ور ہوتا ہے کیونکہ وہ جب مقابلہ میں آتا ہے تو اس کا دماغ بنیادی طور پر مقابل کے ہر وار سے بچاؤ کی شکل اور اس کے ہر داؤ کا جواب اپنے خزانہ میں رکھتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامیابی اسی ہی سے ہوتی ہے۔

دنیا میں باطنی طور پر انسان کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے جو اپنے مکروفریب کی طاقت سے لوگوں کو گمراہی کی وادی میں پھینکتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو شیطان کے مکروفریب سے واقف نہیں ہوتے اور اس کی طاقت وقوت کا جواب نہیں رکھتے وہ گمراہ ہو جاتے ہیں مگر ایسے لوگ جو اس کے ہر داؤ کا جواب رکھتے ہیں اور اس کی طاقت وقوت کی شہ رگ پر ان کا ہاتھ ہوتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ خود اس کی گمراہی سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی محفوظ رکھتے ہیں اور یہ لوگ وہی عالم ہوتے ہیں جن کے قلب ودماغ نور الٰہی کی مقدس روشنی سے منور اور ان کے ذہن وفکر علم ومعرفت کی طاقت سے بھرپور ہوتے ہیں۔

اسی لئے اس حدیث میں فرمایا جارہا ہے کہ شیطان کے مقابلہ میں ایک ہزار عابد جتنی طاقت رکھتے ہیں اتنی طاقت تنہا ایک عالم کے پاس ہوتی ہے کیونکہ جب شیطان لوگوں پر اپنے مکروفریب کا جال ڈالتا ہے اور انھیں خواہشات نفسانی میں پھنسا کر گمراہی کے راستہ پر لگادینا چاہتا ہے تو عالم اس کی چال سمجھ لیتا ہے چنانچہ وہ لوگوں پر شیطان کی گمراہی کو ظاہر کرتا ہے اور ایسی تدابیر انھیں بتادیتا ہے جن پر عمل کرنے سے وہ شیطان کے ہر حملے سے محفوظ رہتے ہیں۔

برخلاف اس کے وہ عابد جو صرف عبادت ہی عبادت کرنا جانتا ہے اور علم ومعرفت سے کوسوں دور ہوتا ہے وہ تو محض اپنی ریاضت ومجاہدہ اور عبادت میں مشغول رہتا ہے اسے یہ خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ شیطان کس چور دروازے سے اس کی عبادت میں خلل ڈال رہا ہے اور اس کی تمام سعی وکوشش کو ملیامیٹ کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر وہ عبادت میں مشغول رہتا ہے، مگر لاعلم ہونے کی وجہ سے وہ شیطان کے مکروفریب میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اس لئے نہ وہ خود شیطان کی گمراہی سے محفوظ رہتا ہے اور نہ وہ دوسروں کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔

(۲۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ وَّوَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غَيْرِ اَهْلِهٖ كَمُقَلِّدِ الْخَنَازِيْرِ الْجَوْهَرَ وَاللُّؤْلُؤَ وَالذَّهَبَ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ اِلٰى قَوْلِهٖ مُسْلِمٍ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ مَتْنُهٗ مَشْهُوْرٌ وَاِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ وَقَدْ رُوِيَ مِنْ اَوْجُهٍ كُلُّهَا ضَعِيْفٌ۔

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے اور نا اہل کو علم سکھانا ایسا ہے جیسے کوئی شخص سور کے گلے میں جواہرات، موتیوں اور سونے کا ہار ڈال دے۔ (ابن ماجہ) اور بیہقیؒ نے اس روایت کو شعب الایمان میں لفظ "مسلم" تک نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کا متن مشہور ہے اور اسناد ضعیف ہیں اور یہ حدیث مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے اور وہ سب ضعیف ہیں۔" (ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث سے علم کی اہمیت و عظمت اور اس کی ضرورت واضح ہوتی ہے کہ ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے علم کا حاصل کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ انسان جس مقصد کے لئے خلیفۃ اللہ بنا کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے وہ بغیر علم کے پورا نہیں ہو سکتا۔ انسان بغیر علم کے نہ خدا کی ذات کو پہنچاتا ہے اور نہ اسے اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ یہاں علم سے مراد "علم دین" ہے جس کی ضرورت زندگی کے ہر دور اور ہر شعبہ میں پڑتی ہے، مثلاً جب آدمی مسلمان ہوتا ہے یا احساس و شعور کی منزل کو پہنچتا ہے تو اسے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی ذات اور اس کی صفات کی معرفت حاصل کرے اور عرفان الٰہی کی مقدس روشنی سے قلب و دماغ کی ہر ظلمت و کجروی کو ختم کرے۔ اسی طرح رسول کی نبوت و رسالت کا جاننا یا ایسی چیزوں کا علم حاصل کرنا جن پر ایمان و اسلام کی بنیاد ہے اس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

پھر جب عملی زندگی سے اسے واسطہ پڑتا ہے تو اسے ضرورت ہوتی ہے کہ اعمال کے احکام کا علم ہو۔ یعنی جب نماز کا وقت آئے گا تو اس پر نماز کے احکام و مسائل سیکھنا واجب ہوگا۔ جب رمضان آئے گا تو روزے کے احکام معلوم کرنا اس کے لئے ضروری ہوگا۔ اگر خدا نے اسے مالی وسعت دی ہے اور صاحب نصاب ہے تو زکوٰۃ کے مسائل جاننا ضروری ہوگا، جب شادی کی تو بیوی کو گھر میں لایا تو حیض و نفاس کے مسائل طلاق وغیرہ اور ایسی چیزیں جن کا تعلق میاں بیوی کی باہمی زندگی اور ان کے تعلقات سے ہے ان کا علم حاصل کرنا واجب ہوگا۔

اسی طرح تجارت و زراعت اور خرید و فروخت کے احکام و مسائل سیکھنا بھی واجب ہوگا گویا زندگی کا کوئی شعبہ ہو خواہ اعتقادات ہوں یا عبادات، معاملات ہوں یا تعلقات، تمام چیزوں کی بصیرت حاصل کرنا اور ان کو جاننا سیکھنا اس پر فرض ہوگا، اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اس کی وجہ سے وہ ہر جگہ حدود شریعت سے تجاوز کرتا رہے گا اور دینی احکام و مسائل سے ناواقفیت کی بنا پر اس کا ہر فعل و عمل خلاف شریعت ہوگا جس کی وجہ سے وہ سخت گناہ گار ہوگا۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں علم سے مراد علم اخلاص اور آفات نفس کی معرفت ہے۔ یعنی ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ نفس کی تمام برائیوں مثلاً حسد، بغض، کینہ اور کدورت کو پہچانیں اور ان چیزوں کا علم حاصل کریں جو اعمال خیر کو فاسد کرتی ہیں۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم کی مقدس روشنی تو انھیں کے نصیب میں ہوتی ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیت طبع کا میلان اس طرف ہوتا ہے نیز جس کی جتنی استعداد و صلاحیت ہوتی ہے اسے علم سے اتنا ہی حصہ ملتا ہے۔ لہٰذا علم سکھانے میں اس بات کا خیال بطور خاص رکھنا چاہئے کہ جس کی جتنی استعداد ہو اور وہ جس معیار کی صلاحیت رکھتا ہو اسی اعتبار سے اسے علم سکھایا جائے۔ یہ نہ ہونا چاہئے کہ کسی شخص کی استعداد و صلاحیت تو انتہائی کم درجہ کی ہے مگر علم اسے انتہائی اعلیٰ و ارفع سکھایا جا رہا ہو اسی طرح ہر علم کے سکھانے کا موقع و محل ہوتا ہے۔ جو علم جس موقع پر ضروری ہو اور جس علم کا جو محل ہو اس کے مطابق سکھایا جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص عوام اور جہلاء کے سامنے یکبارگی تصوف کے اسرار و معانی اور اس کی باریکیاں بیان کرنے لگے تو انھیں اس سے فائدہ ہونا تو الگ رہا اور زیادہ گمراہ ہو جائیں گے۔

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُنَافِقٍ حُسْنُ سَمْتٍ وَلَا فِقْهٌ فِی الدِّیْنِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ دو خصلتیں ایسی ہیں جو منافق میں جمع نہیں ہوتیں۔ ایک تو خلق نیک دوسری دینی سمجھ۔" (ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں اس بات کی رغبت دلائی جا رہی ہے کہ یہ دو وصف چونکہ ایسے ہیں جو مخلص مؤمن ہی کا حصہ ہیں اس لئے ہر

مسلمان کو چاہئے کہ وہ دونوں خصلتوں کو اپنے اندر پیدا کر دے یعنی نیک عادتیں، اچھے اخلاق اور بہترین اوصاف کے جوہر اپنے اندر سموئے اور علم حاصل کر کے دینی سمجھ پیدا کرے۔

علامہ تور بشتی فرماتے ہیں کہ تفقہ فی الدین یعنی دینی سمجھ کی حقیقت یہ ہے کہ دل میں دین کی معرفت جاگزیں ہو پھر زبان سے اس کا اظہار ہو اور اس کے مطابق عمل کرے جس کے سبب سے خوف خدا اور تقویٰ حاصل ہو۔

(۲۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ خَرَجَ فِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَرْجِعَ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص گھر سے علم حاصل کرنے کے لئے نکلا تو وہ جب تک کہ (گھر) واپس نہ آجائے خدا کی راہ میں ہے۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر ماں باپ کی محبّت و شفقت سے منہ پھیر کر اور اپنے گھربار کی تمام راحتیں ترک کر کے علم دین حاصل کرنے کے لئے اپنے وطن و شہر سے نکلتا ہے خواہ وہ علم فرض عین ہو یا فرض کفایہ یعنی ضرورت و حاجت سے زیادہ، تو وہ طالب علم مجاہد فی سبیل اللہ کے مرتبہ کا ہوتا ہے جو ثواب خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کو ہوتا ہے وہی ثواب اس طالب کو بھی ملتا ہے، اس لئے کہ جس طرح ایک مجاہد سر پر کفن باندھ کر محض اس جذبہ سے میدان جنگ میں پہنچتا ہے کہ وہ خدا کے دین کو سربلند کرے اور خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے نام کا بول بالا کرے اسی طرح طالب علم محض اس مقصد کے لئے علم دین حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کی تمام خواہشات کو ختم کر کے اور کسر نفسی اختیار کر کے علم الٰہی کی مقدس روشنی سے ظلم و جہل کی تمام تاریکیوں کو دور کر دے، خدا کے دین کو تمام عالم میں پھیلائے اور شیطان کے مکر و فریب سے لوگوں کو محفوظ رکھ کر شیطان کو ذلیل و خوار کرے۔ لہٰذا یہ جب تک علم حاصل کر کے اپنے گھر واپس نہیں آجاتا برابر میدان جہاد کا ثواب حاصل کرتا رہتا ہے۔

پھر اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب طالب علم حصول علم سے فارغ ہو کر اپنے گھر واپس آجاتا ہے تو اس سے بھی زیادہ مرتبہ اور درجہ پاتا ہے کیونکہ جب وہ تعلیم کو مکمّل کر کے لوٹتا ہے تو دنیا میں علم و معرفت کی روشنی پھیلانے، لوگوں کو تعلیم دینے اور انسانی زندگی کو علم و عمل سے کامل کرنے کے لئے ایک مصلح اور معلّم کی حیثیت میں آتا ہے جس کی وجہ سے وہ وارث انبیاء کے معزز و مقدس لقب سے نوازا جاتا ہے۔

(۲۳) وَعَنْ سَخْبَرَۃَ الْاَزْدِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ کَانَ کَفَّارَۃً لِّمَا مَضٰی رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ ضَعِیْفُ الْاِسْنَادِ وَاَبُوْدَاوٗدَ الرَّاوِیُّ یُضَعَّفُ۔

"اور حضرت سخبرہ[1] ازدیؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا جو شخص علم طلب کرتا ہے تو وہ اس کے گزرے ہوئے (صغیرہ) گناہوں کے لئے کفارہ ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی ابوداؤد (روایت حدیث میں) ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔"

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَنْ یَّشْبَعَ الْمُؤْمِنُ مِنْ خَیْرٍ یَّسْمَعُہٗ حَتّٰی یَکُوْنَ مُنْتَھَاہُ الْجَنَّۃَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ مؤمن بھلائی (یعنی علم) سے سیر نہیں ہوتا وہ اس کو سنتا (یعنی حاصل کرتا) ہے یہاں تک کہ اس کی انتہا جنّت ہوتی ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: طلب علم، ایمان کا خاصہ ہے چونکہ ایمان نور ہی نور ہے اس لئے وہ علم کو جو نور الٰہی ہے پوری طرح سے اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا

---

[1] اسم گرامی سخبرہؓ اور کنیت ابوعبداللہ ہے آپ ازدی ہیں بعض اسدی بتاتے ہیں

ہے۔اسی لئے فرمایا جارہا ہے کہ جب انسان کا قلب و دماغ ایمان کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے تو وہ علم و معرفت کے نور سے انسانی معراج کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جانا چاہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مؤمن کا پیٹ علم سے کبھی نہیں بھرتا وہ جوں جوں علم کی بلندیوں پر پہنچتا رہتا ہے اس کی خواہش و تمنا یہی رہتی ہے کہ وہ اس منزل کی آخری حدود تک پہنچ جائے اگرچہ علم کا میدان چونکہ اتنا وسیع ہے کہ اگر انسان اپنی بڑی سے بڑی زندگی کے ساتھ بھی ایک لمحہ گزارے بغیر اس میں دوڑتا رہے تو وہ اس کی انتہائی حدود کو نہیں پہنچ سکتا، مگر اس کے باوجود مؤمن تمام عمر علم کی تلاش میں رہتا ہے اور وہ عمر کے آخری حصے تک علم کے دامن کو چھوڑنا نہیں چاہتا یہاں تک کہ اس کی زندگی اپنے مقررہ وقت پر آکر ختم ہو جاتی ہے اور وہ علم اس صادق طلب اور سچی دھن کے عوض جس میں وہ زندگی بھر مصروف رہا جنت کی ابدی سعادتوں سے نوازا جاتا ہے۔

درحقیقت اس حدیث میں طالب علم اور اہل علم کے لئے بڑی عظیم بشارت ہے کہ یہ لوگ اس دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں اور رضائے مولیٰ سے ان کا دامن پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل اللہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک حصول علم میں منہمک رہے ہیں باوجودیکہ ان کی علمی فضیلت و عظمت انتہائی درجہ کی ہوتی تھی مگر وہ اس سعادت کے حصول کی خاطر طلب علم میں ہمیشہ مشغول رہتے تھے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات بھی ذہن میں رکھ لینی چاہئے کہ علم کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ اپنے بہت سے گوشوں پر حاوی ہے اس لئے وہ حضرات جو تصنیف و تالیف اور تعلیم و تعلّم میں مشغول رہتے ہیں وہ بھی دراصل طالب علم میں ہی مشغول ہوتے ہیں اس لئے ان کو بھی طلب علم اور تکمیل علم کا ثواب ملتا ہے اور وہ اسی زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهٗ ثُمَّ كَتَمَهٗ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِیُّ۔ (ورواه ابن ماجة عن انس)

”اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جو اسے معلوم تھی مگر اس نے چھپایا (یعنی بتایا نہیں) تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔ ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت انس سے روایت کیا ہے۔“ (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں ایسے عالم کے بارے میں وعید بیان کی جارہی ہے جو دینی باتیں معلوم ہونے کے باوجود لوگوں کو نہیں بتاتا اور سائل کو جواب نہیں دیتا۔ مگر یہ وعید ایسے علم کے بارے میں ہے جس کی تعلیم ضروری اور واجب ہو۔ مثلاً کوئی شخص اسلام لانے کا ارادہ کرے اور کسی عالم سے کہے کہ اسلامی تعلیمات سے مجھے آگاہ کرو اور بتاؤ کہ اسلام کیا چیز ہے یا وہ نماز کے وقت عالم سے پوچھتا ہے کہ نماز کے جو احکام و مسائل ہیں ان سے مجھے آگاہ کرو، یا کسی حلال و حرام چیز کا کوئی فتویٰ معلوم کرنا چاہتا ہے تو ان سب چیزوں کا جواب دینا اور جہاں تک اسے معلوم ہوں صحیح صحیح بات بتانا عالم کے لئے ضروری اور واجب ہے۔ البتہ نوافل و مباح چیزوں کے بارے میں یہ حکم نہیں ہوگا۔

(۲۶) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِیَ بِهِ الْعُلَمَآءَ اَوْلِيُمَارِیَ بِهِ السُّفَهَآءَ اَوْيَصْرِفَ بِهٖ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ۔

”اور حضرت کعب ابن مالکؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص نے علم کو اس غرض سے حاصل کیا کہ اس کے ذریعے علماء پر فخر کرے، بیوقوفوں سے جھگڑے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔ ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔“ (ترمذیؒ)

تشریح: علم اپنی لطافت اور نورانیت کے سبب ریاکاری، خود نمائی، غرور و تکبر اور بے جا فخر و مباہات کی غلاظتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ جب علم کی اولین کرن یہی چاہتی ہے کہ وہ انسان کے دل و دماغ سے ظلم و جہل کی ہر تاریکی کو دور کر دے تو یہ کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے کہ ایک عالم جس کے دماغ میں علم کی مقدس روشنی بھری ہو، ان غیر اسلامی و غیر اخلاقی چیزوں کا مظاہرہ کرے۔ علم کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک انسان تہذیب و شرافت اور تعلیم و ترقی کی انتہائی بلندیوں پر ہونے کے باوجود بھی سراپا انکسار متواضع بنا رہے، ریاکاری و خود نمائی سے الگ رہے اور اخلاق و احسان کی زندگی اختیار کئے رہے۔

اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر کوئی علم محض دنیوی منفعت اور ذاتی وجاہت و عزت کی خاطر حاصل کرتا ہے۔ اگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم حاصل کرنے کے بعد لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں، عوام پر اپنی علم دانی کا سکہ جما کر ان سے مال و دولت حاصل کیا جائے علم کو دنیا کے کاروبار اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے آلہ کار بنایا جائے اور نہ صرف یہ بلکہ علم حاصل کرنے کے بعد وہ علماء حق کے ساتھ غرور و تکبر کا معاملہ کرتا ہے، جاہلوں سے خواہ مخواہ الجھتا رہتا ہے، لوگوں کے سامنے بے جا فخر و مباہات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تو ایسے عالم کو کان کھول کر سن لینا چاہئے کہ چاہے وہ دنیاوی اعتبار سے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے اور تقدیر الٰہی اس کی خواہشات اور اغراض کی تکمیل کرا دے مگر آخرت میں اس کی نیت کے اس کھوٹ کی وجہ سے اس سے سخت بازپرس ہوگی وہاں نہ اس کا علم کام آئے گا اور نہ اس کی سیادت و وجاہت بلکہ اس کو اس عدم اخلاص کی سزا بایں طور بھگتنی ہوگی کہ اسے جہنم کے شعلوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

ہاں، ایسا شخص جو پہلے اپنی نیت میں مخلص تھا، اس کے ارادہ میں کسی قسم کا کوئی کھوٹ نہیں تھا اور اس کا مقصد حاصل کرنے سے محض اعلاء کلمۃ اللہ اور رضائے مولیٰ تھا مگر بعد میں بتقاضائے فطرت و انسانی جبلت اس کی نیت میں کھوٹ پیدا ہو گیا اور اس میں نمود و نمائش اور ریاکاری کا اثر ہو گیا تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہوگا کیونکہ اس معاملہ میں بہر حال وہ معذور ہے۔

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغٰى بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِیْ رِيْحَهَا۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس نے اس علم کو جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کی جاتی ہے، اس غرض سے سیکھا کہ وہ اس کے ذریعہ دنیا کی متاع حاصل کرے تو قیامت کے دن سے اسے جنت کی خوشبو بھی میسر نہیں ہوگی۔"

(احمدؒ، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: جو کوئی علم دین محض اس لئے حاصل کرے کہ اس کے ذریعہ دنیا کی دولت و عزت سمیٹے اور اسے حصول دنیا کے لئے وسیلہ بنائے تو اس کے لئے یہ وعید بیان فرمائی جا رہی ہے۔

ہاں اگر علم دینی نہ ہو دنیاوی ہو تو اس کو اس مقصد کے لئے کہ اسے حصول دنیا کے لئے وسیلہ اور ذریعہ معاش بنا لیا جائے گا حاصل کرنا کوئی برا نہیں ہے لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ وہ علم ایسا نہ ہو جس کے حصول کو شریعت درست قرار نہیں دیتی۔ مثلاً علم نجوم وغیرہ یا دوسرے ایسے علوم جو عقیدہ و عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس حدیث میں یہ کہنا کہ ایسا عالم جس کی نیت حصول علم کے سلسلہ میں خالصاً للہ نہ ہو اسے جنت کی خوشبو بھی میسر نہیں آئے گی، یہ کنایہ ہے بہشت میں عدم دخول سے اور مبالغہ ہے محرومی جنت میں اور اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص مخلص اور مقرب بندوں کے ہمراہ، بغیر عذاب کے جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

(۲۸) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَاَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ۔ ثَلَاثٌ لَا يَغُلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ، اِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ وَالنَّصِيْحَةُ لِلْمُسْلِمِيْنَ وَلُزُوْمُ جَمَاعَتِهِمْ فَاِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ رَوَاهُ الشَّافِعِیُّ وَالْبَيْهَقِیُّ فِیْ

الْمَدْخَلِ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَ اَبُوْدَاؤدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اِلَّا اَنَّ التِّرْمِذِيَّ وَاَبَا دَاوٗدَ لَمْ يَذْكُرَا ثَلَاثٌ لَا يُغِلُّ عَلَيْهِنَّ اِلٰى اٰخِرِهٖ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اس بندہ کو تازہ رکھے (یعنی اس کی قدر و منزلت بہت کافی ہو اور اسے دین و دنیا کی خوشی و مسرت کے ساتھ رکھے) جس نے میری کوئی بات سنی اور اسے یاد رکھا اور ہمیشہ یاد رکھا اور اس کو جیسا سنا ہو بہو لوگوں تک پہنچایا۔ کیونکہ بعض حامل فقہ (یعنی علم دین کے حامل) فقیہ (یعنی سمجھ دار) نہیں ہوتے اور بعض حامل فقہ ان لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہہ (سمجھ دار) ہوتے ہیں۔ اور تین چیزیں ایسی ہیں جن میں مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا۔ ایک تو عمل خاص طور پر خدا کے لئے کرنا، دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرنا اور تیسرے مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا۔ اس لئے کہ جماعت کی دعا ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔" (شافعیؒ، بیہقیؒ در مدخل)

تشریح: مطلب یہ کہ حدیث کو محفوظ اور یاد رکھنے والے بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو خود زیادہ سمجھ دار نہیں ہوتے اور بعض سمجھ رکھتے ہیں لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ جس کے سامنے حدیث بیان کرتے ہیں وہ ان سے زیادہ سمجھ رکھتا ہے لہٰذا چاہئے کہ حدیث جس طرح سنی جائے اسی طرح دوسروں تک اسے پہنچایا جائے تاکہ جس کو حدیث پہنچائی جا رہی ہے اور جس کے سامنے بیان کی جا رہی ہے وہ حدیث کا مطلب بخوبی سمجھ لے۔ اس حدیث نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ راویان حدیث کو چاہئے کہ وہ حدیث کو جن الفاظ میں سنیں بعینہ انہیں الفاظ میں نقل کریں۔

"یُغِلُّ" اگر یاء کے زبر اور غین کے زیر کے ساتھ ہو تو اس کے معنی حقد یعنی کینہ کے ہوتے ہیں اور اگر یا کے پیش اور غین کے زبر کے ساتھ ہو یا حرف یا کے زبر اور غین کے پیش کے ساتھ ہو تو اس کے معنی خیانت کے ہو جاتے ہیں چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ مؤمن ان تین چیزوں میں خیانت نہیں کرتا یعنی مؤمن کے اندر یہ تینوں چیزیں ضرور پائی جاتی ہیں اور جب مؤمن سے یہ تینوں اعمال صادر ہوتے ہیں تو اس میں کینہ داخل نہیں ہوتا کہ وہ اسے ان چیزوں سے منحرف کر دے۔

"خلوص عمل" کا مطلب اور اس کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ بندہ جو عمل کرے وہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضاء کے لئے کرے۔ اس کے علاوہ اس کا مقصد کوئی دوسرا نہ ہو، نہ کوئی دنیوی غرض ہو اور نہ کوئی اخروی منفعت صرف رضائے مولا ہی سامنے ہو اور وہی حاصل مقصد پھر اس میں بھی دو درجے ہو جاتے ہیں۔ عام لوگوں کا جو خلوص عمل ہوتا ہے وہ خاص یعنی اہل اللہ کے خلوص عمل سے کمتر درجہ کا ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنی ریاضت و مجاہدہ اور تعلق مع اللہ کی بنا پر خلوص کی انتہائی بلندیوں تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کا طریقہ یہ ہے کہ حتی المقدور اپنے دوسرے بھائیوں کو خیر و بھلائی کی نصیحت کرتا رہے اور انھیں سیدھی راہ پر لگانے کی کوشش کرتا رہے، نیز دنیاوی اعتبار سے ان کی امداد و اعانت کرے اور ان کی ہر مشکل میں خبر گیری رکھے۔

"مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنے" کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر مرحلہ پر اجتماعیت کے اصول پر کاربند رہے اور اپنے آپ کو کبھی انفرادیت کی راہ پر نہ ڈالے، علماء دین اور علمائے اُمّت کے متفقہ عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کی موافقت کرتا رہے اور ان کے ساتھ رہے۔ مثلاً نماز جمعہ اور جماعت وغیرہ میں ان لوگوں کے ہمراہ رہ کر اجتماعیت کو فروغ دے تاکہ اسلامی طاقت و قوت میں بھی اضافہ ہو اور رحمت خداوندی کے نزول کا سبب بھی ہو کیونکہ جماعت پر خدا کی رحمت ہوتی ہے۔

لفظ مِنْ وَرَائِهِمْ مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں میم کے زیر کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں زبر کے ساتھ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کے مکر و فریب سے بچنے کے لئے جماعت کو مسلمانوں کی دعا گھیرے ہوئے ہے جس کی بنا پر وہ شیطان کی گمراہی سے بچتے ہیں۔ اس میں اس بات پر تنبیہہ مقصود ہے کہ جو کوئی علمائے دین اور صلحائے اُمّت کی جماعت سے اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہے اس کو نہ جماعت کی برکت میسر ہوتی ہے اور نہ مسلمانوں کی دعا حاصل ہوتی ہے۔

(۲۹) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى لَهُ مِنْ سَامِعٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ اَبِي الدَّرْدَآءِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ میں نے سرکار دوعالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو تازہ رکھے (یعنی خوش اور باعزت رکھے) جس نے مجھ سے کوئی بات سنی اور جس طرح سنی تھی اسی طرح اس کو پہنچادیا چنانچہ اکثر وہ لوگ جنھیں پہنچادیا جاتا ہے سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔ (ترمذیؒ ابن ماجہؒ) اور دارمیؒ نے اس حدیث کو ابودراؤد سے روایت کیا ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کی مقدس احادیث کو سننا، ان کے احکام پر عمل کرنا اور ان احادیث کو دوسرے لوگوں تک پہنچانا سعادت وبرکت اور دین ودنیا میں فلاح وکامیابی کا ذریعہ ہے اس پر پوری اُمّت کا عقیدہ وایمان ہے کہ احادیث نبوی کی تعلیم وتعلّم دونوں جہان کی خوش نصیبی اور رضائے الٰہی کا سبب ہے لیکن اس کے باوجود علماء لکھتے ہیں کہ اگر حدیث کے حاصل کرنے، اس کے یاد رکھنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے میں اگر بفرض محال کوئی فائدہ نہ ہوتا تو احادیث کی عظمت ورفعت کی بنا پر دین ودنیا دونوں جگہ حصول برکت ورحمت کے لئے آنحضرت ﷺ کی یہ مقدس دعا ہی کافی ہوتی۔

(۳۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِتَّقُوا الْحَدِيْثَ عَنِّي اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَّجَابِرٍ وَلَمْ يَذْكُرْ اِتَّقُوا الْحَدِيْثَ عَنِّي اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ میری جانب سے حدیث بیان کرنے سے بچو مگر اس حدیث کو بیان کرو جسے تم (سچ) جانو۔ چنانچہ جس شخص نے (جان کر) مجھ پر جھوٹ بولا اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے۔ (ترمذیؒ) اور ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے اور (حدیث کے پہلے جزء) میری جانب سے حدیث بیان کرنے سے بچو جسے تم جانو کا ذکر نہیں کیا ہے۔"

تشریح: مقصد یہ ہے کہ حدیث کے بیان کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور جس حدیث کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو کہ واقعی یہ حدیث آپ ﷺ ہی کی ہے اسے لوگوں کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہئے۔ انھی احادیث کو بیان کرنا چاہئے جن کے بارے میں یقین یا ظن غالب کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ وہ آپ ﷺ ہی کی حدیث ہے تاکہ آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس کی طرف غلط حدیث کی نسبت نہ ہو اور نہ آپ ﷺ کی جانب جھوٹ بات کا انتساب ہو جس پر خدا کی جانب سے سخت عذاب کی قید ہے۔

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَاْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ وَفِي رِوَايَةٍ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ الترمذیؒ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص نے قرآن کے اندر اپنی عقل سے کچھ کہا اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تلاش کرے اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جس شخص نے بغیر علم کے قرآن میں کچھ کہا اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جس طرح حدیث بیان کرنے میں احتیاط سے کام لینے کی ہدایت کی گئی ہے اسی طرح قرآن کا ترجمہ کرنے اور اس کی تفسیر بیان کرنے کے بارے میں بھی اسی احتیاط سے کام لینے کی ہدایت فرمائی جارہی ہے کہ آیات کی وہی تفسیر بیان کی جائے جو احادیث سے ثابت اور علماء اُمّت سے منقول ہوا ہو اور جس پر نقلاً سند موجود ہو۔ یہ نہ ہونا چاہئے کہ آیتوں کی تفسیر اور ان کے مطالب ومقاصد بیان کرنے میں اپنی عقل اور رائے کو دخل دیا جائے کیونکہ اس طرح قرآن کے معنی ومفہوم میں فرق پیدا ہو جاتا ہے جو عذاب خداوندی کا موجب ہے۔

(۳۲) وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِرَأْیِہٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ۔

(رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت جندب[1] راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور وہ حقیقت وواقع کے مطابق بھی ہو تو اس نے تب بھی غلطی کی۔" (ترمذیؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: یعنی کسی شخص نے قرآن کی کسی آیت کی ایسی تفسیر بیان کی جو نہ تو احادیث سے ثابت تھی اور نہ علمائے اُمّت سے منقول بلکہ محض اپنی عقل ورائے پر بھروسہ کر کے آیت کی تفسیر بیان کر دی مگر اتفاق سے اس کی بیان کردہ تفسیر صحیح اور حقیقت وواقعہ کے بالکل مطابق ہوئی کہ اس سے آیت کے معنی و مطالب میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تو اس کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ یہ بھی اس نے غلطی کی کیونکہ تفسیر گو صحیح ہوئی مگر چونکہ اس نے قصداً اپنی عقل اور رائے کو قرآن کی تفسیر میں دخل دیا اور تفسیر کا جو شرعی قاعدہ وطریقہ ہے اس سے انحراف کیا اس لئے وہ بھی خطا کار کے حکم میں شامل کیا جائے گا۔ مجتہد کا معاملہ اس کے برعکس ہے کہ اگر مجتہد اپنے اجتہاد میں غلطی بھی کر جائے تو اس پر نہ صرف یہ کہ کوئی مواخذہ نہیں بلکہ اسے ثواب بھی ملتا ہے۔

"تفسیر" اسے کہتے ہیں کہ آیت کے جو معنی و مطالب بیان کئے جائیں اس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ آیت کی مراد اور اس کا حقیقی مطلب یہی ہے اور یہ بات سوائے اہل تفسیر کی نقل کے جس کی سند آنحضرت ﷺ تک پہنچی ہو درست نہیں ہے یعنی ایسا یقین اور اطمینان اسی تفسیر پر صحیح ہوگا جو اجلہ علماء اور مستند مفسرین سے منقول ہو کیونکہ انھوں نے وہی معنی و مطالب بیان کئے ہیں جو براہ راست سرکار دوعالم ﷺ سے منقول ہیں اور جو واسطہ بالواسطہ ان تک پہنچے ہیں۔

"تاویل" اسے کہتے ہیں کہ کسی آیت کے معنی و مطالب بیان کرتے ہوئے بطریق احتمال کے یہ کہا جائے کہ میں جو معنی بیان کر رہا ہوں اور آیت کی جو تفسیر کر رہا ہوں ہو سکتا ہے کہ مراد اصلی یہی ہو۔ یہ چیز درست اور صحیح ہے لیکن یہ بھی جب ہی صحیح ہوگی کہ بیان کردہ تفسیر قواعد عربی اور شرع کے مطابق ہو۔

(۳۳) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمِرَاءُ فِی الْقُرْاٰنِ کُفْرٌ۔ (رواہ ابوداؤد واحمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالمؐ نے ارشاد فرمایا۔ قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔" (احمدؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: ان لوگوں کا دائرہ کفر کے قریب کر دیا گیا ہے جو قرآن کے معنی و مطالب اور مقاصد ومراد کے تعین میں جھگڑتے رہتے ہیں اور جس کی عقل میں جو آتا ہے اس کو حق اور صحیح سمجھتے ہوئے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیز ایسے کم فہم لوگوں کو جب ظاہری طور پر قرآن کی آیتوں میں معنی ومقصد کے لحاظ سے فرق نظر آتا ہے تو وہ ان میں سے ایک آیت کو ناقابل اعتناء، ناقابل قبول اور ناقابل استشہاد قرار دے کر دوسری آیت کو راجح قرار دے دیتے ہیں۔ گویا اس طرح وہ قرآن ہی کی ایک آیت سے دوسری آیت کو ساقط کر دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا کرنا شرعی نقطۂ نظر سے انتہائی جرم ہے بلکہ ایسی شکل میں جبکہ دو آیتوں میں باہم اختلاف وتضاد نظر آئے تو حتی الامکان دونوں میں تطابق اور توافق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہو تو اسے یہ اعتقاد کر لینا چاہئے کہ یہ میری کم علمی اور بدفہمی کی بنا پر ہے اور حقیقی مفہوم ومراد کا علم اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سونپ دے کہ وہی بہتر جاننے والے ہیں۔

مثلاً اہل سُنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ خیر اور شر سب خدا ہی کی جانب سے ہے اور وہ اپنے اس عقیدہ کی بنیاد اس آیت پر رکھتے ہیں کہ ارشاد ربانی ہے۔

---

[1] آپ کا اسم گرامی جندب ابن عبداللہ ابن سفیان بجلی علقی ہے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اور یزید کے حامیوں میں جو جنگ چل رہی تھی اس وقت یہ حیات تھے اس فتنہ کے چار دن بعد آپ کا انتقال ہوا ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔

"یعنی (اے محمد ﷺ) فرما دیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔"

اہل سنّت والجماعت کا یہ عقیدہ اور ان کی دلیل بالکل صحیح اور صاف واضح ہے۔ لیکن اہل قدر اس کی تردید کرتے ہیں اور اس کے برخلاف اپنا عقیدہ یہ قائم کئے ہوئے ہیں کہ خیر کا خالق خدا ہے اور شر کا خالق خدا نہیں ہے اور شر کا خالق خود انسان ہے اور اپنے عقیدہ کی بنیاد اس آیت پر رکھتے ہیں جو بظاہر پہلی آیت کے متضاد ہے یعنی ارشاد ربانی ہے۔

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔

"جو کچھ از قسم نیکی تمہیں پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ از قسم برائی تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے نفس کی جانب سے ہے۔"

بہرحال اس قسم کے اختلافات اور آیتوں میں تضاد پیدا کرنا منع ہے بلکہ یہ چاہئے کہ اس قسم کی آیتوں میں ایسی آیت پر عمل کیا جائے جس پر مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہو اور دوسری آیت میں ایسی تاویل کی جائے جو شرع کے مطابق ہو، جیسا کہ انھیں دونوں مذکورہ بالا آیت میں دیکھا جائے کہ پہلی آیت پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ خیر و شر تمام اللہ ہی کی جانب سے ہے اور ہر چیز تقدیر الٰہی کے مطابق ہی ہوتی ہے اس پر عمل کیا جائے۔

اور دوسری آیت کی یہ تاویل کی جائے کہ دراصل اس آیت کا تعلق ماقبل کی آیت سے ہے کہ اس میں منافقین کی برائی اور ان کا عقیدہ بیان کیا جا رہا ہے کہ ان منافقوں کو کیا ہوا ہے جو کہ اس چیز کو جو صحیح اور واضح ہے نہیں سمجھتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ نیکی و بھلائی تو خدا کی طرف سے ہے اور برائی خود بندہ کے نفس کی جانب سے ہے۔ گویا اس طرح دونوں آیتوں میں تطبیق ہو جائے گی۔ اس طرح دیگر آیتوں میں بھی مطابقت پیدا کی جائے۔

(۳۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْمًا يَتَدَارَؤُوْنَ فِي الْقُرْاٰنِ فَقَالَ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهٰذَا۔ ضَرَبُوْا كِتَابَ اللّٰهِ بَعْضَهٗ بِبَعْضٍ وَاِنَّمَا نَزَلَ كِتَابُ اللّٰهِ يُصَدِّقُ بَعْضُهٗ بَعْضًا فَلَا تُكَذِّبُوْا بَعْضَهٗ بِبَعْضٍ فَمَا عَلِمْتُمْ مِنْهُ فَقُوْلُوْا وَمَا جَهِلْتُمْ فَكِلُوْهُ اِلٰى عَالِمِهٖ۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ)

"حضرت عمرو[1] ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک جماعت کے بارے میں سنا کہ وہ آپس میں قرآن کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اور جھگڑ رہے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک تم سے پہلے کے لوگ اسی سبب سے ہلاک ہوئے انھوں نے کتاب اللہ کے بعض حصّہ کو بعض پر مارا (یعنی آیات میں تضاد اور اختلاف ثابت کیا کہ فلاں آیت فلاں آیت کے مخالف ہے اور یہ آیت فلاں آیت کے مخالف ہے) اور بے شک کتاب اللہ کا بعض حصّہ بعض کی تصدیق کرتا ہے لہٰذا تم قرآن کے بعض حصّہ کو بعض سے نہ جھٹلاؤ، اور اس کے بارے میں جتنا تم جانتے ہو اس کو بیان کرو اور جو نہیں جانتے ہو اسے جاننے والوں کی طرف سونپ دو۔" (احمدؒ و ابن ماجہ)

تشریح: جیسا کہ اس سے پہلے حدیث میں گزر چکا ہے کہ جن لوگوں کا علم ناقص ہوتا ہے اور جن کے ایمان و عقیدہ میں کمزوری اور ذہن و فکر میں کمی ہوتی ہے وہ آیات میں باہم اختلاف پیدا کرتے رہتے ہیں اور آیت کے حقیقی مفہوم و مراد سے ہٹ کر ان کے ناقص ذہن و فکر میں جو مفہوم آتا ہے اسے بیان کرتے ہیں اور پھر اسی طرز پر اپنے نظریات و اعتقادات کی بنیاد بھی رکھ دیتے ہیں جس کی مثال ماقبل کی حدیث میں بیان کی جا چکی ہے۔

اس کے بارے میں یہاں بھی فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کچھ آیتوں میں اختلاف نظر آئے تو ان میں سے ایک کو دوسرے کے ذریعہ

---

[1] عمرو ابن شعیب تابعی ہیں، عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان سے ہیں۔

ساقط نہ کرو اور نہ اس کی تکذیب کرو بلکہ جہاں تک تمہارا علم مدد کر سکے ان میں تطبیق پیدا کرو، اگر ایسا نہ کر سکو تو پھر تم بجائے اس کے کہ اس میں اپنی عقل و سمجھ کے تیر چلاؤ اس کے حقیقی معنی و مفہوم کا علم اللہ اور اللہ کے رسول کی جانب سونپ دو، یا پھر ایسے علماء و صلحاء جو علم کے اعتبار سے تم سے اعلیٰ و افضل ہوں اور تم پر فوقیت رکھتے ہیں ان سے رجوع کرو۔

(۳۵) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ لِكُلِّ اٰيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَّ بَطْنٌ وَلِكُلِّ حَدٍّ مُّطَّلَعٌ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ قرآن کریم سات طرح پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے ہر آیت ظاہر ہے اور باطن ہے، اور ہر حد کے واسطے ایک جگہ خبردار ہونے کی ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: دنیا کی ہر زبان میں فصاحت و بلاغت اور لب و لہجہ کے اعتبار سے مختلف اسلوب اور مختلف لغات ہوتی ہیں۔ اسی طرح عربی زبان کی بھی سات لغات عرب میں مشہور تھیں، اس کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ قرآن کریم سات طرح یعنی سات لغات پر نازل ہوا ہے۔ ان سات لغات کی تفصیل اس طرح ہے۔ لغت قریش، لغت طے، لغت ہوازن، لغت اہل یمن، لغت ثقیف، لغت ہذیل اور لغت بنی تمیم۔

قرآن کریم سب سے پہلے قریش کی لغت کے مطابق نازل ہوا تھا جو سرکار دو عالم ﷺ کی لغت تھی لیکن جب تمام عرب میں اس لغت کے مطابق قرآن کا پڑھا جانا اس لئے دشوار و مشکل ہوا کہ ہر قبیلہ اور ہر قوم کی اپنی ایک مستقل لغت اور زبان کے لب و لہجہ کا الگ الگ انداز تھا تو سرکار دو عالم ﷺ نے بارگاہ الوہیت میں درخواست پیش کی کہ اس سلسلہ میں وسعت بخشی جائے تو حکم دے دیا گیا کہ ہر شخص قرآن کو اپنی لغت کے مطابق پڑھ سکتا ہے چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ تک اسی طرح چلتا رہا اور لوگ اپنی اپنی لغت کے اعتبار سے قرآن پڑھتے رہے۔

لیکن جب حضرت عثمانؓ نے کلام اللہ کو جمع کیا اور اس کی کتابت کرا کر اسلامی سلطنت کے ہر ہر خطہ میں اسے بھیجا تو انہوں نے اسی لغت کو مستقل قرار دیا جس پر حضرت زید بن ثابتؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم اور حضرت عمر فاروقؓ کے مشورہ سے قرآن کو جمع کیا تھا اور وہ لغت قریش تھی، حضرت عثمانؓ نے یہ حکم بھی فرمایا کہ تمام لغات منسوخ کر دی جائیں صرف اسی ایک لغت کو باقی رکھا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے حکم کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ قرآن صرف ایک لغت میں جمع ہو گیا جس سے دنیا کے ہر خطہ کے لوگوں کے لئے آسانیاں ہو گئیں بلکہ اس کی وجہ سے ایک بڑے فتنہ کی جڑ بھی ختم کر دی گئی اور فتنہ یہ تھا کہ لغات کے اختلافات کی وجہ سے مسلمان آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے تھے اور نوبت بانیجا رسید کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنی لغت کے خلاف قرآن پڑھتا دیکھتا تو یہ سمجھ کر کہ صرف میرے قبیلہ ہی کی لغت صحیح ہے اسے کافر کہہ دیا کرتا تھا، چنانچہ لغت قریش کے علاوہ جس پر قرآن نازل ہوا تھا بقیہ تمام لغات ختم کر دی گئیں اور اگر کوئی لغت باقی بھی رہی تو وہی رہی جس پر صحابہ کا اتفاق رہا اور جو سند متصل اور تواتر کے ساتھ آخر میں قراء سبعہ تک پہنچی اس کے علاوہ لغت میں تکرر یعنی مالہ وادغام وغیرہ کا اختلاف بھی باقی رہا جو آج تک قرا سبعہ میں موجود ہے۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ قرآن سات طرح پر نازل ہوا ہے تو سات طرح سے مراد وہ سات قرأتیں ہیں جو قراء سبعہ پڑھتے ہیں، پھر علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ اگرچہ قرأتیں سات سے زیادہ ہیں لیکن یہاں سات کی تحدید اس لئے کی گئی ہے کہ اختلاف کی بھی سات ہی قسمیں ہیں جن کی طرف یہ سات قرأتیں راجع ہیں۔ جیسے (۱) کلمہ کی ذات میں اختلاف یعنی کلمہ میں کمی و زیادتی میں۔ (۲) جمع اور مفرد کا اختلاف (۳) مذکر اور مؤنث کا اختلاف (۴) صرفی اختلاف یعنی تخفیف و تشدید اور فتح و کسرہ وغیرہ کا اختلاف جیسے مَيِّتٌ اور مَيْت، يَقْنُطُ اور يَقْنِطُ (۵) اعراب کا اختلاف (۶) حروف کا اختلاف جیسے لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ میں نون کی تشدید اور تخفیف (۷) ادائیگی لغات کا اختلاف جیسے تفخیم اور امالہ وغیرہ۔

حدیث کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ہر آیت کا ظاہر ہے اور باطن ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آیت کے ایک ظاہری معنی ہیں جو تمام اہل زبان سمجھتے ہیں اور ایک باطنی معنی ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے وہی بندگان خاص سمجھتے ہیں جن کے قلب و دماغ معرفت کی روشنی سے بھرپور ہوتے ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے کہ ہر حد کے واسطے ایک جگہ خبردار ہونے کی ہے حد کے معنی طرف اور نہایت کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہر ایک ظاہر اور باطن کی ایک حد اور نہایت ہے اور حد و نہایت کے لئے ایک مطلع یعنی ایسا مقام ہے جس پر پہنچنے اور اس کے حاصل کرنے کے بعد آدمی اس حد اور نہایت پر مطلع ہوتا ہے۔

چنانچہ ظاہر کا مطلع یعنی وہ مقام جس پر پہنچ کر حد اور نہایت معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ عربی زبان اور اس کے اصول و قواعد سیکھے جائیں، علم صرف و نحو حاصل کیا جائے کہ قرآن کے ظاہری معنی انہیں سے متعلق ہیں، نیز ہر آیت کا شان نزول اور ناسخ و منسوخ کا علم حاصل کرے، یا اسی طرح وہ دوسری چیزیں ہیں جن پر قرآن کے ظاہری معنی کے سمجھنے کا انحصار ہے۔

باطن کا مطلع یہ ہے کہ ریاضت و مجاہدہ کیا جائے، قرآن کے ظاہری معنی اور ان کے احکام کا اتباع اور ان پر عمل کیا جائے نفس کو تمام برائی اور گناہ و معصیت سے پاک و صاف کیا جائے دل کو عبادت خداوندی اور رضائے الٰہی کے نور سے جلا بخشی جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے حصول کے بعد قرآن کے باطنی علوم اور اس کے اسرار و معارف کا قلب انسان پر انکشاف ہوتا ہے۔

امام محی السنۃؒ نے اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ حدیث کے الفاظ "ظہر" سے مراد قرآن کے الفاظ ہیں اور "بطن" سے مراد الفاظ کی تاویل ہے۔ "مطلع" سے مراد فہم یعنی وہ سمجھ ہے جس کی وجہ سے قرآن کے اندر غور و فکر کرنے والے پر قرآن کے جن علوم و معنی اور تاویل کا انکشاف ہوتا ہے وہ دوسروں پر نہیں ہوتا۔

(۳۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ اٰيَةٌ مُّحْكَمَةٌ اَوْسُنَّةٌ قَآئِمَةٌ اَوْ فَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ وَمَا كَانَ سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ علم تین ہیں (۱) آیت محکم (یعنی مضبوط)۔ (۲) سُنّت قائمہ (۳) فریضہ عادلہ۔ اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زائد ہے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دین کے علم تین ہیں، یا یہ کہ علم دین کی بنیاد تین چیزوں پر ہے۔ "آیت محکم" وہ آیتیں ہیں جو مضبوط اور غیر منسوخ ہیں، اس سے کتاب اللہ کی طرف اشارہ ہے جو کہ اصل قرآن آیات محکمات ہی ہیں اس لئے یہاں صرف انھیں کو ذکر کیا گیا ہے اور وہ دوسرے علوم جو اس کے لئے وسیلہ ہیں وہ بھی اس کے ساتھ متعلق ہیں۔ "سنت قائمہ" یعنی وہ حدیث جو متن اور اسناد کی مخالفت کے ساتھ ثابت ہیں۔

"فریضہ عادلہ" سے اشارہ ہے قیاس اور اجماع کی طرف جو کتاب و سُنّت سے مستنبط ہوتا ہے۔ اس کو فریضہ اس لئے کہا گیا ہے قیاس و اجماع پر بھی عمل کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ پر چنانچہ "عادلہ" کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایسا فریضہ جو کتاب و سنت کے مثل اور عدیل ہے۔

بہر حال حدیث کی توضیح یہ ہوئی کہ دین کے اصول چار ہیں جس پر دین و شریعت کی پوری بنیاد ہے۔ (۱) کتاب یعنی قرآن مجید (۲) سنت یعنی احادیث (۳) اجماع (۴) قیاس اور اس کے علاوہ جو بھی علم ہوگا وہ زائد اور دینی حیثیت سے بے معنی ہوگا۔

(۳۷) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُصُّ اِلَّا اَمِيْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ اَوْ مُخْتَالٌ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَوْ مُرَآءٍ بَدَلَ اَوْ مُخْتَالٍ۔

"اور حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ راوی ہیں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تین آدمی قصہ بیان کریں گے، حاکم یا محکوم یا تکبر کرنے والا۔ اور دارمیؒ نے اس حدیث کو عمرو بن شعیبؓ سے روایت کیا ہے انھوں نے اپنے باپ سے اور انھوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے اور دارمی کی روایت میں لفظ "مختال" یعنی تکبر کرنے والا کی بجائے "او مراء" (یا ریا کار) ہے۔"

تشریح: قصہ بیان کرنے سے مراد وعظ و نصیحت کرنا اور حکایات و قصص بیان کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وعظ و تقریر عموماً تین آدمی کرتے ہیں ان میں سے دو حق پر ہیں یعنی حاکم و محکوم۔ ان ہی لوگوں کو وعظ بیان کرنا چاہئے۔ تیسرا شخص متکبر ہے اس کو وعظ نہیں کہنا چاہئے کیونکہ وہ وعظ کہنے کا اہل نہیں ہے۔

گویا حدیث کا مفہوم یہ ہوا کہ وعظ کہنا اول تو امیر یعنی حاکم کا حق ہے کیونکہ وہ رعیت پر سب سے زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ اور رعایا کی اصلاح کے امور کو بخوبی جانتا ہے۔ اگر حاکم خود وعظ نہ کہے تو علماء میں سے جو عالم تقوی و تقدس میں سب سے افضل و اعلیٰ ہو اور دنیاوی طمع نہ رکھتا ہو، وہ اسے مقرر کرے گا تاکہ وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا رہے، لہٰذا "مامور" سے مراد ایک تو وہ عالم ہوگا جس کو حاکم وقت نے رعایا کی اصلاح کے لئے مقرر کیا ہو یا مامور سے مراد دوسرا وہ شخص ہے جو منجانب اللہ مخلوق کی ہدایت اور اصلاح کے لئے مامور کیا گیا ہو، جیسے علماء اور اولیاء اللہ جو لوگوں کے سامنے وعظ بیان کیا کرتے ہیں اور مخلوق خدا کی اصلاح و ہدایت میں لگے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے ایسے لوگوں پر زجر و توبیخ مقصود ہے جو طلب جاہ اور دولت کی خاطر وعظ بیان کیا کرتے ہیں حالانکہ نہ وہ علمی حیثیت سے اس عظیم منصب کے اہل ہوتے ہیں اور نہ عملی طور پر وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ لوگوں کی اصلاح کر سکیں۔ وعظ بیان کرنا صرف انہی دو آدمیوں کا حصہ ہے اور یہی اس کے مستحق اور اہل ہیں۔ ان کے علاوہ جو وعظ بیان کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ از راہ فخر و تکبر اور حصول جاہ و منفعت کی خاطر یہ کام کر رہا ہے جو عذاب خداوندی کا باعث ہے۔

(۳۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ كَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ وَمَنْ اَشَارَ عَلٰی اَخِیْهِ بِاَمْرٍ یَعْلَمُ اَنَّ الرُّشْدَ فِیْ غَیْرِهٖ فَقَدْ خَانَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا ہو گا تو اس کا گناہ اس شخص پر ہو گا جس نے اس کو (غلط) فتویٰ دیا ہے اور جس شخص نے اپنے بھائی کو کسی ایسے کام کے بارے میں مشورہ دیا جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ اس کی بھلائی اس میں نہیں ہے تو اس نے خیانت کی۔" (ابوداؤد)

تشریح: مثلاً ایک جاہل آدمی کسی عالم کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے آیا عالم نے سائل کو اس کے سوال کا صحیح جواب نہیں دیا بلکہ کم علمی یا کسی دوسری وجہ سے غلط مسئلہ بتا دیا۔ اس جاہل نے یہ نہ جانتے ہوئے کہ یہ مسئلہ غلط ہے۔ اس پر عمل کر لیا تو اس کا گناہ اس جاہل آدمی پر نہیں ہو گا بلکہ اس عالم پر ہو گا جس نے اسے غلط مسئلہ بتا کر غلط عمل کرنے پر مجبور کیا لیکن شرط یہ ہے کہ عالم نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی ہو۔

حدیث کے دوسرے جز کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے کسی بھائی کی بد خواہی اس طرح چاہی کہ اسے اس چیز کا مشورہ دیا جس کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ اس کی بھلائی اس میں نہیں ہے بلکہ دوسرے امر میں ہے تو یہ اس کی خیانت ہے وہ اپنے غیر اخلاقی و غیر شرعی عمل کی بنا پر خائن کہلائے گا۔

(۳۹) وَعَنْ مُعَاوِیَةَ قَالَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنِ الْاُغْلُوْطَاتِ۔ (رواہ ابوداؤد)

---

[1] اسم گرامی عوف بن مالک اشجعی ہے کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے۔ بعض حضرات نے ابوحماد اور بعض نے عمرو بھی لکھا ہے۔ دمشق میں ۷۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی ہے۔ (اسد الغابہ)

"اور حضرت امیر معاویہؓ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مغالطہ دینے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مقصد اس چیز پر تنبیہ ہے کہ علماء سے ایسے مسائل نہ پوچھے جائیں جو مشکل اور پیچیدہ ہونے کی وجہ سے انھیں مغالطہ میں ڈال دیں یا جن سے سائل کا مقصد ہی علماء کو پریشان کرنا اور ان کو مغالطہ میں ڈالنا ہو اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض حضرات جن کے قلب و دماغ علماء کی عزت و عظمت سے خالی ہوتے ہیں وہ انھیں آزمائش میں ڈالنے یا لوگوں کے سامنے ان کی ہتک کرانے کے لئے ان کے سامنے ایسے مسائل بنا بنا کر پیش کرتے ہیں جن میں وہ چکرا جاتے ہیں اور مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے ابتداءً ایسا سوال کیا تو یہ حرام ہے کیونکہ اس سے ایک مؤمن کی ایذا رسانی اور ذہنی تکلیف کا سامان فراہم ہوتا ہے، نیز یہ فتنہ و فساد اور عداوت و نفرت کا سبب ہے، دوسرے یہ کہ ایسے مواقع پر ازراہ فخر و تکبر اپنی فضیلت و قابلیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں حرام ہیں۔

لیکن اگر ایسی شکل ہے کہ دوسرے نے اس سے ایسا سوال کیا اور اس نے اس کے جواب میں الزامًا ایسا ہی سوال کیا تو یہ حرام نہیں ہے۔

(۴۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْفَرَآئِضَ وَالْقُرْاٰنَ وَ عَلِّمُوا النَّاسَ فَاِنِّیْ مَقْبُوْضٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تم فرائض (یعنی فرض چیزیں یا علم فرائض) اور قرآن کریم سیکھ لو اور دوسروں کو بھی سکھلاؤ اس لئے کہ میں قبض کیا جاؤں گا (یعنی اس عالم سے اٹھا لیا جاؤں گا۔" (ترمذیؒ)

(۴۱) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ کُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَشَخَصَ بِبَصَرِهٖ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ قَالَ هٰذَا اَوَانٌ یُخْتَلَسُ فِیْهِ الْعِلْمُ مِنَ النَّاسِ حَتّٰی لَا یَقْدِرُوْا مِنْهُ عَلٰی شَیْءٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) ہم سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ تھے کہ آپ ﷺ نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا۔ یہ وقت ہے کہ علم آدمیوں میں سے جاتا رہے گا، یہاں تک کہ وہ علم کے ذریعہ کسی چیز پر قدرت نہ رکھیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہاں علم سے مراد وحی ہے اور اشارہ ہے اپنی وفات کی طرف یعنی آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی گویا آپ ﷺ وحی کے منتظر تھے۔ چنانچہ بارگاہ الوہیت سے وحی نازل ہوئی اور خبر دے دی گئی کہ اب آپ (ﷺ) کی اجل آگئی ہے اور آپ (ﷺ) اس دنیا سے رخصت ہو کر واصل بحق ہونے والے ہیں اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ وقت آگیا ہے کہ اس دنیا سے وحی منقطع ہو جائے گی۔

(۴۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رِوَایَةً یُوْشِكُ اَنْ یَّضْرِبَ النَّاسُ اَكْبَادَ الْاِبِلِ یَطْلُبُوْنَ الْعِلْمَ فَلَا یَجِدُوْنَ اَحَدًا اَعْلَمَ مِنْ عَالِمِ الْمَدِیْنَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَفِیْ جَامِعِهٖ قَالَ ابْنُ عُیَیْنَةَ اَنَّهٗ مَالِكُ بْنُ اَنَسٍ وَمِثْلُهٗ عَنْ عَبْدِ الرَّزَّاقِ وَقَالَ اِسْحٰقُ ابْنُ مُوْسٰی وَسَمِعْتُ ابْنَ عُیَیْنَةَ اِنَّهٗ قَالَ هُوَ الْعُمَرِیُّ الزَّاهِدُ وَاِسْمُهٗ عَبْدُ الْعَزِیْزِ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایۃً منقول ہے کہ وہ زمانہ قریب ہے جبکہ لوگ علم حاصل کرنے کے لئے اونٹوں کے جگر کو پھاڑ ڈالیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم کسی کو نہیں پائیں گے۔ (ترمذیؒ) اور جامع ترمذیؒ میں ابن عیینہؒ سے منقول ہے کہ مدینہ کے وہ عالم مالک ابن انسؒ ہیں اور عبدالرزاق نے بھی یہی لکھا ہے اور اسحٰق ابن موسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے ابن عیینہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مدینہ کا وہ عالم عمری زاہد ہے (یعنی وہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان سے ہے جن کا نام عبدالعزیز بن عبداللہ ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "روایۃً منقول" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے تو یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے مرفوعًا ہی روایت کی ہے۔ لیکن حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد کو حضرت ابوہریرہؓ کے الفاظ چونکہ یاد نہیں رہے اس لئے انھوں نے اس حدیث کو اس طرح نقل کیا۔

"اونٹوں کے جگر کو پھاڑنے" کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں کے درمیان علم کا چرچہ بڑھے گا اور حصول علم کا شوق افزوں ہوگا تو لوگ دور دراز کا سفر کریں گے اور علم کی خاطر دنیا بھر کی خاک چھانتے پھریں گے، یا یہ کہ درِ علم تک جلد پہنچ جانے کے لئے اونٹوں کو تیزی سے چلائیں گے اور تیز گامی کے ساتھ علم کی منزل مقصود تک پہنچیں گے۔

حدیث کے الفاظ کے مصداق میں کلام ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے کہ مدینہ کے عالم سے زیادہ کوئی بڑا عالم نہیں ملے گا تو مدینہ کے عالم سے کون مراد ہے؟

حضرت سفیان بن عیینہ جو حضرت امام مالکؒ کے اصحاب اور حضرت امام شافعیؒ کے شیوخ میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے مراد حضرت امام مالکؒ کی ذات محترم ہے۔ اسی طرح حضرت عبدالرزاق جو حدیث کے جلیل القدر اور مشہور امام ہیں یہی فرماتے ہیں کہ حدیث میں جس "عالم مدینہ" کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد حضرت امام مالکؒ ہی ہیں۔

لیکن حضرت ابن عیینہ کے ایک شاگرد حضرت اسحٰق بن موسیٰؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عیینہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "عالم مدینہ سے مراد حضرت عمری زاہد ہیں۔" جن کا اسم گرامی عبدالعزیز بن عبداللہ ہے۔ چونکہ یہ حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد میں سے ہیں اس لئے عمری کہا جاتا ہے اور "زاہد" ان کی صفت ہے اس لئے کہ یہ اپنے زمانہ میں مدینہ کے ایک جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے پائے کے زاہد و متقی شخص تھے ان کا نسب اس طرح ہے۔ عبدالعزیز بن عبداللہ بن عمرو بن حفص بن عاصم بن عمر فاروقؓ۔

بہر حال امام ترمذیؒ نے یحییٰ کے واسطہ سے ابن عیینہ کا جو قول نقل کیا ہے وہ اس قول کے مخالف ہے جو ابن عیینہ سے اسحٰق بن موسیٰ نقل کرتے ہیں اس طرح حضرت ابن عیینہ کے اقوال میں اختلاف ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے عیینہ سے جو قول نقل کیا ہے، وہ باعتبار ظن کے ہے یقینی اور حتمی طور پر ان لوگوں نے نقل نہیں کیا ہے۔

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ سرکار دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد صحابہ اور تابعین کے دور کے اعتبار سے ہے کہ ان کے زمانوں میں مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم کسی دوسری جگہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ صحابہ اور تابعین کے بعد جب علم کی مقدس روشنی مدینہ سے نکل کر اطراف عالم میں پھیلی تو اس کے نتیجہ میں دیگر ممالک اور دوسرے شہروں میں ایسے ایسے عالم و فاضل پیدا ہوئے جو اپنے علم و فضل اور دینی فہم و فراست کے اعتبار سے مدینہ کے عالموں سے بڑھے ہوئے تھے۔

اس حدیث کے ظاہری معنی جو ارشاد نبوی ﷺ سے زیادہ قریب اور انسب ہیں یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا مقصد اس ارشاد سے اس بات کی خبر دینا ہے کہ آخر زمانہ میں علم اپنی وسعت و فراخی کے باوجود صرف مدینہ منورہ میں منحصر ہو جائے گا جیسا کہ دیگر احادیث سے یہ بات بصراحت معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

(۴۳) وَعَنْهُ فِيْمَا اَعْلَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اس اُمت کے نفع کے واسطے ہر سو برس پر ایک شخص کو بھیجتا ہے جو اس کے دین کو تازہ کرتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اکثر علماء نے اس حدیث سے یہ مفہوم مراد لیا ہے کہ ہر زمانہ میں اُمت کے اندر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے سب میں ممتاز ایک ایسا شخص موجود ہوتا ہے جو دین کو نکھارتا اور تجدید کرتا ہے جسے مجدد کہا جاتا ہے۔ مجدد اپنے زمانہ میں دین کے اندر ہر پیدا ہونے والی برائی اور خرابی کو دور کرتا ہے۔ بدعت اور رسم و رواج کے جو گہرے پردے دین کی حقیقت پر پڑ جاتے ہیں وہ اپنے علم و معرفت کی قوت سے نھس چاک کرتا ہے اور اُمت کے سامنے پورے دین کو نکھار کر اور صاف و ستھرا کر کے اس کی اپنی اصلی شکل میں پیش کر دیتا ہے۔

چنانچہ بعض حضرات نے تعین بھی کیا ہے کہ فلاں صدی میں فلاں مجدد پیدا ہوا تھا اور فلاں صدی میں فلاں مجدد موجود تھا۔ بعض علماء نے حدیث کے معنی کو عمومیت پر محمول کیا ہے، یعنی خواہ دین کی تجدید کرنے والا کوئی ایک شخص واحد ہو خواہ کوئی جماعت ہو جو دین میں پیدا کی گئی برائیوں اور خرابیوں کو ختم کرے۔

(۴۴) وَعَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْعُذْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ جَابِرٍ فَاِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ فِيْ بَابِ التَّيَمُّمِ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ (رواہ)

"اور حضرت ابراہیم بن عبدالرحمن عذری راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ہر آئندہ آنے والی جماعت میں سے اس کے نیک (یعنی ثقہ اور معتمد) لوگ اس علم (کتاب وسنت) کو حاصل کریں گے اور وہی لوگ اس (علم) کے ذریعہ (آیات واحادیث میں) حد سے گزرنے والوں کی تحریف کو باطلوں کی افتراء پردازی کو اور جاہلوں کی تاویلات کو دور کریں گے، (اس حدیث کو بیہقیؒ نے اپنی کتاب "مدخل" میں حدیث بقیہ بن ولید سے نقل کیا ہے اور انھوں نے معان بن مرفاعہ سے اور انھوں نے ابراہیم بن عبدالرحمن عذری سے نقل کیا ہے) اور حضرت جابرؓ کی روایت (جس کی ابتداء یہ ہے) فانما شفاء العی السوال ہم باب تیمم میں بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۴۵) عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْاِسْلَامَ فَبَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَّاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ۔ (رواہ الدارمی)

"حضرت حسنؓ بصریؒ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص کی موت اس حال میں آئے کہ وہ علم حاصل کر رہا ہو اور (وہ علم) اس غرض سے (حاصل کر رہا ہو) کہ وہ اس کے ذریعہ اسلام کو رائج کرے گا تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا اور وہ مرتبہ نبوت ہے۔" (دارمیؒ)

(۴۶) وَعَنْهُ مُرْسَلًا قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلَيْنِ كَانَا فِيْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ اَحَدُهُمَا كَانَ عَالِمًا يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ، وَالْاٰخَرُ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ اَيُّهُمَا اَفْضَلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ هٰذَا الْعَالِمِ الَّذِيْ يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ عَلَى الْعَابِدِ الَّذِيْ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ كَفَضْلِيْ عَلٰى اَدْنَاكُمْ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت حسن بصریؒ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ سے بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کے بارے میں سوال کیا گیا، ان میں سے ایک تو عالم تھا جو فرض نماز پڑھتا تھا پھر بیٹھ کر لوگوں کو علم سکھاتا تھا۔ اور دوسرا شخص وہ تھا جو دن کو تو روزے رکھتا تھا اور تمام رات عبادت کیا کرتا تھا (چنانچہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا) کہ ان دونوں میں بہتر کون ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اس عالم کو جو فرض نماز پڑھتا ہے اور بیٹھ کر لوگوں کو علم سکھلاتا ہے اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات میں عبادت کرتا ہے ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی کہ مجھے تمہارے میں سے ایک ادنیٰ آدمی پر فضیلت حاصل ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: بنی اسرائیل کے مذکورہ دونوں عالم یوں تو اپنے علم وفضل کے اعتبار سے ہم رتبہ تھے مگر فرق یہ تھا کہ ایک عالم نے تو اپنی زندگی کا

---

[1] حضرت حسن بصری تابعی ہیں آپ کی پیدائش مدینہ میں ہوئی تھی۔ ۱۱۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

مقصد صرف عبادت خداوندی بنالیا تھا چنانچہ وہ دن رات ہمہ وقت عبادت میں مصروف رہا کرتا تھا بندگان خدا کی اصلاح و تعلیم سے اسے غرض نہیں تھی، مگر دوسرا عالم فرض عبادت بھی پوری طرح ادا کرتا تھا اور اپنے اوقات کا بقیہ حصہ لوگوں کی اصلاح و تعلیم میں بھی صرف کیا کرتا تھا۔ لہٰذا دونوں میں افضل اسی شخص کو قرار دیا گیا ہے جو خود بھی اپنے علم پر عمل کرتا تھا اور دوسروں کو بھی علم سکھلا کر انھیں راہ ہدایت پر لگاتا تھا۔

(۴۷) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِيْهُ فِي الدِّيْنِ اِنِ احْتِيْجَ اِلَيْهِ نَفَعَ وَاِنِ اسْتُغْنِيَ عَنْهُ اَغْنٰى نَفْسَهٗ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ بہتر شخص وہ ہے جو دین کی سمجھ رکھتا ہو۔ اگر اس کے پاس کوئی حاجت لائی گئی تو اس نے نفع پہنچایا اور اگر اس سے بے پروائی برتی گئی تو اس نے بھی اپنے نفس کو بے پرواہ رکھا۔" (رزین)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک عالم کی یہ شان ہونی چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کا محتاج کر کے اپنی حیثیت کو کمتر نہ کرے، نیز غلط اغراض و مقاصد کی خاطر عوام کی مصاحبت کی طرف میلان نہ رکھے اور نہ ان سے کسی دنیاوی غرض منافع کی طمع کرے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اپنے آپ کو عوام سے بالکل بے تعلق کر لیا جائے اور اپنے علم سے مخلوق خدا کو محروم رکھا جائے۔ بلکہ اگر عوام دینی ضروریات کے سلسلے میں صرف اسی کے محتاج ہوں اور اس کے علاوہ کسی دوسرے عالم کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کا رجوع اس کی طرف ہو تو اس چاہئے کہ وہ لوگوں کے درمیان جائے اور ان کی دینی و اسلامی ضروریات کو پورا کرکے انہیں نفع پہنچائے۔

ہاں اگر عوام خود اس سے لاپرواہی برتیں کہ نہ انھیں اس سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہو اور نہ وہ اس کے محتاج ہوں تو چاہئے کہ وہ بھی ان سے بے پروائی برتے اور ان سے ترک تعلق کر کے اپنے اوقات کو عبادت خداوندی میں مشغول رکھے یا پھر خدمت علم دین کی خاطر دینی کتابوں کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں منہمک ہو کر اس ذریعہ سے علم کی روشنی پھیلائے۔

(۴۸) وَعَنْ عِكْرِمَةَ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ حَدِّثِ النَّاسَ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً فَاِنْ اَبَيْتَ فَمَرَّتَيْنِ فَاِنْ اَكْثَرْتَ فَثَلَاثَ مِرَارٍ وَلَا تُمِلَّ النَّاسَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَلَا اُلْفِيَنَّكَ تَاْتِي الْقَوْمَ وَهُمْ فِي حَدِيْثٍ مِنْ حَدِيْثِهِمْ فَتَقُصُّ عَلَيْهِمْ فَتَقْطَعُ عَلَيْهِمْ حَدِيْثَهُمْ فَتُمِلُّهُمْ وَلٰكِنْ اَنْصِتْ فَاِذَا اَمَرُوْكَ فَحَدِّثْهُمْ وَهُمْ يَشْتَهُوْنَهٗ وَانْظُرِ السَّجْعَ مِنَ الدُّعَاءِ فَاجْتَنِبْهُ فَاِنِّي عَهِدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابَهٗ لَا يَفْعَلُوْنَ ذٰلِكَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے عکرمہؓ سے فرمایا۔ تم ہر جمعہ کو ایک بار لوگوں کے سامنے حدیث بیان کرو۔ اگر اسے قبول نہ کرو (یعنی ہفتہ میں ایک بار وعظ و نصیحت کو کافی نہ جانو تو ہفتہ میں) دو بار اور بہت کرو تو (ہفتہ میں تین بار وعظ و نصیحت ——— کر سکتے ہو) اور تم لوگوں کو اس قرآن سے تنگ نہ کرو (یعنی ہفتہ میں تین بار سے زیادہ وعظ و نصیحت بیان کر کے لوگوں کو ملول نہ کرو) اور میں تمہیں اس حالت میں نہ پاؤں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنی باتوں میں مشغول ہوں اور تم ان کی باتوں کو منقطع کر کے ان کے سامنے وعظ و نصیحت شروع کر دو اور (اس طرح) تم ان کو کبیدہ خاطر کرو۔ ایسے موقع پر تمہیں چاہئے کہ تم خاموش رہو البتہ وہ اگر تم سے وعظ و نصیحت کی فرمائش کریں تو جب تک اس کے خواہش مند ہوں تم ان کے سامنے حدیث بیان کرو اور تم دعا میں مقفّی عبارت سے صرف نظر کرو اور اس سے بچو، چنانچہ میں نے معلوم کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور ان کے اصحاب ایسا نہیں کرتے تھے (یعنی دعا میں مقفّی عبارت استعمال نہیں کرتے تھے۔" (بخاری)

تشریح: جیسا کہ پچھلے صفات میں گزر چکا ہے اس حدیث میں بھی اسی پر زور دیا جا رہا ہے کہ وعظ و نصیحت کے معاملہ میں اعتدال اور موقع و ماحول کی رعایت ضروری ہے اور اثر اندازی کے اعتبار سے دعوت و تبلیغ کا یہ بنیادی پتھر ہے جس پر تبلیغ کی کامیابی کا پورا دارومدار ہے۔

اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ بتایا جارہا ہے کہ اگر کچھ لوگ کسی بات چیت اور آپس کی گفتگو میں مشغول ہوں تو ایسے موقع پر پہنچ کر وعظ و نصیحت شروع نہیں کر دینی چاہئے، چاہے ان کی بات چیت دنیاوی امور سے متعلق ہو یا دینی باتوں پر مشتمل ہو۔ اگر وہ دین کی بات میں مشغول ہیں تو ظاہر ہے کہ بدرجہ اولیٰ ان کی بات کو منقطع کرنا اور اس میں خلل انداز ہونا خواہ وہ تبلیغ ہی کی خاطر کیوں نہ ہو مناسب نہیں ہوگا۔ اگر بات چیت کا موضوع خالص دنیا بھی ہو تو ایسا کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ جب ایک آدمی اپنی کسی ضروری گفتگو میں مشغول ہو اور وہاں پہنچ کر وعظ و نصیحت شروع کر دی جائے تو گفتگو میں خلل پڑنے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ بتقاضائے بشریت اسے گوارہ نہ کرے اور وہ ایسے موقع پر قرآن و حدیث کی باتیں سننا پسند نہ کرے جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ وہ خواہ مخواہ گناہ میں مبتلا ہوگا بلکہ اس کے قلب پر دین کی عظمت و اہمیت کا نقش بھی قائم نہ ہوگا۔

ہاں اگر مصلحت کا تقاضا ہی یہ ہو کہ انھیں اس گفتگو سے باز رکھا جائے تو پھر ایسا انداز اور طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے انھیں ناگواری بھی نہ ہو اور وہ اس کلام و گفتگو سے رک بھی جائیں، غرض کہ نظر مصلحت ضرورت وقت پر رکھنی چاہئے۔

ویسے جہاں تک ابن عباسؓ کے قول کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ ان کا عکرمہؓ کو حکم دینا اکثر کے اعتبار سے تھا یعنی یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ اکثر و بیشتر لوگ محض دنیاوی باتوں ہی میں مشغول رہا کرتے تھے۔

"دعا میں مقفّی عبارت" کا مطلب یہ ہے کہ دعا تاثیر کے اعتبار سے وہی بہتر ہوتی ہے جو بغیر تصنع و بناوٹ کے سیدھی سادھی ہو اور دل کی گہرائیوں سے نکلی ہو۔ اس لئے دعا کی عبارت کو شعر و شاعری کا رنگ دینا، الفاظ میں قافیہ اور تکلف نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے آنحضرت ﷺ کی ان دعاؤں پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ جو مقفّی و مسجع ثابت ہیں اور جن میں قافیہ بندی بھی ہے۔ اس لئے یہ چیزیں تو آنحضرت ﷺ سے بے تکلف اور از خود صادر ہوتی تھیں ان میں آپ ﷺ کے تکلّف اور کوشش کو دخل نہیں ہوتا تھا۔

(۴۹) وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ فَاَدْرَكَهٗ كَانَ لَهٗ كِفْلَانِ مِنَ الْاَجْرِ فَاِنْ لَّمْ يُدْرِكْهُ كَانَ لَهٗ كِفْلٌ مِّنَ الْاَجْرِ۔ (رواہ الدارمی)

"حضرت واثلہؓ بن اسقع سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص علم کا طالب ہو اور اسے علم حاصل بھی ہو گیا تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا اور اگر اسے علم حاصل نہ ہو تو اس کو ایک حصہ ثواب ملے گا۔" (دارمی)

تشریح: دو ثواب اس طرح ملیں گے کہ ایک ثواب تو طلب علم اور اس کی مشقت و محنت کا ہوگا جو اس نے حصول علم کے سلسلے میں اٹھائی ہیں اور دوسرا ثواب علم کے حاصل ہونے کا اور پھر دوسروں کو علم سکھلانے کا ہوگا یا دوسرا ثواب عمل کا ہوگا جو اس نے علم پر کیا ہے۔ ہاں اس شخص کو جسے اس کی طلب اور کوشش کے باوجود علم حاصل نہیں ہوا صرف ایک ثواب اس کی محنت و مشقت ہی کا ملے گا۔

بہر حال اتنی بات تو طے ہے کہ بہر تقدیر طلب علم میں لگے رہنا چاہئے۔ اگر علم حاصل ہو گیا تو نور علی نور کہ اسے دو، دو ثواب ملیں گے اور اگر علم حاصل نہ ہوا تو یہی کیا کم ہے کہ طلب علم میں مرجانا بھی سعادت ہے۔

گرچہ نہ تواں بد دست رہ بروں شرط یاری ست در طلب مردن

(۵۰) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهٖ وَحَسَنَاتِهٖ بَعْدَ مَوْتِهٖ عِلْمًا عَلَّمَهٗ وَنَشَرَهٗ وَ وَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهٗ اَوْ مُصْحَفًا وَرَّثَهٗ اَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ اَوْ بَيْتًا لِابْنِ السَّبِيْلِ بَنَاهُ اَوْ نَهْرًا اَجْرَاهُ اَوْ صَدَقَةً اَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهٖ فِيْ صِحَّتِهٖ وَحَيَاتِهٖ تَلْحَقُهٗ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهٖ۔ (رواہ ابن ماجۃ والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ مؤمن کو اس کے جس عمل یا جن نیکیوں کا مرنے کے بعد ثواب پہنچتا ہے اس میں ایک تو علم ہے جس کو اس نے سیکھا اور رواج دیا تھا، دوسرے نیک اولاد ہے جس کو اپنے بعد چھوڑا۔ تیسرے قرآن ہے جو

وارثوں کے لئے چھوڑا ہو۔ چوتھے مسجد ہے جس کو اپنی زندگی میں بنالیا گیا ہو، پانچویں مسافر خانہ ہے جس کو اس نے تعمیر کیا ہو، چھٹے نہر ہے جس کو اس نے جاری کیا ہے اور ساتویں وہ خیرات ہے جس کو اس نے اپنی اپنی تندرستی اور زندگی میں اپنے مال سے نکالا ہو، ان تمام چیزوں کا ثواب اس کے مرنے کے بعد اس کو پہنچتا ہے۔" (ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: قرآن کے حکم میں شرعی کتابیں بھی داخل ہیں، اس طرح مسجد کے حکم میں علماء کے قائم کردہ مدرسے اور خانقاہیں جو ذکر اللہ و تزکیہ نفس کے لئے ہوں شامل ہیں یعنی ان سب کا ثواب بھی مرنے کے بعد برابر پہنچتا رہتا ہے۔

(۵۱) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَوْحٰى اِلَىَّ اَنَّهٗ مَنْ سَلَكَ مَسْلَكًا فِىْ طَلَبِ الْعِلْمِ سَهَّلْتُ لَهٗ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ وَمَنْ سَلَبْتُ كَرِيْمَتَيْهِ اَثَبْتُهٗ عَلَيْهِمَا الْجَنَّةَ وَفَضْلٌ فِىْ عِلْمٍ خَيْرٌ مِّنْ فَضْلٍ فِىْ عِبَادَةٍ وَمِلَاكُ الدِّيْنِ الْوَرَعُ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی (خفی) بھیجی ہے کہ جو طلب علم کے لئے راستہ اختیار کرے تو میں اس پر جنّت کے راستے کو آسان کردوں گا اور جس شخص کی میں نے دونوں آنکھیں چھین لی ہوں (یعنی کوئی شخص نابینا ہو گیا ہو) تو اس دنیاوی نعمت سے محرومی اور اس پر صبر و شکر کی بناء پر میں اس کا بدلہ اسے جنّت دوں گا اور علم کے اندر زیادتی عبادت میں زیادتی سے بہتر ہے اور دین کی جڑ پرہیز گاری ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص علم دین کے حصول کے لئے کسی راستہ کو اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنّت کی راہ آسان کردے گا یعنی دنیا میں معرفت و حقیقت کی دولت سے نوازا جائے گا اور عبادت خداوندی کی توفیق عنایت فرمائی جائے گی تاکہ وہ اس کے سبب جنت میں داخل ہو سکے، یا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے شخص پر آخرت میں جنّت کے دروازے کا راستہ اور جنّت میں جو محل اہل علم کے لئے مخصوص ہے اس کی راہ آسان کردی جائے گی۔

گو اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں علم کی جو راہ ہے وہی آخرت میں جنّت کی بھی راہ ہے اور علم کے دروازوں کے علاوہ جنّت کی تمام راہیں بند ہیں یعنی بغیر علم کے جنّت میں داخل ہونا مشکل ہے مگر شرط یہی ہے کہ علم خلوص نیت اور للّٰہیت کے جذبہ سے حاصل کیا گیا ہو اور پھر اس عمل کی توفیق بھی ہوتی ہو ورنہ علم بغیر خلوص اور بغیر عمل کے کوئی حقیقت نہیں رکھے گا اور اس کا مصداق ہوگا کہ ؏

چار پایہ بروکتا بے چند

آخر حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ دین کی اصل اور جڑ ورع (یعنی پرہیز گاری) ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حرام، منکرات اور طمع سے بچنا چاہئے تاکہ عبادات میں ریا اور عدم اخلاص پیدا نہ ہو۔

(۵۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِّنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِّنْ اِحْيَائِهَا۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ رات میں تھوڑی دیر علم کا درس دنیا کی تمام رات کو زندہ رکھنے سے بہتر ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: یعنی تمام رات نماز پڑھنے اور عبادت خداوندی میں مشغول رہنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ تھوڑی دیر تک آپس میں تعلیم و معلّم اور درس و تدریس کا مشغلہ رکھا جائے اسی حکم میں حصول مقصد کے لئے علم کا لکھنا یعنی تصنیف و تالیف اور دینی و علمی کتابوں کا مطالعہ کرنا بھی داخل ہے۔

(۵۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِىْ مَسْجِدِهٖ فَقَالَ كِلَاهُمَا عَلٰى خَيْرٍ وَّ اَحَدُهُمَا اَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ اَمَّا هٰٓؤُلَآءِ فَيَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَيَرْغَبُوْنَ اِلَيْهِ فَاِنْ شَآءَ اَعْطَاهُمْ وَاِنْ شَآءَ مَنَعَهُمْ وَاَمَّا

هٰؤُلَاءِ فَيَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْهَ اَوِالْعِلْمَ وَيُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ فَهُمْ اَفْضَلُ وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ کا گزر دو مجلسوں پر ہوا، جو مسجد نبوی میں منعقد تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ دونوں بھلائی پر ہیں لیکن ان میں سے ایک (نیکی میں) دوسرے سے بہتر ہے۔ ایک جماعت عبادت میں مصروف ہے، خدا سے دعا کر رہی ہے اور اس سے اپنی رغبت کا اظہار کر رہی ہے (یعنی حصول مقصد کے لئے خدا کی طرف امید ہے اور حصول مقصد خواہش الٰہی پر موقوف ہے) لہٰذا اگر خدا چاہے تو انھیں دے اور اگر چاہے نہ دے۔ اور دوسری جماعت فقہ یا علم حاصل کر رہی ہے اور جاہلوں کو علم سکھا رہی ہے، چنانچہ یہ لوگ بہتر ہیں اور میں بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پھر آنحضرت ﷺ خود بھی ان میں بیٹھ گئے۔"

(دارمیؒ)

تشریح: ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ صحابہ کی دو جماعتیں الگ الگ بیٹھی ہوئی ہیں ایک جماعت تو ذکر و دعا میں مشغول تھی اور دوسری جماعت مذاکرۂ علم میں مشغول تھی آپ ﷺ نے ان دونوں میں سے اس جماعت کو بہتر قرار دیا جو مذاکرۂ علم میں مشغول تھی اور پھر نہ صرف یہ کہ زبان ہی سے ان کی فضیلت کا اظہار فرمایا بلکہ خود بھی اس جماعت میں بیٹھ کر علماء کی مجلس کو مزید عزت و شرف کی دولت بخشی۔

علم اور عالموں کی اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہو سکتی ہے کہ سردار انبیاء ﷺ نے عابدوں کی مجلس کو چھوڑ کر عالموں ہی کی ہم نشینی اختیار فرمائی ہے اور اپنے آپ کو ان ہی میں سے شمار کیا ؎

گدایان را ازیں معنی خبر نیست که سلطان جہاں باما ست امروز

(۵۴) وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَآءِ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَاحَدُّ الْعِلْمِ الَّذِيْ اِذَا بَلَغَهُ الرَّجُلُ كَانَ فَقِيْهًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَفِظَ عَلٰى اُمَّتِيْ اَرْبَعِيْنَ حَدِيْثًا فِيْ اَمْرِ دِيْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِيْهًا وَكُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَّشَهِيْدًا۔

"اور حضرت ابو درداءؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ علم کی مقدار کیا ہے کہ جب انسان اتنا علم حاصل کرے تو فقیہ (عالم) ہو جائے اور آخرت میں اس کا شمار زمرہ علماء میں ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو شخص میری اُمت کو فائدہ پہنچانے کے لئے امر دین کی چالیس حدیثیں یاد کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت میں فقیہ اٹھائے گا اور قیامت کے دن میں اس کا شفاعت کرنے والا اور (اس کی اطاعت پر) گواہ بنوں گا۔"

تشریح: علماء لکھتے ہیں کہ اس سے مراد چالیس حدیثوں کا دوسرے لوگوں تک پہنچانا ہے اگرچہ وہ یاد نہ ہوں چنانچہ اس حدیث کے پیش نظر بہت سے علماء نے چالیس احادیث جمع کر کے لوگوں تک پہنچائی ہیں اور اس طرح وہ قیامت میں آنحضرت ﷺ کی شفاعت اور گواہی کے امیدوار ہوئے ہیں۔

(۵۵) وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ اَجْوَدُ جُوْدًا قَالُوا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اَللّٰهُ اَجْوَدُ جُوْدًا ثُمَّ اَنَا اَجْوَدُ بَنِيْ اٰدَمَ وَاَجْوَدُهُمْ مِنْ بَعْدِيْ رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا فَنَشَرَهٗ يَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَمِيْرًا وَّحْدَهٗ اَوْقَالَ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔

"اور حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے (صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ سخاوت کے معاملہ میں سب سے بڑا سخی کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا سخاوت کرنے میں اللہ تعالیٰ سب سے بڑا سخی ہے اور بنی آدم میں سب سے بڑا سخی میں ہوں، پھر لوگوں میں میرے بعد سب سے بڑا سخی وہ شخص ہوگا جس نے علم سیکھا

اور اسے پھیلایا۔ وہ شخص قیامت کے دن ایک امیر یا فرمایا کہ ایک گروہ کی طرح آئے گا۔"

تشریح: آخر روایت میں راوی کو شک ہو گیا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے امیر او حدہ فرمایا امۃ واحدۃ فرمایا یعنی ایسا شخص جس نے علم سیکھا اور اس کو لوگوں کے درمیان پھیلایا تو اس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ آخرت میں ایک امیر کی مانند آئے گا کہ وہ کسی کے تابع نہیں ہو گا بلکہ اس کے ساتھ تابع اور خدام ہوں گے یا آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ وہ تن تنہا شخص ایک گروہ و جماعت کی مانند ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ مخلوق خدا کے درمیان معزز و مکرم ہو گا اور آخرت میں بصد شوکت و حشمت آئے گا۔

(۵۶) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ مَنْهُوْمٌ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ وَمَنْهُوْمٌ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ قَالَ الْاِمَامُ اَحْمَدُ فِي حَدِيْثِ اَبِي الدَّرْدَاءِ هٰذَا مَتْنٌ مَشْهُوْرٌ فِيْمَا بَيْنَ النَّاسِ وَلَيْسَ لَهٗ اِسْنَادٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ حرص کرنے والے دو شخص ہیں جن کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک علم میں حرص کرنے والا کہ اس کا پیٹ کبھی علم سے نہیں بھرتا، اور دوسرا دنیا کی حرص کرنے والا کہ اس کا پیٹ دنیا سے کبھی نہیں بھرتا۔ مذکورہ بالا تینوں حدیثیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت کی ہیں۔ حضرت امام احمدؒ نے حضرت ابوداؤدؒ کی حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کا متن لوگوں میں مشہور ہے مگر اس کی اسناد صحیح نہیں ہے۔"

تشریح: امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن اس کے طرق متعدد ہیں جن میں بعض کو دوسرے بعض کی بنا پر تقویت ملی ہے لیکن ویسے بھی یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ فضائل اعمال کے سلسلہ میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے۔

(۵۷) وَعَنْ عَوْنٍ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ مَسْعُوْدٍ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ صَاحِبُ الْعِلْمِ وَصَاحِبُ الدُّنْيَا وَلَا يَسْتَوِيَانِ اَمَّا صَاحِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضًى لِلرَّحْمٰنِ وَاَمَّا صَاحِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادٰى فِي الطُّغْيَانِ ثُمَّ قَرَاَ عَبْدُ اللّٰهِ كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى قَالَ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عون راوی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا۔ دو حریص ہیں جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا، ایک عالم اور دوسرا دنیادار لیکن یہ (درجہ میں) برابر نہیں ہیں کیونکہ عالم تو خدا کی خوشنودی ورضامندی کو زیادہ کرتا ہے اور دنیادار سرکشی میں زیادتی کرتا ہے۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے دنیادار کے حق میں (دلیل کے طور پر) یہ آیت پڑھی۔ (آیت کا ترجمہ) خبردار! انسان البتہ سرکشی کرتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو (کثرت مال کی بنا پر لوگوں سے) غنی دیکھتا ہے حضرت عون کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے دوسرے یعنی عالم کے حق میں یہ آیت پڑھی۔ (آیت کا ترجمہ) خدا کے بندوں میں عالم خدا سے ڈرتے ہیں۔" (دارمیؒ)

(۵۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُنَاسًا مِنْ اُمَّتِيْ سَيَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ وَيَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ يَقُوْلُوْنَ نَاْتِي الْاُمَرَاءَ فَنُصِيْبُ مِنْ دُنْيَاهُمْ وَنَعْتَزِلُهُمْ بِدِيْنِنَا وَلَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ كَمَا لَا يُجْتَنٰى مِنَ الْقَتَادِ اِلَّا الشَّوْكُ كَذٰلِكَ لَا يُجْتَنٰى مِنْ قُرْبِهِمْ اِلَّا قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ كَاَنَّهٗ يَعْنِي الْخَطَايَا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ میری اُمت میں بہت سے لوگ دین میں سمجھ یعنی دین کا علم حاصل کریں گے اور قرآن پڑھیں گے اور کہیں گے کہ ہم امراء کے پاس جا کر ان کی دنیا اور (دولت) میں سے اپنا حصہ حاصل کریں گے اور اپنے دین کو ان سے یکسو رکھیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا (کہ دین و دنیا ایک جگہ جمع ہو جائیں اور امراء کی صحبت میں بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے) جیسا کہ جس طرح خاردار درخت سے صرف کانٹا ہی حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح امراء کی صحبت سے نہیں حاصل ہوتا مگر! حضرت محمد ابن صباح کہتے ہیں کہ گویا آنحضرت ﷺ کی مراد (لفظ الا کے بعد) خطایا تھی۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے الا کے بعد کسی لفظ کا تکلم نہیں فرمایا چنانچہ حضرت محمد بن صباح جو ایک جلیل القدر محدّث اور حضرت امام بخاریؒ وامام مسلمؒ جیسے ائمہ حدیث کے استاد ہیں۔ اس کی وضاحت فرمارہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی مراد لفظ الا کے بعد خطایا ہے۔ مگر آپ ﷺ نے اسے حذف فرمایا اور اس کا تکلم نہیں کیا۔ اس طرح حدیث کے آخری الفاظ اب اس طرح ہو جائیں گے لا یجتنی من قربهم الا الخطایا یعنی امراء کی صحبت سے حاصل نہیں ہوتا مگر گناہ۔

اب رہا سوال یہ کہ آپ ﷺ نے لفظ خطایا کو حذف کیوں فرمایا۔ تو اس میں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ اس میں اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ امراء کی صحبت کا نقصان اتنا زیادہ ہے کہ اسے زبان سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس اُمت میں ایسے بھی عالم پیدا ہوں گے جن کا مقصد حصول علم سے محض یہ ہوگا کہ وہ علم حاصل کر کے اور قرآن پڑھ کر امراء کے پاس جائیں اور ان کے سامنے اپنی بزرگی وفضیلت کا اظہار کر کے ان سے مال و دولت حاصل کریں اور علم کا جو حقیقی منشاء ومدعا ہوگا یعنی مخلوق خدا کی ہدایت اور عوام الناس کی بغیر کسی لالچ اور طمع کے دینی راہبری اس سے انھیں قطعاً کوئی مطلب نہ ہوگا۔ اور جب ان سے کہا جائے گا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ بیک وقت تفقہ فی الدین اور امراء کی قربت وصحبت جمع ہو جائے؟ تو وہ جواب میں یہ کہیں گے کہ ہم ان سے مال و دولت تو حاصل کریں گے مگر اپنے دین کو ان سے بچائیں گے اور اس کی حفاظت کریں گے حالانکہ یہ امر محال ہے۔

(۵۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْعِلْمِ صَانُوا الْعِلْمَ وَ وَضَعُوْهُ عِنْدَ اَهْلِهٖ لَسَادُوْا بِهٖ اَهْلَ زَمَانِهِمْ وَلٰكِنَّهُمْ بَذَلُوْهُ لِاَهْلِ الدُّنْيَا لِيَنَالُوْا بِهٖ مِنْ دُنْيَاهُمْ فَهَانُوْا عَلَيْهِمْ سَمِعْتُ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ اٰخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُوْمُ (فِيْ) اَحْوَالِ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ فِيْ اَيِّ اَوْدِيَتِهَا هَلَكَ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ مِنْ قَوْلِهٖ مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ اِلٰى اٰخِرِهٖ۔

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا اگر اہل علم (یعنی علماء) علم کی حفاظت کریں اور علم کو اس کے اہل ہی (یعنی قدر دانوں) کے سامنے رکھیں تو وہ بے شک اپنے علم کے سبب دنیا والوں کے سردار بن جائیں لیکن (علماء) نے اگر ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے علم کو دنیاداروں پر خرچ کیا تاکہ اس کے ذریعہ وہ دنیا (یعنی جاہ وجلال) کو حاصل کریں اور علم کا حقیقی مقصد یعنی دنیا والوں کی ہدایت ونصیحت کو موقوف کردیں تو وہ دنیا والوں کی نظر میں ذلیل ہوئے۔ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے اپنے مقاصد میں سے صرف ایک مقصد یعنی آخرت کے مقصد کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیاوی مقصد کو پورا کر دیتا ہے اور جس شخص کے مقاصد پراگندہ ہوں جیسے کہ دنیا کے حالات ہیں تو پھر اللہ کو پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ خواہ کسی جنگل (یعنی دنیا کی کسی حالت) میں ہلاک ہو۔ (ابن ماجہ، بیہقی نے اس حدیث کو شعب الایمان میں ابن عمرؓ سے قول "من جعل الهموم" سے آخر تک روایت کیا ہے۔"

(ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح: یہ حدیث علماء کو احساس وشعور کی ایک دولت بخش رہی ہے اور علم کے سب سے اعلیٰ وبلند مقام کی نشاندہی کر رہی ہے چنانچہ ابن مسعودؓ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ علماء اپنا مرتبہ ومقام پہچانیں اور وہ جس عرفانی مقام پر فائز ہیں اس کی اہمیت ونزاکت کا احساس کریں۔ اس لئے کہ علم دین جن بلند واعلیٰ احساسات کا حامل ہے اسی طرح وہ اپنا ظرف بھی بلند واعلیٰ چاہتا ہے۔ علم کی شان عظمت ہی یہ ہے کہ وہ قدر دانوں اور باشعور اشخاص کے پاس رہے۔ اگر حصول جاہ وجلال کی خاطر علم کو دنیادار سرداروں اور ظالموں کی چوکھٹ کا سجدہ ریز بنایا جاتا ہے تو یہ علم کی سب سے بڑی توہین اور عالم کی سب سے بڑی ذلت ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ ایک بات اس سے بڑی فرمارہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیاوی اعتبار سے سرداری، شوکت وحشمت اور عزت وعظمت کوئی بڑی چیز نہیں ہے بلکہ اصل اور حقیقی سرداری وامارت تو وہ ہے جو فضل وکمال اور بزرگی کے اعتبار سے ہو یہی وجہ ہے کہ علماء کی

یہ شان نہیں ہوا کرتی کہ وہ بادشاہ و امیر بنیں یا حاکم و سردار ہوں، وہ تو علم و فضل اور بزرگی کی طاقت سے دنیا کے روحانی تاجدار ہوتے ہیں اور لوگوں کے دل و دماغ پر حکمران ہوتے ہیں اور ان کے ماسواء ان کے زیر قدم، زیر قلم اور ان کی عقل و احکام کے تابع دار ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن شاہد ہے:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ۔ (المجادلۃ ۵۸:۱۱)

"یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے ان کے جو ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا درجات بلند کرتا ہے۔"

آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ بندہ کا احساس اور اس کا شعور اتنا پاکیزہ اور لطیف ہو جانا چاہئے کہ اس کے دل و دماغ کے ایک ایک گوشہ میں صرف ایک ہی مقصد کی روشنی ہو اور وہ مقصد آخرت ہے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہ ہو اور کوئی غرض نہ ہو تو پھر خدا کی جانب سے اس پر دنیاوی وسعت کے دروازے بھی خود بخود کھول دیئے جاتے ہیں۔

لیکن بندہ کا دل و دماغ اگر اتنا پراگندہ ہو کہ وہ ہمہ وقت دنیا کی چیزوں میں تو لگا رہے اور دنیا کے تفکرات میں مستغرق رہے تو خدا کی جانب سے اس کے ساتھ کوئی اچھا معاملہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ خدا اس سے اتنا بے تعلق ہو جاتا ہے کہ اگر وہ بندہ دنیا کی کسی تکلیف اور کسی بھی مصیبت میں ہلاک ہو جائے تو خدا کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی اور نہ دنیاوی اعتبار سے اور نہ دینی اعتبار سے رحمت خداوندی کی نظر کرم اس کی طرف ہوتی ہے۔ اس طرح وہ دنیا و آخرت دونوں جگہ کے خسران و نقصان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(۶۰) وَعَنِ الْاَعْمَشِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰفَةُ الْعِلْمِ النِّسْيَانُ وَاِضَاعَتُهٗ اَنْ تُحَدِّثَ بِهٖ غَيْرَ اَهْلِهٖ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت اعمش راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا علم کی آفت بھولنا ہے اور علم کا ضائع کرنا یہ ہے کہ اس کو نااہل کے سامنے بیان کیا جائے۔" (داریؒ نے بطریق ارسال کیا ہے)

تشریح: علم کے حاصل ہونے سے پہلے تو بہت سی آفات اور مصیبتیں ہوتی ہیں لكل شئی افة وللعلم افات یعنی ہر چیز کی ایک ہی آفت ہوتی ہے مگر علم کے لئے بہت سے آفات ہیں۔ لیکن حصول علم کے بعد ایک ہی آفت ہے اور وہ نسیان یعنی بھولنا ہے اور یقیناً کسی چیز کا حاصل ہو جانے کے بعد زائل ہو جانا اور ذہن میں آکر پھر محو ہو جانا زبردست روحانی اذیت ہے۔

دراصل اس حدیث سے اس پر تنبیہ مقصود ہے کہ طالب علم اور اہل علم کو چاہئے کہ وہ ایسی باتوں سے اجتناب کریں جو نسیان کا سبب ہیں یعنی گناہ و معصیت سے بچیں اور ان چیزوں میں دل نہ لگائیں جو ذہن و فکر کو غافل کر دیتی ہیں جیسے دنیا کی سحر آفرینیوں اور خواہشات نفسانی میں دلچسپی لینا چنانچہ حضرت امام شافعیؒ نے اسی مضمون کو اس شعر میں ادا کیا ہے

شکوت الی وکیع سوء حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی

ترجمہ: "میں نے اپنے استاد وکیعؒ سے اپنے حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے ترک معصیت کی نصیحت کی۔"

فان العلم فضل من اللہ وفضل اللہ لا یعطی لعاص

ترجمہ: "کیونکہ علم تو خدا کا ایک فضل ہے اور خدا کا فضل گناہ گار کے حصہ میں نہیں آتا۔"

آخر حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ علم کو اس کے نااہل اور ناقدردان کے سامنے پیش کرنا دراصل علم کو ضائع کرنا ہے اور نااہل وہ شخص ہے جو نہ تو علم کو سمجھتا ہے اور نہ علم کی قدر جانتا ہے لہٰذا جب اس کے سامنے علم پیش کیا جائے گا تو علم ضائع ہوگا۔ اس لئے علم انہی کو سکھانا چاہئے جو اس کے اہل اور قدردان ہوں، یعنی وہ علم سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ بھی ان کے اندر موجود

ہو۔

(۶۱) وَعَنْ سُفْيَانَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ لِكَعْبٍ مَنْ اَرْبَابُ الْعِلْمِ؟ قَالَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِمَا يَعْلَمُوْنَ قَالَ فَمَا اَخْرَجَ الْعِلْمَ مِنْ قُلُوْبِ الْعُلَمَآءِ قَالَ الطَّمَعُ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت سفیان راوی ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت کعبؓ سے فرمایا کہ (تمہارے نزدیک) صاحب علم کون ہے حضرت کعبؓ نے جواب دیا وہ لوگ جو اپنے علم کے موافق عمل کریں، پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کون سی چیز عالموں کے دلوں سے علم کو نکال لیتی ہے؟ حضرت کعبؓ نے جواب دیا۔ "لالچ"۔" (دارمیؒ)

تشریح: حضرت عمرؓ کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ علماء کے دلوں سے نور علم اور علم کی عظمت و برکت کو نکالنے والی کونسی چیز ہے اور وہ کیا شے ہے جس کی موجودگی علم کے منافی ہے؟ حضرت کعبؓ نے فرمایا کہ "لالچ" وہ بری خصلت ہے جو علم کے نور کو عالم کے دل سے ضائع کر دیتی ہے۔ کیونکہ جب کسی عالم کے اندر جاہ و جلال کی محبت اور لالچ اور دنیاوی اسباب عیش و عشرت کی طمع پیدا ہو جائے گی تو پھر علم کا نور اور علم کی برکت اپنی جگہ چھوڑ دیں گے اور عالم کے دل و دماغ علم کی حقیقی روشنی سے منور نہ رہ سکیں گے۔

(۶۲) وَعَنِ الْاَحْوَصِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشَّرِّ فَقَالَ لَا تَسْئَلُوْنِيْ عَنِ الشَّرِّ وَسَلُوْنِيْ عَنِ الْخَيْرِ يَقُوْلُهَا ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ اَلَا اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ وَاِنَّ خَيْرَ الْخَيْرِ خِيَارُ الْعُلَمَاءِ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت احوص بن حکیم اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم ﷺ سے "برائی" کے بارے میں سوال کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے برائی کے بارے میں مت پوچھو بلکہ بھلائی کے بارے میں سوال کرو۔ اور ان جملوں کو آپ ﷺ نے تین بار ادا فرمایا۔ خبردار! بد لوگوں میں بدترین برے عالم ہیں اور بھلے لوگوں میں سب سے بہتر بھلے علماء ہیں۔" (دارمیؒ)

تشریح: صحابی کے سوال کا مقصد یا تو نفس برائی کے بارے میں دریافت کرنا تھا جیسا کہ ترجمہ سے معلوم ہوا یا وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ بدترین آدمی کون ہے؟ اور جواب کو دیکھتے ہوئے یہی مقصد زیادہ واضح ہے۔ آپ ﷺ نے اس طرح کے سوال سے منع فرمایا، اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ چونکہ سرکار دو عالم ﷺ کی ذات اقدس سراپا رحمت اور سراپا خیر ہے اس لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ آپ ﷺ سے محض بدی اور برائی ہی کا سوال کیا جاتا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے برائی اور بھلائی دونوں کے بارے میں جواب دے کر اسی طرف اشارہ فرمایا۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ علماء کی ذات چونکہ عوام کے اندر ایک معیار اور نمونہ ہوتی ہے اور لوگ ان کے تابع و معتقد ہوتے ہیں، لہٰذا عالم کی ہر صفت اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کے اثرات دوسروں تک بھی پہنچتے ہیں، عالم اگر نیک اخلاق و عادات اور اچھے خصائل کا ہوتا ہے تو اس کے ماننے والے اور اس کی اتباع کرنے والے بھی نیک اخلاق و عادات کے مالک ہوتے ہیں اور خدانخواستہ عالم بد اخلاق، بدکردار ہو جائے تو پھر اس کے جراثیم دوسرے تک پہنچتے ہیں اور اس کے ماننے والے بھی اسی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

(۶۳) وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ اِنَّ مِنْ اَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَالِمٌ لَا يَنْتَفِعُ بِعِلْمِهٖ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن خدا کے نزدیک مرتبہ میں سب سے بدتر وہ عالم ہے جس نے اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھایا۔" (دارمیؒ)

تشریح: یا تو اس سے مراد وہ عالم ہے جس نے ایسا علم سیکھا جو فائدہ پہنچانے والا نہیں ہے۔ یعنی غیر شرعی علوم اس نے حاصل کئے جو نفع بخش نہیں ہیں یا پھر وہ عالم مراد ہے جس نے علم تو شرعی اور دینی حاصل کیا مگر اس پر عمل نہیں کیا۔

لہٰذا ایسے عالم کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ قیامت کے روز مرتبہ کے اعتبار سے وہ خدا کے نزدیک سب سے بدتر ہوگا یعنی یہ جاہل سے بھی زیادہ برا ہوگا یہی وجہ ہے کہ اس پر جو عذاب ہوگا وہ جاہل کے عذاب سے سخت ہوگا، جیسا کہ منقول ہے۔

ویل للجاھل مرۃ و ویل للعالم سبع مرات۔

یعنی جاہل کے لئے ایک مرتبہ بربادی ہے اور عالم کے لئے سات مرتبہ بربادی ہے، نیز یہ وارد ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ اور سب سے شدید عذاب جس پر ہوگا وہ ایسا عالم ہے کہ جسے اللہ نے علم دیا اور اس نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔

(۶۴) وَعَنْ زِيَادِ بْنِ حُدَيْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ لِي عُمَرُ هَلْ تَعْرِفُ مَا يَهْدِمُ الْإِسْلَامَ قُلْتُ لَا قَالَ يَهْدِمُهُ زَلَّةُ الْعَالِمِ وَجِدَالُ الْمُنَافِقِ بِالْكِتَابِ وَحُكْمُ الْأَئِمَّةِ الْمُضِلِّيْنَ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت زیاد بن حدیر راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ اسلام کی عمارت کو ڈھانے والی کیا چیز ہے؟ میں نے کہا مجھے نہیں معلوم! حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ عالم کا پھسلنا (یعنی کسی مسئلہ میں عالم کا غلطی کرنا اور اس کا گناہ کرنا، منافق کا کتاب اللہ میں جھگڑنا اور گمراہ سرداروں کا حکم جاری کرنا اسلام (کی عمارت) کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: اسلام کی عمارت کو ڈھا دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے جو پانچ بنیادی اصول ہیں، یعنی کلمہ، توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ وہ بیکار محض ہو کر رہ جائیں، چنانچہ جب عالم اپنے حقیقی فرائض یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ادائیگی کو اپنی خواہشات نفسانی کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے تو ان چیزوں میں سستی اور فساد واقع ہو جاتا ہے۔

اسی طرح منافق یعنی وہ شخص جو بظاہر تو اسلام کا دم بھرتا ہے مگر اندرونی طور پر وہ کفر و بدعت کا پوری طرح ہمنوا ہوتا ہے۔ جب قرآن میں جھگڑتا ہے بایں طور پر وہ قرآن کے معنی و مفہوم کی غلط تاویلات کر کے احکام شریعیہ کو رد کرتا ہے تو اس سے ارکان اسلام میں سستی اور دین میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

اسی زمرہ میں وہ روافض اور خوارج نیز دیگر باطل عقائد کے لوگ بھی داخل ہیں جو اپنی خواہشات نفسانی اور ذاتی اغراض کی خاطر غلط سلط تاویلیں کر کے دین و شریعت میں شک و شبہ کا بیج بوتے ہیں۔

(۶۵) وَعَنِ الْحَسَنِ قَالَ الْعِلْمُ عِلْمَانِ فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذَاكَ الْعِلْمُ النَّافِعُ وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذٰلِكَ حُجَّةُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ عَلٰى ابْنِ اٰدَمَ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ علم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ علم جو دل کے اندر رہتا ہے یہ علم تو نفع دیتا ہے اور دوسرا وہ علم ہے جو زبان کے اوپر ہوتا ہے یہ علم آدمی پر خدائے عزوجل کی دلیل و حجت ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: حضرت حسن بصریؒ نے علم کی جو دو قسمیں کی ہیں ان میں سے پہلے کو علم باطن کہا جاتا ہے اور دوسرے کو علم ظاہر چنانچہ جب تک ظاہر کی اصلاح نہیں ہوتی علم باطن سے کچھ میسر نہیں آتا، اسی طرح جب تک باطن کی اصلاح نہیں ہو جاتی علم ظاہر کی تکمیل نہیں ہوتی۔

ابوطالب مکی فرماتے ہیں کہ یہ دونوں علم اصل اور بنیادی ہیں اور ان دونوں میں اس درجہ کا ارتباط و تعلق ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا، جس طرح ایمان و اسلام کہ ایک دوسرے کے بغیر صحیح نہیں ہوتے یا جیسے دل و جسم کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے ٹھیک اسی طرح ان دونوں علوم کا آپس میں ارتباط و تعلق ہے۔ (ملا قاری)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ نفع دینے والا علم وہ ہوتا ہے کہ جب اس کی روشنی سے دل منور ہو جاتا ہے تو دل کے وہ پردے اٹھ جاتے ہیں جو حقائق اشیاء کی معرفت و فہم کے لئے مانع ہیں۔

علم نافع کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو علم معاملہ جو عمل کا باعث ہوتا ہے اور دوسرا علم مکاشفہ جو عمل کا اثر ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے

بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کے دل میں یہ نور علم ڈال دیتا ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے جس علم کو نافع قرار دیا ہے وہ یہی علم ہے اور جو علم زبان کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جو نہ تو تاثیر رکھتا ہے اور نہ دل میں نورانیت پیدا کرتا ہے ؎

علم چوں بر دل زند یاری شود علم چوں بر تن زند ماری شود

چنانچہ اسی علم کو کہا جارہا ہے کہ یہ بندوں پر خدا کی جانب سے حجت اور دلیل ہے کہ خدا بندوں کو الزام دیتے ہوئے فرمائے گا کہ میں نے تو تمہیں علم دیا تھا تم نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ جاہل کے لئے ایک بار بربادی ہے اور عالم کے لئے سات بار کیونکہ یہ دیدہ و دانستہ گمراہ ہوا۔

(۶۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَیْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِیْكُمْ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ یَعْنِیْ مَجْرَی الطَّعَامِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے دو باسن (یعنی دو طرح کے علم) یاد رکھے ہیں، ان میں سے ایک کو تمہارے درمیان میں نے پھیلا دیا ہے اور دوسرا علم وہ ہے کہ اگر میں اسے بیان کروں تو میرا یہ گلا کاٹ ڈالا جائے۔" (بخاریؒ)

تشریح: پہلے علم سے مراد تو علم ظاہر ہے جس کا تعلق احکام و اخلاق وغیرہ سے ہے۔ دوسرے علم کے دو مفہوم لئے جاسکتے ہیں اول تو یہی کہ اس سے مراد وہ علم باطن ہے جس کے اسرار و معانی عوام سے ان کے ناقص فہم کی بنا پر پوشیدہ ہیں اور وہ علم خواص علماء عارفین کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کو آنحضرت ﷺ نے بتایا تھا کہ میرے بعد ایک جماعت کی طرف سے ایک زبردست فتنہ اٹھے گا جس سے بدعات کی بنیاد پڑ جائے گی۔ حضرت ابوہریرہؓ کو اس قوم اور اس قوم کے افراد کے ناموں کا بھی علم تھا چنانچہ ہو سکتا ہے کہ اس سے حضرت ابوہریرہؓ کی مراد یہی علم ہو جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اگر میں اسے لوگوں کے سامنے بیان کردوں گا تو میری جان کے لالے پڑ جائیں گے۔

(۶۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ یٰاَیُّهَا النَّاسُ مَنْ عَلِمَ شَیْئًا فَلْیَقُلْ بِهٖ وَمَنْ لَّمْ یَعْلَمْ فَلْیَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ فَاِنَّ مِنَ الْعِلْمِ اَنْ تَقُوْلَ لِمَا لَا تَعْلَمُ اللّٰهُ اَعْلَمُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی لِنَبِیِّهٖ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِیْنَ۔ (متفق علیہ، سورۃ ص ۸۶)

"اور مروی ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے (لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا) اے لوگو! جو شخص کسی بات کو جانتا ہو تو چاہئے کہ وہ اسے بیان کردے، اور جو نہ جانتا ہو تو چاہئے کہ وہ کہے کہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے اس لئے کہ جس چیز کا اسے علم نہیں ہے، اس کے بارے میں اللہ زیادہ جانتا ہے۔ کہنا بھی علم کی ایک قسم ہے (یعنی معلوم کا غیر معلوم سے تمیز کرنا بھی علم کی ایک قسم ہے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے واسطے فرمایا ہے کہ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِیْنَ (سورہ ص ۸۶) ترجمہ: "یعنی اے محمد (ﷺ) کہہ دیجئے کہ میں اس قرآن پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا اور میں تکلف کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس آیت کے ذریعے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپ لوگوں سے کہہ دیں کہ خدا نے جو کچھ علم مجھے دیا اور جتنا مجھے سکھا دیا اور پھر اس کو پھیلانے اور لوگوں کو سکھانے کا حکم دیا اسی کو لوگوں تک پہنچاتا اور انہیں سکھاتا ہوں، اس کے علاوہ میں کسی دوسری چیز کا دعویٰ اپنی طرف سے نہیں کرتا اور نہ ان چیزوں سے بحث کرتا ہوں جو مشکل اور سخت ہونے کی وجہ سے عوام کے فہم سے بلند و بالا ہیں کیونکہ ایسا کرنا خواہ مخواہ کا تکلف کرنا ہے۔

(۶۸) وَعَنِ ابْنِ سِیْرِیْنَ قَالَ اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ یہ علم (یعنی کتاب و سنت کا علم) دین ہے۔ لہٰذا جب تم اس کو حاصل کرو تو یہ دیکھ لو کہ اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد سے دراصل اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ جب علم حاصل کرنے کا ارادہ کرو یا حدیث حاصل کرو تو اس بات کو خوب اچھی طرح جانچ پرکھ لو کہ تم جس سے علم حاصل کر رہے ہو وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ آیا وہ قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ جب تمہیں اس عالم یا راوی کے حالات کا پوری طرح علم ہو جائے اور سمجھ لو واقعی وہ دیندار، پرہیزگار اور قوی الحافظہ ہے تو اس سے علم حاصل کرو۔ اس طرح ہر کس وناکس کو اپنا استاد نہ بناؤ اور ہر شخص سے حدیث کی روایت نہ کرو خصوصاً اہل بدعت، نفسانی خواہشات کے غلام اور غیر دیندار لوگوں سے اس معاملہ میں اجتناب برتو۔

(۶۹) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ يَا مَعْشَرَ الْقُرَّآءِ اسْتَقِيْمُوْا فَقَدْ سَبَقْتُمْ سَبْقًا بَعِيْدًا وَاِنْ اَخَذْتُمْ يَمِيْنًا وَّ شِمَالاً لَقَدْ ضَلَلْتُمْ ضَلاَلاً بَعِيْدًا۔ (رواہ البخاری)

"اور مروی ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے قاریوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ اے قاریوں کی جماعت سیدھے رہو! اس لئے کہ تم سبقت لے گئے ہو دور کی سبقت اگر تم (سیدھے راستہ سے ہٹ کر) ادھر ادھر ہو گئے تو البتہ بڑی گمراہی میں پڑ جاؤ گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ ان صحابہ کرامؓ سے خطاب ہے جو ابتداء ہی میں اسلام کی دولت سے مشرف ہو گئے تھے۔ چونکہ ان لوگوں نے شروع ہی میں کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اس لئے یہ اپنے فضل وکمال کی بنا پر ان لوگوں سے سبقت لے گئے ہیں جو بعد میں مسلمان ہوئے ہوں گے اگرچہ ان کے اعمال بھی ان ہی جیسے ہوں گے لیکن بعد کے لوگ پہلے والوں کے مرتبہ ودرجہ کو ان کے سبقت اسلام کی بناء پر نہیں پہنچ سکتے۔

بہرحال انھیں مقدس حضرات کو حضرت حذیفہؓ مخاطب فرما رہے ہیں کہ تم لوگ شریعت، طریقت اور حقیقت کی راہ پر مستقیم رہو اس لئے کہ استقامت کرامت سے بہتر ہے۔

استقامت کے معنی یہ ہیں کہ اچھے عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہا جائے، نفع دینے والے علم اور عمل صالح پر مداومت اختیار کی جائے، اخلاص خالص رکھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمام چیزوں سے دھیان ہٹا کر حق تعالیٰ کے ساتھ لو لگائے رہے۔

(۷۰) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ جُبِّ الْحُزْنِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جُبُّ الْحُزْنِ قَالَ وَادٍ فِيْ جَهَنَّمَ تَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ كُلَّ يَوْمٍ اَرْبَعَ مِائَةِ مَرَّةٍ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّدْخُلُهَا قَالَ الْقُرَّآءُ الْمُرَاءُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَكَذَا ابْنُ مَاجَةَ زَادَ فِيْهِ وَاِنَّ مِنْ اَبْغَضِ الْقُرَّآءِ اِلَى اللّٰهِ تعالىٰ الَّذِيْنَ يَزُوْرُوْنَ الْاُمَرَآءَ قَالَ الْمُحَارِبِيُّ يَعْنِي الْجَوَرَةَ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے (صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا۔ تم اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو جب الحزن یعنی غم کے کنویں سے صحابہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! غم کا کنواں کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ دوزخ میں ایک نالہ ہے جس سے دوزخ دن میں چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! اس میں کون داخل ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ قرآن پڑھنے والے جو اپنے اعمال کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور ابن ماجہؒ کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں خدا کے نزدیک مبغوض ترین وہ قاری ہیں جو سرداروں سے ملاقات کرتے ہیں اس حدیث کے راوی حاربی نے کہا ہے کہ سرداروں سے مراد ظالم سردار ہیں۔"

(ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "جب الحزن" دوزخ کی ایک وادی کا نام ہے جو بہت گہری ہے اور کنوئیں کے مشابہ ہے یہ اتنی زیادہ ہیبت ناک اور وحشت ناک ہے کہ دوزخی تو الگ رہے خود دوزخ دن میں چار سو مرتبہ اس سے پناہ مانگتی ہے چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ وہ قاری جو اپنا عمل یعنی قرآن پڑھنا محض دکھلاوے و ریا کے لئے کرتے ہیں اسی وحشت ناک وادی میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ اسی حکم میں ریاکار عالم اور عابد بھی داخل

ہیں، کیونکہ علم کی اصل بنیاد تو قرآن ہی ہے اسی طرح عبادت بھی قرآنی احکام ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے عالم اور عابد جو ریاکار ہیں وہ بھی انھیں قاریوں کے ہمراہ اسی کنواں کا لقمہ بنیں گے۔

"سرداروں سے ملاقات" کا مطلب یہ ہے کہ جو قاری سرداروں سے محض حب جاہ و مال اور دنیاوی طمع و لالچ کی خاطر ملتا ہے وہ خدا کے نزدیک مبغوض ترین ہے۔ ہاں اگر سرداروں سے ملنا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے ہو یا بطریق جبر اور ان کے شر کے دفعیہ کے لئے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

نیز یہاں سرداروں سے بھی وہی سردار مراد ہیں جو ظالم اور جابر ہوں، نیک بخت سردار یا عادل امیر و حاکم کا یہ حکم نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے امراء و سردار جو خدا کے نیک بندے ہوں ان سے ملاقات کرنا عبادت میں داخل ہے۔

(۷۱) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ اَنْ يَّاْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى عُلَمَاءُ هُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت علیؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ عنقریب لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اسلام میں سے صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا اور قرآن میں سے صرف اس کے نقوش باقی رہیں گے۔ ان کی مسجدیں (بظاہر تو) آباد ہوں گی مگر حقیقت میں ہدایت سے خالی ہوں گی۔ ان کے علماء آسمان کے نیچے کی مخلوق میں سے سب سے بدتر ہوں گے۔ انھیں سے (ظالموں کی حمایت و مدد کی وجہ سے) دین میں فتنہ پیدا ہوگا اور انھیں میں لوٹ آئے گا (یعنی انھیں پر ظالم) مسلط کر دیئے جائیں گے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: یہ حدیث اس زمانہ کی نشان دہی کر رہی ہے جب عالم میں اسلام تو موجود رہے گا مگر مسلمانوں کے دل اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہوں گے، کہنے کے لئے تو وہ مسلمان کہلائیں گے مگر اسلام کا جو حقیقی مدعا اور منشاء ہے اس سے کوسوں دور ہوں گے۔ قرآن جو مسلمانوں کے لئے ایک مستقل ضابطہ حیات اور نظام عمل ہے اور اس کا ایک ایک لفظ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی زندگی کے لئے راہ نما ہے۔ صرف برکت کے لئے پڑھنے کی ایک کتاب ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ یہاں "رسم قرآن" سے مراد یہی ہے کہ تجوید و قرأت سے قرآن پڑھا جائے گا، مگر اس کے معنی و مفہوم سے ذہن قطعًا نا آشنا ہوں گے، اس کے اوامر و نواہی پر عمل بھی ہوگا مگر قلوب اخلاص کی دولت سے محروم ہوں گے۔

مسجدیں کثرت سے ہوں گی اور آباد بھی ہوں گی مگر وہ آباد اس شکل سے ہوں گی کہ مسلمان مسجدوں میں آئیں گے اور جمع ہوں گے لیکن عبادت خداوندی، ذکر اللہ اور درس و تدریس جو بناء مسجد کا اصل مقصد ہے وہ پوری طرح حاصل نہیں ہوگا۔

اسی طرح وہ علماء جو اپنے آپ کو روحانی اور دینی پیشوا کہلائیں گے۔ اپنے فرائض منصبی سے ہٹ کر مذہب کے نام پر اُمت میں تفرقے پیدا کریں گے، ظالموں اور جابروں کی مدد و حمایت کریں گے۔ اس طرح دین میں فتنہ و فساد کا بیج بو کر اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کریں گے۔

(۷۲) وَعَنْ زِيَادِ بْنِ لَبِيْدٍ قَالَ ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَقَالَ ذٰلِكَ عِنْدَ اَوَانِ ذَهَابِ الْعِلْمِ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَنُقْرِئُهٗ اَبْنَآءَنَا وَيُقْرِئُهٗ اَبْنَآءُنَا اَبْنَاءَهُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَقَالَ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ زِيَادُ اِنْ كُنْتُ لَاَرَاكَ مِنْ اَفْقَهِ رَجُلٍ بِالْمَدِيْنَةِ اَوَلَيْسَ هٰذِهِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى يَقْرَأُوْنَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ لَا يَعْمَلُوْنَ بِشَيْءٍ مِّمَّا فِيْهِمَا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ عَنْهُ نَحْوَهٗ وَكَذَا الدَّارِمِيُّ عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ۔

(رواہ احمد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت زیاد بن لبیدؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے کسی چیز (یعنی فتنہ اور ابتلاء) کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا یہ اس وقت ہوگا جبکہ علم جاتا

رہے گا۔ (یہ سن کر) میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! علم کس طرح جاتا رہے گا؟ حالانکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں گے۔ ہمارے بچے اپنے بچوں کو پڑھائیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ زیاد! تمہیں تمہاری ماں گم کردے! میں تو تمہیں مدینے کے لوگوں میں بڑا سمجھ دار سمجھتا تھا کیا یہود و نصاریٰ توریت و انجیل کو نہیں پڑھتے ہیں۔ لیکن ان کی کتابوں کے اندر جو کچھ ہے (یعنی احکام) اس میں سے وہ کسی چیز پر عمل نہیں کرتے۔ (احمدؒ، ابن ماجہؒ) اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی ہی روایت زیاد سے اور اسی طرح دارمیؒ نے ابی امامہؓ سے نقل کی ہے۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ، ترمذیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے حضرت زیادؓ کو تنبیہ فرمائی کہ تم نے میرے کلام کا منشاء جانے بغیر یہ خیال کر لیا کہ صرف قرآن کا پڑھ لینا اور اس کا علم حاصل کر لینا ہی کافی ہے یعنی جس نے قرآن پڑھ لیا اور اس کا علم حاصل کر لیا گویا اس نے اس پر عمل بھی کر لیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ محض قرآن کو پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل چیز تو اس کا اتباع اور اس کے احکام پر عمل کرنا ہے اور یہی چیز اس وقت مفقود ہوگی، چنانچہ قرآن کو مسلمان پڑھیں گے اور اس کا علم بھی حاصل کریں گے مگر ان کا عمل قرآن کے مطابق نہیں ہوگا جس طرح کہ یہود و نصاریٰ کہ وہ بھی اپنی کتابوں یعنی توریت و انجیل کو پڑھتے ہیں اور اس کا علم بھی حاصل کرتے ہیں لیکن ان کے احکام پر ذرہ برابر بھی عمل نہیں کرتے۔

(۷۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْهَا النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْقُرْاٰنَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ فَاِنِّیْ امْرُءٌ مَقْبُوْضٌ وَالْعِلْمُ سَيُقْبَضُ وَتَظْهَرُ الْفِتَنُ حَتّٰى يَخْتَلِفَ اِثْنَانِ فِیْ فَرِيْضَةٍ لَّا يَجِدَانِ اَحَدًا يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا۔ (رواہ الدارمی والدارقطنی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مجھ سے فرمایا۔ علم کو سیکھو اور سکھلاؤ، علم فرائض (یا فرض احکام) کو سیکھو اور لوگوں کو بھی سکھلاؤ (اسی طرح) قرآن کو سیکھو اور لوگوں کو بھی سکھلاؤ۔ اس لئے کہ بے شک میں ایک شخص ہوں جو اٹھایا جاؤں گا اور علم بھی اٹھالیا جائے گا اور فتنے ظاہر ہوں گے یہاں تک کہ دو شخص ایک فرض چیز میں اختلاف کریں گے اور کسی کو ایسا نہ پائیں گے جو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرے (یعنی علم کے کم ہو جانے اور فتنوں کے بڑھ جانے) سے یہ حال ہو جائے گا۔" (دارمیؒ، دار قطنیؒ)

(۷۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ عِلْمٍ لَا يُنْتَفَعُ بِهٖ كَمَثَلِ كَنْزٍ لَا يُنْفَقُ مِنْهُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (رواہ احمد والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس علم کی مثال جس سے نفع نہ اٹھایا جائے (یعنی نہ دوسروں کو پڑھایا جائے اور نہ اس پر عمل کیا جائے، اس خزانہ کی مانند ہے جس میں سے خدا کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا جائے۔" (احمدؒ، دارمیؒ)

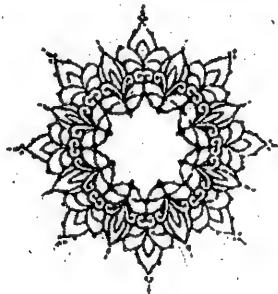

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الطہارۃ

پاکیزگی کا بیان

لغت میں "طہارۃ" کے معنی نظافت اور پاکی کے آتے ہیں جو نجاست کی ضد ہے "طہور" بضم طاء مصدر ہے اور ان چیزوں کو بھی طہور کہتے ہیں جو پاک کرتی ہیں جیسے پانی اور مٹی طہور، بفتح طاء بھی مصدر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اصطلاح شریعت میں "طہارت" کا مفہوم ہے نجاست حکمی یعنی حدث سے اور نجاست حقیقی یعنی خبث سے پاکیزگی حاصل کرنا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَاٰنِ اَوْ تَمْلَأُ مَابَیْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَالصَّبْرُ ضِیَاءٌ وَالْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَیْكَ كُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْا فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ تَمْلَاٰنِ مَابَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَمْ اَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَایَةَ فِی الصَّحِیْحَیْنِ وَلَا فِیْ كِتَابِ الْحُمَیْدِیِّ وَلَا فِی الْجَامِعِ وَلٰكِنْ ذَكَرَهَا الدَّارِمِیُّ بَدَلَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

"حضرت ابی مالک[1] اشعری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا "پاک رہنا آدھا ایمان ہے اور الحمد للہ کہنا (اعمال کی) ترازو کو بھر دیتا ہے اور سبحان اللہ والحمد للہ بھر دیتے ہیں یا فرمایا ہر ایک کلمہ بھر دیتا ہے اس چیز کو جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہے نماز نور ہے صدقہ دلیل ہے، صبر کرنا روشنی ہے اور قرآن تمہارے لئے یا تمہارے اوپر دلیل ہے ہر شخص (جب) صبح کرتا ہے (یعنی سو کر اٹھتا ہے) تو اپنی جان کو (اپنے کاموں میں بیچتا ہے (یعنی لگاتا) ہے لہٰذا وہ اپنی جان کو آزاد کرتا ہے یا ہلاک کرتا ہے۔ (مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ لا الٰہ الا اللہ اکبر بھر دیتے ہیں اس چیز کو جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔" (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ) میں نے اس روایت کو نہ بخاری میں پایا ہے نہ مسلم میں اور نہ ہی کتاب حمیدی و کتاب جامع الاصول میں مجھے یہ روایت ملی ہے البتہ دارمی نے اس روایت کو بجائے سبحان اللہ والحمد للہ کے ذکر کیا ہے۔" (لہٰذا صاحب مصابیح کا اس روایت کو فصل اول میں نقل کرنا درست نہیں ہوا۔)"

تشریح: اس حدیث میں پاکیزگی و طہارت کی انتہائی عظمت و فضیلت کا اظہار ہوتا ہے کہ اسلام میں طہارت کو کیا مقام حاصل ہے چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ پاک رہنا آدھا ایمان ہے اور وجہ ظاہر ہے کہ ایمان سے چھوٹے اور بڑے سب ہی گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور وضو

---

[1] آپ کے نام میں اختلاف ہے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آپ کا نام کعب بن مالک ہے اور بعض کعب بن عاصم کہتے ہیں، عبیدہ، حارث اور عمرو بھی بیان کیے جاتے ہیں، کنیت ابومالک ہے، مشہور صحابی ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

سے صرف چھوٹے گناہ ہی بخشے جاتے ہیں اس لئے طہارت کو آدھے ایمان کا درجہ حاصل ہے۔

درمیان روایت میں راوی کو شک ہو رہا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے لفظ تملاء مفرد فرمایا یا تملان تثنیہ کے ساتھ فرمایا ہے اس لئے انہوں نے دونوں کو نقل کر دیا ہے، اس جملہ کا مطلب ہے کہ سبحان اللہ والحمد للہ پڑھنا اور ان کا ورد رکھنا اتنی فضیلت کی بات ہے اور اس کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر ان دونوں کلموں کو ایک جسم فرض کر لیا جائے تو اتنے عظیم ہیں کہ آسمان اور زمین کے درمیانی حصہ کو بھر دیں۔

نماز کو نور فرمایا گیا ہے اس لئے کہ نماز ہی وہ چیز ہے جو قبر کے اندھیرے اور قیامت کی ظلمت میں روشنی کی مانند ہے جو مؤمن کو گناہوں اور بری باتوں سے بچاتی ہے اور نیکی و بھلائی اور ثواب کے کاموں کی طرف راہنمائی کرتی ہے یا پھر نماز کو نور اس لئے کہا گیا ہے کہ مؤمن کے قلب کو ذات خداوندی کے عرفان کی روشنی سے منور کرتی ہے اور عبادت خداوندی کی ادائیگی و اطاعت الٰہی کی بنا پر نماز پڑھنے والے کے چہرہ پر سعادت و نیک بختی کی چمک پیدا کرتی ہے۔

صدقہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کو دلیل اس لئے کہا گیا ہے کہ مؤمن کے دعویٰ ایمان کی صداقت اور پروردگار عالم سے محبت پر دلالت کرتا ہے یا یہ معنی ہیں کہ جب قیامت میں مالدار سے خدا سوال کرے گا کہ ہم نے تمہیں مال و دولت میں اتنی وسعت بخشی تھی تو تم نے اس مال و دولت کو کہاں خرچ کیا؟ اور اس کا مصرف کیا تھا؟ یعنی تم نے ہماری بخشی ہوئی اس نعمت کو اچھی راہ میں خرچ کیا یا برے راستہ میں لٹا دیا؟ تو اس کے جواب میں صدقہ بطور دلیل پیش ہوگا کہ خداوند قدوس تیرا دیا ہوا مال برے راستہ میں نہیں لٹایا گیا ہے بلکہ اسے تیری ہی راہ میں اور تیری ہی خوشنودی کے لئے خرچ کیا گیا ہے۔

صبر اس کو کہتے ہیں کہ گناہوں سے بچا جائے، طاعات پر مستعد رہا جائے اور کسی مصیبت و تکلیف کے موقعہ پر آہ بکا اور جزع و فزع نہ کیا جائے چنانچہ اس کے بارہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ کامل روشنی کا سبب ہے اس لئے کہ صابر کا قلب و دماغ ایمانی عزم و یقین کی روشنی سے ہمیشہ منور رہتا ہے اور وہ دین و دنیا کے ہر مرحلہ پر کامیاب ہوتا ہے۔

"قرآن کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ تمہارے لئے یا تمہارے اوپر دلیل ہے یعنی تم قرآن پڑھو گے اور اس پر اگر عمل کرو گے تو قرآن تمہیں نفع بخشے گا اور اگر عمل نہ کرو گے تو تمہارے لئے ضرر کا باعث ہوگا۔

"جان کو بیچنے" کے معنی یہ ہیں کہ جس کام کی طرف آدمی متوجہ ہو اس میں اپنی ذات کو کھپا دے، اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص سو کر اٹھتا ہے تو اپنے کام میں لگ جاتا ہے اور دنیا میں مشغول ہو جاتا ہے، لہٰذا اب اس نے اگر اس کام کے بدلے آخرت خرید لی بایں طور کہ اس کام پر آخرت کو ترجیح دی تو اس نے اپنے نفس کو عذاب آخرت سے آزاد کر لیا، اور اگر خدانخواستہ اس نے دنیا اور دنیا کے اس کام کو آخرت کے بدلے خرید لیا بایں طور کہ اس کام کو آخرت پر ترجیح دی تو اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا اور اپنے نفس کو عذاب میں ڈال دیا ۔

بدنیا توانی کہ عقبے خری — بخر جان من ورنہ حسرت بری

(۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰی مَا یَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الْخَطَایَا وَیَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَی الْمَكَارِهِ وَكَثْرَةُ الْخُطٰی اِلَی الْمَسَاجِدِ وَانْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ وَفِیْ حَدِیْثِ مَالِكِ بْنِ اَنَسٍ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ رَدَّدَ مَرَّتَیْنِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِی الرِّوَایَةِ التِّرْمِذِیِّ ثَلَاثًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے (صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا "کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتا دوں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو دور کر دے اور جس کے سبب (جنت میں) تمہارے درجات کو بلند کرے؟ صحابہ نے عرض کیا "ہاں یا

رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا مشقت کے وقت (یعنی بیماری یا سخت جاڑے میں) وضو کو پورا کرنا، مسجد کی طرف (گھر سے دور ہونے کی وجہ سے) کثرت سے قدموں کا رکھنا اور (ایک) نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا پس یہ رباط ہے، اور مالک بن انس کی حدیث میں "پس یہ رباط ہے، پس یہ رباط ہے" دو مرتبہ ہے اور ترمذیؒ کی روایت میں تین مرتبہ ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے خداوند قدوس اپنے بندوں پر اس طرح فضل و کرم فرماتا ہے کہ ان کے نامۂ اعمال سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور جنت میں ان کے مراتب و درجات میں ترقی عطا فرماتا ہے چنانچہ سب سے پہلی چیز "وضو" ہے۔ یوں تو وضو نماز کے لئے شرط اور ضروری ہے لہٰذا جو نماز پڑھے گا وہ وضو بھی کرے گا خواہ کیسا ہی وقت اور کیسا ہی موسم ہو مگر اس جگہ ایک خاص بات کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی سخت وقت میں مثلاً کسی بیماری کی حالت میں یا شدید سردی کے موسم میں عموماً وضو کے معاملہ میں بڑی تساہلی برتی جاتی ہے اور اول تو زبردستی اور صحت کے منافی طریقوں کو اختیار کر کے دو اور تین وقت وضو کو باقی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر اگر وضو کیا جاتا ہے تو ایسے طریقے سے کہ نہ تو اس میں وضو کے آداب اور اس کے سنن و مستحبات کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ وضو پورے طریقہ سے مکمل کیا جاتا ہے۔

ایسے ہی مواقع کے لئے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے سخت اور شدید وقت میں اگر وضو پورے آداب و طریقے ملحوظ رکھ کے اور تمام سنن و مستحبات کا خیال کر کے کیا جائے اور تمام اعضاء وضو پر پانی اچھی طرح پہنچایا جائے اور ان کو تین تین مرتبہ دھویا جائے تو یہ فضل خداوندی کا سبب ہوگا۔

دوسری چیز مسجد کی طرف کثرت سے قدموں کا رکھنا ہے، یعنی ایسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے جانا جو گھر سے دور ہو اس لئے کہ جتنے زیادہ قدم مسجد کی طرف اٹھیں گے اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔

"نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار" یہ ہے کہ مسجد میں ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھا رہے یا اگر مسجد سے نکلے بھی تو دل وہیں دوسری نماز میں لگا رہے اس کی بہت زیادہ فضیلت و عظمت بیان فرمائی جا رہی ہے چنانچہ اس کو "رباط کہا گیا ہے۔"

"رباط اسے کہتے ہیں کہ کوئی مسلمان اسلامی مملکت کی سرحد پر دشمنان اسلام کے مقابلہ پر نگہبانی کی خاطر بیٹھے تاکہ دشمن سرحد پار کر کے اسلامی ملک میں داخل نہ ہو جائیں اس کا ثواب ہے اور بڑی فضیلت ہے جو خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم بھی فرمایا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔

"اے ایمان والو (تکلیف پر) خود صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو۔" (آل عمران ۳: ۲۰۰)

چنانچہ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ نماز کے انتظار میں بیٹھنا اصل رباط ہے کہ جیسے وہاں تو کفار مقابلہ میں بیٹھے ہیں یہاں شیطان کے مقابلہ میں بیٹھے ہیں جو دین کا سب سے بڑا دشمن ہے اس لئے جیسی فضیلت و سعادت رباط میں ہے ویسی ہی فضیلت و سعادت نماز کے انتظار میں بیٹھنے کی ہے اس حدیث میں چونکہ "وضو" کا ذکر آگیا ہے اس لئے اس کے متعلقات کا یہاں بیان کر دینا مناسب ہے۔

وضو میں چار چیزیں فرض ہیں ① تمام منہ کا دھونا ② ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا ③ چوتھائی سر کا مسح کرنا ④ پاؤں کا ٹخنوں تک دھونا وضو میں پورے چہرے کا دھونا فرض ہے اور اسی میں ڈاڑھی بھی شامل ہے، البتہ ڈاڑھی کے تعین میں تھوڑا بہت اختلاف ہے چنانچہ متون میں لکھا ہے کہ ڈاڑھی کے ان بالوں کا مسح کرنا جو منہ کی جلد سے ملے ہوئے ہیں فرض ہے فتاوی عالمگیری اور در مختار میں صحیح اور مفتی بہ قول یہ لکھا ہے کہ ڈاڑھی کے ان بالوں کا مسح کرنا جو منہ کی جلد سے ملے ہوئے ہیں فرض ہے اور لٹکی ہوئی کا دھونا فرض نہیں ہے بلکہ سُنّت ہے واللہ تعالیٰ اعلم وضو میں سُنّت یہ چیزیں ہیں ① ہاتھوں کا پہنچوں تک دھونا ② ابتدائے وضو میں بسم اللہ کہنا ③ مسواک کرنا ④ کلی کرنا ⑤ ناک میں پانی دینا ⑥ ڈاڑھی اور انگلیوں کا خلال کرنا ⑦ ہر عضو کو تین بار دھونا ⑧ نیت کرنا ⑨ اسی ترتیب سے وضو کرنا جس ترتیب سے

قرآن میں مذکور ہے ⑩ تمام سر کا مسح کرنا ⑪ اعضاء وضو کو پے درپے دھونا ⑫ سر کے پانی کے ساتھ ہی کانوں کا مسح کرنا (یعنی ہاتھ پر پانی ڈال کر جب سر پر مسح کیا جائے تو اسی ہاتھ سے کانوں کا مسح کیا جائے، کانوں کے مسح کے لئے الگ سے پانی کی ضرورت نہیں۔

وضو کے مستحبات یہ ہیں ① اعضاء وضو کو دھونے کے لئے دائیں طرف سے شروع کرنا (مثلاً پہلے دایاں ہاتھ دھویا جائے پھر بایاں) ② گردن کا مسح کرنا ③ وضو کے لئے قبلہ رخ بیٹھنا ④ اعضاء کا (دھوتے وقت) پہلی بار ملنا ⑤ غیر معذور کا وقت سے پہلے وضو کر لینا ⑥ ڈھیلی انگوٹھی کو گھمانا پھرانا اسی طرح غسل میں قرط یعنی بالی کو گھمانا پھرانا، لیکن اس کے بارہ میں اتنی بات یاد رکھ لینی چاہئے کہ اگر غسل اور وضو کے وقت ان چیزوں کے متعلق یہ خیال ہو کہ ان کے نیچے بدن پر پانی پہنچ رہا ہے تو پھر یہ عمل مستحب ہو گا اور اگر یہ جانے کے پانی ان کے نیچے نہیں پہنچتا تو پھر ان کو ہلا لینا فرض ہو گا ⑦ خود وضو کرنا مستحب ہے کسی دوسرے سے وضو نہ کرایا جائے ⑧ وضو کے وقت کوئی دنیاوی گفتگو نہ کرنا چاہئے ہاں اگر کوئی مجبوری ہو کہ بغیر کلام وگفتگو کے مقصد اور حاجت فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو کر سکتا ہے ⑨ ہر عضو کو دھونے کے وقت اور مسح کرتے وقت بسم اللہ پڑھے ⑩ ان دعاؤں کا پڑھنا جو عضو کے دھونے کے وقت پڑھنے کے لئے منقول ہیں ⑪ وضو مکمل کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ پر درود و سلام بھیجنا، مگر کتاب "زیلعی" میں لکھا ہے کہ ہر عضو کو دھونے کے بعد درود و سلام بھیجنا مستحب ہے ⑫ وضو کے بعد شہادتین اور وہ دعائیں جو حدیث میں وارد ہیں پڑھنا (آگے حدیث میں یہ دعائیں آرہی ہیں) ⑬ وضو کا بقیہ پانی قبلہ رخ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر پینا ⑭ بھوؤں اور مونچھوں کے نیچے، گوشہ چشم پر اور پاؤں کے کونچوں پر پانی پہنچانے کے لئے تعاہد یعنی خبر گیری کرنا کہ یہ حصے خشک نہ رہ جائیں۔

مکروہات وضو یہ ہیں: ① منہ پر زور سے پانی مارنا ② اسراف کرنا ضرورت اور حاجت سے زیادہ پانی بہانا ③ اعضاء کو تین تین مرتبہ سے زیادہ دھونا ④ نئے پانی سے تین مرتبہ مسح کرنا۔

اور منہیات وضو یہ ہیں: ① عورت کے وضو کے بچے ہوئے پانی سے وضو نہ کرنا چاہئے ② نجس جگہ وضو نہ کرنا چاہئے تاکہ وضو کے پانی کی بے حرمتی نہ ہو، ③ مسجد میں وضو نہ کرنا چاہئے البتہ کسی برتن میں یا اس جگہ جو وضو کے لئے خاص طور پر مقرر ہے وضو کرنا درست ہے ④ تھوک اور رینٹھ وغیرہ وضو کے پانی میں نہ ڈالنا چاہئے۔

③ وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص وضو کرے" اور اچھی طرح کرے (یعنی اس کے سنن و مستحبات کی رعایت کے ساتھ) تو اس کے (صغیرہ) گناہ اس کے بدن سے نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس حدیث میں بھی وضو کی فضیلت اور طہارت کی بڑائی بیان کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وضو کرنا درحقیقت اپنے گناہوں کو اپنے جسم سے دھونا ہے جو جتنا زیادہ جتنی اچھی طرح وضو کرے گا اس کے اتنے ہی گناہ ختم کر دیئے جائیں گے اور پھر بطور مبالغہ کے فرمایا گیا ہے کہ وضو کرنے والے کے ناخنوں کے نیچے کے گناہ بھی وضو کرنے سے نکل جاتے ہیں یعنی وضو کرنے کے بعد اس کو نہ صرف یہ کہ ظاہری پاکی اور طہارت حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ گناہوں سے بھی خوب پاک ہو جاتا ہے، یہ جملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے یہاں یہ محاورہ بولا جاتا ہے کہ تمہاری شیخی ناک کی راہ نکال دیں گے۔

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ اَوِ الْمُؤْمِنُ فَغَسَلَ وَجْهَهٗ خَرَجَ مِنْ وَجْهِهٖ كُلُّ خَطِيْئَةٍ نَظَرَ اِلَيْهَا بِعَيْنَيْهِ مَعَ الْمَآءِ اَوْ مَعَ اٰخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ فَاِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَ مِنْ يَدَيْهِ كُلُّ خَطِيْئَةٍ كَانَ بَطَشَتْهَا يَدَاهُ مَعَ الْمَاءِ اَوْ مَعَ اٰخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ فَاِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَ كُلُّ خَطِيْئَةٍ مَشَتْهَا رِجْلَاهُ مَعَ الْمَآءِ اَوْ مَعَ

اٰخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ حَتّٰی یَخْرُجَ نَقِیًّا مِنَ الذُّنُوْبِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کے سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا" جب کوئی بندہ مسلمان یا فرمایا مؤمن وضو کا ارادہ کرتا ہے اور اپنے منہ کو دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ اس کے وہ تمام گناہ جن کی طرف اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے منہ سے نکل جاتے ہیں (یعنی جو گناہ آنکھوں سے ہوئے ہیں جھڑ جاتے ہیں) پھر جب دونوں ہاتھوں کو دھوتا ہے تو ہاتھوں کے تمام گناہ جن کو اس کے ہاتھ نے پکڑا تھا پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ اس کے ہاتھوں سے خارج ہو جاتے ہیں (یعنی جو گناہ ہاتھ سے ہوئے ہیں جھڑ جاتے ہیں) پھر جب وہ دونوں پاؤں کو دھوتا ہے تو اس کے وہ تمام گناہ جن کی طرف وہ پاؤں سے چلا تھا پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔" (مسلم)

⑤ وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنِ امْرِءٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهٗ صَلٰوةٌ مَكْتُوْبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهَا وَخُشُوْعَهَا وَرُكُوْعَهَا اِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِّمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوْبِ مَالَمْ يُؤْتِ كَبِيْرَةً وَّ ذٰلِكَ الدَّهْرُ كُلُّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا" جو مسلمان فرض نماز کا وقت آنے پر اچھی طرح وضو کرے اور نماز میں خشوع و رکوع کرے تو (اس کی یہ نماز) ان گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے جو اس نے نماز سے پہلے کئے تھے، بشرطیکہ وہ گناہ کبیرہ نہ ہوں اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے (یعنی وہ نماز جو گناہوں کا کفارہ ہے کسی زمانہ میں مخصوص نہیں ہے یہ فضیلت ہر زمانہ میں قائم رہتی ہے۔" (مسلم)

تشریح: نماز کی اصل روح خشوع اور خضوع ہے اس لئے کہ نماز ہی وہ عبادت ہے جو بندہ کی انتہائی بے چارگی اور اس کے عجز کو ظاہر کرتی ہے لہٰذا نماز کے اندر جتنا زیادہ خشوع و خضوع ہوگا اتنے ہی اعلیٰ درجہ تک اس کی رسائی ہوگی نماز میں خشوع کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص نماز پڑھے تو نماز کے جتنے ظاہری و باطنی آداب ہیں سب کو بجالائے اور سب کی رعایت کرے تاکہ دل ترساں رہے جب نماز کے لئے کھڑا ہو تو نہایت سکون کے ساتھ رہے نظر سجدہ کی جگہ پر ہو، سوائے نماز کے کسی دوسری چیز میں مشغول نہ ہو اپنا دھیان نماز ہی میں رکھے کسی دوسری طرف دھیان نہ بٹے، بدن کپڑے اور ڈاڑھی وغیرہ سے کھیلے نہیں، دائیں بائیں طرف دیکھے نہیں اور آنکھ نہ بند کرے، یہ تمام چیزیں اگر نماز میں حاصل ہو جائیں تو پھر انشاء اللہ حضور قلب کی دولت بھی میسر آجائے گی جو عند اللہ نماز کی مقبولیت کا سبب ہے۔

حدیث میں صرف رکوع کا ذکر کیا گیا ہے سجدہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رکوع صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور ان کی نماز میں مشروع ہے یہود و نصاریٰ کی نماز و عبادت میں علی العموم رکوع نہیں ہوتا اس لئے اس کو بیان کر کے اس کی امتیازی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے، آخر میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ایسی نماز صرف صغیرہ گناہوں کے لئے کفارہ ہوتی ہے اور صغیرہ گناہوں کو ختم کر دیتی ہے، کبیرہ گناہوں کا کفارہ نہیں ہوتی۔

⑥ وَعَنْهُ اَنَّهٗ تَوَضَّأَ فَاَفْرَغَ عَلٰی يَدَيْهِ ثَلَاثًا ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهٗ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰی اِلَی الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُسْرٰی اِلَی الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهٖ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنٰی ثَلَاثًا ثُمَّ الْيُسْرٰی ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ نَفْسَهٗ فِيْهِمَا بِشَيْءٍ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَفْظُهٗ لِلْبُخَارِيِّ۔

"اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں منقول ہے کہ "انہوں نے ایک مرتبہ وضو کیا" چنانچہ انہوں نے پہلے اپنے ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی ڈالا پھر تین مرتبہ کلی کی اور ناک جھاڑی (یعنی ناک میں پانی دینے کے بعد ناک سن کی پھر تین مرتبہ منہ دھویا، پھر تین مرتبہ اپنا داہنا ہاتھ کہنی تک دھویا (یعنی کہنی سمیت دھویا) پھر تین مرتبہ اپنا بایاں ہاتھ کہنی تک دھویا، پھر اپنے سر کا مسح کیا، پھر اپنا دایاں پیر تین مرتبہ دھویا، پھر بایاں پیر تین مرتبہ دھویا اور پھر حضرت عثمانؓ نے فرمایا میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے جس طرح اب میں نے

وضو کیا ہے۔" پھر فرمایا جو شخص میرے اس وضو کی مانند وضو کرے (یعنی فرائض و سنن اور مستحبات و آداب کی رعایت کے ساتھ) پھر دو رکعت نماز پڑھے اور نماز کے اندر اپنے دل سے کچھ باتیں نہ کرے (یعنی پورے دھیان سے نماز پڑھے تو اس کے تمام پچھلے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم) اس روایت کے الفاظ بخاری کے ہیں۔"

تشریح: اعضاء وضو کا تین مرتبہ سے زائد دھونا تمام علماء کے نزدیک مکروہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پورے عضو تین مرتبہ دھو چکا ہے تو اب اس پر زیادتی نہ کرے یعنی تین بار سے زائد نہ دھوے اگر ایسی شکل ہے کہ ایک چلو سے آدھا عضو دھویا اور پھر دوسرے چلو سے آدھا دھویا تو یہ ایک مرتبہ ہی کہلائے گا مثلاً اسی طرح کسی عضو کو چھ چلوں سے دھو کر تین بار کو پورا کیا تو یہ زیادتی نہ ہوگی بلکہ تین مرتبہ ہی ہوگا وضو کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا انتہائی درجہ نہیں ہے بلکہ ادنی درجہ ہے اگر زیادہ بھی پڑھے تو افضل ہے۔ بہر حال یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وضو کے بعد نماز یعنی تحیۃ الوضو پڑھنی مستحب ہے اگر فرض یا سنت موکدہ ہی پڑھے تو یہ بھی کافی ہے۔

آخر حدیث میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ نماز میں حضور قلب اور خشوع و خضوع بہت زیادہ مطلوب ہے چنانچہ آخری جملہ کا یہ مطلب ہے کہ جب نماز شروع کرے تو پھر اپنے دل کو نماز میں لگائے خیالات نماز سے باہر کہیں دوسری جگہ بھٹکنے نہ پائیں اور قلب میں دنیا کے خیالات اور ایسے تفکرات کو جو نماز کے منافی ہیں جگہ نہ دے خیال اللہ ہی کی طرف لگائے رکھے اگر خطرات و وسواس دل میں آئیں تو ان کو دفع کرے ہاں اگر دل میں ایسے خطرات پیدا ہوتے ہیں جو نماز میں حضور قلب کے منافی نہیں پھر کچھ مضر نہیں۔

⑦ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهُ ثُمَّ يَقُوْمُ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلاً عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ وَوَجْهِهٖ اِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عقبہؓ بن عامرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو مسلمان وضو کرے اور اچھا وضو کرے پھر کھڑا ہو اور دو رکعت نماز پڑھے دل اور منہ سے متوجہ ہو کر (یعنی ظاہر و باطن کے ساتھ متوجہ ہو کر) تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے۔" (مسلم)

تشریح: فرمایا گیا ہے کہ جب اچھی طرح وضو کرے تو کھڑا ہو اور دو رکعت نماز پڑھے تو یہ کھڑا ہونا یا حقیقۃً ہو یعنی واقعی کھڑا ہو کر نماز پڑھے یا کھڑا ہونا حکماً ہو مثلاً بیٹھ کر پڑھے خصوصاً جب اس کو کوئی عذر اور مجبوری ہو کہ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا یہ دونوں شکلیں مراد ہیں۔

⑧ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُبْلِغُ اَوْفَيُسْبِغُ الْوُضُوْءَ ثُمَّ يَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا فُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةُ يَدْخُلُ مِنْ اَيِّهَا شَاءَ هٰكَذَا، رَوَاهُ مُسْلِمٌ فِيْ صَحِيْحِهٖ وَالْحُمَيْدِيُّ فِيْ اَفْرَادِ مُسْلِمٍ وَكَذَا ابْنُ الْاَثِيْرِ فِيْ جَامِعِ الْاُصُوْلِ وَذَكَرَ الشَّيْخُ مُحْيِ الدِّيْنِ النَّوَوِيُّ فِيْ آخِرِ حَدِيْثِ مُسْلِمٍ عَلٰى مَا رَوَيْنَاهُ وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ، وَالْحَدِيْثُ الَّذِيْ رَوَاهُ الْمُحْيِ السُّنَّةِ فِي الصِّحَاحِ مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ اِلٰى آخِرِهٖ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ فِيْ جَامِعِهٖ بِعَيْنِهٖ اِلَّا كَلِمَةَ اَشْهَدُ قَبْلَ اَنَّ مُحَمَّدًا۔

"اور حضرت عمر بن الخطابؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم میں جو شخص وضو کرے اور (اس کی خوبیوں) کو انتہاء پر پہنچاوے یا آپ ﷺ نے یہ الفاظ فرمائے کہ اور پورا وضو کرے پھر کہے اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ (یعنی میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خدائے واحد کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں اور محمد ﷺ خدا کے بندے اور خدا کے رسول ہیں اور

ل اسم گرامی عقبہ ابن عامر جہنی ہے کنیت میں بہت زیادہ اختلاف ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ابو حماد تھی بعض نے ابو لبید، ابو عمرو غیرہ بھی کہا ہے مصر میں انتقال ہوا ہے۔

ایک روایت میں ہے (کہ اس طرح کہے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یعنی میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی خدائے واحد کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور شہادت دیتا ہوں اس بات کی کہ محمد ﷺ خدا کے بندے اور خدا کے رسول ہیں، تو اس کے لئے جنّت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں جس دروازے میں سے اس کا جی چاہے جنّت میں داخل ہو (مسلم حمیدی جامع الاصول) اور امام نوویؒ نے مسلم کی حدیث کے آخر میں جس کو ہم نے روایت کیا ہے یہ ذکر کیا ہے کہ ترمذی نے (شہادتین پر اس دعا کے) یہ الفاظ زیادہ لکھے ہیں "اے اللہ! مجھ کو توبہ کرنے والوں میں سے بنا اور پاکیزگی کرنے والوں میں شامل کر (یعنی مسلم کی روایت جس طرح ہم نے ذکر کی۔ ہے وہی روایت امام نوویؒ نے مسلم کی شرح میں نقل کی ہے اور اس کے آخر میں رواہ الترمذی الخ کی عبارت بڑھادی ہے) اور وہ حدیث جس کو امام محی السنۃ نے صحاح میں روایت کی ہے یعنی مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ الخ (جس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا" آخر تک) اس کو امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں بعینہ اسی طرح نقل کیا ہے اَنَّ مُحَمَّدًا سے پہلے اَشْهَدُ کا ذکر نہیں کیا ہے۔"

تشریح: مراتب اور درجات کے اعتبار سے جنّت کے آٹھ حصے ہیں چنانچہ اس حدیث میں "آٹھوں دروازوں" کا جو ذکر کیا گیا ہے ان سے حقیقۃً دروازے مراد نہیں بلکہ ان آٹھ حصوں کو ایک ہی اعتبار کیا ہے اور ہر ایک کو دروازے سے تعبیر کیا ہے۔ کبھی ایک کو بھی بہشت کہتے ہیں، اس حساب سے "ہشت بہشت" بولتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ الخ یعنی "اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں میں سے بنا" کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا ہمیں تو اس کی توفیق عنایت فرما کہ جب ہم سے کبھی بتقاضائے بشریت کوئی گناہ سرزد ہو جائے اور ہم سے کوئی لغزش ہو جائے تو ہم اس سے فوراً توبہ کرلیں اور اپنے عیوب سے رجوع کرلیں۔

اس دعا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم سے گناہ زیادہ واقع ہوں بلکہ یہاں یہ مراد ہے کہ جب گناہ سرزد ہو جائے تو ہمارے دلوں میں توبہ کرنے کا داعیہ پیدا کردے خواہ گناہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں تاکہ اس آیت کے مطابق تیرے پسندیدہ اور محبوب بندوں کی جماعت میں شامل ہوسکیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ۔

"یعنی اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

یعنی خدا اپنے ان بندوں کو پسند کرتا ہے جو بارگاہ الوہیت سے منہ نہیں پھیرتے اور کسی موقعہ پر خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے دعا کے آخری جملہ "اور پاکیزگی کرنے والوں میں شامل کر" کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں باطنی پاکیزگی کی دولت سے نواز دے اور ہمارے اندر جتنے برے اخلاق اور بدخصائل ہیں سب سے ہمیں پاک وصاف کردے چنانچہ اس طرف اشارہ ہے کہ جسم اور اعضاء ظاہری کی طہارت وصفائی ہمارے اختیار میں تھی اس کو ہم نے پورا کرلیا، اب باطنی احوال کی طہارت اور اندرونی صفائی تیرے ہاتھوں میں ہے لہٰذا اپنے فضل وکرم سے باطنی پاکیزگی بھی عنایت فرماوے۔

(رباعی)

اے درخم چوگان تو دل ہم چوگوے بیروں نہ فرمان تو جاں یک سرموئے

"اے! کہ تیرے خم چوگان میں ہمارا دل ایک گیند کی طرح ہے، ہم تیرے فرمان سے ایک موئے بدن بھی باہر نہیں ہیں۔"

ظاہر کہ بدست ماست شستیم تمام باطن کہ بدست تست آن راہ تو بشوئے

"ظاہر جو ہمارے قبضہ میں تھا ہم اسے دھو چکے ہیں۔ باطن جو تیرے قبضہ میں ہے اسے تو ہی دھو سکتا ہے۔"

آخر میں مشکوٰۃ کے مؤلف صاحب مصابیح پر ایک اعتراض فرما رہے ہیں، اعتراض یہ ہے کہ صاحب مصابیح نے جو حدیث فاحسن الوضو ثم قال اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریک له و اشهد ان محمدا عبده ورسوله اللهم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطهرین فتحت له ثمانیة ابواب الجنة یدخل من ایها شاء کو صحاح میں نقل کیا ہے حالانکہ اس حدیث کو صحاح میں نقل کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ روایت بخاری و مسلم میں نہیں ہے بلکہ یہ روایت جامع ترمذی کی ہے۔ لہٰذا یہ روایت صحاح کے بجائے حسان میں نقل کرنی چاہئے تھی، پھر دوسری بات یہ ہے کہ ترمذی نے بھی اپنی روایت میں اَنَّ مُحَمَّدًا سے پہلے اَشْھَدُ کا لفظ ذکر نہیں کیا ہے۔

اتنی بات اور جان لینی چاہئے کہ جزری نے حصن حصین میں ابن ماجہ ابن ابی شیبہ، اور ابن سنی کے حوالہ سے شہادتین کے بعد لفظ ثلاث مرات کا ذکر کیا ہے، یعنی شہادتین تین مرتبہ پڑھنی چاہئے اور نسائی و حاکم کی روایت میں اللهم اجعلنی الخ کے بعد یہ بھی منقول ہے سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ لہٰذا اولیٰ اور بہتر ہے کہ جتنی دعائیں منقول ہیں وضو کے بعد سب ملا کر پڑھی جائیں نیز نہانے والے کے لئے بھی یہ دعائیں پڑھنا مستحب ہے۔

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمَّتِیْ يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يُطِيْلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "قیامت کے روز میری اُمّت اس حال میں پکاری جائے گی کہ وضو کے سبب سے ان کی پیشانیاں روشن ہوں گی اور اعضا چمکتے ہوں گے لہٰذا تم میں سے جو شخص چاہے کہ وہ اپنی پیشانی کی روشنی کو بڑھائے تو اسے چاہئے کہ وہ ایسا ہی کرے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: غُرّ جمع ہے اَغَرّ کی جس کے معنی ہیں سفید چہرہ اور محجل اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کے ہاتھ پاؤں سفید ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز وضو کے اثر سے یہ تمام اعضاء روشن ہوں گے اور جب محشر میں نمازیوں کو جنّت میں جانے کے لئے پکارا جائے گا تو وہ لوگوں کے درمیان سے اس طرح اٹھیں گے کہ ان کے اعضاء وضو روشن و چمک دار ہوں گے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کی خواہش ہو کہ قیامت کے روز اس کی پیشانی چمک اور اس کے اعضاء کی سفیدی دراز ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس عمل اور فعل کے کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے جو اس سعادت کا سبب ہوگا یعنی وضو پوری رعایت سے کرے، چہرہ کو پیشانی کے اوپر سے تھوڑی کے نیچے تک اور ایک کان سے دوسرے کان تک خوب اچھی طرح دھوئے۔

تحجیل کی درازگی یہ ہے کہ پاؤں کو خوب اچھی طرح اور ٹخنوں کے اوپر تک دھوئے یہاں تحجیل کی درازگی کا ذکر نہیں فرمایا گیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں یعنی غرا اور محجل آپس میں لازم اور ملزوم ہیں جب ایک کی درازگی کا ذکر فرما دیا تو دوسرا خود بخود مفہوم ہو جائے گا۔

⑩ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَبْلُغُ الْحِلْيَةُ مِنَ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ يَبْلُغُ الْوَضُوْءُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا (جنّت میں) مؤمن کو زیور (وہاں تک) پہنچے گا جہاں تک وضو کا پانی پہنچے گا۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ وضو کا پانی جن اعضاء پر پہنچتا ہے یعنی جو اعضاء وضو میں دھوئے جاتے ہیں جنّت میں ان سب اعضاء کی زیورات سے زیب و زینت کی جائے گی، اسی طرح جس کا وضو جتنا زیادہ بہتر اور مکمل یعنی سُنّت کے مطابق ہوگا جنّت میں اس کے اعضاء وضو کی آرائش اتنے ہی اعلیٰ پیمانہ پر ہوگی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

⑪ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا وَ اعْلَمُوْآ اَنَّ خَیْرَ اَعْمَالِکُمُ الصَّلٰوۃُ وَلَا یُحَافِظُ عَلَی الْوُضُوْءِ اِلَّا مُؤْمِنٌ۔ (رواہ مالک و احمد و ابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت ثوبانؓ[1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "سیدھے رہو اور سیدھے رہنے کی ہرگز طاقت نہ رکھ سکو گے، اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں بہترین چیز نماز ہے اور وضو کی حفاظت مؤمن ہی کرتا ہے۔" (مالک، احمد، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: سیدھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اعمال پر مستقیم رہو اور ہمیشہ سیدھی راہ پر چلتے رہو، ادھر ادھر برے راستوں کی طرح میلان نہ کرو، اور چونکہ یہ امر مشکل تھا اس لئے آگے فرمایا کہ لَنْ تُحْصُوْا یعنی پورے کمال اور رسوخ کے ساتھ تم استقامت اختیار نہیں کر سکتے اور جب یہ فرمادیا گیا کہ استقامت کی طاقت نہیں رکھ سکتے اور اعمال و افعال میں استقامت کے جو حقوق ہیں وہ پوری طرح ادا نہیں ہو سکتے تو آگے ایک نہایت آسان اور سہل راہ کی طرح رہنمائی کر دی گئی یعنی عبادت کی جڑ اور خلاصہ نماز پر آگاہ کر دیا کہ اگر صرف اسی ایک عمل اور ایک عبادت یعنی نماز میں استقامت اختیار کر لو گے تو تمام تقصیرات کا تدارک ہو جائے گا لہٰذا چاہئے کہ نماز پر مداومت اختیار کرو، اس کے جو شرائط و آداب ہوں ان کا خیال رکھو اور اس کے جو حقوق ہیں ان کو پوری طرح سے ادا کرو۔

بعد میں نماز کے مقدمہ اور شرط یعنی وضو اور طہارت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے جس کو نصف ایمان کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا گیا کہ وضو کی محافظت تو مؤمن کا خاصہ ہے اس لئے کہ وہ مؤمن کامل کا قلب و دماغ توجہ الی اللہ کی شعاؤں سے ہر وقت منور رہتا ہے وہ اپنے قلب و بدن دونوں کے ساتھ یعنی ظاہراً بھی اور باطناً بھی، ہر وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ بارگاہ الوہیت میں حاضری بغیر ظاہر و باطن کی صفائی و پاکیزگی اور بدون طہارت کے ادب کے منافی چیز ہے اور شان عبودیت کے خلاف بھی ہے اس لئے مؤمن وضو کی محافظت کرتا ہے اور وضو کے جو آداب و شرائط اور سنن و مستحبات ہیں ان سب کی رعایت کرتا ہے۔

⑫ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ عَلٰی طُھْرٍ کُتِبَ لَہٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص وضو کے اوپر وضو کرے تو اس کے واسطے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔" (ترمذی)

تشریح: ایک تو مطلقاً وضو کرنے کا ثواب و اجر مقرر ہے وہ تو ملتا ہی ہے لیکن جو شخص وضو پر وضو کرے تو اس کے واسطے اس مقررہ اجر و ثواب کے علاوہ مزید دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اس سلسلہ میں علماء لکھتے ہیں کہ یہ اجر و ثواب اس وقت ملتا ہے جب کے پہلے وضو کے بعد فرض یا نفل نماز پڑھ چکا ہو، اور اس کے بعد پھر دوسرا وضو کرے۔

شرح السنۃ میں منقول ہے کہ تجدید وضو اس وقت مستحب ہے جب کہ پہلے وضو سے کوئی نماز پڑھ چکا ہو اور بعض علماء کے نزدیک اگر پہلے وضو کے بعد نماز نہ پڑھی ہو تو وضو کرنا مکروہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑬ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِفْتَاحُ الْجَنَّۃِ الصَّلٰوۃُ وَمِفْتَاحُ الصَّلٰوۃِ الطُّھُوْرُ۔ (رواہ احمد)

"حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی وضو ہے۔" (احمد)

---

[1] آپ کا اسم گرامی ثوبان ابن بجد ہے کنیت ابو عبداللہ ہے بعض حضرات نے ابو عبدالرحمٰن بھی لکھی ہے آپ نے حمص میں ۵۴ھ میں وفات پائی۔

تشریح: جیسے کہ مقفل دروازہ بغیر کنجی کے نہیں کھل سکتا اسی طرح بغیر وضو کے نماز نہیں ہو سکتی اور بغیر نماز کے جنت میں داخلہ نہیں ہو سکتا، اس حدیث میں محافظت نماز کی اہمیت کو بطور نمونہ بیان کیا گیا ہے، کہ گویا نماز حکم ایمان میں ہے کہ بغیر اس کے جنت میں جانا میسر نہیں ہو گا لہٰذا چاہئے کہ نماز خوب اچھی طرح ادا کی جائے اور کبھی نماز ترک و قضا نہ کی جائے کہ دخول جنت کا سبب یہی ہے۔

⑭ وَعَنْ شَبِيْبِ بْنِ اَبِيْ رُوْحٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى صَلَاةَ الصُّبْحِ فَقَرَأَ الرُّوْمَ فَالْتَبَسَ عَلَيْهِ فَلَمَّا صَلَّى قَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ يُصَلُّوْنَ مَعَنَا لَا يُحْسِنُوْنَ الطُّهُوْرَ وَاِنَّمَا يَلْبَسُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ اُولٰئِكَ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت شبیب بن ابی روح آنحضرت ﷺ کے اصحاب میں سے کسی صحابی سے روایت کرتے ہیں کے سرکار دو عالم ﷺ نے (ایک مرتبہ) صبح کی نماز پڑھی اور اس کے اندر سورہ روم کو پڑھا (اثناء نماز میں) آپ ﷺ کو متشابہ ہوا چنانچہ جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو فرمایا "لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ پڑھتے ہیں اور اچھی طرح وضو نہیں کرتے اور اس وجہ سے یہ لوگ ہم پر قرآن میں متشابہ ڈالتے ہیں"۔" (نسائی)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ کسی عمل اور کسی عبادت کے جو سنن و آداب ہوتے ہیں وہ واجب کو کامل کرتے ہیں اور برکت کا سبب ہوتے ہیں، اسی برکت کا اثر نہ صرف یہ کہ عامل ہی کی ذات تک محدود رہتا ہے، بلکہ وہ برکت دوسروں میں بھی سرائیت کرتی ہے جیسے کہ کوتاہی اور قصور عامل کی ذات کے علاوہ دوسرے کے ضرر کا بھی باعث ہوتے ہیں نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سنن و آداب پر عمل نہ کرنے سے فتوحات غیبیہ کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

یہ حدیث در حقیقت ان بے بصیرت لوگوں کے لئے تازیانہ عبرت ہے جو صحبت کی تاثیر کے منکر اور اس سے غافل ہیں لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے غور کرنے کا مقام ہے کہ سرکار دو عالم، سید الرسل ﷺ پر باوجود اس رتبہ کے اور قرآن پڑھنے کی حالت میں جو تقرب الی اللہ کا وقت ہے ایک ادنی امتی کی صحبت نے اثر کیا جس سے وضو کے آداب و سنّت میں کوئی کوتاہی یا قصور ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو قرأت میں متشابہ لگا تو ایسے لوگوں کا کیا حشر ہو گا جو شب و روز اہل فسق اور اہل بدعت کی صحبت کو اختیار کئے رہتے ہیں۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ بھلائی اور بہتری اسی میں ہے کہ اہل فسق اور اہل بدعت کی صحبت و ہم نشینی کو بالکل ترک کر کے علماء حق، صوفیائے کرام اور خدا کے نیک بندوں کی صحبت اختیار کی جائے تاکہ ان کی ہم نشینی اور صحبت کے اثرات و برکات اپنے اندر پیدا ہوں جو دین و دنیا دونوں جگہ کی بھلائی کے لئے ضامن ہیں۔

ابتداء روایت میں راوی نے اس صحابی کا نام ذکر نہیں کیا ہے جس سے یہ حدیث حاصل کی گئی ہے مگر حضرت میرک شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ وہ صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ ہیں۔

⑮ وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ قَالَ عَدَّهُنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ يَدِيْ اَوْفِيْ يَدِهٖ قَالَ التَّسْبِيْحُ نِصْفُ الْمِيْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ يَمْلَاُهٗ وَالتَّكْبِيْرُ يَمْلَاُ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَالصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ وَالطُّهُوْرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ۔

"اور قبیلہ بنی سلیم کے ایک شخص راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے باتوں کو (جو آگے مذکور ہیں) میرے ہاتھ پر یا اپنے ہاتھ پر شمار کیا (چنانچہ) آپ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ کہنا (یعنی اس کا ثواب) آدھی ترازو بھر دیتا ہے اور الحمد للہ (سبحان اللہ کے ساتھ) کہنا (یا فقط الحمد للہ کہنا ہی) پوری ترازو کو بھر دیتا ہے اور اللہ اکبر کہنا بھر دیتا ہے اس چیز کو جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے اور روزہ آدھا صبر ہے اور پاک رہنا آدھا ایمان ہے۔" (ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے)

تشریح: حدیث کو بیان کرتے وقت راوی کو شک ہو گیا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ان باتوں کو میرے ہاتھ پر شمار کیا ہے یا اپنے ہاتھ پر شمار کیا ہے۔ بہر حال ان کو شمار اس طرح کیا کہ یا تو آپ نے ان صحابی کی انگلی پکڑی اور ان کو ہتھیلی پر بند کر کے ان پانچ باتوں کو شمار کیا۔

حدیث میں روزے کو آدھا صبر فرمایا گیا ہے، اس لئے کہ پورا صبر تو یہ ہے کہ نفس کو طاعت پر روکے یعنی احکام کو بجالائے اور گناہوں سے روکے یعنی ممنوع چیزوں کو نہ کرے اور روزہ نام ہے صرف نفس کو طاعت پر روکنے یعنی حکم الٰہی کو بجالانے کا لہٰذا اس اعتبار سے روزہ آدھا صبر ہوا۔

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ الصُّنَابِحِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ فَمَضْمَضَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ فِيْهِ وَ اِذَا اسْتَنْثَرَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ اَنْفِهٖ فَاِذَا غَسَلَ وَجْهَهٗ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ وَجْهِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَشْفَارِ عَيْنَيْهِ فَاِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ يَدَيْهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِ يَدَيْهِ فَاِذَا مَسَحَ بِرَأْسِهٖ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رَأْسِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ اُذُنَيْهِ فَاِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رِجْلَيْهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِ رِجْلَيْهِ ثُمَّ كَانَ مَشْيُهٗ اِلَى الْمَسْجِدِ وَصَلَاتُهٗ نَافِلَةً لَّهٗ۔ (رواہ مالک و النسائی)

"اور حضرت عبداللہؓ صنابحیؒ [1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب بندۂ مؤمن وضو کا ارادہ کرتا ہے اور کلی کرتا ہے تو گناہ اس کے منہ سے خارج ہو جاتے ہیں اور جب ناک جھاڑتا ہے تو گناہ اس کی ناک سے خارج ہو جاتے ہیں اور جب اپنا منہ دھوتا ہے تو گناہ اس کے منہ سے خارج ہوتے ہیں یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کی پلکوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں اور جب اپنے دونوں ہاتھ دھوتا ہے تو گناہ اس کے ہاتھوں سے خارج ہوتے ہیں یہاں تک کہ اس کے دونوں ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں اور جب اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو گناہ اس کے سر سے خارج ہوتے ہیں یہاں تک کہ اس کے دونوں کانوں سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں، اور جب اپنے دونوں پاؤں دھوتا ہے تو گناہ اس کے دونوں پاؤں سے خارج ہوتے ہیں یہاں تک کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں، پھر مسجد کی طرف اس کا چلنا ہوتا ہے اور اس کی نماز اس کے واسطے (اعمال میں) زیادتی ہے"۔ (مالکؒ ونسائیؒ)

تشریح: جیسا کہ اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ وضو کرنے والا اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو گناہ اس کے سر سے خارج ہوتے ہیں پھر آگے فرمایا گیا ہے کہ "یہاں تک کہ اس کے دونوں کانوں سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں" اس جملہ سے اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ کان سر میں داخل ہیں بایں طور کہ جو حکم سر کا ہو گا وہی حکم کان کا ہو گا چنانچہ حنفی مسلک یہی ہے اس لئے یہ مسئلہ ہے کہ جب مسح کے لئے پانی لیا جائے تو اس پانی سے کانوں کا مسح بھی کر لیا جائے کانوں کے مسح کے لئے الگ سے پانی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

آخر حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ "اس کی نماز اس کے واسطے (اعمال) زیادتی ہے" یعنی جب یہ وضو سے فارغ ہوا تو گناہوں سے وضو کی وجہ سے پاک وصاف ہو چکا تھا، اب نماز زائد ہے جو نیکی اور درجات کا سبب ہو گی۔

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَى الْمَقْبَرَةَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَ اِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ وَدِدْتُّ اَنَّا قَدْ رَأَيْنَا اِخْوَانَنَا قَالُوْا اَوَلَسْنَا اِخْوَانَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَنْتُمْ اَصْحَابِيْ وَ اِخْوَانُنَا الَّذِيْنَ لَمْ يَاْتُوْا بَعْدُ فَقَالُوْا كَيْفَ تَعْرِفُ مَنْ لَّمْ يَاْتِ بَعْدُ مِنْ اُمَّتِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اَرَءَيْتَ اَنَّ رَجُلًا لَّهٗ خَيْلٌ غُرٌّ مُّحَجَّلَةٌ بَيْنَ ظَهْرَيْ خَيْلٍ دُهْمٍ بُهْمٍ اَلَا يَعْرِفُ خَيْلَهٗ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَاِنَّهُمْ يَاْتُوْنَ غُرًّا مُّحَجَّلِيْنَ مِنَ الْوُضُوْءِ وَ اَنَا فَرَطُهُمْ عَلَى الْحَوْضِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ مقبرہ (یعنی جنت البقیع) میں (دعاء مغفرت کے لئے) تشریف لائے، چنانچہ (وہاں پہنچ) کر آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اے مؤمنین کی جماعت! تم پر سلامتی ہو (یعنی آپ ﷺ نے اہل قبور کو سلام کیا اور فرمایا) ہم

---

[1] ان کے صحابی ہونے اور نام میں اختلاف ہے یحییٰ ابن معین کا قول تو یہی ہے کہ ان کا نام عبداللہ یا ابوعبداللہ بیان کیا جاتا ہے۔

بھی انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں اور میں اس بات کی تمنا رکھتا ہوں کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا تم میرے دوست ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو ابھی (دنیا میں) نہیں آئے صحابہ نے عرض کیا "یارسول اللہ آپ ﷺ کی اُمت میں سے جو لوگ ابھی نہیں آئے انہیں آپ ﷺ (قیامت میں کس طرح پہچانیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے یہ بتاؤ کہ اگر کسی شخص کے پاس سفید پیشانی اور سفید ہاتھ اور پیر والے گھوڑے ہوں اور وہ نہایت سیاہ گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ اپنے گھوڑے کو پہچان لے گا؟ صحابہ نے عرض کیا ہاں (یارسول اللہ! ان امتیازی اوصاف کی بنا پر تو وہ یقیناً پہچان لے گا) آپ نے فرمایا" وہ (قیامت میں) وضو کے اثر سے سفید پیشانی اور سفید ہاتھ پاؤں کے ساتھ آئیں گے (لہٰذا اس علامت سے میں انہیں پہچان لوں گا) اور میں حوض کوثر پر ان کا میر سامان ہوں گا۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے صحابہ اور ان کے بعد ہونے والے مسلمانوں میں نہ صرف یہ کہ بڑا دلچسپ اور لطیف فرق بیان فرمایا ہے بلکہ صحابہ کو امتیازی شان بھی بخش دی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم میرے دوست ہو اور بعد میں پیدا ہونے والے مؤمنین میرے بھائی ہیں، یعنی تمہارے ساتھ تعلقات کی دو نوعیتیں ہیں ایک تو یہ کہ تم میرے بھائی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ رفیق خاص بھی اور جو بعد میں آنے والے ہیں یعنی تابعین وغیرہ ان کے ساتھ ایک ہی تعلق ہے کہ وہ صرف میرے اسلامی بھائی ہیں۔

"میر سامان" کا مطلب یہ ہے کہ میں ان لوگوں سے پہلے ہی خدا کے یہاں جا کر ان کی مغفرت و بخشش اور بلندی اور درجات کے اسباب درست کروں گا۔

(۱۸) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ مَنْ یُؤْذَنُ لَہٗ بِالسُّجُوْدِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ یُؤْذَنُ لَہٗ اَنْ یَرْفَعَ رَأْسَہٗ فَاَنْظُرُ اِلٰی مَا بَیْنَ یَدَیَّ فَاَعْرِفُ اُمَّتِیْ مِنْ بَیْنِ الْاُمَمِ وَمِنْ خَلْفِیْ مِثْلَ ذٰلِکَ وَعَنْ یَمِیْنِیْ مِثْلَ ذٰلِکَ وَعَنْ شِمَالِیْ مِثْلَ ذٰلِکَ فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ تَعْرِفُ اُمَّتَکَ مِنْ بَیْنِ الْاُمَمِ فِیْمَا بَیْنَ نُوْحٍ اِلٰی اُمَّتِکَ قَالَ ھُمْ غُرٌّ مُحَجَّلُوْنَ مِنْ اَثَرِ الْوُضُوْءِ لَیْسَ اَحَدٌ کَذٰلِکَ غَیْرُھُمْ وَاَعْرِفُھُمْ اَنَّھُمْ یُؤْتَوْنَ کُتُبَھُمْ بِاَیْمَانِھِمْ وَاَعْرِفُھُمْ تَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ ذُرِّیَّتُھُمْ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابودرداءؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن ان لوگوں میں سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جن کو سجدہ کی اجازت دی جائے گی اور (پھر) ان لوگوں میں سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جن کو سجدہ سے سر اٹھانے کی اجازت دی جائے گی چنانچہ میں اس چیز کی طرف دیکھوں گا جو میرے آگے ہوگی (یعنی مخلوق کا مجمع) اور میں امتوں کے درمیان اپنی اُمت کو پہچان لوں گا، پھر میں اپنے پیچھے کی طرف اسی طرح اور اپنے دائیں طرف اور بائیں طرف (بھی) اس طرح دیکھوں گا (یعنی چاروں طرف ازدہام خلق دیکھوں گا اور میں اپنی اُمت کو پہچان لوں گا) ایک صحابیؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ! اپنی اُمت سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام کی اُمت تک کی تمام امتوں میں آپ ﷺ اپنی اُمت کو کیونکر پہچان لیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "میری اُمت کے لوگ وضو کے اثر سے سفید پیشانی اور سفید ہاتھ پاؤں کے ہوں گے اس اُمت کے علاوہ کوئی دوسری اُمت اس طرح (امتیازی وصف کے ساتھ) نہیں ہوگی اور میں اپنی اُمت کو اس طرح بھی پہچان لوں گا کہ (میری امت کے لوگوں کو) ان کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، نیز اس وجہ سے شناخت کر لوں گا کہ ان کی (خورد سال) اولاد ان کے آگے دوڑتی ہوگی۔" (احمدؒ)

تشریح: محشر میں جب سرکار دو عالم ﷺ بارگاہ صمدیت میں حاضر ہوں گے تو شفاعت کے لئے سجدہ میں جائیں گے اور بمقدار ایک ہفتہ سجدہ میں رہیں گے پھر بعد میں بارگاہ الوہیت سے حکم ہوگا کہ اے محمد (ﷺ)! اپنا سر مبارک اٹھایئے اور اے میرے محبوب مانگئے کیا مانگتے ہیں؟ ہم آپ (ﷺ) کی درخواست کو شرف قبولیت بخشیں گے اس کے بعد شافع محشر، آقائے نامدار، سرور کائنات، فخر موجودات جناب رسول اللہ ﷺ (فداہ روحی) مخلوق خدا کی شفاعت کے لئے اپنی لسان مبارک سے بارگاہ خداوندی میں درخواست پیش فرمائیں

گے، حدیث کے ابتدائی حصہ میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اس حدیث میں میدان حشر میں اُمت محمدیہ کی کثرت وزیادتی اور ان کے مراتب میں تفاوت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے چنانچہ فانظر الی مابین یدی (یعنی میں اس چیز کی طرف دیکھوں گا جو میرے آگے ہوگی ایسے ہی عن شمالی مثل ذلک (یعنی اور بائیں طرف اس طرح دیکھوں گا) تک یہی مراد ہے کہ میرے چاروں طرف میری ہی اُمت پھیلی ہوگی اور پھر ان میں مختلف مراتب و درجات کے لوگ ہوں گے۔

صحابی کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے آج تک ایک بڑی لمبی مدت ہے اور ایک بڑا طویل زمانہ ہے اس دوران میں ایک دو نہیں بہت زیادہ اُمتیں گزری ہیں، پھر تعداد شمار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بے انتہاء مخلوق خدا اس زمانہ میں پیدا ہوئی اور مری ہے تو اتنے ازدہام اور اتنی امتوں میں آپ ﷺ اپنی اُمت کو کس طرح پہچان لیں گے، اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے اس امتیازی صفت کا ذکر فرمایا جس سے اُمت محمدیہ کے افراد متصف ہوں گے اور تمام امتوں میں ممتاز ہوں گے۔

اس سلسلہ میں حضرت نوح علیہ السلام کا نام بطور خاص لینے کی وجہ یہی ہے کہ اول تو اس زمانہ کا طول مراد ہے دوسرے چونکہ یہ تمام نبیوں میں بہت زیادہ مشہور ہیں اس لئے ان کا نام لیا۔

بَابُ مَایُوْجِبُ الْوُضُوْءَ
وضو کو واجب کرنے والی چیزوں کا بیان

اس باب میں ان چیزوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو وضو کو توڑتی ہیں چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق ان چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

① پاخانہ اور پیشاب کے راستہ سے نکلنے والی ہر چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جیسے پاخانہ، پیشاب اور ریاح وغیرہ مگر جو ہوا مرد یا عورت کے آگے کے سرے سے نکلتی ہے اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

② اس چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جو نجس ہو (جیسے خون اور پیپ وغیرہ) اور بدن میں خود بخود نکل کر اس حصہ تک پہنچ جائے جس کو غسل یا وضو میں دھونا لازم ہو، یعنی اگر ناک کے بانسے اور آنکھ کے اندر رہے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا کیونکہ ان کا دھونا لازم نہیں ہے۔

③ قے کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے منہ بھر قے کرنے میں خواہ اناج نکلے، پانی نکلے، جما ہوا خون یعنی سودا نکلے ان سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اگر بلغم نکلے تو وضو نہیں ٹوٹتا، اگر پتلے خون یا پیپ کی قے ہو تو اس میں منہ بھرنے کی شرط نہیں بلکہ تھوک کے برابر ہو یا تھوک پر غالب ہو جائے تب بھی وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر کم ہوگا تو نہیں ٹوٹے گا اگر ایک ہی متلی میں تھوڑی قے اتنی مقدار میں ہوئی کہ اگر اسے جمع کیا جائے تو منہ بھر جائے تو اس سے وضو جاتا ہے جس چیز سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے وہ نجس نہیں ہوتی مثلاً تھوڑی سے قے کی یا بدن سے خون اس طرح نکلا کہ وہ جسم پر بہا نہیں تو یہ ناپاک نہیں ہے۔

④ وضو ٹوٹ جاتا ہے دیوانہ ہونے سے۔

⑤ نشے سے۔

⑥ بے ہوش ہو جانے سے۔

⑦ اور بالغ کے قہقہے سے اس نماز میں جو رکوع و سجود والی ہو۔

⑧ مباشرہ فاحشہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، مباشرت فاحشہ اسے کہتے ہیں کہ انتشار اور جنسی ہیجان کے ساتھ مرد کا ستر عورت کے ستر سے

اور عورت کا ستر مرد کے ستر سے مل جائے یا دو عورتوں یا مردوں کے ستر مل جائیں۔

⑨ لیٹ کر اپنے بدن پر یا دیوار وغیرہ پر تکیہ لگا کر سونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن یہ سونا اس طرح ہو کہ اگر تکیہ کی وہ چیز جس پر ٹیک لگا کر سویا ہوا ہے ہٹالی جائے تو گر پڑے۔

⑩ اگر اس طرح سو جائے کہ مقعد زمین سے اٹھ جائے یعنی پہلو پر یا کولھوں پر یا چت یا منہ کے بل، یا کولھے کو دیوار سے لگا کر یا پیٹ پاؤں پر لگا کر جھکا ہوا سو جائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اگر کھڑا کھڑا سو جائے یا رکوع اور سجدہ کی حالت میں سو جائے تو وضو نہیں ٹوٹتا مگر شرط یہ ہے کہ رکوع و سجود ہیئت مسنونہ پر ہوں، اگر زخم میں کیڑے نکلیں یا گوشت کٹ کر گر جائے تو وضو نہیں ٹوٹتا۔

⑪ اگر جونک لگائی جائے اور وہ خون پی کر بھر گئی یا بڑی چیچڑی نے پیٹ بھر خون پیا تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وضو نہیں ٹوٹتا۔

⑫ اگر کسی کی آنکھ دکھنے آتی ہے اور آنسو نکلتے ہیں تو وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس سلسلہ میں اکثر لوگ غافل ہیں اس کا خیال نہیں کرتے اس لئے اس کا خیال رکھنا چاہئے ہاں اگر کوئی شخص ایسا ہے جس کی آنکھیں ہمیشہ جاری رہتی ہیں تو وہ صاحب عذر ہو جاتا ہے۔

⑬ اگر کان دکھتا ہے اور اس سے پیپ یا کچھ لہو نکلے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اگر بغیر درد کان سے پیپ وغیرہ کان سے نکلے تو اس سے وضو نہیں جاتا یہ تمام چیزیں جن کا ذکر کیا گیا ہے سب ناقض وضو ہیں ان سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ان میں سے دو چیزیں یعنی پیشاب اور پاخانہ کے راستہ سے نکلنے والی چیزوں اور نیند پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ چیزیں ناقض وضو ہیں باقی چیزیں مختلف فیہ ہیں۔

الفصل الاول

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ اَحْدَثَ حَتّٰی یَتَوَضَّأَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "بے وضو کی نماز قبول نہیں کی جاتی جب تک کہ وضو نہ کرے۔" (بخاری مسلم)

تشریح: اس کا تعلق اس شخص سے ہے جو پانی رکھتا ہو اور اس کے استعمال کی قدرت بھی اس کے اندر ہو یعنی جس شخص کے پاس پانی اور اس پانی کے استعمال کرنے میں اس کو کوئی عذر شرعی نہ ہو تو اس کو نماز کے لئے وضو کرنا ضروری ہے اگر اس نے وضو نہیں کیا تو اس کی نماز ادا نہیں ہوگی۔

اگر کوئی شخص پانی نہ پائے یا اس کے استعمال کی قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ بجائے وضو کے پاک و صاف مٹی سے تیمم کرے ایسا شخص جو نہ تو پانی پائے اور نہ پاک و صاف مٹی ہی اسے ملے اور نہ وہ ان کے استعمال کی قدرت رکھتا ہو تو ایسے شخص کو اصطلاح شریعت میں فاقد الطہورین کہتے ہیں اس شخص کے بارہ میں یہ حکم ہے کہ وہ نماز نہ پڑھے، ہاں جب پانی وغیرہ پائے تو وضو کر کے نماز پڑھے۔

اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا مسلک دوسرا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص یعنی "فاقد الطہورین" کو چاہئے کہ اس شکل میں بھی وقت نماز کے احترام میں بغیر وضو اور تیمم ہی کے نماز پڑھ لے جب اسے پانی یا مٹی دستیاب ہو جائے تو وضو یا تیمم کر کے قضا کر لے۔

ہمارے علماء رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص قصداً بغیر طہارت کے نماز پڑھ لے اور پھر یہ کہ اس سے اس کا مقصد احترام وقت بھی نہ ہو تو یہ شخص کافر ہو جاتا ہے یا اگر لوگوں کی شرم کی وجہ سے محض دکھلانے کے لئے بھی بغیر طہارت کے نماز پڑھے تو بھی کافر ہو جاتا ہے کیونکہ ان دونوں شکلوں میں اس نے شرع کی تحقیر کی ہے اس لئے ایسا شخص جو اپنے قول سے یا فعل سے شریعت کی تحقیر کا سبب بنتا ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ دائرہ اسلام اور ایمان میں رہ سکے۔

② وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَیْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "بغیر طہارت نماز قبول نہیں کی جاتی اور مال حرام کی خیرات قبول نہیں کی

جاتی۔" (مسلم)

تشریح: حرام مال میں صدقہ خیرات کرنا چونکہ صدقہ و خیرات کی توہین و تحقیر ہے اس لئے اس کو بہت زیادہ قابل نفرت شمار کیا گیا ہے چنانچہ ہمارے علماء نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو شخص مال حرام میں سے صدقہ و خیرات کرتا ہے اور پھر اس کی امید بھی رکھتا ہے کہ اس سے ثواب ملے گا تو کافر ہو جاتا ہے۔

③ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كُنْتُ رَجُلاً مَذَّاءً فَكُنْتُ اَسْتَحْيِيْ اَنْ اَسْاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَكَانِ ابْنَتِهٖ فَاَمَرْتُ الْمِقْدَادَ فَسَأَلَهٗ فَقَالَ يَغْسِلُ ذَكَرَهٗ وَيَتَوَضَّأُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ "مجھے مذی بہت زیادہ آتی تھی چونکہ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی (حضرت فاطمہؓ) میرے نکاح میں تھی اس لئے میں آپ ﷺ سے اس کا حکم دریافت کرتے ہوئے شرماتا تھا (کہ آیا اس سے غسل واجب ہوتا ہے یا وضو) اس لئے میں نے (اس مسئلہ کو آنحضرت ﷺ سے دریافت کرنے کے لئے حضرت مقدادؓ کو مامور کیا، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ سے پوچھا (اس طرح سے کہ ایک شخص ایسا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے) تو آپ نے فرمایا کہ (مذی نکلنے پر) پیشاب گاہ کو دھوڈالے اور وضو کرے۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: یہ حدیث ایک اخلاقی معاملہ میں بڑی لطیف تنبیہ کر رہی ہے کہ داماد کو اپنے سسر سے شہوت کی باتوں کا ذکر کرنا، ایسی چیزوں کا تذکرہ کرنا جن کا تعلق مباشرت عورت سے ہو یا جن کا بیان اخلاق و تہذیب اور شرم و حیا کے منافی ہو مناسب نہیں۔

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ تَوَضَّؤُا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ۔ (رواہ مسلم)
قَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ الْاَجَلُّ مُحْيِيُ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذَا مَنْسُوْخٌ بِحَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكَلَ كَتِفَ شَاةٍ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جس چیز کو آگ نے پکایا ہو اس کے کھانے کے بعد وضو کرو۔" (مسلم)

"امام محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم حضرت ابن عباسؓ کی اس حدیث سے منسوخ ہے کہ "آنحضرت ﷺ نے بکری کا شانہ کھایا پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: پہلے حکم کی منسوخی تو حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ حدیث سے ہو گئی لیکن اس سلسلہ میں اس حدیث کی ایک دوسری تاویل اور کی جاتی ہے وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کے اس حکم کی کہ "آگ کی پکی ہوئی چیز کو کھانے کے بعد وضو کرو" سے مراد یہ ہے کہ جب تم کوئی پکی ہوئی چیز کھاؤ تو چکنائی وغیرہ دور کرنے کے لئے ہاتھ منہ دھو لیا کرو، کیونکہ نہ صرف یہ کہ نظافت و صفائی کا یہی تقاضا ہے بلکہ یہ سنت بھی ہے چنانچہ اسی کو وضو طعام بھی کہا جاتا ہے، اس صورت میں حدیث کو منسوخ کہنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

⑤ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُوْمِ الْغَنَمِ قَالَ اِنْ شِئْتَ فَتَوَضَّأْ وَاِنْ شِئْتَ فَلَا تَتَوَضَّأْ قَالَ اَنَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُوْمِ الْاِبِلِ قَالَ نَعَمْ فَتَوَضَّأْ مِنْ لُحُوْمِ الْاِبِلِ قَالَ اُصَلِّيْ فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ قَالَ نَعَمْ قَالَ اُصَلِّيْ فِيْ مَبَارِكِ الْاِبِلِ قَالَ لَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر[1] بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا کہ "کیا ہم بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو کریں"

---

[1] اسم گرامی جابر بن سمرۃ اور کنیت ابوعبداللہ عامری ہے سن وفات میں اختلاف ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ۶۶ھ میں انہوں نے وفات پائی کچھ حضرات کی تحقیق ہے کہ ان کا سن وفات ۷۴ھ ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا اگر تمہارا جی چاہے تو وضو کرو اور نہ چاہے تو نہ کرو" پھر اس شخص نے پوچھا کیا اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کروں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرو" پھر اس شخص نے سوال کیا "کیا بکریوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھ لوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! پھر اس شخص نے دریافت کیا "کیا اونٹوں کے بندھنے کی جگہ نماز پڑھوں" آپ نے فرمایا "نہیں"۔ "(مسلم)

تشریح: حضرت امام حنبل چونکہ ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہیں اس لئے انہوں نے تو یہ حدیث دیکھ کر حکم لگادیا کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے کیونکہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

لیکن حضرت امام اعظم، حضرت امام شافعی اور حضرت امام مالک رحمہم اللہ کے نزدیک اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا اس لئے کہ یہ حضرات اس حدیث کا محمل وضو کے لغوی معنے "ہاتھ منہ دھونے" کو قرار دیتے ہیں یعنی یہ حضرات فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ اونٹ کے گوشت میں بساندہ اور چکنائی زیادہ ہوتی ہے اس لئے اس کو کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھو لینا چاہئے چونکہ بکری کے گوشت میں بساندھ اور چکنائی کم ہوتی ہے اس لئے اس کے بارے میں فرمادیا کہ اگر طبیعت چاہے اور نظافت کا تقاضا ہو تو ہاتھ منہ دھو لیا کرو اور اگر طبیعت نہ چاہے تو کوئی ضروری نہیں ہے۔

اونٹوں کے بندھنے کی جگہ نماز پڑھنے سے منع فرمانا نہی تنزیہی کے طور پر ہے اور منع اس لئے فرمایا کہ وہاں نماز پڑھنے میں سکون و اطمینان اور خاطر جمعی نہیں رہتی۔ اونٹوں کے بھاگ جانے یا لاات مار دینے اور تکلیف پہنچانے کا خدشہ رہتا ہے بخلاف بکریوں کے چونکہ وہ بیچاری سیدھی سادھی اور بے ضرر ہوتی ہیں اس لئے ان کے رہنے کی جگہ نماز پڑھ لینے کی اجازت دے دی۔

اتنی بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ نماز پڑھنے کے سلسلہ میں یہ جواز اور عدم جواز اس صورت میں ہے جب کہ مرابض (بکریوں کے رہنے کی جگہ) اور مبارک (اونٹوں کے بندھنے کی جگہ) نجاست و گندگی سے خالی ہوں اگر وہاں نجاست ہوگی تو پھر مرابض میں بھی نماز پڑھنی مکروہ ہوگی۔

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَجَدَ اَحَدُكُمْ فِیْ بَطْنِهٖ شَیْئًا فَاَشْكَلَ عَلَیْهِ اَخَرَجَ مِنْهُ شَیْئٌ اَمْ لَا فَلَا یَخْرُجَنَّ مِنَ الْمَسْجِدِ حَتّٰی یَسْمَعَ صَوْتًا اَوْیَجِدَ رِیْحًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ کے اندر کچھ پائے (یعنی قراقر) اور اس پر یہ بات مشتبہ ہو کہ کوئی چیز خارج ہوئی یا نہیں تو اس وقت تک وضو کے لئے مسجد سے باہر نہ نکلے جب تک آواز کو نہ سنے یا بو نہ پائے۔" (مسلم)

تشریح: "جب تک کوئی آواز نہ سنے یا بو نہ پائے" یہ غالب کے اعتبار سے ہے ورنہ اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جب ریاح کا خارج ہونا یقینی طور پر معلوم ہو جائے، خواہ آواز سنے یا نہ سنے بو معلوم ہو یا نہ معلوم ہو تو سمجھ لے کہ وضو ٹوٹ گیا ہے۔

(۷) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ شَرِبَ لَبَنًا فَمَضْمَضَ وَقَالَ اِنَّ لَهٗ دَسَمًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو علم ﷺ نے دودھ پیا (اس کے بعد) کلی کی اور فرمایا دودھ میں چکناہٹ ہوتی ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چکنی چیز کھانے کی بعد کلی کرنا مستحب ہے، اس لئے کہ اگر کلی نہ کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ جو چیز کھائی گئی چکناہٹ کی وجہ سے اس کا کچھ حصہ منہ میں لگا رہ جائے، جب نماز پڑھی جائے تو حالت نماز میں پیٹ میں پہنچ جائے اس پر ہر اس چیز کو

قیاس کیا جاتا ہے جو منہ میں لگی ہو اور حالت نماز میں اس کے پیٹ میں پہنچ جانے کا خوف ہو تو اس سے بھی کلی کرنا مستحب ہے۔

اس حدیث سے علماء نے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے صفائی اور ستھرائی کے لئے ہاتھوں کو دھولینا چاہئے، ہاں اگر ہاتھ پہلے ہی سے صاف ستھرے ہیں اور نجاست و میل نہیں لگی ہے تو پھر ہاتھوں کا دھونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح کھانا کھانے کے بعد بھی ہاتھوں کو دھونا چاہئے اگر کھانا خشک ہونے کی وجہ سے یا چمچہ وغیرہ سے کھانے کی وجہ سے ہاتھ میں کچھ نہ لگے تو پھر ہاتھوں کا دھونا ضروری نہیں ہے۔

آخر میں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ بظاہر تو اس باب سے اس حدیث کی کچھ مناسبت نظر نہیں آتی ہے اس لئے یہ اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ مصنف مشکوٰۃ نے اس حدیث کو اس باب میں کیوں ذکر کیا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ چونکہ اس حدیث میں کلی کا ذکر کیا گیا ہے وہ متعلقات وضو سے ہے اس لئے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا گیا ہے۔

⑧ وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الصَّلَوٰاتِ يَوْمَ الْفَتْحِ بِوُضُوْءٍ وَاحِدٍ وَمَسَحَ عَلٰى خُفَّيْهِ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ لَقَدْ صَنَعْتَ الْيَوْمَ شَيْئًا لَمْ تَكُنْ تَصْنَعُهٗ فَقَالَ عَمْدًا صَنَعْتُهٗ يَا عُمَرُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ[1] فرماتے ہیں کہ "فتح مکہ کے دن سرکار دو عالم ﷺ نے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں (یعنی ایک ہی وضو سے پانچوں نمازیں پڑھیں) اور موزوں پر مسح کیا (یہ دیکھ کر) حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ "آپ (ﷺ) نے آج وہ چیز کی ہے جس کو آپ ﷺ نے کبھی نہیں کیا" آپ ﷺ نے فرمایا "عمرؓ! میں نے ایسا قصداً کیا ہے۔" (مسلم)

تشریح: حضرت عمرؓ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ پہلے تو آپ (ﷺ) کا معمول یہ تھا کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرتے تھے، مگر آج آپ (ﷺ) نے خلاف معمول ایک وقت وضو کر لیا پھر اسی وضو سے آپ (ﷺ) نے پانچوں نماز ادا فرمائی اور پھر ایک نئی چیز کی کہ موزوں پر مسح بھی فرمایا حالانکہ آپ (ﷺ) ایسا کبھی نہیں کرتے تھے۔

اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ میرا عمل کسی دوسری وجہ سے نہیں بلکہ میں نے قصداً کیا ہے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ دونوں صورتیں بھی جائز ہیں اور دوسرے بھی ایسا کر سکتے ہیں۔

⑨ وَعَنْ سُوَيْدِ بْنِ النُّعْمَانِ اَنَّهٗ خَرَجَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ خَيْبَرَ حَتّٰى اِذَا كَانُوْا بِالصَّهْبَاءِ وَهِيَ مِنْ اَدْنٰى خَيْبَرَ صَلَّى الْعَصْرَ ثُمَّ دَعَا بِالْاَزْوَادِ فَلَمْ يُؤْتَ اِلَّا بِالسَّوِيْقِ فَاَمَرَ بِهٖ فَثُرِّيَ فَاَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَكَلْنَا ثُمَّ قَامَ اِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ وَمَضْمَضْنَا ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّاْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سویدؓ بن نعمانؓ[2] راوی ہیں کہ وہ سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ خیبر (کے فتح) کے سال سفر پر گئے جب صہباء کے مقام پر پہنچے جو خیبر کے نزدیک ہے، عصر کی نماز پڑھی اور پھر آپ ﷺ نے توشہ (زاد راہ منگوایا، چنانچہ ستو کے علاوہ کچھ نہ تھا جو حاضر کیا گیا اور آپ ﷺ کے حکم سے اس کو گھولا گیا، پھر آنحضرت ﷺ نے اور ہم نے اس کو کھایا اور پھر مغرب کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے آپ ﷺ نے کلی کی اور ہم نے بھی کلی کی اور وضو نہیں کیا۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث نے اس مسئلہ کی وضاحت کر دی کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کو کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اس لئے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ستو کھایا جو آگ ہی سے تیار کیا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف کلی کر کے مغرب کی نماز پڑھ لی اور وضو نہیں کیا۔

---

[1] اسم گرامی بریدہ بن حصیب ہے ان کی کنیت جو مشہور ہے وہ ابو عبداللہ ہے، یہ مدینہ کے باشندہ تھے مقام مرو میں بزمانہ یزید بن معاویہ ۶۳ھ میں انتقال فرمایا۔

[2] اسم گرامی حضرت سوید ابن نعمان ہے آپ کا شمار اہل مدینہ میں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۱۰) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا وُضُوْءَ اِلَّا مِنْ صَوْتٍ اَوْرِیْحٍ۔ (رواہ احمد و الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا" وضو کرنا آواز یا بو سے واجب ہوتا ہے۔" (احمد، ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ وضو شک سے نہیں ٹوٹتا، جب تک یقین نہ ہو جائے وضو باقی رہتا ہے یعنی پیٹ میں اگر محض قراقر ہو تو اس شبہ سے کہ شاید ریاح کا اخراج ہو گیا ہو وضو نہیں ٹوٹے گا ہاں جب آواز کے نکلنے یا بو سے یقین ہو جائے کہ ریاح خارج ہو گئی ہے تو جب وضو ٹوٹ جائے گا۔

(۱۱) وَعَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَاَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمَذِیِّ فَقَالَ مِنَ الْمَذِیِّ الْوُضُوْءُ وَمِنَ الْمَنِیِّ الْغُسْلُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے (حضرت مقداد کے واسطہ سے) سرکار دو عالم ﷺ سے مذی کے بارہ میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مذی نکلنے سے وضو لازم آتا ہے اور منی نکلنے سے غسل واجب ہوتا ہے۔" (ترمذی)

(۱۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِفْتَاحُ الصَّلٰوةِ الطُّهُوْرُ وَتَحْرِیْمُهَا التَّکْبِیْرُ وَتَحْلِیْلُهَا التَّسْلِیْمُ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْهُ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا" نماز کی کنجی وضو ہے" نماز کی تحریم تکبیر (یعنی اللہ اکبر کہنا) ہے اور نماز کی تحلیل سلام پھیرنا۔ (ابوداؤد، ترمذی، وداری اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت علیؓ اور حضرت ابی سعید سے روایت کیا ہے)

تشریح: تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنے سے نماز شروع ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کھانا پینا اور جتنے کام نماز کے منافی ہیں اب سب حرام ہو گئے ہیں اور سلام پھیرنے سے نماز ختم ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نماز شروع کر دینے سے جتنی چیزیں حرام کر لی گئی تھیں اب وہ سب حلال ہو گئی ہیں اسی کو فرمایا گیا ہے کہ نماز کی تحریم تکبیر اور اس کی تحلیل سلام پھیرنا ہے۔

(۱۳) وَعَنْ عَلِیِّ بْنِ طَلْقٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَسَا اَحَدُکُمْ فَلْیَتَوَضَّأْ وَلَا تَأْتُوا النِّسَاءَ فِیْ اَعْجَازِهِنَّ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت علی بن طلقؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا" جب تم میں سے کوئی حدث کرے (یعنی بغیر آواز کے ہوا خارج ہو) تو اسے وضو کرنا چاہیے، اور تم عورتوں سے (خلاف فطرت) ان کی مقعد (یعنی پاخانہ کی جگہ) میں جماع نہ کرو۔" (ترمذی، ابوداؤد)

(۱۴) وَعَنْ مُعَاوِیَةَ ابْنِ اَبِیْ سُفْیَانَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا الْعَیْنَانِ وِکَاءُ السَّهِ فَاِذَا نَامَتِ الْعَیْنُ اسْتَطْلَقَ الْوِکَاءُ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت معاویہؓ[1] بن ابی سفیان راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا" آنکھیں سرین کا سربند ہیں چنانچہ آنکھ سو جاتی ہے تو سربند کھل جاتا ہے" (دارمی)

تشریح: جب انسان جاگتا رہتا ہے تو گویا اس کے مقعد پر بند لگا رہتا ہے جس کی وجہ سے ہوا خارج نہیں ہوتی بلکہ رکی رہتی ہے اور اگر خارج ہوتی ہے تو اس کا احساس ہوتا ہے اور جب سو جاتا ہے تو چونکہ وہ بے اختیار ہو جاتا ہے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں تو ہوا کے خارج ہونے کا گمان رہتا ہے جس کا اسے یقینی احساس نہیں ہو سکتا اسی لئے نیند کو ناقض وضو کہا جاتا ہے۔

---

[1] اسم گرامی معاویہ کنیت ابوعبدالرحمٰن اور والد کا نام ابوسفیان ہے۔ آپ کاتب وحی ہیں ۶۰ھ میں وفات پائی۔

⑮ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِكَاءُ السَّهِ الْعَيْنَانِ فَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ۔ (رواہ ابوداؤد)

وَقَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ مُحْيُ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ هٰذَا فِيْ غَيْرِ الْقَاعِدِ لِمَا صَحَّ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْتَظِرُوْنَ الْعِشَاءَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُؤُوْسُهُمْ ثُمَّ يُصَلُّوْنَ وَلَا يَتَوَضَّأُوْنَ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمَذِيُّ اِلَّا اَنَّهٗ ذَكَرَ فِيْهِ يَنَامُوْنَ بَدَلَ يَنْتَظِرُوْنَ الْعِشَاءَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُؤُوْسُهُمْ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "سرین کا سربند آنکھیں ہیں لہٰذا جو شخص سو جائے اسے چاہئے" کہ وضو کرے۔" (ابوداؤد)

"اور حضرت امام محی السنۃ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اسی شخص کے واسطے ہے جو بیٹھا نہ ہو (بلکہ لیٹ کر سویا ہو) اس لئے کہ حضرت انسؓ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ "سرکار دو عالم ﷺ کے اصحابؓ عشاء کی نماز (بیٹھے ہوئے) انتظار کیا کرتے تھے یہاں تک کے نیند کے سبب سے ان کے سر جھک جاتے تھے، اس حالت میں وہ اٹھ کر نماز پڑھ لیتے تھے وضو نہ کرتے تھے۔ (ابوداؤد ترمذی) مگر ترمذی نے اپنی روایت میں يَنْتَظِرُوْنَ الْعِشَاءَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُؤُوْسُهُمْ کے بجائے لفظ ینامون ذکر کیا ہے۔

تشریح: حضرت امام محی السنۃ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کا حکم سونے والوں کے بارہ میں نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کے بارہ میں ہے جو لیٹ کر سو جائے، کیونکہ لیٹ کر سونے سے تمام اعضاء ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور اپنے اوپر پوری طرح اختیار نہیں رہتا اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس حالت میں ریاح خارج ہو جائے اور اس کا احساس بھی نہ ہو۔

ہاں جو شخص لیٹ کر نہیں بلکہ بیٹھا بیٹھا اس طرح سو جائے کہ اس کی مقعد زمین پر رکھی رہے اور پھر جب وہ جاگے تو مقعد اسی طرح زمین پر ٹھیری ہوئی ہو تو وضو نہیں ٹوٹتا چاہے وہ جتنا بھی سوئے، چنانچہ حضرت انسؓ کی مذکورہ حدیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بیٹھے ہوئے سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، بیٹھنے کی اقسام فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، جن کو قیاس یا دیگر احادیث سے ثابت کیا گیا ہے۔

⑯ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْوُضُوْءَ عَلٰى مَنْ نَامَ مُضْطَجِعًا فَاِنَّهٗ اِذَا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَتْ مَفَاصِلُهٗ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "وضو اس شخص پر لازم ہوتا ہے جو لیٹ کر سو جائے اس لئے کہ جس وقت آدمی لیٹتا ہے تو اس کے (بدن کے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں) اور پھر ہوا خارج ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: حضرت میرک شاہ نے فرمایا ہے کہ حدیث منکر ہے کیونکہ اس کے راویوں میں ایک راوی یزید الدالانی بھی ہے جو کہ کثیر الخطاء اور فاحش الوہم اور ثقات کے مخالف ہے۔

⑰ وَعَنْ بُسْرَةَ بِنْتِ صَفْوَانَ بْنِ نَوْفَلٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَسَّ اَحَدُكُمْ ذَكَرَهٗ فَلْيَتَوَضَّأْ۔ (رواہ مالک واحمد وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی)

"اور حضرت بسرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم میں سے جو شخص اپنے ذکر (عضو خاص) کو ہاتھ لگائے تو اس کو چاہئے کہ وہ وضو کرے"۔" (مالکؒ، ابوداؤد، ترمذیؒ، نسائی، دارمیؒ)

تشریح: پیشاب گاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جانے میں اختلاف ہے، بلکہ اس مسئلہ میں خود صحابہؓ میں بھی اختلاف تھا چنانچہ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے ذکر کو ننگی ہتھیلی سے چھو دیا تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا، ان کی دلیل یہی مذکور حدیث ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ذکر کو چھو دینے سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان کی دلیل مابعد کی حدیث ہے جو قیس بن علی کی روایت

کے ساتھ جسے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، مسند ابی حنیفہؒ میں مذکور ہے اس کے علاوہ امام اعظمؒ کی دلیل میں اور بہت سی حدیثیں وارد ہیں اس سلسلہ میں مزید تشفی کے لئے شرح ملا علی قاری اور مشکوٰۃ کا ترجمہ حضرت شیخ عبدالحقؒ دہلوی دیکھا جا سکتا ہے۔

حضرت ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں یعنی بسرہ کی یہ حدیث جو شوافع کی دلیل ہے اور طلق بن علی کی حدیث جو آگے آرہی ہے اور حنفیہ کی دلیل ہے، درجہ حسن سے باہر نہیں ہیں لیکن حضرت طلق ابن علی کی حدیث کو حضرت بسرہ کی حدیث پر ترجیح ہوگی اس لئے کہ حضرت بسرہ عورت اور حضرت طلق بن علیؓ مرد ہیں اور ظاہر ہے کہ عورت کے مقابلے میں مرد کی حدیث قوی ہوتی ہے کیونکہ وہ عورت کی نسبت علم اور حدیث کو خوب اچھی طرح یاد رکھتے ہیں اور ان کی قوت حافظہ عورتوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہوتی ہے۔

(۱۸) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ مَسِّ الرَّجُلِ ذَكَرَهُ بَعْدَ مَا يَتَوَضَّأُ قَالَ وَهَلْ هُوَ اِلَّا بُضْعَةٌ مِنْهُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَ النَّسَائِيُّ وَ رَوَى ابْنُ مَاجَةَ نَحْوَهُ وَقَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ مُحْيُ السُّنَّةِ هٰذَا مَنْسُوْخٌ لِاَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ اَسْلَمَ بَعْدَ قُدُوْمِ طَلْقٍ وَ قَدْ رَوَى اَبُوْهُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَفْضٰى اَحَدُكُمْ بِيَدِهٖ اِلٰى ذَكَرِهٖ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا شَيْءٌ فَلْيَتَوَضَّأْ۔ (رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالدَّارَ قُطْنِيُّ وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ عَنْ بُسْرَةَ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا شَيْءٌ)

"اور حضرت طلقؓ بن علیؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا گیا کہ وضو کرنے کے بعد اگر کوئی شخص اپنے ذکر کو چھوئے (تو کیا حکم ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا" وہ بھی تو آدمی کے گوشت کا ایک ٹکڑا ہے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہؒ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے" امام محی السنۃ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مسوخ ہے اس لئے کہ حضرت ابوہریرۃ حضرت طلق بن علیؓ کے آنے کے بعد اسلام لائے ہیں اور حضرت ابوہریرۃؓ سے آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث منقول ہے کہ جب تم میں سے کسی کا ہاتھ اپنے ذکر پر پہنچ جائے اور ہاتھ وذکر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وضو کرے۔" (شافعی دار قطنیؒ اور نسائیؒ نے بسرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے جس میں لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا شَيْءٌ کے الفاظ مذکور ہیں۔

تشریح: آنحضرت ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بدن کے گوشت کے دیگر ٹکڑے مثلاً ہاتھ پاؤں کان ناک وغیرہ ہیں اسی طرح ذکر بھی بندہ کے گوشت ہی کا ایک ٹکڑا ہے اور جب ان دوسرے ٹکڑوں اور حصوں کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو پھر ذکر کے چھو جانے سے کیوں وضو ٹوٹے گا لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ مس ذکر ناقض وضو نہیں ہے۔

امام محی السنۃؒ کا قول در اصل حضرات شوافع کی ترجمانی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرۃؓ طلق بن علیؓ کے بہت بعد اسلام لائے ہیں، کیونکہ حضرت طلقؓ ہجرت کے فوراً بعد جب کہ مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور حضرت ابوہریرۃؓ سن ۷ھ میں غزوہ خیبر کے موقع پر اسلام لائے ہیں اس لئے حضرت طلق بن علیؓ کا آنحضرت ﷺ سے حدیث سننا پہلے ہوا اور حضرت ابوہریرۃؓ کا سننا بعد میں ہوا ہوگا، لہٰذا حضرت طلقؓ کی حدیث منسوخ اور حضرت ابوہریرۃؓ کی حدیث ناسخ ہوئی۔

حنفیہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت طلق کے اسلام لانے کے بعد حضرت ابوہریرۃؓ کے اسلام لانے سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ حضرت ابوہریرۃؓ نے یہ حدیث سنی بھی بعد میں ہو شوافعہ کا یہ دعویٰ تو جب صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ بھی ثابت ہو کہ حضرت ابوہریرۃؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہی حضرت طلقؓ انتقال فرما چکے تھے یا یہ کہ اپنے وطن کو چلے گئے تھے کہ پھر اس کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھی کبھی حاضر نہیں ہوئے، اس لئے کہ اگر حضرت طلقؓ حضرت ابوہریرۃؓ کے اسلام لانے پہلے انتقال فرما جاتے ہیں یا اپنے وطن کو واپس لوٹ جاتے تو پھر حضرت ابوہریرۃؓ کے اسلام لانے کے بعد کچھ نہیں سن سکتے تھے مگر اب تو یہ ممکن ہے کہ حضرت طلقؓ نے یہ حدیث ابوہریرۃؓ

---

[1] اسم گرامی طلق بن علی اور کنیت ابو علی ہے ان کی حدیثیں ان کے بیٹے قیس سے مروی ہیں۔

کے اسلام لانے کے بعد ہی سنی ہو لہٰذا شوافع کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔

حضرت مظہرؒ نے ایک اچھی اور فیصلہ کن بات کہہ دی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہو گیا ہے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث سے تو ثابت ہو رہا ہے کہ مس ذکر ناقض وضو ہے اور حضرت طلقؓ کی حدیث مس ذکر کو ناقض وضو نہیں کہتی لہٰذا اس تعارض کی شکل میں ہمیں چاہئے کہ ہم دوسرے صحابہؓ کے اقوال کی طرف رجوع کریں چنانچہ بہت سے صحابہ مثلاً حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابودرداء، حضرت حذیفہ اور حضرت عمرؓ کے یہ اقوال ثابت ہیں کہ ذکر چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا اس لئے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حنفیہ ہی کا مسلک صحیح ہے کہ مس ذکر ناقض وضو نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱۹) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُ بَعْضَ اَزْوَاجِهٖ ثُمَّ يُصَلِّيْ وَلَا يَتَوَضَّأُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ لَا يَصِحُّ عِنْدَ اَصْحَابِنَا بِحَالٍ اِسْنَادُ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ وَاَيْضًا اِسْنَادُ اِبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيِّ عَنْهَا وَقَالَ اَبُوْدَاوُدَ هٰذَا مُرْسَلٌ وَاِبْرَاهِيْمُ التَّيْمِيُّ لَمْ يَسْمَعْ عَنْ عَائِشَةَ۔

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ اپنی بعض بیویوں کا بوسہ لیتے تھے اور بغیر وضو کے (پہلے ہی وضو سے) نماز پڑھ لیتے تھے (ابوداؤد، ترمذی، نسائی ابن ماجہ) ترمذی نے کہا ہے کہ ہمارے علماء کے نزدیک کسی حال میں عروہ کی سند حضرت عائشہؓ سے نیز ابراہیم تیمی کی بھی سند حضرت عائشہؓ سے صحیح نہیں ہے اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اس لئے کہ ابراہیم تیمی نے حضرت عائشہؓ سے نہیں سنا ہے۔"

تشریح: اس مسئلہ میں بھی علماء کا اختلاف ہے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک غیر محرم عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ غیر محرم عورت کو اگر شہوت کے ساتھ چھوئے تو وضو ٹوٹ جائے گا، ورنہ نہیں ٹوٹے گا ہمارے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا، ان کی دلیل یہی حدیث ہے، نیز حضرت عائشہؓ کی ایک دوسری حدیث بھی جو بخاری و مسلم میں مذکور ہے حضرت امام اعظمؒ کی دلیل ہے جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "آنحضرت ﷺ جب رات میں تہجد پڑھنے کے لئے بیدار ہوتے تو میں سوتی رہتی اور میرے دونوں پاؤں آنحضرت ﷺ کے سجدہ کی جگہ پڑے رہتے تھے چنانچہ آپ ﷺ سجدہ کے وقت میرے پیروں میں ٹھونکا دیتے تھے تو میں اپنے پیر سمیٹ لیتی تھی" لہٰذا اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، امام ترمذی کا یہ کہنا عروہ کی سماعت حضرت عائشہؓ سے ثابت نہیں ہے" بالکل صحیح نہیں ہے کیونکہ صحیح میں (بخاری و مسلم) میں اکثر احادیث میں حضرت عائشہؓ سے حضرت عروہ کی سماع ثابت ہے معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی کے اس قول کو نقل کرنے میں مصنف مشکوٰۃ سے کچھ چوک ہو گئی ہے کیونکہ ترمذیؒ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں لیا جاتا جو مصنف مشکوٰۃ نے اخذ کیا ہے۔

ابوداؤد کا یہ کہنا کہ "یہ حدیث یعنی مرسل کی ایک قسم منقطع) ہے" در اصل حنفیہ کی اس دلیل کو کمزور کرتا ہے کہ جب یہ حدیث مرسل ہے تو حنفیہ کا اس کو اپنی دلیل میں پیش کرنا صحیح نہیں ہے ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہوتی ہے اور نہ صرف ہمارے نزدیک بلکہ جمہور علماء بھی مرسل حدیث کی حجیت کو تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا اس حدیث کو مرسل کہہ کر اسے ناقابل استدلال قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۲۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتِفًا ثُمَّ مَسَحَ يَدَهٗ بِمِسْحٍ كَانَ تَحْتَهٗ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے بکری کا شانہ (یعنی بکری یا گائے کے شانہ گوشت) کھایا، پھر اپنا ہاتھ ٹاٹ سے پونچھ لیا جو آپ ﷺ کے نیچے بچھا ہوتا تھا اور پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھ لی۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث نے بھی حنفیہ کے اس مسلک کی توثیق کر دی ہے کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کھالینے سے وضو نہیں ٹوٹتا، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھانا کھانے کے بعد اگر منہ ہاتھ پر چکنائی وغیرہ لگے تو ان کا دھونا ضروری نہیں ہے۔

(۲۱) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّھَا قَالَتْ قَرَّبْتُ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَنْبًا مَشْوِيًّا فَاَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ قَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس ایک بھنا ہوا پہلو لے گئی چنانچہ آپ ﷺ نے اس میں سے کھایا پھر نماز کے لئے کھڑے ہوگئے اور وضو نہیں کیا (اور نہ ہاتھ منہ دھویا۔" (احمدؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۲۲) عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ اَشْهَدُ لَقَدْ كُنْتُ اَشْوِیْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَطْنَ الشَّاةِ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابورافعؓ فرماتے ہیں کہ اس بات کی قسم کھاتا ہوں کہ میں سرکار دو عالم ﷺ کے لئے بکری کا پیٹ (یعنی پیٹ کے اندر کی چیزیں مثلاً دل کلیجی وغیرہ) بھونتا تھا، آپ ﷺ (اس میں سے کھاتے) پھر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور وضو نہ کرتے۔" (مسلم)

(۲۳) وَعَنْهُ قَالَ اُهْدِيَتْ لَهٗ شَاةٌ فَجَعَلَهَا فِی الْقِدْرِ فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا هٰذَا يَا اَبَا رَافِعٍ فَقَالَ شَاةٌ اُهْدِيَتْ لَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَطَبَخْتُهَا فِی الْقِدْرِ فَقَالَ نَاوِلْنِی الذِّرَاعَ يَا اَبَا رَافِعٍ فَنَاوَلْتُهُ الذِّرَاعَ ثُمَّ قَالَ نَاوِلْنِی الذِّرَاعَ الْاٰخَرَ فَنَاوَلْتُهُ الذِّرَاعَ الْاٰخَرَ ثُمَّ قَالَ نَاوِلْنِی الذِّرَاعَ الْاٰخَرَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّمَا لِلشَّاةِ ذِرَاعَانِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا اِنَّكَ لَوْ سَكَتَّ لَنَا وَلْتَنِیْ ذِرَاعًا فَذِرَاعًا مَا سَكَتَّ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَتَمَضْمَضَ فَاهُ وَغَسَلَ اَطْرَافَ اَصَابِعِهٖ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى ثُمَّ عَادَ اِلَيْهِمْ فَوَجَدَ عِنْدَهُمْ لَحْمًا بَارِدًا فَاَكَلَ ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَصَلّٰى وَلَمْ يَمَسَّ مَآءً رَوَاهُ اَحْمَدُ وَرَوَاهُ الدَّارِمِیُّ عَنْ اَبِیْ عُبَيْدٍ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ ثُمَّ دَعَا بِمَآءٍ اِلٰى آخِرِهٖ۔

"اور حضرت ابورافعؓ راوی ہیں کہ (ایک دن) میرے پاس تحفہ کے طور پر بکری بھیجی گئی، چنانچہ میں نے اس (کے گوشت) کو (پکانے کے لئے) ہانڈی میں ڈال دیا (اسی اثناء میں) آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور فرمایا "ابورافع یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا (یا رسول اللہ! بکری کا گوشت ہے جو میرے پاس ہدیہ کے طور پر آیا تھا اسی کو میں نے ہانڈی میں پکا لیا ہے" آپ نے فرمایا "ابورافع! ایک دست دو! میں نے دست خدمت اقدس میں پیش کر دیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا دوسرا دست دو میں نے دوسرا دست بھی خدمت اقدس میں پیش کر دیا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا ایک دست اور دو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! بکری کے تو دو ہی دست ہوتے ہیں (اور وہ دونوں ہی آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں اب کہاں سے لاؤں) سرکار دو عالم ﷺ نے ان سے فرمایا "ابورافع! اگر تم خاموش رہتے تو مجھ کو دست پر دست دیئے چلے جاتے جب تک کہ تم چپ رہتے، پھر آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور منہ دھویا (یعنی کلی کی) پھر انگلیوں کے پورے دھوئے اور کھڑے ہوئے اور پھر نماز پڑھ کر ابورافع کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے نزدیک ٹھنڈا گوشت دیکھا چنانچہ آپ ﷺ نے اسے کھایا اس کے بعد مسجد تشریف لے گئے اور (شکرانہ کی) نماز پڑھی اور اس حدیث کو دارمی نے بھی روایت کیا ہے مگر ثُمَّ دَعَا بِمَآءٍ سے آخر تک ذکر نہیں کیا ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کو دست کا گوشت بہت زیادہ مرغوب تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ دست کا گوشت زیادہ قوت بخش ہوتا ہے اس لئے آپ ﷺ اسے پسند فرماتے تھے تاکہ جسمانی طاقت و قوت زیادہ حاصل ہو جس کی وجہ عبادت خداوندی بخوبی ادا ہو سکے۔

ارشاد گرامی "اگر تم خاموش رہتے تو مجھ کو دست پر دست دیئے چلے جاتے جب تک کہ تم چپ رہتے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم چپ رہتے اور میں جس طرح مانگتا جارہا تھا تم اسی طرح اٹھا (اٹھا کر دیتے رہتے تو تم دیکھ لیتے کی خداوند کریم اپنی قدرت سے معجزہ کے طور پر بے حد حساب دست مہیا فرماتا، لیکن چونکہ تمہاری نظر صرف ظاہر پر تھی اور تم نے یہ سوچ کر کہ بکری کے صرف دو ہی دست ہوتے ہیں اب کہاں سے لا کر دوں گا اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اور جب تم نے خود ہی ہاتھ کھینچ لیا اور یہ جواب دے دیا تو ادھر سے بھی امداد غیبی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واقعی سب دست ختم ہو گئے یہاں ایک ہلکا سا خلجان واقع ہو سکتا ہے کہ جب باری تعالیٰ کی جانب سے آنحضرت ﷺ کی خواہش کی تکمیل کی خاطر غیبی طور پر بکری کے دست کا انتظام کیا جارہا تھا تو محض ابورافع کے جواب دے دینے سے وہ سلسلہ رک کیوں گیا اور پھر دست ظاہر کیوں نہیں فرمائے گئے۔ جواب یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی جانب سے تمام اعزاز و کرامات اور فضل و عنایات محض خالص نیت اور توجہ الی اللہ کی بناء پر ہوتی ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی توجہ الی اللہ اور خدا کی جانب سے حضوری قلب میں ابورافعؓ کے جواب سے کچھ فرق آگیا ہو اس لئے آپ ان کے جواب کے رد کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، چنانچہ ادھر سے بھی ہاتھ روک لیا گیا اور دست ختم ہو گئے۔

۲۴ وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنْتُ اَنَا وَ اُبَيٌّ وَاَبُوْ طَلْحَةَ جُلُوْسًا فَاَكَلْنَا لَحْمًا وَخُبْزًا ثُمَّ دَعَوْتُ بِوَضُوْءٍ فَقَالَا لِمَ تَتَوَضَّأُ فَقُلْتُ لِهٰذَا الطَّعَامِ الَّذِىْ اَكَلْنَا فَقَالَا اَتَتَوَضَّأُ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَمْ يَتَوَضَّأْ مِنْهُ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنْكَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت انس ابن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں، ابی بن کعبؓ اور ابو طلحہؓ بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے گوشت روٹی کھائی (کھانے سے فارغ ہو کر) میں نے وضو کے لئے پانی منگوایا ابی بن کعبؓ اور طلحہؓ نے کہا "تم وضو کیوں کرتے ہو"! میں نے کہا "اس کھانے کی وجہ سے جو میں نے ابھی کھایا ہے ان دونوں نے کہا "کیا تم پاک چیزوں کے کھانے سے وضو کرتے ہو! ان چیزوں کو کھا کر اس شخص نے وضو نہیں کیا جو تم سے بہتر ہیں (یعنی آنحضرت ﷺ)۔" (احمد)

۲۵ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَ يَقُوْلُ قُبْلَةُ الرَّجُلِ امْرَاَتَهُ وَجَسُّهَا بِيَدِهٖ مِنَ الْمُلَامَسَةِ وَمَنْ قَبَّلَ امْرَاَتَهُ اَوْجَسَّهَا بِيَدِهٖ فَعَلَيْهِ الْوُضُوْءُ۔ (رواہ مالک والشافعی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "مرد کا اپنی عورت سے بوسہ لینا یا اس کو اپنے ہاتھ سے چھونا یہ بھی ملامست ہے اور جس شخص نے اپنی عورت کا بوسہ لیا یا اس کو ہاتھ سے چھوا تو اس پر وضو واجب ہے۔" (مالک، شافعی)

تشریح: قرآن میں جس جگہ ان چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو وضو کو توڑنے والی ہیں انہیں ایک چیز ناقض وضو یہ بھی بتائی گئی ہے کہ:

اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ۔ "یعنی تم عورت سے ملامست کرو۔"

"ملامست" کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اور اس کا محمل کیا ہے؟ اسی میں اختلاف ہو رہا ہے، امام شافعیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ ملامست کے معنی عورت کو ہاتھ لگانا، تو گویا اس طرح امام شافعی کے نزدیک عورت کو محض ہاتھ لگانے کے بعد اگر کسی شخص کا وضو ہے تو وہ ٹوٹ جائے گا لہٰذا اگر وہ نماز پڑھنا چاہے تو اس کو دوبارہ وضو کرنا ضروری ہو گا۔

حضرت ابن عمرؓ کے مذکورہ بالا ارشاد کا مفہوم بھی یہی ہے جو حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی تصدیق کر رہا ہے چنانچہ حضرت ابن عمرؓ یہی فرما رہے ہیں کہ عورت کو صرف ہاتھ لگانا، یا عورت کا بوسہ لینا ملامست میں داخل ہے جس کو قرآن میں ناقض وضو فرمایا گیا ہے۔

ہمارے امام صاحبؒ "ملامست" کے معنی قرار دیتے ہیں "جماع اور ہمبستری" یعنی قرآن میں ملامست عورت کا جو ذکر کیا گیا ہے اور جسے ناقض وضو کہا گیا ہے اس سے جماع اور ہمبستری مراد ہے۔ امام اعظمؒ نے اپنے اس مسلک کی تصدیق میں دلائل کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا ہے جو فقہ کی کتابوں میں بڑی وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔

(۲۶) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ كَانَ يَقُوْلُ مِنْ قُبْلَةِ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ الْوُضُوْءُ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ مرد کو اپنی عورت کا بوسہ لینے سے وضو لازم آتا ہے۔" (مالکؒ)

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ اِنَّ الْقُبْلَةَ مِنَ اللَّمْسِ فَتَوَضَّئُوْا مِنْهَا۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا کہ بوسہ لینا لمس میں داخل ہے (جو قرآن میں مذکور ہے) لہٰذا بوسہ لینے کے بعد وضو کیا کرو۔"

تشریح: حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمرؓ کے ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔

ہمارے امام صاحبؒ کے نزدیک چونکہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا اس لئے ان روایتوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اوّل تو یہ تمام روایتیں صحابہ پر موقوف ہیں یعنی یہ صحابہ کے اقوال ہیں اس لئے ان کا حکم حدیث مرفوع یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد جیسا نہیں ہو سکتا دوسرے ان کے نزدیک یہ روایتیں درجہ صحت کو بھی نہیں پہنچی ہوئی ہیں۔

پھر اس سے قطع نظر آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث موجود ہے جو پہلے ذکر کی گئی اور جس کو حضرت عائشہؓ نے روایت کیا ہے کہ اس سے بصراحت یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، نیز اس کے علاوہ "مسند ابی حنیفہ" میں ایک دوسری حدیث مذکور ہے جسے حضرت ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا لَيْسَ فِي الْقُبْلَةِ وُضُوْءٌ یعنی بوسہ لینے سے وضو لازم نہیں ہوتا" گویا اس حدیث نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ عورت کو چھونے یا اس کا بوسہ لینے سے وضو نہیں ٹوٹتا لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث ان تمام احادیث کے لئے ناسخ ہو جن میں عورت کو چھونے یا اس کا بوسہ لینے کو ناقض وضو کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲۸) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ عَنْ تَمِيْمِ الدَّارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوُضُوْءُ مِنْ كُلِّ دَمٍ سَائِلٍ رَوَاهُمَا الدَّارَقُطْنِيُّ وَقَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ تَمِيْمِ الدَّارِيِّ وَلَا رَآهُ وَيَزِيْدُ بْنُ خَالِدٍ وَيَزِيْدُ بْنُ مُحَمَّدٍ مَجْهُوْلَانِ۔

"حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ[1] تمیم داریؓ[2] سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر بہنے والے خون سے وضو لازم آتا ہے کہ ان دونوں روایتوں کو دار قطنی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے نہ تو تمیم داریؓ سے سنا ہے اور نہ ہی انہیں دیکھا ہے نیز اس روایت کے دو راوی یزید ابن خالد اور یزید ابن محمد مجہول ہیں۔"

تشریح: حضرت امام اعظمؒ کا یہی مسلک ہے کہ ہر بہنے والے خون سے وضو لازم آتا ہے یعنی اگر بدن کے کسی بھی حصہ سے خون نکلا اور نکل کر اس حصہ تک بہہ گیا جس کا دھونا وضو اور غسل میں ضروری ہوتا ہے تو اس سے وضو ٹوٹ جائے گا چنانچہ یہ حدیث امام صاحب کے مسلک کی دلیل ہے، امام صاحب کے علاوہ دیگر ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر خون، پیشاب یا پاخانہ کے راستہ سے نکلے تو وضو ٹوٹ جائے گا اس کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے نکلا تو نہیں ٹوٹے گا۔

حضرت دار قطنیؒ اس حدیث میں کلام فرما رہے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے نہ تو تمیم داریؓ سے سنا ہے اور نہ انہیں دیکھا ہے اس لئے حدیث مرسل ہے، نیز اس حدیث کے دو راوی یزید بن خالد اور یزید بن محمد کے مجہول ہیں گویا ان کا مقصد اس کلام سے یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ کلام ہو اس کو امام صاحب کا اپنے مسلک کی دلیل بنانا کوئی وزنی بات نہیں ہے۔

---

[1] امیر المؤمنین حضرت عمر ابن عبدالعزیز اموی رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور خلیفہ ہیں اور رجب ۱۰۱ھ میں اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔

[2] اسم گرامی تمیم بن اوس الداری ہے ۹ھ میں مشرف با اسلام ہوئے ہیں حضرت عثمان کی شہادت کے بعد شام میں ان کی وفات پائی۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حدیث مرسل یہ نہ صرف یہ کہ ہمارے ہی نزدیک بلکہ جمہور علماء کے نزدیک بھی دلیل اور حجت بن سکتی ہے اسی طرح یزید ابن خالد اور یزیدؒ بن محمد کے مجہول ہونے میں بھی اختلاف ہے بعض حضرات نے تو انہیں مجہول قرار دیا ہے جیسا کہ دار قطنیؒ فرمارہے ہیں مگر بعض حضرات نے انہیں مجہول نہیں کہا ہے اس سے قطع نظر امام صاحبؒ کی اصل دلیل تو یہ حدیث ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

مَنْ قَاءَ اَوْرَعُفَ اَوْ اَمْذٰی فِیْ صَلٰوتِہٖ فَلْیَنْصَرِفْ وَلْیَتَوَضَّأْ وَلْیَبْنِ عَلٰی صَلٰوتِہٖ مَالَمْ یَتَکَلَّمْ۔ (کذافی الہدایہ)

"اگر کسی شخص نے اپنی نماز میں قے کی یا اس کی نکسیر پھوٹی یا مذی نکلی تو اس کو چاہئے کہ وہ نماز سے نکل کر آئے اور پھر وضو کرے اور جب تک کہ کلام نہ کرے اسی نماز پر بناء کرے۔"

نیز ابوداؤد میں بھی اس مضمون کی حدیث منقول ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ پیشاب اور پاخانہ کے مقام کے علاوہ بدن کے کسی دوسرے حصہ سے بھی خون نکلے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

بَابُ اٰدَابِ الْخَلَاءِ

پاخانہ کے آداب کا بیان

آداب ان چیزوں کو کہتے ہیں کہ جس کا ذکر کرنا اچھا اور بہتر ہو وہ چیزیں خواہ عمل سے تعلق رکھتی ہوں خواہ قول سے چنانچہ اس باب میں ان احادیث کو ذکر کیا جارہا ہے جن کا تعلق استنجاء کے آداب سے ہے یعنی ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو استنجاء کے سلسلے میں ممنوع و مکروہ ہیں اور ان چیزوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو استنجاء میں مطلوب و مستحب ہیں۔

(۱) عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَیْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْھَا وَلٰکِنْ شَرِّقُوْا اَوْ غَرِّبُوْا مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ قَالَ الشَّیْخُ الْاِمَامُ مُحْیُ السُّنَّةِ رَحِمَہُ اللّٰہُ ھٰذَا الْحَدِیْثُ فِی الصَّحْرَآءِ اَمَّا فِی الْبُنْیَانِ فَلَا بَأْسَ لِمَارُوِیَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ اِرْتَقَیْتُ فَوْقَ بَیْتِ حَفْصَةَ لِبَعْضِ حَاجَتِیْ فَرَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقْضِیْ حَاجَتَہٗ مُسْتَدْبِرَ الْقِبْلَةِ مُسْتَقْبِلَ الشَّامِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوایوب انصاریؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم بیت الخلاء جاؤ تو قبلہ کی طرف منہ نہ کرو بلکہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ اور پشت رکھو (بخاری و مسلم) حضرت امام محی السنۃؒ فرماتے ہیں کہ یہ جنگل کا حکم ہے آبادی میں ایسا کرنا کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "میں اپنی ضرورت سے حفصہؓ کے مکان پر چڑھا تو میں نے آنحضرت ﷺ کو (بیت الخلا میں) قضاء حاجت کرتے دیکھا، آپ ﷺ قبلہ کی طرف پشت اور شام کی طرف منہ کئے ہوئے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حدیث میں جہت اور سمت کا جو تعیّن فرمایا گیا ہے وہ اہل مدینہ کے اعتبار سے ہے یا ان لوگوں کے لئے جو اسی سمت رہتے ہیں اس لئے کہ مدینہ میں قبلہ جنوب کی طرف پڑتا ہے اس لئے انکو تو مشرق اور مغرب ہی کی طرف منہ اور پشت کرنی ہوگی، ہمارے ملک والوں کے لئے یا ان ممالک کے لئے جو اس سمت میں واقع ہیں ان کو مشرق اور مغرب کی طرف منہ اور پشت نہ کرنی چاہئے کیونکہ یہاں کے اعتبار سے قبلہ مغرب کی طرف پڑتا ہے۔

بہر حال۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، ہمارے امام صاحب تو فرماتے ہیں کہ پیشاب، پاخانہ کے وقت قبلہ کی طرف نہ منہ کرنا چاہئے خواہ جنگل ہو یا آبادی و گھر ہو، اگر کرے گا تو مرتکب حرام ہو گا۔

لہ اسم گرامی خالد ابن زید ہے اور کنیت ابوایوب ہے ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں ان کا انتقال ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک قبلہ کی طرف منہ اور پشت کرنا جنگل میں تو حرام ہے آبادی و گھر میں حرام نہیں ہے۔

حضرت امام اعظمؒ کی دلیل پہلی حدیث ہے جو ابوایوبؓ سے منقول ہے اس حدیث میں قبلہ کی طرف منہ اور پشت نہ کرنے کا حکم مطلقاً ہے اس میں جنگل و آبادی و گھر کی کوئی قید نہیں ہے لہٰذا جو حکم جنگل کا ہوگا وہی حکم آبادی کا بھی ہوگا یہ حدیث نہ صرف یہ کہ حضرت ابوایوبؓ ہی سے منقول ہے بلکہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد اس کی روایت کرتی ہے۔

پھر امام صاحب کی دوسری دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قبلہ کی طرف منہ اور پشت نہ کرنے کا حکم قبلہ کی تعظیم و احترام کے پیش نظر دیا ہے لہٰذا جس طرح جنگل میں تعظیم قبلہ ملحوظ رہے گا اسی طرح آبادی و گھر میں بھی احترام قبلہ کا لحاظ ضروری ہوگا جیسا کہ قبلہ کی طرف تھوکنا اور پاؤں پھیلانا ہر جگہ منع ہے۔

امام محی السنۃؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی جو حدیث روایت کی ہے وہ حضرت امام شافعیؒ کی دلیل ہے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبلہ کی طرف پشت کرنا گھر میں جائز ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اول تو یہ ہو سکتا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کو گھر میں بیت الخلاء کے اندر قبلہ کی طرف پشت اور شام کی طرف منہ کئے ہوئے اس حکم کے نفاذ سے پہلے دیکھا ہوگا، لہٰذا یہ حکم پہلے کے لئے ناسخ ہے، پھر دوسرے یہ کہ آنحضرت ﷺ قبلہ کی طرف مُنہ کئے ہوئے نہیں ہوں بیٹھے ہوں گے بلکہ آپ ﷺ اس انداز سے گھوم کر بیٹھے ہوں گے کہ حقیقت میں قبلہ کی طرف پشت نہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ موقع کی نزاکت کے پیش نظر عبداللہ بن عمرؓ نے وہاں کھڑے ہو کر بغور تو آپ کو دیکھا نہیں ہوگا، بلکہ جب یہ چھت پر چڑھے تو ان کی نظر اچانک ادھر بیت الخلاء کی طرف اٹھ گئی ہوگی اس لئے اس روا روی میں سرسری طور پر عبداللہ بن عمرؓ آپ ﷺ کی نشست کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے اس حدیث کے بارے میں جب یہ احتمال بھی نکل سکتا ہے تو پھر حضرت شافعیؒ کو اپنے مسلک کی دلیل کے لئے اس کا سہارا لینا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ نَهَانَا يَعْنِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ اَوْبَوْلٍ اَوْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِيْنِ اَوْاَنْ نَسْتَنْجِيَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَلَاثَةِ اَحْجَارٍ اَوْاَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيْعٍ اَوْبِعَظْمٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سلمانؓ[1] فرماتے ہیں سرکار دو عالم ﷺ نے ہمیں منع کیا ہے اس سے کہ ہم پاخانہ یا پیشاب کے وقت قبلہ کی طرف منہ کریں اور اس سے کہ ہم داہنے ہاتھ سے استنجاء کریں اور اس سے کہ ہم تین ڈھیلوں سے کم سے استنجاء کریں اور اس سے کہ ہم گوبر یا ہڈی سے استنجاء کریں۔" (مسلمؒ)

تشریح: ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ پاخانہ یا پیشاب کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھنا مکروہ تحریمی ہے اور دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنا مکروہ تنزیہی ہے گویا پہلی نہی تو تحریمی ہے اور دوسری تنزیہی ہے۔

اتنی بات جان لینی چاہئے کہ استنجاء کرنے کے وقت پیشاب گاہ کو دایاں ہاتھ نہ لگانا چاہئے بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ ڈھیلا بائیں ہاتھ میں لے کر اس پر پیشاب گاہ کو رکھ لے مگر دائیں ہاتھ سے پکڑ کر نہ رکھے کیونکہ یہ بھی مکروہ ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک تین ڈھیلوں سے استنجاء کرنا واجب مگر ہمارے امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ استنجاء کے لئے تین ڈھیلے لینا شرط نہیں ہے اگر تین سے کم ہی میں پاکی حاصل ہو جائے تو یہ بھی کافی ہے ان کی دلیل صحیح بخاری کی یہ حدیث ہے کہ "عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ سرکار دو عالم ﷺ پاخانہ کیلئے تشریف لے گئے اور مجھ سے فرمایا کہ تین ڈھیلے لاؤ مجھے ڈھیلے تو دو ہی ملے اس لئے میں اس کے ساتھ گوبر کا ایک ٹکڑا بھی لایا، آنحضرت ﷺ نے دونوں ڈھیلے تو لے لئے اور گوبر کے ٹکڑے کو پھینک دیا۔"

---

[1] اسم گرامی سلمان فارسی اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ ان کی وفات ۳۵ھ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری زمانہ میں ہوئی ہے بعض لوگوں نے کہا کہ ۳۶ھ کے اوائل میں ہوئی ہے۔

③ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ جب پاخانہ میں داخل ہوتے (یعنی داخل ہونے کا ارادہ کرتے) تو یہ دعا پڑھتے اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں ناپاک جنوں اور جنیوں (یعنی نر مادہ دونوں سے)۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: آداب پاخانہ میں سے یہ ہے کہ جب کوئی شخص پاخانہ کے لئے بیت الخلاء میں جائے تو اندر داخل ہونے سے پہلے یہ دعا پڑھ لینی چاہئے، اگر پاخانہ کے لئے جنگل میں جائے تو عین ارادہ کے وقت یعنی دامن وغیرہ سمیٹ کر بیٹھنے لگے اس وقت یہ دعا پڑھ لے۔

④ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَیْنِ فَقَالَ اِنَّھُمَا لَیُعَذَّبَانِ وَمَا یُعَذَّبَانِ فِیْ کَبِیْرٍ اَمَّا اَحَدُھُمَا فَکَانَ لَا یَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِمُسْلِمٍ لَا یَسْتَنْزِہُ مِنَ الْبَوْلِ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَکَانَ یَمْشِیْ بِالنَّمِیْمَۃِ ثُمَّ اَخَذَ جَرِیْدَۃً رَطْبَۃً فَشَقَّھَا بِنِصْفَیْنِ ثُمَّ غَرَزَ فِیْ کُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَۃً قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لِمَ صَنَعْتَ ھٰذَا فَقَالَ لَعَلَّہٗ اَنْ یُّخَفَّفَ عَنْھُمَا مَالَمْ یَیْبَسَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار دوعالم ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے (انھیں دیکھ کر) فرمایا کہ "ان دونوں قبر والوں پر عذاب نازل ہو رہا ہے اور عذاب بھی کسی بڑی چیز پر نہیں نازل ہو رہا ہے (کہ جس سے بچنا مشکل ہو) ان میں ایک تو پیشاب سے نہیں بچتا تھا" مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغل خور تھا" پھر آپ ﷺ نے "کھجور کی" ایک تر شاخ لی اور اس کو بیچ سے آدھوں آدھ چیرا انہیں ایک ایک کر کے دونوں قبروں پر گاڑ دیا۔" صحابہ نے (یہ دیکھ کر) پوچھا "یا رسول اللہ آپ (ﷺ) نے ایسا کیوں کیا ہے"؟ آپ ﷺ نے فرمایا "شاید (اس عمل سے) ان کے عذاب میں (اس وقت تک کے لئے) کچھ تخفیف ہو جائے جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: "مسلم" کے الفاظ کی مناسبت سے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ پہلا شخص جس پر اس کی قبر میں عذاب نازل ہو رہا تھا وہ تھا جو پیشاب سے بچتا نہیں تھا یعنی پیشاب کرتے وقت اس بات کی احتیاط نہیں کرتا تھا کہ چھینٹیں اس کے اوپر نہ پڑیں ایک دوسری روایت میں لا یستبراء کے الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ "وہ شخص پیشاب سے پاکی طلب نہیں کرتا تھا" نیز ایک روایت میں لا یستنتر کے الفاظ مذکور ہیں استنار کے معنی آتے ہیں عضو تناسل کو زور جھاڑنا یا کھینچنا تاکہ پیشاب کے جو قطرے اندر رہ گئے ہوں وہ نکل جائیں) اس طرح معنی یہ ہوں گے وہ شخص پیشاب گاہ کو اچھی طرح جھاڑ کر پیشاب کے قطروں کو نکالتا نہ تھا۔

بہر حال ان تمام الفاظ کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے، مطلب سب کا یہی ہے کہ وہ پیشاب سے پاکی اور صفائی حاصل نہیں کرتا تھا اور چونکہ پیشاب سے پاکی حاصل نہ کرنا گناہ کبیرہ اور نماز کے بطلان کا سبب ہے اس لئے اسے خدا کی جانب سے عذاب میں گرفتار کیا گیا۔

اس سلسلہ میں ایک خاص بات ضروری ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ غلط اور گمراہ کن خیال پیدا ہو گیا ہے کہ چونکہ آنحضرت ﷺ کے بارہ میں یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ ڈھیلے سے پیشاب خشک کرتے تھے اس لئے ہر شخص کو چاہئے کہ پیشاب کے بعد ڈھیلے کا استعمال نہ کرے، یہ انتہائی گمراہی اور کم عقلی کی بات ہے، اگر کسی شخص کا مزاج ہی اتنا قوی اور مضبوط ہو، نیز اسے اس بات کا یقین ہو کہ پیشاب سے فارغ ہو جانے کے بعد قطرے نہیں آئیں گے تو البتہ اس کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ صرف پانی سے استنجاء پاک کر لے ڈھیلے کا استعمال کرنا اس کے لئے ضروری نہیں ہو گا اور جس کے قطرہ دیر تک آتا ہو جیسا کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے تو پھر اگر وہ ڈھیلے کا استعمال نہ کرے صرف پانی سے پاک کرے گا تو اس کے پائجامہ اور کپڑا وغیرہ گندا اور ناپاک ہو گا، جہاں تک حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس کا سوال ہے تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ چونکہ آپ ﷺ کا مزاج مبارک مضبوط اور قوی انتہائی طاقتور تھے اس لئے

آپ ڈھیلے کا استعمال نہیں فرماتے تھے صرف پانی ہی سے استنجاء پاک کر لیتے تھے۔

پھر دوسرے یہ کہ وہ فعل جو آنحضرت ﷺ سے خود ثابت نہ ہو مگر اس کا کرنا کسی نہ کسی وجہ سے مطلوب اور ضروری ہو تو اسے یہ کہہ کر ناقابل اعتناء قرار نہیں دیا جاسکتا کہ یہ فعل چونکہ آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے اس لئے ہم بھی اسے نہیں کرتے مثلاً آپ ﷺ نے فصد نہیں کرائی ہے اب اگر کسی دوسرے کو فصد کی حاجت ہو اور وہ یہ کہے کہ چونکہ آنحضرت ﷺ نے فصد نہیں کرائی ہے اس لئے میں بھی فصد نہیں کراتا تو ظاہر ہے کہ یہ بات اسی کے لئے نقصان دہ ہوگی۔

بہر حال مقصد یہ ہے کہ نظر شارع کی غرض پر ہونی چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ شارع کا اصل مقصد کیا ہے اور وہ ظاہر ہے کہ "طہارت" ہے جس کی ہمیں تاکید کی گئی ہے اس لئے ہمیں تو طہارت حاصل کرنی چاہئے خواہ وہ کسی طرح حاصل ہو پانی سے حاصل ہو یا ڈھیلے سے اس قسم کی بیہودہ احتمالات نکال کر اور غلط حیلہ و بہانہ کر کے اپنے کپڑوں کو گندہ کرنا اور نجاست میں اپنے آپ کو ملوث کرنا اور پھر اسی طرح نماز پڑھنا انتہائی غلط اور گمراہی کی بات ہے، پیشاب سے بچنے اور اس سے احتیاط کرنے کی کتنی اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے کہ:

آپ ﷺ نے فرمایا "عذاب قبر اکثر پیشاب کی بناء پر ہوتا ہے (اس لئے) پیشاب سے پاکی حاصل کرو۔"

یا اسی طرح فرمایا "پیشاب سے پرہیز کرو اس لئے کہ وہ اس چیز کا اول ہے جس کی وجہ سے بندہ قبر میں حساب (کی سختی) میں گرفتار ہوگا (طبرانی) پھر اس کے علاوہ ایک چیز یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ صحابیؓ کا فعل حجت ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "میری سند کو لازم پکڑو اور خلفائے راشدین کی سُنّت کو بھی لازم پکڑو۔"

چنانچہ حضرت عمرؓ کے بارہ میں مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے کہ:۔

ابو بکر عن یسار، بن نمیر کان عمر اذا بال مسح ذکرہ بحائط او حجر لم یمسہ ماء۔

"حضرت عمر فاروقؓ جب پیشاب کرتے تھے تو اپنا عضو تناسل دیوار پر یا پتھر پر پھیرتے تھے اور اس پر پانی لگاتے بھی نہیں تھے۔"

نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ پر کہ پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا چاہئے اہل سُنّت کا اتفاق واجماع ہے، واللہ علم "نمیمۃ" کے معنی ہیں سخن چینی، یعنی کوئی شخص ایسے دو آدمیوں کی بات جن میں آپس میں دشمنی ہو ایک دوسرے تک فساد پھیلانے کے لئے پہنچائے یا کوئی شخص دو آدمیوں میں دشمنی پیدا کرائے اس طرح کہ ایک کی بات دوسرے کے پاس قسم اور گالی وغیرہ سے اس انداز سے نقل کرے جس سے اشتعال پیدا ہو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "نمیمہ" کے معنی یہ ہیں کہ کسی کی گفتگو کسی دوسرے آدمی سے ضرر پہنچانے کے لئے نقل کی جائے۔ بہر حال آج کل عرف عام ہے جسے "چغل خوری" کہتے ہیں وہی معنی "نمیمہ" کے ہیں "چغل خوری" چونکہ انسانی اور اخلاقی نقطہ نظر سے انتہائی بدترین اور کمینہ خصلت ہے اس لئے اسلام بھی چغل خور کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور چغل خوری کو ایک بدتر برائی قرار دیتا ہے چنانچہ صحیحین میں منقول ہے کہ "جنّت میں چغل خور داخل نہیں ہوگا"۔

حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ کعب احبار سے جو ایک بڑے یہودی عالم تھے اور بعد میں اسلام لائے، پوچھا کہ تم نے توریت میں سب سے بڑا گناہ کون سا پڑھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ "چغل خوری"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کا گناہ قتل کے گناہ سے بھی زیادہ ہیبت ناک ہے! انہوں نے کہا "قتل بھی چغل خوری ہی سے ہوتے ہیں اور دوسری برائیاں بھی اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔"

حدیث کے آخر میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے کھجور کی تر شاخ لے کر اس کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ایک ان دونوں قبروں

پر گاڑ دیا اور پھر صحابہؓ کے سوال پر آپ ﷺ نے اس کی وجہ یہ فرمائی کہ جب تک یہ شاخیں تر رہیں گی اس وقت کے لئے ان کے عذاب میں شاید کچھ تخفیف ہو جائے "تو عذاب کے تخفیف کا سبب علماء یہ لکھتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے جب اپنی روحانی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہیں تو سرکار دو عالم ﷺ کی شان رحمت اسے برداشت نہ کر سکی، آپ ﷺ نے بارگاہ الوہیت میں ان کے لئے رحم و کرم کی درخواست کی، ادھر غفور الرحیم نے بھی اپنے حبیب کی درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا اور فیصلہ صادر فرما دیا کہ جب تک ان پر گاڑی ہوئی شاخیں خشک نہ ہوں اس وقت تک ان دونوں پر عذاب میں کمی کر دی جائے۔

چنانچہ اس کی وضاحت بھی ایک دوسری روایت میں موجود ہے جسے مسلم نے نقل کیا ہے اس کے آخری الفاظ یہی ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے میری شفاعت قبول فرمالی ہے کہ جب تک یہ شاخیں تر رہیں گی یہ عذاب میں گرفتار نہیں رہیں گے۔"

بہر حال بظاہر تو اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے جس کی تصدیق بھی مسلم کی اس روایت سے ہو جاتی ہے، ویسے علماء نے اس کے علاوہ بھی بہت سے اسباب لکھے ہیں جو دیگر کتابوں اور شروح میں وضاحت کے ساتھ منقول ہیں چنانچہ کرمانیؒ کا قول ہے کہ "تخفیف عذاب کا سبب وہ تر شاخ تھی کہ اس کے اندر رفع عذاب کی خاصیت تھی مگر یہ خاصیت اس کی بنفسہ نہیں تھی بلکہ یہ خاصیت اسے سرکار دو عالم ﷺ کے دست مبارک کی برکت کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علماء اور صلحاء اور خدا کے نیک بندوں کو چاہئے کہ وہ قبور پر جایا کریں تاکہ ان کی وجہ سے اہل قبر کے عذاب میں تخفیف ہو کیونکہ صالحین کا قبروں پر جانا مردوں کے عذاب میں تخفیف کا باعث ہوتا ہے۔

(۵) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِتَّقُوا الْاَعِنَیْنِ قَالُوْا وَمَا اللَّاعِنَانِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الَّذِیْ یَتَخَلّٰی فِیْ طَرِیْقِ النَّاسِ اَوْفِیْ ظِلِّھِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم ان دو چیزوں سے بچو جو لعنت کا سبب ہیں" صحابہ نے عرض کیا "یارسول اللہ!" وہ چیزیں کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ایک تو یہ ہے کہ کوئی شخص لوگوں کے راستہ میں پاخانہ کرے، دوسرے یہ کہ کوئی شخص لوگوں کے سایہ کے نیچے پاخانہ کرے۔" (مسلم)

تشریح: علماء نے اس ارشاد کی یہ وضاحت کی ہے کہ راستہ سے مراد شاہراہ ہے یعنی ایسا راستہ اور ایسی سڑک وغیرہ جس پر لوگ اکثر چلتے پھرتے ہوں یہاں وہ راستہ مراد نہیں ہے جو ویران پڑا رہتا ہو یا کبھی کبھی اس پر کوئی اکا دکا آدمی چلتا پھرتا ہو۔

"سایہ" مراد وہ سایہ دار درخت ہے یا سائبان ہے جس کے نیچے لوگ اٹھتے بیٹھتے ہوں، یا وہ لوگوں کے سونے کی جگہ ہو بہر حال ان دونوں جگہوں پر پاخانہ کر کے گندگی اور غلاظت پھیلانے سے منع کیا جارہا ہے، اس لئے کہ اس سے مخلوق خدا کی ایذاء رسانی کا سامان ہوتا ہے اور لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک مؤمن و مسلمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کی تکلیف و پریشانی کا سبب بنے۔

(۶) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا شَرِبَ اَحَدُکُمْ فَلَا یَتَنَفَّسْ فِی الْاِنَاءِ وَاِذَا اَتَی الْخَلَاءَ فَلَا یَمَسُّ ذَکَرَہٗ بِیَمِیْنِہٖ وَلَا یَتَمَسَّحْ بِیَمِیْنِہٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو قتادہؓ[1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص پانی پیئے تو (پانی پینے کے) برتن میں سانس نہ لے اور جب پاخانہ میں جائے تو داہنے ہاتھ سے عضو مخصوص کو نہ چھوئے اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجاء کرے۔" (بخاری و مسلم)

---

[1] اسم گرامی حارث بن ربعی ہے انصاری اور خزرجی ہیں آپ اپنی کنیت ابو قتادہ سے مشہور ہیں۔

تشریح: اس حدیث میں دو ادب بتائے جا رہے ہیں پہلی چیز تو یہ بتائی جا رہی ہے کہ جب کوئی شخص پانی پئے تو اسے چاہئے کہ وہ پانی پینے کے دوران اسی برتن میں سانس نہ لے جس میں وہ پانی پی رہا ہے جب اسے سانس لینا ہو تو برتن کو منہ سے جدا کر دے تاکہ منہ یا ناک سے کوئی چیز نکل کر پانی میں نہ گر پڑے۔

دوسری چیز یہ بتائی جا رہی ہے کہ جو کوئی شخص پاخانہ جائے تو اسے چاہئے کہ وہ داہنے ہاتھ سے نہ تو اپنے عضو مخصوص کو چھوئے اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجاء کرے، اس لئے کہ داہنے ہاتھ سے کھانا وغیرہ کھایا جاتا ہے اور یہ چیز صفائی اور پاکیزگی کے خلاف ہے کہ جس ہاتھ سے کھانا وغیرہ کھایا جائے اسی ہاتھ سے ایسے اعضاء کو چھوا جائے جس سے گندگی اور غلاظت لگتی ہو۔

⑦ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَلْيَسْتَنْثِرْ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص وضو کرے تو اسے چاہئے کہ وہ ناک کو بھی جھاڑے اور جو شخص (پاخانہ کے بعد ڈھیلے سے) استنجاء کرے اسے چاہئے کہ طاق ڈھیلے لے (یعنی تین، یا پانچ، یا سات۔" (بخاری ومسلم)

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُ الْخَلَاءَ فَاَحْمِلُ اَنَا وَغُلَامٌ اِدَاوَةً مِّنْ مَّآءٍ وَعَنَزَةً يَسْتَنْجِیْ بِالْمَآءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب پاخانہ کے لئے تشریف لے جاتے تو میں اور ایک لڑکا (یعنی حضرت بلالؓ یا حضرت ابن مسعودؓ) پانی کی چھاگل اور ایک برچھی لیتے، آپ ﷺ (ڈھیلوں سے صفائی کے بعد) پانی سے استنجاء کرتے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپ پاخانہ کے لئے تشریف لے جاتے تو ایک خادم پانی کا برتن اٹھاتے اور دوسرے خادم ایک برچھی ساتھ لے کر چلتے، برچھی اس لئے ساتھ لے جاتے کہ اس سے زمین کو کھود کر نرم کر دیا جائے تاکہ پیشاب اس میں کریں جس کی وجہ سے چھینٹیں نہ پڑیں یا زمین پر بہہ کر پاؤں وغیرہ میں لگنے کا خدشہ نہ رہے۔

دوسری غرض یہ ہوتی تھی کہ بوقت ضرورت اس سے ڈھیلے اکھاڑے اور توڑے جا سکیں یا پھر یہ کہ وقت پر کوئی دوسری ضرورت پیش آئے جس میں اس کی ضرورت پڑے تو اس میں کام آسکے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

⑨ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ نَزَعَ خَاتَمَهُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِیُّ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ وَقَالَ اَبُوْدَاوُدَ هٰذَا حَدِيْثٌ مُّنْكَرٌ وَفِیْ رِوَايَتِهِ وَضَعَ بَدَلَ نَزَعَ۔

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ جب بیت الخلاء تشریف لے جاتے تو اپنی انگوٹھی اتار دیا کرتے تھے" (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) اور ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے، اور ابوداؤد نے کہا کہ یہ حدیث منکر ہے نیز ان کی روایت لفظ نزع کے بجائے لفظ وضع ہے۔"

تشریح: بیت الخلاء میں داخل ہونے کے وقت آپ انگوٹھی اس لئے اتار دیا کرتے تھے کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی میں "محمد رسول اللہ" کھدا ہوا تھا، اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ استنجاء کرنے والے پر واجب ہے کہ جب وہ بیت الخلاء جائے تو اپنے ہمراہ کوئی ایسی چیز نہ لے جائے جس پر اللہ اور اس کے رسول کا نام نقش ہو نیز قرآن بھی نہ لے جائے۔ (طیبیؒ)

بلکہ ابہریؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر صرف دوسرے رسولوں ہی کا نام لکھا ہوا ہو تو اسے بھی اپنے ہمراہ بیت الخلاء میں نہ لے جائے ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہو کہ جب کوئی شخص استنجاء کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے لئے یہ مستحب ہے کہ

وہ اپنے بدن سے ایسی چیزوں کو اتار دے یا الگ کر دے جن پر کوئی قابل تعظیم چیز لکھی ہو، خواہ اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہو یا نبی اور فرشتے کا نام لکھا ہو۔

اگرچہ اس حدیث میں ابوداؤدؒ نے کلام کیا ہے لیکن علماء لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو بطور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے اس سلسلہ میں ملا علی قاریؒ نے ایک مفصل بحث کی ہے، نیز یہ حدیث جامع صغیر میں بھی حاکم وغیرہ سے منقول ہے۔

⑩ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ الْبَرَازَ انْطَلَقَ حَتّٰى لَا يَرَاهُ أَحَدٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ جب پاخانہ کے لئے (جنگل میں) جانے کا ارادہ کرتے تو (اتنی دور) تشریف لے جاتے کہ آپ کو کوئی نہ دیکھتا"۔" (ابوداؤد)

⑪ وَعَنْ أَبِي مُوْسٰى قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَأَرَادَ أَنْ يَّبُوْلَ فَأَتٰى دَمِثًا فِيْ أَصْلِ جِدَارٍ فَبَالَ ثُمَّ قَالَ إِذَا أَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّبُوْلَ فَلْيَرْتَدْ لِبَوْلِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ تھا آپ ﷺ نے پیشاب کرنے کا ارادہ فرمایا، چنانچہ آپ ﷺ ایک دیوار کی جڑ میں (یعنی اس کے قریب) نرم زمین پر پہنچے اور پیشاب کیا، پھر پیشاب سے فراغت کے بعد) آپ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص پیشاب کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ پیشاب کے لئے نرم زمین تلاش کرے (تاکہ چھینٹیں نہ پڑیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: خطابیؒ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے جس دیوار کے پاس بیٹھ کر پیشاب کیا وہ دیوار کسی کی ملکیت میں نہیں ہوگی اس لئے کہ دیوار کی جڑ میں پیشاب کرنا اور دیوار کے نقصان کا سبب ہوتا ہے کیونکہ دیوار کی مٹی کو شور الگ جاتا ہے اس لئے یہ مسئلہ ہے کہ جو دیوار کسی کی ملکیت میں ہو اس کے نیچے بیٹھ کر مالک کی اجازت کے بغیر پیشاب نہیں کرنا چاہئے اب اس میں وسعت ہے کہ اجازت خواہ حقیقۃً ہو یا حکماً۔

⑫ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ الْحَاجَةَ لَمْ يَرْفَعْ ثَوْبَهٗ حَتّٰى يَدْنُوَ مِنَ الْأَرْضِ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد و الدارمی)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب استنجاء کا ارادہ فرماتے تو جب (بیٹھنے کے لئے) زمین سے قریب نہ ہو جاتے کپڑا نہ اٹھاتے تھے۔" (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

تشریح: یہ بھی استنجاء کے ادب اور شرم وحیا کا تقاضہ ہے کہ بغیر ضرورت ستر نہ کھولے اور ظاہر ہے کہ ضرورت جب ہی پڑتی ہے جب کہ استنجاء کے لئے بیٹھنے کے وقت زمین کے بالکل قریب ہو جائے چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہی معمول تھا کہ جب آپ ﷺ بیٹھنے کے وقت زمین سے بالکل متصل نہ ہو جاتے کپڑا اوپر نہ اٹھاتے تھے۔

چنانچہ یہ مسئلہ ہے کہ بیٹھنے سے پہلے یعنی کھڑے ہی کھڑے ستر کا کھول دینا جائز نہیں ہے، خواہ گھر کے بیت الخلاء کے اندر پاخانہ کرنا ہو یا جنگل میں کرنا ہو۔

⑬ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهٖ أُعَلِّمُكُمْ إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَأَمَرَ بِثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ وَنَهٰى عَنِ الرَّوْثِ وَالرِّمَّةِ وَنَهٰى أَنْ يَّسْتَطِيْبَ الرَّجُلُ بِيَمِيْنِهٖ۔ (رواہ ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا (تعلیم و نصیحت کے سلسلہ میں) تمہارے لئے ایسا ہی ہوں جیسے باپ

بیٹے کے لئے ہوتا ہے، چنانچہ میں سکھاتا ہوں کہ "جب تم پاخانہ میں جاؤ تو قبلہ کی طرف نہ تو منہ کرو اور نہ پشت کرو" (اس کے بعد) آپ ﷺ نے (پاخانہ کے بعد) تین ڈھیلوں سے استنجاء کرنے کا حکم فرمایا اور لید (یعنی تمام نجاستوں) اور ہڈی سے استنجاء کرنے کو منع فرمایا نیز آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص دائیں ہاتھ سے استنجاء کرے۔" (ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: اس حدیث سے جہاں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ امور دین اور تذکیر و نصیحت کے سلسلہ میں اپنی اُمت سے آنحضرت ﷺ کو کتنا شغف اور تعلق تھا آپ ﷺ نے اپنے آپ کو باپ اور اُمت کو اولاد کی مثل قرار دیا، وہیں حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کو باپ کی اطاعت کرنی لازم ہے اور باپ پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنی اولاد کو ان چیزوں کے آداب سکھائیں جو ضروریات دین سے ہیں۔

⑭ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَ كَانَتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْيُمْنٰى لِطُهُوْرِهٖ وَطَعَامِهٖ وَكَانَتْ يَدُهُ الْيُسْرٰى لِخَلَائِهٖ وَمَا كَانَ مِنْ أَذًى۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کا داہنا دست مبارک وضو کرنے اور کھانے کے لئے تھے اور بایاں ہاتھ استنجاء اور ہر مکروہ کام کے استعمال کے لئے تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: آپ ﷺ دائیں ہاتھ سے وضو کرتے تھے اور اس سے کھانا بھی کھاتے تھے نیز جتنے اچھے کام ہیں سب دائیں ہاتھ سے انجام دیتے تھے مثلاً ہدیہ، صدقہ و خیرات کرنا یا دوسری چیزیں لینا دینا وغیرہ وغیرہ اور بائیں ہاتھ کو استنجاء کرنے یا ایسی چیزوں کی انجام دہی میں استعمال فرماتے جو مکروہ ہوتیں یعنی ایسی چیزیں جو طبعاً مکروہ ہوں، جیسے ناک سنکنی یا ایسے ہی دوسری چیزیں جنہیں نفس مکروہ سمجھتا ہو۔

اس حدیث سے ظاہری طور پر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وضو وغیرہ کے وقت آپ ﷺ ناک میں پانی دائیں ہاتھ سے دیتے ہوں گے اور ناک بائیں ہاتھ سے صاف کرتے ہوں گے، مگر۔ افسوس کہ جس طرح آج کے دور میں عقل و دین سے بیگانہ لوگوں نے دوسری اسلامی چیزوں کو ترک کر دیا اور دینی آداب کو فیشن پرستی کا بھینٹ چڑھا دیا ہے اسی طرح اس معاملہ میں بھی اکثر لوگ بالکل برعکس عمل اختیار کئے ہوئے ہیں مثلاً آج کل یہ بہت بڑا مرض عام طور پر لوگوں میں سرایت کر چکا ہے کہ کتاب تو لوگ بائیں ہاتھ میں رکھتے ہیں اور اپنے جوتے دائیں ہاتھ میں اٹھاتے ہیں اب اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یا تو ایسے لوگ آداب شریعت سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں یا پھر نفس کی گمراہی میں پھنس کر غفلت اختیار کئے ہوئے ہیں۔

⑮ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا ذَهَبَ اَحَدُكُمْ اِلَى الْغَائِطِ فَلْيَذْهَبْ مَعَهٗ بِثَلَاثَةِ اَحْجَارٍ يَسْتَطِيْبُ بِهِنَّ فَاِنَّهَا تُجْزِئُ عَنْهُ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی والدارمی)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص پاخانہ کے لئے جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے ساتھ تین پتھر (یا ڈھیلے) لے جائے جو کافی ہوں گے (یعنی پانی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔" (احمد، ابوداؤد، نسائی، دارمی)

تشریح: اصل مقصد تو نجاست سے پاکی حاصل کرنا ہے، اور جب تین ڈھیلے سے استنجاء کرے گا اور نجاست صاف کرے گا تو پانی سے استنجاء کی حاجت نہیں رہے گی کیونکہ اصل طہارت اس سے حاصل ہو جائے گی جس سے نماز پڑھنی بھی جائز ہو جائے گی، البتہ ڈھیلے سے استنجاء کرنے کے بعد پانی سے بھی استنجاء کر لے تو یہ اچھی بات ہوگی کیونکہ پانی سے استنجاء کرنا مستحب ہے۔

⑯ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْتَنْجُوْا بِالرَّوْثِ وَلَا بِالْعِظَامِ فَاِنَّهٗ زَادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ زَادَ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم لوگ لید اور ہڈی سے استنجاء نہ کرو کیونکہ (ہڈی) تمہارے بھائی جنات کی غذا ہے۔" (ترمذی نسائی مگر نسائی نے زاد اخوانکم من الجن کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں۔)

تشریح: جس طرح شریعت محمدی کے مخاطب انسان ہیں اسی طرح جنات بھی ہیں اس لئے آنحضرت ﷺ جس طرح انسانوں کی دینوی اور دینی رہبری فرماتے ہیں اسی طرح جنات کی دینی و دنیوی امور کی بھی رعایت فرماتے ہیں، چنانچہ اس حدیث کے ذریعہ انسانوں کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ لید اور ہڈی سے استنجاء نہ کیا جائے کیونکہ ہڈی تو جنات کی غذا ہے اور لید ان کے جانوروں کی خوراک ہے۔

(۱۷) وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رُوَيْفِعُ لَعَلَّ الْحَيَاةَ سَتَطُوْلُ بِكَ بَعْدِيْ فَاَخْبِرِ النَّاسَ اَنَّ مَنْ عَقَدَ لِحْيَتَهٗ اَوْ تَقَلَّدَ وَتَرًا اَوِ اسْتَنْجٰى بِرَجِيْعِ دَآبَّةٍ اَوْ عَظْمٍ فَاِنَّ مُحَمَّدًا مِنْهُ بَرِيْءٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت رویفعؓ ابن ثابتؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اے رویفع! شاید میرے بعد تمہاری زندگی دراز ہو، لہٰذا تم لوگوں کو خبردار کرنا کہ جس شخص نے اپنی ڈاڑھی میں گرہ لگائی یا (گلے میں) تانت کا ہار ڈالا یا جانور کی نجاست (لید اور گوبر وغیرہ) اور ہڈی سے استنجا کیا تو محمد (ﷺ) اس سے بیزار ہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا حضرت رویفعؓ کو اس انداز سے مخاطب کرنے کا یہ معنی ہیں کہ شاید میرے انتقال کی بعد تمہاری زندگی دراز ہو اور تم دوسرے لوگوں کو گناہ کرتے اور رسوم جاہلیت میں انہیں مبتلا دیکھو تو ان باتوں سے انہیں خبردار کر دینا "ڈاڑھی میں گرہ لگانے" کے کئی معنی ہیں، چنانچہ اکثر علماء یہ لکھتے ہیں کہ ڈاڑھی میں گرہ لگانا یہ ہے کہ کوئی شخص تدابیر اور تکلّف اختیار کر کے مثلاً گرہ وغیرہ لگا کر ڈاڑھی کے بالوں کو گھنگریالے بنائے چنانچہ ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے سُنّت کی مخالفت لازم آتی ہے اس لئے کے ڈاڑھی کے بالوں کو سیدھا چھوڑنا سُنّت ہے۔

بعض علماء نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کو یہ عادت تھی کہ جنگ کے وقت اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں گرہ دے لیتے تھے چنانچہ اس سے منع فرمایا گیا ہے کیونکہ اس سے عورتوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔

کچھ علماء نے اس کی معنی یہ لکھے ہیں کہ اہل عجم کی بھی عادت تھی کہ وہ اپنی ڈاڑھی میں گرہ لگا لیتے تھے اس لئے اس سے منع فرمایا کیونکہ اس سے خلقت الٰہی میں تغیر لازم آتا ہے۔ (واللہ اعلم)

لفظ وَتر کے بھی کئی معنی ہیں، یا تو اس کے معنی دورے کے ہیں جس میں زمانہ جاہلیت کے لوگ دفع نظر اور آفات نظر سے محافظت کی خاطر تعویز اور گنڈے وغیرہ باندھ کر بچوں اور گھوڑوں کے گلوں میں ڈال دیتے تھے، اس سے منع فرمایا گیا ہے، بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس سے ڈورے مراد ہیں جن میں کفار گھنٹی اور گھنگرو باندہ کر لٹکاتے تھے یا اس سے کمان کے وہ چلے مراد ہیں جو گھوڑے کے گلے میں ڈالے جاتے ہیں تاکہ نظر نہ لگے، بہرحال، ان تمام رسموں سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے کیونکہ اس سے کافروں کی مشابہت ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ کافروں کی مشابہت سے بیزار ہوتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کفار کی ایسی چھوٹی چھوٹی رسمیں اختیار کرنا گناہ کبیرہ میں شامل نہیں ہیں آنحضرت ﷺ کی بیزاری و ناراضگی کا سبب ہے، تو کفر کی وہ بڑی بڑی رسمیں جن میں بدقسمتی سے آج مسلمان مبتلا ہیں اور جن کا شمار بھی کبیرہ گناہوں میں ہوتا ہے ان سے سرکار دوعالم ﷺ کو کتنی زیادہ نفرت ہوگی اور ان رسموں کے کرنے والوں کا خدا کے یہاں کیا انجام ہوگا؟

(۱۸) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اكْتَحَلَ فَلْيُوْتِرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَّا فَلَا حَرَجَ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَّا فَلَا حَرَجَ وَمَنْ اَكَلَ فَمَا تَخَلَّلَ فَلْيَلْفِظْ وَمَا لَاكَ بِلِسَانِهٖ فَلْيَبْتَلِعْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَّا فَلَا حَرَجَ وَمَنْ اَتَى الْغَائِطَ فَلْيَسْتَتِرْ فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ اِلَّا اَنْ يَجْمَعَ كَثِيْبًا مِنْ رَمْلٍ فَلْيَسْتَدْبِرْهُ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَلْعَبُ بِمَقَاعِدِ بَنِيْ اٰدَمَ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَّا فَلَا حَرَجَ۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ والدارمی)

لہ رویفع بن ثابت بن سکن بن عدی بن حارثہ بنی مالک نجار سے ہیں ان کا شمار اہل مصر میں ہے۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص سرمہ لگائے تو اسے چاہئے کہ طاق سلائیاں لگائے جس نے ایسا کیا (یعنی طاق سلائیاں لگائیں) اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا تو کچھ گناہ نہیں! اور جو شخص استنجاء کرے تو اسے چاہئے کہ طاق ڈھیلے استعمال کرے (یعنی تین پانچ یا سات) جس نے ایسا کیا اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا کچھا گناہ نہیں اور جو شخص کچھ کھائے جو چیز خلال میں نکلے تو اسے چاہئے کہ پھینک دے اور جو چیز زبان سے نکلے تو اسے چاہئے کہ نگل لے، جس نے ایسا کیا اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا کچھا گناہ نہیں اور جو شخص پاخانہ کے لئے جائے تو اسے چاہئے کہ پردہ کرے، اگر کوئی چیز پردہ کی نہ ملے تو (کم از کم) ریت کو جمع کر کے اس کا تودہ اپنے پیچھے کر لے اس لئے کہ شیطان بنی آدم (انسان) کے پاخانہ کے مقام سے کھیلتا ہے جس نے ایسا کیا اچھا کیا، اور جس نے ایسا نہ کیا کوئی گناہ نہیں"۔ " (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: طاق سلائیوں سے سرمہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ تین سلائی ایک آنکھ میں لگائے، زیادہ بہتر یہی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں بھی ایسا ہی معمول منقول ہے کہ آپ ﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی اس میں سے آپ سرمہ اس طرح لگاتے تھے کہ تین سلائی ایک آنکھ میں لگاتے اور تین سلائی دوسری آنکھ میں لگاتے۔

بعضوں نے یہ طریقہ بتایا ہے کہ تین سلائی دائیں آنکھ میں لگائے اور دو سلائی بائیں آنکھ میں لگائے، نیز کچھ حضرات نے کہا ہے کہ پہلے دو سلائی دائیں آنکھ میں لگائے اور دو سلائی بائیں آنکھ میں لگائے اور اس کے بعد پھر ایک سلائی دائیں آنکھ میں لگائے تاکہ ابتدا بھی دائیں آنکھ سے ہو اور اختتام بھی دائیں ہی آنکھ پر ہو، جو شخص طاق سلائی لگائے گا اس کے لئے بہتر اور اچھا ہو گا، اور جو شخص طاق سلائی نہ لگائے گا اس میں کوئی حرج اور گناہ بھی نہیں ہے کیونکہ طاق سلائی لگانا مستحب ہے۔

آپ ﷺ نے طاق ڈھیلوں سے استنجاء کرنے کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے کہ "جس نے ایسا کیا اچھا کیا اور جس نہ ایسا نہ کیا تو کوئی گناہ نہیں، اس سے حنفیہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ تین یا طاق ڈھیلے لینے واجب نہیں ہیں اس سے کم اور زیادہ بھی لئے جا سکتے ہیں البتہ طاق ڈھیلے لینا مستحب ہے، کھانا کھانے کے بعد خلال سے نکالی ہوئی چیز کو منہ سے پھینک دینے کو بہتر قرار دیا جا رہا ہے اور زبان سے نکالی ہوئی چیز کو نگل لینے کے لئے کہا جا رہا ہے اس لئے کہ تنکے سے خلال کرنے میں اکثر خون بھی نکل آتا ہے اس لئے احتیاطاً اس کو پھینک دینا ہی بہتر ہے زبان سے چونکہ خون نکلنے کا احتمال نہیں ہوتا اس لئے اس کو نگل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مگر اتنی بات سمجھ لینی چاہئے کہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ "جس نے ایسا نہ کیا کوئی گناہ نہیں" تو یہ حکم اسی صورت میں ہو گا جب کہ خون نکلنے کا یقین نہ ہو بلکہ احتمال ہو اگر خون نکلنے کا یقین ہو تو پھر خلال میں ہر طرح کی نکلی ہوئی چیز کا نگلنا حرام ہو گا، اور اس کا پھینک دینا واجب ہو گا۔

آخر حدیث میں فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص پاخانہ کے لئے جائے تو پاخانہ کے وقت اسے پردہ کر کے بیٹھنا چاہئے یعنی ایسی جگہ بیٹھے جہاں لوگ نہ دیکھ سکیں اگر پردہ کے لئے کچھ نہ پائے باس طور کے نہ تو ایسی کوئی جگہ ہے جو گھری ہوئی اور لوگوں کی نظروں سے محفوظ ہو اور نہ اپنے پاس ایسا کوئی کپڑا یا کوئی دوسری چیز ہے جس سے پردہ کیا جا سکے تو اس وقت یہ کرنا چاہئے کہ ریت کا تودہ جمع کر لے اور اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جائے اس طرح کسی نہ کسی حد تک پردہ ہو جائے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص پاخانہ کے وقت پردہ کا لحاظ نہیں کرتا تو شیطان اس کے پاخانہ کے مقام سے کھیلتا ہے کھیلنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے اور انہیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس شخص کے ستر کو دیکھیں جو بے پردہ بیٹھا ہوا پاخانہ کر رہا ہے، نیز یہ کہ اگر پردہ نہ کیا جائے تو اس کا بھی خطرہ رہتا ہے کہ جب ہوا چلے تو اس کی وجہ سے ناپاک چھینٹیں اڑ کر بدن اور کپڑے پر پڑیں گی اس لئے پاخانہ کے وقت پردہ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

اس کے بارہ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی پردہ کا لحاظ کرے تو یہ اچھا ہے اور اگر نہ کرے تو کوئی گناہ کی بات بھی نہیں ہے مگر

احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ پردہ کا خیال رکھا جائے بلکہ اگر اس بات کا یقین ہو کہ پردہ نہ کیا گیا تو لوگ دیکھیں گے تو ایسی شکل میں پردہ کرنا لازم اور ضروری ہے، اگر پردہ نہ کرے تو گناہ گار ہو گا۔

اگر بحالت مجبوری کوئی شخص بغیر پردہ کے پاخانہ کے لئے بیٹھ جائے تو پھر اس کی ستر کی طرف قصداً دیکھنے والوں کو گناہ ہو گا، مجبوری سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا موقع آپڑے جب کہ پردہ کا کوئی انتظام ممکن نہ ہو اور اس کو شدید حاجت ہو تو اس صورت میں اسے مجبوری ہے ریت کے تودہ کو پشت کی طرف کرنے کو اس لئے فرمایا گیا ہے کہ آگے کے ستر کو تو دامن وغیرہ سے بھی چھپایا جا سکتا ہے بخلاف پیچھے کے ستر کے کہ اس کو چھپانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔

⑲ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ فِيْ مُسْتَحَمِّهٖ ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ اَوْيَتَوَضَّأُ فِيْهِ فَاِنَّ عَامَّةَ الْوَسْوَاسِ مِنْهُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ اِلَّا اَنَّهُمَا لَمْ يَذْكُرَا ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ اَوْيَتَوَضَّأُ فِيْهِ۔

"اور حضرت عبداللہ بن مغفل[1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی شخص اپنے غسل خانے میں پیشاب نہ کرے جس میں پھر وہ نہائے یا وضو کرے (یعنی یہ عاقل سے بعید ہے کہ نہانے کی جگہ پیشاب کرے اور پھر وہیں نہائے یا وضو کرے) اس لئے کہ اس سے اکثر وساوس پیدا ہوتے ہیں" (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) ترمذی اور نسائی نے ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ اَوْيَتَوَضَّأُ فِيْهِ کہ الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں۔"

تشریح: غسل خانہ میں پیشاب کرنے سے وسواس اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ جب وہاں پیشاب کیا جاتا ہے تو وہ جگہ ناپاک ہو جاتی ہے اور پھر وضو یا غسل کے وقت جب اس پر پانی پڑتا ہے تو دل میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں کہ کہیں چھینٹیں تو نہیں پڑ رہی ہیں اور پھر یہ شبہ رفتہ رفتہ دل میں جم جاتا ہے جس سے ایک مستقل خلجان واقع ہو جاتا ہے۔

ہاں اگر غسل خانہ کی زمین ایسی ہو کہ اس پر سے چھینٹیں اچٹ کر اوپر نہ پڑتی ہوں مثلاً وہاں کی زمین ریتیلی ہو اس کا فرش اور اس میں نالی ایسی ہو کہ پیشاب کا ایک قطرہ بھی وہاں نہ رکتا ہو سب نکل جاتا ہو تو پھر وہاں پیشاب کرنا مکروہ نہیں ہے۔

اتنی بات سمجھ لینی چاہئے کہ یہاں غسل خانہ میں پیشاب کرنے کو جو منع کیا گیا ہے تو نہی تنزیہی ہے نہی تحریمی نہیں ہے۔

⑳ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَرْجِسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ فِيْ جُحْرٍ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبداللہ بن سرجس راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم میں سے کوئی شخص کسی سوراخ میں پیشاب نہ کرے۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: سوراخ میں پیشاب کرنے سے اس لئے روکا جا رہا ہے کہ اکثر و بیشتر سوراخ کیڑے مکوڑوں اور سانپ بچھو کا مسکن ہوتے ہیں چنانچہ ہو سکتا ہے کہ پیشاب کرتے وقت اس میں سے سانپ یا بچھو یا تکلیف دینے والا کوئی دوسرا کیڑا نکل کر ایذاء پہنچائے یا اگر اس سوراخ کے اندر کوئی ضعیف اور بے ضرر جانور ہو تو پھر پیشاب کی وجہ سے اسے تکلیف پہنچے گی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوراخوں میں جنات رہتے ہیں چنانچہ ایک صحابی سعد بن عبادہ خزرجی کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے زمین حوران کے ایک سوراخ میں پیشاب کر دیا تھا تو ان کو جنات نے مار ڈالا اور اس میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

---

[1] حضرت عبداللہ بن مغفل کی کنیت ابوسعید ہے پہلے مدینہ میں سکونت اختیار فرمائی پھر آپ بصرہ چلے گئے آپ کو حضرت عمرؓ نے بصرہ میں مسائل دین کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا تھا آپ کی وفات بمقام بصرہ ۵۹ھ میں ہوئی۔

نَحْنُ قَتَلْنَا سَيِّدَ الْخَزْرَجِ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ وَرَمَيْنَاهُ بِسَهْمَيْنِ فَلَمْ نُخْطِ فُؤَادَهُ

ہم نے قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کیا ہم نے اس کی طرف دو تیر مارے اور اس کے دل کو نشانہ بنانے میں خطا نہیں کی اور بعض علماء یہ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی سوراخ خاص طور پر پیشاب ہی کے لئے ہو تو اس میں پیشاب کرنا مکروہ نہیں ہے۔

(۲۱) وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّقُوا الْمَلَاعِنَ الثَّلَاثَةَ الْبَرَازَ فِي الْمَوَارِدِ وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ وَالظِّلِّ۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت معاذؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم تین چیزوں سے بچو جو لعنت کا سبب ہیں (۱) گھاٹوں پر استنجاء (یعنی پیشاب پاخانہ) کرنے سے (۲) راستہ کے درمیان اور (۳) سایہ میں پیشاب و پاخانہ کرنے سے۔" (ابوداؤد و ابن ماجہ)

تشریح: یہ تین افعال ایسے ہیں جو لعنت کا سبب ہیں یعنی جب کوئی شخص کسی راستہ پر، یا گھاٹ پر، یا سایہ کی جگہ پر پاخانہ کرتا ہے تو جو لوگ اس راستہ سے گزرتے ہیں یا گھاٹ کو استعمال کرتے ہیں، یا سایہ دار جگہ پر آتے ہیں وہ اس شخص پر لعنت بھیجتے ہیں یا اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ شخص ان افعال بد کی بنا پر لوگوں کی ان منفعت اور آرام کو جو ان جگہوں سے مختص ہیں فاسد کرتا ہے، لہٰذا یہ ظالم ہوا اور ظالم شخص ملعون ہوتا ہے۔

موارد ان مکانوں کو کہتے ہیں جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر آپس میں بات چیت کرتے ہیں، بعض علماء نے کہا ہے کہ موارد جمع مورد گھاٹ کو کہتے ہیں جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے۔ سایہ، عام ہے خواہ درخت کا سایہ ہو یا کسی اور چیز کا جہاں لوگ سوتے اور بیٹھتے ہوں، نیز اپنے جانوروں کو باندھتے ہیں۔

(۲۲) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَخْرُجُ الرَّجُلَانِ يَضْرِبَانِ الْغَائِطَ كَاشِفَيْنِ عَنْ عَوْرَتِهِمَا يَتَحَدَّثَانِ فَاِنَّ اللّٰهَ يَمْقُتُ عَلٰى ذٰلِكَ۔

(رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا (ایک ساتھ) دو شخص پاخانہ کے لئے (اس طرح) نہ جائیں کہ دونوں اپنی شرم گاہ کھولے ہوئے ہوں اور باتیں کرتے ہوئے ہوں کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوجاتا ہے۔" (احمد ابوداؤد و ابن ماجہ)

تشریح: مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یہ حرام ہے کہ وہ پاخانہ کے لئے اس طرح بیٹھیں کہ ایک دوسرے کی شرم گاہیں دیکھیں اسی طرح ایسی حالت میں آپس میں باتیں کرنا بھی مکروہ ہے یہ دونوں چیزیں غضب خداوندی کا سبب اور اس کے عتاب کا باعث ہیں۔

اس موقع پر اس تکلیف دہ صورت حال کی وضاحت ضروری ہے کہ آج کل عورتوں میں خصوصیت سے ایسی بداحتیاطیاں پائی جاتی ہیں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے سامنے ستر کھولنے کو قطعاً معیوب نہیں سمجھتیں خصوصاً غسل اور پاخانہ کے وقت اس قسم کی شرمناک حرکتیں عام طور پر کرتی ہیں، ایسی عورتوں کو چاہئے کہ وہ اس حدیث کو غور سے پڑھیں اور پھر سمجھیں کہ وہ ایسی ناشائستہ اور شرم وحیا کے منافی چیزوں کے ارتکاب سے خدا کا غضب مول لے رہی ہیں اور اس کے عتاب کا باعث ہو رہی ہیں۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ پاخانہ کرتے وقت اور جماع (ہم بستری) کے وقت زبان سے ذکر اللہ نہ کیا جائے بلکہ دم کے ساتھ کیا جائے۔

(۲۳) وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الْحُشُوْشَ مُحْتَضَرَةٌ فَاِذَا اَتٰى اَحَدُكُمُ الْخَلَاءَ فَلْيَقُلْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت زید بن ارقمؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "پاخانے شیاطین اور جنات کے حاضر ہونے کی جگہ ہیں، اس لئے جب تم میں سے کوئی بیت الخلا جائے تو اسے چاہئے کہ یہ دعا پڑھے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْخُبُثِ وَ الْخَبَآئِثِ یعنی میں ناپاک جنوں اور جنیوں سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: جنات اور شیاطین پاخانہ میں آتے ہیں اور اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ جو شخص پاخانہ میں آئے اس کو ایذاء پہنچائیں اور تکلیف دیں کیونکہ پاخانہ جانے والا شخص وہاں ستر کھول کر بیٹھا ہے اور ذکر اللہ کر نہیں سکتا اس لئے یہ بتایا جارہا ہے کہ جو شخص پاخانہ جاتے وقت یہ دعا پڑھ لے گا وہ جنات اور شیاطین کی ایذاء و تکلیف سے محفوظ رہے گا۔

اس باب میں جو حدیث نمبر ۳ گزری ہے اس میں اس دعا کے الفاظ اس طرح ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَ الْخَبَآئِثِ چونکہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اسلئے اختیار ہے کہ چاہے وہ دعا پڑھی جائے یا یہ دعا پڑھی جائے لیکن بہتر اور اولیٰ یہ ہے کہ کبھی وہ دعا پڑھ لے اور کبھی یہ پڑھ لے یا دونوں کو ساتھ ساتھ پڑھے۔

(۲۴) وَعَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتْرُ مَا بَيْنَ اَعْيُنِ الْجِنِّ وَ عَوْرَاتِ بَنِیْ اٰدَمَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُهُمُ الْخَلَاءَ اَنْ يَّقُوْلَ بِسْمِ اللّٰهِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَ اِسْنَادُهٗ لَيْسَ بِقَوِیٍّ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب کوئی شخص پاخانہ میں داخل ہو تو جن (شیطان) کی آنکھوں اور انسان کی شرم گاہ کے درمیان کا پردہ یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ کہے۔" (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند قوی نہیں ہے)

تشریح: ارشاد کا مطلب ہے کہ جب انسان بیت الخلاء جاتا ہے، تو چونکہ وہاں ستر کھول کر بیٹھتا ہے اس لئے شیاطین اس کی شرم گاہ دیکھتے ہیں، لہٰذا جب کوئی شخص پاخانہ جائے تو اسے چاہئے کہ بسم اللہ کہہ کر بیت الخلاء جائے کیونکہ اس سے شیاطین ستر نہیں دیکھ سکتے علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں سُنّت یہ ہے کہ جب کوئی شخص بیت الخلاء جائے تو پہلے بسم اللہ اور پھر اس کے بعد وہ دعا پڑھے جو اس سے پہلے حدیث میں گزر چکی ہے، لیکن ان دونوں یعنی بسم اللہ اور مذکورہ دعاؤں میں سے کسی ایک کو بھی پڑھ لیا جائے تو سُنّت ادا ہو جائے گی مگر افضل یہی ہے کہ دونوں پڑھی جائیں یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے، لیکن فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کرنا جائز ہے۔

(۲۵) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَآءِ قَالَ غُفْرَانَكَ۔

(رواہ ترمذی و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم جب پاخانہ سے باہر تشریف لاتے تو فرماتے غُفْرَانَكَ یعنی اے اللہ! میں تیری بخشش کا خواستگار ہوں۔" (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: علماء نے اس وقت بخشش چاہنے کی دو وجہیں لکھی ہیں، اول تو یہ کہ چونکہ سرکار دو عالم ﷺ زبان سے ذکر اللہ کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑتے تھے سوائے اس کے کہ کسی شدید حاجت اور مجبوری مثلاً پیشاب پاخانہ وغیرہ کے وقت ترک فرمادیتے تھے اس کی وجہ سے آپ خدا سے بخشش کے خواستگار ہوتے تھے۔

دوسرے یہ کہ جب انسان کوئی غذا کھاتا ہے، تو وہ غذا معدہ میں پہنچ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ایک حصّہ تو خون بن کر قوت و طاقت پیدا کرتا ہے اور دوسرا حصّہ فضلہ ہو کر پاخانہ کی شکل میں نکل جاتا ہے، اگر قدرت کے اس نظام کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ

لہ آپ انصاری ہیں اور کنیت ابو عمرو ہے آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سترہ غزوات میں شرکت کی ہے آپ کوفہ میں رہتے تھے اور وہیں ۶۸ھ میں انتقال ہوا۔

بندوں پر خدا کا بہت بڑا انعام اور اس کی بہت بڑی نعمت ہے جس کا شکر بندے سے کماحقہ، ادا نہیں ہو سکتا اس لئے آنحضرت ﷺ بخشش چاہتے تھے کہ اے خدا! مجھ سے تیری اس عظیم نعمت کا شکر ادا نہیں ہوا اس لئے تو مجھے اس کوتاہی پر بخش دے۔

بعض مشائخ نے لکھا ہے کہ ایسے موقع پر یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ اپنی احتیاج اور اس بات کا خیال کیا جائے کہ انسان کی ذات کی حیثیت ہی کیا ہے جس میں نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے اور اس کے مقابلہ میں خداوند قدوس کی ذات پاک اور اس کی تقدس کا تصور کرے، افضل یہ ہے کہ لفظ غُفْرَانَكَ کہ بعد یہ دعا پڑھ لی جائے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَذْهَبَ عَنِّى الْاَذٰى وَعَافَانِىْ۔

(۲۶) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَى الْخَلَاءَ اَتَيْتُهُ بِمَاءٍ فِىْ تَوْرٍ اَوْ رَكْوَةٍ فَاسْتَنْجٰى ثُمَّ مَسَحَ يَدَهُ عَلَى الْاَرْضِ ثُمَّ اَتَيْتُهُ بِاِنَاءٍ اٰخَرَ فَتَوَضَّاَ۔ (رواہ ابوداؤد و روی الدارمی و النسائی معناہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب پاخانہ جاتے تو میں آپ ؐ کے لئے پیالہ یا چمڑے کی چھاگل میں پانی لاتا، آنحضرت ﷺ اس سے استنجاء کرتے پھر ہاتھ کو زمین پر رگڑتے پھر اس کے بعد میں (پانی کا) دوسرا برتن لاتا اور آپ ﷺ وضو فرماتے۔" (داری نسائی)

تشریح: تَوْرٌ عرب میں پیتل یا پتھر کا ایک چھوٹا سا برتن پیالہ کی طرح ہوتا ہے، اس میں کھانا کھاتے ہیں، اور بوقت ضرورت اس میں پانی بھر کر اس سے وضو بھی کر لیتے ہیں رَكْوَةٌ چمڑے کی چھاگل کو کہتے ہیں جو پانی رکھنے کا کام آتا ہے۔

تَوْرٌ اور رَكْوَةٌ کے درمیان لفظ اَوْ یا تو شک راوی کے لئے ہے، یعنی ابوہریرہؓ سے جس راوی نے اس حدیث کی روایت کی ہے انہیں یہ شک ہے کہ ابوہریرہؓ نے لفظ تور فرمایا ہے لفظ رکوۃ یا پھر یہ تنویع کے لئے ہے اس طرح حضرت ابوہریرہؓ کے ارشاد کے معنی یہ ہوں گے کہ کبھی تو میں تور میں پانی لایا کرتا تھا اور کبھی رکوۃ میں لاتا تھا۔

استنجاء سے فراغت کے بعد آپ ﷺ زمین پر ہاتھ رگڑ کر اس لئے دھوتے تاکہ ہاتھ سے بدبو نکل جائے اور ہاتھ خوب پاک وصاف ہو چنانچہ پاخانہ سے آکر اس طرح سے ہاتھ دھونا سنت ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ وضو کے لئے دوسرے برتن میں پانی اس لئے نہیں لاتے تھے کہ استنجے کے بقیہ پانی یا اس برتن سے وضو درست نہیں تھا بلکہ اس برتن میں چونکہ پانی صرف استنجے کی ضرورت کے مطابق ہی رہتا ہو گا اس لئے وضو کے لئے دوسرے برتن میں پانی لانے کی ضرورت ہوتی تھی، اس حدیث سے بعض علماء نے یہ اخذ کیا ہے کہ اگر استنجے اور وضو کے پانی کے لئے الگ الگ برتن ہوں تو یہ مستحب ہے۔

(۲۷) وَعَنِ الْحَكَمِ بْنِ سُفْيَانَ قَالَ كَانَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا بَالَ تَوَضَّاَ وَنَضَحَ فَرْجَهُ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت حکم ابن سفیانؓ[1] راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب پیشاب کر چکتے تو وضو فرماتے اور اپنی شرم گاہ پر چھینٹا دیتے!۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: پیشاب کرنے کے بعد جب آپ وضو فرماتے تو دفع وسواس کے لئے تھوڑا سا پانی لے کر ستر کی جگہ ازار پر چھڑک لیتے تھے تاکہ پیشاب کے قطرہ کے وہم باقی نہ رہے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس وسواس و خطرات سے پاک وصاف تھی اس لئے کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کا یہ طرز عمل اُمت کی تعلیم کے لئے تھا کہ پیشاب کرنے کے بعد جب وضو کیا جائے تو تھوڑا سا پانی ستر کی جگہ کپڑے کے اوپر چھڑک لیا جائے، اس لئے کہ اگر پانی نہ چھڑکا جائے اور ستر کی جگہ کپڑے کے اوپر تری کا احساس ہو تو اس سے پیشاب کے قطروں کا وہم ہو گا اور پانی چھڑک

---

[1] اسم گرامی حکم بن سفیان اور کنیت ابوالحکم ثقفی ہے۔

لیا جائے تو اس کے بعد اگر تری کا حساس ہوگا بھی تو یہی سمجھا جائے گا کہ اسی چھڑکے ہوئے پانی کی تری ہے چنانچہ اس سے وسوسہ کی راہ بند ہو جائے گی اور مقصد یہی ہے کہ وسواس و خطرات کی راہ روک دی جائے تاکہ اطمینان قلب کے ساتھ عبادت میں مصروف رہا جا سکے۔

ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ وضوء کے بعد شرم گاہ کے اوپر پانی چھڑکنے کی ایک وجہ تو یہ دفع وسواس ہو سکتی ہے مگر ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے پیشاب وغیرہ کے قطرے رک جائیں باہر نہ آئیں۔

(۲۸) وَعَنْ اُمَيْمَةَ بِنْتِ رُقَيْقَةَ قَالَتْ كَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدَحٌ مِنْ عِيْدَانٍ تَحْتَ سَرِيْرِهٖ يَبُوْلُ فِيْهِ بِاللَّيْلِ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت امیمہؓ بن رقیقہؓ[1] فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے پاس لکڑی کا ایک پیالہ تھا جو آپ ﷺ کی چارپائی کے نیچے رکھا رہتا تھا آپ ﷺ رات کو اس میں پیشاب کر لیا کرتے تھے۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: چونکہ رات میں سردی وغیرہ کی بناء پر اٹھنا تکلیف دہ طور پر پریشانی کا سبب ہوتا ہے اس لئے آپ ﷺ نے ایک پیالہ اس کام کے لئے مخصوص کر لیا تھا، چنانچہ جب آپ ﷺ کو رات میں پیشاب کی حاجت ہوتی تھی اس پیالہ میں پیشاب کر لیا کرتے تھے۔ اور اگر حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو یہاں بھی تعلیم امت ہی مقصد سامنے آئے گا کہ آپ ﷺ نے اپنے طرز عمل سے اُمت کے لئے یہ آسانی پیدا کر دی ہے کہ جب رات میں پیشاب کی حاجت ہو اور سردی وغیرہ کی تکلیف کی بناء پر باہر نکلنا دشوار ہو تو کسی برتن وغیرہ میں پیشاب کر لیا جائے اور صبح اٹھ کر اسے پھینک دیا جائے تاکہ ایک طرف تو تکلیف اور پریشانی میں مبتلاء ہونے سے بچا جائے اور دوسری طرف رات میں بیت الخلاء جانے سے بچ جائیں جو شیاطین کا مسکن ہے اور شیاطین دن کے مقابلہ میں رات کو زیادہ ضرر اور تکلیف پہنچانے کا سبب ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اُمت کے لئے یہ تعلیم سرکار دو عالم ﷺ کی اسی جذبہ رحمت و شفقت کی مرہون منت ہے جو اعمال و افعال کے ہر مرحلہ پر آسانی و سہولت کی صورت میں نظر آتی ہے۔

منقول ہے کہ ایک صحابی نادانستہ طور پر آپ ﷺ کا پیشاب اسی پیالہ میں سے پی گئے تھے جس کا اثر یہ ہوا کہ جب تک وہ زندہ رہے ان کے بدن سے خوشبو آتی رہی اور نہ صرف ان کے بدن سے بلکہ کئی نسلوں تک انکی اولاد کے بدن میں بھی وہی خوشبو باقی رہی۔

(۲۹) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ رَاٰنِى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَبُوْلُ قَائِمًا فَقَالَ يَا عُمَرُ لَا تَبُلْ قَائِمًا فَمَا بُلْتُ قَائِمًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ ابْنُ مَاجَةَ قَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ مُحْيِ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ قَدْ صَحَّ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ اَتَى النَّبِيُّ ﷺ سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، قِيْلَ كَانَ ذٰلِكَ لِعُذْرٍ۔

"اور حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے (ایک روز) مجھے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ "عمر! کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا کرو" چنانچہ اس کے بعد میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا (ابن ماجہ، ترمذی) امام محی السنۃؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہؓ سے منقول ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ ایک قوم کی کوڑی پر گئے اور وہاں کھڑے ہو کر پیشاب کیا (بخاری و مسلم) کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ فعل (کھڑے ہو کر پیشاب کرنا) کسی عذر کی بناء پر تھا۔"

تشریح: متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مکروہ ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ مکروہ تحریمی ہے یا مکروہ تنزیہی چنانچہ بعض علماء کہتے ہیں کہ مکروہ تحریمی ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے۔

---

[1] امیمہ بنت رقیقہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہمشیرہ کی صاحبزادی ہیں۔

جہاں تک حضرت عمرؓ کے فعل کا تعلق ہے اس کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ چونکہ ایام جاہلیت میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا طریقہ رائج تھا اور ان کو وہی عادت پڑی ہوئی تھی اس لئے انہوں نے کھڑے ہو کر پیشاب کر لیا، یا ہو سکتا ہے کہ کسی عذر کی بنا پر انہوں نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا ہو۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ کے متعلق بھی حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا ہے اس سلسلہ میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے بھی کسی عذر کی بنا پر ایسا کیا ہوگا، اور علماء نے وہ اعذار بھی لکھے ہیں چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ چونکہ وہاں نجاست کی وجہ سے آپ نے بیٹھنے کی جگہ نہیں پائی اس لئے کھڑے ہو کر پیشاب کر لیا۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پیر مبارک میں درد تھا اور بعض حضرات کی تحقیق کے مطابق پیٹھ میں درد تھا، اس کی بناء پر آپ ﷺ بیٹھ نہیں سکتے تھے اس لئے کھڑے ہو کر پیشاب کر لیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۳۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَنْ حَدَّثَكُمْ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَبُوْلُ قَائِمًا فَلَا تُصَدِّقُوْهُ مَا كَانَ يَبُوْلُ اِلَّا قَاعِدًا۔ (رواہ احمد و الترمذی و النسائی)

"حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جو شخص یہ حدیث بیان کرے کہ سرکار دو عالم ﷺ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے تو اسے سچ نہ مانو آپ ﷺ نے تو ہمیشہ بیٹھ کر پیشاب کیا۔"

تشریح: امام محی السنۃ نے حضرت حذیفہؓ کی جو روایت نقل فرمائی ہے اس سے تو بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا ہے لیکن حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث اس بات کی بالکل نفی کر رہی ہے، اب۔ ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ حضرت عائشہؓ اپنے علم کے مطابق خبر دے رہی ہیں یعنی انہوں نے چونکہ آنحضرت ﷺ کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہوئے کبھی گھر میں نہیں دیکھا تھا اس لئے انہوں نے اس بات کی سرے سے نفی کر دی اور حضرت حذیفہؓ نے جو صورت واقعہ بیان کی ہے وہ باہر سے متعلق ہے اور وہ بھی عذر کی بناء پر نادر ہے، اور ظاہر ہے کہ نادر شی معدوم کی مانند ہے نیز عذر کی بنا پر اسے مستثنیٰ بھی قرار دیا جا سکتا ہے لہٰذا ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض باقی نہیں رہا۔

(۳۱) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ جِبْرِيْلَ اَتَاهُ فِيْ اَوَّلِ مَا اُوْحِيَ اِلَيْهِ فَعَلَّمَهُ الْوُضُوْءَ وَالصَّلٰوةَ فَلَمَّا فَرَغَ مِنَ الْوُضُوْءِ اَخَذَ غُرْفَةً مِنَ الْمَآءِ فَنَضَحَ بِهَا فَرْجَهُ۔ (رواہ احمد و الدار قطنی)

"اور حضرت زید[1] ابن حارثہؓ سرکار دو عالم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام (جب) سے پہلی وحی کے موقع پر آپ کے پاس تشریف لائے تو آپ کو وضو کرنا سکھایا، پھر نماز پڑھنی سکھائی چنانچہ جب وہ وضو سے فارغ ہوئے تو ایک چلو پانی لیا اور اس کو اپنی شرم گاہ پر چھڑک لیا۔" (احمد، دار قطنی)

تشریح: حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آدمی کی شکل میں آئے اور انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے وضو کیا اور نماز پڑھی تاکہ یہ دیکھ کر آپ ﷺ بھی سیکھ جائیں اسی طرح انہوں نے خدا کی جانب سے ان دونوں چیزوں کی تعلیم آپ ﷺ کو دی پھر اس کے ساتھ ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے وضو کے بعد شرم گاہ پر یا ستر کی جگہ کپڑے کے اوپر وضو کے بعد پانی چھڑک کر بھی آپ کو دکھایا

[1] اسم گرامی زید بن حارثہ، کنیت ابو اسامہ ہے عظیم صحابی ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متبنی بننے کا شرف حاصل ہوا ہے غزوہ موتہ کے موقع پر سرزمین شام میں آٹھ ہجری کو آپ نے شہادت پائی شہادت کے وقت آپ کی عمر ۵۵ سال کی تھی۔

تاکہ دفع وسواس کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جائے۔

(۳۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَآءَ جِبْرِیْلُ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِذَا تَوَضَّأْتَ فَانْتَضِحْ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ وَسَمِعْتُ مُحَمَّدًا یَعْنِی الْبُخَارِیَّ یَقُوْلُ الْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ الْهَاشِمِیُّ الرَّاوِیْ مُنْكَرُ الْحَدِیْثِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "میرے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا" "اے محمد (ﷺ) جب آپ ﷺ وضو کریں تو تھوڑا سا پانی (شرم گاہ پر دفع وسواس کے لئے چھڑک لیا کیجئے" (ترمذی) اور امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث منکر ہے اور میں نے محمدؒ (یعنی امام بخاریؒ) کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس حدیث کے ایک راوی حسن بن علی ہاشمی منکر الحدیث ہیں۔"

(۳۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ بَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ عُمَرُ خَلْفَهٗ بِكُوْزٍ مِنْ مَآءٍ فَقَالَ مَا هٰذَا یَا عُمَرُ قَالَ مَآءٌ نَتَوَضَّأُ بِهٖ قَالَ مَا اُمِرْتُ كُلَّمَا بُلْتُ اَنْ اَتَوَضَّأَ وَلَوْ فَعَلْتُ لَكَانَتْ سُنَّةً۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ نے پیشاب کیا، حضرت عمر فاروقؓ پانی کا لوٹا لے کر آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہوئے، آنحضرت ﷺ نے پوچھا "عمرؓ یہ کیا ہے؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا آپ (ﷺ) کے وضو کے لئے پانی ہے۔" آپ نے فرمایا مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ جب میں پیشاب کروں تو وضو بھی کروں، اگر میں ایسا کروں تو یہ (میرا فعل سُنّت ہو جاتا)۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مجھے بطریق وجوب اور فرض کے یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ جب بھی پیشاب کروں تو اس کے بعد وضوء بھی کروں اور اگر میں اپنی طرف سے یہ فعل اختیار کر لیتا ہوں تو پھر ہر مرتبہ پیشاب کے بعد وضو کرنا سُنّت مؤکدہ ہو جائے گا، بہر حال یہاں سُنّت سے مراد سُنّت مؤکدہ ہی ہے، کیونکہ ویسے تو پانی سے استنجاء کرنا اور ہر وقت باوضو رہنا تمام علماء کے نزدیک متفقہ طور پر مستحب ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ ادنیٰ چیزوں کو اپنی اُمّت کی آسانی اور سہولت کی خاطر کبھی ترک فرما دیتے تاکہ وہ چیزیں اُمّت کے لئے کہیں ضروری نہ ہو جائیں۔

(۳۴) وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ وَ جَابِرٍ وَ اَنَسٍ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰیَةَ لَمَّا نَزَلَتْ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَثْنٰی عَلَیْكُمْ فِی الطُّهُوْرِ فَمَا طُهُوْرُكُمْ قَالُوْا نَتَوَضَّأُ لِلصَّلٰوةِ وَنَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَنَسْتَنْجِیْ بِالْمَآءِ قَالَ فَهُوَ ذَاكَ فَعَلَیْكُمُوْهُ۔ (رواہ ابن ماجۃ، التوبہ ۱۰۸)

"حضرت ابوایوب، جابر، حضرت انسؓ راوی ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ یعنی مسجد قبا میں ایسے مرد (انصاری) ہیں جو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ خوب پاکی حاصل کریں اور اللہ خوب پاکی حاصل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے تو سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "اے انصار کی جماعت! اللہ تعالیٰ نے پاکی کے معاملہ میں تمہاری تعریف کی ہے تمہاری پاکی کیا ہے؟ اور انہوں نے عرض کیا "ہم نماز کے لئے وضو کرتے ہیں، جنابت (ناپاکی) سے غسل کرتے ہیں (جیسا کہ دوسرے مسلمان کرتے ہیں) اور (ڈھیلے کے بعد) پانی سے استنجاء کرتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا" ہاں! وہ یہی ہے، لہٰذا اسے لازم پکڑو۔" (ابن ماجہ)

تشریح: انصار کی عادت تھی کہ وہ پیشاب و پاخانہ کے بعد ڈھیلوں سے صفائی کے بعد پانی سے بھی استنجاء کرتے تھے، اس بنا پر ان کی فضیلت اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی اور انصار کی اس فضیلت کا اظہار ہوا تو آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ آخر وہ کونسی پاکیزگی ہے جسے

حاصل کرنے کے بعد تم اس سعادت کے حقدار ہوئے ہو، جب انہوں نے پاکیزگی کی تفصیل بتائی تو آپ ﷺ نے ان کی تصدیق کر دی کہ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں تمہاری تعریف کی ہے اور پھر بعد میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ بھلائی اور بہتری اسی میں ہے کہ اس سعادت کو ہمیشہ باقی رکھو یعنی جس طرح تم لوگ پاکی حاصل کرتے ہو اسی طرح ہمیشہ حاصل کرتے رہو۔

(۳۵) وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ بَعْضُ الْمُشْرِكِيْنَ وَهُوَ يَسْتَهْزِئُ اِنِّیْ لَاَرٰی صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ حَتَّى الْخِرَآءَةَ قُلْتُ اَجَلْ اَمَرَنَا اَنْ لَّا نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ وَلَا نَسْتَنْجِيَ بِاَيْمَانِنَا وَلَا نَكْتَفِيَ بِدُوْنِ ثَلَاثَةِ اَحْجَارٍ لَيْسَ فِيْهَا رَجِيْعٌ وَلَا عَظْمٌ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَاَحْمَدُ وَاللَّفْظُ لَهُ)

"اور حضرت سلمان ؓ فرماتے ہیں کہ مشرکوں میں سے ایک شخص نے بطور استہزاء یہ کہا کہ میں تمہارے سردار (یعنی آنحضرت ﷺ) کو دیکھتا ہوں تو وہ تمہیں ہر چیز سکھاتے ہیں یہاں تک کہ پاخانہ میں بیٹھنے کی صورت بھی میں نے کہا! ہاں آپ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ (استنجے کے وقت) ہم قبلہ کی طرف رخ کر کے نہ بیٹھیں، اپنے دائیں ہاتھوں سے استنجاء پاک نہ کریں، تین پتھروں سے کم میں استنجاء نہ کریں اور ان پتھروں میں نجاست (یعنی پاخانہ، لید گوبر) نہ ہو اور نہ ہڈی ہو۔" (مسلم احمد الفاظ احمد کے ہیں)

تشریح: اگر مذہب کی بنیاد پر حقیقت کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ مذہب اور دین دراصل نام ہے ایک مکمل ضابطہ حیات کا، اور ایک دستور کامل ہے نظام زندگی کا جس میں انسانوں کے لئے دین اور دنیا دونوں جگہ کے لئے مکمل رہبری کامل راہنمائی اور ہمہ گیر ہدایات ہوں۔

اگر چند مخصوص اعتقادات پر چند مخصوص عبادات اور چند اعمال کا نام، مذہب اور دین، رکھ دیا جائے تو وہ کامل و مکمل مذہب و دین ہی نہیں بلکہ انسانی دماغ کے اختراعات اور نظریات کا مجموعہ ہے۔

اسلام دوسرے تمام مذاہب میں اگر اپنی کوئی امتیازی شان رکھتا ہے اگر دوسرے دینوں پر کوئی تفوق و برتری رکھتا ہے اور اگر دوسری شریعتوں میں اکملیت کا کوئی درجہ رکھتا ہے تو وہ اسلام کی شان ہمہ گیریت اور اس کی شان جامعیت ہے مسلمانوں کو چھوڑیئے وہ تو اسلام کے پیروہی ہیں۔ دنیا کے وہ دانشور اور عقلاء بھی اسلام کے اعتقادات و احکامات کے پابند و متبع نہیں ہیں، آج اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب میں اور دنیا کی تمام شریعتوں میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب اور دین ہے جو انسانوں کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات ایک نظام زندگی اور کائنات کے ہر شعبہ پر حاوی ایک مجموعہ ہدایات ہے جو انسانی زندگی کے ہر چھوٹے وبڑے مسئلہ کی رہبری کرتا ہے۔

چنانچہ اسلام اگر ایک طرف اعتقادات ونظریات کی انتہائی بلندی تک جن وانس کی راہنمائی کرتا ہے، عبادات و احکامات کے بلند و بالا نظام کا تفوق بخشتا ہے، تو دوسری طرف زندگی کی ان چھوٹی راہوں کی بھی معرفت عطا کرتا ہے جو دنیا والوں کی نظر میں حقیر ہیں، جن کی طرف دوسرے مذاہب آنکھ بھی نہیں اٹھاتے۔

دیکھئے ایک بے بصیرت اور عقل و دانائی کا دشمن مشرک، مسلمانوں کا یہی تو مزاق اڑا رہا ہے کہ شارع اسلام کی شان عظمت کا بھی کوئی تقاضا ہے کہ وہ ہر چیز کو سکھاتے پھریں، یہاں تک کہ وہ پیشاب و پاخانہ تک کے مسائل اور ان کے طور طریقے بتاتے ہیں حضرت سلمان فارسی ؓ، اسی کا جواب دے رہے ہیں کہ اے بے خبر و نادان انسان! یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے، استہزاء کا مقام نہیں ہے، تجھے کیا معلوم کہ ہمارے سردار ہم پر کتنے شفیق ہیں؟ ہم پر کتنے مہربان ہیں؟ اُمت پر انتہائی شفقت و محبت ہی کی یہ وجہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ پر ہماری راہنمائی فرماتے ہیں۔

اگر ایک طرف آپ ﷺ توحید و رسالت کے عقائد اور نماز روزہ، زکوٰۃ، اور حج جیسے دینی اصول کے احکام و مسائل ہمیں بتاتے ہیں تو دوسری طرف پیشاب و پاخانہ جیسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے آداب بھی بتائے ہیں اور ہدایات اور راہنمائی کا یہی تو وہ مقام ہے جو آپ ﷺ کی ذات کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ پیشاب و پاخانہ کے وقت ہم قبلہ کی طرف پشت ورخ کر کے نہ بیٹھیں کہ اس سے قبلہ کے احترام پر حرف آتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کیا جائے کیونکہ یہ چیز پاکیزگی و نظافت کے منافی ہے کہ جس ہاتھ سے کھانا کھایا جائے اسی ہاتھ سے گندگی و غلاظت کی صفائی کی جائے۔

آپ ﷺ نے اسے بہتر قرار دیا ہے کہ تین ڈھیلوں یا پتھروں سے کم میں استنجاء نہ کیا جائے کہ صفائی و پاکیزگی کا تقاضا یہی ہے اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ استنجاء کے ڈھیلوں میں لید و گوبر اور دوسری نجاست نہ ہو کہ اس سے بجائے پاکیزگی حاصل ہونے کے اور زیادہ غلاظت و گندگی لگے گی اور ہڈی سے استنجاء نہ کیا جائے کیونکہ ہڈی جنات کی خوراک ہے۔

(۳۶) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَسَنَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْ يَدِهِ الدَّرَقَةُ فَوَضَعَهَا ثُمَّ جَلَسَ فَبَالَ اِلَيْهَا فَقَالَ بَعْضُهُمْ اُنْظُرُوْا اِلَيْهِ يَبُوْلُ كَمَا تَبُوْلُ الْمَرْاَةُ فَسَمِعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ وَيْحَكَ اَمَا عَلِمْتَ مَا اَصَابَ صَاحِبَ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ كَانُوْا اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَوْلُ قَرَضُوْهُ بِالْمَقَارِيْضِ فَنَهَاهُمْ فَعُذِّبَ فِيْ قَبْرِهٖ۔
(رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ ورواہ النسائی عن ابی موسیٰ)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن حسنہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) سرکار دو عالم ﷺ (گھر سے) نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے (اس وقت) آپ ﷺ کے ہاتھ میں ڈھال تھی، اسے آپ ﷺ (اپنے سامنے زمین پر) رکھ دیا پھر اس کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کیا (یہ دیکھ کر) ایک مشرک نے کہا ان کی طرف دیکھو اس طرح پیشاب کرتے ہیں جیسے عورت پیشاب کرتی ہے یہ بات آنحضرت ﷺ نے سن لی اور فرمایا "تجھ پر افسوس ہے" کیا تو اس چیز کو نہیں جانتا جو بنی اسرائیل کے ساتھی کو پہنچی (یعنی عذاب) بنی اسرائیل (جب پیشاب کرتے اور ان) کے (جسم یا کپڑے کو پیشاب لگ جاتا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے چنانچہ (بنی اسرائیل میں سے ایک) شخص نے (اس حکم کو ماننے سے) لوگوں کو روکا، لہٰذا اسے قبر کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی نے اس حدیث کو عبدالرحمٰن سے اور انہوں نے ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے)

تشریح: بنی اسرائیل کی شریعت میں تھا کہ اگر کسی شخص کے بدن پر نجاست لگ جاتی تو اتنے حصے کے گوشت کو چھیل ڈالتے تھے اور اگر کپڑے پر لگ گئی تو اس جگہ سے کپڑا کاٹ ڈالتے تھے مگر ان میں سے ایک شخص نے اپنی شریعت کے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور وہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے سے روکا کرتا تھا لہٰذا اس بنا پر اسے عذاب قبر میں مبتلا کیا گیا۔

اسی طرف آنحضرت ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ بنی اسرائیل کی شریعت کا وہ قاعدہ اگرچہ شرعی اعتبار سے پسندیدہ تھا مگر چونکہ اس میں مال اور جان کا ضرر ہوتا تھا اس لئے خلاف عقل و دانائی تھا مگر اس کے باوجود شریعت کے اس حکم کو نہ ماننے اور دوسرے لوگوں کو اس سے روکنے پر جب اس شخص پر عذاب قبر نازل کیا گیا تو شرم و حیا نہ کرنا بطریق اولیٰ عذاب کا سبب ہے کیونکہ پیشاب کے وقت پردہ کرنا اور شرم کرنا نہ صرف یہ کہ از راہ شریعت پسندیدہ اور بہتر چیز ہے بلکہ عقل و دانائی کے اعتبار سے بھی اولیٰ و افضل ہے۔

(۳۷) وَعَنْ مَرْوَانَ الْاَصْفَرِ قَالَ رَاَيْتُ ابْنَ عُمَرَ اَنَاخَ رَاحِلَتَهُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ ثُمَّ جَلَسَ يَبُوْلُ اِلَيْهَا فَقُلْتُ يَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَلَيْسَ قَدْ نُهِيَ عَنْ هٰذَا قَالَ بَلْ اِنَّمَا نُهِيَ عَنْ ذٰلِكَ فِي الْفَضَاءِ فَاِذَا كَانَ بَيْنَكَ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ شَيْءٌ يَسْتُرُكَ فَلَا بَاْسَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مروان اصفر فرماتے ہیں کہ میں نے (ایک مرتبہ) حضرت ابن عمرؓ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنا اونٹ قبلہ کی طرف بٹھایا پھر خود بیٹھے اور اونٹ کی طرف پیشاب کیا میں نے (یہ دیکھ کر) عرض کیا "ابو عبدالرحمٰن! (یہ حضرت ابن عمرؓ کی کنیت ہے) کیا اس طرح قبلہ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے سے منع نہیں فرمایا گیا" انہوں نے فرمایا "ہاں جنگل میں اس سے منع فرمایا گیا ہے لیکن جب تمہارے اور قبلہ

کے درمیان کوئی چیز حائل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ قول دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ یہ آنحضرت ﷺ کے اس فعل سے دلیل پکڑتے تھے جسے اس باب کی پہلی حدیث میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو قبلہ کی طرف پشت کر کے پاخانہ کرتے ہو دیکھا تھا اور یہ اسی موقع پر بتایا جاچکا ہے کہ اس فعل میں کئی احتمالات پیدا ہوتے ہیں لہٰذا فعل متحمل کو دلیل کے طور پر پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور پھر اس کی بھی وضاحت کی جاچکی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اکثر احادیث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پیشاب و پاخانہ کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ کرنے کا حکم عام ہے اس میں جنگل کی تخصیص نہیں ہے اسی لئے امام اعظمؒ کا یہی مسلک ہے کہ اس حکم میں جنگل و آبادی سب برابر ہیں قبلہ کی طرف منہ و پشت کرنا ہر جگہ ممنوع ہے خواہ جنگل کا کھلا میدان ہو یا آبادی میں گھرے ہوئے مکانات۔

(۳۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَآءِ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ جب بیت الخلاء سے نکلتے تو یہ دعا پڑھتے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ یعنی تمام تعریفیں خدا ہی کو زیبا ہیں جس نے مجھ سے تکلیف دہ چیز (یعنی پاخانہ) کو دور کیا اور مجھے عافیت بخشی۔" (ابن ماجہ)

تشریح: یوں تو اگر کوئی انسان یہ چاہے کہ وہ خدا کی نعمت کو دائرہ شمار میں لے آئے جو اس پر خدا کی جانب سے ہیں تو یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، پیدائش سے لے کر موت تک انسان کی ساری زندگی اور اس کی حیات کا ایک ایک لمحہ خدائے رحیم و کریم کی بے شمار نعمتوں ہی کا رہین منت ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان خدا کی ان بے شمار اور لامحدود نعمتوں کا شکر بھی بجا طور پر ادا نہیں کر سکتا۔

اب آپ پیشاب و پاخانہ ہی کو لے لیجئے بظاہر تو کتنی معمولی سے چیز ہے، اور کتنی غیر اہم ضرورت مگر ذرا کسی حکیم و ڈاکٹر سے اس کی حقیقت تو معلوم کر کے دیکھ لیجئے، ایک طبی ماہر آپ کو بتائے گا کہ ان معمولی چیزوں پر انسان کی زندگی کا کتنا دارومدار ہے اور انسان کی موت و حیات سے اس کا کتنا گہرا تعلق ہے؟ اگر کسی شخص کا کچھ عرصہ کے لئے پیشاب بند ہو جائے، یا کسی کا پاخانہ رک جائے تو اس کی زندگی کے لالے پڑ جاتے ہیں اور، خدانخواستہ اگر اس عرصہ میں غیر معمولی امتداد پیدا ہو جائے تو پھر اس کی زندگی موت کی آغوش میں سوتی نظر آتی ہے۔

تو کیا؟ یہ خدا کا ایک عظیم انعام اور اس کا بہت بڑا فضل و کرم نہیں ہے کہ وہ اس تکلیف دہ چیز کو انسان کے جسم سے تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد کتنی آسانی سے خارج کرتا رہتا ہے، تو یہ کیسے ممکن تھا کہ خدا کے رسول کی وہ زبان جو اس کی چھوٹی چھوٹی نعمتوں پر ہر وقت ادائے شکر و سپاس میں مشغول رہتی تھی اس کی عظیم الشان نعمت پر شکر سے قاصر رہتی۔

چنانچہ یہ حدیث یہی بتا رہی ہے کہ آپ ﷺ جب بھی بیت الخلاء سے باہر نکلتے، خدا کا شکر ادا کرتے کہ اے الٰہ العٰلمین! دنیا کی تمام تعریفیں تیرے ہی لئے زیبا ہیں، تمام حمد و ثناء کا تو ہی مستحق ہے، اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ تیری ذات اپنے بندوں کے لئے سراسر لطف و کرم اور رحمت و شفقت ہے... جس کا ایک ادنیٰ سا اظہار یہ بھی ہے کہ تو نے اس وقت محض اپنے فضل و کرم سے ایک تکلیف دہ چیز کو میرے جسم سے خارج کیا اور اس طرح مجھے سکون و اطمینان عطا فرمایا اور عافیت بخشی۔

بعض احادیث میں آپ ﷺ سے یہ دعا بھی منقول ہے جسے آپ ﷺ بیت الخلا سے باہر آنے کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّیْ مَا یُؤْذِیْنِیْ وَاَبْقٰی عَلَیَّ مَا یَنْفَعُنِیْ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے زیبا ہیں جس نے مجھ سے تکلیف دہ چیز کو دور کیا اور وہ چیز باقی رکھی جو میرے لئے فائدہ مند ہے۔

غذا ہضم ہونے پر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، ایک بڑا حصہ وہ ہوتا ہے جو فضلہ بن جاتا ہے، دوسرا حصہ جو غذا کا اصل جوہر ہوتا ہے وہ خون وغیرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے اس پر زندگی کی بقا منحصر ہوتی ہے، چنانچہ اس دعا میں غذا کی انہی دونوں حصوں کی جانب اشارہ فرمایا گیا

ہے۔

اگر ان دونوں نعمتوں کا کوئی شخص خیال کرے تو اسے احساس ہو کہ یہ کتنی اہمیت کی حامل ہیں لیکن افسوس کہ آج ایسے کتنے ہی بے حس و لاپرواہ انسان ملیں گے جن کے دماغ و شعور میں ان کا تصور بھی نہیں ہوگا۔

(۳۹) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ وَفْدُ الْجِنِّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْهَ اُمَّتَكَ اَنْ يَسْتَنْجُوْا بِعَظْمٍ اَوْ رَوْثَةٍ اَوْ حُمَمَةٍ فَاِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ لَنَا فِيْهَا رِزْقًا فَنَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَالِكَ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب جنات کی جماعت سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) اپنی اُمت کو منع فرما دیجئے کہ وہ گوبر، ہڈی اور کوئلہ سے استنجاء نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں ہمارا رزق پیدا کیا ہے" چنانچہ آن حضرت ﷺ نے ہمیں ان (چیزوں کے استعمال) سے منع فرمایا۔" (ابوداؤد)

تشریح: ہڈی جنات کی خوارک ہے جس سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں، اسی طرح لید ان کے جانوروں کی خوارک ہے نیز کوئلے سے بھی چونکہ جنات فائدہ اٹھاتے ہیں مثلاً کوئلہ سے کھانا وغیرہ پکاتے ہیں یا اس سے روشنی کرتے ہیں اس لئے اس کو بھی رزق میں شمار کیا گیا ہے۔

بَابُ السِّوَاكِ
مسواک کرنے کا بیان

یوں تو مسواک کرنا متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک سُنّت ہے مگر حنفیہ کے نزدیک خاص طور پر وضو کے لئے امام شافعیؒ کے نزدیک وضوء و نماز کے وقت مسواک کرنا مسنون ہے، نیز نماز فجر اور نماز ظہر سے پہلے بھی مسواک کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے، مسواک کرنے میں بڑی خیر و برکت اور بہت فضیلت ہے چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ مسواک کرنے کی فضیلت میں چالیس احادیث وارد ہوئی ہیں، پھر نہ صرف یہ کہ مسواک کرنا ثواب کا باعث ہے بلکہ اس سے جسمانی طور پر بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں چنانچہ مسواک کرنے سے منہ پاک و صاف رہتا ہے، منہ کے اندر بدبو پیدا نہیں ہوتی، دانت سفید و چمک دار ہوتے ہیں، مسوڑوں میں قوت پیدا ہوتی ہے اور دانت مضبوط ہو جاتے ہیں۔

ویسے تو ہر حال میں مسواک کرنا مستحب اور بہتر ہے مگر بعض حالتوں میں اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے مثلاً وضو کرنے کے وقت، قرآن شریف پڑھنے کے لئے، دانتوں پر زردی اور میل چڑھ جانے کے وقت اور سونے، چپ رہنے، بھوک لگنے یا بدبودار چیز کھانے کے سبب منہ کا مزہ بگڑ جانے کی حالت میں مسواک زیادہ مستحب اور اولیٰ ہے۔

مسواک کرنے کے کچھ آداب و طریقے ہیں چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ کسی مجلس و مجمع میں اس طرح مسواک کرنا کہ منہ سے رال ٹپکی ہو مکروہ ہے خصوصاً علماء اور بزرگوں کے قریب اس طرح مسواک کرنا مناسب نہیں ہے۔

مسواک کڑوے درخت مثلاً نیم وغیرہ کی ہونی چاہئے، پیلو کے درخت کی مسواک زیادہ بہتر ہے، چنانچہ احادیث میں بھی پیلو کی مسواک کا ذکر آیا ہے نیز حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ پیلو کی مسواک کی جائے مسواک کا سرا چھنگلیا کی طرح ہونا چاہئے اور مسواک کی لمبائی ایک بالشت کے برابر ہونی چاہئے، مسواک دانتوں کی چوڑائی پر کرنی چاہئے لمبائی پر مسواک نہ کی جائے کیونکہ اس طرح مسواک کرنے سے مسوڑھے چھل جاتے ہیں۔

" مسواک کرنے کے وقت کے بارے میں اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ جب وضو شروع کیا جائے تو کلی کے وقت مسواک کرنی چاہئے

مگر بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وضو کرنے سے پہلے ہی مسواک کر لینی چاہئے، نیز مسواک کرنے میں مستحب ہے کہ مسواک دائیں طرف سے شروع کی جائے۔

اگر کسی شخص کے پاس مسواک نہ ہو یا دانت ٹوٹے ہوئے ہوں تو ایسی حالت میں انگلی سے دانت یا مسوڑھوں کو صاف کرنا چاہئے، یا اسی طرح مسواک کو نرم کرنے کے لئے اگر کوئی پتھر نہ ملے اور ایسی شکل میں مسواک کرنا ممکن نہ ہو تو دانت کو ایسی چیزوں سے صاف کر لیا جائے جو منہ کی بدمزگی کو دور کر دیں جیسے موٹا کپڑا اور منجن وغیرہ یا صرف انگلی ہی سے صاف کر لے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُهُمْ بِتَاخِیْرِ الْعِشَآءِ وَ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اگر میں اپنی اُمت پر اس بات کو مشکل نہ جانتا تو مسلمانوں کو یہ حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز دیر سے پڑھیں اور ہر نماز کے لئے مسواک کریں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: عشاء کی نماز کو تاخیر سے پڑھنا اور ہر نماز کے وقت مسواک کرنا مستحب اور بڑی فضیلت کی بات ہے اسی طرف یہ حدیث اشارہ کر رہی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اگر مجھے اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ میری اُمت دشواری میں مبتلاء ہو جائے گی تو میں یہ فرض قرار دیتا کہ تمام مسلمان عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھا کریں" اب تاخیر کی حد کیا ہے؟ اس بارے میں حضرت امام شافعیؒ کے علاوہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ تہائی یا آدھی رات تک عشاء کی نماز پڑھنا مستحب ہے۔

دوسری بات آپ ﷺ مسواک کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ اگر اس معاملہ میں بھی تنگی و مشکلات کا خوف نہ ہوتا تو اس بات کا اعلان کر دیتا کہ ہر نماز کے وقت یعنی ہر نماز کے وضو کے وقت مسواک کرنا فرض ہے۔

لیکن آپ ﷺ چونکہ اُمت کے حق میں سراپا رحمت و شفقت ہیں اس لئے آپ نے ان چیزوں کو فرض کا درجہ نہیں دیا کہ فرض ہونے کی شکل میں مسلمان تنگی اور تساہلی کی بناء پر ان فرائض پر عمل نہیں کر سکیں گے نتیجے کے طور پر گناہ گار ہوں گے، لہٰذا ان کو صرف مستحب ہی قرار دیا کہ اگر کوئی شخص ان پر عمل نہ کرے اس سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا اور کوئی خدا کا بندہ اس پر عمل پیرا ہو جائے تو یہ اس کے حق میں سرا سر سعادت و نیک بختی کی بات ہوگی۔

② وَعَنْ شُرَیْحِ بْنِ هَانِیءٍ قَالَ سَاَلْتُ عَآئِشَةَ بِاَیِّ شَیْءٍ كَانَ یَبْدَاُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ بَیْتَهٗ قَالَ بِالسِّوَاكِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت شریح ابن ھانی راوی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ سرکار دو عالم ﷺ جب اپنے گھر میں تشریف لاتے تو پہلے کیا کرتے؟ انہوں نے فرمایا کہ سب سے پہلے آپ ﷺ مسواک کرتے۔" (مسلم)

تشریح: آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ ﷺ اپنے گھر میں تشریف لاتے تو سب سے پہلے مسواک کرتے اور یہ آپ ﷺ کے مزاج اقدس کی انتہائی نظافت کی دلیل تھی کہ اگر مجلس مبارک میں خاموش بیٹھنے یا لوگوں سے گفتگو کرنے کی وجہ سے منہ کے اندر کچھ تغیر آ گیا ہو تو وہ دور ہو جائے۔

اگر آپ ﷺ کے اس فعل مبارک کی حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو یہاں بھی تعلیم اُمت کا مقصد سامنے آئے گا لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ انتہائی پاکیزگی و صفائی کے ساتھ رہا کریں یہاں تک کے آپس میں گفتگو و کلام کرنے اور ملنے جلنے کے لئے

مسواک کر لیا کریں تاکہ کوئی شخص منہ کی بدمزگی یا بو کے تغیر کی وجہ سے تکلیف محسوس نہ کرے۔

مسواک کی فضیلت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ منقول ہے کہ مسواک کرنے کے ستر فائدے ہیں جن میں سب سے ادنی اور کم درجہ فائدہ یہ ہے کہ مسواک کرنے والا شخص موت کے وقت کلمہ شہادت کو یاد رکھے گا جس کی بناء پر اس کا خاتمہ یقیناً خیر پر ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کہ افیون کھانے کے ستر نقصان ہیں جن میں سب سے ادنٰی اور کم تر نقصان یہ ہے کہ افیون کھانے والا شخص موت کے وقت کلمۂ شہادت بھول جائے گا، العیاذ باللہ

حضرت علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے یہ تاکید ہے کہ وہ جب گھر میں داخل ہو تو اسے چاہئے کہ وہ سب سے پہلے مسواک کرے کیونکہ اس سے منہ میں بہت زیادہ خوشبو پیدا ہو جاتی ہے جس سے گھر والوں کے ساتھ حسن سلوک میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۳) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ لِلتَّهَجُّدِ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوْصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب رات تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے تو اپنے منہ مسواک سے ملتے اور دھوتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

(۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَاِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَالسِّوَاكُ وَ اِسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَقَصُّ الْاَظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَنَتْفُ الْاِبِطِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَآءِ يَعْنِي الْاِسْتِنْجَآءَ وَقَالَ الرَّاوِيُ وَنَسِيْتُ الْعَاشِرَةَ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ الْمَضْمَضَةَ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةِ الْخِتَانُ بَدَلَ اِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ لَمْ اَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَلَا فِيْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَلٰكِنْ ذَكَرَهَا صَاحِبُ الْجَامِعِ وَكَذَا الْخَطَّابِيُّ فِيْ مَعَالِمِ السُّنَنِ عَنْ اَبِيْ دَاؤُدَ۔ (بروایۃ عمار بن یاسر)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "دس چیزیں فطرت میں سے ہیں (یعنی دین کی باتیں) (۱) لبوں کے بال کٹوانا (۲) داڑھی کا بڑھانا (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی دینا (۵) ناخن کٹوانا (۶) جوڑوں کی جگہ کو دھونا (۷) بغل کے بال صاف کرنا (۸) زیر ناف بالوں کا مونڈنا (۹) پانی کا کم کرنا یعنی پانی کے ساتھ استنجاء کرنا" راوی یعنی مصعب یا زکریا کا بیان ہے کہ دسویں چیز کو میں بھول گیا، ممکن ہے کہ وہ کلی کرنا ہو۔ (مسلمؒ) اور ایک روایت میں (دوسری چیز) "داڑھی بڑھانے" کے بجائے "ختنہ کرانا" ہے اور (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ "مجھے یہ روایت نہ صحیحین یعنی بخاریؒ و مسلمؒ میں ملی ہے اور نہ کتاب حمیدی میں (جو صحیحین کی جامع ہے، البتہ اس روایت کو صاحب جامع الاصول نے (اپنی کتاب میں) ذکر کیا ہے، اسی طرح خطابیؒ نے معالم السنن میں ابوداؤد کے حوالہ سے حضرت عمار ابن یاسر کی روایت کے ساتھ نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں جن دس چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ تمام چیزیں پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعت میں سُنّت تھیں اور آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی شریعت یعنی دین اسلام میں بھی سُنّت ہیں چنانچہ اکثر علماء کے نزدیک فطرت کے یہی معنی ہیں، دوسری شروحات میں اس کے علاوہ علماء کے دوسرے اقوال بھی منقول ہیں لیکن طوالت کی بناء پر یہاں سب کو ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

پہلی چیز لبوں کے بال یعنی مونچھوں کا کٹوانا ہے، اس سلسلہ میں مختار مسلک "یہی ہے مونچھیں کتروائی جائیں اور اس طرح کتروائی جائیں کہ اوپر کے ہونٹ کا کنارہ معلوم ہونے لگے۔

امام اعظمؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ مونچھیں بھوؤں کی برابر رکھنی چاہئیں، البتہ غازیوں اور مجاہدوں کو زیادہ مونچھیں بھی رکھنی جائز ہے کیوں کہ زیادہ مونچھیں دشمن کی نظر میں دہشت کا باعث ہوتی ہیں اور اس سے ان پر رعب چھا جاتا ہے، مونچھوں کا اتنا زیادہ کٹوانا کہ ان کا نشان بھی باقی نہ رہے یا بالکل منڈوانا مکروہ ہے بلکہ بعض علماء کے نزدیک حرام ہے مگر بعض علماء نے اسے سُنّت بھی کہا ہے۔

دوسری چیز داڑھی کا بڑھانا ہے، اس کے بارے میں علماء کا فیصلہ ہے کہ داڑھی کی لمبائی ایک مٹھی کے برابر ہونا ضروری ہے اس سے کم نہ

ہونی چاہئے اگر مٹھی سے زیادہ بھی ہو جائز ہے بشرطیکہ حد اعتدال سے نہ بڑھ جائے۔
داڑھی کو منڈ دانا یا پست کرنا حرام ہے کیونکہ یہ اکثر مشرکین مثلاً انگریز و ہندو کی وضع ہے، اسی طرح منڈی ہوئی یا پست داڑھی ان لوگوں کی وضع ہے جنہیں دین سے کوئی حصہ نصیب نہیں ہے کہ جن کا شمار "گروہ قلندری رمد مشرب" میں ہوتا ہے۔
داڑھی کے بال ایک مٹھی کے برابر چھوڑنا واجب ہے اسے سُنّت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت سُنّت سے ہے جیسے نماز عید کو سُنّت کہتے ہیں حالانکہ عید واجب ہے۔
اگر لمبائی یا چوڑائی میں کچھ بال آگے بڑھ کر بے ترتیب ہو جائیں تو ان کو کترو اکر برابر کرنا جائز ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ انہیں بھی نہ کترو ایا جائے، اگر کسی عورت کے داڑھی نکل آئے تو اسے صاف کر ڈالنا مستحب ہے۔
تیسری چیز مسواک کرنا ہے، اس کے متعلق پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ مسواک کرنا بالاتفاق علماء کے نزدیک سُنّت ہے، بلکہ داؤد نے تو اسے واجب کہا ہے، حضرت شاہ اسحٰقؒ نے اس سے بھی بڑھ کر یہ بات کہی ہے کہ اگر کوئی شخص مسواک کو قصداً چھوڑ دے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔
چوتھی چیز ناک میں پانی دینا ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ وضو کے لئے ناک میں پانی دینا مستحب ہے اور غسل کے لئے ناک میں پانی دینا فرض ہے یہی حکم کلی کا بھی ہے کہ وضو میں کلی کرنا سُنّت ہے اور غسل میں فرض ہے۔
پانچویں چیز ناخن کا کٹوانا ہے، ناخن کسی طرح بھی کٹوائے جائیں اصل سُنّت ادا ہو جائے گی لیکن اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ ناخن کٹوانے کے وقت یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ سب سے پہلے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کے ناخن کٹوائے جائیں اس کے بعد بیچ کی انگلی کے اس کے بعد اس کے پاس کی انگلی کے پھر چھنگلیا کے پھر بعد میں انگوٹھے کے ناخن کٹوائے جائیں، اس کے بعد بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن اس طرح کٹوائے جائیں کہ سب سے پہلے چھنگلیا کے اس کے بعد اس کے پاس کی انگلی اس کے بعد بیچ کی انگلی اس کے بعد شہادت کی انگلی اور پھر بعد میں انگوٹھے کے ناخن کٹوائے جائیں۔
بعض علماء نے یہ طریقہ بھی لکھا ہے کہ سب سے پہلے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ناخن کٹوانا شروع کرے اور چھنگلیا پر پہنچ کر روک دے پھر بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے شروع کرے اور اس کے انگوٹھے تک پہنچ کر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر ختم کر دے۔
اسی طرح پیر کے ناخن اس طرح کٹوانا چاہئے کہ پہلے دائیں پیر کی چھنگلیا سے کٹوانا شروع کرے اور آخر میں بائیں پیر کی چھنگلیا پر لے جا کر ختم کرے بعض علماء نے لکھا ہے کہ جمعہ کے روز ناخن کترو انا مستحب ہے، کچھ حضرات نے ناخن کٹوا کر ان کو زمین میں دفن کر دینے کو بھی مستحب لکھا ہے، اگر ناخن پھینک دیئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن ان کو پاخانہ میں یا غسل کی جگہ میں پھینکنا مکروہ ہے۔
چھٹی چیز براجم یعنی جوڑوں کی جگہ کو دھونا ہے، براجم کہتے ہیں انگلیوں کی گانٹھوں (جوڑوں) کو اور اس کے اوپر کی کھال کو جو چنٹ دار ہوتی ہے اس میں اکثر میل جمع ہوتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ ہاتھ سے کام کاج زیادہ کرتے ہیں ان کی انگلیاں سخت ہو جاتی ہیں اور ان میں میل جم جاتا ہے، لہٰذا ان کو دھونے کی تاکید فرمائی جا رہی ہے، اسی طرح بدن کے وہ اعضاء جن میں میل جم جانے کا گمان ہو جیسے کان، بغل، ناف ان کو بھی دھونے کا یہی حکم ہے۔
ساتویں چیز بغل کے بالوں کو صاف کرنا ہے، اس سلسلہ میں لفظ نتف استعمال فرمایا گیا ہے، نتف بال اکھاڑنے کو کہتے ہیں، چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ بغل کے بالوں کو منڈوانا سُنّت نہیں ہے بلکہ ان کو ہاتھ سے اکھاڑنا سُنّت ہے مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ بغل کے بالوں کو ہاتھ سے اکھاڑنا اس شخص کے لئے افضل ہے جو اس کی تکلیف کو برداشت کر سکتا ہو، ویسے بغل کے بالوں کا منڈوانا یا نورے سے صاف کرنا بھی جائز ہے۔
آٹھوں چیز زیر ناف بالوں کو مونڈنا ہے، یہ بھی سُنّت ہے، زیر ناف بال، اگر منڈانے کی بجائے اکھاڑے جائیں، یا نورے سے صاف

کیے جائیں تو بھی ان کے حکم میں شامل ہوں گے مگر قینچی سے کاٹنے میں سُنّت ادا نہیں ہوتی۔ مقعد (پاخانہ کے مقام) کے گرد جو بال ہوتے ہیں ان کو بھی صاف کرنا مستحب ہوتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ زیر ناف بال نورے[1] سے صاف کیا کرتے تھے واللہ اعلم۔

عورتوں کو زیر ناف بال اکھاڑنا اولیٰ ہے کیونکہ اس سے خاوند کو رغبت زیادہ ہوتی ہے، نیز عورت کے اندر چونکہ خواہشات نفسانی اور شہوت ننانوے حصّہ ہوتی ہے اور مرد میں صرف ایک حصّہ ہوتی ہے اور یہ عطے ہے کہ زیر ناف بال اکھاڑنے سے شہوت کم ہوتی ہے اور مونڈنے سے قوی ہوتی ہے، لہٰذا عورت کے مناسب حال یہی ہے کہ وہ بال اکھاڑے اور مرد کے مناسب حال یہ ہے کہ وہ مونڈے۔

زیر ناف بال مونڈنے، بغل کے بال اکھاڑنے، مونچھیں کتروانے اور ناخن کٹوانے کی مدت زیادہ سے زیادہ چالیس دن ہونی چاہئے، چالیس دن کے اندر اندر ان کو صاف کر لینا چاہئے اس سے زیادہ مدت تک انہیں چھوڑے رکھنا مکروہ ہے۔

نویں چیز پانی کا کم کرنا یعنی پاکی کے ساتھ استنجاء کرنا ہے اِنْتِقَاصُ الْمَآءِ کے دو مطلب ہیں ایک تو یہی جو راوی نے بیان کئے ہیں یعنی پانی کے ساتھ استنجاء کرنا چونکہ استنجاء کرنے میں پانی خرچ ہوتا ہے اور کم ہو جاتا ہے اس لئے اس اِنْتِقَاصُ الْمَآءِ (پانی کا کم کرنا) سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسرے معنی یہ ہیں کہ پانی کے استعمال یعنی استنجاء کرنے کی بناء پر پیشاب کو کم کرنا، مطلب یہ ہے کہ پانی سے استنجاء کرنے کی وجہ سے پیشاب کے قطرے رک جاتے ہیں اس طرح پیشاب میں کمی ہو جاتی ہے۔

ایک دوسری روایت میں انتقاص کی جگہ لفظ انتقاص آیا ہے اس کے معنی ہیں ستر کے اوپر پانی چھڑکنا جیسا کہ پہلی حدیثوں میں گزر چکا ہے، بہرحال یہ دونوں چیزیں بھی سُنّت ہیں۔

ختنہ کرنا امام شافعیؒ کے نزدیک واجب ہے، اکثر علماء کے نزدیک مرد و عورت دونوں کو امام اعظمؒ کے نزدیک مرد کو ختنہ کرنا سُنّت ہے عورت کو مکرمہ یعنی اولیٰ ہے۔

ختنہ چونکہ شعائر اسلام میں سے ہے اس لئے اگر کسی شہر کے تمام ہی لوگ ختنہ ترک کر دیں تو امام وقت کو ان کے ساتھ جنگ کرنی چاہئے تا آنکہ وہ لوگ اس اسلامی شعائر کو اختیار کر لیں جیسے آذان کے بارے میں حکم ہے۔

ختنہ کرنے کی عمر اور وقت کے تعین میں علماء کے یہاں اختلاف ہے، بعض علماء، کے نزدیک پیدائش کے ساتویں دن ختنہ کر دینا چاہئے جیسے عقیقہ ساتویں دن ہوتا ہے، بعض حضرات کے نزدیک سال اور بعض کے نزدیک نو سال کی مدت ہے، بعض علماء کہتے ہیں کہ اس میں کوئی قید نہیں ہے، جب چاہے ختنہ کر دیا جائے، گویا بالغ ہونے سے پہلے پہلے جب بھی وقت اور موقع ہو ختنہ کرایا جا سکتا ہے، امام اعظمؒ کے نزدیک اس صورت میں بلوغ سے پہلے کی شرط بطور خاص ہے کیونکہ ختنہ کرنا سُنّت ہے اور بالغ ہونے کے بعد ستر چھپانا واجب ہے اس لئے اگر کوئی شخص بالغ ہونے کے بعد ختنہ کرائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے ایک سنت کو ادا کرنے کے لئے واجب کو ترک کر دیا حالانکہ سُنّت کی ادائیگی کے لئے واجب کو ترک کر دینا جائز نہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

⑤ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلسِّوَاكُ مُطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَ اَحْمَدُ وَ الدَّارِمِيُّ وَ النَّسَائِيُّ وَرَوَى الْبُخَارِيُّ فِيْ صَحِيْحِهٖ بِلَا اِسْنَادٍ۔

"حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "مسواک کرنا، منہ کی پاکی کا سبب ہے اور پروردگار کی خوشنودی کا باعث ہے" شافعیؒ، احمدؒ، دارمیؒ، نسائیؒ) اور امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اپنی صحیح (جامع بخاری میں بغیر سند کے نقل کیا ہے۔"

⑥ وَعَنْ اَبِيْ اَيُّوْبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ مِّنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ اَلْحَيَاءُ وَيُرْوَى الْخِتَانُ

[1] نورہ ایک خاص مرکب چیز کو کہتے ہیں جو ہڑتال اور چونے سے ملا کر بنائی جاتی تھی جس سے بال اڑ جاتے ہیں۔

وَالتَّعَطُّرُ وَالسِّوَاكُ وَالنِّكَاحُ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوایوبؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا" چار چیزیں رسولوں کے طریقہ میں سے ہیں ① حیا کرنا (ایک روایت میں) ختنہ کرنا مروی ہے (یعنی اس روایت میں تو اَلْحَيَاءُ کا لفظ ہے اور بعض روایت میں اس کے بجائے اَلْخِتَانُ کا لفظ آیا ہے۔ ② خوشبو لگانا ③ مسواک کرنا ④ نکاح کرنا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا کہ چار چیزیں رسولوں کے طریقہ میں سے ہیں اکثر کے اعتبار سے ہے کیونکہ بعض انبیاء ایسے بھی تھے جن کے یہاں ان میں سے کچھ چیزیں نہیں پائی جاتی تھیں مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا تھا۔

یہاں حیا سے مراد ہے کہ بندہ اپنے نفس کو برائی سے الگ رکھے اور بری باتوں سے بچتا رہے۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت شیث علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حنظلہ بن صفوان جو "اصحاب الرس" کے نبی تھے اور سرکار دو عالم ﷺ مختون ہی اس دنیا میں تشریف لائے تھے، یعنی انبیاء و رسول ختنہ کئے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔

سرکار دو عالم ﷺ کے بارے میں بعض علماء کا قول ہے کہ پیدا ہونے کے بعد آپ ﷺ کا ختنہ ہوا ہے، آنحضرت ﷺ چونکہ نظافت و لطافت کے انتہائی بلند مقام پر تھے اس لئے آپ ﷺ کو خوشبو زیادہ مرغوب تھی، چنانچہ منقول ہے کہ آپ خوشبو کے لئے مشک استعمال فرماتے تھے۔

شریعت محمدی ﷺ میں نکاح کی بہت زیادہ اہمیت ہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے نکاح کو اپنی سُنّت قرار دیتے ہوئے اس بات کا اعلان فرمادیا ہے کہ جو شخص میری اس سُنّت سے اعراض کرے گا یعنی نکاح نہیں کرے گا تو وہ میری اُمّت میں سے نہیں ہے۔

حضرت علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے نکاح کے فضائل و مناقب میں منقول جو احادیث جمع کی ہیں ان کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْقُدُ مِنْ لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ فَيَسْتَيْقِظُ اِلَّا يَتَسَوَّكُ قَبْلَ اَنْ يَتَوَضَّأَ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب رات اور دن میں سو کر اٹھتے تو وضو کرنے سے پہلے مسواک کرتے۔"

(احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ دن میں بھی قیلولہ کے وقت آرام فرماتے تھے، چنانچہ دن میں تھوڑا بہت سو لینا اور قیلولہ کے وقت آرام کرنا سُنّت ہے کیونکہ اس کی وجہ سے رات میں خدا کی عبادت کے لئے اٹھنے میں آسانی ہوتی ہے جیسے کہ سحری کھا لینے سے روزہ آسان ہو جاتا ہے۔

نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سو کر اٹھنے کے بعد مسواک کرنا سنت مؤکدہ ہے کیونکہ سونے کی وجہ سے منہ میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور بو میں فرق آ جاتا ہے اس لئے مسواک کرنے سے منہ صاف ہو جاتا ہے۔

اب اس میں احتمال ہے کہ آپ ﷺ پھر وضوء کے لئے دوبارہ مسواک کرتے تھے یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ اسی مسواک پر اکتفا فرماتے ہوں اور وضوء کے وقت دوبارہ مسواک نہ کرتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وضو کے ارادہ کے وقت یا وضو میں کلی کرتے وقت دوبارہ مسواک کرتے ہوں۔ واللہ اعلم۔

⑧ وعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَاكُ فَيُعْطِيْنِي السِّوَاكَ لِأَغْسِلَهٗ فَاَبْدَأُ بِهٖ فَاَسْتَاكُ ثُمَّ اَغْسِلُهٗ وَاَدْفَعُهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ مسواک کرتے اور پھر مجھے دے دیتے تاکہ میں اسے دھوڈالوں چنانچہ میں (آپ سے مسواک لے کر) پہلے اس سے خود مسواک کرتی پھر دھوتی اور آنحضرت ﷺ کو دے دیتی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کے لئے دلیل ہے کہ مسواک کرنے کے بعد اس کو دھونا مستحب ہے، حضرت ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ تین مرتبہ مسواک کی جائے اور ہر مرتبہ اسے پانی سے دھولیا جائے تاکہ اس کا میل کچیل دور ہوتا رہے اور یہ کہ مسواک نرم ہونی چاہئے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ ﷺ سے مسواک لے کر دھونے سے پہلے اپنے منہ میں اس لئے پھیرتی تھیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کی لعاب مبارک کی برکت حاصل ہو، پھر اسے دھو کر آپ ﷺ کو دے دیتی تھیں تاکہ مسواک پوری طرح نہ کی ہو تو اسے مکمل کرلیں۔

یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ کسی دوسرے کی مسواک اس کی رضامندی سے استعمال کرلینا مکروہ نہیں ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صالحین اور بزرگوں کے لعاب وغیرہ سے برکت حاصل کرنا اچھی بات ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑨ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرَانِيْ فِي الْمَنَامِ اَتَسَوَّكُ بِسِوَاكٍ فَجَآءَنِيْ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا اَكْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ فَنَاوَلْتُ السِّوَاكَ الْاَصْغَرَ مِنْهُمَا فَقِيْلَ لِيْ كَبِّرْ فَدَفَعْتُهٗ اِلَى الْاَكْبَرِ مِنْهُمَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ (ایک دن) سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "میں نے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا کہ میں مسواک کر رہا ہوں (اس اثناء میں) دو آدمی میرے پاس آئے، ان میں کا ایک آدمی دوسرے سے بڑا تھا، میں نے ان میں سے چھوٹے کو مسواک دینے کا ارادہ کیا مگر مجھ سے کہا گیا کہ بڑے کو مسواک دو، چنانچہ میں نے ان میں سے بڑے کو مسواک دی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے مسواک کی بزرگی اور فضیلت کا اظہار ہو رہا ہے اس لئے کہ اسے بڑے کو دینے کا حکم کیا جانا اس بات پر دال ہے کہ یہ ایک افضل اور بہترین چیز ہے جب ہی تو بڑے کو جو چھوٹے سے افضل و اعلیٰ تھا، دیئے جانے کا حکم کیا گیا۔

اس حدیث نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ کھانا وغیرہ دینے، خوشبو لگانے یا ایسی ہی دوسری چیزوں میں ابتداء بڑے سے ہی کرنی چاہئے۔

⑩ وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا جَآءَنِيْ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَطُّ اِلَّا اَمَرَنِيْ بِالسِّوَاكِ لَقَدْ خَشِيْتُ اَنْ اُحْفِيَ مُقَدَّمَ فِيَّ۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابی امامہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جبرئیل علیہ السلام جب بھی میرے پاس آتے مجھے مسواک کرنے کا حکم دیتے (یہاں تک کہ) یہ مجھے خوف ہوا کہ (کہیں مسواک کی زیادتی سے) میں اپنے منہ کے اگلے حصہ کو چھیل نہ ڈالوں۔" (احمدؒ)

تشریح: مسواک کی اہمیت اور اس کی فضیلت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب بھی آنحضرت ﷺ کے پاس تشریف لاتے آپ ﷺ کو مسواک کرنے کا حکم دیتے اور آنحضرت ﷺ اس حکم کی بنا پر کثرت سے مسواک کرتے، چنانچہ آپ یہی فرما رہے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بار بار حکم اور اس شدت سے تاکید کی بناء پر میں مسواک اتنی کثرت سے استعمال کرتا ہوں کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ مسواک کی زیادتی سے کہیں میرا منہ نہ چھل جائے۔

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ اَكْثَرْتُ عَلَيْكُمْ فِي السِّوَاكِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "میں نے تم سے مسواک کے متعلق بہت کچھ بیان کیا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مقصد مسواک کی فضیلت و اہمیت کو بتانا ہے اور اس پر تاکید فرمائی ہے کہ مسواک زیادہ سے زیادہ کرنی چاہئے اس لئے کہ کسی چیز کو بار بار بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ چیز بڑی اہمیت و فضیلت کی حامل ہے۔

(۱۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَنُّ وَعِنْدَهُ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا اَكْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ فَاُوْحِيَ اِلَيْهِ فِيْ فَضْلِ السِّوَاكِ اَنْ كَبِّرْ اَعْطِ السِّوَاكَ اَكْبَرَهُمَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ مسواک کر رہے تھے اور آپ ﷺ کے پاس دو آدمی تھے جن میں ایک دوسرے سے بڑا تھا چنانچہ مسواک کی فضیلت میں آپ ﷺ کی طرف یہ وحی نازل فرمائی گئی کہ بڑے کو مقدم رکھو اور ان دونوں میں سے بڑے کو مسواک دو۔" (ابوداؤدؒ)

(۱۳) وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَفْضُلُ الصَّلَاةُ الَّتِيْ يُسْتَاكُ لَهَا عَلَى الصَّلَاةِ الَّتِيْ لَا يُسْتَاكُ لَهَا سَبْعِيْنَ ضِعْفًا۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "وہ نماز جس کے لئے مسواک کی گئی (یعنی وضو کے وقت) اس نماز پر جس کے لئے مسواک نہیں کی گئی ستر درجے کی فضیلت رکھتی ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: اس حدیث سے بھی مسواک کی فضیلت کا اظہار ہو رہا ہے کہ مسواک کی وجہ سے نماز کے مراتب و درجات میں کمی بیشی ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر کسی شخص نے ایک نماز تو اس طرح پڑھی کہ اس نے اس نماز کے لئے وضو کے وقت مسواک اور ایک نماز اس طرح پڑھی کہ اس کے لئے وضو کے وقت مسواک نہیں کی تو پہلے نماز جس کے لئے مسواک کی گئی ہے اس نماز کے مقابلہ میں جس کے لئے مسواک نہیں کی گئی فضیلت اور ثواب کی زیادتی میں ستر درجہ زیادہ ہوگی" گویا دوسری نماز کے مقابلہ میں پہلی نماز کا ثواب ستر گنا زیادہ ملے گیا۔

(۱۴) وَعَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَلَاَخَّرْتُ صَلَاةَ الْعِشَاءِ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ قَالَ فَكَانَ زَيْدُ بْنُ خَالِدٍ يَشْهَدُ الصَّلَوٰتِ فِي الْمَسْجِدِ وَسِوَاكُهُ عَلٰى اُذُنِهِ مَوْضِعَ الْقَلَمِ مِنْ اُذُنِ الْكَاتِبِ لَا يَقُوْمُ اِلَى الصَّلٰوةِ اِلَّا اسْتَنَّ ثُمَّ رَدَّهُ اِلٰى مَوْضِعِهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ اَبُوْدَاوُدَ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ وَلَاَخَّرْتُ صَلَاةَ الْعِشَاءِ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔ (رواہ ابوداؤد و الترمذی)

"حضرت ابوسلمہؓ[۱] حضرت زید ابن خالد الجہنیؓ[۲] سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اگر میں اپنی اُمت کے لئے اسے مشکل نہ جانتا تو میں ان کو ہر نماز کے لئے مسواک کرنے کا حکم دیتا (یعنی یہ اعلان کرتا کہ ہر نماز کے وقت مسواک کرنا واجب ہے) اور عشاء کی نماز میں تہائی رات تک تاخیر کرنا۔ راوی کا بیان ہے کہ (اس کے بعد) زید ابن خالدؓ نماز کے لئے مسجد میں

---

[۱] حضرت ابوسلمہ تابعی ہیں، بعمر ۷۲ سال ۹۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

[۲] حضرت زید ابن خالد جہنیؓ مشہور صحابی ہیں کنیت ابوعبدالرحمٰن بعمر ۸۵ سال بعہد عبدالملک ۷۸ھ میں اور بعض کے خیال کے مطابق حضرت معاویہؓ کے آخری زمانہ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

آتے تو مسواک ان کے کان پر رکھی ہوتی جس طرح کاتب کے کان پر قلم رکھا رہتا ہے، جب وہ نماز کو کھڑے ہوتے فوراً مسواک کر لیتے اور پھر کان پر رکھ لیتے (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ) ابوداؤد نے لَاَخَّرْتُ صَلٰوۃَ الْعِشَآءِ اِلٰی ثُلُثِ اللَّیْلِ کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

باب سنن الوضوء
وضو کی سنتوں کا بیان

یہاں وضو کی سنتوں سے مراد آنحضرت ﷺ کے وہ افعال و اقوال ہیں جو آپ ﷺ سے وضو کے بارے میں منقول ہیں خواہ ان کا تعلق وضو کے فرائض سے ہو یا سُنّت سے یا آداب وضو سے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَیْقَظَ اَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهٖ فَلَا یَغْمِسْ یَدَهٗ فِی الْاِنَاءِ حَتّٰی یَغْسِلَهَا ثَلَاثًا فَاِنَّهٗ لَا یَدْرِیْ اَیْنَ بَاتَتْ یَدُهٗ۔ (متفق علیه)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص سو کر اٹھے تو (اسے چاہئے کہ) اپنے ہاتھ کو پانی کے برتن میں نہ ڈالے جب تک اسے (پہنچوں تک) تین بار دھو نہ لے، اس لئے کہ اسے نہیں معلوم کہ رات بھر اس کا ہاتھ کہاں رہا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ وضو سے پہلے ہاتھوں کو دھونا سُنّت ہے، جہاں تک سو کر اٹھنے کے بعد کی قید کا سوال ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں پانی کی قلت ہوتی ہے، خاص طور پر زمانہ نبوت میں تو پانی بہت ہی کم مقدار میں دستیاب ہوتا تھا، اس لئے اکثر و بیشتر لوگ پانی سے استنجاء نہیں کرتے تھے پہلے ڈھیلوں سے یا پتھروں سے صاف کر لیا کرتے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ گرم ہوا کی بنا پر سوتے میں استنجاء کے مقام پر پسینہ آجاتا ہے، اس صورت میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ رات میں سوتے وقت ہاتھ استنجاء کے مقام پر پہنچ جائے جس سے ہاتھ گندے ہو جائیں جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سونے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا ہاتھ رات کو سوتے وقت کہاں رہا اس لئے آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو چاہئے کہ وہ پہلے اپنے ہاتھوں کو پانی کے برتن میں نہ ڈال دے بلکہ ہاتھ تین مرتبہ دھو ڈالے تاکہ وہ پاک و صاف ہو جائیں اس کے بعد برتن سے پانی لے کر وضو کرلے۔

بہر حال یہاں نیند کی قید تو اس لئے ہے کہ اس میں ہاتھوں کو نجاست لگنے کا احتمال ہے ورنہ ہر ایک وضو کرنے والے کو پہلے تین مرتبہ ہاتھ دھونا چاہئے اس لئے کہ علماء لکھتے ہیں کہ اس طرح ہاتھ دھونا اس شخص کے لئے بھی سُنّت ہے جو سو کر نہ اٹھا ہو کیونکہ ہاتھ دھونے کا سبب یعنی ہاتھ کو نجاست و میل لگنے کا احتمال جاگنے کی حالت میں بھی موجود ہے۔

ہاتھ دھونے کا یہ حکم فرض اور واجب نہیں ہے بلکہ مسنون کے درجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس کا حکم احتیاط کے طور پر دیا ہے اگر کوئی شخص ہاتھ نہ دھوئے تو بھی وہ پاک ہے کہ اگر بغیر دھوئے ہاتھ پانی میں ڈال دے تو اس سے پانی ناپاک و نجس نہیں ہوتا کیونکہ سوتے میں ہاتھ کا ناپاک ہونا یقینی نہیں ہے بلکہ احتمال کے درجہ کی چیز ہے مگر حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ سو کر اٹھنے کے بعد ہاتھ کا دھونا واجب ہے، اگر کوئی شخص سو کر اٹھا اور اس نے بغیر دھوئے ہاتھ پانی میں ڈال دیا تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔

② وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَیْقَظَ اَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهٖ فَتَوَضَّأَ فَلْیَسْتَنْثِرْ ثَلَاثًا فَاِنَّ

الشَّیْطَانَ یَبِیْتُ عَلٰی خَیْشُوْمِہٖ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی سو کر اٹھے اور وضو کا ارادہ کرے تو تین مرتبہ (ناک میں پانی دے کر) ناک کو جھاڑے اس لئے کہ اس کی ناک کے بانسے پر شیطان رات گزارتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: انسان کی ناک کے بانسے پر شیطان کا رہنا اور اس پر رات گزارنے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی حقیقت و کیفیت کا علم تو اللہ اور اس کے رسول ہی کو ہے اس کے رموز و اسرار کی معرفت سے ہماری عقلیں قاصر ہیں۔ لہٰذا ایسے امور کے معاملہ میں جن کی خبر شارع علیہ السلام نے دی ہے۔ بہتر اور اولیٰ طریقہ یہی ہے کہ صرف ان کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے ان پر ایمان لایا جائے اور ان کی حقیقت و کیفیت کے بیان کرنے میں سکوت اختیار کیا جائے۔

بعض حضرات نے اس کی بڑی دلچسپ تاویل بھی کی ہے، مثلاً یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان سو جاتا ہے تو بخارات، رینٹھ اور گرد و غبار ناک میں جمع ہو جاتے ہیں جو دماغ کا قریبی حصہ ہے اس کی بنا پر دماغ جو حواس و شعور کی جگہ ہے مکدر ہو جاتا ہے اور یہ چیز تلاوت قرآن کے آداب کو کما حقہ، ادا کرنے اور اس کے معنی و مطلب کے سمجھنے میں مانع ہوتی ہے، نیز یہ عبادات کی ادائیگی میں سستی اور کسل کا باعث بھی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں شیطان کی منشا کے عین مطابق اور اس کی خوشی کا باعث ہیں، اس لئے اس مشابہت سے کہا گیا ہے کہ سونے والے کی ناک کے بانسہ کے اوپر رات بھر شیطان بیٹھا رہتا ہے۔ بہرحال یہ احتمالات ہیں، ان پر بھی کوئی یقینی حکم نہیں لگایا جا سکتا اس لئے بہتر اور اولیٰ طریقہ وہی ہے جو پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

(۴۳) وَقِیْلَ لِعَبْدِاللّٰہِ بْنِ زَیْدِ بْنِ عَاصِمٍ کَیْفَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَتَوَضَّأُ فَدَعَا بِوَضُوْءٍ فَاَفْرَغَ عَلٰی یَدَیْہِ فَغَسَلَ یَدَیْہِ مَرَّتَیْنِ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ وَجْھَہٗ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ یَدَیْہِ مَرَّتَیْنِ اِلَی الْمِرْفَقَیْنِ ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَہٗ بِیَدِہٖ فَاَقْبَلَ بِھِمَا وَاَدْبَرَ بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِہٖ ثُمَّ ذَھَبَ بِھِمَا اِلٰی قَفَاہُ ثُمَّ رَدَّھُمَا حَتّٰی رَجَعَ اِلَی الْمَکَانِ الَّذِیْ بَدَأَ مِنْہُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَیْہِ رَوَاہُ مَالِکٌ وَالنَّسَائِیُّ وَلِاَبِیْ دَاوٗدَ نَحْوُہٗ ذَکَرَہٗ صَاحِبُ الْجَامِعِ وَفِی الْمُتَّفَقِ عَلَیْہِ قِیْلَ لِعَبْدِاللّٰہِ بْنِ زَیْدِ بْنِ عَاصِمٍ تَوَضَّأْ لَنَا وُضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَدَعَا بِاِنَاءٍ فَاَکْفَأَ مِنْہُ عَلٰی یَدَیْہِ فَغَسَلَھُمَا ثَلَاثًا ثُمَّ اَدْخَلَ یَدَہٗ فَاسْتَخْرَجَھَا فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ کَفٍّ وَاحِدَۃٍ فَفَعَلَ ذٰلِکَ ثَلَاثًا ثُمَّ اَدْخَلَ یَدَہٗ فَاسْتَخْرَجَھَا فَغَسَلَ وَجْھَہٗ ثَلَاثًا ثُمَّ اَدْخَلَ یَدَہٗ فَاسْتَخْرَجَھَا فَغَسَلَ یَدَیْہِ اِلَی الْمِرْفَقَیْنِ مَرَّتَیْنِ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ اَدْخَلَ یَدَہٗ فَاسْتَخْرَجَھَا فَمَسَحَ بِرَأْسِہٖ فَاَقْبَلَ بِیَدَیْہِ وَاَدْبَرَ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَیْہِ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ثُمَّ قَالَ ھٰکَذَا کَانَ وُضُوْءُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَاَقْبَلَ بِھِمَا وَاَدْبَرَ بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِہٖ ثُمَّ ذَھَبَ بِھِمَا اِلٰی قَفَاہُ ثُمَّ رَدَّھُمَا حَتّٰی رَجَعَ اِلَی الْمَکَانِ الَّذِیْ بَدَأَ مِنْہُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا بِثَلَاثِ غَرَفَاتٍ مِنْ مَّاءٍ وَفِیْ اُخْرٰی فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ کَفَّۃٍ وَاحِدَۃٍ فَفَعَلَ ذٰلِکَ ثَلَاثًا وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِلْبُخَارِیِّ فَمَسَحَ رَأْسَہٗ فَاَقْبَلَ بِھِمَا وَاَدْبَرَ مَرَّۃً وَاحِدَۃً ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَیْہِ اِلَی الْکَعْبَیْنِ وَفِیْ اُخْرٰی لَہٗ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ غُرْفَۃٍ وَاحِدَۃٍ۔

"اور حضرت عبداللہ بن زید بن عاصمؓ[1] سے پوچھا گیا کہ سرکار دو عالم کس طرح وضو فرمایا کرتے تھے (یہ سن کر) حضرت عبداللہؓ نے وضو کا پانی منگوایا (جب پانی آ گیا تو) انہوں نے دونوں ہاتھوں پر (پانی) ڈالا اور انہیں پہنچوں تک) دو دو مرتبہ دھویا پھر کلی کی اور پانی ڈال کر ناک کو جھاڑا تین مرتبہ پھر اپنا منہ تین مرتبہ دھویا، پھر اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک دو، دو مرتبہ دھوئے، پھر دونوں ہاتھوں سے سر کا مسح کیا (اسی طرح کہ) دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے تک لے گئے اور پیچھے سے آگے تک لائے یعنی انہوں نے اپنے سر کی اگلی جانب سے شروع کیا اور دونوں ہاتھوں کو گدی تک لے گئے پھر ان کو (پھیر کر) اسی جگہ واپس لائے جہاں سے شروع کیا تھا اور پھر دونوں پاؤں کو دھویا۔ (مالکؒ،

---

[1] اسم گرامی عبداللہ بن زید بن عاصم ہے ابن ام عمارہ کے نام سے مشہور ہیں، ابو محمد کنیت ہے، آپ بزمانہ یزید ۶۴ھ میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

نسائیؒ ابوداؤدؒ) اور بخاری و مسلم میں یہ روایت اس طرح ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عاصمؓ سے کہا گیا کہ جس طرح آنحضرت ﷺ وضو کرتے تھے اسی طرح آپ ہمارے سامنے وضو کریں، چنانچہ عبداللہ بن زید نے (پانی کا) برتن منگوایا (جب پانی کا برتن آگیا تو) انہوں نے اسے جھکایا اور اس سے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈال کر انہیں تین مرتبہ دھویا پھر ہاتھ برتن میں داخل کیا اور اس سے پانی نکالا پھر (اسی) ایک چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی دیا اس طرح انہوں نے تین مرتبہ کیا، پھر انہوں نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈال کر پانی نکالا اور تین مرتبہ منہ دھویا، پھر انہوں نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈال کر نکالا اور سر کا مسح (اس طرح) کیا کہ اپنے دونوں ہاتھ آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی طرف لائے، اور پھر اپنے دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا، پھر فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کا یہی وضو تھا اور بخاریؒ و مسلم کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ "(مسح کے لئے) اپنے ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی طرف لائے یعنی اپنے سر کے اگلے حصہ سے (مسح) شروع کیا اور (ہاتھوں کو) گدی کی طرف لے گئے پھر گدی کی طرف سے وہیں لے آئے جہاں سے (مسح) شروع کیا تھا اور پھر اپنے پاؤں کو دھویا" صحیحین کی ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ "کلی کی ناک میں پانی دیا اور ناک تین مرتبہ جھاڑی تین چلوؤں سے ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ "پس کلی کی اور ایک ہی چلو سے ناک میں پانی ڈالا،" اس طرح تین مرتبہ کیا۔ بخاریؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "پس سر کا مسح کیا (اس طرح کہ) اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور آگے سے پیچھے کی طرف لے آئے اور یہ ایک مرتبہ کیا پھر دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا" بخاری ہی کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں بس کلی کی اور ناک جھاڑی تین مرتبہ صرف ایک چلو سے۔"

تشریح: اس حدیث کے پہلے جزو سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت عبد اللہ بن زید بن عاصمؓ، نے ہاتھوں کو دو مرتبہ دھویا حالانکہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں دوسری روایتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ہاتھ تین مرتبہ دھوتے تھے، اس سلسلہ میں علماء یہ تاویل کرتے ہیں کہ سُنّت تو تین ہی مرتبہ دھونا ہے مگر چونکہ دو مرتبہ بھی دھولینا جائز ہے اس لئے حضرت عبداللہ نے بیان جواز کے لئے اپنے ہاتھوں کو پہنچوں تک دو مرتبہ دھویا۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ دو مرتبہ دھونا جائز ہے۔

اس سلسلہ میں مَرَّتَيْنِ کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے، حالانکہ ایک ہی مرتبہ لانا کافی تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر لفظ مرتین صرف ایک ہی مرتبہ ذکر کیا جاتا تو اس سے یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ دونوں ہاتھ متفرق طور دو مرتبہ دھوئے ہوں گے، یعنی ایک مرتبہ ایک ہاتھ دھویا اور ایک مرتبہ ایک دھویا، لہٰذا اس وہم سے بچانے کے لئے مرتین کو دو مرتبہ ذکر کیا تاکہ یہ بات صاف ہو جائے کہ دونوں ہاتھ ملا کر دو مرتبہ دھوئے۔

سر کے مسح کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کی تین انگلیاں سر کے آگے کی جانب رکھی جائیں اور دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو اور شہادت کی انگلیوں کو نیز ہتھیلیوں کو سر سے جدا رکھا جائے اس طرح ان چھ انگلیوں کو پیچھے گدی کی طرف لے جایا جائے پھر، دو ہتھیلیاں سر کے پچھلے حصہ پر رکھ کر آگے کی طرف لائی جائیں اور پھر دونوں کانوں کے اوپر کے حصہ پر دونوں انگوٹھوں سے اور کانوں کے دونوں سوراخوں میں شہادت کی انگلیوں سے مسح کیا جائے۔

وفی المتفق علیہ کے بعد جو روایتیں نقل کی گئی ہیں وہ صاحب مصابیح کی نقل کردہ نہیں ہیں بلکہ صاحب مشکوٰۃ نے ان کا اضافہ کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ماقبل کی روایت باوجود یکہ بخاریؒ و مسلمؒ میں منقول نہیں ہے مگر صاحب مصابیح نے انہیں صحاح یعنی فصل اوّل میں نقل کیا ہے اس لئے مصنف مشکوٰۃ ان روایتوں کا جو بخاریؒ و مسلم میں منقول ہیں آگے اضافہ کر دیا ہے تاکہ ترتیب صحیح رہے۔

بخاریؒ کی آخری روایت جس کے الفاظ یہ ہیں۔ "پس کلی کی اور ناک جھاڑی تین مرتبہ ایک چلو سے" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک ہی چلو سے ناک میں تین مرتبہ پانی دے کر اسے جھاڑا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین دفعہ میں ہر مرتبہ ایک ایک چلو سے ناک میں پانی دے کر اسے جھاڑا یعنی تین مرتبہ کے لئے تین ہی چلو بھی استعمال کئے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات جان لینی چاہئے کہ کلی کرنے اور ناک میں پانی دینے کے بارے میں مختلف احادیث منقول ہیں، چنانچہ بعض احادیث میں کلی کرنا اور پھر تین چلو سے ناک میں پانی دینا اور بعض روایات میں ایک ہی چلو سے فصل و وصل کے ساتھ منقول ہے یعنی تین چلو سے کلی کرنا اور پھر تین چلو سے ناک میں پانی دینا بھی حدیث سے ثابت ہے اور یہ دونوں ایک ہی چلو سے بھی ثابت ہے، اس طرح اسکی کئی صورتیں ہیں، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک قول صحیح کے مطابق یہ ہے کہ دونوں تین چلو میں کئے جائیں اس طرح کے پہلے ایک چلو پانی لیا جائے اور اس میں تھوڑے پانی سے کلی کر لی جائے اور بقیہ پانی ناک میں ڈالے پھر دوسرا چلو اور اور تیسرا چلو لے کر اسی طرح کیا جائے۔

حضرت امام اعظمؒ کا مذہب یہ ہے کہ ہر ایک تین تین چلو سے کئے جائیں یعنی کلی کے لئے تین چلو استعمال کئے جائیں اور پھر ناک میں پانی دینے کے لئے بھی تین ہی چلو الگ سے استعمال کئے جائیں۔

امام اعظم علیہ الرحمۃ نے اس طریقہ کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ قیاس کے مطابق ہے اس لئے کہ منہ اور ناک دونوں علیحدہ علیحدہ عضو ہیں لہٰذا جس طرح دیگر اعضاء وضو کو جمع نہیں کیا جاتا اسی طرح ان دونوں عضو کو بھی جمع نہیں کیا جائے گا اور اصل فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جو حدیث قیاس کے موافق ہو اسے ترجیح دی جائے۔

جہاں تک شوافع اور حنفیہ کے مذہب میں تطبیق کا تعلق ہے اس سلسلہ میں شمنی نے فتاویٰ ظہیریہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ امام اعظمؒ کے یہاں وصل بھی جائز ہے یعنی امام شافعیؒ کا جو مسلک ہے وہ امام اعظمؒ کے نزدیک بھی صحیح ہے، اسی طرح امام شافعیؒ کے یہاں فصل بھی جائز ہے، یعنی جو مسلک امام اعظمؒ کا ہے وہ امام شافعیؒ کا یہاں بھی صحیح اور جائز ہے۔

نیز ترمذیؒ حضرت امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ کلی کرنے اور ناک میں پانی دینے کو ایک ہی چلو کے ساتھ جمع کرنا جائز ہے لیکن میں اسے زیادہ پسند کرتا ہوں کہ ان دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ چلو استعمال کئے جائیں، اس قول سے صراحت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو گئی کہ حنفیہ اور شوافع کے مسلک میں کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔

(۴) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ تَوَضَّأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّةً مَرَّةً لَمْ يَزِدْ عَلٰى هٰذَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک ایک مرتبہ وضو کیا (یعنی تمام اعضاء وضو کو صرف ایک ایک مرتبہ دھویا) اور اس پر زیادہ نہیں کیا۔" (بخاریؒ)

(۵) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبداللہؓ بن زیدؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے دو، دو مرتبہ وضو کیا (یعنی اعضاء وضو کو دو دو بار دھویا)۔" (بخاریؒ)

(۶) عَنْ عُثْمَانَ اَنَّهٗ تَوَضَّأَ بِالْمَقَاعِدِ فَقَالَ اَلَا اُرِيْكُمْ وُضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے مقام مقاعد میں وضو کیا اور کہا کہ کیا تمہیں آنحضرت ﷺ کا وضو نہ دکھلاؤں؟ چنانچہ انہوں نے تین تین مرتبہ وضو کیا (یعنی انہوں نے اعضاء وضو کو تین تین بار دھو کر بتایا کہ آنحضرت ﷺ اس طرح وضو فرماتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اعضاء وضو کو کبھی ایک ایک مرتبہ دھوتے تھے کبھی دو دو مرتبہ دھوتے تھے اور کبھی تین تین مرتبہ دھوتے تھے، اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ اکثر تین تین مرتبہ ہی دھوتے تھے۔

ؓ اسم گرامی عبداللہ بن زید بن عبد ربہ ہے اور کنیت ابو محمد ہے آپ انصاری ہیں اور آپ صحابی ہیں۔ ۳۲ھ میں بعمر ۶۴ سال آپ کی وفات ہوئی۔

ان میں تطبیق اس طرح ہوگی کے آپ ﷺ کا اعضاء وضو کو کبھی کبھی ایک ایک مرتبہ دھونا بیان جواز کے لئے تھا یعنی اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ ایک ایک مرتبہ دھونا جائز ہے اور اس طرح وضو ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ادنیٰ درجہ ہے اور فرض بھی ایک ایک مرتبہ ہی دھونا ہے، اسی طرح دو دو مرتبہ بھی بیان جواز کے لئے دھوتے تھے کہ اس طرح بھی وضو ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر تین تین مرتبہ اس لئے دھوتے ہیں کہ یہ طہارت کا انتہائی درجہ ہے، لہٰذا اعضاء وضو کو تین تین مرتبہ دھونا سُنّت ہے اور اس پر زیادتی کرنا منع ہے، بعض احادیث میں بعض اعضاء کو تین تین مرتبہ بعض اعضاء کو دو دو مرتبہ اور بعض اعضاء کو ایک ایک مرتبہ بھی دھونا ثابت ہے چنانچہ یہ سب طریقے بھی بیان جواز کے لئے ہیں۔

بعض علماء کے نزدیک اعضاء وضو کو ایک ایک مرتبہ دھونا گناہ ہے کیونکہ اس طرح سُنّت مشہورہ ترک ہوتی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جب خود احادیث سے ایک ایک مرتبہ دھونا ثابت ہے تو اسے گناہ کہنا مناسب نہیں ہے۔

آخر حدیث کے یہ الفاظ کہ "تین تین مرتبہ وضو کیا" یعنی اعضاء وضو کو تین بار دھویا۔ اس سے بظاہر تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سر کا مسح بھی تین مرتبہ کیا ہوگا لیکن جن روایتوں میں اعضاء وضو کے دھونے کی تفصیل اور وضاحت کی گئی ہے جیسے کہ صحیحین کی روایتیں گزری ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سر کا مسح ایک ہی مرتبہ ہے۔

(۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَجَعْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ مَكَّةَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ حَتّٰى اِذَا كُنَّا بِمَاءٍ بِالطَّرِيْقِ تَعَجَّلَ قَوْمٌ عِنْدَ الْعَصْرِ فَتَوَضَّأُوْا وَهُمْ عُجَّالٌ فَانْتَهَيْنَا اِلَيْهِمْ وَاَعْقَابُهُمْ تَلُوْحُ لَمْ يَمَسَّهَا الْمَاءُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ اَسْبِغُوا الْوُضُوْءَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کو واپس لوٹے یہاں تک کہ جس وقت ہم پانی پر پہنچے جو راستہ میں تھا تو کچھ لوگوں نے نماز عصر کے لئے وضو کرنے میں جلدی کی اور وہ لوگ بہت جلدی کرنے والے تھے، چنانچہ جب ہم ان لوگوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ان کی ایڑیاں چمک رہی تھیں (یعنی خشک رہ گئی تھیں کیونکہ) ان تک پانی نہیں پہنچا تھا (ان کی خشک ایڑیوں کو دیکھ کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ویل (خرابی) ہے ایڑیوں کے لئے آگ سے! وضو کو پورا کرو۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ صحابہ کی جماعت کے ہمراہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے لئے واپس لوٹ رہے تھے درمیان سفر عصر کی نماز کا وقت ہوگیا، راستہ میں ایک جگہ پانی کے قریب یہ قافلہ رک گیا، کچھ لوگ یہ سوچ کر کہ نماز عصر کا وقت ہو رہا ہے، وضو کرنے کے لئے پانی کی طرف لپکے چنانچہ وہ لوگ تیز چل کر اس جماعت سے جس میں خود آنحضرت ﷺ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ تھے آگے نکل گئے اور پانی پر پہلے پہنچ کر وقت کی تنگی کے سبب جلدی جلدی وضو کر لیا، جب آنحضرت ﷺ ان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ جلدی کی وجہ سے ان کی پیر پوری طرح دھلے نہیں ہیں جس کی وجہ سے ایڑیاں خشک رہ گئی ہیں، اسی بناء پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایڑیوں کے لئے ویل (خرابی ہے) آگ سے۔

بعض علماء نے "ویل" کے معنی "شدت عذاب" لکھے ہیں۔

کچھ علماء کی تحقیق ہے کہ "ویل" دوزخ میں پیپ اور لہو کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔

بعض محققین لکھتے ہیں کہ "ویل" ایک ایسا کلمہ ہے جسے رنج رسیدہ شخص بولتا ہے اور اصل میں اس کی معنی "ہلاکت اور عذاب" کے ہیں۔

بہر حال ان تمام معانی کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب اور صحیح یہ ہے کہ اس لفظ کا محل اصل ہی کو قرار دیا جائے۔ یعنی ایڑیوں کے لئے عظیم ہلاکت اور دردناک عذاب ہے" خاص طور پر ایڑیوں ہی کے لئے یہ وعید اس لئے ہے کہ وضو میں دھوئی نہیں گئی تھیں، جس کی بناء پر وہ خشک رہ گئی تھیں۔

گو بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یہاں ایڑیوں سے مراد ایڑیوں والے ہیں" یعنی یہ وعید ان لوگوں کے لئے ہے جن کی ایڑیاں وضو میں خشک رہ گئی تھیں۔

آخر میں آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ "وضو کو پورا کرو" یعنی وضو کے جو فرائض و سنن اور مستحبات و آداب ہیں ان سب کو پورا کرو اور سب کی ادائیگی کا خیال رکھو چنانچہ دوسری حدیث میں وارد ہے کہ "(اعضاء وضو کا کوئی حصّہ) اگر ایک ناخون کے برابر بھی خشک رہ جائے گا تو وہ وضوء درست نہیں ہوگا۔"

یہ حدیث اس بات کے لئے دلیل ہے کہ وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے کیونکہ اگر پاؤں دھونا فرض نہ ہوتا تو ایڑیوں کے خشک رہ جانے کی وجہ سے اتنی بڑی وعید نہ فرمائی جاتی، چنانچہ ہر دور کے تمام علماء، اور فقہاء کا یہی عقیدہ اور مسلک رہا ہے کہ وضو میں پیروں کا دھونا فرض ہے صرف مسح کافی نہیں ہے، اس مسئلہ میں کسی بھی ایسے عالم کا اختلاف جو لائق اعتبار اور قابل استناد ہو ثابت نہیں ہے، نیز صحابہ کرام جو آنحضرت ﷺ کے وضو کی کیفیت و تفصیل بیان کرتے ہیں جیسے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن زیدؓ جنہیں حاکی یعنی آنحضرت ﷺ کے وضو کو بیان کرنے والا کہا جاتا ہے یا اسی طرح حضرت جابرؓ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ کرامؓ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت ﷺ وضو میں اگر موزہ پہنے ہوئے نہیں ہوتے تو پیر مبارک دھویا ہی کرتے تھے۔

پھر ایسی بے شمار احادیث جو مرتبہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں منقول ہیں جن سے وضو میں پیروں کا دھونا ہی ثابت ہے اور اس کے ترک کرنے پر وعید بے شمار احادیث میں مذکور ہے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "صحابہؓ پاؤں پر مسح کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے (پیروں کو دھوکر) وضو کو پورا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کے ترک پر وعید فرمائی چنانچہ صحابہؓ نے مسح چھوڑ دیا اور وہ منسوخ ہو گیا۔

امام طحاویؒ، حضرت عبدالملک بن سلیمانؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاء خراسانیؒ سے جو جلیل القدر تابعی ہیں، پوچھا کہ کیا آپ کو کوئی ایک روایت بھی ایسی ملی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ آنحضرت ﷺ کا کوئی بھی صحابی، اپنے پیروں پر مسح کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم! نہیں۔"

بہر حال اس سلسلہ میں خلاصۂ کلام یہ ہے کہ وضو میں پیر کے بارے میں جو حکم قرآن مجید میں مذکور ہے وہ مجمل اور مشتبہ ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی سُنّت نے خواہ وہ قولی ہو یا فعلی اور جو حد شہرت و تواتر کو پہنچتی ہے اس کی تشریح اور وضاحت کردی ہے کہ قرآن پاک میں اس حکم سے خدا کی مراد یہ ہے کہ وضو میں پاؤں کو دھونا چاہئے لہٰذا پاؤں کو دھونا ہی فرض ہے۔

جہاں تک شیعہ فرقہ کے مسلک و معمول کا تعلق ہے کہ وہ لوگ وضو میں پیروں پر مسح کرتے ہیں، اس بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ انتہائی گمراہی میں مبتلا ہیں اور آنحضرت ﷺ کی اتنی زیادہ تفصیل و تشریح اور اتنے کھلے ہوئے حکم کے باوجود ان کا پیروں کا نہ دھونا انتہائی غلط اور غیر شرعی فعل ہے۔ واللہ اعلم۔

(۸) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهٖ وَعَلَى الْعِمَامَةِ وَعَلَى الْخُفَّيْنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے وضو کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی پیشانی کے بالوں کے اوپر پگڑی پر اور موزوں پر مسح کیا۔" (مسلم)

تشریح: سر کے مسح کی مقدار میں علماء کے یہاں اختلاف ہے چنانچہ حضرت امام مالکؒ کے نزدیک پورے سر کا مسح فرض ہے، حضرت امام

ؔ حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شعبہ کے لڑکے ہیں آپ کی کنیت ابوعبداللہ اور ابوعیسیٰ ہے آپ نے بعمر ستر سال پچاس ہجری میں انتقال فرمایا۔

شافعیؒ کے نزدیک سر کے کچھ حصہ کا مسح کافی ہے خواہ وہ تین بال ہی کیوں نہ ہوں، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک چوتھائی سر کا مسح فرض ہے، حضرت امام اعظمؒ کی دلیل یہی حدیث ناصیہ (ناصیہ سر کے آگے کی جانب چوتھائی حصہ کو کہتے ہیں) اسی بنا پر حنفیہ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، اوّل تو یہ کہ امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق مسح پورے سر کا فرض ہو، مگر یہ ظاہر ہے کہ پورے سر کا مسح اگر فرض ہوتا تو پھر آنحضرت ﷺ مسح ناصیہ پر ہی اکتفاء نہ فرماتے، بلکہ ادائے فرض کے لئے پوری ہی سر کا مسح فرماتے، لہٰذا معلوم ہوا کہ پورے سر کا مسح تو فرض ہے نہیں، دوسری شکل یہ ہے کہ چوتھائی سر سے بھی کم پر مسح فرض ہو جیسا کہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے، اس سلسلہ میں بھی یہی بات ہے کہ اگر چوتھائی سر سے کم پر بھی مسح فرض ہوتا تو آنحضرت ﷺ بیان جواز کے لئے اسے بھی اختیار فرماتے مگر یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے چوتھائی سر سے کم پر کبھی مسح نہیں کیا ہے۔ لہٰذا اس سے بھی یہ بات ثابت ہوگئی کہ مسح چوتھائی سر کا ہی فرض ہے۔

پگڑی پر مسح کرنے کے معنی شارحین نے یہ لکھے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے چوتھائی سر کا مسح جو فرض ہے کر لیا تو تکمیل وضو اور ادائے سُنّت کے لئے (کہ تمام سر کا مسح کرنا سُنّت ہے) بجائے اس کے سر کے بقیہ حصہ پر مسح فرماتے، سر کے اوپر بندھی ہوئی پگڑی پر مسح کر لیا۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پگڑی پر مسح کیا ہی نہ ہو بلکہ چوتھائی سر پر مسح کرنے کے بعد آپ ﷺ نے اپنی پگڑی کو درست کیا ہو، راوی نے اس سے گمان کر لیا کہ آنحضرت ﷺ نے پگڑی پر بھی مسح کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس سلسلہ میں جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے اس کی تحقیق یہ ہے کہ بغیر سر کا مسح کیا ہوئے صرف پگڑی پر مسح کر لینا امام اعظمؒ، امام شافعیؒ امام مالکؒ تینوں کے نزدیک مطلقاً درست نہیں ہے مگر امام احمدؒ کے نزدیک اس شرط کے ساتھ درست ہے کہ پگڑی طہارت کے بعد پہنی ہو اور پگڑی نے پورے سر کو ڈھانک لیا ہو جیسا کہ موزہ پر مسح کرنے کا مسئلہ ہے۔

(۹) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِيْ شَأْنِهِ كُلِّهِ فِيْ طُهُوْرِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَتَنَعُّلِهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ حتی الامکان اپنے تمام کاموں کو سیدھے ہاتھ سے شروع کرنا محبوب رکھتے تھے (مثلاً) اپنی طہارت میں، اپنا جوتا پہننے میں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں اچھے کاموں کو داہنے ہاتھ سے شروع کرنے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے بارے میں اسے پسند فرماتے اور عزیز رکھتے تھے کہ جہاں تک اپنا بس چلے تمام کام داہنے ہاتھ سے انجام دیئے جائیں چنانچہ لفظ ما استطاع (حتی الامکان) سے اسی محافظت اور تاکید کی طرف اشارہ ہے۔

"طہارت" دائیں طرف سے شروع کرنے کی یہ شکل تھی کہ وضو میں دایاں ہاتھ اور دایاں پیر پہلے دھوتے تھے اور بایاں ہاتھ و بایاں پیر بعد میں دھوتے تھے، اسی طرح نہانے کے وقت دائیں جانب پہلے دھوتے اور بائیں جانب بعد میں دھوتے تھے۔

بہر حال اس حدیث میں تین چیزیں ذکر کی گئی ہیں، جو مثال کے طور پر ہیں ورنہ تو ہر وہ چیز جو از قبیل بزرگی ہوتی تھی اسے آپ ﷺ دائیں ہاتھ سے شروع کرتے تھے، جیسے کپڑے پہننا، ازار زیب تن کرنا، موزہ پہننا، مسجد میں داخل ہونا، مسواک کرنا، بیت الخلاء سے باہر آنا (یعنی بیت الخلاء سے پہلے دایاں پیر باہر نکالتے تھے، سرمہ لگانا، ناخون کتروانا، بغل کے بال صاف کرنا، لب کے بال کتروانا، سر منڈوانا، زیر ناف بال صاف کرنا، مصافحہ کرنا، کھانا پینا اور کسی چیز کا لینا دینا وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح جو چیز از قبیل بزرگی نہیں ہیں ان کو بائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے، مثلاً بیت الخلاء (یعنی بیت الخلاء میں پہلے بایاں پیر رکھنا، بازار میں جانا، مسجد سے نکلنا، ناک سنکنا، تھوکنا، استنجاء کرنا اور کپڑے اور جوتے اتارنا یا ایسے ہی دوسرے کام، ان کاموں کو بائیں طرف سے شروع کرنے میں ایک لطیف اور پر حقیقت نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ ایسی چیزوں کی ابتداء بائیں طرف کرنے کی وجہ سے دائیں طرف کی تکریم و احترام کا مظاہرہ ہوتا ہے مثلاً جب کوئی شخص مسجد سے نکلتے وقت پہلے بایاں قدم باہر نکالے گا تو دائیں قدم کی تکریم ہوئی بایں طور کہ

دایاں قدم محترم جگہ میں باقی رہا۔ اسی پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان کے ہمراہ جو دو فرشتے ہوتے ہیں ان میں سے دائیں ہاتھ کا فرشتہ دائیں طرف کی فضیلت و احترام کی بناء پر بائیں ہاتھ کے فرشتے پر شرف و فضیلت رکھتا ہے، نیز اسی نقطہ کے پیش نظر کہا جاتا ہے کہ دائیں طرف کا ہمسایہ بائیں طرف کے ہمسایہ پر مقدم ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا لَبِسْتُمْ وَاِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَأُوْا بِأَیَامِنِكُمْ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم لباس (وغیرہ) پہنو یا وضو کرو تو اپنے دائیں طرف سے شروع کرو۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

(۱۱) وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ زَیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَّمْ یَذْکُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوٗدَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَالدَّارِمِیُّ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ عَنْ اَبِیْهِ وَزَادَ فِیْ اَوَّلِهٖ لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّا وُضُوْءَ لَهٗ)

"اور حضرت سعیدؓ بن زیدؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس شخص نے (وضو کے وقت) اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا اس کا وضو نہیں ہوا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور احمدؒ و ابوداؤدؒ نے اس حدیث کو حضرت ابوہریرہؓ سے اور دارمیؒ نے ابوسعید خدریؓ سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے، نیز ان لوگوں نے اپنی روایت کے شروع میں یہ الفاظ زائد ذکر کئے کہ "اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جس نے وضو نہیں کیا"۔)

تشریح: اس حدیث سے وضو کے ابتداء میں بسم اللہ کہنے کی فضیلت و اہمیت کا اظہار ہو رہا ہے، حدیث کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے ابتداء وضو میں اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا یعنی بسم اللہ نہیں کہی تو اس کا وضو درجہ تکمیل کو نہ پہنچا جس کی بنا پر اسے ثواب نہیں ملا۔ ویسے اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت امام احمدؒ کے نزدیک ابتداء وضو میں بسم اللہ کہنا واجب ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک سنت یا مستحب ہے۔

ابتداء وضو میں علماء سلف سے یہ الفاظ کہنے منقول ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِهٖ بعض علماء نے کہا ہے کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کے بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا افضل ہے اور مشہور یہ الفاظ ہیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی دِیْنِ الْاِسْلَامِ۔

روایت کے آخر میں ایک لفظی غلطی ہے، جو ہو سکتا ہے کہ کاتب وغیرہ کا سہو ہو یعنی آخر میں یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں والدارمی عن ابی سعید الخدری عن ابیہ غلط ہے بلکہ صحیح یہ ہے ابی سعید الخدری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی دارمیؒ نے اس حدیث کو حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے اور ابی سعید نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے۔

(۱۲) وَعَنْ لَقِیْطِ بْنِ صَبِرَةَ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْوُضُوْءِ قَالَ اَسْبِغِ الْوُضُوْءَ وَخَلِّلْ بَیْنَ الْاَصَابِعِ وَبَالِغْ فِی الْاِسْتِنْشَاقِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ صَائِمًا۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَرَوَی ابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ اِلٰی قَوْلِهٖ بَیْنَ الْاَصَابِعِ)

---

[1] آپ کا اسم گرامی سعید بن زید اور کنیت ابوالاعور ہے آپ قریشی عدوی ہیں اور آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں آپ کا انتقال ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں بعمر ۷۰ سال بمقام عتیق ہوا۔

"اور حضرت لقیط بن صبرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! مجھے وضو کے بارے میں آگاہ فرمائیے" آپ ﷺ نے فرمایا "تم وضوء کو پورا کرو، انگلیوں میں خلال کرو، اور اگر تمہارا روزہ نہ ہو تو ناک میں اچھی طرح پانی پہنچاؤ۔" (ابوداؤدؒ، داریؒ) نسائیؒ ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے اس حدیث کو بَیْنَ الْاَصَابِعِ تک روایت کیا ہے)

تشریح: سوال کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ مجھے کمال وضو کا طریقہ بتا دیجئے تاکہ اسے اختیار کر کے ثواب کا مستحق ہو سکوں اس، کا جواب آپ ﷺ نے یہ دیا کہ وضو کو پورا کرو، یعنی وضو کے جو فرائض اور سنن و مستحبات ہیں انہیں پورا اور ادا کرو۔

وضو میں انگلیوں کے درمیان خلال کرنا حضرت امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک سُنّت ہے مگر یہ حکم اس شکل میں ہے جبکہ انگلیاں خلقی اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا اور کشادہ ہوں لیکن آپس میں اگر اس طرح ملی ہوں کہ آسانی اور بے تکلفی سے پانی اکے درمیان نہ پہنچا ہو تو پھر انگلیوں کے درمیان خلال کرنا واجب ہوگا۔

حنفیہ کے یہاں انگلیوں کے درمیان خلال کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر دائیں ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر خلال کیا جائے۔ یہی طریقہ اولیٰ ہے۔

پاؤں کی انگلیوں کا خلال بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے کرنا چاہئے اس طرح کہ اسے دائیں پاؤں کی چھنگلیا کے نیچے داخل کر کے خلال کرنا شروع کیا جائے، یہاں تک کہ بائیں پاؤں کی چھنگلیا پر ختم کیا جائے۔

ناک میں پانی دینے کی حد یہ ہے کہ پانی نرمہ ناک تک پہنچایا جائے اور اس میں مبالغہ جو حدیث کا منشا ہے یہ ہے کہ پانی اس سے بھی آگے گزر جائے، مگر جیسا کہ خود حدیث نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ مبالغہ یعنی نرمہ ناک سے بھی آگے پانی پہنچانا اس وقت ہے جب کہ وضو کرنے والا روزہ دار نہ ہو، اگر وضو کرنے والا روزہ دار ہو تو پھر اس کے لئے یہ مبالغہ مکروہ ہے۔

اس موقع پر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک وضو میں سُنّت ہے اور غسل میں فرض مگر امام شافعیؒ کے نزدیک غسل اور وضو میں یہ دونوں چیزیں سُنّت ہیں۔

⑬ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَوَضَّأْتَ فَخَلِّلْ أَصَابِعَ يَدَيْكَ وَرِجْلَيْكَ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ نَحْوَهُ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم نے ارشاد فرمایا "جب تم وضو کرو تو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں اور اپنے پیروں کی انگلیوں کے درمیان خلال کرو۔" (ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔)

تشریح: ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان خلال تو ہاتھوں کو دھونے کے بعد کرنا چاہئے اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیان خلال پاؤں کو دھونے کے بعد کرنا چاہئے، یہی طریقہ افضل اور اولیٰ ہے۔

⑭ وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَوَضَّأَ يَدْلُكُ أَصَابِعَ رِجْلَيْهِ بِخِنْصَرِهٖ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت مستورد[1] بن شدادؓ راوی ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو دیکھا جب آپ ﷺ وضو فرماتے تو اپنے پاؤں کی انگلیوں کو (بائیں ہاتھ کی) چھنگلیا سے ملتے (یعنی پاؤں کی انگلیوں کے درمیان بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے خلال فرماتے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: لفظ یدلک کا مطلب یہ ہے کہ "آپ (بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان) خلال کرتے تھے۔" چنانچہ اس کی

[1] حضرت مستورد رضی اللہ تعالیٰ عنہ شداد کے بیٹے اور فہری قریشی ہیں اور آپ صحابی ہیں۔

تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے جسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے جس میں لفظ (یعنی خلال کرتے تھے) صراحت کے ساتھ آیا ہے اس شکل میں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان خلال کرنا مستحب ہے یا یدلک کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ ﷺ (اپنے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا پاؤں کی انگلیوں پر) پھیرتے تھے، اس صورت میں یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ تمام اعضاء کا ملنا مستحب ہے۔

⑮ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَوَضَّأَ اَخَذَ كَفًّا مِنْ مَّاءٍ فَاَدْخَلَهُ تَحْتَ حَنَكِهٖ فَخَلَّلَ بِهٖ لِحْيَتَهٗ وَقَالَ هٰكَذَا اَمَرَنِيْ رَبِّيْ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب وضو فرماتے تو ایک چلو پانی لیتے، پھر اسے اپنی ٹھوڑی کے نیچے پہنچاتے اور اس سے اپنی داڑھی میں خلال کرتے اور پھر فرماتے کہ میرے پروردگار نے (وحی خفی کے ذریعہ) اسی طرح سے حکم فرمایا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: وضو میں داڑھی کا اس طرح خلال کرنا مستحب ہے، یہ خلال منہ دھونے کے بعد کرنا چاہئے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ انگلیاں داڑھی کے نیچے سے داخل کر کے اوپر کی طرف کو باہر نکالی جائیں۔

⑯ وَعَنْ عُثْمَانَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُخَلِّلُ لِحْيَتَهٗ۔ (رواه الترمذی و الدارمی)

"اور حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ (وضو کرتے وقت) اپنی داڑھی میں خلال کرتے تھے۔" (ترمذیؒ، داریؒ)

⑰ وَعَنْ اَبِيْ حَيَّةَ قَالَ رَاَيْتُ عَلِيًّا تَوَضَّأَ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ حَتّٰى اَنْقَاهُمَا ثُمَّ مَضْمَضَ ثَلَاثًا وَاسْتَنْشَقَ ثَلَاثًا وَغَسَلَ وَجْهَهٗ ثَلَاثًا وَذِرَاعَيْهِ ثَلَاثًا وَمَسَحَ بِرَأْسِهٖ مَرَّةً ثُمَّ غَسَلَ قَدَمَيْهِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَامَ فَاَخَذَ فَضْلَ طَهُوْرِهٖ فَشَرِبَهٗ وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ قَالَ اَحْبَبْتُ اَنْ اُرِيَكُمْ كَيْفَ كَانَ طُهُوْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

"اور حضرت ابو حیہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا چنانچہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو دھویا یہاں تک کہ انہیں پاک کیا، پھر تین مرتبہ کلی کی، تین مرتبہ ناک میں پانی دیا، تین مرتبہ اپنا منہ دھویا، تین مرتبہ دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے، ایک مرتبہ اپنے سر کا مسح کیا اور اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے، پھر کھڑے ہوئے اور وضو کے بچے ہوئے پانی کو کھڑے کھڑے پی لیا اور پھر فرمایا کہ میں نے یہ پسند کیا کہ تمہیں دکھاؤں کہ آنحضرت ﷺ کا وضو کس طرح تھا۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: وضو کے بچے ہوئے پانی میں چونکہ برکت آجاتی ہے اس لئے حضرت علیؓ نے وضو کے بقیہ پانی کو پی لیا، چنانچہ حصول برکت کے لئے وضو کے بقیہ پانی کو پی لینا چاہئے، یہ پانی کھڑے ہو کر پینا بھی جائز ہے۔

⑱ وَعَنْ عَبْدِ خَيْرٍ قَالَ نَحْنُ جُلُوْسٌ نَنْظُرُ اِلٰى عَلِيٍّ حِيْنَ تَوَضَّأَ فَاَدْخَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰى فَمَلَأَ فَمَهٗ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَنَثَرَ بِيَدِهِ الْيُسْرٰى فَعَلَ هٰذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى طُهُوْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهٰذَا طُهُوْرُهٗ۔ (رواه الدارمی)

"اور حضرت عبد خیرؒ فرماتے ہیں کہ ہم بیٹھے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو وضو کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے چنانچہ انہوں نے برتن میں داہنے ہاتھ سے پانی لیا اور منہ میں بھر کر کلی کی اور ناک میں پانی دیا اور بائیں ہاتھ سے ناک سنکی، اسی طرح تین مرتبہ کیا پھر فرمایا "جس کے لئے یہ بات خوش کن ہو کہ وہ سرکار دو عالم ﷺ کے وضو کو دیکھے تو (وہ دیکھے کہ) آنحضرت ﷺ کا وضو یہ ہے (یعنی اس طرح آپ ﷺ وضو فرماتے تھے)۔" (داریؒ)

---

[1] اسم گرامی عمرو بن نصر انمارحی الہمدانی اور کنیت ابو عیسی سے مشہور ہیں تابعی ہیں۔

[2] اسم گرامی عبد خیر یزید اور کنیت ابو عمارہ ہمدانی ہے، آپ تابعی ہیں کوفہ میں سکونت پزیر تھے۔

تشریح: یہاں راوی کا مقصد یہ تھا کہ کلی کرنے اور ناک میں پانی دینے کی کیفیت بیان کرے اس لئے انہوں نے صرف اسی قدر بیان کیا، باقی وضو چونکہ معلوم تھا اس لئے اسے بیان نہیں کیا۔

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ زَیْدٍ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ کَفٍّ وَّاحِدٍ فَعَلَ ذٰلِکَ ثَلَاثًا۔ (رواہ ابوداؤد و الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ بن زید فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے ایک ہی چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی دیا اور تین مرتبہ اسی طرح کیا۔" (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ میں دو احتمال ہیں یعنی اس کے معنی یا تو یہ ہیں کہ آپ نے ایک ہی چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی دیا اور اس طرح تین مرتبہ کیا یا یہ کہ تین چلو سے تین مرتبہ کلی کی اور پھر تین چلو سے تین مرتبہ ناک میں پانی دیا۔ دوسرے معنی زیادہ مناسب اور اکثر روایات کے مطابق ہیں۔

ان کے علاوہ ایک تیسرا احتمال اور بھی ہو سکتا ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ نے ایک ہی چلو سے تین مرتبہ کلی کی اور ناک میں پانی بھی دیا، دوسرا چلو نہیں لیا۔ یہی تمام احتمالات اس سے پہلے گزرنے والی حدیث میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

(۲۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَسَحَ بِرَأْسِہٖ وَاُذُنَیْہِ بَاطِنَھُمَا بِالسَّبَّابَتَیْنِ وَظَاھِرَھُمَا بِاِبْھَامَیْہِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے سر اور دونوں کانوں کا مسح کیا اور کانوں کے اندر کا مسح اپنی شہادت کی انگلیوں سے اور اوپر کا انگوٹھوں سے کیا۔" (نسائی)

(۲۱) وَعَنِ الرُّبَیِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذٍ اَنَّھَا رَاَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَتَوَضَّأُ قَالَتْ فَمَسَحَ رَأْسَہٗ مَا اَقْبَلَ مِنْہُ وَمَا اَدْبَرَ وَصُدْغَیْہِ وَاُذُنَیْہِ مَرَّۃً وَّاحِدَۃً وَفِیْ رِوَایَۃٍ اَنَّہٗ تَوَضَّأَ فَاَدْخَلَ اِصْبَعَیْہِ فِیْ جُحْرَیْ اُذُنَیْہِ۔ (رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَی التِّرْمِذِیُّ الرِّوَایَۃَ الْاُوْلٰی وَاَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَۃَ الثَّانِیَۃَ)

"اور حضرت ربیع[1] بنت معوذؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کو وضو کرتے دیکھا چنانچہ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے سر کے اگلے حصہ پر، پچھلے حصہ پر، کنپٹیوں پر اور کانوں پر ایک مرتبہ مسح کیا، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے وضو کیا چنانچہ (مسح کے لئے) اپنی دونوں انگلیوں کو اپنے دونوں کانوں کے سوراخوں میں داخل کیا۔" (ابوداؤد) ترمذی نے پہلی حدیث کو اور ابن ماجہ نے دوسری حدیث کو روایت کیا ہے۔)

تشریح: لفظ صُدْغَیْہِ اور اُذُنَیْہِ لفظ رَأْسَہٗ پر عطف ہیں اسے عطف خاص علی العام کہتے ہیں یعنی سر کے پانی کے ساتھ مسح کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب آپ ﷺ نے ہاتھ پر پانی لے کر سر کا مسح کیا تو اسی پانی سے کنپٹیوں اور کانوں پر بھی مسح کر لیا ان دونوں کے مسح کے لئے علیحدہ سے پانی نہیں لیا، چنانچہ حضرت امام اعظمؒ کا مسلک یہی ہے۔

صدغ کان اور آنکھ کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں اردو میں کنپٹی کہا جاتا ہے، نیز جو بال اس جگہ پر لٹکے رہتے ہیں اسے بھی صدغ کہتے ہیں۔ (قاموس) اور (ابن مالکؒ نے کہا ہے کہ صدغ ان بالوں کو کہتے ہیں جو سر کے دونوں طرف کان اور ناصیہ (پیشانی کے بال) کے درمیان ہوتے ہیں، یہی معنی حنفی مسلک کے مطابق اور مناسب ہیں۔

شرح السنۃ میں منقول ہے کہ علماء کے یہاں مسئلہ میں اختلاف ہے کہ تین مرتبہ مسح کرنا سُنّت ہے یا نہیں؟ چنانچہ اکثر علماء یہ کہتے ہیں

[1] اسم گرامی ربیع ہے معوذ کی لڑکی ہیں، آپ جلیل القدر صحابیہ ہیں اور انصاریہ ہیں آپ بیعت رضوان میں بھی شامل تھیں۔

کہ مسح ایک ہی مرتبہ کرنا چاہئے، یہی مسلک حضرت امام اعظمؒ، امام احمدؒ، امام ملکؒ کا ہے۔ امام شافعیؒ کے مذہب میں یہ مشہور ہے کہ تین مرتبہ مسح اس طرح کرنا کہ ہر مرتبہ نیا پانی لیا جائے سُنّت ہے، چنانچہ اکثر علماء کا یہی خیال ہے مگر خود امام شافعیؒ تین مرتبہ مسح کرنے کو مستحب کہتے ہیں، امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں) حضرت عثمانؓ سے جو احادیث مروی ہیں وہ سب صحیح ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مسح ایک ہی مرتبہ کرنا چاہئے۔

شمنیؒ کہتے ہیں کہ ہر دفعہ نئے پانی کے ساتھ تین مرتبہ کرنا بدعت ہے مگر ہدایہ میں لکھا ہے کہ ایک ہی پانی سے تین مرتبہ مسح کرنا مشروع ہے اور یہ امام اعظمؒ سے بھی منقول ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ اَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ وَاَنَّهُ مَسَحَ رَأْسَهُ بِمَاءٍ غَيْرِ فَضْلِ يَدَيْهِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ مَعَ زَوَائِدَ)

"اور حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے سر کا مسح اس پانی سے کیا جو ہاتھوں کا بچا ہوا نہ تھا (یعنی نیا پانی لے کر مسح کیا)۔" (ترمذیؒ، مسلمؒ اور مسلم نے اس روایت کو زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جس میں دیگر اعضاء وضو کے دھونے کا بھی ذکر ہے۔)

تشریح: فقہ حنفی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ مثلاً ایک شخص نے وضو کے وقت ہاتھ دھویا اور ہاتھ دھونے کے بعد جو تری اس کے ہاتھوں میں باقی رہ گئی تھی تو اس سے سر کا مسح کر لیا تو مسح ہو جائے، اور اگر کسی عضو پر مسح کرنے کے بعد اس کے ہاتھوں میں تری رہ گئی تو اس سے سر کا مسح کیا تو یہ درست نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں حضرت ابن مسعودؓ کی ایک حدیث بھی نقل کی جاتی ہے، نیز اس مذکورہ حدیث کو بھی ابن لہیعہ کی روایت سے نقل کیا گیا ہے جس میں بماء غیر فضل یدیه کے بجائے یہ الفاظ ہیں بماء غبر من فضل یدیه یعنی لفظ غبر یا کے ساتھ غبر ہے جس کے معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ اس پانی کے ساتھ مسح کیا جو ہاتھ دھونے کے بعد ہاتھ میں باقی رہ گیا تھا، یعنی مسح کے لئے از سر نو پانی نہیں لیا بلکہ پورے ہاتھ دھونے کے بعد جو تری ہاتھوں میں رہ گئی تھی اس سے مسح کر لیا۔ اس طرح حدیث کے معنی بالکل برعکس ہو گئے کیونکہ اس حدیث کے الفاظ سے جو یہاں نقل کی گئی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے سر کا مسح ہاتھوں کے بچے ہوئے پانی سے نہیں کیا بلکہ نیا پانی لے کر کیا لیکن مذکورہ بالا شکل میں صرف ایک نقطہ کے تغیر سے معنی بالکل برعکس ہو گئے۔

مگر جہاں تک سوال کی تحقیق کا ہے تو بات یہی ہے کہ حدیث یہ صحیح ہے جو یہاں نقل کی گئی ہے، لہٰذا۔ اولیٰ یہ ہو اگر مسح کے لئے نیا پانی لیا جائے اور یہ بھی جائز ہو کہ ہاتھ کے باقی بچے ہوئے پانی سے مسح کیا جا سکتا ہے۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ ذَكَرَ وُضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَكَانَ يَمْسَحُ الْمَاقَيْنِ وَقَالَ الْاُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَذَكَرَا قَالَ حَمَّادٌ لَا اَدْرِي الْاُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ مِنْ قَوْلِ اَبِيْ اُمَامَةَ اَمْ مِنْ قَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ نے سرکار دو عالم کے وضو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "آپ ﷺ آنکھ کے کونوں کو بھی ملا کرتے تھے اور کہا کہ دونوں کان بھی سر میں داخل ہیں" (ابی داؤدؒ، ترمذیؒ) اور ابوداؤدؒ و ترمذیؒ نے ذکر کیا ہے کہ حماد نے کہا "میں یہ نہیں جانتا کہ اُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ (یعنی دونوں کان سر میں داخل ہیں) ابوامامہؓ کا اپنا قول ہے یا آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔"

تشریح: "ماق" ناک کی طرف کے گوشہ چشم کو کہتے ہیں (قاموس) اور جوہریؒ نے لکھا ہے کہ "ماق" دونوں طرف کے گوشہ چشم کو کہتے ہیں، لہٰذا اولیٰ یہی ہے کہ دونوں طرف کے گوشہ چشم (کونوں) کو منہ دھوتے وقت ملنا مستحب ہے تاکہ آنکھ کے اندر کا میل کچیل جو گوشۂ چشم میں جمع ہو جاتا ہے، ملنے سے نکل جائے اور آنکھیں صاف ہو جائیں۔

روایت کے اس جز الاذنان من الراس (دونوں کان سر میں داخل ہیں) سے دو حکم ثابت ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ کانوں کا مسح بھی سر کے مسح کے ساتھ کرنا چاہئے، دوسرے یہ کہ سر کے مسح کے لئے جو پانی لیا ہے اسی پانی سے کانوں کا مسح بھی کر لیا جائے کانوں کے مسح کے لئے الگ سے پانی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ پہلے حکم پر تو چاروں ائمہ متفق ہیں، دوسرے حکم میں کچھ اختلاف ہے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ تینوں کا مسلک یہ ہے کہ کانوں کا مسح سر کے مسح کے بچے ہوئے پانی سے ہی کر لینا چاہئے، اس کے لئے الگ سے پانی لینے کی ضرورت نہیں ہے، اس مسلک کی تائید بھی کثیر احادیث سے ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ کانوں کا مسح نئے پانی سے کرنا چاہئے یعنی سر کے مسح کے بچے ہوئی پانی سے کانوں کا مسح کرنا کافی نہ ہوگا، چنانچہ ایک حدیث بھی اس سلسلہ میں منقول ہے جو امام شافعیؒ کے مسلک کی تائید کرتی ہے۔

بہرحال یہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت اکثر و بیشتر سر اور کانوں کا مسح ایک ہی پانی سے کرتے ہوں گے، مگر ایسی شکل میں جب کہ ہاتھ میں تری باقی نہ رہتی ہوگی کبھی کبھی کانوں کے مسح کے لئے لیتے ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

(۲۴) وَعَنْ عَمْرِو ابْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ جَآءَ اَعْرَابِيٌّ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُهٗ عَنِ الْوُضُوْءِ فَاَرَاهُ ثَلَاثًا ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا الْوُضُوْءُ فَمَنْ زَادَ عَلٰى هٰذَا فَقَدْ اَسَآءَ وَتَعَدّٰى وَظَلَمَ۔

(رواہ النسائی وابن ماجۃ وروی ابوداؤد معناہ)

"اور حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ "ایک دیہاتی آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے وضو کی کیفیت پوچھی چنانچہ آپ ﷺ نے اسے اعضاء وضو کو تین مرتبہ دھو کر دکھلایا اور فرمایا کہ (کامل) وضو اس طرح ہے لہٰذا جس نے اس پر زیادہ کیا (یعنی تین مرتبہ سے زیادہ دھویا) اس نے برا کیا، تعدی کی اور ظلم کیا۔" (نسائی و ابن ماجہؒ) اور ابوداؤدؒ نے بھی اسی مطلب کی حدیث روایت کی ہے۔)

تشریح: آپ ﷺ نے سائل کے جواب میں اعضاء وضو کو تین تین مرتبہ دھو کر دکھایا اور اسے بتا دیا کہ اگر تم کامل وضو چاہتے ہو اور اس پر ثواب کے متمنی ہو تو پھر وضو اسی طرح کرو۔ اس پر زیادتی کرنا یعنی اعضاء وضو کو تین مرتبہ سے زیادہ دھونا وضو کرنے والے کے حق میں کوئی مفید بات نہیں ہوگی بلکہ نقصان دہ ہوگی چنانچہ آپ ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں تین الفاظ، استعمال فرمائے ہیں۔

1. برا کیا۔ اس لئے کہ اس نے سُنّت کو ترک کیا۔
2. تعدی کی۔ یعنی زیادتی کر کے حدود سنت سے تجاوز کیا۔
3. ظلم کیا۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے طریقہ اور سُنّت کے خلاف عمل کر کے اپنے نفس پر ظلم کیا۔

(۲۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْمُغَفَّلِ اَنَّهٗ سَمِعَ ابْنَهٗ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ الْقَصْرَ الْاَبْيَضَ عَنْ يَمِيْنِ الْجَنَّةِ قَالَ اَيْ بُنَيَّ سَلِ اللّٰهَ الْجَنَّةَ وَتَعَوَّذْ بِهٖ مِنَ النَّارِ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُوْنَ فِي الطُّهُوْرِ وَالدُّعَآءِ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا۔ "اے اللہ میں تجھ سے جنت کی دائیں طرف سفید محل مانگتا ہوں" تو انہوں نے کہا "اے میرے بیٹے! تم خدا سے جنت مانگو اور (دوزخ کی) آگ سے پناہ چاہو۔" میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "عنقریب اس اُمت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو طہارت اور دعا میں غلو کریں گے۔"

(احمدؒ، ابن ماجہؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: صاحبزادہ کو عبداللہ بن مغفل کی تنبیہ کا مقصد یہ تھے کہ تم جس طرح اور جن قیود کے ساتھ دعا مانگ رہے ہو یہ غلط اور شان عبودیت کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ایک طرف اگر تحکم کا پہلو ہے تو دوسری طرف بہشت میں ایک مخصوص صفت کی طلب یا کسی مخصوص جگہ کا تعین ایک لایعنی اور نامناسب چیز ہے۔ ہاں۔ دعا کا طریقہ یہ ہے کہ تم خدا سے صرف بہشت مانگو اور دوزخ کی آگ سے پناہ چاہو۔ اب آگے خدا کا کام ہوگا کہ وہ جنّت میں اپنے فضل و کرم سے تمہیں مراتب و درجات کی جس بلندی پر چاہے گا پہنچائے گا۔

حد سے تجاوز اور غیر مطلوب زیادتی ہر چیز میں ناپسندیدہ اور غیر مناسب ہو، خواہ وہ چیز شریعت کا مطلوب ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ کیا جارہا ہے، اور لسان نبوت سے پیشگوئی کی جارہی ہے کہ اس امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو خدا کے رسول کے بتائے ہوئے راستہ سے الگ ہو کر اور حدود شریعت سے تجاوز کر کے طہارت اور دعاء میں زیادتی کریں گے۔

"طہارت میں زیادتی" یہ ہے کہ اعضاء وضو کو مسنون طریقہ سے قطع نظر تین مرتبہ سے زیادہ دھویا جائے، پانی ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے یا اعضاء وضو کو دھونے میں اتنا مبالغہ ہو کہ وہ وہم و وسواس کی حد تک پہنچ جائے۔

"دعا میں زیادتی" یہ ہے کہ دعا اس انداز اور اس طریقہ سے مانگی جائے جس سے بے ادبی کا اظہار ہوتا ہو اور وہ شان عبودیت کے خلاف ہو، یا دعا میں غیر ضروری و نامناسب قیود لگائی جائیں یا ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے جو انسانی اعتبار سے احاطۂ امکان سے خارج اور عادۃً محال ہوں۔"

(۴۶) وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ لِلْوُضُوْءِ شَيْطَانًا يُقَالُ لَهُ الْوَلْهَانُ فَاتَّقُوْا وَسْوَاسَ الْمَآءِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ ابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ اِسْنَادُهُ بِالْقَوِيِّ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِيْثِ لِاَنَّا لَا نَعْلَمُ اَحَدًا اَسْنَدَهُ غَيْرَ خَارِجَةَ وَهُوَ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ عِنْدَ اَصْحَابِنَا۔

"اور حضرت ابی بن کعبؓ سرکار دوعالم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "وضو کا ایک شیطان ہے جسے "ولہان" کہا جاتا ہے لہٰذا پانی کے وسوسہ سے بچو" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور محدثین کے نزدیک اس کی اسناد قوی نہیں ہے اس لئے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ خارجہ (ایک عالم) کے علاوہ کسی نے اس کی سند بیان کی ہو اور وہ (خارجہ) ہمارے محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہیں۔"

تشریح: "ولہان" کے معنی ہیں عقل کا جاتے رہنا اور متحیر ہونا۔ یہ نام اس شیطان کا اس لئے ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کر کے انہیں متحیر اور بے عقل کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وضو کرنے والا اس کے چکر میں پھنس کر وہم میں مبتلاء ہو جاتا ہے کہ وہ جب وضو کرتا ہے تو یہ وسوسے اس کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ نا معلوم فلاں عضو پر ٹھیک سے پانی پہنچا ہے یا نہیں؟ فلاں عضو کو ایک مرتبہ دھویا ہے یا دو مرتبہ؟

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "پانی کے وسوسہ سے بچو" یعنی وضو کے وقت پانی استعمال کرنے میں جب اس قسم کے وسوسے اور وہم پیدا ہوں تو انہیں قائم نہ رہنے دو بلکہ انہیں اپنے دل سے باہر نکال پھینکو تا کہ حدود سُنّت سے تجاوز نہ کر سکو، کیونکہ اس شیطان کا مقصد تو یہی ہوتا ہے کہ وضو کرنے والا ان وسوسوں اور اوہام میں مبتلاء ہو کر اعضاء وضو کو تین مرتبہ سے بھی زیادہ دھوڈالے یا ضرورت سے زیادہ پانی خرچ کرے جس کی بنا پر وہ مسنون طریقہ سے ہٹ جائے۔

(۴۷) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَوَضَّاَ مَسَحَ وَجْهَهُ بِطَرَفِ ثَوْبِهِ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دوعالم ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ وضو فرماتے تو اپنے کپڑے کے کونے سے اپنے منہ پونچھتے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جب آپ وضو سے فارغ ہو جاتے تو پانی خشک کرنے کے لئے اپنے کپڑے یعنی چادر وغیرہ کے کونے سے اپنا منہ پونچھ لیتے تھے۔ زیلعیؒ نے شرح کنز میں لکھا ہے کہ وضو کے بعد رومال سے (پانی) خشک کر لینا جائز ہے چنانچہ جیسا کہ حضرت عثمان، حضرت انس، اور حسن ابی علیؓ کے بارے میں بھی یہی منقول ہے اور اس کے بعد آنے والی حدیث بھی اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے، صاحب منیہ نے وضو کے بعد اعضاء وضو کو پونچھنا مستحب لکھا ہے۔

حنفی مسلک کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ وضو کے بعد پانی کو خشک کرنے کے لئے اعضاء وضو کو (کسی کپڑے یا رومال اور تولیہ وغیرہ سے) پونچھنا اگر از راہ تکبر و غرور ہو تو مکروہ ہے اور غرور و تکبر کی بنا پر نہ ہو تو پھر مکروہ نہیں ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے مذہب میں نہ تو وضو کرنے والے کے لئے اور نہ غسل کرنے والے کے لئے کپڑے سے پانی کو خشک کرنا سُنّت ہے۔ ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ جب وضو فرما چکے تو اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ ایک رومال لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تاکہ آپ ﷺ اس سے بھیگے ہوئے اعضاء پونچھ لیں مگر آپ ﷺ نے اسے واپس کر دیا اور اعضاء وضو پر لگے ہوئے پانی کو ہاتھ کے ذریعہ ٹپکانے لگے۔

اس کا جواب علماء حنفیہ کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے اعضاء وضو کو رومال سے پونچھنے سے اس لئے انکار نہیں کیا تھا کہ یہ چیز مناسب نہیں تھی بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص عذر کی بنا پر آپ ﷺ نے رومال واپس فرما دیا ہو۔

(۲۸) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خِرْقَةٌ يُنَشِّفُ بِهَا اَعْضَاءَهُ بَعْدَ الْوُضُوْءِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَيْسَ بِالْقَائِمِ وَاَبُوْ مُعَاذٍ الرَّاوِيُّ ضَعِيْفٌ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے پاس ایک کپڑا تھا جس سے وضو کے بعد اپنے بھیگے ہوئے اعضاء پونچھا کرتے تھے" (ترمذیؒ) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے اور اس کے ایک راوی، ابو معاذ محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔"

تشریح: نہ یہ کہ حضرت امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ وضو کے بعد بھیگے ہوئے اعضاء کو کپڑے سے پونچھنے کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے کوئی صحیح حدیث منقول نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کے صحابہؓ کی ایک جماعت اور تابعین نے وضو کے بعد اعضاء کو پونچھ لینے کی اجازت دی ہے اور ان کی یہ اجازت بھی آنحضرت ﷺ کے کسی قول و فعل سے مستنبط نہیں ہے بلکہ یہ خود ان لوگوں کی اپنی رائے ہے، چنانچہ سید جمال الدین شافعیؒ نے اس مضمون کو نقل کیا ہے۔

اس کا جواب علماء حنفیہ یہ دیتے ہیں کہ آپ لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ جواز ان صحابہؓ وغیرہ کی ذاتی رائے ہے غلط ہے، بلکہ اس کے برعکس آپ کا یہ قول خود آپ کے ذہن کی پیداوار ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

کیونکہ صحابہؓ مثلاً حضرت عثمان، حضرت انس اور حضرت حسن بن علیؓ کی جلالت شان اور اتباع نبوی ﷺ کے جذبہ صادق کے پیش نظر اس کا وہم بھی نہیں کیا جا سکتا کہ دینی معاملات میں کوئی بھی چیز ان کے اپنے ذہن کی پیدا کردہ ہو سکتی ہے لہٰذا ان کا فعل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس حدیث کی اصل ضرور ہے۔

اس کے علاوہ اس کلیہ کو بھی ذہن میں رکھ لینا چاہئے کہ حدیث پر عمل کرنا خواہ وہ حدیث ضعیف ہی کیوں نہ ہو زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے بنسبت اس کے کہ کسی رائے پر عمل کیا جائے، خواہ وہ رائے کتنی ہی مضبوط اور قوی کیوں نہ ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۲۹) وَعَنْ ثَابِتِ ابْنِ اَبِيْ صَفِيَّةَ قَالَ قُلْتُ لِاَبِيْ جَعْفَرٍ هُوَ مُحَمَّدُ الْبَاقِرُ حَدَّثَكَ جَابِرٌ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ مَرَّةً مَرَّةً وَمَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَثَلاَثًا ثَلاَثًا قَالَ نَعَمْ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ثابت[1] بن ابی صفیہ" فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جعفر صادق کے والد سے جن کا نام محمد باقر[2] ہے کہا کہ آپ سے جابر نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ "سرکار دو عالم ﷺ نے (کبھی) ایک ایک مرتبہ (کبھی) دو دو مرتبہ اور (کبھی) تین تین مرتبہ وضو کیا: انہوں نے فرمایا ہاں۔" (ترمذی"، ابن ماجہ")

تشریح: محدثین کی عادت ہے کہ جب شاگرد اپنے شیخ (استاد) سے کوئی حدیث سنتا ہے تو وہ پوچھتا ہے کہ حَدَّثَكَ فَلَانٌ عَنْ فَلَانٍ (اس طرح شاگرد اپنی سند کے سلسلہ کو آنحضرت ﷺ تک پہنچاتا ہے اور استاد خاموش اس سلسلہ سند کو سنتا رہتا ہے) یعنی کیا آپ سے یہ حدیث فلاں نے اور فلاں سے فلاں نے (یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ سے فلاں نے) سنی ہے اس کے جواب میں شیخ کہتا ہے کہ نعم! (یعنی ہاں) گویا روایت حدیث کا یہ ایک طریقہ ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ استاد اپنے شاگرد کے سامنے جب کہتا ہے کہ حدثنی فلاں الخ (یعنی مجھے سے یہ حدیث بیان کی فلاں نے اور فلاں سے فلاں نے یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ سے فلاں نے سنی ہے) تو شاگرد بیٹھا سنتا رہتا ہے۔

بہر حال۔ اسی طرح سے حضرت عثمان بن ابی صفیہ" نے اپنے استاد حضرت امام محمد باقر" سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا کہ حَدَّثَكَ جَابِرٌ الخ یعنی کیا یہ حدیث آپ سے حضرت جابر نے بیان کی ہے۔ اس کے جواب میں محمد باقر" نے اقرار کیا کہ ہاں مجھ سے جابر نے یہ حدیث بیان کی ہے۔

(۳۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَقَالَ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ۔

"اور حضرت عبداللہ بن زید" راوی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ نے دو، دو مرتبہ وضو فرمایا (یعنی اعضاء وضو کو دو، دو بار دھویا) اور پھر فرمایا کہ "یہ نور کے اوپر نور ہے۔""

تشریح: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ اعضاء وضو کو دھویا تو اس سے فرض اداء ہوا اور وہ ایک نور ہوا، پھر اس کے بعد جب دوسری مرتبہ دھویا تو سنت اداء ہوئی اور چونکہ یہ بھی نور ہے اس لئے نور کے اوپر نور ہوا۔

(۳۱) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا وَقَالَ هٰذَا وُضُوْئِىْ وَوُضُوْءُ الْاَنْبِيَاءِ قَبْلِىْ وَوُضُوْءُ اِبْرَاهِيْمَ رَوَاهُمَا رَزِيْنٌ وَالنَّوَوِيُّ ضَعَّفَ الثَّانِىَ فِىْ شَرْحِ مُسْلِمٍ۔

"اور حضرت عثمان" راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے تین تین مرتبہ وضو کیا اور پھر فرمایا کہ "یہ میرا اور مجھ سے پہلے کے انبیاء کا وضو ہے اور حضرت ابراہیم کا وضو ہے" (یہ دونوں حدیثیں رزین نے روایت کی ہیں اور امام نووی" نے شرح مسلم میں دوسری حدیث کو ضعیف کہا ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے تمام انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو ذکر کیا ہے اسے تخصیص بعد تعمیم کہتے ہیں، یعنی انبیاء کا عمومی طور پر ذکر کرنے کے بعد پھر بطور خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسم گرامی کا ذکر کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام طہارت اور نظافت کا بہت زیادہ خیال رکھا کرتے تھے۔

(۳۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ لِكُلِّ صَلَاةٍ وَكَانَ اَحَدُنَا يَكْفِيْهِ الْوُضُوْءُ مَالَمْ يُحْدِثْ۔ (رواہ الدارمی)

---

[1] حضرت ثابت بن ابی صفیہ تابعی ہیں، آپ کی کنیت ابوحمزہ تھی۔ ۱۴۸ھ میں انتقال ہوا ہے۔

[2] حضرت امام محمد باقر" حضرت امام زین العابدین کے صاحبزادے ہیں ۵۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی تھی، آپ کا انتقال ۱۱۷ یا ۱۱۸ھ بمقام مدینہ منورہ ہوا اور جنت البقیع میں دفن ہیں۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ہر (فرض) نماز کے لئے وضو فرمایا کرتے تھے اور ہم کو ایک وضو اس وقت تک کافی ہوتا تھا جب تک کہ وضو نہ ٹوٹتا تھا۔" (دارمیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے لئے ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنا پہلے واجب تھا مگر بعد میں وجوب کا یہ حکم منسوخ ہو گیا، جب کہ اس کے بعد آنے والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، کچھ علماء کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اولیٰ اور عزیمت سمجھ کر ہر نماز کے لئے تازہ وضو فرماتے تھے۔

(۳۳) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ قَالَ قُلْتُ لِعُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَأَيْتُ وُضُوْءَ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ لِكُلِّ صَلَاةٍ طَاهِرًا كَانَ اَوْ غَيْرَ طَاهِرٍ عَمَّنْ اَخَذَهُ فَقَالَ حَدَّثَتْهُ اَسْمَآءُ بِنْتُ زَيْدِ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ حَنْظَلَةَ بْنِ اَبِي عَامِرِ الْغَسِيْلِ حَدَّثَهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اُمِرَ بِالْوُضُوْءِ لِكُلِّ صَلَاةٍ طَاهِرًا كَانَ اَوْ غَيْرَ طَاهِرٍ فَلَمَّا شَقَّ ذٰلِكَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرَ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَوُضِعَ عَنْهُ الْوُضُوْءُ اِلَّا مِنْ حَدَثٍ قَالَ فَكَانَ عَبْدُاللّٰهِ يَرٰى اَنَّ بِهٖ قُوَّةً عَلٰى ذٰلِكَ فَفَعَلَهُ حَتّٰى مَاتَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت محمد بن یحییٰ بن حبان فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے حضرت عبید اللہ سے کہا کہ مجھے یہ بتائیے کہ کیا حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ہر نماز کے لئے وضو کرتے تھے خواہ وہ باوضو ہوں یا بے وضو اور انہوں نے یہ عمل کس سے حاصل کیا تھا؟ حضرت عبید اللہ نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے حضرت اسماء بنت زید بن خطاب نے یہ حدیث بیان کی کہ حضرت عبداللہ بن حنظلہ ابی عامر الغسیل نے ان سے یہ حدیث بیان کی کہ سرکار دو عالم ﷺ کو ہر نماز کا وضو کرنے کے لئے حکم دیا گیا تھا خواہ آپ ﷺ باوضو ہوں یا بے وضو جب آپ کے لئے یہ مشکل ہوا تو ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیا گیا اور وضو کو موقوف کیا گیا (یعنی ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنا واجب نہ رہا، جب تک وضو ٹوٹ نہ جائے" حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ خیال تھا کہ مجھ میں ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنے کی قوت ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی پر موت کے وقت تک عمل کیا۔" (احمدؒ)

تشریح: لفظ غسیل کے معنی ہیں "نہلایا گیا" یہ حضرت حنظلہ کی صفت ہے، حضرت حنظلہ کو غسیل اس لئے کہا جاتا ہے کہ انتقال کے بعد انہیں فرشتوں نے غسل دیا تھا۔ چنانچہ حضرت عروہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے حنظلہ کی اہلیہ محترمہ سے پوچھا کہ ان کا کیا حال تھا؟ (یعنی جب وہ گھر سے نکلے تو کیا کام کر رہے تھے) انہوں نے جواب دیا کہ وہ حالت ناپاکی میں تھے اور (نہانے کے وقت) اپنے سر کا ایک ہی حصہ دھو پائے تھے کہ اتنے میں انہوں نے صدا سنی (کہ جہاد کے لئے بلایا جا رہا ہے، چنانچہ وہ اسی حالت میں گھر سے باہر نکل کھڑے ہوئے اور (غزوۂ احد میں) جام شہادت نوش فرمایا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے دیکھا کہ فرشتے انہیں نہلا رہے تھے۔"

(طیبیؒ)

بہر حال طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسواک بہت زیادہ فضیلت اور بزرگی رکھتی ہے کہ جب ہی تو اسے واجب وضو کا قائم مقام قرار دیا گیا۔

حضرت عبداللہ ابن عمر ہر نماز کے لئے تازہ وضو اس لئے کرتے تھے کہ انہوں نے یہ اجتہاد کیا کہ اگرچہ اس کا وجوب منسوخ ہو گیا ہے مگر اس شخص کے لئے جو اس پر عمل کی طاقت و قوت رکھتا ہے اس کی فضیلت باقی ہے اس لئے انہوں نے جب یہ دیکھا کہ میرے اندر اتنی قوت و ہمت ہے کہ میں اس عمل کو بخوبی پورا کر سکتا ہوں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس فضیلت و سعادت سے محروم ہوں، چنانچہ انہوں نے اسے اپنا معمول بنا لیا کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو فرماتے اور جب تک موت کی آغوش نے انہیں اپنے اندر چھپا نہ لیا وہ اس معمول پر قائم و دائم رہے۔

(۳۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِسَعْدٍ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ فَقَالَ مَاهٰذَا السَّرَفُ يَا سَعْدُ قَالَ اَفِي الْوُضُوْءِ سَرَفٌ قَالَ نَعَمْ وَاِنْ كُنْتَ عَلٰى نَهْرٍ جَارٍ۔ (رواہ احمد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ کا گزر حضرت سعدؓ پر ہوا جب کہ وہ وضو کر رہے تھے (اور وضوء میں اسراف بھی کر رہے تھے) آپ ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا "اے سعد! یہ کیا اسراف (زیادتی ہے)؟" حضرت سعد نے عرض کیا کہ کیا وضو میں بھی اسراف ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! اگرچہ تم نہر جاری ہی پر (کیوں نہ وضو کر رہے) ہو۔"

(احمدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر تنبیہ کر رہی ہے کہ وضو و غسل میں پانی ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اسراف ہے اور اسراف شریعت کی نگاہ میں کوئی محبوب چیز نہیں ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت سعد کو دیکھا کہ وضو میں پانی زیادہ خرچ کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے انہیں تنبیہ فرمائی اس پر حضرت سعد کو بڑا تعجب ہوا کہ پانی کوئی نایاب اور کم یاب چیز تو ہے نہیں پھر اس میں اسراف کے کیا معنی؟ اسی بنا پر انہوں نے سوال بھی کیا کہ کیا وضو میں بھی اسراف ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسراف تو اسے بھی کہیں گے کہ تم نہر جاری پر بیٹھ کر وضو کرو اور وہاں پانی زیادہ خرچ کرو جب کہ نہر یا دریا وغیرہ سے کتنا بھی پانی خرچ کر دیا جائے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔

اس جملہ کی تشریح علماء یہ کرتے ہیں کہ نہر جاری پر اسراف اس لئے ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص حدود شریعت سے تجاوز کر کے ضرورت شرعی سے زیادہ پانی خرچ کرتا ہے تو اس میں عمر اور وقت یوں ہی ضائع ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اسراف ہے۔

علامہ طیبیؒ نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ اس سے اس بات میں مبالغہ منظور ہے کہ جس چیز میں اسراف متصور نہیں ہے جب اس میں بھی اسراف ہو سکتا ہے تو پھر ان چیزوں کا کیا حال ہو گا جس میں اسراف واقعۃً ہوتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ وضو اور غسل وغیرہ میں ضرورت شرعی سے زیادہ پانی خرچ کرنا اسراف میں شامل ہے اور یہ چیز مناسب نہیں ہے۔

(۳۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ وَ ذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ فَاِنَّهٗ يُطَهِّرُ جَسَدَهٗ كُلَّهٗ وَمَنْ تَوَضَّأَ وَلَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ لَمْ يُطَهِّرْ اِلَّا مَوْضِعَ الْوُضُوْءِ۔

"اور حضرت ابوہریرہ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمرؓ سرکار دو عالم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام لیا (یعنی پوری بسم اللہ پڑھ کر وضو شروع کیا) تو اس نے اپنا تمام بدن (گناہوں سے) پاک کیا اور جس نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا تو اس نے صرف اعضاء وضو کو پاک کیا۔"

تشریح: اس حدیث میں وضو میں بسم اللہ کہنے کی فضیلت کا اظہار ہو رہا ہے کہ جو شخص بسم اللہ کہہ کر وضو شروع کرتا ہے اس کا تمام بدن گناہ صغیرہ کی غلاظتوں سے پاک ہو جاتا ہے اور جس شخص نے بغیر بسم اللہ کہے ہوئے وضو کیا تو اس کے انہی اعضاء سے گناہ صغیرہ دور ہوتے ہیں جنہیں وضو میں دھویا گیا ہے۔

نیز اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ وضو میں بسم اللہ کہنا سنت یا مستحب ہے واجب نہیں ہے۔

(۳۶) وَعَنْ اَبِيْ رَافِعٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَوَضَّأَ وُضُوْءَ الصَّلٰوةِ حَرَّكَ خَاتَمَهٗ فِيْ اِصْبَعِهٖ رَوَاهُمَا الدَّارَقُطْنِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ الْاَخِيْرَ۔

"اور حضرت ابورافعؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب نماز کے لئے وضو فرماتے تو اپنی انگلی کی انگوٹھی کو بھی گھما پھرا لیتے۔ (ان دونوں حدیثوں کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہؒ نے صرف دوسری حدیث نقل کی ہے)۔"

تشریح: اس کا مسئلہ یہ ہے کہ انگوٹھی ڈھیلی ہو اور اس بات کا گمان ہو کہ وضو کے وقت پانی انگوٹھی کے نیچے انگلی تک پہنچ جاتا ہے تو اس صورت میں انگوٹھی کو ہلا لینا سُنّت ہوگا، ہاں اگر انگوٹھی تنگ ہو اور یہ یقین ہو کہ انگوٹھی کو ہلائے بغیر اس کے نیچے پانی نہیں پہنچے گا تو پھر انگوٹھی کو ہلا لینا واجب ہوگا تاکہ پانی اس کے نیچے انگلی تک پہنچ جائے۔

بَابُ الْغُسْلِ

نہانے کا بیان

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ اَحَدُکُمْ بَیْنَ شُعَبِهَا الْاَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ وَاِنْ لَّمْ یُنْزِلْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص عورت کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھے پھر کوشش کرے (یعنی جماع کرے) تو اس پر غسل واجب ہو گیا، اگرچہ منی نہ نکلے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "عورت کی چار شاخوں" سے مراد اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر ہیں، یا اس سے مراد عورت کے دونوں پیر اور فرج (شرم گاہ) کی طرفین ہیں۔ یہ جملہ عورت کے پاس جماع کے لئے جانے اور صحبت کرنے کی بلیغ تعبیر ہے، چونکہ آنحضرت ﷺ شرم و حیا کے انتہائی بلند مقام پر تھے، اس لئے آپ ﷺ نے صورت مسئلہ کی وضاحت کے لئے الفاظ کے کنایا کا سہارا لیا ہے) کھلے طور پر آپ ﷺ نے اس کی تشریح نہیں فرمائی ہے۔

بہر حال حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عورت کے پاس جماع کے لئے گیا اور اس نے جماع کیا تو محض حشفہ داخل کرنے سے اس پر غسل واجب ہو جائے گا، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔ خلفائے راشدین اور اکثر صحابہ کرامؓ نیز چاروں اماموں کا یہی مسلک ہے۔

غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں؟

② وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْمَآءُ مِنَ الْمَآءِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ قَالَ الشَّیْخُ الْاِمَامُ مُحْیُ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ هٰذَا مَنْسُوْخٌ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِنَّمَا الْمَآءُ مِنَ الْمَآءِ فِی الْاِحْتِلَامِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَلَمْ اَجِدْهُ فِی الصَّحِیْحَیْنِ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "پانی پانی سے ہے" (یعنی منی نکلنے سے غسل واجب ہو جاتا ہے) (مسلمؒ) اور امام محی السنۃ کہتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے اور ابن عباس نے فرمایا ہے کہ "پانی پانی سے ہے" کا حکم احتلام کے لئے ہے۔ (ترمذیؒ) اور مجھے یہ روایت بخاری و مسلم میں نہیں ملی ہے۔"

تشریح: اس ارشاد کے اسلوب پر بھی غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک طرف تو احکام شریعت کی تعلیم کی ذمہ داری ہے اور دوسری طرف آپ ﷺ شرم و حیا کے انتہائی بلند مقام پر فائز ہیں اس لئے آپ ﷺ ایسا اسلوب اختیار فرماتے ہیں کہ مسئلہ کی وضاحت بھی ہو جائے اور شرم و حیا کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایسے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جو کنایۃً مسئلہ کی وضاحت کر رہے ہیں۔

بہر حال اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب تک انزال نہ ہو یعنی منی نہ نکلے غسل واجب نہیں ہوتا مگر ابھی اس سے پہلے جو حدیث گزری ہے اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ غسل محض دخول حشفہ سے واجب ہو جائے گا خواہ انزال ہو یا نہ ہو، اس طرح ان دونوں

حدیثوں میں تعارض پیدا ہو گیا ہے۔

چنانچہ اسی تعارض کو دفع کرنے کے لئے حضرت امام محی السنۃ کا یہ قول مصنف مشکوٰۃ نقل فرما رہے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے۔ یعنی یہ حضرت ابی بن کعب کی اس روایت سے منسوخ قرار دیا گیا ہے جس میں منقول ہے کہ یہ آسانی ابتداء اسلام میں تھی (کہ جب تک انزال نہ ہو غسل واجب نہیں ہوتا تھا) پھر بعد میں اس حکم کو منسوخ قرار دیا گیا۔

حضرت امام ترمذیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ اسی طرح بہت سے صحابہؓ کے یہ اقوال منقول ہیں کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر بعد میں اسے منسوخ قرار دے کر یہ حکم نافذ کیا گیا کہ جب مرد کا ذکر عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو اور ختنین مل جائیں تو غسل واجب ہو جائے گا، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔

لیکن حضرت ابن عباسؓ اس حدیث کی ایک دوسری توجیہ بیان فرما رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم احتلام کے بارے میں ہے۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ محض خواب دیکھنے سے غسل واجب نہیں ہوتا بلکہ سو کر اٹھنے کے بعد اگر کپڑے وغیرہ پر منی کی تری دیکھی جائے تو غسل واجب ہو جائے گا۔ گویا حضرت ابن عباسؓ کی اس توجیہ کے پیش نظر اس حدیث کو منسوخ ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ یہ حدیث مطلق ہے یعنی اس حکم کا تعلق احتلام سے بھی تھا اور غیر احتلام سے بھی، مگر یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

(۳) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَتْ اُمُّ سُلَيْمٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ فَهَلْ عَلَى الْمَرْاَةِ مِنْ غُسْلٍ اِذَا احْتَلَمَتْ قَالَ نَعَمْ اِذَا رَاَتِ الْمَآءَ فَغَطَّتْ اُمُّ سَلَمَةَ وَجْهَهَا وَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوَ تَحْتَلِمُ الْمَرْاَةُ قَالَ نَعَمْ تَرِبَتْ يَمِيْنُكِ فَبِمَ يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ مُسْلِمٌ بِرِوَايَةِ اُمِّ سُلَيْمٍ اَنَّ مَآءَ الرَّجُلِ غَلِيْظٌ اَبْيَضُ وَمَآءَ الْمَرْاَةِ رَقِيْقٌ اَصْفَرُ فَمِنْ اَيِّهِمَا عَلَا اَوْسَبَقَ يَكُوْنُ مِنْهُ الشَّبَهُ۔

"اور حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ام سلیمؓ نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ، خدائے تعالیٰ حق کے معاملہ میں حیا نہیں کرتا (لہٰذا یہ بتائیے کہ) کیا عورت پر غسل واجب ہے جب کہ اس کو احتلام ہو۔ (یعنی خواب میں مجامعت دیکھے) آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! جب کہ وہ پانی (منی) کو دیکھے" یہ سن کر ام سلمہؓ نے اپنا منہ (شرم کی وجہ سے) ڈھانک لیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ (یعنی کیا مرد کی طرح عورت کے بھی منی ہوتی ہے اور نکلتی ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں! خاک آلودہ ہو تیرا داہنا ہاتھ (اگر ایسا نہ ہوتا تو) پھر اس کا بچہ اس کے مشابہ کیونکر ہو سکتا تھا۔" اور امام مسلمؒ نے ام سلیمؓ کی روایت میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ (آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا، مرد کی منی گاڑھی سفید ہوتی ہے اور عورت کی منی پتلی زرد ہوتی ہے لہٰذا ان میں سے جو منی غالب ہو یا سبقت کرے تو (بچہ کی) مشابہت اسی کے ساتھ ہوتی ہے۔"

تشریح: چونکہ مسئلہ ذرا نازک اور عرفاً خلاف شرم و حیا تھا اس لئے ام سلیمؓ نے پہلے تمہید کے طور پر کہا کہ "اللہ تعالیٰ حق کے معاملہ میں حیا نہیں کرتا" یعنی خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ حق بات پوچھنے میں شرم و حیا کیا جائے، پھر اس کے بعد انہوں نے اصل مسئلہ دریافت کیا۔

آپ ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ محض مجامعت کا خواب دیکھ لینے سے ہی غسل واجب نہیں ہو جاتا جب تک انزال نہ ہو یا صبح اٹھنے کے بعد اس کی کوئی علامت نہ پائے یعنی سو کر اٹھنے کے بعد اگر کپڑے یا بدن پر منی لگی ہوئی دیکھی جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے ہمارے نزدیک یہی حکم مذی کا بھی ہے یعنی اگر سو کر اٹھنے کے بعد کپڑے یا بدن پر مذی دیکھی جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

"خاک آلود ہو تیرا داہنا ہاتھ" یہ شدّ فقرے کنایہ ہے گویا یہ ایک قسم کی بدعا ہے۔ لیکن اس کا استعمال حقیقی معنی میں نہیں بلکہ ایک ایسا جملہ ہے جو اہل عرب کے یہاں تعجب کے وقت بولتے ہیں، اس طرح اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ "ام سلمہؓ! بڑے تعجب کی بات ہے

---

[1] آپ کے نام میں بہت زیادہ اختلاف ہے کچھ علماء نے سلمہ کچھ نے رملہ اور بعض نے ملکیہ لکھا ہے بہر حال حضرت انسؓ کی والدہ محترمہ ہیں۔

کہ تم ایسی بات کہہ رہی ہو؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ اگر عورت کے منی نہ ہوتی تو پھر اکثر بچے جو اپنی ماں کے مشابہ ہوتے ہیں وہ کس طرح ہوتے؟ مرد کی منی کی طرح عورت کی بھی منی ہوتی ہے اور پھر دونوں کی منی سے بچہ کی تخلیق ہوتی ہے۔"

آپ ﷺ نے منی کے جو رنگ بیان کئے ہیں وہ اکثر کے اعتبار سے ہے، یعنی اکثر اور تندرست وصحت مند عورت کی منی کے رنگ ایسے ہوتے ہیں، کیونکہ بعض مردوں کی منی کسی مرض کی بنا پر پتلی یا کثرت مباشرت کی وجہ سے سرخ ہوتی ہے، اس طرح بعض عورتوں کی منی قوت وطاقت کی زیادتی کی وجہ سے سفید بھی ہوتی ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مباشرت کے وقت اگر مرد اور عورت دونوں کی منی ساتھ ہی گر کر رحم مادہ میں پہنچے تو دونوں میں سے جس کی منی بھی غالب ہوگی یا ان دونوں میں سے جس کی منی سبقت کرے گی یعنی ایک دوسرے سے پہلے گر کر رحم مادر میں پہنچے گی بچہ اسی کے مشابہ ہوگا۔

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ بَدَأَ فَغَسَلَ يَدَيْهِ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ يُدْخِلُ اَصَابِعَهُ فِي الْمَآءِ فَيُخَلِّلُ بِهَا أُصُوْلَ شَعْرِهِ ثُمَّ يَصُبُّ عَلٰى رَأْسِهِ ثَلَاثَ غَرَفَاتٍ بِيَدِهِ ثُمَّ يُفِيْضُ الْمَآءَ عَلٰى جِلْدِهِ كُلِّهِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَيْهِ قَبْلَ اَنْ يُدْخِلَهَا الْاِنَاءَ ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِيْنِهِ عَلٰى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ۔

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب غسل جنابت (یعنی ناپاکی کو دور کرنے کے لئے غسل) کا ارادہ فرماتے تو (غسل) اس طرح شروع فرماتے کہ پہلے اپنے دونوں ہاتھ (پہنچوں تک) دھوتے پھر وضو کرتے جس طرح نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے پھر انگلیاں (تر ہونے کے لئے) پانی میں ڈالتے پھر انہیں نکال کر ان (انگلیوں کی تری) سے اپنے بالوں کی جڑوں میں خلال فرماتے پھر دونوں ہاتھوں سے تین چلو (پانی لے کر) سر پر ڈالتے اور پھر اپنے تمام بدن پر پانی بہاتے۔ (بخاریؒ ومسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (جب آپ ﷺ غسل) شروع کرتے تو اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے پھر اپنی شرم گاہ کو دھوتے اور اس کے بعد وضو کرتے۔"

تشریح: حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ ﷺ کے غسل کے طریقہ کو بتا رہی ہیں کہ جب آپ ناپاکی دور کرنے کے لئے غسل فرماتے تو اس کا طریقہ کیا ہوتا تھا؟ چنانچہ آپ فرما رہی ہیں کہ جب آپ ﷺ غسل شروع کرتے تو سب سے پہلے پہنچوں تک اپنے دونوں ہاتھوں کو دھوتے تھے۔ اس کے بعد آپ ﷺ اسی طرح وضو فرماتے جیسے کہ نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے، یعنی اگر آپ کسی ایسی جگہ غسل فرماتے کہ جہاں پاؤں رکھنے کی جگہ پانی جمع نہیں ہوتا مثلاً کسی تخت یا پتھر پر کھڑے ہو کر نہاتے تو وہ پورا وضو فرماتے اور اگر کسی ایسی جگہ نہاتے جہاں کوئی گڑھا وغیرہ ہوتا کہ اس کی وجہ سے پاؤں کے پاس پانی جمع رہتا تھا تو اس شکل میں آپ ﷺ وضو کے وقت پاؤں نہیں دھوتے بلکہ غسل سے فراغت کے بعد اس جگہ سے ہٹ کر پیر دھوتے تھے۔ جیسا کہ اس کے بعد آنے والی حدیث سے وضاحت ہو رہی ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں بھی لکھا ہے کہ اسی طرح کرنا چاہئے یعنی اگر غسل کے وقت پاؤں رکھنے کی جگہ پانی جمع نہ ہوتا ہو تو وضو مکمل کرنا چاہئے اور اگر پاؤں کے پاس پانی جمع ہوتا ہو تو پھر اس وقت پاؤں نہ دھوئے جائیں بلکہ غسل سے فارغ ہو کر وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ پر پیر دھوئے جائیں۔

اس جگہ نکتہ کے طور پر یہ بھی سن لیجئے کہ طبرانیؒ کی روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کو کبھی احتلام نہیں ہوا اور نہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو احتلام ہوا تھا۔

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَتْ مَيْمُوْنَةُ وَضَعْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُسْلًا فَسَتَرْتُهُ بِثَوْبٍ وَصَبَّ عَلٰى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا (ثُمَّ صَبَّ عَلٰى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا) ثُمَّ صَبَّ بِيَمِيْنِهِ عَلٰى شِمَالِهِ فَغَسَلَ فَرْجَهُ فَضَرَبَ بِيَدِهِ الْاَرْضَ فَمَسَحَهَا ثُمَّ غَسَلَهَا فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَغَسَلَ وَجْهَهُ وَذِرَاعَيْهِ ثُمَّ صَبَّ عَلٰى رَأْسِهِ وَاَفَاضَ عَلٰى جَسَدِهِ ثُمَّ تَنَحّٰى فَغَسَلَ

قَدَمَيْهِ فَنَاوَلْتُهُ ثَوْبًا فَلَمْ يَأْخُذْهُ فَانْطَلَقَ وَهُوَ يَنْفُضُ يَدَيْهِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَفْظُهُ لِلْبُخَارِيِّ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ نے فرمایا کہ "میں نے سرکار دوعالم کے لئے غسل کے واسطے پانی رکھا اور کپڑا ڈال کر پردہ کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈال کر انہیں دھویا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور شرم گاہ کو دھویا۔ پھر اپنا بایاں ہاتھ جس سے شرم گاہ کو دھویا تھا، زمین پر رگڑا اور اسے دھویا، پھر کلی کی ناک میں پانی ڈالا اور چہرہ وہاتھوں کو (کہنیوں تک) دھویا، پھر اپنے سر پر پانی ڈالا اور تمام بدن پر بہایا پھر (جہاں آپ ﷺ نے غسل فرمایا تھا) اس جگہ سے ہٹ کر اپنے پاؤں دھوئے۔ اس کے بعد میں نے (بدن پونچھنے کے لئے) کپڑا دیا، لیکن آپ ﷺ نے کپڑا نہیں لیا اور پھر ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہاں سے چلے۔" (بخاری و مسلمؒ الفاظ بخاری کے ہیں)

تشریح: اس حدیث سے اس بات کی وضاحت ہوگئی کہ اگر غسل ایسی جگہ کیا جائے جہاں پاؤں رکھنے کی جگہ پانی جمع ہوتا ہو تو وضو کے وقت پاؤں نہ دھوئے جائیں بلکہ غسل کے بعد وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ پاؤں دھو لئے جائیں چنانچہ آپ ﷺ نے غسل کے بعد وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ پر اس لئے دھوئے تھے کہ غسل کے وقت وضو میں آپ ﷺ نے پاؤں نہیں دھوئے تھے کیونکہ آپ ﷺ نے غسل کسی پتھر، تخت یا بلند جگہ پر نہیں کیا ہوگا جس کی وجہ سے پیروں میں پانی جمع ہوتا ہوگا۔

غسل کے بعد جب حضرت میمونہؓ نے بدن پونچھنے کے لئے کپڑا پیش کیا تو آپ ﷺ نے لینے سے انکار فرما دیا اس کے کئی احتمال علماء نے لکھے ہیں چنانچہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے کپڑا لینے سے اس لئے انکار فرما دیا ہو کہ غسل وغیرہ کے بعد بدن کو نہ پونچھنا ہی افضل تھا یا چونکہ آپ ﷺ کسی جلدی میں جا رہے ہوں گے، اس لئے یہ سوچ کر کہ کپڑے سے بدن پونچھنے میں دیر ہو گئی کپڑا نہیں لیا۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت گرمی کا موسم تھا اس لئے نہانے کے بعد پانی کی تری چونکہ اچھی اور بھلی معلوم ہو رہی تھی، اس لئے آپ ﷺ نے پانی کو بدن سے پونچھنا پسند نہ فرمایا ہو، یا پھر یہ وجہ رہی ہوگی کہ اس کپڑے میں گندگی وغیرہ لگنے کا شبہ ہوگا اس لئے آپ ﷺ نے اسے واپس فرما دیا۔

بہر حال جو بھی صورت حال رہی ہو مگر کپڑے کو واپس کرنا کسی عذر اور سبب ہی کی بنا پر تھا۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط نہیں کیا جا سکتا کہ غسل وغیرہ کے بعد بدن پر لگے ہوئے پانی کو نہ پونچھنا ہی سنت ہے یا یہ کہ پونچھنا مکروہ ہے۔

"ہاتھ جھٹکنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عام طور پر طاقتور اور صحت مند و توانا لوگ چلتے ہوئے ہاتھ ہلاتے چلتے ہیں اسی طرح آپ ﷺ بھی اپنے ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے تشریف لے گئے۔

(۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ امْرَأَةً مِنَ الْاَنْصَارِ سَأَلَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ غُسْلِهَا مِنَ الْمَحِيْضِ فَأَمَرَهَا كَيْفَ تَغْتَسِلُ ثُمَّ قَالَ خُذِيْ فِرْصَةً مِنْ مِسْكٍ فَتَطَهَّرِيْ بِهَا قَالَتْ كَيْفَ اَتَطَهَّرُ بِهَا فَقَالَ تَطَهَّرِيْ بِهَا قَالَتْ كَيْفَ اَتَطَهَّرُ بِهَا قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ تَطَهَّرِيْ بِهَا فَاجْتَذَبْتُهَا اِلَيَّ فَقُلْتُ تَتَبَّعِيْ بِهَا اَثَرَ الدَّمِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ (ایک دن) ایک انصاری عورت نے سرکار دوعالم ﷺ سے اپنے غسل حیض کے بارے میں پوچھا، چنانچہ آپ ﷺ نے اسے غسل کا حکم دیا کہ کس طرح غسل کیا جائے۔" (یعنی پہلی حدیثوں میں غسل کی جو کیفیت گزری ہے آپ ﷺ نے وہ بیان فرمائی، اور پھر فرمایا کہ مشک میں (بھگوئے ہوئے کپڑے) کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے پاکی حاصل کرو، اس نے کہا کہ اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم اس سے پاکی حاصل کرو۔" اس نے پھر پوچھا کہ اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "سبحان اللہ (یعنی اللہ پاک ہے)۔ تم اس سے پاکی حاصل کرو، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کے انہیں

---

[1] ام المؤمنین حضرت میمونہؓ حارث ہلالیہ عامریہ کی بیٹی اور نبی کریمؐ کی زوجہ محترمہ ہیں آپ کا انتقال بمقام سرف ۶۱ھ یا دوسرے قول کے مطابق ۵۱ھ میں ہوا ہے۔

الفاظ کو بار بار سن کر) میں نے اس عورت کو اپنی جانب کھینچ لیا اور اس سے کہا کہ "(تم اس کپڑے کو) خون کی جگہ (یعنی شرم گاہ پر) رکھ لو!۔"
(بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: اس قسم کے مسائل جہاں آرہے ہیں۔ وہاں آپ حدیث کا اسلوب دیکھ رہے ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ ایسے مسائل کو کس انداز سے بیان فرماتے ہیں، بات وہی ہے کہ ایک طرف تو مسائل شرعیہ کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی ذمہ داری آپ ﷺ کے کاندھوں پر ہے جس میں شرم و حیا کی وجہ سے کسی اخفاء کی گنجائش نہیں ہے دوسری طرف آپ ﷺ کی شرم و حیا کے وہ فطری تقاضے ہیں جو خلاف ادب و تہذیب جملوں کی ادائیگی میں حائل ہوتے ہیں۔ اس لئے آپ ﷺ ان مسائل کے بیان میں ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جو شرم و حیا کے دائرے سے سرمو متجاوز نہیں ہوتی اور مسائل کی وضاحت بھی حتی الامکان ہو جاتی ہے۔

اب آپ یہیں دیکھئے کہ ایک سائلہ عورتوں کے مسئلے کی وضاحت چاہتی ہے، آپ ﷺ اسے جواب دیتے ہیں اور پھر اس سلسلے میں نظامت و لطافت کے ایک خاص طریقہ کی طرف اس کی راہنمائی فرمانا چاہتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ اشاروں اشاروں میں اسے سمجھا رہے ہیں، سائلہ زیادہ سمجھ کا ثبوت نہیں دیتی ہے، آپ ﷺ دوبارہ اپنے جملوں کو دہراتے ہیں تاکہ وہ سمجھ جائے مگر وہ مزید وضاحت چاہتی ہے تو آپ پھر انتہائی تعجب سے فرماتے ہیں کہ "سبحان اللہ! تم اس سے پاکی حاصل کرو" یعنی تعجب کی بات ہے کہ تم اتنے سیدھے سادھے اور ظاہر مسئلہ کو نہیں سمجھ پا رہی ہو۔ یہ کوئی ایسا باریک مسئلہ نہیں ہے، کوئی خاص نکتہ نہیں ہے جسے سمجھنے میں اعلیٰ غور و فکر کی ضرورت ہو" حضرت عائشہ اس وقت ذکاوت و ذہانت کا بہترین ثبوت دیتی ہیں، انہوں نے تاڑ لیا کہ ادھر تو عورت آنحضور ﷺ کے مقصد اور مطلب تک پہنچ نہیں پارہی ہے۔ ادھر آپ ﷺ کی شرم و حیا اس سے آگے بڑھ کر مزید وضاحت کی اجازت نہیں دیئے جارہی ہے، چنانچہ آپ اس عورت کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور پھر اسے آنحضرت ﷺ کا مقصد وضاحت کے ساتھ سمجھاتی ہیں۔"

حدیث کے الفاظ خذی فرصۃ من مِسْكٍ فَتَطَهَّرِیْ میں لفظ مسک میم کے زیر کے ساتھ ہے جس کے معنی "مشک" کے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مشک کا ایک بڑا ٹکڑا یا مشک میں بھیگے ہوئے یا رنگے ہوئے کپڑے کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے پاکی حاصل کرو۔ ایک روایت میں میم کے زبر کے ساتھ بھی آیا ہے جس کے معنی چمڑے کے ہیں۔ لیکن روایت کے مطابق اور موقع کی مناسبت سے میم کے زیر کے ساتھ یعنی مشک کے معنی زیادہ بہتر اور اولیٰ ہیں۔

اس مسئلہ میں فقہاء لکھتے ہیں کہ عورت کے لئے (ایام حیض میں) یہ مستحب ہے کہ وہ مشک کا ایک ٹکڑا یا مشک میں رنگ کر معطر کئے ہوئے کپڑے کا ایک ٹکڑا لے کر شرمگاہ پر رکھ لے تاکہ خون کی بدبو جاتی رہے۔

(۷) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ امْرَأَةٌ اَشُدُّ ضَفْرَ رَأْسِیْ اَفَاَنْقُضُهٗ لِغُسْلِ الْجَنَابَةِ فَقَالَ لَا اِنَّمَا یَكْفِیْكِ اَنْ تَحْثِیْ عَلٰی رَأْسِكِ ثَلَاثَ حَثَیَاتٍ ثُمَّ تُفِیْضِیْنَ عَلَیْكِ الْمَآءَ فَتَطْهُرِیْنَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ام سلمہ ؓ فرماتی ہیں کہ "میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں ایک عورت ہوں اپنے سر کے بال بہت مضبوط گوندھتی ہوں، کیا صحبت کے بعد نہانے کے واسطے انہیں کھولا کروں"؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں! "بالوں کو کھولنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمہیں یہی کافی ہے کہ تین لپیں پانی لے کر اپنے سر پر ڈال لیا کرو اور پھر سارے بدن پر پانی بہا لیا کرو، پاک ہو جاؤ گی۔" (مسلم ؒ)

تشریح: اس حدیث کے سلسلے میں صحیح قول یہ ہے کہ حدیث کا مذکورہ بالا حکم صرف عورتوں کے لئے ہے چنانچہ غسل کے وقت اگر بال گندھے ہوئے ہوں اور سر پر پانی اس طرح ڈالا جائے کہ بالوں کی جڑیں بھیگ جائیں تو یہ کافی ہے، بالوں کو کھولنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر یہ جانے کے بالوں کو کھولے بغیر جڑیں نہیں بھیگیں گی تو پھر اس صورت میں بالوں کو کھولنا ضروری ہو گیا۔ مردوں کو ہر صورت میں بال کھول لینے چاہئیں۔

(۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ وَیَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ اِلٰی خَمْسَةِ اَمْدَادٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انس راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ ایک مد (پانی) سے وضو فرماتے اور ایک صاع سے پانچ مد تک (پانی سے غسل فرما لیتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مُدّ ایک پیمانے کا نام ہے جس میں تقریباً ایک سیر اناج آتا ہے اور صاع بھی ایک پیمانہ کا نام ہے جس میں تقریباً چار مد یعنی چار سیر کے قریب اناج آتا ہے۔ یہاں مد اور صاع سے پیمانہ مراد نہیں ہے بلکہ وزن مراد ہے، یعنی آنحضرت ﷺ تقریباً ایک سیر پانی سے وضو فرماتے تھے اور چار سیر اور زیادہ سے زیادہ پانچ سیر پانی غسل پر صرف فرماتے تھے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ تقریباً ایک سیر پانی سے وضو اور تقریباً چار سیر پانی سے غسل کیا جائے لیکن اتنی بات سمجھ لینی چاہئے کہ وضو اور غسل کے لئے پانی کی یہ مقدار اور وزن واجب کے درجہ میں نہیں ہے لیکن یہ سنت ہے کہ وضو اور غسل کے لئے پانی اس مقدار سے کم نہ ہو۔

آپ ﷺ کے وضو کے پانی کی مقدار بعض روایتوں میں دو تہائی مد اور بعض روایتوں میں آدھا مد بھی منقول ہے لہٰذا اس حدیث متفق علیہ کا محل یہ قرار دیا جائے گا کہ آپ اکثر و بیشتر ایک ہی مد سے وضو فرماتے تھے مگر کبھی کبھی اس سے کم مقدار پانی میں بھی وضو فرما لیتے تھے، جیسا کہ ان بعض روایتوں میں منقول ہے۔

⑨ وَعَنْ مُعَاذَةَ قَالَتْ قَالَتْ عَائِشَةُ كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اِنَآءٍ وَّاحِدٍ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ فَيُبَادِرُنِيْ حَتّٰى اَقُوْلَ دَعْ لِيْ دَعْ لِيْ قَالَتْ وَهُمَا جُنُبَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت معاذہ کہتی ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی تھیں کہ "میں اور سرکار دو عالم ﷺ ایک ہی برتن جو دونوں کے درمیان رکھا رہتا تھا، نہاتے تھے اور آپ ﷺ (پانی لینے میں) مجھ سے جلدی کرتے تھے تو میں کہا کرتی تھی "میرے لئے تو پانی چھوڑ دیجئے، میرے لئے بھی تو پانی رہنے دیجئے۔" حضرت معاذہ فرماتی ہیں کہ وہ دونوں (یعنی آنحضرت ﷺ اور حضرت عائشہ) جنبی (یعنی ناپاکی) کی حالت میں ہوتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: جس برتن سے آپ اور حضرت عائشہ صدیقہ مشترکہ طور پر غسل فرماتے تھے وہ ایک طشت کی قسم سے تھا جس میں تین صاع تقریباً بارہ سیر پانی سماتا تھا، غسل کے وقت یہ دونوں اس میں ہاتھ ڈال ڈال کر پانی نکالتے اور اس سے نہاتے، حدیث کے الفاظ "آپ ﷺ (پانی لینے میں) جلدی کرتے تھے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ "آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ کے نہانے سے پہلے تھوڑے سے پانی سے نہا لیتے تھے اور بقیہ پانی چھوڑ دیتے تھے، جس سے حضرت عائشہ نہاتی تھیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی کا برتن دونوں کے درمیان رکھا رہتا تھا اور دونوں اکٹھے اس سے نہاتے تھے۔ حدیث کے آخری جملہ "وہ دونوں حالت ناپاکی میں ہوتے تھے کہ تحت ابن مالک نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس پانی میں جنبی ہاتھ ڈالے وہ پانی طاہر و مطہر ہے جنبی خواہ مرد ہو یا عورت۔

امام ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء کا یہ قول ہے کہ اگر محدث (بے وضو) جنبی (جس پر غسل واجب ہو) اور حائض (حیض والی عورت) کے ہاتھ پاک ہوں اور وہ برتن میں چلو بھرنے کے لئے ہاتھ ڈالیں تو پانی مستعمل (یعنی ناقابل استعمال) نہیں ہوتا۔ کیوں کہ برتن سے پانی نکالنے کے لئے وہ اس طریقے کے محتاج ہیں۔ چنانچہ امام موصوف اپنے اس قول کی دلیل میں یہی حدیث پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ "اس کے برخلاف اگر جنبی پانی کے برتن میں اپنا پاؤں یا سر ڈالے تو پھر پانی ناقابل استعمال ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں اسے کوئی مجبوری نہیں ہے اور نہ اسی طریقہ کی ضرورت ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

⑩ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الرَّجُلِ يَجِدُ الْبَلَلَ وَلَا يَذْكُرُ اِحْتِلَامًا قَالَ يَغْتَسِلُ

وَعَنِ الرَّجُلِ یَرٰی اَنَّہٗ قَدِ احْتَلَمَ وَلَا یَجِدُ بَلَلًا قَالَ لَا غُسْلَ عَلَیْہِ قَالَتْ اُمُّ سُلَیْمٍ ھَلْ عَلَی الْمَرْاَۃِ تَرٰی ذٰلِکَ غُسْلٌ قَالَ نَعَمْ اِنَّ النِّسَآءَ شَقَآئِقُ الرِّجَالِ۔ (رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَی الدَّارِمِیُّ وَ ابْنُ مَاجَۃَ اِلٰی قَوْلِہٖ لَا غُسْلَ عَلَیْہِ)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو (سو کر اٹھنے کے بعد کپڑے پر منی کی) تری محسوس کرے اور خواب (احتلام) اسے یاد نہ ہو؟ آپ نے فرمایا کہ "نہانا چاہئے"! اور ایسے شخص کے بارے میں بھی پوچھا گیا جسے (سو کر اٹھنے کے بعد) احتلام تو یاد ہو مگر تری معلوم نہیں ہوتی؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس پر غسل واجب نہیں" ام سلیمؓ نے پوچھا اگر عورت بھی یہ (تری) دیکھے تو اس پر غسل واجب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" عورتیں بھی مردوں ہی کی مثل ہیں۔" (ترمذیؒ ابوداؤدؒ اور دارمیؒ و ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو "لاغسل علیہ" (اس پر غسل واجب نہیں تک نقل کیا ہے۔)

تشریح: سوال یہ تھا کہ مثلاً ایک شخص ہے وہ سو کر اٹھا اس نے کپڑے پر یا بدن پر منی یا مذی لگی ہوئی ہے مگر اسے کوئی ایسا خواب یاد نہیں ہے کہ اس نے نیند میں کسی سے مباشرت کی ہو جس کی وجہ سے یہ احتلام ہوا ہے تو کیا ایسے شخص پر غسل واجب ہو گیا یا نہیں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اسے نہانا چاہئے! گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ غسل کے وجوب کا دارومدار منی یا مذی کی تری پر ہے خواب کے یاد رہنے نہ رہنے پر نہیں ہے۔

حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ پیدائش اور طبائع کے اعتبار سے عورتیں چونکہ مردوں ہی کی مانند ہیں اس لئے مرد کی طرح اگر عورت بھی جاگنے کے بعد اپنے کپڑے اور بدن پر تری محسوس کرے تو اس پر بھی غسل واجب ہو گا۔

اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ محض تری دیکھ لینے سے غسل واجب ہو جاتا ہے اگرچہ اس بات کا یقین نہ ہو کہ منی کود کر نکلی ہے چنانچہ تابعین کی ایک جماعت اور امام اعظم ابوحنیفہؒ سے یہی منقول ہے۔

اکثر علماء یہ فرماتے ہیں کہ غسل اس وقت تک واجب نہیں ہو گا کہ جب تک یہ جانے کہ منی کود کر نکلی ہے، اگر یہ جانے کہ منی کود کر نکلی ہے تو غسل واجب ہو جائے گا ورنہ بصورت دیگر غسل واجب تو نہ ہو گا مگر احتیاطاً غسل کر لینا مستحب ہو گا۔

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مرد و عورت ایک ہی بستر پر اکٹھے سوئے، جب وہ سو کر اٹھے تو انہوں نے بستر پر منی کی تری محسوس کی۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ یہ کس کی منی کی تری ہے تو اس صورت میں دونوں میں سے کس پر غسل واجب ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شکل میں یہ دیکھا جائے گا کہ منی کا رنگ کیسا ہے؟ اگر وہ سفید ہے تو یہ اس بات کی علامت ہو گی کہ مرد کی ہے لہٰذا مرد پر غسل واجب ہو گا۔ اور اگر رنگ زرد ہے تو پھر غسل عورت پر واجب ہو گا۔ مگر احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مرد و عورت دونوں ہی غسل کر لیں۔"

(۱۱) وَعَنْھَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ وَجَبَ الْغُسْلُ فَعَلْتُہٗ اَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاغْتَسَلْنَا۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب مرد کے ختنہ کی جگہ عورت کے ختنہ کی جگہ سے تجاوز کر جائے (یعنی حشفہ غائب ہو جائے) تو (دونوں پر) غسل واجب ہو جائے گا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "ختان" اس جگہ کو کہتے ہیں جسے ختنہ کے وقت کاٹتے ہیں جو مرد کے عضو تناسل کے آگے ایک کھال ہوتی ہے اور عورت کی شرم گاہ پر مرغ کی کلغی کی طرح ابھرا ہوا ایک حصہ ہوتا ہے لہٰذا فرمایا جا رہا ہے کہ جب ختنین مل جائیں اور حشفہ عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہوتا ہے، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔"

(۱۲) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَحْتَ کُلِّ شَعْرَۃٍ جَنَابَۃٌ فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ وَ اَنْقُوا

الْبَشَرَةَ۔ (رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَ التِّرْمِذِیُّ وَ ابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ وَ الْحَارِثُ بْنُ وَجِیْہِ الرَّاوِیْ وَھُوَ شَیْخٌ لَیْسَ بِذٰلِکَ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا" ہر بال کے نیچے (جڑ میں) جنابت ہوتی ہے لہٰذا بالوں کو (خوب) دھویا کرو اور بدن کو پاک کیا کرو۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ اس حدیث کا ایک راوی حارث ابن وجیہ ایک بوڑھا شخص ہے وہ معتبر نہیں (یعنی کبر سنی اور غلبہ نسیان کی وجہ سے) اس کی روایت قابل اعتماد یعنی قوی نہیں ہے بلکہ ضعیف ہے)

تشریح: اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ غسل جنابت میں سر کے بالوں کو اچھی طرح دھویا جائے تاکہ پانی بالوں کی جڑ میں پہنچ جائے اس لئے اگر پانی بالوں کی جڑ تک نہیں پہنچے گا تو پاکی حاصل نہیں ہوگی، چنانچہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اگر ایک بال کے نیچے کی بھی جگہ خشک رہ جائے گی تو غسل ادا نہ ہوگا۔

بالوں کے ساتھ ساتھ بدن کو بھی اچھی طرح دھونے کا حکم دیا جارہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نہانے کے وقت بدن کو خوب اچھی طرح مل کر میل وغیرہ صاف کرنا چاہئے اور پورے بدن پر پانی اس طرح بہانا چاہئے کہ بدن کا کوئی حصہ بھی خشک نہ رہ جائے کیونکہ اگر بدن پر خشک مٹی، آٹا یا موم وغیرہ لگا رہا اس کے نیچے پانی نہ پہنچا تو ناپاکی دور نہ ہوگی۔

(۱۳) وَعَنْ عَلِیٍّؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَکَ مَوْضِعَ شَعْرَۃٍ مِّنْ جَنَابَۃٍ لَّمْ یَغْسِلْھَا فُعِلَ بِھَا کَذَا وَکَذَا مِنَ النَّارِ قَالَ عَلِیٌّ فَمِنْ ثَمَّ عَادَیْتُ رَاْسِیْ فَمِنْ ثَمَّ عَادَیْتُ رَاْسِیْ فَمِنْ ثَمَّ عَادَیْتُ رَاْسِیْ ثَلَاثًا رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَاَحْمَدُ وَالدَّارِمِیُّ اِلَّا اَنَّھُمَا لَمْ یُکَرِّرَا فَمِنْ ثَمَّ عَادَیْتُ رَاْسِیْ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا" جس نے غسل جنابت میں ایک بال کے برابر جگہ (خشک) چھوڑ دی کہ اسے نہ دھویا تو اسے اس اس طرح آگ کا عذاب دیا جائے گا" حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دشمنی کی۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دشمنی کی" اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دشمنی کی (کہ منڈا ڈالا) تین مرتبہ یہی کہا۔" (ابوداؤدؒ، احمدؒ، دارمیؒ) مگر احمدؒ نے یہ الفاظ "اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دشمنی کی" مکرر ذکر نہیں کئے ہیں۔)

تشریح: یہ حدیث مزید وضاحت کے ساتھ اوپر کی حدیث کی تائید کر رہی ہے اور غسل جنابت میں بالوں کے سلسلے میں غفلت برتنے والوں کو متنبہ کر رہی ہے چنانچہ "اس اس طرح" یہ تعدد سے کنایہ ہے یعنی ایسے شخص کو جس نے غسل احتیاط سے نہیں کیا اور بالوں کی جڑوں میں پانی اچھی طرح نہیں پہنچایا کئی قسم کے اور بہت زیادہ عذاب دیئے جائیں گے۔

حضرت علیؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب میں نے آنحضرت ﷺ کی لسان مبارک سے یہ تہدید اور وعید سنی تو اس خوف سے کہ اگر بال رہے تو غسل جنابت کے وقت شاید ان کی جڑیں خشک رہ جائیں اپنے بالوں سے بالکل دشمنوں جیسا معاملہ کیا جس طرح ایک شخص اپنے دشمن کو اپنے لئے خطرہ کا سبب اور باعث سمجھ کر موقع ملتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے، ایسے ہی میں نے آنحضرت ﷺ کی تہدید اور وعید کی بناء پر ان بالوں کو اپنی عاقبت کی خرابی کا باعث سمجھتے ہوئے ان کا صفایا کر دیا۔

اس حدیث اور حضرت علیؓ کے اس عمل سے یہ معلوم ہوا کہ سر کے بال ہمیشہ منڈاتے رہنا جائز ہے مگر اولیٰ اور سنت بالوں کا رکھنا ہی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدینؓ اپنے سروں پر بال رکھتے تھے اور صرف حج کے موقع پر منڈواتے تھے۔

جہاں تک حضرت علیؓ کے اس ارشاد کا تعلق ہے، اس بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے حضرت علیؓ کی مراد یہ ہے کہ میں نے اپنے سر کے جو بال منڈاوئے ہیں، ان کی کوئی دوسری غرض نہیں ہے یعنی اس سے زیبائش اور آرائش یا کسی راحت و آرام کا طلب مقصود

نہیں ہے بلکہ اصل مقصد وہی ہے جو بیان کیا گیا، اس طرح گویا حضرت علیؓ نے ایک ایسے فعل کے ترک پر عذر بیان کیا جو آنحضرت ﷺ سے مداومت کے ساتھ ثابت ہے۔

(۱۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَوَضَّأُ بَعْدَ الْغُسْلِ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ غسل کرنے کے بعد وضو نہیں فرماتے تھے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ غسل سے پہلے جو وضو غسل کے لئے فرماتے تھے غسل کے بعد پھر دوبارہ وضو نہیں فرماتے تھے، چنانچہ مسئلہ بھی یہی ہے کہ غسل کے لئے جو وضو کیا جاتا ہے وہ کافی ہوتا ہے غسل کے بعد اگر نماز وغیرہ پڑھی جائے تو دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے غسل کے وضو سے نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

(۱۵) وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْسِلُ رَأْسَهُ بِالْخِطْمِيِّ وَهُوَ جُنُبٌ يَجْتَزِئُ بِذَالِكَ وَلَا يَصُبُّ عَلَيْهِ الْمَآءَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ ناپاکی کی حالت میں (غسل کے وقت) خطمی سے سر کو دھو لیتے تھے اور اسی پر کفایت کرتے اور دوبارہ سر پر خالص پانی نہ ڈالتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: جس طرح یہاں آنولہ وغیرہ سے سر دھونے کا رواج تھا ایسے ہی عرب میں خطمی سے سر دھوئے جاتے تھے، چنانچہ حضرت عائشہؓ اس کے بارے میں فرما رہی ہیں کہ آپ ﷺ جب غسل جنابت فرماتے تو اپنے سر کے بال خطمی کے پانی سے دھویا کرتے تھے اور اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ جب سر پر خطمی لگا کر اسے دھونے کے لئے سر پر خطمی ملا ہوا پانی ڈالتے تھے تو پھر دوبارہ پانی بہانے کے وقت سر پر پانی نہیں ڈالتے تھے بلکہ اسی پہلے دھوئے ہوئے کو کافی سمجھتے تھے جیسا کہ عام طور پر نہانے والے یہ کرتے ہیں کہ پہلے سر کو دھوتے ہیں، اس کے بعد غسل کرتے ہیں اور پھر دوبارہ سر پر بھی پانی ڈالتے ہیں آپ ﷺ ایسا نہیں کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ جس پانی سے سر کو دھویا کرتے تھے اس میں خطمی کے اجزاء کم ہوتے ہوں گے کہ جس سے پانی کی حقیقت میں کوئی تغیر نہیں ہوتا ہوگا یعنی سیلان باقی رہتا ہوگا۔

(۱۶) وَعَنْ يَعْلٰى قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى رَجُلًا يَغْتَسِلُ بِالْبَرَازِ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ سِتِّيْرٌ يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالتَّسَتُّرَ فَاِذَا اغْتَسَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ سِتِّيْرٌ فَاِذَا اَرَادَ اَحَدُكُمْ اَنْ يَغْتَسِلَ فَلْيَتَوَارَ بِشَيْئٍ)

"اور حضرت یعلیٰ[1] فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک شخص کو میدان میں ننگا نہاتے ہوئے دیکھا چنانچہ آپ ﷺ (وعظ کے لئے) ممبر پر چڑھے اور پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی پھر فرمایا اللہ تعالیٰ بہت حیادار ہے (یعنی اپنے بندوں سے حیاداروں کا سا معاملہ کرتا ہے بایں طور کہ انہیں معاف کر دیتا ہے اور بہت پردہ پوش ہے (یعنی اپنے بندوں کے گناہ اور عیوب کو پوشیدہ رکھتا ہے) وہ حیا اور پردہ پوشی کو پسند کرتا ہے لہٰذا جب تم میں سے کوئی (میدان میں) نہائے تو اسے چاہئے کہ وہ پردہ کر لیا کرے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ) اور نسائی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ پردہ پوش ہے لہٰذا جب تم میں سے کوئی نہانے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ کسی چیز کا پردہ کر لیا کرے۔)

تشریح: سرکار دو عالم ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب آپ ﷺ کسی اہم اور عظیم مسئلہ کو بیان کرنا چاہتے یا کسی خاص چیز سے آگاہ کرنا

[1] یہاں تحقیق سے یہ بات واضح نہیں ہوئی ہے کہ یہ یعلیٰ بن امیہ تمیمی ہیں یا یعلیٰ ابن مرہ ثقفی ہیں بہر حال یہ دونوں جلیل القدر صحابی ہیں۔

چاہتے تو منبر پر تشریف لے جاتے اور پہلے اللہ جل شانہ کی حمد و ثنا کرتے اس کے بعد اصل مسئلہ کو بیان فرماتے چنانچہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا وہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر ایک کھلی جگہ (میدان میں ننگا نہا رہا ہے تو آپ ﷺ کی جبین شرم و حیا پر بل پڑ گئے، فوراً مسجد نبوی میں پہنچے منبر پر تشریف لے گئے اور لوگوں کے سامنے آپ ﷺ نے شرم و حیا کی اہمیت کو بڑے بلیغ اور ناصحانہ انداز میں بیان فرمایا۔

آپ ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ خداوند قدوس کی ذات پاک تمام محاسن و اوصاف کی جامع ہے چنانچہ شرم و حیا اور پردہ پوشی جو بہت بڑے وصف ہیں یہ بھی خدائے تعالیٰ کے اوصاف میں سے ہیں، چنانچہ خدائے تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس کے اوصاف کی نورانی کرنوں سے اپنے دل و دماغ کو روشن کریں، اس کی جو صفات ہیں ان کو حتی الامکان اپنے اندر پیدا کریں اس لئے وہ اسے پسند کرتا ہے بندے شرم و حیا کے اصولوں پر کاربند رہیں، ان عظیم اوصاف سے اپنے دامن کو مالامال کریں اور پردہ پوشی کو کسی حال میں ترک نہ کریں، لہٰذا تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ شرم اور پردہ کے معاملے میں غفلت اور لاپرواہی نہ برتیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑰ وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ اِنَّمَا كَانَ الْمَآءُ مِنَ الْمَآءِ رُخْصَةً فِيْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ نُهِيَ عَنْهَا۔

(رواہ الترمذی و ابوداؤد و الدارمی)

"حضرت ابی بن کعب فرماتے ہیں کہ "یہ حکم، غسل انزال کے بعد ہی واجب ہوتا ہے ابتدائے اسلام میں آسانی کی وجہ سے تھا، پھر اسے منع فرما دیا گیا (یعنی یہ حکم منسوخ قرار دے دیا گیا۔" (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

تشریح: اس باب کی حدیث نمبر ۲ کی تشریح میں حضرت ابی بن کعب کی اس روایت کا ذکر آچکا ہے، وہاں بھی یہ بتایا گیا تھا کہ ابتداء اسلام میں یہ حکم تھا کہ غسل اسی صورت میں واجب ہوگا جب کہ جماع کے وقت انزال بھی ہو یعنی اس وقت بغیر انزال کے محض ادخال ذکر سے ہی غسل واجب نہیں ہوتا تھا، چنانچہ حضرت ابی بن کعب یہی فرما رہے ہیں کہ یہ حکم (جو اس باب کی حدیث ۲ میں گزرا ہے) پہلے تھا، اب منسوخ ہو گیا ہے اور اب یہ حکم ہو گیا ہے کہ محض جماع ادخال ذکر سے غسل واجب ہو جائے گا، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔"

⑱ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّي اغْتَسَلْتُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَصَلَّيْتُ الْفَجْرَ فَرَأَيْتُ قَدْرَ مَوْضِعِ الظُّفُرِ لَمْ يُصِبْهُ الْمَآءُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْكُنْتَ مَسَحْتَ عَلَيْهِ بِيَدِكَ اَجْزَأَكَ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص سرکار دو عالم ﷺ کے خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے غسل جنابت کیا اور صبح کی نماز پڑھ لی، پھر میں نے دیکھا کہ (بدن پر) ناخن کے برابر (جگہ خشک رہ گئی کہ وہاں) پانی نہیں پہنچا آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم (اس جگہ اپنے بھیگے) ہاتھ سے مسح بھی کر لیتے تو کافی ہو جاتا۔" (ابن ماجہ)

تشریح: آپ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم غسل کے وقت اس جگہ جو خشک رہ گئی تھی بھیگا ہوا ہاتھ پھیر لیتے یا اسے معمولی طور پر دھو دیتے تو یہ کافی ہو جاتا اور تمہارا غسل پورا ہو جاتا۔

اور اگر تمہیں اس جگہ خشکی کا احساس کچھ عرصہ کے بعد ہوا تھا تو تمہیں چاہئے تھا کہ اس جگہ کو دھو لیتے خواہ معمولی طور پر ہی کیوں نہ ہوتا اور جو نماز پڑھ لی تھی اس کی قضاء کرتے۔"

⑲ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتِ الصَّلٰوةُ خَمْسِيْنَ وَالْغُسْلُ مِنَ الْجَنَابَةِ سَبْعَ مَرَّاتٍ وَغَسْلُ الْبَوْلِ مِنَ الثَّوْبِ سَبْعَ

مَرَّاتٍ فَلَمْ يَزَلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُ حَتّٰى جُعِلَتِ الصَّلَاةُ خَمْسًا وَغُسْلُ الْجَنَابَةِ مَرَّةً وَغُسْلُ الثَّوْبِ مِنَ الْبَوْلِ مَرَّةً۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ (پہلے) پچاس نمازیں فرض ہوئیں تھیں، نیز جنابت (ناپاکی) سے نہانا اور کپڑے پر سے پیشاب دھونا سات سات مرتبہ (فرض ہوا تھا) پھر آنحضرت ﷺ متواتر (اللہ تعالیٰ سے ان میں تخفیف کی دعا مانگتے رہے، یہاں تک کہ نماز تو پانچ فرض رہ گئیں اور جنابت سے نہانا اور کپڑے پر سے پیشاب کا دھونا ایک ایک مرتبہ رہ گیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: سرکار دوعالم ﷺ نے جب روحانی اور جسمانی بلندیوں کی تمام منازل کو طے فرما کر شب معراج میں ذات حق جل مجدہ کی قربت حقیقی کا شرف حاصل فرمایا تو اس مقدس اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی سعادت ورفعت کی یادگار کے طور پر بارگاہ حق میں جل مجدہ سے رسول پاک ﷺ کے توسط سے بندوں کے لئے "نماز" کا تحفہ عنایت فرمایا گیا جسے معراج رسول خدا کی اس عظیم سعادت کی مناسبت سے "معراج مؤمنین" کہا گیا ہے۔ نماز چونکہ تمام عبادات الٰہی میں اپنے اجر وثواب اور اپنی عظمت و اہمیت کے اعتبار سے بندوں کے لئے سعادت و نیک بختی اور رضائے مولیٰ کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس لئے اس بنا پر کہ اس عظیم اور مقدس فریضہ کے ذریعہ خدا کے نیک اور اطاعت گزار بندے زیادہ سے زیادہ سعادت و نیک بختی کی دولت سے اپنے دامن مالا مال کر سکیں اور دن ورات میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔"

ظاہر ہے کہ پچاس نمازوں کے فریضہ کا یہ تحفہ بندوں کی سعادت و نیک بختی کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی اہمیت و عظمت کا حامل کیوں نہ ہو مگر سوال یہ تھا کہ انسان کے قویٰ اور ذہن و فکر اس عظیم فریضہ کی ادائیگی کا بار برداشت بھی کر سکیں گے؟ صدقہ جائیے سرکار دوعالم کی ذات اقدس اور آپ ﷺ کی شان رحمت کے اکہ انسانی فطرت و مزاج کا یہ سب سے بڑا رازدان اور انسانیت کا یہ عظیم محسن اور عظیم شفیق راہبر (ﷺ) سمجھ لیتا ہے کہ انسان کے قوائے فکر وعمل اس عظیم بار کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے اور خدا کے بندے نماز کی اتنی بڑی تعداد کی ادائیگی پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے سوچا کہ اگر آج پچاس نمازیں فرض ہو جا رہی ہیں تو کل پوری مخلوق زبردست اخروی خسران اور روحانی اذیت میں مبتلاء ہو جائے گی کیونکہ پچاس نمازیں ادا ہوں گی نہیں، جس کا نتیجہ حکم خداوندی کی نافرمانی کی بنا پر عذاب کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اس وقت آپ ﷺ اپنی امت پر انتہائی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے ہیں اور بارگاہ خداوندی میں نماز کی اس تعداد میں تخفیف چاہتے ہیں، پھر ادھر سے بھی اپنے حبیب ﷺ کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا جاتا ہے اور اس میں کمی کر دی جاتی ہے، مگر آپ ﷺ اس سے بھی مطمئن نہیں ہوتے تو مزید تخفیف کی درخواست پیش کرتے ہیں جب کچھ اور تخفیف ہوتی ہے تو آپ اسے بھی زیادہ اور امت کے حق میں تکلیف مالا یطاق سمجھتے ہوئے اور کمی چاہتے ہیں یہاں تک کہ درخواست اور قبولیت کا یہ سلسلہ پانچ پر آکر ختم ہو جاتا ہے اور پانچ نمازیں فرض قرار دے دی جاتی ہیں۔

چنانچہ اس حدیث میں اسی طرف اشارہ دیا جا رہا ہے کہ شب معراج میں تو نمازیں پچاس ہی فرض ہوئیں تھی مگر آنحضرت ﷺ نے امت کے حق میں انتہائی شفقت و رحمت کے پیش نظر یہ جان کر کہ امت سے اتنی نماز ادا نہیں ہوں گی اس تعداد میں تخفیف کرائی جب بھی آپ تخفیف کی درخواست پیش کرتے پانچ نمازیں کم کر دی جاتیں یہاں تک کہ آخر میں پانچ نمازیں رہ گئیں۔

اسی طرح پہلے ناپاکی دور کرنے کے لئے سات مرتبہ غسل کرنے کا حکم تھا مگر بعد میں اسے بھی منسوخ قرار دے دیا گیا اور صرف ایک مرتبہ غسل واجب کیا گیا۔ یعنی پورے بدن پر ایک مرتبہ پانی بہانے سے فرض اداء ہو جاتا ہے مگر مسنون طریقہ یہ ہے کہ تین مرتبہ جسم پر پانی بہایا جائے، بخاریؒ و مسلمؒ میں اس سلسلہ میں جو حدیث منقول ہے اس میں صرف نماز کا ذکر ہے، غسل اور کپڑے سے پیشاب دھونے کا ذکر نہیں ہے مگر یہاں یہ ابوداؤد کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس میں ان دونوں چیزوں کا بھی ذکر ہے چنانچہ اس روایت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔

بہر حال اس حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کپڑے پر پیشاب اور غلاظت وغیرہ لگ جائے تو اسے صرف ایک بار دھولینا ہی کافی ہے چنانچہ امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے کہ کپڑا ایک مرتبہ دھولینے سے پاک ہو جاتا ہے، لیکن علمائے حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کپڑے پر پیشاب اور غلاظت لگ جائے تو اسے اتنا دھویا جائے کہ اس کی پاکی کا ظن غالب حاصل ہو جائے اور اس کی حدیہ مقرر کی ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ کپڑے کو نچوڑا جائے کیونکہ تین مرتبہ دھولینے سے پاکی کا ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر تفصیل بتا دینی مناسب ہے کہ غسل کن کن مواقع پر واجب اور مستحب ہو جاتا ہے۔

① غسل اس شکل میں فرض ہوتا ہے کہ منی کود کر نکلے اور ریڑھ کی ہڈی سے جدا ہونے کے وقت شہوت بھی ہو اگرچہ باہر نکلتے وقت شہوت باقی نہ رہے۔

② اگر کوئی شخص سو کر اٹھے اور اپنے بستر وغیرہ پر منی کی تری پائے خواہ وہ مذی ہی کیوں نہ ہو تو غسل واجب ہوتا ہے اگرچہ ایسا کوئی خواب یاد نہ ہو جس کی وجہ سے منی نکلی ہے۔

③ اگر زندہ عورت کے آگے یا پیچھے ستر میں ذکر داخل کیا جائے یا لواطت کی جائے تو دونوں یعنی فاعل و مفعول پر غسل فرض ہوگا خواہ انزال ہو نہ ہو۔

④ حیض اور نفاس ختم ہونے کی بعد غسل فرض ہوتا ہے۔

⑤ اگر چوپائے یا مردہ کے آگے یا پیچھے کے حصہ میں ذکر داخل کیا تو اگر انزال ہوگا تو غسل واجب ہوگا ورنہ نہیں۔

⑥ مذی اور ودی نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا، اسی طرح اگر محض خواب یاد ہو اور بستر وغیرہ پر منی کی تری یا اس کی کوئی علامت موجود نہ ہو تو غسل واجب نہیں ہوتا۔

⑦ اگر کوئی غیر مسلمؒ اس حال میں مسلمان ہوا کہ وہ ناپاکی کی حالت میں تھا تو اس پر غسل واجب ہوگا اور اگر ناپاکی کی حالت میں نہیں تھا تو واجب نہیں ہوگا البتہ مستحب ہوگا۔

⑧ زندوں پر میت کو غسل دینا واجب کفایہ ہے، یعنی اگر کچھ لوگ نہلا دیں تو سب بری الذمہ ہو جاتے ہیں، ورنہ سب گناہ گار ہوتے ہیں۔

⑨ جمعہ، عیدین، احرام اور عرفہ کے لئے غسل کرنا سنت ہے۔

⑩ محدث (بے وضو) کو قرآن کریم چھونا ناجائز ہے، ہاں اگر قرآن کریم جزدان یا کسی کپڑے میں لپٹا ہوا ہو تو جائز ہے اور اگر قرآن کی جلد پر محض چولی چڑھی ہوئی ہو تو چھونا درست نہیں ہے۔

⑪ اگر کوئی شخص بے وضو ہے تو اسے کرتے وغیرہ کے آستین یا کسی ایسے کپڑے کے ساتھ جو اس کے بدن پر ہے (مثلاً چادر وغیرہ اوڑھ رکھی ہو) تو قرآن کریم کو پکڑنا اور چھونا مکروہ ہے، ہاں اگر اس کپڑے کو اپنے بدن سے الگ کر کے پھر اس کی ساتھ قرآن کریم کو پکڑے اور چھوئے تو جائز ہو گیا۔

⑫ بے وضو کو تفسیر اور حدیث و فقہ کی کتابوں کو چھونا مکروہ ہے لیکن آستین کے ساتھ چھونا متفقہ طور پر جائز ہے۔

⑬ جس درہم (سکہ) پر قرآن کی کوئی سورۃ لکھی ہو تو بے وضو کے لئے اسے چھونا جائز نہیں ہاں اگر وہ تھیلی وغیرہ میں ہو تو پھر جائز ہے۔

⑭ جنبی کو مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے، اگر کوئی خاص ضرورت ہو تو داخل ہو سکتا ہے اسی طرح اس کے لئے قرآن پڑھنا خواہ ایک آیت سے کم ہی کیوں نہ ہو ناجائز ہے البتہ دعا اور ثنا کے طور پر پڑھ سکتا ہے، ایسے ہی جنبی کو ذکر کرنا تسبیح پڑھنی اور دعا کرنی جائز ہے، ان مسائل میں حیض اور نفاس والی عورتوں کا بھی وہی حکم ہے جو جنبی کا ہے۔

بَابُ مُخَالَطَةِ الْجُنُبِ وَمَا يُبَاحُ لَهُ

جنبی شخص سے ملنے جلنے اور جنبی کے لئے جو امور جائز ہیں ان کا بیان

اس باب میں دو چیزوں سے متعلّق احادیث ذکر کی جارہی ہیں، پہلی چیز تو یہ ہے کہ جنبی شخص (یعنی غسل جس پر واجب ہو) کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کلام کرنا، مصافحہ کرنا اور اس طرح اس کے ساتھ دوسرے معاملات کرنا جائز ہیں دوسری چیز یہ ہے کہ جنبی شخص کے لئے کیا چیزیں جائز ہیں کہ وہ انہیں حالت ناپاکی میں کر سکتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ لَقِيَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا جُنُبٌ فَاَخَذَ بِيَدِيْ فَمَشَيْتُ مَعَهٗ حَتّٰى قَعَدَ فَانْسَلَلْتُ فَاَتَيْتُ الرَّحْلَ فَاغْتَسَلْتُ ثُمَّ جِئْتُ وَهُوَ قَاعِدٌ فَقَالَ اَيْنَ كُنْتَ يَا اَبَاهُرَيْرَةَ فَقُلْتُ لَهٗ فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجِسُ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَ لِمُسْلِمٍ مَعْنَاهُ وَزَادَ بَعْدَ قَوْلِهٖ فَقُلْتُ لَهٗ لَقِيْتَنِيْ وَاَنَا جُنُبٌ فَكَرِهْتُ اَنْ اُجَالِسَكَ حَتّٰى اَغْتَسِلَ وَكَذَا الْبُخَارِيُّ فِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى۔

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے میری ملاقات ہوئی اور میں جنبی تھا۔ آنحضرت ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں آپ کے ہمراہ ہو لیا۔ جب آپ ﷺ بیٹھ گئے تو میں چپکے سے نکل کر اپنے مکان پر آیا اور نہا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے (مجھے دیکھ کر) آپ ﷺ نے فرمایا "تم کہاں تھے؟" میں نے آپ ﷺ سے (اصل واقعہ) ذکر کیا (کہ میں ناپاک تھا اس لئے چلا گیا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا "سبحان اللہ! مومن ناپاک نہیں ہوتا۔" روایت کے الفاظ بخاریؒ کے ہیں مسلمؒ نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے اور ابوہریرہ کے یہ الفاظ مزید نقل کئے ہیں کہ (انہوں نے کہا) میں چونکہ حالت ناپاکی میں تھا اس لئے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ آپ ﷺ کی پاس بیٹھوں جب تک کہ نہا نہ لوں۔" اسی طرح بخاریؒ کی ایک دوسری روایت میں بھی یہ الفاظ منقول ہیں۔"

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جنابت نجاست حکمی ہے کہ شریعت نے اس کا حکم کیا ہے اور اس پر غسل کو واجب قرار دیا ہے، لہٰذا حالت جنابت میں آدمی حقیقۃً نجس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جنبی کا نہ تو جھوٹا ناپاک ہوتا ہے اور نہ اس کا پسینہ ہی ناپاک ہے، اس لئے جنبی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ملنا جلنا، مصافحہ کرنا، کلام کرنا یا اسی طرح اس کے ساتھ دوسرے معاملات کرنا جائز ہیں، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

② وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ ذَكَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ تُصِيْبُهُ الْجَنَابَةُ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأْ وَاغْسِلْ ذَكَرَكَ ثُمَّ نَمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے رات کو جنابت ہو جاتی ہے (یعنی احتلام یا جماع سے غسل واجب ہو جاتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ (اسی وقت) وضو کر کے عضو تناسل کو دھو کر سو جایا کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ وضو کرنا جنبی کے سونے کے لئے طہارت ہے، یعنی جنبی وضو کر کے سویا تو گویا وہ پاک سویا، لہٰذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو رات میں احتلام ہو جائے یا جماع سے فراغت ہو اور اس کے بعد سونے کا ارادہ ہو یا بوجہ کسی ضرورت بے وقت غسل جنابت میں تاخیر کا خیال ہو تو ایسی شکل میں جنبی کو وضو کر لینا سنت ہے۔

اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صورت مذکورہ میں وضو کیا جائے اس کے بعد عضو تناسل کو دھویا جائے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ صحیح مسئلہ یہ ہے کہ پہلے عضو تناسل کو دھونا چاہئے اس کے بعد وضو کرنا چاہئے، اس شکل میں حدیث کی مذکورہ ترتیب کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہاں وضو کرنا اس لئے مقدم کر کے ذکر کیا گیا ہے کہ وضو کا احترام اور اس کی تعظیم کا اظہار پیش نظر تھا۔

(۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ جُنُبًا فَاَرَادَ اَنْ يَّأْكُلَ اَوْيَنَامَ تَوَضَّأَ وُضُوْءَهٗ لِلصَّلٰوةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ حالت ناپاکی میں ہوتے اور کھانا کھانے یا سونے کا ارادہ فرماتے تو نماز کے وضو کی طرح وضو کر لیتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۴) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتٰى اَحَدُكُمْ اَهْلَهٗ ثُمَّ اَرَادَ اَنْ يَّعُوْدَ فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وُضُوْءً۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس آئے (یعنی صحبت کرے) اور پھر اس کے پاس آنے کا (یعنی دوبارہ صحبت کرنے کا) ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ دونوں کے درمیان وضو کر لے۔" (مسلمؒ)

تشریح: ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے دو مرتبہ صحبت کرے اور دونوں مرتبہ کے درمیان وضو کرلے تو دو فائدے ہیں۔ اول تو یہ کہ اس سے پاکیزگی اور طہارت حاصل ہوتی ہے، دوسری یہ کہ نشاط اور لذت زیادہ ہو جاتی ہے۔

بہر حال اس حدیث سے اور اس سے پہلی حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جنبی کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ حالت ناپاکی میں اگر سونے اور کھانے پینے کا یا دوبارہ جماع کرنے کا ارادہ کرے تو اپنے عضو تناسل کو دھو کر وضو کر لے۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ جنبی کے لئے کھانے پینے کے سلسلے میں ان احادیث میں جس وضو کا ذکر ہے، اس سے مراد حقیقۃً وضو نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے وقت میں ہاتھ دھو لئے جائیں اور یہی رائے جمہور علماء کی ہے کیونکہ نسائیؒ کی روایت میں اس مراد کی صراحت بھی موجود ہے۔

لیکن مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے تو بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں نماز کے وضو کی طرح وضو کیا جائے۔ لہٰذا اب ان روایتوں میں تطبیق پیدا کرنے کے لئے یہی کہا جائے گا کہ آنحضور ﷺ ایسے مواقع پر کبھی کبھی اختصار کے طور پر محض ہاتھ ہی دھو لینے کو کافی سمجھتے تھے۔ مگر اکثر و بیشتر آپ ﷺ مکمل وضو فرماتے تھے۔"

(۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَطُوْفُ عَلٰى نِسَآئِهٖ بِغُسْلٍ وَّاحِدٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ ایک غسل کے ساتھ اپنی ازواج مطہرات سے صحبت کر لیا کرتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک شب میں اپنی تمام ازواج مطہرات سے صحبت کیا کرتے تھے اور غسل ایک ہی مرتبہ آخر میں فرماتے تھے یہ نہیں تھا کہ ایک بیوی سے صحبت کے بعد پہلے غسل کرتے ہوں، پھر بعد میں دوسری بیوی کے پاس جاتے ہوں۔ ہاں اس کا احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ درمیان میں وضو فرما لیتے ہوں گے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیان جواز کے لئے آپ ﷺ نے وضو کو ترک کر دیا ہو۔ اس موقع پر ایک ہلکا سے اعتراض ہو سکتا ہے وہ یہ کہ قاعدہ شرعی کے مطابق اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم کا اقل درجہ ایک رات ہے۔ یعنی اگر کسی شخص کے پاس چند بیویاں ہوں تو ان کے درمیان باری مقرر کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ، ہر ایک بیوی کے یہاں کم از کم ایک پوری شب قیام کیا جائے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ ایک ہی رات میں تمام ازواج مطہرات کے پاس کس طرح جایا کرتے

تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذات کے لئے باری مقرر کرنے کا یہ وجوب مختلف فیہ ہے، چنانچہ حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم پر باری مقرر کرنا واجب نہیں تھا۔ بلکہ آپ ﷺ نے از خود راہ احسان باری مقرر فرما رکھی تھی مگر اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر بھی باری مقرر کرنا واجب تھا۔ لیکن آپ ﷺ اپنی تمام ازواج مطہرات کے پاس ایک ہی شب میں خود ان کی رضا و خوشی سے جایا کرتے تھے لہٰذا اس پر کوئی اشکال پیدا نہیں ہو سکتا۔

⑥ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَحَدِيْثُ ابْنِ عَبَّاسٍ سَنَذْكُرُهٗ فِيْ كِتَابِ الْاَطْعِمَةِ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے۔" (مسلمؒ اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث (جو صاحب مصابیح نے اس موقع پر نقل کی ہے) ہم انشاء اللہ کتاب الاطعمہ میں ذکر کریں گے")

تشریح: حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کسی حالت میں ذکر خداوندی اور یاد الٰہی سے غافل نہیں ہوتے تھے آپ ﷺ خواہ حالت ناپاکی میں ہوتے یا بے وضو ہوتے اور یا ان کے علاوہ کسی بھی حالت میں ہوتے اللہ رب العزت کی یاد میں ہمیشہ مشغول رہتے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہاں ذکر سے مراد ذکر قلبی اور قدرت خداوندی تفکر ہے۔ یعنی آپ ﷺ کا قلب مبارک ہمہ وقت ذکر الٰہی میں مشغول اور پروردگار کی قدرتوں پر غور و فکر کرنے میں منہمک رہتا تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

⑦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اغْتَسَلَ بَعْضُ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جَفْنَةٍ فَاَرَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّتَوَضَّأَ مِنْهُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ كُنْتُ جُنُبًا فَقَالَ اِنَّ الْمَآءَ لَا يَجْنُبُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ نَحْوَهٗ وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ عَنْ مَيْمُوْنَةَ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ۔

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) سرکار دو عالم ﷺ کی زوجہ مطہرہ نے لگن سے (یعنی لگن میں بھرے ہوئے پانی سے) چلو لے کر غسل کیا۔ جب آنحضرت ﷺ نے اسی (لگن میں بچے ہوئے) پانی سے وضو کرنے کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں جنبی تھی (اور میں نے اس سے غسل کیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا "پانی تو جنبی نہیں ہوتا۔" (یعنی جنبی کے نہانے سے یا اس کے کسی عضو کے پڑنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا) ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) اور دارمی نے بھی ایسی ہی روایت نقل کی ہے نیز شرح السنۃ میں ابن عباسؓ سے اور انہوں نے حضرت میمونہ سے مصابیح کے ہم الفاظ روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے تو بصراحت یہ معلوم ہوا کہ عورت کے غسل کے بقیہ پانی سے مرد کو وضو کرنا جائز ہے لیکن اسی باب کی تیسری فصل میں ایک حدیث (نمبر ۲) آرہی ہے جس میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورت کے غسل کے بقیہ پانی سے مرد کو وضو کرنے سے منع فرمایا ہے۔

لہٰذا ان دونوں روایتوں میں مطابقت کے لئے یہ کہا جائے گا کہ یہ حدیث تو جواز پر دلالت کرتی ہے اور وہ دوسری حدیث ترک کی اولیت پر دلالت کرتی ہے، یعنی اگر کوئی مرد عورت کے غسل کے بقیہ پانی سے وضو کرنا چاہے تو اس حدیث کی رو سے اس کا وضو جائز تو ہو جائے گا لیکن دوسری حدیث کے پیش نظر اس پانی سے وضو نہ کرنا ہی بہتر اور اولیٰ ہو گا۔

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ يَسْتَدْفِئُ بِيْ قَبْلَ اَنْ اَغْتَسِلَ۔

(رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَرَوَی التِّرمِذِیُّ نَحْوَہُ وَفِی شَرْحِ السُّنَّۃِ بِلَفْظِ الْمَصَابِیْحِ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ (میرے ساتھ) صحبت سے فراغت کے بعد غسل فرماتے، پھر میرے نہانے سے پہلے مجھ سے گرمی حاصل کرتے تھے۔" (ابن ماجہؒ) اور امام ترمذیؒ نے بھی ایسی ہی روایت نقل کی ہے نیز شرح السنۃ میں مصابیح کے ہم لفظ روایت منقول ہے)

تشریح: حضرت عائشہؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ ہم بستری سے فارغ ہوتے تو مجھ سے پہلے ہی آپ ﷺ نہا لیتے تھے اور پھر چونکہ سرد موسم میں نہانے کی وجہ سے ٹھنڈ محسوس ہوتی تھی اس لئے آپ ﷺ میرے پاس تشریف لاتے اور اپنے اعضاء مبارک میرے بدن سے چمٹا کر لیٹ جایا کرتے تھے تاکہ گرمی حاصل ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنبی کا بدن پاک ہوتا ہے لہٰذا اس کے ساتھ مل کر لیٹ جانے میں کچھ حرج نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

⑨ وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَخْرُجُ مِنَ الْخَلَاءِ فَیُقْرِئُنَا الْقُرْاٰنَ وَیَاْکُلُ مَعَنَا اللَّحْمَ وَلَمْ یَکُنْ یَحْجُبُہٗ اَوْیَحْجُزُہٗ عَنِ الْقُرْاٰنِ شَیْیءٌ لَیْسَ الْجَنَابَۃَ۔ (رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِیُّ وَرَوَی ابْنُ مَاجَۃَ نَحْوَہٗ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ پاخانہ سے نکل کر وضو سے پہلے) ہمیں قرآن کریم پڑھا دیا کرتے تھے اور (اسی وقت) ہمارے ساتھ گوشت کھا لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کو قرآن کریم پڑھنے سے سوائے جنابت کے کوئی چیز نہیں روکتی تھی۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ) اور ابن ماجہؒ نے بھی ایسی ہی روایت نقل کی ہے۔)

تشریح: اس حدیث سے دو مسئلوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ اول تو یہ کہ بغیر وضو کے قرآن کریم پڑھنا جائز ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ آپ ہاتھوں سے قرآن کریم کو نہ چھوئے کیونکہ بغیر وضو قرآن کریم کو چھونا ناجائز ہے۔

⑩ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَقْرَءُ الْحَائِضُ وَلَا الْجُنُبُ شَیْئًا مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم نے فرمایا "حائض (ایام والی عورت) اور جنبی قرآن کریم کا کچھ حصہ بھی نہیں پڑھیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو عورت ایام حیض میں ہو یا جو شخص حالت ناپاکی میں ہو وہ قرآن شریف بالکل نہ پڑھے یہاں تک کہ ایک آیت سے کم بھی قرآن کے الفاظ کی تلاوت نہ کرے چنانچہ حضرت امام اعظمؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا مسئلہ یہ ہے کہ حائضہ اور جنبی کو قرآن کریم کی تلاوت بالکل نہ کرنی چاہئے خواہ وہ ایک آیت سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

مگر بعض علماء کے ہاں حائضہ اور جنبی کو ایک ایک آیت یا زیادہ حصہ کی تلاوت تو حرام ہے البتہ ایک آیت سے کم کی تلاوت حرام نہیں ہے۔" اگر حائضہ یا جنبی قرآن کریم کا کوئی حصہ تلاوت کے مقصد سے نہیں بلکہ شکر کے ارادہ سے پڑھے تو یہ جائز ہے، مثلاً کوئی حائضہ یا جنبی کسی ایسے موقع پر جب کہ خدا کا شکر ادا کرنا ہو کہے "الحمد للہ رب العالمین" تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

⑪ وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَجِّھُوْا ھٰذِہِ الْبُیُوْتَ عَنِ الْمَسْجِدِ فَاِنِّی لَا اُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلَا جُنُبٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا "مکانوں کے یہ دروازے مسجد کی طرف سے پھیر دو کیونکہ حائضہ اور جنبی کو مسجد میں داخل ہونا (خواہ وہاں ٹھہرنے کے لئے ہو یا وہاں سے گزرنے کے لئے) جائز نہیں کرتا۔" (ابوداؤد)

تشریح: مسجد خدا کا گھر ہونے کی وجہ سے ایک مقدس اور محترم جگہ ہے، اس پاک جگہ کی عظمت و احترام اور اس کے تقدس کا تقاضہ ہے

کہ کوئی ایسا شخص اس میں داخل نہ ہو جو حالت ناپاکی میں ہو۔ اس لئے آپ ﷺ نے حکم دیا کہ مسجد کی طرف گھروں کو ایسے دروازے جن میں گزرنے کے لئے مسجد سے گزرنا پڑتا ہے ان کے رخ تبدیل کر دیئے جائیں تاکہ جنبی اور حائضہ جو اپنے مکانوں میں جانے کے لئے مسجد سے گزرنے کے لئے مجبور ہیں اس شکل میں مسجد سے نہ گزر سکیں۔"

حضرت امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی جنبی اور حائضہ کسی دوسری جگہ جانے کے لئے مسجد سے گزرنا چاہیں تو وہ گزر سکتے ہیں، لیکن انہیں مسجد کے اندر بحالت ناپاکی بیٹھنا جائز نہیں ہے۔

مگر امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ جس طرح جنبی اور حائضہ کو مسجد کے اندر ٹھہرنا ناجائز ہے اسی طرح انہیں مسجد کے اندر سے گزرنا بھی حرام ہے چنانچہ یہ حدیث امام اعظمؒ کے مسلک کی تائید کر رہی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے جنبی اور حائضہ کو مسجد میں داخل ہونے سے مطلقاً منع فرمایا ہے اس میں گزرنے یا ٹھہرنے کی کوئی قید نہیں ہے۔ لہٰذا اس عموم کا تقاضہ یہ ہے کہ جنبی اور حائضہ کو مطلقاً مسجد میں داخل ہونے سے روکا جائے خواہ وہ گزرنے کے لئے مسجد میں داخل ہوں یا وہاں ٹھہرنے کے لئے۔

⑫ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُ الْمَلَآئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ صُوْرَةٌ وَلَا كَلْبٌ وَلَا جُنُبٌ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "جس گھر میں تصویر یا کتا یا جنبی ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔" (نسائیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "یہاں" فرشتوں سے مراد رحمت کے فرشتے ہیں یعنی جس مکان میں یہ تینوں چیزیں ہوتی ہیں اس میں وہ فرشتے داخل نہیں ہوتے جو رحمت و برکت لاتے ہیں اور خدا کا ذکر سننے کو آسمان سے اترتے ہیں۔

تصویر کا مسئلہ یہ ہے کہ تصویر اگر جاندار کی ہو اور بلند جگہ پر ہو مثلاً دیواروں پر آویزاں ہو، یا چھت پر لگی ہوئی ہو یا ایسے ہی پردوں پر تصویر بنی ہوئی ہوں تو اس سے رحمت کے فرشتے گھر میں داخل نہیں ہوتے۔ ہاں اگر تصویر بچھونے پر ہو یا اسی طرح پاؤں رکھنے کی جگہ پر ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اگر تصویر غیر جاندار کی ہو مثلاً درخت و پہاڑ کی ہو یا کسی عمارت وغیرہ کی ہو تو ان کو رکھنا جائز ہے یا تصویر تو جاندار کی ہو مگر اس کا سر کٹا ہوا ہو تو یہ بھی جائز ہے اسی طرح جو تصویر ایسی جگہ ہو جہاں روندی جاتی ہو مثلاً فرش پر ہو یا تکیہ وغیرہ پر ہو تو وہ بھی مکان میں فرشتوں کے دخول کو مانع نہیں ہے۔ اسی طرح نابالغ لڑکیوں کے لئے گھروں میں گڑیاں رکھنا بھی جائز ہے۔

ایسے سکے جن پر تصویریں بنی ہوئیں ہوں جیسے کہ آج کل سکے یا نوٹ چل رہے ہیں ان کے بارے میں کہا جائے گا کہ اس حدیث کے لفاظ سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ گھر میں ہوں تو وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے مگر مسئلہ یہ ہے کہ مکان میں ان کا رکھنا جائز ہے، یہاں تک کہ ان کو اپنے پاس رکھنا خواہ پگڑی ہی میں رکھے جائز ہیں کیونکہ اگر پچھلے تمام علماء ایسے سکوں کو پاس رکھتے رہے ہیں اور ان کا لین دین کرتے رہے ہیں اور کسی عالم نے بھی ان کے رکھنے کو منع نہیں کیا ہے۔

"کتوں" کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی مکان میں کتے از راہ شوق و فیشن ہوں گے تو یا جائز نہیں ہوگا ہاں اگر ضرورت اور حاجت کی وجہ سے مثلاً شکار کے لئے ہوں یا کھیتوں اور مویشیوں کی حفاظت کے لئے ہوں تو جائز ہے اور ان کو پالنا درست ہے۔

"جنبی سے مراد ہر جنبی نہیں ہے بلکہ وہ جنبی ہے جسے غسل جنابت میں سستی اور کاہلی کی بنا پر تاخیر کرنے کی عادت ہو یعنی وہ غسل کرنے میں اتنی ہی تاخیر کرتا ہو کہ نماز کا وقت بھی نکل جاتا ہو یا پھر وہ جنبی مراد ہے جو وضو نہ کر لیتا ہو۔" (دیکھئے باب کی حدیث نمبر ۲)

⑬ وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا تَقْرَبُهُمُ الْمَلَائِكَةُ جِيْفَةُ الْكَافِرِ وَالْمُتَضَمِّخُ بِالْخَلُوْقِ وَالْجُنُبُ اِلَّا اَنْ يَّتَوَضَّأَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمارؓ بن یاسرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا۔ "تین شخص ایسے ہیں کہ رحمت کے فرشتے ان کے قریب بھی نہیں آتے۔ (۱) کافر کا بدن (۲) خلوق کا ملنے والا (۳) جنبی جب تک کہ وضو نہ کرے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "جیفه" سے مراد کافر کا بدن ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، ویسے تو اصل میں "جیفه" مردار کو کہتے ہیں ظاہر ہے کہ کافر بھی بمنزلہ مردار کے ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ نجاست مثلاً شراب اور سود وغیرہ سے پرہیز نہ کرنے کی وجہ سے نجس وناپاک ہوتا ہے۔

"خلوق" ایک مرکب خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے بنتی ہے اور چونکہ رنگ دار ہوتی ہے اس لئے عورتوں کی مشابہت کی وجہ سے مردوں کو اس کا لگانا ممنوع ہے صرف عورتیں اسے استعمال کر سکتی ہیں، اس لئے اگر کوئی مرد اسے لگالیتا ہے تو رحمت کے فرشتے اس کے قریب بھی نہیں جاتے کیونکہ اس میں رعونت پائی جاتی ہے۔ اور عورتوں سے مشابہت ہوتی ہے۔

دراصل اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص سنت کے خلاف کام کرتا ہے تو اگرچہ وہ بظاہر بازیب وزینت اور خوشبو سے معطر ہوتا ہے نیز لوگوں صاحب، عزت واحترام بھی ہوتا ہے مگر سنت کے خلاف عمل کی وجہ سے حقیقت میں وہ نجس اور کتے سے بھی زیادہ خسیس ہوتا ہے۔

جنبی کے حق میں آپ ﷺ کے ارشاد وتہدید اور زجر وتوبیخ کے لئے ہے تاکہ جنبی غسل جنابت میں تاخیر نہ کریں کیونکہ اس سے جنبی رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

(۱۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ أَنَّ فِي الْكِتَابِ الَّذِيْ كَتَبَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ اَنْ لَّا يَمَسَّ الْقُرْآنَ اِلَّا طَاهِرٌ۔ (رواه مالک والدار قطنی)

"اور حضرت عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمروؓ بن حزم راوی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ نے جو ہدایت نامہ عمرو بن حزم کے لئے لکھا تھا اس میں یہ (حکم بھی) مرقوم تھا کہ قرآن کریم کو پاک لوگ ہی ہاتھ لگایا کریں۔" (مالکؒ، دار قطنیؒ)

تشریح: سرکار دو عالم ﷺ نے حضرت عمرو بن حزم کو نواح یمن کے کسی شہر کا عامل بنا کر بھیجا تھا اور ایک ہدایت نامہ لکھ کر انہیں دیا تھا جس میں فرائض اور صدقات و دیات وغیرہ کے احکام ومسائل کی تفصیل تحریر کی تھی۔ اسی مکتوب گرامی میں یہ حکم بھی تھا جسے راوی یہاں بیان کر رہے ہیں۔

(۱۵) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ انْطَلَقْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِيْ حَاجَةٍ كَانَ مِنْ حَدِيْثِهِ يَوْمَئِذٍ اَنْ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ فِيْ سِكَّةٍ مِنَ السِّكَكِ

۱؎ اسم گرامی عمار بن یاسر اور کنیت ابوالیقظان ہے یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اسلام کی طرف سبقت کی تھی، ان کی والدہ سمیہ تھیں اور وہ پہلی خاتون تھیں جو اللہ عزوجل کی راہ میں شہید کی گئیں، یہ اور ان کی والدہ اور ان کے والد سب کے سب پہلے ایمان لانے والوں میں ہیں حضرت عمار کا شمار صحابہ کی جماعت میں ہوتا ہے جو اسلام لانے کی وجہ سے ظلم وستم کی ہر بھٹی میں ڈالے گئے مگر جب وہاں سے نکلے تو کندن ہو کر! حضرت عمار اس وقت اسلام لائے تھے جب کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ارقم کے گھر میں پوشیدہ تھے۔ یہ اور حضرت صہیب بن سنان دونوں ساتھ ہی اسلام لائے تھے۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما خدا کی راہ میں بہت زیادہ ستائے گئے ہیں، یہاں تک کہ جب مشرکین مکہ انہیں مارتے مارتے تھک گئے اور یہ اپنے ایمان سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹتے تو انہیں آگ میں جلایا کرتے تھے اسی اثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزران کی طرف ہوا کرتا تو آپؐ انہیں آگ میں جلتا ہوا دیکھ کر اپنا دست مبارک ان کے اوپر پھیر کر فرمایا کرتے تھے کہ اے آگ! تو عمار پر ایسی ہی ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا جیسے کہ حضرت ابراہیم پر ہوئی تھی۔ جب آپ زخمی ہوئے تو انہوں نے یہ وصیت کی کہ مجھے انہی کپڑوں کے ساتھ دفن کرنا کیونکہ میں انہی کپڑوں کے ساتھ خدائے تعالیٰ کے سامنے جاؤں گا، چنانچہ حضرت علیؓ نے ان کو ان ہی کپڑوں میں دفن کیا۔ ربیع الاول ۳۷ھ میں ۹۴ برس کی عمر میں جنگ صفین کے دوران آپ نے شہادت پائی۔ (اسد الغابہ)

۲؎ اسم گرامی عمرو بن حزم اور کنیت ابوضحاک ہے، آپ انصاری ہیں سب سے پہلے غزوہ خندق میں شریک ہوئے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں (نواح یمن) میں اہل نجران پر عامل بنا کر بھیجا تھا اس وقت ان کی عمر صرف سترہ سال تھی بمقام مدینہ منورہ ۵۱ھ یا ۵۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

فَلَقِيَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ خَرَجَ مِنْ غَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ حَتّٰى إِذَا كَادَ الرَّجُلُ أَنْ يَتَوَارٰى فِي السِّكَّةِ ضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ عَلَى الْحَائِطِ وَمَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ ثُمَّ ضَرَبَ ضَرْبَةً أُخْرٰى فَمَسَحَ ذِرَاعَيْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَى الرَّجُلِ السَّلَامَ وَقَالَ إِنَّهٗ لَمْ يَمْنَعْنِيْ أَنْ أَرُدَّ عَلَيْكَ السَّلَامَ إِلَّا أَنِّيْ لَمْ أَكُنْ عَلٰى طُهْرٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت نافع" کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت ابن عمرؓ استنجے کے لئے جا رہے تھے میں بھی ان کے ہمراہ ہولیا (پہلے تو) انہوں نے استنجاء کیا اور اس کے بعد انہوں نے اس روز یہ حدیث بیان کی کہ ایک شخص کسی کوچہ میں جا رہا تھا اور سرکار دو عالم ﷺ پیشاب یا پاخانہ سے فارغ ہو کر تشریف لا رہے تھے اس شخص نے آپ ﷺ سے ملاقات کی اور سلام عرض کیا، آنحضرت ﷺ نے سلام کا جواب نہیں دیا جب یہ شخص (دوسرے) کوچہ میں مڑنے کو ہوا تب سرکار دو عالم ﷺ نے (تیمم کے لئے) اپنے دونوں ہاتھ دیوار پر مار کر منہ پر پھیرے پھر (دوسری مرتبہ) مار کر اپنے ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیرے، اس کے بعد اس شخص کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا "مجھے تمہارے سلام کا جواب دینے سے کسی چیز نے نہیں روکا تھا فقط یہ بات تھی کہ میں بے وضو تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: آپ ﷺ نے اس شخص کے سلام کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ دراصل "سلام" اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام ہے گویا عام طور پر ایسے موقع پر سلام کے حقیقی معنی مراد نہیں لئے جاتے بلکہ اس سے سلامتی کے معنی مراد ہوتے ہیں، مگر پھر آپ ﷺ نے اس کے اصل معنی کا احترام کرتے ہوئے بغیر وضو کے اللہ عزوجل کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔

اسی باب میں پہلے کچھ حدیثیں گزری ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بیت الخلاء سے آکر بغیر وضو کے قرآن پڑھتے اور پڑھاتے تھے اور یہ کہ آپ ﷺ بغیر وضو کے ذکر اللہ کیا کرتے تھے۔ بظاہر وہ احادیث اور یہ حدیث آپس میں متعارض نظر آتی ہیں؟

اس تعارض کا دفعیہ یہ کہہ کر کیا جائے گا کہ آپ ﷺ کا بے وضو قرآن پڑھنا یا ذکر اللہ کرنا جیسے کہ پہلی حدیثوں میں گزرا رخصت (آسانی) پر عمل تھا۔ اور یہاں آپ ﷺ نے امت کی تعلیم کے لئے عزیمت (اولیٰ) پر عمل فرمایا ہے۔ یعنی یہاں آپ ﷺ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ بے وضو اللہ کا نام لینا جائز تو ہے مگر افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ باوضو ذکر اللہ کیا جائے۔

اس حدیث سے دو چیزیں معلوم ہوئیں اوّل تو یہ کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ دوسری یہ کہ اگر کوئی شخص کسی عذر کی بناء پر سلام کا جواب نہ دے سکے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ اس کے بعد اپنا وہ عذر جس کی وجہ سے وہ سلام کا جواب نہیں دے سکا ہے، سلام کرنے والے کے سامنے بیان کر دے تاکہ اس کی طرف غرور و تکبر کی نسبت نہ کی جاسکے یعنی سلام کرنے والا یہ نہ سوچے کہ اس نے غرور و تکبر کی بنا پر میرے سلام کا جواب نہیں دیا ہے۔

(۱۶) وَعَنِ الْمُهَاجِرِ بْنِ قُنْفُذٍ أَنَّهٗ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَبُوْلُ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ حَتّٰى تَوَضَّأَ ثُمَّ اعْتَذَرَ إِلَيْهِ وَقَالَ إِنِّيْ كَرِهْتُ أَنْ أَذْكُرَ اللّٰهَ إِلَّا عَلٰى طُهْرٍ رَوَاهُ أَبُوْدَاؤُدَ وَرَوَى النَّسَائِيُّ إِلٰى قَوْلِهٖ حَتّٰى تَوَضَّأَ وَقَالَ فَلَمَّا تَوَضَّأَ رَدَّ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت مہاجر بن قنفذؓ[1] کے بارے میں مروی ہے کہ یہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب کہ آپ ﷺ پیشاب کر رہے تھے، انہوں نے سلام عرض کیا، آنحضرت ﷺ نے جواب نہ دیا، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور پھر یہ عذر بیان فرمایا کہ "میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں کہ بے وضو اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کروں۔" ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے یہ روایت لفظ حتّٰی

---

[1] حضرت مہاجر بن قنفذ قریشی تیمی ہیں کہا جاتا ہے کہ مہاجر اور قنفذ دونوں لقب ہیں اصل میں ان کا نام عمرو بن خلف ہے۔ آپ فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں اور ہجرت کے بعد بصرہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں انتقال ہوا۔

تَوَضَّاءَ (یہاں تک کہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا) تک نقل کی ہے اور کہا کہ جب آپ ﷺ نے وضو فرمالیا تو سلام کا جواب دیا۔

تشریح: "مکروہ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے وضو اللہ کا نام لینا حرام ہے بلکہ اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ افضل اور بہتر یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا مقدس و مبارک نام باوضو لیا جائے، اگر کسی نے بغیر وضو خدا کا نام لیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑰ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُجْنِبُ ثُمَّ یَنَامُ ثُمَّ یَنْتَبِہُ ثُمَّ یَنَامُ۔ (رواہ احمد)

"حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ حالت ناپاکی میں سوجایا کرتے اور پھر جاگتے اور سوجاتے۔" (احمدؒ)

تشریح: اسی باب کی حدیث نمبر ۳ میں گزر چکا ہے کہ جب آپ ﷺ حالت جنابت میں سونے کا ارادہ فرماتے تو پہلے وضو فرمالیا کرتے تھے اس کے بعد سوجایا کرتے تھے، اس حدیث میں گو اس کی صراحت نہیں ہے کہ آپ ﷺ حالت جنابت میں سونے سے پہلے وضو فرماتے تھے مگر یہاں بھی مراد یہی ہے کہ آپ ﷺ وضو کرنے کے بعد ہی آرام فرماتے تھے۔

یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ کبھی کبھی بغیر وضو کے بھی بیان جواز کے لئے سوجایا کرتے تھے تاکہ اس سے یہ معلوم ہو کہ بغیر وضو بھی سوجانا جائز ہے مگر افضل اور بہتر یہی ہے کہ وضو کرنے کے بعد سویا جائے۔

⑱ وَعَنْ شُعْبَةَ قَالَ اِنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ کَانَ اِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ یُفْرِغُ بِیَدِہِ الْیُمْنٰی عَلٰی یَدِہِ الْیُسْرٰی سَبْعَ مَرَّاتٍ ثُمَّ یَغْسِلُ فَرْجَہُ فَنَسِیَ مَرَّۃً کَمْ اَفْرَغَ فَسَأَلَنِیْ فَقُلْتُ لَا اَدْرِیْ فَقَالَ لَا اُمَّ لَکَ وَمَا یَمْنَعُکَ اَنْ تَدْرِیَ ثُمَّ یَتَوَضَّأُ وُضُوْءَہٗ لِلصَّلٰوۃِ ثُمَّ یُفِیْضُ عَلٰی جِلْدِہِ الْمَآءَ ثُمَّ یَقُوْلُ ھٰکَذَا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَتَطَھَّرُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت شعبہ راوی ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ ناپاکی کا غسل فرماتے تو (پہلے) اپنے داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر سات مرتبہ پانی ڈالتے پھر اپنی شرم گاہ دھوتے۔ ایک مرتبہ بھول گئے کہ پانی کتنی مرتبہ ڈالا ہے؟ چنانچہ انہوں نے مجھ سے پوچھا میں نے عرض کیا "مجھے یاد نہیں" انہوں نے فرمایا "تمہاری ماں مرے تمہیں یاد رکھنے سے کس نے روک دیا تھا"؟ پھر نماز کے وضو کی طرح وضو کر کے اپنے سارے بدن پر پانی بہالیا اور کہنے لگے کہ "سرکار دو عالم ﷺ بھی اس طرح پاک ہوا کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: غسل جنابت کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ سے متعلق ستر دھونے سے پہلے ہاتھوں کو دھونے کے بارے میں اس سے پہلے جو احادیث گزری ہیں یا تو وہ مطلق ہیں یعنی ان میں یہ تعداد ذکر نہیں کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کتنی مرتبہ ہاتھ دھوتے تھے یا جن میں تعداد ذکر کی گئی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک دو مرتبہ دھوئے ہیں یا تین مرتبہ، چنانچہ باب الغسل کی پہلی فصل میں خود حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت (نمبر ۵) گزری ہے جس میں یہ تو منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک دھوئے ان کی تعداد ذکر نہیں کی گئی ہے کہ کتنی مرتبہ دھوئے؟ لیکن یہاں حضرت شعبہ حضرت ابن عباسؓ کا یہ عمل نقل فرما رہے ہیں کہ وہ غسل جنابت کے وقت سات مرتبہ پانی ڈال کر ہاتھ دھوتے تھے۔

لہٰذا اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ حضرت ابن عباسؓ کا یہ عمل کسی خاص صورت میں ہوگا یعنی آپؓ کو کوئی ایسی صورت پیش آئی ہوگی۔ جس کی بنا پر بہت زیادہ طہارت و پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے سات مرتبہ دھونا ضرور سمجھا ہوگا۔ یا پھر اس کی تاویل یہ ہوگی کہ سات مرتبہ دھونے کے حکم کے منسوخ ہونے کی اطلاع حضرت ابن عباسؓ کو نہیں ہوئی ہوگی اس لئے انہوں نے اسی پہلے حکم کے مطابق سات مرتبہ دھویا ہوگیا۔

یہ حدیث اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ شاگرد کو اپنے شیخ و استاد کے سامنے انتہائی ہوشیاری کے ساتھ رہنا چاہئے تاکہ شیخ کے ہر ہر

قول اور ہر ہر عمل کو ذہن نشین کر سکے۔ نیز شیخ و استاد کو یہ حق ہے کہ وہ شاگرد کی غفلت اور لاپرواہی پر اسے تنبیہ کرے۔"

⑲ وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَافَ ذَاتَ یَوْمٍ عَلٰی نِسَآئِہٖ یَغْتَسِلُ عِنْدَ ھٰذِہٖ وَعِنْدَ ھٰذِہٖ قَالَ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَلَا تَجْعَلُہٗ غُسْلًا وَّاحِدًا اٰخِرًا قَالَ ھٰذَا اَزْکٰی وَاَطْیَبُ وَاَطْھَرُ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں کہ سرکار دوعالم ایک روز اپنی تمام بیویوں کے پاس آئے (یعنی سب سے جماع کیا) اور ہر ایک بیوی سے (جماع سے فارغ ہو کر علیحدہ علیحدہ) غسل فرمایا۔ ابورافعؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یارسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) نے آخر میں ایک ہی مرتبہ کیوں نہ غسل کر لیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "یہ (یعنی ہر جماع کے بعد غسل کرنا، خوب پاک کرتا ہے، (نفس کے لئے)، بہت خوش آئند ہے اور (جسم کو) خوب صاف کرتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس سے پہلے اسی باب کی حدیث نمبر ۵ سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نے ایک شب میں تمام ازواج مطہرات سے ہم بستری فرما کر آخر میں ایک ہی مرتبہ غسل فرمایا اور یہاں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ آپ نے ایک دن تمام ازواج مطہرات سے ہم بستری فرمائی اور غسل کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہر بیوی کے ساتھ جماع سے فراغت کے بعد علیحدہ علیحدہ غسل فرمایا تو ان دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہوگی کہ آپ ﷺ کا وہ پہلا عمل جو اوپر بیان ہوا وہ اُمت کی آسانی کے لئے تھا یعنی اس بات کا اظہار مقصود تھا تمام بیویوں کے ساتھ ہم بستری سے فراغت کے بعد آخر میں ایک مرتبہ غسل کر لینا کافی ہے لیکن افضل اور بہتر چونکہ یہی ہے کہ ہر جماع کے بعد غسل کیا جائے اس لئے اس وقت آپ ﷺ نے ہر جماع کے بعد علیحدہ علیحدہ غسل فرمایا۔

آپ ﷺ نے حضرت ابورافعؓ کے جواب میں ہر مرتبہ غسل کرنے کی جو وجہ بیان فرمائی ہے اس میں تین لفظ استعمال فرمائے ہیں ① ازکی ② اطیب ③ اطہر۔ ان تینوں الفاظ کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "تطہیر" کا استعمال ظاہری مناسبت سے ہے اور تزکیہ و تطییب کا استعمال باطنی مناسبت سے ہے یعنی تطہیر اخلاق بد کے ازالہ کے لئے ہے اور تزکیہ و تطیب اچھی خصلتوں کے حصول کے لئے ہے گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس طرح غسل کرنے سے برے اخلاق مثلاً غصہ وغیرہ دور ہوتے ہیں اور اچھے اخلاق یعنی حلم و تقویٰ وغیرہ حاصل ہوتے ہیں۔

⑳ وَعَنِ الْحَکَمِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّتَوَضَّأَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ طُھُوْرِ الْمَرْأَۃِ۔ (رَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَۃَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَزَادَ اَوْقَالَ بِسُؤْرِھَا وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ)

"اور حضرت حکمؓ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ "سرکار دوعالم ﷺ نے عورت کے غسل یا وضو کے بچے ہوئے پانی سے مرد کو وضو کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، ترمذیؒ) اور ترمذی نے یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ "یا آپ ﷺ نے منع فرمایا، عورت کے (وضو کے) بقیہ پانی سے" نیز (ترمذیؒ) نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے)

تشریح: لفظ سُؤر یہاں غسل یا وضو کے "بقیہ پانی" کے معنی میں ہے، اس کے لغوی معنی "جھوٹا" مراد نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ راوی کو فقط لفظ میں شک واقعہ ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے یا تو "فضل" کہا ہے یا "سور" فرمایا ہے۔

اس فصل کی حدیث نمبر ۷ کی تشریح میں اس حدیث کا تذکرہ آچکا ہے ان دونوں حدیثوں میں جو تعارض واقع ہو رہا ہے اس کی وضاحت وہاں کی جا چکی ہے علامہ سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث اور اس کے بعد آنے والی حدیث نمبر ۲۱ سے عورت کے غسل یا وضو کے بچے ہوئے پانی سے مرد کو وضو کرنے کی جو ممانعت ثابت ہو رہی ہے اس کو "نہی تنزیہی" پر محمول کیا جائے تاکہ اس حدیث اور

---

[1] اسم گرامی حکم ابن عمر ہے قبیلہ غفار کی نسبت سے مشہور ہیں آپ صحابی ہیں وفات نبی کے بعد بصرہ چلے گئے ان کے سوتیلے بھائی زیاد نے انہیں خراسان کا حاکم بنایا تھا چنانچہ ان کی وفات بھی خراسان کے مضافات مقام مرو میں پچاس ہجری میں ہوئی۔

اس حدیث نمبرے میں جس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی زوجہ مطہرہ کے غسل کے بچے ہوئے پانی سے وضو فرمایا تھا تعارض پیدا نہ ہو سکے اور دونوں حدیثیں اپنی اپنی جگہ قابل عمل رہیں۔

(۲۱) وَعَنْ حُمَيْدِ نِ الْحِمْيَرِيِّ قَالَ لَقِيْتُ رَجُلاً صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعَ سِنِيْنَ كَمَا صَحِبَهُ اَبُوْهُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تَغْتَسِلَ الْمَرْاَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ اَوْ يَغْتَسِلَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ الْمَرْاَةِ زَادَ مُسَدَّدٌ وَّلْيَغْتَرِ فَا جَمِيْعًا رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَ النَّسَائِيُّ وَزَادَ اَحْمَدُ فِيْ اَوَّلِهٖ نَهٰى اَنْ يَّمْتَشِطَ اَحَدُنَا كُلَّ يَوْمٍ اَوْ يَبُوْلَ فِيْ مُغْتَسَلِهٖ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَرْجِسٍ۔

"اور حضرت حمیدؒ حمیریؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص سے ملا جو ابوہریرہؓ کی طرح چار برس سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں رہ چکے تھے انہوں نے کہا کہ "سرکار دو عالم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ عورت مرد "کے غسل" کے بچے ہوئے پانی سے نہائے یا مرد عورت (کے غسل) کے بچے ہوئے پانی سے نہائے۔ (ایک راوی) مسددؒ نے یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ "دونوں اکٹھے ہو کر (علیحدہ علیحدہ) چلو لے کر نہالیں تو جائز ہے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ) "اور امام احمدؒ نے اس روایت کے شروع میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ "آپ ﷺ نے اس سے (بھی) منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص ہر روز کنگھی کرے اور نہانے کی جگہ پیشاب کرے اور ابن ماجہؒ نے یہ روایت عبداللہ بن سرجسؓ سے نقل کی ہے۔"

تشریح: روزانہ کنگھی کرنے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جن کا مقصد صرف بناؤ سنگار اور زیب و زینت ہوتا ہے لہٰذا مسنون طریقہ یہ ہے کہ کنگھی تیسرے روز کی جائے یعنی درمیان میں ایک دن کا ناغہ کرنا چاہئے۔

غسل کرنے کی جگہ پیشاب کرنا اس لئے منع ہے کہ اس سے وسوسے پیدا ہوتے جو عبادت میں حضوری قلب کے لئے سد راہ بنتے ہیں۔

بَابُ اَحْكَامِ الْمِيَاهِ
پانی کے احکام کا بیان
اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ فِي الْمَآءِ الدَّآئِمِ الَّذِيْ لَا يَجْرِيْ ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ مُتَّفَقٌ عَلَيهِ وَ فِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ لَا يَغْتَسِلُ اَحَدُكُمْ فِي الْمَآءِ الدَّآئِمِ وَهُوَ جُنُبٌ قَالُوْا كَيْفَ يَفْعَلُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ يَتَنَاوَلُهٗ تَنَاوُلاً۔

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص اس ٹھہرے ہوئے پانی میں جو بہنے والا نہ ہو پیشاب نہ کرے کہ پھر اسی میں غسل کرنے لگے (یعنی کسی دانشمند سے یہ بعید ہے کہ وہ پانی میں پیشاب کرلے پھر اسی پانی سے غسل کرلے)" (بخاریؒ، و مسلمؒ) "مسلمؒ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ناپاکی کی حالت میں ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے (تاکہ پانی ناپاک نہ ہو جائے) لوگوں نے کہا "ابوہریرہ پھر کس طرح نہانا چاہئے؟ انہوں نے فرمایا "اس میں سے تھوڑا

---

[1] اسم گرامی حمید بن عبدالرحمن ہے، قبیلہ حمیر سے تعلق کی وجہ سے حمیری کی نسبت سے مشہور ہیں جلیل القدر تابعی ہیں اپنے علم و فضل کی بنا پر اہل بصرہ کے امام سمجھے جاتے تھے، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباسؓ سے سماعت کا شرف حاصل ہے۔

تھوڑا پانی (چلو سے) لے کر (پانی سے باہر نہانا چاہئے۔"

تشریح: یہاں جس پانی میں پیشاب کرنے اور پھر اس میں نہانے سے روکا جا رہا ہے اس سے ماء قلیل یعنی تھوڑا پانی مراد ہے کیونکہ ماء کثیر یعنی زیادہ پانی ماء جاری یعنی بہنے والے پانی کا حکم رکھتا ہے جو پیشاب وغیرہ سے ناپاک نہیں ہوتا اور پھر اس میں نہانا بھی جائز ہے۔

بعض علماء نے کہا کہ ماء کثیر یعنی زیادہ پانی میں بھی پیشاب کرنا ممنوع ہے اگرچہ وہ پانی پیشاب وغیرہ سے نجس نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اس میں کوئی شخص پیشاب کرے گا تو اس کے دیکھا دیکھی دوسرے بھی اس میں پیشاب کرنے لگیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عمومی طور پر سب ہی لوگ اس میں پیشاب کرنے کی عادت میں مبتلا ہو جائیں گے جس کی وجہ سے پانی رفتہ رفتہ متغیر ہو جائے گا یعنی جب اس میں زیادتی اور کثرت سے پیشاب کیا جائے گا تو پانی کا رنگ مزہ اور بو تینوں چیزیں بدل جائیں گی اور پانی اصل حیثیت کھو کر ناپاک ہو جائے گا۔

لہٰذا اب اس حدیث میں مذکورہ حکم کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ پہلی شکل یعنی پانی کم ہونے کی صورت میں تو یہ نہی حرمت کے لئے ہے کیونکہ کم پانی میں پیشاب کرنے سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ دوسری شکل یعنی پانی زیادہ ہونے کی صورت میں کراہت کے لئے ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اصطلاح شریعت میں "کم پانی" اور زیادہ پانی کی مقدار اور اس کی تحدید کیا ہے؟ تو اس سلسلہ میں انشاء اللہ تعالیٰ اگلے صفحات میں پوری وضاحت کی جائے گی۔

اسے بھی سمجھ لیجئے کہ حدیث میں پانی کے ساتھ جاری یعنی بہنے والے کی قید کیوں لگائی گئی ہے؟ اس قید کی وجہ یہ ہے کہ اگر پانی جاری یعنی بہنے والا ہو تو خواہ کم ہو یا زیادہ ہو اس میں نجاست مثلاً پیشاب وغیرہ پڑنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

نیز علماء نے لکھا ہے کہ یہ تمام تفصیلات دن کے لئے ہیں، رات میں جنابت کے خوف کی وجہ سے مطلقاً اس میں قضائے حاجت مکروہ اور ممنوع ہے کیونکہ جنات رات کو وہیں رہتے ہیں جہاں پانی ہوتا ہے چنانچہ اکثر و بیشتر ندی و نالے اور تالاب جوہڑ اور نہر وغیرہ رات میں جنات کا مسکن ہوتے ہیں۔

حدیث کے آخری حصہ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی جنبی پانی میں ہاتھ نکالنے کے لئے ڈالے تو پانی مستعمل یعنی ناقابل استعمال نہیں ہوگا اور اگر وہ پانی میں ہاتھ اس لئے ڈالے تاکہ اپنے ہاتھوں کو ناپاکی دور کرنے کے لئے اس میں دھوئے تو اس شکل میں پانی مستعمل یعنی ناقابل استعمال ہو جائے گا۔

(۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّبَالَ فِى الْمَآءِ الرَّاكِدِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (مسلم)

(۳) وَعَنِ السَّآئِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ ذَهَبَتْ بِىْ خَالَتِىْ اِلَى النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ ابْنَ اُخْتِىْ وَجِعٌ فَمَسَحَ رَأْسِىْ وَدَعَالِىْ بِالْبَرَكَةِ ثُمَّ تَوَضَّأَ فَشَرِبْتُ مِنْ وَضُوْئِهٖ ثُمَّ قُمْتُ خَلْفَ ظَهْرِهٖ فَنَظَرْتُ اِلٰى خَاتِمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ مِثْلِ زِرِّ الْحَجَلَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں کہ "میری خالہ مجھے سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں لے گئیں، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (یہ) میرا بھانجا بیمار ہے۔" چنانچہ آپ ﷺ نے میرے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور میرے لئے برکت کی دعا کی، پھر آپ ﷺ نے وضو کیا اور میں نے آپ ﷺ کے وضو کا پانی پی لیا۔ اس کے بعد میں آپ ﷺ کی پشت مبارک کے پیچھے کھڑا ہو کر مہر نبوت کو دیکھنے لگا جو آپ ﷺ کے مونڈھوں کے درمیان تھی اور دلہن کے پلنگ کی گھنڈی کی طرح (چمک رہی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "وضو کے پانی" سے یا تو یہ مراد ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وضو فرمانے کے بعد جو پانی برتن میں باقی رہ گیا تھا حضرت سائبؓ

نے اسے پی لیا یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ ﷺ وضو فرما رہے تھے تو جو پانی آپ ﷺ کے اعضاء وضو سے گرتا جاتا تھا حضرت سائب ؓ حصول برکت و سعادت کے خاطر اسے پیتے جاتے تھے۔

خدائے تعالیٰ نے سرکار دو عالم ﷺ کو نبوت و رسالت کے منصب سے سرفراز فرما کر جب دنیا میں مبعوث کیا تو آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی حقانیت و صداقت کی دلیل کے طور پر جہاں اور بہت سی نشانیاں اور معجزے دیئے وہیں ایک بڑی نشانی آپ ﷺ کے مونڈھوں کے درمیان "مہر نبوت" بھی ثبت فرمائی چنانچہ حضرت سائب ؓ اسی مہر نبوت کی مقدار اور اس کی ہیت بیان فرما رہے ہیں کہ وہ چھپر کھٹ کی گھنڈی کی طرح تھی۔

اس نشانی کو "مہر نبوت" اس لئے کہا جاتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام پر خدائے تعالیٰ کی جانب سے جو کتابیں نازل کی گئی تھیں ان میں آنحضرت ﷺ کی آمد اور بعثت کی خبر دیتے ہوئے آپ ﷺ کی یہ علامت بتائی گئی تھی کہ آپ ﷺ کے مونڈھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ چنانچہ جب آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے تو اسی مہر نبوت کو دیکھ کر آپ ﷺ پہچانے گئے کہ آپ ہی وہی نبی آخر الزماں ہیں جن کی بعث کی خبر پہلے کتابوں میں دی گئی ہے چنانچہ یہ "مہر نبوت" آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی علامت قرار دی گئی اس کے علاوہ علماء نے اس کی وجہ تسمیہ اور بھی لکھی ہیں مگر یہاں طوالت کی وجہ سے سب کو ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔

مہر نبوت کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ اس کے اندرونی حصہ میں وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ کے الفاظ مرقوم تھے اور اندرونی حصہ میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی تَوَجَّهْ حَيْثُ مَا كُنْتَ فَاِنَّكَ مَنْصُوْرٌ یعنی جدھر بھی آپ ﷺ متوجہ ہوں گے ہماری مدد آپ (ﷺ) کے ساتھ ہوگی۔

"مہر نبوت" کے ظاہر ہونے کے وقت میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ جب آپ ﷺ کا سینہ مبارک شق کر کے سیا گیا تو اس کے بعد یہ نمودار ہوئی بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش کے فوراً بعد یہ مہر ظاہر ہوئی اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اس مہر سمیت ہی پیدا ہوئے تھے۔ واللہ اعلم

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

(۴) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمَاۗءِ يَكُوْنُ فِي الْفَلَاةِ مِنَ الْاَرْضِ وَمَا يَنُوْبُهُ مِنَ الدَّوَآبِ وَ السِّبَاعِ فَقَالَ اِذَا كَانَ الْمَاۗءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَ اَبُوْدَاوٗدَ وَ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَ ابْنُ مَاجَةَ وَفِيْ اُخْرٰى لِاَبِيْ دَاوٗدَ فَاِنَّهُ لَا يَنْجَسُ)

"حضرت ابن عمر ؓ فرماتے ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ سے اس پانی کا حکم پوچھا گیا جو جنگل میں زمین پر جمع ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر چوپائے درندے اس پر آتے جاتے رہتے ہیں (یعنی جانور وغیرہ اس پانی میں آکر اسے پیتے ہیں اور اس میں پیشاب وغیرہ بھی کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر پانی دو قلوں کے برابر ہو تو وہ ناپاکی کو قبول نہیں کرتا (یعنی نجاست وغیرہ پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا)۔" (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دارمی، ابن ماجہ اور ابوداؤد کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "وہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔")

تشریح: قُلّہ بڑے مٹکے کو کہتے ہیں جس میں اڑھائی مشک پانی آتا ہے "قلتین" یعنی دو مٹکوں میں پانچ مشک پانی سماتا ہے دو مٹکوں کے پانی کا وزن علماء نے ساڑھے پانچ سو من لکھا ہے اس حدیث کے پیش نظر حضرت امام شافعی ؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر پانی دو مٹکوں کے برابر ہو اور اس میں نجاست و غلاظت گر جائے تو جب تک پانی کا رنگ، مزہ اور بو متغیر نہ ہو پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

لیکن جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے اس کے بارے میں علماء کا بہت زیادہ اختلاف ہے کہ آیا یہ حدیث صحیح بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ سفر السعادہ کے مصنف جو ایک جلیل القدر محدث ہیں لکھتے ہیں کہ "علماء کی ایک جماعت کا قول تو یہ ہے کہ حدیث صحیح ہے مگر ایک دوسری

جماعت کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔"

علی بن مدنیؒ نے جو جلیل القدر علماء اور ائمہ حدیث کے امام اور حضرت امام بخاریؒ کے استاد ہیں لکھا ہے کہ "یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے ثابت ہی نہیں ہے۔"

نیز علماء لکھتے ہیں کہ "یہ حدیث اجماع صحابہ کے برخلاف ہے کیونکہ ایک مرتبہ چاہ زمزم میں ایک حبشی گر پڑا تو حضرت بن عباسؓ اور حضرت ابن زبیرؓ نے یہ حکم دیا کہ کنویں کا تمام پانی نکال دیا جائے اور یہ واقعہ اکثر صحابہ کے سامنے ہوا اور کسی نے بھی اس حکم کی مخالفت نہیں کی۔"

پھر اس کے علاوہ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس مسئلہ میں پانی کی حد اور مقدار متعین کرنے کے سلسلے میں نہ تو حنفیہ کو اور نہ ہی شوافع کو ایسی کوئی صحیح حدیث ہاتھ لگی ہے جس سے معلوم ہو کہ نجاست پڑنے سے کتنی مقدار کا پانی ناپاک ہو جاتا ہے اور کتنی مقدار کا ناپاک نہیں ہوتا۔"

امام طحاویؒ جو فن حدیث کے ایک جلیل القدر امام اور حنفی مسلک تھے فرماتے ہیں کہ "حدیث قلتین (یعنی یہ حدیث) اگرچہ صحیح ہے لیکن اس پر ہمارے عمل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں پانی کی مقدار دو قلہ بتائی گئی ہے اور قلہ کے کئی معنی آتے ہیں، چنانچہ قلہ مٹکے کو بھی کہتے ہیں اور مشک کو بھی، نیز پہاڑ کی چوٹی بھی قلہ کہلاتی ہے، لہٰذا جب یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں حدیث میں قلہ سے کیا مراد ہے تو اس پر عمل کیسے ہو سکتا ہے؟

بہر حال اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ جو علماء صرف حدیث کے ظاہری الفاظ پر عمل کرتے ہیں ان کا مسلک تو یہ ہے کہ "نجاست وغیرہ پڑنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا خواہ پانی کم ہو یا زیادہ ہو، جاری ہو یا ٹھہرا ہوا ہو، اور خواہ نجاست پڑنے سے پانی کا رنگ مزہ اور بو متغیر ہو یا نہ ہو" یہ حضرات دلیل میں اس کے بعد آنے والی حدیث (نمبر ۵) کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ اِنَّ الْمَآءَ طَهُوْرٌ لَّا یُنَجِّسُهٗ شَیْءٌ (یعنی پانی پاک ہے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی) حالانکہ مطلقاً پانی نہیں ہے بلکہ زیادہ پانی ہے۔

ان کے علاوہ تمام علماء اور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ اگر پانی زیادہ ہو گا تو نجاست پڑنے سے ناپاک نہیں ہو گا اور اگر پانی کم ہے تو نجاست پڑنے سے ناپاک ہو جائے گا۔

اب اس کے بعد یہ چاروں اماموں کے ہاں "زیادہ" اور "کم" کی مقدار میں اختلاف ہے چنانچہ حضرت امام مالکؒ تو فرماتے ہیں کہ نجاست پڑنے سے جس پانی کا رنگ، مزہ اور بو متغیر نہ ہو وہ ماء کثیر زیادہ پانی کہلائے گا اور جو پانی متغیر ہو جائے وہ ماء قلیل (کم پانی) کے حکم میں ہو گا۔ حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک اس حدیث کے پیش نظر یہ ہے جو پانی دو قلوں کے برابر ہو گا اسے ماء کثیر کہیں گے اور جو پانی دو قلوں کے برابر نہ ہو گا وہ "ماء قلیل" کہلائے گا۔

حضرت امام اعظمؒ اور ان کے ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ۔ "اگر پانی اتنی مقدار میں ہو کہ اس کے ایک کنارہ کو ہلانے سے دوسرا کنارہ نہ ہلے تو وہ "ماء کثیر ہے اور اگر دوسرا کنارہ ہلنے لگے تو وہ "ماء قلیل" ہے۔"

بعد کے بعض حنفی علماء نے "دہ دردہ" کو ماء کثیر کہا ہے یعنی اتنا بڑا حوض جو دس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ چوڑا ہو اور اتنا گہرا ہو کہ اگر چلو سے پانی اٹھائیں تو زمین نہ کھلے ایسے حوض کو دہ دردہ کہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے حوض کے پانی میں جو "دہ دردہ" ہو ایسی نجاست پڑ جائے جو پڑ جانے کے بعد دکھلائی نہیں دیتی ہو جیسے پیشاب، خون، شراب وغیرہ تو چاروں طرف وضو کرنا درست ہے جدھر چاہے وضو کیا جا سکتا ہے، البتہ اگر اتنے بڑے حوض میں اتنی جناست پڑ جائے کہ پانی کا رنگ یا مزہ بدل جائے یا بدبو آنے لگے تو پانی ناپاک ہو جائے گا اور اگر حوض کی شکل یہ ہو کہ لمبا تو وہ بیس ہاتھ ہو اور چوڑا پانچ ہاتھ ہو یا ایسے ہی لمبا پچیس ہاتھ ہو اور چوڑا چار ہاتھ ہو تو یہ بھی دہ دردہ کی مثل ہی کہلائے گا۔

⑤ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَنَتَوَضَّأُ مِنْ بِئْرِ بُضَاعَةَ وَھِیَ بِئْرٌ یُلْقٰی فِیْھَا الْحِیَضُ وَ لُحُوْمُ الْکِلَابِ وَالنَّتْنُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَآءَ طُھُوْرٌ لَا یُنَجِّسُهٗ شَیْئٌ۔

(رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم بضاعہ کے کنویں (کے پانی) سے وضو کر سکتے ہیں؟ (جب کہ) اس کنویں میں حیض کے (خون میں بھرے ہوئے) کپڑے کتوں کے گوشت اور گندگی ڈالی جاتی ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "(اس کنویں کا) پاک ہے (جب تک کہ اس کے رنگ، مزہ اور بو میں فرق نہ آئے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤد، نسائیؒ)

تشریح: بیر بضاعہ مدینہ کے ایک کنویں کا نام ہے وہ ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں نالے کی رد آتی تھی اس نالے میں جو گندگی اور غلاظت ہوتی تھی وہ اس کنویں میں پڑتی تھی مگر کہنے والے نے کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ لوگ خود اس میں نجاست ڈالتے تھے، حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ اس قسم کی گندگی اور غلط چیزوں کا ارتکاب تو عام مسلمان بھی نہیں کر سکتا چہ جائے کہ وہ ایسی غیر شرعی غیر اخلاقی چیز کا ارتکاب کرتے جو افضل المومنین تھے۔

بہر حال۔ اس کنویں میں بہت زیادہ پانی تھا اور چشمہ دار تھا اس لئے جو گندگی اس میں گرتی تھی بہہ کر نکل جاتی تھی بلکہ علماء کی تحقیق تو یہ ہے کہ اس وقت کنواں جاری تھا اور نہر جاری کی طرح ایک باغ میں بہتا بھی تھا چنانچہ جب آپ ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے کنویں کی اس صفت کی وجہ سے اس کے پانی کے بارے میں وہی حکم فرمایا جو ماء کثیر یا جاری پانی کا ہوتا ہے۔

حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ نجاست پڑنے سے کوئی پانی ناپاک نہیں ہوتا خواہ وہ تھوڑا پانی ہو یا زیادہ پانی بلکہ یہ حکم ماء کثیر یعنی زیادہ پانی کا ہے ماء قلیل یعنی کم پانی کا یہ حکم نہیں ہے۔

حنفیہ کے بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ چشمہ دار کنواں بھی "جاری پانی" کا حکم رکھتا ہے یعنی جو حکم بہنے والے پانی کا ہوتا ہے وہی چشمہ دار کنویں کا ہوتا ہے۔

⑥ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّا نَرْکَبُ الْبَحْرَ وَنَحْمِلُ مَعَنَا الْقَلِیْلَ مِنَ الْمَآءِ فَاِنْ تَوَضَّأْنَا بِہٖ عَطِشْنَا اَفَنَتَوَضَّأُ بِمَآءِ الْبَحْرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھُوَ الطَّھُوْرُ مَاؤُهٗ وَالْحِلُّ مَیْتَتُهٗ۔ (رواہ مالک والترمذی و ابوداؤد والنسائی و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ "ایک شخص نے سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم (کھارے) دریا میں کشتی کے ذریعہ سفر کرتے ہیں اور (میٹھا) پانی اپنے ہمراہ تھوڑا لے جاتے ہیں اس لئے اگر ہم اس پانی سے وضو کرلیں تو پیاسے رہ جائیں! تو کیا ہم دریا کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں (یا تیمم کرلیا کریں) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "دریا کا وہ پانی پاک کرنے والا ہے اس کا مردار حلال ہے۔"

(مالکؒ، ابوداؤدؒ، نسائی، ابن ماجہ، دارمیؒ)

تشریح: "میتۃ" اس مردار جانور کو کہتے ہیں جو بغیر ذبح کئے ہوئے اپنے آپ مرجائے چنانچہ اس حدیث میں میتۃ (سے مراد مچھلی ہے کیونکہ اسے ذبح نہیں کرتے اس کا شکار کرنا اور اسے پانی سے نکالنا ہی اس کو ذبح کرنے کے مترادف ہے۔ البتہ جو مچھلی پانی میں مرجائے وہ حنفیہ کے یہاں حلال نہیں ہے۔

دریائی جانوروں میں مچھلی تمام علماء کے ہاں متفقہ طور پر حلال ہے، دوسرے جانوروں کے بارے میں اختلاف ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

(۷) وَعَنْ اَبِیْ زَیْدٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَہٗ لَیْلَۃَ الْجِنِّ مَا فِیْ اِدَاوَتِكَ قَالَ قُلْتُ نَبِیْذٌ قَالَ تَمْرَۃٌ طَیِّبَۃٌ وَّمَآءٌ طُھُوْرٌ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَزَادَ اَحْمَدُ وَ التِّرْمِذِیُّ فَتَوَضَّاَ مِنْہُ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ اَبُوْزَیْدٍ مَجْھُوْلٌ وَصَحَّ عَنْ عَلْقَمَۃَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمْ اَکُنْ لَیْلَۃَ الْجِنِّ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوزید حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ نے لیلۃ الجن (یعنی جن کی رات) میں ان سے پوچھا کہ تمہاری چھاگل میں کیا ہے! عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ نبیذ (یعنی کھجوروں کا شربت) ہے" آپ ﷺ نے فرمایا کھجوریں پاک ہیں اور پانی پاک کرنے والا ہے (ابوداؤد اور امام احمدؒ و امام ترمذیؒ نے یہ الفاظ زیادہ نقل کئے ہیں کہ "پس آپ ﷺ نے اس سے وضو کیا" نیز امام ترمذی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ابوزید کا پتہ نہیں کہ یہ کون ہیں ہاں حضرت علقمہؒ البتہ عبداللہ بن مسعود سے صحیح طور پر یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ "میں لیلۃ الجن میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نہیں تھا۔" (مسلم)

تشریح: لیلۃ الجن اس رات کو کہتے ہیں جس میں جنات کی ایک جماعت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئی تھی اور آپ ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے ان کے سامنے قرآن کریم پڑھا تھا جس کے بعد وہ جماعت اپنی قوم میں گئی اور اسلام کی دعوت اور قرآن کی تعلیمات سے انھیں آگاہ کیا اس واقعہ کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ جن میں بھی کیا گیا ہے۔

"نبیذ تمر" کی شکل یہ ہوتی ہے کہ چھوارے پانی میں ڈال دیئے جاتے ہیں اور انہیں چند روز تک اسی طرح پانی میں رہنے دیا جاتا ہے جس کے بعد دونوں کا شربت سا بن جاتا ہے اور اس میں ایک قسم کی تیزی بھی آجاتی ہے، یہ شربت جب تک تیز و تند نہیں ہوتا حلال رہتا ہے چنانچہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کے لئے یہ نبیذ تمر بنایا جاتا تھا۔

نبیذ تمر سے وضو کرنا مختلف فیہ ہے، چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر وضو کے لئے خاص پانی نہ ملے تو نبیذ تمر سے وضو کیا جاسکتا ہے اس کی موجودگی میں تیمم کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت امام شافعیؒ اس مسلک سے اختلاف کرتے ہیں، حضرت امام اعظمؒ کی دلیل یہی مذکورہ حدیث ہے یہ حدیث چونکہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے شوافع اس حدیث کو ضعیف ثابت کرتے ہیں چنانچہ حضرت امام ترمذیؒ بھی یہی بات کہہ رہے ہیں کہ حدیث کے راوی ابوزید غیر معروف ہیں اس لئے ان کی روایت کردہ حدیث پر کسی مسلک کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی، امام ترمذی دوسری چیز یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ لیلۃ الجن میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نہیں تھے۔ اس کی شہادت میں وہ حضرت علقمہ کی ایک روایت پیش کر رہے ہیں جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہی سے مروی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ جب عبداللہ بن مسعودؓ کا آنحضرت ﷺ کے ہمراہ اس رات میں ہونا ہی ثابت نہیں ہے تو ابوزید کی یہ روایت یقیناً صحیح نہیں ہوسکتی۔

لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضرت امام اعظمؒ کا مسلک برحق ہے کیونکہ حضرت امام ترمذیؒ کا یہ کہنا ابوزید مجہول راوی ہیں حدیث کی حیثیت پر کچھ اثر انداز نہیں ہوتا اس لئے کہ حدیث کے راویوں کے غیر معروف ہونے کا دعویٰ دوسرے طریقوں سے غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس روایت میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نہیں تھے، بالکل غلط ہے، کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ کی موجودگی دیگر روایتوں سے بھی تحقیق کے ساتھ ثابت ہے چنانچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اس شب میں جنات کو اسلام کی دعوت اور قرآن کی تعلیمات بتانے میں مشغول ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو ایک جگہ بٹھا دیا اور ان کے اردگرد لکیر کھینچ کر ایک دائرہ بنایا اور انھیں ہدایت کی کہ وہ اس دائرہ سے باہر نہ نکلیں۔

حضرت علقمہؒ کی روایت کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے مگر اس کا مطلب حضرت ابن مسعودؓ کی موجودگی کا سرے سے انکار نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ جنات سے ہم کلام تھے اس وقت حضرت ابن مسعودؓ آپ ﷺ کے پاس حاضر نہ

تھے، یا یہ کہ آنحضرت ﷺ جس وقت جنات کے پاس تشریف لے جا رہے تھے ابن مسعودؓ اس وقت آپ ﷺ کے پاس نہیں تھے بلکہ آخر شب میں جا کر آپ ﷺ سے ملاقات کی۔ واللہ اعلم

(۸) وَعَنْ كَبْشَةَ بِنْتِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ وَكَانَتْ تَحْتَ ابْنِ اَبِىْ قَتَادَةَ اَنَّ اَبَاقَتَادَةَ دَخَلَ عَلَيْهَا فَسَكَبَتْ لَهُ وَضُوْءًا فَجَاءَتْ هِرَّةٌ تَشْرَبُ مِنْهُ فَاَصْغٰى لَهَا الْاِنَاءَ حَتّٰى شَرِبَتْ قَالَتْ كَبْشَةُ فَرَاٰنِىْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ فَقَالَ اَتَعْجَبِيْنَ يَا ابْنَةَ اَخِىْ قَالَتْ فَقُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ اِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ اَوِ الطَّوَّافَاتِ۔ (رواہ مالک و احمد والترمذی و ابوداؤد والنسائی و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت کبشہ بنت کعب بن مالک سے جو حضرت ابوقتادہؓ کے بیٹے کی بیوی تھیں مروی ہے کہ "(ایک روز ان کے سسر حضرت ابوقتادہؓ ان کے پاس آئے (کبشہ کہتی ہیں کہ) میں نے ان کے وضو کے لئے (ایک برتن میں) پانی رکھ دیا، ایک بلی آ کر اس میں سے پانی پینے لگی، حضرت ابوقتادہ نے برتن کو اس کی طرف جھکا دیا (تاکہ وہ آسانی سے پانی پی لے) چنانچہ بلی نے پانی پی لیا" کبشہ کہتی ہیں کہ جب حضرت ابوقتادہؓ نے مجھے دیکھا کہ میں (تعجب سے ان کی طرف دیکھ رہی ہوں تو انہوں نے کہا "میری بھتیجی" کیا تمہیں اس پر تعجب ہو رہا ہے؟ میں نے کہا "جی ہاں۔" حضرت ابوقتادہؓ نے کہا کہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا "بلیاں ناپاک نہیں ہیں، کیونکہ یہ تمہارے پاس آنے جانے والوں میں سے ہیں" یا یہ فرمایا "آنے جانے والیوں میں سے ہیں۔" (مالکؒ، احمدؒ ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: حضرت ابوقتادہؓ نے کبشہ کو بھتیجی کہا ہے حالانکہ وہ ان کی بھتیجی نہیں تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں عام طور پر مرد مخاطب کو اگر وہ چھوٹا ہوتا ہے بھتیجا یا چچا کا بیٹا اور عورت مخاطب کو بھتیجی کہہ کر پکارتے ہیں چاہے حقیقت میں ان کا یہ رشتہ نہ ہو کیونکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے، اس لئے وہ اسلامی اخوت کے رشتہ کے پیش نظر اس کی اولاد کو بھتیجا یا بھتیجی کہتے ہیں۔ روایت میں "طوافین" اور "طوافات" دونوں لفظ استعمال فرمائے گئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بلی اگر نر ہے تو اس کی مناسبت سے "طوافین" کا لفظ ہوگا اور اگر بلی مادہ ہے تو اس کی مناسبت سے "طوافات" کا لفظ ہوگا۔

یہ دونوں لفظ یہاں "خادم" کے معنی میں استعمال فرمائے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ "بلیاں تمہاری خادم ہیں" ان کو خادم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بھی انسانوں کی مختلف طریقہ سے خدمت کرتی ہیں اور ان کے آرام و راحت کی بعض چیزوں میں بڑی معاون ہوتی ہیں مثلاً نقصان دہ جانوروں جیسے چوہے وغیرہ کو یہ مارتی ہیں۔ یا ان کو خادم اس مناسبت سے کہا گیا ہے کہ جیسے خادموں کی خبرگیری میں ثواب ہوتا ہے اسی طرح بلیوں کی خبرگیری میں بھی ثواب ہوتا ہے اور جس طرح گھروں میں خادم پھرتے رہتے ہیں اس طرح بلیاں بھی گھروں میں پھرتی رہتی ہیں۔

بہر حال حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلیاں تمہارے پاس ہر وقت خادموں کی طرح رہتی ہیں اور گھر کے ہر حصہ میں پھرا کرتی ہیں اگر ان کے جھوٹے کا ناپاک قرار دے دیا جائے تو تم سب بڑی دشواریوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس لئے یہ حکم کیا جاتا ہے کہ بلیوں کا جھوٹا پاک ہے۔ گویا یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ بلی کا جھوٹا پاک ہے چنانچہ امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ بلیوں کا جھوٹا ناپاک نہیں ہے بلکہ پاک ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ بلی کا جھوٹا مکروہ تنزیہی ہے یعنی اگر بلی کے جھوٹے پانی کے علاوہ دوسرا پانی نہ مل سکے تو اس سے وضو کرنا جائز ہے۔ اس کی موجودگی میں تیمم کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر بلی کے جھوٹے پانی کے علاوہ دوسرا پانی موجود ہو اور اس کے باوجود اسی جھوٹے پانی سے وضو کیا جائے گا تو وضو ہو جائے گا لیکن مکروہ ہوگا۔

امام صاحبؒ اس شکل میں اسے مکروہ بھی اس لئے کہتے ہیں کہ ایک دوسری حدیث میں بلی کو درندہ کہا گیا ہے اور درندہ کے بارے میں بتایا گیا کہ ناپاک ہوتا ہے لیکن یہ حدیث چونکہ اس کے بالکل برعکس ہے اس لئے ان دونوں حدیثوں پر نظر رکھتے ہوئے کوئی ایسا حکم نافذ

کیا جانا چاہئے جو دونوں حدیثوں کے مفہوم کے مطابق ہو لہٰذا اب یہی کہا جائے گا کہ جس حدیث میں بلی کو درندہ کہہ کر اس کی نجاست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس حدیث نے بلی کے نجاست کے حکم کو کراہت میں بدل دیا ہے لہٰذا اس کے جھوٹے کو ناپاک تو نہیں کہیں گے البتہ مکروہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

⑨ وَعَنْ دَاوُدَ بْنِ صَالِحِ بْنِ دِیْنَارٍ عَنْ اُمِّهٖ اَنَّ مَوْلَاتَهَا اَرْسَلَتْهَا بِهَرِیْسَةٍ اِلٰی عَائِشَةَ قَالَتْ فَوَجَدْتُّهَا تُصَلِّیْ فَاَشَارَتْ اِلَیَّ اَنْ ضَعِیْهَا فَجَآءَتْ هِرَّةٌ فَاَكَلَتْ مِنْهَا فَلَمَّا انْصَرَفَتْ عَائِشَةُ مِنْ صَلَاتِهَا اَكَلَتْ مِنْ حَیْثُ اَكَلَتِ الْهِرَّةُ فَقَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّهَا لَیْسَتْ بِنَجَسٍ اِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِیْنَ عَلَیْكُمْ وَاِنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَوَضَّاُ بِفَضْلِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت داؤد بن صالح بن دینار اپنی والدہ مکرمہ سے نقل کرتے ہیں کہ "(ایک روز) انہیں ان کی آزاد کرنے والی مالکہ نے ہریسہ (یعنی حریرہ) دیکر حضرت عائشہ صدیقہ کی خدمت اقدس میں بھیجا ان کی والدہ فرماتی ہیں کہ "میں نے (وہاں پہنچ کر) حضرت عائشہ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا حضرت عائشہ نے اشارہ سے اسے رکھ دینے کے لئے مجھ سے کہا (چنانچہ میں نے ہریسہ کا برتن رکھ دیا اتنے میں) ایک بلی آکر اس میں سے کھانے لگی۔ حضرت عائشہ جب نماز سے فارغ ہوئیں تو حریرہ کو بلی نے جس طرح سے کھایا تھا اسی طرح سے انہوں نے بھی کھالیا پھر فرمایا کہ "سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "بلی ناپاک نہیں ہے اور وہ تمہارے پاس آنے جانے والوں میں سے ہے" اور میں نے خود سرکار دو عالم ﷺ کو بلی کے جھوٹے (پانی) سے وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: داؤد کی والدہ جب حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس حریرہ لے کر پہنچیں تو وہ نماز میں مشغول تھیں اس لئے انہوں نے اپنے ہاتھ یا سر وغیرہ سے انہیں اشارہ کا جس کا مطلب تھا کہ یہ برتن رکھ دو اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اس طرح کے معمولی اشارے جائز ہیں کیونکہ یہ عمل کثیر نہیں ہے چنانچہ نماز کو فاسد اور ختم کر دینے والی چیز یا تو گفتگو ہے یا عمل کثیر ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ خود بلی کے جھوٹے پانی سے وضو فرما لیا کرتے تھے۔ لہٰذا جن علماء کا مسلک یہ ہے کہ بلی کے جھوٹے پانی سے وضو کرنا مکروہ تنزیہی ہے مثلاً امام ابوحنیفہ تو وہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا یہ فعل آسانی و رخصت پر عمل کرنے کے مترادف ہے اور بیان جواز کے لئے ہے۔ البتہ جن علماء کے نزدیک بلی کا جھوٹا پاک ہے ان کو اس حدیث کی کوئی تاویل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اس سے تو ان ہی کے مسلک کی تائید ہوتی ہے علماء نے لکھا ہے کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بلیوں کو پالنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔

⑩ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَتَوَضَّاُ بِمَا اَفْضَلَتِ الْحُمُرُ قَالَ نَعَمْ وَبِمَا اَفْضَلَتِ السِّبَاعُ كُلُّهَا۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت جابر راوی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کیا ہم اس پانی سے وضو کر سکتے ہیں جس کو گدھوں نے جھوٹا کر دیا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں! (اس پانی سے وضو کرنا جائز ہے) اور اس پانی سے بھی (وضو کرنا جائز ہے) جس کو درندوں نے جھوٹا کر دیا ہو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: اس مسئلہ میں کہ گدھوں یا اسی طرح خچروں کا جھوٹا پانی پاک ہے یا نہیں؟ کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی کیونکہ اس مسئلہ میں جو احادیث منقول ہیں ان میں تعارض ہے چنانچہ بعض احادیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جھوٹا حرام ہے اور بعض احادیث سے ان کی اباحت کا پتہ چلتا ہے، جیسا کہ مرقات میں دونوں قسم کی احادیث جمع کی گئی ہیں لہٰذا ان کے ظاہری تعارض کو دیکھتے ہوئے اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور پھر احادیث کے علاوہ صحابہ میں بھی اس مسئلہ کے بارے میں اختلاف منقول ہے چنانچہ حضرت ابن

عمرؓ گدھوں اور خچروں کے جھوٹے کو ناپاک کہتے تھے مگر حضرت ابن عباسؓ اس کے پاک ہونے کے قائل تھے۔

اس حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ درندوں کا جھوٹا پاک ہے جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک درندوں کا جھوٹا ناپاک ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب کوئی درندہ پانی وغیرہ کو جھوٹا کرے گا تو اس میں اس کا لعاب یقیناً پڑے گا اور لعاب گوشت سے پیدا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ درندوں کا گوشت ناپاک ہوتا ہے اس لئے اس کے جھوٹے کو بھی ناپاک کہا جائے گا۔

اب جہاں تک ان حدیثوں کا تعلق ہے جن سے درندوں کے جھوٹے کا پاک ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کے بارے میں علماء کہتے ہیں کہ ان احادیث کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ ان احادیث کی صحت ہی میں کلام کیا جاتا ہے کہ آیا یہ حدیث صحیح بھی ہیں یا نہیں؟ اگر ان احادیث کو صحیح مان بھی لیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ ان احادیث سے درندہ کے جس جھوٹے پانی کے پاک ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس سے وہ پانی مراد ہے جو جنگل میں بڑے بڑے تالابوں میں جمع ہوتا ہے، چنانچہ اس کی تصریح آگے آنے والی احادیث سے بھی جو حضرت یحییٰ اور حضرت ابوسعید سے مروی ہیں، ہوتی ہے جن میں وضاحت کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے کہ اگر وہ درندہ نے ایسے پانی کو جھوٹا کیا جو بہت زیادہ ہو مثلاً کسی بڑے تالاب وغیرہ میں پانی ہے تو پاک ہوگا اگر پانی تھوڑا ہوگا تو وہ درندوں کو جھوٹا کر دینے سے ناپاک ہو جائے گا۔

پھر اس بات کو ذہن نشین کر لیجئے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ ان احادیث میں درندے اور پانی علی العموم مراد ہیں کہ پانی خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ وہ درندوں کے جھوٹا کرنے سے ناپاک نہیں ہوتا تو کیا اس شکل میں یہ لازم نہیں آتا کہ کتوں کے جھوٹے کو بھی پاک کہا جائے حالانکہ کوئی بھی کتے کہ جھوٹے کو پاک نہیں کہتا" لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ جن احادیث سے درندوں کے جھوٹے پانی کا پاک ہونا معلوم ہوتا ہے اس سے وہی پانی مراد ہے جو جنگل میں بڑے بڑے تالابوں میں جمع رہتا ہے اور جو بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

اس موقع پر بر سبیل تذکرہ ایک مسئلہ بھی سن لیجئے۔ یہ تو آپ سب ہی جانتے ہیں کہ کتے کا لعاب وغیرہ بھی ناپاک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کتوں کا لعاب وغیرہ کپڑے یا بدن کے کسی حصہ پر لگ جائے تو اس کو دھو کر پاک کرنا ضروری ہوتا ہے مگر اس سلسلہ میں اتنی بات یاد رکھئے کہ اگر کسی کتے نے کسی آدمی کے بدن کے کسی حصہ کو منہ سے پکڑ لیا یا کسی کپڑے کو منہ میں دبا لیا تو اس کا مسئلہ یہ ہے کہ کتے نے اگر غصہ کی حالت میں پکڑا یا دبایا ہے تو وہ ناپاک نہیں ہوگا۔ اور اگر غصہ کی حالت میں نہیں بلکہ بطور کھیل گلیل اس نے پکڑا اور دبایا ہے تو وہ ناپاک ہو جائے گا اس لئے بدن کے اس حصہ کو اور کپڑے کو دھو کر پاک کرنا ضروری ہوگا۔ اس فرق کی وجہ علماء یہ لکھتے ہیں کہ جب کتا کسی چیز کو غصہ کی حالت میں پکڑتا ہے تو اسے دانتوں سے پکڑتا ہے اور اس کے دانت میں کوئی رطوبت نہیں ہوتی اس لئے اس چیز پر ناپاکی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور جب کسی چیز کو کھیل گلیل کے طریقہ پر پکڑتا ہے تو اسے دانتوں سے نہیں پکڑتا ہے اور ہونٹ چونکہ لعاب وغیرہ سے تر ہوتے ہیں اس لئے اس کی ناپاکی اس چیز کو بھی ناپاک کر دیتی ہے۔

(۱۱) وَعَنْ اُمِّ هَانِئٍ قَالَتْ اِغْتَسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ وَمَيْمُوْنَةُ فِيْ قَصْعَةٍ فِيْهَا اَثَرُ الْعَجِيْنِ۔

(رواہ النسائی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت امام ہانیؓ[1] راوی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ نے اور حضرت میمونہؓ نے ایک طشت میں کہ جس میں گندھے ہوئے آٹے کا کچھ حصہ لگا ہوا تھا غسل فرمایا۔" (نسائیؒ، ابن ماجہ)

تشریح: چونکہ حضرات شوافع کے نزدیک پانی میں تغیر آجانے سے خواہ تغیر کسی پاک و جائز چیز سے آئے یا ناپاک و ناجائز چیز سے وہ پانی وضو و غسل کے استعمال کے قابل نہیں رہتا اس لئے وہ حضرات اس حدیث کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ طشت میں اتنا آٹا نہیں لگا تھا جس سے پانی

[1] آپ کا نام فاختہ ہے مگر ام ہانی کی کنیت سے مشہور ہیں ابوطالب کی صاحبزادی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حقیقی بہن ہیں۔

متغیر ہو جاتا اس لئے آنحضرت ﷺ اور حضرت میمونہؓ نے اس میں غسل کیا۔
مگر حنفیہ کے یہاں چونکہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر پانی کسی پاک و جائز چیز سے متغیر ہو بشرطیکہ پانی گاڑھا نہ ہو جائے تو اس سے وضو اور غسل درست ہے اس لئے انہیں اس حدیث کی کوئی تاویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑫ وَعَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ اِنَّ عُمَرَ خَرَجَ فِي رَكْبٍ فِيْهِمْ عَمْرُو ابْنُ الْعَاصِ حَتّٰى وَرَدُوْا حَوْضًا فَقَالَ عَمْرٌو يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ هَلْ تَرِدُ حَوْضَكَ السِّبَاعُ فَقَالَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ لَا تُخْبِرْنَا فَاِنَّا نَرِدُ عَلَى السِّبَاعِ وَ تَرِدُ عَلَيْنَا رَوَاهُ مَالِكٌ وَ زَادَ رَزِيْنٌ قَالَ زَادَ بَعْضُ الرُّوَاةِ فِي قَوْلِ عُمَرَ وَ اِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَهَا مَا اَخَذَتْ فِي بُطُوْنِهَا وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَنَا طُهُوْرٌ وَ شَرَابٌ۔

"حضرت یحییٰ بن عبدالرحمٰنؒ فرماتے ہیں کہ "حضرت عمر بن خطابؓ ایک قافلہ کے ہمراہ کہ جس میں حضرت عمرو بن عاصؓ بھی تھے چلے جب (اہل قافلہ جنگل میں) ایک تالاب پر پہنچے تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے پوچھا کہ اے تالاب کے مالک کیا تمہارے اس تالاب پر (پانی پینے کے لئے) درندے بھی آتے ہیں؟ (یہ سن کر حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ "اے تالاب کے مالک یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ ہم درندوں پر آتے ہیں اور درندے ہم پر آتے ہیں یعنی کبھی تو ہم پانی پر آتے ہیں اور کبھی درندے پانی پر آتے ہیں اور چونکہ تالاب میں پانی زیادہ ہے اس لئے درندوں کے پینے سے ناپاک نہیں ہوتا (مالکؒ) اور رزینؒ نے کہا ہے کہ "بعض راویوں نے حضرت عمرؓ کے اس قول میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ (حضرت عمرؓ کہتے ہیں) "میں نے خود سرکار دو عالم ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے کہ "درندے جو اپنے پیٹ میں لے جائیں وہ ان کا ہے اور جو باقی رہ جائے وہ ہمارے پینے کے قابل اور پاک کرنے والا ہے۔""

⑬ وَعَنْ اَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْحِيَاضِ الَّتِي بَيْنَ مَكَّةَ وَ الْمَدِيْنَةِ تَرِدُهَا السِّبَاعُ وَ الْكِلَابُ وَ الْحُمُرُ عَنِ الطُّهْرِ مِنْهَا فَقَالَ لَهَا مَا حَمَلَتْ فِي بُطُوْنِهَا وَ لَنَا مَا غَبَرَ طَهُوْرٌ۔ (رواه ابن ماجة)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ سے ان تالابوں کے بارے میں پوچھا گیا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہیں اور ان پر (پانی پینے کے لئے) درندے، کتے اور گدھے آتے رہتے ہیں کہ آیا اس سے کوئی چیز پاک کی جاسکتی ہے یا نہیں؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو ان کے پیٹوں میں آجائے وہ ان کا ہے اور جو باقی رہ جائے وہ ہمارے لئے پاک کرنے والا ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: ان دونوں حدیثوں میں درندوں کے جھوٹے پانی کے پاک ہونے کا جو حکم بیان کیا جارہا ہے وہ مطلقاً پانی کے بارے میں نہیں ہے بلکہ یہ حکم اس پانی کے بارے میں ہے جو بڑے بڑے تالابوں اور حوضوں میں جمع رہتا ہے۔

⑭ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ لَا تَغْتَسِلُوْا بِالْمَاءِ الْمُشَمَّسِ فَاِنَّهُ يُوْرِثُ الْبَرَصَ۔ (رواه الدار قطنی)

"اور حضرت عمر بن خطابؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا دھوپ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل نہ کرو کیونکہ یہ برص (یعنی سفیدی) کی بیماری کا سبب ہوتا ہے۔" (دار قطنیؒ)

تشریح: "دھوپ میں گرم کئے ہوئے پانی" کا مطلب بعض علماء نے یہ اخذ کیا ہے کہ اس پانی سے غسل نہ کرنا چاہئے جو قصداً دھوپ میں رکھ کر گرم کیا گیا ہو لیکن بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے یعنی خواہ پانی کو دھوپ میں قصداً رکھ کر گرم کیا گیا ہو یا پانی کسی جگہ پہلے سے رکھا ہوا ہو اور دھوپ کے آجانے سے گرم ہو گیا ہو۔
حضرت میرک شاہؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث یعنی حضرت عمرؓ کا یہ قول ضعیف ہے اور سرکار دو عالم ﷺ کی کوئی حدیث اس سلسلہ میں منقول نہیں ہے۔

مگر حضرت امام شافعیؒ نے حضرت عمرؓ کے اس قول کو دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے جس کے راوی ثقہ اور معتمد ہیں لہٰذا اس کی صحت میں کوئی کلام صحیح نہیں ہوگا۔

جہاں تک حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کی مراد کا تعلق ہے اس سلسلہ میں یہ کہا جائے گا کہ حضرت عمرؓ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے پانی میں غسل مستقلاً نہ کیا جائے اور نہ اس پانی سے غسل کرنے کی عادت ڈالی جائے تاکہ برص جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کا خدشہ نہ رہے۔

ویسے مسئلہ کی بات یہ ہے کہ دھوپ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے چنانچہ حضرت امام اعظمؒ، امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ تینوں حضرات کے نزدیک اس میں کوئی کراہت نہیں ہے البتہ حضرت امام شافعی کے مسلک میں کچھ اختلاف ہے لیکن ان کا صحیح قول یہ ہے کہ اس پانی سے غسل کرنا مکروہ ہے البتہ ان کے علماء متاخرین نے بھی تینوں ائمہ کی ہمنوائی کرتے ہوئے یہی مسلک اختیار کیا ہے کہ اس میں کراہت نہیں ہے۔

بَابُ تَطْهِيرِ النَّجَاسَاتِ

نجاستوں کے پاک کرنے کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِیْ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ طُهُوْرُ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ اِذَا وَلَغَ فِيْهِ الْكَلْبُ اَنْ يَغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ اُوْلَاهُنَّ بِالتُّرَابِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا پانی پی لے اس (برتن) کو سات مرتبہ دھو لینا چاہئے" (بخاریؒ و مسلم) اور مسلمؒ کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ "تم میں سے جس کے برتن میں کتا پانی پی جائے اس (برتن) کو پاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ اسے سات مرتبہ دھو ڈالے اور پہلی مرتبہ مٹی سے دھوئے۔"

تشریح: اکثر محدثین اور تینوں ائمہ کا مسلک یہی ہے کہ اگر برتن میں کتا منہ ڈال دے یا کسی برتن میں پانی پی لے اور کھا لے تو اس برتن کو سات مرتبہ دھونا چاہئے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اس کو بھی دوسری نجاستوں کے حکم میں شمار کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ اس برتن کو صرف تین مرتبہ بغیر مٹی کے دھو ڈالنا کافی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حدیث میں سات مرتبہ دھونے کا جو حکم دیا جا رہا ہے وہ وجوب کے طریقہ پر نہیں ہے بلکہ اختیار کے طور پر ہے، یا پھر یہ کہ سات مرتبہ دھونے کا یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا جو بعد میں منسوخ ہو گیا! واللہ اعلم۔

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَامَ اَعْرَابِیٌّ فَبَالَ فِی الْمَسْجِدِ فَتَنَاوَلَهُ النَّاسُ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعُوْهُ وَهَرِيْقُوْا عَلٰى بَوْلِهٖ سَجْلًا مِّنْ مَّاءٍ اَوْ ذَنُوْبًا مِّنْ مَّاءٍ فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ (ایک دن) ایک دیہاتی نے مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا (یہ دیکھ کر) لوگ اس کے پیچھے پڑنے لگے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اسے چھوڑ دو اور ایک ڈول میں پانی اس کے پیشاب پر بہا دو اور آپ ﷺ نے فرمایا) تم لوگ آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو تنگی کرنے والے نہیں۔" (البخاری)

تشریح: راوی کو شک ہو رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سَجْلًا مِّنْ مَّاءٍ فرمایا ہے یا ذَنُوْبًا مِّنْ مَّاءٍ کے الفاظ فرمائے ہیں اسی لئے انہوں

نے دونوں نقل کر دیئے ہیں "سجل" اور "ذنوب" دونوں کے معنی ڈول ہی کے ہیں لیکن ان کے استعمال میں تھوڑا سا فرق ہے وہ یہ کہ سجل تو اس ڈول کو کہتے ہیں جس میں پانی ہو خواہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ اور ذنوب پانی سے بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ اس حدیث سے سرکار دو عالم ﷺ کی انتہائی شفقت و رحمت اور آپ ﷺ کے حلم و عفو کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت پر کتنے مہربان اور شفیق تھے چنانچہ نہ یہ کہ آپ ﷺ نے خود اس دیہاتی کی غلطی سے درگزر فرماتے ہوئے اس کو کچھ نہ کہا بلکہ جب صحابہ نے اسے برا بھلا کہا آپ ﷺ نے انہیں اس بات کا احساس دلایا کہ تم جس پیغمبر کے رفیق و ساتھی اور جس امت کے فرد ہو اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہی یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو سختی و پریشانی میں مبتلا نہ کیا جائے اور نہ کسی کی غلطی پر جو عدم واقفیت کی بناء پر سرزد ہو جائے برا بھلا کہا جائے چنانچہ آپ ﷺ کے اس ارشاد سے امت کے لئے یہ تعلیم مقصود ہے کہ لوگوں کو کسی دشواری اور سختی میں نہ ڈالا جائے اور نہ ایسا کوئی معاملہ کیا جائے جس سے دوسرا شخص بددل ہو جائے اور اپنے آپ کو کسی گھٹن اور تنگی میں محسوس کرے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر زمین پر کوئی نجاست و گندگی پڑی ہوئی ہو تو اس نجاست پر زیادہ مقدار میں پانی ڈالنے یا نجاست کو بہادینے سے زمین پاک ہو جاتی ہے۔

یہ حدیث اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ نجاست کا دھوون اگر متغیر نہ ہو تو پاک ہے۔ اگر وہ کسی دوسرے کپڑے، بدن، اور زمین پر یا کسی بوریہ وغیرہ سے چھن کر زمین پر گرے تو یہ چیزیں ناپاک نہیں ہوں گی اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے مگر مختار اور معتمد قول یہ ہے کہ دھوون اگر نجاست کی جگہ اس وقت گرے جب وہ نجاست کے زائل ہونے کی وجہ سے پاک ہو چکی ہو تو اس شکل میں وہ پاک ہو گا اور وہ دھوون جو نجاست کی جگہ سے پاک ہونے سے پہلے جدا ہوا ہو ناپاک ہو گا اور اگر دھوون متغیر ہو جائے بایں طور کہ پانی کے رنگ، مزہ اور بو میں تبدیلی آجائے تو وہ بالاتفاق ناپاک ہے۔

علامہ طیبی شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی وضاحت کر رہی ہے کہ اگر زمین کسی نجاست کی وجہ سے ناپاک ہو جائے تو وہ خشک ہونے سے پاک نہیں ہوتی یعنی وہ جگہ پانی بہا کر نجاست کو زائل کر دینے ہی سے پاک ہو گی اور اس جگہ کو کھرچ ڈالنا یا وہاں سے مٹی کھود کر اٹھا لینا ضروری نہیں ہے۔

مگر امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک خشک ہونے سے زمین پاک ہو جاتی ہے اور اگر کوئی چاہے کہ خشک ہونے سے پہلے ہی زمین پاک ہو جائے تو وہاں سے مٹی کھرچ کر اٹھا دی جائے تاکہ وہ حصہ پاک ہو جائے۔

علماء حنفیہ اس حدیث کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں نے مسجد کی زمین کے اس حصہ کے جہاں خشک ہو جانے سے پہلی جگہ جہاں دیہاتی نے پیشاب کر دیا تھا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہو جس کی بناء پر حکم لگا دیا گیا کہ ناپاک زمین بغیر پانی بہائے ہوئے پاک نہیں ہوتی، جہاں تک سوال پانی ڈالنے کا ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس وقت نجاست کی جگہ پانی بہانے کا حکم اس لئے دیا ہو گا کہ پیشاب کی نجاست میں کچھ کمی ہو جائے اور پیشاب کا رنگ اور اس کی بدبو پانی بہانے کی وجہ سے ختم ہو جائے، مگر زمین کا وہ حصہ خشک ہونے کے بعد ہی پاک ہوا ہو گا۔ اس سلسلہ میں ملا علی قاریؒ نے مشکوٰۃ کی شرح مرقات میں اور بہت سی دلیلیں لکھی ہیں جو وہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ فِي الْمَسْجِدِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَآءَ اَعْرَابِيٌّ فَقَامَ يَبُوْلُ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَهْ مَهْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُزْرِمُوْهُ دَعُوْهُ فَتَرَكُوْهُ حَتّٰى بَالَ ثُمَّ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَاهُ فَقَالَ لَهٗ اِنَّ هٰذِهِ الْمَسَاجِدَ لَا تَصْلُحُ لِشَيْءٍ مِّنْ هٰذَا الْبَوْلِ وَالْقَذَرِ اِنَّمَا هِيَ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَالصَّلٰوةِ وَقِرَآءَةِ الْقُرْاٰنِ اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَاَمَرَ رَجُلًا مِّنَ الْقَوْمِ فَجَآءَ بِدَلْوٍ مِّنْ مَّآءٍ فَشَنَّهٗ عَلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) ہم سرکار دو عالم ﷺ کے پاس مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک دیہاتی آیا اور مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا (یہ دیکھ کر) آنحضرت ﷺ کے صحابہ اس سے کہنے لگے کہ ٹھہر جا! ٹھہر جا! آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ اسے پیشاب کرنے سے نہ روکو بلکہ اسے چھوڑ دو اور پیشاب کرنے دو کیونکہ اگر تمہارے دھمکانے سے اس کا پیشاب رک گیا تو اس کے لئے تکلیف دہ ہوگا یا پھر اس طرح اس کا پیشاب جو ایک ہی جگہ ہے کئی جگہ پھیل جائے گا) صحابہ نے اسے چھوڑ دیا اور اس دیہاتی نے (جب پورا) پیشاب کر لیا تو آنحضرت ﷺ نے اسے بلایا اور (نہایت شفقت و مہربانی سے) فرمایا کہ "مسجدیں پیشاب و گندگی وغیرہ کے لئے نہیں ہیں بلکہ ذکر الٰہی اور نماز و قرآن پڑھنے کے لئے ہیں" یا آپ ﷺ نے اسی کے مثل فرمایا (یعنی راوی کو شک ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ نے اعرابی سے یہی الفاظ فرمائے تھے یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اس بعد آنحضرت ﷺ نے مجلس میں سے ایک شخص کو حکم دیا اس نے ایک ڈول پانی لاکر پیشاب پر بہادیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

④ وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَتْ سَأَلَتِ امْرَأَةٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِحْدَانَا اِذَا اَصَابَ ثَوْبَهَا الدَّمُ مِنَ الْحَيْضَةِ كَيْفَ تَصْنَعُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَصَابَ ثَوْبَ اِحْدَاكُنَّ الدَّمُ مِنَ الْحَيْضَةِ فَلْتَقْرُصْهُ ثُمَّ لِتَنْضَحْهُ بِمَاءٍ ثُمَّ لِتُصَلِّ فِيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی اسماءؓ فرماتی ہیں کہ "ایک عورت نے سرکار دو عالم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ بتائیے کہ اگر ہم میں سے کوئی حیض کا خون کپڑے پر لگا ہوا پائے تو کیا کرے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اگر تم میں سے کسی کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے تو اسے چاہئے کہ (پہلے) چٹکیوں سے اسے ملے پھر پانی سے دھولے اور اسی کپڑے سے (خواہ تر ہی کیوں نہ ہو نماز پڑھ لے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

⑤ وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنِ الْمَنِيِّ يُصِيْبُ الثَّوْبَ فَقَالَتْ كُنْتُ اَغْسِلُهُ مِنْ ثَوْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَخْرُجُ اِلَى الصَّلَاةِ وَاَثَرُ الْغُسْلِ فِیْ ثَوْبِهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سلیمانؒ[1] بن یسارؒ کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کپڑے پر لگی ہوئی منی کے بارے میں پوچھا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ "میں سرکار دو عالم ﷺ کے کپڑے سے منی کو دھویا کرتی تھی چنانچہ آپ ﷺ (جب اسی گیلے کپڑے کے ساتھ) نماز کے لئے تشریف لے جاتے تو اس کپڑے پر (منی کے) دھونے کا نشان رہتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ منی ناپاک ہے اگر منی کسی کپڑے وغیرہ پر لگ جائے تو اسے دھو کر پاک کر لینا چاہئے چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے مگر حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح سنک (یعنی ناک سے نکلنے والی) رطوبت پاک ہے اسی طرح منی بھی پاک ہے۔

⑥ وَعَنِ الْاَسْوَدِ وَهَمَّامٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَفْرُكُ الْمَنِيَّ مِنْ ثَوْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَبِرِوَايَةِ عَلْقَمَةَ وَالْاَسْوَدِ عَنْ عَائِشَةَ نَحْوَهُ ثُمَّ يُصَلِّیْ فِيْهِ۔

"اور حضرت اسودؒ[2] و حضرت ہمامؒ[3] راوی ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ عنہا نے فرمایا "میں سرکار دو عالم ﷺ کے کپڑے سے (خشک منی کھرچ دیا کرتی تھی" (مسلمؒ) اور مسلمؒ نے اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ حضرت علقمہ اور حضرت اسود کی ہی طرح ایک روایت بھی نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ اسی کپڑے سے نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔"

---

1. اسم گرامی سلیمان ابن یسار اور کنیت ابوایوب ہے آپ تابعی ہیں آپ کا ۱۰۷ھ میں بعمر ۵۳ سال میں انتقال ہوا۔
2. حضرت اسود بن ہلال محاربی تابعی ہیں ۸۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔
3. حضرت ہمام ابن حارث نخعی تابعی ہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: یہ حدیث بھی حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مطابق منی کے ناپاک ہونے کو وضاحت کے ساتھ ثابت کر رہی ہے جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا حضرت امام اعظمؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ تر منی کو دھونا چاہئے اور گاڑھی منی کو جو کپڑے کے اندر سرایت نہ کرے خشک ہونے کے بعد کھرچ کر اور رگڑ کر صاف کر دینا چاہئے۔

⑦ وَعَنْ اُمِّ قَيْسٍ بِنْتِ مِحْصَنٍ اَنَّهَا اَتَتْ بِابْنٍ لَهَا صَغِيْرٍ لَمْ يَاْكُلِ الطَّعَامَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَجْلَسَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حِجْرِهٖ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهٖ فَدَعَا بِمَآءٍ فَنَضَحَهٗ وَلَمْ يَغْسِلْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ام قیس[1] بنت محصنؓ سے روایت ہے کہ "وہ اپنے چھوٹے لڑکے کو جو ابھی کھانا نہ کھاتا تھا سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں لائیں آنحضرت ﷺ نے اس بچہ کو اپنی گود میں بٹھالیا اس نے آپ ﷺ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا آنحضرت ﷺ نے پانی منگایا اور کپڑے پر بہادیا اور خوب مل کر نہیں دھویا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر شیرخوار بچہ جو اناج نہ کھاتا ہو کسی کپڑے وغیرہ پر پیشاب کر دے تو اسے دھونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس پر پانی چھڑک دینا کافی ہو جائے گا چنانچہ یہ حدیث بھی بظاہر حضرت امام شافعیؒ ہی کے مسلک کی تائید کر رہی ہے مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ بچہ کے پیشاب کو بھی ہر حال میں دھونا ضروری ہے۔ اس حدیث میں "نضح" جو لفظ آیا ہے اور جس کے معنی چھڑکنا ہیں اس کے معنی یہ دونوں حضرات "دھونا" ہی کہتے ہیں۔ پھر حدیث کے آخری الفاظ "لایغسلہ" (یعنی آپ ﷺ نے پیشاب کو دھویا نہیں) کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خوب مل مل کر نہیں دھویا بلکہ بچہ کے پیشاب کے پیش نظر معمولی طور پر اس پر پانی بہا کر دھو ڈالنا ہی کافی سمجھا یہ دونوں حضرات اس حدیث کی یہ مذکورہ تاویل اس لئے کرتے ہیں کہ دوسری احادیث مثلاً اَسْتَنْزِهُوْا مِنَ الْبَوْلِ (یعنی پیشاب سے پاکی حاصل کرو) سے یہ بات بصراحت ثابت ہوتی ہے کہ ہر ایک کے پیشاب کو دھونا چاہئے حضرت امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں "نضح" سے مراد بغیر ملے اور نچوڑے پانی کا بہانا ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بچوں کو دعا و برکت حاصل کرنے کے لئے بزرگوں اور اولیاء اللہ کے پاس لے جانا مستحب ہے، نیز بچوں کے ساتھ تواضع و نرمی اور محبت و شفقت کا معاملہ کرنا بھی مستحب ہے۔

⑧ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا دُبِغَ الْاِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جب چمڑا دباغت دے دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: چمڑے کو ناپاکی وغیرہ سے پاک کرنے کو دباغت کہتے ہیں۔ چمڑے کو دباغت کئی طرح دی جاتی ہے یا تو چمڑے کو چھالوں وغیرہ میں ڈال کر پکایا جاتا ہے یا دھوپ میں رکھ کر اسے خشک کر لیا جاتا ہے اور اگر چمڑا بغیر دھوپ کے خشک کیا جائے تو اس کو دباغت نہیں کہیں گے بہر حال دباغت کے ذریعہ چمڑا چاروں ائمہ کے نزدیک پاک کیا جا سکتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک تو سور اور آدمی کے چمڑے کے علاوہ ہر طرح کا چمڑا پاک ہو جاتا ہے مگر امام شافعیؒ کے نزدیک کتے کا چمڑا بھی پاک نہیں ہوتا حالانکہ حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرح کا چمڑہ دباغت سے پاک ہو جاتا ہے البتہ آدمی اور سور کا چمڑا مستثنیٰ ہے کیونکہ آدمی کا چمڑا تو انسان کی عظمت و بزرگی کے پیش نظر پاک نہیں ہوتا اور سور کا چمڑا اس لئے پاک نہیں ہوتا کہ وہ نجس عین ہے۔

---

[1] حضرت ام قیسؓ محصن کی لڑکی اور عکاشہ کی بہن ہیں ابتداء ہی میں مکہ میں اسلام کی دولت سے مشرف ہو گئی تھیں۔

(۹) وَعَنْهُ قَالَ تُصُدِّقَ عَلٰی مَوْلَاةٍ لِّمَيْمُوْنَةَ بِشَاةٍ فَمَاتَتْ فَمَرَّ بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ هَلَّا اَخَذْتُمْ اِهَابَهَا فَدَ بَغْتُمُوْهُ فَانْتَفَعْتُمْ بِهٖ قَالُوْا اِنَّهَا مَيْتَةٌ فَقَالَ اِنَّمَا حُرِّمَ اَكْلُهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت بن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت میمونہؓ کی ایک آزاد کردہ باندی کو ایک بکری صدقہ میں دی گئی (اتفاق سے) وہ بکری مرگئی، آنحضرت ﷺ کا اس پر گزر ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم نے اس کا چمڑا نکال کیوں نہ لیا؟ اس چمڑے کو دباغت دے کر اس سے نفع اٹھالیتے! لوگوں نے عرض کیا کہ یہ تو مردار ہے آپ ﷺ نے فرمایا؟ صرف اس کا کھانا حرام ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مردار (یعنی جانور بغیر ذبح کئے ہوئے مرجائے اور اس کا کھانا حرام ہو تو جو اجزاء ذبح کرنے کی صورت میں کھائے جاتے ہیں مثلاً گوشت وغیرہ وہ تو مرنے کے بعد حرام ہو جاتے ہیں لیکن ان کے علاوہ دوسری چیزوں مثلاً دباغت دیئے ہوئے چمڑے دانت، بال اور سینگ وغیرہ سے فائدہ اٹھانا یعنی ان کی خرید و فروخت کرنا اور ان کو دوسری ضرورتوں میں استعمال کرنا جائز ہے۔

(۱۰) وَعَنْ سَوْدَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ مَاتَتْ لَنَا شَاةٌ فَدَ بَغْنَا مَسْكَهَا ثُمَّ مَازِلْنَا نُنْبِذُ فِيْهِ حَتّٰى صَارَ شَنًّا۔ (رواہ البخاری)

"اور سرکار دوعالم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت سودہؓ[1] فرماتی ہیں کہ "ہماری ایک بکری مرگئی تھی ہم نے اس کی کھال نکال کر دباغت دے لی اور ہمیشہ اسی میں نبیذ (یعنی پانی اور کھجوروں کا شربت بناتے رہے یہاں تک کہ وہ پرانی مشک ہوگئی۔" (بخاریؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۱۱) عَنْ لُبَابَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ قَالَتْ كَانَ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ فِيْ حِجْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهٖ فَقُلْتُ الْبَسْ ثَوْبًا وَاَعْطِنِيْ اِزَارَكَ حَتّٰى اَغْسِلَهٗ فَقَالَ اِنَّمَا يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْاُنْثٰى وَيُنْضَحُ مِنْ بَوْلِ الذَّكَرِ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاوٗدَ وَالنَّسَائِيْ عَنْ اَبِي السَّمْحِ قَالَ يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ وَيُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الْغُلَامِ۔

"حضرت لبابہؓ[2] بنت حارثؓ فرماتی ہیں کہ حضرت حسین ابن علیؓ نے سرکار دوعالم ﷺ کی گود میں بیٹھ کر آپ ﷺ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا میں نے عرض کیا کہ "آپ ﷺ (دوسرا) کپڑا پہن کر یہ تہ بند مجھے دے دیجئے تاکہ میں اسے دھوڈالوں آپ نے فرمایا "لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی کا چھنٹا دینا کافی ہے" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) اور ابوداؤدؒ و نسائیؒ کی ایک روایت میں ابوسمح سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا کہ لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی کا چھنٹا دیا جاتا ہے۔"

تشریح: حضرت امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہاں "چھنٹا دینے" سے مراد تڑتڑا دینا یعنی پیشاب کی جگہ پر بغیر ملے اور نچوڑے ہوئے پانی کا بہا دینا ہے اور "دھونے" سے مراد مبالغہ کے ساتھ دھونا ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک لڑکا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا اس نے آپ ﷺ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس پر پانی کا تڑتڑا دو" لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ لڑکے کے پیشاب کو بھی دھونے کا حکم ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لڑکے کے پیشاب پر صرف پانی کا تڑتڑا دینا ہی کافی ہے یعنی اس کو ملنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ لڑکوں کا پیشاب سوراخ کی تنگی کی بناء پر زیادہ نہیں پھیلتا اور لڑکیوں کا پیشاب سوراخ کی فراخی کی وجہ سے

---

[1] ام المؤمنین حضرت سودا رضی اللہ تعالیٰ عنہا زمعہ کی بیٹی ہیں ابتداء اسلام سے مشرف تھیں انتقال ۵۴ھ مدینہ میں ہوا۔

[2] آپ کا نام لبابہ ہے اور حارثؓ کی بیٹی ہیں کنیت ام فضل ہے حضرت عباس بن عبدالمطلب کی بیوی اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کی بہن ہیں۔

زیادہ پھیلتا ہے اس لئے لڑکیوں کے پیشاب کو خوب اچھی طرح دھونا چاہئے۔

(۱۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَطِئَ اَحَدُكُمْ بِنَعْلِهِ الْاَذٰی فَاِنَّ التُّرَابَ لَهٗ طَهُوْرٌ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَلِابْنِ مَاجَةَ مَعْنَاهُ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی اپنے جوتوں کے ساتھ گندگی پر چلے تو مٹی اس کو پاک کر دینے والی ہے۔" (ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے بھی اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے)

تشریح: صورت مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص جوتے پہنے ہوئے راستہ پر چل رہا ہے اتفاق سے کسی جگہ گندگی پڑی ہوئی تھی وہ اس کے جوتوں پر لگ گئی۔ اب پھر وہ جب پاک صاف زمین پر چلے گا تو زمین کی مٹی سے رگڑ کھانے کی وجہ سے اس کا جوتا پاک ہو جائے گا اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ایک شاگرد حضرت امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ اس حدیث میں گندگی سے مراد جو جسم والی اور خشک ہو یعنی اگر کسی راہ چلتے کے جوتے یا موزے میں ایسی گندگی لگ جائے جو جسم والی ہو اور خشک ہو تو پاک زمین پر رگڑ دینے سے وہ جوتا یا موزہ پاک ہو جائے گا اور اگر گندگی خشک نہ ہو تو پھر رگڑنے سے گندگی زائل نہیں ہوگی۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ایک دوسرے شاگرد رشید حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں حدیث کی مراد عام ہے یعنی گندگی خواہ خشک ہو یا تر زمین پر رگڑنے سے پاک ہو جائے گی مگر حضرت امام شافعیؒ کا یہ پہلا قول ہے ان کا جدید مسلک یہ ہے کہ اس گندگی کو ہر حال میں پانی سے دھونا چاہئے زمین پر رگڑنے سے پاک نہیں ہوگی۔

فقہ حنفی میں فتویٰ حضرت امام ابویوسفؒ ہی کے قول پر ہے جو کہ جوتے یا موزے پر اگر تندار نجاست لگ جائے خواہ وہ خشک ہو یا تر ہو تو زمین پر خوب اچھی طرح رگڑ دینے سے موزہ یا جوتا پاک ہو جائے گا۔

یہ سمجھ لیجئے کہ اس مسئلہ میں علماء کا یہ اختلاف تندار نجاست جیسے گوبر وغیرہ ہی کے بارے میں ہے کیونکہ غیر تندار نجاست مثلاً پیشاب و شراب کے بارے میں سب کا متفق طور پر یہ مسلک ہے کہ اسے دھونا ہی واجب ہے۔

(۱۳) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ لَهَا امْرَاَةٌ اِنِّیْ اُطِیْلُ ذَیْلِیْ وَاَمْشِیْ فِی الْمَكَانِ الْقَذِرِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُطَهِّرُهٗ مَا بَعْدَهٗ۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ وَاَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَا الْمَرْاَةُ اُمُّ وَلَدٍ لِاِبْرَاهِیْمَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ)

"اور حضرت ام سلمہؓ راوی ہیں کہ ان سے ایک عورت نے کہا کہ میرا دامن لمبا ہے اور میں ناپاک جگہ میں چلتی ہوں (یہ خیال ہے کہ دامن کو ناپاکی لگ جاتی ہے) حضرت ام سلمہؓ نے کہا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے (اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں) فرمایا تھا کہ "اس کو وہ چیز پاک کرتی ہے جو اس کے بعد ہے (یعنی پاک زمین یا مٹی)۔" (احمدؒ، مالکؒ، ترمذیؒ، ابوداؤد، دارمیؒ) اور ابوداؤد اور دارمیؒ نے کہا ہے کہ (سوال کرنے والی) عورت ابراہیم بن عبد الرحمٰن بن عوف کی ام ولد تھی (جس کا نام حمیدہ تھا)

تشریح: سوال کرنے والی کا مطلب یہ تھا کہ میرا دامن بہت لمبا ہے جب میں چلتی ہوں تو وہ زمین پر لگتا ہوا چلتا ہے اور جب میں ناپاک جگہ سے گزرتی ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید دامن میں نجاست و گندگی لگ گئی ہوگی اس لئے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں حضرت ام سلمہؓ نے آنحضرت ﷺ کا ارشاد نقل فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ناپاک جگہ سے گزرتے ہوئے جب دامن میں نجاست لگ جاتی ہے تو بعد میں پاک صاف جگہ چلنے سے وہ نجاست زمین میں لگ کر جھڑ جاتی ہے اور کپڑا پاک ہو جاتا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ حکم خشک نجاست کے بارے میں ہے کہ اگر خشک نجاست کپڑے کو لگ جائے تو پھر پاک و صاف زمین پر چلنے سے وہ زمین میں لگ کر جھڑ جاتی ہے جس سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔

اس حکم کو خشک نجاست کے بارے میں خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ علماء کا اس بات پر اجماع اور اتفاق ہے کہ اگر کپڑا ناپاک ہو جائے تو وہ بغیر دھوئے پاک نہیں ہوتا، بخلاف جوتے کے (تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ جوتا اگر نجاست کے لگ جانے سے ناپاک ہو جائے تو اس کو پاک و صاف زمین پر رگڑ کر پاک کیا جا سکتا ہے خواہ وہ نجاست تر ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ ابھی اس سے پہلے حدیث کی تشریح میں حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ کا مسلک بیان کیا جا چکا ہے (واللہ اعلم)

⑭ وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لُبْسِ جُلُوْدِ السِّبَاعِ وَالرُّكُوْبِ عَلَيْهَا۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت مقدام بن معدیکربؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے درندوں کی کھالوں کے پہننے اور ان پر سوار ہونے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤد و نسائیؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ درندوں مثلاً شیر اور چیتے وغیرہ کی کھال کا لباس بنا کر انہیں پہنا نہ جائے، اسی طرح ان پر سوار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ درندوں کی کھال کو بچھا کر اس پر بیٹھنا یا گھوڑے کی زین پر ڈال کر اس پر سوار ہونا مناسب نہیں ہے اس طرح ان کے استعمال سے منع اس لئے فرمایا گیا ہے کہ یہ متکبر لوگوں اور خالص دنیاداروں کی عادت ہے لہٰذا نیک لوگوں کو ان سے اجتناب کرنا چاہئے اس شکل میں کہا جائے گا کہ یہ نہی تنزیہی ہے لیکن جن حضرات کے ہاں مردار کے بال نجس ہوتے ہیں اور وہ دباغت سے بھی پاک نہیں ہوتے ان کے نزدیک یہ نہی تحریمی ہے۔

⑮ وَعَنْ اَبِى الْمَلِيْحِ بْنِ اُسَامَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ جُلُوْدِ السِّبَاعِ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَ اَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِىُّ وَزَادَ التِّرْمِذِىُّ وَالدَّارِمِىُّ اَنْ تُفْتَرَشَ)

"اور حضرت ابوالملیح بن اسامہؓ اپنے والد مکرم سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے درندوں کی کھال کو استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (احمدؒ ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور امام ترمذیؒ نے اس روایت میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ "(آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ درندوں کی کھالوں کا فرش بنایا جائے)

⑯ وَعَنْ اَبِى الْمَلِيْحِ اَنَّهٗ كَرِهَ ثَمَنَ جُلُوْدِ السِّبَاعِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوالملیح کے بارے میں منقول ہے کہ "وہ درندوں کی کھالوں کی قیمت کو (بھی) مکروہ سمجھتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس کا مطلب یہ ہے کہ درندوں کی کھال کو خریدنا اور بیچنا بھی مناسب نہیں ہے چنانچہ ابن مالکؒ کا یہی قول ہے اور یہ مسلک ابوالملیح کا بھی ہے فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہوا ہے کہ درندوں کے چمڑے کو دباغت دیے جانے سے پہلے بیچنا باطل ہے مشکوٰۃ کے اصل نسخے میں لفظ رَوَاهُ کے بعد جگہ خالی تھی عبارت مذکورہ بعد میں بڑھائی گئی ہے۔

⑰ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُكَيْمٍ قَالَ اَتَانَا كِتَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ لَا تَنْتَفِعُوْا مِنَ الْمَيْتَةِ بِاِهَابٍ وَلَا عَصَبٍ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ بن عکیمؓ[1] راوی ہیں کہ ہمارے (قبیلہ جہینہ کے پاس سرکار دو عالم ﷺ کا (جو) مکتوب گرامی آیا (اس میں یہ لکھا تھا) کہ تم مردار کے چمڑے اور اس کے پٹھے سے نفع نہ اٹھاؤ۔" (الترمذیؒ، ابوداؤدؒ نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حکم کا تعلق اس چمڑے اور پٹھے سے ہے جو دباغت نہ دیا گیا ہے یعنی دباغت سے پہلے چمڑے اور پٹھے کو استعمال میں لانا جائز

---

[1] حضرت عبداللہ بن عکیم جہنی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تو پایا ہے لیکن یہ تحقیق سے ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے شرف ملاقات حاصل کیا یا نہیں۔

نہیں ہے بلکہ چمڑے اور پٹھے کو دباغت دینے کے بعد استعمال کرنا اور ان سے منفعت حاصل کرنا جائز ہے۔ اکثر احادیث سے یہی ثابت ہے اور اکثر علماء کا مسلک بھی یہی ہے۔

(۱۸) وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَ اَنْ یُسْتَمْتَعَ بِجُلُوْدِ الْمَیْتَةِ اِذَا دُبِغَتْ۔ (رواہ مالک و ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مردار کے چمڑے سے دباغت کے بعد فائدہ اٹھایا جائے۔"

(مالکؒ ابوداؤدؒ)

تشریح: اس سے پہلے اسی باب کی حدیث نمبر۹ کی تشریح میں بتایا جاچکا ہے کہ دباغت کے بعد مردار کے چمڑے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے یعنی اس کو استعمال میں لایا جاسکتا ہے اور اس کی خرید وفروخت بھی کی جاسکتی ہے البتہ اس مسئلہ میں امام مالکؒ کی دو روایتیں ہیں مگر ان کا ظاہری قول یہ ہے کہ مردار کا چمڑا دباغت کے بعد پاک ہوتو جاتا ہے لیکن اسے خشک چیزمیں اور پانی میں رکھنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے پانی کے علاوہ دوسری پتلی اور سیال چیزوں کے لئے اسے استعمال نہ کیا جائے۔

(۱۹) وَعَنْ مَیْمُوْنَةَ قَالَتْ مَرَّ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رِجَالٌ مِنْ قُرَیْشٍ یَجُرُّوْنَ شَاةً لَّھُمْ مِثْلَ الْحِمَارِ فَقَالَ لَھُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ اَخَذْتُمْ اِھَابَھَا قَالُوْا اِنَّھَا مَیْتَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُطَھِّرُھَا الْمَآءُ وَالْقَرَظُ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت میمونہؓ راوی ہیں کہ قریش کے چند آدمی اپنی ایک مری ہوئی بکری کو گدھے کی طرح کھینچتے ہوئے سرکار دو عالم ﷺ کے پاس سے گزرے، آپ ﷺ نے (یہ دیکھ کر) ان سے فرمایا کہ "اے کاش! تم اس کے چمڑے کو نکال لیتے!" (تو یہ کام آجاتا) انہوں نے عرض کیا کہ "یہ تو مردار ہے (یعنی ذبح کی ہوئی نہیں ہے) آپ ﷺ نے فرمایا اسے کیکر کے پتے اور پانی پاک کر دیتے ہیں (یعنی ان دونوں چیزوں کے ذریعہ دباغت سے چمڑا پاک ہوجاتا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤد)

تشریح: دباغت دینے کے کئی طریقے ہیں لیکن کیکر کے پتوں اور پانی سے دباغت کے بعد چمڑا خوب اچھی طرح پاک ہوجاتا ہے اس لیے آپ ﷺ نے بطور خاص ان دو چیزوں کا ذکر فرمایا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ چمڑے کی دباغت و طہارت ان ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ دوسرے طریقوں مثلاً دھوپ وغیرہ سے دباغت و طہارت ہوجاتی ہے۔ البتہ یہ کہا جائے گا کہ اس حدیث کے پیش نظر کیکر کے پتوں اور پانی سے چمڑے کو دباغت دینا مستحب ہے۔

(۲۰) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبِّقِ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَآءَ فِیْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ عَلٰی اَھْلِ بَیْتٍ فَاِذَا قِرْبَةٌ مُعَلَّقَةٌ فَسَاَلَ الْمَآءَ فَقَالُوْا لَہٗ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّھَا مَیْتَةٌ فَقَالَ دِبَاغُھَا طُھُوْرُھَا۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت سلمہ بن محبقؓ راوی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ تبوک کی جنگ کے موقعہ پر ایک شخص کے گھر تشریف لائے تو اچانک آپ ﷺ کی نظر ایک لٹکی ہوئی مشک پر پڑی آپ ﷺ نے پانی مانگا تو لوگوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! یہ تو (دباغت دی ہوئی) مردار کی کھال) ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "دباغت نے اسے پاک کر دیا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۲۱) عَنِ امْرَاَةٍ مِنْ بَنِیْ عَبْدِ الْاَشْھَلِ قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لَنَا طَرِیْقًا اِلَی الْمَسْجِدِ مُنْتِنَةً فَکَیْفَ نَفْعَلُ اِذَا مُطِرْنَا قَالَتْ فَقَالَ اَلَیْسَ بَعْدَھَا طَرِیْقٌ ؟ ھِیَ اَطْیَبُ مِنْھَا قُلْتُ بَلٰی قَالَ فَھٰذِہٖ بِھٰذِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"بنو عبد الاشہل کی ایک عورت کا بیان ہے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مسجد میں آنے کا ہمارا جو راستہ ہے

وہ گندہ ہے جب بارش ہو جائے تو ہم کیا کریں؟ وہ کہتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "کیا اس راستہ کے بعد کوئی پاک صاف راستہ نہیں آتا؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں آپ ﷺ نے فرمایا" یہ پاک راستہ اس ناپاک راستہ کے بدلے میں ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اسی باب کی حدیث نمبر ۱۳ میں اس مسئلہ کی وضاحت کی جا چکی ہے، یہاں بھی اس ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ گندے اور ناپاک راستہ سے جو گندگی لگتی ہے وہ پاک و صاف راستہ میں چلنے کے بعد زمین کی رگڑ سے صاف و پاک ہو جاتی ہے، نیز یہاں بھی یہ ملحوظ رہے کہ آپ ﷺ کے اس ارشاد کا تعلق تن دار نجاست سے ہے کہ اگر گوبر وغیرہ قسم کی کوئی نجاست جوتے اور موزوں پر لگ جائے تو وہ اس طریقہ سے صاف ہو جاتی ہے کیونکہ اگر پیشاب وغیرہ قسم کی نجاست جوتے موزے کپڑے یا بدن کے کسی حصہ پر لگے تو اس کو ہر حال میں دھو کر ہی پاک کیا جائے گا اسی طرح موزے اور جوتے کے علاوہ اگر کپڑے پر تن دار نجاست لگے گی تو بغیر دھوئے کپڑا پاک نہیں ہوگا۔

(۲۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّيْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا نَتَوَضَّأُ مِنَ الْمَوْطِيءِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور زمین پر چلنے (کی وجہ سے وضو نہ کرتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ہم نماز پڑھنے کے لئے مکان سے وضو کر کے چلتے تھے اور مسجد آتے ہوئے ننگے پاؤں چلنے کی وجہ سے پیروں پر یا جوتے اور موزوں پر جو نجاست و گندگی لگ جایا کرتی تھی اسے دھویا کرتے تھے۔

اس ارشاد کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ اس کا تعلق خشک نجاست سے ہے، کہ اگر خشک گندگی مثلاً سوکھا گوبر وغیرہ پیروں پر جوتے و موزے پر لگ جاتا تو اس کو دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کیونکہ صاف زمین پر چلنے کی وجہ سے وہ پاک ہو جایا کرتا تھا اس سے عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ مراد ہے کہ راستہ چلتے وقت جو گرد و غبار پیروں کو لگ جایا کرتا تھا اسے دھوتے تھے۔

تر نجاست مثلاً پیشاب وغیرہ کے بارے میں یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی نجاست و گندگی پیر وغیرہ پر لگ جائے تو تمام علماء کے نزدیک یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اسے دھویا جائے۔

(۲۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتِ الْكِلَابُ تُقْبِلُ وَتُدْبِرُ فِي الْمَسْجِدِ فِيْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرُشُّوْنَ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "سرکار دو عالم کے زمانہ میں مسجد میں کتے آتے تھے اور صحابہ ان کے آنے جانے کی وجہ سے کچھ بھی نہ دھوتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: شروع زمانہ اسلام میں دروازے نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے مسجد کے اندر کتوں کی آمد و رفت رہتی تھی اور چونکہ ان کے پاؤں خشک ہوتے تھے اس لئے کسی چیز کو دھونے کی ضرورت نہ ہوتی تھی جب مسجد میں دروازے لگنے لگے تو اس کی احتیاط ہونے لگی۔

(۲۴) وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا بَأْسَ بِبَوْلِ مَا يُؤْكَلُ لَحْمُهُ وَفِيْ رِوَايَةِ جَابِرٍ قَالَ مَا أُكِلَ لَحْمُهُ فَلَا بَأْسَ بِبَوْلِهِ۔ (رواہ احمد والدار قطنی)

"اور حضرت براءؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ فرماتے تھے کہ "جس چیز کا گوشت کھایا جائے اس کے پیشاب میں کچھ حرج نہیں۔" اور حضرت جابرؓ کی روایت اس طرح ہے کہ "جس جانور کا گوشت کھایا جائے اس کے پیشاب میں کچھ حرج نہیں ہے۔" (احمدؒ، دار قطنیؒ)

تشریح: اس حدیث کے ظاہر الفاظ سے حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ، حضرت امام محمد اور بعض شوافع حضرات نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ جن جانوروں کے گوشت کھائے جاتے ہیں ان کا پیشاب پاک ہے لیکن حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ حضرت امام

ابویوسف ؒ اور تمام علماء کے نزدیک وہ نجس ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس حدیث کے مقابلہ میں ایک حدیث عام وارد ہے کہ اِسْتَنْزِهُوْا مِنَ الْبَوْلِ فَاِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ یعنی پیشاب سے پاکی حاصل کرو اس لئے کہ عذاب قبر اکثر اسی سے ہوتا ہے) لہٰذا اس حدیث کی عمومیت کے پیش نظر ناپاک و نجس ثابت ہوا اس لئے اس احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ جن جانوروں کے گوشت کھائے جاتے ہیں ان کے پیشاب کو بھی ناپاک کہا جائے۔

بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

موزوں پر مسح کرنے کا بیان

موزوں پر مسح کرنے کا جواز سنت اور آثار مشہورہ سے ثابت ہے بلکہ حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے کہ موزہ پر مسح کرنے کے بارے میں منقول حدیث متواتر ہے اور بعض محدثین نے اس حدیث کے راوی صحابہ کی تعداد بھی نقل کی ہے چنانچہ اسّی سے زیادہ صحابہ اس حدیث کو روایت کرتے ہیں جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

علامہ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ علمائے سلف میں سے کسی نے اس سے انکار کیا ہو اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر ۷۰ صحابہ کو اس مسئلہ پر اعتقاد رکھتے ہوئے پایا ہے حضرت امام کرخیؒ کا قول ہے کہ جو شخص موزوں پر مسح کرنے کو قبول نہ کرے یعنی اسے جائز نہ سمجھے مجھے اس کے کافر ہو جانے کا خوف ہے کیونکہ اس کے جواز میں جو حدیثیں منقول ہیں وہ حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ "میں موزوں پر مسح کرنے کا قائل اس وقت تک نہیں ہوا جب تک کہ اس کے جواز پر مشتمل احادیث آفتاب کی روشنی کی طرح مجھے نہ پہنچ گئیں۔" ان اقوال اور ارشادات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ موزوں پر مسح کرنا جائز ہے، اس کے جواز میں کوئی شبہ کوئی شک اور کوئی کلام نہیں ہے۔

اب اس کے بعد یہ سمجھ لیجئے کہ موزوں پر مسح کرنا رخصت [1] یعنی آسانی ہے اور پیروں کو دھونا عزیمت یعنی اولیٰ ہے ہدایہ میں لکھا ہے کہ جو شخص موزوں پر مسح کرنے پر اعتقاد نہ رکھے وہ بدعتی ہے لیکن جو شخص اس مسئلہ پر اعتقاد تو رکھتا ہے مگر عزیمت یعنی اولیٰ پر عمل کرنے کی وجہ سے موزوں پر مسح نہیں کرتا تو اسے ثواب سے نوازا جاتا ہے۔

مواہب لدنیہ میں منقول ہے کہ علماء کے یہاں اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا موزوں پر مسح کرنا افضل ہے یا اسے اتار کر پیروں کو دھونا افضل ہے؟ چنانچہ بعض حضرات کی رائے تو یہ ہے کہ موزوں پر مسح کرنا ہی افضل ہے کیونکہ اس سے اہل بدعت یعنی روافض و خوارج کا رد ہوتا ہے جو اس مسئلہ میں طعن و تشنیع کرتے ہیں، حضرت امام احمدؒ کا مختار مسلک یہی ہے اور امام نوویؒ نے کہا ہے کہ ہمارے علماء یعنی حضرات شوافع کا مسلک یہ ہے کہ پیروں کو دھونا افضل ہے کیونکہ اصل یہی ہے لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ موزوں پر مسح کرنے کو بالکل ترک نہ کیا جائے۔

---

[1] شریعت اسلامی کے مسائل و جزئیات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کے لیے کتنی آسانیاں اور سہولتیں پیدا کی ہیں یہ حقیقت ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی یہ بے پناہ شفقت و محبت ہی ہے جس نے عالمگیر اور سب سے سچے مذہب کو انسان کی عین فطرت و مزاج بنا دیا ہے قدم قدم پر ایسے مسائل سے واسطہ پڑتا رہتا ہے جس میں اسلام اور شارع اسلام نے امت کو بہت زیادہ آسانیاں دی ہیں جن کے بغیر یقیناً مسلمان مشکلات اور تکالیف میں مبتلا ہو جاتے کیونکہ سخت موقعوں پر مثلاً سردی کے موسم میں وضو کرنے کے وقت سب سے زیادہ تکلیف پیروں کو دھونے ہی میں ہوتی ہے لیکن شریعت نے اس سختی اور تکلیف کے پیش نظر موزوں پر مسح کو جائز قرار دے کر امت پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔

صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو دونوں میں کوئی تکلف نہیں تھا، یعنی اگر آپ ﷺ موزہ پہنے ہوتے تھے تو پاؤں دھونے کے لئے انھیں اتارتے نہیں تھے اور اگر موزہ پہنے ہوئے نہیں ہوتے تھے تو مسح کرنے کے لئے انھیں پہنتے نہ تھے، اس بارے میں علماء کے یہاں اختلاف ہے مگر بہتر اور صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اس مسئلہ میں سنت کے موافق ہی عمل کرے یعنی سرکار دوعالم ﷺ کا جو تعامل ذکر کیا گیا ہے اسی طرح تمام مسلمان بے تکلفی کے ساتھ اس پر عمل کریں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنْ شُرَیْحِ بْنِ هَانِیءٍ قَالَ سَأَلْتُ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ عَنِ الْمَسْحِ عَلَی الْخُفَّیْنِ فَقَالَ جَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلاثَةَ اَیَّامٍ وَلَیَالِیَهُنَّ لِلْمُسَافِرِ وَیَوْمًا وَلَیْلَةً لِلْمُقِیْمِ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت شریح بن ہانیؒ راوی ہیں کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ سرکار دوعالم ﷺ نے مسافر کے لئے تین دن اور تین رات اور مقیم کے لئے ایک دن ایک رات کی مدت مقرر فرمائی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مسافر کے لئے موزوں پر مسح کرنے کی مدت تین دن تین رات ہے یعنی وہ تین دن اور تین رات تک وضو کے وقت اپنے موزوں پر مسح کر سکتا ہے اور مقیم کے لئے مسح کی مدت ایک دن اور ایک رات ہے یعنی وہ ایک دن اور ایک رات تک وضو کے وقت اپنے موزوں پر مسح کر سکتا ہے اس مدت کی ابتداء جمہور علماء کے نزدیک اس وقت ہوگی جب کے وضو ٹوٹ جائے مثلاً ایک مقیم شخص نے دوپہر کو وضو کرنے کے بعد موزہ پہنا اور شام کو اس کا وضو ٹوٹ گیا تو مسح کی مدت کی ابتداء شام ہی سے ہوگی یعنی وہ اگلے دن شام تک اپنے موزوں پر مسح کر سکتا ہے۔

(۲) وَعَنِ الْمُغِیْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ اَنَّهٗ غَزَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَزْوَةَ تَبُوْكَ قَالَ الْمُغِیْرَةُ فَتَبَرَّزَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قِبَلَ الْغَائِطِ فَحَمَلْتُ مَعَهٗ اِدَاوَةً قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَمَّا رَجَعَ اَخَذْتُ اُهْرِیْقُ عَلٰی یَدَیْهِ مِنَ الْاِدَاوَةِ فَغَسَلَ یَدَیْهِ وَوَجْهَهٗ وَعَلَیْهِ جُبَّةٌ مِنَ الْاِدَاوَةِ فَغَسَلَ یَدَیْهِ وَوَجْهَهٗ وَعَلَیْهِ جُبَّةٌ مِنْ صُوْفٍ ذَهَبَ یَحْسِرُ عَنْ ذِرَاعَیْهِ فَضَاقَ كُمُّ الْجُبَّةِ فَاَخْرَجَ یَدَیْهِ مِنْ تَحْتِ الْجُبَّةِ وَاَلْقَی الْجُبَّةَ عَلٰی مَنْكِبَیْهِ وَغَسَلَ ذِرَاعَیْهِ ثُمَّ مَسَحَ بِنَاصِیَتِهٖ وَعَلَی الْعِمَامَةِ ثُمَّ اَهْوَیْتُ لِاَنْزِعَ خُفَّیْهِ فَقَالَ دَعْهُمَا فَاِنِّیْ اَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَیْنِ فَمَسَحَ عَلَیْهِمَا ثُمَّ رَكِبَ وَرَكِبْتُ فَانْتَهَیْنَا اِلَی الْقَوْمِ وَقَدْ قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوةِ وَیُصَلِّیْ بِهِمْ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَقَدْ رَكَعَ بِهِمْ رَكْعَةً فَلَمَّا اَحَسَّ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذَهَبَ یَتَاَخَّرُ فَاَوْمَا اِلَیْهِ فَاَدْرَكَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِحْدَی الرَّكْعَتَیْنِ مَعَهٗ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَقُمْتُ مَعَهٗ فَرَكَعْنَا الرَّكْعَةَ الَّتِیْ سَبَقَتْنَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ غزوہ تبوک میں شرکت کی چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ (اسی دوران ایک روز) فجر سے پہلے سرکار دوعالم ﷺ پاخانہ کے لئے باہر تشریف لے گئے میں بھی پانی کی چھاگل لے کر آپ ﷺ کے ہمراہ ہو لیا جب آپ ﷺ (پاخانہ سے) واپس تشریف لائے (اور وضو کرنے کے لئے بیٹھے) تو میں نے آپ ﷺ کے ہاتھوں پر پانی ڈالنا شروع کیا چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے اور منہ دھویا آپ ﷺ ایک اونی جبہ پہنے ہوئے تھے اس کی آستینیں چڑھانی چاہیں لیکن آستینیں تنگ تھیں (اس لئے چڑھ نہ سکیں) آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جبہ کے اندر سے نکال کر جبہ کو مونڈھوں پر ڈال لیا اور دو کہنیوں تک دھو کر چوتھائی سر کا اور پگڑی کا مسح کیا پھر (جب) میں نے آپ ﷺ کے موزے اتارنے کا ارادہ کیا تاکہ آپ ﷺ پیر دھو لیں (تو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ انھیں چھوڑ دو کیونکہ میں نے (پاؤں کی) پاکی کی حالت میں انھیں پہنا تھا (یعنی وضو کرنے کے بعد پہنا تھا) اور آپ ﷺ نے دونوں موزوں پر مسح کیا، پھر آپ ﷺ اور میں دونوں سوار ہو کر واپس لوگوں کے پاس آئے تو (فجر کی)

نماز کے لئے جماعت کھڑی ہوگئی تھی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نماز پڑھا رہے تھے اور ایک رکعت پڑھا بھی چکے تھے جب انھیں آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کا احساس ہوا تو وہ پیچھے ہٹنے لگے (تاکہ آنحضرت ﷺ امامت کریں) مگر آنحضرت ﷺ نے انھیں اشارہ کیا (کہ اپنی جگہ کھڑے رہو اور نماز پڑھائے جاؤ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک رکعت نماز ان کے ساتھ ہی پڑھی (یعنی آپ ﷺ نے دوسری رکعت حضرت عبدالرحمٰن کی اقتداء میں ادا کی) جب انہوں نے سلام پھیرا تو آپ ﷺ کھڑے ہوگئے اور میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھڑا ہوگیا اور جو (پہلی) رکعت رہ گئی تھی ہم نے اسے پڑھ لیا۔" (مسلم)

تشریح: راوی نے آنحضرت ﷺ کے وضو کا ذکر کیا ہے مگر کلی کرنے اور ناک میں پانی دینے کا ذکر نہیں کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو راوی کے پیش نظر اختصار تھا اس لئے انھوں نے ان دونوں چیزوں کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا یا یہ کہ راوی اس کے ذکر کرنے کو بھول گئے ہوں گے، یا پھر اس لئے ذکر نہیں کیا کہ یہ دونوں چیزیں بھی منہ کی حد میں آجاتی ہیں اس لئے صرف منہ دھونے کا ذکر کافی سمجھا۔

پگڑی پر مسح کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے چوتھائی سر پر مسح کرنے کے بعد تمام سر پر مسح کرنے کے بجائے پگڑی پر مسح کر لیا تاکہ تمام سر پر مسح کرنے کی سنت ادا ہو جائے اس کی وضاحت باب الوضوء میں بھی کی جاچکی ہے (دیکھیے باب سنن الوضو کی حدیث نمبر ۸)

بہرحال اس حدیث سے چھ چیزیں ثابت ہوتی ہیں:

❶ آنحضرت ﷺ فجر سے پہلے قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے اس سے یہ ثابت ہوا کہ عبادت مثلاً نماز وغیرہ کا وقت شروع ہونے سے پہلے اس عبادت کے لئے تیاری کرنا مستحب ہے۔

❷ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے وضو کے وقت آپ ﷺ کے اعضاء وضو پر پانی ڈالا اس سے معلوم ہوا کہ اگر دوسرا شخص وضو کرائے تو جائز ہے۔

❸ جب آپ ﷺ قضائے حاجت اور وضو سے فارغ ہو کر تشریف لائے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے جب انہوں نے بتقاضائے ادب پیچھے ہٹنا چاہا تاکہ آنحضرت امامت فرمائیں تو آنحضرت ﷺ نے انہیں روک دیا اور خود بھی آخری رکعت انہیں کی اقتداء میں پڑھی اس سے معلوم ہوا کہ ایک افضل شخص نماز میں اگر اپنے سے کم درجہ شخص کی اقتداء کرے تو یہ جائز ہے نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ نماز کے لئے امام کا معصوم (بے گناہ) ہونا شرط نہیں ہے۔ اس سے اس فرقہ امامیہ کا رد ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ امام کا معصوم ہونا شرط ہے۔

❹ حدیث کے آخری الفاظ سے یہ ثابت ہوا کہ جس شخص کی کوئی رکعت امام کے ساتھ چھوٹ جائے تو اس کی ادائیگی کے لئے اسے اس وقت اٹھنا چاہئے جب کہ امام سلام پھیرلے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو چھوٹی ہوئی رکعت کو ادا کرنے کے لئے امام کے سلام پھیرنے سے پہلے اٹھنا جائز ہی نہیں اور علمائے حنفیہ کے نزدیک سلام پھیرنے سے پہلے اٹھنا مکروہ تحریمی ہے۔ مگر اس صورت میں جب کہ یہ خوف ہو کہ اگر امام کے سلام کا انتظار کیا جائے گا تو نماز فاسد ہو جائے گی تو پہلے بھی اٹھنا جائز ہے مثلاً فجر کی نماز میں امام ایک رکعت پہلے پڑھا چکا تھا ایک شخص دوسری رکعت میں آکر شامل ہوا اب اسے ایک رکعت بعد میں ادا کرنی ہے مگر صورت حال یہ ہے کہ اگر وہ امام کے سلام پھیرنے کی انتظار کرتا ہے تو اسے خوف ہے کہ سورج طلوع ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں نماز فاسد ہو جائے گی لہٰذا اس کے لئے جائز یہ ہو گا کہ وہ امام کے سلام پھیرنے سے پہلے اٹھ جائے اور نماز پوری کرلے اس مسئلہ کی وضاحت فقہ کی کتابوں میں خوب اچھی طرح کی گئی ہے اس کی تفصیل وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

❺ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جماعت کے وقت اگر امام موجود نہ ہو اور اس کے آنے میں دیر ہو اور یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کب آئے گا تو یہ مستحب ہے کہ امام کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ کوئی دوسرا شخص نماز پڑھانی شروع کردے اور اگر امام کے آنے کا وقت معلوم ہو تو اس صورت میں اس کا انتظار کرنا مستحب ہے اور اگر امام کا مکان قریب مسجد ہو تو اسے جماعت کا وقت ہو جانے پر مطلع کرنا مستحب ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۳) عَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ وَلَیَالِیَھُنَّ وَلِلْمُقِیْمِ یَوْمًا وَلَیْلَةً اِذَا تَطَھَّرَ فَلَبِسَ خُفَّیْہِ اَنْ یَمْسَحَ عَلَیْھِمَا۔ (رَوَاہُ الْاَثْرَمُ فِیْ سُنَنِہٖ وَابْنُ خُزَیْمَةَ وَالدَّارَ قُطْنِیُّ وَقَالَ الْخَطَّابِیُّ ھُوَ صَحِیْحُ الْاِسْنَادِ ھٰکَذَا فِی الْمُنْتَقٰی)

"حضرت ابی بکرۃؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت مسافر کو تین دن اور تین رات تک اور مقیم کو ایک دن اور ایک رات تک دی ہے جب کہ انھوں نے موزوں کو وضو کے بعد پہنا ہو۔" (ابن خزیمہؒ دار قطنیؒ) اور خطابی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اسناد کی رو سے صحیح ہے اور منتقی میں (بھی جو ابن تیمیہ حنبلی کی کتاب ہے) اسی طرح منقول ہے۔)

(۴) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْمُرُنَا اِذَا کُنَّا سَفْرًا اَنْ لَّا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ وَلَیَالِیَھُنَّ اِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ وَّلٰکِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَّنَوْمٍ۔ (رواہ الترمذی و النسائی)

"اور حضرت صفوان بن عسالؓ فرماتے ہیں کہ "جب ہم سفر میں ہوتے تھے تو سرکار دو عالم ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ تین دن اور تین رات تک (وضو کرنے کے وقت پیروں کو (دھونے کے لئے) موزے نہ اتارے جائیں، نہ پاخانہ کی وجہ سے نہ پیشاب کی وجہ سے نہ سونے کی وجہ سے البتہ جنابت کی وجہ سے (یعنی غسل واجب ہونے کی صورت میں نہانے کے لئے اتارے جائیں۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ سو کر اٹھنے یا پیشاب و پاخانہ کے بعد وضو کرنے کی صورت میں اس مدت تک جو مسافر یا مقیم کے لئے ہے پیروں کو دھونے کے لئے موزوں کو اتارنا نہیں چاہئے بلکہ موزوں پر مسح کر لیا جائے اور جنابت کی حالت میں یعنی جب غسل واجب ہو جائے تو نہانے کے لئے موزے اتارنے ضروری ہیں کیونکہ اس حالت میں موزوں پر مسح درست نہیں ہے۔

(۵) وَعَنِ الْمُغِیْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ وَضَّأْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ فَمَسَحَ اَعْلَی الْخُفِّ وَاَسْفَلَہٗ۔ (رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا الْحَدِیْثُ مَعْلُوْلٌ وَسَاَلْتُ اَبَازُرْعَةَ وَمُحَمَّدًا یَعْنِی الْبُخَارِیَّ عَنْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ فَقَالَ لَیْسَ بِصَحِیْحٍ وَکَذَا ضَعَّفَہٗ اَبُوْدَاؤدَ)

"اور حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ راوی ہیں کہ میں نے غزوہ تبوک میں سرکار دو عالم ﷺ کو وضو کرایا تھا اور آپ ﷺ نے موزوں کے نیچے اور اوپر مسح کر لیا۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) اور حضرت امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ "یہ حدیث معلول ہے، نیز میں نے اس حدیث کے بارے میں ابوداؤد اور محمد یعنی امام بخاریؒ سے پوچھا تو دونوں نے کہا یہ حدیث صحیح نہیں ہے اسی طرح امام ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے)

تشریح: حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک پشت قدم یعنی موزے کے اوپر مسح کرنا واجب ہے اور موزے کے نیچے یعنی تلوے پر مسح کرنا سنت ہے لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمد کا مسلک یہ ہے کہ مسح فقط پشت قدم یعنی موزے کے اوپر کیا جائے یہ دونوں حضرات کہتے ہیں کہ یہ حدیث جس سے موزے کے دونوں طرف مسح کرنے کا اثبات ہو رہا ہے خود معیار صحت کو پہنچی ہوئی نہیں ہے کیونکہ علماء نے اس کی صحت میں کلام کیا ہے۔ نیز ایسی احادیث بہت زیادہ منقول ہیں جو اس حدیث کے بالکل برعکس ہیں اور جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسح فقط پشت پر کیا جائے لہٰذا عمل اس ہی حدیث پر کیا جائے گا۔ محدثین کی اصطلاح میں "حدیث معلول" اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں ایسا سبب پوشیدہ ہو جو اس بات کا مقتضی ہو کہ اس حدیث کے مطابق عمل نہ کیا جائے۔

اس حدیث کے ضعیف ہونے کی دو وجہ ہیں۔ اول تو یہ کہ حضرت مغیرہؓ تک اس حدیث کی سند کا پہنچنا ثابت نہیں ہے بلکہ اس کی

سند ابوالولاد تک جو مغیرہ کے مولی اور کاتب تھے پہنچتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کو ثور ابن یزید نے رجاء ابن حیوۃ سے روایت کیا ہے اور جاء ابن حیوۃ نے حضرت مغیرہؓ کے کاتب سے روایت کیا ہے حالانکہ رجاء سے ثور کا سماع ثابت نہیں ہے پھر ایک سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس مضمون جو حدیث نمبر ۲ حضرت مغیرہؓ سے مختلف سندوں کے ساتھ منقول ہے اور جو معیار صحت کو پہنچی ہوئی ہے اس میں مطلقاً اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے موزوں پر مسح کیا تھا، اوپر نیچے مسح کرنے کی کوئی وضاحت منقول نہیں ہے پھر حضرت مغیرہؓ کی ایک اور روایت اس کے بعد آرہی ہے اس میں صراحت کے ساتھ یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ نے موزوں کے اوپر مسح کیا۔ لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ اس حدیث میں اضطراب ہے اور یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا جاتا ہے۔

(۶) وَعَنْهُ اَنَّهُ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ عَلٰى ظَاهِرِهِمَا۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ راوی ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو موزوں کے اوپر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے" (ترمذیؒ و ابوداؤدؒ)

تشریح: موزے پر مسح کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی انگلیاں دائیں پاؤں کے پنجے پر بائیں ہاتھ کی انگلیاں بائیں کے پنجے پر رکھی جائیں پھر ان کو کھینچتے ہوئے ٹخنوں کے اوپر تک لایا جائے اس سلسلہ میں اس کا خیال رہے کہ انگلیاں کشادہ رکھی جائیں آپس میں ملی ہوئی نہ ہوں۔ موزوں پر مسح کرنے کا مسنون طریقہ تو یہی ہے اور اگر کسی نے انگلی سے تین مرتبہ اس طرح مسح کیا کہ ہر مرتبہ تازہ پانی لیتا رہا اور ہر مرتبہ نئی جگہ پھیرتا رہا تو مسح جائز ہو گا ورنہ نہیں ان کے علاوہ بہت سے طریقے فقہ کی کتابوں میں لکھے ہوئی ہیں تفصیل وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۷) وَعَنْهُ قَالَ تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَسَحَ عَلَى الْجَوْرَبَيْنِ وَالنَّعْلَيْنِ۔ (رواہ احمد و الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے وضو کیا اور نعلین کے ساتھ جوربین پر مسح کیا۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: قاموس میں لکھا ہے کہ جورب لفافہ پیر کو کہتے ہیں جیسے ہمارے یہاں جراب یا موزہ کہلاتا ہے اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اس کی تفصیل چلپی میں بڑی وضاحت سے مذکور ہے یہاں اس کے بعض احکام و مسائل لکھے جاتے ہیں۔

حنفی مسلک میں جوربین یعنی موزوں پر مسح اس وقت درست ہو گا جب کہ وہ مجلد ہوں یعنی ان کے اوپر نیچے چمڑا لگا ہوا ہو، منعل ہوں یعنی فقط نیچے ہی چمڑا ہو اور ثخنین ہوں۔ ثخنین اس موزے کو کہتے ہیں جس کو پہن کر ایک فرسخ[1] چلا جاسکے اور وہ بغیر باندھے ہوئے پنڈلی پر رکا رہے نیز اس کے اندر کا کوئی حصہ نہ دکھلائی دے اور نہ اس کے اندر پانی چھن سکتا ہو چلپی کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر جوربین منعلین بغیر ثخنین ہوں گے تو اس پر مسح جائز نہیں ہو گا لہٰذا منعلین پر مسح اسی وقت درست ہو گا جب کہ ثخنین بھی ہوں۔

چونکہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جورب پر مسح درست نہیں خواہ وہ منعل ہی کیوں نہ ہو اس لئے یہ حدیث حنفیہ کی جانب سے ان پر حجت ہے جس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جورب پر مسح فرمایا ہے نیز حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت انسؓ ابن مالک اور حضرت عمر بن خطاب کے بارے میں بھی منقول ہے کہ ان حضرات نے اس پر مسح کیا ہے۔

آخر حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "آپ نے نعلیں کے ساتھ جوربین پر مسح کیا" تو یہاں نعلیں کے مفہوم کے تعین میں دو احتمال ہیں اول تو یہ کہ اس سے جوتے مراد ہیں یعنی آپ ﷺ نے جوربین پر جوتوں کے ساتھ مسح کیا چونکہ عرب میں اس وقت ایسے جوتے استعمال ہوتے تھے جو بالکل چپل کی طرح ہوتے تھے اور ان پر اس طرح تسمہ لگا رہتا تھا کہ انہیں پہننے کے بعد پیر کے اوپر کا حصہ کھلا رہتا تھا جس کی وجہ سے موزوں پر مسح کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ یا پھر اس سے یہ مراد ہے کہ آپ ﷺ نے ان جوربین پر مسح کیا جن

---

[1] فرسخ تقریباً پونے چار میل کے فاصلہ کو کہتے ہیں۔

کے نیچے چمڑا لگا ہوتا تھا"۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑧ عَنِ الْمُغِيْرَةِ قَالَ مَسَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْخُفَّيْنِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَسِيْتَ قَالَ بَلْ اَنْتَ نَسِيْتَ بِهٰذَا اَمَرَنِيْ رَبِّيْ عَزَّوَجَلَّ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے موزوں پر مسح کیا (یہ دیکھ کر) میں نے عرض کیا" آپ ﷺ بھول گئے ہیں (یعنی موزے اتار کر پیر نہیں دھوئے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "نہیں! بلکہ تم بھول گئے (کہ میری طرف نسیان کی نسبت کر رہے ہو کیونکہ خدائے بزرگ و برتر نے مجھے اسی طرح حکم دیا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

⑨ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهُ قَالَ لَوْ كَانَ الدِّيْنُ بِالرَّاْيِ لَكَانَ اَسْفَلُ الْخُفِّ اَوْلٰى بِالْمَسْحِ مِنْ اَعْلَاهُ وَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلٰى ظَاهِرِ خُفَّيْهِ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَ لِلدَّارِمِيِّ مَعْنَاهُ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ "اگر دین (صرف) رائے اور عقل ہی پر موقوف ہوتا تو واقعی موزوں کے اوپر مسح کرنے سے نیچے مسح کرنا بہتر ہوتا اور میں نے خود سرکار دو عالم ﷺ کو موزوں کے اوپر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" (ابوداؤدؒ و دارمیؒ)

تشریح: حضرت علیؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ناپاکی اور گندگی چونکہ موزوں کے نیچے کی جانب لگ سکتی ہے اس لئے عقل یہی تقاضا کرتی ہے کہ جس طرف ناپاکی اور گندگی لگنے کا شبہ ہو اسی طرف پاکی اور ستھرائی کے لئے مسح بھی کرنا چاہئے مگر چونکہ شرع میں صراحۃً یہ آگیا ہے کہ مسح اوپر کی جانب کرنا چاہئے اس لئے اب عقل کو دخل دینے کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے مسائل و احکام میں عقل کو دخل نہ دینا چاہئے کیونکہ عقل کامل شریعت کے تابع ہوتی ہے اس لئے کہ خدا کی حکمتوں اور اس کے مراد و مفہوم کو معلوم کرنے میں عقل مطلقاً عاجز ہوتی ہے لہٰذا عاقل کو چاہئے کہ وہ بہر نوع شریعت کا تابع و پابند بن کر رہے عقل کا تابع نہ بنے اس لئے کہ کفار اور اکثر فلاسفہ و حکماء اور اہل ہوا و ہوس اپنی عقلوں پر بھروسہ و پندار کرنے کے سبب اور عقلوں کے تابع ہونے ہی کی وجہ سے گمراہی و ضلالت کے غار میں گرے ہیں۔

چونکہ اس باب کی یہ آخری حدیث ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس کے ضمن میں مسح سے متعلق چند مسائل ذکر کئے جائیں۔

① اگر موزہ کسی جگہ سے پاؤں کی تین چھوٹی انگلیوں کے برابر پھٹ جائے تو اس پر مسح درست نہیں ہوتا، اس طرح اگر ایک موزہ تھوڑا تھوڑا کئی جگہ سے اتنی مقدار میں پھٹ جائے کہ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو وہ تین انگلیوں کے برابر ہو تو اس پر بھی مسح درست نہیں ہوتا اور اگر دونوں موزے تھوڑے تھوڑے اتنی مقدار میں پھٹے ہوں کہ اگر انھیں جمع کیا جائے تو وہ تین انگلیوں کے برابر ہو تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ ان پر مسح درست ہوگا۔

② جن چیزوں سے وضو ٹوٹتا ہے ان سے مسح بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

③ حدث کے بعد موزہ اتارنے سے مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

④ مسح کی مدت ختم ہو جانے کے بعد مسح ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ سردی کی وجہ سے پاؤں کے ضائع ہونے کا خوف نہ ہو، یعنی اگر سردی کی شدت اور کسی بیماری کی وجہ سے یہ خوف ہو کہ موزہ اتارنے سے پاؤں ضائع ہو جائے گا تو مسح کی مدت ختم ہونے کے بعد مسح نہیں ٹوٹے گا جب تک خوف باقی رہے گا مسح بھی باقی رہے گا۔

⑤ اگر موزہ اتارنے یا مدت ختم ہونے کی وجہ سے مسح ٹوٹ جائے اور وضو باقی ہو تو ایسی شکل میں از سر نو وضو کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف پیر دھو کر موزہ پہن لینا کافی ہوگا۔

❻ اگر آدھے سے زیادہ پیر موزہ سے باہر نکل آئے تو بھی مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

❼ اگر مقیم نے مسح کیا اور ایک رات اور ایک دن گزرنے سے پہلے مسافر ہو گیا تو وہ مسح کے لئے سفر کی مدت پوری کرے یعنی تین دن اور تین رات تک مسح کرتا رہے، اسی طرح اگر مسافر نے مسح کیا اور پھر وہ مقیم ہو گیا تو اسے چاہئے کہ ایک دن ایک رات کے بعد موزہ اتار دے کیونکہ اس کی مدت پوری ہو گئی ہے۔

❽ اگر کوئی معذور مثلاً ظہر کے وقت وضو کر کے موزہ پہنے تو جس عذر کی وجہ سے وہ معذور ہے اس کے علاوہ کسی دوسری چیز سے اس کا وضو ٹوٹ جائے تو اس کے لئے مسح کی مدت موزوں پر مسح کرنا جائز ہو گا اور پھر مسح کی مدت ختم ہو جانے کے بعد مسح ٹوٹ جائے گا۔

بَابُ التَّيَمُّمِ
تیمّم کا بیان

"تیمّم"[1] وضو اور غسل کا قائم مقام ہے۔ لغت میں تیمّم کے معنی "قصد" کے آتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں تیمّم سے مراد ہے پاک مٹی کا قصد کرنا یا اس چیز کا قصد کرنا جو مٹی کے قائم مقام ہو جیسے پتھر اور چونا وغیرہ اور طہارت کی نیت کے ساتھ اسے ہاتھ اور منہ پر ملنا۔

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تیمّم کے لئے دو ضربیں یا ایک ضرب ہے؟ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام ابویوسفؒ، حضرت امام مالک اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ تیمّم کے لئے دو ضربیں ہیں یعنی پاک مٹی یا اس کے قائم مقام مثلاً پاک چونے اور پتھر وغیرہ پر دو دفعہ ہاتھ مارنا چاہئے ایک ضرب تو منہ کے لئے ہے اور دوسری ضرب کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے۔ حضرت امام شافعیؒ کا بھی مختار مسلک یہی ہے اور بعض حنابلہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

لیکن حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا مشہور مسلک اور حضرت امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ تیمّم ایک ہی ضرب ہے یعنی تیمّم کرنے والے کو چاہئے کہ ایک ہی مرتبہ پاک مٹی وغیرہ پر ہاتھ مار کر اسے منہ پر اور کہنیوں تک دونوں ہاتھوں پر پھیر لے، حضرت امام اوزاعی، عطاء اور مکحولؒ سے بھی یہی منقول ہے۔ دونوں فریقین کے مذہب و مسلک کی تائید میں احادیث منقول ہیں جو آگے انشاء اللہ آئیں گی اور جن کی حسب موقع تشریح و توضیح بھی کی جائے گی۔ اس موقعہ پر مناسب ہے کہ تیمّم کے کچھ احکام اور وہ صورتیں ذکر کر دی جائیں جن میں تیمّم جائز ہے تیمّم حسب ذیل صورتوں میں جائز ہوتا ہے۔

❶ اتنا پانی جو وضو اور غسل کے لئے کافی ہو اپنے پاس موجود نہ ہو بلکہ ایک میل یا ایک میل سے زائد فاصلہ پر ہو۔

❷ پانی جو موجود تو ہو مگر کسی کی امانت ہو یا کسی سے غصب کیا ہوا ہو۔

❸ پانی کے نرخ کا معمول سے زیادہ گراں ہو جانا۔

❹ پانی کی قیمت کا موجود نہ ہونا خواہ پانی قرض مل سکتا ہو یا نہیں، قرض لینے کے صورت میں اس پر قادر ہو یا نہ ہو، ہاں اگر اپنی ملکیت میں مال ہو اور ایک مدت معینہ کے وعدہ پر قرض مل سکتا ہو تو قرض لے لینا چاہئے۔

❺ پانی کے استعمال سے کسی مرض کے پیدا ہو جانے یا بڑھ جانے کا خوف ہو یا خوف ہو کہ اگر پانی استعمال کیا جائے گا تو صحت یابی میں دیر ہو گی۔

❻ سردی اس قدر شدید ہو کہ پانی کے استعمال سے کسی عضو کے ضائع ہو جانے یا کسی مرض کے پیدا ہو جانے کا خوف ہو اور گرم پانی ملنا

---

[1] تیمّم ۵ھ میں مشروع ہوا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا فامسحوا بوجوھکم وایدیکم منہ "تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمّم کر لیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر ہاتھ اس زمین (کی جنس) پر سے (مار کر) پھیر لیا کرو"۔

ممکن نہ ہو۔

⑦ کسی دشمن یا درندہ کا خوف ہو مثلاً پانی ایسی جگہ ہو جہاں درندے وغیرہ آتے ہوں یا موجود ہوں یا راستہ میں چوروں کا خوف ہو، یا اپنے اوپر کسی کا قرض ہو، یا کسی سے عداوت ہو اور یہ خیال ہو کہ اگر پانی لینے جائے گا تو قرض خواہ اس کو پکڑ لے گا، یا کسی قسم کی تکلیف دے گا، یا پانی کسی غنڈے اور فاسق کے پاس ہو اور عورت کو اس کے حاصل کرنے میں اپنی بے حرمتی کا خوف ہو۔

⑧ پانی کھانے پینے کی ضرورت کے لئے رکھا ہو کہ اسے وضو یا غسل میں خرچ کر دیا جائے تو اس ضرورت میں حرج ہو مثلاً آٹا گوندھنے یا گوشت وغیرہ پکانے کے لئے رکھا ہو، یا پانی اس قدر ہو کہ اگر وضو یا غسل میں صرف کر دیا جائے تو پیاس کا خوف ہو خواہ اپنی پیاس کا یا کسی دوسرے کی پیاس کا، یا اپنے جانوروں کی پیاس کا، بشرطیکہ کوئی ایسی تدبیر نہ ہو سکے کہ مستعمل پانی جانوروں کے کام آسکے۔

⑨ کنوئیں سے پانی نکالنے کی کوئی چیز نہ ہو اور نہ کوئی کپڑا ہو کہ اسے کنوئیں میں ڈال کر تر کرے اور پھر اس سے نچوڑ کر طہارت حاصل کرے، یا پانی مٹکے وغیرہ میں ہو اور کوئی چیز پانی نکالنے کے لئے نہ ہو اور نہ مٹکا جھکا کر پانی لے سکتا ہو، نیز ہاتھ نجس ہوں اور کوئی دوسرا ایسا شخص نہ ہو جو پانی نکال کر دے یا اس کے ہاتھ دھلا دے۔

⑩ وضو یا غسل کرنے میں ایسی نماز کے چلے جانے کا خوف ہو جس کی قضا نہیں ہے جیسے عیدین یا جنازہ کی نماز۔

⑪ پانی کا بھول جانا مثلاً کسی شخص کے پاس پانی تو ہے مگر وہ اسے بھول گیا ہو اور اس کا خیال ہو کہ میرے پاس پانی نہیں ہے۔

تیمّم کرنے کا مسنون و مستحب طریقہ درج ذیل ہے:

پہلے بسم اللہ پڑھ کر تیمم کی نیت کی جائے پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو کسی ایسی مٹی پر جس کو نجاست نہ پہنچی ہو یا اس کی نجاست دھو کر زائل کر دی گئی ہو، ہتھیلیوں کی جانب سے کشادہ کر کے مار کر ملے اس کے بعد ہاتھوں کو اٹھا کر ان کی مٹی جھاڑ ڈالے اور پھر پورے دونوں ہاتھوں کو اپنے پورے منہ پر ملے اس طرح کہ کوئی جگہ ایسی باقی نہ رہ جائے جہاں ہاتھ نہ پہنچے۔ پھر اسی طرح دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مار کر ملے پھر ان کی مٹی جھاڑ ڈالے اور بائیں ہاتھ کی تین انگلیاں سوائے کلمہ کی انگلی اور انگوٹھے کے، داہنے ہاتھ کے انگلیوں کے سرے پر پشت کی جانب رکھ کر کہنیوں تک کھینچ لائے اس طرح کہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی بھی لگ جائے اور کہنیوں کا مسح بھی ہو جائے پھر باقی انگلیوں کو اور ہاتھ کی ہتھیلی کو دوسری جانب رکھ کر انگلیوں تک کھنچا جائے، اسی طرح بائیں ہاتھ کا بھی مسح کرے۔ وضو اور غسل دونوں کے تیمّم کا یہی طریقہ ہے اور ایک ہی تیمم دونوں کے لئے کافی ہے۔ اگر دونوں کی نیت کر لی جائے۔

تیمّم کے کچھ احکام[1] و مسائل یہ ہیں۔

① تیمّم کے وقت نیت کرنا فرض ہے اور نیت کی شکل یہ ہے کہ جس حدث کے سبب سے تیمّم کیا جائے تو اس سے طہارت کی نیت کی جائے یا جس چیز کے لئے تیمم کیا جائے اس کی نیت کی جائے مثلاً اگر نماز جنازہ کے لئے تیمّم کیا جائے یا قرآن مجید کی تلاوت کے لئے تیمّم کیا جائے تو اس کی نیت کی جائے مگر نماز اسی تیمم سے صحیح ہو گی جس میں حدث سے طہارت کی نیت کی جائے یا کسی ایسی عبادت مقصودہ کی نیت کی جائے جو بغیر طہارت کے نہیں ہو سکتی۔

② تیمّم کرتے وقت اعضاء تیمّم سے ایسی چیزوں کو دور کر دینا فرض ہے جس کی وجہ سے مٹی جسم تک نہ پہنچ سکے جیسے روغن یا چربی وغیرہ۔

③ تنگ انگوٹھی تنگ چھلوں اور چوڑیوں کو اتار ڈالنا واجب ہے۔

④ اگر کسی قرینے سے پانی کا قریب ہونا معلوم ہو تو اس کی تلاش میں سو قدم تک خود جانا یا کسی کو بھیجنا واجب ہے۔

---

[1] یہ تمام مسائل عبد الشکور لکھنوی کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

⑤ اگر کسی دوسرے شخص کے پاس پانی موجود ہو اور اس سے ملنے کی امید ہو تو اس سے طلب کرنا واجب ہے۔

⑥ اس ترتیب سے تیمم کرنا سنت ہے جس ترتیب سے آنحضرت ﷺ نے تیمم کیا ہے یعنی پہلے منہ کا مسح پھر دونوں ہاتھوں کا مسح۔

⑦ منہ کے مسح کے بعد داڑھی کا خلال کرنا سنت ہے۔

⑧ جس شخص کو اخیر وقت تک پانی ملنے کا یقین یا گمان غالب ہو تو اس کو نماز کے اخیر وقت تک پانی کا انتظام کرنا مستحب ہے مثلاً کنوئیں سے پانی نکالنے کی کوئی چیز نہ ہو اور یہ یقین یا گمان غالب ہو کہ اخیر وقت رسی اور ڈول مل جائیں گے۔ یا کوئی شخص ریل پر سوار ہو اور یہ بات یقین کے ساتھ معلوم ہو کہ نماز کے اخیر وقت ریل ایسے اسٹیشن پر پہنچ جائے گی جہاں پانی مل سکتا ہے۔

⑨ تیمم نماز کے وقت کے تنگ ہو جانے کی صورت میں واجب ہوتا ہے۔ شروع وقت میں واجب نہیں ہوتا۔

⑩ نماز کا اس قدر وقت ملے کہ جس میں تیمم کر کے نماز پڑھنے کی گنجائش ہو تو تیمم واجب ہوتا ہے اور اگر وقت نہ ملے تو تیمم واجب نہیں۔

⑪ جن چیزوں کے لئے وضو فرض ہے ان کی لئے وضو کا تیمم بھی فرض ہے۔ اور جن چیزوں کے لئے وضو واجب ہے ان کے لئے وضو کا تیمم بھی واجب ہے اور جن چیزوں کے لئے وضو سنت یا مستحب ان کے لئے وضو کا تیمم بھی سنت اور مستحب ہے، یہی حال غسل کا بھی ہے۔

⑫ اگر کوئی شخص حالت جنابت میں ہو اور مسجد میں جانے کی اسے سخت ضرورت ہو تو اس پر تیمم کرنا واجب ہے۔

⑬ جن عبادتوں کے لئے حدث اکبر (یعنی جنابت) اور حدث اصغر (یعنی جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) سے طہارت شرط نہیں ہے۔ جیسے سلام و سلام کا جواب وغیرہ ان کے لئے وضو و غسل دونوں کا تیمم بغیر عذر کے ہو سکتا ہے اور جن عبادتوں میں صرف حدث اصغر سے طہارت شرط نہ ہو جیسے تلاوت قرآن مجید اور اذان وغیرہ ان کے لئے صرف وضو کا تیمم بغیر عذر ہو سکتا ہے۔

⑭ اگر کسی کے پاس مشکوک پانی ہو جیسے گدھے کا جھوٹا پانی تو ایسی حالت میں پہلے اگر وضو کی ضرورت ہو تو وضو، اور غسل کی ضرورت ہو تو غسل کیا جائے اس کے بعد تیمم کیا جائے۔

⑮ اگر وہ عذر جس کی وجہ سے تیمم کیا گیا ہے آدمیوں کی طرف سے ہو تو جب وہ عذر جاتا رہے تو جس قدر نمازیں اس تیمم سے پڑھی ہیں سب کو دوبارہ پڑھنا چاہئے۔ مثلاً کوئی شخص جیل میں ہو اور جیل کے ملازم اس کو پانی نہ دیں یا کوئی شخص اس سے کہے کہ اگر تو وضو کرے گا تو میں تجھ کو مار ڈالوں گا۔

⑯ ایک جگہ سے اور ایک ڈھیلہ سے چند آدمی یکے بعد دیگرے تیمم کریں تو درست ہے۔

⑰ جو شخص پانی اور مٹی دونوں پر قادر نہ ہو خواہ پانی یا مٹی نہ ہونے کی وجہ سے یا بیماری کی وجہ سے تو اس کو چاہئے کہ نماز بلا طہارت پڑھ لے پھر اس نماز کو طہارت سے لوٹا لے مثلاً کوئی شخص ریل میں سوار ہے اور نماز کا وقت ہو گیا ہے مگر نہ تو پانی موجود ہے کہ وہ وضو کرے اور نہ مٹی یا اس قسم کی کوئی دوسری چیز ہے جس سے وہ تیمم کر سکے، ادھر نماز کا وقت بھی ختم ہوا جا رہا ہے تو اسے چاہئے کہ ایسی حالت میں بلا طہارت نماز پڑھ لے۔ اسی طرح کوئی شخص جیل میں ہو اور وہ پاک پانی اور مٹی پر قادر نہ ہو تو وہ بے وضو اور بے تیمم نماز پڑھ لے گا مگر ان دونوں صورتوں میں نماز کا اعادہ ضروری ہو گا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فُضِّلْنَا عَلَى النَّاسِ بِثَلَاثٍ جُعِلَتْ صُفُوْفُنَا كَصُفُوْفِ الْمَلَائِكَةِ وَجُعِلَتْ لَنَا الْاَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوْرًا اِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت حذیفہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہم لوگ (پہلی امتوں کے) لوگوں پر تین چیزوں سے فضیلت دیئے گئے ہیں ① ہماری صفیں (نماز میں یا جہاد میں) فرشتوں کی صفوں جیسی (شمار) کی گئی ہیں۔ ② ہمارے واسطے تمام زمین مسجد بنا دی گئی ہے (کہ جہاں

چاہیں نماز پڑھ لیں)۔ (۳) جس وقت ہمیں پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی ہمارے لئے پاک کر دینے والی ہے۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی اس امت سے پہلے دنیا میں جتنی بھی امتیں پیدا ہوئی ہیں، یوں تو ان سب کے مقابلہ پر یہ امت اپنی گوناگوں خصوصیات اور امتیازات کی بناء پر سب سے زیادہ افضل اور بزرگ ہے۔ عظمت و فضیلت میں کوئی امت اس امت سے مماثل نہیں ہے۔ مگر یہاں آنحضرت ﷺ اس امت کی بعض امتیازی خصوصیات کی طرف جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس امت پر بے پایاں انعامات و احسانات کے نتیجہ ہیں اشارہ فرما رہے ہیں کہ ان چیزوں کے بناء پر میری امت کو دوسری امتوں پر خاص فضیلت و فوقیت دی گئی ہے۔

چنانچہ پہلی چیز تو آپ ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ (نماز یا جہاد میں) اس امت کی صفیں فرشتوں کی صفیں جیسی (شمار) کی گئی ہیں یعنی جس طرح فرشتے صف بندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں کہ جس کی بناء پر انہیں مقام قرب میسر ہے اور بے انتہا بزرگی و سعادت حاصل ہوتی ہے اسی طرح اس امت کو بھی جہاد یا نماز میں صف بندی اور جماعت کی بناء پر خداوند قدوس کا مقام قرب حاصل ہوتا ہے اور اس وجہ سے یہ امت سابقہ امتوں کے مقابلہ میں افضل ہے کیونکہ سابقہ امتوں میں صف بندی اور جماعت نہیں تھی وہ لوگ جس طرح چاہتے نماز پڑھ لیتے مگر اللہ تعالیٰ نے اس امت کو جماعت کا حکم دے کر گویا سعادت و نیک بختی کے اس عظیم راستہ پر لگا دیا کہ جماعت اور صف بندی کی جتنی زیادہ پابندی کی جائے گی سعادت و نیک بختی اور مقام قرب کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

دوسری چیز آپ ﷺ نے یہ فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری امتوں کے مقابلہ پر اس امت پر یہ بھی بڑا احسان فرمایا اور اس کو فضیلت بخشی کہ اس امت کے لوگوں کے لئے تمام زمین کو سجدہ گاہ قرار دے دیا کہ بندہ زمین کے جس پاک حصہ پر خدا کے سامنے جھک جائے اور نماز ادا کرے اس کی نماز قبول کی جائے گی بر خلاف اس کے کہ پچھلی امتوں کے لئے یہ سہولت اور فضیلت نہیں تھی ان لوگوں کی نماز "کنائس" اور "بیع" (جو پچھلی امتوں کے عبادت خانوں کے نام ہیں) اس کے علاوہ اور کہیں جائز نہ ہوتی تھی۔

تیسری چیز آپ ﷺ نے یہ فرمائی ہے کہ اس امت کے لئے تیمم کو جائز کر کے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو دوسری امتوں پر عظیم فضیلت عنایت فرمائی ہے یعنی اگر پانی موجود نہ ہو یا پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو یا پانی کے استعمال سے معذور ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر کے نماز پڑھ لی جائے۔ نماز جائز ہو جائے گی۔

بہر حال۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان تین چیزوں میں ہمیں دوسری امتوں کے مقابلہ پر فضیلت و بزرگی ہے کہ "ہمیں جماعت سے نماز پڑھنے کا حکم ہوا اور اس پر بے شمار اجر و انعام اور ثواب کا وعدہ کیا گیا" ساری زمین ہمارے لئے مسجد قرار دی گئی کہ جہاں چاہیں نماز پڑھ لیں، نماز جائز ہو جائے گی اور جہاں پانی نہ ملے یا پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر کے نماز پڑھ لیں"۔

اس حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیمم صرف مٹی ہی سے کرنا چاہئے اور کسی چیز سے تیمم کرنا درست نہ ہو گا۔ جیسے کہ حضرت امام شافعی ﷺ وغیرہ کا مسلک ہے۔ مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک تیمم ہر اس چیز سے درست ہے جو زمین کی جنس سے ہو، زمین کی جنس کا اطلاق ان چیزوں پر ہوتا ہے جو نہ تو آگ میں جلنے سے پگھلیں نہ نرم ہوں اور نہ جل کر راکھ ہوں جیسے مٹی پتھر اور چونا وغیرہ ان حضرات کی دلیل سرکار دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے جو حضرت جابرؓ سے صحیح بخاری میں منقول ہے کہ:

جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا۔

"یعنی زمین میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی کر دی گئی ہے۔"

اس ارشاد میں لفظ "ارض" کا استعمال کیا گیا ہے جو ہر اس چیز کے مفہوم کو ادا کرتا ہے جو زمین کی جنس سے ہو۔

(۴) وَعَنْ عِمْرَانَ قَالَ كُنَّا فِيْ سَفَرٍ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ فَلَمَّا انْفَتَلَ مِنْ صَلَاتِهِ اِذَا هُوَ

بِرَجُلٍ مُعْتَزِلٍ لَمْ يُصَلِّ مَعَ الْقَوْمِ فَقَالَ مَامَنَعَكَ يَا فُلَانُ اَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ قَالَ اَصَابَتْنِي جَنَابَةٌ وَلَا مَاءَ قَالَ عَلَيْكَ بِالصَّعِيْدِ فَاِنَّهُ يَكْفِيْكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرانؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھے۔ آپ ﷺ نے (ہم) لوگوں کو نماز پڑھائی جب آنحضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی علیحدہ بیٹھا ہوا ہے اس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے فلاں! تمہیں لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے کس نے روک دیا تھا؟ اس نے عرض کیا کہ "مجھے نہانے کی ضرورت ہوگئی ہے اور پانی نہیں ملا" آپ ﷺ نے فرمایا ("ایسی صورت میں) تمہیں مٹی سے (تیمم کر لینا) لازم تھا اور تمہیں وہی کافی تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۳) وَعَنْ عَمَّارٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ اِنِّي اَجْنَبْتُ فَلَمْ اُصِبِ الْمَاءَ فَقَالَ عَمَّارٌ لِعُمَرَ اَمَا تَذْكُرُ اَنَّا كُنَّا فِي سَفَرٍ اَنَا وَاَنْتَ فَاَمَّا اَنْتَ فَلَمْ تُصَلِّ وَاَمَّا اَنَا فَتَمَعَّكْتُ فَصَلَّيْتُ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكَ هٰكَذَا فَضَرَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَفَّيْهِ الْاَرْضَ وَنَفَخَ فِيْهِمَا ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَ لِمُسْلِمٍ نَحْوَهُ وَفِيْهِ قَالَ اِنَّمَا يَكْفِيْكَ اَنْ تَضْرِبَ بِيَدَيْكَ الْاَرْضَ ثُمَّ تَنْفُخَ ثُمَّ تَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَكَ وَكَفَّيْكَ۔

"اور حضرت عمارؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے نہانے کی ضرورت ہے اور پانی نہیں ملا (تو اب تیمم کروں یا کیا کروں؟) حضرت عمار (یہ سن کر) حضرت عمرؓ سے بولے کیا تمہیں یاد نہیں رہا کہ میں اور تم سفر میں تھے اور ہم دونوں کو نہانے کی ضرورت ہوگئی تھی) تو تم نے نماز نہیں پڑھی تھی لیکن میں نے زمین پر لوٹ کر نماز پڑھ لی تھی پھر میں نے آنحضرت ﷺ سے صورت حال ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں اس طرح کر لینا کافی تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے پھر ان پر پھونک مار کر (یعنی جھاڑ کر) ان سے اپنے منہ اور ہاتھوں پر مسح کر لیا۔" (بخاریؒ) "اسی طرح مسلم نے روایت کی ہے (جس کے آخری الفاظ یہ ہیں (کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ) تمہارے لئے یہ کافی ہے کہ اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارو پھر ان میں پھونک مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر مسح کرو۔"

تشریح: اس حدیث میں حضرت عمرؓ کا جواب ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن حدیث کے بعض دوسرے طرق سے مذکور ہے کہ حضرت عمر نے اس شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ لا تصل یعنی جب تک پانی نہ ملے نماز نہ پڑھو! چنانچہ حضرت عمرؓ کا مسلک یہی تھا کہ جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں ہے۔

یا یہ ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسئلہ پوچھنے والے کے سوال پر جو سکوت اختیار فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ جنبی کے لئے تیمم کا حکم ان کے ذہن میں نہیں رہا تھا۔ چنانچہ حضرت عمارؓ نے تمام واقعہ بیان کیا تاکہ حضرت عمرؓ کے ذہن میں اس سے یہ بات پیدا ہو جائے کہ جنبی کے لئے بھی تیمم جائز ہے حضرت عمارؓ نے جو واقعہ بیان کیا اس میں حضرت عمرؓ کے بارے میں جو یہ بتایا کہ انھوں نے غسل کے لئے پانی نہ ہونے کی وجہ سے حالت جنابت میں نماز نہیں پڑھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے یہ سوچا ہوگا کہ ہوسکتا ہے کہ نماز کے آخر وقت تک پانی مل جائے اس لئے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ پانی مل جانے کے بعد غسل کر کے ہی نماز پڑھی جائے یا پھر اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ ان کے ذہن میں بات بیٹھی ہوئی تھی کہ تیمم تو صرف وضو کے قائم مقام ہے غسل کا قائم مقام نہیں ہے۔

ظاہری طور پر یہ وجہ زیادہ قرین قیاس ہے ان کے اس اعتقاد کا سبب یہ تھا کہ چونکہ انھیں اس مسئلہ کی پوری حقیقت معلوم نہیں تھی پھر یہ کہ انہیں اس مسئلہ پر آنحضرت ﷺ سے کبھی سوال کا اتفاق بھی نہ ہوا تھا اس لئے وہ تو یہی سمجھتے ہے کہ تیمم صرف وضو کا قائم مقام ہے غسل کا نہیں ہے حالانکہ متفقہ طور پر سب ہی کے نزدیک تیمم جس طرح وضو کا قائم مقام ہے اس طرح غسل کا قائم مقام بھی ہے۔

حضرت عمارؓ اپنے بارے میں بتا رہے ہیں اس موقع پر میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ یہ کہ میں مٹی میں لوٹ گیا اور اس کے بعد نماز پڑھ لی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ذہن میں بھی یہ مسئلہ پوری وضاحت سے نہیں تھا اس لئے انھوں نے یہ قیاس کر کے جس طرح غسل میں پانی تمام اعضاء پر بہایا جاتا ہے اسی طرح مٹی بھی تمام اعضاء پر پہنچانی چاہئے، مٹی میں لوٹ گئے۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت عمارؓ کو تیمم کا طریقہ بتاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے پھر ہاتھوں پر پھونک مار کر اس پر لگی ہوئی مٹی کو اس لئے جھاڑا تا کہ مٹی منہ پر نہ لگے جس سے منہ کی ہیئت بگڑ جائے کہ وہ مثلہ کے حکم میں ہے جو ممنوع ہے۔ مثلہ اسے کہتے ہیں کہ بدن کے کسی عضو کو کاٹ کر یا ایسا کوئی طریقہ اختیار کر کے جس سے خلقی طور پر اعضاء میں فرق آجائے، اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بگاڑا جائے، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنے چہروں پر بھبھوت وغیرہ ملتے ہیں وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہیں۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ تیمم کے لئے مٹی پر ایک مرتبہ ہاتھ مارنا کافی ہے جیسا کہ دوسرے حضرات کا یہی مسلک ہے مگر امام اعظمؒ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کا مسلک چونکہ یہ ہے کہ تیمم کے لئے مٹی پر دو مرتبہ ہاتھ مارنا چاہئے ایک مرتبہ تو منہ پر پھیرنے کے لئے اور دوسری مرتبہ کہنیوں تک ہاتھوں پر پھیرنے کے لئے اس لئے حضرت شیخ محی الدین نوویؒ اس حدیث کی توجیہ یہ فرماتے ہیں کہ:

سرکار دو عالم ﷺ کا مقصد صرف یہ تھا کہ حضرت عمارؓ کو مٹی پر ہاتھ مارنے کی کیفیت وصورت دکھادیں کہ جنابت کے لئے تیمم اس طرح کر لیا کرو مٹی میں لوٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا چونکہ آپ ﷺ کا مقصد پورے تیمم کی کیفیت بیان کرنا نہیں تھا اس لئے حضرت عمارؓ نے بھی روایت حدیث کے وقت ایک مرتبہ ہاتھ مارنے ہی کو بطور تعلیم ذکر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کے علاوہ حضرت عمارؓ سے جو روایتیں تیمم کے بارے میں منقول ہیں ان میں صراحت کے ساتھ دو مرتبہ ہی ہاتھ مارنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ حدیث میں "کفین" سے "ذراعین" یعنی کہنیوں تک ہاتھ مراد ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں پر کہنیوں تک مسح کیا۔"

④ وَعَنْ اَبِی الْجُهَیْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّمَّةِ قَالَ مَرَرْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ یَبُوْلُ فَسَلَّمْتُ عَلَیْهِ فَلَمْ یَرُدَّ عَلَیَّ حَتّٰی قَامَ اِلٰی جِدَارٍ فَحَتَّهٗ بِعَصًا كَانَتْ مَعَهٗ ثُمَّ وَضَعَ یَدَیْهِ عَلَی الْجِدَارِ فَمَسَحَ وَجْهَهٗ وَذِرَاعَیْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَیَّ وَلَمْ اَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَایَةَ فِی الصَّحِیْحَیْنِ وَلَا فِیْ كِتَابِ الْحُمَیْدِیِّ وَلٰكِنْ ذَكَرَهٗ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت ابوجہیم ابن حارث ابن صمہؓ راوی ہیں کہ "(ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے قریب سے گزرا۔ آپ ﷺ اس وقت پیشاب کر رہے تھے میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا، آپ ﷺ نے جواب نہیں دیا۔ اور پیشاب سے فارغ ہو کر) ایک دیوار کے پاس کھڑے ہوئے اور ایک لاٹھی سے جو آپ ﷺ کے پاس تھی دیوار کھرچ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر مسح کر کے میرے سلام کا جواب دیا۔" (مشکوۃ کے مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "مجھے یہ روایت نہ صحیحین میں ملی ہے اور نہ حمیدی کی کتاب میں ہاں محی السنۃ نے اس کو شرح السنۃ میں ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے (لہٰذا صاحب مصابیح کو چاہئے تھا کہ اس روایت کو پہلی فصل میں ذکر نہ کرتے۔)

تشریح: آپ ﷺ نے اپنے عصاء سے دیوار کی مٹی اس لئے کھرچی کہ اس میں سے غبار اٹھنے لگے کہ اس پر تیمم کرنا افضل ہے اور ثواب کی زیادتی کا باعث ہے۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے ذکر اللہ کے لئے باطہارت ہونا مستحب ہے نیز ہر وقت پاک وصاف اور طاہر رہنا بھی مستحب ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

⑤ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الصَّعِیْدَ الطَّیِّبَ وَضُوْءُ الْمُسْلِمِ وَاِنْ لَّمْ یَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِیْنَ فَاِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْیَمَسَّہُ بَشَرَہٗ فَاِنَّ ذٰلِکَ خَیْرٌ۔ (رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَرَوَی النَّسَائِیُّ نَحْوَہٗ اِلٰی قَوْلِہٖ عَشْرَ سِنِیْنَ)

"حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "پاک مٹی مسلمان کو پاک کرنے والی ہے۔ اگرچہ وہ دس برس تک پانی نہ پائے اور جس وقت پانی مل جائے تو بدن دھولینا چاہئے کیونکہ یہ بہتر ہے۔" (احمدؒ ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) "اور نسائیؒ نے بھی اسی طرح کی روایت عشر سنین تک نقل کی ہے۔"

تشریح: دس برس کی مدت تحدید کے لئے نہیں ہے بلکہ کثرت کے لئے ہے یعنی اگر اتنے طویل عرصہ تک بھی پانی نہ ملے تو غسل یا وضو کے لئے تیمم کیا جاسکتا ہے اور پھر بعد میں جب بھی اتنا پانی مل جائے جو غسل یا وضو کے لئے کافی ہو اور پینے کی ضرورت سے زیادہ ہو نیز اس کے استعمال پر قادر بھی ہو تو غسل کرنا یا وضو کرنا چاہئے کیونکہ اس صورت میں غسل یا وضو واجب ہوگا تیمم جائز نہیں ہوگا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نماز کا وقت ختم ہو جانے پر تیمم نہیں ٹوٹتا بلکہ اس کا حکم وضوؒ کی طرح ہے کہ جس طرح جب تک وضو نہ ٹوٹے ایک وضو سے جتنے فرض یا نفل چاہے پڑھ سکتا ہے اسی طرح ایک تیمم سے بھی کئی وقت کی نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے مگر حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تیمم معذور کے وضو کی طرح ہے کہ جس طرح نماز کا وقت گزر جانے سے معذور کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح نماز کا وقت ختم ہو جانے پر تیمم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا فِیْ سَفَرٍ فَاَصَابَ رَجُلًا مِّنَّا حَجَرٌ فَشَجَّہٗ فِیْ رَأْسِہٖ فَاحْتَلَمَ فَسَأَلَ اَصْحَابَہٗ ھَلْ تَجِدُوْنَ لِیْ رُخْصَۃً فِی التَّیَمُّمِ قَالُوْا مَا نَجِدُ لَکَ رُخْصَۃً وَاَنْتَ تَقْدِرُ عَلَی الْمَاءِ فَاغْتَسَلَ فَمَاتَ فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُخْبِرَ بِذٰلِکَ قَالَ قَتَلُوْہُ قَتَلَھُمُ اللّٰہُ اَلَا سَأَلُوْا اِذَا لَمْ یَعْلَمُوْا فَاِنَّمَا شِفَاءُ الْعِیِّ السُّؤَالُ اِنَّمَا کَانَ یَکْفِیْہِ اَنْ یَّتَیَمَّمَ وَیُعَصِّبَ عَلٰی جُرْحِہٖ خِرْقَۃً ثُمَّ یَمْسَحَ عَلَیْھَا وَیَغْسِلَ سَائِرَ جَسَدِہٖ۔ (رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "ہم سفر میں جارہے تھے کہ ہم میں سے ایک شخص کے پتھر لگا جس نے اس کے سر کو زخمی کر ڈالا (اتفاق سے) اسے نہانے کی حاجت بھی ہوگئی چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے نزدیک (اس صورت میں) میرے لئے تیمم کرنا جائز ہے؟ انھوں نے کہا "ایسی صورت میں جب کہ تم پانی استعمال کر سکتے ہو ہم تمہارے لئے تیمم کی کوئی وجہ نہیں پاتے۔" چنانچہ اس شخص نے غسل کیا (جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) اس کا انتقال ہوگیا۔ جب ہم (سفر سے واپس ہو کر) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ ﷺ نے (انتہائی رنج اور تکلیف کے ساتھ) فرمایا "لوگوں نے اسے مار دیا، خدا بھی انہیں مارے" پھر فرمایا کہ "ان کو جو بات معلوم نہ تھی، اسے انھوں نے دریافت کیوں نہ کر لیا؟ (کیونکہ) نادانی کی بیماری کا علاج سوال ہے اور اسے تو یہی کافی تھا کہ تیمم کر لیتا اور اپنے زخم پر ایک پٹی باندھ کر اس پر مسح کر لیتا اور پھر اپنا تمام بدن دھو لیتا۔" (ابوداؤدؒ) اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو عطاء ابن رباحؒ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔)

ل جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ان سے وضو کا تیمم بھی ٹوٹ جاتا ہے اور جن چیزوں سے غسل واجب ہوتا ہے ان سے غسل کا تیمم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے "علم الفقہ" کا مطالعہ کریں۔

تشریح: بسا اوقات کم علمی اور کسی مسئلہ سے عدم واقفیت بڑے اندوہناک واقعہ کا سبب بن جایا کرتی ہے چنانچہ اس موقعہ پر یہی ہوا کہ جب اس زخمی شخص نے اپنے عذر کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ آیا ایسے حال میں جب میرے سر پر زخم ہے اور پانی اس زخم کے لئے نقصاندہ ہو سکتا ہے تو ناپاکی دور کرنے کے لئے بجائے غسل کے میں تیمم کر سکتا ہوں؟ تو ساتھیوں نے مسئلہ سے ناواقفیت اور اپنی کم علمی کی بنا پر یہ سمجھ کر آیت تیمم فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا کا مطلب یہ ہے کہ تیمم صرف اسی شکل میں جائز ہوگا جب کہ پانی موجود نہ ہو اگر پانی موجود ہو تو تیمم جائز نہیں ہوگا۔ اس شخص سے کہہ دیا کہ تمہارے لئے تیمم جائز ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے؟ حالانکہ انھوں نے یہ نہ سمجھا کہ تیمم جائز نہ ہونے کی شکل یہ ہے کہ پانی موجود ہو اور ساتھ ساتھ اس کے استعمال پر قدرت نیز پانی کے استعمال سے کسی نقصان اور ضرر کا خدشہ بھی نہ ہو۔ ان بیچارے نے ان لوگوں کے علم وفہم پر اعتماد کیا اور اس حالت میں غسل کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانی نے زخم میں شدت پیدا کر دی اور شدت بھی ایسی کہ وہ خدا کا بندہ اسی وجہ سے اللہ کو پیارا ہو گیا۔

بہر حال یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ایسے مواقع پر تیمم بھی کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ تمام بدن کو دھونا بھی چاہئے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے مگر امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک دونوں میں سے ایک ہی چیز کافی ہے۔

حنفیہ کی جانب سے شوافع کو جواب دیتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور پھر قیاس کے خلاف بھی ہے کہ اس سے بدل اور مبدل منہ کا جمع لازم آیا ہے۔

الحاصل اس مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر اگر کسی شخص کو پانی کے استعمال کرنے کی وجہ سے تلف جان کا خوف ہو تو اس کے لئے تیمم کرنا جائز ہے یہ مسئلہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔

اور اگر کسی شخص کو یہ ڈر ہو کہ پانی کے استعمال سے مرض بڑھ جائے گا یا صحتیابی میں تاخیر ہو جائے گی تو ایسی شکل میں بھی حضرت امام اعظمؒ اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک اسے تیمم کر کے نماز پڑھ لینی جائز ہے اور بعد میں نماز کی قضا ضروری نہیں ہے حضرات شوافع کے یہاں بھی تقریباً یہی مسلک ہے۔

اگر کسی شخص کے کسی عضو میں زخم ہو یا پھوڑا ہو اور اس کی پٹی بندھی ہوئی ہو تو اس صورت میں حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر پٹی اتارنے سے تلف جان کا خطرہ ہو تو اسے چاہئے کہ پٹی پر مسح کرے اور تیمم کرے مگر حضرت امام اعظمؒ اور حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی شخص کے بدن کا کچھ حصہ زخمی اور کچھ حصہ اچھا ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ زخمی حصہ کتنا ہے اور اچھا حصہ کتنا ہے اگر زیادہ حصہ اچھا ہے تو اسے دھوئیں گے اور زخم پر مسح کریں اور اگر اکثر حصہ زخمی ہوگا تو تیمم کریں گے اور دھونا ساقط ہو جائے گا۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مسئلہ یہ ہے کہ جو حصہ اچھا ہو اسے دھویا جائے اور زخم کے لئے تیمم کیا جائے۔"

(۷) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ خَرَجَ رَجُلَانِ فِیْ سَفَرٍ فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ وَلَیْسَ مَعَهُمَا مَاءٌ فَتَیَمَّمَا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَصَلَّیَا ثُمَّ وَجَدَا الْمَاءَ فِی الْوَقْتِ فَاَعَادَ اَحَدُهُمَا الصَّلٰوةَ بِوُضُوْءٍ وَلَمْ یُعِدِ الْاٰخَرُ ثُمَّ اَتَیَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَا ذٰلِكَ فَقَالَ لِلَّذِیْ لَمْ یُعِدْ اَصَبْتَ السُّنَّةَ وَاَجْزَأَتْكَ صَلَاتُكَ وَقَالَ لِلَّذِیْ تَوَضَّأَ وَاَعَادَ لَكَ الْاَجْرُ مَرَّتَیْنِ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالدَّارِمِیُّ وَرَوَی النَّسَائِیُّ نَحْوَهٗ وَقَدْ رَوٰی هُوَ وَاَبُوْدَاؤُدَ اَیْضًا عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ مُرْسَلًا)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ "دو شخص سفر کو روانہ ہوئے (اثنائے راہ میں) نماز کا وقت ہوا مگر ان کے پاس پانی نہیں تھا چنانچہ دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی (آگے چل کر) انہیں پانی مل گیا اور نماز کا وقت بھی باقی تھا لہٰذا ان میں سے ایک نے وضو کر کے نماز لوٹائی مگر دوسرے نے نہیں لوٹائی۔ جب دونوں نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو یہ واقعہ ذکر کیا، آنحضرت ﷺ نے (پورا واقعہ سن کر) اس شخص سے جس نے نماز نہیں لوٹائی تھی فرمایا کہ تم نے سنت پر عمل کیا تمہارے لئے وہ نماز کافی ہے اور جس شخص

نے وضو کر کے نماز لوٹائی تھی آپ ﷺ نے اس سے فرمایا" تمہارے لئے دوگنا اجر ہے۔" (ابوداؤد ، دارمی) اور نسائی نے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے اور نسائی و ابوداؤد نے عطا ابن یسار سے مرسلاً بھی نقل کی ہے۔

تشریح : چونکہ پانی نہ ملنے کی صورت میں اگر پانی مل جائے اور نماز کا وقت بھی باقی ہو تو اس نماز کو لوٹانا ضروری ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے جس نے نماز نہیں لوٹائی تھی فرمایا کہ تم نے سنت پر عمل کیا یعنی شریعت کا حکم چونکہ یہی ہے اس لئے تم نے شریعت کے حکم کی پابندی کی ہے کہ تیمم سے نماز پڑھ لینے کے باوجود تم نے نماز نہیں لوٹائی۔ دوسرے شخص کو آپ ﷺ نے دوہرے ثواب کا مستحق قرار دیا کہ ایک ثواب تو ادائے فرض کا اور دوسرا ثواب ادائے نفل کا۔

اس مسئلہ میں علماء کا متفقہ طور پر فیصلہ ہے کہ تیمم کرنے والا نماز سے فارغ ہو کر اگر پانی دیکھے اور اسے پانی مل جائے تو اس کے لئے نماز کو لوٹانا ضروری نہیں ہے خواہ نماز کا وقت باقی کیوں نہ ہو۔

لیکن صورت اگر یہ ہو کہ ایک شخص تیمم کرنے کے بعد نماز پڑھنی شروع کر دے اور درمیان نماز سے پانی مل جائے تو اب وہ کیا کرے؟ آیا نماز ختم کر کے وضو کر لے اور پھر نماز پڑھے یا اپنی نماز تیمم ہی سے پوری کر لے؟ اس مسئلہ پر علماء کا اختلاف ہے؟ چنانچہ جمہور یعنی اکثر علماء کا مسلک تو یہ ہے کہ اس شخص کو اپنی نماز ختم نہیں کرنی چاہئے بلکہ وہ نماز پوری کر لے، اس کی نماز صحیح ہوگی۔

مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ کا ایک قول یہ ہے کہ اس صورت میں اس شخص کا تیمم باطل ہو جائے گا، گویا اسے نماز توڑ کر اور پانی سے وضو کر کے دوبارہ نماز شروع کرنی چاہیے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(٨) وَعَنْ اَبِی الْجُهَیْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّمَّةِ قَالَ اَقْبَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ نَحْوِ بِئْرِ جَمَلٍ فَلَقِیَهُ رَجُلٌ فَسَلَّمَ عَلَیْهِ فَلَمْ یَرُدَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی اَقْبَلَ عَلَی الْجِدَارِ فَمَسَحَ بِوَجْهِهٖ وَیَدَیْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوجہیم ابن حارث ابن صمہؓ راوی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ (مدینہ میں) جمل کے کنوئیں کی طرف سے تشریف لائے آپ ﷺ سے ایک شخص (یعنی خود ابی جہیم) ملے اور سلام کیا سرکار دو عالم ﷺ نے ان کے سلام کا جواب نہیں دیا اور ایک دیوار کے پاس تشریف لائے چنانچہ (پہلے) آپ ﷺ نے منہ اور ہاتھوں کا مسح کیا (یعنی تیمم کیا) پھر سلام کا جواب دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(٩) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ یَاسِرٍ اَنَّهٗ کَانَ یُحَدِّثُ اَنَّهُمْ تَمَسَّحُوْا وَهُمْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِالصَّعِیْدِ لِصَلَاةِ الْفَجْرِ فَضَرَبُوْا بِاَکُفِّهِمُ الصَّعِیْدَ ثُمَّ مَسَحُوْا بِوُجُوْهِهِمْ مَسْحَةً وَاحِدَةً ثُمَّ عَادُوْا فَضَرَبُوْا بِاَکُفِّهِمُ الصَّعِیْدَ مَرَّةً اُخْرٰی فَمَسَحُوْا بِاَیْدِیْهِمْ کُلِّهَا اِلَی الْمَنَاکِبِ وَالْاٰبَاطِ مِنْ بُطُوْنِ اَیْدِیْهِمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمار ابن یاسرؓ یہ بیان کرتے ہیں کہ ("ایک دفعہ) چند صحابہ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے اور (پانی نہ ملنے کی وجہ سے) فجر کی نماز کے لئے انھوں نے پاک مٹی سے (اس طرح) تیمم کیا (کہ پہلے) اپنے ہاتھوں کو مٹی پر مار کر اپنے چہروں پر پھیرا اور دوسری مرتبہ اپنے ہاتھوں کو مٹی پر مار کر اپنے پورے ہاتھوں پر یعنی مونڈھوں تک اور بغلوں کے اندر تک مسح کیا ہاتھوں کے اندر کی طرف سے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح : حدیث کے آخری جملہ من بطون ایدیھم میں لفظ من ابتدا کے لئے ہے یعنی انہوں نے پہلے ہاتھوں کے اندر کے رخ پر ہاتھ پھیرے نہ کہ ہاتھوں کے اوپر کے رخ پر، جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ پہلے ہاتھوں کے اوپر کے رخ پر مسح کرنا مستحب ہے۔ یا پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ "انھوں نے" ہتھیلیوں سے تیمم کرنا شروع کیا۔" یہی معنی زیادہ مناسب ہیں۔

صحابہ نے ہاتھوں پر بغلوں اور مونڈھوں تک مسح کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے خیال کیا کہ آیت تیمم میں "ید" یعنی ہاتھ کا لفظ مذکور ہے جو مطلق ہے۔ اس آیت سے اور اس لفظ سے یہ بصراحت معلوم نہیں ہوتا کہ ہاتھوں پر مسح کہاں تک کیا جائے لہٰذا اس اطلاق کا تقاضا یہ ہے کہ "ید" یعنی ہاتھ جو انگلیوں سے لے کر بغل اور مونڈھے تک کے حصہ کے لئے بولا جاتا ہے اس پورے حصہ پر مسح کیا جائے اس لئے صحابہ نے ہاتھ کے پورے حصہ پر مسح کر ڈالا۔ اب جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ صحابہؓ کا اپنا اجتہاد تھا کیونکہ جمہور علماء نے تیمم میں ہاتھوں پر کہنیوں تک مسح کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے اور وضو کے بارے میں قرآن نے صراحت کے ساتھ بتادیا کہ ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا فرض ہے لہٰذا جس طرح اصل یعنی وضو میں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھویا جاتا ہے۔ وضو کے قائم مقام یعنی تیمم میں بھی ہاتھوں پر مسح وہیں تک کیا جانا چاہئے۔

پھر اس سے پہلے تیمم کے بارے میں کچھ احکام نقل کئے گئے تھے اس حدیث پر چونکہ باب ختم ہو رہا ہے اس لئے مناسب ہے کہ تیمم کے کچھ دوسرے احکام و مسائل جو پہلے نقل نہیں کئے گئے ذکر کر دیئے جائیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تیمم ان چیزوں سے کرنا چاہئے جو زمین کی جنس سے ہوں چنانچہ مٹی، ریت، چونا قلعی، سرمہ، ہڑتال، اور پتھر سے تیمم کیا جا سکتا ہے، اسی طرح موتی اور مونگے کے علاوہ تمام جواہرات سے بھی تیمم کیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی سمجھ لیجئے کہ تیمم کرنے کے لئے ان چیزوں پر جو زمین کی جنس سے ہوں غبار ہونا ضروری نہیں ہے۔ یعنی ان مذکور چیزوں پر غبار نہ ہونے کی صورت میں ں ان سے تیمم کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر ایسی چیز کے ذریعہ تیمم کیا جائے جو زمین کی جنس سے نہ ہو تو اس پر غبار ہونا ضروری ہے، غبار نہ ہونے کی شکل میں اس کے ذریعہ کیا گیا تیمم جائز نہ ہوگا، مثلاً کسی لکڑی، کپڑے یا سونے اور چاندی وغیرہ پر غبار ہو تو اس سے تیمم جائز ہے۔

تیمم کے جواز کے لئے چار شرائط ہیں۔ ① پانی کے استعمال سے حقیقتہ یا حکماً عاجز ہونا۔ ② جس چیز سے تیمم کیا جائے اس کا پاک ہونا۔ ③ استیعاب یعنی اعضاء تیمم کے ہر ہر حصہ پر اس طرح ہاتھ پھیرنا کہ کوئی جگہ مسح سے باقی نہ رہ جائے۔ ④ نیت اس کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نماز اسی تیمم سے صحیح ہوگی جس میں حدیث طہارت کی نیت کی جائے۔ اس سلسلہ میں (حدث یا جنابت کی تعیین شرط نہیں ہے) یا اس عبادت مقصودہ کی نیت کی جائے جو بغیر طہارت کے صحیح نہ ہوتی۔ چنانچہ اگر کافر اسلام قبول کرنے کے لئے تیمم کرے یا کوئی شخص مسجد میں جانے کے لئے تیمم کرے اور پھر یہ چاہے کہ اسی تیمم سے نماز بھی پڑھ لے تو نماز اس تیمم سے جائز نہ ہوگی۔ جنبی، محدث، حائضہ اور نفاس والی عورت سب کے لئے تیمم کا ایک ہی طریقہ ہے جو پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

بَابُ الْغُسْلِ الْمَسْنُوْنِ
غسل مسنون کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَاءَ اَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيَغْتَسِلْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی جمعہ کی نماز پڑھنے آئے تو اسے چاہئے کہ غسل کرلے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مختار مسلک تو یہ ہے کہ غسل جمعہ کی نماز کے لئے ہے کہ اسی طہارت سے جمعہ اداء کرنا چاہئے لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ غسل

یوم جمعہ کی تعظیم و تکریم کے لئے ہے۔
بہر حال: تمام علماء کے نزدیک نماز جمعہ کے لئے غسل کرنا مستحب مؤکدہ ہے مگر حضرت امام مالکؒ کی ایک راویت یہ ہے کہ نماز جمعہ کے لئے غسل کرنا واجب ہے۔

(۲) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غُسْلُ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُحْتَلِمٍ۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ہر بالغ پر جمعہ کے روز نہانا واجب ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "واجب" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص جمعہ کے روز غسل نہ کرے تو وہ گنہ گار ہوگا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ "یہ ثابت ہے کہ جمعہ کے روز غسل کو ترک کرنا مناسب نہیں ہے۔" یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا ہمارے یہاں عام طور کسی مستحق رعایت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "فلاں شخص کی رعایت ہم پر واجب ہے۔"
چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ یہاں اسی طرح ایسے دوسرے مواقع پر "واجب" کا لفظ استعمال فرمانا در اصل استحباب کے حکم کو مؤکد کرنا ہے: اور اس کی وجہ خاص طور پر یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں مسجدیں بہت تنگ اور چھوٹی ہوتی تھیں اور مسلمان صوف کا استعمال کرتے تھے نیز محنت و مشقت بہت زیادہ کیا کرتے تھے چنانچہ جب ان کو پسینہ آتا تھا تو اس کی بو کی وجہ سے آس پاس کے لوگ تکلیف محسوس کرتے تھے اس لئے آپ ﷺ نے اس حکم میں واجب کا لفظ استعمال فرمایا ہے تاکہ لوگ جمعہ کے روز غسل کے اس حکم کو جلدی قبول کرلیں اور اس پر پابندی سے عمل پیرا ہوں۔

(۳) وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَقٌّ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ اَنْ یَّغْتَسِلَ فِیْ کُلِّ سَبْعَۃِ اَیَّامٍ یَوْمًا یَغْسِلُ فِیْہِ رَأْسَہٗ وَجَسَدَہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ہر (عاقل بالغ) مسلمان پر حق ہے (یعنی ثابت اور لازم ہے یا لائق ہے) کہ ہر ہفتہ میں ایک دن (یعنی جمعہ کو) نہائے اور اپنا سارا بدن دھوئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۴) وَعَنْ سَمُرَۃَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فَبِھَا وَنِعْمَتْ وَمَنِ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ اَفْضَلُ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و الترمذی و النسائی والدارمی)

"حضرت سمرہ ابن جندبؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" جس نے جمعہ کے روز وضو ہی کر لیا تو اس نے فرض ادا کیا اور یہ بہت اچھا فرض ہے اور جس شخص نے (نماز جمعہ کے لئے) غسل کیا تو یہ بہت اچھا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: فَبِھَا وَنِعْمَتْ کا مطلب یہ ہے کہ فبھا بفریضہ اخذ و نعمت الفریضہ یعنی (جس شخص نے نماز کے لئے غسل کیا اس نے فرض ادا کیا اور وہ فرض کیا ہی خوب ہے؟
اس سے پہلے حضرت ابوسعید خدریؓ کی جو روایت گزری ہے اس سے تو معلوم ہوتا تھا کہ جمعہ کے روز غسل کرنا واجب ہے مگر یہ حدیث بصراحت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جمعہ کے روز غسل کرنا واجب نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔

(۵) وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ غَسَّلَ مَیِّتًا فَلْیَغْتَسِلْ۔ (رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَ زَادَ اَحْمَدُ وَ التِّرْمِذِیُّ وَ اَبُوْدَاؤدَ وَمَنْ حَمَلَہٗ فَلْیَتَوَضَّأْ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے مردے کو نہلایا ہو اسے خود بھی نہا لینا چاہئے۔" (ابن ماجہؒ) اور احمدؒ، ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے (اس حدیث میں) مزید نقل کیا ہے کہ "آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) جو شخص جنازہ کو کاندھا دینے کا ارادہ کرے اسے وضو کر لینا چاہئے"۔"

تشریح: اس حدیث سے دو چیزیں معلوم ہوئیں۔ اول تو یہ کہ جب کوئی شخص کسی مردہ کو نہلائے تو اسے چاہئے کہ غسل میت سے فراغت کے بعد خود بھی نہا لے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ میت کو غسل دیتے وقت اس کے اوپر چھینٹیں وغیرہ پڑ گئی ہوں لہٰذا پاکی اور صفائی کے لئے نہا لینا مناسب ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک غسل میت کے بعد نہانے کا یہ حکم استحباب کے درجہ میں ہے کیونکہ ایک حدیث صحیح میں یہ ارشاد منقول ہے کہ "اگر تم مردہ کو نہلاؤ تو تم پر غسل لازم نہیں ہے۔

اس حدیث سے دوسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ جب کوئی شخص جنازہ کو اٹھانے کا ارادہ کرے تو اسے وضو کر لینا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص باوضو ہو کر جنازہ کو اٹھائے گا تو جب نماز پڑھنے کی جگہ جنازہ رکھا جائے گا اور غالباً نماز جنازہ شروع ہو گی تو وہ فوراً نماز میں شریک ہو جائے گا یہ نہیں ہو گا وہ تو جنازہ رکھ کر وضو کرنے چلا جائے اور ادھر نماز بھی ہو جائے۔ اس حکم کے بارے میں بھی متفقہ طور پر سب کی رائے یہی ہے کہ یہ حکم استحباب کے درجہ میں ہے یعنی جنازہ اٹھانے سے پہلے وضو کر لینا مستحب ہے ضروری اور واجب نہیں ہے۔"

(۶) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَغْتَسِلُ مِنْ اَرْبَعٍ مِنَ الْجَنَابَةِ وَيَوْمَ الْجُمُعَةِ وَمِنَ الْحِجَامَةِ وَمِنْ غُسْلِ الْمَيِّتِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے نہانے کا حکم دیا کرتے تھے۔ (۱) جنابت یعنی ناپاکی سے (۲) جمعہ کے واسطے (۳) سینگی کھنچوانے سے (۴) مردہ کو نہلانے سے۔" (ابوداؤد)

تشریح: یَغْتَسِلُ کا اگر لفظی ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ سرکار دو عالم ﷺ ان چار چیزوں کی وجہ سے غسل فرمایا کرتے تھے۔" مگر نبی کریم ﷺ کے بارے میں چونکہ یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی کسی مردہ کو نہلایا ہو اس لئے یغتسل کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ ان چار چیزوں کی وجہ سے نہانے کا حکم فرمایا کرتے تھے۔"

بہرحال: ان چار چیزوں میں جنابت یعنی ناپاکی کا غسل تو فرض ہے باقی سب مستحب ہے۔ سینگی کھنچوانے یعنی پچھنے لگوانے کے بعد غسل کرنے کا حکم صفائی و ستھرائی کے لئے ہے گویا پچھنے لگوانے کے بعد اس لئے نہا لینا چاہئے کہ اس کی وجہ سے جو خون وغیرہ لگ گیا ہو اس سے پاکی و صفائی حاصل ہو جائے۔

(۷) وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عَاصِمٍ اَنَّهُ اَسْلَمَ فَاَمَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّغْتَسِلَ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ۔
(رواہ الترمذی و ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت قیسؓ ابن عاصمؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ جب اسلام کی دولت سے بہرور ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں سے نہائیں۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ اور نسائیؒ)

تشریح: اگر کوئی کافر ایسی حالت میں مسلمان ہو کہ وہ حالت جنابت میں تھا تو اس شکل میں اُسے غسل کرنا واجب ہے۔ ورنہ تو اسلام لانے کے بعد نہانا مستحب ہے اور اس سلسلہ میں صحیح اور اولیٰ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان ہونا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ پہلے کلمۂ شہادت پڑھ لے اس کے بعد نہائے۔ اس طرح اس کے لئے یہ بھی سنت ہے کہ نہانے سے پہلے سر منڈا لے۔ آپ ﷺ نے حضرت قیسؓ کو

---

[1] حضرت قیس بن عاصم کی کنیت ابوعلی ہے بن عبدالبر۔

پانی کے ساتھ بیری کے پتوں سے بھی نہانے کا حکم اس لئے دیا تاکہ پاکی اور صفائی پوری طرح حاصل ہو جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑧ عَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ إِنَّ أُنَاسًا مِنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ جَاءُوْا فَقَالُوْا يَا ابْنَ عَبَّاسٍ أَتَرَى الْغُسْلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاجِبًا قَالَ لَا وَلٰكِنَّهُ أَطْهَرُ وَخَيْرٌ لِمَنِ اغْتَسَلَ وَمَنْ لَمْ يَغْتَسِلْ فَلَيْسَ عَلَيْهِ بِوَاجِبٍ وَسَأُخْبِرُكُمْ كَيْفَ بَدْءُ الْغُسْلِ كَانَ النَّاسُ مَجْهُوْدِيْنَ يَلْبَسُوْنَ الصُّوْفَ وَيَعْمَلُوْنَ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ وَكَانَ مَسْجِدُهُمْ ضَيِّقًا مُقَارِبَ السَّقْفِ إِنَّمَا هُوَ عَرِيْشٌ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ يَوْمٍ حَارٍّ وَعَرِقَ النَّاسُ فِيْ ذٰلِكَ الصُّوْفِ حَتّٰى ثَارَتْ مِنْهُمْ رِيَاحٌ آذٰى بِذٰلِكَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَلَمَّا وَجَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ الرِّيَاحَ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِذَا كَانَ هٰذَا الْيَوْمُ فَاغْتَسِلُوْا وَلْيَمَسَّ أَحَدُكُمْ أَفْضَلَ مَا يَجِدُ مِنْ دُهْنِهِ وَطِيْبِهِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ ثُمَّ جَاءَ اللّٰهُ بِالْخَيْرِ وَلَبِسُوْا غَيْرَ الصُّوْفِ وَكُفُوا الْعَمَلَ وَوُسِّعَ مَسْجِدُهُمْ وَذَهَبَ بَعْضُ الَّذِيْ كَانَ يُؤْذِيْ بَعْضُهُمْ بَعْضًا مِنَ الْعَرَقِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عکرمہؓ راوی ہیں کہ عراق کے چند آدمی آئے اور حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا آپ کی رائے میں جمعہ کے دن نہانا واجب ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! مگر (جمعہ کے دن نہانا) بہت زیادہ صفائی اور ستھرائی ہے اور جو شخص غسل کرلے اس کے لئے بہتر ہے اور جو شخص نہ نہائے اس پر واجب بھی نہیں ہے اور میں تم کو بتاتا ہوں کہ جمعہ کے دن غسل کی ابتداء کیوں کر ہوئی؟ (یعنی جمعہ کے روز غسل کس وجہ سے شروع ہوا تو اصل بات یہ تھی کہ اسلام کے شروع زمانہ میں) بعض نادار صحابہ صوف پہنتے تھے اور پیٹھ پر (بوجھ اٹھانے کا) کام کرتے تھے، ان کی مسجد تنگ تھی جس کی چھت نیچی اور کھجور کی ٹہنیوں کی تھی۔ ایک مرتبہ جمعہ کے دن جب سخت گرمی کی وجہ سے) صوف کے اندر لوگ پسینہ سے تر ہو گئے، یہاں تک کہ (پسینہ کی) بدبو پھیلی جس سے لوگ آپس میں تکلیف محسوس کرنے لگے۔ جب سرکار دو عالم ﷺ کو بدبو کا احساس ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "لوگو! جب جمعہ کا دن ہو تو غسل کر لیا کرو بلکہ تم سے جسے تیل یا خوشبو مثلاً عطر وغیرہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی فراوانی کی تو لوگوں نے صوف چھوڑ کر (عمدہ) کپڑے استعمال کرنے شروع کر دیئے محنت و مشقت کے کام بھی چھوٹ گئے، مسجد بھی وسیع ہو گئی اور پسینہ کی وجہ سے جو لوگوں کو آپس میں تکلیف ہوتی تھی وہ بھی جاتی رہی۔" (ابوداؤد)

تشریح: شروع میں جب کہ اسلام کا ابتدائی دور تھا مسلمانوں کی زندگی محنت و مشقت اور تنگی و ناداری سے بھرپور تھی، ایسے، بہت کم صحابہؓ تھے جو مال دار اور خوش حال تھے۔ زیادتی اور کثرت ایسے ہی لوگوں کی تھی جو دن بھر محنت و مشقت کرتے اور جنگلوں اور شہروں میں مزدوری کرتے۔ اس طرح وہ حضرات مشکلات و پریشانی کی جکڑ بندیوں میں رہ کر اپنے دین و ایمان کی آبیاری کیا کرتے تھے۔ لیکن تنگی و پریشان حالی کا یہ دور زیادہ عرصہ نہیں رہا جب اسلام کی حقیقت آفریں آواز مکہ اور مدینہ کی گھاٹیوں سے نکل کر عالم کے دوسرے حصوں میں پہنچی اور مسلمانوں کے لشکر خدا اور خدا کے رسول کا نام بلند کرنے کے لئے ان تمام سختیوں اور پریشانیوں کو زاد راہ بناتے ہوئے قیصر و کسریٰ جیسے والیان ملک کی حشمت و سطوت اور شان و شوکت سے جا ٹکرائے اور جس کے نتیجہ میں انہوں نے دنیا کے اکثر حصوں پر اپنی فتح و نصرت کا علم گاڑ دیئے تو تنگی و پریشان حالی کا وہ دور خدا نے فراخی و وسعت میں تبدیل کر دیا۔ اب مسلمان نادار اور پریشان حال نہ رہے بلکہ مالدار اور خوش حال ہو گئے اور محنت و مشقت کی جگہ دنیا کی جہانبانی و مسند آرائی نے لے لی۔

اس حدیث میں حضرت ابن عباسؓ نے جمعہ کے روز غسل کے حکم کی وجہ بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کے ان دونوں دور کا ایک ہلکا اور لطیف خاکہ پیش فرمایا ہے کہ پہلے تو مسلمان اتنے نادار اور تنگ دست تھے کہ نہ تو ان کے پاس ڈھنگ سے پہننے کے کپڑے تھے اور نہ معیشت کی دوسری آسانیاں میسر تھیں بلکہ وہ لوگ دن بھر محنت و مزدوری کر کے سوکھا روکھا کھاتے اور صوف پہنا کرتے تھے جس کی وجہ

سے جب سخت گرمی میں ان کو پسینہ آتا تو مسجد میں بیٹھے ہوئے آس پاس کے لوگوں کو پسینہ کی بو سے تکلیف ہوا کرتی تھی۔ مگر جب بعد میں خدا نے ان پر مال وزر کے دروازے کھول دیئے تو وہ بغیر کسی کوشش اور محنت کے مال دار اور خوش حال ہو گئے اور خدا نے ان پر اسباب معیشت کی بے انتہا فراوانی کردی۔

حدیث کے آخری لفظ بعضًا مِنَ العِرَقِ میں لفظ من بیان ہے لفظ بعض کا اور یہاں بعض سے مراد اکثر ہے اس طرح اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ اکثر لوگوں کے پسینے جو آپس میں لوگوں کو تکلیف پہنچاتے تھے خوشحالی اور اسباب معیشت کی فراوانی کی وجہ سے ختم ہو گئے۔

بہر حال حضرت ابن عباسؓ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پسینہ کی بدبو کی کثرت کی وجہ سے ابتداء اسلام میں جمعہ کے روز غسل کرنا واجب تھا مگر جب اسباب معیشت کی فراوانی اور مسلمانوں کی خوشحالی کی وجہ سے یہ چیز کم ہو گئی تو غسل کے وجوب کا حکم منسوخ ہو گیا اور اس کی جگہ سنت کے حکم نے لے لی۔ اس طرح اب جمعہ کے روز غسل کرنا واجب نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔

باب الحیض

حیض کا بیان

لغت میں "حیض" کے معنی "جاری ہونا" ہیں اور اصطلاح شریعت میں حیض اس خون کو کہا جاتا ہے جو عورت کے رحم سے بغیر کسی بیماری اور ولادت کے جاری ہوتا ہے اور جسے عرف عام میں "ماہواری" یا ایام بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح رحم عورت سے جو خون کسی مرض کی وجہ سے آتا ہے اسے استحاضہ اور جو خون ولادت کے بعد جاری ہوتا ہے اسے "نفاس" کہتے ہیں۔

حیض کی مدت کم سے کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے لہٰذا اس مدت میں خون خالص سفیدی کے علاوہ جس رنگ میں بھی آئے وہ حیض کا خون شمار ہوگا یعنی حیض کے خون کا رنگ سرخ بھی ہوتا ہے اور سیاہ و سبز بھی، نیز زرد اور مٹی کے رنگ جیسا بھی حیض کے خون کا رنگ ہوتا ہے۔ ایام حیض میں نماز، روزہ نہ کرنا چاہئے البتہ ایام گزر جانے کے بعد روزے تو قضاء ادا کئے جائیں مگر نماز کی قضا نہیں ہوگی۔

مناسب ہے کہ اس موقعہ پر حیض کے کچھ مسائل و احکام (ماخوذ از علم الفقہ) ذکر کر دیئے جائیں۔

① اگر کوئی عورت سو کر اٹھنے کے بعد خون دیکھے تو اس کا حیض اسی وقت سے شمار ہوگا جب سے وہ بیدار ہوئی ہے اس سے پہلے نہیں اور اگر کوئی حائضہ عورت سو کر اٹھنے کے بعد اپنے کو طاہر پائے تو جب سے سوئی ہے اسی وقت سے طاہر سمجھی جائے گی۔

② حیض و نفاس کی حالت میں عورت کے ناف اور زانوں کے درمیان کے جسم کو دیکھنا یا اس سے اپنے جسم کو ملانا بشرطیکہ کوئی کپڑا درمیان میں نہ ہو مکروہ تحریمی ہے اور جماع کرنا حرام ہے۔

③ حیض والی عورت اگر کسی کو قرآن مجید پڑھاتی ہو تو اس کو ایک ایک الفاظ رک رک کر پڑھانے کی غرض سے کہنا جائز ہے۔ ہاں پوری آیت ایک دم پڑھ لینا اس وقت بھی ناجائز ہے۔

④ حیض و نفاس کی حالت میں عورت کے بوسے لینا، اس کا جھوٹا پانی وغیرہ پینا اور اس سے لپٹ کر سونا اور اس کے ناف اور ناف کے اوپر اور زانوں کے نیچے کے جسم سے اپنے جسم کو ملانا اگرچہ کپڑا درمیان میں نہ ہو اور ناف و زانوں کے درمیان کپڑے کے ساتھ ملانا جائز ہے بلکہ حیض والی عورت سے علیحدہ ہو کر سونا یا اس کے اختلاط سے بچنا مکروہ ہے۔

⑤ جس عورت کا حیض دس دن رات آکر بند ہوا ہو تو اس سے بغیر غسل کے خون بند ہوتے ہی جماع جائز ہے اور جس عورت کا خون دس دن رات سے کم آکر بند ہوا ہو تو اگر اس کی عادت سے بھی کم آکر بند ہوا ہے تو اس سے جماع جائز نہیں۔ جب تک کہ اس کی نہ گزر جائے

اگرچہ غسل بھی کر چکے اور عادت

کے موافق اگر بند ہوا ہے تو جب تک غسل نہ کرے یا ایک نماز کا وقت نہ گزر جائے جماع جائز نہیں۔ نماز کا وقت گزر جانے کے بعد بغیر غسل کے بھی جائز ہوگا۔ نماز کا وقت گزر جانے سے یہ مقصود ہے کہ اگر شروع وقت میں خون بند ہوا تو باقی وقت سب گزر جائے اور اگر آخر وقت میں خون بند ہوا تو اس قدر وقت ہونا ضروری ہے کہ جس میں غسل کر کے نماز کی نیت کرنے کی گنجائش ہو اور اگر اس سے بھی کم وقت باقی ہو تو پھر اس کا اعتبار نہیں دوسری نماز کا پورا وقت گزرنا ضروری ہے۔ یہی حکم نفاس کا ہے کہ اگر چالیس دن آ کر بند ہوا ہو تو خون بند ہوتے ہی بغیر غسل کے اور اگر چالیس دن سے کم آ کر بند ہوا ہو تو اور عادت سے بھی کم ہو تو بعد عادت گزر جانے کے اور اگر عادت کے موافق بند ہوا ہو تو غسل کے بعد یا نماز کا وقت گزر جانے کے بعد جماع وغیرہ جائز ہے۔ ہاں ان سب صورتوں میں مستحب ہے کہ بغیر غسل کے جماع نہ کیا جائے۔

❻ جس عورت کا خون دس دن رات سے کم آ کر بند ہوا ہو اور عادت مقرر ہو جانے کی شکل میں عادت سے بھی کم ہو تو اس کو نماز کے آخر وقت مستحب تک غسل میں تاخیر کرنا واجب ہے اس خیال سے کہ شاید پھر خون آ جائے مثلاً اگر عشاء کے شروع وقت خون بند ہوا ہو تو عشاء کے آخر وقت مستحب یعنی نصف شب کے قریب تک اس کو غسل میں تاخیر کرنا چاہئے اور جس عورت کا حیض دس دن یا عادت مقرر ہونے کی شکل میں عادت کے موافق آ کر بند ہوا ہو تو اس کو نماز کے آخر وقت مستحب تک غسل میں تاخیر کرنا مستحب ہے۔

❼ اگر کوئی عورت غیر زمانہ حیض میں کوئی ایسی دوا استعمال کرے جس سے خون آ جائے تو وہ حیض نہیں مثلاً کسی عورت کو مہینہ میں ایک دفعہ پانچ دن حیض ہو تو اس کے حیض کے پندرہ دن کے بعد کسی دوا کے استعمال سے خون آ جائے تو وہ حیض نہیں۔

❽ اگر کسی عادت والی عورت کو خون جاری ہو جائے اور برابر جاری رہے اور اس کو یہ یاد نہ رہے کہ مجھے کتنے دن حیض ہوتا تھا یا پھر یہ یاد نہ رہے کہ مہینہ کی کس کس تاریخ سے شروع ہوتا تھا اور کب ختم ہوتا تھا۔ یا دونوں باتیں یاد نہ رہے تو اس کو چاہئے کہ اپنے غالب گمان پر عمل کرے یعنی جس زمانہ کو وہ حیض کا زمانہ خیال کرے اس زمانہ میں حیض کے احکام پر عمل کرے اور جس زمانہ کو طہارت کا زمانہ خیال کرے اس زمانہ میں طہارت کے احکام پر عمل کرے اور اگر اس کا گمان کسی طرف نہ ہو تو اس کو ہر نماز کے وقت نیا وضو کر کے نماز پڑھنا چاہئے اور روزہ بھی رکھے مگر جب اس کا یہ مرض رفع ہو جائے روزہ کی قضاء کرنی ہوگی اور اگر اس کو شک کی کیفیت ہو تو اس میں دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی زمانہ کی نسبت یہ شک ہو کہ زمانہ حیض کا طہر کا تو اس صورت میں ہر نماز کے وقت نیا وضو کر کے نماز پڑھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو کسی زمانہ کی نسبت پر شک ہو کہ یہ زمانہ حیض کا ہے یا طہر کا یا حیض سے خارج ہونے کا تو اس صورت میں وہ ہر نماز کے وقت غسل کر کے نماز پڑھا کرے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ الْیَهُوْدَ کَانُوْا اِذَا حَاضَتِ الْمَرْاَۃُ فِیْهِمْ لَمْ یُؤَاکِلُوْهَا وَلَمْ یُجَامِعُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ فَسَاَلَ اَصْحَابُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ الْاٰیَۃَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِصْنَعُوْا کُلَّ شَیْءٍ اِلَّا النِّکَاحَ فَبَلَغَ ذٰلِکَ الْیَهُوْدَ فَقَالُوْا مَا یُرِیْدُ هٰذَا الرَّجُلُ اَنْ یَّدَعَ مِنْ اَمْرِنَا شَیْئًا اِلَّا خَالَفَنَا فِیْهِ فَجَاءَ اُسَیْدُ بْنُ حُضَیْرٍ وَعَبَّادُ بْنُ بِشْرٍ فَقَالَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْیَهُوْدَ تَقُوْلُ کَذَا وَکَذَا اَفَلَا نُجَامِعُهُنَّ فَتَغَیَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنْ قَدْ وَجَدَ عَلَیْهِمَا فَخَرَجَا فَاسْتَقْبَلَتْهُمَا هَدِیَّۃٌ مِنْ لَبَنٍ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَرْسَلَ فِیْ اٰثَارِهِمَا فَسَقَاهُمَا فَعَرَفَا اَنَّهٗ لَمْ یَجِدْ عَلَیْهِمَا۔ (رواہ مسلم)

"حضرت انسؓ راوی ہیں کہ "یہود میں جو کوئی عورت ایام سے ہو جاتی تو وہ لوگ نہ صرف یہ کہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے نہ تھے بلکہ گھروں میں سونا بیٹھنا تک چھوڑ دیتے تھے چنانچہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ نے آپ ﷺ سے اس کے بارے میں حکم پوچھا (کہ حائضہ عورتوں کے بارہ میں یہودیوں کا تو یہ عمل ہے ہم کیا کریں؟) جبھی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ الْاٰیۃ (یعنی یہ لوگ

آپ ﷺ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں الخ" نازل فرمائی (آیت کے نازل ہونے کے بعد) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (تم اپنی عورتوں کے ساتھ جب کہ وہ حائضہ ہوں) سوائے صحبت کے جو چاہے کیا کرو جب یہ خبر یہودیوں کو پہنچی تو انہوں نے کہا یہ شخص یعنی محمد ﷺ ہمارے جس دینی امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس میں ہماری مخالفت ضرور کرتے ہیں۔" (یہود کی زبانی یہ سن کر دو صحابہ) حضرت اسید ابن حضیر اور حضرت عباد ابن بشرؓ (دربار رسالت میں) حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہودی ایسا ایسا کہہ رہے ہیں (یعنی انہوں نے یہودیوں کا کلام نقل کیا اور پھر یہ کہا کہ) اگر اجازت ہو (یہودیوں کی موافقت کے لئے) ہم اپنی عورتوں کا پاس (ایام حیض میں) رہنا سہنا چھوڑ دیں۔" (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا اور ہمیں یہ گمان ہو گیا کہ آپ ﷺ ان دونوں پر خفا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں بھی نکل کر چل دیئے۔ ان کے جاتے ہی آنحضرت ﷺ کے پاس کہیں سے تحفہ میں دودھ آگیا، آپ ﷺ نے ان دونوں کے پیچھے (کسی شخص کو بلانے کے لئے) بھیجا (جب وہ آگئے تو) آپ ﷺ نے انہیں وہ دودھ پلا دیا (تاکہ انہیں آنحضرت ﷺ کے لطف و کرم کا احساس ہو جائے چنانچہ دودھ پینے کے بعد انہوں نے جانا کہ آنحضرت ﷺ ہم سے ناراض نہیں ہیں۔" (مسلم)

تشریح: پوری آیت یہ ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ۔

"اور (اے محمد ﷺ) صحابہؓ حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں سو آپ (ﷺ) ان سے کہہ دیجئے کہ وہ تو نجاست ہے لہٰذا ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اس سے مقاربت نہ کرو۔"

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور ان سے مقاربت نہ کرنے کا حکم دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیویوں سے حیض کی حالت میں جماع نہ کرو، اور اس کے علاوہ تمام چیزیں جائز ہیں۔ یعنی ان کے ساتھ کھانا، پینا، گھروں میں رہنا سہنا، لیٹنا، بیٹھنا یہاں تک کہ عورت کے ناف کے اوپر کے حصہ سے اپنا بدن ملانا یا ہاتھ لگانا یہ سب چیزیں جائز ہیں۔

لہٰذا اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایام حیض میں اگر کوئی شخص جماع کرے گا تو وہ شخص گنہ گار ہو گا کیونکہ یہ حرام ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنی عورت سے ایام حیض میں یہ سمجھ کر جماع کرے کہ یہ حلال اور جائز ہے تو وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ اس کا حرام ہونا قرآن سے ثابت ہوتا ہے، (دونوں صحابہؓ نے یہود کی باتیں سن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جو معروضہ پیش کیا تھا اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیجئے کہ خدانخواستہ ان کے ذہن میں اس حکم کی کوئی اہمیت نہ تھی یا یہ کہ ایک اسلامی حکم کے مقابلہ میں یہودیوں کی بات کا انہیں زیادہ خیال تھا بلکہ ان کا مطلب تو صرف یہ تھا کہ آپ ﷺ اجازت دیں تو ہم عورتوں کے ساتھ ایام حیض میں اٹھنا بیٹھنا ترک کر دیں اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیں، تاکہ یہود جو طعن کرتے ہیں وہ نہ کریں اور ہم آپس میں الفت و یک جہتی کے ساتھ رہا کریں۔

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَغْتَسِلُ اَنَا وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اِنَاءٍ وَّاحِدٍ وَكِلَانَا جُنُبٌ وَكَانَ يَاْمُرُنِي فَاَتَّزِرُ فَيُبَاشِرُنِي وَاَنَا حَائِضٌ وَكَانَ يُخْرِجُ رَاْسَهٗ اِلَيَّ وَهُوَ مُعْتَكِفٌ فَاَغْسِلُهٗ وَاَنَا حَائِضٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "میں اور نبی کریم ﷺ دونوں جنابت کی حالت میں ایک برتن سے نہا لیا کرتے تھے۔ (اور بعض اوقات) میں ایام سے ہوتی تو آپ ﷺ مجھے (تہ بند باندھنے کے واسطے) ارشاد فرماتے جب میں تہ بند باندھ لیتی تو آپ ﷺ مجھ سے (ناف کے اوپر اوپر) اپنے بدن لگا کر لیٹ جایا کرتے تھے اور (بعض مرتبہ) آپ اعتکاف میں ہوتے اور اپنا سر مبارک (مسجد سے) باہر نکال دیتے تو میں اپنے ایام کی حالت میں آپ ﷺ کا سر مبارک دھویا کرتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عرب کے قاعدہ اور معمول کے مطابق ایک بڑا برتن جو طشت کے قسم کا ہوتا تھا پانی سے بھرا ہوا آنحضرت ﷺ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان رکھا رہتا اور یہ دونوں اس میں سے چلو بھر بھر کر نہاتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت کے جسم کے اس حصہ سے فائدہ اٹھانا جو ناف کے نیچے اور زانو کے اوپر ہوتا ہے حرام ہے۔ یعنی وہاں ہاتھ لگانا اور جماع کرنا ممنوع ہے چنانچہ اس کی وضاحت دوسری احادیث سے بھی ہوتی ہے اور یہی مسلک امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔

امام محمدؒ، امام احمدؒ اور بعض شوافع حضرات کا مسلک یہ ہے کہ حائضہ عورت سے صرف وطی یعنی شرمگاہ میں دخول کرنا حرام ہے۔

حضرت عائشہؓ کا حجرہ مسجد سے بالکل ملا ہوا تھا یہاں تک کہ اس کا دروازہ بھی مسجد ہی کی طرف کھلا ہوا تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ جب اعتکاف میں ہوتے تھے تو اپنے سر مبارک اسی دروازے سے حجرے کی طرف نکال دیتے تھے وہاں حضرت عائشہؓ بیٹھ کر آپ ﷺ کا سر مبارک دھو دیتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اعتکاف میں بیٹھا ہو اور اپنے جسم کے کسی حصہ کو مسجد سے باہر نکالے تو اسے اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔

(۳) وَعَنْهَا قَالَتْ كُنْتُ اَشْرَبُ وَاَنَا حَائِضٌ ثُمَّ اُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَضَعُ فَاهُ عَلٰى مَوْضِعِ فِيَّ فَيَشْرَبُ وَاَتَعَرَّقُ الْعَرْقَ وَاَنَا حَائِضٌ ثُمَّ اُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَضَعُ فَاهُ عَلٰى مَوْضِعِ فِيَّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں حالت ایام میں پانی پی کر (وہ برتن) نبی کریم ﷺ کو دے دیا کرتی تھی آپ ﷺ اسی جگہ سے جہاں میرا منہ لگا تھا منہ لگا کر پی لیتے اور کبھی میں ایام کی حالت میں ہڈی سے گوشت نوچ کر کھاتی پھر وہ ہڈی آنحضرت ﷺ کو دے دیتی آپ ﷺ اسی جگہ پر منہ رکھ کر گوشتؓ کو نوچتے جہاں میں نے منہ رکھ کر نوچا تھا۔" (مسلم)

تشریح: آپ ﷺ کا یہ عمل دو وجہ سے ہوا کرتا تھا اول تو یہ کہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بے انتہا محبت تھی دوسرے یہ کہ آپ ﷺ کو یہودیوں کی مخالفت منظور ہوتی تھی چنانچہ یہودی تو کہاں حائضہ عورت کے ساتھ گھر میں رہنا اور ان کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہ کرتے تھے اور ادھر یہ معمول تھا کہ حضرت عائشہؓ ایام حیض میں برتن میں جس جگہ سے منہ لگا کر پانی پیا کرتی تھیں آپ ﷺ بھی اسی جگہ منہ (لگا کر پانی پیتے اور حضرت عائشہؓ جس جگہ سے منہ لگا کر ہڈی سے گوشت کو نوچا کرتی تھیں آپ ﷺ بھی اسی جگہ منہ لگا کر ہڈی سے گوشت نوچا کرتے تھے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ کھانا پینا اور اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا جائز ہے نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حائضہ عورت کے اعضاء بدن نجس و ناپاک نہیں ہوتے۔

(۴) وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَّكِئُ فِيْ حِجْرِيْ وَاَنَا حَائِضٌ ثُمَّ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ "میں ایام کی حالت میں ہوتی اور نبی کریم ﷺ میری گود میں سہارا دے کر بیٹھ جاتے اور قرآن کریم پڑھتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث نے بھی اس بات کی وضاحت کر دی کہ حائضہ عورت ظاہری طور پر ناپاک ہوتی ہے اس کی ناپاکی کا حکم صرف حکما ہے اس لئے اگر حائضہ عورت ظاہراً پاک نہ ہوتی اور اس کے بدن کے اعضاء نجس ہوتے تو سرکار دو عالم ﷺ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی گود میں سہارا دے کر جب کہ وہ حالت ایام میں ہوا کرتی تھیں نہ بیٹھتے اور نہ اس طرح بیٹھ کر قرآن کریم پڑھتے۔

(۵) وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاوِلِيْنِي الْخُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَقُلْتُ اِنِّيْ حَائِضٌ فَقَالَ اِنَّ حَيْضَتَكِ لَيْسَتْ فِيْ يَدِكِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ مسجد میں سے چھوٹا بوریہ (جانماز) اٹھا کر مجھے دے دو" (یعنی باہر کھڑی ہو کر اندر ہاتھ ڈال کر بوریا اٹھا لاؤ) میں نے عرض کیا کہ میں تو ایام سے ہوں۔ (اس لئے مسجد میں ہاتھ کیسے داخل کر سکتی ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارے ہاتھ میں تو حیض نہیں ہے۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حائضہ مسجد سے باہر کھڑی ہو کر مسجد کے اندر سے کوئی چیز اٹھالے تو جائز ہے۔ کیونکہ ایام والی عورت کو صرف مسجد کے اندر جانا منع ہے نہ کہ مسجد کے اندر ہاتھ داخل کرنا بھی۔

(۶) وَعَنْ مَيْمُوْنَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِي مِرْطٍ بَعْضُهُ عَلَيَّ وَبَعْضُهُ عَلَيْهِ وَاَنَا حَائِضٌ۔ (متفق علیہ)

"اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ فرماتی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ ایک ایسی چادر میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے کہ جس کا کچھ حصہ تو آپ ﷺ کے اوپر ہوتا تھا اور کچھ حصہ مجھ پر ہوتا تھا اور میں ایام سے ہوتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ حائضہ کا پورا جسم ناپاک نہیں ہوتا بلکہ اس کی شرم گاہ کے علاوہ تمام بدن پاک ہوتا ہے کیونکہ حائضہ کا پورا بدن اگر ناپاک ہوتا ہو تو ایسی چادر میں نماز جائز نہ ہوتی جس کا بعض حصہ تو نمازی پر پڑا ہو اور بعض حصہ نجاست و ناپاکی پر۔

حضرت سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں کہ "صاحب تخریج نے لکھا ہے کہ میں نے یہ حدیث یعنی بخاری و مسلم میں ان کے الفاظ کے ساتھ نہیں پائی ہے البتہ ان میں نیز ابوداؤد میں اس مضمون کی احادیث مذکور ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

(۷) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَتٰى حَائِضًا اَوِامْرَأَةً فِيْ دُبُرِهَا اَوْ كَاهِنًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ ابْنُ مَاجَةَ وَ الدَّارِمِيُّ وَفِيْ رِوَايَتِهِمَا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ لَا نَعْرِفُ هٰذَا الْحَدِيْثَ اِلَّا مِنْ حَكِيْمِ الْاَثْرَمِ عَنْ اَبِيْ تَمِيْمَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے ایام والی عورت سے صحبت کی یا عورت کے پیچھے کی طرف بدفعلی کی۔ یا کسی کاہن کے پاس (غیب کی باتیں پوچھنے) گیا تو اس شخص نے (گویا) محمد (ﷺ) پر نازل کئے گئے دین کا کفر کیا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) "ابن ماجہؒ اور دارمیؒ کی روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "کاہن کے کہے ہوئے کی اس نے تصدیق بھی کر دی تو وہ کافر ہے۔ اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ "ہمیں یہ حدیث معلوم نہیں سوائے اس سند کے کہ اسے حکیم اثرم، ابوتمیمہ سے نقل کرتے ہیں اور وہ ابوہریرہؓ سے۔"

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلال اور جائز سمجھ کر کسی حائضہ سے جماع کرے یا کسی عورت کے پیچھے کی طرف بدفعلی کرے یا کاہن کے پاس جائے اور کاہن اسے غیب کے متعلق جو چیزیں بتائے انہیں وہ سچ جانے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

اور اگر یہ شکل ہو کہ کوئی شخص حائضہ عورت سے جماع یا عورت سے لواطت کرے مگر یہ سمجھتا ہو کہ یہ حلال اور جائز نہیں ہے بلکہ حرام اور ناجائز ہے تو کافر نہیں ہوگا بلکہ فاسق ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کاہن کے پاس جائے مگر اس نے جو چیزیں بتائی ہیں اس کو سچ نہ جانے تو بھی فاسق ہوگا۔ اس صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص نے ایسا کیا گویا اس نے کفران نعمت کیا۔"

کاہن ان شخص کو کہتے ہیں جو آئندہ واقعات کی خبر دیتا ہے اور نجومی اسے کہتے ہیں جو ستاروں کی مدد سے خبر دیتا ہے۔ کاہن اور نجومی

دونوں کا ایک ہی حکم ہے کہ جس طرح کاہن کے پاس غیب کی خبریں جاننے کے لئے ممنوع ہے اور اس کی دی ہوئی خبر پر یقین کرنا کفر ہے اسی طرح نجومی کے پاس بھی جانا فسق اور اس کی بتائی باتوں کو سچ جاننا کفر ہے۔

اس حدیث میں پیچھے کی طرف بدفعلی کرنے کے سلسلہ میں صرف عورت کی جو قید لگائی ہے وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مرد سے اغلام کرنا اس سے بھی زیادہ برا ہے۔"

⑧ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يَحِلُّ لِيْ مِنْ اِمْرَأَتِيْ وَهِيَ حَائِضٌ قَالَ مَا فَوْقَ الْاِزَارِ وَالتَّعَفُّفُ عَنْ ذٰلِكَ اَفْضَلُ۔ (رَوَاهُ رَزِيْنٌ وَقَالَ مُحْيِ السُّنَّةِ اِسْنَادُهُ لَيْسَ بِقَوِيٍّ)

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ کہتے ہیں کہ "میں نے عرض کیا" یا رسول اللہ (ﷺ)! میری بیوی کی ایام کی حالت میں میرے واسطے کیا کیا جائز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "وہ چیز جو تہ بند کے اوپر ہو۔ اور اس سے بھی بچنا بہت ہی بہتر ہے۔" (رزین اور محی السنۃ" فرماتے ہیں اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے ایام کی حالت میں اس کی تہ بند کے اوپر ہاتھ وغیرہ لگانا یا تہ بند کے اوپر اختلاط کرنا اور بوس وکنار کرنا جائز ہے۔ مگر ان چیزوں سے بھی پرہیز کرنے کو زیادہ بہتر اور افضل اس لئے کہا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان امور کی وجہ سے خواہش نفسانی بھڑک اٹھے اور کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو کر جماع کر بیٹھے اس لئے اس حرام فعل سے بچنے کے لئے مناسب ہے کہ ان امور سے بھی اجتناب کیا جائے جو اس کے لئے ممد اور سبب بنتے ہیں۔

اور جہاں تک آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس کا سوال ہے کہ آپ ﷺ کے بارہ میں منقول ہے کہ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے تہ بند کے اوپر اوپر ہاتھ لگاتے تھے اور اختلاط کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکار دو عالم ﷺ اپنے نفس اور جذبات پر قادر تھے۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگوں سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی وہ آنحضرت ﷺ کی طرح اپنے جذبات اور نفس پر قابو رکھ سکیں گے۔

بہرحال۔ مسلک کے اعتبار سے یہ حدیث بھی حنفیہ کی ہی تائید کرتی ہے۔

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَقَعَ الرَّجُلُ بِاَهْلِهٖ وَهِيَ حَائِضٌ فَلْيَتَصَدَّقْ بِنِصْفِ دِيْنَارٍ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و النسائی و الدارمی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اگر کوئی شخص اپنی حائضہ بیوی سے جماع کرے تو اسے نصف دینار صدقہ کر دینا چاہئے۔" (ترمذی"، ابوداؤد"، دارمی"، ابن ماجہ"، نسائی")

تشریح: ایک دینار ساڑھے چار ماشہ سونے کا ہوتا ہے۔ اگر سونا سو روپے تولہ ہو تو ایک دینار چھ روپے کا ہوا اور آدھا دینار تین روپیہ کا۔ خطابی نے کہا ہے کہ اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی حائضہ بیوی سے جماع کرلے تو اس کا کفارہ صرف استغفار ہے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ" اور حضرت امام شافعی" کا یہی مسلک ہے مگر امام شافعی" یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنی حائضہ عورت سے اس وقت جماع کیا جب کہ خون جاری تھا تو اسے ایک دینار صدقہ کرنا مستحب ہے اسی طرح اگر کسی نے انقطاع خون کے بعد صحبت کی تو اسے بھی نصف دینار صدقہ کرنا مستحب ہے۔

حضرت ابن ہمام حنفی" بھی یہی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے حائضہ بیوی سے یہ سمجھ کر صحبت کرے کہ یہ حلال ہے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور جس شخص نے اسے حرام سمجھتے ہوئے کیا تو اس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خداوند کریم کی بارگاہ میں اس حرام فعل کے صدور پر شرمسار ہو کر اس سے توبہ وبخشش کا خواستگار ہو اور ایک دینار یا نصف دینار از روئے استحباب صدقہ کرلے۔

محدثین فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ابن عباسؓ پر مرسل ہے یا موقوف ہے کیونکہ اس حدیث کا آنحضرت ﷺ تک مرفوع متصل ہونا ثابت نہیں ہے۔

(۱۰) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا كَانَ دَمًا أَحْمَرَ فَدِينَارٌ وَإِذَا كَانَ دَمًا أَصْفَرَ فَنِصْفُ دِينَارٍ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ایام کی حالت میں اگر حیض کا) خون سرخ رنگ کا ہو (اور اس حالت میں کوئی صحبت کرے) تو ایک پورا دینار اور اگر خون کا رنگ زرد ہو تو آدھا دینار (صدقہ کرنا لازم ہے)۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ حیض کی حالت میں جماع کرنے سے جو صدقہ دیا جاتا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ جماع کے وقت اگر حیض کے خون کا رنگ سرخ ہو تو ایک دینار صدقہ کرنا ضروری ہے اور اگر حیض کے خون کا رنگ زرد ہو تو آدھا دینار صدقہ کرنا چاہئے چنانچہ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ ابتدائے حیض میں صحبت کرنے کی وجہ سے ایک دینار اور حالت انقطاع میں نصف دینار مستحب ہے۔ وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ ابتداء میں حیض کے خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور آخر میں زرد ہو جاتا ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۱) عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ قَالَ إِنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا يَحِلُّ لِي مِنِ امْرَأَتِي وَهِيَ حَائِضٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَشُدُّ عَلَيْهَا إِزَارَهَا ثُمَّ شَأْنُكَ بِأَعْلَاهَا۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ وَالدَّارِمِيُّ مُرْسَلًا)

"حضرت زید ابن اسلمؒ (بھی) فرماتے ہیں کہ "ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میرے لئے میری بیوی سے جب کہ وہ ایام کی حالت میں ہو تو کیا جائز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس کے جسم پر اس کا تہ بند خوب مضبوط باندھ لو! پھر تہبند کے اوپر تمہارا کام ہے۔" (یعنی ناف سے اوپر تم کو اختلاط مباح ہے اور ناف کے نیچے حرام ہے۔" (مالکؒ اور دارمیؒ نے اس حدیث کو بطریق ارسال روایت کیا ہے)

(۱۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ إِذَا حِضْتُ نَزَلْتُ عَنِ الْمِثَالِ عَلَى الْحَصِيرِ فَلَمْ نَقْرُبْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ نَدْنُ مِنْهُ حَتّٰى نَطْهُرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "جب میں ایام سے ہو جاتی تو بستر سے اتر کر بوریہ پر آجاتی تھی، چنانچہ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جاتی نہ تو نبی کریم ﷺ ان کے نزدیک آتے تھے اور نہ وہ نبی کریم ﷺ کے نزدیک آتی تھیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بظاہر یہ حدیث ان احادیث کے بالکل برعکس ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے ایام کی حالت میں ان کے ساتھ ہم نشینی اختیار کرتے تھے چنانچہ خود حضرت عائشہؓ ہی سے ایسی احادیث مروی ہیں۔ جن میں انھوں نے بتایا ہے کہ آن حضرت ﷺ ان سے ایام حیض میں اختلاط کرتے تھے۔

لہٰذا اس تعارض کو ختم کرنے کے لئے یہ کہا جائے گا کہ یہ حدیث ان احادیث سے منسوخ ہے۔ یا پھر اس حدیث کی توجیہ یہ کی جائے گی کہ یہاں نزدیک نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ ایام کی حالت میں جماع کے لئے ایک دوسرے کے قریب نہ آتے تھے جیسا کہ قرآن مجید کی آیت وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ میں "ان کے نزدیک نہ آؤ جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں" کا مطلب یہ کیا جاتا ہے کہ "ان سے جماع نہ کرو جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں۔ یہاں حدیث کے الفاظ فَلَمْ يَقْرُبْ میں حرف یؔ زبر کے ساتھ اور حرف ر پیش کے ساتھ ہے اسی طرح لَمْ تدن حَتّٰى تطهر دونوں حرف ت کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ مشکوۃ کے اکثر صحیح نسخوں میں ایسی طرح یہ الفاظ مذکور ہیں مگر نسخہ سید جمال الدینؒ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ صحیح اسی طرح فلم نقرب نون اور حرف ر کے زبر کے ساتھ ہے نیز رسول اللہ ﷺ کے لام کو زبر

ہے۔ اسی طرح لم تدن پہلے نون کے زبر اور دوسرے نون کے پیش کے ساتھ ہے اور لفظ نطہر میں بھی نون ہے اور میرک شاہ نے لکھا ہے کہ "اصل ابوداؤد میں یہ الفاظ اسی طرح ہیں۔"

بَابُ الْمُسْتَحَاضَةِ

مستحاضہ کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَآءَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ اَبِي حُبَيْشٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي امْرَأَةٌ اُسْتَحَاضُ فَلَا اَطْهُرُ اَفَاَدَعُ الصَّلٰوةَ فَقَالَ لَا اِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ وَ لَيْسَ بِحَيْضٍ فَاِذَا اَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلَاةَ وَاِذَا اَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ "فاطمہ بنت ابی حبیش نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! میں ایک ایسی عورت ہوں جسے برابر (استحاضہ کا) خون آتا رہتا ہے۔ چنانچہ میں کسی وقت پاک نہیں رہتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "نہیں! یہ تو ایک رگ کا خون ہے، حیض کا خون نہیں ہے لہذا جب تمہیں حیض آنے لگے تو تم نماز چھوڑ دو اور جب حیض ختم ہو جائے تو "جسم سے" خون کو دھو ڈالو (اور نہا کر) نماز پڑھ لو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی عورت مستحاضہ ہو جائے اور وہ ہر وقت استحاضہ کے خون سے ناپاک رہے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ "اگر وہ ایسی عورت ہو جو معتادہ ہو یعنی اس کے حیض کے ایام مقرر ہوں مثلاً اسے ہر ماہ پانچ روز یا چھ روز خون آتا تھا تو جب وہ مستحاضہ ہو جائے تو اسے چاہئے کہ ان دونوں کو جن میں حیض کا خون آتا تھا ایام حیض قرار دے اور ان دنوں میں نماز وغیرہ چھوڑ دے اور جب وہ دن پورے ہو جائیں تو خون کو دھو کر نہائے اور نماز وغیرہ شروع کر دے۔

اور اگر وہ مبتدیہ ہو یعنی ایسی عورت ہو کہ پہلا ہی حیض آنے کے بعد وہ مستحاضہ ہو گئی جس کے نتیجہ میں استحاضہ کا خون برابر جاری ہو تو اسے چاہئے کہ وہ حیض کی انتہائی مدت یعنی دس دن کو ایام حیض قرار دے کر ان دنوں میں نماز وغیرہ چھوڑ دے اور بعد میں نہا دھو کر نماز وغیرہ شروع کر دے۔ اس صورت میں دوسرے ائمہ کے نزدیک عمل تمیز پر ہو گا یعنی اگر خون سیاہ رنگ کا ہو تو اسے حیض کا خون قرار دیا جائے گا اور اگر سیاہ رنگ کا نہ ہو تو وہ استحاضہ کا خون کہلائے گا جیسے کہ آگے والی حدیث سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حضرت امام اعظمؒ اس حدیث کے بارے میں جو آگے آرہی ہے اور جو حضرت عروہؒ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دو طرق سے روایت کی گئی ہے ایک تو ان میں سے مرسل ہے اور دوسری مضطرب اور یہ عجیب بات ہے کہ خون کے رنگ میں امتیاز کی بات صرف عروہؒ کی روایت ہی میں مذکور ہے جس کا حال معلوم ہو چکا کہ ایک طریق سے تو وہ مرسل ہے اور دوسرے طریق سے مضطرب لہٰذا اس حدیث پر کسی مسلک کی بنیاد رکھنا گویا اس مسلک کو کمزور کرنا ہے۔ اور یہ حدیث جو اوپر گزری جس میں دنوں کا اعتبار ہے اور جو ہماری دلیل ہے "صحیح" ہے لہٰذا اس حدیث پر عمل کرنا اولیٰ ہے، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فاطمہ بنت حبیش جنہوں نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر اپنے بارے میں حکم دریافت کیا تھا معتادہ تھیں۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مستحاضہ کو چاہئے کہ وہ ہر فرض نماز کے لئے اپنی شرم گاہ دھو لیا کرے۔ اور حضرت امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ جب نماز کا وقت آئے جب ہی اپنی شرم گاہ دھو لے پھر نہ دھوئے اور لنگوٹا باندھ کر جلدی جلدی وضو کر لے اس کے بعد جو خون

جاری رہے گا اس میں وہ معذور ہوگی لہٰذا آخر وقت تک وہ جو چاہے پڑھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۲) عَنْ عُرْوَۃَ بْنِ الزُّبَیْرِ عَنْ فَاطِمَۃَ بِنْتِ اَبِیْ حُبَیْشٍ اَنَّھَا کَانَتْ تُسْتَحَاضُ فَقَالَ لَھَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا کَانَ دَمُ الْحَیْضِ فَاِنَّہٗ دَمٌ اَسْوَدُ یُعْرَفُ فَاِذَا کَانَ ذٰلِکَ فَاَمْسِکِیْ عَنِ الصَّلٰوۃِ فَاِذَا کَانَ الْاٰخَرُ فَتَوَضَّئِیْ وَصَلِّیْ فَاِنَّمَا ھُوَ عِرْقٌ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"حضرت عروہ[1] بن زبیرؒ (تابعی) حضرت فاطمہ بنت ابی حبیشؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "انہیں استحاضہ کا خون آتا تھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ جب حیض کا خون آئے جس کی پہچان یہ ہے کہ وہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے تو اس وقت تم نماز پڑھنے سے رک جایا کرو اور جب استحاضہ کا خون آنے لگے (یعنی خون سیاہ رنگ کے علاوہ اور کسی رنگ کا ہو) تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو کیوں کہ (یہ حیض کا نہیں بلکہ ایک رگ کا خون ہوتا ہے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث کے بارے میں اس سے پہلے حدیث کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ حدیث ان ائمہ کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ مستحاضہ ایام حیض کے سلسلہ میں تمیز پر عمل کرے کہ اگر خون کا رنگ گاڑھا سیاہ ہو تو اسے حیض کا خون قرار دے کر ان ایام میں نماز وغیرہ ترک کر دے اور رنگ گاڑھا سیاہ نہ ہو تو پھر اسے استحاضہ کا خون سمجھے اور نماز روزہ کرتی رہے چنانچہ اسی جگہ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ حدیث صحیح درجہ کو نہیں پہنچتی اس لئے اس کو کسی ملک کی بنیاد قرار دینا اس مسلک کی کمزوری کو ظاہر کرنے کے مترادف ہے۔

بہر حال۔ یہاں خون کے جو رنگ بتائے گئے ہیں وہ دائمی اور کلی طور پر نہیں ہیں بلکہ آنحضرت ﷺ نے خون کے رنگ اکثر کے اعتبار سے فرمائے ہیں کیونکہ کبھی حیض کا خون سرخ وغیرہ رنگ کا بھی ہوتا ہے۔

حضرات حنفیہ اس حدیث کی وضاحت یہ کرتے ہیں کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کا محمول یہ ہوگا کہ "یہ تمیز عادت کے موافق ہو۔" یعنی جس عورت کو استحاضہ لاحق ہو اور حیض میں جب خون کا رنگ سیاہ ہوگا تو اسے حیض کا خون قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا جب اس کی عادت کے دن گزر جائیں اور ان ہی دنوں میں خون کا رنگ سیاہ بمائل سرخ وغیرہ ہو تو اس کے بعد حیض کا خون شمار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس کی عادت کے موافق خون کا رنگ اب سیاہ نہیں رہا۔

(۳) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ اِنَّ امْرَاَۃً کَانَتْ تُھَرَاقُ الدَّمَ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاسْتَفْتَتْ لَھَا اُمُّ سَلَمَۃَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِتَنْظُرْ عَدَدَ اللَّیَالِیْ وَ الْاَیَّامِ الَّتِیْ کَانَتْ تَحِیْضُھُنَّ مِنَ الشَّھْرِ قَبْلَ اَنْ یُّصِیْبَھَا الَّذِیْ اَصَابَھَا فَلْتَتْرُکِ الصَّلٰوۃَ قَدْرَ ذٰلِکَ مِنَ الشَّھْرِ فَاِذَا خَلَّفَتْ ذٰلِکَ فَلْتَغْتَسِلْ ثُمَّ لْتَسْتَثْفِرْ بِثَوْبٍ ثُمَّ لِتُصَلِّ۔ (رَوَاہُ مَالِکٌ وَ اَبُوْدَاؤدَ وَالدَّارِمِیُّ وَرَوَی النَّسَائِیُّ مَعْنَاہُ)

"اور حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت کو استحاضہ کا خون آتا تھا (اور وہ معتادہ تھی) چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے فتوی پوچھا (کہ اس کا کیا حکم ہے؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اسے چاہئے کہ وہ دیکھے کہ اس بیماری کے آنے سے پہلے اسے مہینہ میں حیض کا خون کتنے دن رات آتا تھا (جب یہ معلوم ہو جائے تو) ہر مہینہ اتنے ہی دنوں نماز پڑھنی چھوڑ دے اور جب وہ دن گزر جائیں تو نہا لے اور (پاجامہ کے اندر) کپڑے کی لنگوٹی باندھ کر نماز پڑھ لیا کرے۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ) اور نسائی نے اس روایت کو بالمعنی نقل کیا ہے۔)

---

[1] حضرت عروہ زبیر بن العوام کے صاحبزادے اور عظیم المرتبت تابعی ہیں ۲۲ھ میں پیدا ہوئے ۱۲۔

تشریح: مستحاضہ کو چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے وہ لنگوٹ اس طرح باندھے کہ خون حتی المقدور رک سکے اگر لنگوٹ باندھنے اور احتیاط کے باوجود بھی خون آئے تو اس سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا نماز صحیح ہو جائے گی قضاء ضروری نہیں ہوگی یہ حکم سلس البول کے مرض کا بھی ہے۔

④ وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ يَحْيَى بْنُ مَعِيْنٍ جَدُّ عَدِيٍّ اسْمُهٗ دِيْنَارٌ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ فِي الْمُسْتَحَاضَةِ تَدَعُ الصَّلَاةَ اَيَّامَ اَقْرَائِهَا الَّتِيْ كَانَتْ تَحِيْضُ فِيْهَا ثُمَّ تَغْتَسِلُ وَ تَتَوَضَّأُ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ وَتَصُوْمُ وَتُصَلِّيْ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت عدی ابن ثابت سے مروی ہے کہ ان کے والد اپنے والد سے یعنی یحیٰی ابن معین سے جو عدی کے دادا ہیں اور جن کا نام دینار ہے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ "آپ ﷺ نے ایک مستحاضہ کے بارے میں فرمایا کہ "جن دنوں اسے (عادت کے موافق) حیض آتا تھا اسے چاہئے کہ ان میں نماز چھوڑ دے پھر (ان دنوں کے بعد ایک مرتبہ) نہائے اور ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرے اور روزہ رکھے اور نماز بھی پڑھے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: یہ حدیث ضعیف ہے نیز ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں فَتَوَضَّأُ لِوَقْتِ كُلِّ صَلٰوةٍ یعنی مستحاضہ ہر نماز کے وقت وضو کرے۔"

⑤ وَعَنْ حَمْنَةَ بِنْتِ جَحْشٍ قَالَتْ كُنْتُ اُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيْرَةً شَدِيْدَةً فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْتَفْتِيْهِ وَ اُخْبِرُهٗ فَوَجَدْتُهٗ فِيْ بَيْتِ اُخْتِيْ زَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيْرَةً شَدِيْدَةً فَمَا تَاْمُرُنِيْ فِيْهَا قَدْ مَنَعَتْنِي الصَّلَاةَ وَ الصِّيَامَ قَالَ اَنْعَتُ لَكِ الْكُرْسُفَ فَاِنَّهٗ يُذْهِبُ الدَّمَ قَالَتْ هُوَ اَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ فَتَلَجَّمِيْ قَالَتْ هُوَ اَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ فَاتَّخِذِيْ ثَوْبًا قَالَتْ هُوَ اَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ اِنَّمَا اَثُجُّ ثَجًّا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاٰمُرُكِ بِاَمْرَيْنِ اَيَّهُمَا صَنَعْتِ اَجْزَاَ عَنْكِ مِنَ الْاٰخَرِ وَاِنْ قَوِيْتِ عَلَيْهِمَا فَاَنْتِ اَعْلَمُ قَالَ لَهَا اِنَّمَا هٰذِهٖ رَكْضَةٌ مِنْ رَكَضَاتِ الشَّيْطَانِ فَتَحَيَّضِيْ سِتَّةَ اَيَّامٍ اَوْسَبْعَةَ اَيَّامٍ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ ثُمَّ اغْتَسِلِيْ حَتّٰى اِذَا رَاَيْتِ اَنَّكِ قَدْ طَهُرْتِ وَاسْتَنْقَاْتِ فَصَلِّيْ ثَلَاثًا وَعِشْرِيْنَ لَيْلَةً اَوْ اَرْبَعًا وَ عِشْرِيْنَ لَيْلَةً وَاَيَّامَهَا وَصُوْمِيْ فَاِنَّ ذٰلِكِ يُجْزِئُكِ وَكَذٰلِكِ فَافْعَلِيْ كُلَّ شَهْرٍ كَمَا تَحِيْضُ النِّسَاءُ وَكَمَا يَطْهُرْنَ مِيْقَاتَ حَيْضِهِنَّ وَطُهْرِهِنَّ وَاِنْ قَوِيْتِ عَلٰى اَنْ تُؤَخِّرِيْنَ الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِيْنَ الْعَصْرَ فَتَغْتَسِلِيْنَ وَتَجْمَعِيْنَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَتُؤَخِّرِيْنَ الْمَغْرِبَ وَتُعَجِّلِيْنَ الْعِشَاءَ ثُمَّ تَغْتَسِلِيْنَ وَتَجْمَعِيْنَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ فَافْعَلِيْ وَتَغْتَسِلِيْنَ مَعَ الْفَجْرِ فَافْعَلِيْ وَصُوْمِيْ اِنْ قَدَرْتِ عَلٰى ذٰلِكَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهٰذَا اَعْجَبُ الْاَمْرَيْنِ اِلَيَّ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و الترمذی)

"اور حضرت حمنہ بنت جحش فرماتی ہیں کہ مجھے بہت ہی کثرت سے استحاضہ کا خون آتا تھا اس لئے نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی تاکہ آپ ﷺ کو اس کی خبر دوں اور اس کا حکم پوچھوں چنانچہ میں اپنی بہن زینب بنت جحش کے مکان میں سرکار دو عالم ﷺ سے ملی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے استحاضہ کا خون بہت ہی کثرت سے آتا ہے جس نے مجھے نماز روزہ سے بھی روک رکھا ہے اس کے بارے میں آپ ﷺ کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے لئے روئی کو بیان کرتا ہوں کیونکہ وہ خون کو لے جاتی ہے (یعنی خون نکلنے کی جگہ روئی رکھ لو تاکہ وہ باہر نہ نکلے) حمنہ نے کہا کہ وہ تو (اس سے نہیں رکے گا کیونکہ) بہت زیادہ ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا (روئی رکھ کر) اس پر لگام کی طرح کپڑا (یعنی لنگوٹ) باندھ لو۔" انھوں نے کہا کہ "وہ اس سے (بھی نہیں رکے گا کیونکہ) زیادہ ہے" آپ ﷺ نے فرمایا پھر (لنگوٹ کے نیچے) ایک کپڑا رکھ لو۔" انھوں نے کہا کہ "وہ اس سے (بھی نہیں رکے گا کیونکہ بہت ہی زیادہ ہے یہاں تک کہ خون بارش

کی (دھار کی) طرح آتا ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا "پھر تو میں تمہیں دو باتوں کا حکم کرتا ہوں ان میں سے تم جس ایک کو بھی اختیار کر لو گی دوسری کی ضرورت نہیں رہے گی اور اگر تمہارے اندر دونوں (پر عمل کرنے) کی طاقت ہوگی تو تم خود ہی دانا ہو (کہ بہت بڑا بار ملے گا لہٰذا تم اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے جو چاہو کرو) چنانچہ آپ ﷺ نے حمنہ سے کہا کہ "یہ استحاضہ شیطان کی لاتوں میں سے ایک لات مارنا ہے لہٰذا تم (ہر مہینہ) چھ یا سات روز کیونکہ (غیب کا علم اللہ کو ہے)، حیض کے ایام قرار دو اور پھر (مدت مذکورہ گزر جانے کے بعد) نہا ڈالو اور جب تم جان لو کہ میں پاک و صاف ہوگئی ہوں تو تئیس دن رات (ایام حیض سات دن قرار دینے کی شکل میں) یا چوبیس دن رات، ایام حیض چھ دن قرار دینے کی شکل میں) نماز پڑھتی رہا کرو، اور اسی طرح مہینے رمضان وغیرہ کے) روزے بھی رکھتی رہا کرو چنانچہ جس طرح عورتیں اپنی اپنی مدت پر ایام سے ہوتی ہیں اور پھر وقت پر پاک ہوتی ہیں تم بھی ہر مہینہ اسی طرح کرتی رہا کرو" کہ چھ دن یا سات دن تو حیض کے ایام قرار دو اور بقیہ دن طہر یعنی پاکی کے ایام قرار دو) تمہارے لئے یہ کافی ہوگا۔ اور اگر تمہارے اندر اتنی طاقت ہو کہ وقت اخیر کر کے اس میں نہالو اور عصر میں جلدی کر کے ان دونوں نمازوں کو اکھٹی پڑھ لو اور پھر مغرب کا وقت آخیر کر کے نہالو اور عشاء میں جلدی کر کے ان دونوں نمازوں کو اکھٹی پڑھ لو اور نماز فجر کے لئے (علیحدہ) نہالو تو اسی طرح کر لیا کرو اور (جن دنوں میں نماز پڑھو ان دنوں میں نفل اور فرض جیسے بھی چاہوں) روزے رکھ لیا کرو اگر تمہارے میں اس کی طاقت ہو تو (اس طرح کرتی رہا کرو) پھر سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ان دونوں باتوں میں سے آخری بات مجھے بہت پسند ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: یوں تو استحاضہ کا خون آنا مرض کی بناء پر ہوتا ہے تاہم آنحضرت ﷺ نے اس کی نسبت شیطان کی طرف فرمائی ہے کہ یہ شیطان کی لاتوں میں سے ایک لات مارنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں بہکانے اور عبادت کے اندر خلل ڈالنے کے لئے شیطان کو موقع ملتا ہے چنانچہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پاکی و صفائی اور نماز وغیرہ میں فساد کا بیج بوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے استحاضہ کی حقیقت بیان فرما کر سائلہ کو دو ایسے حکم دیئے جن پر عمل کرنے سے شیطان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے آپ ﷺ نے ایک حکم تو یہ دیا کہ فَتَحَيَّضِيْ سِتَّةَ اَيَّامٍ اَوْ سَبْعَةَ اَيَّامٍ یعنی چھ روز یا سات روز حیض کے ایام قرار دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہر مہینہ اپنی اوپر عادت کے مطابق چھ دن یا سات دن تک حیض کے احکام جاری رکھ۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سائلہ معتادہ تھی اور وہ حیض کے ایام بھول گئی تھی یعنی اسے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ حیض کا خون ہر مہینہ چھ دن آتا تھا یا سات دن آتا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے اسے فرمایا کہ تم اپنے یقین و گمان پر عمل کرو اگر تمہارا یقین یہ کہتا ہو کہ عادت چھ دن کی تھی تو اس صورت میں چھ دن حیض کے ایام قرار دو اگر اس بات کا گمان غالب ہو کہ عادت سات دن کی تھی تو پھر سات دن حیض کے ایام قرار دو پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے فِیْ عِلْمِ اللّٰہِ فرما کر اس بات کا اشارہ کر دیا کہ تم تو بہر حال اپنے یقین و گمان پر عمل کرو اس بات کا علم بہر صورت اللہ تعالیٰ کو ہے، کہ تمہاری عادت کیا تھی کیونکہ غیب کی باتوں کا جاننے والا تو وہی ہے۔ یا پھر ستۃ ایام او سبعۃ ایام میں او اگر شک کے لئے ہو تو "فی علم اللّٰہ" راوی کا قول ہوگا جو واللہ اعلم کے معنی میں ہوگا۔ اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آنحضرت ﷺ نے تو ستۃ ایام فرمایا ہے یا سبعہ ایام اور خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

آپؐ نے سائلہ سے جو یہ فرمایا کہ "جس طرح عورتیں اپنی اپنی مدت پر ایام سے ہوتی ہیں اور پھر وقت پر پاک ہوتی ہیں۔ تم بھی اسی طرح ہر مہینہ کرتی رہا کرو۔" تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جیسے تمہاری طرح وہ عورتیں جو اپنی عادت کے دن بھول جاتی ہیں اور پھر وہ اپنے ایام ٹھہراتی ہیں تم بھی اسی طرح اپنے ایام قرار دو یعنی اگر ان کے حیض کا وقت اول مہینہ ہے تو ایام حیض قرار دو اور اگر ان کے حیض کا وقت مہینہ کے درمیان میں ہو تو تم بھی ایام حیض درمیان مہینہ کو قرار دو اسی طرح اگر ان کے حیض کا وقت آخر مہینہ میں ہو تو تم آخر مہینہ کو ایام حیض قرار دو۔

بہر حال۔ پہلے حکم کا خلاصہ یہ ہے کہ تم اپنے حیض کے مدت خواہ وہ سات دن ہو یا چھ دن پوری کر کے اس کے بعد نہا ڈالو اور پھر ہر نماز

کے لئے غسل کیا کرو۔

دوسرا حکم آپ ﷺ نے یہ دیا کہ "دو نمازوں کے درمیان ایسے وقت غسل کر لیا کرو کہ ایک نماز کا انتہائی وقت ہو اور دوسری نماز کا ابتدائی وقت پھر اس کے بعد دونوں نمازوں کو اکٹھی پڑھ لیا کرو اس طرح ظہر اور مغرب کو تاخیر کے ساتھ پڑھنے کے لئے جو کہا گیا ہے اس میں دو احتمال ہیں۔ اول تو اس "تاخیر" کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وقت ختم ہونے کے بعد نماز پڑھی جائے مثلاً ظہر اور عصر دونوں وقت کی نماز عصر ہی کے وقت میں پڑھی جائے۔ اسی طرح مغرب کی اور عشاء کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھی جائے جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کہ مطابق مسافر دو نمازوں کو اس طرح جمع کر کے پڑھ سکتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ظہر کی نماز بالکل آخیر وقت میں پڑھی جائے اور عصر کی نماز بالکل ابتداء میں پڑھی جائے، اسی طرح مغرب کی نماز بالکل اخیر وقت میں پڑھی جائے اور عشاء کی نماز بالکل شروع میں پڑھی جائے جیسا کہ حنفی مسلک میں مسافر کے لئے جمع بین الصلوتین کی یہی تاویل کی جاتی ہے اور اسے جمع صوری کہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد آنے والی حدیث بھی اسی مقصد و مراد کی وضاحت کر رہی ہے۔ پس اس دوسرے حکم کا حاصل یہ ہے کہ "روزانہ غسل تو ظہر و عصر کے لئے کیا جائے اور ایک غسل مغرب و عشاء کے لئے اسی طرح ایک غسل فجر کے لئے کیا جائے۔

یہ بات سمجھ لیجئے کہ پہلے حکم کا خلاصہ کرتے ہوئے جو یہ بتایا گیا ہے کہ "ہر نماز کے لئے غسل کیا جائے۔" اس کی صراحت حدیث میں تو نہیں ہے لیکن ارشاد گرامی ان قویت علی ان توخرین الخ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ اس عبارت سے سائلہ کا ہر نماز کے لئے غسل سے عاجز ہونا ہی مفہوم ہوتا ہے اور یہی مسلک حضرت امیر المؤمنین حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعود اور حضرت ابن زبیرؓ وغیرہ کا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کا مسلک یہ ہے کہ دو نمازیں ایک غسل کے ساتھ اکٹھی پڑھی جائیں اور یہی مسلک اس حدیث سے زیادہ قریب اور مطابق ہے کیونکہ اس میں زیادہ آسانی ہے بہ نسبت اس کے کہ ہر نماز کے لئے غسل کیا جائے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بھی اسی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے کہ ھذا اعجب الامرین الیّ یعنی دونوں نمازوں کے لئے غسل کرنا مجھے دوسرے امر یعنی ہر نماز کے لئے غسل سے زیادہ پسند ہے۔" اور اس دوسرے حکم کو پسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کی یہ عادت شریفہ تھی کہ آپ ﷺ امت کے لئے وہی چیز پسند فرماتے تھے جو آسان اور سہل العمل ہو۔

جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک یہ حکم منسوخ ہے یا یہ کہ دونوں صورتوں میں غسل کا حکم معالجہ پر معمول ہے یعنی آپ ﷺ نے غسل کا حکم اس لئے دیا ہے تاکہ خون کی کثرت اور اس کی شدت ختم ہو جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۶) عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ اَبِیْ حُبَيْشٍ اُسْتُحِيْضَتْ مُنْذُ كَذَا وَكَذَا فَلَمْ تُصَلِّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّ هٰذَا مِنَ الشَّيْطَانِ لِتَجْلِسْ فِیْ مِرْكَنٍ فَاِذَا رَأَتْ صَفَارَةً فَوْقَ الْمَاءِ فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالْعَصْرِ غُسْلاً وَّاحِدًا وَّتَغْتَسِلْ لِلْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ غُسْلاً وَّاحِدًا وَّتَغْتَسِلْ لِلْفَجْرِ غُسْلاً وَّاحِدًا وَّتَوَضَّأُ فِيْمَا بَيْنَ ذٰلِكَ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَقَالَ رَوٰى مُجَاهِدٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ لَمَّا اشْتَدَّ عَلَيْهَا الْغُسْلُ اَمَرَهَا اَنْ تَجْمَعَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ)

"حضرت اسماء بنت عمیسؓ کہتی ہیں کہ "میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! فاطمہ بنت ابی حبیش کو (پہلی مرتبہ) اتنی مدت سے استحاضہ آرہا ہے اس لئے وہ (یہ خیال کر کے کہ شاید یہ بھی حیض کے حکم میں ہو) نماز نہیں پڑھ رہی ہیں۔" سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "سبحان اللہ! یہ نماز کا چھوڑنا تو شیطانی اثر ہے؟ اسے چاہئے کہ ایک لگن میں پانی ڈال کر بیٹھ جائے جس وقت پانی پر زردی معلوم ہونے لگے تو ظہر

اور عصر کے لئے ایک غسل کرے، اور مغرب و عشاء کے لئے ایک غسل کرلے اور فجر کے لئے علیحدہ ایک غسل کرے (اور جب ضرورت ہو تو عصر اور عشاء کے لئے) ان کے درمیان وضو کرے۔" (یہ روایت ابوداؤدؒ نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ مجاہدؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ "جب فاطمہؓ کو (ہر نماز کے لئے) غسل کرنا دشوار معلوم ہوا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو (ایک غسل سے) دو نمازیں اکٹھی پڑھنے کا حکم دیا۔)

تشریح: جب ظہر کا وقت بالکل اخیر ہوتا ہے تو آفتاب پر قدرے زردی آجاتی ہے بلکہ زوال کے بعد تغیر ہونا شروع ہو جاتا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے لگن میں دیکھنے کے لئے اس وجہ سے فرمایا کہ وہ زردی پانی پر آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے وہ زردی بڑھتے بڑھتے مغرب کے قریب پوری ہو جاتی ہے اس وقت نماز پڑھنی مکروہ ہے لیکن آپ ﷺ نے جس زردی کے بارے میں فرمایا ہے یہ اس زردی کے علاوہ ہے جو عصر کے بعد ہوتی ہے اور وہ نماز کے لئے کراہت کا وقت ہوتا ہے۔

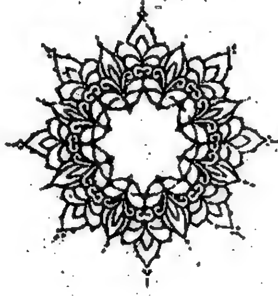

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الصلوٰۃ

نماز کا بیان

لغت میں "صلوٰۃ" دعا کو کہتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں صلوٰۃ چند مخصوص اقوال و افعال کو کہتے ہیں جن کی ابتداء تکبیر سے اور انتہاء سلام پر ہوتی ہے۔ صلوٰۃ کے مادہ اشتقاق کے بارے میں کئی اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔

نووی رحمہ اللہ نے مسلم کی شرح میں کہا ہے کہ صلوٰۃ کا مادہ اشتقاق "صلوین" ہے جو سرین کی دونوں ہڈیوں کو کہتے ہیں چونکہ نماز میں ان دونوں ہڈیوں کو رکوع و سجود کے وقت زیادہ حرکت ہوتی ہے اس لئے اس مناسبت سے نماز کو صلوٰۃ کہا گیا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں "صلوٰۃ" مصلی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ٹیڑھی لکڑی کو آگ سے سینک کر سیدھا کرنا چنانچہ نماز کو صلوٰۃ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انسان کے مزاج میں نفس امارہ کی وجہ سے ٹیڑھا پن ہے لہٰذا جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے۔ تو خداوند قدوس کی عظمت وہیبت کی گرمی جو اس عبادت میں انتہائی قرب خداوندی کی بناء پر حاصل ہوتی ہے اس کے ٹیڑھے پن کو ختم کر دیتی ہے گویا مصلی یعنی نمازی اس مادۂ اشتقاق کی رو سے اپنے نفس امارہ کو عظمت خداوندی اور ہیبت ربانی کی تپش سے سینکنے والا ہوا۔ لہٰذا جو شخص نماز کی حرارت سے سینکا گیا اور اس کا ٹیڑھا پن نماز کی وجہ سے دور کیا گیا تو اس کو آخرت کی آگ یعنی دوزخ سے سینکنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ اپنے اس بندے کو جس نے دنیا میں نماز کی پابندی کی اور کوئی ایسا فعل نہ کیا جو عذاب خداوندی کا موجب ہو تو اسے جہنم کی آگ میں نہ ڈالے گا۔

اس اصطلاحی تعریف کے بعد یہ سمجھ لیجئے کہ نماز اسلام کا وہ عظیم رکن اور ستون ہے جس کی اہمیت و عظمت کے بارے میں امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ اثر منقول ہے کہ:

"جب نماز کا وقت آتا تو ان کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ لوگوں نے پوچھا کہ، امیر المؤمنین! آپ رضی اللہ عنہ کی یہ کیا حالت ہے؟ فرماتے ہیں کہ اب اس امانت[1] کا وقت آگیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، پہاڑوں اور زمین پر پیش فرمایا تھا اور وہ سب اس امانت کے لینے سے ڈر گئے اور انکار کر دیا۔" (احیاء العلوم)

نماز کی تاکید اور اس کے فضائل سے قرآن مجید کے مبارک صفحات مالامال ہیں، نماز کو اداء کرنے اور اس کی پابندی کرنے کے لئے جس سختی سے حکم دیا گیا ہے وہ خود اس عبادت کی اہمیت و فضیلت کی دلیل ہے۔ ایمان کے بعد شریعت نے سب سے زیادہ نماز ہی پر زور دیا ہے چنانچہ قرآن کریم کی یہ چند آیتیں ملاحظہ فرمایئے۔

---

[1] یہ اشارہ ہے اس آیت قرآنی کی طرف: انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنها و اشفقن منها الخ۔

❶ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا۔

"بے شک ایمان والوں پر نماز فرض ہے وقت وقت سے۔"

❷ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی۔

"نمازوں کی خصوصًا درمیانی نماز (عصر) کی پابندی کرو۔"

❸ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّئَاتِ۔

"بے شک نیکیاں (یعنی نمازیں) برائیوں کو معاف کرادیتی ہیں۔"

❹ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ۔

"بے شک نماز برے اور خراب کاموں سے انسان کو بچاتی ہے۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ کے ذکر کا بڑا مرتبہ اور بڑا اثر ہے۔"

بہر حال! نماز ایک ایسی پسندیدہ اور محبوب عبادت ہے جس کی برکتوں اور سعادتوں سے خداوند کریم نے کسی بھی نبی کی شریعت کو محروم نہیں رکھا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزمان سرکار دو عالم ﷺ تک تمام رسولوں کی اُمت پر نماز فرض تھی۔ ہاں نماز کی کیفیت اور تعینات میں ہر اُمت کے لئے تغیر ہوتا رہا۔ سرکار دو عالم ﷺ کی اُمت پر ابتداء رسالت میں دو وقت کی نماز فرض تھی ایک آفتاب کے نکلنے سے قبل اور ایک آفتاب ڈوبنے کے قبل۔ ہجرت سے ڈیڑھ برس پہلے جب سرکار دو عالم ﷺ نے معراج میں ذات حق جل مجدہ کی قربت حقیقی کا عظیم و افضل ترین شرف پایا تو اس مقدس اور باسعادت موقعہ پر پانچ وقت کی نماز کا عظیم و اشرف ترین تحفہ بھی عنایت فرمایا گیا۔ چنانچہ فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء ان پانچ وقتوں کی نماز کا فریضہ صرف اسی اُمت کی امتیازی خصوصیت ہے اگلی امتوں پر صرف فجر کی نماز فرض تھی نیز کسی پر ظہر کی اور کسی پر عصر کی۔

اسلام کی تمام عبادات میں صرف نماز ہی وہ عبادت ہے جس کو سب سے افضل اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ چنانچہ اس پر اتفاق ہے کہ نماز اسلام کا رکن اعظم ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اسلام کا دارومدار اسی عبادت پر ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

ہر مسلمان عاقل بالغ پر ہر روز پانچ وقت نماز فرض عین ہے امیر ہو یا فقیر، تندرست ہو یا مریض اور مقیم ہو یا مسافر ہر ایک کو پانچوں وقت ان آداب و شرائط اور طریقوں کے ساتھ جو خدا اور خدا کے رسول نے نماز کے سلسلہ میں بتائے ہیں خدا کے دربار میں حاضری دینا اور خداوند قدوس کی عظمت و بڑائی اور اپنی بیکسی و لاچاری اور عجز و انکساری کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے یہاں تک کہ جب میدان کارزار میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں اور عورت سب سے زیادہ اور شدید تکلیف دردزہ میں مبتلا ہو تب بھی نماز کا چھوڑنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کی ادائیگی میں دیر کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے یہاں تک کہ اگر کسی عورت کے بچہ کی پیدائش کے وقت بچہ کا کوئی جزو نصف سے کم اس کے خاص حصہ سے باہر آگیا ہو خواہ خون نکلا ہو یا نہ نکلا ہو اس وقت بھی اس کو نماز پڑھنے کا حکم ہے اور نماز میں توقف کرنا جائز[1] نہیں ہے۔

جو شخص نماز کی فرضیت سے انکار کرے وہ کافر ہے اور اس کو ترک کرنے والا گناہ کبیرہ کا مرتکب اور فاسق و فاجر ہے بلکہ بعض جلیل القدر صحابہ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ وغیرہ نماز چھوڑنے والے کو کافر کہتے ہیں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے امام شافعیؒ و امام مالکؒ نماز چھوڑنے کو گردن زنی قرار دیتے ہیں۔ حضرت امام اعظمؒ اگرچہ اس کے کفر کے قائل نہیں تاہم ان کے نزدیک بھی نماز چھوڑنے والے کے لئے سخت تعزیر ہے۔

مصنف مشکوٰۃ نے یہاں "کتاب الصلوٰۃ" کے نام سے جو عنوان قائم فرمایا ہے اس کے تحت نماز سے متعلق وہ تمام احادیث ذکر کی جا

---

[1] علم الفقہ ۱۲۔

رہی ہیں جن سے نماز کی اہمیت و عظمت اور اس کی فضیلت کا پتہ چلتا ہے اور نماز کے جو احکام و فضائل ہیں ان کا استنباط ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلصَّلٰوۃُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَۃُ اِلَی الْجُمُعَۃِ وَرَمَضَانُ اِلٰی رَمَضَانَ مُکَفِّرَاتٌ لِّمَا بَیْنَھُنَّ اِذَا اجْتُنِبَتِ الْکَبَائِرُ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے تو پانچوں نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک اور رمضان سے رمضان تک اس کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جو ان کے درمیان ہوئے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پابندی کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز پڑھے، جمعہ کی نماز پورے آداب کے ساتھ ادا کرے اور اسی طرح رمضان کے روزے رکھے تو ان کے درمیان جو صغیرہ گناہ صادر ہوئے ہیں سب ختم ہو جاتے ہیں البتہ کبیرہ گناہ نہیں بخشے جاتے ہاں اگر خدا چاہے تو وہ کبیرہ گناہ بھی معاف فرما سکتا ہے۔

یہاں ایک ہلکا سا خلجان واقع ہوتا ہے کہ جب ہر روز کی پانچوں وقت کی نمازیں ہی تمام گناہ مٹا دیتی ہیں تو پھر یہ جمعہ وغیرہ کون سے گناہ ختم کرتے ہیں؟ چنانچہ اس خلجان کو رفع کرنے کے لئے ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ان سب میں گناہوں کو مٹانے اور ختم کرنے کی صلاحیت ہے چنانچہ اگر گناہ صغیرہ ہوتے ہیں تو یہ تینوں ان کو مٹا دیتے ہیں ورنہ ان میں سے ہر ایک کے بدلے بے شمار نیکیاں لکھی جاتی ہیں جس کی وجہ سے درجات میں بلندی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے فرمایا کہ یہ تینوں صغیرہ گناہوں کے لئے کفارہ ہیں اور ان کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی ایک کسی گناہ کے لئے کفارہ بن سکے تو دوسرا کفارہ ہو جاتا ہے مثلاً نماز میں کسی تقصیر اور نقصان کی وجہ سے اگر وہ نماز گناہوں کے لئے کفارہ نہ ہو سکے تو ان کو جمعہ ختم کر دیتا ہے اور جمعہ میں بھی کسی تقصیر کی وجہ سے کفارہ ہونے کی صلاحیت نہ رہے تو پھر رمضان ان کے لئے کفارہ ہو جاتا ہے اور اگر سب کے سب کفارہ بننے کی صلاحیت رکھیں تو یہ سب مل کر گناہوں کو اچھی طرح مٹا دیتے ہیں اور کفارہ کی زیادتی کا باعث ہوتے ہیں چنانچہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کئی چراغوں کی۔ اگر کسی مکان میں ایک چراغ ہو گا تو اندھیرا تو ختم ہو جائے گا مگر روشنی کم ہوگی اور اگر چراغ زیادہ ہوں گے تو نور اور روشنی میں اسی حیثیت سے زیادتی ہوگی۔

(۲) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرَأَیْتُمْ لَوْ اَنَّ نَھْرًا بِبَابِ اَحَدِکُمْ یَغْتَسِلُ فِیْہِ کُلَّ یَوْمٍ خَمْسًا ھَلْ یَبْقٰی مِنْ دَرَنِہٖ شَیْءٌ قَالُوْا لَا یَبْقٰی مِنْ دَرَنِہٖ شَیْءٌ قَالَ فَذٰلِکَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ یَمْحُو اللّٰہُ بِھِنَّ الْخَطَایَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا، تم بتاؤ کہ جس کے دروازے کے آگے پانی کی نہر چلتی ہو اور وہ روزمرہ اس میں پانچ مرتبہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل کا کوئی شائبہ بھی رہے گا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ نہیں! میل بالکل باقی نہیں رہے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا (تم سمجھ لو کہ) پانچوں نمازوں کی کہ اللہ تعالیٰ تمام (صغیرہ) گناہوں کو ان نمازوں کے سبب سے اسی طرح مٹا دیتا ہے (جس طرح پانی میل کو اتار دیتا ہے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا اَصَابَ مِنِ امْرَأَۃٍ قُبْلَۃً فَاَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَہٗ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ فَقَالَ الرَّجُلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَلِیْ ھٰذَا؟ قَالَ لِجَمِیْعِ اُمَّتِیْ کُلِّھِمْ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِمَنْ عَمِلَ بِھَا مِنْ اُمَّتِیْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی (غیر) عورت کا بوسہ لے لیا پھر (احساس ندامت و شرمندگی کے ساتھ) نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر صورت واقعہ کی خبر دی (اور آپ ﷺ سے اس کا حکم پوچھا، آنحضرت ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ وحی کے ذریعہ حکم خداوندی کے منتظر رہے اس اثناء میں اس شخص نے نماز پڑھی) جب ہی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ اور نماز کو دن کے وقت اوّل و آخر اور رات کی چند ساعت میں پڑھا کرو کیونکہ نیکیاں (یعنی نمازیں) برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ آیت کے نازل ہونے کے بعد اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ حکم میرے لئے ہے (یا پوری اُمت کے لئے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "(نہیں! یہ حکم) میری اُمت کے لئے ہے۔ ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ کا جواب اس طرح مذکور ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) میری اُمت میں سے جو شخص اس آیت پر عمل کرے اس کے لئے (یہی حکم ہے، یعنی جو شخص بھی برائی کے بعد بھلائی کرے گا اسے یہی سعادت حاصل ہوگی کہ اس بھلائی کے نتیجہ میں اس کی برائی ختم ہو جائے گی)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جن صاحب کا یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک غیر عورت کا بوسہ لے لیا تھا ان کا نام ابوالیسیرؓ تھا۔ ترمذیؒ نے ان کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں وہ خود راوی ہیں کہ، میرے پاس ایک عورت کھجوریں خریدنے کے لئے آئی میں نے اس سے کہا کہ میرے گھر میں اس سے زیادہ اچھی کھجوریں رکھی ہوئی ہیں (اس لئے تم وہاں چل کر دیکھ لو) چنانچہ وہ میرے ہمراہ مکان میں آگئی (وہاں میں شیطان کے بہکانے میں آگیا اور جذبات سے مغلوب ہو کر) اس اجنبی عورت سے بوس و کنار کیا۔ اس نے (میرے اس غلط اور نازیبا رویہ پر مجھے تنبیہ کرتے ہوئے) کہا کہ بندہ خدا! اللہ (کے قہر و غضب) سے ڈرو چنانچہ (خوف خدا سے میرا دل تھرا گیا اور) میں نہایت ہی شرمندہ و شرمسار ہو کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ چنانچہ بارگاہ رسالت میں ان کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہی حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔

آیت کریمہ میں طرفي النّهار یعنی دن کے اوّل و آخر سے دن کا ابتدائی حصہ اور انتہائی حصہ مراد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دن کے اوّل یعنی ابتدائی حصہ سے فجر کی نماز اور آخری حصہ سے ظہر و عصر کی نماز مراد ہے اسی طرح زلفًا من الليل یعنی رات کی چند ساعت سے مغرب و عشاء کا وقت مراد ہے۔ اس طرح اب آیت کریمہ کا مطلب یہ ہوگا "فجر، ظہر، عصر، مغرب، اور عشاء کی نماز پڑھا کرو، کیونکہ نیکیاں (نمازیں) برائیوں کو مٹا دیتی ہیں"۔

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي اَصَبْتُ حَدًّا فَاَقِمْهُ عَلَيَّ قَالَ وَلَمْ يَسْأَلْهُ عَنْهُ وَحَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَصَلّٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةَ قَامَ الرَّجُلُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي اَصَبْتُ حَدًّا فَاَقِمْ فِيَّ كِتَابَ اللّٰهِ قَالَ اَلَيْسَ قَدْ صَلَّيْتَ مَعَنَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ ذَنْبَكَ اَوْ حَدَّكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ "ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مجھ سے ایسا فعل سرزد ہو گیا ہے جس پر حد واجب ہے اس لئے آپ (ﷺ) مجھ پر حد جاری فرمایئے" راوی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس سے حد کے متعلق کچھ دریافت نہیں فرمایا اور نماز کا وقت آگیا۔ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو چکے تو وہ شخص کھڑا ہوا اور پھر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مجھ سے ایک ایسا فعل سرزد ہو گیا ہے جو مستوجب حد ہے اس لئے آپ (ﷺ) میرے بارے میں خدا کا حکم نافذ فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی ہے؟ اس نے کہا کہ جی ہاں! پڑھی ہے! آپ ﷺ نے فرمایا خدا نے تمہاری خطاء یا فرمایا کہ تمہاری حد بخش دی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہاں یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ اس شخص کے الفاظ اَصَبْتُ حَدًّا (یعنی مجھ سے ایسا فعل سرزد ہو گیا ہے جس پر حد واجب ہے) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی ایسے کبیرہ گناہ مثلاً چوری وغیرہ کا ارتکاب کیا تھا جس پر حد واجب ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ نے نماز کی وجہ سے

اس کی بخشش کی خوشخبری سنادی لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ نماز کی وجہ سے کبیرہ گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔

بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے کوئی ایسا گناہ صغیرہ سرزد ہو گیا تھا جو حقیقت میں تو ایسا نہیں تھا جس پر حد جاری ہوتی لیکن چونکہ وہ شخص "صحابیت" جیسے مرتبہ پر فائز تھے جہاں معمولی سا گناہ بھی خوف خداوندی سے دل کو لرزاں کر دیتا ہے اور ایک ہلکی سی معصیت بھی قلب و دماغ کے ہر گوشہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے اس لئے انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ مجھ سے ایک فعل سرزد ہو گیا ہے۔ جس پر ازروئے شریعت حد جاری ہو جائے گی لہٰذا انہوں نے بارگاہ رسالت میں آکر اس طرح ذکر کیا جس سے بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ ان سے واقعی کوئی ایسا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے جو سخت ترین سزا یعنی حد کا مستوجب بنے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ حد سے ان کی مراد تعزیر تھی۔

آپ ﷺ نے اس شخص سے اس کے گناہ کی حقیقت اس لئے دریافت نہیں فرمائی کہ آپ ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا کہ اس شخص نے کس قسم کا گناہ کیا ہے اسی لئے آپ ﷺ نے اسے اس گناہ کی بخشش کی جو خوشخبری دی تھی اپنی طرف سے نہیں دی تھی بلکہ جب آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے بتادیا کہ اس کا گناہ کوئی ایسا گناہ نہیں ہے جس پر حد جاری کی جائے بلکہ ایسا گناہ ہے جو نماز کے ذریعہ معاف ہو گیا ہے تو آپ ﷺ نے اسے یہ خوشخبری سنادی۔

⑤ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الصَّلٰوةُ لِوَقْتِهَا قُلْتُ ثُمَّ اَيٌّ قَالَ بِرُّ الْوَالِدَيْنِ قُلْتُ ثُمَّ اَيٌّ قَالَ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِيْ بِهِنَّ وَلَوِ اسْتَزَدْتُهٗ لَزَادَنِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل سب سے زیادہ پسند ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وقت پر نماز پڑھنی" (یعنی وقت مکروہ میں نماز نہ پڑھی جائے) میں نے کہا کہ پھر کون سا عمل بہتر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ماں باپ کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا" میں نے عرض کیا کہ پھر کون سا عمل بہتر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خدا کی راہ میں جہاد کرنا" ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے آنحضرت ﷺ نے یہی باتیں بیان فرمائی تھیں اگر میں کچھ زیادہ پوچھتا تو آپ ﷺ اس سے بھی زیادہ بیان فرماتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اتنی بات معلوم ہو جانی چاہئے کہ بہترین و افضل اعمال کے بارے میں مختلف احادیث منقول ہیں، چنانچہ اس حدیث سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب اعمال یہ تین ہیں مگر دوسری حدیثوں میں مذکور ہے کہ اسلام کے بہترین و افضل اعمال یہ ہیں کہ (غریبوں مسکینوں کو) کھانا کھلایا جائے۔ اسلام کی تبلیغ کی جائے اور رات میں اس وقت جب کہ لوگ آرام سے بستروں میں پڑے خواب شیریں سے ہمکنار ہوں خدا کی عبادت کی جائے اور نماز پڑھی جائے۔

اسی طرح بعض احادیث میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا سب سے بہترین و افضل عمل یہ ہے کہ لوگ تمہاری زبان اور تمہارے ہاتھ (کی ایذا) سے محفوظ رہیں۔ نیز بعض حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افضل ترین عمل خدا کا ذکر کرنا ہے۔ بہر حال اسی طرح دوسری احادیث میں دیگر اعمال کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اعمال بہترین و افضل ہیں۔

تو۔ اب ان تمام احادیث میں تطبیق اسی طرح ہو گی کہ یہ کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ نے ہر ایک کی رضا و رغبت اور اس کے مزاج کے مطابق جواب دیا ہے یعنی جس نے بہترین عمل کے بارے میں سوال کیا اس کو وہی عمل بتایا جسے اس کے لائق سمجھا اور جو اس کی فطرت و مزاج اور اس کے حال کے مناسب معلوم ہوا۔ چنانچہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم اکثر کسی خاص چیز کے بارے میں کسی وقت کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ فلاں چیز تو سب سے اچھی ہے حالانکہ دل کے اندر اس کی اچھائی و فضیلت کے بارے میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ چیز ہمہ وقت اور ہر حال میں نیز ہر ایک کے لئے سب سے اچھی اور افضل ہو گی بلکہ دل میں بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ چیز اس خاص وقت میں اچھی اور بہتر ہے نہ کہ ہمہ وقت مثلاً خاموشی اور سکوت کا معاملہ ہے کہ جہاں مناسب ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ سکوت کے برابر کوئی چیز نہیں ہے یا خاموشی سے افضل کوئی چیز نہیں ہے غرض آنحضرت ﷺ نے ہر ایک عمل کو حال اور مقام کے مناسب افضل فرمایا ہے۔ مثلاً ابتداء اسلام

میں جہاد ہی لوگوں کے حال مناسب تھا اس لئے جہاد کو فرمایا کہ یہ سب سے بہتر عمل ہے یا اسی طرح کسی شخص کو یا کسی جماعت کو بھو کا ننگا دیکھا تو ان کی امداد و اعانت کی خاطر صدقہ و خیرات کی طرف لوگوں کو رغبت دلائی اور فرمایا کہ صدقہ افضل ترین عمل ہے یا نماز کو باری تعالیٰ کے قریب حقیقی کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ اچھا اور بہتر عمل قرار دیا۔ بہر حال۔ ان میں سے ہر ایک عمل کو افضل ترین عمل کہنے کی وجوہ اور حیثیات مختلف ہیں۔ ہر ایک کی وجہ اور حیثیت اپنی اپنی جگہ دوسرے سے افضل و اعلیٰ ہے۔

(۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نماز کا چھوڑنا بندۂ مؤمن اور کفر کے درمیان (کی دیوار کو ڈھا دیتا) ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہاں لفظ "بین" کا متعلق محذوف ہے یعنی اس حدیث میں یہ عبارت مقدر ہے کہ تَرْكُ الصَّلٰوةِ وُصْلَةٌ بَيْنَ العبد المسلم وبين الكفر جس کا مطلب یہ ہوا کہ بندۂ مؤمن اور کفر کے درمیان نماز بمنزلۂ دیوار کے ہے کہ بندہ اس کی وجہ سے کفر تک نہیں پہنچ سکتا مگر جب نماز ترک کر دی گئی تو گویا درمیان کی دیوار اٹھ گئی لہٰذا نماز چھوڑنا اس بات کا سبب ہوگا کہ نماز چھوڑنے والا مسلمان کفر تک پہنچ جائے گا۔

بہر حال۔ یہ حدیث نماز چھوڑنے والوں کے لئے سخت تہدید ہے اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز کا چھوڑنے والا ممکن ہے کہ کافر ہو جائے کیونکہ جب اس نے اسلام و کفر کے درمیان کی دیوار کو ختم کر دیا تو گویا وہ کفر کی حد تک پہنچ گیا ہے اور جب وہ کفر کی حد تک پہنچ گیا تو ہو سکتا ہے کہ یہی ترک نماز اس کو فسق و فجور اور خدا سے بغاوت و سرکشی میں اس حد تک دلیر کر دے کہ وہ دائرہ کفر میں داخل ہو جائے۔

یہ شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ تارک نماز کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں چنانچہ اصحاب ظواہر تو یہ کہتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کافر ہو جاتا ہے۔ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نماز چھوڑنے والا اگرچہ کافر نہیں ہوتا مگر وہ اس سرکشی و طغیانی کے پیش نظر اس قابل ہے کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص نماز چھوڑ دے اس کو اس وقت تک جب تک کہ نماز نہ پڑھے مارنا اور قید خانہ میں ڈال دینا واجب ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۷) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ صَلَوَاتٍ اِفْتَرَضَهُنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ اَحْسَنَ وُضُوْئَهُنَّ وَصَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ وَاَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَخُشُوْعَهُنَّ كَانَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ اَنْ يَّغْفِرَ لَهٗ وَمَنْ لَّمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ اِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهٗ وَاِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ۔ (رواہ احمد وابوداؤد وروی مالک والنسائی)

"حضرت عبادہ ابن صامتؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے ان پانچ نمازوں کے لئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے (فرائض و مستحبات کی ادائیگی کے ساتھ) اچھی طرح وضو کیا اور ان کو وقت پر پڑھا نیز ان میں رکوع و خشوع کیا (یعنی نمازیں حضوری قلب کے ساتھ پڑھیں) تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ پر ذمہ (یعنی اللہ تعالیٰ کا وعدہ) یہ ہے کہ وہ اس کے (صغیرہ) گناہ بخش دے گا اور جس شخص نے ایسا نہ کیا (یعنی اس نے مذکورہ بالا طریقہ سے یا مطلق نماز نہ پڑھی) تو اللہ تعالیٰ اس کا ذمہ دار نہیں ہے چاہے تو بخش دے چاہے اسے عذاب میں مبتلا کرے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، مالکؒ، نسائیؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز چھوڑنے والا کافر نہیں ہوتا بلکہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب کے بارے میں بھی یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ کو عذاب دے بلکہ اس کا دارومدار سراسر اس کی مرضی پر ہے

کہ اگر وہ چاہے تو عذاب میں مبتلا کرے اور اگر چاہے تو اپنے فضل و کرم سے اسے بخش دے۔

اسی طرح یہ بھی جان لیجئے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ خدا کے حکم سے اسے جس مدت کے لئے دوزخ میں ڈالا جائے گا اس کے بعد وہ اپنی سزا پوری کر کے جنت میں داخل ہونے کا مستحق ہو جائے گا۔ چنانچہ اہل سنّت و الجماعت کا یہی مسلک ہے۔

⑧ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلُّوْا خَمْسَکُمْ وَصُوْمُوْا شَهْرَکُمْ وَادُّوْا زَکَاةَ اَمْوَالِکُمْ وَاَطِیْعُوْا اِذَا اَمَرَکُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّکُمْ۔ (رواہ احمد و الترمذی)

"اور حضرت ابی امامہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ (مسلمانو!) پانچوں وقت اپنی نمازیں پڑھو! اپنے (رمضان کے) مہینے کے روزے رکھو! اپنے مال کی زکوٰۃ دو! اور اپنے سردار کی (جب تک کہ وہ خلاف شرع چیزوں کا حکم نہ کرے) اطاعت کرو! (اگر ایسا کرو گے تو) اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے (یعنی بہشت میں بلند درجات کے حقدار بنو گے)۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: سردار سے مراد بادشاہ، امیر اور حاکم ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے بادشاہ اور امراء کے احکام کی تابعداری اور ان کے فرمان کی اطاعت کریں لیکن اس میں ایک شرط ہے کہ اطاعت و فرمانبرداری کا یہ حکم اسی وقت تک رہے گا۔ جب تک کہ ان کا کوئی حکم حدود و شریعت سے باہر اور خداوند کے رسول کے فرمان کے خلاف نہ ہو، اگر ایسا ہو کہ امراء اور سلاطین حدود شریعت سے تجاوز کر کے غلط احکام دیں یا ایسے فرمان نافذ کریں جو قرآن و سُنّت کے خلاف ہوں تو پھر نہ صرف یہ کہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری ضروری نہیں ہے بلکہ ایسے سلاطین و امراء کو راہ راست پر لانے اور ان کو قرآن و سُنّت کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے اور ملک و قوم کو چلانے کے لئے مجبور کیا جائے۔

یا پھر "سردار" سے مراد علماء ہیں کہ قرآن و سُنّت اور اسلامی شریعت کے علم کے حامل جب مسلمانوں کو کوئی شرعی حکم دیں اور انہیں دین و شریعت کی طرف بلائیں تو ان کی پیروی ہر ایک مسلمان پر ضروری اور لازم ہے اسی طرح "سردار" سے ہر وہ شخص مراد ہو سکتا ہے جو کسی کام کے لئے حاکم اور کارساز مقرر کیا گیا ہو یعنی اگر کوئی مسلمان کسی شخص کو اپنے کسی معاملہ میں حاکم اور راہبر مقرر کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حاکم یا راہبر کے مشوروں کو مانے اور وہ جو صحیح حکم دے اس کی پابندی کرے۔

⑨ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَیْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِیْنَ وَفَرِّقُوْا بَیْنَهُمْ فِی الْمَضَاجِعِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَکَذَا رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ وَفِی الْمَصَابِیْحِ عَنْ سَبْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد مکرم سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تمہارے بچے سات برس کے ہو جائیں تو انہیں نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب وہ دس برس کے ہو جائیں (تو نماز چھوڑنے پر) انہیں مارو۔ نیز ان کے بسترے علیحدہ کر دو (ابوداؤد) اسی طرح شرح السنہ میں عمرو سے اور مصابیح میں سبرہ ابن معبد سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔"

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جب ان کے بچے سات برس کے ہو جائیں تو اسی وقت سے ان کو نماز کی تاکید شروع کر دی جائے تاکہ انہیں نماز کی عادت کم سنی سے ہی ہو جائے اور جب وہ بالغ ہونے کے قریب یعنی دس سال کی عمر میں پہنچ جائیں تو اگر وہ کہنے سننے کے باوجود نماز نہ پڑھیں تو انہیں تاکیداً مار مار کر نماز پڑھانی چاہئے۔ نیز جس طرح ان عمروں میں نماز کی تاکید کرنا ضروری ہے اسی طرح انہیں نماز کی شرائط وغیرہ بھی سکھانی چاہئے تاکہ انہیں ساتھ ساتھ نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو جائے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب بچے اس عمر میں پہنچ جائیں تو انہیں علیحدہ علیحدہ سلانا چاہئے یعنی اگر دو بھائی بہن یا دو

اجنبی لڑکے لڑکی ایک ہی بستر میں سوتے ہوں تو اس عمر میں ان کے بستر الگ کر دینے چاہئیں تاکہ وہ اکٹھے نہ سو سکیں۔

(۱۵) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعَهْدُ الَّذِيْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ۔ (رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، ہمارے اور منافقوں کے درمیان جو عہد ہے وہ نماز ہے لہٰذا جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور منافقین کے درمیان امن و امان کا جو معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم انہیں قتل نہیں کرتے، اور اسلام کے احکام ان پر نافذ نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نماز پڑھنے، جماعت میں حاضر ہونے اور اسلام کے دوسرے ظاہری احکام کی تابعداری کرنے کے سبب سے مسلمانوں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں لہٰذا جس نے نماز کو جو تمام عبادتوں میں افضل ترین ہے ترک کر دیا گویا کہ وہ کافر کے برابر ہو گیا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ نماز ترک کر کے کفر کو ظاہر نہ کریں۔ اس طرح اس جملہ فقد کفر کے معنی یہ ہوئے کہ (جس نے نماز چھوڑ دی) اس نے کفر کو ظاہر کر دیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي عَالَجْتُ امْرَأَةً فِي اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ وَاِنِّي اَصَبْتُ مِنْهَا مَادُوْنَ اَنْ اَمَسَّهَا فَاَنَا هٰذَا فَاقْضِ فِيَّ مَا شِئْتَ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ لَقَدْ سَتَرَكَ اللّٰهُ لَوْسَتَرْتَ عَلٰى نَفْسِكَ قَالَ وَلَمْ يَرُدَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَقَامَ الرَّجُلُ فَانْطَلَقَ فَاَتْبَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا فَدَعَاهُ وَتَلَا عَلَيْهِ هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذَّاكِرِيْنَ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ هٰذَا لَهٗ خَاصَّةً؟ فَقَالَ بَلْ لِلنَّاسِ كَافَّةً۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مدینہ کے کنارے میں نے ایک عورت کو گلے لگا کر سوائے صحبت کے اور سب کچھ کر لیا ہے، (یعنی صحبت تو نہیں کی لیکن بوس و کنار ہو گیا ہے اس لئے) میں حاضر ہو گیا ہوں جو کچھ آپ ﷺ چاہیں میرے بارے میں حکم فرمائیں۔ (یعنی آپ ﷺ میرے لئے جو سزا بھی تجویز فرمائیں گے مجھے منظور ہو گی) حضرت عمرؓ نے (جو اس وقت مجلس نبوی میں حاضر تھے یہ سن کر) فرمایا خدا نے تو تمہارے عیب کی پردہ پوشی فرمائی تھی اگر تم بھی اپنے عیب کو چھپا لیتے (تو اچھا تھا) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (خدا کے حکم کے انتظار میں) اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چنانچہ وہ شخص کھڑا ہوا اور چلا گیا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے اسے بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا جو اسے بلا لایا آپ ﷺ نے اس کے سامنے یہ آیت پڑھی۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذَّاكِرِيْنَ دن کے اوّل و آخر اور رات کی چند ساعتوں میں نماز پڑھا کرو کیونکہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں اور یہ نصیحت، نصیحت ماننے والوں کے لئے ہے۔ لوگوں میں سے ایک شخص (حضرت عمرؓ یا حضرت معاذؓ) نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ حکم خاص طور پر اسی کے لئے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں: سب لوگوں کے لئے یہی حکم ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اسی باب کی پہلی فصل کی تیسری حدیث میں بھی اس آیت کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ دن کے اوّل سے فجر اور آخر سے ظہر و عصر مراد ہیں اسی طرح، "رات کی چند ساعت" سے مراد مغرب و عشاء ہیں۔

حضرت ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ پہلی فصل میں اسی طرح کی جو حدیث نمبر تین گزری ہے وہ تو ایک شخص (ابوالیسرؓ) کا واقعہ ہے اور یہ

حدیث جو یہاں ذکر کی گئی ہے یہ کسی دوسرے صاحب کا واقعہ ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہ آیت بھی اس شخص کے لئے دوسری مرتبہ نازل ہوئی ہو۔ مگر محققین نے لکھا ہے کہ تعدد واقعہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیت بھی مکرر نازل ہوئی ہو اور نہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے بلکہ آنحضرت ﷺ نے وہی آیت جو پہلے شخص کے بارے میں نازل ہوئی تھی بطور سند کے اس شخص کے سامنے بھی تلاوت فرمادی۔

(۱۲) وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ زَمَنَ الشِّتَآءِ وَالْوَرَقُ یَتَهَافَتُ فَاَخَذَ بِغُصْنَیْنِ مِنْ شَجَرَةٍ قَالَ فَجَعَلَ ذٰلِكَ الْوَرَقُ یَتَهَافَتُ قَالَ فَقَالَ یَا اَبَا ذَرٍّ قُلْتُ لَبَّیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ الْمُسْلِمَ لَیُصَلِّی الصَّلٰوةَ یُرِیْدُ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ فَتَهَافَتُ عَنْهُ ذُنُوْبُهٗ كَمَا تَهَافَتُ هٰذَا الْوَرَقُ عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ جاڑے کے موسم میں جبکہ پت جھڑ کا وقت تھا باہر تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے ایک درخت کی دو شاخیں پکڑیں۔ راوی کہتے ہیں کہ جس طرح حسب معمول پت جھڑ کے موسم میں کسی شاخ کو ہلانے سے پتے بہت زیادہ گرنے لگتے ہیں اسی طرح جب آپ ﷺ نے شاخیں پکڑیں تو ان سے پتے جھڑنے لگے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، "ابوذر!" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب بندۂ مؤمن خالصاً للہ نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ بھی ایسے ہی جھڑتے ہیں جس طرح اس درخت سے یہ پتے جھڑ رہے ہیں۔" (احمدؒ)

تشریح: خالصاً للہ نماز پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز کسی کو دکھلانے یا کسی دوسری غرض و مقصد کے لئے نہ پڑھی جائے بلکہ محض اپنے پروردگار کی خوشنودی اور فرمانبرداری اور اس کی رضا کی طلب کے لئے پڑھی جائے۔

(۱۳) وَعَنْ زَیْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰی سَجْدَتَیْنِ لَا یَسْهُوْ فِیْهِمَا غَفَرَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت زید ابن خالد جہنیؓ راوی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ نے فرمایا" جس شخص نے دو رکعت نماز (غافل ہو کر نہیں بلکہ اس درجہ حضوری قلب کے ساتھ) پڑھیں کہ ان میں سہو نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے گناہوں کو بخش دے گا۔" (احمدؒ)

(۱۴) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ ذَكَرَ الصَّلٰوةَ یَوْمًا فَقَالَ مَنْ حَافَظَ عَلَیْهَا كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا وَبُرْهَانًا وَنَجَاةً یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَمَنْ لَّمْ یُحَافِظْ عَلَیْهَا لَمْ تَكُنْ لَّهٗ نُوْرًا وَّلَا بُرْهَانًا وَّلَا نَجَاةً وَّكَانَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَاُبَیِّ بْنِ خَلَفٍ۔ (رواہ احمد والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ راوی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے نماز کا ذکر کیا (یعنی نماز کی فضیلت و اہمیت کو بیان کرنے کا ارادہ فرمایا) چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا، جو شخص نماز پر محافظت کرتا ہے (یعنی ہمیشہ پابندی سے پڑھتا ہے) تو اس کے لئے یہ نماز ایمان کے نور (کی زیادتی کا سبب) اور ایمان کے کمال کی واضح دلیل ہوگی، نیز قیامت کے روز مغفرت کا ذریعہ بنے گی اور جو شخص نماز پر محافظت نہیں کرتا تو اس کے لئے نہ (ایمان کے) نور (کی زیادتی کا سبب بنے گی، نہ (کمال ایمان کی) دلیل اور نہ (قیامت کے روز) مغفرت کا ذریعہ بنے گی بلکہ ایسا شخص قیامت کے روز قارون، فرعون، ہامان اور ابی ابن خلف کے ساتھ (عذاب میں مبتلا) ہوگا۔" (احمدؒ، دارمیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: "نماز کی محافظت" کا مطلب یہ ہے کہ نماز باقاعدگی اور پوری پابندی سے پڑھی جائے۔ کبھی ناغہ نہ ہو، نیز نماز کے تمام فرائض واجبات سنن اور مستحبات اداء کئے جائیں، اس طرح جب کوئی شخص نماز پڑھے گا تو کہا جائے گا کہ اس نے نماز کی محافظت کی اور یہ مذکورہ ثواب کا حقدار ہوگا اور جو شخص اس کے برعکس عمل اختیار کرے گا کہ نہ تو نماز باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ پڑھے اور نہ نماز کے فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات کی رعایت کرے تو اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ ان چیزوں کو ترک کرنے کی وجہ سے مذکورہ عذاب کا مستحق ہوگا۔

لہٰذا غور کرنا چاہئے کہ نماز کی محافظت اور اس پر دوام اختیار کرنے کی کس قدر تاکید ہے اس لئے اس میں کوتاہی کرنا در اصل عذاب خداوندی اور اپنی بربادی کو دعوت دینا ہے۔ نیز یہ بھی خیال کرنا چاہئے کہ جب نماز کی محافظت نہ کرنے پر اس قدر وعید ہے کہ ایسے شخص کا حشر مذکورہ لوگوں جیسے لعین و بدبخت کفار کے ساتھ ہونے کی خبر دی جارہی ہے تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جو نماز کو ترک کرتا ہے اور ایک وقت بھی خدا تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا؟۔

قارون و فرعون جیسے مشہور لعین اور بدبختوں کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ ہامان فرعون کا وزیر تھا۔ ابی بن خلف وہ مشہور مشرک ہے جو آنحضرت ﷺ کا جانی دشمن تھا اور جسے آنحضرت ﷺ نے جنگ احد میں اپنے دست مبارک سے موت کے گھاٹ اتار کر جہنم رسید کیا تھا چنانچہ اسی وجہ سے اس لعین کو امت کے بدبختوں میں سب سے بڑا بدبخت کہا جاتا ہے۔

آخر میں اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص محافظت کرے گا یعنی پورے خلوص اور تمام فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات کے ساتھ نماز ہمیشہ پابندی سے پڑھتا رہے گا تو قیامت میں وہ انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صلحاء کے ہمراہ ہوگا۔ خدائے تعالیٰ ہم سب کو نماز کی پابندی اور پورے ذوق و شوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم سب اس سعادت سے بہرہ ور ہو سکیں۔

⑮ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ شَقِيْقٍ قَالَ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرَوْنَ شَيْئًا مِنَ الْاَعْمَالِ تَرْكُهُ كُفْرٌ غَيْرُ الصَّلَاةِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن شقیق فرماتے ہیں کہ تمام افعال و اعمال میں صرف نماز ہی ایسا عمل تھا جس کے چھوڑنے کو نبی کریم ﷺ کے محترم صحابہ کفر سمجھتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہاں جو حصر کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ صحابہ سوائے نماز کے کسی دوسرے عمل کے چھوڑنے کو کفر نہ سمجھتے تھے تو اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کے نزدیک نہ صرف یہ کہ نماز چھوڑنا بڑے سخت گناہ کی بات تھی بلکہ وہ اسے کفر کے بہت قریب سمجھتے تھے۔

⑯ وَعَنْ اَبِى الدَّرْدَاءِ قَالَ اَوْصَانِىْ خَلِيْلِىْ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَاِنْ قُطِعْتَ وَحُرِّقْتَ وَلَا تَتْرُكْ صَلَاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّدًا فَمَنْ تَرَكَهَا مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ وَلَا تَشْرَبِ الْخَمْرَ فَاِنَّهَا مِفْتَاحُ كُلِّ شَرٍّ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں کہ میرے دوست (نبی کریم ﷺ) نے مجھے یہ وصیت (فرمائی تھی کہ تم کسی کو اللہ کا شریک نہ بنانا خواہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا کیوں نہ دیا جائے اور جان بوجھ کر فرض نماز نہ چھوڑنا جس نے قصداً نماز چھوڑ دی تو اس سے ذمہ بری ہوگیا نیز کبھی شراب نہ پینا کیونکہ یہ ہر برائی کی کنجی ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے حضرت ابودرداء کو افضل بات کی تعلیم دی کہ اگر تم ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا بھی دیے جاؤ تو شرک نہ کرنا، ورنہ تو جبر کی حالت میں جب کہ گردن تلوار کی زد میں ہو تو دل میں ایمان و ایقان کی پوری دولت لئے زبان سے کلمۂ کفر ادا کر لینا جائز ہے۔

"ذمہ کے بری" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے قصداً نماز ترک کر دی تو گویا اس نے اسلام کے ایک بڑے اور بنیادی قانون و حکم سے بغاوت کی جس کی بناء پر اسلام کا عہد اس سے ختم ہوگیا اور وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ اس مطلب کی وضاحت کرنے کے بعد کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد ازراہ تغلیظ یعنی نماز چھوڑنے والے کے لئے انتہائی تہدید اور تنبیہ ہے۔

یا پھر "اس سے ذمہ بری ہوا" کی مراد یہ ہے کہ ایمان لانے اور اسلام کی اطاعت قبول کرنے کی وجہ سے اسلام نے اس کے جان و مال کی حفاظت کی جو ضمانت لی تھی اور اسلامی اسٹیٹ میں اسے جو امان حاصل تھا اب وہ نماز کے ترک کی وجہ سے اسلام کی امان اور ضمانت سے نکل گیا۔ شراب کو تمام برائیوں کی کنجی اس لے فرمایا گیا ہے کہ شراب بنیادی طور پر انسان کے دل و دماغ اور ذہن و فکر کو بالکل

ماؤف کر دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شراب پینے والا شخص جب نشہ کی وجہ سے اپنی عقل سے ہاتھ دھو لیتا ہے تو دنیا بھر کی برائیاں اس سے سرزد ہونے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شراب کو ام الخبائث کہا گیا ہے۔

بَابُ الْمَوَاقِيْتِ

نماز کے اوقات کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقْتُ الظُّهْرِ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُوْلِهٖ مَالَمْ يَحْضُرِ الْعَصْرُ وَ وَقْتُ الْعَصْرِ مَالَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ وَ وَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَالَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ وَ وَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَاءِ اِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ الْاَوْسَطِ وَ وَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوْعِ الْفَجْرِ مَالَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ فَاِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ فَاَمْسِكْ عَنِ الصَّلٰوةِ فَاِنَّهَا تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ ظہر کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہے اور اس کا آخری وقت جب تک ہے کہ آدمی کا سایہ اس کے طول کے برابر ہو جائے عصر کے آنے کے وقت تک۔ اور عصر کا وقت اس وقت تک ہے جب تک آفتاب زرد نہ ہو جائے اور مغرب کی نماز کا وقت اس وقت تک ہے جب تک شفق غائب نہ ہو جائے اور نماز عشاء کا وقت ٹھیک آدھی رات تک ہے اور نماز فجر کا وقت طلوع فجر سے اس وقت تک ہے جب تک سورج نہ نکل آئے اور جب سورج نکل آئے تو نماز سے باز رہو کیونکہ سورج شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان نکلتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس سے پہلے کہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے نماز کے اوقات کے بارے میں عرض کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چند اصطلاحی الفاظ کے معنی بیان کر دیے جائیں جن کو سمجھنے کے بعد مقصد تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

زوال.... آفتاب کے ڈھلنے کو کہتے ہیں جسے ہماری عرف میں دوپہر ڈھلنا کہا جاتا ہے۔

سایہ اصلی.... اس سایہ کو کہتے ہیں جو زوال کے وقت باقی رہتا ہے۔ یہ سایہ ہر شہر کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے کسی جگہ بڑا ہوتا ہے، کسی جگہ چھوٹا ہوتا ہے اور کہیں بالکل نہیں ہوتا، جیسے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں۔

زوال اور سایہ اصلی کے پہچاننے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ ایک سیدھی لکڑی ہموار زمین پر گاڑی جائے اور جہاں تک اس کا سایہ پہنچے اس مقام پر ایک نشان بنا دیا جائے پھر دیکھا جائے کہ وہ سایہ اس نشان کے آگے بڑھتا ہے یا پیچھے ہٹتا ہے۔ اگر آگے بڑھتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ابھی زوال نہیں ہوا اور اگر پیچھے ہٹے تو زوال ہو گیا۔ اگر یکساں رہے نہ پیچھے ہٹے نہ آگے بڑھے تو ٹھیک دوپہر کا وقت ہے اس کو استواء کہتے ہیں۔

ایک مثل.... سایہ اصلی کے سوا جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے۔

دو مثل.... سایۂ اصلی کے سوا جب ہر چیز کا سایہ اس سے دوگنا ہو جائے۔

ان اصطلاحی تعریفات کو سمجھنے کے بعد اب حدیث کی طرف آیئے: سرکار دو عالم ﷺ نے اوقات نماز کے سلسلہ میں سب سے پہلے ظہر کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے وقت نماز کی تعلیم کے سلسلہ میں سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کو یہی نماز پڑھائی تھی، یہی وجہ ہے کہ نماز ظہر کی نماز کو پیشین کہا جاتا ہے۔

نماز ظہر کا اوّل وقت اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب کہ آسمان کے درمیان آفتاب مغرب کی طرف تھوڑا سا مائل ہوتا ہے جس کو زوال کہتے ہیں اور اس کا آخری وقت وہ ہوتا ہے جب کہ آدمی کا سایہ اس کے طول کے برابر علاوہ سایۂ اصلی کے ہو جاتا ہے۔ سایۂ اصلی کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہ سایہ ہوتا ہے جو زوال کے وقت ہوتا ہے یعنی اکثر مقامات پر جب کہ آفتاب سمت راس پر نہیں آتا تو وہاں ٹھیک دوپہر کے وقت ہر چیز کا تھوڑا سا سایہ ہوتا ہے اس سایہ کو چھوڑ کر جب تک کسی چیز کے طول کے برابر سایہ رہے گا ظہر کا وقت باقی رہے گا۔

مالم یحضر العصر (عصر کا وقت آنے تک) یہ جملہ دراصل پہلے جملہ کی تاکید ہے کیونکہ جب ایک مثل تک سایہ پہنچ گیا تو وقت ظہر ختم ہو گیا۔ اور عصر کا وقت شروع ہو گیا چونکہ اس جملہ کا مطلب پہلے ہی جملہ سے ادا ہو گیا تھا اس لئے یہی کہا جائے گا کہ یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ ہاں اتنی بات اور کہی جا سکتی ہے کہ یہ جملہ اس چیز کی دلیل ہے کہ ظہر اور عصر کے درمیان وقت مشترک نہیں ہے جیسا کہ امام مالکؒ کا مسلک ہے۔ عصر کے وقت کی ابتداء تو معلوم ہو گئی کہ جب ظہر کا وقت ختم ہو جائے گا عصر کا وقت شروع ہو جائے گا۔ آخری وقت کی بات یہ ہے کہ جب تک آفتاب زرد نہیں ہو جاتا عصر کا وقت بلا کراہت باقی رہتا ہے چنانچہ حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے۔ البتہ اس کے بعد غروب آفتاب تک وقت جواز باقی رہتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آفتاب کی زردی سے کیا مراد ہے؟ تو بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آفتاب کے زرد ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کی ٹکیہ اتنی متغیر ہو جائے کہ اس کی طرف نظر اٹھانے سے آنکھوں میں خیرگی نہ ہو۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کی جو شعاعیں دیوار وغیرہ پر پڑتی ہیں اس میں تغیر ہو جائے۔

لگے ہاتھوں اتنی بات اور جانتے چلئے کہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ اور صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ نیز حضرت امام زفرؒ وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ ظہر کا وقت ایک مثل تک باقی رہتا ہے اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے چنانچہ ان حضرات کی دلیل یہی حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر کا آخری وقت ایک مثل تک رہتا ہے۔

جہاں تک حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کا تعلق ہے تو ایک روایت کے مطابق ان کا بھی وہی مسلک ہے جو جمہور علماء کا ہے بلکہ بعض حضرات نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ امام اعظمؒ کا فتویٰ بھی اسی مسلک پر ہے چنانچہ در مختار میں بہت سی کتابوں کے حوالوں سے اسی مسلک کو ترجیح دی گئی ہے۔ مگر ان کا مشہور مسلک یہ ہے کہ ظہر کا وقت دو مثل تک رہتا ہے ان کے دلائل ہدایہ وغیر میں مذکور ہیں۔

بہر حال علماء نے اس سلسلہ میں ایک صاف اور سیدھی راہ نکالی ہے وہ کہتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ ظہر کی نماز تو ایک ایک مثل کے اندر اندر پڑھ لی جائے اور عصر کی نماز دو مثل کے بعد پڑھی جائے تاکہ دونوں نمازیں بلا اختلاف ادا ہو جائیں۔

مغرب کا وقت آفتاب چھپنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور شفق غائب ہو جانے کے وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اکثر ائمہ کے نزدیک شفق اس سرخی کو کہتے ہیں جو آفتاب چھپنے کے بعد ظاہر ہوتی ہے چنانچہ اہل لغت کا کہنا بھی یہی ہے۔ مگر حضرت امام اعظمؒ اور علماء کی ایک دوسری جماعت کا قول یہ ہے کہ شفق اس سفیدی کا نام ہے جو سرخی ختم ہونے کے بعد نمودار ہوتی ہے۔

اہل لغت و دیگر ائمہ کے قول کے مطابق حضرت امام اعظمؒ کا بھی ایک قول یہ ہے کہ شفق سرخی کا نام ہے چنانچہ شرح وقایہ میں فتویٰ اسی قول پر مذکور ہے۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مغرب کی نماز تو سرخی غائب ہونے سے پہلے پڑھی جائے اور عشاء کی نماز سفیدی غائب ہونے کے بعد پڑھی جائے تاکہ دونوں نمازیں بلا اختلاف ادا ہوں۔

عشاء کے بارے میں مختار مسلک اور فیصلہ یہ ہے کہ اس کا وقت شفق غائب ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے اور ٹھیک آدھی رات تک بلا کراہت باقی رہتا ہے البتہ وقت جواز طلوع فجر سے پہلے تک رہتا ہے۔

فجر کا وقت طلوع صبح صادق کے بعد شروع ہوتا ہے اور طلوع آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے۔ بظاہر تو حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلوع

صبح صادق کے بعد سے طلوع آفتاب تک تمام وقت نماز فجر کے لئے مختار ہے مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ فجر کی نماز کا وقت مختار اسفار تک ہے اس کے بعد وقت جواز رہتا ہے۔

نماز کے اوقات کی تفصیل جان لینے کے بعد اب حدیث کے آخری جملہ کا مطلب بھی سمجھ لیجئے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "جب سورج نکل آئے تو نماز سے باز رہو کیونکہ سورج شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان نکلتا ہے" اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سورج کے نکلنے کی جگہ شیطان کے دونوں سینگ ہیں کہ سورج اس کے اندر سے طلوع ہوتا ہے بلکہ اس کا مطلب خود ایک روایت نے بتادیا ہے کہ طلوع آفتاب کے وقت شیطان آفتاب کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنا سر آفتاب کے نزدیک کر لیتا ہے اسی طرح غروب آفتاب کے وقت کرتا ہے اس کے اس طرز عمل کا سبب یہ ہے کہ جو لوگ آفتاب کو پوجتے ہیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں ان کفار کے اس طرز عمل کے ذریعہ وہ اپنا گمان یہ رکھتا ہے کہ لوگ میری عبادت کر رہے ہیں اسی طرح وہ اپنے تابعداروں کے ذہن میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ یہ لوگ آفتاب کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہیں بلکہ درحقیقت میری عبادت کر رہے ہیں اور میرے سامنے ماتھے ٹیکتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی اُمت کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ ان اوقات میں نماز نہ پڑھا کریں تاکہ مسلمانوں کی عبادت شیطان کو پوجنے والوں کی عبادت کے اوقات میں نہ ہو۔

(۲) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ اِنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَقْتِ الصَّلَاةِ فَقَالَ لَهُ صَلِّ مَعَنَا هٰذَيْنِ يَعْنِي الْيَوْمَيْنِ فَلَمَّا زَالَتِ الشَّمْسُ اَمَرَ بِلَالاً فَاَذَّنَ ثُمَّ اَمَرَهُ فَاَقَامَ الظُّهْرَ ثُمَّ اَمَرَهُ فَاَقَامَ الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ ثُمَّ اَمَرَهُ فَاَقَامَ الْمَغْرِبَ حِيْنَ غَابَتِ الشَّمْسُ ثُمَّ اَمَرَهُ فَاَقَامَ الْعِشَاءَ حِيْنَ غَابَ الشَّفَقُ ثُمَّ اَمَرَهُ فَاَقَامَ الْفَجْرَ حِيْنَ طَلَعَ الْفَجْرُ فَلَمَّا اَنْ كَانَ الْيَوْمُ الثَّانِي اَمَرَهُ فَاَبْرِدْ بِالظُّهْرِ فَاَبْرَدَبِهَا فَاَنْعَمَ اَنْ يُبْرِدَبِهَا وَصَلَّى الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ اَخَّرَهَا فَوْقَ الَّذِيْ كَانَ وَصَلَّى الْمَغْرِبَ قَبْلَ اَنْ يَغِيْبَ الشَّفَقُ وَصَلَّى الْعِشَاءَ بَعْدَ مَاذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ وَصَلَّى الْفَجْرَ فَاَسْفَرَ بِهَا ثُمَّ قَالَ اَيْنَ السَّائِلُ عَنْ وَقْتِ الصَّلَاةِ فَقَالَ الرَّجُلُ اَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَقْتُ صَلَاتِكُمْ بَيْنَ مَا رَاَيْتُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے نماز کا وقت دریافت کیا (کہ نماز کا اول و آخر وقت کیا ہے) آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ ان دو دنوں میں تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو (تاکہ میں تمہیں نماز کے اوقات دکھادوں) چنانچہ جب سورج ڈھل گیا آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو (اذان کا) حکم دیا، حضرت بلالؓ نے اذان دی۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں (تکبیر کہنے کا، حکم دیا، انہوں نے ظہر کی تکبیر کہی اور آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی) پھر آپ ﷺ نے عصر کی اقامت کا حکم دیا جب کہ سورج بلند اور سفید و صاف تھا (اور عصر کی نماز پڑھائی، پھر مغرب کی اقامت کا حکم دیا جب کہ سورج غروب ہی ہوا تھا، (اور مغرب کی نماز پڑھائی) پھر عشاء کی اقامت کا حکم دیا جب کہ شفق غائب ہوئی تھی اور عشاء کی نماز پڑھائی) پھر فجر نمودار ہوتے ہی آپ ﷺ نے تمام نمازیں اول وقت پڑھا کر دکھادیں کہ نمازوں کا اول وقت یہ ہے) پھر جب دوسرا دن ہوا تو آپ ﷺ نے بلالؓ کو ظہر کو ٹھنڈا کر کے اذان دینے کا حکم دیا اور خوب ٹھنڈا کر کے ظہر کی نماز کو پڑھایا اور عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ سورج بلند تھا لیکن کل کے وقت سے دیر کر کے نماز پڑھائی اور مغرب کی نماز شفق غائب ہونے سے پہلے (یعنی شفق غائب ہونے کے قریب) پڑھائی اور عشاء کی نماز تہائی رات گزر جانے پر پڑھائی اور فجر کی نماز خوب روشنی ہو جانے پر پڑھائی اور اس کے بعد فرمایا نماز کے اوقات دریافت کرنے والا شخص کہاں ہے؟ اس شخص نے سامنے (آکر عرض کیا یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں! آپ ﷺ نے فرمایا، تمہاری نماز کے اوقات ان اوقات کے درمیان ہیں جو تم ان دو دنوں میں) دیکھ چکے ہو۔" (مسلم)

تشریح: سائل کا مطلب یہ تھا کہ نمازوں کے اوقات کے سلسلہ میں یہ بتادیا جائے کہ نماز کا اول وقت کیا ہوتا ہے اور آخر وقت کون سا ہوتا ہے؟ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسے نمازوں کے اوقات کو زبانی سمجھانے سے زیادہ بہتر یہ سمجھا کہ اسے عملی طور پر دکھایا جائے تاکہ

اوقات اس کے ذہن نشین ہو سکیں اس لئے آپ ﷺ نے اسے نماز کا اول و آخر دونوں وقت بتانے کے لئے پہلے دن تو نمازیں اول وقت پڑھیں اور دوسرے دن آخر وقت میں پڑھیں۔

حدیث میں پہلے ظہر کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب آفتاب ڈھل گیا تو آپ ﷺ نے بلال ؓ کو اذان دینے کا حکم دیا چنانچہ انہوں نے اذان دی پھر آپ ﷺ نے اقامت کا حکم دیا تو انہوں نے اقامت کہی۔ اس کے بعد عصر کا ذکر کیا گیا ہے لیکن نہ تو عصر کی نماز کا وقت ذکر کیا گیا ہے اور نہ عصر ہی اور نہ اس کے بعد کی اذانوں کا ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معروف ہے۔

دوسرے دن آپ ﷺ نے ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھا یعنی پہلے روز کے مقابلے میں دوسرے دن ظہر کی نماز اتنی تاخیر سے پڑھی کہ گرمی کی شدت اور تپش کی سختی جاتی رہی تھی۔

عصر کی نماز آپ ﷺ نے پہلے روز کی تاخیر کے مقابلہ میں زیادہ تاخیر سے یعنی دو مثلین کے بعد پڑھی لیکن پہلے روز کی تاخیر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عصر کی نماز میں پہلے روز تاخیر کی گئی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز ظہر سے تاخیر کی گئی تھی۔

دوسرے روز آپ ﷺ نے تمام نمازوں کو تاخیر سے یعنی ان کے آخری اوقات میں ادا کیا جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا۔ مگر آپ ﷺ نے عشاء کو آخر وقت تک مؤخر نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر آپ ﷺ عشاء کو اس کے آخر وقت مختار یعنی آدھی رات تک مؤخر کرتے تو اس سے لوگوں کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے تکلیف اور پریشانی ہوتی اور اگر آپ ﷺ عشاء سے پہلے سو رہتے تو مناسب نہ ہوتا کیونکہ عشاء کی نماز سے پہلے سونا مکروہ ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ان دو دنوں میں ہمارے ساتھ نماز پڑھ کر یہ دیکھ لیا ہے کہ نمازوں کا اول وقت کیا ہے اور آخری وقت کیا ہے لہٰذا شروع سے لے کر آخر تک اول وقت بھی ہے اور اوسط بھی اور آخر وقت بھی ہے لہٰذا اس کے درمیان تم جب چاہو نماز پڑھ سکتے ہو۔ آخر وقت سے مراد وقت مختار ہے نہ کہ وقت جواز۔ اس لئے کہ نمازوں کے جو آخری وقت آپ ﷺ نے بیان فرمائے ہیں ان کے بعد بھی نماز کا وقت باقی رہتا ہے تاہم وہ وقت جواز ہوتا ہے وقت مختار نہیں ہوتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

﴿۳﴾ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّنِیْ جِبْرِيْلُ عِنْدَ الْبَيْتِ مَرَّتَيْنِ فَصَلّٰى بِیَ الظُّهْرَ حِيْنَ زَالَتِ الشَّمْسُ وَكَانَتْ قَدْرَ الشِّرَاكِ وَصَلّٰى بِیَ الْعَصْرَ حِيْنَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلَهُ وَصَلّٰى بِیَ الْمَغْرِبَ حِيْنَ اَفْطَرَ الصَّائِمُ وَصَلّٰى بِیَ الْعِشَاءَ حِيْنَ غَابَ الشَّفَقُ وَصَلّٰى بِیَ الْفَجْرَ حِيْنَ حَرُمَ الطَّعَامُ وَالشَّرَابُ عَلَى الصَّائِمِ فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ صَلّٰى بِیَ الظُّهْرَ حِيْنَ كَانَ ظِلُّهُ مِثْلَهُ وَصَلّٰى بِیَ الْعَصْرَ حِيْنَ كَانَ ظِلُّهُ مِثْلَيْهِ وَصَلّٰى بِیَ الْمَغْرِبَ حِيْنَ اَفْطَرَ الصَّائِمُ وَصَلّٰى بِیَ الْعِشَاءَ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ وَصَلّٰى بِیَ الْفَجْرَ فَاَسْفَرَ ثُمَّ الْتَفَتَ اِلَیَّ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ هٰذَا وَقْتُ الْاَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِكَ وَالْوَقْتُ مَا بَيْنَ هٰذَيْنِ الْوَقْتَيْنِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے (نماز کی کیفیت اور اوقات بتانے کے لئے) امام بن کر خانہ کعبہ کے نزدیک مجھے دو مرتبہ (دو روز) نماز پڑھائی ہے چنانچہ (پہلے روز جس وقت سورج ڈھل گیا اور سایہ تسمہ کی مانند تھا تو مجھے ظہر کی نماز پڑھائی اور جس وقت ہر چیز کا سایہ (علاوہ سایہ اصلی کے) اس کے برابر ہو گیا تو مجھے عصر کی نماز پڑھائی اور جس وقت روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے (یعنی سورج چھپنے کے بعد) تو مجھے مغرب کی نماز پڑھائی اور شفق غائب ہونے کے وقت مجھے عشاء کی نماز پڑھائی اور جس وقت روزہ دار کے لئے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے (یعنی صبح صادق کے بعد) تو مجھے فجر کی نماز پڑھائی۔ اور جب اگلا روز ہوا تو انہوں نے مجھے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ سایہ ایک مثل (کے قریب) ہو گیا اور مجھے عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ روزہ دار افطار کرتا ہے اور مجھے

عشاء کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ تہائی رات ہو گئی تھی اور مجھے فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ خوب روشنی ہو گئی تھی اور پھر (جبرئیل نے) میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اے محمد (ﷺ)! یہ وقت آپ (ﷺ) سے پہلے کے نبیوں (کی نماز) کا ہے اور نماز انہیں دو وقتوں کے بیچ بیچ ہے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: جگہ اور وقت کے اعتبار سے سایۂ اصلی مختلف ہوتا ہے چنانچہ بعض جگہ تو سایہ زیادہ ہوتا ہے اور بعض جگہ کم ہوتا ہے اور بعض وقت سایۂ اصلی ہوتا ہی نہیں جیسا کہ مکہ معظمہ میں انیسویں سرطان کو سایۂ اصلی نہیں ہوتا۔ اس لئے سرکار دو عالم ﷺ نے پہلے روز کی نماز ظہر کے وقت کے بارے میں فرمایا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پہلے دن مجھے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب ان دنوں میں مکہ معظمہ میں سایۂ اصلی جوتوں کے تسموں کی چوڑائی کے برابر تھا گویا وہ ظہر کا اوّل وقت تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

④ عَنِ ابْنِ شَهَابٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ اَخَّرَ الْعَصْرَ شَيْئًا فَقَالَ لَهٗ عُرْوَةُ اَمَا اِنَّ جِبْرِيْلَ قَدْ نَزَلَ فَصَلّٰى اَمَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ اِعْلَمْ مَا تَقُوْلُ يَا عُرْوَةُ فَقَالَ سَمِعْتُ بَشِيْرَ بْنَ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ اَبَا مَسْعُوْدٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ نَزَلَ جِبْرِيْلُ فَاَمَّنِيْ فَصَلَّيْتُ مَعَهٗ ثُمَّ صَلَّيْتُ مَعَهٗ ثُمَّ صَلَّيْتُ مَعَهٗ ثُمَّ صَلَّيْتُ مَعَهٗ ثُمَّ صَلَّيْتُ مَعَهٗ يَحْسُبُ بِاَصَابِعِهٖ خَمْسَ صَلَوَاتٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن شہاب[1] راوی ہیں کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے (ایک روز) عصر کی نماز (وقت مختار سے کچھ) تاخیر کر کے پڑھی حضرت عروہؒ نے (جب یہ دیکھا تو) کہا کہ سمجھ لیجیے! حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر نبی کریم ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر (اوّل وقت) نماز پڑھائی تھی۔ حضرت عمرؒ نے فرمایا، عروہ! ذرا سوچ سمجھ کر کہو کیا کہتے ہو؟ عروہ نے کہا، میں نے حضرت ابو مسعودؓ کے صاحبزادے حضرت بشیرؒ سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے حضرت ابو مسعودؓ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے۔ کہ جبرئیل علیہ السلام آکر میرے امام بنے اور میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، (راوی کہتے ہیں کہ) آنحضرت ﷺ نے پانچ نمازیں انگلیوں پر گن کر بتائیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عروہ کا یہ مقصد تھا کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو یہ یاد دلائیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی امامت کے بارے میں جو حدیث وارد ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو پہلے دن اوّل وقت نمازیں پڑھائی تھیں تو اس سے معلوم ہوا کہ نمازوں کو اوّل وقت پڑھنا افضل ہے اس لئے آپؒ نے اس وقت نماز میں تاخیر کر کے اگرچہ یہ تاخیر زیادہ نہیں تھی فضیلت کی سعادت کو کیوں ترک کیا؟۔

حضرت عمرؒ نے جواب میں جو یہ کہا کہ، عروہ! ذرا سوچ سمجھ کر کہو کیا کہتے ہو؟ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی احادیث کو بیان کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک اہم اور عظیم الشان چیز ہے حدیث کو بیان کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے نیز حدیث کو بغیر سند کے بیان نہ کرنا چاہئے اس لئے سوچ سمجھ کر حدیث بیان کرو اور اس سند کے ساتھ بیان کرو۔

حضرت عروہؒ کی جلالت شان اور رفعت علم و فضل کا گو تقاضا تو یہ تھا کہ ان سے اس قسم کی بات نہ کہی جاتی مگر چونکہ روایت حدیث کی عظمت شان پیش نظر تھی اس لئے انہیں اس طرف توجہ دلائی گئی اور پھر عروہؒ نے بھی روایت حدیث کی اسی عظمت کے پیش نظر حضرت عمرؒ کے توجہ دلانے کو نہ صرف یہ کہ اپنے علم و فضل کے منافی نہ سمجھا بلکہ اسے خیر و برکت کا باعث جان کر اس پر متنبّہ ہوئے اور حدیث کی پوری سند یوں بیان کر کے اپنی قوت حفظ و ذہانت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بات واضح کر دی کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں وہ کوئی معمولی درجہ کی

---

[1] اسم گرامی محمد بن عبداللہ بن شہاب ہے زہری کی نسبت سے مشہور ہیں۔ آپ کی وفات ماہ رمضان ۱۲۴ھ میں ہوئی آپ جلیل القدر تابعیؒ تھے ۱۲۔

نہیں ہے بلکہ اس کی صداقت کا میں یقینی علم رکھتا ہوں کیونکہ یہ وہ روایت ہے جس کو میں نے بشیرؒ سے سنا ہے اور انہوں نے ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابو مسعودؓ سے سنا اور انہوں نے خود آنحضرت ﷺ کی لسان مقدس سے سنا ہے۔

اس حدیث میں راوی نے نماز کے اوقات تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مخاطب کو چونکہ اوقات کی پوری تفصیل معلوم تھی اس لئے یہاں تو صرف صورت واقعہ بیان کی گئی ہے ہاں دوسری روایات میں اوقات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔

⑤ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّهُ كَتَبَ اِلٰى عُمَّالِهِ اَنَّ اَهَمَّ اُمُوْرِكُمْ عِنْدِي الصَّلَاةُ مَنْ حَفِظَهَا وَ حَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهُ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ ثُمَّ كَتَبَ اَنْ صَلُّوا الظُّهْرَ اِذَا كَانَ الْفَيْئُ ذِرَاعًا اِلٰى اَنْ يَكُوْنَ ظِلُّ اَحَدِكُمْ مِثْلَهُ وَالْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ قَدْرَ مَا يَسِيْرُ الرَّاكِبُ فَرْسَخَيْنِ اَوْ ثَلَاثَةً قَبْلَ مَغِيْبِ الشَّمْسِ وَالْمَغْرِبَ اِذَا غَابَتِ الشَّمْسُ وَالْعِشَاءَ اِذَا غَابَ الشَّفَقُ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ فَمَنْ نَامَ فَلَا نَامَتْ عَيْنُهُ وَالصُّبْحَ وَالنُّجُوْمُ بَادِيَةٌ مُشْتَبِكَةٌ۔

(رواہ مالک)

"اور امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اپنے عاملوں (یعنی اسلامی سلطنت کے حکام) کے پاس یہ لکھ کر بھیجا تھا کہ تمہارے سب کاموں میں مہتم بالشان کام میرے نزدیک نماز کا پڑھنا ہے لہٰذا جس نے اس کی محافظت کی (یعنی ارکان و شرائط کے ساتھ نماز پڑھی، اور اس پر نگہبانی رکھی (یعنی اسے ہمیشہ اداء کرتا رہا اور ریاء و نمائش کے سبب اسے باطل نہ کیا) تو گویا اس نے اپنے دین (کے بقیہ امور کی نگہبانی و محافظت کی اور جس نے اسے ضائع کر دیا تو وہ اس چیز کو جو نماز کے علاوہ ہے بہت زیادہ ضائع کرنے والا ہے۔ پھر یہ لکھا کہ ظہر کی نماز ایک گز سایۂ زوال ہونے سے لے کر ایک مثل سایہ تک (علاوہ سایہ اصلی کے) پڑھا کرو اور عصر کی نماز ایسے وقت پڑھا کرو کہ سورج اونچا اور سفید رہے اور سورج ڈوبنے میں) اتنا وقت رہے کہ کوئی سوار سورج ڈوبنے سے پہلے دو یا تین میل طے کر سکے اور مغرب کی نماز سورج ڈوبنے کے بعد پڑھا کرو اور عشاء کی نماز شفق غائب ہونے کے وقت سے تہائی رات تک پڑھا کرو اور جو شخص (عشاء سے پہلے) سو جائے (تو خدا کرے) ان کی آنکھوں کو سونا نصیب نہ ہو (تین مرتبہ یہ دعا کی اور لکھا ہے کہ) صبح کی نماز ایسے وقت پڑھو جب کہ ستارے گنجان چمکتے ہوئے ہوں (یعنی تاریکی میں پڑھو)۔" (مالکؒ)

تشریح: چونکہ نماز دین کا ستون اور بنیاد ہے نیز یہی وہ عبادت ہے جو برائیوں سے روکتی اور بھلائی و سعادت کے راستہ پر لگاتی ہے اس لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس نے نماز کی محافظت کی گویا اس نے دین کے تمام امور کی محافظت کی۔ اسی طرح فرمایا کہ جس نے نماز کو ضائع کیا یعنی نماز یا تو بالکل پڑھی ہی نہیں اور اگر پڑھی تو شرائط و واجبات کا قطعًا لحاظ نہ کیا تو وہ نماز کے علاوہ دیگر واجبات و مستحبات اور دینی امور کو بہت زیادہ ضائع کرنے والا ہے کیونکہ نماز ہی عبادات کی اصل ہے جب اس نے اسی کا خیال نہ رکھا تو اس سے دوسرے امور دین کے خیال رکھنے اور ان پر عمل کرنے کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔

حضرت عمرؓ کا یہ حکم کہ ظہر کی نماز ایک گز سایہ زوال ہونے کے وقت یعنی اس کے فورًا بعد کہ وہ ظہر کا اول وقت ہوگا، پڑھو۔ ان مقامات کے لئے ہے جہاں سایہ اصلی اسی قدر ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سایہ اصلی مقامات اور وقت کے اعتبار سے ہوتا ہے کہ کہیں تو زیادہ ہوتا ہے اور کہیں کم ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے عشاء سے پہلے سونے والے کے بارے میں تین مرتبہ بد دعا تاکید و تہدید کے لئے فرمائی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عشاء سے پہلے نماز پڑھے بغیر جو شخص سو جائے خدا اس کی آنکھوں کو سونا نصیب نہ کرے وہ بے آرامی و بے قراری میں مبتلا رہے۔

چنانچہ حضرت ابن حجر شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عشاء کی نماز سے پہلے سونا حرام ہے مگر حنفیہ کے نزدیک یہ حکم تفصیل پر محمول ہے یعنی اگر کوئی نماز کا وقت شروع ہو جانے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے سوئے اور اسے اس بات کا گمان بھی ہو کہ میں نماز کے آخر وقت تک سوتا ہی رہوں گا تو اس کے لئے یہ سونا جائز نہ ہوگا۔ اور اگر اسے اپنے اوپر کامل اعتماد ہو کہ میں بغیر جگائے ایسے وقت

اٹھ جاؤں گا کہ وقت کے اندر اندر پوری نماز پڑھ لوں گا تو اس کے لئے سونا جائز ہو گا۔

مذکورہ بالا حکم وقت شروع ہو جانے کے بعد سونے کے سلسلہ میں ہے لیکن وقت شروع ہونے سے پہلے سونے کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس بارے میں بھی وہی پہلی تفصیل کی جائے گی۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ وقت شروع ہونے سے پہلے سوجانا مطلق حرام نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی شخص وقت شروع ہونے سے پہلے نماز کے لئے مکلف نہیں ہوتا۔

⑥ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ قَدْرُ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ فِي الصَّيْفِ ثَلَاثَةَ اَقْدَامٍ اِلٰى خَمْسَةِ اَقْدَامٍ وَفِي الشِّتَاءِ خَمْسَةَ اَقْدَامٍ اِلٰى سَبْعَةِ اَقْدَامٍ۔ (رواه ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی نماز ظہر کا اندازہ گرمیوں میں تین قدم سے پانچ قدم تک اور جاڑوں میں پانچ قدم سے سات قدم تک تھا۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: دونوں موسم میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ سردی کے موسم میں سایہ اصلی زیادہ ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں سایہ اصلی کم ہوتا ہے خصوصاً حرمین میں ورنہ یہ دونوں وقت برابر ہیں۔

یہ حدیث بہر صورت زوال کے بعد ظہر کی نماز کو تاخیر کرنے پر دلالت کرتی ہے قدم سے مراد ہر شخص کے قد کا ساتواں حصہ ہے چنانچہ اس اعتبار سے کہ ہر شخص کے قد کا طول اس کے سات قدم (یعنی سات پاؤں) کے برابر ہوتا ہے ہر چیز کا طول سات قدم مقرر[1] ہے۔

بَابُ تَعْجِيلِ الصَّلٰوةِ
جلدی نماز پڑھنے کا بیان

ارشاد ربانی ہے:

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ — "یعنی بھلائیوں میں جلدی کرو۔"

آیت سے معلوم ہوا کہ نماز کے بارے میں اصل یہی ہے کہ اسے جلدی یعنی اوّل وقت ادا کر لیا جائے لیکن اتنی بات سمجھ لیجئے کہ آیت کا مفہوم تو یہی ہے کہ بھلائی کے تمام کاموں کو جن میں نماز بھی شامل ہے جلدی کر ڈالنا بہتر اور مناسب ہے مگر جن مواقع کے لئے شارع علیہ السلام نے تاخیر کا حکم فرمایا ہے وہاں تاخیر کرنا ہی اولیٰ و افضل ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تمام نمازوں کو ان کے اوّل وقت میں اداء کرنا مطلقاً مستحب ہے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے یہاں کچھ تفصیل ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ سردی کے موسم میں تو ظہر کی نماز اوّل وقت پڑھ لینی چاہئے مگر گرمی کے موسم میں ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھنا چاہئے۔ اسی طرح فجر کی نماز ہر موسم میں اجالے میں پڑھنی چاہئے اور عشاء کی نماز تاخیر کے ساتھ پڑھنی چاہئے نیز عصر کی نماز بھی تاخیر کر کے پڑھنی چاہئے مگر اس میں اتنی تاخیر نہ ہو کہ آفتاب متغیر ہو جائے نمازوں کو جلدی پڑھنے کی حد یہ ہے کہ ان کے اوّل وقت کے پہلے نصف حصہ میں ادا کی جائیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ سَيَّارِ بْنِ سَلَامَةَ قَالَ دَخَلْتُ اَنَا وَاَبِيْ عَلٰى اَبِيْ بَرْزَةَ الْاَسْلَمِيِّ فَقَالَ لَهٗ اَبِيْ كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

[1] اس حدیث کی تشریح کے بعد مصنفؒ نے ایک جدول نقل کی ہے جس کو بوجہ طوالت نقل نہیں کیا جاسکتا آج کل اس سے استفادہ ممکن بھی نہیں ۱۲۔

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ فَقَالَ كَانَ يُصَلِّي الْهَجِيْرَ الَّتِي تَدْعُوْنَهَا الْأُوْلٰى حِيْنَ تَدْحَضُ الشَّمْسُ وَيُصَلِّي الْعَصْرَ ثُمَّ يَرْجِعُ اَحَدُنَا اِلٰى رَحْلِهٖ فِيْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ وَنَسِيْتُ مَا قَالَ فِي الْمَغْرِبِ وَكَانَ يَسْتَحِبُّ اَنْ يُؤَخِّرَ الْعِشَاءَ الَّتِي تَدْعُوْنَهَا الْعَتَمَةَ وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا وَكَانَ يَنْفَتِلُ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ حِيْنَ يَعْرِفُ الرَّجُلُ جَلِيْسَهٗ يَقْرَءُ بِالسِّتِّيْنَ اِلَى الْمِائَةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَلَا يُبَالِيْ بِتَاخِيْرِ الْعِشَاءِ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ وَلَا يُحِبُّ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت سیارؒ ابن سلام فرماتے ہیں کہ میں اور میرے والد (ہم دونوں) حضرت ابوبرزہ اسلمیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، میرے والد نے ان سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ فرض نمازیں کس طرح (یعنی کس کس وقت) پڑھتے تھے، انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ ظہر کی نماز جسے پہلی نماز کہا جاتا ہے سورج ڈھلنے کے وقت پڑھتے تھے اور عصر کی نماز (ایسے وقت) پڑھتے تھے کہ ہم میں سے کوئی نماز پڑھ کر مدینہ کے کنارے اپنے مکان پر جا کر سورج روشن ہوتے ہوئے (یعنی اس کے متغیر ہونے سے پہلے) واپس آ جاتا تھا۔ سیار کہتے ہیں کہ مغرب کے بارے میں ابوبرزہؓ نے جو کچھ بتایا تھا وہ میں بھول گیا اور (ابوبرزہؓ کہتے تھے کہ) عشاء کی نماز جسے تم عتمہ کہتے ہو آنحضرت ﷺ تاخیر سے پڑھنے کو بہتر سمجھتے تھے اور عشاء کی نماز سے پہلے سونے اور عشاء کی نماز کے بعد (دنیاوی) باتیں کرنے کو آپ ﷺ مکروہ سمجھتے تھے اور صبح کو نماز ایسے وقت پڑھ (کر فارغ ہو) لیتے تھے کہ ہر شخص اپنے پاس بیٹھنے والے کو پہچان لیتا تھا اور (نماز میں) ساٹھ آیتوں سے لے کر سو آیتوں تک پڑھ لیا کرتے تھے، ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ تہائی رات تک عشاء میں دیر کرنے میں تامل نہ فرماتے تھے اور عشاء کی نماز سے پہلے سونے اور عشاء کی نماز کے بعد باتیں کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہاں ظہر کے بارے میں جو وقت ذکر گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سردی کے موسم میں ظہر کی نماز اول وقت پڑھتے ہوں گے کیونکہ یہ قولاً اور فعلاً ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ گرمی کے موسم میں ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے۔

عتمہ اس تاریکی کو کہتے ہیں جو شفق غائب ہونے کے بعد ہوتی ہے چنانچہ پہلے عرب میں عتمہ عشاء کو کہتے تھے مگر بعد میں آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو منع کر دیا کہ عشاء کو عتمہ نہ کہا جائے۔ یہاں تاخیر سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ عشاء کی نماز تہائی رات تک تاخیر کر کے پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ عشاء کی نماز کے بعد دنیا کی باتیں کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے اور اس سے مقصد یہ تھا کہ اعمال کا خاتمہ عبادت اور ذکر اللہ پر ہونا چاہئے کیونکہ نیند بمنزلہ موت ہے۔

شرح السنۃ میں منقول ہے کہ عشاء سے پہلے سونے کو اکثر علماء نے مکروہ کہا ہے اور بعض حضرات نے سونے کی اجازت دی ہے چنانچہ حضرت عمرؓ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ عشاء سے پہلے سوتے اور بعض علماء کے نزدیک صرف رمضان میں عشاء سے پہلے سونا جائز ہے۔ حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر نیند کا غلبہ ہو اور یہ خوف نہ ہو کہ عشاء کی نماز کا وقت سونے کی نذر ہو جائے گا تو سونا مکروہ نہیں ہے۔

عشاء کے بعد باتوں میں مشغول ہونے کو علماء کی ایک جماعت نے مکروہ کہا ہے چنانچہ حضرت سعید ابن مسیبؓ کے بارے میں بھی منقول ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میرے نزدیک بغیر عشاء کی نماز پڑھے سو رہنا اس سے بہتر ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد کوئی شخص لغو کلام اور دنیاوی باتوں میں مشغول ہو۔

بعض علماء نے عشاء کے بعد علم کی باتیں کرنے کی اجازت دی ہے اسی طرح ضرورت اور حاجت کے سلسلہ میں یا گھر والوں اور مہمان کے ساتھ باتیں کرنے کی بھی اجازت دی ہے۔ (ملا علی قاریؒ)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں جائز ہیں، یعنی اگر کوئی شخص عشاء کی نماز سے پہلے سستی اور کاہلی کو دور رہنے اور نشاط و تازگی حاصل کرنے کے لئے سونا چاہے تو اس کے لئے سونا جائز ہے، اسی طرح عشاء کی نماز کے بعد ایسی باتیں کرنا جو

ضروری ہوں اور بے معنی نہ ہوں جائز ہے۔

② وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ صَلَاةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كَانَ يُصَلِّي الظُّهْرَ بِالْهَاجِرَةِ وَالْعَصْرَ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ وَالْمَغْرِبَ إِذَا وَجَبَتْ وَالعِشَاءَ إِذَا اَكْثَرَ النَّاسُ عَجَّلَ وَإِذَا قَلُّوْا أَخَّرَ وَالصُّبْحَ بِغَلَسٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت محمد بن ابن عمرو ابن حسنؓ ابن علیؓ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت جابر ابن عبداللہ سے نبی کریم ﷺ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نماز دوپہر ڈھلے پڑھتے تھے اور عصر کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ سورج زنار (یعنی روشن) ہوتا تھا اور مغرب کی نماز آفتاب غروب ہونے کے بعد پڑھتے تھے اور عشاء کی نماز میں جب لوگ زیادہ آجاتے تو جلدی ہی پڑھ لیتے تھے اور جب لوگ کم ہوتے تو تاخیر کر کے پڑھتے تھے اور صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھ لیتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عشاء کی نماز کے بارے میں یہاں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اگر لوگ زیادہ آجاتے تو آپ ﷺ نماز جلدی پڑھ لیتے اور اگر کم آتے تو تاخیر کر کے پڑھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جماعت کی کثرت کے پیش نظر نماز کو اوّل وقت سے تاخیر کر کے پڑھنا جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔ چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین نے اوّل وقت نماز پڑھنے کا التزام اسی لئے نہیں کیا ہے کہ تاخیر سے نماز پڑھنے میں جماعت میں کثرت ہو جاتی ہے نہ یہ کہ ان حضرات کے نزدیک اوّل وقت افضل نہیں ہے۔ اول وقت تو بہر صورت افضل ہے لیکن بعض خارجی عوارض جیسے جماعت کی کثرت وغیرہ کی بناء پر تاخیر ہی اولیٰ ہوتی ہے۔

صبح کی نماز تاریکی میں پڑھنے کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ صحابہؓ رات بھر سونے کے بجائے ذکر و عبادت میں مشغول رہنے کی وجہ سے صبح سویرے ہی مسجد میں موجود رہتے تھے اس لئے آپ ﷺ جماعت کی کثرت کے پیش نظر جلدی پڑھ لیتے تھے۔

آخر میں اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اس حدیث سے یہ بالکل ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ مستقلاً تاریکی ہی میں فجر کی نماز پڑھتے تھے اور اگر بفرض محال اسے مان بھی لیا جائے تو یہ ثابت ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے فجر کی نماز روشنی میں پڑھنے کا حکم دیا ہے اور حنفیہ کے نزدیک فعل کے مقابلہ میں امر (یعنی حکم) کو ترجیح دی جاتی ہے۔

③ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا إِذَا صَلَّيْنَا خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالظَّهَائِرِ سَجَدْنَا عَلٰى ثِيَابِنَا اِتِّقَاءَ الْحَرِّ۔ (متفق علیہ ولفظہ للبخاری)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھتے ہوئے گرمی سے بچنے کے لئے اپنے کپڑوں پر سجدہ کر لیا کرتے تھے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: حنفیہ کے نزدیک چونکہ نمازی اپنے پہنے ہوئے کپڑے پر سجدہ کر سکتا ہے اس لئے یہ حضرات اس حدیث کو اپنے مسلک کی دلیل میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ نمازی کو پہنے ہوئے کپڑے پر سجدہ کرنا درست ہے۔ حضرات شوافع کے نزدیک چونکہ ایسے کپڑے پر جو نمازی کے ہلنے سے حرکت کرتا ہو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے وہ حضرات اس حدیث کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ صحابہؓ جن کپڑوں پر سجدہ کرتے تھے وہ ان کے بدن پر نہیں ہوتے تھے بلکہ گرمی سے بچاؤ کی خاطر انہیں علیحدہ فرش پر بچھائے رکھتے تھے۔

اس حدیث کو مصنف مشکوۃ نے باب تعجیل الصلوۃ میں نقل کیا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ زمین پر گرمی کی تپش اوّل وقت ہی رہتی ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ گرمی کے موسم میں بھی ظہر کی نماز اوّل وقت ہی میں پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ یہ بات اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتی کیونکہ بسا اوقات بلکہ زیادہ گرمی کے موسم میں اوّل وقت کی بہ نسبت بعد میں زیادہ گرمی ہو جاتی ہے۔

④ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَابْرِدُوْا بِالصَّلٰوۃِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِلْبُخَارِیِّ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ بِالظُّھْرِ فَاِنَّ شِدَّۃَ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَھَنَّمَ وَاشْتَکَتِ النَّارُ اِلٰی رَبِّھَا فَقَالَتْ رَبِّ اَکَلَ بَعْضِیْ بَعْضًا فَاَذِنَ لَھَا بِنَفَسَیْنِ نَفَسٍ فِی الشِّتَاءِ وَنَفَسٍ فِی الصَّیْفِ اَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْحَرِّ وَاَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الزَّمْھَرِیْرِ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِلْبُخَارِیِّ فَاَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْحَرِّ فَمِنْ سَمُوْمِھَا وَاَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْبَرْدِ فَمِنْ زَمْھَرِیْرِھَا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جب گرمی کی شدت ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرو۔ اور بخاری کی ایک روایت میں ابوسعیدؓ سے منقول ہے کہ ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرو (یعنی ابوہریرہؓ کی روایت میں تو بالصلوٰۃ کا لفظ آیا ہے اور ابوسعیدؓ کی روایت میں بالظہر کا لفظ آیا ہے نیز اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ) کیونکہ گرمی کی شدت دوزخ کی بھاپ سے ہوتی ہے اور (دوزخ کی) آگ نے اپنے رب سے شکایۃً عرض کیا کہ میرے پروردگا! میرے بعض (شعلے) بعض کو کھائے لیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے دو سانس لینے کی اجازت دے دی ہے اب وہ ایک سانس جاڑے میں لیتی ہے اور ایک سانس گرمی میں۔ گرمی میں جس وقت تمہیں زیادہ گرمی معلوم ہوتی ہے اور جاڑے میں جس وقت تمہیں زیادہ سردی معلوم ہوتی ہے (تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ وہ ایک سانس گرمی میں اور ایک سانس سردی میں لیتی ہے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ) اور بخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جس وقت تم گرمی کی شدت محسوس کرتے ہو تو اس کا سبب دوزخ کا گرم سانس ہوتا ہے اور جس وقت تم سردی کی شدت محسوس کرتے ہو تو اس کا سبب دوزخ کا ٹھنڈا سانس ہوتا ہے۔"

تشریح: پروردگار سے دوزخ کی آگ کی یہ شکایت کی کہ، میرے بعض (شعلے) بعض کو کھائے لیتے ہیں۔ کنایہ ہے اجزاء آگ کی کثرت سے اور آپس کے اختلاط سے یعنی آگ کے شعلے اتنے زیادہ ہوتے ہیں اور اس شدت سے بھڑکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ دوسرے شعلے کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس کی جگہ بھی خود لے لے۔ چنانچہ پروردگار نے اسے سانس لینے کی اجازت دے دی یعنی سانس سے مراد شعلہ کو دبانا اور اس کا دوزخ سے باہر نکلنا ہے۔ جس طرح کہ جاندار سانس لیتا ہے تو ہوا باہر نکلتی ہے۔

بہر حال ایسے وقت باوجودیکہ مشقت بہت ہوتی ہے نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ایسے سخت وقت میں جب کہ گرمی اپنی شدت پر ہوتی ہے، دل و دماغ تپش کی وجہ سے بے چین ہوتے ہیں نیز خشوع اور سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوتا جو نماز کی روح ہیں۔

اس موقع پر عقلی طور پر چند اشکال پیدا ہوتے ہیں ان کی وضاحت کردینی ضروری ہے۔

پہلا اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ گرمی اور سردی کی شدت زمین کی حرکت، عرض البلد اور آفتاب کی وجہ سے ہوتی ہے اس لئے یہاں یہ کیسے کہا گیا کہ گرمی کی شدت دوزخ کی بھاپ سے ہوتی ہے؟۔

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہاں دوزخ کی بھاپ کو گرمی کی شدت کا سبب بتایا گیا ہے نہ کہ اصل گرمی کا۔ اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ گرمی اور سردی کی شدت بھی آفتاب کے قرب و بعد کی بناء پر ہوتی ہے کیونکہ اس کے باوجود ہو سکتا ہے کہ دوزخ کا سانس اس میں مزید شدت پیدا کرتا ہو لہٰذا اسکا انکار مخبر صادق کی خبر کے ہوتے ہوئے طریقہ اسلام کے منافی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اتنی بات تو طے ہے کہ زمین میں حرارت کی علت سورج کا مقابلہ اور اس کی شعاعیں پڑنا ہے اور یہ کہیں ثابت نہیں ہوا ہے کہ سورج دوزخ نہیں ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ہمارے نظام کی دوزخ یہی ہو جسے ہم سورج کہتے ہیں کیونکہ سورج میں ناریت کا تموج اور اشتعال اس قدر ہے کہ دوزخ کی تمام صفات اس پر منطبق ہوتی ہیں اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ سورج دوزخ نہیں ہے تو یہ بھی بالکل بعید اور ناممکن نہیں ہے کہ دوزخ علیحدہ ہو اور اس کی گرمی کا اثر زمین پر پڑتا ہو۔

دوسرا اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوزخ نے شکایت کیسے کی کیونکہ دوزخ بے زبان ہے اور بے زبان اظہار مدعا کیسے کر سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح زبان کے لئے تلفظ ضروری نہیں ہے اسی طرح تلفظ کے لئے زبان بھی ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ اکثر

جانوروں کے زبان ہوتی ہے مگروہ تلفظ نہیں کرتے ایسے ہی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے زبان نہیں ہوتی مگروہ بات کرتی ہیں۔ لہٰذا یہ اشکال پیدا کرنا کہ بغیر زبان کے بات کرنا ناممکن ہے کم فہمی کی بات ہے۔ کیونکہ اگر کوئی یہ پوچھنے بیٹھ جائے کہ زبان سے بات کیوں کی جاتی ہے اس سننے کا کام کیوں نہیں لیا جاتا؟ آنکھ سے دیکھتے اور کان سے سنتے کیوں ہو ان سے بات کیوں نہیں کرتے جب کہ یہ سب اعضاء بظاہر ایک ہی مادہ سے بنتے ہیں جو نطفہ ہے تو ہر ایک قوت کی تخصیص کی وجہ ایک خاص چیز سے کیا ہے؟۔

تو اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ یہ صانع مطلق کی قدرت ہے کہ بولنا زبان سے مختص کیا، دیکھنا آنکھ سے اور سننا کان سے ورنہ یہ سب اعضاء گوشت کا ایک حصہ ہونے میں برابر ہیں۔ ٹھیک اسی طرح۔ یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ کیا صانع مطلق کی یہ قدرت نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی ایک مخلوق کو گویائی کی قوت دے دے؟ اور جب کہ حکماء کی ایک جماعت تو یہ بھی کہتی ہے کہ اجرام فلکیہ میں نفوس ہیں اور ان میں احساس و ادراک کی قوت ہے، تو اس صورت میں بولنا بعید ہے؟۔

تیسرا اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوزخ جاندار نہیں ہے وہ سانس کیسے لیتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دوزخ میں نفس ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے اور جب مذکورہ بالا بحث کی رو سے اس سے تکلم ثابت ہو سکتا ہے تو سانس لینے میں کیا اشکال باقی رہ جائے گا!۔

چوتھا اشکال یہ ہے کہ آگ کے ٹھنڈا سانس لینے کے کیا معنی؟۔

اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ آگ سے مراد اس کی جگہ یعنی دوزخ ہے اور اس میں ایک طبقہ زمہریر بھی ہے۔

پانچواں اشکال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس حدیث کے مفہوم کے مطابق تو یہ چاہئے تھا کہ سخت سردی کے موسم میں فجر کو بھی تاخیر سے پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سردی صبح کو سورج نکلتے تک اسی شدت کے ساتھ رہتی ہے اگر طلوع آفتاب تک نماز میں تاخیر کی جاتی ہے تو وہاں سرے سے وقت ہی جاتا رہتا۔

بہر حال۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گرمی کے موسم میں ظہر کی نماز تاخیر سے پڑھنا مستحب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود صحابہ بھی گرمی کے موسم میں ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں منقول ہے کہ صحابہ ظہر کی نماز (تاخیر سے) ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے یہاں تک کہ ٹیلوں کے سائے زمین پر پڑنے لگتے تھے۔ اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ٹیلے چونکہ پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے ان کے سائے زمین پر بہت دیر کے بعد پڑتے ہیں بخلاف دراز چیزوں مثلاً مینار وغیرہ کے ان کے سائے جلدی ہی پڑنے لگتے ہیں۔

بعض روایتوں میں منقول ہے کہ صحابہؓ ظہر کی نماز کے لئے دیواروں کے سایہ میں ہو کر جاتے تھے۔ اور دیواروں کے بارے میں تحقیق ہو چکی ہے کہ اس وقت دیواریں عام طور پر سات سات گز کی ہوتی تھیں۔ لہٰذا ان کے سایہ میں چلنا اس وقت کار آمد ہوتا ہوگا جب کہ سورج کافی نیچے ہوتا ہو۔ بعض حضرات نے تاخیر کی حد آدھا وقت مقرر کی ہے یعنی کچھ علماء یہ کہتے ہیں کہ گرمی کے موسم میں ظہر کی نماز آدھے وقت تک تاخیر کر کے پڑھنی چاہئے۔ بعض شوافع حضرات حدیث سے ثابت شدہ ابراد (یعنی نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھنا) کا محمل وقت زوال کو بتاتے ہیں یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ اس ابراد کا مقصد نماز ظہر میں اتنی تاخیر نہیں ہے جو حنفیہ بتاتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت استواء کی شدید گرمی سے بچنے کے لئے زوال کے وقت ظہر کی نماز پڑھنی چاہئے۔

ان حضرات کی یہ تاویل نہ صرف یہ کہ بعید از مفہوم ہے بلکہ خلاف مشاہدہ بھی ہے کیونکہ وقت استواء کے مقابلہ میں زوال کے وقت گرمی کی شدت میں کمی آجانے کا خیال تجربہ و مشاہدہ ہے۔

ہدایہ میں مذکور ہے کہ جن شہروں میں گرمی کی شدت آفتاب کے ایک مثل سایہ پہنچنے کے وقت ہوتی ہے وہاں تو ابراد کا مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ نماز ایک مثل سایہ کے بعد پڑھی جائے۔

الحاصل۔ ظہر کی نماز کو ابراد میں یعنی ٹھنڈا کر کے پڑھنے کے بارے میں بہت زیادہ حدیثیں وارد ہیں جن سے متفقہ طور پر یہ ثابت ہوتا

ہے کہ گرمی میں ظہر کی نماز ٹھنڈا کر کے پڑھنا ہی افضل و اولیٰ ہے۔ جہاں تک حدیث حباب ؓ کا تعلق ہے جس میں مروی ہے کہ ہم نے آنحضرت ﷺ سے گرمی کے موسم میں دوپہر کی شدت کے بارے میں شکایت کی تو آپ ﷺ نے ہماری درخواست قبول نہیں کی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے گرمی کے موسم میں ظہر کی نماز کو پورے وقت تک مؤخر کرنے کی درخواست کی تھی اس لئے آپ ﷺ نے اسے قبول نہیں فرمایا کہ اگر اتنی تاخیر کی جائے گی تو نماز کا وقت بھی نکل جائے گا۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ابراد رخصت ہے اور وہ بھی سب کے لئے نہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے ہے جو جماعت کے لئے مسجدوں میں جانے کے لئے مشقت و محنت کا سامنا کرتے ہیں۔ جو لوگ تنہا نماز پڑھتے ہوں یا اپنے پڑوس و محلہ کی مسجد میں نماز کے لئے آتے ہوں ان کے لئے میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے کہ وہ اول وقت سے تاخیر نہ کریں، یہ قول ظاہر حدیث کے خلاف ہے اس لئے اس کا اتباع نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت امام ترمذیؒ نے ایک حدیث نقل کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سفر میں بھی باوجودیکہ سب یکجا رہتے تھے ابراء کا حکم فرمایا کرتے تھے، نیز امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے ظہر کی نماز کو تاخیر سے پڑھنے کے لئے کہتا ہے اس مسلک اتباع سُنّت کی وجہ سے اولیٰ و افضل ہے۔

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ حَيَّةٌ فَيَذْهَبُ الذَّاهِبُ اِلَى الْعَوَالِي فَيَاْتِيْهِمْ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ وَبَعْضُ الْعَوَالِي مِنَ الْمَدِيْنَةِ عَلٰى اَرْبَعَةِ اَمْيَالٍ اَوْ نَحْوَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ سورج اونچا اور زندہ (یعنی روشن) ہوتا تھا اور کوئی جانے والا عوالی جا کر واپس آجایا کرتا تھا اور سورج اونچا ہی رہتا تھا اور بعض عوالی مدینہ سے چار میل یا تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہیں۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عوالی عالیہ کی جمع ہے، مدینہ شہر کے باہر بلندی میں جو بستیاں ہیں انہیں عوالی کہا جاتا ہے۔ مسجد بنی قریظہ بھی اسی طرف ہے۔

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى اِذَا اصْفَرَّتْ وَكَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ قَامَ فَنَقَرَ اَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ (عصر کی نماز جو آخر وقت میں پڑھی جاتی ہے) منافق کی نماز ہے وہ بیٹھا ہوا سورج کو دیکھتا رہتا ہے جب سورج زرد ہو کر شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان (چھپنے کے قریب) ہو جاتا ہے تو جلدی سے اٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے اور اللہ کا ذکر بھی اس نماز میں قدرے قلیل ہی کرتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ٹھونگیں مارنے" کا مطلب یہ ہے وہ بغیر طمانیت و سکون کے اس طرح جلدی جلدی سجدے کرتا ہے جیسے جانور دانہ چگتا ہے عصر کی نماز میں سجدے آٹھ ہوتے ہیں مگر یہاں چار اس لئے فرمائے ہیں کہ جب اس نے پہلا سجدہ کر کے اچھی طرح سر نہیں اٹھایا تو گویا دونوں سجدے ایک سجدہ کے حکم میں آگئے یا دونوں سجدوں کو ایک ہی رکن اعتبار کرتے ہوئے بجائے آٹھ کے چار کا وعدہ فرمایا ہے۔

یہاں صرف عصر کی نماز کا ذکر کیا گیا ہے دوسری نمازوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نماز وسطیٰ ہے اور یوں تو سب ہی نمازوں میں ارکان و آداب کا لحاظ نہ کرنا بری بات ہے مگر دوسری نمازوں کی بہ نسبت اس نماز کو دل جمعی اور سکون خاطر کے ساتھ نہ پڑھنا اور اس کے ارکان و آداب کا لحاظ نہ کرنا بہت ہی بری بات ہے۔

مولانا مظہرؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے عصر کی نماز کو سورج کے زرد ہونے تک مؤخر کیا تو اس نے اپنے آپ کو منافقین کے مشابہ ظاہر کیا کیونکہ منافق نماز کی صحت و تکمیل کا کوئی خیال نہیں کرتا وہ تو صرف ظاہری طور پر مسلمان بن کر تلوار سے بچنے کے لئے نماز پڑھتا ہے

اور اسے نماز میں اتنی زیادہ تاخیر کی قطعًا پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ اسے اجر و ثواب کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ منافقین کی عملاً و فعلاً مخالفت کرتے ہوئے عصر کی نماز وقت مختار میں پڑھ لیا کریں۔

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَّذِیْ تَفُوْتُهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلُهُ وَمَالُهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کی عصر کی نماز قضا ہوئی تو گویا اس کا مال اور اس کے اہل و عیال سب لٹ گئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی عصر کی نماز قضا ہو جائے تو وہ ایسا ہے جیسے کہ اس کا گھر بار اور مال اولاد سب فنا کے گھاٹ اتر جائیں یا ان میں کمی واقع ہو جائے لہٰذا جس طرح کہ کوئی شخص اپنے اہل و عیال کی تباہی و بربادی اور مال و متاع کے نقصان سے ڈرتا رہتا ہے جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے یہاں بھی صرف عصر کی نماز ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے نماز وسطی ہے اس کو چھوڑ دینا دوسری نمازوں کے چھوڑنے کے مقابلہ میں زیادہ سخت گناہ ہے۔

⑧ وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے عصر کی نماز چھوڑ دی (گویا) اس کے تمام (نیک) اعمال برباد ہو گئے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کے تمام نیک اعمال برباد ہو جائیں گے، حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ تمام اعمال کے برباد ہو جانے کی بدبختی تو صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جو مرتد مرتا ہے لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے عصر کی نماز چھوڑ دی تو اس نماز کی وجہ سے اسے جو اجر و ثواب ملتا اور اس کی نیکیوں میں جو زیادتی ہوتی ہے وہ اس سے محروم رہا یا یہ کہ اس دن کے اعمال میں جو کمال اسے نماز عصر کی بناء پر حاصل ہوتا وہ ضائع ہو گیا جس سے اس کے اعمال میں کمی واقع ہو گئی۔

حنفیہ کے نزدیک صرف مرتد ہو جانے سے تمام اعمال باطل ہو جاتے ہیں ان کے نزدیک موت کی قید نہیں ہے حتیٰ کہ اگر کسی شخص پر حج واجب تھا اور وہ حج کرنے کے بعد (نعوذ باللہ) مرتد ہو گیا پھر بعد میں خدا نے اسے ہدایت بخشی اور وہ اسلام میں داخل ہو گیا تو اسے حج دوبارہ کرنا ہوگا معتزلہ کے نزدیک کبیرہ گناہوں کے صدور سے بھی اعمال باطل ہو جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

⑨ وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّى الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَنْصَرِفُ اَحَدُنَا وَاِنَّهٗ لَيُبْصِرُ مَوَاقِعَ نَبْلِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت رافع ابن خدیجؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز (ایسے وقت) پڑھتے تھے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد کوئی اپنے تیر کے گرنے کی جگہ دیکھ سکتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے ہمراہ مغرب کی نماز ایسے اوّل وقت پڑھ لیتے تھے کہ نماز پڑھ کر واپس آنے کے بعد اگر کوئی شخص تیر پھینکتا تو وہ یہ دیکھ لیتا تھا کہ وہ تیر جا کر کہاں گرا ہے۔ بہر حال۔ تمام علماء کے نزدیک بالاتفاق مغرب کی نماز اوّل وقت پڑھنا مستحب ہے۔

⑩ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانُوْا يُصَلُّوْنَ الْعَتَمَةَ فِيْمَا بَيْنَ اَنْ يَّغِيْبَ الشَّفَقُ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ الْاَوَّلِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عشاء کی نماز شفق کے غائب ہونے کے بعد

سے اول تہائی رات تک پڑھتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس سے پہلے بتایا جاچکا ہے کہ پہلے عرب میں لوگ عشاء کو عتمہ کہتے تھے مگر آنحضور ﷺ نے جب عشاء کو عتمہ کہنے سے منع کر دیا تو یہ نام ترک کر دیا گیا، مگر یہاں حضرت عائشہؓ نے عشاء کو عتمہ ہی کہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک حضرت عائشہؓ کو یہ معلوم نہیں ہوا ہو گا کہ آنحضرت ﷺ نے عشاء کو عتمہ کہنے سے منع کر دیا ہے۔

عشاء کے وقت کے سلسلہ میں بھی پہلے بتایا جاچکا ہے کہ تہائی رات تک تو وقت مختار ہے اور طلوع صبح سے پہلے پہلے تک وقت جواز رہتا ہے۔

(۱۱) وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُصَلِّي الصُّبْحَ فَتَنْصَرِفُ النِّسَاءُ مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوْطِهِنَّ مَا يُعْرَفْنَ مِنَ الْغَلَسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ (جب) نبی کریم ﷺ صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہوتے تھے تو (وہ) عورتیں (جو آپ کے ہمراہ نماز پڑھتی تھیں) چادروں میں لپٹی ہوئی واپس چلی جاتی تھیں اور اندھیرے کی وجہ سے انہیں کوئی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۱۲) وَعَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَزَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ تَسَحَّرَا فَلَمَّا فَرَغَا مِنْ سَحُوْرِهِمَا قَامَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الصَّلٰوةِ فَصَلّٰى قُلْنَا لِاَنَسٍ كَمْ كَانَ بَيْنَ فَرَاغِهِمَا مِنْ سَحُوْرِهِمَا وَدُخُوْلِهِمَا فِي الصَّلٰوةِ قَالَ قَدْرَ مَا يَقْرَءُ الرَّجُلُ خَمْسِيْنَ اٰيَةً۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت قتادہؒ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت زید ابن ثابتؓ نے (روزہ رکھنے کے لئے) سحری کھائی۔ سحری سے فراغت کے بعد نبی کریم ﷺ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور نماز پڑھی (قتادہؒ کہتے ہیں کہ) ہم نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ ان دونوں کے سحری سے فارغ ہونے اور نماز شروع کرنے کے درمیان کتنے وقت کا وقفہ تھا۔ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ "اتنے وقت کا وقفہ تھا کہ ایک آدمی پچاس (متوسط) آیتیں پڑھ لے۔" (بخاریؒ)

تشریح: علامہ تور پشتیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں وقت کا جو اندازہ بیان کیا گیا ہے اس پر عام مسلمانوں کو عمل کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ عمل براہ راست بارگاہ الوہیت سے مطلع ہو جانے کے بعد تھا۔ دوسرے یہ کہ آنحضرت ﷺ تو دین کے معاملہ میں معصوم عن الخطا تھے کہ آپ سے کسی دینی معاملہ میں معمولی لغزش کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ ہر ایک کو کہاں نصیب!۔

(۱۳) وَعَنْ اَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ اَنْتَ اِذَا كَانَتْ عَلَيْكَ اُمَرَاءُ يُمِيْتُوْنَ الصَّلَاةَ اَوْ يُؤَخِّرُوْنَهَا عَنْ وَقْتِهَا قُلْتُ فَمَا تَاْمُرُنِيْ قَالَ صَلِّ الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا فَاِنْ اَدْرَكْتَهَا مَعَهُمْ فَصَلِّ فَاِنَّهَا لَكَ نَافِلَةٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اس وقت تم کیا کرو گے جب کہ تمہارے امراء (احکام) نماز کو وقت مختار سے ٹال کر، یا وقت مختار سے تاخیر کر کے پڑھیں گے۔ میں نے عرض کیا، ایسے وقت کے لئے آپ ﷺ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ اس وقت تم اپنی نماز کو وقت پر پڑھ لو پھر اگر ان کے ساتھ بھی نماز مل جائے تو ان کے ساتھ بھی پڑھ لو، یہ نماز تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ او کانو ایو خرون عن وقتها لفظ او راوی کا شک ہے یعنی حدیث کے کسی راوی کو شک ہوا ہے کہ اس سے پہلے کے راوی نے لفظ یمیتون کہا ہے یا یو خرون۔ ویسے معنی کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت تم کیا کرو گے جب کہ تم یہ دیکھو گے کہ وہ شخص جو تمہارا حاکم و سردار ہو گا نماز میں سستی و کاہلی کرے گا نماز کو اس کے اول وقت

میں نہ پڑھے گا بلکہ غیر مختار تاخیر کرے گا اور چونکہ وہ تمہارا حاکم ہوگا اس لئے تم اس پر قادر نہیں ہو سکو گے کہ اس کی مخالفت کر کے اسے سیدھی راہ پر لگا دو تمہیں یہ خوف ہوگا کہ اگر نماز اس کے ہمراہ پڑھتے ہو تو اول وقت نماز پڑھنے کی فضیلت ہاتھ سے جاتی ہے اور اگر اس کی مخالفت کرتے ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کی طرف سے تکلیف و ایذاء پہنچنے کا بلکہ جماعت کی فضیلت سے محروم ہونے کا بھی خدشہ رہے گا۔ چنانچہ حضرت ابوذرؓ نے لگے ہاتھوں ایسے موقع کے لئے حکم بھی پوچھ لیا کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو مجھے کیا طریقہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

اس پر آنحضرت ﷺ نے انہیں یہ سیدھا راستہ بتا دیا کہ جب بھی ایسا موقع ہو تو کم سے کم تم اپنی نماز تو صحیح وقت پر ادا کر ہی لینا پھر اس کے بعد اگر تمہیں اتفاق سے ان کی نماز میں بھی شامل ہو جانے کا موقع مل جائے تو ان کے ساتھ بھی نماز پڑھ لینا تمہاری یہ نماز نفل ہو جائے گی، اس طرح تمہیں دوہرا ثواب مل جائے گا۔

چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی امام نماز میں تاخیر کرے تو مقتدیوں کو چاہئے کہ وہ اول وقت اپنی نماز ادا کر لیں پھر بعد میں امام کے ساتھ بھی نماز پڑھ لیں تاکہ اس طرح وقت اور جماعت دونوں کی فضیلت پاسکیں لیکن یہ جان لینا چاہئے کہ یہ حکم صرف ظہر اور عشاء کے بارے میں ہے۔ کیونکہ فجر اور عصر میں تو فرض نماز ادا کر لینے کے بعد نفل نماز پڑھنی مکروہ ہے اور مغرب کی چونکہ تین رکعت فرض ہیں اور تین رکعت نفل مشروع نہیں ہے اس لئے مغرب میں بھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک حدیث کے اطلاق کا تعلق ہے اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ ضرورت کی بناء پر ہے کہ امراء و حکام کے ہمراہ چونکہ نماز نہ پڑھنے اور ان کے خلاف کرنے میں فتنہ و فساد میں مبتلا ہونے کا خدشہ تھا اس لئے آپ ﷺ نے ظہر اور عشاء کی قید نہیں لگائی کہ مکروہات کا ارتکاب اس سے بہتر ہے کہ فتنہ و فساد کو جنم دیا جائے پھر یہ کہ ایسے مواقع پر مکروہات بھی مباح ہو جاتے ہیں۔

آخر میں اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے جو یہ فرمایا تھا وہ محض پیش بندی کے طور پر نہیں فرمایا تھا بلکہ دراصل آپ ﷺ نے معجزہ کے طور پر آئندہ پیش آنے والے یقینی حالات کی پیش گوئی فرمائی تھی۔ چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ بنی امیہ کے دور میں یہ پیش گوئی پوری صداقت کے ساتھ صحیح ہوئی کہ اس زمانہ کے امراء و حکام نماز میں انتہائی سستی و کاہلی کرتے تھے اور نماز کو وقت مختار سے تاخیر کر کے پڑھا کرتے تھے۔

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الصُّبْحَ وَمَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الْعَصْرَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے آفتاب طلوع ہونے سے پہلے صبح کی نماز کی ایک رکعت پالی تو اس نے صبح کی نماز کو پالیا اور جس نے آفتاب غروب ہونے سے پہلے عصر کی نماز کی ایک رکعت پالی تو اس نے عصر کی نماز کو پالیا (یعنی اس کی نماز ضائع نہیں ہوگی لہٰذا اسے چاہئے کہ بقیہ رکعتیں پڑھ کر نماز پوری کر لے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: صورت مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص عصر کی نماز بالکل آخری وقت میں پڑھنے کھڑا ہوا، ابھی اس نے ایک ہی رکعت نماز پڑھ پائی تھی۔ کہ سورج ڈوب گیا اسی طرح ایک شخص فجر کی نماز بالکل آخری وقت میں پڑھنے کھڑا ہو کہ ایک رکعت پڑھنے کے بعد سورج نکل آیا تو اس حدیث کی رو سے دونوں کی نمازیں صحیح ہو جائیں گی۔

مگر اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ اکثر علماء کے نزدیک اس حدیث کے مطابق آفتاب کے طلوع و غروب کی بناء پر فجر، عصر کی نماز باطل نہیں ہوتی لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین فرماتے ہیں کہ عصر کی نماز میں تو یہ شکل صحیح ہے کہ غروب آفتاب کی بناء پر عصر کی نماز باطل نہیں ہوتی لیکن فجر کے بارے میں معاملہ بالکل مختلف ہوگا باین طور کہ طلوع آفتاب کے بعد فجر کی نماز باطل ہو جائے گی۔ اس طرح یہ حدیث چونکہ حضرت امام اعظمؒ کے خلاف ہوگی اس لئے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس حدیث اور ان احادیث میں

جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت نماز خواہ نفل ہوں یا فرض پڑھنا ممنوع ہے۔ تعارض واقع ہو رہا ہے اس لئے ہم نے اصول فقہ کے اس قاعدہ کے مطابق کہ جب دو آیتوں میں تعارض واقع ہو تو حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور جب دو حدیثوں میں تعارض ہو تو قیاس کا سہارا لینا چاہئے، قیاس پر عمل کیا ہے چنانچہ قیاس نے اس حدیث کے حکم کو تو نماز عصر میں ترجیح دی اور احادیث نہی کو فجر کی نماز میں ترجیح دی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فجر میں طلوع آفتاب تک پورا وقت کامل ہوتا ہے۔ لہٰذا طلوع آفتاب سے پہلے پہلے جب نماز شروع کی جاتی ہے تو وہ اسی صفت کمال کے ساتھ واجب ہوتی ہے جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ابتداء صفت کمال سے ہوئی ہے اسی طرح اختتام بھی صفت کمال کے ساتھ یعنی وقت کے اندر اندر ہو۔ مگر جب ایک رکعت کے بعد آفتاب طلوع ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وقت ختم ہو جانے کی وجہ سے نماز میں نقصان پیدا ہو گیا لہٰذا یہ نماز جس طرح صفت کمال کے ساتھ واجب ہوئی تھی اس طرح اداء نہیں ہوئی اور جب صفت کمال کے ساتھ ادا نہیں ہوئی تو گویا پوری نماز باطل ہو گئی۔

اس کے برعکس عصر میں دوسری شکل ہے وہ یہ کہ عصر میں غروب آفتاب تک پورا وقت کامل نہیں ہوتا یعنی جب تک کہ آفتاب زرد نہ ہو جائے اس وقت تک تو وقت مختار یا وقت کامل رہتا ہے مگر آفتاب کے زرد ہو جانے کے بعد آخر میں وقت مکروہ ہو جاتا ہے لہٰذا عصر کی نماز جب بالکل وقت آخر یعنی ناقص میں شروع کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کی ابتداء چونکہ وقت ناقص میں ہوئی اس لئے اس کا وجوب بھی صفت نقصان کے ساتھ ہو لہٰذا اس کا اختتام جب غروب آفتاب پر ہو گا تو کہا جائے گا کہ غروب آفتاب سے نماز میں نقصان پیدا ہو جانے کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوئی۔ کیونکہ جس طرح اس کی ابتداء وقت ناقص میں ہوئی تھی اسی طرح اس کی انتہاء بھی وقت ناقص میں ہوئی گویا جس صفت کے ساتھ نماز واجب ہوتی تھی اسی صفت کے ساتھ یعنی ناقص اداء ہوئی۔

جن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور نصف النہار کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے ان کے بارے میں حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا تعلق نوافل کے ساتھ ہے یعنی اگر کوئی شخص ان تینوں اوقات میں نفل نماز پڑھنا چاہئے تو اس کے لئے یہ جائز نہ ہو گا البتہ فرض نمازیں ان تینوں اوقات میں بھی جائز ہوں گی لیکن حدیث کے الفاظ امام شافعیؒ کے مسلک کی تائید نہیں کرتے ہیں کیونکہ حدیث میں فرض و نفل کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے بلکہ عمومی طور پر تمام نمازوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔ لہٰذا اگر اس بارے میں کسی نماز کی تخصیص کی جاتی ہے تو یہی کہنا پڑے گا کہ یہ حدیث کے ظاہری منشاء اور مفہوم کے سراسر خلاف ہے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے طلوع آفتاب سے پہلے صبح کی نماز کی ایک رکعت پالی تو بے شک اس نے نماز کا وقت پالیا اگرچہ وہ وقت نماز کے مناسب نہیں تھا لیکن پھر وہ وقت نماز کے مناسب اس لئے ہو گیا کہ ایک رکعت کی مقدار وقت بہر حال باقی رہا تھا لہٰذا وہ نماز اس شخص کے لئے لازم ہو گی۔

(۱۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَدْرَكَ اَحَدُكُمْ سَجْدَةً مِنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلٰوتَهٗ وَاِذَا اَدْرَكَ سَجْدَةً مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهٗ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اگر تم میں سے کوئی شخص آفتاب غروب ہونے سے پہلے عصر کی نماز کی ایک رکعت پالے تو اسے نماز پوری کر لینی چاہئے اور اگر آفتاب نکلنے سے پہلے فجر کی نماز کی ایک رکعت پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی نماز پوری پڑھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اسے چاہئے کہ وہ اپنی نماز پوری پڑھے۔ حنفیہ تو اس جملہ کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی نماز کا اعادہ کرے یعنی اس کی قضاء پڑھے اور شوافع کے نزدیک وہی معنی ہیں جو اس سے پہلی حدیث میں ذکر کئے گئے ہیں۔

(۱۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَسِيَ صَلَاةً اَوْنَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا اَنْ يُصَلِّيَهَا اِذَا ذَكَرَهَا وَفِيْ رِوَايَةٍ لَاكَفَّارَةَ لَهَا اِلَّا ذٰلِكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انس راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جو شخص نماز پڑھنی بھول جائے یا نماز کے وقت (غافل) سو جائے (اور وہ نماز رہ جائے) تو اس کا بدل یہی ہے کہ جس وقت یاد آئے پڑھ لے، اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اس نماز کے پڑھ لینے کے سوا اس کا اور کوئی بدل نہیں ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اگر کوئی شخص نماز پڑھنی بھول جائے یا نماز کے وقت ایسا غافل سو جائے کہ نماز کا وقت نکل جائے اور نماز نہ پڑھ سکے تو اس کا کفارہ صرف یہی ہے کہ اسے جب بھی یاد آجائے یا جب بھی سو کر اٹھے نماز قضاء پڑھ لے۔ یہ نہیں کہ جس طرح بغیر عذر کے رمضان کے روزے چھوڑنے کا کفارہ صدقہ وغیرہ ہوتا ہے نماز کے ترک کرنے پر بھی کفارہ کے طور پر کئی نمازیں پڑھنی پڑیں گی یا صدقہ وغیرہ دینا ہوگا۔ ابن ملک فرماتے ہیں کہ۔ اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو نماز پڑھنے سے رہ گئی ہو وہ جب بھی یاد آئے اس کے پڑھنے میں تاخیر نہ کرنی چاہئے۔

(۱۷) وَعَنْ اَبِی قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ فِي النَّوْمِ تَفْرِيْطٌ اِنَّمَا التَّفْرِيْطُ فِي الْيَقْظَةِ فَاِذَا نَسِيَ اَحَدُكُمْ صَلَاةً اَوْ نَامَ عَنْهَا فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، سوتے میں نماز کا رہ جانا قصور میں شمار نہیں بلکہ قصور تو جاگتے میں (شمار) ہوتا ہے (کہ وہ اس طرح سویا) لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھنے سے رہ جائے یا نماز کے وقت غافل سو جائے تو جس وقت بھی یاد آئے پڑھ لے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: واقم الصلوٰۃ لذکری (اور مجھے یاد کرنے کے وقت نماز پڑھ لیا کرو)۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز سے پہلے غافل ہو کر سو جائے تو اس حالت میں نماز کی تاخیر کے قصور کی نسبت سونے والے کی طرف نہیں ہوتی کیونکہ وہ سونے کی حالت میں مکلف نہیں ہے بلکہ مجبور ہے البتہ اس کی طرف قصور کی نسبت جاگنے کی حالت میں ہوگی کہ اس نے ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا جس کی وجہ سے وہ نماز پڑھے بغیر سو گیا مثلاً وقت سے پہلے سو گیا تو اس میں اس کی خطا ہے ایسے ہی اس نے ایسے کام کئے جو نیند کا سبب ہیں مثلاً لیٹ گیا یا شطرنج کے کھیل یا ایسے دوسرے کاموں میں مشغول رہا جو نسیان و بھول کا باعث ہوتے ہیں تو اس میں اس کا قصور ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ نماز کا یاد کرنا بمنزلہ خدا کے یاد کرنے کے ہے اس لئے نماز یاد کرنے کو خدا نے اپنا یاد کرنا قرار دے کر فرمایا کہ جب مجھے یاد کرو یعنی نماز جب تمہیں یاد آئے کہ وہ میرے یاد کرنے کا سبب ہے تو پڑھ لیا کرو۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ لذکری کے معنی یہ ہیں کہ میں جب تمہیں نماز یاد دلا دوں اس وقت نماز پڑھ لیا کرو تمہارا کچھ قصور نہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۱۸) عَنْ عَلِيٍّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا عَلِيُّ ثَلَاثٌ لَا تُؤَخِّرْهَا الصَّلٰوةُ اِذَا اَتَتْ وَالْجَنَازَةُ اِذَا حَضَرَتْ وَالْاَيِّمُ اِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفُوًا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا، علی! تین باتوں کے کرنے میں دیر نہ کیا کرنا۔ ایک تو نماز ادا کرنے میں جب کہ وقت ہو جائے، دوسرے جنازہ میں جب تیار ہو جائے اور تیسرے بے خاوند عورت کے نکاح میں جب کہ اس کا کفو (یعنی ہم قوم مرد) مل جائے۔" (ترمذی)

تشریح: لسان نبوت سے حضرت علی کو تین کاموں میں تاخیر نہ کرنے کی نصیحت فرمائی جا رہی ہے۔ پہلے تو نماز کے بارے میں فرمایا کہ جب نماز کا وقت مختار ہو جائے تو اس میں تاخیر نہ کرنا چاہئے بلکہ سب سے پہلے نماز پڑھو اس کے بعد کوئی دوسرا کام کرو۔

دوسرے نمبر پر جنازہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ جس وقت جنازہ تیار ہو جائے تو اس کی نماز اور اس تدفین میں قطعاً تاخیر نہ کرنی چاہئے۔ علامہ اشرفؒ کا قول علامہ طیبی شافعیؒ نقل کرتے ہیں کہ، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جنازہ کی نماز اوقات مکروہہ (یعنی آفتاب نکلنے ڈوبنے کے وقت اور نصف النہار کے وقت) میں پڑھنی مکروہ نہیں ہے۔ ہاں اگر یہ صورت ہو کہ جنازہ ان اوقات سے پہلے آجائے تو پھر ان اوقات میں نماز پڑھنی مکروہ ہوگی۔ یہی سجدۂ تلاوت کا حکم ہے۔ بہر حال ان تینوں اوقات مکروہہ کے علاوہ تمام اوقات میں حتیٰ کہ فجر کی نماز سے پہلے وبعد میں اور عصر کی نماز کے بعد بھی یہ دونوں چیزیں یعنی نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت مطلقاً مکروہ نہیں ہیں۔

تیسری چیز آپ ﷺ نے یہ فرمائی کہ بے خاوند عورت کا کفو یعنی ہم قوم مرد جب بھی مل جائے اس کے نکاح میں تاخیر نہ کرنی چاہئے۔

ایم بے خاوند عورت کو کہتے ہیں خواہ وہ کنواری ہو یا مطلقہ بیوہ ہو مگر علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "ایم" اس کو کہتے ہیں جس کا زوج (یعنی جوڑہ) نہ ہو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور عورت خواہ ثیب[1] ہو یا باکرہ!۔

"کفو" کا مطلب یہ ہے کہ مرد ان جملہ اوصاف میں عورت کے ہم پلہ و برابر ہو۔ ① نسب۔ ② اسلام۔ ③ حریت۔ ④ دیانت۔ ⑤ مال۔ ⑥ پیشہ۔

اس موقعہ پر حدیث کی مناسبت سے ایک تکلیف دہ صورت حال کی طرف مسلمانوں کی توجہ دلادینا ضروری ہے۔ آج کل یہ عام رواج سا ہوتا جارہا ہے کہ لڑکیوں کی شادی میں، بہت تاخیر کی جاتی ہے اکثر تاخیر تو تہذیب جدید کی اتباع اور رسم ورواج کی پابندی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے حکم وفرمان کے سراسر خلاف ہے لڑکیوں کی فطرت اور ان کے جذبات کا گلا گھونٹ کر ان پر ظلم کے مترادف بھی ہے چنانچہ اس کے نتائج آج کل جس انداز سے سامنے آرہے ہیں اسے ہر شخص جانتا ہے کہ زنا کی لعنت عام ہوگئی ہے، بے حیائی وبے غیرتی کا دور دورہ ہے اور اخلاق وکردار انتہائی پستیوں میں گرتے جارہے ہیں۔

پھر نہ صرف یہ کہ کنواری لڑکیوں کی شادی میں تاخیر کی جاتی ہے بلکہ اگر کوئی عورت شوہر کے انتقال یا طلاق کی وجہ سے بیوہ ہو جاتی ہے تو اس کے دوبارہ نکاح کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے اس طرح اس بے چاری کے تمام جذبات وخواہشات کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس کی پوری زندگی کو حرمان ویاس، رنج والم اور حسرت وبے کیفی کی بھینٹ چڑھادیا جاتا ہے۔

یہ تو تقریباً سب ہی جانتے ہیں کہ تمام اہل سُنّت والجماعت کا متفقہ طور پر یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص کسی معمولی سی سُنّت کا بھی انکار کرے یا اس کی تحقیر کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور یہ سبھی لوگ جانتے ہی ہیں کہ عورت کا نکاح کرنا پیغمبر اسلام ﷺ کی وہ عظیم ومشہور سُنّت ہے جس کی تاکید بے شمار احادیث سے ثابت ہے۔ لیکن۔ افسوس ہے کہ مسلمان جو اسلام کا دعوی کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس سے محبت کا اقرار کرتے ہیں مگر آنحضرت ﷺ کی اس سُنّت پر پابندی کے ساتھ عمل کرنے کا کوئی جذبہ نہیں رکھتے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ کوئی شخص تو اپنی مجبوریوں کی آڑ لے کر لڑکیوں کی شادی میں تاخیر کرتا ہے، کوئی تہذیب جدید اور فیشن کا دلدادہ ہو کر اس سعادت سے محروم رہتا ہے اور کوئی شخص طعن وتشنیع کے خوف سے بیوہ کی شادی کرنے سے معذور بنتا ہے گویا وہ لوگوں کے طعن وتشنیع کو آنحضرت ﷺ کے حکم اور آپ ﷺ کی سُنّت پر ترجیح دیتا ہے حالانکہ دانش مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اس طعن وتشنیع کو اپنے لئے باعث سعادت اور قابل فخر جانے کہ انبیاء علیہم السلام اور خدا کے نیک بندوں کے اچھے کاموں پر ہمیشہ ہی لوگوں نے طعن وتشنیع کی ہے مگر ان لوگوں نے خدا کے حکم کی اطاعت وفرمانبرداری اور نیک کاموں میں کبھی کوتاہی یا قصور نہیں کیا۔

اس موقعہ پر ایک بزرگ کی دلچسپ حکایت سن لیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بزرگ نے اپنی لڑکی کا نکاح اپنے ایک مرید سے جو اس لڑکی

---

[1] وہ عورت جس کا نکاح ہوا، مگر یا تو خاوند مر گیا یا خاوند نے طلاق دے دی ہو۔

کے مناسب ولائق تھا کر دیا اور اس کی خبر کو کسی نہ کسی طرح اپنی بیوی سے بھی پوشیدہ رکھا۔ بعد میں جب ان کی بیوی کو یہ معلوم ہوا تو جز بز ہوئی اور ان سے کہنے لگی کہ، آپ نے اس کا بھی خیال کیا کہ آپ کے اس طرز عمل سے آپ کی ناک کٹ گئی، اور پھر جیسا کہ ان ناقص العقل والدین عورتوں کی عادت ہے ان بے چارے بزرگ کو لاکھ صلواتیں سنائیں۔ وہ بزرگ یہ سمجھ کر کہ عورتوں کے منہ لگنا خواہ مخواہ اپنی عقل خراب کرنا ہے۔ خاموش ہو گئے پھر باہر آکر انہوں نے مریدوں سے پوچھا کہ کیوں بھائیو میرے منہ پر ناک بھی ہے یا نہیں؟ انہوں نے تعجب سے کہا کہ ہاں کیوں نہیں ہے! وہ کہنے لگے کہ میری بیوی تو کہتی ہے کہ میری ناک کٹ گئی۔

اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ آدمی کو چاہئے کہ نیک کام کرنے میں کسی طعن و تشنیع کا خیال نہ کرے کیونکہ حقیقت میں جو بات بری نہیں ہوتی وہ کسی کے کہہ دینے سے بری نہیں ہو جاتی اور نہ اس کام کو کرنے والے کی ذات و شخصیت کو کوئی بٹہ لگتا ہے۔

حضرت مولانا الشاہ عبدالقادرؒ نے آیت وانکحوا الایامی کے ضمن میں اس حدیث کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا، علیؓ! تین کاموں میں دیر نہ کرو۔ ① فرض نماز کی ادائیگی میں جب کہ اس کا وقت ہو جائے۔ ② جنازہ میں جب کہ موجود ہو۔ ③ بیوہ عورت (کے نکاح میں) جب کہ اس کی ذات (و مرتبہ) کا مرد مل جائے۔ جو شخص (بیوہ کو) دوسرا خاوند کرنے میں عیب لگائے (تو سمجھو کہ) اس کا ایمان سلامت نہیں ہے اور جو لونڈی و غلام نیک ہوں (یعنی شادی کر دینے کے بعد ان کے مفرور ہو جانے کا خوف نہ ہو اور تمہیں اعتماد ہو کہ یہ نیک بخت ہیں شادی کے بعد ہمارا کام نہیں چھوڑیں گے) تو ان کا بھی نکاح کر دو۔

⑲ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوَقْتُ الْاَوَّلُ مِنَ الصَّلَاةِ رِضْوَانُ اللّٰهِ وَالْوَقْتُ الْاٰخِرُ عَفْوُ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، نماز کو اوّل وقت ادا کرنا خدا تعالیٰ کی خوشنودی کا موجب ہے اور آخر وقت میں ادا کرنا خدا کی معافی کا سبب ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اول وقت سے مراد اوّل وقت مختار ہے اور اس کی قید لگانے کی ضرورت یوں ہوئی کہ حنفیہ کے نزدیک بعض نماز میں تاخیر کی جاتی ہے جیسے فجر کی نماز کو اور گرمی میں ظہر کی نماز کو تاخیر کر کے پڑھنا ہی مستحب ہے لہٰذا یہ نمازیں مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کا اوّل وقت مختار نہیں ہے بلکہ ان میں تاخیر ہی مختار ہے۔

"آخر وقت" سے مراد وقت مکروہ ہے مثلاً عصر کی نماز میں سورج کا متغیر ہو جانا یا عشاء کی نماز میں وقت کا آدھی رات سے زیادہ گزر جانا۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آخر وقت میں نماز کی فرضیت تو بہر حال ادا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس وقت نماز پڑھنے والا ترک نماز کے گناہ سے تو بچ ہی جاتا ہے کہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

⑳ وَعَنْ اُمِّ فَرْوَةَ قَالَتْ سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ قَالَ الصَّلَاةُ لِاَوَّلِ وَقْتِهَا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ لَا يُرْوَى الْحَدِيْثُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ الْعُمَرِيِّ وَهُوَ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت اُمّ فروہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ (ثواب کی زیادتی کے اعتبار سے) کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نماز کو اس کے اوّل وقت میں پڑھنا۔ (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) اور حضرت امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صرف حضرت عبداللہ ابن عمر عمری سے روایت کی جاتی ہے۔ اور وہ محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہیں۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ایمان کے بعد افضل ترین عمل یہی ہے کہ نماز کو اس کے اوّل وقت میں جماعت کے ساتھ پڑھا جائے۔ کتاب الصلوٰۃ کی حدیث نمبر پانچ کی تشریح کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے کہ افضل اعمال کے سلسلہ میں بہت زیادہ حدیثیں وارد ہیں۔ جن میں مختلف

اعمال کو افضل کہا گیا ہے۔ وہاں اس کی بھی وضاحت کر دی گئی تھی کہ جن جن اعمال کو افضل کہا گیا ہے وہ اپنے اپنے موقع و مناسبت کی بناء پر یقیناً افضل ہیں۔

چنانچہ یہاں پھر سمجھ لیجئے کہ دوسری احادیث میں جن اعمال کو افضل کہا گیا ہے وہاں افضلیت اضافی مراد ہے یعنی بعض اعمال بعض حیثیت سے افضل ہیں اور بعض اعمال کو دوسری وجوہ اور حیثیت سے دوسرے اعمال پر فضیلت حاصل ہے لیکن نماز علی الاطلاق یعنی بہمہ وجوہ ایمان کے بعد تمام اعمال سے افضل و اشرف ہے۔

ترمذیؒ نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ اس کے راوی صرف ایک یعنی عبداللہ ابن عمر عمری ہیں اور وہ بھی محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہیں۔ عبداللہ ابن عمر عمری کے بارے میں غالباً پہلے بھی کسی حدیث کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان سے ہیں اس لئے انہیں عمری کہا جاتا ہے ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے عبداللہ ابن عمر ابن حفص ابن عاصم ابن عمر فاروقؓ۔

بہرحال ترمذیؒ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ حدیث مرتبۂ صحت کو نہیں پہنچتی حالانکہ دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

(۲۱) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ مَاصَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةً لِوَقْتِهَا الْاٰخِرِ مَرَّتَيْنِ حَتّٰى قَبَضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کوئی نماز آخر وقت میں دو دفعہ بھی نہیں پڑھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات دے دی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نمازوں کو ان کے مختار اوقات میں پڑھا کرتے تھے۔ مکروہ اوقات میں نہیں پڑھتے تھے۔ صرف ایک مرتبہ بیان جواز کے لئے آپ ﷺ نے نماز آخر وقت میں پڑھی تھی تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نماز کا آخری وقت یہ ہے اور وقت کے اس حصّہ تک نماز جائز ہو سکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس نماز کو شمار نہیں کیا ہے جو آپ ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کے ہمراہ آخر وقت میں پڑھی تھی کیونکہ حضرت جبریل علیہ السلام سے وقت معلوم کرنے کے لئے آخر وقت نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک سائل کو ایک دن اوّل وقت میں اور ایک دن آخر وقت میں پڑھ کر دکھائی تھی اسے بھی حضرت عائشہؓ نے شمار نہیں کیا ہے اس لئے کہ وہ تعلیم پر محمول ہے۔

(۲۲) وَعَنْ اَبِىْ اَيُّوْبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ اُمَّتِىْ بِخَيْرٍ اَوْ قَالَ عَلَى الْفِطْرَةِ مَالَمْ يُؤَخِّرُوْا الْمَغْرِبَ اِلٰى اَنْ تَشْتَبِكَ النُّجُوْمُ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَاهُ الدَّارِمِىُّ عَنِ الْعَبَّاسِ۔

"اور حضرت ابوایوبؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، میری اُمّت کے لوگ اگر مغرب کی نماز کو (اس قدر) دیر کر کے نہ پڑھا کریں کہ ستارے جگمگانے لگیں تو ہمیشہ بھلائی، یا فرمایا کہ، فطرت (یعنی اسلام کے طریقہ) پر رہیں گے، (ابوداؤدؒ) اور اس روایت کو دارمیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مغرب کے وقت میں فقط ستارے نظر آ جانے سے کراہت نہیں آتی البتہ ستارے گنجان ہو کر جگمگانے لگتے ہیں تو جب وقت مکروہ ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک مرتبہ مغرب کی نماز تاخیر سے پڑھی تھی اور وہ بھی بیان جواز کے لئے ورنہ تو آپ ﷺ ہمیشہ اوّل وقت ہی مغرب کی نماز ادا فرماتے تھے۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِىْ لَاَمَرْتُهُمْ اَنْ يُؤَخِّرُوْا الْعِشَاءَ

اِلٰی ثُلُثِ اللَّیْلِ اَوْنِصْفِهٖ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر مجھے اپنی اُمت کے لوگوں کی تکلیف کا اندیشہ نہ ہوتا تو انہیں (وجوب کے طریقہ پر) یہ حکم دیتا کہ عشاء کی نماز کو تہائی رات تک یا آدھی رات تک تاخیر کر کے پڑھیں۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

(۲۴) وَعَنْ مُعَاذِبْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْتِمُوا بِهٰذِهِ الصَّلَاةِ فَاِنَّكُمْ قَدْ فُضِّلْتُمْ بِهَا عَلٰى سَائِرِ الْاُمَمِ وَلَمْ تُصَلِّهَا اُمَّةٌ قَبْلَكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تم اس نماز (یعنی عشاء کی نماز) کو دیر کر کے پڑھا کرو کیونکہ تمہیں دوسری امتوں پر اس نماز کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے اور تم سے پہلے کسی اُمت نے یہ نماز نہیں پڑھی۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس سے پہلے باب المواقیت کی حدیث نمبر تین میں گزر چکا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کو پانچوں وقت کی نماز پڑھائی اور کہا کہ ھذا وقت الانبیاء من قبلک اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام بھی عشاء کی نماز پڑھتے تھے مگر جو حدیث یہاں ذکر کی گئی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عشاء کی نماز صرف اسی اُمت پر فرض ہے پہلی امتوں پر فرض نہیں تھی۔ لہٰذا محدثین نے ان دونوں حدیثوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ پہلی امتوں میں عشاء کی نماز صرف پیغمبر و رسول ہی پڑھتے تھے۔ کیونکہ یہ نماز ان کی اُمت پر واجب نہیں تھی بلکہ انہیں پر واجب تھی جیسا کہ بعض علماء کے قول کے مطابق تہجد کی نماز آنحضرت ﷺ پر واجب تھی مگر آپ ﷺ کی اُمت پر واجب نہیں ہے اس لئے حضرت جبرئیل کے ارشاد ھذا وقت الانبیاء سے پہلی امتوں پر عشاء کا وجوب ثابت نہیں ہوا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ نماز انبیاء ہی پڑھتے تھے اور اس کو حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ تم سے پہلے کسی اُمت نے یہ نماز نہیں پڑھی۔ تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ پہلے انبیاء علیہم السلام بھی عشاء کی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ نماز پہلی امتوں کے لوگ نہیں پڑھتے تھے بلکہ یہ نماز اسی اُمت کے لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس طرح ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض باقی نہیں رہا۔

آخر میں اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ ھذا وقت الانبیاء من قبلکَ میں لفظ ھٰذَا سے فجر کے وقت اسفار کی طرف اشارہ ہے کہ بخلاف دوسرے اوقات کے اس میں تمام انبیاء شریک ہیں۔

(۲۵) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ اَنَا اَعْلَمُ بِوَقْتِ هٰذِهِ الصَّلَاةِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَةِ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْهَا لِسُقُوْطِ الْقَمَرِ لِثَالِثَةٍ۔ (رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ میں اس نماز یعنی دوسری عشاء کے وقت کو خوب جانتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ اس نماز کو تیسری تاریخ کے چاند چھپنے کے وقت پڑھا کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: تیسری تاریخ کی شب میں چاند رات کے تقریباً پانچویں حصہ میں غروب ہوتا ہے، اس طرح یہ حدیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عشاء کی نماز تاخیر ہی سے پڑھنا مستحب ہے۔ عشاء کی نماز کو دوسری عشاء اس لئے کہا گیا ہے کہ بسا اوقات مغرب کو بھی عشاء کہا جاتا ہے اس اعتبار سے یہ دوسری عشاء ہوئی۔

(۲۶) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْفِرُوْا بِالْفَجْرِ فَاِنَّهٗ اَعْظَمُ لِلْاَجْرِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَالدَّارِمِيُّ وَلَيْسَ عِنْدَ النَّسَائِيْ فَاِنَّهٗ اَعْظَمُ لِلْاَجْرِ۔

"اور حضرت رافع ابن خدیجؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، فجر کی نماز اجالے میں پڑھو کیونکہ اجالے میں نماز پڑھنے سے بہت زیادہ ثواب ہوتا ہے اور نسائی کی روایت میں یہ الفاظ فانہ اعظم للاجر (یعنی اجالے میں نماز پڑھنے سے بہت زیادہ ثواب ہوتا ہے)۔ نہیں ہیں۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی نماز اسفار (اجالے) میں شروع کرنی چاہئے چنانچہ حنفیہ کا ظاہری مسلک یہی ہے کہ فجر کی نماز کی ابتداء و اختتام دونوں ہی اسفار میں ہوں۔

مگر حضرت امام طحاویؒ جو حنفی مسلک کے ایک جلیل القدر امام ہیں، فرماتے ہیں کہ ابتداء تو غلس (اندھیرے) میں ہونی چاہئے اور اختتام اسفار میں، اور اس کا طریقہ یہ ہو کہ قرأت اتنی طویل کی جائے کہ پڑھتے پڑھتے اجالا پھیل جائے۔ چنانچہ علماء فرماتے ہیں کہ امام طحاویؒ کی یہ تاویل اولیٰ اور احسن ہے کیونکہ اس طرح ان تمام احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے جن میں سے بعض تو غلس میں نماز پڑھنے پر دلالت کرتی ہیں اور بعض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسفار میں نماز پڑھنا افضل ہے جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا۔

ان احادیث میں ایک دوسری تطبیق کی وجہ خود ایک حدیث بھی ہے جو شرح السنہ میں منقول ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں موسم کا اعتبار ہوگا یعنی جاڑے کے موسم میں تو غلس میں نماز پڑھنا بہتر ہوگا اور گرمی کے موسم میں اسفار کرنا بہتر ہوگا۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

قَالَ مُعَاذٌ بَعَثَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْيَمَنِ فَقَالَ اِذَا كَانَ فِي الشِّتَاءِ فَغَلِّسْ بِالْفَجْرِ وَاَطِلِ الْقِرَاءَةَ قَدْرَ مَا يُطِيْقُ النَّاسُ وَلَا تُمِلَّهُمْ وَاِذَا كَانَ فِي الصَّيْفِ فَاَسْفِرْ بِالْفَجْرِ فَاِنَّ اللَّيْلَ قَصِيْرٌ وَالنَّاسُ نِيَامٌ فَاَمْهِلْهُمْ حَتّٰى يُدْرِكُوْا يَعْنِي الصَّلٰوةَ۔

"حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے یمن بھیجا تو یہ (بھی) فرمایا کہ جب سردی کا موسم ہو تو فجر کی نماز غلس (اندھیرے) میں پڑھنا اور قرأت طویل کرنا (مگر اتنی کہ) لوگوں پر بھاری نہ ہو کہ وہ تنگ ہو جائیں اور جب گرمی کا موسم ہو تو فجر کی نماز اسفار (اجالے) سے پڑھنا کیونکہ (گرمی میں) رات چھوٹی ہونے کی وجہ سے لوگ سوئے رہتے ہیں اس لئے انہیں اتنا موقع دو کہ وہ نماز میں شریک ہو سکیں۔"

بہر حال علماء حنفیہ کے نزدیک اسفار کی حد یہ ہے کہ طلوع آفتاب تک اتنا وقت رہے کہ اس میں قرأت مسنون (جو چالیس سے ساٹھ یا سو آیتوں تک ہے) ترتیل کے ساتھ پڑھی جا سکے۔ اور نماز کے بعد اگر طہارت میں کوئی خلل معلوم ہو تو طلوع آفتاب سے پہلے پہلے وضو اور مذکورہ بالا طریقہ پر نماز کا اعادہ ممکن ہو سکے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۵۷) عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّي الْعَصْرَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ تُنْحَرُ الْجَزُوْرُ فَتُقْسَمُ عَشْرَ قِسَمٍ ثُمَّ تُطْبَخُ فَنَاْكُلُ لَحْمًا نَضِيْجًا قَبْلَ مَغِيْبِ الشَّمْسِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت رافع ابن خدیجؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ عصر کی نماز پڑھ کر اونٹوں کو ذبح کیا کرتے تھے اور پھر وہ دس حصوں پر تقسیم کیا جاتا، اس کے بعد اسے پکایا جاتا اور پھر ہم سورج چھپنے سے پہلے اس پکے ہوئے گوشت کو کھا کر فارغ ہو جایا کرتے تھے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بظاہر اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عصر کی نماز جلدی یعنی ایک مثل سایہ پہنچنے کے وقت یا اس کے تھوڑی دیر کے بعد پڑھی جاتی ہوگی جیسا کہ آئمہ ثلثہ اور صاحبین کا مسلک ہے اور ایک روایت کے مطابق حضرت امام اعظمؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور بعض حضرات نے فتویٰ بھی اسی روایت پر دیا ہے مگر حضرت امام اعظمؒ کا مشہور مسلک یہ ہے کہ عصر کا وقت دو مثل سایہ کے بعد ہوتا ہے چنانچہ ان کی طرف سے اس حدیث کی یہ تاویل کی جائے گی کہ ہو سکتا ہے کہ گرمیوں میں ایسا ہوتا ہو کیونکہ اس وقت دن بڑا ہوتا ہے۔ نیز حضرت ابن ہمامؒ نے ہدایہ کی شرح میں لکھا ہے کہ اگر عصر کی نماز سورج کے متغیر ہونے سے پہلے پڑھی جائے تو غروب آفتاب تک بقیہ وقت میں

حدیث میں مذکور جیسا عمل بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے چنانچہ جن لوگوں نے امراء و حکام کے ہمراہ کھانا پکانے والے ماہرین کو سفر میں کھانا پکاتے ہوئے دیکھا ہوگا وہ اسے بعید نہیں جانیں گے۔

(۲۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ مَكَثْنَا ذَاتَ لَيْلَةٍ نَنْتَظِرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَةِ فَخَرَجَ اِلَيْنَا حِيْنَ ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ اَوْبَعْدَهُ فَلَا نَدْرِيْ اَشَيْءٌ شَغَلَهُ فِيْ اَهْلِهٖ اَوْغَيْرُ ذٰلِكَ فَقَالَ حِيْنَ خَرَجَ اِنَّكُمْ لَتَنْتَظِرُوْنَ صَلَاةً مَا يَنْتَظِرُهَا اَهْلُ دِيْنٍ غَيْرُكُمْ وَلَوْ لَا اَنْ يَّثْقُلَ عَلٰى اُمَّتِيْ لَصَلَّيْتُ بِهِمْ هٰذِهِ السَّاعَةَ ثُمَّ اَمَرَ الْمُؤَذِّنَ فَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَصَلّٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات ہم عشاء کی نماز کے لئے بہت دیر تک بیٹھے ہوئے نبی کریم ﷺ کا انتظار دیکھتے رہے۔ آنحضرت ﷺ تہائی یا اس سے بھی زیادہ رات جانے کے بعد تشریف لائے اور ہمیں معلوم نہیں کہ آپ ﷺ گھر کے کام میں مشغول رہے تھے (کہ عادت کے مطابق سویرے نماز پڑھنے تشریف نہیں لائے) یا اس کے علاوہ (آپ ﷺ کی ذات اقدس کو کوئی عذر پیش آگیا تھا) آنحضور ﷺ نے آکر فرمایا، تم لوگ نماز کا انتظار کر رہے تھے (اور تمہارے لئے یہ مناسب بھی تھا کیونکہ) نماز کا انتظار تو تم ہی لوگ کیا کرتے ہو۔ تمہارے سوا کسی اور دین والوں نے نماز کا انتظار نہیں کیا۔ اور اگر مجھے اپنی اُمت پر گراں گزرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس نماز کو ہمیشہ اسی وقت پڑھا کرتا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے مؤذن کو (تکبیر کا) حکم دیا اس نے تکبیر کہی اور آپ ﷺ نے نماز پڑھائی۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تمارے سوا کسی بھی دین کے لوگ یعنی یہود و نصاری عشاء کی نماز کا انتظار نہیں کرتے ہیں کیونکہ یہ نماز تو صرف اسی اُمت کے ساتھ مخصوص فرمائی گئی ہے اور کسی اُمت کو نصیب نہیں ہوئی ہے لہٰذا تم اس وقت جب کہ آرام کرنے کا وقت ہے اپنے نفس پر قابو پاکر اور مشقت اٹھا کر نماز کا جتنا زیادہ انتظار کرو گے اتنا ہی زیادہ ثواب پاؤ گے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عشاء کی نماز تہائی رات کے وقت پڑھنا افضل ہے جیسا کہ حضرت امام اعظمؒ کا مسلک ہے مگر جہاں تک آنحضرت ﷺ کے عمل کا تعلق ہے تو یہ بھی ثابت ہے کہ جب صحابہ کی جماعت کا اکثر حصہ اوّل وقت جمع ہو جاتا تھا تو آپ ﷺ اوّل وقت ہی نماز پڑھ لیتے تھے اور جو حضرات تاخیر سے جمع ہوتے تھے وہ دیر میں پڑھتے تھے چنانچہ حضرت امام احمدؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ جو نمازی اوّل وقت جمع ہو جائیں وہ اوّل وقت نماز پڑھ لیں اور جو نمازی تاخیر سے جمع ہوں وہ دیر کر کے پڑھیں۔

(۲۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي الصَّلَوَاتِ نَحْواً مِنْ صَلَاتِكُمْ وَكَانَ يُؤَخِّرُ الْعَتَمَةَ بَعْدَ صَلَاتِكُمْ شَيْئًا وَكَانَ يُخَفِّفُ الصَّلَاةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرۃؓ نے (لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ نبی کریم ﷺ تمہاری نمازوں کے قریب قریب (اوقات میں) نماز پڑھا کرتے تھے مگر عشاء کی نماز تمہاری نماز سے کچھ دیر کر کے پڑھتے تھے اور سبک نماز پڑھتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: نہی کے باوجود حضرت جابرؓ نے عشاء کو عتمہ اس لئے کہا ہے کہ شاید اس وقت تک ان کو نہی کا حکم معلوم نہیں ہوا ہو گا یا پھر یہ نام چونکہ اہل عرب میں پہلے سے جانا پہچانا جاتا تھا اس لئے انہوں نے یہ سوچ کر کہ اس نام سے لوگ اس نماز کو اچھی طرح پہچان لیں گے عتمہ ہی کہا۔

بہر حال یہ حدیث بھی اس بات پر بصراحت دلالت کرتی ہے کہ عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھنا ہی افضل و مستحب ہے۔ "سبک نماز پڑھنے" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھا کرتے تھے مگر علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نماز میں چھوٹی چھوٹی سورتیں اس وقت پڑھتے تھے جب کہ امامت فرماتے اور ضعیف و کمزور لوگوں کی رعایت مد نظر ہوتی۔ اور ویسے بھی یہ بات باعتبار اکثر کے

فرمائی گئی ہے کیونکہ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے مغرب کی دونوں رکعتوں میں سورۂ اعراف بھی پڑھی ہے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ آپ ﷺ کا اتنی بڑی بڑی سورتیں پڑھنا بھی لوگوں پر گراں نہیں گزرتا تھا۔ یعنی آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے میں صحابہؓ کو ایسا کیف و سرور محسوس ہوتا تھا کہ طویل قرأت بھی انہیں ہلکی ہی معلوم ہوتی تھی اور از راہ شوق طول قرأت میں زیادتی کے طالب رہتے تھے اس کے برخلاف دوسرے لوگوں کی امامت میں یہ بات حاصل ہونا مشکل ہے۔

(۳۰) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ صَلَّیْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلَاۃَ الْعَتَمَۃِ فَلَمْ یَخْرُجْ حَتّٰی مَضٰی نَحْوٌ مِنْ شَطْرِ اللَّیْلِ فَقَالَ خُذُوْا مَقَاعِدَکُمْ فَاَخَذْنَا مَقَاعِدَنَا فَقَالَ اِنَّ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا وَاَخَذُوْا مَضَاجِعَھُمْ وَاِنَّکُمْ لَنْ تَزَالُوْا فِیْ صَلَاۃٍ مَا انْتَظَرْتُمُ الصَّلَاۃَ وَلَوْ لَا ضَعْفُ الضَّعِیْفِ وَسَقْمُ السَّقِیْمِ لَاَخَّرْتُ ھٰذِہِ الصَّلٰوۃَ اِلٰی شَطْرِ اللَّیْلِ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ ہم (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جماعت سے نماز پڑھنے گئے۔ (اتفاق سے اس روز) آنحضرت ﷺ آدھی رات کے قریب تک تشریف نہ لائے (بعد ازاں آکر ہم سے) ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا، چنانچہ ہم اپنی جگہوں (سے اٹھے نہیں بلکہ وہیں) پر بیٹھے رہے (اس کے بعد) آپ ﷺ نے فرمایا، دوسرے لوگوں نے نماز پڑھ کر اپنے اپنے بستر سنبھال لئے ہیں اور (تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ) جب تک تم نماز کی انتظار میں رہو گے تمہارا یہ سارا وقت نماز ہی میں شمار کیا جائے گا (یعنی تمہیں اس انتظار کی وجہ سے برابر نماز پڑھنے کا ثواب ملتا رہے گا) اور اگر مجھے ضعیفوں کی کمزوری اور بیماروں کی بیماری کا خیال نہ ہوتا تو میں ہمیشہ یہ نماز آدھی رات تک دیر کر کے پڑھا کرتا۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے آنحضرت ﷺ کا ارشاد گزر چکا ہے کہ (مسلمانوں کے علاوہ) کسی بھی دوسرے دین کے لوگ عشاء کی نماز کا انتظار نہیں کرتے، لہٰذا اس ارشاد کی روشنی میں حدیث کے الفاظ دوسرے لوگوں نے نماز پڑھ کر اپنے اپنے بستر سنبھال لئے ہیں، کی تشریح یہ کی جائے گی کہ دوسرے دین کے لوگ مثلاً یہود و نصاریٰ تو شام کی نماز پڑھ کر یا اپنے مذہب کے مطابق عبادت کر کے اپنے اپنے بستروں پر جا کر نیند کی آغوش میں پہنچ گئے ہیں مگر چونکہ تمہارے نصیب میں اس نماز کی سعادت و فضیلت لکھی ہوئی ہے۔ اس لئے تم اب اس سعادت و فضیلت کی تکمیل کی خاطر نماز کی انتظار میں بیٹھے ہوئے ہو۔ اور چونکہ تم اپنا آرام اپنی نیند اور اپنا چین سب اپنے پروردگار کی عبادت کے انتظار میں لٹا چکے ہو اس لئے تمہارا پروردگار بھی اس محنت و مشقت کا صلہ اس طرح تمہیں دے گا کہ تمہارے اس انتظار کے ایک ایک لمحہ کو سراپا عبادت و باعث سعادت بنا دے گا بایں طور پر کہ تمہارا یہ جتنا وقت انتظار میں گزرا ہے یا جتنا وقت گزرے گا تو سمجھو کہ وہ نماز ہی میں گزرا ہے یا گزرے گا یعنی جتنا ثواب نماز پڑھنے کا ملتا ہے اتنا ہی ثواب اس انتظار کا بھی ملے گا۔

یا پھر اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ دوسرے محلوں کے مسلمان جو اس مسجد میں حاضر نہیں ہیں عشاء کی نماز پڑھ کر سو رہے ہیں اور تم لوگ اب تک نماز عشاء کی انتظار میں یہاں بیٹھے ہو اس طرح ان مسلمانوں کے مقابلہ میں تم زیادہ ثواب و فضیلت کے حقدار بنو گے، یہی معنی مابعد کے الفاظ و انکم لن تزالوا الخ کے زیادہ قریب اور مناسب ہیں۔

بہر حال۔ یہ حدیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عشاء کی نماز میں آدھی رات تک تاخیر جائز ہے بلکہ عبادت کے سلسلہ میں زیادہ محنت و مشقت اٹھانے کی وجہ سے مستحب اور افضل ہے۔

(۳۱) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَشَدَّ تَعْجِیْلًا لِلظُّھْرِ مِنْکُمْ وَاَنْتُمْ اَشَدُّ تَعْجِیْلًا لِلْعَصْرِ مِنْہُ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ نے (لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز (گرمی کے علاوہ دوسرے موسموں میں) تم سے بہت زیادہ جلدی پڑھتے تھے اور تم عصر کی نماز پڑھنے میں آنحضرت ﷺ سے زیادہ جلدی کرتے ہو۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: حضرت اُمّ سلمہؓ کا مقصد اتباع سُنّت پر لوگوں کو رغبت دلانا اور متوجہ کرنا ہے کہ ہر جگہ اور ہر موقع پر آنحضرت ﷺ کی اتباع کرنے میں ہی بھلائی و سعادت ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عصر کی نماز میں تاخیر کرنا مستحب ہے۔ جیسا کہ حضرت امام اعظمؒ کا مسلک ہے۔

(۳۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ الْحَرُّ اَبْرَدَ بِالصَّلَاةِ وَاِذَا كَانَ الْبَرْدُ عَجَّلَ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (ظہر کی) نماز گرمی کے موسم میں ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے اور سردی کے موسم میں جلدی پڑھ لیتے تھے۔" (نسائیؒ)

تشریح: ظہر کے وقت کے سلسلہ میں احادیث میں جو تعارض ہے کہ بعض حدیثوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ظہر کی نماز تاخیر کر کے پڑھتے تھے اور بعض حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلدی پڑھ لیتے تھے۔ اس حدیث سے یہ تعارض ختم ہو جاتا ہے بایں طور کہ گرمی کے موسم میں تو آپ ﷺ ظہر کی نماز تاخیر سے پڑھا کرتے تھے اور سردی کے موسم میں جلدی پڑھتے تھے۔

(۳۳) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهَا سَتَكُوْنُ عَلَيْكُمْ بَعْدِيْ اُمَرَاءُ يَشْغَلُهُمْ اَشْيَاءُ عَنِ الصَّلَاةِ لِوَقْتِهَا حَتّٰى يَذْهَبَ وَقْتُهَا فَصَلُّوا الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُصَلِّيْ مَعَهُمْ قَالَ نَعَمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبادہ ابن صامتؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میرے بعد عنقریب تم پر ایسے (لوگ) حاکم ہوں گے جنہیں دنیا کی چیزیں (یعنی خواہشات نفسانی) وقت (مستحب) پر نماز پڑھنے سے باز رکھیں گی، یہاں تک کہ نماز کا وقت نکل جائے گا (یعنی وقت کراہت آجائے گا) لہٰذا تم اپنی نمازیں وقت پر پڑھتے رہنا (خواہ تنہا ہی کیوں نہ پڑھنی پڑے) ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا پھر (دوبارہ) ان کے ساتھ بھی نماز پڑھیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! (ان کے ساتھ بھی پڑھ لیا کرنا تاکہ ثواب بھی زیادہ ملے اور احکام کی مخالفت کرنے کی وجہ سے فتنہ و فساد بھی پیدا نہ ہو)۔" (ابوداؤدؒ)

(۳۴) وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكُوْنُ عَلَيْكُمْ اُمَرَاءُ مِنْ بَعْدِيْ يُؤَخِّرُوْنَ الصَّلَاةَ فَهِيَ لَكُمْ وَهِيَ عَلَيْهِمْ فَصَلُّوْا مَعَهُمْ مَا صَلَّوُا الْقِبْلَةَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت قبیصہ ابن وقاصؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، میرے بعد تم پر ایسے حاکم ہوں گے جو نماز (وقت مستحب سے) تاخیر کر کے پڑھیں گے اور وہ نماز تمہارے لئے تو فائدہ ہوگی اور ان کے لئے وبال ہوگی لہٰذا جب تک وہ قبلہ (یعنی کعبۃ اللہ) کی طرف نماز پڑھتے رہیں تم بھی ان کے ساتھ نماز پڑھتے رہنا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "فائدہ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے وقت مستحب کی فضیلت حاصل کرنے کی خاطر ان کی نماز سے پہلے نماز پڑھ لی۔ اور پھر اس کے بعد ان کے ساتھ بھی پڑھی تو یہ دوسری نماز تمہارے لئے نفل ہو جائے گی جس کی وجہ سے تمہیں بہت زیادہ ثواب ملے گا اور اگر ان کی نماز سے پہلے نماز نہ پڑھی بلکہ ان ہی کے ہمراہ پڑھی تو اس کے لئے تم پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا کیونکہ ان کے ساتھ وقت مکروہ میں تمہارا نماز پڑھنا فتنہ کے خوف اور فساد کے دفعیہ کی غرض سے ہوگا۔

اسی طرح "وبال" کا مطلب یہ ہے کہ وہ نماز ان کے لئے مؤاخذہ کا باعث ہوگی کہ جب وہ وقت مختار میں نماز ادا کرنے پر قادر تھے تو وقت سے تاخیر کر کے غیر مطلوب وقت میں نماز کیوں پڑھی اور پھر یہ کہ امور دنیا نے انہیں امور عقبیٰ کی انجام دہی سے باز رکھا جو یقیناً کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں۔

(۳۵) وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الْخِيَارِ اَنَّهُ دَخَلَ عَلٰى عُثْمَانَ وَهُوَ مَحْصُوْرٌ فَقَالَ اِنَّكَ اِمَامُ عَامَّةٍ وَنَزَلَ بِكَ مَا تَرٰى وَيُصَلِّي لَنَا اِمَامُ فِتْنَةٍ فَنَتَحَرَّجُ فَقَالَ الصَّلٰوةُ اَحْسَنُ مَا يَعْمَلُ النَّاسُ فَاِذَا اَحْسَنَ النَّاسُ فَاَحْسِنْ مَعَهُمْ وَاِذَا اَسَاءُوْا فَاجْتَنِبْ اِسَاءَتَهُمْ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت عبید اللہ ابن عدی ابن خیارؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب کہ وہ (اپنی شہادت سے پہلے بغاوت کے ایام میں اپنے مکان کے اندر) محصور تھے چنانچہ (عبید اللہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ سے) میں نے عرض کیا کہ آپ ہم سب کے امام (اور امیر) ہیں اور آپ پر جو کچھ (مصائب و پریشانیاں) نازل ہوئی ہیں وہ آپ بھی دیکھ رہے ہیں اور (ہمارا حال یہ ہے کہ) ہمیں فتنہ و فساد کا ایک امام نماز پڑھاتا ہے (جس کے پیچھے نماز پڑھنا) گناہ سمجھتے ہیں، (یہ سن کر) حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا کہ نماز پڑھنا لوگوں کے تمام اعمال سے بہتر و افضل ہے۔ لہٰذا جب لوگ نیکی و بھلائی کریں تو تم بھی ان کے ساتھ نیکی و بھلائی کرو اور اگر وہ برائی کریں تو تم ان کی برائیوں سے بچو۔" (بخاریؒ)

تشریح: "فتنہ و فساد کے امام" سے مراد باغیوں کا سردار ہے جس کا نام کنانہ ابن بشیر تھا۔ حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی نیکیوں میں تو شریک رہو یعنی اگر وہ نیک کام کریں تو تم بھی ان کے ساتھ مل کر وہی نیک کام کرو البتہ ان کی بدی میں شریک نہ رہو۔ اور نماز کا پڑھنا نیک ہی عمل ہے اس لئے باغیوں کے سردار کے پیچھے تم نماز پڑھ سکتے ہو اسے گناہ کی بات نہ سمجھو۔

حضرت عثمانؓ کے اس ارشاد سے ان کے عدل و انصاف اور ان کی حلم و بردباری کے عظیم وصف پر روشنی پڑتی ہے کہ انہوں نے ایک ایسے سخت موقعہ پر جب کہ باغیوں نے اپنے ظلم و ستم کی انتہا کرتے ہوئے انہیں مکان میں محصور کر رکھا تھا اور ان کے اوپر تکالیف و پریشانیوں کے پہاڑ توڑ رہے تھے تو انہوں نے اس وقت بھی ان کی نیکی اور بھلائی کو از راہ بغض و انتقام برائی سے تعبیر نہیں کیا بلکہ اسے اچھا ہی کہا۔ یہ ارشاد اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ہر نیک و بد شخص کے پیچھے نماز جائز ہو جاتی ہے جیسا کہ اہل سنت و الجماعت کا مسلک ہے۔

بَابُ فَضَائِلِ الصَّلٰوةِ
نماز کے فضائل کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنْ عُمَارَةَ بْنِ رُوَيْبَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَنْ يَلِجَ النَّارَ اَحَدٌ صَلّٰى قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا يَعْنِي الْفَجْرَ وَالْعَصْرَ۔ (رواه مسلم)

"حضرت عمارہ[1] ابن رویبہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے سورج نکلنے اور چھپنے سے پہلے (دو نمازیں) یعنی فجر اور عصر کی پڑھیں تو وہ دوزخ میں ہرگز داخل نہیں ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان دونوں نمازوں کو پابندی سے پڑھتا ہے تو وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا۔ بظاہر تو یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص ان دونوں نمازوں پر مداومت کرے گا، وہ دوسری نمازوں کو چھوڑنے یا دوسرے گناہوں کے صدور کے

[1] حضرت عمیرہؓ رویبہ کے صاحبزادے اور قبیلہ بنی جشم بن ثقیف سے ہیں اور کوفی ہیں ۱۲۔

سبب دوزخ میں داخل نہیں کیا جائے گا حالانکہ جمہور علماء کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ نمازیں صغیرہ گناہوں کا کفارہ تو ہو جاتی ہیں، کبیرہ گناہوں کا نہیں ہوتیں۔ چنانچہ علامہ طیبیؒ نے اس حدیث کی توجیہہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ صبح کا وقت عام طور پر آرام کا ہوتا ہے اسی طرح شام کا تجارت وغیرہ کی مشغولیت کا ہوتا ہے لہٰذا جو شخص ان دونوں موانع کے باوجود ان دونوں نمازوں کی محافظت کرتا ہے تو وہ بزبان حال اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ دوسرے اعمال میں بھی کمی زیادتی کرنے والا نہیں ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے) لہٰذا اس بناء پر وہ بخشش کی سعادت سے نوازا جائے گا اور دوزخ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

اور ظاہر یہ ہے کہ اس حدیث سے ان دونوں نمازوں کی فضیلت و عظمت کے بیان میں مبالغہ مراد ہے کہ ان دونوں نمازوں کی فضیلت و عظمت اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کی محافظت کرنے والا شخص دوزخ میں داخل نہ کیا جائے گا اور باوجودیکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے ہر عمل پر جزاء و سزا کا ترتب کرتا ہے مگر وہ چاہے تو ان دونوں نمازوں کے ادا کرنے کے سبب وہ گناہ جو اس سے سرزد ہوئے ہوں بخش سکتا ہے

④ وَعَنْ اَبِی مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى الْبَرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جو شخص ٹھنڈے وقت کی دونوں نمازیں (یعنی فجر و عشاء) پڑھتا رہا تو وہ جنت میں جائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

⑤ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَعَاقَبُوْنَ فِيْكُمْ مَلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ وَيَجْتَمِعُوْنَ فِيْ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الْعَصْرِ ثُمَّ يَعْرُجُ الَّذِيْنَ بَاتُوْا فِيْكُمْ فَيَسْاَلُهُمْ رَبُّهُمْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِهِمْ كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِيْ فَيَقُوْلُوْنَ تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ وَاَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس (آسمان سے) فرشتے رات دن آتے رہتے ہیں (جو تمہارے اعمال لکھتے ہیں اور انہیں بارگاہ الوہیت میں پہنچاتے ہیں) اور فجر و عصر کی نماز میں سب جمع ہوتے ہیں اور جو فرشتے تمہارے پاس رہتے ہیں وہ (جس وقت) آسمان پر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بندوں کے احوال جاننے کے باوجود ان سے (بندوں کے احوال و اعمال) پوچھتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حالت میں چھوڑا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ پروردگار! ہم نے تیرے بندوں کو نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا ہے اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے تو اس وقت بھی وہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے اعمال کو لکھنے اور انہیں اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کے لئے (فرشتوں کی دو جماعتیں بندوں کے ہمراہ رہتی ہیں۔ ایک جماعت تو دن کے اعمال لکھتی ہے اور پھر عصر کے بعد واپس جا کر بارگاہ الوہیت میں اپنی رپورٹ پیش کر دیتی ہے۔ دوسری جماعت رات کے اعمال لکھتی ہے۔ یہ فجر کی نماز کے بعد واپس جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو بندوں کے رات کے اعمال کی رپورٹ دیتی ہے چنانچہ دن اور رات میں دو وقت ایسے ہوتے ہیں جب کہ یہ دونوں جماعتیں جمع ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ تو فجر کے وقت جب کہ رات کے فرشتے واپس جاتے ہیں اور دن کے فرشتے اپنی ڈیوٹی پر آتے ہیں۔ اسی طرح دوسری مرتبہ ان دونوں جماعتوں کا اجتماع عصر کے وقت ہوتا ہے جب کہ دن کے فرشتے اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس جاتے ہیں اور رات کے فرشتے اپنے کام پر حاضر ہوتے ہیں۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اور اس کا علم زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے۔ وہ زمین و آسمانوں کے رہنے والوں کے ایک ایک عمل کو جانتا ہے مگر جب فرشتے بندوں کے اعمال کی رپورٹ لے کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں تو وہ ان سے پوچھتا ہے کہ جب تم اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس لوٹ رہے تھے تو بتاؤ کہ اس وقت میرے بندے کیا کر رہے تھے؟ اور اس کا یہ پوچھنا (نعوذ باللہ) علم حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس سوال سے اس کا مقصد فرشتوں کے سامنے اپنی بندوں کی فضیلت و عظمت کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو بھیجنا چاہا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا کہ پروردگار کیا تو ایسی مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو دنیا میں فساد اور خون ریزی و غارت گری کا بازار سرگرم کرے گی۔ اور پھر انہوں نے اپنی

برتری وبڑائی ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ تیری عبادت کے لئے تو ہم ہی کافی ہیں اور ہم ہی تیری عبادت و پرستش کر بھی سکتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ان سے یہ سوال کر کے ان پر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دیکھو! جس مخلوق کے بارہ میں تمہارا یہ خیال تھا کہ وہ دنیا میں سوائے فتنہ و فساد پھیلانے کے اور کوئی کام نہیں کرے گی اب تم خود دیکھ آئے ہو کہ وہ میری عبادت اور میری پرستش کس پابندی اور کس ذوق وشوق سے کرتی ہے۔

بہر حال! اس حدیث کے ذریعہ آنحضرت ﷺ مسلمانوں کو رغبت دلا رہے ہیں کہ ان دونوں اوقات میں ہمیشہ پابندی سے نماز پڑھتے رہو تاکہ وہ فرشتے خدا کے سامنے تمہارے اچھے اور بہتر اعمال ہی پیش کرتے رہیں اور خداوند قدوس تمہاری فضیلت وبڑائی اسی طرح فرشتوں کے سامنے ظاہر کرتا رہے۔

④ وَعَنْ جُنْدُبِ الْقَسْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى صَلَاةَ الصُّبْحِ فَهُوَ فِيْ ذِمَّةِ اللّٰهِ فَلَا يَطْلُبَنَّكُمُ اللّٰهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْءٍ فَإِنَّهُ مَنْ يَطْلُبُهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْءٍ يُدْرِكْهُ ثُمَّ يَكُبُّهُ عَلٰى وَجْهِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ الْقُشَيْرِي بَدَلَ الْقَسْرِيِّ۔

"اور حضرت جندب قسری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس نے صبح کی نماز پڑھی وہ (دنیا وآخرت میں) اللہ تعالیٰ کے عہد و امان میں ہے لہٰذا ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے اس عہد میں کچھ مواخذہ کرے کیونکہ جس سے اس نے عہد و امان میں مؤاخذہ کیا تو (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) کہ اسے پکڑ کر دوزخ کی آگ میں اوندھے منہ ڈال دے گا۔ (مسلم) اور مصابیح کے بعض نسخوں میں قسری کے بجائے قشیری ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے صبح کی نماز پڑھ لی وہ اللہ تعالیٰ کے عہد و امان میں ہے لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اس شخص سے بدسلوکی نہ کریں، اسے قتل نہ کریں۔ اس کا مال نہ چھینیں، اس کی غیبت نہ کریں اور اس کی بے آبروئی نہ کریں۔ اگر کسی شخص نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی یا اس کے ساتھ کوئی ایسا رویہ اختیار کیا جو اس کی جان ومال اور اس کی آبرو کے لئے نقصان دہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے عہد و امان میں خلل ڈالا لہٰذا اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے سخت مواخذہ کرے گا اور جس بدنصیب سے اللہ تعالیٰ نے مؤاخذہ کیا اس کے لئے نجات کا کوئی ذریعہ نہ ہوگا۔

یا پھر "عہد و امان" سے مراد نماز ہے کہ صبح کی نماز پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے دنیا وآخرت میں امن دینے کا وعدہ کر لیا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ صبح کی نماز ہرگز قضا نہ کریں ورنہ ان کے اور پروردگار کے درمیان جو عہد ہے وہ ٹوٹ جائے گا جس پر اللہ تعالیٰ مواخذہ کرے گا اور اس کے مواخذہ سے بچانے کی کوئی ہمت بھی نہیں کر سکتا۔

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي النِّدَاءِ وَالصَّفِّ الْاَوَّلِ ثُمَّ لَمْ يَجِدُوْا اِلَّا اَنْ يَسْتَهِمُوْا عَلَيْهِ لَاسْتَهَمُوْا وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي التَّهْجِيْرِ لَاسْتَبَقُوْا اِلَيْهِ وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي الْعَتَمَةِ وَالصُّبْحِ لَاَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اگر لوگوں کو اذان کہنے اور (نماز میں) پہلی صف میں کھڑے ہونے کا ثواب معلوم ہو جائے اور بے قرعہ ڈالے انہیں یہ حاصل نہ ہو سکے تو وہ ضرور قرعہ ہی ڈالیں (یعنی اگر لوگ اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کے لئے آپس میں نزاع کریں اور قرعہ ڈال کر دیکھیں کہ کس کا نام نکلتا ہے تو یہ مناسب ہے) اور اگر ظہر کی نماز کے لئے جلدی آنے کا ثواب جان لیں تو اس نماز میں دوڑتے ہوئے آیا کریں اور اگر عشاء و صبح کی نماز کی فضیلت معلوم ہو جائے (تو قوت نہ ہونے کی حالت میں بھی ان نمازوں کے لئے) سرین کے بل چل کر آئیں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اگر تہجیر کے معنی وہی لئے جائیں جو ترجمہ سے ظاہر ہیں یعنی ظہر کی نماز کے لئے جلدی آنا، تو اس فضیلت کا تعلق گرمی کے علاوہ دوسرے موسموں کی ظہر کی نماز سے ہوگا کیونکہ گرمی کے موسم میں ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت پڑھنا مستحب ہے۔ یا پھر "تہجیر کے معنی" طاعت کی طرف جلدی کرنا، ہوں گے اور بعض حضرات نے اس کے معنی "نماز جمعہ کے لئے دوپہر میں جانا) بھی لکھے ہیں۔ واللہ اعلم۔

سرین کے بل چل کر آنے، کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پیروں سے چلنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس نماز کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے اس طرح گھسٹتا ہوا آئے جس طرح ضعیف و معذور چل کر آتے ہیں۔

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ صَلٰوةٌ اَثْقَلَ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ مِنَ الْفَجْرِ وَالْعِشَاءِ وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِيْهِمَا لَاَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، منافقین پر عشاء اور فجر سے زیادہ بھاری کوئی نماز نہیں۔ اگر دونوں کے ثواب وہ جان لیں تو سرین کے بل چلتے ہوئے آیا کریں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: منافقین کے مزاج میں عبادت کے سلسلہ میں کسل و سستی بہت ہوتی ہے پھر جو نمازیں وہ پڑھتے ہیں وہ بھی محض اپنی جان بچانے اور مسلمانوں کو دکھانے سنانے کے لئے پڑھتے ہیں۔ فجر اور عشاء یہ دو وقت ایسے ہیں جو اول تو آرام و استراحت اور نیند کی لذت حاصل کرنے کے ہیں۔ نیز جاڑوں کے موسم میں سردی کے ہیں دوسرے یہ کہ ان اوقات میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے کوئی کسی کو کم ہی پہچانتا ہے اس لئے یہ دونوں نمازیں ان بدبختوں پر بہت گراں ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہ حدیث اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ مخلص و صادق مؤمنین کو چاہئے کہ وہ اس خصلت سے بچیں تاکہ منافقین کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔

⑦ وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَاَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ وَمَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَاَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عثمان غنیؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ لی تو گویا اس نے نصف رات کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور جس شخص نے صبح کی نماز جماعت سے پڑھ لی تو گویا اس نے تمام رات کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگر حدیث کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صبح کی نماز کا ثواب عشاء کی نماز کے ثواب سے زیادہ ہے کہ جب ہی تو کہا گیا ہے کہ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھنے والا، نصف رات تک نماز پڑھنے والے کے برابر ہوتا ہے اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھنے والا پوری رات تک نماز پڑھنے والے کے برابر ہوتا ہے۔

یا پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھی تو اسے آدھی رات تک نماز پڑھنے کا ثواب ملا پھر فجر کی نماز بھی جماعت سے ادا کر لی تو بقیہ نصف رات تک کا ثواب مل گیا اس طرح دونوں نمازوں کے پڑھنے سے پوری رات تک عبادت کرنے والے کے ثواب کا وہ حقدار ہو گیا۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَغْلِبَنَّكُمُ الْاَعْرَابُ عَلٰى اِسْمِ صَلَاتِكُمُ الْمَغْرِبِ قَالَ وَيَقُوْلُ الْاَعْرَابُ هِيَ الْعِشَاءُ وَقَالَ لَا يَغْلِبَنَّكُمُ الْاَعْرَابُ عَلٰى اِسْمِ صَلَاتِكُمُ الْعِشَاءِ فَاِنَّهَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ الْعِشَاءُ فَاِنَّهَا تُعْتِمُ بِحِلَابِ الْاِبِلِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، دیہاتی لوگ نماز مغرب کے نام لینے میں تم پر غالب نہ آجائیں راوی کہتے ہیں کہ دیہاتی لوگ (مغرب کو) عشاء کہتے تھے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ، نماز عشاء کے نام لینے میں بھی دیہاتی لوگ تم پر غالب نہ آجائیں۔ اس نماز کا نام کتاب اللہ میں عشاء ہے (چنانچہ ارشاد ربانی ہے وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ اور وہ دیہاتی لوگ اونٹنیوں کے دودھ

دوہنے کی وجہ سے اس نماز میں تاخیر کر دیتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "دیہاتی لوگوں" سے مراد ایام جاہلیت کے دیہاتی لوگ ہیں جو مغرب کو تو عشاء کہتے تھے اور عشاء کو عتمہ، چنانچہ آپ نے صحابہؓ کو منع فرمادیا کہ یہ نام نہ لئے جائیں کیونکہ اس میں ان کا غالب ہونا لازم آتا ہے اس لئے کہ جب ان لوگوں کا رکھا نام استعمال کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے ان کی زبان کو اپنایا جس کی بناء پر وہ تم پر غالب رہے لہٰذا تم وہی نام استعمال کرو جو قرآن وحدیث میں مذکور ہیں یعنی مغرب اور عشاء۔

لہٰذا۔ بظاہر تو اس نہی کا تعلق دیہاتی لوگوں سے ہے کہ وہ غالب نہ ہوں لیکن حقیقت میں اس نہی کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے کہ وہ ان نمازوں کے ناموں کے سلسلہ میں دیہاتی لوگوں کی موافقت نہ کریں تاکہ مسلمانوں پر ان کا غالب ہونا لازم نہ آئے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی زبان اور اپنا کلام اصطلاح شریعت کے مطابق درست کریں اور جو باتیں کفار وفجار کی زبان زد ہوں ان سے پرہیز کریں۔

نہی اور علت نہی بیان فرمانے کے بعد فَاِنَّهَا بِحِلَابِ الْاِبِلِ کہہ کر آپ ﷺ نے عشاء کو عتمہ کہنے کی وجہ کی طرف بھی اشارہ فرمادیا ہے۔ "تعتم" صحیح روایت میں صیغۂ معروف کے ساتھ ہے اور یہ بتایا جاچکا ہے کہ عتمہ تاریکی کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دیہاتی لوگ اونٹنیوں کے دودھ دوہنے کی وجہ سے عشاء کو تاریکی میں پڑھتے تھے باپں طور پر کہ وہ شفق غائب ہونے کے بعد دودھ دوہنا شروع کرتے تھے پھر اس کے بعد عشاء پڑھتے۔ ایک دوسری روایت میں یہ لفظ صیغۂ مجہول کے ساتھ مذکور ہے جس کے معنی یہ ہوں گے۔ اونٹنیوں کا دودھ دوہنے کی وجہ سے عشاء کی نماز تاریکی میں پڑھی جاتی تھی۔

بہرحال ایام جاہلیت میں عرب کے لوگ عتمہ تاریکی کو کہتے تھے۔ جب اسلام کی مقدس روشنی نے عرب کی سرزمین کو کفر وشرک کے اندھیروں سے صاف کیا اور نمازیں مشروع ہوئیں تو عشاء کی نماز کو دیہاتی لوگ صلوٰۃ العتمہ کہنے لگے چنانچہ اس نام سے مسلمانوں کو روکا گیا اور اہل جاہلیت سے مشابہت کی بناء پر اس نام کو مکروہ قرار دے دیا گیا۔

یہ پہلے بھی کئی جگہ بتایا جاچکا ہے کہ جن روایتوں میں بجائے عشاء کے عتمہ کا لفظ آیا ہے وہ روایتیں اس نہی سے قبل کی ہوں گی۔

⑨ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَ الْخَنْدَقِ حَبَسُوْنَا عَنْ صَلَاةِ الْوُسْطٰى صَلَاةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوْتَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَارًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ غزوۂ خندق کے روز فرماتے تھے کہ (کافروں نے) ہمیں درمیانی نماز یعنی نماز عصر کے پڑھنے سے روکا ہے۔ خداوند تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں میں آگ بھرے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: غزوۂ خندق کو غزوۂ احزاب بھی کہتے ہیں جو ۴ھ یا ۵ھ میں ہوا تھا۔ اس جنگ کو غزوۂ خندق اس لئے کہا جاتا ہے کہ اسی غزوہ کے موقعہ پر حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے دشمنوں سے بچاؤ کی خاطر مدینہ کے گرد خندق کھودی گئی تھی۔ خندق کھودنے میں تمام مسلمانوں کے ہمراہ خود سرکار دوعالم ﷺ (فداہ ابی وامی) بھی بنفس نفیس شریک تھے۔ جس طرح دیگر مخلص مؤمنین دن بھر بھوکے پیاسے رہ کر اللہ کے دین کی حفاظت اور اپنے محبوب پیغمبر کے مشن کی کامیابی کے لئے اس محنت ومشقت میں مصروف رہتے تھے اسی طرح آقائے نامدار سرور کائنات فخر دوعالم جناب محمد رسول اللہ ﷺ بھی بڑی بڑی تکالیف برداشت فرماکر، مصائب ورنج اٹھاکر بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ کر سردی کی شدید پریشانی اور زمین کو کھودنے پتھر اکھاڑنے کی سخت محنت جھیل کر اپنے جانثار رفقاء کے ہمراہ خندق کھودتے تھے۔

اسی جنگ میں بسبب تردد اور تیر اندازی آنحضرت ﷺ کی چار نمازیں قضا ہوگئی تھی کہ انہیں میں عصر کی نماز بھی تھی آنحضرت ﷺ نے عصر کی نماز کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے یہ بددعا فرمائی جس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان کفار ومشرکین نے ہماری نمازیں قضا کرا

کر ہمیں سخت روحانی تکلیف و اذیت میں مبتلا کیا ہے، خدا کرے وہ بھی دنیا و آخرت کے شدید عذاب میں مبتلا کئے جائیں۔

ایک معمولی سا خلجان یہاں واقع ہو سکتا ہے کہ جنگ احد کے موقع پر آپ ﷺ کی ذات اقدس کو جبکہ کفار کی جانب سے بے انتہاء تکلیف پہنچائی گئی تو آپ ﷺ نے وہاں بد دعا نہیں کی اور یہاں بد دعا فرمائی اس کی وجہ کیا ہے؟۔

اس کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ جنگ احد میں آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس کا معاملہ تھا وہاں آپ ﷺ کی شان رحمت کا تقاضا تھا کہ اپنے نفس کے معاملہ میں کسی کے لئے بد دعا نہ کریں مگر یہاں نماز کا سوال تھا جس کا تعلق آپ ﷺ کی ذات سے نہ تھا بلکہ حقوق اللہ سے تھا اس لئے آپ ﷺ نے بد دعا فرمائی۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ "صلوٰۃ وسطیٰ" عصر کی نماز ہے چنانچہ صحابہ اور تابعین میں سے اکثر جلیل القدر حضرات، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ وغیرہ کا قول یہی ہے لہٰذا قرآن شریف کی آیت کریمہ حافظوا علی الصَّلٰوتِ والصلٰوۃ الوسطی (یعنی محافظت کرو تم سب نمازوں کی اور درمیانی نماز کی) میں وسطیٰ سے عصر کی نماز ہی مراد لی جائے گی۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس کے تعین میں اکثر صحابہ اور تابعین کا اختلاف رہا ہے تو اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت تک ان حضرات تک آنحضرت ﷺ کی وہ حدیث (جو آئندہ فصل میں آرہی ہے) نہیں پہنچی ہوگی جس سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ "صلوٰۃ وسطیٰ" سے عصر کی نماز مراد ہے۔ اس لئے وہ حضرات اپنے اجتہاد اور رائے کی بناء پر اس کے تعین میں اختلاف کرتے ہوں گے چنانچہ اس حدیث کی صحت کے بعد یہ متعین ہو گیا کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ واللہ اعلم۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۱۰) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَسَمُرَۃَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلَاۃُ الْوُسْطٰی صَلَاۃُ الْعَصْرِ۔
(رواہ الترمذی)

"حضرت ابن مسعود اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، درمیانی نماز (یعنی قرآن مجید میں جو وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی مذکور ہے وہ) عصر کی نماز ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: صلوٰۃ وسطیٰ (یعنی درمیانی نماز) سے عصر کی نماز اس لئے مراد لی جاتی ہے کہ یہی نماز دن کی دونوں نمازوں (یعنی فجر اور ظہر) اور رات کی دونوں نمازوں (یعنی مغرب و عشاء کے درمیان آتی ہے)۔

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا قَالَ تَشْھَدُہٗ مَلَائِکَۃُ اللَّیْلِ وَمَلَائِکَۃُ النَّھَارِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے قول اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا (یعنی فجر کی نماز فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے) کی تفسیر میں فرماتے تھے کہ صبح کی نماز میں دن اور رات کے فرشتے حاضر (یعنی جمع) ہوتے ہیں۔"
(ترمذیؒ)

تشریح: اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ الاٰیۃ کے معنی قرأت قرآن فجر ہیں اور اس سے مراد فجر کی نماز ہے۔ اسے قرآن اس لئے کہا ہے کہ قرأت نماز کا ایک رکن ہے جیسے کہ بعض مقامات پر نماز کو سجدہ یا رکوع کہا گیا ہے۔

بہر حال۔ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں "مشہود" سے مراد یہ ہے کہ بندوں کے دن اور رات کے اعمال لکھنے والے فرشتے اس نماز میں جمع ہوتے ہیں جیسا کہ اسی باب کی حدیث نمبر تین میں اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑫ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ وَعَائِشَةَ قَالَا اَلصَّلٰوةُ الْوُسْطٰى صَلٰوةُ الظُّهْرِ رَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ زَيْدٍ وَالتِّرْمِذِيُّ عَنْهُمَا تَعْلِيْقًا۔

"حضرت زید ابن ثابتؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ دونوں فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ (یعنی درمیانی نماز) ظہر کی نماز ہے۔ اس روایت کو امام مالکؒ نے صرف حضرت زیدؓ سے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے دونوں (یعنی حضرت زیدؓ و حضرت عائشہؓ) سے بطریق تعلیق یعنی بلا سند روایت کیا ہے۔"

تشریح: حضرت عائشہؓ اور حضرت زید ابن ثابتؓ صلوٰۃ وسطیٰ سے ظہر کی نماز اس لئے مراد لیتے تھے کہ یہ نماز دن کے درمیانی حصہ میں ادا کی جاتی ہے۔

⑬ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّى الظُّهْرَ بِالْهَاجِرَةِ وَلَمْ يَكُنْ يُصَلِّىْ صَلٰوةً اَشَدَّ عَلٰى اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهَا فَنَزَلَتْ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقَالَ اِنَّ قَبْلَهَا صَلَاتَيْنِ وَبَعْدَهَا صَلَاتَيْنِ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز سویرے (یعنی دن ڈھلتے ہی) پڑھ لیتے تھے اور آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ پر ان تمام نمازوں میں جو وہ پڑھتے تھے ظہر کی نماز سے زیادہ سخت کوئی نماز نہ تھی چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى یعنی تم سب نمازوں کی خصوصاً درمیانی نماز کی محافظت کرو۔ اور حضرت زید ابن ثابتؓ فرمایا کرتے تھے کہ ظہر کی نماز سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور بعد میں بھی دو نمازیں ہیں۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جزء سے راوی کا مقصد یہ ہے کہ درمیانی نماز سے مراد ظہر کی نماز ہے۔ لہٰذا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زیدؓ کا یہ ثابت کرنا کہ درمیانی نماز سے مراد ظہر کی نماز ہے ان کا اپنا ذاتی اجتہاد ہے۔ اس لئے ان کا یہ قول آنحضرت ﷺ کی حدیث سے متعارض نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ نے تو صراحت کے ساتھ فرمادیا ہے کہ "درمیانی نماز" سے مراد عصر کی نماز ہے۔

⑭ وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ وَعَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ كَانَا يَقُوْلَانِ الصَّلٰوةُ الْوُسْطٰى صَلٰوةُ الصُّبْحِ رَوَاهُ فِي الْمُوَطَّا وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَابْنِ عُمَرَ تَعْلِيْقًا۔

"اور حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت ابن عباسؓ دونوں کہا کرتے تھے کہ درمیانی نماز (سے مراد) صبح کی نماز ہے۔ (موطا امام مالکؒ) اور یہ روایت حضرت امام ترمذیؒ نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمرؓ سے بطریق تعلیق نقل کی ہے۔"

تشریح: یہ بھی ان دونوں حضرات کا اپنا اجتہاد ہے کہ ان حضرات تک آنحضرت ﷺ کی حدیث نہ پہنچی ہوگی اس لئے انہوں نے بطریق احتمال کہا کہ درمیانی نماز سے مراد صبح کی نماز ہے۔

بہر حال۔ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے کہ درمیانی نماز سے مراد صبح کی نماز ہے مگر حضرت امام نوویؒ جو شافعی المسلک ہیں فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں صحیح احادیث منقول ہیں کہ درمیانی نماز سے مراد نماز عصر ہے۔

گو حضرت ماوردیؒ نے جو شوافع کے ائمہ میں شمار کئے جاتے ہیں یہ وضاحت کی ہے کہ حضرت امام شافعیؒ نے یہ تصریح کردی ہے کہ صبح کی نماز درمیانی نماز ہے۔ تاہم ان صحیح احادیث کو دیکھتے ہوئے جن سے بصراحت ثابت ہے کہ عصر کی نماز ہی درمیانی نماز ہے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شافعی مسلک بھی یہی ہوگا کیونکہ حضرت امام شافعیؒ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ "اگر تم کوئی ایسی حدیث پاؤ جس کے برخلاف میں نے حکم دے رکھا ہو تو میرا صحیح مسلک وہی سمجھنا جو صحیح حدیث سے ثابت ہو اور میرا پہلا حکم دیوار پر پھینک مارنا"۔

⑮ وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ غَدَا اِلٰی صَلَاۃِ الصُّبْحِ غَدَا بِرَایَۃِ الْاِیْمَانِ وَمَنْ غَدَا اِلَی السُّوْقِ غَدَا بِرَایَۃِ اِبْلِیْسَ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت سلمانؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص صبح کی نماز کے لئے جاتا ہے تو گویا وہ ایمان کا جھنڈا لے کر چلتا ہے اور جو شخص صبح بازار جاتا ہے تو گویا وہ شیطان کا جھنڈا لے کر چلتا ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے لشکر اور شیطان کو بیان کرنے کے لئے تمثیل ہے کہ جو شخص فجر کی نماز پڑھنے کے لئے صبح سویرے مسجد کی طرف چلتا ہے تو گویا وہ ایمان کا جھنڈا اٹھا کر شیطان سے جنگ کرنے کے لئے چلتا ہے جس طرح غازی اور مجاہدین دشمنان اسلام سے برسرپیکار ہونے کے لئے اسلامی جھنڈا لے کر چلتے ہیں لہٰذا صبح سویرے فجر کی نماز کو جانے والا شخص اللہ تعالیٰ کے لشکر کا ایک فرد ہوتا ہے اور جو شخص صبح سویرے حصول دنیا کے چکر میں بازار کی طرف چلتا ہے تو وہ شیطان کے لشکر کا ایک فرد ہوتا ہے۔ بایں طور کہ وہ خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نماز کو جانے کی بجائے شیطان کی خواہش پر عمل کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے دین کو کمزور کر کے شیطان کی پیروی و تابعداری کا جھنڈا اٹھا کر اس کی شان و شوکت بڑھاتا ہے لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ یہ تمثیل اس شخص کے حق میں ہے جو فجر کی نماز و وظائف پڑھے بغیر بازار جاتا ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص نماز و تلاوت اور وظائف سے فارغ ہو کر حلال رزق طلب کرنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے سامان حیثیت کی فراہمی کی خاطر بازار جاتا ہے تو وہ اس تمثیل کی رو سے شیطان کے لشکر کا فرد نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کے لشکر کا فرد ہوتا ہے۔

باب الاذان

اذان کا بیان

لغت میں اذان کے معنی "خبر دینا" ہیں اور اصطلاح شریعت میں "چند مخصوص الفاظ کے ساتھ اوقات مخصوصہ میں نماز کا وقت آنے کی خبر دینے" کو اذان کہتے ہیں۔ اس تعریف سے وہ اذان خارج ہے جو نماز کے علاوہ دیگر امور کے لئے مسنون کی گئی ہے جیسا کہ بچے کی پیدائش کے بعد اس کے دائیں کان میں اذان کے کلمات اور بائیں کان میں اقامت کے کلمات کہے جاتے ہیں اور اسی طرح اس شخص کے کان میں اذان کہنا مستحب ہے جو کسی رنج میں مبتلا ہو یا اسے مرگی وغیرہ کا مرض ہو یا وہ غصہ کی حالت میں ہو، یا جس کی عادتیں خراب ہو گئی ہوں خواہ وہ انسان ہو یا جانور۔ چنانچہ حضرت دیلمیؒ راوی ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ایک دن سرکار دو عالم ﷺ نے مجھے غمگین دیکھ کر فرمایا کہ اے ابن ابی طالب: میں تمہیں غمگین دیکھ رہا ہوں لہٰذا تم اپنے اہل بیت میں سے کسی کو حکم دو کہ وہ تمہارے کان میں اذان کہے جس سے تمہارا غم ختم ہو جائے گا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ میں نے آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق عمل کیا تو آپ ﷺ کی بات صحیح ثابت ہوئی نیز اس روایت کو حضرت علیؓ تک نقل کرنے والے ہر راوی نے کہا ہے کہ ہم نے اس طریقہ کو آزمایا تو مجرب ثابت ہوا۔ ایسے ہی حضرت دیلمیؒ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جس کی عادتیں خراب ہو گئی ہوں خواہ وہ انسان ہو یا جانور تو اس کے کان میں اذان کہو"۔

بہر حال۔ فرائض نماز کے لئے اذان کہنا سنت مؤکدہ ہے تاکہ لوگ نماز کے وقت مسجد میں جمع ہو جائیں اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں۔ اذان کی مشروعیت کے سلسلہ میں مشہور اور صحیح یہ ہے کہ اذان کی مشروعیت کی ابتداء عبداللہ ابن زید انصاری اور حضرت عمر فاروقؓ کا خواب ہے جس کی تفصیل آئندہ احادیث میں آئے گی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اذان کا خواب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی دیکھا تھا۔ حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ دس صحابہ کو

خواب میں اذان کے کلمات کی تعلیم دی گئی تھی بلکہ کچھ حضرات نے تو کہا ہے کہ خواب دیکھنے والے چودہ صحابہؓ ہیں۔

بعض علماء محققین کا قول یہ ہے کہ اذان کی مشروعیت خود آنحضرت ﷺ کے اجتہاد کے نتیجہ میں ہوئی ہے جس کی طرف شب معراج میں ایک فرشتہ نے راہنمائی کی تھی چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم شب معراج میں جب عرش پر پہنچے اور سراپردۂ عزت تک جو کبریائی حق جل مجدہ کا محل خاص ہے پہنچے تو وہاں سے ایک فرشتہ نکلا آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ فرشتہ کون ہے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ اس خدا کی قسم! جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے تمام مخلوق سے زیادہ قریب ترین درگاہ عزت سے میں ہوں لیکن میں نے پیدائش سے لے کر آج تک اس وقت کے علاوہ اس فرشتہ کو کبھی نہیں دیکھا ہے چنانچہ اس فرشتہ نے کہا "اللہ اکبر اللہ اکبر" یعنی اللہ بہت بڑا ہے اللہ بہت بڑا ہے۔ پردہ کے پیچھے سے آواز آئی کہ میرے بندہ نے سچ کہا انا اکبر انا اکبر (یعنی میں بہت بڑا ہوں میں بہت بڑا ہوں) اس کے بعد اس فرشتہ نے اذان کے باقی کلمات ذکر کئے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اذان کے کلمات صحابہ کے خواب سے بھی بہت پہلے شب معراج میں سن چکے تھے۔ چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں محقق فیصلہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اذان کے کلمات شب معراج میں سن تو لئے تھے لیکن ان کلمات کو نماز کے لئے اذان میں ادا کرنے کا حکم نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ مکہ میں بغیر اذان کے نماز ادا کرتے رہے یہاں تک کہ مدینہ تشریف لائے اور یہاں صحابہؓ سے مشورہ کیا چنانچہ بعض صحابہؓ نے خواب میں ان کلمات کو سنا اس کے بعد وحی بھی آگئی کہ جو کلمات آسمان پر سنے گئے تھے اب وہ زمین پر اذان کے لئے مسنون کر دیے جائیں۔ واللہ اعلم۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ ذَكَرُوا النَّارَ وَالنَّاقُوْسَ فَذَكَرُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى فَأُمِرَ بِلَالٌ اَنْ يَّشْفَعَ الْاَذَانَ وَاَنْ يُّوْتِرَ الْاِقَامَةَ قَالَ اِسْمَاعِيْلُ فَذَكَرْتُهُ لِاَيُّوْبَ فَقَالَ اِلَّا الْاِقَامَةَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ نے (اذان کی مشروعیت سے پہلے نماز کے وقت کا اعلان کرنے کے سلسلے میں) آگ اور ناقوس کا ذکر کیا۔ بعض لوگوں نے یہود و نصاریٰ کا ذکر کیا (کہ ان کی مشابہت ہوگی) پھر سرور کائنات ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان کے کلمات جفت کہیں (یعنی اذان کے شروع میں اللہ اکبر چار مرتبہ کہیں اور باقی کلمات سوائے آخری کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے جو ایک مرتبہ کہا جاتا ہے وہ دو مرتبہ کہیں) اور تکبیر کے کلمات (سوائے اللہ اکبر کے) ایک ایک مرتبہ کہیں) شیخ اسماعیلؒ (جو اس حدیث کے راوی اور بخاریؒ و مسلمؒ کے استاذ ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کا ذکر ایوب سے (جو اس حدیث کے راوی ہیں اور جنہوں نے حضرت انسؓ کو دیکھا ہے) کیا تو انہوں نے فرمایا کہ لفظ قَدْقَامَتِ الصَّلٰوۃ دو مرتبہ کہنا چاہئے (یعنی تکبیر کے اوّل و آخر میں "اللہ اکبر" کے علاوہ بقیہ کلمات ایک ایک مرتبہ ہیں اور لفظ قَدْقَامَتِ الصَّلٰوۃ دو مرتبہ ہے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے اور یہاں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور مسجد بنائی گئی تو آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ نماز کے وقت اعلان کے لئے کوئی ایسی چیز متعین کی جانی چاہئے جس کے ذریعہ تمام لوگوں کو اوقات نماز کی اطلاع ہو جایا کرے تاکہ سب لوگ وقت پر مسجد میں حاضر ہو جائیں اور جماعت سے نماز ہو سکے چنانچہ بعض صحابہؓ نے یہ مشورہ دیا کہ نماز کے وقت کسی بلند جگہ پر آگ روشن کر دی جایا کرے تاکہ اسے دیکھ کر لوگ مسجد میں جمع ہو جائیں بعضوں کی رائے ہوئی ناقوس بجانا چاہئے تاکہ اس کی آواز سن کر لوگ مسجد میں حاضر ہو جائیں۔

چند صائب الرائے صحابہؓ نے ان تجویزوں کے سلسلہ میں عرض کیا کہ آگ تو یہودی اپنی عبادت کے وقت اعلان کے لئے روشن کرتے ہیں، اسی طرح ناقوس نصاریٰ اپنی عبادت کے وقت اعلان کے لئے بجاتے ہیں لہٰذا ہمیں یہ دونوں طریقے اختیار نہ کرنے چاہئیں

تاکہ یہود و نصاریٰ کی مشابہت لازم نہ آئے، لہٰذا ان کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ سوچنا چاہئے۔
بات معقول تھی اس لئے بغیر کسی فیصلہ کے مجلس برخاست ہوئی اور صحابہؓ اپنے اپنے گھر آ گئے۔ ایک مخلص صحابی حضرت عبداللہ ابن زیدؓ نے جب دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اس سلسلہ میں بہت فکر مند ہیں اور کوئی بہتر طریقہ سامنے نہیں آتا تو بہت پریشان ہوئے ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ مسئلہ کسی طرح جلد از جلد طے ہو جائے تاکہ آنحضرت ﷺ کا فکر دور ہو جائے چنانچہ یہ اسی سوچ و بچار میں گھر آ کر سو گئے خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک فرشتہ شکل ان کے سامنے کھڑا ہوا اذان کے کلمات کہہ رہا ہے۔
بعض روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ ابن زیدؓ فرماتے تھے کہ اس وقت میں بالکل سویا ہوا نہیں تھا بلکہ غنودگی کے عالم میں تھا اور بعض روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر بدگمانی کا خوف نہ ہوتا تو میں کہتا کہ میں اس وقت سویا ہی نہیں تھا۔ اسی بناء پر بعض علماء نے اس واقعہ کو حال اور کشف پر محمول کیا ہے جو ارباب باطن کو حالت بیداری میں ہوتا ہے۔
بہر حال حضرت عبداللہ ابن زیدؓ صبح کو اٹھ کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور اپنا خواب بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ یہ خواب سچ ہے اور فرمایا کہ بلالؓ کو اپنے ہمراہ لو، تم انہیں وہ کلمات جو تمہیں خواب میں تعلیم فرمائے گئے ہیں بتاتے رہو وہ انہیں زور سے ادا کریں گے کیونکہ وہ تم سے بلند آواز ہیں۔
چنانچہ جب اس طرح دونوں نے اذان دی اور حضرت بلالؓ کی آواز شہر میں پہنچی تو حضرت عمر فاروقؓ دوڑتے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ابھی جو کلمات ادا کئے گئے ہیں میں نے بھی خواب میں ایسے ہی کلمات سنے ہیں۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ منقول ہے کہ اسی رات میں دس گیارہ یا چودہ صحابہؓ نے ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔
"ناقوس" نصاریٰ کے یہاں عبادت کے وقت خبر دینے کے سلسلے میں استعمال ہوتا تھا اور اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ وہ لوگ ایک بڑی لکڑی کو کسی چھوٹی لکڑی پر مارتے تھے اس سے جو آواز پیدا ہوتی تھی وہی عبادت کے وقت کا اعلان ہوتی تھی۔
یہودیوں کے بارہ میں تو مشہور یہ ہے کہ وہ اپنی عبادت کے وقت سینگ بجایا کرتے تھے چنانچہ آگ جلانے کا ذکر صرف حضرت انسؓ کی اسی حدیث میں ذکر کیا گیا ہے اور کسی روایت میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے یہاں دو فرقے ہوں گے ایک فرقہ تو سینگ بجاتا ہو گا اور دوسرا فرقہ آگ جلاتا ہو گا۔
یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اذان کے کلمات (شروع میں اللہ اکبر کے علاوہ) تو جفت ہیں اور اقامت کے کلمات طاق ہیں۔ چنانچہ صحابہ و تابعین میں سے اکثر اہل علم اور امام زہریؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام اوزاعیؒ، امام اسحاقؒ اور امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے مگر حضرت امام اعظمؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک اذان و تکبیر دونوں کے کلمات جفت ہیں ان کی دلیل آگے آئے گی۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ مَحْذُوْرَۃَ قَالَ اَلْقٰی عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ التَّاذِیْنَ ھُوَ بِنَفْسِہٖ فَقَالَ قُلْ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ، اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ ثُمَّ تَعُوْدُ فَتَقُوْلُ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ۔ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابومحذورہؓ[1] راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے مجھے خود (بغیر واسطہ کے اذان سکھلائی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کہو! اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں (یعنی جانتا اور بیان کرتا ہوں) کہ اللہ کے سوا

---

[1] آپ کا اسم گرامی سمرہ بن معیر ہے اور ابو محذورہ کی کنیت سے مشہور ہیں۔ آپ نے ہجرت نہ کی آپ مؤذن تھے اور مکہ ہی میں انتقال کیا ۱۲۔

کوئی معبود نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، پھر فرمایا کہ دوبارہ کہو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ آؤ نماز کی طرف، آؤ نماز کی طرف، آؤ فلاح کی طرف، آؤ فلاح کی طرف، اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اللہ اکبر" کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس چیز سے بہت بلند و بالا ہے کہ کوئی شخص اس کی کبریائی و عظمت کی حقیقت کو پہچانے۔ یا اللہ تعالیٰ اس حیثیت سے بہت بڑا ہے کہ اس کی ذات پاک کی طرف ان چیزوں کی نسبت کی جائے جو اس کی عظمت و بزرگی کے مناسب نہیں ہیں، یا پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ، اللہ رب العزت تمام چیزوں سے بہت بڑا ہے۔

اذان و تکبیر میں اللہ اکبر کی حرف را ساکن ہوتی ہے اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمدؒ، اور جمہور علماء کے نزدیک یہ کلمہ اذان میں پہلی بار چار مرتبہ کہا جاتا ہے اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔

اس کلمہ کو چار مرتبہ کہنے میں یہ لطیف نکتہ ہے کہ گویا یہ حکم چار دانگ عالم میں جاری و حاوی ہے اور عناصر اربعہ سے مرکب نفس انسانی کی خواہشات کے تزکیہ میں بہت مؤثر ہے۔

حی علی الفلاح کے معنی یہ ہیں کہ تم ہر مکروہ چیز سے چھٹکارا اور ہر مراد کے ملنے کی طرف آؤ۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ فلاح کے معنی بقا کے ہیں یعنی اس چیز کی طرف دوڑو جو عذاب سے چھٹکارے کا باعث، ثواب ملنے کا سبب اور آخرت میں بقاء کا ذریعہ ہے اور وہ چیز نماز ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک اذان میں ترجیع یعنی شہادتین کو دو مرتبہ کہنا سُنّت ہے۔ ترجیع کی شکل یہ ہوتی ہے کہ پہلے شہادتین کو دو مرتبہ پست آواز سے کہا جاتا ہے پھر دو مرتبہ بلند آواز سے ان حضرات کی دلیل یہی حدیث ہے۔

علمائے حنفیہ فرماتے ہیں کہ یہ تکرار حضرت ابو محذورہ کی تعلیم کے لئے تھا نہ کہ تشریع کے لئے۔ یعنی پہلی مرتبہ ابو محذورہ نے جب شہادتین کو پست آواز سے کہا تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ان کلمات کو پھر ادا کرو اور بلند آواز سے ادا کرو چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابو محذورہ کی جو ایک دوسری روایت منقول ہے اس میں ترجیع نہیں ہے۔

نیز حضرت عبداللہ ابن زید کی حدیث میں بھی جو اذان کے باب میں اصل کی حیثیت رکھتی ہے ترجیع نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت بلالؓ جو مؤذنوں کے سردار ہیں، نہ ان کی اذان میں اور نہ ابن اُمّ مکتوم کی اذان میں جو مسجد نبوی میں اذان کہتے تھے اور نہ ہی حضرت سعد قرظ کی اذان میں جو مسجد قبا کے مؤذن تھے ترجیع منقول ہے۔ پھر یہ کہ اس سلسلہ میں حضرت ابی محذورہ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ تکرار شہادتین کی تعلیم کے لئے تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَ الْاَذَانُ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّتَیْنِ مَرَّتَیْنِ وَالْاِقَامَۃُ مَرَّۃً مَرَّۃً غَیْرَ اَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی)

"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ کے زمانہ میں اذان کے کلمات دو دو دفعہ اور تکبیر کے کلمات ایک ایک دفعہ (کہے جاتے) تھے البتہ (تکبیر میں) قدقامت الصلوۃ بے شک نماز تیار ہے مؤذن دو مرتبہ کہتا تھا۔" (ابوداؤد، نسائی، دارمی)

تشریح: حضرت ابن عمرؓ نے جو یہ فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ میں اذان کے کلمات دو دو مرتبہ کہے جاتے تھے تو اس سے مراد یہ ہے کہ شروع میں اللہ اکبر چار مرتبہ کہتے تھے اور آخر میں لا الہ الا اللہ ایک مرتبہ کہتے تھے ان دونوں کلمات کے علاوہ باقی

کلمات دو دو مرتبہ کہے جاتے تھے۔

اقامت میں جس طرح قدقامت الصلوٰۃ کا استثناء کیا گیا ہے اسی طرح تکبیر یعنی اللہ اکبر کو بھی مستثنیٰ کرنا مناسب تھا کیونکہ تکبیر بھی بلا اختلاف اوّل و آخر میں مکرر ہے۔

④ وَعَنْ اَبِیْ مَحْذُوْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَّمَہُ الْاَذَانَ تِسْعَ عَشْرَةَ کَلِمَةً وَّالْاِقَامَةَ سَبْعَ عَشْرَةَ کَلِمَةً رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ۔

"اور حضرت ابو محذورہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے انہیں اذان کے انیس کلمات اور تکبیر کے سترہ کلمات سکھلائے تھے۔

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حنفی مسلک میں اذان کے پندرہ کلمات ہیں مگر اس حدیث میں انیس ذکر کئے گئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انیس کلمات ترجیع سمیت ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک ہے اور حدیث نمبر دو کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ترجیع تعلیم پر محمول ہے وہ مشروع نہیں ہے۔

تکبیر کے سترہ کلمات بتائے گئے ہیں بایں طور کہ ترجیع کے چار کلمات الگ کر کے اور دو کلمات قدقامت الصلوٰۃ کے بڑھا کر تکبیر کے کلمات سترہ ہوئے اور حضرت امام اعظمؒ کا مسلک بھی یہی ہے لہٰذا یہ حدیث اذان کے بارہ میں تو شوافع کے مسلک کی تائید کرتی ہے کہ ان کے یہاں اذان کے کلمات انیس ہوتے ہیں۔ اور تکبیر کے بارہ میں حنفیہ کے مسلک کے موافق ہے کہ ان کے یہاں تکبیر کے کلمات سترہ ہوتے ہیں چنانچہ تکبیر کے کلمات تعیین میں حنفیہ کی جانب سے یہی حدیث بطور دلیل پیش کی جاتی ہے۔

اس سے پہلے کی حدیث میں جس میں حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق تکبیر کے کلمات کی تعداد گیارہ ثابت ہوتی ہے اگر صحیح ہے تو اس حدیث سے منسوخ ہے۔

⑤ وَعَنْہُ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ عَلِّمْنِیْ سُنَّةَ الْاَذَانِ قَالَ فَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَأْسِہٖ قَالَ تَقُوْلُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ تَرْفَعُ بِھَا صَوْتَکَ ثُمَّ تَقُوْلُ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ تَخْفِضُ بِھَا صَوْتَکَ ثُمَّ تَرْفَعُ صَوْتَکَ بِالشَّھَادَةِ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوةِ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوةِ۔ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ۔ فَاِنْ کَانَ صَلَاةُ الصُّبْحِ قُلْتَ اَلصَّلٰوةُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلٰوةُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابو محذورہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کائنات ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے اذان کا طریقہ سکھا دیجئے! راوی کہتے ہیں کہ (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے ابو محذورہ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور پھر فرمایا کہ کہو اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ ان کے ساتھ آواز بلند کرو، اور پھر کہو، اشھد ان لا الہ الا اللہ، اشھد ان لا الہ الا اللہ۔ اشھد ان محمدا رسول اللہ، اشھد ان محمدا رسول اللہ۔ انہیں آہستہ سے کہہ کر پھر بلند آواز سے شہادت کے کلمات کہو اشھد ان لا الہ الا اللہ، اشھد ان لا الہ الا اللہ۔ اشھد ان محمدا رسول اللہ، اشھد ان محمدا رسول اللہ، حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح، حی علی الفلاح۔ اگر صبح کی نماز کے لئے اذان کہنا چاہو تو (اس کے بعد یہ کلمات کہو الصلوٰۃ خیر من النوم، الصلوٰۃ خیر من النوم۔ (یعنی نماز نیند سے بہتر ہے، نماز نیند سے بہتر ہے، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ۔" (ابوداؤد)

تشریح: "فمسح مقدم رأسہ" کے معنی یا تو وہی ہیں جو ترجمہ سے ظاہر ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو محذورہؓ کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا تاکہ اس کی برکت ابو محذورہ کے دماغ کو پہنچے اور وہ دین کی باتوں کو یاد رکھ سکیں، چنانچہ ایک صحیح نسخہ میں یہ الفاظ اس

طرح ہیں، "فمسح راسی" یعنی آپ ﷺ نے میرے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا، لہٰذا یہ الفاظ اس معنی کی تائید کرتے ہیں جو ترجمہ میں کئے گئے ہیں۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اتفاقی طور پر اپنا دست مبارک خود اپنے سر اقدس پر پھیرا ہوگا۔ راوی نے پورا واقعہ نقل کرنے کی غرض سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا۔

بہر حال اس پہلے ترجمہ کی جو توجیہ کی گئی تھی کہ جن احادیث میں اذان میں شہادتین کا تکرار ذکر کیا گیا ہے تو تعلیم پر محمول ہے تو وہ توجیہ بظاہر اس حدیث کے منافی ہے لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس سلسلہ میں ہم نے ان کثیر روایتوں کو ترجیح دی ہے جن میں ترجیع کا ذکر نہیں کیا گیا ہے نیز حضرت ابو محذورہ کی روایت جس سے ترجیع ثابت ہے وہ پہلے کی ہے اور وہ احادیث جن میں ترجیع مذکور نہیں ہے بعد کی ہیں اس لئے ابو محذورہؓ کی روایت ان روایتوں سے منسوخ ہے۔ واللہ اعلم۔

الصلوٰۃ خیر من النوم کا مطلب یہ ہے۔ ارباب ذوق شوق اور عشق خداوندی سے سرشار لوگوں کے نزدیک نماز کی لذت نیند کی لذت سے بدرجہا بہتر ہے۔

(۶) وَعَنْ بِلَالٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُثَوِّبَنَّ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الصَّلٰوةِ اِلَّا فِيْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ اَبُوْاِسْرَائِيْلَ الرَّاوِيُ لَيْسَ هُوَ بِذَالِكَ الْقَوِيِّ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت بلالؓ کہتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ فجر کی نماز کے علاوہ اور کسی نماز میں تثویب نہ کرو۔ (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور حضرت امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ (اس حدیث کے راوی) ابو اسرائیل محدثین کے نزدیک قوی (یعنی قابل اعتبار) نہیں ہیں۔"

تشریح: "تثویب" وہ اعلام ہوتا ہے جس سے پہلے کوئی اعلام ہو چکا ہو اور اس کی غرض اور اس سے پہلے کے اعلام کی غرض ایک ہو۔ مثلاً پہلے اعلام سے لوگوں کو نماز کے لئے بلانا مقصود ہو تو اس اعلام سے بھی یہی مقصود ہو۔ تثویب کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہنا۔ یہ تثویب اس لئے ہے کہ ایک مرتبہ تو حی علی الصلوٰۃ کہہ کر لوگوں کو نماز کے لئے بلایا گیا پھر دوبارہ الصلوٰۃ خیر من النوم سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا۔ یہ تثویب آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں رائج تھی اور مسنون یہی ہے پھر اس کے بعد کوفہ کے علماء نے اذان و تکبیر کے درمیانی وقفہ میں حی علی الفلاح کہنا رائج کیا، اس کے بعد ہر فرقہ و طبقہ کے لوگوں نے اپنے اپنے عرف کے مطابق کچھ نہ کچھ طریقہ تثویب کے طور پر رائج کیا مگر یہ تمام تثویبیں فجر کی نماز ہی کے لئے رائج کی گئیں، کیونکہ فجر کا وقت نیند اور غفلت کا وقت ہوتا ہے۔

پھر آخر میں متأخرین علماء نے تمام نمازوں کے لئے تثویب رائج کی اور اسے بنظر استحسان دیکھا حالانکہ متقدمین کے نزدیک یہ مکروہ ہے کیونکہ یہ احداث ہے اور بدعت ہے چنانچہ حضرت علیؓ سے بھی اس کا انکار بایں طور منقول ہے کہ ایک شخص تثویب کہتا تھا آپ نے اس کے بارہ میں فرمایا کہ اخرجوا ھذا المبتدع من المسجد یعنی اس بدعتی شخص کو مسجد سے نکال باہر کرو!۔

حضرت عمرؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک دن جب کہ وہ مسجد میں موجود تھے مؤذن کو غیر فجر میں تثویب کرتے ہوئے سنا تو مسجد سے باہر نکل آئے اور دوسروں سے بھی کہا کہ اس شخص کے سامنے نہ رہو، باہر نکل آؤ کیونکہ یہ بدعتی ہے۔

(۷) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِبِلَالٍ اِذَا اَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ وَاِذَا اَقَمْتَ فَاحْدُرْ وَاجْعَلْ بَيْنَ اَذَانِكَ وَاِقَامَتِكَ قَدْرَ مَا يَفْرُغُ الْاٰكِلُ مِنْ اَكْلِهٖ وَالشَّارِبُ مِنْ شُرْبِهٖ وَالْمُعْتَصِرُ اِذَا دَخَلَ لِقَضَاءِ حَاجَتِهٖ وَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْنِيْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ لَا نَعْرِفُهٗ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِ الْمُنْعِمِ وَهُوَ اِسْنَادٌ مَجْهُوْلٌ۔

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ جب تم اذان کہو تو ٹھہر ٹھہر کر کہا کرو اور جب تکبیر کہو تو جلدی جلدی کہا کرو اور اذان و تکبیر کے درمیان اتنا وقفہ کیا کرو کہ کھانے والا اپنے کھانے سے، پینے والا پینے سے، قضائے حاجت والا اپنی حاجت سے فارغ ہو جائے اور اس وقت تک نماز کے لئے کھڑے نہ ہو جب تک مجھے (نماز پڑھانے کے لئے آتا ہوا) نہ دیکھ لو۔ اس حدیث

کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ہم اس حدیث کو سوائے عبدالمنعمؒ کے اور کسی سے نہیں جانتے اور اس کی سند مجہول ہے۔"

تشریح: اذان کو ٹھہر ٹھہر کر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کلمات کو ایک دوسرے سے جدا جدا کر کے اور خفیف سے سکتہ کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر ادا کرو۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اذان کے کلمات کی ادائیگی میں اتنی ڈھیل کرو کہ کلمات بغیر کھینچے ہوئے تاکہ حد سے تجاوز نہ ہو واضح واضح کہہ سکو۔ اسی وجہ سے مؤذنوں کے لئے تاکید ہے کہ وہ اذان کے کلمات کی ادائیگی میں احتیاط سے کام لیں اور قواعد کے مطابق اذان کہیں تاکہ غلطیوں کا ارتکاب نہ ہو سکے کیونکہ بعض غلطیاں ایسی ہیں کہ ان کو قصداً کرنے والا کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے جیسے اشہد کے الف کو مد کے ساتھ ادا کرنا کہ یہ استفہام ہو جاتا ہے اور جس کے معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ کیا میں گواہی دوں الخ؟ یا اللہ اکبر میں حرف با کو مد کے ساتھ کھینچ کر (اکبار) پڑھنا کہ یہ لفظ کبر کی جمع ہو جاتی ہے جس کے معنی اس طبلہ کے آتے ہیں جس کا ایک منہ ہوتا ہے اور دائرہ کی شکل میں ہوتا ہے یا اسی طرح لفظ الہ پر وقف کرنا اور اللہ سے ابتداء کرنا۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب مؤذن تکبیر کے لئے کھڑا ہو تو مجھے مسجد میں آتا ہوا نہ دیکھ لو نماز کے لئے کھڑے نہ ہو، کیونکہ امام کی آمد سے پہلے ہی کھڑے ہو جانا خواہ مخواہ کی تکلیف اٹھانا ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ غالباً آنحضرت ﷺ نماز پڑھانے کے لئے اپنے حجرۂ مبارک سے اس وقت نکلتے ہوں گے جب کہ مؤذن تکبیر شروع کر دیتا ہوگا اور جب مؤذن تکبیر کہتا ہوا حی علی الصلوٰۃ پر پہنچتا ہوگا تو آپ ﷺ اس وقت محراب میں داخل ہوتے ہوں گے۔ اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے یہ کہا ہے کہ جب مؤذن تکبیر شروع کر دے اور حی علی الصلوٰۃ پر پہنچے تو امام اور مقتدیوں کو کھڑے ہو جانا چاہئے اور جب مؤذن قد قامت الصلوٰۃ پر پہنچے تو نماز شروع کر دینی چاہئے۔

⑧ وَعَنْ زِيَادِ بْنِ الْحَارِثِ الصُّدَائِيِّ قَالَ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اُذِّنَ فِيْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ فَاَذَّنْتُ فَاَرَادَ بِلَالٌ اَنْ يُقِيْمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخَا صُدَاءٍ قَدْ اَذَّنَ وَمَنْ اَذَّنَ فَهُوَ يُقِيْمُ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجہ)

"حضرت زید ابن حارث صدائیؓ کہتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے مجھے فجر کی نماز کے لئے اذان کہنے کا حکم دیا۔ چنانچہ میں نے اذان کہی، پھر حضرت بلالؓ نے تکبیر کہنی چاہی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ صدائی کے بھائی نے اذان کہی تھی اور جو اذان کہے اسی کو تکبیر بھی کہنی چاہئے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اخاء صداء یعنی صدائی کے بھائی سے مراد زیاد ابن حارث صدائی ہیں، عرب میں قاعدہ تھا جو شخص جس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اسے اس قبیلہ کا بھائی کہا جاتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس حدیث کے مطابق غیر مؤذن کو تکبیر کہنا مکروہ ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ اکثر و بیشتر حضرت ابن ام مکتوم اذان کہتے تھے اور حضرت بلالؓ تکبیر کہتے تھے۔ امام صاحبؒ کے نزدیک یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ اگر غیر مؤذن تکبیر کہنا چاہے تو مؤذن سے اجازت لے لے۔ اگر مؤذن کو کسی دوسرے کی تکبیر کہنا ناگوار ہو تو پھر غیر مؤذن کو تکبیر کہنا مناسب نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑨ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ الْمُسْلِمُوْنَ حِيْنَ قَدِمُوا الْمَدِيْنَةَ يَجْتَمِعُوْنَ فَيَتَحَيَّنُوْنَ لِلصَّلَاةِ وَلَيْسَ يُنَادِيْ بِهَا اَحَدٌ فَتَكَلَّمُوْا يَوْمًا فِيْ ذٰلِكَ فَقَالَ بَعْضُهُمْ اِتَّخِذُوْا مِثْلَ نَاقُوْسِ النَّصَارٰى وَقَالَ بَعْضُهُمْ قَرْنًا مِثْلَ قَرْنِ الْيَهُوْدِ فَقَالَ عُمَرُ

اَوَلاَ تَبْعَثُوْنَ رَجُلاً يُنَادِيْ بِالصَّلٰوةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا بِلاَلُ قُمْ فَنَادِ بِالصَّلاَةِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مسلمان مدینہ میں آکر جمع ہوگئے تو نماز کے لئے وقت اور اندازہ معین کرنے لگے (کیونکہ) کوئی آدمی نماز کے لئے بلانے والا نہ تھا (ایک روز) جب اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو بعضوں نے کہا کہ نصاریٰ کی طرف ناقوس بنالیا جائے اور بعضوں نے کہا کہ یہود کی طرح سینگ بنالیا جائے (یہ تمام تجاویز سن کر) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک آدمی کیوں نہ مقرر کردیا جائے جو نماز کے لئے (لوگوں کو) بلالیا کرے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بلال! کھڑے ہو کر نماز کے لئے منادی دیا کرو۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ کو منادی کرنے کا جو حکم دیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ جب نماز کا وقت ہوجائے تو کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر الصلوٰۃ جامعۃ کہہ دیا کرو۔ یہ آواز سن کر لوگ نماز کے لئے حاضر ہوجایا کریں گے۔ لہٰذا "منادی" سے مراد نماز کے لئے محض اعلان کرنا ہے نہ کہ اس سے شرعی منادی یعنی اذان مراد ہے۔ اس توجیہ سے پہلی احادیث میں تطبیق ہوجاتی ہے کہ پہلے ایک مجلس میں اس طرح اعلان کرنے کی تجویز پاس ہوئی پھر بعد میں جب دوسری مجلس میں اس پر بحث و مباحثہ ہوا تو حضرت عبداللہ ابن زیدؓ نے اذان کا خواب دیکھا اور آنحضرت ﷺ نے یا تو وحی آجانے کے بعد یا اپنے اجتہاد سے کام لے کر حضرت عبداللہ ابن زیدؓ کے خواب کے مطابق اذان مشروع فرمائی۔

(۱۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَبْدِ رَبِّهٖ قَالَ لَمَّا اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاقُوْسِ يُعْمَلُ لِيُضْرَبَ بِهٖ لِلنَّاسِ لِجَمْعِ الصَّلاَةِ طَافَ بِيْ وَاَنَا نَائِمٌ رَجُلٌ يَحْمِلُ نَاقُوْسًا فِيْ يَدِهٖ فَقُلْتُ يَا عَبْدَاللّٰهِ اَتَبِيْعُ النَّاقُوْسَ قَالَ وَمَا تَصْنَعُ بِهٖ قُلْتُ نَدْعُوْ بِهٖ اِلَى الصَّلاَةِ قَالَ اَفَلاَ اَدُلُّكَ عَلٰى مَا هُوَ خَيْرٌ مِنْ ذٰلِكَ فَقُلْتُ لَهٗ بَلٰى قَالَ فَقَالَ تَقُوْلُ اللّٰهُ اَكْبَرُ اِلٰى اٰخِرِهٖ وَكَذَا الْاِقَامَةَ فَلَمَّا اَصْبَحْتُ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرْتُهٗ بِمَا رَاَيْتُ فَقَالَ اِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَقُمْ مَعَ بِلاَلٍ فَاَلْقِ عَلَيْهِ مَا رَاَيْتَ فَلْيُؤَذِّنْ بِهٖ فَاِنَّهٗ اَنْدٰى صَوْتًا مِنْكَ فَقُمْتُ مَعَ بِلاَلٍ فَجَعَلْتُ اُلْقِيْهِ عَلَيْهِ وَيُؤَذِّنُ بِهٖ قَالَ فَسَمِعَ بِذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَهُوَ فِيْ بَيْتِهٖ فَخَرَجَ يَجُرُّ رِدَاءَهٗ يَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ فَقَدْ رَاَيْتُ مِثْلَ مَا اُرِيَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالدَّارِمِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ اِلاَّ اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرِ الْاِقَامَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ لٰكِنَّهٗ لَمْ يُصَرِّحْ قِصَّةَ النَّاقُوْسِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن زید بن عبد ربہؓ فرماتے ہیں کہ جب سرور کائنات ﷺ نے ناقوس بنائے جانے کا حکم دیا تاکہ نماز کی جماعت میں لوگوں کے حاضر ہونے کے لئے اسے بجایا جائے تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اپنے ہاتھ میں ناقوس لئے ہوئے (جاتا) ہے میں نے اس شخص سے کہا کہ بندہ خدا! کیا تم یہ ناقوس بیچو گے؟ اس شخص نے کہا کہ تم اس کا کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ ہم اسے بجا کر لوگوں کو نماز (کی جماعت) کے لئے بلایا کریں گے۔ اس نے کہا کہ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتادوں؟ میں نے کہا کہ، ہاں ضرور بتاؤ! اس شخص نے کہا کہ کہو اللہ اکبر تک اس نے اذان بتا کر پھر اسی طرح اقامت بھی بتائی، جب صبح ہوئی تو میں آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور جو کچھ خواب میں دیکھا تھا آپ ﷺ سے بیان کیا، آپ ﷺ نے (خواب سن کر) فرمایا کہ، انشاء اللہ تعالیٰ خواب سچا ہے، اب تم بلالؓ کے ساتھ کھڑے ہو کر جو کچھ خواب میں دیکھا ہے انہیں بتاتے جاؤ اور وہ اذان کہیں کیونکہ وہ تم سے بلند آواز ہیں۔ چنانچہ میں بلالؓ کے ساتھ کھڑا ہو کر انہیں سکھلاتا گیا اور وہ اذان دیتے رہے۔ راوی کہتے ہیں کہ، حضرت عمر ابن خطابؓ نے جب اپنے مکان میں اذان کی آواز سنی تو (جلدی کی بنا پر) اپنی چادر کھینچتے ہوئے مکان سے باہر نکلے اور یہ کہتے ہوئے (آنحضرت ﷺ کی خدمت میں) حاضر ہوئے کہ یارسول اللہ! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ الحمد للہ (یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں) یہ حدیث ابوداؤدؒ، دارمیؒ، اور ابن ماجہؒ نے نقل کی ہے مگر ابن ماجہؒ نے تکبیر کا ذکر نہیں کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے لیکن انہوں نے ناقوس کے قصہ کی تصریح نہیں کی ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جزء کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ناقوس بجانے کا حکم دے دیا تھا۔ بلکہ یہاں "حکم" کا مطلب یہ ہے کہ جب اس سلسلہ میں صحابہؓ سے مشورہ کیا اور کوئی مناسب تجویز ذہن میں نہیں آئی تو آپ ﷺ نے ناقوس بجانے کا حکم دینے کا ارادہ فرمایا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ ابن زیدؓ کے خواب کے ذریعہ اس کی نوبت نہ آنے دی۔

یہ حدیث حنفیہ کے مسلک کی مؤید ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تکبیر اور اذان کے کلمات میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح اذان کے کلمات کو سوائے شروع میں اللہ اکبر اور آخر میں لا الہ الا اللہ کے دو دو مرتبہ کہا جاتا ہے اسی طرح تکبیر کے کلمات کو بھی دو مرتبہ کہا جاتا ہے البتہ تکبیر میں صرف قدقامت الصلوٰۃ کا اضافہ ہے جو اذان میں نہیں ہے۔

حضرت عبداللہؓ کے خواب کو سن کر آنحضرت ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی کہ یہ "خواب سچا ہے" اب اس تصدیق کا تعلق یا تو وحی سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس خواب کے سچا ہونے کی خبر دے دی تھی اس لئے آپ ﷺ نے بھی اسے حق کہا یا پھر آپ ﷺ نے اپنے اجتہاد کی بناء پر اس خواب کو سچا مانا۔ اس موقعہ پر آپ ﷺ کا "انشاء اللہ" کہنا برکت اور اظہار طمانیت کے طور پر تھا۔ نہ کہ شک کے لئے۔ اذان کی آواز سن کر حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر جو یہ کہا کہ میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا تھا تو ہوسکتا ہے کہ انہوں نے یہ بات اس وقت کہی ہو جب انہیں معلوم ہو گیا ہو کہ یہ اذان حضرت عبداللہ ابن زید کے خواب کے نتیجہ میں کہی گئی ہے یا پھر انہیں اس خواب کا علم مکاشفہ کے ذریعہ ہو گیا ہوگا۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ مؤذن کا بلند آواز اور خوش گلو ہونا مستحب ہے۔

آخر میں اتنی بات اور جان لیجئے کہ اذان کی مشروعیت ۲ھ میں ہوئی ہے مگر کچھ علماء کی تحقیق یہ ہے کہ اذان ہجرت کے پہلے سال مشروع ہوئی ہے۔

(۱۱) وَعَنْ اَبِي بَكْرَةَ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصَلَاةِ الصُّبْحِ فَكَانَ لَا يَمُرُّ بِرَجُلٍ اِلَّا نَادَاهُ بِالصَّلَاةِ اَوْحَرَّكَهُ بِرِجْلِهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں سرور کائنات ﷺ کے ہمراہ صبح کی نماز کے لئے نکلا، آنحضرت ﷺ جس شخص کے پاس سے گزرتے تھے نماز کے لئے یا تو اسے آواز دیتے تھے یا اس کے پاؤں کو حرکت دے دیتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص نماز کے وقت سو رہا ہو تو اس کو نماز کے لئے جگانا جائز ہے خواہ آواز دے کر جگایا جائے خواہ اس کا پاؤں وغیرہ ہلا کر۔

(۱۲) وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ الْمُؤَذِّنَ جَاءَ عُمَرَ يُؤْذِنُهُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ فَوَجَدَهُ نَائِمًا فَقَالَ الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ فَاَمَرَهُ عُمَرُ اَنْ يَجْعَلَهَا فِي نِدَاءِ الصُّبْحِ۔ (رواہ موطاء)

"اور حضرت امام مالکؒ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ مؤذن حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آکر صبح کی نماز کے لئے انہیں خبردار کر دیتا تھا چنانچہ (ایک دن) مؤذن نے حضرت عمرؓ کو سوتا ہوا پایا تو کہا کہ الصلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) حضرت عمرؓ نے مؤذن کو حکم دیا کہ یہ کلمہ صبح کی اذان میں شامل کیا جائے۔" (مؤطا)

تشریح: بظاہر تو اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا کلمہ حضرت عمرؓ نے اضافہ کیا تھا حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ فجر کی اذان میں یہ کلمہ کہنا تو شروع ہی سے مسنون تھا۔ اب اس حدیث کی توجیہات کی گئی ہیں لیکن زیادہ مناسب اور بہترین توجیہ یہ ہے کہ جب مؤذن نے حضرت عمرؓ کو سوتا ہوا دیکھ کر یہ کلمہ کہا تو انہیں ناگوار ہوا اور فرمایا کہ یہ کلمہ صبح کی اذان میں شامل کیا جائے یعنی یہ کلمہ فجر کی اذان ہی میں کہنا سنت ہے اسی موقع پر تمہیں یہ کلمہ کہنا چاہئے اذان کے سوا سوتے ہوئے کو جگانے

کے لئے یہ کلمہ استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔

⑬ وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عَمَّارِ بْنِ سَعْدٍ مُؤَذِّنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حَدَّثَنِىْ اَبِىْ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِلَالًا اَنْ يَجْعَلَ اِصْبَعَيْهِ فِىْ اُذُنَيْهِ وَقَالَ اِنَّهٗ اَرْفَعُ لِصَوْتِكَ۔

(رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت عبدالرحمٰنؒ ابن سعدؒ ابن عمارؒ ابن سعد مؤذن رسول خدا ﷺ کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد سعدؒ نے اور انہوں نے اپنے والد عمار سے اور انہوں نے سعدؓ کے دادا سے جن کا نام بھی سعد تھا سنا کہ سرور کائنات ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ (اذان کہتے وقت) اپنی دونوں انگلیاں کانوں میں دے لیا کریں کیونکہ اس سے آواز زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: حضرت سعدؓ صحابی ہیں اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے مسجد قبا میں مؤذن تھے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات تک یہ اس مسجد میں اذان کہتے رہے۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت بلالؓ مسجد نبوی میں اذان کہنا چھوڑ کر شام چلے گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے انہیں مسجد قبا سے بلا کر مسجد نبوی میں اذان کہنے کی خدمت پر مامور فرمایا اور یہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس باسعادت خدمت کو انجام دیتے رہے۔ حضرت سعد کے صاحبزادے حضرت عمار تابعی مقبول ہیں اور ان کے بیٹے یعنی حضرت سعدؓ کے پوتے کا نام بھی سعد ہے اور ان کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن مسطور ہیں اس طرح عمار کے والد حضرت سعد ان کے لڑکے سعد کے دادا ہوئے۔

چنانچہ یہ حدیث حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے دادا حضرت سعدؓ سے نقل کی ہے اور انہوں نے اپنے والد حضرت عمارؓ سے نقل کی ہے جو تابعی ہیں اور انہوں نے اپنے والد مکرم حضرت سعدؓ سے سنا ہے جو صحابیت کی سعادت سے مشرف ہیں۔ ابیہ اور جدہ دونوں کی ضمیریں لفظ ابی کی طرف راجع ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اذان کے وقت کانوں میں انگلیاں اس لئے دی جاتی ہیں تاکہ آواز زیادہ سے زیادہ بلند ہو سکے اور اس میں شاید یہ حکمت ہے کہ کانوں میں انگلیاں رکھ لینے سے بلند آواز ہی مؤذن کے کان میں آئے گی اس لئے وہ اس کی کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو سکے۔ پورے زور سے چلا کر اذان کہے۔

بَابُ فَضْلِ الْاَذَانِ وَاِجَابَةِ الْمُؤَذِّنِ

اذان اور اذان کا جواب دینے کی فضیلت کا بیان

اذان اللہ تعالیٰ کے اذکار میں ایک بہت بڑے رتبہ کا ذکر ہے اس میں توحید اور رسالت کی شہادت اعلان کے ساتھ ہوتی ہے اس سے اسلام کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اذان دینے کی فضیلت اور اس کا ثواب بہت زیادہ ہے چنانچہ اس عنوان کے تحت وہ احادیث ذکر کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ اذان دینا در حقیقت برکت و سعادت سے اپنا دامن بھرنا ہے۔

اب اس میں کلام ہے کہ آیا اذان کہنا زیادہ افضل ہے یا امامت کرنا؟ چنانچہ مختار اور معتمد قول یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ وہ امامت کے پورے حقوق بجا لائے گا تو اس کے لئے امامت کرنا افضل ہوگا ورنہ بصورت دیگر اس کے لئے اذان کہنا ہی افضل ہوگا۔

علماء کا اس معاملہ میں اختلاف ہے کہ آیا آنحضرت ﷺ نے بھی اذان کہی ہے یا نہیں؟ گو ایک حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اذان کہی ہے مگر بعض حضرات نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حکم دے کر اذان کہلائی ہے۔ آپ ﷺ کے اس حکم کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے جیسے کہ محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ نے قلعہ بنایا ہے حالانکہ بادشاہ خود اپنے ہاتھ سے قلعہ نہیں بناتا بلکہ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس نے حکم دے کر قلعہ بنوایا ہے۔ دار قطنیؒ کی ایک روایت میں اس کی

تصریح بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اذان کہنے کا حکم کیا تھا (نہ کہ خود اذان دی تھی) واللہ اعلم۔

اذان کا جواب دینا واجب ہے اگر کئی آدمی مل کر اذان دیں تو اس شکل میں حرمت اول کے لئے ہوگی یعنی اس کا جواب دینا چاہئے اور اگر کوئی شخص کئی طرف سے یعنی مختلف محلوں کی مساجد سے اذان سنے تو صرف اپنی مسجد کے مؤذن کا جواب دینا واجب ہوگا اور اگر کوئی شخص اذان کے وقت مسجد میں بیٹھا ہوا ہو تو اس کے لئے اذان کا جواب واجب نہیں ہے کیونکہ اس شکل میں تو اسے اجابت فعلی حاصل ہی ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن پڑھنے والا شخص اذان کا جواب دے یا نہ دے! چنانچہ اس سلسلہ میں مختار قول یہ ہے کہ وہ اذان کا جواب نہ دے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْمُؤَذِّنُوْنَ اَطْوَلُ النَّاسِ اَعْنَاقًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے سرور کائنات ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے روز لوگوں سے زیادہ اونچی گردن والے مؤذن ہوں گے۔" (مسلم)

تشریح: اونچی گردن کے معنی کے تعین میں مختلف اقوال ہیں چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ دنیا میں اذان دیتے تھے وہ قیامت کے روز بہت زیادہ ثواب والے اور مرتبے والے ہوں گے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ مؤذن قیامت کے روز سردار ہوں گے۔ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں قیامت کے روز مؤذن بہت زیادہ ثواب کے امیدوار ہوں گے کیونکہ جو شخص کسی چیز کے حصول کی امید رکھتا ہے وہ گردن اونچی کر کے اس چیز کو دیکھتا ہے، اسی طرح میدان حشر میں جب کہ تمام لوگ حساب و کتاب کی بناء پر رنج و فکر میں ہوں گے۔ مؤذن آرام و راحت کے ساتھ اس بات کے منتظر ہوں گے کہ اب جنت میں داخلہ کا حکم کیا جائے گا۔ بعض حضرات نے اس کے معنی یہ بھی بیان کئے ہیں کہ قیامت کے روز مؤذنوں کو باری تعالیٰ عزاسمہ کی بارگاہ میں مقام قرب و عزت حاصل ہوگا۔

② وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلَاةِ اَدْبَرَ الشَّيْطَانُ لَهٗ ضُرَاطٌ حَتّٰى لَا يَسْمَعَ التَّاذِيْنَ فَاِذَا قُضِیَ النِّدَاءُ اَقْبَلَ حَتّٰى اِذَا ثُوِّبَ بِالصَّلَاةِ اَدْبَرَ حَتّٰى اِذَا قُضِیَ التَّثْوِيْبُ اَقْبَلَ حَتّٰى يَخْطُرَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَنَفْسِهٖ يَقُوْلُ اُذْكُرْ كَذَا اُذْكُرْ كَذَا لِمَا لَمْ يَكُنْ يَذْكُرُ حَتّٰى يَظَلَّ الرَّجُلُ لَا يَدْرِیْ كَمْ صَلّٰى۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب نماز کے لئے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر گوز مارتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا ہے تاکہ اذان نہ سن سکے، جب اذان ختم ہو جاتی ہے تو پھر آتا ہے اور جس وقت تکبیر ہوتی ہے تو پھر پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے جب تکبیر ختم ہو جاتی ہے تو واپس آجاتا ہے تاکہ انسان اور اس کے دل کے درمیان خطرات پیدا کرے چنانچہ (نمازی سے) کہتا ہے کہ فلاں چیز یاد کرو، فلاں بات یاد کرو (اس طرح نماز شروع کرنے سے پہلے مال و اولاد، حساب و کتاب اور خرید و فروخت کے سلسلہ میں) جو باتیں نمازی کو یاد نہیں ہوتیں وہ یاد دلاتا ہے، یہاں تک کہ آدمی (یعنی نمازی کو) کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بعض کہتے ہیں کہ شیطان کا گوز مارنا حقیقۃً ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی جسم رکھتا ہے اس لئے ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے چنانچہ جس طرح گدھے پر جب وزن رکھ دیا جاتا ہے تو وہ بوجھ کی زیادتی کی وجہ سے گوز مارتا ہے اسی طرح شیطان پر بھی اذان بہت بھاری ہوتی ہے اور وہ گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ جب اذان شروع ہوتی ہے تو شیطان ایک آواز نکالتا ہے جو کان میں بھر جاتی ہے اور اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اذان نہ سن سکے۔ اس آواز کو اس کی برائی و خرابی بیان کرنے کے لئے یہاں گوز مارنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان اور اس کے دل کے درمیان خطرات پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نمازی اور اس کے دل کے درمیان وسواس و خطرات حائل کر دیتا ہے اور اس کے دل کو دنیا کی باتوں کی طرف لگا دیتا ہے تاکہ نماز میں حضوری قلب کی دولت میسر نہ آسکے۔

اگر کوئی یہ پوچھے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ شیطان قرات قرآن اور عظمت سے تو بھاگتا نہیں مگر اذان سے بھاگتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اذان کے کلمات میں ایسی ہیبت اور عظمت رکھ دی ہے جو شیطان کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیتی ہے۔

(۳) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَسْمَعُ مَدٰی صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنٌّ وَلَا اِنْسٌ وَلَا شَیْءٌ اِلَّا شَھِدَ لَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ مؤذن کی انتہائی آواز کو جو بھی سنتا ہے خواہ انسان ہو یا جن اور یا جو بھی چیز وہ سب قیامت کے دن مؤذن (کے ایمان) کی گواہی دیں گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مدی کے معنی "انتہا یعنی اخیر" ہیں۔ آواز کی انتہا یہ ہے کہ اس کی بھنک کان میں آجائے اور یہ نہ معلوم ہو کہ آواز دینے والا کیا کہہ رہا ہے۔ یہاں اگرچہ یہی معنی کافی تھا کہ "مؤذن کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے الخ" لیکن مدی بمعنی انتہاء کو ذکر کر کے اس طرف اشارہ مقصود تھا کہ جن کے کان میں اذان کی محض بھنک پڑ جائے گی جب وہ مؤذن کے ایمان کی گواہی دیں گے تو وہ لوگ تو بطریق اولیٰ گواہ ہوں گے جو مؤذن کے قریب ہوں گے اور اذان کو قریب سے سنیں گے۔

علماء لکھتے ہیں کہ درحقیقت اس حدیث سے مؤذن کو ترغیب دلانی مقصود ہے کہ اذان نہایت بلند آواز سے کہا کریں تاکہ ان کے ایمان کی گواہی دینے والے زیادہ سے زیادہ ہوں۔

(۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا یَقُوْلُ ثُمَّ صَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّہٗ مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلَاۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ بِھَا عَشْرًا ثُمَّ سَلُوا اللّٰہَ لِیَ الْوَسِیْلَۃَ فَاِنَّھَا مَنْزِلَۃٌ فِی الْجَنَّۃِ لَا تَنْبَغِیْ اِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللّٰہِ وَاَرْجُوْ اَنْ اَکُوْنَ اَنَا ھُوَ فَمَنْ سَاَلَ لِیَ الْوَسِیْلَۃَ حَلَّتْ عَلَیْہِ الشَّفَاعَۃُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ راوی ہیں۔ کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا جب تم مؤذن کی آواز سنو تو (اس کے جواب میں) اس کے الفاظ کو دہراؤ اور پھر (اذان کے بعد) مجھ پر درود بھیجو کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے تو اس کے بدلہ میں خدا اس پر دس مرتبہ رحمت نازل فرماتا ہے پھر (مجھ پر درود بھیج کر) میرے لئے (خدا سے) وسیلہ کی دعا کرو۔ وسیلہ جنت کا ایک (اعلیٰ) درجہ ہے جو خدا کے بندوں میں سے صرف ایک بندہ کو ملے گا اور مجھ کو امید ہے کہ وہ بندۂ خاص میں ہوں گا لہٰذا جو شخص میرے لئے وسیلہ کی دعا کرے گا (قیامت کے روز) اس کی سفارش مجھ پر ضروری ہو جائے گی۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب مؤذن اذان کہے تو تم بھی مؤذن کے ساتھ اذان کے کلمات دہراتے جاؤ البتہ چند کلمات ایسے ہیں جن کو بعینہٖ دہرانا نہیں چاہئے بلکہ ان کے جواب میں دوسرے کلمات کہنے چاہیں جس کی تفصیل آئندہ حدیث میں آرہی ہے چنانچہ فجر کی اذان میں جب مؤذن الصلوٰۃ خیر من النوم کہے تو اس کے جواب میں صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ وبالحق نَطَقْتَ (یعنی تم نے سچ کہا ہے اور خیر کثیر کے مالک ہوئے اور تم نے سچ بات کہی) کہنا چاہئے۔

"وسیلہ" اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ مطلوبہ چیز کو حاصل کیا جائے اور اس کے سبب سے مطلوبہ چیز کا قرب حاصل ہو چنانچہ جنت کے ایک خاص اور اعلیٰ درجہ کا نام وسیلہ اسی لئے ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہوتا ہے اسے باری تعالیٰ عزاسمہ کا قرب حاصل

ہوتا ہے اور اس کے دیدار کی سعادت میسر آتی ہے نیز جو فضیلت اور بزرگی اس درجہ والے کو ملتی ہے وہ دوسرے درجہ والوں کو نہیں ملتی۔

آپ ﷺ کا ارجو (یعنی مجھ کو امید ہے) فرمانا عاجزی اور انکساری کے طور پر ہے کیونکہ جب آنحضرت ﷺ تمام مخلوق سے افضل و بہتر ہیں تو یہ درجہ یقیناً آپ ﷺ ہی کے لئے ہے۔ کوئی دوسرا اس درجہ کے لائق کیسے ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اس لفظ کی تاویل یہ کی جائے گی کہ یہ یقین سے کنایہ ہے یعنی مجھے یہ یقین ہے کہ یہ درجہ مجھے ہی حاصل ہوگا۔

⑤ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ فَقَالَ اَحَدُكُمُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ ثُمَّ قَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ثُمَّ قَالَ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ قَالَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ قَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ثُمَّ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِنْ قَلْبِهٖ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جب مؤذن اللہ اکبر اللہ اکبر کہے تو تم میں سے بھی ہر شخص اللہ اکبر اللہ اکبر کہے، پھر جب مؤذن اشھد ان لا الہ الا اللہ کہے تو تم میں سے بھی ہر شخص اشھد ان لا الہ الا اللہ کہے، پھر جب مؤذن اشھد ان محمد رسول اللہ کہے تو تم میں سے بھی ہر شخص اشھد ان محمدا رسول اللہ کہے پھر جب مؤذن حی علی الصلوٰۃ کہے تو تم میں سے ہر شخص لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہے پھر جب مؤذن حی علی الفلاح کہے تو تم میں سے ہر شخص لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہے، پھر جب مؤذن اللہ اکبر اللہ اکبر کہے تو تم میں سے ہر شخص کہے اللہ اکبر اللہ اکبر پھر جب موذن کہے لا الہ الا اللہ تو تم بھی کہو لا الہ الا اللہ جس نے (اذان کے جواب میں یہ کلمات) صدق دل سے کہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔" (مسلم)

تشریح: یہاں اللہ اکبر اختصار کی وجہ سے دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ سمجھانے کے لئے دو ہی مرتبہ کہنا کافی تھا اس لئے شہادتین یعنی اشھد ان لا الہ الا اللہ اور اشھد ان محمدا رسول اللہ کو بھی صرف ایک ایک مرتبہ ہی ذکر کیا گیا ہے۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے معنی یہ ہیں، برائی سے بچنے اور نیک کام کرنے کی قوت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ جب مؤذن حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح کہتا ہے تو وہ لوگوں کو نماز کے لئے بلاتا ہے۔ لہٰذا اس کے جواب میں یہ کلمہ کہنے والا گویا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک امر عظیم اور زبردست فرض کی ادائیگی کا معاملہ ہے میں ایک عاجز و کمزور بندہ ہوں۔ میری قوت و طاقت کی کیا مجال کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کی متحمل ہو سکے۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ہی ہوتی ہے جو ہم اس امر عظیم کو پورا کرتے ہیں اور چونکہ نماز کے لئے آنے کی طاقت اور قوت خدا تعالیٰ ہی کی مدد سے ہوتی ہے لہٰذا خدا ہماری مدد فرماتا ہے تو ہم نماز کے لئے آتے ہیں۔

نوویؒ فرماتے ہیں کہ مؤذن جب اذان کہتا ہے تو اس کے کہے ہوئے کلمات کو اسی طرح دہرانا یعنی اس کا جواب دینا مستحب ہے البتہ حیعلتین یعنی حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھنا چاہئے۔ بعض مقامات پر کچھ حضرات حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَلَمْ يَشَاءْ لَمْ يَكُنْ کہتے ہیں یہ غلط اور مسنون طریقہ کے خلاف ہے۔

اذان کا جواب ہر سننے والے کو دینا چاہئے خواہ باوضو ہو یا بے وضو اور خواہ جنبی ہو یا حائض، بشرطیکہ جواب دینے میں کوئی چیز مانع نہ ہو مثلاً کوئی پاخانہ میں ہو یا جماع کرتا ہو، یا نماز پڑھ رہا ہو یا ایسے ہی کوئی دوسرا مانع ہو تو وہ اس وقت جواب نہ دے لیکن اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ان امور سے فراغت کے بعد اذان کے کلمات جواب میں کہے۔

"صدق دل سے کہے" کا تعلق یا تو لاحول ولا قوۃ الا باللہ سے ہے کہ یہ کلمہ صدق دل سے کہا جائے یا پھر اس کا تعلق پوری اذان کے کلمات سے ہے کہ جواب میں تمام کلمات پورے خلوص اور صدق دل کے ساتھ کہے جائیں اور ظاہری طور پر بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ

اس کا تعلق پوری اذان سے ہے۔

جنّت میں تو تمام مسلمان ہی داخل ہوں گے چاہے وہ کسی عذاب کے بغیر داخل ہوں یا عذاب کے بعد داخل ہوں۔ لہٰذا یہاں جنّت میں داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص جو اذان کا جواب صدق دل سے دیتا ہے یعنی زبان سے تو ان کلمات کو ادا کرتا ہے اور دل میں ان کلمات کی صداقت کا پورا اعتقاد رکھتا ہے تو وہ نجات پائے ہوئے لوگوں کے ہمراہ جنّت میں داخل ہو گا۔

(۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِيْنَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَ نِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَا نِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ حَلَّتْ لَهٗ شَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے اذان سن کر (یعنی اذان ختم ہونے اور اس کا جواب دینے کے بعد) یہ دعا پڑھی تو قیامت کے روز مجھ پر اس کی شفاعت لازم ہوگی۔" دعا یہ ہے: اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَ نِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَا نِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ "اے اللہ! مالک اس کامل دعا (اذان) کے اور پروردگار اس نماز قائمہ کے ہمارے سردار محمد رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ (جنّت کا سب سے خاص و اعلیٰ درجہ) اور بزرگی عنایت فرما اور پہنچا ان کو مقام محمود پر جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس دعاء میں اذان کو "دعا" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اذان لوگوں کو نماز اور خدا کے ذکر کی طرف بلاتی ہے۔ نماز کو قائمہ اس لئے کہا گیا ہے کہ نماز ہمیشہ قیامت تک قائم و برقرار رہے گی۔ اس دعاء میں و الفضیلة کے بعد و الدرجة الرفیعة کے الفاظ بھی پڑھے جاتے ہیں مگر یہ کسی روایت میں مذکور نہیں ہیں۔

"مقام محمود" شفاعت عظمیٰ کا مقام ہے اور یہ وہ مقام ہو گا جہاں آنحضرت ﷺ قیامت کے روز عاصیوں کے لئے شفاعت کرنے کے لے کھڑے ہوں گے۔

میدان حشر میں جب ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہو گا مخلوق خدا حساب و کتاب کی پریشانیوں میں مبتلا ہوگی اور تمام لوگ وہاں کی سختیوں کی بناء پر حیران و سرگرداں ہوں گے تو یکے بعد دیگرے تمام انبیاء و رسل کے پاس شفاعت کے لئے جائیں گے مگر وہ سب ہیبت و دہشت کی بنا پر شفاعت کی جرأت نہ کر سکیں گے اور کہیں گے کہ محمد ﷺ کے پاس جاؤ کیونکہ ان کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں، وہی مخلوق خدا کی شفاعت کے حقدار ہیں۔ چنانچہ تمام لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے تب آپ ﷺ بارگاہ احدیت میں حاضر ہو کر لوگوں کی شفاعت کریں گے۔ اس وقت ہر شخص کی زبان پر آپ ﷺ کی تعریف ہوگی اور حق تعالیٰ بھی آپ ﷺ کی تعریف کرے گا گویا شان محمدیت کا پورا پورا ظہور ہو گا۔ اور تمام مخلوق آپ کی اس عظمت و برتری کو رشک کی نگاہوں سے دیکھے گی۔

وعدتہ (جس کا تو نے وعدہ کیا ہے) اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔

"امید ہے کہ آپ (ﷺ) کا پروردگار آپ (ﷺ) کو مقام محمود میں جگہ دے گا۔"

خداوند کریم عنقریب آپ ﷺ کو شافع محشر بنا کر مقام محمود میں کھڑا کرنے والا ہے۔ اور یہ وہ عزّت و کرامت ہے جو بنی آدم میں آپ ﷺ کے علاوہ کسی کو نصیب نہیں اس لئے کہ سب سے زیادہ آپ ﷺ ہی پر عبادت اور شب کا سوز و گداز بھی فرض ہوا ہے ؎

دلا بسوز کہ سوزے تو کارہا بکند دعائے نیم شبی دفع صد بلا بکند

بیہقی کی روایت میں اس دعاء میں وعدتہ کے بعد اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (یعنی بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا) بھی مذکور ہے۔ بعض

لوگ اس کے آگے یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ بھی پڑھتے ہیں حالانکہ احادیث میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔

(۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُغِیْرُ اِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ وَکَانَ یَسْمَعُ الْاَذَانَ فَاِنْ سَمِعَ اَذَانًا اَمْسَکَ وَاِلَّا اَغَارَ فَسَمِعَ رَجُلًا یَقُوْلُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْفِطْرَۃِ ثُمَّ قَالَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجْتَ مِنَ النَّارِ فَنَظَرُوْا اِلَیْہِ فَاِذَا ھُوَ رَاعِیْ مِعْزًی۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ (جب لشکر لے کر کسی جگہ جاتے تو) فجر ہو جانے پر (دشمن کے اوپر) حملہ کیا کرتے تھے اور فجر ہو جانے پر) اذان کا انتظار کیا کرتے تھے (اس آبادی میں سے جس پر حملہ کا ارادہ ہوتا تھا) اگر اذان کی آواز آجاتی تھی تو آپ ﷺ حملہ کرنے سے باز رہتے اور (اذان کی) آواز سنائی نہ دیتی تو حملہ کر دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ دشمن پر حملہ کے لئے جا رہے تھے تو ایک مقام پر آپ ﷺ نے ایک شخص کو اللہ اکبر، اللہ اکبر کہتے ہوئے سنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ، یہ شخص اسلام کے (طریقہ) پر ہے (کیونکہ اذان تو مسلمان ہی کہتا ہے) پھر اس شخص نے کہا اشھد ان لا الہ الا اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ تم شرک سے باز آجانے کی وجہ سے دوزخ سے نکل گئے۔ صحابہؓ نے (چاروں طرف دیکھ کر معلوم کرنا چاہا کہ اذان دینے والا کون ہے تو) دیکھا کہ وہ بکریاں چرانے والا شخص ہے)۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ ﷺ جب دشمنوں پر حملہ کرنے کے لئے تشریف لے جاتے تو اس کا خیال رکھتے کہ صبح کا وقت ہو، تاکہ اس بات کا اچھی طرح پتہ چل جائے کہ جس آبادی پر حملہ کیا جائے گا اس میں مسلمان ہیں یا کافر ہی کافر رہتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت انسؓ کے ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ (فجر ہو جانے پر) اذان کا انتظار کیا کرتے تھے چنانچہ جس آبادی پر حملہ مقصود ہوتا اس میں سے اگر اذان کی آواز آجاتی تو یہ جان کر کہ اس آبادی میں مسلمان ہیں آپ ﷺ حملہ سے باز رہتے تھے اور اگر اذان کی آواز نہ آتی تو پھر آپ ﷺ اس آبادی پر حملہ کر دیتے تھے۔ اذان کا انتظار آپ ﷺ اس لئے کرتے تھے کہ مبادا اس آبادی میں مسلمان ہوں اور ان جانے میں وہ اسلامی لشکر کی زد میں آجائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اذان کے ہونے اور نہ ہونے کو ایمان اور کفر کی علامت سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے روایت فقیہہ میں آتا ہے کہ جو لوگ اذان کو ترک کر دیں گے تو باوجودیکہ اذان سُنّت ہے ایسے لوگ مستحق قتال ہوں گے کیونکہ اذان اسلامی شعار میں سے ہے۔

(۸) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِیْنَ یَسْمَعُ الْمُؤَذِّنَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا غُفِرَ لَہٗ ذَنْبُہٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جو شخص مؤذن کی (اذان) کو سن کر یہ کہے کہ، اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی شریک ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور میں اللہ تعالیٰ کے رب ہونے، محمد ﷺ کے رسول ہونے اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوں تو اس کے (صغیرہ) گناہ بخش دئے جائیں گے۔" (مسلم)

تشریح: اس میں اختیار ہے کہ ان کلمات کو یا تو اس وقت پڑھا جائے جب مؤذن اشھد ان لا الہ الا اللہ کہے یا اذان ختم ہو جانے کے

بعد پڑھے۔ مناسب تو یہی ہے کہ اذان ختم ہونے کے بعد یہ کلمات پڑھے جائیں تاکہ اذان کے دوسرے کلمات کے جواب ترک نہ ہوں۔ اور ظاہر تو یہ ہے کہ مذکورہ ثواب اسی وقت ملے گا جبکہ اذان کے کلمات کا جواب دے کر بعد میں ان کلمات کو پڑھا جائے۔

(۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ كُلِّ اَذَانَيْنِ صَلَاةٌ بَيْنَ كُلِّ اَذَانَيْنِ صَلَاةٌ ثُمَّ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ لِمَنْ شَاءَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مغفلؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے، ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے اور پھر تیسری دفعہ میں یہ فرمایا کہ (یہ نماز) اس شخص کے لئے ہے جو پڑھنا چاہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "دو اذانوں" سے مراد اذان و تکبیر ہیں یعنی اذان اور تکبیر کے درمیان نماز پڑھنی فلاح و سعادت کی بات ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اذان و تکبیر کے درمیان نوافل پڑھنے کی رغبت دلانے کے لئے یہ جملہ مکرر سہ مکرر فرمایا کیونکہ اذان و تکبیر کے درمیان کا وقت بہت زیادہ بابرکت اور فضیلت کا حامل ہوتا ہے اس لئے اس وقت نماز پڑھ کر جو دعا مانگی جاتی ہے وہ بارگاہ احدیت سے رد نہیں کی جاتی ہے بلکہ قبولیت کا درجہ پاتی ہے اور پھر یہ کہ بابرکت اور بافضیلت وقت میں عبادت کا ثواب بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ اذان و تکبیر کے درمیان میں نماز پڑھنی سُنّت ہے مگر آپ نے لمن شآء فرما کر اس طرف اشارہ بھی فرمادیا ہے کہ اس وقت نماز پڑھنا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مغرب میں اذان و تکبیر کے درمیان نفل پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ حضرت بزیرہ اسلمیؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ مغرب کے علاوہ (بقیہ اوقات میں) دونوں اذانوں (یعنی اذان و تکبیر) کے درمیان دو رکعتیں (نماز) ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۱۰) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ اَللّٰهُمَّ اَرْشِدِ الْاَئِمَّةَ وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالشَّافِعِيُّ وَفِيْ اُخْرٰى لَهٗ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، امام ضامن ہوتا ہے اور مؤذن امانت دار ہوتا ہے (پھر آنحضرت ﷺ نے یہ دعا فرمائی) اے اللہ! اماموں کو ہدایت دے (یعنی ان کو نیک علم، صالح عمل اور صلاح و تقوی کی توفیق دے) اور مؤذنوں (سے اگر اذان کہنے میں کمی و زیادتی ہو جاوے تو ان) کو بخش دے۔ (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ) اور امام شافعیؒ نے دوسری روایت مصابیح کے ہم لفظ نقل کی ہے۔"

تشریح: "ضامن" کا مطلب یہ ہے کہ امام دوسروں کی نماز کا ذمہ دار ہوتا ہے بایں طور پر کہ وہ مقتدیوں کے امور نماز مثلاً قرأت کا اور اگر مقتدی رکوع میں امام کے ساتھ مل جائے تو قیام وغیرہ کا متکفل ہوتا ہے اسی طرح وہ سب کی نمازوں کے افعال و ارکان نیز رکعتوں کی تعداد پر نگاہ رکھتا ہے۔ مؤذنوں کے امانت دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کے سلسلہ میں اذان کی آوازوں پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہیں۔

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَذَّنَ سَبْعَ سِنِيْنَ مُحْتَسِبًا كُتِبَ لَهٗ بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد و ابن ماجہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا جو شخص (مزدوری و اجرت کے لالچ کے بغیر) محض ثواب حاصل کرنے کے لئے سات سال تک اذان دے تو اس کے لئے دوزخ سے نجات لکھ دی جاتی ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

⑫ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْجَبُ رَبُّكَ مِنْ رَاعِي غَنَمٍ فِيْ رَأْسِ شَظِيَّةٍ لِلْجَبَلِ يُؤَذِّنُ بِالصَّلَاةِ وَيُصَلِّي فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اُنْظُرُوْا إِلٰى عَبْدِيْ هٰذَا يُؤَذِّنُ وَيُقِيْمُ الصَّلَاةَ يَخَافُ مِنِّيْ قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِيْ وَاَدْخَلْتُهُ الْجَنَّةَ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا تمہارا رب راضی ہوتا ہے پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چرانے والے سے جو نماز کے لئے اذان کہتا ہے اور نماز پڑھتا ہے۔ چنانچہ اللہ بزرگ و برتر (ملائکہ اور ارواح مقربین سے) فرماتا ہے۔ میرے اس بندہ کی طرف دیکھو وہ اذان دیتا ہے اور (پابندی کے ساتھ) نماز پڑھتا ہے اور مجھ سے ڈرتا ہے، چنانچہ میں نے بھی اس بندے کے گناہ بخش دیے ہیں اور میں اسے جنت میں داخل کروں گا۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: یعنی وہ چرواہا جو لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے اور دنیا کے علائق سے دست بردار ہو کر پہاڑ کی چوٹی پر بسیرا کئے ہوئے ہے، جب نماز کا وقت آتا ہے تو اذان کہہ کر اللہ اور اس کے رسول کا نام بلند کرتا ہے اور پابندی سے نماز ادا کر کے اپنے پروردگا کی خوشنودی حاصل کرتا ہے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ اذان دینے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی اذان کے ذریعہ ملائکہ اور جنات نماز کے وقت سے مطلع ہو جاتے ہیں، نیز یہ کہ اس کی اذان مخلوقات میں سے جو چیز بھی سنتی ہے قیامت کے روز اس کے ایمان کی گواہی دے گی اور سنت کا اتباع ہوتا ہے اور جماعت کے معاملہ میں اسے مسلمانوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔

اذان سے اعلام عام یعنی اذان و تکبیر دونوں مراد ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایسا آدمی جب اذان و تکبیر کہتا ہے تو ملائکہ اس کے ہمراہ نماز میں شامل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اسے جماعت کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

"مجھ سے ڈرتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس بندہ کی عبادت کا مقصد نمائش و ریا نہیں ہے بلکہ وہ میرے عذاب سے چونکہ ڈرتا ہے اس لئے اذان بھی کہتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اکیلے شخص کو بھی اذان و تکبیر کہنا مستحب ہے۔

⑬ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ عَلٰى كُثْبَانِ الْمِسْكِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَبْدٌ اَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوْلَاهُ وَرَجُلٌ اَمَّ قَوْمًا وَهُمْ بِهٖ رَاضُوْنَ وَرَجُلٌ يُنَادِيْ بِالصَّلٰوةِ الْخَمْسِ كُلَّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، قیامت کے روز تین آدمی مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے۔ (پہلا) وہ غلام جس نے اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کر کے اپنے آقا کے حقوق بھی اداء کئے اور (دوسرا) وہ شخص جو لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے اور لوگ اس سے خوش ہیں اور (تیسرا) وہ شخص جو رات دن (یعنی ہمیشہ) پانچوں وقت کی نماز کے لئے اذان کہتا ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "عبد" سے مراد مملوک ہے خواہ غلام ہو یا لونڈی۔ امام سے لوگوں کو خوش رہنے کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی اپنے امام سے اس وجہ سے مطمئن و راضی ہوتے ہیں کہ وہ نماز کے احکام و ارکان اور سنن و آداب کی پوری پوری رعایت کرتا ہے۔ اور قرأت اصول و قواعد کے مطابق نیز عمدہ آواز کے ساتھ کرتا ہے لیکن اتنی بات ملحوظ رہے کہ اس سلسلہ میں اعتبار اکثر لوگوں کا ہو گا جو کہ صاحب علم و فراست ہوں۔

بہر حال قیامت کے روز ان تینوں کو مشک کے ٹیلے اس لئے ملیں گے کہ یہ لوگ دنیا میں خواہشات نفسانی کی لذتوں کو اطاعت الٰہی اور فرمانبرداری رسول ﷺ کی سختیوں پر قربان کر دیں گے اس لئے پروردگار عالم اس کے صلہ میں انہیں خوشبو کی صورت میں عظیم انعام عطا

فرمائے گا تاکہ دوسرے لوگوں پر ان کی عظمت و بزرگی ظاہر ہو سکے۔

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤَذِّنُ يُغْفَرُ لَهٗ مَدٰى صَوْتِهٖ وَيَشْهَدُ لَهٗ كُلُّ رَطْبٍ وَّيَابِسٍ وَشَاهِدُ الصَّلٰوةِ يُكْتَبُ لَهٗ خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ صَلٰوةً وَّيُكَفَّرُ عَنْهُ مَا بَيْنَهُمَا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَى النَّسَائِیُّ اِلٰى قَوْلِهٖ كُلِّ رَطْبٍ وَّيَابِسٍ وَقَالَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِ مَنْ صَلّٰى۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، اذان دینے والے کی بخشش اس کی آواز کی انتہاء کے مطابق کی جاتی ہے۔ ہر خشک و تر چیز اور نماز میں آنے والے آدمی اس کے (ایمان کے) گواہ ہو جاتے ہیں۔ پچیس نمازوں کا ثواب (اس کے زائد اعمال میں) لکھا جاتا ہے اور نمازوں کے درمیان اس سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں معاف ہو جاتے ہیں۔ (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) اور نسائیؒ نے اس روایت کو کل رطب و یابس تک نقل کیا ہے، اور یہ الفاظ مزید نقل کئے ہیں کہ وَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ مَنْ صَلّٰى یعنی اور اسے نماز پڑھنے والے کے برابر ثواب ملے گا۔"

تشریح: "آواز کی انتہا کے مطابق بخشش" کا مطلب یہ ہے کہ مؤذن اذان کہتے وقت جس قدر آواز بلند کرتا ہے اس کی مغفرت اسی قدر ہوتی ہے اور اگر وہ آواز کو انتہائی درجہ تک پہنچا دیتا ہے یعنی اس کی جتنی طاقت ہوتی ہے اتنی ہی آواز بلند کرتا ہے تو مغفرت بھی پوری ہی پاتا ہے۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اگر گناہ کا جسم فرض کیا جائے اور وہ اتنے ہوں کہ مؤذن کی آواز جہاں تک بھی پہنچے وہاں تک سما جائیں تو اس کے وہ سب گناہ بخشش دیے جاتے ہیں۔

رطب (تر) سے مراد وہ مخلوق ہیں جن میں نمو ہوتا ہے جیسے انسان اور نباتات وغیرہ اور یابس (خشک) سے جمادات یعنی پتھر اور مٹی وغیرہ مراد ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ وَشَاهِدُ الصَّلٰوةِ لفظ اَلْمُؤَذِّنُ پر عطف کیا گیا ہے اس طرح پورے جملہ کے معنی یہ ہوں گے "مغفرت کی جاتی ہے مؤذن کی اور ان لوگوں کی جو جماعت میں حاضر ہوتے ہیں"۔

مگر ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس کا عطف كُلُّ رَطْبٍ پر ہے اور اسے عطف خاص علی عام کہا جاتا ہے يُكْتَبُ لَهٗ اور عنہ کی ضمیر یا تو شَاهِدُ کی طرف راجع ہے یا پھر مُؤَذِّن کی طرف راجع ہوگی۔

حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ مؤذن نمازیوں کا سا ثواب پاتا ہے کیونکہ یہ ان کو نماز کی طرف بلاتا ہے اور حدیث میں وارد ہے کہ جو شخص بھلی بات کا باعث ہوتا ہے اسے اس بھلائی کے کرنے والے کی مانند ثواب ملتا ہے۔

⑮ وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اجْعَلْنِیْ اِمَامَ قَوْمِیْ قَالَ اَنْتَ اِمَامُهُمْ وَاقْتَدِ بِاَضْعَفِهِمْ وَاتَّخِذْ مُؤَذِّنًا لَّا يَاْخُذُ عَلٰى اَذَانِهٖ اَجْرًا۔ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عثمان بن ابی عاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کائنات ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے میری قوم کا امام مقرر فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم ان کے امام ہو (یعنی میں نے تمہیں تمہاری قوم کا امام مقرر کر دیا مگر یہ یاد رکھو کہ نماز پڑھانے میں) تم ان میں سے بہت زیادہ ضعیف و ناتواں کی اقتداء کرنا اور ایسا مؤذن مقرر کرنا جو اذان کہنے کی مزدوری نہ لے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "ضعیفوں کی اقتداء کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ امامت میں ضعیف و کمزور لوگوں کی رعایت کی جائے یعنی قرأت اتنی لمبی نہ کی جائے اور ارکان نماز اس طرح ادا نہ کئے جائیں کہ وہ لوگ تنگ و پریشان ہو جائیں اور جماعت سے نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام اور مؤذن کے لئے نماز پڑھانے اور اذان دینے کی اجرت حلال نہیں ہے[1]۔ مگر علماء نے یہ لکھا ہے

[1] امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اذان اقامت، امامت اور تعلیم قرآن کے سلسلہ میں معاوضہ لینا جائز نہیں ہے ۱۲۔

کہ اگر امام اور مؤذن بطور خود اپنی اجرت مقرر نہ کرائیں بلکہ لوگ ان کے پاس ان کی حاجت کے مطابق روپیہ پیسہ از خود بھیج دیا کریں تو یہ جائز و حلال ہوگا۔ لہٰذا لوگوں کو چاہئے کہ وہ امام و مؤذن کی خبرگیری کریں اور ان کے پاس از خود اتنا روپیہ اور مال بھجوا دیا کریں جس سے ان کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ فتاویٰ قاضی خاں میں مرقوم ہے کہ جو مؤذن اوقات نماز وغیرہ کے سلسلہ میں علم نہیں رکھتا اسے اذان کہنے کا ثواب نہیں ملتا، اس لئے جو مؤذن اجرت لے گا اسے تو بطریق اولیٰ ثواب نہیں ملے گا۔

(۱۶) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ عَلَّمَنِی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقُوْلَ عِنْدَ اَذَانِ الْمَغْرِبِ اَللّٰهُمَّ هٰذَا اِقْبَالُ لَيْلِكَ وَاِدْبَارُ نَهَارِكَ وَاَصْوَاتُ دُعَائِكَ فَاغْفِرْلِیْ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَالْبَيْهَقِی فِی الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے مجھے سکھلایا تھا کہ میں مغرب کی اذان کے وقت یہ دعا پڑھ لیا کروں اَللّٰهُمَّ هٰذَا اِقْبَالُ لَيْلِكَ وَاِدْبَارُ نَهَارِكَ وَاَصْوَاتُ دُعَائِكَ فَاغْفِرْلِیْ اے اللہ! یہ وقت تیری رات کے آنے کا اور تیرے دن کے واپس جانے اور تیرے پکارنے والوں (یعنی مؤذنوں) کی آوازوں کا! لہٰذا تو میری مغفرت فرما۔" (ابوداؤد، بیہقی)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا یا تو اذان کا جواب دینے کے دوران پڑھ لی جائے یا پھر جواب سے فارغ ہونے کے بعد پڑھی جائے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اذان کا وقت بارگاہ احدیت میں دعاء کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے اس لئے ایسے وقت اپنے گناہوں کی معافی اور خیر و بھلائی کے راستہ پر چلنے کی توفیق کی زیادہ سے زیادہ دعا مانگنی چاہئے تاکہ قبولیت کے مرتبہ کو پہنچ سکے۔

(۱۷) وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ اَوْ بَعْضِ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ بِلَالًا اَخَذَ فِی الْاِقَامَةِ فَلَمَّا اَنْ قَالَ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا وَقَالَ فِیْ سَائِرِ الْاِقَامَةِ كَنَحْوِ حَدِيْثِ عُمَرَ فِی الْاَذَانِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ یا سرور کائنات ﷺ کے کوئی اور صحابی فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ نے تکبیر کہنی شروع کی۔ جب انہوں نے قد قامت الصلوٰۃ کہا تو آنحضرت ﷺ نے (اس کے جواب میں) فرمایا، اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا یعنی اللہ تعالیٰ نماز کو قائم و دائم رکھے اور تکبیر کے بقیہ کلمات کے جوابات وہی فرمائے جس کا ذکر حضرت عمرؓ کی اذان کی حدیث میں ہو چکا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اسی باب کی حدیث نمبر پانچ میں اذان کے کلمات اور ان کے جواب کو جس طرح ذکر کیا گیا ہے اسی طرح تکبیر کے وقت مؤذن جو کلمات کہتا گیا۔ آپ بھی ویسے ہی کلمات کو دہراتے رہے البتہ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا اور قد قامت الصلوٰۃ کے جواب میں اقامھا اللہ و ادامھا کہا۔

(۱۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الْاَذَانِ وَالْاِقَامَةِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، اذان اور تکبیر کے درمیان دعا رد نہیں کی جاتی۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: یوں تو پروردگار عالم اپنی رحمت و شفقت کے ناطے ہر وقت ہی اپنے بندوں کی دعا قبول کرتا ہے اور ان کے دامن امید کو اپنے فضل و کرم کے موتیوں سے معمور کرتا ہے مگر اس ارشاد کے ذریعہ مسلمانوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اذان و تکبیر کے درمیان کا وقت اتنا بابرکت و باسعادت ہوتا ہے کہ اس وقت پروردگار عالم کے سامنے بندہ اپنی جس حاجت کے لئے بھی دامن پھیلاتا ہے اس کی مراد یقیناً پوری کی جاتی ہے اور مانگنے والا جو بھی دعا مانگتا ہے وہ ضرور قبول ہوتی ہے لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اس وقت اپنی دینی اور دنیاوی فلاح و سعادت اور کامیابی و کامرانی کے لئے ضرور دعا مانگا کریں۔

اس سلسلہ میں ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ دعاء خواہ اذان کے بعد متصلاً ہی مانگی جائے یا کچھ دیر کے بعد، ہر صورت میں قبول ہوگی مگر صحیح اور اولیٰ یہ ہے کہ اذان کے فوراً بعد مانگ لینی چاہئے۔

(۱۹) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثِنْتَانِ لَاتُرَدَّانِ اَوْقَلَّمَا تُرَدَّانِ الدُّعَاءُ عِنْدَ النِّدَاءِ وَعِنْدَ الْبَاْسِ حِيْنَ يَلْحَمُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا وَفِيْ رِوَايَةٍ وَتَحْتَ الْمَطَرِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ وَتَحْتَ الْمَطَرِ۔

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ دو دعائیں رد نہیں کی جاتیں، یا فرمایا کہ کم رد کی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ دعا جو اذان (ہونے کے بعد یا اذان شروع ہونے) کے وقت مانگی جاتی ہے، اور دوسری وہ دعا جو (کفار کے ساتھ) جنگ میں مٹھ بھیڑ (یعنی آپس میں قتل وقتال) شروع ہو جانے کے وقت مانگی جاتی ہے۔ ایک دوسری روایت میں (جنگ میں مٹھ بھیڑ کے بجائے) یہ منقول ہے کہ دوسری وہ دعا جو بارش میں (کھڑے ہو کر) مانگی جائے۔ (ابوداؤدؒ، دارمیؒ) مگر دارمی کی روایت میں "تحت المطر" منقول نہیں ہے۔"

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْمُؤَذِّنِيْنَ يَفْضُلُوْنَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْ كَمَا يَقُوْلُوْنَ فَاِذَا انْتَهَيْتَ فَسَلْ تُعْطَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! اذان دینے والے تو بزرگی میں ہم سے بڑھے جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح وہ کہتے ہیں (ساتھ ساتھ) تم بھی اسی طرح کہتے جاؤ اور جب (اذان کے جواب سے) فارغ ہو جاؤ تو جو چاہو مانگو، دیا جائے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: صحابی کا مطلب یہ تھا کہ جو لوگ اذان دیتے ہیں وہ تو اذان دینے کی سعادت و برکت کی وجہ سے ہماری بہ نسبت زیادہ ثواب کے حقدار ہوتے ہیں اس لئے ہمیں بھی کوئی ایسا طریقہ بتا دیجئے جس پر چل کر ہم بھی ثواب میں ان کے ہم پلہ ہو جائیں۔ اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے انہیں یہ طریقہ بتا دیا کہ جب مؤذن اذان کے کلمات کہے تو تم بھی ان کے ساتھ اذان کے کلمات دہراتے جاؤ (سوائے حی علی الصلوٰۃ وحی علی الفلاح کے کہ ان کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللّٰہ کہنا چاہئے) اسی طرح تمہیں بھی ان کے اصل ثواب کی طرح ثواب ملے گا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک دوسری چیز اذان کے جواب سے فراغت کے بعد دعاء مانگنے کو بتا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگر اذان کا جواب دینے کے بعد دعاء مانگی جائے تو فضیلت وبزرگی میں اور اضافہ ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اذان کے وقت مسجد میں موجود ہو تو اسے بھی اذان کے کلمات کا جواب دینا چاہئے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اذان کے وقت مسجد میں موجود شخص کو اذان کا جواب دینا ضروری نہیں ہے کیونکہ اس وقت جب اجابت فعلی حاصل ہے تو اجابت قولی کی کیا ضرورت ہے۔ دل کو لگنے والی بات نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۲۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الشَّيْطَانَ اِذَا سَمِعَ النِّدَاءَ بِالصَّلَاةِ ذَهَبَ حَتّٰى يَكُوْنَ مَكَانَ الرَّوْحَاءِ قَالَ الرَّاوِيْ وَالرَّوْحَاءُ مِنَ الْمَدِيْنَةِ عَلٰى سِتَّةٍ وَثَلَاثِيْنَ مِيْلًا۔ (رواہ مسلم)

"حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا، سرور کائنات ﷺ فرماتے تھے کہ جب شیطان نماز کی اذان سنتا ہے تو بھاگتا ہے یہاں تک کہ مقام روحا تک پہنچ جاتا ہے۔ روای کہتے ہیں روحا مدینہ سے چھتیس کوس کے فاصلے پر ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: شیطان سے مراد جنس شیطان ہے یعنی اذان سن کر یا تو تمام شیطان بھاگ کھڑے ہوتے ہیں یا ان کا سردار بھاگ جاتا ہے اور صحیح یہی ہے۔ حدیث کے آخر جزو کا مطلب یہ ہے کہ اذان سن کر شیطان نماز پڑھنے والے سے اتنا دور ہو جاتا ہے جتنا دور مدینہ سے روحا ہے۔

"راوی" سے حضرت ابوسفیان نافع ابن طلحہ کی ذات مراد ہے جنہوں نے اس حدیث کو حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے۔

(۲۲) وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ اَبِی وَقَّاصٍ قَالَ اِنِّی لَعِنْدَ مُعَاوِيَةَ اِذْ اَذَّنَ مُؤَذِّنُهُ فَقَالَ مُعَاوِيَةُ كَمَا قَالَ مُؤَذِّنُهُ حَتّٰى اِذَا قَالَ حَیَّ عَلَى الصَّلٰوةِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فَلَمَّا قَالَ حَیَّ عَلَى الْفَلَاحِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِيْمِ وَقَالَ بَعْدَ ذٰلِكَ مَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذٰلِكَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت علقمہ ابن وقاصؓ فرماتے ہیں کہ میں (ایک روز) حضرت امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ان کے مؤذن نے اذان دی، چنانچہ مؤذن جس طرح کہتا تھا حضرت معاویہؓ بھی اسی طرح (اس کے ساتھ ساتھ) کہتے رہے، جب مؤذن نے حی علی الصلوۃ کہا تو حضرت معاویہؓ نے کہا لاحول ولاقوۃ الا باللہ جب مؤذن نے حی علی الفلاح کہا تو حضرت معاویہؓ نے کہا لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم اور اس کے بعد مؤذن جو کچھ کہتا رہا حضرت معاویہؓ بھی کہتے رہے۔ (پھر فارغ ہو کر) حضرت معاویہؓ نے کہا میں نے سرور کائنات ﷺ کو اسی طرح کہتے ہوئے سنا ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ کے بعد العلی العظیم کا اضافہ مرویات میں نادر ہے۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ بِلَالٌ يُنَادِیْ فَلَمَّا سَكَتَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ مِثْلَ هٰذَا يَقِيْنًا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم سرور کائنات ﷺ کے ہمراہ تھے کہ حضرت بلالؓ کھڑے ہوئے اور اذان کہنے لگے۔ جب وہ (اذان دے کر) خاموش ہو گئے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے اسی طرح یقیناً (یعنی خلوص دل سے) کہا تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔" (نسائیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص یقین و اعتماد کی پوری قوت اور دل کے پورے خلوص کے ساتھ ان کلمات کو یا تو اذان میں کہے یا اذان کے جواب میں کہے یا مطلقاً کہے تو وہ جنت میں داخل ہونے کا مستحق ہو گا یا نجات پانے والوں کے ہمراہ جنت میں داخل ہو گا۔

(۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعَ الْمُؤَذِّنَ يَتَشَهَّدُ قَالَ وَاَنَا وَاَنَا۔ (ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب مؤذن کو شہادتین کہتے ہوئے سنتے تو فرماتے اور میں بھی اور میں بھی۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: یعنی جب مؤذن اذان میں اشهد ان لا الٰہ الا اللہ، اشهد ان محمدا رسول اللہ کہتا تو آنحضرت ﷺ شہادتین کے جواب میں دو مرتبہ فرماتے وانا وانا (اور میں بھی اور میں بھی) یعنی جس طرح تم خدا کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی دے رہے ہو اسی طرح میں بھی وحدانیت الٰہ اور رسالت محمد کی گواہی دیتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام اُمّت کی طرح خود آنحضرت ﷺ بھی اپنی رسالت کی گواہی دینے کے مکلف تھے۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ آیا آپ ﷺ اُمّت کے افراد کی طرح اشهد ان محمدا رسول اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) یہ کہہ کر گواہی دیتے تھے یا اشهد انی رسول اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں) کہہ کر گواہی دیتے تھے؟ چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ صحیح یہی ہے کہ آپ ﷺ اُمّت کے افراد کی طرح اپنی رسالت کی گواہی دیتے تھے جیسا کہ ابھی حدیث نمبر اکیس میں حضرت معاویہؓ کے بارہ میں گزرا ہے کہ انہوں نے اذان کے جواب میں اشهد ان محمدا رسول اللہ کہا اور پھر فرمایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو اسی طرح فرماتے ہوئے سنا ہے (یعنی آپ ﷺ بھی اذان کے جواب میں اشهد ان محمدا رسول اللہ ہی کہتے تھے)۔

اسی طرح حضرت عائشہؓ کی اس روایت میں اور حضرت معاویہؓ کی روایت میں چونکہ تعارض پیدا ہوتا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ کبھی تو آپ ﷺ اسی طرح فرماتے ہوں گے جیسا کہ حضرت معاویہؓ نے بیان کیا اور کبھی اس طرح فرماتے ہوں گے جیسا کہ حضرت عائشہؓ یہاں بتا رہی ہیں۔

(۲۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَذَّنَ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ سَنَةً وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ وَكُتِبَ لَهُ بِتَاْذِيْنِهٖ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ سِتُّوْنَ حَسَنَةً وَلِكُلِّ اِقَامَةٍ ثَلَاثُوْنَ حَسَنَةً۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جو شخص بارہ برس تک اذان دے اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے اور اس کی اذان کے بدلہ میں (اس کے نامۂ اعمال میں) ہر روز (یعنی ہر اذان کے عوض) ساٹھ نیکیاں اور ہر تکبیر کے بدلہ میں تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔" (ابن ماجہ)

تشریح: اذان کی بہ نسبت تکبیر کا ثواب آدھا غالباً اس لئے ہوتا ہے کہ تکبیر خاص طور پر ان لوگوں کو مطلع کرنے کے لئے ہوتی ہے جو جماعت میں حاضر ہوتے ہیں اور اذان کے ذریعہ عمومی طور پر حاضرین اور غائبین سب ہی کو مطلع کیا جاتا ہے یا پھر اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اذان دینے میں زیادہ محنت برداشت کرنی پڑتی ہے اور اس کی بہ نسبت تکبیر میں کم محنت ہوتی ہے۔

(۲۶) وَعَنْهُ قَالَ كُنَّا نُؤْمَرُ بِالدُّعَاءِ عِنْدَ اَذَانِ الْمَغْرِبِ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی اذان کے وقت دعاء مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: غالباً یہاں وہی مراد ہے جس کا تذکرہ حضرت اُمّ سلمہؓ کی حدیث نمبر پانچ میں آچکا ہے یعنی اللھم ھذا اقبال لیلک و ادبار نہارک الخ۔

بَابٌ

اذان کے بعض احکام کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ بِلَالًا يُنَادِيْ بِلَيْلٍ فَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يُنَادِيَ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ قَالَ وَكَانَ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ رَجُلًا اَعْمٰى لَا يُنَادِيْ حَتّٰى يُقَالَ لَهُ اَصْبَحْتَ اَصْبَحْتَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، بلال (فجر کی اذان خاص) رات سے دے دیتے ہیں لہٰذا جب تک ابن اُمّ مکتوم اذان دیں تم (رمضان میں سحری) کھاتے پیتے رہا کرو۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ابن اُمّ مکتوم ایک نابینا آدمی تھے، جب تک ان سے کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ تم نے صبح کردی، تم نے صبح کردی، وہ اذان نہ دیتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے دو مؤذن تھے، ایک مؤذن تو فجر کے وقت سے پہلے رات میں اذان دیتا تھا اور دوسرا نماز فجر کا وقت شروع ہونے کے بعد اذان دیتا تھا۔ چنانچہ حضرات شوافع کے یہاں دو مؤذن مقرر کرنا سُنّت ہے ایک فجر سے پہلے اخیر آدھی رات میں اذان دینے کے لئے اور دوسرا فجر کے اوّل وقت میں اذان دینے کے لئے۔

حضرات حنفیہ فرماتے ہیں کہ پہلا مؤذن سحر کے لئے یا تہجد کے لئے تھا، اس کا تعلق نماز فجر کی اذان سے نہیں تھا کیونکہ ایک روایت

میں خود آنحضرت ﷺ نے صبح کی اذان وقت سے پہلے دینے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ اسی لئے حنفیہ کے یہاں فجر کی نماز کے لئے وقت سے پہلے رات میں اذان دینا جائز نہیں ہے۔

حدیث کے آخری جملہ اصبحت اصبحت (یعنی تم نے صبح کر دی، تم نے صبح کر دی) سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت ابن اُمّ مکتومؓ صبح ہو جانے کے بعد اذان دیتے تھے تو اس وقت تک سحری کھانا پینا کیسے جائز ہوا؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اصبحت کے معنی یہ ہیں کہ "صبح ہونے والی ہے" اسی کو بطور مبالغہ اصبحت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَمْنَعَنَّكُمْ مِنْ سُحُوْرِكُمْ اَذَانُ بِلَالٍ وَلَا الْفَجْرُ الْمُسْتَطِيْلُ وَلٰكِنَّ الْفَجْرَ الْمُسْتَطِيْرُ فِى الْاُفُقِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَلَفْظُهُ لِلتِّرْمِذِيِّ۔

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، بلالؓ کی اذان تمہیں تمہاری سحری کھانے سے نہ روکے (کیونکہ وہ رات سے اذان دیتے ہیں) اور نہ فجر دراز (یعنی صبح کاذب) البتہ افق پر پھیلی ہوئی فجر (یعنی صبح صادق نمودار ہو جائے تو کھانا پینا چھوڑ دو) (مسلم) الفاظ ترمذیؒ کے ہیں۔"

(۳) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَابْنُ عَمٍّ لِيْ فَقَالَ اِذَا سَافَرْتُمَا فَاَذِّنَا وَاَقِيْمَا وَلْيَؤُمَّكُمَا اَكْبَرُكُمَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مالک ابن حویرثؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے چچا کے صاحبزادے (ہم دونوں) سرور کائنات ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ، جب تم سفر میں جاؤ تو (نماز کے لئے) اذان و تکبیر کہا کرو اور تم میں سے جو بڑا ہو وہ امامت کرے۔"
(بخاریؒ)

تشریح: غالباً یہ دونوں حضرات علم و ورع میں ہم پلہ ہوں گے اس لئے آپ ﷺ نے امام بننے کا حقدار اسے قرار دیا جو عمر میں بڑا ہو، یا پھر "اکبر" (یعنی بڑے) سے مراد افضل ہے کہ دونوں میں سے جو افضل ہو وہ امامت کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ افضلیت کی شرط اذان میں نہیں ہے، تاہم چاہئے یہی کہ اذان وہ شخص دے جو اقامت نماز کا علم رکھتا ہو، نیک اور دیندار ہو۔ بلند آواز اور خوش گلو ہو اور اذان کے کلمات صحیح صحیح ادا کر سکتا ہو۔

(۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِىْ اُصَلِّىْ وَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ اَحَدُكُمْ ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمْ اَكْبَرُكُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مالک ابن حویرثؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ تم مجھے جس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح تم بھی پڑھا کرو، اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی اذان دے دیا کرے اور جو تم میں بڑا ہو وہ امام بن جایا کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ امامت کا مستحق وہی شخص ہوگا جو علم و فضل میں سب سے بڑھا ہوا ہو اور اگر علم و فضل کے اعتبار سے سب برابر ہوں تو جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہوگا وہ امام بنے گا۔

عمر سے مراد وہ عمر ہے جو ایمان و اسلام کی حالت میں گزری ہو یعنی جس شخص کو اسلام قبول کئے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہو وہ حکماً ان لوگوں سے بڑا قرار دیا جائے گا جو اس کے بعد ایمان و اسلام کی سعادت سے مشرف ہوئے ہیں خواہ وہ عمر میں ان سب سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ پہلے اسلام قبول کرنے والے شخص کو دین و شریعت کا علم بعد میں اسلام کا حلقہ بگوش ہونے والوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ قَفَلَ مِنْ غَزْوَةِ خَيْبَرَ سَارَ لَيْلَةً حَتّٰى اِذَا اَدْرَكَهُ الْكَرٰى عَرَّسَ وَقَالَ لِبِلَالٍ اِكْلَاْ لَنَا اللَّيْلَ فَصَلّٰى بِلَالٌ مَا قُدِّرَ لَهُ وَنَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهُ

فَلَمَّا تَقَارَبَ الْفَجْرُ اسْتَنَدَ بِلَالٌ اِلٰی رَاحِلَتِهٖ مُوَجِّهَ الْفَجْرِ فَغَلَبَتْ بِلَالًا عَيْنَاهُ وَهُوَ مُسْتَنِدٌ اِلٰی رَاحِلَتِهٖ فَلَمْ يَسْتَيْقِظْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا بِلَالٌ وَلَا اَحَدٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ حَتّٰى ضَرَبَتْهُمُ الشَّمْسُ فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَّلَهُمْ اِسْتِيْقَاظًا فَفَزِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَیْ بِلَالُ فَقَالَ بِلَالٌ اَخَذَ بِنَفْسِی الَّذِیْ اَخَذَ بِنَفْسِكَ قَالَ اقْتَادُوْا فَاقْتَادُوْا رَوَاحِلَهُمْ شَيْئًا ثُمَّ تَوَضَّأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَمَرَ بِلَالًا وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ فَصَلّٰى بِهِمُ الصُّبْحَ فَلَمَّا قَضَى الصَّلَاةَ قَالَ مَنْ نَسِیَ الصَّلَاةَ فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِیْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب غزوہ خیبر سے واپس ہوئے تو رات بھر سفر کرتے رہے یہاں تک کہ (جب) آپ ﷺ پر غنودگی طاری ہونے لگی تو آپ ﷺ آرام کرنے کے لئے آخری رات میں ایک جگہ اتر گئے اور حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ تم ہمارا خیال رکھنا (یعنی صبح ہو جائے تو ہمیں جگا دینا) یہ فرما کر آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ تو سو گئے اور حضرت بلالؓ نے (تہجد کی) نماز جس قدر ہو سکی پڑھی۔ جب صبح صادق ہونے کو ہوئی، تو حضرت بلالؓ اپنے کجاوہ سے تکیہ لگا کر فجر (مشرق) کی جانب منہ کر کے بیٹھ گئے (تاکہ صبح صادق ہو جائے تو آنحضرت ﷺ کو جگا دیں) حضرت بلالؓ کجاوہ سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے کہ (اتفاق سے) ان کو بھی نیند آگئی (چنانچہ صبح صادق کے وقت) آنحضرت ﷺ حضرت بلالؓ اور صحابہؓ میں سے کوئی بھی بیدار نہ ہوا یہاں تک کہ جب ان کے اوپر دھوپ آگئی (اور اس کی گرمی پہنچی) تو سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی آنکھ کھلی اور آپ ﷺ نے گھبرا کر فرمایا کہ بلال یہ کیا ہوا؟ حضرت بلالؓ (بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور انہوں نے) عرض کیا یارسول اللہ! مجھے بھی اس چیز نے پکڑ لیا جس نے آپ ﷺ کو پکڑ لیا تھا (یعنی نیند نے) آپ ﷺ نے فرمایا، یہاں سے روانہ ہو جاؤ! چنانچہ سب لوگ تھوڑی دور تک اپنی اپنی سواریاں لے کر چلے، پھر آنحضرت ﷺ نے وضو کیا اور حضرت بلالؓ کو تکبیر کہنے کا حکم دیا۔ چنانچہ انہوں نے نماز کے لئے تکبیر کہی اور آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو صبح کی نماز پڑھائی، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا، جو شخص (نیند وغیرہ کی بناء پر) نماز پڑھنی بھول جائے تو یاد آتے ہی فوراً اسے پڑھ لے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اقم الصلوٰۃ لذکری یعنی میرے یاد کرنے کے وقت نماز پڑھ لو۔" (مسلم)

تشریح: خیبر مدینہ سے تقریباً سو میل کے فاصلہ پر ہے، بنو نضیر کے یہودی جب مدینہ سے اجڑے تو خیبر جا بسے اور پھر خیبر یہودیوں کی سازشوں کا اڈا اور مرکز بن گیا۔ لہٰذا اسلام کی حفاظت کی خاطر اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ان کے اس شر انگیز ٹھان کو توڑ دیا جائے چنانچہ سات ہجری میں تقریباً سولہ سو مسلمان مجاہدین کا لشکر سرکار دوعالم ﷺ کی قیادت میں خیبر روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ یہ محاصرہ تقریباً دس روز تک جاری رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی اور خیبر کے تمام قلعوں پر قبضہ ہو گیا۔ اس غزوہ کی کامیابی کا سہرا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سر رہا اور انہیں "فاتح خیبر" کے عظیم لقب سے نوازا گیا کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اسلامی لشکر کا جھنڈا انہیں کے ہاتھ میں دیا تھا۔ اور یہی اسلامی لشکر کی کمانڈ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ خدا تعالیٰ نے ان سے ایک خاص بہادری یہ ظاہر کرائی کہ خیبر کا پھاٹک جو ستر آدمیوں سے بھی نہیں اٹھتا تھا انہوں نے تنہا اسے اکھاڑ پھینکا۔ جب فتح خیبر ہو گیا تو مسلمانوں اور وہاں کے یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی دو خاص دفعات یہ تھیں۔

1. جب تک مسلمان چاہیں گے یہودیوں کو خیبر میں رہنے دیں گے اور جب نکالنا چاہیں گے تو ان کو خیبر سے نکلنا ہو گا۔
2. پیداوار کا ایک حصہ مسلمانوں کو دیا جائے گا۔

بہر حال۔ حدیث میں مذکورہ واقعہ اسی غزوہ سے واپسی کے وقت پیش آیا تھا۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلوع آفتاب کے بعد جب آنکھ کھل گئی تھی تو اسی جگہ آنحضرت ﷺ نے قضا نماز کیوں نہ پڑھ لی؟ اور صحابہؓ کو وہاں سے روانہ ہونے کا حکم دینے کا سبب کیا تھا؟ چنانچہ اس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں حنفی علماء جن کے

نزدیک طلوع آفتاب کے وقت قضا نماز پڑھنا منع ہے، فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس جگہ سے کوچ کرنے کا حکم اس وجہ سے دیا تھا تاکہ آفتاب بلند ہو جائے اور نماز کے لئے وقت مکروہ نکل جائے۔

شافعی علماء جن کے ہاں طلوع آفتاب کے وقت قضاء پڑھنی جائز ہے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ وہاں سے قضا نماز پڑھے بغیر فوراً اس لئے روانہ ہوئے کہ وہ جگہ شیاطین کا مسکن تھی جیسا کہ دوسری روایتوں میں اس کی تصریح موجود ہے چنانچہ مسلمؒ ہی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ دھوپ پھیل جانے پر آنحضرت ﷺ نے یہ حکم دیا کہ ہر شخص اپنی سواری کی عیال پکڑ لے (اور روانہ ہو جائے) اس لئے کہ اس جگہ ہمارے پاس شیطان آگیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ کو صرف تکبیر کہنے کا حکم دیا، اذان کے لئے نہیں فرمایا۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قضاء نماز کے لئے اذان دینا ضروری نہیں ہے جیسا کہ قول جدید کے مطابق حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے۔ لیکن شافعی علماء کے نزدیک قول قدیم کے مطابق صحیح اور معتمد مسلک یہی ہے کہ قضاء نماز کے لئے بھی اذان کہنی چاہیے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت نماز کے لئے اذان کہی گئی تھی چنانچہ ہدایہ میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لیلۃ التعریس (یعنی مذکورہ رات) کی صبح کو نماز فجر کی قضا اذان و تکبیر کے ساتھ پڑھی تھی۔

شیخ ابن الہمامؒ نے اس سلسلہ میں مسلمؒ اور ابوداؤدؒ کی کئی حدیثیں نقل کی ہیں اور فرمایا ہے کہ مسلمؒ کی اس روایت میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ کو تکبیر کہنے کا حکم دیا چنانچہ انہوں نے تکبیر کہی۔ غیر مراد ف نہیں ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بارہ میں صحیح طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ نے اس وقت اذان و تکبیر کے ساتھ نماز پڑھی تھی، لہٰذا اس روایت میں فاقام الصلوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ "چنانچہ انہوں نے نماز کے لئے اذان کے بعد تکبیر کہی"۔

یہاں ایک ہلکا سا خلجان اور پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل بیدار رہتا ہے۔ تو دل کے جاگتے رہنے کے باوجود اس کی کیا وجہ تھی کہ صبح صادق طلوع ہو جانے پر آپ ﷺ مطلع نہیں ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آفتاب کے طلوع و غروب کو دیکھنا آنکھوں کا کام ہے دل کا کام نہیں ہے لہٰذا دل کی بیداری کے باوجود صبح صادق کے طلوع ہو جانے پر آپ ﷺ اس لئے مطلع نہیں ہوئے کہ آپ ﷺ کی آنکھیں سو رہی تھیں۔

اور اگر کوئی یہ سوال کر بیٹھے کہ، آپ ﷺ کو کشف یا وحی کے ذریعہ اطلاع کیوں نہ دی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف تھا، دوسرے اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ اس طریقہ سے اُمّت کو قضا کے احکام معلوم ہو گئے۔

(۶) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوةُ فَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ قَدْ خَرَجْتُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جب نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو جب تک تم مجھے حجرہ سے نکلتا ہوا نہ دیکھ لو نماز کے لئے کھڑے نہ ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: فقہاء نے لکھا ہے کہ تکبیر کہنے والا جب حی علی الصلوٰۃ کہے تو مقتدیوں کو اس وقت کھڑا ہونا چاہئے چنانچہ آنحضرت ﷺ بھی اسی وقت اپنے حجرہ سے نکلتے ہوں گے۔

(۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَأْتُوْهَا تَسْعَوْنَ وَاْتُوْهَا تَمْشُوْنَ وَعَلَیْكُمُ السَّكِیْنَةُ فَمَا اَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَكُمْ فَاَتِمُّوْا مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ فَاِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا كَانَ یَعْمِدُ اِلَی الصَّلَاةِ فَهُوَ فِی الصَّلٰوةِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جب نماز کی تکبیر ہو جائے تو تم (جماعت میں شامل ہونے کے لئے)

دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ وقار و طمانیت کے ساتھ اپنی چال آؤ، جس قدر نماز تم کو (امام کے ساتھ) مل جائے پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے (امام کے سلام کے بعد اٹھ کر) اسے پوری کر لو (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اس لئے کہ جب تم میں سے کوئی نماز کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کو (حکماً) نماز ہی میں شامل سمجھا جاتا ہے۔"

تشریح: عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ جب نماز کھڑی ہو جاتی ہے تو وہ لوگ جو دیر سے مسجد پہنچتے ہیں نماز میں شامل ہونے کے لئے اور خصوصاً اس وقت جب کہ امام رکوع میں چلا جاتا ہے، بہت بے تکے طریقہ سے بھاگتے ہوئے آتے ہیں اور نماز میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اس حدیث سے متنبہ ہونا چاہئے کہ ان کا یہ طریقہ سراسر منشاء شریعت کے خلاف ہے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جماعت کھڑی ہو جانے پر بھاگ کر آنا جائز نہیں ہے بلکہ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ نماز کے لئے دوڑ کر آنا کمزوری عقل اور غفلت کی علامت ہے کیونکہ نماز کے لئے مستعدی اور چستی اس طرح تو شریعت کی نظر میں قابل تعریف ہوگی کہ اگر کسی کو تکبیر اولیٰ کے فوت ہونے یا کسی رکعت کے چھوڑ جانے کا خوف ہو تو وہ پہلے ہی جلدی کر لیا کرے اور جماعت شروع ہونے سے پہلے مسجد پہنچ جایا کرے۔ (حضرت شیخ عبدالحق)۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ علماء کے یہاں اس بارہ میں اختلاف ہے کہ اگر کسی شخص کو تکبیر اولیٰ کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو وہ دوڑتا ہوا آئے یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ایسا شخص دوڑ کر آسکتا ہے کیونکہ حضرت عمر فاروق کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ بقیع میں تھے کہ انہوں نے مسجد سے تکبیر کی آواز سنی تو دوڑتے ہوئے مسجد کی طرف آئے۔

اور بعض علماء نے یہ مناسب قرار دیا ہے کہ ایسے شخص کو اس حدیث کے پیش نظر وقار و سکینت کے ساتھ ہی چل کر مسجد آنا چاہئے کیونکہ جو شخص نماز کا ارادہ کرتا ہے تو گویا وہ نماز ہی میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

لیکن اتنی بات سمجھ لینی چاہئے کہ یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہوگا جو نادانستہ یا کسی مجبوری و معذوری کی بناء پر موخر ہو جائیں ورنہ اگر کوئی شخص دانستہ نماز میں آنے کے لئے دیر کرے تو وہ اس میں شامل نہیں۔

بہر حال اس سلسلہ میں صحیح اور مناسب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تاخیر سے مسجد پہنچے تو اسے چاہئے کہ وہ جماعت میں شریک ہونے کے لئے وقار و طمانیت کے ساتھ تیز تیز چل کر آئے بالکل بے تکے طریقے سے دوڑتا ہوا نہ آئے تاکہ اس حدیث پر عمل بھی ہو جائے اور تکبیر اولیٰ کا ثواب بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ اسی طرح نماز جمعہ کا حکم بھی یہی ہے کہ اگر کسی شخص کو مسجد پہنچنے میں دیر ہو جائے اور اس بات کا یقین ہو کہ اگر جلدی نہ کی تو امام سلام پھیر دے گا اور میں نماز سے رہ جاؤں گا تو اسے تیزی سے آکر امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جانا چاہئے۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِيْ

اور اس باب میں الفصل الثانی نہیں ہے

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۸) عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ قَالَ عَرَّسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً بِطَرِيْقِ مَكَّةَ وَوَكَّلَ بِلَالًا اَنْ يُوْقِظَهُمْ لِلصَّلَاةِ فَرَقَدَ بِلَالٌ وَرَقَدُوْا حَتّٰى اسْتَيْقَظُوْا وَقَدْ طَلَعَتْ عَلَيْهِمُ الشَّمْسُ فَاسْتَيْقَظَ الْقَوْمُ فَقَدْ فَزِعُوْا فَاَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَرْكَبُوْا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِيْ وَقَالَ اِنَّ هٰذَا وَادٍ بِهِ شَيْطَانٌ فَرَكِبُوْا حَتّٰى خَرَجُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِيْ ثُمَّ اَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَنْزِلُوْا وَاَنْ يَتَوَضَّئُوْا وَاَمَرَ بِلَالًا اَنْ يُنَادِيَ لِلصَّلَاةِ

اَوْيُقِيمُ فَصَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ ثُمَّ انْصَرَفَ وَقَدْ رَأَى مِنْ فَزَعِهِمْ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ اَرْوَاحَنَا وَلَوْ شَاءَ لَرَدَّهَا اِلَيْنَا فِي حِيْنٍ غَيْرِ هٰذَا فَاِذَا رَقَدَ اَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَوْنَسِيَهَا ثُمَّ فَزِعَ اِلَيْهَا فَلْيُصَلِّهَا كَمَا يُصَلِّيْهَا فِي وَقْتِهَا ثُمَّ الْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اَبِي بَكْرِ نِ الصِّدِّيْقِ فَقَالَ اِنَّ الشَّيْطَانَ اَتٰى بِلَالًا وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فَاَضْجَعَهُ ثُمَّ لَمْ يَزَلْ يُهَدِّئُهُ كَمَا يُهَدَّأُ الصَّبِيُّ حَتّٰى نَامَ ثُمَّ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَالًا فَاَخْبَرَ بِلَالٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ الَّذِي اَخْبَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبَابَكْرٍ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلًا۔

"حضرت زید ابن اسلمؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ مکہ معظمہ کے راستہ میں (آرام کرنے کے لئے) آخر رات میں ٹھہرے اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ (صبح کی) نماز کے لئے سب کو جگادیں اور جب سب لوگ سو گئے۔ (تھوڑی دیر کے بعد نیند کے غلبہ کی وجہ سے) حضرت بلالؓ کی بھی آنکھ لگ گئی۔ (پہلے تو آنحضرت ﷺ اور ان کے بعد) تمام لوگ اس وقت جاگے جب کہ آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔ سب لوگ (نماز قضاء ہو جانے کی وجہ سے) گھبرا گئے۔ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ سوار ہو کر اس جنگل سے باہر نکل چلیں۔ اور فرمایا کہ، یہ ایک ایسا جنگل ہے جس پر شیطان مسلط ہے چنانچہ سب لوگ سوار ہو کر اس جنگل سے نکل آئے۔ (ایک جگہ پہنچ کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (یہاں) اتر جاؤ اور وضو کرلو۔ اور حضرت بلالؓ کو نماز کے لئے اذان و تکبیر کہنے کا حکم دیا۔ پھر آپ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ (صبح کی) نماز (قضاء باجماعت) پڑھی جب نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کو گھبرایا ہوا دیکھا تو (تسلی دینے کے لئے) فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ نے (سونے کے وقت) ہماری روحیں قبض کرلیں تھیں اگر وہ چاہتا تو ہماری روحوں کو دوسرے وقت (یعنی آفتاب طلوع ہونے سے پہلے) واپس کر دیتا۔ لہٰذا اگر تم میں سے کوئی نماز کے وقت غافل سو جائے یا نماز پڑھنی بھول جائے اور (اس غفلت و نسیان سے) گھبرائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس نماز کو اسی طرح (یعنی اذان و تکبیر اور جماعت کے ساتھ نیز نماز کے تمام شرائط و آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے) پڑھ لے جس طرح اسے اس کے وقت میں پڑھتا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ بلالؓ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے کہ شیطان ان کے پاس آیا اور انہیں (کجاوہ کا) سہارا لینے پر مجبور کر دیا اور جس طرح بچوں کو (سلانے کے لئے) تھپکی دی جاتی ہے شیطان انہیں تھپکتا رہا۔ یہاں تک کہ بلالؓ پر نیند طاری ہوگئی۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ کو بلایا۔ حضرت بلالؓ نے آکر آپ ﷺ سے ویسا ہی بیان کیا جیسے آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بیان فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے (حضرت بلالؓ کا بیان سن کر فرمایا)، کہ میں اس بات کی (پورے یقین کے ساتھ) گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ خدا کے رسول ہیں۔ (یہ روایت امام مالکؒ نے مرسلاً نقل کی ہے)۔"

تشریح: اس قسم کا ایک واقعہ حدیث نمبر پانچ میں ذکر کیا جا چکا ہے مگر بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ پہلے واقعہ سے الگ کوئی دوسرا واقعہ ہے کیونکہ وہ واقعہ تو مدینہ اور خیبر کے راستہ میں پیش آیا تھا اور یہ واقعہ جیسا کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے مکہ اور مدینہ کے درمیان رونما ہوا تھا۔

حدیث کے الفاظ ینادی للصلوٰۃ اویقیم میں لفظ اَوْ جمع کا مفہوم ادا کر رہا ہے جیسا کہ حرف واو دو چیزوں کو جمع کرنے کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس کے معنی جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے یہ ہوں گے کہ آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان اور تکبیر کہنے کا حکم دیا، یا پھر لفظ او اپنے حقیقی مفہوم یعنی شک کو ظاہر کر رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان یا تکبیر کہنے کا حکم دیا۔ مگر صحیح اور اولیٰ پہلے ہی معنی ہیں کیونکہ اس کی تائید ابوداؤد کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں انه صلی اللّٰہ علیه وسلم اَمَرَ بلالاً بالاذان والا قامة (آنحضرت ﷺ نے بلالؓ کو اذان و تکبیر کہنے کا حکم دیا)۔

فلیصلها کما کان یصلیها فی وقتها (وہ اس نماز کو اس طرح پڑھ لے جس طرح اسے اس کے وقت میں پڑھتا تھا) یہ الفاظ بظاہر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اگر جہری نماز قضا ہوئی ہو تو اس کی قضا بھی جہر ہی کے ساتھ پڑھی جائے اور اگر سری نماز قضا ہوئی ہے تو اس

کی قضا بھی سرہی کے ساتھ پڑھی جائے۔ مگر بعض حنفی علماء نے اس سلسلہ میں اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ قضاء نماز کو بہر صورت سر یعنی خاموشی کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔

"اضجعہ" اسندہ کے مفہوم میں ہے یعنی شیطان نے بلالؓ کو اس طرح سہارا دیا کہ ان پر غفلت طاری ہوگئی، جیسا کہ پہلے واقعہ کے سلسلہ میں گزر چکا ہے کہ حضرت بلالؓ تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے کجاوہ سے سہارا لگا کر سو گئے تھے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قضاء نماز پڑھنے کے بعد صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے ان اللّٰہ قبض اروا حنا (اللہ تعالیٰ نے ہماری روحیں قبض کر لی تھیں) فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا تھا کہ ہم سب کا اس موقعہ پر سو جانا در حقیقت تقدیر الٰہی کی بناء پر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر اس طرح غفلت کی نیند مسلط کر دی کہ ہم نماز کے وقت جاگ نہ سکے۔ مگر بعد میں آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے پیش آمدہ صورت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے نیند کی اس غفلت کی نسبت شیطان کی طرف فرمائی کہ شیطان نے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ بلالؓ غافل ہو کر سوتے رہے اور وقت پر نہ اٹھ سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب لوگ سوتے رہے اور نماز قضاء ہوگئی۔ تو اس سے بظاہر دونوں باتوں میں تعارض نظر آتا ہے کہ پہلے تو غفلت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی پھر بعد میں اس غفلت کی نسبت شیطان کی طرف کی؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسئلہ خلق افعال سے متعلق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے اندر نسیان اور غفلت پیدا کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ اس نے شیطان کو اس بات پر قادر کر دیا کہ وہ مذکورہ طریقوں یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تھپکنے وغیرہ سے لوگوں کو غفلت کی نیند میں مبتلا کر دے۔

یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی اعجازی شان کی زبردست غمازی کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے معجزہ کے طور پر حضرت بلالؓ کے سو جانے کی پوری حقیقت و کیفیت بیان کر دی باوجودیکہ آپ ﷺ نے اپنی ظاہری آنکھوں سے اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کیا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اشھد انک رسول اللّٰہ کہہ کر آپ ﷺ کی اسی اعجازی شان کی تصدیق فرمائی۔

⑨ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ مُعَلَّقَتَانِ فِي اَعْنَاقِ الْمُؤَذِّنِيْنَ لِلْمُسْلِمِيْنَ صِيَامُهُمْ وَصَلَاتُهُمْ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ مسلمانوں کی دو چیزیں مؤذنوں کی گردنوں میں لٹکی ہوئی ہیں۔ ایک تو ان کے روزے اور دوسری ان کی نمازیں۔" (ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے مسلمانوں کے دو اہم اور بنیادی اعمال ایسے ہیں جو مؤذن پر موقوف ہیں یعنی مؤذن ان اعمال کی صحت و تکمیل کے ذمہ دار ہیں۔ پہلی چیز تو روزہ ہے کہ مسلمان مؤذنوں کی اذان ہی پر اعتماد کرتے ہوئے افطار کرتے ہیں۔ اور دوسری چیز نماز ہے جس کی ادائیگی مؤذنوں کی اذان کے تحت ہوتی ہے۔

بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ مؤذنوں کو چاہئے کہ وہ اپنی اس عظیم ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ اور اوقات کی پوری رعایت کرتے ہوئے اذان کہا کریں تاکہ مسلمانوں کے ان دونوں اعمال میں خلل واقع نہ ہو۔

بَابُ الْمَسَاجِدِ وَمَوَاضِعِ الصَّلٰوةِ

مساجد اور نماز کے مقامات کا بیان

یہاں نماز کے مقامات سے وہ جگہیں مراد ہیں جن میں نماز پڑھنا مکروہ یا غیر مکروہ ہے۔ چنانچہ ایسے مقامات کی وضاحت آئندہ احادیث

میں کی جائے گی۔ مساجد کے فضائل و برکات کے سلسلہ میں بہت زیادہ احادیث منقول ہیں ان میں سے جن احادیث کو صاحب مشکوٰۃ نے منتخب کیا ہے وہ اس عنوان کے تحت نقل کی جائیں گی البتہ وہ احادیث جنہیں صاحب مشکوٰۃ نے نقل نہیں کیا ہے بلکہ حدیث کی دوسری کتابوں میں نقل ہیں حصول سعادت و برکت کی خاطر ان میں بعض کے ترجمے یہاں نقل کئے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے ذہن میں مساجد کی عظمت و فضیلت کا احساس جاگزیں ہو جس کی وجہ سے وہ خدائے تعالیٰ کی عبادت کے لئے مساجد میں جانے کو دینی اور دنیاوی فلاح و کامرانی کا ذریعہ سمجھیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنے صاحبزادہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا، میرے بیٹے! مسجد تمہارا گھر ہونا چاہئے۔ کیونکہ میں نے سرور کائنات ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مسجدیں پرہیزگاروں کا گھر ہیں لہٰذا جس کا گھر مسجد ہو اللہ تعالیٰ اس کی راحت و رحمت کا اور پلصراط سے جنت کی طرف اس کے گزرنے کا ضامن ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مغفلؓ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا جاتا ہے کہ شیطان سے بچنے کے لئے مسجد ایک مضبوط قلعہ ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ راوی ہیں کہ مساجد زمین کے اوپر اللہ تعالیٰ کا گھر ہیں اور جس کی زیارت کی گئی ہے اس پر یہ حق ہے کہ وہ اپنی زیارت کرنے والے کا اعزاز و اکرام کرتا ہے یعنی جو شخص مسجد میں جاتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کی زیارت کرتا ہے۔ اس طرح مسجد میں جانے والا بندہ تو زیارت کرنے والا ہوا اور جس کی زیارت کی گئی وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہوئی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ مسجد میں آنے والے بندوں کا اعزاز و اکرام کرتا ہے اور انہیں اپنے فضل و کرم کی سعادتوں سے نوازتا ہے۔

سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا، جب کوئی شخص مسجد میں نماز پڑھنے یا اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے جگہ پکڑتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت و شفقت کی نظر فرماتا ہے جس طرح اس شخص کے اہل خانہ جودت کے بعد اپنے گھر لوٹا ہو اس کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں اتنی بات سمجھ لیجئے کہ جن احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں جگہ پکڑنا ممنوع ہے تو اس کی شکل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد میں کسی مخصوص جگہ کو ایسا اختیار کرتا ہے کہ اس جگہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ نہیں بیٹھتا تو یہ ممنوع ہے خواہ اس کا کسی مخصوص جگہ کو اختیار کرنا نماز پڑھنے اور ذکر اللہ ہی کے لئے کیوں نہ ہو کیونکہ اس طرح ریا و نمائش کا شبہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔

اور اس قسم کی وہ احادیث جن سے مسجد میں جگہ پکڑنے کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے اس بات پر محمول ہیں کہ مسجد کو کسی دنیاوی غرض و منفعت سے قطع نظر محض نماز پڑھنے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہنے کی نیت سے جائے قیام قرار دیا جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْبَيْتَ دَعَا فِيْ نَوَاحِيْهِ كُلِّهَا وَلَمْ يُصَلِّ حَتّٰى خَرَجَ مِنْهُ فَلَمَّا خَرَجَ رَكَعَ رَكْعَتَيْنِ فِيْ قُبُلِ الْكَعْبَةِ وَقَالَ هٰذِهِ الْقِبْلَةُ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ۔

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (فتح مکہ کے دن) جب سرور کائنات ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو اس کے چاروں کونوں میں جا کر دعا کی اور بغیر نماز پڑھے باہر نکل آئے اور پھر باہر آکر کعبہ کے سامنے آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا کہ یہی قبلہ ہے۔ (بخاریؒ) مسلمؒ نے اس روایت کو ابن عباسؓ سے اور انہوں نے اسامہ بن زیدؓ سے روایت کیا ہے۔"

تشریح: کعبہ کی طرف اشارہ کر کے یہ فرمانا کہ "یہی قبلہ ہے" اس بات کا اعلان کرنا تھا کہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دائمی طور پر ہو گیا ہے اور یہ قبلہ معین و مقرر ہو چکا ہے جو اب کسی حالت میں منسوخ نہیں ہو گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قبلہ اسی اگلی سمت ہے دوسری سمتوں سے اس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنا درست نہیں ہے اور نہ اس کا مطلب یہ تھا کہ صرف باہر کی سمت سے قبلہ کی طرف متوجہ ہونا معتبر ہے اندر کے حصہ میں نماز درست نہیں ہے جیسا کہ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ قبلہ کے اندر فرض نماز پڑھنا

درست نہیں ہے۔ کعبہ کے اندر نفل پڑھنا متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک جائز ہے کیونکہ آگے آنے والی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث اس کے جواز پر واضح دلیل ہے۔

البتہ فرض پڑھنے کے سلسلہ میں علماء کے یہاں اختلاف ہے چنانچہ اکثر علماء کعبہ کے اندر فرض نماز پڑھنے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں مگر حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کعبہ کے اندر فرض نماز کی ادائیگی سے منع کرتے ہیں۔

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْكَعْبَةَ هُوَ وَاُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ وَعُثْمَانُ بْنُ طَلْحَةَ الْحَجَبِيُّ وَبِلَالُ بْنُ رَبَاحٍ فَاَغْلَقَهَا عَلَيْهِ وَمَكَثَ فِيْهَا فَسَاَلْتُ بِلَالًا حِيْنَ خَرَجَ مَاذَا صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ جَعَلَ عَمُوْدًا عَنْ يَسَارِهٖ وَعَمُوْدَيْنِ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَثَلَاثَةَ اَعْمِدَةٍ وَرَاءَهٗ وَكَانَ الْبَيْتُ يَوْمَئِذٍ عَلٰى سِتَّةِ اَعْمِدَةٍ ثُمَّ صَلّٰى۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ (فتح مکہ کے روز) سرور کائنات ﷺ، اسامہ ابن زیدؓ، عثمان ابن طلحہ حجبیؓ اور بلال ابن رباحؓ خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور حضرت بلالؓ یا حضرت عثمانؓ نے اندر سے دروازہ بند کر لیا (تاکہ لوگ ہجوم نہ کریں) آنحضرت ﷺ تھوڑی دیر تک اندر (دعا وغیرہ میں مشغول) رہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت بلالؓ سے جب کہ وہ یا (آنحضرت ﷺ) خانہ کعبہ سے باہر آئے تو پوچھا کہ سرکار دو عالم ﷺ (خانہ کعبہ کے اندر) کیا کر رہے تھے؟ بلالؓ نے کہا کہ آپ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی ایک ستون آپ کے بائیں طرف تھا، دو داہنی طرف تھے اور تین پیچھے تھے ان دنوں خانہ کعبہ میں چھ ستون تھے (اور اب تین ستون ہیں)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھی تھی مگر اس سے پہلے اس مضمون کی حضرت اسامہ ابن زیدؓ سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کردہ جو حدیث گزری ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر نماز نہیں پڑھی تھی۔ لہٰذا ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اسی طرح ہوگی کہ یہ کہا جائے گا کہ جب آنحضرت ﷺ کے ہمراہ یہ حضرات خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور دروازہ بند کر لیا گیا تو آنحضرت ﷺ کو دعا مانگتے ہوئے دیکھ کر حضرت اسامہؓ بھی کسی دوسرے کونہ میں جا کر دعا میں مشغول ہو گئے، آنحضرت ﷺ جس کونہ میں کھڑے تھے وہاں سے حضرت اسامہؓ تو دور تھے مگر حضرت بلالؓ آپ ﷺ کے قریب ہی تھے اس لئے حضرت بلالؓ نے آنحضرت ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور چونکہ حضرت اسامہؓ اول تو آپ ﷺ سے فاصلہ پر تھے دوسرے وہ خود بھی نماز میں مشغول تھے، پھر یہ کہ آپ ﷺ نے وہ نماز بھی جلد ہی پڑھ لی تھی۔ اس لئے وہ آنحضرت ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔

پھر اس کے علاوہ یہ بھی منقول ہے کہ بیت اللہ کی دیواروں سے تصویریں مٹانے کے واسطے آنحضرت ﷺ نے حضرت اسامہؓ کو پانی لانے کے لئے باہر بھیج دیا تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ جس وقت وہ باہر گئے ہوں آنحضرت ﷺ نے اس عرصہ میں نماز پڑھ لی ہو۔ بہر حال حضرت اسامہؓ اور حضرت بلالؓ دونوں نے اپنے علم و مشاہدہ کے مطابق خبر دی ہے اور بہر صورت ادائیگی نماز کو ثابت کرنا ہی مختار ہے اس کی نفی نہیں۔

(۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةٌ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، میری اس مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں نماز پڑھنا دوسری مسجدوں میں ہزار نمازیں پڑھنے سے بہتر ہے سوائے مسجد حرام کے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مسجد حرام کو مستثنیٰ اس لئے کیا گیا ہے کہ مسجد حرام نہ صرف یہ کہ دوسری مساجد کے مقابلہ میں زیادہ بابرکت ہے بلکہ اپنی عظمت و برکت اور فضیلت کے اعتبار سے مسجد نبوی سے بھی افضل ہے چنانچہ منقول ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے ثواب کے برابر ہوتا ہے۔

اب اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حرم شریف میں وہ کون سی جگہ ہے جہاں نماز ادا کرنے پر اتنا ثواب ملتا ہے، چنانچہ پہلا قول یہ ہے کہ وہ کوئی متعین جگہ نہیں ہے بلکہ پورا حرم اس فضیلت و برکت کا حامل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جس جگہ جماعت ہوتی ہے۔ علماء حنفیہ کے اقوال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اسی قول کو بعض شافعی علماء نے بھی اختیار کیا ہے۔ علماء حنفیہ کے نزدیک ثواب کی اس زیادتی کی فضیلت خاص طور پر فرائض سے متعلق ہے نوافل سے نہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ وہ جگہ خانہ کعبہ ہے۔ یہ چوتھا قول ان چاروں اقوال میں سب سے ضعیف ہے۔

(۴) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَشُدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَمَسْجِدِیْ ھٰذَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، تین مسجدوں کے علاوہ (کسی دوسری جگہ کے لئے) تم اپنے کجاووں کو نہ باندھو (یعنی سفر نہ کرو) مسجد حرام، مسجد اقصیٰ، (یعنی بیت المقدس اور میری مسجد (یعنی مسجد نبوی)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث سے ظاہری طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ کہ خدا نے ان کی عظمت و بزرگی کی زیادتی کے سبب انہیں ایک امتیازی شان عطا فرمائی ہے۔ کسی دوسری جگہ کا سفر جائز نہیں ہے لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ اس ممانعت اور نہی کا تعلق تقرب و عبادت سے ہے یعنی تقرب الی اللہ اور عبادت سمجھ کر ان تینوں جگہوں کے علاوہ اور کسی جگہ کا سفر نہ کرنا چاہئے۔

ہاں اگر کسی دوسری جگہ تحصیل علم، ادائے حقوق، تجارت یا ایسی ہی کسی دوسری ضرورت کی بناء پر سفر کرنا ہو تو یہ الگ چیز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ البتہ اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت کرنے اور متبرک مقامات پر جانے کے سلسلہ میں علماء کے یہاں اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض حضرات نے تو اسے مباح قرار دیا ہے اور بعض حضرات کی رائے ہے کہ یہ حرام ہے یعنی محض اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کرنے اور متبرک مقامات پر پہنچ کر حصول برکت کی خاطر مستقل سفر کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے۔

بعض حضرات نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ کسی دوسری جگہ نذر و منت کی نیت سے سفر کا قصد کرنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ان تین مسجدوں کے علاوہ کسی دوسری جگہ پہنچنے کی نذر مانی جائے تو اس نذر کو پورا کرنا واجب نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس نہی کا تعلق صرف مساجد سے ہے یعنی حصول برکت اور زیارت کے ارادہ سے ان تینوں مساجد کے علاوہ کسی دوسری مسجد کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں مساجد کے علاوہ دیگر مقامات خارج از مفہوم ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان تینوں مقامات کے علاوہ دوسری جگہوں کا سفر کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ اس ارشاد کا مقصد در اصل ان تینوں مساجد کی اہمیت و عظمت اور فضیلت اور ان کے لئے سفر کرنے کی سعادت و خوش بختی کو ظاہر کرنا ہے یعنی آپ ﷺ کے اس ارشاد کا مطمح نظر یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ احساس پیدا ہونا چاہئے کہ اگر وہ سفر کرنا چاہتے ہیں تو پھر ان تینوں مساجد کی زیارت کے لئے سفر کریں کہ یہ مساجد سب سے زیادہ باعظمت و فضیلت اور متبرک ترین مقامات ہیں۔ ان کے علاوہ کسی دوسری جگہ کا سفر کرنا کوئی فلاح و سعادت کی بات نہیں ہے بلکہ بے فائدہ صعوبت و پریشانیوں کو برداشت کرنا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور معرکۃ الآراء تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں اس حدیث کی وضاحت کے دوران تحریر فرمایا ہے کہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کچھ مقامات کو اپنے گمان و خیال کے مطابق باعظمت و بابرکت تصور کر کے وہاں کا سفر کرتے تھے اور ان مقامات کی زیارت کرنے کو سعادت و برکت کے حصول کا ذریعہ جانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اپنے وہم و گمان

کے مطابق کسی جگہ اور مقام کو باعث برکت و فضیلت سمجھنا اور پھر خاص طور پر اس کی زیارت کے لئے وہاں جانا نہ صرف یہ کہ حقیقت سے انحراف اور عقیدہ اور ذہن و فکر کی کمزوری کی علامت ہے بلکہ فتنہ و فساد کا سبب بھی ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے عقیدہ و عمل کو راہ راست پر قائم رکھنے کی خاطر اس غلط طریقہ کو بند فرمادیا تاکہ اسلامی شعائر کے ساتھ غیر شعائر جمع نہ ہو جائیں اور یہ طریقہ غیر اللہ کی عبادت و پرستش کا سبب نہ بن جائے، چنانچہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ مزارات اولیاء اللہ کی عبادت کرنے کی جگہیں یہاں تک کہ کوہ طور یہ سب اس سلسلہ میں برابر ہیں کہ خاص طور پر زیارت یا حصول برکت و سعادت کے جذبہ سے ان مقامات کا سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا بَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَةٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِیْ عَلٰی حَوْضِیْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، میرے مکان اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض (یعنی حوض کوثر) کے اوپر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میرے مکان اور (مسجد نبوی میں) میرے منبر کے درمیان واقع جگہ پر عبادت کرے گا تو اسے اس عظیم سعادت کے صلہ میں جنت کا ایک باغ ملے گا اور جو شخص میرے منبر کے نزدیک عبادت میں مشغول رہے گا تو قیامت کے دن وہ حوض کوثر سے سیراب ہوگا۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے ظاہری معنی ہی پر محمول ہے کیونکہ روضہ کے معنی ٹکڑے کے ہیں لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کے مکان و منبر کے درمیان کی جگہ وہ ٹکڑا ہے جو جنت سے زمین پر اس جگہ منتقل کیا گیا ہے اور یہ ٹکڑا زمین کے دوسرے حصوں کی طرح قیامت کے روز فنا نہیں ہوگا بلکہ جوں کا توں جنت میں واپس چلا جائے گا۔

علامہ تور پشتیؒ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کے منبر اور حجرۂ رسول کے درمیان کی جگہ کو روضہ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس جگہ آنحضرت ﷺ کی قبر کی زیارت کرنے والے، وہاں کے حاضر باش ملائکہ اور جن و انس ہمیشہ عبادت اور ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں ایک جماعت جاتی ہے تو دوسری جماعت آجاتی ہے اس طرح لگاتار وہاں عبادت کرنے والوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے لہٰذا اس مناسبت سے اس جگہ کو روضہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے جیسا کہ ذکر کے حلقوں کو ریاض جنت فرمایا گیا ہے۔

⑥ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَاْتِیْ مَسْجِدَ قُبَاءٍ كُلَّ سَبْتٍ مَاشِیًا وَرَاكِبًا فَیُصَلِّیْ فِیْهِ رَكْعَتَیْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ ہر ہفتہ کو پیدل یا سواری پر مسجد قبا تشریف لے جاتے تھے اور اس میں دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قبا ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے تین کوس کے فاصلہ پر واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں آنحضرت ﷺ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمانے کے وقت مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے قیام فرمایا تھا اور یہیں آپ ﷺ نے ایک مسجد بنائی تھی جو مسجد قبا کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کی فضیلت بہت زیادہ ہے، چنانچہ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا یہ صحیح ارشاد منقول ہے کہ "مسجد قبا میں نماز پڑھنا عمرہ ادا کرنے کے مانند ہے"۔

جلیل القدر اور باعظمت صحابی حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ بیت المقدس میں دو مرتبہ حاضری دینے سے زیادہ میں اسے پسند کرتا ہوں کہ مسجد قبا میں نماز پڑھوں اور اگر لوگ جان لیں کہ مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا کتنا ثواب ہے تو وہ سفر کی مصیبت و مشقت

جھیل کر دور دراز سے اس مسجد میں آنے لگیں۔

بہر حال۔ آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ ہر ہفتہ کے روز مسجد قبا جاتے تھے اور اس میں دو رکعت تحیۃ المسجد یا کوئی دوسری نماز جو تحیۃ المسجد کے قائم مقام ہوتی ہوگی پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ کے اس مبارک عمل سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہفتہ کے روز علماء و صلحاء اور بزرگوں سے ملاقات کرنا سُنّت ہے۔

⑦ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ مَسَاجِدُھَا وَاَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ اَسْوَاقُھَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، خدا کے نزدیک تمام شہروں میں محبوب و پسندیدہ مقامات مساجد ہیں اور بدترین و ناپسندیدہ مقامات بازار ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: مسجدیں خدا کی عبادت کرنے کی جگہ ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مساجد محبوب و پسندیدہ مقامات ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں ہوتا ہے خداوند قدوس اس پر اپنی رحمت کا سایہ کرتا ہے اور اسے خیر و بھلائی کی سعادت سے نوازتا ہے اس کے مقابلہ میں بازار وہ جگہ ہے جہاں شیطان کا سب سے زیادہ تسلط رہتا ہے۔ حرص و طمع، خیانت و بددیانتی، جھوٹ اور خدا کی یاد سے غفلت وہ چیزیں ہیں جو بازار کا جزو لاینفک اور شیطان کی خوشی کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ خدا کے نزدیک بازار بدترین و ناپسندیدہ مقامات ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی ناگزیر ضروریات کی تکمیل کے علاوہ محض سیر و تفریح کی غرض سے بازاروں میں رہتا ہے اس پر محرومی و برائی کا سایہ رہتا ہے اور وہ خدا کی رحمت سے دور ہوتا ہے۔

یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ بت خانے، شراب خانے، اور چکلے وغیرہ تو بازار سے بھی بدترین ہیں پھر انہیں خدا کے نزدیک ناپسندیدہ اور مبغوض ترین مقامات کیوں نہیں کہا گیا ہے؟ بازار کو کیوں کہا گیا ہے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بازاروں کو قائم کرنے کا حکم شارع کی جانب سے ہے اور یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو بنانے اور رکھنے کا حکم شارع کی جانب سے نہیں ہے لہٰذا ارشاد کا مطلب یہ ہے جن مقامات کو بنانا اور قائم رکھنا جائز ہے ان میں بدترین اور ناپسندیدہ مقام بازار ہے۔

⑧ وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ بَنٰی لِلّٰہِ مَسْجِدًا بَنَی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جو شخص خدا کے لئے مسجد بناتا ہے تو خدائے تعالیٰ اس کے لئے جنت میں مکان بنا دیتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: خدا کے لئے مسجد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا حاصل کرنے کے لئے مسجد بناتا ہے، نہ کہ لوگوں کو دکھانے سنانے کے لئے اور اپنا نام پیدا کرنے کے لئے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اس شخص کے لئے جنت میں مکان بنا دیتا ہے اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ جو شخص مسجد بنا کر اس پر اپنا نام لکھتا ہے تاکہ تشہیر کا ذریعہ بنے تو یہ اس کے عدم اخلاص کی دلیل ہے۔

لفظ مسجدًا میں تنکیر (عمومیت) تقلیل کے لئے ہے۔ یعنی اگرچہ کوئی شخص مسجد کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ بنائے اسے اس کا بدلہ اسی طرح دیا جائے گا۔ جس طرح کسی بڑی اور عالیشان مسجد بنانے والے کو۔ چنانچہ روایت میں یہ الفاظ ہیں اگرچہ وہ مسجد بٹیر کے گھونسلہ کی مانند ہو۔

یہ مسجد کی تنگی و اختصار میں مبالغہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تو نیت کو دیکھتا ہے اگر کوئی شخص دنیا کی شہرت اور نمائش کے جذبہ سے بالاتر ہو کر محض خدا کی رضا و خوشنودی کی غرض سے اور اپنی نیت کے پورے اخلاص کے ساتھ مسجد بناتا ہے تو وہ جنت میں خدا کی طرف سے ایک مکان کا حقدار ہوگا اگرچہ اس کی بنائی ہوئی مسجد کتنی چھوٹی اور مختصر کیوں نہ ہو۔

(۹) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ غَدَا اِلَی الْمَسْجِدِ اَوْرَاحَ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُ نُزُلَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ كُلَّمَا غَدَا اَوْرَاحَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جو شخص دن کے اول حصہ میں یا آخری حصہ میں مسجد جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی مہمان نوازی کا سامان تیار کرتا ہے خواہ وہ صبح کو جائے یا شام کو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسجد گویا خدا کا گھر ہے چنانچہ جو شخص مسجد میں جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی زیارت کرنے والوں کی ضیافت کرتا ہے اور انہیں اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھتا۔ مسجد میں جانے کی بہت سی نیتیں ہو سکتی ہیں ان میں سے ایک نیت یہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کی ابتداء میں حدیث انما الاعمال بالنیات کی تشریح کے ضمن میں نیت کے اس مسئلہ اور اس کی اقسام کو مفصل طریقہ سے ذکر کیا جا چکا ہے۔

(۱۰) وَعَنْ اَبِی مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْظَمُ النَّاسِ اَجْرًا فِی الصَّلٰوةِ اَبْعَدُهُمْ فأبعدهم مَمْشًی وَالَّذِیْ یَنْتَظِرُ الصَّلٰوةَ حَتّٰی یُصَلِّیَهَا مَعَ الْاِمَامِ اَعْظَمُ اَجْرًا مِنَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ ثُمَّ یَنَامُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، نماز کا سب سے زیادہ اجر اس شخص کو ملتا ہے۔ جو باعتبار مسافت کے سب سے زیادہ دور ہو (یعنی جس شخص کا گھر مسجد سے جتنا دور ہو گا اور وہ گھر سے چل کر نماز کے لئے مسجد آئے گا اسے اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا) اور جو شخص نماز کے انتظار میں مسجد کے اندر (بیٹھا) رہتا ہے تاکہ امام کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کا ثواب اس شخص سے زیادہ ہے جو (تنہا) اپنی نماز پڑھ کر سو جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے دوسرے جزو کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص نماز میں اس لئے تاخیر کرے کہ امام کے ساتھ نماز پڑھ سکے تو اسے اس شخص کے مقابلہ میں جو امام کا انتظار کئے بغیر تنہا نماز پڑھ کر سو جائے اگرچہ وہ وقت مختار ہی میں نماز کیوں نہ پڑھ لے زیادہ ثواب ملتا ہے اسی طرح ایک شخص تو وہ ہے جو چھوٹی اور مختصر جماعت کے ہمراہ نماز پڑھ لیتا ہے یا کسی امام کے ساتھ نماز ادا کر لیتا ہے جو درحقیقت امام بننے کا حق نہیں رکھتا اور دوسرا وہ شخص ہے جو انتظار کے بعد بڑی جماعت کے ہمراہ نماز پڑھتا ہے یا ایسے امام کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے جو امامت کا حق رکھتا ہے تو اس دوسرے شخص کو پہلے شخص کے مقابلہ میں خصوصاً جب وہ کسل و جلد بازی کے جذبہ سے ایسا کرتا ہے زیادہ ثواب ملے گا۔

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ خَلَتِ الْبِقَاعُ حَوْلَ الْمَسْجِدِ فَاَرَادَ بَنُوْ سَلِمَةَ اَنْ یَّنْتَقِلُوْا قُرْبَ الْمَسْجِدِ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُمْ بَلَغَنِیْ اَنَّكُمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَنْتَقِلُوْا قُرْبَ الْمَسْجِدِ قَالُوْا نَعَمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ اَرَدْنَا ذٰلِكَ فَقَالَ یَا بَنِیْ سَلِمَةَ دِیَارَكُمْ تُكْتَبْ اٰثَارُكُمْ دِیَارَكُمْ تُكْتَبْ اٰثَارُكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کے قریب کچھ مکان خالی ہوئے تو بنو سلمہ نے یہ ارادہ کیا کہ وہ مسجد کے قریب آجائیں۔ سرور کائنات ﷺ کو جب ان کے اس ارادہ کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ رکھتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ! ہم نے یہی ارادہ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، بنو سلمہ! تم اپنے مکانوں ہی میں رہو تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں تم اپنے مکانوں ہی میں رہو تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: بنو سلمہ انصار مدینہ کا ایک خاندان ہے اس خاندان کے افراد مسجد نبوی سے دور رہتے تھے۔ جب مسجد نبوی کے قریب رہنے والوں میں سے کچھ لوگوں کا انتقال ہو جانے یا کسی دوسری جگہ چلے جانے کی وجہ سے ان کے مکانات خالی ہوئے تو بنو سلمہ نے مسجد نبوی کے قریب رہنے کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے ان خالی مکانات میں منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔ جب آنحضرت ﷺ کو ان کے اس ارادہ کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اس وقت تم لوگ جہاں آباد ہو وہی جگہ سعادت و بھلائی کے اعتبار سے تمہارے لئے بہتر

ہے کیونکہ تم لوگ مسجد سے جتنا دور رہو گے مسجد آنے کے لئے تمہیں اتنا ہی چلنا پڑے گا اور نماز کے لئے تم جتنے زیادہ قدم اٹھاؤ گے تمہارے نامہ اعمال میں ان کے بدلے اتنا ہی ثواب لکھا جائے گا اس لئے بھلائی و بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنی سابق جگہ آباد رہو۔

(۱۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ اِمَامٌ عَادِلٌ وَشَابٌّ نَشَأَ فِیْ عِبَادَةِ اللّٰهِ وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ اِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتّٰی یَعُوْدَ اِلَیْهِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ اجْتَمَعَا عَلَیْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَیْهِ وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللّٰهَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ یَمِیْنُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، سات شخص ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اس روز (یعنی قیامت کے دن) اپنے سایہ میں رکھے گا جس روز خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ (۱) انصاف کرنے والا حاکم۔ (۲) وہ جوان جو اپنی جوانی کو خدا کی محبت میں صرف کر دے۔ (۳) وہ شخص جو مسجد سے نکلتا ہے تو جب تک وہ دوبارہ مسجد میں نہیں چلا جاتا اس کا دل مسجد میں لگا رہتا ہے۔ (۴) وہ دو شخص جو محض خدا کے لئے آپس میں محبت رکھتے ہیں اگر یکجا ہوتے ہیں تو خدا کی عبادت میں اور جدا ہوتے ہیں تو خدا کی محبت میں یعنی حاضر و غائب خالص لوجہ اللہ محبت رکھتے ہیں۔ (۵) وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے اور (خوف خدا سے) اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ (۶) وہ شخص جس کو کسی شریف النسب اور حسین عورت نے (برے ارادہ سے) بلایا ہو اور اس نے (اس کی خواہش کے جواب میں) کہہ دیا ہو کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ (۷) وہ شخص جس نے اس طرح مخفی طور پر صدقہ دیا ہو کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی نہ معلوم ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہاں ان سات خوش نصیب اشخاص کی وضاحت کی گئی ہے جو اپنے اعمال و کردار کی بناء پر قیامت کے روز میدان حشر میں خدا کے سایہ میں ہوں گے یعنی خداوند قدوس ان اشخاص کو اپنے دامن رحمت میں جگہ دے گا اور انہیں آخرت کی سختیوں سے بچائے گا۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ سایۂ خداوندی سے مراد عرش کا سایہ ہے۔ یعنی قیامت کے روز جب کہ تمام لوگ پریشان و حیران ہوں گے تو یہ سات اشخاص عرش کے سایہ میں رحمت خداوندی کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ساتواں شخص وہ ہے جو خدا کی راہ میں اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنا مال اتنی پوشیدگی سے خرچ کرتا ہے کہ جب وہ اپنے دائیں طرف کے آدمی کو کوئی چیز یعنی روپیہ پیسہ یا مال وغیرہ دیتا ہے تو اس کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے آدمی کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی اور اس طرح اس کے چھپانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کہیں ریا اور نمائش کا جذبہ نہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے ثواب سے محرومی رہے۔

بعض علماء نے اس کے حقیقی معنی ہی مراد لئے ہیں یعنی وہ شخص اتنے مخفی طریقہ سے صدقہ و خیرات کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ دائیں ہاتھ نے کس کو کیا دیا ہے؟ اس صورت میں یہ جملہ کمال پوشیدگی کے لئے کنایہ ہوگا۔

(۱۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةُ الرَّجُلِ فِی الْجَمَاعَةِ تُضَعَّفُ عَلٰی صَلَاتِهٖ فِیْ بَیْتِهٖ وَفِیْ سُوْقِهٖ خَمْسًا وَعِشْرِیْنَ ضِعْفًا وَذٰلِكَ اَنَّهٗ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ خَرَجَ اِلَی الْمَسْجِدِ لَا یُخْرِجُهٗ اِلَّا الصَّلٰوةُ لَمْ یَخْطُ خُطْوَةً اِلَّا رُفِعَتْ لَهٗ بِهَا دَرَجَةٌ وَحُطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِیْئَةٌ فَاِذَا صَلّٰی لَمْ تَزَلِ الْمَلَائِکَةُ تُصَلِّیْ عَلَیْهِ مَا دَامَ فِیْ مُصَلَّاهُ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَیْهِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ وَلَا یَزَالُ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلَاةٍ مَا انْتَظَرَ الصَّلَاةَ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ اِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ کَانَتِ الصَّلَاةُ تَحْبِسُهٗ وَزَادَ فِیْ دُعَاءِ الْمَلَائِکَةِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ اَللّٰهُمَّ تُبْ عَلَیْهِ مَا لَمْ یُؤْذِ فِیْهِ مَا لَمْ یُحْدِثْ فِیْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جماعت کے ساتھ آدمی کی نماز اس نماز سے جو گھر میں یا (تجارت وغیرہ کی مشغولیت کی بناء پر) بازار میں پڑھی جائے پچیس درجہ فضیلت رکھتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اچھی طرح (یعنی آداب و

شرائط کو ملحوظ رکھ کر) وضو کرتا ہے اور (کسی غرض کی وجہ سے نہیں بلکہ) صرف نماز ہی کے لئے مسجد آتا ہے تو وہ جو قدم اٹھاتا ہے اس کے ہر قدم کے عوض اس کے ثواب میں ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ کم ہو جاتا ہے (یہاں تک کہ وہ مسجد میں داخل ہو جاتا ہے) اور جب تک وہ نماز پڑھ کر اپنے مصلے پر بیٹھا رہتا ہے فرشتے برابر اس کے لئے یہ دعا کرتے رہتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ اے اللہ! اس کی بخشش کر! اے اللہ اس پر رحم کر، جب تک تم میں سے کوئی نماز کے انتظار میں رہتا ہے تو اس کا وہ وقت نماز ہی میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کوئی مسجد میں گیا اور نماز ہی کی وجہ سے وہاں رک گیا (تو گویا وہ نماز ہی میں ہے) اور فرشتوں کی دعاء میں یہ الفاظ زیادہ ہیں اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ اَللّٰهُمَّ تُبْ عَلَيْهِ (یعنی اے اللہ! اس بندہ کی بخشش فرما، اے اللہ اس کی توبہ قبول فرما) اور (یہ اس وقت تک ہوتا رہتا ہے) جب تک کہ وہ کسی (مسلمان) کو (اپنی زبان یا ہاتھ سے) ایذا نہ پہنچائے اور باوضو رہے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پچیس درجہ زیادہ ثواب کی فضیلت اسی وقت حاصل ہوگی جب کہ نماز باجماعت کے ساتھ اور مسجد میں پڑھی جائے۔ حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے نمازی کے حق میں خدا کی رحمت و برکت کی دعا اس وقت تک کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ مسلمان کو اپنے کسی عمل یا اپنے کسی قول سے ایذاء نہیں پہنچاتا۔ گویا فرشتوں کے دعا کرنے کے حق میں یہ حدیث معنوی ہے۔ اس کے بعد حدث ظاہری کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب تک نمازی باوضو رہے یعنی اگر کوئی نمازی کسی مسلمان کو ایذاء پہنچائے گا یا اس کا وضو ٹوٹ جائے گا تو فرشتے اس کے لئے رحمت و برکت اور مغفرت کی دعا نہیں کریں گے۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کی دعا کی فضیلت اسی وقت حاصل ہوگی جب کہ نمازی نماز پڑھ کر وہیں مصلی پر بیٹھا رہے اگر وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھے گا تو یہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔

بعض مشائخ اور بزرگ نماز پڑھ کر ریاء و نمائش وغیرہ کے خوف سے مصلی سے اٹھ جاتے ہیں اور کسی گوشہ وغیرہ میں بیٹھ کر ذکر و تسبیح میں مشغول ہو جاتے ہیں، گو ان کی نیت صحیح اور ان کا یہ طریقہ قابل جزاء و انعام ہے کہ انہیں ذکر و تسبیح کی فضیلت حاصل ہوتی ہے مگر نماز پڑھ کر مصلی ہی پر بیٹھے رہنے کی جو فضیلت ہے وہ انہیں حاصل نہیں ہوتی۔

⑭ وَعَنْ اَبِيْ اُسَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَاِذَا خَرَجَ فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو اسیدؓ[1] راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو۔ تو اسے یہ دعا پڑھنی چاہئے۔ اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ (اے اللہ! اپنی رحمت کے دروازے میرے لئے کھول دے) اور جب مسجد سے نکلے تو یہ دعا پڑھ لیا کرے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ (اے اللہ! میں تیرا ہی فضل چاہتا ہوں)۔" (مسلمؒ)

تشریح: پہلی دعا کا مطلب تو یہ ہے کہ اے اللہ! اس مقدس و محترم جگہ کی برکت سے یا اس مسجد میں نماز پڑھنے کی توفیق دینے کے سبب سے یا نماز کے حقائق ظاہر کرنے کے سبب سے مجھ پر اپنی رحمتوں، اپنی نوازشوں اور اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دے۔ دوسری دعا میں "فضل" سے مراد حلال رزق ہے کیونکہ نماز سے فارغ ہو کر بندہ اسباب معیشت ہی کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔

⑮ وَعَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يَجْلِسَ۔ (متفق علیہ)

---

[1] حضرت ابو اسید مالک بن ربیعہ کے صاحبزادے اور ساعدی انصاری ہیں، بدری صحابہ میں شامل اور سب سے بعد میں ۶۰ھ میں بعمر ۷۸ سال وفات پائی ۱۲۔

"اور حضرت ابوقتادہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو اسے چاہئے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی دلیل ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ تحیۃ المسجد یعنی مسجد میں داخل ہونے کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا واجب ہے اس لئے کہ اس حدیث میں امر وجوب کے لئے ہے۔ حنفیہ کے نزدیک چونکہ تحیۃ المسجد واجب نہیں مستحب ہے اس لئے وہ حضرات کہتے ہیں کہ یہاں امر (حکم) وجوب کے لئے نہیں بلکہ استحباب کے لئے ہے۔

(۱۶) وعن كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْدِمُ مِنْ سَفَرٍ اِلَّا نَهَارًا فِي الضُّحٰى فِاِذَا قَدِمَ بَدَأَ بِالْمَسْجِدِ فَصَلّٰى فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت کعب ابن مالکؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ (کی عادت تھی کہ) جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو چاشت کے وقت آتے اور سب سے پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے اور وہاں دو رکعت نماز پڑھ کر (تھوڑی دیر تک) بیٹھے رہتے۔ (پھر مکان میں تشریف لے جاتے)" (بخاری و مسلم)

تشریح: سفر سے واپسی کے بعد آپ ﷺ مسجد میں دو رکعت نماز پڑھ کر وہاں تھوڑی دیر تک اس لئے بیٹھے رہتے تھے تاکہ وہ صحابہ کرام جو آپ ﷺ کی عدم موجودگی کی وجہ سے آپ ﷺ کی صحبت سے محروم رہتے تھے۔ اس موقعہ پر آپ ﷺ سے شرف ملاقات اور آپ ﷺ کی خدمت کی سعادت حاصل کر سکیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسافر کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ سفر سے واپس آکر گھر جانے سے پہلے اول مسجد میں آکر نماز پڑھے اور تھوڑی دیر تک وہاں بیٹھا رہے۔

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمِعَ رَجُلًا يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَيْكَ فَاِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص یہ سنے (یا دیکھے) کہ کوئی شخص مسجد میں اپنی کوئی گم شدہ چیز تلاش کر رہا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے جواب میں یہ کہہ دے کہ خدا کرے تیری گم شدہ چیز تجھے نہ ملے۔ اس لئے کہ مسجدوں کو اس لئے نہیں بنایا گیا ہے (کہ ان میں جا کر گم شدہ چیزوں کو تلاش یا دریافت کیا جائے)۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس سلسلہ میں بظاہر تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے موقعہ پر یہ کلمات اس شخص کی تنبیہ و توبیخ کے لئے صرف زبان سے ادا کئے جائیں دل سے بددعا نہ کی جائے اور نہ در حقیقت یہ خواہش ہو کہ ایک مسلمان کی گمشدہ چیز اسے واپس نہ ملے۔ اور اگر کوئی شخص در حقیقت دلی خواہش یہی رکھتا ہے کہ ایسے شخص کو اس کی گم شدہ چیز نہ ملے تاکہ آئندہ کے لئے اسے عبرت ہو اور اپنے اس نامناسب فعل کی سزا پائے اور یہ کہ پھر آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کرنے پائے تو ایک حد تک یہ بھی صحیح ہوگا۔

اس سلسلہ میں مسجد کی عظمت و تقدس کا تقاضا تو یہ ہے کہ صرف گم شدہ چیز تلاش کرنے ہی کی تخصیص نہیں بلکہ ہر وہ چیز ممنوع ہے جس کو اختیار کرنا مسجد کی بناء و غرض کے منافی ہو جیسے خرید و فروخت وغیرہ۔ چنانچہ عہد سلف کے بعض علماء اسی بناء پر کہ مسجدیں صرف خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہیں اور کسی مقصد کی تکمیل کے لئے نہیں مسجد میں کسی سائل کو صدقہ وغیرہ دینا بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

(۱۸) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ الْمُنْتِنَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَاَذّٰى مِمَّا يَتَاَذّٰى مِنْهُ الْاِنْسُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جو شخص کہ اس بدبودار درخت (یعنی پیاز، لہسن وغیرہ) میں سے کچھ کھائے تو

ہمارے مسجد کے قریب بھی نہ آئے کیونکہ جس (بدبو) سے انسان کو تکلیف ہوتی ہے اس سے فرشتوں کو بھی تکلیف پہنچتی ہے۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح بدبودار چیزوں سے انسانوں کو تکلیف پہنچتی ہے اسی طرح فرشتے بھی ان سے تکلیف محسوس کرتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ پیاز و لہسن وغیرہ کھا کر مسجدوں میں نہ آئیں کیونکہ مسجد میں فرشتوں کے حاضر ہونے کی جگہیں ہیں اس لئے انہیں تکلیف ہوگی اس حکم میں ہر وہ چیز داخل ہے جو بدبودار ہو اس کا تعلق خواہ کھانے پینے سے ہو یا رہن سہن سے مثلاً منہ غلاظت و بدبو، بغل وغیرہ کی گندگی و تعفن وغیرہ وغیرہ۔ پھر مسجد ہی کی طرح ان دوسری جگہوں کا بھی یہی حکم ہے جہاں مجالس عبادت و وعظ منعقد ہوتی ہوں یا جہاں قرآن و حدیث کی تعلیم ہوتی ہو یا جہاں ذکر و تسبیح کے حلقے ہوتے ہوں کہ ان مقامات پر بھی بدبودار چیزوں کے ہمراہ نہ جانا چاہئے۔

(۱۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْبُزَاقُ فِی الْمَسْجِدِ خَطِیْئَۃٌ وَکَفَّارَتُھَا دَفْنُھَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس تھوک کو زمین میں دبا دیا جائے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مسجد کے تقدس و احترام کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں تھوک کر گندگی و غلاظت نہ پھیلائی جائے اور اگر اتفاقاً ایسی غلطی کا ارتکاب ہو جائے تو اس گناہ کے دفعیہ کا طریقہ یہ ہے کہ اس تھوک کو زمین دوز کر کے اسے دور کر دیا جائے۔

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عُرِضَتْ عَلَیَّ اَعْمَالُ اُمَّتِیْ حَسَنُھَا وَسَیِّئُھَا فَوَجَدْتُ فِیْ مَحَاسِنِ اَعْمَالِھَا الْاَذٰی یُمَاطُ عَنِ الطَّرِیْقِ وَوَجَدْتُ فِیْ مَسَاوِیْ اَعْمَالِھَا النُّخَاعَۃَ تَکُوْنُ فِی الْمَسْجِدِ لَا تُدْفَنُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ میرے سامنے میری اُمت کے اچھے برے اعمال پیش کئے گئے میں نے اس کے نیک اعمال میں تو راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کر دینا پایا اور برے اعمال میں مسجد کے اندر تھوکنا دیکھا جس کو دبایا نہ گیا ہو۔" (مسلم)

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اَحَدُکُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَلَا یَبْصُقْ اَمَامَہٗ فَاِنَّمَا یُنَاجِی اللّٰہَ مَادَامَ فِیْ مُصَلَّاہُ وَلَا عَنْ یَمِیْنِہٖ فَاِنَّ عَنْ یَمِیْنِہٖ مَلَکًا وَلْیَبْصُقْ عَنْ یَسَارِہٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِہٖ فَیَدْفِنُھَا۔ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ سَعِیْدٍ تَحْتَ قَدَمِہِ الْیُسْرٰی۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہو تو اسے چاہئے کہ اپنے سامنے نہ تھوکے اس لئے کہ وہ جب تک نماز کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے مناجات (سرگوشی) کرتا ہے اور اسے اپنے دائیں طرف بھی نہ تھوکنا چاہئے کیونکہ دائیں طرف ایک فرشتہ ہوتا ہے ہاں بائیں طرف یا قدموں کے نیچے تھوک لے اور پھر اسے زمین میں دبا دے۔ ابوسعید کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ بلکہ اپنے بائیں قدم کے نیچے تھوک لے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں نمازی کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے سرگوشی کرتا ہے لہٰذا جس طرح اس موقع پر وہ شخص اپنے مالک کی عزت احترام کے تمام آداب کو ملحوظ رکھتا ہے اسی طرح نمازی کے لئے بھی واجب ہے کہ جب وہ اپنے پروردگار حقیقی کے سامنے نماز کے لئے کھڑا ہو تو حضوری کے تمام شرائط و آداب کا پورا پورا خیال رکھے۔ اور اس سلسلہ میں ایک اہم ادب یہ ہے کہ اپنے سامنے نہ تھوکے، گو خداوند قدوس کی ذات پاک جہت و سمعت کی قیود سے پاک ہے تاہم سامنے نہ تھوکنے کی قید لگا کر

آداب حضوری کے راستہ سے روشناس کرایا جارہا ہے کہ پروردگار عالم کے دربار میں حاضری کے وقت ایسا کوئی طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ جو رب ذوالجلال کی شان عظمت و کبریائی کے منافی ہو۔

"فرشتہ" سے مراد یا کراماً کاتبین کے علاوہ وہ فرشتہ ہے جو خاص طور پر نماز کے وقت نمازی کی تائید اور اس کی رہبری اور اس کی دعا پر آمین کہنے کے لئے حاضر ہوتا ہے، لہٰذا نمازی پر واجب ہے کہ اس فرشتے کی مہمانی کا خیال کرتے ہوئے کراماً کاتبین سے زیادہ اس کا اکرام و احترام کرے کیونکہ کراماً کاتبین تو ہر وقت ہی ساتھ رہتے ہیں اور اس کے اکرام و احترام کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ دوران نماز اپنی دائیں طرف نہ تھوکے کہ یہ فرشتہ اسی سمت رہتا ہے۔

یا پھر "فرشتہ" سے مراد کراماً کاتبین ہے کہ اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ آپ ﷺ نے صرف دائیں طرف تھوکنے سے اس لئے منع فرمایا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ دائیں طرف کا فرشتہ جو بندہ کے نیک اعمال لکھنے پر مقرر ہے بائیں طرف کے فرشتہ سے جو بندہ کے برے اعمال لکھنے پر متعین ہے رتبہ کے اعتبار سے زیادہ افضل ہے جس طرح کہ دائیں سمت بائیں سمت سے افضل ہوتی ہے یا رحمت کا فرشتہ عذاب کے فرشتہ سے زیادہ افضل ہوتا ہے۔

(۲۲) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ لَمْ يَقُمْ مِنْهُ لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے اس بیماری میں جس سے اٹھ نہ سکے (یعنی مرض وفات میں) فرمایا۔ عیسائیوں اور یہودیوں پر خدا کی لعنت ہو انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: سرکار دوعالم ﷺ کا پیمانہ حیات جب لبریز ہونے لگا اور آپ ﷺ کو یقین ہو گیا کہ اب اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آگیا ہے تو آپ ﷺ نے اس خوف سے کہ مبادا میری اُمت کے لوگ بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنائیں اس فعل شنیع کی ممانعت کا اظہار یہودیوں اور عیسائیوں پر لعنت کرتے ہوئے فرمایا کیونکہ ان امتوں کے لوگ اپنے انبیاء کی قبروں پر سجدہ کیا کرتے ہیں۔

قبروں کو سجدہ گاہ بنانا دو طریقوں سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ صاحب قبر یا محض اپنی قبر کی عبادت و پرستش کے مقصد سے قبروں پر سجدہ کیا جائے جیسا کہ بت پرست بتوں کو پوجتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سجدہ تو قبر کو کیا جائے مگر اس سے مقصد خدا تعالیٰ ہی کی عبادت و پرستش ہو اور یہ اعتقاد ہو کہ اس طرح قبر کی طرف نماز پڑھنا اور سجدہ کرنا درحقیقت پروردگار حقیقی کی عبادت کرنا ہے اور یہ کہ اس طریقہ سے پروردگار کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور اس کا قرب میسر ہوتا ہے۔ یہ دونوں طریقے غیر مشروع اور خدا اور رسول کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں۔ پہلا طریقہ تو صریحاً کفر و شرک ہے۔ دوسرا طریقہ بھی حرام ہے کیونکہ اس میں خدا کی پرستش و عبادت میں دوسرے کو شریک کرنا لازم آتا ہے اگرچہ شرک خفی ہے یہ دونوں طریقے خدا کی لعنت کا سبب ہیں۔

یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ نبی کی قبر یا کسی بزرگ و ولی کی قبر کی طرف از راہ بزرگ و تعظیم نماز پڑھنا حرام ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(۲۳) وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلَا وَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّيْ اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جندبؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ آگاہ رہو! تم سے پہلے (یعنی دوسری امتوں کے) لوگوں نے اپنے انبیاء اور اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ لہٰذا خبردار! تم لوگ قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔" (مسلمؒ)

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اجْعَلُوْا فِیْ بُیُوْتِکُمْ مِنْ صَلَاتِکُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْھَا قُبُوْرًا۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ تم کچھ نمازیں اپنے گھروں میں بھی پڑھ لیا کرو اور گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: "گھروں کو قبریں نہ بنانے" کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھروں میں قبریں نہ بناؤ اور اپنے کسی مردہ کو گھر کے اندر دفن نہ کر دیا کرو اس سے یہ مراد ہے کہ قبروں کو گھروں کی مانند نہ سمجھو یعنی جس طرح کسی حاجت و ضرورت کے وقت لوگ اپنے گھروں ہی کا رخ کرتے ہیں تاکہ اس حاجت و ضرورت کو پوری کر سکیں۔ اسی طرح اگر کسی کو کوئی حاجت و ضرورت در پیش ہو تو وہ قبروں پر دوڑا ہوا نہ چلا جائے اور صاحب قبر سے مرادیں نہ مانگنے لگے بلکہ جب کوئی حاجت و ضرورت در پیش ہو تو خدا ہی سے مانگے اور اسی کے سامنے دست سوال دراز کرے کہ سب اسی کے محتاج ہیں یہاں تک کہ جس پیر و صاحب قبر کو حاجت روا اور مرادیں پوری کرنے والا سمجھا جاتا ہے وہ بھی خدا ہی کے رحم و کرم اور اس کے فضل کا محتاج ہے۔ یا پھر اس سے یہ مراد ہے کہ جس طرح مقبروں میں نماز نہیں پڑھی جاتی اسی طرح اپنے گھروں کو بھی بے ذکر الٰہی نہ چھوڑو بلکہ اپنے گھروں میں بھی نمازیں پڑھا کرو تاکہ نماز اور ذکر الٰہی کی برکت سے گھر میں رحمت خداوندی کا نزول ہو۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ سوائے فرض نماز کے سُنّت و نوافل وغیرہ مسجد کی بہ نسبت گھروں میں پڑھنا زیادہ افضل ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَۃٌ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔" (ترمذی)

تشریح: اس حدیث کا تعلق مدینہ منورہ کے باشندوں سے ہے کیونکہ مدینہ منورہ سے قبلہ جانب جنوب واقع ہے نیز اس حدیث کا تعلق ان اطراف کے لوگوں سے بھی ہے جن کا قبلہ مدینہ کے موافق جانب جنوب واقع ہے لہٰذا اس اعتبار سے ان لوگوں کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان ہوا۔

(۲۶) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِیٍّ قَالَ خَرَجْنَا وَفْدًا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَبَایَعْنَاہُ وَصَلَّیْنَا مَعَہٗ وَاَخْبَرْنَاہُ اَنَّ بِاَرْضِنَا بِیْعَۃً لَنَا فَاسْتَوْھَبْنَاہُ مِنْ فَضْلِ طَھُوْرِہٖ فَدَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ وَتَمَضْمَضَ ثُمَّ صَبَّہٗ لَنَا فِیْ اِدَاوَۃٍ وَاَمَرَنَا فَقَالَ اخْرُجُوْا فَاِذَا اَتَیْتُمْ اَرْضَکُمْ فَاکْسِرُوْا بِیْعَتَکُمْ وَانْضَحُوْا مَکَانَھَا بِھٰذَا الْمَاءِ وَاتَّخِذُوْھَا مَسْجِدًا قُلْنَا اِنَّ الْبَلَدَ بَعِیْدٌ وَالْحَرُّ شَدِیْدٌ وَالْمَاءُ یُنْشَفُ فَقَالَ مُدُّوْہُ مِنَ الْمَاءِ فَاِنَّہٗ لَا یَزِیْدُہٗ اِلَّا طِیْبًا۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت طلق ابن علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک جماعت کی شکل میں سرور کائنات ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم سب نے آپ ﷺ سے (اسلام کی) بیعت کر کے آپ ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھی اور پھر یہ بھی عرض کر دیا کہ ہماری سرزمین پر ہمارا ایک گرجا بنا ہوا ہے (اس کو کیا کریں؟) اس کے بعد ہم نے آپ ﷺ کے وضو کا بچا ہوا پانی مانگا۔ آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور وضو کیا اور (وضو کے بعد بقیہ پانی سے) کلی کی اور اس کلی کا پانی ہماری چھاگل میں ڈال دیا اور فرمایا کہ جاؤ! اور جب تم اپنے ملک میں پہنچو تو اس گرجے کو توڑ کر اس کی جگہ پانی چھڑک دینا (تاکہ دین و اسلام کے انوار و برکات وہاں پھیل جائیں) اور پھر وہاں مسجد بنا لینا۔ ہم نے عرض کیا کہ ہمارا شہر تو بہت دور ہے اور گرمی سخت ہے لہٰذا یہ پانی (وہاں پہنچتے پہنچتے) خشک ہو جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں اور پانی ملا لینا اس سے اس کی پاکیزگی و برکت ہی میں اضافہ ہو گا۔" (نسائی)

تشریح: "بیعة" نصاریٰ کے عبادت خانہ کو کہتے ہیں جسے ہمارے یہاں گرجا کہا جاتا ہے۔ یہ حضرات جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے تھے نصاریٰ قوم سے تھے چنانچہ جب یہ لوگ ایمان و اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہو گئے تو ان کی خواہش ہوئی کہ اپنے گرجا کو جو پہلے مذہب کی یادگار عبادت گاہ ہے توڑ ڈالیں اور اس جگہ برکت حاصل کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کے وضو کا بچا ہوا دھان مقدس سے نکلا ہوا متبرک پانی چھڑک ڈالیں تاکہ اس جگہ ایک دوسرے مذہب کی عبادت گاہ ہونے کی وجہ سے وہاں کفرو شرک کے جو جراثیم پیدا ہو گئے ہیں وہ اس پانی کی برکت سے ختم ہو جائیں اور وہاں دین اسلام کے فیوض و برکات پھیل جائیں۔ چنانچہ لفظ فاستو ھبناہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر دھوپ و گرمی کی شدت اور طویل مسافت کی وجہ سے یہ پانی خشک ہونے لگے اور تمہیں اس بات کا خدشہ ہو کہ منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے یہ پانی بالکل ہی خشک ہو جائے گا تو اس پانی میں دوسرا پانی ملا لینا لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اور پانی ملا لینے سے اس پانی کی برکت و فضیلت ختم ہو گئی ہے یا کم ہو گئی ہے بلکہ یہ تو پہلا پانی جو چھاگل میں تھا بعد میں ڈالے جانے والے اس پانی میں خیر و برکت کی زیادتی کرے گا یا پھر بعد میں ڈالے جانے والے اس دوسرے پانی میں منجاب اللہ یہ شرف و فضیلت پیدا ہو جائے گی کہ اس پانی کی وجہ سے چھاگل میں موجود پہلے پانی میں مزید خیر و برکت ہو جائے گی اور حاصل یہ کہ مزید پانی ملا لینے سے خیر و برکت زیادہ ہی ہوگی کم نہ ہوگی یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آب زمزم کو باعث خیر و برکت جاننا اور پھر اسے بطور تبرک دوسری جگہ لے جانا جائز ہے۔

نیز اس پر قیاس کیا جاتا ہے کہ علماء و مشائخ اور اولیاء اللہ کے جھوٹے کھانے اور پانی یا ان کے بدن کے اترے ہوئے کپڑوں کو خیر و برکت کا باعث جاننا اور انہیں متبرک سمجھ کر استعمال کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں حدود شرع سے تجاوز نہ ہو یعنی ان چیزوں کو متبرک و مقدس سمجھ کر ان کی حدیث سے زیادہ تعظیم و تکریم یا نعوذ باللہ ان کی پرستش نہ ہونے لگے۔

(۲۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبِنَاءِ الْمَسْجِدِ فِي الدُّوْرِ وَاَنْ يُنَظَّفَ وَيُطَيَّبَ۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے محلوں میں مسجد بنانے کا حکم فرمایا ہے اور یہ کہ (وہ مسجدیں) پاک و صاف رکھی جائیں اور ان میں خوشبوئیں رکھی جائیں۔" (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محلوں میں مسجدیں بنانا اشد ضروری ہیں کیونکہ مسجدوں کا قیام نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی دینی و مذہبی حمیت اور قومی و ملی بیداری کا ثبوت ہے بلکہ ان کی وجہ سے اہل محلہ پر خدا کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ لیکن اتنی بات سمجھ لیجئے کہ مسجدوں کو محض بنا ڈالنا ہی ایمانی حرارت اور دینی و مذہبی بیداری کا ثبوت نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ مسجدوں کو آباد بھی رکھا جائے۔ وہاں کسی قسم کی کوئی غلاظت و گندگی نہ ڈالی جائے اور نہ وہاں رہنے دی جائے اور اگر بتی وغیرہ خوشبوؤں کے ذریعہ انہیں معطر رکھا جائے۔ اور اگر ان چیزوں کے کرنے کے وقت اس مقدس و محترم جگہ کی تعظیم و تکریم کی نیت کی جائے اور یہ نیت بھی کی جائے کہ پاکی و صفائی اور خوشبو کی وجہ سے مسجد میں آنے والے فرشتے اور مسلمان بھائی خوش ہوں گے تو ثواب میں بہت زیادتی ہوگی۔

(۲۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اُمِرْتُ بِتَشْيِيْدِ الْمَسَاجِدِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَتُزَخْرِفُنَّهَا كَمَا زَخْرَفَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ مجھ کو مسجدوں کے بلند کرنے اور آراستہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جس طرح یہود و نصاریٰ (اپنے عبادت خانوں کی) زینت کرتے ہیں اسی طرح تم بھی (مساجد) کی زینت کرو گے۔" (ابوداؤد)

تشریح: زخرف کہتے ہیں ملمع اور کسی چیز کی کمال خوبی کو حضرت ابن عباسؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ لوگ مسجدوں میں نقش و نگار کریں گے اور ان کے در و دیوار پر سونا چڑھائیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول آنحضرت ﷺ کے بعد حسب عادت، انسانی لوگوں کے افعال کی خبر دینے کے مترادف ہے یعنی آئندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو مسجدوں کو منقش و مزین کریں گے، اور ان کے در و دیوار پر سونا چڑھائیں گے حالانکہ ان کا یہ طریقہ خلاف سُنّت ہوگا کیونکہ اسلام کی سادگی پسند فطرت اس قسم کی چیزوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ دوسرے یہ کہ اس طریقہ سے یہود و نصاریٰ کی مشابہت ہوتی ہے۔

متاخرین علماء نے مساجد کی زیب و زینت اور ان میں نقش و نگار کی اجازت دی ہے اور کہا ہے کہ لوگ اپنے مکانوں کو بلند و مطلا بناتے ہیں اور انہیں منقش و مزین کرتے ہیں اگر مسلمان اپنی مسجدوں کو لکڑی و مٹی سے بالکل سادہ بنائیں تو ہوسکتا ہے کہ عوام کی نظروں میں ان کی وقعت و عظمت نہ ہو اس لئے مسجدوں کو ایسے ڈھنگ سے بنانے کی اجازت دے دی گئی ہے جو موجودہ زمانہ کے معیار پر رفیع و محترم سمجھی جائیں۔

مسجد نبوی زمانہ رسول اللہ ﷺ بالکل سادہ اور کچی تھی دیواریں اینٹوں کی اور چھت کھجور کی ٹہنیوں کی تھی اور اس کے ستون کھجور کی لکڑی کے تھے، پھر جب حضرت عمرؓ نے اس کو دوبارہ بنوایا تو انہوں نے بھی اسی طرح مسجد کو سادہ رکھا۔ اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دور خلافت میں اس مسجد کو از سر نو نئے طرز پر تعمیر کروایا چنانچہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسجد کو وسیع تر بنا دیا بلکہ اس کی دیواروں میں منقش پتھر اور چھت میں سال استعمال کیا اس طرح مسجد نبوی آنحضرت ﷺ کے زمانہ کے مقابلہ میں بہت بڑی اور خوبصورت ہوگئی۔

(۲۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يَّتَبَاهَى النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ۔
(رواہ ابوداؤد، والنسائی و الدارمی وابن ماجہ)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ مساجد کے بارہ میں فخر کیا کریں گے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قرب قیامت میں لوگ بڑی بڑی مسجدیں بنائیں گے اور انہیں آراستہ کریں گے اور اس سے ان لوگوں کا مقصد خدا کی رضا و خوشنودی اور ان کی نیت خالصۃ للہ نہیں ہوگی بلکہ ان کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اپنے اس کارنامے کو دنیا کے سامنے پیش کر سکیں اور دنیا والے ان کی تعریف و بڑائی میں زمین و آسمان کی قلابے ملا دیں۔

(۳۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرِضَتْ عَلَيَّ اُجُوْرُ اُمَّتِيْ حَتّٰى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعُرِضَتْ عَلَيَّ ذُنُوْبُ اُمَّتِيْ فَلَمْ اَرَ ذَنْبًا اَعْظَمَ مِنْ سُوْرَةٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اَوْ اٰيَةٍ اُوْتِيْهَا رَجُلٌ ثُمَّ نَسِيَهَا۔
(رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ میری اُمّت کے ثواب میرے سامنے پیش کئے گئے۔ یہاں تک کہ اس کوڑے اور خاک کا ثواب بھی (پیش کیا گیا) جسے کسی آدمی نے مسجد سے (جھاڑ و دے کر) نکالا ہو، نیز میرے سامنے میری اُمّت کے گناہ بھی پیش کئے گئے۔ ان گناہوں میں مجھ کو اس سے بڑا کوئی گناہ نظر نہیں آیا کہ کسی کو قرآن کی کوئی سورت یا آیت یاد ہو پھر اس نے اس کو بھلا دیا ہو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: کسی کو قرآن کی سورت یا آیت کا یاد ہو جانا خدا کی بڑی نعمت ہے اور جس نے یاد کر کے اسے بھلا دیا گویا اس شخص نے اس نعمت کی سخت بے قدری و ناشکری کی اور اس کی قدر نہ جانی لہٰذا ایسا شخص سخت گناہ گار ہوگا۔

(۳۱) وَعَنْ بُرَیْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَشِّرِ الْمَشَّائِیْنَ فِی الظُّلَمِ اِلَی الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّامِّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَ اَبُوْدَاوٗدَ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ وَ اَنَسٍ۔

"اور حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جو لوگ اندھیرے میں مسجدوں کی طرف جاتے ہیں انہیں یہ خوشخبری پہنچا دو کہ قیامت کے دن (اس کے سبب سے) ان کو کامل روشنی نصیب ہوگی۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا۔ (التحریم ۶۶:۸)

"ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا (اور) یوں دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے اس نور کو اخیر تک رکھیے۔"

(۳۲) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَأَیْتُمُ الرَّجُلَ یَتَعَاهَدُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوْا لَهٗ بِالْاِیْمَانِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جب تم کسی شخص کو مسجد کی خبر گیری کرتے ہوئے دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو اس لئے کہ ارشاد ربانی ہے۔ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اللہ کی مسجدوں کو وہی شخص آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم اگر کسی ایسے شخص کو دیکھو جو اللہ کے گھر کی خبر گیری کرتا ہو یعنی اس کی حفاظت و مرمت کرتا ہے اس میں جھاڑو وغیرہ دے کر اس کی صفائی و ستھرائی رکھتا ہے اس میں نماز پڑھتا ہے اور عبادت کرتا ہے اور اس میں دینی علوم کے درس و تدریس میں مشغول رہتا ہے تو تم اس کے حق میں گواہی دو کہ وہ مرد مؤمن اور خدا اور رسول کا اطاعت شعار و فرمانبردار بندہ ہے۔

(۳۳) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ائْذَنْ لَنَا فِی الْاِخْتِصَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ خَصٰی وَلَا اخْتَصٰی اِنَّ خِصَاءَ اُمَّتِی الصِّیَامُ فَقَالَ ائْذَنْ لَنَا فِی السِّیَاحَةِ فَقَالَ اِنَّ سِیَاحَةَ اُمَّتِی الْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَقَالَ ائْذَنْ لَنَا فِی التَّرَهُّبِ فَقَالَ اِنَّ تَرَهُّبَ اُمَّتِی الْجُلُوْسُ فِی الْمَسَاجِدِ اِنْتِظَارَ الصَّلٰوةِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عثمان[1] ابن مظعونؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مجھ کو خصی (نامرد) ہونے کی اجازت دیجئے (تاکہ زنا میں مبتلا ہونے کا خدشہ نہ رہے) آپ ﷺ نے فرمایا۔ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے (یعنی ہماری سُنّت کے راستہ سے ہٹا ہوا ہے) جو کسی کو خصی کرے یا خود خصی ہو جائے (بلکہ) میری اُمّت کے لئے خصی ہونا روزہ رکھنا ہے (کیونکہ روزہ رکھنے سے شہوت جاتی رہتی ہے) حضرت عثمانؓ نے عرض کیا کہ پھر مجھے سیر و سیاحت کی اجازت عنایت فرمائی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ میری اُمّت کی سیاحی یہی ہے کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کیا جائے۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ اچھا تو پھر مجھے راہب بننے کی اجازت دے دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میری اُمّت کا راہب بننا یہی ہے کہ مسجدوں میں نمازوں کے انتظار میں بیٹھا جائے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: حضرت عثمان ابن مظعون کی خواہش یہ تھی کہ وہ ایسے طریقے اختیار کریں کہ جس سے دنیا کی لذتوں، نفسانی خواہشات اور شیطانی حرکات میں نہ مبتلا ہو سکیں تاکہ خدا کی رضا و خوشنودی حاصل ہو، چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس بات کی

---

[1] اسم گرامی عثمان بن مظعون اور کنیت ابوسائب ہے۔ جلیل القدر صحابی اور چودھویں مرد مسلمان ہیں۔ ہجرت حبشہ میں وہ اور ان کے صاحبزادے سائبؓ شامل تھے اور ہجرت مدینہ میں شریک ہوئے مہاجرین میں سے پہلے صحابی ہیں جنہوں نے مدینہ میں ۲ھ میں وفات پائی، آنحضرتؐ نے آپ کی نعش کو بوسہ دیا تھا۔

اجازت طلب کی کہ وہ اپنی قوت مردمی کو ختم کر کے بالکل نامرد بن جائیں تاکہ زنا جیسے بڑے گناہ میں ملوث ہونے کا خدشہ نہ رہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی اس خواہش کو انسانی فطرت اور اسلامی روح کے منافی سمجھتے ہوئے انہیں اس فعل سے باز رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اگر تم یہی چاہتے ہو کہ نفسانی خواہشات ختم ہو جائیں اور روحانی و عرفانی جذبات غالب رہیں تو اس کا آسان علاج یہ ہے کہ روزہ رکھا کرو کیونکہ روزہ شہوت کو ختم کرتا ہے اور تعلق مع اللہ کے جذبات کو جلا بخشتا ہے۔ پھر انہوں نے سیر و سیاحت کی اجازت طلب کی تاکہ اس مشغلہ سے نفسانی خواہشات میں کمی آجائے۔ آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا کہ کیونکہ زمین پر گھومنا پھرنا اور دور دراز کا سفر اختیار کرنا صرف جہاد فی سبیل اللہ میں مطلوب و محمود ہے، محض سیر و سیاحت کی خاطر خواہ مخواہ دنیا کے چکر کاٹنا جیسا کہ بعض فقیر قسم کے لوگ کرتے ہیں کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی اخروی منفعت و بھلائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے راہب بن جانے کی خواہش ظاہر کی جیسا کہ اہل کتاب میں وہ لوگ جو دیندار اور مذہبی قسم کے ہوتے ہیں دنیاوی علائق سے گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں اور دنیا کی تمام لذتوں اور مشغولیات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ نہ عورتوں کے پاس جاتے ہیں اور نہ دوسرے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کی اس خواہش کو بھی رد کر دیا کیونکہ رہبانیت اہل کتاب کا شیوہ ہے یہ اسلام کی تعلیمات اور اسلام کی فطرت کے بالکل منافی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہماری اُمّت میں رہبانیت صرف اسی قدر ہے کہ مسجدوں میں نمازوں کے انتظار میں بیٹھا جائے کیونکہ اس طرح تمام لوگوں اور دنیا کی تمام چیزوں سے منہ پھیر کر پروردگار کی طرف توجہ ہوتی ہے اور اس پر بے شمار اجر و انعام ملتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اہل کتاب کی جو رہبانیت ہے وہ بالکل بے فائدہ اور بے کار محض ہے کہ اس کا انجام دینی اور دنیوی اعتبار سے اچھا نہیں ہوتا۔

(۳۴) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَائِشٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَيْتُ رَبِّي عَزَّوَجَلَّ فِي اَحْسَنِ صُوْرَةٍ قَالَ فِيْمَا يَخْتَصِمُ الْمَلَاُ الْاَعْلٰى قُلْتُ اَنْتَ اَعْلَمُ قَالَ فَوَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ فَوَجَدْتُ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَتَلَا وَكَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ مُرْسَلًا وَلِلتِّرْمِذِيِّ نَحْوُهُ عَنْهُ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَمُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ وَزَادَ فِيْهِ قَالَ يَا مُحَمَّدُ هَلْ تَدْرِيْ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَاُ الْاَعْلٰى قُلْتُ نَعَمْ فِي الْكَفَّارَاتِ وَالْكَفَّارَاتُ الْمُكْثُ فِي الْمَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلَوَاتِ وَالْمَشْيُ عَلَى الْاَقْدَامِ اِلَى الْجَمَاعَاتِ وَاِبْلَاغُ الْوُضُوْءِ فِي الْمَكَارِهِ وَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ عَاشَ بِخَيْرٍ وَمَاتَ بِخَيْرٍ وَكَانَ مِنْ خَطِيْئَتِهِ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِذَا صَلَّيْتَ فَقُلِ اللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ فَاِذَا اَرَدْتَ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِيْ اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ قَالَ وَالدَّرَجَاتُ اِفْشَاءُ السَّلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ وَالصَّلَاةُ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ وَلَفْظُ هٰذَا الْحَدِيْثِ كَمَا فِي الْمَصَابِيْحِ لَمْ اَجِدْهُ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اِلَّا فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"اور حضرت عبدالرحمن بن عائش راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، میں نے اپنے پروردگار بزرگ و برتر کو (خواب میں) بہت ہی اچھی صورت میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ مقربین فرشتے کس معاملہ میں بحث کر رہے ہیں میں نے عرض کیا پروردگار! تو ہی بہتر جانتا ہے۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ (یہ سن کر) اللہ تعالیٰ نے میرے مونڈھوں کے درمیان اپنا ہاتھ رکھا جس کی ٹھنڈک مجھے اپنے سینہ پر محسوس ہوئی (اور اس کی وجہ سے) میں زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو جان گیا، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ترجمہ: اور اس طرح ہم نے ابراہیم کو زمین و آسمانوں کا تصرف دکھایا تاکہ وہ یقین کرنے والے لوگوں میں شامل ہو جائے۔ (دارمی مرسلاً) اور ترمذی نے یہ بھی روایت بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ عبدالرحمن ابن عائش، ابن عباس اور معاذ ابن جبل سے نقل کی ہے اور اس میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (یعنی آپ کو زمین و آسمانوں کا علم دینے کے بعد سوال فرمایا، کہ اے محمد (ﷺ) آپ کو معلوم ہے کہ مقربین فرشتے کس معاملہ میں بحث کر رہے

ہیں؟ (آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا، ہاں! میں جانتا ہوں کفارات (یعنی گناہوں کو ختم کرنے والی چیزوں) کے بارہ میں گفتگو کر رہے ہیں اور وہ کفارات (یہ) ہیں کہ نمازوں کے بعد مسجدوں میں (دوسرے وقت کی نماز کے انتظار میں یا ذکر و تسبیح کے لئے) بیٹھا جائے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے پیدل چلا جائے اور سختی کے وقت (مثلاً بیماری یا سردی میں اعضاء وضو پر) وضو کا پانی اچھی طرح پہنچایا جائے (لہٰذا) جس نے یہ کیا (یعنی مذکورہ اعمال کئے) وہ بھلائی پر زندہ رہے گا اور بھلائی ہی پر مرے گا اور گناہوں سے ایسا پاک ہو جائے گا گویا اس کی ماں نے آج ہی سے اس کو جنا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے محمد! جب آپ (ﷺ) نماز سے فارغ ہو لیں تو یہ دعا پڑھ لیا کیجئے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ فَاِذَا اَرَدْتَّ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِىْ اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ یعنی اے اللہ! میں تجھ سے نیکیوں کے کرنے اور برائیوں کے چھوڑنے اور مسکینوں کی دوستی کا سوال کرتا ہوں اور جب تو بندوں میں گمراہی ڈالنے (یا انہیں سزا دینے) کا ارادہ کرے تو مجھے بغیر گمراہی کے اٹھا لیجئے۔ اور اللہ تعالیٰ (آنحضرت ﷺ کی تعلیم میں زیادتی کے لئے) فرماتا ہے (یا خود آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں) کہ درجات (یعنی وہ اعمال جن سے بندہ کے درجات بارگاہ حق میں بلند ہوتے ہیں) یہ ہیں کہ (ہر مسلمان کو خواہ وہ آشنا ہو یا نا آشنا) سلام کیا جائے۔ (خدا کی راہ میں مسکینوں کو) کھانا کھلایا جائے اور رات میں اس وقت جب کہ لوگ سو رہے ہوں نماز پڑھی جائے۔ (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ) میں نے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ جیسا کہ مصابیح میں عبدالرحمن سے منقول ہے سوائے شرح السنہ کے اور کسی کتاب میں نہیں دیکھی۔"

تشریح: اگر آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تھا جیسا کہ ایک دوسری روایت میں اس کی وضاحت ہے۔ تو اس میں کچھ اشکال نہیں ہے کیونکہ انسان خواب میں بسا اوقات شکل دار چیز کو بغیر شکل دیکھتا ہے اور کبھی غیر شکل دار کو شکل دار صورت میں دیکھتا ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ نے عالم بیداری میں دیکھا تھا تو پھر اس کی تاویل کرنا ضروری ہوگی۔ اور تاویل یہ ہوگی کہ صورت سے مراد صفت ہے کہ حق تعالیٰ جل مجدہ نے صفت جمال اور لطف و کرم کے ساتھ تجلی فرمائی۔ یہ تاویل حقیقت و محاورہ سے بالکل قریب ہے کیونکہ اکثر و بیشتر صورت کا اطلاق صفت پر ہوتا ہے جیسا کہ روزمرہ کی بول چال میں کسی چیز کی حقیقت و کیفیت کے بیان کے وقت کہا جاتا ہے کہ "صورت حال یہ ہے" یا اس مسئلہ کی صورت یہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ بھی بہتر ہے کہ "صورت" کے معنی کا محمول آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس ہی کو قرار دیا جائے۔ اس طرح آپ ﷺ کے ارشاد کے معنی یہ ہوں گے کہ میں نے اپنے "رب کو دیکھا اور اس وقت میں اچھی صورت میں تھا"۔

آنحضرت ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ مقربین فرشتے کون سے اعمال کی فضیلت و عظمت کے بارہ میں بحث کر رہے ہیں؟ یا یہ کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن کو مقام قبولیت تک پہنچانے میں فرشتے آپس میں تنازعہ کر رہے ہیں۔ بایں طور کہ ایک فرشتہ تو کہتا ہے کہ اس عمل کو مقام قبولیت تک پہلے میں پہنچاؤں اور دوسرا کہتا ہے کہ پہلے میں لے کر جاؤں۔

آنحضرت ﷺ کے مونڈھوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کا ہاتھ رکھنا حقیقی معنی میں نہیں ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ آپ ﷺ کے مونڈھوں کے درمیان رکھا تھا کیونکہ ذات خداوندی ظاہری اجسام کی ثقالت سے پاک و صاف ہے بلکہ دراصل یہ اس چیز سے کنایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو اپنے فضل و کرم اور جزاء و انعام کی زیادتی و کثرت کے ساتھ خاص کیا جیسا کہ دنیاوی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بادشاہ یا امیر اپنے کسی خاص خادم پر بہت زیادہ مہربان ہوتا ہے اور اس سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے تو وہ اس خادم کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا ہے یا اس کی گردن میں باہیں ڈال دیتا ہے۔ یہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اس خادم سے بہت زیادہ خوش ہے اور اس پر انعام و اکرام کی بارش کرنے والا ہے۔

"سینے میں سردی محسوس ہونا" فیض ربانی کا اثر پہنچنے سے کنایہ ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ جب فیض ربانی سینہ میں پہنچا تو زمین و آسمان کے تمام پردے اٹھ گئے اور تمام چیزوں کا علم مجھے حاصل ہو گیا چنانچہ آپ نے اس موقعہ و حال کی مناسبت اور اس کے

امکان پر گواہی دینے کے ارادہ سے مذکورہ آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد ﷺ! جس طرح ہم نے آپ ﷺ کے سامنے سے زمین و آسمانوں کے پردے اٹھا دیئے جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کو تمام چیزوں کا علم حاصل ہو گیا ہے اسی طرح ہم نے اپنے جلیل القدر پیغمبر و خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی دو عالم ربوبیت و الوہیت کی حقیقتوں کو واشگاف کر دیا تھا اور انہیں زمین و آسمانوں کی تمام چیزوں کا مشاہدہ کرا دیا تھا تاکہ وہ خدا کی ربوبیت والوہیت پر یقین کامل کرنے والوں میں سے ہو جائیں اس طرح آیت کے آخری الفاظ ولیکون من الموقنین کا معطوف علیہ محذوف ہو گا اور پوری عبارت یوں ہوگی کہ ہم نے ابراہیم کو عالم ربوبیت والوہیت دکھلا دیئے تھے تاکہ وہ اس کے ذریعہ ہماری ذات کے وجود کے بارہ میں دلیل پکڑ سکے اور یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ غرور و تکبر کی بری عادتوں سے یکسر ہٹ کر اپنے اندر تواضع و انکساری جود و بخشش اور عبادت و ریاضت کے جذبات و اوصاف پیدا کرے اور ان عرفانی اصولوں کی روشنی سے پہلے دل و دماغ کو منور کر کے نہ صرف یہ کہ خدا کا حقیقی بندہ بن جائے بلکہ پوری انسانیت کے لئے باعث رحمت و راحت ہو جائے ؎

شرف مردے جو دست و کرامت بجود ہر کہ ایں ہر دو ندارد عدمش بہ ز وجود

(۳۵) وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ كُلُّهُمْ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ رَجُلٌ خَرَجَ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ حَتّٰى يَتَوَفَّاهُ فَيُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ اَوْيَرُدَّهُ بِمَانَالَ مِنْ اَجْرٍ اَوْغَنِيْمَةٍ وَرَجُلٌ رَاحَ اِلَى الْمَسْجِدِ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ وَرَجُلٌ دَخَلَ بَيْتَهُ بِسَلَامٍ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ تین شخص ایسے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ (اس بات کے لئے) ذمہ دار ہے (کہ وہ انہیں دنیا و آخرت کی آفات و مصیبتوں سے محفوظ رکھے گا) ایک تو وہ شخص جو خدا کی راہ میں جہاد کے لئے نکلا چنانچہ وہ خدا کی ذمہ داری میں ہے کہ یا تو اسے موت (یعنی شہادت کا درجہ) دے کر جنت میں پہنچا دے یا اس کو ثواب و مال غنیمت دے کر گھر واپس پہنچا دے (چنانچہ پہلی اور دوسری صورت یعنی شہادت و ثواب میں تو اسے دین کی سعادت حاصل ہوتی ہے اور تیسری یعنی مال غنیمت میں دنیا کی سعادت و بھلائی ملتی ہے) اور دوسرا وہ شخص ہے جو (نماز کے لئے) مسجد جائے تو اللہ اس کا بھی ضامن ہے (کہ عبادت کے لئے اس کی کوشش اور اس کا ثواب ضائع نہ کرے گا) اور تیسرا وہ شخص ہے جو اپنے گھر میں سلام کرتا ہوا داخل ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری میں ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ پر پہلے شخص کے لئے جو ذمہ ہے اسے تو بیان کر دیا گیا ہے کہ اسے دین اور دنیا دونوں جگہ کیا کیا انعامات ملیں گے لیکن دوسرے اور تیسرے شخص کے لئے جو ذمہ اللہ پر ہے چونکہ وہ ظاہر تھا اس لئے اس کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی "گھر میں سلام کرتا ہوا داخل ہو" اس کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرے، چنانچہ اس صورت میں اس کے لئے اللہ پر یہ ذمہ ہے کہ اس کو اور اس کے گھر والوں کو خیر و برکت سے نوازے گا اور ان پر اپنی رحمتوں اور عنایتوں کے دروازے کھول دے گا دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب گھر میں داخل ہو جائے تو لوگوں کی صحبت سے امن و سلامتی حاصل کرنے کے لئے گھر ہی میں رہنا اپنے اوپر لازم کر لے اور گھر سے باہر نہ نکلے چنانچہ اس صورت میں اس کے لئے اللہ پر یہ ذمہ ہے کہ وہ اسے مصائب و آفات سے محفوظ و سلامت رکھے گا۔

(۳۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ مُتَطَهِّرًا اِلٰى صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ فَاَجْرُهٗ كَاَجْرِ الْحَاجِّ الْمُحْرِمِ وَمَنْ خَرَجَ اِلٰى تَسْبِيْحِ الضُّحٰى لَا يُنْصِبُهٗ اِلَّا اِيَّاهُ فَاَجْرُهٗ كَاَجْرِ الْمُعْتَمِرِ وَصَلَاةٌ عَلٰى اِثْرِ صَلَاةٍ لَا لَغْوَ بَيْنَهُمَا كِتَابٌ فِيْ عِلِّيِّيْنَ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جو شخص وضو کر کے گھر سے نکلے۔ اور فرض نماز ادا کرنے کے لئے مسجد

جائے تو اس کو اتنا ثواب ملے گا جتنا احرام باندھ کر حج کرنے (جانے) والے کو ملتا ہے اور جو شخص چاشت کی (نفل) نماز ہی کے لئے تکلیف اٹھا کر (گھر سے) نکلے (یعنی بغیر کسی غرض اور ریا کے محض چاشت کی نماز پڑھنے ہی کے قصد سے گھر سے نکلے) تو اس کا ثواب عمرہ کرنے والے کے ثواب کے برابر ہے۔ اور (ایک) نماز کے بعد (دوسری) نماز پڑھنا اور ان دونوں نمازوں کے درمیانی وقت میں لغو بیہودہ باتیں نہ کرنا ایسا عمل ہے جو علیین میں لکھا جاتا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں وضو کو احرام سے اور نماز کو حج سے مشابہت دی گئی ہے اور دونوں میں تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح حاجی حج کے ارادہ سے گھر سے نکلتا ہے اور احرام باندھ کر حج کو جاتا ہے تو جس وقت وہ گھر سے نکلتا ہے اسی وقت سے اسے ثواب ملنا شروع ہو جاتا ہے اور اس کے ثواب کا سلسلہ اس کے واپس آجانے تک جاری رہتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص محض نماز کے ارادہ سے نکلتا ہے تو وہ جس وقت گھر سے نکلتا ہے اسے بھی اسی وقت سے ثواب ملنا شروع ہو جاتا ہے اور جب تک وہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر گھر واپس نہیں آجاتا اسے ثواب برابر ملتا ہے لیکن اتنی بات بھی سمجھ لیجئے کہ نمازی اور حاجی کے ثواب میں یہ برابری بہمہ وجوہ نہیں ہے ورنہ توجہ کرنے کے کوئی معنی نہیں رہ جائیں گے۔ یعنی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ثواب میں دونوں بالکل برابر ہیں کیونکہ حاجی کا ثواب نمازی کے ثواب سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ حج کی بہ نسبت عمرہ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو فرض نماز کی بہ نسبت نفل نماز کو حاصل ہے۔ کتاب فی علیین سے حدیث کے آخری جزو کا مطلب کنایۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص نماز کی مداومت و محافظت کرے یعنی تمام نمازوں کو پابندی سے ادا کرتا ہے اور نماز کو اس کی تمام شرائط و آداب کا لحاظ کرتے ہوئے اس طرح پڑھتا رہتا ہے کہ اس کے اس عمل اور نیت میں نماز کے منافی کسی چیز کا دخل نہ ہو تو یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے اعلیٰ اور بہتر کوئی عمل نہیں ہے۔

جو فرشتے نیکیاں لکھنے پر مامور ہیں ان کے دفتر کا نام علیین ہے کہ تمام نیک اعمال وہیں جمع ہوتے ہیں۔

(۳۷) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِیَاضِ الْجَنَّۃِ فَارْتَعُوْا قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا رِیَاضُ الْجَنَّۃِ قَالَ الْمَسَاجِدُ قِیْلَ وَمَا الرَّتْعُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جب تم جنّت کے باغوں میں جایا کرو تو وہاں میوہ کھایا کرو، آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ، یارسول اللہ! دنیا میں جنت کے باغ کہاں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا مسجدیں (جنّت کے باغ ہیں) پھر پوچھا گیا کہ یارسول اللہ! میوہ کھانا کیا ہے (یعنی ان میں میوہ کس طرح کھایا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا سبحان اللّٰہ و الحمدللّٰہ و لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر (مسجدوں میں ان کلمات کا ورد رکھنا میوہ کھانا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مساجد کو جنّت کے باغ اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں عبادت کرنا اور نماز پڑھنا جنّت کے باغوں کے حاصل ہونے کا سبب ہے۔ رتع دراصل اسے کہتے ہیں کہ باغ میں جا کر اچھی طرح میوے اور لذیذ چیزیں کھائی جائیں اور نہر وغیرہ کی سیر کی جائے جیسا کہ باغوں میں جانے والے لوگ یہ کیا کرتے ہیں۔ پھر یہ لفظ ثواب عظیم کے مرتبہ پر پہنچنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

بہرحال۔ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب تم مسجدوں میں جاؤ تو مذکورہ تسبیحات پڑھا کرو کیونکہ اس سے بہت زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے۔

(۳۸) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَتَی الْمَسْجِدَ لِشَیْءٍ فَھُوَ حَظُّہٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص (دین یا دنیا کے) جس کام کے لئے مسجد میں آئے گا اسے اسی میں

سے حصہ ملے گا۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں جس غرض سے آئے گا وہی اس کا نصیب ہوگا۔ یعنی اگر عبادت کے لئے آئے گا تو اسے ثواب ملے گا اور اگر کسی دنیوی زندگی کی غرض سے آئے گا تو گرفتار وبال ہوگا۔ گویا یہ حدیث مضمون کے اعتبار سے نیت کی مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات کا ایک جزو ہے۔

(۳۹) وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ الْحُسَيْنِ عَنْ جَدَّتِهَا فَاطِمَةِ الْكُبْرٰى قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ صَلَّى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَسَلَّمَ وَقَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَإِذَا خَرَجَ صَلَّى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَسَلَّمَ وَقَالَ رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ فَضْلِكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِيْ رِوَايَتِهِمَا قَالَتْ إِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَكَذَا إِذَا خَرَجَ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ بَدَلَ صَلّٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَسَلَّمَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ لَيْسَ اِسْنَادُهُ بِمُتَّصِلٍ وَفَاطِمَةُ بِنْتُ الْحُسَيْنِ لَمْ تُدْرِكْ فَاطِمَةَ الْكُبْرٰى۔

"حضرت فاطمہ بنت حسینؓ اپنی دادی فاطمہ کبریٰ (زہراؓ) سے روایت کرتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب مسجد میں تشریف لاتے تو محمد ﷺ پر درود و سلام بھیجتے، یعنی یہ الفاظ فرماتے صلی اللہ علی محمد یا فرماتے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَسَلِّمْ اور پھر یہ دعا پڑھتے رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ یعنی اے میرے پروردگار، میرے گناہ بخش دے اور میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔ اور جب مسجد سے باہر آتے تو پھر محمد ﷺ پر درود و سلام بھیج کر یہ دعا پڑھتے۔ رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ فَضْلِكَ یعنی اے میرے پروردگار! میرے گناہ بخش دے اور میرے لئے اپنے فضل کے دروازے کھول دے۔ یہ روایت ترمذیؒ، احمدؒ، ابن ماجہؒ نے نقل کی ہے اور احمدؒ و ابن ماجہؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (حضرت فاطمہ فرماتی ہیں کہ) آنحضرت ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے اور اسی طرح جب باہر نکلتے تو صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَسَلِّمْ کے بجائے یہ الفاظ فرماتے بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ یعنی میں اللہ کے نام کے ساتھ داخل ہوتا ہوں اور نکلتا ہوں اور سلامتی ہو رسول پر۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ حضرت حسینؓ کی دختر فاطمہؒ نے حضرت فاطمہ زہراؓ بنت رسول اللہ ﷺ کا زمانہ نہیں پایا ہے اور (ان سے نہیں ملی ہیں)۔"

تشریح: آپ ﷺ نے درود و سلام وغیرہ کے الفاظ اس طرح نہیں فرمائے کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيَّ یا اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِمُحَمَّدٍ کیونکہ درود و سلام کے ساتھ اسم شریف کو مناسبت ہے اسی طرح رَبِّ اغْفِرْلِيْ ارشاد فرمانے میں آپ ﷺ کی تواضع و انکساری کا اظہار ہوتا ہے یا پھر کہا جائے گا کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ اُمت کی تعلیم کے لئے فرمائے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ درود و سلام کن الفاظ کے ذریعہ بھیجا جاتا ہے۔

فاطمہ صغریٰ جو اس حدیث کی راوی اور حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی ہیں انہوں نے اپنی دادی حضرت فاطمہ زہراء بنت رسول اللہ ﷺ کا زمانہ نہیں پایا ہے کیونکہ ان کے وقت میں حضرت امام حسینؓ کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی لہٰذا اس حدیث کی سند متصل نہیں ہوئی کیونکہ درمیان کا ایک راوی متروک ہے۔

(۴۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تَنَاشُدِ الْاَشْعَارِ فِي الْمَسْجِدِ وَعَنِ الْبَيْعِ وَالْاِشْتِرَاءِ فِيْهِ وَاَنْ يَّتَحَلَّقَ النَّاسُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فِي الْمَسْجِدِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ، سرور کائنات ﷺ مسجد میں اشعار پڑھنے، خرید و فروخت کرنے اور جمعہ کے روز نماز سے پہلے لوگوں کو حلقہ باندھ کر بیٹھنے سے (خواہ حلقہ باندھ کر بیٹھنا مذاکرہ علم اور ذکر و تسبیح کے لئے کیوں

نہ ہو) منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: اشعار سے مراد ایسے اشعار ہیں جن میں جھوٹ اور لغو باتیں ذکر کی گئی ہوں کیونکہ مسجد خدا کی عبادت کرنے کی جگہ ہے وہاں خلاف شرع اور جھوٹ و لغو باتوں کو بیان کرنا ناجائز ہے البتہ ایسے اشعار جن میں خدا کی توحید و مناجات اور آنحضرت ﷺ کی یا آپ ﷺ کے مخلص متبعین اور فرمانبردار امتیوں کی تعریف و توصیف، دین و مذہب اور اخلاق و کردار کو جلا بخشنے والی باتوں کا ذکر ہو تو ان کا پڑھنا ہر جگہ جائز اور مستحسن ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ شاعر اسلام حضرت حسانؓ کے لئے جو اپنے اشعار کے ذریعہ آپ ﷺ کی نعت اور کفار کی ہجو بیان کیا کرتے تھے مسجد نبوی میں منبر بچھواتے تھے اور حضرت حسانؓ اس منبر پر کھڑے ہو کر اس قسم کے پاکیزہ اشعار پڑھا کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت جبرئیل حسانؓ کی تائید کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ پیغمبر خدا کی جانب سے کفار سے مقابلہ کرتے ہیں۔

مسجد میں جس طرح خرید و فروخت ممنوع ہے اسی طرح وہاں دنیا کے دوسرے معاملات کرنا منع ہیں۔

جمعہ کے روز نماز پڑھنے سے پہلے مسجد میں حلقہ باندھ کر بیٹھنے کو آپ ﷺ نے جو منع فرمایا ہے علماء اس کے مختلف وجوہ بیان کرتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ حلقہ باندھ کر بیٹھنا نمازیوں کی ہیئت اجتماعی کے خلاف ہے دوسرے یہ کہ جمعہ کے روز نماز جمعہ کے لئے مسجد میں جمع ہونا خود ایک مستقل اور عظیم الشان کام ہے جب تک اس کام یعنی نماز جمعہ سے فارغ نہ ہولیں، دوسرے کام میں مشغول ہونا مناسب نہیں ہے۔ نیز یہ کہ حلقہ باندھ کر بیٹھنا غفلت کا سبب ہے۔ ان دونوں صورتوں میں اس نہی کا تعلق خاص طور پر خطبہ کے وقت سے نہیں ہوگا۔

تیسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ وقت خاموش اور چپ رہنے کا ہے اور نہایت توجہ کے ساتھ امام کا خطبہ سننے کا ہے، اور چونکہ حلقہ باندھ کر بیٹھنے سے امام کے خطبہ کی طرف توجہ کم ہو جاتی ہے لہٰذا یہ درست نہیں ہے۔ اس صورت میں اس ممانعت کا تعلق صرف خطبہ کے وقت سے ہوگا۔ لہٰذا پہلی اور دوسری توجیہ کی صورت میں یہ نہی تنزیہی ہوگی اور تیسری توجیہ کی صورت میں نہی تحریمی ہوگی۔

(۴۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَأَیْتُمْ مَنْ یَبِیْعُ اَوْیَبْتَاعُ فِی الْمَسْجِدِ فَقُوْلُوْا لَا اَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ وَاِذَا رَأَیْتُمْ مَنْ یَنْشُدُ فِیْهِ ضَالَّةً فَقُوْلُوْا لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَیْكَ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جب تم مسجد میں کسی شخص کو خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھو تو کہو کہ خدا کرے تیری سوداگری میں نفع نہ ہو اور جب تم (مسجد میں) کسی شخص کو بلند آواز سے گمشدہ چیز ڈھونڈتے ہوئے دیکھو تو کہو کہ "خدا کرے تیری چیز نہ ملے"۔" (ترمذی، دارمی)

(۴۲) وَعَنْ حَکِیْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّسْتَقَادَ فِی الْمَسْجِدِ وَاَنْ یُّنْشَدَ فِیْهِ الْاَشْعَارُ وَاَنْ تُقَامَ فِیْهِ الْحُدُوْدُ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ فِیْ سُنَنِهٖ وَصَاحِبُ جَامِعِ الْاُصُوْلِ فِیْهِ عَنْ حَکِیْمٍ وَفِی الْمَصَابِیْحِ عَنْ جَابِرٍ۔

"اور حضرت حکیم بن حزامؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے مسجد میں قصاص لینے (یعنی قاتل کا خون بہانے) اور اشعار پڑھنے اور (زنا کرنے، شراب پینے وغیرہ کی) حدود قائم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد) اور اس روایت کو صاحب جامع الاصول نے (اپنی کتاب) جامع الاصول میں حکیم سے (یعنی بغیر لفظ ابن حزام کے) روایت کیا ہے۔ نیز یہ روایت مصابیح میں جابرؓ سے منقول ہے (اور یہ اصول میں موجود نہیں ہے)۔"

(۴۳) وَعَنْ مُعَاوِیَةَ بْنِ قُرَّةَ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ هَاتَیْنِ الشَّجَرَتَیْنِ یَعْنِی الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَقَالَ مَنْ اَکَلَهُمَا فَلَا یَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا وَقَالَ اِنْ کُنْتُمْ لَا بُدَّ اٰکِلِیْهِمَا فَاَمِیْتُوْهُمَا طَبْخًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت معاویہ ابن قرۃؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے دو درختوں یعنی پیاز، لہسن کے کھانے) سے منع کیا ہے اور فرمایا کہ جو شخص ان کو کھائے وہ ہماری (یعنی مسلمانوں کی) مسجدوں کے قریب نہ آئے نیز فرمایا کہ اگر تم انہیں کھانا ضروری ہی سمجھو تو انہیں پکا کر ان کی بدبو دور کر دو (اور کھالو)۔" (ابوداؤد)

تشریح: جملہ مَنْ اَکَلَهُمَا پہلے جملہ کا بیان ہے۔ آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ جو شخص ان کو کھائے۔ وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے۔ پیاز و لہسن کھا کر مسجد میں داخلہ کی ممانعت کو مبالغہ کے طور پر بیان کرنا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان بدبودار چیزوں کو کھائے اسے چاہئے کہ وہ مسجد کی عظمت و احترام کے پیش نظر مسجد کے نزدیک بھی نہ آئے چہ جائیکہ مسجد میں داخل ہو۔ یا پھر قریب نہ آئے۔ کنایہ ہے مسجد میں داخل نہ ہونے سے کہ جو شخص پیاز و لہسن کھائے ہوئے ہو وہ مسجد میں داخل نہ ہو۔

(۴۴) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ اِلَّا الْمَقْبُرَةَ وَالْحَمَّامَ۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، مقبرہ اور حمام کے علاوہ ساری زمین مسجد ہے۔ کہ (ہر جگہ نماز پڑھی جا سکتی ہے)۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

(۴۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّصَلّٰى فِيْ سَبْعَةِ مَوَاطِنَ فِي الْمَزْبَلَةِ وَالْمَجْزَرَةِ وَالْمَقْبُرَةِ وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ وَفِي الْحَمَّامِ وَفِيْ مَعَاطِنِ الْاِبِلِ وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے سات مقامات پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ ① جہاں ناپاک چیزیں ڈالی جاتی ہوں۔ (یعنی کوڑی)۔ ② جہاں جانور ذبح کئے جاتے ہوں۔ ③ راستہ کے درمیان۔ ④ مقبرہ۔ ⑤ حمام کے اندر۔ ⑥ اونٹوں کے بندھنے کی جگہ۔ ⑦ خانہ کعبہ[1] کی چھت پر۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: بعض علماء سلف تو حدیث کے ظاہری الفاظ کو دیکھتے ہوئے یہی فرماتے ہیں کہ مقبرہ کے اندر نماز پڑھنا مکروہ ہے اور بعض علماء کے نزدیک مقبرہ میں نماز پڑھنا جائز ہے لیکن قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک حرام ہے مزبلہ اور مجزرہ (یعنی کوڑی اور مذبح) میں نماز پڑھنا اس لئے مکروہ ہے کہ ان دونوں جگہوں میں نجاست و گندگی پھیلی رہتی ہے۔ چنانچہ ان مقامات میں اگر کسی ایسی جگہ نماز پڑھی جائے جو صاف ہو مگر اس کے قریب ہی نجاست بھی پڑی ہو یا نجاست ہی پر مصلی بچھا کر نماز پڑھی جائے۔ یہ مکروہ ہے اس سے دین کی حقارت و بے وقعتی ظاہر ہوتی ہے اور نماز کی رفعت شان اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے بالکل پاک و صاف جگہ ادا کیا جائے نہ کہ ایسی جگہ جہاں گندگی و نجاست پھیلی ہوئی ہو۔

راستہ کے درمیان نماز پڑھنا اسلئے ممنوع ہے کہ وہاں لوگوں کے آنے جانے کی وجہ سے دھیان بٹتا ہے اور یکسوئی حاصل نہیں ہوتی نیز اس سے لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے۔ پھر دوسرے یہ کہ عام گزرگاہ ہونے کی وجہ سے اگر لوگ مجبوری کی بناء پر نمازی کے آگے سے گزریں گے تو ان کے گزرنے سے نمازی گناہگار ہوگا اور اگر لوگ بے ضرورت ہی گزریں گے۔ تو وہ گناہگار ہوں گے۔

حمام میں نماز پڑھنا اس لئے مکروہ ہے کہ وہ ستر کھلنے اور شیطان کے رہنے کی جگہ ہے کعبہ کی چھت پر بھی نماز پڑھنا اس لئے مکروہ ہے کہ اس سے کعبۃ اللہ کی بے ادبی ہوتی ہے۔ اب علماء کے یہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ ان ساتوں جگہ نماز پڑھنے کو مکروہ کہا گیا ہے تو آیا یہ مکروہ تنزیہی ہے یا مکروہ تحریمی؟ چنانچہ بعض علماء کے نزدیک تو ان ساتوں جگہ نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ مکروہ تحریمی ہے۔

---

[1] کعبۃ اللہ کی چھت پر بلا ضرورت چڑھنا مکروہ ہے البتہ ضرورت کے لئے چھت پر چڑھنا جائز ہے ۱۲۔

(۴۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلُّوْا فِیْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ وَلَا تُصَلُّوْا فِیْ اَعْطَانِ الْاِبِلِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ بکریوں کے بندھنے کی جگہ نماز پڑھو، البتہ اونٹوں کے بندھنے کی جگہ مت پڑھو۔" (ترمذی)

تشریح: اونٹوں کے بندھنے کی جگہ نماز پڑھنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اونٹوں کے پاس نماز پڑھنے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ کھل کر نمازی کو لات وغیرہ نہ ماردیں اس سے نہ صرف یہ کہ نمازی کو تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہے بلکہ اس طرح نماز دلجمعی اور سکون خاطر سے ادا نہیں ہوسکتی البتہ بکریوں سے چونکہ اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لئے ان کے بندھنے کی جگہ نماز پڑھنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

(۴۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں کو مسجد بنالینے (یعنی قبروں پر سجدہ کرنے والوں) اور قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔" (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے ابتداء اسلام میں قبروں کی زیارت کرنے سے منع فرمایا تھا پھر بعد میں آپ ﷺ نے اس کی اجازت دے دی تھی، چنانچہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ اجازت مردوں اور عورتوں دونوں کے حق میں تھی لہٰذا عورتوں کو پہلے تو قبروں کی زیارت کرنے کی اجازت نہیں تھی مگر اب اس عام اجازت کے پیش نظر درست وجائز ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس اجازت کا تعلق صرف مردوں سے ہے عورتوں کے حق میں وہ نہی اب بھی باقی ہے اور وجہ اس کی یہ بیان کرتے ہیں کہ عورتیں چونکہ کمزور دل اور غیر صابر ہوتی ہیں نیز ان کے اندر جزع وفزع کی عادت ہوتی ہے اس لئے ان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ قبروں پر جائیں۔ چنانچہ یہ حدیث بھی بظاہر ان ہی علماء کی تائید کرتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت۔ جمہور علماء کے نزدیک اس حکم سے مستثنیٰ ہے یعنی آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت مرد ہو یا عورت سب کے لئے جائز ہے۔ قبر پر چراغ جلانا اس لئے حرام ہے کہ اس سے بے جا اسراف اور مال کا ضیاع ہوتا ہے۔ البتہ بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر قبر کے پاس کوئی گزرگاہ ہو تو راہ گیروں کی آسانی کے لئے چراغ جلانا یا وہاں روشنی میں کوئی کام کرنے کے لئے چراغ جلانا جائز ہے کیونکہ اس سے قبر پر چراغ جلانا مقصود نہیں ہوگا بلکہ دوسری ضرورت وحاجت پیش نظر ہوگی۔

مولانا محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح اور معتمد قول کے مطابق عورتوں کو قبر کی زیارت کرنا مکروہ تحریمی ہے چنانچہ مستملی میں لکھا ہوا ہے کہ قبروں کی زیارت مردوں کے لئے مستحب ہے اور عورتوں کے لئے مکروہ ہے۔

کتاب مجالس واعظیہ میں مذکور ہے کہ عورتوں کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ قبروں پر جائیں کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ انه علیه الصلوٰة والسلام لعن ذوارات القبور یعنی آنحضرت ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔

نصاب الاحتساب میں منقول ہے کہ عورتوں کے قبروں پر جانے کے جواز اور اس کی خرابی وقباحت کے بارہ میں قاضیؒ سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس کا جواز اور اس کا فساد نہ پوچھو بلکہ یہ پوچھو کہ اس پر جو لعنت وپھٹکار برستی ہے اس کی مقدار کیا ہے؟ (چنانچہ) جان لو! کہ جب عورت قبر پر جانے کا ارادہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی لعنت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور جب وہ قبر پر جانے لگتی ہے تو اس کو ہر طرف سے شیاطین چمٹ جاتے ہیں اور جب قبر پر پہنچ جاتی ہے تو مردہ کی روح اس پر لعنت بھیجتی ہے اور جب قبر سے واپس ہوتی ہے

تو اللہ تعالیٰ کی لعنت میں گرفتار ہوتی ہے۔

حدیث میں وارد ہے کہ جو عورت مقبرہ پر جاتی ہے ساتوں زمینوں اور ساتوں آسمانوں کے فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت میں مقبرہ کا راستہ طے کرتی ہے اور جو عورت اپنے گھر میں بیٹھ کر میت کے لئے دعائے خیر کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو حج اور عمرہ کا ثواب دیتا ہے۔

حضرت سلمان اور حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ مسجد سے نکل کر اپنے مکان کے دروازے پر کھڑے تھے کہ (باہر سے) حضرت فاطمہ زہراءؓ آئیں آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کہاں سے آرہی ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ فلاں عورت کا انتقال ہوگیا ہے اس کے مکان پر گئی تھی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم اس کی قبر پر بھی گئی تھیں؟ حضرت فاطمہؓ نے کہا معاذ اللہ! کیا میں اس عمل کو کر سکتی ہوں جس (کی ممانعت) کے بارہ میں آپ (ﷺ) سے میں سن چکی ہوں! آنحضرت ﷺ نے فرمایا (تم نے یہ اچھا ہی کیا کہ اس کی قبر پر نہ گئیں کیونکہ) اگر تم اس کی قبر پر چلی جاتیں تو تمہیں جنت کی بو (بھی) میسر نہ ہوتی۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اپنی کتاب مالابد منہ میں لکھا ہے کہ "زیارت قبور مرداں را جائز است نہ زناں را" یعنی قبروں کی زیارت مردوں کے لئے تو جائز ہے عورتوں کے لئے نہیں۔

(۴۸) وَعَنْ اَبِي اُمَامَةَ قَالَ اِنَّ حِبْرًا مِنَ الْيَهُوْدِ سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْبِقَاعِ خَيْرٌ فَسَكَتَ عَنْهُ وَقَالَ اَسْكُتُ حَتّٰى يَجِيْئَ جِبْرِيْلُ فَسَكَتَ وَجَاءَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَسَاَلَ فَقَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَلٰكِنْ اَسْاَلُ رَبِّي تَبَارَكَ وَتَعَالٰى ثُمَّ قَالَ جِبْرِيْلُ يَا مُحَمَّدُ اِنِّي دَنَوْتُ مِنَ اللّٰهِ دُنُوًّا مَا دَنَوْتُ مِنْهُ قَطُّ قَالَ وَكَيْفَ كَانَ يَا جِبْرِيْلُ قَالَ كَانَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ سَبْعُوْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِنْ نُوْرٍ فَقَالَ شَرُّ الْبِقَاعِ اَسْوَاقُهَا وَخَيْرُ الْبِقَاعِ مَسَاجِدُهَا رَوَاهُ حَبَّانُ فِي صَحِيْحِهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) ایک یہودی عالم نے سرور کائنات ﷺ سے پوچھا کہ بہترین جگہ کون سی ہے؟ آنحضرت ﷺ اس کے جواب میں خاموش رہے اور فرمایا کہ جب تک جبرئیل علیہ السلام نہیں آجائیں گے میں خاموش رہوں گا۔ چنانچہ آپ ﷺ خاموش رہے۔ جب حضرت جبرئیل آگئے تو آپ ﷺ نے ان سے (یہودی عالم کے سوال کا جواب) پوچھا حضرت جبرئیل نے کہا کہ، اس معاملہ میں آپ ﷺ سے زیادہ میں بھی نہیں جانتا، البتہ میں اپنے پروردگار بزرگ و برتر سے اس کے بارہ میں پوچھوں گا (چنانچہ) پھر حضرت جبرئیل (نے آکر) فرمایا، اے محمد (ﷺ)! آج میں اللہ تعالیٰ سے اس قدر قریب ہوگیا تھا کہ کبھی بھی اتنا قریب نہیں ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، اے جبرئیل! کس قدر (فاصلہ دونوں کے درمیان رہ گیا تھا۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا، میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ستّر ہزار نور کے پردے باقی رہ گئے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے (اس سوال کے جواب میں) فرمایا، کہ بدترین مقامات بازار ہیں اور بہترین مقامات مساجد ہیں۔ (یہ روایت ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عمرؓ سے نقل کی ہے۔"

تشریح: یہ "پردے" مخلوق کی نسبت سے ہیں حق تعالیٰ جل شانہ کی نسبت سے نہیں ہیں کیونکہ خداوند قدوس پردے میں نہیں ہے بلکہ مخلوق خدا پردے میں ہے اور وہ جسمانی و نفسانی پردے ہیں اس کی مثال کسی اندھے کے لئے پردۂ آفتاب کی سی ہے کہ جس طرح آفتاب پردہ میں نہیں ہوتا بلکہ خود اندھے کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے کہ وہ آفتاب کو نہیں دیکھ سکتا اور آفتاب اس کو دیکھتا ہے یعنی اپنی روشنی ڈالتا ہے۔

سائل نے تو صرف "بہتر جگہ" کے بارہ میں سوال کیا تھا لیکن جواب میں مقابلہ کے طور پر بہترین اور بدترین دونوں مقامات کو بتلا دیا گیا تاکہ رحمان اور شیطان دونوں کے گھر معلوم ہو جائیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص سے کوئی ایسا مسئلہ دریافت کیا گیا جو اسے پوری طرح معلوم نہیں ہے تو اسے چاہئے کہ

جواب دینے میں جلدی نہ کرے بلکہ جس کے بارہ میں جانتا ہو کہ وہ اس سوال کا جواب اچھی طرح جانتا ہے اس سے پوچھ لے اور اپنے سے زیادہ علم والے سے پوچھنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرے کیونکہ یہ آنحضرت ﷺ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی سُنّت ہے۔ مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی ہے کیونکہ مصنف مشکوٰۃ کو اس کتاب کا نام معلوم نہیں تھا جس سے یہ روایت نقل کی گئی ہے بعد میں بعض علماء نے کتاب کا مذکورہ نام لکھ دیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۴۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ جَاءَ مَسْجِدِیْ هٰذَا لَمْ یَاْتِ اِلَّا لِخَیْرٍ یَتَعَلَّمُهٗ اَوْ یُعَلِّمُهٗ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَنْ جَاءَ لِغَیْرِ ذٰلِكَ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الرَّجُلِ یَنْظُرُ اِلٰی مَتَاعِ غَیْرِهٖ۔

(رواہ ابن ماجۃ والبیہقی فی شعب الایمان)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے سرور کائنات ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص میری اس مسجد میں محض اس غرض سے آئے کہ نیک کام سیکھے اور سکھلائے تو وہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے ہم رتبہ ہے اور جو شخص اس غرض سے نہ آئے (یعنی کسی برے کام مثلاً لہو ولعب کی نیت سے آئے) تو وہ اس شخص کی مانند ہے جو دوسرے کے اسباب (کو حسرت کی نگاہوں سے) دیکھتا ہے۔"

(ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح: آپ ﷺ نے اپنی مسجد یعنی مسجد نبوی کی تخصیص کر کے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ چونکہ میری مسجد اپنی عظمت و فضیلت کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ وارفع ہے اور دوسری مسجدیں چونکہ اس کے تابع ہیں اس لئے مذکورہ حکم تمام مساجد کے لئے یکساں ہے۔ نیک کام کو سیکھنے اور سکھلانے کی تخصیص صرف ان کی فضیلت و اہمیت کے اظہار کے طور پر ہے ورنہ تو نماز، اعتکاف اور تلاوت و ذکر سب کا یہی حکم ہے۔

حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں نیک مقصد کے تحت نہیں آئے گا اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جس کے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی تو وہ اس چیز کو کسی دوسرے کے پاس دیکھ کر حسرت و افسوس کا اظہار کرتا ہے چنانچہ یہ شخص بھی جب آخرت میں اس شخص کے ثواب کو جو نیک مقصد اور نیک نیت کے ساتھ مسجد آیا تھا دیکھے گا اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ مسجد تو سعادت و بھلائی کے حصول کی جگہ تھی تو وہ انتہائی رنج و حسرت میں مبتلا ہو جائے گا کہ میں کیوں اس دولت سے محروم رہا۔

یا پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کسی غیر آدمی کے پاس کوئی چیز دیکھ کر اسے بری نگاہ سے (یعنی اچک لینے کی نیت سے) دیکھنا منع ہے اس طرح مسجد میں بغیر نیک کام کی نیت کے آنا بھی منع ہے۔

(۵۰) وَعَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ یَکُوْنُ حَدِیْثُهُمْ فِیْ مَسَاجِدِهِمْ فِیْ اَمْرِ دُنْیَاهُمْ فَلَا تُجَالِسُوْهُمْ فَلَیْسَ لِلّٰهِ فِیْهِمْ حَاجَةٌ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً روایت ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، لوگوں پر عنقریب ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ اپنی دنیاداری کی باتیں مسجدوں میں کیا کریں گے لہٰذا تم ان کے پاس بھی نہ بیٹھنا (اگرچہ تم ان کی گفتگو میں شریک نہ ہونا کہ ان کے شریک کہلاؤ) کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے بیزار ہے اور وہ خدا کی پناہ اور اس کی رحمت سے خارج ہیں۔ نیز اس بات سے بھی کنایہ ہے کہ خدا کی بارگاہ میں ان کی اطاعت و عبادت قبولیت کا درجہ نہیں پائے گی۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسجد میں دنیاوی امور کی باتیں کرنا مکروہ ہے چنانچہ اور بہت سی احادیث میں بھی مسجد میں دنیاوی باتیں کرنے سے منع کیا گیا ہے اور دنیاوی باتوں سے مراد ایسی باتیں ہیں جو عبث، بے فائدہ اور حد سے زیادہ ہوں اور اگر دنیاوی باتیں صرف ایک دو کلمہ تک رہیں یا اس درجہ کی نہ ہوں تو وہ اس حکم میں داخل نہیں۔

(۵۱) وَعَنِ السَّائِبِ ابْنِ يَزِيْدَ قَالَ كُنْتُ نَائِمًا فِي الْمَسْجِدِ فَحَصَبَنِيْ رَجُلٌ فَنَظَرْتُ فَإِذَا هُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ اذْهَبْ فَأْتِنِيْ بِهٰذَيْنِ فَجِئْتُهُ بِهِمَا فَقَالَ مِمَّنْ اَنْتُمَا اَوْمِنْ اَيْنَ اَنْتُمَا قَالَا مِنْ اَهْلِ الطَّائِفِ قَالَ لَوْ كُنْتُمَا مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَاَوْجَعْتُكُمَا تَرْفَعَانِ اَصْوَاتَكُمَا فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ میں (ایک روز) مسجد میں پڑا سو رہا تھا کہ کسی شخص نے میرے کنکری ماری میں نے دیکھا کہ وہ حضرت عمر ابن خطاب ؓ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ، تم جا کر ان دونوں اشخاص کو میرے پاس لاؤ۔ (جو مسجد میں بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے) میں ان کو بلا لایا حضرت عمر ؓ نے پوچھا تم کون ہو؟ یا فرمایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم طائف کے رہنے والے ہیں! حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ، اگر تم لوگ مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تم کو سزا دیتا (یعنی مارتا۔ لیکن چونکہ تم لوگ یہاں کے رہنے والے نہیں ہو اور آداب مسجد سے واقف نہیں ہو یا یہ کہ مسافر ہو اس لئے عفو و شفقت کے مستحق ہو اور فرمایا کہ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ) تم لوگ رسول خدا ﷺ کی مسجد میں زور زور سے باتیں کر رہے ہو۔" (بخاری ؒ)

تشریح: جملہ اَوْمِنْ اَيْنَ اَنْتُمَا میں لفظ اَوْ شک کے لئے ہے یعنی راوی کو شک واقع ہو رہا ہے کہ حضرت عمر ؓ نے یہ فرمایا کہ "تم کون ہو؟" یا یہ فرمایا کہ "تم کہاں کے رہنے والے ہو۔" بہر حال مسجد میں بلند آواز سے باتیں کرنا مکروہ ہے اگرچہ موضوع سخن علم ہی کیوں نہ ہو۔

(۵۲) وَعَنْ مَالِكٍ قَالَ بَنٰى عُمَرُ رَحْبَةً فِيْ نَاحِيَةِ الْمَسْجِدِ تُسَمَّى الْبُطَيْحَاءَ وَقَالَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ اَنْ يَلْغَطَ اَوْ يُنْشِدَ شِعْرًا اَوْ يَرْفَعَ صَوْتَهُ فَلْيَخْرُجْ اِلٰى هٰذِهِ الرَّحْبَةِ۔ (رواہ فی الموطا)

"اور حضرت امام مالک ؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق ؓ نے مسجد کے ایک گوشہ میں ایک چبوترہ بنوا دیا تھا جس کا نام بطیحا تھا اور لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ جو شخص لغو باتیں کرنا چاہے یا اشعار پڑھنا چاہے یا (کسی وجہ سے) بلند آواز (سے باتیں) کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ (مسجد سے نکل کر) اس چبوترہ پر آجائے۔" (مؤطا)

(۵۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَاَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُخَامَةً فِي الْقِبْلَةِ فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَيْهِ حَتّٰى رُئِيَ فِيْ وَجْهِهٖ فَقَامَ فَحَكَّهُ بِيَدِهٖ فَقَالَ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا قَامَ فِي الصَّلٰوةِ فَاِنَّمَا يُنَاجِيْ رَبَّهٗ وَاِنَّ رَبَّهٗ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ فَلَا يَبْزُقَنَّ اَحَدُكُمْ قِبَلَ قِبْلَتِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهٖ ثُمَّ اَخَذَ طَرَفَ رِدَائِهٖ فَبَصَقَ فِيْهِ ثُمَّ رَدَّ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَقَالَ اَوْ يَفْعَلُ هٰكَذَا۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (مسجد میں) قبلہ کی طرف رینٹھ پڑا ہوا دیکھا تو آپ کو بہت ناگوار ہوا یہاں تک کہ اس ناگواری کا اثر آپ کے چہرۂ مبارک سے ظاہر ہو رہا تھا۔ چنانچہ آپ کھڑے ہوئے اور اسے خود اپنے دست مبارک سے کھرچ کر پھینکا اور فرمایا کہ، تم میں سے جب کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے سرگوشی کرتا ہے اور اس وقت اس کا پروردگار اس کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے لہٰذا ہر ایک کو چاہئے کہ قبلہ کی طرف ہرگز نہ تھوکے بلکہ اپنے بائیں طرف یا قدموں کے نیچے تھوک لے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے اپنی چادر مبارک کا ایک کونہ لیا اور اس میں کچھ تھوکا اور پھر کپڑے کو آپس میں رگڑ کر فرمایا کہ "اس طرح کر لیا کرو"۔" (بخاری ؒ)

تشریح: اس کا پروردگار اس کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہونے اور اس کے قرب کا ارادہ کرتا ہے لہٰذا چونکہ اس کا مطلوب اور مقصود اس کے اور قبلہ کے درمیان ہے اس لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ قبلہ کی سمت کو تھوک سے بچایا جائے۔

بائیں طرف یا قدموں کے نیچے تھوکنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ کوئی شخص مسجد میں نماز نہ پڑھ رہا ہو۔ مسجد میں نماز پڑھنے کی صورت میں بائیں طرف اور قدموں کے نیچے بھی تھوکنا نہیں چاہئے کہ اس سے مسجد کے آداب و احترام میں فرق آتا ہے بلکہ اس صورت میں اگر تھوکنے کی ضرورت محسوس ہو تو کسی کپڑے میں تھوک لیا جائے پھر اسے رگڑ کر صاف کر لیا جائے۔

(۵۴) وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ خَلاَّدٍ وَهُوَ رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ رَجُلاً اَمَّ قَوْمًا فَبَصَقَ فِي الْقِبْلَةِ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِقَوْمِهِ حِيْنَ فَرَغَ لاَ يُصَلِّيْ لَكُمْ فَاَرَادَ بَعْدَ ذٰلِكَ اَنْ يُصَلِّيَ لَهُمْ فَمَنَعُوْهُ فَاَخْبَرُوْهُ بِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ نَعَمْ، وَحَسِبْتُ اَنَّهُ قَالَ اِنَّكَ قَدْ اٰذَيْتَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سائب ابن خلاد نے جو آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی ہیں فرمایا، ایک شخص جماعت کو نماز پڑھا رہا تھا اور اس نے قبلہ کی طرف تھوک دیا (اتفاق سے) آنحضرت ﷺ (اس کی طرف) دیکھ رہے تھے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو گیا تو آپ ﷺ نے اس کے مقتدیوں سے فرمایا کہ "آئندہ سے یہ شخص تمہیں نماز نہ پڑھائے" اس کے بعد اس شخص نے جب ان کو نماز پڑھانی چاہی تو ان لوگوں نے اسے (امامت سے) روک دیا اور اس سے آنحضرت ﷺ کا ارشاد بیان کر دیا وہ شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں نے ہی لوگوں سے تمہیں امام نہ بنانے کے لئے کہا تھا، اور راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص سے (امامت سے روک دینے کا سبب بیان کرتے ہوئے یہ بھی) فرمایا تھا کہ، تم نے (اس ممنوع فعل کا ارتکاب کر کے) اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف پہنچائی ہے۔" (ابوداؤد)

(۵۵) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ احْتُبِسَ عَنَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ غَدَاةٍ عَنْ صَلاَةِ الصُّبْحِ حَتّٰى كِدْنَا نَتَرَاٰى عَيْنَ الشَّمْسِ فَخَرَجَ سَرِيْعًا فَثُوِّبَ بِالصَّلاَةِ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَجَوَّزَ فِيْ صَلاَتِهِ فَلَمَّا سَلَّمَ دَعَا بِصَوْتِهِ فَقَالَ لَنَا عَلٰى مَصَافِكُمْ كَمَا اَنْتُمْ ثُمَّ انْفَتَلَ اِلَيْنَا ثُمَّ قَالَ اَمَا اِنِّيْ سَاُحَدِّثُكُمْ مَا حَبَسَنِيْ عَنْكُمُ الْغَدَاةَ اِنِّيْ قُمْتُ مِنَ اللَّيْلِ فَتَوَضَّاْتُ وَصَلَّيْتُ مَا قُدِّرَ لِيْ فَنَعَسْتُ فِيْ صَلاَتِيْ حَتَّى اسْتَثْقَلْتُ فَاِذَا اَنَا بِرَبِّيْ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِيْ اَحْسَنِ صُوْرَةٍ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَاُ الْاَعْلٰى قُلْتُ لاَ اَدْرِيْ قَالَهَا ثَلاَثًا قَالَ فَرَاَيْتُهُ وَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ اَنَامِلِهِ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَتَجَلّٰى لِيْ كُلُّ شَيْءٍ وَعَرَفْتُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَاُ الْاَعْلٰى قُلْتُ فِي الْكَفَّارَاتِ قَالَ مَاهُنَّ قُلْتُ مَشْيُ الْاَقْدَامِ اِلَى الْجَمَاعَاتِ وَالْجُلُوْسُ فِي الْمَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلَوَاتِ وَاِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ حِيْنَ الْكَرِيْهَاتِ قَالَ ثُمَّ فِيْمَ قُلْتُ فِي الدَّرَجَاتِ قَالَ وَمَا هُنَّ قُلْتُ اِطْعَامُ الطَّعَامِ وَلِيْنُ الْكَلاَمِ وَالصَّلٰوةُ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ قَالَ سَلْ قُلْتُ اللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَاَنْ تَغْفِرَلِيْ وَتَرْحَمَنِيْ وَاِذَا اَرَدْتَّ فِتْنَةً فِيْ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ وَاَسْاَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُنِيْ اِلٰى حُبِّكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهَا حَقٌّ فَادْرُسُوْهَا ثُمَّ تَعَلَّمُوْهَا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ وَسَاَلْتُ مُحَمَّدَ ابْنَ اِسْمٰعِيْلَ عَنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ فَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت معاذ بن جبل ؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز سرور کائنات ﷺ نے صبح کی نماز میں تشریف لانے میں (خلاف عادت اتنی) تاخیر فرمائی

کہ قریب تھا کہ سورج نکل آئے، اتنے میں آنحضرت ﷺ جھپٹتے ہوئے تشریف لائے چنانچہ نماز کے لئے تکبیر کہی گئی اور آپ ﷺ نے (صحابہؓ کے ہمراہ) نماز پڑھی (اس طرح کہ) نماز میں تخفیف کی (یعنی چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھیں اور سلام پھیرنے کے بعد ہم سے باآواز بلند فرمایا کہ "جس طرح تم لوگ بیٹھے ہو اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا" پھر آپ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ہوشیار! میں آج صبح کی نماز میں دیر سے آنے کی وجہ بیان کرتا ہوں (اور وہ یہ ہے کہ) میں نے آج رات (تہجد کی نماز کے لئے اٹھ کر وضو کیا اور جو کچھ میرے مقدر میں نماز تھی پڑھی اور نماز ہی میں مجھے اونگھ آگئی یہاں تک کہ نیند مجھ پر غالب آگئی (اس وقت) ناگہاں میں نے اپنے پروردگار بزرگ و برتر کو اچھی صورت میں (یعنی اچھی صفت کے ساتھ) دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا، "اے محمد!" میں نے عرض کیا "پروردگار میں حاضر ہوں!" اللہ تعالیٰ نے فرمایا (تمہیں معلوم ہے) مقربین فرشتے کس بات میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ "پروردگار میں نہیں جانتا"۔ اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ اسی طرح پوچھا (اور میں یہی جواب دیتا رہا)۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ، میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے مونڈھے کے درمیان اپنا ہاتھ رکھا یہاں تک کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینہ پر محسوس کی (جس کا اثر یہ ہوا کہ) میرے سامنے ہر شے ظاہر ہوگئی اور میں تمام باتیں جان گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے محمد (ﷺ)!" میں نے عرض کیا کہ "پروردگار میں حاضر ہوں" فرمایا (اب بتاؤ) مقربین فرشتے کس بات میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ گناہوں کو مٹا دینے والی چیزوں کے بارہ میں! اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وہ کون سی چیزیں ہیں؟" میں نے عرض کیا کہ جماعتوں کے واسطے (مسجدوں میں) آجانا اور نماز پڑھ کر (اور دعا وغیرہ کے لئے) مسجد میں بیٹھے رہنا، اور سختی کے ساتھ (جس وقت کہ سردی یا بیماری کی وجہ سے پانی کو استعمال کرنا تکلیف دہ معلوم ہو) اچھی طرح وضو کرنا اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اور کس چیز سے بحث کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ درجات کے بارہ میں! "فرمایا" وہ کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ (غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانا، نرم لہجہ میں بات کرنا اور رات میں اس وقت (یعنی تہجد کی) نماز پڑھنا جب کہ لوگ سوئے ہوں۔ "پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا" اچھا اب اپنے لئے جو چاہو دعا کرو۔ چنانچہ میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میں تجھ سے نیکیوں کے کرنے، برائیوں کے چھوڑنے، مسکینوں کی دوستی، اپنی بخشش اور تیری رحمت کا سوال کرتا ہوں اور جب تو کسی قوم میں گمراہی ڈالنا چاہے تو مجھے بغیر گمراہی کے اٹھا لے اور میں تجھ سے تیری محبت (یعنی یہ کہ میں تجھے دوست رکھوں یا تو مجھے دوست رکھے) اور اس شخص کی محبت جو تجھ سے محبت کرتا ہے، (یعنی یہ کہ میں اسے دوست رکھوں یا وہ مجھے دوست رکھے) اور ایسے عمل کی محبت کا جو تیری محبت سے نزدیک کر دے سوال کرتا ہوں۔ پھر آنحضرت ﷺ نے (ہم سے) فرمایا کہ "یہ خواب بالکل سچ ہے لہٰذا تم اسے یاد کرو اور پھر لوگوں کو سکھلاؤ" (احمدؒ، ترمذیؒ اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسمٰعیل سے اس حدیث کے بارہ میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے)۔"

تشریح: اس حدیث کی وضاحت اسی باب کی حدیث نمبر ۴۳ کی تشریح میں کی جاچکی ہے اس لئے یہاں اب مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے تاہم اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اس حدیث سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تھا اور یہ سوال و جواب حالت خواب ہی میں ہوئے تھے۔

(۵۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ قَالَ فَاِذَا قَالَ ذٰلِكَ قَالَ الشَّيْطَانُ حُفِظَ مِنِّي سَائِرَ الْيَوْمِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ اعوذ باللّٰہ العظیم وبوجھہ الکریم وسلطانہ القدیم من الشیطن الرجیم یعنی میں اللہ عظمت والے بزرگ ذات والے اور ہمیشہ کی سلطنت والے کے ساتھ شیطان مردود سے پناہ مانگتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہونے کے وقت یہ دعا

پڑھتا ہے تو شیطان (اس شخص کے بارہ میں) کہتا ہے کہ یہ بندہ تمام دن میرے شر سے محفوظ رہا۔" (ابوداؤد)

(۵۷) وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ۔ (رواہ مالک مرسلا)

"اور حضرت عطاء ابن یسارؒ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا (یعنی یہ دعا فرمائی) اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُعْبَدُ یعنی: اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا کہ لوگ اس کی عبادت کرنے لگیں۔ (اور آپ ﷺ نے فرمایا) جن لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا ان پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب (نازل) ہوا۔" (مالک رحمہ اللہ مرسلاً)

تشریح: آپ کی دعا کا مطلب یہ ہے کہ پروردگار! تو میری قبر کو اس معاملہ میں بتوں کی مانند نہ کر کہ میری اُمّت کے لوگ میری قبر کی خلاف شرع تعظیم کرنے لگیں یا بار بار زیارت کے لئے میلہ کے طور پر آنے لگیں، یا میری قبر کو سجدہ گاہ قرار دے کر اپنی پیشانیوں کو جو صرف تیری ہی چوکھٹ پر جھکنے کی سزاوار ہے اس پر جھکانے لگیں اور سجدے کرنے لگیں۔

اس حدیث کو اور اس دعا کو بار بار پڑھیے اور ذرا آج کے حالات پر اس کو منطبق کیجئے پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کی اس دعا کا تعلق آنے والے زمانہ سے تھا چنانچہ آپ ﷺ کی عرفانی نگاہوں نے اس وقت دیکھ لیا تھا کہ وہ وقت آنے والا ہے۔ کہ جب کہ میری قبر تو الگ رہی اولیاء اللہ کے مزارات پر سجدہ ریزی ہوگی مقبروں پر میلے لگیں گے وہاں عرس قوالیاں ہوں گی، قبروں پر چادریں اور پھولوں کا چڑھاوا چڑھے گا۔ غرض کہ جس طرح ایک بت پرست قوم خدا کی عبادت و فرمانبرداری سے سرکشی اور تمرد اختیار کر کے بتوں کے ساتھ معاملہ کرتی ہے میری اُمّت کے بدقسمت اور بدنصیب لوگ جو میرے نام کے شیدائی کہلائیں گے، میری محبت سے سرشاری کا دعویٰ کریں گے۔ میری لائی ہوئی پاک و صاف شریعت کی آڑ میں میرے دین کے نام پر وہی معاملہ قبروں کے ساتھ کریں گے لہٰذا آپ نے دعا فرمائی کہ اے پروردگار! تو میری اُمّت کو ایسی گمراہی میں مبتلا نہ کیجئے کہ وہ میری قبر کو پوجنے لگیں۔

جملہ اشتدت غضب الخ کا تعلق دعا سے نہیں ہے بلکہ یہ جملہ مستانفہ یعنی ایک الگ جملہ ہے گویا جب آپ ﷺ نے یہ دعا کی تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ دعا آپ ﷺ کیوں کر رہے ہیں تو اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا اشتد الخ یعنی میں اپنی اُمّت پر انتہائی شفقت و مہربانی کے لئے یہ دعا کر رہا ہوں کہ مبادا یہ بھی اس لعنت میں مبتلا نہ ہو جائیں جس طرح کہ یہود وغیرہ اس لعنت میں مبتلا ہو کر خدائے ذوالجلال کے غضب میں گرفتار ہوئے۔

(۵۸) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَحِبُّ الصَّلَاةَ فِي الْحِيْطَانِ قَالَ بَعْضُ رُوَاتِهٖ يَعْنِي الْبَسَاتِيْنَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ الْحَسَنِ بْنِ اَبِيْ جَعْفَرٍ قَدْ ضَعَّفَهُ يَحْيٰى بْنُ سَعِيْدٍ وَغَيْرُهُ۔

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ "حیطان" میں نماز پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ اس حدیث کے بعض راویوں نے کہا ہے کہ حیطان سے مراد بساتین (یعنی باغات) ہیں۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے (کیونکہ) یہ روایت بجز حسن بن ابی جعفر کی سند کے اور کسی سند سے منقول نہیں ہے اور انہیں بھی یحییٰ ابن سعد وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔"

(۵۹) وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةُ الرَّجُلِ فِيْ بَيْتِهٖ بِصَلَاةٍ وَصَلَاتُهٗ فِيْ مَسْجِدِ الْقَبَائِلِ بِخَمْسٍ وَعِشْرِيْنَ صَلَاةً وَصَلَاتُهٗ فِي الْمَسْجِدِ الَّذِيْ يُجَمَّعُ فِيْهِ بِخَمْسِمِائَةِ صَلَاةٍ وَصَلَاتُهٗ فِي الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى بِخَمْسِيْنَ اَلْفِ صَلَاةٍ وَصَلَاتُهٗ فِيْ مَسْجِدِيْ بِخَمْسِيْنَ اَلْفِ صَلَاةٍ وَصَلَاتُهٗ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَةِ اَلْفِ صَلَاةٍ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت انس ابن مالکؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، آدمی کی نماز اپنے گھر میں ایک ہی نماز کے برابر اور محلّہ کی مسجد میں اس کی پچیس نمازوں کے برابر اور اس مسجد میں جہاں جمع ہوتا ہے (یعنی جامع مسجد میں) اس کی نماز پانچ سو نمازوں کے برابر اور مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس میں) اور میری مسجد (مسجد نبوی ﷺ میں) اس کی نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام میں اس کی نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ مساجد کے مراتب اور ان میں نماز پڑھنے کے ثواب کے فرق و درجات کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ سب سے کم تر درجہ تو خود کسی کے گھر کا ہے یعنی اگر کوئی شخص مسجد کے بجائے اپنے گھر میں نماز پڑھتا ہے تو اسے صرف اسی ایک نماز کا ثواب ملتا ہے اور اگر کوئی شخص اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز ادا کرتا ہے تو اسے پچیس نمازوں کا ثواب دیا جاتا ہے اسی طرح جامع مسجد میں نماز پڑھنے والے کو پانچ سو اور بیت المقدس و مسجد نبوی ﷺ میں نماز پڑھنے والے کو اس کی ایک نماز کے بدلہ میں پچاس ہزار نمازوں کا ثواب دیا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کرے پھر تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں یعنی اسے ایک نماز کے عوض ایک لاکھ نمازوں کا ثواب دیا جاتا ہے۔

(۶۵) وَعَنْ اَبِي ذَرٍّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ فِي الْاَرْضِ اَوَّلُ قَالَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ قُلْتُ ثُمَّ اَيٌّ قَالَ ثُمَّ الْمَسْجِدُ الْاَقْصٰى قُلْتُ كَمْ بَيْنَهُمَا قَالَ اَرْبَعُوْنَ عَامًا ثُمَّ الْاَرْضُ لَكَ مَسْجِدٌ فَحَيْثُ مَا اَدْرَكَتْكَ الصَّلٰوةُ فَصَلِّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کائنات ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! زمین کے اوپر سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا "مسجد حرام" میں نے عرض کی کہ پھر اس کے بعد؟ فرمایا، "مسجد اقصیٰ" (یعنی بیت المقدس) پھر میں نے پوچھا کہ ان دونوں مسجدوں (کی بناء) کے درمیان کتنا فرق تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "چالیس سال" پھر اس کے بعد فرمایا، اب تو ساری زمین تمہارے لئے مسجد ہے (یعنی اس کا ہر حصّہ مسجد کا حکم رکھتا ہے کہ) جہاں نماز کا وقت ہو جائے وہیں نماز پڑھ لو۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کعبۃ اللہ کو بنانے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور بیت المقدس کی بناء رکھنے والے حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں اور تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک ہزار برس سے زیادہ کا فرق ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے یہ کس اعتبار سے فرمایا کہ کعبۃ اللہ اور بیت المقدس کی بناء کے درمیان صرف چالیس سال کا فرق ہے۔

اس کے جواب میں علامہ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ:

"اس حدیث کے ذریعہ ان دونوں مسجدوں کی بناء اول کی طرف اشارہ ہے اور یہ ثابت ہے کہ کعبہ کے بانی اول حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں ہیں۔ اسی طرح بیت المقدس کے بھی بانی اول حضرت سلیمان علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ کعبہ کی بناء سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی ہے پھر حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد تمام روئے زمین پر پھیل گئی۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ان کی اولاد میں سے کسی نے بیت المقدس کی بنیاد رکھی ہو اور ان دونوں کے درمیان چالیس سال کا فرق رہا ہو۔ پھر اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کو بنایا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ:

مجھے اس حدیث کی توثیق علامہ ابن ہشامؒ کے اس مقولہ سے معلوم ہوتی ہے جو انہوں نے کتاب التسبیحات میں لکھا ہے کہ:

"جب حضرت آدم علیہ السلام کعبۃ اللہ کی تعمیر سے فارغ ہو گئے تو انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب بیت المقدس کی سیر کر کے اسے بناؤ چنانچہ انہوں نے اس حکم کی تعمیل میں بیت المقدس بنایا اور اس میں عبادت کی۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کی بناء میں چالیس سال

کے عرصہ کا فرق ہوگا۔"

بعض علماء سے اس حدیث کی توجیہ یہ منقول ہے کہ:

"جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بنایا تو مسجد کی حد مقرر کر دی تھی اسی طرح بیت المقدس کی بھی حد مقرر کر دی ہوگی۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ان کی حدود کو مقرر کرنے کا درمیانی وقفہ چالیس سال کا ہو۔"

بَابُ السَّتْرِ

ستر ڈھانکنے کا بیان

نماز صحیح طور پر ادا ہونے کی جہاں اور بہت سی شرائط ہیں ان ہی میں ایک شرط ستر یعنی شرم گاہ کا چھپانا بھی ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ کے مصنف ؒ اس باب میں اسی سلسلہ کی حدیثیں بیان کریں گے اس کے علاوہ اس باب میں مصنف ؒ ان لباسوں کے بارہ میں بھی احادیث نقل کریں گے جن میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ ؓ نے نمازیں پڑھی ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ عُمَرَ بْنِ اَبِی سَلَمَةَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّی فِی ثَوْبٍ وَاحِدٍ مُشْتَمِلًا بِهٖ فِی بَيْتِ اُمِّ سَلَمَةَ وَاضِعًا طَرَفَيْهِ عَلٰی عَاتِقَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عمر ابن ابی سلمہ ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کائنات ﷺ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرت ام سلمہ ؓ کے مکان میں آپ ﷺ اس کپڑے کو اپنے جسم سے اس طرح لپیٹے ہوئے تھے کہ اس کے دونوں کنارے آپ ﷺ کے مونڈھوں پر تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "اشتمال" اسے کہتے ہیں کہ کپڑے کا وہ کنارہ جو داہنے مونڈھے پر ہے بائیں ہاتھ کے نیچے سے نکالا جائے اور پھر وہ کنارا لے کر جو دائیں ہاتھ کے نیچے سے بائیں ہاتھ پر ڈالا گیا ہے دونوں کو ملا کر سینہ پر گرہ لگائی جائے لیکن گرہ لگانے کی ضرورت صرف اس صورت میں ہوتی ہے جب کہ کپڑے کے کنارے لمبے نہ ہوں اور ان کے کھل جانے کا خوف ہو، اگر کنارے لمبے ہوں تو پھر گرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ یمن کے سفیروں کے لباس سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شارحین کی عبارتوں میں گرہ لگانے کی قید ذکر نہیں کی گئی ہے۔

ان احادیث میں "مشتمل" متوشح اور مخالف بین طرفیہ کے جو الفاظ آئے ہیں سب کے ایک ہی معنی ہیں اور سب کی ایک ہی مذکور بالا صورت ہوتی ہے۔

② وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُصَلِّيَنَّ اَحَدُكُمْ فِی الثَّوْبِ الْوَاحِدِ لَيْسَ عَلٰی عَاتِقَيْهِ مِنْهُ شَیْءٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، تم میں سے کوئی شخص ایک کپڑے میں (اس طرح) نماز نہ پڑھے کہ اس کے کپڑے کا کچھ حصہ مونڈھوں پر نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اشتمال کی صورت میں تو نماز پڑھنے کی اجازت ہے کیونکہ اس میں کپڑے کا کچھ حصہ مونڈھوں پر ہوتا ہے اور اگر مونڈھے پر کپڑے کا کچھ حصہ بھی نہ ہو تو اس صورت میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی اور اس کی حکمت علماء یہ لکھتے ہیں کہ صرف

ایک ہی کپڑا اگر ہو اور اسی کا تہ بند کر لیا جائے اور اس کا کچھ حصّہ مونڈھوں پر ڈالا نہ جائے تو اس صورت میں ستر کھل جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور پھر یہ کہ رب ذوالجلال کے دربار میں حاضری کا وقت ہونے کی وجہ سے یہ بے ادبی کی شکل ہے۔

حضرت امام اعظمؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور جمہور علماء کے نزدیک یہ نہی تنزیہی ہے تحریمی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف ایک کپڑے میں اس طرح نماز پڑھے کہ اس کے کپڑے کا کچھ حصّہ مونڈھوں پر نہ ہو مگر ستر چھپا ہوا ہو تو اس کی نماز ہو جائے گی لیکن کراہت کے ساتھ ہوگی۔ حضرت امام احمد اور دوسرے علماء سلف ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس صورت میں اس شخص کی نماز نہیں ہوگی۔

(۳) وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ صَلّٰى فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ فَلْيُخَالِفْ بَيْنَ طَرَفَيْهِ۔
(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جو شخص صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھے تو اسے چاہئے کہ اس کپڑے کی دونوں طرفوں میں مخالفت رکھے (یعنی اشتمال کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہی اختیار کرے)۔" (بخاریؒ)

(۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَمِيْصَةٍ لَهَا اَعْلَامٌ فَنَظَرَ اِلٰى اَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ اذْهَبُوْا بِخَمِيْصَتِيْ هٰذِهٖ اِلٰى اَبِيْ جَهْمٍ وَاْتُوْنِيْ بِاَنْبِجَانِيَّةِ اَبِيْ جَهْمٍ فَاِنَّهَا اَلْهَتْنِيْ اٰنِفًا عَنْ صَلَاتِيْ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ قَالَ كُنْتُ اَنْظُرُ اِلٰى عَلَمِهَا وَاَنَا فِي الصَّلَاةِ فَاَخَافُ اَنْ يَفْتِنَنِيْ۔

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے ایک ایسی چادر میں نماز پڑھی جس کے کنارے دوسرے رنگ کے تھے یا اس کے کناروں پر کچھ کام کیا ہوا تھا چنانچہ آپ ﷺ نے اس پر کئے ہوئے کام کو دیکھا اور جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ اس چادر کو ابی جہم کے پاس لے جاؤ (اور اسے اس کے حوالہ کر کے) ابی جہم کی انبجانیہ لے آؤ کیونکہ اس چادر نے مجھے میری نماز میں حضوری قلب کی دولت سے باز رکھا ہے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور بخاریؒ کی ایک روایت میں (یہ بھی منقول ہے کہ) آپ ﷺ نے فرمایا "میں نماز کے دوران اس چادر کے نقش و نگار کی طرف دیکھنے لگا اور مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ میری نماز خراب نہ کر دے۔"

تشریح: خمیصہ ایک چادر کو کہتے ہیں جو خز کی یا صوف کی ہوتی ہے جس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور دھاری دار ہوتی ہے لہٰذا جملہ "لها اعلام" یا تو خمیصہ کی تاکید ہے یا اس کا بیان ہے۔ یہ چادر ایک صحابی حضرت ابوجہم تحفہ کے طور پر آپ ﷺ کی خدمت میں لائے تھے آپ ﷺ نے جب اس کو اوڑھ کر نماز پڑھی اور نماز کے آداب کے دوران آپ ﷺ کی نظر اس کی دھاریوں پر پڑی تو قلب مبارک میں کچھ فرق محسوس ہوا، چنانچہ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو گئے تو صحابہؓ سے فرمایا کہ اسے ابوجہم کو واپس کر آؤ، چونکہ آپ ﷺ کو یہ خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے کہ اس چادر کو واپس کر دینے سے ایک مخلص صحابی کی دل شکنی ہو اس لئے آپ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ اس کے بدلہ میں ان سے انبجانیہ لے آؤ۔ انبجان ایک شہر کا نام ہے اس شہر کی بنی ہوئی چادریں بالکل سیاہ ہوتی تھیں۔ اس شہر کی مناسبت سے چادر کو انبجانیہ کہا جاتا تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظاہری نقش و نگار پاک نفوس اور صاف قلوب کو بھی متاثر کرتے ہیں اور یہ تاثیر قلب کی انتہائی صفائی اور لطافت کی بناء پر ہوتی ہے جیسے کہ کسی صاف و شفاف اور سفید چادر پر ایک معمولی سا سیاہ نقطہ بھی پڑ جاتا ہے تو فوراً ظاہر ہو جاتا ہے اور ناگوار محسوس ہوتا ہے اور چادر جتنی زیادہ سفید ہوتی ہے وہ سیاہ نقطہ اتنا ہی زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہی حال ان نفوس قدسیہ کا ہے جن کے قلب و دماغ تعلق مع اللہ اور ریاضت و مجاہدہ کی بناء پر اتنے پاک و صاف ہو جاتے ہیں کہ گناہ و معصیت تو الگ ہے کسی معمولی مباح شے کا ادنیٰ سا تصور بھی قلب و دماغ پر اثر انداز ہو جاتا ہے لیکن ان کے مقابلہ پر آلودگان تیرہ باطن بھی ہوتے ہیں جن کے دل و دماغ پر بڑے بڑے گناہ کا بھی اثر نہیں ہوتا۔

ہمارا خیال ہے کہ اس حدیث کے ذریعہ اصل اُمت کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ نماز کے سلسلہ میں ایسی چیزوں سے احتیاط رکھنی چاہئے جو نماز میں دھیان بٹانے کا سبب بنتی ہوں۔

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ سَتَرَتْ بِهٖ جَانِبَ بَيْتِهَا فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمِيْطِي عَنَّا قِرَامَكِ هٰذَا فَاِنَّهٗ لَا يَزَالُ تَصَاوِيْرُهٗ تَعْرِضُ فِيْ صَلَاتِيْ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے مکان کے ایک حصہ میں ایک پردہ ڈال رکھا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اس پردہ کو ہمارے سامنے سے ہٹالو کیونکہ اس کی تصویریں نماز میں برابر میرے سامنے رہتی ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پردہ حضرت عائشہؓ نے دیوار گیری کے طور پر دیوار پر لگا رکھا ہوگا مگر بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ پردہ چھپر کھٹ کے طریقہ پر تھا۔ بہر حال حضرت عائشہؓ نے یہ پردہ اسی وقت سے لگا رکھا ہوگا جب تک کہ انہیں حدیث نہی معلوم نہیں ہوئی ہوگی۔ جب آنحضرت ﷺ نے انہیں منع فرمادیا تو انہوں نے وہ پردہ اتار ڈالا۔

⑥ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ اُهْدِيَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرُّوْجُ حَرِيْرٍ فَلَبِسَهٗ ثُمَّ صَلّٰى فِيْهِ ثُمَّ انْصَرَفَ فَنَزَعَهٗ نَزْعًا شَدِيْدًا كَالْكَارِهِ لَهٗ ثُمَّ قَالَ لَا يَنْبَغِيْ هٰذَا لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ کی خدمت اقدس میں کسی نے ایک ریشمی قبا تحفہ کے طور پر بھیجی چنانچہ آپ ﷺ نے اسے پہن کر نماز پڑھ لی نماز پڑھنے کے بعد آپ ﷺ نے اس قبا کو اس طرح اتار پھینکا جیسے کوئی بہت برا جانتا ہو پھر فرمایا کہ (ریشمی کپڑے شرک و کفر سے) بچنے والوں کے لائق نہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "فروج" اس قبا کو کہتے ہیں جس میں پیچھے کی طرف چاک ہوتا ہے۔ یہ فروج آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اکیدر بادشاہ رومہ یا بادشاہ اسکندریہ نے تحفۃً بھیجی تھی۔ چونکہ اس وقت مردوں کو ریشمی کپڑا پہننا حرام نہیں تھا اس لئے آپ ﷺ نے اسے زیب تن فرما لیا اور اس میں نماز پڑھ لی مگر یہ سوچ کر کہ ریشمی کپڑا پہننے سے رعونت پائی جاتی ہے آپ ﷺ نے اسے ناپسند فرما کر اتار دیا۔ اس طرح آپ ﷺ نے اپنے اس عمل سے یہ ظاہر فرمادیا کہ اگرچہ اس کا پہننا مباح ہے لیکن خدا کے نیک بندے اور متقی و پرہیزگار لوگ چونکہ عزیمت پر عمل کرتے ہیں اس لئے ان کے لئے یہ مناسب اور بہترین نہیں ہے کہ وہ ریشمی کپڑا پہنیں۔ پھر بعد میں ریشم کا پہننا تمام مسلمان مردوں کے لئے خواہ متقی ہوں یا غیر متقی، حرام ہوگیا۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ یہ نہی اس حالت میں ہوئی ہو تو اس صورت میں متقی عن الشرک مراد ہوگا یعنی مسلمانوں کو یہ پہننا نہ چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

⑦ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ رَجُلٌ اَصِيْدُ اَفَاُصَلِّيْ فِي الْقَمِيْصِ الْوَاحِدِ قَالَ نَعَمْ وَازْرُرْهُ وَلَوْ بِشَوْكَةٍ۔ (رواه ابوداؤد وروى النسائی نحوه)

"اور حضرت سلمہ ابن اکوعؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں ایک شکاری آدمی ہوں، کیا میں ایک ہی کرتے میں نماز پڑھ لیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں (پڑھ لیا کرو) لیکن اسے باندھ لیا کرو خواہ اسے کانٹے ہی سے کیوں نہ اٹکا لیا جائے۔" (ابوداؤد، نسائیؒ)

تشریح: چونکہ شکاری لوگ شکار میں کم کپڑے پہنتے ہیں اور زیادہ کپڑے پہننے سے شکار کرنے میں رکاوٹ ہوتی ہے اس لئے ان صحابی کے سوال کا مقصد یہ تھا کہ میں چونکہ شکار کھیلنے والا آدمی ہوں اور شکار کے وقت عموماً صرف ایک کرتہ ہی پہنے ہوئے ہوتا ہوں اس کے نیچے لنگی بھی نہیں ہوتی تاکہ شکار کے پیچھے دوڑنے میں آسانی رہے تو کیا میں صرف ایک کرتہ ہی میں نماز پڑھ لیا کروں؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ایک کرتہ ہی میں نماز پڑھ سکتے ہو لیکن اس کرتہ کا چاک اگر اتنا کھلا ہوا ہو کہ رکوع و سجود کے وقت ستر کھلنے کا اندیشہ رہے تو اس کے چاک کو باندھ لیا کرو۔ اگر اس وقت چاک بند کرنے کی کوئی چیز موجود نہ ہو تو اس میں کانٹا لگا کر ہی اسے بند کر لیا کرو تاکہ ستر نہ کھلے۔

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ بَیْنَمَا رَجُلٌ یُصَلِّی مُسْبِلٌ اِزَارَهٗ قَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذْهَبْ فَتَوَضَّأْ فَذَهَبَ وَتَوَضَّأَ ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَالَكَ اَمَرْتَهٗ اَنْ یَتَوَضَّأَ قَالَ اِنَّهٗ كَانَ یُصَلِّی وَهُوَ مُسْبِلٌ اِزَارَهٗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَقْبَلُ صَلَاةَ رَجُلٍ مُسْبِلٍ اِزَارَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص ازار لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا سرور کائنات ﷺ نے (یہ دیکھ کر) اس سے فرمایا کہ، "جاؤ اور وضو کرو!" وہ شخص جا کر وضو کر آیا۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) نے اس شخص کو وضو کرنے کے لئے کیوں فرمایا؟ (حالانکہ وہ باوضو تھا) آپ ﷺ نے فرمایا کہ، وہ شخص اپنا ازار لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا اور جو شخص ازار لٹکائے ہوئے ہو اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "اسبال" اسے کہتے ہیں کہ کوئی بھی کپڑا اتنا لمبا پہنا جائے کہ وہ ناز و تکبر کے طور پر نیچے زمین تک لٹکا ہوا ہو۔ گو یہ ازار ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے لیکن اس کا اشتمال اکثر و بیشتر ازار ہی کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا پائجامہ، لنگی اور کرتا وغیرہ غرور و تکبر کی بناء پر ٹخنوں سے نیچے لٹکانا مکروہ ہے، یہی وجہ ہے جب آپ ﷺ نے اس شخص کو ازار لٹکائے ہوئے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ جو شخص ازار لٹکائے ہوئے ہو اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا یعنی اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی نماز کا کمال قبول نہیں کرتا اور ثواب نہیں دیتا اگرچہ اصل نماز ہو جاتی ہے۔

باوجودیکہ وہ شخص باوضو تھا مگر آپ ﷺ نے اسے وضو کرنے کا حکم اس حکمت کی بناء پر دیا تاکہ وہ شخص اس کا سبب معلوم کرنے میں غور فکر کرے اور پھر اسے اس فعل شنیع کی برائی کا احساس ہو، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی برکت اور ظاہری طہارت یعنی وضو کی وجہ سے اس کا باطن غرور و تکبر کی آلائش سے پاک و صاف کر دے کیونکہ ظاہری طہارت باطنی صفائی و پاکیزگی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

⑨ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ حَائِضٍ اِلَّا بِخِمَارٍ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، بالغہ عورت کی نماز بغیر دوپٹہ کے (یعنی سر ڈھانکے بغیر) نہیں ہوتی۔"
(ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: "حائض" سے مراد بالغہ عورت ہے جو حیض کی عمر کو پہنچ جائے خواہ اسے حیض آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کا سر اور اس کے بال ستر میں شامل ہیں لہٰذا اگر کوئی عورت ننگے سر نماز پڑھے گی تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر عورت اتنا باریک کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھے کہ اس کپڑے میں سے بال یا بدن کا رنگ دکھائی دیتا ہو تو اس کی نماز بھی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ یہ حکم آزاد عورت کا ہے لونڈی اس حکم میں داخل نہیں ہے اس کی نماز ننگے سر بھی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا سر ستر نہیں اس کا ستر مرد کی طرح ناف کے نیچے سے زانو کے نیچے تک نیز پیٹ، پیٹھ اور پہلو بھی۔

⑩ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّهَا سَاَلَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتُصَلِّی الْمَرْاَةُ فِیْ دِرْعٍ وَّخِمَارٍ لَیْسَ عَلَیْهَا اِزَارٌ قَالَ اِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغًا یُغَطِّیْ ظُهُوْرَ قَدَمَیْهَا۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَذَكَرَ جَمَاعَةً وَّقَفُوْهُ عَلٰی اُمِّ سَلَمَةَ۔

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے سرور کائنات ﷺ سے پوچھا کہ اگر عورت کے پاس تہبند (یعنی پائجامہ وغیرہ) نہ ہو اور وہ صرف

دوپٹہ اور کرتہ میں نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا (ہاں ہو جائے گی) بشرطیکہ کرتہ اتنا لمبا ہو کہ اس سے اس کے پاؤں کی پشت چھپ جاتی ہو۔ (ابوداؤدؒ) اور ابوداؤدؒ نے کہا کہ ایک جماعت نے اس روایت کو اُمّ سلمہؓ پر موقوف کر دیا ہے یعنی انہوں نے کہا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں ہے بلکہ حضرت اُمّ سلمہؓ کا قول ہے۔"

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کے پاؤں کی پشت بھی ستر میں شامل ہے اس کو نماز میں ڈھانکنا واجب ہے۔

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنِ السَّدْلِ فِی الصَّلٰوةِ وَاَنْ یُّغَطِّیَ الرَّجُلُ فَاهُ۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے نماز میں سدل کرنے اور مرد کو منہ ڈھانکنے سے منع فرمایا ہے۔"

(ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: "سدل" کے معنی یہ ہیں کہ کپڑے کو اپنے سر یا مونڈھے پر ڈال کر دونوں طرف سے اسے لٹکا دیا جائے چنانچہ کپڑا استعمال کرنے کا یہ طریقہ مطلقاً ممنوع ہے کیونکہ اس سے غرور۔ و تکبر کی شان پیدا ہوتی ہے اور نماز میں تو یہ طریقہ بہت ہی برا ہے۔ اس طرح نماز پڑھنے سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ "سدل" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کپڑا اوڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے اندر کرے اور اسی طرح رکوع و سجدہ کرتا رہے۔ چونکہ یہ طریقہ یہودیوں کا تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

عرب میں پگڑی کے کونہ سے منہ پر ڈھاٹا باندھ لیتے تھے جس سے دہانہ چھپ جاتا تھا آپ ﷺ نے نماز میں اس سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ اس طرح نہ تو قرأت اچھی طرح ہوتی ہے اور نہ سجدہ پورے طور پر ہوتا ہے۔ ہاں اگر نماز میں کسی کو ڈکار آئے یا منہ سے بدبو آئے تو اسے ہاتھ سے منہ ڈھانک لینا مستحب ہے۔

(۱۲) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَالِفُوا الْیَهُوْدَ فَاِنَّهُمْ لَا یُصَلُّوْنَ فِیْ نِعَالِهِمْ وَلَا خِفَافِهِمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت شداد ابن اوسؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، (جوتے اور موزے پہن کر نماز پڑھنے میں) یہودیوں کی مخالفت کرو کیونکہ وہ لوگ جوتے اور موزے پہن کر نماز نہیں پڑھتے۔" (ابوداؤد)

تشریح: یہودی جوتے اور موزے پہن کر نماز نہیں پڑھتے تھے اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ یہودیوں کی مخالفت کرو اور جوتے پہن کر (اگر وہ پاک وصاف ہوں) اور موزے پہن کر نماز پڑھ لیا کرو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گمراہ لوگوں کی مخالفت ظاہر کرنے کی غرض سے کسی مباح چیز پر عمل کرنا بہتر ہے اور وجہ یہ ہے کہ اس طرح چونکہ گمراہ لوگوں کی مخالفت لازم آتی ہے اس لئے وہ مباح چیز بھی عزیمت یعنی اولویت کا حکم پیدا کر دیتی ہے۔

(۱۳) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ بَیْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ بِاَصْحَابِهٖ اِذْ خَلَعَ نَعْلَیْهِ فَوَضَعَهُمَا عَنْ یَسَارِهٖ فَلَمَّا رَاٰی ذٰلِكَ الْقَوْمُ اَلْقَوْا نِعَالَهُمْ فَلَمَّا قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلَاتَهٗ قَالَ مَاحَمَلَكُمْ عَلٰی اِلْقَائِكُمْ نِعَالَكُمْ قَالُوْا رَاَیْنَاكَ اَلْقَیْتَ نَعْلَیْكَ فَاَلْقَیْنَا نِعَالَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ جِبْرِیْلَ اَتَانِیْ فَاَخْبَرَنِیْ اَنَّ فِیْهِمَا قَذَرًا اِذَا جَاءَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْیَنْظُرْ فَاِنْ رَاٰی فِیْ نَعْلَیْهِ قَذَرًا فَلْیَمْسَحْهُ وَلْیُصَلِّ فِیْهِمَا۔

(رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں ایک مرتبہ سرور کائنات ﷺ اپنے اصحاب کو نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ ﷺ نے اچانک اپنے

جوتے اتار کر اپنی بائیں طرف (دور ہٹا کر) رکھ لئے جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے جوتے اتار ڈالے۔ آنحضرت ﷺ جب نماز سے فارغ ہوگئے تو فرمایا کہ تمہیں جوتے اتارنے پر کس چیز نے مجبور کر دیا تھا؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے دیکھا کہ آپ (ﷺ) نے اپنے جوتے اتار ڈالے ہیں اس لئے ہم نے بھی اپنے جوتے اتار ڈالے آپ ﷺ نے فرمایا کہ (میں نے تو جوتے اس لئے اتار دئے تھے کہ) میرے پاس جبرئیل آئے اور انہوں نے خبر دی کہ میرے جوتوں میں نجاست لگی ہوئی ہے (اس لئے میں نے جوتے نکال دیئے تھے) تم میں سے جو شخص مسجد میں آئے تو پہلے وہ اپنے جوتے دیکھ لیا کرے۔ اگر ان میں نجاست لگی ہوئی معلوم ہو تو انہیں صاف کرلے (اور انہیں پہنے ہی پہنے) نماز پڑھ لے۔" (ابوداؤد، دارمی)

تشریح: "قذر" (قاف کے زبر اور دال معجمہ کے ساتھ) اس چیز کو کہتے ہیں جسے طبیعت مکروہ رکھے لہٰذا اس لفظ سے بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے جوتے میں ایسی نجاست نہیں لگی ہوگی جس سے نماز درست نہ ہوتی ہو بلکہ کوئی گھناؤنی چیز جیسے رینٹھ وغیرہ لگی ہوگی کیونکہ اگر نجاست لگی ہوتی تو آپ ﷺ از سر نو نماز پڑھتے حالانکہ آپ ﷺ نے جتنی نماز پڑھ لی تھی نہ تو آپ ﷺ نے اس کا اعادہ کیا اور نہ از سر نو نماز پڑھی۔ حضرت جبرئیل کا خبر دینا اور پھر اس خبر کی بناء پر آپ ﷺ کا جوتوں کو اتار دینا اس لئے تھا کہ آپ ﷺ کے مزاج اقدس میں چونکہ صفائی اور ستھرائی بہت زیادہ تھی اس لئے جوتوں پر اس گھناؤنی چیز کا لگا رہنا آپ ﷺ کے مزاج کے مناسب نہیں تھا اور بعض شوافع حضرات کہتے ہیں کہ اگر کسی نمازی کے کپڑے وغیرہ پر نجاست لگی ہوئی ہو اور اسے اس کا علم نہ ہو تو نماز ہو جاتی ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کا یہ قول قدیم ہے۔

بہر حال۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی متابعت واجب ہے کیونکہ صحابہؓ نے کوئی سبب پوچھے بغیر محض آپ ﷺ کو جوتے اتارتے دیکھ کر اپنے جوتے فوراً اتار ڈالے اور پھر آنحضرت ﷺ نے بھی اسے جائز رکھا۔

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ فَلَا یَضَعْ نَعْلَیْهِ عَنْ یَمِیْنِهٖ وَلَا عَنْ یَسَارِهٖ فَتَکُوْنَ عَنْ یَمِیْنِ غَیْرِهٖ اِلَّا اَنْ لَّا یَکُوْنَ عَلٰی یَسَارِهٖ اَحَدٌ وَلْیَضَعْهُمَا بَیْنَ رِجْلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَوْلِیُصَلِّ فِیْهِمَا۔

(رواہ ابوداؤد وروی ابن ماجۃ، معناہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو تو اپنے جوتے کو نہ اپنی دائیں طرف رکھے اور نہ بائیں طرف ہی رکھے کیونکہ ادھر دوسرے آدمی کی دائیں جانب ہوگی۔ ہاں اگر کوئی بائیں جانب نہ ہو تو ادھر رکھ لے (ورنہ) اسے چاہئے انہیں اپنے دونوں پیروں کے درمیان (یعنی اپنے آگے پیروں کے پاس) رکھ لے اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ یا" (اگر جوتے پاک ہوں تو ان کو اتارنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ) انہیں پہنے ہی پہنے نماز پڑھ لے۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نماز کے دوران جوتے اپنی دائیں طرف نہ رکھے جائیں اور بائیں طرف بھی اس لئے نہ رکھے جائیں کہ جو شخص اس کے بائیں طرف کھڑا ہوگا یہ جوتا جو اپنے بائیں طرف رکھا گیا ہے اس شخص کے دائیں طرف پڑے گا۔ لہٰذا جب اپنی دائیں طرف جوتا رکھنا پسند نہ کیا تو اس جوتے کو دوسرے شخص کے دائیں طرف کیوں رکھا جائے کیونکہ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جو چیز اپنے لئے پسند کرتا ہے اپنے ساتھی کے لئے بھی اس چیز کو پسند کرے اور جس چیز کو اپنے لئے ناپسند کرتا ہے اسے اپنے ساتھی کے لئے بھی ناپسند کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑮ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَرَاَیْتُهٗ یُصَلِّیْ عَلٰی حَصِیْرٍ یَسْجُدُ عَلَیْهِ قَالَ وَرَاَیْتُهٗ یُصَلِّیْ فِیْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ مُتَوَشِّحًا بِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ میں سرور کائنات کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ ﷺ ایک بوریہ پر نماز پڑھ رہے ہیں اور اسی پر سجدہ کر رہے ہیں۔ حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ ایک کپڑا اوڑھے ہوئے جو آپ ﷺ کے جسم پر لپٹا ہوا تھا نماز پڑھ رہے تھے۔" (مسلم)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نماز ہر اس چیز پر جائز ہے جو نمازی اور زمین کے درمیان حائل ہو خواہ وہ چیز بوریہ وغیرہ کی قسم سے ہو یا کپڑے اور صوف وغیرہ کی قسم سے۔ گو اس حدیث میں صرف بوریہ کا ذکر کیا گیا ہے لیکن علماء کے پاس اور دلائل ایسے ہیں جن کی رو سے وہ بوریہ کے علاوہ کپڑے وغیرہ پر نماز پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ بغیر کچھ بچھائے ہوئے زمین پر نماز پڑھنا افضل ہے اس لئے کہ خشوع و خضوع نماز کی اصل و روح ہے اور یہ چیزیں زمین پر نماز پڑھنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ ہاں اگر کوئی مجبوری ہو مثلاً سردی یا گرمی کی وجہ سے بغیر کچھ بچھائے ہوئے زمین پر نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو پھر کچھ بچھا لینا ہی بہتر ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ جو چیزیں زمین سے اگی ہوئی نہ ہوں اس پر نماز پڑھنا بہتر نہیں ہے یعنی بوری وغیرہ پر نماز پڑھنا تو افضل و بہتر ہے اور کپڑے وغیرہ پر نماز پڑھنا بہتر نہیں ہے۔

(۱۶) وَعَنْ عَمْرِو ابْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ حَافِيًا وَّمُنْتَعِلًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کائنات ﷺ کو کبھی ننگے پاؤں اور کبھی جوتے پہنے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔" (ابوداؤد)

(۱۷) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ صَلّٰى بِنَا جَابِرٌ فِيْ اِزَارٍ قَدْ عَقَدَهٗ مِنْ قِبَلِ قَفَاهُ وَثِيَابُهٗ مَوْضُوْعَةٌ عَلَى الْمِشْجَبِ فَقَالَ لَهٗ قَائِلٌ تُصَلِّيْ فِيْ اِزَارٍ وَاحِدٍ فَقَالَ اِنَّمَا صَنَعْتُ ذٰلِكَ لِيَرَانِيْ اَحْمَقُ مِثْلُكَ وَاَيُّنَا كَانَ لَهٗ ثَوْبَانِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت محمد ابن منکدر فرماتے ہیں کہ حضرت جابرؓ نے صرف تہ بند باندھ کر جسے انہوں نے اپنی گدی کی طرف باندھ رکھا تھا نماز پڑھی حالانکہ ان کے کپڑے کھونٹی پر لٹکے ہوئے تھے ان سے کسی کہنے والے نے کہا کہ، آپ نے صرف تہبند میں نماز پڑھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ، میں نے یہ اس واسطے کیا تاکہ تم جیسا احمق مجھے دیکھے بھلا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم میں سے وہ کون تھا جس کے پاس دو کپڑے تھے۔" (بخاری)

تشریح: "مشجب" کا عام فہم معنی کھونٹی ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ مشجب اس چیز کو کہتے ہیں جس پر کپڑے لٹکائے یا رکھے جاتے ہیں یا اس چیز کو کہتے ہیں جس پر کبھی کبھی پانی ٹھنڈا ہونے کے لئے مشک لٹکا دی جاتی تھی۔

بہر حال حضرت جابرؓ نے اپنے کپڑے اس پر رکھ دئے تھے اور نماز صرف ایک کپڑے میں اس طرح پڑھ رہے تھے کہ اس کپڑے کا تہبند کر رکھا تھا اور اس کے کونے اوپر کے گلے میں باندھ رکھے تھے چنانچہ ایک شخص نے اس طریقہ کو خلاف سُنّت سمجھتے ہوئے برا خیال کیا اور حضرت جابرؓ سے پوچھا کہ آپ اتنے سارے کپڑوں کی موجودگی میں بھی صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہے ہیں تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ میں صرف ایک کپڑے میں نماز اس لئے پڑھ رہا ہوں تاکہ تم جیسا کم علم مجھے دیکھے اور جان لے کہ نماز صرف ایک کپڑے میں بھی پڑھی جا سکتی ہے یہ خلاف سُنّت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے اسی مقصد کے تحت اسے ڈانٹا اور کہا کہ احمق تو اسے برا کیوں سمجھ رہا ہے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہم میں سے وہ کون تھا جس کے پاس دو کپڑے تھے، ہمارے پاس تو صرف

ایک ایک کپڑا ہوتا تھا اسی میں ہم نماز پڑھتے تھے اور اسی کو دوسری ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔

اس بارہ میں علماء کا اجماع ہے کہ دو کپڑوں میں نماز پڑھنا افضل ہے واجب نہیں ہے کیونکہ اس میں تنگی ہے اور آنحضرت ﷺ نیز آپ ﷺ کے صحابہؓ نے ایک کپڑے میں نماز کبھی تو اس لئے پڑھی کہ ان کے پاس کپڑا ہی صرف ایک تھا اور کبھی بیان جواز کی خاطر ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھ لی۔

الحاصل اگر کوئی شخص ایک ہی کپڑے میں نماز اس لئے پڑھتا ہے کہ اس کے پاس دوسرا کپڑا موجود نہیں ہے یا بیان جواز کی خاطر پڑھتا ہے تو جائز ہے۔ اور اگر کوئی شخص سستی و کاہلی اور بہ نیت حقارت پڑھے گا تو یہ مناسب نہیں ہو گا۔

حضرت جابرؓ کے ارشاد سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کسی کو صحابہؓ کے ترک سُنّت پر لعن وطعن کرنا نہ چاہئے اور ان کے بارہ میں نیک گمان ہی رکھنا چاہئے۔ یعنی اگر کسی صحابی سے کوئی ایسا فعل صادر نظر آئے جو بظاہر خلاف سُنّت معلوم ہوتا ہے تو اس بارہ میں نیک گمان ہی رکھنا چاہئے کہ یہ بیان جواز کے لئے ہے یا پھر اس میں کوئی عذر ہو گا۔

(۱۸) وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ الصَّلَاةُ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ سُنَّةٌ كُنَّا نَفْعَلُهُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا يُعَابُ عَلَيْنَا فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ اِنَّمَا كَانَ ذَاكَ اِذْ كَانَ فِي الثِّيَابِ قِلَّةٌ فَاَمَّا اِذَا وَسَّعَ اللّٰهُ فَالصَّلَاةُ فِي الثَّوْبَيْنِ اَزْكٰى۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنا سُنّت ہے کیونکہ سرور کائنات ﷺ کے زمانہ میں ہم اسی طرح نماز پڑھتے تھے اور ہمیں کوئی برا نہیں کہتا تھا۔ اس پر حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ یہ (یعنی ایک کپڑے میں نماز پڑھنا) اسی وقت تھا جب کہ کپڑوں کی قلت تھی اب کہ اللہ تعالیٰ نے کپڑوں کے بارہ میں وسعت بخش دی تو دو کپڑوں میں ہی نماز پڑھنا بہتر ہے۔" (احمد)

بَابُ السُّتْرَةِ

سترہ کا بیان

یہاں سترہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے نمازی کے سامنے کھڑا کیا جائے جیسے دیوار، ستون، یا لکڑی لوہا وغیرہ۔ نمازی کے آگے سترہ اس لئے کھڑا کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے سجود کی جگہ متمیز ہو جائے اور نمازی کے آگے سے گزرنے والا شخص گنہگار نہ ہو۔ سترہ کی لمبائی کم سے کم ایک ہاتھ اور موٹائی کم از کم ایک انگشت ہونا ضروری ہے۔

مقتدیوں کے لئے امام کا سترہ کافی ہے یعنی اگر امام کے آگے سترہ کھڑا ہو تو مقتدیوں کے آگے سے گزرنا جائز ہے اگرچہ ان کے سامنے کوئی چیز حائل نہ ہو۔

امام اور سترہ کے درمیان سے گزر جانا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر ایسی صورت ہو کہ کوئی نمازی پیچھے سے پہلی صف میں خالی جگہ دیکھے تو اس کے لئے جائز ہے کہ پچھلی صفوں کے سامنے سے گزرتا ہوا پہلی صف میں خالی جگہ پہنچ کر کھڑا ہو جائے کیونکہ یہ پچھلی صف والوں کا قصور ہے کہ انہوں نے آگے بڑھ کر پہلی صف میں جگہ کو پر کیوں نہ کیا۔ سترہ کے مفصل احکام آگے احادیث کی تشریح کے ضمن میں آئیں گے۔

سترہ کے بارہ میں آنحضور ﷺ کا معمول

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْدُوْ اِلَى الْمُصَلّٰى وَالْعَنَزَةُ بَيْنَ يَدَيْهِ تُحْمَلُ وَتُنْصَبُ

بِالْمُصَلّٰی بَیْنَ یَدَیْہِ فَیُصَلِّی اِلَیْھَا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ صبح کے وقت عید گاہ تشریف لے جاتے اور آپ ﷺ کے آگے آگے ایک نیزہ (بھی) لے جایا جاتا جو عید گاہ میں آپ ﷺ کے آگے کھڑا کر دیا جاتا تھا اور آپ ﷺ اس کی طرف (منہ کر کے) نماز پڑھ لیتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: معمول یہ تھا کہ سترہ کرنے اور ڈھیلے وغیرہ توڑنے کے لئے اکثر اوقات خدام آپ ﷺ کے ہمراہ ایک نیزہ لے کر چلتے تھے۔ چنانچہ عید گاہ میں سامنے چونکہ کوئی دیوار وغیرہ نہیں تھی بلکہ میدان ہی میدان تھا اس لئے وہاں بھی آپ ﷺ کے ساتھ نیزہ جاتا تھا جسے آپ ﷺ اپنے سامنے کھڑا کر دیتے تھے۔

اللہ کی تعریف اور سترہ کے سامنے گزرنے کا حکم

(۲) وَعَنْ اَبِیْ جُحَیْفَةَ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمَکَّةَ وَھُوَ بِالْاَبْطَحِ فِیْ قُبَّةٍ حَمْرَاءَ مِنْ اَدَمٍ وَرَأَیْتُ بِلَالًا اَخَذَ وَضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَرَأَیْتُ النَّاسَ یَبْتَدِرُوْنَ ذٰلِکَ الْوَضُوْءَ فَمَنْ اَصَابَ مِنْہُ شَیْئًا تَمَسَّحَ بِہٖ وَمَنْ لَمْ یُصِبْ مِنْہُ اَخَذَ مِنْ بَلَلِ یَدِ صَاحِبِہٖ ثُمَّ رَأَیْتُ بِلَالًا اَخَذَ عَنَزَةً فَرَکَزَھَا وَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حُلَّةٍ حَمْرَاءَ مُشَمِّرًا صَلّٰی اِلَی الْعَنَزَةِ بِالنَّاسِ رَکْعَتَیْنِ وَرَأَیْتُ النَّاسَ وَالدَّوَابَّ یَمُرُّوْنَ بَیْنَ یَدَیِ الْعَنَزَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو جحیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مکہ میں ابطح کے مقام پر آقائے نامدار ﷺ کو سرخ چمڑے کے ایک خیمہ میں دیکھا اور میں نے حضرت بلالؓ کو آنحضرت ﷺ کے وضو کا بچا ہوا پانی لیتے ہوئے دیکھا اور دوسرے لوگوں کو (بھی) میں نے دیکھا کہ وہ پانی حاصل کرنے میں بڑی عجلت کر رہے تھے۔ چنانچہ جس شخص کو اس پانی میں سے کچھ مل گیا اس نے (برکت حاصل کرنے کے لئے) اسے (اپنے بدن اور منہ پر) مل لیا اور جس شخص کو کچھ نہ ملا اس نے ساتھ والے کے ہاتھ کی تری (ہی) لے کر مل لی پھر میں نے بلالؓ کو دیکھا کہ انہوں نے نیزہ لے کر اسے گاڑ دیا۔ آنحضرت ﷺ سرخ دھاریدار جوڑا پہنے اور دامن اٹھائے (خیمہ سے) نکلے اور نیزہ کی طرف کھڑے ہو کر صحابہؓ کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ آدمی اور چوپائے نیزہ کے سامنے آ جا رہے تھے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: "ابطح" ایک نالہ کا نام ہے جو منا کے راستہ میں مکہ کے قریب ہی واقع ہے اس نالہ کو محصب اور بطحا بھی کہتے ہیں۔ ابطح کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس نالہ میں سنگریزے ہیں۔

"حلہ" دو کپڑوں یعنی لنگی اور چادر کو کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے جو حلہ زیب تن فرما رکھا تھا وہ سرخ دھاری دار تھا پورا کپڑا سرخ نہیں تھا جو مردوں کو پہننا مکروہ تحریمی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ سترہ کے سامنے آدمیوں اور چوپاؤں کا گزرنا درست ہے۔

سواری کے جانور اور کجاوہ کی پچھلی لکڑی کو سترہ بنا کر نماز پڑھنا

(۳) وَعَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُعَرِّضُ رَاحِلَتَہٗ فَیُصَلِّیْ اِلَیْھَا مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَزَادَ الْبُخَارِیُّ قُلْتُ اَفَرَأَیْتَ اِذَا ھَبَّتِ الرِّکَابُ قَالَ کَانَ یَاْخُذُ الرَّحْلَ فَیُعَدِّلُہٗ فَیُصَلِّیْ اِلٰی اٰخِرَتِہٖ۔

"اور حضرت نافع حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ اپنی سواری کا اونٹ سامنے بٹھا کر اس کی طرف نماز پڑھ لیتے تھے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور بخاری نے یہ مزید نقل کیا ہے (نافع کہتے ہیں کہ) میں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ جب اونٹ چرنے اور پانی پینے چلے جاتے تھے تو آنحضرت ﷺ کیا کرتے تھے (یعنی ایسی شکل میں آپ ﷺ سترہ کس چیز کو قرار دیتے تھے؟) ابن عمرؓ نے فرمایا (ایسے موقع پر) آپ ﷺ کجاوہ کو ٹھیک کر کے سامنے رکھ لیتے تھے اور اس کی پچھلی لکڑی کی طرف (جو بلند ہونے کی وجہ سے سترہ کا کام دیتی

تھی) نماز پڑھ لیتے تھے۔"

④ وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِاللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَضَعَ اَحَدُكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلَ مُؤْخَرَةِ الرَّحْلِ فَلْيُصَلِّ وَلَا يُبَالِ مَنْ مَرَّ وَرَاءَ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت طلحہ ابن عبیداللہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی کجاوہ کی پچھلی لکڑی کی مانند (کسی چیز کو) سترہ بنا کر رکھ لے تو اسے چاہئے کہ وہ نماز پڑھ لے اور اس (سترہ) کے سامنے سے کوئی گزرے تو اس کی پرواہ نہ کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب نمازی سترہ کے قابل کسی چیز کو اپنے سامنے رکھ کر نماز پڑھے اور سترہ کے سامنے سے کوئی گزرے تو اس کا خیال نہ کرے کیونکہ سترہ کی موجودگی میں سامنے سے کسی کا گزرنا نماز کے خشوع و خضوع پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ یا "پرواہ نہ کرے" کا تعلق گزرنے والے سے ہوگا۔ یعنی اگر نمازی کے آگے سترہ ہو تو اس کے سامنے گزرنے والا شخص کچھ پرواہ نہ کرے کیونکہ سترہ کی موجودگی میں نمازی کے سامنے سے گزرنے کی وجہ سے وہ گنہ گار نہیں ہوگا۔

نمازی کے آگے سے گزر جانا بہت بڑا گناہ ہے

⑤ وَعَنْ اَبِي جُهَيْمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ لَكَانَ اَنْ يَقِفَ اَرْبَعِيْنَ خَيْرًا لَّهُ مِنْ اَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ قَالَ اَبُو النَّضْرِ لَا اَدْرِيْ قَالَ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا اَوْ شَهْرًا اَوْ سَنَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوجہیمؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا۔ نمازی کے آگے سے گزرنے والا اگر یہ جان لے کہ اس کی کیا سزا ہے تو وہ نمازی کے آگے سے گزرنے کے بجائے چالیس تک کھڑے رہنے کو بہتر خیال کرے۔ (اس حدیث کے ایک راوی) حضرت ابونضر کہتے ہیں کہ چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال کہا گیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت امام طحاوی نے "مشکل الآثار" میں فرمایا ہے کہ، یہاں چالیس سال مراد ہے نہ کہ چالیس مہینے یا چالیس دن۔ اور انہوں نے یہ بات حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث سے ثابت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا وہ شخص جو اپنے بھائی کے آگے سے اس حال میں گزرتا ہے کہ وہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے (یعنی نماز پڑھتا ہے) اور وہ (اس کا گناہ) جان لے تو اس کے لئے اپنی جگہ پر ایک سو برس تک کھڑے رہنا قدم اٹھا کر رکھنے سے بہتر ہوگا۔

بہر حال ان احادیث سے معلوم ہوا کہ نمازی کے آگے سے گزرنا بہت بڑا گناہ ہے جس کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ نمازی کے آگے سے گزرنا کتنا بڑا گناہ ہے اور اس کی سزا کتنی سخت ہے۔ تو وہ چالیس برس یا حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک سو برس تک اپنی جگہ پر مستقلاً کھڑے رہنا زیادہ بہتر سمجھے گا بہ نسبت اس کے کہ وہ نمازی کے آگے سے گزرے۔

سترہ اور نمازی کے درمیان سے گزرنے والے کو زبردستی روکنے کا حکم

⑥ وَعَنْ اَبِي سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ اِلٰى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ فَاَرَادَ اَحَدٌ اَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلْيَدْفَعْهُ فَاِنْ اَبٰى فَلْيُقَاتِلْهُ فَاِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَلِمُسْلِمٍ مَعْنَاهُ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص کسی ایسی چیز (یعنی سترہ) کی طرف نماز پڑھے جو اس کے اور لوگوں کے درمیان حائل رہے اور کوئی شخص اس کے آگے سے (یعنی نمازی اور سترہ کے درمیان) سے گزرنے کا ارادہ کرے تو اسے روک دینا چاہئے اگر وہ نہ مانے تو اسے قتل کر دینا چاہئے کیونکہ وہ (ایسی صورت میں) شیطان ہے۔ (حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں

اور مسلم نے اس روایت کو بالمعنی نقل کیا ہے)۔"

تشریح: "قتل" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حقیقۃً ایسے شخص کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہئے بلکہ قتل سے مراد یہ ہے کہ چونکہ نمازی کے آگے سے گزرنا بہت برا ہے اس لئے اگر کوئی شخص نمازی کے آگے سے گزرنا چاہے تو اسے پوری طاقت و قوت کے ساتھ گزرنے سے روک کر اسے اتنی بڑی غلطی کے ارتکاب سے بچایا جائے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کو کسی ایسی چیز کے ذریعہ روکا جائے جس کا استعمال اس روکنے کے سلسلہ میں جائز ہو اور اس روک تھام میں اگر گزرنے والا شخص مر جائے تو علماء کے نزدیک متفقہ طور پر اس کا قصاص نہیں ہوگا۔ ہاں دیت کے واجب ہونے میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ بعض علماء کہتے ہیں کہ ایسی شکل میں دیت واجب ہوگی اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ واجب نہیں ہوگی۔

حدیث میں ایسے شخص کو شیطان کہا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نے چونکہ اس شخص کو بہکا کر اس غلط کام کو کرنے پر مجبور کیا لہٰذا وہ شخص اس شیطانی کام کے کرنے کی بناء پر بمنزلہ شیطان کے ہوا۔

یا اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا غلط کام کرنے والا شخص انسانوں کا شیطان ہے اس لئے کہ شیطان کے معنی سرکش کے ہیں خواہ انسانوں میں سے ہو یا جنات میں سے ہو اسی لئے شریر النفس آدمی کو شیطان الانس کہا جاتا ہے۔

سترہ نماز کی محافظت کرتا ہے

⑦ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَقْطَعُ الصَّلَاةَ الْمَرْاَةُ وَالْحِمَارُ وَالْكَلْبُ وَیَقِیْ ذٰلِكَ مِثْلُ مُؤَخَّرَةِ الرَّحْلِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا، عورت، گدھا اور کتا (نمازی کے آگے سے گزرنے کی صورت میں) نماز کو باطل کر دیتے ہیں اور کجاوہ کی پچھلی لکڑی کی مانند کسی چیز کو (نمازی کے آگے سترہ بنا کر) رکھ لینا (نماز کے) اس باطل کر دینے کو بچا لیتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: نمازی کے آگے سے گزرنا نماز کو باطل نہیں کرتا: جمہور علمائے صحابہ وغیرہم کا یہ مذہب ہے کہ کوئی چیز یا کوئی شخص اگر نمازی کے آگے سے گزر جائے تو نماز باطل نہیں ہوتی خواہ مذکورہ بالا تینوں چیزیں ہوں یا ان کے علاوہ کچھ اور ہوں۔ جہاں تک اس حدیث یا اسی طرح کی دوسری احادیث کا تعلق ہے سب در اصل نمازی کے سامنے سترہ کھڑا کرنے کی اہمیت اور تاکید بیان کرنے میں مبالغہ کے طریقہ پر ہیں۔ یا اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ یہ تین چیزیں ایسی ہیں جو اگر نمازی کے آگے سے گزریں تو نماز میں خشوع و خضوع اور حضورئ قلب کو کھو دیتی ہیں جو در حقیقت نماز کی اصل اور روح ہیں۔ یا پھر اس سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ نمازی کے آگے سے ان چیزوں کے گزرنے سے چونکہ نمازی کا دل ان کی طرف ہٹ جاتا ہے اور اس کا دل ان چیزوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس لئے نماز بھی بطلان کے قریب پہنچ جاتی ہے۔

عورت، گدھے اور کتے کی تخصیص کی وجہ: حدیث سے بظاہر تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نمازی کے آگے سے صرف ان تین چیزوں کے گزر جانے سے نماز پر اثر پڑ سکتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر چیزوں کے گزرنے سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان مذکورہ تین چیزوں کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ ان کی طرف دل بہت زیادہ متوجہ ہو جاتا ہے چنانچہ عورت کی حیثیت تو ظاہر ہی ہے گدھے کا معاملہ بھی یہ ہے کہ گدھے کے ساتھ چونکہ اکثر و بیشتر شیاطین رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کے چیخنے کے وقت اعوذ پڑھنا مستحب ہے اس لئے جب گدھا نمازی کے آگے سے گزرے گا تو نمازی کا دل اس احساس کی بناء پر کہ اس کے ہمراہ شیاطین ہوں گے گدھے کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ یا ایسے ہی کتا نہ صرف یہ کہ نجس عین ہوتا ہے بلکہ اس سے تکلیف پہنچنے کا بھی خطرہ رہتا ہے اس لئے اس کے گزرنے کی

صورت میں بھی ذہن پوری تیزی کے ساتھ اس کی طرف بھٹک جاتا ہے۔

نمازی کے آگے عورت کے آجانے سے نماز باطل نہیں ہوتی

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ وَاَنَا مُعْتَرِضَةٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ كَاعْتِرَاضِ الْجَنَازَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ رات میں نماز پڑھتے رہتے تھے اور میں آپ ﷺ کے اور قبلہ کے درمیان (یعنی آپ ﷺ کے سامنے) اس طرح پڑی رہتی تھی۔ جیسے جنازہ نمازیوں کے آگے رکھا رہتا ہے۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: جنازہ کی مثال دے کر اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ نماز میں مشغول ہوتے تھے میں اس وقت آپ ﷺ کے سامنے کسی گوشہ وغیرہ میں نہیں پڑی رہتی تھی بلکہ آپ ﷺ کے سامنے پوری طرح لیٹی رہتی تھی اور اس کے باوجود آپ ﷺ نماز پڑھتے رہتے تھے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں نمازی کے آگے عورت کے آجانے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

نمازی کے آگے سے گدھی وغیرہ کا گزرنا نماز کو باطل نہیں کرتا

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلٰى اَتَانٍ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْاِحْتِلَامَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي بِالنَّاسِ بِمِنًى اِلٰى غَيْرِ جِدَارٍ فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ فَنَزَلْتُ وَاَرْسَلْتُ الْاَتَانَ تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ اَحَدٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک دن جب کہ میں بالغ ہونے کے قریب تھا گدھی پر بیٹھا ہوا آیا اور آقائے نامدار ﷺ منیٰ میں لوگوں کے ہمراہ نماز پڑھ رہے تھے اور (آپ ﷺ کے) آگے کوئی دیوار نہیں تھی (یعنی آپ ﷺ نے کوئی سترہ نہیں کھڑا کر رکھا تھا، میں بعض صف کے سامنے سے گزرا، پھر گدھی سے اتر کر اسے چھوڑ دیا وہ چرنے لگی اور میں صف میں داخل ہو گیا اور مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔"
(بخاری، مسلم)

تشریح: اس واقعہ کو بیان کرنے سے حضرت ابن عباس کا یہ بتانا مقصود ہے کہ نمازیوں کے آگے سے گدھی کے گزر جانے سے نماز باطل نہیں ہوئی۔ اس وقت حضرت ابن عباس چونکہ بالغ نہیں تھے اس لئے جب وہ نمازیوں کے آگے سے گزرے تو انہیں کسی نے روکا نہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

عصا کو سترہ کے طور پر گاڑنے کے بجائے سامنے رکھ لینے میں علماء کا اختلاف

⑩ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ تِلْقَاءَ وَجْهِهٖ شَيْئًا فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فَلْيَنْصِبْ عَصَاهُ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ مَعَهٗ عَصًا فَلْيَخْطُطْ خَطًّا ثُمَّ لَا يَضُرُّهٗ مَا مَرَّ اَمَامَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھنا چاہے تو اپنے منہ کے سامنے کچھ (مثلاً دیوار و ستون وغیرہ) کرلے اور اگر کچھ نہ ملے تو اپنا عصا (ہی) کھڑا کر لیا کرے اور اگر اس کے پاس عصا بھی نہ ہو تو ایک لکیر ہی کھینچ لیا کرے پھر اس کے آگے کوئی گزر جائے تو کچھ نقصان نہ ہوگا (یعنی خشوع و خضوع میں خلل نہیں پڑے گا۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی اجازت دے رہی ہے کہ اگر کسی نمازی کو کوئی ایسی چیز دستیاب نہ ہو جو سترہ کے طور پر کام دے سکے تو وہ اپنے عصا کو اپنے سامنے سترہ بنا کر کھڑا کر لے۔ اب اس سلسلہ میں اتنی اور سہولت دی گئی ہے کہ اگر زمین نرم ہو تو عصا کو زمین میں گاڑ دیا جائے اور اگر زمین سخت ہو کہ عصا کو گاڑنا مشکل ہو تو پھر اس شکل میں عصا کو گاڑنے کے بجائے اپنے سامنے طولاً رکھ لیا جاوے تاکہ گاڑنے کی مشابہت حاصل ہو جائے۔

فقہ کی کتاب شرح منیہ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی نمازی اپنے عصا کو سترہ کے طور پر بجائے زمین میں گاڑنے کے اپنے سامنے رکھ لے تو بعض علماء کے نزدیک تو اس کے لئے یہ سترہ کے طور پر کافی ہو جائے گا۔ یعنی سترہ کا حکم پورا ہو جائے گا مگر بعض علماء کے نزدیک یہ سترہ کے طور پر کافی نہیں ہوگا۔

کفایہ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی نمازی سترہ کے طور پر عصا کو بجائے گاڑنے کے سامنے رکھنا چاہئے تو اسے عصا کو طولاً رکھنا چاہئے نہ کہ عرضاً۔

سترہ کے لئے کوئی بھی چیز موجود نہ ہونے کی شکل میں سامنے صرف لکیر کھینچ لینے میں علماء کا اختلاف: اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہو رہی ہے کہ اگر کسی نمازی کو سترہ بنانے کے لئے کوئی چیز نہ ملے یہاں تک کہ اس کے پاس عصا بھی نہ ہو تو وہ اپنے سامنے صرف لکیر کھینچ کر نماز پڑھ لے اس کے لئے یہی لکیر سترہ بن جائے گی۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا قول قدیم اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہی ہے بلکہ حنفیہ میں بھی بعد کے بعض علماء نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔

حنفیہ کے اکثر علماء اور حضرت امام مالکؒ اس کے قائل نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک لکیر کھینچ لینا معتبر نہیں ہے۔ حضرت امام شافعیؒ نے بھی قول جدید میں اپنے پہلے مسلک کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سلسلہ میں جو حدیث وارد ہے وہ ضعیف اور مضطرب ہے۔ نیز یہ کہ نمازی اور سامنے سے گزرنے والے کے درمیان سترہ کے طور پر صرف لکیر کا حائل ہونا نہ صرف یہ کہ کوئی اعتبار نہیں رکھتا بلکہ دور سے معلوم و ممیز بھی نہیں ہوتا۔ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ حضرت شیخ ابن الہمامؒ کے قول کا مفہوم بھی یہی ہے کہ لکیر کھینچنے کے بجائے سترہ کھڑا کرنا ہی اتباع سُنّت کی بناء پر اولیٰ اور بہتر ہے کیونکہ سامنے کھڑا ہوا سترہ پوری طرح ظاہر ہونے کی وجہ سے امتیاز بھی رکھتا ہے اور نمازی کے دل کو شکوک و شبہات سے نکال کر سکون خاطر اور اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے۔

اس کے بعد علماء نے وصف خط میں بھی اختلاف کیا ہے کہ لکیر کس طرح کھینچی جائے چنانچہ بعض علماء کے نزدیک لکیر بشکل ہلال کھینچی چاہئے۔ اور بعض حضرات نے جانب قبلہ طولاً کھینچنے کو لکھا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ لکیر عرضاً دائیں طرف سے بائیں طرف کو کھینچی جائے اور مختار طولاً ہی کھینچنا ہے۔

سترہ کو قریب کھڑا کرنا چاہئے

(۱۱) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِىْ حَثْمَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ اِلٰى سُتْرَةٍ فَلْيَدْنُ مِنْهَا لَا يَقْطَعِ الشَّيْطَانُ صَلَاتَهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سہل ابن حثمہؓ کہتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص سترہ کی طرف نماز پڑھے تو اسے چاہئے کہ وہ سترہ کے قریب رہے تاکہ شیطان اس کی نماز نہ توڑے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "سترہ کے قریب" رہنے کا مطلب یہ ہے کہ سترہ اتنے نزدیک کھڑا کیا جائے کہ سجدہ اس کے پاس ہو سکے تاکہ شیطان اس کی نماز میں کوئی خلل نہ ڈال سکے کیونکہ نمازی اگر سترہ سے دور کھڑا ہوگا تو اس کے سامنے سے کسی کے گزرنے کا احتمال ہوگا۔ چنانچہ شیطان ایسی صورت میں اس کے دل میں وسواس و شبہات کے بیج بوئے گا جس سے حضوری قلب میں فرق آجائے گا۔ اور نماز میں حضوری قلب کی

دولت میسر نہیں رہی تو گویا اس کی نماز ٹوٹ گئی اس لئے کہ نماز کا کمال اور ثواب بغیر حضوری قلب کے حاصل نہیں ہوتا لہٰذا سترہ کے قریب کھڑا ہونے کی وجہ سے اس آفت سے حفاظت حاصل ہوگی۔

سترہ پیشانی کے عین سامنے نہ کھڑا کرنا چاہئے

⑫ وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ مَارَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي اِلٰى عُوْدٍ وَلَا عَمُوْدٍ وَلَا شَجَرَةٍ اِلَّا جَعَلَهُ عَلٰى حَاجِبِهِ الْاَيْمَنِ اَوِ الْاَيْسَرِ وَلَا يَصْمُدُ لَهُ صَمْدًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مقداد ابن اسودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ لکڑی، ستون یا درخت کی طرف (منہ کر کے) نماز پڑھتے ہوں اور یہ چیزیں ٹھیک آپ ﷺ کے سامنے کھڑی ہوں بلکہ وہ آپ ﷺ کی داہنی یا بائیں بھوؤں (ابروں کے سامنے ہوتی تھیں اور آپ ﷺ ان کی سیدھ کا قصد نہ کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ سترہ کھڑا کرتے تھے تو اس بات کا بطور خاص خیال رکھتے تھے کہ سترہ پیشانی کے عین سامنے نہ ہو بلکہ آپ ﷺ سترہ کو دائیں یا بائیں بھوؤں کے سامنے کھڑا کرتے تھے اور اس سے آپ ﷺ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ بت پرستی کی مشابہت نہ ہو۔

نمازی کے سامنے سے کتے اور گدھے وغیرہ کا گزرنا نماز کو باطل نہیں کرتا

⑬ وَعَنِ الْفَضْلِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَتَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فِي بَادِيَةٍ لَنَا وَمَعَهُ عَبَّاسٌ فَصَلّٰى فِي صَحْرَاءَ لَيْسَ بَيْنَ يَدَيْهِ سُتْرَةٌ وَحِمَارَةٌ لَنَا وَكَلْبَةٌ تَعْبَثَانِ بَيْنَ يَدَيْهِ فَمَا بَالٰى بِذٰلِكَ۔ (رواہ ابوداؤد وللنسائی نحوہ)

"اور فضل ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ (ایک دن) ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ ہم اپنے جنگل میں (خیمہ زن) تھے حضرت عباسؓ بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے چنانچہ آپ ﷺ نے جنگل میں نماز (اس طرح) پڑھی کہ آپ ﷺ کے سامنے سترہ نہیں تھا۔ ہماری گدھی اور کتیا آپ ﷺ کے سامنے کھیل رہی تھیں مگر آپ ﷺ نے اس کی کچھ پرواہ نہیں کی۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اہل عرب کا دستور تھا کہ وہ لوگ چند دنوں کے لئے جنگل میں خیمہ زن ہو کر جایا کرتے تھے اور وہاں رہا کرتے تھے۔ ہر جماعت کا اپنا اپنا متعین جنگل ہوتا تھا چنانچہ حضرت عباسؓ کا بھی ایک جنگل تھا۔ جن ایام میں وہ اپنے جنگل میں خیمہ زن تھے۔ آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے راوی وہیں کا بیان کر رہے ہیں۔

اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمازی کے سامنے سے اگر گدھے اور کتے وغیرہ گزر جائیں تو نماز باطل نہیں ہوتی، وہیں یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ گزرگاہ پر نماز پڑھنے کی شکل میں نمازی کو اپنے آگے سترہ کھڑا کرنا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔

نمازی کے سامنے سے کسی کے گزرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی

⑭ وَعَنْ اَبِي سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ وَادْرَأُوْا مَا اسْتَطَعْتُمْ فَاِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا۔ نمازی کے آگے سے گزرنے والی کوئی بھی چیز نماز کو نہیں توڑتی (تاہم اگر کوئی نمازی کے آگے سے گزرے تو نماز میں خشوع و خضوع برقرار رکھنے کی خاطر، تم حتی الامکان اسے روکو کیونکہ وہ گزرنے والا شیطان ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث نے بھی بصراحت اس کو واضح کر دیا کہ نمازی کے آگے سے گزرنے والی کوئی بھی چیز نماز کو باطل نہیں کرتی چاہے وہ عورت، کتا، اور گدھا ہی کیوں نہ ہو۔ (دیکھئے حدیث نمبر ۷)۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۵) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَنَامُ بَيْنَ يَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِجْلَایَ فِیْ قِبْلَتِهٖ فَاِذَا سَجَدَ غَمَزَنِیْ فَقَبَضْتُ رِجْلَیَّ وَاِذَا قَامَ بَسَطْتُهُمَا قَالَتْ وَالْبُيُوْتُ يَوْمَئِذٍ لَيْسَ فِيْهَا مَصَابِيْحُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں آقائے نامدار ﷺ کے سامنے (اس طرح سوئی رہتی تھی کہ) میرے دونوں پیر آپ ﷺ کے قبلہ کی طرف (یعنی آپ ﷺ کے سجدہ کرنے کی جگہ) ہوتے تھے۔ جب آپ ﷺ سجدہ کرتے تھے تو مجھے (یعنی پیروں کو) دبا دیتے تھے میں پیروں کو سمیٹ لیتی تھی اور جب آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے تھے تو میں پھر پیر پھیلا دیتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ان دنوں میں گھر کے اندر چراغ نہیں تھے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ سے حضرت عائشہؓ اپنا یہ عذر بیان کرنا چاہتی ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کے سجدہ کرنے کی جگہ پیر اس لئے پھیلائے رکھتی تھی کہ چراغ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ جہاں تک حضرت عائشہؓ کے اس عمل کا تعلق ہے کہ جب آپ ﷺ ان کا پیر دبا دیتے تھے تو وہ اپنا پیر سمیٹ لیتی تھیں اور جب آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے تھے تو وہ اپنے پیر پھیلا دیتی تھیں تو یہ آنحضرت ﷺ کی تقریر یعنی ان کے اس عمل پر آنحضرت ﷺ کی جانب سے نکیر نہ ہونے کی بناء پر تھا۔

نمازی کے آگے سے گزرنا جرم عظیم ہے

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ يَعْلَمُ اَحَدُكُمْ مَالَهٗ فِیْ اَنْ يَّمُرَّ بَيْنَ يَدَیْ اَخِيْهِ مُعْتَرِضًا فِی الصَّلٰوةِ كَانَ لَاَنْ يُّقِيْمَ مِائَةَ عَامٍ خَيْرٌ لَّهٗ مِنَ الْخَطْوَةِ الَّتِیْ خَطَا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا، اگر تم میں سے کوئی یہ جان لے کہ اپنے مسلمان بھائی کے سامنے سے جب کہ وہ نماز پڑھ رہا ہو عرضاً گزرنا کتنا بڑا گناہ ہے تو اس کے لئے سو برس تک کھڑے رہنا ایک قدم آگے بڑھانے سے بہتر معلوم ہو۔"

(ابن ماجہؒ)

(۱۷) وَعَنْ كَعْبِ الْاَحْبَارِ قَالَ لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَیِ الْمُصَلِّیْ مَاذَا عَلَيْهِ لَكَانَ اَنْ يُّخْسَفَ بِهٖ خَيْرًا لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ اَهْوَنَ عَلَيْهِ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت کعب احبارؒ فرماتے ہیں کہ نمازی کے آگے سے گزرنے والا اگر یہ جان لے کہ (اس کے اس جرم کی) سزا کیا ہے تو اس کو اپنا زمین میں دھنسایا جانا نمازی کے آگے سے گزرنے سے زیادہ بہتر معلوم ہو۔ اور ایک روایت میں بجائے "بہتر" کے "زیادہ آسان" کا لفظ ہے۔" (مالکؒ)

نمازی کے آگے سے کتنی دوری پر گزرنا چاہئے

(۱۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ اِلٰى غَيْرِ السُّتْرَةِ فَاِنَّهٗ يَقْطَعُ صَلٰوتَهُ الْحِمَارُ وَالْخِنْزِيْرُ وَالْيَهُوْدِیُّ وَالْمَجُوْسِیُّ وَالْمَرْاَةُ وَتُجْزِیُٔ عَنْهُ اِذَا مَرُّوْا بَيْنَ يَدَيْهِ عَلٰى قَذْفَةٍ بِحَجَرٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا، تم میں سے جو شخص بغیر سترہ کے نماز پڑھے گا تو اس کی نماز اس کے

سامنے سے گدھے، خنزیر، یہودی، مجوسی اور عورت کے گزرنے سے ٹوٹ جائے گی ہاں اگر یہ ایک پتھر پھینکنے کی مسافت کے فاصلہ سے گزریں تو کچھ حرج نہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ پھینکنے کے بعد پتھر جتنی دور جاکر گرتا ہے اتنے فاصلہ کے بعد سے یہ مذکورہ چیزیں اگر نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گزریں تو کچھ حرج نہیں ہے یعنی نماز میں کوئی خلل و قصور نہیں آتا۔

علماء نے لکھا ہے کہ پتھر پھینکنے سے مراد حج میں رمی جمار ہے یعنی حج میں مناروں پر جو کنکر اور جس فاصلہ سے مارے جاتے ہیں اور جس کی مقدار تین ہاتھ لکھی ہے وہی یہاں مراد ہے۔

اس حدیث کی تاویل بھی وہی ہوگی جو اسی باب کی حدیث نمبر سات کی تشریح کے ضمن میں کی جاچکی ہے کہ نماز ٹوٹنے سے کیا مراد ہے؟۔

بَابُ صِفَةِ الصَّلٰوةِ

صفت نماز کا بیان

اس باب کے ذیل میں وہ احادیث نقل کی جارہی ہیں جن سے نماز پڑھنے کی ترکیب معلوم ہوگی کہ نماز کس طرح پڑھی جائے؟ اور نماز کے ارکان و اجزاء کیا ہیں؟۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ فِیْ نَاحِیَةِ الْمَسْجِدِ فَصَلّٰی ثُمَّ جَاءَ فَسَلَّمَ عَلَیْهِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْكَ السَّلَامُ اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ فَرَجَعَ فَصَلّٰی ثُمَّ جَآءَ فَسَلَّمَ عَلَیْهِ فَقَالَ وَعَلَیْكَ السَّلَامُ اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ فَقَالَ فِی الثَّالِثَةِ اَوْفِی الَّتِیْ بَعْدَهَا عَلِّمْنِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اِذَا قُمْتَ اِلَى الصَّلَاةِ فَأَسْبِغِ الْوُضُوْءَ ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ بِمَا تَیَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَسْتَوِیَ قَائِمًا ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ جَالِسًا ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ جَالِسًا وَفِیْ رِوَایَةٍ ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَسْتَوِیَ قَائِمًا ثُمَّ افْعَلْ ذٰلِكَ فِیْ صَلَاتِكَ كُلِّهَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ مسجد کے ایک گوشہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ (پہلے) اس نے نماز پڑھی، اس طرح کہ تعدیل ارکان اور قومہ و جلسہ کی رعایت نہیں کی۔ پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا، آنحضرت ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا "جاؤ اور پھر نماز پڑھو اس لئے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی" وہ چلا گیا اور جس طرح پہلے نماز پڑھی تھی اسی طرح پھر نماز پڑھی اور آپ ﷺ کی خدمت میں آکر سلام عرض کیا، آپ ﷺ نے سلام کا جواب دے کر پھر اس سے فرمایا کہ "جاؤ نماز پڑھو اس لئے کہ تم نے نماز پڑھی ہی نہیں" (اس طرح تین مرتبہ ہوا) تیسری مرتبہ یا چوتھی مرتبہ اس شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ! مجھے سکھلا دیجئے (کہ نماز کس طرح پڑھوں) آپ ﷺ نے فرمایا۔ جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو (پہلے) اچھی طرح وضو کر لو۔ پھر قبلہ

کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو کر تکبیر کہو پھر قرآن کی جو (سورت وغیرہ) تمہیں آسان معلوم ہو اسے پڑھو پھر طمانینت کے ساتھ رکوع کرو پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر طمانینت کے ساتھ سجدہ کرو پھر سر اٹھاؤ اور طمانینت کے ساتھ بیٹھ جاؤ پھر طمانینت کے ساتھ (دوسرا) سجدہ کرو پھر سر اٹھاؤ اور طمانینت کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "پھر سر اٹھاؤ اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ (اس روایت میں جلسۂ استراحت کا ذکر نہیں) پھر اپنی تمام نماز اسی طرح ادا کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: طمانینت کا مطلب یہ ہے کہ رکوع و سجود وغیرہ میں اس طرح پوری دلجمعی اور سکون خاطر کے ساتھ ٹھہرا جائے کہ بدن کے تمام جوڑ اپنی جگہ اختیار کرلیں اور ان ارکان میں جو تسبیحات پڑھی جاتی ہیں وہ پورے اطمینان کے ساتھ پڑھی جائیں۔

رکوع و سجود وغیرہ میں طمانینت فرض ہے یا واجب؟: حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمدؒ، اور حضرت امام ابویوسفؒ اس حدیث کے پیش نظر رکوع، سجود، قومہ اور جلسہ میں طمانینت کی فرضیت کے قائل ہیں اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے طمانینت کے فقدان کی بناء پر نماز کی نفی فرمائی ہے اور یہ چیز فرضیت کی علامت ہے کہ ایک فعل اس کے نہ ہونے سے منتفی اور باطل ہو جائے لہٰذا یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ارکان میں طمانینت اختیار نہیں کی تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی جس کا اعادہ ضروری ہوگا۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک رکوع و سجود میں طمانینت واجب ہے اور قومہ و جلسہ میں سُنّت ہے یہ حضرات اس حدیث کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ یہاں نماز کی نفی مراد نہیں ہے بلکہ نماز کے کمال کی نفی مراد ہے کیونکہ اس حدیث کے آخری الفاظ جو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں منقول ہیں یہ ہیں کہ "آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے فرمایا کہ "اگر تم نے اسے (یعنی طمانینت کو) پورا کیا تو تمہاری نماز مکمل ہوئی اور اس میں سے تم نے جو کچھ کم کیا تو تم نے اپنی نماز ناقص کی۔ لہٰذا اس طرح کا حکم وجوب اور سُنّت کی علامت ہے کہ اس کے بغیر فعل ناقص و ناتمام ہوتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو نماز کا اعادہ کرنے کا حکم اس لئے نہیں دیا تھا کہ اس کی نماز سرے سے ہوئی ہی نہیں تھی بلکہ اس اعادہ کے حکم کا مطلب یہ تھا کہ نماز پورے کمال اور بغیر کسی کراہیت و نقصان کے ادا ہونی چاہئے۔ اور اگر طمانینت فرض ہوتی تو آپ ﷺ اس کو شروع ہی میں منع کر کے نماز پڑھنے سے روک دیتے اور اس کو بغیر فرائض کے نماز نہ پڑھنے دیتے۔

اس حدیث سے چند باتوں کی طرف اشارہ ملتا ہے پہلی چیز تو یہ کہ عالم اور ناصح کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ کسی جاہل اور غلط کام کرنے والے کو نہایت نرمی اور اخلاق کے ساتھ سمجھائے اور اس کے ساتھ نصیحت کا ایسا نرم معاملہ کرے کہ وہ شخص اس کی بات کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے پر خود مجبور ہو جائے کیونکہ بسا اوقات نصیحت کے معاملہ میں بداخلاقی و ترش روئی اصلاح و سدھار پیدا کرنے کی بجائے اور زیادہ ضد و ہٹ دھرمی اور گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔ دوسری چیز یہ ثابت ہوتی ہے کہ ملاقات کے وقت اگرچہ وہ مکرر اور تھوڑی دیر کے بعد ہی ہو سلام کرنا مستحب ہے۔ تیسری چیز یہ ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی نماز کے واجبات میں کچھ خلل و نقصان پیدا کرے تو اس کی نماز صحیح ادا نہیں ہوتی اور وہ حقیقی معنی میں نمازی نہیں کہلاتا بلکہ اس کے بارہ میں یہی کہا جائے گا کہ اس شخص نے نماز نہیں پڑھی۔ پہلی روایت میں جلسۂ استراحت یعنی پہلی اور تیسری رکعت میں دوسرے سجدہ سے اٹھ کر بیٹھنے کا بھی ذکر کیا گیا ہے چنانچہ امام شافعیؒ کے نزدیک جلسۂ استراحت سُنّت ہے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک سُنّت نہیں ہے اس کی مفصل تحقیق انشاء اللہ آگے آئے گی۔

آنحضرت ﷺ کی نماز کا طریقہ

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَفْتِحُ الصَّلٰوةَ بِالتَّكْبِيْرِ وَالْقِرَاءَةِ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَكَانَ اِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَاْسَهُ وَلَمْ يُصَوِّبْهُ وَلٰكِنْ بَيْنَ ذٰلِكَ وَكَانَ اِذَا رَفَعَ رَاْسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ لَمْ يَسْجُدْ

حَتّٰی یَسْتَوِیَ قَائِمًا وَكَانَ اِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السَّجْدَةِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰی یَسْتَوِیَ جَالِسًا وَكَانَ يَقُوْلُ فِیْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّةُ وَكَانَ يَفْرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرٰی وَيَنْصِبُ رِجْلَهُ الْيُمْنٰی وَكَانَ يَنْهٰی عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ وَيَنْهٰی اَنْ يَفْتَرِشَ الرَّجُلُ ذِرَاعَيْهِ افْتِرَاشَ السَّبُعِ وَكَانَ يَخْتِمُ الصَّلٰوةَ بِالتَّسْلِيْمِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نماز تو تکبیر سے اور قرأت الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے اور آپ جب رکوع کرتے تھے تو اپنا سر مبارک نہ تو (بہت زیادہ) بلند کرتے تھے اور نہ (بہت زیادہ) پست بلکہ درمیان درمیان رکھتے تھے (یعنی پیٹھ اور گردن برابر رکھتے تھے) اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو بغیر سیدھا کھڑے ہوئے سجدہ میں نہ جاتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو بغیر سیدھا بیٹھے ہوئے (دوسرے) سجدہ میں نہ جاتے تھے اور ہر دو رکعتوں کے بعد التحیات پڑھتے تھے اور (اور بیٹھنے کے لئے) اپنا بایاں پیر بچھاتے اور دایاں پیر کھڑا رکھتے تھے اور آپ عقبہ شیطان (یعنی شیطان کی بیٹھک) سے منع فرماتے تھے اور مرد کو دونوں ہاتھ سجدہ میں اس طرح بچھانے سے بھی منع کرتے تھے جس طرح درندے بچھالیتے ہیں اور آپ ﷺ نماز کو سلام پر ختم فرماتے تھے۔" (مسلم)

تشریح: حضرت عائشہؓ کا یہ فرمانا کہ آنحضرت ﷺ نماز تو تکبیر سے شروع فرماتے تھے اور قرأت کی ابتداء الحمد للہ رب العالمین سے کرتے تھے۔ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ ﷺ بسم اللہ آہستہ سے پڑھتے تھے جیسا کہ حضرت امام اعظمؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔

قعدہ میں بیٹھنے کا طریقہ اور اس میں ائمہ کا اختلاف: وکان یفرش رجلہ الیسری وینصب رجلہ الیمنی (یعنی آپ ﷺ بیٹھنے کے لئے اپنا بایاں پیر بچھاتے اور دایاں پیر کھڑا رکھتے تھے) اس عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ دونوں قعدوں میں اسی طرح بیٹھتے تھے چنانچہ حضرت امام اعظمؒ کا یہی مسلک ہے کہ دونوں قعدوں میں اسی طرح بیٹھنا چاہئے۔

آئندہ آنے والی حدیث جو حضرت ابوحمید ساعدیؓ سے منقول ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پہلے قعدہ میں افتراش (یعنی پاؤں بچھانا) ہی اختیار کرتے تھے مگر دوسرے قعدہ میں تورک یعنی (کولھوں پر بیٹھنا) اختیار فرماتے تھے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے کہ پہلے قعدہ میں تو افتراش ہونا چاہئے اور دوسرے قعدہ میں تورک۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک دونوں قعدوں میں تورک ہی ہے اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ جس نماز میں دو تشہد ہوں تو اس کے آخری تشہد میں تورک ہونا چاہئے اور جس نماز میں ایک ہی تشہد ہے اس میں افتراش ہونا چاہئے۔

امام اعظمؒ کے مسلک کی دلیل: بنیادی طور پر حضرت امام اعظمؒ کے مسلک کی دلیل یہی حدیث ہے نہ صرف یہی حدیث بلکہ اور بہت سی احادیث وارد ہیں جن میں مطلقاً پاؤں کے بچھانے کا ذکر ہے۔ نیز یہ بھی وارد ہے کہ تشہد میں سُنت یہی ہے اور یہ کہ آنحضرت ﷺ بغیر پہلے اور دوسرے قعدہ کی قید کے تشہد میں اسی طرح بیٹھا کرتے تھے۔ پھر دوسری چیز یہ بھی ہے کہ تشہد میں بیٹھنے کا جو طریقہ امام اعظمؒ نے اختیار کیا ہے وہ دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں زیادہ بامشقت اور مشکل ہے اور احادیث میں صراحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ اعمال میں زیادہ افضل و اعلیٰ عمل وہی ہے جس کے کرنے میں مشقت اور دشواری زیادہ برداشت کرنی پڑے۔

جن احادیث میں آنحضرت ﷺ کے بارہ میں یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ دوسرے قعدہ میں کولھوں پر بیٹھتے تھے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے وہ اس بات پر محمول ہے کہ آنحضرت ﷺ حالت ضعف اور کبر سنی میں اس طرح بیٹھتے تھے کیونکہ دوسرے قعدہ میں زیادہ دیر تک بیٹھنا ہوتا ہے اور کولھوں پر بیٹھنا زیادہ آسان ہے۔

عقبہ شیطان کا مطلب: عقبہ شیطان دراصل ایک خاص طریقہ سے بیٹھنے کا نام ہے جس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ دونوں کولہے زمین پر ٹیک کر دونوں پنڈلیاں کھڑی کرلی جائیں پھر دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھا جائے جس طرح کہ کتے بیٹھا کرتے ہیں۔ قعدہ میں بیٹھنے کا یہ طریقہ اختیار کرنا متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک مکروہ ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ عقبہ شیطان کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کولہے

دونوں اڑیوں پر رکھے جائیں۔ یہ معنی لفظ عقبہ کی رعایت سے زیادہ مناسب ہیں۔

آپ ﷺ نے مرد کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ وہ سجدہ کی حالت میں زمین میں اپنے دونوں ہاتھ اس طرح بچھائے جس طرح درندے یعنی کتے وغیرہ بچھاتے ہیں اس سلسلہ میں مرد کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ سجدہ کے وقت عورتوں کو اس طرح ہی دونوں ہاتھ بچھانے چاہیں کیونکہ اس طرح عورت کے جسم کی نمایش نہیں ہوتی۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب بالکل صاف ہے کہ آپ ﷺ نماز کا اختتام سلام پر فرماتے تھے۔ مگر اتنی بات سن لیجئے کہ نماز میں سلام پھیرنا حنفیہ کے نزدیک تو واجب ہے مگر حضرات شوافع کے نزدیک فرض ہے۔

تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کو کہاں تک اٹھایا جائے؟

(۳) وَعَنْ اَبِي حُمَيْدِ السَّاعِدِيِّ قَالَ فِيْ نَفَرٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَحْفَظُكُمْ بِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَيْتُهُ اِذَا كَبَّرَ جَعَلَ يَدَيْهِ حِذَاءَ مَنْكِبَيْهِ وَاِذَا رَكَعَ اَمْكَنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهُ فَاِذَا رَفَعَ رَاْسَهُ اسْتَوٰى حَتّٰى يَعُوْدَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهُ فَاِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا وَاسْتَقْبَلَ بِاَطْرَافِ اَصَابِعِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ فَاِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْيُمْنٰى فَاِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَةِ الْاٰخِرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْاُخْرٰى وَقَعَدَ عَلٰى مَقْعَدَتِهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابو حمید ساعدیؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے آقائے نامدار ﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت میں فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے طریقہ نماز کو تم میں سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب آپ ﷺ تکبیر کہتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اٹھاتے تھے اور جب رکوع میں جاتے تھے تو اپنے دونوں زانو ہاتھوں سے مضبوط پکڑتے تھے اور اپنی پیٹھ جھکا دیتے تھے (تاکہ گردن کے برابر ہو جائے) اور جب اپنا سر (رکوع سے) اٹھاتے تو سیدھے کھڑے ہو جاتے یہاں تک کہ سارے جوڑ اپنی اپنی جگہ پر آجاتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تو دونوں ہاتھ زمین پر (منہ کے بل) رکھ دیتے تھے اور انہیں نہ پھیلاتے تھے اور نہ (پہلو کی طرف) بیٹھتے تھے اور پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف سامنے رکھتے تھے اور جب دو رکعتیں پڑھنے کے بعد بیٹھتے تھے تو بائیں پاؤں پر بیٹھتے تھے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے تھے اور جب آخری رکعت پڑھ کہ بیٹھتے تھے تو بائیں پاؤں کو آگے نکال دیتے اور دوسرے (یعنی دائیں) پاؤں کو کھڑا کر کے کولھے پر بیٹھ جاتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ جب تکبیر کہتے تھے تو اپنے ہاتھ اپنے مونڈھوں کے برابر اٹھاتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کو کانوں کی لو کے مقابل تک اٹھانا چاہئے کیونکہ دیگر احادیث میں اسی طرح مروی ہے اور چونکہ بعض روایات میں ان دونوں سے الگ ایک تیسرا طریقہ یعنی ہاتھوں کو کانوں کی اوپر کی جانب تک اٹھانا بھی آیا ہے۔ اس لئے امام اعظمؒ نے نہ تو کانوں کے نیچے یعنی مونڈھوں تک اٹھانے کے طریقہ کو اختیار کیا اور نہ کانوں کے اوپر کی جانب تک اٹھانے کے طریقہ کو اختیار کیا بلکہ درمیانی طریقہ اختیار کیا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ نے ان روایات کی تطبیق کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اس طرح اٹھانا چاہئے کہ ہاتھ کی ہتھیلیاں تو کاندھوں کے مقابل رہیں انگوٹھے کانوں کی لو کے مقابل اور انگلیوں کے سرے کان کے اوپر کے حصے پر رکھے جائیں تاکہ اس طریقہ سے تمام احادیث پر عمل ممکن ہو جائے اور روایتوں میں کوئی اختلاف کی گنجائش نہ رہ جائے۔ ان احادیث میں ایک دوسری تطبیق یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ احادیث مختلف اوقات سے متعلق ہیں یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت کبھی تو آپ ﷺ اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہوں گے

اور کبھی اس طرح۔

آپ ﷺ کے رکوع کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ﷺ دونوں ہاتھوں سے دونوں زانو مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے اور انگلیوں کو کشادہ رکھتے تھے اور پھر گردن مبارک کو جھکا کر بالکل پیٹھ کے برابر کر دیتے تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ رکوع میں تو انگلیاں کشادہ رکھنی چاہئیں اور سجدہ میں ملی ہوں نیز تکبیر تحریمہ اور تشہد میں ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے۔

سجدہ میں زمین پر ہاتھ رکھنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کی حالت میں انگلیاں اور ہتھیلیاں زمین پر پھیلا دینی چاہئیں اور پہنچے اٹھے ہوئے اور پہلو اس طرح الگ رکھنے چاہئیں کہ اگر بکری کا بچہ چاہے تو نیچے سے گزر جائے۔

اس حدیث میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ قومہ سے سجدہ میں جانے کے وقت زمین پر پہلے زانو رکھے جائیں یا ہاتھ تو اس سلسلہ میں صحیح مسئلہ یہ ہے کہ درست تو دونوں طریقے ہیں لیکن اکثر ائمہ کے نزدیک افضل اور مختار یہی ہے کہ زمین پر پہلے زانو رکھا جائے۔

رفع یدین

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَاِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوْعِ وَاِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ رَفَعَهُمَا كَذٰلِكَ وَقَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَكَانَ لَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السُّجُوْدِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں تک اٹھاتے اور جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے نیز جب رکوع سے سر اٹھاتے تو تب بھی اسی طرح دونوں ہاتھ (مونڈھوں تک) اٹھاتے اور (رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے) کہتے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ۔ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ (اللہ نے اس شخص کو سن لیا یعنی اس کی تعریف قبول کر لی جس نے اس کی حمد بیان کی۔ اے ہمارے پروردگار! تعریف تو تیرے ہی لئے ہے) اور آنحضرت ﷺ سجدوں میں ایسا نہیں کرتے تھے۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کا مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار! دنیا کی تمام تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی کسی شخص کی تعریف کرتا ہے تو وہ درحقیقت تیری ہی تعریف کرتا ہے کیونکہ سب کو پیدا کرنے والا تو ہی تو ہے اس لئے مصنوع کی تعریف دراصل صانع ہی کی تعریف ہوتی ہے۔

حدیث کے اس جزو سے معلوم ہوا کہ ہر نماز پڑھنے والے کو سمع اللّٰہ لمن حمدہ اور ربنا لک الحمد دونوں کلمات کہنے چاہئیں، مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تنہا نماز پڑھ رہا ہو تو اسے یہ دونوں کلمات کہنے چاہئیں مگر جماعت کی صورت میں امام صرف سمع اللّٰہ لمن حمدہ کہے اور مقتدی ربنا لک الحمد کہیں۔ حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ امام کو دونوں کلمات کہنے چاہئیں اسی قول کو امام طحاوی نے بھی اختیار کیا ہے۔ بلکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے بھی ایک روایت اسی قول کی تائید میں منقول ہے مقتدی کے بارہ میں ان کی رائے بھی یہی ہے کہ وہ صرف ربنا لک الحمد کہیں۔

وکان لا یفعل ذٰلک فی السجود (یعنی آپ ﷺ سجدوں میں ایسا نہیں کرتے تھے) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تکبیر تحریمہ کے بعد آپ ﷺ رکوع میں جانے سے پہلے اور رکوع سے سر اٹھانے کے وقت رفع یدین کرتے تھے اس طرح جب سجدے میں جاتے یا سجدہ سے سر اٹھاتے تو رفع یدین نہیں کرتے تھے چنانچہ حضرات شوافع کا مختار مسلک یہی ہے کہ ان اوقات میں رفع یدین نہیں کرنا چاہئے۔ ان حضرات کے نزدیک رفع یدین کی جو صورت ہے وہ یہی ہے کہ رفع یدین صرف تکبیر تحریمہ، رکوع میں جانے کے وقت اور رکوع سے سر اٹھانے کے وقت کرنا چاہئے۔ ان تینوں موقعوں کے علاوہ اور کسی موقعہ پر رفع یدین کو یہ حضرات صحیح نہیں مانتے۔

⑤ وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ اِذَا دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ كَبَّرَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَاِذَا رَكَعَ رَفَعَ يَدَيْهِ وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ

حَمِدَهٗ رَفَعَ يَدَيْهِ وَإِذَا قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ رَفَعَ يَدَيْهِ وَرَفَعَ ذٰلِكَ ابْنُ عُمَرَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ جب نماز شروع کرتے تو تکبیر کہتے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع میں جاتے تو دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب دو رکعتیں پڑھ کر اٹھتے تب بھی دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ اس حدیث کو آنحضرت ﷺ تک پہنچی ہوئی نقل کرتے تھے (یعنی وہ کہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی اسی طرح کیا ہے)۔" (بخاریؒ)

رفع یدین کے مسئلہ میں حنفیہ کی مستدل احادیث و آثار

۶ وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَبَّرَ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا أُذُنَيْهِ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ فَقَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ وَفِيْ رِوَايَةٍ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا فُرُوْعَ أُذُنَيْهِ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت مالک ابن حویرثؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب تکبیر تحریمہ کہتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے کہ انہیں کانوں کی سیدھ تک لے جاتے تھے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر اسی طرح کرتے تھے (یعنی دونوں ہاتھ کانوں کی سیدھ تک لے جاتے تھے) اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ دونوں ہاتھوں کو اپنے کانوں کے اوپر کی جانب لے جاتے تھے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین یعنی ہاتھوں کو اٹھانے میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ تمام علماء وائمہ اس بات پر متفق ہیں۔ کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرنا چاہئے۔ تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواقع پر رفع یدین کا مسئلہ حنفیہ و شوافع کے درمیان ایک معرکۃ الآراء مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرنا چاہئے اور شوافع کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدین کرنا چاہئے۔

حق تو یہ ہے کہ دونوں طرف دلائل کے انبار ہیں اور احادیث و آثار کے ذخائر ہیں جن کی بنیادوں پر طرفین اپنے اپنے مسلک کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ علماء حنفیہ نے تمام احادیث میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان حضرات کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی تو رفع یدین کرتے ہوں اور کبھی نہ کرتے ہوں، یا یہ کہ پہلے تو آپ ﷺ رفع یدین کرتے تھے لیکن بعد میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواقع کے لئے رفع یدین منسوخ قرار دے دیا گیا۔

حنفیہ کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں بہت زیادہ احادیث و آثار ہیں انہیں یہاں ذکر کیا جاتا ہے تاکہ حنفی مسلک پوری طرح واضح ہو جائے۔

امام ترمذی نے اپنی جامع ترمذی میں دو باب قائم کئے ہیں۔ پہلا باب تو رکوع کے وقت رفع یدین کا ہے۔ اس کے ضمن میں امام ترمذی نے ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ دوسرا باب یہ ہے کہ "ہاتھ اٹھانا صرف نماز کی ابتداء کے وقت دیکھا گیا ہے" اس باب کے ضمن میں امام ترمذی نے حضرت علقمہ کی وہ حدیث جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ "حضرت ابن مسعودؓ نے اپنے رفقاء سے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ آنحضرت ﷺ کی نماز ادا کرتا ہوں" چنانچہ ابن مسعودؓ نے نماز ادا کی اور انہوں نے صرف پہلی مرتبہ ہی (یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت) ہاتھ اٹھائے۔ اسی باب میں امام ترمذیؒ نے براء بن عازبؓ سے بھی اسی طرح منقول ہونا ثابت کیا ہے۔ نیز امام موصوف نے کہا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث حسن ہے اور صحابہ و تابعین میں سے اکثر اہل علم اس کے قائل ہیں اور سفیان ثوری و اہل کوفہ کا قول بھی یہی ہے۔

جامع الاصول میں حضرت ابن مسعودؓ کی حدث کو ابی داؤدؒ ونسائی کے حوالہ سے اور براء ابن عازب کی حدیث کو بھی ابوداؤد کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ "حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا" میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ نماز شروع فرماتے تھے تو (تکبیر تحریمہ کے وقت) دونوں ہاتھ اپنے دونوں مونڈھوں کے قریب تک اٹھاتے تھے اور ایسا دوبارہ نہیں کرتے تھے۔ اور ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ "پھر دوبارہ ہاتھوں کو نہیں اٹھاتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو جاتے تھے۔"

اس موقع پر اتنی سی بات اور سنتے چلئے کہ اس حدیث کے بارہ میں ابوداؤد نے جو یہ کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک صحیح نہ ہونے سے مراد یہ ہو کہ اس خاص سند وطریق سے صحیح ثابت نہیں ہے لہٰذا ایک خاص سند وطریق سے صحیح ثابت نہ ہونا اصل حدیث کی صحت پر کچھ اثر انداز نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ احتمال ہے کہ ابوداؤدؒ کا مقصد اس حدیث کو حسن ثابت کرنا ہو جیسا کہ ترمذی نے کہا ہے لہٰذا اس صورت میں کہا جائے گا تمام ائمہ ومحدثین کے نزدیک حدیث حسن قابل استدلال ہوتی ہے۔

حضرت امام محمدؒ اپنی کتاب "مؤطا" میں حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت کو جس سے رکوع اور رکوع سے سر اٹھانے کے وقت رفع یدین ثابت ہوتا ہے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔ یہ سُنّت ہے کہ ہر مرتبہ جھکنے اور اٹھنے کے وقت تکبیر کہی جائے لیکن رفع یدین سوائے ایک مرتبہ یعنی تحریمہ کے وقت دوسرے مواقع پر نہ ہو اور یہ قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ آثار وارد ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد عاصم ابن کلیب خرمی کی ایک روایت جسے عاصم نے اپنے والد مکرم سے جو حضرت علیؓ کے تابعین میں سے ہیں روایت نقل کی ہے کہ "حضرت علی کرم اللہ وجہہ سوائے تکبیر اولیٰ کے رفع یدین نہیں کرتے تھے۔"

عبدالعزیزؒ ابن حکیم کی روایت نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ "میں نے حضرت ابن عمرؓ کو دیکھا وہ ابتداء نماز میں پہلی تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے اس کے علاوہ اور کسی موقع پر رفع یدین نہیں کرتے تھے۔"

مجاہدؒ کی روایت نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے چنانچہ وہ صرف تکبیر اولیٰ میں رفع یدین کرتے تھے۔ اسودؒ سے منقول ہے کہ "میں نے حضرت عمر ابن خطابؓ کو دیکھا کہ وہ صرف تکبیر اولیٰ میں رفع یدین کرتے تھے۔"

لہٰذا۔ جب حضرت عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، اور حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر صحابہ جو آنحضرت ﷺ سے نہایت قرب رکھتے تھے ترک رفع یدین پر عمل کرتے تھے تو وہ عمل جو اس کے برخلاف ہے قبول کرنے کے سلسلہ میں اولیٰ اور بہتر نہیں ہوگا۔

شرح ابن ہمام میں ایک روایت دار قطنیؒ اور ابن عدیؒ سے نقل کی گئی ہے جسے انہوں نے محمد ابن جابرؒ سے انہوں نے حمادؒ ابن سلیمان سے انہوں نے ابراہیمؒ سے انہوں نے علقمہؒ سے اور انہوں نے عبداللہ سے روایت کیا ہے۔ عبداللہؓ نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ہمراہ نماز پڑھی ہے چنانچہ انہوں نے سوائے تکبیر اولیٰ کے اور کسی موقع پر رفع یدین نہیں کیا۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ مکہ کے دار الخیاطین میں جمع ہوئے۔ امام اوزاعیؒ نے امام صاحبؒ سے پوچھا کہ آپ ﷺ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟ حضرت امام صاحب نے جواب دیا اس لئے کہ آقائے نامدار ﷺ سے اس سلسلہ میں کچھ صحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے! امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ، مجھے زہریؒ نے حضرت سالمؒ کی یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے اپنے والد حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ "آنحضرت ﷺ تکبیر اولیٰ کے وقت، رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے۔" حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ مجھ سے حمادؒ نے ان سے ابراہیمؒ نے اور ان سے علقمہؒ اور اسودؒ نے اور ان دونوں نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "آنحضرت ﷺ صرف ابتداء نماز میں دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے اور دوبارہ ایسا نہیں کرتے تھے۔" یہ روایت سن کر امام اوزاعیؒ نے کہا

کہ میں نے تو زہریؒ سے نقل کیا اور انہوں نے سالمؒ سے اور انہوں نے اپنے باپ حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے اور آپ اس کے مقابلہ میں حمادؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ابراہیمؒ سے اور انہوں نے علقمہؒ سے نقل کیا ہے یعنی میری بیان کردہ سند آپ کی بیان کردہ سند سے عالی اور افضل ہے۔

حضرت امام اعظمؒ نے فرمایا کہ "اگر یہی بات ہے تو پھر سنو کہ حمادؒ، زہریؒ سے زیادہ فقیہ ہیں اور ابراہیمؒ سالمؒ سے زیادہ فقیہ ہیں اور اسی طرح علقمہؒ بھی حضرت ابن عمرؓ کے مقابلہ میں فقہ میں کم نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو آنحضرت ﷺ کی رفاقت و صحابیت کا شرف حاصل ہے۔ نیز اسودؒ کو بھی بہت زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ اور عبداللہ تو خود عبداللہ ہیں۔ یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ کی تعریف و توصیف کیا کی جائے کہ علم فقہ میں اپنی عظمت شان اور آنحضرت ﷺ کی رفاقت و صحبت کی سعادت و شرف کی وجہ سے مشہور ہیں۔"

گویا۔ امام اوزاعی نے تو اسناد کے عالی ہونے کی حیثیت سے حدیث کو ترجیح دی اور حضرت امام اعظمؒ نے راویان حدیث کے فقیہ ہونے کے اعتبار سے حدیث کو ترجیح دی۔ چنانچہ حضرت امام اعظمؒ کا اصول یہی ہے کہ وہ فقیہ راویوں کو غیر فقیہ راویوں پر ترجیح دیتے ہیں جیسا کہ اصول فقہ میں مذکور ہے۔

نہایہ شرح ہدایہ میں "عبداللہ ابن زبیرؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو مسجد حرام میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جو رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کر رہا تھا، انہوں نے اس شخص سے کہا کہ ایسا مت کرو کیونکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کو آنحضرت ﷺ نے پہلے اختیار کیا تھا اور بعد میں اسے ترک کر دیا یعنی ان مواقع پر رفع یدین کا حکم پہلے تھا اب منسوخ ہو گیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے رفع یدین کیا تو ہم نے بھی رفع یدین کیا اور جب آنحضرت ﷺ نے اسے ترک کر دیا تو ہم نے بھی ترک کر دیا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "عشرہ مبشرہ (یعنی وہ دس خوش نصیب صحابہ جن کو آنحضرت ﷺ نے ان کی زندگی ہی میں جنتی ہونے کی بشارت دی تھی) صرف ابتداء نماز ہی میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

حضرت مجاہدؒ حضرت ابن عمرؓ کا معمول نقل کرتے ہیں کہ "میں نے حضرت ابن عمرؓ کے پیچھے سالہا سال نماز ادا کی ہے مگر میں نے ان کو سوائے ابتداء نماز کے اور کسی موقع پر رفع یدین کرتے نہیں دیکھا۔ حالانکہ حضرت ابن عمرؓ کی وہ روایت گزر چکی ہے۔ جس سے تینوں مواقع پر رفع یدین کا اثبات ہوتا ہے اور جو شوافع کی سب سے اہم دلیل ہے۔ لہٰذا اصول حدیث کا چونکہ قاعدہ ہے کہ راوی کا عمل اگر خود اس کی روایت کے خلاف ہو تو روایت پر عمل نہیں کیا جاتا اس لئے حضرت ابن عمرؓ کی وہ روایت ساقط العمل قرار دی جائے گی۔

بہر حال۔ ان روایات و آثار سے معلوم ہوا کہ رفع یدین دونوں کے اثبات میں احادیث و آثار وارد ہیں اور صحابہ کی ایک جماعت خصوصاً حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور ان کے تابعین رفع یدین نہ کرنے ہی کے حق میں ہیں۔ لہٰذا۔ ان تمام موافق و مخالف احادیث کا محمول یہی ہو سکتا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ آنحضرت ﷺ سے اوقات مختلفہ میں دونوں طریقے وجود میں آئے ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے علم فقہ اور ان کی اسناد کا نقطہ منتہا حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور ان کے تابعین کی ذات گرامی ہے اور چونکہ ان کا رجحان عدم رفع یدین کی طرف ہے اس لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ترک رفع یدین کے مسلک ہی کو اختیار کیا ہے اور اب تمام حنفیہ اسی مسلک کے حامی اور اس مسلک پر عامل ہیں۔

علمائے حنفیہ صرف اسی قدر نہیں کہتے بلکہ ان حضرات کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ دیگر مواقع پر رفع یدین کا حکم منسوخ ہے کیونکہ جب حضرت ابن عمرؓ کے بارہ میں یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد یہ ترک رفع یدین ہی اختیار کرتے تھے باوجودیکہ رفع یدین کی

حدیث کے راوی یہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلے تو رفع یدین کا حکم رہا ہوگا مگر بعد میں یہ حکم باوجود کثرت احادیث و آثار کے منسوخ ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس مسئلہ کی پوری تفصیل اپنی کتاب شرح سفر السعادۃ میں نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ان کے نزدیک رفع یدین اور عدم رفع یدین دونوں ہی سُنّت ہیں مگر رفع یدین نہ کرنا ہی اولی اور راجح ہے البتہ دیگر علماء حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ رفع یدین کا حکم اور طریقہ منسوخ ہے۔ واللہ اعلم۔

جلسۂ استراحت کا مسئلہ

⑦ وَعَنْهُ اَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فَاِذَا كَانَ فِيْ وِتْرٍ مِنْ صَلَاتِهٖ لَمْ يَنْهَضْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ قَاعِدًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مالک ابن حویرثؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے آقائے نامدار ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے چنانچہ آپ ﷺ جب اپنی نماز کی طاق رکعت (یعنی پہلی یا تیسری) میں ہوتے تو جب تک سیدھے بیٹھ نہ لیتے اُٹھتے نہ تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ نماز پڑھتے اور پہلی یا تیسری رکعت میں دوسرے سجدہ سے سر اٹھاتے تو پہلے بیٹھتے تھے اس کے بعد اگلی رکعت کے لئے اُٹھتے تھے اسی کو جلسۂ استراحت کہا جاتا ہے۔

جلسۂ استراحت سُنّت ہے یا نہیں؟: حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جلسۂ استراحت سُنّت ہے اور اس کا طریقہ وہی ہے جو پہلے قعدہ میں بیٹھنے کا ہے۔ نیز یہ کہ بیٹھنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے زمین کا سہارا لے کر اٹھنا چاہئے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کا مختار قول یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا جلسۂ استراحت کرنا چونکہ کبر سنی اور ضعف کی وجہ سے تھا اس لئے جس شخص کو جلسۂ استراحت کی حاجت نہ ہو اس کے لئے یہ سُنّت نہیں ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کی مستدل یہی حدیث ہے اور حضرت امام اعظمؒ کی دلیل حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے جس کو ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ "آنحضرت ﷺ (پہلی اور تیسری رکعت کے دوسرے سجدہ سے) پشت قدم پر یعنی بغیر بیٹھے ہوئے اُٹھتے تھے" اگرچہ اس حدیث کے بعض طرق ضعیف ہیں لیکن حدیث صحیح الاصل ہے۔

حضرت ابن ابی شیبہ، حضرت ابن مسعودؓ کے بارہ میں نقل کرتے ہیں کہ "وہ اپنے پشت قدم پر بغیر بیٹھے ہوئے اُٹھتے تھے" نیز انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کے بارہ میں بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور حضرت نعمان ابن ابی عیاس کے بارہ میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ "میں نے بہت سے صحابہؓ کو دیکھا ہے کہ وہ جب پہلی اور تیسری رکعت میں سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو جس حالت میں ہوتے تھے اسی حالت میں بغیر بیٹھے ہوئے اٹھ جاتے تھے۔

بہرحال۔ اس سلسلہ میں بہت زیادہ احادیث و آثار وارد ہیں اور جو احادیث اس کے برعکس وارد ہیں ان کا محمول کبر سنی اور ضعف ہے جیسا کہ اس حدیث کے بارہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کبر سنی اور ضعف کی وجہ سے جلسۂ استراحت اختیار فرماتے تھے۔

تکبیر تحریمہ کے بعد دونوں ہاتھ کہاں اور کس طرح رکھنے چاہئیں

⑧ وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ اَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَفَعَ يَدَيْهِ حِيْنَ دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ كَبَّرَ ثُمَّ الْتَحَفَ بِثَوْبِهٖ ثُمَّ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى فَلَمَّا اَرَادَ اَنْ يَّرْكَعَ اَخْرَجَ يَدَيْهِ مِنَ الثَّوْبِ ثُمَّ رَفَعَهُمَا وَكَبَّرَ فَرَكَعَ فَلَمَّا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَفَعَ يَدَيْهِ فَلَمَّا سَجَدَ سَجَدَ بَيْنَ كَفَّيْهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت وائل[1] ابن حجرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے آقائے نامدار ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہی پھر ہاتھ کپڑے کے اندر کر لئے اور داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا۔ پھر جب رکوع میں جانے کا ارادہ کیا تو دونوں ہاتھ کپڑے سے نکال کر ان کو اٹھایا اور تکبیر کہہ کر رکوع میں چلے گئے اور جب (رکوع سے اٹھتے وقت) سمع اللہ لمن حمدہ کہا تو (اس وقت بھی) ہاتھوں کو اٹھایا۔ پھر جب سجدہ کیا تو دونوں ہاتھوں کے درمیان کیا (یعنی اپنا سر مبارک دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھا۔"

(مسلمؒ)

تشریح: بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے تکبیر تحریمہ کے بعد اپنے دونوں دست مبارک چادر میں ڈھانک لئے اور نیت باندھ لی مگر بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے چادر میں ہاتھ نہیں ڈھانکے بلکہ اپنی آستینوں میں چھپالئے۔ بہر حال علماء لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کپڑوں میں جو چھپائے تھے تو اس کی وجہ غالباً سردی کی شدت ہوگی۔

تکبیر تحریمہ کے بعد داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا یوں تو تمام ائمہ کے نزدیک ایک متفق علیہ مسئلہ ہے لیکن حضرت امام مالکؒ کے نزدیک چھوڑے رکھنا اولیٰ ہے اور باندھنا بھی جائز ہے۔

اس بارہ میں ائمہ کے یہاں اختلاف ہے کہ ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟ امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ہاتھوں کو ناف کے نیچے باندھنا چاہئے اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سینے کے قریب یعنی ناف کے اوپر باندھنے چاہئیں۔ دونوں حضرات کے مطابق حدیثیں وارد ہیں چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں حکم یہی ہے کہ جہاں چاہے ہاتھ باندھ لیا جائے درست ہوگا لیکن اتنی بات جان لینی چاہئے کہ اس مسئلہ میں کوئی خاص طریقہ چونکہ احادیث کے ذریعہ متعین نہیں تھا یعنی نہ تو ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کا طریقہ خاص طور پر ثابت ہے اور نہ ناف کے نیچے بلکہ دونوں طریقہ احادیث کے ذریعہ ثابت ہیں تو حضرت امام اعظمؒ نے ان دونوں صورتوں میں اس صورت کو اختیار کیا جو ادب اور تعظیم کے سلسلہ میں مقرر و متعارف ہے اور وہ ناف کے نیچے باندھنا ہے کیونکہ انتہائی تعظیم و تکریم اور ادب و احترام کے موقع پر ہاتھ ناف کے نیچے ہی باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تکبیر کہنے اور رفع یدین کے وقت ہاتھوں کو کپڑے کے اندر سے نکال لینا چاہئے۔

(۹) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ كَانَ النَّاسُ يُؤْمَرُوْنَ اَنْ يَضَعَ الرَّجُلُ الْيَدَ الْيُمْنٰى عَلٰى ذِرَاعِهِ الْيُسْرٰى فِي الصَّلَاةِ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ فرماتے ہیں کہ "لوگوں کو حکم کیا جاتا تھا کہ نمازی کو نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر رکھنا چاہئے۔"

(بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ احکم الحاکمین اور پروردگار عالم کے سامنے کھڑے ہونے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ ادب و احترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے بلکہ انتہائی ادب و احترام کے ساتھ کھڑا رہے جس کا طریقہ یہ ہو کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر ناف کے نیچے رکھا رہے اور سر جھکا رہے جیسا کہ بادشاہوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔

(۱۰) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَقُوْمُ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْكَعُ ثُمَّ يَقُوْلُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ حِيْنَ يَرْفَعُ صُلْبَهٗ مِنَ الرَّكْعَةِ ثُمَّ يَقُوْلُ وَهُوَ قَائِمٌ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَهْوِيْ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَسْجُدُ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ ثُمَّ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي الصَّلَاةِ كُلِّهَا حَتّٰى

---

[1] حضرت وائل بن حجر حضرمی ہیں۔ حضر موت کے شمار کردہ رئیسوں میں سے ہیں۔ جب یہ اپنے قبیلے کی طرف سے ایلچی بن کر آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے اپنی چادر مبارک زمین پر بچھادی اور ان کو اس پر بٹھایا۔ پھر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ علقمہ اور عبدالجبار ان کے صاحبزادے ہیں۔

يَقْضِيَهَا وَيُكَبِّرُ حِيْنَ يَقُوْمُ مِنَ الثِّنْتَيْنِ بَعْدَ الْجُلُوْسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب نماز کا ارادہ کرتے تو کھڑے ہونے کے وقت تکبیر تحریمہ کہتے پھر رکوع میں جانے کے وقت تکبیر تحریمہ کہتے اور جب رکوع سے اپنی پشت اٹھاتے تو سمع اللہ لمن حمدہ کہتے پھر کھڑے ہی کھڑے "ربنالک الحمد" کہتے پھر جب (سجدہ کے لئے) جھکتے تو تکبیر کہتے اور (سجدہ سے) سر اٹھاتے تو تکبیر کہتے۔ پھر نماز پوری کرنے تک ساری نماز میں یہی کرتے تھے اور جب دو رکعتیں پڑھنے کے بعد اٹھتے تھے تو تکبیر کہتے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس حدیث میں تکبیر تحریمہ اور رکوع و سجود کے مواقع پر صرف تکبیرات کا ذکر کیا گیا ہے ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

افضل نماز کون سی ہے؟

⑪ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الصَّلَاةِ طُوْلُ الْقُنُوْتِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا۔ "سب سے بہتر نماز وہ ہے جس میں قیام طویل ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں طویل قیام کرنا یعنی زیادہ دیر تک کھڑے رہنا اور لمبی سورتیں پڑھنا افضل اور اعلیٰ ہے کیونکہ اس کی وجہ سے مشقت و محنت زیادہ ہوتی ہے اور جذبۂ خدمت و اطاعت کا اظہار ہوتا ہے جو عبادت کی روح ہے۔

نماز میں قیام افضل ہے یا سجود؟: علماء کے یہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ نماز میں آیا قیام افضل ہے یا سجود؟ چنانچہ بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ نماز میں سجود افضل ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ قیام ہی افضل ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہی حدیث ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قیام میں قرآن پڑھا جاتا ہے اور سجدہ میں تسبیح پڑھی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن تسبیح سے افضل ہے۔ حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آنحضرت ﷺ کی نماز کا طریقہ

⑫ عَنْ اَبِيْ حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ قَالَ فِيْ عَشْرَةٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا فَاعْرِضْ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ ثُمَّ يُكَبِّرُ ثُمَّ يَقْرَأُ ثُمَّ يُكَبِّرُ وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ ثُمَّ يَرْكَعُ وَيَضَعُ رَاحَتَيْهِ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ يَعْتَدِلُ فَلَا يُصَبِّيْ رَأْسَهُ وَلَا يُقْنِعُ ثُمَّ يَرْفَعُ رَأْسَهُ فَيَقُوْلُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ ثُمَّ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ مُعْتَدِلًا ثُمَّ يَقُوْلُ اللّٰهُ اَكْبَرُ ثُمَّ يَهْوِيْ اِلَى الْاَرْضِ سَاجِدًا فَيُجَافِيْ يَدَيْهِ عَنْ جَنْبَيْهِ وَيَفْتَحُ اَصَابِعَ رِجْلَيْهِ ثُمَّ يَرْفَعُ رَأْسَهُ وَيَثْنِيْ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى فَيَقْعُدُ عَلَيْهَا ثُمَّ يَعْتَدِلُ حَتّٰى يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ فِيْ مَوْضِعِهٖ مُعْتَدِلًا ثُمَّ يَسْجُدُ ثُمَّ يَقُوْلُ اللّٰهُ اَكْبَرُ وَيَرْفَعُ وَيَثْنِيْ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى فَيَقْعُدُ عَلَيْهَا ثُمَّ يَعْتَدِلُ حَتّٰى يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ اِلٰى مَوْضِعِهٖ ثُمَّ يَنْهَضُ ثُمَّ يَصْنَعُ فِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ اِذَا قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ كَبَّرَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ كَمَا كَبَّرَ عِنْدَ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ ثُمَّ يَصْنَعُ ذٰلِكَ فِيْ بَقِيَّةِ صَلَاتِهٖ حَتّٰى اِذَا كَانَتِ السَّجْدَةُ الَّتِيْ فِيْهَا التَّسْلِيْمُ اَخْرَجَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَقَعَدَ مُتَوَرِّكًا عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْسَرِ ثُمَّ سَلَّمَ قَالُوْا صَدَقْتَ هٰكَذَا كَانَ يُصَلِّيْ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالدَّارِمِيُّ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ مَعْنَاهُ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاوٗدَ مِنْ حَدِيْثِ اَبِيْ حُمَيْدٍ ثُمَّ

رَكَعَ فَوَضَعَ يَدَيْهِ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ كَأَنَّهُ قَابِضٌ عَلَيْهِمَا وَوَتَّرَ يَدَيْهِ فَنَحَّاهُمَا عَنْ جَنْبَيْهِ وَقَالَ ثُمَّ سَجَدَ فَأَمْكَنَ أَنْفَهُ وَجَبْهَتَهُ الْأَرْضَ وَنَحّٰى يَدَيْهِ عَنْ جَنْبَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ وَفَرَّجَ بَيْنَ فَخِذَيْهِ غَيْرَ حَامِلٍ بَطْنَهُ عَلٰى شَيْءٍ مِنْ فَخِذَيْهِ حَتّٰى فَرَغَ ثُمَّ جَلَسَ فَافْتَرَشَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَأَقْبَلَ بِصَدْرِ الْيُمْنٰى عَلٰى قِبْلَتِهِ وَوَضَعَ كَفَّهُ الْيُمْنٰى عَلٰى رُكْبَتِهِ الْيُمْنٰى وَكَفَّهُ الْيُسْرٰى عَلٰى رُكْبَتِهِ الْيُسْرٰى وَأَشَارَ بِأُصْبُعِهِ يَعْنِي السَّبَّابَةَ وَفِي أُخْرٰى لَهُ وَإِذَا قَعَدَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ قَعَدَ عَلٰى بَطْنِ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْيُمْنٰى وَإِذَا كَانَ فِي الرَّابِعَةِ أَفْضٰى بِوَرِكِهِ الْيُسْرٰى إِلَى الْأَرْضِ وَأَخْرَجَ قَدَمَيْهِ مِنْ نَاحِيَةٍ وَاحِدَةٍ۔

"حضرت ابوحمید ساعدیؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے آقائے نامدار ﷺ کے دس صحابہؓ کی جماعت سے کہا کہ میں رسول خدا ﷺ کی نماز (کے طریقہ) کو تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں صحابہ کی جماعت نے کہا کہ اچھا بیان کیجئے۔" انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر مونڈھوں کے برابر لے جاتے اور تکبیر کہتے پھر قرأت کرتے۔ اس کے بعد تکبیر کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اٹھاتے اور رکوع میں جا کر دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنے پر رکھتے اور کمر سیدھی کر لیتے اور سر کو نہ نیچا کرتے تھے اور نہ بلند کرتے تھے (یعنی پیٹھ اور سر برابر رکھتے تھے) پھر سر اٹھاتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ کہتے اور دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اٹھاتے اور سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ پھر تکبیر کہتے ہوئے زمین کی طرف جھکتے اور سجدہ کرتے اور (سجدہ میں) اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں پہلوؤں سے الگ رکھتے تھے اور اپنے پیروں کی انگلیوں کو موڑ کر (ان کے رخ قبلہ کی طرف) رکھتے تھے پھر سجدہ سے سر اٹھاتے اور بایاں پیر موڑ کر (یعنی بچھا کر) اس پر سیدھے بیٹھ جاتے تھے یہاں تک کہ ہر عضو اپنی جگہ پر برابر آجاتا تھا۔ پھر تکبیر کہتے ہوئے (دوسرے) سجدہ میں چلے جاتے اور پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے (سجدہ سے) اٹھتے اور بایاں پیر موڑ کر اس اطمینان سے بیٹھتے (یعنی جلسہ استراحت کرتے) یہاں تک کہ بدن کا ہر عضو اپنی جگہ پر آجاتا تھا پھر دوسری رکعت میں بھی (سوائے ابتداء رکعت میں سبحانک اللھم اور اعوذ باللہ) پڑھنے کے اسی طرح کرتے تھے۔ اور جب دو رکعت پڑھنے (یعنی تشہد) کے بعد کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں تک اٹھاتے جیسے کہ نماز کو شروع کرنے کے وقت تکبیر کہتے تھے پھر باقی نماز اسی طرح پڑھتے تھے اور جب وہ سجدہ (یعنی آخری رکعت کا دوسرا سجدہ) کر چکتے جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے تو اپنا بایاں پیر باہر نکالتے اور بائیں طرف کولھے پر بیٹھ جاتے اور پھر (تشہد وغیرہ پڑھنے کے بعد) سلام پھیرتے تھے۔ (یہ سن کر) وہ سب صحابہ بولے کہ "بے شک تم نے سچ کہا آنحضرت ﷺ اسی طرح نماز پڑھتے تھے۔" (ابوداؤدؒ، دارمیؒ) ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو بالمعنی نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابوداؤدؒ کی ایک روایت جو ابوحمیدؒ سے مروی ہے۔ یہ الفاظ ہیں "پھر رکوع میں جا کر دونوں ہاتھ زانو پر اس طرح رکھے جیسے انہیں مضبوطی سے پکڑے ہوں اور اپنے ہاتھوں کو (کمان کے) چلہ کی طرح رکھا اور کہنیوں کو اپنے دونوں پہلوؤں سے دور رکھا (گویا کہ) کہنیاں چلہ کے مشابہ تھیں اور پہلو کمان کے مشابہ" اور راوی کہتے ہیں کہ "پھر سجدہ میں گئے تو اپنی ناک اور پیشانی کو زمین پر رکھا اور ہاتھوں کو پہلوؤں سے جدا رکھا اور دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کی سیدھ میں اور دونوں رانوں کو کشادہ رکھا اور اپنے پیٹ کو دونوں سے الگ رکھا یہاں تک کہ سجدہ سے فارغ ہوئے اور پھر اس طرح بیٹھے کہ بایاں پیر تو بچھالیا اور داہنے پیر کی پشت قبلہ کی طرف کی اور داہنا ہاتھ دائیں گھٹنے پر اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھ لیا اور (اشھد ان لا الہ الا اللہ کہنے کے وقت) اپنی انگلی یعنی سبابہ سے اشارہ کیا۔ اور ابوداؤدؒ ہی کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "جب دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھتے تو بائیں پیر کے تلوے پر بیٹھتے اور دائیں پیر کو کھڑا کر لیتے تھے اور جب چوتھی رکعت پڑھ کر بیٹھتے تو بائیں کولھے کو زمین سے ملاتے اور دونوں پاؤں کو ایک طرف نکال دیتے تھے۔"

تشریح: انا اعلمکم بصلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے طریقہ کو تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں) ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی خاص مصلحت و ضرورت کی بناء پر بغیر کسی غرور و تکبر اور نفسانیت کے

اظہار حقیقت کے طور پر اپنے علم کی زیادتی کا دعوی کرے تو جائز ہے۔

تکبیر تحریمہ سے پہلے ہاتھ اٹھانے چاہئیں: حدیث کے الفاظ رفع یدیه حتی یحاذی بهما منکبیه ثم یکبر سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو پہلے رفع یدین کرتے اس کے بعد تکبیر تحریمہ کہتے چنانچہ امام اعظمؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ پہلے ہاتھ اٹھائے جائیں اس کے بعد تکبیر تحریمہ کہی جائے۔

سجدہ کی تکمیل زمین پر ناک اور پیشانی دونوں رکھنے سے ہوتی ہے: فامکن انفه وجبهته الارض سے معلوم ہوا کہ سجدہ پیشانی اور ناک دونوں کو زمین پر رکھ کر کرنا چاہئے کیونکہ آنحضرت ﷺ مستقل طور پر سجدہ اسی طرح کرتے تھے اور احادیث بھی اسی کے موافق وارد ہیں لہٰذا سجدہ مکمل تو جب ہی ہوتا ہے کہ ناک اور پیشانی دونوں کو زمین پر رکھا جائے۔ اگر کسی مجبوری اور عذر کی بناء پر سجدہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو زمین پر نہیں رکھا تو مکروہ نہیں ہے۔ اور اگر بغیر کسی عذر اور مجبوری کے ایسا کیا تو اس میں یہ صورت ہوگی کہ اگر زمین پر پیشانی رکھی ہے ناک نہیں رکھی تو یہ متفقہ طور پر جائز ہوگا البتہ سجدہ مکروہ ہوگا اور اگر پیشانی نہیں رکھی بلکہ ناک رکھی تو امام اعظمؒ کے نزدیک یہ بھی بکراہت جائز ہے مگر حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اسی پر فتوی ہے۔

سبابہ کی تحقیق: سبابہ شہادت کی انگلی کو کہتے ہیں۔ "سب" کے لغوی معنی گالی کے ہیں ایام جاہلیت میں اہل عرب جب کسی کو گالی دیتے تھے اس انگلی کو اٹھاتے تھے اس مناسبت سے اس انگلی کا نام اسی وقت سے سبابہ رائج ہو گیا پھر بعد میں اس انگلی کا اسلامی نام مسبحہ اور سباحہ ہو گیا کیونکہ تسبیح و توحید کے وقت اس انگلی کو اٹھاتے ہیں۔

بہر حال۔ حدیث کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے التحیات میں کلمۂ شہادت پڑھتے وقت اس انگلی سے اس طرح اشارہ کیا کہ نفی یعنی اشهد ان لا اله کہتے وقت انگلی اٹھائی اور اثبات یعنی الا اللہ کہتے وقت انگلی رکھ دی۔

تکبیر تحریمہ اور ہاتھ اٹھانے کا طریقہ

(۱۳) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ اَنَّهُ اَبْصَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى كَانَتَا بِحِيَالِ مَنْكِبَيْهِ وَحَاذَى اِبْهَامَيْهِ اُذُنَيْهِ ثُمَّ كَبَّرَ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ يَرْفَعُ لَهُ اِبْهَامَيْهِ اِلٰى شَحْمَةِ اُذُنَيْهِ۔

"اور حضرت وائل ابن حجرؓ راوی ہیں کہ انہوں نے آقائے نامدار ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے تو اپنے دونوں ہاتھ اتنے اٹھائے کہ مونڈھوں کے برابر پہنچ گئے اور دونوں انگوٹھوں کو کانوں تک لے گئے پھر تکبیر کہی۔ (ابوداؤدؒ) اور ابوداؤدؒ ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ۔ آپ ﷺ انگوٹھوں کو کانوں کی لو تک اٹھاتے تھے۔"

تشریح: یہ حدیث بھی حضرت امام اعظمؒ کے مسلک کی تائید کر رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ ہاتھ اٹھانے کے بعد تکبیر کہتے تھے اور انگوٹھوں کو کانوں کی لو تک اٹھاتے تھے۔

ہاتھ باندھنے کا طریقہ

(۱۴) وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ هُلْبٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَؤُمُّنَا فَيَاْخُذُ شِمَالَهُ بِيَمِيْنِهٖ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجہ)

"حضرت قبیصہ ابن ہلبؒ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ ہم لوگوں کو نماز پڑھاتے تو (قیام میں) اپنے داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑتے تھے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہ)

تعدیل ارکان کی تعلیم

⑮ وَعَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ فَصَلّٰى فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ جَاءَ فَسَلَّمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعِدْ صَلَاتَكَ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ فَقَالَ عَلِّمْنِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ اُصَلِّي قَالَ اِذَا تَوَجَّهْتَ اِلَى الْقِبْلَةِ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ وَمَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَقْرَأَ فَاِذَا رَكَعْتَ فَاجْعَلْ رَاحَتَيْكَ عَلٰى رُكْبَتَيْكَ وَمَكِّنْ رُكُوْعَكَ وَامْدُدْ ظَهْرَكَ فَاِذَا رَفَعْتَ فَاَقِمْ صُلْبَكَ وَارْفَعْ رَأْسَكَ حَتّٰى تَرْجِعَ الْعِظَامُ اِلٰى مَفَاصِلِهَا فَاِذَا سَجَدْتَ فَمَكِّنِ السُّجُوْدَ فَاِذَا رَفَعْتَ فَاجْلِسْ عَلٰى فَخِذِكَ الْيُسْرٰى ثُمَّ اصْنَعْ ذٰلِكَ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ وَسَجْدَةٍ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ وَرَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ مَعَ تَغْيِيْرٍ يَسِيْرٍ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ مَعْنَاهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلتِّرْمِذِيِّ قَالَ اِذَا قُمْتَ اِلَى الصَّلَاةِ فَتَوَضَّأْ كَمَا اَمَرَكَ اللّٰهُ بِهٖ ثُمَّ تَشَهَّدْ فَاَقِمْ فَاِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْاٰنٌ فَاقْرَأْ وَاِلَّا فَاحْمَدِ اللّٰهَ وَكَبِّرْهُ وَهَلِّلْهُ ثُمَّ ارْكَعْ۔

"اور حضرت رفاعہ ابن رافعؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص مسجد میں آیا اور نماز پڑھی، پھر آقائے نامدار ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا، آنحضرت ﷺ نے (سلام کا جواب دے کر) فرمایا کہ۔ "اپنی نماز دوبارہ پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی" اس شخص نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! آپ ﷺ مجھے نماز پڑھنے کا طریقہ بتا دیجئے کہ نماز کس طرح پڑھوں؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم قبلہ کی طرف متوجہ ہو تو اللہ اکبر (یعنی تکبیر تحریمہ) کہو پھر سورۂ فاتحہ اور جو کچھ خدا چاہے پڑھو (یعنی سورۂ فاتحہ کے ساتھ جو سورت چاہو پڑھو) اور جب تم رکوع میں جاؤ تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے زانوؤں پر رکھو رکوع میں (اطمینان سے) قائم رہو اور اپنی پشت کو ہموار رکھو اور جب تم (رکوع سے) سر اٹھاؤ تو اپنی پشت کو سیدھا کرو اور سر اٹھاؤ (یعنی بالکل سیدھے کھڑے ہو جاؤ) یہاں تک کہ تمام ہڈیاں اپنی اپنی جگہ آجائیں اور جب سجدہ کرو تو اچھی طرح سجدہ کرو اور جب تم سجدہ سے سر اٹھاؤ تو اپنی بائیں ران پر بیٹھ جاؤ پھر اسی طرح ہر ایک رکوع و سجدہ میں کرو، یہاں تک کہ رکوع، سجود، قومہ اور جلسہ) گویا ہر ایک رکن کی صحیح ادائیگی پر تمہیں اطمینان ہو جائے۔ حدیث کے یہ الفاظ مصابیح کے ہیں اور ابوداؤدؒ نے اسے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ نقل کیا ہے نیز ترمذیؒ اور نسائی نے بھی اس روایت کو بالمعنی نقل کیا ہے اور ترمذی کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو اس طرح وضو کرو جیسا کہ خدا نے تمہیں حکم دیا ہے پھر کلمۂ شہادت پڑھو (جیسا کہ وارد ہے کہ وضو کے بعد کلمۂ شہادت پڑھنا بڑی فضیلت کی بات ہے یا یہ کہ کلمۂ شہادت سے مراد اذان ہے) پھر اچھی طرح نماز ادا کرو (یا اقم کا مطلب یہ ہے کہ تکبیر کہو) اور قرآن میں سے جو کچھ تمہیں یاد ہو اس کو پڑھو اور کچھ یاد نہ ہو تو الحمد للہ، اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کہو۔ پھر رکوع کرو۔"

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جس شخص کو قرآن کی کوئی سورۃ و آیت یاد نہ ہو تو اسے چاہئے کہ وہ قرأت کی جگہ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھ لیا کرے۔ چنانچہ یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی کافر مسلمان ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ نماز کا وقت آنے تک قرآن کی کم سے کم اتنی آیتیں جس کا پڑھنا نماز میں فرض ہے یاد کر لے۔ اگر اس عرصہ میں اسے کچھ بھی یاد نہ ہو سکے تو وہ قرأت کی جگہ ذکر اور تسبیح و تہلیل کر لیا کرے اس کی نماز ادا ہو جائے گی۔

نماز کے بعد دعا مانگنی چاہئے

⑯ وَعَنِ الْفَضْلِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلَاةُ مَثْنٰى مَثْنٰى تَشَهُّدٌ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَتَخَشُّعٌ وَتَضَرُّعٌ وَتَمَسْكُنٌ ثُمَّ تُقْنِعُ يَدَيْكَ يَقُوْلُ تَرْفَعُهُمَا اِلٰى رَبِّكَ مُسْتَقْبِلًا بِبُطُوْنِهِمَا وَجْهَكَ وَتَقُوْلُ يَا رَبِّ يَا رَبِّ وَمَنْ لَمْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَهُوَ كَذَا وَكَذَا وَفِيْ رِوَايَةٍ فَهُوَ خِدَاجٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت فضل ابن عباسؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا۔ (نفل) نماز دو رکعت ہے اور ہر دو رکعت میں التحیات ہے اور

(نماز کی روح) خشوع، عاجزی اور اظہار غریبی ہے پھر (نماز پڑھنے کے بعد) اپنے پروردگار کی طرف دونوں ہاتھ اٹھاؤ، (حضرت فضل کہتے ہیں کہ ثم تقنع یدیک سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ نماز پڑھنے کے بعد تم) اپنے پروردگار کی طرف اپنے ہاتھوں کو اس طرح اٹھاؤ کہ ہاتھوں کی دونوں ہتھیلیاں منہ کی جانب ہوں (جو دعا کا طریقہ ہے) اور یہ کہو کہ "اے میرے رب! اے میرے رب!" اور جو شخص ایسا نہ کرے (یعنی مذکورہ بالا طریقہ پر عمل نہ کرے اور دعا نہ مانگے) تو اس کی نماز ایسی ہے، ویسی ہے (یعنی ناقص ہے) اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ، اس کی نماز ناقص ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے تین چیزوں کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ یعنی پہلی چیز تو یہ ہے کہ نفل نماز دو رکعت پڑھی جائے خواہ دن ہو یا رات۔ یعنی ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا جائے چار رکعتوں کے بعد سلام نہ پھیرا جائے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ نے اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے کہا ہے کہ نفل نماز دو دو رکعت کر کے ہی پڑھنا افضل ہے۔

حضرت امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ چاہے رات ہو چاہے دن، نفل نماز چار چار رکعتیں کر کے پڑھنا ہی افضل ہے، حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک رات میں دو دو اور دن میں چار چار رکعتیں کر کے پڑھنا افضل ہے۔

حضرت امام شافعی کی دلیل تو یہی حدیث ہے۔ حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ نے تراویح پر قیاس کرتے ہوئے یہ حکم دیا ہے اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اپنی دلیل کے طور پر فرماتے ہیں کہ یہ بات صحیح طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ عشاء کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے، نیز ظہر کی نماز میں آپ ﷺ سے چار رکعتیں پڑھنا ثابت ہے۔ پھر اس کے علاوہ ایک چیز یہ بھی ہے کہ چار چار رکعت پڑھنے میں تحریمہ کے اندر زیادہ دیر تک رہنے کی وجہ سے زیادہ مشقت و محنت برداشت کرنی پڑتی ہے اور یہ بتایا جاچکا ہے کہ جس عبادت میں مشقت زیادہ ہوتی ہے وہ افضل ہوتی ہے۔ امام اعظمؒ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد الصلوۃ مثنی مثنی کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ اس ارشاد کی مراد یہ ہے کہ نفل نماز طاق نہیں ہے بلکہ اولی درجہ دو رکعتیں ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ نماز کی روح اور نماز کی معراج خشوع و تضرع اور اظہار عاجزی ہے، بندہ نماز کے اندر جس قدر خشوع کرے گا تضرع سے کام لے گا اور پروردگار کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی بڑائی و عظمت اور اپنی انتہائی بے چارگی و محتاجگی کا اظہار کرے گا نماز اسی قدر مقبولیت کے درجات کو پہنچے گی۔ خشوع کا مطلب یہ ہے کہ باطن میں بندہ اپنے عجز کا احساس کرے، اپنے نفس کو عاجزی و انکساری کے راستہ پر لگائے رہے گویا خشوع عجز باطنی کا نام ہے اور تضرع کا مطلب یہ ہے کہ بندہ ظاہری طور پر اپنے ہر ہر عمل اور ہر ہر زاویہ سے اپنے عجز و انکساری کا اظہار کرے گویا تضرع عجز ظاہری کا نام ہے۔

تیسری چیز یہ کہ نماز کے بعد دعا مانگنی چاہئے۔ یعنی جب بندہ خدا کے دربار میں حاضری دے اور نماز پڑھ کر اپنی عبودیت و فرمانبرداری کا اظہار کر دے تو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نماز کے بعد خدا کی درگاہ میں اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا دے اور اپنی محتاجگی و لاچارگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی دینی و دنیوی بھلائی میں خدا کی مدد و نصرت کا طلب گار ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

امام تکبیرات باآواز بلند کہے

⑰ وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الْمُعَلّٰى قَالَ صَلّٰى لَنَا اَبُوْسَعِيْدِ الْخُدْرِيُّ فَجَهَرَ بِالتَّكْبِيْرِ حِيْنَ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُوْدِ وَحِيْنَ سَجَدَ وَحِيْنَ رَفَعَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ وَقَالَ هٰكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت سعید ابن حارث ابن معلی کہتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے ہمیں نماز پڑھائی چنانچہ جب انہوں نے سجدہ سے اپنا سر اٹھایا

اور جب سجدہ میں گئے نیز جب دو رکعتیں پڑھ کر اٹھے تو بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور فرمایا کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کو اسی طرح (باآواز بلند تکبیرات کہتے) دیکھا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ امام کو چاہئے کہ وہ درمیان نماز تمام تکبیرات باآواز بلند کہے۔ یہاں صرف ان تینوں موقعوں کی تکبیرات کا ذکر یا تو اتفاقاً کیا گیا ہے یا پھر کچھ لوگوں نے ان اوقات کی تکبیرات کا انکار کیا ہوگا اس لئے راوی نے صرف انہیں تکبیرات کو ذکر کیا۔ ویسے اسمٰعیل کی روایت میں بقیہ تکبیرات کا ذکر بھی موجود ہے چنانچہ ان کی روایت کے ابتداء میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں کہ "حضرت ابوہریرہؓ بیمار ہوگئے تھے یا کہیں چلے گئے تھے تو (ان کی عدم موجودگی میں) حضرت ابوسعیدؓ نے نماز پڑھائی چنانچہ انہوں نے نماز شروع ہونے اور رکوع میں جانے کے وقت تکبیرات باآواز بلند کہیں" اس کے بعد بقیہ حدیث بیان کی گئی ہے۔

(۱۸) وَعَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ صَلَّيْتُ خَلْفَ شَيْخٍ بِمَكَّةَ فَكَبَّرَ ثِنْتَيْنِ وَعِشْرِيْنَ تَكْبِيْرَةً فَقُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ اِنَّهُ اَحْمَقُ فَقَالَ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ سُنَّةُ اَبِي الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عکرمہؓ[1] فرماتے ہیں کہ میں نے مکہ میں ایک بوڑھے شخص (یعنی حضرت ابوہریرہؓ) کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے نماز میں بائیس (مرتبہ) تکبیرات کہیں چنانچہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ (معلوم ایسا ہوتا ہے کہ) یہ شخص احمق ہے (جو اتنی زیادہ تکبیریں کہتا ہے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "تیری ماں تجھے روئے یہ طریقہ تو حضرت ابوالقاسم محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: چار رکعتوں میں مع تکبیر تحریمہ کے بائیس تکبیرات ہوتی ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں مروان اور بنی امیہ نے نماز میں تکبیریں باآواز بلند کہنی چھوڑ دی تھیں اس لئے جب حضرت ابوہریرہؓ نے تکبیرات باآواز بلند کہیں تو حضرت عکرمہؓ کو سخت تعجب ہوا۔

(۱۹) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ مُرْسَلًا قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكَبِّرُ فِي الصَّلَاةِ كُلَّمَا خَفَضَ وَرَفَعَ فَلَمْ تَزَلْ تِلْكَ صَلَاتُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت علی بن حسین بطریق مرسل روایت فرماتے ہیں کہ۔ آقائے نامدار ﷺ نماز میں جب جھکتے (یعنی رکوع و سجود میں جاتے) اور جب (قومہ، جلسہ اور قیام کے وقت) اٹھتے تو تکبیر کہتے۔ آپ ﷺ ہمیشہ اسی طرح نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے ملاقات فرمائی (یعنی وفات پائی)۔" (مالکؒ)

رفع یدین صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہے

(۲۰) وَعَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ لَنَا ابْنُ مَسْعُوْدٍ اَلَا اُصَلِّيْ بِكُمْ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى وَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ اِلَّا مَرَّةً وَّاحِدَةً مَعَ تَكْبِيْرِ الْاِفْتِتَاحِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ اَبُوْدَاوُدَ لَيْسَ هُوَ بِصَحِيْحٍ عَلٰى هٰذَا الْمَعْنٰى۔

"اور حضرت علقمہؓ راوی ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے ہم سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں آقائے نامدار ﷺ کی سی نماز نہ پڑھاؤں؟ چنانچہ ابن مسعودؓ نے ہمیں (آنحضرت ﷺ کے طریقے کے مطابق) نماز پڑھائی اور صرف تکبیر تحریمہ کے وقت دونوں ہاتھ اٹھائے۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ) اور ابوداؤد نے کہا کہ یہ حدیث اس طرح صحیح نہیں ہے۔"

تشریح: امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں رفع یدین کے مسئلہ سے متعلق دو باب قائم کئے ہیں۔ ایک باب تو رفع یدین کے اثبات میں اور دوسرا باب عدم رفع یدین کے اثبات میں۔ اسی دوسرے باب میں امام موصوف نے یہ حدیث نقل کی ہے اور کہا ہے کہ اس سلسلہ میں

---

[1] آپ حضرت عبداللہ بن عباس کے آزاد کردہ غلام تھے نام عکرمہ اور کنیت ابوعبداللہ تھی ۱۰۵ھ میں بعمر ۸۰ سال آپ کا انتقال ہوا۔

براء ابن عازب ؓ سے بھی حدیث منقول ہے اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث حسن ہے اس کے تابع صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت ہے۔ نیز سفیان ثوریؒ اور اہل کوفہ کا مسلک بھی اسی حدیث کے مطابق ہے۔

البتہ امام موصوف نے پہلے باب میں عبداللہ ابن مبارک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رفع یدین کی حدیث ثابت ہے اور عدم رفع یدین کے سلسلہ میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کی حدیث جو حنفیہ کی مستدل ہے ثابت نہیں ہے۔

بہر حال اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حنفیہ کے مسلک عدم رفع یدین کے اثبات میں اس حدیث کے علاوہ اور بہت احادیث و آثار وارد ہیں جن کو پہلے ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ السَّاعِدِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ اِسْتَقْبَلَ الْقِبْلَۃَ وَرَفَعَ یَدَیْہِ وَقَالَ اللّٰہُ اَکْبَرُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوحمید الساعدیؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو (پہلے) قبلہ کی طرف متوجہ ہوتے (پھر) دونوں ہاتھ اٹھاتے اور (اس کے بعد) اللہ اکبر کہتے۔" (ابن ماجہؒ)

آنحضرت ﷺ کا اپنے پیچھے کی چیزوں کا معجزہ کے طور پر دیکھنا

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الظُّھْرَ وَفِیْ مُؤَخَّرِ الصُّفُوْفِ رَجُلٌ فَاَسَاءَ الصَّلَاۃَ فَلَمَّا سَلَّمَ نَادَاہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَافُلَانُ اَلَا تَتَّقِی اللّٰہَ اَلَا تَرٰی کَیْفَ تُصَلِّیْ اِنَّکُمْ تَرَوْنَ اَنَّہٗ یَخْفٰی عَلَیَّ شَیْءٌ مِّمَّا تَصْنَعُوْنَ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَرٰی مِنْ خَلْفِیْ کَمَا اَرٰی مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے (ایک مرتبہ) ہمیں ظہر کی نماز پڑھائی۔ آخر صف میں ایک شخص کھڑا تھا جس نے ٹھیک طرح نماز نہیں پڑھی۔ جب اس شخص نے سلام پھیرا تو آنحضرت ﷺ نے اسے آواز دے فرمایا کہ، اے فلاں! کیا اللہ بزرگ و برتر سے نہیں ڈرتے؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے نماز کس طرح پڑھی ہے؟ تم تو یہ جانتے ہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو مجھے معلوم نہیں ہوتا حالانکہ خدا کی قسم جس طرح میں اپنے سامنے کی چیزیں دیکھتا ہوں اسی طرح اپنے پیچھے کی چیزیں بھی دیکھ لیتا ہوں۔" (احمدؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم ﷺ کو اس دنیا میں شریعت حق دے کر مبعوث فرمایا تو جہاں آپ ﷺ کی رسالت و نبوت کے دلائل و شواہد میں بہت ساری چیزیں دیں وہیں آپ ﷺ کو کچھ معجزات بھی عنایت فرمائے تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کے ذہن و فکر پر آنحضرت ﷺ کی عظمت و برتری اور آپ ﷺ کی سچائی و صداقت عیاں ہو سکے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آپ ﷺ جس طرح اپنے سامنے اور آگے کی چیزوں کو دیکھ لیتے تھے ایسے ہی اپنے پیچھے کی چیزوں کو بھی دیکھنے پر قادر تھے اور یہ دیکھنا خرق عادت یعنی معجزہ کے طور پر ہوتا تھا جس کی راہنمائی وحی الہام کے ذریعہ ہوتی تھی۔

مگر اتنی بات یاد رکھ لیجئے کہ اس معجزہ سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ﷺ کو علم غیب حاصل تھا کیونکہ اول تو یہ بتایا جا چکا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ خصوصیت صرف معجزہ کے طور پر حاصل تھی۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ اس وصف پر از خود قادر نہ تھے بلکہ اس سلسلہ میں وحی الہام کے ذریعہ آپ ﷺ کی رہنمائی کی جاتی تھی۔ پھر یہ کہ آپ ﷺ کو یہ وصف ہمیشہ حاصل نہیں رہتا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا تھا۔ اگر آپ ﷺ کو علم غیب حاصل ہوتا تو نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ وحی والہام کی راہنمائی کے بغیر از خود اس وصف پر قادر ہوتے بلکہ یہ وصف آپ ﷺ کو ہمیشہ ہمیشہ حاصل ہوتا چنانچہ اس کی تائید خود ایک روایت سے ہوتی ہے کہ:

"غزوہ تبوک کے موقعہ پر آنحضرت ﷺ کی اونٹنی کہیں غائب ہوگئی، جب بہت زیادہ تلاش کے بعد بھی اس کا کہیں پتہ نہ چلا تو منافقین نے کہنا شروع کیا کہ محمد (ﷺ) تو یہ کہتے ہیں کہ میں آسمان کی باتیں تم تک پہنچاتا ہوں تو کیا وہ اتنا بھی نہیں جان سکتے کہ ان کی اونٹنی کہاں

ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "خدا کی قسم! میں تو صرف انہیں چیزوں کو جان سکتا ہوں جن کے بارہ میں میرا خدا مجھے علم دے! اور اب میرے خدا نے مجھے (بتادیا اور) دکھادیا ہے کہ میری اونٹنی فلاں جگہ ہے اور اس کی مہار ایک درخت کی شاخ میں اٹکی ہوئی ہے۔"

اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ "میں انسان ہوں، میں تو (اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر) یہ بھی نہیں جانتا کہ اس دیوار کے پیچھے کیا ہے؟۔

شیخ سعدیؒ نے اس حقیقت کی ترجمانی اس طرح کی ہے ۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

بہر حال۔ آنحضرت ﷺ کی حالت نماز آپ ﷺ کی دوسری حالتوں کے مقابلہ میں زیادہ افضل و اعلیٰ ہوتی تھی اس لئے دوسرے مواقع کی بہ نسبت آپ ﷺ پر حالت نماز میں کائنات کی چیزوں کی حقیقت و معرفت کامل طور پر واضح و ظاہر ہوتی تھی۔ پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ کا نماز میں خدا کے سامنے حاضر ہونا اور متوجہ الی اللہ ہونے کے یہ معنی نہیں تھے کہ آپ ﷺ کائنات سے بیخبر ہو جاتے تھے بلکہ نماز کی حالت میں آپ ﷺ اشیاء کائنات سے پوری پوری طرح باخبر رہتے تھے اور آپ ﷺ کا احساس و شعور پوری قوت سے اشیاء عالم کا ادراک کرتا تھا، چنانچہ خدا کے وہ نیک و فرمانبردار بندے بھی جو ریاضت و مجاہدہ اور تعلق مع اللہ کی بناء پر کاملین کے درجہ میں ہوتے ہیں حالت نماز میں کائنات کی اشیاء سے باخبر رہتے ہیں۔ اگر ایک طرف ان کے قلوب بارگاہ خداوندی میں پوری طرح حاضر رہتے ہیں تو دوسری طرف ان کے احساس و شعور دنیا کی چیزوں سے بھی مطلع رہتے ہیں اسی وجہ سے مشائخ کہتے ہیں کہ نماز مقام کشف و حضور ہے نہ محل غیبت اور استغراق!۔

بعض حضرات نے ان تمام مباحث سے ہٹ کر یہ بھی کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان دو سوراخ تھے جن کے ذریعہ آپ ﷺ پیچھے کی جانب دیکھتے تھے۔ یہ روایت صحیح نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی ثبوت ہے بلکہ کسی ذہن کی افتراع محض ہے۔

بَابُ مَا يَقْرَأُ بَعْدَ التَّكْبِيْرِ

تکبیر تحریمہ کے بعد پڑھی جانے والی چیزوں کا بیان

نماز کے شروع میں جن دعاؤں اور اذکار کا پڑھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے مثلاً انی وجہت الخ یا سبحانک اللھم الخ یا ان کے علاوہ دیگر دعائیں ان سب کو یا بعض کو فرائض و نوافل میں پڑھنا امام شافعی کے نزدیک مستحب ہے، امام اعظمؒ، امام مالکؒ، اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ صرف سبحانک اللھم الخ پڑھا جائے اور اس کے علاوہ جو دعائیں ثابت ہیں وہ سب نوافل پر محمول ہیں یعنی آنحضرت ﷺ ان دعاؤں کو نفلوں میں پڑھا کرتے تھے۔

حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک سبحانک اللھم الخ اور انی وجہت الخ دونوں دعاؤں کو پڑھنا چاہئے۔ امام طحاویؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے ان دونوں دعاؤں کی ترتیب میں نمازی کو اختیار ہے خواہ وہ پہلے سبحانک اللھم پڑھے یا انی وجہت کو پہلے پڑھ لے ویسے مشہور یہی ہے کہ انی وجہت، سبحانک اللھم کے بعد پڑھا جائے۔

تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان آنحضرت ﷺ کی دعا

① عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْكُتُ بَيْنَ التَّكْبِيْرِ وَبَيْنَ الْقِرَاءَةِ اِسْكَاتَةً فَقُلْتُ

بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِسْکَاتَکَ بَیْنَ التَّکْبِیْرِ وَبَیْنَ الْقِرَاءَۃِ مَا تَقُوْلُ قَالَ اَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰھُمَّ نَقِّنِیْ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِالْمَآءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان مکمل خاموشی اختیار کرتے تھے (یعنی باآواز بلند نہ پڑھتے تھے) چنانچہ میں نے (ایک دن) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپ (ﷺ) تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان خاموش رہتے ہوئے کیا پڑھا کرتے ہیں؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا "میں یہ (دعا) پڑھا کرتا ہوں۔ اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰھُمَّ نَقِّنِیْ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِالْمَآءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ "اے اللہ! مجھ میں اور میرے گناہوں میں اتنا بعد پیدا کر دے جیسا کہ تو نے مشرق و مغرب کے درمیان بعد پیدا کر رکھا ہے (یعنی میرے گناہوں کو کمال بخشش عطا کر) اے اللہ! مجھے گناہوں سے اس طرح پاک کر دے جیسے سفید کپڑے سے میل دور کیا جاتا ہے (یعنی مجھے گناہوں سے کمال پاکی عطا کر) اے اللہ! میرے گناہ پانی، برف اور اولوں سے دھو ڈال۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: دعا کے آخر جملہ (اے اللہ میرے گناہ پانی، برف اور اولوں سے دھو ڈال) سے یہ مراد ہے کہ الہ العالمین! میرے گناہوں کو اپنے فضل و کرم کے مختلف طریقوں سے بخش دے۔ "گویا یہاں بخشش میں مبالغہ مقصود ہے نہ کہ حقیقۃً ان چیزوں سے گناہوں کو دھونا۔"

آنحضرت ﷺ کس کس موقع پر کون کون سی دعائیں پڑھتے تھے

(۴) وَعَنْ عَلِیٍّؓ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ کَانَ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوۃَ کَبَّرَ ثُمَّ قَالَ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْمَلِکُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَنْتَ رَبِّیْ وَاَنَا عَبْدُکَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ جَمِیْعًا اِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ وَاھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَھْدِیْ لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَھَا لَا یَصْرِفُ عَنِّیْ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ وَالْخَیْرُ کُلُّہٗ فِیْ یَدَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ اَنَا بِکَ وَاِلَیْکَ تَبَارَکْتَ وَتَعَالَیْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ وَاِذَا رَکَعَ قَالَ اَللّٰھُمَّ لَکَ رَکَعْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَکَ سَمْعِیْ وَبَصَرِیْ وَمُخِّیْ وَعَظْمِیْ وَعَصَبِیْ فَاِذَا رَفَعَ رَاْسَہٗ قَالَ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدُ وَاِذَا سَجَدَ قَالَ اَللّٰھُمَّ لَکَ سَجَدْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ خَلَقَہٗ وَصَوَّرَہٗ وَشَقَّ سَمْعَہٗ وَبَصَرَہٗ تَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ثُمَّ یَکُوْنُ مِنْ اٰخِرِ مَا یَقُوْلُہٗ بَیْنَ التَّشَھُّدِ وَالتَّسْلِیْمِ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَسْرَفْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِلشَّافِعِیِّ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ وَالْمَھْدِیُّ مَنْ ھَدَیْتَ اَنَا بِکَ وَاِلَیْکَ لَا مَنْجَا مِنْکَ وَلَا مَلْجَاَ اِلَّا اِلَیْکَ تَبَارَکْتَ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ، جب نماز شروع کرتے تو (پہلے) تکبیر (تحریمہ) کہتے۔ پھر یہ دعا پڑھتے۔ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَنْتَ رَبِّيْ وَ اَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعًا اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ وَ اهْدِنِيْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّآ اَنْتَ وَ اصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا اِلَّآ اَنْتَ لَبَّيْكَ وَ سَعْدَيْكَ وَ الْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ وَ الشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ اَنَا بِكَ وَ اِلَيْكَ تَبَارَكْتَ وَ تَعَالَيْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَ اَتُوْبُ اِلَيْكَ

میں نے اپنا منہ اس ذات کی طرف متوجہ کیا جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے درحالیکہ میں حق کی طرف متوجہ ہونے والا اور دین باطل سے بیزار ہوں اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو شرک کرتے ہیں، میری نماز، میری عبادت میری زندگی اور میری موت خدا ہی کے لئے ہے جو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی کا مجھے حکم کیا گیا ہے اور میں مسلمانوں (یعنی فرمانبرداروں) میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو بادشاہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو ہی میرا رب ہے اور میں تیرا ہی بندہ ہوں، میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں (چونکہ تو نے فرمایا ہے کہ جو بندہ اپنے گناہوں کا اعتراف و اقرار کرتا ہوا میری بارگاہ میں آئے میں اسے بخش دوں گا) لہٰذا تو میرے تمام گناہوں کو بخش دے کیونکہ تیرے علاوہ اور کوئی گناہ نہیں بخش سکتا اور بہترین اخلاق کی طرف میری راہنمائی کر۔ کیونکہ بجز تیرے اور کوئی بہترین اخلاق کی طرف راہنمائی نہیں کر سکتا اور بدترین اخلاق کو مجھ سے دور کر دے کیونکہ بجز تیرے اور کوئی بد اخلاقی سے مجھے نہیں بچا سکتا۔ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں اور تیرا حکم بجالانے پر تیار ہوں۔ تمام بھلائیاں تیرے ہاتھ میں ہیں اور برائی تیری جانب منسوب نہیں کی جاتی، میں تیرے ہی سبب سے ہوں اور تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں تو بابرکت ہے اور اس بات سے بلند ہے (کہ تیری ذات وصفات کی حقیقت وکنہ تک کسی عقل کی رسائی ہو سکے) میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تیرے ہی سامنے توبہ کرتا ہوں۔" اور جب آپ ﷺ رکوع میں جاتے تو یہ (دعا) پڑھتے۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَ بِكَ اٰمَنْتُ وَ لَكَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِيْ وَ بَصَرِيْ وَ مُخِّيْ وَ عَظْمِيْ وَ عَصَبِيْ "اے اللہ! میں نے تیرے ہی لئے رکوع کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور تیرے ہی لئے اسلام لایا اور میری سماعت، میری بینائی، میرا ذہن میری ہڈی اور میرے پٹھے تیرے ہی لئے جھکے ہوئے ہیں۔" اور جب (رکوع سے) سر اٹھاتے تو یہ (دعا) پڑھتے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْاَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مِلْاَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْئٍ بَعْدُ "اے اللہ! اے ہمارے رب! تیرے ہی لئے حمد ہے آسمانوں اور زمینوں کے برابر اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کے برابر اور اس چیز کے برابر جو بعد کو تو پیدا کرے یعنی آسمانوں اور زمین وغیرہ کے بعد اور جو معدوم چیزیں پیدا کرنا چاہے۔" اور جب سجدہ میں جاتے تو یہ (دعا) پڑھتے۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ وَ بِكَ اٰمَنْتُ وَ لَكَ اَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَ صَوَّرَهٗ وَ شَقَّ سَمْعَهٗ وَ بَصَرَهٗ تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ "اے اللہ! میں نے تیرے لئے سجدہ کیا، تجھ پر ایمان لایا اور تیرے ہی لئے اسلام سے بہرہ ور ہوا، میرے منہ نے اسی ذات کو سجدہ کیا جس نے اس کو پیدا کیا اس کو صورت دی، اس کے کان کھولے اور اس کی آنکھ کھولی۔ اللہ بہت بابرکت اور بہترین پیدا کرنے والا ہے۔" اور پھر سب سے آخری دعا جو التحیات اور سلام پھیرنے کے درمیان ہوتی یہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ مَا قَدَّمْتُ وَ مَا اَخَّرْتُ وَ مَا اَسْرَرْتُ وَ مَا اَعْلَنْتُ وَ مَا اَسْرَفْتُ وَ مَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَ اَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ "اے اللہ! میرے اگلے پچھلے تمام گناہ بخش دے اور ان گناہوں کو بخش دے جو میں نے پوشیدہ اور اعلانیہ کئے ہیں اور (اس) زیادتی کو بخش دے (جو میں نے اعمال اور مال خرچ کرنے میں کی ہیں) اور ان گناہوں کو بھی بخش دے جن کا علم مجھ سے زیادہ تجھ کو ہے اور تو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے عزت و مرتبہ میں آگے کرنے والا اور جس کو چاہے پیچھے ڈالنے والا ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔" (مسلمؒ) اور امام شافعی کی روایت میں (پہلی دعا میں فی یدیک) کے بعد یہ الفاظ ہیں۔ وَ الشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ وَ الْمَهْدِيُّ مَنْ هَدَيْتَ اَنَا بِكَ وَ اِلَيْكَ لَا مَنْجَا مِنْكَ وَ لَا مَلْجَاَ اِلَّا اِلَيْكَ تَبَارَكْتَ "یعنی برائی تیری طرف منسوب نہیں ہے اور ہدایت یافتہ وہی ہے جس کو تو نے ہدایت بخشی اور میں تیری ہی قوت کے ذریعہ ہوں اور تیری طرف رجوع کرنے والا ہوں۔ نہیں ہے نجات (اور بے پروائی) تیری ذات سے اور نہیں ہے پناہ مگر تیری طرف اور تو ہی بابرکت ہے۔"

تشریح : وَالشَّرُّ لَیْسَ..... اِلَیْكَ (یعنی برائی تیری طرف منسوب نہیں ہے) کا مطلب یہ ہے کہ از راہ ادب و تعظیم برائی کی نسبت تیری طرف نہیں کی جاتی اگرچہ برائی و بھلائی کا خالق تو ہی ہے اگر تو نے ایک طرف بھلائی کو پیدا کیا ہے تو دوسری طرف برائی کی بھی تخلیق کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے برائی کو پیدا کیا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔ اگر کوئی قباحت و برائی ہے تو وہ بندہ کے ارتکاب میں ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ یعنی میں مخلوق کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْكَ کے معنی یہ ہیں کہ برائی وہ چیز ہے جو تیرے تقرب اور تیری خوشنودی کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے۔ یا یہ کہ برائی تیری طرف صعود نہیں کرتی یعنی تیری بارگاہ میں قبول نہیں ہوتی۔ جیسا کہ بھلائی کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ یعنی (اس پروردگار) کی طرف نیک و پاکیزہ باتیں صعود کرتی ہیں یعنی مقبولیت کا درجہ پاتی ہیں)۔

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا جَاءَ فَدَخَلَ الصَّفَّ وَقَدْ حَفَزَهُ النَّفَسُ فَقَالَ اَللّٰهُ اَکْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُبَارَکًا فِیْهِ فَلَمَّا قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلَاتَهٗ قَالَ اَیُّکُمُ الْمُتَکَلِّمُ بِالْکَلِمَاتِ فَاَرَمَّ الْقَوْمُ فَقَالَ اَیُّکُمُ الْمُتَکَلِّمُ بِالْکَلِمَاتِ فَاَرَمَّ الْقَوْمُ فَقَالَ اَیُّکُمُ الْمُتَکَلِّمُ بِهَا فَاِنَّهٗ لَمْ یَقُلْ بَاْسًا فَقَالَ رَجُلٌ جِئْتُ وَقَدْ حَفَزَنِیَ النَّفَسُ فَقُلْتُهَا فَقَالَ لَقَدْ رَاَیْتُ اثْنَیْ عَشَرَ مَلَکًا یَبْتَدِرُوْنَهَا اَیُّهُمْ یَرْفَعُهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) ایک شخص آیا اور نماز کی صف میں شامل ہو گیا۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا اس نے کہا اللّٰہ اکبر، الحمد للّٰہ حمدًا طیبًا مبارکًا فیه (یعنی اللہ بہت بڑا ہے تمام تعریفیں خدا ہی کے لئے ہیں ایسی تعریفیں جو بہت زیادہ پاکیزہ اور بابرکت ہیں) جب آنحضرت ﷺ نماز پڑھ چکے تو پوچھا کہ تم میں سے یہ کلمات کس نے کہے تھے؟ سب لوگ (جو نماز میں حاضر تھے اس خوف سے کہ شاید ہم سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ناراضگی کا اظہار ہے) خاموش رہے، آپ نے پھر فرمایا کہ تم میں سے کس نے یہ کلمات کہے تھے؟ پھر بھی کسی نے جواب نہیں دیا، آپ ﷺ نے پھر (تیسری مرتبہ) فرمایا کہ، تم میں سے کس نے یہ کلمات کہے تھے (اور خوف نہ کرو کیونکہ) جس نے یہ کلمات کہے ہیں اس نے کوئی بری بات نہیں کہی ہے۔ "ایک شخص نے عرض کیا" یا رسول اللہ! جب میں آیا تو میرا سانس چڑھا ہوا تھا میں نے ہی یہ کلمات کہے تھے۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے دیکھا کہ بارہ فرشتے جلدی کر رہے تھے کہ ان کلموں کو (پروردگار کی بارگاہ میں) پہلے کون لے جائے۔" (مسلم)

تشریح : اس شخص نے آنحضرت ﷺ کے استفسار پر جو یہ کہا کہ جب میں آیا تو میرا سانس چڑھا ہوا تھا اور میں نے یہ کلمات کہے تھے تو اس کا یہ کہنا بیان حقیقت اور اظہار واقعہ کے طور پر تھا۔ ان کلمات کے کہنے کے سلسلہ میں کسی عذر کا بیان کرنا مقصود نہیں تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

تکبیر تحریمہ کے بعد کی دعا

(۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ قَالَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰی جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ لَا نَعْرِفُهٗ اِلَّا مِنْ حَارِثَةَ وَقَدْ تُکُلِّمَ فِیْهِ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهٖ۔

"حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب نماز شروع کرتے تو (تکبیر تحریمہ کے بعد) یہ پڑھا کرتے تھے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰی جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُكَ اے اللہ تو پاک ہے اور ہم تیری پاکی تیری تعریف کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

تیرا نام بابرکت ہے، تیری شان بلند و برتر ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ یہ حدیث ترمذیؒ اور ابوداؤد نے نقل کی ہے نیز ابن ماجہؒ نے (بھی) اس روایت کو ابوسعید سے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو ہم سوائے (بواسطہ) حارثہ راوی کے نہیں جانتے اور اس میں قوت حافظہ کے فقدان کی وجہ سے کلام کیا گیا ہے۔"

تشریح: علامہ طیبی شافعیؒ نے اس حدیث کے بارہ میں کہا ہے کہ یہ حدیث حسن مشہور ہے اور اس حدیث پر خلفائے راشدین میں سے حضرت عمر فاروقؓ نے عمل کیا ہے نیز یہ حدیث مسلم میں بھی منقول ہے۔ اس موقعہ پر علامہ موصوف نے اس حدیث کی تقویت کے بارہ میں بہت لمبی چوڑی بحث کی ہے جسے اہل علم و نظر ان کی کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔

۵ وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّهُ رَأَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي صَلَاةً قَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ثَلَاثًا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ نَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ وَهَمْزِهٖ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَذَكَرَ فِيْ اٰخِرِهٖ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ وَقَالَ عُمَرُ نَفْخُهُ الْكِبْرُ وَنَفْثُهُ الشِّعْرُ وَهَمْزُهُ الْمُوْتَةُ۔

"اور حضرت جبیر ابن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے چنانچہ آپ (تکبیر تحریمہ کے بعد، کہتے تھے اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (یعنی اللہ بہت بڑا و برتر ہے، اللہ بہت بڑا و برتر ہے، اللہ بہت بڑا و برتر ہے، اللہ کے واسطے بہت تعریف ہے۔ اللہ کے واسطے بہت تعریف ہے اور پاکی بیان کرتا ہوں اللہ کی صبح و شام، تین مرتبہ یعنی پہلے کلمات کی طرح وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا کو بھی تین مرتبہ کہتے تھے اور پھر اس کے بعد یہ کہتے تھے) اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ نَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ وَهَمْزِهٖ (یعنی میں شیطان کے تکبر، اس کے شعروں اور اس کے وسوسوں سے پناہ مانگتا ہوں، اس حدیث کو ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے البتہ ابن ماجہ نے وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا ذکر نہیں کیا ہے اور آخر میں مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ذکر کیا ہے۔

نیز حضرت ابن عمرؓ فرماتے تھے کہ شیطان کے نفخ سے تکبر، اس کے نفث سے شعر اور اس کے ہمز سے جنون مراد ہے۔"

تشریح: "نفخ شیطان" سے مراد تکبر و خود پسندی ہے جس میں شیطان آدمی کو اس طرح پھنساتا ہے کہ اس کو خود اس کی نظر میں اس حیثیت سے دکھاتا ہے کہ وہ آدمی اپنے آپ کو اچھا اور اعلیٰ سمجھ کر تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اس طرح شیطان آدمی سے تکبر کا ارتکاب کراتا ہے۔ گویا نفخ شیطان کا مطلب یہ ہوا کہ شیطان آدمی میں تکبر کی لہر پھونک دیتا ہے۔

نفث سے جس کے معنی دم کرنے یعنی پھونکنے کے ہیں سحر مراد لیا گیا ہے جو شیطان آدمی پر کرتا ہے یا آدمی سے کسی دوسرے پہ کراتا ہے یہ معنی ارشاد ربانی وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ کی مناسبت سے زیادہ اولیٰ ہے کیونکہ اس آیت کریمہ میں نَفّٰثٰتِ سے مراد سحر کرنے والی عورتیں ہیں۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ "نفثت" سے مراد غیر سنجیدہ اور برے مضمون کے اشعار ہیں جنہیں شیطان آدمی کے تخیل میں ڈالتا ہے اور پھر انہیں اس کی زبان سے صادر کراتا ہے جیسے برے منتر یا وہ غلط اشعار جن میں مسلمانوں کی ہجو اور کفر و فسق کے الفاظ ہوتے ہیں۔

"ہمز" سے مراد غیبت کرنا اور لعن و طعن کرنا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ہمز شیطان سے اس کا وسوسہ مراد ہے جیسا کہ اس آیت اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ میں ہمزات سے مراد شیطان کے وسوسے لئے گئے ہیں۔

بہر حال یہ معانی اسی وقت مراد لئے جائیں گے جب کہ یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث میں حضرت عمرؓ سے ان تینوں الفاظ کی جو توضیح نقل کی گئی ہے وہ حضرت عمرؓ کا قول نہیں ہے بلکہ کسی راوی کا ہے۔ اگر یہ توضیح صحیح طور پر حضرت عمرؓ سے ثابت ہو تو پھر وہی معنی مراد ہوں گے جو حضرت عمرؓ سے منقول ہیں ان کے علاوہ دوسرے معنی مراد نہیں لئے جائیں گے۔

آنحضرت ﷺ نماز میں دو جگہ خاموشی اختیار کرتے تھے

(۶) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّهُ حَفِظَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَكْتَتَيْنِ سَكْتَةً اِذَا كَبَّرَ وَسَكْتَةً اِذَا فَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ فَصَدَّقَهُ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ۔ (رواہ ابوداؤد وروی الترمذی وابن ماجۃ والدارمی نحوہ)

"اور حضرت سمرۃ ابن جندبؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آقائے نامدار ﷺ سے دو سکتے (یعنی چپ رہنا) یاد رکھے ہیں۔ ایک سکتہ تو تکبیر تحریمہ کہہ لینے کے بعد اور ایک سکتہ آپ ﷺ اس وقت کرتے تھے جب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ پڑھ کر فارغ ہوتے تھے۔ "حضرت ابی ابن کعبؓ نے (بھی سمرہ کے) اس قول کی تصدیق کی ہے۔" (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: تکبیر تحریمہ کے بعد خاموشی اختیار کرنے سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ اس وقت باآواز بلند نہیں پڑھتے تھے چنانچہ اس موقعہ پر دعائے استفتاح (یعنی سبحانک اللھم الخ) پڑھنے کے لئے خاموشی اختیار کرنا تمام آئمہ کے نزدیک متفق علیہ مسئلہ ہے۔ دوسری جگہ یعنی سورۂ فاتحہ ختم کرنے کے بعد خاموشی اختیار کرنا حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک سُنّت ہے تاکہ مقتدی اس عرصہ میں سورۂ فاتحہ پڑھ لیں اور امام کے ساتھ منازعت لازم نہ آئے جو ممنوع ہے حنفیہ اور مالکیہ مسلک میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد خاموشی اختیار کرنا مکروہ ہے۔

(۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَهَضَ مِنَ الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ اسْتَفْتَحَ الْقِرَاءَةَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَلَمْ يَسْكُتْ هٰكَذَا فِيْ صَحِيْحِ مُسْلِمٍ وَ ذَكَرَهُ الْحُمَيْدِيُّ فِيْ اَفْرَادِهِ وَكَذَا صَاحِبُ الْجَامِعِ عَنْ مُسْلِمٍ وَحْدَهُ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب دوسری رکعت پڑھنے کے بعد اٹھتے تو الحمد للہ رب العالمین شروع کر دیتے تھے اور خاموش نہ رہتے تھے۔ (مسلم) اس روایت کو حمیدی نے اپنی کتاب افراد میں ذکر کیا ہے۔ نیز صاحب جامع الاصول نے بھی اس روایت کو مسلمؒ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: چونکہ یہ وہم ہوسکتا تھا کہ دوسری رکعت کے بعد دوسرا شفعہ شروع ہونے کے وقت شاید سبحانک اللھم پڑھنے کے لئے خاموشی اختیار کرتے ہوں اس لئے حضرت ابوہریرہؓ نے اس کی وضاحت کردی کہ جب آپ ﷺ دوسری رکعت کے بعد دوسرے شفعہ کے لئے اٹھتے تھے تو سبحانک اللھم نہیں پڑھتے تھے بلکہ الحمد للہ رب العالمین شروع کر دیتے تھے۔ یہ بھی محتمل ہے کہ اس کے معنی یہ ہوں کہ جب آپ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے تھے الحمد للہ رب العالمین شروع کر دیتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

تکبیر تحریمہ کے بعد کی دعا

(۸) عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَفْتَحَ الصَّلَاةَ كَبَّرَ ثُمَّ قَالَ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ لِاَحْسَنِ الْاَعْمَالِ وَاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَقِنِيْ سَيِّئَ الْاَعْمَالِ وَسَيِّئَ الْاَخْلَاقِ لَا يَقِيْ سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب نماز شروع کرتے تو (پہلے) تکبیر تحریمہ (یعنی اللہ اکبر) کہتے پھر یہ دعا پڑھتے اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ لِاَحْسَنِ الْاَعْمَالِ وَاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَقِنِيْ سَيِّئَ الْاَعْمَالِ وَسَيِّئَ الْاَخْلَاقِ لَا يَقِيْ سَيِّئَهَا اِلَّا

اَنْتَ میری نماز میری عبادت میری زندگی اور میری موت (سب کچھ) پروردگار عالم ہی کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان (یعنی فرمانبردار) ہوں۔ اے اللہ! نیک اعمال اور حسن اخلاق کی طرف میری راہنمائی کر کیونکہ بہترین اعمال و اخلاق کی طرف تو ہی راہنمائی کر سکتا ہے اور مجھے برے اعمال و بد اخلاقی سے بچا کیونکہ برے اعمال و اخلاق سے تو ہی بچا سکتا ہے۔" (نسائیؒ)

تشریح: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (یعنی میں سب سے پہلا مسلمان ہوں) کی تشریح میں علماء لکھتے ہیں کہ یہ خصوصیت صرف آنحضرت ﷺ کو ہی حاصل ہے کہ سب سے پہلا اسلام آپ ﷺ کا ہے کیونکہ پیغمبر اپنی اُمت میں سب سے پہلا مسلمان ہوتا ہے چونکہ قرآن میں آنحضرت ﷺ کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ اس طرح کہیں اس لئے آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے یہ بات کہ وہ انا اول المسلمین کہے درست نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا جھوٹ ہوگا، چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز میں اس طرح کہے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ لیکن اس سلسلہ میں صحیح یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان الفاظ کو آیت قرآنی کی تلاوت کی نیت سے، نہ کہ اپنی حالت کی خبر دینے کی نیت سے ادا کرے تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔

اس مسئلہ میں ایک خیال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس جملہ کو "خبر" قرار نہ دے بلکہ اس کا مقصد تجدید ایمان و اسلام کی انشاء اور اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسا کہ امراء و سلاطین کے تابعدار لوگ کسی حکم کے صادر ہونے کے وقت کہتے ہیں کہ "جو بھی حکم ہو اس کی اطاعت پہلے جو کرے گا وہ میں ہوں گا۔" گویا اس طرح اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

(۹) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مَسْلِمَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ يُصَلِّيْ تَطَوُّعًا قَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَذَكَرَ الْحَدِيْثَ مِثْلَ حَدِيْثِ جَابِرٍ اِلَّا اَنَّهُ قَالَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ ثُمَّ يَقْرَأُ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت محمد بن مسلمہؓ کہتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب نماز نفل پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو یہ کہتے اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اللہ بہت بڑا ہے۔ میں نے اپنا منہ اس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے درحالیکہ میں توحید کرنے والا ہوں اور مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ (اس کے بعد راوی نے حضرت جابرؓ (کی مذکورہ بالا حدیث) کی مانند حدیث بیان کی ہے لیکن محمدؓ نے (وانا اول المسلمین کی جگہ) وانا من المسلمین کے الفاظ ذکر کئے ہیں۔ پھر اس کے بعد آنحضرت ﷺ یہ کہتے ہیں اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ اے اللہ! تو ہی بادشاہ ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے اور تیرے ہی لئے تعریف ہے۔ اس کے بعد (اعوذ و بسملہ پڑھ کر) قرأت کرتے تھے۔" (نسائی)

بَابُ الْقِرَاءَةِ فِي الصَّلٰوةِ

نماز میں قراءت کا بیان

کتنی رکعتوں میں قراءت فرض ہے: نماز میں قراءت یعنی قرآن کریم پڑھنا تمام علماء کے نزدیک متفقہ طور پر فرض ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کتنی رکعتوں میں پڑھنا فرض ہے؟ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک پوری نماز میں قراءت فرض ہے۔ حضرت امام مالکؒ کے ہاں للاکثر حکم الکل (اکثر کل کے حکم میں ہے) کے کلیہ کے مطابق تین رکعت میں فرض ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق دو رکعتوں میں قراءت فرض ہے۔ حضرت امام احمدؒ کا مسلک قول مشہور ہے کے مطابق امام شافعیؒ کے مسلک کے

موافق ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور حضرت زفرؒ کے نزدیک صرف ایک رکعت میں قراءت فرض ہے۔

نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا بیان

① عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتٰبِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْاٰنِ فَصَاعِدًا)

"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے (نماز میں) سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز پوری نہیں ہوئی۔" (بخاریؒ، مسلمؒ) "اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ اور اس کے بعد قرآن سے کچھ نہ پڑھے۔"

تشریح: مسلمؒ کی آخری روایت کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کے ساتھ قرآن کی کوئی اور سورۃ یا اور کچھ آیتیں پڑھنا بھی ضروری ہے

نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ میں ائمہ کے مسلک: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اگر کوئی شخص سورہ فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ چنانچہ اسی حدیث سے امام شافعیؒ نے اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا فرض ہے کیونکہ حدیث نے صراحت کے ساتھ ایسے شخص کی نماز کی نفی کی ہے جس نے نماز میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔

حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں ہے بلکہ واجب ہے۔ اس حدیث کے بارہ میں امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہاں نفی کمال مراد ہے یعنی بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز ادا تو ہو جاتی ہیں مگر مکمل طور پر ادا نہیں ہوتی۔ اس کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (یعنی قرآن میں سے جو پڑھنا آسان ہو وہ پڑھو، اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں بلکہ مطلق قرآن کی کوئی بھی سورۃ یا آیتیں پڑھنا فرض ہے۔ اس کے علاوہ خود آنحضرت ﷺ نے بھی ایک اعرابی کی نماز کے سلسلہ میں یہ تعلیم فرمائی تھی کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (یعنی تمہارے لئے قرآن میں سے جو کچھ پڑھنا آسان ہو وہ پڑھو)

بہرحال۔ حنفیہ مسلک کے مطابق نماز میں فرض کہ جس کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی قرآن کی ایک آیت یا تین آیتوں کا پڑھنا ہے خواہ سورہ فاتحہ ہو یا دوسری کوئی سورۃ و آیت اور سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے اس کے بغیر نماز ناقص ادا ہوتی ہے۔

سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے سے نماز ناقص ادا ہوتی ہے

② وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيْهَا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ فَهِيَ خِدَاجٌ ثَلَاثًا غَيْرُ تَمَامٍ فَقِيْلَ لِاَبِيْ هُرَيْرَةَ اِنَّا نَكُوْنُ وَرَآءَ الْاِمَامِ قَالَ اقْرَأْ بِهَا فِيْ نَفْسِكَ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ وَلِعَبْدِيْ مَا سَاَلَ فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ وَاِذَا قَالَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِيْ وَاِذَا قَالَ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ قَالَ مَجَّدَنِيْ عَبْدِيْ ——— وَاِذَا قَالَ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ قَالَ هٰذَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَاَلَ فَاِذَا قَالَ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ قَالَ هٰذَا لِعَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَاَلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا "جو شخص نماز پڑھے اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی وہ نماز ناقص

ہے (آپ ﷺ نے یہ) تین مرتبہ (فرمایا کہ وہ نماز ناقص ہے) حضرت ابوہریرہؓ سے (یہ سن کر) کسی نے پوچھا کہ جب ہم امام کے پیچھے ہوں (تو اس وقت بھی پڑھیں؟) انھوں نے کہا کہ (ہاں اگر) اپنے دل میں آہستہ سے پڑھو کہ بس تم ہی سن سکو اس لئے کہ میں آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اللہ بزرگ و برتر فرماتا ہے کہ میں نے نماز (یعنی سورۂ فاتحہ) اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کی ہے۔ (اس طرح کہ حمد و ثنا تو میرے لئے ہے اور دعا بندے کے لئے) اور بندہ جو کچھ مانگے وہ اسے دیا جائے گا چنانچہ جب بندہ کہتا ہے کہ "الحمدللّٰہ رب العالمین" (یعنی تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہاں کا پروردگار ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ میرے بندہ نے میری تعریف بیان کی، جب بندہ کہتا ہے الرحمٰن الرحیم (یعنی اللہ بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہے "میرے بندہ نے میری ثنا بیان کی، جب بندہ کہتا ہے مٰلک یوم الدین یعنی (اللہ) انصاف (قیامت) کے دن کا حاکم ہے۔ تو پروردگار فرماتا ہے میرے بندہ نے میری تعظیم کا اظہار کیا ہے جب بندہ کہتا ہے ایاک نعبد و ایاک نستعین یعنی (اے پروردگار!) ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے (یعنی عبادت اللہ کے لئے ہیں اور مدد مانگنا بندہ کے لئے ہے) اور میرا بندہ جو مانگے گا وہ اسے ملے گا۔ جب بندہ کہتا ہے اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم و لا الضالین یعنی (اے پروردگا) ہم کو سیدھے راستہ پر چلا ان لوگوں کے راستے جن پر تیرا فضل و کرم رہا ہے نہ کہ ان کے راستے جن پر تیرا غضب رہا ہے اور نہ گمراہوں کے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یہ میرے بندہ کے لئے ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے اور بندہ جو مانگے گا وہ اسے ملے گا۔" (مسلم)

تشریح: قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین (میں نے نماز اپنے اور بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کی ہے) میں نے نماز سے مراد سورہ فاتحہ ہے جیسے کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے مقتدی کو بھی سورۂ فاتحہ پڑھنے کے لئے کہا اور مابعد کی حدیث سے استدلال کیا کہ جب سورۂ فاتحہ ایسی فضیلت ہے تو مقتدی کو بھی سورہ فاتحہ پڑھنا چاہئے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں۔ تین آیتیں یعنی الحمد سے مٰلک یوم الدین تک تو خالص اللہ تعالےٰ کی مدح و ثنا میں ہیں اور ایک آیت یعنی ایاک نعبد و ایاک نستعین خدا اور بندہ کے درمیان مشترک ہے کہ آدھی آیت یعنی ایاک نعبد میں خدا کی عبادت و بندگی کا قرار ہے اور آدھی آیت یعنی و ایاک نستعین میں بندہ کی جانب سے حاجت کی طلب اور مدد کی درخواست ہے اور بعد کی جو تین آیتیں ہیں صرف بندہ کی دعا پر مشتمل ہیں۔

بسم اللہ سورہ فاتحہ کا جزء نہیں ہے:

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بسملہ (یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) داخل فاتحہ اور اس کا جزء نہیں ہے جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے کیونکہ اگر بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزء قرار دے کر بجائے سات کے آٹھ آیتیں شمار کی جائیں تو تقسیم صحیح نہیں ہوگی اور ایک طرف تو ساڑھے چار آیتیں ہو جائیں گی اور ایک طرف ساڑھے تین رہ جائیں گی لہٰذا اس صورت میں نصف نصف تقسیم صحیح نہیں رہے گی۔ نیز یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ سورہ فاتحہ کی سات آیتوں میں سے "صراط الذین انعمت علیھم" بھی ایک آیت ہے۔

سورہ فاتحہ کے سلسلہ میں اس باب کی پہلی حدیث کی تشریح کے ضمن میں آئمہ کے مذاہب کو نقل کیا گیا تھا اور حنفی مسلک کی وضاحت کی گئی تھی لیکن اس موقعہ پر یہ بحث کچھ تشنہ رہ گئی تھی اس لئے ہم یہاں کچھ وضاحت کے ساتھ اس بحث کو پیش کرتے ہیں۔

مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں؟: سورۂ فاتحہ کے سلسلہ میں ائمہ کے یہاں دو بحثیں چلتی ہیں اول تو یہ کہ مطلقاً سورہ فاتحہ پڑھنا فرض ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس بحث کی توضیح پہلے کی جا چکی ہے کہ امام شافعی کے نزدیک سورہ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اور امام اعظمؒ کے

نزدیک واجب ہے۔ دوسری بحث یہ ہے کہ سورہ فاتحہ مقتدی کو پڑھنی چاہئے یا نہیں؟

حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول سے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنا چاہئے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ سے صحیح روایت میں منقول ہے کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے خواہ بلند آواز کی نماز ہو یا آہستہ آواز کی۔ اور یہی حضرت امام احمدؒ کا بھی مسلک ہے، امام مالکؒ کے نزدیک فرض نہیں مگر آہستہ آواز کی نماز میں مستحب ہے ہمارے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسف و امام محمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ آہستہ آواز اور بلند آواز دونوں قسم کی نمازوں میں سورہ فاتحہ پڑھنا مقتدی پر فرض نہیں ہے بلکہ حنفی فقہاء تو اس کو مکروہ تحریمی لکھتے ہیں۔

امام محمدؒ کے مسلک کی تحقیق: ابھی ہم نے اوپر لکھا ہے کہ حضرت امام اعظمؒ اور صاحبین کا متفقہ طور پر یہ مسلک ہے کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھا فرض نہیں ہے مگر اس سلسلہ میں کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے جس کی بنیاد پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام محمدؒ کا مسلک امام اعظمؒ اور امام ابویوسفؒ سے کچھ مختلف ہے چنانچہ ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں اور کچھ دوسرے علماء نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام محمدؒ اس کے قائل ہیں کہ آہستہ آواز کی نماز میں مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امام محمدؒ کی طرف اس قول کی نسبت کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کیونکہ امام محمدؒ کی کتابوں سے بالکل صاف طریقہ پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں شیخین یعنی امام اعظمؒ اور امام ابویوسفؒ سے بالکل متفق ہیں۔ چنانچہ امام محمدؒ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

لا قراَۃَ خلف الامام فیما جھر فیه ولا فیما لم یجھر بذٰلك جاءت عامة الاثار وھو قول ابی حنیفه رحمه اللّٰہ تعالٰی۔

"نماز خواہ بلند آواز کی ہو یا آہستہ آواز کی کسی حال میں بھی امام کے پیچھے قراءت نہیں ہے اسی کے مطابق ہمیں بہت سے احادیث پہنچی ہیں اور یہی قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے۔"

نیز امام موصوف نے اپنی دوسری تصنیف کتاب الاثار میں قراءت خلف الامام کے عدم اثبات میں احادیث و آثار کو نقل کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

وبه ناخذ لا نری القراءۃ خلف الامام شیء من الصلوۃ یجھر فیه او لا یجھر فیه۔

"اور یہی (یعنی عدم قراءت خلف الامام) ہمارا بھی مسلک ہے ہم قراءت خلف الامام کو کسی بھی نماز میں خواہ وہ بلند آواز کی نماز ہو یا آہستہ آواز کی نماز روا نہیں رکھتے۔"

بہرحال مذکورہ بالا مذہب کو دیکھتے ہو یہ بات ظاہر ہوئی کہ سورہ فاتحہ کے سلسلہ میں حنفیہ دو چیزوں کے قائل ہیں۔ اول تو یہ مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا کسی بھی حال میں فرض نہیں خواہ وہ نماز بلند آواز کی ہو یا آہستہ آواز کی اور دوسرے یہ کہ اگر کوئی مقتدی سورہ فاتحہ پڑھتا ہے تو گویا وہ مکروہ تحریمی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس موقعہ پر ہم صرف اتنی بات صاف کریں گے کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض کیوں نہیں ہے اور اس کے دلائل کیا ہیں۔

تو جاننا ہے کہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے ان کی سب سے بڑی دلیل اس باب کی پہلی حدیث ہے یعنی لا صلوۃ الا بفاتحة الکتاب ان حضرات کے نزدیک امام کا پڑھنا مقتدی کے حق میں کافی نہیں بلکہ ہر ایک شخص کو بطور خود پڑھنا ضروری ہے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ امام کا پڑھنا مقتدی کے لئے کافی ہے۔ جب امام نے پڑھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پوری جماعت نے پڑھا، چنانچہ وہ اپنے اس قول کی تائید میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں من کان له امام فقراءۃ الامام قراءۃ له (یعنی جو شخص کسی امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ تو اس امام کی قراءت اس (مقتدی) کی بھی قراءت سمجھی جائے گی) گو بعض علماء نے اگرچہ اس حدیث کی صحت میں کلام کیا ہے۔ مگر

حقیقت میں ان کا کلام صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث بہت سی اسناد سے ثابت ہے جن میں سے بعض اسناد تو اس درجہ کی صحیح و سالم ہیں کہ اس میں کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں۔

بہر حال اس حدیث سے یہ بات بصراحت ثابت ہوتی ہے کہ مقتدی کو قراءت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ تو سورہ فاتحہ کی اور نہ کسی اور سورۃ کی۔ اس موقع پر یہ احتمال بھی پیدا نہیں کیا جاسکتا کہ شاید اس حدیث کا تعلق بلند آواز کی نماز سے ہو کیونکہ یہ بات بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد عصر کی نماز کے وقت تھا۔ ، جو آہستہ آواز کی نماز ہے اور جب آہستہ آواز کی نماز میں یہ حکم ہے تو بلند آواز کی نماز میں تو بدرجہ اولی یہی حکم ہوگا۔

بسم اللہ باواز بلند پڑھنا چاہئے یا آہستہ

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبَا بَكْرٍ وَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانُوْا يَفْتَتِحُوْنَ الصَّلٰوةَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ آقاء نامدار ﷺ ، حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ نماز الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔" (مسلم)

تشریح: بظاہر تو اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز شروع کرتے وقت سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے لیکن سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنا تمام ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہے کیونکہ دوسری احادیث سے بسم اللہ کا پڑھنا ثابت ہوتا ہے خواہ بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کا جزء مانا جائے جیسا کہ شوافع کہتے ہیں خواہ نہ مانا جائے جیسا کہ حنفیہ کہتے ہیں۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں الحمد للہ رب العالمین سے مراد سورہ فاتحہ ہے یعنی آپ ﷺ سورہ فاتحہ سے نماز شروع کرتے تھے جیسا کہ یہ کہا جائے کہ فلاں شخص نے الم پڑھا تو اس سے مراد سورہ بقرہ ہی لی جاتی ہے اور یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک بسم اللہ سورۃ کا جزء ہے لہٰذا اس قول سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ آپ ﷺ بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔

حنفیہ کی جانب سے اس کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ یہاں مطلق نفی مراد نہیں ہے بلکہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ بسم اللہ باواز بلند نہیں پڑھتے تھے بلکہ آہستہ سے پڑھتے تھے اور باواز بلند نماز کی ابتداء الحمد للہ رب العالمین سے کرتے تھے کیونکہ یہ بات پوری صحت کی ساتھ ثابت ہو چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ ، خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بسم اللہ باواز بلند نہیں پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ باواز بلند پڑھی جانے والی نماز میں بھی آہستہ سے پڑھتے تھے۔

حضرت شیخ ابن ہمامؒ نے بعض حفاظ حدیث (یعنی وہ لوگ جن کو بہت زیادہ احادیث زبانی یاد رہتی تھیں) سے نقل کیا ہے کہ کوئی بھی ایسی حدیث ثابت نہیں ہے جس میں بسم اللہ کا باواز بلند پڑھنا بصراحت ثابت ہوتا ہو ہاں اگر کوئی ایسی حدیث ثابت بھی ہے کہ جس سے بسم اللہ باواز بلند پڑھنا ثابت ہوتا ہے تو اس کی اسناد میں کلام کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ صحابہ تابعین اور تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت سے بسم اللہ باواز آہستہ پڑھنا بکثرت منقول ہے اور اگر اتفاقی طور پر کسی کے بارہ میں باواز بلند پڑھنا ثابت ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو انہوں نے لوگوں کی تعلیم کے لئے بسم اللہ باواز بلند پڑھی ہوگی یا پھر یہ ان مقتدیوں کی روایت ہے جو ان کے بالکل قریب نماز میں کھڑے ہوتے تھے کہ اگر وہ، بسم اللہ آہستہ سے بھی پڑھتے تھے تو مقتدی سن لیتے تھے اور اسی کو انہوں نے باواز بلند پڑھنے سے تعبیر کیا۔

امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب جامع ترمذی میں اس مسئلہ سے متعلق دو باب قائم کئے ہیں ایک باب میں تو ان احادیث کو نقل کیا ہے جن سے بسم اللہ باواز بلند پڑھنا ثابت ہے اور دوسرے باب میں وہ احادیث نقل کی ہیں جو آہستہ آواز سے پڑھنے پر دلالت کرتی ہیں اور امام

موصوف نے ترجیح انہیں احادیث کو دی ہے جن سے باآواز آہستہ پڑھنا ثابت ہوتا ہے اور کہا ہے کہ اس طرف (یعنی بسم اللہ آہستہ پڑھنے کے مسلک کے حق میں) اکثر اہل علم مثلاً صحابہ میں سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور تابعین وغیرہ ہیں۔

آمین کہنے کا حکم

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَّنَ الْاِمَامُ فَاَمِّنُوْا فَاِنَّهُ مَنْ وَافَقَ تَامِيْنُهُ تَأْمِيْنَ الْمَلَائِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ قَالَ اِذَا قَالَ الْاِمَامُ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِيْنَ فَاِنَّهُ مَنْ وَافَقَ قَوْلُهُ قَوْلَ الْمَلَائِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِیِّ وَلِمُسْلِمٍ نَحْوُهُ وَفِیْ اُخْرٰى لِلْبُخَارِیِّ قَالَ اِذَا اَمَّنَ الْقَارِئُ فَاَمِّنُوْا فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ تُؤَمِّنُ فَمَنْ وَافَقَ تَامِيْنُهُ تَامِيْنَ الْمَلَائِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا" جب امام (سورہ فاتحہ کی قراءت کے بعد) آمین کہے تو (چونکہ اس وقت فرشتے آمین کہتے ہیں اس لئے) تم بھی آمین کہو۔ کیونکہ جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے سارے پچھلے گناہ بخش دیتا ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ) "ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا" جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو کیونکہ جس شخص کا (آمین) کہنا فرشتوں کے (آمین) کہنے سے مل جاتا ہے اس کے پہلے سارے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں مسلم کی حدیث کے الفاظ بھی اس کے مثل ہیں۔

اور بخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ " آپ نے فرمایا جب قرآن کا پڑھنے والا (یعنی) امام یا کوئی بھی مطلقاً پڑھنے والا آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ (اس وقت) فرشتے آمین کہتے ہیں اور جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو اس کے پہلے سارے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔"

تشریح: آمین کے معنی یہ ہیں کہ "اے اللہ! میری دعا قبول کر!" چنانچہ جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پڑھے تو مقتدیوں کو چاہئے کہ وہ آمین کہیں۔

آمین کہنے والے فرشتوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اعمال کو لکھتے ہیں لیکن بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ان کے علاوہ دوسرے فرشتے مراد ہیں۔

مقتدی کی نماز کا طریقہ

⑤ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَى الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّيْتُمْ فَاَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمْ اَحَدُكُمْ فَاِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَاِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِيْنَ يُجِبْكُمُ اللّٰهُ فَاِذَا كَبَّرَ وَرَكَعَ فَكَبِّرُوْا وَارْكَعُوْا فَاِنَّ الْاِمَامَ يَرْكَعُ قَبْلَكُمْ وَيَرْفَعُ قَبْلَكُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتِلْكَ بِتِلْكَ قَالَ وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ يَسْمَعُ اللّٰهُ لَكُمْ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَايَةٍ لَهٗ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ وَقَتَادَةَ وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا" جب تم (باجماعت) نماز پڑھو تو (پہلے) اپنی صفوں کو سیدھی کرو پھر (تم میں سے) ایک شخص تمہارا امام بنے، چنانچہ جب وہ امام تکبیر تحریمہ یعنی) اللہ اکبر کہے تو تم (بھی اللہ اکبر) کہو، جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول کرے گا اور جب امام (رکوع میں جانے کے لئے) اللہ اکبر کہے اور رکوع میں جائے تم بھی اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع میں چلے جاؤ اور امام تم سے پہلے رکوع کرتا ہے اور تم سے پہلے سر اٹھاتا ہے۔ چنانچہ

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ امام کا پہلے سر اٹھانا پہلے رکوع کرنے کا بدلہ ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا "جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللهم ربنا لک الحمد کہو خدا تمہاری تعریف سنتا ہے۔ اور مسلمؒ کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ "فتسلک بتلک" یعنی امام سے پہلے سر اٹھانا پہلے رکوع کرنے کا بدلہ ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ امام مقتدی سے پہلے رکوع سے سر اس لئے اٹھاتا ہے تاکہ امام اور مقتدی کے رکوع کی مقدار برابر ہو جائے۔ گویا آپ ﷺ کا یہ ارشاد واضح طور پر یوں ہے کہ "جب امام رکوع میں تم سے پہلے گیا تو گویا اس وقت تمہارے اور امام کی رکوع کی مقدار برابر نہ رہی مگر جب امام نے رکوع سے تم سے پہلے سر اٹھالیا اور تم نے اس کے بعد سر اٹھایا تو گویا تمہاری اس تاخیر سے وہ لمحہ پورا ہو گیا جس میں امام نے رکوع میں جانے میں تم سے پہل کی تھی اور جس طرح تم رکوع میں امام کے بعد گئے اسی طرح رکوع سے اٹھے بھی امام کے بعد ہی لہٰذا امام اور مقتدی دونوں کے رکوع کی مقدار پوری ہو گئی۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو مقتدی اللهم ربنا لک الحمد کہیں مگر ایک دوسری روایت میں ربنا ولک الحمد (واؤ کے ساتھ) کے الفاظ مروی ہیں۔ نیز ایک روایت میں اللهم ربنا ولک الحمد بھی مروی ہے۔

یہ حدیث حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اس مسئلہ میں مستدل ہے کہ امام رکوع سے اٹھتے ہوئے صرف سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور مقتدی ربنا لک الحمد کہیں حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک امام، مقتدی اور منفرد تینوں ہی کو یہ دونوں کلمات کہنے چاہئیں صاحبین سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے لیکن اس قید کے ساتھ کہ امام ربنا لک الحمد آہستہ آواز سے کہے۔

منفرد یعنی تنہا نماز پڑھنے والے شخص کے بارہ میں متفقہ طور پر یہ حکم ہے کہ وہ دونوں کلمات کہے اگرچہ صرف ایک پر اکتفا کرنا بھی جائز ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اکتفاء ربنا لک الحمد پر کیا جائے۔ دونوں کلمات کہنے کی صورت میں سمع اللہ اٹھتے ہوئے اور ربنا لک الحمد حالت قیام میں کہا جائے۔

حدیث کا آخری جملہ و اذاقرأ فانصتو (یعنی جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو) حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دلیل ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنا چاہئے قراءت نہ کرنی چاہئے خواہ نماز بلند آواز کی ہو یا آہستہ آواز کی۔

نماز میں قراءت کا طریقہ

⑥ وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ فِي الْاُوْلَيَيْنِ بِاُمِّ الْكِتَابِ وَسُوْرَتَيْنِ وَفِی الرَّكْعَتَيْنِ الْاُخْرَيَيْنِ بِاُمِّ الْكِتَابِ وَيُسْمِعُنَا الْاٰيَةَ اَحْيَانًا وَيُطَوِّلُ فِی الرَّكْعَةِ الْاُوْلٰى مَالَا يُطِيْلُ فِی الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ وَ هٰكَذَا فِی الْعَصْرِ وَهٰكَذَا فِی الصُّبْحِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ ظہر کی نماز میں پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور دو سورتیں (یعنی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ اور ایک سورۃ) پڑھتے تھے اور بعد کی دونوں رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پڑھتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں (بھی) کوئی آیت سنا دیا کرتے تھے اور دوسری رکعت کی بہ نسبت پہلی رکعت کو زیادہ طویل کرتے تھے اسی طرح عصر اور فجر کی نماز میں بھی کرتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ظہر کی نماز میں یوں تو قراءت سری (یعنی آہستہ آواز سے) سے ہوتی ہے اور اسی طرح آنحضرت ﷺ بھی پڑھتے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بسا اوقات ظہر کی نماز میں کوئی آیت یا سورۃ باآواز بلند بھی پڑھ دیا کرتے تھے اور اس سے آپ ﷺ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ لوگ جان لیں کہ سورہ فاتحہ کے بعد کوئی سورۃ یا کوئی آیت بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ یا لوگوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ آپ ﷺ فلاں

سورت کی قراءت کر رہے ہیں۔ اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ یہاں ظہر کی تخصیص تقیدی نہیں ہے بلکہ اتفاقی ہے۔ یعنی آپ ﷺ ہر نماز میں ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

پہلی رکعت کو طویل کرنے کا مسئلہ: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی رکعت کو دوسری رکعتوں سے زیادہ طویل کرنا چاہئے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہی ہے کہ تمام نمازوں میں پہلی رکعت کو دوسری رکعت کی بہ نسبت زیادہ طویل کرنا چاہئے۔ حنفیہ میں سے حضرت امام محمدؒ کا بھی مسلک یہی ہے، ان حضرات نے ظہر، عصر اور صبح کی نمازوں میں پہلی رکعت کو طویل کرنے کے مسئلہ کو احادیث سے ثابت کیا ہے اور مغرب و عشاء کو ان تینوں پر قیاس کیا ہے۔ عبدالرزاقؒ نے اس حدیث کے آخر میں معمرؒ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ "ہمارا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ پہلی رکعت کو اس لئے طویل کرتے تھے کہ لوگ پہلی رکعت پالیں، امام ابوداؤد اور ابن خزیمہؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک پہلی رکعت کو طویل کرنا صرف فجر کی نماز کے ساتھ خاص ہے کیونکہ یہ وقت نیند و غفلت کا ہوتا ہے۔ ورنہ تو دونوں رکعتیں چونکہ استحقاق قراءت میں برابر ہیں۔ اس لئے مقدار قراءت میں بھی برابر ہونی چاہئیں چنانچہ ایک حدیث میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر رکعت میں تیس آیتوں کی مقدار قراءت کیا کرتے تھے۔ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے کہ جس سے پہلی رکعت کو طویل کرنے کا اثبات ہوتا ہے تو یہ اس بات پر محمول ہے کہ چونکہ پہلی رکعت میں دعا کے استفتاح (یعنی سبحانک اللھم اور اعوذ باللہ و بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اس لئے پہلی رکعت طویل معلوم ہوتی تھی نیز یہ کہ طوالت تین آیتوں سے بھی کم کی مقدار میں ہوتی تھی۔

خلاصہ میں لکھا ہے کہ حضرت امام محمدؒ کا مسلک احب یعنی اچھا ہے۔

نماز میں آنحضرت ﷺ کے قیام کی مقدار

(۷) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کُنَّا نَحْزُرُ قِیَامَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فِی الظُّھْرِ وَالْعَصْرِ فَحَزَرْنَا قِیَامَہٗ فِی الرَّکْعَتَیْنِ الْاُوْلَیَیْنِ مِنَ الظُّھْرِ قَدْرَ قِرَاءَۃِ الٓمٓ تَنْزِیْلُ السَّجْدَۃِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فِیْ کُلِّ رَکْعَۃٍ قَدْرَ ثَلَاثِیْنَ اٰیَۃً وَحَزَرْنَا قِیَامَہٗ فِی الْاُخْرَیَیْنِ قَدْرَ النِّصْفِ مِنْ ذٰلِکَ وَحَزَرْنَا فِی الرَّکْعَتَیْنِ الْاُوْلَیَیْنِ مِنَ الْعَصْرِ عَلٰی قَدْرِ قِیَامِہٖ فِی الْاُخْرَیَیْنِ مِنَ الظُّھْرِ وَفِی الْاُخْرَیَیْنِ مِنَ الْعَصْرِ عَلَی النِّصْفِ مِنْ ذٰلِکَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم ظہر اور عصر کی نماز میں آقائے نامدار ﷺ کے قیام (کی مقدار) کا اندازہ کرتے، چنانچہ ہم نے اندازہ کیا کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں الم تنزیل السجدہ پڑھنے کے بقدر قیام کرتے تھے اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "ہر رکعت میں تیس آیتیں پڑھنے کے بقدر قیام کرتے تھے اور (ظہر کی) آخری دو رکعتوں میں ہم نے اس سے نصف کا اندازہ کیا۔ اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں ظہر کی آخری دونوں رکعتوں کی بقدر قیام کا اور عصر کی آخری دونوں رکعتوں میں اس کے نصف کی بقدر قیام کا ہم نے اندازہ کیا۔" (مسلم)

تشریح: الم تنزیل السجدہ کے بقدر کا مطلب یا تو یہ ہے کہ دونوں رکعتوں میں آپ ﷺ کے مجموعی قیام کی مقدار سورہ الم تنزیل السجدہ ہوتی تھی یا اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ ہر رکعت میں الم السجدہ پڑھنے کے بقدر قراءت کرتے تھے اس آخری مطلب کی تائید دوسری روایت بھی کرتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر رکعت میں تیس آیتوں کے بقدر قراءت کرتے تھے اور الم تنزیل السجدہ میں انتیس آیتیں ہیں، اگر پہلے مطلب کو صحیح مانا جائے تو یہ دوسری روایت کے خلاف ہو گا لہٰذا بہتر یہی ہو گا کہ یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ ہر رکعت میں سورہ الم تنزیل السجدہ کی بقدر قراءت کرتے تھے۔

آخری رکعتوں میں قراءت کا مسئلہ: حدیث کے ان الفاظ وحزرنا قیامہ فی الاخرین یعنی (ظہر) کی آخری دو رکعتوں میں اس سے نصف کا ہم نے اندازہ کیا۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ظہر کی آخری دونوں رکعتوں میں بھی سورہ فاتحہ کی ساتھ کوئی دوسری سورت جو پہلی دونوں رکعتوں کی سورتوں سے مختصر ہوتی تھی پڑھتے تھے چنانچہ امام شافعیؒ کا مسلک قول جدید کے مطابق یہی ہے لیکن ان کے یہاں فتوے ان کے قول قدیم پر ہے جو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق ہے کہ آخری دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورت پڑھنا ضروری نہیں ہے۔

لہٰذا اس حدیث کی تاویل یہ ہوگی کہ آنحضرت ﷺ کا یہ فعل سُنّت پر محمول نہیں بلکہ بیان جواز پر محمول ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ آخری دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کبھی کبھی کوئی اور سورہ بھی ملا کر قراءت کرتے تھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس طرح پڑھنا بھی جائز ہے لیکن اتنی بات جان لینی چاہئے کہ تمام ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ آخری دونوں رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پڑھنا ہی سُنّت ہے بلکہ حنفیہ کا کہنا تو یہ کہ اگر کوئی شخص سورہ فاتحہ بھی نہ پڑھے بلکہ صرف تسبیح (یعنی سبحان اللہ وغیرہ کہہ لے تو بھی جائز ہے لیکن قراءت افضل ہے، امام نخعیؒ، امام ثوریؒ اور کوفہ کے تمام علماء کا قول بھی یہی ہے۔

محیط میں یہ لکھا کہ اگر کوئی شخص آخری دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے بجائے قصداً سکوت اختیار کرے تو یہ خلاف سُنّت ہونے کی وجہ سے ایک غلط فعل ہوگا۔ حسن بن زیادؒ نے حضرت امام اعظمؒ کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ آخری دونوں رکعتوں میں قراءت کرنا واجب ہے۔ ابن شیبہ نے حضرت علیؓ اور حضرت مسعودؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ پہلی دونوں رکعتوں میں قراءت کرو اور آخری دونوں رکعتوں میں تسبیح پر اکتفاء کرو" اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر کوئی شخص آخری دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورہ بھی پڑھ لے تو سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا" اور یہی صحیح بھی ہے کیونکہ آخری دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ بھی پڑھ لے تو سجدہ سہواً واجب نہیں ہوگا اور یہی صحیح بھی ہے کیونکہ آخری دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا سُنّت ہے اور کسی دوسری سورت کا ترک کرنا واجب نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ سجدہ سہو کسی واجب کو چھوڑ دینے یا واجب پر عمل نہ کرنے ہی کی وجہ سے ضروری ہوتا ہے"۔

حضرت امام احمدؒ کے ہاں اولی اور صحیح یہ ہے کہ آخری دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کسی دوسری سورۃ کا پڑھنا مکروہ نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بارہ میں منقول ہے کہ آپ ﷺ آخری دونوں رکعتوں میں کبھی کبھی سورہ فاتحہ کے علاوہ اور کوئی سورۃ یا کچھ آیتیں بھی پڑھ لیا کرتے تھے لیکن سورہ فاتحہ کے ساتھ کسی دوسری سورۃ کا نہ پڑھنا ہی مستحب ہے۔

ظہر کی نماز کی قراءت

⑧ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ بِاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَفِيْ رِوَايَةٍ بِسَبِّحِ اسْمِ رَبِّكَ الْاَعْلٰى وَفِي الْعَصْرِ نَحْوَ ذٰلِكَ وَفِي الصُّبْحِ اَطْوَلَ مِنْ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ ظہر کی نماز میں سورہ واللیل اذا یغشی پڑھا کرتے تھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ سورۃ سبح اسم ربک الاعلی پڑھا کرتے تھے اور عصر کی نماز میں بھی اسی قدر (کوئی آیت یا سورۃ) پڑھتے تھے اور صبح کی نماز میں اس سے لمبی قراءت کرتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: جس طرح دیگر احادیث میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ فلاں نماز میں فلاں سورۃ پڑھتے تھے اور اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ سورۃ پہلی رکعت میں پڑھتے تھے یا دوسری میں۔ یا ایک رکعت میں بغیر پہلی دوسری کے تعین کے پڑھتے تھے۔ اس طرح اس حدیث میں بھی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ آپ ﷺ ظہر کی نماز میں سورہ واللیل اذا یغشی کس رکعت میں پڑھتے تھے آیا پہلی

رکعت میں یا دوسری میں؟

اس سلسلہ میں دو ہی احتمال ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ آپ ﷺ ایک ہی سورۃ کو دونوں رکعتوں میں پڑھتے تھے یا یہ کہ ایک سورۃ کا کچھ حصہ تو پہلی رکعت میں پڑھتے تھے اور کچھ حصہ دوسری رکعت میں (پہلے احتمال میں تکرار لازم آئے گا اور دوسرے میں تبعیض (یعنی کسی ایک سورۃ کا کچھ حصہ پہلی رکعت میں اور کچھ حصہ دوسری رکعت میں پڑھنا لازم آئے گا، اور یہ دونوں یعنی تکرار و تبعیض غیر اولی ہیں اگرچہ جائز ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ سے تکرار تبعیض ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ ایک رکعت میں پوری سورۃ پڑھنا اگرچہ وہ چھوٹی ہو افضل ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک رکعت میں کسی سورۃ کا کچھ حصہ پڑھا جائے اگرچہ وہ سورت طویل ہو۔ ہاں اس مسئلہ میں تراویح مستثنیٰ ہے کیونکہ اس میں تو پورا قرآن سارے مہینہ میں ختم کرنا افضل ہے لہٰذا ان سے دونوں احتمالات اور ان میں پیدا شدہ اشکالات کو دیکھتے ہوئے کوئی ایسا تیسرا احتمال پیدا کیا جائے گا جو حدیث کے منشاء کے مطابق اور اس سے مناسب ہو اور وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ مذکورہ سورۃ کے علاوہ کوئی دوسری سورۃ بھی پڑھتے تھے خواہ پہلی رکعت میں پڑھتے ہوں یا دوسری میں۔

مغرب کی نماز کی قراءت

⑨ وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالطُّوْرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جبیر ابن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کو مغرب کی نماز میں سورہ طور پڑھتے ہوئے سنا ہے۔"

(بخاریؒ، مسلمؒ)

فقہاء کی جانب سے نمازوں میں تعیّن قراءت کی دلیل

⑩ وَعَنْ أُمِّ الْفَضْلِ بِنْتِ الْحَارِثِ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ فضل بنت حارثؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کو مغرب کی نماز میں سورہ مرسلات عرفا پڑھتے ہوئے سنا ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: یہ احادیث اور وہ حدیث جس میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ مغرب کی نماز میں سورہ اعراف، سورہ انفال اور سورہ دخان پڑھتے تھے یا اسی قسم کی دوسری احادیث سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نمازوں میں کسی خاص اور متعیّن سورۃ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے بلکہ نمازی کی آسانی و سہولت پر موقوف ہے کہ وہ جس نماز میں جو بھی سورۃ چاہے پڑھ سکتا ہے۔ فقہا جو یہ لکھتے ہیں کہ فجر و ظہر میں طوال مفصل، عصر و عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل پڑھنا چاہئے تو ان کے تعیّن قراءت کی اصلی دلیل یہ ہے کہ حضرت امیر المؤمنین عمر فاروقؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو جو اس زمانہ میں کوفہ کے گورنر تھے ایک خط لکھا تھا اس میں یہ مذکورہ تفصیل لکھی تھی اس کے مطابق نمازوں میں قراءت کا اس طرح تعیّن قرار پایا۔ اس مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ اقدس میں طول و قصر کے سلسلہ میں قراءت کا مسئلہ اختلاف احوال و اوقات اور مصلحت جواز کے ساتھ مختلف تھا پھر بعد میں حضرت عمرؓ کے اس مکتوب گرامی کی روشنی میں قراءت کا ایک نہج اور اصول مقرر کیا گیا جس کو فقہاء کی اصطلاح[1] میں طوال مفصل، اور اوساط مفصل اور قصار مفصل کا نام دیا گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو کوئی دلیل براہ راست آنحضرت ﷺ کے کسی قول و فعل سے ہاتھ لگی ہو اور

[1] "طوال مفصل" سورہ حجرات سے سورۃ والسماء ذات البروج تک اور "اوساط مفصل" سورہ و السماء ذات البروج سے سورہ لم یکن تک اور "قصار مفصل" سورہ لم یکن کے بعد سے سورۃ الناس تک کی سورتوں کو کہا جاتا ہے ۱۲۔

آنحضرت ﷺ اسی طریقہ کے مطابق کبھی کبھی قراءت کرتے ہوں جس کو حضرت عمرؓ نے اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا ہے اور کبھی کبھی اس کے برعکس آپ ﷺ کا وہی معمول رہتا ہو جو ان احادیث میں مذکور ہے۔ بہر حال ہم تو سمجھتے ہیں کہ فقہاء کے مقرر کردہ اس اصول کے لئے حضرت عمرؓ کا یہ قول ہی دلیل کے لئے کافی ہے؟

فرض نماز پڑھنے والے کو نفل نماز پڑھنے والے کی اقتداء کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ يُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يَأْتِي فَيَؤُمُّ قَوْمَهُ فَصَلَّى لَيْلَةً مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ ثُمَّ اَتٰى قَوْمَهُ فَاَمَّهُمْ فَافْتَتَحَ بِسُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فَانْحَرَفَ رَجُلٌ فَسَلَّمَ ثُمَّ صَلّٰى وَحْدَهُ وَانْصَرَفَ فَقَالُوْا لَهُ نَافَقْتَ يَا فُلَانُ قَالَ لَا وَاللّٰهِ وَلَاٰتِيَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَاُخْبِرَنَّهُ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا اَصْحَابُ نَوَاضِحَ نَعْمَلُ بِالنَّهَارِ وَاِنَّ مُعَاذًا صَلّٰى مَعَكَ الْعِشَاءَ ثُمَّ اَتٰى قَوْمَهُ فَافْتَتَحَ بِسُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فَاَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مُعَاذٍ فَقَالَ يَا مُعَاذُ اَفَتَّانٌ اَنْتَ اِقْرَأْ وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ آقائے نامدار ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ کر آتے اور پھر اپنی قوم کو نماز پڑھایا کرتے تھے چنانچہ (ایک دن) انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ عشاء کی نماز پڑھی اور پھر آکر اپنی قوم کی امامت کی اور (نماز میں) سورہ بقرہ شروع کردی (جب قراءت طویل ہوئی تو) ایک شخص سلام پھیر کر جماعت سے نکل آیا اور تنہا نماز پڑھ کر چلا گیا لوگوں نے (جب یہ دیکھا تو اس سے کہا کہ "فلانے! کیا تو منافق ہو گیا ہے (کیونکہ جماعت سے جان بچا کر نکل بھاگنا تو منافقوں ہی کا کام ہے) اس نے کہا "نہیں خدا کی قسم (میں منافق نہیں ہوا ہوں) میں آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر حقیقت حال بیان کروں گا" چنانچہ وہ شخص بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہم اونٹوں والے ہیں، دن کو کام کرتے ہیں (یعنی) اونٹوں کے ذریعہ پانی کھینچ کر درختوں کی آبپاشی کرتے ہیں اور دن بھر محنت و مشقت میں لگے رہتے ہیں) معاذؓ رات کو آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ کر آئے اور ہمیں نماز پڑھائی اور سورہ بقرہ شروع کردی (لمبی قراءت ہونے اور اپنے تھکے ہوئے ہونے کی وجہ سے میں بددل ہو گیا) یہ سن کر آنحضرت ﷺ حضرت معاذؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "معاذ! کیا تم فتنہ پیدا کرنے والے ہو (یعنی کیا تم لوگوں سے جماعت ترک کرا کر انہیں دین سے بیزار اور فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہو؟ بہتر یہ ہے کہ) تم سورہ والشمس وضحها سورہ والضحی سورہ واللیل اذا یغشی اور سورہ سبح اسم ربک الاعلی پڑھا کرو۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: یہ شخص نعوذ باللہ جماعت یا نماز سے متنفر نہیں ہوا تھا بلکہ چونکہ دن بھر کی محنت و مشقت کی وجہ سے تھکا ماندہ تھا اس لئے جب قراءت لمبی ہوئی اور نماز نے طوالت اختیار کی تو یہ مجبور ہو کر جماعت سے نکل آیا اور اپنی نماز تنہا پڑھ لی۔ اسی وجہ سے جماعت سے نکلتے ہوئے باوجودیکہ سلام پھیرنے کا کوئی موقعہ و محل نہ تھا اس نے سلام پھیرا کیونکہ اس نے سوچا کہ نماز سے سلام پھیر کر نکلے تاکہ کم سے کم نماز پوری ہونے کی مشابہت تو ہو ہی جائے۔

ایک دوسری روایت میں سبح اسم ربک الاعلی کے بعد کچھ اور سورتیں بھی ذکر کی گئی ہیں مثلاً اذا السماء انفطرت اذا السماء انشقت اور سورہ بروج و طارق۔

حضرات شوافع نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ فرض نماز پڑھنے والے کو نفل نماز پڑھنے والے کی اقتداء کرنا جائز ہے اس لئے کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ جب آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے تھے تو ان کی فرض نماز ادا ہو جاتی تھی اور اپنی جماعت کے ساتھ جو نماز پڑھتے تھے وہ نفل رہتی تھی اور ان کے مقتدیوں کی نماز فرض ہوتی تھی اور آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کے اس عمل کو جائز رکھا

انہیں اس عمل سے منع نہیں کیا۔

علماء حنفیہ کے نزدیک چونکہ فرض نماز پڑھنے والے کو نفل نماز پڑھنے والے کی امامت میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے اس لئے حضرات شوافع کو جواب دیا جاتا ہے کہ "نیت ایک ایسی شے ہے جس پر کوئی دوسرا شخص مطلع نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ خود نیت کرنے والا یہ نہ بتائے کہ اس نے کیا نیت کی تھی۔ لہٰذا یہ غالب ہے کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ آنحضرت ﷺ کے ہمراہ بہ نیت فرض نہیں بلکہ آپ ﷺ سے طریقہ نماز سیکھنے اور آپ کی نماز کی برکت و فضیلت حاصل کرنے نیز تہمت نفاق سے بچنے کی خاطر بہ نیت نفل نماز پڑھتے ہوں پھر اپنی قوم کے پاس آکر انہیں فرض نماز پڑھاتے ہوں گے تاکہ دونوں فضیلتیں حاصل ہو جائیں۔ لہٰذا حضرت معاذؓ کے اس عمل کو اس صورت پر محمول کرنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ شکل تو بالاتفاق سب علماء کے نزدیک جائز ہے بخلاف پہلی شکل کے کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

امام کو مقتدیوں کی رعایت کرنی چاہئے: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امام کو ضعیف و کمزور مقتدیوں کی رعایت کے پیش نظر نماز میں تخفیف کرنا سُنّت ہے اگر اسے اس بات کا احساس ہو کہ پیچھے مقتدی ضعیف و کمزور ہیں یا دن بھر کی محنت و مشقت سے تھکے ماندے ہیں یا انہیں کوئی دوسری مجبوری و تکلیف لاحق ہے تو اسے نماز ہلکی پھلکی پڑھانی چاہے اتنی لمبی قراءت نہ کرنی چاہئے جس سے ضعیف و کمزور لوگ تکلیف و پریشانی محسوس کریں اور اس بناء پر جماعت کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

نماز عشاء کی قراءت

(۱۲) وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْعِشَاءِ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَمَا سَمِعْتُ اَحَدًا اَحْسَنَ صَوْتًا مِّنْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کو عشاء کی نماز میں سورہ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ پڑھتے ہوئے سنا اور میں نے آنحضرت ﷺ کی آواز سے اچھی کوئی آواز نہیں سنی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سرکار دو عالم ﷺ جس طرح باطنی طور پر دنیا کے سب سے مکمل و اکمل انسان تھے اسی طرح مبداء فیاض نے آپ ﷺ کو ظاہری جسمانی حسن و خوبصورتی کے بھی سب سے اعلیٰ و ارفع مرتبہ پر فائز کیا تھا پھر یہ کہ جس طرح خدا نے آپ ﷺ کو حسن صورت کا سب سے اعلیٰ نمونہ بنایا تھا اسی طرح آپ ﷺ کو حسن آواز میں بھی سب سے امتیازی درجہ عنایت فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت براء ابن عازب کی یہ شہادت کہ میں نے آپ ﷺ کی آواز سے زیادہ کوئی اچھی آواز نہیں سنی محض ایک جذباتی عقیدت کا تاثر یا مبالغہ آرائی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت کی شہادت ہے جس کی صداقت کو اپنے تو الگ رہے کبھی بیگانوں نے بھی چیلنج کرنے کی جرات نہیں کی۔

جیسا کہ ابھی حدیث نمبر ۸ کی تشریح کے ضمن میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی اس حدیث جس کی یہی وضاحت ہے کہ آپ ﷺ عشاء کی نماز میں سورہ والتین والزیتون ایک رکعت میں پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں کسی دوسری سورۃ کی قراءت فرماتے تھے۔

نماز فجر کی قراءت

(۱۳) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْفَجْرِ بِقٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ وَنَحْوِهَا وَكَانَتْ صَلَاتُهُ بَعْدُ تَخْفِيْفًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ فجر کی نماز میں سورہ ق والقرآن المجید یا ایسی ہی (طویل) کوئی دوسری سورۃ پڑھتے تھے اور آپ ﷺ فجر کی نماز کے بعد کی دوسری نماز ہلکی پڑھتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ فجر کی نماز کے علاوہ اوقات کی نمازیں زیادہ لمبی نہیں پڑھتے تھے اور فجر کی نماز

میں طویل قراءت کیا کرتے تھے کیونکہ ہنگام صبح گاہی بارگاہ الوہیت میں دعاوں کے قبول ہونے اور برکت وسعادت حاصل ہونے کا وقت ہوتا ہے۔

(۱۴) وَعَنْ عَمْرِو ابْنِ حُرَيْثٍ اَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْفَجْرِ وَاللَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو ابن حریثؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انھوں نے آقائے نامدار ﷺ کو فجر کی نماز میں واللیل اذا عسعس (یعنی سورۃ اذا الشمس کورت) پڑھتے سنا ہے۔" (مسلمؒ)

(۱۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصُّبْحَ بِمَكَّةَ فَاسْتَفْتَحَ سُوْرَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ حَتّٰى جَآءَ ذِكْرُ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ اَوْ ذِكْرُ عِيْسٰى اَخَذَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَعْلَةٌ فَرَكَعَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن سائبؓ فرماتے ہیں کہ (فتح مکہ کے بعد ایک مرتبہ) آقائے نامدار ﷺ نے ہمیں مکہ میں فجر کی نماز پڑھائی اور سورہ مؤمن یعنی قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ شروع کی جب آپ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ یا عِيْسٰى کے ذکر پر پہنچے تو آپ ﷺ کو کھانسی اٹھی (جس کی وجہ سے سورۃ پوری کئے بغیر) آپ ﷺ رکوع میں چلے گئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے قراءت میں سورۃ قد افلح المومنوں شروع کی اور جب آپ ﷺ اس آیت ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هَارُوْنَ پر کہ جس میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کا ذکر ہے یا اس آیت وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً پر کہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے پہنچے تو ان جلیل القدر پیغمبروں کے ذکر سے آپ ﷺ کا دل بھر آیا اور رونے لگے جس کی وجہ سے کھانسی کا غلبہ ہو گیا چنانچہ آپ ﷺ اس گریہ وکھانسی کی وجہ سے سورۃ پوری نہ کر سکے اور اس آیت پر قراءت ختم کر کے رکوع میں چلے گئے۔

جمعہ کے روز نماز فجر کی قراءت

(۱۶) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْفَجْرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِالٓمّٓ تَنْزِيْلُ فِي الرَّكْعَةِ الْاُوْلٰى وَفِي الثَّانِيَةِ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جمعہ کے روز نماز فجر کی پہلی رکعت میں الٓمّٓ تَنْزِيْلُ اور دوسری رکعت میں هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ پڑھتے تھے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حضرات شوافع اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جمعہ کے روز نماز فجر میں حدیث میں مذکورہ سورتیں ہی پڑھنی چاہئیں مگر حنفیہ چونکہ تعیّن سورۃ سے منع کرتے ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اولیٰ نہیں ہے کہ کسی خاص سورۃ کو کسی خاص نماز کے ساتھ اس طرح متعین کر لیا جائے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری سورت پڑھی ہی نہ جائے۔ ان حضرات کے نزدیک تعیّن قراءت وسورۃ کی ممانعت کی وجہ صرف یہ ہے کہ اگر کسی خاص نماز کے ساتھ کسی خاص سورۃ کو متعین کر دیا جائے گا تو لوگ اسی ایک سورۃ کو لازم وواجب سمجھ کر پڑھیں گے اور اس کے علاوہ دوسری سورتوں کو پڑھنا مکروہ سمجھیں گے۔

ہاں اگر کوئی شخص مثلاً اس حدیث کے مطابق جمعہ کے روز نماز فجر کی پہلی رکعت میں الٓمّٓ تنزیل سورۃ السجدہ) اور دوسری رکعت میں هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ (سورۃ دہر) حضرت ﷺ کی قراءت کی برکت حاصل کرنے اور اتباع سنّت کے جذبہ سے پڑھا کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ ان سورتوں کے علاوہ کبھی کبھی کوئی دوسری سورت بھی پڑھ لیا کرے تاکہ کم علم اور عوام یہ نہ سمجھیں کہ ان سورتوں کے علاوہ کوئی دوسری سورت پڑھنی جائز نہیں ہے۔

اس کے علاوہ حنفیہ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس عمل پر آنحضرت ﷺ کا دوام ثابت نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کبھی کبھی یہ سورتیں

پڑھا کرتے تھے لہٰذا کبھی کبھی پڑھنا تو ہر شخص کے لئے افضل ہے۔
اس موقعہ پر یہ مسئلہ بھی سن لیجئے کہ اگر کوئی شخص صبح کی نماز میں سورۂ سجدہ پڑھے تو اسے سجدہ تلاوت بھی کرنا چاہئے اگرچہ شوافع کے کچھ علماء نے بعض ایام میں امام کے لئے اس کو ترک کرنا ہی اولیٰ قرار دیا ہے لیکن آنحضرت ﷺ سے سجدہ تلاوت کرنا ہی ثابت ہے۔

نماز جمعہ کی قراءت

⑰ وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِي رَافِعٍ قَالَ اسْتَخْلَفَ مَرْوَانُ اَبَاهُرَيْرَةَ عَلَى الْمَدِيْنَةِ وَخَرَجَ اِلٰى مَكَّةَ فَصَلّٰى لَنَا اَبُوْهُرَيْرَةَ الْجُمُعَةَ فَقَرَأَ سُوْرَةَ الْجُمُعَةِ فِي السَّجْدَةِ الْاُوْلٰى وَفِي الْاٰخِرَةِ اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ بِهِمَا يَوْمَ الْجُمُعَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبید اللہ ابن رافع فرماتے ہیں کہ مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو مدینہ میں خلیفہ (یعنی اپنا قائم مقام گورنر) مقرر کیا اور خود مکہ چلا گیا چنانچہ (اس کی عدم موجودگی میں) حضرت ابوہریرہؓ نے ہمیں جمعہ کی نماز پڑھائی اور انہوں نے پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ اِذَا جَآءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ پڑھی اور فرمایا کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کو جمعہ کے روز (یعنی نماز جمعہ میں) ان دونوں سورتوں کو پڑھتے ہوئے سنا ہے۔" (مسلمؒ)

نماز عیدین و جمعہ کی قراءت

⑱ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْعِيْدَيْنِ وَفِي الْجُمُعَةِ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى وَهَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ قَالَ وَاِذَا اجْتَمَعَ الْعِيْدُ وَالْجُمُعَةُ فِي يَوْمٍ وَاحِدٍ قَرَأَ بِهِمَا فِي الصَّلَاتَيْنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ عید و بقر عید و جمعہ کی نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى اور هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (کی سورتیں) پڑھا کرتے تھے۔ اور حضرت نعمان کہتے ہیں کہ "جب عید اور جمعہ ایک دن جمع ہو جاتے تو آپ ﷺ (عید و جمعہ کی) دونوں نمازوں میں یہی دونوں سورتیں پڑھتے تھے" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ عیدین اور جمعہ کی نماز میں ان دونوں سورتوں کا پڑھنا مستحب مؤکدہ ہے وہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ نماز جمعہ میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون ہمیشہ نہیں پڑھتے تھے۔

⑲ وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سَاَلَ اَبَا وَاقِدِ اللَّيْثِيَّ مَا كَانَ يَقْرَأُ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْاَضْحٰى وَالْفِطْرِ فَقَالَ كَانَ يَقْرَأُ فِيْهِمَا بِقٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ وَاقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبید اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوواقد لیثیؓ سے پوچھا کہ "آقائے نامدار ﷺ عید اور بقر عید کی نماز میں کیا پڑھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ ان دونوں نمازوں میں سورہ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ اور سورہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ پڑھا کرتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت عمر فاروقؓ آنحضرت ﷺ سے کمال قرب رکھتے تھے اور آپ ﷺ کے احوال و کوائف سے بخوبی واقف تھے اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے حضرت ابوواقد لیثیؓ سے یہ سوال اس لئے کیا تھا تاکہ ان نمازوں میں آنحضرت ﷺ کی قراءت کے بارہ میں جان سکیں البتہ یہ کہا جائے گا کہ اس سوال سے ان کا مقصد یہ تھا کہ حاضرین اس سوال و جواب سے آنحضرت ﷺ کی قراءت کا علم بخوبی حاصل کر سکیں اور اس واقفیت کو اپنے ذہن میں قائم رکھ سکیں۔

فجر کی نماز سُنّت کی قراءت

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ فِیْ رَکْعَتَی الْفَجْرِ بِقُلْ یَآ اَیُّهَا الْکَافِرُوْنَ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ فجر کی دونوں سُنّت رکعتوں میں سورہ قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکَافِرُوْنَ اور سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتے تھے۔" (مسلم)

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقْرَأُ فِیْ رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَالَّتِیْ فِیْ اٰلِ عِمْرَانَ قُلْ یٰٓاَهْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ فجر کی دونوں سُنّت رکعتوں میں سورہ بقرہ کی یہ آیت قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا اور (سورہ آل عمران کی) یہ آیت قُلْ یٰٓاَهْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ پڑھتے تھے۔" (مسلم)

تشریح: پہلی آیت جو سورہ بقرہ کی ہے پورے طور پر یوں ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (البقرۃ ۲:۱۳۶)

"(مسلمانو!) کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو (کتابیں) موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں ان پر اور جو دیگر پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں ان سب پر (ایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (خدا واحد) کے فرمانبردار ہیں۔"

دوسری آیت جو سورہ آل عمران میں ہے پوری یہ ہے:

قُلْ یٰٓاَهْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران ۳:۶۴)

"(اے محمد ﷺ) فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب (یہودیو اور عیسائیو جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں (تسلیم) کی گئی ہے اس کی طرف آؤ۔ وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم (خدا کے) فرمانبردار ہیں۔"

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ فجر کی سنتوں میں کبھی کبھی تو یہ دونوں آیتیں پڑھتے ہوں گے اور اکثر بیشتر قل یا ایہا الکافرون اور قل ھو اللہ احد پڑھتے ہوں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سورت کا کچھ حصہ خاص طور سے سورۃ کے درمیان سے پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ابتداء نماز میں بسم اللہ پڑھنا

(۲۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَفْتَتِحُ صَلَاتَهٗ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ رَوَاهُ

التِّرمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيثٌ لَيْسَ اِسْنَادُهُ بِذَاكَ۔

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں آقائے نامدار ﷺ اپنی نماز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرتے تھے اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے۔"

تشریح: بسم اللہ سے نماز شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ابتداء نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم آہستہ آواز سے پڑھتے اس کے بعد قراءت شروع کرتے تھے۔ آہستہ آواز کی قید اس لئے لگائی ہے تاکہ یہ حدیث پہلے گذرنے والی احادیث کے خلاف نہ رہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی نماز کی ابتداء الحمد للہ رب العالمین سے فرمایا کرتے تھے۔

میرک شاہ نے کہا ہے کہ امام ترمذی کا اس کو ضعیف الاسناد کہنا محل غور ہے کیونکہ یہ حدیث حسن ہے اور اس کی اسناد بالکل صحیح ہے۔

آمین بآواز بلند کہی جائے یا آہستہ

(۲۳) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ فَقَالَ اٰمِيْنَ مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد، والدارمی وابن ماجۃ)

"اور حضرت وائل ابن حجرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ نے (نماز میں) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ پڑھا اور پھر دراز آواز سے آمین کہی۔" (ابوداؤدؒ، دارمیؒ، ترمذیؒ)

تشریح: "دراز آواز سے آمین کہنے" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے آمین بآواز بلند کہی یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے لفظ آمین میں الف کو مد کے ساتھ یعنی کھینچ کر کہا۔

آمین کہنے کا مسئلہ بھی ائمہ کے یہاں مبحث فیہ ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات جاننا چاہئے کہ اس مسئلہ میں تو سب ائمہ متفق ہیں کہ سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا ہر نمازی کے لئے سُنّت ہے خواہ منفرد ہو یا امام، اسی طرح مقتدی کو بھی آمین کہنا سُنّت ہے خواہ امام کہے یا نہ کہے۔ اب اختلاف اس چیز میں ہے کہ آیا آمین بآواز بلند کہی جائے یا آہستہ آواز سے؟ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک آمین بآواز بلند کہنی چاہئے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک آمین آہستہ آواز سے کہنی چاہئے چنانچہ وہ ان احادیث کے بارہ میں جن سے آمین بآواز بلند کہنا ثابت ہے اور جو شافعی وغیرہ کی مستدل ہیں یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام احادیث اس بات پر محمول ہیں کہ ابتداء اسلام میں آپ ﷺ تعلیم کی خاطر آمین بآواز بلند کہتے تھے تاکہ صحابہؓ یہ جان لیں کہ سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا چاہئے۔ صحابہ جب یہ سیکھ گئے تو آپؐ آمین آہستہ آواز سے کہنے لگے چنانچہ حضرت ابن ہمامؒ نے کہا ہے کہ احمدؒ، ابویعلیؒ، طبرانیؒ، دارمیؒ، اور حاکمؒ نے شعبہؒ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

"علقمہ ابن وائل اپنے والد مکرم حضرت وائل سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے (یعنی وائلؓ) نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھی چنانچہ آنحضرت ﷺ جب "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پر پہنچے تو آہستہ آواز سے آمین کہی۔"

حضرت ابن عمرؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "چار چیزیں ایسی ہیں جنہیں امام کو آہستہ آواز سے پڑھنا چاہئے۔

(۱) اعوذ باللہ (۲) بسم اللہ (۳) سبحانک اللھم (۴) آمین

حضرت ابن مسعودؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ بھی آمین آہستہ آواز سے کہتے تھے اس کے علاوہ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ کلمات دعا کو آہستہ آواز سے پڑھنا ہی اولی اور صحیح ہے کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً یعنی اپنے رب سے دعا گڑ گڑا کر اور چپکے سے کرو۔"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آمین بھی دعا ہی ہے لہٰذا آمین کو آہستہ سے کہنا اس آیت پر عمل کرنا ہے۔ نیز یہ کہ اس بات پر اجماع

ہے کہ آمین قرآن کا لفظ نہیں ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ اس کی آواز قرآن کے الفاظ کی آواز سے ہم آہنگ نہ ہو جس طرح کہ مصحف (یعنی اوراق قرآن) میں لکھنا جائز نہیں ہے۔

آمین کی برکت

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ زُهَيْرِ النُّمَيْرِيِّ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَأَتَيْنَا عَلٰى رَجُلٍ قَدْ اَلَحَّ فِی الْمَسْأَلَةِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْجَبَ اِنْ خَتَمَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ بِاَیِّ شَیْءٍ يَخْتِمُ قَالَ بِاٰمِيْنَ۔
(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابی زہیر نمیریؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات کو ہم آقائے نامدار ﷺ کے ہمراہ (باہر) نکلے اور ایک ایسے شخص کے پاس آئے جو دعا کرنے میں از حد زاری کر رہا تھا آنحضرت ﷺ نے فرمایا "واجب کیا اگر ختم کیا" ایک شخص نے پوچھا کہ (یارسول اللہ ﷺ) کس چیز کے ساتھ ختم کرے؟ فرمایا "آمین کے ساتھ۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "واجب کیا اگر ختم کیا" کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ شخص اپنی دعا پر آمین کہہ کر مہر لگا دے یا آمین پر ختم کر دے تو اس کے لئے جنّت و مغفرت واجب ہو گئی یعنی یہ جنّت و مغفرت کا حق دار ہو گیا یا اس کی دعا قبول ہو گئی۔

"ختم" کے دو معنی نقل کئے گئے ہیں مہر لگانا یا ختم کرنا۔ پہلے معنی اس حدیث امین خاتم رب العالمین کی مناسبت سے زیادہ اولیٰ و بہتر ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آمین اللہ رب العالمین کی مہر ہے اس کی وجہ سے آفات و بلائیں ختم ہوتی ہیں جس طرح سے کہ مہر سے خط محفوظ رہتا ہے یا وہ چیزیں قابل اعتماد ہوتی ہیں جن پر مہر لگی ہوئی ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پروردگار سے دعا مانگے تو اس کو چاہیے کہ دعائیہ کلمات کہنے کے بعد آمین بھی کہے تاکہ اس کی برکت کی وجہ سے وہ بارگاہ قاضی الحاجات میں مقبولیت کے مرتبہ سے نوازی جائے اور وہ دعا کامل رہے کیونکہ آمین بمنزلہ مہر کے ہے۔

آنحضرت ﷺ مغرب میں طویل قراءت بھی کرتے تھے

(۲۵) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الْمَغْرِبَ بِسُوْرَةِ الْاَعْرَافِ فَرَّقَهَا فِیْ رَكْعَتَيْنِ۔
(رواہ النسائی)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے مغرب کی نماز میں سورہ اعراف (اس طرح) پڑھی کہ اسے دونوں رکعتوں میں تقسیم کر دیا۔" (نسائیؒ)

تشریح: یوں تو آنحضرت ﷺ مغرب کی نماز میں قراءت مختصر کرتے تھے مگر کبھی کبھی آپ ﷺ بیان جواز کے لئے طویل قراءت بھی کرتے تھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مغرب میں نماز میں طویل قراءت کرنا جائز ہے۔ چنانچہ مغرب کی نماز میں سورہ اعراف پڑھنا اسی مقصد کے تحت تھا جہاں تک تنگی وقت کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغرب کا وقت طویل قراءت کی گنجائش رکھتا ہے خصوصاً جب شفق کا اطلاق سفیدی پر کیا جائے۔

"دونوں رکعتوں میں تقسیم" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس سورۃ کا کچھ حصّہ تو پہلی رکعت میں پڑھا اور کچھ حصّہ دوسری رکعت میں۔ اس طرح پوری سورۃ کو دونوں رکعتوں میں ختم کیا۔

معوذتین کی فضیلت

(۲۶) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ كُنْتُ اَقُوْدُ لِرَسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاقَتَهُ فِی السَّفَرِ فَقَالَ لِیْ يَا عُقْبَةُ اَلَا اُعَلِّمُكَ

خَيْرَ سُوْرَتَيْنِ قُرِائَتَا فَعَلَّمَنِیْ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ قَالَ فَلَمْ يَرَنِی سُرِرْتُ بِهِمَا جِدًّا فَلَمَّا نَزَلَ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ صَلّٰى بِهِمَا صَلَاةَ الصُّبْحِ لِلنَّاسِ فَلَمَّا فَرَغَ اِلْتَفَتَ اِلَیَّ فَقَالَ يَا عُقْبَةُ كَيْفَ رَأَيْتَ۔

(رواہ احمد وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک سفر میں آقائے نامدار ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑے چل رہا تھا کہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا "عقبہ! کیا میں تمہیں دو بہترین سورتیں جو پڑھی گئی ہیں (یعنی مجھ پر نازل کی گئی ہیں) نہ بتلادوں؟ چنانچہ آپ ﷺ نے مجھے (معوذتین یعنی) قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس سکھائیں۔ عقبہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے ان دونوں سورتوں سے زیادہ خوش نہیں دیکھا۔ پھر جب آپ ﷺ صبح کی نماز پڑھنے کے لئے اترے تو لوگوں کو نماز میں یہی دونوں سورتیں پڑھائیں۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوگئے تو میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "عقبہ! تم نے (ان کی فضیلت کو) دیکھا؟"۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "بہترین سورتوں" کا مطلب یہ ہے کہ شیطان مردود کے مکر و فریب اور نفس کی گمراہی سے خدا کی پناہ مانگنے کے سلسلہ میں معوذتین بہترین سورتیں ہیں

آنحضرت ﷺ نے حضرت عقبہؓ کو یہ سورتیں سکھانے کے بعد جب دیکھا کہ وہ ان سورتوں کو دیکھ کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے کیونکہ دوسری سورتوں کی طرح ان سورتوں میں خدا کی وحدانیت اور پاکیزگی کا بیان نہیں ہے تو آنحضرت ﷺ نے صبح کی نماز میں انہیں سورتوں کو پڑھ کر فرمایا کہ عقبہ! تم نے ان سورتوں کی فضیلت دیکھی کہ میں نے ان کو فجر کی نماز میں جو تمام نمازوں سے افضل نماز ہے اور جس میں طویل قراءت کرنا مستحب ہے پڑھا۔

جمعہ کے روز نماز مغرب کی قراءت

(۲۷) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِیْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ قُلْ يَا اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ۔

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جمعہ کے روز مغرب کی نماز میں قل یا ایہا الکافرون اور قل ہو اللہ پڑھا کرتے تھے یہ حدیث شرح السنۃ میں منقول ہے اور ابن ماجہؒ نے یہ حدیث ابن عمرؓ سے نقل کی ہے لیکن اس میں "لیلۃ الجمعۃ" کے الفاظ نہیں ہیں۔"

تشریح: نماز میں مغرب سے مغرب کی فرض نماز مراد ہے یعنی آپ جمعہ کے روز مغرب کی فرض نماز میں یہ دونوں سورتیں پڑھا کرتے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ نماز مغرب سے مغرب کی سنتیں مراد ہوں۔ واللہ اعلم

ابن حبان نے قل ھو اللہ کے الفاظ کے بعد یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ و فی العشاء سورۃ الجمعۃ و المنافقون یعنی شب جمعہ میں آپ ﷺ عشاء کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون پڑھا کرتے تھے۔

ابن مالکؒ نے کہا ہے کہ "یہ حدیث یا اسی قسم کی دوسری احادیث دوام پر محمول نہیں ہیں یعنی آپ ﷺ کا یہ ہمیشہ کا معمول نہیں تھا۔ بلکہ کبھی آپ دوسری سورتیں پڑھا کرتے تھے اور کبھی ان سورتوں کی قراءت کرتے تھے تاکہ لوگ یہ جان لیں کہ ہر ایک سورۃ کو پڑھنا جائز ہے۔ کسی خاص سورۃ کو پڑھنا ضروری نہیں ہے۔

(۲۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ مَا اُحْصِیْ مَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِی الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ وَفِی الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْفَجْرِ بِقُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ بَعْدَ الْمَغْرِبِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ آقائے نامدار ﷺ کی مغرب کی نماز کے بعد اور فجر کی نماز سے پہلے دونوں سنتوں میں قل یا ایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد پڑھتے سنا ہے اس حدیث کو ابن ماجہؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا مگر ان کی روایت میں "بعد المغرب" کے الفاظ نہیں ہیں۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دونوں سنتوں اور فجر کی دونوں سنتوں میں قل یا ایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد دونوں سورتیں اتنی کثرت سے پڑھا کرتے تھے کہ میں ان کا شمار نہیں کر سکتا۔

(۲۹) وَعَنْ سُلَيْمَانَ ابْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ اَحَدٍ اَشْبَهَ صَلَاةً بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فُلَانٍ قَالَ سُلَيْمَانُ صَلَّيْتُ خَلْفَهُ فَكَانَ يُطِيْلُ الرَّكْعَتَيْنِ الْاُوْلَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَيُخَفِّفُ الْاُخْرَيَيْنِ وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ وَيَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِقِصَارِ الْمُفَصَّلِ وَيَقْرَأُ فِي الْعِشَاءِ بِوَسَطِ الْمُفَصَّلِ وَيَقْرَأُ فِي الصُّبْحِ بِطِوَالِ الْمُفَصَّلِ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ اِلٰى وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ۔

"اور حضرت سلیمان ابن یسارؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی شخص کے پیچھے آقائے نامدار ﷺ کی نماز کے مشابہ نماز نہیں پڑھی مگر فلاں شخص کے پیچھے سلیمانؒ کہتے ہیں کہ میں نے بھی اس شخص کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ وہ ظہر کی پہلی دونوں رکعتوں کو طویل پڑھتے تھے اور آخری دونوں رکعتوں کو ہلکی پڑھتے تھے، عصر کی نماز میں تخفیف کرتے تھے۔ مغرب کی نماز میں قصار مفصل اور عشاء میں اوساط مفصل اور فجر کی نماز میں طوال مفصل پڑھا کرتے تھے۔ اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے مگر ان کی روایت صرف ویخفف العصر تک ہے" (نسائی)

تشریح: "فلاں شخص" کے تعین کے سلسلہ میں بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات مراد ہے اور بعض حضرات کی رائے ہے "فلاں شخص" سے مراد وہ شخص ہے جس کو خلیفہ مروان نے مدینہ میں حاکم مقرر کر رکھا تھا۔

اس حدیث میں ظہر اور عصر کی قراءت کا اجمالی طور پر ذکر کیا ہے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ ظہر کی نماز میں طوال مفصل پڑھتے تھے۔ بلکہ صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ ظہر کی نماز میں طویل قراءت کرتے تھے۔ اسی طرح عصر کی نماز میں بھی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اس میں قصار مفصل پڑھتے تھے یا اوساط مفصل؟ صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ عصر کی نماز میں تخفیف کرتے تھے۔

بہر حال نمازوں کی قراءت کے سلسلہ میں فقہاء نے ایک اصول و نہج بنایا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ نمازوں میں قراءت کرنے کے سلسلہ میں عملی طور پر کوئی خلجان واقع نہیں ہو اور وہ یہ کہ فجر و ظہر کی نماز میں طوال مفصل، عصر و عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل پڑھی جائیں۔ اس مسئلہ کی وضاحت اس سے پہلے بھی ایک حدیث کی تشریح کے ضمن میں کی جا چکی ہے اور وہاں اس کے اصطلاحی ناموں کی تعریف بھی کی گئی ہے چنانچہ ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجئے کہ فقہاء کی اصطلاح میں "مفصل" سے سورہ حجرات سے سورہ والناس تک کی سورتیں مراد ہیں ان سورتوں کو مفصل اس لئے کہا گیا ہے کہ "فصل" کے معنی جدا ہونے کے ہیں چنانچہ سورہ حجرات سے ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ایک دوسرے سے درمیان میں بسم اللہ ہونے کی وجہ سے جدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ پھر مفصل یعنی سورہ حجرات سے سورہ والناس تک کی سورتوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) چھوٹی سورتیں۔ (۲) متوسط سورتیں (۳) بڑی سورتیں۔

سورہ حجرات سے سورہ بروج تک کو طوال مفصل یعنی مفصل کی بڑی سورتیں کہتے ہیں۔

سورہ بروج سے سورہ لم یکن (البینہ) تک کو اوساط مفصل یعنی مفصل کی متوسط سورتیں کہتے ہیں۔

اور سورہ لم یکن سے سورہ والناس تک کو قصار مفصل یعنی مفصل کی چھوٹی سورتیں کہتے ہیں۔

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کا بیان

(۳۰) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كُنَّا خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ فَقَرَأَ فَثَقُلَتْ عَلَيْهِ الْقِرَاءَةُ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ لَعَلَّكُمْ تَقْرَأُوْنَ خَلْفَ اِمَامِكُمْ قُلْنَا نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا تَفْعَلُوْا اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَاِنَّهُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَلِلنَّسَائِيِّ مَعْنَاهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاؤُدَ قَالَ وَاَنَا اَقُوْلُ مَالِيْ يُنَازِعُنِي الْقُرْاٰنُ فَلَا تَقْرَأُوْا بِشَيْءٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ اِذَا جَهَرْتُ اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ۔

"اور حضرت عبادۃ بن صامت فرماتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ فجر کی نماز میں آقائے نامدار ﷺ کے پیچھے تھے آپ ﷺ نے جب قراءت شروع کی تو آپ ﷺ کو پڑھنا بھاری ہوگیا۔ پھر جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ "شاید تم لوگ امام کے پیچھے قراءت کیا کرتے ہو؟ ہم نے عرض کیا "جی ہاں یارسول اللہ (ﷺ)! آپ ﷺ نے فرمایا "سوائے سورہ فاتحہ کے کچھ نہ پڑھا کرو اس لئے کہ جو شخص یہ سورہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ (ابوداؤد، ترمذی) نسائی نے یہ روایت بالمعنی نقل کی ہے اور ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "آپ ﷺ نے (صحابہ کا جواب سن کر) فرمایا جب ہی تو میں (اپنے دل میں) کہتا تھا کہ یہ کیا ہوگیا جو قراءت مجھ پر بہار گلو رہی ہے، جب میں باآواز بلند پڑھا کروں تو تم لوگ بجز سورہ فاتحہ کے اور کچھ مت پڑھا کرو۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نماز میں باآواز بلند قراءت کر رہے تھے، آپ ﷺ کے پیچھے مقتدی صحابہ بجائے اس کے کہ خاموشی اختیار کر کے آپ ﷺ کی قراءت سنتے خود بھی قراءت کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقتدیوں کی قراءت آنحضرت ﷺ کی قراءت میں اثر انداز ہوئی اور آپ ﷺ کی نماز میں خربطہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے آپ ﷺ کے لئے قراءت کرنا مشکل ہوگیا کیونکہ بسا اوقات کامل چیز پر ناقص چیز بھی اثر انداز ہو جاتی ہے جیسا کہ کتاب الطہارت کی ایک حدیث میں گذر چکا ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ نے صبح کی نماز میں قراءت شروع کی اور پھر اچانک رک گئے اور پھر اس رکنے کا سبب یہ بیان کیا کہ کچھ ایسے لوگ میرے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں جو ٹھیک طرح سے وضو نہیں کرتے یعنی ان کا وضو ناقص رہ جاتا ہے جو میری نماز و قراءت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بظاہر اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے ائمہ کے یہاں اس مسئلہ میں اختلاف ہے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ امام اور منفرد یعنی تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے مگر مقتدی کے لئے واجب نہیں ہے خواہ نماز بلند آواز کی ہو یا آہستہ آواز کی۔ اس کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔

"(نماز میں) جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور خاموشی اختیار کرو۔"

امام صاحب اس حدیث کو ابتداء پر محمول کرتے ہیں یعنی یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر بعد میں منسوخ ہوگیا۔

(۳۱) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْصَرَفَ مِنْ صَلَاةٍ جَهَرَ فِيْهَا بِالْقِرَاءَةِ فَقَالَ هَلْ قَرَأَ مَعِيَ اَحَدٌ مِنْكُمْ اٰنِفًا فَقَالَ رَجُلٌ نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنِّيْ اَقُوْلُ مَالِيْ اُنَازَعُ الْقُرْاٰنَ قَالَ فَانْتَهَى النَّاسُ عَنِ الْقِرَاءَةِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا جَهَرَ فِيْهِ بِالْقِرَاءَةِ مِنَ الصَّلَوَاتِ حِيْنَ سَمِعُوْا ذٰلِكَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مالک واحمد وابوداؤد والترمذی والنسائی وروی ابن ماجۃ نحوہ)

"اور حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) آقائے نامدار ﷺ (جہری) نماز سے جس میں قراءت باآواز بلند کی جاتی ہے فارغ ہوئے (اور نمازیوں کی طرف متوجہ ہو کر) فرمایا "ابھی تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قراءت کی ہے؟" ایک شخص نے عرض کیا ہاں! یارسول اللہ! آنحضرت ﷺ نے فرمایا (میں جبھی تو دل میں) کہتا تھا کہ کیا ہوگیا جو میں قرآن پڑھنے میں الجھتا ہوں" حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ جب

لوگوں نے یہ سنا تو ان نمازوں میں جن میں آنحضرت ﷺ قراءت باآواز بلند کرتے تھے آپ کے ساتھ قراءت کرنے سے رک گئے۔"

(مالکؒ، احمدؒ، ابوداؤدؒ ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے بصراحت سے معلوم ہو گیا کہ صحابہ جہری نمازمیں امام کے پیچھے مطلقاً کچھ نہیں پڑھتے تھے نہ تو سورہ فاتحہ کی قراءت کرتے تھے اور نہ کسی دوسری سورت وآیت کی لہٰذا حنفیہ کا مسلک ثابت ہوا کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قراءت کرنا جائز نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث اس سے پہلے گذرنے والی حدیث کے لئے ناسخ ہو جس میں کہا گیا ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہئے کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ بعد میں اسلام لائے ہیں اس لئے ان کی روایت کردہ حدیث بھی اس حدیث کے بعد کی ہوگی اور ظاہر ہے کہ بعد کا حکم پہلے حکم کے لئے ناسخ ہوا کرتا ہے۔

(۳۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَالْبَيَاضِيِّ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُصَلِّيَ يُنَاجِي رَبَّهٗ فَلْيَنْظُرْ مَا يُنَاجِيْهِ وَلَا يَجْهَرْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ بِالْقُرْآنِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابن عمر اور حضرت بیاضیؓ روایت کرتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا "نمازی اپنے پروردگار سے (حالت نماز میں) مناجات کرتا ہے لہٰذا اسے چاہئے کہ جو مناجات وہ کرتا ہے اس میں غور کرے (یعنی ذکر و قراءت حضور قلب اور خشوع و خضوع کے ساتھ کرے) اور قرآن کو پڑھنے میں تم میں سے کوئی ایک دوسرے پر اونچی آواز نہ کرے۔" (احمدؒ)

تشریح: حدیث کا آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص قرآن پڑھے خواہ نماز میں پڑھے یا نماز کے علاوہ پڑھے تو اسے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس کی آواز دوسرے نمازی یا دوسرے قاری کی آواز پر اونچی نہ ہو۔ اس طرح کسی ذکر کرنے والے یا سونے والے کے سامنے بھی اونچی آواز سے نہ پڑھے تاکہ ان لوگوں کو اس کی وجہ سے تکلیف نہ پہنچے۔

امام کی متابعت ضروری ہے

(۳۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ فَاِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا "امام اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، لہٰذا جب امام اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: فاذا کبر فکبروا کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ مقتدی تکبیر، امام کے تکبیر کہنے کے بعد کہیں۔ نہ تو اس کے ساتھ ساتھ کہیں اور نہ اس سے پہلے کہیں اور یہ حکم تکبیر تحریمہ میں تو واجب ہے البتہ دوسری تکبیرات میں مستحب ہے۔

حدیث کے دوسرے جزء فاذا قرأ سے مراد مطلق قراءت ہے یعنی خواہ امام باآواز بلند قراءت کرے یا آہستہ سے پڑھے۔ دونوں صورتوں میں مقتدیوں کو خاموشی سے اس کی قراءت سننا چاہئے اس کے لئے آپ ﷺ نے "فانصتوا" یعنی چپ رہو فرمایا۔ فاستمعوا یعنی سنو نہیں فرمایا ارشاد ربانی ہے۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔

"یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو (بلند آواز سے پڑھنے کی صورت میں) اسے سنو اور (آہستہ آواز سے پڑھنے کی صورت میں) خاموش رہو۔"

لہٰذا معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو کچھ پڑھنا مطلقاً ممنوع ہے خواہ نماز جہری (باآواز بلند ہو یا سری باآواز آہستہ)

سورہ فاتحہ کی قراءت میں ائمہ کے مسلک: حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا خواہ نماز جہری ہو یا سری

واجب ہے اور سورہ فاتحہ کے علاوہ کوئی سورۃ وغیرہ پڑھنا جائز ہے۔

حضرت امام احمدؒ، حضرت امام مالکؒ، اور ایک قول کے مطابق خود حضرت امام شافعیؒ کا بھی مسلک یہ ہے کہ مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ کا پڑھنا صرف سری نماز میں واجب ہے جہری نماز میں محض امام کی قراءت سننا کافی ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں خواہ نماز سری ہو یا جہری دونوں صورتوں میں مطلقاً قراءت مقتدی کے لئے ممنوع ہے نیز صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسف اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک بھی مقتدی کو پڑھنا مکروہ ہے۔

حضرت امام محمدؒ جو حضرت امام اعظمؒ کے جلیل القدر شاگرد اور فقہ حنفیہ کے امام ہیں فرماتے ہیں کہ "صحابہؓ" کی ایک جماعت کے قول کے مطابق امام کے پیچھے مقتدی اگر سورہ فاتحہ کی قراءت کرے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ عمل اس دلیل پر کیا جائے جو زیادہ قوی اور مضبوط ہو، چنانچہ حنفیہ کی دلیل یہ حدیث ہے۔

مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ قِرَاءَةٌ لَهٗ۔

"یعنی (نماز میں) جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت ہی اس (مقتدی) کی قراءت ہوگی۔"

یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ بخاریؒ و مسلمؒ کے علاوہ سب ہی نے اسے نقل کیا ہے اور ہدایہ میں تو یہاں تک مذکور ہے علیہ اجماع الصحابۃ یعنی اسی پر صحابہؓ کا اجماع و اتفاق تھا۔

جو شخص قراءت پر قادر نہ ہو وہ کیا پڑھے

(۳۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي اَوْفٰى قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّي لَا اَسْتَطِيْعُ اَنْ اٰخُذَ مِنَ الْقُرْاٰنِ شَيْئًا فَعَلِّمْنِيْ مَا يُجْزِئُنِيْ قَالَ قُلْ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا لِلّٰهِ فَمَاذَا لِيْ قَالَ قُلِ اللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَعَافِنِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ فَقَالَ هٰكَذَا بِيَدَيْهِ وَقَبَضَهُمَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا هٰذَا فَقَدْ مَلَاَ يَدَيْهِ مِنَ الْخَيْرِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَانْتَهَتْ رِوَايَةُ النَّسَائِيِّ عِنْدَ قَوْلِهٖ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

"اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص آقائے نامدار ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں (فوری طور پر) قرآن میں سے کچھ یاد کر لینے پر قادر نہیں ہو سکتا اس لئے آپ ﷺ مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیجئے جو میرے لئے کافی ہو" آپ ﷺ نے فرمایا تم یہ پڑھ لیا کرو سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ یعنی اللہ پاک ہے اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ بہت بڑا ہے، گناہوں سے بچنے کی توفیق اور عبادت کرنے کی طاقت صرف خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اس شخص نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! یہ تو خدا کے لئے ہے میرے لئے کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا (اپنے لئے) تم یہ پڑھ لیا کرو۔ اللھم ارحمنی وعافنی واھدنی وارزقنی یعنی اے پروردگا مجھ پر رحم فرما، مجھ کو عافیت سے رکھ! میری ہدایت کر! اور مجھے رزق دے" پھر اس شخص نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس طرح اشارہ کیا اور ان کو بند کیا اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اس شخص نے اپنے دونوں ہاتھ نیکی سے بھر لئے۔" (نسائی کی روایت الا باللہ تک ختم ہوگئی ہے۔)

تشریح: حدیث کے آخری جملوں کا مطلب یہ ہے کہ جب سائل نے قراءت کا کوئی بدل دریافت کیا اور آنحضرت ﷺ نے اسے بتا دیا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور ان کو بند کیا اور اپنے اس عمل سے گویا اس بات کا اقرار کیا کہ آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے میں نے اسے سچ و برحق جانا اور اسے یقین و اعتماد کے ساتھ اپنے دل و دماغ میں جاگزین کر لیا ہے جس طرح کہ جب کسی شخص کو کوئی

قیمتی و اعلیٰ چیز ہاتھ لگتی ہے تو وہ اس چیز کو اپنی مٹھی میں بند کر لیتا ہے۔

مصنف مشکوٰۃ علیہ الرحمتہ نے اس حدیث کو باب القراءۃ میں نقل کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائل قرآن میں سے اتنا بھی یاد نہ کر سکتا تھا جس سے اس کی نماز درست ہو جاتی۔ مگر یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بات کچھ بعید ہی معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جو عربی زبان سے پوری طرح واقف تھا کیا اتنا بھی یاد نہ کر سکتا تھا کہ وہ نماز میں پڑھ سکے۔ پھر یہ کہ جتنے کلمات اسے بتائے گئے ہیں۔ اگر وہ ان کلمات کی بقدر بھی قرآن میں سے کچھ یاد کر لیتا تو اس کی نماز کی ادائیگی کے لئے کافی تھا۔

اس اشکال کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ سائل اسی وقت مسلمان ہوا تھا کہ نماز کا وقت آگیا اور چونکہ وہ فوری طور پر اس پر قادر نہیں ہو سکتا تھا کہ قرآن میں سے کچھ یاد کر سکے اس لئے آسانی و سہولت کے پیش نظر یہ کلمات سکھا دیئے گئے۔

یا پھر اس حدیث کو ابتداء اسلام پر محمول کیا جائے گا کہ ان دنوں احکام و مسائل کے نفاذ کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ آسانی و سہولت کو پیش نظر رکھا جاتا تھا" یہ توجیہ زیادہ اولیٰ ہے۔

احکام الٰہی پر آنحضرت ﷺ کے عمل کی ایک مثال

(۳۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا قَرَأَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى قَالَ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى۔

(رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب (کسی نماز میں) سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى پڑھا کرتے تھے تو سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہتے تھے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ احکام الٰہی پر کس قدر عمل کرتے تھے؟ اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے آپ ﷺ کی زندگی کا بنیادی اصول یہی تھا کہ پروردگار عالم جو حکم دے فوراً اس کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور اس کے بعد اس حکم پر اپنے متبعین کو بھی عمل کرائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ جب بھی نماز میں سورہ اعلیٰ پڑھا کرتے تھے چونکہ اس سورۃ کے ابتدائی الفاظ سبح اسم ربک الاعلی کا مطلب ہے کہ "اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرو جو بلند مرتبہ ہے" اس لئے آپ اس حکم کی بجا آواری یہ کہہ کر کیا کرتے تھے کہ سبحان ربی الاعلی میں اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتا ہوں جو بلند مرتبہ ہے۔

نماز میں کن آیتوں کی قراءت کے بعد کیا کہنا چاہئے؟

(۳۶) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ مِنْكُمْ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ فَانْتَهٰى اِلٰى اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ فَلْيَقُلْ بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَمَنْ قَرَأَ لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَانْتَهٰى اِلٰى اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى فَلْيَقُلْ بَلٰى وَمَنْ قَرَأَ وَالْمُرْسَلَاتِ فَبَلَغَ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ فَلْيَقُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ اِلٰى قَوْلِهٖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا کہ "تم میں سے جو شخص سورہ والتین والزیتون پڑھے، اور (اس آیت) اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ یعنی کیا خدا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ پر پہنچے تو یہ الفاظ کہا کرے بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (یعنی ہاں! اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں) اور جو شخص سورہ لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ پڑھے اور (اس آیت) اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى (یعنی کیا اس خدا) کو اس بات پر قدرت نہیں کہ مردوں کو جلا اٹھائے) پر پہنچے تو کہے "بَلٰى" (یعنی ہاں وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے) اور جو شخص سورہ والمرسلات پڑھے اور (اس آیت) فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ یعنی

اس کے بعد یہ کون سی بات پر ایمان لائیں گے) تو کہے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (یعنی ہم اللہ پر ایمان لائے) ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے اس روایت کو (والتین کی آیت) وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: ان آیتوں یا اس قسم کی دوسری آیتوں کے جواب دینے کے سلسلہ میں علماء کے یہاں اختلاف ہے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خواہ یہ آیتیں نماز میں پڑھی جائیں یا نماز سے باہر پڑھی جائیں بہر صورت ان کے جواب میں مذکورہ الفاظ کہنے چاہئیں اور نماز خواہ نفل ہو یا فرض۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ نماز سے باہر پڑھنے اور نفل نمازوں میں قراءت کرنے کی شکل میں تو جواب دینا چاہئے فرض نمازوں میں نہیں!

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ صرف نماز سے باہر پڑھنے کی صورت میں جواب دیا جائے نماز میں نہیں، خواہ فرض ہو یا نفل، تاکہ یہ وہم نہ ہو جائے کہ یہ الفاظ بھی قرآن ہی کے ہیں۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حدیث کے ظاہری اطلاق پر نظر کرتے ہوئے کہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ حکم تو نمازی کے بارہ میں ہے (لہٰذا چاہئے کہ یہ جواب نماز میں بھی دیئے جائیں) تو ہم کہیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ حکم نفل نمازوں کے بارہ میں ہو، فرض نمازوں کے بارہ میں نہ ہو۔ کیونکہ خود آقائے نامدار ﷺ کے بارہ میں حضرت حذیفہؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ آنحضرت رات (یعنی تہجد) کی نماز میں جب کسی آیت پر پہنچتے جس میں رحمت خداوندی کا ذکر ہوتا تھا تو آپ ﷺ اس جگہ قراءت روک کر پروردگار سے طلب رحمت کی درخواست کیا کرتے تھے اور جب کسی آیت پر پہنچتے جس میں عذاب الٰہی کا ذکر ہوتا تھا تو آپ ﷺ اس جگہ قراءت روک کر پروردگار کے عذاب سے پناہ مانگتے تھے" نیز یہ کہ آپ ﷺ کے اس معمول یا حکم کو کسی صحابی نے بھی جہری فرائض نماز کے سلسلہ میں روایت نہیں کیا ہے۔

(۳۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اَصْحَابِهٖ فَقَرَأَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةَ الرَّحْمٰنِ مِنْ اَوَّلِهَا اِلٰى اٰخِرِهَا فَسَكَتُوْا فَقَالَ لَقَدْ قَرَأْتُهَا عَلَى الْجِنِّ لَيْلَةَ الْجِنِّ فَكَانُوْا اَحْسَنَ مَرْدُوْدًا مِنْكُمْ كُنْتُ كُلَّمَا اَتَيْتُ عَلٰى قَوْلِهٖ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ قَالُوْا لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) آقائے نامدار ﷺ اپنے اصحابؓ کی ایک جماعت کے پاس تشریف لائے اور ان کے سامنے سورۂ رحمٰن اول تا آخر پڑھی صحابہ خاموشی اختیار کئے رہے۔ آپ ﷺ نے (جب سورۃ ختم کرلی تو) فرمایا کہ "یہ سورۃ میں نے جنات کے سامنے اس رات میں پڑھی تھی جبکہ وہ اسلام قبول کرنے اور قرآن سننے کے لئے) جمع ہوئے تھے اور وہ جواب دینے میں تم سے بہتر تھے چنانچہ جب میں اس آیت فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (یعنی خدا کی کون سے نعمتوں کو تم جھٹلاتے ہو؟) پر پہنچتا تو وہ یہ جواب دیتے لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ (یعنی اے پروردگار! ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے ہیں اور تمام تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں" اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

دونوں رکعتوں میں ایک سورۃ پڑھنا

(۳۸) عَنْ مُعَاذِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْجُهَنِيِّ قَالَ اِنَّ رَجُلًا مِنْ جُهَيْنَةَ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ فِي الصُّبْحِ اِذَا زُلْزِلَتْ فِي الرَّكْعَتَيْنِ كِلْتَيْهِمَا فَلَا اَدْرِيْ اَنَسِيَ اَمْ قَرَأَ ذٰلِكَ عَمْدًا۔ (ابوداؤدؒ)

"حضرت معاذ ابن عبداللہ جہنیؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ اس نے آقائے نامدار ﷺ کو فجر کی دونوں رکعتوں میں سورہ اذا زلزلت الارض پڑھتے سنا ہے اور میں نہیں جانتا کہ آنحضرت ﷺ نے قصداً ایسا کیا تھا یا آپ ﷺ بھول گئے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ فجر کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورۃ اذا زلزلت الارض اس طرح پڑھی کی پہلی رکعت میں پوری سورت پڑھی پھر دوسری رکعت میں بھی وہی سورۃ پوری پڑھی اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایسا قصداً بیان جواز کے لئے کیا تھا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اصل سُنّت اس طرح بھی ادا ہو جاتی ہے۔ ویسے جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو بات یہی ہے کہ افضل عدم تکرار ہے۔ یعنی ایک ہی سورۃ دو رکعتوں میں مکرر نہ پڑھی جائے اور خصوصاً فرائض میں تو اس کا خیال رکھنا چاہئے۔

(۳۹) وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ اِنَّ اَبَابَكْرِ الصِّدِّيْقَؓ صَلَّى الصُّبْحَ فَقَرَأَ فِيْهِمَا بِسُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ كِلْتَيْهِمَا۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت عروہ ابن زبیرؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فجر کی نماز پڑھی اور دونوں رکعتوں میں سورہ بقرہ پڑھی۔" (مالکؒ)

تشریح: دونوں رکعتوں میں سوۂ بقرہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سورۃ کا کچھ حصہ تو آپؓ نے ایک رکعت میں پڑھا اور کچھ حصہ دوسری رکعت میں اور یہ بھی بیان جواز کے لئے کیا کیونکہ آنحضرت ﷺ سے اس پر مداومت ثابت نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ اکثر ایک رکعت میں پوری سورۃ ہی پڑھتے تھے دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورۃ اس طرح متفرق طور پر پڑھنا نادر ہے۔

حضرت عثمانؓ نماز فجر میں سورہ یوسف کثرت سے پڑھتے تھے

(۴۰) وَعَنِ الْفَرَافِصَةِ بْنِ عُمَيْرِ الْحَنَفِيِّ قَالَ مَا اَخَذْتُ سُوْرَةَ يُوْسُفَ اِلاَّ مِنْ قِرَاءَةِ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ اِيَّاهَا فِي الصُّبْحِ مِنْ كَثْرَةِ مَا كَانَ يُرَدِّدُهَا۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت فرافصہ[1] ابن عمیر حنفیؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ میں نے سورہ یوسف، حضرت عثمان ابن عفانؓ سے (سن سن کر) یاد کی ہے کیونکہ وہ اس سورت کو فجر کی نماز میں کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔" (مالکؒ)

تشریح: اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ علماء تو نمازوں میں کسی خاص متعیّن سورت پر مداومت کرنے کو مکروہ لکھتے ہیں تاکہ قرآن کی بقیہ سورتوں کو ترک کرنا لازم نہ آئے حالانکہ حضرت عثمانؓ کا یہ معمول اسکے منافی ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ علماء جو مکروہ لکھتے ہیں اس سے انکی مراد تمام نمازوں میں کسی متعین سورت پر مداومت کرنا ہے اور حضرت عثمانؓ کا جو معمول ثابت ہے وہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ تو صرف فجر کی نماز ہی میں سورہ یوسف بہت کثرت سے پڑھتے تھے تمام نمازوں میں نہیں۔ بعض علماء نے سورہ یوسف کا یہ اثر نقل کیا ہے کہ سورہ یوسف کے پڑھنے پر مداومت کرنا شہادت کی سعادت حاصل ہونے کا سبب ہے جس کا واضح ثبوت خود حضرت عثمانؓ کی ذات گرامی ہے کہ آپ شہید ہوئے۔

(۴۱) وَعَنْ عَامِرِ ابْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ صَلَّيْنَا وَرَاءَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ الصُّبْحَ فَقَرَأَ فِيْهِمَا بِسُوْرَةِ يُوْسُفَ وَسُوْرَةِ الْحَجِّ قِرَاءَةً بَطِيْئَةً قِيْلَ لَهُ اِذًا لَقَدْ كَانَ يَقُوْمُ حِيْنَ يَطْلُعُ الْفَجْرُ قَالَ اَجَلْ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت عامر[2] ابن ربیعہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) ہم نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے پیچھے صبح کی نماز پڑھی۔ انھوں نے دونوں رکعتوں میں سوۂ یوسف اور سوۂ حج کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا۔ کسی نے حضرت عامرؓ سے پوچھا کہ حضرت عمرؓ فجر کے طلوع ہوتے ہی (نماز کے

---

[1] فرافصہؒ مدینہ طیبہ کے رہنے والے اور مشہور تابعی ہیں۔ آپ قبیلہ بنی حنیفہ کی طرف نسبت کی وجہ سے حنفی کہے جاتے ہیں۔

[2] حضرت عامرؓ آل خطاب کے حلیف تھے۔ آپ کی کنیت ابوعبداللہ ہے آپ بدر اور دوسرے غزوات میں شریک رہے اور ۳۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

لئے) کھڑے ہو جاتے ہوں گے؟ (یعنی وہ اول وقت میں نماز شروع کر دیتے ہوں گے کیونکہ اتنی طویل قراءت جب ہی ممکن ہے) انھوں نے فرمایا کہ "ہاں۔" (مالکؒ)

تشریح: فجر کی نماز کے لئے اول وقت کھڑے ہو جانا متفقہ طور پر سب کے نزدیک جائز ہے لہٰذا یہ حدیث جواز پر محمول ہے مختار یعنی اولیت پر نہیں۔ اس لئے کہ اس حدیث سے کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ ہمیشہ اول وقت کھڑے ہوتے تھے۔

(۴۲) وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ مَامِنَ الْمُفَصَّلِ سُوْرَةٌ صَغِيْرَةٌ وَلَا كَبِيْرَةٌ اِلَّا قَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَؤُمُّ بِهَا النَّاسَ فِي الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ مفصل کی کوئی بھی چھوٹی بڑی سورت ایسی نہیں ہے جو میں نے آقائے نامدار ﷺ سے لوگوں کو فرض نماز پڑھاتے وقت نہ سنی ہو۔" (مالکؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے بیان جواز کے طور پر مفصل کی سورتیں مختلف اوقات میں نمازوں میں پڑھ کر لوگوں کو بتادیا کہ نماز میں ہر سورت کا پڑھنا جائز ہے۔

(۴۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ بِحٰمٓ الدُّخَانِ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عتبہ ابن مسعودؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے مغرب کی نماز میں سورہ حم دخان پڑھی ہے اس روایت کو نسائی نے مرسلاً نقل کیا ہے (کیونکہ عبداللہ ابن عتبہ تابعی ہیں)۔"

تشریح: یہاں دونوں ہی احتمال ہیں کہ یا تو آپ ﷺ نے مغرب کی دونوں رکعتوں میں حم دخان پوری سورۃ پڑھی یا پھر یہ کہ اس کا کچھ حصہ تھوڑا تھوڑا دونوں رکعتوں میں پڑھا۔ واللہ اعلم

بَابُ الرُّكُوْعِ
رکوع کا بیان

لغت میں رکوع "کے معنی جھکنا" ہیں اور اصطلاح شریعت میں یہ نماز کا ایک رکن ہے یعنی وہ حالت ہے جب کہ قیام میں قراءت سے فارغ ہو کہ جھکتے ہیں جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس بارہ میں یہ امتیاز اُمت محمدیہ کو ہی حاصل ہے کہ رکوع صرف اسی اُمت کی نماز میں مشروع ہے دوسری اُمتوں کی نمازوں میں مشروع نہیں تھا۔"

رکوع و سجود ٹھیک طریقہ سے ادا کرنا چاہیے

(۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقِيْمُوا الرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ فَوَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَرَاكُمْ مِنْ بَعْدِيْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ راوی ہیں کہ آقاء نامدار ﷺ نے فرمایا "مسلمانو!) رکوع اور سجود ٹھیک طریقہ سے کیا کرو، خدا کی قسم میں تمہیں اپنے پیچھے سے بھی دیکھ لیا کرتا ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اقیموا الرکوع و السجود کا مطلب یہ ہے کہ رکوع و سجود (قاعدہ کے مطابق اور ٹھہر ٹھہر کر نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ کیا کرو۔ ان ارکان کو جلدی جلدی ادا نہ کیا کرو کہ جس سے نہ رکوع ہی پوری طرح ادا ہو اور نہ سجدہ ہی حقیقی معنے میں کہلانے کا مستحق ہو۔

"اپنے پیچھے سے دیکھنے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم لوگ میرے سامنے ہونے کی صورت میں نظر آتے ہو اسی طرح ازراہ معجزہ تم لوگ میرے پیچھے رہنے کی حالت میں بھی میری نظروں میں رہتے ہو اور تمہاری حرکات و سکنات سب پر میری نظر رہتی ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت اچھے طریقہ پر باب صفۃ الصلوۃ کی تیسری فصل میں کی جا چکی ہے۔

(۲) وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ کَانَ رُکُوْعُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ سُجُوْدُہٗ وَ بَیْنَ السَّجْدَتَیْنِ وَ اِذَا رَفَعَ مِنَ الرُّکُوْعِ مَاخَلَا الْقِیَامَ وَالْقُعُوْدَ قَرِیْبًا مِّنَ السَّوَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براء ابن عازب ؓ فرماتے ہیں کہ قیام و قعود کے علاوہ آقائے نامدار ﷺ کا رکوع، سجدہ، دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور رکوع سے سر اٹھانا یہ چاروں چیزیں مقدار میں تقریباً برابر ہوتی تھیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے ارکان نماز کی مقدار اس طرح بیان کی جاری ہے کہ چار ارکان یعنی رکوع، قومہ، سجدہ، اور جلسہ سب آپس میں تقریباً برابر ہوتے تھے البتہ قیام میں چونکہ قراءت کرتے تھے اور قعود میں التحیات پڑھتے تھے اس لئے یہ دونوں ارکان بقیہ ارکان کے مقابلہ میں طویل ہوتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کا قومہ و سجدہ

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ قَامَ حَتّٰی نَقُوْلَ قَدْ اَوْھَمَ ثُمَّ یَسْجُدُ وَیَقْعُدُ بَیْنَ السَّجْدَتَیْنِ حَتّٰی نَقُوْلَ قَدْ اَوْھَمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر (رکوع سے) کھڑے ہوتے تو (اتنی دیر تک ٹھہرے رہتے کہ ہم (اپنے دل میں) کہنے لگتے کہ آنحضرت ؐ نے ایک رکعت چھوڑ دی پھر آپ سجدہ میں جاتے اور دونوں سجدوں کے درمیان اتنی دیر تک بیٹھے رہتے کہ ہم (اپنے دل میں) کہتے کہ آپ ﷺ نے یہ سجدہ چھوڑ دیا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت انس ؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ رکوع سے سر اٹھاتے تو قومہ میں کافی دیر تک کھڑے رہا کرتے تھے یہاں تک کہ بسا اوقات آپ ﷺ کا اتنی دیر تک قومہ میں رہنا ہمیں اس گمان میں مبتلا کر دیتا تھا کہ شاید آنحضرت ﷺ نے اس رکعت کو کہ جس کے رکوع سے آپ ﷺ فارغ ہوئے ہیں ختم کر دیا ہے اور اب از سر نو نماز شروع کر دی ہے اس طرح آپ ﷺ سجدہ سے اٹھ کر دونوں سجدوں کے درمیان جلسہ میں اتنی دیر تک بیٹھے رہتے کہ ہمیں خیال گزرتا کہ شاید آنحضرت ﷺ نے اس سے پہلے سجدہ کو کہ جس سے ابھی آپ ﷺ نے سر اٹھایا ہے ختم کر دیا ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ قومہ و جلسہ میں اتنی طوالت نفل نمازوں میں کرتے ہوں گے اور یہ بھی امکان ہے کہ بیان جواز کی خاطر فرض نمازوں میں بھی کبھی کبھی کر لیتے ہوں گے۔

(۴) وَعَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُکْثِرُ اَنْ یَّقُوْلَ فِیْ رُکُوْعِہٖ وَسُجُوْدِہٖ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ یَتَاَوَّلُ الْقُرْاٰنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ قرآن کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنے رکوع و سجود میں یہ دعا بہت کثرت سے پڑھتے تھے۔ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اے اللہ تو پاک ہے، اے ہمارے پروردگار میں تیری تعریف بیان کرتا ہوں، اے اللہ تو میرے گناہ بخش دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قرآن میں چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ اسْتَغْفِرْہُ یعنی اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ پاکی بیان کرو اور اس سے مغفرت مانگو" اس لئے آنحضرت ﷺ کے اس حکم کی بجا آوری کے لئے رکوع و سجود میں اپنے پروردگار کی

تسبیح و تعریف کرتے اور اس سے مغفرت مانگتے تھے کیونکہ خشوع و خضوع کے تمام مواقع و احوال میں رکوع و سجود ہی افضل ترین مواقع و محل ہیں۔ بعض دوسری احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ رکوع و سجود کے علاوہ بھی اس دعا کا ورد رکھتے تھے چنانچہ بعض احادیث میں مذکور ہے کہ سورہ اذا جاء کہ جس میں یہ آیت مذکور ہے نازل ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ کا آخر عمر میں یہی ذکر تھا۔

⑤ وَعَنْهَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ رُكُوْعِهٖ وَسُجُوْدِهٖ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ اپنے رکوع و سجدہ میں یہ کہا کرتے تھے۔ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ فرشتوں اور روح (یعنی جبرئیل علیہ السلام) کا پروردگار بہت پاک ہے اور نہایت پاک ہے۔" (مسلم)

رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے کی ممانعت

⑥ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَقْرَأَ الْقُرْاٰنَ رَاكِعًا اَوْ سَاجِدًا فَاَمَّا الرُّكُوْعُ فَعَظِّمُوْا فِيْهِ الرَّبَّ وَاَمَّا السُّجُوْدُ فَاجْتَهِدُوْا فِي الدُّعَاءِ فَقَمِنٌ اَنْ يُّسْتَجَابَ لَكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ آقاء نامدار ﷺ نے فرمایا "لوگو خبردار ہو! مجھے اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ میں اس حالت میں رکوع یا حالت سجدہ میں قرآن پڑھوں! لہٰذا تم رکوع میں اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کرو اور سجدہ میں دعا کی پوری پوری کوشش کیا کرو۔ مناسب ہے کہ یہ دعا تمہارے لئے قبول کی جائے۔" (مسلم)

تشریح: بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ یہ نہی تنزیہی ہے اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ نہی تحریمی ہے اور قیاس بھی یہی کہتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نماز کی تمام حالتوں (ہیئتوں) میں سے ہر حالت و ہیئت کو ذکر کی انواع میں سے ہر ایک نوع ذکر کے لئے مقرر کیا ہے مثلاً قیام کو جو کہ نماز کی تمام حالتوں و ہیئتوں میں سب سے زیادہ افضل اور رکن اعظم ہے قرآن پڑھنے کے لئے مقرر کیا ہے جو تمام اذکار میں سے سب سے افضل و اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی جانب سے حالت قیام کو صرف قرآن پڑھنے کے لئے مقرر کرنے کے بعد کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے خلاف کیا جائے اور اگر کوئی اس کا خلاف کرے گا تو وہ یا فعل حرام کا مرتکب ہوگا یا اس کا یہ فعل مکروہ ہوگا۔ اسی طرح دوسرے ارکان کے بارہ میں قیاس کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ میں رکوع و سجود میں قرآن پڑھوں کیونکہ رکوع و سجود اس لئے مقرر کئے گئے ہیں کہ ان میں پروردگار عالم کی بڑائی بیان کی جائے اور دعا مانگی جائے۔"

"رکوع میں بڑائی بیان کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ سبحان ربی العظیم پڑھو۔

سجدہ میں دعا مانگنے کا حکم دیا گیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ دعا کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ دعا کی ایک قسم تو یہ ہوتی ہے کہ پروردگار سے اپنے مطلب و مراد کے لئے درخواست کی جائے اور دعا کی دوسری قسم یہ ہوتی ہے کہ پروردگار کی حمد و ثنا اور تکبیر کی جائے اور اس کے ذکر میں مشغول رہا جائے کیونکہ رحیم و کریم کی تعریف وغیرہ بیان کرنا اور اس کے ذکر میں مشغول رہنا بھی حقیقت میں دعا ہی ہے۔ لہٰذا سجدہ میں کثرت سے دعا کرنے کا جو حکم فرمایا گیا ہے وہ دونوں قسم کی دعاؤں پر شامل ہے اس سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کا ذکر پر اکتفا کرنا اور صریحاً دعا سے منع کرنا بھی دعا کے حکم میں عین بجا آوری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مَنْ شَغَلَهٗ ذِكْرِيْ عَنْ مَسْئَلَتِيْ اَعْطَيْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِي السَّائِلِيْنَ (یعنی جس شخص کو میرے ذکر نے مجھ سے سوال کرنے سے روکا (اس طرح کہ وہ شخص میرے ذکر میں مشغول ہونے کی وجہ سے مجھ سے سوال نہ کر سکا) تو میں اس شخص کو اس چیز سے کہ جو مانگنے والوں کو دیتا ہوں (بہتر (چیز) بخشتا ہوں۔" مگر شرط یہ ہے کہ وہ شخص اس وقت پروردگار کے ذکر میں خلوص دل سے مشغول رہے۔

بعض محققین حنفیہ نے ان دونوں چیزوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ نوافل میں تو صریح دعا مانگنی چاہئے اور فرائض میں صرف تسبیحات پر اکتفاء کرنا چاہئے۔

⑦ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَالَ الْاِمَامُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ فَاِنَّهٗ مَنْ وَّافَقَ قَوْلُهٗ قَوْلَ الْمَلَائِكَةِ غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا۔ جب امام (رکوع سے اٹھتے ہوئے) سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم لک الحمد کہو کیونکہ جس شخص کا یہ کہنا فرشتوں کے کہنے کے ہم آہنگ ہو جائے تو اس کے پہلے کئے ہوئے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس موضوع سے متعلق باب القرائۃ کی پہلی فصل میں اچھی طرح وضاحت کی جا چکی ہے۔ حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یہ عمل اختیار کرے گا تو انشاء اللہ اس وعدہ کے مطابق اس کے تمام صغیرہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ کبیرہ گناہوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر خدا چاہے گا تو انہیں بھی ازراہ فضل و کرم بخش دے گا کیونکہ اس کی ذات بڑی رحیم و کریم اور غفور ہے۔

قومہ کی دعا

⑧ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَفَعَ ظَهْرَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْاَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْاَ الْاَرْضِ وَمِلْاَ مَاشِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیٰؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب رکوع سے اپنی پشت مبارک اٹھاتے تو یہ کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے قبول کیا اس شخص کی حمد کو جس نے اس کی حمد و ثنا کی۔ اے اللہ اور اے ہمارے پروردگار! تیرے ہی لئے تمام تعریف ہے آسمانوں بھر، زمین بھر اور بقدر بھرنے اس چیز کو جس کو تو آسمانوں اور زمینوں کے بعد پیدا کرنا چاہئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حنفیہ کہتے ہیں کہ حدیث میں مذکورہ کلمات میں ربنا لک الحمد کے بعد کے کلمات یعنی ملا السموات سے آخر تک صرف نفل نمازوں میں پڑھنے چاہئیں۔ فرائض میں نہیں۔

⑨ وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَفَعَ ظَهْرَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ قَالَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْاَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْاَ الْاَرْضِ وَمِلْاَ مَاشِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ اَهْلُ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو یہ کہتے تھے "اے اللہ اور اے ہمارے پروردگار! تیرے ہی لئے تمام تعریف ہے آسمانوں بھر زمین بھر اور اس چیز کے بھرنے کے بقدر جس کو تو آسمانوں اور زمین کے بعد پیدا کرنا چاہے۔ اے ہر قسم کی تعریف اور بزرگی کے مستحق تیری ذات اس تعریف سے بالاتر ہے جو بندہ کرتا ہے ہم سب تیرے ہی بندے ہیں۔ اے اللہ! تو نے جو چیز عطا فرمادی ہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس چیز کو تو نے دینے سے روک دیا اس کو کوئی دینے والا نہیں اور دولتمند کو اس کی دولتمندی تیرے عذاب سے کوئی نفع نہیں دیتی (یعنی عذاب سے نہیں بچا سکتی)۔" (مسلمؒ)

⑩ وَعَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّيْ وَرَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا رَفَعَ رَاْسَهٗ مِنَ الرَّكْعَةِ قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقَالَ رَجُلٌ وَّرَاءَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ مَنِ الْمُتَكَلِّمُ اٰنِفًا قَالَ اَنَا قَالَ رَاَيْتُ بِضْعَةً وَّثَلَاثِيْنَ مَلَكًا يَبْتَدِرُوْنَهَا اَيُّهُمْ يَكْتُبُهَا اَوَّلُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت رفاعہ ابن رافعؓ فرماتے ہیں کہ ہم آقائے نامدار ﷺ کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے چنانچہ آپ ﷺ جب رکوع سے سر مبارک اٹھاتے تو سمع اللہ لمن حمدہ (یعنی اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی حمد و ثنا کو قبول کیا جس نے اس کی حمد و ثنا کی) کہتے (ایک دن آپ ﷺ نے جب رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے یہ کلمات کہے تو) ایک شخص نے جو آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا کہا رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ (یعنی اے ہمارے پروردگار! تیرے لئے ہی تعریف اور بہت تعریف ہے (ایسی تعریف) جو (شرک و ریا کی آمیزش سے) پاک اور (کثرت اخلاص و حضوری قلب کی وجہ سے) بابرکت ہے۔ آنحضرت ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ ابھی (ان کلمات کو) کون پڑھ رہا تھا؟ اس شخص نے عرض کیا کہ میں تھا! آپ ﷺ نے فرمایا "میں نے کچھ اوپر تیس فرشتوں کو دیکھا جو آپس میں اس بات میں جلدی کر رہے تھے کہ ان کلمات کے ثواب کو پہلے کون لکھے۔" (بخاریؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

تعدیل ارکان کا حکم اور ائمہ کے مسلک

(۱۱) عَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُجْزِئُ صَلَاةُ الرَّجُلِ حَتّٰى يُقِيْمَ ظَهْرَهُ فِي الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا "کسی شخص کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک کہ وہ رکوع اور سجدہ میں اپنی کمر کو سیدھا نہ کرے۔" (ابوداؤد، ترمذیؒ، نسائیؒ ابن ماجہؒ، دارمیؒ) اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: شرح منیۃ المصلی میں لکھا ہے کہ تعدیل ارکان یعنی رکوع و سجود میں اتنا ٹھہرنا کہ جسم کے تمام اعضاء جوڑ اپنی جگہ آجائیں۔ اس حدیث کی بنا پر حضرت امام شافعیؒ حضرت امام مالک، حضرت امام احمدؒ اور حنفیہ میں حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک فرض ہے اور اس کی ادنیٰ مقدار ایک تسبیح کے بقدر ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک تعدیل ارکان واجب ہے۔

پھر منیۃ المصلی میں یہ بھی لکھا ہے کہ رکوع سے اٹھ کر کھڑے ہونا یعنی قومہ اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا یعنی جلسہ اور طمانینت یہ سب چیزیں بھی حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک فرض اور حضرت امام ابوحنیفہؒ و حضرت امام محمدؒ کے نزدیک سنّت ہیں۔ علامہ ابن ہمامؒ کی رائے یہ ہے کہ قومہ اور جلسہ کے بارہ میں مناسب اور بہتر یہ ہے کہ ان دونوں کو واجب کہا جائے۔ واللہ اعلم

رکوع و سجود کی تسبیحات

(۱۲) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اجْعَلُوْهَا فِيْ رُكُوْعِكُمْ فَلَمَّا نَزَلَتْ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى قَالَ اجْعَلُوْهَا فِيْ سُجُوْدِكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت "فسبح باسم ربک العظیم" نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ اس کو (سبحان ربی العظیم کی صورت میں) اپنے رکوع میں شامل کرلو اور جب یہ آیت "سبح اسم ربک الاعلی" نازل ہوئی تو فرمایا کہ اس کو (سبحان ربی الاعلی کی صورت میں) اپنے سجدوں میں داخل کرلو۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

(۱۳) وَعَنْ عَوْنِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَكَعَ اَحَدُكُمْ فَقَالَ فِيْ رُكُوْعِهٖ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَدْ تَمَّ رُكُوْعُهٗ وَذٰلِكَ اَدْنَاهُ وَاِذَا سَجَدَ فَقَالَ فِيْ سُجُوْدِهٖ سُبْحَانَ رَبِّيَ

الْاَعْلٰی ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَدْ تَمَّ سُجُوْدُہٗ وَذٰلِکَ اَدْنَاہُ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ لَیْسَ اِسْنَادُہٗ بِمُتَّصِلٍ لِاَنَّ عَوْنًا لَمْ یَلْقَ ابْنَ مَسْعُوْدٍ۔

"اور حضرت عون ابن عبداللہ حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی رکوع کرے تو اس رکوع میں سبحان ربی العظیم تین مرتبہ کہنا چاہئے اس کا رکوع پورا ہوگا اور یہ ادنی درجہ ہے اور جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اسے سجدہ میں سبحان ربی الاعلی تین مرتبہ کہنا چاہئے اس کا سجدہ پورا ہوگا اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ عونؒ کی ملاقات ابن مسعودؓ سے ثابت نہیں ہے۔"

تشریح: رکوع و سجود میں اس تسبیحات کو تین مرتبہ کہنا ادنی درجہ کمال سُنّت کا ہے ورنہ تو اصل سُنّت ایک مرتبہ میں ادا ہو جاتی ہے اور کمال سُنّت کا اوسط درجہ پانچ مرتبہ ہے اور اعلی درجہ سات مرتبہ کہنا ہے اور انتہائے کمال کی کوئی حد نہیں ہے گو بعض حضرات نے دس مرتبہ کہا ہے اور بعض حضرات نے تو تقریباً قیام کی مقدار تک کہا ہے لیکن بہر صورت امام کو مقتدیوں کی رعایت لازم ہوگی۔

فنی طور پر اتنی بات بھی سمجھ لیجئے کہ حدیث منقطع کو مستدل بنانا غلط نہیں ہے کیونکہ متفقہ طور پر سب کے نزدیک فضائل اعمال کے سلسلہ میں حدیث منقطع پر بھی عمل کرنا جائز ہے۔

⑭ وَعَنْ حُذَیْفَۃَ اَنَّہٗ صَلّٰی مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَکَانَ یَقُوْلُ فِیْ رُکُوْعِہٖ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ وَفِیْ سُجُوْدِہٖ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی وَمَا اَتٰی عَلٰی اٰیَۃِ رَحْمَۃٍ اِلَّا وَقَفَ وَسَاَلَ وَمَا اَتٰی عَلٰی اٰیَۃِ عَذَابٍ اِلَّا وَقَفَ وَتَعَوَّذَ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَالدَّارِمِیُّ وَرَوَی النَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ اِلٰی قَوْلِہِ الْاَعْلٰی وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت حذیفہؓ راوی ہیں کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھی چنانچہ آپ ﷺ رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلی پڑھتے تھے اور جب بھی آپ ﷺ (قراءت میں) کسی آیت رحمت پر پہنچتے تو وہاں رک جاتے اور طلب رحمت کی دعا کرتے اور جب کسی آیت عذاب پر پہنچتے تو وہاں رک کر عذاب سے پناہ مانگتے۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ، نسائی اور ابن ماجہ نے اس روایت کو سبحان ربی الاعلی تک نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: علماء حنفیہ اور علماء مالکیہ اس حدیث کو آنحضرت ﷺ کی نفل نماز پر محمول کرتے ہیں کیونکہ ان حضرات کے نزدیک فرض نماز میں درمیان قراءت دعا مانگنی اور پناہ مانگنی جائز نہیں ہے لیکن اس حدیث کو جواز پر حمل کرنا بھی ممکن ہے کیونکہ ہو سکتا ہے آنحضرت ﷺ نے کبھی بیان جواز کی خاطر فرض نماز میں بھی ایسا کیا ہو۔ شیخ جزریؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو مسلمؒ نے بھی نقل کیا ہے لہٰذا مؤلف مشکوٰۃ کو یہ حدیث دوسری فصل کی بجائے پہلی فصل میں نقل کرنا چاہئے تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑮ وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ قُمْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا رَکَعَ مَکَثَ قَدْرَ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ وَیَقُوْلُ فِیْ رُکُوْعِہٖ سُبْحَانَ ذِی الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَکُوْتِ وَالْکِبْرِیَاءِ وَالْعَظَمَۃِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت عوف ابن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آقائے نامدار ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھی چنانچہ جب آپ رکوع میں گئے تو بقدر سورہ بقرہ "پڑھنے کے" بقدر ٹھہرے اور (رکوع میں) یہ کہتے جاتے تھے۔ "قہر و بادشاہت اور بڑائی و بزرگی کا مالک (خدا) پاک ہے۔" (نسائیؒ)

تشریح: یہ فرض نماز کا ذکر نہیں ہے بلکہ بعض حضرات کے قول کے مطابق یہ تہجد کی نماز تھی اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ نماز کسوف تھی۔

⑯ وَعَنِ ابْنِ جُبَیْرٍ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسَ ابْنَ مَالِکٍ یَقُوْلُ مَا صَلَّیْتُ وَرَاءَ اَحَدٍ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

أَشْبَهُ صَلاَةً بِصَلاَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا الْفَتٰى يَعْنِي عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ قَالَ قَالَ فَحزَرْنا رُكُوْعَهُ عَشْرَ تَسْبِيْحَاتٍ وَ سُجُوْدَهُ عَشْرَ تَسْبِيْحَاتٍ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس ابن مالکؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "میں نے آقائے نامدار ﷺ کی وفات کے بعد اس نوجوان یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے علاوہ کسی کے پیچھے ایسی نماز نہیں پڑھی جو آنحضرت ﷺ کی نماز کے مشابہ ہو۔" راوی کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے فرمایا "ہم نے ان کے (یعنی آنحضرت ﷺ کے یا حضرت عمرؒ کے، رکوع کا دس تسبیحات (کے بقدر) اور سجدہ کا دس تسبیحات (کے بقدر) اندازہ کیا۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جتنی دیر میں وہ رکوع یا سجدہ کرتے تھے ہم دس تسبیحیں پڑھ لیا کرتے تھے لہٰذا وہ بھی دس یا دس سے کم و بیش تسبیحات پڑھتے ہوں گے۔

⑰ وَعَنْ شَقِيْقٍ قَالَ اِنَّ حُذَيْفَةَ رَأَى رَجُلاً لَا يُتِمُّ رُكُوْعَهُ وَلَا سُجُوْدَهُ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهُ دَعَاهُ فَقَالَ لَهُ حُذَيْفَةُ مَاصَلَّيْتَ قَالَ وَاَحْسِبُهُ قَالَ وَلَوْمُتَّ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ الْفِطْرَةِ الَّتِيْ فَطَرَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (البخاری)

"اور حضرت شقیق فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ (نماز میں) اپنے رکوع و سجود کو پوری طرح ادا نہیں کر رہا تھا چنانچہ جب وہ نماز پڑھ چکا تو حضرت حذیفہؓ نے اسے بلایا اور کہا کہ تم نے پوری (طرح) نماز نہیں پڑھی۔" حضرت شقیق کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے اس شخص سے یہ بھی کہا کہ اگر تم (ایسی نماز سے بغیر توبہ کئے ہوئے) مرجاؤ تو تم غیر فطرت پر (یعنی اس طریقہ اسلام کے خلاف) مرو گے جس پر اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو پیدا کیا۔" (بخاریؒ)

⑱ وَعَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْوَأُ النَّاسِ سَرِقَةً الَّذِيْ يَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِهٖ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِهٖ قَالَ لَا يُتِمُّ رُكُوْعَهَا وَلَا سُجُوْدَهَا۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوقتادہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا چوری کرنے کے اعتبار سے سب سے بڑا چور وہ ہے جو اپنی نماز کی چوری کرے۔" صحابہ نے عرض کیا "یارسول اللہ (ﷺ)! نماز کی چوری کیسے ہوتی ہے"؟ فرمایا "رکوع و سجود کا پورا نہ کرنا۔" (احمدؒ)

تشریح: مال کی چوری کرنے والے سے نماز کی چوری کرنے والا شخص اس لئے برا ہے کہ مال چرانے والا کم سے کم چوری مال سے دنیا میں فائدہ تو اٹھا لیتا ہے اور پھر یہ کہ مالک سے معاف کرنے کے بعد یا سزا کے طور پر (اسلامی قانون کے مطابق) اپنے ہاتھ کٹوا کر وہ مؤاخذہ آخرت سے بچ جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف نماز کی چوری کرنے والا شخص ثواب کے معاملہ میں خود اپنے نفس کا حق مارتا ہے اور اس کے بدلہ میں عذاب آخرت کو لے لیتا ہے لیکن اس نقصان و خسران کے علاوہ اس کے ہاتھ اور کچھ نہیں لگتا۔"

⑲ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ مُرَّةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَاتَرَوْنَ فِي الشَّارِبِ وَالزَّانِيْ وَالسَّارِقِ وَذٰلِكَ قَبْلَ اَنْ تَنْزِلَ فِيْهِمُ الْحُدُوْدُ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ هُنَّ فَوَاحِشُ وَفِيْهِنَّ عُقُوْبَةٌ وَاَسْوَءُ السَّرِقَةِ الَّذِيْ يَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِهٖ قَالُوْا وَكَيْفَ يَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِهٖ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا يُتِمُّ رُكُوْعَهَا وَلَا سُجُوْدَهَا۔ (رواہ مالک و احمد وروی داری نحوہ)

"حضرت نعمان ابن مرہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے (صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا "شراب پینے والے، زنا کرنے والے، اور چوری کرنے والے کے بارہ میں تم لوگوں کا کیا خیال ہے (کہ وہ کس قدر گناہ گار ہیں؟) آپ ﷺ نے یہ سوال حدود نازل ہونے سے پہلے کیا تھا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ گناہ کبیرہ ہیں جن کی سزا بھی ہے اور بدترین چوری وہ چوری ہے جو انسان اپنی نماز میں کرتا ہے۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) انسان اپنی نماز میں چوری کیسے کرتا ہے؟ فرمایا "وہ رکوع و سجود کو پوری طرح ادا نہیں کرتا۔" (مالکؒ، داریؒ)

تشریح: نقل کردہ روایت میں لفظ ترون تا کے زبر کے ساتھ ہے جس کی معنی یہ ہیں کہ تم کیا اعتقاد کرتے ہو؟ لیکن ایک نسخہ میں تا کے پیش کے ساتھ بھی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ راوی کے الفاظ میں یہ سوال حدود نازل ہونے سے پہلے کیا تھا۔ وجہ سوال کو ظاہر کر رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ سوال صحابہؓ سے اس وقت کیا تھا جب کہ ان افعال کی برائی صحابہؓ کو اچھی طرح معلوم نہ تھی جب ان افعال بد کی حدود (سزائیں) متعین ہوگئیں تو پھر سب کے ذہن میں ان کی برائی راسخ ہوگئی اور ان میں کوئی شبہ نہ رہا۔

بَابُ السُّجُوْدِ وَفَضْلِهٖ
سجدہ کی کیفیت اور اس کی فضیلت کا بیان

"زمین پر سر ٹیکنا اور عاجزی کا اظہار کرنا" سجدہ کے لغوی معنی ہیں۔ اصطلاح شریعت میں سجدہ کہتے ہیں "خدا کے سامنے اپنی عبودیت اور کمال عجز و انکساری کے اظہار کے طور پر بندہ کا اپنے سر کو زمین پر ٹیک دینا۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اعضاء سجدہ

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰى سَبْعَةِ اَعْظُمٍ عَلَى الْجَبْهَةِ وَالْيَدَيْنِ وَالرُّكْبَتَيْنِ وَاَطْرَافِ الْقَدَمَيْنِ وَلَا نَكْفُتَ الثِّيَابَ وَلَا الشَّعْرَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "مجھے (جسم کی) سات ہڈیوں یعنی پیشانی، دونوں ہاتھ، گھٹنے اور دونوں پیروں کے پنجوں پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ ممنوع ہے کہ ہم کپڑوں اور بالوں کو سمیٹیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ سجدہ میں جسم کے کس کس عضو کو زمین پر ٹیکنا چاہئے چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ سجدہ کے وقت پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پیروں کے پنجوں کو زمین پر ٹیکنا چاہئے۔

اکثر ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ سجدہ ناک اور پیشانی دونوں سے کرنا چاہئے بغیر ان دونوں کو زمین پر ٹیکے ہوئے سجدہ جائز نہیں ہوتا مگر حضرتِ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور صاحبین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر محض پیشانی ہی ٹیک کر سجدہ کر لیا جائے تو جائز ہے البتہ بغیر کسی عذر کے ایسا کرنا مکروہ ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک محض ناک کو زمین پر ٹیک کر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے ہاں اگر کوئی ایسا عذر پیش ہو کہ پیشانی کو زمین پر ٹیکنا ممکن نہ ہو تو جائز ہے، اس سلسلہ میں حضرت امام اعظمؒ کے دو قول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ جائز نہیں ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ جائز ہے لیکن کراہت کے ساتھ۔

سجدہ میں دونوں پیروں کو زمین پر رکھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص سجدہ میں دونوں پیر زمین سے اٹھالے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور ایک پیر اٹھالے گا تو سجدہ مکروہ ہوگا۔ سجدہ میں پیروں کی انگلیوں کو قبلہ کی طرف رکھنا فرض ہے خواہ ایک ہی انگلی رکھی جائے۔ اگر انگلیاں قبلہ کی سمت نہ ہوں گی تو جائز نہیں ہوگا۔

در مختار میں ایک جگہ مذکور ہے کہ "پیشانی اور دونوں پیروں کے ساتھ سجدہ کرنا فرض ہے اور دونوں پیروں میں کم سے کم ایک انگلی زمین پر رکھنا شرط ہے اور ہاتھوں اور زانوؤں کو زمین پر رکھنا سُنّت ہے، حنفیہ اور شافعیہ کا مسلک یہی ہے۔

سجدہ میں بال اور کپڑے کو ہٹانے اور سمیٹنے کی ممانعت: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ میں جاتے ہوئے بالوں

اور کپڑوں کو اس غرض سے سمیٹنا اور ہٹانا تاکہ وہ خاک آلود اور گندے نہ ہوں ممنوع ہے، ویسے بھی بغیر اس مقصد کے یوں ہی کپڑوں اور بالوں کو سمیٹنا یا دامن وغیرہ کا باندھ لینا ممنوع ہے۔

بالوں کو سمیٹنے کا مطلب یہ ہے کہ سر کے بالوں کو جمع کر کے دستار وغیرہ کے اندر کر لیا جائے تاکہ سجدہ میں لٹکنے نہ پائیں۔ اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ بالوں کو ایسے ہی چھوڑ دینا چاہئے تاکہ وہ بھی سجدہ کریں۔

سجدہ میں طمانینت کا حکم

(۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اعْتَدِلُوْا فِى السُّجُوْدِ وَلَا يَبْسُطْ اَحَدُكُمْ ذِرَاعَيْهِ انْبِسَاطَ الْكَلْبِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "سجدہ میں (اطمینان سے) ٹھہرو! اور تم میں سے کوئی شخص (سجدہ میں) اپنے دونوں ہاتھوں کو کتے کی طرح نہ پھیلائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ میں "اعتدال" یعنی ٹھہرنے سے مراد یہ ہے کہ سجدہ میں طمانینت یعنی خاطر جمعی سے ٹھہرا جائے اور سجدہ میں جو تسبیح پڑھی جاتی ہے اسے اطمینان سے پڑھا جائے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "سجدہ میں اعتدال سے مراد یہ ہے کہ پشت کو ہموار رکھا جائے، دونوں ہاتھ زمین پر رکھے جائیں، کہنیاں زمین سے اوپر اٹھی رہیں اور پیٹ زانوں سے الگ رہے۔

سجدہ میں ہاتھوں اور کہنیوں کو رکھنے کا طریقہ

(۳) وَعَنِ الْبَرَاءِ ابْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَجَدْتَ فَضَعْ كَفَّيْكَ وَارْفَعْ مِرْفَقَيْكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "جب تم سجدہ کرو تو اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھو اور کہنیوں کو زمین سے اونچا رکھو۔" (مسلمؒ)

تشریح: سجدہ میں ہاتھوں کو رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں زمین پر کانوں کے سامنے رکھی رہیں، انگلیاں آپس میں ملی ہوں، اور یہ کہ ہاتھ کھلے رہیں کسی کپڑے وغیرہ کے اندر انہیں چھپانا مکروہ ہے۔

"کہنیوں کو اونچا رکھنے" کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ دونوں کہنیاں زمین سے اونچی رہیں یا پھر یہ کہ دونوں پہلوؤں سے اونچی رہیں۔ بہر صورت یہ حکم خاص طور پر مردوں کے لئے ہے عورتوں اس حکم میں شامل نہیں ہیں کیونکہ عورتوں کو تو سجدہ میں کہنیوں کو زمین پر پہلوؤں سے ملی ہوئی رکھنے کا حکم ہے اس لئے کہ اس طرح جسم کی نمائش نہیں ہوتی اور پردہ اچھی طرح ہوتا ہے۔

(۴) وَعَنْ مَيْمُوْنَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَجَدَ جَافٰى بَيْنَ يَدَيْهِ حَتّٰى لَوْ اَنَّ بَهْمَةً اَرَادَتْ اَنْ تَمُرَّ تَحْتَ يَدَيْهِ مَرَّتْ هٰذَا لَفْظُ اَبِى دَاؤُدَ كَمَا صَرَّحَ فِى شَرْحِ السُّنَّةِ بِاِسْنَادِهٖ وَلِمُسْلِمٍ بِمَعْنَاهُ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَجَدَ لَوْ شَاءَتْ بَهْمَةٌ اَنْ تَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ لَمَرَّتْ۔

"اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ فرماتی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ جب سجدہ میں جاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان اتنا فرق رکھتے تھے کہ اگر بکری کا بچہ آپ ﷺ کے ہاتھوں کے نیچے سے گذرنا چاہے تو گذر سکتا تھا۔" یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں جیسا کہ خود بغوی نے شرح السنۃ میں اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور مسلمؒ نے یہ حدیث بالمعنی نقل کی ہے (جس کے الفاظ یہ ہیں) کہ حضرت میمونہؓ نے فرمایا۔

"آنحضرت ﷺ (اس طرح) سجدہ کرتے تھے کہ اگر بکری کا بچہ آپ ﷺ کے ہاتھوں میں سے نکلنا چاہتا تو نکل جاتا۔"

تشریح: ہاتھوں کے درمیان فرق رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ سجدہ میں اپنے دونوں بازو پہلو سے اور پیٹ اور ران سے الگ رکھتے تھے۔

حدیث میں بکری کے بچہ کے لئے "بھمۃ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ بھمۃ بکری کے اس بچہ کو کہتے ہیں جو بڑا ہو کر اپنے پیروں چلنے لگتا ہے اور جب بکری کے بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت اسے "سخلۃ" کہتے ہیں۔

"ہذا لفظ ابی داؤد" سے مصنف مشکوٰۃ کا مقصد صاحب مصابیح پر اعتراض کرنا ہے کہ اس حدیث کو جس کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔ پہلی فصل میں نقل کرنا نہیں چاہئے تھا کیونکہ پہلی فصل میں تو صرف شیخین یعنی بخاری و مسلم کی روایت کردہ احادیث ہی نقل کی جاتی ہیں۔

⑤ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَالِكِ ابْنِ بُحَيْنَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَجَدَ فَرَّجَ بَيْنَ يَدَيْهِ حَتّٰى يَبْدُوَ بَيَاضُ اِبْطَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مالک ابن بحینہؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ جب سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھوں کو اتنا کشادہ رکھتے تھے کہ آپ کے بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو جاتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بحینہ حضرت عبداللہؓ کی والدہ کا نام ہے اور مالک ان کے والد کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مالک اور ابن کے درمیان کے الف کو باقی رکھ کر مالک کو تنوین کے ساتھ پڑھتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ مالک بحینہ کے بیٹے کا نام ہے بلکہ یہ جانیں کہ بحینہ کے لڑکے حضرت عبداللہ ہی ہیں اور ابن مالک و ابن بحینہ دونوں نسبتیں انہیں کی ہیں۔

بہر حال۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے آنحضرت ﷺ کو جب نماز پڑھتے دیکھا تھا اس وقت آپ ﷺ کے بدن مبارک پر کپڑا نہ تھا، یا ان کی مراد یہ ہوگی کہ آپ ﷺ کی بغل کی جگہ معلوم ہوتی تھی اور "بغلوں کی سفیدی" اس لئے کہا ہے کہ آپ ﷺ کی بغل مبارک بالکل سفید اور صاف و شفاف تھی جیسا کہ آپ ﷺ کا پورا بدن ہی آئینہ کی طرح سفید اور صاف و شفاف تھا، دوسرے لوگوں کی طرح آپ ﷺ کی بغلیں سیاہ اور مکدر نہ تھیں۔

سجدہ میں آنحضرت ﷺ کی دعا

⑥ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ سُجُوْدِهٖ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ كُلَّهٗ دِقَّهٗ وَجُلَّهٗ وَ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ وَعَلَانِيَتَهٗ وَسِرَّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ اپنے سجدہ میں یہ کہتے تھے، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ كُلَّهٗ دِقَّهٗ وَجُلَّهٗ وَاَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ وَعَلَانِيَتَهٗ وَسِرَّهٗ اے اللہ! میرے تمام چھوٹے بڑے، پہلے پچھلے، کھلے ہوئے اور چھپے ہوئے گناہ بخش دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ سجدہ میں کبھی کبھی یہ دعا بھی پڑھا کرتے تھے۔ پھر یہ احتمال بھی ہے کہ یا تو آپ ﷺ اس دعا کو تسبیح یعنی سبحان ربی الاعلی کے ساتھ پڑھتے ہوں گے یا بغیر تسبیح کے صرف اسی دعا پر اکتفاء فرماتے ہوں گے۔

"چھپے ہوئے گناہوں" سے مراد وہ گناہ ہیں جو انسان کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں ورنہ تو خدا کے نزدیک چھپے ہوئے کھلے ہوئے گناہ دونوں یکساں ہیں۔ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى یعنی وہ (خدا) پوشیدہ سے پوشیدہ چیزوں کو بھی جانتا ہے۔

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ فَقَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً مِّنَ الْفِرَاشِ فَالْتَمَسْتُهٗ فَوَقَعَتْ يَدِيْ عَلٰى بَطْنِ قَدَمَيْهِ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوْبَتَانِ وَهُوَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے رحمت عالم ﷺ کو بستر پر موجود نہ پایا، میں آپ ﷺ کو تلاش کر رہی تھی کہ میرا ہاتھ آپ ﷺ کے پیروں کو جا لگا (چنانچہ میں نے دیکھا کا) آپ ﷺ بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز تھے اور آپ ﷺ کے دونوں پیر مبارک کھڑے ہوئے تھے اور آپ ﷺ یہ کہہ رہے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ اے اللہ! میں تیری خوشنودی کے ذریعہ تیرے غیظ و غضب سے (یعنی ان افعال سے جو مجھ پر یا میری اُمت پر تیرے غضب کا ذریعہ بنیں پناہ مانگتا ہوں، تیری معافی کے ذریعہ تیرے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں اور تجھ سے (یعنی تیری رحمت کے ذریعہ تیرے قہر سے) پناہ کا طلبگار ہوں۔ میں تیری تعریف کا شمار و احاطہ نہیں کر سکتا۔ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ خود تو نے اپنی تعریف کی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کے چھونے سے مرد کا وضو نہیں ٹوٹتا جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے کہ عورت کو چھونا ناقص وضو نہیں ہے۔

لا احصي ثناء عليك کا مطلب یہ ہے کہ پروردگار! مجھ میں اتنی طاقت و قوت نہیں ہے کہ تیری ایسی تعریف کر سکوں جو تیری شان کے لائق ہو، تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف میں یہ کہا ہے کہ۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

"تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور پروردگار ہے زمین کا، پروردگار جہانوں کا ہے اور زمین و آسمانوں میں اسی کے لئے بڑائی و بزرگی ہے اور وہ غالب و دانا ہے۔" (قرآن)

سجدہ پروردگار سے قریب ہونے کا ذریعہ ہے

⑧ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْرَبُ مَايَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ فَاَكْثِرُوا الدُّعَاءَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "بندہ کا خدا سے قریب ترین ہونا اس وقت شمار ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہو اس لئے تم (سجدہ میں) بہت زیادہ دعا کیا کرو۔" (مسلمؒ)

تشریح: یوں تو خداوند قدوس ہر وقت اور ہر حال میں اپنے بندوں سے نزدیک رہتا ہے مگر سب سے زیادہ نزدیک اس وقت ہوتا ہے جب بندہ سجدہ میں ہوتا ہے یعنی سجدہ کی حالت میں خدا بندہ سے راضی ہوتا ہے اور دعا قبول کرتا ہے اسی لئے آپ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ سجدہ میں کثرت سے دعا مانگنی چاہئے تاکہ وہ قبولیت کے درجہ کو پہنچے۔

سجدہ تلاوت کے وقت شیطان کی آہ و بکاہ

⑨ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَرَأَ ابْنُ اٰدَمَ السَّجْدَةَ فَسَجَدَ اعْتَزَلَ الشَّيْطَانُ يَبْكِيْ يَقُوْلُ يَاوَيْلَتٰى اُمِرَ ابْنُ اٰدَمَ بِالسُّجُوْدِ فَسَجَدَ فَلَهُ الْجَنَّةُ وَاُمِرْتُ بِالسُّجُوْدِ فَاَبَيْتُ فَلِيَ النَّارُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "جب ابن آدم (یعنی بندۂ مؤمن) سجدہ کی آیت پڑھتا ہے اور (پڑھنے والا یا سننے والا) سجدہ کرتا ہے تو اس وقت شیطان لعین روتا ہوا ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ "واحسرتا! ابن آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا اور (اس کے بدلہ میں) وہ جنت کا حقدار ہے اور مجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو میں نے (سجدہ نہ کر کے پروردگار کی) نافرمانی کی چنانچہ (اس کے نتیجہ میں) مجھے آگ ملی۔" (مسلمؒ)

کثرت سجدہ جنّت میں آنحضرت ﷺ کی رفاقت کا ذریعہ ہے

⑮ وَعَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ كَعْبٍ قَالَ كُنْتُ اَبِيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَيْتُهٗ بِوَضُوْءِهٖ وَحَاجَتِهٖ فَقَالَ لِىْ سَلْ فَقُلْتُ اَسْاَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِى الْجَنَّةِ قَالَ اَوْغَيْرَ ذٰلِكَ قُلْتُ هُوَ ذَاكَ قَالَ فَاَعِنِّىْ عَلٰى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ربیعہؓ ابن کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں رات میں رحمت عالم ﷺ کے ساتھ رہا کرتا تھا اور وضو کا پانی دوسری ضروریات (مثلاً مسواک، جائے نماز وغیرہ) پیش کیا کرتا تھا (ایک روز) سرکار دوعالم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "(دین و دنیا کی بھلائیوں میں سے جو کچھ مانگنا چاہتے ہو) مانگو!" میں نے عرض کیا "میری درخواست تو صرف یہ ہے کہ جنّت میں مجھ کو آپ ﷺ کی رفاقت نصیب ہو۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "(جس مرتبہ کو تم پہنچنا چاہتے ہو یہ تو بہت عظیم ہے اس کے سوا) کچھ اور مانگو۔" میں نے عرض کیا "میری درخواست تو بس یہی ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا "سو اس مرتبہ کو حاصل کرنے کے لئے) تم کثرت سے سجود کے ذریعہ اپنی ذات سے میری مدد کرو۔" (مسلم)

تشریح: ربیعہؓ چونکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی ضروریات پیش کرنے پر معمور تھے۔ اس لئے ان کی اس خدمت اور جذبۂ اطاعت و فرمانبرداری کے صلہ میں آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم دین و دنیا کی جو بھی بھلائی چاہتے ہو مانگ لو۔ ظاہر ہے کہ ایک وفادار خادم اور جاں قربان کرنے والا غلام اس سے بڑی اور کیا تمنا رکھ سکتا ہے کہ اس کا وہ آقا جس کی خدمت نے اس کو دین و دنیا کی عظیم سعادتوں سے نواز رکھا ہے جنّت میں بھی اس کی رفاقت کی سعادت حاصل ہو جائے چنانچہ انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میری سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی خواہش تو بس یہی ہے کہ جس طرح آپ ﷺ نے اس دنیا میں اپنے قدموں میں جگہ دے رکھی ہے اسی طرح جنّت کی پر سعادت فضا میں بھی آپ ﷺ کی رفاقت کا شرف حاصل ہو جائے، پہلے تو آنحضرت ﷺ نے چاہا کہ یہ اس کے علاوہ کچھ اور مانگ لیں مگر جب دیکھا کہ انہیں اپنی اس خواہش پر اصرار ہے تو فرمایا کہ "اس عظیم مرتبے اور اس بڑی سعادت کو حاصل کرنے کے لئے تم کثرت سجود کے ذریعہ اپنی ذات سے میری مدد کرو۔ یعنی اگر تمہارا یہی اصرار ہے اور تم اسی خواہش کی تکمیل چاہتے ہو تو پھر آؤ تم کو میں ایک ایسا راستہ بتا دیتا ہوں جو تمہاری منزل مقصود تک جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہارا اپنا تو کام یہ ہونا چاہئے کہ نماز پڑھتے رہو اور بارگاہ خداوندی میں کثرت سے سجدہ کر کے اپنی عجز و بے چارگی کا اظہار کیا کرو اور سجدہ میں دعا کرتے رہا کرو، ادھر میں بھی تمہارے لئے دعا کرتا ہوں اور حصول مقصد اور تمہاری اس خواہش کی تکمیل کے لئے کوشش کرتا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ میں تمہیں جو بتاؤں یعنی جو حکم دوں اس پر پورا پورا عمل کرتے رہو کہ راہ سعادت حاصل ہونے کی تدبیر یہی ہے اور انشاء اللہ اس کے بعد تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔

فتح قفل ارچہ کلید است اے عزیز جنبش از دست تو می خواہمند نیز

یعنی: عزیز من! قفل اگرچہ کنجی ہی سے کھلتا ہے لیکن تمہارے ہاتھ کی حرکت بھی تو ضروری ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کی خدمت کرنا اور ان کی رضا خوشنودی کو پوری کرنا در حقیقت فضیلت و سعادت کے حصول کا ذریعہ ہے خاص طور پر سرکار دوعالم ﷺ کی رضا کو مدنظر رکھنا تو دین دنیا کی سب سے بڑی سعادت و بھلائی ہے۔

اس حدیث میں اس بات پر تنبیہ بھی ہے کہ طالب صادق کو چاہئے کہ اس کا مطلوب صرف آخرت کی نعمتیں ہوں کہ جن کو دوام و بقاء حاصل ہے دنیا کی لذتوں کی طرف التفات نہ کرے کہ جو فانی اور ختم ہو جانے والی ہیں۔ لیکن شرط یہ بھی ہے کہ بندگی میں اپنی طرف

---

[1] حضرت ربیعہ بن کعب نام اور ابو فراس کنیت ہے۔ آپ سفر و حضر میں حضورؐ کے ساتھ رہے اور ۶۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

سے کوئی قصور نہ ہو کیونکہ محض آرزو اور تمنا ہی منزل مقصود تک نہیں پہنچاتی بلکہ اس میں اپنی طرف سے کوشش و سعی کو بھی دخل ہوتا ہے جیسا کہ بڑوں نے کہا ہے کہ "کسی تمنا اور آرزو کے ہوتے ہوئے کوشش و سعی نہ کرنا بلکہ بیکار بیٹھنا ٹھنڈے لوہے کو کوٹنا ہے۔

کار کن کار بگزار گفتار کاندریں راہ کار دار دکار

یعنی عمل کرو، زبانی جمع خرچ سے بچو، کیونکہ اس راستہ میں تو صرف عمل ہی عمل ہے۔

(۱۱) وَعَنْ مَعْدَانَ بْنِ طَلْحَةَ قَالَ لَقِيْتُ ثَوْبَانَ مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اَخْبِرْنِيْ بِعَمَلٍ اَعْمَلُهُ يُدْخِلُنِيَ اللّٰهُ بِهِ الْجَنَّةَ فَسَكَتَ ثُمَّ سَاَلْتُهُ فَسَكَتَ ثُمَّ سَاَلْتُهُ الثَّالِثَةَ فَقَالَ سَاَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عَلَيْكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ لِلّٰهِ فَاِنَّكَ لَا تَسْجُدُ لِلّٰهِ سَجْدَةً اِلَّا رَفَعَكَ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْكَ بِهَا خَطِيْئَةً قَالَ مَعْدَانُ ثُمَّ لَقِيْتُ اَبَا الدَّرْدَاءِ فَسَاَلْتُهُ فَقَالَ لِيْ مِثْلَ مَا قَالَ لِيْ ثَوْبَانُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت معدان بن طلحہؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ سے ملاقات کی اور ان سے عرض کیا کہ "مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے کہ اس کے کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دے۔ ثوبانؓ (میرا سوال سن کر) خاموش رہے، میں نے دوبارہ عرض کیا وہ پھر بھی خاموش رہے جب میں نے تیسری مرتبہ عرض کیا تو انھوں نے فرمایا کہ "یہی سوال میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے کیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے (میرے سوال کے جواب میں) فرمایا تھا کہ "تم کثرت سے بارگاہ خداوندی میں سجدہ کیا کرو، تم ایک سجدہ خدا کے حضور میں کرو گے تو اس کی وجہ سے خدا تمہارا ایک درجہ بلند کر دے گا اور اس کی وجہ سے ایک گناہ کم کر دے گا۔" معدانؒ کہتے ہیں کہ میں نے پھر حضرت ابودرداءؓ سے ملاقات کی اور ان سے بھی وہی سوال کیا (جو ثوبانؓ سے کیا تھا) چنانچہ انھوں نے بھی مجھے وہی جواب دیا جو ثوبانؓ نے دیا تھا۔" (مسلم)

تشریح: حضرت معدان کے دو مرتبہ سوال کرنے پر بھی حضرت ثوبانؓ نے جواب اس لئے نہیں دیا کہ سائل کو رغبت زیادہ ہو، اور آتش شوق بھڑک کر جواب کی اہمیت و عظمت کا احساس کر سکے اور عملی قوت پوری طرح بیدار ہو جائے۔

سجدوں سے مراد کوئی خاص سجدے نہیں ہیں بلکہ نماز کے سجدے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور سجدہ تلاوت یا سجدہ شکر بھی مراد لئے جا سکتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

سجدہ کرنے کا طریقہ

(۱۲) عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ وَاِذَا نَهَضَ رَفَعَ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد و الترمذی و النسائی و ابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت وائل ابن حجرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ سجدہ کرنے کا ارادہ کرتے تو پہلے اپنے دونوں گھٹنے (زمین پر) ٹیکتے اور پھر دونوں ہاتھ رکھتے اور جب سجدہ سے اٹھنے کا ارادہ کرتے تو پہلے اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے پھر دونوں گھٹنے اٹھاتے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ سجدہ کرتے وقت پہلے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکنے چاہئیں اس کے بعد دونوں ہاتھ رکھے جائیں اسی طرح سجدہ سے اٹھتے وقت پہلے دونوں ہاتھ اور پھر دونوں گھٹنے اٹھانے چاہئیں ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ (سجدہ سے) گھٹنوں کے بل اٹھتے تھے اور اپنے دونوں ہاتھ رانوں پر ٹیکتے تھے۔"

علماء نے اعضاء سجدہ کو زمین پر رکھنے کے سلسلہ میں ایک اصول متعین کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اعضاء سجدہ کو زمین پر ٹیکنا زمین کے قرب کے اعتبار سے ہے یعنی جو عضو میں سے زیادہ قریب ہو اسے پہلے زمین پر رکھا جائے اسی ترتیب سے تمام عضو رکھے جائیں اور سجدہ سے اٹھتے وقت اس کا عکس ہونا چاہئے۔ یعنی جو عضو زمین سے سب سے زیادہ قریب ہو اسے سب سے بعد میں اٹھانا چاہئے۔

زمین پر ناک اور پیشانی ٹیکنے کے سلسلہ میں مسئلہ تو یہ ہے کہ ناک اور پیشانی یہ دونوں عضو کے حکم ہیں کہ دونوں عضو ایک ساتھ زمین پر ٹیکنے چاہئیں لیکن بعض حضرات کا قول یہ بھی ہے کہ ناک زمین سے زیادہ قریب ہے اس لئے پہلے ناک رکھی جائے اس کے بعد پیشانی ٹیکی جائے۔

علامہ شمنیؒ نے فرمایا ہے کہ "سجدہ میں جاتے وقت اگر کسی عذر مثلاً موزہ وغیرہ کی بناء پر گھٹنوں کو دونوں ہاتھوں سے پہلے رکھنا دشوار ہو تو پہلے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک لئے جائیں اس کے بعد دونوں گھٹنے رکھے جائیں۔

⑬ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَجَدَ اَحَدُكُمْ فَلَا یَبْرُكْ كَمَا یَبْرُكُ الْبَعِیْرُ وَلْیَضَعْ یَدَیْهِ قَبْلَ رُكْبَتَیْهِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِیُّ وَالدَّارِمِیُّ قَالَ اَبُوْسُلَیْمَانَ الْخَطَّابِیُّ حَدِیْثُ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ اَثْبَتُ مِنْ هٰذَا وَقِیْلَ هٰذَا مَنْسُوْخٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی جب سجدہ کرے تو وہ اونٹ کے بیٹھنے کی طرح نہ بیٹھے بلکہ اسے چاہئے کہ اپنے دونوں گھٹنے سے پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

اور ابوسلیمان خطابیؒ نے کہا ہے کہ حضرت وائل ابن حجرؓ کی حدیث اس حدیث سے زیادہ (صحیح) ثابت ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔"

تشریح: اونٹ کے بیٹھنے کی طرح نہ بیٹھنے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ زمین پر بیٹھنے کے وقت اپنے دونوں گھٹنے زمین پر پہلے رکھتا ہے۔ اس طرح سجدہ میں جاتے وقت پہلے دونوں گھٹنے زمین پر نہ ٹیکے جائیں۔

آپؐ نے اونٹ کی بیٹھک سے مشابہت دی ہے باوجودیہ کہ اونٹ بیٹھتے وقت زمین پر پاؤں رکھنے سے پہلے ہاتھ رکھتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا گھٹنا پاؤں میں ہوتا ہے اور جانور کا گھٹنا ہاتھ میں ہوتا ہے لہٰذا جب کوئی شخص سجدہ میں جاتے وقت زمین پر پہلے گھٹنے رکھے گا تو اونٹ کے بیٹھنے سے مشابہت ہوگی۔

بہرحال۔ یہ حدیث اوپر کی حدیث کی مخالف ہے کیونکہ پہلی حدیث تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ پہلے گھٹنے زمین پر ٹیکے جائیں اور اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہاتھ زمین پر رکھے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کا یہاں بھی اختلاف ہے چنانچہ جیسا اوپر کی حدیث کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے جمہور علماء حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ اوپر کی حدیث پر جو حضرت وائل ابن حجر سے مروی ہے عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکے جائیں۔

حضرت امام مالکؒ، اوزاعیؒ، اور کچھ دوسرے علماء حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلے زمین پر دونوں ہاتھ ٹیکے جائیں۔

ان دونوں احادیث کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت سے حضرت وائل ابن حجرؓ کی اوپر والی حدیث زیادہ صحیح، قوی تر اور مشہور تر ہے اور حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے اس حدیث کو مرتبہ صحت پر پہنچا کر اسے ترجیح دی ہے اور فن حدیث کا یہ قاعدہ ہے کہ جب دو حدیثیں ایک دوسرے کے مخالف ہوتی ہیں تو عمل قوی تر اور صحیح تر پر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کو حضرت وائل کی روایت سے منسوخ قرار دیا ہے۔

نیز ایک روایت میں حضرت ابن خزیمہؒ سے بھی مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب سجدہ میں جاتے تھے تو (سجدہ کی) ابتدا گھٹنے سے

کرتے تھے یعنی پہلے گھٹنوں کو زمین پر ٹیکتے تھے۔ انہی وجوہات کی طرف مؤلف مشکوٰۃ نے قال ابو سلیمان الخ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

دونوں سجدوں کے درمیان آنحضرت ﷺ کی دعا

⑭ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِيْ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ کہا کرتے تھے کہ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِيْ اے اللہ مجھے بخش دے مجھ پر رحم کر، مجھے ہدایت فرما (دونوں جہاں کی بلاؤں اور امراض ظاہر و باطن سے) مجھے محفوظ رکھ اور مجھے رزق عطا فرما۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

⑮ وَعَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ رَبِّ اغْفِرْلِيْ۔ (رواہ النسائی والدارمی)

"اور حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ کہا کرتے تھے کہ رَبِّ اغْفِرْلِيْ اے میرے پروردگار مجھے بخش دے۔" (نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: اس روایت کو ابن ماجہؒ نے بھی نقل کیا ہے مگر ان کی روایت میں یہ دعائیہ کلمات تین مرتبہ مذکور ہیں یعنی آپ ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا تین مرتبہ پڑھتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جلدی جلدی سجدہ کرنے کی ممانعت

⑯ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ شِبْلٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نَقْرَةِ الْغُرَابِ وَافْتِرَاشِ السَّبُعِ وَاَنْ يُوَطِّنَ الرَّجُلُ الْمَكَانَ فِي الْمَسْجِدِ كَمَا يُوَطِّنُ الْبَعِيْرُ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی)

"حضرت عبدالرحمٰن ابن شبلؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے کوے کی طرح ٹھونگ مارنے اور درندوں کی طرح (ہاتھوں کو) بچھانے سے منع فرمایا ہے اور (اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ) کوئی شخص مسجدوں میں جگہ مقرر کرے جیسا کہ اونٹ مقرر کرتا ہے۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: اس حدیث میں تین چیزوں سے منع کیا جا رہا پہلی تو یہ کہ جس طرح کوا زمین سے دانہ چگنے کے لئے جلدی جلدی چونچ زمین پر مار کر دانہ اٹھاتا ہے اس طرح سجدہ سے سر جلدی جلدی نہ اٹھایا جائے۔ دوسری چیز یہ کہ جانور مثلاً کتے اور بھیڑیئے وغیرہ جس طرح اپنے پنجے زمین پر بچھا کر بیٹھتے ہیں اس طرح سجدہ کے وقت پنجے زمین پر نہ بچھا دیئے جائیں۔ تیسری چیز یہ کہ جس طرح اونٹ اپنے بیٹھنے کی ایک جگہ متعین و مقرر کر لیتا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرا اونٹ اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا اسی طرح مسجد میں کوئی جگہ متعین نہ کی جائے کہ اس جگہ کسی دوسرے کو نہ بیٹھنے دیا جائے کیونکہ مسجد سب کے لئے ہے جو جہاں چاہے بیٹھ سکتا ہے اپنے لئے کسی ایک جگہ کو متعین و مقرر کر کے وہاں دوسرے کو بیٹھنے سے روکنا مکروہ و ممنوع ہے۔

علامہ حلوانیؒ لکھتے ہیں کہ "ہمارے علماء کے نزدیک یہ مکروہ ہے کہ مسجد میں کسی خاص کپڑے کو اس لئے متعین کر لیا جائے کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کپڑے میں نماز پڑھی ہی نہ جائے کیونکہ اس طرح عبادت اس خاص کپڑے کے ساتھ عادت بن جاتی ہے کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کپڑے میں نماز پڑھنا دشواری و گرانی کا باعث بنتا ہے حالانکہ عبادت جب عادت ہو جاتی ہے تو اسے ترک کر دینا

چاہئے چنانچہ اسی وجہ سے ہمیشہ روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ پر اس کو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مسجد میں کسی جگہ کو اپنے لئے متعین کر لینا اور اس جگہ کسی دوسرے کو بیٹھنے سے روکنا شریعت کی نظر میں کوئی مستحسن فعل نہیں ہو سکتا جب کہ اس سے مقصد بھی کوئی اچھا نہ ہو۔

دونوں سجدوں کے درمیان اقعاء ممنوع ہے

(۱۷) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَلِيُّ اِنِّي اُحِبُّ لَكَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِيْ وَ اَكْرَهُ لَكَ مَا اَكْرَهُ لِنَفْسِيْ لَا تُقْعِ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "اے علی! جو چیز میں اپنے لئے محبوب رکھتا ہوں وہ چیز تمہارے لئے بھی محبوب رکھتا ہوں اور جو چیز اپنے لئے ناپسند کرتا ہوں وہ چیز تمہارے لئے بھی ناپسند کرتا ہوں، دونوں سجدوں کے درمیان اقعاء نہ کرو۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس یوں تو پورے عالم ہی کے لئے سراپا رحمت و شفقت تھی مگر آپ ﷺ اپنی اُمت کے لوگوں کے لئے تو بے انتہا شفیق تھے۔ آپ ﷺ کی شفقت و محبت ہی کا یہ اثر تھا کہ آپ ﷺ جس چیز کو اپنے لئے پسند فرماتے تھے۔ وہی چیز اپنی اُمت کے افراد کے لئے بھی پسند فرماتے تھے اور جس چیز کو اپنے لئے ناپسند سمجھتے اسے اپنی اُمت کے لوگوں کے لئے بھی ناپسند سمجھتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے اسی جذبہ کا اظہار حضرت علیؓ سے فرمایا اور یہ ظاہر کر دیا کہ چونکہ میں دونوں سجدوں کے درمیان اقعاء کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا اس لئے تمہارے اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی مجھے یہ چیز پسند نہیں ہے اس لئے اس سے بچو۔

اقعاء کی تحقیق: اقعاء کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح بیٹھا جائے کہ کولہے زمین پر لگے ہوئے ہوں اور رانیں اور پنڈلیاں کھڑی ہوں اور ہاتھ زمین پر رکھے ہوں جس طرح کتا زمین پر بیٹھتا ہے۔ اقعاء کے صحیح معنی تو یہی ہیں البتہ بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ کہا ہے کہ دونوں سجدوں کے درمیان پیر کے پنجوں کو کھڑا کر کے ایڑیوں پر بیٹھا جائے۔ ان کے علاوہ علماء نے اور بھی کئی معنی لکھے ہیں۔ بہر حال اقعاء کی جو بھی شکل اختیار کی جائے۔ دونوں سجدوں کے درمیان اسے اختیار کرنا متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک مکروہ ہے۔

رکوع میں کمر سیدھی کرنا چاہئے

(۱۸) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ الْحَنَفِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى صَلَاةِ عَبْدٍ لَا يُقِيْمُ فِيْهَا صُلْبَهٗ بَيْنَ خُشُوْعِهَا وَ سُجُوْدِهَا۔ (رواه احمد)

"اور حضرت طلق ابن علی حنفیؓ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا "اللہ بزرگ و برتر اس بندہ کی نماز کی طرف نہیں دیکھتا جو اپنی نماز کے سجود و رکوع میں اپنی کمر سیدھی نہیں کرتا۔" (احمدؒ)

تشریح: بارگاہ خداوندی میں وہی نماز مقبولیت کے درجہ کو پہنچتی ہے جس کے تمام ارکان پوری طرح ادا کئے جاویں اگر کوئی رکن اپنے قواعد و آداب کے مطابق درست نہیں ہوتا تو نماز قبولیت کے درجہ کو نہیں پہنچتی چنانچہ رکوع و سجود چونکہ نماز کے اہم ترین رکن ہیں اس لئے ان میں اگر نقص رہ جاتا ہے تو گویا پوری نماز ناقص رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ نماز اتمام و کمال کے مرتبہ کو نہیں پہنچتی لہٰذا اس حدیث کے ذریعہ تنبیہ کیا جارہا ہے کہ رکوع و سجود (کو پوری) احتیاط کے ساتھ ادا کرنا چاہئے یعنی پہلے رکوع و سجود سے اٹھنے کے بعد کمر کو اچھی طرح سیدھا کر لینا چاہئے اس کے بعد دوسرا رکوع و سجدہ کیا جائے اگر ایسا نہیں کیا جائے گا بلکہ پہلے رکوع و سجدہ سے اٹھ کر کمر کو سیدھی کئے بغیر دوسرے رکوع و سجدہ میں جلدی جلدی جائے گا تو وہ رکوع سجود ادا کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا اس کی نماز کی طرف خداوند قدوس نظر بھی نہیں کرے گا یعنی اسے قبول نہیں کرے گا۔

دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں

(۱۹) وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يَقُوْلُ مَنْ وَضَعَ جَبْهَتَهُ بِالْاَرْضِ فَلْيَضَعْ كَفَّيْهِ عَلَى الَّذِيْ وَضَعَ عَلَيْهِ جَبْهَتَهُ ثُمَّ اِذَا رَفَعَ فَيَرْفَعُهُمَا فَاِنَّ الْيَدَيْنِ تَسْجُدَانِ كَمَا يَسْجُدُ الْوَجْهُ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت نافعؒ راوی ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "جو شخص اپنی پیشانی زمین پر رکھے (یعنی سجدہ کرے) تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو بھی زمین پر وہیں رکھے جہاں پیشانی رکھی ہے پھر جب (سجدہ سے) اٹھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو بھی اٹھائے کیونکہ جس طرح چہرہ سجدہ کرتا ہے اسی طرح دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں۔" (مالکؒ)

تشریح: نمازی جب سجدہ میں جاتا ہے تو صرف اس کی پیشانی اور ناک ہی سجدہ میں نہیں جاتی بلکہ اس کا ہر عضو بارگاہ خداوندی میں جھکتا ہے اور سجدہ کرتا ہے اسی لئے فرمایا جارہا ہے کہ سجدہ کے وقت ہاتھوں کو بھی زمین پر پیشانی رکھنے کی جگہ یعنی پیشانی کے برابر رکھنے چاہئیں تاکہ ہاتھوں کا سجدہ بھی پورا ہو جائے۔

سجدہ میں دونوں ہاتھ کہاں رکھے جائیں؟: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سجدہ میں دونوں ہاتھوں کو پیشانی کے برابر رکھا جائے۔ چنانچہ حنفیہ کا مختار مسلک بھی یہ ہے شوافع کا مختار مسلک یہ ہے کہ سجدہ میں دونوں ہاتھ مونڈھوں کے برابر رکھے جائیں۔

حدیث کے الفاظ فَلْيَضَعْ كَفَّيْهِ عَلَى الَّذِيْ الخ کا مطلب صحیح طور پر تو یہی ہے کہ دونوں ہاتھ پیشانی کے برابر رکھے جائیں لیکن اس کے یہ معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں کہ دونوں ہاتھوں کو بھی زمین پر اسی طرح رکھے جس طرح پیشانی رکھی ہے یعنی قبلہ رخ رکھے۔ واللہ اعلم

بَابُ التَّشَهُّدِ

تشہد کا بیان

شہادت کے معنی گواہی دینا اور ایسی سچی خبر دینا کہ اس میں دل زبان کے ساتھ ہو یعنی جو خبر زبان سے دی جائے وہی دل میں بھی ہو۔ "تشہد" کہتے ہیں گواہ ہونے کو اس علم کے اظہار کرنے کو جو دل میں ہے۔

اصطلاح شریعت میں تشہد اشهد ان لا الٰه الا الله و اشهد ان محمداً رسول الله کو اور اس ذکر کو جو قعدۂ نماز میں پڑھا جاتا ہے کہتے ہیں۔ گویا التحیات کو تشہد اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس میں شہادتین کا کلمہ بھی پڑھا جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

التحیات میں ہاتھوں کو رکھنے کا طریقہ

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَعَدَ فِي التَّشَهُّدِ وَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى رُكْبَتِهِ الْيُسْرٰى وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى رُكْبَتِهِ الْيُمْنٰى وَعَقَدَ ثَلَاثَةً وَّخَمْسِيْنَ وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ كَانَ اِذَا جَلَسَ فِي الصَّلٰوةِ وَضَعَ يَدَيْهِ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ وَرَفَعَ اِصْبَعَهُ الْيُمْنٰى الَّتِيْ تَلِي الْاِبْهَامَ يَدْعُوْبِهَا وَيَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى رُكْبَتِهِ بَاسِطَهَا عَلَيْهَا۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب تشہد (یعنی التحیات) میں بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر رکھتے اور اپنا داہنا ہاتھ اپنے داہنے گھٹنے پر رکھتے تھے اور اپنا (داہنا) ہاتھ مثل عدد ترپّن کے بند کر کے شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔

اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب آپ ﷺ نماز (کے قعدہ) میں بیٹھتے تو دونوں ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں پر رکھ لیتے تھے اور داہنے ہاتھ کی اس انگلی کو جو انگوٹھے کے قریب ہے (یعنی شہادت کی انگلی کو) اٹھاتے اور اس کے ساتھ دعا مانگتے (یعنی) اس کو اٹھا کر اشارہ وحدانیت کرتے) اور بایاں ہاتھ اپنے زانو پر کھلا ہوا رکھتے۔" (مسلم)

تشریح: "مثل عدد ترپین" کا مطلب یہ ہے کہ اہل حساب گنتی کے وقت انگلیوں کے جس طرح بند کرتے جاتے ہیں کہ انہوں نے ہر انگلی کو ایک عدد متعین کے لئے مقرر کیا ہوا ہے کہ انہیں اکائیوں کے لئے یہاں رکھا جائے اور دائی، سیکڑہ اور ہزار کے لئے فلاں فلاں جگہ۔ لہٰذا راوی کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شہادت کی انگلی کو اشارہ کے لئے اٹھاتے وقت بقیہ انگلیوں کو اس طرح بند کیا جس طرح ترپین کے عدد کے لئے انگلیوں کو بند کرتے ہیں اور صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ چھنگلیا، اس کے قریب والی انگلی اور بیچ کی انگلی کو بند کر لیا جائے۔ شہادت کی انگلی کھلی رکھی جائے اور انگوٹھے کے سرے کو شہادت کی انگلی کی جڑ میں رکھا جائے۔ یہ عدد ترپین (۵۳) کہلاتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور ایک روایت کے مطابق حضرت امام احمدؒ نے اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے۔

حنفیہ کے نزدیک شہادت کی انگلی اٹھانے کا طریقہ: ابھی آپ نے عقد ترپین کی وضاحت پڑھی اسی طرح ایک عدد تسعین (۹۰) ہوتا ہے اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ چھنگلیا اور اس کے قریب والی انگلی کو بند کر لیا جائے اور شہادت کی انگلی کو کھول دیا جائے اور انگوٹھے کا سرا بیچ کی انگلی کے سرے پر رکھ کر حلقہ کی شکل دے دی جائے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ شہادت کی انگلی اٹھانے کے لئے یہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اور حضرت امام احمدؒ کا ایک قول بھی یہی ہے نیز حضرت امام شافعیؒ کا قول قدیم بھی یہی ہے اور یہی طریقہ آگے آنے والی مسلمؒ کی روایت سے بھی ثابت ہے جو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے مروی ہے، اسی طرح احمدؒ، و ابوداؤدؒ نے بھی حضرت وائل ابن حجرؓ سے نقل کیا ہے۔

حضرت امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ داہنے ہاتھ کی تمام انگلیاں بند کر لی جائیں اور شہادت کی انگلی کھلی رکھی جائے۔

بعض احادیث میں انگلیوں کو بند کئے بغیر شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا بھی ثابت ہے چنانچہ بعض حنفی علماء کا مختار مسلک یہی ہے، اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ کا عمل بھی مختلف رہا ہوگا کہ آپ ﷺ کبھی تو اشارہ بغیر عقد کے کرتے ہوں گے اور کبھی عقد کے ساتھ کرتے ہوں گے۔ اسی بنا پر ان مختلف احادیث کی توجیہہ کہ جن سے یہ دونوں طریقے ثابت ہوتے ہیں یہی کی جاتی ہے۔

ماوراء النہر (یعنی بخارا و سمرقند وغیرہ) اور ہندوستان[1] کے حنفیہ نے اس عمل عقد و اشارت (یعنی داہنے ہاتھ کی انگلیوں کو بند کر کے شہادت کی انگلی کو اٹھانے) کو ترک کیا ہے، گو متقدمین کے یہاں یہ عمل جاری تھا مگر متاخرین نے اس میں اختلاف کیا ہے لیکن حرمین اور عرب کے دوسرے شہروں کے علماء کے نزدیک مختار مسلک عمل عقد و اشارت کرنا ہی ہے۔

علامہ شیخ ابن الہمامؒ نے جن کا شمار محققین حنفیہ میں ہوتا ہے فرمایا ہے کہ "اول تشہد (التحیات) میں شہادتین تک تو ہاتھ کھلا رکھنا چاہئے اور تہلیل کے وقت انگلیوں کو بند کر لینا چاہئے نیز (شہادت کی انگلی سے) اشارہ کرنا چاہئے۔" موصوف لکھتے ہیں کہ "اشارہ کرنے کو منع کرنا روایت اور درایت کے خلاف ہے۔"

محیط میں مذکور ہے کہ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو اٹھانا حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک سُنّت ہے اور حضرت امام ابویوسف سے بھی اسی طرح ثابت ہے۔ علامہ نجم الدین زاہدیؒ فرماتے ہیں کہ "ہمارے علماء کا متفقہ طور پر یہ قول ہے کہ عمل اشارت سُنّت ہے۔"

لہٰذا جب صحابہ کرام تابعین، ائمہ دین، محدثین عظام، فقہائے اُمت اور علماء کوفہ و مدینہ سب ہی کا مذہب و مسلک یہ ہے کہ التحیات

---

[1] ممکن ہے کہ صاحب مظاہر حق علامہ نواب قطب الدین کے زمانہ میں عمل عقد و اشارت کے ترک کے قائل ہوں مگر اب تو سب حنفی اس کے قائل ہیں۔

میں شہادتین کے وقت دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو اٹھانا یعنی اشارہ وحدانیت کرنا چاہئے اور یہ کہ اس کے ثبوت میں بہت زیادہ احادیث اور اقوال صحابہؓ وارد ہیں تو پھر اس پر عمل کرنا ہی اولیٰ وارجح ہوگا۔

اشارہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب کلمۂ شہادت پر پہنچے تو شافعیہ کے نزدیک الا اللہ کہتے وقت شہادت کی انگلی اٹھالی جائے اور حنفیہ کے نزدیک جس وقت لا الٰہ کہے تو انگلی اٹھائے اور جب الا اللہ کہے تو انگلی رکھ دے۔ اس سلسلہ میں اتنی بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ انگلی سے اوپر کی جانب اشارہ نہ کیا جائے تاکہ جہت کا وہم پیدا نہ ہو جائے۔

حدیث کے الفاظ "یدعو بھا" (اس کے ساتھ دعا مانگتے) کا مطلب یہی ہے کہ: آپ ﷺ شہادت کی انگلی اٹھا کر اشارہ وحدانیت کرتے جس کی طرف ترجمہ میں یہ بھی اشارہ کر دیا گیا ہے یا پھر دعا سے مراد ذکر ہے کہ ذکر کو دعا بھی کہتے ہیں کیونکہ ذکر کرنے والا بھی مستحق انعام و اکرام ہوتا ہے۔

حدیث کے آخری جملہ "بایاں ہاتھ اپنے زانو پر کھلا ہوا رکھتے تھے" کا مطلب یہ ہے کہ بائیں ہاتھ کو زانو کے قریب یعنی ران پر کھلا ہوا قبلہ رخ رکھتے تھے۔

(۲) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَیْرِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَعَدَ یَدْعُوْ وَضَعَ یَدَهُ الْیُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْیُمْنٰى وَیَدَهُ الْیُسْرٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْیُسْرٰى وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ وَوَضَعَ اِبْهَامَهُ عَلٰى اِصْبَعِهِ الْوُسْطٰى وَیُلْقِمُ كَفَّهُ الْیُسْرٰى رُكْبَتَهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب (نماز میں التحیات پڑھنے کے لئے) بیٹھتے تو اپنے دائیں ہاتھ کو اپنی دائیں ران پر اور اپنے بائیں ہاتھ کو اپنی بائیں ران پر رکھتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے اور اپنے انگوٹھے کو اپنی بیچ کی انگلی پر رکھتے (یعنی اس طرح حلقہ بنا لیتے تھے) اور آپ ﷺ (کبھی) اپنے بائیں ہاتھ سے بایاں گھٹنا پکڑ لیتے۔" (مسلم)

تشریح: جیسا کہ ابھی پہلے بتایا جا چکا ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ التحیات میں کلمۂ شہادت پڑھتے وقت دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اٹھاتے وقت یہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ چھنگلیا اور اس کے قریب والی انگلی کو بند کر لیا جائے اور انگوٹھے کے سرے کو بیچ کی انگلی کے سرے پر رکھ کر حلقہ بنا لیا جائے اور شہادت کی انگلی اٹھالی جائے۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک التحیات پڑھنے کے لئے بیٹھتے وقت ہی اس طرح حلقہ بنا لینا چاہئے لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ حلقہ انگلی اٹھاتے وقت ہی بنانا چاہئے۔

(۳) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنَّا اِذَا صَلَّیْنَا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قُلْنَا السَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ قَبْلَ عِبَادِهِ اَلسَّلَامُ عَلٰى جِبْرِیْلَ اَلسَّلَامُ عَلٰى مِیْكَائِیْلَ اَلسَّلَامُ عَلٰى فُلَانٍ فَلَمَّا انْصَرَفَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَقْبَلَ عَلَیْنَا بِوَجْهِهٖ قَالَ لَا تَقُوْلُ السَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّلَامُ فَاِذَا جَلَسَ اَحَدُكُمْ فِی الصَّلٰوةِ فَلْیَقُلِ التَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِیْنَ فَاِنَّهُ اِذَا قَالَ ذٰلِكَ اَصَابَ كُلَّ عَبْدٍ صَالِحٍ فِی السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ ثُمَّ لِیَتَخَیَّرْ مِنَ الدُّعَاءِ اَعْجَبَهُ اِلَیْهِ فَیَدْعُوْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم سرور کائنات ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے تو (قعدہ میں التحیات کی بجائے) یہ پڑھا کرتے تھے۔ اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ قَبْلَ عِبَادِهِ اَلسَّلَامُ عَلٰى جِبْرَئِیْلَ اَلسَّلَامُ عَلٰى مِیْكَائِیْلَ اَلسَّلَامُ عَلٰى فُلَانٍ اللہ پر سلام ہے، اس کے بندوں پر سلام بھیجنے سے پہلے، جبرئیل پر سلام ہے میکائیل پر سلام ہے اور فلاں (یعنی فرشتوں میں سے کسی فرشتے پر یا انبیاء میں سے کسی نبی پر سلام ہے۔" چنانچہ (ایک دن) جب آنحضرت ﷺ (نماز پڑھ کر) فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "اللہ پر سلام"

نہ کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ (تو خود) سلام ہے (یعنی پرودگار کی ذات تمام آفات و نقصانات سے محفوظ و سالم ہے وہ بندوں کو تمام ظاہری و باطنی آفات و نقصانات سے سلامتی دیتا ہے اور چونکہ اس کے لئے اور اس کی طرف سے سلامتی ثابت ہے اس لئے سلامتی کے لئے دعا تو اس کے لئے کرنی چاہئے جس کو نقصانات و آفات کا خوف ہو اور جو اس کی سلامتی کا محتاج ہو) لہٰذا جب تم میں سے کوئی نماز (کے قعدہ) میں بیٹھے تو یہ کہے اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ سب تعریفیں اور بدنی عبادتیں (یعنی نماز وغیرہ اور مالی عبادتیں (یعنی زکوٰۃ وغیرہ) اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اے نبی ﷺ تم پر سلام اور اللہ کی برکتیں ہوں۔ ہم پر بھی سلام اور اللہ کے سب نیک بندوں پر سلام۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص ان کلمات کو کہتا ہے تو اس کی برکت زمین و آسمان کے ہر نیک بندے کو پہنچتی ہے۔ (اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کلمات کو شہادتین پر ختم فرمایا جو تمام اعمال کی اصل اور خلاصہ ہے۔ چنانچہ فرمایا)۔ " اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ " میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ " (پھر فرمایا) اس کے بعد بندہ کو جو دعا اچھی لگے اسے اختیار کرے اور خدا کے سامنے دست سوال دراز کرے۔ " (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ کو معراج حاصل ہوئی اور آپ ﷺ بارگاہ خداوندی میں باریاب ہوئے تو اللہ جل شانہ کی تعریف میں آپ ﷺ نے یہ کلمات فرمائے:

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ۔

"تمام تعریفیں اور مالی و بدنی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔"

اس کے جواب میں بارگاہ الوہیت سے فرمایا گیا۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔

"اے نبی تم پر سلام اور اللہ کی برکتیں و رحمتیں!۔"

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

علینا و علی عباد اللہ الصالحین۔

"ہم پر بھی سلام اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی سلام۔"

تب جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ:

اشهد ان لا اله الا اللّٰه و اشهد ان محمدا عبده و رسوله۔

"میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔"

بہر حال السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحیں میں "نیک بندوں" کی قید لگا کر اس طرح اشارہ کر دیا گیا ہے کہ بد بخت و بدکار بندوں پر سلام بھیجنا یا ان کو سلام کہنا مناسب نہیں ہے۔ اس کی سعادت کے حقدار اور لائق تو وہی بندے ہیں جو اپنے عقیدۂ و فکر اور اعمال و کردار کے اعتبار سے خدا اور خدا کے رسول کی نظر میں پسندیدہ ہیں جنہیں "صالح" کہا جاتا ہے اور "بندہ صالح" وہی ہے جو حقوق اللہ و حقوق العباد دونوں کی رعایت کو مد نظر رکھتا ہے اور دونوں کو پورا کرتا ہے۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا ہے کہ "صلاح" دراصل اس حالت کا نام ہے جس میں بندہ کے ذاتی و نفسانی ارادے و خواہشات موت کے گھاٹ اتر جائیں اور اللہ تعالیٰ کی مراد و مقصد پر قائم رہے (جس کی وجہ سے وہ بندہ صالح کہلانے کا مستحق ہو) لہٰذا بندہ کو

چاہئے کہ وہ پروردگار کی رضا و خواہش پر اس کیفیت کے ساتھ راضی اور اپنے تمام امور کو خداوند عالم کی طرف اس طرح سونپنے والا ہو جائے جیسا کہ نومولود بچہ دایہ کے ہاتھ میں یا میت نہلانے والوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

علماء کہتے ہیں کہ "جب بندہ اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے اور اس کا جذبہ بندگی و اطاعت اس قدر لطیف و پاکیزہ ہو جاتا ہے تو وہ یقینی طور پر تمام دنیاوی و جسمانی اور نفسانی آفات اور بلاؤں سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔

آخر میں۔ اتنی بات اور سمجھتے چلئے کہ التحیات کو دونوں قعدوں میں پڑھنا چاہئے اور یہ کہ درمیان کا قعدہ (یعنی جب دو رکعتوں کے بعد بیٹھتے ہیں) واجب ہے اور آخری قعدہ (جس میں سلام پھیرا جاتا ہے) فرض ہے۔

(۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ فَكَانَ يَقُوْلُ اَلتَّحِيَّاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوٰتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَلَمْ اَجِدْ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَلَا فِي الْجَمْعِ بَيْنَ الصَّحِيْحَيْنِ سَلَامٌ عَلَيْكَ وَسَلَامٌ عَلَيْنَا بِغَيْرِ اَلِفٍ وَلَامٍ وَلٰكِنْ رَوَاهُ صَاحِبُ الْجَامِعِ عَنِ التِّرْمِذِيِّ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جس طرح ہمیں قرآن کی کوئی سورۃ سکھاتے تھے اسی طرح تشہد سکھایا کرتے تھے چنانچہ کہا کرتے تھے کہ اَلتَّحِيَّاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوٰتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ تمام بابرکت تعریفیں اور تمام مالی و بدنی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں، اے نبی ﷺ! تم پر سلام اور اللہ کی برکت و رحمتیں" ہم پر بھی سلام اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔"

(مسلم)

اور مؤلف مشکوۃ فرماتے ہیں کہ میں نے نہ تو صحیحین (یعنی بخاری و مسلم میں) اور نہ جمع بین صحیحین میں لفظ "سلام علیک" اور "سلام علینا" بغیر الف لام کے پایا ہے البتہ اس طرح اس کو صاحب جامع الاصول نے ترمذی (کے حوالہ) سے نقل کیا ہے۔

تشریح: اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے تشہد یعنی التحیات کے جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں اس پر حضرات شافعیہ عمل کرتے ہیں اور التحیات میں انہیں الفاظ کو پڑھتے ہیں لیکن حنفیہ حضرات کے یہاں حضرت ابن مسعودؓ کے روایت کردہ تشہد کے الفاظ پر جو اس سے پہلے روایت میں گذرے ہیں عمل کیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے روایت کردہ تشہد کے بارہ میں محدثین صراحت کرتے ہیں کہ یہ صحیح تر ہے۔

چنانچہ حضرت علامہ ابن حجر شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "تشہد کے سلسلہ میں جتنی احادیث مروی ہیں ان سب میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت کردہ حدیث سب سے زیادہ صحیح تر ہے۔

حضرت امام احمدؒ بھی ابن مسعودؓ کی حدیث پر عمل کرتے ہیں اور صحابہ و تابعین میں اکثر اہل علم کا معمول بھی انہیں کی حدیث کے مطابق تھا۔ پھر یہ کہ خود آنحضرت ﷺ کے بارہ میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ابن مسعودؓ کے روایت کردہ تشہد کے لئے حکم فرمایا تھا کہ اسے لوگوں کو سکھایا جائے، چنانچہ مسند امام احمد ابن حنبلؒ میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابن مسعودؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ اسی تشہد کو لوگوں کو سکھائیں۔

ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ "آنحضرت ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور آپ ﷺ جس طرح مجھے قرآن کی تعلیم دیتے تھے اسی طرح آپ ﷺ نے مجھے (یہ) تشہد سکھایا۔

پھر حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ کی روایتوں میں یہ بھی بڑا فرق ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کو تو بخاری و مسلم دونوں نے نقل کیا ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کو صرف مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت امام مالکؒ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے وہ تشہد اختیار فرمایا ہے جو حضرت عمرؓ سے منقول ہے یعنی اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ الذاکیات للّٰہ الطیبات للّٰہ السلام علیک ایھا النبی الخ۔

بہر حال علماء لکھتے ہیں کہ یہ پوری بحث صرف اولیت و افضلیت سے متعلق ہے یعنی حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک حضرت ابن مسعودؓ سے مروی تشہد پڑھنا افضل ہے اور حضرت امام شافعیؒ کے ہاں حضرت ابن عباس سے مروی تشہد پڑھنا افضل ہے۔ لیکن جہاں تک جواز کا سوال ہے تو مسئلہ یہ ہے کہ ان میں سے جو تشہد بھی چاہے پڑھ لیا جائے جائز ہوگا۔

روایت کے آخری الفاظ ولم اجد الخ سے دراصل مولف مشکوٰۃ، صاحب مصابیح پر ایک اعتراض کر رہے ہیں وہ یہ کہ صاحب مصابیح نے ابن عباسؓ سے مروی تشہد میں "سلام علیک" اور "سلام علینا" کو بغیر الف لام کے ذکر کیا ہے۔ حالانکہ اس طرح یہ روایت بخاری و مسلم میں منقول نہیں لہٰذا صاحب مصابیح کا اس روایت کو پہلی فصل میں ذکر کرنا صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اشارہ کے وقت شہادت کی انگلی کو متحرک رکھنا

(۵) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثُمَّ جَلَسَ فَافْتَرَشَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُسْرٰى وَحَدَّ مِرْفَقَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَقَبَضَ ثِنْتَيْنِ وَحَلَّقَ حَلْقَةً ثُمَّ رَفَعَ اِصْبَعَهُ فَرَأَيْتُهُ يُحَرِّكُهَا يَدْعُوْبِهَا۔ (رواہ ابوداؤد والدارمی)

"حضرت وائل ابن حجرؓ فرماتے ہیں کہ "پھر سرور کائنات ﷺ (سجدہ سے سر اٹھا کر اس طرح) بیٹھے (کہ) اپنا بایاں پیر تو بچھا لیا اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا اور دائیں ران پر دائیں کہنی الگ رکھی (یعنی کہنی کو ران پر رکھتے وقت اسے پہلو سے نہیں ملایا) اور دونوں انگلیاں (یعنی چھنگلیا اور اس کے قریب والی انگلی) بند کر کے (حنفیہ کے مسلک کے مطابق درمیان کی انگلی اور انگوٹھے کا) حلقہ بنایا پھر آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی اٹھائی اور میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ اس انگلی کو حرکت دیتے تھے اور اس سے اشارہ (توحید) کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: یہ حدیث ایک مسلسل حدیث کا ٹکڑا ہے جس میں آنحضرت ﷺ کی تمام نماز کی تفصیل ذکر کی گئی ہے چونکہ اس موقع پر موضوع کی رعایت کے پیش نظر جلسہ کی کیفیت ذکر کرنی مقصود تھی اس لئے ثُمَّ جَلَسَ سے اس ٹکڑے کو ذکر کیا گیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ شہادت کی انگلی کو اٹھا کر اسے متحرک رکھنا چاہئے چنانچہ حضرت امام مالکؒ کا مسلک یہی ہے کہ اشارہ کے وقت گلی کو ہلاتے رہنا چاہئے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے یہاں انگلی کو متحرک نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ اس کے بعد کی حدیث نے لا یتحرکھا کہہ کر صراحت کے ساتھ اس فعل سے منع کر دیا ہے۔

جہاں تک اس حدیث کے الفاظ کا تعلق ہے تو کہا جائے گا کہ یہاں "یتحرکھا" یعنی حرکت دینے سے مراد انگلی کا اٹھانا ہی ہے کیونکہ انگلی کو اٹھانے میں بھی بہر حال حرکت ہوتی ہے اس توجیہ سے اس حدیث میں اور مابعد کی حدیث میں تطبیق بھی ہو جائے گی۔

اشارہ کے وقت انگلی کو متحرک نہ رکھنا چاہئے

(۶) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُشِيْرُ بِاِصْبَعِهٖ اِذَا دَعَا وَلَا يُحَرِّكُهَا رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ اَبُوْدَاوُدَ وَلَا يُجَاوِزُ بَصَرُهٗ اِشَارَتَهٗ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب (قعدہ میں) دعا کرتے (یعنی کلمہ شہادت پڑھتے تھے) تو اپنی انگلی سے اشارہ کرتے تھے لیکن اس کو ہلاتے نہ تھے (ابوداؤد، نسائی) اور ابوداؤدؒ نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "اور آپ ﷺ کی نظر اشارہ (کی انگلی) سے تجاوز نہ کرتی تھی۔"

تشریح: ابوداؤدؒ کے روایت کردہ آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ انگلی اٹھانے کے وقت آپ ﷺ کی نظر انگلی ہی پر رہتی تھی دوسری طرف نہیں دیکھتے تھے تاکہ خیالات کی رو دوسری طرف نہ جائے بلکہ مضمون توحید دل میں رہے اور خشوع و خضوع حاصل رہے۔

اشارہ صرف ایک انگلی سے کرنا چاہئے

(۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اِنَّ رَجُلاً کَانَ یَدْعُوْ بِاِصْبَعَیْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحِّدْ اَحِّدْ۔

(رواہ الترمذی والنسائی والبیہقی فی الدعوات الکبیر)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص تشہد میں (شہادت کی) دونوں انگلیوں سے اشارہ کرتا تھا چنانچہ سرور کائنات ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "ایک انگلی سے اشارہ کرو۔ ایک ہی انگلی سے اشارہ کرو۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: جیسا کہ ابوداؤدؒ و نسائیؒ نے صراحت کی ہے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ قعدہ میں کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں سے اشارہ وحدانیت کرتے تھے جب آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھا تو انہیں اس طریقہ سے منع فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ قاعدہ کے مطابق صرف ایک ہی انگلی یعنی داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرو۔

قعدہ میں ہاتھوں پر ٹیک لگا کر نہ بیٹھنا چاہئے

(۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ یَجْلِسَ الرَّجُلُ فِی الصَّلٰوةِ وَهُوَ مُعْتَمِدٌ عَلٰی یَدِهٖ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهٗ نَهٰی اَنْ یَعْتَمِدَ الرَّجُلُ عَلٰی یَدَیْهِ اِذَا نَهَضَ فِی الصَّلٰوةِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص نماز میں اپنے ہاتھ پر ٹیک لگا کر بیٹھے (احمد، ابوداؤد) اور ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "آنحضرت ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص نماز میں اٹھتے ہوئے ہاتھوں پر سہارا دے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جزء کا مطلب تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص قعدہ میں بیٹھے یا قعدہ سے کھڑا ہونے لگے تو اسے چاہئے کہ ہاتھ پر ٹیک نہ لگائے۔

دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ "سجدہ وغیرہ سے اٹھتے وقت بھی ہاتھوں کا سہارا نہ لیا جائے یعنی ہاتھوں کو زمین پر ٹیکے بغیر گھٹنے کی طاقت سے اٹھا جائے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا عمل اسی حدیث پر ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے یہاں ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر ہی سجدہ وغیرہ سے اٹھتے ہیں۔ ان کی مستدل وہ حدیث ہے جس سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سجدہ وغیرہ سے اٹھتے وقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیکا تھا حنفیہ اس حدیث کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا یہ عمل ضعف اور کبرسنی پر محمول ہوگا کہ اس وقت چونکہ ضعف و کمزوری کی وجہ سے آپ ﷺ کے لئے بغیر ہاتھوں کو ٹیکے ہوئے اٹھنا ممکن نہیں تھا اس لئے آپ ﷺ ہاتھوں کو سہارا دے کر اٹھے ورنہ تو آپ ﷺ بغیر عذر ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر نہیں اٹھتے تھے۔

قعدہ کی مقدار میں فرق

(۹) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الرَّکْعَتَیْنِ الْاُوْلَیَیْنِ کَاَنَّهٗ عَلَی الرَّضْفِ حَتّٰی

يَقُوْمَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ پہلی دو رکعتوں میں (یعنی پہلے قعدہ میں) تشہد کے لئے اس قدر بیٹھتے تھے گویا آپ ﷺ گرم پتھر پر بیٹھے ہیں اور (جلد ہی) کھڑے ہو جاتے تھے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص گرم پتھر پر زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتا بلکہ جلد ہی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسی طرح آپ ﷺ پہلے قعدہ میں چونکہ صرف التحیات پڑھتے تھے دیگر دعا اور درود وغیرہ نہیں پڑھتے تھے اس لئے التحیات پڑھتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے اس کے برعکس آخری قعدہ میں چونکہ التحیات کے ساتھ درود اور دوسری دعائیں بھی پڑھی جاتی ہیں اس لئے اس میں بیٹھنے کی مقدار پہلے قعدہ میں بیٹھنے کی مقدار سے زیادہ ہوتی تھی۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑩ عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَسْاَلُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ۔

(رواہ النسائی)

"حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جس طرح قرآن کی کوئی سورۃ سکھاتے تھے اسی طرح تشہد بھی سکھاتے تھے (یعنی جس طرح باعتبار قرأت قرآن کے الفاظ مختلف ہیں اسی طرح تشہد کے الفاظ بھی مختلف ہیں چنانچہ اس روایت میں تشہد کے الفاظ اس طرح ہیں)
بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَسْاَلُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ یعنی اللہ کے نام اور اللہ کی توفیق کے ساتھ شروع کرتا ہوں اور تمام تعریفیں اور تمام مالی وبدنی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اے نبی ﷺ تم پر سلام ہو اور اللہ کی برکت ورحمتیں! اور ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی سلام، اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں خدا سے جنّت کی درخواست کرتا ہوں اور دوزخ سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔" (نسائیؒ)

شہادت کی انگلی شیطان کے لئے باعث تکلیف ہے

⑪ وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ كَانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اِذَا جَلَسَ فِي الصَّلَاةِ وَضَعَ يَدَيْهِ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ وَ اَشَارَ بِاِصْبَعِهٖ وَاَتْبَعَهَا بَصَرَهٗ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهِيَ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنَ الْحَدِيْدِ يَعْنِي السَّبَّابَةَ۔ (رواہ احمدؒ)

"اور حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ جب نماز یعنی قعدہ) میں بیٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھتے اور (شہادت کی) انگلی سے اشارہ (وحدانیت) فرماتے اور نظر انگلی پر رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا یہ (یہ شہادت کی انگلی) شیطان پر لوہے سے زیادہ سخت ہے" یعنی شہادت کی انگلی سے اشارہ وحدانیت کرنا شیطان پر نیزہ وغیرہ پھینکنے سے زیادہ سخت ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ شیطان کی آرزو اور تمنا تو یہ ہے کہ ہر شخص ضلالت وگمراہی اور کفر وشرک میں مبتلا ہو جائے لیکن جب وہ ایک نمازی کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کی تمنا و آرزو کے برخلاف کفر وشرک سے اظہار بیزاری کرتے ہوئے شہادت کی انگلی سے اشارہ کر کے خدا کی وحدانیت کا اظہار کر رہا ہے تو اس کی امیدوں پر اوس پڑ جاتی ہے اور اس وقت اسے اتنی ہی شدید تکلیف پہنچتی ہے جتنی کہ اس کے نیزہ

وغیرہ مارنے سے پہنچ سکتی ہے۔

التحیات آہستہ آواز سے پڑھنا سُنّت ہے

⑭ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ كَانَ يَقُوْلُ مِنَ السُّنَّةِ اِخْفَآءُ التَّشَهُّدِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "تشہد (یعنی التحیات) آہستہ آواز سے پڑھنا سُنّت ہے (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: جب کوئی صحابی کسی فعل کے بارہ میں یہ کہے کہ "یہ سُنّت ہے" تو اس کا یہ قول "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ" کے حکم میں ہو گا یعنی وہ حدیث مرفوع ہوگی۔ چنانچہ ابن مسعودؓ کی اس حدیث کے پیش نظر جمہور محدّثین اور فقہا کا مسلک یہی ہے کہ تشہد یعنی التحیات آہستہ آواز سے پڑھنا چاہئے۔

بَابُ الصَّلٰوةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفَضْلِهَا

آنحضرت ﷺ پر درود بھیجنے اور اس کی فضیلت کا بیان

لغوی طور پر "صلوۃ" کے معنی دعا، رحمت اور استغفار ہیں اور درود کا مطلب ہے بندوں کی جانب سے آنحضرت ﷺ کے لئے اللہ جل شانہ کی ایسی رحمت کو طلب کرنا جو دنیا و آخرت کی بھلائی کو شامل ہو۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کو آنحضرت ﷺ پر صلوٰۃ وسلام یعنی درود بھیجنے کا حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

"اے ایمان والو! ان (یعنی آنحضرت ﷺ) پر سلام ورحمت بھیجو۔"

علماء اُمّت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم وجوب کے لئے ہے چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ جتنی مرتبہ بھی آنحضرت ﷺ کا نام مبارک سنا جائے ہر ہر بار درود بھیجا جائے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ جس طرح پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ آپ ﷺ کی نبوت کی گواہی دینی فرض ہے اسی طرح پوری عمر میں صرف ایک مرتبہ آپ ﷺ پر درود بھیجنا فرض ہے۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ درود بھیجنا مستحب و مسنون اور شعار اسلام میں سے ہے جس پر بےحد و حساب اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔

حضرت قاضی ابوبکرؒ تو فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر فرض کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر درود و سلام بھیجا جائے اور چونکہ اس سلسلہ میں کوئی خاص وقت متعین نہیں کیا ہے اس لئے واجب ہے کہ درود و سلام زیادہ سے زیادہ بھیجا جائے اور اس میں غفلت نہ برتی جائے" لیکن بعض حضرات نے حضرت قاضی ابوبکرؒ کے اس قول کے مقابلہ میں پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔

التحیات میں درود پڑھنا فرض ہے یا سنت: حضرت امام شافعیؒ نے التحیات میں درود پڑھنے کو فرض کہا ہے لیکن علماء نے صراحت کی ہے کہ امام شافعی کا یہ قول شاذ ہے اس مسئلہ میں امام شافعی کا موافق کوئی عالم نہیں ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ کا معتمد و مفتی بہ قول یہ ہے کہ کوئی شخص اگر ایک ہی مجلس میں سرور کائنات ﷺ کا نام مبارک کئی مرتبہ سنے تو اس پر صرف ایک مرتبہ درود بھیجنا واجب ہے اور ہر مرتبہ بھیجنا مستحب ہے اور التحیات میں درود پڑھنا سُنّت ہے۔

صلوٰۃ وسلام کے الفاظ کا استعمال غیر انبیاء کے لئے جائز ہے یا نہیں؟: علماء کے یہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ انبیاء کے

علاوہ دوسرے لوگوں کے ناموں سے ساتھ صلوٰۃ و سلام کے الفاظ استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً آنحضرت ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ ﷺ یا دوسرے انبیاء کے اسماء کے ساتھ علیہ السلام کے الفاظ بولے اور لکھے جاتے ہیں تو اس طرح انبیاء کے علاوہ کسی دوسری شخص کے نام کے ساتھ ان الفاظ کا استعمال جائز ہو گا یا نہیں؟ چنانچہ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ "ان الفاظ کا استعمال صرف انبیاء کے لئے مخصوص ہے۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے لئے ان الفاظ کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے البتہ دوسرے لوگوں کے اسماء کے ساتھ غفر اللہ، رحمہ اللہ اور رضی اللہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔

علامہ طیبی نے نقل کیا ہے کہ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگوں پر درود بھیجنا خلاف اولیٰ ہے۔ بعض حضرات نے حرام اور مکروہ بھی کہا ہے

اس مسئلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ "غیر انبیاء اور ملائکہ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا ابتداء اور مستقلاً مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ یہ اہل بدعت کا شعار ہے البتہ انبیاء کے ساتھ ان پر بھیجنا جائز ہے مثلاً اس طرح کہا جاسکتا ہے صلی اللہ علی محمد و علی الہ و اصحابہ و سلم یعنی محمد ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل اولاد پر اور آپ ﷺ کے صحابہ پر اللہ کی رحمت و برکت: واللہ اعلم

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

التحیات میں درود پڑھنے کا طریقہ

① وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ لَیْلٰی قَالَ لَقِیَنِیْ کَعْبُ بْنُ عُجْرَۃَ فَقَالَ اَلَا اُھْدِیْ لَکَ ھَدِیَّۃً سَمِعْتُھَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ بَلٰی فَاَھْدِھَا لِیْ فَقَالَ سَاَلْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ الصَّلٰوۃُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ فَاِنَّ اللّٰہَ قَدْ عَلَّمَنَا کَیْفَ نُسَلِّمُ عَلَیْکَ قَالَ قُوْلُوْا اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ اِلَّا اَنَّ مُسْلِمًا لَمْ یَذْکُرْ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ فِی الْمَوْضِعَیْنِ۔

"حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ (تابعی) فرماتے ہیں کہ حضرت کعب ابن عجرہ (صحابی) سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ میں تمہیں وہ چیز بطور ہدیہ پیش نہ کروں جسے میں نے رحمت عالم ﷺ سے سنا ہے؟ میں نے عرض کیا "جی ہاں! مجھے وہ ہدیہ ضرور عنایت فرمایئے" انہوں نے فرمایا کہ "ہم چند صحابہ" نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) اور اہل بیت نبوت پر ہم درود کس طرح بھیجیں؟ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تو بتا دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام کس طرح ——— بھیجا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہو! اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اے اللہ! محمد پر اور آل محمد ﷺ پر رحمت نازل کر جیسا کہ تو نے ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم پر رحمت نازل فرمائی بیشک تو بزرگ و برتر ہے۔ اے اللہ! محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ پر برکت نازل کر جیسا کہ تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر برکت نازل کی، بیشک تو بزرگ و برتر ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: صحابہ کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو حکم دیا ہے کہ آپ ﷺ پر درود اور سلام بھیجیں تو سلام بھیجنے کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیں سکھایا ہے کہ التحیات میں ہم "السلام علیک ایھا النبی" کہا کریں۔ اب یہ بھی بتا دیجئے کہ درود کس طرح بھیجیں؟

صحابہ کے قول "اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتادیا ہے کہ آپ ﷺ پر سلام کس طرح بھیجیں" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی لسان اقدس کے ذریعہ ہمیں سلام بھیجنے کی تعلیم دی۔ اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تعلیم اس لئے کہا گیا ہے کہ حقیقت میں آنحضرت ﷺ کی تعلیم اللہ تعالیٰ ہی کی تعلیم ہے کیونکہ آپ ﷺ نے جو بھی احکام بیان فرمائے ہیں وہ از خود اور اپنے ذہن و فکر سے نہیں بیان فرمائے ہیں بلکہ وہ احکام بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ ﷺ کو دیئے گئے اس کو آپ ﷺ نے اپنی لسان اقدس کے ذریعہ نافذ فرمایا۔

آل کی تعریف و تحقیق: اہل و عیال کو کہتے ہیں اس کے معنی "تابعدار" بھی مراد لئے جاتے ہیں چنانچہ "وعلی ال محمد" میں آل کے تعین کے سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ "ال محمد" سے مراد صرف آپ ﷺ کے اہل و عیال ہیں۔ کچھ حضرات نے کہا ہے کہ آل سے مراد تابعدار مراد ہیں، بعض علماء کی رائے ہے کہ ہر مؤمن آل محمد میں سے ہے کسی نے کہا ہے کہ ہر متقی مؤمن آل محمد میں شامل ہے یہ سب علماء کے اقوال ہیں لیکن بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث میں آل سے مراد تابعدار ہیں۔ گو بعض علماء نے تو "آل" کی تفسیر "اہل بیت" سے کی ہے یعنی ان حضرات کے نزدیک "آل محمد" سے اہل بیت یعنی وہ لوگ مراد ہیں جن پر صدقہ حرام ہے اور "جنہیں بنی ہاشم" کہا جاتا ہے۔

امام فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ "اہل بیت" میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات اور اولاد شامل ہیں اور چونکہ حضرت علیؓ کا ربط بھی ان سب سے حضرت فاطمہؓ کی وجہ سے بہت زیادہ تھا اس لئے وہ بھی اہل بیت میں داخل ہیں۔

"کما صلیت علی ابراہیم" میں صرف حضرت ابراہیم کی تخصیص کی گئی ہے اور کسی نبی کو ذکر نہیں کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو حضرت ابراہیم علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے جد امجد ہیں، دوسرے یہ کہ اصول دین میں شریعت محمدی ان کے تابع ہے۔"

"اے اللہ محمد ﷺ پر برکت نازل کر" کا مطلب یہ ہے کہ "خداوند قدوس! تونے ہمارے سرکار و سردار رحمت عالم ﷺ کو جو شرف و فضیلت عطا فرمایا اور آپ ﷺ کو جو بزرگی و بڑائی دی ہے اس کو ہمیشہ اور باقی رکھ!

روایت کے آخری الفاظ الا ان مسلما لم یذکر الخ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمؒ نے جو روایت نقل کی ہے اس کے پہلے اور دوسرے دونوں ہی درود میں "علی ابراہیم" کے الفاظ نہیں ہیں یعنی اس کے الفاظ اس طرح ہیں "کما صلیت علی آل ابراھیم" اور "کما بارکت علی آل ابراھیم"

(۲) وَعَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ السَّاعِدِیِّ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ نُصَلِّیْ عَلَیْكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُوْلُوْا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوحمید ساعدیؓ فرماتے ہیں کہ "صحابہ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ) ہم آپ (ﷺ) پر درود کس طرح بھیجیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کہو"؟ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اے اللہ محمد ﷺ پر، آپ ﷺ کی ازواج مطہرات پر اور آپ ﷺ کی اولاد پر رحمت نازل فرما جیسا کہ تونے ابراہیم علیہ السلام پر رحمت نازل فرمائی اور محمد ﷺ پر، آپ ﷺ کی ازواج مطہرات پر اور آپ ﷺ کی اولاد پر برکت نازل فرما یا جیسا کہ تونے ابراہیم علیہ السلام پر برکت نازل فرمائی، بے شک تو بزرگ و برتر ہے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: درود کے الفاظ مختلف طریقہ سے وارد ہوئے ہیں جیسا کہ ابھی آپ نے دیکھا۔ پہلی حدیث میں درود کے الفاظ کچھ اور ہیں اور اس حدیث کے الفاظ کچھ اور چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ پہلی حدیث میں جو درود ذکر کیا گیا ہے وہ پڑھ لینا کافی ہے بعض روایتوں میں وَارْحَمْ

كَمَا رَحِمْتَ وَ تَرَحَّمْتَ کے الفاظ بھی مذکور ہیں مگر یہ الفاظ صحیح طور پر ثابت نہیں ہیں۔
بعض محدثین نے وضاحت کی ہے کہ جس حدیث میں ان الفاظ وَتَرَحَّمْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا تَرَحَّمْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ کا بھی اضافہ ہے وہ حدیث حسن ہے۔ واللہ اعلم

درود بھیجنے کی فضیلت

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا "جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمت نازل فرمائے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: چونکہ ارشاد ربانی ہے مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا یعنی جو شخص ایک نیکی کرتا ہے تو اس کے لئے اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب ہے اس لئے جو شخص آں حضرت ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بشارت کے مطابق اس شخص پر دس مرتبہ رحمت نازل فرماتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرَ صَلَوَاتٍ وَحُطَّتْ عَنْهُ عَشْرُ خَطِيَّاتٍ وَرُفِعَتْ لَهٗ عَشْرُ دَرَجَاتٍ۔ (رواہ النسائی)

"حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس (مرتبہ) رحمتیں نازل فرمائے گا، اس کے دس گناہوں کو معاف کرے گا اور (تقرب الی اللہ کے سلسلہ میں) اس کے دس درجے بلند کرے گا۔" (نسائیؒ)

(۵) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْلَى النَّاسِ بِیْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلَاةً۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن لوگوں میں سب سے زیادہ مجھ سے قریب وہ لوگ ہوں گے جو مجھ پر اکثر درود پڑھنے والے ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: ابن حبانؒ نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ "آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اور آپ ﷺ کی یہ بشارت عظمی محدثین کرام پر زیادہ صادق آتی ہے چونکہ کوئی جماعت محدثین سے زیادہ درود نہیں بھیجتی اس لئے قیامت کے دن تمام لوگوں میں سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ سے قریب یہی مقدس طبقہ ہوگا۔

فرشتے امتیوں کے سلام آنحضرت ﷺ تک پہنچاتے ہیں

(۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِی الْاَرْضِ يُبَلِّغُوْنِیْ مِنْ اُمَّتِیَ السَّلَامَ۔ (رواہ النسائی و الدارمی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کے بہت سے فرشتے جو زمین پر سیاحت کرنے والے ہیں میری اُمت کا سلام میرے پاس پہنچاتے ہیں۔" (نسائی، دارمیؒ)

تشریح: اس حدیث کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو روضہ اقدس سے دور رہتے ہیں اور انہیں روضہ مقدس پر حاضری کا شرف حاصل نہیں ہوتا، چنانچہ ایسے لوگ جب آنحضرت ﷺ پر قلیل یا کثیر تعداد میں سلام بھیجتے ہیں تو فرشتے ان کا سلام بارگاہ نبوت میں بصد عقیدت و احترام پیش کرتے ہیں۔

البتہ وہ حضرات جنہیں خدا نے اپنے محبوب کے روضہ اقدس پر حاضری کی سعادت سے نواز رکھا ہے جب وہ بارگاہ نبوت میں سلام پیش کرتے ہیں تو آنحضرت ﷺ تک پہنچانے کے لئے فرشتوں کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ روضہ اقدس پر حاضر ہونے والوں کے سلام آنحضور ﷺ خود سنتے ہیں۔

اس حدیث سے چند باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اول یہ کہ آنحضرت ﷺ کو حیات جسمانی حاصل ہے کہ جس طرح آپ ﷺ کو اس دنیا میں زندگی حاصل تھی اس طرح آپ ﷺ کو قبر میں بھی زندگی حاصل ہے۔

دوم یہ کہ آنحضرت ﷺ کی اُمت کے لوگ جب آپ ﷺ پر سلام بھیجتے ہیں تو آپ ﷺ خوش ہوتے ہیں جو سلام بھیجنے والے کے حق میں انتہائی سعادت و خوش بختی کی بات ہے۔

سوم یہ کہ جب فرشتے کسی اُمتی کا سلام بارگاہ نبوت میں پیش کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سلام قبولیت کے درجہ کو پہنچ گیا ہے۔ اور اگلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ۔ آپ ﷺ سلام بھیجنے والے کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں نیز ایک روایت میں مذکور ہے کہ "جب فرشتے سلام لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتے ہیں تو سلام بھیجنے والے کا نام بھی لیتے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں۔ یا رسول اللہ (ﷺ)! مولانا محمد قطب الدین محی الدین آپ کی خدمت بابرکت میں سلام عرض کرتے ہیں۔ یا آپ کا ایک ادنیٰ غلام عبداللہ جاوید ابن مولانا محمد عبدالحق خدمت اقدس میں نذرانہ سلام پیش کرتا ہے۔ یا فقیر محمد اصغر خدمت عالیہ میں سلام عرض کرتا ہے۔

در مجلس آں نازنیں حرفے کہ ازما می رود ۔ جاں می دہم درآز والے قاصد آخر باز گو

آنحضرت ﷺ سلام بھیجنے والے کے سلام کا جواب دیتے ہیں

⑦ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَى رُوْحِي حَتّٰى اُرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ۔ (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی الدعوات الکبیر)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو مجھ پر لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔" (ابوداؤد"، بیہقی")

تشریح: اہل سُنت والجماعت کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ آقائے نامدار فخر دو عالم ﷺ (فداہ ابی وامی) عالم برزخ میں زندہ ہیں مگر اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ عالم برزخ میں زندہ نہیں ہیں بلکہ جب کوئی شخص آپ ﷺ کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے تو اس وقت آپ ﷺ کی روح مبارک جسم پاک میں لوٹ آتی ہے پھر آپ ﷺ سلام کا جواب دیتے ہیں۔

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ "روح لوٹانے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ روح مبارک آپ ﷺ کے مقدس بدن میں ہمہ وقت موجود نہیں رہتی صرف سلام بھیجنے کے وقت اسے کچھ وقت کے لئے بدن میں واپس کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ۔ آپ ﷺ کی روح مبارک چونکہ ہمہ وقت مشاہدہ رب العزت میں مستغرق رہتی ہے اس لئے اس کو حالت استغراق و مشاہدہ سے ہٹا کر اس عالم کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے تاکہ آپ ﷺ اپنے امتیوں کے درود و سلام سنیں اور اس کا جواب دیں۔ چنانچہ روح

مبارک کے اسی متوجہ کرنے اور آگاہ کرنے کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ میری روح کو مجھ پر لوٹا دیتا ہے" ورنہ تو تمام انبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

اب سوال یہ رہ گیا کہ حدیث میں مذکورہ فضیلت خاص طور پر ان لوگوں سے متعلق ہے جو روضہ اقدس پر حاضری دیتے ہیں اور اس کی زیارت کرتے ہیں یا عمومی طور پر سب لوگوں کے لئے ہے؟ تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فضیلت کا تعلق عمومی طور پر ہے۔ یعنی خواہ کوئی شخص آپ ﷺ کے مزار اقدس پر حاضر ہو کر سلام پیش کرے یا کسی دور دراز علاقہ سے سلام بھیجے۔ البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ جو شخص روضہ اقدس پر حاضری کا شرف حاصل نہیں کر سکتا آپ ﷺ ان کا سلام فرشتوں کے واسطے سے سنتے ہیں جیسا کہ تیسری فصل میں حضرت ابوہریرہؓ کی آنے والی حدیث سے بھی معلوم ہو جائے گا۔

گھروں کو قبر نہ بنایا جائے

(۸) وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا وَلَا تَجْعَلُوْا قَبْرِيْ عِيْدًا وَصَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ حَيْثُ كُنْتُمْ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اپنے گھروں کو قبروں کی طرح نہ رکھو اور میری قبر پر عید (کی طرح میلہ) نہ مقرر کرو۔ تم مجھ پر درود پڑھا کرو۔ کیونکہ تم جہاں کہیں بھی ہو تمہارا درود میرے پاس پہنچتا ہے۔" (نسائیؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جزء کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اول یہ کہ اپنے گھروں کو قبروں کی طرح نہ سمجھ لو کہ جس طرح مردے اپنی قبر میں پڑے رہتے ہیں تم بھی اپنے گھروں میں مردوں کی طرح پڑے رہو ان میں نہ عبادت کرو اور نہ کچھ نمازیں پڑھو بلکہ اسی طرح گھروں میں بھی عبادت کرو اور کچھ نمازیں پڑھو تاکہ اس کے انوار و برکات گھر اور گھر والوں کو پہنچیں اور اسکی شکل یہ ہونی چاہئے کہ فرض نمازیں تو مساجد میں ادا کرو اور سنن نوافل اپنے گھر آ کر پڑھو کیونکہ نوافل مساجد کی بہ نسبت گھر میں ادا کرنا زیادہ افضل ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ۔ اپنے گھروں میں مردے دفن نہ کرو۔ اس موقعہ پر یہ اشکال پیدا نہ کیجئے کہ خود آنحضرت ﷺ تو اپنے گھر ہی زیر زمین آرام فرما ہیں۔ کیونکہ یہ صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کو ایسا نہ کرنا چاہئے۔

تیسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قبروں کو سکونت کی جگہ قرار نہ دو جیسا کہ آجکل اولیاء اللہ کے مزارات اور قبرستانوں پر ان کے خدام مجاوروں نے سکونت اختیار کر رکھی ہے، تاکہ دل کی نرمی اور طبیعت و مزاج کی شفقت و رحمت ختم نہ ہو جائے بلکہ ایسا کرنا چاہئے کہ قبروں کی زیارت کر کے اور ان پر فاتحہ وغیرہ پڑھ کر اپنے گھروں کو واپس آجاؤ۔

حدیث کے دوسرے جز "میری قبر کو عید (کی طرح) قرار نہ دو" کا مطلب یہ ہے کہ میری قبر کو عید گاہ کی طرح نہ سمجھو کہ وہاں جمع ہو کر زیب و زینت اور لہو و لعب کے ساتھ خوشیاں مناؤ اور اس سے لطف و سرور حاصل کرو۔ جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنے انبیاء کی قبروں پر اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔

حدیث کے اس جزء سے آج کل کے ان نام نہاد ملاؤں اور بدعت پرستوں کو یہ سبق حاصل کرنا چاہئے جنھوں نے اولیاء اللہ کے مزارات کو اپنی نفسانی خواہشات اور دنیاوی اغراض کا منبع و مرجع بنا رکھا ہے اور ان مقدس بزرگوں کے مزارات پر عرس کے نام سے دنیا کی وہ خرافات اور ہنگامہ آرائیاں کرتے ہیں جن پر کفر و شرک بھی خندہ زن ہیں، مگر افسوس یہ ہے کہ ان کے حلوے مانڈوں، نذر و نیاز اور لذت پیٹ و دہن نے ان کی عقل پر نفس پرستی اور ہوس کاریوں کے وہ موٹے پردے چڑھا دیئے ہیں جن کی موجودگی میں نہ انہیں نعوذ باللہ قرآنی احکام کی ضرورت ہے اور نہ انہیں کسی حدیث کی حاجت۔ اللہ ان لوگوں کو ہدایت دے۔ آمین۔

بعض علماء نے اس جزء کی تشریح یہ کی ہے کہ عید کی طرح سال میں صرف ایک دو مرتبہ ہی میری قبر کی زیارت کے لئے نہ آیا کرو بلکہ

اکثر و بیشتر حاضر ہوا کرو۔ اس صورت میں آپ ﷺ نے اپنی قبر کی زیادہ سے زیادہ زیارت اور اس محیط علم و عرفان اور منبع امن و سکون پر اکثر و بیشتر حاضری پر اُمت کے لوگوں کو ترغیب دلائی ہے۔

حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ مجھ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجو، اگر کوئی شخص میرے روضہ سے دور ہے اور بعد مسافت اختیار کئے ہوئے ہے تو اس کو اس کا خیال نہ کرنا چاہئے بلکہ اسے چاہئے کہ وہ اپنی جگہ بیٹھا ہوا ہی مجھ پر درود بھیجتا رہے کیونکہ جہاں سے بھی درود بھیجا جائے گا میرے پاس پہنچ جائے گا۔ اس طرح آپ ﷺ نے ان مشتاقان زیارت کی جنہیں روضۂ اقدس پر حاضری کی سعادت حاصل نہیں ہو سکی، تسلی فرمائی ہے کہ اگرچہ مجبوریوں کی بناء پر تم مجھ سے دور ہو لیکن تمہیں چاہئے کہ توجہ اور حضور قلب سے غافل نہ رہو کہ ع

قرب جانے چوں بود بعد مکانے سہل ست

درود نہ بھیجنے پر وعید

⑨ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ وَرَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ دَخَلَ عَلَيْهِ رَمَضَانُ ثُمَّ انْسَلَخَ قَبْلَ اَنْ يُغْفَرَ لَهُ وَرَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ اَدْرَكَ عِنْدَهُ اَبَوَاهُ الْكِبَرَ اَوْ اَحَدُهُمَا فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "خاک آلود ہو اس شخص کی ناک کہ اس کے سامنے میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود نہ بھیجا، خاک آلود ہو اس شخص کی ناک کہ اس پر رمضان آیا اور اس کی بخشش سے پہلے گذر گیا اور خاک آلود ہو اس شخص کی ناک کہ اس کے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک نے اس کے سامنے بڑھاپا پایا اور انھوں نے اسے جنت میں داخل نہیں کیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں تین قسم کے لوگوں کے لئے وعید بیان کی جا رہی ہے، سب سے پہلے ان لوگوں کے بارہ میں کہا گیا ہے۔ جن کے سامنے سرور کائنات فخر دوعالم ﷺ کا نام نامی اسم گرامی لیا جائے یا آپ ﷺ کا ذکر مبارک کیا جائے اور وہ آپ ﷺ پر درود نہ بھیجیں کہ ان کی ناک خاک آلود ہو یعنی وہ ذلیل و خوار ہوں اور ہلاک ہوں۔

بظاہر اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مجلس میں جب بھی آپ ﷺ کا اسم گرامی لیا جائے ہر مرتبہ درود بھیجنا یعنی ﷺ کہنا واجب ہوتا ہے کیونکہ اس کے ترک پر اتنی شدت کے ساتھ وعید بیان فرمائی جا رہی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ ہر مرتبہ درود بھیجنا واجب نہیں ہے صرف ایک مرتبہ درود بھیجنا واجب ہے البتہ ہر مرتبہ درود بھیجنا مستحب و افضل ہے اب اس حدیث کی توجیہ یہ کی جائے گی کہ وجوب کی دلیل آخرت کی وعید ہوتی ہے اور چونکہ اس وعید کا تعلق آخرت سے نہیں ہے اس لئے اس کا انتہائی امر یہ ہے کہ یہ وعید ہر مرتبہ درود بھیجنے کے استحباب و افضلیت پر دلالت کرتی ہے نہ کہ وجوب پر۔

دوسرے قسم کے لوگ جن کے لئے وعید بیان کی جا رہی ہے وہ ہیں جو رمضان کے حقوق ادا نہیں کرتے نہ تو روزہ ہی ٹھیک سے رکھتے ہیں اور نہ رمضان میں عبادتیں ہی پورے ذوق شوق سے کرتے ہیں اور چونکہ یہ تمام چیزیں مغفرت اور بخشش کا ذریعہ ہیں اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ ان کے لئے تباہی و ہلاکت ہو جو رمضان میں اس مقدس مہینہ کے فضل و شرف سے محروم رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس مہینہ میں بخشش کی سعادت سے نوازے بھی نہیں جاتے اور یہ مہینہ اپنی تمام سعادتوں کے ساتھ گذر جاتا ہے۔

تیسری قسم کے لوگ جن سے اس نوعیت کا تعلق ہے وہ وہ ہیں جو اپنے ماں باپ کے اطاعت گذار و فرمانبردار نہیں ہیں۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک نہیں کیا، ان کے حقوق ادا نہ کئے، اس کی رضامندی و خوشنودی کا خیال نہیں رکھا اور خاص طور پر ان کی کبرسنی میں ان کی خدمت اور دیکھ بھال نہیں کی وہ در حقیقت بڑے بدنصیب ہیں کیونکہ انھوں نے ان

چیزوں کو ترک کر کے آخرت کا عذاب اور نقصان مول لیا ہے کہ یہ چیزیں جنت میں داخل ہونے کا سبب اور ذریعہ ہیں۔

درود و سلام کی فضیلت

⑩ وَعَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَاءَ ذَاتَ یَوْمٍ وَالْبِشْرُ فِیْ وَجْهِهٖ فَقَالَ اِنَّهٗ جَاءَنِیْ جِبْرِیْلُ فَقَالَ اِنَّ رَبَّكَ یَقُوْلُ اَمَا یُرْضِیْكَ یَا مُحَمَّدُ اَنْ لَا یُصَلِّیْ عَلَیْكَ اَحَدٌ مِنْ اُمَّتِكَ اِلَّا صَلَّیْتُ عَلَیْهِ عَشْرًا وَلَا یُسَلِّمُ عَلَیْكَ اَحَدٌ مِنْ اُمَّتِكَ اِلَّا سَلَّمْتُ عَلَیْهِ عَشْرًا۔ (رواہ النسائی والدارمی)

"اور حضرت ابوطلحہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) رحمت عالم ﷺ (صحابہؓ کے پاس) تشریف لائے اور اس وقت آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر بشاشت کھیل رہی تھی، آپ ﷺ نے (صحابہؓ کے دریافت کرنے کے بعد یا دریافت کرنے سے پہلے ہی) فرمایا۔ میرے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے تھے، وہ کہتے تھے کہ پروردگار فرماتا ہے، کہ اے محمد ﷺ! کیا آپ (ﷺ) اس بات سے راضی نہیں ہیں کہ آپ (ﷺ) کی اُمت میں سے جو کوئی آپ ﷺ پر درود بھیجے گا میں اس پر دس مرتبہ رحمت نازل کروں گا اور آپ (ﷺ) کی اُمت میں سے جو کوئی آپ ﷺ پر سلام بھیجے گا میں اس پر دس مرتبہ سلام بھیجوں گا۔" (نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ چونکہ اپنی اُمت کے حق میں انتہائی مشفق و مہربان تھے اور اُمت کے لئے خیر کی طلب آپ ﷺ کی انتہائی غرض و خواہش تھی اس لئے جب آپ ﷺ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ یہ عظیم بشارت دی گئی تو آپ ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی و مسرت سے کھل اٹھا اور آپ ﷺ نے یہ عظیم بشارت صحابہؓ اور ان کے واسطے سے پوری اُمت تک پہنچا دی۔

درود و سلام بھیجنے کی کوئی مقررہ حد نہیں ہے

⑪ وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اُكْثِرُ الصَّلَاةَ عَلَیْكَ فَكَمْ اَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلَاتِیْ فَقَالَ مَا شِئْتَ قُلْتُ الرُّبُعَ قَالَ مَا شِئْتَ فَاِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَیْرٌ لَكَ قُلْتُ النِّصْفَ قَالَ مَا شِئْتَ فَاِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَیْرٌ لَكَ قُلْتُ فَالثُّلُثَیْنِ قَالَ مَا شِئْتَ فَاِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَیْرٌ لَكَ قُلْتُ اَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِیْ كُلَّهَا قَالَ اِذًا تُكْفٰی هَمُّكَ وَیُكَفَّرُ لَكَ ذَنْبُكَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابی ابن کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ ﷺ پر کثرت سے درود بھیجتا ہوں (یعنی کثرت سے درود بھیجنا چاہتا ہوں اب آپ ﷺ بتلا دیجئے کہ) اپنے لئے دعا کے واسطے جو وقت میں نے مقرر کیا ہے اس میں سے کتنا وقت آپ پر درود بھیجنے کے لئے مخصوص کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "جس قدر تمہارا جی چاہے!" میں نے عرض کیا "کیا چوتھائی (وقت مقرر کر دوں)"؟ فرمایا "جتنا تمہارا جی چاہے اور اگر زیادہ مقرر کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے" میں نے عرض کیا "تو پھر دو تہائی مقرر کر دوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "جس قدر تمہارا جی چاہے اور اگر زیادہ مقرر کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے" میں نے عرض کیا "اچھا تو پھر میں اپنی دعا کا سارا وقت ہی آپ ﷺ کے درود کے واسطے مقرر کئے دیتا ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ تمہیں کفایت کرے گا، تمہارے دین و دنیا کے مقاصد کو پورا کرے گا اور تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اجعل لک من صلوتی میں لفظ "صلوۃ" سے مراد دعا ہے۔ حضرت ابن کعبؓ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میری خواہش ہے کہ آپ ﷺ پر بہت زیادہ درود بھیجوں۔ چونکہ میں نے اپنے اوقات میں سے ایک خاص وقت کو اس لئے مقرر کر رکھا ہے کہ میں اس وقت اپنے نفس کے لئے دعا کیا کرتا ہوں، اب میں چاہتا ہوں کہ اسی وقت میں آپ ﷺ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجا کروں لہٰذا آپ ﷺ ہی مقرر فرما دیجئے کہ اس وقت کا کتنا حصہ میں درود بھیجنے میں صرف کروں؟

آنحضرت ﷺ نے ان کی اس درخواست پر درود بھیجنے کے لئے اس وقت کا کوئی حصہ مقرر نہیں فرمایا بلکہ اسے ان کے اختیار پر چھوڑ

دیا اور فرمادیا کہ تم تو خود ہی جانتے ہو کہ درود بھیجنے کی کتنی فضیلت ہے اور اس کے کیا فضائل و برکات ہیں اس مقدس کام کے لئے تمہاری سعادت جتنا وقت چاہے مقرر کرلو، تاہم یہ سمجھ لو کہ تم اس کام کے لئے جتنا زیادہ سے زیادہ وقت دوگے اسی قدر تمہارے حق میں بہتر ہوتا۔ چنانچہ جب انھوں نے اپنے اس پورے وقت کو درود بھیجنے پر صرف کرنے کا اظہار کیا تو آنحضرت ﷺ نے اظہار اطمینان و خوشنودی فرمایا اور فرمایا کہ تم نے ایک مستقل وقت کو اس مقدس عمل کے لئے متعیّن کر کے در حقیقت دنیا اور آخرت کی بھلائی اور مقاصد کو حاصل کرلیا ہے کیونکہ جب بندہ اپنی طلب اور رغبت کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور محبوب چیز میں خرچ کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کو اپنی خواہشات اور اپنے مطالب پر قدم رکھتا ہے تو خداوند اقدس اس کے تمام امور و مہمات میں اس کا مددگار و حامی ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے تمام دنیوی و دینی مقاصد پورے ہو جاتے ہیں مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ یعنی جو اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ درود شریف کی یہ برکت و فضیلت ہے کہ جو شخص اس کا ورد رکھے اور اسے اپنی زندگی کا ایک ضروری جزء بنالے تو اس کے لئے دین و دنیا دونوں جگہ آسانیاں اور سہولتیں فراہم ہو جاتی ہیں اور اس کے تمام مقاصد خیر پورے ہو جاتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ "جب میرے شیخ بزرگوار حضرت عبدالوہاب متقیؒ نے مجھے مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے رخصت فرمایا تو یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ جاؤ! اور یاد رکھو کہ اس راہ میں اداء فرض کے بعد کوئی عبادت آنحضرت ﷺ پر درود بھیجنے کا مماثل نہیں ہے لہٰذا (ادائے فرض کے بعد) تم اپنے اوقات کو اسی مقدس مشغلہ میں صرف کرنا اور کسی دوسری چیز میں مشغول نہ ہونا"

حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ "اس کے لئے کوئی عدد مقرر فرمادیا جائے (کہ میں اتنی تعداد میں درود پڑھ لیا کروں)" شیخ عبدالوہابؒ نے فرمایا "اس سلسلہ میں کسی عدد کا تعیّن کرنا شرط نہیں ہے بلکہ درود شریف اتنی کثرت کے ساتھ پڑھنا کہ اس کے ساتھ رطب اللسان ہو جاؤ اور اسی کے رنگ میں رنگین ہو جاؤ اور اسی میں مستغرق ہو جاؤ"

حصن حصین کے مصنف علام نے مفتاح میں لکھا ہے کہ "آنحضرت ﷺ پر درود بھیجنے کے بے شمار فوائد ہیں، اور دنیا اور آخرت میں اس کے لئے بے انتہا ثمرات مرتب ہوتے ہیں خصوصاً تنگی و پریشانی، کسی خاص مہم، فکرات اور مطلب برآری کے سلسلہ میں اس کا بارہا تجربہ ہوا ہے چنانچہ خود میرا تجربہ ہے کہ میں اکثر خوف و ہلاکت کی جگہ گھر گیا اور مجھے وہاں سے اگر نجات ملی تو آنحضرت ﷺ پر درود بھیجنے کے صدقہ میں۔

درود کے بعد مانگی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے

﴿۱۲﴾ وَعَنْ فُضَالَةَ بْنِ عُبَیْدٍ قَالَ بَیْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ اِذْ دَخَلَ رَجُلٌ فَصَلّٰی فَقَالَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَارْحَمْنِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَجِلْتَ اَیُّھَا الْمُصَلِّیْ اِذَا صَلَّیْتَ فَقَعَدْتَ فَاحْمَدِ اللّٰہَ بِمَا ھُوَ اَھْلُہٗ وَصَلِّ عَلَیَّ ثُمَّ ادْعُہٗ قَالَ ثُمَّ صَلّٰی رَجُلٌ اٰخَرُ بَعْدَ ذٰلِکَ فَحَمِدَ اللّٰہَ وَصَلّٰی عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّھَا الْمُصَلِّیْ اُدْعُ تُجَبْ۔ (رواہ الترمذی وروی ابوداؤد والنسائی نحوہ)

"اور حضرت فضالہ ابن عبیدؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) جبکہ رحمت عالم ﷺ بیٹھے ہوتے تھے اچانک ایک شخص آیا اس نے نماز پڑھی اور پھر یہ دعا مانگی۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ اے اللہ مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما! (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے نماز پڑھنے والے تم نے (دعا کی ترکیب ترک کر کے) جلدی کی" اور پھر فرمایا کہ) جب تم نماز پڑھو تو (نماز کے بعد دعا کے لئے) بیٹھو اور خدا کی تعریف کہ جس تعریف کے وہ لائق ہے بیان کرو اور مجھ پر درود بھیجو، پھر (تم جو چاہو خدا سے مانگو (گویا آپ ﷺ نے اسے دعا کے یہ آداب

وطریقے سکھائے) حضرت فضالہؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک دوسرے شخص نے نماز پڑھی (آخر میں) اس نے اللہ تعالیٰ کی تعریف بھی بیان کی اور آنحضرت ﷺ پر درود بھی بھیجا (مگر اس نے دعا نہیں مانگی) آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "اے نماز پڑھنے والے، دعا بھی مانگو قبول کی جائے گی۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

(۱۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنْتُ اُصَلِّيْ وَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاضِرٌ وَاَبُوْبَكْرٍ وَ عُمَرُ مَعَهٗ فَلَمَّا جَلَسْتُ بَدَاْتُ بِالثَّنَاءِ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى ثُمَّ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ دَعَوْتُ لِنَفْسِيْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَلْ تُعْطَهْ سَلْ تُعْطَهْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) میں نماز پڑھ رہا تھا رحمت عالم ﷺ (بھی وہیں) تشریف فرما تھے اور آپ ﷺ کے پاس حضرت ابوبکر و حضرت عمرؓ بھی حاضر تھے، چنانچہ (نماز کے بعد) جب میں بیٹھا تو اللہ جل شانہ، کی تعریف بیان کرنا شروع کی اور پھر آنحضرت ﷺ پر درود بھیجا، اس کے بعد میں اپنے (دینی و دنیاوی مقاصد کے) لئے مانگنے لگا (یہ دیکھ کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "مانگو! دیئے جاؤ گے، مانگو دیئے جاؤ گے (یعنی دعا مانگو ضرور قبول ہوگی)۔" (ترمذیؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اُمی کی تحقیق

(۱۴) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّكْتَالَ بِالْمِكْيَالِ الْاَوْفٰى اِذَا صَلّٰى عَلَيْنَا اَهْلَ الْبَيْتِ فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَذُرِّيَّتِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔ (رواہ ابوداؤدؒ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو یہ پسند ہو (یعنی اس کی خواہش ہو) کہ اسے بھرپور (اور زیادہ سے زیادہ) ثواب ملے تو اسے چاہئے کہ ہم اہل بیت پر اس طرح درود بھیجے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَذُرِّيَّتِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ اے بار خدایا! محمد ﷺ پر جو نبی امی ہیں، آپ ﷺ کی ازواج مطہرات پر جو سب مؤمنوں کی مائیں ہیں اور آپ ﷺ کی اولاد و اہل بیت پر رحمت نازل فرما جیسا کہ تو نے ابراہیم علیہ السلام پر رحمت نازل فرمائی بیشک تو بزرگ و برتر ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: سرکار دوعالم ﷺ کے جہاں اور بہت سے اسماء ہیں کہ جو آپ ﷺ کی مختلف خصوصیات و صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ وہیں آپ ﷺ کا ایک خاص اور عظیم لقب امی بھی ہے، آپ ﷺ کا یہ لقب توریت و انجیل اور آسمان سے اتری ہوئی تمام کتابوں میں مذکور ہے۔

"امی" لغت میں اس شخص کو کہتے ہیں جو نہ تو لکھنا جانتا ہو اور نہ لکھے ہوئے کو پڑھنا جانتا ہو اور نہ کبھی مکتب و مدرسہ گیا ہو اور نہ کسی سے تعلیم حاصل کی ہو اور چونکہ امی منسوب ہے ام یعنی ماں کی طرف لہٰذا اس مناسبت سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچہ کی طرح ہے اسے کسی نے نہ لکھنے کی تعلیم دی ہے اور نہ پڑھنے کی۔

چنانچہ جب آنحضرت ﷺ اس دنیا میں آخری نبی کی حیثیت سے مبعوث فرمائے گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کسی استاد، کسی مکتب اور کسی معلم کا محتاج نہیں رکھا بلکہ خود آپ ﷺ کو دین و دنیا کے تمام علوم سے پوری طرح مکمل کر کے اس دنیا میں بھیجا چنانچہ اس دنیا میں نہ تو آپ ﷺ نے کسی مکتب میں قدم رکھا اور نہ کسی استاد کی شاگردی کی بلکہ بظاہر نہ تو آپ ﷺ لکھتے تھے اور نہ لکھے ہوئے کو

پڑھتے تھے اس وجہ سے آپ ﷺ کو امی کہا گیا ۔

نگار من کہ بہ مکتب نہ رفت وخط نہ نوشت   بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد
یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست   کتب خانہ چند ملت بشست
بہ تعلیم و ادب اور اچہ نسبت   کہ خود زآغاز او آمد موؤب

بعض حضرات کہتے ہیں کہ امی دراصل ام القری یعنی مکہ کی طرف منسوب ہے جو تمام زمین کی اصل ہے۔

درود نہ بھیجنے والا بخیل ہے

⑮ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْبَخِيْلُ الَّذِيْ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ رَوَاهُ اَحْمَدُ عَنِ الْحُسَيْنِ ابْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "بخیل وہ شخص ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا گیا (یعنی میرا نام لیا گیا) اور اس نے مجھ پر درود نہیں بھیجا (ترمذیؒ) اس حدیث کو امام احمدؒ نے حسین ابن علیؓ سے نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ایک بخیل تو مال کا ہوتا ہے کہ وہ مال کی خواہش کی وجہ سے اپنی جبلت طبعی کے تقاضہ پر بخل کرتا ہے کہ کسی کو اپنا مال نہیں دیتا مگر بڑا بخیل وہ شخص ہے جو اپنی طبعی کسل و غفلت اور سستی کے غلط تقاضہ کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے نام پر اپنی زبان اور اپنے دل سے درود کا ایک کلمہ نہیں نکالتا اور اس طرح وہ اداء حق اور شکر نعمت کا لحاظ بھی نہیں کرتا حالانکہ آنحضرت ﷺ کا اُمت پر وہ احسان و انعام ہے کہ اگر امت کے لوگ آپ ﷺ کے نام پر اپنی جانیں بھی قربان کر دیں تو کم ہے چہ جائیکہ مجلس میں آپ ﷺ کا مبارک ذکر ہو اور آپ ﷺ کا نام لیا جائے اور اس شخص کی زبان سے اور اس سے دل سے درود کے چند الفاظ بھی نہ نکلیں؟

مرحبا اے پیک مشتاقان پیغام دوست   تاکنم جاں از سر رغبت فرائے نام دوست

درود آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچتے ہیں

⑯ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِيْ سَمِعْتُهٗ وَمَنْ صَلّٰى عَلَيَّ نَائِيًا اُبْلِغْتُهٗ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص میری قبر کے پاس "کھڑا ہو کر" مجھ پر درود پڑھتا ہے میں اس کو سنتا ہوں اور جو شخص دور سے مجھ پر بھیجتا ہے وہ میرے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو میری قبر کی زیارت کی سعادت میسر آتی ہے اور وہ وہاں حاضر ہو کر سلام بھیجتا ہے تو میں بغیر کسی واسطہ کے اس کے سلام کو سنتا ہوں اور جس کو یہ سعادت میسر نہیں آتی بلکہ وہ جہاں کہیں سے بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اس کا سلام ملائکہ سیاحین میرے پاس پہنچا دیتے ہیں اور سلام کا جواب میں دونوں صورتوں میں دیتا ہوں۔

اس حدیث سے اندازہ لگانا چاہے کہ آنحضرت ﷺ پر سلام بھیجنے کی فضیلت و سعادت ہے اور یہ کہ آنحضرت ﷺ سلام بھیجنے والے کو اور خاص طور پر اس شخص کو جو برابر اور کثرت سے آپ ﷺ پر سلام بھیجتا ہے کیا شرف و مرتبہ حاصل ہے؟ اگر کسی کے ایک سلام کا جواب بھی بارگاہ نبوت سے حاصل ہو جائے تو بہت بڑی سعادت ہے چہ جائیکہ برابر اور ہر سلام کا جواب ملتا رہے۔

بہر سلام مکن رنجہ درجواب آن لب — کہ صد سلام بس یکے جواب از تو

درود کی فضیلت

(۱۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ مَنْ صَلّٰى عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَلَائِكَتُهُ سَبْعِيْنَ صَلَاةً۔ (رواہ احمدؒ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ فرماتے ہیں کہ "جو شخص رحمت عالم ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اس پر اللہ اور اس کے فرشتے ستر مرتبہ رحمت بھیجتے ہیں۔" (احمدؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ درود بھیجنے کا یہ ثواب جمعہ کے دن سے متعلق ہے اس لئے کہ یہ ثابت ہے کہ جمعہ کے روز اعمال کا ثواب ستر گنا زیادہ ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حج اکبر (جو جمعہ کو ہوتا ہے) ستر حج کے برابر ہوتا ہے۔

اگر یہ حدیث موقوف ہے یعنی حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کا قول ہے لیکن پھر بھی مرفوع (آنحضرت ﷺ کا ارشاد کے حکم میں ہے کیونکہ کوئی بھی صحابی اعمال کا ثواب از خود بیان نہیں کر سکتا جب تک وہ اسے آنحضرت ﷺ سے سن نہ لے اس لئے یقینی بات ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے یہ مضمون آنحضرت ﷺ سے سنا ہوگا۔

(۱۸) وَعَنْ رُوَيْفِعٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَلّٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ اَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت رویفعؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص محمد ﷺ پر درود بھیجے اور (درود بھیجنے کے بعد یہ بھی) کہے اَللّٰهُمَّ اَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اے پروردگار! محمد ﷺ کو اس مقام پر جگہ دے جو تیرے نزدیک مقرب ہے قیامت کے دن تو اس کے لئے میری شفاعت واجب ہو جاتی ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: "مقام مقرب" سے مراد مقام محمود ہے جہاں قیامت کے دن آنحضرت ﷺ کھڑے ہو کر اللہ جل شانہ، کی ثنا و تعریف بیان فرمائیں گے اور بندوں کے حق میں شفاعت کریں گے۔

یوں تو آنحضرت ﷺ کی شفاعت تمام مسلمانوں کے لئے ثابت ہے کہ آپ ﷺ ہر امتی کے لئے شفاعت فرمائیں گے یہ نہیں ہوگا کہ کسی امتی کے لئے شفاعت فرمائیں اور کسی کے لئے نہیں پھر بھی اس شخص کو جو درود کے بعد مذکورہ دعا پڑھتا ہے ایک خاص درجہ حاصل ہوگا کہ اس کے لئے آنحضرت ﷺ کی شفاعت واجب ہوگی۔ یا اس کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس ارشاد سے درحقیقت ایسے شخص کے خاتمہ بالخیر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ یہ شخص حسن خاتمہ کی دولت سے نوازا جائے گا۔

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى دَخَلَ نَخْلاً فَسَجَدَ فَاَطَالَ السُّجُوْدَ حَتّٰى خَشِيْتُ اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَدْ تَوَفَّاهُ قَالَ فَجِئْتُ اَنْظُرُ فَرَفَعَ رَاْسَهٗ فَقَالَ مَالَكَ فَذَكَرْتُ لَهٗ ذٰلِكَ قَالَ فَقَالَ اِنَّ جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لِيْ اَلَا اُبَشِّرُكَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ لَكَ مَنْ صَلّٰى عَلَيْكَ صَلَاةً صَلَّيْتُ عَلَيْهِ وَمَنْ سَلَّمَ عَلَيْكَ سَلَّمْتُ عَلَيْهِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) رحمت عالم ﷺ (مسجد سے یا مکان سے) نکل کر کھجوروں کے ایک باغ میں داخل ہو گئے اور وہاں (بارگاہ خداوندی میں) سجدہ ریز ہو گئے اور سجدہ میں آپ ﷺ نے اتنا طول کیا کہ میں ڈرا کہ (خدانخواستہ) کہیں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات تو نہیں دے دی، چنانچہ میں آپ ﷺ کو دیکھنے کے لئے آیا کہ آیا آپ ﷺ زندہ ہیں یا واصل بحق ہو چکے ہیں، آپ ﷺ نے (میری آہٹ پا کر) اپنا سر مبارک (زمین سے) اٹھایا اور فرمایا کہ "کیا ہوا......؟" (یعنی ایسی کیا بات پیش آگئی جو تم پر

اس قدر (گھبراہٹ اور غم کی علامت طاری ہے) تب میں نے صورت حال ذکر کی (کہ نصیب دشمناں میں تو آپ ﷺ کی طرف سے ڈر ہی گیا تھا) راوی کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مجھ سے کہا ہے کہ کیا آپ ﷺ کو یہ خوش خبری نہ سنادوں کہ اللہ بزرگ و برتر فرماتا ہے کہ جو شخص آپ ﷺ پر درود بھیجے میں اس پر رحمت بھیجوں گا اور جو شخص آپ ﷺ پر سلام بھیجے میں اس پر سلام بھیجوں گا۔" (احمدؒ)

تشریح: امام احمدؒ نے اپنی دوسری روایات میں آخر میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور سجدۂ شکر کے سلسلہ میں اس سے زیادہ صحیح حدیث میری نظر میں نہیں ہے اور یہ روایت متعدد طریق سے مروی ہے۔

قبولیت دعا درود پر موقوف ہوتی ہے

(۲۵) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اِنَّ الدُّعَاءَ مَوْقُوْفٌ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَا يَصْعَدُ مِنْهُ شَيْءٌ حَتّٰى تُصَلِّيَ عَلٰى نَبِيِّكَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت امیر المؤمنین حضرت عمر ابن خطابؓ فرماتے ہیں کہ "دعا اس وقت تک آسمان اور زمین کے درمیان معلق رہتی ہے اور اس میں سے کوئی چیز اوپر نہیں چڑھتی جب تک کہ تم اپنے نبی پر درود نہ بھیجو" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت درود پر موقوف ہے کیونکہ درود خود مقبول ہے اس لئے اس کے توسط اور وسیلہ سے دعا بھی مقبول ہوتی ہے ؎

مور مسکین ہو سے داشت کہ در کعبہ رسد — دست درپائے کبوتر زدہ ناگاہ رسید

حصن حصین میں منقول ہے کہ حضرت شیخ ابوسلیمان درانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "جب تم اللہ کے سامنے اپنی کسی حاجت کی تکمیل کے لئے دست دعا دراز کرو تو ابتداء آنحضرت ﷺ پر درود بھیجنے سے کرو اس کے بعد تم جو کچھ چاہتے ہو اس کے لئے دعا مانگو اور دعا کو درود پر ختم کرو (یعنی دعا سے پہلے بھی آنحضرت ﷺ پر درود بھیجو اور دعا کے بعد بھی) کیونکہ اللہ جل شانہ اپنے فضل و کرم سے دونوں درودوں کو قبول کرتا ہے اور وہ اس چیز سے بزرگ و برتر ہے کہ اس دعا کو چھوڑ دے جو ان دونوں درودوں کے درمیان ہے (یعنی اللہ کے رحم و کرم سے یہ بات بعید ہے کہ وہ دونوں درودوں کو تو قبول کرے ان کے درمیان مانگی جانے والی دعا کو قبول نہ کرے)

علامہ طیبیؒ اس حدیث کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ "یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خود حضرت عمرؓ کا ارشاد گرامی ہو اس شکل میں یہ حدیث موقوف ہوگی اور یہ ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہو اس صورت میں یہ حدیث مرفوع ہوگی اور صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے یعنی حضرت عمرؓ کا ہی ارشاد ہے۔

لیکن محققین علماء حدیث فرماتے ہیں کہ "اس قسم کی بات کوئی راوی اپنی طرف سے کہہ نہیں سکتا (جیسا کہ اسی باب کی حدیث نمبر ۷ کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے) اس لئے یہ حدیث روایۃً تو موقوف ہی ہے لیکن حکماً مرفوع ہے۔"

بَابُ الدُّعَاءِ فِي التَّشَهُّدِ

تشہد میں دعا پڑھنے کا بیان

آخری قعدہ میں التحیات اور درود کے بعد دعا مانگنا سُنّت ہے، فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ نمازی التحیات اور درود پڑھنے کے بعد اپنی خواہش و پسند کے مطابق دعا مانگے لیکن دعا عام لوگوں کے کلام کے مشابہ نہ ہو جیسے کہ کوئی دعا مانگنے لگے "یا اللہ! مجھے روٹی دے مجھے

کپڑا دے وغیرہ وغیرہ" اس قسم کی دعا مانگنی ذرا مناسب نہیں ہے۔

ابھی باب التشہد میں بھی آپ نے وہ حدیث پڑھی! جو حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے اس میں بھی یہ الفاظ منقول ہیں کہ انہیں آنحضرت ﷺ نے التحیات کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "پھر ان دعاؤں کو اختیار کرو جو تمہیں پسند ہوں"۔ اور چونکہ تشہد میں آنحضرت ﷺ سے خاص دعائیں منقول ہیں کہ آپ تشہد میں وہ دعائیں پڑھا کرتے تھے۔ لہٰذا "پسندیدہ" سے مراد آنحضرت ﷺ سے وہی منقول دعائیں ہوسکتی ہیں۔

بہرحال۔ حاصل یہ ہے کہ تشہد میں انہیں دعاؤں کو پڑھنا جو آنحضرت ﷺ سے منقول ہیں زیادہ اولیٰ اور افضل ہے کیونکہ وہ دعائیں دنیا اور آخرت دونوں کے مقاصد کو جامع ہیں چنانچہ اس باب کے تحت وہ دعائیں نقل کی جائیں گی جنہیں آنحضرت ﷺ تشہد میں پڑھا کرتے تھے یا جن کی تعلیم آپ ﷺ دوسرے لوگوں کو فرمایا کرتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

تشہد میں آنحضرت کی دعا

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوْ فِى الصَّلَاةِ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَفِتْنَةِ الْمَمَاتِ اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ فَقَالَ لَهُ قَائِلٌ مَا اَكْثَرَ مَا تَسْتَعِيْذُ مِنَ الْمَغْرَمِ فَقَالَ اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا غَرِمَ حَدَّثَ فَكَذَبَ وَوَعَدَ فَاَخْلَفَ۔ (متفق علیہ)

"ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نماز میں (تشہد کے بعد) یہ دعا مانگتے تھے: اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَفِتْنَةِ الْمَمَاتِ اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ اے اللہ میں عذاب قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور کانے دجال کے فتنہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور زندگی کے فتنوں اور موت کے فتنوں سے تیری پناہ کا طلب گار ہوں اے پروردگار! میں تجھ سے گناہوں سے اور قرض سے پناہ چاہتا ہوں۔

(راوی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کی یہ دعا سن کر) کسی کہنے والے نے کہا کہ "آپ ﷺ کا قرض سے پناہ مانگنا بڑے تعجب کی بات ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "جب آدمی قرضدار ہوتا ہے تو باتیں بناتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔"

(بخاری ومسلم)

تشریح: دجال آخر زمانہ میں قیامت کے قریب پیدا ہوگا جو خدائی کا دعویٰ کرے گا اور لوگوں کو اپنے مکر و فریب اور شعبدہ بازیوں سے گمراہ کرے گے۔ اس کا مفصل ذکر انشاء اللہ مشکوٰۃ کے آخری ابواب میں آئے گا۔

دجال کو مسیح کیوں کہتے ہیں: دجال کو مسیح اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی ایک آنکھ ملی ہوئی ہوگی یعنی وہ کانا ہوگا یا کہ وہ چونکہ ممسوح ہوگا اسلئے اس مناسبت سے اسے مسیح کہا جاتا ہے۔ ممسوح کا مطلب ہے "تمام بھلائیوں، نیکیوں اور خیر و برکت کی باتوں سے بالکل بعید، نا آشنا اور ایسا کہ جیسے اس پر کبھی ان چیزوں کا سایہ بھی نہ پڑا ہوگا"۔ اور ظاہر ہے کہ اتنی بری خصلتوں کا حامل دجال کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔؟

حضرت عیسیٰ کو مسیح کہنے کی وجہ: اسی کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب بھی "مسیح" ہے جس کی اصل مسیحا ہے اور مسیحا عبرانی زبان میں "مبارک" کو کہتے ہیں یا یہ کہ مسیح کے معنی ہیں "بہت سیر کرنے والا" چونکہ قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں آسمان سے اتارے جائیں گے اور دنیا سے گمراہی و ضلالت اور برائیوں کی جڑ اکھاڑنے اور پھر تمام عالم پر خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے حکمرانی

کرنے پر مامور فرمائے جائیں گے اور اس سلسلے میں آپ ﷺ کو امور مملکت کی دیکھ بھال کرنے اور خدا کے دین کو عالم میں پھیلانے اور کانے دجال کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے تقریباً پوری دنیا میں پھرنا پڑے گا۔ اس لئے اس مناسبت سے مسیح آپ ﷺ کا لقب قرار پایا ہے۔

بہر حال لفظ مسیح کا اطلاق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دجال ملعون دونوں پر ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان امتیازی فرق یہ ہے کہ جب صرف "مسیح" لکھا اور بولا جاتا ہے تو اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی مراد لی جاتی ہے اور جب دجال ملعون مراد ہوتا ہے تو لفظ مسیح کو دجال کے ساتھ قید کر دیتے ہیں یعنی "مسیح دجال" لکھتے اور بولتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے اس دعا میں چھ چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی ہے ① عذاب قبر۔ ② فتنہ دجال ③ فتنہ زندگی۔ ④ فتنہ موت ⑤ گناہ ⑥ قرض۔ یہ چھ چیزیں اپنی ہیبت و ہلاکت اور دینی و دنیاوی خسران و نقصان کے باعث بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان چیزوں سے اگر خداوند تعالیٰ نے نجات دی اور اپنا فضل و کرم فرمادیا تو دینی و دنیاوی، دونوں زندگیاں کامیابی و کامرانی سے اور رحمت و سعادت کی ہم آغوش ہوگی اور اگر خدانخواستہ کہیں کسی بدنصیب ان میں سے کسی ایک سے بھی پالا پڑ گیا تو جانئے کہ اس کی دنیا بھی تباہ و برباد ہو جائے گی اور آخرت کی تمام سہولتیں و آسانیاں اور وہاں کی رحمتیں و سعادتیں بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی اور وہ عذاب خداوندی کا مستحق ہوگا اسی لئے آنحضرت ﷺ نے خود ان چیزوں سے پناہ مانگ کر اُمت کے لئے تعلیم کا دروازہ کھولا ہے کہ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے پروردگار سے ان سخت و ہیبت ناک چیزوں سے پناہ مانگتا رہے تاکہ پروردگار اس کو ان سے محفوظ و مامون رکھے۔

عذاب قبر اور فتنہ دجال یہ تو بالکل ظاہر ہیں ان کی کسی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں ہے البتہ "فتنہ زندگی" یہ ہے کہ صبر و رضا کے فقدان کی وجہ سے زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں میں گرفتار ہو اور نفس ان چیزوں میں مشغول و مستغرق ہو جائے جو راہ ہدایت اور راہ حق سے ہٹا دیتی ہوں اور زندگی کو گمراہیوں و ضلالتوں کی کھائی میں پھینک دیتی ہوں۔

"فتنہ موت" کا مطلب یہ ہے کہ "شیطان لعین حالت نزع میں اپنے مکر و فریب کا جال پھینکنے اور مرنے والے کے دل میں وسواس و شبہات کے بیج بو کر اس کے آخری لمحوں کو جس پر دائمی نجات و عذاب کا دارومدار ہے برائی و گمراہی کی بھینٹ چڑا دے تاکہ اس دنیا سے رخصت ہونے والا نعوذ باللہ ایمان و یقین کے ساتھ نہیں بلکہ کفر و تشکیک کے ساتھ فوت ہو جائے (العیاذ باللہ) اسی طرح منکر نکیر کے سوالات کی سختی، عذاب قبر کی شدت اور عذاب عقبیٰ میں گرفتاری بھی موت کے فتنہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے ہر مسلمان کو محفوظ و مامون رکھے۔ آمین"

لفظ "ماثم" یا تو مصدر ہے یعنی گناہ کرنا، یا اس سے مراد وہ چیز ہے جو گناہ کا باعث ہے۔

بہر حال اس کا مطلب یہ ہے کہ ان گناہوں سے خدا کی پناہ، جس کے نتیجہ میں بندہ عذاب آخرت اور خدا کی ناراضگی مول لیتا ہے۔ یا ان چیزوں سے خدا کی پناہ جو گناہ صادر ہونے کا ذریعہ ہیں، یا جن کو اختیار کر کے بندہ راہ راست سے ہٹ جاتا ہے اور ضلالت و گمراہی کی راہ پر پڑ جاتا ہے۔

قرض سے پناہ مانگنے کی وجہ: قرض سے پناہ مانگنے پر ایک صحابی کو تعجب ہوا کہ قرض میں ایسی کونسی برائی ہے جس سے پناہ مانگی جارہی ہے بلکہ اس سے تو بہت سے ضرورت مندوں کے کام پورے ہوتے ہیں اور دنیاوی حالات میں اس سے بڑی حد تک مدد ملتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی قباحت اور برائی کی جس کی بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یقیناً ایسی ہی ہے کہ اس سے پناہ مانگی جانی چاہئے۔ اول تو دنیاوی اعتبار سے بھی کسی کا قرضدار ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے پھر دین و آخرت کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کی وجہ سے ایسی چیزوں کا ارتکاب ہوتا ہے جو شریعت کی نظر میں نہ صرف یہ کہ معیوب بلکہ عذاب آخرت کا سبب بنتی ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص کسی سے قرض مانگنے جاتا ہے تو پہلا مرحلہ یہی ہوتا ہے جب وہ گنہ گار ہوتا ہے کیونکہ بسا اوقات قرض مانگنے والا سیکڑوں بہانے تراشتا ہے،

سیکڑوں غلط سلط باتیں بناتا ہے اور مقصد بر آری کے لئے بڑے سے بڑا جھوٹ بولنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ قرض کی ادائیگی کا آتا ہے کہ قرض دار قرض لیتے وقت ایک وقت و عرصہ متعین کرتا ہے جس میں وہ قرض کی ادائیگی کا وعدہ کرتا ہے مگر تجربہ شاہد ہے کہ کوئی ایک آدھ ہی قرضدار ایسا ہوگا جو وقت معینہ پر ادائیگی کر دیتا ہوگا ورنہ اکثر و بیشتر وعدہ خلافی کرتے ہیں اس موقع پر بھی نہ صرف یہ کہ وعدہ خلافی ہوتی ہے بلکہ عدم ادائیگی کے عذر میں ہر طرح کا جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ اس طرح قرضدار وعدہ خلافی اور جھوٹ کا ارتکاب کر کے گناہ گار ہوتا ہے۔ پھر عدم ادائیگی کا یہ عذر ایک دو مرتبہ ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو بہت دنوں تک چلتا رہتا ہے اس طرح قرضدار مسلسل جھوٹ پر جھوٹ بولتا ہے، ہر مرتبہ وعدہ خلافیاں کرتا ہے اور اس طرح وہ گناہوں کی پوٹ اپنے اوپر لادتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں عذاب خداوندی اور مؤاخذہ آخرت کا سبب ہیں اس لئے ایسی غلط چیز سے پناہ مانگی گئی ہے۔

نماز میں کن چیزوں سے پناہ مانگنی چاہئے

② وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَرَغَ اَحَدُكُمْ مِنَ التَّشَهُّدِ الْاٰخِرِ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ اَرْبَعٍ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص (نماز میں) آخری تشہد (یعنی التحیات) سے فارغ ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ چار چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کا طلب گار ہو۔ ① عذاب دوزخ، ② عذاب قبر، ③ فتنہ زندگی و موت۔ ④ مسیح دجال کی برائی۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ کہ قعدہ آخر میں تشہد سے فراغت کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہئے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَاءِ وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ۔

"اے اللہ! میں دوزخ کے عذاب، قبر کے عذاب، زندگی اور موت کے فتنوں، اور مسیح دجال کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

③ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُعَلِّمُهُمْ هٰذَا الدُّعَاءَ كَمَا يُعَلِّمُهُمُ السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ يَقُوْلُ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ ہم صحابہؓ اور اہل بیت کو یہ دعا اسی طرح سکھاتے تھے جس طرح آپ ﷺ ہمیں قرآن کی کوئی سورۃ سکھایا کرتے تھے چنانچہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ (کہ دعا اس طرح پڑھو اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ اے اللہ! میں عذاب جہنم سے تیری پناہ مانگتا ہوں، عذاب قبر سے تیری پناہ کا طلب گار ہوں، مسیح دجال کے فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور زندگی و موت کے فتنہ سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔" (مسلم)

تشہد و درود کے بعد کی دعا

④ وَعَنْ اَبِیْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِّمْنِیْ دُعَاءً اَدْعُوْبِهٖ فِیْ صَلَاتِیْ قَالَ قُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔

(متفق علیہ)

"اور امیر المؤمنین حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ سے، عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی دعا بتا دیجئے کہ جسے میں اپنی نماز میں (تشہد و درود کے بعد) پڑھ لیا کروں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ پڑھ لیا کرو: اَللّٰهُمَّ اِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيْرًا وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ اے پروردگار! بیشک میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے علاوہ کوئی دوسرا گناہوں کو نہیں بخش سکتا لہٰذا تو مجھے بخش دے خاص طور سے بخشنا، اور مجھ پر رحم فرما، بیشک تو بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس روایت میں لفظ کثیرًا ثاء مثلثہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور مسلمؒ کی بعض روایات میں باء موحدہ کے ساتھ یعنی کبیرًا ذکر کیا گیا ہے لہٰذا اس دعا کو دونوں الفاظ کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے یعنی کبھی تو کثیرًا پڑھا جائے اور کبھی کبیرًا پڑھ لیا ہے۔

سلام پھیرنے کا بیان

⑤ وَعَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كُنْتُ اَرٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ يَسَارِهٖ حَتّٰى اَرٰى بَيَاضَ خَدِّهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عامر ابن سعد (تابعیؒ) اپنے والد مکرم (حضرت سعد ابن وقاصؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی حضرت سعدؓ نے) فرمایا کہ میں دیکھتا تھا کہ رحمت عالم ﷺ اپنے دائیں اور بائیں (اس طرح) سلام پھیرتے تھے کہ میں آپ کے رخساروں کی سپیدی دیکھ لیتا تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سلام پھیرنے کے وقت اپنا چہرہ مبارک اتنا پھیرتے تھے کہ آپ ﷺ کا منور رخسار نظر آنے لگتا تھا۔

قربان جایئے حضرت سعدؓ کی اس سعادت پر کہ ان کو نماز میں رحمت عالم سرور کائنات ﷺ کا پہلوئے مبارک نصیب ہوتا تھا۔

کاش کے اندر نمازم جاشود پہلوئے تو تابہ تقریب سلام افتد نظر بروئے تو

نماز کے بعد امام مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھے

⑥ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى صَلَاةً اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ جب نماز پڑھ کر فارغ ہو جاتے تھے تو ہماری طرح اپنا مبارک منہ متوجہ کر کے بیٹھتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب جماعت ختم ہو جاتی اور آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو لیتے تھے تو اپنا روئے اقدس مقتدیوں کی طرف متوجہ کر کے بیٹھ جاتے تھے۔

⑦ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْصَرِفُ عَنْ يَمِيْنِهٖ۔ (رواہ مسلم)

ؑ آپ کا نام عبداللہ اور کنیت ابوبکر ہے لقب آپ کا صدیق و عتیق ہے۔ بعض محققین کے مطابق آپ کا اصل نام عبدالکعبہ تھا پھر آپؐ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔ آپ کے والد عثمان اور کنیت ابو قحافہ تھی۔ سب مسلمان مردوں میں آپ پہلے ایمان لائے اور ہجرت میں یار غار تھے حضورؐ کے وصال کے بعد آپ کو خلیفہ بنایا گیا ۱۳ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور روضۂ اطہر میں مدفون ہوئے۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نماز سے فارغ ہونے کے بعد (کبھی) اپنی دائیں طرف پھیر کے بیٹھتے تھے۔" (مسلم)

⑧ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَا يَجْعَلُ اَحَدُكُمْ لِلشَّيْطَانِ شَيْئًا مِنْ صَلَاتِهٖ يُرٰى اَنْ حَقًّا عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَنْصَرِفَ اِلَّا عَنْ يَمِيْنِهٖ لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَثِيْرًا يَنْصَرِفُ عَنْ يَسَارِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے (یعنی) اس چیز کو لازم جانے کہ (نماز کے بعد) دائیں جانب ہی سے پھرے، کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ رحمت عالم ﷺ اکثر بائیں جانب سے پھرا کرتے تھے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ان احادیث کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سلام پھیرنے کے بعد کبھی تو دائیں جانب سے پھرتے تھے اور بائیں طرف بیٹھتے تھے، اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ آپ ﷺ سلام پھیر کر دعا مانگتے اور اپنے حجرہ شریف کی جانب جو بائیں طرف تھا تشریف لے جاتے تو کبھی اس کے برعکس کرتے تھے بائیں طرف سے پھر کر دائیں طرف بیٹھ جاتے تھے۔

پہلے طریقہ کو عزیمت یعنی اولیت پر حمل کیا گیا ہے کیونکہ اس میں دائیں طرف سے ابتداء ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ کا فعل اکثر اسی طرح ہوتا تھا، لیکن حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ دوسری صورت یعنی بائیں طرف سے پھرنا اگرچہ رخصت یعنی جائز ہے اور اس صورت کو کم ہی اختیار بھی کیا جاتا تھا لیکن سُنّت کو واجب کا درجہ دینا چونکہ ٹھیک نہیں ہے اس لئے صرف پہلی صورت یعنی دائیں طرف سے پھرنے کو لازم و واجب قرار نہ دیا جائے اور شارع کی جانب سے دی گئی رخصت (یعنی اجازت) کو کہ وہ دوسری صورت ہے ناقابل اختیار نہ جانا جائے اس لئے کہ حدیث شریف میں وارد ہے "حق تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی جانب سے عنایت کی گئی رخصتوں پر عمل کیا جائے جیسا کہ وہ عزیمتوں پر عمل کرنے کو پسند کرتا ہے"۔

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ چیز پسندیدہ اور محبوب ہے کہ اس عمل کو اختیار کیا جائے جس میں عزیمت یعنی اولیت ہے، اسی طرح اس کے نزدیک یہ چیز بھی قابل قبول اور پسندیدہ ہے کہ ان اعمال کو بھی اختیار کیا جائے جن کو حق تعالیٰ نے اولیٰ و افضل نہ سہی بہر حال جائز مقرر کر رکھا ہے۔

حضرات شوافعؒ نے ان احادیث سے مصلی کے لئے یہ درمیانی طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ اپنی ضرورت و سہولت جس طرف دیکھے، اسی طرف پھرے یعنی اگر اس کا مکان وغیرہ اس کے دائیں جانب ہے تو اسے دائیں طرف پھرنا چاہئے اور اگر بائیں طرف ہو تو اسے بائیں طرف پھرنا چاہئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی منقول ہے کہ "رحمت عالم ﷺ کبھی مقتدیوں کی طرف بھی منہ کر کے اور پشت قبلہ کی طرف کر کے بیٹھتے تھے" جیسا کہ اوپر کی حدیث میں گذرا۔

"نماز میں شیطان کا حصہ" اس لئے کہا گیا ہے کہ جب کوئی شخص ایک غیر لازم چیز کو اپنے اوپر واجب و لازم ہونے کا اعتقاد کرے گا تو گویا وہ شیطان کا تابع ہوا لہٰذا اس کی نماز کا کمال جاتا رہے گا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جس شخص نے کسی امر مستحب کو مستقل طریقہ سے اختیار کئے رکھا اور اسے لازم کا درجہ دے دیا اور رخصت (یعنی جواز) پر عمل نہ کیا تو سمجھو کہ شیطان اسے گمراہ کرنے کے لئے اس کے پاس پہنچ گیا ہے۔"

کاش کہ۔ اہل بدعت اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ انہوں نے امر مستحب تو کجا خلاف شرع چیزوں اور بدعات کو اپنے اوپر لازم و واجب گردان کر اپنے آپ کو ضلالت و گمراہی کی کس وادی میں پھینک رکھا ہے اور اپنے اوپر شیطان کو کتنا مسلّط کر رکھا ہے۔

یہ چاروں حدیثیں یعنی حدیث عامرؓ، حدیث ثمرہؓ، حدیث انسؓ اور حدیث عبداللہؓ اس باب کے موضوع سے متعلق تو نہیں ہیں البتہ اس کے متعلقات سے ہیں۔

نماز کے بعد کی دعا

⑨ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كُنَّا اِذَا صَلَّيْنَا خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْبَبْنَا اَنْ نَكُوْنَ عَنْ يَمِيْنِهٖ يُقْبِلُ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ قَالَ فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ رَبِّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ اَوْ تَجْمَعُ عِبَادَكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم رحمت عالم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو اسے پسند کرتے تھے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے داہنی جانب ہوں تاکہ آپ ﷺ (سلام کے وقت سب سے پہلے) ہماری طرف متوجہ ہوں، براءؓ کہتے ہیں کہ "میں نے آنحضرت ﷺ کو (سلام کے بعد دعا کے طور پر) یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ رَبِّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ اَوْ تَجْمَعُ عِبَادَكَ اے پروردگار مجھے اپنے عذاب سے بچا اس روز جب کہ تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا یا جمع کرے گا۔" (مسلم)

تشریح: یا تو آپ ﷺ یہ دعا ازراہ تواضع اور انکسار فرماتے ہوں گے یا اس سے آپ ﷺ کا مقصد اُمّت کو تعلیم دینا تھا کہ لوگ نماز کے بعد اس دعا کو پڑھا کریں۔

"تبعث" اور "تجمع" میں راوی کو شک واقع ہورہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو "یوم تبعث" فرمایا ہے یا "یوم تجمع" فرمایا ہے۔ بہرحال اس دعا کو ان دونوں الفاظ کے ساتھ کسی بھی ایک لفظ کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔

نماز کے بعد مقتدیوں کا امام سے پہلے اٹھ جانا غیر مستحب ہے

⑩ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اِنَّ النِّسَآءَ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنَّ اِذَا سَلَّمْنَ مِنَ الْمَكْتُوْبَةِ قُمْنَ وَثَبَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ صَلّٰى مِنَ الرِّجَالِ مَاشَاءَ اللّٰهُ فَاِذَا قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ الرِّجَالُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ کے زمانہ مبارک میں عورتیں (جب مردوں کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھتی تھیں تو) فرض نماز کا سلام پھیر کر فوراً اٹھ جاتی تھیں اور اپنے گھروں کو چلی جاتی تھیں اور آنحضرت ﷺ اور مردوں میں سے جو لوگ نماز میں شامل ہوتے تھے جتنی دیر اللہ کو منظور ہوتا بیٹھے رہتے تھے، پھر جب آنحضرت ﷺ کھڑے ہوتے تو سب مرد کھڑے ہوجاتے (اور اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے)۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ میں جب کہ عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ہی آپ ﷺ کے پیچھے نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتی تھیں اس وقت عورتوں کا یہ دستور ہوتا تھا کہ جوں ہی آنحضرت ﷺ سلام پھیر کر فارغ ہوتے وہ اس وجہ سے کہ راستہ میں مردوں سے مڈبھیڑ نہ ہو اور ان کے ساتھ راستہ میں چلنا نہ پڑے فوراً اٹھ جاتیں اور اپنے گھروں کو چل دیتیں تھیں۔

نماز کے بعد آنحضرت ﷺ کے بیٹھنے کے بارے میں کوئی دائمی معمول مذکور نہیں کہ آپ تمام نمازوں کے بعد ہمیشہ اتنی دیر تک بیٹھتے تھے بلکہ اسکا انحصار اختلاف اوقات پر ہوتا تھا چنانچہ آپ ﷺ سلام پھیر کر کبھی تو اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ الخ پڑھنے تک بیٹھتے تھے اور کبھی آپ ﷺ اتنا بیٹھتے تھے کہ دعا وغیرہ سے فارغ ہو کر قرآن کریم پڑھتے اور صحابہؓ کو احکام الٰہی کی تعلیم دیتے اور کبھی آپ ﷺ فجر کی نماز میں مصلے پر طلوع آفتاب تک بیٹھے رہتے تھے۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ امام کے لئے اس قسم کی ضرورت کے وقت نماز کے بعد مصلی پر کچھ دیر تک بیٹھے رہنا مستحب ہے۔ نیز مقتدیوں کے لئے یہ مستحب ہے کہ جب تک امام مصلے سے نہ اٹھے وہ بھی نہ اٹھیں۔

وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ جَابِرِ بْنِ سَمُرَۃَ فِیْ بَابِ الضَّحْکِ اِنْشَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

اور جابر ابن سمرہ کی (وہ) حدیث جس میں نماز کے بعد سے طلوع آفتاب تک آنحضرت ﷺ کا بیٹھنا مذکور ہے اور جسے صاحب مصابیح نے یہاں نقل کیا تھا، ہم انشاء اللہ باب الضحک میں نقل کریں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نماز کے بعد کی دعا

(١١) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ اَخَذَ بِیَدِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ لَاُحِبُّکَ یَا مُعَاذُ فَقُلْتُ وَاَنَا اُحِبُّکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ فَلَا تَدَعْ اَنْ تَقُوْلَ فِیْ دُبُرِ کُلِّ صَلَاۃٍ رَبِّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِیُّ اِلَّا اَنَّ اَبَادَاؤُدَ لَمْ یَذْکُرْ قَالَ مُعَاذٌ وَاَنَا اُحِبُّكَ۔

"حضرت معاذ ابن جبلؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) رحمت عالم ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے کر فرمایا کہ: معاذ! میں تمہیں دوست رکھتا ہوں۔ "میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں بھی آپ ﷺ کو دوست رکھتا ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا "(جب تم مجھے دوست رکھتے ہو تو) کسی بھی نماز کے بعد اس دعا کو پڑھنا ترک نہ کرو رَبِّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ "اے پروردگار! تو اپنے ذکر، اپنے شکر اور اپنی اچھی عبادت میں میری مدد کر۔"

اس روایت کو احمدؒ، ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے مگر ابوداؤدؒ نے معاذؓ کے یہ الفاظ وَاَنَا اُحِبُّكَ نقل نہیں کئے ہیں۔"

تشریح: "اچھی عبادت" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی عبادت ہو خواہ بدنی ہو یا مالی، پورے کمال اور حضور قلب کی اس کیفیت کے ساتھ کی جائے گویا کہ عبادت کرنے والا اللہ جل شانہ، کو دیکھ رہا ہے اور اس کی عبادت کر رہا ہے۔ کتاب الایمان کی بھی ایک حدیث میں "اچھی عبادت" کا یہی مطلب بیان کیا گیا ہے وہاں اس کی وضاحت اچھی طرح کی جا چکی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کو دوست رکھتا ہے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنی دوستی اور محبت کا اظہار اس سے کر دے۔

یہ حدیث اس فعل و قول اخذ بیدی ویقول انا احبك کے ساتھ مسلسل ہے۔ اس اصطلاح کی تعریف علماء و محدثین بخوبی سمجھتے ہیں چونکہ عوام سے اس کا تعلق نہیں ہے اس لئے ان کے سامنے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

سلام پھیرنے کا طریقہ

(١٢) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُسَلِّمُ عَنْ یَمِیْنِہٖ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ حَتّٰی یُرٰی بَیَاضُ خَدِّہِ الْاَیْمَنِ وَعَنْ یَسَارِہٖ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ حَتّٰی یُرٰی بَیَاضُ خَدِّہِ الْاَیْسَرِ۔ (رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَلَمْ یَذْکُرِ التِّرْمِذِیُّ حَتّٰی یُرٰی بَیَاضُ خَدِّہٖ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنْ عَمَّارِ بْنِ یَاسِرٍ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ اپنی دائیں جانب السلام علیکم ورحمۃ اللہ (یعنی تم پر اللہ کی سلامتی اور اللہ کی رحمت) کہتے ہوئے سلام پھیرتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دائیں رخسار کی سفیدی نظر آتی اور اپنی بائیں جانب بھی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہوئے سلام پھیرتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے بائیں رخسار کی سفیدی نظر آتی۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ)

ترمذی نے اپنی روایت میں حتی یری بیاض خدہ کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو عمارؓ ابن یاسر سے

نقل کیا ہے۔

تشریح: ابوداؤد اور نسائی نے تو اس روایت کو انہیں الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ مگر امام ترمذیؒ نے اپنی روایت میں حتی یری بیاض خدہ (یہاں تک کہ آپ کے رخسار کی سفیدی نظر آئی) نقل کیا ہے بلکہ انہوں نے صرف اس قدر نقل کیا ہے کہ کان یسلم عن یمینہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وعن یسارہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن ماجہؒ نے عمار ابن یاسرؓ سے یہ حدیث پوری اسی طرح نقل کی ہے نہ کہ ترمذیؒ کی طرح اس کا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نماز کے بعد اکثر بائیں جانب پھر کر بیٹھتے تھے

⑬ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ اَكْثَرُ انْصِرَافِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ صَلَاتِهٖ اِلٰى شِقِّهِ الْاَيْسَرِ اِلٰى حُجْرَتِهٖ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نماز کے بعد اکثر بائیں جانب اپنے حجرہ کی طرف پھر جاتے تھے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارک کا دروازہ مسجد میں بائیں محراب کی طرف تھا۔ اس لیے جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو جاتے تھے تو اکثر و بیشتر بائیں جانب پھرتے تھے اور اپنے حجرہ میں تشریف لے جاتے تھے۔

فرض کے بعد سنتیں پڑھنے کے لیے جگہ بدل لینی چاہیئے

⑭ عَنْ عَطَاءِ الْخُرَسَانِيِّ عَنِ الْمُغِيْرَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُصَلِّى الْاِمَامُ فِى الْمَوْضِعِ الَّذِىْ صَلّٰى فِيْهِ حَتّٰى يَتَحَوَّلَ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ عَطَاءُ الْخُرَاسَانِيُّ لَمْ يُدْرِكِ الْمُغِيْرَةَ۔

"حضرت عطاء خراسانیؒ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا، امام اس جگہ نماز نہ پڑھے جہاں نماز پڑھ چکا ہے بلکہ وہاں سے سرک جائے اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ عطاء خراسانی کی ملاقات حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے (ثابت) نہیں ہے (لہٰذا یہ حدیث منقطع ہے)۔"

تشریح: یہاں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جس جگہ فرض نماز پڑھی گئی ہے اسی جگہ سنتیں نہ پڑھی جائیں بلکہ اس جگہ سے ذرا ہٹ کر اور جگہ بدل کر دوسری جگہ سنتیں پڑھی جائیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات جان لیجئے کہ اس حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم خاص طور پر امام ہی کے لئے ہے مقتدی اس میں شامل نہیں ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ حکم مجموعی طور پر امام اور مقتدی سب کے لئے ہے۔

فرض اور سنتیں دونوں ایک ہی جگہ پڑھنے سے منع یا تو اس لئے کیا گیا ہے کہ کوئی آنے والا یہ گمان نہ کرے کہ نمازی ابھی فرض نماز ہی پڑھ رہا ہے یا اس لئے کہ دونوں جگہیں قیامت کے روز پروردگار کے سامنے نمازی کی اطاعت گزاری کی گواہی دیں جس سے اس کے مرتبہ میں اضافہ ہو۔

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ حکم ان فرض نمازوں کے بارے میں ہے جن کے بعد سُنّت موکدہ ہیں اور جن فرض نمازوں کے بعد سنتیں نہیں پڑھی جاتیں جیسے فجر و عصر تو ان کے بارے میں یہ حکم نہیں ہے مگر بعض علماء کی یہی رائے ہے کہ یہ حکم تمام نمازوں کے بارے میں یکساں طور پر ہے۔

⑮ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَضَّهُمْ عَلَى الصَّلَاةِ وَنَهَاهُمْ اَنْ يَنْصَرِفُوْا قَبْلَ انْصِرَافِهٖ مِنَ

الصَّلَاۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ صحابہؓ کو نماز پڑھنے کی رغبت دلاتے تھے اور ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے کہ وہ نماز کے بعد آپ ﷺ کے اٹھنے سے پہلے اٹھیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جزء کا مطلب یہ ہے کہ یا تو آپ ﷺ صحابہؓ کو مطلقاً نماز پڑھنے کی تاکید فرماتے تھے یا انہیں اس بات کی رغبت دلاتے تھے کہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں۔

آپ ﷺ کے ارشاد کے دوسرے جزو کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز ختم ہو جائے اور دعاء وغیرہ سے فارغ ہو جائے تو جب تک میں نہ اٹھ جاؤں مقتدی نہ اٹھیں تاکہ راستہ میں مرد عورتوں سے مل نہ جائیں جیسا کہ پہلے ایک حدیث میں گزر چکا ہے کہ نماز کے بعد آنحضرت ﷺ اور دوسرے لوگ بیٹھے رہتے تھے یہاں تک کہ جب عورتیں اٹھ کر چلی جاتی تھیں تو پہلے آپ ﷺ اٹھتے تھے اس کے بعد دوسرے لوگ اٹھ کر اپنے گھروں کو چل دیتے تھے۔ اس صورت میں یہ نہی تنزیہی ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں "پہلے اٹھنے" سے مراد مسبوق[1] کا اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ اس صورت میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہو گا کہ جب تک امام سلام نہ پھیرے اس وقت تک مسبوق اپنی بقیہ رکعتیں پڑھنے کے لئے کھڑا نہ ہو بلکہ جب امام سلام پھیر لے تب مسبوق کھڑا ہو۔ اس سلسلہ میں اتنی بات جان لیجئے کہ یہ شکل یعنی مسبوق کا امام کے سلام پھیرنے سے پہلے اٹھ کھڑا ہونا حنفیہ کے نزدیک حرام ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

تشہد کے بعد آنحضرت کی دعا

(۱۶) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ صَلَاتِهِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الْاَمْرِ وَالْعَزِيْمَةَ عَلَى الرُّشْدِ وَاَسْاَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَاَسْاَلُكَ قَلْبًا سَلِيْمًا وَلِسَانًا صَادِقًا وَاَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَرَوَى اَحْمَدُ نَحْوَهُ۔

"حضرت شداد ابن اوسؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ اپنی نماز میں (تشہد کے بعد) یہ دعا پڑھا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الْاَمْرِ وَالْعَزِيْمَةَ عَلَى الرُّشْدِ وَاَسْاَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَاَسْاَلُكَ قَلْبًا سَلِيْمًا وَلِسَانًا صَادِقًا وَاَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ اے پروردگار! میں تجھ سے دین میں ثابت قدمی اور راہ راست کے قصد کا سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے تیری نعمت کے شکر اور تیری عبادت کے حسن کی درخواست کرتا ہوں اور تجھ سے قلب سلیم اور سچی زبان مانگتا ہوں اور تجھ سے وہ بھلائی چاہتا ہوں جس کو تو جانتا ہے اور اس برائی سے پناہ مانگتا ہوں جس کو تو جانتا ہے اور معافی چاہتا ہوں ان گناہوں سے جن کو تو جانتا ہے۔" (نسائیؒ، احمدؒ)

تشریح: یہ دعا بھی آنحضرت ﷺ کی لسان مقدس سے تعلیم اُمّت کے پیش نظر ارشاد ہوئی ہے کہ اُمّت کے لوگ اس طرح دعا مانگا کریں۔ ورنہ تو جہاں تک آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے آپ ﷺ کو یہ تمام بھلائیاں اور سعادتیں حاصل تھیں جن کی طرف اس دعا میں اشارہ کیا گیا ہے اور تمام گناہوں سے آپ محفوظ تھے، نیز آپ ﷺ کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخشے جا چکے تھے۔

"راہ راست کے قصد" کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! مجھے اس بات کی توفیق عنایت فرما کہ تو نے ہدایت کا جو راستہ دکھلایا ہے اس پر ہمیشہ ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہوں اور ہدایت کو اپنی زندگی کے لئے لازم پکڑوں۔

---

[1] مسبوق اس شخص کو کہتے ہیں جو جماعت میں ایک رکعت یا اس سے زیادہ ہو جانے کے بعد آکر شریک ہوا ہو۔

"تجھ سے تیری نعمت کے شکر اور تیری عبادت کے حسن کی درخواست کرتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! مجھے اس بات کی توفیق عنایت فرما کہ تیری ان نعمتوں کو جن سے تونے مجھے سرفراز فرمایا ہے تیری اطاعت و فرمانبرداری میں اس طرح صرف کروں کہ تیرے احکام و فرمان کا پابند رہوں اور جن چیزوں سے تونے منع کیا ہے ان سے بچتا رہوں اور تیری عبادت کو اس کے پورے شرائط و آداب اور پورے ارکان کے ساتھ ادا کروں۔

"قلب سلیم" اس دل کو کہتے ہیں جو برے عقائد، کمزور خیالات اور غلط اعتقادات و نظریات سے پاک و صاف ہو اور خواہشات نفسانی کی طرف اس کا میلان نہ ہو نیز یہ کہ وہ ماسوی اللہ سے خالی ہو۔

دعا کے جملہ وَاَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَاتَعْلَمُ میں لفظ ما موصولہ ہے یا موصوفہ اور عائد محذوف ہے۔ اسی طرح اس جملہ میں لفظ من زائد ہے یہ بیانیہ اور مبین محذوف ہے۔ گویا اصل میں یہ عبارت اس طرح ہے اسالک شیاھو خیر ماتعلم یعنی میں تجھ سے اس اچھی چیز کی درخواست کرتا ہوں جس کے بارے میں تو جانتا ہے کہ وہ اچھی ہے یعنی میں ایسی چیز کی درخواست نہیں کرتا جس کے بارہ میں میرا خیال ہے کہ وہ اچھی چیز ہے۔ کیونکہ بندہ تو کسی چیز کو اچھی سمجھ لیتا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ اچھی نہیں ہوتی۔ اس لئے میں وہی چیز مانگتا ہوں جو تیرے نزدیک اچھی ہے۔ اسی طرح واعوذبک من شر ماتعلم کا مطلب بھی یہی ہے کہ میں اس بری چیز سے پناہ مانگتا ہوں جو تیرے نزدیک بری ہے اور جس کے بارے میں تیرا فیصلہ ہے کہ یہ بندہ کے حق میں برائی کا باعث ہے۔

(۱۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ صَلٰوتِهٖ بَعْدَ التَّشَهُّدِ اَحْسَنُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ وَاَحْسَنُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نماز میں التحیات کے بعد فرماتے تھے، بہترین کلاموں کا کلام اللہ کا ہے اور بہت بہترین طریقوں کا طریقہ محمد ﷺ کا ہے روایت کیا اس کو نسائی نے۔"

آنحضرت ﷺ کے سلام کا طریقہ

(۱۸) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَلِّمُ فِي الصَّلَاةِ تَسْلِيْمَةً تِلْقَاءَ وَجْهِهٖ ثُمَّ يَمِيْلُ اِلَى الشِّقِّ الْاَيْمَنِ شَيْئًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نماز میں ایک سلام پھیرتے تھے سامنے کے رخ پھر تھوڑا سا منہ کو دائیں جانب پھیرتے تھے۔ اس طرح آپ ﷺ سلام پورا فرماتے تھے۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ سلام پھیرتے تھے تو یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے کہ سلام کی ابتدا قبلہ رخ کرتے تھے درمیان میں دائیں جانب اس قدر چہرہ مبارک پھیرتے تھے کہ رخسار مبارک کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی جیسا کہ پہلی روایتوں میں گذر چکا ہے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نماز میں صرف ایک ہی سلام دائیں جانب پھیرتے تھے چنانچہ حضرت امام مالکؒ اسی حدیث کے پیش نظر فرماتے ہیں کہ نماز میں صرف ایک ہی سلام مشروع ہے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے یہاں متفقہ طور پر نماز میں دو سلام یعنی دائیں اور بائیں دونوں جانب مشروع ہیں، کیونکہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دائیں اور بائیں دونوں طرف سلام پھیرنا چاہیے۔

اب اس حدیث کی تاویل ان ائمہ ثلاثہ کی جانب سے یہ کی جاتی ہے کہ ایک سلام تو آپ ﷺ بلند آواز سے کہتے تھے اور دوسرا سلام آہستہ آواز سے، اس لئے حضرت عائشہؓ نے یہاں بلند آواز سے کہے جانے والے سلام کا اعتبار کیا اور صرف اسی ایک کو ذکر کیا۔

سلام پھیرتے وقت جواب کی نیت

(۱۹) وَعَنْ سَمُرَةَ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَرُدَّ عَلَى الْاِمَامِ وَ نَتَحَابَّ وَ اَنْ يُسَلِّمَ بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سمرہؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم سلام پھیرتے وقت امام کے سلام کے جواب کی نیت کریں، ہم آپس میں محبت رکھیں اور ایک دوسرے کو سلام کریں۔" (ابوداؤد)

تشریح: پہلے حکم کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی جب سلام پھیریں تو اس وقت وہ یہ نیت کریں کہ ہم امام کے سلام کا جواب دے رہے، اس کی شکل یہ ہوگی جو مقتدی امام کے دائیں جانب ہوں وہ تو دوسرے سلام میں، جو مقتدی بائیں جانب ہوں وہ پہلے سلام میں اور جو مقتدی امام کے مقابل ہوں وہ دونوں سلام میں امام کے سلام کے جواب کی نیت کریں اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب امام سلام پھیرے تو وہ بھی اس وقت یہ نیت کرے کہ میں مقتدیوں کو سلام کر رہا ہوں۔

دوسرے حکم کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان آپس میں یعنی نمازیوں اور اللہ کے تمام بندوں سے محبت کریں، ان کے ساتھ خوش خلقی، مروت اور اچھے اخلاق سے پیش آئیں۔

تیسرے حکم کا مطلب یہ ہے کہ "جس طرح امام سلام پھیرتے وقت مقتدیوں پر سلام کی اور مقتدی سلام پھیرتے وقت امام کے سلام کے جواب کی نیت کرتے ہیں اسی طرح تمام مقتدی نماز میں سلام پھیرتے وقت آپس میں ایک دوسرے کے سلام کی نیت کریں۔ اس طرح کہ دائیں طرف سلام پھیرتے وقت دائیں جانب کے مقتدیوں کی نیت کریں اور بائیں طرف سلام پھیرتے وقت بائیں جانب کے مقتدیوں کی نیت کرنی چاہئے۔ اور ہر نمازی کو چاہئے کہ وہ دونوں سلام میں ملائکہ کی بھی نیت کرے کیونکہ احادیث میں اس کا حکم بھی دیا گیا ہے اور حنفیہ کے بعض علماء نے تو کہا ہے کہ یہ سُنّت ہے گو دوسرے حضرات نے اسے ترک کیا ہے۔

بَابُ الذِّكْرِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ

نماز کے بعد ذکر کا بیان

اس باب کے تحت وہ احادیث ذکر کی جائیں گی جن سے نماز کے بعد دعا اور دیگر اوراد و وظائف کے پڑھنے کی اہمیت اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے، یہاں "ذکر" کا لفظ عام ہے جو دعا اور اوراد و وظائف سب پر حاوی ہے۔

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ جن فرض نمازوں کے بعد سنتیں پڑھی جاتی ہیں ان کے بعد نمازی دعا اور اوراد و وظائف کے لئے کتنی دیر تک بیٹھ سکتا ہے، چنانچہ درمختار میں لکھا ہے کہ فرض نماز پڑھ لینے کے بعد سنتوں کے پڑھنے میں تاخیر کرنا مکروہ ہے البتہ اللھم انت السلام (آخر تک) کے بقدر دعا وغیرہ پڑھنے کے لئے کچھ دیر بیٹھنا ثابت ہے۔

علامہ حلوانیؒ کا قول یہ ہے کہ اوراد و وظائف پڑھنے کی غرض سے فرض و سنتوں کے درمیان وقفہ میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اسی قول کو کمالؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔

علامہ حلبیؒ نے ان دونوں اقوال میں تطبیق یوں پیدا کی ہے کہ اگر یہاں مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی نہ لیا جائے بلکہ مکروہ تنزیہی مراد لیا جائے تو ان دونوں اقوال میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہے گا کیونکہ پہلے قول کا مطلب پھر یہ ہوگا کہ اوراد و وظائف پڑھنے کے لئے سنتوں کے پڑھنے میں تاخیر کرنا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے البتہ مکروہ تنزیہی ہے یعنی اگر تاخیر نہ کی جائے تو بہتر ہوگا۔ اسی طرح علامہ حلوانیؒ کے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ فرض نماز پڑھنے کے بعد اوراد و وظائف پڑھنے کے لئے سنتوں میں تاخیر کرنے میں اگرچہ کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن

مناسب یہی ہے کہ تاخیر نہ کی جائے، اس طرح یہ دونوں قول اپنی اپنی جگہ صحیح رہے اور دونوں میں کوئی تضاد بھی باقی نہیں رہا۔

صاحب درمختار کے ایک قول کا مفہوم یہ ہے کہ "یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فرض و سُنّت کے درمیان دعا اور اوراد و وظائف پڑھے جائیں تو تعارض دور ہوجاتا ہے۔"

اس کے بعد موصوف فرماتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ نماز کے بعد[1] تین مرتبہ استغفر اللہ پڑھا جائے، آیتہ الکرسی اور معوذات (یعنی سورہ قل ہو اللہ، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) پڑھی جائے اور سبحان اللہ، الحمد للہ، اور اللہ اکبر تینتیس تینتیس مرتبہ پڑھے جائیں اور پھر ایک مرتبہ تہلیل (لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک الخ) پڑھ کر سو کے عدد کو پورا کیا جائے پھر اس کے بعد دعا مانگی جائے اور دعا کو اس جملہ پر ختم کیا جائے سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

جماعت ختم ہوجانے کے بعد جب سنتیں پڑھی جائیں تو مقتدیوں کو چاہئے کہ صفوں کو توڑ دیں یعنی سُنّت پڑھنے کے لئے صف بندی کے ساتھ کھڑے نہ ہوں بلکہ آگے پیچھے ہٹ کر کھڑے ہوں۔ اور امام کو بھی چاہئے کہ وہ بھی امامت کے مصلے سے ہٹ کر آگے پیچھے یا دائیں بائیں ہوجائے تاکہ بعد میں آنے والے نمازیوں کو یہ خیال نہ ہو کہ ہنوز جماعت کھڑی ہے اور کوئی نمازی اسی خیال میں امام کی اقتدا کر کے نماز کے لئے کھڑا ہوجائے اور پھر اس کی اقتداء فاسد ہو۔

اس چیز میں بھی اختلاف ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد دعا اور اوراد وغیرہ پڑھنے کے لئے امام کے لئے دائیں طرف گھوم کر بیٹھنا افضل ہے یا بائیں طرف؟ چنانچہ صحیح قول یہ ہے کہ اسے اختیار ہے چاہے دائیں طرف گھوم کر بیٹھے اور چاہے بائیں طرف لیکن اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ بائیں طرف گھوم کر بیٹھنا ہی متفقہ طور پر سب کے نزدیک افضل ہے کیونکہ حجرہ شریف اسی سمت ہے۔

اگر کوئی شخص فرض نماز کے بعد سنتیں پڑھ لے اور اس کے بعد احادیث میں مذکورہ اوراد و وظائف پڑھے تو یہ اس بعدیت کے منافی نہیں ہوگا جو احادیث میں مذکور ہیں (یعنی احادیث میں مذکور ہے کہ نماز کے بعد فلاں فلاں دعا یا وظیفہ پڑھا جائے تو اگر کوئی شخص فرض نماز پڑھ کر پہلے سنتیں پڑھے اور پھر اس کے بعد مذکورہ اوراد و وظائف پڑھے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ اس فضیلت سے محروم رہا۔ کیونکہ حدیث کا مقصد تو یہ ہے کہ یہ اوراد و وظائف نماز کے بعد پڑھے جائیں خواہ سنتوں کے بعد بلکہ سنتوں کے بعد ہی پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔

اس طرح صحیح احادیث سے چونکہ یہ ثابت ہے کہ فجر اور مغرب کی نماز کے بعد لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ دس مرتبہ پڑھا جائے، یا ان نمازوں کے بعد آیتہ الکرسی پڑھنا احادیث سے ثابت ہے تو اگر کوئی شخص مغرب کی فرض نماز کے بعد پہلے سنتیں پڑھ لے اور پھر اس کے بعد آیتہ الکرسی یا مذکورہ بالا تہلیل پڑھے تو حدیث کے مطابق اسے وہی فضیلت حاصل ہوگی جو فرض نماز کے بعد انہیں پڑھنے پر حاصل ہوتی۔

بعض لوگ یہ سوچ کر کہ جلدی بھی ہوجائے اور مذکورہ بالا چیزوں کو پڑھنے کی فضیلت بھی حاصل ہوجائے، مغرب کی سنتوں میں آیتہ الکرسی پڑھ لیتے ہیں یہ محض وہم ہے کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ مغرب کی سنتوں میں قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھا کرتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز کے اختتام پر اللہ اکبر کہنا

(۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ اَعْرِفُ انْقِضَاءَ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالتَّكْبِيْرِ۔ (متفق علیہ)

[1] جن نمازوں میں سنتیں نہیں پڑھی جاتیں ان میں فرض کے بعد اور جن کے بعد سنتیں پڑھی جاتی ہیں ان میں سنتوں کے بعد یہ اوراد پڑھے جائیں ۱۲۔

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں رحمت عالم ﷺ کی نماز کے ختم ہونے کو آپ ﷺ کے اللہ اکبر کہنے سے پہچان لیتا تھا۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: نماز کے اختتام پر "اللہ اکبر" کہنے کی مراد کے تعین میں شارحین حدیث کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنے سے مراد "ذکر" ہے جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں فرض نماز سے فراغت کے وقت لوگوں کے لئے باآواز بلند ذکر مقرر تھا۔ پھر حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں، کہ میں نماز کے اختتام کو اسی کے ذریعہ پہچانتا تھا (یعنی جب لوگ بلند آواز سے ذکر کرتے تھے تو میں جان لیتا تھا کہ نماز ہو چکی ہے)۔ ابن عباسؓ کی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام بخاریؒ نے پھر ابن عباسؓ کی اس روایت کو نقل کیا ہے جو یہاں ذکر کی گئی ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ تکبیر سے مراد مطلق "ذکر" ہے۔

لیکن اتنی بات بھی سمجھتے چلئے کہ حضرت امام شافعیؒ نے آنحضرت ﷺ کے اس ذکر بالجہر کو تعلیم اُمت پر محمول کیا ہے چنانچہ بیہقی وغیرہ نے آہستہ آواز سے ذکر کرنے پر صحیحین کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ صحابہؓ کو اس بات کا حکم دیا کرتے تھے کہ وہ تہلیل و تکبیر بلند آواز سے نہ کریں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو، وہ (یعنی خدا) تو تمہارے ساتھ ہے اور قریب ہے"

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں "تکبیر" سے مراد وہ تکبیر ہے جو نماز کے بعد تسبیح و تحمید کے ساتھ دس مرتبہ یا تیس مرتبہ پڑھتے ہیں۔ کچھ محققین کی رائے ہے کہ "آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں نماز کے بعد ایک بار یا تین بار تکبیر کہی جاتی تھی۔"

بعض علماء کا قول ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا تعلق ایام منی سے ہے کہ وہاں تشریق کی تکبیرات کہتے تھے، بہر حال۔ ان تمام اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے بھی سب سے بڑا اشکال حضرت ابن عباسؓ کے اس قول پر یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ کیا وجہ ہے کہ ابن عباسؓ سلام سے تو نماز کے اختتام کو نہ جانتے تھے اور تکبیر سے جانتے تھے کہ نماز ہو چکی ہے۔؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اس وقت صغیر السن تھے اس لئے ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ جماعت میں شریک نہ ہوتے ہوں گے، یا پھر یہ احتمال ہے کہ وہ جماعت میں شریک تو ہوتے ہوں گے لیکن پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہوں گے اس لئے وہاں تک آنحضرت ﷺ کی آواز نہ پہنچنے کے سبب وہ سلام پر نماز کے اختتام کو نہ پہچانتے ہوں گے بلکہ جب مقتدی باآواز بلند تکبیر کہتے ہوں گے تو وہ یہ جان لیتے ہوں گے کہ نماز ختم ہو گئی۔ واللہ اعلم۔

فرض کے بعد آنحضرت ﷺ کے بیٹھنے کی مقدار

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَلَّمَ لَمْ يَقْعُدْ إِلَّا مِقْدَارَ مَا يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔ (رواہ مسلم)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ جب (فرض نماز کا) سلام پھیر لیتے تھے تو صرف اس دعا کے بقدر بیٹھتے تھے اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ اے اللہ! تو سالم ہے (یعنی تمام عیوب سے پاک ہے) اور تجھی سے (بندوں کی تمام آفات سے) سلامتی ہے۔ اے بزرگی و بخشش والے تو برتر ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جن فرض نمازوں کے بعد سنتیں پڑھی جاتی ہیں ان کے سلام کے بعد آنحضرت ﷺ صرف اسی قدر بیٹھتے تھے کہ یہ دعا پڑھ لیں۔ لیکن جن فرض نمازوں کے بعد سنتیں نہیں ہیں جیسے فجر، عصر، ان کے سلام پھیرنے کے بعد آپ ﷺ کا اس سے زیادہ بیٹھنا بھی ثابت ہے، چنانچہ اسی بناء پر علماء لکھتے ہیں کہ ان نمازوں کے بعد طلوع آفتاب و غروب آفتاب تک

ذکر میں مشغول رہنا مستحب ہے۔

سلام کے بعد "نہ بیٹھنے" کی ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ آپ ﷺ ہیئت نماز میں صرف اتنی ہی دیر تک بیٹھے رہتے کہ یہ دعا پڑھ لیں یا یہ کہ آپ اکثر و بیشتر صرف اسی قدر بیٹھتے تھے۔

یہاں جو دعا ذکر کی گئی ہے اس میں یہ الفاظ بھی پڑھے جاتے ہیں وَاِلَیْكَ یَرْجِعُ السَّلَامُ فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَاَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ حالانکہ یہ الفاظ احادیث سے ثابت نہیں ہیں بلکہ بعد میں ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

(۳) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلَاتِہٖ اِسْتَغْفَرَ ثَلَاثًا وَقَالَ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ثوبانؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ جو اپنی نماز سے فارغ ہو لیتے تو (پہلے) تین مرتبہ استغفار کرتے اور (پھر) یہ دعا پڑھتے اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ سلام پھیر لیتے تھے تو پہلے تین مرتبہ استغفار کرتے یعنی استغفر اللہ تین مرتبہ کہتے اس کے بعد مذکورہ بالا دعا پڑھتے۔

بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ استغفار کے لئے تین مرتبہ اس طرح کہتے تھے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔

فرض نماز کے بعد کی دعا

(۴) وَعَنِ الْمُغِیْرَۃِ بْنِ شُعْبَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ فِیْ دُبُرِ کُلِّ صَلَاۃٍ مَکْتُوْبَۃٍ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ لَہُ الْمُلْكُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ لَہُ الْمُلْكُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں، اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے ہر قسم کی تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ! جو چیز تو نے عطا کی ہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اور جس چیز کو تو نے روک دیا ہے اس کو کوئی دینے والا نہیں ہے اور دولت مند کو اس کی دولت تیرے عذاب سے بچانے والی نہیں ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ یہ دعا اور دیگر دعائیں و کلمات اذکار جو مختلف احادیث میں مذکور ہیں نماز کے بعد پڑھا کرتے تھے علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ بعض اوقات تو سلام پھیرنے کے بعد بغیر کچھ پڑھے ہوئے کھڑے ہوتے تھے اور بعض اوقات مذکورہ دعا و اذکار میں سے کچھ یا سب پڑھا کرتے تھے۔

چونکہ احادیث سے نماز کے بعد پڑھنے کے لئے مختلف دعائیں ثابت ہیں اس لئے بعض علماء نے ان کے پڑھنے کی ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ اول تو استغفار کیا جائے اس کے بعد اللھم انت السلام آخر تک پڑھا جائے پھر اس کے بعد لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ آخر تک پڑھا جائے۔ ان دعاؤں کے علاوہ اور بہت سی دعائیں بھی احادیث میں مذکور ہیں جن کے بارے میں ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ انہیں نماز کے بعد پڑھا کرتے تھے۔

اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ "بعد" سے یہ مراد نہیں کہ یہ دعائیں فرض نماز کے بعد متصلاً ہی پڑھنی چاہئیں بلکہ اگر سنتوں کے بعد بھی یہ

دعائیں پڑھی جائیں گی تو "نماز کے بعد" پڑھنا ہی کہلائے گا۔

(۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ الزُّبَیْرِ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا سَلَّمَ مِنْ صَلَاتِہٖ یَقُوْلُ بِصَوْتِہِ الْاَعْلٰی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّآ اِیَّاہُ لَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ جب اپنی نماز سے سلام پھیرتے تھے تو (سلام کے بعد) بلند آواز سے یہ کلمات پڑھا کرتے تھے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّآ اِیَّاہُ لَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں، اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے ہر قسم کی تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، گناہوں سے باز رہنے اور عبادت کرنے کی قوت صرف خدا ہی کی مدد سے ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں، خدا ہی کے لئے اس کی بندگی کو خالص کرنے والے ہیں اگرچہ کافر اسے برا سمجھیں۔" (مسلم)

تشریح: علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ان کلمات دعا کو بھی تعلیم اُمت کے پیش نظر بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ امام نوویؒ نے کتاب مہذب میں لکھا کہ "اس دعا کو اور اس کے علاوہ دیگر دعاؤں کو آہستہ آواز سے پڑھنا افضل ہے خواہ امام ہو یا منفرد، ہاں اگر اس بات کی ضرورت ہو کہ کوئی دعا کسی کو سکھانا ہے تو اس کو بلند آواز سے پڑھ لینا چاہئے، چنانچہ اس دعا کو آنحضرت ﷺ کے بلند آواز سے پڑھنے کو اسی پر محمول کیا گیا ہے کہ چونکہ آپ ﷺ کا مقصد، صحابہؓ کو یہ دعا سکھانا تھا اس لئے آپ ﷺ بلند آواز سے پڑھتے تھے اور جب لوگوں کو دعا یاد ہو گئی تو اسے آہستہ آواز سے پڑھنا ہی افضل ہوا۔

نماز کے بعد کن چیزوں سے پناہ مانگنی چاہئے

(۶) وَعَنْ سَعْدٍ اَنَّہٗ کَانَ یُعَلِّمُ بَنِیْہِ ھٰؤُلَآءِ الْکَلِمَاتِ وَیَقُوْلُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَتَعَوَّذُ بِھِنَّ دُبُرَ الصَّلٰوۃِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سعدؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کلمات دعا کے یہ الفاظ سکھاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ رحمت عالم ﷺ اپنی نماز کے بعد انہیں الفاظ کے ذریعے پناہ مانگا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ اے اللہ! میں نامرادی سے تیری پناہ چاہتا ہوں، بخل سے تیری پناہ کا طلب گار ہوں، ناکارہ عمر سے تیری پناہ کا خواستگار ہوں۔ اور فتنہ دنیا و عذاب قبر سے (یعنی ان چیزوں سے جو عذاب قبر کا سبب ہیں) تیری پناہ مانگتا ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہاں "جبن" سے مراد "طاعت کی جرات نہ کرنا" ہے اور "بخل" سے مراد یہ ہے کہ کسی غیر کو مال علم اور خیر خواہی سے فائدہ نہ پہنچایا جائے۔ "ناکارہ عمر" کا مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی کے اس اسٹیج پر پہنچ جائے جہاں عقل میں خلل آجاتا ہے اعضا ضعیف ہو جاتے ہیں طاقت و قوت یکسر جواب دے دیتی ہے اور ایسا شخص بالکل اپاہج و معذور ہو کر دین و دنیا کے کاموں کے لئے ناکارہ بن جاتا ہے۔ اسی عمر سے پناہ مانگنی چاہئے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا حاصل اور مقصود تو صرف یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہا جائے اس کی نعمتوں کا اچھی طرح شکر ادا کیا جاتا رہے اور ظاہر ہے کہ اسی ناکارہ عمر میں کوئی شخص نہ پوری طرح عبادت کر سکتا ہے اور نہ اداء شکر میں مشغول رہ سکتا ہے۔ اس طرح زندگی اور عمر کا جو اصل مقصد ہے وہ فوت ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ناکارہ زندگی سے

بچائے۔

نماز کے بعد کی تسبیح اور اس کی فضیلت

(۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِيْنَ اَتَوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا قَدْ ذَهَبَ اَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالدَّرَجَاتِ الْعُلٰى وَالنَّعِيْمِ الْمُقِيْمِ فَقَالَ وَمَا ذَاكَ قَالُوْا يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّى وَ يَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَلَا نَتَصَدَّقُ وَيُعْتِقُوْنَ وَلَا نُعْتِقُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفَلَا اُعَلِّمُكُمْ شَيْئًا تُدْرِكُوْنَ بِهٖ مَنْ سَبَقَكُمْ وَتَسْبِقُوْنَ بِهٖ مَنْ بَعْدَكُمْ وَلَا يَكُوْنُ اَحَدٌ اَفْضَلَ مِنْكُمْ اِلَّا مَنْ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُمْ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ تُسَبِّحُوْنَ وَتُكَبِّرُوْنَ وَتَحْمَدُوْنَ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ مَرَّةً قَالَ اَبُوْصَالِحٍ فَرَجَعَ فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِيْنَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا سَمِعَ اِخْوَانُنَا اَهْلُ الْاَمْوَالِ بِمَا فَعَلْنَا فَفَعَلُوْا مِثْلَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَيْسَ قَوْلُ اَبِیْ صَالِحٍ اِلَى الْاٰخِرِهٖ اِلَّا عِنْدَ مُسْلِمٍ وَفِی الْبُخَارِیْ تُسَبِّحُوْنَ فِیْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ عَشْرًا وَتَحْمَدُوْنَ عَشْرًا وَتُكَبِّرُوْنَ عَشْرًا بَدَلَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ لِلْبُخَارِیِّ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن فقراء مہاجرین رحمت عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! دولت مند لوگ بلند درجات (یعنی ثواب، قرب الٰہی اور رضائے حق) اور دائمی نعمت (یعنی بہشت کی نعمت کو حاصل کرنے میں ہم سے سبقت) لے گئے (یعنی وہ اپنے مال و دولت کی وجہ سے بڑا ثواب حاصل کرتے ہیں اور بہشت کی نعمتوں کے مستحق ہوتے ہیں اور ہم تو اپنی غربت و افلاس کی وجہ سے بلندی درجات میں ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں) آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ کیسے؟ انہوں نے عرض کیا وہ اسی طرح نماز پڑھتے ہیں جس طرح ہم پڑھتے ہیں اور وہ اسی طرح روزہ رکھتے ہیں جس طرح ہم رکھتے ہیں (ان اعمال میں تو وہ اور ہم برابر ہیں لیکن مال و زر کی وجہ سے) وہ صدقہ و خیرات کرتے ہیں اور (غربت و افلاس کی وجہ سے) ہم صدقہ و خیرات کر نہیں سکتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں ہم غلام آزاد نہیں کر سکتے (اس طرح وہ ان اعمال کے ثواب کے حق دار ہو جاتے ہیں اور ہم محروم رہتے ہیں) (یہ سن) کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا "کیا میں تم لوگوں کو ایسی بات نہ بتادوں کہ اس پر عمل کر کے تم ان لوگوں کے درجات کو پہنچ جاؤ جو تم سے پہلے اسلام لا چکے ہیں اور ان لوگوں کے مرتبہ سے بڑھ جاؤ جو تمہارے بعد کے ہیں (یعنی تمہارے بعد اسلام لائے ہیں یا تمہارے بعد پیدا ہوں گے) اور (مال دار لوگوں میں سے) کوئی شخص تم سے بہتر نہ ہوگا بجز اس شخص کے جو تم ہی جیسا عمل کرے (یعنی اگر مالدار لوگوں نے میری بتائی ہوئی بات پر تمہاری طرح عمل کیا تو پھر مرتبہ کے اعتبار سے وہی تم سے بہتر ہوں گے) فقراء نے عرض کیا "یا رسول اللہ! بہتر ہے، فرمایئے (وہ کیا بات ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "تم لوگ ہر نماز کے بعد سبحان اللہ، اللہ اکبر اور الحمد للہ تینتیس مرتبہ پڑھ لیا کرو۔"

(حدیث کے ایک راوی) ابوصالح فرماتے ہیں کہ (کچھ دنوں کے بعد) فقراء مہاجرین (پھر) آنحضرتؐ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے دولت مند بھائیوں نے ہمارے عمل کا حال سنا اور وہ بھی وہی کرنے لگے جو ہم کرتے ہیں (اس طرح پھر وہی لوگ ہم سے افضل ہوئے) آپ ﷺ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور روایت کے آخری الفاظ جو ابوصالح کا قول ہے صرف مسلمؒ ہی نے نقل کئے ہیں۔ نیز بخاریؒ کی ایک روایت میں تینتیس مرتبہ پڑھنے کے بجائے یہ ہے کہ "ہر نماز کے بعد دس دس مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔"

تشریح: پہلی روایت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "ہر نماز کے بعد سبحان اللہ، اللہ اکبر، اور الحمد للہ تینتیس مرتبہ پڑھو" تو اس میں تین احتمال ہیں اول تو یہ کہ ان تینوں کلمات کو مجموعی طور سے تینتیس تینتیس مرتبہ پڑھا جائے چنانچہ مشائخ کا عمل اسی پر ہے اور یہی افضل بھی اور یہ کہ اس کی صراحت بھی بعض روایت میں تو موجود ہے۔ سوم یہ کہ ان تینوں کلمات کو ملا کر تینتیس مرتبہ پڑھا جائے، اس طرح ان میں سے ہر

ایک کو بھی تینتیس مرتبہ پڑھنا ہو جائے گا۔

شکر کرنے والا امیر صبر کرنے والے غریب سے افضل ہے: حدیث کے آخری لفظ ذلک فضل اللّٰہ الخ کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدا نے دولت مند لوگوں کو تم پر فضیلت دی ہے تو یہ محض اس کا فضل و کرم ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے نواز کر اس کے قدموں میں مال و دولت کے ڈھیر ڈال دیتا ہے لہٰذا تمہیں چاہئے کہ اس معاملہ میں صبر کا دامن پکڑے رہو اور تقدیر الٰہی پر راضی رہو کہ اس نے بعض بندوں کو بعض بندوں پر فضیلت و بزرگی عطا فرما دی ہے۔

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ شکر کرنے والا دولت مند صبر کرنے والے غریب سے افضل ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اتنی بات بھی ہے کہ دولت مند اپنے مال و دولت کے معاملہ میں مختلف قسم کے گناہ کے خوف سے خالی نہیں ہوتا جب کہ فقیر و غریب ان گناہوں کے خوف سے جو مال و دولت کی بناء پر صادر ہوتے ہیں امن میں رہتا ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے چنانچہ حضرت جنیدؒ اور دیگر اکثر اہل اللہؒ فضیلت فقر کے قائل ہیں اور ابن عطاءؒ کا قول ہے کہ شاکر دولت مند جو دولت کا حق ادا کرتا ہو صابر غریب سے افضل ہے۔

(۸) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُعَقِّبَاتٌ لَا يَخِيْبُ قَائِلُهُنَّ اَوْ فَاعِلُهُنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ ثَلَاثٌ وَثَلَاثُوْنَ تَسْبِيْحَةً وَثَلَاثٌ وَثَلَاثُوْنَ تَحْمِيْدَةً وَاَرْبَعٌ وَثَلَاثُوْنَ تَكْبِيْرَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عجرہؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا ہر فرض نماز کے بعد پڑھنے کے چند کلمات ہیں جن کا کہنے والے، یا فرمایا کہ کرنے والا (حصول ثواب سے) محروم نہیں رہ سکتا (اور وہ کلمات یہ ہیں) سبحان اللہ تینتیس بار، الحمد للہ تینتیس اور اللہ اکبر چونتیس بار کہنا۔" (مسلم)

(۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَبَّحَ اللّٰهَ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَحَمِدَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَكَبَّرَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ فَتِلْكَ تِسْعَةٌ وَّتِسْعُوْنَ وَقَالَ تَمَامُ الْمِائَةِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ غُفِرَتْ خَطَايَاهُ وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ہر نماز کے بعد سبحان اللہ تینتیس مرتبہ، الحمد للہ تینتیس مرتبہ اللہ اکبر تینتیس مرتبہ کہے جن کا مجموعی عدد ننانوے ہو اور سو کے عدد کو پورا کرنے کے لئے ایک مرتبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کہے تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر (یعنی بہت زیادہ) ہوں۔" (مسلم)

تشریح: بعض روایات میں ولہ الحمد کے بعد یحی ویمیت اور بعض میں بیدہ الخیر کے الفاظ بھی منقول ہیں، مذکورہ بالا کلمات جو نماز کے بعد پڑھے جاتے ہیں ان کے مختلف عدد منقول ہیں چونکہ آنحضرت ﷺ خود بھی انہیں مختلف عدد کے ساتھ پڑھتے تھے اس لئے ان کلمات کو احادیث میں مذکور اعداد میں سے جس عدد کے ساتھ بھی پڑھا جائے گا۔ اصل سنّت ادا ہو جائے گی۔ حافظ زین عراقیؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ تمام اعداد بہتر ہیں اور جو عدد سب سے بڑا ہے وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

ان تسبیحات کے ورد کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ انہیں داہنے ہاتھ کی انگلیوں پر پڑھتے تھے اور یہ بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ انہیں انگلیوں پر شمار کرو کیونکہ قیامت کے روز انگلیوں سے (بندہ کے اعمال

ل اس دار الفناء میں جتنے ازم پیدا ہوئے وہ فانی ہیں صحیح اور باقی رہنے والی بات یہی ہے کہ انسانی جدوجہد اور تدابیر تقدیر الٰہی سے پابستہ زنجیر ہیں ۱۲۔

کے سلسلہ میں) سوال کیا جائے گا اور (جواب کے لئے) انہیں گویائی کی قوت دی جائے گی۔ صحابہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ انہیں کھجور کی گٹھلیوں پر پڑھتے تھے۔ بہر حال ان تسبیحات کو انگلیوں پر پڑھنا ہی افضل ہے اور گٹھلیوں وغیرہ پر پڑھنا بھی جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

قبولیت دعا کا وقت

⑩ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الدُّعَاءِ اَسْمَعُ قَالَ جَوْفَ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ وَدُبُرَ الصَّلَوَاتِ الْمَکْتُوْبَاتِ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ عرض کیا گیا یارسول اللہ کس وقت دعا بہت زیادہ مقبول ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا رات کے آخری حصہ میں (یعنی سحر کے وقت) اور فرض نمازوں کے بعد۔" (ترمذی)

ہر نماز کے بعد معوذات پڑھنے کا حکم

⑪ وَعَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقْرَأَ بِالْمُعَوِّذَاتِ فِیْ دُبُرِ کُلِّ صَلَاۃٍ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و النسائی والبیہقی فی الدعوات الکبیر)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ہر نماز کے بعد معوذات پڑھوں۔" (احمدؒ و ابوداؤدؒ، نسائیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: معوذات قرآن کی ان سورتوں کو کہتے ہیں جن کی ابتداء میں "اعوذ" کا لفظ ہے یعنی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ یہاں ان دونوں سورتوں کے لئے "معوذات" جمع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ اقل جمع دو ہیں اور بعض علماء نے کہا ہے کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اور قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ بھی معوذات میں تغلیباً داخل ہیں یعنی قل اعوذ برب الناس کو امتیاز دے کر سب کو معوذات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان دونوں سورتوں کی ابتداء میں "اعوذ" کا لفظ نہیں ہے۔ گویا اس قول کے مطابق آپ نے چار سورتوں یعنی قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس، قل ھو اللہ اور قل یایھا الکافرون کے پڑھنے کا حکم دیا تھا۔

طلوع و غروب آفتاب تک ذکر میں مشغول رہنے کی فضیلت

⑫ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاَنْ اَقْعُدَ مَعَ قَوْمٍ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ مِنْ صَلَاۃِ الْغَدَاۃِ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اُعْتِقَ اَرْبَعَۃً مِنْ وَلَدِ اِسْمَاعِیْلَ وَلَاَنْ اَقْعُدَ مَعَ قَوْمٍ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ مِنْ صَلَاۃِ الْعَصْرِ اِلٰی اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اُعْتِقَ اَرْبَعَۃً۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ ایک ایسی جماعت کے ساتھ میرا بیٹھنا جو نماز فجر سے طلوع آفتاب تک خدا کے ذکر میں مشغول ہو میرے نزدیک حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے چار غلام آزاد کرنے سے بہتر ہے اور عصر کی نماز کے بعد سے غروب آفتاب تک ایسے لوگوں میں میرا بیٹھنا جو خدا کے ذکر میں مشغول ہوں میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ میں چار غلام آزاد کروں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے آخری الفاظ میں بھی چار غلام سے مراد حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے چار غلام ہوں اور یہ بھی

احتمال ہے کہ یہاں چار غلام مطلق مراد ہوں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کی تخصیص آپ ﷺ نے اس لئے کی کہ وہ افضل عرب ہیں اور خود آنحضرت ﷺ ان کی اولاد میں سے ہیں۔

(۱۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى الْفَجْرَ فِيْ جَمَاعَةٍ ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللّٰهَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ كَانَتْ لَهٗ كَاَجْرِ حَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَامَّةٍ تَامَّةٍ تَامَّةٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا جو شخص فجر کی نماز جماعت سے پڑھے اور طلوع آفتاب تک اللہ کی یاد میں مشغول رہے اور پھر دو رکعت نماز پڑھے تو اسے حج و عمرہ کی مانند ثواب ملے گا راوی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا پورے حج و عمرہ کا پورے حج و عمرہ کا پورے حج و عمرہ کا (ثواب اسے ملے گا)۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص فجر کی نماز جماعت سے پڑھ کر اسی مسجد میں اور اسی مصلی پر طلوع آفتاب تک ذکر خداوندی میں مسلسل مشغول رہے اور پھر اس کے بعد دو رکعت نماز نفل پڑھے تو اسے اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ ایک پورے حج و عمرہ کا ثواب ملتا ہے اور اگر کوئی شخص حالت ذکر میں طواف کے لئے یا طلب علم کے لئے اور یا مسجد ہی میں مجلس وعظ میں جانے کے لئے مصلے سے اٹھا یا اسی طرح کوئی شخص وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر چلا آئے مگر ذکر خداوندی میں برابر مشغول بھی رہے تو اسے بھی مذکورہ ثواب ملے گا۔

ذکر سے فارغ ہو کر طلوع آفتاب کے بعد دو رکعت نماز سورج کے ایک نیزہ کے بقدر بلند ہو جانے کے بعد پڑھنی چاہئے تاکہ وقت کراہت ختم ہو جائے اس نماز کو نماز اشراق کہتے ہیں اور اکثر احادیث میں اس کا نام صلوۃ الضحٰی بھی منقول ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں نمازیں ایک ہی ہیں جن کے الگ الگ یہ دو نام ہیں۔ اس کا ابتدائی وقت آفتاب کے بلند ہو جانے کے بعد شروع ہو جاتا ہے اور انتہائی وقت سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے ہے۔ ابتدائی وقت میں پڑھی جانے والی نماز کو "نماز اشراق" کہتے ہیں اور انتہائی وقت میں پڑھی جانے والی نماز "نماز چاشت" کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے۔

فرمایا گیا ہے کہ ایسے شخص کو حج و عمرہ دونوں کا ثواب تو فرض نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی بناء پر ملتا ہے اور عمرہ کا ثواب نفل نماز (یعنی نماز اشراق) پڑھنے کی وجہ سے ملتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

دو نمازوں کے درمیان وقفہ کرنا چاہئے

(۱۴) وَعَنِ الْاَزْرَقِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ صَلّٰى بِنَا اِمَامٌ لَنَا يُكْنٰى اَبَا رِمْثَةَ قَالَ صَلَّيْتُ هٰذِهِ الصَّلَاةَ اَوْ مِثْلَ هٰذِهِ الصَّلَاةِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَقُوْمَانِ فِي الصَّفِّ الْمُقَدَّمِ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَكَانَ رَجُلٌ قَدْ شَهِدَ التَّكْبِيْرَةَ الْاُوْلٰى مِنَ الصَّلَاةِ فَصَلّٰى نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ يَسَارِهٖ حَتّٰى رَاَيْنَا بَيَاضَ خَدَّيْهِ ثُمَّ انْفَتَلَ كَانْفِتَالِ اَبِيْ رِمْثَةَ يَعْنِيْ نَفْسَهٗ فَقَامَ الرَّجُلُ الَّذِيْ اَدْرَكَ مَعَهُ التَّكْبِيْرَةَ الْاُوْلٰى مِنَ الصَّلَاةِ يَشْفَعُ فَوَثَبَ عُمَرُ فَاَخَذَ بِمَنْكِبَيْهِ فَهَزَّهٗ ثُمَّ قَالَ اجْلِسْ فَاِنَّهٗ لَنْ يَهْلِكَ اَهْلُ الْكِتَابِ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ بَيْنَ صَلَاتِهِمْ فَصْلٌ فَرَفَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَصَرَهٗ فَقَالَ اَصَابَ اللّٰهُ بِكَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ازرق ابن قیس کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہمارے امام نے کہ جن کی کنیت ابو رمثہؓ تھی ہمیں نماز پڑھائی اور (نماز کے بعد) انہوں نے فرمایا کہ "میں نے (ایک روز) یہ نماز یا اس کی مانند نماز رحمت عالم ﷺ کے ہمراہ پڑھی، حضرت ابو رمثہؓ کہتے تھے کہ (اس نماز میں) حضرت

ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما (بھی) آنحضرت ﷺ کی دائیں طرف پہلی صف میں کھڑے تھے، ایک شخص (پیچھے سے آکر) نماز کی تکبیر اولی میں شریک ہوا، آنحضرت ﷺ نے نماز پڑھی اور سلام (کے وقت آپ ﷺ نے اپنے چہرہ مبارک کو اتنا) پھیرا کہ ہم نے آپ ﷺ کے مبارک رخساروں کی سفیدی دیکھ لی، پھر آپ ﷺ ابورمثہؓ کی یعنی میری طرح پھر کر بیٹھ گئے وہ شخص جو تکبیر اولی میں شریک تھا کھڑا ہو گیا اور دو رکعت نماز پڑھنے لگا، حضرت عمرؓ (یہ دیکھ کر) فوراً اٹھے اور اس شخص کے دونوں مونڈھے پکڑ کر ہلائے اور فرمایا کہ بیٹھ جاؤ! کیونکہ اہل کتاب (یعنی یہود و نصاری) اسی لئے ہلاکت کی وادی میں جاگرے کہ اپنی نمازوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ (حضرت عمرؓ کی یہ بات سن کر) آنحضرت ﷺ نے نظر مبارک اوپر اٹھائی اور فرمایا کہ اے خطاب کے بیٹے! اللہ نے تمہیں راہ حق پر پہنچایا (یعنی تم نے سچ کہا)۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ابتداء حدیث میں حضرت ابورمثہؓ نے اپنے قول "یہ نماز" سے اس نماز کی طرف اشارہ کیا تھا جو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ پڑھی تھی اور وہ ظہر یا عصر کی نماز تھی۔

الفاظ او مثل ھذہ الصلوٰۃ (یا اس کی مانند نماز) میں حرف او راوی کے شک کو ظاہر کر رہا ہے، یعنی اس روایت کے روای کو شک ہے کہ حضرت ابورمثہؓ نے ہذہ الصلوٰۃ فرمایا تھا یا مثل ہذہ الصلوٰۃ۔

فرمایا گیا ہے کہ "ایک شخص (پیچھے سے آکر) نماز کی تکبیر اولی میں شریک ہوا یہاں" "تکبیر اولی" کی قید اس مقصد کے تحت لگائی گئی ہے کہ تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ شخص مسبوق نہیں تھا کہ اپنی بقیہ نماز پوری کرنے کے لئے سلام کے بعد اٹھا تھا بلکہ وہ جماعت کے ساتھ پہلی ہی رکعت میں شامل ہو گیا تھا اور وہ سلام کے بعد سُنّت موکدہ پڑھنے کے لئے اٹھ گیا تھا۔

"فرق" سے مراد یا تو سلام پھیرنے کے ساتھ فرق کرنا ہے یا جگہ بدل کر فرق کرنا مراد ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں منقول ہے کہ "تم میں سے جو شخص نماز اداء کرتا ہے اسے کیا دشواری ہے کہ وہ آگے بڑھ جائے یا پیچھے ہٹ جائے یا دائیں طرف ہٹ کر کھڑا ہو جائے (یعنی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز پڑھنے کے لئے پہلی جگہ سے ہٹ جانا چاہئے) یا گفتگو کرنے اور مسجد سے نکلنے کے ساتھ فرق کرنا مراد ہے جیسا کہ مسلم کی ایک روایت میں حضرت سائبؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا "ہمیں سرکار دو عالم ﷺ نے حکم فرمایا تھا کہ ہم (دو نماز کے درمیان وصل نہ کریں تاوقتیکہ کوئی گفتگو کریں یا باہر نکلیں (اور اس طرح دونوں نمازوں کے درمیان وقفہ کریں۔

اس حدیث کو مصنف کتاب نے اس باب یعنی باب الذکر بعد الصلوٰۃ میں ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ "فرق" سے مراد نماز فرض کے بعد ذکر کا ترک کرنا ہے یعنی فرض نماز کے بعد چاہئے کہ ذکر کیا جائے جو کہ (اس موقع کے لئے دعاؤں کی شکل میں) احادیث میں مذکور ہے۔ اس کے بعد اٹھ کر سنتیں پڑھی جائیں۔

نیز یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نماز فرض کے ساتھ نفل نماز کو ملانا نہیں چاہئے یعنی دونوں نمازوں کے درمیان اتنا توقف کرنا چاہئے کہ دونوں میں کوئی اشتباہ نہ ہو۔

نماز کے بعد کی تسبیح

⑮ وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ ثَابِتٍ قَالَ أُمِرْنَا اَنْ نُسَبِّحَ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَ نَحْمَدَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَنُكَبِّرَ اَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ فَاَتٰى رَجُلٌ فِي الْمَنَامِ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقِيْلَ لَهٗ اَمَرَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُسَبِّحُوْا فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ كَذَا وَكَذَا قَالَ الْاَنْصَارِيُّ فِيْ مَنَامِهٖ نَعَمْ قَالَ فَاجْعَلُوْهَا خَمْسًا وَّعِشْرِيْنَ وَاجْعَلُوْا فِيْهَا التَّهْلِيْلَ فَلَمَّا اَصْبَحَ غَدَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَافْعَلُوْا۔

(رواہ احمد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت زید ابن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ہر نماز کے بعد سبحان اللہ تینتیس مرتبہ الحمد للہ تینتیس مرتبہ اللہ اکبر چونتیس مرتبہ کہیں (حضرت زیدؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن) ایک انصاری نے ایک فرشتہ خواب میں دیکھا فرشتہ نے اس انصاری سے کہا کہ "رسول اللہ ﷺ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم ہر نماز کے بعد اتنی اتنی تسبیح پڑھو؟ اس انصاری نے کہا کہ ہاں! فرشتہ نے کہا کہ "ان تینوں کلمات (کے پڑھنے) کی تعداد پچیس پچیس مقرر کرو اور اس کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ بھی پچیس مرتبہ مقرر کر لو (تاکہ سو کا عدد پورا ہو جائے) جب صبح ہوئی تو انصاری آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے خواب سے آگاہ کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس پر عمل کرو۔"

(احمدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد "اس پر عمل کرو" کی مراد غالباً یہ ہوگی کہ جس طرح تمہیں تسبیح پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اس طرح بھی پڑھو اور جس طرح فرشتہ نے خواب میں بتایا ہے اس طرح بھی پڑھ لیا کرو اور یہ بھی چونکہ ذکر کا ایک طریقہ ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی توثیق فرما دی، اگر آنحضرت ﷺ تقریر یعنی توثیق نہ فرماتے تو محض خواب اس سلسلہ میں حجت نہ ہوتا

آیۃ الکرسی کی فضیلت

(۱۶) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَعْوَادِ هٰذَا الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ مَنْ قَرَاَ اٰيَةَ الْكُرْسِيِّ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ اِلَّا الْمَوْتُ وَمَنْ قَرَاَهَا حِيْنَ يَاْخُذُ مَضْجَعَهُ اٰمَنَهُ اللّٰهُ عَلٰى دَارِهِ وَدَارِ جَارِهِ وَاَهْلِ دُوَيْرَاتٍ حَوْلَهُ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ اِسْنَادُهُ ضَعِيْفٌ۔

"اور امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ کو لکڑی کے اس منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو شخص ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھتا ہے اسے بہشت میں جانے سے سوائے موت کے اور کوئی چیز نہیں روک سکتی اور جو شخص (آیت الکرسی کو) اپنی خواب گاہ میں جاتے وقت (یعنی سونے کے وقت) پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مکان میں اور اس کے ہمسایہ میں (یعنی جو مکانات اس کے مکان سے ملے ہوئے ہوں) اور اس کے گرداگرد مکانات میں (جو اگرچہ اس کے مکان سے متصل نہ ہوں) امن دیتا ہے" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی اسناد ضعیف ہے۔

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں سے ایک خلجان واقع ہوتا ہے وہ یہ کہ موت دخول جنت سے مانع نہیں ہے بلکہ موت تو خود جنت میں جانے کا ذریعہ ہے لہٰذا چاہئے تو یہ تھا کہ بجائے اس کے یہ فرمایا جائے لم یمنعه من دخول الجنة الا الموت یعنی اس کے بہشت میں جانے سے سوائے موت کے اور کوئی چیز نہیں روک سکتی) یہ فرمایا جاتا کہ لم یمنعه من دخول الجنة الا الحیوة (یعنی اس کے بہشت میں جانے سے سوائے حیات کے اور کوئی چیز نہیں روک سکتی، کیونکہ انسان اس دنیا میں حیات کے جال میں پھنسا ہوا ہے جب زندگی ختم ہوگی اور موت آئے گی جنت میں اس وقت ہی دخول ممکن ہوگا لہٰذا دخول جنت کی مانع موت نہیں بلکہ حیات ہے۔

اس کا مختصر جواب علامہ طیبیؒ نے یہ دیا ہے کہ بندہ اور جنت کے درمیان موت ایک پردہ ہے کہ ایک طرف تو حیات ہے، اور دوسری طرف جنت ہے جب یہ پردہ ہٹے گا یعنی بندہ کو موت آئے گی تو فوراً جنت میں داخل ہو جائے گا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "یہاں" موت سے مراد بندہ کا قیامت کے روز قبر سے اٹھنے سے پیشتر قبر میں بند رہنا ہے چنانچہ جب بندہ قبر سے اٹھے گا فوراً جنت میں داخل ہو جائے گا۔

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے فضائل اعمال کے سلسلہ میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کرنا جائز ہے حدیث کے پہلے جزو کو نسائیؒ ابن حبانؒ اور طبرانیؒ نے بھی نقل کیا ہے ایک روایت میں آیت الکرسی کے ساتھ قل ہو اللہ پڑھنا بھی مذکور ہے۔

نماز فجر و مغرب کے بعد ذکر کی فضیلت

(۱۷) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ غَنْمٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَالَ قَبْلَ اَنْ يَّنْصَرِفَ وَيَثْنِيَ رِجْلَيْهِ مِنْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ وَالصُّبْحِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ عَشْرَ مَرَّاتٍ كُتِبَ لَهٗ بِكُلِّ وَاحِدَةٍ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَمُحِيَتْ عَنْهُ عَشْرُ سَيِّئَاتٍ وَرُفِعَ لَهٗ عَشْرُ دَرَجَاتٍ وَكَانَتْ لَهٗ حِرْزًا مِنْ كُلِّ مَكْرُوْهٍ وَحِرْزًا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ وَلَمْ يَحِلَّ لِذَنْبٍ اَنْ يُّدْرِكَهٗ اِلَّا الشِّرْكَ وَكَانَ مِنْ اَفْضَلِ النَّاسِ عَمَلًا اِلَّا رَجُلًا يَفْضُلُهٗ يَقُوْلُ اَفْضَلَ مِمَّا قَالَ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَهٗ عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ اِلٰى قَوْلِهٖ اِلَّا الشِّرْكَ وَلَمْ يَذْكُرْ صَلَاةَ الْمَغْرِبِ وَلَا بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن غنم روای ہیں کہ "رحمت عالم ﷺ فرماتے تھے "جو شخص فجر اور مغرب کے بعد (نماز کی) جگہ سے اٹھنے سے پیشتر اور پاؤں موڑنے سے پہلے (یعنی جس طرح التحیات کے لئے بیٹھتا ہے اس ہیئت کے ساتھ) ان کلمات کو پڑھے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے، اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے واسطے تمام تعریفیں ہیں اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہے، وہی (جسے چاہتا ہے) زندہ رکھتا ہے اور جسے چاہتا ہے) موت دے دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے تو اس کے لئے ہر ایک بار کے بدلہ میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس کے دس گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور اس کے (مرتبہ کے) دس درجے بلند کر دیئے جاتے ہیں اور یہ کلمات اس کے لئے ہر بری چیز اور شیطان مردود سے امان کا باعث بن جاتے ہیں (یعنی نہ تو اس پر کسی دینی دنیاوی آفت وبلا کا اثر ہوتا ہے اور نہ مردود شیطان اس پر حاوی ہوتا ہے۔ اور شرک کے علاوہ کوئی گناہ (توفیق استغفار اور رحمت پروردگار کی وجہ سے) اسے ہلاکت میں نہیں ڈالتا (یعنی اگر شرک میں مبتلا ہو جائے گا تو پھر اس عظیم عمل کی وجہ سے بھی بخشش نہیں ہوگی) اور وہ شخص عمل کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے بہتر ہوگا سوائے اس شخص کے جو اس سے زیادہ افضل عمل کرے گا یعنی (یہ اس شخص سے تو افضل نہیں ہو سکتا جس نے یہ کلمات) اس سے زیادہ کہے ہوں۔" (احمد) اس روایت کو امام ترمذیؒ نے بھی ابوذرؓ سے صرف الا الشرک تک نقل کی ہے نیز ان کی روایت میں صلوۃ المغرب اور بیدہ الخیر کے الفاظ بھی منقول نہیں ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

نماز فجر کے بعد ذکر کی فضیلت

(۱۸) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بَعْثًا قِبَلَ نَجْدٍ فَغَنِمُوْا غَنَائِمَ كَثِيْرَةً وَاَسْرَعُوا الرَّجْعَةَ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَّا لَمْ يَخْرُجْ مَا رَاَيْنَا بَعْثًا اَسْرَعَ رَجْعَةً وَلَا اَفْضَلَ غَنِيْمَةً مِنْ هٰذَا الْبَعْثِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى قَوْمٍ اَفْضَلَ غَنِيْمَةً وَاَفْضَلَ رَجْعَةً قَوْمًا شَهِدُوْا صَلَاةَ الصُّبْحِ ثُمَّ جَلَسُوْا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ حَتّٰى طَلَعَتِ الشَّمْسُ فَاُولٰئِكَ اَسْرَعُ رَجْعَةً وَاَفْضَلُ غَنِيْمَةً رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَحَمَّادُ ابْنُ اَبِيْ حُمَيْدٍ الرَّاوِيْ هُوَ ضَعِيْفٌ فِي الْحَدِيْثِ۔

"اور امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ (ایک موقع) رحمت عالم ﷺ نے ایک لشکر نجد کی طرف بھیجا چنانچہ وہ لشکر (فتح وکامیابی کے بعد) بہت زیادہ مال غنیمت لے کر بہت جلد (مدینہ) واپس لوٹ آیا، ہم میں سے ایک شخص نے جو لشکر کے ساتھ نہیں گیا تھا کہا کہ "ہم نے تو ایسا کوئی لشکر نہیں دیکھا جو اس لشکر کی طرح اتنی جلدی واپس آیا ہو اور اپنے ساتھ اتنا مال غنیمت بھی لایا ہو! (یہ سن کر) سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ "کیا میں تمہیں ایک ایسی جماعت کے بارے میں نہ بتلاؤں جو مال غنیمت میں اور جلد واپسی میں اس لشکر سے بھی بڑھی ہوئی ہے (تو سنو) وہ جماعت وہ ہے جو فجر کی نماز (کی جماعت) میں حاضر ہوئی ہو اور پھر سورج نکلنے تک بیٹھی ہوئی خدا کا ذکر کرتی رہی ہو،

یہی وہ لوگ ہیں جو جلد واپس آنے اور مال غنیمت لانے میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں۔" (یہ روایت ترمذیؒ نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی حماد ابن ابوحمید ضعیف ہیں)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس لشکر کے لوگوں کو صرف دنیا کی دولت ملی جو فانی ہے اور اس جماعت کے لوگوں کو تھوڑی سی دیر میں بہت زیادہ ثواب ملا جو باقی رہنے والا ہے جیسا کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔

مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَاعِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ۔

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ فانی ہے اور جو کچھ اللہ جل شانہ کے پاس ہے وہ باقی ہے۔"

لہٰذا اس جماعت کے لوگ نہ صرف یہ کہ مال غنیمت کے اعتبار سے اس لشکر کے لوگوں سے افضل ثابت ہوئے بلکہ جلد واپس لوٹنے میں بھی ان سے بڑھے رہے۔

بَابُ مَالَا يَجُوْزُ مِنَ الْعَمَلِ فِي الصَّلٰوةِ وَمَا يُبَاحُ مِنْهُ

نماز میں جائز اور ناجائز چیزوں کا بیان

اس باب میں ان چیزوں کا ذکر کیا جائے گا جن کو نماز میں اختیار کرنا جائز ہے نیز ایسی چیزوں کو بھی ذکر کیا جائے گا جن کو نماز میں اختیار کرنا حرام، مکروہ اور مباح ہے اور جن سے نماز پر کسی بھی حیثیت سے اثر پڑتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز میں چھینک کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا مفسد نماز ہے

① عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ قَالَ بَيْنَا اَنَا اُصَلِّي مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا عَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ فَقُلْتُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ فَرَمَانِي الْقَوْمُ بِاَبْصَارِهِمْ فَقُلْتُ وَاثُكْلَ اُمِّيَاهُ مَا شَأْنُكُمْ تَنْظُرُوْنَ اِلَيَّ فَجَعَلُوْا يَضْرِبُوْنَ بِاَيْدِيْهِمْ عَلٰى اَفْخَاذِهِمْ فَلَمَّا رَاَيْتُهُمْ يُصَمِّتُوْنَنِي لٰكِنِّي سَكَتُّ فَلَمَّا صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبِاَبِيْ هُوَ وَاُمِّي مَا رَاَيْتُ مُعَلِّمًا قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ اَحْسَنَ تَعْلِيْمًا مِنْهُ فَوَاللّٰهِ مَا كَهَرَنِي وَلَا ضَرَبَنِي وَلَا شَتَمَنِي قَالَ اِنَّ هٰذِهِ الصَّلَاةَ لَا يَصْلُحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ اِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيْحُ وَالتَّكْبِيْرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْاٰنِ اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي حَدِيْثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ وَقَدْ جَاءَنَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ وَاِنَّ مِنَّا رِجَالًا يَاْتُوْنَ الْكُهَّانَ قَالَ فَلَا تَاْتِهِمْ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُوْنَ قَالَ ذٰلِكَ شَيْءٌ يَجِدُوْنَهٗ فِي صُدُوْرِهِمْ فَلَا يَصُدَّنَّهُمْ قَالَ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّوْنَ قَالَ كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهٗ فَذَاكَ رَوَاهُ مُسْلِمٌ قَوْلُهٗ لٰكِنِّي سَكَتُّ هٰكَذَا وَجَدْتُ فِي صَحِيْحِ مُسْلِمٍ وَكِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَصُحِّحَ فِي جَامِعِ الْاُصُوْلِ بِلَفْظَةِ كَذَا فَوْقَ لٰكِنِّي۔

"حضرت معاویہؓ ابن حکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) سرور کونین ﷺ کے ہمراہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ (درمیان نماز) اچانک جماعت میں سے ایک شخص کو چھینک آگئی میں نے (جواب میں) یرحمک اللہ کہا (یہ سن کر) لوگوں نے مجھ کو گھورنا شروع کیا (کہ نماز میں چھینک کا جواب دیتے ہو) میں نے کہا کہ "تمہاری ماں تمہیں گم کر دے تم لوگ مجھے کیوں گھور رہے ہو لوگوں نے (میری گفتگو سن کر مجھے چپ کرانے اور اظہار تعجب کے لئے) اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ مارنے شروع کئے (جب) میں نے دیکھا کہ لوگ مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں (تو

مجھے بہت غصہ آیا کیونکہ مجھے اپنے اس فعل کی برائی کا علم نہ تھا) لیکن میں خاموش رہا جب نبی کریم ﷺ نماز پڑھا چکے (تو کیا کہوں) میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان میں نے تو ایسا اچھا تعلیم دینے والا نہ آپ ﷺ سے پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا خدا کی قسم! نہ تو آپ ﷺ نے مجھے ڈانٹا، نہ مارا، اور نہ برا بھلا کہا۔ (ہاں اتنا) فرمایا کہ "نماز میں انسان کی بات مناسب نہیں ہے، نماز تو تسبیح و تکبیر اور قرآن پڑھنے کا نام ہے" یا آپ نے اس کے مانند کچھ اور فرمایا (یعنی راوی کو شک ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہی الفاظ فرمائے تھے یا اس کے مانند دوسرے الفاظ تھے میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ (ﷺ)! میں ایک نو مسلم ہوں (ابھی تک دین کے تمام احکام مجھے معلوم نہیں تھے ہاں (اب) خدا نے ہمیں اسلام کی دولت سے مشرف فرمایا ہے، (تو دین کے تمام احکام سیکھ لوں گا پھر میں نے عرض کیا کہ) ہم میں سے بہت لوگ کاہنوں کے پاس جاتے ہیں (اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟) فرمایا "تم ان کے پاس ہرگز نہ جایا کرو" میں نے عرض کیا ہم میں سے بہت لوگ بدفالی (بھی) لیتے ہیں۔ فرمایا "یہ ایک ایسی چیز ہے جسے وہ اپنے دلوں میں پاتے ہیں (یعنی یہ ان کا محض وہم اور ذہن کی اختراع ہے جو کاموں کے نفع و نقصان میں کوئی اثر نہیں رکھتا) انہیں اپنے کام سے رکنا نہیں چاہئے معاویہؓ کہتے ہیں میں نے پھر عرض کیا "ہم میں سے بعض لوگ خط کھینچتے ہیں اور اس کے ذریعہ وہ غیب کی کچھ باتیں بتاتے ہیں) فرمایا انبیاء میں سے ایک نبی تھے جو خط کھینچتے تھے لہٰذا جس شخص کا خط کھینچنا اس نبی کے خط کھینچنے کے موافق ہو وہ اس بات کو حاصل کر لیتا ہے۔" (مسلم) مؤلف مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ لٰکِنِّی سَکَتُّ کو صحیح مسلم اور کتاب حمیدی میں اسی طرح دیکھا ہے (البتہ) صاحب جامع الاصول نے لفظ "لٰکِنِّی" کے اوپر لفظ "کذا" لکھ کر اس کی صحت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تشریح: وَاثُکْلُ اُمِّیَاہُ (یعنی تمہاری ماں تمہیں گم کرے) ان الفاظ کی تشریح پہلے بھی کسی موقع پر کی جا چکی ہے چنانچہ وہاں بتایا جا چکا ہے کہ اہل عرب کے یہاں یہ الفاظ ایسے موقع پر استعمال کئے جاتے تھے جب کہ مخاطب کی کوئی بات یا اس کا کوئی فعل قابل تعجب ہوتا تھا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں چھینکنے والے نے الحمد للہ کہا ہوگا اس کے جواب میں حضرت معاویہؓ نے یرحمک اللہ کہا۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں چھینک کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا حرام ہے جس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اب اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے ایک مفسد نماز فعل کا ارتکاب کیا تو آنحضرت ﷺ نے انہیں نماز لوٹانے کا حکم کیوں نہیں دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ نو مسلم تھے اسلام قبول کئے ہوئے انہیں زیادہ دن نہیں گذرے تھے اس لئے انہیں معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ نماز میں گفتگو کرنا منسوخ ہو چکا ہے اب گفتگو کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اس لئے آپ ﷺ نے اس کی ناواقفیت کی بناء پر انہیں نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔

حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص نماز میں یرحمک اللہ" کہے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں دوسرے شخص کو خطاب کرنا پایا جاتا ہے اور اگر کوئی "یرحمہ اللہ" کہے تو نماز اس کی باطل نہیں ہوتی

حضرت ابن ہمامؒ کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے نفس کے لئے یرحمك اللہ" کہے تو نماز فاسد نہیں ہوتی جیسا کہ یرحمنی اللہ کہنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

ارشاد نبوت اِنَّ ھٰذِہِ الصَّلٰوۃَ لَا یَصْلُحُ فِیْھَا شَیْءٌ مِّنْ کَلَامِ النَّاسِ (نماز میں انسان کی بات مناسب نہیں ہے) میں "کلام الناس" اس لئے فرمایا گیا ہے تاکہ اس حکم سے وہ تسبیحات و اذکار نکل جائیں جو نماز میں پڑھے جاتے ہیں جو اگرچہ انسان کا کلام ہی ہیں لیکن ان سے انسانوں کو خطاب کرنے یا ان کو سمجھانے کا ارادہ نہیں ہوتا لہٰذا یہاں "کلام الناس" (انسان کی بات) سے مراد وہ کلام ہے جس میں لوگوں کو خطاب کیا گیا ہو یا خود مخاطب بننے کا ارادہ ہو۔

فقہاء لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص کسی نمازی سے حالت نماز میں پوچھے کہ "تمہارے پاس کیا اور کس قسم کا مال ہے؟ اور وہ نمازی جواب میں یہ آیت پڑھے اَلْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ (گھوڑے، خچر اور گدھے) یا کسی نماز پڑھنے والے کے آگے کوئی کتاب رکھی ہو اور

ایک شخص یحیٰی نامی سامنے کھڑا ہوا ہو اور وہ اس شخص کو خطاب کرنے کی نیت سے یہ آیت پڑھے یَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ (اے یحیٰی یہ کتاب لے لو) تو ان صورتوں میں نمازی نے اگرچہ قرآن کی آیتیں پڑھی ہیں لیکن یہ پڑھنا چونکہ ایک دوسرے شخص کو خطاب کرنے کے ارادہ سے ہے اس لئے نماز فاسد ہو جائے گی۔ ہاں اگر خطاب کا ارادہ نہ کرے بلکہ قرات کے ارادہ سے پڑھے گا تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔

کاہن کی تعریف: عرب میں کاہن ان لوگوں کو کہتے ہیں جو جنات، شیاطین اور ارواح خبیثہ کے ساتھ تعلق رکھتے تھے، اور شیاطین جھوٹ سچ خبریں ان کو بتاتے تھے، اس طرح وہ لوگ علم غیب کا دعوی کر کے شیاطین و جنات کی پہنچائی ہوئی انہی باتوں کو غیب کی بات کہہ کر دوسرے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ ایسے لوگوں کے پاس جانے سے آنحضرت ﷺ نے روکا ہے چنانچہ ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی عراف یا کاہن کے پاس جائے اور ان کی بتائی ہوئی باتوں کو سچ جانے تو اس نے بیشک محمد ﷺ پر اتاری گئی چیز (یعنی قرآن) سے کفر کیا۔" اس روایت کو امام احمدؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

عراف کسے کہتے ہیں: کاہن کی تعریف تو معلوم ہو گئی، اب یہ بھی جان لیجئے عراف کسے کہتے ہیں۔ عراف اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی عمل یا جادو و منتر کے ذریعہ کسی چیز کی حقیقت بیان کرتا ہے، چوری کی چیزوں کا پتہ بتاتا ہے اور مکان کی کسی گم شدہ چیز کا حال بتاتا ہے ان کے پاس بھی جانے سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

عمل رمل: جس طرح جنات و شیاطین کے ذریعہ یا علم نجوم کے ذریعہ غیب کی باتوں کا پتہ لگانے کی کچھ لوگ کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح رمل کے ذریعہ بھی کچھ لوگ غیب کی باتوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ رمل اس علم کا نام ہے جس میں خطوط کھینچ کر اور ان کے ذریعہ حساب لگا کر پوشیدہ باتوں کو جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حدیث کے الفاظ سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے رمل کے بارے میں ایک ایسا کلیہ بیان فرمادیا ہے جس سے کسی نہ کسی حد تک علم رمل کا جواز نکلتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ وہ نبی جو علم رمل جانتے تھے اور خط کھینچتے تھے حضرت ادریس علیہ السلام یا حضرت دانیال علیہ السلام تھے اس کے بعد حدیث کی طرف آیئے، آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے علم رمل کا جواز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ بقول خطابیؒ یہاں آنحضرت ﷺ نے تعلیق بالمحال کی ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے فَمَنۡ وَافَقَ خَطَّهٗ ازراہ زجر فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کا خط کھینچنا اس نبی علیہ السلام کے خط کھینچنے کے موافق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو ان نبی کا معجزہ تھا اور معجزہ صرف نبی کی ذات تک محدود رہتا ہے اور پھر یہ کہ اگر کوئی شخص خط کھینچے اور کہے کہ یہ اس نبی کے خط کھینچنے کے موافق ہے تو یہ غلط ہوگا۔ اس لئے کہ خط کی موافقت صحیح طور سے تواتر یا نص سے ثابت ہوسکتی ہے جو آنحضرت ﷺ سے منقول ہو۔ جب کہ آنحضرت ﷺ سے یہ منقول نہیں۔ لہٰذا ارشاد نبوت سے حاصل یہ نکلا کہ جب کسی رمّال (علم رمل جاننے والا) اور اس نبی کے خط میں موافقت نہیں ہوسکتی عمل رمل کو اختیار کرنا بھی درست نہیں۔

اسی طرح کے دو اور سلسلے ہیں ان کا مدار حساب پر ہے جنہیں اصطلاحی طور پر عمل تکسیر اور عمل تخریج سے موسوم کیا جاتا ہے ان کے بارے میں بھی محققین علماء اور مشائخ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ اعمال بھی شرعاً جائز نہیں ہیں اور ان کا بھی وہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ آخر عبارت کا مطلب یہ ہے کہ لفظ "کذا" علامت صحت ہے یعنی اگر یہ ضرورت محسوس ہو کہ عبارت میں کسی ایسے لفظ پر کہ جس کے بارے میں عدم صحت کا گمان ہو گیا ہے کوئی ایسی علامت لگادی جائے جس کے ذریعہ سے اس لفظ کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے تو اس موقع پر اس لفظ پر کذا الکھ دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ اسی طرح صحیح ہے، چونکہ اس حدیث کا لفظ "لکنی" اصول میں ہے، مگر مصابیح میں نہیں ہے، اس صورت میں یہ ممکن تھا کہ اس لفظ کے عدم صحت کا گمان ہو جاتا۔ اس لئے صاحب جامع الاصول نے اس لفظ پر کذا الکھ کر اس بات کی تصحیح کر دی ہے کہ یہ لفظ اصول میں یوں ہی ہے اور یہ صحیح ہے۔

نماز میں سلام کا جواب دینا حرام ہے

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ کُنَّا نُسَلِّمُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ فِی الصَّلٰوۃِ فَیَرُدُّ عَلَیْنَا فَلَمَّا رَجَعْنَا مِنْ عِنْدِ النَّجَاشِیِّ سَلَّمْنَا عَلَیْہِ فَلَمْ یَرُدَّ عَلَیْنَا فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کُنَّا نُسَلِّمُ عَلَیْکَ فِی الصَّلٰوۃِ فَتَرُدُّ عَلَیْنَا فَقَالَ اِنَّ فِی الصَّلٰوۃِ لَشُغْلًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نماز میں ہوتے اور ہم آپ ﷺ کو سلام کرتے تو آپ ﷺ ہمارے سلام کا جواب دیتے تھے پھر کچھ دنوں کے بعد جب ہم نجاشی کے یہاں سے واپس آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے (حسب معمول) ہم نے آپ ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے ہمارے سلام کا جواب نہیں دیا جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو) ہم نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہم آپ (ﷺ) کو نماز میں سلام کرتے تھے آپ (ﷺ) جواب دیتے تھے آج آپ (ﷺ) نے جواب کیوں نہیں دیا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نماز خود ایک بڑا شغل ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت ملک حبشہ کا بادشاہ ایک عیسائی تھا جس کا لقب نجاشی تھا چونکہ یہ ایک عالم تھا اس لئے جب توریت و انجیل کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کے نبی برحق ہونا معلوم ہوا تو وہ آنحضرت ﷺ کی رسالت پر ایمان لاکر خدا کے اطاعت گزار بندوں میں شامل ہو گئے، جب ۹ھ میں ان کا انتقال ہوا تو آنحضرت ﷺ کو بہت افسوس ہوا اور آپ ﷺ نے صحابہ کرام کے ہمراہ کھڑے ہو کر ان کے جنازہ کی غائبانہ نماز پڑھی۔

چونکہ انہیں آنحضرت ﷺ سے بہت زیادہ عقیدت تھی اس لئے جب مسلمان مکہ میں کفار کے ہاتھوں بڑی اذیت ناک تکالیف میں مبتلا ہو گئے اور ان کی جانوں کے لالے پڑ گئے تو اکثر صحابہؓ آنحضرت ﷺ کے ایماء پر ان کے ملک کو ہجرت کر گئے انہوں نے اپنے ملک میں صحابہؓ کی آمد کو اپنے لئے دین و دنیا کی بہت بڑی سعادت سمجھ کر صحابہؓ کی بہت زیادہ خدمت کی اور ان کے ساتھ بہت زیادہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے بعد میں جب صحابہؓ کو علم ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے جا چکے ہیں تو وہ بھی مدینہ چلے آئے۔

چنانچہ اسی وقت کا واقعہ حضرت ابن مسعودؓ بیان فرما رہے ہیں کہ حبشہ سے واپس آنے والے قافلہ میں میں بھی شریک تھا جب ہم لوگ مدینہ پہنچ کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے ہم نے حسب معمول آپ ﷺ کو سلام کیا مگر آپ ﷺ نے ہمارے سلام کا جواب نہ دیا پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ ﷺ نے ہمارے استفسار پر فرمایا کہ نماز خود ایک بہت بڑا شغل ہے یعنی نماز میں قرآن و تسبیحات اور دعا و مناجات پڑھنے کا شغل ہی اتنی اہمیت و عظمت کا حامل ہے کہ ایسی صورت میں کسی دوسرے شخص سے سلام و کلام کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے یا یہ کہ نمازی کا فرض ہے کہ نماز میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہے اور جو کچھ نماز میں پڑھے اس پر غور کرے اور نماز کے سوا کسی دوسری جانب خیال کو متوجہ نہ ہونے دے اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں کسی کے سلام کا جواب دینا یا کسی سے گفتگو کرنا حرام ہے کیونکہ اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

سر یا ہاتھ کے اشارہ سے سلام کا جواب دینا مفسد نماز نہیں: شرح منیہ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی نمازی کسی کے سلام کا جواب ہاتھ یا سر کے اشارہ سے دے یا اسی طرح کوئی شخص نمازی سے کسی چیز کو طلب کرے اور وہ سر یا ہاتھوں سے ہاں یا نہیں اشارہ کرے تو اس کی نماز فاسد تو نہیں البتہ مکروہ ہو جائے گی۔

نماز میں زمین کو برابر کرنے کا مسئلہ

③ وَعَنْ مُعَیْقِیْبٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الرَّجُلِ یُسَوِّی التُّرَابَ حَیْثُ یَسْجُدُ قَالَ اِنْ کُنْتَ فَاعِلًا

فَوَاحِدَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت معیقیب[1] سرور کونین ﷺ سے اس شخص کے بارے میں روایت کرتے ہیں جس نے اپنے بارے میں آپ ﷺ سے پوچھا تھا کہ (نماز میں) سجدہ کی جگہ سے مٹی برابر کرتا ہوں اس کا کیا حکم ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم برابر کرنا ضروری ہی سمجھو تو صرف ایک مرتبہ ایسا کر لیا کرو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: شرح منیہ میں لکھا ہے کہ حالت نماز میں سجدہ کی جگہ سے کنکر وغیرہ ہٹانا یا زمین برابر کرنا مکروہ ہے ہاں اگر صورت یہ ہو کہ سجدہ کی جگہ سے کنکر ہٹائے بغیر نشیب و فراز کی وجہ سے زمین برابر کئے بغیر اس جگہ سجدہ کرنا ممکن نہ ہو تو وہاں سے کنکر ہٹا لیا جائے یا زمین برابر کر لی جائے مگر ایسا صرف ایک مرتبہ یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔

نماز میں خصر ممنوع ہے

④ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَصْرِ فِی الصَّلٰوةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے نماز میں خصر (کوکھ پر ہاتھ رکھنے) سے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

تشریح: اس روایت میں لفظ خصر ہے بعض روایتوں میں نهی عن الاختصار اور اَنْ يُصَلِّیَ مختصرًا کے الفاظ بھی منقول ہیں۔

خصر کی تعریف: لغت میں خصر انسان کی کمر اور کوکھ کو کہتے ہیں، علماء کے یہاں "خصر واختصار" کی تعریف "کمر یا کوکھ پر ہاتھ رکھنا" کی جاتی ہے حدیث کا حاصل یہ ہے کہ نماز میں کوئی شخص اپنی کوکھ یعنی پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑا نہ ہو۔

نماز میں خصر ممنوع کیوں ہے: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے سے منع کیوں فرمایا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اس کی مختلف وجوہ ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونا سماجی حیثیت سے کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی جاننے والے جانتے ہیں کہ اکثر و بیشتر کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونا یا چلنا دنیا کے ان بدنصیب لوگوں کا شیوہ ہے جنہیں دنیا و سماج کے ہر طبقہ میں انتہائی ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے یعنی "ٹرنخے اور ہیجڑے"

اس کے علاوہ ایک دوسری حدیث میں صراحت کے ساتھ اس کی توجیہ یہ فرمائی گئی ہے کہ اختصار اہل نار کی حالت آرام کا ایک ذریعہ ہے جس کی تشریح یوں کی جاتی ہے کہ قیامت کے روز میدان حشر میں جب تمام لوگ حساب کتاب کے انتظار میں کھڑے ہوں گے تو اس وقت کثرت مشقت اور تعب کی وجہ سے وہ لوگ جن کے حصہ میں دوزخ کی آگ ہوگی اپنی کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوں گے تاکہ اس طرح کچھ دیر کے لئے آرام مل جائے جیسا کہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص ایک طویل عرصہ تک کھڑا کھڑا تھک جاتا ہے تو ایک ٹانگ پر پورے بدن کا بوجھ ڈال کر اور کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے یا یہ کہ اس حدیث میں اہل نار سے مراد یہودی ہیں کہ ان کی عادت ایسے کھڑے ہونے کی ہے۔

تیسری توجیہ ایک روایت کی روشنی میں یہ ہے کہ جس وقت شیطان مردود کو زمین پر اتارا گیا اور اسے ملعون قرار دیا گیا اس وقت وہ اپنی کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا تھا۔

لہٰذا ان تمام توجیہات کو پیش نظر کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونا چونکہ اہل نار اور شیطان ملعون کی صفت ہے اس لئے ان کی مشابہت

---

[1] حضرت معیقیب سعید ابن العاص کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ انہوں نے مہر نبوت کو بوسہ دیا تھا۔ بیت المال کی خدمت پر مامور رہے ۴۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

سے بچنے کے لئے مسلمانوں کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے نہ ہوں نهى عن الخصر کا صحیح مطلب اور تشریح جو صحابہؓ اور علماء سلف سے منقول ہیں مذکورہ بالا ہے لیکن بعض حضرات نے اس حدیث کی تشریح یہ بھی کی ہے کہ خصر (مخصرہ) کے معنی میں ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں عصا پر ٹیک لگا کر کھڑا نہ ہونا چاہئے اس کے علاوہ دیگر تشریحات بھی کی گئی ہیں مگر جیسا کہ بتایا گیا ہے صحیح تشریح اور توضیح وہی ہے جو پہلے ذکر کی گئی۔ (اشعۃ اللمعات)

نماز میں ادھر ادھر دیکھنا کیسا ہے

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ سَئَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْاِلْتِفَاتِ فِى الصَّلٰوةِ فَقَالَ هُوَ اِخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطٰنُ مِنْ صَلٰوةِ الْعَبْدِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ سے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کے بارے میں پوچھا کہ آیا یہ مفسد نماز ہے یا نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اچک لینا ہے کہ شیطان بندے کی نماز میں سے اچک لیتا ہے۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص نماز میں پوری توجہ اور پورے آداب کی ساتھ نہیں کھڑا رہتا بلکہ ادھر ادھر دیکھتا ہے تو شیطان مردود ایسے نمازی کی نماز کے کمال کو اچک لیتا ہے یعنی اس طرح نماز کا کمال باقی نہیں رہتا یہاں ادھر ادھر دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ نماز میں کوئی شخص گردن گھما کر ادھر ادھر اس طرح دیکھے کہ منہ قبلہ کی طرف سے پھر جائے تو اس کا مسئلہ یہ ہے کہ ایسے شخص کی نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔

اور اگر کوئی شخص نماز میں ادھر ادھر اس طرح دیکھے کہ منہ کے ساتھ ساتھ سینہ بھی قبلہ کی طرف سے بالکل پھر جائے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھنے سے نہ تو نماز فاسد ہوتی ہے اور نہ مکروہ ہوتی ہے البتہ یہ بھی خلاف اولیٰ ہے۔

نماز میں دعا کے وقت نگاہ آسمان کی طرف نہ اٹھانی چاہئے

⑥ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَنْتَهِيَنَّ اَقْوَامٌ عَنْ رَفْعِهِمْ اَبْصَارَهُمْ عِنْدَ الدُّعَاءِ فِى الصَّلٰوةِ اِلَى السَّمَاءِ اَوْ لَتُخْطَفَنَّ اَبْصَارُهُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا۔ لوگ نماز میں دعا کے وقت اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف اٹھانے سے باز رہیں ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے ازراہ زجر یہ فرمایا ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ نماز میں دعا مانگنے کے وقت اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف نہ اٹھائیں ورنہ ان کی بینائی چھن لی جائے گی۔

اس سلسلہ میں یہ مسئلہ ہے کہ یوں تو نماز میں مطلقاً اور خاص طور پر دعا کے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھانی مکروہ ہے کیونکہ اس طرح اس بات کا وہم پیدا ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے لئے آسمان میں مکان متعین ہے کہ وہ صرف آسمان ہی پر موجود ہے حالانکہ وہ مکانیت سے پاک ہے وہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے۔

نماز کے علاوہ دوسرے مواقع پر آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے کے بارے میں اختلاف ہے بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ جائز ہے مگر صحیح یہ ہے کہ نماز کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی دعا کے وقت نگاہ اوپر نہ اٹھانی چاہئے۔

ایک روایت میں منقول ہے کہ "آنحضرت ﷺ نماز میں اپنی نظر مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے تھے مگر جب یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ تو آنحضرت ﷺ اپنی نگاہ مبارک نیچے رکھنے لگے۔

آنحضرت کا اپنی نواسی کو نماز میں کاندھے پر بٹھانا

(۷) وَعَنْ اَبِی قَتَادَةَ قَالَتْ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَؤُمُّ النَّاسَ وَاُمَامَةُ بِنْتُ اَبِی الْعَاصِ عَلٰی عَاتِکِهٖ فَاِذَا رَکَعَ وَضَعَهَا وَاِذَا رَفَعَ مِنَ السُّجُوْدِ اَعَادَهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ سرور کونین ﷺ (ایک روز) لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے (اور آپ ﷺ کی نواسی) امامہ بنت ابوالعاص آپ ﷺ کے مبارک کاندھے پر بیٹھی تھیں جب آپ ﷺ رکوع کرتے امامہ کو (اشارہ سے نیچے) بٹھا دیتے اور جب سجدے سے اٹھتے تو ان کو اپنے کاندھے پر بٹھالیتے تھے۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: ابوالعاصؓ سرکار دو عالم ﷺ کے داماد تھے جن کی شادی آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ سے ہوئی تھی انہیں کی بیٹی کا نام امامہ تھا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب: یہاں یہ ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ نماز میں آنحضرت ﷺ کا امامہ کو اٹھانا اور نیچے بٹھانا اور پھر اٹھا کر کاندھے پر رکھنا فعل[1] کثیر ہوا اور اگر فعل کثیر نہ بھی ہو تو قلیل فعل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اس لئے حالت نماز میں یہ فعل مکروہ ضرور تھا لہٰذا سمجھ میں نہیں آتا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟

خطابیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ "آنحضرت ﷺ کا امامہ کو اٹھانا اور بٹھانا قصدانہ تھا چونکہ امامہ حضرت ﷺ سے بہت زیادہ مانوس تھیں اور آپ ﷺ کے مبارک کاندھے پر چڑھ کر بیٹھ جاتی تھیں اور پھر رکوع کے وقت کاندھے سے گر پڑتی تھیں گویا اس طرح آنحضرت ﷺ انہیں اتارتے تھے لہٰذا ان کو کاندھے سے اتارنا یا کاندھے پر بٹھانا آنحضرت ﷺ کا فعل نہیں ہو بلکہ اس فعل کی نسبت آپ ﷺ کی طرف مجازاً کر دی گئی اس توجیہ کے پیش نظر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ فعل کثیر تھا کیونکہ فعل کثیر تو اس فعل کو کہتے ہیں جو پے در پے کیا جائے اور یہاں پے در پے نہیں پایا جاتا۔

ایک توجیہ یہ بھی کی جا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ عمل اس وقت کا ہے جب نماز میں فعل کثیر حرام نہیں ہوا تھا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا۔

نماز میں جمائی کے وقت منہ بند کر لینا چاہئے

(۸) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَثَاءَبَ اَحَدُکُمْ فِی الصَّلٰوةِ فَلْیُکْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ فَاِنَّ الشَّیْطٰنَ یَدْخُلُ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَةِ لِلْبُخَارِیِّ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اِذَا تَثَاءَبَ اَحَدُکُمْ فِی الصَّلٰوةِ فَلْیُکْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ وَلَا یَقُلْ هَا فَاِنَّمَا ذَالِکُمْ مِنَ الشَّیْطٰنِ یَضْحَکُ مِنْهُ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو نماز میں جمائی آئے تو اسے چاہئے کہ وہ حتی الامکان اسے روکے کیونکہ (جمائی کے وقت) شیطان (منہ میں) گھس جاتا ہے۔" (مسلم)

اور بخاری کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ "جب تم میں سے کسی کو نماز میں جمائی آئے تو حتی الامکان اسے روکنا چاہئے اور "ہا" نہ کہے (جیسا کہ جمائی کے وقت بے اختیار منہ سے یہ لفظ نکل جاتا ہے) اس لئے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے اور وہ اس سے ہنستا ہے۔

تشریح: پیٹ بھرنے حواس کی کدورت اور بدن کے ثقل کی وجہ سے جمائی آتی ہے اور یہ عبادت میں کسل و سستی کا باعث بنتی ہے اس لئے اس کی نسبت شیطان کی طرف فرمائی گئی ہے کہ جمائی لیتے وقت شیطان منہ میں گھس جاتا ہے یعنی ایسی حالت میں اس کے لئے نمازی کو

---

[1] فعل کثیر وہ ہے جو بار بار کیا جائے اور خصوصاً دونوں ہاتھوں سے کیا جائے۔

بہکانے اور عبادت سے روکنے کا موقعہ بہت اچھی طرح میسر آتا ہے اور اس کے ہنسنے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسی حالت میں نمازی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ اس سے عبادت میں کسل اور سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو شیطان کا عین منشا ہے۔

لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ نماز میں جب کسی کو جمائی آئے تو اسے چاہئے کہ حتی الامکان جمائی کو روکے اور ایسی صورت میں منہ بند کرے اور منہ بند کرنے کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ ہونٹ بھینچ لئے جائیں اور نچلا ہونٹ دانتوں میں پکڑ لیا جائے یا جب جمائی آئے تو بائیں ہاتھ کی پشت منہ پر رکھ لی جائے۔

بعض فرماتے ہیں کہ جمائی روکنے کی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ جب جمائی آئے تو فوراً دل میں یہ خیال پیدا کر لینا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کو کبھی جمائی نہیں آئی۔ محض اس خیال سے جمائی رک جائے گی کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ مجرب ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جن کے ساتھ ایک واقعہ

(۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عِفْرِیْتًا مِنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ الْبَارِحَةَ لِیَقْطَعَ عَلَیَّ صَلَاتِیْ فَاَمْکَنَنِی اللّٰهُ مِنْهُ فَاَخَذْتُهُ فَاَرَدْتُ اَنْ اَرْبِطَهُ عَلٰی سَارِیَةٍ مِنْ سَوَارِی الْمَسْجِدِ حَتّٰی تَنْظُرُوْا اِلَیْهِ کُلُّکُمْ فَذَکَرْتُ دَعْوَةَ اَخِیْ سُلَیْمَانَ رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ فَرَدَدْتُهُ خَاسِئًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ (ایک روز) سرور کونین ﷺ نے فرمایا آج رات جنوں میں ایک دیو (یعنی ایک سرکش شیطان) چھٹ کر میرے پاس آیا تاکہ میری نماز میں خلل ڈالے مگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس پر حاوی کر دیا چنانچہ میں نے اسے پکڑ لیا اور چاہا کہ مسجد (نبوی) کے ستونوں میں سے کسی ستون سے اسے باندھ دوں تاکہ تم سب لوگ اسے دیکھ لو پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا یاد آگئی رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ اے پروردگار مجھے ایسی بادشاہت عطا فرما جو میرے بعد اور کسی کے لئے مناسب نہ ہو چنانچہ میں نے اسے ذلیل بنا کر چھوڑ دیا۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ حضرت سلمان علیہ السلام کی دعا میں بادشاہت سے مراد جنات و شیاطین کو مسخر کرنا اور ان پر تصرف حاصل کرنا ہے چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا اپنے لئے کی تھی اور یہ مرتبہ صرف اپنے لئے ہی چاہا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے یہ نہیں چاہا کہ اس شیطان کو مسجد نبوی کے ستون سے باندھ کر ایسا طریقہ اختیار کریں کہ جس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس خصوصیت پر کچھ اثر پڑے اور اپنے تصرف کا ظہار ہو ورنہ تو آنحضرت ﷺ کو خود بھی یہ خصوصیت اور مرتبہ اور شیاطین و جنات پر تصرف کی قدرت حضرت سلیمان علیہ السلام سے زیادہ حاصل تھی۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ شیطان کو چھونا نماز کو نہیں توڑتا۔

نماز میں کسی خاص موقعہ پر اشارہ کیا جا سکتا ہے

(۱۰) وَعَنْ سَهْلِ ابْنِ اَبِیْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَابَهُ شَیْءٌ فِیْ صَلٰوتِهٖ فَلْیُسَبِّحْ فَاِنَّمَا التَّصْفِیْقُ لِلنِّسَاءِ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ التَّسْبِیْحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِیْقُ لِلنِّسَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل بن ابی سعدؓ کہتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا جس شخص کو نماز میں کوئی بات پیش آئے تو اسے چاہئے کہ وہ سبحان اللہ کہے اور دستک دینا یعنی تالی بجانا عورتوں کے لئے مخصوص ہے اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ فرمایا سبحان اللہ کہنا مردوں کے لئے مخصوص ہے اور تالی بجانا عورتوں کے لئے (مخصوص) ہے۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ حالت نماز میں اگر کوئی خاص واقعہ پیش آجائے مثلاً کوئی شخص گھر میں نماز پڑھ رہا ہے اور باہر دروازہ پر اسے کسی

نے آواز دی یا کسی نے گھر میں آنے کی اجازت طلب کی اور اسے معلوم نہیں کہ صاحب خانہ نماز پڑھ رہا ہے اور باہر دروازہ پر اسے کسی نے آواز دی پھر یہ کہ گھر میں کوئی دوسرا شخص ایسا موجود نہیں ہے جو باہر کی آوز کا جواب دے تو ایسی صورت میں مرد نمازی کو چاہئے کہ وہ باآواز بلند "سبحان اللہ" کہہ کر نماز میں مشغول ہونے کا اشارہ کر دے۔

اسی طرح اگر کوئی عورت نماز پڑھ رہی ہو تو مذکورہ بالا صورت میں اس کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ سبحان اللہ نہ کہے بلکہ تالی بجادے تاکہ باہر سے آواز دینے والا سمجھ لے کہ گھر میں صرف عورت موجود ہے اور وہ بھی نماز پڑھ رہی ہے۔ عورتوں کو سبحان اللہ کہنے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ جس طرح وہ خود غیر مردوں کے سامنے نہیں آسکتی اسی طرح وہ اپنی آواز بھی غیر مرد کو نہیں سناسکتی۔

اور ایسے موقعہ پر عورتوں کے لئے تالی بجانے کا بھی ایک طریقہ ہے وہ یہ کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر ماری جائے۔ ایک ہاتھ کی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر نہ مارا جائے جیسا کہ گانے والیاں تالی بجاتی ہیں کیونکہ اس طرح تالی بجانے سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نماز میں سلام کا جواب نہیں دینا چاہئے

(۱۱) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ کُنَّا نُسَلِّمُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ فِی الصَّلٰوۃِ قَبْلَ اَنْ نَاتِیَ اَرْضَ الْحَبَشَۃِ فَیَرُدُّ عَلَیْنَا فَلَمَّا رَجَعْنَا مِنْ اَرْضِ الْحَبَشَۃِ اَتَیْتُہٗ فَوَجَدْتُہٗ یُصَلِّیْ فَسَلَّمْتُ عَلَیْہِ فَلَمْ یَرُدَّ عَلَیَّ حَتّٰی اِذَا قَضٰی صَلٰوتَہٗ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ مِنْ اَمْرِہٖ مَا یَشَاءُ وَاِنَّ مِمَّا اَحْدَثَ اَنْ لَّا تَتَکَلَّمُوْا فِی الصَّلٰوۃِ فَرَدَّ عَلَیَّ السَّلَامَ وَقَالَ اِنَّمَا الصَّلٰوۃُ لِقِرَاءَۃِ الْقُرْاٰنِ وَذِکْرِ اللّٰہِ فَاِذَا کُنْتَ فِیْھَا فَلْیَکُنْ ذٰلِکَ شَانُکَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ملک حبشہ سے واپسی سے قبل ہم سرور کونین ﷺ کو جب کہ آپ ﷺ نماز میں ہوتے تھے سلام کرتے تھے اور آپ ﷺ ہمارے سلام کا جواب دے دیا کرتے تھے پھر جب ہم ملک حبشہ سے واپس ہوئے تو میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت میں نے آپ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا مگر آپ ﷺ نے جواب نہیں دیا جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوگئے تو فرمایا "خداوند تعالیٰ اپنے جس حکم کو چاہتا ہے ظاہر کرتا ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اب یہ حکم ظاہر کیا ہے کہ نماز میں بات چیت نہ کیا کرو" پھر آپ ﷺ نے میرے سلام کا جواب دیا اور اس کے بعد فرمایا نماز صرف قرآن پڑھنے اور خدا کا ذکر کرنے کے لئے ہے لہٰذا جب تم نماز کی حالت میں ہو تو تمہارا بھی یہی حال ہونا چاہئے یعنی صرف قرآن پڑھو اور خدا کا ذکر کرو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد سلام کا جواب دینا مستحب ہے۔ اسی طرح اگر کوئی استنجا کرتا ہوا ہو یا قرآن پڑھتا ہوا ہو اور کوئی دوسرا شخص اسی حالت میں اسے سلام کرے تو اس کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ ان امور سے فراغت کے بعد سلام کا جواب دے۔

نماز میں اشارہ سے سلام کا جواب دینے کا مسئلہ

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قُلْتُ لِبِلَالٍ کَیْفَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَرُدُّ عَلَیْھِمْ حِیْنَ کَانُوْا یُسَلِّمُوْنَ عَلَیْہِ وَھُوَ فِی الصَّلٰوۃِ قَالَ کَانَ یُشِیْرُ بِیَدِہٖ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃِ النَّسَائِیُّ نَحْوُہٗ وَعِوَضَ بِلَالٍ صُھَیْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ جب سرور کونین ﷺ حالت نماز میں ہوتے تھے اور اس وقت کوئی آپ ﷺ کو سلام کرتا تھا تو آپ ﷺ سلام کا جواب کس طرح دیتے تھے؟ حضرت بلالؓ نے فرمایا آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے اشارہ کر دیا کرتے تھے۔" (ترمذیؒ) اور نسائی میں ایک روایت بجائے ابن عمرؓ کے صہیب سے اچھی طرح منقول ہے (یعنی ترمذی کی روایت میں تو یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت بلالؓ سے یہ سوال کیا اور نسائیؒ کی روایت میں یہ ہے کہ حضرت صہیبؓ نے حضرت بلالؓ سے یہ سوال کیا تھا)۔

تشریح: آنحضرت ﷺ اگر حالت نماز میں ہوتے اور اس وقت کوئی آپ ﷺ کو سلام کرتا تو آپ ﷺ اس کے سلام کا جواب اپنے ہاتھ کے اشارہ سے دیا کرتے تھے اور اشارہ کرنے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ہاتھ کا پنجہ کھول کر ہتھیلی کو زمین کی طرف لے جاتے تھے جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ کی روایت میں اس کی صراحت بھی کی گئی ہے اور آپ ﷺ صرف انگلی سے اشارہ کر لینے پر اکتفا کر لیا کرتے تھے۔

نماز میں سلام کا جواب ہاتھ یا سر کے اشارہ سے دینا مکروہ ہے: فتاویٰ ظہیریہ میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص حالت نماز میں کسی کے سلام کے جواب میں ہاتھ یا سر کے اشارہ کرے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔

خلاصہ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص سر یا ہاتھ کے اشارہ سے سلام کا جواب دے گا۔ تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ صحیح اور مفتی بہ قول جو شرح منیہ اور شامی وغیرہ میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ نمازی کو کسی کے سلام کا جواب ہاتھ یا سر کے اشارہ سے دینا مکروہ تنزیہی ہے لہٰذا اب اس حدیث کی توجیہ یہ کی جائے گی کہ آنحضرت ﷺ حالت نماز میں سلام کا جواب ہاتھ کے اشارہ سے اس وقت دیا کرتے تھے جب نماز میں بات چیت ممنوع نہیں قرار دیا گیا تھا جب نماز میں کسی قسم کی کوئی بھی گفتگو ممنوع قرار دے دی گئی تو سلام کا جواب بھی زبان یا اشارہ سے دینا منسوخ ہو گیا کیونکہ اشارہ کرنا بھی ایک طرح کلام ہی کے معنی میں ہے۔

نماز میں چھینکنے کے بعد حمد کرنا

(۱۳) وَعَنْ رِفَاعَةَ ابْنِ رَافِعٍ قَالَ صَلَّيْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَطَسْتُ فَقُلْتُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ مُبَارَكًا عَلَيْهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضٰى فَلَمَّا صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْصَرَفَ فَقَالَ مَنِ الْمُتَكَلِّمُ فِي الصَّلٰوةِ فَلَمْ يَتَكَلَّمْ اَحَدٌ ثُمَّ قَالَهَا الثَّانِيَةَ فَلَمْ يَتَكَلَّمْ اَحَدٌ ثُمَّ قَالَهَا الثَّالِثَةَ فَقَالَ رِفَاعَةُ اَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدِ ابْتَدَرَهَا بِضْعَةٌ وَّثَلَاثُوْنَ مَلَكًا اَيُّهُمْ يَصْعَدُ بِهَا۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت رفاعہ ابن رافعؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے سرور کونین ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی نماز کے درمیان مجھے چھینک آگئی میں نے یہ کلمات حمد کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ مُبَارَكًا عَلَيْهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضٰى تمام تعریف خدا کے لئے ہے بہت زیادہ تعریف، بہت پاکیزہ یعنی خالص بابرکت) اور برکت کی گئی جیسی (تعریف) کہ دوست رکھتا ہے ہمارا رب اور پسند کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ جب نماز پڑھ چکے تو (ہماری طرف) متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ نماز میں باتیں کرنے والا کون ہے؟ آنحضرت ﷺ کی ناراضگی کے خوف) سے کوئی نہیں بولا پھر آپ ﷺ نے دوسری مرتبہ یہی فرمایا جب بھی کوئی نہیں بولا جب تیسری مرتبہ آپ ﷺ نے یہی فرمایا تو رفاعہ نے کہا یا رسول اللہ (ﷺ) میں ہوں آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے (میں نے دیکھا) کہ تیس سے زیادہ فرشتے ان کلمات کو لے جانے میں جلدی کر رہے تھے کہ ان میں سے کون پہلے اس کو لے جائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نماز میں چھینکنے والے کو حمد کرنا جائز ہے لیکن اولیٰ یہ ہے کہ حمد دل میں کہے یا خلاف اولیٰ سے بچنے کی خاطر چھینک کے بعد سکوت اختیار کرے جیسا کہ شرح منیہ میں مذکور ہے۔

جمائی شیطانی اثر ہے

⑭ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلتَّثَاءُبُ فِي الصَّلٰوةِ مِنَ الشَّيْطٰنِ فَاِذَا تَثَاءَبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَكْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِي اُخْرٰى لَهُ وَلِابْنِ مَاجَةَ فَلْيَضَعْ يَدَهُ عَلٰى فِيْهِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "نماز میں جمائی لینا شیطان (کے اثر) سے ہے لہٰذا جب تم میں سے کسی کو نماز میں جمائی آئے تو اسے حتی الامکان روکنا چاہئے۔ ترمذیؒ کی ایک دوسری روایت اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں (کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ نماز میں جسے جمائی آئے تو اسے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لینا چاہئے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ جمائی کا آنا شیطانی اثر کی وجہ سے ہے کیونکہ جمائی عبادت میں کسل و سستی اور نیند و غفلت کا باعث بنتی ہے اور شیطان ان چیزوں سے خوش ہوتا ہے اس لئے جمائی کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

نماز کے راستہ میں انگلیوں کے درمیان تشبیک نہ کرنے کا حکم

⑮ وَعَنْ كَعْبِ ابْنِ عُجْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَوَضَّاَ اَحَدُكُمْ فَاَحْسَنَ وُضُوْءَهُ ثُمَّ خَرَجَ عَامِدًا اِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يُشَبِّكَنَّ بَيْنَ اَصَابِعِهِ فَاِنَّهُ فِي الصَّلٰوةِ۔ (رواہ احمد و الترمذی و ابوداؤد و النسائی والدارمی)

"اور حضرت کعب ابن عجرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی وضو کرے تو اچھی طرح وضو کرے پھر نماز کا ارادہ کر کے مسجد کی طرف چلے (اور اسے چاہئے کہ راستہ میں) انگلیوں کے درمیان تشبیک نہ کرے کیونکہ وہ اس وقت سے گویا نماز میں ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابو داؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص وضو کرے تو اسے چاہئے کہ وہ وضو کے تمام شرائط و آداب کو ملحوظ رکھے اور حضور قلب کے ساتھ وضو کرے تاکہ وضو پورے کمال اور حسن کے ساتھ ادا ہو۔ چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ جس قدر توجہ اور حضور قلب وضو میں حاصل ہوگا اسی قدر نماز میں خشوع و خضوع اور توجہ پیدا ہوگی۔

تشبیک کیا ہے؟ حدیث کے دوسرے جزو کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی وضو کے بعد نماز کے ارادہ سے مسجد کی طرف چلے تو راستہ میں انگلیوں کے درمیان تشبیک نہ کرے یعنی ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر کھیلتا ہوا نہ چلے کیونکہ جب وہ نماز کی نیت سے گھر سے نکلا ہے تو گویا وہ نماز ہی میں ہے اور خشوع و خضوع کے منافی ہونے کی وجہ سے تشبیک چونکہ نماز میں ممنوع ہے اس لئے نماز کے راستے میں یہ بھی ممنوع ہے اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جو چیز نماز میں ممنوع ہے وہ نماز کے لئے مسجد آتے ہوئے راستہ میں بھی ممنوع ہوگی۔

اس حدیث سے اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ نماز کے راستہ میں حضور اور خشوع و ادب اور وقار کے ساتھ چلے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ایک باب "مسجد میں تشبیک" کے موضوع پر قائم کیا ہے جس کے تحت انہوں نے دو حدیثیں نقل کی ہیں "دونوں حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مسجد میں انگلیوں کے درمیان تشبیک جائز ہے لہٰذا علماء نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے ثابت شدہ ممانعت کی تعلق اس صورت سے ہے کہ جب کوئی شخص انگلیوں کے درمیان تشبیک محض کھیل اور تفریح طبع کی خاطر کرے اور کوئی شخص بطریق تمثیل کرے تو جائز ہے یا پھر بخاریؒ کی روایت کردہ احادیث کی یہ توجیہ بھی کی جا سکتی ہے کہ ان احادیث کا تعلق اس وقت سے ہے جب کہ انگلیوں کے درمیان تشبیک کی ممانعت کا حکم نہیں ہوا تھا۔ واللہ اعلم

نماز میں ادھر ادھر دیکھنے سے ثواب میں کمی ہو جاتی ہے

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَزَالُ اللّٰہُ تَعَالٰی عَزَّ وَجَلَّ مُقْبِلًا عَلَی الْعَبْدِ وَھُوَ فِیْ صَلَاتِہٖ مَالَمْ یَلْتَفِتْ فَاِذَا الْتَفَتَ اِنْصَرَفَ عَنْہُ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب کوئی بندہ نماز میں ہوتا ہے تو اللہ عزوجل اس بندہ کی طرف اس وقت تک متوجہ رہتا ہے جب تک وہ ادھر ادھر (گردن پھیر کر) نہیں دیکھتا چنانچہ جب بندہ ادھر ادھر دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: ابن ملکؒ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے منہ پھیرنے سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی نمازی حالت نماز میں گردن پھیر کر ادھر ادھر دیکھتا ہے تو اس کے ثواب میں کمی ہو جاتی ہے۔

امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے ایک صحیح روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ جب بندہ نماز میں کھڑا ہوتا ہے۔ تو پروردگار اپنی بزرگ و برتر ذات کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوتا ہے (مگر) جب وہ بندہ (نماز میں) ادھر ادھر دیکھتا ہے اور اپنی نظر کو غیر کی طرف متوجہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم تو کس کی طرف دیکھ رہا ہے کیا تیرے لئے مجھ سے بھی کوئی بہتر ہے کہ جس کی طرف تیری نظر متوجہ ہو رہی ہے؟ میری طرف اپنا منہ پھیر جب بندہ دوبارہ ادھر ادھر دیکھتا ہے تو پروردگار پھر یہی فرماتا ہے اور جب تیسری مرتبہ ادھر ادھر دیکھتا ہے تو اللہ جل شانہ اپنے روئے مبارک جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے اس بندہ کی طرف سے پھیر لیتا ہے۔

نماز میں نظر سجدہ کی جگہ رکھنی چاہئے

(۱۷) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا اَنَسُ اِجْعَلْ بَصَرَكَ حَیْثُ تَسْجُدُ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ سُنَنِ الْكَبِیْرِ مِنْ طَرِیْقِ الْحَسَنِ عَنْ اَنَسٍ یَرْفَعُہُ الْجَزْرِیْ۔

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ انسؓ نماز میں تم اپنی نگاہ وہاں رکھو جہاں سجدہ کرتے ہو اس روایت کو بیہقی نے سنن کبیر میں حضرت انسؓ سے بطریق حسن نقل کیا ہے جس کو جزری نے مرفوع کہا ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری نماز میں نظر سجدہ کی جگہ رکھنی چاہئے چنانچہ شوافع کا عمل اسی پر ہے مگر علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے "کہ مستحب یہ ہے کہ حالت قیام میں نظر سجدہ کی جگہ، رکوع میں پشت قدم پر، سجدہ میں ناک کی طرف اور بیٹھنے کی حالت میں زانو پر رکھنی چاہئے یہی مسلک حنفیہ کا بھی اتنے اضافہ کے ساتھ ہے کہ سلام کے وقت نظر کاندھوں پر رکھنی چاہئے بعض علماء کا یہ بھی قول ہے کہ حرم شریف میں نماز پڑھتے ہوئے نظر کعبہ پر رکھنی چاہئے۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نماز میں آنکھیں بند کرنا مکروہ ہے اصل مشکوۃ میں روایت کے بعد جگہ خالی ہے بعد میں کسی شارح نے "البیہقی" سے آخر تک کی عبارت کا اضافہ کیا ہے۔

نماز میں ادھر ادھر دیکھنے پر وعید

(۱۸) وَعَنْہُ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا بُنَیَّ اِیَّاكَ وَالْاِلْتِفَاتَ فِی الصَّلٰوۃِ فَاِنَّ الْاِلْتِفَاتَ فِی الصَّلٰوۃِ ھَلَكَۃٌ فَاِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَفِی التَّطَوُّعِ لَا فِی الْفَرِیْضَۃِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے میرے بیٹے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے سے بچو کیونکہ نماز میں (گردن پھیر کر) ادھر ادھر دیکھنا (آخرت میں) ہلاکت کا سبب ہے اور اگر دیکھنا ضروری ہو تو نفلوں میں (تو خیر مضائقہ نہیں) مگر فرضوں میں

(ہرگز نہیں۔" (ترمذی)

تشریح : نماز میں گردن ادھر ادھر پھیر کر دیکھنا آخرت میں ہلاکت کا سبب اس لئے ہے کہ ایسا کرنے والا دراصل شیطان کی اطاعت کرتا ہے کیونکہ شیطان کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ بندہ نماز میں پوری توجہ اور لگن کے ساتھ نہ رہے بلکہ ان کی نظر اور اس کا ادھر ادھر بھٹکتا رہے۔

حدیث کے الفاظ فَاِنْ كَانَ لَابُدَّ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا احساس وشعور اور تمہاری سعادت اس بات سے متاثر نہیں ہوتی کہ تمہاری نماز میں نقصان ہو جائے یا نماز کا کمال ختم ہو جائے تو کم از کم فرض نماز میں تو ایسا نہ کرو کہ ادھر ادھر دیکھ کر اس نماز کے کمال کو ختم کرو ہاں نفل نماز میں تو کسی نہ کسی حد تک انگیز بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ نفل نماز فرض نماز کے مقابلہ میں کچھ سہل ہے کہ فرض نماز کے لئے بہت زیادہ اور کامل اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں ذرا سا بھی نقصان اخروی حیثیت سے تباہی وہلاکت کا باعث بن سکتا ہے اور عقلمندی اور سعادت کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے کہ ادھر ادھر دیکھ کر نفل نماز میں بھی کوئی نقصان نہ پیدا کرنا چاہئے حقیقت میں نفل نماز کا نقصان فرض نماز کے نقصان کا باعث ہے اس لئے کہ نوافل در حقیقت فرائض کی تکمیل کرنے والے ہیں لہٰذا حدیث کے اس جملہ سے مطلب اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ نفل نماز میں ادھر ادھر دیکھنا مکروہ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد اس بات کی طرف رغبت دلاتا ہے کہ فرض نماز اپنی عظمت واہمیت کے اعتبار سے اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ اس قسم کے افعال کا ارتکاب کر کے نماز میں نقصان پیدا کیا جائے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کی کراہت فرض نماز کی بہ نسبت نفل نماز میں کم ہے۔

نماز میں کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھنا مکروہ نہیں ہے

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَلْحَظُ فِى الصَّلٰوةِ يَمِيْنَاهُ شِمَالًا وَيَلْوِىْ عُنُقَهٗ خَلْفَ ظَهْرِهٖ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نماز میں کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھتے تھے مگر پیچھے پیٹھ کر طرف اپنی گردن بھی نہیں موڑتے تھے۔" (ترمذی، نسائی)

تشریح : آنحضرت ﷺ نماز میں دائیں بائیں کن انکھیوں سے یا تو اس لئے دیکھتے تھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نماز میں اس طرح دیکھنا نماز کو باطل نہیں کرتا یا پھر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے مقتدیوں کے احوال دیکھنے کے لئے آپ ﷺ اس طرح دیکھا کرتے تھے۔

بہر حال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھنا تو مکروہ ہے مگر کن انکھیوں سے اس طرح دیکھنا کہ گردن کا رخ متبدل نہ ہو مکروہ نہیں ہے اگرچہ اس طرح نہ دیکھنا بھی اولیٰ ہے۔

نماز میں شیطانی اثرات

(۲۰) وَعَنْ عَدِيِّ ابْنِ ثَابِتٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ رَفَعَهٗ قَالَ الْعُطَاسُ وَالنُّعَاسُ وَالتَّثَاؤُبُ فِى الصَّلٰوةِ وَالْحَيْضُ وَالْقَيْءُ وَالرُّعَافُ مِنَ الشَّيْطٰنِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عدی ابن ثابت اپنے والد مکرم سے اور وہ اپنے والد یعنی عدی کے دادا سے جنہوں نے اس حدیث کو آنحضرت ﷺ تک پہنچایا ہے نقل کرتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "نماز میں چھینکنا، اونگھنا، جمائی کا آنا اور حیض کا آنا اور قے کا ہونا اور نکسیر کا پھوٹنا شیطان کے (اثر) سے ہے۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں جب نماز میں پیدا ہوتی ہیں تو شیطان بہت زیادہ خوش ہوتا ہے کیونکہ ان چیزوں سے نماز پر اثر پڑتا ہے۔
یہاں چھینک سے مراد بکثرت چھینکنا ہے لہٰذا یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چھینکنے کو پسند کرتا ہے کیونکہ اس چھینکنے سے مراد معتدل طریقے پر چھینکنا ہے اور معتدل کا اطلاق تین سے کم پر ہوتا ہے۔
ان دونوں احادیث کے درمیان ظاہری وجہ تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ "نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں چھینکنے کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور مکروہ چھینک وہ ہے جو نماز میں آئے۔
ان چیزوں سے شیطان اس لئے خوش ہوتا ہے کہ چھینکنا قرأت و حضور کے لئے مانع ہے اور اونگھ اور جمائی عبادت میں کسل و سستی کا باعث ہیں اور حیض و نکسیر و قے مفسد صلوٰۃ ہیں۔
حدیث میں پہلے تین چیزوں (چھینک، اونگھ، جمائی) کے ذکر کے بعد "فی الصلوٰۃ" ذکر کر کے آخر کی تین چیزیں (یعنی حیض، قے، نکسیر) کو جدا کر دیا گیا ہے اور اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ پہلی تین چیزیں مفسد صلوٰۃ نہیں ہیں بلکہ مکروہ ہیں جب کہ آخری تینوں چیزیں مفسد صلوٰۃ ہیں یعنی ان سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

رونے سے نماز باطل نہیں ہوتی

(۲۱) وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ الشِّخِّیْرِ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ یُصَلِّی وَلِجَوْفِہٖ اَزِیْزٌ کَاَزِیْزِ الْمِرْجَلِ یَعْنِی یَبْکِیْ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَفِیْ صَدْرِہٖ اَزِیْزٌ کَاَزِیْزِ الرَّحٰی مِنَ الْبُکَاءِ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَرَوَی النَّسَائِیُّ الرِّوَایَۃَ الْاُوْلٰی وَاَبُوْدَاؤدَ الثَّانِیَۃَ۔

"اور حضرت مطرف ابن عبداللہ بن شخیر اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں ایک روز سرور کونین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، اور آپ ﷺ کے اندر سے دیگ کے جوش جیسی آواز آ رہی تھی یعنی آنحضرت ﷺ رو رہے تھے" اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اس وقت آپ ﷺ کے سینہ سے چکی کی سی رونے کی آواز آ رہی تھی۔" (احمد)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رونے سے نماز باطل نہیں ہوتی ہدایہ میں اس مسئلہ کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص نماز میں بہت روئے اور دوزخ یا عذاب وغیرہ کے ذکر اور یاد سے متأثر ہو کر آہ کرے یا یا آواز بلند روئے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوگی اور اگر کوئی شخص کسی جسمانی درد اور تکلیف کی شدت کی وجہ سے آہ کرے یا یا آواز بلند روئے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔

نماز میں کنکریاں نہ ہٹانے کا حکم

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اَحَدُکُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَلَا یَمْسَحُ الْحَصَا فَاِنَّ الرَّحْمَۃَ تُوَاجِھُہٗ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو جائے تو اسے ہاتھ سے کنکری نہ ہٹانا چاہئے گویا رحمت سامنے ہوتی ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: رحمت سامنے ہوتی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص دنیا سے منہ موڑ کر نماز کی حالت میں اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت اس کے سامنے رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے اس لئے ایسے مقدس و باعظمت موقع پر نمازی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ کنکریوں سے کھیل کرے یا اس قسم کا کوئی دوسرا فعل کر کے بے ادبی کا معاملہ کرے کہ جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے انوار فضل و رحمت

سے محروم ہو جائے۔

سجدہ کی جگہ صاف کرنے کے لئے پھونک نہ ماری جائے

(۲۳) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ رَأَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُلَامًا لَنَا يُقَالُ لَهُ اَفْلَحُ اِذَا سَجَدَ نَفَخَ فَقَالَ يَا اَفْلَحُ تَرِّبْ وَجْهَكَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے ہمارے ایک غلام جس کا نام افلح تھا دیکھا کہ وہ جب سجدہ کرتا ہے تو سجدہ کی جگہ صاف کرنے کے لئے پھونک مارتا ہے تاکہ منہ خاک آلود نہ ہو جائے آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "افلح" اپنے منہ پر مٹی لگنے دو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ سجدہ کی جگہ کو پھونک مار کر صاف نہ کرو بلکہ اپنے منہ کو خاک آلود ہو جانے دو کیونکہ بارگاہ خداوندی میں حاضری کے وقت اظہار عجز و بے کسی کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ اور اس سے بہت زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے۔

کوکھ پر ہاتھ رکھنا دوزخیوں کے آرام لینے کی صورت ہے

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِخْتِصَارُ فِي الصَّلٰوةِ رَاحَةُ اَهْلِ النَّارِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا نماز میں اختصار (یعنی کوکھ پر ہاتھ رکھنا) دوزخیوں کے آرام لینے کی صورت ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس باب کی حدیث نمبر ۴ کی تشریح کے ضمن میں خصرو اختصار کی وضاحت کی جا چکی ہے وہاں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ میدان حشر میں جب دوزخی کھڑے کھڑے بہت زیادہ تکلیف محسوس کریں گے تو وہ اپنے کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جائیں گے اور اس طرح وہ کچھ دیر کے لئے آرام اور سکون کی خواہش کریں گے اس لئے آنحضرت ﷺ نے نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونے کو منع فرمایا ہے کہ دوزخیوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔

نماز میں سانپ و بچھو مارنے کا مسئلہ

(۲۵) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُقْتُلُوا الْاَسْوَدَيْنِ فِي الصَّلٰوةِ الْحَيَّةَ وَالْعَقْرَبَ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد والترمذی والنسائی معناہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "نماز میں دو کالوں یعنی سانپ اور بچھو کو مار ڈالو۔" (احمدؒ، ترمذیؒ اور نسائی بالمعنی)

تشریح: ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں نماز پڑھتے ہوئے سانپ یا بچھو سامنے آجائے تو ان کو ایک چوٹ یا دو چوٹ کے ساتھ مارنا چاہئے اس سے زیادہ چوٹ نہ مارنی چاہئے کیونکہ یہ عمل کثیر ہو جائے گا جس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ شرح منیہ میں بعض مشائخ کا قول مذکور ہے کہ یہ (یعنی نماز میں سانپ، بچھو مارنے کا حکم) اس صورت میں ہے جب کہ نمازی کو بہت زیادہ یعنی تین قدم پے در پے چلنا نہ پڑے اور نہ زیادہ مشغولیت ہو یعنی تین چوٹ پے در پے مارنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور اگر کوئی نمازی سانپ یا بچھو مارنے کی غرض سے پے در پے تین قدم چلے گا یا پے در پے تین چوٹیں مارے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ اتنا زیادہ چلنا یا اتنی مقدار مشغولیت

اختیار کرنا عمل کثیر ہے۔ سرخسیؒ نے اسے مبسوط میں ذکر کیا ہے اور پھر کہا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اس سلسلہ میں یہ فرق نہ کیا جائے کہ تین قدم چلنے سے یا تین چوٹیں مارنے سے نماز فاسد ہو جائے گی کیونکہ جس طرح حدث پیش آجانے (یعنی وضو ٹوٹ جانے کی شکل میں زیادہ چلنے کی سہولت دی گئی ہے اسی طرح اس مسئلہ میں بھی سہولت دی گئی ہے لیکن تحقیقی طور پر صحیح بات یہی ہے کہ تین قدم چلنے یا تین چوٹ مارنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے

البتہ اتنی سہولت ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ سانپ یا بچھو نماز میں سامنے آجائے اور اس کا مارنا ضروری ہو تو ایسی صورت میں ان کو مارنے کے لئے نماز توڑ دینا مباح ہے جیسا کہ کسی مظلوم کی فریاد رسی یا کسی کو ڈوبنے اور ہلاکت سے بچانے کی خاطر نماز توڑ دینا مباح ہے یعنی اگر کسی چھت سے گر جانے یا آگ میں جل جانے یا کنویں وغیرہ میں ڈوب جانے کا قوی خطرہ ہو اور قریب ہی ایک شخص نماز میں ہو تو ایسی صورت میں اس نمازی کو چاہئے کہ نماز کو توڑ دے اور انہیں بچانے کی کوشش کرے یا اسی طرح کسی نمازی کو حالت نماز میں اپنی یا غیر کی کسی چیز کے ضائع ہو جانے کا خوف ہو اور اس کی قیمت ایک درہم تک ہو تو اسے اس چیز کو بچانے کے لئے نماز توڑ دینا جائز ہے۔

اس حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف کالے سانپ ہی کو مارا جا سکتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ حدیث میں کالے سانپ کی تخصیص محض تغلیباً کی گئی ہے چنانچہ ہدایہ میں لکھا ہے کہ ہر قسم کے سانپوں کو مارنا جائز ہے کالے سانپ ہی کی تخصیص نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ نماز کی حالت میں دروازہ کھولتے تھے

(۲۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي تَطَوُّعًا وَالْبَابُ عَلَيْهِ مُغْلَقٌ جِئْتُ فَاسْتَفْتَحْتُ فَمَشٰى فَفَتَحَ لِيْ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰى مُصَلَّاهُ وَذَكَرَتْ اَنَّ الْبَابَ كَانَ فِي الْقِبْلَةِ۔

(رواہ احمد، وابوداؤد، والترمذی والنسائی نحوہ)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ گھر میں نفل نماز میں مشغول ہوتے اور دروازہ بند رہا کرتا تھا میں (گھر میں آئی تو دروازہ کھلواتی اور آپ ﷺ چل کر میرے لئے دروازہ کھول دیا کرتے تھے پھر مصلے پر واپس آجاتے (اور اپنی نماز میں مشغول ہو جاتے) اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دروازہ قبلہ کی جانب تھا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دروازہ چونکہ قبلہ کی طرف تھا اس لئے آنحضرت ﷺ دروازہ کھولنے کے لئے تشریف لاتے تھے تو آپ ﷺ کا چہرہ مبارک قبلہ کی طرف سے پھرتا نہیں تھا کیونکہ قبلہ سامنے ہی ہوتا تھا پھر جب مصلے پر واپس تشریف لاتے تو پچھلے پاؤں ہٹ کر آتے تھے تاکہ پشت قبلہ کی طرف نہ ہو۔

علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا حجرہ مبارک زیادہ وسیع و عریض نہیں بلکہ بہت تنگ تھا اس لئے ایک دو قدم سے زیادہ چلنا نہیں پڑھتا تھا کہ عمل کثیر ہوتا لیکن اس کے باوجود ایک اشکال پھر بھی واقع ہوتا ہے کہ دو قدم چلنا دروازہ کھولنا اور پھر مصلے پر واپس آنا یہ سب مل کر تو عمل کثیر ہو جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ افعال پے در پے نہیں ہوتے تھے کہ عمل کثیر ہو سکیں۔

نماز میں وضو ٹوٹ جانے کا مسئلہ

(۲۷) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَسَا اَحَدُكُمْ فِي الصَّلٰوةِ فَلْيَنْصَرِفْ وَلْيَتَوَضَّأْ وَلْيُعِدِ الصَّلَاةَ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ مَعَ زِيَادَةٍ وَنُقْصَانٍ۔

"اور حضرت طلق ابن علیؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "نماز کی حالت میں جب تم میں سے کسی کی بغیر آواز کے ریح خارج ہو تو اسے چاہئے کہ جا کر وضو کرے اور نماز کو دوبارہ پڑھے۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے بھی کچھ کمی زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر نماز کی حالت میں کسی کی ریح خود بخود خارج ہو جائے تو اسے وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھنا افضل ہے لیکن فقہی شرائط کے مطابق اگر کوئی شخص وضو کر کے نماز از سر نو شروع نہ کرے بلکہ جہاں سے نماز چھوڑی تھی اسی پر بقیہ نماز کی بناء کرے تو جائز ہے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے اور انہوں نے اس حدیث سے ثابت کیا ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔

یہ مسئلہ تو خود بخود ریح خارج ہونے کا ہے، اگر کوئی شخص حالت نماز میں قصداً ریح خارج کرے تو اس کے لئے دوبارہ وضو کر کے از سر نو نماز پڑھنا واجب ہے۔

(۲۸) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْدَثَ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاتِهٖ فَلْيَأْخُذْ بِاَنْفِهٖ ثُمَّ لِيَنْصَرِفْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کا وضو حالت نماز میں ٹوٹ جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی ناک پکڑ کر نماز سے نکل آئے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر حالت نماز میں کسی شخص کی ریح خارج ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ ناک پکڑ کر وضو کے لئے چلا جائے تاکہ لوگ یہ گمان کریں کہ نکسیر پھوٹی ہے۔ ناک پکڑ کر نماز سے نکلنے کا حکم اس لئے فرمایا گیا تاکہ ایسا شخص ایسے موقعہ پر شرمندگی و ندامت سے بچ جائے۔ کیونکہ ظاہر ہونا کہ اس شخص کی ریح خارج ہوئی ہے عام طور پر شرمندگی و ندامت کا باعث بنتا ہے پھر یہ لوگ اس کے بارے میں کوئی چہ میگوئی نہ کریں گے بلکہ یہ جانیں گے کہ اس کی نکسیر پھوٹ گئی ہے جس کی وجہ سے وہ نماز سے نکل گیا ہے۔

اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو لوگوں کی نظروں میں معیوب اور محل اعتراض بنتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس فعل کو پوشیدہ رکھے اور لوگوں پر ظاہر نہ کرے تاکہ لوگ نہ اس کی بے آبروئی کے درپے ہوں اور نہ کھلم کھلا اس کی طرف وہ عیب منسوب کیا جائے جسے وہ چھپائے رکھنا چاہتا ہے اور اس کا یہ فعل چھپانا جھوٹ میں شمار نہیں ہوگا بلکہ معاریض[1] کی قسم سے ہوگا۔

(۲۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْدَثَ اَحَدُكُمْ وَقَدْ جَلَسَ فِيْ اٰخِرِ صَلَاتِهٖ قَبْلَ اَنْ يُسَلِّمَ فَقَدْ جَازَتْ صَلٰوتُهٗ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ اِسْنَادُهٗ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ وَقَدِ اضْطَرَبُوْا فِيْ اِسْنَادِهٖ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "اگر تم میں سے کسی کا وضو اس وقت ٹوٹے جب کہ وہ اپنی نماز کے آخری قعدہ میں (بمقدار تشہد بیٹھ چکا) ہو اور سلام نہ پھیرا ہو تو اس کی نماز پوری ہو گئی۔ ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کی اسناد مضبوط نہیں ہے اور انہوں نے اس کی اسناد میں اضطراب کیا ہے۔"

تشریح: حدیث کی مذکورہ صورت میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قصداً وضو توڑے گا تو اس کی نماز پوری ہو جائے گی کیونکہ ان کے نزدیک نمازی کا اپنے کسی بھی فعل کے ذریعہ نماز سے نکلنا فرض ہے یعنی اگر کوئی شخص نماز کے پورے ارکان ادا کرنے کے بعد نماز کو مکمل طور ختم کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسا فعل اختیار کرے جو نماز کے خاتمہ کا ذریعہ بن جائے جیسا کہ سلام پھیرنا۔

چنانچہ اتنی بات سمجھ لیجئے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک نماز کو محض سلام کے ذریعہ ہی ختم کرنا فرض نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص نماز کے ارکان کے بعد بجائے سلام پھیرنے کے کوئی ایسا دوسرا فعل اختیار کرے جو نماز کے منافی ہو تو اس کی نماز پوری ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ امام

[1] کسی واقعہ کو اس طرح بیان کرنا کہ واقعہ کی پوری صراحت نہ ہو ایسے انداز کو تعریض کہتے ہیں ۱۲۔

اعظمؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آخری قعدہ میں تشہد وغیرہ پڑھنے کے بعد قصدًا اپنی وضو توڑ ڈالے تو اس کی نماز پوری ہو جائے گی کیونکہ اس نے نماز کے ارکان پورے کرنے کے بعد ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو نماز کے خاتمہ کا ذریعہ بن گیا ہے اگرچہ وہ ترک واجب کا گنہ گار ہو گا مگر فرض ادا ہو جائے گا کیونکہ امام اعظمؒ کے نزدیک سلام کے ذریعہ نماز کو پورا کرنا واجب ہے۔ صاحبین یعنی امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک قصدًا وضو توڑنے کی شرط نہیں ہے بلکہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا صورت میں کسی کی وضو خود بخود ٹوٹ جائے تو جب بھی اس کی نماز تمام ہو جائے گی یعنی فرض پورا ہو جائے گا۔

لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ حدیث قصدًا وضو توڑنے پر محمول ہے اور صاحبین کے نزدیک مطلق ہے خواہ کوئی قصدًا وضو توڑ دے یا اس کی وضو خود بخود ٹوٹ جائے۔ چنانچہ یہ حدیث حنفیہ خصوصًا صاحبینؒ کے مسلک کی مؤید ہے بخلاف حضرت امام شافعیؒ کے کہ ان کے نزدیک نماز کو صرف سلام کے ذریعہ پورا کرنا فرض ہے۔

حدیث مضطرب وہ حدیث کہلاتی ہے جو مختلف الفاظ اور مختلف وجوہ سے نقل کی گئی ہو اور یہ چیز حدیث کے ضعف کی علامت ہوتی ہے کیونکہ حدیث کا اس طرح مروی ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ راویان حدیث کو حدیث پوری طرح یاد نہیں رہی۔ ملا علی قاری نے اس حدیث کو مضطرب و ضعیف تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے جن کو امام طحاویؒ نے نقل کیا ہے اور اصول حدیث میں یہ بات مسلم ہے کہ کسی حدیث ضعیف کا متعدد طرق سے مروی ہونا اسے حسن کے قرب کر دیتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ کا ایک واقعہ

(۳۰) عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ اِلَى الصَّلَاةِ فَلَمَّا كَبَّرَ اِنْصَرَفَ وَ اَوْمَأَ اِلَيْهِمْ اَنْ كَمَا كُنْتُمْ ثُمَّ خَرَجَ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ جَاءَ وَرَأْسُهُ يَقْطُرُ فَصَلّٰى بِهِمْ فَلَمَّا صَلّٰى قَالَ اِنِّی كُنْتُ جُنُبًا فَنَسِيْتُ اَنْ اَغْتَسِلَ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَرَوٰى مَالِكٌ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ مُرْسَلًا۔

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) سرور کونین ﷺ نماز کے لئے (مسجد میں) تشریف لائے، جب تکبیر کہنے کا ارادہ کیا گیا تو آپ ﷺ پیچھے مڑے اور صحابہ کو یہ اشارہ کر کے کہ تم اپنی اپنی جگہ کھڑے رہو، مسجد سے باہر نکلے، چنانچہ آپ ﷺ نے غسل کیا اور اس حال میں واپس تشریف لائے کہ آپ ﷺ کے سر مبارک سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، پھر آپ ﷺ نے صحابہؓ کو نماز پڑھائی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا کہ "مجھے غسل کی حاجت تھی مگر میں غسل کرنا بھول گیا تھا۔" (احمدؒ) امام مالکؒ نے بھی اس حدیث کو عطاء ابن یسارؒ سے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔

سجدہ کی جگہ کو گرمی سے بچانے کے لئے حضرت جابرؓ کا طریقہ

(۳۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنْتُ اُصَلِّی الظُّهْرَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاٰخُذُ قَبْضَةً مِنَ الْحَصٰى لِتَبْرُدَ فِی كَفِّی اَضَعُهَا لِجَبْهَتِی اَسْجُدُ عَلَيْهَا لِشِدَّةِ الْحَرِّ۔ (رواہ ابوداؤد وروی النسائی نحوہ)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں ظہر کی نماز سرور کونین ﷺ کے ہمراہ پڑھا کرتا تھا اور ایک مٹھی میں کنکریاں لے لیتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ میں ٹھنڈی ہو جائیں۔ چنانچہ (سجدہ کی جگہ کی) شدت گرمی سے بچنے کی خاطر میں ان کنکریوں کو سجدہ کے وقت اپنی پیشانی کے نیچے رکھ لیتا تھا۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نماز میں اس قدر فعل اختیار کرنا معاف ہے اور اتنا فعل عمل کثیر بھی نہیں ہے۔

نماز میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ شیطان کا ایک عجیب معاملہ

(۳۲) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّى فَسَمِعْنَاهُ يَقُوْلُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ ثُمَّ قَالَ اَلْعَنُكَ بِلَعْنَةِ اللّٰهِ ثَلَاثًا وَبَسَطَ يَدَهُ كَاَنَّهُ يَتَنَاوَلُ شَيْئًا فَلَمَّا فَرَغَ مِنَ الصَّلَاةِ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ سَمِعْنَاكَ تَقُوْلُ فِى الصَّلٰوةِ شَيْئًا لَمْ نَسْمَعْكَ تَقُوْلُهُ قَبْلَ ذٰلِكَ وَرَأَيْنَاكَ بَسَطْتَ يَدَكَ قَالَ اِنَّ عَدُوَّ اللّٰهِ اِبْلِيْسَ جَاءَ بِشِهَابٍ مِنْ نَارٍ لِيَجْعَلَهُ فِىْ وَجْهِىْ فَقُلْتُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قُلْتُ اَلْعَنُكَ بِلَعْنَةِ اللّٰهِ التَّامَّةِ فَلَمْ يَسْتَأْخِرْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ اَرَدْتُ اَنْ اٰخُذَهُ وَاللّٰهِ لَوْلَا دَعْوَةُ اَخِيْنَا سُلَيْمَانَ لَاَصْبَحَ مُوْثَقًا يَلْعَبُ بِهِ وِلْدَانُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) سرور کونین ﷺ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے (نماز کے درمیان) میں نے سنا کہ آپ ﷺ فرما رہے ہیں "تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں" پھر آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ فرمایا کہ "تجھ پر لعنت کرتا ہوں، خدا کی لعنت" اور (یہ فرماتے ہوئے) آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک اس طرح پھیلائے گویا آپ ﷺ کسی چیز کو پکڑ رہے ہوں، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوگئے تو ہم نے کہا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم نے آج آپ ﷺ کو نماز میں ایسی بات کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس سے پہلے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ______ یہ کہتے نہیں سنا اور آج ہم نے آپ ﷺ کو ہاتھ پھیلاتے ہوئے بھی دیکھا ہے؟" آپ ﷺ نے یہ فرمایا اللہ کا دشمن ابلیس ملعون آگ کا شعلہ لے کر آیا تھا تاکہ اسے میرے منہ میں ڈالے چنانچہ میں نے تین مرتبہ یہ کہا کہ "میں تجھ سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں" پھر میں نے کہا کہ "میں تجھ پر لعنت کرتا ہوں اللہ کی پوری لعنت، وہ نہیں ہٹا تو میں نے (یہ الفاظ) تین مرتبہ کہے، جب وہ پھر بھی نہ ہٹا تو میں نے (اپنے ہاتھ پھیلا کر) اسے پکڑنا چاہا لیکن خدا کی قسم! اگر ہمارے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو وہ (مسجد کے ستون سے) صبح تک بندھا رہتا اور مدینہ کے بچے اس کے ساتھ کھیلتے۔" (مسلم)

تشریح: اسی باب کی حدیث نمبر ۹ کے ضمن میں اس کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کے تابع ہونے اور ان پر تصرف کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی اور جنات ان کے فرمانبردار ہوئے چنانچہ یہ سوچ کر کہ اس معاملہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی امتیازی حیثیت پر اثر پڑے گا آنحضرت ﷺ نے اس کو اپنا تابع کرنا نہیں چاہا اس حدیث سے یہ بات پوری قوت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ ابلیس یقیناً جنات کی قوم سے ہے۔

نماز میں اشارہ سے سلام کا جواب دینے کا مسئلہ

(۳۳) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ وَهُوَ يُصَلِّىْ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَرَدَّ الرَّجُلُ كَلَامًا فَرَجَعَ اِلَيْهِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَقَالَ لَهُ اِذَا سُلِّمَ عَلٰى اَحَدِكُمْ وَهُوَ يُصَلِّىْ فَلَا يَتَكَلَّمْ وَلْيُشِرْ بِيَدِهٖ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا گذر ایک شخص پر ایسی حالت میں ہوا کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ حضرت عبداللہ نے اس شخص کو سلام کیا اور اس نے حضرت عبداللہؓ کے سلام کا جواب زبان سے دیا، حضرت عبداللہ اس کی طرف لوٹے اور فرمایا کہ "جب تم میں سے کسی کو نماز پڑھنے کی حالت میں سلام کیا جائے تو اس سے بولنا نہیں چاہئے بلکہ اسے چاہئے کہ وہ (سلام کا جواب دینے کے لئے) اپنے ہاتھ سے اشارہ کردے۔" (مالکؒ)

تشریح: اسی باب میں حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت (نمبر ۱۲) گذر چکی ہے۔ اس کی تشریح کے ضمن میں نماز کی حالت میں ہاتھ یا سر کے اشارہ سے سلام کا جواب دینے کا مسئلہ بیان کیا جاچکا ہے کہ یہ حکم پہلے تھا پھر بعد میں اشارۃً بھی سلام کا جواب دینا منسوخ ہوگیا۔

بَابُ السَّھْوِ سجدہ سہو کا بیان

نماز کے سنن و مستحبات اگر ترک ہو جائیں تو اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آتی یعنی نماز صحیح ہو جاتی ہے اور نماز کے فرائض میں سے کوئی چیز اگر سہواً یا عمداً چھوٹ جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے جس کا کوئی تدارک نہیں جس کی وجہ سے نماز کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔ نماز کے واجبات میں سے اگر کوئی چیز عمداً چھوڑ دی جائے تو اس کا بھی تدارک نہیں ہو سکتا اور نماز فاسد ہو جاتی ہے اور اگر نماز کے واجبات میں سے کوئی چیز عمداً نہیں بلکہ سہواً چھوڑ دی جائے تو اس کا تدارک ہو سکتا ہے اور وہ تدارک یہ ہے کہ قعدہ اخیر میں التحیات پڑھنے کے بعد داہنی طرف ایک سلام پھیر کر دو سجدے کر لئے جائیں اور سجدہ کے بعد پھر قعدہ کیا جائے اور التحیات درود شریف اور دعا حسب معمول پڑھ کر سلام پھیرا جائے انہیں سجدوں کو سجدہ سہو کہا جاتا ہے۔

اتنی بات سمجھ لیجئے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال میں جو شرعی چیزوں کی خبر دینے اور دینی احکام کے بیان سے متعلق ہیں نہ تو کبھی سہو ہوا ہے اور نہ یہ ممکن ہے ہاں آپ ﷺ کے افعال میں سہو ہوتا تھا وہ بھی اسی حکمت و مصلحت کے پیش نظر تاکہ امت کے لوگ اسی طرح سہو کے مسائل سیکھ لیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

رکعتوں کی تعداد بھول جانے کی صورت میں سجدہ سہو کا حکم

① عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا قَامَ يُصَلِّي جَاءَهُ الشَّيْطَانُ فَلَبَسَ عَلَيْهِ حَتّٰى لَا يَدْرِي كَمْ صَلّٰى فَاِذَا وَجَدَ ذٰلِكَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے پاس شیطان آتا ہے اور اسے شک و شبہ میں مبتلا کر دیتا ہے یہاں تک کہ اس (نمازی) کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں، لہٰذا تم میں سے کسی کو اگر یہ صورت پیش آئے تو اسے چاہئے کہ وہ آخری قعدہ میں) بیٹھ کر دو سجدے کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث میں جو صورت بیان کی گئی ہے وہ سہو سے متعلق نہیں ہے بلکہ شک کی صورت ہے اور شک و سہو کے درمیان فرق یہ ہے کہ سہو میں ایک جانب کا تعین ہوتا ہے (کہ فلاں چیز بھول گیا) اور شک میں تردد ہوتا ہے کہ آیا یہ صحیح ہے یا وہ اور شیطان ملعون کی کیا مجال تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کو شک و شبہ میں مبتلا کر دیتا۔ ہاں غلبہ استغراق اور آخرت کی طرف بے انتہا توجہ کی بناء پر آپ ﷺ کو سہو ہو جاتا تھا۔ سجدہ سہو واجب ہونے کے سلسلہ میں شک اور سہو دونوں کا یکساں حکم ہے، اس مسئلہ کی پوری وضاحت آئندہ حدیث کی تشریح میں ملاحظہ فرمائیے۔

② وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِي سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا شَكَّ اَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهٖ فَلَمْ يَدْرِ كَمْ صَلّٰى ثَلَاثًا اَوْ اَرْبَعًا فَلْيَطْرَحِ الشَّكَّ وَلْيَبْنِ عَلٰى مَا اسْتَيْقَنَ ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يُّسَلِّمَ فَاِنْ كَانَ صَلّٰى خَمْسًا شَفَعْنَ لَهٗ صَلَاتَهٗ وَاِنْ كَانَ صَلّٰى اِتْمَامًا لِاَرْبَعٍ كَانَتَا تَرْغِيْمًا لِلشَّيْطَانِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَرَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ عَطَاءٍ مُرْسَلًا وَفِيْ رِوَايَتِهٖ شَفَعَهَا بِهَاتَيْنِ السَّجْدَتَيْنِ۔

"اور حضرت عطاء ابن یسار حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص درمیان نماز شک میں مبتلا ہو جائے اور اسے یاد نہ رہے کہ اس نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار رکعتیں تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا شک دور کرے اور جس عدد پر اسے یقین ہو اس پر بناء کرے (یعنی کسی ایک عدد کا تعین کر کے نماز پوری کر لے) اور پھر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کر لے۔ اگر اس نے پانچ رکعتیں پڑھی ہوں گی تو یہ پانچ رکعتیں ان دو سجدوں کے ذریعہ اس کی نماز کو جفت کر دیں گی اور اگر اس نے پوری چار رکعتیں پڑھی ہوں گی تو یہ دونوں سجدے شیطان کی ذلت کا سبب بنیں گے" مسلمؒ اور امام مالکؒ نے اس روایت کو عطاء سے بطریق ارسال

نقل کیا ہے نیز امام مالکؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "کہ نمازی ان دونوں سجدوں کے ذریعہ پانچ رکعتوں کو جفت کردے گا۔"

تشریح: صورت مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے درمیان نماز وہ شک و شبہ میں مبتلا ہو گیا یعنی اسے یہ یاد نہیں رہا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تو اسے چاہئے کہ وہ کمتر عدد کا تعین کرے اور اسی کا گمان غالب کر کے نماز پڑھ لے مثلاً اسے یہ شبہ ہو کہ نہ معلوم میں نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار رکعتیں تو اس صورت میں اسے تین رکعتوں کا تعین کر کے نماز پوری کرنی چاہئے اور پھر آخری قعدہ میں التحیات پڑھنے کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے داہنی طرف سلام پھیر کر سہو کے دو سجدے کرنا چاہئے۔ بخاری کی روایت میں سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ سہو کرنے کی قید نہیں ہے چنانچہ اسی وجہ سے ائمہ کے یہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ سجدہ سلام پھیرنے سے پہلے کرنا چاہئے یا سلام پھیرنے کے بعد۔ اس مسئلہ کی تفصیل ہم آئندہ کسی حدیث کی تشریح کے ضمن میں بیان کریں گے۔

حدیث میں سہو کے دونوں سجدوں کا فائدہ بھی بتایا گیا ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے مذکورہ صورت میں تین رکعت کا تعین کر کے ایک رکعت اور پڑھ لی حالانکہ حقیقت میں وہ چار رکعتیں پہلے پڑھ چکا تھا اس طرح اس کی پانچ رکعتیں ہو گئی تو یہ پانچ رکعتیں ان دونوں سجدوں کی وجہ سے اس کی نماز کو شفع (جفت کر دیں گی کیونکہ وہ دونوں سجدے ایک رکعت کے حکم میں ہیں یعنی یہ پانچ رکعتیں ان دونوں سجدوں سے مل کر چھ رکعت کے حکم میں ہو جائیں گی اور اگر اس نے حقیقت میں تین ہی رکعتیں پڑھی تھیں اور سہو کی صورت میں اس نے تین ہی کا تعین کر کے ایک رکعت اور پڑھی اور اس کی چار رکعتیں پوری ہو گئیں تو اس کے وہ دونوں سجدے شیطان کی ذلت کا سبب بن جائیں گے۔ یعنی اس صورت میں جب کہ اس شخص نے چار ہی رکعتیں پڑھی ہیں تو دونوں سجدے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ نماز کو جفت کر دیں جیسا کہ پہلی صورت (پانچ رکعتیں پڑھنے کی صورت) میں ان دونوں سجدوں کی ضرورت تھی لیکن ان دونوں سجدوں کا جو بظاہر زائد معلوم ہوتے ہیں یہ فائدہ ہوا کہ ان سے شیطان کی ذلت و ناکامی ہوئی۔ کیونکہ شیطان کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ نمازی کو شک و شبہ میں مبتلا کر کے اسے عبادت سے باز رکھے حالانکہ نمازی نے اس کے برعکس دو سجدے اور کر کے عبادت چھوڑنے کے بجائے اس میں اور زیادتی کی جو یقینی بات ہے کہ شیطان کی ناکامی و نامرادی کا باعث ہے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شک کی صورت میں اقل (کمتر) کو اختیار کرنا چاہئے تحری (غالب گمان) پر عمل نہ کیا جائے چنانچہ جمہور ائمہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

امام ترمذیؒ کا قول یہ ہے کہ اہل علم میں سے بعض حضرات کا مسلک یہ ہے کہ شک کی صورت میں نماز کا اعادہ کرنا چاہئے یعنی اگر کسی کو درمیان نماز رکعتوں کی تعداد کے بارے میں شک ہو جائے تو اسے چاہئے کہ نماز کو از سر نو پڑھے۔

اس مسئلہ میں امام اعظم ابوحنیفہ کے مسلک کا حاصل یہ ہے کہ "اگر کسی شخص کو نماز میں شک ہو جائے کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تو اگر اس شخص کی عادت شک کرنے کی نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ پھر نئے سرے سے نماز پڑھے اور اگر اس کو شک ہونے کی عادت ہو تو اپنے غالب گمان پر عمل کرے یعنی جتنی رکعتیں اس کو غالب گمان سے یاد پڑیں تو اسی قدر رکعتیں سمجھے کہ پڑھ چکا ہے اور اگر غالب گمان کسی طرف نہ ہو تو کمتر عدد کو اختیار کرے مثلاً کسی کو ظہر کی نماز میں شک ہوا کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار اور غالب گمان کسی طرف نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ تین رکعتیں شمار کرے اور ایک رکعت اور پڑھ کر نماز پوری کر لے پھر سجدۂ سہو کر لے۔

اتنی بات سمجھ لینی چاہئے کہ غالب گمان پر عمل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ شریعت میں غالب گمان کو اختیار کرنے کی اصل موجود ہے جیسا کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ نماز پڑھنا چاہے جہاں اسے قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو سکے تو اس کے لئے حکم ہے کہ وہ جس سمت کے بارے میں غالب گمان رکھے کہ ادھر قبلہ ہے اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے اس کی نماز ہو جائے گی۔ غالب گمان کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں احادیث بھی مروی ہیں۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کی ایک روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک واقع ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ صحیح رائے قائم کر کے (یعنی کسی ایک پہلو پر غالب گمان کر کے) نماز

پوری کرلے" اس حدیث کو شمنیؒ نے بھی شرح نقایہ میں نقل کیا ہے نیز جامع الاصول میں بھی نسائیؒ سے ایک حدیث تحری (غالب گمان) پر عمل کرنے کے صحیح ہونے کے بارے میں منقول ہے۔

امام محمدؒ نے اپنی کتاب موطأ میں تحری کی افادیت کے سلسلہ میں یہ کہتے ہوئے کہ "تحری کے سلسلہ میں بہت آثار وارد ہیں" بڑی اچھی بات یہ کہی ہے کہ "اگر ایسا نہ کیا جائے یعنی تحری کو قابل قبول نہ قرار دیا جائے تو شک اور سہو سے نجات ملنی بڑی مشکل ہوگی اور ہر شک و شبہ کی صورت میں اعادہ بڑی پریشانی کا باعث بن جائے گا۔"

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس موقع پر مسئلہ مذکورہ کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "اس موقع پر حاصل کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں تین احادیث منقول ہیں۔ پہلی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں جب بھی کسی کو شک واقع ہو جائے تو وہ نماز کو ازسرنو پڑھے۔ دوسری حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ "جب کسی کو نماز میں شک واقع ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ صحیح بات کو حاصل کرنے کے لئے تحری کرے یعنی غالب گمان پر عمل کرے۔ تیسری حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ "جب نماز میں شک واقع ہو تو یقین پر عمل کرنا چاہئے یعنی جس پہلو پر یقین ہو اسی پر عمل کیا جائے۔"

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ان تینوں حدیثوں کو اپنے مسلک میں جمع کر دیا ہے اس طرح کہ انہوں نے پہلی حدیث کو تو مرتبہ شک واقع ہونے کی صورت پر محمول کیا ہے، دوسری حدیث کو کسی ایک پہلو پر غالب گمان ہونے کی صورت پر محمول کیا ہے اور تیسری حدیث کو کسی بھی پہلو پر غالب گمان نہ ہونے کی صورت پر محمول کیا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ "حضرت امام اعظمؒ کے مسلک کے کمال جامعیت اور انتہائی محقق ہونے کی دلیل ہے۔

(۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الظُّهْرَ خَمْسًا فَقِيْلَ لَهٗ اَزِيْدَ فِي الصَّلَاةِ فَقَالَ وَ مَا ذَاكَ قَالُوْا صَلَّيْتَ خَمْسًا فَسَجَدَ سَجْدَ تَيْنِ بَعْدَ مَاسَلَّمَ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَنْسٰى كَمَاتَنْسَوْنَ فَاِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُوْنِي وَ اِذَا شَكَّ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاتِهٖ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ ثُمَّ لِيُسَلِّمْ ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) سرور کونین ﷺ نے ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھ لی، چنانچہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ "کیا نماز میں کچھ زیادتی ہوگئی ہے؟ آنحضرت ﷺ نے پوچھا کیا ہوا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں" (یہ سن کر) آپ ﷺ نے سلام پھیر لینے کے بعد دو سجدے کئے۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "میں انسان ہی تو ہوں، جس طرح تم بھولتے تو اس طرح میں بھی بھول جاتا ہوں جب میں کچھ بھول جایا کروں، مجھے یاد دلایا کرو، اور جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ صحیح رائے قائم کرے اور اس رائے کی بنیاد پر نماز پوری کرلے اور پھر سلام پھیر کر دو سجدے کرلے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں کمتر پر عمل کرنے کو نہیں کہا گیا ہے گو مراد یہی ہے کہ اگر تحری فائدہ نہ دے یعنی کسی بھی عدد کے بارے میں غالب گمان نہ ہو سکے تو کمتر عدد کو اختیار کر کے نماز پوری کرلی جائے چونکہ حضرات شوافع تحری کے قائل نہیں ہیں اس لئے وہ بھی اس حدیث کے الفاظ فلیتحر الصواب سے مراد "کمتر عدد کو اختیار کرنا" لیتے ہیں۔

حنفیہ کے ہاں پانچ رکعت ادا کرلینے کی صورت میں مسئلہ کی کچھ تفصیل ہے۔ چنانچہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قعدہ اخیرہ بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے اور پانچویں رکعت کا سجدہ کرنے سے پہلے اسے یاد آجائے تو اسے چاہئے کہ فوراً بیٹھ جائے اور التحیات پڑھ کر سجدہ سہو کرلے۔ اور اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کر چکا ہو تو پھر نہیں بیٹھ سکتا اور اس کی یہ نماز اگر فرض کی نیت سے پڑھ رہا تھا تو فرض ادا نہیں ہوگا بلکہ نفل ہو جائے گی۔ اور اسے اختیار ہوگا کہ ایک رکعت کے ساتھ دوسری رکعت اور ملالے تاکہ یہ رکعت بھی ضائع نہ ہو اور دو رکعتیں یہ بھی نفل ہو جائیں، اگر عصر اور فجر میں یہ واقعہ پیش آئے تب بھی دوسری رکعت ملا سکتا ہے اس لئے کہ عصر و فجر

کے فرض کے بعد نفل مکروہ ہے اور یہ رکعتیں فرض نہیں رہیں بلکہ نفل ہوگئی ہیں پس گویا فرض سے پہلے نفل پڑھی گئی ہیں اور اس میں کچھ کراہت نہیں۔ مغرب کے فرض میں صرف یہی رکعت کافی ہے دوسری رکعت نہ ملائی جائے، ورنہ پانچ رکعتیں ہو جائیں گی اور نفل میں طاق رکعتیں منقول نہیں اور اس صورت میں سجدہ سہو کی ضرورت نہ ہوگی۔

یہ شکل تو قعدہ اخیرہ میں بیٹھے بغیر رکعت کے لئے اٹھ جانے کی تھی۔ اگر کوئی شخص قعدہ اخیرہ میں التحیات پڑھنے کے بقدر بیٹھ کر سلام پھیرنے سے پہلے پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے تو اگر وہ پانچویں رکعت کا سجدہ نہ کر چکا ہو تو فوراً بیٹھ جائے اور چونکہ سلام کے ادا کرنے میں جو واجب تھا تاخیر ہوگئی اس لئے سجدہ سہو کرلے اگر پانچوں رکعت کا سجدہ کرنیکے بعد یاد آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ اب نہ بیٹھے بلکہ ایک رکعت اور ملادے تاکہ یہ پانچویں رکعت ضائع نہ ہو اور اگر رکعت نہ ملائے بلکہ پانچویں رکعت کے بعد سلام پھیر دے تب بھی جائز ہے مگر ملا دینا بہتر ہے۔ اس صورت میں اس کی وہ رکعتیں اگر فرض نیت کی تھیں تو فرض ادا ہوں گی نفل نہ ہوں گی۔ عصر اور فجر کے فرض میں بھی دوسری رکعت ملا سکتا ہے اس لئے کہ عصر اور فجر کے فرض کے بعد قصداً نفل پڑھنا مکروہ ہے اور اگر سہواً پڑھ بھی لیا جائے تو کچھ کراہت نہیں۔ اس صورت میں فرض کے بعد جو رکعتیں پڑھی گئیں ہیں یہ ان مؤکدہ سنتوں کے قائم مقام نہیں ہو سکتیں جو فرض کے بعد ظہر و مغرب اور عشاء کے وقت مسنون ہیں کیونکہ ان سنتوں کا تحریمہ سے ادا کرنا آنحضرت ﷺ سے منقول ہے۔

یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ آنحضرت ﷺ چار رکعت کے بعد قعدہ اخیرہ میں بیٹھ کر پھر بعد میں رکعت کے لئے اٹھ گئے تھے چونکہ اس حدیث سے بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پانچویں رکعت کے ساتھ چھٹی رکعت نہیں ملائی تھی اور صرف سہو پر اکتفاء کیا جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے اس لئے کہا جائے گا کہ یہاں یہ احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بیان جواز کی خاطر ایسا کیا ہوگا"

④ وَعَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِحْدٰى صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ قَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ قَدْ سَمَّاهَا أَبُوْ هُرَيْرَةَ وَلٰكِنْ نَسِيْتُ أَنَا قَالَ فَصَلّٰى بِنَا رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ إِلٰى خَشَبَةٍ مَعْرُوْضَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَاتَّكَأَ عَلَيْهَا كَأَنَّهُ غَضْبَانُ وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ وَوَضَعَ خَدَّهُ الْأَيْمَنَ عَلٰى ظَهْرِ كَفِّهِ الْيُسْرٰى وَخَرَجَتْ سَرَعَانُ الْقَوْمِ مِنْ أَبْوَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالُوْا أَقَصُرَتِ الصَّلَاةُ وَفِي الْقَوْمِ أَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ فَهَابَاهُ أَنْ يُكَلِّمَاهُ وَفِي الْقَوْمِ رَجُلٌ فِيْ يَدَيْهِ طُوْلٌ يُقَالُ لَهُ ذُو الْيَدَيْنِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَنَسِيْتَ أَمْ قَصُرَتِ الصَّلَاةُ فَقَالَ لَمْ أَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ فَقَالَ أَكَمَا يَقُوْلُ ذُو الْيَدَيْنِ فَقَالُوْا نَعَمْ فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰى مَا تَرَكَ ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ كَبَّرَ وَسَجَدَ مِثْلَ سُجُوْدِهِ أَوْ أَطْوَلَ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَكَبَّرَ ثُمَّ كَبَّرَ وَسَجَدَ مِثْلَ سُجُوْدِهِ أَوْ أَطْوَلَ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَكَبَّرَ فَرُبَّمَا سَأَلُوْهُ ثُمَّ سَلَّمَ فَيَقُوْلُ نُبِّئْتُ أَنَّ عِمْرَانَ ابْنَ حُصَيْنٍ قَالَ ثُمَّ سَلَّمَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَفْظُهُ لِلْبُخَارِيِّ وَفِي أُخْرٰى لَهُمَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَدَلَ لَمْ أَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ فَقَالَ قَدْ كَانَ بَعْضُ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

"اور حضرت ابن سیرینؒ [1] حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا" (ایک دن) سرور کونین ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز جس کا نام ابوہریرہؓ نے تو بتایا تھا مگر میں بھول گیا، ہمیں پڑھائی۔ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہمارے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی اور تیسری رکعت کے لئے اٹھنے کی بجائے) سلام پھیر لیا، پھر اس لکڑی کے سہارے جو مسجد میں عرضاً کھڑی تھی کھڑے ہوگئے اور (محسوس ایسا ہوتا تھا) گویا آپ ﷺ غصہ کی حالت میں ہیں، آپ ﷺ نے اپنا داہنا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھا اور انگلیوں میں انگلیاں ڈال لیں اور اپنا بایاں رخسار مبارک اپنے بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ لیا۔ جلد باز لوگ (جو نماز کی ادائیگی کے بعد ذکر اور دعا وغیرہ کے لئے

[1] آپ کا اسم گرامی محمد اور کنیت ابوبکر ہے حضرت انس بن مالکؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ کے تیس بچے تھے جو آپ کی زندگی ہی میں ایک سو وفات پا گئے صرف ایک صاحبزادے عبداللہ بن محمد بن سیرین بقید حیات تھے۔ ستر سال کی عمر میں ۱۱۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

نہیں ٹھہرتے تھے) مسجد کے دروازوں سے جانے لگے، صحابہؓ کہنے لگے کہ کیا نماز میں کمی ہوگئی ہے؟ (کہ آنحضرت ﷺ نے چار رکعت کے بجائے دو ہی رکعتیں پڑھی ہیں؟) صحابہؓ کے درمیان (جو مسجد میں باقی رہ گئے تھے) حضرت ابوبکر و حضرت عمرؓ بھی موجود تھے مگر خوف کی وجہ سے ان کو آنحضرت ﷺ سے کلام کرنے کی جرات نہ ہوئی صحابہؓ میں ایک اور شخص (بھی) تھے جن کے ہاتھ لمبے تھے اور جنہیں (اسی وجہ سے) ذوالیدین (یعنی ہاتھوں والا کے لقب سے) پکارا جاتا تھا انہوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! کیا آپ (ﷺ) بھول گئے ہیں یا نماز ہی میں کمی ہوگئی ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "نہ تو میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی ہوئی ہے" پھر (صحابہؓ سے مخاطب ہوئے اور) فرمایا "کیا تم بھی یہی کہتے ہو جو ذوالیدینؓ کہہ رہے ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "جی ہاں یہی بات ہے" (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ آگے آئے اور جو نماز (یعنی دو رکعت) چھوٹ گئی تھی اسے پڑھا اور سلام پھیر کر تکبیر کہی اور حسب معمول سجدوں جیسا یا ان سے بھی کچھ طویل سجدہ کیا اور پھر تکبیر کہہ کر سر اٹھایا" لوگ ابن سیرینؒ سے پوچھنے لگے کہ "پھر اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے سلام پھیر دیا ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ مجھے عمران بن حصینؓ سے یہ خبر ملی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ "پھر آنحضرت ﷺ نے سلام پھیر دیا" اس روایت کو بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کیا ہے مگر الفاظ بخاری کے ہیں۔

اور بخاری و مسلم ہی کی ایک اور روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (ذوالیدینؓ کے جواب میں) لم انس ولم تقصر (یعنی نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی ہوئی ہے) کے بجائے یہ فرمایا کہ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس میں سے کچھ بھی نہیں ہے" انہوں نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! اس میں سے کچھ تو ضرور ہوا ہے۔"

تشریح: فتح الباری میں اس حدیث کی بہت لمبی چوڑی شرح کی گئی ہے اگر اس کو یہاں نقل کی جائے تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی البتہ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اس حدیث کے بارے میں دو اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا اشکال تو یہ ہے کہ علماء کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ خبر میں تو آنحضرت ﷺ کو سہو ہونا ناممکن ہے اور افعال میں بھی اختلاف ہے مگر آنحضرت ﷺ نے یہاں ذوالیدین کے جواب میں جو یہ فرمایا کہ نہ تو میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی ہی ہوئی ہے" کیا خلاف واقعہ نہیں ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو خبر میں بھی سہو ہو سکتا تھا۔

اس کا جواب مختصر طریقہ پر یہ ہے کہ "آنحضرت ﷺ سے سہو ہونا ان خبروں میں ناممکن ہے جو تبلیغ شرائع، دینی علم اور وحی الٰہی سے متعلق ہیں نہ کہ تمام خبروں میں۔

دوسرا یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ سے افعال بھی سرزد ہوئے اور آپ ﷺ نے گفتگو بھی کی مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے از سر نو نماز نہیں پڑھی بلکہ جو رکعتیں باقی رہ گئی تھیں انہیں کو پورا کر لیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ مفسد نماز وہ کلام و افعال ہیں جو قصداً واقع ہوئے ہوں نہ کہ وہ کلام و افعال جو سہواً ہو گئے ہوں جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ لیکن چونکہ یہ جواب نہ صرف یہ کہ خود اپنے اندر جھول رکھتا ہے بلکہ حنفیہ کے مسلک کے مطابق بھی نہیں ہے کیونکہ ان کے ہاں مطلقاً کلام مفسد صلوٰۃ ہے خواہ قصداً صادر ہوا ہو یا سہواً۔ اس لئے علماء حنفیہ کے نزدیک اس اشکال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ نماز میں کلام اور افعال کا جواز منسوخ نہیں ہوا تھا۔

حضرت امام احمدؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ نماز میں کلام مطلقاً مفسد صلوٰۃ ہے خواہ قصداً ہو یا سہواً مگر ان کے یہاں اتنی گنجائش بھی ہے کہ نماز میں جو کلام امام یا مقتدی نے نماز کی کسی مصلحت کے پیش نظر صادر ہوا ہو گا وہ مفسد نماز نہیں ہو گا جیسا کہ حدیث مذکورہ میں پیش آمدہ صورت ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کو جب حضرت ابن سیرینؒ لوگوں کے سامنے بیان کر چکے تو ان سے بطریق استفہام اکثر لوگوں نے پوچھا کہ کیا ابوہریرہؓ نے ثم سلم بھی کہا تھا گویا ان لوگوں کے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے سجدہ سہو سلام کے بعد کیا تھا یا پہلے کیا تھا اسکے جواب میں ابن سیرین نے کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں تو یہ الفاظ مجھے یاد نہیں پڑتے، ہاں حضرت عمران ابن حصین نے یہی حدیث مجھ

سے روایت کی ہے ان کی روایت میں ثُمَّ سَلَّمَ کے الفاظ موجود ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سجدہ سہو سلام کے بعد کیا تھا اور میں نے ابوہریرہ ؓ کی روایت میں ثُمَّ سَلَّمَ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ عمران ابن حصین ؓ ہی کی روایت سے اس جگہ لایا ہوں۔

سجدہ سہو سلام پھیر کر کرنا چاہئے یا اس کے بغیر؟

⑤ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُحَيْنَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى بِهِمُ الظُّهْرَ فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْاُولَيَيْنِ لَمْ يَجْلِسْ فَقَامَ النَّاسُ مَعَهٗ حَتّٰى اِذَا قَضَى الصَّلَاةَ وَانْتَظَرَ النَّاسُ تَسْلِيْمَهٗ كَبَّرَ وَهُوَ جَالِسٌ فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يُّسَلِّمَ ثُمَّ سَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن بحینہ ؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) سرور کونین ﷺ نے صحابہ ؓ کو ظہر کی نماز پڑھائی، اور پہلی دو رکعتیں پڑھ کر (پہلے قعدہ میں بیٹھے بغیر تیسری رکعت کے لئے) کھڑے ہوگئے، دوسرے لوگ بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے ہوگئے، یہاں تک کہ جب نماز پڑھ چکے اور (آخری قعدہ میں) لوگ سلام پھیرنے کے منتظر تھے کہ آپ ﷺ نے بیٹھے بیٹھے تکبیر کہی اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کئے اور اس کے بعد سلام پھیرا۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: حضرت امام شافعی ؒ کے مسلک میں اس حدیث کے مطابق سجدہ سہو سلام پھیرنے سے پہلے ہی کیا جاتا ہے لیکن دوسری روایتوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد ہی سجدہ سہو کیا ہے نیز حضرت عمر فاروق ؓ کے بارے میں بھی ثابت ہوا ہے کہ وہ سلام پھیرنے کے بعد ہی سجدہ سہو کیا کرتے تھے لہٰذا حضرت عمر ؓ کا عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

درود و دعا سجدہ سہو سے پہلے پڑھنی چاہئے یا بعد میں

⑥ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى بِهِمْ فَسَهَا فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ تَشَهَّدَ ثُمَّ سَلَّمَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"حضرت عمران بن حصین ؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے (ایک روز) لوگوں کو نماز پڑھائی (درمیان نماز) آپ ﷺ کو سہو ہوگیا، چنانچہ آپ ﷺ نے (سلام پھیر کر) دو سجدے کئے اس کے بعد آپ ﷺ نے التحیات پڑھی اور سلام پھیرا امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: حضرت عمران کا قول فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ کا مطلب یہی ہے کہ آپ ﷺ نے سلام پھیر کر سہو کے دونوں سجدے کئے جیسا کہ تیسری فصل کی پہلی حدیث سے جو انہیں سے مروی ہے بصراحت معلوم ہو جائے گا۔

اس حدیث میں نماز کا وہ رکن ذکر نہیں کیا گیا ہے جس کے بارے میں آنحضرت ﷺ کو سہو ہوگیا اور آپ ﷺ اس کی ادائیگی کو بھول گئے تھے نیز اس حدیث میں سجدہ سہو کے بعد تشہد پڑھنے کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ دوسری روایتوں میں تشہد کا ذکر نہیں ہے۔

حضرت عمران ؓ کی اس روایت کی روشنی میں جو تیسری فصل میں آرہی ہے یہ حدیث حنفیہ کے مسلک کی دلیل ہے کہ پہلے سلام پھیر کر سجدہ سہو کرنا چاہئے۔ اسی طرح امام احمد ؒ کا مسلک بھی یہی ہے بلکہ شوافع و مالکیہ کے بعض حضرات کا بھی یہی مسلک ہے۔

اس مسئلہ میں علماء کے یہاں اختلاف ہے کہ درود و دعا جو التحیات میں پڑھی جاتی ہیں اس تشہد میں پڑھنا چاہئے جو سجدہ سہو سے پہلے ہے یا سجدہ سہو کے بعد کے تشہد میں پڑھنا چاہئے؟ چنانچہ امام کرخی ؒ نے تو یہ اختیار کیا ہے کہ درود و دعا سجدہ سہو کے بعد کے تشہد میں

پڑھے جائیں اور ہدایہ میں بھی اسی کو صحیح کہا گیا ہے۔ البتہ ہدایہ کی بعض شروح میں یہ کہا گیا ہے کہ سجدہ سہو سے پہلے تشہد میں پڑھنا بہتر ہے۔ امام طحاویؒ کا قول یہ ہے کہ دونوں تشہد میں پڑھنا چاہئے۔ شیخ ابن ہمامؒ نے بھی امام طحاویؒ کے قول کی تائید کرتے ہوئے کہا ہے کہ احتیاط اسی میں ہے۔

حنفیہ کا معمول پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ "التحیات پڑھنے کے بعد دائیں طرف سلام پھیرا جائے اس کے بعد سہو کے دو سجدے کئے جائیں اس کے بعد دوبارہ التحیات اور پھر درود دعا پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے۔

(۷) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ ابْنِ شُعْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ الْاِمَامُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ فَاِنْ ذَكَرَ قَبْلَ اَنْ يَسْتَوِيَ قَائِمًا فَلْيَجْلِسْ وَاِنِ اسْتَوٰى قَائِمًا فَلَا يَجْلِسْ وَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جب امام دو رکعت پڑھ کر (پہلے قعدہ میں بیٹھے بغیر تیسری رکعت کے لئے) کھڑا ہو جائے تو اگر سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے اسے یاد آجائے تو اسے چاہئے کہ وہ (قعدہ کے لئے) بیٹھ جائے اور اگر وہ سیدھا کھڑا ہو چکا ہو (اور اس کے بعد اسے یاد آئے) تو وہ (اب) نہ بیٹھے اور (آخری قعدہ میں) سہو کے دو سجدے کرلے۔" (ابوداؤدؒ وابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صورت مذکورہ میں معتبر پوری طرح کھڑا ہونا یا پوری طرح کھڑا نہ ہونا ہے۔ اس سلسلہ میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ ایسا شخص اگر بیٹھنے کے قریب تر ہو جائے تو التحیات پڑھے اور اگر کھڑے ہونے کے قریب تر ہو تو نہ بیٹھے بلکہ اپنی بقیہ دونوں رکعتیں پوری کرلے۔

"قریب تر بیٹھنے" کا مطلب یہ ہے کہ اٹھتے وقت اس کے نیچے کا بدن (مثلاً ٹانگیں وغیرہ) سیدھا نہ ہو جائے، اور اگر نیچے کا بدن سیدھا ہو جائے تو کھڑے ہونے کے قریب تر ہوگا۔

شیخ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اقربیت کے سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ کی بھی ایک روایت ہے جس کو بخاری کے مشائخ نے اختیار کیا ہے مگر جیسا کہ اوپر بتایا گیا صحیح مسلک یہی ہے کہ جب تک پورا کھڑا نہ ہو جائے بیٹھا جا سکتا ہے پورا کھڑا ہو جانے کی صورت میں بیٹھنا نہیں چاہئے، یہی قول صحیح ہے اور اس کی تائید یہ حدیث بھی کرتی ہے۔

اگر کوئی شخص کھڑا ہونے سے پہلے قعدہ کے لئے بیٹھ جائے گا تو اس کے لئے سجدہ سہو کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہاں جو شخص پورا کھڑا ہو جائے گا اور پہلا قعدہ چھوٹ جائے گا تو اس کو سجدہ سہو کرنا ہوگا۔

اس سلسلہ میں اتنی بات اور جان لیجئے، جب کوئی شخص پہلے قعدہ میں بیٹھے بغیر تیسری رکعت کے لئے پوری طرح کھڑا ہو جائے تو اس کو بیٹھنا نہیں چاہئے کیونکہ اگر وہ بیٹھ جائے گا تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۸) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الْعَصْرَ وَسَلَّمَ فِيْ ثَلَاثِ رَكْعَاتٍ ثُمَّ دَخَلَ مَنْزِلَهُ فَقَامَ اِلَيْهِ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ الْخِرْبَاقُ وَكَانَ فِيْ يَدَيْهِ طُوْلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَذَكَرَ لَهُ صَنِيْعَهُ فَخَرَجَ غَضْبَانَ يَجُرُّ رِدَاءَهُ حَتّٰى انْتَهٰى اِلَى النَّاسِ فَقَالَ اَصَدَقَ هٰذَا قَالُوْا نَعَمْ فَصَلّٰى رَكْعَةً ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عمران ابن حصینؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) سرور کونین ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی اور تین رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا اور گھر میں تشریف لے گئے۔ ایک شخص نے کہ جس کا نام خرباق تھا اور اس کے ہاتھ کچھ لمبے تھے (یعنی ذوالیدین) کھڑے ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ" اور انہوں نے (یعنی ذوالیدین) نے واقعہ بیان کیا (یعنی تین رکعت پڑھ کر سلام پھیرنے کے بارے میں ذکر کیا یہ سن کر؛ آنحضرت ﷺ غصہ میں اپنی چادر مبارک کھینچتے ہوئے باہر نکلے اور لوگوں کے پاس (مسجد میں) پہنچے اور فرمایا کہ "کہ کیا ذوالیدین ٹھیک کہہ

رہے ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "جی ہاں" ! چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک رکعت پڑھی، پھر سلام پھیرا اور سہو کے دو سجدے کر کے سلام پھیر دیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ تین رکعت کے بعد سلام پھیر کر گھر تشریف لے گئے اور وہاں سے تشریف لائے، اس عرصہ میں قبلہ کی جانب سے منہ بھی پھرا، گفتگو بھی ہوئی اور بہت زیادہ چلنا ہوا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے از سر نو نماز نہیں پڑھی بلکہ صرف ایک رکعت جو پڑھنے سے رہ گئی تھی پڑھی، لہٰذا یہ افعال سہواً ہونے کے باوجود (بھی حنفیہ کے مسلک میں چونکہ مفسد نماز ہیں اس لئے حنفیہ کی جانب سے اس حدیث کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ نماز میں گفتگو کی طرح یہ بھی منسوخ ہے یعنی یہ افعال و کلام پہلے نماز میں جائز تھے پھر بعد میں منسوخ ہو گئے۔ اور یہ واقعہ جواز کے منسوخ ہونے سے پہلے کا ہے۔

"خرباق" انہیں ذوالیدینؓ کا نام ہے جن کی حدیث اس سے پہلے (نمبر۴) گزر چکی ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ جو اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے اور وہ واقعہ جو حدیث نمبر۴ میں ذکر کیا گیا ہے دونوں ایک ہی ہیں لیکن اس حدیث اور حدیث نمبر۴ میں چونکہ بعض باتوں میں باہم تضاد ہے اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ دنوں ایک ہی واقعہ نہیں ہیں بلکہ الگ الگ واقعے ہیں اور دونوں واقعوں میں آنحضرت ﷺ سے گفتگو کرنے والے حضرت ذوالیدینؓ ہی تھے۔

اس حدیث کے آخری جملوں سے یہ بات بصراحت معلوم ہوگئی کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے سلام پھیرا پھر سجدہ سہو کیا، اس کے بعد سلام پھیر کر نماز پوری کی، چنانچہ علامہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ یہی مسلک امام ابوحنیفہؒ کا ہے کہ ان کے یہاں سلام کے بعد سہو کے دو سجدے زیادتی اور نقصان کے پیش نظر کئے جاتے ہیں اس کے بعد تشہد پڑھا جاتا ہے اور سلام پھیرا جاتا ہے۔

نماز میں کمی کا شک واقع ہو جانے کی صورت میں کیا کیا جائے

(۹) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ صَلّٰى صَلَاةً يَشُكُّ فِي النُّقْصَانِ فَلْيُصَلِّ حَتّٰى يَشُكَّ فِي الزِّيَادَةِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ[1] فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جس شخص کو نماز پڑھتے ہوئے کمی کا شک ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اور پڑھ لے تاکہ زیادتی کا شک ہو جائے۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہی ہے کہ شک واقع ہو جانے کی صورت میں اگر کسی ایک جانب غالب گمان نہ ہو اور شک بھی کمی میں واقع ہو مثلاً چار رکعت والی نماز میں شک ہو جائے کہ نہ معلوم تین پڑھی ہیں یا چار تو ایسے شخص کو چاہئے کہ زیادتی میں شک کرے یعنی کم تعدد کو اختیار کرے جیسے صورت مذکورہ میں تین رکعت کو اختیار کر کے ایک رکعت اور پڑھ لے تاکہ اب کمی کے شک کے بجائے زیادتی کا شک ہو جائے کہ نہ معلوم چار رکعتیں پڑھی ہیں یا پانچ رکعتیں۔

آنحضرت ﷺ سے نماز میں کتنی جگہوں پر سہو ہوا تھا: نماز میں آنحضرت ﷺ سے چند مواقع پر سہو ہوا تھا۔ ایک قعدہ اول میں سہوا ہوا تھا جیسا کہ عبداللہ ابن بحینہؓ کی روایت نمبر۵ میں مذکور ہوا۔ دوسرا سہو آخری دونوں رکعتوں میں ہوا تھا۔ جیسا کہ حضرت ذوالیدینؓ کے واقعہ حدیث نمبر۴ سے معلوم ہوا۔ تیسرا سہو آخری رکعت میں ہوا تھا جیسا کہ خرباقؓ والی حدیث نمبر۸ میں گذرا اور چوتھا سہو آپ ﷺ کو پانچویں رکعت کی زیادتی میں ہوا تھا جیسا کہ عبداللہ ابن مسعودؓ کی حدیث نمبر۳ سے معلوم ہوا۔ لہٰذا علماء مجتہدین نے آنحضرت ﷺ کے عمل پر قیاس کرتے ہوئے یہ کلیہ بنایا کہ اگر نماز میں کسی شخص سے نماز کے واجبات میں سے کسی واجب میں سہو

[1] نام عبدالرحمٰن اور کنیت ابومحمد ہے قریش کی ایک شاخ بنو زہرہ میں پیدا ہوئے جن دس صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی ان میں ایک ہیں۔ غزوہ تبوک میں حضورؐ نے ان کے پیچھے نماز پڑھی ۳۲ھ میں بہتر سال کی عمر میں وفات پائی ۱۲۔

ہو جائے تو اس پر سہو کا سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں جتنی احادیث گزری ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے سہو ہو جانے کی صورت میں بعض موقعوں پر تو سجدہ سہو سلام سے پہلے کیا اور بعض مواقع پر سلام پھیرنے کے بعد کیا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کا عمل چونکہ دونوں طرح تھا اس لئے یہی کہا جائے گا کہ دونوں طریقے جائز ہیں لیکن ائمہ نے اس سلسلہ میں اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق الگ الگ صورت کو مقرر کر دیا ہے۔

سجدہ سہو کے وقت کے بارے میں ائمہ کے مسلک: چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ہر موقع پر سجدہ سہو سلام سے پہلے کرنا چاہئے۔ اس طرح وہ ان احادیث کو کہ جن سے سلام سے پہلے سجدہ سہو کرنا ثابت ہوتا ہے ان احادیث پر کہ جن سے سلام کے بعد سجدہ سہو کرنا ثابت ہوتا ہے ترجیح دیتے ہیں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ تمام مواقع پر سلام پھیر کر سجدہ سہو کرنا چاہئے کیونکہ اس کے ثبوت میں بہت زیادہ صحیح احادیث وارد ہیں۔ نیز یہ کہ ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، احمدؒ، اور عبدالرزاقؒ نے ثوبانؓ کی یہ روایت نقل کی ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ہر سہو کے لئے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے ہیں" لہٰذا جب آنحضرت ﷺ کا عمل متضاد مروی ہے کہ کبھی تو آپ ﷺ نے سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ کیا ہے اور کبھی سلام پھیرنے کے بعد۔ تو ایسی صورت میں امام اعظمؒ نے آنحضرت ﷺ کے قول کو بطور دلیل اختیار کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک قول فعل سے قوی ہے جیسا کہ اصول فقہ میں مذکور ہے۔

حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ جس موقع پر آنحضرت ﷺ نے سلام سے پہلے سجدہ کیا ہے اس موقع پر سلام سے پہلے ہی سجدہ کرنا چاہئے اور جس موقع پر آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ کیا ہے اس موقع پر سلام پھیر کر ہی سجدہ کیا جائے علماء لکھتے ہیں کہ حضرت امام احمدؒ کا یہ قول سب سے قوی اور بہتر ہے۔

اتنی بات سمجھ لینی چاہئے کہ سجدہ سہو کے بارے میں یہ تمام اختلافات کہ سجدہ سلام کے بعد کرنا چاہئے یا پہلے محض فضیلت سے متعلق ہیں یعنی بعض ائمہ کے نزدیک سلام کے بعد سجدہ کرنا زیادہ افضل ہے اور بعض کے نزدیک سلام سے پہلے افضل ہے لیکن جہاں تک جواز کا تعلق ہے تو جیسا کہ ائمہ اربعہ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے اس بات پر سب متفق ہیں کہ جائز دونوں طرح ہے۔ ہدایہ میں لکھا ہے کہ "صحیح تر یہ ہے کہ دونوں طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرنا چاہئے۔

بَابُ سُجُوْدِ الْقُرْاٰنِ

قرآن کے سجدوں کا بیان

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق قرآن مجید میں چودہ آیتیں ایسی ہیں جن کے پڑھنے اور سننے سے خواہ سننا قصداً نہ ہو ایک سجدہ واجب ہوتا ہے۔ ان آیتوں کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔ دیگر ائمہ کے نزدیک سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے بلکہ سنّت ہے۔ سجدہ تلاوت صرف ایک مرتبہ دو تکبیروں کے درمیان (یعنی ایک تکبیر سجدہ میں جاتے وقت اور دوسری تکبیر سجدہ سے اٹھتے وقت) کیا جاتا ہے اس سجدہ کے لئے رفع یدین، تشہد اور سلام کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سجدہ تلاوت صحیح ہونے کی وہی سب شرطیں ہیں جو نماز کے صحیح ہونے کی ہیں یعنی طہارت، ستر کی پردہ پوشی، نیت، اور استقبال قبلہ تحریمہ اس میں شرط نہیں۔ اس کی نیت میں آیت کی تعیین شرط نہیں ہے کہ یہ سجدہ فلاں آیت کے سبب سے ہے۔ اور اگر نماز میں آیت سجدہ پڑھی جائے اور فوراً سجدہ کیا جائے تو نیت بھی شرط نہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

سورۂ نجم کا سجدہ

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَجَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّجْمِ وَسَجَدَ مَعَهُ الْمُسْلِمُوْنَ وَالْمُشْرِكُوْنَ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "سرور کونین ﷺ نے سورۂ نجم میں سجدہ کیا اور آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں جنوں اور سب آدمیوں نے (بھی) سجدہ کیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ سورۂ نجم کی تلاوت کرتے ہوئے آیت سجدہ "فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا" "سجدہ کرو اللہ کا اور عبادت کرو۔" پر پہنچے تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی فرمانبرداری کی غرض سے سجدہ کیا جب آپ ﷺ نے سجدہ کیا تو تمام مسلمانوں نے بھی آپ ﷺ کی متابعت میں سجدہ کیا، اسی طرح مشرکین نے بھی جب اپنے بتوں یعنی لات و منات اور عزیٰ کے نام سنے تو انہوں نے بھی سجدہ کیا، یا پھر مشرکوں کے سجدہ کرنے کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ مکہ میں مسجد الحرام کے اندر جب سورۂ نجم کی ان آیتوں۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى۔

"یعنی: بھلا تم لوگوں نے لات و عزیٰ کو دیکھا اور تیسرے منات کو (کہ یہ بت کہیں خدا ہو سکتے ہیں مشرکو!) کیا تمہارے لئے تو بیٹے ہیں اور خدا کے لئے بیٹیاں۔"

کو پڑھنے لگے تو شیطان ملعون نے اپنی آواز کو آنحضرت ﷺ کی آواز سے مشابہ بنا کر یہ پڑھا

تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔

"یعنی: یہ بت بلند مرغابیاں ہیں اور بیشک ان کی شفاعت امید بخش ہے۔"

مشرکین یہ سمجھے کہ (نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ نے ہمارے بتوں کی تعریف کی ہے اس سے وہ بہت زیادہ خوش ہوئے چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا تو انہوں نے بھی سجدہ کر ڈالا۔"

بعض مفسرین نے اس موقع پر یہ تفسیر کی ہے کہ یہ الفاظ شیطان نے ادا نہیں کئے تھے بلکہ نعوذ باللہ خود آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سہواً نکل گئے تھے۔ یہ قول بالکل غلط اور محض ذہنی اختراع ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ شیطان ملعون نے اپنی آواز کو آنحضرت ﷺ کی آواز سے مشابہ بنا کر یہ الفاظ ادا کر دیئے جس سے مشرکین یہ سمجھ بیٹھے کو خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں۔

حدیث میں "مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور سب آدمیوں" سے مراد وہ ہیں جو آنحضرت ﷺ کے پاس اس وقت موجود تھے۔ لفظ "اِنْس" تعمیم بعد تخصیص ہے۔

سورۂ انشقاق اور سورۂ علق کے سجدے

② وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَجَدْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ وَاِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے سرور کونین ﷺ کے ساتھ (سورۂ انشقاق یعنی إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ اور (سورۂ علق یعنی) اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں سجدہ کیا۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا رد ہوتا ہے کہ مفصل میں سجدہ نہیں ہے

سجدہ تلاوت واجب ہے

③ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ السَّجْدَةَ وَنَحْنُ عِنْدَهُ فَيَسْجُدُ وَنَسْجُدُ مَعَهُ فَنَزْدَحِمُ حَتّٰى مَا يَجِدُ اَحَدُنَا لِجَبْهَتِهِ مَوْضِعًا يَسْجُدُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ سجدہ (کی کوئی آیت) پڑھتے اور ہم آپ ﷺ کے قریب ہوتے تھے تو جب آنحضرت ﷺ سجدہ کرتے ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کرتے اور (اس وقت) ہم لوگوں کا اس قدر اژدحام ہوتا تھا کہ ہم میں سے بعض کو تو اپنی پیشانی ٹیک کر سجدہ کرنے کی جگہ بھی نہیں ملتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سجدہ کی کوئی آیت تلاوت فرماتے تو اس موقع پر آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کرنے کے لئے اتنے زیادہ لوگوں کا ہجوم ہوجاتا تھا کہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے بعض لوگوں کو تو آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کرنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا اور وہ پھر بعد میں سجدہ کرتے تھے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سجدہ تلاوت واجب ہے کیونکہ تلاوت کا سجدہ واجب نہ ہوتا تو لوگ اتنا زیادہ اہتمام، اژدحام کیوں کرتے۔

ایسے موقع پر جب کہ تلاوت کرنے والے کے پاس لوگ بیٹھے ہوں اور اس کی تلاوت سن رہے ہوں تو سجدہ کی کوئی آیت پڑھنے کے بعد سجدہ کرنے کے سلسلے میں سُنّت یہ ہے کہ تلاوت کرنے والا شخص آگے ہوجائے اور تلاوت سننے والے اس کے پیچھے ہو کر صف باندھیں اس طرح سب لوگ سجدہ کرلیں۔ یہ اقتداء صورۃً ہے حقیقۃً اقتداء نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کا سورۂ نجم میں سجدہ نہ کرنا

④ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَرَأْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّجْمِ فَلَمْ يَسْجُدْ فِيْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت زید ابن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ کے سامنے سورۂ نجم تلاوت کی اور آپ ﷺ نے اس میں سجدہ نہیں کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ کی جانب سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر سورۂ نجم میں سجدہ بیان جواز کے لئے نہیں کیا، حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ مفصل میں سجدہ نہیں ہے اس لئے آپ ﷺ نے سجدہ نہیں کیا اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرف سے اس حدیث کی توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقعہ پر سجدہ یا تو اس لئے نہیں کیا کہ اس وقت آپ ﷺ باوضو نہیں تھے، یا یہ کہ وہ وقت کراہت تھا، یا پھر آپ ﷺ نے سجدہ اس لئے ترک کیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ سجدہ تلاوت فرض نہیں ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ سجدہ تلاوت فی الفور واجب نہیں ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس وقت تو سجدہ نہ کیا ہو البتہ بعد میں کسی وقت کرلیا ہو۔ لہٰذا اس سے کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ سورۂ نجم کا سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ گذر چکا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے اور دوسرے لوگوں نے بھی سورۂ نجم کا سجدہ کیا تھا۔

سورۂ صٓ کا سجدہ

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَجْدَةُ صٓ لَيْسَ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُوْدِ وَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْجُدُ فِيْهَا وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ مُجَاهِدٌ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ أَاَسْجُدُ فِيْ صٓ فَقَرَأَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ حَتّٰى اَتٰى فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ فَقَالَ نَبِيُّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّنْ اُمِرَ اَنْ يَقْتَدِيَ بِهِمْ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا "سورہ صٓ کا سجدہ بہت تاکیدی سجدوں میں سے نہیں ہے اور میں نے سرور کونین ﷺ کو اس سورۃ میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت مجاہدؒ نے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ "کیا میں سورہ صٓ میں سجدہ کروں" حضرت ابن عباسؓ نے آیت وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ سے فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ پڑھی اور فرمایا "تمہارے نبی ﷺ بھی انہی لوگوں میں سے ہیں جنہیں پہلے نبیوں کی اتباع کا حکم تھا۔" (بخاریؒ)

تشریح: لَيْسَ مِنْ عَزَآئِمِ السُّجُوْدِ (بہت تاکیدی سجدوں میں سے نہیں) کا مطلب فقہ حنفی کی رو سے یہ ہے کہ یہ سجدہ فرائض میں سے نہیں ہے بلکہ واجبات تلاوت میں سے ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ سورۂ صٓ میں آنحضرت ﷺ کا سجدہ کرنا حضرت داؤد علیہ السلام کی موافقت اور ان کی توبہ کی قبولیت کے شکر کے طور پر تھا۔

حضرت ابن عباسؓ نے حضرت مجاہدؒ کے سوال کے جواب میں پہلے آیت پڑھی جس سے اس بات کی دلیل دینا مقصود تھا کہ آنحضرت ﷺ ان لوگوں میں سے ہیں کہ جنہیں سابقہ انبیاء کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا حضرت ابن عباسؓ کے جواب کے مطلب یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو ان کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے تو تمہیں بطریق اولیٰ ان کی پیروی کرنی چاہئے یعنی جب حضرت داؤد علیہ السلام نے سجدہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے بھی ان کی موافقت وپیروی میں سجدہ کیا تو ہم کو چاہئے کہ ہم بھی سجدہ کریں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

قرآن میں کل کتنے سجدے ہیں؟

⑥ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ اَقْرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسَ عَشْرَةَ سَجْدَةً فِي الْقُرْاٰنِ مِنْهَا ثَلَاثٌ فِي الْمُفَصَّلِ وَفِيْ سُوْرَةِ الْحَجِّ سَجْدَتَيْنِ۔ (رواه ابوداؤد و ابن ماجة)

"حضرت عمرو ابن العاصؓ کہتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے انہیں (یعنی عمرو ابن العاص کو) قرآن میں پندرہ سجدے پڑھائے ان میں سے تین تو مفصل (سورتوں میں ہیں اور دو سجدے سورہ حج میں ہیں۔" (ابو داؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں لفظ اقراء کے بجائے لفظ اقرانی ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں ان کے سامنے پڑھوں۔ اس حدیث کے مطابق قرآن کریم کی پندرہ آیتیں ایسی ہیں جن کے پڑھنے اور سننے سے ایک سجدہ واجب ہوتا ہے۔ آیتوں کی تفصیل یہ ہے:

① سورہ اعراف کے آخر میں یہ آیت:

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ۔

"بیشک[1] جو لوگ (یعنی فرشتے) تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے غرور اور انکار نہیں کرتے اور اس کا سجدہ کرتے ہیں۔"

۲ سورۂ رعد کے دوسرے رکوع میں یہ آیت:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔

"وہ تمام[2] چیزیں جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہیں خوشی سے، کوئی ناخوشی سے اور ان کے سایہ صبح و شام۔"

۳ سورۂ نحل کے پانچویں رکوع کے آخر کی یہ آیت:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ. يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔

"اور تمام[3] جاندار جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب خدا کے آگے سجدہ کرتے ہیں اور فرشتے بھی، اور وہ ذرا بھی غرور نہیں کرتے اور اپنے پروردگار سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے ہیں نیز انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔"

۴ سورۂ بنی اسرائیل کے بارھویں رکوع میں یہ آیت:

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا۔

"اور وہ[4] منہ کے بل گر پڑتے ہیں (اور) روتے جاتے ہیں اور اس سے ان کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے (یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو آنحضرت ﷺ سے پہلے ایماندار لوگ تھے)۔"

۵ سورۂ مریم کے چوتھے رکوع میں یہ آیت:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا۔

"جب[5] پڑھی جاتی ہیں ان پر رحمٰن کی آیتیں تو گرتے ہیں وہ سجدہ کرنے کے لئے روتے ہوئے (یہ انبیاء اور ان کے اصحاب کا حال بیان کیا گیا ہے)۔"

۶ سورۂ حج کے دوسرے رکوع میں یہ آیت:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ط اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۔

"کیا تم[6] نے نہیں دیکھا کہ جو (مخلوق) آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے آدمی ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا ہے اور جس شخص کو خدا ذلیل کرے اس کو کوئی

---

[1] اس آیت میں وله یسجدون پر سجدہ ہے۔
[2] اس آیت میں بالغدو و الاصال پر سجدہ ہے۔
[3] اس آیت میں ویفعلون مایؤمرون پر سجدہ ہے۔
[4] اس آیت میں ویزیدهم خشوعا پر سجدہ ہے۔
[5] اس آیت میں سجّدا وبکیا پر سجدہ ہے۔
[6] اس آیت میں یسجد له پر سجدہ ہے مگر پوری آیت پڑھنے کے بعد سجدہ ہے۔

عزت دینے والا نہیں، بے شک خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

❼ سورۂ حج کے آخری رکوع کی یہ آیت:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

"اے[1] ایمان والو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تاکہ فلاح پاؤ۔"

❽ سورۂ فرقان کے پانچویں رکوع کی یہ آیت:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا۔

"اور جب[2] ان (عرب کے کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمٰن کا تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے۔ کیا ہم سجدہ کرلیں اس کو جس کو تم کہتے ہو اور ہم کو نفرت بڑھتی ہے۔"

❾ سورۂ نمل کے دوسرے رکوع میں یہ آیت:

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔

"اور[3] نہیں سمجھتے کہ خدا کو جو آسمانوں اور زمین میں چھپی چیزوں کو نکالتا ہے اور تمہارے پوشیدہ و ظاہر اعمال کو جانتا ہے کیوں سجدہ نہ کریں؟ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔"

❿ سورۂ الم تنزیل السجدہ کے دوسرے رکوع میں یہ آیت:

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۔

"ہماری آیتوں[4] پر وہی لوگ ایمان رکھتے ہیں کہ جب انہیں وہ آیتیں یاد دلائی جائیں تو سجدہ کرنے کے لئے گر جائیں اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کریں اور یہ لوگ غرور نہیں کرتے۔"

⓫ سورۂ صٓ کے دوسرے رکوع میں یہ آیت:

وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ۔

"اور[5] (داؤد علیہ السلام) گر پڑے سجدہ کے لئے اور توبہ کی۔ پس ہم نے ان کو بخش دیا اور بے شک ہمارے یہاں ان کا تقرب ہے اور عمدہ مقام ہے۔"

⓬ سورۂ حم سجدہ کے پانچویں رکوع میں یہ آیت:

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ۔

---

[1] اس آیت میں لعلکم تفلحون پر سجدہ ہے۔
[2] اس آیت میں وزادھم نفورا پر سجدہ ہے۔
[3] اس آیت میں حضرت سلیمان کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور یہاں رب العرش العظیم اور بعض کے نزدیک لعلکم تغلبون پر سجدہ ہے۔
[4] اس آیت میں لا یسکتبرون پر سجدہ ہے۔
[5] اس آیت میں وحسن ماب پر سجدہ ہے۔

"اگر یہ لوگ سرکشی کریں تو (خدا کو بھی ان کی پرواہ نہیں) جو (فرشتے) تمہارے پروردگار کے پاس ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور کبھی تھکتے ہی نہیں۔"

⑬ سورہ نجم کے آخر میں یہ آیت:

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا۔

"سجدہ[2] کرو اللہ کا اور عبادت کرو۔"

⑭ سورۂ انشقت میں یہ آیت:

فَمَالَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ۔

"تو ان[3] لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔"

⑮ سورۂ اقرأ میں یہ آیت:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔

"(اے محمد!) سجدہ[4] کیجئے اور اللہ سے نزدیک ہو جائیے۔"

ائمہ کے ہاں سجدوں کی تعداد: ائمہ کے یہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ قرآن کریم میں کل کتنی آیتیں ایسی ہیں جن کے پڑھنے یا سننے سے ایک سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتا ہے۔ حضرت امام احمدؒ نے اس حدیث کے مطابق کہا ہے کہ ایسی آیتیں پندرہ ہیں جن کی تفصیل اوپر کی گئی چنانچہ انہوں نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کیا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے یہاں آیت سجدہ کی تعداد چودہ ہے۔ اس طرح کہ سورۂ حج میں تو دو سجدے ہیں اور سورۂ ص میں کوئی سجدہ نہیں ہے۔

حضرت امام مالکؒ کے یہاں آیت سجدہ کی تعداد گیارہ ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ سورۂ ص، سورۂ نجم، سورۂ انشقت اور سورۂ اقرا میں سجدہ نہیں ہے حضرت امام شافعیؒ کا قول قدیم بھی یہی ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کل سجدوں کی تعداد چودہ ہے اس طرح کہ سورۂ حج میں دو سجدے نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سجدہ ہے جو دوسرے رکوع میں ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ حضرت عمرو ابن العاص کی یہ حدیث جس سے سجدوں کی تعداد پندرہ ثابت ہوتی ہے ضعیف ہے اور اس کو دلیل بنانا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس کے بعض راوی مجہول ہیں۔

نماز میں بھی سجدۂ تلاوت کرنا چاہئے: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نماز فرض اور نماز نفل میں اگر کوئی آیت سجدہ کی قرأت کی جائے تو نماز ہی میں سجدہ کیا جائے یعنی جو سجدۂ تلاوت نماز میں واجب ہوا سے خارج نماز میں ادا نہ کیا جائے۔ آیت سجدہ اگر فرض نماز میں پڑھی جائے تو اس کے سجدہ میں نماز کے سجدہ کی طرح سبحان ربی الاعلی کہنا ہی بہتر ہے اور اگر نفل نماز میں یا خارج نماز میں پڑھی جائے تو اس کے سجدہ میں اختیار ہے کہ سبحان ربی الاعلی کہا جائے یا اور تسبیحیں جو احادیث میں وارد ہوئی پڑھی جائیں مثلاً یہ تسبیح:

---

[1] اس آیت میں لا یسئمون پر سجدہ ہے یا تعبدون پر ہے۔
[2] اس آیت میں واعبدوا پر سجدہ ہے۔
[3] اس آیت میں لا یسجدون پر سجدہ ہے۔
[4] اس آیت میں واقترب پر سجدہ ہے۔

سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

"میرے منہ نے اس ذات کا سجدہ کیا جس نے اس کو پیدا کیا جس نے اسی کو بنایا اور اس میں کان و آنکھ پیدا کیں اپنی طاقت اور قوت سے پس بزرگ ہے اللہ اچھا پیدا کرنے والا ہے۔"

نماز میں آخر سورۃ میں سجدہ کی آیت آجانے کا مسئلہ: بعض علماء کا یہ قول ہے کہ نماز میں سجدہ کی جو آیت آخر سورۃ میں آجائے تو رکوع کرنا ہی سجدہ کے لئے کافی ہو جاتا ہے یعنی رکوع کرنے میں سجدۂ تلاوت بھی ادا ہو جاتا ہے۔ یہ قول حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا ہے اور یہی مسلک حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ کی تفصیل اس طرح مذکور ہے کہ اگر آیت سجدہ نماز میں پڑھی جائے اور فوراً رکوع کیا جائے یا آیت سجدہ کے بعد دو تین آیتیں پڑھ کر رکوع کر لیا جائے اور اس رکوع میں جھکتے وقت سجدۂ تلاوت کی بھی نیت کر لی جائے تو سجدہ ادا ہو جائے گا اور اگر اسی طرح آیت سجدہ پڑھنے کے بعد نماز کا سجدہ کیا تب بھی سجدہ ادا ہو جائے گا اور اس میں نیت کی بھی ضرورت نہ ہوگی مگر شرط یہی ہے کہ ہر دو صورت میں آیت سجدہ کے بعد تین آیتوں سے زیادہ قرأت نہ کی گئی ہو کیونکہ تین آیتوں کے پڑھنے میں تو اختلاف بھی ہے مگر یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ تین سے زیادہ آیتیں پڑھنے کی صورت میں نماز کے رکوع یا سجود میں سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوگا بلکہ الگ سے سجدۂ تلاوت کرنا ضروری ہوگا۔

دو سجدوں کی وجہ سے سورۂ حج کی فضیلت

(۷) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فُضِّلَتْ سُوْرَةُ الْحَجِّ بِاَنَّ فِيْهَا سَجْدَتَيْنِ قَالَ نَعَمْ وَمَنْ لَمْ يَسْجُدْهُمَا فَلَا يَقْرَأْهُمَا رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَيْسَ اِسْنَادُهُ بِالْقَوِيِّ وَفِي الْمَصَابِيْحِ فَلَا يَقْرَأْهَا كَمَا فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔ (رواہ ابوداؤد، والترمذی)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! سورۂ حج کو اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! جو شخص دونوں سجدے نہ کرے تو وہ ان دونوں سجدوں کی آیتوں کو نہ پڑھے۔" (ابوداؤد" ترمذی") امام ترمذی" فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے اور مصابیح میں مثل شرح السنۃ کے فلا یقراھما (تو وہ دونوں سجدوں کی آیتوں کو نہ پڑھے) کے بجائے فَلَا يَقْرَأْهَا (تو وہ اس سورۃ کو نہ پڑھے) کے الفاظ ہیں۔

تشریح: آنحضرت ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص سجدے کی ان دونوں آیتوں کو نہ پڑھے تو اسے وہ آیتیں ہی نہ پڑھنی چاہیں تاکہ وہ ترک واجب کا گنہگار نہ ہو یعنی قرآن کریم پڑھنے والے کے حق میں سجدہ کی آیت کی تلاوت کی وجہ سے ایک سجدہ مشروع ہوا ہے اور سجدۂ تلاوت کرنا تلاوت کے حقوق میں سے ہے لہٰذا اگر کوئی شخص سجدۂ تلاوت کو ترک کرنے کے درپے ہو تو اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ ان آیتوں ہی کو نہ پڑھے جن کی وجہ سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے کیونکہ سجدہ واجب ہے اور اس کو چھوڑنے والا گنہگار ہوتا ہے اس لئے ترک سجدہ سے ترک تلاوت اولیٰ ہے۔

مشکوٰۃ کے ایک دوسرے صحیح نسخہ میں بجائے فَلَا يَقْرَأْهُمَا کے فَلَمْ يَقْرَأْهَا کے الفاظ ہیں اس طرح آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے معنی یہ ہوں گے کہ جس نے وہ دونوں سجدے نہ کئے گویا اس نے انہیں پڑھا ہی نہیں یعنی جب اس نے اس آیت کے تقاضا پر عمل نہ کیا تو اس کا پڑھنا نہ پڑھنا دونوں برابر ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سورۂ حج کا دوسرا سجدہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ" کے نزدیک واجب نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ وہ سجدہ نماز کا ہے کیونکہ وہاں لفظ "ارکعوا" کا مذکور ہونا اس بات کا قرینہ ہے۔

امام ترمذیؒ نے آخر میں ھٰذَا حَدِیْثٌ لَیْسَ اِسْنَادُہٗ بِالْقَوِی کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

سورۂ الٓمّ تنزیل السجدہ کا سجدہ

⑧ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَجَدَ فِیْ صَلٰوۃِ الظُّھْرِ ثُمَّ قَامَ فَرَکَعَ فَرَأَوْا اَنَّہٗ قَرَأَ تَنْزِیْلَ السَّجْدَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز سرور کونین ﷺ نے ظہر کی نماز میں سجدہ کیا اور کھڑے ہوئے پھر رکوع کیا اور لوگوں کو یہ گمان تھا کہ آنحضرت ﷺ نے سورۂ آلم تنزیل السجدہ پڑھی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: صحابہؓ نے محض سجدے سے معلوم نہیں کیا تھا کہ آپ ﷺ نے سورہ آلم تنزیل السجدہ پڑھی ہے بلکہ سورت کی ایک آیت آنحضرت ﷺ سے سنی ہوگی اس سے انہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ آپ ﷺ یہ سورہ پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ (آہستہ آواز سے پڑھی جانے والی نمازوں میں) کبھی کبھی ایک آیت باآواز بلند بھی پڑھ دیا کرتے تھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں سورۃ کی قرأت ہو رہی ہے یا یہ کہ انتہائی شوق اور حضور قلب کی وجہ سے بے اختیار آپ ﷺ کی لسان مقدس سے کوئی آیت باآواز بلند جاری ہو جاتی تھی۔

بظاہر اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے آیت سجدہ پڑھ کر جب سجدہ کیا اور سجدہ سے اٹھے تو بقیہ سورۃ پوری نہیں کی بلکہ رکوع میں چلے گئے چنانچہ یہ جائز ہے اگرچہ افضل یہی ہے کہ سجدے سے اٹھ کر بقیہ سورۂ پوری کی جائے اس کے بعد رکوع کیا جائے لہٰذا یہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا بیان جواز کی خاطر کیا ہو باوجودیکہ نص سے بصراحت تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ نے بقیہ سورہ پوری نہیں کی اور رکوع میں چلے گئے تاہم بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے محض رکوع پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مستقلاً سجدہ کیا جیسا کہ حنفیہ کے یہاں ایسی صورت میں رکوع ہی میں سجدہ ادا ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ افضل اور اولیٰ چونکہ سجدہ کر لینا ہی ہے اس لئے آپ ﷺ نے افضل طریقہ کو اختیار فرمایا۔

سجدۂ تلاوت قاری اور سامع دونوں پر واجب ہوتا ہے

⑨ وَعَنْہُ اَنَّہٗ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقْرَأُ عَلَیْنَا الْقُرْاٰنَ فَاِذَا مَرَّ بِالسَّجْدَۃِ کَبَّرَ وَسَجَدْنَا مَعَہٗ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ ہمارے سامنے قرآن کریم پڑھتے اور جب آیت سجدہ کی کسی آیت پر پہنچتے تو تکبیر کہتے اور سجدہ کرتے اور ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کرتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے یہ بات بصراحت معلوم ہوگئی کہ سجدۂ تلاوت قاری (یعنی قرآن کریم پڑھنے والے) اور سامع (یعنی تلاوت سننے والے) دونوں پر واجب ہے۔

صرف سجدہ کے وقت تکبیر کہنی چاہئے: یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ سجدۂ تلاوت کے لئے تکبیر صرف سجدہ میں جاتے وقت کہنی چاہئے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا اسی پر عمل ہے۔

البتہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک یہ مسئلہ ہے کہ جب کوئی شخص سجدۂ تلاوت کرے تو اسے پہلے ہاتھ اٹھا کر تکبیر تحریمہ کہنی چاہئے اس کے بعد سجدہ کے لئے دوسری تکبیر کہے حضرت عائشہؓ کی ایک روایت کی روشنی میں یہ ثابت ہے کہ سجدۂ تلاوت کے وقت پہلے کھڑے ہونا اور اس کے بعد سجدہ میں جانا مستحب ہے۔

(۱۰) وَعَنْهُ اَنَّهُ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ عَامَ الْفَتْحِ سَجْدَةً فَسَجَدَ النَّاسُ كُلُّهُمْ مِنْهُمُ الرَّاكِبُ وَالسَّاجِدُ عَلَى الْاَرْضِ حَتّٰى اَنَّ الرَّاكِبَ لَيَسْجُدُ عَلٰى يَدِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فتح مکہ کے سال (کوئی) آیت سجدہ پڑھی چنانچہ تمام لوگوں نے (آنحضرت ﷺ کے ساتھ) سجدۂ تلاوت کیا سجدہ کرنے والوں میں بعض تو سواریوں پر تھے اور بعض زمین پر تھے سواریوں والے اپنے ہاتھ ہی پر سجدہ کرتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے یا تو آیت سجدہ کے ساتھ کچھ اور آیتیں بھی ملا کر پڑھی ہوں گی یا پھر محض آیت سجدہ بیان جواز کے لئے پڑھی ہوگی، کیونکہ حنفیہ کے مسلک کے مطابق صرف آیت سجدہ کی تلاوت کرنا خلاف استحباب ہے۔

"سواریوں والے اپنے ہاتھ ہی پر سجدہ کرتے تھے" کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی سواریوں مثلاً گھوڑے وغیرہ پر بیٹھے ہوئے تھے وہ اپنے ہاتھوں کو زین وغیرہ پر رکھ کر ان پر سجدہ کرتے تھے اس طرح انہیں حالت سجدہ میں زمین کی سی سختی حاصل ہو جاتی تھی۔

حضرت ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص گردن جھکا کر اپنے ہاتھوں پر سجدہ کرے تو اس کا سجدہ جائز ہو جائے گا اور یہی قول حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ہے البتہ حضرت امام شافعیؒ کا یہ قول نہیں ہے۔

ابن ملکؒ نے حضرت امام اعظمؒ کا جو یہ قول ذکر کیا ہے یہ ان کے مسلک میں غیر مشہور ہے چنانچہ شرح منیہ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ہجوم و اژدہام کی وجہ سے اپنی ران پر سجدہ کرلے تو جائز ہوگا اسی طرح ران کے علاوہ کسی دوسرے عضو پر بھی سجدہ کرنا جائز ہے جب کہ اسے کوئی ایسا عذر پیش ہو جو سجدہ کرنے سے مانع ہو، بغیر عذر ایسا کرنا جائز نہ ہوگا نیز اگر کوئی شخص اپنا ہاتھ زمین پر رکھ کر اس پر سجدہ کرلے تو اگرچہ اسے کوئی عذر نہ ہو یہ جائز ہے مگر مکروہ ہوگا۔

ابن ہمام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو سجدہ کی کوئی آیت پڑھے اور سجدہ کرنے پر قادر نہ ہو تو اسے سجدہ کا اشارہ کرلینا کافی ہوگا۔

آنحضرت کا مفصل سورتوں میں سجدہ نہ کرنا

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَسْجُدْ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الْمُفَصَّلِ مُنْذُ تَحَوَّلَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ مدینہ تشریف لانے کے بعد مفصل سورتوں میں سے کسی سورۃ میں سجدہ نہیں کیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: حضرت ابن عباسؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ تشریف لانے سے پہلے مکہ میں تو مفصل سورتوں میں سجدۂ تلاوت کیا اور ان کے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی کیا مگر جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے تو یہاں مفصل سورتوں میں سجدۂ تلاوت نہیں کیا۔

ابوہریرہؓ کی حدیث سے تعارض: اس حدیث سے تو بصراحت یہ بات معلوم ہوئی کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں مفصل سورتوں میں سجدۂ تلاوت نہیں کیا حالانکہ اس سے پہلے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت نمبر ایک گزر چکی ہے کہ جس میں ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ اور اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ میں سجدہ کیا ہے لہٰذا اب جب کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض پیدا ہو گیا تو ان میں سے کسی ایک کو راجح قرار دینا ہوگا اور راجح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہوگی کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ مدینہ میں سات ہجری میں اسلام لائے اور ظاہر ہے کہ ان کی روایت کا تعلق مدینہ ہی سے ہے اور فنی طور پر بھی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت صحیح تر ہے پھر یہ کہ ان کے علاوہ بہت زیادہ صحابہؓ کی روایت ہے کہ مفصل سورتوں میں سجدہ ہے نیز اصول ہے کہ مثبت پہلو منفی پہلو پر فوقیت رکھتا

ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے منفی پہلو ثابت ہوتا ہے جب کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت مثبت پہلو کو ظاہر کر رہی ہے۔

لہٰذا حاصل یہ نکلا کہ مفصّل سورتوں میں آنحضرت ﷺ کا سجدہ کرنا ثابت ہے اس لئے ان سورتوں میں سجدہ کی جو آیتیں ہیں ان کی تلاوت یا سماعت پر سجدہ کرنا چاہئے۔

مفصّل چھوٹی سورتوں کو کہتے ہیں کہ وہ سورہ حجرات سے آخر تک ہیں۔

سجدۂ تلاوت کی تسبیح

(۱۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ سُجُوْدِ الْقُرْآنِ بِاللَّيْلِ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ رات کو قرآن کے سجدوں میں یہ تسبیح پڑھتے تھے۔ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ میرے منہ نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اپنی قوت وقدرت سے کان اور آنکھیں بنائیں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) اور حضرت امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ "حدیث حسن صحیح ہے۔""

تشریح: رات کی قید اتفاقی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ سے یہ تسبیح رات ہی میں سنی ہوگی چنانچہ اسی کو بیان کیا ورنہ تو رات یا دن کی قید کے بغیر مطلقاً طور پر بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ یہ تسبیح سجدۂ تلاوت میں پڑھتے تھے نیز بعض روایت میں یہ تسبیح بھی منقول ہے۔

رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ۔

"میرے پروردگار میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا مجھے بخش دے۔"

حنفیہ کا صحیح مسلک یہ ہے سجدۂ تلاوت میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنا کافی ہے جیسا کہ نماز کے سجدوں میں پڑھتے ہیں لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ سجدۂ تلاوت کے جو تسبیحیں ثابت ہوئی ہیں ان کا پڑھنا اولیٰ ہے۔

(۱۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَاَيْتُنِي اللَّيْلَةَ وَاَنَا نَائِمٌ كَاَنِّيْ اُصَلِّيْ خَلْفَ شَجَرَةٍ فَسَجَدْتُ فَسَجَدَتِ الشَّجَرَةُ لِسُجُوْدِيْ فَسَمِعْتُهَا تَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْرًا وَضَعْ عَنِّيْ بِهَا وِزْرًا وَاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْرًا وَتَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَرَاَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَجْدَةً ثُمَّ سَجَدَ فَسَمِعْتُهُ وَهُوَ يَقُوْلُ مِثْلَ مَا اَخْبَرَهُ الرَّجُلُ عَنْ قَوْلِ الشَّجَرَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ وَتَقَبَّلْهَا كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔ (ترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز ایک شخص سرور کونین ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے آج رات خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ گویا ایک درخت کے نیچے میں نماز پڑھ رہا ہوں اور یہ بھی دیکھا کہ جب میں نے سجدۂ تلاوت کیا تو اس درخت نے بھی میرے ساتھ سجدے کے وقت سجدہ کیا تو میں نے یہ سنا کہ وہ درخت یہ دعا پڑھتا تھا۔ اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْرًا وَضَعْ عَنِّيْ بِهَا وِزْرًا وَاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْرًا وَتَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ اے اللہ! میرے لئے اس سجدے کا ثواب اپنے پاس رکھ اور اس کی وجہ سے میرے گناہ معاف فرما اور اس سجدے کو میرے واسطے ذخیرہ بنا کر اپنے پاس رکھ اور میرے اس سجدہ کو ایسا قبول کر جیسا اپنے بندے داؤد سے قبول کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ دعا پڑھنے کی غرض سے اسی مجلس میں یا بعد میں سجدہ کی آیت پڑھ کر سجدۂ تلاوت کیا اور میں نے آپ ﷺ کو (دعا کے) وہی کلمات کہتے ہوئے

سنے جو اس آدمی نے درخت سے نقل کئے تھے یعنی آپ ﷺ نے وہی دعا پڑھی۔" (ترمذی)

اس روایت کو ابن ماجہؒ نے بھی نقل کیا ہے مگر ان کی روایت میں وَّتَقَبَّلْهَا مِنِّي كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ کے الفاظ نہیں ہیں نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے سورۂ صٓ کے سجدہ کی آیت پڑھی ہوگی اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں ہے کہ آپ ﷺ نے بھی یا تو سورۂ صٓ ہی کے سجدہ کی آیت پڑھی ہوگی یا پھر سورۂ سجدہ کی تلاوت کی ہوگی۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سورۂ والنجم کا سجدہ

⑭ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ وَالنَّجْمِ فَسَجَدَ فِيْهَا وَسَجَدَ مَنْ كَانَ مَعَهُ غَيْرَ اَنَّ شَيْخًا مِنْ قُرَيْشٍ اَخَذَ كَفًّا مِنْ حَصًى اَوْتُرَابٍ فَرَفَعَهُ اِلٰى جَبْهَتِهِ وَقَالَ يَكْفِيْنِيْ هٰذَا قَالَ عَبْدُاللّٰهِ فَلَقَدْ رَاَيْتُهُ بَعْدُ قُتِلَ كَافِرًا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ الْبُخَارِيُّ فِيْ رِوَايَةٍ وَهُوَ اُمَيَّةُ بْنُ خَلَفٍ۔

"حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے ایک روز سورۂ والنجم کی تلاوت فرمائی اور اس میں سجدہ کیا آپ ﷺ کے پاس جو لوگ تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا۔ مگر قریش کے ایک بوڑھے نے کنکریاں یا مٹی کی ایک مٹھی لے کر اپنی پیشانی پر لگالی اور بولا کہ میرے لئے یہی کافی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اس واقعہ کے بعد دیکھا کہ وہ شخص کفر کی حالت میں مارا گیا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ) اور بخاریؒ نے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "وہ بوڑھا امیہ بن خلف تھا۔"

تشریح: یہ واقعہ فتح مکہ سے پہلے کا ہے امیہ بن خلف قریش کا ایک معزز سردار اور ذی اثر فرد تھا اسلام اور آنحضرت ﷺ کے خلاف کی جانے والی تمام سازشوں میں اس کا پارٹ بڑا اہم ہوتا تھا اسے اپنی بڑائی پر بڑا ناز تھا، چنانچہ اس موقع پر جب کہ آنحضرت ﷺ کے ہمراہ مجلس میں موجود تمام ہی اشخاص نے کیا مسلمان اور کیا کفار جب آنحضرت ﷺ کے ہمراہ سجدہ کیا تو اس شخص نے ازراہ غرور و تکبر سجدہ نہیں کیا بلکہ یہ حرکت کی کہ کنکری یا مٹی کی ایک مٹھی لے کر اسے پیشانی سے لگالیا۔

سورۂ صٓ کا سجدہ

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَجَدَ فِيْ صٓ وَقَالَ سَجَدَهَا دَاوُدُ تَوْبَةً وَنَسْجُدُهَا شُكْرًا۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے سورۂ صٓ میں سجدہ کیا اور فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے سورۂ صٓ کا یہ سجدہ توبہ کی قبولیت کے لئے کیا تھا (جس کی تفصیل سورۂ صٓ میں مذکور ہے) اور ہم یہ سجدہ (ان کی قبولیت پر) شکر گزاری کے لئے کرتے ہیں۔" (نسائیؒ)

بَابُ اَوْقَاتِ النَّهْيِ

ان اوقات کا بیان جن میں نماز پڑھنا ممنوع ہے

اس باب کے تحت وہ احادیث نقل کی جائیں گی جو اوقات نہی کو ظاہر کرتی ہیں یعنی جن اوقات میں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ لہٰذا یہ باب

ان تینوں اوقات کو شامل ہے جن میں نماز حرام ہے جیسے طلوع آفتاب کا وقت، غروب آفتاب کا وقت اور استواء کا وقت یعنی نصف النہار کا وقت اور ان اوقات کو بھی شامل ہے جیسے فجر[1] اور عصر کی نماز کے بعد کا وقت۔

حنفیہ کے مسلک میں یہ نہی فرض اور نفل دونوں کو شامل ہے چنانچہ پہلے تینوں اوقات یعنی طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور استواء کے وقت نماز جائز نہیں ہے خواہ ادا ہو یا قضا البتہ اسی دن کے عصر کی نماز جائز ہے اسی طرح نہ جنازہ کی نماز جائز ہے اور نہ تلاوت کا سجدہ جائز ہے ہاں اس جنازہ کی نماز جائز ہوگی جو انہیں اوقات میں لایا گیا ہو اسی طرح وہ سجدہ تلاوت جائز ہوگا جب آیت سجدہ انہیں اوقات میں پڑھی گئی ہو۔ تاہم ان اوقات سے مؤخر کرنا اولیٰ ہوگا۔

نماز جنازہ سجدہ تلاوت اور قضا نماز فجر کے پورے وقت میں اور عصر کی نماز کے بعد بھی جائز ہے نفل نماز ان اوقات میں بھی مکروہ ہے اگر کوئی شخص ان اوقات میں نفل نماز شروع کر دے گا وہ لازم ہو جائے گی یعنی اس وقت سے اسے نماز توڑ دینی چاہئے اور پھر وقت مکروہ کے نکل جانے کے بعد اس کی قضا پڑھنی چاہئے اور اگر کوئی شخص نماز توڑے نہیں بلکہ اسی وقت پوری کرے تو وہ اس سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے مگر نماز توڑ دینا ہی افضل ہے۔

حضرت امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک ان اوقات میں قضا نماز اور اس جنازہ کی نماز جو اسی وقت لایا گیا ہو جائز ہے نیز تحیۃ المسجد کی نماز پڑھنی بھی جائز ہے اگر اتفاق سے مسجد میں داخل ہو جائے اور اگر کوئی شخص قصداً تحیۃ المسجد کی نماز پڑھنے کی خاطر مسجد میں ان اوقات میں آئے یا قضا نماز میں تاخیر اس مقصد سے کرے کہ انہیں اوقات میں پڑھے تو اس صورت میں جائز نہیں کیونکہ ان اوقات میں قصداً یہ نمازیں پڑھنا حدیث کے بموجب ممنوع ہے اسی طرح ان کے نزدیک ان اوقات میں کسوف کی نماز وضو کے بعد کی دو رکعت نماز اور احرام و طواف کی دو رکعت نماز نیز سجدہ تلاوت جس کی آیت انہیں اوقات میں پڑھی جائے جائز ہے۔

ان اوقات میں نماز پڑھنے کی کراہت حنفیہ کے نزدیک ہر زمانہ اور ہر جگہ ہے لیکن حضرت امام شافعی اور ان علماء کے نزدیک جو حضرت امام شافعی کے ساتھ ہیں جمعہ کے روز استواء یعنی نصف النہار کے وقت نماز جائز ہے نیز ان اوقات میں مکہ معظمہ میں بھی نماز جائز ہے۔

اتنی بات سمجھ لیجئے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک اس سلسلہ میں احوط (یعنی احتیاط پسندی پر مبنی) ہے کیونکہ جب کسی چیز کے بارے میں مباح اور حرام دونوں کے دلائل متعارض ہوں تو حرمت کے پہلو کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

طلوع و غروب آفتاب کے وقت نماز نہیں پڑھنی چاہئے

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَحَرّٰى اَحَدُكُمْ فَيُصَلِّيْ عِنْدَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَلَا عِنْدَ غُرُوْبِهَا وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ اِذَا طَلَعَ حَاجِبُ الشَّمْسِ فَدَعُوا الصَّلَاةَ حَتّٰى تَبْرُزَ فَاِذَا غَابَ حَاجِبُ الشَّمْسِ فَدَعُوا الصَّلٰوةَ حَتّٰى تَغِيْبَ وَلَا تَحَيَّنُوْا بِصَلٰوتِكُمْ طُلُوْعَ الشَّمْسِ وَلَا غُرُوْبَهَا فَاِنَّهَا تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطٰنِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص آفتاب کے نکلنے اور ڈوبنے کے وقت نماز پڑھنے کا قصد نہ کرے۔ ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب سورج کا کنارہ نکل آئے تو نماز چھوڑ دو یہاں تک کہ سورج خوب

---

[1] طلوع صبح صادق سے طلوع آفتاب تک فجر کے پورے وقت میں فجر کی دو سنتوں کے علاوہ دوسرے نوافل مکروہ ہیں البتہ فرض و واجب کی قضا پڑھی جا سکتی ہے مگر عصر کا پورا وقت مکروہ نہیں بلکہ فرض نماز کے بعد نفل پڑھنا مکروہ ہے البتہ فرض و واجب کی قضا فرض عصر کے بعد بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہو جائے یعنی (ایک نیزہ کے بقدر بلند ہو جائے) نیز جب سورج کا کنارہ ڈوب جائے تو مطلقاً کوئی بھی نماز خواہ فرض ہو یا نفل چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ بالکل غروب ہو جائے اور آفتاب کے طلوع ہونے و غروب ہونے کے وقت نماز پڑھنے کا ارادہ نہ کرو اس لئے کہ سورج شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حدیث کے الفاظ "قصد نہ کرے" سے حضرت امام شافعیؒ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان اوقات میں قصداً تحیۃ المسجد اور قضا کی نماز پڑھے گا تو اس حدیث کی رو سے خلاف کرے گا ہاں اگر کوئی شخص اتفاقاً پڑھ لے تو جائز ہو گا لیکن حنفیہ کہتے ہیں کہ حدیث کا مقصد مطلق طور پر ان اوقات میں نماز پڑھنے سے منع کرنا ہے اس میں قصداً یا اتفاقاً کی قید لگانا حدیث کے منشاء کے خلاف ہے۔

شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان آفتاب نکلنے کا مطلب: "شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان آفتاب نکلنے کا مطلب اس کے سر کے دونوں جانبوں کے درمیان آفتاب کا نکلنا ہے یعنی شیطان طلوع آفتاب کے وقت آفتاب کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ آفتاب اس کے سر کے دونوں جانبوں کے درمیان نکلے اور اس حرکت سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ آفتاب کو پوجتے ہیں شیطان ان کا قبلہ بن جائے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس وقت نماز پڑھنے کو منع فرمایا ہے تاکہ خدا کے ان باغیوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔"

وہ تین اوقات جن میں نماز پڑھنا ممنوع ہے

(۲) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ ثَلَاثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَانَا اَنْ نُصَلِّيَ فِيْهِنَّ اَوْ نَقْبُرَ فِيْهِنَّ مَوْتَانَا حِيْنَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً حَتّٰى تَرْتَفِعَ وَحِيْنَ يَقُوْمُ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ حَتّٰى تَمِيْلَ الشَّمْسُ وَحِيْنَ تَضَيَّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوْبِ حَتّٰى تَغْرُبَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ تین وقتوں میں نماز پڑھنے اور اپنے مردوں کو دفن کرنے سے منع فرماتے تھے۔ اول آفتاب نکلنے کے وقت یہاں تک کہ بلند ہو جائے، دوسرے دوپہر کا سایہ قائم ہونے "یعنی نصف النہار" کے وقت یہاں تک کہ آفتاب ڈھل جائے اور تیسرے اس وقت جبکہ آفتاب ڈوبنے لگے یہاں تک کہ غروب ہو جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "مردوں کو دفن کرنے" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان اوقات میں مردے دفن نہ کئے جائیں بلکہ اس کا مطلب جنازہ کی نماز سے منع کرنا ہے کیونکہ مردے ہر وقت دفن کئے جاسکتے ہیں۔

فجر و عصر کے بعد کوئی نماز نہ پڑھنی چاہئے

(۳) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا صَلَاةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰى تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ وَلَا صَلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغِيْبَ الشَّمْسُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا صبح (کی نماز) کے بعد اس وقت تک کہ (بقدر نیزہ) آفتاب بلند نہ ہو جائے کوئی نماز نہیں اور عصر کی نماز کے بعد اس وقت تک کہ آفتاب چھپ نہ جائے کوئی نماز نہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہاں نفی سے مراد نماز کے کمال کی نفی ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں اوقات میں نماز پڑھنا حرام نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے۔

نماز کے اوقات

(۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ فَقَدِمْتُ الْمَدِيْنَةَ فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ فَقُلْتُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الصَّلَاةِ فَقَالَ صَلِّ صَلَاةَ الصُّبْحِ ثُمَّ اَقْصِرْ عَنِ الصَّلَاةِ حِيْنَ تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ وَحِيْنَئِذٍ يَسْجُدُ

لَهَا الْكُفَّارُ ثُمَّ صَلِّ فَإِنَّ الصَّلَاةَ مَشْهُوْدَةٌ مَحْضُوْرَةٌ حَتَّى يَسْتَقِلَّ الظِّلُّ بِالرُّمْحِ ثُمَّ اَقْصِرْ عَنِ الصَّلَاةِ فَإِنَّ حِيْنَئِذٍ تُسْجَرُ جَهَنَّمُ فَإِذَا اَقْبَلَ الْفَيْءُ فَصَلِّ فَإِنَّ الصَّلَاةَ مَشْهُوْدَةٌ مَحْضُوْرَةٌ حَتَّى تُصَلِّيَ الْعَصْرَ ثُمَّ اَقْصِرْ عَنِ الصَّلَاةِ حَتَّى تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَإِنَّهَا تَغْرُبُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ وَحِيْنَئِذٍ يَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّارُ قَالَ قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ فَالْوُضُوْءَ حَدِّثْنِي عَنْهُ قَالَ مَا مِنْكُمْ رَجُلٌ يُقَرِّبُ وَضُوْءَهُ فَيُمَضْمِضُ وَيَسْتَنْشِقُ فَيَسْتَنْثِرُ اِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا وَجْهِهٖ وَفِيْهِ وَخَيَاشِيْمِهٖ ثُمَّ اِذَا غَسَلَ وَجْهَهٗ كَمَا اَمَرَهُ اللّٰهُ اِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا وَجْهِهٖ مِنْ اَطْرَافِ لِحْيَتِهٖ مَعَ الْمَاءِ ثُمَّ يَغْسِلُ يَدَيْهِ اِلَى الْمِرْفَقَيْنِ اِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا يَدَيْهِ مِنْ اَنَامِلِهٖ مَعَ الْمَاءِ ثُمَّ يَمْسَحُ رَأْسَهٗ اِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا رَأْسِهٖ مِنْ اَطْرَافِ شَعْرِهٖ مَعَ الْمَاءِ ثُمَّ يَغْسِلُ قَدَمَيْهِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ اِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا رِجْلَيْهِ مِنْ اَنَامِلِهٖ مَعَ الْمَاءِ فَإِنْ هُوَ قَامَ فَصَلّٰى فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَمَجَّدَهٗ بِالَّذِيْ هُوَ لَهٗ اَهْلٌ وَفَرَّغَ قَلْبَهٗ لِلّٰهِ اِلَّا انْصَرَفَ مِنْ خَطِيْئَتِهٖ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو ابن عبسہؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ مدینہ تشریف لائے تو میں بھی مدینہ آیا اور آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا یہ یارسول اللہ مجھے نماز کے اوقات بتا دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "صبح کی نماز پڑھو اور پھر نماز سے رک جاؤ جب تک کہ آفتاب طلوع ہو کر بلند نہ ہو جائے اس لئے کہ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان نکلتا ہے اور اس وقت کافر (یعنی سورج کو پوجنے والے) اس کو سجدہ کرتے ہیں پھر (اشراق کی) نماز پڑھو کیونکہ اس وقت کی نماز مشہودہ ہے (یعنی فرشتے نمازی کی گواہی دیتے ہیں) اور اس میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں یہاں تک کہ (جب) سایہ نیزہ پر چڑھ جائے اور زمین پر نہ پڑے (یعنی ٹھیک دوپہر ہو جائے) تو نماز سے رک جاؤ کیونکہ اس وقت دوزخ جھونکی جاتی ہے، پھر جب سایہ ڈھل جائے تو (ظہر کے فرض اور جو چاہو نفل) نماز پڑھو کیونکہ یہ وقت فرشتوں کے شہادت دینے اور حاضری کا ہے یہاں تک کہ تم عصر کی نماز پڑھ لو پھر نماز سے رک جاؤ یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو جائے کیونکہ آفتاب شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور اس وقت کفار (یعنی آفتاب کو پوجنے والے) اس کی طرف سجدہ کرتے ہیں" حضرت عمرو ابن عبسہ فرماتے ہیں کہ میں نے (پھر) عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! وضو (کی فضیلت) کے متعلق (بھی) بتا دیجئے! آپ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص وضو کا پانی لے اور (نیت کرنے، اور بسم اللہ پڑھنے اور دونوں ہاتھوں کو پہنچوں تک دھونے کے بعد) کلی کرے اور ناک میں پانی دے کر اس کے چہرے (کے اندر) کے منہ کے اور ناک کے نتھنوں کے (صغیرہ) گناہ جھڑ جاتے ہیں پھر جب وہ اپنے چہرے کو خدا کے حکم کے مطابق دھوتا ہے تو اس کے چہرے کے گناہ اس کی داڑھی کے کناروں سے پانی کے ساتھ گر جاتے ہیں اور جب وہ اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوتا ہے تو اس کے دونوں ہاتھوں کے گناہ اس کی انگلیوں کے سرے سے پانی کے ساتھ گر جاتے ہیں، پھر جب وہ اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کے گناہ اس کے بالوں کے کناروں سے پانی کے ساتھ گر جاتے ہیں اور جب وہ اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوتا ہے تو اس کے دونوں پیروں کے گناہ اس کی انگلیوں کے سرے سے پانی کے ساتھ گر جاتے ہیں اور پھر (وضو سے فارغ ہو کر) جب وہ کھڑا ہوتا ہے اور نماز پڑھتا ہے نیز (نماز کے بعد) اللہ کی تعریف کرتا ہے ثنا بیان کرتا ہے (یعنی ذکر اللہ بہت زیادہ کرتا ہے) اور اسے اس بزرگی کے ساتھ جس کا وہ لائق ہے یاد کرتا ہے اور اپنے دل کو اللہ کے لئے فارغ (یعنی اس کی طرف متوجہ) کرتا ہے تو وہ (نماز کے بعد) گناہوں سے ایسا پاک ہو کر لوٹتا ہے گویا اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا ہے۔" (مسلم)

تشریح: حدیث کے الفاظ "جب سایہ نیزہ پر چڑھ جائے اور زمین پر نہ پڑے" کا تعلق مکہ و مدینہ اور ان کے گردونواح سے ہے کیونکہ ان مقامات پر بڑے دنوں میں عین نصف النہار کے وقت سایہ زمین پر بالکل نہیں پڑتا۔

حدیث کے آخری الفاظ سے یہ مفہوم واضح ہوتا ہے کہ صغیرہ اور کبیرہ دونوں گناہ بخش دئے جاتے ہیں تو اس سلسلہ میں تحقیقی بات یہ ہے کہ صغیرہ گناہ تو ضرور ہی بخش دیتے ہیں البتہ کبیرہ گناہوں کی بخشش کا انحصار حق تعالیٰ کی مشیت اور اس کی مرضی پر ہے کہ چاہے تو وہ کبیرہ گناہ بھی اپنے فضل و کرم سے بخش سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا عصر کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا

⑤ وَعَنْ كُرَيْبٍ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ وَالْمِسْوَرَ بْنَ مَخْرَمَةَ وَعَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ الْاَزْهَرِ اَرْسَلُوْهُ اِلٰى عَائِشَةَ فَقَالُوْا اقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ وَسَلْهَا عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ قَالَ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَبَلَّغْتُهَا مَا اَرْسَلُوْنِي فَقَالَتْ سَلْ اُمَّ سَلَمَةَ فَخَرَجْتُ اِلَيْهِمْ فَرَدُّوْنِي اِلٰى اُمِّ سَلَمَةَ فَقَالَتْ اُمُّ سَلَمَةَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى عَنْهُمَا ثُمَّ رَاَيْتُهٗ يُصَلِّيْهِمَا ثُمَّ دَخَلَ فَاَرْسَلْتُ اِلَيْهِ الْجَارِيَةَ فَقُلْتُ قُوْلِي لَهٗ تَقُوْلُ اُمُّ سَلَمَةَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَمِعْتُكَ تَنْهٰى عَنْ هَاتَيْنِ الرَّكْعَتَيْنِ وَاَرَاكَ تُصَلِّيْهِمَا قَالَ يَا ابْنَتَ اَبِي اُمَيَّةَ سَاَلْتِ عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ وَاِنَّهٗ اَتَانِي نَاسٌ مِنْ عَبْدِالْقَيْسِ فَشَغَلُوْنِي عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ بَعْدَ الظُّهْرِ فَهُمَا هَاتَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت کریبؓ (حضرت ابن عباسؓ کے خادم) راوی ہیں کہ حضرت ابن عباس، مسور ابن مخرمہ اور عبدالرحمن ابن ازہرؓ نے انہیں (یعنی کریبؓ کو) حضرت عائشہؓ کی خدمت میں بھیجا اور ان سے ان تینوں نے کہا کہ (ہماری طرف سے) حضرت عائشہؓ کی خدمت میں سلام پیش کرکے ان سے عصر کے بعد دو رکعت نماز کے بارے میں پوچھنا کریب کہتے ہیں کہ "میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان تینوں نے جس پیغام کو پہنچانے کے لئے مجھے بھیجا تھا میں نے وہ پیغام ان تک پہنچا دیا" حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "حضرت ام سلمہؓ (کے پاس جاؤ اور ان) سے پوچھو" میں (یہ جواب سن کر) ان تینوں صحابہؓ کے پاس واپس لوٹ آیا، انہوں نے مجھے (پھر) حضرت ام سلمہؓ کے پاس بھیجا، حضرت ام سلمہؓ نے (میرا سوال سن کر) فرمایا کہ "میں نے سرور کونین ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ ان دونوں رکعتوں (کے پڑھنے) سے منع فرمایا کرتے تھے۔ پھر میں نے (ایک دن) دیکھا کہ آپ ﷺ ان دونوں رکعتوں کو پڑھتے ہیں۔ جب آپ ﷺ (ان دونوں رکعتوں کو مسجد میں پڑھ کر گھر میں یا باہر صحن میں پڑھ کر مکان کے اندرونی حصہ میں داخل ہوئے تو میں نے خادمہ کو آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور اس سے کہا کہ تم آنحضرت ﷺ سے جاکر کہو کہ ام سلمہ کہتی ہے کہ یارسول اللہ میں نے آپ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ ان دونوں رکعتوں (کے پڑھنے) سے منع فرماتے تھے اور (اب) میں نے آپ ﷺ کو دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے (اس کی کیا وجہ ہے؟) آنحضرت ﷺ نے (خادمہ سے کہا کہ اُمّ سلمہ سے جاکر کہو کہ) ابی امیہ کی بیٹی! تم نے عصر کے بعد دو رکعتوں کے (پڑھنے کے) بارے میں پوچھا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ قبیلہ عبدالقیس کے کچھ لوگ (اسلامی تعلیمات اور احکام سیکھنے کی غرض سے) میرے پاس آئے تھے چنانچہ (انہیں دینی احکامات بتانے کی مشغولیت میں) ظہر کے بعد کی میری دونوں رکعتیں رہ گئی تھیں انہیں کو میں نے عصر کے بعد پڑھا ہے۔"

(متفق علیہ)

تشریح: سائلین کا مطلب یہ تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد نفل وغیرہ پڑھنے سے منع فرمایا تھا تو خود عصر کے بعد دو رکعت نماز کیوں پڑھی تھی چنانچہ انہوں نے حضرت کریب کو حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا تاکہ وہ اس کی تحقیق کریں اور حضرت عائشہ سے حقیقت حال معلوم کریں حضرت عائشہؓ نے حضرت کریب کو حضرت ام سلمہؓ کا حوالہ دیا کہ ان سے معلوم کیا جائے، کیونکہ حضرت ام سلمہؓ اس بارے میں پوری طرح واقفیت رکھتی تھیں اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے آپ ﷺ کے اس عمل کے بارے میں پہلے ہی تحقیق کرلی تھی، حضرت عائشہؓ نے جب حضرت کریب کو حضرت ام سلمہؓ کے پاس جانے کو کہا تو انہیں قاعدہ میں حضرت ام سلمہؓ کے پاس ہی جانا چاہئے تھا لیکن وہ بپاس ادب پہلے ان تینوں صحابیوں کے پاس آئے جن کے پیغامبر بن کر وہ حضرت عائشہؓ کے پاس گئے تھے، جب ان صحابیوں نے انہیں حضرت ام سلمہؓ کے پاس بھیجا تب وہ ان کے پاس گئے اور ان تینوں صحابیوں کا پیغام انہیں پہنچا کر حقیقت حال سے مطلع ہوئے۔

حضرت ام سلمہؓ کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ عصر کے بعد جو دو رکعتوں سے منع فرماتے تھے تو ان دو رکعتوں سے

آپ کی مراد مطلقاً نفل نماز پڑھنا تھا اور اسی کے ضمن میں ان دونوں رکعتوں کی نہی بھی شامل تھی۔ لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں رکعتوں ہی کے پڑھنے سے منع فرمایا ہو۔

ابوامیہ حضرت ام سلمہ کے والد کا نام تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے خادمہ سے فرمایا کہ ام سلمہؓ سے اس سوال کا جواب اس طرح دینا یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے براہ راست حضرت ام سلمہؓ کو جواب دیتے ہوئے ابوامیہ کی بیٹی! کہہ کر مخاطب فرمایا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ علم دین کی تعلیم احکام شریعت کی تبلیغ اور مخلوق خدا کی ہدایت کرنا نماز نفل پر مقدم ہے اگرچہ سنت غیر مؤکدہ ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ظہر کی فرض نماز کے بعد کی سنتوں کو موخر کیا اور پہلے وفد عبدالقیس کو دینی مسائل اور احکام شریعت کی تعلیم دی۔

یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اگر نوافل وقتیہ فوت ہو جائیں تو انہیں دوسرے وقت قضا پڑھ لینا چاہئے جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک ہے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک میں نوافل وقتیہ کو صرف انہیں کے اوقات میں پڑھنا چاہئے غیر وقت میں ان کی قضاء نہیں ہے چنانچہ ان کی جانب سے اس حدیث کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ظہر کی فرض نماز کے بعد ہی سنت کی دونوں رکعتیں پڑھنی شروع کر دی گئی ہوں گی مگر وفد عبدالقیس کو علم دین کی تعلیم دینے کی ضرورت کی وجہ سے آپ ﷺ نے نماز توڑ دی ہوگی اس وجہ سے آپ ﷺ نے ان دونوں رکعتوں کی قضا عصر کی نماز کے بعد پڑھی۔

اس موقعہ پر اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث سے تو یہ معلوم ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ نے عصر کے بعد جو دو رکعت نماز پڑھی تھی وہ دراصل ظہر کے فرض کے بعد کی سنتیں تھیں جو وفد عبدالقیس کے ساتھ تعلیم دین کی مشغولی کی بناء پر پڑھنے سے رہ گئی تھیں لیکن ان احادیث کا کیا جواب ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ تو ہمیشہ ہی عصر کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "اس خدا کی قسم جس نے آنحضرت ﷺ کو اس دنیا سے اٹھایا آپ ﷺ نے عصر کے بعد کی دو رکعتیں پڑھنا نہ چھوڑیں یہاں تک کہ آپ ﷺ نے پروردگار سے ملاقات کی۔" اس قسم کی دیگر روایتیں بھی منقول ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ عصر کی فرض نماز کے بعد دوسری نماز پڑھنا مکروہ ہے چنانچہ جمہور علماء کی بھی یہی رائے نیز امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں بھی ثابت ہے کہ وہ عصر کی فرض نماز کے بعد دوسری نماز پڑھنے سے منع فرماتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ایسے لوگوں کو مارتے بھی تھے جو عصر کے بعد نفل وغیرہ پڑھتے تھے۔

لہٰذا۔ اب یہی کہا جائے گا کہ اس ممانعت کے باوجود آنحضرت ﷺ کا عصر کی نماز کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا دراصل آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا جیسا کہ آپ ﷺ صوم وصال (پے در پے روزے) رکھتے تھے مگر دوسروں کو اس سے منع فرماتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

فجر کی سنتوں کی قضا کا مسئلہ

(۶) عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ قَيْسِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَاَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يُصَلِّي بَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ رَكْعَتَيْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الصُّبْحِ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّي لَمْ اَكُنْ صَلَّيْتُ الرَّكْعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا فَصَلَّيْتُهُمَا الْاٰنَ فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَهٗ وَقَالَ اِسْنَادُ هٰذَا الْحَدِيْثِ لَيْسَ بِمُتَّصِلٍ لِاَنَّ مُحَمَّدَ ابْنَ اِبْرَاهِيْمَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ قَيْسِ بْنِ عَمْرٍو وَفِي شَرْحِ السُّنَّةِ وَنُسَخِ الْمَصَابِيْحِ عَنْ قَيْسِ بْنِ فَهْدٍ نَحْوَهٗ۔

"حضرت محمد ابن ابراہیم، قیس ابن عمرو سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا (ایک دن) سرور کونین ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ فجر کی فرض نماز کے بعد دو رکعت نماز پڑھ رہا ہے، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "صبح کی نماز دو رکعت (پھر فرمایا کہ دو رکعت ہی پڑھو)" اس شخص نے عرض کیا کہ "فجر کی فرض نماز سے پہلے دو رکعتیں (سنت) میں نے نہیں پڑھی تھیں انہیں کو میں نے اس وقت پڑھا ہے۔" آنحضرت ﷺ (یہ سن کر) خاموش ہو گئے۔ (ابوداؤدؒ) امام ترمذیؒ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی اسناد متصل نہیں ہے کیونکہ محمد بن ابراہیم کا قیس ابن عمرو سے سننا ثابت نہیں ہے، نیز شرح السنہ اور مصابیح کے بعض نسخوں میں قیس ابن قہد سے اسی طرح منقول ہے۔"

تشریح: حدیث کے جملہ صَلٰوۃُ الصُّبْحِ رَکْعَتَیْنِ سے پہلے ایک لفظ مقدر ہے یعنی یہ عبارت پوری طرح یوں ہے اجعلوا صلٰوۃَ الصُّبْحِ رَکْعَتَیْنِ۔ لفظ رَکْعَتَیْنِ نفی زیادتی کی تاکید کے لئے مکرر فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فجر کی فرض دو ہی رکعتیں پڑھو اس کے بعد اور کوئی نماز نہ پڑھو۔

آنحضرت ﷺ نمازی کا جواب سن کر خاموش رہے۔ محدثین کی اصطلاح میں اس خاموشی کو تقریر کہا جاتا ہے آنحضرت ﷺ کے سامنے کوئی عمل کیا گیا اور آپ ﷺ نے اس پر سکوت فرمایا گویا آپ ﷺ اس عمل سے راضی ہوئے۔ لہٰذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر فجر کی فرض نماز سے پہلے کی دو سنتیں نہ پڑھی جا سکیں تو فرض پڑھنے کے بعد ان کی قضا پڑھنی چاہئے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک اس سلسلہ میں مسئلہ یہ ہے کہ فجر کی سنتوں کی قضا نہ تو طلوع آفتاب سے پہلے ہے اور نہ طلوع آفتاب کے بعد ہے لیکن سنتیں اگر فرض کے ساتھ فوت ہوں گی تو وہ بھی فرض کے ساتھ زوال آفتاب سے پہلے پہلے قضا پڑھی جائیں گی۔

حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ محض سنتوں کی بھی قضا پڑھی جا سکتی ہے مگر طلوع آفتاب کے بعد سے زوال آفتاب تک۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت ابویوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ سنتوں میں اصل عدم قضا ہے اور قضا واجب کے ساتھ مخصوص ہے اور حدیث جو سنتوں کے قضا کے اثبات میں وارد ہے وہ ان سنتوں کے بارے میں ہے جو فرض کے ساتھ فوت ہو گئی ہوں بقیہ سنتیں اپنی اصل (عدم قضا) پر رہیں گی یعنی ان کی قضا نہیں کی جائے گی جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو محمد ابن ابراہیم کی یہ حدیث چونکہ ضعیف ہے اس لئے اسے کسی مسلک کی بنیاد اور دلیل بنانا ٹھیک نہیں ہے۔

اسی طرح دوسرے اوقات کی سنتوں کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ وقت کے بعد تنہا ان کی قضا نہ کی جائے البتہ وہ سنتیں جو فرض کے ساتھ فوت ہو گئی ہوں فرض کے ساتھ ان کی قضا کے بارے میں اختلاف ہے۔

خانہ کعبہ کا طواف ہر وقت کیا جا سکتا ہے

(۷) وَعَنْ جُبَیْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا بَنِی عَبْدِ مَنَافٍ لَا تَمْنَعُوْا اَحَدًا طَافَ بِھٰذَا الْبَیْتِ وَصَلّٰی اَیَّةَ سَاعَةٍ شَاءَ مِنْ لَیْلٍ اَوْ نَھَارٍ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت جبیر ابن مطعمؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "اے عبد مناف کی اولاد! کسی کو اس گھر (خانہ کعبہ) کا طواف کرنے سے نہ روکو! اور رات دن میں جس وقت کوئی چاہئے اسے نماز پڑھنے دو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: خانہ کعبہ کی خدمت عبد مناف کی اولاد کے سپرد تھی، اور وہاں کے انتظامات و نگرانی انہیں کے ذمہ تھی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے انہیں حکم فرمایا کہ رات و دن کے کسی بھی حصہ میں کوئی خانہ کعبہ کا طواف کرنا چاہے تو اسے نہ روکو بلکہ اسے طواف کرنے دو، چنانچہ رات

ودن کے ہر حصہ میں خواہ آفتاب کے طلوع کا وقت ہو یا استواء (نصف النہار) کا وقت ہو تمام علماء کے نزدیک خانہ کعبہ کا طواف کیا جاسکتا ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

خانہ کعبہ میں ہر وقت نماز پڑھنے کا مسئلہ: البتہ اس بارے میں علماء کا یہاں اختلاف ہے کہ خانہ کعبہ میں رات و دن کے کسی بھی حصہ میں خواہ اوقات مکروہہ کیوں نہ ہوں نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس حدیث کی بناء پر خانہ کعبہ میں ہر وقت کوئی بھی نماز خواہ وہ طواف کی دو رکعتیں ہوں یا دوسری نماز ہو پڑھی جاسکتی ہے۔

حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ خانہ کعبہ میں صرف طواف کی دو رکعتیں کسی وقت بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک خانہ کعبہ کے اندر اوقات مکروہہ میں کوئی بھی نماز جائز نہیں ہے اوقات کی حرمت اور کراہت کے سلسلے میں مکہ کا حکم بھی دیگر شہروں کی طرح ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اوقات کی حرمت و کراہت کا حکم اور ان میں نماز پڑھنے کی ممانعت کے سلسلہ میں جو احادیث منقول ہیں وہ سب عام ہیں ان میں کسی جگہ اور کسی شہر کی کوئی تخصیص نہیں ہے کہ فلاں جگہ تو ان اوقات میں نماز پڑھنی جائز ہے اور فلاں جگہ نا جائز ہے۔ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی مراد یہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جس وقت چاہے نماز پڑھی جاسکتی البتہ اوقات مکروہہ میں وہاں بھی نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ اس تاویل سے تمام احادیث میں موافقت اور مطابقت بھی ہو جاتی ہے جو ایک ضروری چیز ہے۔

جمعہ کے روز نصف النہار کے وقت نماز پڑھنے کا مسئلہ

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنِ الصَّلٰوةِ نِصْفَ النَّهَارِ حَتّٰی تَزُوْلَ الشَّمْسُ اِلَّا یَوْمَ الْجُمُعَةِ۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے ٹھیک دوپہر کے وقت جب تک کہ آفتاب ڈھل نہ جائے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے البتہ جمعہ کے دن (جائز ہے)۔" (شافعیؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ کا تو یہی مسلک ہے کہ جمعہ کے روز ٹھیک دوپہر کے وقت بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ کے روز بھی نصف النہار کے وقت نماز پڑھنی درست نہیں ہے[1] اس لئے کہ وہ احادیث جن میں مطلقاً نہی ثابت ہے اس حدیث کے مقابلہ میں زیادہ مشہور ہیں اور یہ حدیث ضعیف ہے جو ان احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی یا پھر یہ کہا جائے گا کہ قاعدہ کے مطابق کسی چیز کے بارے میں حرام اور مباح دونوں کے دلائل ہوں تو حرام کے دلائل کو ترجیح دی جائے گی۔

⑨ وَعَنْ اَبِی الْخَلِیْلِ عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَرِهَ الصَّلٰوةَ نِصْفَ النَّهَارِ حَتّٰی تَزُوْلَ الشَّمْسُ اِلَّا یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَقَالَ اِنَّ جَهَنَّمَ تُسْجَرُ اِلَّا یَوْمَ الْجُمُعَةِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَقَالَ اَبُو الْخَلِیْلِ لَمْ یَلْقَ اَبَا قَتَادَةَ۔

"اور حضرت ابوالخلیلؒ حضرت ابوقتادہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ "سرور کونین ﷺ ٹھیک دوپہر کے وقت جب تک کہ سورج نہ ڈھل جائے نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے علاوہ جمعہ کے دن کے۔ نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "علاوہ جمعہ" کے دن کے روزانہ (دوپہر کے وقت) دوزخ جھونکی جاتی ہے۔" اس روایت کو امام ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت ابوقتادہؓ سے ابوالخلیلؒ کی ملاقات ثابت نہیں ہے (لہٰذا اس حدیث کی اسناد متصل نہیں ہے)۔"

---

[1] امام اعظمؒ کا مسلک تو یہی ہے جو یہاں نقل کیا گیا مگر ابو یوسفؒ کا قول صحیح اور معتمد ہے کذا فی الاشباہ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اوقات مکروہہ

(۱۰) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ الصُّنَابِحِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّمْسَ تَطْلُعُ وَمَعَھَا قَرْنُ الشَّیْطَانِ فَاِذَا ارْتَفَعَتْ فَارَقَھَا ثُمَّ اِذَا اسْتَوَتْ قَارَنَھَا فَاِذَا زَالَتْ فَارَقَھَا فَاِذَا دَنَتْ لِلْغُرُوْبِ قَارَنَھَا فَاِذَا غَرَبَتْ فَارَقَھَا وَنَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الصَّلٰوۃِ فِیْ تِلْکَ السَّاعَاتِ۔ (رواہ مالک و احمد والنسائی)

"حضرت عبداللہ صنابحیؒ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کے ساتھ شیطان کا سینگ ہوتا ہے پھر جب وہ بلند ہو جاتا ہے تو وہ الگ ہو جاتا ہے پھر جب دوپہر ہوتی ہے تو شیطان آفتاب کے قریب آجاتا ہے اور جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو شیطان اس کے قریب آجاتا ہے اور جب آفتاب غائب (یعنی غروب) ہو جاتا ہے تو شیطان اس سے جدا ہو جاتا ہے اور آنحضرت ﷺ نے ان اوقات میں (یعنی آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت اور ٹھیک دوپہر کے وقت) نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔"

(مالکؒ، احمدؒ، نسائیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے نماز خواہ حقیقۃً ہو یا حکماً جیسے نماز جنازہ یا سجدہ تلاوت اور امام مالکؒ نے باوجودیکہ یہ روایت خود نقل کی ہے مگر وہ ٹھیک دوپہر کے وقت نماز کے حرام ہونے کے قائل نہیں ہیں بلکہ انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ "ہم نے اہل فضل کو دیکھا ہے کہ وہ کوشش کرتے تھے اور دوپہر میں نماز ادا کرتے تھے۔"

نماز عصر کے بعد کوئی نماز جائز نہیں

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ بَصْرَۃَ الْغِفَارِیِّ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْمُخَمَّصِ صَلٰوۃَ الْعَصْرِ فَقَالَ اِنَّ ھٰذِہٖ صَلٰوۃٌ عُرِضَتْ عَلٰی مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ فَضَیَّعُوْھَا فَمَنْ حَافَظَ عَلَیْھَا کَانَ لَہٗ اَجْرُہٗ مَرَّتَیْنِ وَلَا صَلٰوۃَ بَعْدَھَا حَتّٰی یَطْلُعَ الشَّاھِدُ وَالشَّاھِدُ النَّجْمُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوبصرہ غفاریؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) سرور کونین ﷺ نے مقام مخمص میں ہمیں عصر کی نماز پڑھائی اور پھر فرمایا کہ یہ نماز تم سے پہلے لوگوں پر لازم کی گئی تھی لیکن انہوں نے ضائع کر دیا (یعنی نہ تو انہوں نے اس کی مداومت کی اور نہ اس کے حقوق ادا کئے) لہٰذا جو شخص اس نماز کی حفاظت کرے گا (یعنی اس کو ہمیشہ پڑھتا اور اس کے حقوق ادا کرتا رہے گا) اس کو دوگنا ثواب ملے گا اور (آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) عصر کے بعد کوئی نماز نہیں جب تک کہ شاہد نہ نکلے اور شاہد ستارہ ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "دوگنا ثواب" کا مطلب یہ ہے کہ ایک ثواب تو اس لئے ملے گا کہ یہ (یعنی نماز پڑھنا) نیک عمل ہے اور ہر نیک عمل پر ثواب ملتا ہے اور دوسرا ثواب اس نماز کی محافظت کرنے کی وجہ سے ملے گا برخلاف پچھلی قوموں کے کہ انہوں نے اس کی محافظت نہیں کی، اس لئے وہ مستحق عذاب ہوئے۔

ستارہ کو شاہد اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ رات کو حاضر ہوتا ہے یعنی طلوع ہوتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک غروب نہ ہو جائے عصر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہ پڑھی جائے۔

عصر کے بعد دو رکعت نماز پڑھنے کی ممانعت

(۱۲) وَعَنْ مُعَاوِیَۃَ قَالَ اِنَّکُمْ لَتُصَلُّوْنَ صَلٰوۃً لَقَدْ صَحِبْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَمَا رَاَیْنَاہُ یُصَلِّیْھِمَا وَلَقَدْ

نَهٰى عَنْهُمَا يَعْنِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت معاویہؓ نے (لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ تم لوگ نماز پڑھتے ہو اور ہم سرور کونین ﷺ کی صحبت میں رہے لیکن ہم نے آپ کو یہ دو رکعتیں پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ آپ نے تو ان کو یعنی عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: دیگر روایات میں تو صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ عصر کے بعد دو رکعت نماز پڑھتے تھے لیکن یہاں حضرت معاویہؓ اس سے انکار کر رہے ہیں لہٰذا اس حدیث کی تاویل یہ کی جائے گی کہ حضرت معاویہؓ کے ارشاد کی مراد آپ ﷺ یہ دو رکعتیں باہر لوگوں کے سامنے تو پڑھتے نہیں تھے۔ البتہ گھر میں عام لوگوں کی نگاہوں سے الگ ہو کر پڑھتے ہوں گے تاکہ دوسرے لوگ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کی پیروی نہ کریں کیونکہ عصر کے بعد یہ دو رکعتیں صرف آنحضرت ﷺ ہی کو پڑھنی درست تھیں دوسرے لوگوں کے لئے جائز نہیں تھیں۔ حضرت امام طحاویؒ اس مسئلہ میں کہ آیا عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنا جائز ہیں یا نہیں؟ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے متواتر احادیث ثابت ہیں کہ آپ ﷺ نے عصر کی فرض نماز پڑھ لینے کے بعد کوئی دوسری نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے نیز صحابہؓ کا عمل بھی اسی پر رہا ہے اس واسطے یہ کسی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس کا خلاف کرے یعنی عصر کے بعد نماز پڑھنے کو جائز قرار دے۔

(۱۳) وَعَنْ اَبِي ذَرٍّ قَالَ وَقَدْ صَعِدَ عَلٰى دَرَجَةِ الْكَعْبَةِ مَنْ عَرَفَنِي فَقَدْ عَرَفَنِي وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْنِي فَاَنَا جُنْدُبٌ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا صَلٰوةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَلَا بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ اِلَّا بِمَكَّةَ اِلَّا بِمَكَّةَ اِلَّا بِمَكَّةَ۔ (رواہ احمد ورزین)

"اور حضرت ابوذرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے کعبہ کے زینے پر چڑھ کر فرمایا کہ جس شخص نے مجھے پہچانا (یعنی میرا نام جان لیا) اس نے مجھے (یعنی میری سچائی کو) پہچان لیا اور جس نے مجھ کو نہیں پہچانا تو (میں اس کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ "میں جندبؓ ہوں" میں نے سرور کونین ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد جب تک آفتاب طلوع نہ ہو جائے کوئی نماز نہیں ہے اور نہ عصر کی نماز کے بعد کوئی نماز ہے جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے مگر مکہ میں "مگر مکہ میں" "مگر مکہ میں۔" (احمد، رزین)

تشریح: خانہ کعبہ کا دروازہ چونکہ بلند ہے اس لئے اس پر چڑھنے کے لئے زینہ تھا، چنانچہ اب بھی ایک چوبی زینہ منبر کی شکل میں ہے، جو خانہ کعبہ کے سامنے چاہ زمزم کے پاس رکھا رہتا ہے جب خانہ کعبہ کے اندر داخلہ ہوتا ہے تو اس کو دروازہ کے سامنے لگا دیتے ہیں اور پھر اس کے بعد اس زینہ کو وہاں سے ہٹا کر اپنی جگہ رکھ دیتے ہیں لہٰذا احتمال ہے کہ اس وقت بھی اس قسم کا یا کسی دوسری طرح کا زینہ ہو گا جس کے ذریعہ خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتے ہوں گے۔

بہر حال حضرت ابوذرؓ نے کہ جن کا نام جندبؓ تھا۔ خانہ کعبہ کے زینہ پر چڑھ کر یہ بات کہی تاکہ لوگ ان کی صداقت شعاری اور سچائی کی بناء پر حدیث کو صحیح جانیں۔ اس طرح حضرت ابوذرؓ نے گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ ابوذرؓ سے زیادہ کسی راست گو اور سچے انسان پر نہ تو آسمان نے سایہ کیا اور نہ زمین نے اپنے اوپر اٹھایا۔

مکہ مکرمہ میں اوقات مکروہہ میں نماز کے جائز ہونے کے مسئلہ کو اس سے پہلے حدیث نمبر سات میں بتایا جا چکا ہے اس موقعہ پر تو صرف اتنی بات جان لیجئے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

بَابُ الْجَمَاعَةِ وَفَضْلِهَا

جماعت اور اس کی فضیلت کا بیان

جماعت کی فضیلت اور تاکید میں صحیح احادیث اس کثرت سے وارد ہیں کہ اگر سب کو یکجا کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے اس باب

کے تحت اسی قسم کی احادیث نقل کی جائیں گی جن سے جماعت کی فضیلت وتاکید اور اس کے احکام و مسائل کا علم حاصل ہوگا۔ ان احادیث کو دیکھنے کے بعد یقینی طور پر آپ یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ جماعت نماز کی تکمیل میں ایک اعلیٰ درجہ کی شرط ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کبھی جماعت کو ترک نہیں فرمایا حتی کہ حالت مرض میں جبکہ آپ ﷺ کے لئے خود چل کر مسجد میں پہنچنا ممکن نہ تھا دو آدمیوں کے سہارے سے مسجد تشریف لے گئے اور جماعت سے نماز پڑھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت محمدیہ میں جماعت کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے اور ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ نماز جیسی عظیم عبادت کی شان اسی کی متقاضی تھی کہ جس چیز سے اس کی تکمیل ہو اسے اعلیٰ درجہ پر پہنچایا جائے۔

جماعت فرض و واجب ہے یا نہیں؟: اس بارے میں علماء کے یہاں اختلاف ہے کہ آیا جماعت سنت ہے یا واجب اور یا فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ چنانچہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جماعت فرض عین ہے الا کسی عذر کی وجہ سے، یہ قول امام احمدؒ، داؤدؒ، عطاءؒ، اور ابوثورؒ کا ہے بعض علماء کا قول یہ ہے کہ جو کوئی نماز کے لئے اذان سنے اور مسجد میں حاضر نہ ہو تو اس کی نماز درست نہیں، حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جماعت فرض کفایہ ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین کا مسلک یہ ہے کہ جماعت سنت مؤکدہ واجب کے قریب ہے لیکن فقہ کی کتابوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جماعت کے بارے میں حنفی فقہاء کے دو قول ہیں، بعض کتابوں میں جماعت کو واجب لکھا گیا ہے اور بعض میں سنت مؤکدہ اور وجوب ہی کا قول راجح اور اکثر محققین حنفیہ کا مسلک بیان کیا گیا ہے چنانچہ مشہور محقق حضرت ابن ہمام لکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر مشائخ کا مسلک یہی ہے جماعت واجب ہے لیکن اس کو سنت کس لئے کہا جاتا ہے کہ جماعت کا ثبوت سنت یعنی حدیث سے ہے نہ یہ کہ خود جماعت سنت ہے جیسا کہ نماز عیدین، وہ واجب ہے مگر اسے سنت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت حدیث سے ہے۔

جماعت کے احکام و مسائل: کتاب بدائع میں لکھا ہے کہ جماعت کے لئے مسجد میں حاضر ہونا ہر عاقل بالغ غیر معذور پر واجب اور اگر ایک مسجد میں جماعت نہ ملے تو دوسری مسجدوں میں پھرنا واجب نہیں ہے البتہ جماعت کی سعادت حاصل کرنے کی خاطر اگر دوسری مسجدوں میں جائے تو یہ اچھی ہی بات ہوگی، قدوری نے لکھا ہے کہ اس صورت میں کہ اگر مسجد میں جماعت نہ ملے، تو چاہئے کہ اہل وعیال کو جمع کر کے گھر ہی میں جماعت سے نماز پڑھ لی جائے۔

اس مسئلہ میں علماء کے یہاں اختلاف ہے کہ محلہ کی مسجد میں جماعت افضل ہے یا جامع مسجد میں، اگر ایک محلہ میں دو مسجدیں ہوں تو ان میں سے قدیم مسجد کو اختیار کرنا چاہئے اور اگر دونوں برابر ہوں تو پھر جو مسجد قریب ہو اسے اختیار کیا جائے، جماعت نماز تراویح میں اگرچہ ایک قرآن مجید جماعت کے ساتھ ہو چکا ہو اور نماز کسوف کے لئے سنت مؤکدہ ہے، رمضان کے وتر میں جماعت مستحب ہے رمضان کے علاوہ اور کسی زمانہ کے وتر میں جماعت مکروہ تنزیہی ہے مگر اس کے مکروہ ہونے میں یہ شرط ہے کہ مواظبت کی جائے اگر مواظبت نہ کی جائے بلکہ کبھی کبھی دو تین آدمی جماعت سے پڑھ لیں تو مکروہ نہیں۔

نماز خسوف میں اور تمام نوافل میں جماعت مکروہ تحریمی ہے بشرطیکہ نوافل اس اہتمام سے ادا کئے جائیں جس اہتمام سے فرائض کی جماعت ہوتی ہے یعنی اذان و اقامت کے ساتھ یا کسی اور طریقہ سے لوگوں کو جمع کر کے، ہاں اگر بے اذان و اقامت کے اور بے بلائے ہوئے دو تین آدمی جمع ہو کر کسی نفل کو جماعت سے پڑھ لیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔

جماعت کی حکمتیں اور فائدے: جماعت کی حکمتیں کیا ہیں؟ اور اس کے کیا فائدے مرتب ہوتے ہیں، اس موضوع پر علماء نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس سلسلہ میں امام الکبیر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جو لطیف و جامع بات کہی ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی چنانچہ اس موقع پر انہیں کی تقریر نقل کی جاتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

❶ کوئی چیز اس سے زیادہ سود مند نہیں کہ کوئی عبادت اس طرح رسم عام کر دی جائے کہ وہ عبادت ایک ضروری عادت ہو جائے کہ اس کو

چھوڑنا کسی عادت کو ترک کرنے کی طرح ناممکن ہو جائے اور تمام عبادتوں میں نماز سے زیادہ عظیم و شاندار کوئی عبادت نہیں کہ اس کے ساتھ یہ خاص اہتمام کیا جائے۔

❷ مذہب میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں جاہل بھی عالم بھی، لہٰذا یہ بڑی مصلحت کی بات ہے کہ سب لوگ جمع ہو کر ایک دوسرے کے سامنے اس عبادت کو ادا کریں کہ اگر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو دوسرا اسے بتادے گویا اللہ کی عبادت ایک زیور ہوئی کہ تمام پرکھنے والے اسے دیکھتے ہیں جو خرابی اس میں ہوتی ہے بتلادیتے ہیں اور جو عمدگی ہوتی ہے اسے پسند کرتے ہیں پس نماز کی تکمیل کا یہ ایک ذریعہ ہوگا۔

❸ جو لوگ بے نمازی ہوں گے ان کا بھی اس سے حال کھل جائے گا اور ان کے وعظ و نصیحت کا موقع ملے گا۔

❹ چند مسلمانوں کا مل کر اللہ کی عبادت کرنا اور اس سے دعا مانگنا حق تعالیٰ کی رحمت کے نزول اور قبولیت کے لئے ایک عجیب خاصیت رکھتا ہے۔

❺ اس امت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا یہ مقصود ہے کہ اس کے نام کا کلمہ بلند ہو اور کلمۂ کفر پست ہو اور روئے زمین پر کوئی اسلام سے غالب نہ رہے اور یہ بات جب ہی ہو سکتی ہے کہ یہ طریقہ مقرر کیا جائے کہ تمام مسلمان خواہ وہ کسی درجہ اور کسی طبقہ کے ہوں، عام و خاص مسافر اور مقیم، چھوٹے اور بڑے سب ہی اپنی کسی بڑی اور مشہور عبادت کے لئے جمع ہوں اور اسلام کی شان و شوکت اور اس کی ترغیب دی گئی اور اس کے چھوڑنے کی ممانعت کی گئی۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

❻ جماعت میں یہ فائدہ بھی ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حال پر اطلاع ہوتی رہے گی، اور ایک کے درد و مصیبت میں شریک ہو سکیں گے جس سے دینی اخوت اور ایمانی محبت کا پورا اظہار و استحکام ہوگا جو اس شریعت کا ایک بڑا مقصود ہے اور جس کی تاکید و فضیلت جابجا قرآن عظیم اور احادیث نبی کریم ﷺ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ (علم الفقہ)

موجودہ زمانہ کی نظریاتی دوڑ کے مطابق دیکھا جائے تو جماعت اسلام کے نظریۂ مساوات کا سب سے اعلیٰ مظہر ہے دن میں پانچ مرتبہ خدا کے تمام بندے جو دنیاوی اعتبار سے کسی بھی منصب و مرتبہ کے ہوتے ہیں اپنی تمام برتری و فوقیت اور اپنے دنیاوی جاہ وجلال کو بالائے طاق رکھ کر خدا کے حضور میں تمام عام مسلمانوں کے ساتھ مل کر سربسجود ہو جاتے ہیں اور زبان حال سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ترک جماعت کے عذر: جیسا کہ بتایا جاچکا ہے ہر عاقل بالغ غیر معذور پر جماعت واجب ہے لیکن اگر ایسا کوئی شخص ہو یعنی اسے ایسا عذر لاحق ہو جس کی وجہ سے وہ مسجد میں جاکر جماعت میں شریک نہیں ہو سکتا تو اس کے لئے جماعت واجب نہیں رہتی، چنانچہ فقہاء نے ترک جماعت کے پندرہ عذر (ماخوذ از علم الفقہ) بیان کئے ہیں۔

❶ نماز کے صحیح ہونے کی شرط مثلاً طہارت یا ستر عورت وغیرہ کا نہ پایا جانا۔

❷ پانی کا بہت زوروں کے ساتھ برسنا، اس سلسلہ میں حضرت امام محمدؒ نے اپنی کتاب موطا میں لکھا ہے کہ اگرچہ شدید بارش کی صورت میں جماعت کے لئے نہ جانا جائز ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ جاکر جماعت سے نماز پڑھی جائے۔

❸ مسجد کے راستہ میں سخت کیچڑ کا ہونا۔

❹ سردی اتنی سخت ہو کہ باہر نکلنے میں یا مسجد تک جانے میں کسی بیماری کے پیدا ہو جانے یا بڑھ جانے کا خوف ہو۔

❺ مسجد تک جانے میں مال و اسباب کے چوری ہو جانے کا خوف ہو۔

❻ مسجد جانے میں کسی دشمن کے مل جانے کا خوف ہو۔

❼ مسجد جانے میں کسی قرض خواہ کے ملنے کا اور اس سے تکلیف پہنچنے کا خوف ہو بشرطیکہ اس کے قرض کے ادا کرنے پر قادر نہ ہو اگر قادر

ہو تو وہ ظالم سمجھا جائے گا اور اس کو ترک جماعت کی اجازت نہ ہوگی۔

⑧ رات اس قدر اندھیری ہو کہ راستہ نہ دکھائی دیتا ہو ایسی حالت میں یہ ضروری نہیں کہ لالٹین وغیرہ ساتھ لے کر جائے۔

⑨ رات کا وقت ہو اور آندھی بہت سخت چلتی ہو۔

⑩ کسی مریض کی تیمار داری کرنا ہو کہ اس کے جماعت میں چلے جانے سے اس مریض کی تکلیف یا وحشت کا خوف ہو۔

⑪ پیشاب یا پاخانہ معلوم ہوتا ہو۔

⑫ سفر کا ارادہ رکھتا ہو اور خوف ہو کہ جماعت سے نماز پڑھنے میں دیر ہو جائے گی اور قافلہ نکل جائے گا، ریل کا مسئلہ بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے مگر فرق اس قدر کہ وہاں ایک قافلہ کے بعد دوسرا قافلہ بہت دنوں کے بعد ملتا ہے اور یہاں ریل ایک دن میں کئی بار جاتی ہے اگر ایک وقت کی ریل نہ ملی تو دوسرے وقت جاسکتا ہے ہاں اگر ایسا ہی سخت حرج ہوا ہو تو جماعت چھوڑ دینے میں مضائقہ نہیں۔

⑬ فقہ وغیرہ پڑھنے یا پڑھانے میں ایسا مشغول رہتا ہو کہ بالکل فرصت نہ ملتی ہو۔

⑭ کوئی ایسی بیماری مثلاً فالج وغیرہ ہو یا اتنا ضعیف ہو کہ چلنے پر قادر نہ ہو یا نابینا ہو اگرچہ اس کو مسجد تک پہنچا دینے والا کوئی مل سکے یا لنگڑا ہو یا دونوں طرف سے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں۔

⑮ کھانا تیار یا تیاری کے قریب ہو اور ایسی بھوک لگی ہو کہ نماز میں جی نہ لگنے کا خوف ہو۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جماعت کی نماز کا ثواب

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلَاةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ دَرَجَةً۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا" جماعت کی نماز تنہا نماز سے (ثواب میں) ستائیس درجہ زیادہ ہوتی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت سے تو جماعت کی نماز کے ثواب کی زیادتی ستائیس درجہ معلوم ہوتی ہے مگر دوسری روایتوں میں پچیس درجہ زیادتی مذکور ہے چنانچہ علماء محدثین لکھتے ہیں کہ اکثر روایتوں میں یہی ثابت ہے کہ جماعت کی نماز کا ثواب تنہا نماز کے ثواب سے پچیس درجہ زیادہ ہوتا ہے حضرت عمرؓ ہی کی ایک ایسی روایت ہے کہ جس میں ستائیس درجہ کا ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا اس حدیث اور ان احادیث میں یہ تطبیق پیدا کی جائے گی کہ پہلے وحی کے ذریعہ پچیس ہی درجہ ثواب کی زیادتی معلوم ہوئی ہوگی پھر بعد میں حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ستائیس درجہ ثواب کی زیادتی کا اعلان فرمایا ہوگا۔

یا تطبیق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ کہا جائے کہ درجات کا اختلاف نمازی کے احوال کے تفاوت کی بناء پر ہے یعنی کسی نمازی کے جماعت کی نماز کا ثواب اس کے اپنے احوال کی بناء پر ستائیس گنا ملتا ہے اور کسی نمازی کے جماعت کی نماز کا ثواب اس کے اپنے احوال کی بناء پر پچیس گنا ملتا ہے۔

اس بارے میں اختلاف ہے کہ ثواب کی زیادتی کی یہ فضیلت اس جماعت کی نماز کے ساتھ مختص ہے جو مسجد میں ادا کی جائے گی یا اس جماعت کی نماز کے لئے بھی ہے جو مسجد میں نہیں بلکہ گھر وغیرہ میں ادا کی جائے چنانچہ کچھ علماء کی رائے تو یہ ہے کہ یہ فضیلت مسجد کی جماعت کے ساتھ مختص ہے مگر دوسرے بعض علماء کا قول ہے کہ یہ فضیلت عمومی طور پر ہر جماعت کی نماز کے لئے ہے خواہ مسجد میں ادا کی

جانے والی جماعت ہو یا مسجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ۔

ترک جماعت پر وعید

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اٰمُرَ بِحَطَبٍ فَیُحْطَبُ ثُمَّ اٰمُرَ بِالصَّلٰوةِ فَیُؤَذَّنُ لَهَا ثُمَّ اٰمُرَ رَجُلًا فَیَؤُمُّ النَّاسَ ثُمَّ اُخَالِفَ اِلٰی رِجَالٍ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَا یَشْهَدُوْنَ الصَّلٰوةَ فَاُحَرِّقَ عَلَیْهِمْ بُیُوْتَهُمْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ یَعْلَمُ اَحَدُهُمْ اَنَّهٗ یَجِدُ عَرْقًا سَمِیْنًا اَوْ مِرْمَاتَیْنِ حَسَنَتَیْنِ لَشَهِدَ الْعِشَاءَ۔ (رواہ البخاری و لمسلم نحوہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے ارادہ کیا کہ (کسی خادم کو) لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں اور جب لکڑیاں جمع ہو جائیں تو (عشاء) کی نماز کے لئے اذان کہنے کا حکم دوں اور جب اذان ہو جائے تو لوگوں کو نماز پڑھانے کے لئے کسی شخص کو مامور کروں اور پھر میں ان لوگوں کی طرف جاؤں (جو بغیر کسی عذر کے نماز کے لئے جماعت میں نہیں آتے اور ان کو اچانک پکڑوں) ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ (آپ ﷺ نے یہ فرمایا) ان لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے اور ان کے گھروں کو جلا دوں اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے (جو لوگ نماز کے لئے جماعت میں شریک نہیں ہوتے ان میں سے) اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ (مسجد میں) گوشت کی فربہ ہڈی بلکہ گائے یا بکری کے دو اچھے کھر مل جائیں گے تو عشاء کی نماز میں حاضر ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے جماعت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو لوگ جماعت کے لئے مسجدوں میں نہیں آتے ان لوگوں کو عذاب خداوندی میں گرفتار ہونے کی وعید کس مبالغہ کے ساتھ بیان فرمائی جارہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بذات خود ارادہ فرمایا کہ جماعت ترک کر دیں اور ان لوگوں کو جماعت میں حاضر نہ ہونے کے جرم کی سزا دیں۔

آخر حدیث میں ایسے لوگوں کی ذہنی افتاد اور طبعی کمزوری کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ انہیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مسجد میں دنیا کی ایسی حقیر شئی بھی مل جائے گی تو وہ نماز میں شریک ہونے کے لئے بھاگے ہوئے آئیں مگر آخر کی سعادت و ثواب اور حق جل شانہ، کا قرب عظیم و غیر فانی چیز کے حصول کی طرف ان کا میلان نہیں ہوتا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امام کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی عذر کی بناء پر کسی کو اپنا قائم مقام بنا دے اور خود اپنی ضرورت کی وجہ سے چلا جائے۔

نابینا شخص کو بھی جماعت میں شریک ہونے کی تاکید

③ وَعَنْهُ قَالَ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ اَعْمٰی فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَیْسَ لِیْ قَائِدٌ یَقُوْدُنِیْ اِلَی الْمَسْجِدِ فَسَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ یُرَخِّصَ لَهٗ فَیُصَلِّیَ فِیْ بَیْتِهٖ فَرَخَّصَ لَهٗ فَلَمَّا وَلّٰی دَعَاهُ فَقَالَ هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ بِالصَّلٰوةِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاَجِبْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک نابینا شخص (حضرت عبداللہ ابن مکتومؓ) سرور کونین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! میرے لئے ایسا کوئی راہبر نہیں ہے جو مجھے مسجد میں لے جائے۔ پھر انہوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ انہیں گھر میں نماز پڑھ لینے کی رخصت (یعنی اجازت) دے دی جائے، آنحضرت ﷺ نے انہیں اجازت دے دی (اس کے بعد) جب وہ (مجلس نبوی ﷺ سے) واپس لوٹے تو آنحضرت ﷺ نے انہیں (پھر) بلایا اور ان سے فرمایا کہ کیا تم نماز کی اذان سنتے ہو؟ انہوں نے کہا

کہ ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے مسجد میں حاضر ہونا ضروری ہے۔" (مسلم)

تشریح: صحیحین کی حدیث میں منقول ہے کہ "جب حضرت عتبان ابن مالک نے اپنی بینائی کا شکوہ کیا (کہ اس کی وجہ سے میں مسجد میں حاضری سے معذور ہوں) تو آنحضرت ﷺ نے انہیں اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ اپنے گھر ہی میں نماز پڑھ لیا کریں۔" لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ نابینا شخص کو جماعت چھوڑنے کی اجازت ہے مگر جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ ابن مکتوم کو جماعت چھوڑنے کی اجازت نہیں دی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فضلائے مہاجرین میں سے تھے ان کی شان کے لائق یہی بات تھی کہ وہ اولیٰ پر عمل کریں یعنی جماعت میں حاضر ہوا کریں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے انہیں پہلے تو اجازت دے دی مگر پھر وحی آجانے یا اجتہاد کے بدل جانے کی وجہ سے آپ ﷺ نے اجازت واپس لے لی، اس حدیث میں اذان سننے کے بعد مسجد میں حاضری کی ضرورت و اہمیت کو کمال مبالغہ کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

سخت سردی و بارش کی وجہ سے جماعت چھوڑ دینا جائز ہے

(۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ اَذَّنَ بِالصَّلٰوةِ فِیْ لَيْلَةٍ ذَاتِ بَرْدٍ وَرِيْحٍ ثُمَّ قَالَ اَلَا صَلُّوْا فِی الرِّحَالِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْمُرُ الْمُؤَذِّنَ اِذَا كَانَتْ لَيْلَةٌ ذَاتُ بَرْدٍ وَّمَطَرٍ يَقُوْلُ اَلَا صَلُّوْا فِی الرِّحَالِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ایک رات میں جبکہ (سخت) سردی اور ہوا تھی نماز کے لئے اذان دی، اور (اذان سے فارغ ہو کر لوگوں سے) کہا کہ خبردار! اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو" پھر فرمایا کہ سرور کونین ﷺ اس رات میں جبکہ (سخت) سردی اور بارش ہوتی موذن کو حکم دیتے تھے۔ کہ وہ (اذان سننے کے بعد لوگوں سے پکار کر یہ بھی) کہہ دے کہ "خبردار! اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سخت سردی اور بارش بھی ترک جماعت کے لئے عذر ہے ایسے اوقات میں جماعت چھوڑ کر اپنے گھر میں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

حضرت ابن ہمامؒ حضرت ابو یوسفؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ؟ میں نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے پوچھا کہ کیچڑ وغیرہ کی حالت میں جماعت کے لئے آپ کیا حکم دیتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ "جماعت کو چھوڑ دینا مجھے پسند نہیں۔"

کھانا سامنے آجائے تو کھانے سے فارغ ہو کر نماز پڑھنی چاہیے

(۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَ عَشَاءُ اَحَدِكُمْ وَاُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَابْدَؤُا بِالْعَشَاءِ وَلَا يَعْجَلُ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْهُ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يُوْضَعُ لَهُ الطَّعَامُ وَتُقَامُ الصَّلَاةُ فَلَا يَاْتِيْهَا حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْهُ وَاِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قِرَاءَةَ الْاِمَامِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کے سامنے رات کا کھانا رکھا جائے اور (اسی وقت) نماز کی تکبیر کہی جائے تو وہ کھانا شروع کر دے اور کھانا کھانے میں جلدی نہ کرے بلکہ اس سے اطمینان کے ساتھ فارغ ہو۔" اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے کھانا رکھا جاتا اور نماز شروع ہو جاتی تو نماز کے لئے اس وقت تک نہ آتے جب تک کہ کھانے سے فارغ نہ ہو لیتے اور امام کی قرأت سنتے رہتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ظاہر ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ نماز پڑھنے والا بھوکا ہو اور وہ جانتا ہو کہ اس بھوک کی حالت میں نماز پڑھوں گا تو دھیان کھانے ہی میں لگا رہے گا اور نماز دل جمعی اور سکون کے ساتھ ادا نہیں کر سکوں گا تو اس کے لئے یہی اولیٰ ہو گا کہ وہ پہلے کھانا کھالے

اس کے بعد نماز پڑھے بشرطیکہ وقت میں وسعت ہو یعنی اتنا وقت ہو کہ وہ کھانے سے فراغت کے بعد باطمینان نماز پڑھ سکتا ہو۔"

بول براز کی حاجت کے وقت نماز نہ پڑھنی چاہئے

(۶) وَعَنْ عَآئِشَةَ اِنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا صَلٰوةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ وَلَا هُوَ يُدَافِعُهُ الْاَخْبَثَانِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کھانا سامنے ہونے کی صورت میں نماز کامل نہیں ہوتی اور نہ اس حالت میں (نماز پوری ہوتی ہے) جب کہ دو خبیث (یعنی پیشاب و پاخانہ) اس (کی نماز میں حضوری قلب) کو ختم کریں۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے سامنے کھانا آگیا ہو یا اسے پیشاب و پاخانہ کی حاجت ہو تو اسے اس وقت نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ بلکہ وہ ان چیزوں سے فارغ ہو کر نماز پڑھے۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ "جب کسی کے سامنے کھانا آجائے اور اسے کھانے کی خواہش ہو یا اسی طرح بول و براز کا تقاضا ہو تو ایسی صورت میں اسے نماز پڑھنی مکروہ ہے اور ریح وقے بھی اسی حکم میں ہے یعنی ان کو روک کر نماز پڑھے کیونکہ ان کی وجہ سے نماز میں حضوری قلب اور خشوع و خضوع باقی نہ رہے گا جس کی وجہ سے نماز کامل طور پر ادا نہ ہوگی۔ مگر ان سب صورتوں میں وسعت وقت کی شرط ہے اگر وقت تنگ ہو تو بہر صورت نماز پہلے پڑھنی چاہئے۔

فرض نماز کی تکبیر ہو جانے پر دوسری نماز نہیں پڑھنی چاہئے

(۷) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَلَا صَلٰوةَ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جب نماز کھڑی ہو جائے (یعنی فرض نماز کے لئے تکبیر کہی جائے) تو فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز نہ پڑھنی چاہئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مؤذن کے تکبیر کہنے کے بعد فجر کی سنتیں بھی نہ پڑھنی چاہئیں بلکہ امام کے ساتھ فرض نماز میں شریک ہو جانا چاہئے چنانچہ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر فجر کی سنتیں پڑھنے میں فرض کی ایک رکعت بھی ہاتھ لگ جانے کا یقین ہو تو سنتیں پڑھ لی جائیں اس کے بعد جماعت میں شریک ہو جائے تاکہ سنتوں کا ثواب بھی ہاتھ سے نہ جائے اور جماعت کا ثواب بھی مل جائے۔ لیکن اس صورت میں سنتیں صف سے الگ ایک طرف پڑھنی چاہئیں ہاں اگر سنتیں پڑھنے میں فرض نماز کی دونوں رکعتیں فوت ہو جانے کا خوف ہو تو پھر اس صورت میں سنتیں چھوڑ دیں۔

حضرت ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ "اس حدیث میں جو حکم ذکر کیا گیا ہے فجر کی سنتیں اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

صلوھا وان طردتکم الخیل۔

"فجر کی سنتیں (ضرور) پڑھو اگرچہ تمہیں لشکر ہانکے۔"

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ فجر کی سنتوں کو پڑھنے کی بڑی تاکید ہے انہیں چھوڑنا نہیں چاہئے۔

حضرت علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ "فجر کی سنتیں تمام سنتوں میں سب سے زیادہ اہم اور قوی تر ہیں یہاں تک کہ حسنؒ کی

حضرت امام ابوحنیفہؒ سے یہ روایت ہے کہ "فجر کی سنتوں کو بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں۔

عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت

(۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَأْذَنَتِ امْرَأَةُ اَحَدِكُمْ اِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يَمْنَعْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کی عورت مسجد میں جانے کی اجازت مانگے تو اس کو منع مت کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ "یہ نہی کراہت تنزیہی پر محمول ہے اور حضرت مظہرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورتوں کو مسجد میں جانا جائز ہیں لیکن موجودہ دور میں فتنہ کے خوف سے عورتوں کو مسجد میں جانا مکروہ ہے چنانچہ اس کی مؤید بخاریؒ و مسلمؒ کی یہ روایت ہے کہ "حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا "اگر آنحضرت ﷺ اس چیز کو دیکھتے جو عورتوں نے پیدا کی ہے تو بے شک آپ ﷺ ان کو (مسجد جانے سے) منع کر دیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا۔"

نیز حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے عورتوں کو (مسجد میں) جانے سے منع فرمایا مگر بوڑھی عورتوں کو (اجازت دی وہ بھی) کاروبار کے (یعنی میلے اور پرانے) کپڑوں میں۔"

اس کا حال یہ ہے کہ اگر بوڑھی عورتیں بغیر بناؤ سنگار اور خوشبو لگائے بغیر مسجد میں جانا چاہیں تو ان کے لئے ایک حد تک اجازت ہے۔ مگر جوان عورتوں کو تو مسجد میں جانے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ پھر یہ کہ اس زمانہ میں عورتیں مسجدوں میں دینی مسائل و احکام سیکھنے کی خاطر جایا کرتی تھیں لیکن اب تو اس کی بھی احتیاج نہیں کیوں کہ دینی مسائل و احکام اتنے مشہور و واضح ہو چکے ہیں کہ گھر میں بیٹھی عورتوں کو بآسانی معلوم ہو جاتے ہیں۔"

عورتیں خوشبو لگا کر مسجد میں نہ جائیں

(۹) وَعَنْ زَيْنَبَ امْرَأَةِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا شَهِدَتْ اِحْدَاكُنَّ الْمَسْجِدَ فَلَا تَمَسَّ طِيْبًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی زوجہ مطہرہ حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی (عورت) مسجد میں جائے تو وہ خوشبو نہ لگائے۔" (مسلمؒ)

(۱۰) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا امْرَأَةٍ اَصَابَتْ بَخُوْرًا فَلَا تَشْهَدْ مَعَنَا الْعِشَاءَ الْاٰخِرَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جو عورت بخور (یعنی خوشبو) لگائے وہ ہمارے ساتھ عشاء کی نماز میں شریک نہ ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: خوشبودار چیز کا دھواں لینے کو بخور کہتے ہیں جیسے اگر وغیرہ۔ اس حدیث میں خاص طور پر عشاء کے وقت کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ اندھیرے کا وقت ہوتا ہے اس میں کسی فتنہ و شر کے پیدا ہونے کا زیادہ خوف رہتا ہے۔ ویسے اوپر والی حدیث میں گزر ہی چکا ہے کہ آپ ﷺ نے مطلقاً خوشبو لگا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

عورتوں کو گھر ہی میں نماز پڑھنا بہتر ہے

⑪ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَمْنَعُوْا نِسَاءَ کُمُ الْمَسَاجِدَ وَبُیُوْتُھُنَّ خَیْرٌ لَّھُنَّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "تم اپنی عورتوں کو مسجدوں (میں آنے) سے نہ روکو لیکن (نماز پڑھنے کے لئے) ان کی گھر ان کے لئے بہتر ہیں۔" (ابوداؤد)

عورت کو کس جگہ نماز پڑھنا افضل ہے

⑫ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلَاۃُ الْمَرْأَۃِ فِیْ بَیْتِھَا اَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِھَا فِیْ حُجْرَتِھَا وَصَلَاتُھَا فِیْ مَخْدَعِھَا اَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِھَا فِیْ بَیْتِھَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "عورت کا گھر کے اندر (یعنی دالان میں) نماز پڑھنا صحن میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور کوٹھری میں نماز پڑھنا کھلے ہوئے مکان میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عورت جتنا پوشیدہ اور باپردہ ہو کر نماز پڑھے اس کے لئے افضل اور بہتر ہے کیونکہ اس کا سارا دارو مدار پردہ کے اوپر ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ نِعْمَ الصِّھْرُ الْقَبْرُ (یعنی اچھی سسرال قبر ہے۔)

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو نماز پڑھنے کے لئے جس قدر پردہ زیادہ ہو بہتر ہے۔

خوشبو لگا کر مسجد میں جانے والی عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی

⑬ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ حِبِّیْ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تُقْبَلُ صَلَاۃُ اِمْرَأَۃٍ تَطَیَّبَتْ لِلْمَسْجِدِ حَتّٰی تَغْتَسِلَ غُسْلَھَا مِنَ الْجَنَابَۃِ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَی اَحْمَدُ وَالنَّسَائِیُّ نَحْوَہٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اس عورت کی نماز قبول نہیں کی جاتی جو مسجد جانے کے لئے خوشبو لگائے یہاں تک کہ وہ اگر خوشبو لگائے ہوئے ہو تو اچھی طرح غسل نہ کرے جیسا کہ ناپاکی کا غسل کیا جاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ، احمدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث میں بھی اسی بات سے شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ کوئی عورت خوشبو لگا کر مسجد میں جانے کی جرأت نہ کرے یہاں تک کہ اگر کسی نے خوشبو لگا رکھی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ مسجد جاتے وقت غسل کر لے یعنی اگر اس نے پورے بدن پر خوشبو لگا رکھی ہے تو سارا بدن پانی سے دھو ڈالے تاکہ اس کے بدن سے خوشبو جاتی رہے اور اگر بدن کے کسی خاص حصہ پر خوشبو لگی ہوئی ہو تو صرف اسی حصہ کو دھو ڈالے اور اگر خوشبو کپڑوں پر لگی ہوئی ہو تو اس صورت میں وہ کپڑے تبدیل کر دیئے جائیں۔

خوشبو لگے ہوئے بدن کو دھونے یا کپڑے کو بدلنے کا یہ حکم اسی صورت میں ہے جب کہ مسجد میں جانے کا ارادہ کرلے۔ اگر مسجد میں جانے کا ارادہ نہ ہو بلکہ گھر ہی میں نماز پڑھنی ہو تو پھر اس حکم پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔

حضرت ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم خوشبو لگا کر مسجد جانے والی عورتوں کو زجر میں مبالغہ کے طور پر ہے کیونکہ اس صورت میں فتنہ و شر زیادہ پیدا ہوتا ہے معطر عورت کی طرف لوگوں کی رغبت زیادہ ہوتی ہے۔

خوشبو لگا کر باہر نکلنے والی عورتوں کے بارے میں وعید

⑭ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّ عَیْنٍ زَانِیَۃٌ وَاِنَّ الْمَرْأَۃَ اِذَا اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ بِالْمَجْلِسِ فَھِیَ کَذَا وَکَذَا یَعْنِیْ زَانِیَۃٌ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَلِاَبِیْ دَاوٗدَ وَالنَّسَائِیِّ نَحْوُہٗ۔

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "ہر آنکھ زنا کرنے والی ہے (جب کہ وہ کسی غیر عورت کی طرف بری نظر سے دیکھے کیونکہ اجنبی عورت کی طرف بری نظر سے دیکھنا آنکھ کا زنا ہے) اور جو عورت خوشبو لگا کر (مردوں کی) مجلس سے گزرے (اور چاہے کہ لوگ اس کی طرف دیکھیں تو وہ ایسی ہے ایسی ہے یعنی زانیہ ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: جس عورت نے خوشبو لگا کر مردوں کی مجلس میں اپنے آپ کو جلوہ گاہ بنایا تو وہ زانیہ ہے کیونکہ اس نے خوشبو لگا کر غیر مردوں کو اس بات کی رغبت دلائی کہ وہ اس کی طرف دیکھیں اور جب انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ آنکھوں کے زنا میں مبتلا ہوئے اور چونکہ یہ عورت اس فتنہ کا خود باعث بنی اس لئے گو اسی نے زنا کے فعل کا ارتکاب کیا۔

فجر اور عشاء کی نمازوں کی فضیلت

⑮ وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمًا الصُّبْحَ فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ اَشَاھِدٌ فُلَانٌ قَالُوْا لَا قَالَ اَشَاھِدٌ فُلَانٌ قَالُوْا لَا قَالَ اِنَّ ھَاتَیْنِ الصَّلَاتَیْنِ اَثْقَلُ الصَّلَوَاتِ عَلَی الْمُنَافِقِیْنَ وَلَوْ تَعْلَمُوْنَ مَافِیْھِمَا لَاَتَیْتُمُوْھُمَا وَلَوْ حَبْوًا عَلَی الرُّکَبِ وَاِنَّ الصَّفَّ الْاَوَّلَ عَلٰی مِثْلِ صَفِّ الْمَلَائِکَۃِ وَلَوْ عَلِمْتُمْ مَافَضِیْلَتُہٗ لَابْتَدَرْتُمُوْہُ وَاِنَّ صَلَاۃَ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ اَزْکٰی مِنْ صَلَاتِہٖ وَحْدَہٗ وَصَلَاتُہٗ مَعَ الرَّجُلَیْنِ اَزْکٰی مِنْ صَلَاتِہٖ مَعَ الرَّجُلِ وَمَا کَثُرَ فَھُوَ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز سرور کونین ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی جب آپ ﷺ سلام پھیر چکے تو (ایک شخص کا نام لے کر اس کے بارے میں) فرمایا کہ فلاں شخص حاضر ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ نہیں! آپ ﷺ نے (ایک دوسرے شخص کا نام لے کر اس کے بارے میں) فرمایا کہ فلاں شخص حاضر ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ نہیں! (اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "تمام نمازوں میں یہ دونوں (یعنی فجر و عشاء کی) نمازیں منافقین پر بہت گراں گزرتی ہیں، اگر تم جان لیتے کہ ان دونوں نمازوں کا کتنا ثواب ہے، تو تم (دوڑ کر اور) گھٹنوں کے بل (یعنی افتاں وخیزاں) آتے اور (ثواب و فضیلت نیز تقرب الی اللہ کے سلسلہ میں) پہلی صف فرشتوں کی صف کی طرح ہے اگر تم پہلی صف کی فضیلت جان لو تو اس میں شامل ہونے کے لئے جلدی پہنچنے کی کوشش کرنے لگو اور آدمی کا اکیلے نماز پڑھنے سے دوسرے آدمی کے ساتھ مل کر پڑھنا زیادہ ثواب کا باعث ہے اور دو آدمیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا ایک آدمی کے ساتھ نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب کا باعث ہے اور جس قدر زیادہ (نمازی ایک ساتھ یعنی جماعت سے نماز پڑھتے) ہوں اللہ کے نزدیک یہ سب سے محبوب ہے۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: منافق کا ہر عمل ریا پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی ہر عبادت نمائش کی خاطر ہوتی ہے چنانچہ فجر و عشاء کے علاوہ دوسری نمازیں تو منافقین پر زیادہ گراں نہیں گزرتیں کیونکہ ان نمازوں میں نہ صرف یہ کہ زیادہ کسل و سستی نہیں ہوتی بلکہ ریا و نمائش بھی خوب ہو جاتی ہے برخلاف اس کے کہ فجر و عشاء کی نماز میں چونکہ محنت زیادہ پڑتی ہے، کسل بھی ہوتا ہے اور پھر یہ ہے کہ ریا و نمائش کا زیادہ موقع نہیں ملتا اس لئے یہ دونوں نمازیں ان پر بڑی گراں گزرتی ہیں۔ اسی کی طرف اس حدیث میں اشارہ فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد ان دونوں نمازوں کی فضیلت کو ظاہر کر دیا گیا ہے تاکہ مخلص و صادق مسلمان ان نمازوں کی سعادت سے کسی بھی وجہ سے محروم نہ رہیں۔

جماعت سے نماز پڑھنے والوں پر شیطان غالب نہیں ہوتا

(۱۶) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَامِنْ ثَلَاثَۃٍ فِی قَرْیَۃٍ وَلَا بَدْوٍ لَا تُقَامُ فِیْھِمُ الصَّلٰوۃُ اِلَّا قَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطَانُ فَعَلَیْکَ بِالْجَمَاعَۃِ فَاِنَّمَا یَاکُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِیَۃَ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت ابودرداءؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جس بستی اور جنگل میں تین آدمی ہوں اور جماعت سے نماز نہ پڑھتے ہوں تو ان پر شیطان غالب رہتا ہے لہٰذا تم جماعت کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ اس بکری کو بھیڑیا کھا جاتا ہے جو ریوڑ سے الگ ہو (کر تنہا رہ) جاتی ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اجتماعیت میں فلاح و کامیابی ہے اور انفرادیت میں خسران و ناکامی، چنانچہ اسلام اپنے متبعین کو اجتماعیت کی تعلیم بڑی اہمیت کے ساتھ دیتا ہے اور اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ اگر اپنی قوم و ملی شان و شوکت کو برقرار رکھنا ہے اور اپنی امتیازی حیثیت کو پوری طاقت کے ساتھ دنیا سے منوانا ہے تو پھر اجتماعیت کے راستہ سے کبھی انحراف نہ کرنا، یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اکثر و بیشتر عبادات شان اجتماعیت کی حامل ہیں۔

یہ تو دنیا کی دیکھی بات ہے کہ جو شخص تن تنہا رہتا ہے نہ تو اس کی کوئی حیثیت و وقعت ہوتی ہے اور نہ اس کی کسی بات میں کوئی طاقت ہوتی ہے جب کوئی چاہتا ہے بڑی آسانی کے ساتھ اس پر قابو پالیتا ہے لیکن جو افراد اجتماعیت کے ساتھ رہتے ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی ہر بات میں ایک وزن ہوتا ہے بلکہ ان کی قوت و طاقت سے سب ہی لوگ مرعوب رہتے ہیں۔ یہی حالت شیطان کی ہے کہ کسی تنہا مسلمان پر اس کا اثر بہت جلدی ہو جاتا ہے مگر اس کے برخلاف مسلمانوں کی کسی جماعت پر اس کے مکر و فریب کا جادو نہیں چلتا۔

چنانچہ اس حدیث میں یہی بتایا جا رہا ہے کہ اگر کسی بستی یا کسی جنگل میں تین اشخاص رہتے ہوں اور اس کی مثال یہ دی گئی ہے کہ جس طرح ایک بھیڑیا بکریوں کے کسی ریوڑ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا مگر جب کوئی بکری ریوڑ سے الگ ہو کر بالکل تنہا رہ جاتی ہے تو بھیڑیا اسے آن واحد میں اپنی غذا بنا لیتا ہے۔

بغیر عذر جماعت میں شریک نہ ہونے والے نمازی کی نماز قبول نہیں ہوتی

(۱۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمِعَ الْمُنَادِیَ فَلَمْ یَمْنَعْہُ مِنِ اتِّبَاعِہٖ عُذْرٌ قَالُوْا وَمَا الْعُذْرُ قَالَ خَوْفٌ اَوْ مَرَضٌ لَمْ تُقْبَلْ مِنْہُ الصَّلٰوۃُ الَّتِی صَلّٰی۔ (رواہ ابوداؤد و الدار قطنی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جو شخص اذان کہنے والے (یعنی مؤذن) کی اذان سنے اور مؤذن کی تابعداری (یعنی مسجد پہنچ کر جماعت میں شریک ہونے) سے اسے کوئی عذر نہ روکے، لوگوں نے پوچھا کہ عذر کیا ہے؟ فرمایا کہ "(دشمن سے) ڈرنا، بیماری" تو اس کی نماز جو بغیر جماعت (اگرچہ مسجد ہی میں) پڑھے قبول نہیں کی جاتی۔" (ابوداؤدؒ، دار قطنیؒ)

تشریح: حضرت ابن عباسؓ یہ حدیث بیان فرما رہے تھے کہ لوگوں نے درمیان میں پوچھا کہ وہ کیا عذر ہے جو جماعت سے روک سکتا ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ڈر، خواہ کسی دشمن سے جان کا ہو یا مال و آبرو کا، یا کوئی سخت بیماری ہو" حضرت ابن مالکؒ نے "ڈر" کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈر خواہ تو کسی کے ظلم کا شکار ہو جانے کا ہو یا ڈر کسی قرضدار کا ہو ایسی صورت میں کہ وہ اپنی مفلسی کی وجہ سے قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو۔ ان اعذار کے علاوہ اس سے پہلے بقیہ عذر ذکر کئے جا چکے ہیں مثلاً سخت سردی و بارش یا کھانا سامنے آچکا ہو، یا استنجے کی حاجت ہو یہ سب چیزیں ترک جماعت کے حق میں معقول عذر ہیں۔ اسی طرح بیماری بھی عذر ہے، مگر ایسی بیماری جس کی وجہ سے مسجد میں پہنچنا ممکن نہ ہو۔

بہر حال اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص مؤذن کی اذان سنے اور پھر مؤذن کی تابعداری کرے یعنی جماعت میں بلاعذر شریک نہ ہو تو اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی عذر کی بنا پر جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز قبول ہو جائے گی لیکن اتنی بات سمجھ لیجئے کہ یہاں "قبول نہ ہونے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی نماز سرے سے ادا نہیں ہوگی بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ اس کے ذمہ سے نماز کی فرضیت تو ساقط ہو جائے گی مگر اسے نماز کا ثواب نہیں ملے گا۔ جیسا کہ اگر کوئی شخص غصب کی گئی زمین پر نماز پڑھے تو اس کے ذمہ سے نماز کی فرضیت تو ساقط ہو جاتی ہے مگر اسے نماز کا ثواب نہیں ملتا یا اسی طرح اگر کوئی شخص حرام مال سے حج کرے تو اس کے ذمہ سے فرض تو اتر جاتا ہے مگر اسے ثواب نہیں ملتا۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس حدیث اور اس سے پہلے گزرنے والی حدیث کے پیش نظر کسی شخص کے لئے قصداً بلاعذر جماعت ترک کرنے کی مطلقاً اجازت نہیں ہے۔

جماعت کھڑی ہو جائے اور استنجے کی حاجت ہو تو پہلے استنجے سے فارغ ہو جانا چاہئے

(۱۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ وَوَجَدَ اَحَدُکُمُ الْخَلَاءَ فَلْیَبْدَأْ بِالْخَلَاءِ۔ (رواہ الترمذی وروی مالک و ابوداؤد و النسائی نحوہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن ارقمؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اگر نماز (کے لئے) جماعت کھڑی ہو جائے اور تم میں سے کسی کو پاخانہ کی حاجت ہو تو اسے چاہئے کہ وہ پہلے پاخانہ کو چلا جائے (اگرچہ جماعت ترک ہو جائے)۔"

(ترمذیؒ، مالکؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تین چیزوں کی ممانعت

(۱۹) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ یَفْعَلَھُنَّ لَا یَؤُمَّنَّ رَجُلٌ قَوْمًا فَیَخُصَّ نَفْسَہٗ بِالدُّعَاءِ دُوْنَھُمْ فَاِنْ فَعَلَ ذٰلِکَ فَقَدْ خَانَھُمْ وَلَا یَنْظُرُ فِیْ قَعْرِبَیْتٍ قَبْلَ اَنْ یَسْتَاْذِنَ فَاِنْ فَعَلَ ذَالِکَ فَقَدْ خَانَھُمْ وَلَا یُصَلِّ وَھُوَ حَقِنٌ حَتّٰی یَتَخَفَّفَ۔ (رواہ ابوداؤد و للترمذی نحوہ)

"اور حضرت ثوبان راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "تین چیزیں ایسی ہیں جن کا کرنا کسی کے لئے حلال نہیں ہے۔ اول تو یہ کہ کوئی شخص کبھی جماعت کا امام بنے اور دعاء میں جماعت کو شریک کئے بغیر اپنی ذات کو مخصوص کرے اگر کسی نے ایسا کیا تو اس نے جماعت کے ساتھ خیانت کی۔

دوم یہ کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں اجازت حاصل کئے بغیر نظر نہ ڈالے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو اس نے گھر والوں کے ساتھ خیانت کی۔

سوم یہ کہ کوئی شخص ایسی حالت میں نماز نہ پڑھے کہ وہ پیشاب یا پاخانہ تو کئے ہوئے ہو یہاں تک کہ وہ (استنجے سے فارغ ہو کر) ہلکا ہو جائے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

کھانے کی وجہ سے نماز میں تاخیر کی ممانعت

(۲۰) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُؤَخِّرُوا الصَّلٰوۃَ لِطَعَامٍ وَلَا لِغَیْرِہٖ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے (صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ "کھانے کے لئے یا کسی اور وجہ سے نماز کو (اس کے وقت سے) مؤخر نہ کرو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: اس سے پہلے ایک حدیث نمبر ۶ گزر چکی ہے جس سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ (جب کھانا سامنے آجائے تو) پہلے کھانا کھا لیا جائے اور

اس کے بعد نماز پڑھی جائے اور یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ کھانے وغیرہ کی خاطر نماز کو مؤخر نہ کیا جائے، چونکہ ان دونوں احادیث میں تعارض واقع ہو رہا ہے اس لئے سمجھ لیجئے کہ یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ اگر کھانا کھانے کی صورت میں نماز کا وقت ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو پھر یہی حکم ہے کہ نماز کو مؤخر نہ کیا جائے۔

اور حدیث نمبر۶ کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ وقت میں وسعت ہو اور کھانا سامنے آچکا ہو نیز کھانے کی خواہش بھی ہو تو یہ حکم ہو گا کہ پہلے کھانا کھالیا جائے اس کے بعد نماز پڑھی جائے۔ اس تشریح سے دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض باقی نہیں رہا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جماعت سے نماز پڑھنے کی تاکید

(۲۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُنَا وَمَا يَتَخَلَّفُ عَنِ الصَّلَاةِ اِلَّا مُنَافِقٌ قَدْ عُلِمَ نِفَاقُهٗ اَوْ مَرِيْضٌ اِنْ كَانَ الْمَرِيْضُ لَيَمْشِي بَيْنَ رَجُلَيْنِ حَتّٰى يَاْتِيَ الصَّلٰوةَ وَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَّمَنَا سُنَنَ الْهُدٰى وَاِنَّ مِنْ سُنَنِ الْهُدٰى اَلصَّلَاةُ فِي الْمَسْجِدِ الَّذِيْ يُؤَذَّنُ فِيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَلْقَى اللّٰهَ غَدًا مُسْلِمًا فَلْيُحَافِظْ عَلٰى هٰذِهِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ حَيْثُ يُنَادٰى بِهِنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ شَرَعَ لِنَبِيِّكُمْ سُنَنَ الْهُدٰى وَاِنَّهُنَّ مِنْ سُنَنِ الْهُدٰى وَلَوْ اَنَّكُمْ صَلَّيْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ كَمَا يُصَلِّيْ هٰذَا الْمُتَخَلِّفُ فِيْ بَيْتِهٖ لَتَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ وَلَوْ تَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ لَضَلَلْتُمْ وَمَا مِنْ رَجُلٍ يَتَطَهَّرُ فَيُحْسِنُ الطُّهُوْرَ ثُمَّ يَعْمِدُ اِلٰى مَسْجِدٍ مِنْ هٰذِهِ الْمَسَاجِدِ اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِكُلِّ خَطْوَةٍ يَخْطُوْهَا حَسَنَةً وَرَفَعَهٗ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْهُ بِهَا سَيِّئَةً وَلَقَدْ رَأَيْتُنَا وَمَا يَتَخَلَّفُ عَنْهَا اِلَّا مُنَافِقٌ مَعْلُوْمُ النِّفَاقِ وَلَقَدْ كَانَ الرَّجُلُ يُؤْتٰى بِهٖ يُهَادٰى بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ حَتّٰى يُقَامَ فِي الصَّفِّ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے دیکھا ہے کہ نماز باجماعت سے صرف وہی منافق لوگ پیچھے رہ جاتے تھے جن کا نفاق معلوم اور کھلا ہوا تھا (یعنی جن لوگوں کا نفاق پوشیدہ تھا وہ بھی جماعت میں حاضر ہوتے تھے) یا بیمار رہ جاتے تھے (یعنی جس مریض کو مسجد آنے کی کچھ نہ کچھ طاقت ہوتی تھی وہ بھی جماعت میں آتا تھا چنانچہ "جو مریض دو آدمیوں کے درمیان (یعنی ان کے سہارے سے) چل سکتا تھا وہ بھی نماز میں آتا تھا۔ (اس کے بعد) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا" بے شک سرور کونین ﷺ نے ہمیں ہدایت کے طریقے سکھائے ہیں اور ہدایت کے ان طریقوں میں سے (ایک طریقہ) اس مسجد میں (جماعت سے) نماز پڑھنا ہے جس میں اذان دی جاتی ہو۔" ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا "جس شخص کے لئے یہ بات خوش کن ہو کہ وہ کل کے دن خدا سے کامل مسلمان کی حیثیت سے ملاقات کرے تو اسے چاہئے کہ وہ ان پانچوں نمازوں کی اس جگہ حفاظت کرے جہاں ان نمازوں کے لئے اذان دی جاتی ہو (یعنی مسجد میں ان پانچوں نمازوں کو جماعت کے ساتھ پابندی سے ادا کرتا رہے) کیونکہ اللہ جل شانہ نے تمہارے نبی کریم ﷺ کے لئے ہدایت کے (تمام) طریقے مقرر کر دیئے تھے اور ان پانچوں نمازوں کو جماعت سے پڑھنا بھی ہدایت کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ اگر تم اپنی نماز کو اپنے گھروں میں (اگرچہ جماعت سے) پڑھو گے جیسا کہ یہ پیچھے رہنے والا (یعنی منافق) نماز پڑھتا ہے تو "سمجھ لو کہ "تم اپنے نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑنے والے ہو گے اور اگر اپنے نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑ دو گے تو بیشک گمراہ ہو جاؤ گے۔ اور جو شخص پاک ہو کر اچھی طرح وضو کرتا ہے (یعنی وضو کے پورے حقوق و آداب کا لحاظ رکھتا ہے اور اس کے تمام واجبات و سنن کو ادا کرتا ہے" اور پھر ان مساجد میں سے کسی مسجد میں جاتا ہے تو خداوند قدوس اس کے ہر قدم کے بدلہ جو وہ (مسجد کی راہ میں" رکھتا ہے ایک نیکی لکھتا ہے اور اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور ایک برائی کو اس سے دور کر دیتا ہے، ہم نے دیکھا ہے کہ کھلے ہوئے منافق کے علاوہ کوئی

شخص جماعت سے پیچھے نہ رہتا تھا (یعنی جماعت ترک نہ کرتا تھا) یہاں تک کہ بیمار آدمی اس حالت میں نماز میں لایا جاتا کہ وہ (انتہائی ضعف و کمزوری کی وجہ سے دو آدمیوں کا سہارا لئے ہوئے ہوتا اور اس کو صف میں لا کھڑا کر دیا جاتا تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: سنن الھدی (ہدایت کے طریقے) ان طریقوں اور راستوں کو کہتے ہیں جن پر عمل کرنا ہدایت کا موجب اور حق تعالیٰ جل شانہ کے قرب اور اس کی رضاء کا باعث ہو۔

آنحضرت ﷺ کے افعال کی قسمیں! آنحضرت ﷺ کے افعال دو نوعیت کے ہوتے تھے! ایک قسم کے افعال تو وہ تھے۔ جنہیں آنحضرت ﷺ بطور عبادت کرتے تھے۔ دوسرے قسم کے افعال وہ تھے جو آپ ﷺ بطریق عادت کرتے تھے۔ جن افعال کو آپ ﷺ بطریق عادت کرتے تھے انہیں "سنن زوائد" کہا جاتا ہے اور جن افعال کو آپ ﷺ بطریق عبادت کرتے تھے انہیں "سنن ہدیٰ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پھر سنن ہدیٰ کی دو قسمیں ہیں ① سنن مؤکدہ۔ ② سنن غیر مؤکدہ۔

سنن مؤکدہ۔ وہ افعال ہیں جنہیں آپ ﷺ نے بطریق مواظبت کے کیا اور لوگوں کو ان افعال کے کرنے کی تاکید فرمائی۔

سنن غیر مؤکدہ۔ وہ افعال ہیں جو نہ تو آپ ﷺ سے بطریق مواظبت کے صادر ہوتے تھے اور نہ ان پر عمل کرنے کے لئے لوگوں کو تاکید فرماتے تھے۔

اس حدیث میں جس سنن ہدیٰ کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے مراد "سنن مؤکدہ" ہیں۔ جو حضرات جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں یہ تعریف ان کے نقطہ نظر کے بھی منافی نہیں ہے کیونکہ لغۃً واجب بھی سنن ہدیٰ کی تعریف میں داخل ہے۔

احمدؒ اور طبرانیؒ نے آنحضرت ﷺ سے مرفوعًا یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ظلم پورا ظلم، کفر اور نفاق (کا حامل شخص) وہ (شخص) ہے کہ اللہ کے پکارنے والے کو سنا کہ وہ مسجد کی طرف (نماز کی جماعت میں شریک ہونے کے لئے) پکارتا ہے مگر اس (شخص نے) جواب نہیں دیا (یعنی مسجد میں پہنچ کر جماعت میں شریک نہیں ہوا) اس روایت کی روشنی میں معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے بارے میں جو مسجد میں ہونے والی جماعت کو ترک کرتے ہیں آنحضرت ﷺ کی یہ سخت ترین وعید ہے۔

کما یصلی ھذا المتخلف فی بیتہ (جیسا کہ یہ پیچھے رہنے والا شخص اپنے گھر میں نماز پڑھتا ہے) بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خاص شخص تھا جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتا تھا چنانچہ ابن مسعودؓ نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح یہ شخص جماعت کی سعادت سے اپنے آپ کو محروم کر کے گھر میں نماز پڑھ لیتا، اسی طرح اگر تم لوگ بھی اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے تو یہ سمجھ لو کہ اس شخص کی طرح تمہارا بھی یہ فعل آنحضرت ﷺ کی سنت کو چھوڑنے کے مرادف ہوگا اور ظاہر ہے کہ سنت کو ترک کرنے والا شخص ضلالت و گمراہی کی تباہ کن کھائی میں گرتا ہے۔

جماعت کو چھوڑنے والا سخت گناہ گار ہوتا ہے

㉒ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْلَا مَافِی الْبُيُوْتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالذُّرِّيَّةِ اَقَمْتُ صَلٰوةَ الْعِشَاءِ وَاَمَرْتُ فِتْيَانِیْ يُحَرِّقُوْنَ مَافِی الْبُيُوْتِ بِالنَّارِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "اگر گھر میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں عشاء کی نماز قائم کر کے خادموں کو حکم دیتا کہ (جو لوگ نماز میں حاضر نہیں ہوئے ان کے) گھر بار آگ میں جلا دیئے جائیں۔" (احمدؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں اور بچوں کے لئے جماعت سے نماز پڑھنا چونکہ واجب نہیں ہے اس لئے ان کو بچانے کا خیال ضروری ہے کہ یہ بے خطا دوسروں کی سزا میں تکلیف نہ پا جائیں۔ اگر عورتیں اور بچے گھروں میں نہ ہوتے تو عشاء کی نماز قائم کرنے

کا حکم دیتا اور صحابہؓ سے کہتا کہ جو لوگ جماعت میں حاضر نہیں ہوئے ہیں ان کو اُن کے گھر کے اسباب کو آگ کے شعلوں میں جھونک دیا جائے تاکہ انہیں احساس ہو کہ جماعت کو ترک کرنے کی سزا کیا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ جماعت چھوڑنے والا سخت گناہ گار ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسے جلانے کا قصد فرمایا۔

اذان ہو جانے کے بعد بغیر نماز پڑھے مسجد سے نہ نکلنے کا حکم

(۲۳) وَعَنْهُ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كُنْتُمْ فِي الْمَسْجِدِ فَنُوْدِيَ بِالصَّلٰوةِ فَلَا يَخْرُجْ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُصَلِّيَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ تم مسجد میں موجود ہو اور نماز کے لئے اذان ہو جائے تو تم میں سے کوئی شخص بغیر نماز پڑھے مسجد سے نہ نکلے۔" (احمدؒ)

تشریح: علماء حنفیہ کے نزدیک اذان کے بعد مسجد سے نہ نکلنے کا یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو کسی دوسری جماعت کا منتظم نہ ہو یعنی اگر کوئی شخص کسی دوسری مسجد کا امام ہو تو اذان کے بعد مسجد سے جا سکتا ہے اگر کوئی شخص دوسری مسجد کا امام نہ ہو یا جا کر واپس آنے کا قصد نہ کرے تو اس کو اذان سن کر مسجد سے نکلنا جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص نماز پڑھ چکا ہے تو اس کے لئے مسجد سے نکلنا مکروہ نہیں لیکن ظہر اور عشاء میں نماز میں اگر مؤذن تکبیر کہنی شروع کر دے تو اسے بھی نماز پڑھ لینے کے باوجود جماعت میں شریک ہونا چاہئے تاکہ ترک جماعت کا الزام نہ آئے دوسرے آئمہ کے نزدیک ایسی صورت میں ہر نماز میں شریک ہو جانا چاہئے۔ ان کے یہاں ظہر و عشاء کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

(۲۴) وَعَنْ اَبِي الشَّعْثَاءِ قَالَ خَرَجَ رَجُلٌ مِّنَ الْمَسْجِدِ بَعْدَ مَا اُذِّنَ فِيْهِ فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ اَمَّا هٰذَا فَقَدْ عَصٰى اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوشعثاء فرماتے ہیں کہ (ایک دن) اذان ہو جانے کے بعد ایک شخص مسجد سے نکلا تو حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ "اس شخص نے ابوالقاسم (یعنی رسول اللہ) ﷺ کی نافرمانی کی۔" (مسلمؒ)

(۲۵) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْرَكَهُ الْاَذَانُ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ خَرَجَ لَمْ يَخْرُجْ لِحَاجَةٍ وَّهُوَ لَا يُرِيْدُ الرَّجْعَةَ فَهُوَ مُنَافِقٌ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عثمان ابن عفانؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جو شخص مسجد میں ہو اور اذان ہو جائے پھر وہ بغیر کسی ضرورت کے مسجد سے چلا جائے اور (جماعت میں شریک ہونے کے لئے) واپس آنے کا ارادہ بھی نہ رکھتا ہو تو وہ منافق ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: اگر کوئی شخص مسجد میں موجود ہو اور اذان ہو جائے اور پھر وہ جماعت کی سعادت سے منہ موڑ کر مسجد سے چلا جائے تو یہ بڑی بد بختی کی بات ہے۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ ایسا شخص ترک جماعت کا گناہ گار ہونے کی وجہ سے منافق کی طرح ہوتا ہے۔

زبان و عمل سے اذان کا جواب نہ دینے والے کی نماز کامل نہیں ہوتی

(۲۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يُجِبْهُ فَلَا صَلَاةَ لَهٗ اِلَّا مِنْ عُذْرٍ۔ (رواہ الدار قطنی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اذان سنی اور اس کا جواب نہ دیا تو اس کی نماز (کامل یا قبول) نہیں ہوتی مگر کسی عذر کی وجہ سے (ایسا کیا تو مضائقہ نہیں۔" (دار قطنیؒ)

تشریح: اذان کا جواب دینا ایک تو زبان سے ہوتا ہے جیسے مؤذن کلمات اذان کہے تو سننے والا ان کلمات کو دہرائے اور ایک جواب عمل سے ہوتا ہے چنانچہ جو شخص مؤذن کی اذان سن کر مسجد میں جماعت سے نماز پڑھنے کے لئے آتا ہے وہ اپنے عمل سے مؤذن کی اذان کا جواب دیتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زبان و عمل دونوں کے جواب پر نماز کی قبولیت اور نماز کی تکمیل موقوف ہے یعنی جس شخص نے اذان سن کر اس کا جواب نہ تو زبان سے دیا اور نہ مسجد میں آکر عمل سے دیا تو اس کی نماز پائے تکمیل اور رباب قبولیت کو نہیں پہنچتی اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اصل جواب عمل یعنی مسجد میں آنا ہی ہے اور اس کی زیادہ تاکید ہے۔

نابینا شخص کو بھی جماعت نہ چھوڑنی چاہئے

(۲۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ اُمِّ مَكْتُوْمٍ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْمَدِيْنَةَ كَثِيْرَةُ الْهَوَامِ وَالسِّبَاعِ وَاَنَا ضَرِيْرُ الْبَصَرِ فَهَلْ تَجِدُلِيْ مِنْ رُخْصَةٍ فَقَالَ هَلْ تَسْمَعُ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَحَيَّ هَلًا وَلَمْ يُرَخِّصْ۔

(رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مکتوم فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مدینہ میں موذی جانور اور درندے بہت ہیں اور میں نابینا ہوں (اس عذر کی وجہ سے) کیا آپ ﷺ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں جماعت میں نہ آؤں اور اپنی نماز گھر پڑھ لوں) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن) کر فرمایا کیا تم حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح سنتے ہو؟ میں نے عرض کیا "جی ہاں" فرمایا "جماعت میں آیا کرو" اور انہیں جماعت چھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے خاص طور پر حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح کا ذکر کیا کیونکہ ان الفاظ میں نماز کی طرف بلانا اور ترغیب ہے۔

(۲۸) وَعَنْ اُمِّ الدَّرْدَاءِ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ اَبُوالدَّرْدَاءِ وَهُوَ مُغْضَبٌ فَقُلْتُ مَا اَغْضَبَكَ قَالَ وَاللّٰهِ مَا اَعْرِفُ مِنْ اَمْرِ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا اِلَّا اَنَّهُمْ يُصَلُّوْنَ جَمِيْعًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ام درداء فرماتی ہیں کہ (ایک روز میرے خاوند) حضرت ابو درداء میرے پاس غصہ میں بھرے ہوئے آئے (ان کی حالت دیکھ کر) میں نے پوچھا کہ کس چیز نے آپ کو غضبناک بنایا؟ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم! سرور کونین ﷺ کی امت کے بارے میں (پہلی جیسی) ایک یہی بات جانتا تھا کہ وہ جماعت سے نماز پڑھتے ہیں (مگر اب اسے بھی چھوڑ دیتے ہیں)۔" (بخاری)

فجر کی نماز جماعت سے پڑھنا رات بھر عبادت کرنے سے بہتر ہے

(۲۹) وَعَنْ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ سُلَيْمَانَ بْنِ اَبِيْ حَثْمَةَ قَالَ اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَقَدَ سُلَيْمَانَ بْنَ اَبِيْ حَثْمَةَ فِيْ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَاِنَّ عُمَرَ غَدَا اِلَى السُّوْقِ وَمَسْكَنُ سُلَيْمَانَ بَيْنَ الْمَسْجِدِ وَالسُّوْقِ فَمَرَّ عَلَى الشِّفَاءِ اُمِّ سُلَيْمَانَ فَقَالَ لَهَا لَمْ اَرَ سُلَيْمَانَ فِي الصُّبْحِ فَقَالَتْ اِنَّهُ بَاتَ يُصَلِّيْ فَغَلَبَتْهُ عَيْنَاهُ فَقَالَ عُمَرُ لَاَنْ اَشْهَدَ صَلَاةَ الصُّبْحِ فِيْ جَمَاعَةٍ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَقُوْمَ لَيْلَةً۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت ابوبکر ابن سلیمان ابن ابی حثمہ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) حضرت عمر فاروق نے فجر کی نماز میں (میرے والد) حضرت سلیمان ابن ابی حثمہ کو نہیں پایا۔ حضرت عمر جب صبح کو بازار جانے لگے تو سلیمان کا مکان مسجد اور بازار کے درمیان تھا اس لئے وہ سلیمان کی والدہ شفاء کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ "(کیا بات ہے) آج میں نے سلیمان کو فجر کی نماز میں نہیں دیکھا؟ سلیمان کی والدہ کہنے لگیں (کہ بات یہ ہوئی) کہ سلیمان نے آج پوری رات نماز پڑھنے میں گزاری اور (صبح ہوتے ہوتے) ان کی آنکھ لگ گئی (اس لئے وہ نماز فجر میں حاضر نہ

ہو سکے، حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں صبح کی نماز جماعت سے پڑھ لینا رات بھر (عبادت کے لئے) کھڑے رہنے سے بہتر سمجھتا ہوں۔" (مالکؒ)

تشریح: اس حدیث سے نماز فجر با جماعت پڑھنے کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ لگایئے کہ حضرت سلیمانؓ رات بھر عبادت خداوندی میں مصروف رہے اور نماز پڑھتے رہے مگر صبح ہوتے ہوتے آنکھ لگ جانے کی وجہ سے چونکہ وہ فجر کی جماعت میں شریک نہ ہو سکے تو حضرت عمرؓ نے ان کی والدہ سے فرمایا کہ میرے نزدیک یہ افضل نہیں ہے کہ رات بھر عبادت کی جائے مگر فجر کی جماعت چھوڑ دی جائے اگر کوئی شخص رات بھر عبادت خداوندی میں مشغول رہنے کے باوجود فجر کی جماعت میں شامل ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے افضل کوئی بات ہی نہیں ہے۔ مگر رات بھر عبادت خداوندی میں مصروف رہنے اور پھر بعد میں بتقاضائے بشریت آنکھ وغیرہ لگ جانے کی وجہ سے فجر کی جماعت ترک ہو جائے تو میں اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ بہتر ہے کہ رات بھر آرام کیا جائے اور فجر کی جماعت میں پابندی سے شرکت کی جائے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رات میں عبادت کرنے اور تہجد کی نماز پڑھنے سے فجر کی جماعت میں شریک ہونا زیادہ فضیلت کی بات ہے۔

دو آدمیوں کی جماعت ہو جاتی ہے

(۳۰) وَعَنْ اَبِی مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِثْنَانِ فَمَا فَوْقَهُمَا جَمَاعَةٌ۔ (رواه ابن ماجة)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "دو شخص ہوں یا دو سے زیادہ ہوں، ان سے جماعت (ہو سکتی) ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جماعت کے انعقاد کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ بہت بڑی تعداد میں لوگ ہوں یا کم سے کم تین آدمیوں کا ہونا ضروری ہے بلکہ اگر صرف دو آدمی ہوں اور ان میں سے ایک امام بن جائے اور دوسرا مقتدی، اس طرح دونوں مل کر نماز پڑھ لیں تو جماعت ہو جاتی ہے اور دونوں کو جماعت کا ثواب مل جاتا ہے۔

عورتوں کے مسجد جانے کا مسئلہ

(۳۱) وَعَنْ بِلَالِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَمْنَعُوا النِّسَآءَ حُظُوْظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ اِذَا اسْتَأْذَنَّكُمْ فَقَالَ بِلَالٌ وَاللّٰهِ لَنَمْنَعُهُنَّ فَقَالَ لَهٗ عَبْدُاللّٰهِ اَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَقُوْلُ اَنْتَ لَنَمْنَعُهُنَّ وَفِيْ رِوَايَةِ سَالِمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ فَاَقْبَلَ عَلَيْهِ عَبْدُاللّٰهِ فَسَبَّهٗ سَبًّا مَا سَمِعْتُ سَبَّهٗ مِثْلَهٗ قَطُّ وَقَالَ اُخْبِرُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَقُوْلُ وَاللّٰهِ لَنَمْنَعُهُنَّ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت بلال ابن عبداللہؒ اپنے والد مکرم (حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے (ایک روز) کہا کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا کہ "جب عورتیں تم سے مسجد جانے کی اجازت مانگیں تو تم انہیں (روک کر) ان کو مساجد کے حصہ سے محروم نہ کرو (یعنی مسجد میں جانے کا ثواب انہیں ملتا ہے تو انہیں مسجدوں میں جانے سے روک کر اس ثواب کے حاصل کرنے سے نہ روکو) بلالؒ نے کہا کہ "خدا کی قسم ہم تو انہیں ضرور منع کریں گے" حضرت عبداللہؓ نے بلالؒ سے فرمایا کہ "میں تو کہہ رہا ہوں کہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے اور تم کہتے ہو کہ ہم تو انہیں ضرور منع کریں گے۔ ایک دوسری روایت میں حضرت سالم نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ "پھر (اس کے بعد) حضرت عبداللہؓ بلالؒ کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں اس قدر برا بھلا کہا کہ میں نے تو کبھی حضرت عبداللہؓ کی زبان سے انہیں اس قدر برا بھلا کہتے نہیں سنا اور پھر کہا کہ "میں تو کہتا ہوں یہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے اور تم کہتے ہو کہ ہم انہیں ضرور منع کریں گے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ بلالؓ سے اس لئے ناراض ہوئے اور انہیں برا بھلا کہا کہ انہوں نے بظاہر ایسے الفاظ سے جواب دیا جن سے اپنی رائے کے ساتھ حدیث کا مقابلہ کرنا معلوم ہوتا تھا۔ اگر بلالؓ اس کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے کہتے کہ اب اس زمانہ میں عورتوں کا مسجد میں جانا مناسب نہیں ہے تو حضرت عبداللہؓ ناراض نہ ہوتے، یہی وجہ ہے کہ علماء نے ماحول کی نزاکت کے پیش نظر عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں لکھا ہے کہ "ہمارے زمانہ میں امام عورتوں کی نیت نہ کرے۔

اس سلسلہ میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ موجودہ دور کے تمام علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اب اس زمانہ میں جب کہ فتنہ و شر کا دور دورہ ہے عورتوں کے لئے مسجد میں جانا مکروہ ہے۔

(۳۲) وَعَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَمْنَعَنَّ رَجُلٌ اَهْلَهُ اَنْ يَاْتُوا الْمَسَاجِدَ فَقَالَ ابْنٌ لِعَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَاِنَّا نَمْنَعُهُنَّ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ اُحَدِّثُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَقُوْلُ هٰذَا قَالَ فَمَا كَلَّمَهُ عَبْدُاللّٰهِ حَتّٰى مَاتَ۔ (رواہ احمد)

"حضرت مجاہد حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا ہے کہ "کوئی شخص اپنے اہل (یعنی اپنی بیوی) کو مساجد میں جانے سے منع نہ کرے۔" (یہ سن کر) حضرت عبداللہؓ کے ایک صاحبزادہ (بلال) نے کہا کہ "ہم تو انہیں منع کریں گے۔" حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ "میں تو آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم یہ کہہ رہے ہو۔" راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت عبداللہؓ نے اپنے بیٹے سے (آخر عمر تک) گفتگو نہیں کی یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی۔" (احمدؒ)

تشریح: اس حدیث کی وضاحت وہی ہے جو پہلے کی جا چکی ہے کہ اپنے صاحبزادے سے حضرت عبداللہؓ کی اس قدر شدید ناراضگی کہ آخر عمر تک ان سے گفتگو نہیں کی محض اس بناء پر تھی کہ ان کے صاحب زادے نے اپنے مافی الضمیر کو اس انداز سے ظاہر کیا جو حدیث نبوی کے مقابل معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال اس حدیث سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ اگر کسی شخص کی اولاد سنت کو ترک کر دے یا سنت کے خلاف اپنی رائے کو غلط انداز میں پیش کرے تو اس سے ترک کلام کیا جا سکتا ہے۔

اس باب کی چونکہ یہ آخری حدیث ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کے حاصل کرنے کے بعض طریقے اور مسائل جن کا جاننا ضروری ہے نقل کر دیئے جائیں۔

جماعت کے بعض مسائل

اگر کوئی شخص[1] اپنے محلہ یا مکان کے قریب مسجد میں ایسے وقت پر پہنچا کہ وہاں جماعت ہو چکی تھی تو اس کو مستحب ہے کہ دوسری مسجد میں دوبارے جماعت کے لئے جائے اور اسے یہ بھی اختیار ہے کہ اپنے گھر واپس آکر آدمیوں کو جمع کر کے جماعت کر لے۔

اگر کوئی شخص نفل نماز شروع کر چکا ہو اور فرض جماعت ہونے لگے تو اس کو چاہئے کہ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے اگرچہ چار رکعت نفل کی نیت کی ہو۔ یہی حکم ظہر اور جمعہ کی سنت مؤکدہ کا ہے کہ اگر شروع کر چکا ہو اور فرض ہونے لگے تو دو ہی رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے اور پھر ان سنتوں کو فرض کے بعد پڑھ لے۔ ظہر کی سنتیں ان سنتوں کے بعد پڑھی جائیں جو فرض کے بعد پڑھی جاتی ہیں۔

اگر فرض نماز ہو رہی ہو تو پھر سنت وغیرہ شروع نہ کی جائے بشرطیکہ کسی رکعت کے چلے جانے کا خوف ہو ہاں اگر یقین یا گمان غالب ہو کہ کوئی رکعت نہ جانے پائے گی تو پڑھ لے۔ مثلاً ظہر کے وقت جب فرض شروع ہو جائے اور خوف ہو کہ سنت پڑھنے سے کوئی رکعت جاتی رہے گی تو پھر مؤکدہ سنتیں جو فرض سے پہلے پڑھی جاتی ہیں چھوڑ دے اور فرض کے بعد دو رکعت سنت مؤکدہ پڑھ کر ان سنتوں کو پڑھ لے مگر فجر کی سنتیں چونکہ زیادہ مؤکدہ ہیں لہٰذا ان کے لئے حکم ہے کہ اگر فرض شروع ہو چکا ہو تب بھی ادا کر لی جائیں، بشرطیکہ قعدۂ اخیرہ

---

[1] ماخوذ از علم الفقہ ۱۲۔

مل جانے کی امید ہو اور اگر قعدہ اخیرہ کے بھی نہ ملنے کا خوف ہو تو پھر نہ پڑھے۔

اگر یہ خوف ہو کہ فجر کی سنت اگر نماز سنن و مستحبات وغیرہ کی پابندی سے ادا کی جائے تو جماعت نہ ملے گی تو ایسی حالت میں چاہئے کہ صرف فرائض اور واجبات پر اختصار کرے اور سنن وغیرہ چھوڑ دے۔ فرض شروع ہو جانے کی صورت میں جو سنتیں پڑھی جائیں خواہ فجر کی ہوں یا کسی اور وقت کی تو وہ ایسے مقام پر پڑھی جائیں جو مسجد سے علیحدہ ہو اس لئے کہ جہاں فرض نماز ہوتی ہو تو پھر کوئی دوسری نماز وہاں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ اور اگر کوئی ایسی جگہ نہ ملے تو صف سے علیحدہ مسجد کے کسی گوشہ میں پڑھ لے اور یہ بھی نہ ہو تو نہ پڑھے۔ اگر جماعت کا قعدہ مل جائے اور رکعتیں نہ ملیں تب بھی جماعت کا ثواب مل جائے گا اگرچہ اصطلاح فقہاء میں اس کو جماعت کی نماز نہیں کہتے۔ جماعت سے ادا کرنا جب ہی کہا جائے گا کہ جب کل رکعتیں مل جائیں۔ یا اکثر رکعتیں مل جائیں مثلاً چار رکعت والی نماز کی تین رکعتیں مل جائیں یا تین رکعت والی نماز کی دو رکعت مل جائیں اگرچہ بعض فقہا کے نزدیک جب تک کل رکعتیں نہ ملیں جماعت میں شمار نہیں ہوتا۔

جس رکعت کا رکوع امام کے ساتھ مل جائے گا تو سمجھا جائے گا کہ وہ رکعت مل گئی۔ ہاں اگر رکوع نہ ملے تو پھر اس رکعت کا شمار ملنے میں نہ ہوگا۔

بَابُ تَسْوِيَةِ الصَّفِّ

صفوں کے برابر کرنے کا بیان

صفوں کو برابر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگ نماز کے لئے جماعت میں کھڑے ہوں تو صف بندی اس طرح کریں کہ آپس میں بالکل مل کر کھڑے ہوں تاکہ ایک دوسرے کے درمیان خلا نہ رہے اور آگے پیچھے ہٹ کر کھڑے نہ ہوں بلکہ برابر کھڑے رہیں اگر کئی صفیں ہوں تو وہ اس طرح قائم کی جائیں کہ ایک دوسری صف کے درمیان شروع سے لے کر آخر تک یکساں فرق رہے ایسا نہ ہو کہ کسی جگہ سے تو دونوں صفوں کا درمیانی فاصلہ کم ہو اور کسی جگہ سے زیادہ۔ اس باب کے تحت جو احادیث نقل کی جائیں گی ان سے صفوں کو برابر کرنے کی اہمیت و تاکید معلوم ہوگی اور صف بندی کے جو مسائل و احکام ہیں وہ واضح ہوں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

صف برابر رکھنے کا حکم

① عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَوِّيْ صُفُوْفَنَا حَتّٰى كَاَنَّمَا يُسَوِّيْ بِهَا الْقِدَاحَ حَتّٰى رَاٰى اَنَّا قَدْ عَقَلْنَا عَنْهُ ثُمَّ خَرَجَ يَوْمًا فَقَامَ حَتّٰى كَادَ اَنْ يُكَبِّرَ فَرَاٰى رَجُلاً بَادِيًا صَدْرُهُ مِنَ الصَّفِّ فَقَالَ عِبَادَ اللّٰهِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوْهِكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت نعمان ابن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہماری صفیں (اس طرح) برابر (سیدھی) کیا کرتے تھے کہ گویا تیر بھی ان صفوں سے سیدھا کیا جاسکتا تھا یہاں تک کہ ہم بھی آپ ﷺ سے (صفوں کی برابر کرنے کی اہمیت) سمجھ گئے۔ ایک دن آنحضرت ﷺ (مکان سے نکل کر) تشریف لائے اور (نماز کے لئے) کھڑے ہوگئے اور تکبیر (تحریمہ) کہنے ہی کو تھے کہ ایک آدمی کا سینہ صف سے کچھ نکلا ہوا آپ ﷺ نے دیکھ لیا چنانچہ (یہ دیکھ کر) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اے اللہ کے بندو! اپنی صفیں سیدھی کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اختلاف ڈال دے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: عرب میں تیر کی ہمواری اور سیدھا پن اس قدر مشہور تھا کہ دوسری چیزوں کے سیدھے پن اور ہمواری کو بھی تیر سے تشبیہ دیا

کرتے تھے اس طرح گویا تیر بھی ان صفوں سے سیدھا کیا جاتا تھا۔" یہ جملہ کسی چیز کی ہمواری اور سیدھے پن کے لئے مثل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ تیروں کے ذریعہ دوسری چیزوں کو سیدھا اور برابر کرتے ہیں اور یہاں یہ مبالغہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے کہ صفیں اس قدر سیدھی اور ہموار ہوتی تھیں کہ تیر بھی ان کے ذریعہ سیدھے کئے جاسکتے تھے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ عبارت اپنے عکس پر محمول ہے لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا صفیں تیروں کے ذریعہ برابر کرتے تھے" حدیث کے آخری جملہ کا مطلب مولانا مظہر نے یہ بیان کیا ہے کہ ظاہری ادب و فرمانبرداری نہیں کرو گے تو تمہاری یہ ظاہری نافرمانی تمہارے باطن یعنی دلوں کے اختلاف کی طرف تمہیں پہنچائے گی۔ جو آگے چل کر آپس کے بغض و عناد اور کدورت و عداوت کا سبب بن جائے گی اور پھر قلوب کے یہ اختلاف اور یہ باطنی بری خصلتیں تمہاری ظاہری زندگی میں بھی اس طرح سرایت کر جائیں گی کہ تمہارے درمیان بغض و عداوت پیدا ہو جائے گی چنانچہ تم میں سے ہر شخص ایک دوسرے سے اعراض کرے گا اور کسی کے دل میں کسی کے لئے ہمدردی کا کوئی جذبہ باقی نہ رہ جائے گا بہرحال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ صفوں کو سیدھا اور ہموار رکھنے کی بڑی اہمیت ہے جب جماعت کھڑی ہو تو ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو صف کے برابر کرلے اور ایک دوسرے سے آگے پیچھے نہ کھڑا ہونا چاہئے، اگر صف کو سیدھا کرنے کے اس حکم کی پیروی نہیں کی جائے گی تو جان لو کہ خداوند قدوس اس کی سزا تمہیں یہ دے گا کہ تمہارے درمیان بغض و نفرت پیدا ہو جائے گی جس سے تمہاری معاشرتی و سماجی امن و سکون کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔

جب تک ایک صف پوری نہ ہو دوسری صف قائم نہ کی جائے

(۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَاَقْبَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ وَتَرَاصُّوْا فَاِنِّيْ اَرَاكُمْ مِنْ وَّرَآءِ ظَهْرِيْ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ قَالَ اَتِمُّوا الصُّفُوْفَ فَاِنِّيْ اَرَاكُمْ مِنْ وَّرَآءِ ظَهْرِيْ۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز جب) نماز کھڑی ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے اپنا چہرہ مبارک ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "اپنی صفیں سیدھی کرو، اور آپس میں مل کر کھڑے ہو، بیشک میں اپنی پشت کے پیچھے سے بھی تمہیں دیکھ سکتا ہوں (یعنی نماز کی حالت میں مکاشفہ کے ذریعہ نمازیوں کے احوال پر مطلع رہتا ہوں) اس روایت کو بخاری نے نقل کیا ہے اور بخاری و مسلم دونوں کی روایت یہ ہے کہ "(آنحضرت نے فرمایا) "صفوں کو پورا کر لیا کرو، میں تم کو اپنی پشت کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔"

تشریح: دوسری روایت کے الفاظ "صفوں کو پورا کر لیا کرو" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک ایک صف پوری نہ ہو جائے دوسری صف قائم نہ کرو ایسا نہ ہونا چاہئے کہ آگے کی صف میں جگہ خالی ہو اور اس میں مزید نمازیوں کے کھڑے ہونے کی گنجائش ہو لیکن اس کے باوجود پیچھے دوسری صف قائم کر لی جائے ایسا کرنا غلط ہے۔

صف برابر رکھنا نماز کی تکمیل میں سے ہے

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ فَاِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَةِ الصَّلَاةِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ اِلَّا اَنَّ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ تَمَامِ الصَّلَاةِ۔

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی صفوں کو برابر رکھا کرو کیونکہ صفوں کو برابر رکھنا نماز کی تکمیل میں ہے۔" (بخاری) مسلم کی روایت من اقامۃ الصلوۃ کے بجائے من تمام الصلوۃ کے الفاظ ہیں)

تشریح: قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے اقیموا الصلوۃ یعنی نماز تعدیل ارکان، سنن و آداب کی رعایت کے ساتھ پڑھو لہٰذا یہاں حدیث میں

الفاظ اقامۃ الصلوۃ سے اسی آیت کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ صفوں کو برابر کرنا بھی اقیموا الصلاۃ کے حکم میں داخل ہے۔

صف برابر نہ رکھنے سے قلوب میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے

④ وَعَنْ اَبِی مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَمْسَحُ مَنَاکِبَنَا فِی الصَّلٰوۃِ وَیَقُوْلُ اسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُکُمْ لِیَلِیَنِیْ مِنْکُمْ اُولُو الْاَحْلَامِ وَ النُّھٰی ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ قَالَ اَبُوْ مَسْعُوْدٍ فَاَنْتُمُ الْیَوْمَ اَشَدُّ اِخْتِلَافًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (جب نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو) ہمارے مونڈھوں پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرماتے تھے کہ "برابر برابر رہو مختلف (یعنی آگے پیچھے کھڑے) نہ ہو ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا اور تم میں سے جو لوگ عاقل و بالغ ہوں وہ میرے قریب رہیں پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہوں اور پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہوں۔" حضرت ابو مسعودؓ نے (لوگوں کے سامنے یہ حدیث بیان کر کے) فرمایا کہ آج تم لوگوں میں اختلاف بہت زیادہ ہے۔" (مسلم)

تشریح: "مختلف نہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ جب صف بندی کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو تو اس بات کا بطور خاص خیال رکھو کہ سب کے بدن برابر رہیں ایک دوسرے سے آگے پیچھے ہو کر کھڑے نہ ہو اور اپنے بدن کا کوئی عضو صف سے باہر نہ نکالو اور اگر تم لوگ صف میں اپنے بدن کے ظاہری اعضاء کو غیر برابر اور ناہموار رکھو گے تو اس کا اثر باطنی طور پر یہ ہو گا کہ تمہارے قلوب میں اختلاف پیدا ہو جائے گا کیونکہ بدن کے ظاہری اعضاء اور قلب کے درمیان بڑا لطیف تعلق ہے اور ایک دوسرے کی تاثیر بڑی عجیب ہے اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے ظاہری اعضاء کی ٹھنڈک باطنی اعضاء پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور باطنی اعضاء کی ٹھنڈک ظاہری اعضاء کو متاثر کرتی ہے اسی طرح صف میں ظاہری بدن کو غیر برابر رکھنا قلوب پر اثر انداز ہوتا ہے جس کا خاصہ ہے کہ دلوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

صف کی ترتیب

حدیث کے دوسرے جزو میں صف کی ترتیب یہ بتائی گی ہے کہ میرے قریب وہ لوگ کھڑے ہوں جو صاحب عقل فہم اور بالغ ہوں، یعنی پہلی صف میں ان لوگوں کو کھڑا ہونا چاہئے جو بالغ اور عقل و فہم کے مالک ہوں تاکہ وہ نماز کی کیفیت اور اس کے احکام دیکھیں اور یاد کریں اور پھر امت کے دوسرے لوگوں کو ان کی تعلیم دیں، پھر دوسری صف میں وہ لوگ کھڑے ہوں جو ان کے قریب ہوں یعنی مراہق (جو بالغ ہونے کے قریب ہوں) اور لڑکے، اور پھر تیسری صف میں وہ کھڑے ہوں جو ان کے قریب ہوں یعنی مخنث (جن میں مرد و عورت دونوں کی علامتیں پائی جائیں) پھر ان سب کے بعد آخر میں عورتوں کی صف قائم کی جائے یہاں حدیث میں عورتوں کی صف کے بارے میں ذکر نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ متعین ہے آخر میں عورتوں ہی کی صف ہوتی ہے۔

آخر میں حضرت ابو مسعودؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "آج تمہارے اندر افتراق و انتشار پیدا ہو گیا ہے اور آپس میں تم لوگ جو اتنا اختلاف کرتے ہو نیز فتنوں کی جو بھرمار ہو رہی ہے ان سب کی وجہ یہی ہے کہ تم لوگ اگر ان فتنوں اور اختلاف سے بچنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے ظاہری اختلاف کو ختم کر ڈالو یعنی صفوں کو برابر رکھو پھر اللہ تعالیٰ تمہارے باطنی اختلاف کو بھی ختم کر دے گا۔

مساجد میں شور و غل نہ مچانا چاہئے

⑤ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِیَلِیَنِیْ مِنْکُمْ اُولُو الْاَحْلَامِ وَالنُّھٰی ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثَلَاثًا وَاِیَّاکُمْ وَھَیْشَاتِ الْاَسْوَاقِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو لوگ صاحب عقل اور بالغ ہوں وہ (نماز میں) میرے

قریب کھڑے ہوں پھر وہ لوگ کھڑے ہوں جو ان کے قریب ہوں۔" یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین بار فرمائے اور تم (مساجد میں) بازاروں کی طرح شور وغل مچانے سے بچو۔" (مسلمؒ)

تشریح: پہلی حدیث میں عورتوں کی صف کا ذکر نہ پیش نظر تھا اس لئے وہاں ثم الذین یلونھم کے الفاظ دو مرتبہ ذکر فرمائے گئے اور یہاں چونکہ عورتوں کی صف کا ذکر بھی پیش نظر تھا اس لئے یہ الفاظ تین مرتبہ فرمائے گئے اس طرح صف کے چار درجے ہو گئے، یعنی پہلی صف میں بالغ اور صاحب عقل و فہم لوگ کھڑے ہوں اس کے بعد کی صفوں میں مراہق اور لڑکے کھڑے ہوں۔ اس کے بعد صفوں میں مخنث کھڑے ہوں اور پھر آخر میں عورتوں کی صف قائم کی جائے۔

(۶) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اَصْحَابِہٖ تَاَخُّرًا فَقَالَ لَھُمْ تَقَدَّمُوْا وَائْتَمُّوْا بِیْ وَلْیَأْتَمَّ بِکُمْ مَنْ بَعْدَکُمْ لَا یَزَالُ قَوْمٌ یَتَاَخَّرُوْنَ حَتّٰی یُؤَخِّرَھُمُ اللّٰہُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (جب) دیکھا کہ صحابہ (پہلی صف میں آنے میں) تاخیر کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "آگے بڑھو! اور میری اقتداء کرو تاکہ وہ لوگ جو تمہارے پیچھے کھڑے ہوں تمہاری اقتداء کریں (اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا) ایک جماعت ہمیشہ (پہلی صف میں کھڑے ہونے میں) تاخیر کرتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بھی (اپنی فضل اور رحمت میں) انہیں پیچھے ڈال دے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے جب صحابہ کو دیکھا کہ وہ پہلی صف میں کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کرتے تو ان سے فرمایا کہ آگے بڑھو اور پہلی صف میں کھڑے ہو کر میری اقتداء کرو یعنی میرے پیچھے مجھ سے قریب ہو کر کھڑے رہو تاکہ میرے افعال دیکھتے رہو اسی طرح جو لوگ تم سے پیچھے کھڑے ہوں وہ تمہاری متابعت کریں کیونکہ پچھلی صف کے لوگ اگلی صف کے لوگوں کی متابعت بایں طور کرتے ہیں کہ نماز کے جو افعال اگلی صف والے کرتے ہیں وہی افعال پچھلی صف والے کرتے رہتے ہیں لہٰذا یہ متابعت اور اقتداء ظاہر کے اعتبار سے ہے ورنہ تو حقیقت میں سب نمازی امام ہی کے تابع ہوتے ہیں۔

صفیں پوری اور برابر رکھنی چاہئیں

(۷) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَرَاٰنَا حَلَقًا فَقَالَ مَالِیْ اَرَاکُمْ عِزِیْنَ ثُمَّ خَرَجَ عَلَیْنَا فَقَالَ اَلَا تَصُفُّوْنَ کَمَا تَصُفُّ الْمَلَائِکَۃُ عِنْدَ رَبِّھَا فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ تَصُفُّ الْمَلَائِکَۃُ عِنْدَ رَبِّھَا قَالَ یُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْاُوْلٰی وَیَتَرَاصُّوْنَ فِی الصَّفِّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرۃؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان تشریف لائے اور ہمیں مختلف حلقوں میں بیٹھے دیکھ کر فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ میں تمہیں الگ الگ جماعتوں کی صورت میں (بیٹھے ہوئے) دیکھ رہا ہوں (یعنی اس طرح الگ الگ جماعت کر کے نہ بیٹھا کرو کیونکہ یہ نااتفاقی اور انتشار کی علامت ہے) پھر اسی طرح (ایک روز) آنحضرت ﷺ ہمارے درمیان تشریف لائے اور فرمایا کہ تم لوگ (نماز میں) اس طرح صف کیوں نہیں باندھتے جس طرح فرشتے خدا کے حضور میں (بندگی کے لئے کھڑے ہونے کے واسطے) صف باندھتے ہیں۔" ہم نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ فرشتے اپنے پروردگار کے حضور میں کس طرح صف باندھتے ہیں؟ فرمایا "پہلی صفوں کو پوری کرتے ہیں اور صف میں بالکل (برابر، برابر) کھڑے ہوتے ہیں۔" (مسلمؒ)

مرد اور عورت کی بہترین صف کون سی ہے؟

(۸) وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ اَوَّلُھَا وَشَرُّھَا اٰخِرُھَا وَخَیْرُ

صُفُوْفِ النِّسَاءِ اٰخِرُهَا وَشَرُّهَا اَوَّلُهَا۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے اور بدترین صف پچھلی صف ہے عورتوں کی بہترین صف پچھلی صف ہے اور بدترین صف پہلی صف ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: بہترین سے مراد ثواب کی زیادتی ہے یعنی پہلی صف والے دوسری صف والوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ثواب کے حق دار ہوتے ہیں۔

مردوں کے لئے بہترین صف پہلی صف کو اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس صورت میں وہ امام سے قریب ہوتے ہیں اور عورتوں سے دور اور پچھلی صف بدترین اس لئے ہوتی ہے کہ اس شکل میں امام سے دوری ہو جاتی ہے اور عورتوں سے نزدیکی۔ اس طرح عورتوں کے لئے پہلی صف اس لئے بدترین ہے کہ وہ پہلی صف میں کھڑی ہونے سے مردوں سے نزدیک ہو جاتی ہیں پچھلی صف ان کے لئے اس وجہ سے بہترین ہے کہ اس صورت میں وہ مردوں سے دور رہتی ہیں۔

بہرحال حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو تو پہلی صف میں کھڑا ہونے کی کوشش کرنی چاہئے اور عورتوں کو آخری صف میں شامل ہونے کی سعی کرنی چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

صفوں میں خلاء رکھنا چاہئے

(۹) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُصُّوْا صُفُوْفَكُمْ وَقَارِبُوْا بَيْنَهَا وَحَاذُوْا بِالْاَعْنَاقِ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنِّيْ لَاَرَى الشَّيْطَانَ يَدْخُلُ مِنْ خُلَلِ الصَّفِّ كَاَنَّهَا الْحَذَفُ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اپنی صفیں ملی ہوئی رکھو (یعنی آپس میں خوب مل کر کھڑے ہو) اور صفوں کے درمیان قرب رکھو (یعنی آپس میں خوب مل کر کھڑے ہو) اور صفوں کے درمیان قرب رکھو (یعنی دو صفوں کے درمیان اس قدر فاصلہ نہ ہو کہ ایک صف اور کھڑی ہو سکے) نیز اپنی گردنیں برابر رکھو (یعنی صف میں تم میں سے کوئی بلند جگہ پر کھڑا نہ ہو بلکہ ہموار جگہ پر کھڑا ہو تاکہ سب کی گردنیں برابر رہیں) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میں شیطان کو بکری کے کالے بچہ کی طرح تمہاری صفوں کی کشادگی میں گھستے دیکھتا ہوں۔" (ابوداؤدؒ)

صفیں پوری کرو

(۱۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتِمُّوا الصَّفَّ الْمُقَدَّمَ ثُمَّ الَّذِيْ يَلِيْهِ فَمَا كَانَ مِنْ نَقْصٍ فَلْيَكُنْ فِي الصَّفِّ الْمُؤَخَّرِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "پہلی صف کو پوری کرو پھر اس کے قریب (یعنی اس کے بعد) ہو اسے پوری کرو اور صف میں جو کمی رہے تو وہ سب سے پچھلی صف میں ہونی چاہئے۔" (ابوداؤدؒ)

پہلی صفوں کی فضیلت

(۱۱) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ يَلُوْنَ الصُّفُوْفَ الْاُوْلٰى وَمَا مِنْ خَطْوَةٍ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ خَطْوَةٍ يَمْشِيْهَا يَصِلُ بِهَا صَفًّا۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو لوگ پہلی صفوں کے قریب ہوتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قدم سے زیادہ محبوب کوئی قدم نہیں ہے جو چل کر صف میں ملے (یعنی اگر صف میں جگہ خالی رہ گئی ہو تو وہاں جاکر کھڑا ہو جائے)۔" (ابوداؤد)

تشریح: چونکہ دوسری صف کو بھی ان صفوں پر جو اس کے بعد ہوتی ہیں فضیلت حاصل ہے اس لئے جب آنحضرت ﷺ نے پہلی صف کی بہت زیادہ فضیلت بیان فرمائی تو "پہلی صفوں" کے اور دوسری صف کی فضیلت کی طرف بھی اشارہ فرمادیا۔

صف میں دائیں طرف کھڑا ہونا افضل ہے

⑫ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلٰى مَيَامِنِ الصُّفُوْفِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "صفوں کے دائیں طرف والے لوگوں پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ صف میں امام کے دائیں طرف کھڑا ہونا خواہ امام سے دور ہی کیوں نہ ہو بائیں طرف کھڑے ہونے سے خواہ امام سے کتنا ہی نزدیک کیوں نہ ہو افضل ہے ہاں اگر صف میں بائیں طرف جگہ خالی ہو تو پھر صف کی دونوں جانب کو برابر کرنے کے پیش نظر بائیں طرف ہی کھڑا ہونا افضل ہوگا۔

آنحضرت ﷺ صفوں کو برابر کرنے کے بعد نماز شروع کرتے تھے

⑬ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَوِّيْ صُفُوْفَنَا اِذَا اُقِيْمَتْ اِلَى الصَّلَاةِ فَاِذَا اسْتَوَيْنَا كَبَّرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ "جب ہم لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو (پہلے) نبی کریم ﷺ ہماری صفوں کو (زبان یا ہاتھ سے) برابر فرماتے چنانچہ جب صفیں برابر ہو جاتیں تو آپ تکبیر تحریمہ کہتے۔" (ابوداؤد)

⑭ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ عَنْ يَمِيْنِهٖ اِعْتَدِلُوْا سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ وَعَنْ يَسَارِهٖ اعْتَدِلُوْا سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (جب نماز شروع کرتے تو پہلے) اپنے دائیں طرف (متوجہ ہو کر) فرمایا کرتے تھے "سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اپنی صفیں برابر کر لو" پھر بائیں طرف (بھی متوجہ ہو کر یہی) فرماتے تھے کہ "سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اپنی صفیں برابر کر لو۔" (ابوداؤد)

نماز میں نرم مونڈھے والے بہتر ہیں

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خِيَارُكُمْ اَلْيَنُكُمْ مَنَاكِبَ فِي الصَّلَاةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جن کے مونڈھے نماز میں بہت نرم رہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: نماز نرم مونڈھے کو توضیح و تشریح میں علماء نے بہت کچھ لکھا ہے اس کے کئی معنی ہیں چنانچہ اس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ "اگر کوئی

شخص جماعت میں اس طرح کھڑا ہو کہ صف برابر نہ ہوئی ہو اور پیچھے سے آکر کوئی شخص اس کا مونڈھا پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا ہو جانے کے لئے کہے تو وہ ضد و ہٹ دھرمی اور تکبر نہ کرے بلکہ اس شخص کا کہنا مان لے اور سیدھا کھڑا ہو کر صف برابر کر لے۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص صف میں آکر کھڑا ہونا چاہے اور جبکہ صف میں جگہ بھی ہو تو اسے منع نہ کرے صف میں کھڑا ہو جانے دے، اس کے تیسرے معنی یہ ہیں کہ "مونڈھوں کو نرم رکھنا" نماز میں خشوع و خضوع اور سکون و وقار کے لئے کنایہ ہے۔ یعنی نماز میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو نہایت خاطر جمعی، حضوری قلب اور اطمینان و وقار کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اسْتَوُوْا اسْتَوُوْا، اِسْتَوُوْا فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنِّيْ لَاَرَاكُمْ مِنْ خَلْفِيْ كَمَا اَرَاكُمْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت انس راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ تم (نماز میں) برابر کھڑے ہوا کرو، برابر کھڑے ہوا کرو، برابر کھڑے ہوا کرو، اور قسم ہے اس ذات کی جس قبضہ میں میری جان ہے میں جس طرح اپنے سامنے سے تمہیں دیکھتا ہوں اسی طرح (مشاہدہ اور مکاشفہ کے ذریعہ) اپنے پیچھے سے بھی تمہیں دیکھتا ہوں۔" (ابوداؤد)

پہلی صف کے مقابلہ میں دوسری صف کی فضیلت کم ہے

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى الصَّفِّ الْاَوَّلِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَلَى الثَّانِيْ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى الصَّفِّ الْاَوَّلِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَلَى الثَّانِيْ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى الصَّفِّ الْاَوَّلِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَلَى الثَّانِيْ قَالَ وَعَلَى الثَّانِيْ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ وَحَاذُوْا بَيْنَ مَنَاكِبِكُمْ وَلِيْنُوْا فِيْ اَيْدِيْ اِخْوَانِكُمْ وَسُدُّوا الْخَلَلَ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَدْخُلُ فِيْمَا بَيْنَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْحَذَفِ يَعْنِيْ اَوْلَادَ الضَّاْنِ الصِّغَارَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے پہلی صف (والوں) پر رحمت بھیجتے ہیں" (یہ سن کر) صحابہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! دوسری صف (والوں) پر بھی (یعنی اس طرح فرمایئے کہ پہلی اور دوسری صف پر رحمت بھیجتے ہیں مگر) آنحضرت ﷺ نے (اس مرتبہ بھی دوسری صف کا ذکر نہیں کیا بلکہ) فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے پہلی صف پر رحمت بھیجتے ہیں" صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اور دوسری صف پر بھی فرمایئے آنحضرت ﷺ نے (پھر یہی) فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے پہلی صف پر رحمت بھیجتے ہیں۔" صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اور دوسری صف پر بھی فرمایئے۔" آپ ﷺ نے فرمایا اور دوسری صف پر بھی (اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں) پھر آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ "اپنی صفوں کو برابر کرو، اپنے مونڈھوں کو ہموار رکھو (یعنی ایک سطح اور ہموار جگہ پر کھڑے ہو اور اونچا نیچا ہو کر مت کھڑے ہو) اور اپنے بھائیوں کے ہاتھ کے آگے نرم رہو۔ (یعنی اگر کوئی شخص مونڈھے پر ہاتھ رکھ کر تمہیں صف میں برابر کرے تو اس سے انکار نہ کرو بلکہ برابر ہو جاؤ، نیز صفوں میں خلا پیدا نہ کرو کیونکہ شیطان خذف یعنی بھیڑ کا چھوٹا بچہ بن کر تمہارے درمیان گھس جاتا ہے۔" (احمد)

تشریح: صحابہ کے قول وعلی الثانی میں جو عطف ہے اسے عطف تلقین کہتے ہیں یعنی صحابہ کا مطلب یہ تھا کہ پہلی صف کی فضیلت تو آپ ﷺ نے بیان فرما دی دوسری صف کی فضیلت بھی بیان فرما دیجئے کہ دوسری صف پر بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تیسری مرتبہ دوسری صف کو بھی پہلی صف کی صفت مذکورہ میں شامل فرما دیا جس سے معلوم ہو کہ فضیلت

کے اعتبار سے دوسری صف کا درجہ پہلی صف سے کم تر ہے۔

(۱۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقِیْمُو الصُّفُوْفَ وَحَاذُوْ بَیْنَ الْمَنَاکِبِ وَسُدُّو الْخَلَلَ وَلِیْنُوْ بِاَیْدِیْ اِخْوَانِکُمْ وَلَا تَذَرُوْ فُرُجَاتِ الشَّیْطَانِ وَمَنْ وَّصَلَ صَفًّا وَصَلَہُ اللّٰہُ وَمَنْ قَطَعَہٗ قَطَعَہُ اللّٰہُ۔ (رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَی النَّسَائِیُّ مِنْہُ قَوْلَہٗ مَنْ وَّصَلَ صَفًّا اِلٰی اٰخِرِہٖ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "صفوں کو سیدھی کرو، اپنے مونڈھوں کے درمیان ہمواری رکھو، صفوں کے خلاء کو پر کرو، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم رہو (یعنی اگر کوئی شخص تمہیں ہاتھوں سے پکڑ کر صف میں برابر کرے تو اس کو کہنا مانو) اور صفوں میں شیطان کے لئے خلا نہ چھوڑو اور (فرمایا) جس شخص نے صف کو ملایا (یعنی صف میں خالی جگہ پر جا کھڑا ہو گیا)) تو اللہ تعالیٰ اسے (اپنے فضل اور اپنی رحمت سے) ملا دے گا اور (یاد رکھو) جو شخص صف کو توڑے گا تو اللہ تعالیٰ اسے توڑ ڈالے گے (یعنی مقام قرب سے دور پھینک دے گا۔" (ابوداؤد) نسائی نے اس حدیث کو من وصل صفا سے آخر تک نقل کیا ہے (یعنی نسائی کی روایت میں من وصل صفا سے پہلے عبارت نہیں ہے)

امام کو بیچ میں کھڑا ہونا چاہئے

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَوَسَّطُوا الْاِمَامَ وَسُدُّو الْخَلَلَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "امام کو بیچ میں رکھو (یعنی صف بندی اس طرح کرو کہ امام دائیں اور بائیں آدمی برابر ہوں) اور (صف کے) خلا کو بند کرو۔" (ابوداؤدؒ)

پہلی صف میں شمولیت نہ کرنے پر وعید

(۲۰) وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَزَالُ قَوْمٌ یَتَاَخَّرُوْنَ عَنِ الصَّفِّ الْاَوَّلِ حَتّٰی یُؤَخِّرَھُمُ اللّٰہُ فِی النَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ نے فرمایا "کچھ لوگ ہمیشہ پہلی صف سے پیچھے ہٹتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں دوزخ میں پیچھے ڈالے رکھے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حی یوخر اللّٰہ فی النار کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ "(جو لوگ پہلی صف میں شامل ہونے کی کوشش نہیں کریں گے اور برابر پیچھے کی صفوں میں شامل ہوتے رہیں گے تو) اللہ تعالیٰ انہیں آخر الامر دوزخ میں داخل کرے گا یا دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ میں پیچھے رہنے والا کرے گا۔

بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ پہلی صف میں شامل ہونے کی کوشش کرتے مگر انہوں نے چونکہ اپنی تساہلی اور کاہلی کی بناء پر ہمیشہ پچھلی صفوں میں کھڑا رہ کر اپنے آپ کو اس ثواب سے محروم رکھا اس لئے اس کے بدلہ میں وہ یہ سزا پائیں گے۔

صف کے پیچھے تنہا کھڑے ہونے والے کا حکم

(۲۱) وَعَنْ وَابِصَۃَ ابْنِ مَعْبَدٍ قَالَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَجُلًا یُصَلِّیْ خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَہٗ فَاَمَرَہٗ اَنْ یُّعِیْدَ الصَّلٰوۃَ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت وابصہ ابن معبدؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ صف کے پیچھے تنہا (کھڑا ہوا) نماز پڑھ رہا

تھا چنانچہ آپ ﷺ نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔" (ابوداؤد، ترمذی) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

تشریح: چونکہ پہلی صف میں جگہ خالی تھی اس کے باوجود وہ شخص صف کے پیچھے تنہا کھڑا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے اسے بطور استحباب دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔

اس سلسلہ میں مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص صف کے پیچھے تنہا کھڑا ہو کر نماز پڑھے گا یعنی پچھلی صف میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا نمازی نہیں ہوگا۔ تو امام احمدؒ کے مسلک کے مطابق اس کی نماز نہیں ہوگی۔ مگر حضرت امام اعظمؒ، حضرت امام شافعیؒ، اور حضرت امام مالکؒ ان تینوں ائمہ کے نزدیک صف کے پیچھے تنہا پڑھنے والے کی نماز ہو جاتی ہے۔ تاہم ان حضرات کا قول بھی یہ ہے کہ صف کے پیچھے تنہا نماز نہیں پڑھنی چاہئے کیونکہ یہ مکروہ ہے۔

بَابُ الْمَوْقِفِ

امام اور مقتدی کے کھڑے ہونے کی جگہ کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ فِيْ بَيْتِ خَالَتِي مَيْمُوْنَةَ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهٖ فَاَخَذَ بِيَدِيْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِهٖ فَعَدَلَنِي كَذٰلِكَ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِهٖ اِلَى الشِّقِّ الْاَيْمَنِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میں نے اپنی خالہ اُم المؤمنین حضرت میمونہؓ کے یہاں رات گزاری چنانچہ (جب) نبی کریم ﷺ (تہجد) نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آپ ﷺ کے بائیں طرف جا کر کھڑے ہو گیا آنحضرت ﷺ نے اپنے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ کر اس طرح پھیرا (کہ) مجھے اپنے پیچھے کی جانب سے لا کر دائیں طرف کھڑا کر لیا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے کئی مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔

① نفل نماز جماعت سے پڑھنا جائز ہے۔ ② اگر جماعت صرف دو آدمیوں کی ہو یعنی ایک امام ہو اور ایک مقتدی۔ تو مقتدی کو امام کی دائیں جانب کھڑا ہونا چاہئے۔ ③ نماز میں تھوڑا سا عمل جائز ہے۔ ④ مقتدی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ امام سے آگے ہو کیونکہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کو آگے کی جانب سے پھیرنے کی بجائے اپنے پیچھے سے پھیر کر دائیں طرف لا کھڑا کیا۔ ⑤ ایسے شخص کے پیچھے اقتداء جائز ہے جس نے شروع سے امام کی نیت نہ کر رکھی ہو۔

ہدایہ میں لکھا ہے کہ "صورت مذکورہ میں اگر تنہا مقتدی امام کے پیچھے یا بائیں طرف نماز پڑھے تو جائز ہے لیکن مناسب نہیں ہے۔

تین آدمیوں کی جماعت

② وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُصَلِّيَ فَجِئْتُ حَتّٰى قُمْتُ عَنْ يَسَارِهٖ فَاَخَذَ بِيَدِيْ فَاَدَارَنِيْ حَتّٰى اَقَامَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهٖ ثُمَّ جَاءَ جَبَّارُ بْنُ صَخْرٍ فَقَامَ عَنْ يَسَارِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخَذَ بِيَدَيْنَا جَمِيْعًا فَدَفَعَنَا حَتّٰى اَقَامَنَا خَلْفَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آکر آپ ﷺ کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا آنحضرت ﷺ نے (اپنے پیچھے سے) میرا (داہنا) ہاتھ پکڑا اور (اپنے پیچھے کی جانب سے مجھے لا کر) اپنے دائیں طرف کھڑا کر دیا۔ پھر

جبار ؓ ابن صخر آئے اور آنحضرت ﷺ کے بائیں طرف کھڑے ہوگئے آنحضرت ﷺ نے ہمارے دونوں کے ہاتھ اکٹھا پکڑے (یعنی اپنے دائیں ہاتھ سے ایک کا بایاں ہاتھ پکڑا اور اپنے بائیں ہاتھ سے دوسرے کا دایاں ہاتھ پکڑا) اور ہمیں (اپنی اپنی جگہ سے) ہٹا کر اپنے پیچھے کھڑا کر دیا۔" (مسلم ؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مقتدی ایک ہو تو وہ امام کے دائیں طرف کھڑا ہو جائے اور اگر ایک سے زیادہ مقتدی ہوں تو پھر سب امام کے پیچھے کھڑے ہوں۔

قاضی ؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھوں کو ایک مرتبہ یا بغیر وقفہ سے دو مرتبہ حرکت میں لانے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

مقتدی مرد و عورت کس طرح کھڑے ہوں

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ صَلَّيْتُ اَنَا وَيَتِيْمٌ فِيْ بَيْتِنَا خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اور یتیم نے اپنے مکان میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز (جماعت سے) پڑھی اور اُم سلیم ہمارے پیچھے تھیں۔" (مسلم ؒ)

تشریح: ام سلیم حضرت انس ؓ کی والدہ محترمہ کا نام تھا اور یتیم ان کے بھائی کا نام تھا۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یتیم ہی ان کا نام تھا لیکن کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ ان کا نام ضمیرہ تھا۔

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگر امام کے پیچھے مرد و عورت دونوں مقتدی کی حیثیت سے نماز میں شامل ہوں تو مردوں کو اپنی صف آگے قائم کرنی چاہئے۔ اور عورتوں کی صف پیچھے رکھنی چاہئے۔

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى بِهٖ وَبِاُمِّهٖ اَوْ خَالَتِهٖ قَالَ فَاَقَامَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَاَقَامَ الْمَرْاَةَ خَلْفَنَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ نے ان کے (یعنی حضرت انس ؓ کے) اور ان کی والدہ (ام سلیم) یا ان کی خالہ کے ہمراہ نماز پڑھی حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ (اس موقع پر) آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اپنے دائیں طرف اور عورت (یعنی ان کی والدہ یا خالہ) کو اپنے پیچھے کھڑا کیا۔" (مسلم ؒ)

(۵) وَعَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ اَنَّهٗ اِنْتَهٰى اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ رَاكِعٌ فَرَكَعَ قَبْلَ اَنْ يَّصِلَ اِلَى الصَّفِّ ثُمَّ مَشٰى اِلَى الصَّفِّ فَذَكَرَ ذٰلِكَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصًا وَلَا تَعُدْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوبکرہ ؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ (ایک مرتبہ نماز میں شامل ہونے کے لئے) آنحضرت ﷺ کے پاس اس وقت پہنچے جب کہ آپ ﷺ رکوع میں تھے وہ (اس بات کے پیش نظر کہ رکوع ہاتھ سے چلا نہ جائے نیت اور تکبیر تحریمہ کے بعد) صف میں پہنچنے سے پہلے ہی رکوع میں چلے گئے پھر آہستہ آہستہ چل کر صف میں شامل ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا تو آپ نے ان سے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ (اطاعت اور نیک کام کے بارہ میں) تمہاری حرص اور زیادہ کرے۔ لیکن آئندہ ایسا نہ کرنا۔" (بخاری ؒ)

تشریح: جس وقت حضرت ابوبکرہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور آپ ﷺ رکوع میں جا چکے تھے یہ بجائے اس کے کہ صف میں شامل ہو کر نیت اور تکبیر تحریمہ کے بعد رکوع میں جاتے صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی نیت اور تکبیر تحریمہ کے بعد رکوع میں چلے گئے اور پھر وہاں سے دو قدموں کے برابر یا دو قدموں سے بھی زیادہ مگر غیر متوالیہ یعنی قدم پے در پے رکھتے

ہوئے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر قدم رکھتے ہوئے چلے اور صف میں شامل ہو گئے چنانچہ دو ایک قدم چلنے سے نماز کا اعادہ لازم نہیں آتا لیکن اولیٰ یہی ہے کہ اس سے بھی احتراز کیا جائے۔

حدیث کے آخری لفظ "لاتعد" کئی طرح منقول ہے ① ایک تو اسی طرح جیسا کہ یہاں حدیث میں نقل کیا گیا ہے کہ یعنی تا کے زبر اور عین کے پیش کے ساتھ جو عود سے ماخوذ ہے اس کے معنی ہیں آئندہ ایسا نہ کرنا۔ ② دوسرے عین کے سکون اور دال کے پیش کے ساتھ لا تعد جو عدوم دوڑنا سے ماخوذ ہے۔ اس طرح اس لفظ کا مطلب یہ ہوگا کہ آئندہ نماز کے لئے چلنے میں اس طرح جلد نہ کرنا بلکہ صبر و سکون اور اطمینان و وقار کے ساتھ چلو۔ یہاں تک کہ صف میں شامل ہو جاؤ پھر اس کے بعد نماز شروع کرو ③ تیسرے تا کہ پیش اور عین کے زبر کے ساتھ یعنی لاتعد جو اعادۃ (لوٹنا) سے ماخوذ ہے۔ اس شکل میں حدیث کے معنی یہ ہوں گے "جو نماز تم پڑھ چکے ہو اسے لوٹاؤ نہیں۔"

بہر حال: ان سب میں پہلا قول یعنی لاتعد (آئندہ نہ کرنا) ہی عقل و نقل کی روشنی میں سب سے زیادہ صحیح اور اولیٰ ہے یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ صف کے پیچھے تنہا کھڑا ہونا نماز کو باطل نہیں کرتا کیونکہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرہؓ سے نماز لوٹانے کے لئے نہیں فرمایا۔ ہاں کراہت بلاشبہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

تین آدمیوں کی جماعت ہو تو ان میں سے ایک امام بن جائے

⑥ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا کُنَّا ثَلَاثَةً اَنْ یَّتَقَدَّمَنَا اَحَدُنَا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت سمرۃ ابن جندبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ جب ہم تین آدمی (نماز پڑھنے والے) ہوں تو ہم میں سے ایک آدمی (جو ہم میں بہتر ہو) ہمارے آگے ہو جائے (یعنی ہمارا امام بن جائے)۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے تو تین آدمیوں کی جماعت کے بارہ میں معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک آدمی جو امامت کا مستحق ہو۔ آگے ہو جائے اور امامت کا فریضہ انجام دے۔ یہی حکم دو آدمیوں کی جماعت کا بھی ہے کہ ایک آدمی امام بن جائے اور دوسرا مقتدی، مگر دو آدمیوں کی جماعت کی صورت میں امام آگے نہیں ہوگا بلکہ دونوں برابر برابر کھڑے ہوں گے یعنی امام بائیں جانب رہے اور مقتدی دائیں طرف۔

امام کے لئے تنہا جگہ پر کھڑا ہونا مکروہ ہے

⑦ وَعَنْ عَمَّارٍ اَنَّهُ اَمَّ النَّاسَ بِالْمَدَائِنِ وَقَامَ عَلٰی دُکَّانٍ یُصَلِّیْ وَالنَّاسُ اَسْفَلَ مِنْهُ فَتَقَدَّمَ حُذَیْفَةُ فَلَمَّا فَرَغَ عَمَّارٌ مِنْ صَلَاتِهٖ قَالَ لَهٗ حُذَیْفَةُ اَلَمْ تَسْمَعْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا اَمَّ الرَّجُلُ الْقَوْمَ فَلَا یَقُمْ فِیْ مَقَامٍ اَرْفَعَ مِنْ مَقَامِهِمْ اَوْ نَحْوَ ذٰلِكَ فَقَالَ عَمَّارٌ لِذٰلِكَ اتَّبَعْتُكَ حِیْنَ اَخَذْتَ عَلٰی یَدِیْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمارؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے (ایک روز) مدائن میں (جو کوفہ کے نزدیک ایک شہر ہے) لوگوں کی امامت کی چنانچہ وہ نماز پڑھنے کے لئے ایک چبوترہ پر کھڑے ہوئے۔ مقتدی ان سے نیچے کھڑے تھے (یہ دیکھ کر) حضرت حذیفہؓ "صف سے نکل کر" آگے بڑھے اور عمار کے دونوں ہاتھ پکڑے (اور انہیں نیچے کی طرف کھینچا تاکہ وہ چبوترہ سے اتر کر مقتدوں کے برابر کھڑے ہوں) حضرت عمارؓ نے حضرت حذیفہؓ سے کوئی تعارض نہیں کیا۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ نے انہیں (چبوترہ سے) نیچے اتار لیا۔ حضرت عمارؓ جب نماز پڑھ کر فارغ ہو چکے تو حضرت حذیفہؓ نے ان سے کہا کہ "کیا آپ نے یہ نہیں سنا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص کسی جماعت کا امام بنے تو وہ اس جگہ پر نہ کھڑا ہو جو مقتدیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ سے بلند ہو۔" یا اس کے مانند الفاظ فرمائے حضرت عمارؓ نے جواب

دیا کہ "اسی لئے تو جب آپ نے میرے ہاتھ پکڑے تو میں نے آپ کا اتباع کیا۔ (اور کوئی تعارض نہیں کیا یعنی آپ کا کہنا مان کر نیچے اتر آیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: صورت مذکورہ میں مسئلہ یہ ہے کہ امام تنہا بلند مقام پر اس طرح کھڑا ہو کہ کچھ مقتدی تو اس کے ساتھ اسی بلند جگہ پر ہوں اور کچھ نیچے ہوں تو یہ مکروہ نہیں ہے البتہ اگر امام تنہا بلند مقام پر کھڑا ہو اور تمام مقتدی نیچے ہوں تو یہ مکروہ ہوگا چنانچہ حضرت عمارؓ اس طرح کھڑے ہوئے کہ وہ تنہا بلند جگہ پر تھے ان کے ساتھ کچھ مقتدی نہیں تھے اور اس لئے حضرت حذیفہؓ نے انہیں نیچے اتار کر کھڑا کیا۔

اگر امام نیچے اور مقتدی بلند جگہ پر ہوں تو کیا حکم ہے

صورت تو یہ ہے کہ امام بلند جگہ پر ہو اور مقتدی نیچے ہوں، اگر معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی امام تو نیچے کھڑا ہو اور مقتدی بلند مقام پر ہوں تو مسئلہ میں مشائخ کے یہاں اختلاف ہے چنانچہ حضرت امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ مکروہ نہیں ہے اس لئے کہ اس طرح اہل کتاب (یعنی غیر مسلموں) کے ساتھ مشابہت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے یہاں امام کو بطور خاص بلند جگہ پر کھڑا کیا جاتا تھا لہٰذا امام کو تنہا بلند جگہ پر کھڑا ہونا تو ان کی مشابہت کے پیش نظر مکروہ ہو سکتا ہے لیکن امام کا نیچی جگہ پر اور مقتدیوں کا اونچی جگہ پر کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہو سکتا ہے۔

لیکن جب تک ظاہری روایات اور عقلی تقاضہ کا تعلق ہے تو یہ بھی مکروہ ہے کیونکہ اس طرح امام کی حقارت لازم آتی ہے اور اس کی عظمت پر حرف آتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس بلندی پر امام کو تنہا کھڑا ہونا مکروہ ہے اس کی حد کیا ہے؟ یعنی وہ کتنی بلند جگہ ہو کہ اس پر امام تنہا کھڑا نہ ہو؟ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ بقدر قد آدمی بلندی پر امام کے لئے تنہا کھڑا ہونا مکروہ ہے لیکن دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ بلندی کی حد ایک ہاتھ ہے یعنی اگر ایک ہاتھ اونچی جگہ پر بھی امام کھڑا ہوگا تو یہ مکروہ ہوگا اور اسی قول پر فتویٰ ہے یہ تو مسئلہ کی وضاحت تھی اب حدیث کی طرف آئیے!

حدیث کے الفاظ وقام علی دکان یصلی سے ظاہری طور پر یہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ جس وقت حضرت حذیفہؓ نے حضرت عمارؓ کو ٹوکا اور انہیں نیچے اتارا اس وقت حضرت عمارؓ حقیقۃً نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے تھے یعنی نیت باندھ چکے تھے یا انہوں نے صرف نماز پڑھنے کا ارادہ ہی کیا تھا اور کھڑے ہی ہو رہے تھے کہ حضرت حذیفہؓ نے انہیں نیچے اتارا؟

ظاہری طور پر یہی ہے کہ حضرت عمارؓ نے اس وقت تک نیت نہیں باندھی تھی بلکہ نماز کے لئے کھڑے ہو ہی رہے تھے اور نیت باندھنے والے تھے کہ یہ واقعہ پیش آیا۔

اَوْ نَحْوَ ذَالِكَ حضرت حذیفہؓ نے آنحضرت ﷺ کی حدیث جب بیان فرمائی تو آخر میں یہ الفاظ فرمائے کیونکہ انہیں حدیث کے الفاظ بعینہٖ یاد نہیں رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو بعینہٖ یہی الفاظ فرمائے تھے یا اس کے مانند دوسرے الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔

حدیث کے آخری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمارؓ کو یہ مسئلہ معلوم تھا اور وہ آنحضرت ﷺ سے یہ سن چکے تھے کہ امام کو تنہا بلند جگہ پر نہ کھڑا ہونا چاہئے، لہٰذا یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب حضرت عمارؓ ارشاد نبوت پر مطلع تھے اور انہیں یہ مسئلہ معلوم تھا تو انہوں نے اس کے خلاف کیوں کیا؟

اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ حضرت عمارؓ کو یہ مسئلہ معلوم تھا اور وہ آنحضرت ﷺ سے اس کی ممانعت سن بھی چکے تھے مگر اس وقت ان کے ذہن میں نہ یہ حدیث رہی اور نہ انہیں یہ مسئلہ یاد آیا۔ ہاں جب حضرت حذیفہؓ نے تعارض کیا اور انہیں نیچے اتارا تو یہ

مسئلہ ان کو یاد آیا اور ایک صادق سچے فرمانبردار ہونے کے ناطے انہوں نے فوراً اس پر عمل کیا۔

تعلیم کے پیش نظر امام تنہا او نچی جگہ کھڑا ہو سکتا ہے

⑧ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدِنِ السَّاعِدِيِّ اَنَّهُ سُئِلَ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ الْمِنْبَرُ فَقَالَ هُوَ مِنْ اَثْلِ الْغَابَةِ عَمِلَهُ فُلَانٌ مَوْلٰى فُلَانَةٍ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَامَ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ عَمِلَ وَوُضِعَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَكَبَّرَ وَقَامَ النَّاسُ خَلْفَهُ فَقَرَأَ وَرَكَعَ وَرَكَعَ النَّاسُ خَلْفَهُ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ رَجَعَ الْقَهْقَرٰى فَسَجَدَ عَلَى الْاَرْضِ ثُمَّ عَادَ اِلَى الْمِنْبَرِ ثُمَّ قَرَأَ ثُمَّ رَكَعَ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ رَجَعَ الْقَهْقَرٰى حَتّٰى سَجَدَ بِالْاَرْضِ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَفِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ نَحْوَهُ وَقَالَ فِيْ اٰخِرِهٖ فَلَمَّا فَرَغَ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا صَنَعْتُ هٰذَا لِتَاْتَمُّوْا بِيْ وَلِتَعَلَّمُوْا صَلَاتِيْ۔

"اور حضرت سہل ابن سعد ساعدیؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے (ایک روز) پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ کا منبر کس چیز (یعنی کس لکڑی) کا تھا؟ انہوں نے فرمایا کہ "وہ جنگلی جھاؤ کی لکڑی کا تھا۔ جسے فلاں شخص نے جو فلاں عورت کا آزاد کردہ غلام تھا۔ آنحضرت ﷺ کے لئے بنایا تھا۔ چنانچہ جب وہ تیار ہو گیا اور (مسجد میں) رکھا گیا تو آنحضرت ﷺ (اس پر کھڑے ہوئے اور) قبلہ رو ہو کر (نماز کے لئے) تکبیر تحریمہ کی اور سب لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے آنحضرت ﷺ نے "منبر ہی" قرأت فرمائی اور رکوع کیا، اور دوسرے لوگوں نے بھی آنحضرت ﷺ کے پیچھے رکوع کیا، پھر آنحضرت ﷺ نے اپنے سر مبارک رکوع سے اٹھایا اور پچھلے پاؤں ہٹ کر (یعنی منبر سے اتر کر) زمین پر سجدہ کیا۔" یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور بخاری و مسلم کی متفقہ روایت بھی اسی طرح ہے اس حدیث کے راوی نے حدیث کے آخر میں یہ (بھی) کہا ہے کہ "(جب نماز سے) آنحضرت ﷺ فارغ ہوئے تو فرمایا کہ "یہ میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ تم لوگ میری پیروی کرو اور میری نماز (کی کیفیات اور اس کے احکام و مسائل) سیکھ لو۔"

تشریح: مدینہ منورہ سے نو کوس کے فاصلہ پر ایک جنگل ہے وہاں درخت بہت کثرت سے تھے وہیں کے جھاؤ کی لکڑی سے آنحضرت ﷺ کے لئے منبر بنایا گیا تھا۔

فلاں شخص سے مراد "یاقوم رومی" ہیں اور "فلاں عورت سے عائشہ انصاریہ" کی ذات مراد ہے۔

مولانا مظہرؒ نے لکھا ہے کہ "اس منبر پر چڑھنے اترنے کے لئے تین سیڑھیاں تھیں جو بہت قریب قریب بنائی گئی تھیں ان کے ذریعہ سے منبر پر ایک یا دو قدم کے ساتھ چڑھنا بہت آسان تھا۔ لہٰذا اس وجہ سے فعل کثیر لازم نہیں آیا کہ آپ ﷺ کی نماز باطل ہوتی۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اگر امام اس بات کا ارادہ کرے کے اس کی نماز کی حرکات و سکنات اور اس کی کیفیات کو دور و نزدیک کھڑے ہوئے سب ہی نمازی دیکھیں اور اس کے ذریعہ نماز کے احکام و مسائل سیکھیں تو اس کے لئے بلند جگہ پر تنہا کھڑا ہونا جائز ہے۔

ھذا الفظ البخاری (یہ الفاظ بخاری کے ہیں) کہ الفاظ اور اس کے بعد عبارت نقل کر کے مصنف مشکوٰۃ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ حدیث چونکہ بخاری و مسلم دونوں ہی نے نقل کی ہے اس لئے اس کو پہلی فصل میں ذکر کرنا چاہئے تھا لیکن اس حدیث کو اس فصل میں اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ صاحب مصابیح نے اس کو حسان میں (بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے ائمہ حدیث کی روایتوں کے ساتھ) نقل کیا تھا اس لئے صاحب مصابیح کی اتباع میں ہم نے بھی اس فصل میں نقل کرنا مناسب سمجھا۔

اعتکاف میں آنحضرت ﷺ کی امامت

⑨ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حُجْرَتِهٖ وَالنَّاسُ يَاْتَمُّوْنَ بِهٖ مِنْ وَرَاءِ الْحُجْرَةِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ نے اپنے حجرہ کے اندر نماز پڑھی اور لوگوں نے حجرہ کے باہر آپ ﷺ کی اقتدا کی۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث کا تعلق رمضان شریف سے ہے آنحضرت ﷺ نے مسجد کے ایک حصہ میں اعتکاف کے لئے بوریہ کا ایک حجرہ سا بنالیا تھا۔ آپ ﷺ نے اس حجرہ میں چند شب تراویح کی نماز پڑھی چنانچہ صحابہ اس موقع پر حجرہ سے باہر کھڑے ہو کر آپ ﷺ کی اقتدا کرتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

صف بندی کا طریقہ

(۱۰) وَعَنْ اَبِيْ مَالِكِ نِ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ اَلَا اُحَدِّثُكُمْ بِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَقَامَ الصَّلَاةَ وَصَفَّ الرِّجَالَ وَصَفَّ خَلْفَهُمُ الْغِلْمَانَ ثُمَّ صَلّٰى بِهِمْ فَذَكَرَ صَلَاتَهٗ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا صَلٰوةُ قَالَ عَبْدُ الْاَعْلٰى لَا اَحْسِبُهٗ اِلَّا قَالَ اُمَّتِيْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابومالک اشعریؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے (لوگوں سے) کہا کہ "کیا میں تمہیں نبی کریم ﷺ کی نماز (کی کیفیت) سے آگاہ نہ کروں؟ (تو سنو کہ) آنحضرت ﷺ نے نماز (کے لئے لوگوں) کو کھڑا کر کے (اول) مردوں کی صف قائم کی پھر ان کے پیچھے لڑکوں کی صف باندھی اور انہیں نماز پڑھائی۔" ابومالکؓ نے آنحضرت ﷺ کی نماز (کی کیفیت) بیان کی (اور کہا کہ) آنحضرت ﷺ نے (نماز پڑھ کر) فرمایا "نماز اسی طرح پڑھنی چاہئے۔ عبد الاعلیٰ (جنہوں نے یہ روایت ابومالک سے نقل کی ہے) کہتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ ابومالکؓ نے "میری امت کی" (بھی) کہا ہے یعنی ابومالکؓ نے حدیث کے آخری الفاظ اس طرح نقل کئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا هٰكَذَا صَلٰوةُ اُمَّتِيْ (یعنی میری) امت کی نماز اسی طرح ہونی چاہئے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ "میری امت کے لوگوں کو چاہئے کہ نماز کی جو کیفیت مجھ سے نقل کی گئی ہے اسی طرح نمازیں پڑھیں نیز اس سے یہ تنبیہ بھی مقصود ہے کہ جو لوگ اس طریقہ سے یعنی سنت نبوی کے مطابق نماز نہیں پڑھیں گے وہ اپنے اس عمل سے یہ ظاہر کریں گے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی تابعدار امت میں سے نہیں ہیں۔

(۱۱) وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عُبَادٍ قَالَ بَيْنَا اَنَا فِي الْمَسْجِدِ فِي الصَّفِّ الْمُقَدَّمِ فَجَبَذَنِيْ رَجُلٌ مِنْ خَلْفِيْ جَبْذَةً فَنَحَّانِيْ وَقَامَ مَقَامِيْ فَوَاللّٰهِ مَا عَقَلْتُ صَلَاتِيْ فَلَمَّا انْصَرَفَ اِذَا هُوَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ فَقَالَ يَا فَتٰى لَا يَسُوْءُكَ اللّٰهُ اِنَّ هٰذَا عَهْدٌ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْنَا اَنْ نَلِيَهٗ ثُمَّ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَقَالَ هَلَكَ اَهْلُ الْعُقَدِ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ وَاللّٰهِ مَا عَلَيْهِمْ اٰسٰى وَلٰكِنْ اٰسٰى عَلٰى مَنْ اَضَلُّوْا قُلْتُ يَا اَبَا يَعْقُوْبَ مَا تَعْنِيْ بِاَهْلِ الْعُقَدِ قَالَ الْاُمَرَاءُ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت قیس ابن عبادؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ (ایک روز) میں مسجد میں پہلی صف میں کھڑا (نماز پڑھ رہا) تھا۔ ایک شخص نے پیچھے سے مجھے کھینچا اور مجھ کو ایک طرف کر کے خود میری جگہ کھڑا ہو گیا خدا کی قسم! (اس غصہ کی وجہ سے کہ اس نے مجھے پہلی صف سے جو افضل ہے کھینچ لیا باوجودیکہ میں وہاں پہلے سے کھڑا تھا) مجھے اپنی نماز کا بھی ہوش نہ رہا۔ (کہ میں نماز کس طرح ادا کر رہا ہوں اور کتنی رکعتیں پڑھ رہا ہوں) جب وہ شخص نماز پڑھ چکا (اور میں نے بھی نماز پڑھنے کے بعد دیکھا) تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت ابی بن کعبؓ تھے (مجھے غصہ کی حالت میں دیکھ کر) انہوں نے فرمایا کہ "اے جوان (اس وقت میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہیں غمگین نہ کرے۔ (چونکہ) ہمارے لئے آنحضرت ﷺ کی یہ وصیت ہے کہ ہم آپ کے پاس کھڑے ہوا کریں (اس لئے آپ کے بعد اب ہم امام کے قریب

کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں) پھر قبلہ کی طرف منہ کر کے تین مرتبہ فرمایا "رب کعبہ کی قسم! اہل عقد (یعنی سردار) ہلاک ہوگئے! اور فرمایا خدا کی قسم! مجھے سرداروں کا کوئی غم نہیں ہے، غم تو ان لوگوں (یعنی رعایا) کا ہے جنہیں سردار گمراہ کرتے ہیں (بایں طور کہ جو کام سردار کرتے ہیں وہی کام ان کی رعایا کرتی ہے) قیس ابن عباد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی ابن کعب سے عرض کیا کہ "ابو یعقوب! اہل عقد سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا "امراء (یعنی سردار و حکام)۔" (نسائی)

تشریح: حضرت ابن بن کعب کے الفاظ اِنَّ هٰذَا عَهْدٌ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الخ سے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

لِيَلِنِي مِنْكُمْ أُولُو الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى۔

"یعنی (نماز میں) تم میں سے صاحب عقل و بالغ میرے نزدیک کھڑے ہوا کریں۔"

اس ارشاد کا حاصل چونکہ یہ تھا کہ جو لوگ صاحب عقل و فہم اور بالغ ہوں وہ امام کے قریب کھڑے ہوا کریں اور قیس ابن عباد اس زمرہ میں آتے نہیں تھے۔ اس لئے حضرت ابی بن کعبؓ نے انہیں وہاں سے ہٹادیا اور خود وہاں کھڑے ہوگئے۔

هَلَكَ اَهْلُ الْعَقْدِ (اہل عقد یعنی سردار و حکام ہلاک ہوگئے) اس کا مطلب یہ ہے کہ رعایا کے اعمال و کردار اور ان کے دینی و دنیاوی احکام و افعال یہاں تک صف بندی کی رعایت اور نگہداشت حکام و سرداروں کے ذمہ ہے لیکن وہ حکام و سردار جو اپنی رعایا کے دینی و دنیوی کاموں کے نگہبان و سربراہ ہونے کی حیثیت سے لوگوں کے افعال و کردار پر نظر رکھتے تھے اور انہیں سنت نبوی پر چلاتے تھے ختم ہوگئے۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا دینی کاموں میں سست رفتاری بے راہ روی، اور غلط انداز عمل و انداز فکر پیدا ہوگیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے ذریعہ حضرت کعبؓ نے اپنے زمانہ کے حاکم پر طعن کیا ہے مگر حضرت کعبؓ کا انتقال چونکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں ہوا ہے اس لئے یہ کہا جائے گا کہ ان الفاظ کا محمل خود خلیفہ کی ذات نہیں ہے بلکہ حضرت کعبؓ کے پیش نظر حضرت عثمان کے وہ بعض حکام ہوں گے جو اپنے فرائض کو پورے طور سے انجام نہیں دیتے تھے۔

بَابُ الْاِمَامَةِ

امامت کا بیان

شریعت میں نماز کی امامت کا بڑا اہم اور عظیم الشان کام ہے تمام مقتدیوں کی نمازوں کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے امام مقرر کرنے کے سلسلہ میں شریعت نے کچھ شرائط مقرر کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ اس اہم اور عظیم الشان منصب کا حامل کون شخص ہو سکتا ہے، اس باب کے تحت اس قسم کی احادیث نقل کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ امام مقرر کرنے کے وقت کن باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور یہ کہ امامت کا استحقاق کن لوگوں کو حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ مقتدیوں کے چاہئے کہ حاضر نمازیوں میں جس شخص میں امامت کے لائق زیادہ اوصاف ہوں اس کو امام بنائیں اگر کئی شخص ایسے ہوں جن میں امامت کی لیاقت ہو تو کثرت رائے پر عمل کیا جائے یعنی جس شخص کی طرف زیادہ لوگوں کی رائیں ہوں اسی کو امام بنایا جائے اگر کسی ایسے شخص کی موجودگی میں جو امامت کا مستحق اور لائق ہو کسی غیر مستحق اور نالائق شخص کو امام بنایا جائے گا تو سب نمازی ترک سنت کے فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔

① امامت کا سب سے زیادہ مستحق اس شخص کو ہے جو نماز کے مسائل خوب جانتا ہو بشرطیکہ ظاہری طور پر اس میں کوئی فسق وغیرہ نہ ہو اور کم سے کم بقدر قرأت مسنون اسے قرآن یاد ہو۔ ② پھر وہ شخص جو قرآن مجید اچھا یعنی عمدہ آواز سے قرأت کے قاعدہ کے موافق پڑھتا

ہو۔ ③ پھروہ شخص جو سب سے زیادہ خوبصورت ہو ④ پھروہ شخص جو سب میں عمر زیادہ رکھتا ہوں ⑤ پھروہ شخص جو سب میں زیادہ خلیق ہو ⑥ پھروہ شخص جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو ⑦ پھروہ شخص جو سب میں عمدہ لباس پہنے ہو ⑧ پھروہ شخص جس کا سر سب سے زیادہ بڑا ہو ⑨ پھروہ شخص جو مقیم ہو بہ نسبت مسافروں کے ⑩ پھروہ شخص جو اصلی آزاد ہو ⑪ پھروہ شخص جس نے حدث اصغر سے تیمم کیا ہو بنسبت اس شخص کے جس نے حدث اکبر سے تیمم کیا ہو۔

جس شخص میں دو وصف پائے جائیں وہ امامت کا زیادہ مستحق ہے بہ نسبت اس شخص کے جس میں ایک ہی وصف پایا جاتا ہو۔ مثلاً وہ شخص جو نماز کے مسائل بھی جانتا ہو اور قرآن مجید بھی اچھی طرح پڑھتا ہو امامت کا زیادہ مستحق اور اہل ہے بہ نسبت اس شخص کے جو صرف نماز کے مسائل جانتا ہو قرآن مجید اچھی طرح نہ پڑھتا ہو۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

امامت کا مستحق کون ہے؟

① عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُھُمْ لِکِتَابِ اللّٰہِ فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقِرَاءَۃِ سَوَاءً فَاَعْلَمُھُمْ بِالسُّنَّۃِ فَاِنْ کَانُوْا فِی السُّنَّۃِ سَوَآءً فَاَقْدَمُھُمْ ھِجْرَۃً فَاِنْ کَانُوْا فِی الْھِجْرَۃِ سَوَاءً فَاَقْدَمُھُمْ سِنًّا وَلَا یَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِیْ سُلْطَانِہٖ وَلَا یَقْعُدُ فِیْ بَیْتِہٖ عَلٰی تَکْرِمَتِہٖ اِلَّا بِاِذْنِہٖ رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَّہٗ وَلَا یَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِیْ اَھْلِہٖ۔

"حضرت ابو مسعودؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قوم کی امامت وہ شخص کرے جو "نماز کے احکام و مسائل جاننے کے ساتھ" قرآن مجید سب سے اچھا پڑھتا ہو (یعنی تجوید سے واقف ہو۔ اور حاضرین میں سب سے اچھا قاری ہو) اگر قرآن مجید اچھا پڑھنے میں سب برابر ہوں۔ تو وہ شخص امامت کرے جو (قرأت مسنونہ اچھی طرح پڑھنے کے ساتھ) سنت کا علم سب سے زیادہ جانتا ہو۔ اگر (قرآن مجید اچھی پڑھنے اور) سنت کا علم جاننے میں سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرے جو (مدینہ میں) سب سے پہلے ہجرت کر کے آیا ہو اگر (علم قرأت اور) ہجرت میں سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرے جو عمر میں سب سے بڑا ہو! اور کوئی دوسرے کے علاقہ میں امامت نہ کرے (یعنی دوسرے مقررہ امام کی جگہ امامت نہ کرے) اور کسی کے گھر میں اس کی مسند پر اس کی اجازت کے بغیر نہ بیٹھے۔" (مسلم) اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "(آپ ﷺ نے فرمایا) کہ کوئی شخص دوسرے کے گھر میں (اس کی اجازت کے بغیر اگرچہ وہ صاحب خانہ سے افضل ہی کیوں نہ ہو) امامت نہ کرے۔"

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ فَاَعْلَمُھُمْ بِالسُّنَّۃِ میں سنت سے مراد آنحضرت ﷺ کی احادیث ہیں عہد صحابہؓ میں جو شخص احادیث زیادہ جانتا تھا وہ بڑا فقیہ مانا جاتا تھا حضرت امام احمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کا عمل اسی حدیث پر ہے، یعنی ان حضرات کے نزدیک امامت کے سلسلہ میں قاری عالم پر مقدم ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ حضرت امام محمدؒ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ زیادہ علم جاننے والا اور فقیہ امامت کے سلسلہ میں بڑے قاری پر مقدم ہے کیونکہ علم قرأت کی ضرورت تو نماز کے صرف ایک ہی رکن میں (یعنی قرأت کے وقت ہوتی ہے، برخلاف اس کے کہ علم کی ضرورت نماز کے تمام ارکان میں پڑتی ہے)

جن احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالم پر سب سے اچھا قرآن پڑھنے والا مقدم ہے اس کا جواب ان حضرات کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو لوگ قاری ہوتے تھے وہی سب سے زیادہ علم والے بھی ہوتے تھے کیونکہ وہ لوگ

قرآن کریم مع احکام کے سیکھتے تھے اسی وجہ سے احادیث میں قاری کو عالم پر مقدم رکھا گیا ہے، اور اب ہمارے زمانہ میں چونکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اکثر قاری مسائل سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لئے ہم عالم کو قاری پر مقدم رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان حضرات کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مرض الموت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے لوگوں کو نماز پڑھوائی باوجودیکہ وہ قاری نہ تھے بلکہ سب سے زیادہ علم والے تھے حالانکہ اس وقت ان سے زیادہ بڑے بڑے موجود تھے۔ فافہم

ہجرۃ کے بارے میں ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ آج کل ہجرت چونکہ متروک ہے اس لئے اب یہاں حقیقی ہجرت کے بجائے معنوی ہجرت (یعنی گناہوں اور برائیوں سے ترک) کا اعتبار ہوگا یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے علم اور قرأت میں برابری کے بعد پرہیزگار کو مقدم رکھا ہے یعنی اگر دو شخص ایسے جمع ہوں جو عالم بھی ہوں اور قاری بھی ہوں تو ان دونوں میں امامت کا مستحق وہ شخص ہوگا جو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ پرہیزگاری کے وصف کے حامل ہو۔

اس حدیث میں امامت کے صرف اتنے ہی مراتب ذکر کئے گئے ہیں لیکن علماء نے کچھ اور مراتب ذکر کئے ہیں چنانچہ اگر عمر میں بھی سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرے جو سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہو اگر اخلاق میں بھی سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرے جو اچھے چہرے والا ہو یعنی خوبصورت ہو اگر خوبصورتی میں بھی سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرے جو سب سے عمدہ لباس پہنے ہوئے ہو یا سب سے زیادہ شریف النسب ہو اگر تمام اوصاف میں سب برابر ہوں تو اس صورت میں بہتر شکل یہ ہے کہ قرعہ ڈالی جائے جس کا نام نکل آئے وہ امامت کرے یا پھر قوم جسے چاہئے اپنا امام مقرر کرے اور اس کے پیچھے نماز پڑھے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی سلطنت و علاقہ میں امامت نہ کرے اسی طرح ایسی جگہ بھی امامت نہ کرے جس کا مالک کوئی دوسرا شخص ہو جیسا کہ دوسری روایت کے الفاظ فی اھلہ سے ثابت ہوا۔

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مقام پر حاکم وقت امامت کرتا ہے یا حاکم وقت کی جانب سے مقرر شدہ اس کا نائب جو امیر اور خلیفہ کے ہی حکم میں ہوتا ہے امامت کے فرائض انجام دیتا ہے تو کسی دوسرے شخص کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ سبقت کر کے امامت کرے خاص طور پر عیدین اور جمعہ کی نماز میں تو یہ بالکل ہی مناسب نہیں ہے۔

اسی طرح جس مسجد میں امام مقرر ہو یا کسی مکان میں صاحب خانہ کی موجودگی میں مقررہ امام اور صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر امامت کی طرف سبقت کرنا کسی دوسرے شخص کا حق نہیں ہے کیونکہ اس طرح امور سلطنت میں انحطاط آپس میں بغض و عناد ترک ملاقات، افتراق و اختلاف اور فتنہ فساد کا دروازہ کھلتا ہے اور جب کہ جماعت کی مشروعیت ہی انہیں غیر اخلاقی چیزوں کے سدباب کے لئے ہوئی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابن عمرؓ کا یہ رویہ قابل تقلید ہے کہ وہ اپنے فضل و شرف اور علم و تقوی کے باوجود حجاج بن یوسف جیسے ظالم و فاسق کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا کَانُوْا ثَلَاثَۃً فَلْیَؤُمَّھُمْ اَحَدُھُمْ وَاَحَقُّھُمْ بِالْاِمَامَۃِ اَقْرَأُھُمْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم (نماز پڑھنے کے لئے) تین آدمی (جمع) ہوں تو ان میں سے ایک امام بن جائے اور ان میں امامت کا زیادہ مستحق وہ ہے جو زیادہ تعلیم یافتہ ہو۔" (مسلم)

تشریح: "تین آدمیوں" کی قید اتفاقی ہے تین سے کم یا زیادہ ہونے کی شکل میں بھی یہی حکم ہے کہ ان میں سے ایک امام بن جائے اور باقی مقتدی علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ کے اکثر صحابہؓ عمر کا ایک بڑا حصہ طے کر چکے تھے جب اسلام کی سعادت سے مشرف ہوئے اس وجہ سے وہ لوگ قرآن پڑھنے سے پہلے علم دین سیکھتے تھے لیکن بعد میں یہ صورت نہ رہی بلکہ اب تو لوگ عمر کے ابتدائی حصہ ہی میں علم دین حاصل کرنے سے پہلے قرآن کریم پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔

بہر حال۔ امامت کے سلسلہ میں اچھے قاری پر اس فقیہ اور عالم کو اولیت حاصل ہوگی جو نماز کے احکام و مسائل کا علم جانتا ہو معاملات کا زیادہ علم رکھنے والا قاری پر مقدم نہیں ہو سکتا۔

وَذُکِرَ حَدِیْثُ مَالِکِ بْنِ الْحُوَیْرِثِ فِیْ بَابِ فَضْلِ الْاَذَانِ اور مالک بن حویرث کی روایت باب فضل الاذان کے بعد کے باب میں ذکر کی جا چکی ہے (یعنی اس حدیث کو صاحب مصابیح نے یہاں ذکر کیا تھا مگر ہم نے اسے وہاں نقل کر دیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِیُؤَذِّنْ لَکُمْ خِیَارُکُمْ وَلْیَؤُمَّکُمْ قُرَّاءُکُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو لوگ بہتر ہیں انہیں اذان دینی چاہئے اور تم میں جو لوگ خوب تعلیم یافتہ ہوں انہیں تمہاری امامت کرنی چاہئے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: نماز و روزہ کے اوقات کی ذمہ داری مؤذنوں پر ہی ہوتی ہے نیز جب مؤذن بلند جگہ پر کھڑے ہو کر آذان دیتا ہے تو بسا اوقات اس کی نظر لوگوں کے گھروں پر پڑتی ہے لہٰذا مؤذن اگر صاحب دیانت اور دیندار متقی ہو گا تو وہ نماز روزے کے اوقات کی بھی رعایت کرے گا اور اپنی نظر کو نامحرم پر پڑنے سے بھی بچائے گا۔

(۴) وَعَنْ اَبِیْ عَطِیَّةَ الْعُقَیْلِیِّ قَالَ کَانَ مَالِکُ بْنُ الْحُوَیْرِثِ یَاْتِیْنَا اِلٰی مُصَلَّانَا یَتَحَدَّثُ فَحَضَرَتِ الصَّلٰوۃُ یَوْمًا قَالَ اَبُوْعَطِیَّةَ فَقُلْنَا لَهٗ تَقَدَّمْ فَصَلِّهْ قَالَ لَنَا قَدِّمُوْا رَجُلًا مِنْکُمْ یُصَلِّیْ بِکُمْ وَسَاُحَدِّثُکُمْ لِمَ لَا اُصَلِّیْ بِکُمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَا یَؤُمَّهُمْ وَلْیَؤُمَّهُمْ رَجُلٌ مِنْهُمْ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ اِلَّا اَنَّهٗ اقْتَصَرَ عَلٰی لَفْظِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

"اور حضرت ابوعطیہ عقیلیؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ حضرت مالک ابن حویرثؓ (صحابی) ہماری مسجد میں آیا کرتے تھے اور (ہمارے سامنے آنحضرت ﷺ کی) حدیث بیان کرتے (اور بات چیت کرتے رہتے) تھے ایک دن (جب کہ وہ ہمارے درمیان مسجد میں موجود تھے) نماز کا وقت ہو گیا۔ ابوعطیہ" کہتے ہیں کہ ہم نے مالکؓ سے (ان کی شان صحابیت کی عظمت و فضیلت کے پیش نظر) کہا کہ آگے ہو جائیے اور ہمیں نماز پڑھائیے حضرت مالکؓ نے فرمایا کہ "تم اپنے ہی میں سے کسی کو آگے کرو تاکہ وہ تمہیں نماز پڑھائے اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نماز کیوں نہیں پڑھاتا (تو سنو کہ) میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جو شخص کسی قوم سے ملاقات کرے تو وہ ان کی امامت نہ کرے (بلکہ) ان میں سے کسی شخص کو ان کی امامت کرنی چاہئے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ) نسائی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے مگر انہوں نے صرف آنحضرت ﷺ ذکر نہیں کیا بلکہ صرف آنحضرت ﷺ کے الفاظ پر اکتفاء کیا ہے یعنی انہوں نے اپنی روایت میں حضرت مالکؓ کے مسجد میں آنے کا واقعہ اور ان کا امامت سے انکار کرنا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف آنحضرت ﷺ کے الفاظ "من زار" سے آخر تک نقل کیا ہے)

تشریح: حضرت مالکؓ نے اپنی فضیلت و بڑائی اور ان لوگوں کی اجازت کے باوجود امامت کا فریضہ انجام نہیں دیا کیونکہ ان کے سامنے آنحضرت ﷺ کا یہ اشارہ تھا کہ انہوں نے بظاہر حدیث پر عمل کرنا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھا۔

نابینا کی امامت جائز ہے

(۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اسْتَخْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ابْنَ اُمِّ مَکْتُوْمٍ یَؤُمُّ النَّاسَ وَهُوَ اَعْمٰی۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم کو اپنا قائم مقام مقرر کیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں اور وہ

نابینا تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نابینا کی امامت بلا کراہت جائز ہے اس سلسلہ میں حنفی مسلک میں یہ فقہی روایتیں بھی وارد ہیں کہ اگر نابینا قوم کا سردار ہو تو اس کی امامت جائز ہے بلکہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر نابینا بہت زیادہ علم کا حامل ہو تو امامت کے سلسلہ میں وہ اولیٰ ہے۔ (شرح کنز، اشباہ والنظائر)

ناپسندیدہ امام کی نماز قبول نہیں ہوتی

(۶) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَۃٌ لَا تُجَاوِزُ صَلَاتُھُمْ اٰذَانَھُمْ اَلْعَبْدُ الْاٰبِقُ حَتّٰی یَرْجِعَ وَامْرَأَۃٌ بَاتَتْ وَزَوْجُھَا عَلَیْھَا سَاخِطٌ وَاِمَامُ قَوْمٍ وَھُمْ لَہٗ کَارِھُوْنَ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جن کی نماز ان کے کانوں سے بلند نہیں ہوتی (یعنی درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی) ایک تو اپنے مالک کے یہاں سے بھاگا ہوا غلام جب تک کہ وہ (اپنے مالک کے پاس) واپس نہ آجائے دوسرے وہ عورت جو اس حالت میں رات گزار دے کہ اس کا خاوند اس سے ناراض ہو تیسرے وہ امام جسے اس کی قوم پسند نہ کرتی ہو۔" (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریح: غلام کے حکم میں باندی بھی داخل ہے یعنی اگر باندی بھی اپنے آقا کے یہاں سے بھاگ جائے تو اس کا بھی یہی حال ہوگا کہ جب تک وہ اپنے آقا کے پاس واپس نہ آجائے گی اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔

عورت کے بارہ میں جو فرمایا گیا ہے تو یہ اس شکل میں ہے جب کہ عورت بدخلق ہو اور اس کا خاوند اس کی بدخلقی، نافرمانبرداری اور بے ادبی کی وجہ سے اس سے ناراض ہو، اور اگر خاوند ہی بدخلق ہو اور اپنی بیوی سے ناحق ناراض و خفا ہے تو عورت گنہگار نہیں ہوگی بلکہ مرد ہی گنہگار ہوگا۔

امام کے بارہ میں حضرت ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ امام پر یہ گناہ اس وقت ہوگا جب کہ اس کی بدعت اور اس کے فسق یا اس کے جہل کی وجہ سے اس کے مقتدی اس سے ناراض ہوں اور اگر مقتدی کسی دینوی غرض کے تحت اس سے کراہت و عداوت رکھتے ہوں تو امام مطلقاً گنہگار نہیں ہوگا اور نہ ایسے امام کے حق میں حدیث کا مذکورہ بالا حکم ہے بلکہ مقتدی ہی گنہگار ہوں گے۔

اتنی بات بھی سمجھ لیجئے کہ حدیث میں مذکورہ امام سے نماز کا امام بھی ہے اور حاکم و خلیفہ بھی یعنی اگر کسی حاکم اور خلیفہ سے اس کی رعایا اس کی بداعمالیوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے ناخوش ہوگی تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار ہوگا۔

تین شخصوں کی نماز قبول نہیں ہوتی

(۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَۃٌ لَا تُقْبَلُ مِنْھُمْ صَلَاتُھُمْ مَنْ تَقَدَّمَ قَوْمًا وَھُمْ لَہٗ کَارِھُوْنَ وَرَجُلٌ اَتَی الصَّلَاۃَ دِبَارًا وَالدِّبَارُ اَنْ یَّاْتِیَھَا بَعْدَ اَنْ تَفُوْتَہٗ وَرَجُلٌ اعْتَبَدَ مُحَرَّرَہٗ۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جن کی نماز قبول نہیں ہوتی (یعنی انہیں نماز کا ثواب نہیں ملتا) ایک تو وہ شخص جو کسی قوم کا امام ہو اور قوم اس سے خوش نہ ہو دوسرا شخص جو نماز میں پیچھے آئے اور پیچھے کا مطلب یہ ہے کہ نمازوں کا (مستحب) وقت نکل جانے کے بعد آئے، اور تیسرا وہ شخص جو آزاد کو غلام سمجھے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اعتبد محررۃ (آزاد کو غلام سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ غلام کو آزاد کردے اور پھر بعد میں زبردستی اس سے خدمت لینے لگے، یا غلام کو آزاد کر دیا مگر اس کی آزادی کو خود اس غلام سے چھپائے یا کسی آزاد شخص کے بارہ میں دعوی کرے کہ یہ میرا غلام ہے اور اس کے

ساتھ غلاموں جیسا سلوک بھی کرے۔ یا بردہ (غلام) مول لے کر اس پر مالکانہ تصرف کرے مگر حقیقت میں اس کی خریداری شرعی طور نہ ہوئی ہو جیسا کہ لوگ غیر شرعی طور پر غلام اور لونڈی مول لیتے ہیں۔

شرعی غلام اور لونڈی کی تفصیل فقہاء اس طرح لکھتے ہیں کہ "اگر مسلمانوں کی جماعت دارالاسلام سے دارالحرب جا کر غلبہ حاصل کرے اور زبردستی حربی کافر کو خواہ مرد ہوں یا عورت یا خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے غلام اور لونڈی بنا کر دارالاسلام میں لائے یا۔ اسی طرح کسی ملک کے حربی کفار دوسرے ملک کے حربی کفار پر غلبہ حاصل کر کے انہیں زبردستی لے آئیں تو ان دونوں صورتوں میں غلام اور لونڈی بنانے والے خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر ان غلام اور لونڈیوں کے مالک ہوتے ہیں ان غلام اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کرنا ان کو رہن رکھنا ان کا ہبہ کرنا۔ لونڈیوں کے ساتھ بغیر نکاح کے ہم بستری کرنا اور اسی طرح ان پر تمام مالکانہ تصرفات کرنے جائز ہیں نیز اس صورت میں لونڈی کی اولاد بھی ان ہی کا حکم رکھتی ہے بشرطیکہ وہ مالک یا ذی رحم مالک سے پیدا نہ ہو اور اگر ان میں سے کسی سے پیدا ہوگی تو وہ آزاد ہوگی بہر حال فقہاء نے بردے کی یہ دونوں قسمیں لکھ کر مزید قسمیں بھی لکھی ہیں اور ان میں سے بعض کے بارے میں کہا ہے کہ ان صورتوں میں شرعی بردے نہیں ہوتے اور بعض کے بارہ میں اختلاف کیا ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ مذکورہ بالا دونوں قسموں کے علاوہ اور کسی صورت میں شرعی بردے نہیں ہوتے اور نہ ان کی خرید و فروخت شرعی طور پا جائز ہوتی ہے۔

لہٰذا مسلمان کو چاہئے کہ وہ غلام اور لونڈی کے بارہ میں احتیاط سے کام لیں اگر شرعی لونڈی ہو تو اسے خدمت میں لائیں ورنہ ایسا نہ کریں کہ جس پر بھی لونڈی ہو جانے کا داغ لگ جائے اگر وہ شرعی لونڈی نہ ہو جانوروں کی طرح اندھا دھند اس سے صحبت نہ کرنے لگیں کہ درحقیقت ایسا کرنا حرام کاری اور زنا میں مبتلا ہونا ہے اسی طرح اس کے ساتھ دیگر مالکانہ تصرفات بھی نہ کئے جائیں۔

امامت سے عام گریز قیامت کی علامت ہے

(۸) وَعَنْ سَلَامَةَ بِنْتِ الْحُرِّ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يَتَدَافَعَ اَهْلُ الْمَسْجِدِ لَا يَجِدُوْنَ اِمَامًا يُصَلِّي بِهِمْ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت سلامہ بنت حرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کی علامتوں میں سے (ایک علامت یہ ہے کہ مسجد کے لوگ امامت کو دفع کریں گے یعنی امام بننے سے گریز کریں گے) اور کوئی نماز پڑھانے والا ان کو نہ ملے گا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یہ دراصل آخری زمانہ کے عام جہل و فسق سے کنایہ ہے کہ قیامت کے قریب جہل و فسق عمومی طور پر اس طرح پھیل جائے گا۔ اور لوگ اتنے جاہل و نااہل پیدا ہوں گے کہ کوئی شخص امامت کا اہل نہیں ہوگا تمام لوگ اپنی نااہلی و جہالت کے پیش نظر امامت سے گریز کرنے لگیں گے اور آس پاس میں ایک دوسرے سے نماز پڑھانے کے لئے کہیں گے مگر ہر شخص امام بننے سے انکار کرے گا۔

ہاں اگر کوئی شخص کسی کو اپنے سے افضل سمجھ کر خود امامت سے گریز کرے اور اس سے نماز پڑھانے کے لئے کہے تو اس کا تعلق اس حدیث سے نہیں ہوگا کیونکہ دوسرے کو افضل اور اپنے سے بہتر سمجھ کر خود کو امامت سے گریز کرنا اور اس افضل کو امامت کے لئے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

فاسق کی امامت جائز ہے

(۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْجِهَادُ وَاجِبٌ عَلَيْكُمْ مَعَ كُلِّ اَمِيْرٍ بَرًّا كَانَ اَوْ فَاجِرًا وَاِنْ عَمِلَ الْكَبَائِرَ وَالصَّلٰوةُ وَاجِبَةٌ عَلَيْكُمْ خَلْفَ كُلِّ مُسْلِمٍ بَرًّا كَانَ اَوْ فَاجِرًا وَاِنْ عَمِلَ الْكَبَائِرَ وَالصَّلٰوةُ وَاجِبَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ بَرًّا كَانَ اَوْ فَاجِرًا وَاِنْ عَمِلَ الْكَبَائِرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے اوپر جہاد ہر سردار کے ہمراہ خواہ وہ نیک ہو یا بد واجب ہے اگرچہ وہ (سردار) گناہ کبیرہ کرتا ہو اور تم پر نماز ہر مسلمان کے پیچھے واجب ہے خواہ وہ (نماز پڑھانے والا) نیک ہو یا بد واجب ہے اگرچہ گناہ کبیرہ کرتا ہو اور نماز جنازہ ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ نیک ہو یا بد اگرچہ گناہ کبیرہ کرتا ہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: جہاد واجب ہے کا مطلب یہ ہے کہ بعض صورتوں میں تو جہاد فرض عین ہے اور بعض صورتوں میں فرض کفایہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے خواہ وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو بشرطیکہ اس کا فسق کفر کی حد تک نہ پہنچ چکا ہو فاسق کے پیچھے نماز ادا تو ہو جاتی ہے لیکن اس کے پیچھے نماز پڑھنا بہر حال مکروہ ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ نیک بخت کی موجودگی میں فاسق کو امامت نہ کرنی چاہئے۔

"نماز جنازہ کے واجب ہونے" کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر جنازہ کی نماز پڑھنا فرض کفایہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

نابالغ کی امامت کا مسئلہ

⑮ عَنْ عَمْرِو ابْنِ سَلِمَةَ قَالَ كُنَّا بِمَاءٍ مَمَرَّ النَّاسِ يَمُرُّ بِنَا الرُّكْبَانُ نَسْأَلُهُمْ مَالِلنَّاسِ؟ مَالِلنَّاسِ؟ مَاهٰذَا الرَّجُلِ فَيَقُوْلُوْنَ يَزْعَمُ اَنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَهُ اَوْحٰى اِلَيْهِ اَوْحٰى اِلَيْهِ كَذَا فَكُنْتُ اَحْفَظُ ذٰلِكَ الْكَلَامَ فَكَاَنَّمَا يُغْرٰى فِيْ صَدْرِيْ وَكَانَتِ الْعَرَبُ تَلَوَّمُ بِاِسْلَامِهِمُ الْفَتْحَ فَيَقُوْلُوْنَ اتْرُكُوْهُ وَقَوْمَهُ فَاِنَّهُ اِنْ ظَهَرَ عَلَيْهِمْ فَهُوَ نَبِيٌّ صَادِقٌ فَلَمَّا كَانَتْ وَقْعَةُ الْفَتْحِ بَادَرَ كُلُّ قَوْمٍ بِاِسْلَامِهِمْ وَبَدَرَ اَبِيْ قَوْمِيْ بِاِسْلَامِهِمْ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ جِئْتُكُمْ وَاللّٰهِ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ حَقًّا فَقَالَ صَلُّوْا صَلَاةَ كَذَا فِيْ حِيْنِ كَذَا وَصَلَاةَ كَذَا فِيْ حِيْنِ كَذَا فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ اَحَدُكُمْ فَلْيَؤُمَّكُمْ اَكْثَرُكُمْ قُرْاٰنًا فَنَظَرُوْا فَلَمْ يَكُنْ اَحَدٌ اَكْثَرَ قُرْاٰنًا مِنِّيْ لِمَا كُنْتُ اَتَلَقّٰى مِنَ الرُّكْبَانِ فَقَدَّمُوْنِيْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَاَنَا ابْنُ سِتٍّ اَوْسَبْعِ سِنِيْنَ وَكَانَتْ عَلَيَّ بُرْدَةٌ كُنْتُ اِذَا سَجَدْتُ تَقَلَّصَتْ عَنِّيْ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ مِنَ الْحَيِّ اَلَا تُغَطُّوْنَ عَنَّا اِسْتَ قَارِئِكُمْ فَاشْتَرَوْا فَقَطَعُوْا لِيْ قَمِيْصًا فَمَا فَرِحْتُ بِشَيْءٍ فَرْحِيْ بِذَالِكَ الْقَمِيْصِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عمرو ابن سلمہؓ فرماتے ہیں کہ ہم پانی کے کنارے رہتے تھے جو لوگوں کی گزرگاہ تھا قافلے ہمارے پاس سے گزرتے ہم ان سے پوچھتے تھے کہ لوگوں کے واسطے (ایک شخص یعنی آنحضرت ﷺ نے جو دین نکالا ہے وہ) کیا ہے؟ اور اس شخص (یعنی حضرت محمد ﷺ) کی صفات کیا ہیں؟ وہ لوگ ہم سے بیان کرتے کہ وہ (رسول ﷺ) دعوی کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں (اپنا نبی برحق بنا کر) بھیجا ہے اور (قافلہ کے لوگ قرآن کی آیتیں سنا کر کہا کرتے تھے کہ یہ) ان کے پاس وحی آتی ہے (اس طرح) ان کے پاس وحی آتی ہے چنانچہ میں (آنحضرت ﷺ کے اوصاف کو جو قافلے والے بیان کرتے تھے اور کلام کو) یعنی قافلے والے جو آیتیں پڑھ کر سنایا کرتے ان کو اس طرح یاد کر لیتا تھا گویا وہ میرے سینے میں جم جاتی تھیں (یعنی قرآن کی آیتیں مجھے خود یاد ہو جایا کرتی تھیں) اہل عرب (آنحضرت ﷺ کی جماعت کے علاوہ) اسلام لانے کے سلسلہ میں مکہ کے فتح ہونے کا انتظار کر رہے تھے (یعنی یہ کہتے تھے کہ اگر مکہ فتح ہو گیا تو ہم اسلام لائیں گے اور یہ) کہا کرتے تھے کہا ان (رسول ﷺ) کو ان کی قوم پر چھوڑ دو اگر وہ اپنے لوگوں پر غالب آ گئے (اور مکہ کو فتح کر لیا) تو سمجھو کہ وہ سچے نبی ہیں (کیونکہ ان کی اس ظاہری بے سروسامانی اور مادی کمزوری کے باوجود اہل عرب پر غالب آ جانا اور مکہ کو فتح کر لینا ان کا معجزہ ہو گا اور معجزہ صرف سچے نبی ہی سے صادر ہو سکتا ہے چنانچہ جب خدا نے اپنے دین کا بول بالا کیا اور) مکہ فتح ہو گیا تو لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے میرے والد نے اپنی قوم پر پہل کی اور (سب سے پہلے) اسلام لے آئے جب وہ (یعنی میرے والد) لوٹ کر آئے تو اپنی قوم سے) کہنے

لگے لہ "خدا کی قسم! میں سچے نبی (ﷺ) کے پاس سے آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ فلاں وقت میں ایسی (اور اتنی) نماز پڑھو اور فلاں وقت میں ایسی (اور اتنی) نماز پڑھو (یعنی آپ نے نماز کی کیفیات اور اوقات بیان کئے) اور جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور تم میں جو شخص قرآن سب سے زیادہ جاننے والا ہو وہ تمہاری امامت کرے چنانچہ جب نماز کا وقت آیا اور جماعت کی تیاری ہوئی تو لوگوں نے آپس میں دیکھا (کہ امام کسے بنایا جائے!) مجھ سے زیادہ کوئی قرآن کا جاننے والا نہیں تھا کیونکہ میں (تو پہلے ہی سے) قافلہ والوں سے قرآن سیکھ رہا تھا چنانچہ لوگوں نے مجھے آگے کر دیا (اور نماز میں میری اقتداء کی) اس وقت میری عمر چھ یا سات سال کی تھی اور میرے بدن پر فقط ایک چادر تھی چنانچہ جب میں سجدہ کرتا تو وہ چادر میرے بدن سے سرک جاتی تھی (اور کولھے کھل جاتے تھے) قوم میں سے ایک عورت نے (یہ دیکھ کر) کہا کہ ہمارے سامنے سے تم لوگ اپنے امام کی شرم گاہ کیوں نہیں ڈھانکتے؟ تب قوم نے کپڑا خریدا اور میرے لئے کرتہ بنوایا دیا اس کرتہ کی وجہ سے مجھے جیسی خوشی ہوئی ایسی خوشی کبھی نہیں ہوئی تھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: عام طور پر "سلمہ" لام کے زبر کے ساتھ ہے مگر یہ عمرو جو قوم کے امام بنے تھے ان کے والد کے نام "سلمہ" میں لام زیر کے ساتھ ہے۔

اس کے بارہ میں علماء کے یہاں اختلاف ہے کہ عمرو ابن سلمہ بھی اپنے والد کے ہمراہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے گئے یا نہیں؟ اسی وجہ سے اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ صحابی ہیں یا نہیں؟ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد تنہا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں گئے تھے یہ ان کے ساتھ نہیں گئے تھے۔

حضرت امام شافعیؒ لڑکے کی امامت کے جواز میں اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ لڑکے کی امامت جائز ہے البتہ جمعہ کی نماز میں نابالغ لڑکے کی امامت کے سلسلہ میں امام شافعی کے دو قول ہیں ایک قول سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ جمعہ کی نماز میں بھی لڑکے کی امامت کے جواز کے قائل ہیں اور دوسرے قول سے عدم جواز کا اثبات ہوتا ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، حضرت امام مالک اور حضرت امام احمدؒ کہتے ہیں کہ نابالغ کی امامت جائز نہیں ہے البتہ نفل نماز کے سلسلہ میں علماء حنفیہ کے یہاں اختلاف ہے چنانچہ بلخ کے مشائخ نماز میں نابالغ لڑکے کی امامت کے جواز کے قائل ہیں اور اسی پر ان کا عمل ہے نیز مصر اور شام میں بھی اس پر عمل کیا جاتا ہے ان کے علاوہ دیگر علماء نے نفل نماز میں بھی نابالغ لڑکے کی امامت کو ناجائز قرار دیا ہے چنانچہ علماء ماوراء النہر کا عمل اسی پر ہے۔

زیلعیؒ نے شرح کنز میں اس مسئلہ کے متعلق کہا ہے کہ "امام شافعیؒ نے اس مسئلہ میں کہ نابالغ لڑکے کی امامت جائز ہے حضرت عمرو ابن سلمہ کے اس قول فقدمونی الخ سے استدلال کیا ہے لیکن ہمارے (یعنی حنفیہ کے) نزدیک حضرت ابن مسعودؓ کے اس قول کی روشنی میں کہ "وہ لڑکا جس پر حدود واجب نہیں ہوئی ہیں امامت نہ کرے" نابالغ لڑکے کی امامت جائز نہیں ہے اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کا قول بھی یہی ہے کہ "لڑکا جب تک محتلم (یعنی بالغ) نہ ہو جائے امامت نہ کرے۔"

لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کہ فرض نماز پڑھنے والا نابالغ لڑکے کی اقتداء کرے جہاں تک عمرو ابن سلمہ کی امامت کا تعلق ہے تو اس کے بارہ میں یہ کہا جائے گا کہ ان کی امامت آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی بنا پر نہیں تھی بلکہ یہ ان کی قوم کے لوگوں کا اپنے اجتہاد تھا کہ عمرو چونکہ قافلہ کے لوگوں سے قرآن کریم سیکھ چکے تھے اس لئے ان کو امام بنا دیا۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ حضرات شوافع حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور دوسرے بڑے بڑے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال سے تو استدلال نہیں کرتے۔ ایک نابالغ لڑکے (عمرو ابن سلمہ) کے فعل کو مستدل بناتے ہیں۔

آزاد کردہ غلام کی امامت

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَمَّا قَدِمَ الْمُهَاجِرُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ الْمَدِيْنَةَ كَانَ يَؤُمُّهُمْ سَالِمٌ مَوْلٰى اَبِيْ حُذَيْفَةَ وَفِيْهِمْ عُمَرُ

وَ اَبُوْسَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الْاَسَدِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں پہلے آنے والے مہاجرین آئے تو ابی حذیفہ کے آزاد کردہ غلام حضرت سالمؓ انہیں نماز پڑھاتے تھے اور ان (مقتدیوں) میں حضرت عمرؓ، حضرت ابوسلمہؓ ابن عبدالاسد (بھی) ہوتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت سالمؓ حذیفہ کے آزاد کردہ غلام اور بہت اچھے قاری تھے ان کا شمار نہایت بزرگ اور اونچے درجہ کے قراء صحابہ میں ہوتا تھا آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ "قرآن کریم چار لوگوں سے حاصل کرو اور ان چار لوگوں میں حضرت سالمؓ کا نام بھی شمار کیا تھا۔

حضرت عمرؓ حضرت ابوسلمہ ابن عبدالاسد اور ان جیسے دوسرے جلیل القدر اور باعظمت و فضیلت صحابہؓ کی موجودگی میں حضرت سالمؓ کے امام مقرر ہونے کی وجہ یا تو یہ تھی کہ یہ بہت اچھے قاری تھے یا پھر اس میں کوئی اور مصلحت ہوگی۔

وہ لوگ جن کی نماز قبول نہیں ہوتی

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا تُرْفَعُ لَهُمْ صَلَاتُهُمْ فَوْقَ رُؤُسِهِمْ شِبْرًا رَجُلٌ اَمَّ قَوْمًا وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ وَامْرَأَةٌ بَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَلَيْهَا سَاخِطٌ وَاَخَوَانِ مُتَصَارِمَانِ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین لوگ ایسے ہیں جن کی نماز ان کے سر سے بالشت بھر (بھی) بلند نہیں ہوتی (یعنی درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی) ایک تو وہ شخص جو قوم کا امام ہو اور قوم اس سے (دینی امور میں) ناخوش ہو۔ دوسرے وہ عورت جو اس حالت میں رات گزارے کہ اس کا خاوند (اس کی نافرمانی یا اس کی جانب سے اپنے حق کی عدم ادائیگی کی وجہ سے) خفا ہو تیسرے ایسے دو بھائی جو آپس میں ناخوش ہوں۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے دو بھائیوں کی بھی نماز قبول نہیں ہوتی جو آپس میں ناخوش و ناراض ہوں اور تین دن سے زیادہ سلام وغیرہ ترک کئے رہیں۔

باب ما علی الامام

امام پر لازم چیزوں کا بیان

اس باب کے تحت وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ مقتدیوں کی رعایت کے سلسلہ میں امام کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز کو بھاری نہ بنانا چاہئے

(۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ اِمَامٍ قَطُّ اَخَفَّ صَلَاةً وَلَا اَتَمَّ صَلَاةً مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِنْ كَانَ لَيَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَيُخَفِّفُ مُخَافَةَ اَنْ تُفْتَنَ اُمُّهُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی نماز سے زیادہ ہلکی اور کامل نماز کسی امام کے پیچھے نہیں پڑھی اور آپ ﷺ کی (عادت یہ تھی کہ) جب آپ (نماز میں) کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو اس اندیشہ سے کہ اس کی ماں کہیں فکر مند نہ ہو جائے نماز کو ہلکا کر دیتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حدیث کے اول جز کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نماز باوجود پورے کمال و اتمام کے بہت ہلکی ہوتی تھی اور ہلکی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ قرأت اور تسبیحات حد سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور قرأت میں بے محل مد و شد نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کی قرأت بے تکلف اور ترتیل کے ساتھ ہوتی تھی اور یہ تو آنحضرت ﷺ کی قرأت کی خاصیت تھی کہ اگرچہ وہ طویل ہوتی تھی مگر لوگوں کو ہلکی معلوم ہوتی تھی۔

حاصل یہ کہ آپ ﷺ کی قرأت ہلکی ہوتی تھی اور رکوع و سجود نیز تعدیل ارکان وغیرہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔

حنفی مسلک میں یہ مسئلہ ہے کہ امام کے لئے مناسب نہیں ہے کہ تسبیحات وغیرہ کو اتنا طویل کرے کہ لوگ ملول ہوں کیونکہ نماز کو زیادہ طویل کرنا نماز کی طرف سے لوگوں کو بے توجہ بنانا ہے اور یہ مکروہ ہے ہاں اگر مقتدیوں ہی کی یہ خواہش ہو کہ قرأت و تسبیحات وغیرہ طویل ہوں تو پھر ان میں امام زیادتی کر سکتا ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں اس طرح امام کو یہ بھی نہ چاہئے کہ مقتدیوں کو خوش کرنے کی غرض سے قرأت اور تسبیحات میں اس درجہ سے بھی کمی کر دے جو سب سے کم مسنون درجہ ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب نماز میں کسی بچہ کے رونے کی آواز سنتے تو نماز ہلکی کر دیا کرتے تھے۔ تاکہ اس بچے کی ماں جو جماعت میں شامل ہوتی، بچے کی طرف سے فکر میں نہ پڑ جائے اور جس کی وجہ سے اس کی نماز کا حضور اور خشوع و خضوع ختم ہو جائے۔

خطابیؒ نے اس جملہ کی تشریح میں کہا ہے کہ "اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ امام رکوع میں ہونے کی حالت میں اگر آہٹ پائے کہ کوئی شخص نماز میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ رکوع میں اس شخص کا انتظار کرے تاکہ وہ شخص رکعت حاصل کرے مگر بعض حضرات نے اسے مکروہ قرار دیا ہے بلکہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے والے کے بارہ میں یہ خوف ہے کہ وہ کہیں شرک کی حد تک پہنچ جائے گا۔ چنانچہ یہی مسلک حضرت امام مالک کا بھی ہے۔ حنفی مسلک یہ ہے کہ امام اگر رکوع کو تقرب الی اللہ کی نیت سے نہیں بلکہ اس مقصد سے طویل کرے گا کہ کوئی آنے والا شخص رکوع میں شامل ہو کر رکعت پالے تو یہ مکروہ تحریمی ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی بڑے گناہ کے مرتکب ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے تاہم کفر و شرک کی حد تک نہیں پہنچے گا کیونکہ اس سے اس کی نیت غیر اللہ کی عبادت بہر حال نہیں ہوگی۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر امام آنے والے کو پہچانتا نہیں ہے تو اس شکل میں رکوع کو طویل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ اس کا ترک اولیٰ ہے ہاں اگر کوئی امام تقرب الی اللہ کی نیت سے رکوع کو طویل کرے اور اس پاک جذبہ کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ایسی حالت کا ہونا چونکہ نادر ہے اور پھر یہ کہ اس مسئلہ کا نام ہی "مسئلہ الریا" ہے اس لئے اس سلسلہ میں کمال احتیاط ہی اولیٰ ہے۔

(۲) وَعَنْ اَبِي قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي لَاَدْخُلُ فِي الصَّلَاةِ وَاَنَا اُرِيْدُ اِطَالَتَهَا فَاَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَاَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي مِمَّا اَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ اُمِّهِ مِنْ بُكَائِهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت قتادہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نماز میں داخل ہوتا ہوں تو نماز کو طویل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں مگر جب بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو یہ جان کر کہ بچے کے رونے کی وجہ سے اس کی ماں سخت فکر مند ہوگی نماز میں تخفیف کر دیتا ہوں۔" (بخاریؒ)

(۳) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ لِلنَّاس فَلْيُخَفِّفْ فَاِنَّ فِيْهِمُ السَّقِيْمَ وَالضَّعِيْفَ وَالْكَبِيْرَ وَاِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ لِنَفْسِهٖ فَلْيُطَوِّلْ مَاشَاءَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو اسے چاہئے کہ نماز کو ہلکی کرے کیوں کہ مقتدیوں میں بیمار کمزور اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں (اور ان کی رعایت ضروری ہے) اور جب تم میں سے کوئی شخص تنہا اپنی نماز پڑھے تو اسے اختیار ہے کہ جس قدر چاہے نماز کو طویل کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں امام کے لئے یہ ہدایت دے دی گئی ہے کہ وہ نماز پڑھاتے وقت مقتدیوں کی رعایت ضرور کرے اس بات کا لحاظ رکھے کہ مقتدیوں میں بیمار بوڑھے اور کمزور لاغر لوگ بھی ہوں گے جو نماز کی طوالت سے تکلیف و پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پریشانی اور تکلیف سے بچنے کی خاطر جماعت میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیں اس لئے ان کی رعایت کے پیش نظر نماز ہلکی ہی پڑھانی چاہئے ہاں اگر کوئی شخص تنہا نماز پڑھ رہا ہو تو اسے اختیار ہے کہ جس قدر چاہے طویل نماز پڑھے۔

اسی طرح اگر تمام مقتدی حضور قلب کے حامل ہوں اور نماز کی طوالت سے گھبراتے نہ ہوں نیز مذکورہ بالا لوگوں میں سے یعنی بیمار و ضعیف وغیرہ نہ ہوں تو اس شکل میں بھی امام جس قدر چاہے طویل نماز پڑھائے۔

④ وَعَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِيْ حَازِمٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ اَبُوْمَسْعُوْدٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَاَتَاَخَّرُ عَنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ مِنْ اَجْلِ فُلَانٍ مِمَّا يُطِيْلُ بِنَا فَمَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَوْعِظَةٍ اَشَدَّ غَضَبًا مِنْهُ يَوْمَئِذٍ ثُمَّ قَالَ اِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ فَاَيُّكُمْ مَا صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيَتَجَوَّزْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَالْكَبِيْرَ وَذَا الْحَاجَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت قیس ابن ابی حازم کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے مجھ سے فرمایا کہ (ایک دن) ایک شخص نے (نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر) کہا کہ یا رسول اللہ! میں صبح کی نماز سے اس لئے پیچھے رہ جاتا ہوں کہ فلاں آدمی ہمیں بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو نصیحت کرنے کے بارہ میں اس دن جیسا غصہ میں بھرے ہوئے کبھی نہیں دیکھا چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم میں سے بعض لوگ (طویل نماز پڑھا کر جماعت سے) لوگوں کو نفرت دلانے والے ہیں (خبردار) تم میں سے جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو اسے چاہئے کہ وہ ہلکی نماز پڑھائے کیونکہ مقتدیوں میں کمزور، بوڑھے اور حاجت مند لوگ بھی ہوتے ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

غلط نماز پڑھانے والا امام اپنی غلطی کا خمیازہ خود بھگتے گا

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلُّوْنَ لَكُمْ فَاِنْ اَصَابُوْا فَلَكُمْ وَاِنْ اَخْطَاُوْا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہیں امام نماز پڑھائیں گے چنانچہ اگر وہ نماز اچھی پڑھائیں گے تو اس کا فائدہ تمہارے لئے ہے (اور ان کے لئے بھی ہے) اور اگر انہوں نے خطا کی (بے طرح نماز پڑھائی) تو تمہیں (پھر بھی) ثواب ملے گا اور اس کا گناہ ان پر ہوگا۔" (بخاریؒ)

تشریح: اگر امام اچھی طرح اور شرعی و مسنون طریقہ سے پڑھائے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا ثواب امام اور مقتدی دونوں ہی کو ملے گا اور اگر امام نماز بے قاعدہ اور غیر شرعی و غیر مسنون طریقہ سے پڑھائے گا تو اس کی ذمہ داری مقتدیوں پر نہیں ہے مقتدیوں کو تو اس صورت میں بھی ثواب ملے گا کیونکہ انہوں نے تو نماز اچھی طرح ادا کی اور جماعت میں شریک ہونے کی نیت کی البتہ امام اپنی غلطی اور خطا کا خمیازہ خود بھگتے گا کیونکہ اس نے نماز پڑھانے میں تقصیر کی ہے۔

اس حدیث کے ذریعہ دراصل آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو وصیت فرمائی ہے کہ بعد میں جب برے اور غلط کار حاکم پیدا ہوں گے اور امامت کریں گے تو وہ امامت کی ادائیگی میں احکام و آداب کی رعایت نہیں کریں گے۔ لہٰذا اس وقت تم کو چاہئے کہ اپنی نماز درست اور صحیح طریقہ پر ادا کرو۔ اگر امام اچھی طرح نماز پڑھائے گا تو اس کا فائدہ امام اور مقتدی دونوں کو ہوگا ورنہ غلط نماز پڑھانے کی شکل میں مقتدیوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا غلط نماز پڑھانے کی ذمہ داری تنہا امام پر ہوگی اور نقصان اسی کو ہوگا۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِي

اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بوڑھے اور بیمار مقتدیوں کی رعایت امام کے لئے ضروری ہے

(۶) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِي الْعَاصِ قَالَ اٰخِرُ مَا عَهِدَ اِلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَمْتَ قَوْمًا فَاَخِفَّ بِهِمُ الصَّلٰوةَ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِي رِوَايَةٍ لَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ اُمَّ قَوْمَكَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي اَجِدُ فِي نَفْسِي شَيْئًا قَالَ اُدْنُهْ فَاَجْلَسَنِي بَيْنَ يَدَيْهِ ثُمَّ وَضَعَ كَفَّهٗ فِي صَدْرِي بَيْنَ ثَدْيَيَّ ثُمَّ قَالَ تَحَوَّلْ فَوَضَعَ فِي ظَهْرِي بَيْنَ كَتِفَيَّ ثُمَّ قَالَ اُمَّ قَوْمَكَ وَمَنْ اَمَّ قَوْمًا فَلْيُخَفِّفْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الْكَبِيْرَ وَاِنَّ فِيْهِمُ الْمَرِيْضَ وَاِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَاِنَّ فِيْهِمْ ذَا الْحَاجَةِ فَاِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ وَحْدَهٗ فَلْيُصَلِّ كَيْفَ شَاءَ۔

"حضرت عثمان ابن ابی العاص ؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے جو آخری وصیت کی تھی وہ یہ تھی کہ "جب تم لوگوں کی امامت کرو تو انہیں ہلکی نماز پڑھاؤ۔" (مسلم) "مسلم" کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمان ؓ سے فرمایا کہ اپنی قوم کی امامت کرو۔" حضرت عثمان ؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے اپنے دل میں کچھ کھٹک محسوس ہوتی ہے آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ میرے قریب آؤ۔" (جب میں آپ ﷺ کے قریب آگیا تو) آپ ﷺ نے مجھے اپنے آگے بٹھایا اور میرے سینہ پر دونوں چھاتیوں کے درمیان اپنا دست مبارک رکھا پھر فرمایا کہ پشت پھیرو (میں نے اپنی پشت آپ کی جانب کر دی) چنانچہ آپ ﷺ نے میری پشت پر دونوں منڈھوں کے درمیان اپنا دست مبارک پھیر کر فرمایا کہ "جاؤ اور) اپنی قوم کی امامت کرو اور (یہ یاد رکھو کہ) جب کوئی شخص کسی قوم کا امام بنے تو اسے چاہئے کہ ہلکی نماز پڑھائے کیونکہ ان میں بوڑھے بھی ہیں اور بیمار بھی ان میں کمزور لوگ بھی ہوتے ہیں اور حاجتمند بھی ہاں جب کوئی تنہا نماز پڑھے تو اسے اختیار جس طرح چاہئے پڑھے۔"

تشریح: حضرت عثمان ؓ کے ارشاد انی اجدفی نفسی شئیا (یعنی مجھے اپنے دل میں کچھ کھٹک محسوس ہوتی ہے) کا مطلب یہ تھا کہ میں امامت کے حقوق کی ادائیگی سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں یا کچھ وسوسے اور شبہات ہیں جو دل میں آتے ہیں یا یہ کہ امامت کے وقت میرے دل کے اندر ایک قسم کی برتری اور غرور کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کیفیات کے دفعیہ کے لئے ان کے سینے اور پشت پر اپنا دست مبارک پھیرا جس کی برکت سے ان کے دل کی وہ کھٹک جاتی رہی جس کی موجودگی انہیں امامت پر آمادہ نہ ہونے دیتی تھی۔

فاذا صلی احد کم الخ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تنہا نماز پڑھنے والا اپنی نماز کے معاملہ میں مختار ہے چاہے تو وہ طویل نماز پڑھے چاہے مختصر لیکن علماء لکھتے ہیں کہ تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے افضل یہی ہے کہ وہ طویل نماز پڑھے۔

اس زمانہ کے ائمہ کا معاملہ بڑا عجیب ہے جب وہ لوگوں کو نماز پڑھاتے ہیں تو بہت زیادہ طوالت سے کام لیتے ہیں مگر جب تنہا نماز پڑھتے ہیں تو صرف اتنے ہی اختصار پر اکتفا کرتے ہیں جس سے نماز ادا ہو جائے۔ ائمہ کو اس طریق کار کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

(۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْمُرُنَا بِالتَّخْفِيْفِ وَيَؤُمُّنَا بِالصَّافَّاتِ۔ (رواه النسائی)

"اور حضرت ابن عمر ؓ فرماتے ہیں کہ "نبی کریم ﷺ ہمیں ہلکی نماز (پڑھانے) کا حکم دیا کرتے تھے اور آپ ہمیں نماز پڑھاتے تو سورہ صافات کی قرأت کرتے۔" (نسائی)

تشریح: حدیث کے دونوں جزمیں بظاہر تو تعارض نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو آپ ہلکی نماز پڑھانے کا حکم دیتے تھے اور دوسری طرف خود امامت کرتے وقت سورہ صافات کی قرأت فرماتے جو ایک طویل سورت ہے، اس تعارض کو دفع کرنے کے لئے علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ لمبی لمبی سورتیں اور بہت زیادہ آیتیں بہت کم عرصہ میں پڑھ لیتے تھے جس سے لوگوں کو کوئی گرانی اور اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی اور یہ خصوصیت دوسروں کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح دونوں جزئیں کوئی تعارض نہیں رہا۔

بَابُ مَا عَلَى الْمَأْمُوْمِ مِنَ الْمُتَابَعَةِ وَحُكْمِ الْمَسْبُوْقِ

مقتدی کے لئے امام کی تابعداری کے لزوم اور مسبوق کا بیان

اس باب کے تحت وہ احادیث ذکر کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ مقتدی کیلئے امام کی تابعداری کتنی ضروری اور لازم ہے اور یہ کہ مقتدی کو امام کی متابعت کن چیزوں میں اور کس طرح کرنی چاہئے۔

نیز اس باب میں وہ احادیث بھی نقل کی جائیں گی جن سے مسبوق کا حکم معلوم ہوگا کہ وہ اپنی نماز کس طرح پوری کرے اور اسے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ گذشتہ صفحات میں کسی موقع پر مسبوق کی تعریف کی جا چکی ہے یعنی مسبوق اس نمازی کو کہتے ہیں جو ابتداء سے جماعت میں شریک نہ ہو بلکہ ایک رکعت یا اس سے زیادہ ہو جانے کی بعد جماعت میں آکر شریک ہوا ہو۔

امام کی متابعت کے سلسلہ میں آنے والی احادیث کے ضمن میں حسب موقع مسائل کی وضاحت کی جائے گی تاہم اس موقع پر اجمالی طور پر اتنی بات جانتے چلئے کہ نماز کے ان ارکان میں جو فرض یا واجب ہیں تمام مقتدیوں کو امام کی متابعت و موافقت کرنا واجب ہے ہاں ان ارکان میں جو سنت وغیرہ ہیں مقتدیوں کے لئے امام کی متابعت ضروری نہیں چنانچہ اگر امام، شافعی المذہب ہو اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرے یعنی دونوں ہاتھوں کو اٹھائے تو حنفی مقتدی کو ہاتھوں کا اٹھانا ضروری نہیں ہے کیونکہ ان دونوں موقعوں پر رفع یدین ان کے نزدیک بھی سنت ہے اس طرح فجر کی نماز میں شافعی المذہب امام قنوت پڑھے تو حنفی مقتدیوں کے لئے قنوت پڑھنا واجب نہیں ہاں رات میں قنوت پڑھنا واجب ہے لہٰذا اسی طرح شافعی المذہب امام اگر اپنے مذہب کے موافق قنوت رکوع کے بعد پڑھے تو حنفی مقتدیوں کو بھی امام کی متابعت و موافقت کے پیش نظر رکوع کے بعد ہی قنوت پڑھنا چاہئے۔ (علم الفقہ)

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

امام کی متابعت

(۱) عَنْ بَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّي خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ لَمْ يَحْنِ اَحَدٌ مِنَّا ظَهْرَهُ حَتّٰى يَضَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَبْهَتَهُ عَلَى الْاَرْضِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت براء ابن عازب ؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے چنانچہ آپ جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو جب تک آنحضرت ﷺ (سجدہ کیلئے) اپنی جبین مبارک زمین پر نہیں رکھتے تھے ہم میں سے کوئی شخص اپنی پیٹھ جھکاتا (بھی) نہیں تھا" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: حضرت براء ؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہم رکوع سے اٹھ کر آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہی سجدہ میں نہیں چلے جاتے تھے بلکہ کھڑے رہتے تھے اور جب آنحضرت ﷺ زمین پر اپنی پیشانی رکھ لیتے تو ہم سجدہ میں جاتے۔ مولانا مظہر ؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مقتدی کے لئے یہ سنت ہے کہ وہ اپنی نماز کے ارکان امام کی نماز کے ارکان کے اس قدر بعد ادا کرے اور اگر

امام کے افعال وصلوٰۃ اور مقتدی کے افعال صلوٰۃ کے درمیان ادائیگی کا اتنا وقفہ نہ ہو تو بھی جائز ہے مگر تکبیر تحریمہ کے وقت مقتدی کے لئے اتنا توقف کرنا ضروری ہے کہ جب امام تکبیر تحریمہ کہہ کر فارغ ہو تو مقتدی تکبیر تحریمہ کہیں۔

مگر حنفی فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مقتدی کے لئے امام کی متابعت بطریق مواصلت واجب ہے یعنی مقتدیوں کو ہر رکن امام کے ساتھ ہی بلا تاخیر ادا کرنا چاہئے، تحریمہ بھی امام کی تحریمہ کے ساتھ کریں، رکوع بھی امام کے رکوع کے ساتھ، قومہ بھی امام کے قومہ کے ساتھ، سجدہ بھی امام کے سجدہ کے ساتھ غرض کہ ہر فعل امام کے ہر فعل کے ساتھ کریں۔ ہاں اگر قعدہ اولی میں امام اس سے پہلے کھڑا ہو جائے کہ مقتدی التحیات پوری کریں تو مقتدیوں کو چاہئے کہ التحیات پوری کر کے سلام پھیریں۔ ہاں رکوع و سجود میں اگر مقتدیوں نے تسبیح تین مرتبہ بھی نہ پڑھی ہوں اور امام سر اٹھائے تو صحیح مسئلہ یہی ہے کہ مقتدیوں کو چاہئے کہ وہ تسبیح پڑھے بغیر ہی امام کے ساتھ کھڑے ہو جائیں، اگر مقتدی رکوع یا سجدہ سے اپنے سر امام کے سر اٹھانے سے پہلے اٹھاویں تو ان کو چاہئے کہ وہ دوبارہ رکوع یا سجدہ میں چلے جائیں اور پھر امام کے ساتھ ہی اپنا سر اٹھائیں اس طرح یہ رکوع یا سجدے دو نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی شمار ہوں گے۔

مقتدی امام سے پہلے کوئی رکن ادا نہ کریں

(۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهٗ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ اِمَامُكُمْ فَلَا تَسْبِقُوْنِىْ بِالرُّكُوْعِ وَلَا بِالسُّجُوْدِ وَلَا بِالْقِيَامِ وَلَا بِالْاِنْصِرَافِ فَاِنِّىْ اَرَاكُمْ مِنْ اَمَامِىْ وَمِنْ خَلْفِىْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی جب آپ نماز پڑھا چکے تو اپنا چہرہ مبارک ہماری طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ لوگو! میں تمہارا امام ہوں! لہٰذا تم رکوع کرنے، سجدہ کرنے کھڑے ہونے اور پھرنے (یعنی نماز سے فارغ ہونے) میں مجھ سے جلدی نہ کیا کرو میں تمہیں اپنے آگے اور (بذریعہ مکاشفہ یا بطور معجزہ یا بذریعہ مشاہدہ) اپنے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔" (مسلمؒ)

(۳) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُبَادِرُوا الْاِمَامَ اِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَاِذَا قَالَ وَلَا الضَّآلِّيْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِيْنَ وَاِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ اِلَّا اَنَّ الْبُخَارِىَّ لَمْ يَذْكُرْ وَاِذَا قَالَ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم اپنے امام پر پہل نہ کیا کرو۔ جب امام تکبیر کہے تو تم (بھی اس کے ساتھ ہی) تکبیر کہو جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو جب امام رکوع کرے تو تم رکوع میں جاؤ اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد (اے اللہ اے ہمارے رب تمام تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں) کہو۔" اس روایت کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے مگر بخاری نے اپنی روایات میں وَاِذَا قَالَ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے الفاظ نقل نہیں کئے ہیں۔"

تشریح: "فقولوا آمین" کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ جب امام سورہ فاتحہ پڑھے تو مقتدی خاموش کھڑے رہ کر اسے سنیں اور سورہ فاتحہ کی قرأت نہ کریں۔

حدیث کے آخری جزو سے یہ معلوم ہوا کہ امام جب رکوع سے اٹھتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو مقتدی ربنا لک الحمد کہیں جیسا کہ امام اعظمؒ کا مسئلہ ہے۔

امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی بھی بیٹھ کر نماز پڑھیں یا کھڑے ہو کر

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكِبَ فَرَسًا فَصُرِعَ عَنْهُ فَجُحِشَ شِقُّهُ الْاَيْمَنُ فَصَلّٰى صَلَاةً

مِنَ الصَّلَوَاتِ وَهُوَ قَاعِدٌ فَصَلَّيْنَا وَرَاءَهُ قُعُوْدًا فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ فَاِذَا صَلّٰى قَائِمًا فَصَلُّوْا قِيَامًا وَاِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَاِذَا رَفَعَ فَارْفَعُوْا وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَاِذَا صَلّٰى جَالِسًا فَصَلُّوْا جُلُوْسًا اَجْمَعُوْنَ۔ قَالَ الْحُمَيْدِيُّ: قَوْلُهٗ اِذَا صَلّٰى جُلُوْسًا فَصَلُّوْا جُلُوْسًا هُوَ فِيْ مَرَضِهِ الْقَدِيْمِ ثُمَّ صَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا وَالنَّاسُ خَلْفَهٗ قِيَامٌ لَمْ يَأْمُرْهُمْ بِالْقُعُوْدِ وَاِنَّمَا يُؤْخَذُ بِالْاٰخِرِ فَالْاٰخِرِ مِنْ فِعْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَاتَّفَقَ مُسْلِمٌ اِلٰى اَجْمَعُوْنَ وَزَادَ فِيْ رِوَايَةٍ فَلَا تَخْتَلِفُوْا عَلَيْهِ وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ کسی سفر کے دوران" نبی کریم ﷺ گھوڑے پر سوار تھے کہ (اتفاقاً) آپ ﷺ نیچے گر پڑے اس کی وجہ سے آپ ﷺ کی داہنی کروٹ (ایسی) چھل گئی (کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر آپ ﷺ قادر نہ رہے) چنانچہ آپ ﷺ نے (ان پانچ فرض) نمازوں میں سے کوئی نماز ہمیں بیٹھ کر پڑھائی ہم نے آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھ کر (ہی) نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ نماز پڑھ کر فارغ ہو گئے تو (ہم سے مخاطب ہو کر) فرمایا کہ امام اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے لہٰذا جب امام کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو تم کھڑے ہو کر نماز پڑھو جب وہ رکوع کرے تو تم (بھی) رکوع کرو اور جب وہ رکوع سے اٹھے تو تم (بھی) رکوع سے اٹھو، جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو ربنا لک الحمد کہو اور جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب مقتدی بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔" حمیدیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد کہ "جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔" آپ ﷺ کی پہلی بیماری میں تھا اور اس کے بعد (مرض الموت میں انتقال سے ایک دن پہلے) آنحضرت ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی تو لوگوں نے آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور آپ ﷺ نے انہیں بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا اور آنحضرت ﷺ کے اسی فعل پر عمل کیا جاتا ہے جو آخری ہے (یعنی پہلا فعل منسوخ اور دوسرا فعل ناسخ ہوتا ہے)۔" یہ الفاظ بخاریؒ کے ہیں اور مسلمؒ بھی لفظ اجمعون تک بخاریؒ کے موافق ہیں (یعنی روایت کو اس لفظ تک بخاری اور مسلم دونوں نے نقل کیا ہے) اور ایک دوسری روایت میں مسلمؒ نے یہ الفاظ مزید نقل کئے ہیں کہ (آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا) کہ امام کے خلاف نہ کرو اور جب وہ (امام) سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔"

تشریح: اس روایت کے آخر میں جن حمیدی کا قول نقل کیا گیا ہے یہ وہ حمیدی نہیں جو جمع بین الصحیحین کے مؤلف ہیں بلکہ یہ بخاریؒ کے استاذ حمیدی ہیں بہر حال اکثر ائمہ کا مسلک حمیدی کے قول کے مطابق ہی ہے کہ اگر امام کسی عذر کی بناء پر بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی کھڑے ہو کر پڑھیں انہیں بیٹھ کر نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔

آنحضرت کی علالت اور حضرت ابوبکرؓ کی امامت کا واقعہ

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا ثَقُلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَ بِلَالٌ يُؤْذِنُهٗ بِالصَّلٰوةِ فَقَالَ مُرُوْا اَبَابَكْرٍ اَنْ يُّصَلِّيَ بِالنَّاسِ فَصَلّٰى اَبُوْبَكْرٍ تِلْكَ الْاَيَّامَ ثُمَّ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَدَ فِيْ نَفْسِهٖ خِفَّةً فَقَامَ يُهَادٰى بَيْنَ رَجُلَيْنِ وَرِجْلَاهُ تَخُطَّانِ فِي الْاَرْضِ حَتّٰى دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَلَمَّا سَمِعَ اَبُوْبَكْرٍ حِسَّهٗ ذَهَبَ يَتَاَخَّرُ فَاَوْمَاَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ لَّا يَتَاَخَّرَ فَجَاءَ حَتّٰى جَلَسَ عَنْ يَّسَارِ اَبِيْ بَكْرٍ فَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ يُصَلِّيْ قَائِمًا وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ قَاعِدًا يَقْتَدِيْ اَبُوْبَكْرٍ بِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسُ يَقْتَدُوْنَ بِصَلَاةِ اَبِيْ بَكْرٍ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُمَا يُسْمِعُ اَبُوْبَكْرٍ النَّاسَ التَّكْبِيْرَ۔

"اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ بہت زیادہ بیمار تھے تو (ایک دن) حضرت بلالؓ آپ ﷺ کو نماز کے لئے بلانے آئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو ان

دنوں میں سترہ نماز پڑھائیں پھر جب (ایک دن) آنحضرت ﷺ نے اپنی طبیعت کچھ ہلکی محسوس فرمائی تو آپ ﷺ (نماز کے لئے مسجد کو) دو آدمیوں کا سہارا لے کر (اس طرح) آئے کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے صحابہؓ کے مونڈھوں پر ٹیک رکھے ہوئے تھے اور (ضعف و کمزوری کے سبب) آپ ﷺ کے پیر مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے جب آپ مسجد میں داخل ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ کی آمد کی آہٹ محسوس کی اور پیچھے ہٹنا شروع کیا (تاکہ آنحضرت ﷺ ان کی جگہ کھڑے ہو جائیں اور امامت کریں) آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کیا کہ پیچھے نہ ہٹو پھر آپ ﷺ (آگے) بڑھے اور حضرت ابوبکرؓ کے بائیں طرف بیٹھ گئے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے رہے اور آنحضرت ﷺ "ضعف و کمزوری کی بناء پر) بیٹھ کر نماز پڑھتے رہے حضرت ابوبکرؓ آنحضرت ﷺ کی نماز کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکرؓ کی نماز کی اقتداء کرتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد "ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرت ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں افضل ہیں نیز یہ کہ تمام لوگوں میں حضرت ابوبکرؓ ہی آنحضرت ﷺ کی خلافت کے سب سے زیادہ مستحق اور سب سے اولیٰ ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ کی جانب سے حضرت ابوبکرؓ کو امامت کے اس عظیم اور سب سے اہم منصب کا اہل و اولیٰ قرار دیئے جانے کی پیش نظر ہی بعض جلیل القدر صحابہ کا یہ ارشاد بالکل حقیقت پسندانہ اور منشاء رسالت کے عین مطابق تھا کہ "آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو ہمارے دین (کی پیشوائی) کے لئے پسند فرمایا تو کیا ہم انہیں اپنی دنیا (کی رہبری) کے لئے پسند نہ کریں؟ یعنی جب آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی زندگی میں دین کا سب سے بڑا اور اہم منصب امامت عنایت فرما کر اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا تھا کہ میرے بعد ابوبکرؓ ہی کی وہ شخصیت ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کی دینی پیشوائی اور رہبری کو انجام دے سکے تو حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں کی دینوی رہبری اور پیشوائی کے بدرجہ اولیٰ مستحق ہوئے لہٰذا خلافت جیسے عظیم الشان منصب کے سب سے زیادہ اہل وہی ہیں۔

رَجُلَیْنِ (دو صحابہؓ) سے مراد حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کی ذات گرامی ہے یعنی آپ ﷺ اپنی کمزوری و ناتوانی کے سبب حجرہ مبارک سے مسجد نبوی تک ان دونوں جلیل القدر صحابہؓ کے مونڈھوں پر سہارا دیکر تشریف لائے۔

حدیث کے الفاظ والناس یقتدون بصلوۃ ابی بکرؓ (اور لوگ حضرت ابوبکرؓ کی نماز کی اقتدا کر رہے تھے) کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ چونکہ بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے اور حضرت ابوبکرؓ آپ ﷺ کے پہلوئے مبارک میں کھڑے تھے اس لئے آنحضرت ﷺ جو فعل کرتے حضرت ابوبکرؓ بھی اسی طرح کرتے تھے اور جو فعل حضرت ابوبکرؓ کرتے تھے دوسرے مقتدی بھی اسی طرح کرتے جاتے تھے۔ لہٰذا یہاں اقتداء کے یہی معنی ہیں یہ معنی مراد نہیں ہیں کہ آنحضرت ﷺ تو حضرت ابوبکرؓ کے امام تھے اور حضرت ابوبکرؓ دوسرے مقتدیوں کے امام تھے کیونکہ مقتدی کی اقتداء کرنا جائز نہیں۔

بہر حال حاصل یہ ہے کہ امام آنحضرت ﷺ ہی تھے حضرت ابوبکرؓ بھی آپ ﷺ کی اقتداء کر رہے تھے اور دوسرے لوگ بھی آپ ﷺ ہی کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے۔

کیا نماز کے دوران امامت میں تغیر جائز ہے

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نماز کے دوران امامت میں تغیر جائز ہے؟ یعنی نماز شروع ہو چکی ہے ایک امام لوگوں کو نماز پڑھا رہا ہے ایک دوسرا شخص آتا ہے اور شروع سے نماز پڑھانے والے امام کی جگہ کھڑا ہو جاتا ہے اور امامت شروع کر دیتا ہے تو کیا یہ جائز ہے؟ جیسا کہ واقعہ مذکورہ میں صورت پیش آئی کہ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو نماز پڑھانی شروع کر دی تھی کہ آنحضرت ﷺ بعد میں تشریف لائے اور حضرت ابوبکرؓ کی جگہ لوگوں کی امامت شروع فرمادی! تو اس سلسلہ میں علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ علماء کا اس بارہ میں

اجماع ہے کہ صورت مذکور میں آنحضرت ﷺ کا یہ فعل آپ ﷺ کے خصائص میں تھا، یعنی دوسروں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اس طرح امامت میں تغیر کیا جائے۔

لیکن حضرت امام شافعیؒ نے اس میں اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ مذکورہ بالا صورت کی طرح امامت اور اقتداء جائز ہے (ملاحظہ فرمایئے مرقاۃ شرح مشکوۃ)

اس سلسلہ میں بعض علماء حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت ابوبکرؓ نماز شروع کر چکے تھے یعنی حضرت ابوبکرؓ نے اس وقت نماز شروع نہیں کی تھی چنانچہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور امامت شروع فرمادی۔ واللہ اعلم

اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی صاف ہو گیا کہ اگر امام کسی عذر کی بناء پر بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھیں چنانچہ ہدایہ میں لکھا ہوا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھانے والے امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی جائے۔

نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جمعہ، عیدین، نیز زیادہ نمازی ہونے کی صورت میں عام نمازوں میں بھی مؤذنوں کے لئے جائز ہے کہ وہ امام کے ساتھ تکبیرات باآواز بلند کہتے جائیں تاکہ جو مقتدی امام سے فاصلہ پر ہوں وہ بھی تکبیرات سن لیں۔

امام سے پہلے سر اٹھانے پر وعید

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَا یَخْشَی الَّذِیْ یَرْفَعُ رَاْسَهٗ قَبْلَ الْاِمَامِ اَنْ یُحَوِّلَ اللّٰهُ رَاْسَهٗ رَاْسَ حِمَارٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص جو امام سے پہلے (رکوع و سجود سے) سر اٹھاتا ہے اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ جل شانہ اس کے سر کو بدل کر گدھے جیسا سر کر دے گا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: جو شخص نماز کے ارکان امام کے ساتھ ادا نہیں کرتا بلکہ امام سے پہلے ہی ادا کر لیتا ہے مثلاً رکوع و سجود سے امام کے سر اٹھانے سے پہلے اپنا سر اٹھا لیتا ہے تو ایسے شخص کے بارہ میں مذکورہ بالا حدیث سخت ترین وعید ہے۔

گو علماء لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایسا کرے گا اللہ تعالیٰ اسے گدھے کے مانند کم فہم و عقل کر دے گا کیونکہ تمام جانوروں میں گدھا ہی سب سے زیادہ کم فہم ہوتا ہے لہٰذا یہ مسخ حقیقی نہیں ہو گا بلکہ مسخ معنوی ہو گا۔ تاہم علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس حدیث کو اپنے حقیقی معنی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس امت میں بھی مسخ ممکن ہے جیسا کہ "باب اشراط الساعۃ" میں مذکور ہے اور اس کے مؤید ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ ان یحول اللّٰہ صورۃ صورۃ حمار یعنی اللہ تعالیٰ اس سے نہیں ڈرتا کہ اس کی صورت کو گدھے جیسی صورت کر دے۔

خطابیؒ فرماتے ہیں کہ "اس امت میں بھی مسخ جائز ہے لہٰذا اس حدیث کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنا جائز ہے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ مسخ خاص ہے اور امت کے لئے جو مسخ ممتنع ہے وہ مسخ عام ہے چنانچہ احادیث صحیحہ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

مسخ صورت کی ایک عبرت ناک مثال

علامہ ابن حجرؒ کے مذکورہ بالا قول کی تائید ایک عبرتناک واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو ایک جلیل القدر محدث سے منقول ہے کہ وہ طلب علم اور حصول حدیث کی خاطر دمشق کے ایک عالم کے پاس پہنچے جو اپنے علم و فضل کی بناء پر بہت مشہور تھا انہوں نے اس عالم سے درس لینا شروع کیا مگر حصول علم کے دوران یہ واقعہ طالب علم کے لئے بڑا حیرتناک بنا رہا کہ استاد پوری مدت میں کبھی بھی ان کے سامنے نہیں آیا درس کے وقت استاد اور شاگرد کے درمیان ایک پردہ حائل رہتا تھا، ان کو اس کی بڑی خواہش تھی کہ کم سے کم ایک مرتبہ اپنے استاد کے

چہرے کی زیارت تو کریں، چنانچہ جب انہیں اس عالم کی خدمت میں رہتے ہوئے بہت کافی عرصہ گذر گیا تو اس نے یہ محسوس کر لیا کہ طالب علم حصول حدیث کے شوق اور تعلق شیخ کے بھرپور جذبات کا پوری طرح حامل ہے تو استاد نے ایک دن درمیان میں حائل پردہ کو اٹھایا ان کے حیرت اور تعجب کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ جو جلیل القدر عالم اور ان کا استاد جس کے علم و فضل کی شہرت چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اپنے انسانی چہرہ سے محروم ہے بلکہ اس کا منہ گدھے جیسا ہے استاد نے شاگرد کی حیرت اور تعجب کو دیکھتے ہوئے جو بات کہی اسے سنئے اور اس سے عبرت حاصل کیجئے۔ اس نے کہا:

اے میرے بیٹے! نماز کے ارکان ادا کرنے کے سلسلہ میں امام پر پہل کرنے سے بچنا! میں نے جب یہ حدیث سنی کہ "کیا وہ شخص جو امام سے پہلے سر اٹھاتا ہے اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ جل شانہ اس کے سر کو بدل کر گدھے جیسا سر کر دے گا۔" تو مجھے بہت تعجب ہوا اور میں نے اسے بعید از امکان تصور کیا چنانچہ (یہ میری بدقسمتی کہ میں نے تجربہ کے طور پر) نماز کے ارکان ادا کرنے کے سلسلہ میں امام پر پہل کی جس کا نتیجہ میرے بیٹے اس وقت تمہارے سامنے ہے کہ میرا چہرہ واقعی گدھے کے چہرے جیسا ہو گیا۔

بہر حال ملا علی قاری اس کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد دراصل شدید تہدید اور انتہائی وعید کے طور پر ہے یا یہ کہ ایسے شخص کو برزخ یا دوزخ میں اس عذاب کے اندر مبتلا کیا جائے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

امام کی موافقت کرنے کا حکم

(۷) وَعَنْ عَلِيٍّ وَمُعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَتٰى أَحَدُكُمُ الصَّلَاةَ وَالْإِمَامُ عَلٰى حَالٍ فَلْيَصْنَعْ كَمَا يَصْنَعُ الْإِمَامُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"حضرت علی اور حضرت معاذ ابن جبلؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص (جماعت میں شریک ہونے کے لئے) نماز میں آئے اور امام کسی حالت میں ہو تو جو کچھ امام کر رہا ہے وہی اسے کرنا چاہئے۔" اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ افعال نماز میں اس شخص کو امام کی اقتداء کرنی چاہئے اور اسے ارکان نماز کی ادائیگی کے سلسلہ میں امام سے مقدم یا مؤخر نہ ہونا چاہئے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امام جس حالت میں بھی ہو اس کی موافقت اسے کرنی چاہئے، یعنی جماعت شروع ہو جانے کے بعد اگر کوئی شخص بعد میں شریک ہونے کے لئے آئے تو امام جس حالت میں ہو اسے اس کی موافقت کرنی چاہئے اگر امام حالت قیام میں ہو تو اسے بھی وہی حالت اختیار کرنی چاہئے اگر وہ رکوع میں ہو تو اسے بھی رکوع میں چلے جانا چاہئے اگر سجدہ میں ہو تو اسے بھی سجدہ میں چلے جانا چاہئے دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ جماعت شروع ہو جانے کے بعد یوں ہی کھڑے رہتے ہیں یا باتوں میں مصروف رہتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ جب امام رکوع میں جائے تو جا کر نماز میں شریک ہوں یہ طریقہ بہت غلط اور غیر شرعی ہے اس سے اجتناب ضروری ہے۔

امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے تاہم علماء کا اس حدیث پر عمل ہے اور نوویؒ نے بھی کہا ہے کہ حدیث کی اسناد ضعیف ہے لیکن جس حدیث پر علماء کا عمل ہوتا تھا اسے امام ترمذیؒ صحیح قرار دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ حدیث کی صحت علماء کے عمل سے ثابت ہو جائے جیسا کہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث پہنچی کہ جو شخص لا الہ الا اللہ ستر

ہزار مرتبہ پڑھے تو اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے اسی طرح جس شخص کے لئے پڑھا جائے اس کی بھی مغفرت کر دی جاتی ہے چنانچہ میں اس کلمہ کو روایت کردہ عدد کے مطابق خاص طور سے کسی کے لئے نیت کئے بغیر پڑھا کرتا تھا اتفاق سے ایک دن میں ایک جگہ دعوت میں گیا وہاں میرے چند رفیق بھی تھے ان میں سے ایک شخص جوان تھا جو کشف کے سلسلے میں بہت مشہور تھا کھانے کے دوران اچانک وہ رونے لگا میں نے حیرت زدہ ہو کر اس سے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں (کشف کے ذریعہ) دیکھ رہا ہوں کہ میری ماں عذاب میں مبتلا ہے یہ سنتے ہی میں نے کلمہ مذکورہ کا ثواب دل ہی دل میں اس کی ماں کے لئے بخش دیا اب وہ ہنسنے لگا اور اس نے کہا کہ "اب میں اپنی ماں کو جنت میں دیکھ رہا ہوں۔"

اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے فرمایا کہ اس شخص کے کشف کے صحیح ہونے سے میں نے اس حدیث کو صحیح جانا اور اس حدیث کے صحیح ہونے سے اس شخص کے کشف کو صحیح مانا"

رکوع میں شریک ہو جانے سے پوری رکعت ہو جاتی ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جِئْتُمْ اِلَى الصَّلَاةِ وَنَحْنُ سُجُوْدٌ فَاسْجُدُوْا وَلَا تَعُدُّوْهُ شَيْئًا وَمَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلَاةَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم (جماعت میں شریک ہونے کے لئے) نماز میں آؤ اور مجھے سجدہ کی حالت میں پاؤ تو تم بھی سجدہ میں چلے جاؤ اور اس سجدہ کو کسی حساب میں نہ لگاؤ، ہاں جس شخص نے (امام کے ساتھ) رکوع پالیا تو اس نے پوری رکعت پالی۔" (ابوداؤد)

تشریح: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت میں آکر اس حال میں شریک ہو کہ امام سجدہ میں ہو اور وہ بھی سجدہ میں چلا جائے تو اس کی پوری رکعت نہیں ہوتی ہاں اگر کوئی شخص اس حال میں شریک ہو کہ امام رکوع میں ہو اور اسے رکوع مل جائے تو اس کی پوری رکعت ادا ہو جاتی ہے چنانچہ اس حدیث کے پہلے جزء کا مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت میں اس وقت شریک ہو جب امام سجدہ میں ہو تو وہ سجدہ میں چلا جائے۔ مگر اس سجدہ کی وجہ سے وہ اس رکعت کا ادا کرنا نہ سمجھے کیونکہ جس طرح رکوع میں شریک ہو جانے سے پوری رکعت مل جاتی ہے اسی طرح سجدہ میں شریک ہونے سے پوری رکعت نہیں ملتی۔

دوسرے جزو کے علماء نے دو مطلب بیان کئے ہیں ① حدیث میں لفظ "رکعة" سے رکوع مراد ہے اور "صلوٰة" سے رکعت یعنی جس نے امام کو رکوع میں پایا اور وہ رکوع اس نے بھی پالیا تو اس کو پوری رکعت مل گئی ② رکعة اور صلوٰة دونوں اپنے حقیقی معنی میں استعمال کئے گئے ہیں اس طرح حدیث کے اس جزء کا مطلب یہ ہو گا کہ جس شخص نے جماعت میں ایک رکعت بھی پالی تو اس نے امام کے ساتھ پوری نماز کو پالیا لہٰذا اسے نماز باجماعت کا ثواب بھی ملے گا اور جماعت کی فضیلت بھی حاصل ہوگی۔

چالیس روز تکبیر اولیٰ کے ساتھ باجماعت نماز پڑھنے والے کے لئے بشارت

⑨ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا فِیْ جَمَاعَةٍ يُدْرِكُ التَّكْبِيْرَةَ الْاُوْلٰى كُتِبَ لَهٗ بَرَاءَتَانِ بَرَاءَةٌ مِّنَ النَّارِ وَبَرَاءَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص چالیس روز تک اللہ تعالیٰ کے لئے جماعت کے ساتھ اس طرح نماز پڑھے کہ وہ تکبیر اولیٰ بھی پائے تو اس کے لئے دو قسم کی نجات لکھی جاتی ہے ایک تو دوزخ سے نجات اور دوسری نفاق سے نجات۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو مسلسل چالیس روز تک یہ سعادت حاصل ہو جائے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضاء کی خاطر جماعت سے نماز اس طرح پڑھے کہ اس کی تکبیر تحریمہ فوت نہ ہو یعنی وہ ابتداء سے نماز میں شریک رہے کہ جب امام تکبیر تحریمہ کہے تو وہ بھی تکبیر کہے یا بعض علماء کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ امام کے سبحانک اللھم پڑھنے تک جماعت میں شریک ہو جائے تو اس کے لئے بارگاہ رب العزت سے دو چیزوں سے نجات کا پروانہ عنایت فرمادیا جاتا ہے ایک تو دوزخ سے کہ اسے انشاء اللہ دوزخ کی آگ دیکھنا نصیب نہیں ہوگی اور دوسرے نفاق سے۔

نفاق سے نجات کا مطلب

نفاق سے نجات کا پروانہ دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مرد مؤمن کو اس بات سے اپنے حفظ و امان میں رکھے گا کہ اس سے منافقوں جیسے عمل سرزد ہوں جیسے نماز میں کسل و سستی اور ریا، جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی وغیرہ وغیرہ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے اہل حق اور اہل اخلاص کے سے عمل کرنے کی توفیق دے گا اور آخرت میں اسے اس عذاب سے کہ جس میں منافقین کو مبتلا کیا جائے گا۔ بچائے گا نیز میدان حشر میں اس کے بارے میں یہ گواہی دی جائے گی کہ یہ بندہ منافق نہیں ہے بلکہ بندہ مومن و صادق ہے اور رحم و کرم کی یہ بارشیں محض اس وجہ سے ہوں گی کہ یہ شخص نماز میں اس قدر پہلے آیا کہ تکبیر اولیٰ میں شریک ہو سکے نیز دل کے پورے خلوص اور انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز میں کھڑے ہو کر اپنے رب کی خوشنودی اور رضامندی کو حاصل کیا۔ حق تعالیٰ ہم سب کو اس سعادت سے بہرہ مند فرمائے۔ آمین۔

جماعت کی نیت سے مسجد میں جانے والے کو جماعت نہ ملنے کی صورت میں بھی ثواب ملتا ہے

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ وُضُوْئَهٗ ثُمَّ رَاحَ فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلُّوْا اَعْطَاهُ اللّٰهُ مِثْلَ اَجْرِ مَنْ صَلَّاهَا وَحَضَرَهَا لَا یَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَیْئًا۔ (رواه ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس شخص نے وضو کیا اور اچھا (یعنی پورے شرائط و آداب اور حضور دل کے ساتھ) وضو کیا اور پھر (مسجد میں) گیا اور وہاں دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے اس نمازی کے برابر ثواب عنایت فرمادیتا ہے جس نے وہاں جماعت میں حاضر ہو کر نماز پڑھی تھی اور اس کا ثواب دینے سے دوسرے (یعنی جماعت میں حاضر ہونے والوں) کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کرتا۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کی نیت سے مسجد میں آئے اور اتفاق سے اسے جماعت نہ مل سکے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے جماعت میں شریک ہونے والوں کے برابر ہی ثواب عنایت فرماتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ قصداً دیر کر کے جماعت میں شریک ہونے سے نہ رہ جائے بلکہ اتفاقاً یا کسی عذر کی بناء پر اس کی جماعت جاتی رہے اگر کوئی شخص قصداً جماعت کے وقت حاضر نہ ہو بلکہ جماعت ہو جانے کی بعد آئے تو اسے یہ ثواب نہیں ملے گا۔

حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ اسے یہ ثواب ان نمازیوں کے ثواب میں سے جو جماعت میں حاضر تھے کم کر کے نہیں ملے گا کہ جس کی وجہ سے ان کے ثواب میں کمی ہو جائے بلکہ ان نمازیوں کو تو اپنے فعل یعنی جماعت میں شریک ہونے کا بھرپور اجر ملے گا اور اسے جماعت کی نیت اور جماعت کے حاصل کرنے کے غلبۂ شوق کی بناء پر ثواب دیا جائے گا۔

جماعت کی فضیلت

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ وَقَدْ صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلَا رَجُلٌ یَتَصَدَّقُ عَلٰی هٰذَا

فَيُصَلِّي مَعَهُ فَقَامَ رَجُلٌ فَصَلّٰى مَعَهُ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز مسجد میں) ایک شخص ایسے وقت پہنچا جب کہ نبی کریم ﷺ نماز پڑھ چکے تھے آپ نے (اس شخص کو دیکھ کر) فرمایا کہ "کیا کوئی شخص ایسا نہیں جو اسے خدا کی راہ میں دے۔" چنانچہ ایک شخص (آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سن کر) کھڑا ہوا اور اس نے اس شخص کے ساتھ نماز پڑھی۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: یتصدق (خدا کی راہ میں دے) کا مطلب یہ تھا کہ کیا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس شخص کے ساتھ بایں طور احسان کرے کہ وہ اس کے ساتھ نماز پڑھے تاکہ اسے جماعت کا ثواب حاصل ہو جائے اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کو نیک راہ بتائے یا اس کے نیک راستہ اختیار کرنے کا باعث بنے تو اسے وہی اجر و ثواب ملے گا جو خدا کی راہ میں بخشش کا ثواب ملتا ہے۔

مولانا مظہرؒ فرماتے ہیں کہ آنے والے شخص کے ساتھ نماز پڑھنے کو صدقہ (خدا کی راہ میں دینے) سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ اس شخص کے ساتھ نماز پڑھنے والے نے اس کو چھبیس گنا زیادہ ثواب صدقہ کیا کیونکہ اگر وہ اس شخص کے ساتھ نماز پڑھتا تو جماعت نہ ہوتی اور تنہا نماز پڑھنے کی وجہ سے ایک ہی نماز کا ثواب ملتا اور اس شخص کے باعث جماعت حاصل ہونے کی وجہ سے اسے ستائیس نمازوں کا ثواب ملا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ کے مرض موت میں ابوبکرؓ کی امامت کا واقعہ

(۱۴) عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَقُلْتُ اَلَا تُحَدِّثِيْنِي عَنْ مَرَضِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ بَلٰى ثَقُلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَصَلَّى النَّاسُ فَقُلْنَا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَهُمْ يَنْتَظِرُوْنَكَ فَقَالَ ضَعُوْا لِيْ مَاءً فِي الْمِخْضَبِ قَالَتْ فَفَعَلْنَا فَاغْتَسَلَ فَذَهَبَ لِيَنُوْءَ فَاُغْمِيَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَفَاقَ فَقَالَ اَصَلَّى النَّاسُ قُلْنَا لَا هُمْ يَنْتَظِرُوْنَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ ضَعُوْا لِيْ مَاءً فِي الْمِخْضَبِ قَالَتْ فَقَعَدَ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ ذَهَبَ لِيَنُوْءَ فَاُغْمِيَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَفَاقَ فَقَالَ اَصَلَّى النَّاسُ قُلْنَا لَا هُمْ يَنْتَظِرُوْنَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ ضَعُوْا لِيْ مَاءً فِي الْمِخْضَبِ فَقَعَدَ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ ذَهَبَ لِيَنُوْءَ فَاُغْمِيَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَفَاقَ فَقَالَ اَصَلَّى النَّاسُ قُلْنَا لَا هُمْ يَنْتَظِرُوْنَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَالنَّاسُ عُكُوْفٌ فِي الْمَسْجِدِ يَنْتَظِرُوْنَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِصَلَاةِ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَةِ فَاَرْسَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اَبِيْ بَكْرٍ بِاَنْ يُصَلِّيَ بِالنَّاسِ فَاَتَاهُ الرَّسُوْلُ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْمُرُكَ اَنْ تُصَلِّيَ بِالنَّاسِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَكَانَ رَجُلًا رَقِيْقًا يَا عُمَرُ صَلِّ بِالنَّاسِ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ اَنْتَ اَحَقُّ بِذٰلِكَ فَصَلّٰى اَبُوْبَكْرٍ تِلْكَ الْاَيَّامَ ثُمَّ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَدَ فِيْ نَفْسِهٖ خِفَّةً وَخَرَجَ بَيْنَ رَجُلَيْنِ اَحَدُهُمَا الْعَبَّاسُ لِصَلَاةِ الظُّهْرِ وَاَبُوْبَكْرٍ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ فَلَمَّا رَاٰهُ اَبُوْبَكْرٍ ذَهَبَ لِيَتَاَخَّرَ فَاَوْمَاَ اِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَنْ لَا يَتَاَخَّرَ قَالَ اَجْلِسَانِيْ اِلٰى جَنْبِهٖ فَاَجْلَسَاهُ اِلٰى جَنْبِ اَبِيْ بَكْرٍ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ وَقَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَبَّاسٍ فَقُلْتُ لَهٗ اَلَا اَعْرِضُ عَلَيْكَ مَا حَدَّثَتْنِيْ عَائِشَةُ عَنْ مَرَضِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَاتِ فَعَرَضْتُ عَلَيْهِ حَدِيْثَهَا فَمَا اَنْكَرَ مِنْهُ شَيْئًا غَيْرَ اَنَّهٗ قَالَ اَسَمَّتْ لَكَ الرَّجُلَ الَّذِيْ كَانَ مَعَ الْعَبَّاسِ قُلْتُ لَا قَالَ هُوَ عَلِيٌّ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عبید اللہ ابن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ "کیا آپ مجھ سے نبی کریم ﷺ کی بیماری کا حال (کہ جس میں آپ آخری مرتبہ نماز پڑھانے کے لئے مسجد تشریف لے گئے تھے) بیان فرمائیں گی؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "ہاں (کیوں نہیں!) تو سنو کہ جب) آنحضرت ﷺ زیادہ بیمار ہوئے تو (نماز کے وقت) پوچھا کہ "کیا

لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟" ہم نے کہا کہ "ابھی نہیں یارسول اللہ! لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" (یہ سن کر) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "(اچھا) میرے لئے لگن (طشت) میں پانی رکھو۔" حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ "ہم نے لگن میں پانی رکھ دیا" چنانچہ آپ نے غسل کیا اور چاہا کہ کھڑے ہوں مگر "کمزوری کی وجہ سے آپ کو غش آگیا اور) بے ہوش ہوگئے، جب ہوش آیا تو پھر فرمایا کہ "کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟" ہم نے کہا کہ "ابھی نہیں، لوگ آپ کے منتظر ہیں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا "لگن میں پانی رکھو۔" حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ (جب ہم لگن میں پانی رکھ دیا تو) آپ ﷺ نے غسل فرمایا اور چاہا کہ کھڑے ہوں مگر بے ہوش ہوگئے جب ہوش آیا تو پھر پوچھا کہ "کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟" ہم نے عرض کیا کہ ابھی نہیں لوگ آپ کے منتظر ہیں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا "لگن میں پانی رکھو۔" (جب ہم نے پانی رکھ دیا تو) آپ بیٹھے اور غسل کیا اور پھر جب اٹھنا چاہا تو بے ہوش ہوگئے جب ہوش آیا تو فرمایا کہ "کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟" ہم نے عرض کیا کہ "نہیں لوگ آپ (ﷺ) کے منتظر ہیں یارسول اللہ! اور لوگ مسجد میں بیٹھے ہوئے عشاء کی نماز کے لئے آنحضرت ﷺ کا انتظار کر رہے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے کسی کو (یعنی حضرت بلال کو) حضرت ابوبکرؓ کے پاس یہ کہلا کر بھیجا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں، چنانچہ قاصد (یعنی حضرت بلالؓ) ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے لئے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں! حضرت ابوبکرؓ ایک نرم دل آدمی تھے (یہ سن کر) حضرت عمرؓ سے کہنے لگے کہ عمرؓ تم ہی لوگوں کو نماز پڑھا دو (کیونکہ میں تو آنحضرت ﷺ کی جگہ کھڑے ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا) لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اس عظیم مرتبہ) کے سب سے زیادہ اہل آپ ہیں! چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ان دنوں میں (یعنی آنحضرت کے ایام مرض میں سترہ نمازیں لوگوں کو پڑھائیں۔" جب (ایک روز) آنحضرت ﷺ اپنے مرض میں کچھ تخفیف محسوس فرمائی تو دو آدمیوں کا سہارا لے کہ ان میں سے ایک حضرت عباسؓ تھے نماز ظہر کے لئے (مسجد میں) تشریف لے گئے حضرت ابوبکرؓ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے جب انہوں نے آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی آہٹ سنی تو پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا، لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں اشارہ کے ذریعہ پیچھے ہٹنے سے منع فرمادیا اور ان دونوں سے (جن کا سہارا لے کر آپ ﷺ مسجد آئے تھے) فرمایا کہ "مجھے ابوبکرؓ کے پہلو میں بٹھا دو!" چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بٹھا دیا اور آپ ﷺ بیٹھے (نماز پڑھاتے) رہے حضرت عبداللہ (اس حدیث کے راوی) کہتے ہیں کہ میں (حضرت عائشہ سے یہ حدیث سن کر) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ کیا میں آپ رضؓ سے وہ حدیث نہ بیان کر دوں جو میں نے حضرت عائشہؓ سے آنحضرت ﷺ کی بیماری کے بارہ میں سنی ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "ہاں بیان کرو! چنانچہ میں نے ان کے سامنے حضرت عائشہؓ کی حدیث بیان کی حضرت ابن عباسؓ نے اس میں سے کسی بات کا انکار نہیں کیا البتہ یہ فرمایا کہ کیا حضرت عائشہؓ نے تم سے اس شخص کا نام بیان کیا ہے جو حضرت عباسؓ کے ساتھ تھے؟ میں نے کہا کہ نہیں "حضرت ابن عباسؓ" نے فرمایا کہ وہ حضرت علیؓ تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ نے حضرت عباسؓ کا نام تو لے لیا مگر دوسرے شخص کا نام نہیں لیا جو ان کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو سہارا دے کر مسجد لے گئے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کے ایک طرف تو حضرت عباسؓ مستقل طور آپ ﷺ کو سہارا دیئے ہوئے تھے مگر دوسری طرف ایک ہی شخص مقرر نہ تھا بلکہ نوبت بہ نوبت بدلتے جاتے تھے کبھی تو حضرت علیؓ سہارا دیتے کبھی حضرت اسامہؓ یا فضل ابن عباسؓ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسری طرف روایت میں حضرت عائشہؓ کے الفاظ کچھ اس طرح منقول ہیں جو بطریق احتمال سب ناموں کو شامل ہیں چنانچہ وہ الفاظ یہ ہیں کہ "آپ ﷺ کے دوسری طرف اہل بیت میں سے ایک شخص (سہارا دیئے ہوئے) تھے۔

سورہ فاتحہ نہ پڑھنے سے ادھورا ثواب ملتا ہے

(۱۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّهٗ کَانَ یَقُوْلُ مَنْ اَدْرَكَ الرَّکْعَةَ فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ وَمَنْ فَاتَتْهُ قِرَاءَةُ اُمِّ الْقُرْاٰنِ فَقَدْ فَاتَهٗ خَیْرٌ کَثِیْرٌ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جس نے رکوع پایا اسے پوری رکعت مل گئی اور جو شخص سورہ فاتحہ پڑھنے سے رہ گیا وہ بہت سارے ثواب سے (بھی محروم) رہ گیا۔" (مالکؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس نے نماز میں سورہ فاتحہ پڑھی تو چونکہ وہ اس وجہ سے بہت زیادہ ثواب سے محروم رہ گیا اس لئے اس کی نماز کا ثواب ناقص ہے۔

اس حدیث سے بین طریقہ پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہوتا تو نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کی وجہ سے کمی و نقصان نہیں ہوتا بلکہ نماز نہ ہونے کی وجہ سے سرے سے ثواب ملتا ہی نہیں۔

امام پر پہل کرنے کی وعید

(۱۴) وَعَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ الَّذِیْ یَرْفَعُ رَأْسَهٗ وَیَخْفِضُهٗ قَبْلَ الْاِمَامِ فَاِنَّمَا نَاصِیَتُهٗ بِیَدِ الشَّیْطَانِ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ (یہ بھی) فرماتے تھے کہ "جو شخص (رکوع و سجود میں) اپنے سر کو امام سے پہلے اٹھائے یا جھکائے تو (سمجھو کہ) اس کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں ہے۔" (مالکؒ)

بَابُ مَنْ صَلّٰی صَلٰوۃً مَرَّتَیْنِ
دو مرتبہ نماز پڑھنے والے شخص کا بیان

اگر کوئی شخص ایک ہی نماز دو مرتبہ خواہ حقیقۃً خواہ صورۃً پڑھتا ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آیا دونوں مرتبہ کی نمازیں ایک ہی قسم سے ادا ہوں گی یا ان کی حیثیت میں فرق ہو جائے گا؟ یعنی دونوں مرتبہ فرض ادا ہوں گے یا ایک مرتبہ فرض اور دوسری مرتبہ نفل؟ یہی باتیں بتانے کے لئے یہ باب قائم کیا گیا ہے اور انہیں مضامین پر مشتمل احادیث اس باب کے تحت نقل کی جائیں گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضرت معاذؓ کے دو مرتبہ نماز پڑھنے کی حقیقت

(۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ کَانَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ یُصَلِّیْ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ یَاْتِیْ قَوْمَهٗ فَیُصَلِّیْ بِهِمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ (پہلے تو) نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے تھے اور پھر اپنی قوم کے پاس آکر انہیں نماز پڑھاتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت معاذ ابن جبلؓ کا یہ معمول تھا کہ وہ عشاء کی سنتیں یا نفل آنحضرت ﷺ کے ہمراہ پڑھتے تھے تاکہ آنحضرت ﷺ کے ہمراہ اور مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی فضیلت و سعادت حاصل ہو جائے اور آنحضرت ﷺ سے نماز پڑھنے کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے پھر وہاں سے اپنی قوم میں آکر لوگوں کو فرض نماز پڑھایا کرتے تھے۔

(۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ کَانَ مُعَاذٌ یُصَلِّیْ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی قَوْمِهٖ فَیُصَلِّیْ بِهِمُ الْعِشَاءَ وَهِیَ لَهٗ نَافِلَةٌ۔ (رواہ البیہقی و البخاری)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ عشاء کی نماز (پہلے تو) نبی کریم ﷺ کے ہمراہ پڑھتے تھے پھر اپنی قوم میں آتے اور ان کو

عشاء کی نماز پڑھاتے اور وہ ان کے لئے نفل ہوتی۔"

تشریح: حضرت معاذؓ آنحضرت ﷺ کے ہمراہ پہلے تو عشاء کی نماز پڑھتے وقت عشاء کی سُنّت کی نیت کرتے ہوں گے یا نفل نماز کی نیت کر لیتے ہوں گے پھر اپنی قوم کے پاس آکر ان کی امامت کرتے اور اس وقت فرض نماز پڑھتے تھے۔

حدیث کے آخری الفاظ وَهِيَ لَهٗ نَافِلَةٌ کا مطلب سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ دو مرتبہ نماز پڑھنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ ایک شخص نے اپنے مکان میں تنہا یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اس کے بعد مسجد آیا تو دیکھا کہ وہاں اسی نماز کی جماعت ہو رہی ہے جو پہلے پڑھ چکا ہے۔ وہ مسجد میں جماعت کی فضیلت حاصل کرنے کی غرض سے جماعت میں شریک ہو کر دوبارہ نماز پڑھ لیتا ہے اس صورت میں فرض نماز کی ادائیگی چونکہ پہلے ہو چکی ہے اس لئے یہ جماعت کی نماز اس کے لئے نفل ہو جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کسی مسجد کا امام ہے وہ اپنی مسجد میں نماز پڑھانے سے پہلے کسی خاص موقعہ پر یا کسی خاص شخص کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت حاصل کرنے کی غرض سے بہ نیت نفل نماز پڑھ لیتا ہے پھر اس کے بعد اپنی مسجد میں آکر لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے ایسی صورت میں بعد کی نماز فرض ادا ہو گی اور پہلی نماز نفل ہو جائے گی۔

اس تفصیل کو سمجھنے کے بعد اس جملہ کا مطلب آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہ دوسری نماز جو جماعت کے ساتھ فرض یا نفل ادا ہوتی ہے یا پہلی نماز دو مرتبہ پڑھنے والے کے حق میں نافلہ یعنی خیر و بھلائی کی زیادتی اور ثواب کی کثرت کا باعث ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے اس جملہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "وہ دوسری نماز جو حضرت معاذؓ قوم کے ہمراہ پڑھتے تھے حضرت معاذؓ کی نفل نماز اور ان کی قوم کی عشاء کی فرض نماز ہوتی تھے۔" حقیقت سے دور ہے کیونکہ یہ بات تو اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب کی اس مطلب کو بیان کرنے والے حضرت معاذؓ کا کوئی ایسا قول بھی پیش کریں جس میں حضرت معاذؓ خود یہ بتائیں کہ ان کی نیت دونوں مرتبہ کیا ہوتی تھی کیونکہ نیت کی حقیقت تو اس وقت تک معلوم نہیں ہوتی جب تک کی نیت کرنے والا اپنی نیت کے بارے میں خود نہ بتائے کہ اس کی نیت کیا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت معاذؓ نماز پڑھتے وقت نیت دل میں کرتے ہوں گے زبان سے اظہار نہیں کرتے ہوں گے جیسا کہ ابن ہمامؒ نے نقل کیا ہے کہ زبان سے نیت کرنا بدعت ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ زبان سے نیت کرتے تھے پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ جملہ "وہی نافلہ" حدیث کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اضافہ ہے جو صحیح روایتوں میں موجود نہیں ہے چنانچہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ نے اپنے اجتہاد و مسلک کے مطابق اس کا اضافہ کیا ہے پھر یہ مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں یہ جگہ خالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف مشکوٰۃ نے سنن کے کسی بھی طریق سے یہ جملہ نہیں پایا۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ "علماء حدیث کا یہ قول ہے کہ "وھی لہ نافلة" حدیث جابرؓ میں غیر محفوظ ہے۔

نفل نماز پڑھنے والے کے پیچھے فرض نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں ائمہ کا جو اختلاف ہے اسے پوری وضاحت کے ساتھ مظاہر حق جدید کی قسط ۹ میں "باب القراۃ فی الصلوٰۃ" کی حدیث نمبر ۱۰ کی تشریح کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جماعت کے ساتھ دوبارے نماز پڑھنے کا حکم

(۴) عَنْ يَزِيْدَ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ شَهِدْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَجَّتَهٗ فَصَلَّيْتُ مَعَهٗ صَلَاةَ الصُّبْحِ فِيْ مَسْجِدِ الْخَيْفِ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهٗ وَانْحَرَفَ فَاِذَا هُوَ بِرَجُلَيْنِ فِيْ اٰخِرِ الْقَوْمِ لَمْ يُصَلِّيَا مَعَهٗ قَالَ عَلَيَّ بِهِمَا فَجِيْءَ بِهِمَا تَرْعَدُ فَرَائِصُهُمَا فَقَالَ مَا مَنَعَكُمَا اَنْ تُصَلِّيَا مَعَنَا فَقَالَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا كُنَّا قَدْ صَلَّيْنَا فِيْ رِحَالِنَا قَالَ فَلَا تَفْعَلَا اِذَا

صَلَّیْتُمَا فِیْ رِحَالِکُمَا ثُمَّ اَتَیْتُمَا مَسْجِدَ جَمَاعَۃٍ فَصَلِّیَا مَعَھُمْ فَاِنَّھَا لَکُمَا نَافِلَۃٌ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد والنسائی)

"حضرت یزید ابن اسودؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حج (حجۃ الوداع) میں شریک تھا چنانچہ (اس موقع پر ایک دن میں نے آپ ﷺ کے ہمراہ مسجد خیف میں صبح کی نماز پڑھی جب آپ ﷺ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دو شخص جماعت کے آخر میں بیٹھے ہوئے ہیں جنھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی آنحضرت ﷺ نے (انہیں دیکھ کر لوگوں سے) فرمایا کہ "ان دونوں کو میرے پاس لاؤ!" وہ دونوں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس حال میں حاضر کئے گئے کہ (آنحضرت ﷺ کی ہیبت کی وجہ سے) ان کے مونڈھوں کا گوشت تھرتھر رہا تھا آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہیں ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روک دیا تھا؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اپنے مکان میں نماز پڑھ چکے تھے۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "آئندہ ایسا نہ کرنا، اگر تم اپنے مکان میں نماز پڑھ چکو اور اس مسجد میں آؤ جہاں جماعت ہو رہی ہو تو لوگوں کے ساتھ (بھی) نماز پڑھ لو، یہ نماز تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آخر میں پڑھی جانے والی نماز نفل ہو جائے گی خواہ پہلی نماز جماعت سے پڑھی ہو یا تنہا پڑھی ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

④ عَنْ بُسْرِ بْنِ مِحْجَنٍ عَنْ اَبِیْہِ اَنَّہٗ کَانَ فِیْ مَجْلِسٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاُذِّنَ بِالصَّلَاۃِ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰی وَرَجَعَ وَمِحْجَنٌ فِیْ مَجْلِسِہٖ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مَنَعَکَ اَنْ تُصَلِّیَ مَعَ النَّاسِ اَلَسْتَ بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ فَقَالَ بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَلٰکِنِّیْ کُنْتُ قَدْ صَلَّیْتُ فِیْ اَھْلِیْ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا جِئْتَ الْمَسْجِدَ وَکُنْتَ قَدْ صَلَّیْتَ فَاُقِیْمَتِ الصَّلَاۃُ فَصَلِّ مَعَ النَّاسِ وَاِنْ کُنْتَ قَدْ صَلَّیْتَ۔ (رواہ مالک و النسائی)

"حضرت بسر ابن محجن اپنے والد محترم سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ان کے والد محترم حضرت محجن) ایک مجلس میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے کہ نماز کیلئے اذان ہو گئی چنانچہ آنحضرت ﷺ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے نماز پڑھ کر جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو دیکھا محجنؓ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے تمہیں کس چیز نے روک دیا تھا کیا تم مسلمان نہیں ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہاں میں مسلمان ہوں لیکن (بات یہ ہوئی کہ) میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نماز پڑھ چکا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ جب تم مسجد میں آؤ اور نماز (اپنے گھر میں) پڑھ چکے ہو اور مسجد میں جماعت کھڑی ہو تو لوگوں کے ساتھ (دوبارہ) نماز پڑھ لو اگرچہ تم نماز پڑھ چکے ہو۔" (مالکؒ، نسائیؒ)

دوبارہ نماز پڑھنا باعث ثواب ہے

⑤ وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ اَسَدِ بْنِ خُزَیْمَۃَ اَنَّہٗ سَاَلَ اَبَا اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیَّ قَالَ یُصَلِّیْ اَحَدُنَا فِیْ مَنْزِلِہِ الصَّلَاۃَ ثُمَّ یَاْتِی الْمَسْجِدَ وَتُقَامُ الصَّلَاۃُ فَاُصَلِّیْ مَعَھُمْ فَاَجِدُ فِیْ نَفْسِیْ شَیْئًا مِنْ ذٰلِکَ فَقَالَ اَبُوْ اَیُّوْبَ سَاَلْنَا عَنْ ذٰلِکَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ فَذٰلِکَ لَہٗ سَھْمُ جَمْعٍ۔ (رواہ مالک و ابوداؤد)

"اور قبیلہ اسد ابن خزیمہ کے ایک شخص کے بارے میں مروی ہے کہ اس نے حضرت ابوایوب انصاریؓ سے پوچھا کہ "ہم میں سے کوئی شخص (اپنے گھر میں) نماز پڑھ لیتا ہے پھر وہ مسجد میں آتا ہے اور (دیکھتا ہے کہ) وہاں نماز پڑھی جا رہی ہے تو کیا میں نے ان کے ساتھ (دوبارہ)

نماز پڑھ لوں؟ میں اپنے دل میں ایک کھٹک محسوس کرتا ہوں (یعنی میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا دوبارہ نماز پڑھنا میرے لئے بہتر ہے یا نہیں؟) حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ "میں نے (بھی اس مسئلہ کو) آنحضرت ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یہ (دوبارہ نماز پڑھنا) اس کے لئے جماعت کا نصیبہ ہے۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: فذلک له سهم جمع کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مرتبہ مکان میں فرض نماز پڑھ لینے کے بعد پھر دوبارہ مسجد میں جماعت کے ساتھ وہی نماز پڑھتا ہے تو اس کے حق میں سراسر سعادت کی بات ہے کیونکہ اس طرح اسے جماعت کی فضیلت اور اس کا ثواب ہاتھ لگتا ہے لہٰذا اس سلسلہ میں دل کے اندر کوئی وسوسہ و شبہ پیدا نہ کرنا چاہئے۔

دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم

(۶) وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ جِئْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ فَجَلَسْتُ وَلَمْ اَدْخُلْ مَعَهُمْ فِي الصَّلَاةِ فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَآنِيْ جَالِسًا فَقَالَ اَلَمْ تُسْلِمْ يَا يَزِيْدُ قُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ اَسْلَمْتُ قَالَ وَمَا مَنَعَكَ اَنْ تَدْخُلَ مَعَ النَّاسِ فِيْ صَلَاتِهِمْ قَالَ اِنِّيْ كُنْتُ قَدْ صَلَّيْتُ فِيْ مَنْزِلِيْ اَحْسَبُ اَنْ قَدْ صَلَّيْتُمْ فَقَالَ اِذَا جِئْتَ الصَّلَاةَ فَوَجَدْتَ النَّاسَ يُصَلُّوْنَ فَصَلِّ مَعَهُمْ وَاِنْ كُنْتَ قَدْ صَلَّيْتَ تَكُنْ لَكَ نَافِلَةً وَهٰذِهٖ مَكْتُوْبَةٌ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت یزید ابن عامرؓ فرماتے ہیں (ایک روز) میں نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، اور آپ ﷺ اس وقت (لوگوں کے ہمراہ) نماز پڑھ رہے تھے میں (ایک طرف) بیٹھ گیا اور ان لوگوں کے ساتھ جماعت میں شامل نہیں ہوا جب آنحضرت ﷺ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے اور مجھے (ایک طرف) بیٹھے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ "یزید کیا تم مسلمان نہیں ہو کہ نماز نہیں پڑھی؟ میں نے عرض کیا "ہاں رسول اللہ! بیشک میں مسلمان ہوں!" آپؐ نے فرمایا تو پھر لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہونے سے تمہیں کس چیز نے روک دیا تھا؟ میں نے عرض میں اپنے مکان میں نماز پڑھ چکا تھا اور (اب آتے وقت) یہ خیال تھا کہ آپ (ﷺ) بھی نماز سے فارغ ہو چکے ہوں گے پھر فرمایا۔" جب تم نماز کو آؤ اور لوگوں کو (نماز پڑھتے ہوئے) پاؤ تو تم بھی ان کے ہمراہ نماز میں شامل ہو جاؤ اگرچہ تم (پہلے وہ) نماز پڑھ چکے ہو اور یہ (دوسری مرتبہ کی نماز تمہارے لئے نفل ہو جائے گی اور وہ (پہلی نماز) فرض ادا ہوگی۔" (ابوداؤدؒ)

(۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَهٗ فَقَالَ اِنِّيْ اُصَلِّيْ فِيْ بَيْتِيْ ثُمَّ اُدْرِكُ الصَّلَاةَ فِي الْمَسْجِدِ مَعَ الْاِمَامِ اَفَاُصَلِّيْ مَعَهٗ قَالَ لَهٗ نَعَمْ قَالَ الرَّجُلُ اَيَّتَهُمَا اَجْعَلُ صَلَاتِيْ قَالَ ابْنُ عُمَرَ وَذٰلِكَ اِلَيْكَ اِنَّمَا ذٰلِكَ اِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ يَجْعَلُ اَيَّتَهُمَا شَاءَ۔ (رواه مالک)

"اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے ایک شخص نے پوچھا "میں اپنے گھر میں نماز پڑھ لیتا ہوں پھر مسجد میں (ایسے وقت پہنچتا ہوں کہ) لوگ امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہوتے ہیں تو کیا میں بھی اس امام کے پیچھے نماز پڑھوں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "ہاں! پھر اس شخص نے پوچھا کہ (ان میں سے) اپنی (فرض) نماز کسے قرار دوں؟ (پہلی یا دوسری کو) حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا (کیا یہ تمہارا کام ہے؟ (یعنی ان میں سے کسی ایک کو فرض نماز مقرر کرنا تمہارا کام نہیں ہے) یہ تو اللہ بزرگ و برتر کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے تمہاری (فرض) نماز قرار دے۔" (مالکؒ)

تشریح: یہ حدیث بعض شوافع اور غزالیؒ کے اس قول کی تائید کرتی ہے کہ ان دونوں نمازوں میں ایک نماز بلا تعین فرض ادا ہوتی ہے خواہ پہلی نماز ہو یا دوسری۔

لیکن اکثر احادیث سے یہ بات بصراحت معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں میں پہلی نماز فرض ادا ہوتی ہے اور دوسری نماز نفل ہو جاتی ہے

اور یہی بات قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ کوئی شخص کسی ایسے کام کو جو اس کے لئے ایک وقت میں ایک مرتبہ کرنا ضروری ہو اگر دو مرتبہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ بری الذمہ پہلی مرتبہ ہوتا ہے نہ کہ دوسری مرتبہ، اسی طرح نماز فرض کی ادائیگی پہلی مرتبہ ہوتی ہے اور دوسری مرتبہ کی نماز اس کے حق میں نفل کی صورت میں فضیلت وسعادت کا سرمایہ بن جاتی ہے۔

ایک نماز کو دوبارہ نہ پڑھنے کا حکم

⑧ وَعَنْ سُلَيْمَانَ مَوْلٰى مَيْمُوْنَةَ قَالَ اَتَيْنَا ابْنَ عُمَرَ عَلَى الْبَلَاطِ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ فَقُلْتُ اَلَا تُصَلِّيْ مَعَهُمْ قَالَ قَدْ صَلَّيْتُ وَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تُصَلُّوْا صَلَاةً فِيْ يَوْمٍ مَرَّتَيْنِ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد والنسائی)

"اور امّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت سلیمانؒ فرماتے ہیں کہ "ایک روز" ہم حضرت ابن عمرؓ کے پاس مقام بلاط میں آئے لوگ اس وقت (مسجد میں) نماز پڑھ رہے تھے میں نے ابن عمرؓ سے عرض کیا کہ آپ لوگوں کے ہمراہ نماز نہیں پڑھتے؟ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا "میں نماز پڑھ چکا ہوں اور میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تم ایک دن (یعنی ایک وقت میں) ایک نماز دو مرتبہ نہ پڑھو۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ، احمدؒ)

تشریح: "بلاط" مدینہ منورہ میں ایک جگہ کا نام ہے جسے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے مسجد سے باہر اس مقصد کے لئے بنایا تھا کہ لوگوں کو باتیں وغیرہ کرنی ہوں تو مسجد سے باہر اس جگہ کیا کریں اور مسجد میں دنیاوی امور پر مشتمل بات چیت نہ ہو۔"

دوبارہ نماز پڑھنے کے حکم کی تطبیق گزشتہ احادیث سے

بظاہر یہ حدیث گذشتہ احادیث سے متعارض نظر آتی ہے جو ایک نماز کو دوبارہ پڑھنے پر دلالت کرتی ہیں لہٰذا اس حدیث کے حکم و گذشتہ احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ دراصل اس حدیث کے حکم کا تعلق اس شخص سے ہے جو پہلی مرتبہ جماعت سے نماز پڑھ چکا ہو اور گزشتہ احادیث کا تعلق اس شخص سے ہے جس نے پہلی مرتبہ نماز جماعت سے نہیں بلکہ تنہا پڑھی ہو جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے۔ یا۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دوسری مرتبہ نماز بطریق فرضیت نہ پڑھو یعنی دوسری نماز اگر نفل جان کر اور نفل کی نیت سے پڑھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں حضرت ابن عمرؓ کے الفاظ قد صلیت (میں نماز پڑھ چکا ہوں) کی یہ تشریح کی جائے گی کہ حضرت ابن عمرؓ شاید جماعت سے نماز پڑھ چکے ہوں گے اس لئے وہ دوبارہ نماز میں شریک نہیں ہوئے یا یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے۔ وہ فجر یا عصر و مغرب کا وقت ہوگا۔ کہ ان اوقات میں دوبارہ نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔

آخر میں اتنی بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس سلسلہ میں اکثر حدیثیں عام ہیں یعنی ان احادیث سے بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ حکم کہ اگر کوئی شخص تنہا نماز پڑھ کر مسجد میں آئے اور وہاں جماعت ہو رہی ہو تو وہ جماعت میں شریک ہو جائے اور دوبارہ نماز پڑھ لے تمام اوقات کی نمازوں سے متعلق ہے لیکن مجتہدین اور علماء نے ان احادیث پر بھی نظر رکھی ہے جن سے بعض اوقات میں دوبارہ نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیا گیا ہے لہٰذا ان احادیث کے پیش نظر انہوں نے ان اوقات کو متعین کر دیا ہے جن میں دوبارہ نماز پڑھ لینی چاہئے اور ان اوقات کو بھی مختص کر دیا ہے جن میں دوبارہ نماز نہ پڑھنی چاہئے چنانچہ اگلی حدیث میں یہ تخصیص مذکور ہے۔

وہ اوقات جن میں دوبارہ نماز پڑھنا ممنوع ہے

⑨ وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يَقُوْلُ مَنْ صَلَّى الْمَغْرِبَ اَوِ الصُّبْحَ ثُمَّ اَدْرَكَهُمَا مَعَ الْاِمَامِ فَلَا يُعِدْ لَهُمَا۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت نافع" راوی ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے مغرب یا فجر کی نماز (تنہا) پڑھ لی اور پھر ان نمازوں کو امام کے ساتھ پایا (یعنی جہاں جماعت ہو رہی تھی وہاں پہنچ گیا) تو وہ ان کو دوبارہ نہ پڑھے۔" (مالک")

تشریح: یہ حدیث حضرت امام مالکؒ کے مسلک کی تائید کرتی ہے کیونکہ ان کے یہاں صرف مغرب اور فجر کی نمازوں کا اعادہ ممنوع ہے مگر حنفیہ کے یہاں عصر کی نماز بھی اس حکم میں ہے حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تمام نمازوں میں اعادہ ہو سکتا ہے اس حدیث میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا حکم اس شخص کے بارہ میں ہے جس نے پہلی مرتبہ جماعت سے نہیں بلکہ تنہا پڑھی ہو لہٰذا پہلی مرتبہ جماعت سے نماز پڑھ لینے کی شکل میں تو بطریق اولیٰ دوبارہ نماز پڑھنی چاہئے۔

بَابُ السُّنَنِ وَفَضَائِلِهَا

سنتوں اور اس کی فضیلتوں کا بیان

شریعت اسلامی میں نماز چونکہ سب سے عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے نیز دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں اس کی بڑی اہمیت اور خداوند قدوس کی بارگاہ میں سب سے زیادہ محبوب ہے اس لئے اس عبادت میں جتنی زیادہ کثرت اور زیادتی اختیار کی جاتی ہے اسی قدر نہ صرف یہ کہ بندہ کی سعادت و بھلائی بے پناہ رفعتیں اور عروج پاتی ہیں بلکہ وہ اپنی پوری عبودیت اور خداوند عالم کی حاکیت و کبریائی کا اظہار بھی کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت میں دوسری عبادتوں کو جہاں صرف فرائض تک محدود رکھا ہے وہاں اس عبادت کو فرائض وواجبات کے علاوہ سنن سے بھی نوازا ہے چنانچہ ہر فرض نماز کی ساتھ کچھ سنتیں بھی مقرر کی گئی ہیں تاکہ نہ صرف یہ کہ وہ فرض کے ساتھ آسانی سے ادا ہو جائیں بلکہ فرض نماز کی ادائیگی میں جو نقصان و کوتاہی واقع ہو گئی ہو وہ پوری ہو جائے۔

سنتیں یعنی وہ نماز جو دن ورات میں فرض نمازوں کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

1. رواتب یہ وہ سُنّت نمازیں کہلاتی ہیں جن پر آنحضرت ﷺ نے مداومت اختیار فرمائی۔
2. غیر رواتب یہ وہ سُنّت نمازیں کہلاتی ہیں جن پر آنحضرت ﷺ نے مداومت اختیار نہیں فرمائی جیسے عصر کے وقت کی سنتیں۔

سنتیں پڑھنے کا بھی وہی طریقہ ہے جو فرض نماز پڑھنے کا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ فرض نماز کی صرف دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے بعد دوسری سورت بھی پڑھنے کا حکم ہے اور سُنّت نماز کی سب رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے بعد دوسری سورت بھی پڑھی جاتی ہے اور سُنّت نماز کی رکعتوں میں جو سورتیں پڑھی جاتی ہیں ان کا برابر نہ ہونا خلاف سُنّت نہیں ہے نیز سُنّت نمازیں دن میں دو رکعت تک اور رات میں چار رکعت تک ایک ہی سلام سے پڑھی جا سکتی ہیں مگر دو رکعت کے بعد التحیات پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ (علم الفقہ)

یہ بات بھی جان لیجئے کہ سُنّت نفل تطوع، مندوب، مستحب، مرغوب فیہ اور حسن یہ تمام الفاظ مترادف ہیں ان سب کے معنی ایک ہی ہیں۔ یعنی وہ نماز جس کے پڑھنے کو شارع نے نہ پڑھنے پر ترجیح دی ہے اگرچہ ان نمازوں میں بعض ایسی ہیں جو دوسرے بعض کے مقابلہ میں سُنّت مؤکدہ ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

سنتوں کی تعداد اور ان کی پڑھنے کی فضیلت

(۱) عَنْ اُمِّ حَبِيْبَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى فِيْ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً بُنِيَ لَهُ بَيْتٌ

فِي الْجَنَّةِ اَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ هَا وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ) وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يُصَلِّي لِلّٰهِ كُلَّ يَوْمٍ ثِنْتَىْ عَشْرَةَ رَكْعَةً تَطَوُّعًا غَيْرَ فَرِيْضَةٍ اِلَّا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ اَوْ اِلَّا بُنِيَ لَهٗ بَيْتٌ فِي الْجَنَّةِ۔

"حضرت اُمّ حبیبہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص دن ورات میں بارہ رکعتیں نماز پڑھے تو اس کے لئے جنت میں گھر بنایا جاتا ہے (اور وہ بارہ رکعتیں یہ ہیں) چار رکعت ظہر (کی فرض نماز سے پہلے) اور دو رکعت اس کے بعد، دو رکعت مغرب (کی فرض نماز) کے بعد، دو رکعت عشاء (کی فرض نماز) کے بعد اور دو رکعت فجر کی (فرض) نماز سے پہلے۔" (ترمذیؒ)

"اور مسلمؒ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت ام حبیبہ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو بندہ مسلمان ہر دن میں اللہ جل شانہ کے لئے فرض نمازوں کے علاوہ بارہ رکعتیں (سنت) پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بناتا ہے یا یہ فرمایا کہ "اس کے لئے جنت میں گھر بنایا جاتا ہے۔"

تشریح: حدیث میں دن ورات کی سنتوں کی جو تعداد مذکورہ تفصیل کے ساتھ بتائی گئی ہے وہ تمام سنتیں مؤکدہ ہیں اور فجر کی دونوں سُنّت رکعتیں سب سے زیادہ مؤکدہ ہیں حتیٰ کہ حضرت امام حسن بصریؒ اور بعض حنفیہ حضرات نے ان کو واجب تک کہا ہے امام حسنؒ نے تو مغرب کی دونوں سنتوں کو بھی واجب کہا ہے لیکن اس حدیث کے پیش نظر ان کے قول کی تردید کی گئی ہے کہ وہ واجب نہیں بلکہ سُنّت ہیں۔

(۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فِيْ بَيْتِهٖ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ فِيْ بَيْتِهٖ قَالَ وَحَدَّثَتْنِيْ حَفْصَةُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ حِيْنَ يَطْلُعُ الْفَجْرُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ظہر (کی فرض نماز) سے پہلے دو رکعتیں، اس کے بعد دو رکعتیں اور آپ ﷺ کے گھر (یعنی حضرت حفصہؓ جو ابن عمرؓ کی بہن تھیں کے حجرہ) میں مغرب (کی فرض نماز) کے بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں نیز حضرت ابن عمر نے فرمایا۔ کہ حضرت حفصہؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ دو ہلکی رکعتیں اس وقت پڑھا کرتے تھے جب فجر طلوع ہوتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابن عمرؓ نے ظہر سے پہلے کی سنتوں کے لئے "رکعتین کا استعمال فرمایا ہے جس کا ظاہری مطلب تو یہی ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر سے پہلے دو رکعتیں پڑھیں لیکن اہل علم کا قول ہے کہ تثنیہ (دو) جمع (چار) کے منافی نہیں ہے یعنی اگر یہاں "رکعتین" کے معنی بجائے دو رکعت کے چار رکعت مراد لئے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اس توجیہ کے ذریعہ اس حدیث میں اور اس حدیث میں کہ جس سے ظہر کی فرض نماز سے پہلے چار رکعت سنتیں ثابت ہوتی ہیں تطبیق ہو جاتی ہیں۔ (ملا علی قاریؒ)

حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ کی مستدل ہے کیونکہ ان کے نزدیک ظہر کی نماز فرض سے پہلے سُنّت دو رکعتیں مگر حنفیہ کے نزدیک چار رکعتیں ہیں حنفیہ مسلک کی مستدل بھی بہت سی احادیث مروی ہیں جو حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمّ حبیبہؓ وغیرہ سے منقول ہیں نیز حضرت امام ترمذیؒ نے حنفیہ مسلک کے حق میں فرمایا ہے کہ اسی مسلک پر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ میں سے اکثر اہل علم کا عمل ہے اور یہی قول سفیان ثوریؒ، ابن المبارکؒ اور اسحٰق کا بھی ہے نیز حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا قول بھی چار رکعتوں ہی کے بارہ میں منقول ہے لیکن اس طرح کہ چار رکعتیں دو سلام کے ساتھ پڑھی جائیں حضرت

ابن عمرؓ کے اس ارشاد کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی چار رکعت سنتیں گھر میں پڑھا کرتے تھے لہٰذا ازواج مطہرات نے چار رکعتوں ہی کے بارہ میں ذکر کیا اور جب آپ ﷺ فرض نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں تشریف لاتے تو وہاں تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھتے تھے اس لئے تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں کو حضرت ابن عمرؓ نے ظہر کی سنتیں سمجھ کر فرمایا کہ میں نے آپ ﷺ کے ہمراہ ظہر کی فرض نماز سے پہلے دو رکعت سنّت پڑھی ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ نے یہاں ظہر، مغرب، اور عشاء کی سنتوں کا تذکرہ کیا ہے فجر کی سنتوں کا تذکرہ نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صبح کے وقت آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نماز نہیں پڑھتے تھے اس لئے فجر کی سنتیں خود ذکر نہیں کیں بلکہ حضرت حفصہؓ کی روایت کر دی تاکہ ان نمازوں کے ساتھ فجر کی سنتیں بھی معلوم ہو جائیں۔

جمعہ کی سنتیں

(۳) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُصَلِّي بَعْدَ الْجُمُعَةِ حَتّٰى يَنْصَرِفَ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ فِيْ بَيْتِهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ (گھر میں) واپس تشریف لاتے اور مکان میں دو رکعتیں پڑھتے۔" (بخاری)

تشریح: حضرت ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں رکعتین سے جمعہ کی سنتیں مراد ہیں چنانچہ ایک قول کے مطابق حضرت امام شافعیؒ کا عمل اسی حدیث پر ہے کہ جمعہ کی سُنّت ظہر ہی کی سُنّت کی طرح یعنی دو رکعتیں ہیں دیگر صحیح احادیث میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ جمعہ کی نماز سے پہلے بھی اور جمعہ کی نماز کے بعد بھی چار چار رکعت سنتیں پڑھتے تھے چنانچہ حضرت امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ کے بعد چھ رکعتیں سُنّت پڑھنی چاہئیں۔

جیسا کہ پہلے کسی موقعہ پر بتایا جا چکا ہے کہ نوافل نماز گھر میں پڑھنی افضل ہیں اس لئے آنحضرت ﷺ جمعہ کے بعد کی سنتیں گھر ہی میں پڑھا کرتے تھے۔

آنحضرت کے نوافل کی تعداد

(۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ شَقِيْقٍ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنْ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تَطَوُّعِهِ فَقَالَتْ كَانَ يُصَلِّيْ فِيْ بَيْتِيْ قَبْلَ الظُّهْرِ اَرْبَعًا ثُمَّ يَخْرُجُ فَيُصَلِّيْ بِالنَّاسِ ثُمَّ يَدْخُلُ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَكَانَ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ الْمَغْرِبَ ثُمَّ يَدْخُلُ بَيْتِيْ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَكَانَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ تِسْعَ رَكَعَاتٍ فِيْهِنَّ الْوِتْرُ وَكَانَ يُصَلِّيْ لَيْلًا طَوِيْلًا قَائِمًا وَلَيْلًا طَوِيْلًا قَاعِدًا وَكَانَ إِذَا قَرَأَ وَهُوَ قَائِمٌ رَكَعَ وَسَجَدَ وَهُوَ قَائِمٌ وَإِذَا قَرَأَ قَاعِدًا رَكَعَ وَسَجَدَ وَهُوَ قَاعِدٌ وَكَانَ إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَزَادَ اَبُوْدَاوُدَ ثُمَّ يَخْرُجُ فَيُصَلِّيْ بِالنَّاسِ صَلَاةَ الْفَجْرِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن شقیق فرماتے ہیں کہ میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نبی کریم ﷺ کی نفل نمازوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ "آنحضرت ﷺ پہلے میرے گھر میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھتے پھر (مسجد) تشریف لے جاتے (اور وہاں) لوگوں کے ہمراہ (ظہر کی فرض) نماز پڑھتے پھر آپ ﷺ (گھر میں) تشریف لاتے اور دو رکعتیں نماز پڑھتے۔ (اسی طرح) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز لوگوں کے ہمراہ (مسجد میں) ادا فرماتے اور پھر (گھر میں) تشریف لاکر دو رکعتیں نماز پڑھتے۔ نیز آپ ﷺ عشاء کی نماز لوگوں کے ہمراہ (مسجد میں) پڑھتے اور پھر میرے گھر تشریف لاکر دو رکعتیں نماز پڑھتے اور آپ ﷺ رات میں (تہجد کی) نماز (کبھی) نو رکعت پڑھا کرتے تھے ان میں وتر (کی نماز بھی) شامل ہوتی اور رات میں دیر تک کھڑے ہو کر اور دیر تک بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور جس وقت آپ ﷺ

کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تو کھڑے ہی کھڑے رکوع و سجود میں چلے جایا کرتے تھے اور جب بیٹھ کر نماز پڑھتے تو بیٹھے ہی ہوئے رکوع و سجود میں جایا کرتے تھے اور جب صبح صادق ہوتی تو دو رکعت فجر کی سُنّت پڑھ لیتے تھے۔" (مسلمؒ) ابوداؤدؒ نے یہ الفاظ مزید نقل کئے ہیں کہ "(فجر کی دو سنتیں پڑھ کر) پھر آپ ﷺ (مسجد) تشریف لے جاتے اور وہاں لوگوں کے ہمراہ فجر کی فرض نماز ادا فرماتے۔"

تشریح: یہ حدیث اس بات کی صریحی طور پر دلیل ہے کہ سنتیں گھر میں ہی پڑھنا افضل ہیں "فِيهِنَّ الْوِتْرُ" کا مطلب یہ ہے "جب آنحضرت ﷺ تہجد کی نماز ادا فرماتے تو اس کے ساتھ وتر بھی تین رکعت (جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے) یا ایک رکعت (جیسا دیگر ائمہ کا مسلک ہے) پڑھ لیا کرتے تھے۔"

رات میں آنحضرت ﷺ کی نماز پڑھنے کے سلسلہ میں مختلف روایتیں منقول ہیں کہ کبھی رکعتین پڑھتے کبھی آٹھ اور کبھی نو اسی طرح کبھی دس کبھی گیارہ اور کبھی تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

رَكَعَ وَسَجَدَ وَهُوَ قَائِمٌ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت آپ ﷺ تہجد کی نماز کھڑے ہو کر پڑھا کرتے تھے تو آپ حالت قیام ہی سے کوع و سجود میں جایا کرتے تھے یہ نہیں ہوتا تھا کہ قرأت تو کھڑے ہو کر کرتے ہوں اور رکوع و سجدہ بیٹھ کر کرتے ہوں اسی طرح جب آپ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے تو رکوع و سجود بھی بیٹھے ہوئے ہی کرتے تھے تاہم اس صورت کے بارہ میں یہ بھی منقول ہے کہ آپ رکوع و سجود میں کھڑے ہو کر جایا کرتے تھے یعنی قرأت تو بیٹھ کر کرتے پھر کھڑے ہوتے اور تھوڑی سی قرأت کر کے تب رکوع و سجود میں جاتے تھے۔

بہر حال تمام احادیث کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ تہجد کی نماز تین طرح سے پڑھتے تھے۔

1. پوری نماز کھڑے ہو کر پڑھتے تھے۔
2. پوری نماز بیٹھ کر پڑھتے تھے۔
3. قرأت بیٹھ کر کرتے پھر کھڑے ہوتے اور رکوع و سجود میں جاتے۔

اس تیسری صورت کا عکس نہیں فرماتے تھے۔ یعنی اس طرح نماز نہیں پڑھتے تھے کہ قرأت تو کھڑے ہو کر کرتے ہوں اور پھر بیٹھ کر رکوع و سجود میں جاتے ہوں جیسا کہ یہ حدیث اس کی نفی کر رہی ہے۔

فجر کی سنتوں کی تاکید

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى شَيْءٍ مِنَ النَّوَافِلِ اَشَدَّ تَعَاهُدًا مِنْهُ عَلٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ۔ (متفق علیہ)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ نے نوافل کے پڑھنے میں کسی کی ایسی محافظت اور مداومت نہیں فرماتے تھے جیسی کہ فجر کی (سُنّت کی) دو رکعت کے پڑھنے پر مداومت اور محافظت فرماتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ فجر اس کی سنتیں اتنی زیادہ اہم اور مؤکدہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ کسی بھی حال میں خواہ سفر میں ہوتے یا حضر میں انہیں پڑھنا نہیں چھوڑتے تھے۔

فجر کی سنتوں کی اہمیت و عظمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ بغیر کسی عذر کے فجر کی سنتوں کو بیٹھ کر پڑھنا درست نہیں ہے۔

فجر کی سنتوں کی فضیلت

⑥ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا فجر کی سنتوں کی دو رکعتیں دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ بہتر ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: فجر کی سنتوں کو دنیا اور دنیا کی چیزوں پر یہ فضیلت اس صورت میں دی گئی ہے کہ دنیا اور دنیا کی چیزیں اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دی جائیں تب بھی فجر کی سنتیں ہی افضل ہوں گی کیونکہ دنیا کی چیزوں میں بخل کرنے اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنے میں اچھائی کب ہے کہ فجر کی سنتوں کو ان سے افضل کہا جاتا۔

علماء نے لکھا ہے کہ سب سے زیادہ مؤکدہ سنتیں فجر کی ہیں اس کے بعد مغرب کی سنتیں اور اس کے بعد ظہر کی فرض نماز کے بعد کی سنتیں اس کے بعد عشاء کی فرض نماز کے بعد کی سنتیں اور پھر سب کے بعد ظہر کی فرض نماز سے پہلے کی سنتیں۔

مغرب کی فرض نماز سے پہلے دو رکعت پڑھنے کا حکم

⑦ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلُّوْ قَبْلَ صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ صَلُّوْا قَبْلَ صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ لِمَنْ شَاءَ كَرَاهِيَةَ اَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مغفلؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مغرب کی فرض نماز سے پہلے (دو رکعتیں) نماز پڑھو (آپ نے یہ الفاظ دو مرتبہ فرمائے اور پھر) بوجہ اس بات کے مکروہ سمجھنے کے کہ لوگ انہیں سُنّت نہ قرار دے دیں تیسری مرتبہ یہ فرمایا کہ "جو چاہے (پڑھ لیا کرے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: دو مرتبہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ مغرب کی فرض نماز پڑھنے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھ لیا کرو مگر پھر یہ جان لو کہ لوگ دونوں رکعتوں کو سُنّت مؤکدہ کا درجہ دے دیں گے "لمن شاء" (جو چاہے) کہہ کر اس بات کی آگاہی دے دی کہ یہ دو رکعتیں سُنّت نہیں ہیں بلکہ ان کا درجہ زیادہ سے زیادہ استحباب تک ہے اگر کوئی شخص انہیں پڑھ لے گا تو اسے ثواب ملے گا۔ اور جو شخص نہیں پڑھے گا اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

مغرب کی فرض نماز سے پہلے دو رکعتیں نفل پڑھنے کے سلسلہ میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اکثر فقہاء نے انہیں پڑھنے سے منع کیا ہے چنانچہ باب "فضل الاذان" کی حدیث نمبر ۹ کے ضمن میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے اور اس باب کی تیسری فصل میں بھی اس کی کچھ تفصیل ذکر کی جائے گی۔

جمعہ کے بعد چار رکعت سنتیں پڑھنی چاہیے

⑧ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُصَلِّيًا بَعْدَ الْجُمُعَةِ فَلْيُصَلِّ اَرْبَعًا رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ اُخْرٰى لَهٗ قَالَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا اَرْبَعًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص جمعہ (کی فرض نماز) کے بعد نماز پڑھنے والا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ چار رکعت پڑھے۔ مسلمؒ اور مسلم ہی کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کی نماز پڑھے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے بعد چار رکعت سنتیں بھی پڑھے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

ظہر کی سنتیں پڑھنے کی فضیلت

⑨ عَنْ اُمِّ حَبِيْبَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ حَافَظَ عَلٰى اَرْبَعِ رَكَعَاتٍ قَبْلَ الظُّهْرِ وَ

اَرْبَعٍ بَعْدَ هَاحَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ۔ (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ)

"حضرت اُمّ حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص ظہر (کی فرض نماز) سے پہلے چار رکعت اور اس کے بعد چار رکعت کی محافظت کرتا ہے (یعنی انہیں پابندی سے بلاناغہ پڑھتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس پر (دوزخ کی) آگ حرام کر دیتا ہے (بایں طور کے اس کو مطلقاً دوزخ میں نہیں ڈالے گا یا یہ کہ اسے دوزخ میں ابدی طور پر نہیں رکھے گا)۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس روایت سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظہر کے بعد چار رکعت نماز ایک ہی سلام سے پڑھی جائے جب کہ دوسری روایت میں منقول ہے کہ ظہر کے بعد کی چار رکعتیں دو سلام کے ساتھ ادا کی جائیں، بہرحال اس موقع پر یہ بحث ہے کہ ظہر کی یہ چار رکعتیں جن کے بارہ میں حدیث میں ذکر کیا جا رہا ہے آیا سُنّت کی دو رکعتوں کے علاوہ ہیں یا سُنّت کی وہ دونوں رکعتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ تو ظاہری طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ چار رکعتیں سُنّت کی ان دونوں رکعتوں کے علاوہ ہیں جو فرض کے بعد پڑھی جاتی ہیں لیکن ملا علی قاریؒ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چار رکعتوں میں سُنّت کی وہ دونوں رکعتیں بھی شامل ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ان چار رکعتوں میں دو رکعت سُنّت مؤکدہ ہیں اور دو رکعت مستحب اور اولیٰ یہ ہے کہ یہ چار رکعت دو سلام کے ساتھ ادا کی جائیں۔

ظہر سے پہلے چار رکعت نماز پڑھنے کی فضیلت

⑩ وَعَنْ اَبِيْ اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ قَبْلَ الظُّهْرِ لَيْسَ فِيْهِنَّ تَسْلِيْمٌ تُفْتَحُ لَهُنَّ اَبْوَابُ السَّمَاءِ۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوایوب انصاریؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ظہر سے پہلے کی وہ چار رکعتیں کہ جن (کے درمیان) میں سلام نہیں پھیرا جاتا (یعنی ان چار رکعتوں کے پڑھنے کے سلسلہ میں افضل یہی ہے کہ چار رکعتیں پوری کر کے آخر میں سلام پھیرا جائے) ان کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: ظہر سے پہلے پڑھی جانے والی چار رکعتوں کی فضیلت ظاہر فرمائی جا رہی ہے کہ جب وہ پڑھی جاتی ہیں تو ان کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں یعنی وہ بارگاہ رب العزت میں پہنچ کر قبولیت کا درجہ پاتی ہیں اور ان کے سبب سے رحمت الٰہی کے انوار نازل ہوتے ہیں۔

ان چار رکعتوں کے بارہ میں بھی اختلاف ہے آیا ان سے مراد سُنّت راتبہ کی وہی چار رکعتیں ہیں جو ظہر کے فرض سے پہلے پڑھی جاتی ہیں یا ان کے علاوہ ہیں جن کو نماز فی الزوال کہتے ہیں۔ چنانچہ مختار قول یہی ہے کہ یہ غیر رواتب یعنی فجر کے فرض سے پہلے کی سُنّت مؤکدہ کے علاوہ نماز فی الزوال کی چار رکعتیں ہیں۔

نماز فی الزوال کی فضیلت

⑪ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ اَرْبَعًا بَعْدَ اَنْ تَزُوْلَ الشَّمْسُ قَبْلَ الظُّهْرِ وَقَالَ اِنَّهَا سَاعَةٌ تُفْتَحُ فِيْهَا اَبْوَابُ السَّمَاءِ فَاُحِبُّ اَنْ يَّصْعَدَلِيْ فِيْهَا عَمَلٌ صَالِحٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن سائبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سورج ڈھلنے کے بعد اور ظہر سے پہلے (فی الزوال کی) چار رکعت نماز پڑھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "یہ ایسا وقت ہے جس میں (نیک اعمال کے اوپر جانے کے لئے) آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں لہٰذا میں اسے محبوب رکھتا ہوں کہ اس وقت میرا نیک عمل اوپر جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج ڈھلنے کے بعد کا وقت ساعت قبولیت ہے اس وقت جو بھی نیک عمل کیا جائے گا وہ بارگاہ رب

العصر میں مقبولیت کا درجہ پائے گا اور ظاہر ہے کہ تمام نیک اعمال میں نماز سب سے افضل ہے اس لئے اس وقت نماز پڑھنا افضل ہو گا۔

عصر کی سنتیں

⑫ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً صَلَّى قَبْلَ الْعَصْرِ اَرْبَعًا۔ (رواہ احمد و الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت نازل فرمائے جو عصر (کی فرض نماز) سے پہلے چار رکعت نماز پڑھتا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

عصر کی سنتیں دو رکعت ہیں یا چار رکعت

⑬ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي قَبْلَ الْعَصْرِ اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ يَفْصِلُ بَيْنَهُنَّ بِالتَّسْلِيْمِ عَلَى الْمَلَائِكَةِ الْمُقَرَّبِيْنَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُؤْمِنِيْنَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عصر سے پہلے چار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ اور ان کے درمیان مقرب فرشتوں اور ان کے بعد میں جو مسلمان اور مؤمنین ہیں سب پر سلام بھیج کر فرق کرتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہاں "تسلیم" (سلام بھیجنے) سے مراد التحیات پڑھنا ہے، یعنی آپ ﷺ دو رکعتوں کے بعد التحیات پڑھتے تھے اور پھر چار رکعتوں کے بعد سلام پھیرتے تھے۔

عصر کی سنتیں دو ہیں یا چار ہیں

⑭ وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي قَبْلَ الْعَصْرِ رَكْعَتَيْنِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عصر سے پہلے دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: عصر کی سنتوں کے بارہ میں متعدد روایتیں منقول ہیں بعض سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ عصر سے پہلے دو رکعتیں سُنّت کی پڑھا کرتے تھے اور بعض روایتوں سے چار رکعت کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے تو وہ دو رکعت پڑھے اور چاہے تو چار رکعت، تاہم افضل چار ہی رکعت پڑھنا ہے۔

صلوۃ الاوابین کی فضیلت

⑮ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى بَعْدَ الْمَغْرِبِ سِتَّ رَكْعَاتٍ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيْمَا بَيْنَهُنَّ بِسُوْءٍ عُدِلْنَ لَهُ بِعِبَادَةِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ سَنَةً رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ عُمَرَ بْنِ اَبِيْ خَثْعَمٍ وَسَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ اِسْمَاعِيْلَ يَقُوْلُ هُوَ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ وَضَعَّفَهُ جِدًّا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مغرب کی نماز پڑھ کر چھ رکعت (نفل اس طرح) پڑھے کہ ان کے درمیان کوئی فحش گفتگو نہ کرے تو ان رکعتوں کا ثواب اس کے لئے بارہ سال کی عبادت کے ثواب کے برابر ہو جائے گا۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ ہم یہ حدیث صرف عمر ابن خثعم کی سند کے (اور کسی سند سے) نہیں جانتے اور میں نے محمد ابن اسمٰعیل بخاریؒ سے سنا وہ کہتے تھے کہ یہ (عمر ابن خثعم) منکر الحدیث ہے نیز انہوں نے اس حدیث کو بہت ضعیف کہا ہے۔"

تشریح: مغرب کی نماز کے بعد چھ رکعت نماز نفل تین سلام کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اسے صلوٰۃ الاوابین کہتے ہیں یہ نماز سنت ہے اور اس نماز کا نام "صلوٰۃ الاوابین" حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے اس نماز کی بہت زیادہ فضیلت ہے جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے۔

حدیث سے بظاہر تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ مغرب کے بعد جو دو رکعت معمولی سُنّت پڑھی جاتی ہے وہ بھی ان چھ رکعتوں میں شامل ہے، نیز اگلی حدیث میں صلوٰۃ الاوابین کی جو بیس رکعتیں ذکر کی جارہی ہیں ان میں بھی یہ دونوں رکعتیں داخل ہیں۔

علامہ یحییٰؒ نے فرمایا ہے کہ "پہلے دو رکعتیں سُنّت کی الگ سے پڑھ لی جائیں اس کے بعد میں اختیار ہے کہ چاہے کوئی چاروں رکعت پڑھ لے، چاہے دو ہی پڑھے۔

اس حدیث کو اگرچہ امام ترمذی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے مگر فضائل اعمال کے سلسلہ میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کرنا جائز ہے پھر اس کے علاوہ اس حدیث کو ابن خزیمہؒ نے اپنی صحیح میں اور ابن ماجہؒ نے بھی نقل کیا ہے، نیز میرکؒ کا قول یہ ہے کہ حضرت عمار ابن یاسرؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھتے تھے نیز انہوں نے فرمایا ہے کہ "میں نے اپنے محبوب رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھتا ہے اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اگرچہ وہ (گناہ) دریا کے جھاگ کے مانند ہوں۔ (طبرانیؒ)

حضرت مولانا شاہ اسحٰق محدث دہلوی کا قول ہے کہ "ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس حدیث میں صلوٰۃ الاوابین کی جو چھ رکعت ذکر کی گئی ہیں یا اسی طرح اگلی حدیث میں جو بیس رکعتیں ذکر کی جائیں گے یہ دونوں تعداد مغرب کے بعد کی سُنّت مؤکدہ کی دو رکعت کے علاوہ ہے۔

صلوٰۃ الاوابین کی انتہائی تعداد بیس رکعت ہے

(۱۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى بَعْدَ الْمَغْرِبِ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً بَنَى اللّٰهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مغرب کے بعد بیس رکعتیں (صلوٰۃ الاوابین) کی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے بہشت میں گھر بناتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: گو محدثین نے اس حدیث کو بھی ضعیف قرار دیا ہے لیکن علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس بارہ میں ایک حدیث اور منقول ہے کہ "نبی کریم ﷺ اس نماز کی بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے یہ صلوٰۃ الاوابین ہے لہٰذا جس شخص نے یہ نماز پڑھی تو (سمجھو کہ) اس کی مغفرت کر دی گئی۔" چنانچہ اکثر علماء سلف اور صلحائے امت اسے پڑھنا اپنی سعادت جو خوش بختی تصور کرتے تھے اور اسے پڑھتے تھے۔

علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ صلوٰۃ الاوابین کی رکعت کی تعداد کے سلسلے میں مختلف احادیث منقول ہیں چنانچہ ایک حدیث تو اس سے پہلے ہی گذر چکی ہے جس میں چھ رکعت ذکر کی گئی ہے ایک حدیث یہ ہے جس میں بیس رکعت منقول ہے اسی طرح بعض روایتوں میں دو رکعت اور بعض روایتوں میں چار رکعت بھی منقول ہے۔ لہٰذا ان تمام احادیث کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ صلوٰۃ الاوابین کی کم سے کم دو رکعت ہے اور زیادہ سے زیادہ بیس رکعت جو شخص دو سے لے کر بیس تک جتنی زیادہ رکعتیں پڑھ گا اس کے حق میں اسی قدر بہتری و بھلائی ہوگی۔

عشاء کی سنتیں

(۱۷) وَعَنْهَا قَالَتْ مَا صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ قَطُّ فَدَخَلَ عَلَيَّ صَلّٰى اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ اَوْسِتَّ

رَکَعَاتٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ جب بھی (مسجد میں) عشاء (کی فرض) نماز پڑھ کر میرے پاس آتے تھے تو (سُنّت کی) چار رکعت یا چھ رکعت ضرور پڑھتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: عشاء کے بعد سنتوں کے سلسلہ میں جتنی بھی مشہور روایتیں منقول ہیں ان میں یا تو دو رکعت پڑھنا منقول ہے یا چار رکعت، صرف یہی ایک ایسی حدیث ہے جس میں چھ رکعت پڑھنے کا ذکر کیا جا رہا ہے جن احادیث میں دو رکعت پڑھنے کا ذکر ہے ان میں سے کچھ پہلے بھی گزر چکی ہیں جن روایتوں سے چار رکعت پڑھنا معلوم ہوتا ہے ان میں سے منجملہ ایک حدیث یہ بھی ہے جس کو سعید ابن منصور نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ "آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس شخص نے عشاء سے پہلے چار رکعت نماز پڑھی تو گویا اس نے اس رات میں تہجد (کی نماز) پڑھی اور جس شخص نے عشاء کے بعد چار رکعت نماز پڑھی تو گویا اس نے لیلۃ القدر میں چار رکعت نماز پڑھی۔

بہر حال۔ اس روایت کی وضاحت یہ ہے کہ آپ عشاء کے بعد جو چار رکعتیں پڑھتے تھے اس میں سے دو رکعت تو سُنّت مؤکدہ ہوتی تھیں اور دو رکعت مستحب۔ البتہ "او ست رکعات" میں حرف او کے بارہ میں دو احتمال ہیں یا تو یہ شک کے لئے ہے یا پھر تنویع کے لئے ہے۔

ارشادی باری ادبار النجوم اور ادبار السجود سے فجر اور مغرب کی سنتیں مراد ہیں

⑱ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ الرَّكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ وَاِدْبَارِ السُّجُوْدِ الرَّكْعَتَانِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (تسبیح) اور ادبار النجوم سے فجر سے پہلے کی دو رکعتیں (یعنی فجر کی سنتیں) مراد ہیں اور (تسبیح) ادبار السجود سے مغرب کے بعد کی دو رکعتیں (یعنی مغرب کی سنتیں) مراد ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: قرآن کریم کی سورۂ طور کے آخر میں یہ آیت ہے:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ۝۔ (الطور ۵۲: ۴۹)

"جب تم اٹھا کرو تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیا کرو اور رات کے بعض اوقات میں بھی اور ستارون کے پیٹھ پھیرنے (یعنی ڈوبنے) کے وقت بھی اس کی پاکی بیان کرو۔"

اس آیت کے بارہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ادبار النجوم ستاروں کے پیٹھ پھیرنے کے وقت پر پروردگار کی پاکی بیان کرنے سے فجر کی سنتیں پڑھنی مراد ہیں کہ وہ ستاروں کے چھپنے کے وقت یعنی صبح صادق کے بعد پڑھی جاتی ہیں۔

اس طرح قرآن کریم کی سورہ ق کی یہ آیت ہے:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ۝۔ (ق ۵۰: ۳۹،۴۰)

"اور آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے اور آفتاب کے غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرو، اور رات کے بعض اوقات میں بھی اور سجود کے بعد بھی اس کی پاکی بیان کرو۔"

حدیث کے دوسرے جزء میں آنحضرت ﷺ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا کہ "اس میں "سجود" سے مراد مغرب کی تین رکعت فرض ہیں اور "ادبار السجود" یعنی سجود کے بعد پاکی بیان کرنے سے مغرب کے فرض کے بعد کی دو رکعت سنتیں پڑھنی مراد ہیں۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ظہر سے پہلے چار رکعت نماز پڑھنے کا ثواب

(۱۹) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَرْبَعٌ قَبْلَ الظُّهْرِ بَعْدَ الزَّوَالِ تُحْسَبُ بِمِثْلِهِنَّ فِي صَلَاةِ السَّحَرِ وَمَامِنْ شَيْءٍ اِلَّا وَهُوَ يُسَبِّحُ اللّٰهَ تِلْكَ السَّاعَةَ ثُمَّ قَرَأَ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دَاخِرُوْنَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ظہر سے پہلے اور سورج ڈھلنے کے بعد (ظہر کی سُنّت یا فی الزوال کی) چار رکعت نماز (ثواب اور فضیلت میں) تہجد کے وقت چار رکعت نماز پڑھنے کے برابر ہوتی ہیں اور اس وقت (یعنی ظہر سے پہلے اور سورج ڈھلنے کے بعد) تمام چیزیں اللہ رب العزت کی پاکی کی تسبیح کرتی ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "يَتَفَيَّؤُ ظِلٰلُهُ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دَاخِرُوْنَ" "تمام چیزوں کے سائے دائیں طرف سے اور بائیں طرف سے اللہ جل شانہ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے جھکتے ہیں اور وہ سب حقیر ہیں۔" (ترمذی، بیہقی)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اس وقت نماز پڑھنے کی ترغیب دلانے کے لئے اپنے ارشاد کی دلیل کے طور پر یہ آیت پڑھی آیت میں سجدے سے مراد تابعداری ہے خواہ وہ طبعاً ہو یا اختیاراً۔ اور اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں جس چیز کو جس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اس مقصد کی تکمیل ہی در حقیقت پروردگار کی تابعداری ہے۔

عصر کے بعد دو رکعت نماز کا ذکر

(۲۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَاتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ عِنْدِيْ قَطُّ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ قَالَتْ وَالَّذِيْ ذَهَبَ بِهٖ مَا تَرَكَهُمَا حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ۔

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "نبی کریم ﷺ نے کبھی بھی میرے نزدیک (یعنی میرے گھر میں) عصر کے بعد دو رکعت (نماز پڑھنی) نہیں چھوڑی۔ (بخاری و مسلمؒ) اور بخاریؒ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا قسم ہے اس پاک ذات کی جس نے رسول اللہ ﷺ کی روح مبارک قبض کی، آپ ﷺ نے یہ دو رکعتیں کبھی نہ چھوڑیں یہاں تک کہ وصال حق فرمایا۔

تشریح: گزشتہ صفحات میں کسی موقعہ پر عصر کے بعد نماز پڑھنے کی سلسلہ میں بتایا جاچکا ہے یہ دو رکعت پڑھنی آنحضرت ﷺ کی خصوصیت تھی اور صرف آنحضرت ﷺ کے لئے جائز تھی، دوسرے لوگوں کو عصر کے بعد نفل نماز پڑھنا جائز نہیں کیونکہ اس کی مخالفت میں بہت زیادہ احادیث منقول ہیں۔

غروب آفتاب کے بعد اور مغرب کی نماز سے پہلے نفل نماز پڑھنے کا مسئلہ

(۲۱) وَعَنِ الْمُخْتَارِ بْنِ فُلْفُلٍ قَالَ سَأَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ عَنِ التَّطَوُّعِ بَعْدَ الْعَصْرِ فَقَالَ كَانَ عُمَرُ يَضْرِبُ الْاَيْدِيَ عَلٰى صَلَاةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ وَكُنَّا نُصَلِّيْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ فَقُلْتُ لَهٗ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْهِمَا قَالَ كَانَ يَرَانَا يُصَلِّيْهِمَا فَلَمْ يَأْمُرْنَا وَلَمْ يَنْهَنَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مختار ابن فلفل فرماتے ہیں کہ میں نے (ایک دن) حضرت انسؓ سے عصر کے بعد نفل نماز پڑھنے کے بارہ پوچھا تو انہوں نے

فرمایا کہ (اس معاملہ میں) امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ (کا تو اتنا سخت رویہ تھا کہ وہ) عصر کے بعد نفل نماز کی نیت باندھنے والے کے ہاتھ پر مارتے تھے (یعنی انتہائی سختی اور شدت سے اس وقت نماز پڑھنے سے منع کرتے تھے) اور ہم نبی کریم ﷺ کے زمانہ مبارک میں آفتاب غروب ہونے کے بعد اور مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعتیں (نفل نماز کی) پڑھا کرتے تھے۔ (یہ سن کر) میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ کیا آنحضرت ﷺ بھی یہ دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا آپ ﷺ ہمیں نماز پڑھتے دیکھتے تھے لیکن ہمیں اس کے پڑھنے کا نہ تو حکم ہی دیتے تھے اور نہ ہمیں اس کے پڑھنے سے منع فرماتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت انسؓ نے اپنے قول نہ تو ہمیں حکم ہی دیتے تھے اور نہ منع فرماتے تھے، سے آنحضرت ﷺ کی تقریر ثابت کی یعنی آپ ﷺ اس وقت نماز پڑھنے کو درست سمجھتے تھے کیونکہ اگر آپ ﷺ کے نزدیک اس وقت نماز پڑھنا مکروہ ہوتا تو آپ ﷺ اس سے ضرور منع فرماتے، لیکن خلفائے راشدین کے بارہ میں ثابت ہے کہ وہ حضرات اس وقت نماز پڑھنے کو درست نہیں سمجھتے تھے لہٰذا اس سلسلہ میں خلفائے راشدین کی اقتداء کافی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر فقہاء نے اس وقت نماز پڑھنے سے منع کیا ہے کیونکہ اس میں مغرب کی نماز کی تاخیر لازم آتی ہے۔

(۲۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا بِالْمَدِيْنَةِ فَاِذَا اَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ لِصَلَاةِ الْمَغْرِبِ ابْتَدَرُوا السَّوَارِيَ فَرَكَعُوا رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى اِنَّ الرَّجُلَ الْغَرِيْبَ لَيَدْخُلُ الْمَسْجِدَ فَيَحْسَبُ اَنَّ الصَّلَاةَ قَدْ صُلِّيَتْ مِنْ كَثْرَةِ مَنْ يُّصَلِّيْهِمَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ میں تھے (اس وقت یہ حال تھا کہ) جب موذن مغرب کی اذان دیتا تو (بعض صحابہؓ یا تابعینؒ) مسجد کے ستونوں کی طرف دوڑتے اور دو رکعت نماز پڑھنے لگتے، یہاں تک کہ کوئی مسافر شخص اگر مسجد میں آتا تو اکثر لوگوں کو (تنہا تنہا) دو رکعت نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر یہ گمان کرتا کہ نماز ہو چکی ہے (اور اب لوگ سنتیں پڑھ رہے ہیں)۔" (مسلمؒ)

تشریح: علامہ طیبی شافعیؒ فرماتے ہیں کہ غروب آفتاب کے بعد اور مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت نماز کے اثبات کی یہ حدیث ظاہری دلیل ہے۔ اس سلسلہ میں ملا علی قاری حنفیؒ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ یہ حدیث اس وجہ سے ان دونوں رکعتوں کے اثبات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ اس طریقہ کے نادر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ عمومی طور پر مغرب کی نماز کی ادائیگی میں جلدی فرماتے تھے جب کہ ان دونوں رکعتوں کے پڑھنے سے نہ صرف یہ کہ مغرب کی ادائیگی میں تاخیر لازم آتی ہے بلکہ بعض علماء کے قول کے مطابق تو نماز کا اپنے وقت سے خروج ہی لازم آجاتا ہے۔

لہٰذا اس حدیث کی تاویل یا تو یہ کی جائے گی کہ حضرت انسؓ یہ ہمیشہ کا طریقہ نقل نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی ایک دن بعض لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہو کہ مغرب کی اذان سنتے ہی مسجد آگئے ہوں اور وہاں نماز مغرب سے پہلے دو رکعت نماز نفل پڑھ لی ہو یا پھر اس کی سب سے بہتر تاویل جیسا کہ بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ پہلے یہ نماز پڑھی جاتی تھی مگر پھر بعد میں اسے چھوڑ دیا گیا، لہٰذا اب اس نماز کا پڑھنا مکروہ ہے۔

(۲۳) وَعَنْ مَرْثَدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ اَتَيْتُ عُقْبَةَ الْجُهَنِيَّ فَقُلْتُ اَلَا اُعَجِّبُكَ مِنْ اَبِيْ تَمِيْمٍ يَرْكَعُ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ فَقَالَ عُقْبَةُ اِنَّا كُنَّا نَفْعَلُهُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْتُ فَمَا يَمْنَعُكَ الْاٰنَ قَالَ الشُّغْلُ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت مرثد ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عقبہ جہنیؓ (صحابی) کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ کیا میں آپ کو ابوتمیم (تابعی) کا ایک تعجب انگیز فعل نہ بتاؤں؟ (وہ یہ کہ) ابوتمیمؒ مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت نماز (نفل) پڑھتے ہیں؟ حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ یہ نماز تو ہم (میں سے بعض صحابہؓ کبھی کبھی) آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی پڑھا کرتے تھے، جب میں نے پوچھا کہ پھر یہ نماز

پڑھنے سے آپ کو کس چیز نے روک رکھا ہے؟ تو فرمایا کہ دنیاکی مشغولیت[1] نے۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث سے کم سے کم اتنی بات تو ثابت ہو ہی گئی کہ یہ نماز سُنّت نہیں ہے بلکہ مباح ہے کیونکہ اگر مسنون ہوتی تو حضرت عقبہؓ کو جو صحابیت جیسے عظیم مرتبہ پر فائز تھے دنیا کی مشغولیت سُنّت کی ادائیگی یعنی اس نماز کے پڑھنے سے نہ روکتی۔

نوافل گھروں میں ادا کئے جائیں

(۴۴) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتٰى مَسْجِدَ بَنِي عَبْدِ الْاَشْهَلِ فَصَلّٰى فِيْهِ الْمَغْرِبَ فَلَمَّا قَضَوْا صَلَاتَهُمْ رَاٰهُمْ يُسَبِّحُوْنَ بَعْدَهَا فَقَالَ هٰذِهٖ صَلَاةُ الْبُيُوْتِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَفِيْ رِوَايَةِ التِّرْمِذِيِّ وَالنَّسَائِيِّ قَامَ نَاسٌ يُصَلُّوْنَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِهٰذِهِ الصَّلَاةِ فِي الْبُيُوْتِ۔

"اور حضرت کعب ابن عجرہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) نبی کریم ﷺ (انصار کے ایک قبیلہ) بنی عبدالاشہل کی مسجد میں تشریف لائے اور وہاں مغرب کی (فرض اور سنت) نماز پڑھی، جب (بعض) لوگ (اپنی فرض) نماز پڑھ چکے تو آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ وہ فرض نماز ادا کرنے کے بعد نفل نماز (یعنی مغرب کی سنتیں بھی وہیں) پڑھ رہے ہیں آنحضرت ﷺ نے (دیکھ کر) فرمایا کہ یہ (یعنی مغرب کی سُنّت یا مطلقاً نفل نماز) گھر میں پڑھنے کی ہے۔" (ابوداؤد) ترمذیؒ و نسائیؒ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب لوگ (فرض نماز کے بعد) نفل پڑھنے کھڑے ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم پر لازم ہے کہ یہ نماز (اپنے اپنے) گھروں میں پڑھو۔

تشریح: حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ نفل نماز خواہ وہ سُنّت مؤکدہ ہو یا غیر مؤکدہ گھر میں پڑھنی افضل ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ گھر میں نوافل نماز پڑھنے والا ریاو نمائش سے دور اور اخلاص و صدق کے قریب تر ہوتا ہے بلکہ اس سے گھروں میں رحمت خداوندی اور برکت کا نزول ہوتا ہے۔

ویسے جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو تمام علماء کے نزدیک متفقہ طور پر مسجد میں نفل نماز پڑھنی مکروہ نہیں ہے مسجد اور گھر کے پڑھنے میں صرف افضلیت اور غیر افضلیت کا فرق ہے۔

لیکن اتنی بات بھی سمجھ لیجئے کہ گھروں میں نفل نماز پڑھنے کا یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جو فرض نماز کی ادائیگی کے بعد گھروں کو واپس ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں جو لوگ فرض کی ادائیگی کے بعد گھر نہیں جاتے جیسے مسجد کے اندر اعتکاف میں بیٹھنے والے تو وہ مسجد ہی میں نوافل پڑھ لیں۔

بہر حال فرض نماز کے علاوہ نفل نمازیں گھر جا کر پڑھنی افضل ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا کہ آپ فرض مسجد میں پڑھ کر حجرۂ مبارک میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں نوافل پڑھتے تھے۔ ہاں کسی خاص عذر اور سبب کی بات تو الگ ہے کہ ایسے موقع پر مسجد ہی میں نوافل بھی پڑھ لیتے تھے۔ پھر بھی مغرب کی سنتیں گھر میں پڑھنے کا اہتمام تو آپ ﷺ بطور خاص فرماتے تھے اور اکثر گھر ہی میں پڑھتے تھے یہی وجہ ہے کہ مغرب کی سنتوں کے بارہ میں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مغرب کی نماز سُنّت مسجد میں پڑھے تو وہ مسنون ادا نہیں ہوتی بلکہ بعض علماء تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مغرب کی سنتیں مسجد میں پڑھنے والا گنہ گار ہوتا ہے۔ مگر جمہور علماء کی رائے ہے کہ گنہگار نہیں ہوتا کیونکہ انہیں گھر میں ادا کرنے کا حکم امر وجوبی نہیں ہے بلکہ امر استحبابی ہے۔

ہدایہ کے حاشیہ میں جامع صغیر سے منقول ہے کہ کوئی شخص مغرب کی نماز مسجد میں پڑھے اور اس کو یہ خوف ہو کہ اگر گھر میں گیا تو کسی مشغولیت کی بناء پر سُنّت وہاں نہیں پڑھ سکوں گا تو اسے چاہیے کہ وہ مغرب کی سُنّت بھی مسجد کے صحن میں پڑھ لے اور اگر گھر پہنچ کر کسی

---

[1] مشغولیت زیادہ ہو تو نوافل کو دوسرے وقت پر چھوڑا جا سکتا ہے۔

کام میں مشغول ہو جانے کا خوف نہ ہو تو افضل یہی ہے کہ وہ گھر جا کر نماز سُنت پڑھے۔

مغرب کی سنتوں میں طویل قرأت

(۲۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُطِيْلُ الْقِرَاءَةَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ حَتّٰى يَتَفَرَّقَ اَهْلُ الْمَسْجِدِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مغرب (کی فرض نماز) کے بعد دو رکعت (سُنّت میں کبھی اتنی) طویل قرأت فرماتے تھے کہ مسجد کے لوگ (اپنی اپنی نمازوں سے فارغ ہو کر) چلے جاتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ مغرب کی سنتیں مسجد میں پڑھتے تھے لہٰذا اس سلسلہ میں کئی احتمال ہیں اوّل تو یہ کہ آنحضرت ﷺ کو کوئی ایسا عذر پیش آگیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ حجرۂ مبارک میں تشریف نہیں لے جا سکے ہوں گے اس لئے سنتیں مسجد ہی میں پڑھ لیں۔

دوم یہ کہ آنحضرت ﷺ اس وقت اعتکاف میں ہوں گے اس لئے سنتیں پڑھنے کے لئے حجرۂ مبارک میں نہیں گئے۔

چہارم احتمال یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سنتیں مسجد میں پڑھی ہی نہ ہوں بلکہ اپنے حجرۂ مبارک میں پڑھی ہوں جو مسجد سے بالکل ملا ہوا تھا اور اس کا دروازہ بھی مسجد ہی کی طرف تھا۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے سامنے سے آپ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہو اور اسی کو یہاں بیان کیا ہو۔

جہاں تک حدیث کے اس جزء کا تعلق ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے مغرب کی سنتوں میں طویل قرأت کی تو اس کے بارہ میں بھی ظاہری احتمال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کسی دن اتنی طویل قرأت کی ہوگی ورنہ تو مغرب کی سنتوں میں آپ ﷺ اکثر چھوٹی سورتیں پڑھا کرتے تھے چنانچہ یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ مغرب کی سُنت میں قل یاایھا الکافرون اور قل ھو اللّٰہ کی قرأت کیا کرتے تھے۔

مغرب کے بعد نفل پڑھنے کی فضیلت

(۲۶) وَعَنْ مَكْحُوْلٍ يَبْلُغُ بِهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَلّٰى بَعْدَ الْمَغْرِبِ قَبْلَ اَنْ يَّتَكَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ رُفِعَتْ صَلَاتُهٗ فِيْ عِلِّيِّيْنَ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت مکحولؒ (تابعی) اس روایت کو آنحضرت ﷺ تک پہنچاتے ہیں (یعنی آنحضرت سے بطریق ارسال روایت کرتے ہیں) کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص مغرب (کی فرض یا سُنت مؤکدہ) نماز پڑھ کر (دنیاوی) گفتگو کرنے سے پہلے دو رکعت اور ایک روایت میں ہے کہ چار رکعت نماز پڑھے تو اس کی یہ نماز علیین میں پہنچائی جاتی ہے۔"

تشریح: "دو رکعت" سے سُنت بھی مراد ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ بھی اسی طرح چار رکعت میں دو رکعت سُنت اور دو رکعت اس کے علاوہ یا چاروں کی چاروں ہی سُنت کے علاوہ مراد لی جا سکتی ہیں۔

بہر حال یہ دو رکعت یا چار رکعت جو سُنت کے علاوہ ہوں صلوۃ الاوابین کہی جاتی ہیں اس نماز کی فضیلت اس سے پہلے بھی نقل کی جا چکی ہے یہاں بھی اس کی فضیلت و عظمت بیان کی جا رہی ہے کہ اس نفل نماز کے پڑھنے والے شخص کی یہ نماز یا اس نماز کے ساتھ اس کی فرض نماز بھی مقام علیین میں پہنچائی جاتی ہے یعنی اس کی نمازیں قبولیت کے انتہائی مرتبہ پر پہنچتی ہیں اور اس شخص کو بے پناہ اجر و ثواب سے نوازا جاتا ہے۔

علّیین کیا ہے؟

ساتویں آسمان پر ایک مقام کا نام علیین ہے جہاں مؤمنین کی روحیں پہنچائی جاتی ہیں اور وہاں ان کے عمل لکھے جاتے ہیں۔

(۲۷) وَعَنْ حُذَيْفَةَ نَحْوَهُ وَزَادَ فَكَانَ يَقُوْلُ عَجِّلُوا الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فَإِنَّهُمَا تُرْفَعَانِ مَعَ الْمَكْتُوْبَةِ رَوَاهُمَا رَزِيْنٌ وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ الزِّيَادَةَ عَنْهُ نَحْوَهَا فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ۔

"اور حضرت حذیفہؓ سے (بھی) اسی طرح (یعنی اوپر والی حدیث) مروی ہے لیکن ان کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ تم لوگ مغرب کے بعد دو رکعت (سنتیں) جلدی پڑھ لیا کرو کیونکہ وہ (دونوں رکعتیں) فرضوں کے ساتھ اوپر (علیین میں) پہنچائی جاتی ہیں، یہ دونوں روایتیں رزینؒ نے نقل کی ہیں اور بیہقیؒ نے حذیفہؓ کے زائد الفاظ کو اسی طرح شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں رکعتیں چونکہ فرض نماز کے ساتھ مقام علیین میں پہنچائی جاتی ہیں اس لئے ان کو فرض نماز کے بعد زیادہ تاخیر کر کے نہ پڑھو تاکہ وہ فرشتے جو اعمال کو علیین تک پہنچاتے ہیں منتظر نہ رہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ ان اوراد واذکار کو جنہیں فرض کے بعد جلدی پڑھنا ثابت ہو چکا ہے ان دونوں رکعتوں کے بعد پڑھنا اس تعجیل (جو احادیث میں فرض کے فوراً بعد اوراد و اذکار کے پڑھنے کے سلسلہ میں ثابت ہے) کے منافی نہیں ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ ان اوراد و اذکار کو ان دونوں کے رکعتوں کے بعد پڑھنا بعدیت (یعنی حدیث کے اس حکم کہ فرض نماز کے بعد اوراد و اذکار پڑھے جائیں) کا منافی نہیں ہے اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ پیچھے باب الذکر بعد الصلوۃ میں وہ احادیث گزر چکی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرض نماز کے فوراً بعد اوراد و اذکار (جن کی تفصیل ان احادیث میں مذکور ہے) پڑھے جائیں۔

تو اب اگر ان اوراد و اذکار کو فرض نماز کے بعد پڑھنے کے بجائے اس حدیث کی فضیلت کے پیش نظر دو رکعت سنتوں کے بعد پڑھے جائیں تو ان احادیث سے ثابت شدہ تعجیل و بعدیت (یعنی اوراد و اذکار کو فرض نماز کے فوراً بعد پڑھنے کے حکم) کے خلاف نہیں ہوگا۔

لیکن اس بات کے علاوہ یہاں ایک اور اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ ان دونوں رکعتوں کو گھر میں پڑھنے کی فضیلت بھی احادیث ہی سے ثابت ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ان دونوں رکعتوں کو گھر میں پڑھے اور اس کا گھر بھی مسجد سے دور ہو تو ظاہر ہے کہ اس حدیث کے پیش نظر ان دونوں رکعتوں کے پڑھنے میں جلدی نہیں ہو سکتی۔ تو اس صورت میں کیا کیا جائے۔ آیا ان احادیث کے پیش نظر ان دونوں رکعتوں کو گھر ہی جا کر پڑھا جائے تاکہ گھر میں پڑھنے کی فضیلت حاصل ہو۔ یا اس حدیث کے پیش نظر مسجد ہی میں پڑھا جائے تاکہ ان کو جلدی پڑھ لینے کی فضیلت حاصل ہو جائے؟۔

اس سلسلہ میں علماء لکھتے ہیں کہ نوافل نماز گھر میں پڑھنے کی فضیلت چونکہ بہت زیادہ ہے اور پھر یہ کہ اس کی تاکید بھی بہت زیادہ کی گئی ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ سنتوں کو گھر ہی میں پڑھا جائے۔ واللہ اعلم۔

فرض و نوافل کے درمیان فرق کرنا چاہیے

(۲۸) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَطَاءٍ قَالَ اِنَّ نَافِعَ بْنَ جُبَيْرٍ اَرْسَلَهُ اِلَى السَّائِبِ يَسْئَلُهُ عَنْ شَيْءٍ رَاٰهُ مِنْهُ مُعَاوِيَةُ فِي الصَّلَاةِ فَقَالَ نَعَمْ صَلَّيْتُ مَعَهُ الْجُمُعَةَ فِي الْمَقْصُوْرَةِ فَلَمَّا سَلَّمَ الْإِمَامُ قُمْتُ فِيْ مَقَامِيْ فَصَلَّيْتُ فَلَمَّا دَخَلَ اَرْسَلَ اِلَيَّ فَقَالَ لَا تَعُدْ لِمَا فَعَلْتَ اِذَا صَلَّيْتَ الْجُمُعَةَ فَلَا تَصِلْهَا بِصَلَاةٍ حَتّٰى تَتَكَلَّمَ اَوْ تَخْرُجَ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَنَا بِذٰلِكَ اَنْ لَا نُوْصِلَ بِصَلَاةٍ حَتّٰى نَتَكَلَّمَ اَوْ نَخْرُجَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو ابن عطاؒ (تابعی) کے بارے میں منقول ہے کہ انہیں (یعنی عمرو) کو حضرت نافع ابن جبیرؒ (تابعی) نے حضرت سائب

(صحابی) کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان سے وہ چیزیں پوچھیں جو حضرت امیر معاویہؓ نے انہیں نماز میں کرتے ہوئے دیکھا تھا (اور اس سے انہیں منع کیا تھا چنانچہ حضرت عمرو حضرت سائب کے پاس گئے اور ان سے اس چیز کی تفصیل معلوم کی تو) انہوں نے فرمایا کہ ہاں (ایک مرتبہ) میں نے حضرت امیر معاویہؓ کے ہمراہ مقصورہ میں جمعہ کی نماز پڑھی جب امام نے سلام پھیرا تو میں اسی جگہ (جہاں جمعہ کی نماز پڑھی تھی) کھڑا ہو گیا اور (فرض و سُنّت میں کوئی امتیاز کئے بغیر جمعہ کی سنت) نماز پڑھنے لگا، جب حضرت امیر معاویہؓ (نماز سے فراغت کے بعد) اپنے مکان پر چلے گئے تو میرے پاس ایک شخص کو یہ کہلا بھیجا کہ اس وقت تم نے جو کچھ کیا ہے آئندہ ایسا نہ کرنا، (یعنی جس جگہ نماز پڑھو اسی جگہ امتیاز پیدا کئے بغیر نفل نماز نہ پڑھنا چنانچہ) جب تم جمعہ کی نماز پڑھو تو اس (جمعہ کی فرض نماز) کو کسی (دوسری یعنی نفل یا قضا) نماز سے نہ ملاؤ تاوقتیکہ تم کوئی گفتگو نہ کر لو یا (مسجد سے) باہر نہ نکل جاؤ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہم ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ نہ ملائیں تاوقتیکہ (درمیان میں) بات چیت نہ کر لیں یا (مسجد سے) باہر نہ چلے جائیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: پچھلے زمانہ میں جب کہ سلاطین و امراء نمازیں پڑھنے کے لئے مسجد میں آتے تھے تو ان کی امتیازی حیثیت و شان کے پیش نظر ان کے لئے مسجد کے اندر ایک مخصوص جگہ بنا دی جاتی تھی جسے مقصورہ کہا جاتا تھا، بادشاہ یا خلیفہ مسجد میں آکر اسی جگہ نماز پڑھتا تھا۔

حدیث کے الفاظ اذا صلیت الجمعة میں جمعہ کی قید اتفاقی اور مثال کے طور پر ہے کیونکہ جمعہ کے علاوہ بھی تمام نمازوں کا یہی حکم ہے کہ فرض کے ساتھ نوافل نماز ملا کر نہ پڑھی جائیں چنانچہ اس کی تائید حضرت امیر معاویہؓ کی روایت کردہ حدیث کر رہی ہے جس میں کسی خاص نماز کے بارہ میں نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ ہر نماز کے متعلق یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب فرض نماز پڑھ لی جائے تو نوافل پڑھنے کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے فرض اور نوافل میں فرق و امتیاز پیدا ہو جائے مثلاً جس جگہ فرض نماز پڑھی گئی ہے اسی جگہ (خواہ سُنّت مؤکدہ ہو یا غیر مؤکدہ) نہ پڑھی جائے بلکہ اس جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ کھڑے ہو کر پڑھی جائے تاکہ دونوں نمازوں کے درمیان امتیاز پیدا ہو سکے اور اس سے فرض و نفل کے درمیان التباس پیدا نہ ہو۔

چنانچہ حدیث کے الفاظ او نخرج سے اسی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اب او نخرج سے مسجد سے حقیقۃً نکلنا بھی مراد ہو سکتا ہے یعنی فرض پڑھ کر مسجد سے نکل کر گھر وغیرہ آجائے اور وہاں نوافل پڑھے جائیں اور حکماً نکلنا بھی مراد ہو سکتا ہے یعنی جس جگہ فرض نماز پڑھی ہے اس جگہ سے ہٹ کر نوافل دوسری جگہ پڑھے جائیں۔

فرض و نوافل کے درمیان نمازوں کے درمیان فرق و امتیاز پیدا کرنے کی ایک اور صورت ہے اور وہ یہ کہ جب فرض نماز پڑھ لی جائے تو اس کے بعد کسی دوسرے شخص سے کوئی گفتگو کر لی جائے تاکہ اس سے ان دونوں نمازوں کے درمیان فرق و امتیاز پیدا ہو جائے چنانچہ حتی نتکلم سے یہی بتایا جا رہا ہے۔

اتنی بات ملحوظ رہے کہ فرض و نوافل کے درمیان جس فرق و امتیاز کے لئے کہا جا رہا ہے وہ دنیاوی بات چیت اور گفتگو ہی سے حاصل ہوتا ہے ذکر اللہ وغیرہ سے وہ فرق حاصل نہیں ہوتا۔

(۲۹) وَعَنْ عَطَاءٍ قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا صَلَّى الْجُمُعَةَ بِمَكَّةَ تَقَدَّمَ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ يَتَقَدَّمُ فَيُصَلِّي أَرْبَعًا وَإِذَا كَانَ بِالْمَدِينَةِ صَلَّى الْجُمُعَةَ ثُمَّ رَجَعَ إِلَى بَيْتِهِ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ وَلَمْ يُصَلِّ فِي الْمَسْجِدِ فَقِيلَ لَهُ فَقَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهُ رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَفِي رِوَايَةِ التِّرْمِذِيِّ قَالَ رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ صَلَّى بَعْدَ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ صَلَّى بَعْدَ ذٰلِكَ أَرْبَعًا۔

"اور حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ جب مکہ میں جمعہ کی نماز پڑھ چکتے تو (جس جگہ فرض نماز پڑھتے اس سے) آگے بڑھ جاتے اور دو رکعت پڑھتے اس کے بعد پھر آگے بڑھتے اور چار رکعت نماز پڑھتے اور جب آپ مدینہ میں ہوا کرتے تو (یہ معمول تھا کہ) جمعہ کی (فرض) نماز پڑھ کر اپنے مکان تشریف لاتے اور گھر میں دو رکعت نماز پڑھتے مسجد میں (فرض کے علاوہ کوئی نماز) نہیں پڑھتے تھے، جب ان سے

اس (گھر میں پڑھنے اور مسجد میں نہ پڑھنے) کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ (اس لئے کہ) نبی کریم ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔" (ابوداؤد) اور ترمذیؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عطاء نے کہا کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کو دیکھا ہے کہ وہ جمعہ کے بعد دو رکعت پڑھ کر پھر چار رکعت پڑھتے تھے۔"

تشریح: حضرت ابن عمرؓ کا فرض پڑھ کر سنّت پڑھنے کے لئے آگے بڑھ جانا بمنزلہ مسجد سے نکلنے کے تھا جیسا کہ حضرت امیر معاویہؓ کے ارشاد میں مذکور ہوا۔

علماء نے لکھا ہے کہ مکہ اور مدینہ کے معمول کے درمیان فرق غالباً اس لئے تھا کہ مدینہ میں حضرت ابن عمرؓ کا مکان مسجد کے قریب تھا اور مکہ میں چونکہ مسافر ہوتے تھے اور قیام گاہ حرم سے فاصلہ پر ہوتی تھی اس لئے مدینہ میں تو آپ کا معمول یہ ہوتا تھا کہ فرض پڑھ کر مکان پر تشریف لے جاتے تھے اور وہاں سنتیں پڑھتے تھے مگر مکہ میں مکان کے دور ہونے کی وجہ سے سنتیں بھی مسجد ہی میں پڑھ لیتے تھے مگر جگہ بدل کر دونوں نمازوں کے درمیان فرق کرتے رہتے تھے۔ اور اس طرح آگے بڑھنے کو گھر کے قائم مقام کر لیتے تھے۔

مکہ اور مدینہ کے معمول کے درمیان دوسرا فرق یہ تھا کہ مکہ میں تو آپ جمعہ کے بعد چھ رکعت پڑھا کرتے تھے اور مدینہ میں دو ہی رکعت پڑھتے تھے چنانچہ مکہ میں اس زیادتی کی وجہ یہ تھی کہ حرم میں چونکہ نماز پڑھنے کا ثواب بہت زیادہ ہوتا ہے اس لئے وہاں زیادہ نماز پڑھتے تھے۔

چونکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ کے بعد سنتیں چار رکعت ہیں اس لئے ملا علی قاریؒ نے حدیث کے الفاظ کہ حضرت ابن عمرؓ جمعہ کے بعد دو رکعت پڑھتے پھر اس کے بعد (آگے بڑھ کر) چار رکعت پڑھتے تھے کا مطلب یہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ پہلے جمعہ کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اس کے بعد انہوں نے چار رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں یعنی ان دو رکعتوں میں جو ان کے نزدیک احادیث سے ثابت تھیں اور جنہیں آپ پہلے پڑھا کرتے تھے دو رکعتوں کا اور اضافہ کر دیا اس طرح بعد میں چار رکعت پڑھنے لگے۔

صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک جمعہ کے بعد سنتیں چھ رکعتیں ہی ہیں یعنی وہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی فرض نماز پڑھ کر پہلے چار رکعت سنّت پڑھی جائے پھر اس کے بعد دو رکعت سنّت اور پڑھی جائے۔

فقہ حنفیہ میں سنتوں کی تفصیلی تعداد

چونکہ یہ بات ختم ہو رہی ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس موقع پر تمام نمازوں کی سنتوں کی تفصیلی تعداد ذکر کر دی جائے تاکہ وہ ذہن میں محفوظ رہیں۔ فجر کے وقت فرض سے پہلے دو رکعت سنّت مؤکدہ ہیں ان کی تاکید تمام مؤکدہ سنتوں سے زیادہ ہے یہاں تک کہ بعض روایات میں امام ابوحنیفہؒ سے ان کا وجوب منقول ہے اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ ان کے انکار سے کفر کا خوف رہتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ فجر کی سنتیں نہ چھوڑو چاہے تمہیں گھوڑے کچل ڈالیں یعنی جان جانے کا خوف ہو تب بھی نہ چھوڑو، اس سے مقصود صرف تاکید اور ترغیب ہے ورنہ جان کے خوف سے تو فرائض کا چھوڑنا بھی جائز ہے۔

ظہر کے وقت فرض سے پہلے چار رکعت ایک سلام سے اور فرض کے بعد دو رکعت سنّت مؤکدہ ہیں۔

جمعہ کے وقت فرض سے پہلے چار رکعتیں ایک سلام سے سنّت مؤکدہ ہیں اور فرض کے بعد بھی ایک ہی سلام سے چار رکعتیں سنّت ہیں۔

عصر کے وقت کوئی سنّت مؤکدہ نہیں، ہاں فرض سے پہلے چار رکعتیں ایک سلام سے مستحب ہیں۔

مغرب کے وقت فرض کے بعد دو رکعت سنّت مؤکدہ ہیں۔

عشاء کے وقت فرض کے بعد دو رکعت سنّت مؤکدہ ہیں اور فرض سے پہلے چار رکعتیں ایک سلام سے مستحب ہیں۔

وتر کے بعد بھی دو رکعتیں نبی کریم ﷺ سے منقول ہیں لہٰذا وتر کے بعد دو رکعت مستحب ہیں۔

بَابُ صَلٰوةِ اللَّيْلِ
رات کی نماز کا بیان

"رات کی نماز" یعنی تہجد وغیرہ کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ سے جو روایات ان کے پڑھنے کے طریقے وغیرہ کے بارے میں منقول ہیں وہ اس باب کے تحت نقل کی جائیں گی۔

رات میں نماز پڑھنے کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ سے مختلف روایتیں منقول ہیں ان میں سے جس روایت کے مطابق بھی نماز پڑھی جائے گی اتباع نبوی کی فضیلت اور سُنّت کی ادائیگی کی سعادت حاصل ہوگی ہاں اگر تمام روایات کی اتباع کے پیش نظر یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ کبھی تو کسی روایت کے مطابق پڑھی جائے اور کبھی کسی روایت کے مطابق، تو یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ انتہائی مناسب اور بہتر بلکہ سُنّت کے عین مطابق ہوگا۔

رات میں آنحضرت ﷺ کی نماز کی رکعتوں کی تعداد کے بارہ میں مختلف روایتیں منقول ہیں، چنانچہ تیرہ، گیارہ، نو، اور سات رکعتیں منقول ہیں، بعض علماء نے پانچ رکعتیں بھی روایت کی ہیں، تاہم تیرہ سے زیادہ ثابت نہیں ہے، پھر یہ کہ بعض علماء نے یہ تعداد فجر کی سُنّت کے ساتھ ذکر کی ہے اور بعض نے فجر کی سُنّت کے علاوہ اور صحیح قول یہی ہے، اسی طرح وتر کی تعداد کے بارہ میں بھی مختلف روایتیں ہیں، بعض روایتوں میں تو وتر ایک رکعت کے ساتھ منقول ہے اور بعض میں تین رکعتوں کے ساتھ، نیز بعض روایات میں وتر کی رکعت کو بھی نماز تہجد کی رکعتوں میں شامل کر کے انہیں شمار کیا گیا ہے اور بعض روایات میں وتر کی رکعتوں کو ان سے الگ شمار کیا گیا ہے اسی طرح بعض روایات میں وتر کا اطلاق ایک رکعت پر کیا گیا ہے اور بعض میں تین، پانچ اور سات تک پر کیا گیا ہے بلکہ بعض روایات میں تو رات کی تمام نماز کو وتر کہا گیا ہے، انہیں تمام روایات کو آپ تفصیل کے ساتھ اس باب میں پڑھیں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عشاء و فجر کے درمیان گیارہ رکعت

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِيمَا بَيْنَ اَنْ يَّفْرُغَ مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ اِلَى الْفَجْرِ اِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً يُسَلِّمُ مِنْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ فَيَسْجُدُ السَّجْدَةَ مِنْ ذٰلِكَ قَدْرَ مَا يَقْرَأُ اَحَدُكُمْ خَمْسِيْنَ اٰيَةً قَبْلَ اَنْ يَّرْفَعَ رَاْسَهٗ فَاِذَا سَكَتَ الْمُؤَذِّنُ مِنْ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَتَبَيَّنَ لَهُ الْفَجْرُ قَامَ فَرَكَعَ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ ثُمَّ اضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْمَنِ حَتّٰى يَاْتِيَهُ الْمُؤَذِّنُ لِلْاِقَامَةِ فَيَخْرُجُ۔ (متفق علیہ)

"ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نماز عشاء سے فارغ ہو کر نماز فجر تک (اکثر) گیارہ رکعت نماز پڑھا کرتے تھے اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے اور (پھر آخر میں) ایک رکعت کے ساتھ وتر کر لیا کرتے تھے اور اس رکعت میں اتنا طویل سجدہ کرتے جتنی دیر میں کوئی شخص اپنا سر اٹھانے سے پہلے پچاس آیتیں پڑھ لے پھر جب مؤذن فجر کی اذان دے کر خاموش ہو جاتا اور فجر طلوع ہو جاتی یعنی صبح کی روشنی پھیلنے لگتی تو آپ ﷺ کھڑے ہوتے اور دو رکعتیں ہلکی (یعنی فجر کی سنتیں) پڑھتے اور (اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے) اپنی داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے تھے یہاں تک کہ مؤذن تکبیر کے لئے (یعنی تکبیر کہنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے) آپ ﷺ کے پاس آتا تو آپ ﷺ نماز کے لئے (مسجد) تشریف لے جاتے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حدیث کے الفاظ ویوتر بواحدۃ کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ﷺ وتر کے لئے ایک رکعت علیحدہ پڑھتے تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے

کہ آپ ﷺ گیارہ رکعتیں اس طرح پڑھا کرتے تھے کہ آخری دونوں رکعتوں یعنی نویں اور دسویں کے ساتھ ایک رکعت بڑھا کر تینوں کو وتر بنادیا کرتے تھے۔

ابن حجر شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، اول یہ کہ وتر کی کم سے کم ایک رکعت ہے یعنی وتر کی ایک رکعت علیحدہ سے پڑھی جاسکتی ہے، دوم یہ کہ تہجد کی نماز میں ہر دو رکعت پر سلام پھیر دینا چاہیے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے۔

فیسجد السجدۃ الخ سے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر رکعت کا سجدہ بقدر مذکورہ طویل کرتے تھے لیکن اس کا مفہوم یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ صرف وتر کے سجدوں میں سے ایک سجدہ یا وتر کے سب سجدے بقدر مذکور طویل کرتے تھے۔

بعض مقامات پر کچھ لوگ وتر کے بعد کیفیت معروفہ کے ساتھ دو سجدے کرتے ہیں اور بعض ضعیف فقہی روایات میں ان کی فضیلت بھی مذکور ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ احادیث سے ان دونوں سجدوں کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ فقہ کی وہ روایت جو معتمد و مختار ہیں ان میں ان کا کوئی ذکر ہے۔ نیز حرمین شریفین بلکہ پورے عرب میں کہیں بھی یہ سجدے نہیں کئے جاتے۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی منقول ہے جس میں ان سجدوں کو "اختراع محض" کا درجہ دیا گیا ہے پھر یہ کہ چاروں ائمہ میں سے کوئی بھی امام اس کے نہ مسنون ہونے کا قائل ہے اور نہ ہی مستحب ہونے کا بلکہ بلاد عرب کے اکثر حنفیہ تو اسے جانتے بھی نہیں اور بعض علماء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، بہرحال اگر کسی جگہ یہ طریقہ رائج ہے تو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

رکعتین خفیفتین یعنی فجر کی سنتیں ہلکی پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ سُنّت کی دونوں رکعتوں میں قل یاایھا الکافرون اور قل ھواللہ پڑھا کرتے تھے اور یہی مستحب ہے مگر لازم نہیں ہے۔

فجر کی سنتیں پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے آپ ﷺ اس لئے لیٹ جاتے تھے تاکہ تمام رات عبادت خداوندی اور نماز میں مشغول رہنے کی وجہ سے جو تکان وغیرہ پیدا ہو جاتا تھا وہ تھوڑی دیر آرام کر لینے سے ختم ہو جائے اور فرض پوری چستی اور بشاشت کے ساتھ ادا ہوں، لہٰذا مختار یہ ہے کہ جو شخص رات میں عبادت الٰہی اور ذکر اللہ وغیرہ میں مشغول رہے اس کے لئے فجر کی سنتیں پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے بغرض استراحت لیٹ جانا مستحب ہے۔

فجر کی فرض نماز اور سنتوں کے درمیان بات چیت کرنا

(۲) وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَإِنْ كُنْتُ مُسْتَيْقِظَةً حَدَّثَنِي وَإِلَّا اضْطَجَعَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب فجر کی سنتیں پڑھ لیتے تو اگر میں جاگتی ہوتی تو مجھ سے بات چیت میں مشغول ہو جاتے اور اگر میں سوتی ہوئی ہوتی تو (آپ ﷺ بھی) لیٹ جاتے۔" (مسلم)

تشریح: حضرت ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ فجر کی فرض نماز اور سنتوں کے درمیان فرق کرنا جائز ہے نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس وقت (یعنی فجر کی فرض نماز اور سنتوں کے درمیان) اپنے اہل خانہ سے بات چیت میں مشغول ہونا مستحب ہے، گویا حضرت ابن مالکؒ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "فرض اور سُنّت نمازوں کے درمیان گفتگو کرنا نماز کو یا اس کے ثواب کو ختم کر دیتا ہے" یہ قول غلط ہے لیکن پھر بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا محور دنیا نہیں ہوتی تھی بلکہ آپ ﷺ کی گفتگو دینی اور اخروی موضوع سے متعلق ہوتی تھی، اس لئے اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ فرض و سُنّت نمازوں کے درمیان دنیاوی گفتگو میں مشغول ہونا خلاف اولیٰ ہے۔ کیونکہ سُنّت نمازوں کی مشروعیت کی حکمت ہی یہ ہے کہ فرض نماز پڑھنے والا شخص

پہلے سے کچھ نمازیں پڑھ کر "حالت کمال" کے لئے تیار ہو اور اس سے غفلت و سستی دور ہو جائے تاکہ فرض نماز میں پورے خشوع و خضوع کمال حضور اور عبادت خداوندی کے حقیقی و پر لطف جذبہ کے ساتھ شامل ہو سکے اور اس کا دل و دماغ دنیا سے پوری طرح یکسو ہو کر توجہ الی اللہ میں پوری طرح مستغرق ہو جائے، بر خلاف اس کے سُنّت نماز پڑھ کر فرض شروع کرنے سے پہلے دنیاوی گفتگو میں مشغول ہونا اس حکمت کے خلاف ہے کیونکہ اس طرح دل و دماغ شوق و حضوری سے الگ ہو کر دنیا کی باتوں کے چکر میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ صحابہ وغیرہ میں سے بعض علماء نے طلوع فجر کے بعد نماز فجر ادا کرنے سے پہلے کسی دنیاوی گفتگو میں مشغول ہونے کو مکروہ کہا ہے ہاں ذکر اللہ یا ایسا دنیاوی کلام جس کی حقیقت میں اس وقت ضرورت ہو اس سے مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ احمدؒ، اسحاقؒ کا یہی قول ہے۔

لہٰذا اس حدیث کے بارہ میں کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ فجر کی سُنّت پڑھ کر حضرت عائشہؓ سے جو کلام کرتے تھے یا تو وہ دینی اور اخروی ہوتا تھا یا پھر کسی حاجت اور ضرورت کی بنا پر آپ ﷺ ان سے گفتگو میں مشغول ہوتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کی ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ اِنْ کَانَتْ لَهُ اِلَیَّ حَاجَةٌ کَلَّمَنِیْ (اگر آپ ﷺ کو کوئی ضرورت مجھ سے متعلق ہوتی تو آپ ﷺ مجھ سے گفتگو کرتے) بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

فجر کی سنتوں کے بعد استراحت!

③ وَعَنْهَا قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰی رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ اضْطَجَعَ عَلٰی شِقِّهِ الْاَیْمَنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ فجر کی دو رکعت سنتیں پڑھ کر اپنی داہنی کروٹ پر (یعنی رو بقبلہ) لیٹ جاتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

④ وَعَنْهَا قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ مِنَ اللَّیْلِ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَکْعَةً مِّنْهَا الْوِتْرُ وَرَکْعَتَا الْفَجْرِ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ رات میں تیرہ رکعتیں نماز پڑھتے تھے ان میں وتر (کی تین رکعتیں) اور فجر کی سُنّت کی دو رکعتیں بھی شامل ہوتیں۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ رات میں جو تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے ان میں وتر کی تین رکعتیں اور فجر کی سُنّت کی دو رکعتیں بھی شامل ہوتی تھیں، گو حدیث کے الفاظ میں وتر کے ساتھ "تین رکعت" کا ذکر نہیں ہے لیکن تمام علماء کے نزدیک چونکہ وتر کی تین رکعتیں ہی پڑھنا افضل ہے اس لئے "تین رکعت" کی قید لگانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ پھر یہ کہ دوسری روایات میں تین رکعت کی صراحت بھی ہے۔ چنانچہ ترمذیؒ نے شمائل میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ثم یصلی ثلثا (پھر آپ ﷺ تین رکعتیں پڑھتے تھے) اسی طرح مسلمؒ کی روایت ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ (یعنی پھر آپ ﷺ تین رکعت وتر پڑھتے تھے) کے الفاظ منقول ہیں۔

اس حدیث میں "رکعتوں کی تعداد" تیرہ اس طرح نقل کی گئی ہے کہ فجر کی سُنّت کی دو رکعتوں کو بھی ان میں شمار کیا گیا ہے ورنہ تو آنحضرت ﷺ رات میں مع وتر کے کل گیارہ رکعتیں نماز پڑھا کرتے تھے جیسا کہ دوسری روایتوں میں مذکور ہے چونکہ تہجد کی نماز پڑھنے اور فجر کی سنتیں پڑھنے کا درمیانی وقفہ زیادہ نہیں ہوتا تھا بلکہ تقریباً دونوں نمازیں ساتھ ہی پڑھتے تھے اس لئے ان دونوں رکعتوں کو بھی ان میں شمار کر لیا گیا ہے۔

⑤ وَعَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَةَ عَنْ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّیْلِ فَقَالَتْ سَبْعٌ وَّتِسْعٌ وَاِحْدٰی عَشْرَةَ رَکْعَةً سِوٰی رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سرور کائنات کی رات کی نماز کے بارہ میں دریافت کیا (کہ کتنی رکعتیں پڑھتے تھے؟) تو انہوں نے فرمایا کہ کبھی تو آپ ﷺ سات رکعتیں پڑھتے تھے کبھی نو رکعتیں اور کبھی گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے علاوہ فجر کی سنتوں کے۔" (بخاری)

تشریح: ظاہر یہ ہے کہ "علاوہ فجر کی سنتوں کے" کا تعلق احدی عشرۃ رکعۃ (گیارہ رکعتوں سے) ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جن روایات میں تیرہ رکعتیں منقول ہیں ان میں دو رکعت فجر کی سُنّت کی بھی شامل ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں جو یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ نے رات میں پندرہ رکعتیں بھی پڑھی ہیں تو اس کا محمول یہ ہے کہ پندرہ میں فجر کی سُنّت کی دو رکعتیں بھی شمار کی گئی ہیں، یعنی تیرہ رکعت تہجد کی اور دو رکعت فجر کی سُنّت کی لیکن اس احتمال سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ بارہ رکعتیں تو آپ ﷺ نے تہجد کی پڑھی ہوں اور تین رکعتیں وتر کی۔ چنانچہ اس کی دلیل ایک روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ جس روز آنحضرت ﷺ پر نیند کا غلبہ ہوجاتا تھا اور آپ ﷺ تہجد پڑھے بغیر سو جاتے تھے تو دن میں بارہ رکعتیں پڑھ لیا کرتے تھے۔

تہجد کی ابتدائی دو رکعتوں کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟

(۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ لِيُصَلِّيَ افْتَتَحَ صَلَاتَهُ بِرَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب رات میں (تہجد کی) نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو اپنی نماز کی ابتداء دو ہلکی رکعتوں سے فرماتے تھے۔"

تشریح: "کتاب ازہار" میں لکھا ہے کہ "دو ہلکی رکعتیں" وضو کی دو رکعتیں ہیں کہ ان میں تخفیف یعنی ان کو مختصر پڑھنا ہی مستحب ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں رکعتیں تہجد کی ہوتی تھیں جو تحیۃ الوضو کے قائم مقام تھیں اور آپ ﷺ اس وقت وضو کے لئے علیحدہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔

(۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ مِنَ اللَّيْلِ فَلْيَفْتَتِحِ الصَّلَاةَ بِرَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص رات میں (نماز پڑھنے کے لئے نیند سے اٹھے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی نماز کی ابتداء دو ہلکی رکعتوں سے کرے۔" (مسلم)

(۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَتْ بِتُّ عِنْدَ خَالَتِيْ مَيْمُوْنَةَ لَيْلَةً وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهَا فَتَحَدَّثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَ أَهْلِهِ سَاعَةً ثُمَّ رَقَدَ فَلَمَّا كَانَ ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرِ أَوْ بَعْضُهُ قَعَدَ فَنَظَرَ إِلَى السَّمَاءِ فَقَرَأَ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ حَتّٰى خَتَمَ السُّوْرَةَ ثُمَّ قَامَ إِلَى الْقِرْبَةِ فَأَطْلَقَ شِنَاقَهَا ثُمَّ صَبَّ فِي الْجَفْنَةِ ثُمَّ تَوَضَّأَ وُضُوْءً حَسَنًا بَيْنَ الْوُضُوْئَيْنِ لَمْ يُكْثِرْ وَقَدْ أَبْلَغَ فَقَامَ فَصَلّٰى فَقُمْتُ وَتَوَضَّأْتُ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ فَأَخَذَ بِأُذُنِيْ فَأَدَارَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهِ فَتَتَامَّتْ صَلَاتُهُ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتّٰى نَفَخَ وَكَانَ إِذَا نَامَ نَفَخَ فَأَذَنَهُ بِلَالٌ بِالصَّلَاةِ فَصَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ وَكَانَ فِيْ دُعَائِهِ اللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَّفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَّفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَمِيْنِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَسَارِيْ نُوْرًا وَّفَوْقِيْ نُوْرًا وَّتَحْتِيْ نُوْرًا وَّأَمَامِيْ نُوْرًا وَّخَلْفِيْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ لِّيْ نُوْرًا وَّزَادَ بَعْضُهُمْ وَفِيْ لِسَانِيْ نُوْرًا وَّذَكَرَ وَعَصَبِيْ وَلَحْمِيْ وَدَمِيْ وَشَعْرِيْ وَبَشَرِيْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُمَا

وَاجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَّاَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا وَفِیْ اُخْرٰی لِمُسْلِمٍ اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میں نے اپنی خالہ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کے یہاں ایک رات گزاری، آنحضرت ﷺ (بھی اس رات کو) انہیں کے یہاں تھے (یعنی اس رات کو حضرت میمونہ کے یہاں کی باری تھی) کچھ رات گئے تک آپ ﷺ اپنی زوجہ (حضرت میمونہؓ) سے باتیں کرتے رہے پھر سو گئے، جب تہائی یا اس سے بھی کچھ رات باقی رہ گئی تو آپ ﷺ اٹھ بیٹھے اور آسمان کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات و دن کے اختلاف (یعنی کبھی) اندھیرا، کبھی اجالا، کبھی گرمی، کبھی جاڑا، کبھی درازی، کبھی کمی) میں بے شک عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں) آپ ﷺ نے پوری سورۃ پڑھی، پھر اٹھ کر مشک کے پاس گئے اور اس کا بند کھول کر پیالہ میں پانی ڈالا، پھر اچھا درمیانہ وضو کیا (یعنی نہ تو پانی اتنا زیادہ بہایا کہ حد اسراف کو پہنچ جاتا اور نہ اتنا کم ڈالا کہ عضاء وضو بھی تر نہ ہوتے، بلکہ درمیانہ درجہ کا اچھا وضو کیا چنانچہ حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ درمیانہ وضو کا مطلب یہ ہے کہ) بہت زیادہ پانی نہیں بہایا بلکہ (جن اعضاء کا دھونا فرض ہے) پانی ان اعضاء تک پہنچایا، پھر آپ ﷺ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے (یہ دیکھ کر) میں بھی اٹھا اور (جس طرح آنحضرت ﷺ نے وضو کیا تھا) میں بھی اسی طرح وضو کر کے آنحضرت کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا، آنحضرت ﷺ نے میرا کان پکڑ کر اپنی بائیں طرف سے مجھے گھما کر اپنی دائیں طرف مجھے کھڑا کر دیا جب آپ ﷺ کی تیرہ رکعت نماز پوری ہو گئی تو لیٹ گئے، چونکہ آپ ﷺ سوتے وقت خراٹے لیتے تھے اس لئے سو کر خراٹے لینے لگے، اتنے میں حضرت بلالؓ نے آکر نماز کا وقت شروع ہو جانے اور جماعت کے تیار ہونے کی اطلاع کی، چنانچہ آپ ﷺ نے وضو کئے بغیر (سنت) نماز پڑھی اور آپ ﷺ (فرض و سُنّت کے درمیان) دعا میں یہ پڑھتے تھے: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّمِیْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّسَارِیْ نُوْرًا وَّفَوْقِیْ نُوْرًا وَّتَحْتِیْ نُوْرًا وَّاَمَامِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا (اے اللہ! میرے دل میں، میری آنکھوں میں، میرے کانوں میں، میرے دائیں، میرے بائیں، میرے اوپر، میرے نیچے، میرے آگے، میرے پیچھے، نور عطا کر اور میرے لئے نور ہی نور پیدا کر دے) اور بعض راویوں نے یہ الفاظ بھی نقل کئے وَفِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا (یعنی میری زبان میں نور پیدا کر دے) بعض راویوں نے یہ الفاظ ذکر کئے ہیں۔ وَعَصَبِیْ وَلَحْمِیْ وَدَمِیْ وَشَعْرِیْ وَبَشَرِیْ یعنی میرے اعصاب میں، میرے گوشت میں، میرے خون میں، میرے بالوں میں، اور میری جلد میں نور پیدا کر دے (بخاری و مسلم) اور بخاری و مسلم ہی کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں وَاجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَّاَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا یعنی اے اللہ! میری جان میں نور پیدا کر دے اور میرے لئے نور میں بڑائی دے۔ مسلم کی ایک دوسری روایت میں یہ ہے اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا یعنی اے اللہ! مجھے نور عطا فرما۔"

تشریح: جب حضرت بلالؓ نے آکر آنحضرت ﷺ کو نماز کا وقت ہو جانے کی اطلاع دی اور آپ ﷺ نیند سے بیدار ہوئے۔ تو بغیر وضو کئے ہی فجر کی سنتیں پڑھ لیں اس موقع پر یہ اشکال پیدا نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے وضو کئے بغیر نماز کیسے پڑھ لی؟ کیونکہ علماء لکھتے ہیں کہ سو جانے کے باوجود آنحضرت ﷺ نے وضو اس لئے نہیں کیا کہ فقط سو جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا بلکہ نیند سے بیداری کے بعد نماز پڑھنے کے لئے وضو اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ نیند میں وضو ٹوٹ جانے کا احتمال رہتا ہے۔ مگر آنحضرت ﷺ کا دل چونکہ ہمیشہ بیدار رہتا تھا یہاں تک کہ نیند کی حالت میں بھی آپ ﷺ کے دل پر کوئی غفلت طاری نہیں ہوتی تھی اس لئے آپ ﷺ کے سونے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ﷺ کا وضو ٹوٹ گیا ہو، اور آپ ﷺ کو معلوم نہ ہوا ہو۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد ایسی بات چیت جس کا موضوع دین و آخرت اور وعظ و نصیحت ہو یا اپنے اہل خانہ سے بطریق اختلاط ہو تو وہ مکروہ نہیں ہے۔

یہ حدیث حضرت عائشہؓ کی گزشتہ حدیث کے مخالف نظر آتی ہے کیونکہ یہاں حضرت ابن عباسؓ کے قول سے تو معلوم ہوتا ہے کہ

آنحضرت ﷺ نے رات میں جو تیرہ رکعتیں پڑھیں ان میں وتر کی تین رکعت تو شامل تھیں لیکن فجر کی سُنّت کی دو رکعتیں ان میں شامل نہیں تھیں۔ جب کہ عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ رکعتوں میں وتر کے ساتھ ساتھ فجر کی دو رکعتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔

لہٰذا ان دونوں حدیثوں میں اس تاویل سے مطابقت پیدا کی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی تو تیرہ رکعت اس طرح پڑھتے تھے کہ ان میں فجر کی دو سنتیں بھی شامل ہوتی تھیں جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے ذکر کیا ہے اور کبھی اس طرح پڑھتے تھے کہ ان میں فجر کی دو سنتیں شامل نہیں ہوتی تھیں جیسے کہ یہاں حضرت ابن عباسؓ کے الفاظ سے مفہوم ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نیند کی حالت میں خراٹے لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ خراٹے لینا سانس کی نالیوں کی کشادگی اور قوائے جسمانی کی صفائی اور صحت کی علامت ہے اور اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نہ صرف یہ کہ روحانی اور باطنی طور پر کامل و اکمل تھے بلکہ جسمانی طور پر بھی انتہائی صحت مند، قوی اور مضبوط و صاف اعضاء جسم کے مالک تھے۔

حدیث میں مذکورہ دعاء "دعائے طویل" کہلاتی ہے یہ دعا اکثر مشائخ کے معمول میں داخل ہے اسے تہجد کے بعد بھی پڑھنا ثابت ہے۔ اس دعا کی بڑی عظمت و فضیلت اور برکت ہے چنانچہ حضرت شیخ امام شہاب الدین سہروردیؒ نے "عوارف" میں لکھا ہے کہ جس شخص کو بھی میں نے اس دعا پر مواظبت و مداومت کرتے دیکھا ہے اس کے پاس ایک برکت محسوس ہوئی ہے۔

وتر کی تین رکعتیں ہیں

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ رَقَدَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَيْقَظَ وَتَسَوَّكَ وَتَوَضَّأَ وَهُوَ يَقُوْلُ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَتّٰى خَتَمَ السُّوْرَةَ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ اَطَالَ فِيْهِمَا الْقِيَامَ وَالرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ ثُمَّ انْصَرَفَ فَنَامَ حَتّٰى نَفَخَ ثُمَّ فَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ سِتَّ رَكَعَاتٍ كُلَّ ذٰلِكَ يَسْتَاكُ وَيَتَوَضَّأُ وَيَقْرَأُ هٰؤُلَاءِ الْاٰيَاتِ ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ (ایک رات) سرور کائنات ﷺ کے ہاں سوئے چنانچہ (انہوں نے بیان کیا کہ) آپ ﷺ رات میں بیدار ہوئے، مسواک کی اور وضو کیا پھر یہ آیت پڑھی اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آخر سورہ تک، اس کے بعد آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی جس میں قیام، رکوع اور سجود کو طویل کیا پھر (دو رکعت نماز سے) فارغ ہو کر سو گئے اور خراٹے لینے لگے، تین مرتبہ آپ ﷺ نے اسی طرح کیا (یعنی دو رکعت مذکورہ طریقہ پر پڑھ کر لیٹ جاتے پھر اٹھ کر دو رکعت پڑھتے اور پھر لیٹ جاتے) اس طرح آپ ﷺ نے تین مرتبہ میں چھ رکعتیں پڑھیں اور تینوں مرتبہ میں سے ہر بار آپ ﷺ مسواک بھی کرتے وضو بھی کرتے اور آیتیں بھی پڑھتے تھے۔ پھر آخر میں آپ ﷺ نے وتر کی تین رکعتیں پڑھیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث بصراحت اس بات کی دلیل ہے کہ وتر کی تین ہی رکعتیں ہیں چنانچہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہی ہے۔ گو حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک وتر کی ایک ہی رکعت ہو سکتی ہے لیکن اس حد تک تو وہ بھی حنفیہ ہی کے ساتھ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی وتر کے لئے صرف ایک رکعت پڑھنا مکروہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کی نماز تہجد کی کیفیت

⑩ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ اَنَّهٗ قَالَ لَاَرْمُقَنَّ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّيْلَةَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ طَوِيْلَتَيْنِ طَوِيْلَتَيْنِ طَوِيْلَتَيْنِ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُمَا دُوْنَ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُمَا دُوْنَ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُمَا دُوْنَ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا ثُمَّ اَوْتَرَ فَذٰلِكَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً

رَوَاهُ مُسْلِمٌ قَوْلُهٗ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُمَا دُوْنَ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا اَرْبَعَ مَرَّاتٍ هٰكَذَا فِيْ صَحِيْحِ مُسْلِمٍ وَاَفْرَادِهٖ مِنْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَمُوَطَّأ مَالِكٍ وَسُنَنِ اَبِيْ دَاوٗدَ وَجَامِعِ الْاُصُوْلِ۔

"اور حضرت زید بن خالد جہنیؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ میں نے ارادہ کیا کہ) میں آج کی رات سرور کائنات ﷺ کی نماز کو دیکھتا رہوں گا چنانچہ (میں نے دیکھا کہ) پہلے آپ ﷺ نے دو رکعتیں ہلکی پڑھیں پھر دو رکعتیں طویل طویل سی پڑھیں، پھر آپ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھیں جو ان دونوں رکعتوں سے کم (طویل) تھیں جو آپ ﷺ نے ان سے پہلے پڑھی تھیں، پھر آپ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھیں جو پہلے پڑھی گئی دونوں رکعتوں سے کم (طویل) تھیں، پھر آپ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھیں جو پہلے پڑھی جانے والی دونوں رکعتوں سے کم (طویل) تھیں۔ پھر آپ ﷺ نے وتر پڑھے اور یہ سب تیرہ رکعتیں ہو گئیں (مسلمؒ) اور زید کا یہ قول کہ پھر دو رکعتیں پڑھیں جو پہلے پڑھی گئی دونوں رکعتوں سے کم تھیں، صحیح مسلم میں حمیدی کی کتاب میں کہ جس میں انہوں نے فقط مسلمؒ کی ہی روایتیں نقل کی ہیں اور موطا امام مالکؒ، سنن ابی داؤد، نیز جامع الاصول سب میں چار مرتبہ منقول ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے صریحی طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ نے وتر کی تین رکعتیں پڑھی تھیں یا ایک ہی رکعت پڑھی تھی، کیونکہ اگر دو رکعتیں ہلکی اس نماز میں شمار نہ کی جائیں تو وتر کی تین رکعتیں ثابت ہو جائیں گی اور اگر ان دونوں رکعتوں کو بھی اس نماز میں شامل کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وتر کی ایک ہی رکعت پڑھی گئی تھی۔ تاہم صحیح اور ظاہر یہی ہے کہ دونوں ہلکی رکعتیں اس نماز میں شامل نہیں تھیں اس طرح آپ ﷺ نے وتر کی تین رکعتیں پڑھیں۔

حمیدی کی کتاب "جمع بین الصحیحین" میں تین قسم کی احادیث منقول ہیں۔ ① متفق علیہ یعنی بخاری و مسلم دونوں کی روایتیں۔ ② افراد بخاری یعنی وہ روایتیں جنہیں صرف بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔ ③ افراد مسلم۔ یعنی وہ روایتیں جنہیں صرف مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ لہٰذا روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُمَا دُوْنَ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا متن صحیح مسلم میں چار مرتبہ منقول ہے اسی طرح کتاب حمیدی کہ جس میں صرف مسلم کی روایات منقول ہیں۔ موطا، امام مالکؒ، سنن ابی داؤد اور جامع الاصول میں بھی چار ہی مرتبہ منقول ہے۔ مؤلف مشکوٰۃ نے اس چیز کو یہاں اتنی شدومد اور مبالغہ کے ساتھ اس لئے بیان کیا ہے کہ صاحب مصابیح کا رد ہو جائے کہ انہوں نے اس عبارت کو تین مرتبہ نقل کیا ہے جس کی بنا پر رکعتوں کی تعداد گیارہ رہ جاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ آخر عمر میں نفل نماز بیٹھ کر پڑھتے تھے

⑪ وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ لَمَّا بَدَّنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَثَقُلَ كَانَ اَكْثَرُ صَلَاتِهٖ جَالِسًا۔ (متفق علیہ)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ جب عمر کے آخری حصہ میں پہنچے اور (بڑھاپے کی وجہ سے) بدن بھاری ہو گیا تو آپ ﷺ اکثر نفل نمازیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

نماز تہجد میں آنحضرت ﷺ کون کون سی سورتیں پڑھتے تھے؟

⑫ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَقَدْ عَرَفْتُ النَّظَآئِرَ الَّتِيْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرِنُ بَيْنَهُنَّ فَذَكَرَ عِشْرِيْنَ سُوْرَةً مِّنْ اَوَّلِ الْمُفَصَّلِ عَلٰى تَالِيْفِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ سُوْرَتَيْنِ فِيْ رَكْعَةٍ اٰخِرُهُنَّ حٰمٓ الدُّخَانُ وَعَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو سورتیں آپس میں ہم مثل ہیں اور سرور کائنات ﷺ جنہیں جمع کرتے تھے میں انہیں جانتا ہوں۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنی ترتیب کے مطابق بیس سورتیں جو مفصل کے اول میں ہیں گن کر بتائیں۔ آنحضرت ﷺ ان

سورتوں کو اس طرح جمع کرتے تھے کہ ایک ایک رکعت میں دو دو سورتیں پڑھا کرتے تھے اور (ان بیس سورتوں میں) آخری دو سورتیں حٰمٓ الدُّخَانُ اور عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ہیں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "آپس میں ہم مثل سورتوں" سے مراد وہ سورتیں ہیں جو طوالت و اختصار میں آپس میں برابر ہیں۔ مفصّل کا مطلب باب القراءۃ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ قول مشہور کے مطابق سورۂ حجرات سے آخر تک کی سورتوں کو "مفصّل" کہتے ہیں۔ وہ سورتیں جو آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ترتیب کے مطابق کہ جنہوں نے کلام اللہ کو جمع کیا تھا، یکجا کیا تھا، ان بیس سورتوں کی تفصیل ابوداؤد میں اس طرح مذکور ہے:

آنحضرت ﷺ ایک ایک رکعت میں دو، دو سورتیں (اس طرح) پڑھا کرتے تھے کہ سورۂ رحمٰن اور سورۂ نجم ایک رکعت میں، اقتربت الساعۃ اور الحاقہ ایک رکعت میں، طور اور ذاریات ایک رکعت میں، اذا وقعت الواقعۃ اور سورۂ نون ایک رکعت میں، سال سائل اور والنازعات ایک رکعت میں، ویل للمطففین اور عبس ایک رکعت میں، مدثر اور مزمل ایک رکعت میں، ھل اتی اور لااقسم بیوم القیامۃ ایک رکعت میں، عم یتساءلون اور مرسلات ایک رکعت میں، دخان اور اذا الشمس کورت ایک رکعت میں، ابوداؤد نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ یہ ترتیب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے جمع کرنے کے مطابق ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ طریقہ کے مطابق آنحضرت ﷺ سورۂ دخان اور عم یتساءلون ایک رکعت میں پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں سورتیں نہ صرف یہ کہ ہم مثل اور آپس میں برابر نہیں ہیں بلکہ اس طرح حدیث کے اس آخری جزء اور حدیث کے ظاہری معنی و مفہوم میں مطابقت نہیں رہے گی، چنانچہ اس جزء کی توضیح یہ کی جائے گی کہ حدیث کے ان الفاظ کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ "ان بیس سورتوں میں کی آخری سورتیں حم الدخان اور اس کے ہم مثل یعنی اذا الشمس کورت اور عم یتساءلون اور اس کے ہم مثل یعنی والمرسلات ہیں"۔ اس کا مطلب اب یہ ہو جائے گا کہ آپ ﷺ ایک رکعت میں حم الدخان اور اذا الشمس کورت پڑھتے تھے جو ہم مثل اور برابر کی سورتیں ہیں اسی طرح ایک رکعت میں عم یتساءلون اور والمرسلات پڑھتے تھے جو ہم مثل اور برابر کی سورتیں ہیں۔

قرآن پڑھنے کی ترتیب: علماء کا اس بات پر اجماع اور اتفاق ہے کہ قرآن کریم اسی ترتیب کے مطابق پڑھا جائے جو اب مروج ہے کسی دوسری ترتیب کے مطابق نہ پڑھا جائے، ہاں بچوں کو ضرورتاً یعنی تعلیم وغیرہ کی وجہ سے آخر کی طرف سے بھی پڑھا دینا جائز ہے اور اگر نماز میں خلاف ترتیب قرآن پڑھا جائے گا تو یہ خلاف اولیٰ ہوگا بلکہ بعض علماء کے نزدیک تو یہ مکروہ ہے چنانچہ حضرت امام احمدؒ کا یہی مذہب ہے۔

پہلی رکعت میں سورۂ والناس پڑھ لینے کا مسئلہ: اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی رکعت میں سورۂ والناس پڑھ لے تو دوسری میں کیا پڑھے؟ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس شکل میں دوسری رکعت میں بھی سورۂ والناس ہی پڑھنی چاہیے، لیکن حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر پہلی رکعت میں سورۂ والناس پڑھی گئی ہے تو دوسری رکعت میں سورۂ بقرہ شروع کر دی جائے اس طرح کہ الٓمٓ سے لے کر مفلحون تک کی آیتیں پڑھی جائیں، ایک روایت میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے بھی یہی منقول ہے بلکہ یہی قول زیادہ اولیٰ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آنحضرت ﷺ کی نماز تہجد کی کیفیت

(۱۳) عَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ فَكَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ثَلَاثًا ذُوالْمَلَكُوْتِ

وَالْجَبَرُوْتِ وَالْكِبْرِيَآءِ وَالْعَظَمَةِ ثُمَّ اسْتَفْتَحَ فَقَرَأَ الْبَقَرَةَ ثُمَّ رَكَعَ فَكَانَ رُكُوْعُهُ نَحْوًا مِّنْ قِيَامِهِ فَكَانَ يَقُوْلُ فِيْ رُكُوْعِهِ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ فَكَانَ قِيَامُهُ نَحْوًا مِّنْ رُكُوْعِهِ يَقُوْلُ لِرَبِّيَ الْحَمْدُ ثُمَّ سَجَدَ فَكَانَ سُجُوْدُهُ نَحْوًا مِّنْ قِيَامِهِ فَكَانَ يَقُوْلُ فِيْ سُجُوْدِهِ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُوْدِ وَكَانَ يَقْعُدُ فِيْمَا بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ نَحْوًا مِّنْ سُجُوْدِهِ وَكَانَ يَقُوْلُ رَبِّ اغْفِرْلِيْ رَبِّ اغْفِرْلِيْ فَصَلّٰى اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ قَرَأَ فِيْهِنَّ الْبَقَرَةَ وَاٰلِ عِمْرَانَ وَالنِّسَآءَ وَالْمَائِدَةَ اَوِ الْاَنْعَامَ شَكَّ شُعْبَةُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت حذیفہؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے سرور کائنات ﷺ کو رات میں (تہجد کی) نماز پڑھتے دیکھا ہے چنانچہ (ان کا بیان ہے کہ) آنحضرت ﷺ نے تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر یہ کہا ذو الملکوت و الجبروت و الکبریاء و العظمة (اللہ تعالیٰ، ملک، غلبہ، بڑائی اور بزرگی کا مالک ہے) اس کے بعد آپ ﷺ نے سبحانک اللھم پڑھ کر سورۂ بقرہ کی قرأت فرمائی اور اس کے بعد رکوع کیا آپ ﷺ کا رکوع (تقریباً) قیام کے برابر تھا، رکوع میں آپ نے سبحان ربی العظیم کہا پھر رکوع سے سر اٹھایا اور آپ ﷺ کا کھڑا ہونا یعنی قومہ (تقریباً) آپ ﷺ کے رکوع کے برابر تھا اور (رکوع سے اٹھ کر سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد) آپ ﷺ کہتے لِرَبِّيَ الْحَمْدُ (میرے پروردگار ہی کے لئے ساری تعریف ہے) پھر سجدہ کیا اور آپ ﷺ کے سجدہ کی مقدار آپ کے قومہ کے برابر تھی اور سجدہ میں آپ ﷺ کہتے سبحان ربی الاعلی پھر آپ ﷺ نے سجدہ سے سر اٹھایا اور آپ ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان (یعنی جلسہ میں) اپنے سجدے کے برابر بیٹھتے اور یہ کہتے رب اغفرلی رب اغفرلی (اے میرے رب میری بخشش کر اے میرے رب مجھے بخش دے) اسی طرح آپ ﷺ نے چار رکعتیں پڑھیں۔ اور ان (چاروں رکعتوں میں) سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ یا سورۂ انعام پڑھیں (حدیث کے راوی شعبہؒ کو شک واقع ہوگیا ہے (کہ حدیث میں آخری سورۃ مائدہ کا ذکر کیا گیا تھا یا انعام کا)۔"

تشریح: "آپ کا رکوع قیام کے برابر تھا" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حقیقۃً آپ ﷺ کا رکوع تقریباً قیام کے برابر تھا، یا یہ کہ آپ ﷺ رکوع میں اتنی ہی دیر تک رہتے تھے جتنی دیر تک قیام کرتے تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپ نے معمول سے کچھ زیادہ قیام کو طویل کیا تھا اسی طرح رکوع کو بھی مقدار معمول سے زیادہ دراز کیا، ہاں کبھی دونوں یعنی قیام اور رکوع برابر بھی ہوتے تھے جیسا کہ نسائیؒ نے حضرت عوف بن مالکؓ کی روایت نقل کی ہے۔

"رب اغفرلی" دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اس سلسلہ میں یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ رب اغفرلی دو مرتبہ کہتے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے احتمال دو سے زائد بہت مرتبہ کہنا ہو۔ واللہ اعلم۔

نماز تہجد میں زیادہ قیام کی فضیلت

⑭ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَامَ بِعَشْرِ اٰيَاتٍ لَّمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ وَمَنْ قَامَ بِمِائَةِ اٰيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْقَانِتِيْنَ وَمَنْ قَامَ بِاَلْفِ اٰيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْمُقَنْطِرِيْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، جو شخص دس آیتوں کے (پڑھنے کے) ساتھ قیام کرے تو وہ غافلین میں شمار نہیں کیا جاتا (یعنی اس کا نام صحیفہ غافلین میں نہیں لکھا جاتا) اور جو شخص سو آیتوں کے (پڑھنے کے) ساتھ قیام کرے تو اس کا نام فرمانبرداروں میں لکھا جاتا ہے اور جو شخص ہزار آیتوں کے (پڑھنے کے) ساتھ قیام کرے تو اس کا نام بہت زیادہ ثواب پانے والوں میں لکھا جاتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص تہجد کی نماز میں دس، سو یا ہزار آیتوں کی قراءت ترتیل اور اطمینان کے ساتھ کرے تو اسے مذکورہ بالا ثواب اور سعادت کی فضیلت حاصل ہوگی اور اگر کوئی شخص اپنی نماز میں دس آیتیں پڑھے گا تو فضیلت و ثواب کے اعتبار سے وہ آدمی اس

سے کمتر ہوگا جو سو آیتیں اپنی نماز میں پڑھے گا، اسی طرح جو شخص سو آیتیں اپنی نماز میں پڑھے گا تو وہ فضیلت و سعادت کے اعتبار سے اس شخص سے کم تر ہوگا جو اپنی نماز میں ایک ہزار آیتوں کی قراءت کرے گا۔

اس موقع پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ آیتوں کی مذکورہ تعداد ایک رکعت میں پڑھنے کا اعتبار ہوگا یا ایک سے زائد رکعت میں یہ تعداد پڑھی جائے۔

دوم یہ کہ یہ تعداد سورۂ فاتحہ کی آیتوں کو شامل ہے یا اس کے علاوہ ہے۔

پہلے سوال کے متعلق علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ آیتوں کی مذکورہ تعداد دو یا دو سے زیادہ رکعتوں میں پڑھی جائے۔

دوسرے سوال کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث کے ظاہری الفاظ تو یہی مراد بتاتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ دس آیتیں ہوں لیکن صحیح اور ظاہر یہ ہے کہ حدیث میں مذکورہ ثواب اس شکل میں بھی حاصل ہوتا ہے کہ مذکورہ تعداد سورۂ فاتحہ کو شامل کر کے پڑھی جائے بایں طور کہ سات آیتیں تو سورۂ فاتحہ کی ہو جائیں گی اور تین آیتیں مزید کہ جو نماز کی قراءت کا ادنی درجہ ہے۔

قانتین کے معنی ہیں اطاعت پر مواظبت اور مداومت کرنے والے یا عبادت خداوندی میں قیام (یعنی کھڑے ہونے) کو طویل کرنے والے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نماز میں سو آیتیں پڑھتے ہیں ان کا نام اطاعت خداوندی پر مواظبت و مداومت کرنے والوں میں لکھا جاتا ہے۔ یا عبادت خداوندی میں قیام کو طویل کرنے والوں کی جماعت میں لکھا جاتا ہے جو انتہائی سعادت اور خوش بختی کی بات ہے۔

علامہ طیبی کے الفاظ سے جو اس حدیث کی تشریح میں ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث مطلق ہے، دن یا رات کے ساتھ مقید نہیں ہے یعنی خواہ کوئی سی بھی نماز ہو، دن کی ہو یا رات کی ہو جس نماز میں بھی آیتوں کی مذکورہ تعداد پڑھی جائے گی، ثواب حاصل ہوگا، تاہم علامہ بغوی نے اس حدیث کو کامل ترین موقعہ پر یعنی باب "صلاۃ اللیل" میں نقل کر کے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ رات میں یعنی تہجد کی نماز میں مذکورہ تعداد میں جو آیتیں پڑھی جائیں گی تو اس کا ثواب بہت زیادہ حاصل ہوگا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ "قیام کرنا" اس بات سے کنایہ ہے کہ مذکورہ تعداد میں آیتیں یاد کی جائیں اور انہیں ہر وقت پڑھا جائے نیز یہ کہ ان کے معنی و مقاصد میں غور و فکر اور ان پر عمل کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

نماز تہجد میں آنحضرت ﷺ کی قراءت کا طریقہ

(۱۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَتْ قِرَآءَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّيْلِ يَرْفَعُ طَوْرًا وَيَخْفِضُ طَوْرًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رات کی نماز میں سرور کائنات ﷺ کی قراءت مختلف ہوتی تھی۔ کبھی تو آپ ﷺ بلند آواز سے قراءت فرماتے اور کبھی پست آواز سے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جیسا وقت اور موقع دیکھتے اسی کے مطابق قراءت فرماتے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر آپ ﷺ تنہا ہوتے، اور دوسروں کی نیند خراب ہونے کا خدشہ نہ ہوتا تو آپ ﷺ باآواز بلند قراءت فرماتے تھے اور اگر آس پاس کوئی سویا ہوا ہوتا تو پھر آپ ﷺ اس کی نیند اچاٹ ہونے کے خوف سے قراءت پست آواز سے فرماتے تھے۔

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ قِرَآءَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى قَدْرِ مَا يَسْمَعُهُ مَنْ فِي الْحُجْرَةِ وَهُوَ فِي الْبَيْتِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ اتنی آواز سے قراءت فرماتے تھے کہ اگر آپ ﷺ حجرہ کے اندر پڑھتے ہوتے تو باہر صحن میں موجود شخص سن لیتا تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: یعنی نہ تو آپ بہت زیادہ بلند آواز سے قراءت کرتے تھے اور نہ بالکل ہی پست آواز سے کہ کوئی سن بھی نہ سکے، بلکہ اتنی آواز سے

پڑھا کرتے تھے کہ اگر آپ ﷺ حجرہ کے اندر نماز پڑھتے ہوئے ہوتے تو وہ لوگ جو باہر صحن میں موجود ہوتے تھے آپ ﷺ کی قراءت سن لیتے تھے۔

اتنی بات جان لیجئے کہ قراءت کے سلسلے میں یہ جو کچھ بیان کیا جارہا ہے اس کا تعلق رات یعنی تہجد کی نماز سے ہے کیونکہ جب آپ ﷺ مسجد میں نماز پڑھتے تھے تو رات کی نماز کی بہ نسبت زیادہ بلند آواز سے قراءت فرماتے تھے۔

تہجد کی قراءت میں ابوبکرؓ و عمرؓ کا طریقہ

⑰ وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ لَيْلَةً فَاِذَا هُوَ بِاَبِیْ بَكْرٍ يُصَلِّی وَيَخْفِضُ مِنْ صَوْتِهٖ وَمَرَّ بِعُمَرَ وَهُوَ يُصَلِّی رَافِعًا صَوْتَهٗ قَالَ فَلَمَّا اجْتَمَعَا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَبَابَكْرٍ مَرَرْتُ بِكَ وَاَنْتَ تُصَلِّی تَخْفِضُ صَوْتَكَ قَالَ قَدْ اَسْمَعْتُ مَنْ نَاجَيْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَقَالَ لِعُمَرَ مَرَرْتُ بِكَ وَاَنْتَ تُصَلِّی رَافِعًا صَوْتَكَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاَطْرُدُ الشَّيْطَانَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَابَكْرٍ ارْفَعْ مِنْ صَوْتِكَ شَيْئًا وَقَالَ لِعُمَرَ اِخْفِضْ مِنْ صَوْتِكَ شَيْئًا۔ (رواہ ابوداؤد وروی الترمذی نحوہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرور کائنات ﷺ رات میں باہر نکلے تو ناگہاں حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے گزرے جو نماز میں پست آواز سے (قرآن کریم) پڑھ رہے تھے، پھر آپ ﷺ حضرت عمرؓ کے پاس سے گزرے جو نماز میں بلند آواز سے (قرآن کریم) پڑھ رہے تھے، ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ جب (صبح کو) حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ دونوں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یکجا (حاضر) ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ، ابوبکرؓ! (آج کی رات) ہم تمہارے پاس سے گزرے تو تم نماز میں پست آواز سے (قرآن کریم) پڑھ رہے تھے؟ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یارسول اللہ! میں جس سے مناجات کر رہا تھا اسے ہی سنا رہا تھا (یعنی میں اپنے پروردگا کی مناجات میں مشغول تھا اور وہ سننے کے لئے بلند آواز کا محتاج نہیں ہے وہ ہر طرح سے سنتا ہے) پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ، عمرؓ! (آج کی رات) ہم تمہارے پاس سے (بھی) گزرے تھے تم نماز میں باآواز بلند (قرآن کریم) پڑھ رہے تھے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! میں (باآواز بلند قرآن کریم پڑھ کر ان) سوئے ہوئے لوگوں کو جگاتا تھا (جو عبادت خداوندی یعنی تہجد کے وقت اٹھنا تو چاہتے ہیں مگر نیند کے غلبہ کی وجہ سے ان کی آنکھیں کھل نہیں پاتیں) اور شیطان کو بھگاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے (دونوں کی باتیں سن کر حضرت ابوبکرؓ سے) فرمایا کہ، ابوبکر! تم اپنی آواز کو کچھ اور بلند کرو اور (حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ) عمرؓ! تم اپنی آواز کو پست کرو یعنی اس طرح آنحضرت ﷺ نے حد اعتدال کی طرف دونوں کی راہنمائی فرمائی۔" (ابوداؤد، ترمذی)

آنحضرت ﷺ ایک آیت پڑھتے ہوئے تمام رات کھڑے رہے

⑱ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَصْبَحَ بِاٰيَةٍ وَالْاٰيَةُ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (رواہ النسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ (ایک رات نماز تہجد میں) سرور کائنات ﷺ صبح تک کھڑے رہے اور یہ آیت پڑھتے رہے۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اگر تو انہیں بخش دے تو بڑا حکمت والا ہے۔" (نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن! باری تعالیٰ کے حضور اپنی اُمت کے حق میں یہ آیت عرض کریں گے اور رحمت دو عالم شافع محشر، سرکار دو عالم ﷺ نے تہجد کے وقت اپنی اُمت کے حسب حال یہ آیت پڑھی یعنی پروردگار کے حضور آپ ﷺ نے اپنی

اُمّت کا حال عرض کیا اور خدا کی بخشش کے طلب گار ہوئے، صدقہ جایئے سرکار ﷺ کے (آپ ﷺ پر میری جان قربان) کہ نماز تہجد میں کھڑے ہونے کے وقت سے لے کر صبح تک بار بار یہی دعا آپ ﷺ پڑھتے اور اپنی اُمّت کی مغفرت و بخشش چاہتے رہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم الف الف صلوٰۃ۔

فجر کی سنتیں پڑھ کر داہنی کروٹ پر لیٹنا چاہئے

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَلْيَضْطَجِعْ عَلٰى يَمِيْنِهٖ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص فجر کی سُنّت کی دو رکعتیں پڑھ لے تو اسے چاہئے کہ جماعت شروع ہونے تک اپنی داہنی کروٹ پر لیٹ رہے۔" (ترمذی و ابوداؤد)

تشریح: فجر کی سنتیں پڑھ کر جماعت شروع ہونے تک داہنی کروٹ پر لیٹ رہنے کی توجیہ بعض حنفی علماء نے یہ بیان کی ہے کہ نماز تہجد اور رات میں عبادت خداوندی میں مشغول رہنے کی وجہ سے چونکہ سستی اور طبیعت میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے فجر کی سنتیں پڑھ کر تھوڑی دیر لیٹ رہنے کا حکم دیا تاکہ کسل و سستی ختم ہو جائے اور کچھ راحت و سکون حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے فرض نماز اطمینان و سکون اور قلب و دماغ کی بشاشت و فرحت کے ساتھ ادا ہو۔

ابن مالک فرماتے ہیں کہ جو شخص رات میں خدا کی عبادت میں مشغول رہتا ہے اور نماز تہجد پڑھتا ہے اس شخص کے حق میں یہ (یعنی فجر کی سنتیں پڑھنے کے بعد داہنی کروٹ پر لیٹ جانے کا حکم) امر استحباب ہے۔

حضرت سید زکریاؒ جن کا شمار حنفیہ کے یہاں علم حدیث کے مشائخ میں ہوتا ہے، فرماتے ہیں کہ لائق اور بہتر یہ ہے کہ یہ طریقہ (یعنی سُنّت پڑھ کر داہنی کروٹ پر لیٹنا) پوشیدہ طور پر اختیار کرے یعنی گھر میں ایسا کرے۔ مسجد میں لوگوں کے سامنے نہ کرے، نیز یہ کہ یہ لیٹنا محض لیٹنے کی حد تک رہے اور اپنے آپ کو نیند سے بچائے، ایسا نہ ہو کہ لیٹ کر سو جائے اور اٹھ کر جماعت میں شریک ہو اور اس طرح فرض نماز بغیر وضو پڑھ لے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مداومت عمل

(۲۰) عَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَةَ اَیُّ الْعَمَلِ كَانَ اَحَبَّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتِ الدَّائِمُ قُلْتُ فَاَیَّ حِيْنٍ كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ قَالَتْ كَانَ يَقُوْمُ اِذَا سَمِعَ الصَّارِخَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مسروق فرماتے ہیں کہ میں نے اُمّ المؤمنین عائشہؓ سے دریافت کیا کہ سرور کونین ﷺ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کون سا عمل تھا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ مداومت عمل۔ میں نے پھر (یہ) پوچھا کہ رات میں تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے آپ ﷺ کس وقت کھڑے ہوتے تھے؟ فرمایا کہ آپ ﷺ اس وقت کھڑے ہوتے تھے جب مرغ کی آواز سنتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "مداومت عمل" کا مطلب یہ ہے کہ وہ نیک اور با مقصد عمل جس کو کرنے والا ہمیشہ پابندی کے ساتھ کرتا ہے اور جیسا کہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ اگرچہ وہ عمل قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

ہمارے اطراف میں تو عام طور پر مرغ رات کے بالکل آخری حصہ یعنی صبح کے قریب بولتے ہیں مگر عرب میں عمومی طور پر آدھی رات

کے بعد مرغ بولتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ مرغ کے بولنے کی آواز سن کر اٹھتے تھے اور اس وقت تہجد کی نماز پڑھتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کا رات کا معمول

(۲۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا كُنَّا نَشَآءُ اَنْ نَّرٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى اللَّيْلِ مُصَلِّيًا اِلَّا رَأَيْنَاهُ وَلَا نَشَآءُ اَنْ نَّرَاهُ نَائِمًا اِلَّا رَأَيْنَاهُ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں، اگر ہم چاہتے کہ سرور کونین ﷺ کو رات میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں تو آپ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے ہی دیکھتے تھے اور اگر یہ چاہتے کہ آنحضرت ﷺ کو سوتے ہوئے دیکھیں تو آپ ﷺ کو سوتے ہوئے ہی دیکھتے تھے۔" (نسائی)

تشریح: حضرت انسؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ رات میں تہجد وغیرہ پڑھنے کے سلسلہ میں معتدل رویہ اختیار فرماتے تھے، نہ تو تمام رات تہجد وغیرہ ہی میں گزار دیتے تھے اور نہ تمام رات سوتے ہی رہتے تھے بلکہ آپ ﷺ ہر رات میں سوتے بھی تھے اور تہجد وغیرہ کی نماز بھی پڑھتے تھے۔

لہٰذا آپ ﷺ چونکہ نماز تہجد وغیرہ کے لئے نہ تو تمام رات بیدار ہی رہتے تھے اور نہ تمام رات سوتے ہی رہتے تھے اس لئے آپ ﷺ رات میں نماز تہجد وغیرہ میں مشغول بھی دیکھے جاتے تھے اور سوتے ہوئے بھی آپ ﷺ کو دیکھا جاتا تھا۔

(۲۲) وَعَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قُلْتُ وَاَنَا فِىْ سَفَرٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَاَرْقُبَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلصَّلٰوةِ حَتّٰى اَرٰى فِعْلَهٗ فَلَمَّا صَلّٰى صَلٰوةَ الْعِشَآءِ وَهِىَ الْعَتَمَةُ اضْطَجَعَ هَوِيًّا مِّنَ اللَّيْلِ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ فَنَظَرَ فِى الْاُفُقِ فَقَالَ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا حَتّٰى بَلَغَ اِلٰى اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ثُمَّ اَهْوٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى فِرَاشِهٖ فَاسْتَلَّ مِنْهُ سِوَاكًا ثُمَّ اَفْرَغَ فِىْ قَدَحٍ مِّنْ اِدَاوَةٍ عِنْدَهٗ مَآءً فَاسْتَنَّ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى حَتّٰى قُلْتُ قَدْ صَلّٰى قَدْرَ مَا نَامَ ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتّٰى قُلْتُ قَدْ نَامَ قَدْرَ مَا صَلّٰى ثُمَّ اسْتَيْقَظَ فَفَعَلَ كَمَا فَعَلَ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّقَالَ مِثْلَ مَا قَالَ فَفَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَبْلَ الْفَجْرِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت حمید بن عبدالرحمن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ کے ایک صحابی نے بیان کیا کہ (ایک مرتبہ) جب کہ میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھا تو (اپنے دل میں یا اپنے بعض احباب سے) کہا کہ خدا کی قسم! آنحضرت ﷺ (جب تہجد کے لئے اٹھیں گے تو آپ ﷺ) کو میں نماز کے وقت دیکھتا رہوں گا تاکہ میں آپ ﷺ کے افعال دیکھوں (اور پھر اسی کے مطابق عمل کروں) چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے عشاء کی نماز کہ جسے عتمہ کہتے ہیں پڑھ لی تو لیٹ گئے (اور کچھ دیر آرام کیا، پھر آپ ﷺ بیدار ہوئے اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ آیت رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا پڑھی یہاں تک کہ آپ ﷺ اس آیت تک پہنچے اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ بے شک تو وعدہ سے پھرا نہیں کرتا۔ پھر آپ ﷺ اپنے بستر کی طرف متوجہ ہوئے اور وہاں سے مسواک نکالی، اس کے بعد ایک چھاگل میں سے جو آپ ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھی (وضو کرنے یا مسواک تر کرنے کے لئے) پیالہ میں پانی نکالا پھر مسواک کرنے کے بعد (وضو کر کے یا پہلے کے وضو کے ساتھ نماز پڑھنے) کھڑے ہو گئے اور (جب) آپ ﷺ نے نماز پڑھ لی، میں نے (دل میں) کہا کہ جتنی دیر آپ سوئے تھے اتنی ہی دیر اب آپ ﷺ نے نماز پڑھی پھر آپ ﷺ لیٹ گئے اور میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ جتنی دیر آپ ﷺ نے نماز پڑھی تھی اتنی ہی دیر سوئے، پھر آپ ﷺ بیدار ہوئے اور جو کچھ پہلے کیا تھا وہی اب کیا یعنی مسواک وغیرہ کی اور جو کچھ (یعنی آیت مذکورہ) پہلے پڑھا تھا وہی اب پڑھا، آنحضرت ﷺ نے نماز فجر سے پہلے اسی طرح تین مرتبہ کیا۔" (نسائی)

تشریح: آیت پڑھنے کے سلسلہ میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ کہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس رات میں مذکورہ آیت اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ

اَلْمِيْعَادَ تک ہی پڑھی ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ نے یہ آیتیں آخر سورہ تک پڑھی ہوں گی مگر سننے والے نے انک لاتخلف المیعاد کے بعد کی آیتیں نہیں سنی ہوں گی۔

اسی طرح اس حدیث میں اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث نمبر آٹھ میں تطبیق بھی پیدا ہو جائے گی جس سے معلوم ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آخر سورۃ تک تلاوت کی تھی۔

(۲۳) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ مُمَلَّكٍ اَنَّهٗ سَأَلَ اُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قِرَآءَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَلَاتِهٖ فَقَالَتْ وَمَا لَكُمْ وَصَلَاتِهٖ كَانَ يُصَلِّي ثُمَّ يَنَامُ قَدْرَ مَا صَلّٰى ثُمَّ يُصَلِّي قَدْرَ مَا نَامَ ثُمَّ يَنَامُ قَدْرَ مَا صَلّٰى ثُمَّ يُصَلِّي قَدْرَ مَا نَامَ ثُمَّ يَنَامُ قَدْرَ مَا صَلّٰى حَتّٰى يُصْبِحَ ثُمَّ نَعَتَتْ قِرَآءَتَهٗ فَاِذَا هِيَ تَنْعَتُ قِرَآءَةً مُفَسَّرَةً حَرْفًا حَرْفًا۔

(رواه ابوداؤد والترمذی والنسائی)

"اور حضرت یعلی بن مملک کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے (ایک مرتبہ) حضرت اُمّ سلمہؓ زوجہ مطہرہ سرور کونین ﷺ سے آنحضرت ﷺ کی قراء ت اور نماز کے بارہ میں پوچھا (جو آپ ﷺ رات میں پڑھتے تھے) انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ کی نماز (اور قراء ت بیان کرنے) سے تمہیں کیا (حاصل ہوگا تم میں اتنی قوت کہاں کہ آپ ﷺ کے برابر قراء ت کر سکو اور آپ ﷺ کی طرح نماز پڑھ سکو، اور اگر سننا ہی چاہتے ہو تو سنو کہ) آپ نماز پڑھتے، پھر جتنی دیر تک آپ ﷺ نماز پڑھتے اتنی ہی دیر تک سوتے، پھر (اٹھ کر) اتنی ہی دیر تک نماز پڑھتے جتنی دیر تک سو چکے ہوتے پھر جتنی دیر تک آپ ﷺ نماز پڑھتے اتنی ہی دیر تک سوتے یہاں تک کہ (یہ سلسلہ جاری رہتا اور) صبح ہو جاتی، اس کے بعد حضرت اُمّ سلمہؓ نے آپ ﷺ کی قراء ت بیان کی یہاں تک کہ انہوں نے خوب واضح اور ایک ایک حرف قراء ت کا بیان کیا۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ)

بَابُ مَا يَقُوْلُ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ

آنحضرت ﷺ رات کی نماز میں جو کچھ پڑھتے تھے اس کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز تہجد میں آنحضرت ﷺ کی دعا

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَتَهَجَّدُ قَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ وَّقَوْلُكَ حَقٌّ وَّالْجَنَّةُ حَقٌّ وَّالنَّارُ حَقٌّ وَّالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَّمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ فَاغْفِرْلِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ۔ (متفق علیه)

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ جب رات میں تہجد (کی نماز) پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو یہ (دعا) پڑھتے اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ

اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ وَّقَوْلُكَ حَقٌّ وَّالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَّمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ فَاغْفِرْلِيْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ (اے میرے رب تیرے ہی لئے تمام تعریفیں ہیں تو ہی آسمانوں اور زمین کو قائم رکھنے والا ہے اور اس چیز کو جو ان کے درمیان ہے اور تمام تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں تو ہی زمین و آسمانوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہیں سب کو روشن کرنے والا ہے اور تمام تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں اور تو ہی زمین و آسمانوں کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا بادشاہ ہے اور سب تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں تو ہی حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تیری ملاقات حق ہے تیرا کلام حق ہے، بہشت حق ہے، دوزخ حق ہے، تمام نبی حق ہیں، محمد ﷺ حق ہیں اور قیامت حق ہے، اے پروردگار! میں تیرا تابعدار ہوں، میں نے تیرے تمام احکامات قبول کئے، میں تجھ پر ایمان لایا اور تجھی پر بھروسہ کیا، تیری طرف میں نے رجوع کیا، تیری ہی مدد سے میں (دین کے) دشمنوں سے جھگڑتا ہوں اور تیرے ہی پاس اپنی فریاد لایا ہوں، پس تو میرے ان گناہوں کو بھی بخش دے جو میں نے پہلے کئے ہیں اور ان گناہوں کو بھی جو بعد میں مجھ سے سرزد ہوں گے نیز ان گناہوں کو بھی (بخش دے) جو میں نے پوشیدہ طور پر اور ظاہری طور پر کئے اور جو کچھ میری خطائیں ہیں جنہیں تو ہی مجھ سے بہتر جانتا ہے (سب کو معاف کر دے) اور تو ہی (جسے چاہے) آگے کرنے والا اور پیچھے ڈال دینے والا ہے تو ہی معبود ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: ظاہر تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ یہ دعا افتتاح یعنی تکبیر تحریمہ کے بعد یا رکوع کے بعد قومہ میں پڑھتے تھے جیسا کہ بعض روایتوں میں اس کی تصریح ہے۔

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ اِفْتَتَحَ صَلَاتَهٗ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَاِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ جب رات میں کھڑے ہوتے اور (تہجد کی) نماز شروع کرتے تو یہ دعا پڑھتے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَاِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اے اللہ! اے پروردگار جبریل، میکائیل، اسرافیل کے! اے پیدا کرنے والے آسمانوں اور زمین کے اور اے پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس چیز میں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں فیصلہ کرے گا، اے اللہ امر حق میں جو اختلاف کیا گیا ہے اس میں میری راہنمائی کر، کیونکہ جسے تو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔" (مسلم)

نیند سے بیدار ہونے کے بعد کی تسبیح اور اس کی فضیلت

(۳) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَارَّ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِيْ اَوْ قَالَ ثُمَّ دَعَا اُسْتُجِيْبَ لَهٗ فَاِنْ تَوَضَّأَ وَصَلّٰى قُبِلَتْ صَلَاتُهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبادہ بن صامتؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا جو شخص رات میں بیدار ہو تو یہ تسبیح پڑھے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ

وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اس کے لئے بادشاہت ہے اور اس کے لئے تمام تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور پاک ہے اللہ، تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ بہت بڑا ہے اور گناہوں سے بچنا اور عبادت کی قوت اللہ کی مدد سے ہے) اور اس کے بعد یہ کہے رَبِّ اغْفِرْلِیْ (اے میرے رب بخش دے) یا فرمایا کہ پھر دعا کرے (یعنی راوی کو شک واقع ہوگیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خاص طور پر رَبِّ اغْفِرْلِیْ پڑھنے کو فرمایا یہ فرمایا کہ جو دعا چاہے پڑھے) اس کی دعا قبول کی جائے گی، پھر اگر وضو کرے اور نماز پڑھے تو اس کی نماز قبول کی جائے گی۔" (بخاری)

تشریح: "تعار" کے معنی بعض نے نیند سے بیدار ہونے اور بعض نے کروٹ لینے کے لکھے ہیں اور ابن مالکؒ نے اس کے معنی آواز کے ساتھ جاگنے کے لکھے ہیں جیسا کہ بیدار ہونے کے وقت منہ سے آواز نکلتی ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اسے پسند اور بہتر قرار دیا ہے کہ جاگنے کے بعد جو آواز منہ سے نکلے وہ تسبیح وغیرہ کی آواز ہو چنانچہ اللہ سے تعلق رکھنے والے جب نیند سے بیدار ہوتے ہیں تو ان کے منہ سے کلمہ یا اسی قسم کی تسبیح و دعا کی آواز نکلتی ہے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس دعا کو جو نیند سے بیدار ہونے کے بعد پڑھی جاتی ہے "درھم الکیس" کہتے ہیں یعنی جس طرح کوئی شخص درہم و روپیہ تھیلی میں رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے اس میں سے نکالتا ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے اسی طرح یہ دعا ہے جو مؤمن کے قلب و دماغ میں محفوظ رہتی ہے جب وہ نیند سے بیدار ہوتا ہے اور یہ دعا اس کے منہ سے نکلتی ہے تو وہ بارگاہ رب العزت میں قبولیت کا درجہ پاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جاگنے کے وقت آنحضرت ﷺ کی دعا

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَيْقَظَ مِنَ اللَّيْلِ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِیْ وَاَسْأَلُكَ رَحْمَتَكَ اَللّٰهُمَّ زِدْنِیْ عِلْمًا وَّلَا تُزِغْ قَلْبِیْ بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنِیْ وَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ جب رات میں (نیند سے) بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِیْ وَاَسْأَلُكَ رَحْمَتَكَ اَللّٰهُمَّ زِدْنِیْ عِلْمًا وَّلَا تُزِغْ قَلْبِیْ بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنِیْ وَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے، اے اللہ! میں تیری تعریف کے ساتھ تیری تسبیح کرتا ہوں، اپنے گناہوں کی بخشش چاہتا ہوں اور تجھ سے تیری رحمت کا طلبگار ہوں۔ اے اللہ! میرے علم میں زیادتی عطا فرما اور مجھے ہدایت یافتہ بنانے کے بعد (حق سے باطل کی طرف) میرے دل میں کجروی پیدا نہ ہونے دے اور اپنے پاس سے میرے لئے (ایمان وہدایت پر ثابت قدمی اور دینی توفیق کی) رحمت عطا فرما بے شک تو ہی بخشنے والا ہے۔"

رات میں بیداری کے بعد ذکر اللہ کی فضیلت

⑤ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ مُّسْلِمٍ يَبِيْتُ عَلٰى ذِكْرٍ طَاهِرًا فَيَتَعَارُّ مِنَ اللَّيْلِ فَيَسْأَلُ اللّٰهَ خَيْرًا اِلَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِيَّاهُ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا، جو بھی مسلمان رات میں پاکی کی حالت میں (یعنی وضو یا تیمم کر کے) ذکر

اللہ کرتا ہوا سو جائے اور پھر رات میں بیدار ہونے کے بعد خدا سے بھلائی کی دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے (دنیا یا آخرت میں ضرور ہی) بھلائی دیتا ہے۔" (احمد، ابوداؤد)

نماز تہجد سے پہلے آنحضرت ﷺ کی تسبیح و دعا

⑥ وَعَنْ شَرِيْقِ الْهَوْزَنِيِّ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَسَأَلْتُهَا بِمَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْتَتِحُ اِذَا هَبَّ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَتْ سَأَلْتَنِيْ عَنْ شَيْءٍ مَاسَأَلَنِيْ عَنْهُ اَحَدٌ قَبْلَكَ كَانَ اِذَا هَبَّ مِنَ اللَّيْلِ كَبَّرَ عَشْرًا وَّحَمِدَ اللّٰهَ عَشْرًا وَّقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَشْرًا وَّقَالَ سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ عَشْرًا وَّاسْتَغْفَرَ اللّٰهَ عَشْرًا وَّهَلَّلَ اللّٰهَ عَشْرًا ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ ضِيْقِ الدُّنْيَا وَضِيْقِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ عَشْرًا ثُمَّ يَفْتَتِحُ الصَّلٰوةَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت شریق الہوزنی فرماتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور ان سے پوچھا کہ سرور کونین ﷺ رات میں بیدار ہونے کے بعد (عبادت) کس چیز سے شروع کرتے تھے؟ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ تم، نے مجھ سے (آج) وہ چیز پوچھی ہے جو تم سے پہلے کسی نے مجھ سے نہیں پوچھی (تو سنو کہ) آنحضرت ﷺ جب رات میں بیدار ہوتے تو (پہلے) اللہ اکبر دس مرتبہ الحمد للہ دس مرتبہ، سبحان اللہ وبحمدہ دس مرتبہ، سبحان الملک القدوس دس مرتبہ کہتے، دس مرتبہ استغفار کرتے، لا الہ الا اللہ دس مرتبہ کہتے اور دس مرتبہ یہ کہتے: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ ضِيْقِ الدُّنْيَا وَضِيْقِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ (اے پروردگار! میں تجھ سے دنیا کی تنگی (یعنی سختیوں) اور آخرت کی تنگی سے پناہ مانگتا ہوں۔ پھر اس کے بعد آپ ﷺ نماز تہجد شروع فرماتے)" (ابوداؤد)

تشریح: صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے یہاں دس تسبیحات ہیں جو سات سات مرتبہ پڑھی جاتی ہیں اور جنہیں ان کی اصطلاح میں "مسبعات عشرہ" کہتے ہیں، اس حدیث میں سات تسبیحات ہیں جنہیں دس دس مرتبہ پڑھنا ذکر کیا گیا۔ چنانچہ صوفیاء کی اصطلاح "مسبعات عشرہ" کے مقابلہ میں محدثین کرام رحمہم اللہ کے یہاں اس حدیث میں مذکورہ تسبیحات اور ان کے اعداد کو "معشرات سبعہ" کہتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑦ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ كَبَّرَ ثُمَّ يَقُوْلُ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ ثُمَّ يَقُوْلُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا ثُمَّ يَقُوْلُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ، رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ اَبُوْدَاوُدَ بَعْدَ قَوْلِهٖ غَيْرُكَ ثُمَّ يَقُوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثَلَاثًا وَفِيْ اٰخِرِ الْحَدِيْثِ ثُمَّ يَقْرَأُ۔

"حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ جب رات میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہہ کر یہ پڑھتے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ (اے اللہ تو پاک ہے ہم تیری حمد کرتے ہیں تیرا نام بابرکت ہے تیری بزرگی بلند ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے) پھر اللہ اکبر کبیرا (اللہ بہت بڑا ہے بڑا) کہتے اور یہ دعا پڑھتے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ (میں اللہ سننے والے، جاننے والے کی شیطان مردود سے، اس کے وسوسے سے، اس کے تکبر سے اور اس کے برے شعر سکھانے سے پناہ مانگتا ہوں، (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) ابوداؤد نے اپنی روایت میں حدیث کے الفاظ ولا الہ غیرک کے بعد یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ پھر آپ ﷺ لا الہ الا اللہ تین مرتبہ کہتے اور آخر حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر پڑھتے، یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ الخ پڑھنے کے بعد قراءت فرماتے۔"

⑧ وَعَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ كَعْبِ الْاَسْلَمِيِّ قَالَ كُنْتُ اَبِيْتُ عِنْدَ حُجْرَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكُنْتُ اَسْمَعُهٗ اِذَا قَامَ

مِنَ اللَّيْلِ يَقُوْلُ سُبْحَانَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الْهَوِيَّ ثُمَّ يَقُوْلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ الْهَوِيَّ۔ رَوَاهُ النَّسَائِيَّ وَلِلتِّرْمِذِيَّ نَحْوَهُ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ربیعہ بن کعب اسلمیؓ فرماتے ہیں کہ میں سرور کونین ﷺ کے حجرۂ مبارک کے قریب ہی رات بسر کیا کرتا تھا، چنانچہ میں آپ ﷺ کی آواز سنا کرتا تھا کہ جب آپ ﷺ رات میں (تہجد کی) نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو دیر تک سُبْحَانَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (تمام عالم کا پروردگار پاک ہے) کہا کرتے تھے، پھر دیر تک کہتے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ (اللہ پاک ہے میں اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہوں) (نسائیؒ) ترمذیؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

بَابُ التَّحْرِيْضِ عَلٰى قِيَامِ اللَّيْلِ

رات کے قیام پر رغبت دلانے کا بیان

قیام اللیل (رات کا قیام) کا مطلب ہے "رات میں عبادت خداوندی مثلاً نماز تہجد اور ذکر اللہ وغیرہ میں مشغول رہنا" اسی مناسبت سے "قائم اللیل" ان خوش نصیب اور باسعادت لوگوں کو کہا جاتا ہے جو راتوں کو اٹھ کر اپنے پروردگار کی عبادت اور اس کے ذکر و یاد میں مشغول رہتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

رات میں عبادت خداوندی سے روکنے کے لئے شیطان کی مکاریاں

(۱) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْقِدُ الشَّيْطَانُ عَلٰى قَافِيَةِ رَأْسِ اَحَدِكُمْ اِذَا هُوَ نَامَ ثَلَاثَ عُقَدٍ يَضْرِبُ عَلٰى كُلِّ عُقْدَةٍ عَلَيْكَ لَيْلٌ طَوِيْلٌ فَارْقُدْ فَاِنِ اسْتَيْقَظَ فَذَكَرَ اللّٰهَ انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ فَاِنْ تَوَضَّأَ انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ فَاِنْ صَلّٰى انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ فَاَصْبَحَ نَشِيْطًا طَيِّبَ النَّفْسِ وَاِلَّا اَصْبَحَ خَبِيْثَ النَّفْسِ كَسْلَانَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم میں سے کوئی شخص (رات میں) سوتا ہے تو شیطان مردود اس کے سر کی گدی پر تین گرہ لگاتا ہے۔ ہر گرہ پر (یہ کہہ کر) مارتا ہے (یعنی اس کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے) کہ "ابھی بہت رات باقی ہے سو تا رہ" لہٰذا اگر کوئی شخص (شیطان کے اس مکر میں نہیں آتا اور عبادت الٰہی کے لئے) جاگتا ہے اور (دل میں ہی یا زبان سے) اللہ کو یاد کرتا ہے تو (غفلت و سستی کی) ایک گرہ کھل جاتی ہے پھر جب وہ وضو کرتا ہے تو (نجاست کی) دوسری گرہ کھل جاتی ہے اور اس کے بعد جب نماز پڑھتا ہے تو (کسالت و بطالت کی) تیسری گرہ (بھی کھل جاتی ہے چنانچہ ایسا شخص شادماں اور پاک نفس صبح کرتا ہے ورنہ تو (جو شخص نہ جاگتا ہے نہ ذکر کرتا ہے اور نہ وضو کر کے نماز ہی پڑھتا ہے تو وہ) کاہل اور پلید نفس صبح کر دیتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "گرہ" کے معنی و مراد کے تعین میں اختلاف ہے ابن مالکؒ کا قول یہ ہے کہ "گرہ" سے مراد "کسل و سستی کی گرہ" ہے یعنی شیطان اپنی مکاریوں کے ساتھ رات میں عبادت خداوندی کے لئے اٹھنے والوں کے کسل و سستی کا باعث ہوتا ہے۔

میرکؒ کے قول کے مطابق بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ "یہ حقیقت پر محمول ہے یعنی شیطان مردود واقعی سونے والے کی گدی پر گرہ لگا دیتا ہے جیسا کہ جادوگر جادو کرتے وقت کسی پر گرہ لگاتے ہیں اس کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جو مرقات میں منقول ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ مجاز پر محمول ہے، گویا گرہ لگانا جو ساحر کا فعل ہے کہ وہ اس کے ذریعہ مسحور کو اس کی مراد سے روک دیتا ہے

اس کے ساتھ سونے والے کو رات میں نماز پڑھنے اور ذکر اللہ میں مشغول ہونے سے شیطان کے روکنے کو مشابہت دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح ایک ساحر سحر کے وقت کسی پر گرہ لگا کر اس کو اس کے مقاصد سے روک دیتے ہیں بایں طور کہ مسحور کی عملی قوتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اسی طرح شیطان بھی رات میں سونے والوں کو اپنی مکاریوں کے ذریعہ ذکر اللہ اور نماز میں مشغول ہونے کے لئے اٹھنے سے روک دیتا ہے۔

کچھ علماء کا قول یہ ہے کہ "اس سے مراد دل کی گرہ اور شیطان کی طرف سے سونے والے کو ایک چیز پر مصمم اور قائم کرنا ہے یعنی شیطان سونے والے کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے اور اس بات کا اسے یقین دلاتا ہے کہ ابھی رات بہت باقی ہے، سو تا رہ، لہٰذا شیطان کی فریب کاریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بیدار ہو کر نماز پڑھنے سے رک جاتا ہے۔

حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص رات میں شیطان کے مکر و فریب میں نہیں پھنستا اور اس کے بہکاوے میں نہیں آتا بلکہ وہ وقت پر اٹھ کر نماز تہجد اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس کے لئے صبح اپنی جلو میں شادمانی و خوش نصیبی اور پاک نفسی و پاکیزگی کی سعادتیں لئے ہوئے آتی ہے جس کی وجہ سے وہ تمام دن خدا کی رحمتوں کے سایہ میں رہتا ہے اور اس کے دل و دماغ ہر قسم کے خوف و خطر سے لاپرواہ ہو کر دین و دنیا کے امور میں اطمینان سے لگا رہتا ہے۔

اس کے برخلاف جو شخص رات میں شیطان کی عیاریوں کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے مکر کے جال میں پھنس جاتا ہے جس کی وجہ سے نہ تو وہ رات میں اٹھ کر ذکر اللہ کرتا ہے اور نہ ہی نماز تہجد میں مشغول ہوتا ہے بلکہ سویا رہتا ہے تو اس کے لئے صبح اپنے دامن میں کسالت و بطالت و غفلت و پلید نفسی کے غلیظ ڈھیر لے کر آتی ہے جس کی وجہ سے وہ تمام دن پلید نفس، غمگین دل، متفکر اور اپنے امور کی انجام دہی میں حیران و پریشان اور کسل مند رہتا ہے یعنی سستی و غفلت کی وجہ سے وہ اپنے جس کام کو بھی کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس میں ناکام اور بددل رہتا ہے کیونکہ وہ شیطان کے مکر و فریب کے جال میں مقید اور قرب خداوندی کی رحمتوں سے دور ہوتا ہے۔

آنحضرت کی کثرت عبادت اداء شکر کے لئے ہوتی تھی

(۲) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ قَالَ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ فَقِيْلَ لَهٗ لِمَ تَصْنَعُ هٰذَا وَقَدْ غُفِرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ قَالَ اَفَلَا اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے رات میں (نماز پڑھنے کے لئے) اس قدر قیام کیا (یعنی اتنی دیر تک کھڑے رہے) کہ آپ ﷺ کے مبارک پاؤں پر ورم آگیا (یہ حال دیکھ کر) آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ ﷺ اس قدر عبادت کیوں کرتے ہیں آپ ﷺ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "کیا میں اللہ کا شکر ادا کرنے والا بندہ نہ بنوں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے تمام گناہ بخش دیئے ہیں اور مجھے دین و دنیا کے سب سے اعلیٰ مقام پر فائز کیا ہے تو کیا میرا حق یہی ہے کہ میں عبادت کی محنت و مشقت اٹھا کر اس خدا کا جس نے مجھے اپنی بیشمار رحمتوں اور نعمتوں سے سرفراز کیا ہے شکر گذار بندہ نہ بنوں؟ نہیں بلکہ خدا نے مغفرت و بخشش کی جو نعمت مجھے عطا فرمائی ہے۔ اور اپنی جس لامحدود بے انتہا نعمتوں سے مجھے نوازا ہے اس کے پیش نظر میرا فرض ہے کہ میں اس کی خوشنودی و رضا حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت و مشقت اٹھاؤں اور زیادہ سے زیادہ عبادت کروں تاکہ اس کا شکر ادا کرنے والا بندہ بن جاؤں۔

عبادت کے بارہ میں حضرت علیؓ کا مقولہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات علم و فضل، ذہانت و فراست اور عقل و دانش کے اعتبار سے پوری اُمت میں امتیازی مقام کی حامل ہے عبادت کے بارہ میں انہوں نے جو تجزیہ فرمایا ہے اور جو رائے قائم کی ہے اسے سنئے اور اپنے

لئے مشعل راہ قرار دیجئے فرمایا:

"جن لوگوں نے (نعمتوں کی) طلب (یعنی جنّت کی آرزو اور ثواب کی تمنّا) میں عبادت کی تو ایسی عبادت سوداگروں کی عبادت ہے۔"

"جن لوگوں نے (عذاب خداوندی اور دوزخ کے) ڈر سے عبادت کی تو وہ غلاموں کی عبادت ہے۔"

اور "جن لوگوں نے اپنے مولی کی دی ہوئی نعمتوں کی ادائیگی شکر کے لئے عبادت کی تو وہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے" (اور یہی عبادت سب سے اونچے درجے کی عبادت ہے)

رات میں خداوند کی عبادت کے لئے نہ اٹھنے والے کی برائی

(۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ ذُكِرَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ فَقِيْلَ لَهٗ مَا زَالَ نَائِمًا حَتّٰى اَصْبَحَ مَا قَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ قَالَ ذٰلِكَ رَجُلٌ بَالَ الشَّيْطَانُ فِيْ اُذُنِهٖ اَوْقَالَ فِيْ اُذُنَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) سرور کونین ﷺ کے سامنے ایک شخص کا ذکر آیا، چنانچہ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ وہ شخص صبح تک سویا رہتا ہے نماز کے لئے نہیں اٹھتا" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "وہ ایسا شخص ہے کہ اس کے کان میں یا آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے دونوں کانوں میں شیطان پیشاب کرتا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "نماز" سے مراد تہجد کی نماز بھی ہوسکتی ہے اور فجر کی نماز بھی یعنی یا تو یہ شخص تہجد کی نماز کے لئے نہیں اٹھتا ہوگا یا یہ کہ فجر کی نماز اس کی قضا ہو جاتی ہوگی۔

بہرحال شیطان کے پیشاب کرنے کے بارہ میں بعض علماء نے کہا ہے کہ حقیقۃً ایسا ہوتا ہے چنانچہ بعض صالحین کے بارہ میں منقول ہے کہ (کسی دن) ان کی آنکھ نہ کھلی جس کی وجہ سے (تہجد یا فجر کی فرض) نماز وہ نہ پڑھ سکے چنانچہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص جو سیاہ رنگ کا تھا آیا اور اس نے اپنا پیر اٹھا کر ان کے کان میں پیشاب کر دیا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ "شیطان کا پیشاب کرنا" اس بات سے کنایہ ہے کہ شیطان ایسے آدمی کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کو حقیر و کمتر سمجھتا ہے تو اس پر پیشاب کر دیتا ہے۔

عورتوں کے لئے نماز تہجد کا ذکر

(۴) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتِ اسْتَيْقَظَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً فَزِعًا يَقُوْلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاذَآ اُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْخَزَآئِنِ وَمَاذَآ اُنْزِلَ مِنَ الْفِتَنِ مَنْ يُّوْقِظُ صَوَاحِبَ الْحُجُرَاتِ يُرِيْدُ اَزْوَاجَهٗ لِكَيْ يُصَلِّيْنَ رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ ایک روز رات میں سرور کونین ﷺ گھبرا کر یہ کہتے ہوئے بیدار ہوگئے کہ سبحان اللہ! آج کی رات کس قدر خزانے اتارے گئے ہیں اور کس قدر فتنے نازل کئے گئے ہیں، ہے کوئی جو ان حجروں والیوں کو اٹھادے، آپ ﷺ کی مراد ازواج مطہرات سے تھی کہ وہ (اٹھ کر) نماز پڑھیں (تاکہ رحمت خداوندی حاصل کر سکیں اور عذاب و فتنوں سے بچ سکیں کیونکہ) اکثر عورتیں دنیا میں (تو) کپڑے پہننے والی ہیں لیکن آخرت میں ننگی ہوں گی۔" (بخاری)

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ جو خزانے اور مال آنحضرت ﷺ کی اُمّت میں مقدر ہو چکے تھے کہ کس اُمّتی کو کتنا مال وزر ملے گا اور کسی اُمّتی کی قسمت میں کتنی دولت لکھی ہے اس رات میں ان کا اترنا آنحضرت ﷺ کو معلوم ہو گیا تھا اس طرح اس رات میں جتنے فتنے مقدر ہو چکے تھے وہ بھی اس رات میں آنحضرت ﷺ کو پہلے ہی سے معلوم ہو گئے تھے۔

ملا علی قاریؒ اور دیگر علماء فرماتے ہیں کہ حدیث میں "خزانے) سے مراد رحمت خداوندی اور" فتنے) سے مراد اس کا عذاب ہے۔

عوتوں کے لئے وعید: حدیث کے آخری جز کے کئی مطلب ہیں اول یہ کہ اکثر عورتیں دنیا میں تو طرح طرح کے اور عمدہ سے عمدہ کپڑے پہنیں اور ان پر فخر ومباہات کریں گی حالانکہ ان کی حالت یہ ہوگی کہ حکم خداوندی کو نہ ماننے کی وجہ سے وہ آخرت میں نیک اور اچھے اعمال سے خالی ہوں گی۔ دوم یہ کہ اکثر عورتیں دنیا میں نیند کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی یعنی نیند کی غفلت کی وجہ سے خدا کی یاد سے غافل ہونگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آخرت میں اچھے درجات اور بڑائیوں سے خالی ہوں گی، سوم یہ کہ اکثر عورتیں جسم کو ظاہر کرنے والے ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی کہ وہ دنیا میں لباس پوش ہوں گی مگر آخرت کے حکم کے اعتبار سے ننگی ہوں گی، یعنی جو کپڑے دیکھنے میں عمدہ خوبصورت اور باریک معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے جالی اور نائیلون وغیرہ کے کپڑے کہ جن کا عورتوں کے لئے استعمال کرنا از روئے شرع ممنوع ہے ایسے کپڑے والی عورتیں آخرت میں ننگی ہوں گی۔

اس حدیث سے ان عورتوں کو خاص طور پر عبرت حاصل کرنی چاہئے جو آج کے فیشن زدہ دور میں کپڑوں کے معاملہ میں انتہائی بے راہ روی اور غیر شرعی طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور ایسے ایسے کپڑے استعمال کرتی ہیں جو خدا اور خدا کے رسول کی مرضی کے خلاف اور آخرت کے عذاب کا موجب ہیں۔

مائیں اور بہنیں کان کھول کر سن لیں کہ دنیا چاہے جتنی فیشن زدہ ہو جائے، تہذیب و تمدن چاہے جتنے عروج پر پہنچ جائیں اور انسان کی ذہنی و فکری اور عملی جولانیاں چاہے چاند کو مسخر کرلیں، اسلام اور پیغمبر اسلام کے وہ فرمان جو آج سے چودہ سو سال پہلے جاری ہوئے تھے آج بھی پوری طرح موجود ہیں، ان کی اہمیت اور ان پر عمل کرنے کی شدت کسی حال میں بھی ختم نہیں ہو سکتی، اسلامی اور شرعی احکام کا دقیانوسیت کے الفاظ سے مذاق اڑا کر، فیشن کا نام لے کر آج بھلے کوئی عورت اپنی ظاہری زندگی کو اور دنیا کی نظروں میں جاذب نظر دیدہ زیب اور ماڈرن معزز بنالے مگر اسے یاد رکھ لینا چاہئے کہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی اور موجودہ فیشن کے فانی رنگ و روپ کو ختم کر کے ایک دن اسے اس خدا کی بارگاہ میں پہنچنا ہے جو غفار رحیم ہونے کے ساتھ ساتھ جبار و قہار بھی ہے اور پھر انہیں وہاں اپنی بد عملیوں کا جواب دینا ہوگا۔

رحمت خداوندی کے نزول کا وقت

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰی كُلَّ لَیْلَةٍ اِلَی السَّمَآءِ الدُّنْیَا حِیْنَ یَبْقٰی ثُلُثُ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ وَیَقُوْلُ مَنْ یَّدْعُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبُ لَهٗ مَنْ یَّسْاَلُنِیْ فَاُعْطِیَهٗ مَنْ یَّسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرُ لَهٗ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِّمُسْلِمٍ ثُمَّ یَبْسُطُ یَدَیْهِ یَقُوْلُ مَنْ یُّقْرِضُ غَیْرَ عَدُوْمٍ وَّلَا ظَلُوْمٍ حَتّٰی یَنْفَجِرَ الْفَجْرُ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا" ہر رات میں آخر تہائی رات کے وقت ہمارا بزرگ و برتر پروردگار دنیا کے آسمان (یعنی نیچے کے آسمان) پر نزول فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اسے قبولیت بخشوں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت کا طلبگار ہو اور میں اسے بخشوں؟ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ پھر اللہ جل شانہ اپنے (لطف و رحمت کے) دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے اور کہتا ہے کہ کون ہے جو ایسے کو قرض دے جو نہ فقیر ہے اور نہ ظلم کرنے والا ہے اور صبح تک یہی فرماتا رہتا ہے۔"

تشریح: یَنْزِلُ رَبُّنَا (ہمارا رب نزول فرماتا ہے) کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ جل شانہ خود آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے کیونکہ وہ جسم کی ثقالت و کثافت سے پاک و صاف ہے اور ایسا نور ہے جو ہمہ وقت کائنات کے ذرہ ذرہ پر محیط و حاوی ہے اور کسی خاص مقام و کسی وقت کا پابند نہیں ہے۔

چنانچہ حضرت علامہ ابن حجرؒ اور امام مالک نے اس کی تاویل کرتے ہوئے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ "اللہ جل شانہ کا فرمان، اس کی رحمت یا اس کے ملائکہ اس وقت آسمان دنیا پر اترتے ہیں (اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ اعلان کرتے ہیں) چنانچہ اس کی تائید ایک حدیث صحیح سے بھی ہوتی ہے جو مرقات میں مذکور ہے، یا پھر یہ کہا جائے کہ یہ ارشاد متشابہات میں سے ہے جس کے حقیقی معنی و مطلب اللہ جل شانہ ہی جانتا ہیں۔

مَنْ يَدْعُوْنِیْ دعا کے معنی ہیں پکارنا جیسا کہ بندہ کہے "یا رب" اس کے مقابلہ پر اجابت اور قبولیت ہوتی ہے جیسے کہ پروردگار بندہ کے اس پکارنے کے جواب میں کہے "لبیک عبدی"

مَنْ يَسْأَلُنِیْ سوال کے معنی ہیں "کسی کا مانگنا اور اس کا طلب کرنا" اور اس کے مقابلہ میں سوال کا پورا کرنا ہے یعنی جو چیز طلب کی جائے اور مانگی جائے اس کا دینا۔

یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں منقول ہے کہ "اللہ جل شانہ (آسمان دنیا پر) اس وقت نزول فرماتا ہے جب اوّل تہائی رات گذر جاتی ہے" نیز اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں منقول ہے کہ "اس وقت نزول فرماتا ہے جب آدھی رات یا دو تہائی رات گذرتی ہے" کیونکہ احتمال ہے کہ بعض صورتوں میں تو نزول آخری تہائی رات کے وقت، بعض راتوں میں اوّل تہائی رات کے گذرنے کے بعد اور بعض راتوں میں آدھی یا دو تہائی رات گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔

مَنْ يُقْرِضُ کون ہے جو قرض دے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کون ہے جو بطریق قرض اور جزا لینے کے لئے بدنی اور مالی عبادت اللہ جل شانہ کو دے جو نہ تو فقیر ہے اور نہ عطا و بخشش سے عاجز ہے نیز یہ کہ نہ ظلم کرنے والا ہے کہ اپنے عہد کو پورا نہ کرے یا ناقص ثواب دے۔ یعنی اس پیرایہ سے مسلمانوں کو دنیا میں نیک و صالح عمل کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ کون خوش نصیب اور باسعادت مسلمان ہے جو آخرت کی سعادتوں و راحتوں اور وہاں کے ثواب کی امید میں اس غنی پروردگار کے لئے دنیا میں نیک عمل کرے جو اس کے حق یعنی آخرت میں دنیا کے نیک عمل کا ثواب دینے میں عاجز نہیں ہے اور کون خوش نصیب و سعادت مند مؤمن ہے جو اس عادل اللہ کے لئے دنیا میں نیک عمل کرتا ہے تو اللہ جل شانہ اس کا ثواب اس کے عمل سے بھی کئی گنا زیادہ کر کے دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بطور خاص قابل غور ہے کہ یہاں اللہ جل شانہ کی تعریف بایں طور کی گئی ہے کہ اس کی پاک ذات سے ان دونوں صفت یعنی فقر اور ظلم کی نفی کی گئی ہے کیونکہ قرض کی واپسی کے سلسلہ میں یہی دونوں صفتیں حائل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی عاجز و فقیر ہوتا ہے تو وہ قرض کی واپسی سے معذور ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ظالم ہوتا ہے تو اپنے ظلم کی بنا پر قرض کی پوری ادائیگی نہیں کرتا بلکہ اس میں کمی و نقصان کر کے واپس کر دیتا ہے اور اللہ جل شانہ کی ذات ان دونوں صفتوں سے پاک ہے۔

نہ تو وہ ظالم ہے اور نہ عاجز فقیر ہے بلکہ عادل ہے اور غنی ہے لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دنیا میں بھلائی کرے گا اور نیک عمل کرے گا وہ اللہ جل شانہ کے پاس عقبیٰ میں کامل جزاء اور ثواب پائے گا۔

ہر رات میں قبولیت کی ایک ساعت ہوتی ہے

(۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ فِی اللَّيْلِ لَسَاعَةً لَا يُوَافِقُهَا رَجُلٌ مُّسْلِمٌ يَسْأَلُ اللّٰهَ فِيْهَا خَيْرًا مِّنْ اَمْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِلَّا اَعْطَاهُ اِيَّاهُ وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ رات میں ایک ایسی ساعت آتی ہے کہ جو مسلمان اسے پاتا ہے اور اس میں اللہ جل شانہ سے دنیا یا آخرت کی کسی بھلائی کا سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے (ضرور) پورا فرماتا ہے اور (قبولیت کی) یہ ساعت ہر رات میں آتی ہے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ہر شب میں ایک گھڑی ضرور آتی ہے جو قبولیت کی بشارت اپنے دامن میں لئے ہوئی آتی ہے جس باسعادت و خوش نصیب مسلمان کو وہ ساعت اور وہ گھڑی نصیب ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس میں جل شانہ کے سامنے اپنی جس دنیاوی اخروی بھلائی کے لئے درخواست پیش کرتا ہے بامراد و کامیاب ہوتا ہے اور اس کی درخواست بارگاہ رب العزت سے قبولیت کا درجہ پاتی ہے ہاں وہ قبولیت اللہ جل شانہ کی طرف سے عطاو بخشش حکماً بھی ہو سکتی ہے اور حقیقۃً بھی۔

ساعت قبولیت کے تعین کے بارہ میں علماء کے یہاں اختلاف ہے چنانچہ بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ یہ ساعت مبہم ہے جیسے لیلۃ القدر اور ساعت جمعہ کہ ان میں کسی خاص وقت کے بارہ میں تعین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ساعت فلاں وقت اور فلاں ٹائم آتی ہے اسی طرح ہر رات میں بھی قبولیت کی ساعت کا کوئی خاص وقت اور ٹائم مقرر نہیں ہے بلکہ کسی بھی وقت آجاتی ہے بعض علماء کہتے ہیں کہ نصف شب کا وقت ساعت قبولیت ہے واللہ اعلم۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز اور روزے

(۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الصَّلَاةِ اِلَى اللّٰهِ صَلَاةُ دَاوُدَ وَاَحَبُّ الصِّيَامِ اِلَى اللّٰهِ صِيَامُ دَاوُدَ كَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَيَقُوْمُ ثُلُثَهٗ وَيَنَامُ سُدُسَهٗ وَيَصُوْمُ يَوْمًا وَّيُفْطِرُ يَوْمًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کو تمام نمازوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز زیادہ پسند اور تمام روزوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے زیادہ پسند ہیں (ان کی نماز کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ) وہ آدھی رات سوتے اور تہائی رات قیام کرتے (یعنی نماز پڑھتے) اور پھر رات کے چھٹے حصہ میں سوتے اور وہ (روزہ اس طرح رکھتے تھے کہ) ایک دن تو روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز اور ان کے روزے کا یہ طریقہ بہت پسند تھا اس لئے اس طریقہ کے مطابق پڑھی جانے والی نفل نماز اور رکھے جانے والے نفل روزے اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔

مذکورہ بالا طریقہ سے رات میں پڑھی جانے والی نماز اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب اس لئے ہے کہ جب کوئی شخص رات کے دو تہائی حصے سوئے گا اور اس کا نفس اتنی دیر تک آرام کرلے گا تو اس کی عبادت پوری فرحت بشاشت اور قلب و دماغ کے پورے نشاط کے ساتھ ادا ہوگی۔

اس طرح مذکورہ بالا طریقہ سے رکھے جانے والے روزے بھی اس لئے پسندیدہ ہیں کہ اس میں نفس کو بہت زیادہ محنت و مشقت ہوتی ہے جو حاصل عبادت ہے۔

رات کی عبادت میں آنحضرت ﷺ کا معمول

(۸) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ تعنی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنَامُ اَوَّلَ اللَّيْلِ وَيُحْيِيْ اٰخِرَهٗ ثُمَّ اِنْ كَانَتْ لَهٗ حَاجَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ قَضٰى حَاجَتَهٗ ثُمَّ يَنَامُ فَاِنْ كَانَ عِنْدَ النِّدَآءِ الْاَوَّلِ جُنُبًا وَثَبَ فَاَفَاضَ عَلَيْهِ الْمَاءَ وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ جُنُبًا تَوَضَّأَ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ (رات اس طرح بسر کرتے تھے کہ) آپ ﷺ رات کے ابتدائی حصہ میں تو سوتے تھے اور رات کے آخری حصہ کو زندہ رکھتے (یعنی بیدار رہتے اور عبادت کرتے) تھے پھر اگر آپ کو اپنی زوجہ مطہرہ سے (ہم بستری کی) ضرورت ہوتی تو اپنی ضرورت پوری کرتے اور سو جاتے، چنانچہ اگر آپ (فجر کی) پہلی اذان کے وقت حالت ناپاکی میں ہوتے تو اٹھتے اور

اپنے بدن پر پانی ڈالتے (یعنی نہاتے) اور اگر ناپاکی کی حالت میں نہ سوتے تو نماز کے لئے وضو کرتے اور پھر فجر کی سُنّت کی دو رکعتیں پڑھتے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: شمائل میں حضرت عائشہؓ سے یہ روایت تفصیلی طور پر اس طرح بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا "آنحضرت ﷺ رات کے ابتدائی حصہ میں (یعنی عشاء کی نماز کے بعد سے آدھی رات تک) سوتے پھر سدس رابع و خامس یعنی چوتھے و پانچویں و چھٹے حصہ میں تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے جب سحر کا وقت ہوتا تو وتر پڑھتے پھر بستر پر (آرام فرمانے کے لئے) تشریف لے آتے (کیونکہ نماز تہجد وغیرہ سے فراغت کے بعد اور نماز فجر سے پہلے کچھ دیر تک آرام کرنا مستحب ہے تاکہ فجر کی نماز اور اس کے بعد کے اوراد و ظائف کی ادائیگی کے لئے بشاشت و قوت حاصل ہو سکے) پھر اگر (کسی دن) آپ کو اپنی زوجہ مطہرہ سے ہم بستری کی ضرورت ہوتی تو اسے پوری کرتے یہاں تک کہ آپ ﷺ (فجر کی) اذان سن کر اٹھتے اور اگر حالت ناپاکی میں ہوتے تو اپنے بدن پر پانی ڈالتے یعنی نہاتے) اور اگر حالت ناپاکی میں نہ ہوتے تو وضو کرتے اور (فجر کی سُنّت کی دونوں رکعتیں گھر ہی میں پڑھ کر) نماز کے لئے باہر (مسجد میں) تشریف لے جاتے۔

اس تفصیل کی روشنی میں حدیث بالا کے ابتدائی جز "رات کے ابتدائی حصہ میں سوتے اور رات کے آخری حصہ کو زندہ رکھتے تھے" کے معنی واضح ہو گئے ہیں۔

بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ وظیفہ زوجیت سے فراغت کے بعد وضو کرتے ہوں گے، اس کے بعد پھر سوتے ہوں گے۔

"ندا اول" (پہلی اذان) سے مراد اذان متعارف ہے اور "دوسری اذان" تکبیر کو کہتے ہیں۔

حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ آدھی رات تو سوتے تھے اور آدھی رات اپنے پروردگار کی عبادت میں گذارتے تھے، کیونکہ اول سدس یعنی رات کے ابتدائی چھٹے حصہ میں عشاء تک جاگتے تھے پھر عشاء کے بعد دوسرے تیسرے سدس میں آرام فرماتے تھے پھر چوتھے اور پانچویں سدس میں بیدار رہتے اور چھٹے سدس میں سو جاتے اس طرح تین سدس تو آپ ﷺ سوتے اور تین سدس بیدار رہتے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نماز تہجد پڑھنے کی تاکید و فضیلت

(۹) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَاِنَّهٗ دَأْبُ الصَّالِحِيْنَ قَبْلَكُمْ وَهُوَ قُرْبَةٌ لَكُمْ اِلٰى رَبِّكُمْ وَمُكَفِّرَةٌ لِّلسَّيِّاٰتِ وَمَنْهَاةٌ عَنِ الْاِثْمِ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "قیام لیل (یعنی نماز تہجد پڑھنے کو) ضروری جانو کیونکہ (اول تو) یہ طریقہ تم سے پہلے کے نیک لوگوں کا ہے اور پھر (دوسرے یہ کہ) قیام لیل تمہارے لئے پروردگار کی نزدیکی اور گناہوں کے دور ہونے کا سبب ہے، نیز یہ کہ تمہیں گناہوں سے باز رکھنے والا ہے۔" (ترمذی)

تشریح: "نیک لوگوں" سے مراد پہلے زمانے کے انبیاء اور اولیاء ہیں گویا اس طرح آنحضرت ﷺ اپنی اُمت کے لوگوں کو تنبیہ فرما رہے ہیں کہ تمہیں تو یہ نماز بطریق اولی پڑھنی چاہئے کیونکہ تم تو پہلے کی تمام امتوں سے بہتر اور اعلی ہو۔

یہ حدیث اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جو لوگ تمام فرائض کی نماز تو پڑھتے ہیں لیکن تہجد کی نماز نہیں پڑھتے تو وہ صالحین کاملین کے زمرہ میں داخل نہیں ہیں بلکہ ان کا درجہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ظاہری طور پر زکوٰۃ دینے والوں کا درجہ ہوتا ہے ان لوگوں کے مقابلہ پر جو پوشیدہ

طور پر زکوٰۃ دیتے ہیں۔

نماز تہجد پڑھنے والوں کی خوش بختی

⑩ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَۃٌ یَضْحَکُ اللّٰہُ اِلَیْھِمُ الرَّجُلُ اِذَا قَامَ بِاللَّیْلِ یُصَلِّیْ وَالْقَوْمُ اِذَا صَفُّوْا فِی الصَّلٰوۃِ وَالْقَوْمُ اِذَا صَفُّوْا فِیْ قِتَالِ الْعَدُوِّ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "تین (قسم کے) لوگ ایسے ہیں جن کی طرف (دیکھ کر) اللہ جل شانہ ہنستا ہے (یعنی ان سے بے حد خوش ہوتا ہے اور ان کی طرف اپنی رحمت و عنایت کی نظر فرماتا ہے) ① وہ شخص جو رات میں تہجد کی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے ② وہ لوگ جو نماز پڑھنے کے لئے اپنی صفوں کو درست کرتے ہیں ③ وہ لوگ جو دشمنوں سے لڑنے کے لئے (یعنی جہاد کے وقت) صف بندی کرتے ہیں۔" (شرح السنۃ)

آخری شب میں ذکر کی فضیلت

⑪ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَنْبَسَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقْرَبُ مَایَکُوْنُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَکُوْنَ مِمَّنْ یَّذْکُرُ اللّٰہَ فِیْ تِلْکَ السَّاعَۃِ فَکُنْ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ اِسْنَادًا۔

"اور حضرت عمرو بن عنبسہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "پروردگار اپنے بندہ سے سب سے زیادہ قریب آخری شب میں ہوتا ہے لہٰذا اگر تم بھی اس وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں میں ہوسکتے ہو تو ضرور ہو (یعنی اس بات کی کوشش کرو کہ تم بھی ان خوش نصیب مسلمانوں میں شمار کئے جاؤ جو اس وقت اپنے پروردگار کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں اور سعادت و خوش بختی کے خزانے اپنے دامن میں سمیٹ کر پروردگار کی رضا و خوشنودی کو اپنے قریب تر پاتے ہیں) امام ترمذیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور سند کی وجہ سے غریب ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رات کا آخری حصّہ بایں طور افضل و اشرف ہے کہ وہ اپنے دامن میں پروردگار کی رحمتوں اور اس کی عنایتوں کے خزانے سمیٹے ہوئے ہوتا ہے، اب یہ قسمت اور مقدر والوں کی بات ہے کہ کون اس خزانے سے مستفید ہوتا ہے اور کون محروم رہ جاتا ہے۔

چنانچہ جن کی طبیعت سعادت مند ہوتی ہے وہ رات کے اس حصّہ میں اٹھ کر رحمت خداوندی کے خزانے سے اپنے دامن کو بھرتے ہیں اور جو حرماں نصیب ہوتے ہیں وہ شیطان کی لوریاں کھا کھا کر نہ صرف اپنے دل و دماغ اور جسم کو نیند کے حوالے کئے ہوتے ہیں بلکہ ان کی سعادت اور ان کی خوش بختی بھی غفلت و سستی کی نذر ہو جاتی ہے۔

بہر حال پروردگار کا اپنے بندہ سے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رضا و خوشنودی بندہ سے قریب تر ہوتی ہے اور اس کی رحمتوں کا سایہ بندہ کے اوپر ہوتا ہے

آخری نصف رات سے رات کا وہ حصّہ مراد ہے جس کی ابتداء ثلث آخر (یعنی آخری تہائی) سے ہوتی ہے اور وہی وقت تہجد کی نماز کے لئے اٹھنے کا ہوتا ہے۔

حضرت عمروؓ بن عنبسہ جنہیں لسان نبوت سے حدیث میں مذکورہ سعادت حاصل کرنے کے لئے فرمایا جا رہا ہے حضرت حق جل مجدہ کی درگاہ کبریائی کے ایک مجذوب اور دربار رسالت (ﷺ) کے ایک مقرب اور ذی شان خادم تھے ان کی بہت زیادہ عظمت اور فضیلت ہے

ابتداء ظہور نبوت میں جبکہ آنحضرت ﷺ مکہ میں کفرو شرک سے اکڑی ہوئی گردنوں کو خداء واحد کے حضور میں جھکانے کی سعی میں مصروف تھے اور آپ ﷺ کی تبلیغ کی ابتداء ہو چکی تھی تو حضرت عمرو بن عنبسہؓ اپنے وطن میں تھے یکایک ان کے دل میں نور توحید ضوفشاں ہوا اور شرک و بت پرستی کی کراہیت و نفرت نے بے چین کر دیا، جب ہی سنا کہ ایک شخص مکہ میں پیدا ہوا ہے جو لوگوں کو توحید کی طرف بلاتا ہے اور بتوں کی عبادت سے منع کرتا ہے، یہ سنتے ہی قلب مضطر نے فوراً ہی مکہ پہنچنے پر مجبور کر دیا، انہوں نے مکہ پہنچ کر آنحضرت ﷺ کے بارہ میں دریافت کیا، آنحضرت (فداہ روحی) اس زمانہ میں کفار کی شدید مخالفت اور دشمنان دین کی بے پناہ سختیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے دشمنوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو کر خدا کے دین کی تبلیغ اور اس کی عبادت میں مصروف تھے، حضرت عمرو بن عنبسہ نے لوگوں سے پوچھا کہ "تم میں کون شخص پیدا ہوا ہے جو تمہاری روش اور تمہارے راستہ سے ہٹ کر دوسرے دین کی طرف دنیا کو بلاتا ہے"؟ لوگوں نے کہا کہ "ہاں ایک دیوانہ ہے (آپ ﷺ کی عقل و دانش پر دونوں جہان قربان) جس نے اپنے باپ دادا کا طریقہ اور راستہ چھوڑ دیا ہے اور ایک نئی رسم نکالی ہے

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند

انہوں نے پوچھا کہ "اچھا وہ کہاں ملیں گے"؟ لوگوں نے کہا کہ "وہ شخص آدھی رات کو باہر نکلتا ہے اور اس خانہ کعبہ کے ارد گرد گھومتا ہے۔"

حضرت عمرو بن عنبسہ آدھی رات کے وقت حرم شریف میں آئے اور کعبۃ اللہ کے پردہ مبارک میں چھپ کر کھڑے ہو گئے اچانک دیکھا کہ ایک شخص ظلمتوں کے پردوں کو چیرتا ہوا نور کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے نمودار ہوا، اس شخص کی سراپا کشش، شخصیت اور نورانی چہرہ و جسم کا یہ عالم کہ مہرو ماہ اس کے سامنے شرمندہ اور دنیا کے تمام لوگ اس کے پاک آستانے کی خاک (ﷺ) عمرو فوراً پردہ سے نکل کر باہر آئے اور نمودار ہونے والے شخص کو سلام کیا اور پوچھا کہ "آپ کون ہیں اور آپ کا دین کیا ہے؟" انہوں نے فرمایا کہ "میں خدا کا رسول ہوں (ﷺ) اور میرا دین لا الہ الا اللہ ہے" یہ خوشی سے جھوم اٹھے اور فوراً بولے کہ "میں بھی اس دین کو پسند کرتا ہوں" چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے جبھی ایمان لائے، اس طرح حضرت عمرو بن عنبسہ تیسرے یا چوتھے مسلمان ہیں یعنی ان سے پہلے صرف دو یا تین آدمی ہی اسلام کی دولت سے مشرف ہو سکے تھے۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے انہیں رخصت کیا اور فرمایا کہ "میرے پروردگار نے مجھ سے ایک وعدہ کیا ہے۔ جب وہ وعدہ پورا ہو گا تو میرے پاس آنا" چنانچہ آنحضرت ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے عمرو بن عنبسہ آپ ﷺ کے پاس مدینہ پہنچ گئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل کی اور نگاہ نبوت کی کرشمہ سازی نے آپ ﷺ کو درجہ کمال پر پہنچا دیا۔

عبادت میں ایک دوسرے کی مدد کی جائے

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلّٰى وَاَيْقَظَ امْرَأَتَهٗ فَصَلَّتْ فَاِنْ اَبَتْ نَضَحَ فِیْ وَجْهِهَا الْمَآءَ رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّتْ وَاَيْقَظَتْ زَوْجَهَا فَصَلّٰى فَاِنْ اَبٰى نَضَحَتْ فِیْ وَجْهِهِ الْمَاءَ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو رات میں اٹھ کر (خود بھی تہجد کی) نماز پڑھے اور اپنی بیوی کو بھی جگائے تاکہ وہ بھی نماز پڑھے اور اگر بیوی (نیند کے غلبہ اور کثرت غفلت و سستی کی وجہ سے) نہ جاگے تو (اس کی نیند ختم کرنے کے لئے) اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے اور اللہ تعالیٰ اس عورت پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو رات میں اٹھ کر (خود بھی تہجد کی) نماز پڑھے اور اپنے خاوند کو جگائے تاکہ وہ بھی نماز پڑھے اور اگر شوہر (غلبہ نیند و سستی کی وجہ سے) نہ جاگے تو وہ اس کے منہ

پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "رات میں اٹھ کر نماز پڑھنے" سے مراد تہجد کی ہی نماز ہے لیکن اگر مرد و عورت کسی کی بھی کوئی نماز قضا ہو گئی ہو اور اس وقت اس کے ذمہ قضا ہو تو قضا نماز کا پڑھنا ہی اس وقت اولیٰ ہو گا۔

"منہ پر پانی کے چھینٹے دینے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کو نماز پڑھنے اور پروردگار کی عبادت کے لئے بیدار کرنے کے واسطے جس طرح بھی ممکن ہو، سعی و کوشش کرے۔

بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ خاوند و بیوی جس طرح سماجی زندگی اور دنیاوی امور میں ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہوتے ہیں اسی طرح انہیں دینی امور، طاعت الٰہی اور عبادت خداوندی کے بارہ میں بھی ایک دوسرے کا مددگار و معاون بننا چاہئے اور اگر کسی وقت بیوی نماز نہ پڑھے تو شوہر کا حق ہے کہ وہ اسے جس طرح بھی ممکن ہو نماز پڑھنے پر مجبور کرے۔ اسی طرح اگر خاوند نماز پڑھنے میں تساہل و سستی کرے یا کسی ایسی وجہ سے نماز پڑھنے سے رک جائے جو نماز کی ادائیگی میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے تو بیوی کا حق ہے کہ وہ اسے پوری قوت سے نماز پڑھنے کے لئے کہے اور جو چیز اس کے نماز پڑھنے میں رکاوٹ بن رہی ہے اسے ختم کرے۔ مثلاً اگر میاں بیوی دونوں میں سے کوئی ایک اس طرح غفلت میں پڑا ہوا ہے کہ اس کی نماز خواہ فرض نماز ہو یا تہجد وغیرہ کی نماز رہی جاتی ہو تو دونوں میں سے جو بھی بیدار ہو وہ دوسرے کو بھی نیند سے اٹھائے اگر وہ نہ اٹھے تو ایسی ترکیب کرے جس سے اس کی نیند ختم ہو جائے اور وہ اٹھ کر نماز پڑھ سکے۔

اسی طرح کسی ایک جگہ اجتماعی طور پر رہنے والے لوگوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں اور رفیقوں میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن کر رہیں اور ایک دوسرے کو نماز پڑھنے اور عبادت خداوندی میں مشغول و مصروف رکھنے کی کوشش کریں۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ کسی شخص پر بھلائی کے معاملہ میں جبر کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔

قبولیت دعا کا وقت

(۱۳) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الدُّعَآءِ اَسْمَعُ قَالَ جَوْفُ اللَّیْلِ الْاٰخِرُ وَدُبُرُ الصَّلٰوۃِ الْمَکْتُوْبَاتِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) سرور کونین ﷺ سے پوچھا گیا کہ "یا رسول اللہ! کس وقت کی دعا بہت زیادہ مقبول ہوتی ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "آخری تہائی رات میں اور فرض نمازوں کے بعد۔" (ترمذی)

اعمال صالحہ کرنے والوں کے لئے بشارت

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ مَالِكِ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ غُرَفًا یُّرٰی ظَاهِرُهَا مِنْ بَاطِنِهَا وَ بَاطِنُهَا مِنْ ظَاهِرِهَا اَعَدَّهَا اللّٰہُ لِمَنْ اَلَانَ الْکَلَامَ وَاَطْعَمَ الطَّعَامَ وَتَابَعَ الصِّیَامَ وَصَلّٰی بِاللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ رَوَاہُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَرَوَی التِّرْمِذِیُّ عَنْ عَلِیٍّ نَحْوَہٗ وَفِیْ رِوَایَتِهٖ لِمَنْ اَطَابَ الْکَلَامَ۔

"اور حضرت ابومالک اشعریؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جنت میں ایسے بالاخانے ہیں جن کے باہر کی چیزیں اندر اور اندر کی چیزیں باہر دکھائی دیتی ہیں اور یہ بالاخانے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے تیار کئے جو دوسرے لوگوں سے نرمی سے بات کرتے ہیں (غریب و ناداروں کو) کھانا کھلاتے ہیں، پے درپے (یعنی اکثر) نفل روزے رکھتے ہیں اور رات میں ایسے وقت (تہجد کی) نماز پڑھتے ہیں جب کہ (اکثر) لوگ نیند کی آغوش میں ہوتے ہیں۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ نیز ترمذیؒ نے بھی اس طرح کی روایت حضرت علیؓ سے نقل کی ہے مگر ان کی روایت میں لمن اطاب الکلام کے الفاظ ہیں (اور دونوں کے معنی ایک ہی ہیں)۔"

تشریح: بعض علماء فرماتے ہیں کہ حدیث میں پے در پے نفل روزے رکھنے کے بارہ میں جو فرمایا گیا ہے تو اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ ہر مہینے میں کم سے کم تین روزے بہ نیت نفل رکھے جائیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

نماز تہجد کو ترک کرنے کی ممانعت

⑮ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا عَبْدَاللّٰهِ لَا تَکُنْ مِثْلَ فُلَانٍ کَانَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ فَتَرَکَ قِیَامَ اللَّیْلِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے (ایک روز) مجھ سے فرمایا کہ "عبداللہ (دیکھو) فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا کہ وہ رات میں قیام کرتا تھا (یعنی تہجد کی نماز پڑھتا تھا) پھر بعد میں رات کے قیام کو اس نے چھوڑ دیا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: کوئی صحابی ہوں گے جو پہلے تو تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے مگر پھر بعد میں بغیر کسی عذر کے محض نفس کی خواہش میں مبتلا ہو کر اس عظیم سعادت سے کنارہ کشی کر بیٹھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو کو متنبہ فرمایا کہ دیکھو کہیں تم بھی انہیں کی طرح نماز تہجد کو چھوڑ کر فریب نفس میں مبتلا نہ ہو جانا کیونکہ ایسے لوگ جو نیک عمل کی عادت اور اپنے معمولات دینی کو بغیر کسی عذر و مجبوری کے چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں وہ ان لوگوں کے سلسلہ میں داخل ہو جاتے ہیں جن کے بارہ میں صحیح فیصلہ یہی ہے کہ تَارِکُ الْوِرْدِ مَلْعُوْنٌ (یعنی معمولات دینی کو چھوڑنے والا ملعون ہے)

گویا اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ عبادت خداوندی کو ترک کر دینا اور عادت یعنی نفسانیت کے غلط راستہ کی طرف لوٹنا در حقیقت سعادت مندی اور صلاح و فلاح میں زیادتی کے بعد نقصان کا واقع ہو جانا ہے جس سے آنحضرت ﷺ نے بایں طور پناہ مانگی ہے کہ نعوذ باللہ من الحور بعد الکور (یعنی ہم زیادتی کے بعد نقصان کے واقع ہو جانے سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔

لہٰذا راہ طریقت و شریعت کے سالک کو چاہئے کہ نہ صرف کہ وہ اپنی عبادت خداوندی اور ذکر اللہ کی عادت کو ترک نہ کرے اور اس میں کمی نہ اختیار کرے بلکہ ان میں زیادتی ہی کا طالب رہے کیونکہ یہ کہا گیا ہے "جو شخص زیادتی کا طالب نہیں ہے وہ نقصان کے راستہ پر ہے۔"

رات میں حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت اور ساعت قبولیت

⑯ وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ کَانَ لِدَاوٗدَ عَلَیْهِ السَّلَامُ مِنَ اللَّیْلِ سَاعَةٌ یُوْقِظُ فِیْهَا اَهْلَهٗ یَقُوْلُ یَا اٰلَ دَاوٗدَ قُوْمُوْا فَصَلُّوْا فَاِنَّ هٰذِهٖ سَاعَةٌ یَسْتَجِیْبُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِیْهَا الدُّعَآءَ اِلَّا لِسَاحِرٍ اَوْ عَشَّارٍ۔

(رواہ احمد)

"اور حضرت عثمان بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے رات (کے آخری نصف حصہ) میں ایک وقت (مقرر) تھا جس میں وہ اپنے اہل خانہ کو جگاتے اور فرماتے کہ "اے آل داؤد! اٹھو اور نماز پڑھو کیونکہ یہ ایسا وقت ہے جس میں اللہ بزرگ و برتر دعا کو قبول فرماتا ہے سوائے جادوگر اور عشار (کی دعا) کے (یعنی ان دونوں کی دعا اس وقت بھی قبول نہیں ہوتی)۔" (احمدؒ)

تشریح: عشار سے چوکیدار قسم کے وہ راہزن مراد ہیں جو راستوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور لوگوں کے مال از راہ ظلم لے لیتے ہیں، اس سے وہ

عمال بھی مراد لئے جاسکتے ہی جو محصول وغیرہ کی وصولیابی کے لئے مقرر ہوتے ہیں اور ناجائز وغلط طریقہ پر لوگوں سے ان کے مال واسباب غصب کرتے ہیں۔

بہرحال حاصل یہ ہے کہ اس مقدس ساعت اور رحمت خداوندی کے عام فیضان کے اس بابرکت موقع پر بھی ساحر یعنی جادوگر اور عشار کی دعا قبول نہیں ہوتی کیونکہ ان لوگوں سے مخلوق خدا کو بہت تکلیف پہنچتی ہے اور پروردگار عالم ان لوگوں کے ساتھ کبھی بھی بہتر معاملہ نہیں فرماتا جو اس کی مخلوق کے لئے ایذا رسانی اور تکلیف ومصیبت کا سبب بنتے ہیں، اسی وجہ سے بعض عارفین کا یہ عارفانہ ارشاد ہے کہ "کمال عبودیت یعنی پوری طرح اللہ کا بندہ ہو جانا چاہئے کہ حکم خداوندی کی تعظیم کی جائے اور مخلوق خدا کے ساتھ شفقت و مہربانی کا برتاؤ کیا جائے۔

نماز تہجد کی فضیلت

(۱۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَفْضَلُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الْمَفْرُوْضَةِ صَلَاةٌ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز رات میں پڑھی جانے والی (یعنی تہجد کی) نماز ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: حضرت میرکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابی اسحٰق مروزی شافعیؒ کے اس قول کی دلیل ہے کہ تہجد کی نماز سنن رواتب سے افضل ہے جبکہ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ سنن رواتب افضل ہیں، چنانچہ ابواسحٰق مروزیؒ ہی کا قول قوی تر ہے کیونکہ یہ حدیث صراحت کے ساتھ ان کے قول کی تائید کر رہی ہے۔

بہرحال اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ نماز تہجد بایں طور افضل ہے کہ اس نماز میں نفس بہت زیادہ مشقت میں مبتلا ہوتا ہے اور اس نماز کو پڑھنے والا ریا و نمائش سے بعید ہوتا ہے اور سنن رواتب بایں جہت افضل ہیں کہ فرض نمازوں کے ساتھ ان کے پڑھنے کی بہت تاکید کی گئی ہے نیز یہ کہ سنن رواتب فرض نمازوں کے لئے متمم ہیں یعنی ان کے ذریعہ فرض نمازیں درجہ کمال و اتمام کو پہنچتی ہیں، لہٰذا اس طرح دونوں کی افضلیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے اور دونوں اقوال میں کوئی منافات نہیں ہے، یا پھر رات کی نماز کی فضیلت کے بارہ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رات کی نماز اس لئے افضل ہے کہ یہ وتر پر بھی مشتمل ہے اور وتر واجب ہے۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کے بارہ میں منقول ہے کہ انتقال کے بعد انہیں کسی نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ پروردگار نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ:

تاهت العبادات وفنيت الاشارات ومانفعنا الا ركعات صلينا ها في جوف الليل۔

"وہ باتیں جو میں حقائق و معارف کے بیان میں کہتا تھا جاتی رہیں اور وہ نکات جو میں بیان کیا کرتا تھا ختم ہو گئے مجھے تو صرف نماز کی ان چند رکعتوں نے فائدہ دیا جو نصف شب میں پڑھا کرتا تھا۔"

گویا طالبین راہ حقیقت و شریعت اور سالکین راہ طریقت کو ترغیب دلائی گئی کہ تصوف و طریقت کے حکمات و نکات کے پیچھے نہ پڑو اور گفتار کے نہیں کردار کے غازی بنو، عملی زندگی کو سنوارنے اور خدا کی بندگی کی راہ پر لگانے کی پوری پوری کوشش کرو اور عبادت و ریاضت کا پورا پورا اہتمام کرو کیونکہ اسی میں دنیا کی بھی بھلائی ہے اور آخرت کی بھی۔

کار کن کار، بگزر از گفتار کاندریں راہ کار دارد کار

تہجد کی نماز برائی سے روکتی ہے

(۱۸) وَعَنْهُ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ فُلَانًا یُصَلِّی بِاللَّیْلِ فَاِذَا اَصْبَحَ سَرَقَ فَقَالَ اِنَّہٗ سَیَنْھَاہُ مَا تَقُوْلُ۔ (رواہ احمد و البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص سرور کونین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ فلاں شخص رات کو تو نماز پڑھتا ہے مگر صبح اٹھ کر چوری کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا "عنقریب اس کی نماز اسے اس چیز سے روک دے گی جو تم کہہ رہے ہو۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: نماز کی خاصیت ہے کہ وہ انسان کو برائی کے راستہ سے روکتی ہے اور نیکی کے راستہ پر گامزن کرتی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔

"نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔"

چنانچہ آنحضرت ﷺ کے سامنے جب ایک ایسے شخص کا ذکر کیا گیا جو رات میں تو عبادت خداوندی یعنی نماز تہجد میں مشغول رہتا ہے اور صبح اٹھ کر چوری جیسے برے فعل کا مرتکب ہوتا تھا تو آپ ﷺ نے یہی فرمایا کہ اگر وہ خلوص نیت اور جذبہ خالص کے تحت رات کی نماز پر مداومت کرتا ہے تو انشاء اللہ جلد ہی اللہ تعالیٰ اس نماز کی برکت سے اسے اس فعل قبیح سے توبہ کی توفیق عطا فرمادے گا اور اپنے قلب و دماغ میں نماز کی برکت و نورانیت کے اثر کی وجہ سے وہ چوری سے باز رہے گا۔

اہل خانہ کے ہمراہ نماز تہجد پڑھنے کی فضیلت

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَیْقَظَ الرَّجُلُ اَھْلَہٗ مِنَ اللَّیْلِ فَصَلَّیَا اَوْ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ جَمِیْعًا کُتِبَا فِی الذّٰکِرِیْنَ وَالذّٰکِرَاتِ۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری و حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی شخص رات میں بیوی کو جگائے اور وہ دونوں نماز پڑھیں، یا یہ فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک دو رکعتیں اکٹھی پڑھیں تو وہ (دونوں) ذکر کرنے والے مردوں اور ذکر کرنے والی عورتوں (کے زمرہ) میں لکھے جاتے ہیں۔" (ابوداؤد و ابن ماجہ)

تشریح: حدیث میں لفظ "اہل" سے مراد صرف بیوی بھی لی جا سکتی ہے اور بیوی اولاد، غلام اور لونڈیاں بھی مراد لی جا سکتی ہیں۔ درمیان روایت راوی کو شک واقع ہو گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لفظ فَصَلَّیَا (یعنی اور وہ دونوں نماز پڑھیں) فرمایا ہے، یا لفظ صلی (یعنی ہر ایک دو رکعتیں اکٹھی پڑھیں) فرمایا ہے۔ بہرکیف یہ صرف لفظی اختلاف ہے دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

ذکر کرنے والے مردوں اور ذکر کرنے والی عورتوں سے قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا۔

"اور اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے مرد اور عورتیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مغفرت اور بہت زیادہ ثواب (کا اجر و انعام) تیار کر رکھا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ جو شخص رات میں خود بھی اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھے گا اور ذکر اللہ میں مشغول رہے گا اور اپنی بیوی و دیگر اہل خانہ کو بھی جگا کر خدا کی عبادت میں مشغول رکھے گا تو ان سب کا شمار ان نیک و باسعادت مرد و عورتوں میں ہوگا جن کی فضیلت اس آیت میں بیان کی جا رہی ہے۔

اُمت میں بلند مرتبہ کون لوگ ہیں

(۲۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَشْرَافُ اُمَّتِیْ حَمَلَۃُ الْقُرْاٰنِ وَاَصْحَابُ اللَّیْلِ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "میری اُمت کے اشراف یعنی بلند مرتبہ لوگ قرآن اٹھانے والے (اور رات (میں اٹھنے) والے ہیں۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "قرآن اٹھانے والے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم یاد کرتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں بایں طور کہ قرآن نے جن امور کو کرنے کا حکم دیا ہے ان کو کرتے ہیں اور جن امور سے منع کیا ہے ان سے بچتے ہیں، آنحضور کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ میری اُمت کے بلند مرتبہ اور باسعادت افراد ہیں، چنانچہ قرآن حفظ کرنے والے اور اس کے احکام کے پابند لوگوں کی فضلیت ایک دوسری روایت میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ "جس شخص نے قرآن حفظ کیا تو بیشک اس پر فیضان نبوت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں مگر اس کے پاس وحی (یعنی وحی جلی) نہیں آتی، البتہ وحی خفی اس کے پاس آتی ہے (یعنی وحی جلی کے مطالب و معارف کا فیضان اس کے قلب و دماغ پر ہوتا ہے) مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم حفظ کرنے والا شخص اس وجہ سے بہت زیادہ فضیلت و سعادت کا پیکر مانا جاتا ہے کہ اس کے قلب کے اندر قرآن کے الفاظ کی شکل میں نور نبوت ودیعت فرمادیا جاتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وحی خفی یعنی قرآن کے ظاہری الفاظ کے مطالب و معارف کا فیضان اس کے قلب و دماغ کو منور کر دیتا ہے اور قرآن کے الفاظ کے نور کی برکت سے وحی جلی پر جو کہ انبیاء کا مخصوص حصہ ہے اس کا ایمان و ایقان قوی تر ہو جاتا ہے۔

علامہ یحییٰؒ کہتے ہیں کہ "قرآن حفظ کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن یاد کرے اور اپنی عملی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھالے، بایں طور کہ قرآن نے جو احکام دیے ہیں ان پر پورے قلبی خلوص اور مداومت کے ساتھ عمل کرے ورنہ تو محض قرآن یاد کرنے والا اور اس پر عمل کرنے والا ان لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کے بارہ میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ:

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا۔

"یعنی (جو لوگ حافظ قرآن ہوں مگر عامل قرآن نہ ہوں تو) وہ ایسے ہیں جیسے کہ گدھے پر کتابیں لاد دی جائیں۔"

یعنی جس طرح کہ گدھے پر کتابیں لاد دینے سے گدھے کو ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں پہنچتا بالکل اسی طرح قرآن پر عمل نہ کرنے والے حافظ کو بھی قرآن حفظ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور وہ سعادت و مرتبہ کے اعتبار سے کسی بھی حیثیت میں نہیں ہوتا۔

اَصْحَابُ اللَّیْلِ (رات والے) سے مراد وہ لوگ ہیں جو نماز و قرآن پڑھنے کے لئے شب بیداری پر مداومت کرتے ہیں یعنی پابندی کے ساتھ روزانہ رات میں اٹھتے ہیں اور عبادت خداوندی و ذکر اللہ میں مشغول ہوتے ہیں ایسے لوگ خدا اور خدا کے رسول کی نظروں میں بڑی فضیلت کے حامل ہوتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق اُمت مرحومہ کے بلند مرتبہ افراد میں شمار کئے جاتے ہیں۔

رات کی عبادت کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا معمول

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ اَبَاهُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ مَاشَاءَ اللّٰهُ حَتّٰى اِذَا كَانَ مِنْ اٰخِرِ اللَّيْلِ اَيْقَظَ اَهْلَهٗ لِلصَّلٰوةِ يَقُوْلُ لَهُمُ الصَّلٰوةُ ثُمَّ يَتْلُوْ هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْاَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ان کے پدر بزرگوار حضرت عمر بن خطابؓ رات میں جس قدر اللہ چاہتا نماز پڑھتے رہتے اور رات

جب آخر ہوتی تو اپنی زوجہ محترمہ کو نماز پڑھنے کے لئے اٹھاتے اور فرماتے کہ "نماز پڑھو، پھر یہ آیت پڑھتے وَأْمُرْ اَھْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (اور اے محمد ﷺ) اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیئے اور خود بھی اس (کی مشقتوں) پر صبر کیجئے ہم آپ (ﷺ) سے رزق نہیں مانگتے، رزق تو ہم ہی آپ (ﷺ) کو دیتے ہیں اور آخرت (کی بھلائی) تو پرہیز گاروں ہی کے لئے ہے)۔" (مالک)

تشریح: آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے متعلقین اور اہل خانہ کو نماز پڑھنے کی ہدایت کرتے رہیئے اور خود بھی نماز پڑھنے کی مشقتوں محنتوں پر صبر کیجئے اور اس سلسلہ میں آپ ﷺ کے متعلقین کو بھی جو محنت و مشقت اٹھانی پڑے اسے بھی برداشت کیجئے اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی میں مشغول رہئے، اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کیجئے، اسی سے ظاہری و باطنی غناء کے لئے مدد کے طلبگار رہئے اپنے رزق اور معاش کی فکر نہ کیجئے اور دیکھئے ہم آپ (ﷺ) سے رزق نہیں مانگتے کہ اپنے رزق اور اسباب معیشت کے حصول اور دوسروں کے لئے رزق کی ذمہ داری آپ کو جدوجہد اور محنت وسعی کے ایسے بندھنوں میں باندھ دے جو آپ (ﷺ) کے لئے ادائیگی نماز میں رکاوٹ بن جائے جس طرح ہم دوسروں کو رزق دیتے ہیں اسی طرح آپ (ﷺ) کو بھی رزق بخشتے ہیں، آپ (ﷺ) کا کام تو صرف یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کے امور سے منہ موڑ کر اپنے قلب و دماغ کو صرف آخرت کی بھلائی اور اپنے متعلقین کی اصلاح میں مصروف رکھئے اور یہ جان لیجئے کہ عاقبت محمودہ یعنی دنیا اور آخرت دونوں جگہ انجام کار بخیر ہونا صرف متقیوں اور خدا کے نیک بندوں ہی کے لئے ہے۔

بَابُ الْقَصْدِ فِي الْعَمَلِ

اعمال میں میانہ روی اختیار کرنے کا بیان

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جس طرح دنیاوی امور میں افراط و تفریط یعنی حد سے زیادہ زیادتی اور حد سے زیادہ کمی غیر نفع بخش ہے اسی طرح دینی امور یعنی اعمال نفل میں بھی افراط و تفریط مطلوب نہیں ہے بلکہ اس راستہ پر بھی میانہ روی اور ان میں اعتدال اختیار کرنا ہی ضروری ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُفْطِرُ مِنَ الشَّهْرِ حَتّٰى نَظُنَّ اَنْ لَّا يَصُوْمَ مِنْهُ وَيَصُوْمُ حَتّٰى نَظُنَّ اَنْ لَّا يُفْطِرَ مِنْهُ شَيْئًا وَكَانَ لَا تَشَآءُ اَنْ تَرَاهُ مِنَ اللَّيْلِ مُصَلِّيًا اِلَّا رَاَيْتَهٗ وَلَا نَائِمًا اِلَّا رَاَيْتَهٗ۔ (رواه البخاری)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ مہینہ (کے اکثر ایام) میں (نفل) روزہ نہ رکھتے، یہاں تک کہ ہم گمان کرتے کہ آپ ﷺ اس مہینہ میں روزہ نہیں رکھیں گے اور آپ ﷺ (اسی مہینہ یا دوسرے مہینہ کے اکثر ایام میں) روزہ رکھتے تھے یہاں تک کہ ہم گمان کرتے کہ اب (اس مہینہ کا) کوئی دن بھی آپ ﷺ بغیر روزہ نہیں چھوڑیں گے اور اگر آپ ﷺ کو رات میں نماز پڑھتے ہوئے تم دیکھنا چاہتے تو نماز پڑھتے ہوئے بھی دیکھ لیتے اور اگر آپ ﷺ کو رات میں سوتے ہوئے تم دیکھنا چاہتے تو سوتے، ہی ہوئے دیکھ لیتے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اعمال نفل میں اعتدال کی راہ اختیار فرماتے تھے چنانچہ نہ تو آپ ﷺ ہمیشہ روزہ ہی رکھتے تھے کہ افراط یعنی زیادتی لازم آتی اور نہ ہمیشہ بغیر روزہ کے رہتے تھے کہ تفریط یعنی کمی لازم آتی، بلکہ آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ ہر مہینہ میں کچھ دن تو آپ ﷺ روزہ سے رہا کرتے تھے اور کچھ دن بغیر روزہ کے۔

اسی طرح نفل نماز کے سلسلہ میں بھی آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ رات میں آپ ﷺ سوتے بھی تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے، نہ تو

تمام رات سوتے ہی تھے اور نہ تمام رات نماز ہی میں گزارتے تھے۔ غرضکہ تمام امور میں آپ ﷺ کا عمل اوسط درجہ کا تھا، نہ زیادہ تھا اور نہ کم تھا۔

مداومت عمل کی فضیلت

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ اَدْوَمُهَا وَاِنْ قَلَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا" (بندوں کے نیک اعمال میں) خدا کے نزدیک سب سے محبوب وہ عمل ہے جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حضرت مظہرؒ فرماتے ہیں کہ "اہل تصوف و طریقت اسی حدیث کے پیش نظر اوراد و وظائف کو ترک کرنا ایسا ہی برا جانتے ہیں جیسا کہ فرائض کے ترک کو، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ ترک اولیٰ ہے یعنی فرائض کے ترک اور اوراد و وظائف کے ترک میں فرق ہے، فرائض کا ترک گناہ کبیرہ ہے جبکہ اوراد و وظائف کا ترک اولیٰ کا ترک کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ اولیٰ کا ترک کرنا فرائض کے ترک کرنے کے درجہ میں نہیں آسکتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب بندہ نے طاعت بغیر ضرورت کے ترک کی تو گویا اس نے مولیٰ کی عبادت سے اعراض کیا لہٰذا وہ عتاب کا مستحق ہوا، بخلاف مداومت کرنے والے کے کہ وہ اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ پروردگار کا محبوب ہو۔

وَاِنْ قَلَّ (اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو) کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑا عمل اگر اس پر مداومت و مواظبت اختیار کی جائے تو وہ زیادہ عمل سے جب کہ اس کے آداب و شرائط کی رعایت نہ ہوتی ہو اور ہمیشہ نہ کیا جاتا ہو، بہتر ہے۔

بساط سے باہر عبادت نہ کرنی چاہئے

(۳) وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا" تم اسی قدر عمل کیا کرو جتنی کہ (ہمیشہ) کرنے کی طاقت رکھتے ہو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ (ثواب دینے میں) تنگی نہیں کرتا یہاں تک کہ تم خود تنگی نہ کرو (یعنی تنگ آکر عبادت ہی نہ چھوڑ دو)۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اپنے لئے اتنی زیادہ عبادت ضروری قرار نہ دے دو جسے تم ہمیشہ نباہنے کی طاقت نہ رکھتے ہو بلکہ اسی قدر عبادت کرو کہ جتنی تم ہمیشہ پابندی کے ساتھ کر سکو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ثواب دینے میں تنگی نہیں کرتا یعنی ثواب دینا ترک نہیں کرتا یہاں تک کہ تم خود عبادت کی زیادتی سے پریشان ہو کر سرے سے عبادت ہی نہ چھوڑ دو۔

حاصل یہ کہ اللہ جل شانہ عبادت کرنے والے کو ثواب دیئے جاتا ہے ہاں اگر کوئی شخص زیادتی کے سبب تھک کر عبادت چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ثواب دینا بھی چھوڑ دیتا ہے لہٰذا عبادت کے معاملہ میں اعتدال کی راہ اختیار کرنی چاہئے تاکہ ہمیشہ عبادت جاری رہے اور حق تعالیٰ کی طرف سے ثواب کا سلسلہ بھی قائم رہے۔

اس وقت تک عبادت کرنی چاہے جب تک دل لگے

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُصَلِّ اَحَدُكُمْ نَشَاطَهٗ وَاِذَا فَتَرَ فَلْيَقْعُدْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا" تمہیں چاہئے کہ اسی وقت تک نماز پڑھو جب تک کہ خوش دلی رہے، اور جب طبیعت سست ہو جائے تو بیٹھ جاؤ۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آخرت کی راہ سعادت اور بھلائی اختیار کرنے والے کو چاہئے کہ عبادت میں اپنی بساط اور طاقت کے مطابق کوشش کرے طاعت کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرے اور تنگ دلی و انقباض کے ساتھ عبادت کرنے سے احتراز کرے۔ عبادت اسی وقت تک کرے جب تک کہ بشاشت قلبی اور سکون و اطمینان حاصل رہے۔ جب طبیعت سست ہو جائے تو عبادت ترک کر دے، اگر کوئی شخص عبادت کرتے کرتے تھک جائے اور سست ہو جائے، نیز عبادت چھوڑ کر اس خیال سے کسی امر مباح میں مشغول ہو جائے مثلاً سو جائے یا گفتگو وغیرہ میں لگ جائے تاکہ آئندہ عبادت کے لئے مزید بشاشت و خوشی اور اطمینان و سکون حاصل ہو سکے تو اس کی یہ مشغولیت عبادت و طاعت ہی میں شمار کی جاتی ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ "عالم کی نیند (بھی) عبادت ہے"

کسالت و ملالت اور طبیعت کی تنگی کے وقت نفل اعمال کو ترک کر دینے کے سلسلہ میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، چنانچہ ایسے موقعہ پر جبکہ طبیعت میں اضمحلال اور سستی پیدا ہو جائے نفل اعمال کو ترک کر دینے کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ عمل کا نفس پر گراں ہونا آخر کار عمل کے بالکل چھوٹ جانے یا اس میں نقصان واقع ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے۔

لیکن اتنی بات سمجھ لیجئے کہ نفس کو بہت زیادہ عبادت کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے تاکہ طبیعت عبادت کی مشقت و ریاضت کی خوگر ہو جائے، کاہل طبیعت، آرام طلب اور سست مزاج لوگوں کی طرح نہ ہو جانا چاہئے جو کہ مختصر سی عبادت اور تھوڑے سے عمل میں بھی تھک جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عبادت اور ریاضت و مجاہدہ کو ادھورا چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن بہت زیادہ عبادت کرنے کی اگر عادت پڑ جاتی ہے تو زیادہ سے زیادہ عبادت طبیعت پر گراں نہیں ہوتی، چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو پہلے دو رکعت نماز پڑھنی اور قرآن کے ایک پارے کی تلاوت بھی گراں گذرتی تھی اور اس کی وجہ سے ان کی طبیعت میں سستی و اضمحلال پیدا ہو جاتا تھا انہوں نے ہی جب زیادہ عبادات اور ریاضت و مجاہدہ کی عادت پیدا کر لی اور اپنے نفس اور اپنی طبیعت کو راہ خداوندی کی سعادتوں کے حصول کی خاطر مشقت و محنت کا عادی بنا لیا تو انہیں سو رکعت نماز پڑھنی اور قرآن کے دس پاروں کی تلاوت بھی آسان معلوم ہونے لگی۔

اونگھنے کی حالت میں نماز نہ پڑھنی چاہئے

(۵) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا نَعَسَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّيْ فَلْيَرْقُدْ حَتّٰى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ فَإِنَّ اَحَدَكُمْ إِذَا صَلّٰى وَهُوَ نَاعِسٌ لَا يَدْرِيْ لَعَلَّهٗ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کی حالت میں اونگھنے لگے تو اسے چاہئے کہ سو رہے یہاں تک کہ نیند جاتی رہے کیونکہ جب تم میں سے کوئی اونگھتا ہوا نماز پڑھتا ہے تو نیند کے غلبہ کی وجہ سے اسے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ تو مغفرت کا طالب ہو مگر (اونگھنے کی وجہ سے) اپنے نفس کے لئے (اس کی زبان سے) بد دعا نکل جائے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ کہ نیند کے غلبہ اور اونگھنے کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ ایسے وقت نہ تو دل و دماغ حاضر رہتے ہیں اور نہ زبان ہی قابو میں ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ایسی حالت میں انسان کہنا کچھ چاہتا ہے مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اس پر نیند کا غلبہ ہے اور وہ اونگھ رہا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل و دماغ اور زبان پر غفلت و سستی کا قبضہ ہے اب وہ اس حالت میں کہنا چاہتا ہے

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ۔ —— "اے اللہ میری مغفرت فرما۔"

مگر نیند کی غفلت اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا کر رہی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اعْفِرْلِيْ۔ —— "اے اللہ مجھے خاک آلود کر دے۔"

دیکھا آپ نے؟ نیند کی غفلت سے صرف ایک نقطہ کے فرق نے کیا گل کھلا دیا" کہاں تو اپنی مغفرت اور آخرت میں اپنی عزت و کامیابی کی دعا مانگنا چاہتا تھا اور کہاں اپنے نفس کے لئے بد دعا کے الفاظ نکال کر ذلت و خواری کا سامان کر بیٹھا، اسی لئے منع کیا جا رہا ہے کہ جب نیند کا غلبہ ہو اور اونگھ کا تسلط ہو تو ایسے وقت میں نماز نہ پڑھنی چاہئے۔

دین آسان چیز ہے اسے اپنے عمل سے سخت اور ہیبت ناک نہ بناؤ

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ وَّلَنْ یُّشَادَّ الدِّیْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا وَاسْتَعِیْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَیْءٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا" بیشک دین آسان ہے لیکن جو شخص دین میں سختی کرتا ہے دین اس پر غالب آجاتا ہے لہٰذا (دینی امور میں) میانہ روی اور اپنی طاقت کے مطابق عمل اختیار کرو اور (جنت و سلامتی نیز اللہ رب العزت کے انعامات و اکرامات کے ساتھ) خوش رہو (کیونکہ اللہ رب العزت تو تھوڑے ہی سے عمل پر) اگر وہ مداومت اور خلوص نیت کے ساتھ ہو تو بہت زیادہ ثواب دیتا ہے) اور صبح کے وقت شام کے وقت نیز کچھ رات کے آخری حصہ میں بھی اللہ رب العزت سے مدد مانگو۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں صفائی کے ساتھ اعلان کیا جا رہا ہے کہ دین بہت آسان ہے انسانی مزاج و فطرت کے عین مطابق ہے اور انسان کی ذہنی، فکری، عملی قوتیں بڑے سکون کے ساتھ اس کی ہمنوا بن سکتی ہیں۔ ہاں اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں کہ کوئی شخص اپنی طرف سے بے جا پابندیاں عائد کر کے اعمال کی زیادتی کرے اور دین و شریعت میں اپنی طرف سے باتیں بڑھا کر خود ہی اپنے اوپر مشکلات و تنگیوں کو مسلّط کرے۔

چنانچہ یہاں صراحت کے ساتھ حکم دیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ دین کے احکام بہت آسان مقرر کئے ہیں اس لئے رہبانیت کے طور پر ان احکام کو اپنے لئے سخت و ہیبت ناک نہ بناؤ۔

"دین اس پر غالب آجاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس پر غیر واجب باتیں واجب کر لیتا ہے اور مشکل طریقوں سے عبادت کی مشغولیت اختیار کر لیتا ہے تو دین اس پر غالب آجاتا ہے یعنی وہ بعد میں دین کے حق کی ادائیگی سے عاجز ہو جاتا ہے اس طرح وہ مغلوب اور دین غالب ہو جاتا ہے۔

قَارِبُوْا کا مطلب یہ ہے کہ سہولت اور آسانیوں کے ساتھ دینی امور کے قریب ہو جاؤ اور اپنے اوپر بے جا پابندیوں کو عائد کر کے اور سختی و مشکلات میں اپنے آپ کو مبتلا کر کے دین سے بعد اختیار نہ کرو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ قَارِبُوْا دراصل سَدِّدُوْا (یعنی میانہ روی اختیار کرو) کی تاکید ہے لہٰذا جو معنی "سَدِّدُوْا" کے ہیں وہی معنی "قَارِبُوْا" کے ہیں بعض حضرات نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ "اللہ جل شانہ، کا قرب ڈھونڈو۔"

بہر حال حدیث کا اصل یہ ہے کہ بہت زیادہ عبادت نہ کرو کہ ہر وقت اپنے آپ کو عبادت کی محنت و مشقت ہی میں مبتلا رکھو بلکہ ان تین اوقات میں عبادت کر لینے ہی کو غنیمت جانو یعنی دن کے ابتدائی حصہ میں، دن کے آخری حصہ میں اور رات کے آخری حصہ میں، یہ تہجد کی نماز کی طرف اشارہ ہے۔

رات کے بقیہ اوراد و وظائف کو دن میں پڑھ لینا چاہئے

(۷) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهٖ اَوْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ فَقَرَاَهٗ فِیْمَا بَیْنَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَصَلٰوةِ الظُّهْرِ كُتِبَ لَهٗ كَاَنَّمَا قَرَاَهٗ مِنَ اللَّیْلِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "(جو شخص رات میں) پورا وظیفہ پڑھے بغیر سو رہا یا وظیفہ کا کچھ حصہ پڑھنے سے رہ گیا اور پھر اس نے اس کو نماز فجر اور نماز ظہر کے درمیان پڑھ لیا تو اس کے لئے یہی لکھا جائے گا کہ گویا اس نے رات ہی کو پڑھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے کلام اللہ، نماز اور اوراد و اذکار کی قسم سے کچھ وظیفہ مقرر کر رکھا ہے جسے وہ رات میں پڑھتا ہے مگر کسی دن وہ سو گیا اور اس کا پورا وظیفہ یا اس وظیفہ کا کچھ حصہ رات میں پڑھنے سے رہ گیا اور اس نے نماز فجر، اور نماز ظہر کے درمیان یعنی زوال سے پہلے پڑھ لیا تو اس کے لئے رات ہی میں پڑھنے کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

اسی طرح دن کے وظیفہ کا حکم ہے کہ اگر دن میں وظیفہ پڑھنے سے رہ گیا اور پھر اس رات میں پڑھ لیا تو اس کے لئے دن ہی میں پڑھنے کا ثواب لکھا جاتا ہے رات دن آپس میں ایک دوسرے کے خلیفہ ہیں۔

حدیث میں صرف رات کے وظیفہ ہی کے بارہ میں اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اکثر و بیشتر رات ہی کا وظیفہ رہ جاتا ہے یعنی نیند کے غلبہ کی وجہ سے نماز تہجد اور اوراد و اذکار فوت ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا گیا ہے۔

معذوری کی حالت میں بیٹھ کر اور لیٹ کر نماز پڑھنے کا حکم

⑧ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلِّ قَائِمًا فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عمران بن حصینؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "نماز کھڑے ہو کر پڑھو، اور اگر (کسی عذر کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر) قادر نہ ہو سکو تو بیٹھ کر پڑھو، اور اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے پر بھی) قادر نہ ہو سکو تو (پھر) کروٹ پر پڑھو۔" (بخاریؒ)

تشریح: اگر کوئی شخص کسی عذر شدید مثلاً سخت بیماری وغیرہ کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو بیٹھ کر اپنی نماز ادا کرے اور اگر عذر اتنا شدید ہو کہ بیٹھ کر بھی قدرت سے باہر ہو تو پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ (لیٹے لیٹے) کروٹ سے بقبلہ ہو کر پڑھ لے پھر اس میں بھی اتنی آسانی کہ اگر کوئی شخص قبلہ کی طرف منہ نہ کر سکے یا یہ کہ کوئی شخص ایسا پاس موجود نہ ہو جو معذور کا منہ قبلہ کی طرف کر سکے تو جس طرف بھی منہ ہو ادھر ہی کی طرف نماز پڑھ لے، ایسے موقع پر کسی بھی سمت منہ کر کے نماز پڑھ لینا جائز ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ لیٹ کر نماز پڑھنے کے سلسلہ میں افضل یہ ہے کہ رو بقبلہ ہو کر چت لیٹے مونڈھے کے نیچے تکیہ رکھ کر سر کو اونچا کرے اور اشاروں سے نماز پڑھے۔ چنانچہ دار قطنیؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ اس سے چت لیٹ کر ہی نماز پڑھنے کا اثبات ہوتا ہے یہاں جو حدیث ذکر کی گئی ہے اس کے بارہ میں حنفیہ کی طرف سے کہا جاتا ہے آنحضرت ﷺ نے یہ حکم بطور خاص حضرت عمرانؓ کے لئے فرمایا تھا کیونکہ وہ بواسیر کے مرض میں مبتلا تھے اور چت نہیں لیٹ سکتے تھے لہٰذا یہ حدیث دوسروں کے لئے حجت نہیں ہو سکتی۔

آخر میں اتنی بات اور جان لیجئے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حکم فرض نماز کے لئے ارشاد فرمایا ہے اس لئے نفل نمازوں میں یہ بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

بغیر عذر بیٹھ کر نفل نماز پڑھنے والے کو آدھا ثواب ملتا ہے

⑨ وَعَنْهُ أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَلَاةِ الرَّجُلِ قَاعِدًا قَالَ إِنْ صَلّٰى قَائِمًا فَهُوَ أَفْضَلُ وَمَنْ صَلّٰى قَاعِدًا فَلَهُ نِصْفُ أَجْرِ الْقَائِمِ وَمَنْ صَلّٰى نَائِمًا فَلَهُ نِصْفُ أَجْرِ الْقَاعِدِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عمران بن حصینؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس شخص کے بارہ میں پوچھا جو (کھڑے ہونے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفل نماز بیٹھ کر پڑھتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تو بہتر تو وہی ہے جو کھڑے ہو کر نماز پڑھے لیکن جو شخص (نفل)

نماز (بغیر عذر) کے بیٹھ کر پڑھے گا تو اسے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی بہ نسبت نصف ثواب ملے گا۔" (بخاری)

تشریح: یہ حدیث نفل نماز پر محمول ہے کیونکہ فرض نماز تو بغیر عذر کے بیٹھ کر پڑھنا درست ہی نہیں ہے ہاں اگر کوئی عذر ہو تو قیام ساقط ہو جاتا ہے اور معذور بیٹھ کر فرض نماز بھی پڑھ سکتا ہے۔

بہر حال حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نفل نماز بغیر عذر کے بیٹھ کر پڑھنے والے کو نماز کا پورا ثواب نہیں ملتا بلکہ جتنا ثواب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کو ملتا ہے اس کا نصف ثواب اسے ملتا ہے ہاں اگر کوئی عذر ہو کہ کھڑے ہونے پر قادر نہ ہو تو پھر بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی بہ نسبت آدھا ثواب نہیں ملے گا بلکہ اسے بھی پورا ثواب ملے گا۔

بغیر عذر لیٹ کر نفل نماز پڑھنی جائز ہے یا نہیں: حضرت علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "جو شخص کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر نفل نماز پڑھ سکتا ہے اور اسے قیام و قعود کی قدرت نہیں ہے تو آیا اس شخص کے لئے نفل نماز لیٹ کر پڑھنا جائز ہے یا نہیں چنانچہ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ بغیر عذر لیٹ کر نفل نماز پڑھنا جائز نہیں ہے مگر علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ بغیر عذر لیٹ کر نفل نماز پڑھنا جائز ہے۔

نیز اس جماعت کا یہ قول بھی ہے کہ بغیر عذر لیٹ کر نفل نماز پڑھنے والے کو بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی بہ نسبت آدھا ثواب ملتا ہے جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ حسن بصریؒ کا قول بھی یہی ہے اور حدیث سے ثابت ہونے کی وجہ سے یہی قول صحیح تر اور اولی ہے۔

مگر حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے اور اس حدیث کے بارہ میں ان کی طرف سے کہا گیا ہے کہ یہ حدیث فرض نماز کے بارہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص اس درجہ بیمار ہو کہ مرض کی زیادتی اور شدت کے باوجود کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر نماز پڑھنا اس کے لئے ممکن ہو تو اسے لیٹ کر نماز پڑھنے کی صورت میں بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی بہ نسبت آدھا ثواب ملے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نیند آتے تک باوضو ذکر اللہ میں مشغولیت

⑩ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ اَوٰی اِلٰی فِرَاشِهٖ طَاهِرًا وَّ ذَکَرَ اللّٰهَ حَتّٰی یُدْرِکَهُ النُّعَاسُ لَمْ یَتَقَلَّبْ سَاعَةً مِّنَ اللَّیْلِ یَسْأَلُ اللّٰهَ فِیْهَا خَیْرًا مِّنْ خَیْرِ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ اِلَّا اَعْطَاهُ اِیَّاهُ ذَکَرَ النَّوَوِیُّ فِیْ کِتَابِ الْاَذْکَارِ بِرِوَایَةِ ابْنِ السُّنِّیِّ۔

"حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص (وضو یا تیمم کے ذریعہ نجاستوں سے یا یہ کہ گناہوں سے) پاک ہو کر اپنے بستر پر لیٹے اور نیند آنے تک (زبان سے یا دل سے) ذکر اللہ میں مشغول رہے تو وہ رات میں جب بھی اس حال میں کروٹ بدلے کہ اللہ جل شانہ سے دنیا اور آخرت کی کسی بھلائی کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ بھلائی ضرور دیتا ہے، (یہ حدیث نووی نے کتاب الاذکار میں ابن السنی کی روایت سے نقل کی ہے۔"

وہ دو خوش نصیب جن سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے

⑪ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَجِبَ رَبُّنَا مِنْ رَجُلَیْنِ رَجُلٌ ثَارَ عَنْ وِطَائِهٖ وَلِحَافِهٖ مِنْ بَیْنِ حِبِّهٖ وَاَهْلِهٖ اِلٰی صَلَاتِهٖ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ لِمَلَائِکَتِهٖ اُنْظُرُوْا اِلٰی عَبْدِیْ ثَارَ عَنْ فِرَاشِهٖ وَوِطَائِهٖ مِنْ بَیْنِ حِبِّهٖ وَاَهْلِهٖ اِلٰی صَلٰوتِهٖ رَغْبَةً فِیْمَا عِنْدِیْ وَشَفَقًا مِّمَّا عِنْدِیْ وَرَجُلٌ غَزَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَانْهَزَمَ مَعَ اَصْحَابِهٖ فَعَلِمَ مَا عَلَیْهِ

فِي الْاِنْهِزَامِ وَمَالَهُ فِي الرُّجُوْعِ فَرَجَعَ حَتّٰى هُرِيْقَ دَمُهُ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ لِمَلَائِكَتِهِ اُنْظُرُوْا اِلٰى عَبْدِيْ رَجَعَ رَغْبَةً فِيْمَا عِنْدِيْ وَشَفَقًا مِمَّا عِنْدِيْ حَتّٰى هُرِيْقَ دَمُهُ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ "سرور کونین ﷺ نے فرمایا" ہمارا رب دو آدمیوں سے بہت خوش ہوتا ہے ایک تو وہ آدمی جو رات میں اپنے نرم بستر و لحاف سے اور اپنی محبوبہ اور بیوی کے پاس سے (تہجد کی) نماز کے لئے اٹھتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے "میرے بندہ کی طرف دیکھو جو میرے پاس کی چیزوں (یعنی جنت اور ثواب) کے شوق سے اور میرے پاس کی چیزوں (یعنی دوزخ اور عذاب) کے ڈر کی وجہ سے اپنے فرش و نرم بستر اور اپنی محبوبہ اور بیوی کو چھوڑ کر اپنی نماز پڑھنے کے لئے اٹھا۔ اور دوسرا وہ آدمی جس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور (بغیر کسی شدید عذر کے) اپنے ساتھیوں سمیت (میدان چھوڑ کر) بھاگ نکلا، مگر جب اسے (بلا عذر میدان جہاد سے) بھاگ نکلنے کی سزا، اور پھر (جنگ میں) واپس آجانے کا ثواب یاد آیا تو (میدان کارزار میں) واپس آگیا اور (خدا کے دشمنوں سے) اس قدر لڑا کہ جام شہادت نوش کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے کہ "میرے بندہ کی طرف (بنظر تعجب) دیکھو جو میرے پاس کی چیزوں (یعنی جنت و ثواب) کے شوق میں اور میرے پاس کی چیزوں (یعنی دوزخ و عذاب) کے خوف سے (میدان جنگ میں) لوٹ آیا (اور راہ خدا میں) یہاں تک (لڑا) کہ اپنی جان بھی دیدی۔" (شرح السنہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ رات کے پر سکون ماحول اور آرام میں کسی شخص کے لئے نرم بستر، آرام دہ لحاف اور محبوب بیوی کا قرب ہی سب سے زیادہ پسندیدہ اور پیاری چیزیں ہوتی ہیں مگر اس کے باجود وہ شخص اپنے رب کی عبادت اور اس کی جزاء و انعام کے شوق میں ان سب چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے اور پرودگار کے حضور میں اپنی بندگی و عبودیت کا نذرانہ پیش کرنے لگتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی تمام پسندیدہ چیزیں دنیا میں تو قلب و دماغ کے سکون اور انسانی عیش و مسرت کا سامان بن سکتی ہیں مگر نہ تو یہ قبر میں نفع پہنچائیں گی اور نہ حشر میں کامیابی و سرخروئی کی ضامن ہوں گی۔ قبر اور حشر میں تو صرف پروردگار کی اطاعت اور اس کی عبادت ہی کام آئے گی اور وہی سعادت و کامیابی کی منزل سے ہم کنار کریں گی۔

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے واسطے عبادت کرنا اور اس پر ثواب کی امید رکھنا اخلاص اور کمال کے منافی نہیں ہے اگرچہ یہ اکمل درجہ کے منافی ہے کیونکہ عبادت کے سلسلہ میں اکمل درجہ یہی ہے کہ عبادت محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لئے کی جائے اور اس سے کوئی غرض مثلاً ثواب کا حصول یا عذاب کا خوف وابستہ نہ ہو لیکن ہاں کوئی شخص اگر عبادت محض ثواب کے واسطے یا عذاب کے خوف سے کرتا ہے تو اسے یہ نہ جان لینا چاہئے کہ اس کی یہ عبادت، عبادت نہیں صرف تضیع اوقات ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۴) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ حُدِّثْتُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلَاةُ الرَّجُلِ قَاعِدًا نِصْفُ الصَّلَاةِ قَالَ فَاَتَيْتُهُ فَوَجَدْتُهُ يُصَلِّيْ جَالِسًا فَوَضَعْتُ يَدِيْ عَلٰى رَأْسِهِ فَقَالَ مَالَكَ يَا عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو قُلْتُ حُدِّثْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ قُلْتَ صَلَاةُ الرَّجُلِ قَاعِدًا عَلٰى نِصْفِ الصَّلٰوةِ وَاَنْتَ تُصَلِّيْ قَاعِدًا قَالَ اَجَلْ وَلٰكِنِّيْ لَسْتُ كَاَحَدٍ مِّنْكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے یہ حدیث بیان کی گئی کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "(بغیر عذر) بیٹھ کر (نفل) نماز پڑھنے والے کی نماز (کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کے مقابلہ میں آدھی ہوتی ہے" حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ "میں (ایک دن) آنحضرت ﷺ خدمت اقدس میں حاضر ہوا (تو اتفاق سے) آنحضرت ﷺ اس وقت بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے (جب نماز سے فارغ ہوئے تو) میں نے

آپ ﷺ کے سر مبارک پر اپنا ہاتھ رکھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "عبداللہ بن عمرو! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا" یارسول اللہ! مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز آدھی ہوتی ہے اور اب آپ ﷺ ہی بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا" ہاں ایسا ہی ہے (یعنی تم نے جو کچھ سنا ہے) صحیح ہے لیکن میں تم جیسا تو نہیں ہوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اہل عرب کی عادت ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے کوئی تعجب کی بات دیکھتا ہے تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور ان کے نزدیک ایسا کرنا کوئی خلاف ادب نہیں ہے، بلکہ یہ کمال محبت اور انتہائی بے تکلفی کے سبب سے ہوتا ہے چونکہ حضرت عبداللہ بن عمرو کو آنحضرت ﷺ سے انتہا درجہ کی محبت اور بے تکلفی تھی اس لئے جب آپ ﷺ نے نماز پڑھ لی تو انہوں نے بھی ازراہ تعجب اپنا ہاتھ آپ ﷺ کے سر مبارک پر رکھا اور انہیں تعجب اس بات پر ہوا کہ آنحضرت ﷺ تو افضل بات پر عمل کیا کرتے تھے پھر آپ ﷺ نے بیٹھ کر نماز کیوں پڑھی۔

آنحضرت ﷺ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ نہ تو دوسروں پر مجھے اور نہ مجھ پر دوسروں کو قیاس کرو کیونکہ یہ تو صرف میری خصوصیت ہے کہ بیٹھ کر بھی نماز پڑھتا ہوں تو میری نماز ناقص نہیں ہوتی، میں چاہے جس طرح بھی نماز پڑھوں میری نماز پوری ادا ہوتی ہے۔

نماز میں راحت و سکون ہے

⑬ وَعَنْ سَالِمِ بْنِ اَبِي الْجَعْدِ قَالَ قَالَ رَجُلٌ مِّنْ خُزَاعَةَ لَيْتَنِي صَلَّيْتُ فَاسْتَرَحْتُ فَكَاَنَّهُمْ عَابُوْا ذٰلِكَ عَلَيْهِ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَقِمِ الصَّلٰوةَ يَابِلَالُ اَرِحْنَا بِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سالم بن ابی الجعد فرماتے ہیں کہ (ایک دن) قبیلہ خزاعہ کا ایک آدمی کہنے لگا کہ "کاش میں نماز پڑھتا اور راحت پاتا" جب لوگوں نے اس کے اس کہنے کو برا سمجھا تو اس نے کہا کہ "میں نے سرور کونین ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے (حضرت بلال ؓ سے) فرمایا کہ "بلال! نماز کے لئے تکبیر کہو تاکہ ہم اس کے ذریعہ راحت حاصل کریں۔" (ابوداؤد)

تشریح: نماز کی تاثیر انسانی راحت واطمینان اور قلبی سکون ہے جو شخص خلوص قلب کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اسے ایک عجیب قسم کی راحت ملتی ہے اور اس کے دل و دماغ میں سکون و اطمینان کے خزانے بھر جاتے ہیں چنانچہ قبیلہ خزاعہ کے مذکورہ شخص کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز پڑھوں اور پھر اپنے پروردگار کی عبادت، اس کی مناجات اور حمد اور اس کے کلام پاک کے پڑھنے کی لذت سے راحت و سکون حاصل کروں۔

لوگوں نے اس کے کہنے کو جو برا سمجھا تو ایک وجہ تھی وہ یہ کہ اس کے قول کے دو معنی محتمل تھے اوّل تو یہ کہ "نماز کے ذریعہ راحت پاؤں" دوسرے یہ کہ "نماز سے راحت پاؤں" یعنی نماز پڑھ کر آرام سے بیٹھ جاؤں۔ اس کی مراد تو اوّل معنی تھے لیکن لوگوں نے دوسرے معنی مراد لئے جو انہیں پسند نہیں تھے اس لئے اس نے لوگوں کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اور مراد کو واضح کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد جو آپ ﷺ نے حضرت بلال ؓ سے فرمایا تھا نقل کیا کہ "اے بلال تکبیر اقامت کہو تاکہ ہم اس کے ذریعہ راحت حال کریں" کیونکہ آپ ﷺ کے لئے تو بس خدا کی عبادت ہی میں راحت تھی اور نماز میں مشغول رہنا ہی آپ ﷺ کے لئے آرام و سکون کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ نماز ہی کے اندر اپنے پروردگار کی بڑائی اور اپنے خالق کی مناجات و حمد بیان کی جاتی ہے کہ ایک کامل و اکمل بندے کا اپنے پروردگار کی مناجات میں مشغول رہنا ہی اس کے لئے سب سے بڑی راحت ہے اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ۔

"مجھے تو نماز (ہی) میں راحت ملتی ہے۔"

بَابُ الْوِتْرِ
نماز وتر کا بیان

وتر[1] ہر اس نماز کو کہہ سکتے ہیں جس میں طاق رکعتیں ہوں مگر فقہا کے یہاں وتر اسی خاص نماز کو کہتے ہیں جس کا وقت عشاء کی نماز کے بعد ہے جو عام طور پر عشاء کے فوراً بعد ہی پڑھی جاتی ہے اور اس باب میں اسی نماز وتر کا بیان ہوگا۔

نماز وتر واجب ہے یا سنت

نماز وتر کے سلسلہ میں ائمہ کے یہاں دو چیزوں میں اختلاف پایا جاتا ہے پہلی چیز تو یہ کہ آیا نماز وتر واجب ہے یا سنت؟ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ وتر کی نماز واجب ہے حضرت امام شافعیؒ اور حضرت قاضی ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ سُنّت ہے۔

نماز وتر کی ایک رکعت ہے یا تین رکعتیں

علماء کے نزدیک دوسرا اختلاف یہ ہے کہ نماز وتر کی ایک رکعت ہے یا تین؟ حنفیہ کے یہاں وتر کی تین رکعتیں ہیں جب کہ اکثر ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ نماز وتر صرف ایک ہی رکعت ہے تاہم ان حضرات کے نزدیک بھی وتر کے لئے صرف ایک رکعت پڑھنا مکروہ ہے بلکہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ پہلے دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرا جائے اس کے بعد ایک وتر پڑھی جائے۔

نماز وتر کا طریقہ

وتر کی نماز مغرب کی نماز کی طرح (حنفیہ کے مسلک کے مطابق) تین رکعت پڑھی جاتی ہے، اس کے پڑھنے کا وہی طریقہ ہے جو فرض نمازوں کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرض کی محض دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے بعد دوسری سورت ملائی جاتی ہے جب کہ وتر کی نماز میں تینوں رکعتوں میں دوسری سورت پڑھنے کا حکم ہے اور تیسری رکعت میں دوسری سورت کے بعد دونوں ہاتھ تکبیر کے ساتھ کانوں تک اٹھا کر (جس طرح کہ تکبیر تحریمہ کے وقت اٹھاتے ہیں) پھر باندھے جائیں اور بآواز آہستہ دعا قنوت پڑھی جائے، دعا قنوت یہ ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ وَنَسْتَهْدِيْكَ وَ نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ اِلَيْكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَ نُثْنِيْ عَلَيْكَ الْخَيْرَ وَنَشْكُرُكَ وَ لَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ ط اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ وَ نَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ۔

"اے اللہ! تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تجھی سے ہدایت کے طالب ہیں، تجھی سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں ہم تیرے ہی سامنے توبہ کرتے ہیں، تیرے ہی اوپر ایمان لاتے ہیں، تیری ہی (اچھی تعریفیں بیان کرتے ہیں، ہم تیرا ہی شکر ادا کرتے ہیں ناشکری نہیں کرتے اور جو شخص تیری ناشکری کو نافرمانی کرے ہم اس کو چھوڑتے ہیں۔ اے پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تیری ہی نماز پڑھتے ہیں تجھی کو سجدہ کرتے ہیں، تیری ہی طرف دوڑتے آتے ہی، تیری ہی عبادت میں جلد مستغرق ہو جاتے ہیں، تیری رحمت کے امیدوار ہیں ہم تیرے ہی عذاب سے ڈرتے ہیں بے شک تیرا عذاب کافروں پر نازل ہونے والا ہے۔"

اگر اس کے بعد یہ دعا بھی پڑھ لی جائے تو بہتر ہے۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْ مَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَ بَارِكْ لِيْ فِيْمَا اَعْطَيْتَ وَقِنِيْ شَرَّمَا

[1] لفظ وتر میں واؤ کو زیر اور زبر دونوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں مگر زیر کے ساتھ پڑھنا زیادہ مشہور ہے۔

قَضَیْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْكَ اِنَّهٗ لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ وَلَا یَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ۔

"اے اللہ! ان لوگوں کے ساتھ مجھے ہدایت دے جنہیں تو نے ہدایت بخشی، مجھے ان لوگوں کے ساتھ مصیبتوں اور آفتوں سے بچا جنہیں تو نے بچایا ہے، ان لوگوں کے ساتھ مجھ سے محبت کر جن سے تو نے محبت کی اور جو کچھ تو نے مجھے دیا ہے اس میں برکت عطا فرما اور مجھے ان برائیوں سے بچا جو مقدر ہوں بے شک تو حاکم ہے محکوم نہیں اور جس سے تو محبت کرے وہ ذلیل نہیں ہو سکتا اور جس سے تجھ کو عداوت ہو وہ عزت نہیں پا سکتا، اے اللہ تیری ذات بزرگ و برتر ہے۔"

اگر کسی کو دعاء قنوت یاد نہ ہو تو وہ بجائے دعا قنوت کے یہ پڑھ لے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ "اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی آرام دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔"

اور اگر کوئی اس کے پڑھنے پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ یا یَا رَبِّ تین مرتبہ کہہ لے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز وتر کی رکعتوں کا مسئلہ

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةُ اللَّیْلِ مَثْنٰی مَثْنٰی فَاِذَا خَشِیَ اَحَدُكُمُ الصُّبْحَ صَلّٰی رَكْعَةً وَّاحِدَةً تُوْتِرُلَهٗ مَا قَدْ صَلّٰی۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا رات کی نماز دو دو رکعت ہے اور جب کسی کو صبح ہونے کا اندیشہ ہونے لگے تو ایک رکعت پڑھ لے، یہ (ایک رکعت) پہلی پڑھی ہوئی نماز کو طاق کر دے گی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ رات میں پڑھی جانے والی نفل نمازیں دو دو رکعت کر کے پڑھی جائیں چنانچہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ نے اس حدیث کے پیش نظر کہا ہے کہ افضل یہی ہے کہ رات میں نفل نمازیں اس طرح پڑھی جائیں کہ ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرا جائے یعنی دو دو رکعت کر کے پڑھی جائیں۔ حدیث کے دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ رات میں نماز میں مشغول رہنے والا شخص جب یہ دیکھے کہ رات ختم ہو رہی ہے اور صبح نمودار ہونے والی ہے تو وہ ان نمازوں کے بعد ایک رکعت پڑھ لے تاکہ یہ ایک رکعت پہلی پڑھی ہوی نمازوں کو طاق کر دے، اس طرح یہ حدیث امام شافعیؒ کی دلیل ہے کیونکہ ان کے نزدیک وتر کی ایک ہی رکعت ہے۔

امام طحاوی حنفیؒ نے صلی رکعة واحدة الخ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ایک رکعت اس طرح پڑھے کہ اس سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لے تاکہ یہ رکعت شفع یعنی اس ایک رکعت سے پہلے پڑھی گئی دونوں رکعتوں کو طاق کر دے۔ گویا ایک رکعت علیحدہ نہ پڑھی جائے بلکہ دو رکعتوں کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ "اس حدیث سے تو یہ کہیں ثابت ہی نہیں ہوتا کہ وتر کی ایک رکعت علیحدہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ پڑھی جائے" لہٰذا اس کے ذریعہ وتر کی ایک رکعت ہونے پر استدلال کرنا درست ہی نہیں ہے۔

پھر وتر کی تین ہی رکعتیں ہونے کے سلسلہ میں حنفیہ کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صلوة بتیرا یعنی تنہا ایک رکعت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

جہاں تک صحابہ اور سلفؒ کے عمل کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اکثر فقہا صحابہ اور سلف کا معمول وتر کی تین رکعتیں ہی پڑھنا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے ان کو تو اس سلسلہ میں بہت زیادہ اہتمام تھا

انہوں نے ایک مرتبہ حضرت سعید بن مسیب ؒ کو وتر کی ایک رکعت پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ "کیسی ناقص نماز پڑھتے ہو؟ دو رکعت اور پڑھو ورنہ تمہیں سزا دوں گا" (نہایہ)

ترمذیؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے وتر کی تین رکعتیں نقل کی ہیں اور اسی کو عمران بن حصین ؓ، حضرت عائشہ ؓ، ابن عباس ؓ، اور ابوایوب کی طرف منسوب کیا ہے اور آخر میں انہوں نے صراحت کر دی ہے کہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت اسی طرف ہے۔

حضرت عمر فاروق ؓ اور حضرت ابن مسعود ؓ کے بارے میں مؤطا امام محمد میں مذکور ہے کہ ان کے نزدیک بھی وتر کی تین ہی رکعتیں ہیں۔ حضرت امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ سلف کا اسی پر معمول تھا۔ (ہدایہ)

تین رکعت کی وتر صحابہ میں مشہور تھی، ایک رکعت کی وتر تو عام طور پر لوگ جانتے بھی نہ تھے چنانچہ حضرت معاویہ ؓ کو ابن عباس ؓ کے مولیٰ نے ایک رکعت وتر پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کو بہت تعجب ہوا انہوں نے حضرت عباس ؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کو بڑے اہتمام کے ساتھ بیان کیا۔ حضرت ابن عباس ؓ نے ان کی وحشت و حیرت یہ کہہ کر ختم کر دی کہ معاویہ فقیہ ہیں۔ رسول اللہ کی صحبت سے مشرف ہو چکے ہیں ان پر اعتراض نہ کرو۔ (بخاریؒ)

بہرحال ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وتر کی تین ہی رکعتیں ہیں جن احادیث سے وتر کی ایک رکعت ثابت ہوتی ہے وہ سب قابل تاویل ہیں جو انشاء اللہ حسب موقع بیان کی جائیں گی۔

یا یہ کہ ان میں آنحضرت ﷺ کی پہلی حالتوں کا ذکر ہے آخر فعل آپ ﷺ کا بھی تین ہی رکعت پر تھا جو صحابہ میں مشہور ہوا اور ظاہر ہے کہ اُمت کے لئے آپ کا وہی فعل حجت اور دلیل بن سکتا ہے جس پر آپ ﷺ نے آخر میں عمل اختیار فرمایا ہو۔

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوِتْرُ رَكْعَةٌ مِّنْ اٰخِرِ اللَّيْلِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمر ؓ راوی ہیں کہ سرکار کونین ﷺ نے فرمایا "آخری رات میں وتر (پڑھنا افضل ہے اور اس کی ایک رکعت ہے)۔" (مسلمؒ)

تشریح: الوتر رکعۃ کا مطلب یہ ہے کہ "پہلے پڑھی گئی دو رکعتوں کے ساتھ ملی ہوئی وتر کی ایک رکعت ہے" گویا کہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ وتر سے ہٹ کر تاویل کا راستہ اختیار کرتے ہوئے یہ معنی اس لئے بیان کئے گئے ہیں تاکہ ان حدیث میں جن سے وتر کے لئے تین رکعتیں پڑھنا ثابت ہے اور ان احادیث میں جن سے وتر کی ایک رکعت کا اثبات ہوتا ہے تطبیق پیدا ہو جائے اور حدیث کے حقیقی معنے و مفہوم میں کوئی تعارض پیدا نہ ہو۔

وتر کے پڑھنے کا مختار اور افضل وقت آخری رات ہے جب کہ تہجد وغیرہ کی نماز پڑھ لی جائے لیکن عام طور سے چونکہ لوگ رات میں تہجد کی نماز کے لئے نہیں اٹھتے اس لئے عشاء کی نماز کے فوراً بعد ہی وتر بھی پڑھ لئے جاتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ وتر کی ایک ہی رکعت ہے۔ جن احادیث سے وتر کی تین رکعتیں پڑھنا ثابت ہے وہ آگے ذکر کی جائیں گی۔

ایک تشہد کے ساتھ پانچ رکعت پڑھنے کا مسئلہ

(۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً يُوْتِرُ مِنْ ذٰلِكَ بِخَمْسٍ لَا يَجْلِسُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا فِيْ اٰخِرِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ رات میں (تہجد کے وقت) تیرہ رکعت پڑھتے تھے جن میں سے پانچ رکعتوں میں وتر پڑھتے اور ان میں سوائے آخری رکعت کے کسی میں بھی، (تشہد کے لئے) نہیں بیٹھتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: رات میں آنحضرت ﷺ کی نماز کئی طریقوں سے ذکر کی گئی ہے ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پہلے آپ ﷺ آٹھ رکعتیں

چار سلام کے ساتھ یعنی دو دو رکعت کر کے پڑھتے تھے اور پھر آخر میں پانچ رکعتیں ایک تشہد اور ایک سلام کے ساتھ اس طرح پڑھتے تھے کہ اسی میں وتر کی نیت بھی کر لیتے تھے یعنی وتر کی نماز بھی انہیں پانچ رکعتوں میں شامل ہوتی تھی اور ان پانچ رکعتوں میں سے کسی ایک رکعت میں بھی نہ تو تشہد کے لئے بیٹھتے تھے اور نہ سلام پھیرتے تھے بلکہ آخری رکعت میں تشہد کے لئے بیٹھتے اور سلام پھیرتے۔

لہٰذا یہ حدیث صریح طور پر اس بات کی دلیل ہے کہ پانچ رکعتیں اس طرح ملا کر پڑھنا کہ ان میں سے کسی ایک رکعت میں بھی تشہد کے لئے نہ بیٹھا جائے بلکہ صرف آخری یعنی پانچویں رکعت کے بعد قعدہ کیا جائے جائز ہے لیکن فقہا کے یہاں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے چنانچہ جن حضرات کے یہاں یہ جائز نہیں ہے وہ عدم جلوس کی تاویل عدم سلام سے کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک لا یجلس فی شی الا فی اخرھا کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ ان پانچ رکعتوں میں صرف آخری رکعت کے بعد سلام پھیرتے تھے درمیان میں کسی بھی رکعت کے بعد سلام نہیں پھیرتے تھے چنانچہ بعض روایتوں میں مذکور بھی ہے کہ لم یسلم الا فی اخرین بعض حضرات نے یہ تاویل بھی کی ہے کہ ان پانچ رکعتوں میں سوائے آخری رکعت کے کسی میں بھی جلوس دراز نہیں کرتے تھے یعنی طویل قعدہ نہیں کرتے تھے صرف آخری رکعت میں آپ ﷺ کا قعدہ طویل ہوتا تھا۔

بہر حال چار سے زیادہ رکعتوں کو ملا کر ایک سلام کے ساتھ پڑھنا متفقہ طور پر تمام علماء کے یہاں جائز ہے لیکن حنفیہ کے یہاں اتنا فرق ہے کہ ان کے نزدیک آٹھ رکعت تک ملا کر ایک سلام کے ساتھ پڑھنا تو بلا کراہت جائز ہے مگر آٹھ رکعتوں کے بعد کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

آنحضرت ﷺ کی نماز تہجد و نماز وتر

④ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ هِشَامٍ قَالَ انْطَلَقْتُ اِلٰى عَآئِشَةَ فَقُلْتُ يَا اُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْبِئِيْنِيْ عَنْ خُلُقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ اَلَسْتَ تَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ قُلْتُ بَلٰى قَالَتْ فَاِنَّ خُلُقَ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ الْقُرْاٰنَ قُلْتُ يَآ اُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْبِئِيْنِيْ عَنْ وِتْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ كُنَّا نُعِدُّ لَهٗ سِوَاكَهٗ وَطَهُوْرَهٗ فَيَبْعَثُهُ اللّٰهُ مَاشَآءَ اَنْ يَّبْعَثَهٗ مِنَ اللَّيْلِ فَيَتَسَوَّكُ وَيَتَوَضَّأُ وَيُصَلِّيْ تِسْعَ رَكْعَاتٍ لَا يَجْلِسُ فِيْهَا اِلَّا فِي الثَّامِنَةِ فَيَذْكُرُ اللّٰهَ وَيَحْمَدُهٗ وَيَدْعُوْهُ ثُمَّ يَنْهَضُ وَلَا يُسَلِّمُ فَيُصَلِّي التَّاسِعَةَ ثُمَّ يَقْعُدُ فَيَذْكُرُ اللّٰهَ وَيَحْمَدُهٗ وَيَدْعُوْهُ ثُمَّ يُسَلِّمُ تَسْلِيْمًا يُّسْمِعُنَا ثُمَّ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ وَهُوَ قَاعِدٌ فَتِلْكَ اِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً يَا بُنَيَّ فَلَمَّا اَسَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَخَذَ اللَّحْمَ اَوْتَرَ بِسَبْعٍ وَّصَنَعَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ مِثْلَ صَنِيْعِهٖ فِي الْاُوْلٰى فَتِلْكَ تِسْعٌ يَّا بُنَيَّ وَكَانَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى صَلَاةً اَحَبَّ اَنْ يُّدَاوِمَ عَلَيْهَا وَكَانَ اِذَا غَلَبَهٗ نَوْمٌ اَوْ وَجَعٌ عَنْ قِيَامِ اللَّيْلِ صَلّٰى مِنَ النَّهَارِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً وَّلَا اَعْلَمُ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ كُلَّهٗ فِيْ لَيْلَةٍ وَّلَا صَلّٰى لَيْلَةً اِلَى الصُّبْحِ وَلَا صَامَ شَهْرًا كَامِلًا غَيْرَ رَمَضَانَ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت سعد بن ہشام فرماتے ہیں کہ میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "اُمّ المؤمنین! مجھے سرور کونین ﷺ کے خلق کے بارے میں بتلایئے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا "کیا تم نے قرآن کریم نہیں پڑھا ہے"؟ میں نے عرض کیا "جی ہاں! پڑھا ہے"! فرمایا "آنحضرت ﷺ کا خلق قرآن ہی تھا (یعنی قرآن کریم میں جتنے بھی اخلاق کریمہ اور صفات حمیدہ مذکور ہیں آنحضرت ﷺ نے ان سب کو اپنی ذات میں سمو لیا تھا۔ گویا! آنحضرت کی اخلاقی زندگی قرآن حکیم کا عملی نمونہ تھی) پھر میں نے عرض کی "ام المؤمنین! اچھا آنحضرت ﷺ کے وتر کے بارے میں مجھے بتایئے (کہ آپ ﷺ وتر کس وقت اور کس طرح نیز کتنی رکعت پڑھا کرتے تھے) "حضرت عائشہ ﷺ نے فرمایا "میں (پہلے ہی سے) آنحضرت کی مسواک اور وضو کے لئے پانی کا انتظام کئے رہتی تھی، اور جب اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو رات میں اٹھانا چاہتا تھا، اٹھاتا، چنانچہ (آپ بیدار ہو کر پہلے) مسواک کرتے، پھر وضو کرتے اور نو رکعت نماز پڑھتے اور

سوائے آٹھویں رکعت کے اور کسی رکعت میں نہ بیٹھتے، جب آٹھویں رکعت پڑھ لیتے تو (تشہد میں) بیٹھتے اور خدا کا ذکر کرتے، اس کی تعریف بیان کرتے اور دعا مانگتے (یعنی التحیات پڑھتے کہ اس میں خدا کا ذکر، حمد اور دعا سب ہی کچھ ہے) پھر سلام پھیرے بغیر نویں رکعت پڑھنے کھڑے ہو جاتے، پھر نویں رکعت پوری کر کے تشہد میں) بیٹھتے اور اللہ کا ذکر کرتے، اس کی تعریف بیان کرتے اور اس سے دعا مانگتے (یعنی التحیات پڑھ کر جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ دعا پڑھتے) پھر ہمیں سناتے ہوئے باآواز بلند) سلام پھیرتے، پھر سلام پھیرنے کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھتے اور اے میرے بچے، یہ کل گیارہ رکعتیں ہوگئیں اور جب آپ کی عمر زیادہ ہوگئی اور (بڑھاپے کی وجہ سے بدن پر گوشت چڑھ گیا تو سات رکعت مع وتر کے پڑھنے لگے اور دو رکعت پہلے ہی جیسے (یعنی بیٹھ کر) پڑھتے رہے۔ اے میرے بچے یہ کل نو رکعتیں ہوئیں اور آنحضرت ﷺ جب کوئی نماز پڑھتے تو اس بات کو پسند کرتے کہ اسے ہمیشہ پڑھے جائیں اور جب (کسی دن) آپ ﷺ کو نیند زیادہ آجاتی یا کوئی اور تکلیف پیش آجاتی جس کیوجہ سے آپ ﷺ کے لئے رات میں کھڑے ہونا ممکن نہ ہوتا) تو آپ ﷺ دن کے پہلے حصّہ میں (یعنی زوال سے پہلے) بارہ رکعت پڑھ لیتے اور میں نہیں جانتی کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی ایک رات میں پورا قرآن مجید پڑھا یا صبح تک (یعنی شروع رات سے آخر رات تک، نماز پڑھی ہو اور نہ آپ ﷺ کبھی سوائے رمضان کے پورے مہینے روزے رکھے۔" (مسلم)

تشریح: جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ مداومت عمل کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی نفل نماز پڑھتے یا اسی طرح کوئی بھی نفل عبادت کرتے تو اس پر دوام اختیار فرماتے۔ ہاں اگر کوئی عذر پیش آجاتا یا بیان جواز کا اظہار مقصود ہوتا تو کبھی ترک بھی فرما دیتے تھے۔

یہاں تو حضرت عائشہ فرما رہی ہیں کہ آنحضرت رمضان کے علاوہ کسی بھی مہینہ میں پورے مہینے روزے نہیں رکھتے تھے جب کہ ان کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ شعبان میں پورے مہینہ روزے رکھتے تھے۔ لہٰذا حضرت عائشہؓ کی ان دونوں روایتوں کے ظاہری تعارض کو خود انہیں کی ایک تیسری روایت نے ختم کر دیا ہے جس میں انہوں نے تصریح کر دی ہے کہ "آنحضرت ﷺ شعبان (میں پورے مہینہ نہیں بلکہ اس) کے اکثر دنوں میں روزے رکھتے تھے۔

وتر کے بعد دو رکعت نفل پڑھنے کا مسئلہ

وتر کے بعد دو رکعت نفل پڑھنے کا اثبات نہ صرف یہ کہ اسی روایت سے ہوتا ہے بلکہ اور بھی بہت سی روایتیں وارد ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے وتر پڑھنے کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھی جا سکتی ہے لیکن ابھی اس کے بعد ہی ایک روایت آرہی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ اجعلوا اخر صلاتکم باللیل وترا (اپنی رات کی نماز میں آخری نماز وتر کو رکھو) لہٰذا بظاہر ان تمام روایتوں میں بڑا سخت تعارض نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس تعارض کو رفع کرنے کے لئے علماء کو بڑی محنت کرنی پڑی ہے۔

حضرت امام مالکؒ نے تو سرے سے اس حدیث کا انکار کر دیا ہے جس سے وتر کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا ثابت ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

حضرت امام احمدؒ نے درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ وتر کے بعد دو رکعت نماز نہ تو میں خود پڑھتا ہوں اور نہ کسی دوسرے کو پڑھنے سے منع کرتا ہوں۔

جمہور علماء کا کہنا ہے کہ چونکہ وتر کے بعد دو رکعت نفل کا پڑھنا بہر حال حدیث صحیح سے ثابت ہے اس لئے اس سے بالکل صرف نظر بھی نہیں کیا جا سکتا لہٰذا یہ حضرات دونوں رکعتوں کے پڑھنے کے قائل ہیں جہاں تک احادیث کے باہم تعارض کو رفع کرنے کا سوال ہے تو ان حضرات کی جانب سے ان احادیث میں دو طرح کی تطبیق پیدا کی گئی ہے۔

ایک تو یہ کہ اجعلوا اخر صلاتکم باللیل وترا میں صلوٰۃ سے مراد ان دو رکعتوں کے علاوہ دوسری نوافل ہیں اس طرح اس

حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ رات میں وتر پڑھ لینے کے بعد ان دونوں رکعتوں کے علاوہ دوسرے نوافل نہ پڑھو۔

دوسری تطبیق جمہور علماء کی طرف سے یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس سلسلہ میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ کبھی تو وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھ لی جائیں اور کبھی نہ پڑھی جائیں تاکہ دونوں احادیث پر عمل ہوتا رہے۔ گویا یوں کہنا چاہئے کہ حدیث اجعلوا اخر صلوٰ تک الخ استحباب پر محمول ہے نہ کہ وجوب پر یعنی اس میں جو حکم دیا گیا ہے وہ استحباب کے طور پر ہے وجوب کے طور پر نہیں ہے۔

اس کے بعد یہ بات بھی اختلافی ہے کہ آیا نبی کریم ﷺ وتر کے بعد دو رکعت اس صورت میں پڑھتے تھے جب کہ آپ ﷺ وتر رات کے ابتدائی حصّہ میں ہی یعنی عشاء کے بعد ادا کرتے تھے یا اس شکل میں پڑھتے تھے جب کہ آپ ﷺ وتر آخری رات میں تہجد کے بعد ادا کرتے تھے؟ چنانچہ اس سلسلہ میں ابوامامہؓ کہ جو حدیث منقول ہے وہ تو مطلق ہے اس میں صرف اتنا ہی مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ یہ کچھ ذکر نہیں ہے کہ اول شب میں پڑھتے تھے یا آخری شب میں مگر ثوبانؓ سے جو حدیث منقول ہے وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ کا وتر کے بعد دو رکعت کا پڑھنا اس صورت میں تھا جب کہ آپ ﷺ اول شب میں وتر ادا کرتے تھے یہ دونوں حدیثیں اسی باب کے آخر میں آرہی ہیں۔

بخاریؒ و مسلمؒ اور موطا کی راویتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ قیام لیل کی صورت میں تھا یعنی آپ ﷺ رات میں تہجد کی نماز پڑھتے تو وتر کے بعد دو رکعت بھی پڑھا کرتے تھے اور یہی صحیح بھی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ دونوں رکعتیں وتر کے ملحق ہیں اور وتر کی سنتوں کے قائم مقام ہیں۔ یعنی جس طرح فرض نماز کی سنتیں ہوتی ہیں کہ وہ فرض نماز سے پہلے یا بعد میں پڑھی جاتی ہیں اسی طرح یہ دونوں رکعتیں وتر کی سنتوں کے قائم مقام ہیں جو وتر کے بعد پڑھی جاتی ہیں۔

وتر رات کی آخری نماز ہونی چاہئے

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اجْعَلُوْا اٰخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "اپنی رات کی نماز میں آخری نماز وتر کو قرار دو۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث کے بارے میں اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے مگر اس موقع پر بھی ایک مرتبہ پھر جان لیجئے کہ اس حدیث میں جو حکم دیا جا رہا ہے وہ وجوب کے طور پر نہیں ہے بلکہ استحباب کے طور پر ہے۔

⑥ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَادِرُوا الصُّبْحَ بِالْوِتْرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "صبح (کے آثار نمایاں ہونے پر) وتر میں جلدی کرو۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے وتر پڑھ لیا کرو حنفیہ کے نزدیک یہ حکم وجوب کے لئے ہے اگر رات میں وتر کی نماز رہ جائے تو دن میں اس کی قضا پڑھنا واجب ہے۔

وتر کے اوقات

⑦ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَافَ اَنْ لَّا يَقُوْمَ مِنْ اٰخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوْتِرْ اَوَّلَهٗ وَمَنْ طَمِعَ اَنْ يَّقُوْمَ اٰخِرَهٗ فَلْيُوْتِرْ اٰخِرَ اللَّيْلِ فَاِنَّ صَلَاةَ اٰخِرِ اللَّيْلِ مَشْهُوْدَةٌ وَّذٰلِكَ اَفْضَلُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو اس بات کا خوف ہو کہ آخر رات میں وتر پڑھنے کے لئے) نہ اٹھ سکوں گا تو اسے چاہئے کہ وہ شروع رات ہی میں (یعنی عشاء کے فوراً بعد) وتر پڑھ لے، اور جس شخص کو آخر رات میں اٹھنے کی امید ہو تو وہ آخر رات ہی میں وتر پڑھے کیونکہ آخر رات کی نماز مشہودہ ہے (یعنی) اس وقت رحمت کے فرشتوں اور انوار و برکات کا نزول ہوتا ہے اور یہ

(یعنی آخر رات میں وتر پڑھنا) افضل ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آخر رات کی فضیلت و برکات کے بارے میں آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں رات کے اس حصّہ میں جو بھی عبادت کی جائے گی وہ ثواب و سعادت کے اعتبار سے بہت زیادہ افضل ہوگی۔ اسی لئے آخر رات میں وتر کی نماز پڑھنا افضل ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ اس افضل وقت میں وتر کی ادائیگی ہوتی ہے بلکہ اس وقت رحمت کے فرشتوں اور حق تعالیٰ کے انوار و برکات کے نزول کی وجہ سے ثواب بھی بہت زیادہ ملتا ہے۔

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مِنْ كُلِّ اللَّيْلِ اَوْتَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَوَّلِ اللَّيْلِ وَاَوْسَطِهٖ وَاٰخِرِهٖ وَانْتَهٰى وِتْرُهٗ اِلَى السَّحَرِ۔ (متفق علیہ)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے رات کے ہر حصّہ میں وتر کی نماز پڑھی ہے یعنی ابتدائی رات میں بھی (یعنی عشاء کی نماز کے فوراً بعد) رات کے درمیانی حصّہ میں بھی اور آخر رات میں بھی مگر آخر عمر میں آپ ﷺ نے وتر کے لئے سحر کا وقت یعنی رات کا چھٹا حصہ) مقرر کر لیا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

آنحضرت ﷺ کی طرف سے حضرت ابوہریرہؓ کو تین باتوں کی وصیت

⑨ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اَوْصَانِيْ خَلِيْلِيْ بِثَلَاثٍ صِيَامِ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَكْعَتَيِ الضُّحٰى وَاَنْ اُوْتِرَ قَبْلَ اَنْ اَنَامَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میرے دوست یعنی سرور کونین ﷺ نے مجھے تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی ایک تو ہر مہینہ میں تین روزے رکھنے کی دوسرے دو رکعت ضحی کی نماز پڑھنے کی اور تیسرے یہ کہ سونے سے پہلے وتر پڑھ لوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ہر مہینہ کے تین روزے" کے تعین میں مختلف اقوال ہیں چنانچہ بعض علماء نے کہا ہے کہ مہینہ کے تین روزے سے ایام بیض یعنی ہر مہینہ کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کے روزے مراد ہیں۔ بعض حضرات کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ ایک روزہ ابتدائی مہینہ میں ایک روزہ درمیان میں اور ایک روزہ آخر مہینہ میں رکھا جائے۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ مطلق ہے، یعنی اختیار ہے کہ پورے مہینہ میں جب چاہے تین روزے رکھ لے۔

"ضحی کی دو رکعتوں سے" نماز اشراق یا نماز چاشت مراد ہے جو آفتاب بلند ہونے کے بعد پڑھی جاتی ہے ان نمازوں کا ادنی درجہ دو رکعت ہے، مگر اشراق کی نماز کا اکثر درجہ چھ رکعت اور چاشت کی نماز کا بارہ رکعت ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کو اول شب میں وتر پڑھ لینے کے لئے اس وجہ سے فرمایا کہ وہ رات کے ابتدائی حصّہ میں آنحضرت ﷺ کی احادیث کو یاد کرنے اور ان کی تکرار میں مشغول رہتے تھے جس کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا اس وجہ سے ان کے لئے آخر رات میں اٹھنا بہت مشکل تھا چنانچہ اسی مشغولیت علم کی وجہ سے انہیں اشراق یا چاشت کی بھی دو ہی رکعتیں پڑھنے کے لئے فرمایا۔ لہٰذا اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ علم دین کے حصول اور اس کی ترویج و اشاعت میں مشغول رہنا نفل عبادت کی مشغولیت سے بہتر ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آنحضرت ﷺ شروع رات میں بھی وتر پڑھتے تھے

⑩ عَنْ غُضَيْفِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ قُلْتُ لِعَائِشَةَ اَرَأَيْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ

فِیْ اَوَّلِ اللَّیْلِ اَمْ فِی اٰخِرِہٖ قَالَتْ رُبَّمَا اغْتَسَلَ فِیْ اَوَّلِ اللَّیْلِ وَرُبَّمَا اغْتَسَلَ فِیْ اٰخِرِہٖ قُلْتُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِی الْاَمْرِ سَعَۃً قُلْتُ کَانَ یُوْتِرُ فِیْ اَوَّلِ اللَّیْلِ اَمْ فِیْ اٰخِرِہٖ قَالَتْ رُبَّمَا اَوْتَرَ فِیْ اَوَّلِ اللَّیْلِ وَرُبَّمَا اَوْتَرَ فِیْ اٰخِرِہٖ قُلْتُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِی الْاَمْرِ سَعَۃً قُلْتُ کَانَ یَجْھَرُ بِالْقِرَاءَۃِ اَمْ یَخْفِتُ قَالَتْ رُبَّمَا جَھَرَ بِہٖ وَرُبَّمَا خَفَتَ قُلْتُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِی الْاَمْرِ سَعَۃً رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَی ابْنُ مَاجَۃَ الْفَصْلَ الْاٰخِیْرَ۔

"حضرت غضیف ابن حارث فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا کہ سرور کونین ﷺ غسل جنابت شروع رات میں کرتے تھے یا آخر رات میں؟ یعنی آپ ﷺ جماع سے فارغ ہوتے ہی نہا لیتے تھے یا اس وقت تو سو رہتے اور جب تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے تو نہاتے) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "کبھی تو آپ ﷺ (جماع سے فارغ ہوتے ہی) شروع رات ہی میں نہا لیتے تھے اور کبھی آخر میں غسل فرماتے" میں نے کہا "اللہ بہت بڑا ہے تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے زیبا ہیں جس نے دینی امور میں آسانی عطا فرمائی" اور پھر پوچھا کہ "آپ ﷺ وتر کی نماز شروع رات میں (عشاء کے فوراً بعد ہی) پڑھ لیتے تھے یا آخر شب میں پڑھتے تھے"؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا "کبھی تو شروع رات ہی میں پڑھ لیتے تھے اور کبھی آخر رات میں پڑھتے تھے" میں نے کہا "اللہ بہت بڑا ہے تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے زیبا ہیں جس نے دینی امور میں آسانی عطا فرمائی" اور پھر پوچھا کہ "آپ ﷺ تہجد کی نماز میں یا مطلقاً کسی بھی نماز میں) قرأت با آواز بلند فرماتے تھے یا آہستہ آواز سے؟ انہوں نے فرمایا "کبھی تو با آواز بلند قرأت فرماتے تھے اور کبھی آہستہ آواز سے" میں نے کہا "اللہ بہت بڑا ہے تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے زیبا ہیں جس نے دینی امور میں آسانی عطا فرمائی" ابوداؤد، ابن ماجہؒ نے اس روایت کا صرف آخری فقرہ (جس میں قرأت کا ذکر ہے) نقل کیا ہے۔"

نماز تہجد و وتر کی رکعتوں کی تعداد

(۱۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَبِیْ قَیْسٍ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَۃَ بِکَمْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْتِرُ قَالَتْ کَانَ یُوْتِرُ بِاَرْبَعٍ وَّثَلَاثٍ وَسِتٍّ وَثَلَاثٍ وَّ ثَمَانٍ وَّثَلَاثٍ وَّعَشْرٍ وَّثَلَاثٍ وَّلَمْ یَکُنْ یُوْتِرُ بِاَنْقَصَ مِنْ سَبْعٍ وَّلَا بِاَکْثَرَ مِنْ ثَلَاثَ عَشْرَۃَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن ابی قیس فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا سرور کونین ﷺ کتنی رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے۔" حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "آنحضرت ﷺ کبھی چار اور تین (یعنی سات) کبھی چھ اور تین (یعنی نو) رکعتوں کے ساتھ، کبھی آٹھ اور تین (یعنی گیارہ) رکعتوں کے ساتھ اور کبھی دس اور تین (یعنی تیرہ) رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے اور آپ ﷺ سات سے کم اور تیرہ سے زیادہ رکعتوں کے ساتھ کبھی وتر نہیں پڑھتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: چار اور تین رکعتوں کے ساتھ کا مطلب یہ ہے کہ چار رکعت تو تہجد کی ہوتی تھی اور تین رکعت وتر کی، اس طرح مجموعی طور پر سات رکعتیں ہو گئیں۔ گویا پہلی چار رکعتوں کو بھی مجازاً وتر ہی میں شمار کیا اسی طرح چھ رکعت تہجد کی اور تین وتر کی ان کی مجموعی تعداد نو رکعت ہوئی، آٹھ رکعت تہجد کی اور تین رکعت وتر کی ان کی مجموعی تعداد گیارہ رکعت ہوئی اور دس تہجد کی اور تین رکعت وتر کی، ان کی مجموعی تعداد تیرہ رکعت ہوئی۔

بہر حال یہ حدیث صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ وتر کی ایک رکعت نہیں بلکہ تین رکعت ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی وتر کی نماز سات سے کم اور تیرہ سے زیادہ رکعت کے ساتھ نہیں پڑھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اکثر آپ ﷺ سات رکعت سے کم کے ساتھ وتر نہیں پڑھتے، چنانچہ آپ ﷺ سے پانچ رکعتیں بھی ثابت ہیں۔ اسی طرح اکثر آپ ﷺ تیرہ رکعت سے زیادہ کے ساتھ وتر نہیں پڑھتے تھے چنانچہ پندرہ رکعتیں بھی آپ ﷺ سے پڑھنی ثابت ہیں

نماز وتر واجب ہے

⑫ وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْوِتْرُ حَقٌّ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّوْتِرَ بِخَمْسٍ فَلْیَفْعَلْ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّوْتِرَ بِثَلَاثٍ فَلْیَفْعَلْ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّوْتِرَ بِوَاحِدَۃٍ فَلْیَفْعَلْ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوایوب راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا وتر (کی نماز) ہر مسلمان پر حق (یعنی لازم) ہے لہٰذا جو شخص وتر پانچ رکعت پڑھنا چاہے وہ پانچ رکعت پڑھ لے، جو شخص تین رکعت پڑھنا چاہے وہ تین رکعت پڑھ لے اور جو شخص ایک ہی رکعت پڑھنا چاہے وہ ایک ہی رکعت پڑھ لے۔" (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: "حق" کے معنی ہیں واجب اور ثابت، لہٰذا حضرت امام ابوحنیفہ تو حق کے معنی واجب مراد لیتے ہیں، اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ وتر کی نماز واجب ہے، حضرت امام شافعی حق کے معنی ثابت مراد لیتے ہیں یعنی وتر کی نماز سُنّت سے ثابت ہے لہٰذا وہ فرماتے ہیں کہ وتر کی نماز سُنّت ہے چونکہ اس حدیث میں وتر کی رکعتوں کی تعداد پانچ بھی ثابت ہے اور تین اور ایک بھی، اس لئے حضرت سفیان ثوری اور دیگر ائمہ نے تو پانچ کے عدد کو اختیار کیا ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نے تین کے عدد کو قبول کیا ہے اور حضرت امام شافعی نے ایک کے عدد کو اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وتر کی ایک ہی رکعت ہے۔

وتر کی فضیلت

⑬ وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ وِتْرٌ یُّحِبُّ الْوِتْرَ فَاَوْتِرُوْا یَآ اَھْلَ الْقُرْاٰنِ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ "اللہ تعالیٰ وتر ہے، وتر کو دوست رکھتا ہے، لہٰذا اے اہل قرآن وتر پڑھو۔"

(ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "اللہ تعالیٰ وتر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات وصفات میں یکتا ہے، تنہا ہے اس کا کوئی مثل نہیں ہے اسی طرح اپنے افعال میں بھی وہ یکتا ہے کہ کوئی اس کا مددگار اور شریک نہیں ہے۔

"وتر کو دوست رکھتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وتر کی نماز پڑھنے والے کو بہت زیادہ ثواب سے نوازتا ہے اور اس کی اس نماز کو قبول فرماتا ہے۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ جل شانہ، چونکہ اپنی ذات وصفات اور اپنے افعال میں یکتا و تنہا ہے کہ کوئی اس کا مثل، شریک اور مددگار نہیں اس لئے وہ طاق عدد کو پسند فرماتا ہے اور چونکہ وتر بھی طاق ہے اس لئے اس کو بھی پسند کرتا ہے اور اس کے پڑھنے والے کو بہت زیادہ ثواب کی سعادت سے نوازتا ہے۔

⑭ وَعَنْ خَارِجَۃَ بْنِ حُذَافَۃَ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ اَمَدَّکُمْ بِصَلٰوۃٍ ھِیَ خَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ اَلْوِتْرُ جَعَلَہُ اللّٰہُ لَکُمْ فِیْمَا بَیْنَ صَلٰوۃِ الْعِشَآءِ اِلٰی اَنْ یَّطْلَعَ الْفَجْرُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت خارجہ بن حذافہ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) سرور کونین ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ "اللہ جل شانہ، نے ایک (ایسی) نماز سے تمہاری امداد کی ہے (یعنی نماز پنج گانہ سے ایک اور زیادہ نماز تمہیں دی ہے) جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے اور وہ وتر (کی نماز) ہے اور تمہارے لئے یہ نماز عشاء کی نماز کے بعد سے فجر نکلنے تک کے درمیان مقرر کی گئی ہے (یعنی اس کا وقت ان اوقات کے درمیان درمیان ہے جب چاہو پڑھو۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: چونکہ عرب میں سرخ اونٹ بہت قیمتی ہوتے ہیں اور عرب والوں کے لئے اموال میں یہ سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں اس لئے آنحضرت ﷺ نے رغبت دلانے کے لئے فرمایا کہ وتر کی نماز سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے گو یا مراد یہ ہے کہ وتر کی نماز دنیا کی تمام متاع

سے زیادہ بہتر ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وتر کی نماز واجب ہے اور اس کو عشاء کی نماز سے پہلے پڑھنا جائز نہیں ہے۔

وتر کی قضا کا حکم

⑮ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَامَ عَنْ وِتْرِهٖ فَلْيُصَلِّ اِذَا اَصْبَحَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت زید بن اسلمؒ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص وتر سے غافل ہو کر (یعنی وتر پڑھے بغیر) سو جائے تو اسے چاہئے کہ صبح ہو تو پڑھ لے" اس روایت کو ترمذیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: اگر کسی ایسے شخص کی وتر کی نماز رات میں پڑھنے سے رہ جائے جو صاحب ترتیب ہے تو صبح اٹھ کر اگر اس کے لئے ممکن ہو یعنی اتنا وقت ہو کہ وتر پڑھ سکے تو فجر کی فرض نماز سے پہلے وتر کی قضا پڑھ لے۔ اور اگر فجر کے فرض سے پہلے اس کا پڑھنا ممکن نہ ہو یعنی اتنا وقت نہ ہو تو پھر فجر کی فرض نماز پڑھنے کے بعد پڑھے۔

ہاں اگر ایسے شخص کے وتر رہ گئے ہوں جو صاحب ترتیب نہیں ہے تو اسے اختیار ہے چاہے تو نماز فجر سے پہلے پڑھ لے اور چاہے نماز فرض کے بعد پڑھے۔

آنحضرت وتر میں کون کونسی سورتیں پڑھتے تھے

⑯ وَعَنْ عَبْدِالْعَزِيْزِ بْنِ جُرَيْجٍ قَالَ سَأَلْنَا عَائِشَةَ بِاَيِّ شَيْءٍ كَانَ يُوْتِرُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ كَانَ يَقْرَأُ فِي الْاُوْلٰى بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى وَفِي الثَّانِيَةِ بِقُلْ يَآ اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ وَفِي الثَّالِثَةِ بِقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَّالْمُعَوِّذَتَيْنِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ اَبْزٰى وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ وَالدَّارِمِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَلَمْ يَذْكُرَا وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ۔

"اور حضرت عبدالعزیز بن جریجؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ سرور کونین ﷺ وتر میں کون کون سے سورتیں پڑھا کرتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "آپ ﷺ پہلی رکعت میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى دوسری رکعت میں قُلْ يَآيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور تیسری رکعت میں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھا کرتے تھے (ترمذیؒ و ابوداؤدؒ) اور اس روایت کو امام نسائیؒ نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیؒ سے، امام احمدؒ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے اور امام دارمیؒ نے حضرت عباسؓ سے نقل کیا مگر امام دارمیؒ نے اپنی روایت میں لفظ معوذتین ذکر نہیں کیا ہے یعنی انہوں نے محض یہ نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ وتر کی تیسری رکعت میں صرف قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھتے تھے۔"

تشریح: محقق علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ "حنفیہ نے آخری روایت یعنی دارمیؒ کی نقل کردہ روایت پر عمل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ وتر کی تیسری رکعت میں قل ھو اللہ پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ حنفی حضرات وتر کی تیسری رکعت میں صرف قل ھو اللہ ہی پڑھتے ہیں۔ حنفی حضرات کے پیش نظر صرف یہی روایت نہیں بلکہ حضرت عائشہؓ ہی کی ایک دوسری روایت بھی ان کے مسلک کی دلیل ہے جس میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ تیسری رکعت میں قل ھو اللہ ہی پڑھتے تھے۔

جہاں تک حضرت عائشہؓ کی اس روایت کا تعلق ہے جو یہاں نقل کی گئی ہے اور جس سے وتر کی تیسری رکعت میں قل ھو اللہ کے علاوہ معوذتین (یعنی قل اعوذ برب الفلق و قل اعوذ برب الناس) کا پڑھنا بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس پر حنفیہ اس لئے عمل نہیں کرتے کہ اول تو اس روایت کی سند میں ضعف ہے، دوسرے یہ کہ اس میں جو طریقہ ذکر کیا گیا ہے وہ آنحضرت ﷺ کی عادت کے خلاف معلوم ہوتا ہے

کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں تو یہ صراحت سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ بعد کی رکعت کو پہلی رکعتوں کی بنسبت مختصر کرتے تھے جب کہ اس روایت کے پیش نظر تیسری رکعت میں پہلی دونوں رکعتوں کی بنسبت کہیں زیادہ طویل ہو جاتی ہے ملا علی قاری نے اس سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے اور حنفیہ کی طرف سے اور بھی دلائل پیش کئے ہیں جسے اہل علم ان کی کتاب "مرقاۃ" میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ حدیث بصراحت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ وتر کی تینوں رکعتیں ایک ہی سلام سے پڑھتے تھے۔

وتر میں پڑھی جانے والی دعا

(۱۷) وَعَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ عَلَّمَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلِمَاتٍ اَقُوْلُهُنَّ فِيْ قُنُوْتِ الْوِتْرِ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَآ اَعْطَيْتَ وَقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ اِنَّهٗ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت حسن بن علیؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے مجھے کچھ کلمات سکھائے ہیں تاکہ میں انہیں وتر کی دعا قنوت میں پڑھا کروں (اور وہ کلمات دعا یہ ہیں) اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَآ اَعْطَيْتَ وَقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ اِنَّهٗ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ اے اللہ! مجھے ہدایت کر ان لوگوں کے ساتھ (یعنی انبیاء و اولیاء کے ساتھ) جن کو تو نے ہدایت کی مجھے دنیا اور آخرت کی مصیبتوں اور آفتوں سے بچا اور ان لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے بچایا اور مجھ سے محبت کر ان لوگوں کے ساتھ جن سے تو نے محبت کی اور جو کچھ تو نے مجھے عطا کیا ہے (یعنی عمر، مال، علم اور نیک اعمال) ان میں برکت عطا فرما اور مجھے ان برائیوں سے بچا جو مقدر ہوں، بے شک تو جو چاہتا ہے وہ حکم کرتا ہے اور تجھے کوئی حکم نہیں کرتا (یعنی تو حاکم مطلق ہے محکوم نہیں ہے اور جسے تو دوست رکھتا ہے وہ ذلیل نہیں ہو سکتا اے ہمارے رب تو بابرکت ہے (یعنی دارین پر تیرا خیر ہی خیر محیط ہے) اور تیری ذات بلند و برتر ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: حضرت حسنؓ کے الفاظ اقولهن فی قنوت الوتر (تاکہ میں وتر کی دعا قنوت میں پڑھا کروں) سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قنوت الوتر کو مطلقاً ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دعا تمام سال یعنی تمام دنوں میں پڑھنی مراد ہے جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے مگر حضرات شوافع دعائے قنوت کو رمضان کے آخری نصف ایام میں وتر کے ساتھ مقید کرتے ہیں گویا کہ شافعیؒ حضرات کے یہاں تو صرف رمضان کے نصف آخری ایام میں وتر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھی جاتی ہے جب کہ حنفی حضرات تمام دنوں میں نماز وتر میں دعاء قنوت پڑھتے ہیں۔

اللهم اهدنی اے اللہ! مجھے ہدایت کر یعنی ہدایت کے راستہ پر مجھے ثابت قدم رکھ۔ یا ہدایت کے اسباب و ذرائع زیادہ سے زیادہ مجھے عطا فرما تاکہ ان کو اختیار کر کے میں اعلیٰ مرتبہ اور اعلیٰ درجہ پر پہنچ سکوں۔

اِنَّهٗ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ (جسے تو دوست رکھتا ہے وہ ذلیل نہیں ہو سکتا) کا مطلب یہ ہے کہ جسے تو نے اپنا دوست بنا لیا بایں طور کہ اسے نیک راستہ پر چلنے اور صالح اعمال اختیار کرنے کی توفیق عطا فرما کر سعادت و خوش بختی کے مرتبہ پر فائز کیا وہ آخرت میں ذلیل و شرمسار نہیں ہو سکتا۔ پھر یہاں مطلقاً ذلت سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار بندہ جسے وہ محبوب رکھتا ہے، نہ آخرت میں نادم شرمسار ہو سکتا ہے اور نہ ہی دنیا میں ذلت و رسوائی اس کے پاس پھٹک سکتی ہے۔ اگرچہ بظاہر دنیا کی نظروں میں وہ کسی بلاء مصیبت میں گرفتار ہو یا کوئی شخص اسے ذلیل و خوار کرے مگر حقیقت میں وہ اللہ کے نزدیک باعظمت و باعزت ہی ہوتا ہے جیسا کہ دنیا کے لوگوں نے اللہ کے پیغمبر اور نبی حضرت زکریا علیہ السلام کو آرے سے چیرا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ذبح کیا۔ لہٰذا ان جلیل القدر پیغمبروں کو ظلم و ستم کے اس اسٹیج سے اس لئے

گزرنا نہیں پڑا کہ معاذ اللہ وہ خدا کے محبوب اور دوست نہیں تھے بلکہ در حقیقت ان کو امتحان و آزمائش میں ڈالا گیا۔ غرضیکہ دنیا والوں کے ذلیل کرنے سے خدا کے نیک و محبوب بندے ذلیل نہیں ہوتے اللہ کے نزدیک وہ عزت والے ہی ہوتے ہیں۔

بعض روایتوں میں اِنَّهٗ لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ کے بعد وَلَا یَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ (اور جس سے تجھ کو عداوت ہو وہ عزت نہیں پا سکتا) کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ اسی طرح بعض روایتوں میں وَتَعَالَیْتَ کے بعد نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ اِلَيْكَ (اے اللہ ہم اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور تیرے ہی سامنے توبہ کرتے ہیں) اور بعض روایتوں میں اس کے بعد کے الفاظ مزید نقل کئے گئے ہیں۔

بہر حال حضرات شوافع کی دعا قنوت یہ ہے وہ حضرات اسی دعا کو وتر اور فجر نماز میں پڑھتے ہیں حنفی حضرات کے یہاں وتر کی نماز میں جو دعائے قنوت پڑھی جاتی ہے وہ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ الخ ہے جو ہم شروع باب میں نقل کر چکے ہیں۔

بعض علماء کی رائے ہے کہ وتر کی نماز میں اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ الخ اور اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ الخ دونوں دعائیں پڑھنا افضل ہے جیسا کہ شروع باب میں ہم نے دونوں دعائیں نقل کی ہیں۔

دعائے قنوت کے سلسلہ میں ائمہ کے یہاں مختلف فیہ چیزیں

محقق علامہ ابن ہمام علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ دعا قنوت کے سلسلہ میں ائمہ کے یہاں تین باتیں مختلف فیہ ہیں ایک تو یہ کہ دعا قنوت رکوع سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟ دوسری بات یہ کہ دعاء قنوت وتر کی نماز میں تمام دنوں میں پڑھی جائے یا صرف رمضان کے آخری نصف حصہ میں؟ تیسری چیز یہ کہ دعا قنوت وتر کے علاوہ کسی اور نماز میں پڑھی جائے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ تو فرماتے ہیں کہ دعائے قنوت رکوع کے بعد پڑھی جائے مگر حضرات امام اعظم ابوحنیفہؒ کی دلیل بہت زیادہ قوی ہے اس سلسلہ میں اہل علم اور محققین حضرات مرقاۃ میں پوری تفصیل دیکھ سکتے ہیں جہاں تک دوسری اور تیسری مختلف باتوں کا تعلق ہے تو ہم انشاء اللہ ان دونوں مسئلوں کو آگے آنے والے باب "باب القنوت" میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

نماز وتر کے سلام کے بعد کی تسبیح

(۱۸) وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَلَّمَ فِي الْوِتْرِ قَالَ سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ يُطِيْلُ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّلنَّسَآئِيِّ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ اَبْزٰى عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ يَقُوْلُ اِذَا سَلَّمَ سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ ثَلَاثًا وَّيَرْفَعُ صَوْتَهٗ بِالثَّالِثَةِ۔

"اور حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ جب وتر کی نماز میں سلام پھیرتے تو یہ کہتے سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ (یعنی پاک ہے بادشاہ نہایت پاک)(ابوداؤد "نسائی") نسائی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "آپ ﷺ یہ (تسبیح) تین مرتبہ کہتے تھے اور تیسری مرتبہ میں آواز بلند فرماتے تھے، نیز نسائیؒ نے ایک روایت عبدالرحمٰن بن ابزی سے نقل کی ہے جس میں وہ (عبدالرحمٰن) اپنے والد مکرم سے نقل کرتے (ہوئے کہتے) ہیں کہ (آنحضرت ﷺ جب سلام پھیر لیتے تو تین مرتبہ سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ کہتے اور تیسری مرتبہ میں بآواز بلند فرماتے۔"

تشریح: دار قطنیؒ نے جو روایت نقل کی ہے اس میں رَبُّ الْمَلَآئِكَةِ وَالرُّوْحِ کے الفاظ بھی مذکور ہیں، گویا پوری تسبیح یوں ہے سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ رَبُّ الْمَلَآئِكَةِ وَالرُّوْحِ۔

نماز وتر میں آنحضرت ﷺ کی دعا

(۱۹) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ اٰخِرِ وِتْرِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ بِمُعَافَاتِكَ

مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ اپنی نماز وتر کے آخر میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَآئِكَ مِنْ سَخَطِكَ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ اے اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری رضا و خوشنودی کے ذریعہ تیرے غضب سے اور تیری عافیت کے ذریعہ تیرے عذاب سے اور میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے ذریعہ تیرے آثار صفات (یعنی تیرے غضب و غصہ سے (مجھ میں طاقت نہیں کہ تیری تعریف کر سکوں کیونکہ) تیری تعریف کا شمار نہیں تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے اپنی تعریف کی۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ یہ دعا وتر کی تیسری رکعت میں رکوع کے بعد پڑھا کرتے تھے چنانچہ حضرت امام مالکؒ نے اس کو اختیار کیا ہے بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ ﷺ یہ دعا سلام کے بعد پڑھتے تھے اور بعض کا قول ہے کہ سلام سے پہلے التحیات میں پڑھتے تھے اسی طرح بعض محققین کا کہنا ہے کہ آپ یہ دعا سجود میں پڑھا کرتے تھے۔

نسائی نے ایک روایت اور نقل کی ہے جس میں صراحت کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب اپنی نماز سے فارغ ہو جاتے اور بستر پر تشریف لاتے تو یہ دعا پڑھتے۔ واللہ اعلم

مستقل طور پر کسی خاص دعا قنوت کو مقرر کر لینے کا مسئلہ

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ "علماء کی ایک جماعت سے منقول ہے کہ دعائے قنوت کے سلسلہ میں توقیف نہ کی جائے یعنی ایک ہی دعا کو پڑھنے کے لئے بطور خاص مقرر نہ کر لیا جائے کیونکہ کسی دعا کو مقرر کر لینے اور پھر اسی کو مستقل طور پر پڑھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ دعا زبان پر بایں طور جاری ہو جاتی ہے کہ قلب زبان کی ہمنوائی سے محروم ہوتا ہے۔ یعنی اس دعا کے پڑھنے کے وقت عادت کے مطابق صرف زبان ہی کام کرتی ہے دل میں نہ تو دعا کے مقصود کی لگن ہوتی ہے اور نہ اس کی طرف رغبت کا احساس ہوتا ہے لہٰذا دعا کا جو مقصود اور مطلوب ہوتا ہے وہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ دعا تو وہی کام کرتی ہے جو قلب کی گہرائیوں سے نکلتی ہے اور جو احساس و شعور اور دلی رغبت زبان کی ہمنوا ہوتی ہے۔

لیکن بعض دوسرے علماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ حکم اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُكَ الخ کے علاوہ دوسری دعاؤں کے بارے میں ہے یعنی اس دعا کو بطور خاص مستقل طور پر پڑھنے کے لئے مقرر کر لینا منع نہیں ہے البتہ اس کے علاوہ دوسری دعاؤں کو مستقل طور پر اختیار نہ کیا جائے بلکہ کبھی کوئی دعا پڑھ لی جائے اور کبھی کوئی کیونکہ صحابہؓ نے اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُكَ الخ کے پڑھنے پر اتفاق کیا ہے اور یہی دعا مستقل طور پر پڑھتے تھے اگرچہ اس کے علاوہ دوسری دعائے قنوت بھی جائز ہے۔ اسی طرح "محیط" میں اللھم اھدنی الخ کو بھی مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے یعنی اس دعا کی توقیف بھی ممنوع نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت معاویہؓ کا ایک رکعت وتر پڑھنا

(۲۰) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قِیْلَ لَهٗ هَلْ لَّكَ فِیْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ مُعَاوِیَةَ مَا اَوْتَرَ اِلَّا بِوَاحِدَةٍ قَالَ اَصَابَ اِنَّهٗ فَقِیْهٌ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ ابْنُ اَبِیْ مُلَیْكَةَ اَوْتَرَ مُعَاوِیَةُ بَعْدَ الْعِشَآءِ بِرَكْعَةٍ وَعِنْدَهٗ مَوْلًی لِّابْنِ عَبَّاسٍ فَاَتَی ابْنَ عَبَّاسٍ فَاَخْبَرَهٗ فَقَالَ دَعْهُ فَاِنَّهٗ قَدْ صَحِبَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ "امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو وتر کی ایک رکعت میں پڑھتے ہیں؟ حضرت عباسؓ نے فرمایا "وہ فقیہ ہیں (جو کچھ کرتے ہیں) اچھا کرتے ہیں" ایک دوسری روایت میں حضرت ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ نے عشاء کی نماز کے بعد وتر کی ایک رکعت پڑھی، ان کے پاس ہی حضرت ابن عباس کے آزاد کردہ غلام بھی موجود تھے (جب انہوں نے یہ دیکھا تو) وہ حضرت ابن عباس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں بتایا (کہ حضرت معاویہؓ نے وتر کی ایک رکعت پڑھی ہے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "ان کے بارے میں کچھ نہ کہو، انہیں آنحضرت ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہے (ہوسکتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کا کوئی ایسا عمل دیکھا ہو جو دوسرے نہ دیکھ سکے ہوں)۔" (بخاریؒ)

تشریح: بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے وتر کی ایک ہی رکعت پڑھی ہوگی جس پر دیکھنے والوں کو تعجب ہوا ہو کہ جب دوسرے صحابہؓ وتر کی تین رکعتیں پڑھتے ہیں تو یہ ایک ہی رکعت کیوں پڑھتے ہیں؟ اور پھر انہوں نے اس کا تذکرہ حضرت ابن عباس سے کیا لیکن یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے پہلے پڑھی گئی دو رکعت سے ملی ہوئی وتر کی رکعت پڑھی ہو، اس صورت میں دیکھنے والوں نے اس لئے اعتراض کیا کہ حضرت معاویہؓ نے صرف وتر ہی پر اکتفا کیا ہوگا اور عشاء کی نماز یا تہجد کی نماز چھوڑ دی ہوگی۔

وتر پڑھنے کی تاکید

(۲۱) وَعَنْ بُرَیْدَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ يُوْتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ يُوْتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ يُوْتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرور کونین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "وتر حق (یعنی واجب) ہے لہٰذا جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے (یعنی ہمارے تابعداروں میں سے) نہیں ہے، وتر حق ہے لہٰذا جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے، وتر حق ہے لہٰذا جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: وتر کی اہمیت اور اس کی حقیقت کو اس انداز سے بار بار بیان کرنا اور پھر اس کے نہ پڑھنے والے کے بارے میں یہ کہنا کہ جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہمارے تابعداروں میں سے نہیں ہے اس بات پر صریح دلیل ہے کہ وتر کی نماز واجب ہے جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے۔

وتر کی قضاء پڑھنی چاہئے

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَّامَ عَنِ الْوِتْرِ اَوْنَسِيَهٗ فَلْيُصَلِّ اِذَا ذَكَرَ وَاِذَا اسْتَيْقَظَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا "جو شخص وتر پڑھے بغیر سو جائے یا اسے پڑھنا بھول جائے تو اسے چاہئے کہ جب بھی اسے یاد آئے یا نیند سے بیدار ہو تو (اس کی قضا) پڑھ لے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یہ حدیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وتر کی نماز واجب ہے کیونکہ اگر واجب نہ ہوتی تو اس کی قضا پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا۔

نماز وتر واجب ہے یا سنت

(۲۳) وَعَنْ مَّالِكٍ بَلَغَهٗ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ ابْنَ عُمَرَ عَنِ الْوِتْرِ اَوَاجِبٌ هُوَ؟ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ قَدْ اَوْتَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَوْتَرَ الْمُسْلِمُوْنَ فَجَعَلَ الرَّجُلُ يُرَدِّدُ عَلَيْهِ وَعَبْدُاللّٰهِ يَقُوْلُ اَوْتَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَوْتَرَ الْمُسْلِمُوْنَ۔ (رواہ فی الموطا)

"اور حضرت امام مالکؒ کے بارے میں منقول ہے کہ انہیں یہ بات پہنچی ہے کہ "ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ

"وتر کی نماز واجب ہے (یا سُنّت ہے) حضرت عبداللہؓ نے (کوئی صریح جواب دینے کی بجائے) فرمایا کہ "وتر کی نماز آنحضرت ﷺ نے بھی پڑھی ہے! وہ شخص بار بار یہی سوال کرتا تھا اور حضرت ابن عمرؓ یہی کہے جاتے تھے کہ "وتر کی نماز آنحضرت ﷺ نے بھی پڑھی ہے اور دوسرے مسلمانوں نے بھی پڑھی ہے۔" (موطا)

تشریح: کسی سوال کے جواب دینے کا ایک بلیغ طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر مدلول (اصل جواب) کا ذکر نہ کیا جائے اور صرف دلیل بیان کردی جائے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب ایک شخص نے وتر کی نماز کے وجوب یا سُنّت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے مدلول کے بجائے صرف دلیل پر اکتفا کیا گو ان کا مطلب یہ تھا کہ وتر کی نماز واجب ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا مستقل طور پر بطریق مواظبت وتر کی نماز پڑھنا اور اہل اسلام کا اس پر اجماع ہونا اس بات کی دلیل ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ جب سائل حضرت ابن عمرؓ سے صریح جواب چاہنے کے لئے ان سے بار بار سوال کرتا تھا تو انہوں نے صاف طریقہ سے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ وتر کی نماز واجب ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے انداز بیان اور جواب کا یہ طریقہ احتیاط کے پیش نظر اختیار کیا کیونکہ انہوں نے اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ سے کوئی صریح بات نہیں سنی تھی اس لئے انہوں نے بھی صریح جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

نماز وتر کی قرأت

(۲۴) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ يَقْرَأُ فِيْهِنَّ بِتِسْعِ سُوَرٍ مِّنَ الْمُفَصَّلِ يَقْرَأُ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ بِثَلَاثِ سُوَرٍ اٰخِرُهُنَّ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ وتر کی تین رکعتیں پڑھا کرتے تھے جن میں آپ ﷺ مفصّل کی نو سورتیں (اس طرح) پڑھا کرتے تھے (کہ) ہر رکعت میں تین تین سورتیں پڑھتے اور آخر سورت قُل ہو اللہ ہوا کرتی تھی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: بعض روایتوں میں اس اجمال کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ پہلی رکعت میں اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ، اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ اور اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ پڑھتے، دوسری رکعت میں وَالْعَصْرِ۔ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ اور اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ پڑھتے اور تیسری رکعت میں قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، تَبَّتْ يَدَا اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھتے تھے۔

حضرت ابن عمرؓ کا واقعہ

(۲۵) وَعَنْ نَّافِعٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ بِمَكَّةَ وَالسَّمَآءُ مُغِيْمَةٌ فَخَشِيَ الصُّبْحَ فَاَوْتَرَ بِوَاحِدَةٍ ثُمَّ انْكَشَفَ فَرَاٰى اَنَّ عَلَيْهِ لَيْلًا فَشَفَعَ بِوَاحِدَةٍ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فَلَمَّا خَشِيَ الصُّبْحَ اَوْتَرَ بِوَاحِدَةٍ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمرؓ کے ہمراہ مکہ معظمہ میں تھا اور (اس دن رات میں) آسمان ابر آلود تھا، جب حضرت ابن عمرؓ کو صبح ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے ایک رکعت وتر کی پڑھ لی، پھر ابر صاف ہو گیا اور انہوں نے دیکھا کہ ابھی رات (کافی باقی) ہے، چنانچہ انہوں نے ایک رکعت اور پڑھ کر (پہلی رکعت کے ساتھ ملا کر اسے) دوگانہ کر دیا اور اس کے بعد دو دو رکعت (نفل کی) پڑھتے رہے، جب پھر صبح ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے وتر کی ایک رکعت پڑھ لی" (مالکؒ)

بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ایک اور طریقہ

(۲۶) وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ جَالِسًا فَيَقْرَأُ وَهُوَ جَالِسٌ فَاِذَا بَقِيَ مِنْ قِرَآءَتِهٖ قَدْرَ مَا يَكُوْنُ ثَلَاثِيْنَ اَوْ اَرْبَعِيْنَ اٰيَةً قَامَ وَقَرَاَ وَهُوَ قَآئِمٌ ثُمَّ رَكَعَ ثُمَّ سَجَدَ ثُمَّ يَفْعَلُ فِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ (آخر عمر میں دن یا رات میں اس طرح بھی) بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے (طویل قرأت کی وجہ سے) بیٹھے بیٹھے قرأت فرماتے اور جب قرأت تیس یا چالیس آیتیں باقی رہ جاتیں تو کھڑے ہو جاتے اور انہیں کھڑے کھڑے پڑھتے پھر رکوع کرتے اور سجدہ میں جاتے اسی طرح دوسری رکعت میں بھی پڑھتے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس طرح نماز پڑھنی بالاتفاق جائز ہے لیکن اس کا عکس جائز نہیں چنانچہ اس کی تفصیل "باب السنن" میں بیان کی جا چکی ہے۔

بظاہر اس باب سے اس حدیث کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث میں چونکہ شفع (دوگانہ) کا ذکر ہے جو وتر کا مقدمہ ہے اس لئے اسے اس باب میں نقل کیا گیا ہے۔

وتر کے بعد کی دو رکعتیں

(۲۷) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ بَعْدَ الْوِتْرِ رَكْعَتَيْنِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَزَادَ ابْنُ مَاجَةَ خَفِيْفَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ۔

"اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ وتر کے بعد کی دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔" (ترمذیؒ) ابن ماجہؒ نے اس روایت میں خَفِيْفَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں یعنی آنحضرت وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

(۲۸) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ ثُمَّ يَرْكَعُ رَكْعَتَيْنِ يَقْرَأُ فِيْهِمَا وَهُوَ جَالِسٌ فَاِذَا اَرَادَ اَنْ يَّرْكَعَ قَامَ فَرَكَعَ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ وتر کی ایک رکعت پڑھتے پھر دو رکعتیں (نفل کی) پڑھتے جن میں آپ ﷺ بیٹھے بیٹھے قرأت فرماتے اور جب رکوع کرنا چاہتے تو کھڑے ہوتے اور رکوع کرتے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث پہلی حدیث کے منافی ہے کیونکہ کبھی تو آپ ﷺ وتر کے بعد کی دونوں رکعتیں کھڑے ہوئے بغیر مطلقاً بیٹھے بیٹھے پڑھتے اور کبھی اس طرح بیٹھ کر قرأت کے بعد جب رکوع میں جانے کا ارادہ کرتے تو کھڑے ہو جاتے اور رکوع کرتے۔

وتروں کے بعد دو رکعتوں کی فضیلت

(۲۹) وَعَنْ ثَوْبَانَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ هٰذَا السَّهَرَ جُهْدٌ وَّثِقْلٌ فَاِذَا اَوْتَرَ اَحَدُكُمْ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ فَاِنْ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ وَاِلَّا كَانَتَا لَهٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ثوبانؓ راوی ہیں کہ سرکار کونین ﷺ نے فرمایا (تہجد کے لئے) رات میں بیدار ہونا مشکل اور گراں ہوتا ہے اس لئے جب تم میں سے کوئی شخص (رات کے آخری حصہ میں جاگنے) کا یقین نہ رکھتا ہو اور سونے سے پہلے یعنی عشاء کی نماز کے بعد وتر پڑھتے تو اسے چاہئے کہ دو رکعتیں پڑھ لے، اگر وہ نماز تہجد کے لئے رات میں اٹھ گیا تو بہتر ہے اور اگر نہ اٹھ سکا تو پھر دو رکعتیں کافی ہوں گی (یعنی ان دونوں رکعتوں کے پڑھنے کی وجہ سے اسے نماز تہجد کا ثواب مل جائے گا۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

وتروں کے بعد کی دونوں رکعتوں کی قرأت

(۳۰) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْهِمَا بَعْدَ الْوِتْرِ وَهُوَ جَالِسٌ يَقْرَأُ فِيْهِمَا اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ وَقُلْ يَآ اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اور ان میں اذا زلزلت الارض اور قل یا ایھا الکافرون پڑھتے تھے۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

بَابُ الْقُنُوْتِ

قنوت کا بیان

لغوی طور پر قنوت کے کئی معنی ہیں۔ ① طاعت کرنا ② نماز میں کھڑے ہونا ③ اللہ تعالیٰ کے سامنے خاکساری کرنا، اسی طرح "دعا" کو بھی قنوت کہتے ہیں، اصطلاحاً "دعاء مخصوص" کو کہتے ہیں جو یہاں مراد ہے، چنانچہ شوافع کے یہاں دعاء قنوت اللھم اھدنی الخ ہے۔

حضرات حنفیہ کے نزدیک دعاء قنوت اللھم انا نستعینك الخ ہے (دونوں دعائیں مکمل طور پر پچھلے باب میں نقل کی جاچکی ہیں) جسے حنفی علماء صحیح سند و طریق کے ساتھ طبرانی وغیرہ سے نقل کرتے ہیں۔

نیز محقق علامہ حضرت ابن ہمامؒ نے ابوداؤدؒ سے نقل کیا ہے کہ "آنحضرت ﷺ (ایک روز) قبیلہ مضر کے لوگوں کے (ظلم و ستم اور ان کی دہشت و بربریت کے پیش نظر ان) کے لئے بددعا فرما رہے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ ﷺ کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کر کے فرمایا کہ:

یا محمد (ﷺ) ان اللہ لم یبعثكَ سبابا و لا لعانا انما بعثكَ رحمة۔

"اے محمد (ﷺ) آپ (ﷺ) کو اللہ تعالیٰ نے برا کہنے والا اور لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا ہے بلکہ آپ ﷺ کو تو (دونوں جہان کے لئے) رحمت کا باعث بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی لَیۡسَ لَكَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ (یعنی اس چیز میں آپ ﷺ کا کوئی دخل نہیں ہے) بعد ازاں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کو یہ دعا اللھم انا نستعینک الخ سکھائی "شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی اپنی کتاب "درمنثور" میں اس دعا کو کچھ مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

رحمت عالم ﷺ کو بددعا کی ممانعت

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَرَادَ اَنْ یَّدْعُوَ عَلٰی اَحَدٍ اَوْیَدْعُوَ لِاَحَدٍ قَنَتَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ فَرُبَّمَا قَالَ اِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْوَلِیْدَ ابْنَ الْوَلِیْدِ وَسَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ وَّ عَیَّاشَ بْنَ اَبِیْ رَبِیْعَةَ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَكَ عَلٰی مُضَرَ وَاجْعَلْهَا سِنِیْنَ كَسِنِیْ یُوْسُفَ یَجْهَرُ بِذٰلِكَ وَكَانَ یَقُوْلُ فِیْ بَعْضِ صَلَاتِهٖ اَللّٰهُمَّ الْعَنْ فُلَانًا وَّفُلَانًا لِاَحْیَآءٍ مِنَ الْعَرَبِ حَتّٰی اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ الاٰیة۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ جب کسی کو بددعا دیتے یا کسی کے لئے دعا کرنے کا ارادہ فرماتے تو رکوع کے بعد قنوت پڑھتے، چنانچہ بعض وقت جب کہ آپ ﷺ سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کہہ لیتے تو یہ دعا کرتے اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْوَلِیْدَ ابْنَ الْوَلِیْدِ وَسَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ وَّعَیَّاشَ بْنَ اَبِیْ رَبِیْعَةَ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَكَ عَلٰی مُضَرَ وَاجْعَلْهَا سِنِیْنَ كَسِنِیْ یُوْسُفَ (اے اللہ! ولید بن ولید کو

سلمہ بن ہشام کو اور عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات دے اور اے اللہ! قوم مضر پر تو اپنا سخت عذاب نازل کر اور اس عذاب کو ان پر قحط کی صورت میں مسلط کر، ایسا قحط جو یوسف علیہ السلام کے قحط کی مانند ہو (یعنی قوم مضر پر تو اپنا عذاب اس قحط کی شکل میں مسلط کر جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں قوم پر مسلط کیا گیا تھا) یہ دعا آپ ﷺ باآواز بلند کرتے تھے اور کسی نماز میں آپ ﷺ عرب کے (ان) قبائل کے لئے جو کافر تھے) اس طرح بددعا فرماتے اَللّٰھُمَّ الْعَنْ فُلَانًا وَّ فُلَانًا (اے اللہ! فلاں فلاں پر لعنت فرما) پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ الآیۃ" (اس معاملہ میں آپ ﷺ کا کچھ دخل نہیں ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: بعض صحابہ کرامؓ جو کفار کی قید میں تھے اور ان کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے ان کی رہائی و نجات کے لئے آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایا کرتے تھے اور عرب کے وہ قبائل جو مسلمانوں کا قافیہ تنگ کئے رہتے تھے ان کے لئے بددعا فرماتے تھے، چنانچہ ولید ابن الولید قریشی مخزومی جو اسلام کے مایہ ناز فرزند اور اسلامی فوج کے کمانڈر انچیف حضرت خالد بن ولیدؓ کے بھائی تھے، جنگ بدر کے موقع پر کفار مکہ کی جانب سے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کے ہاتھوں گرفتار ہوئے، ان کے بھائی خالد اور ہشام دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور اسیر بھائی کی طرف سے چار ہزار درہم بطور فدیہ دے کر ان کو رہا کرایا اور مکہ لے گئے۔ ولید جب رہا ہو کر مکہ پہنچے تو وہاں اسلام کی مقدس روشنی نے ان کے قلب و دماغ کو منور کیا اور وہ مسلمان ہو گئے، لوگوں نے ان سے کہا کہ جب تم مسلمانوں کے پاس مدینہ میں قید تھے تو اسی وقت فدیہ دینے سے پہلے ہی مسلمان کیوں نہیں ہو گئے کیونکہ وہاں مسلمان ہو جانے کی شکل میں چار ہزار درہم جو فدیہ میں دیئے وہ بھی بچ جاتے اور مسلمان بھی ہو جاتے؟

انہوں نے کہا کہ "مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگا کہ لوگ یہ کہیں کہ قید سے گھبرا کر اسلام لے آیا۔"

مکہ کے کفار اور قبیلہ کے لوگوں کو یہ کیسے گوارا ہوتا کہ ولید اسلام لے آئیں اور اس کی سزا انہیں نہ ملے چنانچہ بھائیوں نے انہیں قید میں ڈال دیا اور جتنا بھی ظلم ان پر ہو سکتا تھا کیا گیا، آنحضرت ﷺ کو جب ان کی حالت مظلومیت کا پتہ چلا تو آپ ﷺ نے پروردگار کی بارگاہ میں ان کی رہائی اور نجات کے لئے دعا مانگی، اس طرح وہ کفار مکہ کے چنگل سے بچ کر مدینہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آگئے۔

سلمہ بن ہشامؓ، ابوجہل کے بھائی تھے اور بالکل ابتدائی دور میں اسلام لے آئے تھے، کفار مکہ نے انہیں بھی قید کر رکھا تھا اور ان پر انتہائی ظلم وجور کرتے تھے، یہ بھی ان کے ہاتھوں سے نکل کر مدینہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آگئے۔

عیاشؓ بن ابی ربیعہ بھی ابوجہل کے ماں کی طرف سے اخیافی بھائی تھے، قدیم الاسلام ہیں، ابتدائی دور میں اسلام کی دولت سے مشرف ہو کر حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ جب مدینہ آئے اور ان سے کہا کہ تمہاری ماں تمہارے لئے سخت بے چین ہے اور اس نے قسم کھائی ہے کہ جب تک تمہیں دیکھ نہیں لے گی، سایہ میں نہیں بیٹھے گی۔

عیاشؓ کو ماں کی محبت ابوجہل جیسے ظالم شخص کے پاس کھینچ لائی۔ مکہ پہنچ کر ابوجہل نے انہیں باندھ کر قید میں ڈال دیا اور ان پر ظلم کر کے اپنے جذبہ وحشت و بربریت کی تسکین حاصل کرتا رہا تاآنکہ یہ بھی اس قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مدینہ آگئے۔ آخر میں معرکہ تبوک کے موقع پر کفار سے مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔

یہ وہ خوش نصیب اصحاب تھے جن کی رہائی و نجات کے لئے آنحضرت ﷺ کی لسان مقدس دعا میں مشغول ہوتی تھی، گویا حدیث کی پہلی دعا اللھم انج الخ اس بات کی مثال ہے کہ آنحضرت ﷺ قنوت میں مؤمنین کے لئے دعا فرماتے تھے۔ حدیث کی دوسری دعا اللھم اشدد الخ اس بات کی مثال ہے کہ آپ ﷺ قنوت میں ظلم و ستم کے پیکر کفار کے لئے بددعا فرماتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ کی بددعا کا اثر یہ ہوا کہ اہل مکہ سات سال تک مسلسل قحط میں گرفتار رہے یہاں تک کہ انہوں نے مردار کی ہڈیاں کھا کر زندگی کے وہ سخت دن پورے کئے۔

آیت لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی شان رحمت کے مناسب چونکہ یہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ کسی

کے لئے بددعا فرمائیں اس لئے آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے منع فرمادیا گیا کہ کسی شخص کے لئے اس کا نام لے کر آپ ﷺ بددعا نہ فرمائیں چنانچہ شروع باب میں اس کی تفصیل ذکر کی جاچکی ہے۔

کسی آفت و بلا کے وقت دعاء قنوت فرضی نمازوں میں پڑھنی چاہئے: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے مثلاً دشمن حملہ آور ہو، قحط اپنی لپیٹ میں لے لے، کوئی وبا پھیل جائے، خشک سالی ہو جائے، یا اس قسم کی کوئی بھی صورت پیش آجائے جس سے مسلمان مصیبت و تکلیف میں مبتلا ہو جائیں تو لوگوں کو چاہئے کہ وہ تمام فرض نمازوں میں دعاء قنوت پڑھنے کا اہتمام کریں۔

چنانچہ حضرات حنفیہ کے یہاں بھی کسی حادثہ اور وبا کے وقت فرض نمازوں میں دعاء قنوت پڑھنا جائز ہے۔

دعاء قنوت پڑھنے کا وقت

② وَعَنْ عَاصِمِ الْاَحْوَلِ قَالَ سَأَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ عَنِ الْقُنُوْتِ فِي الصَّلَاةِ كَانَ قَبْلَ الرُّكُوْعِ اَوْ بَعْدَهُ قَالَ قَبْلَهُ اِنَّمَا قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ شَهْرًا اِنَّهُ كَانَ بَعَثَ اُنَاسًا يُقَالُ لَهُمُ الْقُرَّاءُ سَبْعُوْنَ رَجُلًا فَاُصِيْبُوْا فَقَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ شَهْرًا يَدْعُوْا عَلَيْهِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عاصم احول کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے دعاء قنوت کے بارے میں پوچھا کہ (صبح کی نماز میں یا وتر کی یا کسی حادثہ کی یا وبا پھیلنے کے وقت ہر فرض) نماز میں وہ رکوع سے پہلے پڑھی جاتی تھی یا رکوع کے بعد؟ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ رکوع سے پہلے (اور فرمایا کہ) آنحضرت ﷺ نے (صبح کی نماز میں یا سب نمازوں میں) رکوع کے بعد دعاء قنوت صرف ایک مرتبہ پڑھی تھی (اور وہ بھی) اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے چند صحابہؓ کو جنہیں قراء کہتے تھے اور تعداد میں ستر تھے (تبلیغ کے لئے کہیں) بھیجا تھا (وہاں کے لوگوں نے) انہیں شہید کر دیا اس لئے آنحضرت ﷺ نے ایک مہینہ تک رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھ کر قراء کو شہید کرنے والوں کے لئے بددعا کی۔"

(بخاری ومسلم)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رکوع کے بعد دعاء قنوت کا پڑھنا منسوخ ہو گیا ہے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے۔

قراء سبعون کی شہادت کا واقعہ: قراء سبعون یعنی ستر قاری اصحاب صفہ میں سے تھے انہیں قراء اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ قرآن کریم بہت زیادہ پڑھتے اور بہت یاد کرتے تھے۔ حالانکہ یہ حضرات بہت زیادہ غریب اور زاہد تھے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ صفہ میں ہر وقت قرآن اور علم کے سیکھنے میں مشغول رہتے تھے لیکن اس کے باوجود جب بھی مسلمان کسی حادثہ میں مبتلا ہوتے تو یہ حضرات پوری شجاعت اور بہادری کے ساتھ حادثہ کا مقابلہ کرتے اور مسلمانوں کی مدد کرتے۔

ان میں سے بعض حضرات تو ایسے تھے جو دن بھر جنگل سے لکڑیاں جمع کر کے لاتے اور انہیں بیچ کر اہل صفہ کے لئے کھانا خریدتے تھے اور رات میں قرآن کریم کی تلاوت و درود میں مشغول رہتے تھے۔

ان خوش نصیب صحابہؓ کو آنحضرت ﷺ نے اہل نجد کی طرف بھیجا تھا تاکہ یہ وہاں پہنچ کر ان قبائل کو اسلام کی طرف بلائیں اور ان کے سامنے قرآن کریم پڑھیں جو کفر و شرک اور ظلم و جہل میں پھنس کر تباہی و بربادی کے راستہ پر لگے ہوئے ہیں جب یہ لوگ بیر معونہ پر جو مکہ اور عسفان کے درمیان ایک موضع ہے، اترے تو عامر بن طفیل، رعل، ذکوان اور قارہ نے ان قراء صحابہ پر بڑی بے دردی سے حملہ کیا اور پوری جماعت کو شہید کر ڈالا، ان میں سے صرف ایک صحابی حضرت کعب بن زید انصاری بچ گئے وہ بھی اس طرح کے جب یہ زخمی ہو کر گر گئے اور جسم بالکل نڈھال ہو گیا، تو ان بدبختوں نے یہ سمجھ کر کہ ان کی روح نے بھی جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ان سے الگ ہوئے مگر خوش قسمتی سے ابھی ان میں زندگی کے آثار موجود تھے چنانچہ وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے اور خدا نے ان کو صحت و

تندرستی عطا فرمائی یہاں تک کہ غزوہ خندق میں شہید ہوئے۔

بہر حال جب سرور دو عالم ﷺ کو اس عظیم حادثہ اور ظالم کفار کے ظلم و بربریت کا علم ہوا تو آپ ﷺ کو بے حد غم ہوا، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ہم نے آنحضرت ﷺ کو کسی کے لئے اتنا غمگین نہیں دیکھا جتنا کہ آپ ﷺ ان مظلوم صحابہؓ کے لئے غمگین ہوئے چنانچہ آپ ﷺ مسلسل ایک مہینہ تک قنوت میں ان بد بخت کفار کے لئے بد دعا کرتے رہے، یہ واقعہ ۴ھ میں پیش آیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

دعاء قنوت کس وقت پڑھنی چاہئے؟

(۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهْرًا مُتَتَابِعًا فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ وَصَلَاةِ الصُّبْحِ اِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ مِنَ الرَّكْعَةِ الْآخِرَةِ يَدْعُوْ عَلٰى اَحْيَآءٍ مِّنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ عَلٰى رَعْلٍ وَذَكْوَانَ وَعُصَيَّةَ وَيُؤَمِّنُ مَنْ خَلْفَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے مسلسل ایک مہینہ تک (یعنی ہر روز) ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اور فجر کی نمازوں کی آخری رکعت میں سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد قنوت پڑھی ہے جس میں آپ ﷺ بنی سلیم کے چند قبیلوں رعل، ذکوان اور عصیہ کے لئے بددعا کرتے تھے اور پیچھے کے لوگ (یعنی مقتدی) آمین کہتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہمیشہ فرض نمازوں میں دعا قنوت نہیں پڑھنی چاہئے بلکہ جب مسلمانوں کے لئے کوئی حادثہ پیش آجائے مثلاً کوئی دشمن حملہ کردے، قحط پڑ جائے یا کوئی وبا پھیل جائے تو ایسے وقت میں فرض نمازوں میں دعا قنوت پڑھی جائے۔

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَنَتَ شَهْرًا ثُمَّ تَرَكَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے ایک مہینہ تک (رکوع کے بعد) دعا قنوت پڑھی ہے پھر آپ ﷺ نے (مطلقاً فرض نمازوں میں یا یہ کہ رکوع کے بعد قنوت پڑھنے کو ترک کردیا۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: اکثر اہل علم یہی فرماتے ہیں کہ دعا قنوت نہ تو فجر کی نماز میں مشروع ہے اور نہ وتر کے علاوہ کسی دوسری نماز میں، چنانچہ یہ حضرات اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث بھی ہیں جو فرض نمازوں میں ترک قنوت پر دلالت کرتی ہیں، اہل علم اور محققین اس کی تفصیل مرقاۃ میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ فجر کی نماز میں تو دعاء قنوت ہمیشہ پڑھنی چاہئے اور نمازوں میں کسی حادثہ اور وبا کے وقت پڑھی جائے۔

(۵) وَعَنْ اَبِيْ مَالِكِ الْاَشْجَعِيِّ قَالَ قُلْتُ لِاَبِيْ يَآ اَبَتِ اِنَّكَ قَدْ صَلَّيْتَ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ هٰهُنَا بِالْكُوْفَةِ نَحْوًا مِّنْ خَمْسِ سِنِيْنَ اَكَانُوْا يَقْنُتُوْنَ قَالَ اَيْ بُنَيَّ مُحْدَثٌ۔

(رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابو مالک اشجعی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد مکرم سے دریافت کیا کہ ابا جان! آپ نے سرور کونین ﷺ کے پیچھے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر، حضرت عثمانؓ کے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پیچھے یہیں کوفہ میں تقریباً پانچ سال تک نماز پڑھی ہے کیا یہ

حضرات دعا قنوت پڑھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ "میرے بیٹے! قنوت بدعت ہے۔" (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: حضرت ابومالک اپنے والد محترم سے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ اور خلفاء رابعہ بھی فجر کی نماز میں اور دیگر نمازوں میں قنوت پڑھتے تھے جیسا کہ اب بعض لوگ ان نمازوں میں قنوت پڑھتے ہیں؟

اس کا جواب ان کے والد نے یہ دیا کہ جو لوگ فجر کی اور دوسری نمازوں میں مستقل طریقہ سے یعنی ہمیشہ دعا قنوت پڑھتے ہیں وہ بدعت میں مبتلا ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے تو وتر کے علاوہ فجر کی نماز میں صرف ایک مہینہ تک قنوت پڑھی ہے اس کے بعد آپ ﷺ نے ترک کر دیا تھا جیسا کہ ابھی پچھلی حدیث میں ذکر کیا گیا، گویا یہ حدیث حضرت امام ابوحنیفہ کی دلیل ہے۔

حضرات شوافع فرماتے ہیں کہ جن احادیث میں نماز فجر کے اندر قنوت نہ پڑھنا ذکر کیا گیا ہے وہ سب ضعیف ہیں لیکن ملا علی قاری نے اس قول کا جواب بہت معقول اور مدلل طریقے سے دیا۔ نیز انہوں نے خلفاء اربعہ سے بھی اسی طرح کی روایتیں نقل کی ہیں اس بحث کی تفصیل ان کی شرح میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آخری نصف رمضان میں اور رکوع کے بعد قنوت پڑھنے کا مسئلہ

(٦) عَنِ الْحَسَنِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ جَمَعَ النَّاسَ عَلٰى اُبَيِّ ابْنِ كَعْبٍ فَكَانَ يُصَلِّيْ لَهُمْ عِشْرِيْنَ لَيْلَةً وَّلَا يَقْنُتُ بِهِمْ اِلَّا فِي النِّصْفِ الْبَاقِيْ فَاِذَا كَانَتِ الْعَشْرُ الْاَوَاخِرُ تَخَلَّفَ فَصَلّٰى فِيْ بَيْتِهٖ فَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَبَقَ اُبَيٌّ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَسُئِلَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ عَنِ الْقُنُوْتِ فَقَالَ قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَبْلَ الرُّكُوْعِ وَبَعْدَهٗ۔

(رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب نے لوگوں کو رمضان میں نماز تراویح کے لئے) جمع کیا اور حضرت ابی بن کعب کو امام بنایا، حضرت ابی بن کعب نے ان کو بیس رات تک نماز پڑھائی اور انہوں نے لوگوں کے ساتھ دعا قنوت سواء آخری نصف رمضان کے اور دنوں میں نہیں پڑھی اور جب آخر کے دس روزے رہ گئے حضرت ابی بن کعب مسجد میں نہ آئے بلکہ (وتر کی) نماز اپنے گھر میں پڑھنے لگے، لوگ کہتے کہ "ابی بھاگ گئے" (ابوداؤد) اور حضرت انس بن مالک سے کسی نے دعا قنوت کے بارے میں پوچھا کہ (رکوع سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟) تو انہوں نے فرمایا کہ "آنحضرت ﷺ نے دعا قنوت رکوع کے بعد پڑھی ہے" ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ "آپ ﷺ نے دعا قنوت کبھی رکوع سے پہلے اور کبھی رکوع کے بعد پڑھی ہے۔"

تشریح: حضرت ابی بن کعب ایک جلیل القدر اور بڑی عظمت و شان کے مالک صحابی تھے، جہاں ان کی اور بہت سی امتیازی خصوصیات تھی وہیں آپ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ نے آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں پورا قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔

نیز یہ کہ صحابہ میں بڑے اونچے درجہ کے قاری مانے جاتے تھے، اسی وجہ سے آپ کو "سید القراء" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، چنانچہ حضرت عمر فاروق نے ان کی انہیں خصوصیات کی بنا پر انہیں رمضان میں تراویح کی نماز کے لئے امام مقرر فرمایا تاکہ لوگ ان کی اقتدا میں نماز تروایح پڑھیں۔

یہ دونوں حدیثیں جو حضرت حسن بصری سے منقول ہیں حضرات شوافع کی مستدل ہیں۔

پہلی حدیث تو اس بات کی دلیل ہے کہ "دعاء قنوت صرف رمضان کے آخری نصف حصہ میں پڑھی جائے" علماء احناف فرماتے ہیں کہ اول تو مطلقاً وتر میں دعا قنوت کا پڑھنا مشروع ہوا ہے اور چونکہ وتر کی نماز ہمیشہ پڑھی جاتی ہے اس لئے دعا قنوت بھی ہمیشہ پڑھی جائے گی۔

دوسرے یہ کہ زیادہ ایسی ہی احادیث وارد ہیں جن میں بلا تخصیص رمضان، وتر کی نماز میں دعاء قنوت پڑھنا ثابت ہوتا ہے لہٰذا اس اعتبار سے بھی ہمیشہ وتر کی نماز میں دعاء قنوت کا پڑھنا اولیٰ اور ارجح ہوگا۔

دوسری حدیث شوافع کے لئے اس بات کی دلیل ہے کہ "دعاء قنوت رکوع کے بعد پڑھی جائے" اس کا جواب حنفی علماء کی جانب سے یہ دیا جاتا ہے کہ رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھنے کے سلسلہ میں احادیث زیادہ تعداد میں منقول ہیں، پھر یہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی انہیں احادیث کے مطابق نقل کیا گیا ہے اس لئے انہیں احادیث پر عمل کرنا چاہئے۔

جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جن سے رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھنا ثابت ہوتا ہے تو اس کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ ان احادیث کا تعلق صرف ایک مہینہ سے ہے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کے بعد قنوت پڑھی ہے۔ مستقل طریقہ سے رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھنے سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رمضان کے آخری نصف حصہ میں خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باغیوں کے لئے بددعا کرنے کی وجہ سے دعاء قنوت پڑھتے ہوں گے کیونکہ صحیح سند کے ساتھ حضرت عمر فاروقؓ سے منقول ہے کہ:

"جب آدھا رمضان گذر جائے تو (رمضان کے آخری نصف حصہ میں) وتر میں کفار پر لعنت بھیجنا سنت ہے"

اَبَقَ اُبَیٌّ کے الفاظ کہہ کر لوگوں نے حضرت ابی کو بھاگنے والے غلام کے ساتھ تشبیہ دی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی نظر میں حضرت ابی کا یہ عمل کہ "آخری دس دنوں میں مسجد نہیں آئے" مکروہ معلوم ہوا۔ حالانکہ حضرت ابی کسی عذر کی بنا پر ہی رمضان کے آخری عشرہ میں مسجد نہیں آئے ہوں گے۔

اور عذر یہی ہوسکتا ہے کہ وہ ان ایام میں خلوت اختیار کرتے تھے تاکہ عبادت کا وہ کمال خلوت میں حاصل ہو جائے جو جلوت میں حاصل نہیں ہوتا۔

حدیث کے الفاظ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء قنوت رکوع کے بعد پڑھی ہے" سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک مہینہ تک (فجر کی نماز میں) رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھی ہے اور اس پر دلیل بخاریؒ و مسلمؒ کی وہ روایت ہے جو عاصم احولؒ سے منقول ہے (ملاحظہ فرمائے اسی باب کی حدیث نمبر ۲)

آخری روایت کا مفہوم یہ ہے کہ "کبھی (یعنی وتر میں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے تھے اور کبھی (یعنی کسی حادثہ و وباء کے وقت) رکوع کے بعد پڑھتے تھے"

اس مفہوم سے ان تمام احادیث میں تطبیق ہو جائے گی جن میں سے بعض روایات تو رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھنے پر دلالت کرتی ہیں اور بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑتے تھے۔"

بَابُ قِيَامِ شَهْرِ رَمَضَانَ

ماہ رمضان میں قیام کا بیان

ماہ رمضان میں قیام سے مراد ہے اس بابرکت مہینہ کی مقدس راتوں میں عبادت خداوندی کے لئے یعنی نماز تراویح اور تلاوت قرآن وغیرہ کے لئے جاگتے رہنا۔

نماز تراویح: یہاں اس باب کے تحت زیادہ تراویح سے متعلق احادیث نقل کی جائیں گی اور اس نماز کی فضیلت اور اس کے احکام و مسائل بیان کئے جائیں گے اس موقع پر نماز تراویح کا چند احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

❶ رمضان میں نماز تراویح مرد و عورت دونوں کے لئے سُنّت مؤکدہ ہے۔
❷ جس رات کو رمضان کا چاند دیکھا جائے اسی رات سے تراویح شروع کی جائے اور جب عید کا چاند دیکھا جائے چھوڑ دی جائے۔
❸ نماز تراویح روزہ کی تابع نہیں ہے جو لوگ کسی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکیں ان کو بھی تراویح کا پڑھنا سُنّت ہے اگر نہ پڑھیں گے تو ترک سُنّت کا گناہ ان پر ہوگا۔
❹ نماز تراویح کا وقت عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوتا ہے اور عشاء کی نماز کے بعد تراویح پڑھ چکا ہو اور اس کے بعد معلوم ہو کہ عشاء کی نماز میں کچھ سہو ہو گیا جس کی وجہ سے عشاء کی نماز نہیں ہوئی تو اس عشاء کی نماز کے بعد تراویح کا اعادہ بھی کرنا چاہئے۔
❺ اگر عشاء کی نماز جماعت سے نہ پڑھی گئی ہو تو تراویح بھی جماعت سے نہ پڑھی جائے اس لئے کہ تراویح عشاء کی تابع ہے ہاں جو لوگ جماعت سے عشاء کی نماز پڑھ کر تراویح جماعت سے پڑھ رہے ہوں ان کے ساتھ شریک ہو کر اس شخص کو بھی تراویح کا جماعت سے پڑھ لینا درست ہو جائے گا۔ جس نے عشاء کی نماز بغیر جماعت کے پڑھی ہے اس لئے کہ وہ ان لوگوں کا تابع سمجھا جائے گا جن کی جماعت درست ہے۔
❻ اگر کوئی مسجد میں ایسے وقت پہنچے کہ عشاء کی نماز ہو چکی ہو تو اسے چاہئے کہ پہلے عشاء کی نماز پڑھے پھر تراویح میں شریک ہو اور اس درمیان میں تراویح کی کچھ رکعتیں ہو جائیں تو ان کو وتر پڑھنے کے بعد پڑھ لے۔
❼ مہینہ میں ایک مرتبہ قرآن مجید کا ترتیب وار تراویح میں پڑھنا سُنّت مؤکدہ ہے لوگوں کی کاہلی یا سستی کی وجہ سے اس کو ترک نہ کرنا چاہیے ہاں اگر یہ اندیشہ ہو کہ پورا قرآن مجید پڑھا جائے گا تو لوگ نماز میں نہ آئیں گے اور جماعت ٹوٹ جائے یا ان کو بہت ناگوار ہو گا تو بہتر ہے کہ جس قدر لوگوں کو گراں نہ گذرے اسی قدر پڑھا جائے۔ یا الم ترکیف سے آخر تک کی دس سورتیں پڑھ دی جائیں۔ ہر رکعت میں ایک سورت پھر جب دس رکعتیں ہو جائیں تو انہیں سورتوں کو دوبارہ پڑھ دے یا اور جو سورتیں چاہے پڑھے۔
❽ ایک قرآن مجید سے زیادہ نہ پڑھا جائے تاوقتیکہ لوگوں کا شوق نہ معلوم ہو جائے۔
❾ ایک رات میں پورے قرآن مجید کا پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ لوگ شوقین ہوں کہ انہیں گراں نہ گذرے اگر گراں گذرے اور ناگوار ہو تو مکروہ ہے۔
❿ تراویح میں کسی سورت کے شروع پر ایک مرتبہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے پڑھ دینا چاہئے اس لئے کہ بسم اللہ بھی قرآن مجید کی ایک آیت ہے۔ اگرچہ کسی سورت کا جز نہیں، پس اگر بسم اللہ بالکل نہ پڑھی جائے تو مقتدیوں کا قرآن مجید پورا نہ ہوگا۔
⓫ تراویح کا رمضان کے پورے مہینے میں پڑھنا سُنّت ہے اگرچہ قرآن مجید مہینہ پورا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے مثلاً پندرہ روز میں یا بیس روز میں پورا قرآن مجید پڑھ دیا جائے تو بقیہ پندرہ یا دس روز میں تراویح کا پڑھنا سُنّت موکدہ ہے۔
⓬ صحیح یہ ہے کہ تراویح میں قل ہو اللہ کا تین مرتبہ پڑھنا جیسا کہ آجکل دستور ہے مکروہ ہے۔
⓭ نماز تراویح کی نیت اس طرح کی جائے نَوَيْتُ اَنْ اُصَلِّيَ رَكْعَتَي صَلٰوةِ التَّرَاوِيحِ سُنَّةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابِهٖ میں دو رکعت نماز تراویح پڑھنے کی نیت کرتا ہوں جو نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ کی سُنّت ہے۔
⓮ نماز تراویح پڑھنے کا وہی طریقہ ہے جو دیگر نمازوں کا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

باجماعت نماز تراویح سُنّت ہے

① عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّخَذَ حُجْرَةً فِي الْمَسْجِدِ مِنْ حَصِيْرٍ فَصَلّٰى فِيْهَا لَيَالِيَ حَتّٰى

اجْتَمَعَ عَلَيْهِ نَاسٌ ثُمَّ فَقَدُوْا صَوْتَهُ لَيْلَةً وَّظَنُّوْا اَنَّهُ قَدْ نَامَ فَجَعَلَ بَعْضُهُمْ يَتَنَحْنَحُ لِيَخْرُجَ اِلَيْهِمْ فَقَالَ مَازَالَ بِكُمُ الَّذِیْ رَاَيْتُ مِنْ صَنِيْعِكُمْ حَتّٰى خَشِيْتُ اَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ كُتِبَ عَلَيْكُمْ مَا قُمْتُمْ بِهٖ فَصَلُّوْا اَيُّهَا النَّاسُ فِیْ بُيُوْتِكُمْ فَاِنَّ اَفْضَلَ صَلَاةِ الْمَرْءِ فِیْ بَيْتِهٖ اِلَّا الصَّلَاةَ الْمَكْتُوْبَةَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت زید ابن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے (رمضان میں) مسجد میں بوریئے کا ایک حجرہ بنایا اور کئی راتیں اس میں (تراویح کے علاوہ نفل) نماز پڑھی (جب لوگ جمع ہو جاتے تو آنحضرت ﷺ حجرہ سے باہر تشریف لاتے اور فرائض و تراویح جماعت کے ساتھ پڑھتے) یہاں تک کہ (ایک روز بہت زیادہ) لوگ جمع ہو گئے (آنحضرت ﷺ چونکہ فرض نماز پڑھ کر حجرہ میں تشریف لے جا چکے تھے اور جیسا کہ آپ ﷺ کا معمول تھا کچھ دیر کے بعد باہر تشریف نہ لائے اس لئے لوگوں نے آپ کی کوئی آہٹ محسوس نہیں کی چنانچہ وہ یہ سمجھے کہ آپ ﷺ سو گئے اور لوگوں نے کھنکارنا شروع کیا تاکہ آپ ﷺ (بیدار ہو جائیں اور نماز تراویح کے لئے) باہر تشریف لے آئیں (جیسا کہ آپ ﷺ گذشتہ راتوں تشریف لاتے تھے) آنحضرت ﷺ نے (حجرہ سے باہر نکل کر یا اندر ہی سے) فرمایا کہ "تمہارا کام جو میں دیکھ رہا ہوں برابر جاری رہے (یعنی جماعت سے تراویح پڑھنے کا شوق اور عبادت کے معاملہ میں تمہارا یہ جذبہ ہمیشہ رہے اور پھر فرمایا) لیکن مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ ہو جائے (یعنی اگر میں ہمیشہ نماز تراویح جماعت سے پڑھتا تو یہ نماز تم پر فرض ہو جاتی) اور اگر یہ نماز فرض ہو جاتی تو تم اس کی ادائیگی سے قاصر رہتے، لہٰذا اے لوگو! تم اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو کیونکہ انسان کی بہترین نماز وہی ہے جسے اس نے اپنے گھر میں پڑھا ہو سوائے فرض نماز کے (کہ اسے مسجد میں ہی پڑھنا افضل ہے۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے مسجد نبوی میں اعتکاف کے لئے بوریئے کا ایک حجرہ سا بنا لیا تھا۔ اسی میں آپ ﷺ رمضان کی بابرکت اور مقدس ساعتوں میں عبادت خداوندی اور ذکر اللہ میں مشغول رہا کرتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں بوریئے کا یا اسی قسم کی کسی دوسری چیز کا معتکف بنا لینا جائز ہے لیکن یہ شرط ہے کہ اپنی حاجت و ضرورت سے زیادہ جگہ نہ روکی جائے ورنہ تو بصورت دیگر حرام ہوگا کیونکہ زیادہ جگہ گھیرنے سے دوسرے نمازیوں کو تنگی ہوگی بشرطیکہ جگہ ایسی ہو جس کی لوگوں کو احتیاج اور ضرورت ہو اگرچہ کبھی کبھی ہی ضرورت ہو ہاں اگر کوئی شخص قرینہ سے جانتا ہو کہ اگر لوگ بہت تعداد میں بھی مسجد میں آجائیں گے تب بھی معتکف کے لئے گھیری ہوئی جگہ کی انہیں احتیاج نہیں ہوگی تو ایسی صورت میں ضرورت سے زیادہ بھی جگہ گھیر لینا حرام نہیں ہوگا۔ یہ تفصیل اس بات پر بصراحت دلالت کرتی ہے کہ ایام حج میں مسجد حرام کے اندر لوگوں کو تنگی میں مبتلا کرنا حرام ہے۔

یہ حدیث جہاں آنحضرت ﷺ کی اُمت کے حق میں انتہائی شان رحمت کی غمازی کر رہی ہے کہ آپ نے نماز تراویح کی جماعت پر اس لئے مداومت نہیں فرمائی کہ کہیں یہ نماز اُمت کے لئے فرض ہی قرار نہ دیدی جائے جس سے اُمت کے لوگ تنگی و پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔ وہیں یہ حدیث اس بات کی بھی صریح دلیل ہے کہ تراویح کی نماز با جماعت پڑھنا سُنّت ہے۔

فَصَلُّوْا اَيُّهَا النَّاسُ الخ (لہٰذا، اے لوگو! تم اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو) میں امر استحبابی ہے یعنی آپ ﷺ نے یہ حکم وجوب اور لزوم کے طور پر نہیں دیا بلکہ مقصد یہ ہے کہ فرض نماز کے علاوہ دیگر سنن و نوافل گھروں میں پڑھنے بہتر اور مناسب ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عام نگاہوں سے بچ کر گھروں میں سُنّت و نفل نماز پڑھنے میں ریاء و نمائش کا کوئی ادنیٰ سا جذبہ بھی ظاہر نہیں ہو جو ظاہر ہے کہ عبادت کے سلسلہ میں انتہائی مستحسن اور مطلوب ہے۔

فَاِنَّ اَفْضَلَ الصَّلٰوةِ الخ (انسان کی بہترین نماز وہی ہے جسے اس نے اپنے گھر میں پڑھا ہو) یہ حکم تمام سنن و نوافل نمازوں کے بارے میں ہے کہ کوئی بھی سُنّت یا نفل نماز ہو سب سے بہتر وہی نماز ہے جسے نمازی نے عام نگاہوں سے بچ کر اپنے گھر میں پڑھا ہو مگر وہ نوافل اس حکم میں شامل نہیں ہیں جو شعار اسلام میں سے ہیں مثلاً نماز کسوف، نماز استسقاء اور نماز عیدین کیونکہ ان نمازوں کو مسجد ہی میں پڑھنا افضل ہے۔

نیز مسافروں کے لئے کعبہ اور مسجد نبوی بھی ان احکام میں شامل نہیں ہیں یعنی اگر کسی خوش نصیب کو کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی کی زیارت کا شرف حاصل ہو اور وہ مسافر ہو تو اس کے لئے افضل یہی ہے کہ وہ فرض نمازوں کے ساتھ سنن و نوافل بھی مسجد حرام یا مسجد نبوی میں ہی پڑھے کیونکہ مسافروں کو یہ موقعہ کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے کہ وہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کر سکیں اس لئے مسافر اس موقعہ کو غنیمت جانے اور زیادہ سے زیادہ نمازیں مسجد حرام اور مسجد نبوی میں پڑھے۔

اور یہ (یعنی مسجد حرام اور مسجد نبوی کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دینا) اس بات پر قیاس کیا جاتا ہے کہ مشائخ نے فرمایا ہے کہ مسافروں کے لئے کعبۃ اللہ کا طواف نفل نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ واللہ اعلم

رمضان کی راتوں میں عبادت کرنے کی فضیلت

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُرَغِّبُ فِیْ قِیَامِ رَمَضَانَ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّاْمُرَهُمْ فِیْهِ بِعَزِیْمَةٍ فَیَقُوْلُ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ فَتُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالْاَمْرُ عَلٰی ذٰلِكَ ثُمَّ كَانَ الْاَمْرُ عَلٰی ذٰلِكَ فِیْ خِلَافَةِ اَبِیْ بَكْرٍ وَّصَدْرًا مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ عَلٰی ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ قیام رمضان (یعنی نماز تراویح) کی ترغیب دیا کرتے تھے لیکن تاکید کے ساتھ صحابہؓ کو کوئی حکم نہیں دیا کرتے تھے چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ "جو شخص صحیح اعتقاد کے ساتھ حصول ثواب کے لئے (یعنی ریاء و نمائش کے جذبہ کے ساتھ نہیں بلکہ محض اللہ جل شانہ کی رضاء و خوشنودی کے لئے رمضان میں قیام کرتا ہے اس کے پہلے گناہ صغیرہ بخش دیئے جاتے ہیں" آنحضرت ﷺ نے وفات پائی اور قیام رمضان کا معاملہ اسی طرح رہا (یعنی نماز تراویح کے لئے جماعت مقرر نہیں تھی بلکہ جو جانتا تھا حصول ثواب کے لئے پڑھ لیتا تھا) پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت میں بھی یہی صورت رہی اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کے ابتدائی ایام میں بھی یہی معمول رہا (اور حضرت عمرؓ نے نماز تراویح کے لئے جماعت کا حکم دیا اور اس کا التزام کیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "صحیح اعتقاد اور حصول ثواب کے لئے رمضان میں قیام کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ "رمضان کی مقدس و بابرکت راتوں میں عبادت خداوندی کے لئے شب بیداری کرنا" یا اس سے یہ بھی مراد ہے کہ "جو شخص صحیح اعتقاد کے ساتھ نماز تراویح پڑھے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان رکھتا ہو اور اس بات کو سچ جانتا ہو کہ رمضان کی راتوں میں عبادت خداوندی میں مشغول ہونا مثلاً نماز تراویح وغیرہ کا پڑھنا اللہ تعالیٰ کے قریب اور اس کی رضا و خوشنودی کا باعث ہے تو اس کے وہ گناہ صغیرہ جو اس سے سر زد ہو چکے ہیں معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

سُنّت و نفل نماز گھر میں پڑھنے کی فضیلت اور اس کے اثرات

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَضٰی اَحَدُكُمُ الصَّلَاةَ فِیْ مَسْجِدِهٖ فَلْیَجْعَلْ لِبَیْتِهٖ نَصِیْبًا مِنْ صَلَاتِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ فِیْ بَیْتِهٖ مِنْ صَلَاتِهٖ خَیْرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرتاج (دو عالم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اپنی (فرض) نماز مسجد میں پڑھے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی نماز کا کچھ حصہ اپنے گھر کے لئے بھی رکھ لے (یعنی سُنّت و نوافل بلکہ قضاء بھی گھر میں پڑھے) کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی نماز کے سبب اس کے گھر میں بھلائی پیدا کرتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ گھروں میں سنن و نوافل پڑھنے کی فضیلت اور گھر میں ان نمازوں کے پڑھنے کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کو بتایا جا رہا ہے چنانچہ فرمایا کہ جو شخص فرض نماز مسجد میں پڑھتا ہے اور سُنّت و نفل گھر میں پڑھتا ہے اس کے گھر میں اللہ تعالیٰ اس نماز

کے سبب سے بھلائی پیدا فرماتا ہے یعنی گھر والوں کو نیک توفیق دیتا ہے اور مکینوں کے رزق و عمر میں برکت عطا فرماتا ہے۔

نماز تراویح اس حکم میں شامل نہیں ہے کیونکہ بالاتفاق یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز تراویح کے مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ اور صحابہؓ کا بھی اس پر اجماع تھا۔

اس حدیث کو جو بظاہر اس باب سے متعلق نہیں ہے اس باب میں نقل کر کے گویا (اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ رمضان میں بھی کچھ نمازیں گھر میں بھی پڑھنی چاہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں آنحضرت ﷺ کی عبادت

④ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ صُمْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ یَقُمْ بِنَا شَیْئًا مِنَ الشَّھْرِ حَتّٰی بَقِیَ سَبْعٌ فَقَامَ بِنَا حَتّٰی ذَھَبَ ثُلُثُ اللَّیْلِ فَلَمَّا کَانَتِ السَّادِسَۃُ لَمْ یَقُمْ بِنَا فَلَمَّا کَانَتِ الْخَامِسَۃُ قَامَ بِنَا حَتّٰی ذَھَبَ شَطْرُ اللَّیْلِ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ نَفَّلْتَنَا قِیَامَ ھٰذِہِ اللَّیْلَۃِ فَقَالَ اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا صَلّٰی مَعَ الْاِمَامِ حَتّٰی یَنْصَرِفَ حُسِبَ لَہٗ قِیَامُ لَیْلَۃٍ فَلَمَّا کَانَتِ الرَّابِعَۃُ لَمْ یَقُمْ بِنَا حَتّٰی بَقِیَ ثُلُثُ اللَّیْلِ فَلَمَّا کَانَتِ الثَّالِثَۃُ جَمَعَ اَھْلَہٗ وَنِسَاءَہٗ وَالنَّاسَ فَقَامَ بِنَا حَتّٰی خَشِیْنَا اَنْ یَفُوْتَنَا الْفَلَاحُ قُلْتُ وَمَا الْفَلَاحُ قَالَ السَّحُوْرُ ثُمَّ لَمْ یَقُمْ بِنَا بَقِیَّۃَ الشَّھْرِ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَرَوَی ابْنُ مَاجَۃَ نَحْوَہٗ اِلَّا اَنَّ التِّرْمِذِیَّ لَمْ یَذْکُرْ ثُمَّ لَمْ یَقُمْ بِنَا بَقِیَّۃَ الشَّھْرِ۔

"حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے (رمضان میں) سرتاج دو عالم ﷺ کے ہمراہ روزے رکھے، آپ ﷺ نے مہینے کے اکثر ایام میں ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا (یعنی آپ ﷺ نے رمضان کی راتوں میں ہمارے ساتھ فرض نماز کے علاوہ کوئی اور نماز نہیں پڑھی) یہاں تک کہ جب سات راتیں باقی رہ گئیں (یعنی تئیسویں شب آئی) تو آپ ﷺ نے ہمارے ساتھ تہائی رات تک قیام (یعنی ہمیں نماز تراویح پڑھائی) جب چھ راتیں باقی رہ گئیں (یعنی چوبیسویں شب آئی) تو آپ نے ہمارے ساتھ آدھی رات تک قیام کیا میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کاش آج کی رات قیام اور زیادہ کرتے (یعنی اگر آپ ﷺ آدھی رات سے بھی زیادہ تک ہمیں نماز پڑھاتے رہتے تو بہتر ہوتا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص (فرض) نماز امام کے ساتھ پڑھتا ہے تو اس سے فارغ ہو کر واپس جاتا ہے تو اس کے لئے پوری رات کی عبادت کا ثواب لکھا جاتا ہے (یعنی عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھنے کی وجہ سے اسے پوری رات کی عبادت کا ثواب ملتا ہے نیز یہ کہ نوافل کا اسی وقت پڑھتے رہنا مناسب اور بہتر جب تک دل لگے) جب چار راتیں باقی رہ گئیں (یعنی چھبیسویں شب آئی) تو ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا یہاں تک کہ تہائی رات باقی رہ گئی (اور ہم اسی انتظار میں لگے رہے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائیں اور ہمیں نماز پڑھائیں) جب تین راتیں باقی رہ گئیں (یعنی ستائیسویں شب آئی) تو آنحضرت ﷺ نے اپنے گھر والوں، اپنی عورتوں اور سب لوگوں کو جمع کیا اور ہمارے ساتھ قیام کیا (یعنی تمام رات میں نماز پڑھتے رہے) یہاں تک کہ ہمیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں فلاح فوت نہ ہو جائے" راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا "فلاح کیا ہے"؟ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ (فلاح سے مراد) سحر کا کھانا (ہے) پھر آنحضرت ﷺ نے ہمارے ساتھ مہینہ کا باقی دنوں میں (یعنی اٹھائیسویں اور انتیسویں شب میں) قیام نہیں کیا" ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ)، ابن ماجہ نے بھی اس طرح کی روایت نقل کی ہے نیز ترمذی نے اپنی روایت میں ثم لم یقم بنا بقیۃ الشھر (یعنی آپ ﷺ نے ہمارے ساتھ مہینہ کے باقی دنوں میں قیام نہیں کیا، کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے رمضان کے پہلے دو عشروں میں تراویح کی نماز صحابہؓ کو نہیں پڑھائی اس کا

سبب وہی ہے جو پہلی حدیث میں گذر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھے اندیشہ ہے کہ یہ نماز فرض نہ ہو جائے" حدیث کے الفاظ حتی بقي سبع الخ (یعنی یہاں تک کہ جب سات راتیں باقی رہ گئیں) کے بارہ میں علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ حساب باعتبار یقین کے ہے یعنی انتیس دن کا مہینہ یقینی ہے اسی پر حساب لگایا ہے جیسا کہ ترجمہ کے دوران قوسین میں اس کی وضاحت کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

"سحر کھانے" کو "فلاح" اس لئے کہا ہے کہ اس کے ذریعہ روزہ رکھنے کی قوت و طاقت حاصل ہوتی ہے جو درحقیقت فلاح کا سبب ہے۔ آخری راتوں میں قیام کا تفاوت فضیلت کے تفاوت کے اعتبار سے تھا یعنی جن راتوں کی فضیلت کم تھی ان راتوں میں قیام کم کیا اور جن راتوں کی فضیلت زیادہ تھی ان میں فضیلت کی اسی زیادتی کے مطابق قیام بھی زیادہ کیا یہاں تک کہ ستائیسویں شب میں آپ ﷺ نے تمام رات قیام کیا۔ کیونکہ اکثر علماء کے قول کے مطابق "لیلۃ القدر" ستائیسویں ہی شب ہے یہی وجہ کہ آپ ﷺ نے اس رات میں اپنے گھر والوں، عورتوں کو جمع کیا اور سب کے ساتھ پوری رات عبادت خداوندی میں مشغول رہے۔

ماہ شعبان کی پندرویں شب کی فضیلت

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ فَقَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً فَاِذَا هُوَ بِالْبَقِيْعِ فَقَالَ اَكُنْتِ تَخَافِيْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَرَسُوْلُهٗ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنَّكَ اَتَيْتَ بَعْضَ نِسَائِكَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَنْزِلُ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَغْفِرُ لِاَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ كَلْبٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ ابْنُ مَاجَةَ وَزَادَ رَزِيْنٌ مِمَّنِ اسْتَحَقَّ النَّارَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ سَمِعْتُ مُحَمَّدًا يَعْنِي الْبُخَارِيَّ يُضَعِّفُ هٰذَا الْحَدِيْثَ۔

"اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک (مرتبہ اپنی باری میں) رات کو میں نے سرتاج دو عالم ﷺ کو بستر پر نہیں پایا (جب میں نے تلاش کیا تو) یکایک کیا دیکھتی ہوں کہ آپ ﷺ بقیع میں موجود ہیں (مجھے دیکھ کر) آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تمہیں اس بات کا خوف تھا کہ اللہ اور اس کا رسول تم پر ظلم کریں گے"؟ میں نے عرض کیا کہ: "یا رسول اللہ (ﷺ)! مجھے خیال ہوا تھا کہ آپ ﷺ اپنی کسی اور بیوی کے پاس تشریف لے گئے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نصف ماہ شعبان کی رات (یعنی شعبان کی پندرہویں شب) میں آسمان دنیا (یعنی پہلے آسمان) پر نزول فرماتا ہے اور قبیلہ بنو کلب (کی بکریوں) کے ریوڑ کے بالوں سے بھی زیادہ تعداد میں گناہ بخشتا ہے اور رزینؒ نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "مؤمنین میں سے) جو لوگ دوزخ کے مستحق ہو چکے ہیں انہیں بخشتا ہے" امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے محمد یعنی امام بخاریؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "یہ حدیث ضعیف" ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "بقیع" مدینہ منورہ میں ایک قبرستان کا نام ہے اسی کو جنت البقیع بھی کہتے ہیں۔

یہاں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے ایک دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ اسی واقعہ کو ذرا تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان فرماتی ہیں کہ "جب میں نے آنحضرت ﷺ کو (رات کو اپنی باری کے موقعہ پر) بستر پر نہیں پایا تو میں نے اپنے بدن پر اپنے کپڑے لپیٹے اور آپ ﷺ کے نقش قدم ڈھونڈتی ہوئی باہر نکل گئی اچانک میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ بقیع میں سجدہ میں پڑے ہوئے ہیں اور سجدہ بھی آپ ﷺ نے اتنا دراز کیا کہ مجھے تو یہ شبہ ہوا کہ (خدانخواستہ) آپ ﷺ کا وصال ہو گیا ہے جب آپ ﷺ (بہت دیر کے بعد سجدہ سے اٹھ کر) سلام پھیر چکے تو میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم ڈرتی تھیں کہ خدا اور اس کا رسول تمہارے ساتھ ظلم کا معاملہ کریں گے، یعنی تمہیں یہ خیال ہو گیا تھا کہ میں تمہاری باری چھوڑ کر کسی اور بیوی کے یہاں چلا گیا ہوں"؟ (اس جملہ میں "اللہ" کا ذکر زینت اور حسن کلام کے لئے ہے)

اس کے بعد حضرت عائشہؓ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ "یا رسول اللہ! میں نے یہ گمان نہیں کیا کہ (نعوذ باللہ) خدا اور خدا کے

رسول ﷺ نے میرے ساتھ ظلم کا معاملہ کیا ہے بلکہ مجھے تو خیال ہو گیا تھا کہ یا تو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یا اپنے ہی اجتہاد سے میرے پاس سے اٹھ کر کسی دوسری بیوی کے یہاں چلے گئے ہیں۔

حضرت علامہ ابن حجرؒ حضرت عائشہؓ کے اس جواب کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ "خدانخواستہ اگر حضرت عائشہؓ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے جواب میں نعم (جی ہاں) فرمادیتیں تو معاملہ اتنا نازک تھا کہ حضرت عائشہؓ کا یہ جواب کفر شمار ہوتا مگر حضرت عائشہؓ اپنی فراست اور ذہانت سے صورت حال سمجھ گئیں اس لئے جواب انہوں نے اس پیرایہ سے دیا کہ اپنی پریشانی و حیرانی کا عذر بیان کیا پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے پاس سے اٹھ آنے کا عذر بیان کیا کہ "شعبان کی پندرہویں شب میں اللہ جل شانہ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے یعنی اپنی رحمت کاملہ کا فیضان اس بیکراں طور پر ہوتا ہے۔ کہ قبیلہ بنو کلب کے ریوڑ کے جتنے بال ہیں ان سے بھی زیادہ لوگوں کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ وقت چونکہ برکات ربانی اور تجلیات رحمانی کے اترنے کا تھا اس لئے میں نے چاہا کہ ایسے بابرکت اور مقدس وقت میں اپنی اُمت کے لوگوں کے بخشش کی دعا کروں چنانچہ میں جنت البقیع میں پہنچ کر اپنے پروردگار کی مناجات اور اس سے دعا مانگنے میں مشغول ہو گیا۔

یہ حدیث ضعیف ہے جیسا کہ آخر روایت میں حضرت امام ترمذیؒ کے قول سے معلوم ہوا۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی کئی جگہ بتایا جاچکا ہے کہ فضائل اعمال کے سلسلہ میں ضعیف احادیث پر عمل کرنا بالاتفاق جائز ہے۔

یہ حدیث اگرچہ اس باب سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی لیکن معنوی طور پر اس حدیث کو باب سے مناسبت یہ ہے کہ شعبان کی پندرہویں شب بھی اپنی فضیلت و برکت کی زیادتی کی بناء پر قیام رمضان کے مقدمہ کی مانند ہے۔ واللہ اعلم۔

نفل نماز گھر میں پڑھنے کی فضیلت

⑥ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةُ الْمَرْءِ فِيْ بَيْتِهِ اَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهِ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت زید ابن ثابتؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا" آدمی کی اپنے گھر میں پڑھی ہوئی نماز اس نماز سے بہتر ہے جو میری مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں پڑھی جائے علاوہ فرض کے (کہ فرض نماز مسجد ہی میں پڑھنی بہتر ہے)۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: باوجود یہ کہ مسجد نبوی میں ایک نماز کا ثواب ہزار نماز کے ثواب کے برابر ہوتا ہے لیکن نفل نمازوں کو گھروں میں ہی پڑھنا مسجد نبوی میں نفل نماز پڑھنے سے افضل قرار دیا گیا ہے کیونکہ گھروں میں پڑھی گئی نماز ریا و نمائش کے جذبہ سے بالکل پاک و صاف ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد اس وقت کا ہے جب کہ آپ ﷺ نے رمضان میں چند شب کا قیام ترک کر دیا تھا اور اس کا عذر بیان کرتے ہوئے گھروں میں نماز پڑھنے کی فضیلت بیان کی اور پھر فرمایا کہ جاؤ اپنے گھروں میں نماز پڑھو!

نماز تراویح گھر میں پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں: اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے حضرت امام ملکؒ، حضرت امام ابو یوسفؒ اور بعض شوافع نے یہ کہا ہے کہ نماز تراویح کے سلسلہ میں افضل یہ ہے کہ یہ نماز گھر میں تنہا پڑھی جائے جہاں تک آنحضرت ﷺ کے عمل کا سوال ہے کہ آپ نے نماز تراویح مسجد میں پڑھی ہے تو اس بارہ میں ان حضرات کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسجد میں نماز تراویح بیان جواز کے خاطر پڑھی تھی۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ معتکف تھے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام شافعیؒ، شوافع علماء کی اکثریت اور بعض مالکیہ حضرات کا متفقہ طور پر یہ مسلک ہے کہ نماز تراویح کا مسجد میں پڑھنا ہی افضل ہے جیسا کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ اور اس کے بعد کے دوسرے صحابہؓ نے اس نماز کو مسجد ہی میں پڑھنا مقرر کیا اور پھر اسی پر تمام مسلمانوں کا ہمیشہ عمل رہا، کیونکہ نماز تراویح شعار دین ہے۔ اور نماز عیدین کے مشابہ ہے۔ فقہ کی

کتابوں میں اس مسئلہ میں مختار اور بہتر طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی ایسا آدمی ہو جو مسلمانوں کی پیشوائی و رہبری کے مرتبہ پر فائز ہو اور اس کی وجہ سے جماعت میں کثرت ہوتی ہو تو اسے چاہئے کہ وہ نماز تراویح مسجد میں پڑھے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر جائز ہے کہ گھر ہی میں پڑھ لی جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت عمرؓ کا نماز تراویح کے لئے جماعت مقرر کرنا

(۷) عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِالْقَارِيِّ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ لَيْلَةً اِلَى الْمَسْجِدِ فَاِذَا النَّاسُ اَوْزَاعٌ مُتَفَرِّقُوْنَ يُصَلِّي الرَّجُلُ لِنَفْسِهٖ وَيُصَلِّي الرَّجُلُ فَيُصَلِّي بِصَلَاتِهِ الرَّهْطُ فَقَالَ عُمَرُ اِنِّي لَوْ جَمَعْتُ هٰؤُلَاءِ عَلٰى وَاحِدٍ لَكَانَ اَمْثَلَ ثُمَّ عَزَمَ فَجَمَعَهُمْ عَلٰى اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ ثُمَّ خَرَجْتُ مَعَهٗ لَيْلَةً اُخْرٰى وَالنَّاسُ يُصَلُّوْنَ بِصَلَاةِ قَارِئِهِمْ قَالَ عُمَرُ نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ وَالَّتِي تَنَامُوْنَ عَنْهَا اَفْضَلُ مِنَ الَّتِي تَقُوْمُوْنَ يُرِيْدُ اٰخِرَ اللَّيْلِ وَكَانَ النَّاسُ يَقُوْمُوْنَ اَوَّلَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عبدالرحمٰن ابن عبدالقاریؒ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ رمضان کی) رات میں حضرت عمر فاروقؓ کے ہمراہ مسجد میں گیا وہاں ہم نے کیا دیکھا کہ لوگ متفرق اور بکھرے ہوئے تھے (یعنی) کوئی تو (عشاء کی نماز کے بعد نفل) نماز تنہا پڑھ رہا تھا اور کوئی اس طرح پڑھ رہا تھا کہ چند آدمی اور بھی اس کے ساتھ تھے (گویا کچھ لوگ تو الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے اور کچھ لوگ جماعت کے ساتھ پڑھ رہے تھے یہ صورت حال دیکھ کر) حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا "اگر میں ان لوگوں کو ایک قاری کے پیچھے جمع کر دوں تو بہتر ہو گا" چنانچہ انہوں نے اس کا ارادہ کر لیا اور سب لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کے پیچھے جمع کر دیا (یعنی انہیں نماز تراویح کے لئے لوگوں کا امام مقرر کر دیا) حضرت عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ "(پھر اس کے بعد) میں ایک رات حضرت عمرؓ کے ہمراہ مسجد میں گیا، وہاں سب لوگ اپنے امام یعنی حضرت ابی ابن کعبؓ) کے ہمراہ نماز پڑھ رہے تھے (یہ دیکھ کر) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اچھی بدعت ہے" اور (تراویح کی) اس وقت کی نماز جب کہ تم سوتے رہتے ہو اس وقت کی نماز سے بہتر ہے" اس سے حضرت عمرؓ کی مراد آخری رات تھی (یعنی حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کا یہ مطلب تھا کہ تراویح کی نماز رات کے آخری حصہ میں پڑھنی رات کے اول وقت پڑھنے سے بہتر ہے کیونکہ) اس وقت لوگ تراویح کی نماز اول وقت پڑھ لیا کرتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: نعمت البدعة (یہ اچھی بدعت ہے) کا مطلب یہ ہے کہ یہ جماعت کا مقرر ہونا اچھی بدعت ہے ہے کہ اصل جماعت گویا حضرت عمرؓ نے تقرر جماعت کو اچھی بدعت کہا نہ کہ اچھی بدعت سے ان کی مراد اصل جماعت تھی کیونکہ جماعت تو آنحضرت ﷺ کے عمل سے ثابت ہو چکی ہے کہ آپ ﷺ نے کئی مرتبہ تراویح کی نماز جماعت سے پڑھی جیسا کہ پچھلی حدیثوں میں گذر چکا ہے ویسے اگر حقیقت پر نظر کی جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ تقریر جماعت بھی "اچھی بدعت" سے آگے بڑھ کر سُنّت کے درجہ میں آجاتا ہے کیونکہ خلفاء راشدین کے قائم کئے ہوئے طریقے بھی سُنّت ہی ہیں۔

بہرحال حاصل یہ ہے کہ یہاں "بدعت" کے لغوی معنی کا اعتبار ہے نہ کہ ان معنی کا جو فقہا کی اصطلاح میں مفہوم ہوتا ہے۔

تراویح کی رکعتوں کی تعداد

(۸) وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ اَمَرَ عُمَرُ اُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ وَتَمِيْمًا الدَّارِيَّ اَنْ يَقُوْمَا لِلنَّاسِ فِيْ رَمَضَانَ بِاِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً فَكَانَ الْقَارِيُّ يَقْرَأُ بِالْمِئِيْنَ حَتّٰى كُنَّا نَعْتَمِدُ عَلَى الْعَصَاءِ مِنْ طُوْلِ الْقِيَامِ فَمَا كُنَّا نَنْصَرِفُ اِلَّا فِيْ فُرُوْعِ الْفَجْرِ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت سائب ابن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت تمیم داریؓ کو حکم دیا کہ وہ رمضان (کی راتوں) میں لوگوں کو (تراویح کی) گیارہ رکعت نماز پڑھائیں اور (اس وقت) امام (تراویح میں) وہ سورتیں پڑھا کرتا تھا جن میں سے ہر ایک میں ایک سو سے زیادہ آیتیں ہیں، چنانچہ قیام کے طویل ہونے کی وجہ سے ہم اپنے عصاء کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے تھے اور فجر کے قریب نماز سے فارغ ہوتے تھے۔" (مالکؒ)

تشریح: حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت تمیم داریؓ دونوں کو امامت کے حکم کا مطلب یہ تھا کہ کبھی وہ امام بنیں اور کبھی وہ، لہٰذا اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے دونوں کو باری باری نماز پڑھانے کا اس طرح حکم دیا ہو کہ کچھ رکعتیں حضرت ابی بن کعبؓ پڑھائیں اور کچھ رکعتیں تمیم داریؓ پڑھائیں اور یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں کو الگ الگ راتوں میں امامت کا حکم دیا ہو بایں طور کہ کچھ راتوں میں ایک امامت کرے اور کچھ راتوں میں دوسرا۔

اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تراویح کی گیارہ ہی رکعتیں ہیں جیسا کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا، حالانکہ علماء لکھتے ہیں کہ یہ بات پایہ ثبوت کو صحت کے ساتھ پہنچ چکی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں تراویح کی بیس رکعتیں پڑھی جاتی تھی لہٰذا اس حدیث کے بارہ میں یہی کہا جائے گا کہ حضرت عمرؓ کبھی تو بیس رکعتیں پڑھتے ہونگے اور کبھی گیارہ رکعتوں پر ہی اکتفا کرتے ہوں گے۔ یا یہ کہ آنحضرت ﷺ سے چونکہ تراویح کی گیارہ رکعتیں پڑھنی ثابت ہوئی ہیں اس لئے آنحضرت ﷺ کے عمل مبارک سے مشابہت کے قصد سے حضرت عمرؓ نے بعض راتوں میں گیارہ رکعت پڑھنے کا حکم دیا پھر اس کے بعد تراویح کی بیس رکعتیں ہی مستقل طور پر مقرر کی گئیں جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے بھی ایک روایت تیس رکعتیں پڑھنی منقول ہوئی ہیں جن میں تین رکعتیں وتر کی شامل ہیں۔

نفل نماز میں سہارا لینا جائز ہے: حدیث کے الفاظ کنا نعتمد علی العصاء کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تراویح میں اتنی طویل قرأت کی جاتی تھی کہ ہم لوگ قیام میں کھڑے کھڑے تھک جاتے تھے جس کی وجہ سے اپنے عصاء سے ٹیک لگا کر کھڑے ہونے پر ہم لوگ مجبور ہوتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں مسئلہ یہ ہے کہ نفل نمازوں میں یوں تو عام طور پر بھی لیکن خاص طور پر ضعف کی حالت میں ٹیک لگانا یا کسی چیز کا سہارا لے لینا جائز ہے۔

(۹) وَعَنِ الْاَعْرَجِ قَالَ مَا اَدْرَكْنَا النَّاسَ اِلَّا وَ هُمْ يَلْعَنُوْنَ الْكَفَرَةَ فِيْ رَمَضَانَ قَالَ وَكَانَ الْقَارِئُ يَقْرَأُ سُوْرَةَ بَقَرَةٍ فِيْ ثَمَانِيْ رَكَعَاتٍ فَاِذَا قَامَ بِهَا فِيْ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً رَأَى النَّاسُ اَنَّهُ قَدْ خَفَّفَ۔ (رواہ مالکؒ)

"اور حضرت اعرجؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ "ہم نے ہمیشہ لوگوں کو دیکھا کہ وہ رمضان (کے روزوں) میں کفار پر لعنت بھیجا کرتے تھے اور (اس زمانہ میں) قاری (یعنی نماز تراویح کا امام) سورہ بقرہ کو آٹھ رکعتوں میں پڑھا کرتا تھا اور جو (کبھی) سورہ بقرہ کو بارہ رکعتوں میں پڑھتا تو لوگ سمجھتے کہ نماز ہلکی پڑھ گئی ہے۔" (مالکؒ)

تشریح: گو حدیث سے بصراحت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کفار پر لعنت پورے رمضان کے وتروں کے ساتھ مخصوص تھا۔ اس طرح تمام حدیثوں میں تطبیق پیدا ہو جائے گی چنانچہ اس مفہوم کو اختیار کرنے کے بعد یہ حدیث حضرت عمرؓ کی اس حدیث کے منافی نہیں ہوگی جس سے ثابت ہو چکا ہے کہ جب رمضان کا نصف حصہ گذر جائے تو وتروں میں کفار پر لعنت بھیجنا سنت ہے۔

کفار پر لعنت بھیجنے کا سبب یہ تھا کہ جب کفار نے اس بابرکت اور مقدس و باعظمت مہینہ کی تعظیم نہ کی جس کی عظمت و بزرگی خود باری تعالیٰ عزاسمہ نے بیان فرمائی ہے اور سرچشمہ ہدایت و فیضان کلام اللہ سے ذرہ برابر بھی ہدایت حاصل نہیں کی جو اسی باعظمت مہینہ میں نازل ہوا ہے تو وہ اس بات کے مستحق ہوئے کہ ان پر لعنت بھیجی جائے۔

نماز تراویح کی رکعتوں کی تعداد کے بارہ میں ابھی پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجئے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز تراویح کی

رکعتوں کی کوئی تعداد متعین نہیں فرمائی تھی بلکہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا عمل مختلف رہا ہے۔ آپ ﷺ سے آٹھ رکعتیں بھی مستون ہیں اور یہ بھی آتا ہے کہ آپ ﷺ نے گیارہ رکعتیں پڑھی ہیں۔ اسی طرح تیرہ اور بیس رکعتیں بھی آپ ﷺ سے پڑھنی منقول ہیں مگر حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں تراویح کی بیس رکعتیں متعین فرمادیں اس کے بعد تمام صحابہؓ کا اسی پر عمل رہا حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی اپنے اپنے زمانہ خلافت میں اس کا انتظام رکھا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ "میری سُنّت اور میرے خلفاء راشدین کی سُنّت اپنے اوپر لازم قرار دو، اسے اپنے دانتوں سے پکڑو"

لہٰذا اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے اس حکم کی موجودگی میں تراویح بیس رکعتوں کے اس لئے قائل نہیں ہوتا کہ ان کا ثبوت قطعی آنحضرت ﷺ سے نہیں ہے تو اس کے بارہ میں سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ منشاء نبوت اور حقیقت سُنّت کی صریح خلاف ورزی کر رہا ہے۔

نماز تراویح کا انتہائی وقت

⑮ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ اَبِیْ بَكْرٍ قَالَ سَمِعْتُ اُبَیًّا یَقُوْلُ كُنَّا نَنْصَرِفُ فِیْ رَمَضَانَ مِنَ الْقِیَامِ فَنَسْتَعْجِلُ الْخَدَمَ بِالطَّعَامِ مَخَافَةَ فَوْتِ السُّحُوْرِ وَفِیْ اُخْرٰی مَخَافَةَ الْفَجْرِ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت عبداللہ ابن ابی بکرؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے حضرت ابی کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہم رمضان مبارک میں جب قیام (یعنی نماز تراویح) سے فارغ ہوتے تھے تو خادموں سے اس خوف سے کہ کہیں سحری کا وقت ختم نہ ہو جائے جلد کھانے کے لئے کہتے تھے" ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "فجر ہو جانے کے خوف سے (ہم خادموں کو جلد کھانے کے لئے کہتے تھے)۔" (مالکؒ)

پندرہویں شعبان کی شب میں بنی آدم کی پیدائش و موت لکھی جاتی ہے

⑯ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَلْ تَدْرِیْنَ مَافِیْ هٰذِهِ اللَّیْلَةِ یَعْنِیْ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ قَالَتْ مَا فِیْهَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ فِیْهَا اَنْ یُكْتَبَ كُلُّ مَوْلُوْدِ بَنِیْ اٰدَمَ فِیْ هٰذِهِ السَّنَةِ وَفِیْهَا اَنْ یُكْتَبَ كُلُّ هَالِكٍ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ فِیْ هٰذِهِ السَّنَةِ وَفِیْهَا تُرْفَعُ اَعْمَالُهُمْ وَفِیْهَا تُنْزَلُ اَرْزَاقُهُمْ فَقَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا مِنْ اَحَدٍ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَقَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی ثَلَاثًا قُلْتُ وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَضَعَ یَدَهٗ عَلٰی هَامَتِهٖ فَقَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ مِنْهُ بِرَحْمَتِهٖ یَقُوْلُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِی الدَّعْوٰتِ الْكَبِیْرِ۔

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے (مجھ سے) سے فرمایا کہ "کیا تم جانتی ہو کہ اس شب میں یعنی پندرہویں شعبان کی شب میں کیا ہوتا ہے؟ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ مجھے تو معلوم نہیں آپ ﷺ ہی بتائیے کہ) کیا ہوتا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "بنی آدم میں کا ہر وہ شخص جو اس سال میں پیدا ہونے والا ہوتا ہے اس رات میں لکھا جاتا ہے، بنی آدم میں کا ہر وہ شخص جو اس سال مرنے والا ہوتا ہے اس رات میں لکھا جاتا ہے اس رات میں بندوں کے اعمال (اوپر) اٹھائے جاتے ہیں اور اسی رات میں بندوں کے رزق اترتے ہیں" حضرت عائشہؓ نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ! کوئی شخص بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا" آپ نے یہ الفاظ تین مرتبہ فرمائے میں نے عرض کیا "اور نہ آپ یا رسول اللہ (ﷺ) (یعنی آپ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر جنّت میں داخل نہیں ہونگے؟) آنحضرت ﷺ نے اپنا دست مبارک اپنے سر مبارک پر رکھا اور فرمایا "اور نہ میں! (یعنی میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر جنّت میں داخل نہیں ہوں گا) مگر یہ کہ اللہ جل شانہ، (اپنے فضل و کرم کے صدقہ میں) مجھے اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے" یہ الفاظ بھی آپ ﷺ نے تین بار فرمائے (بیہقی نے یہ روایت دعوات کبیر میں نقل کی ہے)۔"

تشریح: دنیا میں جتنے بھی انسان پیدا ہونگے یا وفات پائیں گے ان سب کی پیدائش و موت کے بارہ میں، بہت پہلے ہی عمومی طور پر لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے مگر شعبان کی پندرہویں شب میں پھر دوبارہ ان لوگوں کی پیدائش اور موت کا وقت لکھ دیا جاتا ہے جو اس سال پیدا ہونے والے یا مرنے والے ہوتے ہیں۔

"اعمال اٹھائے جاتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ "اس سال میں بندہ سے جو بھی نیک و صالح اعمال سرزد ہونے والے ہونگے وہ اس رات میں لکھ دیئے جاتے ہیں جو ہر روز سرزد ہونے کے بعد بارگاہ رب العزت میں اٹھائے جائیں گے۔

"رزق اترنے" سے مراد رزق کا لکھا جانا ہے یعنی اس سال جس بندہ کے حصہ میں جتنا رزق آئے گا اس کی تفصیل اس شب میں لکھی جاتی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں منقول ہے کہ "اس شب میں موت اور رزق لکھے جاتے ہیں اور اس سال میں حج کرنے والے کا نام (بھی) اس شب میں لکھا جاتا ہے۔"

جب حضرت عائشہؓ نے سنا کہ وہ اعمال صالحہ جو سال بھر میں بندہ سے سرزد ہونے والے ہوتے ہیں کرنے سے پہلے ہی لکھ دیئے جاتے ہیں تو سمجھیں کہ جنّت میں داخل ہونے کا دارومدار محض تقدیر اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر ہے، دخول جنّت عمل پر موقوف نہیں ہے چنانچہ انہوں نے فرمایا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَامِنْ یَدْخُلُ الخ اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بے شک جنّت میں داخل ہونا تو محض اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم ہی پر موقوف ہے وہ جسے چاہے اپنے فضل و کرم سے جنّت میں داخل کرے اور جسے چاہے نہ داخل کرے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی قرآن کریم کی اس آیت:

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔

"یہ جنّت وہ جو تمہیں اس چیز کے بدلہ میں دی گئی ہے جو تم کرتے تھے۔ (یعنی دنیا میں نیک اعمال کرتے تھے)۔"

کے معارض نہیں ہے کیونکہ نیک اعمال تو جنّت میں داخل ہونے کا ظاہری سبب ہیں مگر دخول جنّت کا حقیقی سبب تو اللہ جل شانہ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت ہی ہے نہ کہ اعمال نیک پھر یہ کہ نیک اعمال بھی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں۔ اگر کسی بندے کے ساتھ خدا کی توفیق شامل حال نہ ہو اور اس کے فضل و کرم اور اس کی رحمت کا سایہ اس پر نہ ہو تو وہ نیک اعمال کیسے کر سکتا ہے نیک و صالح اعمال تو بندہ جب ہی کرتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی رحمت بندہ کی رہنمائی کرتی ہے۔ لہٰذا اس طرح بھی یہی کہا جائے گا کہ جنّت میں داخل ہونا تو محض پروردگار کی رحمت پر موقوف ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ "جنّت میں داخل ہونا تو محض پروردگا کی رحمت کے سبب ہے اور جنّت میں درجات کا تفاوت اعمال کے تفاوت پر موقوف ہے یعنی بندہ جنّت میں داخل تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے ہو گا ہاں اعمال کی کارفرمائی اس درجہ کی ہو گی جس بندہ کے نیک اعمال جس درجہ کے ہونگے جنّت میں اسے اس کے مطابق درجہ ملے گا۔

شب برات میں کینہ توز اور مشرک، پرودگار کی عام بخشش سے محروم ہوتا ہے

(۱۲) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَیَطَّلِعُ فِیْ لَیْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَیَغْفِرُ لِجَمِیْعِ خَلْقِهٖ اِلَّا لِمُشْرِكٍ اَوْ مُشَاحِنٍ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ وَ فِیْ رِوَایَتِهٖ اِلَّا اثْنَیْنِ مُشَاحِنٌ وَقَاتِلُ نَفْسٍ۔

"اور حضرت موسیٰ اشعریؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالمؐ نے فرمایا "اللہ جل شانہ، نصف شعبان کی رات کو (یعنی شب برات میں دنیا والوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور مشرک اور کینہ رکھنے والے کے علاوہ اپنی تمام مخلوق کی بخشش فرماتا ہے" (ابن ماجہؒ)، امام احمدؒ نے اس روایت کی عبد اللہ ابن عمروؓ ابن العاصؓ سے نقل کیا اور ان کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ کینہ رکھنے والے اور (ناحق کی کسی کی) زندگی ختم کر دینے والے (کے علاوہ اللہ تعالیٰ اس شب میں تمام مخلوق کی بخشش فرماتا ہے)۔"

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اس بابرکت اور مقدس رات میں اپنی رحمت کاملہ کے ساتھ دنیا والوں پر متوجہ ہوتا ہے تو اس کا دریائے رحمت اتنے جوش میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے حقوق کو بھی معاف کر دیتا ہے اور اپنی بندگی و عبادت اور اطاعت و فرمانبرداری میں سرزد ہوئی کوتاہیوں اور لغزشوں سے درگزر فرما دیتا ہے۔ مگر کفر اور حقوق العباد (بندوں کے حق) کو معاف نہیں فرماتا اور ان کے معاملہ میں اتنی مہلت دیتا ہے کہ اگر وہ توبہ کرلیں تو ان کی توبہ قبول کی جائے اور اگر توبہ نہ کریں اور اپنی بداعتقادی اور بدعملی سے باز نہ آئیں تو انہیں عذاب میں مبتلا کیا جائے۔

کینہ توز (کپٹ رکھنے والے) سے مراد وہ شخص ہے جو شرعی جہت سے نہیں بلکہ نفس امارہ کی فریب کاریوں میں مبتلا ہو کر خواہ مخواہ دوسروں کے لئے اپنے سینہ میں بغض و حسد کی آگ جلائے رکھتا ہے ایسا بدباطن شخص بھی اس بابرکت رات میں پروردگار کی عام بخشش سے کوئی حصہ نہیں پاتا شب برات میں جو بدبخت رحمت الٰہی کے سایہ میں نہیں ہوتا بایں طور کہ ان کی بخشش نہیں ہوتی ان کی تفصیل مختلف روایتوں میں مذکور ہے چنانچہ یہاں تو کفر کرنے والے، کینہ توز اور ناحق کسی کی جان لینے والے کا ذکر کیا گیا ہے۔

بعض روایتوں میں اتنا اور منقول ہے کہ ناتا کاٹنے والے (یعنی رشتہ داری اور بھائی بندی کو منقطع کرنے اور کرانے والے، کو بھی اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا۔ اسی طرح بعض روایتوں میں ازار لٹکانے والوں یعنی ٹخنوں سے نیچا پائجامہ، لنگی لٹکانے والوں، ماں باپ کی نافرمانی کرنے والوں، ہمیشہ شراب پینے والوں، بعض روایتوں میں زنا کرنے والوں، بعض روایتوں میں عشار یعنی ظلم کے ساتھ محصول لینے والوں، جادو کرنے والوں، کاہن، عریف یا غیب کی باتیں بتانے والوں اور صاحب عرطبہ یعنی باجا بجانے والوں کا ذکر کیا گیا ہے یعنی یہ وہ بدبخت لوگ ہیں جو اس مقدس شب میں پروردگار کی عام رحمت سے محروم رہتے ہیں۔

پندرہویں شعبان کے روزے اور شب برات کی عبادت کا حکم

(۱۳) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا وَصُوْمُوْا يَوْمَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ اَلَا مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرَ لَهٗ اَلَا مُسْتَرْزِقٌ فَاَرْزُقَهٗ اَلَا مُبْتَلًى فَاُعَافِيَهٗ اَلَا كَذَا اَلَا كَذَا حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ "جب نصف شعبان کی رات ہو (یعنی شب برات) تو اس رات میں نماز پڑھو اور اس کے دن میں (یعنی پندرہویں کو) روزہ رکھو، کیونکہ اللہ جل شانہ، اس رات میں آفتاب چھپنے کے وقت آسمان دنیا (یعنی نیچے کے آسمان) پر نزول فرماتا ہے (یعنی اپنی رحمت عام کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے) اور (دنیا والوں سے) فرماتا ہے کہ " آگاہ! ہے کوئی بخشش چاہنے والا کہ میں اسے بخشوں؟ آگاہ! ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ میں اسے رزق دوں؟ آگاہ! ہے کوئی گرفتار مصیبت کہ میں اسے عافیت بخشوں؟ آگاہ! ہے کوئی ایسا اور ایسا (یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر ضرورت اور ہر تکلیف کا نام لے کر اپنے بندوں کو پکارتا رہتا ہے مثلاً فرماتا ہے مثلاً کوئی مانگنے والا ہے کہ میں عطا کروں؟ ہے کوئی غمگین کہ میں اسے خوشی و مسرت کے خزانے بخشوں؟ وغیرہ وغیرہ) یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: شب برات کی عظمتوں اور فضیلتوں کا کیا ٹھکانہ؟ یہی وہ مقدس شب ہے کہ پروردگار عالم اپنی رحمت کاملہ اور رحمت عامہ کے ساتھ اہل دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے دنیا والوں کو اپنی رحمت کی طرف لاتا ہے، ان کے دامن میں رحمت و بخشش اور عطاء کے خزانے بھرتا ہے۔

بشارت ہو ان نفوس قدسیہ کو اور ان خوش بختوں کو جو اس مقدس شب میں اپنے پرودگار کی رحمت کا سایہ ڈھونڈتے ہیں عبادت و بندگی کرتے ہیں، اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کی درخواست پیش کرتے ہیں اور مولیٰ ان کی درخواستوں کو اپنی

رحمت کاملہ کے صدقہ قبول فرماتا ہے۔

واحسرتا! ان حرماں نصیبوں پر، جو اس بابرکت وباعظمت شب کی تقدیس کا استقبال لہو ولعب سے کرتے ہیں، آتش بازی جیسے قبیح فعل میں مبتلا ہو کر اپنی نیک بختی وسعادت کو بھسم کرتے ہیں، کھیل کود اور حلوے مانڈے کے چکر میں پڑ کر رحمت خداوندی سے بعد اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم شب برات کی عظمت وفضیلت کا احساس کریں۔ اس رات کی تقدیس کا احترام کریں اور عبادت وبندگی کا مخلصانہ نذرانہ پروردگار کی بارگاہ میں پیش کر کے اس کی رحمت عامہ سے اپنے دین ودنیا کی سعادتوں اور کامرانیوں کو حاصل کریں اکثر صحابہؓ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابن مسعودؓ وغیرہما سے منقول ہے کہ وہ اس رات میں یہ دعا بطور خاص پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ کَتَبْتَنَا اَشْقِیَاءَ فَامْحُہٗ وَاکْتُبْنَا سُعَدَاءَ وَ اِنْ کُنْتَ کَتَبْتَنَا سُعَدَاءَ فَاَثْبِتْنَا فَاِنَّكَ تَمْحُوْ مَنْ تَشَاءُ وَتُثْبِتُ عِنْدَكَ اُمُّ الْکِتَابِ۔

"اے پروردگار! اگر تو نے (لوح محفوظ) ہمیں شقی لکھ رکھا ہے تو اسے مٹا دے اور ہمیں سعید ونیک بخت لکھ دے اور اگر تو نے (لوح محفوظ میں) ہمیں سعید ونیک بخت لکھ رکھا ہے تو اسے قائم رکھ، بیشک جسے تو چاہے مٹائے اور جسے چاہے قائم رکھے اور تیرے ہی پاس اُمّ الکتاب (لوح محفوظ) ہے۔

پندرہویں شعبان کی شب میں اس دعا کا پڑھنا حدیث میں منقول ہے لیکن وہ حدیث قوی نہیں ہے اس دعا کے الفاظ ان کنت کتبتنا اشقیاء میں کتابت سے مراد "کتابت معلقہ" ہے کہ اس میں تغیر وتبدل ممکن ہے یہاں "کتابت محکمہ" مراد نہیں ہے۔ کیونکہ لوح محفوظ میں آخری طور پر جو بات محکم لکھ دی گئی ہے اس میں تغیر وتبدل ممکن نہیں۔"

پندرہویں شعبان کی شب میں نماز الفیہ پڑھنے کی حقیقت: کتاب الآلی میں لکھا ہے کہ "اس رات میں نماز الفیہ یعنی سو رکعتیں نفل نماز اس طرح پڑھی جائیں کہ ہر رکعت میں دس دس قل کی قرأت ہو جیسا کہ دیلمی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔" لیکن یہ روایت موضوع ہے چنانچہ اس سلسلہ میں بعض رسائل میں لکھا ہے کہ علی بن ابراہیمؒ نے فرمایا کہ یہ "جو طریقہ رائج کیا گیا ہے کہ پندرہویں شعبان کی شب میں نماز الفیہ پڑھی جاتی ہے۔ (یعنی سو رکعتیں اس طرح پڑھتے ہیں کہ ہر رکعت میں دس دس قل کی قرأت ہوتی ہے اور اس کو جماعت سے ادا کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس میں نماز جمعہ وعیدین سے بھی زیادہ اہتمام کرتے ہیں اس کے بارہ میں نہ کوئی صحیح حدیث ہی ثابت ہے نہ کسی صحابی وتابعی کا کوئی مضبوط ارشاد ہی منقول ہے الا یہ کہ اس سلسلہ میں ضعیف اور موضوع روایتیں ضرور نقل کی جاتی ہیں لہٰذا کوئی شخص صاحب قوت القلوب اور صاحب اخبار وغیرہما کے منقولات سے اس سلسلہ میں غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے (یعنی یہ نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ) عوام اس نماز کی وجہ سے زیادہ فتنوں میں مبتلا ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ اس نماز کی ادائیگی کے وقت روشنی وچراغاں کو ضروری قرار دیدیا گیا تھا جس کی وجہ سے اکثر فسق وفجور کے کام صادر ہونے لگے۔

چنانچہ بہت سے اولیاء اللہ ان امور کی وجہ سے ڈرے کہ کہیں خدا کا کوئی ادبار وعذاب نازل نہ ہو جائے چنانچہ وہ اتنے زیادہ خوف زدہ اور پریشان ہوئے کہ وہ آبادیوں کو چھوڑ کر اور عبادت خداوندی کی آڑ میں ہونے والے فسق وفجور سے منہ موڑ کر جنگلوں میں چلے گئے اس نماز کی ابتدا کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اول اول یہ نماز بیت المقدس میں ۴۴۸ھ میں شروع ہوئی اور اس طریقہ کے رائج ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ کے جاہل اور اقتدار طلب آئمہ مساجد نے اپنے جذبہ اقتدار وجاہ طلبی کی تسکین کے لئے اور عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنے اردگرد جمع کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا چنانچہ اس طرح انہوں نے بہت سے فائدے بھی حاصل کئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے نیک وصالح آئمہ کو پیدا کیا، انہوں نے اس بدعت کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اللہ کے ان نیک بندوں کی سعی و

کوشش سے یہ طریقہ ختم ہوا یہاں تک کہ ۸۰۰ھ کے اوائل میں مصر و شام کے شہروں میں یہ بدعت بالکل ہی ختم ہو گئی۔"

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا مضمون نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ۔"اس سلسلہ میں میں یہ کہتا ہوں (اتنی بات تو طے ہے کہ نماز الفیہ کے سلسلہ میں حدیث ضعیف منقول ہے اور نفل اعمال کے سلسلہ میں، ضعیف حدیث پر بھی عمل کرنا جائز ہے علماء نے اس نماز کے پڑھنے سے جو منع کیا ہے وہ اس لئے کہ اس کے ساتھ بہت زیادہ منکرات (مثلاً چراغاں وغیرہ) کا اجتماع ہو گیا تھا لہٰذا اگر کوئی شخص تنہا اور مذکورہ بالا منکرات کے بغیر اس نماز کو پڑھنا چاہے تو جائز ہے پڑھ سکتا ہے

اس نماز کے وقت چراغاں کی ابتدا اور اس کی وجہ کے بارہ میں منقول ہے کہ "اول اول چراغا کا رواج قوم برامکہ میں ہوا۔ کیونکہ یہ قوم پہلے آتش پرست تھی جب یہ لوگ مسلمان ہو گئے تو چونکہ ان کے قلب کی گہرائیوں نے ایمان اور اسلام کو پوری طرح قبول نہیں کیا تھا اور ان کے دل میں اپنے قدیم مذہب کی کسی نہ کسی حیثیت محبت باقی تھی اس لئے انہوں نے ایک ایسی چیز کو اسلام میں داخل کیا جو اس وہم میں مبتلا کر دے کہ یہ سُنّت اور شعار دین میں سے ہے۔ یعنی اس نماز کے وقت چراغاں کرنے لگے جس سے دراصل ان کا مقصد آگ کی عبادت کرنا تھا کیونکہ وہ عام مسلمانوں کے ساتھ اس (چراغ کی شکل میں) آگ کی طرف رکوع و سجدہ کرتے تھے۔

کسی بھی عمل کے وقت چراغاں کرنا مستحب نہیں ہے: کسی دوسری ضرورت و حاجت کے وقت کسی بھی جگہ چراغاں کرنا شریعت میں مستحب نہیں ہے چنانچہ بعض حاجی جو پڑھے لکھے نہیں ہوتے جبل عرفات مشعر حرام اور منی میں چراغ وغیرہ جلاتے ہیں اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ اختراع محض ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔

تراویح کی ختم رات میں نمائشی اجتماع بدعت ہے: علامہ طرطوسی کی تحقیق یہ ہے کہ "جس رات میں تراویح ختم ہوتی ہے اس موقع پر (محض ختم میں شرکت کے لئے) عوام کا اجتماع یا منبر وغیرہ نصب کرنا (یا چراغاں کرنا) بدعت ہے۔

ملا علی قاریؒ علامہ طرطوسی کی اس تحقیق کے بارہ میں کہتے ہیں۔ کہ "اللہ تعالیٰ طرطوسیؒ پر اپنی رحمت نازل فرمائے انہوں نے کیا (عمدہ) تحقیق کی ہے اور (بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ) اس غلط طریقہ کو اہل حرمین شریفین نے اختیار کیا ہوا ہے چنانچہ وہاں جس رات میں تراویح ختم ہوتی ہے اس موقع پر مردوں، عورتوں، لڑکوں اور غلاموں کا اس قدر (اور اتنے اہتمام کے ساتھ) اجتماع ہوتا ہے کہ نماز عیدین، نماز جمعہ اور نماز کسوف میں بھی اتنے زیادہ لوگ جمع نہیں ہوتے۔ اس اجتماع کے موقع پر بہت زیادہ نئے نئے منکرات اور غلط اور فاسد اعمال اور افعال کا صدور ہوتا ہے لوگ چراغوں کی طرف منہ کرتے ہیں اور بیت اللہ شریف کی طرف پیٹھ کرتے ہیں اور مطاف کے بیچ میں بالکل آتش پرستوں کی طرح اس ازدہام کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں کہ وہاں کی جگہ طواف کرنے والوں کے لئے تنگ اور پریشان کن ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس وقت طواف کرنے والے، اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہنے والے نمازی اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے بہت زیادہ تکلیف و پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں فَنَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالْغُفْرَانَ وَالرِّضْوَانَ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ۔

باب صلوٰۃ الضُحٰی
نماز ضحیٰ کا بیان

"ضحیٰ" مشتق ہے الضحو والضحوۃ سے جس کے معنی ہیں "آفتاب کا بلند ہونا، دن کا چڑھنا، چاشت کا وقت، چنانچہ آفتاب بلند ہونے کے بعد پڑھی جانے والی نماز کو "نماز ضحیٰ" کہتے ہیں۔

ضحیٰ کی دو نمازیں ہیں نماز اشراق اور نماز چاشت: ضحیٰ کی دو نمازیں ہیں ایک نماز کو "اشراق" کہتے ہیں اور دوسری نماز "نماز چاشت" کہلاتی ہے یعنی بقدر ایک یا دو نیزہ آفتاب بلند ہونے کے بعد، جب کہ وقت مکروہ ختم ہو جاتا ہے اور نماز پڑھنے کا وقت شروع

ہو جاتا ہے تو پہلے پہر تک ضحی کی جو نماز پڑھی جاتی ہے اسے اصطلاح میں "نماز اشراق" کہتے ہیں اور جب آفتاب خوب بلند ہو جائے، فضاء میں اچھی طرح گرمی پیدا ہو جائے اور دھوپ اتنی زیادہ پھیل جائے کہ دوسرا پہر شروع ہو جائے تو زوال سے پہلے پہلے ضحی کی نماز پڑھی جاتی ہے وہ اصطلاح میں "نماز چاشت" کہلاتی ہے عربی میں ان دونوں نمازوں کو ضحوۃ صغری اور ضحوۃ کبری کہتے ہیں۔

نسائی نے ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "جب آفتاب مشرق کی جانب ایسا ہوتا ہے جیسا کہ عصر کے وقت مغرب کی جانب ہوتا ہے تو آنحضرت ﷺ دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ اور جب آفتاب مشرق کی جانب ایسا ہوتا جیسا کہ ظہر کے وقت مغرب کی جانب ہوتا ہے تو آپ ﷺ چار رکعت نماز پڑھتے۔"

اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ ضحی کی دو نمازیں ہیں۔

نماز اشراق کی کم از کم دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ چھ رکعتیں۔ اسی طرح نماز چاشت کی کم سے کم دو رکعتیں ہیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں لیکن علماء کے نزدیک مختار چار رکعتیں ہی پڑھنا ہے کیونکہ جن احادیث سے آنحضرت ﷺ کا چار رکعتیں پڑھنا ثابت ہے وہ احادیث زیادہ صحیح ہیں پھر یہ کہ زیادہ احادیث و آثار چار رکعتوں ہی کے بارے میں منقول ہیں۔

نماز ضحی کی بہت زیادہ فضیلت منقول ہے یہ نماز اکثر علماء کے قول کے مطابق مستحب ہے یہ نماز اس نیت سے پڑھی جاتی ہے۔

نَوَيْتُ اَنْ اُصَلِّيَ اَرْبَعَ رَكْعَاتِ صَلٰوةِ الضُّحٰى سُنَّةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

"میں نے یہ ارادہ کیا کہ چار رکعت نماز ضحی جو نبی کریم ﷺ کی سُنّت ہے پڑھوں۔"

شیخ ولی الدین ابن عراقیؒ فرماتے ہیں کہ "صلوٰۃ ضحی کے بارہ میں صحیح اور مشہور حدیثیں بہت زیادہ منقول ہیں یہاں تک کہ محمد ابن جریر طبرانی نے کہا ہے کہ اس بارہ میں جو احادیث منقول ہیں وہ درجہ تواتر معنوی کو پہنچی ہوئی ہیں۔

قاضی ابوبکرؒ فرماتے ہیں کہ "یہ نماز پچھلے انبیاء اور رسولوں کی نماز ہے۔"

علامہ سیوطیؒ نے دیلمیؒ سے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ "نماز ضحی حضرت داؤد علیہ السلام کی اکثر نماز ہے۔"

ابن بخارؒ نے حضرت ثوبان کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ "نماز ضحی وہ نماز ہے جسے حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز چاشت کی آٹھ رکعتیں

① عَنْ اُمِّ هَانِیٍٔ قَالَتْ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ بَيْتَهَا يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ فَاغْتَسَلَ وَصَلّٰى ثَمَانِيَ رَكْعَاتٍ فَلَمْ اَرَ صَلَاةً قَطُّ اَخَفَّ مِنْهَا غَيْرَ اَنَّهٗ يُتِمُّ الرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ وَقَالَتْ فِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى وَذٰلِكَ ضُحًى۔ (متفق علیہ)

"حضرت اُمّ ہانیؓ فرماتی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ جب فتح مکہ کے دن میرے مکان میں تشریف لائے تو (پہلے) آپ ﷺ نے غسل فرمایا اور (اس کے بعد) آٹھ رکعت نماز پڑھی میں نے اس سے پہلے آپ ﷺ کی اس سے ہلکی کوئی نماز نہیں دیکھی لیکن آپ رکوع و سجود پورا کرتے تھے۔ ایک دوسری روایت میں انہوں نے فرمایا کہ "یہ نماز چاشت تھی۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حضرت اُمّ ہانی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بہن ہیں۔ ان کا نام فاختہ تھا یہ بڑی عظمت و فضیلت کی مالک صحابیہ ہیں مکہ میں آنحضرت ﷺ کی زیادہ تر تبلیغی جد و جہد کا مرکز انہیں کا مکان تھا۔

چاشت کی نماز آپ ﷺ نے آٹھ رکعتیں یا تو دو سلام کے ساتھ یعنی چار چار رکعت کر کے پڑھی ہوں گی یا یہ بھی احتمال ہے کہ چار سلام

کے ساتھ یعنی دو دو رکعت کر کے پڑھی ہوں بہر حال "ہلکی نماز" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت آپ ﷺ نے زیادہ طویل سورتوں کی قرأت نہیں فرمائی اسی طرح تسبیحات وغیرہ بھی زیادہ نہیں پڑھیں۔

نماز ضحیٰ میں آنحضرت ﷺ کی نماز کی رکعتوں کی تعداد

② وَعَنْ مُعَاذَةَ قَالَتْ سَأَلْتُ عَائِشَةَ كَمْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي صَلَاةَ الضُّحٰى قَالَتْ اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ وَيَزِيْدُ مَاشَاءَ اللّٰهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت معاذہ فرماتی ہیں کہ میں نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ سرتاج دو عالم ﷺ نماز ضحیٰ کی کتنی رکعتیں پڑھتے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ "آپ چار رکعتیں پڑھتے تھے اور اس سے زیادہ بھی جس قدر اللہ چاہتا تھا پڑھتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ و یزید ماشاء اللہ کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ نماز ضحیٰ کی آپ ﷺ زیادہ سے زیادہ بارہ رکعت پڑھتے تھے بارہ سے زیادہ کی تعداد کسی حدیث میں منقول نہیں ہے۔

یہ حدیث دونوں وقت کی نماز کو محتمل ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ حدیث میں مذکورہ سوال و جواب کا تعلق نماز اشراق سے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ نماز چاشت سے ہو۔

کتاب احبار میں لکھا ہے کہ "بہتر یہ ہے کہ ان نمازوں میں سورہ والشمس، سورہ واللیل، سورہ والضحیٰ اور الم نشرح کی قرأت کی جائے۔

نماز ضحیٰ کی فضیلت

③ وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصْبِحُ عَلٰى كُلِّ سُلَامٰى مِنْ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ فَكُلُّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةٌ وَكُلُّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ وَكُلُّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ وَكُلُّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَيُجْزِئُ مِنْ ذٰلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "صبح ہوتے ہی تمہاری ہر ہڈی پر صدقہ لازم ہو جاتا ہے لہٰذا ہر تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے ہر تحمید یعنی الحمد للہ کہنا صدقہ ہے ہر تحلیل یعنی لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے ہر تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے برائی سے روکنا صدقہ ہے۔ اور ان سب کے بدلہ میں نماز ضحیٰ کی دو رکعتیں پڑھ لینا کافی ہوتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب انسان صبح کرتا ہے اور اس کے جسم کی ایک ایک ہڈی اور ایک ایک جوڑ آفت و بلا سے صحیح و سالم ہوتا ہے۔ تو اس کی وجہ سے وہ کاروبار اور دنیا کی دیگر مصروفیات میں مشغول رہنے کے قابل رہتا ہے لہٰذا اس عظیم نعمت پر ادائیگی شکر کے لئے ایک ایک ہڈی کے عوض اسے صدقہ دینا لازم ہوتا ہے اور یہ صدقہ صرف چند کلمات ہیں جن کو پڑھنے سے ایک ایک ہڈی اور ایک ایک جوڑ کی طرف سے صدقہ ادا ہو جاتا ہے اور وہ کلمات بھی بھاری بھر کم نہیں ہیں، زیادہ طویل اور سخت نہیں ہیں بلکہ نہایت آسان اور بلا تکلف ادا ہونے والے ہیں یعنی سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر۔

وَيُجْزِئُ مِنْ ذٰلِكَ کا مطلب یہ ہے کہ ان کلمات کے کہنے کی بجائے اگر ضحیٰ کی دو رکعتیں پڑھ لی جائیں تو شکرانہ ادا ہو جاتا ہے ان کلمات کے کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ نماز تو پورے بدن اور تمام اعضا جسمانی کا عمل ہے جس کے ذریعہ بدن کا ایک ایک عضو مصروف عبادت ہو کر اپنا شکرانہ ادا کرتا ہے لہٰذا مناسب اور بہتر یہ ہے کہ اس نماز کو ہمیشہ پڑھنا چاہئے۔

نماز چاشت کا بہتر وقت

④ وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ اَرْقَمَ اَنَّهٗ رَاٰى قَوْمًا يُصَلُّوْنَ مِنَ الضُّحٰى فَقَالَ لَقَدْ عَلِمُوْا اَنَّ الصَّلَاةَ فِيْ غَيْرِ هٰذِهِ السَّاعَةِ اَفْضَلُ اِنَّ

رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلَاۃُ الْاَوَّابِیْنَ حِیْنَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک جماعت کو ضحیٰ کے وقت (چاشت کی) نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ لوگ (احادیث کے ذریعہ) جانتے ہیں کہ اس وقت کے علاوہ دوسرے وقت میں نماز پڑھنا بہتر ہے (یعنی اس وقت زیادہ۔ ثواب ملتا ہے چنانچہ) سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اللہ جل شانہٗ کی جانب کامل توجہ رکھنے والوں کی نماز کا وقت وہ ہے۔ جب کہ اونٹوں کے بچے (یعنی ان کے پیر) گرم ہونے لگیں۔" (مسلم)

تشریح: جب حضرت زیدؓ نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ انہوں نے نماز چاشت کے مختار اور بہتر وقت کا انتظار نہیں کیا بلکہ اول وقت ہی نماز پڑھنے لگے تو انہیں بہت تعجب ہوا اور ان کے بارہ میں فرمایا کہ اگرچہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی حدیث سن چکے ہیں اور انہیں علم ہے کہ یہ وقت نماز چاشت کا افضل وقت نہیں ہے بلکہ افضل اور بہتر وقت تو اس کے بعد شروع ہوگا اس کے باوجود یہ لوگ اس وقت نماز نہ معلوم کیوں پڑھ رہے ہیں؟ چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی روشنی میں بتایا کہ نماز چاشت کا بہتر اور افضل وقت وہ ہے جب کہ اونٹوں کے بچے گرم ہونے لگیں یعنی آفتاب بلند ہو جائے اور دھوپ اتنی پھیل جائے کہ گرمی کی شدت سے زمین گرم ہو جائے جس کی وجہ سے اونٹوں کے پیر جلنے لگیں اور دھوپ و گرمی میں اتنی شدت تقریباً ڈیڑھ پہر گذرنے پر آتی ہے۔

بہر حال اس حدیث سے صریح طور پر معلوم ہو گیا کہ نماز چاشت کا وقت یہ ہے کہ آفتاب خوب بلند ہو جائے، دھوپ اچھی طرح پھیل جائے اور ایک پہر ختم ہونے کے بعد دوسرا پہر شروع ہو جائے اس طرح اس نماز کا آخری وقت دوپہر یعنی زوال سے پہلے پہلے تک ہوگا۔

نماز چاشت کا مذکورہ وقت افضل اس لئے ہے کہ اس وقت عام طور پر طبیعت میں کسل و سستی پیدا ہو جاتی ہے اور جی یہی چاہتا ہے کہ آرام کیا جائے لہٰذا ایسے وقت میں آرام اور طبیعت کے تقاضہ کو پس پشت ڈال کر وہی بندگان خدا نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جو بارگاہ رب العزت کی طرف کامل رجوع اور توجہ رکھتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نماز چاشت کی برکت

⑤ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ وَاَبِیْ ذَرٍّ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ اللّٰہِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اَنَّہٗ قَالَ یَا ابْنَ اٰدَمَ اِرْکَعْ لِیْ اَرْبَعَ رَکْعَاتٍ مِنْ اَوَّلِ النَّھَارِ اَکْفِكَ اٰخِرَہٗ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالدَّارِمِیُّ عَنْ نُعَیْمِ بْنِ ھَمَّازٍ الْغَطْفَانِیِّ وَاَحْمَدُ عَنْھُمْ۔

"حضرت ابودرداءؓ اور حضرت ابوذرؓ (دونوں) روایت کرتے ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! تو دن کے شروع حصہ میں چار رکعت نماز خالص طور پر میرے لئے (یعنی جذبہ نمائش دریاء سے پاک ہو کر) پڑھ! میں تجھ کو اس دن کی شام تک کفایت کروں گا۔" (ترمذیؒ) ابوداؤدؒ، و دارمیؒ نے نعیم ابن ہمار غطفانی سے اور امام احمدؒ نے ان سب سے یہ روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: خداوند قدوس کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "اے بندے! تو دن کے ابتدائی حصہ میں محض میری رضا اور خوشنودی کی خاطر چار رکعت نماز پڑھ لیا کر جس کے بدلہ میں میں دن کے آخری حصہ یعنی شام تک تیری حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کرتا رہوں گا۔ اور تیرے دل میں جو کچھ برائی یعنی پریشانی اور تنگی ہے میں اسے ختم کروں گا گویا دن کے ابتدائی حصہ میں میری عبادت کے لئے اپنا دل فارغ رکھ میں دن کے آخری حصہ تک تیری حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کر کے تیرے دل کو اطمینان و فراغت بخشوں گا۔ مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ

(یعنی جو کچھ شخص خدا کا ہو جاتا ہے خدا اس کا ہو جاتا ہے)

"دن کے شروع حصہ میں چار رکعت نماز" سے نماز اشراق بھی مراد لی جا سکتی ہے اور نماز چاشت بھی مراد ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم

نماز اشراق کی فضیلت

(۶) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِي الْاِنْسَانِ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَسِتُّوْنَ مَفْصِلًا فَعَلَيْهِ اَنْ يَتَصَدَّقَ عَنْ كُلِّ مَفْصِلٍ مِنْهُ بِصَدَقَةٍ قَالُوْا وَمَنْ يُطِيْقُ ذٰلِكَ يَانَبِيَّ اللّٰهِ قَالَ النُّخَاعَةُ فِي الْمَسْجِدِ تَدْفِنُهَا وَالشَّيْئُ تُنَحِّيْهِ عَنِ الطَّرِيْقِ فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فَرَكْعَتَا الضُّحٰى تُجْزِءُكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرتاج دوعالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "انسان (کے جسم) میں تین سو ساٹھ بند (جوڑ) ہیں لہٰذا ہر انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے (جسم کے) ہر جوڑ کے بدلہ میں صدقہ دے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! کون اس کی طاقت رکھتا ہے؟ (کہ اپنے جسم کے ہر ہر جوڑ کے بدلہ میں صدقہ دے) آپ ﷺ نے فرمایا "مسجد میں پڑے ہوئے تھوک کو دفن کر دینا (صدقہ ہی دینا ہے) راستہ سے کسی (تکلیف دہ) چیز (مثلاً نجاست کانٹے، پتھر) کو ہٹا دینا (بھی ایک صدقہ ہے) اور اگر تو (تین سو ساٹھ جوڑوں کی طرف سے صدقہ دینے والی کوئی چیز) نہ پاؤ تو ضحیٰ (یعنی اشراق) کی دو رکعتیں پڑھ لینا تمہارے لئے کافی ہے۔" (اس کے بعد کسی دوسرے صدقہ کی ضرورت نہیں ہے)۔" (ابوداؤد)

تشریح: "لازم" سے مراد وجوب شرعی نہیں ہے کہ جس کو چھوڑنے والا گنہ گار ہوتا ہے بلکہ تاکید مراد ہے کیونکہ نہ تو ضحیٰ کی دو رکعتوں کو خواہ وہ نماز اشراق ہو یا نماز چاشت کسی بھی امام اور عالم نے واجب کہا ہے اور نہ کسی کے نزدیک مذکورہ بالا دونوں صدقے ہی واجب ہیں۔ اگرچہ نہ صرف یہ کہ شریعت کی رو سے بلکہ عقلاً بھی دیکھا جائے تو فیصلہ یہی کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت پر اجمالی اور تفصیلی دونوں طریقوں سے شکر ادا کرنا ہر انسان پر واجب ہے۔

(۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى الضُّحٰى ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً بَنَى اللّٰهُ لَهٗ قَصْرًا مِنْ ذَهَبٍ فِي الْجَنَّةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ۔

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص ضحیٰ کی بارہ رکعتیں پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں سونے کا محل بناتا ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ ہم بجز اسی سند کے (یعنی جو ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے) اور کسی سند سے اسے نہیں جانتے۔"

(۸) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسِ الْجُهَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَعَدَ فِيْ مُصَلَّاهُ حِيْنَ يَنْصَرِفُ مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ حَتّٰى يُسَبِّحَ رَكْعَتَيِ الضُّحٰى لَا يَقُوْلُ اِلَّا خَيْرًا غُفِرَ لَهٗ خَطَايَاهُ وَاِنْ كَانَتْ اَكْثَرَ مِنْ زَبَدِ الْبَحْرِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت معاذ ابن انس جہنیؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص فجر کی نماز پڑھ کر اسی جگہ (برابر) بیٹھا رہے یہاں تک کہ (آفتاب طلوع اور بلند ہونے کے بعد) ضحیٰ کی دو رکعتیں پڑھے اور ان دونوں یعنی نماز فجر و نماز ضحیٰ کے درمیان) نیک کلام کے علاوہ دوسری بات نہ کرے تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اگرچہ وہ دریا کے جھاگ کے برابر کیوں نہ ہوں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جز "من قعد الخ" کی تشریح میں ملا علی قاریؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ "اگر کوئی شخص فجر کی نماز پڑھ کر ذکر و فکر میں مشغول اور نیک کاموں مثلاً علم کے سیکھنے سکھانے، وعظ و نصیحت اور بیت اللہ کے طواف میں مصروف رہے اور جب سورج طلوع ہو کر بلند ہو جاتا ہے تو خواہ گھر میں خواہ مسجد میں نماز ضحیٰ کی دو رکعتیں پڑھ لے اور یہ کہ نماز فجر اور نماز

ضحیٰ کے درمیان سوائے نیک اور صالح کلام کے کوئی اور گفتگو و کلام نہ کرے تو اس کے صغیرہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ جل شانہ، اپنے فضل و کرم کے صدقہ میں گناہ کبیرہ بھی بخش دے۔"

لہٰذا ملا علی قاریؒ کی اس تقریر سے یہ معلوم ہوا کہ ارشاد گرامی "من قعد" (جو شخص بیٹھا رہے) بطور تمثیل کے فرمایا گیا ہے ورنہ تو یہاں ذکر اللہ اور نیک کاموں میں مشغول رہنا مراد ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں۔ کہ "یہاں ضحیٰ کی نماز سے اشراق کی نماز مراد ہے جب کہ دوسری احادیث میں ضحیٰ سے اشراق اور چاشت دونوں نمازیں متحمل ہوتی ہیں اور بظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "یہ ثواب اسی شخص کو ملتا ہے جو نماز فجر سے فارغ ہو کر اسی جگہ بیٹھا رہے جہاں اس نے نماز پڑھی ہے اور کوئی شخص اس جگہ سے اٹھ کر خلوت میں جا کر بیٹھ گیا اور وہاں ذکر اللہ و عبادت میں مشغول رہا تو اسے مذکورہ ثواب نہیں ملے گا۔ اگرچہ بعض علما نے لکھا ہے کہ اگر پریشانی کا ڈر ہو یا یہ کہ ریا و نمائش کا وسوسہ پیدا ہو جانے کا شوق ہم تو ایسی صورت میں خلوت میں جا کر عبادت و ذکر اللہ میں مشغولیت اختیار کی جائے علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایسے موقع پر قبلہ رخ بیٹھنے کو ضروری سمجھا جائے اور اگر نیند کا غلبہ ہونے لگے تو اسے دفع کیا جائے۔

شیخ الاسلام شہاب الدین سہروردیؒ نے کہا ہے کہ "ایسا عمل جس کی جزا دنیا ہی میں فی الوقت باطن کی نورانیت کی شکل میں حاصل ہوتی ہے، یہی عمل ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَافَظَ عَلٰى شُفْعَةِ الضُّحٰى غُفِرَتْ لَهٗ ذُنُوْبُهٗ وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا جو شخص ضحیٰ کی دو رکعتوں پر محافظت کرتا ہے (یعنی ہمیشہ پڑھتا ہے) تو اس کے تمام (صغیرہ) گناہ بخش دیے جائیں گے اگرچہ وہ دریا کے جھاگ کے برابر کیوں نہ ہوں۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

حضرت عائشہؓ اور نماز ضحیٰ

(۱۰) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا كَانَتْ تُصَلِّى الضُّحٰى ثَمَانِىَ رَكَعَاتٍ ثُمَّ تَقُوْلُ لَوْ نُشِرَلِىْ اَبَوَاىَ مَا تَرَكْتُهَا۔ (رواہ مالک)

"اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ وہ نماز ضحیٰ کی آٹھ رکعتیں پڑھا کرتی تھیں فرماتیں کہ میرے لئے میرے ماں باپ بھی زندہ کر دیئے جائیں تو بھی میں اس نماز کو نہ چھوڑوں۔" (امام مالکؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد مبالغہ کے لئے تعلیق بالمحال ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس نماز کو پڑھ کر اتنی زیادہ لذت حاصل ہوتی ہے اور اتنا سرور ہوتا ہے کہ اگر میرے ماں باپ بھی زندہ ہو جائیں باوجودیکہ ان کا زندہ ہونا محال ہے تو ان سے ملاقات کی خوشی اور مسرت بھی مجھے اس نماز سے نہیں روک سکتی۔ گویا حضرت عائشہؓ نے اس کے ذریعہ لوگوں کو ترغیب دلائی ہے کہ اس نماز کو ہمیشہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھا جائے۔

نماز ضحیٰ کے بارہ میں آنحضرت ﷺ کا معمول

(۱۱) وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّى الضُّحٰى حَتّٰى نَقُوْلَ لَا يَدَعُهَا وَيَدَعُهَا حَتّٰى نَقُوْلَ لَا يُصَلِّيْهَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ (جب) ضحیٰ کی نماز پڑھتے تو ہم کہتے کہ اب آپ اس نماز کو چھوڑیں گے نہیں اور جب (کبھی) چھوڑتے تو ہم کہتے کہ اب آپ اس نماز کو نہ پڑھیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جیسا کہ نفل اعمال کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کوئی بھی نفل عمل ہمیشہ نہیں کرتے تھے تاکہ اس التزام کی وجہ سے وہ عمل فرض نہ ہو جائے۔ اسی طرح نماز ضحیٰ کے بارہ میں بھی آپ ﷺ کا یہی معمول تھا کہ آپ ﷺ اُمت کے حق میں انتہائی شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، اس نماز کو کبھی کبھی ترک فرما دیتے تھے تاکہ التزام کے طور پر ہمیشہ اس نماز کو پڑھنے سے اس کی فرضیت کا حکم نازل نہ ہو جائے جس سے اُمت کے لوگ تنگی میں مبتلا ہو جائیں۔

اس موقعہ پر اتنی بات سمجھ لیجئے کہ یہ آنحضرت ﷺ ہی کی خصوصیت تھی کوئی بھی فعل آنحرت ﷺ کے التزام کی وجہ سے فرض ہو جاتا تھا اگر اُمت کے لوگ کوئی فعل التزام کے ساتھ کریں تو فرض نہیں ہوگا۔ لہٰذا اب تمام مسلمان التزام کے ساتھ نماز ضحیٰ ہمیشہ پڑھیں گے تو یہ نماز فرض نہیں ہوگی بلکہ مستحب ہی رہے گی۔

⑭ وَعَنْ مُوَرِّقِ الْعِجْلِي قَالَ قُلْتُ لِابْنِ عُمَرَ تُصَلِّي الضُّحٰى قَالَ لَا قُلْتُ فَعُمَرُ قَالَ لَا قُلْتُ فَاَبُوْ بَكْرٍ قَالَ لَا قُلْتُ فَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا اِخَالُهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مورق عجلی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ "کیا آپ ضحیٰ کی نماز پڑھتے ہیں" انہوں نے فرمایا کہ "نہیں" میں نے کہا کہ "حضرت عمرؓ؟ انہوں فرمایا کہ "وہ بھی نہیں پڑھتے تھے" پھر میں نے پوچھا کہ "حضرت ابوبکرؓ؟" انہوں نے فرمایا کہ "وہ بھی نہیں پڑھتے تھے۔" پھر میں نے پوچھا کہ "اچھا آنحضرت ﷺ"؟ انہوں نے فرمایا کہ "میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ بھی نہیں پڑھتے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کے بارہ میں نماز ضحیٰ پڑھنے کی جو نفی فرمائی اس کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ انکار اس بات پر مبنی ہے کہ آپ مسجد میں ضحیٰ کی نماز نہیں پڑھتے تھے یا حضرت ابن عمرؓ آنحضرت ﷺ کے عمل مبارک اور اس نماز کے پڑھنے کے بارہ میں آپ ﷺ کے ارشاد پر مطلع نہیں ہونگے یا پھر یہ کہ حضرت ابن عمرؓ نے مطلقاً نفی نہیں فرمائی۔ بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ ﷺ اس نماز کو مستقل طریقہ سے ہمیشہ نہیں پڑھتے تھے تاکہ یہ نماز فرض قرار نہ دیدی جائے۔

بہرحال اس نماز کا آنحضرت ﷺ سے پڑھنا اور دوسروں کے لئے اس کے پڑھنے پر تاکید کرنا بہت روایتوں سے ثابت ہے۔ اس لئے اس نماز کے ثبوت میں اس روایت سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

ملا حنفیؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ آنحضرت ﷺ کے بعد اس نماز کے فرض ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں رہا اس لئے یہ کہنا زیادہ مناسب اور بہتر ہے کہ تمام مسلمانوں کو اس نماز پر مداومت یعنی ہمیشہ پابندی کے ساتھ پڑھنا مستحب ہے۔ چنانچہ اکثر علما اور مشائخ کا یہ مسلک ہے۔

بَابُ التَّطَوُّعِ

نفل نماز کا بیان

"تطوع" طوع وطاعت سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں "انقیاد اور فرمانبرداری کرنا" نافلہ عبادت کو تطوع اور نافلہ کرنے والے کو "مُتَطَوِّع" کہتے ہیں لہٰذا اس باب کے تحت اس نمازوں سے متعلق احادیث نقل کی جائیں گی جو نفل ہیں۔

یوں تو فرض و واجب کے سوا ہر نماز کو نفل کہتے ہیں خواہ سُنت ہو یا مستحب لیکن "تطوع" کا اطلاق اکثر ان نمازوں پر ہوتا ہے جو غیر رواتب یعنی غیر سُنت مؤکدہ ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

تحیۃ الوضو کی فضیلت

① وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِبِلَالٍ عِنْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِيَا بِلَالُ حَدِّثْنِی بِاَرْجٰی عَمَلٍ عَمِلْتَهٗ فِی الْاِسْلَامِ فَاِنِّی سَمِعْتُ دَفَّ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَیَّ فِی الْجَنَّةِ قَالَ مَاعَمِلْتُ عَمَلاً اَرْجٰی عِنْدِی اَنِّی لَمْ اَتَطَهَّرْ طُهُوْرًا فِی سَاعَةٍ مِنْ لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ اِلَّا صَلَّيْتُ بِذَالِكَ الطُّهُوْرِ مَاكُتِبَ لِی اَنْ اُصَلِّیَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ) ایک دن سرتاج دوعالم ﷺ نے نماز فجر کے وقت حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ بلال ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے حالت اسلام میں کون سا عمل کیا ہے جس سے تمہیں ثواب کی بہت زیادہ امید ہے کیونکہ میں نے جنت میں اپنے آگے تمہارے جوتوں کی آواز سنی ہے۔ حضرت بلالؓ نے عرض کیا "میں نے ایسی زیادہ امید کا کوئی عمل نہیں کیا سوائے اس کے کہ رات دن میں جب بھی میں پاکی حاصل کرتا ہوں تو اس پاکی سے جس قدر میرے مقدر میں ہے میں نماز ضرور پڑھتا ہوں۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا جنت میں اپنے آگے حضرت بلالؓ کے قدموں کی آواز سننا بذریعہ مکاشفہ تھا کہ عالم غیب سے آپ ﷺ پر نیند کی حالت میں یا حالت بیداری میں یہ ظاہر کیا گیا یا پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں جنت میں اپنے آگے حضرت بلالؓ کے جوتوں کی آواز سنی ہوگی۔

حضرت بلالؓ کا آنحضرت کے آگے چلنا (جیسا کہ آپ ﷺ نے ان کے جوتوں کی آواز سنی) اسی درجہ میں تھا جس درجہ میں کہ خدام کا مخدوم کے آگے چلنا ہوتا ہے۔

"پاکی" سے مراد وضو بھی ہو سکتا ہے اور غسل و تیمم بھی۔ اسی طرح یہ تینوں بھی اس سے مراد لئے جا سکتے ہیں۔

اس حدیث میں جس نماز کی فضیلت کا بیان کیا گیا ہے وہ نماز وہ ہے جو وضو کرنے کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ اس نماز کو اصطلاح میں تحیۃ الوضو یا شکر وضو کہتے ہیں۔

استخارہ کی نماز و دعا

② وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا الْاِسْتِخَارَةَ فِی الْاُمُوْرِ كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ يَقُوْلُ اِذَاهَمَّ اَحَدُكُمْ بِالْاَمْرِ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الْفَرِيْضَةِ ثُمَّ لِيَقُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَيْرٌ لِّی فِی دِيْنِی وَمَعَاشِی وَعَاقِبَةِ اَمْرِی اَوْقَالَ فِی عَاجِلِ اَمْرِی وَ آجِلِهٖ فَاقْدِرْهُ لِی وَيَسِّرْهُ لِی ثُمَّ بَارِكْ لِی فِيْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّی فِی دِيْنِی وَمَعَاشِی وَعَاقِبَةِ اَمْرِی اَوْ قَالَ فِی عَاجِلِ اَمْرِی وَ آجِلِهٖ فَاصْرِفْهُ عَنِّی وَاصْرِفْنِی عَنْهُ وَاقْدِرْلِی الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِی بِهٖ قَالَ وَيُسَمِّی حَاجَتَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ ہمارے تمام کاموں کے لئے دعائے استخارہ اس طرح سکھاتے تھے۔ جیسے قرآن کریم کی کوئی سورۃ سکھاتے تھے (یعنی آپ ﷺ اس دعا کی تعلیم کا بہت اہتمام رکھتے تھے) چنانچہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ "جب تم میں سے کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کرے تو اس کو چاہئے کہ فرض نماز کے علاوہ دو رکعت (نفل) پڑھے پھر یہ دعا پڑھے۔"

اے اللہ! میں تیرے علم کے وسیلہ سے تجھ سے بھلائی مانگتا ہوں اور تیری قدرت کے واسطہ سے (نیک عمل کرنے کی) تجھ سے قدرت مانگتا ہوں اور میں تجھ سے تیرا فضل مانگتا ہوں کیونکہ تو ہی (ہر چیز پر) قادر ہے میں (تیری مرضی کے بغیر کسی چیز پر) قادر نہیں ہوں، تو

(سب چیزوں کو) جانتا ہے میں کچھ نہیں جانتا اور تو پوشیدہ باتوں کو بھی جاننے والا ہے، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام (یعنی مقصد) میرے لئے میرے دین میں، میری دنیا میں، میری زندگی اور میری آخرت میں، یا فرمایا، اس جہان (یعنی دنیا) میں اور اس جہان (آخرت) میں بہتر ہے تو اسے میرے لئے مہیا فرمادے اور اسے میرے لئے آسان فرمادے، پھر اس میں میرے واسطے برکت دے اور اگر تو اس امر (یعنی میرے مقصد اور میری مراد) کو میرے دین، میری زندگی اور میری آخرت میں، یا فرمایا، اس جہان اور اس جہان میں برا جانتا ہے تو مجھے اس سے اور اسے مجھ سے پھیردے اور میرے لئے جہاں بھلائی ہو وہ مہیا فرما پھر اس کے ساتھ مجھے راضی کر۔" (بخاریؒ) راوی کہتے ہیں کہ (لفظ ہذا الامر کی جگہ) اپنی حاجت کا نام لینا چاہئے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اگر ایسے کام کا ارادہ کیا جائے جو مباح ہو اور اس کی کامیابی و بھلائی میں شک و تردد ہو مثلاً سفر کا ارادہ ہو، تجارت شروع کرنے کا خیال ہو، نکاح کرنا چاہتا ہو یا اسی قسم کے دوسرے مباح کام تو ایسے موقع پر مناسب اور بہتر یہ ہے کہ استخارہ کو اپنا راہبر و مشیر بنایا جائے۔ کھانے پینے یا اسی قسم کے دوسرے مقرر و متعین کاموں کے لئے استخارہ نہیں کرنا چاہئے اگر کوئی کام خیر محض ہو تو اس میں استخارہ نہ کیا جائے استخارہ کی برکت یہ ہے کہ کام شروع کرنے والے کے حق میں جو بات بھی بہتر ہوتی ہے وہ اس کے دل میں جگہ لے لیتی ہے اور دل اپنے حق میں بہتر بات ہی کا فیصلہ کرتا ہے۔

استخارہ کا طریقہ یہ ہے کہ باوضو ہو کر کسی بھی وقت علاوہ اوقات مکروہ کے استخارہ کی نیت سے دو رکعت نماز پڑھے اور اس کے بعد مذکورہ دعا پڑھی جائے۔ اگر سنّت کی، تحیۃ المسجد کی یا تحیۃ الوضو کی پڑھی جانے والی نمازوں میں سے ہی دو رکعت پڑھنے کے بعد دعاء استخارہ پڑھ لی جائے تو بھی جائز ہے لیکن اولیٰ یہی ہے کہ علیحدہ سے دو رکعت نماز بطور خاص استخارہ کی نیت ہی سے پڑھنی چاہئے۔ اس نماز میں جو بھی سورت پڑھنی چاہے پڑھ سکتا ہے کسی خاص سورۃ کا تعین نہیں ہے تاہم بعض روایتوں میں کہ قل یا ایہا الکافرون اور قل ہو اللہ پڑھنا بہتر ہے۔

دعا کے الفاظ "او عاجل امری" میں صرف اور صرف راوی کے شک کو ظاہر کر رہا ہے، یعنی راوی کو شک واقع ہو گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فی دینی و معاشی و عاقبۃ امری فرمایا ہے یا ان تینوں الفاظ کی جگہ عاجل امری و اجلہ فرمایا۔ بہرحال افضل یہ ہے کہ اس دعا میں یہ دونوں جملے پڑھے جائیں۔

حدیث کے آخری الفاظ ویسمی حاجتہ کا مطلب یہ ہے کہ دعا میں لفظ ھذا الامر بطریق عموم واقع ہے استخارہ کرنے والا اپنی دعا میں اس جگہ اپنا مقصد اور اپنی مراد ظاہر کرے مثلاً "ھذا الامر" کی بجائے یوں کہے "ھذا السفر یا ھذا الاقامۃ" یا اسی طرح جو بھی مقصد ہو ذکر کرے نیز یہ بھی جائز ہے کہ پہلے ھذا الامر کہہ لے اس کے بعد اپنا مقصد اور اپنی مراد کا ذکر کرے۔

ایک اور روایت میں یہ مختصر استخارہ بھی منقول ہے کہ "اگر کسی شخص کو جلدی ہو اور کوئی وقتی و ہنگامی کام ہو تو اسے چاہئے کہ وہ صرف یہ پڑھ لے۔

اَللّٰھُمَّ خِرْلِیْ وَ اخْتَرْلِیْ وَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی اِخْتِیَارِیْ۔

"اے اللہ! (میرے حق میں تیرے نزدیک جو بہتر اور مناسب ہو اسے) میرے لئے پسند اور میرے لئے اختیار فرما اور مجھے میرے اختیار کا پابند نہ بنا۔

حضرت انسؓ ایک روایت میں فرماتے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "انس! جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ سے سات مرتبہ استخارہ کرو، پھر اس کے بعد (اس کا نتیجہ) دیکھو، تمہارے دل میں جو کچھ ڈالا جائے (یعنی استخارہ کے نتیجہ میں بارگاہ حق کی جانب سے، جو چیز القاء کی جائے اسی کو اختیار کرو کہ تمہارے لئے وہی بہتر ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نماز توبہ کا بیان

④ عَنْ عَلِیٍّ قَالَ حَدَّثَنِی اَبُوْبَکْرٍ وَصَدَقَ اَبُوْبَکْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَامِنْ رَجُلٍ یُذْنِبُ ذَنْبًا ثُمَّ یَقُوْمُ فَیَتَطَھَّرُ ثُمَّ یُصَلِّیْ ثُمَّ یَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ اِلاَّ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ ثُمَّ قَرَأَ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ اِلاَّ اَنَّ ابْنَ مَاجَۃَ لَمْ یَذْکُرِ الْاٰیَۃَ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ۔

"امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مجھ سے فرمایا اور حضرت ابوبکرؓ نے بالکل سچ فرمایا کہ میں نے سرتاج دو عالم ﷺ سے یہ ارشاد گرامی سنا ہے کہ "جو شخص گناہ کرتا ہے اور گناہ پر ندامت ہونے کی وجہ سے، اٹھ کر وضو کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے اور پروردگار سے اپنے گناہ کی مغفرت چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف فرما دیتا ہے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔" اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گذرتے ہیں جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو (یعنی اس کے عذاب کو) یاد کر لیتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں۔ اس روایت کو ترمذیؒ اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے مگر ابن ماجہؒ نے آیت ذکر نہیں کی ہے۔"

تشریح: صدق ابوبکر (حضرت ابوبکرؓ نے بالکل سچ فرمایا) یہ جملہ معترضہ کے طور پر ہے جس کے ذریعہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بزرگی ان کی عظمت اور ان کے انتہائی سچے ہونے کو ظاہر فرمایا ہے جن کی سچائی اور صداقت اس پایہ کی تھی کہ خود آنحضرت ﷺ نے انہیں "صدیق" کے لقب سے سرفراز فرمایا۔

حضرت علیؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ ان کی عادت تھی کہ وہ کسی بھی راوی کی نقل کردہ حدیث کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ راوی سے وہ قسم نہ کھلوا لیتے تھے چنانچہ جب راوی ان سے کہتا کہ "میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے یہ حدیث اسی طرح سنی ہے تو آپ اسے قبول فرماتے لیکن جب کوئی حدیث حضرت ابوبکرؓ سے سنتے تو بغیر قسم کے قبول کر لیتے تھے۔

فَیَتَطَھَّرُ کا مطلب تو یہی ہے کہ گناہ کرنے والا وضو کر کے نماز پڑھے لیکن افضل غسل کرنا ہے نہ صرف یہ بلکہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا سب سے زیادہ افضل ہے۔

یُصَلِّیْ کا مطلب یہ ہے کہ دو رکعت نماز پڑھے جس میں سے ایک رکعت میں سورہ فاتحہ کے ساتھ قل یا ایہا الکافرون پڑھی جائے۔ اور دوسری رکعت میں قل ہو اللہ کی قرأت کی جائے اس نماز کو نماز توبہ کہا جاتا ہے۔

حدیث کے الفاظ ثم یستغفر اللّٰہ (پھر پروردگار کی بارگاہ میں توبہ مانگتا ہے اور نہ صرف یہ کہ اس گناہ کو چھوڑ دیتا ہے بلکہ آئندہ کبھی گناہ میں مبتلا نہ ہونے کا پختہ عزم کرتا ہے اور اس عزم پر ثابت قدم رہتا ہے پھر یہ کہ اگر اس کے ذمہ کسی کا کوئی حق ہوتا ہے تو اس کا تدارک کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد کے بعد بطور دلیل کے آیت کی تلاوت فرمائی کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہی خداوند کریم بھی فرماتا ہے لِذُنُوْبِھِمْ کے بعد آیت کا بقیہ حصہ یہ ہے۔

وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلاَّ اللّٰہُ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَافَعَلُوْا وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ، اُولٰئِکَ جَزَآؤُھُمْ مَّغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ۔ (آل عمران ۳: ۱۳۵، ۱۳۶)

"اور ہے کون؟ جو گناہوں کو بخشتا ہو، اور یہ لوگ اپنے فعل (گناہ) پر اصرار نہیں کرتے اور وہ جانتے ہیں، ان لوگوں کی جزاء بخشش ہے۔ ان

کے رب کی طرف سے اور ایسے باغ ہیں کہ ان کے نیچے سے نہریں چلتی ہونگی (اور) وہ ان میں ہمیشہ بستے رہیں گے اور (اچھے) کام کرنے والوں کا بدلہ بہت اچھا ہے۔"

اس آیت کا شان نزول بعض مفسرین کی روایت کے مطابق ایک مخصوص واقعہ ہے۔ ایک صحابیؓ سے بتقاضائے بشریت ایک لغزش ہوگئی مگر وہ فوراً متنبہ ہوگئے جس سے وہ انتہائی نادم اور شرمندہ ہوئے ان کی ندامت و شرمندگی اور رب العزت کی بارگاہ میں اس لغزش سے ان کی صدق دل سے توبہ واستغفار کے پیش نظر یہ آیت نازل فرمائی گئی۔

یہ دو آیتیں ہیں پہلی آیت میں لفظ "والذین" مبتداء ہے، دوسری آیت میں "اولئک" خبر ہے یعنی پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان خدا سے ڈرنے والے اور اس کے ثواب وعذاب پر یقین رکھنے والے جب بتقاضائے بشریت کسی خطا و لغزش اور گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ایمان و یقین سے بھرپور ان کا ضمیر انہیں فوراً متنبہ کرتا ہے وہ ایسے موقع پر اپنے خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اس کی عبادت و بندگی کر کے اس سے اپنی لغزش کی معافی چاہتے ہیں اپنی خطا و گناہ پر شرمندگی و ندامت کا اظہار کر کے توبہ مانگتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ کسی گناہ پر ڈھٹائی کے ساتھ عمل پیرا نہیں رہتے۔ بلکہ آئندہ کے لئے کسی گناہ میں مبتلا نہ ہونے کا عزم کرتے ہیں اور اپنے پختہ عزم پر قائم رہتے ہیں۔

دوسری آیت میں ایسے لوگوں کی جزاء بیان کی جارہی ہے کہ خداوند کریم اپنی رحمت کے صدقہ میں ان لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے ان کی غلطی سے درگزر کرتا ہے اور چونکہ یہ گناہوں سے صدق دل کے ساتھ معافی کے خواستگار ہوتے ہیں اس لئے ان کی بخشش فرماتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں جنّت اور جنّت کی نعمتوں کے حقدار ہوتے ہیں۔

مصیبت کے وقت نماز نفل

④ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا حَزَنَهٗ اَمْرٌ صَلّٰى۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ "سرتاج دوعالم ﷺ جب کسی مصیبت سے دوچار ہوتے تو (نفل) نماز پڑھتے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ آنحضرت ﷺ کو جب کوئی رنج وغم ہوتا یا کوئی مصیبت رونما ہوتی تو آپ ﷺ رنج وغم اور مصیبت سے چھٹکارا پاتے اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے طور پر نماز پڑھتے کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔

"اے اہل ایمان! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو۔"

علماء لکھتے ہیں کسی رنج اور مصیبت کے وقت نماز نفل پڑھنے کی حکمت یہ ہے کہ جب انسان نماز میں مشغول ہوتا ہے تو اس کے سامنے عالم ربوبیت کھل جاتا ہے اور جب اس پر عالم ربوبیت منکشف ہو جاتا ہے تو دنیا ازخود اس کی نظروں میں بالکل حقیر و بے وقعت ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کے دل میں دنیا کے ہونے (یعنی دنیا کی راحت و آسائش) اور دنیا کے نہ ہونے (یعنی دنیا کی تکلیف و مصیبت) کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں رہتا۔ لہٰذا اگر دنیا اسے نہیں ملتی بایں طور کہ وہ دنیا کے رنج وغم اور تکلیف و مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو متوحش اور پریشان نہیں ہوتا اور اگر دنیا اسے ملتی ہے بایں طور کہ دنیا کی راحت و چین اور آرام و آسائش اسے حاصل ہوتی ہے تو وہ خوش نہیں ہوتا جیسا کہ یہ عارفانہ مقولہ کہا گیا۔ "اگر ہے تو خوشی نہیں اور اگر نہیں تو غم نہیں۔"

تحیۃ الوضو کی فضیلت

⑤ وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ اَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَا بِلَالًا فَقَالَ بِمَاسَبَقْتَنِي اِلَى الْجَنَّةِ مَادَخَلْتُ

الجنّة قطّ الاّ سمعتُ خشخشتك امامی قال یارسول اللّٰہ ما اذنتُ قطّ الاّ صلّیتُ رکعتین وما اصابنی حدثٌ قطّ الاّ توضّأتُ عندہٗ ورأیتُ انّ للّٰہ علیّ رکعتین فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بھما۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) سرتاج دوعالم ﷺ نے صبح کے وقت فجر کی نماز کے بعد حضرت بلالؓ کو طلب کیا اور (جب وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "کس عمل کے ذریعہ تم نے جنت میں مجھ سے پیش روی اختیار کی ہے (کیونکہ) میں جب بھی جنت میں داخل ہوا تو اپنے آگے آگے تمہارے جوتوں کی آواز سنی؟ انہوں نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! میں نے جب بھی اذان دی ہے تو اس کے بعد دو رکعت نماز (ضرور) پڑھی ہے اور جب بھی میرا وضو ٹوٹا ہے میں نے اسی وقت وضو کر لیا ہے اور میں نے خدا کے واسطے دو رکعت نماز پڑھنی ضروری سمجھا ہے۔ (یعنی ہر وضو کے بعد پابندی کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھنی میں نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھی ہے) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "اسی وجہ سے تم اس (عظیم) درجہ کو پہنچے ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حدیث میں مذکورہ مضمون کی وضاحت اس باب کے شروع میں پہلی حدیث کی تشریح کے ضمن میں کی جاچکی ہے۔ چنانچہ وہاں یہ بتایا جاچکا ہے کہ جنت میں حضرت بلالؓ کا آنحضرت ﷺ کے آگے آگے ہونا خادم کی حیثیت سے تھا۔ جو خود ایک بہت بڑا درجہ اور بڑی فضیلت کی بات ہے چنانچہ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم آخر وہ کون سا عمل کرتے ہو جس کی وجہ سے تمہیں خدمت خاص کا یہ عظیم مرتبہ حاصل ہوا؟ حدیث کے حقیقی معنی یہی ہیں۔ اس کے ظاہری معنی و مفہوم مراد لے کر کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہئے۔ کہ اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) حضرت بلالؓ کو آنحضرت پر بھی اس موقع پر فضیلت حاصل تھی کہ وہ آپ ﷺ سے پہلے جنت میں داخل ہوئے کیونکہ یہ مرتبہ تو کسی نبی اور پیغمبر کو بھی حاصل نہیں ہوگا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے پہلے جنت میں داخل ہو جائے چہ جائیکہ آپ کی اُمّت کے ایک فرد کو یہ امتیاز حاصل ہو جائے کہ ان دو چیزوں یعنی ہمیشہ باوضو رہنے اور نماز تحیۃ الوضو پڑھنے کی وجہ سے آپ ﷺ سے پہلے وہ جنت میں داخل ہو۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

نماز حاجت

(۶) وعن عبداللّٰہ بن ابی اوفٰی قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من کانت لہٗ حاجۃٌ الی اللّٰہ او الٰی احدٍ من بنی اٰدم فلیتوضّأ فلیحسن الوضوء ثمّ لیصلّ رکعتین ثمّ لیثن علی اللّٰہ تعالٰی ویصلّ علی النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثمّ لیقل لا الٰہ الّا اللّٰہ الحلیم الکریم سبحان اللّٰہ ربّ العرش العظیم والحمد للّٰہ ربّ العالمین اسألك موجبات رحمتك وعزائم مغفرتك والغنیمۃ من کلّ برٍّ والسّلامۃ من کلّ اثمٍ لا تدع لی ذنبًا الّا غفرتہٗ ولا ھمًّا الّا فرّجتہٗ ولا حاجۃً ھی لك رضًی الّا قضیتھا یا ارحم الرّاحمین رواہ التّرمذیّ وابن ماجۃ وقال التّرمذیّ ھٰذا حدیثٌ غریبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا جس شخص کو اللہ تعالیٰ یا کسی آدمی کی طرف کوئی حاجت ہو (یعنی خواہ دینی حاجت) تو اسے چاہئے کہ (پہلے) وضو کرے اور اچھا وضو (یعنی پورے آداب کی رعایت کے ساتھ) کرے اور دو رکعت نماز پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کر کے اور نبی ﷺ پر درود بھیج کر یہ دعا پڑھے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ چشم پوشی اور بخشش کرنے والے کے پاک ہے اللہ جو مالک ہے عرش عظیم کا، اور سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو سارے جہان کا پروردگار ہے، اے اللہ میں تجھ سے ان چیزوں کو مانگتا ہوں جن پر رحمت ہوتی ہے اور جو تیری بخشش کا سبب ہوتی ہیں اور مانگتا ہوں اپنا حصہ ہر نیکی سے اور بچنا چاہتا ہوں ہر گناہ سے، اے اللہ! میرے کسی گناہ کو بے بخشے ہوئے اور کسی غم کو بے دور کئے ہوئے اور کسی جماعت کو جو تیرے نزدیک پسند ہو، بے پورا کئے ہوئے نہ چھوڑ اے بہت رحم کرنے والے رحم کرنے والوں سے۔" (امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریح: جب کسی کو کوئی حاجت یا ضرورت پیش آئے تو خواہ وہ حاجت بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے ہو یا بالواسطہ کسی بندے سے متعلق ہو مثلاً کسی کو نوکری کی خواہش ہو، یا کسی سے نکاح کرنا چاہتا ہو، یا ایسی کوئی اور ضرورت ہو، جسے کسی شخص سے پورا کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ اچھی طرح وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھے پھر اللہ تعالیٰ جل شانہ کی تعریف و بڑائی بیان کرکے درود شریف پڑھے جو نماز میں التحیات کے بعد پڑھا جاتا ہے اس کے بعد حدیث میں مذکورہ دعا پڑھے۔ دعا کے بعد اس کی جو حاجت و ضرورت ہو، اسے پروردگار کی بارگاہ میں پیش کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے اپنے مقصد برآری کے لئے دعا کرے۔

حاجت روائی اور مقصد برآری کے لئے یہ نماز کہ جسے اصطلاح میں "صلوٰۃ الحاجت" یعنی نماز حاجت کہتے ہیں بہت مجرب ہے بعض بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے اپنی ضرورتوں میں اس طریقہ سے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت بیان کی، اللہ تعالیٰ نے ان کے مقصد اور ان کی حاجت کو پورا فرمایا۔ (علم الفقہ)

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حاجت مند کو اپنی حاجت روائی اور اس نماز و دعا کو پڑھنے کے لئے شنبہ کے دن صبح کے وقت اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جو شخص شنبہ کے دن صبح کے وقت (نماز حاجت اور اس کی دعا پڑھ کر اپنی حلال و جائز حاجت کو طلب کرے تو میں اس کی حاجت روائی کا ضامن ہوں۔" (ملا علی قاریؒ)

یوں تو یہ نماز اور یہ دعا تمام حاجتوں اور ضرورتوں کے لئے ہے لیکن قوت حافظہ کی اگر حاجت ہو تو اس کے لئے بطور خاص الگ نماز ہے جس کو صلوٰۃ الحافظ (حافظ کی نماز) کہتے ہیں جو حصن حصین میں مذکور ہے اس کی اردو شرح میں اس نماز کی روایت بالتفصیل لکھی گئی ہے وہاں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔

بَابُ صَلٰوةِ التَّسْبِيحِ
نماز تسبیح کا بیان

نماز تسبیح مستحب ہے جس کے بے شمار اجر و ثواب ہے اس کی چار رکعتیں پڑھنی آنحضرت ﷺ سے منقول ہیں بہتر یہ ہے کہ چاروں رکعتیں ایک ہی سلام سے پڑھی جائیں۔ اگر دو سلام سے پڑھی جائیں تب بھی درست ہیں۔ ہر رکعت میں پچھتر مرتبہ تسبیح کہنا چاہئے اور پوری نماز میں تین سو مرتبہ۔

نماز تسبیح پڑھنے کا طریقہ: نماز تسبیح کی نیت اس طرح کی جائے:

نَوَيْتُ اَنْ اُصَلِّي اَرْبَعَ رَكَعَاتِ صَلٰوةِ التَّسْبِيحِ۔

"میں نے چار رکعت نماز تسبیح پڑھنے کا ارادہ کیا۔"

اس نیت کے بعد تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھے جائیں اور سبحانک اللھم پڑھ کر پندرہ مرتبہ یہ تسبیح کہی جائے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ پھر اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر الحمد اور سورۃ پڑھی جائے اس کے بعد دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھی جائے پھر رکوع میں اور رکوع سے اٹھ کر سمع اللہ لمن حمدہ وربنا لک الحمد کہہ کر دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھی جائے پھر سجدہ میں جا کر اور دونوں سجدوں میں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد اور دونوں سجدوں کے درمیان دس دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھی جائے پھر دوسری رکعت میں الحمد سے پہلے پندرہ مرتبہ الحمد اور دوسری سورت کے بعد دس مرتبہ رکوع اور قومہ، دونوں سجدوں اور درمیان میں دس دس مرتبہ اسی تسبیح کو پڑھا جائے اسی طرح تیسری اور چوتھی رکعت پڑھی جائے اور ان میں یہی تسبیح اس تعداد میں پڑھی جائے۔

نماز تسبیح کی فضیلت

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِلْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ یَا عَبَّاسُ یَا عَمَّاہُ اَلَا اُعْطِیْکَ اَلَا اَمْنَحُکَ اَلَا اُخْبِرُکَ اَلَا اَفْعَلُ بِکَ عَشْرَ خِصَالٍ اِذَا اَنْتَ فَعَلْتَ ذٰلِکَ غَفَرَ اللّٰہُ لَکَ ذَنْبَکَ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ قَدِیْمَہٗ وَحَدِیْثَہٗ خَطَاَہٗ وَعَمْدَہٗ صَغِیْرَہٗ وَکَبِیْرَہٗ سِرَّہٗ وَعَلَانِیَتَہٗ اَنْ تُصَلِّیَ اَرْبَعَ رَکْعَاتٍ تَقْرَأُ فِیْ کُلِّ رَکْعَۃٍ فَاتِحَۃَ الْکِتَابِ وَسُوْرَۃً فَاِذَا فَرَغْتَ مِنَ الْقِرَاءَۃِ فِیْ اَوَّلِ رَکْعَۃٍ وَاَنْتَ قَائِمٌ قُلْتَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ خَمْسَ عَشْرَۃَ مَرَّۃً ثُمَّ تَرْکَعُ فَتَقُوْلُھَا وَاَنْتَ رَاکِعٌ عَشْرًا ثُمَّ تَرْفَعُ رَاْسَکَ مِنَ الرُّکُوْعِ فَتَقُوْلُھَا عَشْرًا ثُمَّ تَھْوِیْ سَاجِدًا فَتَقُوْلُھَا وَاَنْتَ سَاجِدٌ عَشْرًا ثُمَّ تَرْفَعُ رَاْسَکَ مِنَ السُّجُوْدِ فَتَقُوْلُھَا عَشْرًا ثُمَّ تَسْجُدُ فَتَقُوْلُھَا عَشْرًا ثُمَّ تَرْفَعُ رَاْسَکَ فَتَقُوْلُھَا عَشْرًا فَذٰلِکَ خَمْسٌ وَسَبْعُوْنَ فِیْ کُلِّ رَکْعَۃٍ تَفْعَلُ ذٰلِکَ فِیْ اَرْبَعِ رَکْعَاتٍ اِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تُصَلِّیَھَا فِیْ کُلِّ یَوْمٍ مَرَّۃً فَافْعَلْ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَفِیْ کُلِّ جُمُعَۃٍ مَرَّۃً فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَفِیْ کُلِّ شَھْرٍ مَرَّۃً فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَفِیْ کُلِّ سَنَۃٍ مَرَّۃً فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَفِیْ عُمْرِکَ مَرَّۃً رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَابْنُ مَاجَۃَ وَالْبَیْھَقِیُّ فِی الدَّعْوَاتِ الْکَبِیْرِ وَرَوَی التِّرْمِذِیُّ عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ نَحْوَہٗ۔

"حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے حضرت عباس ابن عبد المطلبؓ سے فرمایا کہ اے عباس! اے میرے چچا کیا نہ دوں میں آپ کو؟ کیا نہ دوں میں آپ کو؟ کیا نہ بتاؤں میں آپ کو؟ کیا آپ کو دس خصلتوں کا مالک نہ بنادوں؟ کہ اگر آپ ان کو اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے اور پچھلے، پرانے اور نئے، قصداً اور سہواً، چھوٹے اور بڑے، پوشیدہ اور ظاہر تمام گناہوں کو بخش دے (تو سنئے کہ) آپ چار رکعت نماز (اس طرح) پڑھیئے کہ ہر رکعت سورۂ فاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھے۔ جب آپ پہلی رکعت میں قرأت سے فارغ ہو جائیں تو کھڑے ہی کھڑے پندرہ مرتبہ (یہ تسبیح) کہیے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ پھر رکوع میں جایئے اور (رکوع کی تسبیح سبحان ربی العظیم کہنے کے بعد) رکوع میں یہ تسبیح دس مرتبہ کہئے پھر رکوع سے سر اٹھایئے اور (سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد) یہ تسبیح دس مرتبہ کہئے پھر سجدہ میں جایئے اور (سبحان ربی الاعلیٰ کہنے کے بعد) یہ تسبیح دس مرتبہ کہئے پھر سجدہ میں سر اٹھایئے اور تسبیح دس مرتبہ کہئے پھر (دوسرے) سجدہ میں جایئے اور (سجدہ کی تسبیح کہنے کے بعد) یہ تسبیح دس مرتبہ کہئے۔ پھر اپنا سر سجدہ سے اٹھایئے اور یہ تسبیح دس مرتبہ کہئے یہ سب پچھتر تسبیحات ہوئیں ہر رکعت میں اسی طرح چاروں رکعت میں کیجئے (یعنی مذکورہ طریقہ سے یہ تسبیح پچھتر مرتبہ ہر رکعت میں پڑھئے) اگر آپ اس نماز کو روزانہ پڑھنے پر قدرت رکھتے ہوں تو روزانہ پڑھے۔ اگر روزانہ نہ پڑھ سکیں تو ہفتہ میں ایک مرتبہ پڑھے۔ اگر ہر ہفتہ نہ پڑھ سکیں تو مہینہ میں ایک مرتبہ پڑھئے اگر ہر مہینہ نہ پڑھ سکیں تو سال میں ایک مرتبہ پڑھئے اور اگر ہر سال نہ پڑھ سکیں تو کم سے کم پوری عمر میں ایک مرتبہ (تو ضرور ہی) پڑھ لیجئے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، بیہقیؒ، فی دعوات الکبیر) امام ترمذیؒ نے اسی طرح کی روایت حضرت ابورافعؓ سے نقل کیا ہے۔

تشریح: "کیا آپ کو دس خصلتوں کا مالک نہ بناؤں" کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو ایسی چیز بتائے دیتا ہوں جس کو آپ اگر اختیار کریں گے تو آپ دس قسم کے گناہ (جو حدیث میں ذکر کئے گئے ہیں) بخش دیئے جائیں گے۔

بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ "دس خصلتوں" سے مراد اس نماز میں حالت قیام کی پندرہ مرتبہ تسبیح کہنے کے علاوہ بقیہ حالتوں میں دس دس مرتبہ تسبیح کہنا ہے۔

حدیث میں لفظ عَلَانِیَتَہٗ کے بعد عَشْرَ خِصَالٍ کے الفاظ یہاں مشکوٰۃ میں ذکر نہیں کئے گئے ہیں۔ لیکن "اصول" میں موجود ہیں۔ چنانچہ "حصن حصین" میں بھی یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں اسی لئے طیبیؒ نے لکھا ہے کہ سیاق حدیث کے پیش نظر یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ دس خصلتوں سے مراد یہ چیزیں ہیں۔

① چار رکعت نماز پڑھنا۔ ② ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنا۔ ③ سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور صورت پڑھنا۔ ④ حالت قیام میں پندرہ مرتبہ مذکورہ تسبیحات کا کہنا۔ ⑤ ان تسبیحات کا رکوع میں دس مرتبہ کہنا۔ ⑥ ان تسبیحات کا دس مرتبہ قومہ میں کہنا۔ ⑦ ان تسبیحات کا دس مرتبہ سجدہ میں کہنا۔ ⑧ ان تسبیحات کا دس مرتبہ جلسہ میں کہنا۔ ⑨ ان تسبیحات کا دس مرتبہ سجدوں میں کہنا۔ ⑩ ان تسبیحات کا دس مرتبہ جلسہ استراحت میں کہنا۔

اس روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیام میں قرأت کے بعد پندرہ مرتبہ یہ تسبیح پڑھی جائے اسی طرح اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے سجدہ سے اٹھ کر بھی یہ تسبیح پڑھی جائے جب کہ ہم نے ابتداء باب میں یہ طریقہ نقل کیا ہے کہ حالت قیام میں سبحانک اللھم کے بعد پندرہ مرتبہ تسبیح پڑھی جائے پھر قرأت کے بعد دس مرتبہ تسبیح پڑھی جائے اور دوسرے سجدے سے اٹھنے کے بعد تسبیح پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ تو یہ دونوں طریقے الگ الگ روایتوں میں مذکور ہیں پھر یہ کہ ان دونوں طریقوں میں تسبیح کی تعداد میں کوئی فرق نہیں ہے صرف پڑھنے کے مواقع میں فرق ہے اس لئے اختیار ہے کہ ان دونوں طریقوں میں سے جس طریقہ کو چاہے اختیار کیا جائے اور بہتر یہ ہے کہ کبھی اس طریقہ کے مطابق عمل کیا جائے اور کبھی اس طریقہ کے مطابق تسبیحات پڑھی جائیں تاکہ قعدوں میں یہ تسبیحات بخلاف اور ارکان کے التحیات کے پہلے پڑھی جائیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ اس نماز میں یہ سورتیں پڑھی جائیں اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ۔ وَالْعَصْرِ، قُلْ یٰاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ بعض روایتوں میں اذا زلزلت، والعادیات، اذا جاء اور سورہ اخلاص کا پڑھنا بھی منقول ہے۔

جلال الدین سیوطیؒ نے امام احمدؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ نماز تسبیح میں سلام پھیرنے سے پہلے یہ دعا بھی پڑھنی چاہئے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ تَوْفِیْقَ اَھْلِ الْھُدٰی وَاَعْمَالَ اَھْلِ الْیَقِیْنِ وَمُنَاصَحَۃَ اَھْلِ التَّوْبَۃِ وَعَزْمَ اَھْلِ الصَّبْرِ وَجِدَّ اَھْلِ الْخَشْیَۃِ وَطَلَبَ اَھْلِ الرَّغْبَۃِ وَتَعَبُّدَ اَھْلِ الْوَرْعِ وَعِرْفَانَ اَھْلِ الْعِلْمِ حَتّٰی اَخَافَکَ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ مَخَافَۃً تَحْجُزُنِیْ عَنْ مَعَاصِیْکَ وَحَتّٰی اَعْمَلَ بِطَاعَتِکَ عَمَلًا اَسْتَحِقُّ بِہٖ رِضَاکَ وَحَتّٰی اُنَاصِحُکَ بِالتَّوْبَۃِ خَوْفًا مِّنْکَ وَحَتّٰی اُخْلِصَ لَکَ النَّصِیْحَۃَ حَیَاءً مِّنْکَ وَحَتّٰی اَتَوَکَّلَ عَلَیْکَ فِی الْاُمُوْرِ کُلِّھَا وَحُسْنَ ظَنٍّ بِکَ سُبْحَانَ خَالِقِ النُّوْرِ۔

"اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں اہل ہدایت کی سی توفیق اہل یقین (یعنی راسخ العقیدہ اور راسخ العمل لوگوں) کے سے اعمال، اہل توبہ کی سی خالص توبہ، اہل صبر کی سی پختگی، اہل خشیت کی سخت کوشش، طالبین حق کی سی طلب، پرہیزگاروں کی سی عبادت اور اہل علم کی سی معرفت، یہاں تک کہ میں تیری ہی ذات سے ڈرنے لگوں۔ اے اللہ! میں تجھ سے (تیرے) خوف کا طلبگار ہوں جو مجھے تیری نافرمانیوں سے روک دے تاکہ میں تیری نافرمانبرداری وخوشنودی کا وہ عمل کرنے لگوں جو مجھے تیری رضا کا مستحق گردانے تیرے خوف سے سچی توبہ کرنے لگوں یہاں تک کہ تیری ذات پر اچھا گمان رکھتے ہوئے تمام امور میں تیری ذات پر بھروسہ کرنے لگوں اور اے نور کے پیدا کرنیوالے آپ ہر عیب اور برائی سے پاک ہیں۔"

اس نماز کی فضیلت کے بارے میں عبد العزیزؒ ابن داؤدؒ لکھتے ہیں کہ جو شخص جنت میں داخل ہونا چاہے تو وہ نماز تسبیح کو اپنے اوپر لازم قرار دے لے۔

ابو عثمان زاہدؒ نے فرمایا ہے کہ مصیبت و پریشانی کے دفیعہ اور غم وحزن کو دور کرنے کے لئے اس نماز کے علاوہ میں نے کوئی اور چیز نہیں پائی۔ یعنی نماز تسبیح پڑھنے سے یہ چیزیں جاتی رہتی ہیں۔

اس نماز کی انہیں عظیم فضیلتوں کے پیش نظر اکثر آئمہ ومشائخ اور بزرگ اس نماز کو پڑھتے رہے ہیں۔ جمعہ کے روز دوپہر ڈھلنے کے بعد اس نماز کا پڑھنا مستحب ہے اگر اس نماز میں سجدہ سہو کی ضرورت پڑ جائے تو سجدہ سہو کے اندر یہ تسبیحات نہ پڑھی جائیں کیونکہ اس طرح تسبیحات کی مقدار تین سو سے آگے بڑھ جائے گی۔

جن مسلمانوں کو خدا نے اپنی عبادت واطاعت کی توفیق دی ہے اور انہیں زیادہ سے زیادہ عمل خیر کرنے کی سعادت سے نوازا ہے ان کیلئے اس نماز کے پڑھنے کے سلسلہ میں درجہ اعتدال یہ ہے کہ یہ نماز ہر جمعہ کو پڑھی جائے چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا اسی پر عمل تھا کہ وہ ہر جمعہ کے روز زوال کے بعد اس نماز کو پڑھتے تھے اور انہیں سورتوں کی قرأت کرتے تھے جو ابھی اوپر ان سے نقل کی گئی ہیں۔

قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کی پرسش ہوگی

(۲) وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اَوَّلَ مَا یُحَاسَبُ بِہِ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ عَمَلِہٖ صَلَاتُہٗ فَاِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ اَفْلَحَ وَاَنْجَحَ وَاِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ فَاِنِ انْتَقَصَ مِنْ فَرِیْضَتِہٖ شَیْءٌ قَالَ الرَّبُّ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اُنْظُرُوْا ھَلْ لِعَبْدِیْ مِنْ تَطَوُّعٍ فَیُکَمَّلُ بِھَا مَا انْتَقَصَ مِنَ الْفَرِیْضَۃِ ثُمَّ یَکُوْنُ سَائِرُ عَمَلِہٖ عَلٰی ذٰلِکَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ ثُمَّ الزَّکٰوۃُ مِثْلُ ذٰلِکَ ثُمَّ تُؤْخَذُ الْاَعْمَالُ عَلٰی حَسَبِ ذٰلِکَ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَاہُ اَحْمَدُ عَنْ رَجُلٍ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے روز بندہ کے اعمال میں سب سے پہلے جس عمل کے بارے میں محاسبہ کیا جائے گا وہ اس کی نماز ہوگی، لہٰذا اگر اس کی نماز درست ہوگی (یعنی اس نے نماز کو صحیح ادا کیا ہوگا۔ یا یہ کہ اس کی نماز مقبول ہوئی ہوگی) تو وہ فلاح اور کامیابی پائے گا اور اگر نماز فاسد ہوگی (یعنی نماز ادا نہ کی گئی یا ادا تو کی گئی مگر غیر صحیح اور غیر مقبول) تو وہ ثواب سے ناامید ہوگا اور (عذاب میں مبتلا ہونے کی وجہ سے) خسارے میں رہے گا۔ ہاں اگر (کسی کی) فرض نماز میں کچھ کمی رہ گئی (یعنی نماز کے فرض، واجب اور سُنّت مؤکدہ ارکان میں سے کوئی رکن رہ گیا اور نماز مکمل ہوگئی) تو اللہ بزرگ و برتر (فرشتوں سے) فرمائے گا کہ دیکھو میرے بندے کے پاس (یعنی اس کے نامہ اعمال میں) کچھ سُنّت یا نفل نماز بھی ہے؟ لہٰذا اگر اس کے نامہ اعمال میں سُنّت و نفل نماز ہوگی تو اس کے ذریعے سے اس کی فرض نماز کی کمی پوری کی جائے گی، پھر اسی طرح بندہ کے دوسرے اعمال کا حساب ہوگا۔ ایک دوسری روایت میں (آخری الفاظ) یوں ہیں پھر ایسے ہی زکوٰۃ کا حساب ہوگا اور پھر بقیہ اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا۔ یہ روایت ابوداؤدؒ نے نقل کی ہے اور امام احمدؒ نے یہ روایت ایک (دوسرے) شخص سے نقل کی ہے۔"

تشریح: ایک دوسری روایت میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز بندہ سے سب سے پہلے جس چیز کے بارے میں سوال کیا جائے گا وہ خون ہوگا اور یہاں فرمایا جارہا ہے کہ سب سے پہلے "نماز" کا محاسبہ ہوگا۔ لہٰذا ان دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے تو سب سے پہلے نماز کا مواخذہ ہوگا اور بندوں کے حقوق میں سب سے پہلے "خون" کا حساب لیا جائے گا۔

حدیث کے آخری الفاظ "پھر اسی طرح بندہ کے دوسرے اعمال کا حساب ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح فرض نماز کی کوئی کمی سُنّت و نفل نماز سے پوری کی جائے گی اسی طرح دوسرے فرض اعمال بھی کوئی کوتاہی ہوگی تو اسے نفل اعمال کے ذریعے پورا کیا جائے گا۔ مثلاً اگر فرض روزوں میں کوئی نقصان واقع ہوگا تو وہ نقصان نفل روزے سے پورا کیا جائے گا اگر زکوٰۃ میں کچھ نقصان ہوگا تو صدقہ نفل سے اسے پورا کیا جائے گا۔ اگر فرض حج میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی تو نفل حج یا عمرہ سے پوری کی جائے گی اور اگر کسی پر کسی کا کوئی حق (مطالبہ) ہوگا تو اس کے نامہ اعمال صالحہ سے اس مطالبہ کی بقدر حصّہ لے کر صاحب مطالبہ کو دیدیا جائے گا اسی طرح تمام اعمال کے بارے میں پورا پورا محاسبہ کیا جائے گا۔

نماز اور نمازی کی عظمت و فضیلت

(۳) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَذِنَ اللّٰہُ لِعَبْدٍ فِیْ شَیْءٍ اَفْضَلَ مِنَ الرَّکْعَتَیْنِ یُصَلِّیْھِمَا وَاِنَّ الْبِرَّ لَیُذَرُّ عَلٰی رَأْسِ الْعَبْدِ مَادَامَ فِیْ صَلَاتِہٖ وَمَا تَقَرَّبَ الْعِبَادُ اِلَی اللّٰہِ بِمِثْلِ مَا خَرَجَ مِنْہُ یَعْنِی الْقُرْاٰنَ۔

(رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ جل شانہ، بندہ کے کسی عمل پر اپنی رحمت کے ساتھ اتنا زیادہ متوجہ نہیں ہوتا جتنا کہ اس کی پڑھی ہوئی دو رکعت نماز پر (چونکہ تمام اعمال میں نماز سب سے زیادہ افضل ہے اس لئے بندے پر اس کے اور اعمال کی بنسبت نماز پڑھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عنایت، بہت زیادہ ہوتی ہے) اور بندہ جب تک نماز میں مشغول رہتا ہے اور اس کے سر پر نیکی و بھلائی چھڑکی جاتی ہے (یعنی اس کے اوپر رحمت و ثواب کا جو نیکی کا نتیجہ ہے جو نزول ہوتا ہے) اور بندہ خدا کا تقرب حاصل کرنے میں جس قدر اس سے نکلے ہوئے سرچشمہ ہدایت یعنی قرآن کریم سے فائدہ اٹھاتا ہے اتنا کسی چیز سے نہیں (یعنی خدا کا قرب جتنا زیادہ قرآن کریم پڑھنے سے ہوگا اتنا اور کسی چیز سے حاصل نہیں ہوگا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

بَابُ صَلٰوةِ السَّفَرِ

نماز سفر کا بیان

مسافر جب اپنے گاؤں یا شہر کی آبادی سے باہر نکل جائے تو اس پر قصر واجب ہے، پوری چار رکعت والی فرض نماز کی دو رکعتیں ہی پڑھنا واجب ہے اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں جب کہ اس پر قصر واجب ہے، پوری چار رکعت پڑھے گا تو گنہگار ہوگا اور دو واجب کو چھوڑنے والا ہوگا یعنی ایک واجب تو قصر کا ترک ہوگا اور دوسرے قعدۂ اخیرہ کے بعد فوراً اسلام پھیرنا، کیونکہ مسافر کے حق میں پہلا قعدہ ہی قعدۂ اخیرہ ہوتا ہے اس کے بعد اسے فوراً اسلام پھیر دینا چاہئے تھا اور اس نے نہیں پھیرا بلکہ کھڑا ہوگیا اس طرح اس نے دوسرے واجب کو ترک کیا۔

اس موقع پر اتنی بات بھی جانتے چلئے کہ مسافر کے لئے قصر کے جواز میں کسی بھی عالم اور کسی بھی امام کا اختلاف نہیں ہے صرف اتنی بات ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو قصر واجب ہے لیکن امام شافعیؒ کے یہاں قصر اولیٰ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسافر قصر نہیں کرے گا تو وہ امام صاحب کے مسلک کی رو سے گنہگار ہوگا، مگر حضرت شافعیؒ کا مسلک اسے گنہگار نہیں قرار دے گا۔ بلکہ اولیٰ و افضل چیز کو ترک کرنے والا کہلائے گا۔

مسافت قصر: قصر اتنی مسافت کے لئے واجب ہوتا ہے جو متوسط چال سے تین دن سے کم میں طے نہیں ہوسکتی۔ متوسط چال سے مراد آدمی یا اونٹ کی متوسط رفتار ہے تین دن کی مسافت سے یہ مراد ہے کہ صبح سے دوپہر تک چلے نہ یہ کہ صبح سے شام تک، اسی لئے فقہاء نے موجودہ زمانہ میں اس مسافت کا اندازہ اڑتالیس میل کیا ہے گویا اگر کوئی شخص اڑتالیس میل (تقریباً ۷۸ کلو میٹر) کی مسافت کے لئے اپنے گھر سے سفر پر نکلے تو جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اپنے گاؤں یا شہر کی آبادی سے باہر نکلتے ہی اس پر قصر واجب ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص مسافت قصر (یعنی ۴۸ میل یا ۷۸ کلو میٹر) کو کسی تیز سواری مثلاً گھوڑے یا ریل وغیرہ کے ذریعے تین دن سے کم میں طے کرے تب بھی وہ مسافر سمجھا جائے گا اسے بھی قصر نماز پڑھنی چاہئے۔

مدت قصر: مسافر کو اس وقت تک قصر کرنا چاہئے۔ جب تک کہ اپنے وطن اصلی نہ پہنچ جائے یا کسی مقام پر کم سے کم پندرہ دن ٹھہرنے کا قصد نہ کرے بشرطیکہ وہ مقام ٹھہرنے کے لائق ہو اگر کوئی شخص دریا میں ٹھہرنے کی نیت کرے یا دار الحرب میں یا اسی طرح جنگل میں تو اس نیت کا کچھ اعتبار نہ ہوگا۔ ہاں خانہ بدوش لوگ اگر جنگل میں بھی پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کریں تو یہ نیت صحیح ہو جائے گی اس لئے کہ وہ جنگلوں میں ہی رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔

اگر کوئی شخص اس مقدار مسافت کو قطع کرنے سے قبل کہ جس کا سفر میں اعتبار کیا گیا ہے کسی مقام پر ٹھہرنے کی یا اپنے وطن لوٹ جانے کی نیت کرے تو وہ مقیم ہو جائے گا۔ اگرچہ پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت کی ہو اب یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے سفر کے ارادہ کو ختم کر دیا

ہے۔

قصر کے کچھ مسائل:

❶ مندرجہ ذیل صورتوں میں اگر کوئی مسافر مسافت سفر پوری کرنے کے بعد پندرہ دن سے بھی زیادہ ٹھہر جائے تو وہ مقیم نہ ہوگا اور اس پر قصر کرنا واجب رہے گا۔

(الف)— پندرہ دن ٹھہرنے کا ارادہ نہ ہو مگر کسی وجہ سے بلاقصد وارادہ زیادہ ٹھہرنے کا اتفاق ہو جائے۔

(ب)— کچھ نیت ہی نہ کی ہو، بلکہ امروز، فردا میں اس کا ارادہ وہاں سے چلے جانے کا ہو مگر وہ اسی پس وپیش میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہر جائے۔

(ج)— پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کرے مگر وہ مقام قابل سکونت نہ ہو۔ (د) پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے مگر دو مقام پر، بشرطیکہ ان دونوں مقامات میں اس قدر فاصلہ ہو کہ ایک مقام کی اذان کی آواز دوسرے مقام میں نہ جاسکتی ہو، مثلاً دس روز مکہ معظمہ میں رہنے کا ارادہ کرے اور پانچ روز منیٰ میں مکہ سے منیٰ تین میل کے فاصلے پر ہے اور اگر رات کو تو ایک مقام میں رہنے کی نیت کرے اور دن کو دوسرے مقام میں تو جس موضع میں رات کو ٹھہرنے کی نیت کرلی ہے وہ اس کا وطن اقامت ہو جائے گا وہاں اس کو قصر کی اجازت نہ ہوگی اب دوسرا مقام جہاں وہ دن میں رہتا ہے اگر اس پہلے مقام سے سفر کی مسافت پر ہے تو وہاں جانے سے مسافر ہو جائے گا ورنہ مقیم رہے گا اور اگر ایک مقام دوسرے مقام سے اس قدر قریب ہو کہ ایک جگہ کی اذان کی آواز دوسری جگہ جاسکتی ہے تو وہ دونوں مقام ایک ہی سمجھے جائیں گے اور دونوں جگہ پندرہ دن ٹھہرنے کے ارادہ سے مقیم ہو جائے گا۔

❷ مقیم کی اقتداء مسافر کے پیچھے ہر حال میں درست ہے کہ خواہ اداء نماز ہو یا قضا، مسافر امام جب دو رکعتیں پڑھ کے سلام پھیر دے تو مقیم مقتدی کو چاہئے کہ اٹھ کر اپنی نماز پوری کرلے اور اس میں قرأت نہ کرے بلکہ چپ کھڑا رہے اس لئے کہ وہ لاحق ہے اور قعدہ اولیٰ اس مقتدی پر بھی فرض ہوگا مسافر امام کو مستحب ہے کہ سلام پھیرنے کے فوراً بعد مقتدیوں کو اپنے مسافر ہونے کی اطلاع یہ کہہ کر دے کہ "میں مسافر ہوں، مقتدی اپنی نماز پوری کرلیں"۔

مسافر بھی مقیم کی اقتداء کر سکتا ہے مگر وقت کے اندر، وقت کے بعد نہیں۔ اس لئے کہ مسافر جب مقیم کی اقتداء کرے گا تو امام کی اتباع میں چار رکعت یہ بھی پڑھے گا اور امام کا قعدۂ اولیٰ نفل ہوگا اور اس کا فرض، امام کی تحریمہ قعدۂ اولیٰ کے نفل ہونے کے ساتھ ہوگی اور مسافر مقتدی کی اس کی فرضیت کے ساتھ پس فرض نماز پڑھنے والے کی اقتداء نفل نماز پڑھنے والے کے پیچھے ہوئی اور یہ درست نہیں۔

مسافر فجر کی سنتوں کو ترک نہ کرے اور مغرب کی سُنّت کو بھی ترک کرنا بہتر نہیں ہے اور باقی سنتوں کے ترک کا اختیار ہے مگر بہتر یہ ہے کہ اگر چل رہا ہو اور اطمینان نہ ہو تو نہ پڑھے ورنہ پڑھ لے۔ (علم الفقہ)

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی قصر نماز

① عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلَّی الظُّھْرَ بِالْمَدِیْنَۃِ اَرْبَعًا وَصَلَّی الْعَصْرَ بِذِی الْحُلَیْفَۃِ رَکْعَتَیْنِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں سرتاج دوعالم ﷺ نے مدینہ میں ظہر کی نماز چار رکعت پڑھی اور ذی الحلیفہ میں عصر کی نماز دو رکعت پڑھی۔"

(بخاری ومسلم)

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب حج کے لئے مکہ کے سفر کا ارادہ فرمایا تو مدینہ میں ظہر کی نماز چار رکعت پڑھی پھر جب مدینہ سے نکلے اور ذوالحلیفہ پہنچے۔ تو وہاں قصر فرمایا اور عصر کی نماز دو رکعت پڑھی ذوالحلیفہ ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے کہ جب مسافر شرعی اپنے شہر یا گاؤں کے مکانات سے باہر نکل جائے تو قصر کی نماز پڑھنے لگے۔

② عَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبِ الْخُزَاعِيِّ قَالَ صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ اَكْثَرُ مَا كُنَّا قَطُّ وَ اٰمَنُهُ بِمِنٰى رَكْعَتَيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حارثہ ابن وہب خزاعیؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے ہمیں منیٰ میں دو رکعتیں پڑھائیں اور اس موقعہ پر ہم اتنی تعداد میں تھے کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھے اور امن کی حالت میں تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حجۃ الوداع کا ذکر ہے اس موقع پر چونکہ اسلام کی حقانیت و صداقت اکثر دلوں میں اپنا گھر کر چکی تھی اور مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی اس لئے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہؓ جتنی زیادہ تعداد میں تھے اس سے پہلے کسی موقع پر نہ تھے۔

"امن کی حالت میں تھے" کا مطلب یہ ہے کہ کفار کے کسی حملہ اور ان سے کسی جنگ وغیرہ کا کوئی خوف نہیں تھا۔ بلکہ بہت اطمینان اور سکون کی حالت میں تھے اس کا ذکر بطور خاص اس لئے کیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قصر کی مشروعیت کفار کے فتنوں کے خوف پر موقوف نہیں ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت سے ظاہری طور پر مفہوم ہوتا ہے بلکہ سفر میں بہر صورت قصر کرنا چاہئے چنانچہ اگلی حدیث میں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

آیت قصر میں خوف کی قید اور اس کی وضاحت

③ وَعَنْ يَعْلَى بْنِ اُمَيَّةَ قَالَ قُلْتُ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اِنَّمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَقَدْ اَمِنَ النَّاسُ قَالَ عُمَرُ عَجِبْتُ مِمَّا عَجِبْتَ مِنْهُ فَسَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت یعلی ابن امیہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ سے عرض کیا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد یہ ہے کہ "کم نماز پڑھو (یعنی قصر کرو) اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے"۔ تو اب جب کہ لوگ امن میں ہیں (اور کافروں کے ستانے کا خوف جاتا رہا ہے تو قصر کی کیا ضرورت ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ جس پر تمہیں تعجب ہے اسی پر مجھے بھی تعجب ہوا تھا چنانچہ میں نے سرتاج دو عالم ﷺ سے اس بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (نماز میں قصر) اللہ تعالیٰ کا ایک احسان ہے جو تم پر کیا گیا ہے لہٰذا تم اس کا صدقہ (یعنی احسان) قبول کرو۔" (مسلمؒ)

تشریح: مسافر کے لئے نماز میں قصر کی اجازت کے بارے میں جو آیت نازل ہوئی تھی اور جس کا ایک جز یہاں حدیث میں نقل کیا گیا ہے وہ پوری یوں ہے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔

"اور (مسلمانو!) جب تم کہیں سفر کرو، تو تمہارے لئے یہ گناہ نہیں ہے کہ کم (یعنی قصر) نماز پڑھو اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔"

اس آیت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حالت سفر میں قصر کی اجازت اسی وقت دی ہوگی جب کہ کافروں کے ستانے اور ان کے پریشان کرنے کا خطرہ ہو، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آیت میں خوف کی قید عادت اور اغلب کے اعتبار سے لگائی گئی ہے کہ اکثر مسافروں کو خوف ہوتا ہے خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ کافر ہر وقت اور ہر موقع پر درپے آزار ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فاقبلو اصدقتہ فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ حالت سفر میں قصر نماز پڑھنے کا حکم صرف کافروں کے خوف کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ یہ آسانی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان تمام بندوں پر جو حالت سفر میں ہوتے ہیں۔ ایک احسان ہے جس سے ہر مسافر فیضیاب ہوسکتا ہے خواہ کسی بھی قسم کا کوئی خوف ہو یا نہ ہو۔

"فاقبلوا" میں حکم وجوب کے لئے ہے یعنی ہر شرعی مسافر کے لئے قصر کرنا واجب اور ضروری ہے چنانچہ اس سے حنیفہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ حالت سفر میں قصر واجب ہے اور قصر نہ کرنا یعنی پوری نماز پڑھنا غیر پسندیدہ ہے۔

مدت اقامت

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ اِلٰى مَكَّةَ فَكَانَ يُصَلِّى رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى رَجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ قِيْلَ لَهُ اَقَمْتُمْ بِمَكَّةَ شَيْئًا قَالَ اَقَمْنَا بِهَا عَشْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ کے ہمراہ حجۃ الوداع کے موقع پر مدینہ سے مکہ گئے اور آپ ﷺ نے (چار رکعت والی نماز کی) دو دو رکعتیں پڑھیں یہاں تک کہ ہم مدینہ واپس آئے۔ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ لوگ مکہ میں کچھ دن ٹھہرے تھے؟ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (ہاں) ہم لوگ مکہ میں دس دن ٹھہرے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ اور آپ کے رفقاء صحابہؓ کا قیام مکہ میں دس دن اس طرح رہا کہ آپ ﷺ مکہ میں ذی الحجہ کی چار تاریخ کو پہنچے تھے اور ارکان حج وغیرہ سے فراغت کے بعد چودہویں ذی الحجہ کی صبح کو وہاں سے مدینہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

بہرحال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حالت سفر میں کسی جگہ دس دن ٹھہرنے سے کوئی شخص مقیم نہیں ہوتا اس کے لئے قصر نماز پڑھنی جائز ہے جب کہ یہ حدیث بظاہر حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے خلاف معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کے نزدیک اگر کوئی شخص کہیں چار دن سے زیادہ ٹھہر جائے گا تو پھر اس کے لئے قصر جائز نہیں ہوگا بلکہ اسے پوری نماز پڑھنی ضروری ہوگی اس کی پوری تفصیل اگلی حدیث میں آرہی ہے۔

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَافَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَفَرًا فَاَقَامَ تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْمًا يُصَلِّى رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ قَالَ بْنُ عَبَّاسٍ فَنَحْنُ نُصَلِّى فِيْمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَكَّةَ تِسْعَةَ عَشَرَ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فَاِذَا اَقَمْنَا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ صَلَّيْنَا اَرْبَعًا۔
(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرتاج دو عالم ﷺ (کہیں) سفر میں تشریف لے گئے اور وہاں انیس دن قیام فرمایا (دوران قیام) آپ ﷺ دو دو رکعتیں نماز پڑھتے رہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ بھی جب مکہ اور اپنے (یعنی مدینہ) کے درمیان کہیں انیس دن قیام کرتے ہیں تو دو دو رکعتیں نماز پڑھتے ہیں اور جب اس سے زیادہ ٹھہرتے ہیں تو چار رکعت نماز پڑھتے ہیں۔"
(بخاریؒ)

تشریح: فاقام تسعۃ عشر یوما کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ انیس دن بغیر نیت اقامت کے اس طرح ٹھہرے کہ امروز فردا میں وہاں سے روانہ ہوجانے کا ارادہ فرماتے رہے مگر بلا قصد و ارادہ آپ ﷺ کا قیام وہاں انیس دن ہوگیا۔ مگر اس سے حضرت ابن عباسؓ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر کوئی شخص حالت سفر میں کہیں انیس دن ٹھہر جائے تو وہ قصر نماز پڑھ سکتا ہے۔ ہاں انیس دن بعد اس کے لئے

قصر جائز نہیں ہوگا اس مسئلہ میں حضرت ابن عباسؓ منفرد ہیں اور کسی کا بھی یہ مسلک نہیں ہے۔

مدت اقامت کے سلسلہ میں ابتداء باب میں تفصیل کے ساتھ مسئلہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اس موقع پر پھر جان لیجئے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حالت سفر میں کسی جگہ پندرہ دن سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو اس کے لئے قصر جائز نہیں ہے بلکہ وہ پوری نماز پڑھے اور اگر کوئی شخص پندرہ دن یا پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو قصر نماز پڑھے بلکہ اگر وہ اقامت کی نیت نہ کرے اور آج کل میں وہاں سے روانہ ہونے کا ارادہ کرتا رہے اور اس طرح بلا قصد ارادہ اس کے قیام کا سلسلہ برسوں تک بھی دراز ہو جائے تب بھی وہ قصر نماز پڑھتا رہے امام طحاویؒ نے یہی مسئلہ جلیل القدر صحابہؓ مثلاً حضرت ابن عمرؓ وغیرہ سے نقل کیا ہے۔

حضرت امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ آزربائیجان میں چھ مہینے اس طرح ٹھہرے رہے کہ آج کل میں وہاں سے چلنے کا ارادہ کرتے رہے مگر بلا قصد وارادہ ان کا قیام اس قدر طویل ہو گیا چنانچہ وہ اس مدت میں برابر قصر نماز پڑھتے رہے اس موقع پر دیگر صحابہؓ بھی ان کے ہمراہ تھے اسی طرح حضرت انسؓ بھی مروان کے بیٹے عبدالملک کے ہمراہ شام میں دو مہینے تک بلا قصد ارادہ ٹھہرے رہے اور وہاں دو دو رکعت نماز پڑھتے رہے۔

اس مسئلے میں حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی جگہ علاوہ دو دن آنے اور جانے کے چار روز سے زیادہ قیام کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ مقیم ہو جاتا ہے اس کے لئے قصر جائز نہیں ہے وہ پوری نماز پڑھے اسی طرح اقامت کی نیت کے بغیر امروز وفردا میں چلنے کا ارادہ کرتے کرتے بلا قصد وارادہ اٹھارہ دن سے زیادہ ٹھہر جائے تو تب بھی اس کے لئے قصر جائز نہیں ہوگا وہ پوری نماز پڑھے امام شافعیؒ کے فقہ میں یہی معتمد اور صحیح قول ہے۔

مسافر حالت سفر میں اگر نفل نہ پڑھے تو کوئی مضائقہ نہیں

(۶) وَعَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ قَالَ صَحِبْتُ ابْنَ عُمَرَ فِيْ طَرِيْقِ مَكَّةَ فَصَلّٰى لَنَا الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ جَاءَ رَحْلَهُ وَجَلَسَ فَرَأَى نَاسًا قِيَامًا فَقَالَ مَا يَصْنَعُ هٰؤُلَاءِ قُلْتُ يُسَبِّحُوْنَ قَالَ لَوْ كُنْتُ مُسَبِّحًا اَتْمَمْتُ صَلَاتِيْ صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ لَا يَزِيْدُ فِي السَّفَرِ عَلٰى رَكْعَتَيْنِ وَاَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ كَذٰلِكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حفص ابن عاصم فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) مکہ اور مدینہ کے درمیان راستہ میں مجھے حضرت ابن عمرؓ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا (جب وقت ہو گیا تو) انہوں نے ہمیں ظہر کی نماز دو رکعت پڑھائیں اور اس کے بعد جب وہ اپنے خیمے میں واپس آئے تو دیکھا کہ لوگ کھڑے ہوئے ہیں انہوں نے پوچھا کہ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ نفلیں پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر مجھے نفل نماز پڑھنی ہوتی تو میں اپنی فرض نماز پوری نہ پڑھتا (یعنی اگر یہ موقع نفل نماز پڑھنے کا ہوتا تو فرض نمازیں پوری پڑھنی زیادہ اہم ہوتیں مگر جب آسانی کے پیش نظر فرض نماز کو قصر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تو نفل نماز کو ترک کرنا ہی اولیٰ ہوگا کیونکہ فرض کو ادا کرنا نفل پڑھنے سے اولیٰ ہے) مجھے سرتاج دو عالم ﷺ کی رفاقت کا شرف حاصل ہے آپ ﷺ سفر کی حالت میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، نیز مجھے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی رفاقت کا شرف بھی حاصل ہے ان حضرات کا بھی یہی معمول تھا (کہ سفر میں دو رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔"

تشریح: حضرت ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ حالت سفر میں نفل نہ پڑھے جائیں۔ سُنّت راتبہ نمازوں کا حکم دوسری فصل میں انشاء اللہ مذکور ہوگا۔

جمع بین الصلوٰتین

(۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْمَعُ بَيْنَ صَلَاةِ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ اِذَا كَانَ عَلٰى ظَهْرِ

سَيْرٍ وَيَجْمَعُ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ جب سفر میں ہوتے تو ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ پڑھتے تھے اور (اسی طرح) مغرب وعشاء کی نماز (بھی) ایک ساتھ پڑھتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرات شوافع نے اس حدیث کے ظاہری مفہوم کو اپنا مستدل بناتے ہوئے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ سفر کی حالت میں جمع بین الصلوٰتین یعنی ظہر وعصر کی نماز ایک ہی وقت میں ایک ساتھ پڑھ لینا جائز ہے خواہ عصر کی نماز ظہر کے وقت پڑھ لی جائے خواہ ظہر کی عصر کے وقت اسی طرح مغرب وعشاء کی نمازوں کو بھی ایک ساتھ پڑھ لینا جائز ہے چاہے مغرب کے وقت عشاء کی نماز پڑھ لی جائے اور چاہے عشاء کی نماز مغرب کے وقت۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک چونکہ جمع بین الصلوٰتین جائز نہیں ہے اس لئے ان کی طرف سے اس حدیث کی جو شوافع کی سب سے بڑی مستدل ہے یہ تاویل کی جاتی ہے کہ یہ حدیث جمع صوری پر محمول ہے یعنی آنحضرت ﷺ ظہر وعصر کی نماز ایک ساتھ اس طرح پڑھتے تھے کہ ظہر کو تو اس کے بالکل آخری وقت پڑھتے اور عصر کی نماز اس کے بالکل ابتدائی وقت میں ادا فرماتے۔ لہٰذا ظاہری صورت کے اعتبار سے تو یہ جمع بین الصلوٰتین ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں نمازیں ایک ساتھ پڑھیں لیکن حقیقت میں دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھی جاتی تھیں اسی طرح مغرب کی نماز تاخیر سے بالکل آخری وقت میں پڑھتے اور عشاء کی نماز ابتدائی وقت میں ادا فرماتے۔

سواری پر نماز پڑھنے کا مسئلہ

⑧ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِي السَّفَرِ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهٖ يُوْمِئُ اِيْمَاءً صَلَاةَ اللَّيْلِ اِلَّا الْفَرَائِضَ وَيُوْتِرُ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ جب سفر میں ہوتے تو رات کی نماز علاوہ فرض نماز کے اپنی سواری پر اشارہ سے پڑھتے اور سواری کا منہ جس سمت ہوتا اسی سمت آپ ﷺ کا بھی منہ ہوتا نیز نماز وتر بھی آپ ﷺ سواری ہی پر پڑھ لیتے تھے۔"

(بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ جدھر سواری کا منہ ہوتا (ادھر ہی کو آپ ﷺ بھی منہ کئے ہوئے نماز پڑھتے رہتے تھے لیکن تکبیر تحریمہ کے وقت اپنا روئے مبارک بہر صورت قبلہ ہی کی طرف رکھتے تھے۔ جیسا کہ حضرت انسؓ کی روایت سے معلوم ہوگا اشارہ سے نماز پڑھنے" کا مطلب یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرتے تھے نیز یہ کہ آپ ﷺ سجدہ کا جو اشارہ کرتے وہ رکوع کے اشارے سے پست ہوتا تھا۔

اس حدیث سے دو مسئلے مستنبط ہوتے ہیں اول تو یہ کہ سواری پر نفل نماز پڑھنی جائز ہے لیکن فرض نہیں اس حدیث میں اگرچہ رات کی نماز کا ذکر کیا گیا ہے لیکن دوسری روایتوں میں عام نفل نمازوں کا ذکر موجود ہے لہٰذا یہ حکم سُنّت مؤکدہ اور اس کے علاوہ دیگر سنن ونوافل نمازوں کو بھی شامل ہے مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت میں ثابت ہے کہ فجر کی سنتوں کے لئے سواری سے اتر جانا مستحب ہے بلکہ ایک دوسری روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی سنتوں کو سواری سے اتر کو پڑھنا واجب ہے۔ اسی لئے اس نماز کو بغیر کسی عذر کے بیٹھے بیٹھے پڑھنا جائز نہیں ہے فرض نماز سواری پر پڑھنا جائز نہیں ہے لیکن مندرجہ ذیل اعذار کی صورت میں فرض نماز بھی سواری پر پڑھ لینا جائز ہے۔

① کوئی شخص جنگل میں ہو اور اپنے مال یا اپنی جان کی ہلاکت کا خوف غالب ہو مثلاً یہ ڈر ہو کہ اگر سواری سے اتر کر نماز پڑھنے لگوں گا تو کوئی چور یا راہزن مال واسباب لے کر چلتا بنے گا یا کوئی درندہ نقصان پہنچائے گا یا قافلہ سے بچھڑ جاؤں گا یا راستہ بھول جاؤں گا۔ ②

سواری میں کوئی ایسا سرکش جانور ہو یا کوئی ایسی چیز ہو جس پر اترنے کے بعد پھر چڑھنا ممکن نہ ہو۔ ③ نماز پڑھنے والا اتنا ضعیف اور بڈھا ہو کہ خود سے نہ تو سواری سے اتر سکتا ہو اور نہ سواری پر چڑھنے پر قادر ہو اور نہ کوئی ایسا شخص پاس موجود ہو جو سواری سے اتار سکے اور اس پر چڑھا سکے۔ ④ زمین پر اتنی کیچڑ ہو کہ اس پر نماز پڑھنا ممکن نہ ہو۔ ⑤ یا بارش کا عذر ہو۔

بہر حال ان صورتوں میں فرض نماز بھی سواری پر پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ اعذار اور ضرورتیں شرعی و قواعد و قوانین سے مستثنٰی ہوتی ہیں۔

جہاں تک آنحضرت ﷺ کے اس عمل کا تعلق ہے کہ آپ ﷺ وتر کی نماز بھی سواری پر پڑھ لیتے تھے تو اس کے بارے میں امام طحاوی ؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ پہلے نماز وتر کے حکم کی تاکید کے پیش نظر اور اس کی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے سواری پر وتر کی نماز پڑھ لیتے تھے مگر جب لوگوں کے ذہن میں اس نماز کی تاکید و اہمیت بیٹھ گئی اور اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کی اتنی تاکید فرمادی کہ اس کے چھوڑنے کو روا نہیں رکھا تو بعد میں آپ ﷺ وتر کی نماز بھی سواری سے اتر کر زمین پر پڑھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ اسی طرح کرتے تھے حضرت امام محمد ؒ نے اپنی کتاب "موطا" میں صحابہ ؓ و تابعین ؒ کے ایسے بہت آثار نقل کئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حضرات وتر کی نماز پڑھنے کے لئے اپنی سواریوں سے اتر جاتے تھے۔

علامہ شمنی ؒ فرماتے ہیں کہ "نماز فرض کی طرح جنازہ کی نماز، منت مانی ہوئی نماز نذر اور وہ سجدہ تلاوت کہ جس کی آیت سجدہ کی تلاوت زمین پر کی گئی ہو سواری پر جائز نہیں ہے۔

حدیث سے دوسرا مسئلہ یہ مستنبط ہوتا ہے کہ سواری پر نماز پڑھنا سفر کے ساتھ مشروط ہے چنانچہ آئمہ جمہور کا یہی مسلک ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ ؒ و حضرت امام ابویوسف ؒ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے لیکن حضرت امام ابوحنیفہ ؒ کا محقق اور صحیح مسلک یہ ہے کہ "سواری پر نماز کا جواز نمازی کے شہر سے باہر ہونے کے ساتھ مشروط ہے خواہ مسافر ہو یا مسافر نہ ہو، چنانچہ اگر کوئی مسافر بھی شہر کے اندر ہو تو امام ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک اس کے لئے سواری پر نفل نماز پڑھنی جائز نہیں ہے لیکن حضرت امام محمد ؒ کے نزدیک جائز ہے اگرچہ مکروہ ان کے نزدیک بھی ہے حضرت امام ابویوسف ؒ فرماتے ہیں کہ مسافر شہر کے اندر بھی سواری پر نفل پڑھے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اب اس کے بعد اس میں اختلاف ہے کہ شہر سے کتنے فاصلے پر ہونے کی صورت میں سواری پر نماز پڑھنا جائز ہے چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک کم سے کم دو فرسخ (چھ میل) شہر سے باہر ہونا ضروری ہے بعض حضرات نے تین فرسخ اور بعض حضرات نے ایک کوس متعین کیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ شہر و آبادی کے مکانات سے باہر ہوتے ہی سواری پر نماز نفل پڑھنا جائز ہے جیسا کہ قصر نماز کے جواز کے سلسلے میں قاعدہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آنحضرت ﷺ کا نماز قصر نہ پڑھنا

⑨ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُلُّ ذَالِكَ قَدْ فَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَصَرَ الصَّلَاةَ وَاَتَمَّ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے سب کچھ کیا ہے آپ ﷺ نے (سفر کی حالت میں) کم رکعتیں بھی پڑھی ہیں اور پوری بھی پڑھی ہیں۔" (شرح السنۃ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ حالت سفر میں دونوں طریقوں پر عمل فرماتے تھے یعنی چار رکعت والی نماز کی دو رکعت بھی پڑھتے تھے اور پوری چار رکعت بھی پڑھتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام شافعی ؒ کا عمل اسی حدیث پر ہے وہ فرماتے ہیں کہ سفر میں قصر کرنا بھی جائز ہے اور پوری نماز پڑھنا بھی جائز ہے جب کہ حضرت امام ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک سفر میں پوری نماز پڑھنی جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص قصر نہیں کرے

گا بلکہ پوری نماز پڑھے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔
یہ حدیث اگرچہ امام شافعیؒ کی دلیل ہے لیکن اہل نظر کا کہنا ہے کہ اس حدیث کے سلسلہ روایت میں ابراہیم بن یحییٰ کا نام بھی آتا ہے جس کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف قرار دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مرتبہ صحت کو پہنچی ہوئی نہیں ہے اور سفر کی حالت میں آنحضرت ﷺ سے پوری نماز پڑھنا ثابت نہیں ہے اور دار قطنیؒ اور بیہقیؒ وغیرہ نے جو روایت نقل کی ہے جس سے حالت سفر میں اتمام اور قصر دونوں کا جواز ثابت ہوتا ہے بلکہ دار قطنیؒ نے اس کی صراحت بھی کی ہے کہ اس کی سند صحیح ہے تو اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کا تعلق حکم اول سے ہوگا یعنی ابتداء میں تو اتمام اور قصر دونوں جائز تھے۔ مگر بعد کو قصر ہی کو ضروری قرار دیدیا گیا۔
یہاں حضرت عائشہؓ کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس کے ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ حدیث کے پہلے جز کا تعلق تو ان نمازوں سے ہے جن میں قصر کیا جاتا ہے مثلاً چار رکعت والی نماز اور دوسرے جز کا تعلق ان نمازوں سے ہے جن میں قصر ہوتا ہی نہیں جیسے تین یا دو رکعت والی نماز یعنی آپ ﷺ چار رکعت والی نماز میں تو قصر کرتے تھے اور تین رکعت و دو رکعت والی نماز کو پوری پڑھتے تھے اسی مفہوم کو مراد لینے سے ظاہری معنی و مفہوم سے زیادہ دور جانا نہیں پڑتا کیونکہ قصر و اتمام دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مفہوم ہو جاتے ہیں اور یہ توجیہہ بہت مناسب اور قریب از حقیقت ہے۔

بلا قصد و ارادہ پندرہ دن سے زیادہ قیام کی صورت میں قصر جائز ہے

(۱۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَشَهِدْتُ مَعَهُ الْفَتْحَ فَاَقَامَ بِمَكَّةَ ثَمَانِيَ عَشْرَةَ لَيْلَةً لَا يُصَلِّي اِلَّا رَكْعَتَيْنِ يَقُوْلُ يَا اَهْلَ الْبَلَدِ صَلُّوْا اَرْبَعًا فَاِنَّا سَفْرٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ کے ہمراہ غزوات میں شامل ہوا ہوں چنانچہ فتح مکہ میں (بھی) میں آپ ﷺ کے ہمراہ موجود تھا۔ آپ ﷺ (اس موقع پر) مکہ میں اٹھارہ راتیں مقیم رہے اور (چار رکعت والی نماز) دو رکعت پڑھتے رہے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ اے اہل شہر تم لوگ چار رکعت نماز پڑھو میں مسافر ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: پہلے بتایا جاچکا ہے کہ کسی جگہ بلا قصد و ارادہ پندرہ روز سے زیادہ بھی قیام کی صورت میں مسافر نماز قصر پڑھ سکتا ہے چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں آپ ﷺ کا قیام اٹھارہ راتیں رہا۔ آپ ﷺ آج کل میں وہاں سے روانگی کا پروگرام بناتے رہے مگر قیام بغیر قصد و ارادہ اتنا طویل ہوگیا چنانچہ آپ ﷺ قصر نماز پڑھتے رہے چونکہ مکہ کے قیام کے دوران آپ ﷺ ہی امامت فرماتے تھے۔ اس لئے آپ اپنی دو رکعتیں پوری کر کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدیوں کو فرمادیا کرتے تھے کہ اہل شہر چار رکعت نماز پوری کریں میں مسافر ہوں چنانچہ مسافر امام کے لئے مقیم مقتدیوں کو اس طرح مطلع کر دینا مستحب ہے۔
اسی حدیث سے معلوم ہوگیا کہ اگر مقیم مسافر کی اقتداء کرے تو اس کے لئے چار رکعت نماز پوری پڑھنی ضروری ہے امام کی متابعت میں دو رکعتیں ہی پڑھنی جائز نہیں ہے ہاں اگر مسافر مقیم کی اقتداء کرے تو اس کو متابعت کے پیش نظر چار رکعتیں ہی پڑھنی چاہئے۔

قصر صرف چار رکعت والی نماز ہی میں جائز ہے

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ فِي السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ فِي الْحَضَرِ الظُّهْرَ اَرْبَعًا وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَصَلَّيْتُ مَعَهُ فِي السَّفَرِ الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ وَلَمْ يُصَلِّ بَعْدَهَا شَيْئًا وَالْمَغْرِبَ فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ سَوَاءً ثَلَاثَ رَكْعَاتٍ وَلَا يَنْقُصُ فِي حَضَرٍ وَلَا سَفَرٍ وَهِيَ وِتْرُ النَّهَارِ وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سفر کی حالت میں سرتاج دوعالم ﷺ کے ہمراہ ظہر کی دو رکعتیں اور اس کے بعد (یعنی سُنّت کی) دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا میں نے سرتاج دوعالم ﷺ کے ہمراہ سفر میں بھی نماز پڑھی ہے اور شہر (یعنی حضر) میں بھی، چنانچہ میں نے شہر میں تو آپ ﷺ کے ہمراہ ظہر کی چار رکعتیں اور اس کے بعد (سُنّت کی) دو رکعتیں پڑھی ہیں آپ ﷺ اس نماز میں سفر و شہر میں کوئی (زیادتی) نہیں کرتے تھے اور مغرب ہی کی نمازون کے وتر (کہلاتے) ہیں اور اس کے بعد (سُنّت کی) دو رکعتیں پڑھتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ بات بصراحت معلوم ہوئی کہ سفر کی حالت میں قصر ان ہی نمازوں میں جائز ہے جو چار رکعت والی ہیں جیسے ظہر، عصر اور عشاء جو نماز چار رکعت والی نہیں ہیں جیسے مغرب اور فجر اور ان میں قصر جائز نہیں ہے۔ یہ نمازیں جس طرح حضر میں پڑھی جاتی ہیں اسی طرح انہیں سفر میں پڑھنی چاہئے۔

وھی وتر النھار کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح نماز وتر رات کے وتر ہیں اسی طرح مغرب کی نماز دن کے وتر ہیں گویا اس قول سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ وتر کی نماز ایک سلام کے ساتھ تین رکعتیں ہیں۔

ابن ملک نے فرمایا ہے کہ "یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سُنّت مؤکدہ حضر کی طرح سفر میں بھی پڑھنی چاہئے۔ مگر حنفیہ کے یہاں معتمد اور صحیح قول یہ ہے کہ جب مسافر کسی جگہ منزل کرے تو وہاں سنتیں پڑھ لے مگر راستہ میں چھوڑ دے نہ پڑھے۔

جمع بین الصلوٰتین

⑭ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ اِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ اَنْ يَرْتَحِلَ جَمَعَ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَاِنِ ارْتَحَلَ قَبْلَ اَنْ تَزِيْغَ الشَّمْسُ اَخَّرَ الظُّهْرَ حَتّٰى يَنْزِلَ الْعَصْرَ وَفِي الْمَغْرِبِ مِثْلَ ذَالِكَ اِذَا غَابَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ اَنْ يَرْتَحِلَ جَمَعَ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ فَاِنِ ارْتَحَلَ قَبْلَ اَنْ تَغِيْبَ الشَّمْسُ اَخَّرَ الْمَغْرِبَ حَتّٰى يَنْزِلَ لِلْعِشَاءِ ثُمَّ يَجْمَعُ بَيْنَهُمَا۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ غزوۂ تبوک میں (اسی طرح عمل فرماتے تھے کہ) جب کوچ کرنے سے پہلے دوپہر ڈھل جاتی تو آپ ﷺ ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ پڑھ لیتے تھے اور جب آپ ﷺ دوپہر ڈھلنے سے پہلے ہی کوچ فرماتے تو ظہر کی نماز میں تاخیر فرماتے اور عصر کے لئے اترتے (یعنی ظہر و عصر دونوں نمازیں ایک ساتھ پڑھتے) مغرب کی نماز میں بھی آپ ﷺ اسی طرح کرتے تھے کہ اگر آفتاب آپ ﷺ کے کوچ کرنے سے پہلے غروب ہو جاتا تو مغرب و عشاء دونوں نمازیں ایک ساتھ پڑھتے اور اگر آفتاب غروب ہونے سے پہلے ہی کوچ فرماتے تو نماز مغرب میں تاخیر فرماتے یہاں تک کہ عشاء کی نماز کے لئے اترتے اور (اس وقت) دونوں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھتے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے شوافع نے جمع بین الصلوٰتین کے سلسلے میں جمع تقدیم و جمع تاخیر ثابت کی ہے اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے کہ ان کے نزدیک سفر میں دو نمازوں کو ایک ایک ساتھ پڑھ لینا جائز ہے اور ان دونوں نمازوں کو ان میں سے کسی ایک وقت بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

حنفیہ کے یہاں چونکہ جمع بین الصلوٰتین جائز نہیں ہے اس لئے وہ اس سلسلے میں ابوداؤد کا قول نقل کرتے ہیں کہ "وقت سے پہلے ہی نماز پڑھ لینے کے سلسلے میں کوئی بھی حدیث قوی ثابت نہیں ہے"۔

گویا ابوداؤدؒ کا یہ قول اس حدیث کے ضعیف ہونے پر دلیل ہے پھر یہ کہ حنفیہ کی دلیل بخاری و مسلم کی وہ روایت ہے جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ "میں نے آنحضرت ﷺ کو کوئی بھی نماز غیر مقررہ وقت میں پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہے"۔ لہٰذا ان دونوں حدیثوں کے تعارض کی شکل میں حضرت ابن مسعودؓ کی یہ حدیث ہی راجح ہوگی۔ کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں اس

سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے تفقہ اور علم کی زیادتی اور روایت حدیث کے سلسلے میں احتیاط پسندی میں سب سے ممتاز ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی روایت کردہ حدیث سب سے زیادہ صحیح اور معتمد ہوگی۔

سواری پر نماز پڑھنا

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَافَرَ وَاَرَادَ اَنْ يَتَطَوَّعَ اِسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ بِنَاقَتِهٖ فَكَبَّرَ ثُمَّ صَلّٰى حَيْثُ وَجَّهَهٗ رِكَابُهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں سرتاج دوعالم ﷺ جب سفر کرتے (یعنی شہر سے باہر نکلتے خواہ مسافر ہوتے یا مقیم) اور نماز نفل پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو اپنی اونٹنی کا منہ قبلہ کی طرف کرتے اور تکبیر تحریمہ کہتے، پھر جس طرف سواری منہ کرتی آپ ﷺ اسی طرف نماز پڑھتے رہتے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: امام شافعیؒ کے نزدیک مذکورہ شکل میں قبلہ کی طرف منہ کرنا شرط ہے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک فرض نماز میں تو شرط ہے مگر نفل نماز میں شرط نہیں ہے یعنی جو عذر (حدیث نمبر۸ میں) ذکر کئے جاچکے ہیں ان کی وجہ سے اگر سواری پر فرض نماز پڑھی جائے تو قبلہ رو ہو کر تکبیر تحریمہ کہنی ضروری ہے۔

⑭ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ بَعَثَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَاجَةٍ فَجِئْتُ وَهُوَ يُصَلِّيْ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ نَحْوَ الْمَشْرِقِ وَيَجْعَلُ السُّجُوْدَ اَخْفَضَ مِنَ الرُّكُوْعِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے مجھے کسی کام سے (کہیں) بھیجا۔ جب میں واپس آیا تو دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اپنی سواری پر مشرق کی طرف منہ کئے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور سجدہ رکوع سے پست تر کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ آپ رکوع و سجدہ دونوں اشارہ سے کرتے تھے، چنانچہ سجدہ کے لئے تو زیادہ اور رکوع کے لئے کم جھکتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت عثمانؓ کا منیٰ میں قصر نہ کرنا

⑮ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِنًى رَكْعَتَيْنِ وَاَبُوْبَكْرٍ بَعْدَهٗ وَعُمَرُ بَعْدَ اَبِيْ بَكْرٍ وَعُثْمَانُ صَدْرًا مِنْ خِلَافَتِهٖ ثُمَّ اَنَّ عُثْمَانَ صَلّٰى بَعْدُ اَرْبَعًا فَكَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذَا صَلّٰى مَعَ الْاِمَامِ صَلّٰى اَرْبَعًا وَاِذَا صَلَّاهَا وَحْدَهٗ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے منیٰ میں (چار رکعت والی نماز کی) دو رکعت پڑھی ہے آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی دو رکعت نماز پڑھی ہے ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے بھی دو رکعت نماز پڑھی ہے حضرت عثمان غنیؓ نے بھی ابتدائے خلافت میں تو دو ہی رکعت پڑھی ہے لیکن بعد میں چار رکعت پڑھنے لگے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ جب امام (یعنی حضرت عثمانؓ کے ساتھ) نماز پڑھتے تھے تو چار رکعت پڑھتے تھے اور جب اکیلے (یعنی سفر میں) نماز پڑھتے تو دو رکعت ہی پڑھتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ آنحضرت ﷺ اور اپنے زمانہ خلافت میں حضرت ابوبکر و عمر فاروقؓ جب حج کے لئے سفر کرتے اور منیٰ میں پہنچتے

تو وہاں بھی مسافرانہ نماز (یعنی قصر نماز) پڑھتے تھے۔ اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ نے بھی اپنی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں تو دو ہی رکعت نماز پڑھی ہے مگر بعد میں وہ چار رکعت نماز پڑھنے لگے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے اس عمل کے بارے میں کئی سبب نقل کئے جاتے ہیں چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ مکہ میں متاہل تھے اس کی تائید امام احمدؒ کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ "حضرت عثمانؓ نے منیٰ میں چار رکعتیں پڑھیں تو لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا، انہوں نے فرمایا کہ لوگو! میں مکہ میں متاہل یعنی قبیلہ دار ہوں اور میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو شخص کسی شہر میں متاہل ہو تو وہ مقیم کی طرح نماز پڑھے"۔ حضرت عثمانؓ کے اس عمل پر لوگوں کی حیرت اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ سفر میں پوری نماز نہیں پڑھتے تھے اور یہ کہ حالت سفر میں قصر لازم ہے ورنہ تو لوگ حیرت کا اظہار کیوں کرتے۔

حضرت عثمانؓ کے اس عمل کی ایک دوسری توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ موسم حج میں بہت زیادہ مسلمان منیٰ میں جمع ہوتے تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو نومسلم تھے اور دین کے احکام پوری طرح نہیں جانتے تھے اس لئے حضرت عثمانؓ ان کو دکھانے کے لئے چار رکعتیں پڑھتے تھے تاکہ ناواقف مسلمان جان لیں کہ نماز کی چار رکعتیں ہیں اگر قصر کرتے اور دو رکعت پڑھتے تو وہ لوگ یہ جانتے کہ دو ہی رکعتیں فرض ہیں۔

یا پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آخر میں حضرت عثمانؓ کا عمل حضرت عائشہؓ کی رائے کے مطابق ہوگیا تھا کیونکہ حضرت عائشہؓ کے نزدیک سفر میں قصر اور اتمام دونوں ہی جائز تھے۔

قصر رخصت سے زیادہ عزیمت ہے

⑯ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ فُرِضَتِ الصَّلَاةُ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ هَاجَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَفُرِضَتْ اَرْبَعًا وَتُرِكَتْ صَلَاةُ السَّفَرِ عَلَى الْفَرِيْضَةِ الْاُوْلٰى قَالَ الزُّهْرِيُّ قُلْتُ لِعُرْوَةَ مَابَالُ عَائِشَةَ تُتِمُّ قَالَ تَاَوَّلَتْ كَمَا تَاَوَّلَ عُثْمَانُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا (ابتداء سفر و حضر میں) نماز کی دو ہی رکعتیں فرض ہوئی تھیں پھر سرتاج دو عالم ﷺ نے ہجرت فرمائی تو (مقیم کے لئے) چار رکعتیں فرض قرار دی گئیں اور حالت سفر میں پہلی ہی دو رکعتیں فرض رہیں۔ زہریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عروہؒ سے عرض کیا کہ حضرت عائشہؓ کو کیا ہوا کہ وہ سفر میں پوری (چار رکعت) نماز پڑھتی ہیں۔ انہوں نے فرمایا وہ بھی ایسی تاویل کرتی ہیں جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے تاویل کی ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں نماز کی دو دو رکعتیں فرض کی گئی تھیں لیکن بعد میں ظہر، عصر و عشاء کی چار چار رکعت فرض قرار دی گئیں۔ البتہ مغرب کی نماز کو پہلے ہی حکم پر قائم رکھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفر کی حالت میں چار رکعت والی نماز کی دو رکعت پڑھنا چار رکعت مشروع ہونے کے بعد رخصت نہیں ہے بلکہ اصل میں مشروع ہی ہے چونکہ دو رکعتیں ہیں اس لئے قصر عزیمت یعنی لازم ہے نہ کہ رخصت جس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کا جی چاہے قصر کرے اور جس کا جی چاہے پوری نماز پڑھے۔ چنانچہ اس سے حضرت امام اعظمؒ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے لہٰذا اگر کوئی حالت سفر میں جب کہ اس پر قصر لازم ہو۔ پوری چار رکعت پڑھے گا اور پہلے قعدہ میں بیٹھے گا تو وہ برا کرے گا اور اس کی زائد دو رکعت نفل ہو جائیں گی اور اگر کوئی شخص چار رکعت اس طرح پڑھے گا کہ پہلے قعدہ میں نہ بیٹھے گا کہ حکماً وہی قعدۂ اخیر ہے تو اس کی فرض نماز باطل ہو جائے گی۔

حدیث کے آخری الفاظ تاولت کما تاول عثمان کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت عثمانؓ سفر کی حالت میں چار رکعت نماز پڑھتے تھے اور اپنے اس عمل کی تاویل کرتے تھے اسی طرح حضرت عائشہؓ بھی سفر میں چار رکعت نماز پڑھتی تھیں اور اپنے اس عمل کی تاویل کرتی

تھیں اب سوال یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ اور انہیں کی طرح حضرت عائشہؓ کی تاویل کیا تھی؟

تو علماء لکھتے ہیں کہ اس تاویل کے بارے میں صحیح قول یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ و حضرت عائشہؓ دونوں ہی سفر کی حالت میں قصر و اتمام دونوں جائز رکھتے تھے۔

قصر خدا کا حکم ہے

(۱۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ فَرَضَ اللّٰهُ الصَّلَاةَ عَلٰی لِسَانِ نَبِيِّكُمْ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِی الْحَضَرِ اَرْبَعًا وَفِی السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ وَفِی الْخَوْفِ رَكْعَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ جل شانہ، نے تمہارے نبی سرتاج دو عالم ﷺ کی زبانی حضر میں چار رکعت فرض کی ہیں۔ اور سفر میں دو رکعت اور خوف کی حالت میں ایک رکعت فرض کی ہے۔" (مسلم)

تشریح: وفی السفر رکعتین حنفیہ کے مسلک کی صریح دلیل ہے کہ سفر کی حالت میں دو ہی رکعتیں پڑھی جائیں پوری نماز نہ پڑھنی چاہئے۔

وفی الخوف رکعة (خوف کی حالت میں ایک رکعت فرض ہے) اس کے ظاہری مفہوم پر علماء سلف میں سے ایک جماعت نے عمل کیا ہے جس میں حسن بصریؒ اور اسحٰقؒ بھی شامل ہیں لیکن جمہور علماء فرماتے ہیں کہ نماز کی رکعتوں کے اعتبار سے امن اور خوف کی نماز میں کوئی فرق نہیں ہے جتنی رکعتیں حالت امن میں پڑھی جاتی ہیں اتنی ہی رکعتیں خوف کی حالت میں بھی پڑھنی چاہئیں ان کی طرف سے اس حدیث کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوگانہ حقیقی یا حکمی امام کے ساتھ پڑھنے کے سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ ایک رکعت تو امام کے ساتھ پڑھی جائے اور ایک رکعت تنہا پڑھی جائے جیسا کہ خوف کی حالت میں آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ سے نماز پڑھنے کا طریقہ احادیث صحیحہ میں ثابت ہے۔ اور شہر میں مطلقاً خوف کی حالت میں چار رکعتیں اور تین رکعتیں اس طرح پڑھی جائیں کہ امام کے ساتھ دو رکعتیں پڑھی جائیں اور بقیہ تنہا پڑھی جائیں۔ اس کی تفصیل صلوٰۃ الخوف کے باب میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

قصر قرآن و سُنّت سے ثابت ہے

(۱۸) وَعَنْهُ وعن ابْنِ عُمَرَ قَالَا سَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ وُهُمَا تَمَامٌ غَيْرُ قَصْرٍ وَالْوِتْرُ فِی السَّفَرِ سُنَّةٌ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ وحضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے سفر کی نماز کے لئے دو رکعتیں مقرر کی ہیں اور وہ ناقص نہیں ہیں پوری ہیں اور سفر میں وتر سُنّت ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: سفر کی حالت میں قصر نماز پڑھنا تو قرآن کریم سے ثابت ہے لہٰذا حدیث کے الفاظ آنحضرت ﷺ نے اسے اپنے قول و فعل سے واضح کیا ہے۔

وُهُمَا تَمَامٌ غَيْرُ قَصْرٍ (اور وہ ناقص نہیں ہیں پوری ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ سفر کی نماز کے لئے مشروع ہی دو رکعتیں ہیں نہ یہ کہ پہلے چار رکعتیں مشروع تھیں پھر بعد میں دو رکعتیں کم کر دی گئی ہیں۔

اور وتر سفر میں سُنّت ہے۔ یعنی سفر میں نماز وتر پڑھنا سُنّت سے ثابت ہے یا یہ کہ سفر کی حالت میں نماز وتر پڑھنا اسلام کی سنتوں میں سے ایک سُنّت ہے یہ مفہوم وجوب وتر کے منافی نہیں ہوگا۔ کیونکہ نماز وتر جس طرح حضر میں واجب ہے اسی طرح سفر میں بھی واجب ہے۔

مسافت قصر کی حد

(۱۹) وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ كَانَ يَقْصُرُ الصَّلَاةَ فِيْ مِثْلِ مَايَكُوْنُ بَيْنَ مَكَّةَ وَالطَّائِفِ وَفِيْ مِثْلِ مَابَيْنَ مَكَّةَ وَعُسْفَانَ وَفِيْ مِثْلِ مَابَيْنَ مَكَّةَ وَجُدَّةَ قَالَ مَالِكٌ وَذٰلِكَ اَرْبَعَةُ بُرُدٍ۔ (رواہ فی الموطا)

"اور حضرت امام مالکؒ راوی ہیں کہ ان کو حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں پہنچی ہے کہ وہ (یعنی حضرت ابن عباسؓ) اس مسافت کے دوران جو مکہ اور طائف مکہ اور عسفان، مکہ اور جدہ کے درمیان ہے قصر نماز پڑھتے تھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ مسافت چار برید ہے۔" (موطا)

تشریح: چار برید سولہ فرسخ کے برابر ہے، ایک فرسخ تین میل کو کہتے ہیں اور ایک میل (محدثین کے یہاں) چار ہزار ہاتھ کی مسافت کو کہتے ہیں۔ اس طرح چار برید اڑتالیس میل کی مسافت ہوئی۔ اگر ایک منزل کو بارہ میل کی مسافت مانی جائے تو چار برید کی چار منزلیں ہوئیں۔

بظاہر اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں جن تین مسافت کا ذکر کیا گیا ہے وہ یکساں ہوں یعنی جتنی مسافت مکہ اور طائف کے درمیان ہو اتنی ہی مسافت مکہ اور عسفان کے درمیان ہو اسی طرح جتنی مسافت ان دونوں کی الگ الگ ہو اتنی ہی مسافت مکہ اور جدہ کے درمیان ہو۔ حالانکہ حقیقت میں یہ تینوں مسافت برابر نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ حضرت امام مالکؒ کے قول ذلک اربعۃ برید (یہ مسافت چار برید ہے) کا تعلق آخری مسافت یعنی مکہ اور جدہ کے درمیان کی مسافت سے ہے کہ مکہ اور جدہ کا درمیانی فاصلہ چار برید ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کے مذکورہ بالا فعل کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں مسافت قصر کی کوئی حد بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ مطلقاً سفر ذکر کیا گیا ہے قصر نماز کے باب کی احادیث پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں جہاں بھی قصر نماز کا ذکر کیا گیا ہے اور آپ ﷺ کے قصر نماز پڑھنے کو بیان کیا گیا ہے ان تمام مواقع کی مسافت میں فرق ہے بعض مسافت کم ہے اور بعض مسافت زیادہ ہے آپ ﷺ کے بعد صحابہؓ، تابعین اور آئمہ وعلماء اُمت کی آسانی کے لئے اپنے اپنے اجتہاد کے ذریعہ اور غور و فکر کے ساتھ مسافت قصر کی حد مقرر کی ہے کہ اس حد سے کم مسافت میں نماز قصر نہیں ہوگی بلکہ پوری ہی پڑھی جائے گی اور اس مسافت یا اس سے زائد مسافت کی صورت میں قصر واجب ہوگا۔

چنانچہ امام شافعیؒ نے ایک روایت کے مطابق ایک روز کی مسافت اور دوسری روایت کے مطابق دو روز کی مسافت کو مقرر کیا ہے لیکن ان کے مسلک کی کتاب "حاوی" میں سولہ فرسخ کا تعین کیا گیا ہے اور یہی مسلک حضرت امام مالک و حضرت امام احمدؒ کا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے مسافت قصر کے سلسلے میں تین منزل کی حد مقرر کی ہے اور ایک منزل اتنی مسافت پر ہو کہ چھوٹے دنوں میں قافلہ صبح کو چل کر دوپہر کے بعد منزل پر پہنچ جائے۔

حضرت امام ابویوسفؒ نے دو روز اور تیسرے روز کے اکثر حصہ کی مسافت کو مسافت قصر قرار دیا ہے۔

اصحاب ظواہر (وہ جماعت جو صرف حدیث کے ظاہری الفاظ پر عمل پیرا ہوتی ہے) نے مطلقاً سفر کا اعتبار کیا ہے یعنی ان کے نزدیک مسافت قصر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے خواہ سفر لمبا ہو یا چھوٹا ہو ہر صورت میں نماز قصر ادا کی جائے گی۔

اس سلسلہ میں اگر چاروں آئمہ کے مسلک کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت اور نتیجہ کے اعتبار سے سب کا یکساں ہی مسلک ہے کیونکہ حنفیہ کے نزدیک مشہور مسلک کے مطابق مسافت قصر (۴۸) میل مقرر ہے، حاوی کے قول کے مطابق شوافع کے یہاں سولہ فرسخ مقرر ہے اور سولہ فرسخ حساب کے اعتبار سے (۴۸) میل کے برابر ہے اسی طرح حضرت امام مالکؒ و حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے۔ لہٰذا چاروں مسلک میں مسافت قصر (۴۸) میل ہوئی۔ واللہ اعلم

سفر میں نماز پڑھنے کا بیان

(۲۰) وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَمَانِیَۃَ عَشَرَ سَفَرًا فَمَا رَأَیْتُہٗ تَرَکَ رَکْعَتَیْنِ اِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ الظُّھْرِ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ مجھے سرتاج دو عالم ﷺ کے ہمراہ اٹھارہ دن میں سفر کا شرف حاصل رہا ہے میں نے اس دوران میں یہ کبھی نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ نے زوال آفتاب کے بعد نماز ظہر سے پہلے دو رکعتیں چھوڑی ہوں۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریح: بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ زوال آفتاب کے بعد اور نماز ظہر سے پہلے دو رکعتیں فرض سے پہلے کی سنتیں پڑھتے ہوں گے اور سفر کی وجہ سے چار رکعت پر اکتفا کرتے ہوں گے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دو رکعتیں تحیۃ الوضو کی ہوں۔

(۲۱) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ عَبْدَ اللّٰہِ ابْنِ عُمَرَ کَانَ یَرَی ابْنَہٗ عُبَیْدَ اللّٰہِ یَتَنَفَّلُ فِی السَّفَرِ فَلَا یُنْکِرُ عَلَیْہِ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ اپنے صاحبزادے حضرت عبید اللہؒ کو سفر کی حالت میں نفل نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے اور منع نہیں کرتے تھے۔" (مالکؒ)

تشریح: ہوسکتا ہے کہ حضرت عبید اللہؒ سنّت مؤکدہ پڑھتے ہوں گے۔ یا یہ کہ وہ اس اعتقاد کے باوجود کہ سفر کی حالت میں نفل نماز کو چھوڑ دینا جائز ہے۔ اگر وقت میں وسعت دیکھتے ہوں گے، تو دوسرے نوافل پڑھنے لگتے ہوں گے۔ لہٰذا اس مفہوم کی صورت میں حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں اس روایت کو جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے قافلہ کے لوگوں کو سفر میں نفل نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ (دیکھئے حدیث نمبر ۶۰) اس بات پر محمول کیا جائے کہ انہوں نے وہاں یا تو ان لوگوں کو اس لئے منع کر دیا تھا کہ وہ دوسرے نوافل تنگ وقت میں پڑھ رہے تھے۔ یا یہ کہ وقت میں تو وسعت تھی۔ مگر انہوں نے یہ گمان کیا ہوگا، کہ وظائف مثلاً نوافل وغیرہ اس قدر لازم ہیں کہ انہیں سفر کی حالت میں بھی نہ چھوڑنا چاہئے۔ حالانکہ ایسا کوئی حکم نہیں ہے۔ اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے ان کو نوافل پڑھنے سے روک کر ان کے اس گمان وخیال کی تردید فرمائی۔ کیونکہ اللہ جل شانہ تو اپنے فضل وکرم سے مسافر بندہ کے نامہ اعمال میں اس عمل کا ثواب بھی لکھتا ہے جو وہ از قسم عبادت حضر ہو یعنی اپنے گھر میں کرتا تھا۔ ورنہ تو جہاں تک نفس نماز کا تعلق ہے اس سے بہتر کون سی مشغولیت ہوسکتی ہے اور بغیر کسی وجہ کے اس کے پڑھنے سے کون روک سکتا ہے۔ جب کہ حضرت ابن عمرؓ خود جانتے تھے کہ نماز سے روکنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی۔

"بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے (یعنی) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے؟"

بَابُ الْجُمُعَۃِ

جمعہ کا بیان

لفظ "جمعہ" جو ہفتہ کے ایک دن کا نام ہے فصیح زبان و لغت کے اعتبار سے جیم اور میم دونوں کے پیش کے ساتھ ہے لیکن جیم کے پیش اور میم کے سکون کے ساتھ بھی مستعمل ہوا ہے۔

اس دن کو جمعہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جمع اور پوری کی گئی تھی۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس

دن کو جمعہ کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب بہشت سے دنیا میں اتارے گئے تو اسی دن زمین پر وہ حضرت حوا کے ساتھ جمع ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ علماء نے اور بھی وجہ تسمیہ بیان کئے ہیں چنانچہ بعض حضرات کا قول ہے کہ اس دن چونکہ تمام لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نماز کے لئے جمع ہوتے ہیں اس لئے اسے یوم الجمعہ کہا جاتا ہے۔

جمعہ اسلامی نام ہے زمانہ جاہلیت میں اس دن کو عروبہ کہا جاتا تھا۔ لیکن بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ عروبہ بہت قدیم نام تھا مگر زمانہ جاہلیت ہی میں یہ نام بدل دیا گیا تھا اور اس دن کو جمعہ کہا جانے لگا تھا۔

جمعہ کا روز نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت سے پہلے زمانہ جاہلیت میں بھی ایک امتیازی اور شرف و فضیلت کا دن مانا جاتا تھا مگر اسلام نے اس دن کو اس کی حقیقی عظمت و فضیلت کے پیش نظر بہت ہی زیادہ باعظمت و بافضیلت دن قرار دیا۔

گذشتہ صفحات میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نماز سے زیادہ اور کوئی عبادت پسند نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بندوں پر اللہ جل شانہ کی طرف سے جو بے انتہا نعمتوں کی بارش ہوتی ہے اور جن کا سلسلہ انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک ہے۔ بلکہ پیدائش سے قبل اور موت کے بعد بھی انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے ہمکنار رہتا ہے اس کے ادائے شکر کے لئے ہر دن میں پانچ وقت نماز مقرر کی اور جمعہ کے دن چونکہ تمام دنوں سے زیادہ نعمتیں بندوں پر نازل ہوتی ہیں اس لئے اس دن ایک خاص نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ جماعت کے باب میں جماعت کی حکمتیں اور اس کے فائدے بیان کئے جاچکے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہوچکا ہے کہ جماعت میں جتنی زیادہ کثرت ہوگی اور مسلمان جتنی بڑی تعداد میں نماز کے لئے جمع ہوں گے اسی قدر ان فوائد کا زیادہ ظہور ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے۔ جب کہ محلوں کے مسلمان اور اس مقام کے اکثر لوگ ایک جگہ جمع ہو کر نماز پڑھیں چونکہ ہر روز پانچوں وقت اس قدر اجتماع لوگوں کی پریشانی و تکلیف کے پیش نظر ممکن نہ ہوتا اس لئے شریعت نے ہفتہ میں ایک دن ایسا مقرر فرما دیا جس میں مختلف محلوں اور گاؤں کے مسلمان آپس میں ایک جگہ جمع ہو کر اس عبادت کو اداء کریں اور چونکہ جمعہ کا دن تمام دنوں میں افضل و اشرف تھا لہٰذا یہ تخصیص اسی دن کے لئے کی گئی۔

اگلی امتوں کو بھی خدائے تعالیٰ نے اس دن عبادت کا حکم فرمایا تھا مگر انہوں نے اپنے تمرد و سرکشی اور اپنی بدنصیبی کی بناء پر اس میں اختلاف کیا اور ان کی اس سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس عظیم سعادت سے محروم رہے اور یہ فضیلت و سعادت بھی اسی اُمت مرحومہ کے حصہ میں پڑی۔ یہود نے سنیچر کا دن مقرر کر لیا اس خیال سے کہ اس دن میں اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے پیدا کرنے سے فارغ ہوا تھا۔ عیسائیوں نے اتوار کا دن مقرر کیا اس خیال سے کہ یہ دن ابتدائے آفرینش کا ہے۔

چنانچہ اب تک یہ دونوں فرقے ان دنوں میں عبادت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں، اپنے تمام کام کاج چھوڑ کر اس دن چرچ و عبادت گاہوں میں ضرور جاتے ہیں۔ عیسائی حکومتوں میں اتوار کے دن اسی سبب سے تمام دفاتر و تعلیم گاہوں میں تعطیل ہوتی ہے۔ بعض مسلم حکومتوں کی یہ مرعوبیت اور بدنصیبی ہے کہ وہ بھی عیسائی حکومتوں کے اس خالص مذہبی طرز عمل کو بدل نہ سکیں اور اپنے ملکوں میں بجائے جمعہ کے اتوار کے دن عام تعطیل کرنے پر مجبور ہیں۔

نماز جمعہ کی فرضیت: نماز جمعہ فرض عین ہے، قرآن مجید، احادیث متواترہ اور اجماع اُمت سے ثابت ہے اور اسلام کے شعائر اعظم میں سے ہے نماز جمعہ کی فرضیت کا انکار کرنے والا کافر اور اس کو بلاعذر چھوڑنے والا فاسق ہے، نماز جمعہ کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

"اے ایمان والو! جب نماز جمعہ کے لئے اذان کہی جائے تو تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے "ذکر" سے مراد نماز جمعہ اور اس کا خطبہ ہے۔ "دوڑنے" سے مراد اس نماز کے لئے نہایت اہتمام کے ساتھ جانا۔ نماز جمعہ کی فرضیت آنحضرت ﷺ کو مکہ ہی میں معلوم ہوگئی تھی، مگر غلبہ کفر کے سبب اس کے ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی آپ نے نماز جمعہ شروع کردی۔

مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے حضرت اسعد ابن زرارہؓ نے اپنے اجتہاد صائب اور کشف صادق سے جمعہ کی نماز شروع کردی تھی۔ (علم الفقہ)

نماز جمعہ کے بارے میں یہاں چند باتیں عرض کردی گئی ہیں آئندہ ابواب میں حسب موقع نماز جمعہ کے احکام و مسائل اور اس کے فضائل کو بیان کیا جاتا رہے گا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جمعہ کی فضیلت سے یہود و نصاریٰ کا اعراض

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بَیْدَ اَنَّهُمْ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا وَاُوْتِیْنَاهُ مِنْ بَعْدِهِمْ ثُمَّ هٰذَا یَوْمُهُمُ الَّذِیْ فُرِضَ عَلَیْهِمْ یَعْنِیْ یَوْمَ الْجُمُعَةِ فَاخْتَلَفُوْا فِیْهِ فَهَدَانَا اللّٰهُ لَهُ وَالنَّاسُ لَنَا فِیْهِ تَبَعٌ اَلْیَهُوْدُ غَدًا وَالنَّصَارٰی بَعْدَ غَدٍ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَنَحْنُ اَوَّلُ مَنْ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ بَیْدَ اَنَّهُمْ وَذَكَرَ نَحْوَهٗ اِلٰی اٰخِرِهٖ وَفِیْ اُخْرٰی لَهٗ عَنْهُ وَعَنْ حُذَیْفَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ اٰخِرِ الْحَدِیْثِ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ مِنْ اَهْلِ الدُّنْیَا وَالْاَوَّلُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ الْمَقْضِیُّ لَهُمْ قَبْلَ الْخَلَائِقِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ ہم دنیا میں بعد میں آئے ہیں اور قیامت کے دن شرف و مرتبہ میں سب سے آگے ہوں گے علاوہ ازیں اہل کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) کو اللہ کی طرف سے ہم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور ہمیں بعد میں کتاب ملی ہے پھر یہ دن یعنی جمعہ کا دن ان (اہل کتاب) پر فرض کیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس میں اختلاف کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دن (یعنی جمعہ) کے بارے میں ہماری ہدایت فرمائی بایں طور کہ ہم نے خدا کے حکم کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اس دن کو خدا کی عبادت کے لئے اختیار کیا۔ اور لوگ یعنی یہود و نصاریٰ نہ صرف شرف و فضیلت بلکہ دن کے اعتبار سے بھی ہمارے تابع ہیں۔ یہود نے کل (یعنی جمعہ کے بعد کے دن سنیچر) کو اختیار کیا اور نصاریٰ نے پرسوں (یعنی سنیچر کے بعد کا دن اتوار) اختیار کیا۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم ہی کی ایک روایت میں حضرت ابوہریرہؓ و حضرت حذیفہؓ سے یوں منقول ہے کہ دونوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے حدیث کے آخر میں فرمایا۔ (دنیا میں آنے کے اعتبار سے) ہم سب سے پیچھے ہیں اور قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے کہ ساری مخلوقات سے پہلے ہمارے لئے (حساب کا اور جنت میں داخل ہونے کا) حکم کیا جائے گا۔"

تشریح: حدیث کے الفاظ "ہمیں بعد میں کتاب ملی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ گذشتہ امتوں کے پاس خدائے تعالیٰ کی کتاب پہلے نازل ہوئی ہے اور پھر سب سے بعد میں ہماری اُمت کو قرآن کریم سے نوازا گیا ہے مگر درحقیقت یہی چیز ہماری اُمت کے لئے تمام امتوں کے مقابلہ میں شرف و فضیلت کی دلیل ہے کیونکہ اصولی بات ہے کہ جو کتاب بعد میں آتی ہے وہ پہلی کتاب کو منسوخ قرار دے دیتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو کتاب پہلی کتاب کو منسوخ قرار دے گی وہ اپنی عظمت و فضیلت کے اعتبار سے تمام کتابوں پر حاوی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کا قول نحن الاخرون بھی اُمت محمدی کی فضیلت و عظمت کے بیان کے لئے ہے۔

ارشاد گرامی فاختلفوا فیہ کی وضاحت و تشریح میں شارحین حدیث کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہود و نصاریٰ پر جمعہ کے روز کو فرض کرنے سے کیا مراد ہے؟ اور یہ کہ اہل کتاب نے اس میں کیا اختلاف کیا؟

چنانچہ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مسلمانوں پر جمعہ کی نماز فرض کی ہے بعینہ اسی طرح اہل کتاب پر بھی جمعہ کے روز عبادت کرنا فرض قرار دیا تھا اور انہیں یہ حکم دیا تھا کہ وہ اسی روز عبادت خداوندی کے لئے آپس میں جمع ہوا کریں جیسا کہ حدیث کے الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے مگر انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اسی معاملہ میں بھی خدا کے حکم سے اعراض کیا اور اپنی سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا جمعہ کو فرض کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں تمہارے لئے ایک ایسا دن فرض قرار دیا ہے جس میں تم اپنے دنیوی امور سے فارغ ہو کر اور تمام کام کاج چھوڑ کر خدا کی عبادت اور ذکر میں مشغول رہو لہٰذا تم اپنی اجتہاد اور فکری قوت سے کام لیتے ہوئے اس دن کو متعین کر لو کہ وہ کونسا دن ہے؟ گویا اس طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ اہل کتاب کے اجتہاد و فکر کا امتحان تھا کہ آیا یہ حق اور صحیح بات دریافت کر لینے اور اس پر مطلع ہو جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں؟ چنانچہ یہود نے تو سنیچر کے دن کو متعین کیا اور کہا کہ یہی دن عبادت خداوندی میں اجتماعیت کے ساتھ مشغول ہونے کا دن ہے اور اسی دن کی سب سے زیادہ فضیلت ہے کیونکہ اسی دن اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے پیدا کرنے سے فارغ ہوا تھا۔ لہٰذا ہمیں بھی چاہئے کہ ہم اس دن دنیا کے کاروبار سے فراغت حاصل کر کے عبادت میں مشغول رہیں۔

نصاریٰ نے اتوار کا دن مقرر کیا انہوں نے اس دن کو بایں طور تمام دنوں سے زیادہ افضل و بابرکت جانا کہ یہی دن ابتدائے آفرینش کا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ مبداء کمالات و انعامات ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ جل شانہ مخلوق پر اپنے فیض اور اپنی نعمتوں کے ساتھ متوجہ ہوا۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت و پرستش بہت زیادہ کی جائے اور بندے دنیا کی مصروفیتوں سے منہ موڑ کر اپنے پیدا کرنے والے اور اپنے پالنہار کی بندگی میں مصروف رہیں یہی دن سب سے زیادہ مناسب اور بہتر ہو سکتا ہے۔

لیکن یہود و نصاریٰ دونوں اپنے اجتہاد اور اپنی رائے میں ناکام رہے ان کی طبیعت اور ان کے مزاج میں چونکہ تمرد و سرکشی کا مادہ زیادہ تھا۔ سعادت و بھلائی کے نور سے ان کے قلوب پوری طرح مستفید نہ تھے اس لئے وہ اصل مقصد اور اصل دن جو خدا کے علم میں تھا اس کو تو پہچان نہ سکے بلکہ اپنی اپنی دلیلوں کا سہارا لے کر دوسرے دنوں کو اختیار کر بیٹھے۔

برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدیہ ﷺ کو ہدایت سے نوازا اور اپنے فضل و کرم سے اصل دن یعنی جمعہ کی معرفت عطا فرمائی چنانچہ جب اللہ جل شانہ نے اس آیت یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ کے ذریعے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جمعہ کو خدا کی عبادت کی جائے تو اس کے ساتھ انہیں اس حکم کی بجا آوری کی توفیق بھی عطا فرمائی اور اس اُمت کو اس مرحلے پر بھی تمرد و سرکشی اور خود ساختہ دلیلوں کے ذریعے گمراہ نہیں کیا چنانچہ مسلمانوں نے خدا کے اس حکم کے آگے گردن اطاعت جھکا دی اور ایک سچی فرمانبردار اُمت ہونے کے ناطے جمعہ ہی کے دن کو خدا کی عبادت و بندگی کے لئے اختیار کر لیا۔

"لوگ ہمارے تابع ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ کا روز چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا دن ہونے کی وجہ سے نسل انسانی کے لئے مبداء اور انسانی زندگی کا سب سے پہلا دن ہے اس لئے اس دن عبادت کرنے والے عبادت کے اعتبار سے متبوع اور اس کے بعد کے دو دن یعنی سنیچر و اتوار کو عبادت کرنے والے تابع ہوئے۔

اسی بنا پر یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ کہ شرعًا اور اصولاً جمعہ کا دن ہی ہفتہ کا پہلا دن ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ عرف عام اس کے برخلاف ہے۔

جمعہ کے دن کی فضیلت

(۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْرُ یَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَةِ فِیْهِ خُلِقَ

آدَمُ وَفِيْهِ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَفِيْهِ اُخْرِجَ مِنْهَا وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ ان دنوں کا جن میں آفتاب طلوع ہوتا ہے سب سے بہتر دن جمعہ ہے اسی دن حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔ (یعنی ان کی تخلیق مکمل ہوئی) اسی دن وہ بہشت میں داخل ہوئے اور اسی دن انہیں بہشت سے نکالا گیا (اور زمین پر اتارا گیا) اور قیامت بھی جمعہ ہی کے روز قائم ہوگی۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جملہ کے ذریعہ بطور مبالغہ جمعہ کے دن کی فضیلت ظاہر کرنا مقصود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام دنوں میں سب سے زیادہ افضل دن جمعہ ہے کیونکہ ایسا کوئی بھی دن نہیں ہے جس میں آفتاب طلوع نہ ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا دن ہونے کی وجہ سے جمعہ کے دن کی فضیلت تو ظاہر ہے لیکن بہشت سے نکلنے کا دن ہونے کی وجہ سے جمعہ کی فضیلت اس لئے ہے کہ دراصل حضرت آدم علیہ السلام کا جنّت سے نکل کر زمین پر آنا انبیاء اور اولیاء کی پیدائش کا سبب اور ان کی مقدس زندگیوں سے بے شمار احسانات کے ظہور کا باعث ہوا۔ ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام کی موت بارگاہ رب العزت میں ان کی حاضری کا سبب ہوئی اسی طرح قیامت کا قائم ہونا جنّت میں داخل ہونے کا سبب ہے جس میں پرہیزگاروں اور نیکوکاروں سے اللہ تعالیٰ کے کئے گئے وعدے ظاہر ہوں گے۔

"قیامت قائم ہونے" سے مراد یا تو پہلا صور ہے کہ جس کی آواز سے زمین و آسمان فنا ہو جائیں گے اور پوری دنیا موت کی آغوش میں پہنچ جائے گی یا دوسرا صور بھی مراد لیا جا سکتا ہے جو تمام مخلوق کو دوبارہ زندہ کرنے اور انہیں احکم الحاکمین کی بارگاہ میں حساب کے لئے پیش کرنے کے واسطے پھونکا جائے گا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ تمام دنوں میں عرفہ کا دن افضل ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ جمعہ کا روز افضل ہے۔ جیسا کہ اس حدیث سے مفہوم ہوتا ہے لیکن یہ اختلاف و تضاد اس صورت میں ہے جب کہ مطلقاً یہ کہا جائے کہ دنوں میں سب سے افضل دن عرفہ ہے یا اسی طرح کہا جائے کہ جمعہ کا دن سب سے افضل دن ہے اور اگر دونوں اقوال کا مفہوم اس طرح لیا جائے کہ جو حضرات عرفہ کی افضلیت کے قائل ہیں ان کی مراد یہ ہے کہ سال میں سب سے افضل دن عرفہ ہے اور جو حضرات کہتے ہیں کہ جمعہ سب سے افضل دن ہے ان کی مراد یہ ہے کہ ہفتہ کے دنوں میں سب سے افضل دن جمعہ ہے۔

اس طرح نہ صرف یہ کہ دونوں اقوال میں کسی تطبیق اور تاویل کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ دونوں اقوال اپنی اپنی جگہ صحیح اور قابل قبول ہوں گے ہاں اگر حسن اتفاق سے عرفہ (یعنی ذی الحجہ کی نویں تاریخ) جمعہ کے روز ہو جائے تو نور علیٰ نور کہ یہ دن مطلقاً تمام دنوں میں سب سے زیادہ افضل ہوگا اور اس دن کیا جانے والا عمل تمام اعمال میں افضل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ خوش قسمتی سے اگر حج جمعہ کے روز ہوتا ہے تو اس کو حج اکبر کہتے ہیں۔ کیونکہ جو حج جمعہ کے دن ہوتا ہے وہ فضیلت و مرتبہ کے اعتبار سے جمعہ کے علاوہ دوسرے ایام میں ادا ہونے والے ستر حجوں پر بھاری ہوتا ہے۔

جمعہ کی فضیلت و عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابن مسیبؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جمعہ نفل حج سے زیادہ محبوب ہے۔

جامع صغیر میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت مرفوعاً منقول ہے کہ "جمعہ حج المساکین ہے"۔

جمعہ کے دن ساعت قبولیت

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجُمُعَةِ لَسَاعَةً لَا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ يَسْأَلُ اللّٰهَ فِيْهَا خَيْرًا اِلَّا اَعْطَاهُ اِيَّاهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ مُسْلِمٌ قَالَ وَهِيَ سَاعَةٌ خَفِيْفَةٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُمَا قَالَ اِنَّ فِي الْجُمُعَةِ لَسَاعَةً لَا يُوَافِقُهَا مُسْلِمٌ قَائِمٌ يُصَلِّيْ يَسْأَلُ اللّٰهَ خَيْرًا اِلَّا اَعْطَاهُ اِيَّاهُ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ جمعہ کے دن ایک ایسی ساعت آتی ہے کہ جسے اگر کوئی بندہ مؤمن پائے اور اس میں اللہ تعالیٰ سے بھلائی کا سوال کرے تو خدا اس کو وہ بھلائی عطا کر دیتا ہے۔ (یعنی اس ساعت میں مانگی جانے والی دعا ضرور مقبول ہوتی ہے) بخاریؒ و مسلمؒ ایک روایت میں مسلمؒ نے یہ الفاظ مزید نقل کئے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا وہ ساعت بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اور بخاری و مسلمؒ کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا بلاشک وشبہ جمعہ کے روز ایک ایسی ساعت آتی ہے کہ جسے اگر کوئی بندۂ مؤمن جو نماز کے لئے کھڑا ہو پالے اور خدا سے بھلائی کے لئے دعا کرے تو اس کو خدا وہ بھلائی ضرور عطا فرما دیتا ہے۔"

تشریح: جمعہ کے روز ایک خاص ساعت ہے جس میں بندہ کی جانب سے پروردگار میں پیش کی جانے والی ہر درخواست منظور ہوتی ہے مگر وہ ساعت متعین اور ظاہر نہیں ہے بلکہ اسے پوشیدہ رکھا گیا ہے یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ ساعت کب آتی ہے اور اسے پوشیدہ رکھنے سے حکمت یہ ہے کہ لوگ اس ساعت کی امید میں پورے دن عبادت میں مشغول رہیں اور جب وہ ساعت آئے تو ان کی عبادت ودعا اس خاص ساعت میں واقع ہو۔

علامہ جزریؒ فرماتے ہیں کہ "قبولیت کی جو ساعت منقول ہیں ان سب میں جمعہ کے روز کی ساعت قبولیت میں مطلب برآری اور دعا کے قبول ہونے کی امید بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اعطاہ ایاہ کا مطلب یا تو یہ ہے کہ بندہ اس مقبول ساعت میں دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے بایں طور پر کہ اس کا مقصد دنیا ہی میں پورا کر دیتا ہے یا قبولیت دعا کی یہ صورت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی مصلحت اور بندہ کی بہتری ہی کے لئے دنیا میں تو اس کی دعا کا کوئی اجر ظاہر نہیں فرماتا بلکہ وہ اس کے لئے ذخیرۂ آخرت ہو جاتی ہے کہ وہاں اس کا ثواب اسے دیا جائے گا۔

لفظ قائم یصلی کے معنی یہ ہیں کہ "نماز پابندی اور مداومت کے ساتھ پڑھتا ہو" یا یہ معنی ہیں کہ دعا پر مواظبت ومزاولت کرتا ہو، یا یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ "نماز کا انتظار کرتا ہو"۔ یہ تاویلات اس لئے کی گئی ہیں تاکہ تمام روایات میں مطابقت ہو جائے۔

جمعہ کے دن ساعت قبولیت کب آتی ہے

(۴) وَعَنْ اَبِی بُرْدَةَ بْنِ اَبِی مُوْسٰی قَالَ سَمِعْتُ اَبِی یَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ شَأْنِ سَاعَةِ الْجُمُعَةِ مَابَیْنَ اَنْ یَجْلِسَ الْاِمَامُ اِلٰی اَنْ تُقْضَی الصَّلٰوةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابی بردہ ابن ابی موسیٰ راوی ہیں کہ میں نے اپنے والد مکرم (حضرت ابوموسیٰؓ) سے سنا وہ فرماتے تھے کہ میں نے سرتاج دو عالم ﷺ کو جمعہ (کے دن) کی ساعت قبولیت کے بارے میں فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ ساعت (خطبہ کے لئے) امام کے منبر پر بیٹھنے اور نماز پڑھی جانے تک کا درمیانی عرصہ ہے۔" (مسلم)

تشریح: جمعہ کے روز قبولیت دعا کی ساعت منقول ہے۔ اور اس کی حقیقت میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہے لیکن علماء کے یہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ وہ ساعت کونسی ہے؟ یعنی وہ کونسا وقت ہے جس میں ساعت قبولیت آتی ہے؟ چنانچہ بعض علماء کی تحقیق تو یہ ہے کہ شب قدر کی ساعت قبولیت اور اسم اعظم کی طرح جمعہ کے روز کی ساعت قبولیت بھی مبہم یعنی غیر معلوم ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ وہ ساعت ہر جمعہ کو بدلتی رہتی ہے کسی جمعہ کو تو دن کے ابتدائی حصے میں آتی ہے اور کسی جمعہ کو درمیانی حصے میں اور اسی طرح کسی جمعے کو دن کے آخری حصے میں آتی ہے لیکن اکثر علماء کا کہنا یہ ہے کہ وہ ساعت متعین اور معلوم ہے لیکن اس میں بھی اختلاف ہے کہ اگر وہ ساعت متعین اور معلوم ہے تو کونسی ساعت ہے۔ اور وہ کونسا وقت ہے جس میں یہ عظیم ومقدس ساعت پوشیدہ ہے۔ اس بارے میں پینتیس اقوال منقول ہیں۔

① جمعہ کے روز فجر کی نماز کے لئے مؤذن کے اذان دینے کا وقت۔
② فجر کے طلوع ہونے سے آفتاب کے طلوع ہونے تک کا وقت۔
③ عصر سے آفتاب غروب ہونے تک کا وقت۔
④ خطبہ کے بعد امام کے منبر سے اترنے سے تکبیر تحریمہ کہے جانے تک کا وقت۔
⑤ آفتاب نکلنے کے فوراً بعد کی ساعت۔
⑥ طلوع آفتاب کا وقت۔
⑦ ایک پہر باقی دن کی آخری ساعت۔
⑧ زوال شروع ہونے سے آدھا سایہ ہو جانے تک کا وقت۔
⑨ زوال شروع ہونے سے ایک ہاتھ سایہ آجانے تک کا وقت۔
⑩ ایک بالشت آفتاب ڈھلنے کے بعد سے ایک ہاتھ آفتاب ڈھل جانے تک کا وقت۔
⑪ عین زوال کا وقت۔
⑫ جمعہ کی نماز کے لئے موذن جب اذان کہے وہ وقت۔
⑬ زوال شروع ہونے سے نماز جمعہ میں شامل ہونے تک کا وقت۔
⑭ زوال شروع ہونے سے امام کے نماز جمعہ سے فارغ ہونے تک کا وقت۔
⑮ زوال آفتاب تک کا وقت۔
⑯ خطبہ کے لئے امام کے منبر پر چڑھنے سے نماز جمعہ شروع ہونے تک کا وقت۔
⑰ امام کے نماز جمعہ سے فارغ ہونے تک کا وقت۔
⑱ خطبہ کے لئے امام کے منبر پر چڑھنے اور ادائیگی نماز کے درمیان کا وقت۔
⑲ اذان سے ادائیگی نماز کے درمیان کا وقت۔
⑳ امام کے منبر پر بیٹھنے سے نماز پوری ہو جانے تک کا وقت۔
㉑ خرید و فروخت کے حرام ہونے اور ان کے حلال ہونے کے درمیان کا وقت یعنی اذان کے وقت سے نماز جمعہ ختم ہو جانے تک۔
㉒ اذان کے قریب کا وقت۔
㉓ امام کے خطبہ شروع کرنے اور خطبہ ختم کرنے تک کا وقت۔
㉔ خطبہ کے لئے امام کے منبر پر چڑھنے اور خطبہ شروع کرنے کا درمیانی وقت۔
㉕ دونوں خطبوں کے درمیان امام کے بیٹھنے کا وقت۔
㉖ خطبہ سے فراغت کے بعد امام کے منبر سے اترنے کا وقت۔
㉗ نماز کے لئے تکبیر شروع ہونے سے امام کے مصلیٰ پر کھڑے ہونے تک کا وقت۔
㉘ تکبیر شروع ہونے سے اختتام نماز تک کا وقت۔
㉙ جمعہ کی نماز سے فراغت کے فوراً بعد کا وقت۔
㉚ عصر کی نماز سے غروب آفتاب تک کا وقت۔
㉛ نماز عصر کے درمیان کا وقت۔

(۳۲) عصر کی نماز سے (غروب آفتاب سے پہلے) نماز کا آخری وقت مستحب رہنے تک کا وقت۔
(۳۳) مطلقاً نماز عصر کے بعد کا وقت۔
(۳۴) نماز عصر کے بعد کی آخری ساعت۔
(۳۵) اور وہ وقت جب کہ آفتاب ڈوبنے لگے۔

منقول ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت فاطمہ زہرا اور تمام اہل بیت نبوت رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے خادموں کو متعین کرتے تھے کہ وہ ہر جمعہ کے روز آخری گھڑی کا خیال رکھیں اور اس وقت سب کو یاد دلائیں تاکہ وہ سب اس گھڑی میں پروردگار کی عبادت، اس کے فکر اور اس سے دعا مانگنے میں مشغول ہو جائیں۔

یہاں جو حدیث نقل کی گئی ہے اس کے متعلق بلقینیؒ سے پوچھا گیا کہ خطبہ کے وقت دعا کیونکر مانگی جائے کیونکہ یہ حکم ہے کہ جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو اس وقت خاموشی اختیار کی جائے۔

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "دعا کے لئے تلفظ شرط نہیں ہے بلکہ اپنے مقصود و مطلوب کا دل میں دھیان رکھنا کافی ہے یعنی دعا کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ دعا کے الفاظ زبان سے ادا کئے جائیں بلکہ یہ بھی کافی ہے کہ دل ہی دل میں دعا مانگ لی جائے اس طرح مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور خطبہ کے وقت خاموش رہنے کے شرعی حکم کے خلاف بھی نہیں ہوگا۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "یہ بات مجھے معلوم ہوئی ہے کہ جمعہ کی شب میں بھی مانگی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جمعہ کی فضیلت اور ساعت قبولیت

(۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ خَرَجْتُ اِلَى الطُّوْرِ فَلَقِیْتُ كَعْبَ الْاَحْبَارِ فَجَلَسْتُ مَعَهٗ فَحَدَّثَنِیْ عَنِ التَّوْرَاةِ وَحَدَّثْتُهٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ فِیْمَا حَدَّثْتُهٗ اَنْ قُلْتُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْرُ یَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَةِ فِیْهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِیْهِ اُهْبِطَ وَفِیْهِ تِیْبَ عَلَیْهِ وَفِیْهِ مَاتَ وَفِیْهِ تَقُوْمُ السَّاعَةُ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا وَهِیَ مُصِیْخَةٌ یَوْمَ الْجُمُعَةِ مِنْ حِیْنَ تُصْبِحُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ شَفَقًا مِنَ السَّاعَةِ اِلَّا الْجِنَّ وَالْاِنْسَ وَفِیْهِ سَاعَةٌ لَا یُصَادِفُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ وَهُوَ یُصَلِّیْ یَسْأَلُ اللّٰهَ شَیْئًا اِلَّا اَعْطَاهُ اِیَّاهُ قَالَ كَعْبٌ ذَالِكَ فِیْ كُلِّ سَنَةٍ یَوْمٌ فَقُلْتُ بَلْ فِیْ كُلِّ جُمُعَةٍ فَقَرَأَ كَعْبُ التَّوْرَاةَ فَقَالَ صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ لَقِیْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ سَلَامٍ فَحَدَّثْتُهٗ بِمَجْلِسِیْ مَعَ كَعْبِ الْاَحْبَارِ وَمَا حَدَّثْتُهٗ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ فَقُلْتُ لَهٗ قَالَ كَعْبٌ ذَالِكَ فِیْ كُلِّ سَنَةٍ یَوْمٌ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ كَذَبَ كَعْبٌ فَقُلْتُ لَهٗ ثُمَّ قَرَأَ كَعْبُ التَّوْرَاةَ فَقَالَ بَلْ هِیَ فِیْ كُلِّ جُمُعَةٍ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ صَدَقَ كَعْبٌ ثُمَّ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ قَدْ عَلِمْتُ اَیَّةَ سَاعَةٍ هِیَ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ فَقُلْتُ اَخْبِرْنِیْ بِهَا وَلَا تَضِنَّ عَلَیَّ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ هِیَ اٰخِرُ سَاعَةٍ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ فَقُلْتُ وَكَیْفَ تَكُوْنُ اٰخِرُ سَاعَةٍ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یُصَادِفُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ وَهُوَ یُصَلِّیْ فِیْهَا فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ اَلَمْ یَقُلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا یَنْتَظِرُ الصَّلٰوةَ فَهُوَ فِیْ صَلَاةٍ حَتّٰى یُصَلِّیَ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ فَقُلْتُ بَلٰى قَالَ فَهُوَ ذَالِكَ۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَرَوٰى اَحْمَدُ اِلٰى قَوْلِهٖ صَدَقَ كَعْبٌ)

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) میں کوہ طور کی طرف گیا، اور وہاں کعب احبار سے ملاقات کی میں ان کے پاس بیٹھ گیا انہوں نے

میرے سامنے تورات کی کچھ باتیں کیں اور میں نے ان کے سامنے سرتاج دو عالم ﷺ کی حدیثیں بیان کیں میں نے ان کے سامنے جو احادیث بیان کیں ان میں سے ایک حدیث یہ بھی تھی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان دنوں میں جن میں آفتاب طلوع ہوتا ہے سب سے بہتر دن جمعہ کا ہے، جمعہ کے دن حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے، اسی روز وہ جنت سے (زمین پر) اتارے گئے، اسی دن (یعنی جس جمعہ کو جنت سے اتارے گئے) اسی جمعہ کو آخری گھڑی میں یا یہ کہ دوسرے جمعہ کے دن ان کی توبہ قبول کی گئی، اسی دن ان کی وفات ہوئی اور جمعہ ہی کے دن قیامت قائم ہوگی اور ایسا کوئی چوپایہ نہیں ہے جو جمعہ کے دن طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک قیامت قائم ہونے کا منتظر نہ رہتا ہو (یعنی چوپاؤں کو بھی یہ معلوم ہے کہ قیامت جمعہ کے روز آئے گی) اس لئے وہ ہر جمعہ کو دن بھر اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں آج ہی قیامت قائم نہ ہو جائے، علاوہ جنات اور انسانوں کے (یعنی جن وانس کو اس انتظار سے غافل رکھا گیا ہے تاکہ اس ہولناکی سے انسانی زندگی کا شیرازہ منتشر نہ ہو جائے) اور جمعہ کے دن ایک ایسی ساعت آتی ہے کہ جسے کوئی بندہ مسلمان کہ وہ (حکمًا یا حقیقتاً) نماز پڑھتا ہوا ہو۔ (یعنی نماز کا انتظار کرتا ہوا ہو یا دعا مانگتا ہوا ہو) اسے پالے اور اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرے تو اسے وہ چیز ضرور دی جاتی ہے (یعنی وہ اس وقت جو دعا مانگتا ہے قبول ہوتی ہے) کعب احبار نے (یہ سن کر) کہا کہ یہ دن (جو ساعت قبولیت کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے) سال میں ایک مرتبہ آتا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں! یہ دن تو ہر ہفتہ میں ایک مرتبہ آتا ہے۔ کعب نے (اسی بات کی تصدیق کے لئے) تورات پڑھی اور (اس کے بعد) کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے سچ کہا ہے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ (اس کے بعد پھر) میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے ملا اور ان سے کعب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا اور جمعہ کے بارے میں کعب سے میں نے جو حدیث بیان کی تھی وہ بھی بتائی پھر میں نے عبداللہ ابن سلام سے یہ بھی کہا کہ کعب کہتے تھے کہ یہ دن سال میں ایک مرتبہ آتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن سلامؓ نے فرمایا کہ کعب نے غلط کہا۔ پھر میں نے کہا کہ لیکن کعب نے بعد میں تورات پڑھی اور کہا کہ (رسول اللہ ﷺ کا کہنا ٹھیک ہی ہے کہ) یہ ساعت ہر جمعہ کے روز آتی ہے۔ عبداللہ ابن سلامؓ نے فرمایا کہ کعب نے یہ سچ کہا۔ اور پھر کہنے لگے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کونسی ساعت ہے؟ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ پھر مجھ کو بتلایئے اور بخل سے کام نہ لیجئے۔ حضرت عبداللہ ابن سلامؓ نے فرمایا کہ وہ جمعہ کے دن کی آخری گھڑی ہے۔ میں نے کہا کہ وہ ساعت جمعہ کے دن کی آخری گھڑی کیونکر ہو سکتی ہے جب کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ جو بندۂ مؤمن اس ساعت کو پائے اور وہ اس میں نماز پڑھتا ہوا ہو؟ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ ساعت جمعہ کے دن کی آخری گھڑی ہے اس وقت تو نماز نہیں پڑھی جاتی کیونکہ مکروہ ہے؟ حضرت عبداللہ ابن سلامؓ نے فرمایا (یہ تو صحیح ہے لیکن) کیا یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں ہے؟ کہ جو شخص نماز کی انتظار میں اپنی جگہ بیٹھا رہے تو وہ حکمًا) نماز ہی کے حکم میں ہے یہاں تک کہ وہ حقیقتاً نماز پڑھے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے (یہ سن کر) کہا کہ ہاں! آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن سلامؓ نے فرمایا۔ بس نماز سے مراد نماز کا انتظار کرنا ہے۔ (اور دن کے آخری حصہ میں نماز کے انتظار میں بیٹھنا ممنوع نہیں ہے اس وقت اگر کوئی دعا مانگے تو وہ قبول ہوگی) مالکؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور امام احمدؒ نے بھی یہ روایت صدق کعب تک نقل کی ہے۔"

تشریح: حدیث کے الفاظ حین تصبح حتی تطلع الشمس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت چونکہ جمعہ کے روز طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کے درمیانی عرصہ میں ہی قائم ہوگی اس لئے چوپائے ہر جمعہ کے روز اس عرصہ میں قیامت کے قائم ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ لہٰذا اس پورے وقت میں جب حیوان قیامت کا خیال رکھتے ہیں اور اس سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ تو انسانوں کو بطریق اولیٰ یہ چاہئے کہ وہ جمعہ کے روز دن بھر خدا کی عبادت اور اس کے ذکر میں مشغول رہیں اور اس چیز سے جو پیش آنے والی ہے (یعنی قیامت سے) ڈرتے رہیں۔

یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی ایک اعجازی شان کی غمازی کر رہی ہے کہ آپ ﷺ نے امی ہونے کے باوجود اس عظیم الشان چیز کی خبر دی جو یہود میں توراۃ کے ایک بڑے عالم سے بھی پوشیدہ تھی حالانکہ توراۃ میں اس کا ذکر موجود تھا۔ گویا توراۃ کا عالم توراۃ میں ذکر کی گئی چیز

سے بے خبر اور آپ ﷺ جو امی تھے اس سے پوری طرح باخبر درحقیقت یہ بڑا زبردست معجزہ ہے کہ آنحضرت ﷺ بظاہر تو امی تھے مگر خدا نے آپ ﷺ کے سینہ میں علوم و معرفت کا بحر بیکراں موجزن کر رکھا تھا۔

کعب احبار یہودیوں میں ایک بڑے پایہ کے عالم اور بہت دانشمند مانے جاتے تھے انہوں نے آنحضرت ﷺ کا زمانہ تو پایا ہے لیکن آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تھے بعد میں حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانہ میں اسلام کی نعمت سے مشرف ہوئے۔ حضرت عبداللہ ابن سلامؓ بھی یہودیوں کے ایک بڑے عالم تھے یہ آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ ہی میں اسلام لاکر صحابیت کے شرف عظیم سے مشرف ہوگئے تھے رضی اللہ عنہ۔

(۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلْتَمِسُوا السَّاعَةَ الَّتِىْ تُرْجٰى فِىْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ اِلٰى غَيْبُوْبَةِ الشَّمْسِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا، جمعہ کے دن کی اس ساعت کو کہ جس میں قبولیت دعا کی امید ہے کہ عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک تلاش کرو۔" (ترمذیؒ)

فضائل جمعہ

(۷) وَعَنْ اَوْسِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَفْضَلِ اَيَّامِكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خُلِقَ اٰدَمُ وَفِيْهِ قُبِضَ وَفِيْهِ النَّفْخَةُ وَفِيْهِ الصَّعْقَةُ فَاَكْثِرُوْا عَلَيَّ مِنَ الصَّلَاةِ فِيْهِ فَاِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوْضَةٌ عَلَيَّ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ تُعْرَضُ صَلَاتُنَا عَلَيْكَ وَقَدْ اَرِمْتَ قَالَ يَقُوْلُوْنَ بَلِيْتَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْاَرْضِ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی وابن ماجۃ والدارمی والبیہقی فی الدعوات الکبیر)

"حضرت اوس بن اوسؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ جمعہ کا دن تمہارے لئے بہترین دنوں میں سے ہے۔ (کیونکہ) اس دن آدم علیہ السلام کی تخلیق کی گئی اسی دن ان کی روح قبض کی گئی، اسی دن (دوسرا) صور پھونکا جائے گا۔ (جس کی آواز سے مردے زندہ ہو کر میدان حشر میں جمع ہوں گے)۔ اسی دن (پہلا) صور پھونکا جائے گا (جس کی آواز سے قیامت قائم ہوگی اور تمام مخلوق فنا کے گھاٹ اتر جائے گی) لہٰذا اس دن تم لوگ مجھ پر زیادہ درود بھیجو کیونکہ تمہارے درود میرے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے درود آپ (ﷺ) کے سامنے کس طرح پیش کئے جائیں گے۔ جب کہ (ہمارے درود بھیجنے کے وقت) آپ کی ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی؟ راوی کہتے ہیں کہ لفظ ارمت سے صحابہؓ کی مراد لفظ بلیت تھی یعنی آپ ﷺ کا جسد مبارک بوسیدہ ہو چکا ہوگا۔ (آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین کے لئے انبیاء کے جسم حرام کر دیئے ہیں۔ (یعنی انبیاء کے جسم زمین فنا نہیں کرتی۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: ارشاد گرامی ان من افضل ایامکم یوم الجمعۃ اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یا تو عرفہ کا دن سب دنوں میں افضل ہے یا پھر عرفہ اور جمعہ دونوں دن فضیلت کے اعتبار سے مساوی ہیں۔

جمعہ کے دن بہت زیادہ درود بھیجنے کے لئے آپ ﷺ نے اس لئے حکم دیا ہے کہ درود افضل عبادات سے ہے اور چونکہ جمعہ کے دن ہر نیکی کا ثواب ستر درجہ زیادہ ملتا ہے اس لئے جمعہ کے دن درود پڑھنا اولیٰ ہوگا۔ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں آنحضرت ﷺ پر درود بھیجنے کے وقت بہت زیادہ فضائل دوسری احادیث سے بھی ثابت ہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے یہ حق تعالیٰ کی جانب سے ایک عظیم الشان نعمت ہے لہٰذا جمعہ کے دن اور جمعہ کی شب میں آنحضرت ﷺ پر بہت زیادہ درود بھیجا جائے اور اس سے غافل نہ رہا جائے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح زمین دوسرے مردوں کے ساتھ معاملہ کرتی ہے کہ چند ہی دنوں کے بعد ان کے اجسام زمین کی نذر ہو جاتے ہیں اور گل سڑ جاتے ہیں ایسا معاملہ انبیاء کے مبارک اجسام کے ساتھ نہیں ہوتا نہ تو ان کے اجسام فنا ہوتے ہیں نہ گلتے سڑتے ہیں۔ بلکہ وہ جوں کے توں قبروں میں دنیا کی طرح زندہ رہتے ہیں اور حق تعالیٰ کی جانب سے انہیں وہاں حیات جسمانی حقیقی عنایت فرمائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ بالکل صاف اور واضح ہے اور اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ انبیاء اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور انہیں بالکل دنیا کی طرح حقیقی جسمانی حیات حاصل ہے نہ کہ انہیں حیات معنوی روحانی حاصل ہے جیسا کہ شہداء کو حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ شہداء کے علاوہ دوسرے مردے بھی اپنی قبروں میں سلام کلام سنتے ہیں اور بعض ایام میں ان کے اقرباء کے اعمال بھی ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْیَوْمُ الْمَوْعُوْدُ یَوْمُ الْقِیَامَةِ وَالْیَوْمُ الْمَشْهُوْدُ یَوْمُ عَرَفَةَ وَالشَّاهِدُ یَوْمُ الْجُمُعَةِ وَمَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرَبَتْ عَلٰی یَوْمٍ اَفْضَلَ مِنْهُ فِیْهِ سَاعَةٌ لَا یُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُؤْمِنٌ یَدْعُوا اللّٰهَ بِخَیْرٍ اِلَّا اسْتَجَابَ اللّٰهُ لَهٗ وَلَا یَسْتَعِیْذُ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا اَعَاذَهٗ مِنْهُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ لَا یُعْرَفُ اِلَّا مِنْ حَدِیْثِ مُوْسٰی ابْنِ عُبَیْدَةَ وَهُوَ یُضَعَّفُ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا دن موعود قیامت کا دن ہے مشہود عرفہ کا دن ہے اور شاہد جمعہ کا دن ہے۔ آفتاب کسی ایسے دن طلوع و غروب نہیں ہوتا جو جمعہ کے دن سے افضل ہو (یعنی جمعہ کا دن سب سے افضل ہے) اس دن ایک ایسی ساعت آتی ہے جسے اگر کوئی بندۂ مؤمن پالے اور اس میں اللہ تعالیٰ سے بھلائی مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور بھلائی دیتا ہے یا جس چیز سے پناہ مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور پناہ دیتا ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ ایک شخص موسیٰ بن عبیدہ کے اور کسی سے (اس کا نقل ہونا) معلوم نہیں ہوتا اور یہ (موسیٰ محدثین کے یہاں روایت حدیث میں) ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: سورۂ بروج کی آیت ہے:

وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ۔

"اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ ہے اور حاضر ہونے والے کی اور جو اس کے پاس حاضر کیا جائے اس کی۔"

اس آیت کی تفسیر یہ حدیث یہاں کر رہی ہے کہ "یوم موعود" سے مراد قیامت کا دن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے آنے کی خبر دی ہے اور مؤمنوں سے اس دن کے آنے کے بعد بہشت کی نعمتوں کا وعدہ کیا ہے۔

"شاہد" سے مراد جمعہ کا دن ہے کہ جو مخلوق کے پاس حاضر ہوتا ہے اور ہر ہفتہ آتا رہتا ہے۔

"مشہود" سے مراد عرفہ کا دن ہے کہ تمام عالم سے مسلمان اور ملائکۃ اللہ اس دن حاضر ہوتے ہیں اور ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اگرچہ امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے راوی موسیٰ کو روایت حدیث کے سلسلے میں ضعیف کہا جاتا ہے لیکن یہ حدیث اپنی جگہ پر اس لئے قابل اسناد و قابل قبول ہے کہ اس متون کی دوسری حدیثیں جو دوسرے راویوں سے مروی ہیں اس حدیث کو تقویت دیتی ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جمعہ کی فضیلت

(۹) عَنْ اَبِیْ لُبَابَةَ بْنِ عَبْدِ الْمُنْذِرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ یَوْمَ الْجُمُعَةِ سَیِّدُ الْاَیَّامِ وَاَعْظَمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَهُوَ اَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ یَوْمِ الْاَضْحٰی وَیَوْمِ الْفِطْرِ فِیْهِ خَمْسُ خِلَالٍ خَلَقَ اللّٰهُ فِیْهِ اٰدَمَ وَاَهْبَطَ اللّٰهُ فِیْهِ اٰدَمَ

اِلَى الْاَرْضِ وَفِيْهِ تَوَفَّى اللّٰهُ اٰدَمَ وَفِيْهِ سَاعَةٌ لَا يَسْئَالُ الْعَبْدُ فِيْهَا شَيْئًا اِلَّا اَعْطَاهُ مَالَمْ يَسْئَلْ حَرَامًا وَفِيْهِ تَقُوْمُ السَّاعَةُ مَامِنْ مَلَكٍ مُقَرَّبٍ وَلَا سَمَاءٍ وَلَا اَرْضٍ وَلَا رِيَاحٍ وَلَا جِبَالٍ وَلَا بَحْرٍ اِلَّا هُوَ مُشْفِقٌ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَى اَحْمَدُ عَنْ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَخْبِرْنَا عَنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ مَاذَا فِيْهِ مِنَ الْخَيْرِ قَالَ فِيْهِ خَمْسُ خِلَالٍ وَسَاقَ اِلَى آخِرِ الْحَدِيْثِ۔

"حضرت ابولبابہ ابن عبد المنذرؓ راوی ہیں سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "جمعہ کا دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام دنوں کا سردار ہے اور تمام دنوں کا سردار ہے اور تمام دنوں میں سب سے زیادہ باعظمت ہے اور خدا کے نزدیک جمعہ کے دن کی عظمت عید اور بقرعید کے دن سے بھی زیادہ ہے اور اس دن کی پانچ باتیں ہیں۔ (جو اس کی عظمت وفضیلت کی دلیل ہیں) ① اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی ② اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا ③ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو وفات دی ④ اسی دن ایک ساعت آتی ہے کہ اس میں بندہ اللہ تعالیٰ سے حرام چیز کے سوا جو کچھ بھی مانگتا ہے اللہ تعالیٰ ضرور عنایت فرماتا ہے یعنی حرام چیز مانگنا مقبول نہیں ہے ⑤ اور اسی دن قیامت قائم ہوگی۔ تمام مقرب فرشتے آسمان، زمین، ہوا، پہاڑ اور دریا سب جمعہ کے دن سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ قیامت جمعہ کے دن آنی ہے نہ معلوم کس وقت آجائے (ابن ماجہؒ) اور امام احمدؒ نے حضرت سعدؓ ابن معاذ سے اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک انصاری صحابیؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے جمعہ کے بارے میں بتائیے کہ اس دن کی کیا خوبیاں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس دن کی پانچ باتیں ہیں باقی حدیث آخر تک اسی طرح نقل کی ہے (جو اوپر ذکر کی گئی ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ وھو اعظم عند اللہ من یوم الاضحی ویوم الفطر سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو عرفہ کا دن جمعہ سے افضل ہے یا فضیلت کے اعتبار سے یہ دونوں دن مساوی ہیں لیکن حضرت رزینؒ کی نقل کردہ روایت میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ تمام دنوں میں سب سے افضل دن عرفہ کا دن ہے۔

وفیہ خمس (اور اس دن کی پانچ باتیں ہیں) جمعہ کے فضائل کے بیان میں تحدید اور حصر کے لئے نہیں فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ جمعہ کے دن کی صرف یہی پانچ باتیں فضیلت کی ہیں بلکہ اس دن کی اور بھی ایسی باتیں ہیں جو فضیلت وعظمت کے اعتبار سے جمعہ کو تمام دنوں میں امتیاز بخشتی ہیں مثلاً منقول ہے کہ جنت میں اللہ تعالیٰ کی زیارت کا شرف بھی جمعہ کے دن حاصل ہوا کرے گا یا اسی طرح اور دوسری باتیں منقول ہیں۔

جمعہ کی وجہ تسمیہ

⑮ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قِيْلَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَيِّ شَيْءٍ سُمِّيَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ قَالَ لِاَنَّ فِيْهَا طُبِعَتْ طِيْنَةُ اَبِيْكَ اٰدَمَ وَفِيْهَا الصَّعْقَةُ وَالْبَعْثَةُ وَفِيْهَا الْبَطْشَةُ وَفِىْ اٰخِرِ ثَلَاثِ سَاعَاتٍ مِنْهَا سَاعَةٌ مَنْ دَعَا اللّٰهَ فِيْهَا اسْتُجِيْبُ لَهٗ۔

(رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ سے پوچھا گیا کہ جمعہ کا نام جمعہ کس سبب سے رکھا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس وجہ سے کہ اس دن تمہارے باپ آدم علیہ السلام کی مٹی جمع کی گئی اور اس کا خمیر بنایا گیا۔ اس دن (پہلا) صور پھونکا جائے گا (کہ اس کی آواز سے تمام دنیا والے مرجائیں گے) اور (دوسرا) صور پھونکا جائے گا (کہ اس کی آواز سے تمام مردے دوبارہ زندہ ہوجائیں گے) اور اس دن (قیامت کی) سخت داروگیر ہوگی نیز اس دن کے آخر کی تین ساعتوں میں ایک ایسی ساعت ہے (یعنی جمعہ کی آخری ساعت) کہ اس وقت جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے اس کی دعا قبول ہوگی۔" (احمدؒ)

تشریح: علامہ یحییٰ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اس دن کا نام جمعہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ مذکورہ بالا ایسی عظیم الشان چیزیں اس دن میں جمع کر دی گئی ہیں۔

لیکن یہ بات بھی مخفی نہ رہے کہ قطع نظر اس بات کے کہ یہ تمام باتیں بہ ہیئت مجموعی "جمعہ" کی وجہ تسمیہ کو ظاہر کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک خود بھی اپنی اپنی جگہ جمعیت اور اجتماعیت کے مفہوم پر حاوی ہیں۔

جمعہ کے دن آنحضرت ﷺ پر کثرت سے درود بھیجنا چاہئے

(۱۱) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکْثِرُوا الصَّلَاۃَ عَلَیَّ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فَاِنَّہٗ مَشْھُوْدٌ یَشْھَدُہُ الْمَلَائِکَۃُ وَاِنَّ اَحَدًا لَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ اِلَّا عُرِضَتْ عَلَیَّ صَلَاتُہٗ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْھَا قَالَ قُلْتُ وَبَعْدَ الْمَوْتِ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ فَنَبِیُّ اللّٰہِ حَیٌّ یُرْزَقُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابودرداءؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجو کیونکہ جمعہ کا دن مشہود (یعنی حاضر کیا گیا) ہے اس دن ملائکہ حاضر ہوتے ہیں اور جو شخص بھی مجھ پر درود بھیجتا ہے اس کا درود میرے سامنے (بذریعہ مکاشفہ یا بذریعہ ملائکہ) پیش کیا جاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہوتا ہے۔ ابودرداء کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر) عرض کیا کہ مرنے کے بعد بھی درود آپ ﷺ کے سامنے پیش کئے جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ زمین پر انبیاء کے اجسام کا کھانا حرام کیا ہے چنانچہ خدا کے نبی (اپنی اپنی قبر میں بالکل دنیا کی حقیقی زندگی کی طرح) زندہ ہیں اور رزق دیئے جاتے ہیں۔" (ابن ماجہ)

تشریح: یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی تائید کرتی ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ (آیت کریمہ وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ وَشَاھِدٍ وَّمَشْھُوْدٍ میں) مَشْھُوْدٍ سے مراد جمعہ کا دن ہے جب کہ پہلے گزرنے والی حدیث نمبر ۸ حضرت علیؓ کی تفسیر کی موید ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ اگرچہ یہاں بھی "مشہود" سے یوم جمعہ مراد لینا بایں اعتبار کہ اسی دن ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی تفسیر کے منافی نہیں ہے تاہم یہ احتمال بھی قوی تر ہے کہ حدیث کے الفاظ میں "فَاِنَّہٗ" کی ضمیر جمعہ کی طرف نہیں بلکہ کثرت درود کی طرف راجع ہے جو کہ لفظ "اکثروا" سے مفہوم ہوتا ہے اس طرح حدیث کے معنی یہ ہوں گے جمعہ کے روز مجھ پر کثرت سے درود بھیجو کیونکہ کثرت درود مشہودہ (یعنی فرشتوں کے حاضر ہونے کا سبب) ہے۔

عُرِضَتْ صَلٰوتُہٗ کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو ہمیشہ ہی جب مجھ پر کوئی شخص درود بھیجتا ہے۔ تو اس کا درود میرے سامنے پیش کیا جاتا ہے مگر جمعہ کا دن چونکہ سب سے افضل دن ہے اس لئے جمعہ کے دن بھیجا جانے والا درود بطریق اولیٰ میرے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگرچہ درود بھیجنے کی مدت کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو چنانچہ حَتّٰی یَفْرُغَ فرما کر اس طرف فرمادیا گیا ہے کہ جب تک درود پڑھنے والا خود ہی فارغ نہ ہو جائے یا درود پڑھنا ترک نہ کر دے اس وقت تک پوری مدت کے درود برابر میرے سامنے پیش کئے جاتے رہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد سن کر حضرت ابودرداء یہ سمجھے کہ شاید یہ حکم ظاہری حالت یعنی آپ ﷺ کی دنیاوی زندگی ہی سے متعلق ہے چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ سے اس بارے میں جب سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ زمین پر انبیاء کے اجسام کھانا حرام ہے یعنی جس طرح دوسرے مردوں کے جسم قبر میں فنا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح انبیاء کے جسم قبر میں فنا نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی اصلی حالت میں موجود رہتے ہیں اس لئے انبیاء کے لئے فنا حالت یعنی دنیا کی ظاہری زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح وہ یہاں ہیں اسی طرح وہاں ہیں اسی لئے کہا گیا ہے۔

اَوْلِیَآءُ اللّٰہِ لَا یَمُوْتُوْنَ وَلٰکِنْ یَنْتَقِلُوْنَ مِنْ دَارٍ اِلٰی دَارٍ۔

"اللہ کے دوست اور حقیقی بندے مرتے نہیں وہ تو صرف ایک مکان سے دوسرے مکان کو منتقل ہو جاتے ہیں۔"

لہٰذا جس طرح یہاں دنیا کی زندگی میں میرے سامنے درود پیش کئے جاتے ہیں اسی طرح میری قبر میں بھی میرے سامنے درود پیش کئے جاتے رہیں گے۔

حدیث کے آخری الفاظ حَتّٰی یرزق کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کو اپنی اپنی قبروں میں حق تعالیٰ کی طرف سے معنوی رزق دیا جاتا ہے اور "رزق" سے رزق حسی مراد لیا جائے تو یہ حقیقت کے منافی نہیں ہوگا بلکہ صحیح ہی ہوگا۔ کیونکہ جب شہداء کی ارواح کے بارے میں منقول ہے کہ وہ جنت کے میوے کھاتی ہیں تو انبیاء شہداء سے بھی اشرف و اعلیٰ ہیں اس لئے ان کے لئے بھی یہ بات بطریق اولیٰ ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی قبروں میں رزق حسی دیئے جاتے ہوں۔

جمعہ کو مرنے والے مؤمن کے لئے بشارت

⑫ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اِلَّا وَقَاهُ اللّٰهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِمُتَّصِلٍ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ ایسا کوئی مسلمان نہیں ہے جو جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں انتقال کرے اور اللہ تعالیٰ اسے فتنہ (یعنی قبر کے سوال اور قبر کے عذاب) سے نہ بچائے۔ (احمدؒ، ترمذیؒ) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اس کی اسناد متصل نہیں ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی خوش قسمت مسلمان کا جمعہ کے روز یا جمعہ کی شب میں انتقال کرنا درحقیقت اس کی سعادت اور آخرت کی بھلائی کی دلیل ہے کیونکہ جمعہ کی مقدس ساعتوں میں انتقال کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ کی بے پناہ رحمتوں اور اس کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے چنانچہ جمعہ کو انتقال کرنے والے مسلمانوں کے حق میں بہت زیادہ بشارتیں منقول ہیں۔

مثلاً ایک روایت میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ جو مسلمان جمعہ کے دن مرتا ہے وہ عذاب قبر سے نجات دیا جاتا ہے اور وہ قیامت کے دن اس حال میں (میدان حشر میں) آئے گا کہ اس کے اوپر شہیدوں کی مہر ہوگی۔

یا ایک دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص جمعہ کے دن مرتا ہے اس کے لئے شہید کا اجر و ثواب لکھا جاتا ہے اور وہ قبر کے فتنہ سے بچایا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "جس مسلمان مرد یا عورت کا انتقال جمعہ کے روز یا جمعہ کی شب میں ہوتا ہے اور اسے فتنہ قبر اور عذاب قبر سے بچایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی ملاقات اس حال میں ہوگی کہ قیامت کے دن میں اس سے کوئی محاسبہ نہیں ہوگا کیونکہ اس کے ساتھ گواہ ہوں گے جو اس کی (سعادت و بھلائی) کی گواہی دیں گے یا اس پر شہداء کی مہر ہوگی۔

جمعہ مسلمانوں کے لئے عید کا دن ہے

⑬ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ قَرَأَ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الْآيَةَ وَعِنْدَهٗ يَهُوْدِيٌّ قَالَ لَوْ نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ عَلَيْنَا لَاتَّخَذْنَاهَا عِيْدًا فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَاِنَّهَا نَزَلَتْ فِيْ يَوْمِ عِيْدَيْنِ فِيْ يَوْمِ جُمُعَةٍ وَيَوْمِ عَرَفَةَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے (ایک دن) یہ آیت پڑھی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الاية جس کا مضمون یہ ہے کہ آج کے دن ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا تمہارے اوپر اپنی تمام نعمتیں پوری کر دیں اور ہم نے تمہارے لئے

از روئے دین اسلام کو پسند کیا ہے) ان کے پاس (اس وقت) ایک یہودی (بیٹھا ہوا) تھا اس نے (ابن عباسؓ سے یہ آیت سن کر) کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس کو (یعنی اس دن کو جس میں یہ آیت نازل ہوئی تھی) عید قرار دیتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ آیت دو عیدوں کے دن یعنی حجۃ الوداع کے موقع پر، جمعہ اور عرفہ کے دن نازل ہوئی ہے امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: یہودی کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ آیت ہم پر اترتی تو اتنی عظیم الشان نعمت کی خوشی اور اس کے شکرانے کے طور پر ہم اس کو بڑی عید کا دن مناتے۔ مگر تعجب ہے کہ مسلمانوں نے اس دن کو یادگار اور عید کا دن قرار نہیں دیا؟ اس کے جواب میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس آیت کو ایک ایسے دن نازل فرمایا جو ایک نہیں دو عیدوں پر حاوی تھا تو پھر ہمیں اس دن کو یادگار دن قرار دینے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے جو آخری حج ادا فرمایا تھا وہ جمعہ کے دن تھا۔ گویا ایک تو جمعہ ہونے کی وجہ سے خود وہ دن افضل و اشرف تھا دوسرے دن عرفہ (یعنی حج) ہونے کے سبب سے اس کی فضیلت و عظمت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا اور اسی دن یہ آیت نازل ہوئی اور ظاہر ہے کہ اپنی عظمت و فضیلت کے اعتبار سے مسلمانوں کے لئے اس سے بڑا عید کا دن اور کون سا ہو سکتا ہے۔

جمعہ کی رات روشن رات اور جمعہ کا دن چمکتا دن ہے

⑭ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ رَجَبُ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ قَالَ وَكَانَ يَقُوْلُ لَيْلَةُ الْجُمُعَةِ لَيْلَةٌ اَغَرُّ وَيَوْمُ الْجُمُعَةِ يَوْمٌ اَزْهَرُ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب رجب کا مہینہ آتا تو سرتاج دو عالم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ! رجب اور شعبان کے مہینے (کی ہماری اطاعت و عبادات) میں ہمیں برکت دے اور ہمیں رمضان تک پہنچا نیز حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جمعہ کی رات روشن رات ہے اور جمعہ کا دن چمکتا دن ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "اور ہمیں رمضان تک پہنچا" کا مطلب یہ ہے کہ "اے خدایا! ہمیں یہ سعادت بخش کہ پورا رمضان پائیں اور رمضان کے تمام دنوں میں ہمیں روزے رکھنے اور نماز تراویح پڑھنے کی توفیق ہو"۔

جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات کی نورانیت معنوی یا تو بالذات ہوتی ہے یا پھر یہ کہ جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں جو عبادت کی جاتی ہے اس کی برکت اور اس کے سبب سے معنوی نورانیت پیدا ہوتی ہے۔

بَابُ وُجُوْبِهَا

جمعہ کے واجب ہونے کا بیان

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جمعہ کی نماز فرض عین ہے چنانچہ یہاں "وجوب" سے مراد فرض ہے۔

علامہ یحییٰؒ فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ فریضہ محکمہ ہے جو قرآن کریم، احادیث رسول اور اجماع اُمّت سے ثابت ہے۔ نماز جمعہ کی فرضیت کا انکار کرنے والا کافر ہو جاتا ہے قرآن کریم کی جس آیت سے جمعہ کی فرضیت ثابت ہے اس کے الفاظ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ میں ذکر سے مراد جمعہ کی نماز اور اس کا خطبہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز جمعہ ترک کرنے کی وعید

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّهُمَا قَالَا سَمِعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ عَلٰى اَعْوَادِ مِنْبَرِهٖ لَيَنْتَهِيَنَّ اَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمُ الْجُمُعَاتِ اَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ثُمَّ لَيَكُوْنُنَّ مِنَ الْغَافِلِيْنَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابن عمر اور حضرت ابوہریرہؓ دونوں راوی ہیں کہ ہم نے سرتاج دوعالم ﷺ کو اپنے منبر کی لکڑی (یعنی اس کی سیڑھیوں پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ نماز جمعہ کو چھوڑنے سے باز رہیں ورنہ تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگادے گا اور وہ غافلوں میں شمار ہونے لگیں گے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں میں سے ایک چیز مقرر ہے یا تو نماز جمعہ کو نہ چھوڑنا، یا دلوں پر مہر لگ جانا، اگر لوگ نماز جمعہ نہیں چھوڑیں گے تو ان کے دلوں پر مہر نہ لگے گی اور اگر چھوڑدیں گے تو ان کے دلوں پر مہر لگادی جائے گی۔

"دلوں پر مہر لگانا" اس بات سے کنایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے بدبخت لوگوں کے دلوں کو انتہائی غفلت میں مبتلا کردے گا اور انہیں نصیحت و بھلائی قبول کرنے سے باز رکھے گا۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ان کے حق میں یہی نکلے گا کہ ایسے لوگ خدا کے سخت عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

② عَنْ اَبِی الْجَعْدِ الضُّمَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ ثَلَاثَ جُمَعٍ تَهَاوُنًا بِهَا طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهٖ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ وَرَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ وَاَحْمَدُ عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ۔

"حضرت ابی الجعد ضمیریؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا جو شخص محض سستی و کاہلی کی بنا پر تین جمعے چھوڑدے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگادے گا۔" (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمیؒ اور امام مالکؒ نے اس روایت کو صفوان ابن سلیم سے اور امام احمدؒ نے ابی قتادہ سے نقل کیا ہے)

بغیر عذر نماز جمعہ چھوڑنے کی صورت میں صدقہ دینا چاہئے

③ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ فَلْيَتَصَدَّقْ بِدِيْنَارٍ فَاِنْ لَمْ يَجِدْ فَبِنِصْفِ دِيْنَارٍ۔ (رواہ احمد والبوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت سمرۃ ابن جندبؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص بغیر کسی عذر کے جمعہ چھوڑدے تو چاہئے کہ ایک دینار صدقہ دے اور اگر ایک دینار میسر نہ ہو تو آدھا دینار دے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

جمعہ کی اذان سننے والے پر نماز جمعہ واجب ہے

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْجُمُعَةُ عَلٰى مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص (جمعہ کی) اذان سنے اس پر جمعہ کی نماز واجب ہو جاتی

ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص جمعہ کی اذان سنے تو اس کے لئے جمعہ کی تیاری کرنا اور جمعہ کی نماز کے لئے جانا واجب ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو علی الاطلاق اس کے ظاہری معنی پر محمول کیا جائے گا تو اس سے بڑے اشکالات پیدا ہوں گے اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس حدیث کا مفہوم یہ لیا جائے کہ جمعہ اس شخص پر واجب ہے جو کسی ایسی جگہ ہو جہاں اس کے اور شہر کے درمیان بقدر آواز پہنچنے کا فاصلہ ہو یعنی اگر کوئی شہر میں پکارے تو جہاں وہ ہے وہاں آواز پہنچ جائے۔

شرح منیہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ "جمعہ اس شخص پر لازم ہے جو شہر کے اطراف میں کسی ایسی جگہ ہو کہ اس کے اور شہر کے درمیان فاصلہ نہ ہو بلکہ ملے ہوئے مکانات ہوں (اگرچہ وہ اذان کی آواز نہ سنے) اور اگر اس کے اور شہر کے درمیان کھیت اور چراگاہ وغیرہ حائل ہونے کی وجہ سے فاصلہ ہو تو اس پر جمعہ واجب نہیں اگرچہ وہ اذان سنے۔ مگر امام محمدؒ سے منقول ہے کہ اگر وہ اذان کی آواز سنے تو اس پر جمعہ واجب ہوگا۔ فتویٰ حضرت امام محمدؒ کے قول ہی پر ہے۔

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْجُمُعَةُ عَلٰى مَنْ اٰوَاهُ اللَّيْلُ اِلٰى اَهْلِهٖ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ اِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "جمعہ کی نماز اس شخص پر فرض ہے جو رات اپنے گھر بسر کر سکے"۔ (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد ضعیف ہے)۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جمعہ ایسے شخص پر واجب ہے جس کی جائے سکونت اور اس مقام کے درمیان کہ جہاں نماز جمعہ پڑھی جاتی ہے اتنا فاصلہ ہو کہ نماز جمعہ کے بعد بآسانی رات ہونے سے پہلے پہلے اپنے گھر لوٹ کر آ سکے اور رات اپنے اہل و عیال کے ساتھ گزار سکے۔

وہ لوگ جن پر نماز جمعہ واجب نہیں ہے

⑥ وَعَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِيْ جَمَاعَةٍ اِلَّا عَلٰى اَرْبَعَةٍ عَبْدٍ مَمْلُوْكٍ اَوِامْرَاَةٍ اَوْصَبِيٍّ اَوْمَرِيْضٍ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ عَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِيْ وَائِلٍ۔

"اور حضرت طارقؒ ابن شہاب راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "جمعہ حق ہے اور جماعت کے ساتھ ہر مسلمان پر واجب ہے علاوہ چار آدمیوں کے، غلام جو کسی کی ملک میں ہو عورت، بچہ اور مریض (کہ ان پر جمعہ واجب نہیں ہے)۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "جمعہ حق ہے" یعنی جمعہ کی فرضیت کتاب اللہ اور سُنّت رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ثابت ہے اسی طرح "واجب ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر علاوہ مذکورہ اشخاص کے جمعہ کی نماز باجماعت فرض ہے۔

مذکورہ لوگوں پر جمعہ کیوں واجب نہیں: غلام چونکہ دوسرے کی ملکیت اور تصرف میں ہوتا ہے اس لئے اس پر جمعہ فرض نہیں کیا گیا۔ عورت پر جمعہ اس لئے فرض نہیں ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کے ذمہ خاوند کے حقوق اتنے زیادہ متعلق ہیں کہ نماز جمعہ میں شمولیت ان کی ادائیگی سے مانع ہوگی، بلکہ جمعہ کی نماز میں چونکہ مردوں کا ہجوم زیادہ ہوتا ہے اس لئے نماز جمعہ میں عورتوں کی شمولیت بہت سے فتنہ فساد کا موجب بن سکتی ہے۔ بچہ چونکہ غیر مکلف ہے اس لئے اس پر جمعہ فرض نہیں۔ اسی طرح مریض پر اس کے ضعف و ناتوانی اور دفع ضرر کے سبب جمعہ فرض نہیں ہے لیکن مریض سے مراد وہ مریض ہے جو کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ جس کی وجہ سے جمعہ میں حاضر ہونا دشوار و

مشکل ہو۔

ان کے علاوہ دوسری احادیث سے جن لوگوں پر جمعہ کا فرض نہ ہونا ثابت ہے ان میں دیوانہ بھی ہے جو بچہ کے حکم میں ہے ایسے ہی مسافر، اندھے اور لنگڑے پر بھی جمعہ فرض نہیں ہے ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ ایسا بوڑھا جس کو ضعف و ناتوانی لاحق ہو بیمار کے حکم میں ہے اس لئے اس پر اور اس معذور پر بھی جو اپنے پیروں پر چل سکنے پر قادر نہ ہو جمعہ فرض نہیں نیز ایسے تیمار دار پر بھی جمعہ فرض نہیں جس کے جمعہ میں چلے جانے کی وجہ سے بیمار کی تکلیف و وحشت بڑھ جانے یا اس کے ضائع ہو جانے کا خوف ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑦ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِقَوْمٍ یَتَخَلَّفُوْنَ عَنِ الْجُمُعَۃِ لَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ اٰمُرَ رَجُلاً یُصَلِّی بِالنَّاسِ ثُمَّ اُحَرِّقَ عَلٰی رِجَالٍ یَتَخَلَّفُوْنَ عَنِ الْجُمُعَۃِ بُیُوْتَھُمْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے ان لوگوں کے بارہ میں جو نماز جمعہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں (یعنی نماز جمعہ نہیں پڑھتے) فرمایا کہ میں سوچتا ہوں کہ میں کسی شخص سے کہوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے اور پھر میں (جاکر) ان لوگوں کے گھر بار جلا دوں جو (بغیر عذر کے) جمعہ چھوڑ دیتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں ان لوگوں کے لئے بڑی سخت وعید ہے، جو بلا کسی عذر اور مجبوری کے نماز جمعہ نہیں پڑھتے ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اس حدیث سے عبرت حاصل کریں اور نماز جمعہ کبھی بھی نہ چھوڑیں۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَرَکَ الْجُمُعَۃَ مِنْ غَیْرِ ضَرُوْرَۃٍ کُتِبَ مُنَافِقًا فِیْ کِتَابٍ لَا یُمْحٰی وَلَا یُبَدَّلُ وَفِیْ بَعْضِ الرِّوَایَاتِ ثَلَاثًا۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص بغیر کسی عذر کے نماز جمعہ چھوڑ دیتا ہے وہ ایسی کتاب میں منافق لکھا جاتا ہے جو نہ کبھی مٹائی جاتی ہے اور نہ تبدیل کی جاتی ہے" اور بعض روایات میں یہ ہے کہ "جو شخص تین جمعہ چھوڑ دے" (یہ وعید اس کے لئے ہے)۔" (شافعیؒ)

تشریح: من غیر ضرورۃ کا مطلب یہ ہے کہ ترک جماعت کے جو عذر ہیں مثلاً کسی ظالم اور دشمن کا خوف، پانی برسنا، برف پڑنا یا راستہ میں کیچڑ وغیرہ کا ہونا وغیرہ وغیرہ اگر ان میں سے کسی عذر کی بنا پر جمعہ کی نماز میں نہ جائے تو وہ منافق نہیں لکھا جائے گا ہاں بغیر کسی عذر اور مجبوری کے جمعہ چھوڑنے والا منافق لکھا جائے گا۔

فی کتاب لا یمحی ولا یبدل میں کتاب سے مراد "نامہ اعمال" ہے حاصل یہ ہے کہ نماز جمعہ چھوڑنے والا اپنے نامہ اعمال میں کہ جس میں نہ تنسیخ ممکن ہے اور نہ تغیر و تبدل، منافق لکھ دیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ نفاق جیسی ملعون صفت ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ جاتی ہے تاکہ آخرت میں یا تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اسے عذاب میں مبتلا کر دے یا اپنے فضل و کرم سے درگزر فرماتے ہوئے اسے بخش دے غور و فکر کا مقام ہے کہ نماز جمعہ چھوڑنے کی کتنی شدید وعید ہے؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے عذاب سے محفوظ رکھے۔

نماز جمعہ چھوڑنے والا کچھ اپنا ہی کھوتا ہے

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَعَلَیْہِ الْجُمُعَۃُ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ اِلَّا مَرِیْضٌ اَوْ مُسَافِرٌ اَوِ امْرَاَۃٌ اَوْ صَبِیٌّ اَوْ مَمْلُوْکٌ فَمَنِ اسْتَغْنٰی بِلَھْوٍ اَوْ تِجَارَۃٍ اسْتَغْنَی اللّٰہُ عَنْہُ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ

حَمِيْدٌ۔ (رواہ الدار قطنی)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر جمعہ کے دن نماز جمعہ فرض ہے علاوہ مریض مسافر، عورت بچہ اور غلام کے (کہ ان پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے (لہٰذا جو شخص کھیل کود اور تجارت وغیرہ میں مشغول ہو کر نماز جمعہ سے بے پروائی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بے پرواہ ہے اور اللہ بے پرواہ اور تعریف کیا گیا ہے۔" (دار قطنی")

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کھیل کود، تجارت اور دنیا کی دوسری مشغولیتوں میں منہمک ہو کر نماز جمعہ کی پرواہ نہیں کرتا اور نماز جمعہ چھوڑنے کا اسے کوئی احساس نہیں ہوتا تو وہ اپنا ہی کچھ کھوتا ہے اور اپنا ہی کچھ نقصان کرتا ہے کیونکہ ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ بھی بے پروائی اختیار کر لیتا ہے اور اس پر اپنی عنایت و مہربانی اور کرم نہیں کرتا اور جس بدنصیب پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی مہربانی نہ ہو دین و دنیا دونوں جگہ اس کی تباہی و بربادی کے بارہ میں کس کم بخت کو شبہ ہو سکتا ہے؟

بَابُ التَّنْظِيفِ وَالتَّبْكِيرِ

پاکی حاصل کرنے اور جمعہ کے لئے سویرے جانے کا بیان

"پاکی حاصل کرنے" سے مراد ہے غسل کے ذریعہ بدن پاک کرنا اور لبوں (مونچھوں) کا کتروانا، ناخن کٹوانا، زیر ناف کے بال صاف کرنا بغل کے بال دور کرنا، کپڑوں کا پاک کرنا اور خوشبو استعمال کرنا، جمعہ کے دن یہ تمام چیزیں سُنّت ہیں اس کی تفصیل کتاب الطہارت میں مسواک کے بیان میں گزر چکی ہے۔

"جمعہ کے لئے سویرے جانے" سے مراد ہے مسجد یا جہاں نماز ادا کی جاتی ہو وہاں نماز جمعہ کے لئے نماز کے اول وقت پہنچ جانا۔ اگر کوئی شخص نماز جمعہ کے لئے مسجد میں دن کے اول وقت میں ہی پہنچ جائے تو یہ افضل ہے چنانچہ امام غزالیؒ نے بعض علماء سلف سے یہ معمول نقل کیا ہے کہ وہ عبادت کی طرف پیش روی اختیار کرنے کے جذبہ سے نماز جمعہ کے لئے جمعہ کے دن صبح ہی سے مسجد پہنچ جایا کرتے تھے۔ مگر اتنی بات ذہن نشین رہنی چاہئے۔ کہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے والوں نے جو یہ معمول بنایا ہے کہ وہ جمعہ کے روز صبح سویرے ہی مسجد مقدس میں جگہ روکنے کے لئے اپنے اپنے مصلّی بچھا دیتے ہیں مگر وہاں بیٹھتے نہیں بلکہ چلے جاتے ہیں اور پھر نماز کے وقت آجاتے ہیں۔ تو اس کے بارہ میں علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایسے لوگ وہاں بیٹھ کر ذکر فکر میں مشغول رہیں تو بہتر ہے ورنہ محض جگہ روکنے کی خاطر مصلّی بچھا کر چلے جانا مناسب نہیں کیونکہ اس سے لوگوں کو تنگی پیدا ہوتی ہے۔

اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ جامع مسجد میں جگہ روکنے کے لئے اول وقت پہنچ کر اپنے اپنے کپڑے، بچھا دینا اور پھر وہاں سے کھانا وغیرہ کھانے کے لئے گھر چلے جانا مناسب نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز جمعہ کے آداب

① عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهٖ اَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيْبِ بَيْتِهٖ ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ ثُمَّ يُصَلِّيْ مَا كُتِبَ لَهٗ ثُمَّ يُنْصِتُ اِذَا تَكَلَّمَ

الامَامُ اِلاَّ غُفِرَ لَهٗ مَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰی۔ (رواہ البخاری)

"حضرت سلمانؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص جمعہ کے دن نہائے اور جس قدر ہو سکے پاکی حاصل کرے اور اپنے پاس سے (یعنی گھر میں جو بلا تکلف میسر ہو سکے) تیل ڈالے اور اپنے گھر سے عطر لگائے اور پھر مسجد کے لئے نکلے اور (مسجد پہنچ کر) دو آدمیوں کے درمیان فرق نہ کرے اور پھر جتنی بھی اس کے مقدر میں ہو (یعنی جمعہ کی سُنّت نوافل یا قضاء نماز پڑھے اور امام کے خطبہ پڑھتے وقت خاموش رہے تو اس جمعہ اور گذشتہ جمعہ کے درمیان کے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "اور جس قدر ہو سکے پاکی اختیار کرے" کا مطلب یہ ہے کہ لبیں کتروائے، ناخن کٹوائے، زیر ناف کے بال صاف کرے بغلوں کے بال دور کرے اور پاک وصاف کپڑے پہنے۔

"دو آدمیوں کے درمیان فرق نہ کرے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسجد میں باپ بیٹا یا ایسے دو آدمی جو آپس میں محبت و تعلق رکھتے ہوں ایک جگہ پاس بیٹھے ہوں تو ان کے درمیان نہ بیٹھے یا دو آدمیوں کے درمیان اگر جگہ نہ ہو تو وہاں نہ بیٹھے کہ انہیں تکلیف ہوگی ہاں اگر جگہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

یا "فرق نہ کرنے" سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو پھلانگتا ہوا، صفوں کو چیرتا پھاڑتا آگے کی صفوں میں نہ جائے بلکہ جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائے اور اگر بغیر پھلانگے اور بغیر صفوں کے چیرے پھاڑے پہلی صف میں پہنچ سکتا ہے تو پھر آگے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں یہ حکم اس صورت کا ہے جب کہ آگے کی صفوں میں جگہ نہ ہو۔ ہاں اگر یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں آگے کی صفوں میں جاؤں گا تو لوگ مجھے وہاں بیٹھنے کی جگہ دیدیں گے یا یہ کہ اگلی صفوں میں جگہ خالی پڑی ہو تو پھر صفوں کو چیر پھاڑ کر بھی آگے جانا درست ہوگا کیونکہ یہ پچھلی صفوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا قصور ہے کہ وہ آگے بڑھ کر پہلی صفوں میں کیوں نہیں بیٹھتے اور خالی جگہ کو پر کیوں نہیں کرتے۔

در حقیقت یہ حدیث اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ نماز جمعہ کے لئے اول وقت مسجد پہنچ جانا چاہے۔ تاکہ وہاں "فرق نہ کرنے" اور صفوں کو چیرنے پھاڑنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اغْتَسَلَ ثُمَّ اَتَی الْجُمُعَةَ فَصَلّٰی مَا قُدِرَ لَهٗ ثُمَّ اَنْصَتَ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْ خُطْبَتِهٖ ثُمَّ یُصَلِّیَ مَعَهٗ غُفِرَ لَهٗ مَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰی وَفَضْلُ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے غسل کیا پھر جمعہ میں آیا اور جس قدر کہ اس کے نصیب میں تھی نماز پڑھی پھر امام کے خطبہ سے فارغ ہونے تک خاموش رہا اور اس کے ساتھ نماز پڑھی تو اس جمعہ سے گذشتہ جمعہ تک بلکہ اس سے تین دن زیادہ کے اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "تین دن کی زیادتی" اس لئے ہے کہ ہر نیکی کا ثواب دس گنا زیادہ ہوتا ہے لہٰذا جمعہ سے جمعہ تک تو سات دن ہوئے اور تین دن کا اسی میں اور اضافہ کر دیا گیا تاکہ دہائی پوری ہو جائے۔

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ اَتَی الْجُمُعَةَ فَاسْتَمَعَ وَاَنْصَتَ غُفِرَ لَهٗ مَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْجُمُعَةِ وَزِیَادَةُ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ وَمَنْ مَسَّ الْحَصٰی فَقَدْ لَغَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا (یعنی آداب وضو کی رعایت کے ساتھ) پھر جمعہ میں آیا اور (اگر نزدیک تھا تو) خطبہ سنا اور (اگر دور تھا اور خطبہ نہ سن سکتا تھا تو) خاموش رہا تو اس (جمعہ) کے اور گذشتہ جمعہ کے درمیان بلکہ اس سے بھی تین دن زیادہ کے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور جس نے کنکریوں کو چھوا اس نے لغو کیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "کنکریوں کو چھوا" یعنی نماز میں کنکریوں سے شغل کیا بایں طور کے سجدے کی جگہ برابر کرنے کے لئے انہیں ایک مرتبہ سے زیادہ

برابر کیا" بعض حضرات کہتے ہیں کہ "اس سے مراد یہ ہے کہ خطبہ کے وقت کنکریوں سے کھیلتا رہا"

"لغو" کے معنی باطل اور بے فائدہ بات" لہٰذا نمازی کے کنکریوں سے کھیلنے یا کنکریوں کو چھونے کو لغو" کے ساتھ مشابہت اس لئے دی گئی ہے کہ یہ فعل خطبہ سننے سے مانع ہوتا ہے۔

جمعہ میں اول وقت آنے والے کی فضیلت

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ وَقَفَتِ الْمَلَائِكَةُ عَلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ يَكْتُبُوْنَ الْاَوَّلَ فَالْاَوَّلَ وَمَثَلُ الْمُهَجِّرِ كَمَثَلِ الَّذِيْ يُهْدِيْ بَدَنَةً ثُمَّ كَالَّذِيْ يُهْدِيْ بَقَرَةً ثُمَّ كَبْشًا ثُمَّ دَجَاجَةً ثُمَّ بَيْضَةً فَاِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ طَوَوْا صُحُفَهُمْ وَيَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا" جب جمعہ کا دن آتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازے پر آکھڑے ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص مسجد میں اول وقت) آتا ہے پہلے وہ اس کا نام لکھتے ہیں پھر اس کے بعد پہلے آنے والوں کا نام لکھتے ہیں اور جو شخص مسجد میں اول (وقت) جمعہ میں آتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسا کوئی شخص مکہ میں قربانی کے لئے اونٹ بھیجتا ہے۔ (کہ جس کا بہت زیادہ ثواب ہوتا ہے) پھر اس کے بعد جو شخص جمعہ میں آتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص مکہ میں قربانی کے لئے گائے بھیجتا ہے۔ پھر اس کے بعد جو شخص آتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص دنبہ بھیجتا ہے پھر اس کے بعد جو شخص آتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی صدقہ میں مرغی دیتا ہے پھر اس کے بعد جو شخص آتا ہے وہ صدقہ میں انڈا دینے والے کی مانند ہوتا ہے اور جب امام (خطبہ کے لئے منبر پر) آتا ہے تو وہ اپنے صحیفے لپیٹ لیتے ہیں اور خطبہ سننے لگتے ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حدیث کے ابتدائی حصہ کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے دن یا تو صبح ہی سے یا طلوع آفتاب یا پھر (جیسا کہ بہتر اور راجح قول ہے۔) زوال کے وقت سے مسجد کے دروازے پر فرشتے آکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور جس ترتیب سے نمازی آتے ہیں اسی ترتیب سے ان کا نام لکھتے رہتے ہیں اس طرح جو لوگ اول وقت مسجد میں آتے ہیں ان کا نام سب سے پہلے ہوتا ہے گویا وہ سب سے افضل ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ بعد میں آتے ہیں ان کا نام بعد میں لکھا جاتا ہے اس طرح وہ لوگ اول وقت آنے والوں کی بہ نسبت کم فضیلت والے شمار کئے جاتے ہیں۔ اور یہ فرشتے ان فرشتوں کے علاوہ ہوتے ہیں۔ جو بندوں کے اعمال لکھنے پر مامور ہیں۔

خطبہ کے وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ممنوع ہے

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَنْصِتْ وَالْاِمَامُ يَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا" جمعہ کے دن جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو اگر تم نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے یہ بھی کہا "چپ رہو" تو تم نے بھی لغو کام کیا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: خطبہ کے وقت چونکہ کسی بھی قسم کے کلام اور گفتگو کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے اس وقت ایسے شخص کو جو گفتگو کر رہا ہو خاموش ہوجانے کے لئے کہنا بھی اس حدیث کے مطابق "لغو" ہے اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ کے وقت مطلقاً کلام اور گفتگو ممنوع ہے اگرچہ وہ کلام و گفتگو امر بالمعروف (اچھی بات کے کرنے) اور نہی عن المنکر (بری بات سے روکنے ہی سے متعلق کیوں نہ ہو۔ ہاں اس وقت یہ فریضہ اشارہ کے ذریعہ ادا کیا جاسکتا ہے لیکن زبان سے کہنے کی اجازت نہیں ہے۔

خطبہ کے وقت خاموشی اختیار کرنے کا مسئلہ: جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو اس وقت خاموش رہنا اکثر علماء کے نزدیک واجب ہے امام

ابو حنیفہؒ بھی انہیں میں شامل ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک مستحب ہے چنانچہ امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے لیکن مذاہب ملانیہ" میں لکھا ہے اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں ایک قول وجوب کا ہے اور دوسرا استحباب کا، امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ جس وقت امام خطبہ کے لئے چلے اس وقت بھی نماز شروع کرنا یا کلام کرنا دونوں ممنوع ہیں اگر کوئی شخص نماز (مثلاً سنت وغیرہ) پڑھ رہا ہو اور امام خطبہ شروع کر دے تو اس شخص کو دو رکعت پوری کر کے نماز توڑ دینی چاہئے۔ مگر حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک امام کے خطبہ کے لئے چلنے اور خطبہ شروع کرنے کے درمیان اسی طرح اس کے خطبہ ختم کرنے کے بعد سے تکبیر تحریمہ شروع ہو جانے تک کلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ کراہیت کلام اس وجہ سے ہے کہ کلام میں مشغول رہنے والا شخص خطبہ نہیں سن سکتا اور ظاہر ہے کہ یہ مواقع خطبہ سننے کے نہیں ہیں اس لئے ایسے اوقات میں کلام کرنا جائز ہے۔

مگر حضرت امام ابو حنیفہؒ ان دونوں کی ممانعت کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حدیث ہے اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام (جب امام خطبہ کے لئے چلے تو اس وقت نہ نماز جائز ہے اور نہ کلام) نیز صحابہؓ کے اقوال بھی اسی طرح ہیں۔ اور صحابیؓ کے قول کو حجت اور دلیل قرار دینے میں نہ صرف یہ کہ کوئی شک و شبہ نہیں ہے بلکہ قول صحابیؓ کی تقلید و پیروی واجب ہے علماء نے لکھا ہے کہ خطبہ کے وقت صاحب ترتیب کے لئے قضا نماز پڑھنی مکروہ نہیں ہے۔

اس شخص کے بارہ میں جو امام سے دور ہو اور خطبہ کی آواز اس تک نہ پہنچ رہی ہو علماء کے مختلف اقوال ہیں لیکن صحیح اور مختار قول یہ ہے کہ وہ شخص بھی گفتگو و کلام نہ کرے بلکہ اس کے لئے بھی خاموش رہنا واجب ہے۔

خطبہ کے وقت کے آداب: علماء نے صراحت کی ہے کہ جس وقت امام خطبہ پڑھ رہا ہو اس وقت کھانا پینا یا کتابت وغیرہ دنیوی امور میں مشغول ہونا حرام ہے سلام اور چھینک کا جواب دینا بھی مکروہ ہے اس سلسلہ میں در مختار میں ایک کلمہ لکھا گیا ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ حُرِّمَ فِي الصَّلٰوةِ حُرِّمَ فِي الْخُطْبَةِ یعنی جو چیزیں نماز میں حرام ہیں وہ خطبہ کے وقت بھی حرام ہیں۔ خطبہ کے وقت درود بھی زبان سے نہیں بلکہ دل میں کہہ لیا جائے۔ خطبہ کے وقت کسی شخص کو اس کی خلاف شرع حرکت سے روکنا زبان سے تو مکروہ ہے لیکن ہاتھ یا آنکھ کے اشارے سے اسے منع کر دینا مکروہ نہیں ہے۔

بہر حال اس حدیث کی باب سے وجہ مناسبت یہ ہے کہ اس باب کا مقتضی یہ ہے کہ جمعہ میں سویرے سے جانا ثواب کی زیادتی کا باعث ہے اور کوئی شخص سویرے سے مسجد پہنچ گیا مگر اس نے وہاں امام کے خطبہ پڑھتے وقت کسی کو زبان سے نصیحت کی تو گویا اس سے ایک لغو کام صادر ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سویرے سے مسجد میں پہنچ جانے کا ثواب جاتا رہا۔ لہٰذا اسے چاہئے کہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں سویرے سے پہنچ جائے اور وہاں ایسی کوئی حرکت نہ کی جائے جس سے ثواب جاتا رہے۔

مسجد میں کسی کو اس کی جگہ سے نہ ہٹانا چاہئے

(۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُقِيْمَنَّ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ثُمَّ يُخَالِفُ اِلٰى مَقْعَدِهٖ فَيَقْعُدُ فِيْهِ وَلٰكِنْ يَقُوْلُ افْسَحُوْا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن (جامع مسجد میں پہنچ کر) اپنے مسلمان بھائی کو اس کی جگہ سے نہ اٹھائے اور وہاں خود بیٹھنے کا ارادہ نہ کرے۔ ہاں (لوگوں سے) یہ کہہ دے کے (بھائیو) جگہ کشادہ کر دو۔" (مسلم)

تشریح: مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کو ہٹا کر اس کی جگہ پر اس کی رضاء کے بغیر بیٹھنا حرام ہے اور اگر رضا حاصل ہو تو وہ بھی حقیقۃً ہونی چاہئے۔ نہ کہ کسی خوف و حیا کی وجہ سے ہو اس طرح اگر کوئی شخص کسی کو پہلے سے مسجد میں بھیج دے تاکہ وہ وہاں اس کے لئے جگہ روک لے تو اس شخص کو بھی اس جگہ سے اٹھانا حرام ہے۔ کیونکہ کوئی شخص بھی محض کسی کو بھیج کر جگہ رکوا لینے سے مسجد وغیرہ جیسی مقدس

جگہوں کا حقدار نہیں ہوتا۔ بلکہ جو شخص جس جگہ بیٹھا ہوا ہے وہ اس جگہ پہلے پہنچ جانے کی وجہ سے اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے اگرچہ وہاں پہنچنے پر اس کی یہی نیت کیوں نہ ہو کہ جس شخص نے مجھے بھیجا ہے اس کے لئے میں جگہ روک رہا ہوں اور یہاں وہی شخص آکر بیٹھے گا چنانچہ خود اس شخص کے لئے اپنی جگہ سے اپنے بھیجنے والے کے لئے اٹھنا اور اس کے ساتھ اس سلسلہ میں ایثار کا معاملہ کرنا مکروہ ہے۔ بشرطیکہ وہ شخص اس سے فضیلت میں کم درجہ کا ہو یعنی اگر کوئی اس سے زیادہ افضل ہو تو اس کے ساتھ ایثار کا معاملہ کرنا مکروہ نہیں ہے اور اس کے لئے وہاں سے اٹھنا مکروہ اس لئے ہے کہ عبادات میں بلا عذر مکروہ ہے۔

جہاں تک اس آیت وَالَّذِيْنَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ کا تعلق ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے ایثار کرنے والوں کی فضیلت بیان فرمائی ہے تو اس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ یہاں وہ ایثار مراد ہے جس کا تعلق حظ نفس (یعنی طبعی ضروریات و خواہشات) سے ہو۔

اب تو غالباً کہیں یہ دستور نہیں ہے مگر پہلے زمانہ میں بعض اصحاب ثروت و دولت جن کی زندگی کا بنیادی مقصد دوسروں پر ظلم کرنا تھا اپنے خادموں اور ملازموں کو جامع مسجد میں بھیجتے تھے اور وہاں پہنچ کر پہلے سے بیٹھے ہوئے کمزور و غریب لوگوں کو مار مار کر اور دھکے دے دے کر اٹھا دیتے تھے اور اپنے آقاؤں کے لئے جگہ بنا لیتے تھے اسی زمانہ کے کسی عارف سے اس غلط طریقہ کے بارے میں جب کہا گیا تو انہوں نے نہایت تاسف کے ساتھ یہ عارفانہ مقولہ ارشاد فرمایا کہ "جب ان کی عبادت کا یہ حال ہے تو ان کے ظلم و گناہ کا کیا عالم ہوگا؟

افسحوا (جگہ کشادہ کرو) اس طرح اس وقت کہنا چاہے جب کہ جگہ میں کشادگی کی گنجائش ہو ورنہ بصورت دیگر یہ بھی نہ کہنا چاہے اور نہ لوگوں کو تنگ کرنا چاہے بلکہ جہاں بھی جگہ مل جائے وہیں نماز پڑھ لے اگرچہ مسجد کے دروازوں ہی میں جگہ کیوں نہ ملے۔

باب کے ساتھ حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ اس حدیث میں یہ رغبت دلائی جا رہی ہے کہ نماز پڑھنے والا جامع مسجد میں سویرے سے پہنچ جائے تاکہ کسی کو اٹھانے ہٹانے کی ضرورت نہ پڑے۔

جمعہ کے روز عمدہ لباس زیب تن کرنا چاہئے

⑦ عَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ وَ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلَبِسَ مِنْ اَحْسَنِ ثِيَابِهٖ وَمَسَّ مِنْ طِيْبٍ اِنْ كَانَ عِنْدَهٗ ثُمَّ اَتَى الْجُمُعَةَ فَلَمْ يَتَخَطَّ اَعْنَاقَ النَّاسِ ثُمَّ صَلّٰى مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ ثُمَّ اَنْصَتَ اِذَا خَرَجَ اِمَامُهٗ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْ صَلَاتِهٖ كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا بَيْنَهَا وَبَيْنَ جُمُعَتِهِ الَّتِیْ قَبْلَهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے عمدہ لباس پہنے اور اگر میسر ہو تو خوشبو لگائے پھر جمعہ میں آئے اور وہاں لوگوں کی گردنوں پر نہ پھلانگے پھر جتنی اللہ نے اس کے مقدر میں لکھ رکھی ہو نماز پڑھے اور جب امام (خطبہ کے لئے) چلے تو خاموشی اختیار کرے یہاں تک کہ نماز سے فراغت حاصل کرے تو یہ اس کے اس جمعہ اور اس پہلے جمعہ کے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "عمدہ لباس" سے مراد سفید کپڑے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو سفید ہی کپڑے پسند تھے۔

جامع مسجد پیدل جانا افضل ہے

⑧ وَعَنْ اَوْسِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ غَسَّلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاغْتَسَلَ وَبَكَّرَ وَابْتَكَرَ وَمَشٰى وَلَمْ يَرْكَبْ وَدَنَا مِنَ الْاِمَامِ وَاسْتَمَعَ وَلَمْ يَلْغُ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ خُطْوَةٍ عَمَلُ سَنَةٍ اَجْرُ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا۔

(رواہ الترمذی، وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت اوس بن اوسؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص جمعہ کے دن نہلائے اور خود نہائے، سویرے سے (جامع

مسجد) جائے (تاکہ) شروع سے خطبہ پالے اور پیدل جائے، سوار نہ ہو اور امام کے قریب بیٹھے اور خطبہ سنے نیز یہ کہ کوئی بیہودہ بات زبان سے نہ نکالے تو اس کے ہر قدم کے بدلے ایک سال کے روزوں اور رات میں عبادت کرنے کا ثواب لکھا جائے گا۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: غَسَّلَ (نہلانے) کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی کو نہلائے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی بیوی سے صحبت کرے تاکہ اس کے نہانے کا باعث ہو یا یہ مراد ہے کہ اپنے کپڑے صاف کرائے اور دھلوائے یا اپنا سر خطمی وغیرہ سے دھوئے جمعہ کے روز اپنی بیوی سے ہم بستری بہتر اس لئے ہے کہ اس سے زنا کا خطرہ دل میں پیدا نہیں ہوتا اور نماز میں حضور قلب حاصل ہوتا ہے۔

اس حدیث میں لفظ "مشی" کے بعد "لم یر کب" کی قید کا مقصد اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ تمام راستہ پاپیادہ چلے بالکل سوار نہ ہو۔ چونکہ لفظ "مشی" اپنے عمومی مفہوم میں تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ خواہ تمام راستہ پیدل چلے یا تھوڑی تھوڑی دور پیدل چل کر پھر سوار ہو جائے۔ اس لئے "لم یر کب" ذکر کر کے اس بات کی تاکید فرما دی گئی کہ جامع مسجد جانے کے لئے سواری بالکل استعمال نہ کی جائے بلکہ تمام راستہ پیدل چل کر جامع مسجد پہنچے۔

جمعہ کے لئے بطور خاص اچھے کپڑے بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

⑨ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا عَلٰى اَحَدِكُمْ اِنْ وَجَدَ اَنْ يَتَّخِذَ ثَوْبَيْنِ لِيَوْمِ الْجُمُعَةِ سِوٰى ثَوْبَيْ مِهْنَتِهٖ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن سلامؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جسے مقدور ہو اگر وہ نماز جمعہ کے لئے علاوہ کاروبار کے کپڑوں کے دو کپڑے اور بنالے تو کوئی مضائقہ نہیں (ابن ماجہؒ) اور امام مالکؒ نے یہ روایت یحیٰی ابن سعد سے نقل کی ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو سہولت و آسانی کے ساتھ یہ میسر ہو کہ وہ ان کپڑوں کے علاوہ جنہیں وہ ہمیشہ پہنتا ہے اور ان کپڑوں میں گھر باہر کا کاروبار کرتا ہے نماز جمعہ کے لئے دو مزید کپڑے بنالے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص بطور خاص جمعہ اور عیدین کے لئے اچھے کپڑے بنائے تو یہ زہد و تقوی کے منافی نہیں ہوگا چنانچہ خود سرکار دوعالم ﷺ کے بارہ میں ثابت ہے کہ آپ کے پاس دو ایسے کپڑے تھے جنہیں آپ ﷺ بطور خاص جمعہ ہی کے روز زیب تن فرماتے تھے۔

امام کے قریب بیٹھ کر خطبہ سنو

⑩ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُحْضُرُوا الذِّكْرَ وَادْنُوْا مِنَ الْاِمَامِ فَاِنَّ الرَّجُلَ لَا يَزَالُ يَتَبَاعَدُ حَتّٰى يُؤَخَّرَ فِي الْجَنَّةِ وَاِنْ دَخَلَهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سمرۃ بن جندبؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ "خطبہ کے وقت جلد حاضر ہوا کرو اور امام کے قریب بیٹھا کرو، کیونکہ آدمی (بھلائیوں کی جگہ سے بلا عذر) جتنا دور ہوتا جاتا ہے جنت کے داخل ہونے میں پیچھے رہے گا۔ اگرچہ جنت میں داخل ہو بھی جائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ اس بات کی رغبت دلائی جا رہی ہے کہ ہمیشہ اعلیٰ امور اختیار کئے جائیں اور ادنی چیزوں پر قناعت نہ کی جائے۔

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

گردنوں کو پھلانگنے کی وعید

⑪ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ الْجُهَنِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَخَطّٰى رِقَابَ النَّاسِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اُتُّخِذَ جِسْرًا اِلٰى جَهَنَّمَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت معاذؓ ابن انس جہنیؓ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص جمعہ کے دن (جامع مسجد میں جگہ حاصل کرنے کے لئے) لوگوں کی گردنیں پھلانگے گا وہ جہنم کی طرف پل بنایا جائے گا" ترمذیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: سیدؒ نے کہا ہے حدیث کی اسناد عن معاذ ابن انس عن ابیہ سہواً نقل ہو گئی ہے کیونکہ معاذ کے والد انس کو نہ شرف روایت حاصل ہے اور نہ فیض صحبت ہی میسر ہوا ہے لہٰذا صحیح اسناد اس طرح ہے عَنْ سَهْلِ ابْنِ مَعَاذٍ عَنْ اَبِيْهِ (سہل ابن معاذ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں) جیسا کہ ترمذیؒ میں منقول ہے۔

حدیث کے الفاظ "جہنم کی طرف پل بنایا جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن ایسے شخص کو اپنے فعل کی مثل بدلہ ملے گا یعنی جس طرح اس نے گردنوں کو پھلانگ کر لوگوں کو اپنی گذر گاہ بنایا اس طرح اس کو جہنم کی طرف پل بنا کر لوگوں کے لئے گذر گاہ بنایا جائے گا۔

خطبہ کے وقت بیٹھنے کا ایک ممنوع طریقہ

⑫ وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْحَبْوَةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْاِمَامُ يَخْطُبُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت معاذ ابن انسؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے جمعہ کے دن جب کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو "گوٹ مارنے" سے منع فرمایا ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "گوٹ مارنا" ایک خاص نشست اور بیٹھنے کے ایک مخصوص طریقے کو کہتے ہیں جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اکڑوں بیٹھ کر سرین کو زمین پر ٹیک کر کپڑے یا ہاتھوں کے ذریعے دونوں گھٹنے اور رانیں پیٹ کے ساتھ ملالی جاتی ہیں۔

خطبہ کے وقت اس طرح بیٹھنے سے منع فرمایا گیا ہے کیونکہ ایسی حالت میں نیند آجاتی ہے جس کی وجہ سے خطبہ کی سماعت نہیں ہو سکتی بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح بیٹھنے والا غنودگی کے عالم میں ایک پہلو پر گر جاتا ہے یا بیٹھے ہی بیٹھے اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا۔

اونگھ آنے کی صورت میں جگہ بدل دینی چاہئے

⑬ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَعَسَ اَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلْيَتَحَوَّلْ مِنْ مَجْلِسِهٖ ذَالِكَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن (مسجد میں بیٹھے اونگھنے لگے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی جگہ بدل دے (یعنی جس جگہ بیٹھا ہے وہاں سے اٹھ جائے اور دوسری جگہ جا کر بیٹھ جائے اس طرح نیند کا غلبہ کم ہو جائے گا)۔" (ترمذیؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

کسی کو اس کی جگہ سے نہ اٹھاؤ

⑭ عَنْ نَافِعٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّقِيْمَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَقْعَدِهٖ وَيَجْلِسَ فِيْهِ قِيْلَ لِنَافِعٍ فِي الْجُمُعَةِ قَالَ فِي الْجُمُعَةِ وَغَيْرِهَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "سرتاج دوعالم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر خود وہاں بیٹھ جائے" نافع سے پوچھا گیا کہ "کیا یہ ممانعت جمعہ کے لئے ہے"؟ انہوں نے فرمایا کہ "جمعہ کے لئے بھی اور جمعہ کے علاوہ بھی۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: چونکہ اس طرز عمل سے منع فرمایا گیا ہے کہ اس سے ایک مسلمان بھائی کو تکلیف پہنچتی ہے لہٰذا یہ ممانعت کیا جمعہ اور کیا غیر جمعہ ہر موقع سے متعلق ہے۔

آداب جمعہ کی رعایت کرنے والے کے لئے بشارت

⑮ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْضُرُ الْجُمُعَةَ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ فَرَجُلٌ حَضَرَهَا بِلَغْوٍ فَذٰلِكَ حَظُّهٗ مِنْهَا وَرَجُلٌ حَضَرَهَا بِدُعَاءٍ فَهُوَ رَجُلٌ دَعَا اللّٰهَ اِنْ شَاءَ اَعْطَاهُ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَهٗ وَرَجُلٌ حَضَرَهَا بِاِنْصَاتٍ وَسُكُوْتٍ وَلَمْ يَتَخَطَّ رَقَبَةَ مُسْلِمٍ وَلَمْ يُؤْذِ اَحَدًا فَهِيَ كَفَّارَةٌ اِلَى الْجُمُعَةِ الَّتِيْ تَلِيْهَا وَزِيَادَةُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ وَذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ (رواہ ابوداؤدؒ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "جمعہ (کی نماز) میں تین طرح کے لوگ آتے ہیں ایک وہ شخص جو لغو کلام اور بیکار کام کے ساتھ آتا ہے (یعنی وہ خطبہ کے وقت لغو بیہودہ کلام اور بیکار کام میں مشغول ہوتا ہے) چنانچہ جمعہ کی حاضری میں اس کا یہی حصہ ہے (یعنی وہ جمعہ کے ثواب سے محروم رہتا ہے اور لغو کلام و فعل کا وبال اس کے حصہ میں آتا ہے) دوسرا وہ شخص ہے جو جمعہ میں دعا کے لئے آتا ہے (چنانچہ وہ خطبہ کے وقت دعا میں مشغول رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی دعا اسے خطبہ سننے یا خطبہ کے کمال ثواب سے باز رکھتی ہے) پس وہ دعا مانگتا ہے خواہ اللہ تعالیٰ (اپنے فضل و کرم کے صدقہ میں) اس کی دعا کو قبول فرمائے یا نہ قبول فرمائے تیسرا وہ شخص جمعہ میں آتا ہے جو (اگر خطبہ کے وقت امام کے قریب ہوتا ہے تو خطبہ سننے کے لئے) خاموش رہتا ہے اور (اگر امام سے دور ہوتا ہے اور خطبہ کی آواز اس تک نہیں پہنچتی تب بھی خطبہ کے احترام میں وہ) سکوت اختیار کرتا ہے نیز نہ تو وہ لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہے اور نہ کسی کو ایذا پہنچاتا ہے لہٰذا اس کے واسطے یہ جمعہ اس (یعنی پہلے) جمعہ تک جو اس سے ملا ہوا ہے بلکہ اور تین دن زیادہ تک کا کفارہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا یعنی جو ایک نیکی کرے گا۔ اس کو اس نیکی کا دس گناہ ثواب دیا جائے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ان شاء اعطاہ و ان شاء منعہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص چونکہ خلافِ ادب اور خلافِ حکم اس وقت دعا میں مشغول رہتا ہے اس لئے اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو محض اپنے فضل و کرم کے صدقہ میں اس کی دعا کو قبول فرمالے گا ورنہ تو از راہ عدل اس کے اس فعل بد کی وجہ سے کہ وہ دعا میں مشغول رہ کر خطبہ سننے سے غافل رہا اس کی دعا قبول نہیں فرمائے گا خطبہ کے وقت دعا میں مشغول ہونا حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے جب کہ دوسرے علماء کے یہاں حرام ہے۔ مشکوۃ کے ایک دوسرے نسخہ میں لفظ يَلْغُوا صیغہ مضارع کے ساتھ نقل کیا گیا ہے لیکن صحیح بِلَغْوٍ ہی جیسا کہ یہاں نقل کیا گیا ہے کیونکہ یہ اگلے جملوں کے مطابق ہے۔

ولم یوذ احد کا مطلب یہ ہے کہ مسجد میں آکر اس نے کسی شخص کو ایذا اور تکلیف نہیں پہنچائی بایں طور کہ مثلاً نہ تو کسی کو اس کی

جگہ سے اٹھایا نہ کسی دوسرے کے جسم کے کسی عضو پر چڑھ کر بیٹھا یا اسی طرح نہ تو کسی کے مصلیٰ پر اس کی مرضی کے بغیر بیٹھا اور نہ لہسن و پیاز جیسی اشیاء کی بدبو سے کسی کو تکلیف پہنچائی۔

خطبہ کے وقت بات چیت کرنے والوں کے لئے وعید

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَکَلَّمَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ فَھُوَ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا وَالَّذِیْ یَقُوْلُ لَہٗ اَنْصِتْ لَیْسَ لَہٗ جُمُعَۃٌ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص جمعہ کے دن اس حالت میں جب کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو بات چیت میں مشغول ہو تو وہ گدھے کی مانند ہے کہ جس پر کتابیں لاد دی گئیں ہوں اور جو شخص اس (بات چیت میں مشغول رہنے والے) سے کہے "چپ رہو" تو اس کے لئے جمعہ کا ثواب نہیں ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: کمثل الحمار کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص اس گدھے کی طرح ہے جس کی پشت پر کتابیں لاد دی جائیں یہ دراصل عالم کے علم پر عمل نہ کرنے سے کنایہ ہے نیز اس بات سے کنایہ ہے کہ اس شخص نے انتہائی محنت و مشقت برداشت کر کے علم حاصل کیا مگر اس علم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

جو شخص مشغول گفتگو کو خاموش ہونے کے لئے کہے اس کو بھی جمعہ کا ثواب اس لئے نہیں ملتا کہ اس سے ایسا لغو اور بے فائدہ کلام صادر ہوا جس کی ممانعت ثابت ہو چکی ہے جیسا کہ اس کی تفصیل حضرت ابوہریرہؓ کی راویت نمبر ۵ میں بیان کی جا چکی ہے۔

خطبہ کے وقت آنحضرت ﷺ کا کلام اور اس کی وضاحت: ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کے روز جب کہ آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے ایک اعرابی آیا اور اس نے عرض کیا "یارسول اللہ! میرا مال تباہ و برباد ہو گیا، میرے اہل و عیال بھوکے ہیں ہمارے لئے دعا کیجئے! آنحضرت ﷺ نے اسی حالت میں اپنے ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی" یا اسی طرح بعض روایتوں میں آنحضرت ﷺ سے خطبہ کی حالت میں بات چیت کرنا ثابت ہے تو ان روایتوں کے بارہ میں کئی احتمال ہیں اول تو یہ کہ آپ ﷺ کا دعا میں مشغول ہونا یا بات چیت کرنا خطبہ کی حالت میں نہیں تھا بلکہ یا تو خطبہ شروع ہونے سے پہلے یا خطبہ شروع ہونے کے بعد آپ ﷺ دعا یا بات چیت میں مشغول ہوئے ایک احتمال یہ ہے کہ ان روایتوں کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب کہ خطبہ کی حالت میں اس قسم کی مشغولیت ممنوع نہیں تھی یا پھر یہ کہا جائے کہ یہ آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔

مسلمانوں کے لئے جمعہ عید ہے

(۱۷) وَعَنْ عُبَیْدِ بْنِ السَّبَّاقِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ جُمُعَۃٍ مِنَ الْجُمَعِ یَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِیْنَ اِنَّ ھٰذَا یَوْمٌ جَعَلَہُ اللّٰہُ عِیْدًا فَاغْتَسِلُوْا وَمَنْ کَانَ عِنْدَہٗ طِیْبٌ فَلَا یَضُرُّہٗ اَنْ یَمَسَّ مِنْہُ وَعَلَیْکُمْ بِالسِّوَاکِ رَوَاہُ مَالِکٌ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنْہُ وَھُوَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مُتَّصِلًا۔

"اور حضرت عبید اللہؒ ابن سباق بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے فرمایا "اے مسلمانوں کی جماعت! یہ (جمعہ) کا وہ دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (مسلمانوں کی) عید قرار دیا ہے۔ لہٰذا (اس دن غسل) کرو اور جس شخص کو خوشبو میسر ہو اگر وہ اسے استعمال کرے تو کوئی حرج نہیں نیز تم مسواک ضرور کیا کرو" (مالکؒ) ابن ماجہؒ نے بھی یہ حدیث عبید اللہ ابن سباق سے انہوں نے ابن عباس سے متصل نقل کی ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جمعہ کا دن عید یعنی فقراء و مساکین اور اولیاء اللہ و صالحین کے لئے خوشی و مسرت اور زیب و زینت کرنے کا دن

ہے اس دن نہاؤ یعنی خوب اچھی طرح طہارت اور ستھرائی حاصل کرو۔ اور خوشبو استعمال کرو خوشبو ایسی ہونی چاہئے کہ جس میں خوشبو تو ہو مگر رنگ نہ ہو جیسے عطر وغیرہ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ خوشبوؤں میں سب سے افضل خوشبو ایسا مشک ہے جس میں گلاب کی آمیزش ہو کیونکہ آنحضرت ﷺ اکثر و بیشتر مشک ہی کا استعمال فرماتے تھے۔

حدیث کے الفاظ و من کان عندہ طیب فلا یضرہ ان یمس کے بارہ میں اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ یہ پیرایہ بیان وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی گناہ کا گمان ہوتا ہے لیکن خوشبو استعمال کرنا اور خاص طور پر جمعہ کے دن سُنّت موکدہ ہے لہٰذا اس موقعہ پر یہ پیرایہ بیان کیوں اختیار کیا گیا؟ تو جواب یہ ہوگا کہ بعض مسلمان یہ گمان کرتے تھے کہ خوشبو چونکہ عورتوں کے استعمال میں زیادہ آتی ہے اور عورتیں زیادہ تر اس کے استعمال کی عادی ہوتی ہیں اس لئے مردوں کے لئے اس کا استعمال مناسب نہ ہوگا چنانچہ اس گمان اور گناہ کی نفی اس پیرایہ بیان سے کی گئی ہے جیسا کہ طواف یعنی صفا و مروہ کی سعی ارکان حج میں سے ہے اور واجب ہے لیکن اس کے باوجود اس بارہ میں حق تعالیٰ نے یہ پیرایہ بیان اختیار فرمایا لَاجُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (یعنی اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ صفا و مروہ کی سعی کی جائے) حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے دن اور خاص طور پر غسل و وضو کے وقت مسواک ضرور استعمال کرنی چاہئے۔

جمعہ کے دن غسل کرنے اور خوشبو لگانے کی اہمیت

(۱۸) وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَقًّا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ اَنْ يَّغْتَسِلُوْا يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلْيَمَسَّ اَحَدُهُمْ مِنْ طِيْبِ اَهْلِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فَالْمَاءُ لَهٗ طِيْبٌ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت براءؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا مسلمانوں پر جمعہ کے دن نہانا واجب ہے نیز مسلمانوں کو چاہیے کہ ان میں کا ہر شخص اپنے گھر میں سے خوشبو لیکر استعمال کرے اور اگر کسی کو خوشبو میسر نہ ہو تو اس کے لئے پانی ہی خوشبو ہے" یہ روایت احمدؒ، ترمذیؒ نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے)۔"

تشریح: "من طیب اھله" اس لئے فرمایا گیا ہے کہ عورتیں اکثر خوشبو رکھتی ہیں اس سے گویا اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کسی کے پاس خوشبو نہ ہو تو وہ اپنی بیوی سے مانگ لے لیکن خوشبو زنانی یعنی ایسی نہ ہو کہ اس میں رنگ کی آمیزش ہو۔ فَالْمَاءُ لَهٗ طِيْبٌ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس خوشبو نہ ہو اور اس کے گھر میں بھی بیوی وغیرہ کے پاس نہ ملے تو وہ پانی سے نہالے کہ پانی بمنزلہ خوشبو کے ہے کیونکہ پانی پاکیزگی اور ستھرائی کا سبب ہے اور بدن کی بدبو اس سے جاتی رہتی ہے۔

یہ حدیث اور اوپر کی حدیث حضرت امام مالکؒ کے مسلک کی مؤید ہے کیونکہ ان کے نزدیک جمعہ کے دن غسل کرنا واجب ہے لیکن جمہور علماء کے نزدیک چونکہ جمعہ کے دن غسل واجب نہیں لہٰذا ان حضرات نے احادیث کو سُنّت پر محمول کیا ہے کیونکہ ان کے علاوہ دوسری اور بہت سی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ جمعہ کے دن غسل واجب نہیں ہے تاہم علماء لکھتے ہیں کہ جمعہ کے دن غسل نہ کرنا مکروہ ہے۔

بَابُ الْخُطْبَةِ وَالصَّلٰوةِ

خطبہ اور جمعہ کی نماز کا بیان

لغت میں خطبہ مطلقاً تقریر، گفتگو اور اس کلام کو کہتے ہیں کہ جس کے ذریعہ لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہو، لیکن شریعت کی اصطلاح میں "خطبہ" اس کلام اور مجموعہ الفاظ کو کہتے ہیں جو پند و نصائح، ذکر و ارشاد، درود و سلام اور شہادتین پر مشتمل ہو۔

نماز جمعہ میں خطبہ فرض اور شرط ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک خطبہ کی کم سے کم مقدار سبحان اللہ یا الحمد للہ یا لا الہ الا اللہ کہہ دینا ہے۔ اگرچہ آنحضرت ﷺ سے طویل خطبہ منقول ہے لیکن طویل خطبہ واجب یا سُنّت ہے شرط اور فرض نہیں ہے کہ بغیر طویل خطبہ کے جمعہ کی نماز درست نہ ہوتی ہو۔ مگر حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ طویل ذکر اور پند و نصیحت کہ جسے عرف عام میں خطبہ کہا جاتا ہے ضروری ہے محض سبحان اللہ یا الحمد للہ کہہ لینے کو خطبہ نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک دو خطبے نہ پڑھے جائیں خطبہ جائز ہی نہیں ہوتا۔ ان تمام ائمہ کے دلائل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نماز جمعہ کا وقت

① عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ یُصَلِّی الْجُمُعَةَ حِیْنَ تَمِیْلُ الشَّمْسُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ جمعہ کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جب کہ آفتاب ڈھل جاتا۔" (بخاریؒ)

تشریح: نماز جمعہ پڑھنے کے سلسلہ میں آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب سردی کا موسم ہوتا تھا تو آپ ﷺ آفتاب ڈھلتے ہی جمعہ کی نماز پڑھ لیتے تھے مگر شدید گرمی کے دنوں میں ٹھنڈے وقت پڑھتے تھے جیسا کہ آگے حضرت انسؓ کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوگا۔

② وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ مَاكُنَّا نُقِیْلُ وَلَا نَتَغَدّٰی اِلَّا بَعْدَ الْجُمُعَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر قیلولہ کرتے تھے اور کھانا کھاتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: دوپہر میں استراحت کرنے کو قیلولہ کہتے ہیں خواہ سویا جائے یا نہ سویا جائے۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ہم جمعہ کے روز دوپہر کے کھانے اور قیلولہ میں مشغول نہ رہتے تھے بلکہ سویرے سے نماز جمعہ کے لئے چلے جاتے تھے نماز کے بعد کھانا کھاتے اور قیلولہ کرتے تھے۔

③ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَدَّ الْبَرْدُ بَكَّرَ بِالصَّلٰوةِ وَاِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ اَبْرَدَ بِالصَّلٰوةِ یَعْنِی الْجُمُعَةَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ سخت سردی کے موسم میں جمعہ کی نماز سویرے سے پڑھ لیتے تھے اور جب شدید گرمی کے دن ہوتے تو دیر سے پڑھتے تھے۔" (بخاریؒ)

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جمعہ کی پہلی اذان نہیں ہوتی تھی

④ وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ یَزِیْدَ قَالَ كَانَ النِّدَاءُ یَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوَّلُهٗ اِذَا جَلَسَ الْاِمَامُ عَلَی الْمِنْبَرِ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِیْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ فَلَمَّا كَانَ عُثْمَانُ وَكَثُرَ النَّاسُ زَادَ النِّدَاءَ الثَّالِثَ عَلَی الزَّوْرَاءِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سائبؒ ابن یزید فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمرؓ کے زمانہ میں جمعہ کی پہلی اذان وہ ہوتی تھی جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی تھی مگر جب عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور لوگوں کی کثرت ہو گئی تو تیسری اذان کا اضافہ کیا گیا جو زوراء میں دی جاتی تھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں جمعہ کی اذان کے سلسلے میں معمول یہ تھا کہ جب آپ نماز جمعہ کے لئے تشریف لاتے اور منبر پر بیٹھتے تو اذان کہی جاتی تھی۔ جمعہ کی پہلی اذان جو نماز کا وقت شروع ہو جانے کے بعد کہی جاتی ہے اس وقت مقرر نہیں تھی۔ زمانہ

رسالت کے بعد حضرت ابوبکر و عمرؓ کے زمانہ خلافت میں بھی یہی معمول رہا۔ مگر جب حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے یہ دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ میں مسلمان تعداد میں کم تھے اور یہ بھی کہ مسجد کے قریب ہی سکونت پذیر تھے بلکہ اکثر مسلمان تو ہمہ وقت بارگاہ رسالت ہی میں حاضر رہتے تھے اور اب نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی ہے بلکہ اکثر مسلمان مسجد سے دور دراز علاقوں میں سکونت پذیر ہیں اور اپنے اپنے کاروبار میں مشغول رہتے ہیں تو انہوں نے یہ مناسب جانا کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان کہی جائے تاکہ جو لوگ دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں وہ بھی خطبہ میں حاضر ہو جائیں۔ اسی طرح اسی وقت سے اذان اول کہی جانے لگی۔ لہٰذا "تیسری اذان" سے مراد یہی پہلی اذان ہے کہ حدیث میں اس کو "تیسری اذان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ اذان وقوع کے اعتبار سے اول ہے کہ سب سے پہلے کہی جاتی ہے مگر آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں چونکہ مقرر شدہ دو اذانوں (یعنی ایک تو وہ اذان جو خطبہ کے وقت کہی جاتی ہے اور دوسری تکبیر) کے بعد یہ اذان مقرر ہوئی ہے اس لئے اسے "تیسری اذان" کہا جاتا ہے۔

بہر حال وہ اذان جو نماز جمعہ کے لئے سب سے پہلی کہی جاتی ہے حضرت عثمانؓ نے مقرر کی ہے اور وہ بھی سُنّت ہے اسے بدعت نہیں کہا جائے گا کیونکہ حضرات خلفاء راشدینؓ کا فعل اور ان کا مقرر کردہ طریقہ بھی سُنّت ہی میں شمار ہوتا ہے۔

اب تو غالباً کسی بھی جگہ طریقہ رائج نہیں ہے مگر پہلے بعض مقامات پر یہ معمول تھا کہ سنتیں پڑھنے کے وقت مزید ایک اذان کہی جاتی تھی جو نہ تو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مقرر تھی اور نہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے دور میں مقرر ہوئی اور نہ اکثر مسلم ممالک و بلاد میں اس وقت اذان کہی جاتی تھی نہ معلوم کس شخص نے یہ بدعت جاری کی تھی۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو نماز جمعہ کے لئے پہلی اذان ہو جانے کے بعد خرید و فروخت (یا کوئی بھی دنیاوی مشغولیت) حرام ہو جاتی ہے اور نماز جمعہ میں جلدی پہنچنے کے لئے اس کی تیاریوں اور اہتمام میں مشغول ہو جانا واجب ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ دو خطبے پڑھتے تھے اور دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے

⑤ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُطْبَتَانِ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَيُذَكِّرُ النَّاسَ فَكَانَتْ صَلَاتُهٗ قَصْدًا وَّخُطْبَتُهٗ قَصْدًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ دو خطبے پڑھا کرتے تھے اور دونوں (خطبوں) کے درمیان بیٹھتے تھے، ان خطبوں میں آپ قرآن کریم پڑھتے تھے اور لوگوں کو پند و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ نیز آپ ﷺ کی نماز بھی اوسط درجہ کی ہوتی تھی اور آپ کا خطبہ بھی اوسط درجہ کا ہوتا تھا نہ بہت زیادہ طویل ہوتا تھا اور نہ بالکل ہی مختصر۔" (مسلم)

تشریح: آپ دونوں خطبوں کے درمیان اس قدر بیٹھا کرتے تھے کہ جسم مبارک کا ہر ہر عضو اپنی اپنی جگہ پر آجاتا تھا۔ چنانچہ فقہاء نے دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنے کا صرف اتنا عرصہ مقرر کیا ہے کہ جس میں تین مرتبہ "سبحان اللہ" کہا جا سکے دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا واجب نہیں ہے بلکہ سُنّت ہے۔ یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ صحیح طور پر یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھ کر کوئی دعا پڑھتے تھے۔

مختصر مگر پُر تاثیر خطبہ خطیب کی دانائی کی علامت ہے

⑥ وَعَنْ عَمَّارٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ طُوْلَ صَلٰوةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهٖ مَئِنَّةٌ مِّنْ فِقْهِهٖ فَاَطِيْلُوا الصَّلٰوةَ وَاقْصُرُوا الْخُطْبَةَ وَاِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمارؓ کہتے ہیں کہ میں نے سرتاج دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لمبی نماز پڑھنی اور مختصر خطبہ پڑھنا آدمی کی دانائی کی

علامت ہے۔ لہٰذا تم نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کرو کیونکہ بعض بیان سحر (کی تاثیر لئے ہوئے ہوتا) ہے۔" (مسلم)

تشریح: خطبہ کی حالت میں لوگوں کی توجہ مخلوق (یعنی خطبہ پڑھنے والے) کی طرف ہوتی ہے جب کہ نماز کی حالت میں توجہ کا مرکز خالق (یعنی اللہ تعالیٰ) کی ذات ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث بالا بڑے ہی بلیغ انداز میں یہ بتانا چاہتی ہے کہ انسان کی سمجھ داری اور اس کی دانائی کا تقاضہ یہ ہونا چاہیے کہ اس حالت کو زیادہ دراز اور طویل کیا جائے جس میں بندہ کی توجہ اپنے خالق کی طرف ہو اور اس حالت کو مختصر کیا جائے جس میں توجہ مخلوق کی طرف منعطف ہو رہی ہو۔ لیکن اتنی بات سمجھ لیجئے کہ یہاں نماز طویل کرنے سے مراد یہ ہے کہ نماز سُنّت کے موافق ہو۔ یعنی نماز پڑھنے کے سلسلہ میں جو درجہ آنحضرت ﷺ سے منقول اور ثابت ہے نہ تو اس سے طویل ہو اور نہ اس سے مختصر ہی ہو۔ اس طرح اس حدیث میں اور اوپر والی حدیث میں مطابقت پیدا ہو جائے گی۔

وَاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ سِحْرًا (کیونکہ بعض بیان سحر ہے) گویا یہ خطبہ کو مختصر کرنے کے سلسلہ میں دلیل بیان کی جا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خطبہ ایسا پڑھنا چاہیے جو "قَلَّ وَدَلَّ" کا پورا پورا مصداق ہو۔ یعنی اس کے الفاظ مختصر ہوں مگر حقائق و معنی کے دریا اپنے اندر سموئے ہوئے ہو۔ کیونکہ جس طرح سحر کے مختصر ترین الفاظ میں بہت زیادہ تاثیر ہوتی ہے اسی طرح اس بیان اور اس تقریر میں بھی جو الفاظ کے معنی کے اعتبار سے جامع و مانع ہو، ایک عظیم تاثیر ہوتی ہے جس کی وجہ سے سامعین کے قلوب ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف مائل و منتقل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا حدیث کے ان الفاظ میں بیان و تقریر کی تعریف بھی ہے اور مذمت بھی بایں طور کہ اگر کوئی بیان سامعین کے قلوب و دماغ کو برائی کی طرف سے نیکی کی طرف مائل کر دے تو وہ اچھا ہے اور جو بیان سامعین کے ذہن و فکر کو نیکی کے راستہ سے ہٹا کر برائی کے راستہ پر موڑ دینے والا ہو وہ برا ہے۔

خطبہ ارشاد فرماتے وقت آنحضرت ﷺ کی کیفیت

(۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَطَبَ اِحْمَرَّتْ عَیْنَاهُ وَعَلَا صَوْتُهٗ وَاشْتَدَّ غَضَبُهٗ حَتّٰی کَاَنَّهٗ مُنْذِرُ جَیْشٍ یَقُوْلُ صَبَّحَکُمْ وَمَسَّاکُمْ وَیَقُوْلُ بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ کَهَاتَیْنِ وَیَقْرُنُ بَیْنَ اِصْبَعَیْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰی۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ جب (جمعہ کا یا کوئی اور) خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ ﷺ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور آواز بلند ہو جاتی اور غصہ تیز ہو جاتا تھا یہاں تک کہ (ایسا محسوس ہوتا) گویا آپ لوگوں کو (دشمن کے لشکر سے) ڈرا رہے ہوں اور فرما رہے ہوں کہ صبح و شام میں تم پر (دشمن کا لشکر ڈاکہ ڈالنے والا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ خطبہ میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے اور قیامت کو اس طرح ساتھ ساتھ بھیجا گیا ہے" یہ کہہ کر آپ اپنی دو انگلیوں یعنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملاتے۔" (مسلم)

تشریح: انوار جلال کبریائی کی تجلی اور اُمت مرحومہ کی تقصیرات کے مشاہدہ کی وجہ سے خطبہ کے وقت آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں اسی طرح اپنی اُمت کے غم و فکر کی وجہ سے یا یہ کہ سامعین کے کانوں تک اپنے الفاظ پہنچانے کے لئے آپ کی آواز بلند ہوتی تھیں تاکہ لوگوں کے قلوب متاثر ہوں۔ نیز اس وقت آپ کا غصہ اُمت کی اعتقادی و عملی بے راہ روی کے پیش نظر تیز ہو جاتا تھا۔

بہر حال حاصل یہ ہے کہ جس طرح اپنی قوم اور اپنے لشکر کی غفلت شعاریوں اور کوتاہیوں کو دیکھ کر اس کو دشمن کے خطرناک ارادوں اور منصوبوں سے ڈرانے والا اپنی آواز کو بلند کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور غصہ تیز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اپنی اُمت کی غفلت شعاریوں کے پیش نظر خطبہ کے وقت آنحضرت ﷺ کی یہ کیفیت و حالت ہوتی تھی۔

حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ "جس طرح بیچ کی انگلی شہادت کی انگلی سے تھوڑی سی بڑھی ہوئی ہے اسی طرح میں بھی قیامت سے بس تھوڑا ہی پہلے دنیا میں آیا ہوں۔ قیامت کے آنے کا وقت میری بعثت کے وقت سے متصل ہی ہے میرے بعد جلد ہی

قیامت آنے والی ہے۔

خطبہ میں آنحضرت قرآن کی آیتیں پڑھا کرتے تھے

(۸) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ عَلَى الْمِنْبَرِ وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت یعلیٰؓ ابن امیہ کہتے ہیں کہ میں نے سرتاج دو عالم ﷺ کو منبر پر یہ (آیت) پڑھتے ہوا سنا ہے یَامَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ اے سردار! تو اپنے پروردگار سے کہہ کہ وہ ہمارا کام تمام کرے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس آیت میں دوزخیوں اور دوزخ کے سردار کے سوال و جواب کا بیان ہے کہ دوزخی دوزخ کے عذاب کی شدت سے گھبرا کر سردار یعنی داروغہ دوزخ سے کہیں گے کہ اے سردار تم اپنے پروردگار سے عرض کرو کہ وہ ہمارا کام تمام کرے یعنی ہمیں موت دیدے تاکہ اس عذاب سے ہمیں چھٹکارا ہے" اس کے آگے داروغہ دوزخ کا جواب بھی مذکور ہے وہ کہے گا کہ إِنَّكُمْ مَاكِثُونَ یعنی موت اور اس عذاب سے چھٹکارا کی تمہاری تمام تمنائیں باطل اور بیکار ہیں تو تم ہمیشہ ہمیشہ اس آگ ہی میں جلتے اور اسی طرح عذاب میں مبتلا رہو گے"۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرانے کے لئے یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔

(۹) وَعَنْ أُمِّ هِشَامٍ بِنْتِ حَارِثَةَ بْنِ النُّعْمَانِ قَالَتْ مَا أَخَذْتُ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ إِلَّا عَنْ لِسَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُهَا كُلَّ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ إِذَا خَطَبَ النَّاسَ۔ (رواہ مسلم)

"حارثہ ابن نعمان کی بیٹی حضرت ام ہشامؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سورہ "قٓ والقران المجید" سرتاج دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے صرف اس طرح سیکھی ہے کہ آپ ہر جمعہ منبر پر جب لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرماتے تو یہ سورۃ پڑھا کرتے تھے (اور میں سن سن کر یاد کر لیتی تھی)۔" (مسلمؒ)

تشریح: چونکہ خطبہ میں یکبارگی آنحضرت ﷺ سے پوری سورۃ کا پڑھنا ثابت نہیں ہے اس لئے اس حدیث کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر جمعہ کے روز خطبہ میں اس سورۃ کے تھوڑے تھوڑے حصے تلاوت فرماتے ہوں گے۔ اسی طرح ام ہشام نے آپ سے ہر جمعہ میں تھوڑا تھوڑا سن کر پوری سورت یاد کر لی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

عمامہ باندھ کر خطبہ پڑھنا

(۱۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ قَدْ أَرْخَى طَرَفَيْهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو ابن حریثؓ کہتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے جمعہ کے روز اس حال میں خطبہ ارشاد فرمایا ہے کہ آپ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا جس کے دونوں کنارے آپ نے اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان چھوڑ رکھے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: ایک ضعیف حدیث میں منقول ہے کہ عمامہ باندھ کر پڑھی گئی نماز ان ستر نمازوں سے بہتر ہے جو بغیر عمامہ پڑھی گئی ہوں" بہر حال علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث بالا سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے روز زیبائش اختیار کرنا، اچھے اور عمدہ لباس زیب تن کرنا، سیاہ عمامہ باندھنا اور عمامہ کے دونوں کناروں کو دونوں مونڈھوں کے درمیان لٹکانا سنت ہے" میرکؒ کا قول اس حدیث کے بارہ میں یہ ہے کہ جس خطبہ کے بارے میں یہاں بتایا جا رہا ہے یہ خطبہ آپ ﷺ نے مرض موت میں ارشاد فرمایا تھا۔ زیلعیؒ کا کہنا ہے کہ سیاہ کپڑے کا استعمال کرنا سنت ہے۔ صاحب مدخل نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا عمامہ سات ہاتھ کا تھا۔ سیوطی نے ایسے صحابہ اور تابعین کا ذکر کیا

ہے جو سیاہ عمامہ باندھتے تھے ان میں انس ابن مالکؓ، عمار ابن یاسرؓ، معاویہؓ، ابودرداؓ، براءؓ، عبدالرحمٰن ابن عوفؓ، واثلہؓ، سعید ابن مسیبؒ، حسن بصریؒ، اور سعید ابن جبیرؒ وغیرہ شامل ہیں۔

نوویؒ نے لکھا ہے کہ عمامہ دونوں طریقوں سے باندھنا جائز ہے خواہ شملہ چھوڑا جائے یا نہ چھوڑا جائے۔ ان میں سے کوئی طریقہ مکروہ نہیں ہے۔

خطبہ کے وقت تحیۃ المسجد پڑھنے کا مسئلہ

(١١) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ يَخْطُبُ اِذَا جَآءَ اَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَۃِ وَالْاِمَامُ يَخْطُبُ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ وَلْيَتَجَوَّزْ فِيْھِمَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے روز (مسجد میں آئے) اور امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو دو رکعتیں پڑھ لے مگر دونوں رکعتیں ہلکی (یعنی مختصر) پڑھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ نے اس روایت کو "تحیۃ المسجد" پر محمول کیا ہے۔ ان کے نزدیک تحیۃ المسجد کی نماز واجب ہے اگرچہ امام خطبہ ہی کیوں نہ پڑھ رہا ہو۔ یہی مسلک امام احمدؒ کا بھی ہے۔ یہ دونوں حضرات اس حدیث کو اپنی دلیل بناتے ہیں کہ تحیۃ المسجد واجب ہے جب ہی تو آپ ﷺ نے خطبہ کے دوران بھی اس کے پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حنفیہ کے نزدیک تحیۃ المسجد جب کہ خطبہ کے علاوہ دوسرے اوقات میں ہی واجب نہیں ہے تو خطبہ کے دوران بطریق اولی واجب نہیں ہوگی چنانچہ حضرت امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ نیز جمہور صحابہؓ اور تابعینؒ ان کے ہم نوا ہیں۔

ان حضرات کی طرف سے اس حدیث کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ یہاں خطبہ سے مراد خطبہ کا ارادہ ہے۔ یعنی آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ دو رکعتیں اس وقت بھی پڑھی جا سکتی ہیں جب کہ امام خطبہ کے لئے اٹھ جائے اور خطبہ پڑھنے کا ارادہ کر رہا ہو نہ یہ کہ بالفعل خطبہ پڑھ ہی رہا ہو۔ اس تاویل کی بنیاد وہ قرائن اور صحیح احادیث ہیں جن سے خطبہ کے وقت حرمت نماز ثابت ہو چکی ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "جب امام (خطبہ کے لئے) نکلے (یعنی خطبہ پڑھنے کے لئے منبر کی طرف چلے) تو اس وقت نہ بات چیت درست ہے اور نہ نماز ہی درست ہے" نہ صرف یہ ارشاد نبوی ہے۔ بلکہ علیؓ اور حضرت عمرؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ بھی امام کے نکلنے کے بعد کلام اور نماز دونوں کو مکروہ جانتے تھے۔ لہٰذا قول صحابہؓ بھی حجت ہے اور ہمارے نزدیک اس کی تقلید واجب ہے اگر سُنّت سے منقول کوئی چیز اس کے معارض نہ ہو۔

اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے جو یہ روایت متعدد طرق سے منقول ہے کہ "ایک شخص مسجد میں اس وقت داخل ہوا جب کہ آنحضرت ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو اس شخص نے پوچھا کہ اے فلاں شخص! تم نے (تحیۃ المسجد کی) نماز پڑھی ہے؟ اس نے عرض کیا کہ "نہیں" آپ نے اس سے فرمایا کہ دو رکعت، نماز پڑھ لو اور مختصر پڑھو" تو اس کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا تھا جب کہ خطبہ کے وقت نماز کی ممانعت نہیں ہوئی تھی، یا یہ کہ یہ اجازت صرف اسی شخص کے لئے مخصوص تھی، بعض حضرات کی تحقیق تو یہ ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کے خطبہ شروع کرنے سے پہلے پیش آیا تھا۔

حضرت شیخ ابن ہمامؒ نے اس سلسلہ میں جو بات فرمائی ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اور ان احادیث میں جن سے خطبہ کے وقت نماز پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوئی ہے کوئی معارضہ اور اختلاف ہی لازم نہیں آتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جب یہ شخص مسجد میں داخل ہوا اور آپ ﷺ نے اس سے نماز پڑھنے کے لئے فرمایا تو آپ نے خطبہ روک دیا ہوگا۔ جب وہ شخص نماز سے فارغ ہو گیا ہوگا تب آپ ﷺ نے خطبہ مکمل فرمایا"

حضرت ابن ہمامؒ کی یہ بات محض قیاسی اور تاویل کے درجہ تک محدود نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صورت حال یہی ہوئی تھی چنانچہ دار قطنیؒ کی روایت نے بالکل واضح الفاظ میں یہ صراحت کی ہے کہ "آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ دو رکعت نماز پڑھو، پھر جب تک وہ شخص نماز سے فارغ نہیں ہوا آپ خاموش رہے (نماز سے فراغت کے بعد آپ نے پھر خطبہ مکمل فرمایا)۔

جس نے امام کے ساتھ ایک رکعت پائی اس نے پوری نماز پالی

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصَّلَاةِ مَعَ الْاِمَامِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلَاةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس شخص نے نماز کی ایک رکعت امام کے ساتھ پائی اس نے نماز پالی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حکم عام طور پر تمام نمازوں کے لئے ہے جمعہ ہی کے لئے مخصوص نہیں چنانچہ قسط نمبر ۴ میں کتاب الصلوۃ کے باب ماعلی الماموم میں تقریباً اسی مضمون کی یہ حدیث گذر چکی ہے کہ من ادرک رکعة فقد ادرک الصلوۃ اس کی وضاحت وہاں بھی کی جاچکی ہے۔ لیکن اس حدیث کو جو یہاں نقل کی جارہی ہے امام شافعیؒ نے جمعہ کی نماز کے ساتھ مخصوص و مقید کیا ہے اور اس کی بنیاد انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت پر رکھی ہے جو اسی باب کے آخر میں آرہی ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں لکھا ہے کہ "جس شخص کو جمعہ کی نماز میں امام کے ساتھ نماز کا جو حصہ بھی ملے اسے امام کے ساتھ ادا کرے اور اس حصہ پر جمعہ کی بناء کر کے بقیہ نماز پوری کرلے" اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ مَا اَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَافَاتَكُمْ فَاقْضُوْا یعنی نماز کا جو حصہ امام کے ساتھ پاؤ اسے ادا کرو اور جو کچھ رہ جائے اسے پورا کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص جمعہ کی نماز میں بالکل آخر میں اس حال میں شریک ہوا کہ امام التحیات میں تھا یا سجدہ سہو میں تھا تو اسے چاہیے کہ وہ اسی حالت میں جماعت میں شریک ہوجائے اور امام کے ساتھ اسے نماز جمعہ کا جو بھی حصہ ہاتھ لگا ہے اسی پر جمعہ کی بناء کر کے بقیہ نماز پوری کرلے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت امام ابویوسف رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ البتہ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص امام کے ساتھ جمعہ کی دوسری رکعت کا اکثر حصہ پائے تو اسے اس حصہ پر جمعہ کی بناء کرنی چاہئے۔ لیکن جس شخص کو دوسری رکعت کا اکثر حصہ نہ ملے تو وہ اس پر جمعہ کی بناء نہ کرے بلکہ ظہر کی بناء کرے۔

دوسری رکعت کا اکثر حصہ پانے سے مراد دوسری رکعت کا رکوع پانا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص دوسری رکعت کے رکوع میں بھی شریک ہوگیا تو اسے اکثر حصہ مل گیا اور اگر امام کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد وہ جماعت میں شریک ہوا تو اسے اکثر حصہ پانا نہیں کہیں گے۔

شیخ ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ نے اپنے مذکورہ بالا مسلک کی بنیاد جس حدیث پر رکھی ہے وہ حدیث بھی مطلق ہے جمعہ کے ساتھ اس کی تخصیص نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آنحضرت ﷺ کے خطبہ پڑھنے کا طریقہ

⑬ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَخْطُبُ خُطْبَتَیْنِ كَانَ یَجْلِسُ اِذَا صَعِدَ الْمِنْبَرَ حَتّٰى یَفْرُغَ اَرَاهُ الْمُؤَذِّنُ ثُمَّ یَقُوْمُ فَیَخْطُبُ ثُمَّ یَجْلِسُ وَلَا یَتَكَلَّمُ ثُمَّ یَقُوْمُ یَخْطُبُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ سرتاج دوعالم ﷺ دو خطبے اس طرح پڑھا کرتے تھے (کہ) جب آپ منبر پر چڑھتے تو (پہلے) بیٹھتے یہاں تک کہ فارغ ہوتا، راوی کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ کہا تھا کہ "یہاں تک کہ موذن فارغ ہوتا" پھر آپ اٹھتے اور (پہلا) خطبہ ارشاد فرماتے، پھر تھوڑی سی دیر بیٹھتے (لیکن اس بیٹھنے کے درمیان) کوئی کلام نہ کرتے، پھر کھڑے ہوتے اور (دوسرا) خطبہ ارشاد فرماتے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ اذا صعد المنبر کے پیش نظر علماء نے کہا ہے کہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا مستحب ہے۔ دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار کے بارہ میں علامہ ابن حجرؒ کا ارشاد ہے کہ اولی یہ ہے کہ سورہ اخلاص پڑھنے کے بقدر بیٹھنا چاہئے "کوئی کلام نہ کرتے" کا مطلب یہ ہے کہ دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنے کے عرصہ میں نہ تو آپ ﷺ دعا کرتے تھے اور نہ کچھ پڑھتے تھے۔

مسئلہ یہ ہے کہ دوسرے خطبہ میں نبی کریم ﷺ کے آل و اصحاب و ازواج مطہرات خصوصا خلفاء راشدین اور حضرت حمزہؓ و عباسؓ کے لئے دعا کرنا مستحب ہے، بادشاہ وقت کے لئے بھی دعا کرنا جائز ہے۔ لیکن "شرح منیہ" میں لکھا ہے کہ بادشاہوں کی ایسی تعریف کرنا جو غلط ہو اور ان کے ایسے اوصاف بیان کرنا جن سے وہ متصف نہ ہوں اشد مکروہ (یعنی مکروہ تحریمی) ہے کیونکہ اس طرح عبادت کے ساتھ گناہ یعنی جھوٹ کو ملانا لازم آتا ہے۔ اس مسئلہ کی شدت اس سے بخوبی واضح ہوتی ہے کہ ہمارے بعض ائمہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہمارے زمانہ کے بادشاہوں کو عادل کہنا حدود کفر کے قریب ہو جاتا ہے۔

حدیث میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ "آنحضرت ﷺ دونوں خطبوں کے درمیان کلام نہ کرتے تھے" تو اس کے بارہ میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تو وہی تشریح کی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے شرح طیبی سے نقل کیا ہے کہ دونوں خطبوں کے درمیان قرآن کی آیتیں پڑھنا اولی ہے کیونکہ حضرت ابن حبان کی ایک روایت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھتے تو کتاب اللہ کی آیتیں پڑھا کرتے تھے چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس عرصہ میں سورۂ اخلاص پڑھنا مستحب ہے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے اس جملہ کی تشریح کے وقت حضرت شیخ عبدالحق کے سامنے یہ روایت نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔

خطبہ کے وقت نمازی خطیب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھیں

(۱۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَوٰى عَلَى الْمِنْبَرِ اسْتَقْبَلْنَاهُ بِوُجُوْهِنَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ مُحَمَّدِ ابْنِ الْفَضْلِ وَهُوَ ضَعِيْفٌ ذَاهِبُ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے کہ سرتاج دوعالم ﷺ جب (خطبہ کے وقت) منبر پر تشریف فرما ہوتے تو ہم اپنے منہ آپ ﷺ کی طرف متوجہ کر لیتے" امام ترمذیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کو ہم بجز محمد ابن فضل کی سند کے اور کسی سند سے نہیں جانتے اور وہ ضعیف ہیں انہیں حدیث یاد نہیں رہتی تھی۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ خطبہ کے وقت خطبہ سننے کے لئے اپنے منہ خطیب کی طرف کر کے بیٹھیں۔ اسی طرح خطیب بھی لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر خطبہ پڑھے۔

حنفیہ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ جب خطیب خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھے تو لوگوں کو سلام نہ کرے مگر حضرت امام شافعیؒ و امام احمدؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے

(۱۵) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ قَائِمًا ثُمَّ يَجْلِسُ ثُمَّ يَقُوْمُ فَيَخْطُبُ قَائِمًا فَمَنْ نَبَّاكَ اَنَّهُ كَانَ يَخْطُبُ جَالِسًا فَقَدْ كَذَبَ فَقَدْ وَاللّٰهِ صَلَّيْتُ مَعَهُ اَكْثَرَ مِنْ اَلْفَي صَلَاةٍ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت جابرؓ ابن سمرہ کہتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ کھڑے ہو کر (پہلا) خطبہ ارشاد فرماتے پھر بیٹھتے، پھر (دوسرا) خطبہ (بھی) کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے لہٰذا تم سے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آنحضرت ﷺ بیٹھ کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو بلاشبہ وہ شخص جھوٹا ہے خدا کی قسم! میں نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ دو ہزار سے زیادہ نمازیں پڑھی ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "دو ہزار سے زائد نمازوں" سے صرف جمعہ کی نمازیں مراد نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جمعہ اور جمعہ کے علاوہ دوسری دو ہزار سے زائد نمازیں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ پڑھی ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے سب سے پہلا جمعہ مدینہ میں آکر پڑھا ہے اور مدینہ میں آپ کی کل مدت اقامت دس سال تھی لہٰذا اس طرح آپ ﷺ کی حیات میں تمام جمعوں کی تعداد پانچ سو سے زائد نہیں ہوتی بہر حال حضرت جابرؓ کا مقصد آنحضرت ﷺ کے ساتھ معیت و رفاقت کی کثرت بیان کرنا ہے۔

شرح منیہ میں یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ جو شہر جنگ و جدل سے اور بذریعہ تلوار فتح ہوا ہو جیسا کہ مکہ فتح ہوا تھا تو وہاں خطیب تلوار کے ساتھ خطبہ پڑھے اور جس شہر کے باشندے بخوشی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں جیسے مدینہ تو وہاں بغیر تلوار کے خطبہ پڑھنا چاہیے۔ ینابیع میں لکھا ہے کہ دوسرا خطبہ پہلے خطبہ کی بہ نسبت کم آواز سے پڑھنا چاہیے۔

(۱۶) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ اَنَّهُ دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اُمِّ الْحَكَمِ يَخْطُبُ قَاعِدًا فَقَالَ انْظُرُوْا اِلٰى هٰذَا الْخَبِيْثِ يَخْطُبُ قَاعِدًا وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عجرہؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ (ایک مرتبہ جمعہ کے روز) مسجد میں (اس وقت) داخل ہوئے جب کہ عبدالرحمٰن ابن ام الحکم (جو بنی امیہ میں سے تھا بیٹھ کر خطبہ پڑھ رہا تھا، کعب ابن عجرہ نے کہا کہ (ذرا) اس خبیث کی طرف دیکھو بیٹھ کر خطبہ پڑھ رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا یعنی جب لوگوں سوداگری یا کھیل دیکھتے ہیں تو اس کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور آپ ﷺ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: سرکار دو عالم ﷺ کے مقدس زمانہ میں ایک مرتبہ مدینہ میں سخت قحط پڑا، اہل مدینہ سخت پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہوئے، انہیں دنوں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضرت ﷺ جمعہ کے روز منبر پر کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ناگہاں ایک قافلہ تجارت شام سے مدینہ میں داخل ہوا۔ صحابہ کرام جو فاقہ کشی اور بھوک سے بے حد بے حال و لاغر ہو رہے تھے خطبہ نبی کے دوران ہی اس قافلہ کو دیکھنے کے لئے اضطراراً مسجد سے باہر چلے گئے کچھ صحابہ جن کی تعداد بارہ تھی بدستور مسجد میں بیٹھے خطبہ سنتے رہے جب ہی آیت بالا نازل ہوئی حضرت کعبؓ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اللہ جل شانہ، کے اس قول سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ خطبہ کھڑے ہو کر پڑھا جاتا ہے اور صحیح احادیث سے بھی یہی ثابت ہے۔ اس کے باوجود جو یہ شخص بیٹھ کر خطبہ پڑھ رہا ہے تو اس کے خبث باطن میں کیا شک ہے۔

بہر حال آیت بالا کے الفاظ "آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں" سے یہ بات واضح ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے، چنانچہ امام شافعیؒ کے نزدیک کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا خطبہ کی شرط ہے جب کہ حنفیہ کے نزدیک سُنّت ہے۔

جمعہ اور خطبہ کے اوقات: جمعہ کی صحیح ادائیگی کے شرائط میں سے ایک شرط وقت ہے چنانچہ جمعہ کی نماز وقت کے بعد بخلاف دوسری

نمازوں کے صحیح نہیں ہوتی۔ جمعہ کا وقت وقت ظہر ہے چنانچہ جمعہ کی نماز وقت سے پہلے جائز نہیں ہے مگر حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک درست ہے۔ اسی طرح عصر کا وقت شروع ہو جانے کے بعد بھی نماز جمعہ جائز نہیں ہے مگر حضرت امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے۔

حدیث بالا اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ حرام یا مکروہ چیزوں کے ارتکاب کرنے والے پر سختی کرنا یا اس کے ساتھ غصہ کا معاملہ کرنا جائز ہے اس لئے کہ اس چیز کے خلاف عمل کرنا جس کی مداومت آنحضرت ﷺ سے ثابت ہو چکی ہے خبث باطن کی نشانی ہے۔

خطبہ کے وقت ہاتھوں کو بلند نہ کرنا چاہئے

⑰ وَعَنْ عُمَارَةَ بْنِ رُوَيْبَةَ اَنَّهٗ رَاٰی بِشْرَ بْنَ مَرْوَانَ عَلَی الْمِنْبَرِ رَافِعًا يَدَيْهِ فَقَالَ قَبَّحَ اللّٰهُ هَاتَيْنِ الْيَدَيْنِ لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَزِيْدُ عَلٰی اَنْ يَّقُوْلَ بِيَدِهٖ هٰكَذَا وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهِ الْمُسَبِّحَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمارہ ابن رویبہ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے (ایک مرتبہ) بشر ابن مروان کو منبر پر (خطبہ کے وقت) اپنے ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے دیکھا (جیسا کہ آجکل مقررین و واعظین دوران تقریر جوش خطابت میں اپنے ہاتھوں کو بلند کرتے ہیں) تو فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کا ستیاناس کرے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے اس سے زیادہ اشارہ نہیں کرتے تھے۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ حضرت عمارہ نے جب بشر کو دیکھا کہ وہ طریقہ سنّت کے خلاف اپنے ہاتھوں کو زیادہ بلند کر رہا ہے تو انہیں بہت زیادہ ناگواری ہوئی جس کا انہوں نے ان الفاظ میں اظہار فرمایا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ آنحضرت ﷺ صرف اس قدر اشارہ کرتے تھے اور وہ بھی اس لئے کرتے تھے تاکہ لوگ پوری دل جمعی کے ساتھ مخاطب ہوں اور خطبہ سننے کی طرف راغب ہوں۔ نیز خطبہ کے فرمودات پر عمل پیرا ہونے کا ولولہ اور جذبہ پیدا ہو۔

آنحضرت ﷺ کا خطبہ کے وقت منبر پر کھڑے ہو کر ابن مسعودؓ کو مسجد میں بلانا

⑱ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا اسْتَوٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَی الْمِنْبَرِ قَالَ اجْلِسُوْا فَسَمِعَ ذٰلِكَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ فَجَلَسَ عَلٰی بَابِ الْمَسْجِدِ فَرَاٰهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ تَعَالَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ (ایک مرتبہ) جمعہ کے روز (خطبہ کے لئے) منبر پر کھڑے ہوئے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ (خطبہ سننے کے لئے بیٹھ جاؤ۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے جب یہ ارشاد سنا تو وہ مسجد کے دروازہ ہی پر بیٹھ گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھا تو فرمایا کہ عبداللہ ابن مسعود یہاں آجاؤ۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ منبر پر خطبہ کے لئے کھڑے ہونے کی صورت میں کلام کرنا جائز ہے مگر حنفیہ کے نزدیک خطیب کے لئے خطبہ کی حالت میں کلام کرنا جائز نہیں ہے بشرطیکہ وہ کلام امر بالمعروف کے طور پر نہ ہو (مگر خطیب کو چاہئے کہ امر بالمعروف کے سلسلہ میں اگر کسی سے کچھ کہے تو عربی زبان میں کہے اگر کسی اور زبان میں کہے گا تو مکروہ ہوگا)

حضرت علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب خطبہ کے لئے منبر پر کھڑے ہوتے تو آپ ﷺ نے حاضرین میں سے کسی کو اس وقت نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتے دیکھ لیا چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بیٹھنے کا حکم فرمایا کیونکہ خطبہ کے لئے منبر پر خطیب کے بیٹھنے کے وقت، نماز پڑھنی حرام ہے جیسا کہ تمام علما کا متفقہ مسلک ہے۔

جمعہ کی نماز نہ ملنے کی صورت میں ظہر کی نماز پڑھ لینے کا مسئلہ

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْرَكَ مِنَ الْجُمُعَةِ رَكْعَةً فَلْیُصَلِّ اِلَیْهَا اُخْرٰی وَمَنْ فَاتَتْهُ الرَّكْعَتَانِ فَلْیُصَلِّ اَرْبَعًا اَوْقَالَ الظُّهْرَ۔ (رواہ الدار قطنی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو جمعہ کی ایک رکعت (امام کے ساتھ مل جائے تو وہ اس کے ساتھ دوسری رکعت ملائے (یعنی دوسری رکعت تنہا کھڑا ہو کر پوری کرے) اور جس شخص کو دونوں رکعتیں نہ ملیں تو اسے چاہئے کہ وہ چار رکعت پڑھے یا فرمایا کہ ظہر پڑھے۔" (دار قطنی)

تشریح: اگرچہ نوویؒ نے وضاحت کی ہے کہ یہ حدیث ضعف سے خالی نہیں ہے تاہم اگر اس حدیث کو صحیح تسلیم بھی کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس شخص کو جمعہ کی دونوں رکعتوں سے مطلقاً کچھ بھی ہاتھ نہ لگے تو وہ ظہر کی چار رکعت پڑھ لے۔ اس مسئلہ کی وضاحت حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت کی تشریح کے ضمن میں جو اس باب کے پہلی فصل کے آخر میں گذری ہے بیان کی جا چکی ہے۔

بَابُ صَلٰوةِ الْخَوْفِ

نماز خوف کا بیان

کفار کے خوف اور دشمن کے مقابل ہونے کے وقت جو نماز پڑھی جاتی ہے اسے نماز خوف کہتے۔ خوف کی نماز کتاب وسُنّت سے ثابت ہے۔ نیز اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد یہ نماز باقی اور ثابت ہے اگرچہ بعض حضرات کا قول ہے کہ نماز خوف صرف آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک ہی کے ساتھ مخصوص تھی۔ نیز بعض حضرات مثلاً حضرت امام مالکؒ کے نزدیک یہ نماز حالت سفر کے ساتھ مخصوص ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ نماز سفر و حضر دونوں صورتوں میں جائز ہے۔

بحسب اختلاف زمانہ و مقام یہ نماز متعدد طریقوں پر روایت کی گئی ہے چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ سولہ طریقوں سے منقول ہے۔ بعض حضرات نے اس سے زائد اور بعض نے اس سے کم کہا ہے لیکن علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ احادیث میں جتنے بھی طریقے منقول ہیں تمام کے تمام معتبر ہیں علماء کے یہاں اختلاف صرف ترجیح اور فوقیت کے بارہ میں ہے کہ کسی نے کسی طریقے کو ترجیح دی ہے اور اس پر عمل کیا ہے جو صحاح ستہ میں مذکور ہے۔

علامہ شمنیؒ نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز خوف چار جگہ پڑھی ہے۔ ذات الرقاع، بطن نخل، عسفان اور ذی قرد۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ نماز خوف تھی تو حالت سفر میں مگر فقہاء نے اس پر قیاس کرتے ہوئے اس نماز کو حضر میں بھی جائز رکھا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دشمن کے مدمقابل ہونے کی صورت میں آنحضرت ﷺ کی نماز اور جماعت

(۱) عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قِبَلَ نَجْدٍ فَوَازَیْنَا الْعَدُوَّ فَصَافَفْنَا لَهُمْ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ لَنَا فَقَامَتْ طَائِفَةٌ مَّعَهٗ وَاَقْبَلَتْ طَائِفَةٌ عَلَی الْعَدُوِّ وَرَكَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْ مَّعَهٗ وَسَجَدَ سَجْدَتَیْنِ ثُمَّ انْصَرَفُوْا مَكَانَ الطَّائِفَةِ الَّتِیْ لَمْ تُصَلِّ فَجَاءُوْا فَرَكَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِهِمْ رَكْعَةً وَّسَجَدَ سَجْدَتَیْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ كُلُّ وَّاحِدٍ مِّنْهُمْ فَرَكَعَ لِنَفْسِهٖ رَكْعَةً

وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ وَرَوٰى نَافِعٌ نَحْوَهُ وَزَادَ فَإِنْ كَانَ خَوْفٌ هُوَ اَشَدُّ مِنْ ذٰلِكَ صَلُّوْا رِجَالًا قِيَامًا عَلٰى اَقْدَامِهِمْ اَوْرُكْبَانًا مُسْتَقْبِلِى الْقِبْلَةِ اَوْغَيْرَ مُسْتَقْبِلِيْهَا قَالَ نَافِعٌ لَا اَرَى ابْنَ عُمَرَ ذَكَرَ ذٰلِكَ اِلَّا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(رواہ البخاری)

"حضرت سالم ابن عبداللہ ابن عمرؓ اپنے والد (حضرت عبداللہ ابن عمرؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم (ایک مرتبہ) سرتاج دو عالم ﷺ کے ہمراہ نجد کی طرف جہاد کے لئے گئے (جب) ہم دشمنوں کے سامنے ہوئے تو ہم نے ان (سے مقابل) ہونے کے لئے صفیں باندھ لیں، آنحضرت ﷺ ہمیں نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک جماعت آپ کے ساتھ (نماز کے لئے) کھڑی ہوئی اور دوسری جماعت دشمن کے مدمقابل کھڑی رہی، آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ جو آپ ﷺ کے ہمراہ (نماز کی جماعت میں) شریک تھے ایک رکوع کیا اور دو سجدے کئے پھر وہ لوگ (جو آپ ﷺ کے ہمراہ نماز میں تھے) ان لوگوں کی جگہ چلے گئے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی تھی (اور دشمن کے مدمقابل کھڑے تھے) جن لوگوں نے نماز نہیں پڑھی تھی وہ آئے (اور آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نماز میں شریک ہوگئے) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کے ہمراہ ایک رکوع اور دو سجدے کئے پھر سلام پھیرا۔ اور یہ لوگ کھڑے ہوگئے اور ہر ایک نے اپنا اپنا ایک ایک رکوع اور دو دو سجدے کر لئے"۔ نافعؒ نے بھی اسی طرح روایت بیان کی ہے۔ مگر انہوں نے اتنا اور زیادہ بیان کیا ہے کہ "اگر (عین جنگ کی حالت ہو اور) خوف اس سے بھی زیادہ ہو (کہ مذکورہ بالا طریقہ سے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو) تو لوگ پیادہ کھڑے کھڑے یا (پیادہ نہ ہو سکیں تو) سواری پر (اگر ممکن ہو تو) قبلہ کی طرف (اور اگر ممکن نہ ہو تو) کسی بھی طرح رخ کر کے نماز پڑھ لیں" حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ الفاظ آنحضرت ﷺ سے ہی نقل کئے ہوں گے۔" (بخاری)

تشریح: "نجد" بلند زمین کو کہتے ہیں یہاں نجد سے مراد نجد حجاز ہے۔ نجد یمن مراد نہیں ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تعدد جماعت یعنی کئی کئی مرتبہ جماعت کرنا مکروہ ہے خصوصاً جب کہ تمام نمازی حاضر ہوں۔ ایسے ہی یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ فرض نماز نفل نماز پڑھنے والے کے پیچھے جائز نہیں ہوتی ورنہ تو آنحضرت ﷺ دونوں جماعتوں کو الگ الگ دو دو مرتبہ نماز پڑھاتے نیز جماعت کے واجب ہونے کی بھی یہ حدیث دلیل ہے کہ ایسی حالت میں بھی جب کہ دشمن کا لشکر مدمقابل ہو جماعت نہ چھوڑی جائے۔

حضرت ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا طریقہ سے نماز خوف کی ادائیگی اس وقت ضروری ہوتی ہے جب کہ سب لوگ ایک ہی شخص کو امام بنانے پر مصر ہوں۔ اگر ایسی صورت حال نہ ہو تو پھر افضل یہ ہے کہ ایک امام ایک جماعت کو پوری نماز پڑھائے اور دوسرا امام دوسری جماعت کو پوری نماز پڑھائے۔

حدیث کے الفاظ فقام کل واحد منهم (اور یہ لوگ کھڑے ہوگئے الخ) کی تفصیل و تشریح علماء حنفیہ میں سے بعض شارحین نے یہ بیان کی ہے کہ یہ جماعت جو بعد میں آکر نماز میں شریک ہوئی تھی آنحضرت ﷺ کے سلام پھیرنے کے بعد دشمن کی مقابلہ پر چلی گئی اور پہلی جماعت جو پہلی رکعت میں شریک ہوئی تھی وہاں سے اپنی جگہ یعنی نماز پڑھنے آگئی اور تنہا تنہا اپنی بقیہ نماز پوری کی اور سلام پھیر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی گئی اس کے بعد پھر دوسری جماعت یہاں آگئی اور اس نے بھی تنہا اپنی بقیہ نماز پوری کی اور سلام پھیر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی گئی۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ بعض علماء سے یہی تفصیل اور طریقہ منقول ہے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ اگرچہ یہ تفصیل حدیث میں وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کی گئی ہے اور نہ صراحت کے ساتھ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن حضرت ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا ایک جز ثابت ہوتا ہے اور وہ یہ کہ پہلی جماعت ایک رکعت پڑھ کر چلی جائے اور دوسری جماعت دوسری رکعت میں آکر امام کے ساتھ شریک ہو اور اس دوسری جماعت کی موجودگی میں امام اپنی نماز پوری کر

کے سلام پھیر دے۔ البتہ حضرت امام اعظمؒ کا پورا مسلک اور ان کا نقل کردہ پورا طریقہ ایک دوسری روایت سے ثابت ہوتا ہے جو حضرت ابن عباسؓ پر موقوف ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہ مسلک اور ان کی روایت حضرت امام محمدؒ نے اپنی کتاب الآثار میں نقل کی ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات سمجھ لینا چاہئے کہ نماز خوف کے بارہ میں حضرت امام اعظمؒ کا جو مسلک ہے اور انہوں نے جو تفصیل بیان کی ہے وہ حدیث موقوف سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ اس باب میں عقل کو کوئی دخل نہیں لہٰذا حدیث موقوف بھی حدیث مرفوع کے درجہ میں ہوگی۔

اور پھر یہ کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ بھی ہے کہ صورت مذکورہ میں پہلی جماعت اپنی نماز بغیر قرات کے لاحق کی طرح پوری کرے اور دوسری جماعت قرات کے ساتھ پوری کرے جیسا کہ مسبوق اپنی نماز قرات کے ساتھ پوری کرتے ہیں لیکن یہ صورت اس وقت کی ہے جب کہ نماز حالت سفر میں پڑھی جا رہی ہو اور امام مسافر ہو یا نماز دو رکعت والی نماز ہو اور اگر امام مقیم ہو اور نماز چار رکعت والی ہو تو دونوں جماعتوں سے ہر ایک جماعت امام کے ساتھ دو دو رکعت پڑھے گی۔ لیکن نماز اگر تین رکعت والی ہو جیسے مغرب کی تو خواہ سفر ہو یا حضر دونوں صورتوں میں پہلی جماعت امام کے ساتھ دو رکعت پڑھے گی اور دوسری جماعت ایک رکعت اور ہر جماعت اپنی اپنی نماز مذکورہ بالا طریقہ سے پوری کرے گی۔

حدیث کے آخری الفاظ قیاما علی اقدامھم سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نمازی رکوع اور سجدہ ترک کر دیں۔ یعنی مذکورہ بالا صورت میں جب کہ لوگ پیادہ کھڑے کھڑے یا سواری پر نماز پڑھیں تو رکوع اور سجدہ سر کے اشارہ سے کر لیں نماز خوف کے سلسلہ میں مذکورہ بالا طریقہ اگرچہ خلاف قیاس ہے کیونکہ خود حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک چلنا، سوار ہونا اور لڑنا نماز کو فاسد کر دیتا ہے۔ پھر یہ کہ اس صورت میں نہ صرف کہ عمل کثیر بہت ہوتا ہے بلکہ قبلہ سے بھی انحراف ہوتا ہے لیکن چونکہ قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ کی احادیث صحیحہ میں نماز خوف اور اس کا طریقہ وارد ہو گیا ہے۔ اس لئے اسے مشروع رکھا گیا ہے۔

نماز خوف کا ایک اور طریقہ

(۲) وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ رُوْمَانَ عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ عَمَّنْ صَلّٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ ذَاتِ الرِّقَاعِ صَلَاةَ الْخَوْفِ اَنَّ طَائِفَةً صَفَّتْ مَعَهٗ وَطَائِفَةٌ وِجَاهَ الْعَدُوِّ فَصَلّٰى بِالَّتِيْ مَعَهٗ رَكْعَةً ثُمَّ ثَبَتَ قَائِمًا وَاَتَمُّوْا لِاَنْفُسِهِمْ ثُمَّ انْصَرَفُوْا فَصَفُّوْا وِجَاهَ الْعَدُوِّ وَجَاءَتِ الطَّائِفَةُ الْاُخْرٰى فَصَلّٰى بِهِمُ الرَّكْعَةَ الَّتِيْ بَقِيَتْ مِنْ صَلَاتِهٖ ثُمَّ ثَبَتَ جَالِسًا وَاَتَمُّوْا لِاَنْفُسِهِمْ ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَاَخْرَجَ الْبُخَارِيُّ بِطَرِيْقٍ اٰخَرَ عَنِ الْقَاسِمِ عَنْ صَالِحِ ابْنِ خَوَّاتٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِيْ حَثْمَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

"اور حضرت یزید ابن رومان حضرت صالح ابن خوات سے اور وہ اس شخص سے جس نے سرتاج دوعالم ﷺ کے ہمراہ ذات الرقاع کے دن نماز خوف پڑھی تھی (نماز خوف کا یہ طریقہ) نقل کرتے ہیں کہ (اس دن) ایک جماعت نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ (نماز کے لئے) صف بندی کی اور دوسری جماعت دشمن کے مقابل صف آرا ہو گئی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس جماعت کے ہمراہ جو آپ ﷺ کے ساتھ تھی ایک رکعت نماز پڑھ کر آنحضرت ﷺ کھڑے رہے اور اس جماعت نے خود اپنی نماز پوری کی (یعنی دوسری رکعت جماعت نے خود تنہا پڑھی) پھر اس کے بعد یہ جماعت (نماز سے فارغ ہو کر) واپس ہوئی اور دشمن کے مقابل صف آرا ہو گئی اور وہ جماعت جو دشمن کے مقابل صف آرا تھی (نماز کے لئے) آئی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے وہ دوسری رکعت جو باقی رہ گئی تھی اس جماعت کے ساتھ پڑھی اور (التحیات میں) بیٹھے رہے اور پھر اس جماعت نے اپنی وہ پہلی رکعت جو باقی تھی تنہا ادا کی اور التحیات میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ شریک ہو گئی پھر آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ) بخاریؒ نے اس روایت کو ایک اور سند کے ساتھ نقل کیا ہے یعنی

طرح کہ "قاسم صالح ابن خوات" سے اور وہ حضرت سہل ابن ابی حثمہ سے اور وہ آنحضرت ﷺ سے نقل کرتے ہیں۔

تشریح: "ذات الرقاع" کے دن جس شخص نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھی تھی ان کا نام سہل ابن ابی حثمہ ہے کیونکہ محمد ابن قاسم نے صلوٰۃ الخوف کی حدیث صالح ابن خوات سے اور انہوں نے حضرت سہل ابن ابی حثمہ سے نقل کی ہے جیسا کہ بخاری کی روایت میں بیان کیا گیا ہے۔

"ذات الرقاع" ایک غزوہ کا نام ہے جو ۵ھ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ کفار کے مقابلہ کے لئے گئے مگر بغیر جنگ کئے ہوئے واپسی ہوئی۔ اسی موقع پر یہ نماز پڑھی گئی تھی۔

اس غزوہ کو "ذات الرقاع" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس وقت جو مسلمان غزوہ میں شریک ہونے کے لئے میدان جہاد کی طرف گئے تھے وہ ننگے پاؤں تھے جس کی وجہ سے ان کے پاؤں میں سوراخ ہو گئے تھے اور ناخن ٹوٹ گئے تھے چنانچہ ان مجاہدین نے اپنے پیروں پر رقاع یعنی چیتھڑے لپیٹ لئے تھے اسی مناسبت سے یہ غزوہ "ذات الرقاع" (یعنی چیتھڑوں والا) کے نام سے مشہور ہوا۔

اس حدیث میں نماز خوف کا جو طریقہ نقل کیا گیا ہے یہ ایک اور طریقہ ہے اس میں بھی ہر جماعت نے ایک ایک رکعت آنحضرت ﷺ کے ہمراہ پڑھی اور ایک ایک رکعت تنہا پوری کی۔ لیکن یہاں فرق یہ ہے کہ ہر ایک جماعت نے جو ایک ایک رکعت تنہا پڑھی وہ آنحضرت ﷺ کے نماز میں رہنے کے دوران ہی پڑھی جب کہ پہلے طریقہ میں ہر ایک جماعت نے اپنی اپنی ایک رکعت نماز آنحضرت ﷺ کے نماز سے فارغ ہونے کے بعد پڑھی تھی۔ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے جو اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا حلم

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَقْبَلْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اِذَا كُنَّا بِذَاتِ الرِّقَاعِ قَالَ كُنَّا اِذَا اَتَيْنَا عَلٰى شَجَرَةٍ ظَلِيْلَةٍ تَرَكْنَاهَا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَجَاءَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَسَيْفُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُعَلَّقٌ بِشَجَرَةٍ فَاَخَذَ سَيْفَ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاخْتَرَطَهٗ فَقَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَخَافُنِيْ قَالَ لَا قَالَ فَمَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّيْ قَالَ اللّٰهُ يَمْنَعُنِيْ مِنْكَ قَالَ فَتَهَدَّدَهٗ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَغَمَدَ السَّيْفَ وَعَلَّقَهٗ قَالَ فَنُوْدِيَ بِالصَّلٰوةِ فَصَلّٰى بِطَائِفَةٍ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ تَاَخَّرُوْا وَصَلّٰى بِالطَّائِفَةِ الْاُخْرٰى رَكْعَتَيْنِ قَالَ فَكَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعُ رَكَعَاتٍ وَلِلْقَوْمِ رَكْعَتَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ہم سرتاج دو عالم ﷺ کے ہمراہ (جہاد کے لئے روانہ ہوئے یہاں تک کہ ہم ذات الرقاع پہنچے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ) جب ہمیں کوئی سایہ دار درخت ملتا تو ہم اسے آنحضرت ﷺ کے واسطے چھوڑ دیتے تھے۔ (تاکہ آپ ﷺ اس سایہ میں استراحت فرمائیں چنانچہ ذات الرقاع میں ایسا ہی ہوا کہ آنحضرت ﷺ ایک سایہ دار درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے کہ) ایک مشرک آیا اور اس نے آنحضرت ﷺ کی تلوار جو درخت سے لٹکی ہوئی تھی اتار کر نیام سے کھینچ لی (آنحضرت ﷺ کو اس کی خبر نہیں ہوئی کیونکہ یا تو آپ سو رہے تھے یا اس کی طرف سے غافل تھے) اس نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ "کیا تم مجھ سے ڈرتے ہو؟" آنحضرت نے فرمایا کہ "نہیں" (میں تجھ سے کیوں ڈرنے لگا کیونکہ میرے رب کے سوا دوسرا کوئی نہ مجھے نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان) اس نے کہا کہ "پھر تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھے تجھ سے اللہ بچائے گا" جابرؓ کہتے ہیں کہ صحابہ نے (جب یہ دیکھا تو) اس کو دھمکایا، اس نے تلوار نیام میں رکھ کر اسے درخت سے لٹکا دیا" حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ پھر (ظہر یا عصر کی) نماز کے لئے اذان (اور تکبیر) کہی گئی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے (پہلے) ایک جماعت کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں اور وہ جماعت (دو رکعت نماز پڑھ

کر دشمن کے مقابلہ کے ارادہ سے) پیچھے ہٹ گئی، پھر آپ نے دوسری جماعت کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں" جابرؓ کہتے ہیں کہ (اس طرح) آنحضرت ﷺ کی چار رکعتیں ہوئیں اور لوگوں کی دو دو رکعتیں ہوئیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نہ صرف یہ کہ نہایت شجاع تھے بلکہ کفار کی جانب سے پہنچائی جانے والی ایذا پر صبر کرتے تھے اور جاہل کفار اگر آپ کے ساتھ بے تمیزی کا کوئی معاملہ کرتے تھے تو آپ اسے انتہائی حلم کے ساتھ برداشت فرماتے تھے۔

واقدیؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب اس مشرک نے غلط ارادہ کے ساتھ تلوار نکالی تو اس کی پیٹھ میں شدید درد شروع ہو گیا جس سے وہ بوکھلا گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ وہ یہ حالت دیکھ کر مسلمان ہو گیا اور اس کی وجہ سے بہت زیادہ مخلوق نے ہدایت پائی۔ لیکن ابوعوانہؒ نے نقل کیا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہوا مگر اس نے یہ عہد کیا کہ کبھی بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہیں لڑوں گا۔

بہرحال آنحضرت ﷺ نے اس کی اس بدتمیزی پر اسے کوئی سزا نہیں دی۔ اس کی وجہ یا تو اس کی تالیف قلب تھی یا کوئی اور وجہ رہی ہوگی کہ آپ ﷺ نے اسے معاف فرما دیا۔

اس روایت کے بارہ میں مولانا مظہرؒ کا قول یہ ہے کہ اس سے پہلے نقل کی گئی روایت اور اس روایت میں اختلاف ہے باوجودیکہ دونوں روایتوں کا تعلق ایک ہی جگہ یعنی غزوہ ذات الرقاع سے ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ دونوں روایتیں ایک ہی جگہ سے متعلق ہیں مگر اوقات میں فرق و اختلاف ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں روایتوں کا محمول یہ ہوگا کہ غزوۂ ذات الرقاع میں اس جگہ آنحضرت ﷺ نے دو مرتبہ نماز پڑھی ہے۔ ایک مرتبہ تو اس طریقہ کے مطابق جو سہلؓ ابن ابی حثمہ نے بیان کیا ہے اور ایک مرتبہ اس طریقہ کے مطابق جو حضرت جابرؓ بیان کر رہے ہیں۔ لہٰذا حضرت سہلؓ کی روایت صبح کی نماز پر محمول کی جائے گی اور حضرت جابرؓ کی اس روایت کا محمول ظہر یا عصر کی نماز ہوگی۔ یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں روایتیں تعدد غزوات پر محمول کی جائیں گی۔

جیسا کہ حضرت جابرؓ کے ارشاد سے ثابت ہو رہا ہے اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے چار رکعتیں پڑھیں اور دوسرے لوگوں کی دو ہی رکعتیں ہوئیں، تو علماء نے اس کی کئی وجہیں بیان کی ہیں ان میں سب سے صحیح اور بہتر توجیہ یہ ہے کہ یا تو یہ واقعہ آیت قصر کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے یا پھر یہ کہ جس جگہ یہ نماز پڑھی گئی تھی وہاں قصر واجب نہیں ہوتا تھا چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور علماء نے حدیث کے الفاظ لقوم رکعتان کی مراد یہ بیان کی ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ دو دو رکعتیں پڑھیں اور باقی دو دو رکعتیں تنہا تنہا پوری کیں۔ واللہ اعلم

نماز خوف کا ایک طریقہ

④ وَعَنْهُ قَالَ صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الْخَوْفِ فَصَفَفْنَا خَلْفَهُ صَفَّيْنِ وَالْعَدُوُّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ فَكَبَّرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَبَّرْنَا جَمِيْعًا ثُمَّ رَكَعَ وَرَكَعْنَا جَمِيْعًا ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ وَرَفَعْنَا جَمِيْعًا ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُوْدِ وَالصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ وَقَامَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ فِيْ نَحْرِ الْعَدُوِّ فَلَمَّا قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السُّجُوْدَ وَقَامَ الصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ انْحَدَرَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ بِالسُّجُوْدِ ثُمَّ قَامُوْا ثُمَّ تَقَدَّمَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ وَتَأَخَّرَ الْمُقَدَّمُ ثُمَّ رَكَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَكَعْنَا جَمِيْعًا ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُوْدِ وَالصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ الَّذِيْ كَانَ مُؤَخَّرًا فِي الرَّكْعَةِ الْأُوْلٰى وَقَامَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ فِيْ نَحْرِ الْعَدُوِّ فَلَمَّا قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السُّجُوْدَ وَالصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ انْحَدَرَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ بِالسُّجُوْدِ فَسَجَدُوْا ثُمَّ سَلَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَلَّمْنَا جَمِيْعًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے ہمیں (ایک مرتبہ) نماز خوف پڑھائی، چنانچہ ہم نے آپ ﷺ کے پیچھے دو صفیں باندھ لیں اور دشمن ہمارے اور ہمارے قبلہ کے درمیان تھا آپ نے تکبیر کہی ہم سب نے بھی (یعنی دونوں صفوں نے) تکبیر کہی، جب آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا تو ہم سب نے (دونوں صفوں نے) بھی (اپنے سر رکوع سے) اٹھائے، پھر سجدہ کے لئے اس صف کے ساتھ جھکے جو آپ ﷺ کے قریب تھی (یعنی پہلی صف) اور دوسری صف دشمن کے مقابلہ (قومہ ہی میں) کھڑی رہی پھر جب آپ ﷺ سجدہ کر چکے اور آپ ﷺ کے ساتھ وہ صف کھڑی ہوگئی (جو آپ ﷺ کے قریب تھی یعنی پہلی صف) تو پچھلی صف والے سجدہ میں چلے گئے۔ پھر یہ کھڑے ہوگئے۔ اس کے بعد اگلی صف پیچھے ہٹ آئی اور (پچھلی صف آگے بڑھ گئی پھر آنحضرت ﷺ نے قیام میں قرات کی اور) رکوع کیا تو ہم سب نے بھی رکوع کیا۔ پھر آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا تو ہم سب نے بھی رکوع سے سر اٹھایا۔ پھر آنحضرت ﷺ سجدہ میں گئے اور صف جو آپ ﷺ کے قریب تھی اور پہلی رکعت میں پیچھے تھی آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ میں چلی گئی اور پچھلی صف (جو پہلی رکعت میں آگے تھے) دشمن کے مقابلہ میں کھڑی رہی۔ پھر جب آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے قریب کی صف کے سب لوگ سجدہ سے فارغ ہوگئے تو پچھلی صف نے سجدہ کیا۔ پھر اس کے بعد آپ نے اور ہم سب نے (یعنی دونوں صفوں نے التحیات پڑھ کر) سلام پھیرا۔" (مسلمؒ)

تشریح: نماز خوف کا یہ ایک اور طریقہ ہے آنحضرت ﷺ جیسا وقت اور جیسا موقع دیکھتے اسی کے مطابق نماز خوف پڑھتے تھے۔ چنانچہ یہاں چونکہ دشمن سامنے ہی قبلہ کی طرف تھا اس لئے اسلامی لشکر ایک ہی جگہ اس طرح نماز پڑھتا رہا کہ دشمن کا لشکر مد مقابل رہا چنانچہ کسی جماعت کو کسی اور طرف بھیجنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، پورا لشکر رکوع تک تو متفق رہا اس کے بعد صرف اتنا فرق ہوا کہ جب ایک صف سجدہ میں گئی تو دوسری صف کھڑی رہی اور جب دوسری صف سجدہ میں گئی تو پہلی صف کھڑی رہی۔ جیسا کہ حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ یہ نماز آنحضرت ﷺ نے عسفان میں ادا فرمائی تھی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نماز خوف کا آنحضرت ﷺ کے ساتھ مختص ایک ہی طریقہ

⑤ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ صَلَاةَ الظُّهْرِ فِي الْخَوْفِ بِبَطْنِ نَخْلٍ فَصَلّٰى بِطَآئِفَةٍ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ جَآءَ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى فَصَلّٰى بِهِمْ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ نے مقام "بطن نخل" میں خوف کے وقت ظہر کی نماز پڑھی چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس طرح نماز پڑھائی کہ ایک جماعت کو دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ پھر جب دوسری جماعت آئی تو اسے بھی دو رکعت نماز پڑھا کر سلام پھیر دیا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "بطن نخل" مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق یہ حدیث اس پر محمول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قصر کی نماز پڑھی۔ یعنی آپ ﷺ نے چار رکعت کے بجائے دو رکعت نماز ادا فرمائی اس کے بعد دو رکعت نماز نفل پڑھی۔ حضرت امام شافعیؒ کے ہاں نفل نماز پڑھنے والے کے پیچھے فرض نماز پڑھنے والا اقتدا کر سکتا ہے۔

حنفی مسلک کے مطابق اس حدیث کی تشریح بظاہر ایک سخت مسئلہ ہے کیونکہ اگر اسے سفر پر حمل کیا جائے تو نفل نماز پڑھنے والے کے پیچھے فرض نماز پڑھنے والے کی اقتدا لازم آتی ہے اور حنفیہ کے یہاں یہ درست نہیں ہے لہٰذا یہ سفر کی نماز تو قرار نہیں دی جا سکتی۔ اب اگر اس حدیث کا محمول حضر کی نماز قرار دی جائے تو پھر ہر دو رکعت پر سلام پھیرنا لازم آتا ہے جو نماز کے منافی ہے لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ یہ کہا جائے کہ نماز تو حالت حضر ہی میں پڑھی گئی تھی البتہ ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرنا یہ صرف آپ ﷺ کی خصوصیات میں

سے تھا جو دوسروں کے لئے جائز نہیں ہے چنانچہ لوگوں نے اپنی بقیہ دو دو رکعتیں آپ کے سلام پھیرنے کے بعد بطور خود پوری کیں اس طرح ان کی بھی چار رکعتیں ہو گئیں۔

اس سلسلہ میں حضرت امام طحاویؒ نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ بہت مناسب معلوم ہوتی ہے انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ ایک فرض نماز دو مرتبہ پڑھی جا سکتی تھی۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

نماز خوف کا ایک اور طریقہ

⑥ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزَلَ بَيْنَ ضَجْنَانَ وَعُسْفَانَ فَقَالَ الْمُشْرِكُوْنَ لِهٰؤُلَاءِ صَلَاةٌ هِيَ اَحَبُّ اِلَيْهِمْ مِنْ اٰبَاءِهِمْ وَاَبْنَاءِهِمْ وَهِيَ الْعَصْرُ فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ فَتَمِيْلُوْا عَلَيْهِمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً وَاِنَّ جِبْرِيْلَ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَهٗ اَنْ يُقَسِّمَ اَصْحَابَهٗ شَطْرَيْنِ فَيُصَلِّيْ بِهِمْ وَتَقُوْمُ طَائِفَةٌ اُخْرٰى وَرَاءَهُمْ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ فَتَكُوْنُ لَهُمْ رَكْعَةٌ وَلِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَانِ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ (جہاد کے لئے) ضجنان اور عسفان کے درمیان اترے تو مشرک (آپس میں) کہنے لگے کہ مسلمانوں کی ایک نماز ہے جو ان کے نزدیک ان کے باپ اور بیٹے سے بھی زیادہ محبوب ہے اور وہ نماز عصر ہے چنانچہ تم اپنے مقصد (یعنی جنگ) کے لئے تیار ہو جاؤ اور جب مسلمان اس نماز میں مصروف ہوں تو) ان پر یکبارگی حملہ کر دو۔ جب ہی آپ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور فرمایا کہ "آپ ﷺ اپنے صحابہؓ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں۔ ایک حصہ کو تو نماز پڑھائیں اور دوسرا حصہ ان کے پیچھے دشمن کے خطرناک ارادوں کا جواب دینے کے لئے) کھڑا رہے (اسی طرح دوسرے حصہ کو نماز پڑھائیں تو پہلا حصہ دشمن کے مدمقابل رہے نیز تمام نمازیوں کو) چاہئے کہ اپنے دفاع کا سامان یعنی سپر و ہتھیار وغیرہ اپنے پاس رکھیں۔ اس طرح لوگوں کی تو (امام کے ساتھ) ایک ایک رکعت ہو جائے گی اور آنحضرت ﷺ کی دو رکعتیں۔" (ترمذیؒ و نسائیؒ)

تشریح: ضجنان ایک پہاڑ کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے اور عسفان ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے دو منزل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

بَابُ صَلٰوةِ الْعِيْدَيْنِ

عیدین کی نماز کا بیان

شوال کے مہینہ کی پہلی تاریخ کو عید الفطر (عید) اور ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو عید الاضحی (بقر عید) اور دونوں کے مجموعہ کو "عیدین" کہتے ہیں۔ یہ دونوں تاریخیں اسلام میں عید اور خوشی کے دن ہیں جس میں دو دو رکعت نماز بطور شکر کے پڑھی جاتی ہے۔ عیدین کی نماز حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں واجب ہیں جب کہ حضرت امام شافعیؒ اور دوسرے علماء عیدین کی نماز کو سنت موکدہ کہتے ہیں۔

"عید" لفظ "عود" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "بار بار آنا" چنانچہ اس دن کو عید اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ دن بار بار یعنی ہر برس آتا ہے۔ چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس دن کا نام "عید" اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ عود کرتا ہے یعنی بندوں پر اپنی رحمت اور

بخشش کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے عید کے بارہ میں یہ عارفانہ جملے بیان کئے جاتے ہیں کہ:

لَیْسَ الْعِیْدُ لِمَنْ لَبِسَ الْجَدِیْدَ اِنَّمَا الْعِیْدُ لِمَنْ اٰمَنَ مِنَ الْوَعِیْدِ، لَیْسَ الْعِیْدُ لِمَنْ تَنَجَّرَ بِالْعُوْدِ اِنَّمَا الْعِیْدُ لِلتَّائِبِ الَّذِیْ لَا یَعُوْدُ لَیْسَ الْعِیْدُ لِمَنْ تَزَیَّنَ بِزِیْنَۃِ الدُّنْیَا اِنَّمَا الْعِیْدُ لِمَنْ تَزَوَّدَ بِزَادِ التَّقْوٰی۔ لَیْسَ الْعِیْدُ لِمَنْ رَکِبَ الْمَطَایَا اِنَّمَا الْعِیْدُ لِمَنْ تَرَکَ الْخَطَایَا لَیْسَ الْعِیْدُ لِمَنْ بَسَطَ الْبِسَاطَ اِنَّمَا الْعِیْدُ لِمَنْ جَاوَزَ الصِّرَاطَ۔

"عید اس شخص کے لئے نہیں ہے جو نئے کپڑے پہنے بلکہ اس کے لئے ہے جو عید سے امن میں (یعنی برے کاموں سے بچتا رہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا مستحق ہو اور اس کے عتاب سے امن میں رہے) عید اس شخص کے لئے نہیں ہے جو عود کی خوشبو سے معطر ہو بلکہ اس کے لئے ہے جو توبہ کرنے والا ہو کہ پھر گناہ نہ کرے عید اس شخص کے لئے نہیں ہے جو آرائش دنیا کی زینت اختیار کرے بلکہ اس کے لئے ہے جو تقوی (پرہیزگاری) کو آخرت کے لئے زادراہ بنائے۔ عید اس شخص کے لئے نہیں ہے جو سواریوں پر سوار ہو بلکہ اس کے لئے ہے جو گناہوں کو ترک کرے۔ اور عید اس شخص کے لئے نہیں جو (آرائش و زیبائش کے) فرش بچھائے بلکہ اس کے لئے ہے جو پل صراط سے گذر جائے گا۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عیدین کی نماز

① عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَخْرُجُ یَوْمَ الْفِطْرِ وَالْاَضْحٰی اِلَی الْمُصَلّٰی فَاَوَّلُ شَیْءٍ یَبْدَأُ بِہِ الصَّلَاۃُ ثُمَّ یَنْصَرِفُ فَیَقُوْمُ مُقَابِلَ النَّاسِ وَالنَّاسُ جُلُوْسٌ عَلٰی صُفُوْفِھِمْ فَیَعِظُھُمْ وَیُوْصِیْھِمْ وَیَاْمُرُھُمْ وَاِنْ کَانَ یُرِیْدُ اَنْ یَّقْطَعَ بَعْثًا قَطَعَہٗ اَوْ یَاْمُرُھُمْ بِشَیْءٍ اَمَرَ بِہٖ ثُمَّ یَنْصَرِفُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ (جب) عید الفطر اور عید الاضحی (کی نماز) کے لئے تشریف لاتے تو (وہاں) سب سے پہلا یہ کام فرماتے کہ (خطبہ سے پہلے) نماز ادا فرماتے، پھر نماز سے فارغ ہوتے اور لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور لوگ اپنی صفوں پر بیٹھے رہتے چنانچہ آپ ﷺ ان کو وعظ و نصیحت فرماتے، وصیت کرتے اور احکام صادر فرماتے، اگر (جہاد کے لئے) کہیں کوئی لشکر بھیجنا ہوتا تو اس کی روانگی کا حکم فرماتے اس طرح اگر (لوگوں کے معاملات و مقدمات کے بارہ میں کوئی حکم دینا ہوتا تو حکم صادر فرماتے پھر (گھر) واپس تشریف لے آتے۔" (بخاریؒ، و مسلمؒ)

تشریح: مدینہ منورہ کی عید گاہ شہر سے باہر ہے، جس کا فاصلہ کہتے ہیں کہ حجرہ شریف سے ایک ہزار قدم ہے۔ وہ جگہ انتہائی متبرک اور مقدس ہے۔ اب اس کے ارد گرد چار دیواری بنا دی گئی ہے۔

بہر حال شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ امام وقت کے لئے ضروری ہے کہ وہ عیدین کی نماز کے لئے عید گاہ جائے۔ ہاں اگر کوئی عذر مانع ہو تو پھر شہر کی مسجد ہی میں نماز پڑھائے ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ امام وقت کے لئے مسنون ہے کہ وہ خود تو عید کی نماز کے لئے عید گاہ جائے اور کسی ایسے شخص کو اپنا قائم مقام بنا دے جو شہر میں ضعیفوں کو نماز پڑھائے لیکن حضرت علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ عید گاہ جانے کا مسئلہ مسجد حرام اور بیت المقدس کے علاوہ دوسری جگہوں کے لئے ہے کیونکہ نہ صرف ان دونوں مقدس مسجدوں کی عظمت و تقدس کے پیش نظر بلکہ صحابہؓ اور تابعینؒ کی اتباع میں بھی مسجدوں میں تمام ہی نمازیں پڑھنی افضل ہیں۔

فیقوم کا مطلب یہ ہے کہ آپ نماز سے فراغت کے بعد خطبہ ارشاد فرمانے کے لئے لوگوں کے سامنے زمین پر کھڑے ہوتے تھے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں عید گاہ میں منبر نہیں تھا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تو عید گاہ میں

منبر کا انتظام کیا گیا اس لئے کہ منبر پر کھڑے ہو کر پڑھے گئے خطبہ کی آواز دور دور تک پہنچتی ہے۔

"ونصیحت کرتے" یعنی مسلمانوں کو آپ اس موقع پر دنیا سے زہد اختیار کرنے اور آخرت کے طرف دھیان رکھنے کی نصیحت فرماتے، نیز آپ ﷺ لوگوں کے سامنے ثواب کی عظمت و فضائل بیان کرتے اور گناہوں سے ڈراتے تاکہ لوگ اس دن کی خوشیوں اور مسرتوں میں مشغول ہو کر اطاعت سے غافل اور گناہوں میں مبتلا نہ ہو جائیں جیسا کہ آجکل لوگوں کا حال ہے۔ اور "وصیت کرتے" یعنی لوگوں کو تقوی یعنی پرہیز گاری اختیار کرنے کی وصیت فرماتے۔ تقوی کے تین درجے ہیں۔ ادنی درجہ یہ ہے کہ شرک سے بچا جائے۔ وسط درجہ یہ ہے کہ خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے اور ممنوع چیزوں سے بچا جائے۔ اور اعلی درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہمہ وقت حضور قلوب کے ساتھ متوجہ اور ماسوا اللہ سے بے غرض رہا جائے۔ "احکام صادر فرماتے" یعنی لوگوں کے معاملات کے بارہ میں جو احکام دینے ہوتے تھے وہ صادر فرماتے نیز عید الفطر میں فطرہ کے احکام اور عید الاضحی میں قربانی کے احکام بیان فرماتے۔

(۲) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِيْدَيْنِ غَيْرَ مَرَّةٍ وَلَا مَرَّتَيْنِ بِغَيْرِ اَذَانٍ وَلَا اِقَامَةٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرتاج دو عالم ﷺ کے ہمراہ عید و بقر عید کی نماز بغیر اذان و تکبیر کے ایک دو مرتبہ نہیں (بلکہ بہت مرتبہ) پڑھی ہے۔" (مسلم)

تشریح: شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اصحاب میں سے اکثر اہل علم کا یہی مسلک تھا کہ عید و بقر عید کی نماز میں نہ تو اذان مشروع ہے اور نہ تکبیر، اسی طرح دوسرے نوافل میں بھی اذان و تکبیر نہیں ہے بلکہ کتاب ازہار میں تو یہ لکھا ہے کہ مکروہ ہے۔

عیدین کا خطبہ نماز کے بعد پڑھنا چاہئے

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرَ يُصَلُّوْنَ الْعِيْدَيْنِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ حضرت ابوبکر ابن منذرؓ کا قول ہے کہ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عید کا خطبہ نماز کے بعد پڑھنا چاہئے۔"

تشریح: ابن منذرؒ کا قول ہے کہ فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عید و بقر عید کا خطبہ نماز کے بعد پڑھنا چاہئے۔ نماز سے پہلے خطبہ پڑھنا جائز نہیں ہے لیکن اگر کسی شخص نے نماز سے پہلے ہی خطبہ پڑھ لیا تو تمام علماء کے نزدیک نماز جائز ہو جائے گی منقول ہے کہ مروان ابن حکم جب مدینہ کا حاکم ہوا اور اس نے خطبہ نماز سے پہلے پڑھا تو اس کے اس فعل کو صحابہؓ نے بہت برا جانا۔

عیدین کی نماز کے لئے اذان و تکبیر مشروع نہیں ہے

(۴) وَسُئِلَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَشَهِدْتَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِيْدَ؟ قَالَ نَعَمْ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ وَلَمْ يَذْكُرْ اَذَانًا وَّلَا اِقَامَةً ثُمَّ اَتَى النِّسَاءَ فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَرَاَيْتُهُنَّ يُهْوِيْنَ اِلٰى اٰذَانِهِنَّ وَحُلُوْقِهِنَّ يَدْفَعْنَ اِلٰى بِلَالٍ ثُمَّ ارْتَفَعَ هُوَ وَبِلَالٌ اِلٰى بَيْتِهٖ۔ (متفق علیہ)

"(مروی ہے کہ ایک مرتبہ) حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ سرتاج دو عالم ﷺ کے ہمراہ عید میں شریک ہوئے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ "ہاں" (پھر آپ نے یہ تفصیل بیان کی کہ) آنحضرت ﷺ (عید گاہ) تشریف لے گئے چنانچہ آپ ﷺ نے وہاں عید کی نماز پڑھی پھر خطبہ ارشاد فرمایا" حضرت ابن عباسؓ نے (آنحضرت ﷺ کی نماز تفصیل سے بیان کرنے کے دوران) تکبیر و اذان کا ذکر نہیں کیا" (پھر انہوں نے فرمایا کہ) اس کے بعد آپ ﷺ عورتوں کی جماعت کی طرف آئے، ساتھ میں حضرت بلالؓ بھی تھے، ان عورتوں کو

نصیحت فرمائی، دین کے احکام یاد کرائے۔ ثواب و عذاب کے بارہ میں بتایا اور ان کو صدقہ (یعنی فطرہ وزکوٰۃ یا محض اللہ کے نام پر) دینے کا حکم فرمایا، چنانچہ میں نے عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ اپنے کانوں اور گلوں کی طرف (زیور اتارنے کے لئے) بڑھاتی تھیں اور کانوں اور گلوں کے زیور (اتار اتار کر) حضرت بلالؓ کے حوالہ کر رہی تھیں (تاکہ وہ ان کی طرف سے فقراء و مساکین کو تقسیم کر دیں) پھر اس کے بعد آنحضرت ﷺ اور حضرت بلالؓ اپنے گھر تشریف لے آئے۔" (بخاریؒ)

تشریح: جیسا کہ حضرت جابر ابن سمرۃؓ نے بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس روایت سے بھی ثابت ہو رہا ہے کہ نماز عید و بقر عید کے لئے اذان و تکبیر مشروع نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں آپ ﷺ کے حکم سے عورتیں بھی نماز عید و بقر عید میں عید گاہ جاتی تھیں۔ چنانچہ جب آپ ﷺ مردوں کو وعظ و نصیحت فرما چکے تو علیحدہ سے عورتوں کے پاس بھی انہیں پند و نصیحت کرنے کے لئے تشریف لے گئے کیونکہ عورتیں مردوں سے الگ ایک طرف بیٹھی ہوئی تھیں اس لئے جب آپ مردوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو آواز ان تک اچھی طرح نہیں پہنچتی تھی۔

نماز عیدین سے پہلے یا بعد میں نفل نماز پڑھنے کا مسئلہ

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى يَوْمَ الْفِطْرِ رَكْعَتَيْنِ لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهُمَا وَلَا بَعْدَهُمَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے عید الفطر کے دن (نماز عید کی) دو رکعتیں پڑھیں نہ تو آپ ﷺ نے ان سے پہلے (نفل) نماز پڑھی اور نہ بعد میں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ یہ نفی عید گاہ سے متعلق ہے کیونکہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز عید سے پہلے (نفل) نماز نہیں پڑھتے تھے ہاں جب (عید گاہ سے) اپنے گھر تشریف لے جاتے تو دو رکعتیں پڑھتے" چنانچہ در مختار میں لکھا ہے کہ نماز عید سے پہلے نفل نماز پڑھنی مطلقاً مکروہ ہے یعنی عید گاہ میں بھی مکروہ ہے اور گھر میں بھی۔ البتہ نماز عید کے بعد عید گاہ میں نفل نماز پڑھنی مکروہ ہے مگر گھر میں جائز ہے۔

عید گاہ میں عورتوں کے جانے کا مسئلہ

⑥ وَعَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ اُمِرْنَا اَنْ نُخْرِجَ الْحُيَّضَ يَوْمَ الْعِيْدَيْنِ وَ ذَوَاتِ الْخُدُوْرِ فَيَشْهَدْنَ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَدَعْوَتَهُمْ وَتَعْتَزِلُ الْحُيَّضُ عَنْ مُصَلَّاهُنَّ قَالَتْ اِمْرَاَةٌ يَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِحْدَانَا لَيْسَ لَهَا جِلْبَابٌ قَالَ لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ عطیہ فرماتی ہیں کہ ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم عید و بقر عید کے دن ان عورتوں کی (بھی) جو ایام والی ہوں (یعنی جو ایام سے ہوں یا یہ کہ جو بالغ ہوں) اور ان عورتوں کو (بھی جو پردہ نشین ہوں (گویا تمام عورتوں کو) عید گاہ لے چلیں اور یہ سب مسلمانوں کی جماعت اور دعا میں شریک ہوں۔ نیز جو عورتیں ایام سے ہوں وہ نماز پڑھنے کی جگہ سے الگ رہیں" ایک عورت نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہم میں سے جس کے پاس چادر نہیں (وہ کیا کرے؟)" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اسے ساتھ والی چادر اڑھا دے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: خطابیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے تمام عورتوں کو عید گاہ جانے کا حکم فرمایا تاکہ جن عورتوں کو کوئی عذر نہیں ہے وہ تو نماز پڑھیں اور جن عورتوں کو کوئی عذر ہے انہیں نماز اور دعا کی برکت پہنچے" گویا اس طرح لوگوں کو ترغیب دلائی جا رہی ہے کہ وہ نمازوں میں

شریک ہوں۔ وعظ و ذکر کی مجالس میں حاضر ہوں اور علماء و صلحا کا قرب حاصل کریں تاکہ انہیں خدا کے ان نیک و مقدس بندوں کی برکت حاصل ہو" اگرچہ آنحضرت ﷺ کے مقدس زمانہ میں عورتوں کے لئے عید گاہ جانا ممنوع نہیں تھا مگر آجکل کے زمانہ میں فتنہ و فساد کے خوف سے عورتوں کے لئے عید گاہ جانا مستحب نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں عورتوں کے عید گاہ جانے کی توجیہہ امام طحاویؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ چونکہ اس وقت اسلام کا ابتدائی دور تھا مسلمان بہت کم تھے اس لئے آنحضرت ﷺ کا یہ مقصد تھا کہ اگر تمام عورتیں بھی عید گاہ جائیں گی تو مسلمانوں کی تعداد زیادہ معلوم ہوگی جس سے کفار پر رعب پڑے گا۔ لہٰذا آجکل نہ صرف اس کی ضرورت ہے بلکہ عورتوں کی موجودگی چونکہ بہت زیادہ محرمات و مکروہات کا ذریعہ بن سکتی ہے اس لئے علماء نے عورتوں کو عید گاہ جانے سے روک دیا ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی عورت کے پاس ایسی کوئی چادر اور کوئی کپڑا نہ ہو جسے اوڑھ کر وہ عید گاہ جا سکے تو اس کی ساتھ والی کو چاہئے کہ یا تو اس کے پاس کئی چادریں ہوں تو ایک چادر عاریتاً اس عورت کو دے دے جسے وہ بعد میں واپس کر دے گی یا پھر یہ کہ اگر اس کے پاس کئی نہیں بلکہ ایک ہی چادر ہے تو اپنی چادر کا ایک حصہ اس کو اڑھا دے اور دونوں ایک جگہ بیٹھ جائیں۔

نغمہ و سرور کا مسئلہ

(۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ اَبَا بَكْرٍ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا جَارِيَتَانِ فِيْ اَيَّامِ مِنًى تُدَفِّفَانِ وَ تَضْرِبَانِ وَفِيْ رِوَايَةٍ تُغَنِّيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتِ الْاَنْصَارُ يَوْمَ بُعَاثَ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهٖ فَانْتَهَرَهُمَا اَبُوْبَكْرٍ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ فَقَالَ دَعْهُمَا يَا اَبَا بَكْرٍ فَاِنَّهَا اَيَّامُ عِيْدٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ يَا اَبَا بَكْرٍ اِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيْدًا وَهٰذَا عِيْدُنَا۔ (متفق علیہ)

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "ایام منی میں (یعنی جس دنوں میں حجاج منی میں قیام کرتے ہیں اور جو ایام تشریق کہلاتے ہیں انہیں میں سے بقر عید کے دن یا اس کے بعد کے دنوں میں) حضرت ابوبکر صدیقؓ میرے پاس تشریف لائے جب کہ اس وقت میرے پاس (انصار کی لڑکیوں میں سے) دو چھوکریاں بیٹھی ہوئی دف بجا رہی تھیں" ایک دوسری روایت میں ان الفاظ کی بجائے یا یہ کہ مزید) یہ الفاظ ہیں کہ "چھوکریاں (وہ اشعار) گا رہی تھیں جو انصار نے بعاث (کی جنگ کے متعلق) کہے تھے اور آنحضرت ﷺ (اس وقت) منہ پر کپڑا ڈالے ہوئے (لیٹے) ہوئے تھے حضرت ابوبکرؓ ان چھوکریوں کو دھمکانے لگے (یعنی انہیں گانے بجانے سے منع فرمایا) آنحضرت ﷺ نے اپنا منہ کھولا اور فرمایا کہ "ابوبکرؓ انہیں چھوڑ دو (کچھ نہ کہو) کیونکہ یہ عید (یعنی خوشی) کے دن ہیں" ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا" ابوبکر! ہر قوم کی عید ہوتی ہے یہ ہماری عید ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لفظ تضربان گویا تدفعان کی تاکید کے لئے استعمال کیا گیا ہے لیکن بعض حضرات نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ "وہ لڑکیاں اچھلتی کودتی تھیں اور دف بجاتی تھیں"

دف بجانے کا مسئلہ: دف باجے کے بارہ میں علماء کے دو قول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ دف بجانا مطلقاً مباح ہے یعنی کسی بھی وقت اور کسی بھی موقعہ پر بجایا جا سکتا ہے اس کے برخلاف دوسرا قول یہ ہے کہ مطلقاً حرام ہے۔ اس سلسلہ میں صحیح مسئلہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر مثلاً نکاح، ولیمہ یا اس قسم کی دوسری تقریبات میں کہ جو انہیں دونوں کے حکم میں ہوں، نیز عیدین میں دف بجانا مباح ہے۔ پھر علماء نے دف میں فرق کیا ہے یعنی اگر دف جھانجدار ہے تو اس کا بجانا مکروہ ہے اور اگر جھانجدار نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے۔ اگرچہ جھاندار دف کے بارہ میں بھی علماء نے اختلاف کیا ہے۔

حدیث کے الفاظ تُغَنِّيَانِ (گا رہی تھیں) کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں وہ اشعار پڑھ رہی تھیں جن میں شجاعت و بہادری کے مضمون مذکور

تھے اور جو انصار نے "بعاث" پر چڑھائی اور وہاں کی جنگ کے متعلق کہے تھے جیسا کہ بہادروں کی عادت ہے کہ جنگ کے وقت اپنی شجاعت و بہادری پر مشتمل اشعار بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں "بعاث" ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بعض حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں انصار کے دو قبیلوں "اوس اور خزرج" کے درمیان سخت جنگ ہوئی تھی جس میں قبیلہ اوس کامیاب رہا تھا اسی جنگ کو "جنگ بعاث" کہا جاتا ہے۔

بہر حال لڑکیاں جو اشعار گا رہی تھیں وہ فواحش اور حسن و عشق کے ان مضامین کے حامل نہیں تھے جن کا پڑھنا معیوب اور ممنوع ہے بلکہ وہ اشعار جنگ و جدل کے کارناموں، معرکہ آرائیوں کی پر شجاعت داستانوں اور میدان جنگ کی گرم کہانیوں پر مشتمل تھے جن کے پڑھنے سے اشاعت دین میں مدد ملتی تھی بایں طور کہ وہ کفار سے جہاد کرنے کے لئے مؤمنین کو ترغیب دلاتے تھے ورنہ ان لڑکیوں کی کیا مجال کہ عائشہ صدیقہؓ کی موجودگی میں اور سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے وہ برے اور معیوب اشعار کی جرات بھی کرتیں۔

چنانچہ بخاریؒ کی ایک روایت میں لفظ "تغنیان" کے بعد یہ الفاظ بھی مذکور ہیں کہ ولیستا بمغنیتین یعنی لڑکیاں اشعار گا رہی تھیں اور گانا ان لڑکیوں کا کسب و پیشہ نہیں تھا کہ کوئی زیادہ اچھا گاتی ہوں اور گانے بجانے کے فن میں مشہور ہوں یا یہ کہ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ خیالات فاحشہ و خواہشات نفسانی کے ہیجان و اشتیاق کا سبب بنتی ہوں جو فتنہ و فساد کا باعث ہوتا بلکہ وہ بالکل اسی انداز میں اشعار پڑھ رہی ہیں جیسا کہ اکثر شریف زادیاں اپنے گھروں میں پاکیزہ خیالات کا حامل اشعار گنگنایا کرتی ہیں۔

فانتھر ھا ابو بکر (حضرت ابوبکر ان چھوکریوں کو دھمکانے لگے) یعنی جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ نے ان لڑکیوں سے کہا کہ "سرکار دو عالم ﷺ کے قریب مزمار شیطان (یعنی شیطانی باجا) بجاتی ہو؟ گویا حضرت ابوبکرؓ نے انہیں تنبیہ کی اور اس فعل سے منع فرمایا" اصطلاحاً مزمار ہر اس باجے کو کہتے ہیں جو گویے بجاتے ہیں مثلاً بانسری، دف رباب (سارنگی) حضرت ابوبکرؓ نے لڑکیوں کے باجے کو شیطانی باجا اس لئے کہا کہ جس طرح شیطان اپنی ذات سے انسانوں کی عملی زندگی کو نیک کاموں سے ہٹا کر برے کاموں میں مشغول کر دیتا ہے اسی طرح باجا بھی انسانی قلوب کو یاد الٰہی کے مقدس راستہ سے ہٹا کر لہو و لعب و ناجائز خواہشات کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح گذشتہ امتوں اور غیر مسلموں کے یہاں خوشی و مسرت اور عید کا ایک خاص دن ہوتا ہے جیسے قوم مجوس کے یہاں "نوروز" ایک خاص دن ہے جس میں وہ اپنی عید مناتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی خوشی و مسرت اور شادمانی کے دو دن ہیں اور وہ عید و بقر عید کے دن ہیں۔

یہ مشابہت صرف تمثیل کی حد تک ہے ان کے معتقدات و افعال کے ساتھ مشابہت مقصود نہیں ہے یعنی اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ جس طرح غیر مسلم اپنے خوشی و تہواروں کے دن غلط غلط کام کرتے ہیں اسی طرح غلط کام مسلمان بھی ان دنوں میں کر سکتے ہیں۔ چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ عید و بقر عید کے دن غیر مسلموں کے تہوار کی مشابہت اختیار کرنا کفر ہے مثلاً غیر شرعی اور غیر مناسب زیبائش و آرائش کرنا، انڈے لڑانا، مردوں کا مہندی لگانا، ناچ گانوں میں مشغول ہونا وغیرہ وغیرہ۔

حدیث سے اہل سماع کا غلط استدلال: اس حدیث سے اہل سماع کو بڑی زبردست غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ان لوگوں نے اس حدیث کی بنیاد پر ڈھولک و ہارمونیم جیسے ساز کے ساتھ قوالی کے مباح ہونے اور اس کے سننے کو جائز قرار دیا ہے حالانکہ اس حدیث کا قطعی طور پر وہ مفہوم و مطلب نہیں ہے جو اہل سماع نے مراد لیا ہے بلکہ بنظر انصاف اور بغیر کسی تعصب و ہٹ دھرمی کے اگر معقولیت پسند قلب و دماغ کے ساتھ اس حدیث کے حقیقی مفہوم کو دیکھا جائے تو وہ پوری وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ نے ان لڑکیوں کو گانے اور دف بجانے سے اس لئے منع کیا اور انہیں دھمکایا کہ ان کے نزدیک گانا بجانا مطلقاً معیوب و ممنوع تھا۔ نیز انہوں نے یہ گمان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے ان لڑکیوں کو ان کے گانے بجانے سے اس لئے منع نہیں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ حالانکہ حضرت ابوبکرؓ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ ﷺ نے اس دن

بہت معمولی طریقہ پر اشعار پڑھنے کی اجازت دے دی تھی جس کا شمار حقیقی گانے بجانے اور لہو ولعب میں نہیں تھا۔

حاصل یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کو اس فرق اور تفصیل کا علم نہیں تھا اس لئے انہوں نے لڑکیوں کو اشعار پڑھنے سے روکا جس پر آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ وہ لڑکیوں کو کچھ نہ کہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے صرف اس قدر ثابت ہوا کہ عید کے روز یا ایسے کسی موقع پر جہاں خوشی منانی مباح ہے شریعت کی حدود کی اندر رہتے ہوئے کچھ اشعار پڑھ لینا مباح ہے پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس واقعہ کا تعلق ایک مخصوص جگہ اور مخصوص وقت سے ہے جس سے گانے بجانے کا مطلقاً مباح ہونا لازم نہیں آتا۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ "اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی خاص موقع پر ایک آدھ مرتبہ دف بجانا اور سماع ممنوع نہیں ہے لیکن اس پر مداومت کرنا مکروہ ہے کیونکہ مستقل طور پر گانا بجانا وصف تقوی اور اخلاق فاضلہ کو ختم کر دیتا ہے جس کی وجہ سے ایسا شخص شریعت کی نظر میں اپنا اعتماد کھو دیتا ہے۔

ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ دف جائز ہے جب کہ اس میں چھانج نہ ہو اور کبھی کبھی ایک آدھ دفعہ بجایا جائے۔ نیز ایسے اشعار پڑھنے جائز ہیں جس میں کسی کی برائی و مذمت نہ بیان کی گئی ہو اور جو فحش مضامین پر مشتمل نہ ہوں۔ فتاوی قاضیخاں میں لکھا ہے کہ "باجوں کا سننا گناہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "باجوں کا سننا گناہ، اس کی مجلس میں شرکت فسق اور اس سے لطف اندوز ہونا شعار کفر سے ہے۔

نیز مسئلہ یہ ہے کہ اگر غیر اختیاری طور پر باجے کی آواز کان میں پڑ جائے تو کوئی گناہ نہیں۔ باجوں کی آواز سے حتی الامکان بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ ایسے موقعہ پر آپ ﷺ کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے۔

علماء لکھتے ہیں کہ "زمانہ جاہلیت کے ایسے عربی اشعار پڑھنا کہ جن میں فحش مضامین مثلاً شراب و کباب اور حسن و عشق کے تذکرے ہوں مکروہ ہے۔

ایک جلیل القدر محدث نے اس حدیث کی تشریح میں سماع و غنا کا مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ لکھا ہے اس موقعہ پر اس کا خلاصہ نقل کر دینا مناسب ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ:

اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دف بجانا اور گانا ممنوع ہے ہاں کچھ مواقع پر مثلاً عید میں یا اسی قسم کی دوسری خوشی کی تقریب میں یعنی نکاح وغیرہ میں اس کی ایک حد تک اجازت ہے، کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ صحابہ میں سب سے زیادہ فضیلت مآب ہیں۔ انہیں احکام دین خوب اچھی طرح معلوم تھے انہوں نے گانے کو "مزمار شیطان" کہا آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر جواباً انہیں منع فرمایا تو اس بات سے منع نہیں فرمایا تھا کہ گانے کو "مزمار شیطان" کہا۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں عید کے دن کے لئے منع فرمایا کہ آج کے دن اتنی شدت اختیار نہ کرو۔ گویا آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مقصد گانے بجانے کی ممانعت کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ کے قول کی تردید نہیں تھا بلکہ مراد یہ تھی کہ گانے بجانے کا صرف اتنا معمولی درجہ کہ جس میں یہ لڑکیاں مشغول ہیں آج کے دن ممانعت کے حکم سے مستثنیٰ ہے اگر لڑکیاں شرعی و اخلاقی حدود میں رہ کر شجاعت و بہادری کی تعریف و توصیف پر مشتمل اشعار ترنم کے ساتھ پڑھ رہی ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے صرف یہ کہ خود لڑکیوں کے اس فعل سے کوئی دلچسپی نہیں لی (جیسا کہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ اس وقت سو رہے تھے" بلکہ حضرت ابوبکرؓ کو بھی اس کی ترغیب نہیں دلائی بلکہ آپ ﷺ نے ایک طرح اس سے لاپروائی بھی برتی، گویا آپ ﷺ نے اپنے اس فعل کے ذریعہ بھی اس دن اس کے ناجائز ہونے کی طرف اشارہ فرمایا۔

لہٰذا یہ حدیث مطلق طور پر سماع و غنا اور گانے بجانے کی اباحت کی دلیل قرار نہیں دی جا سکتی۔ جیسا کہ بعض حضرات اس حدیث کے در از حقیقت مفہوم کا سہارا لے کر سماع و غنا کے مطلقاً جواز کو ثابت کرتے ہیں۔

سماع کی حرمت و کراہت: یہ تو حدیث کی وضاحت اور اس کی تشریح تھی۔ اب اصل مسئلہ کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ اس بارہ میں

سلف کی رائے کیا ہے۔ سماع و غنا کا مسئلہ ہمیشہ سے علماء و فقہاء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی بھی اس سلسلہ میں مختلف رائیں تھی۔ لیکن جلیل القدر صحابہؓ اس کی حرمت و کراہت کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے آیت کریمہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ کی مراد غنا (نغمہ و سرور) بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس و حضرت ابن مسعودؓ تو اس مراد کے تعین کے سلسلہ میں قسم تک کھاتے اور کہا کرتے تھے کہ یہاں "غنا" مراد ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کے نزدیک آیت کریمہ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ میں شیطان کی آواز سے مراد "غنا" ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ گانے سے اور گانا سننے سے منع فرمایا کرتے تھے۔

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد منقول ہے کہ "اگر کوئی ایسا شخص مرجائے جس کے پاس گائن (گانے والی عورت) ہو تو اس کی نماز جنازہ مت پڑھو۔

حضرت ابو امامہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "گائن (گانے والی عورت) کی نہ تو خرید و فروخت کرو اور نہ انہیں تعلیم دو (یعنی ان سے مکمل مقاطعہ رکھو) اس ارشاد گرامی کے مثل یہ آیت کریمہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے بعض علماء کہتے ہیں کہ جو احادیث نغمہ سرور کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں ان کا تعلق اس ممانعت سے قبل کے زمانہ سے ہے۔ جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی اور غنا کی ممانعت واضح ہوئی تو احادیث منسوخ قرار دے دی گئیں۔

حضرت ابن مسعودؓ سے یہ ارشاد منقول ہے کہ "غنا نفاق کو اسی طرح اگاتا ہے جیسے پانی سبزہ کو اگاتا ہے"۔

حضرت جابرؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے یوں ہی غنا نفاق کو اگاتا ہے"

حضرت انسؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "غناء اور لہو ولعب دل میں نفاق کو اس طرح اگاتے ہیں جیسے پانی گھاس کو اگاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "غنا کی محبت دل میں نفاق کو اس طرح اگاتی ہے جیسے پانی گھاس کو اگاتا ہے" ان ارشادات میں نفاق سے مراد وہ عملی نفاق ہے جو ظاہری احوال کے برخلاف گناہ کی خواہش کو پوشید رکھتا ہو۔ حضرت فضیل بن عیاض فرماتے ہیں کہ "غنا زنا کا منتر ہے"

بہر حال۔ اس سلسلہ میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے اس قسم کے اور بہت سے ارشادات منقول ہیں۔ جہاں تک فقہاء کا تعلق ہے انہوں نے بھی اس کی حرمت اور کراہت کو بہت زیادہ شدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ چاروں اماموں کا متفقہ طور پر جو مشہور اور صحیح قول ہے وہ یہ ہے کہ "غنا مکروہ ہے" اگرچہ اس کی حرمت کا اطلاق بھی منقول ہے۔

چنانچہ قاضی ابو لطیفؒ نے شعبیؒ، سفیان ثوریؒ، حمادؒ، نخعیؒ اور فاکہیؒ سے اس کا حرام ہونا نقل کیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے بھی تفسیر معالم التنزیل میں یہی لکھا کہ "چاروں ائمہ کے یہاں غنا حرام ہے"

علامہ قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ غنا کی حرمت کے بارہ میں اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ لہو ولعب کے قبیل سے ہے جو متفقہ طور پر سب کے یہاں مذموم ہے۔ ہاں جو غنا محرمات سے محفوظ ہو وہ تھوڑا بہت شادی بیاہ، عید اور اسی قسم کی دوسری تقریبات میں جائز ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا رجحان غنا کی اباحت کی طرف ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ یہاں جس غنا اور نغمہ اور سرور کے بارہ میں بحث کی جارہی ہے اور جو حرمت و اباحت کا محل اختلاف ہے وہ اس قسم کا غنا ہے جسے گویے اور گلوکار بطور فن اور پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں چنانچہ وہ صرف لوگوں کی طبیعتوں میں انتشار و ہیجان اور کیف و نشاط پیدا کرنے کے لئے ایسے اشعار گاتے ہیں جو محض محرمات کے ذکر پر مشتمل ہوتے ہیں! ہاں وہ غنا مباح ہیں جو ایسے پاکیزہ اشعار پر مشتمل ہوں جن سے قلوب روحانی استنباط محسوس کریں اور جو محرمات و مکروہات کے ذکر پر مشتمل نہ ہوں مثلاً خدا تعالیٰ کی حمد، رسول اکرم ﷺ کی نعت، حرمین شریفین یا دوسری مقدس چیزوں کی منقبت، جہاد اور میدان جہاد کے اوصاف جیسے حدا

نصب، رکبانی بچوں کو خوش کرنے یا انہیں سلانے کے لئے ماؤں بہنوں کی لوریاں، بزرگان دین کی جائز توصیف و تعریف، قطع مسافت کے لئے مسافروں کی وابستگی، خوشی و مسرت کے اظہار اور اسی قسم کے دوسرے مضامین کے حامل اشعار ترنم کے ساتھ پڑھنا یہ ناجائز نہیں ہے بلکہ ایک حد تک یہ مستحب ہے کیونکہ یہ نیک و بامقصد اعمال کے لئے موجب نشاط ہے"

جو لوگ غنا کی اباحت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ غنا اور سماع اکثر صحابہ، تابعین، محدثین اور علماء دین سے جو اصحاب زہد و تقوی ہیں، سے منقول ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ غنا کی حرمت و کراہت کے سلسلہ میں ائمہ یا بعض اکابر سے جو سخت الفاظ منقول ہیں وہ دراصل اس غنا پر محمول ہیں جس میں فحش مضامین یا ان سے غیر شرعی چیزوں مثلاً مزامیر وغیرہ کا ارتباط ہوتا ہو۔ یہ بات ان حضرات کی جانب سے اسی لئے کہی جاتی ہے تاکہ ائمہ اور علماء کے قول و فعل میں تطبیق ہو جائے کیونکہ ان سے بھی غنا کا سننا منقول ہے۔

پہلے زمانہ کے بزرگوں اور مشائخ اور بعد کے بزرگوں اور مشائخ کے اقوال و افعال کے درمیان بھی اختلاف ہے چنانچہ پہلے زمانہ کے مشائخ جو راہ طریقت کے پیش رو اور راہنما ہیں اس سے اجتناب کرتے تھے مگر بعد کے بعض مشائخ سے سماع کی ابتدا ہوئی ہے اس سلسلہ میں پہلے زمانہ کے مشائخ کے قول و فعل کے بارہ میں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ حماد دباس جو اپنے وقت کے امام طریقت اور سلسلہ قادریہ کے ایک جلیل القدر شیخ تھے۔ ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کے لئے جا رہے تھے کہ راستہ میں اچانک ان کے کان میں گانے کی آواز پہنچی، فوراً رک گئے اور فرمایا کہ آج مجھ سے کون سا ایسا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی سزا میں مجھے اس میں مبتلا کیا گیا ہے؟ بہت دیر تک غور کرتے رہے مگر ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی جس سے یہ سمجھتے کہ فلاں گناہ ہوا ہے۔ جب گھر واپس آئے تو پھر تحقیق شروع کی۔ بہت دیر کے بعد معلوم ہوا کہ ایک تصویر دار پیالہ خرید لیا تھا۔ فرمایا یہی سبب ہے جس کی وجہ سے میں اس سزا میں گرفتار ہوا (کہ گانے کی آواز میرے کان میں پہنچی)

حضرت غوث الاعظمؒ کے قول و ارشادات دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موصوفؒ بھی اس کو مکروہ جانتے تھے

حضرت شبلیؒ کے بارہ میں منقول ہے کہ ان سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ "غنا جائز ہے؟" انہوں نے پوچھا کہ "کیا غنا حق ہے؟" (یعنی اس میں غیر شرعی و غیر اخلاقی مضامین مذکور نہیں ہیں) لوگوں نے کہا کہ "نہیں!" فرمایا کہ "اگر وہ حق نہیں ہے تو پھر گمراہی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ اس کے مکروہ ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ اس کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ طبیعت میں انتشار، خواہشات نفسانی میں ہیجان اور عورتوں کی طرف میلان ہوتا ہے بلکہ اس میں نفس امارہ کی رعونت و خوشی، عقل کی سبکی اور دنائت کا اظہار بھی ہے۔ البتہ خدا کے ذکر اور اس کی یاد میں مشغول ہو جانا ہر اس شخص کے لئے جو خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا ہے سب سے بہتر ہے"

حضرت شیخ ابو الحسن شاذلیؒ جو سلسلہ شاذلیہ کے امام اور پیشوا ہیں فرماتے ہیں کہ "جو لوگ سماع میں مشغول ہوتے ہیں اور ظالموں کے یہاں کھانا کھاتے ہیں ان میں یہودیت کا ایک حصہ شامل ہے جس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ سماع کے کئی درجہ ہیں۔ ① نوجوانوں کے لئے حرام محض ہے کیونکہ نوجوانوں کے مزاج و طبیعت پر خواہشات نفسانی کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے سماع ان کے لئے بجائے کوئی اچھا اثر مرتب کرنے کے ان کی خواہشات نفسانی میں اور زیادہ انتشار و ہیجان پیدا کرتا ہے۔ ② اس شخص کے لئے مکروہ ہے جو اکثر اوقات بطریق لہو و لعب کے سماع میں مشغول رہے۔ ③ اس شخص کے لئے مباح ہے جو محض ترنم اور خوش گلوئی سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ④ اس شخص کے لئے مندوب ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی محبت کا غلبہ ہو اور سماع اس کے لئے صرف اچھے اثرات مرتب کرے

مشائخ چشتیہ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ سماع سے دلچسپی رکھتے تھے مگر ان کی دلچسپی آداب و شرائط کے حدود کے اندر ہوتی تھی چنانچہ وہ حضرات اکثر و بیشتر خلوت میں سماع سنتے تھے جہاں نہ تو غیر ہوتے تھے اور نہ نامحرم۔ حضرت شیخ المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے

بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی سماع سنتے تھے لیکن ان کی مجلس سماع مزامیر و قوالی جیسی لغویات سے پاک ہوتی تھی۔" بہر حال مطلب یہ ہے کہ جو صوفیہ سماع کے قائل ہیں ان کے یہاں یہ کلیہ مقرر ہے کہ سماع صرف "اہل دل" کے لئے مباح ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ سماع کے آداب و شرائط مقرر کئے ہیں بلکہ یہ بھی بتادیا ہے کہ سماع سننے کا اہل کسے کہا جاسکتا ہے۔ اور ایسے ہی سماع کی ممانعت کے سلسلہ میں فقہاء اور اکابر اولیاء اللہ کے جو الفاظ منقول ہیں ان کا تعلق اس نغمہ سرور سے ہے جس کے ساتھ غیر مشروع چیزیں مثلاً مزامیر وغیرہ کی آمیزش ہو اور جس کی بنیاد محض خواہشات نفسانی اور لہو ولعب ہو ورنہ تو فی نفسہ خوش گلوئی ممنوع نہیں ہے کیونکہ وہ مباح الاصل ہے۔

پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس طرح خوش گلوئی کے اندر مفاسد ہیں اسی طرح مصالح خیر بھی ہیں مثلاً نغمہ و ترنم سخت دل کو نرم کرتا ہے اور عبادت میں ذوق و شوق اور حلاوت و خشوع پیدا کرتا ہے تاہم اس کے باوجود نغمہ و ترنم پر مداومت اکابر سلف کے طریقہ اتباع سے بعید ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جو شخص اس پر مداومت کرے گا وہ اس کی دلچسپی کو عبادت و ریاضت پر ترجیح دینے لگے گا اور شیطان کا مکر و فریب اسے اس راستہ سے اپنے جال میں پھنسا کر اطاعت و شریعت کی اہمیت کو اس کی نظر میں کم کردے گا جس کی وجہ سے وہ غلط راستہ پر بھٹکنے لگے گا۔ لہٰذا سماع بذاتہ تو مباح ہے لیکن غلط عوارض جیسے عورت و شراب کے ذکر، نامحرم عورتوں اور امرد کے گانے، مزامیر یعنی ڈھول وہارمونیم وغیرہ کی آمیزش، نفسانی خواہشات، سماع کی نااہلیت اور اس پر مداومت کی وجہ سے ممنوع ہے۔

چنانچہ یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ جو لوگ معرفت و حقیقت اور محبت و حال کے مدعی ہو کر اپنے ایک خاص جذبہ کی تسکین کی خاطر سماع میں مشغول ہو کر حقیقی ذکر اللہ اور تلاوت قرآن کریم وغیرہ سے محروم رہتے ہیں وہ اپنے نفس کے دھوکہ اور شیطان کے فریب میں مبتلا ہیں کہ وہ درحقیقت راہ راست سے ہٹ کر غلط راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ روز بروز راہ دین و شریعت سے دور تر ہوتے جارہے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ دیگر عبادات میں کیا مشغول رہتے کہ ان کی نمازیں بھی بے روح ہو کر محض "نشست و برخاست" کا ایک مجموعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اور نمازیں بھی جبراً اور ریاء کی وجہ سے یا مخلوق خدا کی نظروں میں بظاہر اپنی دینی و مذہبی زندگی کو نمایاں کرنے کے لئے پڑھتے ہیں۔ کاش انہیں سماع سے اس قدر دلچسپی نہ ہوتی صرف وہ نماز روزہ اور دیگر فرائض خلوص نیت کے ساتھ ادا کرتے تو ان کا دین تو کم سے کم بنا رہتا۔ اس سلسلہ میں یہ صورت بھی ہے کہ آجکل جو لوگ سماع کے قائل ہیں ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ فلاں بزرگ سماع سنتے تھے یا ہمارے فلاں پیشوا اس کے قائل تھے لہٰذا جب انہوں نے اسے اختیار کیا تو ہم بھی ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی اتباع میں سماع کو جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ بھی محض فریب نفس ہے کیونکہ اگر بزرگوں نے سماع کو اختیار کیا اور اس سے دلچسپی رکھی تو وہ ان کی حالت بے خودی اور غلبہ حال تھا، انہوں نے اگر سماع سنا ہے تو اس پر مداومت کی ہے بلکہ کبھی کبھی مصلحت کے پیش نظر سنا ہے۔ پھر یہ کہ ان کے یہاں مجالس سماع کی یہ جلوہ نگاری نہیں تھی بلکہ انہوں نے خلوت میں اور خلوص نیت کے ساتھ سنا ہے نیز انہوں نے ضروری قرار دے کر کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا ہے کہ بہر صورت اس پر عمل کیا جائے۔ پھر یہ کہ کہاں ان بزرگوں کا جذبہ حال و بے خودی اور اخلاص نیت اور کہاں ہمارے دور کی دنیاوی و نفسانی خواہشات اور فریب نفس؟ اب تو ان بزرگوں کی صرف اس بات کی تقلید ہے نہ ان کے صالح افکار کی اطاعت ہے اور ان کے نیک اعمال و مقدس زندگیوں کی پیروی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ "بدنام کنندہ نکونامے چند"۔

حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں سے نہ تو ان لوگوں کو کوئی حقیقی نسبت ہے اور نہ ان بزرگوں کا کوئی ان سے تعلق ہے۔ اور جو لوگ ان امور کو باپ دادا کی روایت سمجھ کر بغیر اہلیت کے اختیار کئے ہوئے ہیں ان کے حال پر یہ آیت کریمہ صادق آتی ہے کہ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ۔

حاصل یہ ہے کہ آجکل جو یہ طریقہ رائج ہے کہ اولیاء اللہ کے مزارات پر عرس کے نام پر محض نمود و نمائش اور حب جاہ و شہرت کے

جذبہ سے جشن منایا جاتا ہے مجالس رقص و سرور منعقد ہوتی ہیں، قوالوں اور گویوں کی جماعت اپنی قوالی اور ساز و سامان کے ساتھ بلائے اور بغیر بلائے صرف شہرت اور مال حاصل کرنے کے لئے آتی ہے۔ حاشااللہ! کہ پہلے زمانہ کے کسی بزرگ کا یہ طریقہ رہا ہوا اور کسی بزرگ نے آجکل کی طرح یہ ڈھونگ رچائے ہوں؟؟

اور پھر غضب یہ کہ ان چیزوں کو مشائخ کے عرسوں میں قرب خدا کا ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے ایسے لوگ غور کریں کہ انہوں نے گمراہی و ضلالت کا کیسا راستہ اختیار کر رکھا ہے یہ کون سی مذہبی اور دینی زندگی ہے؟ کاش یہ لوگ اپنے آپ کو متقی و پرہیزگار اور بزرگان دین کے شیدائی نہ کہتے اور اپنے جسم آزاد پر نام نہاد زہد و تقوی کا یہ جامہ تنگ مزین نہ کرتے۔

خوب اچھی طرح جان لیجئے کہ ایسے لوگوں کی شرعًا و دیانۃً نہ تو اطاعت واجب ہے اور نہ ان کی تعظیم ضروری ہے اس لئے کہ اگر ان لوگوں کی عزت و توقیر کی جائے گی تو اس طرح ان کے ان اعمال و افعال کی تائید و مدد ہوگی۔ خدا ہم سب کو بھی اسی راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو اس نے اپنے پیغمبر رسول اکرم ﷺ کے ذریعہ ہمیں دکھایا ہے۔ آمین۔

آنحضرت ﷺ عید گاہ جانے سے پہلے کھجور تناول فرماتے تھے

(۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَغْدُوْ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَاْكُلَ تَمَرَاتٍ وَيَاْكُلُهُنَّ وِتْرًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انس فرماتے ہیں کہ سرتاج دو عالم ﷺ کھجوریں تناول فرمائے بغیر عید گاہ تشریف نہیں لے جاتے تھے اور کھجوریں طاق کھاتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: آپ ﷺ عید کے روز عید گاہ جانے سے بیشتر کھجوریں نوش فرما کر گویا کھانے میں جلدی کرتے تھے تاکہ پہلے دنوں یعنی ایام رمضان میں امتیاز پیدا ہو جائے کیونکہ جس طرح رمضان میں نہ کھانا واجب ہے اسی طرح عید کے روز کھانا واجب ہے۔

آپ ﷺ کھجوریں طاق یعنی تین، پانچ، سات یا اس سے کم اور زیادہ تناول فرماتے تھے چونکہ ہر کام میں "طاق" کی رعایت رکھنا بہتر ہے اس لئے آپ ﷺ اس معاملہ میں بھی طاق کا لحاظ فرماتے تھے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ یعنی اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق کو پسند فرماتا ہے۔

عید کے روز آپ ﷺ کھجوریں اس لئے نوش فرماتے تھے کہ وہی اس وقت موجود ہوتی تھیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ کھجوریں کھانے میں حکمت یہ تھی کہ وہ شریں ہوتی ہے اور شرینی تقویت بصر کا ذریعہ بنتی ہے خاص طور پر خلو معدہ کے وقت تو نگاہوں کی تقویت کے لئے یہ بڑی زود اثر ہوتی ہے لہٰذا روزوں کی وجہ سے جو ضعف ہو جاتا تھا کھجوریں اپنے اثرات سے اسے ختم کرتی تھیں۔ پھر یہ کہ شیرنی مقتضاء ایمان کے موافق ہے۔ چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ جو شخص خواب میں شیرنی کھاتے دیکھے اسے حلاوت ایمان نصیب ہوگی۔ نیز شیرنی دل کو نرم کرتی ہے اس سبب سے شیرنی کے ساتھ افطار کرنا افضل ہے۔

آنحضرت ﷺ عید گاہ ایک راستہ سے جاتے اور دوسرے راستہ سے واپس آتے

(۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدٍ خَالَفَ الطَّرِيْقَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابر فرماتے ہیں کہ جب عید کا روز ہوتا تو سرتاج دو عالم ﷺ راستوں میں فرق کرتے۔" (بخاری)

تشریح: یعنی عید گاہ ایک راستہ سے تشریف لے جاتے اور دوسرے راستہ سے واپس آتے اور اس کی حکمت یہ تھی تاکہ دونوں راستے اور دونوں راستوں پر رہنے والے جن و انس عبادت کی گواہی دیں۔ اس کے علاوہ اور کئی وجوہ بھی علماء نے لکھی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ

یہ سب احتمال کے درجہ میں ہیں۔ علماء نے اپنے اپنے فہم کے مطابق اس کی وجہیں بیان کی ہیں۔ اصل حقیقت اور وجہ کیا تھی؟ یہ اللہ اور اس کا رسول ہی جانتے ہیں۔

قربانی کا وقت

(۱۰) وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ فَقَالَ اِنَّ اَوَّلَ مَانَبْدَأُبِهٖ فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا نُصَلِّي ثُمَّ نَرْجِعُ فَنَنْحَرُ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدْ اَصَابَ سُنَّتَنَا وَمَنْ ذَبَحَ قَبْلَ اَنْ نُصَلِّيَ فَاِنَّمَا هُوَ شَاةُ لَحْمٍ عَجَّلَهٗ لِاَهْلِهٖ لَيْسَ مِنَ النُّسُكِ فِيْ شَيْءٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براءؓ راوی ہیں سرتاج دوعالم ﷺ نے یوم النحر (یعنی بقر عید کے دن) ہمارے سامنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ "اس دن سب سے پہلا کام جو ہمیں کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہم (عید الاضحی کی) نماز پڑھیں پھر گھر واپس جائیں اور قربانی کریں، لہٰذا جس شخص نے اس طرح عمل کیا (کہ قربانی سے پہلے نماز و خطبہ سے فراغت حاصل کرلی) اس نے ہماری سُنّت کو اختیار کیا اور جس شخص نے نماز سے پہلے قربانی کرلی وہ قربانی نہیں ہے بلکہ وہ گوشت والی بکری ہے جسے اس نے اپنے گھر والوں کے لئے جلدی ذبح کر لیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نماز سے پہلے قربانی کر لینے سے قربانی کا ثواب نہیں ملتا بلکہ اس کا شمار اس گوشت میں ہو جاتا ہے جو روزانہ گھر والے کھاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مشروع یہ ہے کہ پہلے عید قربانی کی نماز پڑھی جائے اس کے بعد خطبہ پڑھا جائے اور سنا جائے پھر قربانی کی جائے چونکہ حدیث بالا میں قربانی کا وقت پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس لئے علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ عید قرباں کے دن طلوع فجر سے پہلے قربانی جائز نہیں۔ البتہ طلوع فجر کے بعد قربانی کا وقت شروع ہونے کے سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ جب آفتاب بقدر نیزہ بلند ہو جائے اور اس کے بعد کم از کم دو رکعت نماز اور دو مختصر خطبے کی بقدر وقت گزر جائے تو قربانی کا وقت شروع ہوتا ہے اس کے بعد قربانی کرنا جائز ہے خواہ بقر عید کی نماز ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اس وقت سے پہلے قربانی جائز نہیں ہے خواہ قربانی کرنے والا شہر میں رہتا ہو یا دیہات کا رہنا والا ہو، نیز امام شافعیؒ کے نزدیک قربانی کا وقت تیرہویں تاریخ کے غروب آفتاب تک رہتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قربانی کا وقت شہر والوں کے لئے عید قربان کی نماز کے بعد شروع ہوتا ہے اور دیہات والوں کے لئے طلوع فجر کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں قربانی کا آخری وقت بارہویں تاریخ کے آخر تک رہتا ہے۔

قربانی واجب ہے یا سنت: حضرت امام شافعیؒ کے یہاں قربانی واجب نہیں ہے بلکہ سُنّت ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ ہر صاحب نصاب پر قربانی واجب ہے اگرچہ نصاب نامی نہ ہو۔

(۱۱) وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْبَجَلِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَلْيَذْبَحْ مَكَانَهَا اُخْرٰى وَمَنْ لَّمْ يَذْبَحْ حَتّٰى صَلَّيْنَا فَلْيَذْبَحْ عَلَى اسْمِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جندب ابن عبداللہ بجلیؓ راوی ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا "جو شخص (قربانی کا جانور) عید قربان کی نماز سے پہلے ذبح کر دے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے بدلے (قربانی کیلئے) دوسرا جانور ذبح کرے اور جو شخص نماز پڑھنے تک ذبح نہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ (نماز کے بعد) اللہ تعالیٰ کے نام پر (قربانی کا جانور) ذبح کر دے" (یہ قربانی درست ہوگی جس کا ثواب اسے ملے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۱۲) وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَاِنَّمَا يَذْبَحُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَقَدْ تَمَّ نُسُكُهٗ وَاَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براءؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے (قربانی کا جانور) نماز سے پہلے ذبح کیا تو گویا اس نے اپنے (محض کھانے کے) واسطے ذبح کیا (اس لئے اسے قربانی کا ثواب حاصل نہیں ہوا) جس شخص نے نماز کے بعد ذبح کیا تو بلاشبہ اس کی قربانی ادا ہو گئی اور (اس طرح) اس نے مسلمانوں کے طریقے کو اپنایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جمہور علماء کا مسلک یہی ہے مگر تعجب ہے کہ اتنی واضح اور صحیح احادیث کے باوجود حضرت امام شافعیؒ نے نہ معلوم کیوں جمہور علماء کے مسلک کے خلاف یہ کہا کہ قربانی کا وقت شروع ہو جانے کی بعد قربانی کر لینی جائز ہے۔ خواہ نماز ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو جیسا کہ ابھی پیچھے ان کا مسلک نقل کیا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ عیدگاہ میں قربانی کرتے تھے

⑬ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْبَحُ وَيَنْحَرُ بِالْمُصَلّٰى۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ عیدگاہ میں ذبح اور نحر کرتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: بکری، دنبہ، بھیڑ، گائے بھینس اور اونٹ یہ جانور خواہ نر ہوں یا مادہ، ان کے علاوہ دوسرے جانوروں کی قربانی جائز نہیں، اونٹ کے علاوہ بقیہ جانوروں کے حلال کرنے کو "ذبح" کہتے ہیں، اور اونٹ کے حلال کرنے کو "نحر" کہتے ہیں نحر کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اونٹ کو کھڑا کر کے اس کے سینہ میں نیزہ مارا جاتا ہے جس سے وہ گر پڑتا ہے۔ اگرچہ اونٹ کو ذبح کرنا بھی جائز ہے لیکن نحر افضل ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

مسلمانوں کے لئے خوشی کے دو دن

⑭ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُوْنَ فِيْهِمَا فَقَالَ مَا هٰذَانِ الْيَوْمَانِ قَالُوْا كُنَّا نَلْعَبُ فِيْهِمَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَبْدَلَكُمُ اللّٰهُ بِهِمَا خَيْرًا مِّنْهُمَا يَوْمَ الْاَضْحٰى وَيَوْمَ الْفِطْرِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ نے دو دن مقرر کر رکھے تھے جن میں وہ لہو و لعب کرتے (اور خوشیاں مناتے) تھے، آپ ﷺ نے (یہ دیکھ کر) پوچھا کہ "یہ دو دن کیسے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا کہ "ان دونوں دنوں میں ہم زمانہ جاہلیت میں کھیلا کودا کرتے تھے"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان دونوں دنوں کے بدلے ان سے بہتر دو دن مقرر کر دیئے ہیں اور وہ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: زمانہ جاہلیت میں اہل مدینہ کے لئے دو دن مقرر تھے جن میں وہ لہو و لعب میں مشغول ہوتے تھے اور خوشیاں منایا کرتے تھے ان میں سے ایک دن "نوروز" تھا اور دوسرا دن "مہرجان"۔ نوروز کے دن آفتاب برج حمل میں جاتا ہے اور مہرجان کے دن برج میزان میں داخل ہوتا ہے۔ چونکہ ان دونوں دنوں میں آب و ہوا معتدل ہوتی ہے۔ اور رات برابر ہوتے ہیں اس لئے ان دنوں کو حکماء نے خوشی منانے کی لئے مقرر کر لیا تھا چنانچہ وہی رسم لوگوں میں چلی آتی تھی۔ یہاں تک کہ جب اہل مدینہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو شروع میں پرانی عادت کے مطابق ان دنوں میں پہلے زمانہ کی طرح خوشی منایا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے جب ان دنوں کی حقیقت دریافت فرمائی تو وہ اس کی کوئی حقیقت بیان نہ کر سکے صرف اتنا بتا سکے کہ پرانے زمانے سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے اور ان دنوں میں ہم اسی طرح خوشی مناتے چلے آتے ہیں، تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دنوں سے تمہیں اب کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان دنوں

سے بہتر تمہیں عیدین کے دو دن عنایت فرما دیئے ہیں تم ان بابرکت دنوں میں خوشی منا سکتے ہو۔ گویا اس طرح آپ ﷺ نے ایک طرف تو یہ اشارہ فرمایا کہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ حقیقی عید اور خوشی عبادت کے دن منائے۔ لہٰذا اس حدیث میں عیدین کے دن لہو و لعب میں مشغول ہونے کی ممانعت ہے۔ دوسری طرف یہ اشارہ خفی ہے کہ عیدین میں بہت معمولی طریقہ پر کھیل کود اور اس انداز اور اس طریقہ سے خوشی منانا کہ جس میں حدود شریعت سے تجاوز اور فحاشی نہ ہو جائز ہے۔

یہ حدیث نہایت لطیف انداز میں یہ بتا رہی ہے کہ غیر مسلموں کے تہوار کی تعظیم کرنا اور ان میں خوشی منانا، نیز ان کی رسموں کو اپنانا ممنوع ہے نیز یہ حدیث غیر مسلموں کی عید و تہوار میں شرکت و حاضری کی ممانعت کو بھی ظاہر کر رہی ہے۔ بعض علماء نے تو اسے اتنا سخت جانا ہے کہ اس عمل پر کفر کا حکم لگایا ہے چنانچہ ابوحفص کبیر حنفی فرماتے ہیں کہ جو شخص نوروز کی عظمت و توقیر کے پیش نظر اس دن مشرکوں کو تحفہ میں انڈا بھیجے (جیسا کہ اس روز مشرکین کا طریقہ ہے) تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور اس کے تمام اعمال نابود ہو جاتے ہیں۔

حضرت قاضی ابوالمحاسن ابن منصور حنفی کا قول ہے کہ "اگر کوئی اس دن وہ چیزیں خریدے جو دوسرے دنوں میں نہیں خریدتا ہے (جیسا کہ ہمارے یہاں دیوالی کے روز کھیلیں اور مٹھائی کے بنے ہوئے کھلونے وغیر خریدے جاتے ہیں) یا اس دن کسی کو تحفہ بھیجتا ہے اور اس سے اس کا مقصد اس دن کی تعظیم ہو جیسا کہ مشرک اس دن کی تعظیم کرتے ہیں تو وہ شخص کافر ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص محض اپنے استعمال اور فائدہ اٹھانے یا حسب عادت کسی کو ہدیہ بھیجنے کی نیت سے خریدتا ہے۔ تو کافر نہیں ہوتا لیکن یہ بھی مکروہ ہے لیکن اس طرح کافروں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے اس لئے اس سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔

اس طرح اگر کوئی شخص عاشورہ کے دن خوشی مناتا ہے تو خوارج کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے اور اگر اس دن غم و الم ظاہر کرنے والی چیزیں اختیار کرتا ہے تو روافض کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے لہٰذا ان دونوں باتوں سے بچنا چاہئے۔ یہ بات بھی جان لیجئے کہ نوروز کی عظمت و توقیر کے سلسلہ میں روافض مجوسیوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ اسی دن حضرت عثمانؓ شہید کئے گئے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت منعقد ہوئی تھی۔

فتاوی ذخیرہ میں لکھا ہے کہ جو شخص ہولی اور دیوالی دیکھنے کے لئے بطور خاص نکلتا ہے وہ حدود کفر سے قریب ہو جاتا ہے کیونکہ اسی میں اعلان کفر ہوتا ہے لہٰذا ایسا شخص گویا اپنے عمل سے کفر کی مدد کرتا ہے اسی پر "نوروز" دیکھنے کے لئے نکلنے کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بعض مسلمان ایسا کرتے ہیں۔ یہ بھی موجب کفر ہے۔

"تجنیس" میں مذکور ہے کہ ہمارے مشائخ اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جس شخص نے اہل کفار کے معتقدات و معاملات میں سے کسی چیز کے اچھا ہونے کا اعتقاد رکھا تو وہ حدود کفر میں داخل ہو جائے گا۔ اسی پر اس مسئلہ کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے اہل ہوا و ہوس انسان مثلاً شریعت کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرنے والے نام نہاد صوفیا کے کسی کلام یا کسی قول کے بارہ میں اچھا خیال رکھے اور یہ کہے کہ یہ کلام معنوی ہے یا یہ کہے کہ فلاں قول ایسا ہے جس کے معنی صحیح ہیں تو اگر حقیقت میں وہ کلام و قول کفر آمیز ہو تو اس کے بارہ میں اچھا عقیدہ رکھنے والا اور اسے صحیح کہنے والا بھی کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح "نوادر الفتاوی" میں منقول ہے کہ جو شخص غیر مسلموں کی رسومات کو اچھا جانے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ "عمدۃ الاسلام" میں لکھا ہے کہ جو شخص کافروں کی رسومات ادا کرے مثلاً نئے مکان میں بیل اور گائے اور گھوڑے کو زرد و سرخ رنگ کرے یا بندھن دار باندھے تو کافر ہو جاتا ہے۔"

حاصل یہ کہ ان معتقدات و رسومات سے قطعاً احتراز کرنا چاہیے جن سے اسلام اور شریعت کا دور کا بھی واسطہ ہو بلکہ ان کی بنیاد خالص غیر اسلامی و غیر شرعی چیزوں پر ہے۔

عید میں نماز سے پہلے اور بقر عید میں نماز کے بعد کھانا پینا چاہئے

(۱۵) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَطْعَمَ وَلَا يُطْعَمُ يَوْمَ الْاَضْحٰى حَتّٰى

يُصَلِّي۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ و الدارمی)

"اور حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ عید کے دن بغیر کچھ کھائے پیئے عید گاہ تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ اور بقر عید کے دن بغیر نماز پڑھے کچھ نہیں کھاتے پیتے تھے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: عید کے روز نماز سے پہلے کھانے پینے کا سبب گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ بقر عید کے روز آپ غرباء و مساکین کا ساتھ دینے اور ان کی دلجوئی کی خاطر بقر عید کی نماز کے بعد ہی کچھ تناول فرماتے تھے۔ کیونکہ غرباء و مساکین کو تو کچھ کھانا پینا اسی وقت نصیب ہوتا تھا جب قربانی ہو جاتی اور اس کا گوشت ان لوگوں میں تقسیم ہو جاتا اس لئے آپ ان کی وجہ سے خود بھی کھانے پینے میں تاخیر فرماتے تھے۔

تکبیرات عیدین

(۱۶) وَعَنْ كَثِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَبَّرَ فِي الْعِيْدَيْنِ فِي الْاُوْلٰى سَبْعًا قَبْلَ الْقِرَاءَةِ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت کثیر ابن عبداللہ اپنے والد سے اور وہ کثیر کے دادا سے (یعنی اپنے والد مکرم) سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عیدین کی نماز میں پہلی رکعت میں قرات سے پہلے پانچ تکبیریں کہیں۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی رکعت میں قرات سے پہلے تحریمہ اور رکوع کی تکبیروں کے علاوہ سات تکبیریں کہیں۔ اسی طرح دوسری رکعت میں قیام اور رکوع کی تکبیروں کے علاوہ پانچ تکبیریں کہیں۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا اسی پر عمل ہے اس سلسلہ میں مفصل بحث آگے آ رہی ہے۔

(۱۷) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ مُرْسَلًا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ كَبَّرُوْا فِي الْعِيْدَيْنِ وَالْاِسْتِسْقَاءِ سَبْعًا وَخَمْسًا وَصَلَّوْا قَبْلَ الْخُطْبَةِ وَجَهَرُوْا بِالْقِرَاءَةِ۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت جعفر ابن محمد مرسلا روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ عیدین اور استسقاء کی نماز میں سات اور پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے اور (عیدین و استسقاء کی) نماز خطبہ سے پہلے پڑھا کرتے تھے، نیز قرات با آواز بلند پڑھتے تھے۔" (شافعیؒ)

تشریح: "جعفر" سے مراد امام جعفرؒ صادق ابن محمد باقرؒ ابن علی یعنی امام زین العابدین ابن حضرت امام حسینؓ ابن حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ سات اور پانچ کی وضاحت حدیث بالا تاکید کی ہے کہ پہلی رکعت میں قرات سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں قرات سے پہلے پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے، یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

(۱۸) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا مُوْسٰى وَحُذَيْفَةَ كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكَبِّرُ فِي الْاَضْحٰى وَالْفِطْرِ؟ فَقَالَ اَبُوْ مُوْسٰى كَانَ يُكَبِّرُ اَرْبَعًا تَكْبِيْرَهٗ عَلَى الْجَنَائِزِ فَقَالَ حُذَيْفَةُ صَدَقَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سعید ابن عاص فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوموسیٰ و حضرت حذیفہؓ سے سوال کیا کہ رسول کریم ﷺ عید و بقر عید کی نماز میں کتنی تکبیریں کہتے تھے؟ تو حضرت ابوموسیٰؓ نے جواب دیا کہ "جس طرح آپ ﷺ نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہتے تھے اسی طرح عیدین کی نماز میں بھی چار تکبیریں کہا کرتے تھے" حضرت حذیفہؓ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "ابوموسیٰؓ نے سچ کہا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت ابوموسیٰؓ کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح آپ ﷺ نماز جنازہ میں پڑھتے وقت چار تکبیریں کہا کرتے تھے اسی طرح آپ ﷺ عیدین کی نماز میں بھی ہر رکعت میں چار تکبیریں کہا کرتے تھے اس طرح کہ پہلی رکعت میں تو قرات سے پہلے تکبیر تحریمہ سمیت چار تکبیریں کہتے تھے اور دوسری رکعت میں قرات کے بعد رکوع کی تکبیر سمیت چار تکبیریں کہتے تھے۔

اس سلسلہ میں یہ بات جان لینی چاہئے کہ تکبیرات عید کے سلسلہ میں متضاد احادیث منقول ہیں اسی وجہ سے ائمہ کے مسلک میں بھی اختلاف ظاہر ہوا ہے چنانچہ تینوں اماموں کے نزدیک عیدین کی نماز میں پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کے ہاں تو پہلی رکعت میں سات تکبیریں مع تکبیر تحریمہ کے ہیں اور اسی طرح دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں تکبیر قیام سمیت ہیں جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک پہلی رکعت میں سات تکبیریں تکبیر تحریمہ کے علاوہ اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں تکبیر قیام کے علاوہ ہیں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ تین تکبیریں پہلی رکعت میں اور تکبیر رکوع کے علاوہ تین تکبیریں دوسری رکعت میں ہیں جیسا کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ نیز اسی کو حضرت ابن مسعودؓ نے بھی اختیار کیا ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق حضرت ابن عباسؓ کا مسلک ہے یہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جن سے حضرت امام شافعیؒ استدلال کرتے ہیں تو ان کی صحت و ضعف اور ان کی اسناد و طرق کے بارہ میں بہت زیادہ اعتراضات ہیں جس کو یہاں نقل کرنے کا موقع نہیں ہے۔ علماء حنفیہ اپنے مسلک کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ تکبیرات عیدین کے سلسلہ میں جب متضاد و مختلف احادیث سامنے آئیں تو ہم نے ان میں سے ان احادیث کو اپنا معمول بہ قرار دیا جن میں تکبیرات کی تعداد کم منقول تھی کیونکہ عیدین کی زائد تکبیریں اور رفع یدین بہرحال خلاف معمول ہیں اس لئے کم تعداد کا اختیار کرنا ہی اولیٰ ہوگا۔

امام خطبہ دیتے وقت عصا وغیرہ کا سہارا لے لے

⑲ وَعَنِ الْبَرَاءِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُوْوِلَ يَوْمَ الْعِيْدِ قَوْسًا فَخَطَبَ عَلَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت براءؓ راوی ہیں کہ عید کے دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کمان پیش کی گئی چنانچہ آپ ﷺ نے اس کا سہارا لے کر خطبہ ارشاد فرمایا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح عصاء وغیرہ ٹیک کر خطبہ پڑھا جاتا ہے اسی طرح آپ ﷺ نے عصاء کی بجائے کمان ٹیک کر اس کے سہارے خطبہ ارشاد فرمایا۔

⑳ وَعَنْ عَطَاءٍ مُرْسَلًا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا خَطَبَ يَعْتَمِدُ عَلٰى عَنَزَتِهٖ اِعْتِمَادًا۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت عطاء بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب خطبہ ارشاد فرماتے تو اپنے نیزے پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے۔" (شافعیؒ)

㉑ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ شَهِدْتُ الصَّلَاةَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ يَوْمِ عِيْدٍ فَبَدَأَ بِالصَّلٰوةِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ بِغَيْرِ اَذَانٍ وَّلَا اِقَامَةٍ فَلَمَّا قَضَى الصَّلٰوةَ قَامَ مُتَّكِئًا عَلٰى بِلَالٍ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَوَعَظَ النَّاسَ وَذَكَّرَهُمْ وَحَثَّهُمْ عَلٰى طَاعَتِهٖ وَمَضٰى اِلَى النِّسَاءِ وَمَعَهٗ بِلَالٌ فَاَمَرَهُنَّ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ عید کے دن نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز میں شریک ہوا، چنانچہ آپ ﷺ نے اذان و تکبیر کے بغیر خطبہ سے پہلے نماز شروع فرمائی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو (خطبہ کے لئے) حضرت بلال کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے، آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی تعریف بیان فرمائی۔ لوگوں کو نصیحت کی اور انہیں عذاب و ثواب (کے احکام یاد دلائے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے کی ترغیب دلائی۔ پھر آپ ﷺ عورتوں کی جماعت کی طرف متوجہ ہوئے حضرت بلالؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے (وہاں بھی) آپ ﷺ نے عورتوں کو اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا، ان کو نصیحت کی اور انہیں عذاب و ثواب (کے احکام) یاد دلائے۔" (نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خطیب کے لئے مناسب ہے کہ وہ خطبہ دیتے وقت کسی چیز مثلاً تلوار، کمان، برچھی، عصا یا کسی آدمی کا

سہارا لے کر کھڑا ہو۔

عید گاہ جانے کا طریقہ

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَرَجَ يَوْمَ الْعِيْدِ فِيْ طَرِيْقٍ رَجَعَ فِيْ غَيْرِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب عید کے دن (عید گاہ) ایک راستہ سے تشریف لے جاتے تو واپس دوسرے راستہ سے ہوتے تھے۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: عید گاہ جانے کے لئے ایک راستہ اختیار کرنا اور واپسی کے لئے دوسرا راستہ اختیار کرنا مسنون ہے، اس کی حکمت اسی باب کی فصل میں ایک حدیث کی تشریح کے ضمن میں بیان کی جا چکی ہے۔

عید گاہ جاتے ہوئے۔ راستہ میں یعنی اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہ۔ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد پڑھتے رہنا چاہئے۔ صاحبین کے نزدیک تو عید و بقر عید دونوں موقع پر راستہ میں یہ تکبیر بلند آواز سے پڑھنی چاہئے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ عید میں تو یہ تکبیر آہستہ آواز سے۔ اور بقر عید میں بلند آواز سے پڑھنا چاہئے۔

عذر کی وجہ سے عیدین کی نماز شہر کی مسجد میں پڑھی جا سکتی ہے

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ اَصَابَهُمْ مَطَرٌ فِیْ يَوْمِ عِيْدٍ فَصَلّٰى بِهِمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الْعِيْدِ فِی الْمَسْجِدِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) عید کے دن بارش ہونے لگی تو نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کو مسجد میں نماز پڑھائی۔"

(ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ عیدین کی نماز شہر سے باہر جنگل میں ادا فرماتے تھے مگر جب بارش ہوتی تو آپ ﷺ مسجد نبوی ہی میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ عیدین کی نماز جنگل میں (یعنی عید گاہ میں) ادا کرنا افضل ہے۔ ہاں کوئی عذر پیش آجائے تو پھر شہر کی مسجد میں ادا کی جا سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں اہل مکہ کے لئے مسئلہ یہ ہے کہ وہ عیدین کی نماز مسجد حرام ہی میں ادا کریں جیسا کہ آجکل عمل ہے اسی طرح اہل مدینہ بھی عیدین کی نماز مسجد نبوی ہی میں پڑھتے ہیں۔

عیدین کی نماز تاخیر سے اور بقر عید کی نماز جلدی پڑھ لینی چاہئے

(۲۴) وَعَنْ اَبِی الْحُوَيْرِثِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اِلٰى عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ وَهُوَ بِنَجْرَانَ عَجِّلِ الْاَضْحٰى وَاَخِّرِ الْفِطْرَ وَذَكِّرِ النَّاسَ۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت ابی الحویرثؓ راوی ہیں کہ رسول کریم نے حضرت عمروؓ بن حزم کو جو نجران میں تھے یہ (حکم لکھ کر بھیجا کہ بقر عید کی نماز جلدی اور عید کی نماز تاخیر سے ادا کرو نیز (خطبہ میں) لوگوں کو پند و نصیحت کرو۔" (شافعیؒ)

تشریح: نجران ایک شہر کا نام ہے آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرو ابن حزمؓ کو وہاں کا عامل بنا کر بھیجا تھا جب کہ ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے انہیں یہ احکام لکھ کر بھیجے تھے تاکہ وہ اس پر عمل کریں۔ بقر عید کی نماز جلدی ادا کر لینے کے لئے اس واسطے فرمایا تاکہ لوگ نماز سے جلدی فارغ ہو کر قربانی وغیرہ میں مشغول ہو جائیں۔ اس طرح عید کی نماز تاخیر سے ادا کرنے کے لئے اس واسطے فرمایا تاکہ لوگ نماز سے پہلے صدقہ فطر ادا کر لیں۔

چاند کی شہادت زوال کے بعد آئے تو عید کی نماز دوسرے دن پڑھی جائے

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ عُمَیْرِ بْنِ اَنَسٍ عَنْ عُمُوْمَةٍ لَّهٗ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَكْبًا جَاءُوْا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَشْهَدُوْنَ اَنَّهُمْ رَءَوا الْهِلَالَ بِالْاَمْسِ فَاَمَرَهُمْ اَنْ یُّفْطِرُوْا وَاِذَا اَصْبَحُوْا اَنْ یَّغْدُوْا اِلٰی مُصَلَّاهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت عمیر بن انس اپنے چچاؤں سے جو نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے تھے، نقل کرتے ہیں کہ "ایک قافلہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ شہادت دی کہ انہوں نے کل عید کا چاند دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہؓ کو افطار کا حکم دیا اور فرمایا کہ صبح عید گاہ جائیں۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: رمضان کی تیسویں شب یعنی انتیس تاریخ کو اہل مدینہ نے عید کا چاند نہیں دیکھا چنانچہ انہوں نے تیس تاریخ کو روزہ رکھا۔ اتفاق سے اسی روز ایک قافلہ باہر سے مدینہ آیا اور اس نے آنحضرت ﷺ کے سامنے اس بات کی شہادت دی کہ ہم نے کل چاند دیکھا۔ آپ ﷺ نے اس قافلہ کی شہادت کو مانتے ہوئے لوگوں کو حکم دیا کہ روزہ افطار کر دیں۔ اور چونکہ چاند ہونے کی یہ شہادت زوال آفتاب کے بعد آئی تھی اور نماز عید کا وقت نہ رہا تھا۔ جیسا کہ ایک روایت میں یہ صراحت بھی ہے کہ انهم قدموا اخر النهار (یعنی قافلہ دن کے آخری حصہ میں مدینہ پہنچا تھا) آپ ﷺ نے نماز عید کے بارہ میں یہ حکم دیا کہ کل صبح ادا کی جائے۔ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا اسی پر عمل ہے کہ آفتاب بلند ہونے کے بعد نماز عید کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور زوال آفتاب تک رہتا ہے۔

شرح منیہ میں لکھا کہ "اگر کوئی ایسا عذر پیش آجائے جو عید الفطر کے روز زوال آفتاب سے پہلے نماز عید کی ادائیگی کے لئے مانع ہو تو عید کی نماز اس روز پڑھنے کی بجائے دوسرے روز زوال آفتاب سے پہلے ادا کر لی جائے۔ اگر دوسرے دن بھی کوئی عذر نماز کی ادائیگی کے لئے مانع ہو تو پھر نماز نہ پڑھی جائے۔

بخلاف بقر عید کی نماز کے کہ اگر اس کی ادائیگی کے لئے کوئی عذر پہلے اور دوسرے روز مانع ہو تو تیسرے روز بھی اس کی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ ویسے بقر عید کی نماز میں بلا عذر بھی دوسرے یا تیسرے دن تک تاخیر جائز ہے مگر مکروہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عیدین کی نماز میں اذان و تکبیر نہیں ہے

(۲۶) عَنِ ابْنِ جُرَیْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَطَاءٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَا لَمْ یَكُنْ یُؤَذَّنُ یَوْمَ الْفِطْرِ وَلَا یَوْمَ الْاَضْحٰی ثُمَّ سَاَلْتُهٗ یَعْنِیْ عَطَاءً بَعْدَ حِیْنٍ عَنْ ذٰلِكَ فَاَخْبَرَنِیْ قَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ اَنْ لَّا اَذَانَ لِلصَّلٰوةِ یَوْمَ الْفِطْرِ حِیْنَ یَخْرُجُ الْاِمَامُ وَلَا بَعْدَ مَا یَخْرُجُ وَلَا اِقَامَةَ وَلَا نِدَاءَ وَلَا شَیْءَ لَا نِدَاءَ یَوْمَئِذٍ وَّلَا اِقَامَةَ۔ (رواہ مسلم)

"ابن جریجؒ کہتے ہیں کہ عطاؒ نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ "نہ تو عید کے دن (نماز عید کے لئے) اذان دی جاتی تھی اور نہ بقر عید کے دن" ابن جریج کہتے ہیں کہ "کچھ مدت کے بعد پھر میں نے دوبارہ عطاء سے یہی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ "مجھے حضرت جابر ابن عبداللہ نے بتایا ہے کہ عید کے دن نماز عید کے لئے اذان نہیں ہے نہ تو امام کے باہر آنے کے وقت اور نہ امام کے باہر آجانے پر، اور نہ تکبیر ہے اور نہ نداء ہے اور نہ کچھ اور، اس دن نہ نداء ہے نہ تکبیر۔" (مسلمؒ)

تشریح: ابن جریج نے یا تو عطاء سے دوبارہ اس مسئلہ کی تفصیل معلوم کی ہوگی یا بعینہ وہی مسئلہ پوچھا ہوگا۔ بہر حال عطاء نے دوسری مرتبہ

کے جواب میں صرف عید الفطر کا ذکر کیا عید الاضحی کا نہیں، وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ یہ سمجھے کہ صرف عید الفطر کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے سائل عید الفطر پر عید الاضحی کو بھی قیاس کر لے گا۔

"نداء" سے "الصلوٰۃ الصلوٰۃ" یا اس طرح کے دوسرے الفاظ جو نماز کی اطلاع دینے کے لئے استعمال کئے جائیں کہنا مراد ہے "لانداء" کے بعد لفظ "لاشئ" لانداء کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے، پھر اس کے بعد حدیث کے آخری الفاظ لانداء یومئذ و لا اقامۃ بھی تاکید کے لئے دوبارہ استعمال کئے گئے ہیں۔ (شیخ عبدالحق)

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ لفظ "لانداء" اول سے آخر تک پہلے جملہ کی تاکید ہے اور مناسب یہ ہے کہ لفظ نداء سے اذان مراد لی جائے کیونکہ عیدین کے موقع پر اذان و تکبیر کی بجائے الصلوٰۃ جامعۃ پکار کر کہنا تمام علماء کے نزدیک مستحب ہے۔ گویا حضرت شیخ عبدالحقؒ کے قول کے مطابق حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ عیدین کی نماز کے لئے جس طرح اذان و تکبیر مشروع نہیں ہے اسی طرح نماز کی اطلاع کے لئے کوئی اور لفظ مثلاً "الصلوٰۃ جامعۃ" پکارنا بھی مشروع نہیں ہے جب کہ حضرت ملا علی قاریؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ عیدین کی نماز میں اذان و تکبیر تو مشروع نہیں ہاں نماز کی اطلاع دینے کے لئے نداء یعنی "الصلوۃ جامعۃ" پکار کر کہنا مستحب ہے۔

لہٰذا ان دونوں اقوال کے باہم اختلاف و تضاد کو اس تطبیق کے ذریعہ ختم کیا جائے حضرت شیخ نے نداء کی جو نفی کی ہے وہ عید گاہ کے اندر بطریق التزام کے ہے یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ اول تو عید گاہ کے اندر اور دوسرے بطریق التزام نداء نہ دی جائے اور حضرت ملا علی قاریؒ نے نداء کو جو مستحب لکھا ہے تو اس کا تعلق عید گاہ سے باہر اور کبھی کبھی کہنے سے ہے یعنی "الصلوٰۃ جامعۃ" عید گاہ سے باہر اور کبھی کبھی پکار کر کہنا مستحب ہے۔ واللہ اعلم۔

عیدین میں خطبہ نماز کے بعد پڑھنا چاہئے

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَخْرُجُ یَوْمَ الْاَضْحٰی وَ یَوْمَ الْفِطْرِ فَیَبْدَأُ بِالصَّلٰوۃِ فَاِذَا صَلّٰی صَلٰوتَہٗ قَامَ فَاَقْبَلَ عَلَی النَّاسِ وَھُمْ جُلُوْسٌ فِیْ مُصَلَّاھُمْ فَاِنْ کَانَتْ لَہٗ حَاجَۃٌ بِبَعْثٍ ذَکَرَہٗ لِلنَّاسِ اَوْکَانَتْ لَہٗ حَاجَۃٌ بِغَیْرِ ذٰلِکَ اَمَرَھُمْ بِھَا وَکَانَ یَقُوْلُ تَصَدَّقُوْا تَصَدَّقُوْا تَصَدَّقُوْا وَکَانَ اَکْثَرَ مَنْ یَّتَصَدَّقُ النِّسَآءُ ثُمَّ یَنْصَرِفُ فَلَمْ یَزَلْ کَذٰلِکَ حَتّٰی کَانَ مَرْوَانُ بْنُ الْحَکَمِ فَخَرَجْتُ مُخَاصِرًا مَرْوَانَ حَتّٰی اَتَیْنَا الْمُصَلّٰی فَاِذَا کَثِیْرُ بْنُ الصَّلْتِ قَدْ بَنٰی مِنْبَرًا مِنْ طِیْنٍ وَلَبِنٍ فَاِذَا مَرْوَانُ یُنَازِعُنِیْ یَدَہٗ کَاَنَّہٗ یَجُرُّنِیْ نَحْوَ الْمِنْبَرِ وَ اَنَا اَجُرُّہٗ نَحْوَ الصَّلٰوۃِ فَلَمَّا رَأَیْتُ ذٰلِکَ مِنْہُ قُلْتُ اَیْنَ الْاِبْتِدَاءُ بِالصَّلٰوۃِ فَقَالَ لَا یَا اَبَا سَعِیْدٍ قَدْ تُرِکَ مَا تَعْلَمُ قُلْتُ کَلَّا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا تَاْتُوْنَ بِخَیْرٍ مِّمَّا اَعْلَمُ ثَلٰثَ مِرَارٍ ثُمَّ انْصَرَفَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اور بقر عید کے دن (عید گاہ) جاتے تو (پہلے) نماز شروع کرتے جب نماز سے فارغ ہو جاتے تو (خطبہ کے لئے) کھڑے ہو کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، لوگ اپنی نماز کی جگہ بیٹھے رہتے چنانچہ اگر آپ ﷺ کو کہیں لشکر بھیجنا ہوتا تو (اس وقت) لوگوں کے سامنے اس کا ذکر فرماتے (اور لشکر بھیجتے) یا لوگوں کی کوئی اور حاجت ہوتی (یعنی مسلمانوں کے فائدہ کی کوئی بات ہوئی) تو اس کے بارہ میں حکم فرماتے اور آنحضرت ﷺ (اپنے خطبہ کے دوران) یہ فرمایا کرتے تھے صدقہ دو، صدقہ دو، صدقہ دو، چنانچہ عورتیں زیادہ صدقہ و خیرات دیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ اپنے مکان واپس تشریف لاتے (آپ ﷺ کے مبارک زمانہ اور آپ ﷺ کے بعد چاروں خلفاء کے دور خلافت میں نیز اس کے بعد تک بھی) یہی معمول جاری رہا (کہ خطبہ نماز کے بعد ہوتا اور خطبہ منبر پر نہیں بلکہ زمین ہی پر کھڑے ہو کر پڑھا جاتا رہا) یہاں تک کہ (امیر معاویہؓ کی جانب سے مدینہ کا حکم) مروان ابن حکم مقرر ہوا (ایک مرتبہ عید کے دن) میں مروان ابن حکم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے عید گاہ آیا (جب ہم عید گاہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ) وہاں کثیر ابن صلت نے

مٹی اور کچی اینٹ کا منبر بنا رکھا تھا۔ اچانک مروان مجھے اپنے ہاتھ کے سامنے کھینچنے لگا گویا وہ مجھے منبر کی طرف کھینچ رہا تھا (تاکہ نماز سے پہلے خطبہ پڑھے) اور میں اس کو نماز کی طرف کھینچ رہا تھا (تاکہ وہ پہلے نماز پھر خطبہ پڑھے) جب میں نے یہ دیکھا (کہ وہ پہلے خطبہ پڑھنے پر مصر ہے) تو میں نے کہا کہ عید کی نماز پہلے پڑھنے کا وہ فعل کہاں ہے؟ (جس پر آنحضرت ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانہ سے عمل ہوتا چلا آیا ہے) مروان نے کہا کہ "ابوسعیدؓ! جھگڑا نہ کرو، جس بات کو تم جانتے ہو اب وہ متروک ہے (یعنی میں نے مصلحت کے پیش نظر خطبہ سے پہلے نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور مصلحت یہ ہے کہ اگر خطبہ نماز کے بعد پڑھا جائے گا تو لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگیں گے) میں نے کہا کہ ہرگز نہیں! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے جو چیز میں جانتا ہوں تم اس سے بہتر چیز لا ہی نہیں سکتے" میں نے یہ بات تین مرتبہ اس سے کہی۔ پھر (مروان کے اس فعل کی وجہ سے) ابوسعیدؓ (عید گاہ سے) چلے گئے (اور جماعت میں شریک نہیں ہوئے۔" (مسلم)

تشریح: صدقہ و خیرات یعنی اللہ کے نام پر اپنا مال خرچ کرنے کی جو اہمیت و فضیلت ہے اس کے پیش نظر آپ ﷺ اپنے خطبہ میں لفظ تصدقوا تین مرتبہ تاکیداً فرمایا کرتے تھے، یا یہ کہ تین مرتبہ فرمانا تین حالتوں کی طرف اشارہ ہے ① صدقہ دو اپنی زندگی کے واسطہ۔ ② صدقہ دو اپنی موت کے لئے۔ ③ اور صدقہ دو اپنی آخرت کے لئے۔

"مخاصر" دو شخصوں کے اس طرح باہم ہاتھ پکڑے ہوئے چلنے کو کہتے ہیں کہ ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کے کولھے کے قریب ہو۔

مروان ابن حکم ۲ھ میں پیدا ہوا تھا مگر اسے آنحضرت ﷺ سے شرف زیارت حاصل نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح کثیر ابن صلت کے بارہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش بھی آنحضرت ﷺ ہی کے زمانہ مبارک ہی میں ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے صاحب جامع الاصول نے انہیں صحابہ میں شمار کیا ہے جب کہ بعض محققین نے انہیں تابعی کہا ہے۔ ان کا مکان عید گاہ کے قریب تھا انہوں نے ہی عید گاہ میں منبر بنایا تھا تاکہ عیدین کا خطبہ اس پر کھڑے ہو کر پڑھا جائے جیسا کہ جمعہ کا خطبہ منبر پر کھڑے ہو کر پڑھنا مسنون ہے۔ لہٰذا ظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مروان ابن حکم نے عید گاہ میں منبر بنوایا ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ ثم انصرف کے یہ معنی بھی محتمل ہو سکتے ہیں کہ مروان منبر کی طرف آیا تاکہ خطبہ پڑھے اور اس نے حضرت ابوسعیدؓ کی یہ بات نہ مانی کہ پہلے نماز پڑھی جائے پھر خطبہ پڑھا جائے۔

عیدین کی نماز کا طریقہ: عیدین کی نماز دو رکعت ہے جس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا نیت کرکے اور تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھ لے پھر سبحانک اللھم پڑھ کر تین مرتبہ اللہ اکبر کہے اور ہر مرتبہ مثل تکبیر تحریمہ کے دونوں کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور تکبیر کے بعد لٹکا دے اور ہر تکبیر کے بعد اتنی دیر توقف کرے کہ تین مرتبہ سبحان اللہ کہہ سکیں۔ تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ نہ لٹکائے بلکہ ہاتھ باندھ لے اور اعوذ باللہ، بسم اللہ، پڑھ کر سورہ فاتحہ اور کوئی دوسری سورۃ پڑھ کر رکوع و سجدہ کر کے کھڑا ہو۔ پھر دوسری رکعت میں پہلے سورۃ فاتحہ اور دوسری سورۃ پڑھ لے اس کے بعد تین تکبیریں اسی طرح کہے جس طرح پہلی رکعت میں سبحانک اللھم پڑھ کر کہی تھی۔ لیکن یہاں تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ نہ باندھے بلکہ لٹکائے رکھے اور پھر چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے اور نماز پوری کرے۔ نماز کے بعد امام کو چاہئے کہ وہ منبر پر کھڑے ہو کر دو خطبے پڑھے۔ عید الفطر کے خطبہ میں صدقہ فطر کے احکام و مسائل بیان کرے اور عید الاضحیٰ کے خطبہ میں قربانی اور تکبیر تشریق کے احکام بیان کرے۔

تکبیر تشریق یعنی ہر فرض نماز کے بعد فرض نماز پڑھنے والے کے لئے ایک مرتبہ اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد کہنا واجب ہے۔ یہ تکبیر عرفہ یعنی ذوالحجہ کی نویں تاریخ کی فجر سے تیرہویں تاریخ کی عصر تک کہنا چاہئے۔ یہ تکبیر عورت اور مسافر پر واجب نہیں۔ ہاں اگر یہ لوگ کسی ایسے شخص کی مقتدی ہوں جن پر تکبیر کہنا واجب ہے تو ان پر بھی تکبیر واجب ہو جائے گی۔ (علم الفقہ)

بَابٌ فِي الْاُضْحِيَةِ

قربانی کا بیان

حنفی مسلک میں قربانی ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو مقیم اور غنی ہو یعنی نصاب کا مالک ہو اگرچہ نصاب نامی نہ ہو حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک قربانی سُنّت موکدہ ہے حضرت امام احمدؒ کا بھی مشہور اور مختار قول یہی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قربانی کا جانور اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا چاہئے

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ ضَحّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَبْشَيْنِ اَمْلَحَيْنِ اَقْرَنَيْنِ ذَبَحَهُمَا بِيَدِهٖ وَسَمّٰى وَكَبَّرَ قَالَ رَاَيْتُهٗ وَاضِعًا قَدَمَهٗ عَلٰى صِفَاحِهِمَا وَيَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے دو دنبوں کی جو سینگوں والے (یعنی جن کے سینگ لمبے تھے یا یہ کہ سینگ ٹوٹے ہوئے نہ تھے) اور ابلق (یعنی سیاہ رنگ کے) تھے قربانی کی۔ آپ ﷺ نے بسم اللہ واللہ اکبر کہہ کر (خود) اپنے ہاتھ سے انہیں ذبح کیا" حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ ان کے پہلو (یا کلے) پر پاؤں رکھے ہوئے تھے اور بسم اللہ واللہ اکبر کہتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قربانی کرنے والے کے لئے مستحب ہے کہ اگر وہ ذبح کے آداب جانتا ہو تو قربانی کا جانور خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرے ورنہ بصورت دیگر اپنی طرف سے کسی دوسرے شخص سے ذبح کرائے اور خود وہاں موجود رہے۔ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا (یعنی بسم اللہ کہنا) حنفیہ کے نزدیک شرط ہے اور تکبیر کہنی (یعنی واللہ اکبر کہنا) تمام علماء کے نزدیک مستحب ہے۔ حدیث کے آخری الفاظ ویقول بسم اللہ واللہ اکبر میں اس طرف اشارہ ہے کہ لفظ واللہ اکبر واؤ کے ساتھ کہنا افضل ہے۔ ذبح کے وقت درود پڑھنا ہمارے علماء کے نزدیک مکروہ ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک سُنّت ہے۔

قربانی کے دنبہ کی صفات

② وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِكَبْشٍ اَقْرَنَ يَطَأُ فِيْ سَوَادٍ وَيَبْرُكُ فِيْ سَوَادٍ وَيَنْظُرُ فِيْ سَوَادٍ فَاُتِيَ بِهٖ لِيُضَحِّيَ بِهٖ قَالَ يَا عَائِشَةُ هَلُمِّي الْمُدْيَةَ ثُمَّ قَالَ اشْحَذِيْهَا بِحَجَرٍ فَفَعَلَتْ ثُمَّ اَخَذَهَا وَاَخَذَ الْكَبْشَ فَاَضْجَعَهٗ ثُمَّ ذَبَحَهٗ ثُمَّ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَاٰلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ ثُمَّ ضَحّٰى بِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (قربانی کے لئے) ایک ایسے سینگ دار دنبہ کے لانے کا حکم دیا جو سیاہی میں چلتا ہو (یعنی اس کے پاؤں سیاہ ہوں) سیاہی میں بیٹھتا ہو (یعنی اس کا پیٹ اور سینہ سیاہ ہو) اور سیاہی میں دیکھتا ہو (یعنی اس کی آنکھوں کے گرد سیاہی ہو) چنانچہ (جب) آپ کے لئے قربانی کے واسطے ایسا دنبہ لایا گیا (تو) فرمایا کہ "عائشہ! چھری لاؤ (جب چھری لائی تو) پھر فرمایا کہ اسے پتھر پر (رگڑ کر) تیز کرو، میں نے چھری تیز کی، آپ ﷺ نے چھری لی اور دنبہ کو پکڑ کر اسے لٹایا پھر جب اسے ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو یہ فرمایا کہ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَاٰلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ (یعنی اے اللہ! اسے محمد (ﷺ)، آل محمد (ﷺ) اور اُمّت محمد (ﷺ) کی طرف سے قبول فرما) پھر اسے ذبح کر دیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: جب جانور کو ذبح کیا جا رہا ہو اس کے سامنے چھری تیز کرنا مکروہ ہے کیونکہ حضرت عمر فاروقؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں

نے ایک ایسے شخص کو درے سے مارا تھا جس نے ایسا کیا تھا۔ اسی طرح ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح کرنا بھی مکروہ ہے۔
آنحضرت ﷺ نے ذبح کرتے وقت جو الفاظ ارشاد فرمائے اس سے مراد صرف ثواب میں اُمت کو شریک کرنا تھا نہ یہ کہ آپ ﷺ نے سب کی طرف سے قربانی کی تھی کیونکہ ایک دنبہ یا ایک بکری کی قربانی کئی آدمیوں کی طرف سے درست نہیں ہے۔

کس عمر کے جانور کی قربانی کرنی چاہئے؟

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّةً اِلَّا اَنْ يَّعْسُرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوْا جَذْعَةً مِنَ الضَّأْنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "تم (قربانی میں صرف) مسنّہ جانور ذبح کرو، ہاں اگر مسنّہ نہ پاؤ تو پھر دنبہ بھیڑ کا جزعہ ذبح کر لو۔" (مسلم)

تشریح: مسنہ یا جزعہ کسی خاص جانور کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک اصطلاح ہے جو قربانی کے جانور کی عمر کے سلسلہ میں مستعمل ہوتی ہے۔ چنانچہ حنفی مسلک کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے کہ اونٹوں میں وہ اونٹ مسنّہ کہلاتا ہے جو پورے پانچ سال کی عمر کا ہو اور چھٹے برس میں داخل ہو چکا ہو۔ گائے، بھینس اور بیل میں مسنّہ اسے کہتے ہیں جو پورا دو سال کی عمر کا ہو تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ بھیڑ اور دنبہ میں مسنّہ وہ ہے جو اپنی عمر کا پورا ایک سال گزار کر دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ لہٰذا ان جانوروں میں قربانی کے لئے جانور کا مسنّہ ہونا ضروری ہے۔ ہاں دنبہ اور بھیڑ کا اگر جزعہ بھی ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔ جزعہ بھیڑ یا دنبہ کا وہ بچہ کہلاتا ہے جس کی عمر ایک برس سے تو کم ہو مگر چھ مہینہ سے زیادہ ہو۔
بعض حضرات کہتے ہیں کہ جزعہ کی قربانی اس صورت میں جائز ہوگی جب کہ وہ اتنا فربہ ہو کہ اگر اسے مسنّہ کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے تو دور سے دیکھنے والا اسے بھی مسنّہ گمان کرے اگر وہ فربہ نہ ہو بلکہ چھوٹا ہو اور دبلا ہو تو اس کی قربانی درست نہیں۔
بظاہر حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر مسنّہ بہم نہ پہنچے یا اس کی قیمت میسر نہ ہو تو جزعہ کی قربانی درست ہے ورنہ بصورت دیگر اس کی قربانی درست نہیں ہوگی۔ بلکہ فقہاء کہتے ہیں کہ یہ استحباب پر محمول ہے یعنی مستحب تو یہی ہے کہ اگر مسنّہ مل جائے اور اس کے خریدنے کی استطاعت ہو تو جزعہ کی قربانی نہ کرے۔ ویسے اگر مسنّہ ہوتے ہوتے بھی کوئی جزعہ کی قربانی کرے گا تو درست ہوگی۔"

بکری کے بچہ کی قربانی

(۴) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَاهُ غَنَمًا يَقْسِمُهَا عَلٰى صَحَابَتِهٖ ضَحَايَا فَبَقِيَ عَتُوْدٌ فَذَكَرَهٗ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ضَحِّ بِهٖ اَنْتَ وَفِيْ رِوَايَةٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَصَابَنِيْ جَذْعٌ قَالَ ضَحِّ بِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عقبہؓ ابن عامر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں بکریوں کا ایک ریوڑ دیا تاکہ وہ اسے صحابہ میں بطریق قربانی کے تقسیم کر دیں چنانچہ (انہوں نے تقسیم کر دیا) تقسیم کے بعد بکری کا ایک بچہ باقی رہ گیا، انہوں نے اس کے بارہ میں آنحضرت ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس کی قربانی تم کر لو" ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے دنبہ کا ایک بچہ ملا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس کی قربانی کر لو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "عتود" بکری کے اس بچہ کو کہتے ہیں جو موٹا تازہ ہو اور ایک سال کی عمر کا ہو۔ لہٰذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بکری کے ایک سال کے بچہ کی قربانی جائز ہے چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ "عتود" بکری کے اس بچے کو کہتے ہیں جو چھ مہینہ سے زیادہ کا ہو اس صورت میں یہ حکم صرف عقبہ ابن عامر کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ دوسروں کے لئے عتود کی قربانی جائز نہیں ہوگی۔ "جزعہ" کے بارہ میں پہلے بھی بتایا جاچکا ہے۔ یعنی دنبہ کا وہ بچہ جو چھ مہینے سے زیادہ کا ہو۔"

عید گاہ میں قربانی افضل ہے۔

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْبَحُ وَيَنْحَرُ بِالْمُصَلّٰى۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عید گاہ میں قربانی کے جانور کو ذبح اور نحر کیا کرتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: باب صلوٰۃ العیدین کی پہلی فصل کے آخر میں ذبح اور نحر کے معنی اور ان کے باہم فرق کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے۔ علماء لکھتے ہیں کے عید گاہ میں قربانی کرنا افضل ہے۔

قربانی کے حصے

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَقَرَةُ عَنْ سَبْعَةٍ وَالْجَزُوْرُ عَنْ سَبْعَةٍ۔ (رواہ مسلم و ابوداؤد و اللفظ لہ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "قربانی کے لئے) ایک گائے اور ایک اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے کافی ہے۔" (مسلمؒ ابوداؤدؒ)

قربانی کرنے والے کے لئے کچھ ہدایتیں

⑦ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ وَ اَرَادَ بَعْضُكُمْ اَنْ يُضَحِّيَ وَلَا يَمَسَّ مِنْ شَعْرِهٖ وَبَشَرِهٖ شَيْئًا وَفِيْ رِوَايَةٍ فَلَا يَاْخُذَنَّ شَعْرًا وَلَا يَقْلِمَنَّ ظُفُرًا وَفِيْ رِوَايَةٍ مَنْ رَاٰى هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ وَاَرَادَ اَنْ يُضَحِّيَ فَلَا يَاْخُذْ مِنْ شَعْرِهٖ وَلَا مِنْ اَظْفَارِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب ذی الحجہ کا پہلا عشرہ شروع ہوجائے تو تم میں سے جو شخص قربانی کرنے کا ارادہ کرے وہ (اس وقت تک کہ قربانی نہ کرے) اپنے بال اور ناخن بالکل نہ کتروائے۔" ایک روایت میں یوں ہے کہ "نہ بال کٹوائے اور نہ ناخن کتروائے۔" ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "جو شخص بقر عید کا چاند دیکھے اور وہ قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ (قربانی کر لینے تک) اپنے بال اور ناخن نہ کٹوائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: بقر عید کا چاند دیکھ لینے کے بعد قربانی کر لینے تک بال وغیرہ کٹوانے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے تاکہ احرام والوں کی مشابہت حاصل ہوجائے۔ لیکن یہ ممانعت تنزیہی ہے لہٰذا بال وغیرہ کا نہ کٹوانا مستحب ہے اور اس کے خلاف عمل کرنا ترک اولی ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس کے خلاف کرنا مکروہ ہے۔"

عشرہ ذی الحجہ کے نیک اعمال کی فضیلت

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ اَيَّامٍ الْعَمَلُ الصَّالِحُ فِيْهِنَّ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْاَيَّامِ الْعَشْرِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَا الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ وَلَا جِهَادٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فَلَمْ يَرْجِعْ مِنْ ذٰلِكَ بِشَيْءٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "دنوں میں کوئی دن نہیں ہے جس میں نیک عمل کرنا خدا کے نزدیک ان

دس دنوں (ذی الحجہ کے پہلے عشرہ) سے زیادہ محبوب ہو۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا (ان ایام کے علاوہ دوسرے دنوں میں) خدا کی راہ میں جہاد کرنا بھی (ان دنوں کے نیک اعمال کے برابر) نہیں ہے؟ فرمایا ہاں! اس شخص کا جہاد جو اپنی جان و مال کے ساتھ (خدا کی راہ میں لڑنے) نکلا اور پھر واپس نہ ہوا (ان دنوں کے نیک اعمال سے بھی زیادہ افضل ہے)۔" (بخاری)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر جہاد ایسا ہو جس میں مال و جان سب خدا کی راہ میں قربان ہو جائے اور جہاد کرنے والا مرتبہ شہادت پا جائے تو وہ جہاد البتہ خدا کے نزدیک ان دس دنوں کے نیک اعمال سے بھی زیادہ محبوب ہے کیونکہ ثواب نفس کشی و مشقت کے بقدر ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ خدا کی راہ میں اپنی جان اور اپنا مال قربان کر دینے سے زیادہ نفس کشی اور مشقت کیا ہو سکتی ہے؟

چونکہ رمضان کے نیک اعمال کی بھی بہت زیادہ فضیلت و عظمت بیان کی گئی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس حدیث کی مراد یہ ہو کہ ان دنوں کے نیک اعمال ایام رمضان کے نیک اعمال کے علاوہ دوسرے دنوں کے نیک اعمال سے زیادہ محبوب ہیں یا رمضان کے نیک اعمال اس حیثیت سے سب سے زیادہ محبوب ہیں کہ ان دنوں میں فرض روزے رکھے جاتے ہیں۔ اور بہت زیادہ برگزیدہ و مقدس ترین شب یعنی لیلۃ القدر بھی رمضان ہی میں آتی ہے اور ذی الحجہ کے پہلے عشرہ کے اعمال اس اعتبار سے سب سے زیادہ محبوب ہیں کہ بہت زیادہ برگزیدہ اور با عظمت و فضیلت دن یعنی "عرفہ" انہیں دنوں میں آتا ہے۔ اور اعمال حج بھی انہیں ایام میں ہوتے ہیں۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

قربانی کے وقت کی دعا

(۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ ذَبَحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الذَّبْحِ كَبْشَيْنِ اَقْرَنَيْنِ اَمْلَحَيْنِ مَوْجُوْئَيْنِ فَلَمَّا وَجَّهَهُمَا قَالَ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ عَلٰى مِلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَّاُمَّتِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ثُمَّ ذَبَحَ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَحْمَدَ وَاَبِيْ دَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ ذَبَحَ بِيَدِهٖ وَقَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَنِّيْ وَعَمَّنْ لَّمْ يُضَحِّ مِنْ اُمَّتِيْ۔

"حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ذبح کے دن (یعنی عید قرباں کے دن) دو دنبے جو سینگ دار، ابلق اور خصی تھے ذبح کرنے چاہے تو ان کو قبلہ رخ کیا اور یہ پڑھا۔ یعنی میں اپنا منہ اس ذات کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس حال میں کہ میں دین ابراہیم پر ہوں جو توحید کو ماننے والے تھے اور میں بھی مشرکین میں سے نہیں ہوں بلاشبہ میری نماز، میری تمام عبادتیں، میری زندگی اور میری موت (سب کچھ) اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں اے اللہ! یہ قربانی تیری عطاء سے ہے اور خالص تیری ہی رضا کے لئے ہے تو اس کو محمد ﷺ اور اس کی اُمت کی جانب سے قبول فرما ساتھ نام اللہ کے اور اللہ بہت بڑا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ذبح کیا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) نیز احمدؒ ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "آنحضرت ﷺ نے (دونوں دنبے) اپنے ہاتھ سے ذبح کئے ہیں کہا بسم اللہ و اللہ اکبر، اے اللہ! یہ قربانی میری جانب سے ہے اور میری اُمت کے ہر اس فرد کی طرف سے ہے جس نے قربانی نہیں کی۔"

تشریح: خصی سے مراد وہ ہے جس کے بیضے کوٹ کر اس کی شہوت ختم کر دی جاتی ہے اس کی قربانی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ایسا خصی فربہ ہوتا ہے اور اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔

وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں) اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آنحضرت ﷺ نبوت ملنے

سے پہلے کس شریعت کے مطابق عبادت کیا کرتے تھے؟ چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ نبوت ملنے سے پہلے آپ ﷺ کی عبادت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے مطابق ہوتی تھی، بعض علماء کا قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق اور بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق آپ عبادت کیا کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں صحیح قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کسی بھی شریعت کے مطابق عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی فہم اور اپنے وجدان کے موافق آپ ﷺ اپنی عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ البتہ یہ بات بالکل اجماعی طور پر محقق اور ثابت ہے کہ آپ ﷺ زندگی کے کسی بھی دور میں بت پرستی کی نجاست میں ملوث نہیں ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عبادت کس نوع اور کس طریقہ کی تھی؟ تو اس کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ وہ غیر معلوم ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ ﷺ اس وقت کس طرح عبادت کرتے تھے؟

عَنْ مُحَمَّدٍ وَاُمَّتِهٖ میں مشارکت یا تو ثواب پر محمول ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے ذبح کے وقت یہ الفاظ فرما کر اپنی قربانی کے ثواب میں اپنی اُمت کو بھی شریک فرمالیا۔ یا اسے حقیقت پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے مگر اس صورت میں کہا جائے گا یہ آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ "اس سلسلہ میں واضح ترین بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک دنبہ تو اپنی طرف سے قربان کیا اور دوسرے دنبہ کی قربانی اُمت کی طرف سے کی۔"

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر قربانی کرنے والا ذبح کرنے پر قادر ہو تو اس کے لئے اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کرنا مستحب ہے اگرچہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔"

میت کی طرف سے قربانی جائز ہے

⑩ وَعَنْ حَنَشٍ قَالَ رَاَيْتُ عَلِيًّا يُضَحِّيْ بِكَبْشَيْنِ فَقُلْتُ لَهٗ مَاهٰذَا؟ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصَانِیْ اَنْ اُضَحِّيَ عَنْهُ فَاَنَا اُضَحِّيْ عَنْهُ۔ (رواہ ابوداؤد وروی الترمذی نحوہ)

"اور حضرت حنش فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دو دنبے قربانی کرتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ یہ کیا؟ (یعنی جب ایک دنبہ کی قربانی کافی ہے تو دو دنبوں کی قربانی کیوں کرتے ہیں؟) انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے یہ وصیت فرمائی تھی کہ (ان کے وصال کے بعد) میں ان کی طرف سے قربانی کروں لہٰذا میں ان کی طرف سے قربانی کرتا ہوں۔" (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: اس سلسلہ میں دونوں ہی احتمال ہیں یا تو حضرت علیؓ اپنی قربانی کے علاوہ دو دنبے آنحضرت ﷺ کی طرف سے قربان کرتے ہوں گے جیسا کہ آنحضرت ﷺ اپنی زندگی میں دو دنبوں کی قربانی کرتے تھے، یا پھر یہ کہ حضرت علیؓ ایک دنبہ کی قربانی تو اپنی طرف سے کرتے ہوں گے اور ایک دنبہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کا یہ ہمیشہ کا معمول تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے ہر سال قربانی کرتے تھے۔

یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ میت کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے اگرچہ بعض علماء نے اسے جائز نہیں کہا ہے۔ ابن مبارکؒ کا قول یہ ہے کہ "میں اسے پسند کرتا ہوں کہ میت کی طرف سے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ اس کی طرف سے قربانی نہ کی جائے، ہاں اگر میت کی طرف سے قربانی کی ہی جائے تو اسکا گوشت بالکل نہ کھایا جائے بلکہ سب کا سب اللہ کے نام پر تقسیم کر دیا جائے

عیب دار جانور کی قربانی نہ کرنی چاہیے

⑪ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَّسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْاُذُنَ وَاَنْ لَّا نُضَحِّيَ بِمُقَابَلَةٍ وَلَا مُدَابَرَةٍ وَّلَا شَرْقَاءَ وَلَا خَرْقَاءَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ اَبُوْدَاوٗدَ وَ النَّسَائِيُّ وَ الدَّارِمِيُّ وَ ابْنُ مَاجَةَ وَانْتَهَتْ رِوَايَتُهٗ اِلٰى قَوْلِهٖ

وَالاُذُنَ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم (قربانی کے جانور کے) آنکھ اور کان کو خوب اچھی طرح دیکھ لیں (کہ کوئی ایسا عیب اور نقصان نہ ہو جس کی وجہ سے قربانی درست نہ ہو اور یہ حکم بھی دیا ہے کہ) ہم اس جانور کی قربانی نہ کریں جس کا کان اگلی طرف سے یا پچھلی طرف سے کٹا ہوا ہو اور نہ اس جانور کی جس کے کان لمبائی میں چرے ہوئے اور گولائی میں پھٹے ہوئے ہوں" یہ روایت ترمذی ابوداؤد، نسائی، دارمی اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے لیکن ابن ماجہ کی روایت لفظ "والاذن" پر ختم ہوگئی ہے۔"

تشریح: حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس بکری کی قربانی جائز نہیں ہے جس کا کان تھوڑا سا بھی کٹا ہوا ہو جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اگر کان آدھے سے کم کٹا ہوا ہو۔"

حضرت امام طحاوی حنفیؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حضرت امام شافعیؒ کا عمل اس حدیث پر ہے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے جو بہت جامع ہے کیونکہ اس مسلک سے اس حدیث میں اور قتادہؓ کی حدیث میں تطبیق ہو جاتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ "حضرت قتادہ حضرت ابن کلیب سے یہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عضبائے قرن واذن (کی قربانی) سے منع فرمایا ہے۔" قتادہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید ابن مسیبؓ سے پوچھا کہ "یہ عضبائے اذن کیا ہے؟" تو انہوں نے فرمایا کہ جس کا کان آدھا یا آدھے سے زیادہ کٹا ہوا ہو۔

حنفیہ کے نزدیک کیسے جانور کی قربانی جائز نہیں؟: اس مسئلہ میں حنفیہؒ کا مسلک ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ "ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے جس کا کان تہائی یا تہائی سے زیادہ کٹا ہوا ہو۔ ایسے جانور کی قربانی بھی درست نہیں ہے جس کے کان پیدائشی نہ ہوں، اسی طرح ایسے جانور کی قربانی بھی درست نہیں جس کی دم اور ناک تہائی یا تہائی سے زیادہ کٹی ہوئی ہو، جو جانور اندھا یا کانا ہو یا ایک آنکھ کی تہائی روشنی یا اس سے زیادہ جاتی رہی ہو تو اس کی قربانی بھی جائز نہیں ہے، جس جانور کے تھن خشک ہو گئے ہوں اس کی قربانی بھی درست نہیں اور ایسے جانور کی بھی درست نہیں جس میں مغز نہ رہا ہو اور نہ ایسے لنگڑے کی جو قربانی کی جگہ تک نہ جا سکے اور نہ ایسے بیمار کی جو گھاس نہ کھا سکے نہ ایسے جانور کی جس کے خارش ہو، نہ بغیر دانت کے جانور کی جو گھاس نہ کھا سکتا ہو اور نہ نجاست خور جانور کی، ہاں ایسے جانور کی قربانی درست ہے جس کا کان لمبائی میں یا اس کے منہ کی طرف سے پھٹ جائے اور لٹکا ہوا ہو یا پیچھے کی طرف پھٹا ہوا، اس صورت میں کہا جائے گا یہ حدیث کہ جس سے ایسے جانور کی قربانی کی ممانعت معلوم ہو رہی ہے نہی تنزیہی پر محمول ہے۔

⑫ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نُضَحِّيَ بِاَعْضَبِ الْقَرْنِ وَالْاُذُنِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، راوی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ ہم ایسے جانور کی قربانی کریں جس کے سینگ ٹوٹے ہوئے اور کان کٹے ہوئے ہوں۔" (ابن ماجہ)

تشریح: حنفی مسلک میں ایسے جانور کی قربانی جائز و درست ہے جس کے پیدائش ہی سے سینگ نہ ہوں یا ٹوٹے ہوئے ہوں یا ان کا خول اتر گیا ہے لہٰذا یہ حدیث نہی تنزیہی پر محمول کی جائے گی۔ البتہ ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ہوگی جس کے سینگ بالکل جڑ سے ٹوٹ گئے ہوں۔

⑬ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ مَاذَا يُتَّقٰى مِنَ الضَّحَايَا فَاَشَارَ بِيَدِهٖ فَقَالَ اَرْبَعًا اَلْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ظَلْعُهَا وَالْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا وَالْمَرِيْضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا وَالْعَجْفَاءُ الَّتِيْ لَا تُنْقِيْ۔

(رواہ مالک و احمد و الترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت براء ابن عاب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیسے جانور کی قربانی لائق نہیں؟ تو آپ نے ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ چار طرح کے جانور قربانی کے قابل نہیں۔ ① لنگڑا۔ جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو یعنی جو چل نہ سکے۔ ② کانا جس کا کانا پن ظاہر ہو یعنی ایک آنکھ سے بالکل دکھائی نہ دیتا ہو یا تہائی یا تہائی سے زیادہ روشنی جاتی رہی ہو۔ ③ بیمار۔ جس کی بیماری ظاہر ہو یعنی جو بیماری کی وجہ سے گھاس نہ کھا سکے۔ ④ ایسا دبلا کہ جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔" (مالکؒ، احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

فربہ جانور کی قربانی بہتر ہے

⑭ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُضَحِّیْ بِکَبْشٍ اَقْرَنَ فَحِیْلٍ یَنْظُرُ فِیْ سَوَادٍ وَّیَاْکُلُ فِیْ سَوَادٍ وَّیَمْشِیْ فِیْ سَوَادٍ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ ایسے سینگ دار فربہ دنبہ کی قربانی کرتے تھے جو سیاہی میں دیکھتا تھا یعنی اس کی آنکھوں کے گرد سیاہی تھی، سیاہی میں کھاتا تھا یعنی اس کا منہ بھی سیاہ تھا اور سیاہی میں چلتا تھا یعنی اس کے پاؤں بھی سیاہ تھے۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: علماء لکھتے ہیں کہ ایسے جانور کی قربانی کرنا جو بہت فربہ اور موٹا ہو مستحب ہے۔ چنانچہ ایک فربہ بکری کی قربانی دو دبلی بکریوں کی قربانی سے افضل ہے۔ ایسے ہی زیادہ گوشت والی بکری کی قربانی کم گوشت والی بکری کی قربانی سے افضل ہے بشرطیکہ گوشت خراب نہ ہو یعنی زیادہ گوشت والی بکری کا گوشت خراب ہو تو پھر اس کی قربانی افضل نہیں ہے۔

جذع کی قربانی

⑮ وَعَنْ مُجَاشِعٍ مِنْ بَنِیْ سُلَیْمٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ اِنَّ الْجَذَعَ یُوَفِّیْ مِمَّا یُوَفِّیْ مِنْهُ الثَّنِیَّ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ)

"قبیلہ بنی سلیم کے (ایک فرد) حضرت مجاشع راوی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جذع (یعنی وہ دنبہ یا بھیڑ جس کی عمر چھ مہینے سے زیادہ ہو) کافی ہے اس چیز سے کہ کفایت کرے اس کو "ثنی"۔" (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح کہ اس بکری کی قربانی جائز ہے جو ایک سال سے زیادہ کی ہو اسی طرح جزع کی قربانی بھی جائز ہے۔

"ثنی" بھی ایک اصطلاحی لفظ ہے جو قربانی کے جانور کی عمر کے سلسلہ میں استعمال کیا جاتا ہے، چنانچہ بکری میں "ثنی" وہ بکری کہلاتی ہے جو ایک سال پورا کر کے دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔ بیل اور گائے میں "ثنی" وہ ہے جو دو سال کر کے تیسرے سال میں ہو، اونٹ میں "ثنی" وہ ہے جو پانچ سال پورے کرنے کے بعد چھٹے سال میں داخل ہو چکا ہو۔

⑯ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ نِعْمَةُ الْاُضْحِیَّةُ الْجَذَعُ مِنَ الضَّاْنِ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ دنبہ کے جزع (یعنی چھ ماہ کے بچہ) کی قربانی بہتر ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: دنبہ کی جزع کے قربانی کی تعریف سے دراصل لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ دنبہ کے چھ مہینہ کے بچہ کی قربانی جائز ہے بخلاف بکری کے جزع کے کہ اس کی قربانی درست نہیں۔"

قربانی میں شرکت

⑰ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَحَضَرَ الْاَضْحٰى فَاشْتَرَكْنَا فِي الْبَقَرَةِ سَبْعَةً وَفِي الْبَعِيْرِ عَشْرَةً رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہم (ایک) سفر میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ تھے کہ عید قربان آگئی، چنانچہ گائے (کی قربانی) میں ہم سات آدمی اور اونٹ (کی قربانی) میں دس آدمی شریک ہوئے (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے"

تشریح: اسحٰق ابن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر عمل کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ قربانی کے لئے ایک اونٹ میں دس آدمیوں کو شریک ہو جانا چاہئے بلکہ تمام علماء کے نزدیک یہ اس حدیث کے ذریعہ منسوخ قرار دے دی گئی ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ جس طرح گائے کی قربانی سات آدمیوں سے درست ہے اسی طرح اونٹ کی قربانی بھی سات ہی آدمیوں کی طرف سے کی جا سکتی ہے۔"

قربانی کی فضیلت

⑱ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ وَاِنَّهُ لَيَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَقَعَ بِالْاَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا۔ (رواه الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "ابن آدم کا نحر (یعنی قربانی کے دن) ایسا کوئی عمل نہیں جو خدا کے نزدیک خون بہانے (یعنی قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب ہو، اور (قربانی کا) وہ ذبح کیا ہوا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں اور بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور قربانی کا خون قبل اس کے کہ زمین پر گرے (یعنی ذبح کرنے کے ارادہ کے وقت ہی) بارگاہ خداوندی میں قبول ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تم اس کی وجہ سے (یعنی قربانی کر کے) اپنے نفس کو خوش کرو۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: زین العرب فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بقر عید کے دن سب سے افضل عبادت قربانی کے جانور کا خون بہانا ہے اور قربانی کا جانور قیامت کے روز اسی طرح آئے گا جس طرح کے دنیا میں قربانی سے پہلے بغیر کسی عیب کے تھا تاکہ وہ قربانی کرنے والے کے ہر ہر عضو کی طرف سے نعم البدل اور پل صراط پر اس کی سواری ہو۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری قربانی قبول کرتا ہے اور اس کے بدلہ میں تمہیں بہت زیادہ ثواب سے نوازتا ہے تو قربانی کرنے کی وجہ سے تمہارے اندر کسی قسم کی کوئی تنگی یا کراہت پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ اس عظیم بشارت کی وجہ سے تمہارے نفس کو مطمئن اور تمہارے دل کو خوش ہونا چاہئے۔"

عشرہ ذی الحجہ کی عبادتوں کی فضیلت

⑲ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اَيَّامٍ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ اَنْ يُّتَعَبَّدَ لَهٗ فِيْهَا مِنْ عَشْرِ ذِي الْحِجَّةِ يَعْدِلُ صِيَامُ كُلِّ يَوْمٍ مِّنْهَا بِصِيَامِ سَنَةٍ وَقِيَامُ كُلِّ لَيْلَةٍ مِّنْهَا بِقِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ اِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "ایسا کوئی دن نہیں ہے کہ جس میں عبادت کرنا عشرہ ذی الحجہ سے زیادہ افضل ہو اس میں سے ہر دن کے روزے ایک سال کے روزوں کے برابر قرار دیئے جاتے ہیں اور اس میں ہر رات کی عبادت شب قدر کی

عبادت کے برابر قرار دی جاتی ہے (ترمذی، ابن ماجہ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد ضعیف ہیں۔"

تشریح: طلب یہ ہے کہ خدا کے نزدیک ان دنوں میں عبادت کرنا دوسرے دنوں میں عبادت کرنے سے زیادہ محبوب ہے خصوصاً قربانی کرنا دوسرے اعمال سے زیادہ افضل اور محبوب ہے۔ اور عشرہ ذی الحجہ کی فضیلت کے سلسلہ میں پوری وضاحت پہلی فصل میں گذر چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بقر عید کی نماز سے پہلے قربانی درست نہیں

(۲۰) عَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ شَهِدْتُ الْاَضْحٰی يَوْمَ النَّحْرِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَعْدُ اَنْ صَلّٰى وَفَرَغَ مِنْ صَلَاتِهٖ وَسَلَّمَ فَاِذَا هُوَ يَرٰى لَحْمَ اَضَاحِيَّ قَدْ ذُبِحَتْ قَبْلَ اَنْ يَّفْرُغَ مِنْ صَلَاتِهٖ فَقَالَ مَنْ كَانَ ذَبَحَ قَبْلَ اَنْ يُّصَلِّيَ اَوْ نُصَلِّيَ فَلْيَذْبَحْ مَكَانَهَا اُخْرٰى وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ صَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ ذَبَحَ وَقَالَ مَنْ كَانَ ذَبَحَ قَبْلَ اَنْ يُّصَلِّيَ فَلْيَذْبَحْ اُخْرٰى مَكَانَهَا وَمَنْ لَّمْ يَذْبَحْ فَلْيَذْبَحْ بِاسْمِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت جندب ابن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں (ایک مرتبہ) عید قرباں میں جو نحر یعنی قربانی کا دن ہے رسول کریم ﷺ کے ہمراہ (عید گاہ) حاضر ہوا، ابھی آپ نے نماز اور خطبہ شروع نہیں فرمایا تھا) کہ کیا دیکھتے ہیں کہ قربانی کا گوشت رکھا ہے اور نماز پڑھنے سے پہلے ہی قربانی ہوگئی ہے، آپ نے فرمایا کہ جس نے قبل اس کے کہ نماز پڑھے، یا یہ فرمایا کہ قبل اس کے کہ ہم نماز پڑھیں (قربانی کا جانور) ذبح کر دیا ہے اسے چاہئے کہ وہ اس کے بدلہ میں دوسرا جانور) ذبح کرے" ایک اور روایت میں ہے کہ "حضرت جندبؓ نے فرمایا" آنحضرت ﷺ نے بقر عید کے روز نماز اور خطبہ ارشاد فرمایا پھر (قربانی کا جانور) ذبح کیا اور فرمایا کہ جو شخص قبل اس کے کہ نماز پڑھے، یا فرمایا کہ قبل اس کے کہ ہم نماز پڑھیں ذبح کیا تو اسے چاہئے کہ (نماز کے بعد قربانی کا جانور) اللہ کے نام کے ساتھ ذبح کر دے۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

ایام قربانی

(۲۱) وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ قَالَ الْاَضْحٰی يَوْمَانِ بَعْدَ يَوْمِ الْاَضْحٰی رَوَاهُ مَالِكٌ وَقَالَ بَلَغَنِيْ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ مِثْلَهٗ۔

"اور حضرت نافعؒ راوی ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا "بقر عید کے دن کے بعد قربانی کے دو دن ہیں۔" امام مالکؒ نے یہ روایت نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "مجھے حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، سے بھی اس قسم کی روایت پہنچی ہے۔"

تشریح: حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ تینوں ائمہ کا عمل اسی حدیث پر ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ قربانی کا آخری وقت ذی الحجہ کی بارہویں تاریخ کے غروب آفتاب تک رہتا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آخری وقت تیرہویں تاریخ تک رہتا ہے۔ یہ حدیث تینوں ائمہ کی مستدل اور حضرت امام شافعی پر حجت ہے۔

آنحضرت ﷺ ہمیشہ قربانی کرتے تھے

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرَ سِنِيْنَ يُضَحِّيْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں دس سال قیام فرما رہے اور (ہر سال قربانی) کرتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: قربانی واجب ہونے کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس پر مداومت فرمائی اور ہمیشہ قربانی کرتے رہے۔"

قربانی حضرت ابراہیمؑ کی سُنّت ہے

(۲۳) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِيُّ قَالَ سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالُوْا فَمَا لَنَا فِيْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ قَالُوْا فَالصُّوْفُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ مِنَ الصُّوْفِ حَسَنَةٌ۔ (رواہ احمد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت زیدؓ ابن ارقم راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے اصحاب نے دریافت کیا کہ "یارسول اللہ! یہ قربانی کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ (یعنی ان کی سنت) ہے۔" صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! پھر اس میں ہمارے لئے کیا ثواب ہے؟" فرمایا "گائے اور بکری کی قربانی کرنے میں کہ جن کے بال ہوتے ہیں) ہر بال کے بدلہ ایک نیکی ہے (انہوں نے عرض کیا کہ "صوف" (یعنی دنبہ، بھیڑ اور اونٹ کی اون اور اس کے بدلہ میں کیا ثواب ملتا ہے؟)" فرمایا "اون کے ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی۔" (احمدؒ ابن ماجہؒ)

بَابُ الْعَتِيْرَةِ

عتیرہ کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

فرع اور عتیرہ کا ممانعت

(۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا فَرَعَ وَلَا عَتِيْرَةَ قَالَ وَالْفَرَعُ اَوَّلُ نِتَاجٍ كَانَ يُنْتَجُ لَهُمْ كَانُوْا يَذْبَحُوْنَهُ لِطَوَاغِيْتِهِمْ وَالْعَتِيْرَةُ فِيْ رَجَبَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "فرع اور عتیرہ (کی) اسلام میں (کوئی حقیقت) نہیں۔" ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ "فرع جانور کا وہ پہلا بچہ ہے جو کافروں کے یہاں پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ایام جاہلیت میں یہ طریقہ تھا کہ کسی کے ہاں جب جانور کے پہلا بچہ پیدا ہوتا تھا تو وہ اسے بتوں کے نام پر ذبح کرتا تھا۔ ابتداء اسلام میں بھی یہ طریقہ جاری رہا کہ مسلمان اس بچہ کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیتے تھے مگر بعد میں اس طریقہ کو منسوخ قرار دے دیا گیا اور کفار کی مشابہت کے پیش نظر مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا گیا۔

عتیرہ کسے کہتے ہیں؟: نیز ایام جاہلیت میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ لوگ ماہ رجب کے پہلے عشرہ میں اپنے معبود کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ایک بکری ذبح کرتے تھے اسی کو عتیرہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ابتداء اسلام میں مسلمان بھی ایسا کرتے تھے مگر کافر تو اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے اور مسلمان اسے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھ کر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے پھر بعد میں اسے بھی منسوخ قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا گیا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ ممانعت اسی لئے تھی کہ وہ اسے اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے، اگر اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن صحیح مسئلہ یہی ہے کہ بت پرستوں کی مشابہت سے بچنے کے لئے یہ ممانعت عام ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۱) عَنْ مِخْنَفِ بْنِ سُلَیْمٍ قَالَ کُنَّا وُقُوْفًا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِعَرَفَۃَ فَسَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ عَلٰی کُلِّ اَھْلِ بَیْتٍ فِیْ کُلِّ عَامٍ اُضْحِیَّۃً وَعَتِیْرَۃً ھَلْ تَدْرُوْنَ مَالْعَتِیْرَۃُ ھِیَ الَّتِیْ تُسَمُّوْنَھَا الرَّجَبِیَّۃَ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ ضَعِیْفُ الْاِسْنَادِ وَقَالَ اَبُوْدَاؤدَ وَالْعَتِیْرَۃُ مَنْسُوْخَۃٌ۔

"حضرت مخنف ابن سلیم فرماتے ہیں کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے ہمراہ (ایک حج کے موقعہ پر) عرفات میں کھڑے ہوئے تھے کہ میں نے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے۔ "لوگو! ہر گھر والے پر ہر سال قربانی کرنا اور عتیرہ کرنا واجب ہے اور تم جانتے ہو عتیرہ کیا ہے؟ عتیرہ وہ ہے جسے تم رجبیہ کہتے ہو (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ) امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب اور ضعیف الاسناد ہے نیز حضرت ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ عتیرہ منسوخ قرار دیا جاچکا ہے۔ (یہ اب جائز نہیں ہے۔)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

تنگ دست پر قربانی واجب نہیں

(۳) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ بِیَوْمِ الْاَضْحٰی عِیْدًا جَعَلَہُ اللّٰہُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ قَالَ لَہٗ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَاَیْتَ اِنْ لَّمْ اَجِدْ اِلَّا مَنِیْحَۃً اُنْثٰی اَفَاُضَحِّیْ بِھَا قَالَ لَا وَلٰکِنْ خُذْ مِنْ شَعْرِکَ وَاَظْفَارِکَ وَتَقُصُّ شَارِبَکَ وَتَحْلِقُ عَانَتَکَ فَذَالِکَ تَمَامُ اُضْحِیَّتِکَ عِنْدَ اللّٰہِ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"حضرت عبداللہ! ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں بقر عید کے دن کو عید قرار دوں اور اللہ تعالیٰ نے اس دن کو اس اُمت کے لئے عید مقرر فرمایا ہے۔" ایک شخص نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مجھے یہ بتایئے کہ اگر مجھے مادہ منیحہ کے علاوہ اور (جانور) میسر نہ ہو تو کیا میں اسی کو قربانی کر لوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! ہاں تم اپنے بال بنوالو اپنے ناخن ترشوالو، لبوں کے بال کترو الو اور زیر ناف کے بال صاف کر لو، خدا کے نزدیک تمہاری یہی قربانی ہو جائے گی یعنی تمہیں قربانی کی مانند ثواب مل جائے گا۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "منیحہ" منح سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "عطاء و بخشش، اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ وہ ازراہِ ہمدردی و احسان اپنی کوئی دودھ والی اونٹنی محتاجوں کو دے دیا کرتے تھے تاکہ وہ اس کے دودھ، اون اور اس کے بچوں سے اپنی ضرورت و احتیاج کے وقت تک فائدہ اٹھائے اور جب ان کی ضرورت و حاجت پوری ہو جائے تو اسے واپس کر دیں۔ چنانچہ ان صحابی کے پاس اسی قسم کا کوئی جانور تھا جو انہیں کسی نے ضرورت و حاجت کے پیش نظر دیا تھا انہوں نے بقر عید میں اسی جانور کی قربانی کی اجازت چاہی تو آنحضرت ﷺ نے منع فرما دیا۔ کیونکہ اول تو قاعدہ کے مطابق اپنی ضرورت کے بعد وہ جانور انہیں اصل مالک کو واپس کرنا تھا۔ دوسرے اس جانور کے علاوہ ان کے پاس ایسا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتے۔ لہٰذا حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قربانی تنگ دست و غریب پر واجب ہے۔

جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ تنگدست کے لئے قربانی کرنا مستحب ہے، مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قربانی صرف اس شخص پر واجب ہے جو نصاب کا مالک ہو۔"

بَابُ صَلٰوةِ الْخُسُوْفِ

نماز خسوف کا بیان

مشہور اہل لغت اہل علم کا قول یہ ہے کہ "خسوف" چاند گرہن کو کہتے ہیں اور "کسوف" سورج گرہن کو۔ اس باب میں جتنی احادیث نقل کی جائیں گی سب کی سب سورج گرہن سے متعلق ہیں۔ ہاں صرف ایک حدیث جو پہلی فصل کی دوسری حدیث ہے اس کے بارہ میں احتمال ہے کہ وہ "چاند گرہن" سے متعلق ہے لہٰذا مؤلف مشکوٰۃ کے لئے بہتر یہ تھا کہ وہ اس باب کا نام "باب صلوٰۃ الخسوف" کی بجائے "باب صلوٰۃ الکسوف" رکھتے۔

بعض علماء نے لفظ کسوف دونوں جگہ استعمال کیا ہے سورج گرہن میں بھی چاند گرہن میں بھی، اسی طرح بعض حضرات نے لفظ خسوف کو بھی دونوں جگہ استعمال کیا ہے۔

سورج گرہن کی نماز بالاتفاق جمہور علماء کے نزدیک مسنون ہے۔ حنفیہ کے نزدیک سورج گرہن کی نماز دو رکعت با جماعت بغیر خطبہ کے ہے۔ چاند گرہن کی نماز بھی دو رکعت ہے مگر اس میں جماعت نہیں ہے بلکہ ہر شخص الگ الگ یہ نماز پڑھے حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں میں جماعت اور خطبہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

سورج گرہن کے وقت آنحضرت ﷺ کی نماز

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ الشَّمْسَ خَسَفَتْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَعَثَ مُنَادِيًا اَلصَّلٰوةُ جَامِعَةٌ فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰى اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ فِيْ رَكْعَتَيْنِ وَاَرْبَعَ سَجَدَاتٍ قَالَتْ عَائِشَةُ مَا رَكَعْتُ رُكُوْعًا قَطُّ وَلَا سَجَدْتُ سُجُوْدًا قَطُّ كَانَ اَطْوَلَ مِنْهُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانہ مبارک میں (ہجرت کے بعد ایک مرتبہ) سورج گرہن ہوا چنانچہ آپ ﷺ نے ایک منادی والے کو (لوگوں کے درمیان) بھیجا کہ وہ یہ منادی کردے کہ "الصلوٰۃ جامعۃ" یعنی نماز جمع کرنے والی ہے چنانچہ (جب لوگ جمع ہوگئے تو) آپ ﷺ آگے بڑھے اور دو رکعت نماز پڑھائی جن میں چار رکوع کئے اور چار سجدے کئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "(جتنے طویل رکوع اور سجدے میں نے اس دن نماز خسوف میں کئے) اس سے زیادہ طویل میں نے نہ کبھی رکوع کیا اور نہ کبھی سجدہ کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: نماز خسوف میں لوگوں کو جمع کرنے کے لئے "الصلوٰۃ جامعۃ" پکار کر کہنا سنت ہے خاص طور پر جب کہ لوگ اس نماز کے لئے جمع نہ ہوئے ہوں۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ نماز جماعت کے ساتھ جامع مسجد میں یا عید گاہ میں پڑھی جائے نیز یہ نماز اوقات مکروہہ میں نہ پڑھی جائے۔

فصلی اربع رکعات الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے چار رکوع اور چار سجدے کئے یعنی ہر رکعت میں دو رکوع اور دو سجدے کئے لیکن امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مسلک میں دوسری نمازوں کی طرح اس نماز میں بھی ہر رکعت میں ایک ہی رکوع ہے۔ ان کی دلیل وہ احادیث ہیں جن سے ایک ہی رکوع کرنا ثابت ہے بلکہ اس باب میں ایک حدیث قولی بھی منقول ہے اور یہ کلمہ ہے کہ جہاں قول اور فعل ثابت ہوتے ہیں تو فعل پر قول کو ترجیح دی جاتی ہے۔

نماز خسوف کی قراءت

④ وَعَنْهَا قَالَتْ جَهَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ صَلَاةِ الْخُسُوْفِ بِقِرَاءَتِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نماز خسوف یعنی چاند گرہن کی نماز میں قراءت بآواز بلند پڑھی تھی۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

سورج گرہن کا حقیقی سبب

③ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسُ مَعَهٗ فَقَامَ قِيَامًا طَوِيْلًا نَحْوًا مِنْ قِرَاءَةِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ ثُمَّ رَكَعَ رُكُوْعًا طَوِيْلًا ثُمَّ رَفَعَ فَقَامَ قِيَامًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَكَعَ رُكُوْعًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الرُّكُوْعِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَفَعَ ثُمَّ سَجَدَ ثُمَّ قَامَ فَقَامَ قِيَامًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَكَعَ رُكُوْعًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الرُّكُوْعِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَفَعَ فَقَامَ قِيَامًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَكَعَ رُكُوْعًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الرُّكُوْعِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَفَعَ ثُمَّ سَجَدَ ثُمَّ انْصَرَفَ وَقَدِ انْجَلَتِ الشَّمْسُ فَقَالَ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَا يَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهٖ فَاِذَا رَاَيْتُمْ ذٰلِكَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَاَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِيْ مَقَامِكَ هٰذَا ثُمَّ رَاَيْنَاكَ تَكَعْكَعْتَ فَقَالَ اِنِّيْ رَاَيْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُوْدًا وَلَوْ اَخَذْتُهٗ لَاَكَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا وَرَاَيْتُ النَّارَ فَلَمْ اَرَ كَالْيَوْمِ مَنْظَرًا اَقَطُّ اَفْظَعَ وَرَاَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا النِّسَاءَ فَقَالُوْا بِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ بِكُفْرِهِنَّ قِيْلَ يَكْفُرْنَ بِاللّٰهِ قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ وَيَكْفُرْنَ الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰى اِحْدٰهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَاَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَاَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانہ میں سورج گرہن ہوا، آپ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ (اس طرح) نماز پڑھی کہ سورہ بقرہ کی قرأت کی بقدر طویل قیام فرمایا (یعنی اتنی دیر تک قیام میں کھڑے رہے جتنی دیر تک سورۂ بقرہ پڑھی جا سکتی ہے) پھر آپ ﷺ نے رکوع کیا، رکوع بھی اتنا طویل تھا، رکوع سے سر اٹھایا اور بڑی دیر تک کھڑے رہے لیکن یہ قیام پہلے قیام سے کم تھا، پھر (دوبارہ) رکوع کیا، یہ رکوع بھی طویل تھا مگر پہلے رکوع سے کم، پھر کھڑے ہوئے اور سجدہ کیا، پھر (دوسری رکعت کے لئے) کھڑے ہوئے اور بہت طویل قیام کیا مگر یہ قیام پہلی رکعت کے قیام سے کم تھا، پھر رکوع میں گئے یہ رکوع بھی طویل تھا مگر پہلے رکوع سے کم، پھر کھڑے ہوئے اور دیر تک کھڑے رہے مگر یہ قیام پہلے قیام سے کم تھا۔ پھر (دوبارہ) رکوع کیا یہ رکوع بھی طویل تھا مگر پہلے رکوع سے کم پھر کھڑے ہوئے اور سجدہ کیا اس کے بعد (یعنی التحیات اور سلام کے بعد) نماز سے فارغ ہوئے تو سورج روشن ہو چکا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا سورج اور چاند خدا کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں! یہ نہ کسی مرنے کی وجہ سے گرہن ہوتے ہیں اور نہ کسی کے پیدا ہونے کی وجہ سے جب تم یہ دیکھو کہ (یہ گرہن میں آگئے ہیں) تو خدا کی یاد میں مشغول ہو جاؤ۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! (نماز کے دوران) ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ نے اپنی جگہ سے کسی چیز کے لینے کا ارادہ کیا پھر ہم نے آپ ﷺ کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا؟ آپ نے فرمایا" (جب تم نے مجھے کسی چیز کے لینے کے لئے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تھا اس وقت) میں نے جنّت کو دیکھا تھا اور اس میں سے خوشہ انگور لینے کا ارادہ کیا تھا، اگر میں خوشہ انگور لے لیتا تو بلاشبہ تم اسے رہتی دنیا تک کھاتے اور جب تم نے مجھے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا تھا (اس وقت) میں نے دوزخ دیکھی تھی (اس کی گرمی کے پہنچنے کے ڈر سے پیچھے ہٹ گیا تھا) چنانچہ آج کے دن کی طرح کسی دن میں نے ایسی ہولناک جگہ کبھی نہیں دیکھی اور دوزخ میں میں نے زیادہ عورتیں ہی دیکھی ہیں۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! کس وجہ سے؟" آپ ﷺ نے فرمایا۔ ان کے کفر کی وجہ سے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "کیا عورتیں اللہ کے کفر میں مبتلا ہیں۔" ؟ فرمایا "نہیں" بلکہ وہ شوہروں کی نعمتوں اور احسان کا کفران

کرتی ہیں (یعنی شوہروں کی ناشکری و نافرمانی کرتی ہیں اور کسی کا احسان نہیں مانتیں) چنانچہ تم ان میں سے کسی کے ساتھ مدتوں تک بھلائی کرتے رہو مگر جب بھی وہ کسی چیز کو اپنی مرضی کے خلاف پائے گی تو یہی کہے گی کہ میں نے کبھی بھی تمہارے یہاں بھلائی نہیں دیکھی۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ایتان من ایت اللّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ "سورج و چاند" خدا کی الوہیت اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے اس بات کی دو نشانیاں ہیں کہ یہ دونوں خداوند قدوس کے تابعدار اور فرمانبردار پیدا کئے گئے ہیں انہیں اپنی طرف سے کسی کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت تو کیا ہوتی ان میں اتنی بھی طاقت نہیں ہے کہ اپنے اندر کسی قسم کے پیدا ہوئے نقصان اور عیب کو ختم کر سکیں۔ لہٰذا کیسے بد عقل و کند فہم اور کور بخت ہیں وہ لوگ جو اس چیز کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی چاند و سورج کو معبود قرار دیتے ہیں ان کے سامنے اپنی پیشانی جھکاتے ہیں؟ اس کے بعد آپ ﷺ نے اہل جاہلیت کے اس عقیدہ کو ختم فرمایا کہ کسی عظیم حادثہ مثلاً کسی بڑی شخصیت کے مرنے اور وباء عام یعنی قحط وغیرہ کی وجہ سے سورج و چاند گرہن میں آتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے آگاہ فرمایا کہ یہ خیالات باطل اور اعتقادات فاسد ہیں حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا ان دونوں کو گرہن میں مبتلا کر کے صرف اپنی قدرت کا اظہار کرتا ہے اور لوگوں کو اپنے غضب سے ڈراتا ہے۔

فاذکروا اللّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ چاند و سورج گرہن کے وقت اگر نماز کے وقت مکروہہ نہ ہوں تو کسوف و خسوف کی نماز پڑھو اور اگر اوقات مکروہہ ہوں تو پھر نماز نہ پڑھو بلکہ پروردگار کی تسبیح و تہلیل اور تکبیر نیز استغفار میں مشغول ہو جاؤ۔ لیکن یہ بات جان لو کہ یہ حکم "امر استحبابی" کے طور پر ہے وجوب کے طور پر نہیں ہے کیونکہ نماز کسوف و خسوف واجب نہیں ہے۔ بلکہ بالاتفاق تمام علماء کے نزدیک سُنت ہے۔

"رہتی دنیا تک کھاتے" یعنی جیسا کہ بہشت کے میووں کی خاصیت ہے، انگور کے اس خوشہ میں سے جو دانہ کھاتے اس کی جگہ دوسرا دانہ پیدا ہو جاتا اسی طرح وہ خوشہ رہتی دنیا تک چلتا رہتا۔

جنت کے اس خوشۂ انگور کو آنحضرت ﷺ کے نہ لینے کا سبب یہ تھا کہ اگر آپ اسے لے لیتے اور لوگ اسے دیکھ لیتے تو ایمان بالغیب کی کوئی حقیقت و اہمیت باقی نہ رہ جاتی۔

④ وَعَنْ عَائِشَةَ نَحْوَ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَالَتْ ثُمَّ سَجَدَ فَاَطَالَ السُّجُوْدَ ثُمَّ انْصَرَفَ وَ قَدِانْجَلَتِ الشَّمْسُ فَخَطَبَ النَّاسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَا يَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهٖ فَاِذَا رَاَيْتُمْ ذٰلِكَ فَادْعُوا اللّٰهَ وَكَبِّرُوْا وَصَلُّوْا وَتَصَدَّقُوْا ثُمَّ قَالَ يَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ وَاللّٰهِ مَا مِنْ اَحَدٍ اَغْيَرُ مِنَ اللّٰهِ اَنْ يَّزْنِيَ عَبْدُهٗ اَوْ تَزْنِيَ اَمَتُهٗ يَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ وَاللّٰهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَّ لَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ سے (بھی) حضرت ابن عباس کی مذکورہ بالا روایت کی طرح روایت منقول ہے چنانچہ انہوں نے یہ (بھی) فرمایا ہے کہ پھر آنحضرت ﷺ سجدہ میں گئے تو بڑا طویل سجدہ کیا پھر نماز سے فارغ ہوئے تو (آفتاب) روشن ہو چکا تھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے (لوگوں کے سامنے) خطبہ ارشاد فرمایا، چنانچہ (پہلے) آپ نے خدا کی حمد و ثنا بیان فرمائی اور پھر فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، نہ تو کسی کی موت کی وجہ سے انہیں گرہن لگتا ہے۔ اور نہ کسی کی پیدائش کی وجہ سے چنانچہ جب تم گرہن دیکھو تو خدا سے دعا مانگو، تکبیر کہو اور نماز پڑھو نیز اللہ کی راہ میں خیرات کرو۔ پھر فرمایا کہ اے اُمت محمد (ﷺ) قسم ہے پروردگار کی اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں ہے۔ جب کہ اس کا کوئی بندہ زنا کرتا ہے یا اس کی کوئی بندی زنا میں مبتلاء ہوتی ہے اور اے امت محمد (ﷺ) قسم ہے خدا کی، اگر تم لوگ وہ چیز جان لو جو میں جانتا ہوں (یعنی یوم آخرت کی ہولناکی اور پروردگار کا غضب) تو اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا ہنسنا کم اور تمہارا رونا زیادہ ہو جائے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس روایت میں سجدہ کی طوالت، خطبہ، دعا، تکبیر، نماز اور خیرات کرنے کا ذکر و حکم اور حدیث کے آخری الفاظ مزید منقول ہیں جب کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

"غیرت" کے اصل معنی ہیں "اپنے حق میں کسی غیر کی شرکت کو برا جاننا۔" اور اللہ تعالیٰ کی غیرت کا مطلب ہے "اپنے احکام میں بندوں کی نافرمانی اور امر و نہی کے خلاف کرنے کو برا جاننا۔" ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ خدا کا کوئی بندہ یا اس کی کوئی بندی جب زنا میں مبتلا ہوتی ہے تو اس معاملہ میں تمہیں جتنی غیرت محسوس ہوتی ہے اور ان دونوں سے تمہیں جتنی نفرت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی غیرت اس سے کہیں زیادہ شدید اور اس کی نفرت تمہاری نفرت سے کہیں زیادہ سخت ہوتی ہے۔

گرہن کے وقت آنحضرت ﷺ کی کیفیت

⑤ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ خَسَفَتِ الشَّمْسُ فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَزِعًا یَخْشٰی اَنْ تَکُوْنَ السَّاعَۃُ فَاَتَی الْمَسْجِدَ فَصَلّٰی بِاَطْوَلِ قِیَامٍ وَّرُکُوْعٍ وَّسُجُوْدٍ مَارَاَیْتُہٗ قَطُّ یَفْعَلُہٗ وَقَالَ ھٰذِہِ الْاٰیَاتُ الَّتِیْ یُرْسِلُ اللّٰہُ لَا تَکُوْنُ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَیَاتِہٖ وَلٰکِنْ یُّخَوِّفُ اللّٰہُ بِھَا عِبَادَہٗ فَاِذَا رَاَیْتُمْ شَیْئًا ذٰلِکَ فَافْزَعُوْا اِلٰی ذِکْرِہٖ وَدُعَائِہٖ وَاسْتِغْفَارِہٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں کہ (جب) سورج گرہن ہوا تو نبی کریم ﷺ گھبرائے ہوئے کھڑے ہو گئے اور آپ ﷺ پر ایسا خوف طاری ہوا جیسے قیامت ہو گئی ہو۔ چنانچہ آپ مسجد میں تشریف لائے اور طویل قیام و رکوع اور سجود کے ساتھ نماز پڑھی، میں نے اس طرح کبھی آپ ﷺ کو (اتنا طویل قیام و رکوع اور سجود) کرتے ہوئے نہیں دیکھا پھر آپ ﷺ نے فرمایا یہ نشانیاں جو اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے۔ نہ تو کسی کے مرنے کے سبب سے (ظاہر ہوتی) ہیں اور نہ کسی کی پیدائش کی وجہ سے، ہاں اس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، لہٰذا جب تم ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی دیکھو تو خدا سے ڈرتے ہوئے اس کا ذکر کرنے، اس سے دعا مانگنے اور استغفار کرنے میں مصروف ہو جاؤ۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: الفاظ یخشی ان تکون الساعۃ دراصل راوی نے بطریق تمثیل استعمال کئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اس موقع پر اس طرح گھبرائے ہوئے اور خوف زدہ تھے جیسا کہ کوئی شخص قیامت شروع ہو جانے پر گھبرا جائے اور خوف زدہ ہو جائے۔ آپ ﷺ کا یہ خوف اس وجہ سے نہیں تھا کہ آپ ﷺ یہ سمجھے ہوں کہ قیامت شروع ہو گئی ہے کیونکہ آپ ﷺ پوری طرح جانتے تھے کہ جب تک میں لوگوں میں موجود ہوں قیامت نہیں آسکتی۔

بہر حال، آنحضرت ﷺ خدا کی نشانیوں کے ظہور مثلاً سورج و چاند گرہن، زلزلے، آندھی و طوفان اور چمک و کڑک کے وقت جو گھبراتے اور ڈرتے تھے تو اس میں صرف زمین کے اوپر بسنے والے انسانوں کی شفقت کا جذبہ کار فرما ہوتا تھا چنانچہ آپ ﷺ اپنی ذات کی طرف سے نہیں بلکہ دنیا والوں کی طرف سے خوف زدہ ہو جایا کرتے تھے کہ کہیں یہ اپنے دامن میں دنیا والوں کی تباہی و بربادی کا پیغام نہ لئے ہو اور اس صورت میں لوگوں پر خدا کا عذاب نازل نہ ہو جائے۔

وقال ھذہ الایات کا مطلب یہ ہے کہ چاند و سورج کا گرہن ہونا، زلزلوں اور آندھی و طوفان کا آنا اور بجلی کی کڑک وغیرہ یہ سب خدا کی قدرت کی نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے اور انسانوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ دیکھو میں تغیر حالت، قسمت کے چھین لینے اور عذاب نازل کرنے پر کیسا قادر ہوں؟

نماز کسوف میں رکوع و سجود کی تعداد

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنْکَسَفَتِ الشَّمْسُ فِیْ عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ مَاتَ اِبْرٰھِیْمُ بْنُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰی بِالنَّاسِ سِتَّ رَکَعَاتٍ بِاَرْبَعِ سَجَدَاتٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں جس دن آنحضرت ﷺ کے صاجزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تھا سورج گرہن ہوا، چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو چھ رکوع اور چار سجدے کے ساتھ نماز پڑھائی۔" (مسلم)

تشریح: حضرت ابراہیم آنحضرت ﷺ کے صاجزادے تھے جو ماریہ قبطیہ کے بطن سے ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۰ھ میں حالت شیر خوارگی میں وفات پاگئے تھے، ان کی عمر صرف اٹھارہ مہینے یا اس سے کچھ زیادہ ہوئی تھی۔ جس دن ان کا انتقال ہوا اس دن سورج کو گرہن لگا۔ چنانچہ لوگوں نے کہا کہ سورج گرہن ان کی وفات ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس کی آنحضرت ﷺ نے تردید فرمائی جیسا کہ گذشتہ روایتوں سے معلوم ہو چکا ہے۔

"چھ رکوع اور چار سجدے کے ساتھ" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی اور ہر رکعت میں تین تین رکوع اور دو دو سجدے کئے۔ جیسا کہ اس باب کی احادیث میں اس نماز کے رکوع کی تعداد مختلف بیان ہوئی ہے۔ لہٰذا حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ان احادیث کو ترجیح دی ہے جن میں ہر رکعت میں صرف ایک رکوع کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ اصل یہی ہے کہ ہر رکعت میں ایک رکوع ہو بلکہ اس بارہ میں قولی اور فعلی دونوں طرح کی احادیث منقول ہیں۔ پھر یہ کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی مستدل روایت کے علاوہ دوسری روایتیں مضطرب ہیں جن میں کسی ایک تعداد کا تعین بڑا مشکل ہے حضرت امام شافعیؒ نے دو رکوع والی حدیث کو ترجیح دی ہے، حضرت امام شافعیؒ اور دوسرے اکثر اہل علم حضرات کے یہاں یہ بھی مسئلہ ہے کہ اگر گرہن دیر تک رہے تو یہ جائز ہے کہ ہر رکعت میں تین یا چار یا پانچ رکوع بھی کئے جا سکتے ہیں۔

(۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ كَسَفَتِ الشَّمْسُ ثَمَانَ رَكَعَاتٍ فِيْ اَرْبَعِ سَجَدَاتٍ وَعَنْ عَلِيٍّ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے سورج گرہن کے وقت دو رکعت نماز آٹھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ (اس طرح) پڑھائی (کہ ہر رکعت میں چار چار رکوع اور دو دو سجدے کئے) اور اسی طرح حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے۔" (مسلم)

تشریح: وعن علی مثل ذلک کا مطلب یہ ہے کہ یا تو حضرت علیؓ نے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس طرح نماز ادا فرمائی یا پھر یہ کہ حضرت علیؓ کے بارہ میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے بھی اس طرح نماز ادا فرمائی۔

سورج گرہن کے وقت آنحضرت ﷺ کا طریقہ

(۸) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كُنْتُ اَرْتَمِيْ بِاَسْهُمٍ لِيْ بِالْمَدِيْنَةِ فِيْ حَيَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ كَسَفَتِ الشَّمْسُ فَنَبَذْتُهَا فَقُلْتُ وَاللّٰهِ لَاَنْظُرَنَّ اِلٰى مَا حَدَثَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ كُسُوْفِ الشَّمْسِ قَالَ فَاَتَيْتُهُ وَهُوَ قَائِمٌ فِي الصَّلَاةِ رَافِعٌ يَدَيْهِ فَجَعَلَ يُسَبِّحُ وَيُهَلِّلُ وَيُكَبِّرُ وَيَحْمَدُ وَيَدْعُوْ حَتّٰى حُسِرَ عَنْهَا فَلَمَّا حُسِرَ عَنْهَا قَرَأَ سُوْرَتَيْنِ وَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ فِيْ صَحِيْحِهٖ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ وَكَذَا فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ وَفِيْ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ۔

"اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن سمرہ فرماتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے زمانہ حیات میں مدینہ میں اپنے تیروں سے تیراندازی کیا کرتا تھا (چنانچہ ایک دن میں تیراندازی میں مشغول تھا) کہ سورج گرہن ہوا، میں نے تیروں کو پھینک دیا اور (دل میں) کہا کہ خدا کی قسم میں یہ ضرور دیکھوں گا کہ سورج گرہن ہونے سے آنحضرت ﷺ کی کیا حالت ہوتی ہے (یعنی یہ دیکھوں گا کہ آپ ﷺ اس وقت کیا کرتے ہیں؟) حضرت عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ "(یہ سوچ کر) میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (میں نے سنا کہ) آپ ﷺ سبحان اللہ لا الہ الا للہ، اللہ اکبر اور الحمد للہ پڑھنے اور دعا مانگنے لگے، یہاں تک کہ سورج گرہن سے نکل آیا۔ جب سورج سے ظلمت دور ہوئی تو آپ ﷺ

نے دو سورتیں پڑھیں اور دو رکعت نماز ادا فرمائی (یعنی آپ ﷺ نے نماز کی دو رکعتیں پڑھیں جن میں دو سورتوں کی قرأت کی)"۔ یہ حدیث مسلمؒ نے اپنی صحیح مسلم میں عبدالرحمٰن ابن سمرہ سے نقل کی ہے، نیز شرح السنۃ میں بھی (یہ روایت) اسی طرح (عبدالرحمٰن ابن سمرہ سے) منقول ہے اور مصابیح کے نسخوں میں یہ روایت جابر ابن سمرہ سے نقل کی گئی ہے۔"

تشریح: وَهُوَ قَائِمٌ فِي الصَّلٰوةِ کا مطلب یہ ہے کہ "آپ ﷺ دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے نماز کے سے انداز میں قبلہ کی طرف رخ کئے ہوئے کھڑے تھے اور لوگ صف باندھے کھڑے تھے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہاں "صلوٰۃ" یعنی نماز سے مراد "دعا" ہے۔ یہ تاویل اس لئے کی جاتی ہے کہ یہ کسی بھی مسلک سے معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرت ﷺ سورج گرہن کے وقت حالت نماز میں اذکار کے وقت اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔"

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جاچکا ہے، نماز کسوف کے رکوع کی تعداد کے بارہ میں مختلف احادیث مروی ہیں چنانچہ جن روایتوں سے ہر رکعت میں کئی کئی رکوع کا اثبات ہوتا ہے۔ وہ سب مضطرب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بارہ میں خود راوی بھی مضطرب ہیں کہ بعض نے تین تین رکوع بیان کئے ہیں، بعض نے چار چار رکوع اور بعض نے پانچ رکوع تک کی تعداد روایت کی ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ اضطراب موجب ضعف ہوتا ہے لہٰذا ان روایتوں کا ترک کرنا واجب ہوا جو تعدد رکوع کو ثابت کرتی ہیں اسی لئے حضرت امام ابوحنیفہ نے انہیں روایات کو اپنا مستدل قرار دیا ہے۔ جن سے ہر رکعت میں ایک ایک رکوع کرنا ثابت ہے۔

سورج گرہن میں غلام آزاد کرنا چاہئے

(۹) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ قَالَتْ لَقَدْ اَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعِتَاقَةِ فِيْ كُسُوْفِ الشَّمْسِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سورج گرہن میں غلام آزاد کرنے کا حکم فرمایا ہے۔" (بخاریؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

نماز کسوف کی قرأت باآواز بلند ہو یا آہستہ آواز سے؟

(۱۰) عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ كُسُوْفٍ لَا نَسْمَعُ لَهٗ صَوْتًا۔

(رواہ الترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ)

"حضرت سمرہؓ ابن جندب فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں سورج گرہن کے وقت (اس طرح) نماز پڑھائی (کہ) ہم آپ ﷺ کی آواز نہیں سنتے تھے۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: یہ حدیث اور اسی قسم کی اور احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نماز کسوف میں امام باآواز بلند قرأت نہ کرے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے۔ بخاری و مسلم نیز دوسری کتابوں میں ایسی روایات بھی منقول ہیں کہ جن سے نماز کسوف کی قرأت کا باآواز بلند ہونا ثابت ہوتا ہے۔ روایات کے اس تعارض کے پیش نظر حضرت ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ جب روایتوں میں تعارض پیدا ہوا تو ان روایتوں کو ترجیح دینا ضروری ہوا جن سے قرأت کا باآواز آہستہ ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ دن کی نماز میں قرأت کا باآواز آہستہ ہونا اصل ہے۔

کرشمہ خداوندی کے ظہور کے وقت سجدہ

(۱۱) وَعَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ قِيْلَ لِابْنِ عَبَّاسٍ مَاتَتْ فُلَانَةُ بَعْضُ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَرَّ سَاجِدًا فَقِيْلَ لَهٗ

تَسْجُدُ فِیْ هٰذِهِ السَّاعَةِ فَقَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَيْتُمْ اٰيَةً فَاسْجُدُوْا وَاَیُّ اٰيَةٍ اَعْظَمُ مِنْ ذِهَابِ اَزْوَاجِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ ابوداؤد و الترمذی)

"اور حضرت عکرمہؓ راوی ہیں کہ (جب) حضرت ابن عباسؓ سے یہ کہا گیا کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے فلاں زوجہ مطہرہ (یعنی حضرت صفیہ) انتقال فرما گئیں (تو) وہ (اس عظیم حادثہ کی خبر سنتے ہی) سجدہ میں گر پڑے (یا یہ کہ انہوں نے نماز پڑھی) ان سے پوچھا گیا آپ اس وقت سجدہ (کیوں) کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "جب تم کوئی نشانی (یعنی کرشمہ خداوندی) دیکھو تو سجدہ کرو، اور آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کی دائمی جدائی سے زیادہ بڑی نشانی اور کیا ہو سکتی ہے؟" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت ابن عباسؓ سے لوگوں کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ اس وقت بلا سبب سجدہ کیوں کرتے ہیں جب کہ بلا وجہ سجدہ کرنا ممنوع ہے؟ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب تم بلاؤں اور مصیبتوں کے آنے کی صورت میں خدا کے کرشموں میں سے جن کہ ذریعہ خدا اپنے بندوں کو ڈراتا ہے کوئی کرشمہ دیکھو تو بارگاہ خداوندی میں فوراً سجدہ ریز ہو جاؤ، اور ظاہر ہے کہ خدا کا کون سا کرشمہ اس سے زیادہ ڈرانے والا عظیم اور سخت تر ہو گا کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات اس دنیا سے رخصت ہو جائیں، کیونکہ ان مقدس ماؤں کو آنحضرت ﷺ کی زوجیت میں ہونے اور آپ ﷺ سے انتہائی ارتباط و اختلاط کی وجہ سے جو عظمت و فضیلت حاصل تھی دوسروں کو حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا جس طرح ان کی حیات دنیا اور دنیا والوں کے لئے امن و برکت کا سبب اور نیکی و بھلائی کا باعث تھی اس طرح ان کی وفات دنیا اور اہل دنیا کے لئے امن و برکت اور بھلائی کے اٹھ جانے کا سبب اور انسانوں کے عذاب خداوندی میں مبتلا ہو جانے کے خوف کا باعث ہے اس لئے ان کی برکت کے منقطع ہو جانے کے وقت اللہ کی یاد میں مشغول اور بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہو جانا ہی بہتر ہے کہ خدا کے ذکر اور سجدہ کی برکت سے عذاب خداوندی دفع ہو جائے۔"

علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی "فاسجدوا" (سجدہ کرو) کا مطلب یہ ہے کہ "نماز پڑھو" جب کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس ارشاد سے صرف سجدہ کرنا ہی مراد ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "ارشاد نبوی میں لفظ "ایۃ" مطلق ہے اس لئے اس کو اگر چاند و سورج گرہن پر محمول کیا جائے تو سجدہ سے نماز مراد ہو گی اگر اس کے علاوہ دوسری نشانیوں مثلاً طوفان آندھی یا زلزلہ وغیرہ پر اطلاق کیا جائے تو پھر سجدہ سے سجدہ ہی مراد ہو گا اگرچہ اس صورت میں بھی نماز مراد لی جا سکتی ہے کیونکہ یہ منقول ہے کہ جب ایسی کوئی صورت پیش آتی تو آنحضرت ﷺ نماز پڑھنے لگتے تھے۔

حضرت ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ منقول ہے کہ سخت طوفان، آندھی اور ظلمت چھا جانے کے وقت نماز پڑھنا ہی اچھا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے بارہ میں بھی مروی ہے کہ انہوں نے بصرہ میں زلزلہ کے وقت نماز پڑھی تھی۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

نماز کسوف کے رکوع و سجدہ اور تلاوت

(۱۲) عَنْ اُبَیِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى بِهِمْ فَقَرَأَ بِسُوْرَةٍ مِنَ الطُّوَلِ وَرَكَعَ خَمْسَ رَكَعَاتٍ وَ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ قَامَ اِلَى الثَّانِيَةِ فَقَرَأَ بِسُوْرَةٍ مِنَ الطُّوَلِ ثُمَّ رَكَعَ خَمْسَ رَكَعَاتٍ وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ جَلَسَ كَمَا هُوَ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ يَدْعُوْ حَتّٰى انْجَلٰى كُسُوْفُهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابیؓ ابن کعب فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ مبارک میں سورج گرہن ہوا تو آپ ﷺ نے صحابہ کو نماز پڑھائی جس میں آپ ﷺ نے (پہلی رکعت میں) طویل سورتوں میں سے ایک سورۃ کی قرأت فرمائی اور پانچ رکوع و دو سجدے کئے۔ پھر دوسری

رکعت) کے لئے کھڑے ہوئے تو (اس میں بھی) طویل سورتوں میں سے ایک سورۃ کی قرأت فرمائی اور پانچ رکوع و دو سجدے کئے پھر اسی طرح (یعنی بہیئت نماز) قبلہ رخ بیٹھے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ آفتاب روشن ہو گیا۔" (ابوداؤد)

حنفیہ کی مستدل حدیث

(۱۳) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ يُصَلِّىْ رَكْعَتَيْنِ وَيَسْأَلُ عَنْهَا حَتّٰى انْجَلَتِ الشَّمْسُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَفِىْ رِوَايَةِ النَّسَائِىِّ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى حِيْنَ انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ مِثْلَ صَلٰوتِنَا يَرْكَعُ وَيَسْجُدُ وَلَهٗ فِىْ اُخْرٰى اَنَّ النَّبِىَّ ﷺ خَرَجَ يَوْمًا مُسْتَعْجِلًا اِلَى الْمَسْجِدِ وَقَدِ انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ فَصَلّٰى حَتّٰى انْجَلَتْ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اَهْلَ الْجَاهِلِيَّةِ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا يَخْسِفَانِ اِلَّا لِمَوْتِ عَظِيْمٍ مِنْ عُظَمَآءِ اَهْلِ الْاَرْضِ وَاِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا يَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهٖ وَلٰكِنَّهُمَا خَلِيْقَتَانِ مِنْ خَلْقِهٖ يُحْدِثُ اللّٰهُ فِىْ خَلْقِهٖ مَا شَآءَ فَاَيُّهُمَا انْخَسَفَتْ فَصَلُّوْا حَتّٰى يَنْجَلِىَ اَوْ يُحْدِثَ اللّٰهُ اَمْرًا۔

"اور حضرت نعمانؓ ابن بشیر فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں سورج گرہن ہوا تو آپ ﷺ نے دو دو رکعت نماز پڑھنی شروع کی (یعنی دو رکعت نماز پڑھ کر دیکھتے اگر گرہن ختم نہ ہوتا تو پھر دو دو رکعت نماز پڑھتے اسی طرح گرہن تک نماز پڑھتے رہے) اور (اللہ تعالیٰ سے یہ دعا) مانگتے (کہ خدایا آفتاب روشن کر دے یا یہ کہ ہر دو رکعت کے بعد لوگوں سے گرہن کے بارہ میں پوچھتے کہ گرہن ختم ہوا یا نہیں؟ اگر لوگ کہتے کہ ابھی گرہن باقی ہے تو پھر نماز میں مشغول ہو جاتے) یہاں تک کہ آفتاب روشن ہو گیا۔" (ابوداؤد) اور نسائیؒ کی روایت ہے کہ "جب سورج گرہن ہوا تو آپ ﷺ نے ہماری نماز کی طرح نماز پڑھی جس میں رکوع و سجدہ کرتے تھے" نسائیؒ کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "ایک روز جب کہ سورج کو گرہن ہوا تھا آنحضرت ﷺ عجلت کے ساتھ مسجد میں تشریف لائے اور نماز پڑھی یہاں تک کہ آفتاب روشن ہو گیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ "زمانہ جاہلیت کے لوگ کہا کرتے تھے کہ زمین پر رہنے والے بڑے آدمیوں میں سے کسی بڑے آدمی کے مرجانے کی وجہ سے سورج اور چاند کو گرہن لگتا ہے، حالانکہ (حقیقت یہ ہے کہ) سورج و چاند نہ تو کسی کے مرجانے کی وجہ سے گرہن میں آتے ہیں اور نہ کسی کی پیدائش کی وجہ سے۔ یہ دونوں محض اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے دو مخلوق ہیں، خدا جو چاہتا ہے اپنی مخلوق میں تغیر (مثلاً گرہن، روشنی اور اندھیرا) پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا جب ان میں سے کوئی گرہن میں آئے تو تم نماز پڑھنی شروع کر دو یہاں تک کہ وہ روشن ہو جائے یا اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ظاہر ہو جائے (یعنی عذاب آجائے یا قیامت شروع ہو جائے)۔" (نسائیؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ "ہماری نماز کی طرح" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نماز کسوف کی ہر رکعت میں کئی کئی رکوع نہیں کئے بلکہ جس طرح کہ ہم روز مرہ نماز پڑھتے ہیں اسی طرح آپ ﷺ نے بھی اس وقت نماز پڑھی اور ہر رکعت میں ایک ایک رکوع اور دو دو سجدے کئے۔" یہ حدیث حنفیہ کے مسلک کی دلیل ہیں اس کے علاوہ اور احادیث بھی منقول ہیں جو اس مسئلہ میں حنفیہ کے مسلک کی تائید کرتی ہیں۔

بَابُ فِىْ سُجُوْدِ الشُّكْرِ

سجدۂ شکر کا بیان

علماء کے یہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ خارج از نماز صرف سجدہ کرنا جائز مسنون اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں صرف سجدہ کرنا بدعت محض اور حرام ہے اور شریعت میں اس کی کوئی

شکر مشروع ہے جب کہ دوسرے علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے اور حدیث کے مفہوم کے بارہ میں کہا ہے کہ یہاں دراصل "سجدہ" سے مراد نماز ہے ان کی اس تاویل کی دلیل یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چاشت کے وقت دو رکعت نماز پڑھی جب کہ آپ ﷺ کو جنگ میں فتح کی خوشخبری دی گئی یا یہ کہ ابوجہل کا سر کاٹ کر لایا گیا۔"

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر بندہ ہر نئی حاصل ہونے والی نعمت پر سجدہ کو لازم قرار دے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پل بھی سجدہ سے خالی نہ ہو کیونکہ انسانی زندگی کا کوئی بھی پل ایسا نہیں آتا جو اپنے دامن میں اللہ تعالیٰ کی نعمت نہ لئے ہوئے ہو۔ پھر یہ کہ انسان کی زندگی خود اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے کہ ہر سانس کا باہر آنا اور اندر جانا اور آنے والا ہر لمحہ اور ہر پل ایک نعمت ہے، چونکہ اس طرح نہ صرف یہ کہ لوگ بہت زیادہ مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہو جائیں گے بلکہ انسانی زندگی کا پورا نظام معطل ہو کر رہ جائے گا اس لئے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک سجدۂ شکر سنت نہیں ہے۔

کسی مبتلائے بلا کو دیکھ کر اپنی عافیت پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے

(۲) وَعَنْ اَبِي جَعْفَرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَجُلًا مِنَ النَّغَاشِيِّيْنَ فَخَرَّ سَاجِدًا رَوَاهُ الدَّارُقُطْنِيُّ مُرْسَلًا وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ۔

"اور حضرت ابوجعفرؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بونے (پست قد آدمی) کو دیکھا تو سجدہ میں گر پڑے۔" دار قطنی نے یہ روایت بطریق ارسال نقل کی ہے اور شرح السنہ میں مصابیح کے الفاظ میں (منقول ہے)۔"

تشریح: نغاش اور نغاشی اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت ہی پستہ قد، ناقص الخلقت اور ضعیف الحرکت ہو ایسے ہی ایک شخص کو جب آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہو گئے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ یہ مسنون ہے کہ جب کسی ایسے شخص کو دیکھا جائے جو مبتلائے بلا ہو تو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ شکر کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بلا سے محفوظ رکھا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ خاص ادب ہے کہ یہ سجدۂ شکر پوشید طور پر کیا جائے تاکہ وہ مبتلائے بلا رنجیدہ نہ ہو۔ لیکن کسی فاسق کو دیکھ کر اس بات کا سجدۂ شکر کرنا کہ خدا نے مجھے اس فسق سے محفوظ رکھا ہے علانیہ طور پر فاسق کے سامنے ہی ہونا چاہئے تاکہ اسے ندامت اور شرمندگی ہو اور وہ اپنے فسق سے باز آجائے۔ چنانچہ حضرت شبلیؒ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے جب ایک ایسے شخص کو دیکھا جو دنیا کی لذتوں میں اپنے آپ کو گم کر چکا تھا تو اس کے سامنے ہی فرمایا کہ الحمدللہ الذی عافانی مما ابتلاک بہ یعنی اس خدا کے لئے تعریف ہے جس نے مجھے اس بلا سے محفوظ رکھا جس میں تم مبتلا ہو۔

امت کے حق میں آنحضرت ﷺ کی شفقت

(۳) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ مَكَّةَ نُرِيْدُ الْمَدِيْنَةَ فَلَمَّا كُنَّا قَرِيْبًا مِنْ عَزْوَزَاءَ نَزَلَ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ فَدَعَا اللّٰهَ سَاعَةً ثُمَّ خَرَّ سَاجِدًا فَمَكَثَ طَوِيْلًا ثُمَّ قَامَ فَرَفَعَ يَدَيْهِ سَاعَةً ثُمَّ خَرَّ سَاجِدًا فَمَكَثَ طَوِيْلًا ثُمَّ قَامَ فَرَفَعَ يَدَيْهِ سَاعَةً ثُمَّ خَرَّ سَاجِدًا قَالَ اِنِّيْ سَاَلْتُ رَبِّيْ وَشَفَعْتُ لِاُمَّتِيْ فَاَعْطَانِيْ ثُلُثَ اُمَّتِيْ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِرَبِّيْ شُكْرًا ثُمَّ رَفَعْتُ رَأْسِيْ فَسَاَلْتُ رَبِّيْ لِاُمَّتِيْ فَاَعْطَانِيْ ثُلُثَ اُمَّتِيْ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِرَبِّيْ شُكْرًا ثُمَّ رَفَعْتُ رَأْسِيْ فَسَاَلْتُ رَبِّيْ لِاُمَّتِيْ فَاَعْطَانِي الثُّلُثَ الْآخَرَ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِرَبِّيْ شُكْرًا۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ مدینہ کے ارادہ سے مکہ سے روانہ ہوئے، جب ہم عزوزا کے قریب (جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے) پہنچے تو آنحضرت ﷺ (اونٹنی سے) اترے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر تھوڑی دیر تک اپنے

حقیقت نہیں ہے۔ اسی بناپر نماز وتر کے بعد کے دونوں سجدوں کی حرمت بیان کی جاتی ہے۔ دوسرے حضرات کے نزدیک جائز اور کراہت کے ساتھ مشروع ہے۔

اس مسئلہ کی حقیقت اور تفصیل یہ ہے کہ خارج از نماز سجدہ کئی طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو سجدۂ سہو ہے یہ نماز ہی کے حکم میں ہے اس کے بارہ میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ دوسرا سجدۂ تلاوت ہے ظاہر ہے کہ اس کے بارہ میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تیسرا سجدۂ مناجات ہے جو خارج از نماز ہے اس کے بارہ میں اکثر علماء کے ظاہری اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سجدہ مکروہ ہے چوتھا سجدۂ شکر ہے جو حصول نعمت اور خاتمہ مصیبت وبلا پر کیا جاتا ہے۔

اس سجدہ میں علماء کے یہاں اختلاف ہے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے یہاں یہ سجدہ سُنّت ہے۔ حنفیہ میں سے حضرت امام محمدؒ کا بھی یہی قول ہے اس مسلک کی تائید میں آثار و احادیث بھی بکثرت منقول ہیں حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے یہاں یہ سجدہ مکروہ ہے۔ یہ حضرات اپنی دلیل کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان گنت ہیں جن کا شمار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ بندہ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہر ہر نعمت کا شکر بھی ادا کر سکے اس لئے اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کے حصول پر سجدۂ شکر کا حکم دینا اسے ایسی تکلیف و مشقت میں مبتلا کر دینا ہے جسے برداشت کرنا اس کی طاقت سے باہر ہے۔

لیکن جو حضرات سجدۂ شکر کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ "نعمتوں" سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو نئی ہوں کہ کبھی کبھی حاصل ہوتی ہوں وہ نعمتیں مراد نہیں ہیں جو مستقل اور دائمی، ہوں جیسے خود انسان کا وجود اس کے توابع اور اس کے لوازمات کہ یہ بھی در حقیقت خدا کی عظیم نعمتیں ہیں جو بندہ کو مستقل طور پر حاصل ہیں۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ کے بارہ میں مروی ہے کہ جب آپ ﷺ کو ابوجہل لعین کے قتل ہو جانے کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے سجدۂ شکر کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے مسیلمہ کذاب کے مرنے کی خبر سن کر سجدہ کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارہ میں تبایا جاتا ہے کہ جب ذی الثدیہ خارجی قتل کر دیا گیا تو انہوں نے سجدۂ شکر کیا۔ اسی طرح مشہور صحابی حضرت کعبؓ ابن مالک کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے قبول توبہ کی بشارت کے وقت سجدۂ شکر کیا۔"

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الْاَوَّلِ وَالثَّالِثِ
اور اس باب میں پہلی فصل اور تیسری فصل نہیں ہے

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

خوشی کے وقت آنحضرت ﷺ کا سجدۂ شکر

(۱) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَاءَهٗ اَمْرٌ سُرُوْرًا اَوْ يُسَرُّ بِهٖ خَرَّ سَاجِدًا شَاكِرًا لِلّٰهِ تَعَالٰی رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو جب خوشی کا امر پیش آتا۔ یا راوی نے لفظ "سُرُوْرٌ" کی بجائے يُسَرُّبِه کہا ہے یعنی آنحضرت ﷺ کو جب کوئی ایسا امر پیش آتا جس سے آپ خوش ہوتے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑتے۔" اور ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت نے حدیث کے ظاہری مفہوم کو دیکھتے ہوئے کہا ہے کہ حصول نعمت پر سجدۂ

دونوں ہاتھ اٹھائے (دعامانگتے) رہے، پھر سجدہ میں گر پڑے۔ اور دیر تک سجدہ میں رہے پھر کھڑے ہوئے اور تھوڑی دیر تک اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے (دعامانگتے) رہے۔ پھر سجدہ میں گر پڑے۔ پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "میں نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور اپنی اُمت (کے گناہوں کی بخشش، عیوب کی پردہ پوشی اور بلندی درجات) کے لئے شفاعت کی، چنانچہ مجھے تہائی اُمت (کی مغفرت) عطافرمادی گئی، میں اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے پروردگار سے اپنی اُمت کے لئے (اس کی رضا اور مغفرت کی) درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اور تہائی اُمت (کی مغفرت) عطافرمادی میں اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے پروردگار سے اپنی اُمت کے لئے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے باقی تہائی اُمت (کی بھی مغفرت) عطافرمادی، چنانچہ میں اپنے پروردگار کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا۔" (احمدؒ، ابوداؤد)

تشریح: پہلی مرتبہ میں سابقین یعنی ان لوگوں کی مغفرت عطافرمائی گئی جو بھلائی کرنے میں سبقت اور پیش روی کرتے ہیں اور اعمال میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں کرتے، دوسری مرتبہ میں مقتصدین یعنی اوسط درجہ والوں کی مغفرت عطافرمائی گئی۔ اور تیسری مرتبہ میں ان لوگوں کی بھی مغفرت عطافرمادی گئی جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں یعنی معصیت و گناہ میں مبتلا رہتے ہیں۔

اس موقع پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کتنی آیات اور احادیث سے تو یہ ثابت ہو چکا ہے جو لوگ گناہ کبیرہ میں مبتلا رہتے ہیں انہیں آخرت میں عذاب دیا جائے گا لیکن یہاں اس حدیث سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ان لوگوں کو عذاب نہیں دیا جائے گا کیونکہ تمام ہی اُمت کی مغفرت عطافرمادی گئی ہے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دعا، شفاعت اور حق تعالیٰ کی جانب سے مغفرت سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعا و سفارش سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی اُمت کو خسف و مسخ اور ان جیسے دوسرے عذابوں سے پروانہ اَمن دے دیا ہے کہ جس طرح پہلی امتوں کے لوگ اپنی بدکرداری اور بداعمالی کی وجہ سے ان جیسے ہولناک عذاب میں اس دنیا میں مبتلا کر دئیے جاتے تھے امت محمدی کو اس دنیا میں ان عذاب سے دوچار نہیں کیا جائے گا لہذا۔ یہاں مغفرت کا تعلق آخرت کے اس عذاب سے نہیں ہے جو ہر گنہگار کو اس کی بدعملی و بدکرداری کی مناسبت سے دیا جائے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ "یہاں مراد یہ ہے، کہ آنحضرت ﷺ کی دعا اور سفارش سے اُمت مرحومہ کو دائمی عذاب سے پروانہ اَمن دے دیا گیا ہے کہ امت کے گناہگار و بدکردار لوگ دائمی طور پر دوزخ میں نہیں رہیں گے۔ بلکہ اپنے اپنے جرم کی مناسبت سے سزا پا کر آنحضرت ﷺ کی سفارش سے دوزخ سے نکال لئے جائیں گے اور پھر دائمی طور پر جنّت میں داخل کر دئے جائیں گے۔

بَابُ صَلٰوةِ الْاِسْتِسْقَاءِ

نماز استسقاء کا بیان

"استسقا" کے لغوی معنی ہیں "پانی طلب کرنا" اور اصطلاح شریعت میں اس کا مطلب ہے "قحط اور خشک سالی میں طلب بارش کے لئے بتائے گئے طریقوں کے مطابق نماز پڑھنا اور دعا کرنا۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی نماز استسقاء

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ اِلَى الْمُصَلّٰى يَسْتَسْقِىْ فَصَلّٰى بِهِمْ

رَكْعَتَيْنِ جَهَرَ فِيْهِمَا بِالْقِرَاءَةِ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ يَدْعُوْ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَحَوَّلَ رِدَآءَهٗ حِيْنَ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عبداللہ ابن زیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ لوگوں کے ہمراہ طلب بارش کے لئے عید گاہ تشریف لے گئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہاں دو رکعت نماز پڑھائی جس میں بلند آواز سے قرأت فرمائی اور قبلہ رخ ہو کر دعا مانگی نیز آپ ﷺ نے (دعا کے لئے) اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے اور قبلہ رخ ہوتے وقت اپنی چادر پھیر دی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ اور صاحبین (حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمدؒ) کے نزدیک استسقاء کی نماز عید کی نماز کی طرح ہے اور حضرت امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ استسقاء کی دو رکعت نماز اسی طرح پڑھی جائے جیسا کہ دوسری نماز پڑھی جاتی ہے۔

نماز استسقاء کے بارہ میں حنفیہ کا مسلک

نماز استسقاء کے سلسلہ میں خود حنفیہ کے یہاں دو قول ہیں، حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ استسقاء نماز نہیں ہے بلکہ دعا و استغفار ہے وہ فرماتے ہیں کہ جن اکثر احادیث میں استسقاء کا ذکر آیا ہے ان میں نماز مذکور نہیں ہے بلکہ صرف دعا کرنا مذکور ہے۔ پھر حضرت عمر فاروقؓ کے بارہ میں صحیح روایت منقول ہے کہ انھوں نے استسقاء کے لئے صرف دعا و استغفار پر اکتفا فرمایا نماز نہیں پڑھی، اگر اس سلسلہ میں نماز مسنون ہوتی تو وہ ترک نہ کرتے۔ اور ایسے ضروری مشہور واقعات کا انہیں معلوم نہ ہونا جب کہ زمانہ نبوت کو بھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے بعید ہے اور معلوم ہونے کی صورت میں اسے ترک کرنا حضرت عمرؓ کی شان سے بعید تر ہے۔

صاحبین کا مسلک اس کے خلاف ہے۔ ان حضرات کے نزدیک نہ صرف یہ کہ استسقاء کے لئے نماز منقول اور مسنون ہے بلکہ اس نماز میں جماعت اور خطبہ بھی مشروع ہے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے قول لا صلوٰۃ فی الاستسقاء (یعنی استسقاء کے لئے نماز نہیں ہے) کی مراد یہ ہے کہ اس نماز کے لئے جماعت خطبہ اور خصوصیت سُنّت و شرط نہیں، اگر ہر شخص الگ الگ نفل نماز پڑھے اور دعا و استغفار کرے تو بہتر ہے۔ اس وقت حنفیہ کے یہاں فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے کیونکہ نماز استسقاء آنحضرت ﷺ سے ثابت اور منقول ہے جس کا ایک واضح ثبوت مذکورہ بالا حدیث ہے۔

نماز استسقاء کے سلسلہ میں یہ افضل ہے کہ اس کی دونوں رکعتوں میں سے پہلی رکعت "سورہ ق" یا "سبح اسم ربک الاعلی" اور دوسری رکعت میں "اقتربت الساعة" یا "سورۃ غاشیہ" کی قرأت کی جائے۔

"چادر پھیرنا" دراصل تغیر حالت کے لئے اچھا شگون لینے کے درجہ میں ہے جس طرح چادر الٹ پلٹ دی گئی ہے اسی طرح موجودہ حالت میں بھی تبدیلی اور تغیر ہو جائے بایں طور کہ قحط کے بدلہ ارزانی ہو جائے اور خشک سالی کی بجائے باران رحمت سے دنیا سیراب ہو جائے۔

چادر پھیرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے لے جاکر دائیں ہاتھ سے چادر کی بائیں جانب کے نیچے کا کونا پکڑا جائے اور بائیں ہاتھ سے چادر کی دائیں جانب کے نیچے کا کونا پکڑ لیا جائے پھر دونوں ہاتھوں کو پیٹھ کے پیچھے اس طرح پھیرا اور پلٹا جائے کہ دائیں ہاتھ میں چادر کا پکڑا ہوا کونا دائیں مونڈھے پر آجائے اور بائیں ہاتھ میں چادر کا پکڑا ہوا کونا بائیں مونڈھے پر آجائے اس طریقہ سے چادر کا دایاں کونا تو بائیں ہو جائے گا اور بایاں کونا دائیں ہو جائے گا۔ نیز اوپر کا حصہ نیچے پہنچ جائے گا اور نیچے کا حصہ اوپر آجائے گا۔

آنحضرت ﷺ کی چادر کے بارہ میں کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ آپ ﷺ کی چادر چار ہاتھ لمبی اور دو ہاتھ ایک بالشت چوڑی تھی۔

آنحضرت ﷺ نماز استسقاء میں دعا کے وقت ہاتھ زیادہ بلند کرتے تھے

(۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ شَيْءٍ مِنْ دُعَائِهٖ اِلَّا فِي الْاِسْتِسْقَاءِ فَاِنَّهٗ يَرْفَعُ حَتّٰى

یُرٰی بَیَاضُ اِبِطَیْہِ۔ متفق علیہ۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ استسقاء کے علاوہ اور کسی موقع پر دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے چنانچہ (استسقاء کے لئے دعا کے وقت) آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ اتنے (زیادہ) بلند کرتے تھے کہ آپ ﷺ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت انسؓ کے ارشاد کی مراد استسقاء کے علاوہ کسی دوسرے موقع پر دعا کے وقت بالکل اٹھانے کی نفی نہیں ہے کیونکہ استسقاء کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی دعا کے وقت آنحضرت ﷺ سے دونوں ہاتھوں کا بلند کرنا ثابت ہو چکا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ دوسرے مواقع پر بھی دعا کے وقت اپنے دونوں ہاتھوں کو اتنا زیادہ اور سر سے اونچا بلند نہیں کرتے تھے کہ آپ ﷺ کی مبارک بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی۔ ہاں استسقاء کے موقع پر دعا کے لئے آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ اتنے زیادہ اٹھاتے تھے کہ اگر کوئی کپڑا نہ اوڑھے ہوتے تھے تو بغلوں کی سفیدی تک نظر آنے لگتی تھی۔ علماء لکھتے ہیں کہ جس مقصد اور مراد کے لئے دعا مانگی جارہی ہو وہ مقصد جتنا زیادہ اہم اور عظیم ہو دعا کے وقت دونوں ہاتھ بھی اتنے زیادہ اوپر اٹھانے چاہئیں۔

دعا کے وقت ہاتھوں کی ہیئت

③ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِسْتَسْقٰی فَاَشَارَ بِظَھْرِ کَفَّیْہِ اِلَی السَّمَاءِ رَوَاہُ مُسْلِمٌ۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے طلب بارش کے لئے دعا مانگی تو اپنے دونوں ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کرلی۔"

(مسلمؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ بارش کے لئے دعا مانگتے وقت ہتھیلیوں کی پشت کو آسمان کی طرف کر دینا بھی اچھا شگون لینے کے درجہ میں ہے جیسا کہ چادر پلٹ کر اچھا شگون لیا جاتا ہے۔ ہاتھوں کی پشت کو آسمان کی طرف کرنا دراصل اس طرف اشارہ ہے کہ خدا کرے اسی طرح بادلوں کے پیٹ بھی زمین کی طرف ہو جائیں اور وہ اپنے اندر کے ذخیرۂ آب کو زمین پر انڈیل دیں۔

دعا کے وقت اٹھتے ہوئے ہاتھوں کی ہیئت کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ جو شخص بلاء مثلاً قحط وغیرہ کے دور ہونے کی دعا مانگے تو وہ اپنے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کرے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے کسی نعمت کی طلب کے لئے دعا کرے تو وہ ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف کرے۔"

بارش کے وقت آنحضرت ﷺ کی دعا

④ وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا رَأَی الْمَطَرَ قَالَ اَللّٰھُمَّ صَیِّبًا نَّافِعًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب بارش دیکھتے تو یہ دعا مانگتے اَللّٰھُمَّ صَیِّبًا نَّافِعًا یعنی اے اللہ! نفع دینے والی بارش خوب برسا۔" (بخاریؒ)

بارش کے وقت آنحضرت ﷺ کا عمل

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اَصَابَنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَطَرٌ قَالَ فَحَسَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَوْبَہٗ حَتّٰی اَصَابَہٗ مِنَ الْمَطَرِ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لِمَ صَنَعْتَ ھٰذَا قَالَ لِاَنَّہٗ حَدِیْثُ عَھْدٍ بِرَبِّہٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ

"آپ ﷺ نے (اپنے سر سے یا پیٹھ سے) کپڑا اتار لیا یہاں تک کہ آپ ﷺ کے (سر مبارک یا پیٹھ کے) اوپر بارش کا پانی گرنے لگا۔" ہم نے (یہ دیکھ کر) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) نے ایسا کیوں کیا"؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس لئے کہ یہ پانی اپنے پروردگار کے پاس سے ابھی ابھی آیا ہے۔" (مسلم)

تشریح: آپ ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ یہ پانی اپنے رَب کے حکم سے ابھی ابھی اوپر سے اترا ہے اور اس عالم کثیف کے اجزاء سے ابھی تک آلودہ نہیں ہوا ہے نہ ہی اس تک ابھی گناہگاروں کے ہاتھ پہنچ پائے ہیں اس لئے یہ پانی متبرک ہے جس کا کچھ حصّہ میں اپنے بدن پر لے رہا ہوں۔" علماء لکھتے ہیں کہ بارش کے وقت (اپنے کسی بھی مطلب اور مقصد کے لئے) دعا مانگنا سُنّت ہے کیونکہ اس وقت دعا قبول ہوتی ہے کیونکہ اس وقت کی دعا قبول ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

استسقاء میں چادر پھیرنے کا بیان

(۶) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ زَیْدٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَی الْمُصَلّٰی فَاسْتَسْقٰی وَحَوَّلَ رِدَاءَہٗ حِیْنَ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَۃَ فَجَعَلَ عِطَافَہُ الْاَیْمَنَ عَلٰی عَاتِقِہِ الْاَیْسَرِ وَجَعَلَ عِطَافَہُ الْاَیْسَرَ عَلٰی عَاتِقِہِ الْاَیْمَنِ ثُمَّ دَعَا اللّٰہَ۔

(رواہ ابوداؤد)

"حضرت عبداللہ ابن زیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ عید گاہ تشریف لے گئے اور وہاں بارش مانگی۔ چنانچہ جب آپ ﷺ قبلہ رخ ہوئے تو اپنی چادر کا دایاں کونا گھما کر اپنے بائیں مونڈھے پر لائے اور چادر کا بایاں کونا گھما کر اپنے دائیں مونڈھے پر لائے پھر اللہ تعالیٰ سے (بارش کے لئے) دعا مانگی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث میں استسقاء کے لئے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے صرف دعا کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۷) وَعَنْہُ اَنَّہٗ قَالَ اسْتَسْقٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَمِیْصَۃٌ لَہٗ سَوْدَآءُ فَاَرَادَ اَنْ یَّاْخُذَ اَسْفَلَھَا فَیَجْعَلَہٗ اَعْلَاھَا فَلَمَّا ثَقُلَتْ قَلَّبَھَا عَلٰی عَاتِقَیْہِ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے بارش طلب (کرنے کے لئے دعا) کی تو اس وقت آپ ﷺ کے جسم مبارک پر سیاہ رنگ کی چادر تھی، آپ ﷺ نے یہ ارادہ کیا کہ چادر کے نیچے کا کونا پلٹ کر اسے اوپر کی جانب لائیں (جیسا کہ چادر پھیرنے کا طریقہ ہے) مگر اس میں جب آپ ﷺ کو دقت پیش آئی تو آپ ﷺ نے اپنے ہی مونڈھے پر چادر پلٹ لی۔" (احمد وابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق جب چادر پھیرنے میں دقت محسوس ہوئی تو آپ ﷺ نے صرف یہ کیا کہ چادر کا دایاں کونا بائیں مونڈھے پر کر لیا اور بایاں کونا دائیں مونڈھے پر۔ آپ ﷺ نے چادر مبارک دوسرے خطبہ میں پھیری تھی کیونکہ چادر پھیرنے کا وقت اور موقع وہی ہے۔

(۸) وَعَنْ عُمَیْرٍ مَوْلٰی اَبِی اللَّحْمِ اَنَّہٗ رَأَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَسْتَسْقِیْ عِنْدَ اَحْجَارِ الزَّیْتِ قَرِیْبًا مِّنَ الزَّوْرَاءِ قَائِمًا یَدْعُوْ یَسْتَسْقِیْ رَافِعًا یَدَیْہِ قِبَلَ وَجْھِہٖ لَا یُجَاوِزُ بِھِمَا رَأْسَہٗ وَرَوَی التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ نَحْوَہٗ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمیرؓ سے جو ابی اللحم کے آزاد کردہ غلام تھے، روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو "احجا الزیت" کے پاس جو "زوراء"

کے قریب ہے، بارش مانگتے ہوئے دیکھا۔ آپ ﷺ کھڑے ہوئے طلب بارش کے لئے دعا مانگ رہے تھے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ کی طرف اٹھائے ہوئے تھے جو سر سے اونچے نہیں تھے۔" ترمذیؒ" اور نسائیؒ" نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "احجا الزیت" مدینہ میں ایک جگہ کا نام تھا اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہاں سیاہ پتھر تھے جو اتنے چمک دار تھے جن کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا ان پتھر پر روغن زیتون ملا ہوا ہے۔ "زوراء" بھی مدینہ کے بازار میں ایک جگہ کا نام تھا۔ اس حدیث میں دعا کے وقت اٹھے ہوئے ہاتھوں کی یہ ہیئت بیان کی جارہی ہے کہ آپ ﷺ کی دونوں ہتھیلیاں منہ کی طرف یعنی اوپر کی جانب تھیں۔ بنابریں یہ روایت اس روایت کے منافی نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ دعا کے وقت آپ ﷺ اپنے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی ہتھیلیاں زمین کی طرف رکھتے تھے کیونکہ کبھی تو آپ ﷺ اس طرح سے دعا مانگتے کہ ہتھیلیاں آسمان کی طرف ہوتی تھیں جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوا۔ اور کبھی اس طرح خدا کی بارگاہ میں دست سوال دراز کرتے تھے کہ ہتھیلیاں زمین کی طرف ہوتی تھیں جیسا کہ گذشتہ روایت سے معلوم ہوا۔ اسی طرح یہاں اس روایت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ آپ ﷺ کے اٹھے ہوئے ہاتھ سر مبارک سے اونچے نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا یہ بھی حضرت انسؓ کی اس روایت کے منافی نہیں ہے جس سے معلوم ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ طلب بارش کے لئے دعا مانگتے وقت اپنے ہاتھ بہت زیادہ بلند کرتے تھے، یہاں بھی یہی بات ہے کہ کبھی تو آپ ﷺ اپنے ہاتھ بہت زیادہ بلند کرتے تھے جیسا کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا ہے اور کبھی بہت زیادہ بلند نہیں کرتے تھے جیسا کہ یہاں عمیر بیان کر رہے ہیں۔

استسقاء کے وقت آنحضرت ﷺ خشوع و خضوع اور تضرع اختیار کرتے تھے

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِيْ فِى الْاِسْتِسْقَاءِ مُتَبَذِّلًا مُتَوَاضِعًا مُتَخَشِّعًا مُتَضَرِّعًا۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد و النسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ استسقاء کے لئے باہر نکلے اور اس وقت آپ ﷺ کی کیفیت یہ تھی کہ (ظاہر میں تو) آپ ﷺ زینت ترک کئے ہوئے اور متواضع تھے (باطن میں) عاجزی و بیچارگی اور (ذکر اللہ میں زبان کی مشغولیت کے ساتھ) تضرع اختیار کئے ہوئے تھے۔" (نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: بارش کے لئے دعا کرنے اور پروردگار سے رحمت مانگنے کے لئے جب آپ ﷺ باہر نکلتے تھے تو آپ ﷺ کا ظاہر و باطن اور زبان و دل گویا پورا وجود مبارک انتہائی بے چارگی اور عجز اختیار کئے ہوئے ہوتا تھا، چنانچہ نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ اس موقع پر بندہ کی انتہائی محتاجی و بیچارگی اور عاجزی کے اظہار کے لئے آپ ﷺ ظاہری طور پر زیب و زینت (یعنی لباس وغیرہ میں خوش سلیقگی، ترک کر کے سراپا عجز و انکسار ہوتے تھے بلکہ باطنی طور پر بھی آپ ﷺ کا قلب مبارک خوف خدا سے لرزاں اور زبان مبارک تضرع و زاری میں مشغول ہوتی تھی۔

بارش کی دعا

⑩ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَسْقٰى قَالَ اَللّٰهُمَّ اسْقِ عِبَادَكَ وَبَهِيْمَتَكَ وَانْشُرْ رَحْمَتَكَ وَاَحْيِ بَلَدَكَ الْمَيِّتَ۔ (رواہ مالک والبوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا (یعنی حضرت عبداللہؓ صحابی سے) روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "نبی کریم ﷺ جب بارش مانگتے تو یہ دعا پڑھتے اَللّٰهُمَّ اسْقِ عِبَادَكَ وَبَهِيْمَتَكَ وَانْشُرْ رَحْمَتَكَ وَاَحْيِ بَلَدَكَ الْمَيِّتَ یعنی اے اللہ اپنے بندوں اور اپنے جانوروں کو پانی سے سیراب فرمادے اپنی رحمت پھیلادے، اور اپنی مردہ (یعنی خشک) زمینوں کو زندگی (یعنی شادابی و سر

سبزی) عطا فرما۔" (ابوداؤد)

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوَاكِئُ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا غَيْثًا مُّغِيْثًا مَرِيْئًا مُّرِيْعًا نَافِعًا غَيْرَ ضَارٍّ عَاجِلًا غَيْرَ اٰجِلٍ قَالَ فَاَطْبَقَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول کریم ﷺ (استسقاء کے لئے) ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے اور یہ دعا فرما رہے تھے اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا غَيْثًا مُّغِيْثًا مَرِيْئًا مُّرِيْعًا نَافِعًا غَيْرَ ضَارٍّ عَاجِلًا غَيْرَ اٰجِلٍ یعنی اے اللہ؟ تو ہمیں بارش سے سیراب فرما جو فریاد رسی کرے اور جس کا انجام بہتر ہو اور جو ارزانی کرنے والی اور نفع پہنچانے والی ہو اور جلد آنے والی ہو دیر میں آنے والی نہ ہو۔" حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ (اس دعا کے بعد) آسمان ابر آلود ہو گیا۔" (ابوداؤد)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ شَكَى النَّاسُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُحُوْطَ الْمَطَرِ فَاَمَرَ بِمِنْبَرٍ فَوُضِعَ لَهٗ فِي الْمُصَلّٰى وَوَعَدَ النَّاسَ يَوْمًا يَخْرُجُوْنَ فِيْهِ قَالَتْ عَائِشَةُ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ بَدَا حَاجِبُ الشَّمْسِ فَقَعَدَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَكَبَّرَ وَحَمِدَ اللّٰهَ ثُمَّ قَالَ اِنَّكُمْ شَكَوْتُمْ جَدْبَ دِيَارِكُمْ وَاسْتِئْخَارَ الْمَطَرِ عَنْ اِبَّانِ زَمَانِهٖ عَنْكُمْ وَقَدْ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَدْعُوْهُ وَوَعَدَكُمْ اَنْ يَّسْتَجِيْبَ لَكُمْ ثُمَّ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْغَنِيُّ وَنَحْنُ الْفُقَرَاءُ اَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ وَاجْعَلْ مَا اَنْزَلْتَ لَنَا قُوَّةً وَبَلَاغًا اِلٰى حِيْنٍ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ فَلَمْ يَتْرُكِ الرَّفْعَ حَتّٰى بَدَا بَيَاضُ اِبِطَيْهِ ثُمَّ حَوَّلَ اِلَى النَّاسِ ظَهْرَهٗ وَقَلَّبَ اَوْ حَوَّلَ رِدَاءَهٗ وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ وَنَزَلَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ فَاَنْشَاَ اللّٰهُ سَحَابَةً فَرَعَدَتْ وَبَرَقَتْ ثُمَّ اَمْطَرَتْ بِاِذْنِ اللّٰهِ فَلَمْ يَاْتِ مَسْجِدَهٗ حَتّٰى سَالَتِ السُّيُوْلُ فَلَمَّا رَاٰى سُرْعَتَهُمْ اِلَى الْكِنِّ ضَحِكَ حَتّٰى بَدَتْ نَوَاجِذُهٗ فَقَالَ اَشْهَدُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَاَنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ لوگوں نے رسول کریم ﷺ سے بارش نہ ہونے کی شکایت کی، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ عید گاہ میں منبر رکھا جائے چنانچہ جب عید گاہ میں منبر رکھ دیا گیا تو آپ ﷺ نے لوگوں سے ایک دن کے بارہ میں طے کیا کہ اس دن سب لوگ عید گاہ چلیں گے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (متعین دن کو) آنحضرت ﷺ سورج کا کنارہ ظاہر ہوتے ہی (عید گاہ) تشریف لے گئے، اور منبر پر بیٹھ کر تکبیر کہی اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا کہ "تم نے (اللہ اور اس کے رسول سے) اپنے شہروں کی قحط سالی اور بارش کے اپنے وقت پر نہ برسنے کی شکایت کی تھی، اب اللہ تعالیٰ تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ تم اس سے (بارش کے لئے دعا) مانگو اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ تمہاری دعا قبول ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا "تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے مہربان اور بخشش کرنے والا ہے اور یوم جزاء کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اے اللہ! تو معبود ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو غنی (بے پرواہ) ہے اور ہم فقیر و محتاج ہیں۔ ہم پر بارش برسا اور جو چیز کہ تو نازل کرے (یعنی بارش) اس کو ایک مدت دراز تک ہماری مدت اور (اس کے ذریعہ اپنے اپنے مقاصد و منافع تک) پہنچنے کا سبب بنا۔" اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور اتنے بلند اٹھائے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، پھر اپنی پشت مبارک لوگوں کی طرف پھیر کر اپنی چادر الٹی یا یہ کہ پھیری اور اپنے ہاتھ یوں ہی اٹھائے رہے پھر لوگوں کی طرف منہ کر کے (منبر سے) نیچے تشریف لائے اور دو رکعت نماز پڑھی۔" جب ہی اللہ تعالیٰ نے بادل ظاہر فرمائے جو گرجنے لگے اور بجلی چمکنے لگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بارش شروع ہوگئی یہاں تک کہ آپ ﷺ اپنی مسجد تک نہ آنے پائے تھے کہ نالے بہنے لگے، جب آپ ﷺ نے لوگوں کو سایہ (یعنی بارش سے بچنے کے لئے محفوظ مقام) ڈھونڈھنے میں جلدی کرتے دیکھا

تو ہنس پڑے یہاں، تک کہ آپ ﷺ کی کچلیاں ظاہر ہو گئیں پھر فرمایا "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔" (ابوداؤد)

تشریح: حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ اور ایک روایت کے مطابق حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ نماز استسقاء کے بعد دو خطبے پڑھنا سُنّت ہے اور خطبہ کی ابتداء استغفار کے ساتھ کرنی چاہئے جیسے کہ عیدین کے خطبہ کی ابتداء تکبیر کے ساتھ ہوتی ہے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت امام احمدؒ کے نزدیک خطبہ مشروع نہیں ہے صرف دعا و استغفار پر اکتفا کرنا چاہئے۔

حضرت ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اصحاب سنن اربعہ نے حضرت اسحٰق ابن عبداللہ ابن کنانہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (استسقاء کے لئے) عید گاہ جاکر تمہاری طرح خطبہ نہیں پڑھا بلکہ آپ ﷺ برابر دعا کرتے گریہ وزاری کرتے اور اللہ کی عظمت وبڑائی بیان کرتے رہے نیز آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی جیسا کہ عید میں پڑھتے تھے۔"

وسیلہ سے بارش کے لئے دعا

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ اِذَا قَحِطُوا اسْتَسْقٰى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا قَالَ فَيُسْقَوْنَ۔ (رواه البخاری)

اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ جب (بارش نہ ہونے کے وجہ سے) قحط سالی ہوتی تو امیر المؤمنین حضرت عمر ابن خطابؓ حضرت عباس ابن عبد المطلب کے وسیلہ سے بارش کے لئے دعا فرماتے تھے چنانچہ وہ فرماتے "اے اللہ! ہم تیرے نبی ﷺ کے وسیلہ سے تجھ سے دعا کرتے تھے پس تو ہمیں سیراب کرتا تھا اب ہم تیرے نبی ﷺ کے چچا کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں پس تو ہمیں سیراب کر۔" حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (اس دعا سے) بارش ہو جاتی تھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: منقول ہے کہ جب حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ جو ان کے ہمراہ ہوتے تھے حضرت عباسؓ کے وسیلہ سے دعا مانگتے تو حضرت عباسؓ فرماتے کہ "اے پروردگار! تیرے پیغمبر کی اُمت نے میرا وسیلہ اختیار کیا ہے۔ خداوندا! تو میرے اس بڑھاپے کو رسوا مت کر اور مجھے ان کے سامنے شرمندہ نہ کر۔" چنانچہ حضرت عمرؓ و دیگر صحابہ کی دعا اور حضرت عباسؓ کے ان الفاظ میں اتنی تاثیر ہوتی کہ جب ہی بارش شروع ہو جاتی تھی۔

استسقاء کے سلسلہ میں ایک نبی کا واقعہ

⑭ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ خَرَجَ نَبِيٌّ مِّنَ الْاَنْبِيَآءِ بِالنَّاسِ يَسْتَسْقِيْ فَاِذَا هُوَ بِنَمْلَةٍ رَافِعَةٍ بَعْضَ قَوَائِمِهَا اِلَى السَّمَآءِ فَقَالَ ارْجِعُوْا فَقَدِ اسْتُجِيْبَ لَكُمْ مِّنْ اَجْلِ هٰذِهِ النَّمْلَةِ۔ (رواه الدار قطنی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "انبیاء میں سے ایک نبی لوگوں کے ہمراہ استسقاء کے لئے نکلے پس اس نبی نے اچانک ایک چیونٹی کو دیکھا جو اپنے کچھ پاؤں آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے (کھڑی) تھی (یہ دیکھ کر) نبی نے فرمایا کہ "واپس چلو! اس چیونٹی کی وجہ سے تمہاری دعا قبول کرلی گئی۔" (دار قطنیؒ)

تشریح: منقول ہے کہ یہ نبی حضرت سلیمان علیہ السلام تھے۔ واقعہ سے مقصود در حقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرت کا اظہار ہے اور یہ بتانا ہے کہ نہ صرف یہ کہ پروردگار کی رحمت تمام مخلوقات پر یکساں ہیں بلکہ اس کا علم تمام موجودات کے احوال و کوائف کو گھیرے ہوئے ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مسبب الاسباب اور قاضی الحاجات ہے۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں یہ بھی منقول ہے کہ وہ چیونٹی یہ دعاء کرتی تھی اَللّٰھُمَّ اِنَّا خَلْقٌ مِّنْ خَلْقِكَ لَاغِنٰی بِنَا عَنْ رِزْقِكَ فَلَا تُھْلِکْنَا بِذُنُوْبِ بَنِیْ اٰدَمَ یعنی اے پروردگار! تیری مخلوقات میں سے ہم ایک مخلوق ہیں تیرے رزق سے ہم مستغنی نہیں ہیں سو تو ہمیں انسانوں کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک نہ کر۔"

باب في الرياح والمطر

ہواؤں کا بیان

مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں یہاں صرف لفظ "باب" لکھا ہوا ہے جیسا کہ مؤلف مشکوٰۃ کی عادت ہے کہ وہ بعض مواقع پر صرف لفظ باب لکھ کر ایک باب قائم کرتے ہیں جو در حقیقت کوئی الگ سے اور مستقل باب نہیں ہوتا بلکہ بیان کردہ پہلے باب کے لواحق اور متممات پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن ایک صحیح نسخہ میں اس موقع پر "باب في الرياح" اور اسی طرح ایک دوسرے نسخہ میں "باب الرياح" لکھا ہوا ہے جس کا مطلب ہے "ہواؤں کا بیان" گویا اس باب میں ہواؤں سے متعلق احادیث نقل کی جائیں گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ہوا رحمت بھی ہے اور عذاب بھی

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَاُھْلِکَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" پروا ہوا کے ذریعے میری مدد کی گئی اور قوم عاد پچھوا ہوا کے ذریعہ ہلاک کی گئی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: غزوہ خندق کے موقع پر جب کفار نے اپنی پوری قہرمانی طاقتوں کے ساتھ مدینہ کا بڑا شدید محاصرہ کیا تو منجانب اللہ مسلمانوں کی اس طرح مدد کی گئی کہ پروا ہوا نہایت تیز و تند چلنی شروع ہوگئی جس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ اس نے لشکر کفار کے خیمے اکھاڑ ڈالے۔ ان کی ہانڈیاں اوندھا دیں اور ان کے منہ پر کنکروں کی بارش کر دی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رعب و دہشت کی ایسی ہیبت ناک لہر دوڑا دی کہ وہ حواس باختہ ہوگئے اور شکست کا منہ دیکھ کر میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ گویا یہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا فضل اور آنحضرت ﷺ کا ایک عظیم معجزہ تھا

"قوم عاد" گذشتہ امتوں میں ایک بڑی سرکش اُمّت گذری ہے اس امت کے لوگوں کے قد بارہ بارہ گز کے تھے۔ جب اس قوم کی سرکشی و بدکرداری نے حد سے تجاوز کر کے خدا کے عذاب کو دعوت دی تو بڑی زبردست پچھم کی ہوا چلی جس نے ان کو اس طرح زمین پر دے مارا کہ ان کے سر چکنا چور ہوگئے، پیٹ پھٹ گئے اور آنتیں باہر نکل پڑیں۔

لہٰذا اس ارشاد گرامی سے آنحضرت ﷺ کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ہوا اللہ تعالیٰ کی تابعدار ہے کبھی تو وہ خدا کے حکم سے رحمت خداوندی کی شکل میں مدد و نصرت بن کر آتی ہے اور کبھی وہی ہوا اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے عذاب الٰہی کی صورت میں کسی قوم کے لئے ہلاکت و بربادی کا پیغام لے کر آتی ہے۔

ابر و ہوا دیکھ کر آنحضرت ﷺ کی کیفیت

② وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَارَأَیْتُ رَسُوْلَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ضَاحِکًا حَتّٰی اَرٰی مِنْہُ لَھَوَاتِہٖ اِنَّمَا کَانَ یَتَبَسَّمُ فَکَانَ

اِذَا رَأٰی غَیْمًا اَوْرِیْحًا عُرِفَ فِیْ وَجْھِہٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو کبھی بھی اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ مجھے آپ ﷺ کا کوا نظر آیا ہو۔ آپ صرف تبسم فرماتے تھے اور جب ابر یا ہوا دیکھتے تو آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کا تغیر (صاف) پہچانا جاتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ جب ابر یا ہوا دیکھتے تو متفکر ہو جاتے تھے اور چہرۂ مبارک پر اس ڈر اور خوف کے آثار صاف پہچانے جاتے کہ کہیں یہ ابر یا ہوا اپنے دامن میں لوگوں کے لئے نقصان و ضرر کا سامان نہ لئے ہو۔

اس روایت میں حضرت عائشہؓ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ یوں تو آنحضرت ﷺ "شہود" یعنی جلال کبریائی کے مشاہدہ کی وجہ سے ہمیشہ ہی خائف و لرزاں رہا کرتے تھے اور کسی بھی وقت آپ ﷺ کا قلب مبارک خوف و خشیت سے خالی نہیں رہتا تھا۔ مگر خاص طور پر جب ابر یا ہوا دیکھتے تو اور زیادہ متفکر اور متردد ہو جاتے تھے۔

تیز ہوا کے وقت آنحضرت ﷺ کی دعا

(۳) وَعَنْھَا قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا عَصَفَتِ الرِّیْحُ قَالَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَھَا وَخَیْرَ مَافِیْھَا وَخَیْرَ مَا اُرْسِلَتْ بِہٖ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّھَا وَشَرِّ مَا فِیْھَا وَشَرِّ مَا اُرْسِلَتْ بِہٖ وَاِذَا تَخَیَّلَتِ السَّمَاءُ تَغَیَّرَ لَوْنُہٗ وَخَرَجَ وَدَخَلَ وَاَقْبَلَ وَاَدْبَرَ فَاِذَا مَطَرَتْ سُرِّیَ عَنْہُ فَعَرَفَتْ ذٰلِکَ عَائِشَۃُ فَسَأَلَتْہُ فَقَالَ لَعَلَّہٗ یَا عَائِشَۃُ کَمَا قَالَ قَوْمُ عَادٍ فَلَمَّا رَأَوْہُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِیَتِھِمْ قَالُوْا ھٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَیَقُوْلُ اِذَا رَأَی الْمَطَرَ رَحْمَۃً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب شدت کی ہوا چلتی تو آنحضرت ﷺ یہ دعا فرماتے "اے اللہ! میں مانگتا ہوں تجھ سے بھلائی جو اس (ہوا) کی ذات میں ہے اور بھلائی اس چیز کی جو اس میں ہے (یعنی اس کے منافع) اور بھلائی اس چیز کی جس کے لئے یہ ہوا بھیجی گئی ہے (یعنی اس کی مدد) اور پناہ مانگتا ہوں تیرے ذریعہ اس کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے جو اس میں ہے (یعنی یہ عذاب کا باعث نہ ہو)۔ اور جب آسمان ابر آلود ہوتا تو آنحضرت ﷺ (کے چہرہ مبارک) کا رنگ بدل جاتا چنانچہ (اضطراب و گھبراہٹ کی وجہ سے ایک جگہ نہ رہتے بلکہ) کبھی گھر سے باہر نکلتے اور کبھی باہر سے اندر آتے اس طرح پھر آتے اور پھر جاتے۔ جب بارش شروع ہو جاتی تو آپ ﷺ کا خوف و اضطراب ختم ہو جاتا (ایک مرتبہ) حضرت عائشہؓ نے جب یہ (تغیر و اضطراب) محسوس کیا تو آنحضرت ﷺ سے اس کا سبب پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "عائشہ" کیا! خبر یہ ابر ویسا ہی ہو جس کی نسبت قوم عاد نے کہا تھا کہ "یہ ابر ہے جو ہم پر برسے گا۔" چنانچہ اس آیت میں قوم عاد کا حال بیان کیا گیا ہے کہ "جب انہوں نے ابر کو اپنے نالوں اور وادیوں پر آتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ یہ ابر ہے جو ہم پر برسے گا۔" اور ایک روایت میں بجائے (فَاِذَا مَطَرَتْ سُرِّیَ عَنْہُ) یہ الفاظ ہیں کہ "جب آپ ﷺ بارش کو دیکھتے تو یہ فرماتے کہ یہ بارش باعث رحمت ہو۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مذکورہ بالا آیت میں قوم عاد کی ہلاکت کی ابتداء کا ذکر کیا گیا ہے کہ عذاب خداوندی جب ابر کی شکل میں ان پر نمودار ہوا تو اسی خوش فہمی میں رہے کہ یہ ابر ہمارے اوپر بارش برسائے گا، مگر حق تعالیٰ نے ان کی اس خوش فہمی کو جلد ہی ہلاکت و تباہی میں بدل دیا جس کا اظہار اسی آیت کے دوسرے الفاظ بَلْ ھُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ الآیہ کے ذریعہ بایں طور کیا گیا ہے کہ (نہیں) بلکہ (یہ) وہ چیز ہے جس کے لئے تم جلدی کرتے تھے یعنی آندھی جس میں دکھ دینے والا عذاب بھرا ہوا ہے (جو) ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے تباہ کئے دیتی ہے پھر وہ کل کو ایسے رہ گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، گنہگار لوگوں کو ہم اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔

پس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب ابر دیکھتے تو پڑھتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح قوم عاد نے ابر دیکھ کر یہ سمجھا تھا کہ ہم پر بارش ہوگی اور پھر وہ ابر ان پر بارش تو کیا برساتا بلکہ ایسی تند و تیز آندھی آئی جس نے آن واحد میں پوری قوم کو ہلاکت کی وادی میں

پھینک دیا اسی لئے ہمارے لئے بھی یہ ابر ہلاکت و بربادی کا باعث نہ ہو؟۔

غیب کے پانچ خزانے

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَفَاتِيْحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ ثُمَّ قَرَأَ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ الآيه۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "غیب کے خزانے پانچ ہیں" پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی (جس کا ترجمہ یہ ہے) اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے اور وہی بارش برساتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: غیب کے پانچ خزانے ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ کوئی دوسرا ان پر مطلع نہیں ہے۔ انہیں پانچ خزانوں کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَافِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ یعنی بلاشبہ اللہ ہی کو قیامت قائم ہونے اور بارش برسانے کا علم ہے اور وہی جانتا ہے کہ (ماں کے) پیٹ میں کیا ہے (یعنی لڑکا ہے یا لڑکی، گورا ہے یا کالا اور پورا ہے یا ادھورا وغیرہ وغیرہ) اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا (یعنی دنیا میں بھلائی کرے گا یا برائی اور آخرت میں ثواب پائے گا یا عذاب) اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کون سی زمین پر مرے گا، بیشک اللہ ہی جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔ یہ غیب کی وہ پانچ چیزیں ہیں جن کی کلیات کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہاں خدا کے بعض برگزیدہ و نیک بندے ان میں سے کسی بعض جزئیات کو جان جاتے ہیں (مگر وہ بھی اسی وقت جب کہ اللہ اپنے کسی ذریعہ سے بتا دیتا ہے)۔

سخت قحط کیا ہے؟

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَتِ السَّنَةُ بِاَنْ لَّا تُمْطَرُوْا وَلٰكِنَّ السَّنَةَ اَنْ تُمْطَرُوْا وَلَا تُنْبِتُ الْاَرْضُ شَيْئًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سخت قحط اس کا نام نہیں ہے کہ تم پر بارش نہ ہو بلکہ سخت قحط یہ ہے کہ تم پر بارش ہو مگر زمین کچھ نہ اگائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: قاضی نے کہا کہ جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوا شدید اور سخت قحط سالی یہ نہیں ہے کہ بارش نہ ہو اور سوکھا پڑ جائے بلکہ شدید اور سخت قحط سالی اس کا نام ہے کہ بارش تو ہو مگر زمین کی پیداوار بالکل بند ہو جائے کیونکہ فائدہ اور بھلائی کی امید اور توقع اور پھر اس کے اسباب و وسائل کے ظاہر ہو جانے کے بعد غیر متوقع طریقہ پر نقصان و ضرر پہلے سے متوقع نقصان و مایوسی سے کہیں زیادہ سخت اور شدید ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

ہوا کو برا کہنے کی ممانعت

⑥ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الرِّيْحُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ تَاْتِيْ بِالرَّحْمَةِ وَبِالْعَذَابِ فَلَا تَسُبُّوْهَا وَسَلُوا اللّٰهَ مِنْ خَيْرِهَا وَعُوْذُوْا بِهٖ مِنْ شَرِّهَا۔ رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَ اَبُوْدَاوُدَ وَ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ہوا خدا کی رحمت ہے، وہ رحمت بھی لاتی ہے اور عذاب بھی۔ پس تم (اگر تمہیں اس سے کوئی نقصان پہنچے تو) اسے برا نہ کہو ہاں تم خدا سے اس کی بھلائی طلب کرو اور اللہ سے اس کے نقصان سے پناہ مانگو۔" (شافعیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: سخت ہوا اور آندھی جو خدا کے سرکش اور نافرمانبردار بندوں کے لئے عذاب کا ذریعہ بن کر آتی ہے وہ بھی حقیقت میں رحمت ہی ہے کیونکہ خدا کے نیک و فرمانبردار بندے اس کی تباہی سے محفوظ رہتے ہیں۔

⑦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلًا لَعَنَ الرِّيْحَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا تَلْعَنُوا الرِّيْحَ فَاِنَّهَا مَامُوْرَةٌ وَاِنَّهُ مَنْ لَعَنَ شَيْئًا لَيْسَ لَهُ بِاَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک شخص نے کسی ایسی چیز پر لعنت کی جو لعنت کی مستحق نہ تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہوا پر لعنت نہ کرو کیونکہ وہ تو (رحمت یا عذاب کے لئے) خدا کی جانب سے مامور ہے اور جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت کرتا ہے جو لعنت کی مستحق نہیں ہوتی تو وہ لعنت اسی لعنت کرنے والے پر لوٹ آتی ہے۔" یہ روایت امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ لعنت کا باعث تین ہی چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ ① کفر ② بدعت ③ فسق، اور ظاہر ہے کہ ہوا میں ان تین چیزوں میں سے کوئی بھی چیز نہیں پائی جاتی اس لئے آنحضرت ﷺ نے ہوا کو لعنت دینے سے منع فرمایا۔

⑧ وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسُبُّوا الرِّيْحَ فَاِذَا رَاَيْتُمْ مَا تَكْرَهُوْنَ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهِ الرِّيْحِ وَخَيْرِ مَا فِيْهَا وَخَيْرِ مَا اُمِرَتْ بِهٖ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ هٰذِهِ الرِّيْحِ وَشَرِّ مَا فِيْهَا وَشَرِّ مَا اُمِرَتْ بِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابی ابن کعبؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہوا کو برا نہ کہو، ہاں جب تم یہ دیکھو کہ (اس کے جھلسا دینے والے جھونکوں یا اس کی ٹھنڈی لہروں کی وجہ سے) تمہیں وہ ناگوار محسوس ہو رہی ہے (یا اس کی تیز و تندی کی وجہ سے تمہیں تکلیف یا نقصان ہو رہا ہے) دعا کرو کہ "اللہ! ہم تجھ سے اس ہوا کی بھلائی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اس کی بھلائی اور جس چیز کے لئے یہ مامور کی گئی ہے اس کی بھلائی مانگتے ہیں اور ہم تجھ سے اس ہوا کی برائی سے اور جو کچھ اس کے اندر ہے اس کی برائی سے اور جس چیز کے لئے یہ مامور کی گئی ہے اس کی برائی سے پناہ چاہتے ہیں۔" (ترمذیؒ)

تیز ہوا کے وقت آنحضرت ﷺ کی دعا

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا هَبَّتْ رِيْحٌ قَطُّ اِلَّا جَثَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رَحْمَةً وَّلَا تَجْعَلْهَا عَذَابًا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رِيَاحًا وَلَا تَجْعَلْهَا رِيْحًا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا وَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ وَاَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب بھی (تیز) ہوا چلتی تو نبی کریم ﷺ (اللہ کے سامنے عجز و انکساری کے اظہار) اُمت کی طرف سے خوف اور تعلیم کے پیش نظر کہ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کریں) دوزانوں ہو کر بیٹھ جاتے تھے اور یہ دعا فرماتے۔ "اے اللہ! اس ہوا کو ریاح (یعنی رحمت) بنا، ریح (یعنی عذاب) نہ بنا۔" حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیات کریمہ ہیں (جن کا ترجمہ یہ ہے) کہ "اور بھیجی ہم نے ان پر تیز و تند ہوا۔" اور "بھیجی ہم نے ان پر بانجھ ہوا (یعنی ایسی ہوا جو درختوں کو ثمر آور نہیں ہونے دیتی تھی)" اور

بھیجیں ہم نے میوہ لانے والی ہوائیں۔" اور یہ کہ بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ (بارش کی) خوشخبری لانے والی ہوائیں۔" (شافعیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مشہور اور صحیح یہ ہے کہ لفظ "ریح" جو مفرد ہے عذاب کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ اس روایت میں ذکر کردہ پہلی دونوں آیتوں سے معلوم ہوا، اور لفظ "ریاح" جو جمع ہے رحمت کے موقع پر مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ آخر کی دونوں آیتوں سے ثابت ہوا۔

پس حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت میں مذکورہ دعا میں "ریاح" سے مراد رحمت اور "ریح" سے مراد "عذاب" ہے لیکن ابو جعفر طحاویؒ نے اس میں اشکال ظاہر کیا ہے کیونکہ قرآن کریم ہی میں یہ بھی ارشاد ہے کہ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ریح" رحمت و بھلائی کے لئے مستعمل ہے۔

اسی طرح بعض احادیث میں بھی لفظ "ریح" جو مفرد ہے خیر و شر دونوں موقعوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت ابوہریرہؓ گذشتہ روایت (نمبر۶) کے الفاظ الریح من روح اللہ الخ کو دیکھ لیجئے۔ لہٰذا اس اشکال کے پیش نظر خطابیؒ نے اس حدیث کی توجیہہ یہ کی ہے کہ جب بہت ساری ہوائیں آتی ہیں تو وہ ابر و بارش لاتی ہیں اور کھیتوں میں نمو پیدا کرتی ہیں۔ جب کہ ایک ہوا میں یہ تاثیر کم ہوتی ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے یہ دعا فرمائی کہ "اے اللہ! اس ہوا کو ریاح بنا، ریح نہ بنا۔"

ابر کے وقت کی دعا

⑩ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَبْصَرْنَا شَيْئًا مِنَ السَّمَاءِ تَعْنِي السَّحَابَ تَرَكَ عَمَلَهُ وَاسْتَقْبَلَهُ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَافِيْهِ فَاِنْ كَشَفَهُ اللّٰهُ حَمِدَ اللّٰهَ وَ اِنْ مَطَرَتْ قَالَ اَللّٰهُمَّ سَقْيًانَا فِعًا رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالشَّافِعِيُّ وَاللَّفْظُ لَهُ۔

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب آسمان سے گھٹا اٹھتی دیکھتے تو (مباح) کام کاج چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو جاتے اور یہ دعا فرماتے "اے اللہ! جو کچھ اس میں برائی ہو میں اس سے تیری پناہ چاہتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ (بغیر برسائے) آسمان کو صاف کر دیتا تو آپ ﷺ اللہ کی حمد بیان فرماتے اور اگر بارش شروع ہو جاتی تو یہ دعا فرماتے کہ "اللہ! نفع دینے والا پانی برسا۔" ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، الفاظ شافعیؒ کے ہیں۔"

گرج کے وقت کی دعا

⑪ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا سَمِعَ صَوْتَ الرَّعْدِ وَالصَّوَاعِقِ قَالَ اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب گرج کی آواز سنتے یا آپ ﷺ کو بجلی کا گرنا معلوم ہوتا تو یہ دعا فرماتے۔ اے اللہ! ہمیں اپنے غضب سے نہ مار اور اپنے عذاب سے ہلاک نہ کر اور ہمیں عافیت میں رکھ (یعنی ہمیں عافیت کی موت دے) پہلے اس کے (کہ تیرا عذاب نازل ہو)" احمدؒ ترمذیؒ، اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑫ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّهُ كَانَ اِذَا سَمِعَ الرَّعْدَ تَرَكَ الْحَدِيْثَ وَقَالَ سُبْحَانَكَ الَّذِي يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهِ۔ (رواہ مالک)

"حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ جب گرج کی آواز سنتے تو بات چیت چھوڑ دیتے تھے اور یہ پڑھنے لگتے۔" پاک

وہ ذات جس کی، "رعد" تسبیح کرتا ہے اس کی تعریف کے ساتھ، اور فرشتے اس کے خوف سے۔" (مالک)

تشریح: "رعد" فرشتے کا نام ہے جو بادل ہنکانے پر مقرر ہے۔ چنانچہ گرج در حقیقت اس کی تسبیح کی آواز ہے حضرت ابن عباس ؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضرت عمر ؓ کے ہمراہ سفر میں تھے کہ گرج، بجلی کی چمک اور سردی نے ہمیں آلیا، حضرت کعب ؓ نے (یہ دیکھ کر) کہا کہ جو شخص گرج کی آواز سن کر تین مرتبہ یہ پڑھے سُبْحَانَ مَنْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ تو وہ ان چیزوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ چنانچہ ہم نے یہ پڑھنا شروع کیا اور خدا تعالیٰ نے ہمیں محفوظ رکھا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ایسے موقع پر جب کہ بادل کی چمک و گرج اور بجلی کی تڑپ و کڑک، خوف و اضطرب کی لہر پیدا کردے ان مقدس الفاظ کا ورد سکونِ قلب اور حفاظت کے لئے بہت موثر ہے۔

لِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلاً وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

اللہ تعالیٰ کا صد ہزار شکر و احسان کہ آج مورخہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ بروز بدھ بوقت ۱/۲ ۱۲ بجے شب "مظاہر حق جلد اول" کی ترتیب و تسوید سے فراغت ہوئی۔ خداوند قدوس اپنے ایک ناچیز کوتاہ عمل بندہ کی اس خدمت کو قبول و مقبول فرمائے۔ آمین

عبداللہ جاوید

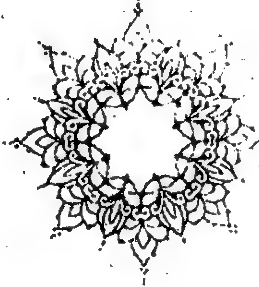

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الجنائز

جنازے کا بیان

"جنائز" جنازہ کی جمع ہے، لفظ جنازہ لغت کے اعتبار سے جیم کے زیر اور زبر دونوں کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے لیکن زیادہ فصیح جیم کے زیر کے ساتھ ہی ہے۔ جنازہ میت یعنی مردے کو جو تخت پر ہو، کہتے ہیں۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ لفظ "جنازہ" یعنی جیم کے زبر کے ساتھ میت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور "جنازہ" یعنی جیم کے زیر کے ساتھ تابوت اور اس تخت یا چارپائی کو کہتے ہیں جس پر مردہ کو رکھ کر اٹھاتے ہیں، بعض حضرات نے اس کے برعکس کہا ہے یعنی "جنازہ" تابوت یا تخت کو کہتے ہیں اور جنازہ میت کو کہا جاتا ہے۔

بَابُ عِیَادَةِ الْمَرِیْضِ وَثَوَابِ الْمَرَضِ

بیمار کی عیادت اور بیماری کے ثواب کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بیمار کی عیادت کرنی چاہئے

① وَعَنْ اَبِي مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَطْعِمُوا الْجَائِعَ وَعُوْدُوا الْمَرِیْضَ وَفُکُّوا الْعَانِیَ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بھوکے (یعنی مضطر و مسکین اور فقیر) کو کھانا کھلاؤ، بیمار کی عیادت کرو، اور قیدی کو (دشمن کی قید سے) چھڑاؤ۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث میں تین باتوں کا حکم دیا جا رہا ہے یہ "وجوب علی الکفایۃ" کے طور پر ہے جس کے مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص بھی ان احکام کو پورا کرلے تو بقیہ دوسرے لوگوں کے لئے انہیں پورا کرنا ضروری نہیں ہے تاہم سب کے لئے ان احکام پر عمل کرنا سُنّت اور باعث ثواب ضرور ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص ان احکام کو پورا نہ کرے تو پھر سب ہی لوگ نافرمانی کے گناہ میں مبتلا ہوں گے۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے لکھا ہے کہ "بھوکے کو اس صورت میں کھانا کھلانا سُنّت ہے اگر وہ حالت اضطرار میں نہ ہو یعنی اس بھوکے کی یہ کیفیت نہ ہو کہ اگر اسے کھانا نہ کھلایا گیا تو مر جائے۔ مگر اس شکل میں اسے کھانا دینا فرض ہے کہ وہ حالت اضطرار کو پہنچ چکا ہو،

اس طرح کوئی بھوکا کسی ایسے مقام پر ہو جہاں ایک نہیں بلکہ کئی آدمی ذی مقدور ہوں یعنی اس بھوکے کو کھانا کھلانے کی استطاعت رکھتے ہوں تو ان سب ذی المقدور لوگوں پر بھوکے کو کھانا کھلانا فرض کفایہ ہو گا کہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی بھوکے کو کھانا کھلا دیا تو سب لوگ بری الذمہ ہو جائیں گے۔ ہاں اگر بھوکا کسی ایسی جگہ ہو جہاں صرف ایک ہی آدمی ذی مقدور ہو اور بقیہ سب لوگ مفلس وقلاش ہوں تو اس ذی مقدور پر بھوکے کو کھانا کھلانا فرض عین ہو گا۔ ایسے ہی اس بیمار کی عیادت اور مزاج پرسی سُنّت ہے جس کا کوئی خبر گیر اور تیمار دار ہو اور اس بیمار کی عیادت و مزاج پرسی واجب ہے جس کا کوئی خبر گیر و تیمار دار نہ ہو۔

مسلمان کے مسلمان پر حقوق

② وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ خَمْسٌ رَدُّ السَّلَامِ وَعِیَادَةُ الْمَرِیْضِ وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ وَاِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَتَشْمِیْتُ الْعَاطِسِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (ایک) مسلمان کے (دوسرے) مسلمان پر پانچ حق ہیں۔ ① سلام کا جواب دینا ② بیمار کی عیادت کرنا ③ جنازہ کے ساتھ جانا ④ دعوت قبول کرنا ⑤ چھینکنے والے کا جواب دینا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: مذکورہ بالا پانچوں چیزیں فرض کفایہ ہیں۔ سلام کرنا سُنّت ہے اور وہ بھی حقوق اسلام میں سے ہے جیسا کہ اگلی حدیث سے معلوم ہو گا۔ مگر سلام کرنا ایسی سنت ہے جو فرض سے بھی افضل ہے کیونکہ اسے کرنے سے نہ صرف یہ کہ تواضع و انکساری کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ اداء سُنّت واجب کا سبب بھی ہے۔

بیمار کی عیادت اور جنازہ کے ساتھ جانے کے حکم سے اہل بدعت مستثنیٰ ہیں۔ یعنی روافض وغیرہ کی نہ تو عیادت کی جائے اور نہ ان کے جنازہ کے ساتھ جایا جائے۔

"دعوت قبول کرنے" سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی مدد کے لئے بلائے تو اس کی درخواست قبول کی جائے اور اس کی مدد کی جائے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ "دعوت قبول کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مہمانداری اور ضیافت کے لئے مدعو کرے تو اس کی دعوت کو قبول کر کے اس کی طرف سے دی گئی ضیافت میں شرکت کی جائے بشرطیکہ ضیافت کسی بھی حیثیت سے ایسی نہ ہو جس میں شرکت گناہ کا باعث ہو جیسا کہ حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جو ضیافت محض ازراہ مفاخرت اور نام و نمود کی خاطر ہو اس میں شرکت نہ کی جائے چنانچہ سلف یعنی صحابہؓ اور پہلے زمانہ کے علماء کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ ایسی ضیافت کو ناپسند کرتے تھے۔

"چھینکنے والے کا جواب دینے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر چھینکنے والا "الحمدللہ" کہے تو اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہا جائے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اسلام کے ان تمام حقوق کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے خواہ نیک مسلمان ہوں یا بد۔ یعنی ایسے مسلمان ہوں جو گنہگار تو ہوں مگر مبتدع (بدعتی) نہ ہوں تاہم اس احتیاط اور امتیاز کو مدنظر رکھا جائے کہ بشاشت یعنی خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا اور مصافحہ کرنا صرف نیک مسلمان ہی کے ساتھ مختص ہونا چاہئے فاجر یعنی ایسے بد اور گنہگار مسلمان کے ساتھ جو علی الاعلان معصیت و گناہ میں مبتلا رہتا ہے بشاشت و مصافحہ ضروری نہیں ہے۔

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ سِتٌّ قِیْلَ مَاهُنَّ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِذَا لَقِیْتَهٗ فَسَلِّمْ عَلَیْهِ وَاِذَا دَعَاكَ فَاَجِبْهُ وَاِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْ لَهٗ وَاِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ فَشَمِّتْهُ وَاِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ وَاِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(ایک) مسلمان کے (دوسرے) مسلمان پر چھ حق ہیں" عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ فرمایا ① جب تم مسلمان سے ملاقات کرو تو اسے سلام کرو ② جب تمہیں کوئی (اپنی مدد کے لئے یا ضیافت کی خاطر)

بلائے تو اسے قبول کرو۔ ③ جب تم سے کوئی خیر خواہی چاہے تو اس کے حق میں خیر خواہی کرو ④ جب کوئی چھینکے اور الحمد للہ کہے تو (یرحمک اللہ کہہ کر) اس کا جواب دو۔ ⑤ جب کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو۔ ⑥ جب کوئی مرجائے تو (نماز جنازہ اور دفن کرنے کے لئے) اس کے ساتھ جاؤ۔" (مسلم)

تشریح: وَاِذَا مَرِضَ الخ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان بیمار ہو تو اس کی عیادت کے لئے جانا چاہئے اور اس کی مزاج پرسی کرنی چاہئے اگرچہ عیادت اور مزاج پرسی ایک ہی مرتبہ کیوں نہ کی جائے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ بعض اوقات میں بیمار کی عیادت نہ کی جائے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔

اس حدیث میں اسلام کے چھ حقوق بتائے گئے ہیں جب کہ گذشتہ حدیث میں حقوق کی تعداد پانچ بیان کی گئی تھی، گویا اس حدیث میں "خیر خواہی" کا مزید ذکر کیا گیا ہے۔ تو اس بارہ میں یہ بات جان لینی چاہئے کہ احادیث میں حقوق کی جو تعداد ذکر کی گئی ہے وہ حصر کے طور پر نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر بہت زیادہ حقوق ہیں جن کو بتدریج مختلف احادیث میں تھوڑا تھوڑا کر کے بیان کیا گیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ احکام بذریعہ وحی آپ کے پاس اسی طرح بتدریج نازل ہوئے ہوں گے یعنی پہلے تو پانچ حقوق کا حکم نازل کیا گیا ہوگا پھر چھ حقوق کے احکام نازل کئے گئے۔

④ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ اَمَرَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَبْعٍ وَنَهَانَا عَنْ سَبْعٍ اَمَرَنَا بِعِيَادَةِ الْمَرِيْضِ وَاتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ وَرَدِّ السَّلَامِ وَاِجَابَةِ الدَّاعِيْ وَاِبْرَارِ الْمُقْسِمِ وَنَصْرِ الْمَظْلُوْمِ وَنَهَانَا عَنْ خَاتَمِ الذَّهَبِ وَعَنِ الْحَرِيْرِ وَالْاِسْتَبْرَقِ وَالدِّيْبَاجِ وَالْمِيْثَرَةِ الْحَمْرَاءِ وَالْقَسِّيِّ وَاٰنِيَةِ الْفِضَّةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَعَنِ الشُّرْبِ فِي الْفِضَّةِ فَاِنَّهُ مَنْ شَرِبَ فِيْهَا فِي الدُّنْيَا لَمْ يَشْرَبْ فِيْهَا فِي الْاٰخِرَةِ (متفق علیہ)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں سات چیزوں کا حکم دیا ہے اور سات چیزوں سے منع فرمایا ہے وہ یہ ہیں: ① بیمار کی عیادت کرنا ② جنازہ کے ہمراہ جانا ③ چھینکنے والے کو جواب دینا ④ سلام کا جواب دینا ⑤ بلانے والے کی دعوت قبول کرنا ⑥ قسم کھانے والے کی قسم پورا کرنا ⑦ اور مظلوم کی مدد کرنا۔ اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے وہ یہ ہیں ① سونے کی انگوٹھی پہننے سے ② ریشم کے کپڑے پہننے سے ③ اطلس کے کپڑے استعمال کرنے سے ④ لاہی (دیباج) کے کپڑے پہننے سے ⑤ سرخ زین پوش استعمال کرنے سے ⑥ قسی کے کپڑے پہننے سے۔ ⑦ اور چاندی کے برتن استعمال کرنے سے" ایک روایت کے یہ الفاظ بھی ہیں کہ "چاندی کے برتن میں پینے سے (بھی منع فرمایا ہے) کیونکہ جو شخص چاندی کے برتن میں دنیا میں پئے گا آخرت میں اسے چاندی کے برتن میں پینا نصیب نہ ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "قسم کھانے والے کی قسم پوری کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پیش آنے والی بات کے بارے میں قسم کھائے اور تم اس کی قسم پوری کرنے پر قادر ہو اور اس میں کوئی گناہ بھی نہ ہو تو تمہیں اس کی قسم پوری کرنی چاہئے مثال کے طور پر کوئی شخص تمہیں مخاطب کرتے ہوئے قسم کھائے کہ میں تم سے جدا نہیں ہوں گا جب تک کہ تم فلاں کام نہ کرو، پس اگر تم اس کام کے کرنے پر قادر ہو تو وہ کام کر ڈالو تاکہ اس کی قسم نہ ٹوٹے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو یہ قسم دلائے کہ تمہیں خدا کی قسم تم یہ کام کرو۔ تو اس شخص کے لئے مستحب ہے کہ وہ پروردگار کے نام کی تعظیم کی خاطر وہ کام کرلے اگرچہ واجب نہیں ہے۔

"مظلوم کی مدد کرنا" کی تشریح میں علماء لکھتے ہیں کہ مظلوم کی مدد کرنا واجب ہے اور اس حکم میں مسلمان اور ذمی دونوں برابر کے شریک ہیں یعنی جس طرح ایک مظلوم مسلمان کی مدد کرنا واجب ہے اسی طرح اس مظلوم کافر (ذمی) کی مدد کرنا بھی واجب ہے جو اسلامی ریاست کا تابعدار شہری بن کر رہتا ہو اور جزیہ (ٹیکس) ادا کرتا ہے" پھر مدد بھی عام ہے اگر لسانی مدد کی ضرورت ہو تو زبان و قول سے مدد کی

جائے اور فعلی مدد کی ضرورت ہو تو فعل عمل کے ذریعہ مدد کی جائے۔

"میثرہ" اس زین پوش کو کہتے ہیں جس میں روئی بھری ہوئی ہوتی ہے اور اسے گھوڑے وغیرہ کی سواری کی زین پر ڈال کر اس پر بیٹھتے ہیں اسے "نمدزین" بھی کہتے ہیں دنیاداروں کی عادت ہے کہ وہ اس زین پوش کو ازراہ تکبر و رعونت حریر و دیباج وغیرہ سے بناتے ہیں۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ زین پوش حریر کا ہو تو خواہ وہ کسی بھی رنگ کا ہو حرام ہے۔ ہاں اگرچہ حریر کا نہ ہو مگر سرخ رنگ کا ہو تو اس کا استعمال مکروہ ہے۔ اگر سرخ رنگ کا نہ ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

"قسی" ایک کپڑے کا نام تھا جو ریشم اور کتان سے بنا جاتا تھا اور "قس" کی طرف منسوب تھا جو مصر کے ایک علاقہ کا نام ہے۔ حدیث میں چاندی کے برتن استعمال کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس طرح سونے کے برتن کا استعمال بھی ممنوع ہے بلکہ سونے کے برتن استعمال کرنا چاندی کے برتن استعمال کرنے سے بھی زیادہ گناہ ہے اس حدیث میں جن چیزوں سے منع کیا جارہا ہے ان کا تعلق صرف مردوں سے ہے عورتوں سے نہیں ہے ہاں چاندی سونے کے برتن کے استعمال کی ممانعت مرد وعورت دونوں کے لئے ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ "آخرت میں اسے چاندی کے برتن میں پینا نصیب نہ ہوگا" کی صحیح وضاحت یہ ہے کہ جس شخص نے دنیا میں چاندی کا برتن استعمال کیا اُسے آخرت میں اس وقت تک کہ اس کے عذاب کی مدت ختم نہ ہو جائے۔ چاندی کے برتن میں پینا نصیب نہ ہوگا۔ یا وقوف اور حساب کے وقت اسے چاندی کے برتن میں پینا نصیب نہ ہوگا یا پھر یہ کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ کچھ عرصہ تک اس سے محروم رہے گا پھر بعد میں یہ پابندی اس سے ختم کردی جائے گی، یہی مراد اس حدیث کی ہے جس میں (مردوں کے لئے) ریشم پہننے کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ من لبسه في الدنيا لم يلبسه في الاخرة (یعنی جس شخص نے دنیا میں ریشم پہنا اسے آخرت میں ریشم پہننا نصیب نہیں ہوگا) اسی طرح اس حدیث کی بھی یہی وضاحت ہے جس میں شراب کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ من شربها في الدنيا لم يشربها في الاخرة (یعنی جس نے دنیا میں شراب پی اسے آخرت میں شراب پینا نصیب نہ ہوگا۔

عیادت کا ثمرہ

⑤ وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُسْلِمَ اِذَا عَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ يَزَلْ فِيْ خُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَرْجِعَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ثوبانؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مسلمان جو اپنے کسی (بیمار) مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو (گویا) وہ بہشت کی میوہ خوری میں (مصروف) رہتا ہے یہاں تک کہ وہ (عیادت سے) واپس نہ آجائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے کسی بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کے لئے جاتا ہے تو جب تک کہ بیمار کی عیادت اور مزاج پرسی سے فارغ ہو کر نہ آجائے برابر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں سے فیضیاب ہوتا رہتا ہے جس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس انسانی اور اخلاقی ہمدردی و مروت کی بناء پر بہشت اور بہشت کی میوہ خوری کا مستحق ہو جاتا ہے۔

عیادت کی اہمیت

⑥ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِيْ قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ اَعُوْدُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ عَبْدِيْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ عُدْتَّهٗ لَوَجَدْتَّنِيْ عِنْدَهٗ يَا ابْنَ اٰدَمَ اِسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِيْ قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ اُطْعِمُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِيْ فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ اَطْعَمْتَهٗ لَوَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِيْ يَا ابْنَ اٰدَمَ اِسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِيْ قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ أَسْقِيْكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِيْ فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهٖ اَمَا

عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْسَقَيْتَهٗ وَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِيْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ" قیامت کے روز (بندہ سے) فرمائے گا اے ابن آدم! میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہیں کی"؟ بندہ عرض کرے گا کہ "اے میرے رب! میں تیری عیادت کس طرح کرتا کہ تو تو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے (اور بیماری سے پاک ہے)" اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "کیا تجھے معلوم نہیں ہوا تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے؟ اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی تھی، کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس بیمار بندہ کی عیادت کرتا تو مجھے (یعنی میری رضا) اس کے پاس پاتا۔ (پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا" اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا"؟ بندہ عرض کرے گا کہ "اے میرے رب! میں تجھے کھانا کس طرح کھلاتا تو تو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے (اور کسی چیز کا محتاج نہیں ہے)" اللہ تعالیٰ فرمائے گا "کیا تجھے یاد نہیں کہ تجھ سے میرے فلاں بندہ نے کھانا مانگا تھا اور تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا تھا۔ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اسے (یعنی اس کے ثواب کو) میرے پاس پاتا" (پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا) اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا؟" بندہ عرض کرے گا" کہ اے میرے پروردگار! میں تجھے پانی کس طرح پلاتا؟ تو تو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے (تجھے نہ پانی کی ضرورت اور نہ کسی اور چیز کی حاجت)" اللہ تعالیٰ فرمائے گا "تجھ سے میرے فلاں بندہ نے پانی مانگا اور تو نے اسے پانی نہیں پلایا، کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اسے پانی پلاتا تو اسے (یعنی اس کے ثواب کو) میرے پاس پاتا۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث میں ذکر کی گئی تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت یعنی عیادت کرنے اور بعد کی دونوں صورتوں کا یہ فرق ملاحظہ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ مریض کی عیادت کے بارہ میں تو یہ فرمائے گا کہ اگر تو مریض کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ جب کہ کھانا کھلانے اور پانی پلانے کے بارہ میں فرمائے گا کہ اگر تو کھانا کھلاتا یا یہ کہ اگر تو پانی پلاتا تو اس کے ثواب کو میرے پاس پاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مریض کی عیادت کرنا بھوکے کو کھانا کھلانے اور پیاسے کو پانی پلانے سے افضل ہے۔

اپنے سے کمتر اور ادنیٰ مریض کی بھی عیادت کرنی چاہئے

(۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰى اَعْرَابِيٍّ يَعُوْدُهٗ وَكَانَ اِذَا دَخَلَ عَلٰى مَرِيْضٍ يَعُوْدُهٗ قَالَ لَا بَأْسَ طُهُوْرٌ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ فَقَالَ لَهٗ لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ قَالَ كَلَّا بَلْ حُمّٰى تَفُوْرُ عَلٰى شَيْخٍ كَبِيْرٍ تَزِيْرُهُ الْقُبُوْرَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَعَمْ اِذًا (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ (ایک مرتبہ) ایک اعرابی (گنوار) کے پاس اس کی بیماری کا حال پوچھنے کے لئے تشریف لے گئے آنحضرت ﷺ (کا طریقہ یہ تھا کہ) جب آپ کسی کے پاس عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تو اس سے فرماتے کہ "کوئی ڈر نہیں (یعنی بیماری سے غم نہ کھاؤ اس لئے کہ) یہ بیماری (گناہوں سے) پاک کرنے والی ہے اگر اللہ چاہے" چنانچہ آپ ﷺ نے (اس وقت) اس دہقانی سے بھی یہی فرمایا کہ "کوئی ڈر نہیں، یہ بیماری (گناہوں سے) پاک کرنے والی ہے اگر اللہ چاہے" دہقانی نے کہا کہ "ہرگز نہیں، بلکہ یہ بخار ہے جو بڑے بوڑھے پر چڑھ آیا ہے اور اسے قبر کی زیارت کرا دے گا (یعنی موت کی آغوش میں پھینک دے گا۔) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "اچھا (اگر تم یہی سمجھتے ہو تو) یوں ہی سہی۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ حدیث آنحضرت ﷺ کے کمال تواضع اور مساوات عمل کی مظہر ہے کہ آپ ایک دہقانی کی عیادت کے لئے اس کے پاس تشریف لے گئے، گویا آپ ﷺ نے اپنے اس عمل مبارک سے اُمت کے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ صرف انہیں لوگوں کی مزاج پرسی کے لئے نہیں جانا چاہئے جو اپنے سے اونچے یا ہم مرتبہ ہوں بلکہ ان لوگوں کی بھی عیادت کرنی چاہئے جو کسی بھی حیثیت سے اپنے سے کم تر اور ادنیٰ درجے کے ہوں۔

"اچھا (اگر تم یہی سمجھتے ہو تو) یوں ہی سہی یعنی آنحضرت ﷺ نے اس دیہاتی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ میں تو تمہارے سامنے بیماری کا ثواب بیان کر رہا ہوں مگر تم اس نعمت کا انکار کر رہے ہو اگر تمہارا خیال یہی ہے تو پھر جان لو کہ اس طرح ہوگا جس طرح تم کہہ رہے ہو کیونکہ کفران نعمت کرنے والے کی سزا ہی یہ ہے کہ وہ اس نعمت سے محروم ہو جائے۔

دیہاتی کے اس رویہ اور اس کی ان بات کی بناء پر احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ کافر ہو مگر علماء نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ وہ مسلمان تھا مگر چونکہ بیوقوف اور ناسمجھ اجڈ گنوار تھا اسی لئے بیماری کی تکلیف اور شدت درد سے بیتاب و مضطرب ہو کر اس قسم کے الفاظ اپنی زبان سے نکال بیٹھا۔

بیمار کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعاء شفاء

(۸) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَكٰى مِنَّا اِنْسَانٌ مَسَحَهُ بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ قَالَ اَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُكَ شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا (متفق علیہ)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (کا یہ طریقہ تھا کہ) جب ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا آپ ﷺ اس پر داہنا ہاتھ پھیرتے اور یہ (دعا) فرماتے۔ اے لوگوں کے پروردگار! بیماری دور کر دے اور شفا دے تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیرے سوا کسی کی شفاء ایسی نہیں جو بیماری کو دور کر دے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

(۹) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ اِذَا اشْتَكَى الْاِنْسَانُ الشَّيْءَ مِنْهُ اَوْ كَانَتْ بِهٖ قُرْحَةٌ اَوْ جُرْحٌ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاِصْبَعِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ تُرْبَةُ اَرْضِنَا بِرِيْقَةِ بَعْضِنَا لِيُشْفٰى سَقِيْمُنَا بِاِذْنِ رَبِّنَا (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب کوئی شخص اپنے بدن کے کسی حصہ (کے درد) کی شکایت کرتا، یا (اس کے جسم کے کسی عضو پر) پھوڑا یا زخم ہوتا تو نبی کریم ﷺ اپنی انگلی سے اشارہ کر کے یہ دعا فرماتے خدا کے نام سے میں برکت حاصل کرتا ہوں، یہ مٹی ہمارے بعض آدمیوں کے لعاب دہن سے آلودہ ہے (یہ ہم اس لئے کہتے ہیں تاکہ) پروردگار کے حکم سے ہمارا بیمار تندرست ہو جائے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: منقول ہے کہ اس بارہ میں آنحضرت ﷺ کا یہ طریقہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ اپنا لعاب مبارک اپنی انگلی پر لگاتے اور اسے مٹی پر رکھتے پھر اس خاک آلودہ انگلی کو درد کی جگہ رکھ کر اس عضو پر پھیرتے جاتے تھے اور مذکورہ بالا دعا یعنی بسم اللہ الخ پڑھتے رہتے۔

پھوڑوں اور زخموں کے علاج کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کا یہ طریقہ اور یہ دعا در حقیقت رموز الٰہی میں سے ایک رمز ہے جسے آنحضرت ﷺ ہی جانتے تھے ہماری عقلیں اس رمز کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ تاہم قاضی بیضاویؒ نے از راہ احتمال کے لکھا ہے کہ طبی نقطہ نظر سے یہ بات ثابت ہے کہ تبدیلی مزاج کے سلسلہ میں لعاب دہن بہت موثر ہوتا ہے اسی طرح مزاج کو اپنی حالت پر برقرار رکھنے کے لئے وطن کی مٹی بہت تاثیر رکھتی ہے یہاں تک کہ حکماء لکھتے ہیں کہ مسافر کو چاہئے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے وطن کی کچھ خاک ضرور رکھے اور تھوڑی سی خاک پانی کے برتن میں ڈال دے اور اسی برتن سے دوران سفر پیتا رہے تاکہ اس کی وجہ سے مزاج کی تبدیلی سے محفوظ رہے۔

لہٰذا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اسی بناء پر یہ طریقہ اختیار فرماتے ہوں۔ نیز دوسرے شارحین نے بھی اس کی توجیہات بیان کی ہیں مگر وہ سب احتمال ہی کے درجہ میں ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ خدا کا بھید ہے جس کی حقیقت تک ہماری عقلوں کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

اشرفؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث رقیہ یعنی منتر کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہے بشرطیکہ اس منتر میں کفر کی آمیزش نہ ہو جیسے سحر یا کلمہ کفر و شرک وغیرہ۔ نیز اس سلسلہ میں مسئلہ یہ ہے کہ منتر خواہ کسی بھی زبان کا ہو، ہندی و اردو کا ہو یا عربی و فارسی اور ترکی وغیرہ کا، اس کا پڑھنا اس وقت تک درست نہیں ہے تاوقتیکہ اس کے معنی معلوم نہ ہو جائیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں الفاظ کفر ہوں۔ ہاں حدیث میں

ایک منتر بسم اللہ شجۃ قرنیۃ الخ بچھو کے کاٹے کے لئے منقول ہے اگرچہ اس کے معنی معلوم نہیں ہیں مگر اس کا پڑھنا جائز ہے۔

بیماری میں آیات پڑھ کر دم کرنا چاہئے

⑮ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَكٰى نَفَثَ عَلٰى نَفْسِهٖ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَمَسَحَ عَنْهُ بِيَدِهٖ فَلَمَّا اشْتَكٰى وَجَعَهُ الَّذِيْ تُوُفِّيَ فِيْهِ كُنْتُ اَنْفُثُ عَلَيْهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ الَّتِيْ كَانَ يَنْفُثُ وَ أَمْسَحُ بِيَدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَتْ كَانَ اِذَا مَرِضَ اَحَدٌ مِنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ نَفَثَ عَلَيْهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ۔

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بیمار ہوتے تو معوذات پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے اور اپنا ہاتھ بدن پر (جہاں تک پہنچتا) پھیرتے، چنانچہ جب آپ ﷺ اس بیماری میں مبتلا تھے جس میں آپ ﷺ نے وفات پائی تو میں معوذات پڑھ کر آپ ﷺ پر دم کرتی تھی جیسا کہ آپ ﷺ خود معوذات پڑھ کر اپنے اوپر دم فرمایا کرتے تھے، نیز میں آپ کا ہاتھ آپ ﷺ کے بدن پر پھیرا کرتی تھی۔ اس طرح کہ میں معوذات پڑھ کر آنحضرت ﷺ کے ہاتھوں پر دم کرتی تھی اور پھر آپ ﷺ کے دونوں ہاتھ آپ ﷺ کے بدن مبارک پر پھیرتی۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

مسلم کی ایک دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ سے یہ منقول ہے کہ "جب گھر والوں میں سے کوئی بیمار ہوتا تو آنحضرت ﷺ معوذات پڑھ کر اس پر دم فرمایا کرتے تھے۔

تشریح: معوذات سے مراد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کی سورتیں ہیں۔ چنانچہ حدیث میں معوذات بصیغہ جمع آیتوں کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے۔ یا یہ کہ چونکہ اقل جمع (یعنی جمع کا سب سے کم درجہ) دو ہیں اس لئے ان دونوں سورتوں کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "معوذات" سے مراد تین سورتیں یعنی قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس، اور قل ھو اللہ ہیں اور ان تینوں کو معوذات کا نام تغلیبا دیا گیا ہے۔ یہی بات زیادہ معتمد ہے بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ "معوذات" میں ان تینوں سورتوں کے علاوہ "قل یا ایھا الکافرون" بھی داخل ہے۔ واللہ اعلم۔

مسلم کی دوسری روایت میں "ہاتھ پھیرنے" کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا اس موقع پر جہاں یہ احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ دم کرنے کے ساتھ ہاتھ بھی پھیرتے ہوں گے۔ لیکن یہاں اس کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ "دم کرنے" سے ہاتھ کا پھیرنا بھی خود بخود مفہوم ہو جاتا ہے وہیں یہ بھی احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ جس طرح دم کرنے کے ساتھ ہاتھ پھیرتے تھے اس طرح کسی کسی موقعہ پر صرف دم کرنے ہی پر اکتفاء کرتے ہوں گے اور ہاتھ نہ پھیرتے ہوں گے۔ لیکن صحیح اور قریب از حقیقت وضاحت وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے اور اولیٰ بھی یہی ہے کہ دم بھی کیا جائے اور ہاتھ بھی پھیرا جائے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کلام اللہ کی آیتیں پڑھ کر بیمار پر دم کرنا سُنّت ہے۔

درد ختم کرنے کی دعا

⑪ وَعَنْ عُثْمَانَ ابْنِ اَبِی الْعَاصِ اَنَّهٗ شَكٰى اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعًا يَجِدُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَعْ يَدَكَ عَلَى الَّذِيْ يَأْلَمُ مِنْ جَسَدِكَ وَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ ثَلَاثًا وَقُلْ سَبْعَ مَرَّاتٍ اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَ قُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَ اُحَاذِرُ قَالَ فَفَعَلْتُ فَاَذْهَبَ اللّٰهُ مَا كَانَ بِيْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عثمانؓ ابن ابی العاص کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ سے درد کی شکایت کی جسے وہ اپنے بدن (کے کسی حصہ) میں محسوس کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "تمہارے بدن کے جس حصہ میں درد ہے وہاں اپنا

ہاتھ رکھ کر (پہلے) تین مرتبہ بسم اللہ پڑھو اور (پھر) سات مرتبہ یہ پڑھو۔ میں اللہ سے اس کی عزت اور اس کی قدرت کے ذریعہ اس برائی (یعنی درد) سے پناہ مانگتا ہوں جسے میں (اس وقت) محسوس کر رہا ہوں اور (آئندہ اس کی زیادتی سے) ڈرتا ہوں۔

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق) میں نے ایسا ہی کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری تکلیف دور کر دی۔" (مسلم)

آنحضرت ﷺ کے علالت اور حضرت جبریل علیہ السلام کی دعا

⑫ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ جِبْرِیْلَ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اشْتَکَیْتَ فَقَالَ نَعَمْ قَالَ بِسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْكَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ یُؤْذِیْكَ مِنْ شَرِّ کُلِّ نَفْسٍ اَوْعَیْنِ حَاسِدٍ اَللّٰہُ یَشْفِیْكَ بِسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْكَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور (مزاج پرسی کے طور پر) کہا کہ "اے محمد (ﷺ) کیا آپ علیل ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں"! حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا خدا کے نام پر آپ ﷺ پر افسوں پڑھتا ہوں۔ ہر اس چیز سے جو آپ ﷺ کو اذیت پہنچائے اور ہر شخص کی برائی یا پر حاسد آنکھ سے اللہ آپ ﷺ کو شفاء دے خدا کے نام سے آپ ﷺ پر افسوں پڑھتا ہوں۔" (مسلم)

برائی و حادثہ سے خدا کی پناہ میں دینا

⑬ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُعَوِّذُ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ اُعِیْذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّةِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّةٍ وَیَقُوْلُ اِنَّ اَبَاکُمَا یُعَوِّذُ بِهَا اِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحَاقَ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ اَکْثَرِ نُسَخِ الْمَصَابِیْحِ بِهِمَا عَلٰی لَفْظِ التَّثْنِیَةِ

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ حضرت حسن و حضرت حسینؓ کو ان الفاظ کے ذریعہ (خدا کی) پناہ میں دیتے تھے۔ میں تمہیں کلمات اللہ تعالیٰ کے ذریعہ جو کامل ہیں، ہر شیطان کی برائی، ہر ہلاک کر دینے والے زہریلے جانور اور ہر نظر لگانے والی آنکھ سے (خدا کی) پناہ میں دیتا ہوں اور آپ ﷺ یہ (بھی) فرماتے تھے کہ تمہارے باپ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) ان کلمات کے ذریعہ اپنے صاحبزادہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کو خدا کی پناہ میں دیتے تھے۔

مصابیح کے اکثر نسخوں میں (لفظ "بہا" کی بجائے) "بہما" تثنیہ کی ضمیر کے ساتھ ہے۔" (بخاری)

تشریح: کلمات اللہ تعالیٰ سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ کی معلومات ہیں یا اس کے اسماء پاک اسی طرح اس کی کتابیں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔

"ہر شیطان کی برائی سے" کا مطلب ہے "ہر سرکش اور حد سے بڑھ جانے والے کی برائی سے خواہ وہ آدمیوں میں سے ہو خواہ جنات میں سے یا جانوروں سے۔"

"ہامہ" اس زہریلے جانور کو کہتے ہیں جس کے کاٹے سے آدمی ہلاک ہو جائے جیسے سانپ وغیرہ۔ جس زہریلے جانور کے کاٹے سے آدمی مرتا نہیں اسے "سامہ" کہتے ہیں جیسے بچھو، زنبور (بھڑ) وغیرہ۔ نیز بعض مواقع پر حشرات الارض ہوام (ہامہ کی جمع) کہتے ہیں۔

روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہاں جو حدیث نقل کی گئی ہے اس کے الفاظ اِنَّ اَبَاکُمَا کَانَ یُعَوِّذُ بِهَا میں لفظ "بہا" ضمیر مفرد کے ساتھ نقل کیا گیا ہے جب کہ مصابیح کے اکثر نسخوں میں اس موقع پر "بہما" ضمیر تثنیہ کے ساتھ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس ضمیر تثنیہ حدیث کے دو جملوں مِنْ شَرِّ کُلِّ شَیْطَانٍ اور مِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّةٍ کی طرف راجع ہوگی۔ لیکن اس میں چونکہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے اس لئے علامہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ جن نسخوں میں "بہما" تثنیہ کی ضمیر کے ساتھ لکھا گیا ہے وہاں کاتب سے سہو ہو گیا ہے صحیح

"بہا" یعنی مفرد کی ضمیر کے ساتھ ہی ہے۔

تکلیف و مصیبت اللہ کی رحمت ہے

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّصِبْ مِنْهُ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ جس شخص کو بھلائی پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے، وہ (اس بھلائی کے حصول کے لئے) مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "مصیبت" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسے دل قبول اور پسند نہ کرے، لہٰذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مصیبت خواہ وہ تکلیف و بیماری کی صورت میں ہو یا حادثہ و صدمہ کی شکل میں، ہمیشہ خدا کے قہر اور عذاب ہی کے طور پر نہیں آتی بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس بندہ پر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کا سایہ کرنا چاہتا ہے اور اسے خیر و بھلائی کے راستہ پر ڈالنا چاہتا ہے تو اسے کسی مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ اس کے گناہ صاف ہو جاتے ہیں بلکہ اس کے قلب و دماغ کو مصیبت کی سختی مجلی و مصفا کر کے خیر و بھلائی کے نور کو اپنے اندر ضیا بار کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی بندہ مصیبت و تکلیف پر صبر کرے اور راضی برضا رہے تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ یہ مصیبت اس کے لئے اپنے دامن میں خدا کی رضا اور رحمت لے کر آئی ہے۔

ہاں اگر کوئی بندہ کسی مصیبت پر صبر و ضبط کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ کر جزع فزع کرنے لگے اور ناخوش و خفا ہونے لگے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ یہ مصیبت اس کے حق میں رحمت نہیں بلکہ عذاب خداوندی ہے۔

رنج و غم کا پہنچنا گناہوں کو دور کرتا ہے

⑮ وَعَنْهُ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا یُصِیْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا اَذًى وَلَا غَمٍّ حَتّٰى الشَّوْكَةِ یُشَاكُهَا اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَایَاهُ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مسلمانوں کو جب کوئی رنج، دکھ فکر، حزن ایذا اور غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ کانٹا چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہ دور کر دیتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: الفاظ "ہم و حزن" وغیرہ کے معنی قریب قریب یکساں ہیں صرف ہم اور غم میں فرق یہ ہے کہ ہم آئندہ واقع ہونے والے معاملہ سے تعلق رکھتا ہے یعنی اگر کوئی ایسا مشکل امر پیش آنے والا ہو جس کے کرنے یا نہ کرنے سے رنج و ملال پہنچے تو وہاں ہم استعمال کیا جاتا ہے اور غم کا تعلق گذرے ہوئے واقع سے ہوتا ہے۔

بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان کو کسی بھی نوعیت کا یا کسی بھی طرح کا کوئی رنج و ملال اور غم و مصیبت پہنچے تو وہ اس کے صغیرہ گناہوں کے دور ہونے کا ذریعہ ہے۔

آنحضرت ﷺ پر تکلیف و بیماری کی سختی و زیادتی

⑯ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ یُوْعَكُ فَمَسَسْتُهٗ بِیَدِیْ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ لَتُوْعَكُ وَعْكًا شَدِیْدًا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَجَلْ اِنِّیْ اُوْعَكُ كَمَا یُوْعَكُ رَجُلَانِ مِنْكُمْ قَالَ فَقُلْتُ ذٰلِكَ لِاَنَّ لَكَ اَجْرَیْنِ فَقَالَ اَجَلْ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یُصِیْبُهٗ اَذًى مِنْ مَرَضٍ فَمَا سِوَاهُ اِلَّا حَطَّ اللّٰهُ بِهٖ سَیِّئَاتِهٖ كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میں نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اس وقت آپ ﷺ کو بخار تھا میں نے آپ ﷺ پر اپنا ہاتھ پھیر کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) کو بہت سخت بخار ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں! مجھے تمہارے دو آدمیوں کے برابر بخار چڑھتا ہے!" حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے عرض کیا" یہ اس وجہ سے ہوگا کہ آپ کو دوگنا ثواب ملے"؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں!" اور پھر فرمایا جس مسلمان کو بیماری کی وجہ سے یا اس کے علاوہ کسی اور وجہ سے تکلیف پہنچتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہ (اسی طرح) دور کر دیتا ہے جیسے درخت اپنے پتے جھاڑتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۱۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَأَيْتُ اَحَدًا الْوَجَعُ عَلَيْهِ اَشَدُّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس کی بیماری آنحضرت ﷺ کی بیماری سے زیادہ سخت و شدید ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

موت کی سختی بلندی درجات کی علامت ہے

(۱۸) وَعَنْهَا قَالَتْ مَاتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ حَاقِنَتِيْ وَ ذَاقِنَتِيْ فَلَا اَكْرَهُ شِدَّةَ الْمَوْتِ لِاَحَدٍ اَبَدًا بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرے سینہ اور گردن کے درمیان وفات پائی، میں نبی کریم ﷺ کے بعد کسی شخص کی موت کی سختی کو کبھی برا نہیں سمجھتی۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ کے ارشاد کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپ ﷺ میرا سہارا لئے ہوئے تھے اور آپ ﷺ کا سر مبارک میرے سینہ اور گردن کے بیچ رکھا ہوا تھا لہٰذا میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس وقت آنحضرت ﷺ حالت نزع کی کتنی شدید تکلیف میں مبتلا تھے اور آپ ﷺ کی موت کتنی سخت تھی!؟

حدیث کے دوسرے جزو فلا اکرہ شدۃ الموت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو میں یہ سمجھتی تھی کہ حالت نزع کی تکلیف اور موت کی سختی گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن جب میں نے آنحضرت ﷺ کی موت دیکھی تو مجھے معلوم ہوا کہ موت کی سختی گناہوں کی کثرت اور خاتمہ بالخیر نہ ہونے کی علامت نہیں ہے بلکہ موت کی سختی اور سکرات الموت کی شدت بلندی درجات کے لئے ہوتی ہے۔

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ موت کی آسانی اور سکرات الموت میں تخفیف بزرگی اور فضیلت کی بات نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا آنحضرت ﷺ کو یہ فضیلت بطریق اولیٰ حاصل ہوتی۔

مؤمن اور منافق کی زندگی کی مثال

(۱۹) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْخَامَةِ مِنَ الزَّرْعِ تُفَيِّئُهَا الرِّيَاحُ تَصْرَعُهَا مَرَّةً وَتَعْدِلُهَا اُخْرٰى حَتّٰى يَاْتِيَهُ اَجَلُهُ وَ مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ الْاَرْزَةِ الْمُجْذِيَةِ الَّتِيْ لَا يُصِيْبُهَا شَيْءٌ حَتّٰى يَكُوْنَ انْجِعَافُهَا مَرَّةً وَاحِدَةً (متفق علیہ)

"اور حضرت کعب ابن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمن کی مثال کھیت کی تروتازہ اور نرم شاخ کی سی ہے کہ جسے ہوائیں جھکا دیتی ہیں، کبھی اسے گرا دیتی ہیں اور کبھی سیدھا کر دیتی ہیں یہاں تک کہ اس کا وقت پورا ہو جاتا ہے اور منافق کی مثال صنوبر کے درخت کی سی ہے جو جما کھڑا رہتا ہے اسے کوئی جھٹکا نہیں لگتا (یعنی نہ تو وہ ہوا کے دباؤ سے گرتا ہے اور نہ جھکتا ہے) یہاں تک کہ وہ دفعۃً زمین پر آگرتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مؤمن کی مثال تو کھیتی کی تروتازہ اور نرم شاخ سے دی جارہی ہے کہ جس طرح ہواؤں کے تھپیڑے اس شاخ پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں بایں طور کہ کبھی وہ شاخ کو گرادیتے ہیں کبھی سیدھا کردیتے ہیں۔ مگر وہ شاخ ہواؤں کے سخت و تند تھپیڑے کھا کھا کر اپنی جگہ اپنے وقت کے آخری لمحہ تک کھڑی رہتی ہے۔ اسی طرح مؤمن کا حال بھی یہی ہے کبھی تو اسے مصائب و آلام اور ضعف و بیماری کے سخت تھپیڑے گرادیتے ہیں، کبھی صحت و تندرستی اور خوشی و مسرت کے جانفزا جھونکے ان کی زندگی میں بشاشت وانبساط کی زندگی پیدا کردیتے ہیں اس طرح وہ اپنی زندگی کے دن پورے کرتا رہتا ہے۔

منافق کی مثال صنوبر کے درخت سے دی گئی ہے کہ جس طرح صنوبر کا درخت بظاہر ایک جگہ کھڑا رہتا ہے اور اس پر ہوا کا دباؤ اثر انداز نہیں ہوتا مگر جب اس کا وقت آتا ہے تو وہ یکبارگی زمین پر آرہتا ہے اسی طرح منافق کا حال ہے کہ وہ دنیاوی زندگی میں بظاہر خوش و خرم اور ہشاش بشاش نظر آتا ہے نہ اس پر مصائب و آلام کی بارش ہوتی ہے اور نہ بیماری و ضعف کے تھپیڑے اس پر اثر انداز ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ یکبارگی بغیر کسی بیماری و ضعف کے موت کی وادی میں گرجاتا ہے۔

گویا حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ مؤمن و مسلمان کی زندگی مصائب و آلام اور تکلیف و پریشانی میں گزرتی ہے کبھی وہ بیماری و ضعف کے جال میں پھنسا رہتا ہے کبھی اسے مال و زر کی کمی اپنی لپیٹ میں لیتی ہے کبھی دوسرے دنیاوی حوادث و آلام اس کی روشن زندگی پر سیاہ بادل بن کر چھاجاتے ہیں مگر مؤمن مسلمان اسی حالت میں جیتا جاتا ہے اور یہ تمام چیزیں اس کے حق میں اخروی سعادت و خوش بختی کی علامت قرار دی جاتی ہیں بشرطیکہ صبر و رضا اور شکر کا دامن کسی بھی مرحلہ پر ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

اس کے مقابلہ پر منافق و فاسق کی زندگی ہوتی ہے جس پر نہ تو زیادہ ترغم و آلام کا سایہ ہوتا ہے نہ بیماری و پریشانی کے سیاہ بادل اور نہ دوسری دنیاوی ذلت و ناکامرانی اور مصیبت و پریشانی کا چکر، بلکہ وہ بظاہر تندرست و توانا اور خوش و خرم رہتا ہے اس طرح نہ اسے وہ درجہ ملتا ہے جو مصائب و پریشانی کے کفارہ کے طور پر مسلمان کو حاصل ہوتا ہے اور نہ اسے وہ ثواب و سعادت میسر آتی ہے جو بیماری و پریشانی میں مبتلا ہوکر مؤمن و مسلمان کی اخروی کامیابی و فلاح کا ضامن بنتی ہے۔

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الزَّرْعِ لَا تَزَالُ الرِّیْحُ تُمِیْلُهٗ وَلَا یَزَالُ الْمُؤْمِنُ یُصِیْبُهُ الْبَلَاءُ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ شَجَرَةِ الْاَرْزَةِ لَا تَهْتَزُّ حَتّٰى تُسْتَحْصَدَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمن کی مثال کھیتی کی سی ہے کہ (جس طرح) ہوائیں اسے ہمیشہ جھکائے رہتی ہے (اسی طرح) مؤمن کو ہمیشہ بلائیں اپنی لپیٹ میں لئے رہتی ہیں اور منافق کی مثال صنوبر کے درخت کی سی ہے۔ کہ اگرچہ وہ ہواؤں کے دباؤ سے ہلتا بھی نہیں مگر (آخر کار جڑ ہی سے) اکھڑ جاتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ منافق دنیاوی زندگی میں مصائب و تکلیف سے زیادہ دوچار نہیں ہوتا اور نہ بلاء آلام اس پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں تاکہ یہاں کی مصیبتوں کے بدلہ میں اس کے لئے اخروی زندگی کا عذاب ہلکا نہ ہوجائے جب کہ مسلمان کا دنیا میں مصائب و آلام میں مبتلا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اسے آخرت میں بڑی پر سکون اور پر مسرت زندگی حاصل ہوگی۔

بیماری کو برا نہ کہو

(۲۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اُمِّ السَّائِبِ فَقَالَ مَالَكِ تُزَفْزِفِیْنَ قَالَتِ الْحُمّٰى لَا بَارَكَ اللّٰهُ فِیْهَا فَقَالَ لَا تَسُبِّی الْحُمّٰى فَاِنَّهَا تُذْهِبُ خَطَایَا بَنِیْ اٰدَمَ كَمَا یُذْهِبُ الْكِیْرُ خَبَثَ الْحَدِیْدِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ حضرت اُمّ صائبؓ کے پاس (جو تپ و لرزہ میں مبتلا تھیں) تشریف لائے اور (ان کی حالت دیکھ کر) فرمایا کہ "یہ تمہیں کیا ہوا جو تم کانپ رہی ہو؟" انہوں نے عرض کیا کہ "بخار ہے اللہ اس میں برکت نہ دے"

آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بخار کو برا مت کہو کیونکہ بخار بنی آدم کے گناہوں کو اسی طرح دور کرتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کو صاف کر دیتی ہے۔" (مسلم)

تشریح: ایک روایت میں منقول ہے کہ "اللہ تعالیٰ مؤمن کی تمام خطائیں اس کے ایک رات کے بخار کی وجہ سے دور فرما دیتا ہے" اسی طرح ابوداؤد کی ایک روایت میں منقول ہے کہ "ایک رات کا بخار ایک برس کے گناہ دور کر دیتا ہے۔

زمانہ بیماری کے فوت شدہ اوراد و نوافل کا ثواب ملتا ہے

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ اَوْسَافَرَ کُتِبَ لَہٗ بِمِثْلِ مَا کَانَ یَعْمَلُ مُقِیْمًا صَحِیْحًا (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوموسیٰ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر میں جاتا ہے (اور اس کی بیماری یا سفر کی وجہ سے اس کے اوراد و نوافل فوت ہو جاتے ہیں) تو (اس کے نامۂ اعمال میں اتنے عمل لکھ دیئے جاتے ہیں جو وہ حالت قیام اور زمانہ تندرستی میں کیا کرتا تھا۔" (بخاری)

طاعون میں مرنے والے کی فضیلت

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الطَّاعُوْنُ شَھَادَۃُ کُلِّ مُسْلِمٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت انس راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "طاعون (میں مرنا) ہر مسلمان کے لئے شہادت ہے۔" (بخاری)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس علاقہ میں جہاں طاعون کی بیماری پھیل جاتی ہے جو مسلمان صبر و برداشت کے دامن کو نہیں چھوڑتا اور بیماری سے ڈر کر کسی دوسری جگہ بھاگتا نہیں بلکہ اللہ پر بھروسہ کر کے وہیں پڑا رہتا ہے اور اگر وہ طاعون میں مبتلا ہو کر مر جاتا ہے تو اسے شہید کے اجر سے نوازا جاتا ہے۔

طاعون ایک عام بیماری اور وباء کا نام ہے جس علاقہ میں یہ بیماری پیدا ہوتی ہے وہاں کی آب و ہوا، عام مزاج اور انسانوں کے جسم تمام ہی چیزیں اس بیماری کے جراثیم اور اس کے فساد سے متأثر ہو جاتی ہیں۔

بعض لوگوں نے کہا کہ طاعون اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں بدن کے نرم حصوں پر زخم ہو جاتے ہیں۔ جیسے بغل وغیرہ اور ان زخموں کے گرد سیاہی، سبزی یا سرخی ہوتی ہے۔

شہید کا ثواب پانے والے

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الشُّھَدَاءُ خَمْسَۃٌ اَلْمَطْعُوْنُ وَالْمَبْطُوْنُ وَالْغَرِیْقُ وَصَاحِبُ الْھَدْمِ وَالشَّھِیْدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا شہداء پانچ ہیں ① طاعون زدہ ② پیٹ کی بیماری (یعنی دست اور استسقاء میں مرنے والا ③ پانی میں بے اختیار ڈوب کر مر جانے والا ④ دیوار یا چھت کے نیچے دب کر مر جانے والا۔ ⑤ خدا کی راہ میں شہید ہونے والا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: پانی میں ڈوب کر مر جانے والے۔ اس شخص کو شہادت کا ثواب ملے گا جو بے اختیار و بلا قصد پانی میں ڈوب گیا ہو یعنی بارادہ خود پانی میں نہ ڈوبے۔ اس طرح اگر دریا میں کشتی ڈوب جائے یا ٹوٹ جائے تو سب لوگ یا کچھ لوگ دریا میں ڈوب جائیں تو ان میں سے اسی

ڈوبنے والے کو شہادت کا ثواب ملے گا جو کسی گناہ و معصیت کے ارادہ سے کشتی میں نہ بیٹھا ہو۔

اس حدیث میں پانچ قسم کے شہیدوں کا تذکرہ کیا گیا۔ لہٰذا اس سلسلہ میں یہ بات جان لینی چاہئے کہ حقیقی شہید صرف وہی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان قربان کر دے۔ شہیدوں کی دیگر قسمیں حکمی ہیں یعنی وہ مرنے والے حقیقی شہید تو نہیں ہوتے ہاں اس کی بے کسی و بے بسی کی موت کی بناء پر انہیں شہادت کا ثواب ملتا ہے۔

اس موقع پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہاں اس حدیث میں چار قسم کے حکمی شہیدوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ حکمی شہیدوں کی اور بھی، بہت زیادہ قسمیں جن کے بارے میں دیگر مشہور احادیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ بعض علماء مثلاً سیوطیؒ وغیرہ نے ان کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ اس حدیث میں جو شہداء حکمی ذکر کئے گئے ہیں ان کے علاوہ دوسرے حکمی شہداء یہ ہیں۔

ذات الجنب (یعنی نمونیہ کی بیماری) میں مرنے والا، جل کر مرجانے والا، حالت حمل میں مرجانے والی عورت یا باکرہ مرجانے والی عورت، وہ عورت جو حاملہ ہونے کے بعد سے بچہ کی پیدائش تک یا بچہ کا دودھ چھٹانے تک مرجائے، سل یعنی دق کے مرض میں مرنے والا، حالت سفر میں مرنے والا، سفر جہاد میں سواری سے گر کر مرجانے والا، مرابط یعنی اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کے دوران مرجانے والا، گڑھے میں گر کر مرجانے والا، درندوں یعنی شیر وغیرہ کا لقمہ بن جانے والا، اپنے مال، اپنے اہل و عیال، اپنے دین، اپنے خون اور حق کی خاطر قتل کیا جائے والا، دوران جہاد اپنی موت مرجانے والا، اور وہ شخص جسے شہادت کی پر خلوص تمنا اور لگن ہو مگر شہادت کا موقع اسے نصیب نہ ہو اور اس کا وقت پورا ہو جائے اور شہادت کی تمنا دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو جائے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جس شخص کو حاکم وقت ظلم و تشدد کے طور پر قید خانہ میں ڈال دے اور وہ وہیں مرجائے تو وہ شہید ہے جو شخص مظلومانہ طریقہ پر زدو کوب کیا جائے اور وہ زدو کوب کے نتیجے میں بعد میں مرجائے تو وہ شہید ہے اور جو شخص توحید کی گواہی دیتے ہوئے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دے تو وہ شہید ہے۔

حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع روایت ہے کہ "تپ (بخار) شہادت سے، حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ روایت کرتے ہیں میں نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! شہداء میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بافضیلت شہید کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ شخص جو ظالم حاکم کے سامنے کھڑے ہو کر اسے اچھا اور نیک کام کرنے کا حکم دے اور برے کام سے روکے اور وہ حاکم اس شخص کو مار ڈالے۔

حضرت ابوموسیٰؓ سے مروی ہے کہ "جس شخص کو گھوڑا یا اونٹ کچل اور روند ڈالے اور وہ مرجائے یا زہریلے جانور کے کاٹنے سے مرجائے تو شہید ہے۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "جس شخص کو کسی سے عشق ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عشق میں پاکباز و متقی رہا بلکہ اس نے اپنے عشق کو چھپایا بھی اور اسی حال میں اس کا انتقال ہو گیا تو وہ شہید ہے۔

آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے کہ جو شخص کشتی میں بیٹھا ہوا دوران سر اور قے میں مبتلا ہو تو اسے شہید کا اجر ملتا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعا روایت ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے عورت کے لئے غیرت و خودداری لازم رکھی ہے اور مردوں کے لئے جہاد ضروری قرار دیا ہے لہٰذا عورتوں میں سے جس عورت نے اپنی سوکن کی موجودگی میں صبر و ضبط کے دامن کو پکڑے رکھا تو اسے شہید کا اجر ملے گا۔

حضرت عائشہؓ بطریق مرفوع روایت کرتی ہیں کہ "جو شخص روزانہ دن میں پچیس مرتبہ یہ دعا اللھم بارک لی فِی الموت و فیما بعد الموت پڑھے اور بستر مرگ پر اس کا انتقال ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے شہید کا ثواب عنایت فرماتے ہے۔

حضرت ابن عمرؓ مرفوعا روایت کرتے ہیں کہ "جو شخص ضحیٰ (یعنی اشراق و چاشت) کی نماز پڑھے اور مہینہ میں تین دن روزہ رکھے اور وتر کی نماز نہ حالت سفر میں چھوڑے نہ حالت قیام میں تو اس کے لئے شہید کا اجر لکھا جاتا ہے۔

اسی طرح اُمت میں عوامی طور پر اعتقادی و عملی گمراہی کے وقت سُنّت پر مضبوطی سے قائم رہنے والا اور طلب علم میں مرنے والا شہید ہے "طلب علم میں مرنے والے" سے وہ شخص مراد ہے جو حصول علم اور درس و تدریس میں مشغول ہو یا تصنیف و تالیف میں مصروف ہو اور یا محض کسی علمی مجلس میں حاضر ہو، جس شخص نے اپنی زندگی اس طرح گزار دی ہو کہ لوگوں کی مہمانداری و خاطر و تواضع اس کا شیوہ رہا ہو تو وہ شہید ہے، مرتث یعنی وہ شخص جو میدان کارزار میں زخمی ہو کر فوراً نہ مرجائے بلکہ کم سے کم اتنی دیر تک زندہ رہے کہ دنیا کی کسی چیز سے فائدہ اٹھائے تو وہ بھی شہید ہے۔ جو شخص مسلمانوں تک غلہ پہنچائے اور جو شخص اپنے اہل و عیال اور اپنے غلام و لونڈی کے لئے کمائے وہ شہید ہے۔ ایسے ہی وہ جنبی جسے کافر میدان کارزار میں مار ڈالیں اور شریق یعنی وہ شخص جو گلے میں پانی پھنس جانے اور دم گھٹ جانے کی وجہ سے مرجائے وہ شہید ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو مسلمان اپنے مرض میں حضرت یونس علیہ السلام کی یہ دعا لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ چالیس مرتبہ پڑھے اور اسی مرض میں انتقال کرے تو اسے شہید کا ثواب دیا جاتا ہے اور اگر اس مرض سے اسے چھٹکارا مل جائے تو وہ اس حال میں صحت مند ہوتا ہے کہ اس کی مغفرت ہو چکی ہوتی ہے۔

یہ بھی حدیث میں وارد ہے کہ سچا اور امانتدار تاجر قیامت کے دن شہداء کے ساتھ ہوگا اور جو شخص جمعہ کی شب میں مرتا ہے وہ شہید ہے۔

نیز حدیث میں یہ بھی منقول ہے کہ بلا اجرت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اذان دینے والا موذن اس شہید کی مانند ہے جو اپنے خون میں لت پت تڑپتا ہو، نیز وہ موذن جب مرتا ہے تو اس کی قبر میں کیڑے نہیں پڑتے۔

منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس بار اپنی رحمت نازل فرماتا ہے۔ جو شخص مجھ پر دس مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر سو مرتبہ اپنی رحمت نازل فرماتا ہے اور جو شخص مجھ پر سو مرتبہ درود بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان براۃ یعنی نفاق اور آگ سے نجات لکھ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن شہیدوں کے ساتھ رکھے گا۔

منقول ہے کہ جو شخص صبح کے وقت تین مرتبہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ اور سورہ حشر کی آخری تین آیتیں پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے مقرر کرتا ہے اور اس کے لئے شام تک بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ اور وہ شخص اگر اس دن مرجاتا ہے تو اس کی موت شہید کی موت ہوتی ہے اور جو شخص یہ شام کو پڑھتا ہے وہ بھی اسی اجر کا مستحق ہوتا ہے۔

منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو وصیت کی کہ جب تم رات میں سونے کے لئے اپنے بستر پر جاؤ تو سورہ حشر کی آخری آیتیں پڑھ لو اور فرمایا کہ "اگر تم (رات میں یہ پڑھنے کے بعد سوئے اور اسی رات میں) مرگئے تو شہید کی موت پاؤ گے۔

منقول ہے کہ جو شخص مرگی کے مرض میں مرجاتا ہے وہ شہید ہوتا ہے، جو شخص حج اور عمرہ کے دوران مرتا ہے شہید ہوتا ہے، جو شخص باوضو مرتا ہے شہید ہوتا ہے اسی طرح رمضان کے مہینہ میں، بیت المقدس میں، مکہ میں یا مدینہ میں مرنے والا شخص شہید ہوتا ہے، دبلاہٹ کی بیماری میں مرنے والا شخص شہید ہوتا ہے۔ جو شخص کسی آفت و بلا میں مبتلاء ہو اور وہ اسی حالت میں ضرر و بلا پر صبر و رضا کا دامن پکڑے ہوئے مرجائے تو شہید ہے۔ جو شخص صبح و شام مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ جس کے پڑھنے کی فضیلت کا تذکرہ ایک حدیث میں کیا گیا ہے پڑھے تو وہ شہید ہے۔

منقول ہے کہ جو شخص نوے برس کی عمر میں یا آسیب زدہ ہو کر مرے یا اس حال میں مرے کہ اس کے ماں باپ اس سے خوش ہوں اور یا نیک بخت بیوی اس حال میں مرے کہ اس کا خاوند اس سے خوش راضی ہو تو وہ شہید ہے۔ نیز وہ مسلمان بھی شہید ہے جو کسی ضعیف مسلمان کے ساتھ کلمہ خیر یا اس کی کسی طرح کی مدد کر کے بھلائی کا معاملہ کرے۔ واللہ اعلم۔

طاعون زدہ علاقہ میں صبر وثبات کی فضیلت

(۲۵) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الطَّاعُوْنِ فَاَخْبَرَنِىْ اَنَّهٗ عَذَابٌ يَبْعَثُهُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَشَاءُ وَاِنَّ اللّٰهَ جَعَلَهٗ رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ لَيْسَ مِنْ اَحَدٍ يَقَعُ الطَّاعُوْنُ فَيَمْكُثُ فِىْ بَلَدِهٖ صَابِرًا مُحْتَسِبًا يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا يُصِيْبُهٗ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِ شَهِيْدٍ (رواه البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے طاعون کی حقیقت دریافت کی تو آپ ﷺ نے مجھے بتایا کہ (ویسے تو) یہ عذاب ہے جسے اللہ تعالیٰ جس پر چاہے بھیجتا ہے (لیکن) اللہ تعالیٰ نے اسے (ان) مؤمنین کے لئے (باعث) رحمت قرار دیا ہے (جو اس میں ابتلاء کے وقت صبر کرتے ہیں) اور جس شہر یا جس جگہ طاعون ہو اور (کوئی مؤمن) اپنے اس شہر میں ٹھہرا رہے اور صبر کرنے والا اور خدا سے ثواب کا طالب رہے (یعنی اس طاعون زدہ علاقہ میں کسی اور غرض و مصلحت سے نہیں بلکہ محض ثواب کی خاطر ٹھہرا رہے) نیز یہ جانتا ہو کہ اسے کوئی چیز (یعنی کوئی اذیت و مصیبت) نہیں پہنچے گی مگر صرف وہی جو خدا نے (اس کے مقدر میں) لکھ دی اور جس سے کہیں مفر نہیں) تو اس مؤمن کو شہید کے مانند ثواب ملے گا۔" (بخاریؒ)

طاعون زدہ علاقہ کے بارہ میں واضح ہدایت وضابطہ

(۲۶) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّاعُوْنُ رِجْزٌ اُرْسِلَ عَلٰى طَائِفَةٍ مِّنْ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ اَوْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَاِذَا سَمِعْتُمْ بِهٖ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَيْهِ وَاِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَاَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِّنْهُ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ ابن زیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "طاعون عذاب ہے جو بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر بھیجا گیا تھا" یا فرمایا کہ ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے" (یعنی راوی کو شک ہو گیا ہے کہ آپ ﷺ نے پہلا جملہ ارشاد فرمایا تھا یا دوسرا) لہٰذا جب تم کسی علاقہ کے بارہ میں سنو کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے تو وہاں مت جاؤ اور جس طاعون زدہ علاقہ میں تم (پہلے سے) موجود ہو تو وہاں سے نکل مت بھاگو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "بنی اسرائیل کی ایک جماعت" سے مراد وہ جماعت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (یعنی داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے) مگر انہوں نے سرکشی اور نافرمانی کا مظاہرہ کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ یعنی پس ہم نے ان کی سرکشی و نافرمانی کی وجہ سے) ان پر آسمان سے عذاب اتارا۔ ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ وہ "آسمانی عذاب" طاعون تھا جسے اللہ تعالیٰ نے اس بدبخت و سرکش قوم پر نازل فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عذاب وبلا میں مبتلا ہو کر اس قوم کے چوبیس ہزار بڑے بڑے بوڑھے آناً فاناً موت کے گھاٹ اتر گئے۔

اس حدیث میں طاعون زدہ علاقہ کے بارے میں دو ہدایتیں دی جارہی ہیں ایک تو یہ کہ جس علاقہ میں طاعون پھیلا ہوا ہو اور تم وہاں پہلے سے موجود نہ ہو تو اب طاعون پھیلنے کی وجہ سے اس علاقہ میں نہ جاؤ۔ اس سے منع فرمایا جارہا ہے تاکہ اپنی جان کو جانتے بوجھتے ہلاکت میں ڈالنا لازم نہ آئے۔

دوسری ہدایت یہ ہے کہ جس علاقہ میں طاعون پھیلا ہوا ہو تو وہاں پہلے سے موجود ہو تو اب محض طاعون پھیلنے کی وجہ سے اس علاقہ سے نکل کر کسی دوسری جگہ نہ بھاگ جاؤ۔ کیونکہ اس طرح کی تکلیف و پریشانی کے خوف سے اور موت کے ڈر سے بھاگنے کا مطلب ہوگا کہ تقدیر کے لکھے ہوئے فیصلہ سے فرار اختیار کرنا جو لاحاصل ہے۔

لہٰذا کسی عام وبا پھیلنے کے وقت کے بارے میں شریعت اسلامی کا یہی ضابطہ ہے کہ جس طرف وبا پھیلی ہوئی ہو وہاں جائے نہیں اور

جس جگہ پہلے سے موجود تھا اور وہاں وبا پھیل گئی تو پھر وہاں سے بھاگے نہیں جو شخص بھاگے گا وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب اور راندہ درگاہ الٰہی ہو گا" ہاں وبا کے علاوہ دوسرے بعض مواقع پر جہاں ہلاکت کا ظن غالب ہو بھاگنے کی اجازت ہے مثلاً کوئی شخص گھر میں ہو اور زلزلہ آجائے یا گھر میں آگ لگ جائے یا اسی طرح کسی ایسی دیوار کے نیچے بیٹھا ہوا ہو جس کے گرنے کا خطرہ ہو تو جان بچانے کے لئے وہاں سے بھاگنا جائز ہے۔

بینائی سے محرومی اور اس پر صبر اخروی سعادت کی نشانی

(۲۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اِذَا ابْتَلَيْتُ عَبْدِيْ بِحَبِيْبَتَيْهِ ثُمَّ صَبَرَ عَوَّضْتُهٗ مِنْهُمَا الْجَنَّةَ يُرِيْدُ عَيْنَيْهِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے کسی بندہ کو اس کی دونوں پیاری چیزوں میں مبتلا کر دیتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں ان دونوں کے بدلہ میں اسے جنت دیتا ہوں (راوی کہتے ہیں کہ اس کی دونوں پیاری چیزوں سے) آنحضرت ﷺ کی مراد "اس کی دونوں آنکھیں ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: اللہ جل شانہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو میں اندھا کر دیتا ہوں تو اس کو اس کی دونوں آنکھوں کے بدلہ میں بہشت دیتا ہوں، یعنی اسے نجات پائے ہوئے لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل کروں گا، یا یہ کہ اسے جنت میں مخصوص مراتب و درجات عطا کروں گا۔

لہٰذا جب کوئی شخص اپنی بینائی سے محروم ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ نہ تو اس کی وجہ سے اپنی زبان شکایت کو دراز نہ کرے اور نہ دل میں کوئی تنگی اور تکدر پیدا کرے بلکہ ایسی صورت میں صبر و شکر کی راہ پر گامزن رہے اور جانے کہ اندھا ہو جانا غضب خداوندی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ گناہوں کے دور ہونے، درجات کے بلند ہونے اور نگاہ بد سے بچانے کے لئے حق تعالیٰ نے آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ جب عمر کے آخری حصہ میں اندھے ہو گئے تو فرمایا کرتے تھے کہ وہ خلوت جسے میں تمام عمر چاہا کرتا تھا اب میسر آئی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

عیادت کا اجر

(۲۸) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ مُسْلِمٍ يَعُوْدُ مُسْلِمًا غُدْوَةً اِلَّا صَلّٰى عَلَيْهِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ حَتّٰى يُمْسِيَ وَاِنْ عَادَهٗ عَشِيَّةً اِلَّا صَلّٰى عَلَيْهِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ حَتّٰى يُصْبِحَ وَكَانَ لَهٗ خَرِيْفٌ فِي الْجَنَّةِ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو مسلمان (دوسرے بیمار) مسلمان کو دن کے پہلے حصہ میں یعنی دوسرے پہر سے پہلے پہلے عیادت کرتا ہے تو ستر ہزار فرشتے اس کے لئے شام ہونے تک رحمت و مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور جو مسلمان دن کے آخری حصہ میں یعنی زوال کے بعد عیادت کرتا ہے تو ستّر ہزار فرشتے اس کے لئے صبح ہونے تک رحمت و مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور بہشت میں اس کے لئے ایک باغ مقرر کر دیا جاتا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

آنکھوں کی بیماری میں عیادت کرنے کا مسئلہ

(۲۹) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ عَادَنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ وَجَعٍ كَانَ بِعَيْنَيَّ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت زید ابن ارقم فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میری عیادت فرمائی جب کہ میری آنکھوں میں درد تھا۔" (احمد، ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس شخص کی عیادت کرنا سُنت ہے جو آنکھیں دکھنے یا آنکھ کی دوسری بیماری میں مبتلا ہو جب کہ ایک روایت کا جو جامع صغیر میں منقول ہے یہ مفہوم ہے کہ "تین بیماریاں ایسی ہیں جن میں بیمار کی عیادت نہ کی جائے (۱) آنکھیں دکھنے میں، (۲) داڑھ درد میں (۳) دنبل (پھوڑے) میں۔

چونکہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہے اس لئے ان دونوں میں اس تاویل کے ذریعہ تطبیق پیدا کی جائے گی کہ "ان بیماریوں میں بیمار کی عیادت وہ لوگ نہ کریں جن کے لئے بیمار کو تکلیف کرنا پڑے یا ان کا آنا بیمار کے لئے گراں ہو کیونکہ اگر وہ لوگ ایسے بیمار کی عیادت کے لئے جائیں گے تو آنکھ دکھنے یا آنکھ کی دوسری بیماری کی شکل میں بیمار کو اپنی آنکھ کھولنے پر مجبور ہونا پڑیگا۔ یا داڑھ دکھنے کی صورت میں اسے گفتگو کرنے کی وجہ سے بہت زیادہ تکلیف ہوگی اسی طرح اگر دنبل ہوگا تو وہ ان کی وجہ سے ٹھیک طریقہ سے بیٹھنے پر مجبور ہوگا اور ظاہر ہے پھوڑے کی وجہ سے اس کے لئے کسی ایک اور ٹھیک ہیئت پر بیٹھنا بہت زیادہ تکلیف کا باعث ہوگا۔ ہاں اگر ایسے لوگ عیادت کے لئے جائیں جن کی وجہ سے بیمار کو تکلیف نہ کرنا پڑے یا ان کا جانا بیمار پر گراں نہ گزرے تو ان بیماریوں میں بھی عیادت کے لئے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہاں جو حدیث نقل کی جارہی ہے وہ آخری صورت پر محمول ہوگی اور جامع صغیر کی روایت پہلی صورت پر محمول کی جائے گی۔

عیادت کے واسطے جانے کے لئے وضو کرنا سُنّت ہے

(۳۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ وَعَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ مُحْتَسِبًا بُوْعِدَ مِنْ جَهَنَّمَ مَسِيْرَةَ سِتِّيْنَ خَرِيْفًا (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انس راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے وضو کیا اور اچھا (یعنی پورا) وضو کیا اور پھر (حصول) ثواب کے ارادے سے اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کی تو اس کو دوزخ سے ساٹھ برس (کی مسافت) کی بقدر دور رکھا جاتا ہے۔" (ابوداود)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عیادت کے لئے وضو کرنا سُنت ہے اور غالباً اس کی حکمت یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ عیادت، عبادت ہے اور یہ ظاہر ہی ہے کہ وضو سے عبادت کامل و افضل ہوتی ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ ایسی حالت میں اگر دعا کی جائے تو قبول ہوگی۔

عیادت کے وقت بیمار کے لئے دعا

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَعُوْدُ مُسْلِمًا فَيَقُوْلُ سَبْعَ مَرَّاتٍ اَسْاَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَشْفِيَكَ اِلَّا شُفِيَ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ قَدْ حَضَرَ اَجَلُهُ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی مسلمان کسی بیمار مسلمان کی عیادت کرتا ہے اور سات مرتبہ یہ کہتا ہے کہ اَسْاَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَشْفِيَكَ یعنی میں اللہ بزرگ و برتر سے جو عرش عظیم کا مالک ہے دعا کرتا ہوں کہ وہ تجھے شفا دے" تو اللہ تعالیٰ اسے شفا دیتا ہے بشرطیکہ اس کا وقت نہ آگیا ہو (یعنی اس کا مرض لاعلاج نہ ہو)۔" (ابوداؤد و ترمذی)

بخار اور درد کی دعا

(۳۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُعَلِّمُھُمْ مِنَ الْحُمّٰی وَمِنَ الْاَوْجَاعِ کُلِّھَا اَنْ یَقُوْلُوْا بِسْمِ اللّٰہِ الْکَبِیْرِ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ مِنْ شَرِّ کُلِّ عِرْقٍ نَعَّارٍ وَمِنْ شَرِّ حَرِّ النَّارِ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ لَا نَعْرِفُہٗ اِلَّا مِنْ حَدِیْثِ اِبْرَاھِیْمَ بْنِ اِسْمَاعِیْلَ وَھُوَ یُضَعَّفُ فِی الْحَدِیْثِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ صحابہؓ کو سکھلایا کرتے تھے کہ وہ (یعنی بیمار لوگ) بخار بلکہ ہر درد (سے شفا کے لئے اس طرح دعا کیا کریں بِسْمِ اللّٰہِ الْکَبِیْرِ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ مِنْ شَرِّ کُلِّ عِرْقٍ نَعَّارٍ وَمِنْ شَرِّ حَرِّ النَّارِ یعنی میں برکت چاہتا ہوں اللہ بزرگ وبرتر کے نام سے اور پناہ چاہتا ہوں اللہ بزرگ وبرتر کی، ہر رگ جوش مارنے والی کی برائی (یعنی تکلیف) سے اور آگ کی برائی سے۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ ہم اس حدیث کو ابراہیم ابن اسمٰعیل کے علاوہ اور کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں جانتے اور وہ (یعنی ابراہیم) روایت حدیث کے بارہ میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔"

تشریح: "ہر رگ جوش مارنے والی" سے مراد وہ خون ہے جو رگ میں جوش مارتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس خون سے پناہ چاہے جو رگ میں جوش مارتا ہے کیونکہ جب خون غالب آجاتا ہے تو تکلیف پہنچاتا ہے بایں طور کہ اس سے بخار اور دوسرے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ حدیث ابن شیبہ، ترمذی، ابن ماجہ ابن ابی الدنیا ابن سنی اور حاکم نے روایت کی ہے اور بیہقیؒ نے دعوات کبیر میں اس کی صحت کی تصدیق کی ہے۔

بیماری میں کیا دعا پڑھی جائے

(۳۳) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنِ اشْتَکٰی مِنْکُمْ شَیْئًا اَوِ اشْتَکَاہُ اَخٌ لَہٗ فَلْیَقُلْ رَبُّنَا اللّٰہُ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ تَقَدَّسَ اسْمُکَ اَمْرُکَ فِی السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ کَمَا رَحْمَتُکَ فِی السَّمَاءِ فَاجْعَلْ رَحْمَتَکَ فِی الْاَرْضِ اِغْفِرْ لَنَا حُوْبَنَا وَخَطَایَانَا اَنْتَ رَبُّ الطَّیِّبِیْنَ اَنْزِلْ رَحْمَۃً مِنْ رَحْمَتِکَ وَشِفَاءً مِّنْ شِفَائِکَ عَلٰی ھٰذَا الْوَجَعِ فَیَبْرَأُ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابودرداؓ راوی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تم میں سے جس شخص کو کوئی بیماری ہو یا اس کا کوئی بھائی بیمار ہو تو اسے چاہئے کہ یہ دعا پڑھے۔ ہمارا پروردگار اللہ ہے، ایسا اللہ جو آسمان میں ہے (تمام نقصانات سے) تیرا نام پاک ہے، تیری حکومت آسمان وزمین (دونوں) میں ہے، جیسی تیری رحمت آسمان میں ہے ویسی ہی تو اپنی رحمت زمین پر نازل فرما، تو ہمارے چھوٹے اور بڑے گناہ بخش دے تو پاکیزہ لوگوں کا پروردگار ہے (یعنی ان کا محب اور کارساز ہے اور تو اپنی رحمت میں سے (جو ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے) رحمت عظیمہ) نازل فرما، اور اس بیماری سے اپنی شفا عنایت فرما" (اس دعا کے پڑھنے سے بیمار انشاء اللہ) اچھا ہو جائے گا۔" (ابوداؤد)

تشریح: جیسی تیری رحمت آسان میں ہے۔ کا مطلب یہ ہے کہ آسمان میں تو تیری رحمت ہر ہر جگہ ہے اور وہاں کے ہر ہر رہنے والے پر ہے" بخلاف زمین اور زمین کے رہنے والوں کے کہ یہاں تو رحمت خاص بعضوں پر ہوتی ہے اور بعضوں پر نہیں ہوتی یعنی رحمت خاص سے صرف مؤمن ہی فیضیاب ہوتے ہیں نہ کہ کافر اگرچہ رحمت عام سب کے کئے یکساں ہے خواہ مؤمن ہو یا کافر جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ــــ "میری رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے۔"

"پاکیزہ لوگوں" سے مراد مؤمن ہیں جو شرک سے پاک ہوتے ہیں" یا وہ متقی مسلمان مراد ہیں جو برے افعال اور فاسد ولایعنی اقوال سے بچتے ہیں۔

عیادت کے وقت کی دعا

(۳۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا جَآءَ الرَّجُلُ یَعُوْدُ مَرِیْضًا فَلْیَقُلْ اَللّٰھُمَّ اشْفِ عَبْدَکَ یَنْکَأُ لَکَ عَدُوًّا اَوْیَمْشِیْ لَکَ اِلٰی جَنَازَۃٍ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص کسی مریض کے پاس عیادت کے لئے آئے تو اسے یہ دعائیہ الفاظ کہنے چاہئیں اَللّٰھُمَّ اشْفِ عَبْدَکَ یَنْکَأُ لَکَ عَدُوًّا اَوْیَمْشِیْ لَکَ اِلٰی جَنَازَۃٍ یعنی اے اللہ! اپنے بندہ کو شفا دے تاکہ وہ تیرے بندہ کو ایذاء پہنچائے (یعنی دشمنان دین سے جنگ وجدال کر کے انہیں زخمی اور قتل کرے) یا تیری خوشی ورضا کی خاطر جنازہ کی طرف (یعنی نماز جنازہ کے لئے) چلے۔" (ابوداؤدؒ)

تکلیف ومصیبت مسلمان کے لئے گناہوں کا کفارہ

(۳۵) وَعَنْ عَلِیِّ بْنِ زَیْدٍ عَنْ اُمَیَّۃَ اَنَّھَا سَأَلَتْ عَآئِشَۃَ عَنْ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ اِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ وَعَنْ قَوْلِہٖ (وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْءً یُّجْزَبِہٖ) فَقَالَتْ مَاسَأَلَنِیْ عَنْھَا اَحَدٌ مُنْذُ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ھٰذِہٖ مُعَاتَبَۃُ اللّٰہِ الْعَبْدَ بِمَا یُصِیْبُہٗ مِنَ الْحُمّٰی وَالنَّکْبَۃِ حَتَّی الْبِضَاعَۃِ یَضَعُھَا فِیْ یَدِ قَمِیْصِہٖ فَیَفْقِدُھَا فَیَفْزَعُ لَھَا حَتّٰی اِنَّ الْعَبْدَ لَیَخْرُجُ مِنْ ذُنُوْبِہٖ کَمَا یَخْرُجُ التِّبْرُ الْاَحْمَرُ مِنَ الْکِیْرِ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ۔

"اور حضرت علیؒ ابن زید (بصری تابعی) امیہ سے روایت کرتے کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے معنی پوچھے۔

اگر تم وہ چیز جو تمہارے دلوں میں ہے ظاہر کردو یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ اِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ اور اس آیت کے معنی بھی پوچھے وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْءً یُّجْزَبِہٖ جو شخص برا عمل کرے گا (یعنی خواہ صغیرہ گناہ کرے خواہ کبیرہ گناہ) تو اس کی جزاء (یعنی اس کی سزا دنیا یا آخرت میں) دی جائے گی۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "جیسا کہ میں نے اس کے بارہ میں رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا تھا ویسا کسی نے مجھ سے اس مسئلہ کے بارہ میں نہیں پوچھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے (میرے دریافت کرنے پر) فرمایا کہ "یہ (یعنی محاسبہ اور سزا جو دونوں آیتوں میں مذکور ہیں) اللہ تعالیٰ کا عتاب ہے جس میں بندہ بخار ورنج (کی تکلیف) کی صورت میں مبتلا ہوتا ہے یہاں تک کہ کوئی بندہ اپنا کچھ مال اپنے کرتہ کے آستین (یا جیب) میں رکھتا ہے اور (پھر وہ مال گم ہو جاتا ہے جسے) وہ نہیں پاتا چنانچہ وہ اس مال کے نہ ملنے سے غمگین ہوتا ہے (تو اس کی وجہ سے اس کے گناہ دور کئے جاتے ہیں اور ہمیشہ یہی سلسلہ جاری رہتا ہے کہ بندہ کسی تکلیف اور رنج میں مبتلا رہتا ہے) یہاں تک کہ وہ بندہ اپنے گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسا کہ سونا اور چاندی بھٹی سے (آگ میں پڑنے کی وجہ سے) سرخ نکلتا ہے۔" (ترمذی)

تشریح: ان دونوں آیتوں کے معنی پوچھنے کی وجہ یہ تھی کہ پہلی آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندوں سے ان کے دلوں کے خطرات و وسواس اور برے خیالات پر محاسبہ کیا جائے گا اور دوسری آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کو ہر برے عمل پر سزا دی جاتی ہے خواہ وہ عمل چھوٹا ہو یا بڑا تھوڑا ہو یا زیادہ چنانچہ اس سے صحابہؓ پریشان ہوئے کہ کیا کریں کیونکہ ان سے بچنا ممکن نہیں چنانچہ حضرت امیہؓ نے حضرت عائشہؓ سے ان آیات کا مطلب پوچھا تو انہوں نے ان آیات کی وضاحت کی جس کا حاصل یہ ہے کہ ان آیات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مؤمنین کو ان کے دل کی تمام باتوں اور ان کے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرے گا بلکہ آیات میں محاسبہ اور سزا کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو ان سے سرزد ہوئے گناہوں کی وجہ سے دنیا میں اپنے عتاب میں مبتلا کرتا ہے بایں طور کہ کسی کو بیماری کی تکلیف میں اور کسی کو دوسرے رنج وغم میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ یہ چیزیں ان کے گناہوں کا کفارہ

ہو جائیں عتاب کے معنی یہ ہیں کہ "کوئی شخص اپنے کسی دوست سے اس کی کسی غلط روی اور بے ادبی کی وجہ سے بظاہر اس پر اپنے غصہ کا اظہار کرے مگر دل میں اس کی محبت بدستور باقی رہے۔"

(۳۶) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یُصِیْبُ عَبْدًا نَکْبَۃٌ فَمَا فَوْقَھَا اَوْدُوْنَھَا اِلَّا بِذَنْبٍ وَمَا یَعْفُو اللّٰہُ عَنْہُ اَکْثَرُ وَقَرَأَ وَمَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْ عَنْ کَثِیْرٍ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابو موسیٰؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بندہ کو جو معمولی ایذاء پہنچتی ہے یا کوئی تکلیف پہنچتی ہے خواہ وہ اس سے کم ہو یا زیادہ ہو، یہ اس کے گناہوں کا ثمرہ ہوتا ہے اور وہ گناہ جنہیں اللہ تعالیٰ (بغیر سزا دیئے) دنیا و آخرت میں بخش دیتا ہے ان گناہوں سے بہت زیادہ ہوتے ہیں جن پر وہ سزا دیتا ہے آنحضرت ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَمَآ اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْ عَنْ کَثِیْرٍ اور از قسم مصیبت جو چیز تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں پیدا کی ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سے (گناہوں یا گنہ گاروں) کو معاف فرما دیتا ہے۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تمہیں جو بھی مصیبت و تکلیف اور بیماری وغیرہ پہنچتی ہے وہ سب تمہاری بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ گویا یہاں گنہ گاروں کو مخاطب کیا جا رہا ہے کہ اپنی بداعمالیوں اور غلط کاریوں سے باز آجاؤ اور نیک راستہ پر چلنے ہی کو اپنی دینی و دنیوی راحت و سکون کا ذریعہ جانو، ہاں جب وہ لوگ کسی مصیبت و تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں جو گنہ گار نہیں ہوتے تو اس سے ان کی آزمائش و امتحان مقصود ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے درجات میں بلندی ہوتی ہے، اگرچہ خدا کے نیک اور برگزیدہ بندے کسی معمولی سی تکلیف اور پریشانی میں بھی مبتلا ہوتے ہیں اور اپنے عجز و بیچارگی کے احساس کی وجہ سے وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ ہماری شامت اعمال کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کے بارہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ چوہے نے ان کے جوتے کے تسمہ کو کتر لیا تو وہ اتنا متاثر ہوئے کہ روتے جاتے تھے کہ آہ! نامعلوم میں کس گناہ میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی سزا میں نے یہ پائی ہے۔

حالت بیماری میں زمانۂ تندرستی کے اعمال نیک لکھ دیئے جاتے ہیں

(۳۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا کَانَ عَلٰی طَرِیْقَۃٍ حَسَنَۃٍ مِنَ الْعِبَادَۃِ ثُمَّ مَرِضَ قِیْلَ لِلْمَلَکِ الْمُوَکَّلِ بِہٖ اُکْتُبْ لَہٗ مِثْلَ عَمَلِہٖ اِذَا کَانَ طَلِیْقًا حَتّٰی اُطْلِقَہٗ اَوْ اَکْفِتَہٗ اِلَیَّ

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب بندہ عبادت کے نیک راستہ پر ہوتا ہے اور پھر بیمار ہو جاتا ہے (اور اس عبادت کے کرنے پر قادر نہیں رہتا) تو اس فرشتہ سے جو اس بندہ پر (اس کے نیک اعمال لکھنے پر) متعین ہوتا ہے کہا جاتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) کہ اس بندہ کے لئے (اس کے نامہ اعمال میں) اس عمل کے مثل لکھو جو وہ تندرستی کی حالت میں کیا کرتا تھا، یہاں تک کہ میں اسے تندرستی عطا کروں، یا اسے (اپنے پاس) بلالوں۔"

(۳۸) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا ابْتُلِیَ الْمُسْلِمُ بِبَلَاءٍ فِیْ جَسَدِہٖ قِیْلَ لِلْمَلَکِ اُکْتُبْ لَہٗ صَالِحَ عَمَلِہِ الَّذِیْ کَانَ یَعْمَلُ فَاِنْ شَفَاہُ غَسَلَہٗ وَطَھَّرَہٗ وَاِنْ قَبَضَہٗ غَفَرَلَہٗ وَرَحِمَہٗ۔ رَوَاھُمَا فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی مسلمان جسمانی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ (اس بندہ کی نیکی لکھنے والے) فرشتہ سے فرماتا ہے کہ اس کے نامہ اعمال میں تم وہی نیک عمل لکھتے رہو جو یہ (اس بیماری سے پہلے) کرتا تھا چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس مسلمان کو شفا دی تو اس کے گناہوں کو دھوتا ہے اور پاک کرتا ہے۔ اور اگر اسے اٹھا لیتا ہے تو اس کو بخشتا ہے اور اس پر رحم فرماتا ہے یہ دونوں روایتیں بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کی ہیں۔"

راہ خدا میں شہادت کے علاوہ شہادت کی اور اقسام

(۳۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَتِيْكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشَّهَادَةُ سَبْعٌ سِوَى الْقَتْلِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الْمَطْعُوْنُ شَهِيْدٌ وَالْغَرِيْقُ شَهِيْدٌ وَصَاحِبُ ذَاتِ الْجَنْبِ شَهِيْدٌ وَالْمَبْطُوْنُ شَهِيْدٌ وَصَاحِبُ الْحَرِيْقِ شَهِيْدٌ وَالَّذِيْ يَمُوْتُ تَحْتَ الْهَدَمِ شَهِيْدٌ وَالْمَرْأَةُ تَمُوْتُ بِجُمْعٍ شَهِيْدٌ (رواہ مالک وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت جابرؓ ابن عتیک راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اس شہادت کے علاوہ جو خدا کی راہ میں ہو شہادت کی اور سات قسمیں ہیں (۱) جو شخص طاعون میں مرے شہید ہے۔ (۲) جو شخص ڈوب کر مرجائے شہید ہے۔ (۳) جو شخص ذات الجنب میں مرے شہید ہے۔ (۴) جو شخص پیٹ کی بیماری (یعنی دست اور استقاء) میں مرجائے شہید ہے۔ (۵) جو شخص جل کر مرجائے شہید ہے۔ (۶) جو شخص دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مرجائے۔ (۷) اور وہ عورت جو حالت حمل میں یا باکرہ مرے شہید ہے۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ حقیقی شہید تو وہی ہے جو راہ خدا میں دین کے دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کام آئے اس کے علاوہ سات قسم کے اور شہید ہیں جو حقیقی شہید تو نہیں لیکن حکم میں شہید ہی کے ہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی قسمیں ہیں جو مختلف احادیث میں مذکور ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں ذکر کیا گیا ہے۔

"ذات الجنب" ایک مشہور بیماری ہے اس بیماری سے پہلو کے اندر دل اور سینہ کے قریب پھنسیاں ہو جاتی ہے اور اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ مریض کا سانس رکتا ہے اور بخار اور کھانسی رہتی ہے۔

سخت مصیبت میں کون لوگ مبتلا ہوتے ہیں

(۴۰) وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ النَّاسِ اَشَدُّ بَلَاءً قَالَ الْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ يُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلٰى حَسَبِ دِيْنِهٖ فَاِنْ كَانَ فِيْ دِيْنِهٖ صُلْبًا اِشْتَدَّ بَلَاؤُهٗ وَاِنْ كَانَ فِيْ دِيْنِهٖ رِقَّةٌ هُوِّنَ عَلَيْهِ فَمَا زَالَ كَذٰلِكَ حَتّٰى يَمْشِيَ عَلَى الْاَرْضِ مَالَهٗ ذَنْبٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ

"اور حضرت سعدؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں کون شخص (محنت و مصیبت کی) زیادہ بلاء میں مبتلا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "انبیاء پھر وہ لوگ جو انبیاء سے بہت زیادہ مشابہ ہوں پھر وہ لوگ جو ان سے بہت زیادہ مشابہ ہوں۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا) انسان اپنے دین کے مطابق (مصیبت میں) مبتلا کیا جاتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنے دین میں سخت ہوتا ہے تو اس کی مصیبت بھی سخت ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اپنے دین میں نرم ہوتا ہے تو اس کی مصیبت بھی ہلکی ہوتی ہے، (لہٰذا اپنے دین میں سخت شخص اسی طرح ہمیشہ) مصیبت و بلاء میں گرفتار رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کی مغفرت ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ زمین کے اوپر اس حال میں چلتا ہے کہ (اس کے نامہ اعمال میں کوئی گناہ نہیں ہوتا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) امام ترمذی یہ فرماتے ہیں کہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام مصیبت و بلاء میں سب سے زیادہ مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ وہ بلاء و مصیبت میں اسی طرح لذت محسوس کرتے ہیں جس طرح کے عام انسان نعمت و راحت میں لذت محسوس کرتے ہیں، پھر ان کے بعد وہ لوگ مصیبت و سختی میں مبتلا ہوتے ہیں جو ان کے مشابہ ہوتے ہیں یعنی اولیاء اللہ اور صلحاء انہیں بھی مصیبت و تکلیف کی سخت آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے تاکہ وہ بہت زیادہ ثواب کے مستحق ہوں مگر ان کی مصیبت و بلاء کی سختی انبیاء کی مصیبت و بلاء کی سختی سے کم ہوتی ہے اس کے بعد ان لوگوں کا نمبر آتا ہے جو مرتبہ اور درجہ کے اعتبار سے اولیاء اللہ سے کم ہوتے ہیں۔

آخر میں یہ کلیہ بیان فرمایا جارہا ہے کہ جو شخص اپنے دین پر سختی سے قائم رہتا ہے اور کسی مرحلہ پر بھی اس کے قدم میں لغزش نہیں آتی

اس کی مصیبت وبلاء بھی بڑی سخت ہوتی ہے کیونکہ وہ صاحب یقین ہوتا ہے چنانچہ جب وہ اپنی مصیبت کی سختی پر صبر کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے گناہوں کی وجہ سے اسی کا اہل ہوں تو اس کی وجہ سے اس کا ایمان کامل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق مضبوط تر ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے گناہ دور ہوتے ہیں اور اس کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو شخص اپنے دین میں نرم رو ہوتا ہے اس کی بلاء و مصیبت کی سختی بھی کم ہوتی ہے۔ تاکہ وہ بے صبری کا مظاہرہ نہ کر سکے اور اپنے ایمان و تعلق باللہ کے قوی نہ ہونے کی وجہ سے دین کے دائرہ سے نہ نکل جائے۔

اخروی بھلائی موت کی سختی میں ہے

(۴۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا اَغْبِطُ اَحَدًا بِهَوْنِ مَوْتٍ بَعْدَ الَّذِیْ رَأَیْتُ مِنْ شِدَّةِ مَوْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے رسول کریم ﷺ کی موت کی سختی کو دیکھا ہے۔ کسی کے لئے موت کی آسانی کی دعا نہیں کرتی۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو میں موت کی آسانی کی آرزومند رہا کرتی تھی۔ مگر جب میں نے آنحضرت ﷺ کی موت کی سختی دیکھی وہ آرزو باقی نہ رہی بلکہ اب میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اخروی سعادت و بھلائی موت کی سختی میں ہے موت کی آسانی میں نہیں ہے۔

سکرات الموت میں آنحضرت ﷺ کا عمل

(۴۲) وَعَنْهَا قَالَتْ رَأَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ بِالْمَوْتِ وَعِنْدَهٗ قَدَحٌ فِیْهِ مَاءٌ وَهُوَ یُدْخِلُ یَدَهٗ فِی الْقَدَحِ ثُمَّ یَمْسَحُ وَجْهَهٗ ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی مُنْکَرَاتِ الْمَوْتِ اَوْسَکَرَاتِ الْمَوْتِ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ سکرات الموت میں مبتلا تھے آپ ﷺ کے پاس ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں پانی تھا آپ ﷺ پیالہ میں اپنا ہاتھ ڈبوتے پھر اپنا چہرہ مبارک پر پھرتے اور یہ فرماتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی مُنْکَرَاتِ الْمَوْتِ اَوْسَکَرَاتِ الْمَوْتِ اے اللہ موت کی سختی دور کرنے کے ساتھ میری مدد فرمایا "موت کی سختی" کے بجائے "موت کی شدت" فرماتے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: سکرات الموت میں آپ ﷺ اپنے ہاتھ کو پانی میں تر کر کے چہرہ مبارک پر اس لئے پھیرتے تھے تاکہ موت کی سختی اور شدت کی وجہ سے جو حرارت اور گرمی پیدا ہو گئی تھی اس میں تخفیف ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ کی موت کی سختی اور شدت کے بارہ میں علماء نے کئی وجہیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک تو وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ پر سکرات الموت کی یہ کیفیت اس لئے طاری ہوئی تاکہ امت کے لوگ اس کے سبب سے اپنی موت کے بارہ میں زیادہ پریشان اور ہراساں نہ ہوں۔ جب امتی یہ دیکھیں گے کہ آنحضرت ﷺ کی روح پاک نے کس طرح جسد مبارک سے جدائی حاصل کی تو وہ اپنے بارہ میں صبر کے دامن کو پکڑے رہیں گے جس کی وجہ سے ان کی جان کنی میں آسانی ہوگی۔

دنیا کی سزا آخرت کی سزا سے بہتر ہے

(۴۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الْخَیْرَ عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوْبَةَ فِی الدُّنْیَا وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ اَمْسَکَ عَنْهُ بِذَنْبِهٖ حَتّٰی یُوَافِیَهٗ بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کی بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اس کے گناہوں کی سزا جلد ہی دنیا میں دے دیتا ہے اور جب اپنے کسی بندہ کی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہوں کی سزا کو روکے رکھتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اس کو اس کے گناہوں کی پوری پوری سزا دے گا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: دنیا کی سزا بہر صورت آخرت کی سزا سے بہتر ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنے ان نیک بندوں کو جو کسی گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں دنیا ہی میں مصیبت و تکلیف یا بیماری وغیرہ کی صورت میں سزا دیتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا کا عذاب ہلکا ہوتا ہے بایں طور کہ دنیا کی مدت کم ہوتی ہے جو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتی ہے۔ ہاں وہ لوگ جو خدا کی مسلسل نافرمانی کی وجہ سے خدا کا غضب مول لیتے ہیں اور آخرت کی بدبختی میں مبتلا ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں سزا نہیں دیتا بلکہ ان کی رسی دراز کئے جاتا ہے تاکہ انہیں آخرت کے عذاب میں مبتلا کیا جائے جو دنیا کے عذاب سے کہیں دردناک اور شدید ہوگا۔

بلاو مصیبت میں راضی برضا رہنا چاہئے

(۴۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عُظْمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ وَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَاءُ وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بڑی مصیبتوں کے بدلہ بڑا اجر ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو پسند کرتا ہے تو اسے (مصیبتوں میں) مبتلا کر دیتا ہے چنانچہ جو (مصائب وبلاء) میں راضی رہا تو اس کے لئے (اللہ تعالیٰ کی) رضا ہے اور جو شخص (مصیبت کے ابتلاء سے) ناراض رہا تو اس کے لئے (اللہ کی ناراضگی ہے۔" (ترمذیؒ و ابن ماجہؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ جب کسی شخص سے خوش ہوتا ہے تو اسے مصیبت وبلاء میں مبتلا کر دیتا ہے اسی طرح جب کسی شخص سے ناراض و ناخوش ہوتا ہے تو اسے بھی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے اگرچہ اس دوسرے جزو کو حدیث میں بظاہر ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن حدیث کے الفاظ فَمَنْ رَضِيَ الخ سے یہ جزو بھی مفہوم ہوتا ہے۔

گویا حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ بندہ کی خوشی و ناخوشی حق تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کی علامت ہے جو شخص مصیبت وبلا میں راضی برضا رہتا ہے وہ خدا کا پسندیدہ و محبوب ہوتا ہے بایں طور کہ خدا بھی اس سے راضی و خوش رہتا ہے اور جو شخص مصیبت وبلاء کی سختیوں پر زبان شکایت دراز کرتا ہے اور ناراضگی و ناخوشی کا اظہار کرتا ہے وہ راندہ درگاہ الٰہی ہوتا ہے بایں طور کہ خدا اس سے خوش و راضی نہیں رہتا۔

چنانچہ منقول ہے کہ صحابہؓ آپس میں یہ سوال کرتے تھے کہ کس طرح معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کس بندہ سے خوش و راضی ہے اور کس بندہ سے ناخوش و ناراض ہے؟ پھر یہ جواب دیتے تھے کہ اگر بندہ خدا سے خوش و راضی ہے تو سمجھا جائے گا کہ خدا اس بندہ سے خوش و راضی ہے اور اگر بندہ خدا سے ناخوش و ناراض ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ خدا اس سے ناراض و ناخوش ہے۔

اہل ایمان دنیا میں ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ آخرت کی دائمی راحت پاتے ہیں

(۴۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ اَوِالْمُؤْمِنَةِ فِيْ نَفْسِهٖ وَمَالِهٖ وَوَلَدِهٖ حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ وَمَا عَلَيْهِ مِنْ خَطِيْئَةٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوٰى مَالِكٌ نَحْوَهٗ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمن مرد یا مؤمن عورت کی جان، اس کے مال اور اس کی اولاد کو ہمیشہ

مصیبت وبلاء پہنچتی رہتی ہے یہاں تک کہ (جب) وہ (مرنے کے بعد) اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرتا ہے تو اس پر (یعنی اس کے نامہ اعمال میں) کوئی گناہ نہیں ہوتا (کیونکہ مصیبت وبلاء) کی وجہ سے اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں) امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور امام مالکؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ نیز امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

ابتلاء و مصیبت سعادت کے اس مرتبہ پر پہنچا دیتی ہے جو اعمال سے حاصل نہیں ہوتا

(۴۶) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ خَالِدِنِ السُّلَمِيِّ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهٖ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ فِيْ جَسَدِهٖ اَوْفِيْ مَالِهٖ اَوْفِيْ وَلَدِهٖ ثُمَّ صَبَّرَهٗ عَلٰى ذٰلِكَ حَتّٰى يُبْلِغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِيْ سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت محمد ابن خالد سلمی اپنے باپ سے اور وہ ان کے دادا (یعنی اپنے والد مکرم) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بندہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے (جنت میں) جو عظیم درجہ مقدر ہوتا ہے اور وہ اسے اپنے عمل کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدن یا اس کے مال یا اس کی اولاد کو (مصیبت میں) مبتلا کر دیتا ہے اور پھر اسے صبر کی توفیق عطا فرماتا ہے یہاں تک کہ اسے اس درجہ تک پہنچا دیتا ہے جو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقدر تھا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بندہ مصیبت وبلا پر صبر کرنے کی وجہ سے اخروی سعادت کے اس عظیم درجہ و مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے جہاں اپنی عبادت و اطاعت کے ذریعہ سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔

دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے عیش کدہ

(۴۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ شِخِّيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُثِّلَ ابْنُ اٰدَمَ وَاِلٰى جَنْبِهٖ تِسْعٌ وَتِسْعُوْنَ مَنِيَّةً اِنْ اَخْطَأَتْهُ الْمَنَايَا وَقَعَ فِي الْهَرَمِ حَتّٰى يَمُوْتَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ

"اور حضرت عبداللہؓ ابن شخیر راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ابن آدم اس حال میں پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے پہلو میں (یعنی اس کے قریب) ننانوے مہلک بلائیں ہیں اگر وہ بلائیں اسے نہیں پہنچتیں تو بڑھاپے میں مبتلا ہوتا ہے یہاں تک کہ مرجاتا ہے" ترمذیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انسان جب عدم سے وجود میں آتا ہے تو اس کے چاروں طرف بلاؤں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہوتا ہے وہ ایسی ایسی بلاؤں اور مصیبتوں میں گھرا ہوا ہوتا ہے جن سے خلاصی نہیں ہوتی اور اگر اتفاقاً کوئی شخص ان بلاؤں اور مصیبتوں سے نجات پائے رہتا ہے تو آخر میں بڑھاپے کے جال میں پھنس جاتا ہے اور بڑھاپا بھی ایسا جو "درد بے دوا" اور "بلائے بے انتہا" ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ دنیا مؤمن کے لئے ایک قید خانہ اور کافر کے لئے عیش کدہ ہے، لہٰذا مسلمانوں کو لازم آتا ہے کہ وہ دنیا کی ہر مصیبت و بلاء کے موقع پر صبر کر کے دامن کو ہاتھ سے پکڑے رہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر راضی اور صابر رہیں کہ اخروی فلاح و سعادت کی یہی ضمانت ہے۔

ایک حدیث قدسی میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "جو بندہ میری اتاری ہوئی مصیبت وبلاء پر صبر نہ کرے میری دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرے اور میرے فیصلہ سے راضی نہ رہے تو وہ میرے علاوہ کوئی دوسرا رب ڈھونڈ لے"

سوچئے کہ ایسے شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کتنی شدید ہے۔ جو صبر و شکر کی راہ پر گامزن نہ ہو اور اللہ کے فیصلہ پر راضی نہ رہے اللھم احفظنا منہ و وفقنا للصبر و الشکر و الرضاء

دنیا میں راحت و سکون سے رہنے والوں کی قیامت کے دن تمنّا

(۴۸) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوَدُّ اَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِيْنَ يُعْطٰى اَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ اَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِى الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيْضِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن جب کہ مبتلائے مصیبت وبلاء بہت زیادہ اجر و ثواب سے نوازے جائیں گے تو اہل عافیت (یعنی وہ لوگ جو دنیا میں مصیبت و بلاؤں سے محفوظ رہے اور ان کی زندگی بڑے عیش و عشرت میں گزری) یہ تمنا کریں گے کہ کاش! دنیا میں ان کے بدن کی کھال قینچیوں سے کاٹی جاتی (تاکہ جس طرح مبتلائے مصیبت آج اتنے زیادہ اجر و ثواب سے نوازے جا رہے ہیں اسی طرح ہمیں بھی بہت زیادہ ثواب ملتا) امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

گناہوں کا کفارہ بیماری

(۴۹) وَعَنْ عَامِرِ الرَّامِ قَالَ ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاَسْقَامَ فَقَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَصَابَهُ السَّقَمُ ثُمَّ عَافَاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنْهُ كَانَ كَفَّارَةً لِمَا مَضٰى مِنْ ذُنُوْبِهٖ وَمَوْعِظَةً لَهٗ فِيْمَا يَسْتَقْبِلُ وَاِنَّ الْمُنَافِقَ اِذَا مَرِضَ ثُمَّ اُعْفِيَ كَانَ كَالْبَعِيْرِ عَقَلَهٗ اَهْلُهٗ ثُمَّ اَرْسَلُوْهُ فَلَمْ يَدْرِ لِمَ عَقَلُوْهُ وَلِمَ اَرْسَلُوْهُ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْاَسْقَامُ وَاللّٰهِ مَا مَرِضْتُ قَطُّ فَقَالَ قُمْ عَنَّا فَلَسْتَ مِنَّا (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عامر رامیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) بیماریوں کا ذکر کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مؤمن جب کسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے اس بیماری سے نجات دیتا ہے تو وہ بیماری (نہ صرف یہ کہ) اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے (بلکہ) زمانہ آئندہ کے لئے باعث نصیحت (بھی) ہوتی ہے۔ یعنی بیماری اسے متنبہ کرتی ہے۔ چنانچہ وہ آئندہ گناہوں سے بچتا ہے) اور جب منافق بیمار ہوتا ہے اور پھر اسے بیماری سے نجات دی جاتی ہے تو اس کی مثال اس اونٹ کی سی ہوتی ہے جسے اس کے مالک نے باندھا اور پھر چھوڑ دیا اور اونٹ نے یہ نہ جانا کہ مالک نے اسے کیوں باندھا تھا اور کیوں چھوڑ دیا؟ (یہ سن کر) ایک شخص نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ ﷺ! بیماری کیا چیز ہے؟ میں تو کبھی بھی بیمار نہیں ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا! ہمارے پاس سے اٹھ کھڑے ہو! تم ہم میں سے نہیں ہو!۔"

(ابوداؤد)

تشریح: مؤمن بیماری سے صحت پانے کے بعد متنبہ ہو جاتا ہے چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے گناہوں کی وجہ سے بیماری میں مبتلا ہوا تھا اس لئے وہ نہ صرف یہ کہ اپنے گزشتہ گناہوں پر نادم و شرمسار ہوتا ہے اور توبہ کرتا ہے بلکہ آئندہ بھی گناہوں سے بچتا ہے اس کے برعکس منافق کا حال یہ ہے کہ جب بیماری سے صحتیاب ہوتا ہے تو اس کی مثال بالکل اس اونٹ کی سی ہوتی ہے کہ جسے اگر اس کا مالک باندھ دے تو یہ نہ جانے کہ مجھے باندھا کیوں ہے اور اگر چھوڑ دے تو یہ نہ سمجھے کہ مجھے چھوڑا کیوں ہے۔

چنانچہ منافق بیماری کی وجہ سے متنبہ نہیں ہوتا نہ تو وہ نصیحت و عبرت پکڑتا ہے اور نہ گناہوں پر نادم و شرمسار ہو کر توبہ کرتا ہے اسی لئے اس کی بیماری نہ تو اس کے گزشتہ گناہوں کا کفارہ کرتی ہے اور نہ زمانہ آئندہ میں اس کے لئے باعث نصیحت و عبرت ہوتی ہے کہ وہ گناہوں سے بچ سکے فَاُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ آنحضرت کے ارشاد گرامی "تم ہم میں سے نہیں ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے اہل طریقہ میں سے نہیں ہو، کیونکہ جس طرح ہم بیماری اور بلاؤں میں مبتلا ہوئے ہیں اس طرح تم مبتلا نہیں ہوئے ہو۔

عیادت کے وقت مریض کی دلداری کرو

(۵۰) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلْتُمْ عَلَی الْمَرِیْضِ فَنَفِّسُوْا لَہٗ فِیْ اَجَلِہٖ فَاِنَّ ذٰلِکَ لَا یَرُدُّ شَیْئًا وَیُطَیِّبُ بِنَفْسِہٖ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَ ابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم مریض کے پاس (اس کا حال پوچھنے کے لئے) جاؤ تو اس کی زندگی کے بارہ میں اس کا غم دور کرو (یعنی تسلی و تشفی دلاؤ کہ فکر و غم نہ کرو تم جلد ہی صحتیاب ہو جاؤ گے اور تمہاری عمر دراز ہوگی) اس لئے کہ یہ (تسلی و تشفی اگرچہ) کسی چیز کو (یعنی مقدر کے لکھے کو) ٹال نہیں سکتی (مگر) مریض کا دل (ضرور) خوش ہوتا ہے۔ (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب وقت نزع قریب ہو تو مریض کے لئے مستحب ہے کہ وہ مسواک کرے چنانچہ صحیح احادیث میں آنحضرت ﷺ کے بارہ میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے انتقال کے وقت مسواک فرمائی تھی اور اس کی حکمت بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اس سے روح کا نکلنا آسان و سہل ہو جاتا ہے اسی طرح اس وقت فرشتوں کی خاطر خوشبو لگانا مستحب ہے، نیز پاکیزہ کپڑے پہننا، نماز پڑھنا اور نہانا بھی مستحب ہے۔

پیٹ کی بیماری میں مرنے والا قبر کے عذاب سے محفوظ رہیگا

(۵۱) وَعَنْ سُلَیْمَانَ بْنِ صُرَدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَتَلَہٗ بَطْنُہٗ لَمْ یُعَذَّبْ فِیْ قَبْرِہٖ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ

"اور حضرت سلیمان ابن صردؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص پیٹ کی بیماری (مثلاً دست و استسقاء وغیرہ میں مر گیا تو اسے اس کی قبر کے عذاب میں مبتلا نہیں کیا جائے گا (احمدؒ و ترمذیؒ) امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: پیٹ کے مرض میں مرنے والے کے لئے سعادت اس لئے ہے کہ اس مرض کی سختی کی وجہ سے گناہ دور ہو جاتے ہیں اور یہ شہید مرتا ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے اور شہید کے بارہ میں صحیح مسلم میں یہ حدیث منقول ہے کہ "شہید کے تمام گناہ علاوہ دین (یعنی بندوں کے حقوق) کے بخش دیئے جاتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

غیر مسلم کی عیادت

(۵۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ غُلَامٌ یَھُوْدِیٌّ یَخْدُمُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَمَرِضَ فَاَتَاہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعُوْدُہٗ فَقَعَدَ عِنْدَ رَاْسِہٖ فَقَالَ لَہٗ اَسْلِمْ فَنَظَرَ اِلٰی اَبِیْہِ وَھُوَ عِنْدَہٗ فَقَالَ اَطِعْ اَبَا الْقَاسِمِ فَاَسْلَمَ فَخَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ یَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْقَذَہٗ مِنَ النَّارِ (رواہ البخاری)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا تھا جو نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ جب وہ بیمار ہوا تو نبی کریم ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی عیادت کی اور اس کے سر کے قریب بیٹھ گئے اور اس سے فرمایا کہ "تم مسلمان ہو جاؤ" لڑکے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اس کے باپ نے کہا "ابوالقاسم (یعنی آنحضرت ﷺ) کا حکم مانو۔ چنانچہ وہ لڑکا مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ یہ فرماتے ہوئے باہر نکلے کہ "حمد و ثنا اس خدا کی جس نے اس لڑکے کو (اسلام کے ذریعہ) آگ سے

نجات دی۔" (بخاریؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ فقعد عند راسه سے معلوم ہوا کہ عیادت کے وقت مریض کے سر کے پاس بیٹھنا مستحب ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کافر ذمی سے خدمت لینی اور اگر کوئی کافر ذمی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے لئے جانا جائز ہے۔

کتاب خزانہ میں لکھا ہے کہ یہود کی عیادت کے لئے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ہاں مجوسیوں کی عیادت کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔ اسی طرح فاسق کی عیادت کے بارہ میں بھی اگرچہ علماء نے اختلاف کیا ہے لیکن صحیح تر یہ ہے کہ فاسق کی عیادت کے لئے جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہ حدیث نابالغ کے اسلام قبول کرنے کے بارہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ حضرت امام موصوفؒ فرماتے ہیں کہ نابالغ کا اسلام قبول کرنا صحیح ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہاں حدیث میں جس یہودی لڑکے کا ذکر کیا جارہا ہے اس کا نام عبد القدوس ہے۔

عیادت کے لئے پیادہ پا جانا افضل ہے

(۵۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَادَ مَرِیْضًا نَادٰی مُنَادٍ مِّنَ السَّمَاءِ طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّأْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلاً (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص بیمار کی عیادت کرتا ہے تو پکارنے والا (یعنی فرشتہ) آسمان سے پکار کر کہتا ہے کہ "خوشی ہو تمہیں دنیا و آخرت میں اچھا ہو چلنا تیرا (آخرت میں یا دنیا میں) اور حاصل ہو تجھے بہشت کا ایک بڑا درجہ و مرتبہ۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اصل مقصد تو عیادت کے لئے مریض کے پاس پہنچنا ہے۔ خواہ کسی بھی طرح اور کسی بھی ذریعہ سے پہنچا جائے لیکن علماء لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ عیادت کے لئے پیادہ پا جانا افضل ہے۔

مریض کے حال کی اطلاع دینے کا طریقہ

(۵۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ عَلِیًّا خَرَجَ مِنْ عِنْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ وَجَعِهِ الَّذِیْ تُوُفِّیَ فِیْهِ فَقَالَ النَّاسُ یَا اَبَا الْحَسَنِ کَیْفَ اَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَصْبَحَ بِحَمْدِ اللّٰهِ بَارِئًا (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت جب کہ آنحضرت ﷺ مرض الموت میں مبتلا تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ (جب) نبی کریم ﷺ کے پاس سے اٹھ کر باہر تشریف لائے تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ "ابوالحسن (یہ حضرت علیؓ کی کنیت تھی) آنحضرت ﷺ پر صبح کیسی گزری "انہوں نے فرمایا" خدا کا شکر ہے آپ ﷺ نے بیماری سے اچھے ہونے والے کی طرح صبح گزاری" (یعنی شکر ہے کہ آپ ﷺ آج اچھے ہیں)۔" (بخاریؒ)

تشریح: جب لوگوں نے حضرت علیؓ سے آنحضرت ﷺ کی صحت کے بارے میں پوچھا تو حضرت علیؓ نے ان الفاظ کے ذریعہ جواب دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب آپ ﷺ قریب بصحت ہیں" حضرت علیؓ کا یہ جواب یا تو ان کے اپنے گمان کے مطابق تھا کہ وہ یہ ہی سمجھ رہے ہوں گے کہ آنحضرت ﷺ جلد ہی صحتیاب ہونے والے ہیں یا پھر یہ کہ حضرت علیؓ نے آنحضرت ﷺ کی بیماری کی شدت کے احساس اور صحت سے مایوسی کے باوجود یہ جواب فال نیک کے طور پر دیا۔

چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ جب کسی عیادت کرنے والے تیماردار سے مریض کا حال پوچھا جائے تو اگرچہ بیمار کی حالت مایوس کن ہو مگر اس

بارہ میں ادب اور طریقہ یہی ہے کہ فال نیک کے طور پر اس طرح سے امید افزاء اور خوش کن جواب دینا چاہئے۔

علاج توکل کے منافی نہیں

⑤⑤ وَعَنْ عَطَاءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ قَالَ قَالَ لِی ابْنُ عَبَّاسٍ اَلَا اُرِیْكَ امْرَاَةً مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ قُلْتُ بَلٰی قَالَ هٰذِهِ الْمَرْاَةُ السَّوْدَاءُ اَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اُصْرَعُ وَاِنِّی اَتَکَشَّفُ فَادْعُ اللّٰهَ لِیْ فَقَالَ اِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَكِ الْجَنَّةُ وَاِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللّٰهَ اَنْ یُعَافِیَكِ فَقَالَتْ اَصْبِرُ فَقَالَتْ اِنِّی اَتَکَشَّفُ فَادْعُ اللّٰهَ اَنْ لَّا اَتَکَشَّفَ فَدَعَالَهَا (متفق علیہ)

"اور حضرت عطاء ابن ابی رباح فرماتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت ابن عباسؓ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک جنتی عورت نہ دکھلاؤں؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں! ضرور دکھلائیے) انہوں نے فرمایا کہ یہ "کالی عورت (پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ) یہ عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ "یارسول اللہ! میں مرگی کے مرض میں مبتلا ہوں (جب مرگی اٹھتی ہے) تو میں ڈرتی ہوں کہ کہیں حالت بیخودی میں) میرا ستر نہ کھل جائے لہٰذا آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دعا کیجئے (کہ میری بیماری جاتی رہے) آپ ﷺ نے فرمایا "اگر چاہو تو صبر کرو تاکہ تمہیں جنت ملے اور اگر چاہو تو میں دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں شفا دے" عورت نے عرض کیا کہ میں صبر ہی کرونگی اور پھر کہنے لگی کہ "مگر میں ستر کھل جانے سے ڈرتی ہوں، آپ اللہ سے بس یہ دعا کر دیجئے کہ (مرض کی شدت اور حالت بیخودی میں) میرا ستر نہ کھلے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کے لئے دعا فرمائی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس عورت کا نام سُعیرہ یا سُقیرہ اور یا سیکرہ تھا، ایک روایت کے مطابق یہ عورت اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی کنگھی کرنے والی تھی۔

اس حدیث سے اس طرف اشارہ ہے کہ مصیبت و بلاء صبر کرنے اور رضا بتقدیر رہنے کے پیش نظر دوا اور دعا کو ترک کر دینا جائز ہے۔ بلکہ حدیث کا ظاہری مفہوم تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ صبر و رضا کے ساتھ ہمیشہ مرض میں مبتلا رہنا صحت مند اور عافیت میں رہنے سے بہتر ہے لیکن یہ نسبت بعض افراد کے یعنی یہ اس شخص کے لئے افضل ہے جس کا مرض مخلوق خدا کی نفع رسانی کے تعطل کا باعث نہ بنے۔ نیز حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ علاج و معالجہ ترک کر دینا افضل ہے اگرچہ علاج و معالجہ کرنا ابوداؤد کی حدیث کے مطابق سُنّت ہے جس میں مروی ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ "کیا ہم (بیماری میں) دوا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں دوا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مرض ایسا پیدا نہیں کیا جس کی دوا بھی پیدا نہ کی ہو۔ علاوہ بڑھاپے کے۔ چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ علاج و معالجہ توکل کے منافی نہیں ہے کیونکہ علاج و معالجہ صرف اسباب کے درجہ میں ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود بھی علاج و معالجہ کو اختیار فرمایا تھا حالانکہ آنحضرت ﷺ متوکلین کے سردار ہیں لیکن اس کے باوجود از راہ توکل علاج و معالجہ ترک کرنا جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ترک فرمایا تھا، باعث فضیلت ہے۔

مبتلائے مرض ہو کر مرنا بہتر ہے

⑤⑥ وَعَنْ یَحْیٰی بْنِ سَعِیْدٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا جَاءَهُ الْمَوْتُ فِیْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَجُلٌ هَنِیْئًا لَهٗ مَاتَ وَلَمْ یُبْتَلَ بِمَرَضٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَیْحَكَ مَا یُدْرِیْكَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ ابْتَلَاهُ بِمَرَضٍ فَکَفَّرَ عَنْهُ مِنْ سَیِّئَاتِهٖ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت یحییٰ ابن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ اقدس میں ایک شخص کو (اچانک) موت نے آدبوچا) ایک دوسرے

شخص نے کہاکہ اسے موت مبارک ہو، اس طرح مرا کہ کسی مرض میں مبتلا نہ ہوا! یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا، کہ افسوس ہے تم پر، تمہیں کیا معلوم؟ (یعنی بغیر مرض و بیماری کے اچانک مرجانے کو اچھا نہ سمجھو) اگر اللہ تعالیٰ اسے مرض کے ساتھ موت دیتا تو (مرض کے بعد بدلہ میں) اس کی خطائیں دور کر دیتا۔" (یہ روایت امام مالکؒ نے بطریق ارسال نقل کی ہے)

صابر مریض کی فضیلت

۵۷ وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ وَالصُّنَابِحِيِّ اَنَّهُمَا دَخَلَا عَلٰى رَجُلٍ مَرِيْضٍ يَعُوْدَانِهِ فَقَالَا لَهُ كَيْفَ اَصْبَحْتَ بِنِعْمَةٍ قَالَ شَدَّادٌ اَبْشِرْ بِكَفَّارَاتِ السَّيِّئَاتِ وَ حَطِّ الْخَطَايَا فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ اِذَا اَنَا ابْتَلَيْتُ عَبْدًا مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنًا فَحَمِدَنِيْ عَلٰى مَا ابْتَلَيْتُهُ فَاِنَّهُ يَقُوْمُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذٰلِكَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ مِنَ الْخَطَايَا وَيَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى اَنَا قَيَّدْتُ عَبْدِيْ وَ ابْتَلَيْتُهُ فَاَجْرُوْا لَهُ مَا كُنْتُمْ تُجْرُوْنَ لَهُ وَهُوَ صَحِيْحٌ (رواہ احمد)

"اور شداد ابنؓ اوس اور حضرت صنابحیؒ کے بارہ میں مروی ہے کہ یہ دونوں ایک بیمار شخص کے پاس گئے اور اس کی عیادت کی، چنانچہ دونوں نے مریض سے پوچھا کہ تم نے صبح کیسی گزاری؟ مریض نے کہا کہ میں نے (رضاء و تسلیم اور صبر و شکر کی) نعمت کے ساتھ صبح کی (یعنی مرض و تکلیف کی وجہ سے میں کبیدہ خاطر نہیں ہوں بلکہ رضاء بتقدیر اور صبر کے دامن کو پکڑے ہوئے ہوں جس کی وجہ سے میرا دل خوش و مطمئن ہے) حضرت شداد نے فرمایا کہ "گناہوں کے جھڑنے اور خطاؤں کے دور ہونے کی بشارت سے خوش ہو، کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جب میں اپنے بندوں میں سے کسی بندہ مؤمن کو (بیماری و مصیبت میں) مبتلا کرتا ہوں اور وہ بندہ اس ابتلاء پر (دل گیر و ناخوش نہیں ہوتا بلکہ) میری تعریف کرتا ہے تو وہ اپنے بستر علالت سے ایسا (گناہوں سے پاک و صاف ہو کر) اٹھتا ہے جیسا کہ وہ اس دن گناہوں سے پاک و صاف تھا جس روز اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔ نیز پروردگا بزرگ و برتر (فرشتوں سے) فرماتا ہے کہ "میں نے اپنے بندہ کو قید میں ڈالا ہے اور اس آزمائش میں مبتلا کیا تھا، لہٰذا تم (اس کے نامہ اعمال میں) وہ (نیک) اعمال لکھنا جاری رکھو جو تم اس کے زمانہ تندرستی میں لکھنا جاری رکھتے تھے۔" (احمدؒ)

مصیبت گناہوں کی زیادتی کو ختم کرتی ہے

۵۸ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَثُرَتْ ذُنُوْبُ الْعَبْدِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ مَا يُكَفِّرُهَا مِنَ الْعَمَلِ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ بِالْحُزْنِ لِيُكَفِّرَهَا عَنْهُ (رواہ احمد)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب (کسی) بندہ کے گناہ بہت زیادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے اعمال میں ایسا کوئی نیک عمل نہیں ہوتا جو ان کے گناہوں کو دور کرے تو اللہ تعالیٰ اسے غم و حزن میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس بندہ کے گناہوں کو دور کر دے۔" (احمدؒ)

تشریح: ایک اور روایت میں جسے طبرانیؒ اور حاکم نے نقل کیا ہے۔ یہ منقول ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر قلب غمگین کو دوست رکھتا ہے۔

عیادت کرنے والے کی سعادت

۵۹ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَادَ مَرِيْضًا لَمْ يَزَلْ يَخُوْضُ الرَّحْمَةَ حَتّٰى يَجْلِسَ فَاِذَا جَلَسَ اغْتَمَسَ فِيْهَا (رواہ مالک و احمد)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص کسی بیمار (کے پاس جاتا ہے اور اس کی عیادت کرتا ہے تو جب تک وہ بیٹھتا نہیں دریائے رحمت میں داخل رہتا ہے اور جب بیمار کے پاس بیٹھتا ہے تو دریائے رحمت میں ڈوب جاتا ہے۔" (احمدؒ، مالکؒ)

بخار اور اس کا علاج ارشاد نبوی ﷺ کی روشنی میں

(۶۰) وَعَنْ ثَوْبَانَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَصَابَ اَحَدَكُمُ الْحُمّٰی فَاِنَّ الْحُمّٰی قِطْعَةٌ مِنَ النَّارِ فَلْیُطْفِئْهَا عَنْهُ بِالْمَاءِ فَلْیَسْتَنْقِعْ فِیْ نَهْرٍ جَارٍ وَلْیَسْتَقْبِلْ جِرْیَتَهٗ فَیَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اشْفِ عَبْدَكَ وَصَدِّقْ رَسُوْلَكَ بَعْدَ صَلٰوةِ الصُّبْحِ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَلْیَنْغَمِسْ فِیْهِ ثَلَاثَ غَمَسَاتٍ ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ فَاِنْ لَّمْ یَبْرَأْ فِیْ ثَلَاثٍ فَخَمْسٌ فَاِنْ لَّمْ یَبْرَأْ فِیْ خَمْسٍ فَسَبْعٌ فَاِنْ لَّمْ یَبْرَأْ فِیْ سَبْعٍ فَتِسْعٌ فَاِنَّهَا لَا تَكَادُ تُجَاوِزُ تِسْعًا بِاِذْنِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ

"اور حضرت ثوبانؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جب تم میں سے کوئی شخص بخار میں مبتلا ہو اور وہ بخار (چونکہ) آگ کا ایک ٹکڑا ہے اس لئے اسے پانی سے بجھانا چاہئے لہٰذا اس شخص کو (جو بخار میں مبتلا ہے) چاہئے کہ وہ جاری نہر میں اترے اور پانی کے بہاؤ کی طرف کھڑا ہو اور یہ دعا پڑھے بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اشْفِ عَبْدَكَ وَصَدِّقْ رَسُوْلَكَ شفا طلب کرتا ہوں میں خدا کے بابرکت نام سے اے اللہ! اپنے بندہ کو شفا دے اور اپنے رسول کو (یعنی ان کے اس قول کو سچا کر) بایں طور کہ مجھے شفا دے۔

اور یہ عمل نماز فجر کے بعد سورج نکلنے سے پہلے کرے اور تین دن تک پانی میں غوطے لگائے، اگر تین دن میں اچھا نہ ہو تو پھر (یہ عمل) پانچ دن تک کرے اور اگر پانچ دن میں بھی اچھا نہ ہو تو پھر سات دن تک (یہ عمل) کرے اور اگر سات دن میں بھی اچھا نہ ہو تو پھر نو دن تک (یہ عمل) کرے اللہ جل شانہ کے حکم سے بخار نو دن سے تجاوز نہیں کرے گا (یعنی اس عمل کے بعد بخار جاتا رہے گا امام ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: لفظ وَلْیَنْغَمِسْ (غوطے لگائے) دراصل لفظ فَلْیَسْتَنْقِعْ (نہر میں اترے) کا بیان ہے، لہٰذا اس عبارت کے یہ معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں کہ تین غوطے تین دنوں میں (یعنی ایک ایک غوطہ روزانہ) لگائے جائیں اور یہ معنی بھی محتمل ہو سکتے ہیں کہ ہر روز تین تین غوطے لگائے جائیں۔

حدیث بالا بخار میں کے لئے جو علاج تجویز کیا جا رہا ہے وہ علاج مخصوص ہے یعنی ہر بخار میں یہ علاج کارگر نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صفراوی بخار کے بعض اقسام سے ہے جس میں اہل حجاز مبتلا ہوتے ہیں، چونکہ بعض بخار میں پانی کا استعمال نہ صرف یہ کہ مضر بلکہ باعث ہلاکت ہوتا ہے اس لئے ہر بخار میں علاج کا یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہئے ہاں اگر کسی بخار میں طبیب حاذق اور معتمد معالج اجازت دے دے تو پھر اس پر بلا جھجک عمل کرنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں خطابیؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص کسی ایسے بخار میں مبتلا ہوا جس میں پانی کا استعمال مضر تھا مگر اس نے ناسمجھی میں پانی میں غوطے لگائے جس کا اثر یہ ہوا کہ حرارت بدن میں رک گئی۔ چنانچہ وہ اتنا بیمار ہوا کہ ہلاکت کے قریب پہنچ گیا۔ جب کسی نہ کسی طرح اچھا ہوا تو ظالم نے یہ تو نہ سمجھا کہ حدیث کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے خود مصیبت میں پھنسا البتہ نفس حدیث کے بارہ میں اول فول بکنے لگا حالانکہ اگر وہ بیوقوفی اور ناسمجھی کا ثبوت نہ دیتا بلکہ یہ جانتا کہ حدیث کا یہ حکم ہر نوع کے بخار کے لئے نہیں ہے بلکہ بعض مخصوص بخار کے لئے ہے تو مصیبت میں کیوں پھنستا؟

بخار کو برا نہ کہو

(۶۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ ذُكِرَتِ الْحُمّٰی عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَسَبَّهَا رَجُلٌ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسُبَّهَا فَاِنَّهَا تَنْفِی الذُّنُوْبَ كَمَا تَنْفِی النَّارُ خَبَثَ الْحَدِیْدِ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ کے سامنے بخار کا ذکر ہوا تو ایک شخص اسے برا کہنے لگا (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "بخار کو برا نہ کہو کیونکہ بخار گناہوں کو اسی طرح دور کرتا ہے جس طرح آگ لوہے کے میل کو دور کر دیتی ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب بخار گناہوں کو دور کر دیتا ہے تو عقل و دانش کا تقاضہ یہ ہونا چاہئے کہ بخار کے معاملہ میں شکر گزاری کی راہ پر لگا جائے نہ کہ ناشکری کی جائے چنانچہ مشائخ رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ بلاو مصیبت میں بھی اسی طرح شکر خداوندی کیا جائے جس طرح نعمت و راحت میں خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ خداوند قدوس کسی پر جب کوئی بلا نازل فرماتا ہے تو اس بلاء میں بھی اس کی کوئی نہ کوئی رحمت ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔

مؤمن کامل بخار میں کیوں مبتلا ہوتا ہے؟

(۶۲) وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَادَ مَرِيْضًا فَقَالَ اَبْشِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ هِىَ نَارِى اُسَلِّطُهَا عَلٰى عَبْدِى الْمُؤْمِنِ فِى الدُّنْيَا لِتَكُوْنَ حَظَّهٗ مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (رواہ احمد و ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک بیمار کی عیادت کی (جب بخار میں مبتلا تھا) اور اس سے فرمایا کہ "تمہیں خوشخبری ہو! کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بخار میری آگ ہے۔ جسے میں اپنے بندہ پر اس لئے مسلط کرتا ہوں تاکہ وہ (بخار) اس کے حق میں قیامت کے دن دوزخ کی آگ کا بدلہ اور حصہ ہو جائے۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا یعنی تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو (قیامت کے دن) دوزخ میں داخل نہ ہو۔ لہٰذا بندہ مؤمن کو اس داخل ہونے کے بدلے میں دنیا میں بخار میں مبتلا کیا جاتا ہے اس طرح وہ بخار کی وجہ سے عذاب سے جو دوزخ میں داخل ہونے کی وجہ سے ہوتا بچا رہے گا اگرچہ داخل ہونا بایں طور سب کے لئے ہوگا کہ پل صراط دوزخ کے اوپر قائم کیا جائے گا اور اس کے اوپر سے سب ہی گزریں گے۔

مذکورہ بالا تشریح کے پیش نظر حدیث میں لفظ "مؤمن" کے ساتھ "کامل" کی قید لگا دینی چاہئے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حدیث کے مفہوم کا تعلق "مؤمن کامل" سے ہے۔ کیونکہ بعض گنہ گار مؤمن بھی آتش دوزخ کے عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے اس طرح وہ مؤمن جو اپنے گناہوں کی وجہ سے دوزخ کے عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔ حدیث کے مفہوم و مصداق سے خارج ہو جائیں گے۔

فقر و بیماری گناہوں کی بخشش کا ذریعہ

(۶۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الرَّبَّ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ وَعِزَّتِىْ وَجَلَالِىْ لَا اُخْرِجُ اَحَدًا مِنَ الدُّنْيَا اُرِيْدُ اَغْفِرُ لَهٗ حَتّٰى اَسْتَوْفِىَ كُلَّ خَطِيْئَةٍ فِىْ عُنُقِهٖ بِسَقَمٍ فِىْ بَدَنِهٖ وَاِقْتَارٍ فِىْ رِزْقِهٖ (رواہ رزین)

"اور انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ بزرگ و برتر فرماتے ہیں کہ قسم ہے اپنی عزت و بزرگی کی جس بندہ کو میں بخشا چاہتا ہوں اسے میں دنیا سے اس وقت تک نہیں اٹھاؤں گا جب تک کہ اس کے بدن کو بیماری میں مبتلا کر کے اور اس کے رزق کی تنگی میں ڈال کر اس کے ہر گناہ کا بدلہ جو اس کے ذمہ ہوں گے نہ دے لوں گا۔" (رزینؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس بندہ کو میں آخرت کی ابدی سعادت سے نوازنا چاہتا ہوں اس کے گناہوں کی سزا دنیا ہی میں بایں طور دیدیتا ہوں کہ کبھی تو اسے بیماری میں مبتلا کر دیتا ہوں کبھی مال و رزق کی تنگی اس پر مسلط کر دیتا ہوں۔ پس وہ بخشا جاتا ہے اور عذاب آخرت سے نجات پاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ فقر و بیماری اور بلاو مصیبت گناہوں کو دور کرتی ہے۔

ابن مسعودؓ کا ایک واقعہ

(۶۴) وَعَنْ شَقِيْقٍ قَالَ مَرِضَ عَبْدُاللّٰهِ ابْنُ مَسْعُوْدٍ فَعُدْنَاهُ فَجَعَلَ يَبْكِيْ فَعُوْتِبَ فَقَالَ اِنِّيْ لَا اَبْكِيْ لِاَجْلِ الْمَرَضِ لِاَنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْمَرَضُ كَفَّارَةٌ وَاِنَّمَا اَبْكِيْ اَنَّهٗ اَصَابَنِيْ عَلٰى حَالِ فَتْرَةٍ وَلَمْ يُصِبْنِيْ فِيْ حَالِ اجْتِهَادٍ لِاَنَّهٗ يُكْتَبُ لِلْعَبْدِ مِنَ الْاَجْرِ اِذَا مَرِضَ مَاكَانَ يُكْتَبُ لَهٗ قَبْلَ اَنْ يَمْرَضَ فَمَنَعَهٗ مِنْهُ الْمَرَضُ (رواہ رزین)۔

"اور حضرت شقیق فرماتے ہیں کہ (جب) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ بیمار ہوئے (تو) ہم لوگ آپ کی عیادت کو گئے، وہ ہمارے سامنے رونے لگے لوگوں نے۔ (یہ گمان کر کے کہ وہ بیماری کی تکلیف اور اپنی زندگی کی محبت کی وجہ سے رورہے ہیں) اس پر ناگواری کا اظہار کیا، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں بیماری کی وجہ سے نہیں رورہاہوں کیونکہ میں نے تو خود رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بیماری گناہوں کے دور ہونے کا سبب ہے میں تو صرف اس لئے رورہاہوں کہ میں سستی (یعنی بڑھاپے) کی حالت میں بیماری میں مبتلا ہوا قوت (یعنی جوانی) کی حالت میں بیماری میں مبتلا کیوں نہیں ہوا؟ کیونکہ جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو (اس کے ایام بیماری میں) وہی اعمال لکھے جاتے ہیں جو اس کے بیمار ہونے سے پہلے لکھے جاتے تھے اور اب بیماری نے اسے اس عمل سے باز رکھا۔" (رزینؒ)

تشریح: جوانی کے ایام میں بحالت صحت و تندرستی نیک عمل بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لئے اس بشارت کے مطابق کہ "اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے حالت بیماری میں بیمار بندہ کے نامہ اعمال میں فرشتوں کو ان اعمال کا ثواب لکھنے کا حکم دیتا ہے جنہیں وہ حالت تندرستی میں کیا کرتا تھا اور اب بیماری کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ ایام جوانی کی بیماری میں بھی بہت زیادہ اعمال کا ثواب لکھاجاتا ہے اور ایام پیری میں بحالت صحت چونکہ عمل کم ہوتے ہیں اس لئے ایام پیری کی بیماری میں بھی کم اعمال کا ثواب لکھاجاتا ہے اس لئے حضرت ابن مسعودؓ یہی فرماتے ہیں کہ کاش میں ایام جوانی میں بیمار ہوتا تاکہ میرے نامہ اعمال میں زیادہ اعمال کا ثواب لکھاجاتا۔

عیادت کب کی جائے؟

(۶۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَعُوْدُ مَرِيْضًا اِلَّا بَعْدَ ثَلَاثٍ (رواہ ابن ماجۃ والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تین دن کے بعد مریض کی عیادت کرتے تھے۔" (ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ بیمار ہونے کے تین دن بعد مریض کی عیادت کے لئے آپ تشریف لے جاتے تھے اس سلسلہ میں جہاں تک کہ مسئلہ کا تعلق ہے تو جمہور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ عیادت کسی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں ہے جب چاہے کرے خواہ پہلے کرے خواہ بعد میں۔ چنانچہ بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے بلکہ بعض حضرات نے تو اسے حدیث موضوع قرار دیا ہے۔

مریض سے اپنے لئے دعا کراؤ

(۶۶) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلْتَ عَلٰى مَرِيْضٍ فَمُرْهُ يَدْعُوْلَكَ فَاِنَّ دُعَاءَهٗ كَدُعَاءِ الْمَلَائِكَةِ (رواہ ابن مالک)

"اور حضرت عمر فاروقؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم بیمار کے پاس جاؤ تو اس سے کہو کہ تمہارے لئے دعا کرے کیونکہ اس کی دعا فرشتوں کی دعا کی طرح ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مریض کی دعا کو فرشتوں کی دعا کے مانند قرار دیا گیا ہے کیونکہ بیمار کو ملائکہ کے ساتھ بہت مشابہت ہوتی ہے بایں طور کہ جس طرح فرشتے گناہوں سے پاک و صاف رہتے ہیں، ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتے ہیں اور ہمہ وقت بارگاہ رب العزت میں دعا مناجات

اور التجا کرتے رہتے ہیں، اسی طرح بیمار بھی گناہوں سے بچتا ہے، ہر وقت اللہ ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے اور ہمہ وقت دعا و زاری اور التجا میں مصروف رہتا ہے۔

مریض کے پاس غل غپاڑہ نہ مچانا چاہئے

(۶۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مِنَ السُّنَّةِ تَخْفِيفُ الْجُلُوسِ وَقِلَّةُ الصَّخَبِ فِي الْعِيَادَةِ عِنْدَ الْمَرِيضِ قَالَ وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا كَثُرَ لَغَطُهُمْ وَاخْتِلَافُهُمْ قُوْمُوْا عَنِّي (رواہ رزین)

"اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عیادت کے وقت مریض کے پاس کم بیٹھنا اور شور و غوغا نہ کرنا سنت ہے" نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جب کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں شور و غوغا اور اختلاف زیادہ ہوا تو فرمایا کہ میرے پاس سے اٹھ کھڑے ہو۔" (رزین)

تشریح: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ عیادت کے آداب میں سے ایک ادب یہ ہے کہ مریض کے پاس عیادت کے وقت صرف اتنا عرصہ کے لئے بیٹھنا چاہئے جس میں بیمار کی مزاج پرسی اور اس کے حالات و کیفیات کا علم ہو جائے۔ گویا اس کے پاس خواہ مخواہ کے لئے زیادہ دیر تک بیٹھ کر بیمار کے مزاج پر بوجھ نہ بننا چاہئے وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ بیمار کے پاس بیٹھ کر غل غپاڑہ مچانا اور شور و غوغا کرنا مکروہ ہے۔

روایت کے دوسرے جزو کی تفصیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی کی روایت کی روشنی میں جو بخاری و مسلم میں مروی ہے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب مرض میں مبتلا ہوئے اور وصال کا وقت قریب آیا تو اس موقع پر جب کہ آپ کے پاس بہت زیادہ لوگ جمع تھے جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوات قلم لاؤ میں تمہارے لئے ایک وصیت نامہ لکھے دیتا ہوں تاکہ تم میرے بعد گمراہی میں مبتلا نہ ہو سکو! (یہ سن کر حاضرین کو مخاطب کر کے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شدت مرض غالب ہے) اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم وصیت نامہ لکھنے کے لئے فرما رہے ہیں ورنہ تو وصیت نامہ کی کیا ضرورت کیونکہ) تمہارے پاس قرآن موجود ہے اور کتاب اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد اہل بیت اور دوسرے لوگوں نے بھی اپنی اپنی بات کہنی شروع کر دی کوئی تو کہتا تھا کہ قلم و دوات لا دینا چاہئے۔ تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لئے وصیت نامہ لکھ دیں بعض لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کی تائید کر رہے تھے۔ غرض اس معاملہ میں جب بحث و مباحثہ زیادہ بڑھا اور لوگوں کے اظہار رائے نے شور و غوغا کی صورت اختیار کر لی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم سب لوگ میرے پاس سے اٹھ کھڑے ہو۔

اس صورت واقعہ سے روافض یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وصیت نامہ میں خلافت کے بارہ میں کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ (مثلاً یہ کہ میرے بعد خلیفہ اول علی رضی اللہ عنہ ہوں) مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اس سے روک دیا۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ روافض کا یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس واقعہ کی حقیقت تو یہ تھی کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وصیت نامہ لکھنے کا ارادہ فرمایا اور حاضرین میں اختلاف پیدا ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ بات آئی کہ مصلحت یہی ہے کہ کوئی وصیت نامہ نہ لکھا جائے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اپنے اختیار سے نہ صرف یہ کہ اس وقت وصیت نامہ نہیں لکھا بلکہ لکھنے کا ارادہ بھی ترک فرما دیا کیونکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے لکھنے کا مصمم ارادہ فرما لیا ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی کیا مجال تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ کی راہ میں رکاوٹ بنتے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے بعد تین دن تک زندہ رہے اور ان ایام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ موجود نہیں تھے بلکہ اہل بیت مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہما بارگاہ رسالت میں حاضر رہے اگر آپ اس موقع پر خلافت کے بارے میں کوئی وصیت نامہ لکھنے ہی میں

مصالحت سمجھتے تو ضرور لکھتے۔ پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ نے خلافت کے بارہ میں ایسا طریقہ اختیار فرمایا جس میں کسی شک و شبہ اور تاویل کی گنجائش ہی نہ رہی تھی آپ ﷺ نے اپنے آخری ایام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نماز میں لوگوں کا امام مقرر فرمایا۔ اسی وجہ سے حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے واسطے لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

"آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو ہمارے دین کے لئے امام منتخب فرمایا یعنی نماز میں ہمارا امام مقرر فرما دیا تو کیا ہم انہیں اپنی دنیا کے لئے یعنی خلافت کے لئے منتخب نہ کریں؟ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت ابوبکرؓ کو نماز میں لوگوں کا امام بننے کے لئے بلا بھیجا تو اس وقت میں آپ ﷺ کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور آپ مجھے دیکھ رہے تھے (مگر آپ نے مجھے امام مقرر نہیں فرمایا) حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارہ میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ کہ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (یعنی یہ لوگ ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے)۔"

منقول ہے کہ ابوسفیان ابن حرب نے (جب ایک موقع) حضرت علیؓ سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں ابوبکرؓ سے لڑائی کے لئے مدینہ کا میدان گھوڑوں اور پیادوں سے بھردوں (تو) حضرت علیؓ ابوسفیان کی اس بات سے بہت ناراض ہوئے اور انہیں ڈانٹا اور بہت برا بھلا کہا تاکہ نہ صرف ابوسفیان بلکہ دوسرے لوگ بھی جان لیں کہ ابوبکرؓ کی خلافت منشاء نبوت کے مطابق ہونے کی وجہ سے اتنی مستحکم اور حقیقی ہے کہ اس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نہ تو اس وقت آنحضرت ﷺ ہی نے حضرت علیؓ کی خلافت کے بارہ میں کچھ لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا اور نہ خود حضرت علیؓ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ میں حضرت ابوبکرؓ سے مقدم ہوں اور خلافت میرا حق ہے کیونکہ حضرت علیؓ اگر حضرت ابوبکرؓ پر فضیلت رکھتے اور خلافت پہلے ان کا حق ہوتا تو آنحضرت ﷺ اس کی ضرور وصیت کرتے۔ چہ جائیکہ آپ ﷺ نے اس کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں فرمایا جب کہ حضرت ابوبکرؓ کو نماز میں لوگوں کا امام مقرر فرما کر اس طرف کھلا ہوا اشارہ فرما دیا تھا کہ میرے بعد ابوبکرؓ ہی خلیفہ ہوں گے۔

عیادت کے وقت مریض کے پاس بہت کم بیٹھنا چاہئے

(۶۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِيَادَةُ فَوَاقُ نَاقَةٍ وَفِی رِوَايَةِ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ مُرْسَلاً اَفْضَلُ الْعِيَادَةِ سُرْعَةُ الْقِيَامِ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عیادت کا افضل مرتبہ اونٹنی کے دو مرتبہ دوہنے کے درمیانی وقفہ کے بقدر ہے اور حضرت سعید ابن مسیب کی روایت کے جو بطریق ارسال منقول ہے یہ الفاظ ہیں کہ "بہترین عیادت وہی ہے جس میں عیادت کرنے والا جلد اٹھ کھڑا ہو۔" (بیہقی)

تشریح: پہلی حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اونٹنی کا دودھ دو مرتبہ یا تین مرتبہ کر کے دوہتے ہیں جن کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ دودھ دوہا پھر ذرا رک گئے اور بچوں کو تھنوں سے لگا دیا تاکہ دودھ خوب اترے پھر اس کے بعد دودھ دوہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح دونوں مرتبہ کا درمیانی وقفہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا عیادت کے بارہ میں فرمایا جا رہا ہے۔ جب کوئی کسی مریض کے پاس عیادت کے لئے جائے تو اس کے لئے افضل یہ ہے کہ وہ مریض کے پاس زیادہ دیر تک نہ بیٹھے بلکہ دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیانی وقفہ کے بقدر بیٹھے تاکہ مریض کو تکلیف نہ ہو۔

کتابوں میں ایک شخص کا واقعہ منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت سری سقطیؒ کی عیادت کو گئے جب کہ وہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ ہم ان کے پاس بہت دیر تک بیٹھے رہے اس وقت ان کے پیٹ میں بہت درد ہو رہا تھا ہم نے اس سے کہا کہ آپ ہمارے لئے دعا

فرمائیے۔ انہوں نے فرمایا کہ "اے اللہ! ان لوگوں کو مریض کی عیادت کرنے کے آداب و طریقے سکھا! گویا انہوں نے اس دعا سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ مریض کے پاس جب عیادت کے لئے جائے تو زیادہ دیر تک نہ بیٹھے بلکہ تھوڑی دیر بیٹھ کر اور عیادت کر کے چلا آئے۔

ہاں اگر کوئی عیادت کرنے والا یہ جانے کہ بیمار پر اس کا زیادہ دیر تک بیٹھنا گراں نہیں گزر رہا ہے بلکہ دوست ہونے کی حیثیت سے یا برکت حاصل کرنے کی غرض سے اور یا خدمت دلداری کی وجہ سے مریض کی خواہش یہ ہے کہ وہ اس کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھے تو اس صورت میں مریض کے پاس سے جلدی اٹھ کھڑا ہونا افضل نہیں ہوگا۔

مریض جو چیز مانگے کھلادینی چاہئے

(۶۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَادَ رَجُلًا فَقَالَ لَهُ مَاتَشْتَهِيْ قَالَ اَشْتَهِيْ خُبْزَ بُرٍّ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ عِنْدَهُ خُبْزُ بُرٍّ فَلْيَبْعَثْ اِلٰى اَخِيْهِ ثُمَّ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَهٰى مَرِيْضُ اَحَدِكُمْ شَيْئًا فَلْيُطْعِمْهُ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کی عیادت کی پھر اس سے پوچھا کہ کیا چیز کھانے کو تمہارا جی چاہتا ہے؟ اس نے کہا کہ "گیہوں کی روٹی کھانے کو میرا جی چاہتا ہے" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جس شخص کے پاس گیہوں کی روٹی ہو اسے چاہئے کہ وہ اپنے بھائی کو (یعنی اس مریض) کے پاس بھیجدے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی بیمار ہو اور کسی چیز کی خواہش کرے تو اسے وہ چیز کھلادینی چاہئے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: خواہش سے مراد "خواہش" صادق ہے اور وہ صحت کی نشانی ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض مریضوں کو اس چیز کا کھانا کہ جسے کھانے کے لئے مریض کا دل چاہتا ہو نقصان دہ نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ وہ چیز مقدار میں تھوڑی ہو اور ایسی نہ ہو جس کے نقصان اور ضرر کا پہلو غالب ہو۔ لہٰذا حاصل کلام یہ ہے کہ اس حدیث کا یہ حکم اِذَا اشْتَهٰى تا فَلْيُطْعِمْهُ کلی اور عمومی طور پر نہیں ہے بلکہ جزئی اور انفرادی طور پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مریض کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ جو بھی چیز مانگے خواہ وہ اس کے مرض کے لئے کتنی ہی نقصان دہ اور مضر کیوں نہ ہو اسے دیدی جائے بلکہ بعض مخصوص حالات میں اگر کوئی مریض کسی ایسی چیز کے کھانے کی خواہش کرے جس میں نقصان اور ضرر کا پہلو غالب نہ ہو اور یہ کہ معالج اس کے خلاف نہ ہو تو وہ چیز مریض کو دے دینی چاہئے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم توکل یا زندگی سے مایوسی پر مبنی ہے یعنی جس مریض کی زندگی کی امید باقی نہ ہو اس کے بارہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ جو چیز مانگے اسے کھلادینی چاہئے۔

حالت مسافرت کی موت کی فضیلت

(۷۰) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ تُوُفِّيَ رَجُلٌ بِالْمَدِيْنَةِ مِمَّنْ وُلِدَ بِهَا فَصَلّٰى عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا لَيْتَهُ مَاتَ بِغَيْرِ مَوْلِدِهِ قَالُوْا وَلِمَ ذَاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا مَاتَ بِغَيْرِ مَوْلِدِهِ قِيْسَ لَهُ مِنْ مَوْلِدِهِ اِلٰى مُنْقَطَعِ اَثَرِهِ فِي الْجَنَّةِ (رواہ النسائی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ فرماتے ہیں کہ ایک ایسے شخص کی وفات مدینہ میں ہوئی جو مدینہ ہی میں پیدا ہوا تھا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور پھر فرمایا کہ "کاش! یہ شخص اپنے پیدا ہونے کی جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ مرا ہوتا!؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! یہ کیوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے وطن کے علاوہ کسی دوسری جگہ مرتا ہے تو اس کے وطن سے لیکن اس کے مرنے

کے مقام تک کی جگہ اس کے لئے جنت میں پیائش کی جاتی ہے۔" (نسائی"، ابن ماجہ")

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص وطن سے دور حالت سفر میں مرتا ہے تو اس کے وطن اور اس کے مرنے کی جگہ تک کے درمیان جتنی مسافت ہوتی ہے اس کے بقدر جگہ اس کو جنت میں ملتی ہے لیکن اس بارہ میں صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ سفر سے مراد سفر طاعت یعنی جہاد وغیرہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اجر و انعام اس شخص کو ملتا ہے جو جہاد کے لئے یا دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یا اسی قسم کے دوسرے بامقصد و مطلوب کام کے لئے وطن سے دور مرا ہو۔

(۷۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْتُ غُرْبَةٍ شَهَادَةٌ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حالت مسافرت کی موت شہادت ہے۔" (ابن ماجہ")

(۷۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ مَرِيْضًا مَاتَ شَهِيْدًا وَّوُقِيَ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَغُدِيَ وَرِيْحَ عَلَيْهِ بِرِزْقِهٖ مِنَ الْجَنَّةِ (رواہ ابن ماجۃ والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص بحالت مرض مرتا ہے تو وہ شہید مرتا ہے اور قبر کے فتنوں سے بچایا جاتا ہے نیز (ہر) صبح و شام اسے جنت سے رزق دیا جاتا ہے۔" (ابن ماجہ"، بیہقی")

تشریح: مشکوٰۃ کے صحیح نسخوں میں لفظ "مریضا" ہی لکھا ہوا ہے لیکن بعض نسخوں میں تغیر کر کے "مریضا" کے بجائے لفظ "غریبا" لکھ دیا گیا ہے لیکن صحیح ابن ماجہ میں لفظ "مرابطا" منقول ہے۔ اسی لئے میرک" نے مشکوٰۃ کے اپنے نسخہ کے حاشیہ میں یہ الفاظ "صوابہ مرابطا" (یعنی صحیح لفظ مرابطا ہی ہے) لکھ کر اس کے نیچے یہ لکھا ہے کہ کذافی سنن ابن ماجہ فی باب ماجاء من مات مرابطا مات شہیدا پھر یہ کہ لفظ مریضا کے بارے میں علماء نے تو لکھا ہے کہ مرض سے مراد عام مرض ہے جب کہ بعض حضرات نے خاص مرض جیسے استسقاء مراد لیا ہے۔ لیکن ملا علی قاری" فرماتے ہیں کہ یہاں ان قیود کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ یہاں راوی سے چوک ہوگئی ہے کیونکہ حدیث کے صحیح الفاظ من مات مرابطا ہیں نہ کہ من مات مریضا۔

طاعون کی موت شہید کی موت کی طرح ہے

(۷۳) وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَخْتَصِمُ الشُّهَدَاءُ وَالْمُتَوَفَّوْنَ عَلٰى فُرُشِهِمْ اِلٰى رَبِّنَا عَزَّ وَجَلَّ فِي الَّذِيْنَ يَتَوَفَّوْنَ مِنَ الطَّاعُوْنِ فَيَقُوْلُ الشُّهَدَاءُ اِخْوَانُنَا قُتِلُوْا كَمَا قُتِلْنَا وَيَقُوْلُ الْمُتَوَفَّوْنَ اِخْوَانُنَا مَاتُوْا عَلٰى فُرُشِهِمْ كَمَا مُتْنَا فَيَقُوْلُ رَبُّنَا انْظُرُوْا اِلٰى جِرَاحِهِمْ فَاِنْ اَشْبَهَتْ جِرَاحُهُمْ جِرَاحَ الْمَقْتُوْلِيْنَ فَاِنَّهُمْ مِنْهُمْ وَمَعَهُمْ فَاِذَا جِرَاحُهُمْ قَدْ اَشْبَهَتْ جِرَاحَهُمْ (رواہ احمد والنسائی)

"اور حضرت عرباض ابن ساریہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "شہداء اور وہ لوگ جو اپنے بچھونوں پر (یعنی اپنے گھروں میں) مرے ہیں (اور حقیقی شہید نہیں ہوئے ہیں) اپنے پروردگار بزرگ برتر کے سامنے ان لوگوں کے بارہ میں جو طاعون زدہ ہو کر مرے ہیں، جھگڑا کریں گے چنانچہ شہدا تو یہ کہیں گے کہ "یہ لوگ طاعون زدہ ہو کر مرے ہیں) ہمارے بھائی ہیں (یعنی ہمارے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں لہٰذا انہیں ہمارا ہم مرتبہ ہونا چاہئے) کیونکہ جس طرح ہم قتل کئے گئے تھے اسی طرح یہ بھی قتل کئے گئے تھے، اور جو لوگ اپنے بچھونوں پر مرے ہیں کہیں گے کہ "ہمارے بھائی ہیں (یعنی ہماری طرح ہیں) کیونکہ یہ لوگ اسی طرح بچھونوں پر مرے ہیں جس طرح کہ ہم مرے ہیں" پس ہمارا پروردگار فرمائے گا کہ ان کے زخموں کو دیکھا جائے اگر ان کے زخم شہدا کے زخم کی مانند ہیں تو یہ شہدا میں سے ہیں (یعنی باعتبار ثواب کے شہدا کے ہم پلہ ہیں اور (حشر و مرتبہ میں) ان کے ساتھ ہیں" چنانچہ جب دیکھا جائے گا تو ان کے زخم شہدا کے زخم کے مشابہ ہوں گے۔" (احمد" ونسائی")

تشریح: بارگاہ رب العزت میں طاعون میں مرنے والوں کے بارہ میں شہدا کی اس دلیل کہ "جس طرح ہم قتل کئے گئے اسی طرح یہ بھی قتل کئے گئے ہیں۔ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم دشمنان دین اور کفار کے ہاتھوں زخمی ہو کر مرے ہیں اسی طرح یہ بھی جنات کے ہاتھوں زخمی ہو کر مرے ہیں۔ کیونکہ علماء نے لکھا ہے کہ بسا اوقات طاعون زدہ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اسے کوئی نیزے مار رہا ہو اسی لئے اس مرض کو "طاعون" کا نام دیا گیا ہے جو "طعن" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "نیزہ مارنا" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص طاعون میں مبتلا ہو کر مرے گا وہ شہیدوں میں سے ہے اس لئے قیامت کے روز وہ ان کے ساتھ ہو گا۔

طاعون سے بھاگنے کی مذمت اور اس پر صبر کرنے کی فضیلت

(۷۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْفَارُّ مِنَ الطَّاعُوْنِ كَالْفَارِّ مِنَ الزَّحْفِ وَالصَّابِرُ فِيْهِ لَهٗ اَجْرُ شَهِيْدٍ (رواہ احمد)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "طاعون کی بیماری سے (یعنی جہاں یہ وبا پھیلی ہو وہاں) بھاگنے والا جہاد میں کفار کے مقابلہ سے بھاگنے والے کی طرح ہے اور طاعون میں صبر کرنے والے کو شہید کا ثواب ملتا ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مشابہت گناہ کبیرہ کے اعتبار سے ہے یعنی جس طرح کفار کے مقابلہ سے بھاگنے والا گناہ کبیرہ میں مبتلا ہوتا ہے اسی طرح طاعون سے بھاگنے والے کو بھی گناہ کبیرہ ہوتا ہے۔

اور یہ اعتقاد رکھتے ہوئے طاعون زدہ علاقہ سے بھاگنا کہ اگر میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا تو سلامت رہوں گا اگر نہ بھاگا تو مر جاؤں گا۔ کفر ہے۔ بظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طاعون میں صبر کرنے والے کو شہید کا ثواب ملتا ہے اگرچہ اس کی موت نہ ہو۔

بَابُ تَمَنِّى الْمَوْتِ وَذِكْرِهٖ

آرزوئے موت اور موت کو یاد رکھنے کی فضیلت کا بیان

جسمانی تکلیف و مصیبت اور دنیاوی ضرر و نقصان مثلاً مرض، تنگدستی اور دوسری بلاء و پریشانیوں کی وجہ سے موت کی آرزو کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ بے صبری اور تقدیر الٰہی پر راضی نہ ہونے کی علامت ہے۔

دیدار الٰہی کے شوق و محبت، اس سرائے فانی اور اس کی محبت سے نجات، دار البقاء پہنچنے کی خواہش اور وہاں کی نعمتوں کی تمنا میں موت کی آرزو ایمان اور کمال ایمان کی نشانی ہے۔ اسی طرح دینی ضرر و نقصان کے خوف سے بھی موت کی آرزو کرنا مکروہ نہیں ہے۔

"موت کو یاد رکھنا" دراصل کنایہ ہے اس بات سے کہ اللہ رب العزت کا خوف قلب میں جاگزین ہو، اس کی رضاء و خوشنودی کا حصول اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری ہمہ وقت پیش نظر رہے رسول کریم ﷺ کی محبت اور آن کی لائی ہوئی شریعت پر عمل ہو، توبہ و استغفار کا ورد ہو اور دنیاوی نفع و نقصان پر آخرت کے نفع و نقصان کو مقدم رکھا جائے۔ ورنہ تو محض موت کو یاد رکھنا اور یاد کرنا اور عملی طور پر بے راہ روی اختیار کرنا چنداں فائدہ مند نہیں ہے بلکہ قساوت قلب کا سبب ہے جیسا کہ غفلت کے ساتھ اللہ رب العزت کو یاد کرنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نسأل اللّٰه العافية۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

موت کی آرزو نہ کرو

(۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَمَنّٰى اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ اِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهٗ اَنْ يَّزْدَادَ

خَيْرًا وَاِمَّا مُسِيْئًا فَلَعَلَّهُ اَنْ يَسْتَعْتِبَ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص موت کی آرزو نہ کرے (کیونکہ) اگر وہ (یعنی موت کی آرزو کرنے والا) نیکو کار ہے تو ہو سکتا ہے کہ (اس کی عمر دراز ہونے کی وجہ سے) اس کے نیک اعمال میں زیادتی ہو جائے اور اگر بدکار ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ (توبہ کر کے اور لوگوں کے حقوق ادا کر کے اللہ رب العزت کی رضا و خوشنودی حاصل کر لے۔" (بخاریؒ)

② وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَمَنّٰى اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ وَلَا يَدْعُ بِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهٗ اِنَّهٗ اِذَا مَاتَ اِنْقَطَعَ اَمَلُهٗ وَاِنَّهٗ لَا يَزِيْدُ الْمُؤْمِنَ عُمُرُهٗ اِلَّا خَيْرًا (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص نہ (تو دل سے) موت کی آرزو کرے اور نہ (زبان سے) موت کی دعا مانگے قبل اس کے کہ اس کی موت آئے۔ کیونکہ انسان جب مرجاتا ہے تو (بھلائی کی زیادتی کے لئے) اس کی امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں اور مؤمن کی عمر کی درازی اس کی بھلائی ہی میں زیادتی کرتی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: ظاہر ہے کہ جب انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے تو نیکی و بھلائی کی راہیں بھی منقطع ہو جاتی ہیں کیونکہ اگر زندگی ہوگی تو اعمال نیک ہوں گے اور جب اعمال نیک ہوں گے تو سعادت و بھلائی میں زیادتی ہی زیادتی ہوگی اسی لئے فرمایا گیا کہ بندہ مؤمن کی زندگی جب دراز ہوتی ہے تو اس کیوجہ سے اس کی بھلائی و سعادت میں زیادتی ہوتی ہے کیونکہ بندہ مؤمن بلاء و مصیبت پر صبر کرتا ہے نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے، تقدیر الٰہی سے راضی رہتا ہے اور خدا تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ کے احکام کی فرمانبرداری کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کا ثواب بڑھتا ہی جاتا ہے۔

دنیاوی تکلیف و نقصان کی وجہ سے موت کی آرزو کرنے کی ممانعت

③ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ اَصَابَهٗ فَاِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص (جسمانی و مالی) ضرر و تکلیف کی وجہ سے کہ جو اسے پہنچے موت کی آرزو نہ کرے اور اگر اس قسم کی آرزو ضروری ہی ہے تو پھر یہ دعا مانگے اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ اے اللہ! مجھ کو اس وقت تک زندہ رکھ جب تک میرے لئے زندگی (موت سے) بہتر ہو اور مجھے موت دے اس وقت جب کہ میرے لئے موت (زندگی سے) بہتر ہو۔"

تشریح: نوویؒ نے فتویٰ دیا ہے کہ دینی فتنہ و فساد کے خوف سے موت کی آرزو کرنا مکروہ نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت امام شافعیؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ وغیرہما کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ان حضرات نے دینی فتنہ و فساد کے خوف سے موت کی آرزو کی تھی اسی طرح راہ خدا میں شہادت کی آرزو کرنی بھی مستحب ہے اس لئے کہ یہ حضرت عمرؓ وغیرہ سے ثابت و منقول ہے بلکہ حضرت معاذؓ کے بارہ میں تو یہاں تک منقول ہے کہ انہوں نے طاعون عمواس کے وقت موت کی آرزو کی تھی اس سے معلوم ہوا کہ شہادت کی آرزو کرنا اگرچہ وہ از قسم طاعون وغیرہ ہی کیوں نہ ہو مستحب ہے۔

مسلم میں یہ روایت منقول ہے کہ جس شخص نے صدق دل سے اور خلوص نیت کے ساتھ شہادت کی تمنا کی تو اسے شہادت کا ثواب دیا جاتا ہے (اگرچہ اسے شہادت حاصل نہ ہو سکے)

مدینہ میں موت کی آرزو کرنا مستحب ہے کیونکہ بخاریؒ میں منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ دعا مانگی تھی۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ بِبَلَدِ رَسُوْلِكَ

"اے اللہ! اپنی راہ میں مجھے شہادت نصیب فرما اور اپنے رسول کے شہر میں مجھے موت دے۔"

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک زندگی موت سے بہتر ہے جب تک کہ گناہ کے مقابلہ میں طاعات زیادہ ہوں اور زمانہ دینی فتنہ وفساد سے خالی ہو۔ ہاں جب صورت حال بالکل برعکس ہو۔ بایں طور کہ طاعات کے مقابلہ میں گناہ زیادہ ہوں اور زمانہ دینی فتنہ وفساد سے خالی نہ ہو تو پھر جینے سے مرجانا ہی بہتر ہے۔

لقاء مولیٰ اور موت

④ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ فَقَالَتْ عَائِشَةُ اَوْبَعْضُ اَزْوَاجِهٖ اِنَّا لَنَكْرَهُ الْمَوْتَ قَالَ لَيْسَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا حَضَرَهُ الْمَوْتُ بُشِّرَ بِرِضْوَانِ اللّٰهِ وَكَرَامَتِهٖ فَلَيْسَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا اَمَامَهٗ فَاَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ وَاَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَاِنَّ الْكَافِرَ اِذَا حُضِرَ بُشِّرَ بِعَذَابِ اللّٰهِ وَعُقُوْبَتِهٖ فَلَيْسَ شَيْءٌ اَكْرَهَ اِلَيْهِ مِمَّا اَمَامَهٗ فَكَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ وَكَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةِ عَائِشَةَ وَالْمَوْتُ قَبْلَ لِقَاءِ اللّٰهِ

"اور حضرت عبادہؓ ابن صامت راوی ہیں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا "جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا ہے" (یہ سن کر) اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ نے یا آپ ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کسی اور زوجہ مطہرہ نے عرض کیا کہ "ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں!!! آپ ﷺ نے فرمایا یہ (مراد) نہیں بلکہ (مراد یہ ہے کہ) جب مؤمن کی موت آتی ہے تو اس بات کی خوشخبری دی جاتی ہے کہ خدا اس سے راضی ہے اور اسے بزرگ رکھتا ہے چنانچہ وہ اس چیز سے جو اس کے آگے آنے والی ہے (یعنی اللہ کے ہاں اپنے اس فضیلت و مرتبہ سے) زیادہ کسی چیز (یعنی دنیا اور دنیا کی چمک دمک) کو محبوب نہیں رکھتا، اس لئے بندہ مؤمن اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ اور جب کافر کو موت آتی ہے تو اسے (قبر میں) خدا کے عذاب اور (دوزخ کی سخت ترین) سزا کی خبر دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اس چیز سے جو اس کے آگے آنے والی ہے (یعنی عذاب و سزا سے) زیادہ اور کسی چیز کو ناپسند نہیں کرتا اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے (یعنی اسے اپنی رحمت اور مزید نعمت سے دور رکھتا ہے)

اس روایت کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں منقول ہے کہ "موت اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے پہلے ہے۔"

تشریح: مشہور تو یہی ہے کہ لقاء مولیٰ (یعنی خدا کی ملاقات) سے مراد موت ہے، لیکن اس بارہ میں تحقیقی بات یہ ہے کہ لقاء مولیٰ سے "موت مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے" کہ آخرت کی طرف متوجہ ہونا، حق تعالیٰ کی رحمت و مغفرت اور اس کی رضا و خوشنودی کا طالب ہونا، دنیا کی طرف مائل نہ ہونا اور دنیا و آخرت کی زندگی کی محبت میں گرفتار نہ ہونا۔ لہٰذا جس شخص نے دنیا ترک کی اور دنیا اور اس کی چیزوں کو ناپسند کیا اس نے گویا لقاء مولیٰ کو پسند کیا! اور جس شخص نے دنیا کو اختیار کیا، دنیا کی چیزوں کی محبت میں گرفتار ہوا اور دنیا کی طرف اپنا میلان رکھا اس نے گویا لقاء مولیٰ کو ناپسند رکھا! یہی وجہ ہے کہ لقاء مولیٰ کا اشتیاق موت کی محبت اور اس کے اشتیاق کو لازم ہے یعنی جو شخص لقاء مولیٰ کو پسند کرے گا وہ موت کو بھی پسند کرے گا کیونکہ لقاء مولیٰ کے لئے موت وسیلہ ہے۔

ام المؤمنینؓ چونکہ یہی سمجھیں تھیں کہ لقاء مولیٰ سے مراد موت ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد لیس الامر کذالک کے ذریعہ وضاحت فرمائی کہ لقاء مولیٰ سے مراد موت نہیں ہے اور نہ یہ مراد ہے کہ بتقاضائے جبلت طبعی موت سے محبت ہو اور بالفعل موت

کی آرزو کرنی چاہئے بلکہ مراد یہ ہے کہ جو شخص رضاء حق کا طالب ہو اور لقاء مولیٰ کا شائق ہوتا ہے وہ لقاء مولیٰ کے لئے وسیلہ ہونے کی وجہ سے موت کو ہمیشہ عقلی طور پر محبوب رکھتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب زندگی کا وقت پورا ہونے لگتا ہے اور موت کا وقت قریب آتا ہے اور اسے حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خوشخبری دیدی جاتی ہے تو پھر اس وقت وہ موت کو طبعی طور پر پسند کرتا ہے اور لقاء مولیٰ کا اشتیاق اس کی طبعی خواہش کی آواز بن جاتا ہے چنانچہ حدیث کے الفاظ ولکن المؤمن الخ (یعنی جب مؤمن کو موت آتی ہے تو اس بات کی خوشخبری دی جاتی ہے کہ خدا اس سے راضی ہے الخ) اسی بات کی وضاحت کررہے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایت کے الفاظ "موت اللہ کی ملاقات سے پہلے ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار موت سے پہلے ممکن نہیں ہے بلکہ موت کے بعد ہی یہ شرف حاصل ہوتا ہے یا پھر یہ مراد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے وہ موت کو بھی پسند کرتا ہے کیونکہ اس عظیم شرف و سعادت کا حصول موت کے ذریعہ سے ممکن ہے اور یہ کہ لقاء الٰہی کا وجود موت کے وجود سے پہلے متصور نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لقاء الٰہی اور موت دونوں ایک چیز نہیں ہیں بلکہ دونوں الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔

مؤمن کی موت خود اس کی راحت کا ذریعہ ہے اور فاجر کی موت دنیا والوں کی راحت کا سبب ہے

(۵) وَعَنْ اَبِي قَتَادَةَ اَنَّهُ كَانَ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرَّ عَلَيْهِ بِجَنَازَةٍ فَقَالَ مُسْتَرِيْحٌ اَوْ مُسْتَرَاحٌ مِنْهُ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْمُسْتَرِيْحُ وَالْمُسْتَرَاحُ مِنْهُ فَقَالَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ يَسْتَرِيْحُ مِنْ نَصَبِ الدُّنْيَا وَ اَذَاهَا اِلٰى رَحْمَةِ اللّٰهِ وَالْعَبْدُ الْفَاجِرُ يَسْتَرِيْحُ مِنْهُ الْعِبَادُ وَالْبِلَادُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ "(ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ کے سامنے ایک جنازہ لایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "یہ راحت پانے والا ہے۔ یا یہ کہ اس سے دوسروں کو راحت نصیب ہوئی؟" صحابہ نے عرض کیا کہ "راحت پانے والا کون ہے" اور وہ کون ہے جس سے دوسروں کو راحت نصیب ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا "بندہ مؤمن اپنی موت کے ذریعہ دنیا کے رنج و ایذاء سے راحت پاتا ہے اور خدا کی رحمت کی طرف جاتا ہے اور بندہ فاجر (یعنی گنہ گار) کی موت کے ذریعہ اس کے شر و فساد سے بندے، شہر، درخت اور جانور (سب ہی) راحت پاتے ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب بندہ مؤمن وفات پاتا ہے تو وہ دنیا کے رنج سے بایں طور راحت پاتا ہے کہ دنیا میں اعمال و احوال کی وجہ سے وہ جس مشقت و محنت میں مبتلا تھا اس سے نجات مل جاتی ہے اور دنیا کی ایذا سے بایں طور راحت پاتا ہے کہ دنیاوی تکلیف و پریشانی مثلاً گرمی سردی، تنگدستی و مفلسی وغیرہ سے یا یہ کہ اہل دنیا کی ایذا رسانی سے اسے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ اسی لئے مسروقؒ نے کہا ہے کہ مجھے کسی چیز پر بھی کسی چیز کے سبب سے اتنا رشک نہیں آتا جتنا رشک کہ اس مؤمن پر آتا ہے جو قبر میں سلا دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے عذاب سے مامون ہو جاتا ہے اور دنیا سے راحت و سکون پالیتا ہے۔ نیز ابوداؤد فرماتے ہیں کہ "میں اپنے رب کے پاس جانے کے شوق میں موت کو پسند کرتا ہوں۔ گناہوں کے کفارہ کے لئے مرض کو پسند کرتا ہوں۔ اور اپنے رب کے سامنے تواضع و انکساری کی خاطر فقر کو پسند کرتا ہوں۔

جب بندہ فاجر یعنی گنہ گار مرتا ہے تو اس سے بندے تو یوں راحت پاتے ہیں کہ جب وہ اپنی زندگی میں خلاف شرع باتیں کرتا اور لوگ اسے منع کرتے تو وہ انہیں ایذا پہنچاتا اور اگر سکوت و خاموشی اختیار کرتے تو اپنے دین اور اپنی دنیا کو نقصان پہنچاتے۔ اور جب وہ گنہ گار مر گیا تو لوگوں نے اس سے چھٹکارا پایا۔ اور شہر و درخت وغیرہ اس کے مرنے سے بایں طور راحت پاتے ہیں کہ گناہ و ظلم ہونے کی وجہ سے عالم میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ ارکان دین میں خلل واقع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ گنہ گار و ظالم کو مبغوض رکھتا ہے لہٰذا اس کی وجہ سے زمین اور وہ تمام چیزیں جو زمین میں ہیں نقصان اٹھاتی ہیں پھر یہ کہ اس کے شومی گناہ کے سبب اللہ تعالیٰ بارش نہیں برساتا، اب جب کہ

مرا تو بادلوں نے اپنے منہ کھول دیئے اور زمین کا شجر و پودا ہرا بھرا ہو گیا اور اس طرح سب ہی نے راحت پائی۔

دنیا میں مسافر بلکہ راہ گیر کی طرح رہو

⑥ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمَنْکِبِی فَقَالَ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْعَابِرُ سَبِیْلٍ وَکَانَ ابْنُ عُمَرَ یَقُوْلُ اِذَا اَمْسَیْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ وَمِنْ حَیَاتِكَ لِمَوْتِكَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (پہلے تو) میرا مونڈھا پکڑا (تاکہ میں متنبہ ہو جاؤں) پھر فرمایا "تم دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر بلکہ راہ گیر ہو" حضرت ابن عمرؓ (اس کے بعد لوگوں سے) فرمایا کرتے تھے کہ "جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو، نیز اپنی صحت کو بیماری سے غنیمت جانو، اور اپنی زندگی کو موت سے غنیمت سمجھو۔"
(بخاریؒ)

تشریح: یہاں حدیث میں لفظ بمنکبی حرف یا کے سکون کے ساتھ بصیغہ مفرد نقل کیا گیا ہے جب کہ مشکوٰۃ کے ایک دوسرے نسخہ میں حرف یا کے تشدید کے ساتھ بصیغہ تثنیہ منقول ہے۔

فَاِنَّكَ غَرِیْبٌ (گویا تم مسافر ہو) کا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا کی طرف رغبت نہ رکھو اس لئے کہ تم اس دنیا سے آخرت کی طرف سفر کرنے والے ہو، لہٰذا تم اس دنیا کو اپنا وطن نہ بناؤ، دنیا کی لذتوں کے ساتھ الفت نہ رکھو اور دنیادار لوگوں سے اور ان کے اختلاط سے اپنے آپ کو بچاؤ کیونکہ تم ان سب لوگوں سے جدا ہونے والے ہو، اس دنیا میں اپنی بقا کو وہم و گمان بھی نہ رکھو، ان امور سے قطعا اجتناب کرو جن سے ایک مسافر غیر وطن میں اجتناب کرتا ہے اور ان چیزوں سے مشغول نہ رہو جن میں وہ مسافر کہ جو اپنے اہل و عیال اور اپنے وطن کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہے، مشغول نہیں ہوتا، گویا کہ تم کلیۃً اس دنیا میں بالکل اسی طرح رہو جس طرح کہ ایک مسافر اپنے وطن اور اپنے اہل و عیال سے دور غیر وطن میں رہتا ہے۔

پھر آگے زیادہ مبالغہ کے ساتھ فرمایا کہ "بلکہ ایک راہ گیر (راستہ چلنے والے) کی طرح رہو کیونکہ مسافر تو اپنے سفر کے دوران مختلف شہروں میں قیام بھی کر لیتا ہے بخلاف راستہ چلنے والے کے کہ وہ تو کسی جگہ قیام بھی نہیں کرتا۔

لہٰذا دنیا کو نہ صرف یہ کہ سفر گاہ سمجھنا چاہئے بلکہ یہ خیال کرنا چاہئے کہ راستہ چل رہا ہوں نہ تو وطن میں ہوں اور نہ حالت سفر میں کہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔

"جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو الخ" اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو اپنی موت کے وقت کا علم نہیں ہے نہ معلوم موت کا پنجہ کس وقت گردن آ دبوچے، ایک لمحے کے لئے بھی کسی زندگی کا بھروسہ نہیں ہے صبح کے وقت کسی کو معلوم نہیں کہ شام کا وقت دیکھنا بھی نصیب ہو گا یہ نہیں، شام کے وقت کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ صبح تک اس کی زندگی ضرور ہی باقی رہے گی حاصل یہ کہ صبح و شام ہر وقت تم موت کو اپنے سامنے حاضر سمجھو، زندگی کی آرزوں اور تمناؤں کو دراز نہ کرو، عمل خیر کرنے میں پیش روی اختیار کرو دن کی عبادات اور نیک اعمال کو رات پر اور رات کی عبادات و نیک اعمال کو دن پر اٹھا نہ رکھو کیونکہ ؎

غنیمتے شمر اے شمع وصل پروانہ کہ ایں معاملہ تا صبح دم نہ خواہد ماند

"صحت کو بیماری سے غنیمت جانو" کا مطلب یہ ہے کہ صحت و تندرستی کی حالت میں جس قدر ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرو تاکہ حالت بیماری میں جب کہ تم نیک اعمال کرنے پر قادر نہ رہو گے ویسا ہی ثواب پا سکو۔

"اپنی زندگی کو موت سے غنیمت جانو" یعنی تمہاری جتنی بھی زندگی ہے اس میں عمل ہی عمل کئے جاؤ تاکہ جب یہ زندگی اپنا وقت پورا

کرے اور تم موت کی آغوش میں پہنچ جاؤ تو پھر اس کے بعد تمہاری زندگی کے انہیں اعمال کا ثواب تمہیں پہنچتا رہے ۔

غنیمت داں جوانا دولت حسن جوانی را نہ پنداری کہ ایام جوانی جاوداں باشد

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے الفاظ اِذَا اَمْسَیْتَ...... مِنْ حَیَاتِكَ لِمَوْتِكَ حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد موقوف ہے لیکن "احیاء العلوم" میں اسے مرفوعاً یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

خدا کی ذات سے رحمت ہی کی امید رکھو

⑦ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِثَلَاثَةِ اَيَّامٍ يَقُوْلُ لَا يَمُوْتَنَّ اَحَدُكُمْ اِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰهِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو وفات سے تین دن پہلے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تم میں سے کوئی شخص اس حال میں نہ مرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان نہ رکھتا ہو۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور بخشش پر کامل اعتقاد اور اس کے وعدہ رحم و کرم پر اعتقاد رکھنا چاہئے اور ہمہ وقت اس کے کرم اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا چاہئے۔ نیز یہ کہ ہر شخص اللہ کے ساتھ ہر وقت اچھا گمان رکھے کہیں ایسا نہ ہو کہ بدگمانی اور رحمت سے مایوسی کی حالت میں مر جائے اور وہ مبتلائے قہر خداوندی ہو۔

علماء نے لکھا ہے کہ اخروی سعادت کی علامت یہ ہے کہ زندگی کے پورے عرصے میں خوف غالب رہے اور جب مرنے کے قریب پہنچے تو اس کی رحمت و بخشش کی امید غالب رہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ "اللہ کے ساتھ نیک گمان رکھنے" سے مراد "نیک اعمال کرنا ہے" یعنی اپنی زندگی میں اچھے اعمال کرنے چاہئیں تاکہ موت کے وقت خدا کے ساتھ اچھا گمان رہے کیونکہ جس کی زندگی خدا کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کی خاطر عبادات و نیک اعمال میں گزاری ہوگی۔ وہ مرنے کے وقت خدا کے ساتھ یہی نیک گمان قائم کئے رہے گا کہ انشاء اللہ میرے ساتھ اچھا ہی معاملہ ہوگا اس کے برخلاف جس کی زندگی خدا کی نافرمانی اور برے اعمال میں گزری ہوگی وہ موت کے وقت خدا کے ساتھ برا ہی گمان رکھے گا کیونکہ جب موت سر پر کھڑی ہوگی تو اسے اپنی زندگی کے برے اعمال یاد آئیں گے اس وقت اسے خیال پیدا ہوگا کہ میرے ساتھ اچھا معاملہ نہیں ہوگا۔

نیز علماء لکھتے ہیں کہ "امید" کی حقیقت یہ ہے کہ عمل کرے اور امید رکھے خدمت مولیٰ کرے اور نظر اس کی عطا پر رکھے نہ کہ جھوٹی امید جو عمل سے باز رکھے اور گناہوں کا باعث ہو، یہ امید نہیں ہے بلکہ آرزو اور غرور ہے۔

حضرت امام حسن بصریؒ کا یہ قول منقول ہے کہ "اگر تم میں سے کوئی شخص (جو بے عمل ہے) یہ کہتا ہے کہ میں اپنے پروردگار کے ساتھ اچھا گمان رکھتا ہوں تو وہ جھوٹ کہتا ہے کیونکہ اگر وہ اپنے پروردگار کے ساتھ اچھا گمان رکھتا تو نیک عمل بھی کرتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

قیامت کے دن خدا کا سب سے پہلا سوال

⑧ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ شِئْتُمْ اَنْبَاْتُكُمْ مَا اَوَّلُ مَا يَقُوْلُ اللّٰهُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَا اَوَّلُ مَا يَقُوْلُوْنَ لَهٗ قُلْنَا نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ هَلْ اَحْبَبْتُمْ لِقَائِيْ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ يَا رَبَّنَا فَيَقُوْلُ لِمَ فَيَقُوْلُوْنَ رَجَوْنَا عَفْوَكَ وَمَغْفِرَتَكَ فَيَقُوْلُ قَدْ وَجَبَتْ لَكُمْ مَغْفِرَتِيْ۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَاَبُوْنُعَيْمٍ فِيْ

الْحِلْیَةِ

"حضرت معاذ ابن جبلؓ راوی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (ہمیں مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ "اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہ بات بتادوں جو اللہ قیامت کے دن سب سے پہلے مؤمنین سے فرمائے گا اور وہ بات بھی بتادوں جو سب سے پہلے مؤمنین اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے؟ ہم نے عرض کیا کہ "ہاں رسول اللہ! (ہمیں ضرور بتادیجئے) آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ مؤمنین سے فرمائے گا کہ کیا تم میری ملاقات کو پسند کرتے تھے مؤمنین عرض کریں گے کہ ہاں! اے ہمارے رب (ہم تیری ملاقات کو پسند کرتے تھے) پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ "تم میری ملاقات کو کیوں پسند کرتے تھے؟ مؤمنین عرض کریں گے "اس لئے کہ ہم تجھ سے معافی و درگزر اور تیری بخشش و مغفرت کی امید رکھتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تمہارے لئے میری بخشش واجب ہوگئی۔ یہ روایت شرح السنۃ میں ابونعیم نے حلیہ میں نقل کی ہے۔"

تشریح: ہوسکتا ہے کہ "ملاقات" سے مراد "دار آخرت کی طرف رجوع کرنا" ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ "ملاقات" سے مراد حق تعالیٰ کا دیدار ہو۔

ابن مالکؒ نے کہا ہے کہ حدیث میں لفظ لِمَ کے بعد یہ الفاظ ہونے چاہئیں لِاَیِّ سَبَبٍ اَذْنَبْتُمْ یعنی حق تعالیٰ پھر فرمائے گا کہ تم نے کیوں گناہ کئے ہیں؟ لیکن صحیح یہی الفاظ ہیں لِمَ اَحْبَبْتُمْ لِقَائِی یعنی میری ملاقات کو کیوں پسند کرتے تھے" جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

موت کو کثرت سے یاد کرو

(۹) وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتُ (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(دنیا کی) لذتوں کو کھودینے والی چیز کو، کہ جو موت ہے کثرت سے یاد کرو۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: صحیح یہی ہے کہ لفظ "ھاذم" ذال کے ساتھ ہے جس کے معنی ہیں قطع کرنے والا، چنانچہ جن لوگوں نے دال کے ساتھ یعنی لفظ "ہادم" بمعنی ڈھانے والا جو نقل کیا ہے صحیح نہیں ہے ہوسکتا ہے کہ اس بارہ میں کسی راوی سے چوک ہوگئی ہو۔

بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ موت کو کثرت سے یاد کرنا چاہئے کیونکہ موت کو یاد کرنے سے غفلت جو نیک اعمال کے راستہ میں رکاوٹ بنتی ہے دور ہوتی ہے، موت کی یاد دنیا (کے برے کاموں) کی مشغولیت سے باز رکھتی ہے اور موت کو یاد کرنے والا طاعات و عبادات کی طرف متوجہ رہتا ہے جو توشۂ آخرت ہے۔

نسائی نے اس روایت میں یہ الفاظ مزید نقل کئے ہیں۔ فَاِنَّهٗ لَا یَذْكُرُ فِیْ كَثِيْرٍ اِلَّا قَلَّلَهٗ وَلَا فِیْ قَلِيْلٍ اِلَّا كَثَّرَهٗ (ترجمہ) جب مال کی زیادتی میں موت یاد آتی ہے تو وہ مال کو کم کردیتی ہے (یعنی موت یاد آجانے کی وجہ سے مال کی طرف کوئی رغبت نہیں رہتی اور مال کو فانی سمجھنے لگتا ہے اس لئے اس وقت زیادہ مال بھی نظروں میں حقیر ہوجانے کی وجہ سے کم ہی محسوس ہوتا ہے) اور جب مال کی کمی میں موت یاد آجاتی ہے تو وہ مال کو زیادہ کردیتی ہے (یعنی جب موت یاد آتی ہے تو دنیا کو فانی سمجھ کر کم مال پر قناعت کرتا ہے اس لئے تھوڑا مال بھی زیادہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

اللہ سے حیا کرنے کا حق

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَاتَ يَوْمٍ لِاَصْحَابِهِ اسْتَحْيُوْا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ قَالُوْا

اِنَّا نَسْتَحْیِیْ مِنَ اللّٰہِ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ قَالَ لَیْسَ ذٰلِكَ وَلٰکِنْ مَنِ اسْتَحْیٰی مِنَ اللّٰہِ حَقَّ الْحَیَاءِ فَلْیَحْفَظِ الرَّاْسَ وَمَا وَعٰی وَلْیَحْفَظِ الْبَطْنَ وَمَا حَوٰی وَلْیَذْکُرِ الْمَوْتَ وَالْبِلٰی وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ تَرَكَ زِیْنَةَ الدُّنْیَا فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدِ اسْتَحْیٰی مِنَ اللّٰہِ حَقَّ الْحَیَاءِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ ایک روز نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ "اللہ سے حیا کرو جیسا کہ حیا حق ہے (یعنی جس طرح اللہ سے حیا کرنی واجب ہے) اور جس حیا کا وہ لائق ہے اس حیا کا حق ادا کرو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا جو حق ہے اس حق کو ادا کرو) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا نبی اللہ! ہم بلاشبہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے ہیں (بایں طور کہ فی الجملہ اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرتے ہیں) اور تعریف اللہ کے لئے ہے (یعنی خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں یہ توفیق عطا فرمائی ہے" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "حیا کا حق یہ نہیں ہے جسے تم یہ کہتے ہو کہ ہم خدا سے حیا کرتے ہیں بلکہ (حیا کا حق تو یہ۔ ہے کہ) جو شخص اللہ سے حیا کرنے میں حیا کا حق ادا کرے تو اسے چاہئے کہ وہ سر کی اور جو کچھ سر کے ساتھ ہے اس کی محافظت کرے پیٹ کی اور جو کچھ پیٹ کے ساتھ ہے اس کی محافظت کرے اور اسے چاہئے کہ موت کو اور ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے کو یاد رکھے، اور جو شخص آخرت کی بھلائی کا ارادہ کرتا ہے وہ دنیا کی زینت و آرائش کو چھوڑ دیتا ہے" لہٰذا جس شخص نے یہ (مذکورہ بالا ہدایت پر عمل) کیا اس نے اللہ تعالیٰ سے حیا کی اور حق حیا ادا کیا" احمد و ترمذیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "سر کی محافظت کا مطلب یہ ہے کہ سر جسے خدا نے شرف مکرمت سے نوازا ہے خدا کے علاوہ کسی اور کے کام نہ آئے۔ سر کو جسے خدا نے انسانی تقدس عطا فرمایا ہے انسان کے ہاتھوں تراشے گئے فانی بتوں اور خود انسانوں کے سامنے سجدہ ریز کر کے ذلیل نہ کیا جائے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے اور اپنی دینداری کا سکہ جمانے کے لئے نماز نہ پڑھی جائے۔ سر کو خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے جھکایا نہ جائے۔ اور سر کو ازراہ غرور و تکبر بلند نہ کیا جائے۔

"سر کے ساتھ" کی چیزوں سے مراد ہیں، زبان، آنکھ، اور کان اور ان چیزوں کی محافظت کا مطلب یہ ہے کہ ان اعضاء کو گناہ سے بچایا جائے، جیسے زبان کو غیبت میں مبتلا نہ کیا جائے اور نہ جھوٹ بولا جائے، آنکھ سے نامحرم اور گناہ کی چیزیں نہ دیکھی جائیں اور کان سے کسی کی غیبت اور جھوٹ مثلاً کہانی وغیرہ نہ سنی جائے۔

"پیٹ کی محافظت" کا مطلب یہ ہے کہ حرام اور مشتبہ چیزیں نہ کھائی جائیں۔

"پیٹ کے ساتھ چیزوں سے جسم کے وہ حصے اور اعضاء مراد ہیں جو پیٹ سے ملے ہوئے ہیں، جیسے ستر، ہاتھ پاؤں اور دل وغیرہ، مطلب یہ ہے کہ جسم کے ان اعضاء اور حصوں کی بھی گناہ سے محفوظ رکھا جائے مثلاً ستر کو حرام کاری میں مبتلا نہ کیا جائے، گناہ و فواحش کی جگہ جیسے، میلے، تماشے، ناچ گانے میں نہ جایا جائے کہ اس طرح پاؤں معصیت سے محفوظ رہیں گے ہاتھوں سے کسی کو کسی بھی طرح کی ایذا نہ پہنچائی جائے۔ جیسے نہ تو کسی کو مارے پیٹے، نہ کسی کا مال چوری کر کے یا چھین کر لے اور نہ نامحرم کو ہاتھ لگائے، اسی طرح دل کو برے عقیدوں، گندے خیالات اور خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی یاد سے پاک رکھا جائے۔

آخر میں انسان کے جسم خاکی کے فانی ہونے کا احساس دلایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ اس بات کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ آخرت کا ایک نہ ایک دن اس دنیا سے تعلق ہو جائے گا اور یہ فانی جسم خواہ کتنا ہی حسین و جمیل اور باعظمت کیوں نہ ہو قبر کی آغوش میں سلا دیا جائے گا۔ جہاں گوشت تو گوشت ہڈیاں تک بوسیدہ و خاک ہو جائیں گی۔

پھر اس کے بعد وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ الخ فرما کر ایک ضابطہ بیان فرما دیا گیا ہے کہ جو شخص جانتا ہے کہ دنیا فانی ہے وہ دنیا اور دنیا کی لذات و خواہشات کو ترک کر دیتا ہے، نیز یہ کہ جو شخص آخرت کے ثواب اور وہاں کی ابدی نعمتوں اور سعادتوں کی خواہش رکھتا ہے وہ دنیا کی ظاہری زیب و زینت چھوڑ دیتا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں پورے کمال کے ساتھ کسی ایک شخص میں یہاں تک کہ اولیا میں بھی جمع نہیں

ہو سکتیں۔

اس حدیث کو لوگوں کے سامنے زیادہ سے زیادہ بیان کرنا، اس کی اشاعت کرنا اور اس کے مفہوم و مطالب سے عوام کو باخبر کرنا بڑی سعادت اور فضیلت کی بات ہے۔ چنانچہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو کثرت کے ساتھ ذکر و بیان کرنا مستحب ہے۔

موت تحفۂ مومن ہے

⑪ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہؓ ابن عمرو راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "مؤمن کا تحفہ موت ہے" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مؤمن کے حق میں موت اللہ تعالیٰ کی جانب سے بمنزلہ تحفہ ہے، کیونکہ مؤمن موت کے ذریعہ آخرت کے اجر و ثواب اور وہاں کے بلند درجات کو پہنچتا ہے۔

پیشانی کے پسینے کے ساتھ مرنے کا مطلب اور اس کی حقیقت

⑫ وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ يَمُوْتُ بِعَرَقِ الْجَبِيْنِ (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمن پیشانی کے پسینے کے ساتھ مرتا ہے۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ "پیشانی کے پسینہ کے ساتھ مرنا" جان کنی کی شدت سے کنایہ ہے جس کے سبب سے مرنے والے کے گناہ دور ہوتے ہیں اور آخرت میں اس کے مرتبے بلند ہوتے ہیں۔

بعضوں نے کہا ہے کہ یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ مؤمن تادم مرگ حلال روزی کی طلب میں مشقت و محنت اٹھاتا ہے اور عبادت میں ریاضت و مجاہدہ کرتا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ "مرنے کے وقت پیشانی پر پسینہ آنا" سعادت و بھلائی کی علامت ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ "اس سے مراد یہ ہے کہ موت مؤمن کے لئے مشقت و شدت اور کرب و تکلیف کا سبب نہیں ہے سوائے اس کے کہ صرف اس کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم

ناگہانی موت

⑬ وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْتُ الْفُجَاءَةِ اَخْذَةُ الْاَسَفِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَ زَادَ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَرَزِيْنٌ فِيْ كِتَابِهٖ اَخْذَةُ الْاَسَفِ لِلْكَافِرِ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِ۔

"اور حضرت عبید اللہ ابن خالد راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ناگہانی موت (اللہ کے) غضب کی پکڑ ہے۔" (ابوداؤد) بیہقی نے شعب الایمان میں اور رزینؒ نے اپنی کتاب میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ "غضب کی پکڑ کافر کے لئے ہے۔ مگر مؤمن کے لئے رحمت ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ناگہانی موت غضب خداوندی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کیونکہ اچانک موت واقع ہو جانے کی صورت میں مرنے والے کو اتنی بھی مہلت نہیں ملتی کہ سفر آخرت کی تیاری کرے بایں طور کہ توبہ و استغفار کر کے اپنے گناہوں کی بخشش چاہے اور نیک و صالح اعمال کر کے بارگاہ رب العزت میں سرخروئی حاصل کرے لیکن علماء لکھتے ہیں کہ یہ یعنی "ناگہانی موت کو

غضب کی پکڑ" فرمانا کافروں کے لئے ہے اور ان لوگوں کے لئے ہے جو نیک راستہ پر نہیں ہیں جیسا کہ حدیث کے آخری الفاظ سے کہ جسے بیہقی اور رزینؒ نے نقل کیا ہے معلوم ہوتا ہے۔ گویا حاصل کلام یہ ہوا کہ ناگہانی موت اچھے و نیک لوگوں کے لئے اچھی چیز ہے اور برے و بدکار لوگوں کے لئے بری چیز ہے۔

موت کے وقت رحمت خداوندی کی امید

⑭ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى شَابٍّ وَهُوَ فِي الْمَوْتِ فَقَالَ كَيْفَ تَجِدُكَ قَالَ اَرْجُو اللّٰهَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنِّي اَخَافُ ذُنُوْبِي فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَجْتَمِعَانِ فِيْ قَلْبِ عَبْدٍ فِيْ مِثْلِ هٰذَا الْمَوْطِنِ اِلَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ مَا يَرْجُو وَاٰمَنَهٗ مِمَّا يَخَافُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) نبی کریم ﷺ ایک جوان کے پاس تشریف لے گئے جو سکرات الموت میں مبتلا تھا آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "تم اپنے آپ کو کس حال میں پاتے ہو؟ (یعنی اس وقت آیا تمہارا دل رحمت خداوندی کی امید سے بھرپور ہے یا غضب خداوندی سے ہراساں و ترساں؟ اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں (یعنی اپنے آپ کو رحمت خداوندی کی رحمت کا امیدوار پاتا ہوں) لیکن اس کے باجود اپنے گناہوں سے خوف زدہ (بھی ہوں) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جب ایسے وقت میں بندہ کے دل میں خوف و امید (دونوں) جمع ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز عنایت فرماتا ہے جس کی وہ امید رکھتا ہے (یعنی اپنی رحمت) اور اسے اس چیز سے (یعنی عذاب سے) امن میں رکھتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے" ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "ایسے وقت" سے مراد یا تو خاص طور پر سکرات الموت کا وقت ہے یا پھر ایسے اوقات بھی مراد ہیں جو سکرات الموت کے وقت کی طرح ہوتے ہیں جن میں انسان حکما بالکل موت کے کنارے پر ہوتا ہے جیسے لڑائی کا وقت یا قصاص کا وقت یا اسی قسم کے دوسرے اوقات۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

نیک اعمال میں زیادتی کے لئے درازی عمر باعث سعادت ہے

⑮ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَمَنَّوُا الْمَوْتَ فَاِنَّ هَوْلَ الْمُطَّلَعِ شَدِيْدٌ وَاِنَّ مِنَ السَّعَادَةِ اَنْ يَطُوْلَ عُمْرُ الْعَبْدِ وَيَرْزُقَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ الْاِنَابَةَ (رواه احمد)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "موت کی آرزو نہ کرو کیونکہ جان کنی کا خوف سخت ہے، بیشک یہ نیک بختی ہے کہ بندہ کی عمر دراز ہو اور اللہ تعالیٰ اسے طاعات کی طرف پھیر دے۔" (احمدؒ)

تشریح: مُطَّلَعْ اس بلند جگہ کو کہتے ہیں جس پر چڑھ کر کسی چیز کو دیکھتے ہیں، یہاں حدیث کے الفاظ میں "مطلع" سے مراد سکرات الموت اور اس کی سختی ہے کہ پہلے انسان اس میں گرفتار ہوتا ہے پھر مرتا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ موت کی آرزو میں کوئی فائدہ اور نیک بختی نہیں ہے، جو شخص موت کی آرزو کرتا ہے وہ غم و آلام کی سختی دل شکستگی اور صبر و عزم کی کمی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے لہٰذا مرتے وقت اس کا غم اور اس کی دل شکستگی و مایوسی اور زیادہ ہوگی اور ایسے میں غضب خداوندی کا مستحق بھی ہوگا اس لئے موت کی آرزو سے کیا فائدہ؟ اس سے معلوم ہوا کہ بے صبری اور دل شکستگی و مایوسی کی وجہ سے موت کی آرزو ممنوع ہے ہاں دیدار الٰہی کے اشتیاق و شوق اور عالم آخرت کی محبت کی وجہ سے موت کی آرزو جائز ہے۔

حدیث کے الفاظ ان من السعادۃ سے آرزوئے موت کی ممانعت کی دوسری علت یہ بیان فرمائی جارہی ہے کہ موت کی آرزو نہ کرو کیونکہ موت تو خود ایک نہ ایک دن آنے ہی والی ہے، دنیا کی اس چند روزہ زندگی کو غنیمت جانو اور اس زندگی میں آخرت کے لئے جو کچھ توشہ تیار کر سکتے ہو کر لو، یعنی نیک اعمال کئے جاؤ تاکہ جب موت آ ہی جائے اور تم اس دنیا سے دار البقاء کو سدھارو تو تمہارا دامن نیک و صالح اعمال کی سعادت سے بھرپور ہو۔ اَلدُّنْیَا مَزْرَعُ الْاٰخِرَۃِ یعنی یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہاں نیک اعمال کرو گے تو وہاں کام آئیں گے۔

(۱۶) وَعَنْ اَبِی اُمَامَۃَ قَالَ جَلَسْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَّرَنَا وَرَقَّقَنَا فَبَکٰی سَعْدُ بْنُ اَبِی وَقَّاصٍ فَاَکْثَرَ الْبُکَاءَ فَقَالَ یَا لَیْتَنِی مِتُّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا سَعْدُ اَعِنْدِیْ تَتَمَنَّی الْمَوْتَ فَرَدَّدَ ذٰلِکَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ یَا سَعْدُ اِنْ کُنْتَ خُلِقْتَ لِلْجَنَّۃِ فَمَا طَالَ عُمُرُکَ وَحَسُنَ مِنْ عَمَلِکَ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکَ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) ہم لوگ رسول کریم ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے، آپ ﷺ نے پند و نصیحت فرمائی اور (آخرت کا خوف دلا کر) ہمارے دلوں کو نرم کر دیا، چنانچہ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ رونے لگے اور بہت روئے اور پھر کہنے لگے کہ "کاش! میں (بچپن ہی میں) مر جاتا (تو گنہ گار نہ ہوتا اور عذاب آخرت سے نجات پاتا) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "سعد! کیا تم میرے سامنے موت کی آرزو کرتے ہو؟" اور آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین بار کہے اور پھر ارشاد فرمایا "سعد! اگر تم جنت کے لئے پیدا کئے گئے ہو تو تمہاری عمر جس قدر دراز ہوگی اور جتنے اچھے اعمال ہوں گے اسی قدر تمہارے لئے بہتر ہوگا۔" (احمدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی "کیا تم میرے سامنے موت کی آرزو کرتے ہو"؟ کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد تو موت کی آرزو کے لئے کوئی وجہ ہو سکتی ہے مگر میرے ہوتے ہوئے موت کی آرزو کیسی"؟ کیوں کہ میرے جمال باکمال کا دیدار اور میری صحبت کا شرف عظیم تمہارے لئے ہر نعمت سے بہتر اور اعلیٰ ہے اگرچہ میرے سامنے مرنے کے بعد تمہیں وہاں کے اعلیٰ مراتب اور نعمتیں ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔ اور اس میں کیا شک کہ سرکار دوعالم ﷺ کے روئے مقدس اور چہرہ مبارک کے دیدار کے مرتبہ عظیم کو اور کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی۔

ایک مرد عارف سے کسی شخص نے پوچھا کہ مؤمن کے لئے جینا بہتر ہے یا مرنا؟ اس نے عارفانہ جواب دیا کہ "زمانہ نبوت میں جب کہ سرکار دوعالم ﷺ کے جمال جہاں آرا کے دیدار کی نعمت عظمیٰ حاصل تھی) مؤمن کے لئے جینا بہتر تھا اور اب ان کے بعد تو مرنا ہی بہتر ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کے بعد دوسری شق ذکر نہیں فرمائی گئی ہے جو گویا یہاں محذوف ہے اور وہ یہ ہے کہ وَاِنْ کُنْتَ خُلِقْتَ لِلنَّارِ فَلَا خَیْرَ فِیْ مَوْتِکَ وَلَا یُحْسِنُ الْاِسْرَاعُ اِلَیْہِ یعنی اور اگر تم (نعوذ باللہ) آگ کے لئے پیدا کئے گئے ہو تو جب بھی نہ مرنے میں بھلائی ہے اور نہ موت کے لئے جلدی کرنی اچھی بات ہے۔

حضرت خبابؓ کا واقعہ

(۱۷) وَعَنْ حَارِثَۃَ بْنِ مُضَرِّبٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی خَبَّابٍ وَقَدِ اکْتَوٰی سَبْعًا فَقَالَ لَوْلَا اَنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَتَمَنَّ اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ لَتَمَنَّیْتُہٗ وَلَقَدْ رَاَیْتُنِیْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَمْلِکُ دِرْھَمًا وَاِنَّ فِیْ جَانِبِ بَیْتِی الْاٰنَ لَاَرْبَعِیْنَ اَلْفَ دِرْھَمٍ قَالَ ثُمَّ اُتِیَ بِکَفَنِہٖ فَلَمَّا رَاٰہُ بَکٰی وَقَالَ لٰکِنْ حَمْزَۃُ لَمْ یُوْجَدْ لَہٗ کَفَنٌ اِلَّا بُرْدَۃٌ مَلْحَاءُ اِذَا جُعِلَتْ عَلٰی رَاْسِہٖ قَلَصَتْ عَنْ قَدَمَیْہِ وَاِذَا جُعِلَتْ عَلٰی قَدَمَیْہِ قَلَصَتْ عَنْ رَاْسِہٖ حَتّٰی مُدَّتْ عَلٰی رَاْسِہٖ وَجُعِلَ عَلٰی قَدَمَیْہِ الْاِذْخِرُ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ اِلَّا اَنَّہٗ لَمْ یَذْکُرْ ثُمَّ اُتِیَ بِکَفَنِہٖ اِلٰی اٰخِرِہٖ۔

"اور حضرت حارثہ ابن مضرب (تابعی) فرماتے ہیں کہ میں حضرت خباب (صحابی) کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ (وہ بیمار تھے) اور انہوں نے اپنے بدن پر سات جگہ داغ لگوائے تھے چنانچہ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ "اگر میں نے رسول پاک ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نہ سنا ہوتا "تم میں سے کوئی شخص موت کی آرزو نہ کرے" تو میں ضرور موت کی آرزو کرتا۔ میں نے رسول کریم ﷺ کے ہمراہ اپنے تئیں دیکھا ہے میں ایک درہم کا مالک بھی نہیں تھا اور اب یہ حال ہے کہ میرے گھر کے کونے میں چالیس ہزار درہم پڑے ہیں" حضرت حارثہ فرماتے ہیں کہ پھر حضرت خباب کے پاس ان کا کفن لایا گیا (جو بہت اعلیٰ اور نفیس تھا) جب انہوں نے اسے دیکھا تو رونے لگے اور فرمایا کہ اگرچہ یہ کفن جائز ہے لیکن) حضرت امیر حمزہ کو (پورا) کفن نہیں ملا صرف ایک سیاہ اور سفید دھاری والی چادر تھی اور (وہ بھی اتنی چھوٹی تھی) جب ان کے سر پر اڑھائی جاتی تو پیر کھل جاتے تھے اور جب ان کے پیر پر ڈالی جاتی تھی تو سر کھل جاتا تھا۔ آخر کار اس چادر سے سر کو ڈھانک دیا گیا اور پیروں کو "اذخر" سے چھپایا گیا" اس روایت کو احمد اور ترمذی نے نقل کیا ہے لیکن ترمذی نے ثُمَّ اُتِیَ بِکَفَنِہٖ سے آخر تک الفاظ نقل نہیں کئے ہیں۔"

تشریح: حضرت خباب ابن ارت جلیل القدر صحابی ہیں پہلے اسلام لانے والوں میں شمار کئے جاتے تھے یہی وہ مرد حق آگاہ ہیں جنہوں نے کفار کے ظلم وستم کے اس خشمگین ماحول میں سب سے پہلے اپنے اسلام کا اظہار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے انتہا تکلیف و سختیوں اور ظلم ستم میں مبتلا کئے گئے حضرت خباب بدر اور دوسرے جہادوں میں شریک ہوئے ہیں اور ۳۷ھ میں واصل بحق ہوئے۔ رضی اللہ عنہ۔

"بدن پر داغ لگوانے" اس زمانہ میں بہت سے امراض میں ایک معروف علاج تھا۔ ایک موقع پر اس سے منع فرمایا گیا ہے مگر بعض علماء نے وضاحت کی ہے کہ یہ ممانعت اس لئے فرمائی گئی تھی کہ اس طریقہ علاج کو اختیار کرنے والے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اسی سے شفا ہوتی ہے لہٰذا اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ اعتقاد یہ ہو کہ یہ طریقہ علاج تو صرف ایک ظاہر سبب کے درجہ میں ہے شفا دینے والا اللہ ہی ہے تو پھر اس طریقہ علاج کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، یا یہ کہا جائے گا کہ یہ ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ فی الواقع اس طریقہ علاج کی ضرورت و حاجت نہ ہو۔

حضرت خباب کی طرف سے آرزوئے موت یا تو اس لئے تھی کہ وہ اس مرض کی شدت سے کہ جس کے لئے انہوں نے داغ لگوائے تھے بہت زیادہ بے قرار و بیتاب تھے یا پھر اس کیوجہ ان کی تونگری اور مالداری تھی کہ ان کا یہ احساس تھا کہ مال وزر یہ افراط و بہتات کہیں میرے پائے استقامت میں کوئی لغزش پیدا نہ کردے جس کیوجہ سے میں آخرت کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں اور یہی وجہ زیادہ صحیح ہے کہ کیونکہ ان کے یہ الفاظ وَلَقَدْ رَأَيْتُنِي الخ اس پر دلالت کرتے ہیں۔

حضرت حمزہ عبدالمطلب کے صاحبزادے اور آنحضرت ﷺ کے چچا تھے، جنگ احد میں آپ نے شہادت پائی اور سید الشہداء کے لقب سے یاد فرمائے گئے۔

"اذخر" وہاں کی ایک گھاس کا نام ہے جو خوشبو دار ہوتی ہے۔ یہ گھاس چھت کے تختوں پر بچھائی جاتی ہے اور دوسری بہت سی ضروریات میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صبر کرنے والا مفلس و تنگ دست، شکر کرنے والے مالدار سے افضل ہے کیونکہ حضرت خباب جیسے جلیل القدر صحابی نے اپنے حال پر کہ انہیں مالداری و تونگری حاصل تھی اور ظاہر ہے کہ ان کے شاکر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ تاسف کیا"۔

بَابُ مَا يُقَالُ عِنْدَ مَنْ حَضَرَهُ الْمَوْتُ

قریب المرگ کے سامنے جو چیز پڑھی جاتی ہے اس کا بیان

قریب المرگ سے مراد وہ مریض ہے جس پر علامات موت ظاہر ہونے لگیں اور علماء نے لکھا ہے کہ علامات موت یہ ہیں کہ مریض کے پاؤں سُست ہو جاتے ہیں کہ اگر انہیں کھڑا کیا جائے تو کھڑے نہ ہو سکیں، ناک کا تانسہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے کنپٹیاں بیٹھ جاتی ہیں اور بیضتین کا پوست لٹک جاتا ہے۔

قریب المرگ کے پاس پڑھی جانے والی چیز سے مراد ہے کلمہ طیبہ یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی تلقین، سورہ یٰسین کی تلاوت، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھنا اور دعائے مغفرت وغیرہ۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قریب المرگ کو تلقین

(۱) عَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ وَاَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو لوگ قریب المرگ ہوں انہیں (کلمہ) لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو۔" (مسلمؒ)

تشریح: "تلقین" کے معنی پڑھنا ہیں تلقین سے مراد قریب المرگ کے روبرو کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھنا، تاکہ وہ بھی سن کر پڑھے مگر قریب المرگ سے نہ کہا جائے کہ تم بھی پڑھو مبادا کہ شدت مرض یا بدحواسی کے سبب اس کے منہ سے انکار نکل جائے۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ تلقین مستحب ہے۔

مریض و قریب المرگ کے سامنے بھلائی کے کلمات ہی کہے جائیں

(۲) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا حَضَرْتُمُ الْمَرِيْضَ اَوِ الْمَيِّتَ فَقُوْلُوْا خَيْرًا فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ يُؤَمِّنُوْنَ عَلٰى مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (رواہ مسلمؒ)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی مریض کے پاس یا قریب المرگ کے پاس جاؤ تو منہ سے خیر و بھلائی کے کلمات نکالو کیونکہ تمہاری زبان سے جو کچھ نکلتا ہے (خواہ دعائے خیر و بھلائی ہو یا دعاء شر و بد) فرشتے آمین کہتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے لفظ "میت" سے میت حکمی یعنی قریب المرگ بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور میت حقیقی یعنی وہ مردہ بھی مراد ہو سکتا ہے لہٰذا اگر میت حکمی مراد ہو گا تو لفظ "او" راوی کے شک کے اظہار کے لئے ہو گا اور اگر میت حقیقی مراد لیا جائے تو لفظ "او" تنویع کے لئے ہو گا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ مریض و قریب المرگ کے سامنے اپنی زبان سے خیر و بھلائی کے کلمات ادا کرو بایں طور کہ اپنے لئے تو خیر کی، مریض کے لئے شفا کی اور میت کے لئے مغفرت کی دعا کرو۔

مصیبت کے وقت صبرورضا کا اجر

(۳) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ مُسْلِمٍ تُصِيْبُهُ مُصِيْبَةٌ فَيَقُوْلُ مَا اَمَرَهُ اللّٰهُ بِهِ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِىْ فِىْ مُصِيْبَتِىْ وَاخْلُفْ لِىْ خَيْرًا مِنْهَا اِلَّا اَخْلَفَ اللّٰهُ لَهٗ خَيْرًا مِنْهَا فَلَمَّا مَاتَ اَبُوْ سَلَمَةَ قُلْتُ اَىُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ مِنْ اَبِىْ سَلَمَةَ اَوَّلُ بَيْتٍ هَاجَرَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اِنِّىْ قُلْتُهَا فَاَخْلَفَ اللّٰهُ لِىْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی مسلمان کسی (چھوٹی یا بڑی) مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ الفاظ کہتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی طرف ہم کو واپس جانا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِىْ فِىْ مُصِيْبَتِىْ وَاخْلُفْ لِىْ خَيْرًا مِنْهَا اے اللہ! میری مصیبت پر مجھے ثواب دے اور (اس مصیبت میں) جو چیز میرے ہاتھ سے گئی ہے اس کا نعم البدل عطا فرما تو اللہ تعالیٰ اسے اس چیز کا بہتر بدلہ عطا فرماتا ہے حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ جب ابوسلمہؓ (یعنی میرے پہلے شوہر) کا انتقال ہوا تو میں نے کہا کہ "ابوسلمہؓ سے بہتر کون مسلمان ہوگا، وہ ابوسلمہؓ جنہوں نے سب سے پہلے مع اہل وعیال کے آنحضرت ﷺ کی طرف ہجرت کی اور پھر میں نے مذکورہ بالا کلمات کہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ابوسلمہؓ کے بدلے میں آنحضرت ﷺ کو عطا فرمایا (یعنی میں آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئی)۔" (مسلم)

تشریح: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ "ہم اور جو چیزیں کہ ہماری کہلائی ہیں سب خدا ہی کی ملکیت اور اس کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ہم لوٹ کر اسی طرف جانے والے ہیں گویا اس آیت میں یہ تسلیم و اقرار ہے کہ خود ہماری جان اور ہماری ذات اور وہ چیزیں جن کا ہم اپنے مالک کو سمجھتے ہیں اور وہ ہمارے تصرف و اختیار میں ہیں اور ہماری طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے وہ سب کی سب حقیقت میں خدا ہی کی ملکیت میں ہے ہمارے پاس تو وہ صرف عاریتاً ہیں۔ خدا ہی کی طرف سے ہماری ابتداء ہوئی ہے اور اس کی طرف ہماری انتہا بھی ہے۔

لہٰذا جو شخص اس مضمون کو اپنے قلب و دماغ میں راسخ کرے اور جس مصیبت میں وہ مبتلا ہو اس مصیبت پر صبر و رضا کے دامن کو پکڑے رہے تو اس کے لئے وہی مصیبت کی ہر مصیبت آسان و سہل ہو جاتی ہے لیکن اتنی بات جان لینی چاہئے کہ مصیبت و بلاء پر جزع و فزع کے ساتھ اس آیت کو محض زبان سے ادا کرنا چنداں مفید نہیں ہے۔

اگر کسی شخص کو یہ اشکال پیدا ہوا کہ مذکورہ بالا آیت و کلمات کے پڑھنے کا حکم بیان نہیں فرمایا تو پھر ارشاد گرامی کے اس جزء، فَيَقُوْلُ مَا اَمَرَهُ اللّٰهُ بِهِ (اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ کہے) کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب مختصر طور پر یہ ہوگا کہ جب اس آیت اور مذکورہ بالا کلمات کے پڑھنے والے کی فضیلت بیان فرمادی تو گویا یہ حکم ہی فرمایا گیا ہے۔

لفظ "اجرنی" ہمزہ (الف) کے جزم اور جیم کے پیش کے ساتھ بھی منقول ہے۔ اور ہمزہ کے زبر اور جیم کے زیر کے ساتھ بھی منقول ہے۔ مگر دونوں کا معنی و مراد ایک ہی ہے۔ حضرت ام سلمہؓ کے ارشاد فَلَمَّا مَاتَ اَبُوْ سَلَمَةَ (جب ابوسلمہؓ کا انتقال ہوا الخ) کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث مبارک پہلے سے سن رکھی تھی، چنانچہ جب میرے خاوند ابوسلمہؓ نے آنحضرت ﷺ کے سامنے وفات پائی تو آپ کے حکم کی بجا آوری کی خاطر اور اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے میں نے چاہا کہ یہی کلمات پڑھوں مگر پھر میرے دل میں یہ خیال ہوا کہ حضرت ابوسلمہؓ سے بہتر اور کون شخص ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ ابوسلمہؓ کے بدلہ میں مجھے بطور خاوند عطا فرمائے گا۔ چنانچہ اُمّ سلمہؓ حضرت ابوسلمہؓ کی فضیلت بیان کرتی ہیں کہ جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ گئے تھے۔ ان میں حضرت ابوسلمہؓ ہی وہ سب سے پہلے مرد حق آگاہ تھے جنہوں نے اپنے اہل وعیال سمیت ہجرت کی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، پھر یہ

کہ حضرت ابوسلمہؓ آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد اور رضائی یعنی دودھ شریک بھائی تھے اس کے بعد حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ باوجود (اس خلجان کے میں نے مذکورہ کلمات پڑھے جس کے سبب سے مجھے دنیا و آخرت کی سب سے عظیم سعادت و فضیلت حاصل ہوئی یعنی آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئی جو افضل البشر ہیں۔

میت کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعا

④ وَعَنْهَا قَالَتْ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَبِيْ سَلَمَةَ وَقَدْ شَقَّ بَصَرُهٗ فَاَغْمَضَهٗ ثُمَّ قَالَ اِنَّ الرُّوْحَ اِذَا قُبِضَ تَبِعَهُ الْبَصَرُ فَضَجَّ نَاسٌ مِنْ اَهْلِهٖ فَقَالَ لَا تَدْعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اِلَّا بِخَيْرٍ فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ يُؤَمِّنُوْنَ عَلٰى مَا تَقُوْلُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَبِيْ سَلَمَةَ وَارْفَعْ دَرَجَتَهٗ فِي الْمَهْدِيِّيْنَ وَاخْلُفْهُ فِيْ عَقِبِهٖ فِي الْغَابِرِيْنَ وَاغْفِرْلَنَا وَلَهٗ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ وَافْسَحْ لَهٗ فِيْ قَبْرِهٖ وَنَوِّرْ لَهٗ فِيْهِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (میرے پہلے شوہر) حضرت ابوسلمہؓ کے پاس اس وقت تشریف لائے جب کہ ان کی آنکھیں پتھرا گئیں تھیں چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی آنکھوں کو بند کیا" اور فرمایا کہ جب روح قبض کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ بینائی بھی چلی جاتی ہے" ابوسلمہؓ کے اہل بیت (یہ سن کر سمجھ گئے کہ ابوسلمہؓ کا انتقال ہو گیا چنانچہ وہ سب رونے، چلانے لگے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اپنے نفسوں کے بارہ میں خیر و بھلائی ہی کی دعا کرو (یعنی واویلا اور بددعا نہ کرو) کیونکہ تم (بری یا بھلی) جس دعا کے بھی الفاظ اپنے منہ سے نکالتے ہو اس پر فرشتے آمین کہتے ہیں۔ پھر آپ نے یہ دعا ارشاد فرمائی۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَبِيْ سَلَمَةَ وَارْفَعْ دَرَجَتَهٗ فِي الْمَهْدِيِّيْنَ وَاخْلُفْهُ فِيْ عَقِبِهٖ فِي الْغَابِرِيْنَ وَاغْفِرْلَنَا وَلَهٗ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ وَافْسَحْ لَهٗ فِيْ قَبْرِهٖ وَنَوِّرْ لَهٗ فِيْهِ اے اللہ! ابوسلمہؓ کو بخش دے اور اس کا مرتبہ بلند فرما ان لوگوں میں جو سیدھی راہ دکھائے گئے ہیں اور اس کے پسماندگان کا جو باقی رہے ہوئے لوگوں میں ہیں کارساز بن جا اور اے دونوں جہاں کے پروردگار! ہمیں اور اس کو بخش دے اور اس کی قبر میں کشادگی کر اور اس کے لئے قبر کو منور فرما دے۔ آمین۔" (مسلمؒ)

تشریح: ارشاد گرامی کے الفاظ اِنَّ الرُّوْحَ اِذَا قُبِضَ الخ کے ذریعہ گویا آپ اغماض یعنی آنکھیں بند کرنے کی علت بیان فرما رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آنکھوں کو اس لئے بند کر دیا کہ جب روح قبض کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ بینائی بھی چلی جاتی ہے لہٰذا آنکھیں کھلی رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

وصال کے بعد آپ ﷺ پر ڈالی گئی چادر

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ تُوُفِّيَ سُجِّيَ بِبُرْدٍ حِبَرَةٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا جب وصال ہو گیا تو آپ ﷺ کے (جسد اطہر) پر یمنی چادر ڈالی گئی۔" (بخاری و مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آخری کلام کلمہ طیب دخول جنّت کی ضمانت

⑥ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ اٰخِرُ كَلَامِهٖ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت معاذ ابن جبلؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو گا وہ جنت میں داخل ہو گا۔" (ابوداودؒ)

تشریح: مراد یہ ہے کہ جو شخص آخری وقت میں پورا کلمہ طیب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھے گا وہ جنت میں داخل ہوگا اب یہ احتمال ہے کہ چاہے تو یہ دخول جنت عذاب سے پہلے دخول خاص ہے یا اپنے گناہوں کے بقدر عذاب دیئے جانے کے بعد ہو۔ لیکن پہلا ہی احتمال صحیح معلوم ہوتا ہے تاکہ ان مؤمنین میں جو کلمہ طیب پڑھتے ہوئے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کریں اور ان مؤمنین میں کہ جن کا آخری کلام کلمہ طیب نہ ہو امتیاز پیدا ہو جائے۔

قریب المرگ کے سامنے سورہ یٰسین پڑھنے کا حکم

⑦ وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِقْرَءُوْا سُوْرَةَ يٰسٓ عَلٰى مَوْتَاكُمْ۔

(رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت معقل ؓ ابن یسار راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اپنے مردوں کے سامنے سورۃ یٰسین پڑھو۔"

(احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "مردوں" سے مراد قریب المرگ ہیں۔ اس صورت میں سوہ یٰسین پڑھنے کی حکمت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ قریب المرگ اس سورۃ میں مذکورہ مضامین مثلاً ذکر اللہ، احوال قیامت، بعث اور اسی قسم کے دوسرے عجیب وبدیع مضامین سے لطف اندوز ہو۔

یہ بھی احتمال ہے کہ حدیث میں لفظ "مردوں" سے قریب المرگ مراد نہ ہوں بلکہ حقیقی مردے مراد ہوں اس صورت میں اس کلمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ سورہ یٰسین مردہ کے پاس اس کے گھر میں دفن سے پہلے یا دفن کے بعد اس کی قبر کے سرہانے پڑھی جائے۔

ابن مردویہؒ وغیرہ نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس میت (یعنی قریب المرگ یا حقیقی میت) کے سر کے پاس سورۃ یٰسین پڑھی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرماتا ہے۔

ابن عدیؒ وغیرہ نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "جو شخص اپنے والدین کی یا ان میں سے کسی ایک کی (یعنی صرف ماں کی یا صرف باپ کی) قبر پر ہر جمعہ کو جاتا ہے اور پھر وہاں سورہ یٰسین پڑھتا ہے تو صاحب قبر کے لئے سورۃ یٰسین کے تمام حروف کی تعداد کے بقدر مغفرت عطا کی جاتی ہے۔" علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں "جمعہ" سے مراد حسب ظاہر خاص طور پر "یوم جمعہ" بھی ہوسکتا ہے اور پورا ہفتہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔

مسلمان میت کو بوسہ دینا جائز ہے

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبَّلَ عُثْمَانَ بْنَ مَظْعُوْنٍ وَهُوَ مَيِّتٌ وَهُوَ يَبْكِيْ حَتّٰى سَالَ دُمُوْعُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى وَجْهِ عُثْمَانَ (رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عثمان ابن مظعون کی وفات کے بعد ان کو بوسہ دیا اور ان کی میت پر روئے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے آنسو حضرت عثمان کے چہرہ پر (ٹپک کر) بہہ نکلے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مہاجرین میں سے حضرت عثمانؓ ابن مظعون ہی کا سب سے پہلے انتقال مدینہ میں ہوا ہے چنانچہ سب سے پہلے یہی بقیع میں دفن کئے گئے جس کے بعد بقیع کو قبرستان کی حیثیت دی گئی آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے پتھر اٹھا کر ان کی قبر پر بطور نشان کے رکھا۔ رضی اللہ عنہ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان میت کو دفن کرنے سے پہلے بوسہ دینا اور مسلمان میت پر آنسوؤں کے ساتھ رونا جائز ہے۔

⑨ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ اَبَابَكْرٍ قَبَّلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مَيِّتٌ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ نے رسول کریم ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کے جسد اطہر پر بوسہ دیا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تجہیز و تکفین میں جلدی کرنی چاہئے

⑩ وَعَنْ حُصَيْنِ بْنِ وَحْوَحٍ اَنَّ طَلْحَةَ بْنَ الْبَرَاءِ مَرِضَ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُهُ فَقَالَ اِنِّي لَا اَرٰى طَلْحَةَ اِلَّا قَدْ حَدَثَ بِهِ الْمَوْتُ فَاٰذِنُوْنِيْ بِهٖ وَعَجِّلُوْا فَاِنَّهٗ لَا يَنْبَغِيْ لِجِيْفَةِ مُسْلِمٍ اَنْ تُحْبَسَ بَيْنَ ظَهْرَانَيْ اَهْلِهٖ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حصینؓ ابن وحوح فرماتے ہیں کہ طلحہؓ ابن براء بیمار ہوئے تو نبی کریم ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور (ان کے اہل بیت سے) فرمایا کہ "میرا خیال ہے کہ طلحہؓ کی موت آگئی ہے (یعنی ان پر علامات موت ظاہر ہونے لگی ہیں) لہٰذا جب ان کا انتقال ہو جائے تو مجھے (فورا) خبر دینا۔ تاکہ میں ان کی نماز پڑھنے کے لئے آسکوں) اور تم تجہیز و تکفین اور تدفین میں جلدی کرنا کیونکہ مسلمان میت کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اسے لوگوں کے درمیان روکے رکھا جائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اگر میت کی تکفین و تدفین میں تاخیر ہو تو لاش کے سڑ جانے کا خوف ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ لاش کے سڑ جانے سے لوگ اس سے بے اعتنائی اور نفرت کا معاملہ کرتے ہیں اس صورت میں میت کی حقارت اور توہین ہوتی ہے مؤمن کو چونکہ اللہ تعالیٰ معظم و مکرم پیدا فرماتا ہے اس لئے فرمایا کہ اس کی تکفین و تدفین میں جلدی کرو تاکہ مذکورہ بالا صورت پیدا نہ ہو سکے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قریب المرگ کو تلقین کرو

⑪ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ لِلْاَحْيَاءِ قَالَ اَجْوَدُ وَاَجْوَدُ۔

(رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم لوگ قریب المرگ کو اس کلمہ کی تلقین کرو۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو بردبار و بزرگ ہے پاک ہے اللہ جو عرش عظیم کا مالک ہے، تمام تعریفیں اللہ کی ہی ہیں جو دونوں جہاں کا پروردگا ہے۔

صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! تندرستوں کو یہ کلمہ سکھانا کیسا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "بہتر اور بہت بہتر۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: ابن عساکرؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں نے رسول کریم ﷺ سے چند کلمات سنے ہیں کہ جو شخص انہیں اپنے انتقال کے وقت پڑھ لے تو وہ جنت میں داخل ہو گا اور وہ کلمات یہ ہیں۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ تین مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ تین مرتبہ اور اس کے بعد تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

مؤمن اور کافر کی روح قبض ہونے کا بیان

⑫ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَيِّتُ تَحْضُرُهُ الْمَلَائِكَةُ فَاِذَا كَانَ الرَّجُلُ صَالِحًا قَالُوْا اُخْرُجِيْ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الطَّيِّبِ اُخْرُجِيْ حَمِيْدَةً وَاَبْشِرِيْ بِرَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَرَبٍّ غَيْرِ

غَضْبَانَ فَلَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَخْرُجَ ثُمَّ يُعْرَجُ بِهَا اِلَى السَّمَاءِ فَيُفْتَحُ لَهَا فَيُقَالُ مَنْ هٰذَا فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانٌ فَيُقَالُ مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الطَّيِّبَةِ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الطَّيِّبِ اُدْخُلِي حَمِيْدَةً وَاَبْشِرِيْ بِرَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ فَلَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَنْتَهِيَ اِلَى السَّمَاءِ الَّتِي فِيْهَا اللّٰهُ فَاِذَا كَانَ الرَّجُلُ السُّوْءُ قَالَ اُخْرُجِي اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الْخَبِيْثِ اُخْرُجِي ذَمِيْمَةً وَاَبْشِرِيْ بِحَمِيْمٍ وَغَسَّاقٍ وَاٰخَرَ مِنْ شَكْلِهٖ اَزْوَاجٌ فَمَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَخْرُجَ ثُمَّ يُعْرَجُ اِلَى السَّمَاءِ فَيُفْتَحُ لَهَا فَيُقَالُ مَنْ هٰذَا فَيُقَالُ فُلَانٌ فَيُقَالُ لَا مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الْخَبِيْثَةِ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الْخَبِيْثِ اِرْجِعِيْ ذَمِيْمَةً فَاِنَّهَا لَا تُفْتَحُ لَكِ اَبْوَابُ السَّمَاءِ فَتُرْسَلُ مِنَ السَّمَاءِ ثُمَّ تَصِيْرُ اِلَى الْقَبْرِ۔

(رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کہ جو شخص قریب المرگ ہوتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آتے ہیں اور اگر وہ نیک وصالح ہوتا ہے تو (اس کی روح سے رحمت کے) فرشتے کہتے ہیں کہ "اے پاک جان جو پاک بدن میں تھی! اس حال میں (جسم سے) نکل کہ (خدا اور مخلوق کے نزدیک تیری تعریف کی گئی ہے اور تجھے خوشخبری ہو (دائمی) راحت وسکون کی، جنّت کے پاک رزق کی اور خدا سے ملاقات کی جو (تجھ پر) غضبناک نہیں ہے" قریب المرگ کے سامنے فرشتے برابر یہی بات کہتے ہیں یہاں تک کہ روح (خوشی خوشی) باہر نکل آتی ہے اور پھر فرشتے اسے آسمان کی طرف لے جاتے ہیں، آسمان کا دروازہ اس کے لئے (فرشتوں کے کہنے سے یا پہلے ہی سے کھول دیا جاتا ہے (آسمان کے دربان) پوچھتے ہیں کہ یہ کون شخص ہے؟ اسے لے جانے والے فرشتے (اس کا نام ونسب بتا کر) کہتے ہیں کہ "یہ فلاں شخص (کی روح) ہے" پس کہا جاتا ہے کہ آفرین ہو اس جان پاک کو جو پاک بدن میں تھی اور (اے پاک جان آسمان میں) داخل ہو، اس حال میں کہ تیری تعریف کی گئی ہے اور خوشخبری ہو تجھے راحت کی، پاک رزق کی اور پروردگار سے ملاقات کی جو غضبناک نہیں ہے، اس روح سے برابر یہی بات کہی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس آسمان پر (یعنی عرش پر) پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اللہ رب العزت کی رحمت خاص جلوہ فرما ہے!" اور اگر وہ برا (یعنی کافر) ہوتا ہے تو ملک الموت کہتے ہیں کہ "اے خبیث جان جو پلید بدن میں تھی اس حال میں (جسم سے، نکل کہ تیری برائی کی گئی ہے اور یہ بری خبر سن لے کہ گرم پانی، پیپ اور ان کے علاوہ دوسری طرح کے عذاب تیرے منتظر ہیں۔ اس بدبخت قریب المرگ کے سامنے بار بار یہی کہا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی روح (بادل نخواستہ) باہر نکل آتی ہے پھر اس آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے (تاکہ اس کی ذلت وخواری اس پر ظاہر کر دی جائے) جب اس کے لئے آسمان کے دروازے کھلوائے جاتے ہیں تو دربانوں کی طرف سے پوچھا جاتا ہے کہ "یہ کون شخص ہے؟" جواب دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص!" پس کہا جاتا ہے کہ "نفریں ہو اس خبیث جان پر جو پلید جسم میں تھی اور (اے خبیث جان) واپس چلی جا اس حال میں کہ تیری برائی کی گئی ہے اور تیرے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے" چنانچہ اسے آسمان سے پھینک دیا جاتا ہے اور وہ قبر کی طرف آجاتی ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "اس کے پاس فرشتے آتے ہیں۔ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قریب المرگ کے پاس اس کی روح قبض کرنے کے لئے رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے دونوں آتے ہیں، اگر قریب المرگ نیک وصالح ہوتا ہے تو رحمت کے فرشتے اپنا کام کرتے ہیں اور قریب المرگ بدکار ہوتا ہے تو پھر عذاب کے فرشتے اپنا کام کرتے ہیں۔

"نیک وصالح" سے یا تو عمومی طور پر مؤمن مراد ہے یا پھر وہ نیک بخت مراد ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ادا کرتا ہے اور اس کی زندگی اطاعت وفرمانبرداری کی راہ پر گذری ہو۔

حدیث میں نیک وصالح اور کافر کی روح قبض کرنے کے بارہ میں تو تفصیل بتائی گئی ہے لیکن "فاسق" کے بارہ میں بالکل سکوت اختیار کیا گیا ہے کیونکہ فاسق کے بارہ میں کتاب وسنت کا یہی طریقہ ہے کہ اس کے بارہ میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے تاکہ وہ خوف ورجاء کے درمیان رہے۔

مؤمن اور کافر کے روح کے درمیان اس امتیاز اور فرق کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ کافر کی روح تو آسمان سے دھتکار دی جاتی ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے اسفل السافلین میں قید کر دیا جاتا ہے بخلاف مؤمن صالح کی روح کہ اسے آزادی حاصل ہوتی ہے اور آسمان وزمین میں جہاں چاہتی ہے سیر کرتی ہے، جنّت میں میوے کھاتی ہے۔ عرش کے نیچے قندیلوں کی طرف اپنی جگہ اختیار کرتی ہے، پھر یہ کہ اسے قبر میں اپنے جسم کے ساتھ بھی تعلّق رہتا ہے بایں طور کہ مردہ قبر میں قرآن کی تلاوت کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، سکوت وراحت سے لطف اندوز ہوتا ہے، دولھا کی نیند سوتا ہے اور اپنے اپنے حسب مراتب ودرجات جنّت میں اپنا مسکن دیکھتا رہتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ روح کا معاملہ اور برزخ کے احوال اگرچہ خوارق عادات میں سے ہیں کہ ہماری دنیاوی زندگی ان سے مانوس ومتعارف نہیں لیکن اس امور کے وقوع کے بارہ میں کسی قسم کا شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا خَرَجَتْ رُوْحُ الْمُؤْمِنِ تَلَقَّاهَا مَلَكَانِ یُصْعِدَانِهَا قَالَ حَمَّادٌ فَذَكَرَ مِنْ طِیْبِ رِیْحِهَا وَذَكَرَ الْمِسْكَ قَالَ وَیَقُوْلُ اَهْلُ السَّمَآءِ رُوْحٌ طَیِّبَةٌ جَاءَتْ مِنْ قِبَلِ الْاَرْضِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْكِ وَعَلٰی جَسَدٍ كُنْتِ تَعْمُرِیْنَهٗ فَیُنْطَلَقُ بِهٖ اِلٰی رَبِّهٖ ثُمَّ یَقُوْلُ انْطَلِقُوْا بِهٖ اِلٰی اٰخِرِ الْاَجَلِ قَالَ وَاِنَّ الْكَافِرَ اِذَا خَرَجَتْ رُوْحُهٗ قَالَ حَمَّادٌ وَذَكَرَ مِنْ نَتْنِهَا وَذَكَرَ لَعْنًا وَیَقُوْلُ اَهْلُ السَّمَاءِ رُوْحٌ خَبِیْثَةٌ جَاءَتْ مِنْ قِبَلِ الْاَرْضِ فَیُقَالُ انْطَلِقُوْا بِهٖ اِلٰی اٰخِرِ الْاَجَلِ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ فَرَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَیْطَةً كَانَتْ عَلَیْهِ عَلٰی اَنْفِهٖ هٰكَذَا (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب مؤمن کی روح (اس کے جسم) سے نکلتی ہے تو اسے دو فرشتے لے کر آسمان کی طرف چلتے ہیں" حماد (جو اس حدیث کو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہتے ہیں کہ "اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یا ابوہریرہؓ نے اس روح کی خوشبو کا اور مشک کا ذکر کیا۔ یعنی کہ اس روح سے مشک کی خوشبو آتی ہے۔ (یہ الفاظ حمادؒ نے اس لئے کہے ہیں کہ انہیں وہ الفاظ بعینہٖ یاد نہیں رہے جو انہوں نے سنے تھے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا" (جب فرشتے مؤمن کی روح کو لے کر آسمان پر پہنچتے ہیں) تو اہل آسمان کہتے ہیں کہ پاک روح زمین سے آئی ہے، پھر وہ روح کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ تجھ پر اور تیرے بدن پر کہ جس کو تو آباد رکھتی تھی اپنی رحمت فرمائے، پھر فرشتے اس کو پروردگار کے پاس (یعنی عرش پر) لے جاتے ہیں اور پروردگار یہ حکم فرماتا ہے کہ "اسے لے جاؤ اور قیامت کے دن تک کے لئے مہلت دیدو" حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب کافر کی روح اس کے جسم سے باہر نکلتی ہے! حمادؒ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یا ابوہریرہؓ نے اس کی بدبو کا اور لعنت کا ذکر کیا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب کافر کی روح آسمان پر پہنچتی ہے۔ تو اہل آسمان کہتے ہیں کہ ایک ناپاک روح زمین سے آئی ہے پھر (اس ناپاک روح کے بارہ میں) یہ فیصلہ سنایا جاتا ہے کہ "اسے لے جاؤ" اور قیامت تک کے لئے مہلت دے دو۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی چادر کا کونا (کہ جو آپ کے جسم مبارک پر تھی) اپنی ناک پر اس طرح رکھا۔" (مسلم)

تشریح: جب مؤمن کی روح کو بارگاہ رب العزت میں پیش کیا جاتا ہے تو اللہ رب العزت اس کے بارہ میں فرماتا ہے کہ اسے لے جاؤ اور قیامت کے دن تک کے لئے مہلت دے دو تاکہ وہ جنّت میں یا جنّت کے قریب رہے اور پروردگار کی رحمتوں سے نوازی جاتی رہے کہ پھر اس کے بعد ہمارے پاس (قیامت کے دن) اسے لوٹ کر آنا ہے جب کہ بعد الحساب اس کے لئے جنّت کی دائمی سعادت کا آخری فیصلہ کیا جائے گا۔ گویا حدیث میں "اجل" سے مراد "مدت برزخ" ہے کہ جس کی انتہا یوم حساب (یعنی قیامت کا دن) ہے برزخ اس عالم کو کہا جاتا ہے جو موت سے قیامت کے دن تک کا درمیانی وقفہ ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ "اس طرح رکھا" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اپنی چادر کا کونہ اپنی ناک پر رکھ کر بتایا کہ

آنحضرت ﷺ نے اس طرح اپنی چادر کا کونہ اپنی ناک پر رکھا تھا۔ ناک پر اپنی چادر کا کونہ رکھنے کی وجہ یہ تھی۔ کہ گویا آنحضرت ﷺ کو ازراہ مکاشفہ کافر کی روح اور اس کی بدبو محسوس ہوئی جس کی وجہ سے آپ نے اپنی چادر کا کونہ ناک پر رکھ لیا۔

(۱۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا حُضِرَ الْمُؤْمِنُ اَتَتْ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ بِحَرِيْرَةٍ بَيْضَاءَ فَيَقُوْلُوْنَ اُخْرُجِيْ رَاضِيَةً مَرْضِيًّا عَنْكِ اِلٰى رَوْحِ اللّٰهِ وَرَيْحَانٍ وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ فَتَخْرُجُ كَأَطْيَبِ رِيْحِ الْمِسْكِ حَتّٰى اَنَّهٗ لَيُنَاوِلُهٗ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حَتّٰى يَأْتُوْا بِهٖ اَبْوَابَ السَّمَاءِ فَيَقُوْلُوْنَ مَا اَطْيَبَ هٰذِهِ الرِّيْحَ الَّتِيْ جَاءَتْكُمْ مِنَ الْاَرْضِ فَيَأْتُوْنَ بِهٖ اَرْوَاحَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَلَهُمْ اَشَدُّ فَرَحًا بِهٖ مِنْ اَحَدِكُمْ بِغَائِبِهٖ يَقْدُمُ عَلَيْهِ فَيَسْأَلُوْنَهٗ مَاذَا فَعَلَ فُلَانٌ مَاذَا فَعَلَ فُلَانٌ فَيَقُوْلُوْنَ دَعُوْهُ فَاِنَّهٗ كَانَ فِيْ غَمِّ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ قَدْ مَاتَ اَمَا اَتَاكُمْ فَيَقُوْلُوْنَ قَدْ ذُهِبَ بِهٖ اِلٰى اُمِّهِ الْهَاوِيَةِ فَاِنَّ الْكَافِرَ اِذَا احْتُضِرَ اَتَتْهُ مَلَائِكَةُ الْعَذَابِ بِمِسْحٍ فَيَقُوْلُوْنَ اخْرُجِيْ سَاخِطَةً مَسْخُوْطًا عَلَيْكِ اِلٰى عَذَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَتَخْرُجُ كَاَنْتَنِ رِيْحِ جِيْفَةٍ حَتّٰى يَأْتُوْنَ بِهٖ اِلٰى بَابِ الْاَرْضِ فَيَقُوْلُوْنَ مَا اَنْتَنَ هٰذِهِ الرِّيْحَ حَتّٰى يَأْتُوْنَ بِهٖ اَرْوَاحَ الْكُفَّارِ۔

(رواہ احمد و النسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب مؤمن کی موت کا وقت آتا ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑا لے کر آتے ہیں اور روح سے کہتے ہیں کہ "تو (جسد سے) نکل اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و مہربانی، بہترین رزق اور پروردگار کی طرف کہ جو تجھ پر غضبناک نہیں ہے چل، چنانچہ روح مشک کی بہترین خوشبو کی طرح (جسم سے) نکلتی ہے اور فرشتے اس کو (ازراہ تعظیم و تکریم) ہاتھوں ہاتھ لے چلتے ہیں یہاں تک کہ اسے لیکر آسمان کے دروازوں تک آتے ہیں، وہاں فرشتے آپس میں کہتے ہیں کہ "کیا خوب ہے یہ خوشبو جو تمہارے پاس زمین سے آرہی ہے" پھر اسے ارواح مؤمنین کے پاس علیین میں، یا جنت میں یا جنت کے دروازہ پر اور یا عرش کے نیچے کہ جہاں مؤمنین کی روحیں اپنے اپنے حسب مراتب و درجات رہتی ہیں) لاتے ہیں، چنانچہ وہ روحیں اس روح کے آنے سے اسی طرح خوش ہوتی ہیں جس طرح تم میں سے کوئی شخص اس وقت خوش ہوتا ہے جب کہ اس کے پاس اس کا غائب آتا ہے یعنی تم میں سے کوئی شخص جب سفر سے واپس آتا ہے تو جس طرح اس کے اہل و عیال اس کی واپسی پر خوش ہوتے ہیں اسی طرح آسمان میں مؤمنین کی روحیں اس وقت بہت زیادہ خوش ہوتی ہے جب کہ کسی مؤمن کی روح زمین سے ان کے پاس آتی ہے، پھر تمام روحیں اس روح سے پوچھتیں ہیں کہ "فلاں کیا کرتا ہے اور فلاں کیا کرتا ہے؟ یعنی روحیں ان متعارفین کے بارہ میں جنہیں وہ دنیا میں چھوڑ کر آئی تھیں نام بنام پوچھتی ہیں کہ فلاں فلاں شخص کا کیا حال ہے، مگر پھر روحیں (خود) آپس میں کہتی ہیں کہ "اس روح کو چھوڑ دو (ابھی کچھ نہ پوچھو کیونکہ) یہ دنیا کے غم و الام میں تھی (جب اسے ذرہ سکون مل جائے تو پوچھنا) چنانچہ روح (جب سکون پالیتی ہے تو خود کہتی ہے) کہ فلاں شخص (جو بدکار تھا اور جس کے بارہ میں تم پوچھ رہے ہو) مر گیا، کیا وہ تمہارے پاس نہیں آیا؟ چنانچہ وہ روحیں اسے بتاتی ہیں کہ تو اس کی ماں کی طرف کہ وہ دوزخ کی آگ ہے لے گئے" اور جب کافر کی موت کا وقت آتا ہے تو عذاب کے فرشتے اس کے پاس ٹاٹ کا فرش لے کر آتے ہیں اور اس کی روح سے کہتے ہیں کہ اے روح کافر! اللہ عزوجل کے عذاب کی طرف نکل اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے ناراض ہے اور تجھ پر ناراضگی کی مار ہے، چنانچہ روح (کافر کے جسم سے) مردار کی بدبو کی طرح نکلتی ہے پھر فرشتے اسے آسمان کے دروازوں کی طرف لاتے ہیں وہاں فرشتے کہتے ہیں کہ "کتنی بری ہے یہ بدبو! پھر اس کے بعد اسے کافروں کی ارواح کے پاس لے جایا جاتا ہے۔"

(احمدؒ و نسائیؒ)

تشریح: مؤمن کی موت کے وقت رحمت کے فرشتے ریشم کا ٹکڑا غالباً اس لئے لاتے ہیں تاکہ اس کی روح کو اس میں لپیٹ کر لے جائیں۔

ماذا فعل فلان (فلاں کیا کرتا ہے) یعنی مؤمنین کی ارواح آنے والی روح مؤمن سے ان لوگوں کے بارہ میں کہ جنہیں وہ دنیا میں جانتی تھیں اور دنیا میں چھوڑ آئی تھیں پوچھتی ہیں کہ فلاں فلاں شخص کس کس حال میں ہیں؟ اور اس دریافت حال سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر

یہ معلوم ہو کہ ان کی زندگی خدا اور خدا کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری میں گزر رہی ہے تو خوش ہوں اور راہ حق پر ان کی استقامت کے لئے دعا کریں اور اگر کسی کے بارہ میں انہیں یہ معلوم ہو کہ اس کی زندگی گناہ و معصیت کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے تو رنج و غم کریں اور خدا سے ان کی ہدایت اور ان کی مغفرت و تحسین کی دعا مانگیں۔

حتی یا تون بہ الی باب الارض (پھر فرشتے اسے زمین کے دروازوں کی طرف لاتے ہیں) کے بارہ میں علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "زمین کے دروازوں سے مراد آسمان زمین (یعنی پہلے آسمان) کے دروازے ہیں جیسا کہ گزشتہ حدیث نمبر ۱۲ کے الفاظ ثم یعرج بھا الی السماء دلالت کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی احتمال ہے کہ "زمین کے دروازوں" سے مراد زمین ہو" اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کافر کی روح اسفل السافلین کی طرف پھینک دی جاتی ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک بھی دوسری صورت بہتر اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔

"کافروں کی ارواح کے پاس لے جایا جاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اسے کافروں کی ارواح کے پاس کہ جن کا مسکن سجین" ہے، پہنچادیا جاتا ہے۔ "سجین" جہنم کی گہرائیوں میں ایک جگہ کا نام ہے۔

⑮ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جَنَازَةِ رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ فَانْتَهَيْنَا اِلَى الْقَبْرِ وَلَمَّا يُلْحَدْ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ جَلَسْنَا حَوْلَهٗ كَاَنَّ عَلٰى رُءُوْسِنَا الطَّيْرَ وَفِيْ يَدِهٖ عُوْدٌ يَنْكُتُ بِهٖ فِي الْاَرْضِ فَرَفَعَ رَأْسَهٗ فَقَالَ اسْتَعِيْذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ اِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا وَاِقْبَالٍ مِنَ الْاٰخِرَةِ نَزَلَ اِلَيْهِ مَلَائِكَةٌ مِنَ السَّمَاءِ بِيْضُ الْوُجُوْهِ كَاَنَّ وُجُوْهَهُمُ الشَّمْسُ مَعَهُمْ كَفَنٌ مِنْ اَكْفَانِ الْجَنَّةِ وَحَنُوْطٌ مِنْ حَنُوْطِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَجْلِسُوْا مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ ثُمَّ يَجِيْءُ مَلَكُ الْمَوْتِ عَلَيْهِ السَّلَامُ حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهٖ فَيَقُوْلُ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ اُخْرُجِيْ اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ قَالَ فَتَخْرُجُ تَسِيْلُ كَمَا تَسِيْلُ الْقَطْرَةُ مِنَ السِّقَاءِ فَيَاْخُذُهَا فَاِذَا اَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوْهَا فِيْ يَدِهٖ طَرْفَةَ عَيْنٍ حَتّٰى يَاْخُذُوْهَا فَيَجْعَلُوْهَا فِيْ ذٰلِكَ الْكَفَنِ وَفِيْ ذٰلِكَ الْحَنُوْطِ وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَاَطْيَبِ نَفْحَةِ مِسْكٍ وُجِدَتْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ قَالَ فَيَصْعَدُوْنَ بِهَا فَلَا يَمُرُّوْنَ يَعْنِيْ بِهَا عَلٰى مَلَاءٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ اِلَّا قَالُوْا مَا هٰذَا الرُّوْحُ الطَّيِّبُ فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ بِاَحْسَنِ اَسْمَائِهِ الَّتِيْ كَانُوْا يُسَمُّوْنَهٗ بِهَا فِي الدُّنْيَا حَتّٰى يَنْتَهُوْا بِهَا اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَسْتَفْتِحُوْنَ لَهٗ فَيُفْتَحُ لَهُمْ فَيُشَيِّعُهٗ مِنْ كُلِّ سَمَاءٍ مُقَرَّبُوْهَا اِلَى السَّمَاءِ الَّتِيْ تَلِيْهَا حَتّٰى يُنْتَهٰى بِهٖ اِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ اُكْتُبُوْا كِتَابَ عَبْدِيْ فِيْ عِلِّيِّيْنَ وَاَعِيْدُوْهُ اِلَى الْاَرْضِ فَاِنِّيْ مِنْهَا خَلَقْتُهُمْ وَفِيْهَا اُعِيْدُهُمْ وَمِنْهَا اُخْرِجُهُمْ تَارَةً اُخْرٰى قَالَ فَتُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ فَيَأْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَادِيْنُكَ فَيَقُوْلُ دِيْنِيَ الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ وَ مَا عِلْمُكَ فَيَقُوْلُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَاٰمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ اَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَالْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى الْجَنَّةِ قَالَ فَيَأْتِيْهِ مِنْ رُوْحِهَا وَطِيْبِهَا فَيُفْسَحُ لَهٗ فِيْ قَبْرِهٖ مَدَّ بَصَرِهٖ قَالَ وَيَأْتِيْهِ رَجُلٌ حَسَنُ الْوَجْهِ حَسَنُ الثِّيَابِ طَيِّبُ الرِّيْحِ فَيَقُوْلُ اَبْشِرْ بِالَّذِيْ يَسُرُّكَ هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِيْ كُنْتَ تُوْعَدُ فَيَقُوْلُ لَهٗ مَنْ اَنْتَ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ يَجِيْئُ بِالْخَيْرِ فَيَقُوْلُ اَنَا عَمَلُكَ الصَّالِحُ فَيَقُوْلُ رَبِّ اَقِمِ السَّاعَةَ رَبِّ اَقِمِ السَّاعَةَ حَتّٰى اَرْجِعَ اِلٰى اَهْلِيْ وَمَالِيْ قَالَ وَاِنَّ الْعَبْدَ الْكَافِرَ اِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا وَاِقْبَالٍ مِنَ الْاٰخِرَةِ نَزَلَ اِلَيْهِ مِنَ السَّمَاءِ مَلَائِكَةٌ سُوْدُ الْوُجُوْهِ مَعَهُمُ الْمُسُوْحُ فَيَجْلِسُوْنَ مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ ثُمَّ يَجِيْءُ مَلَكُ الْمَوْتِ حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهٖ فَيَقُوْلُ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ اُخْرُجِيْ اِلٰى سَخَطٍ مِنَ اللّٰهِ قَالَ فَتَفَرَّقُ فِيْ جَسَدِهٖ فَيَنْتَزِعُهَا كَمَا يُنْزَعُ السَّفُّوْدُ مِنَ الصُّوْفِ

الْمَبْلُولِ فَيَأْخُذُهَا فَإِذَا اَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوْهَا فِيْ يَدِهٖ طَرْفَةَ عَيْنٍ حَتّٰى يَجْعَلُوْهَا فِيْ تِلْكَ الْمُسُوْحِ وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَاَنْتَنِ رِيْحِ جِيْفَةٍ وُجِدَتْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ فَيَصْعَدُوْنَ بِهَا فَلَا يَمُرُّوْنَ بِهَا عَلٰى مَلَأٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ اِلَّا قَالُوْا مَاهٰذَا الرُّوْحُ الْخَبِيْثُ فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ بِاَقْبَحِ اَسْمَائِهِ الَّتِيْ كَانَ يُسَمّٰى بِهَا فِي الدُّنْيَا حَتّٰى يَنْتَهٰى بِهٖ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيُسْتَفْتَحُ لَهٗ فَلَا يُفْتَحُ لَهٗ ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اُكْتُبُوْا كِتَابَهٗ فِيْ سِجِّيْنَ فِي الْاَرْضِ السُّفْلٰى فَتُطْرَحُ رُوْحُهٗ طَرْحًا ثُمَّ قَرَأَ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْتَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ فَتُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ وَيَاتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَادِيْنُكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَاهٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ اَنْ كَذَبَ فَافْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى النَّارِ فَيَاْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُوْمِهَا وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهٗ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ اَضْلَاعُهٗ وَيَاتِيْهِ رَجُلٌ قَبِيْحُ الْوَجْهِ قَبِيْحُ الثِّيَابِ مُنْتِنُ الرِّيْحِ فَيَقُوْلُ اَبْشِرْ بِالَّذِيْ يَسُوْءُكَ هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِيْ كُنْتَ تُوْعَدُ فَيَقُوْلُ مَنْ اَنْتَ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ يَجِيْئُ بِالشَّرِّ فَيَقُوْلُ اَنَا عَمَلُكَ الْخَبِيْثُ فَيَقُوْلُ رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَةَ وَفِيْ رِوَايَةٍ نَحْوَهٗ وَزَادَفِيْهِ اِذَا خَرَجَ رُوْحُهٗ صَلّٰى عَلَيْهِ كُلُّ مَلَكٍ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَكُلُّ مَلَكٍ فِي السَّمَاءِ وَفُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ السَّمَاءِ لَيْسَ مِنْ اَهْلِ بَابٍ اِلَّا وَهُمْ يَدْعُوْنَ اللّٰهَ اَنْ يُّعْرَجَ بِرُوْحِهٖ مِنْ قِبَلِهِمْ وَتُنْزَعُ نَفْسُهٗ يَعْنِي الْكَافِرَ مَعَ الْعُرُوْقِ فَيَلْعَنُهٗ كُلُّ مَلَكٍ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَكُلُّ مَلَكٍ فِي السَّمَاءِ وَتُغْلَقُ اَبْوَابُ السَّمَاءِ لَيْسَ مِنْ اَهْلِ بَابٍ اِلَّا وَهُمْ يَدْعُوْنَ اللّٰهَ اَنْ لَّا يُعْرَجَ رُوْحُهٗ مِنْ قِبَلِهِمْ (رواہ احمد)

"اور حضرت براءؓ ابن عازب فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ ہم) نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ایک انصاری شخص کے جنازہ کے ساتھ چلے ہم قبر پر پہنچے (قبر تیار نہ ہونے کیوجہ سے) ابھی جنازہ سپرد خاک نہیں ہوا تھا۔ رسول کریم ﷺ ایک جگہ تشریف فرما ہو گئے ہم بھی آپ کے گرد اگرد (اس طرح) بیٹھ گئے گویا کہ ہمارے سروں پر پرندے ہیں (یعنی ہم بالکل خاموش سر جھکائے بیٹھے) آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ جس سے آپ ﷺ زمین کرید رہے تھے (جس طرح کہ کوئی شخص انتہائی تفکر و استغراق کے عالم میں ہوتا ہے) پھر آپ ﷺ نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور (ہمیں مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ عذاب قبر سے اللہ کی پناہ مانگو۔ آپ ﷺ نے یہ دو یا تین بار فرمایا۔ اور پھر فرمایا "جب بندہ مؤمن دنیا سے اپنا تعلق ختم کرنے کو ہوتا ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے (یعنی مرنے کے قریب ہوتا ہے) تو اس کے پاس آسمان سے نہایت روشن چہرے والے فرشتے اترتے ہیں (جن کے چہرہ کی چمک دمک ایسی ہوتی ہے) گویا کہ ان کے چہرے آفتاب ہیں، ان کے ہمراہ جنت کا (یعنی ریشمی کپڑے کا) کفن اور جنت کی خوشبو (یعنی مشک و عنبر وغیرہ کی خوشبو) ہوتی ہے اور وہ (بسبب کمال ادب اور روح نکلنے کے انتظار میں) اس کے سامنے اتنی دور کہ جہاں تک کہ اس کی نگاہ پہنچ سکے، بیٹھ جاتے ہیں، پھر ملک الموت علیہ السلام آتے ہیں اور اس کے سر کے قریب بیٹھ کر کہتے ہیں کہ "اے پاک جان! اللہ بزرگ و برتر کی طرف سے مغفرت و بخشش اور اس کی خوشنودی کی طرف پہنچنے کے لئے جسم سے) نکل!" آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ "(یہ سن کر) بندہ مؤمن کی جان (اس کے جسم سے) اس طرح (یعنی آسانی اور سہولت سے) نکل آتی ہے جس طرح کہ مشک سے پانی کا قطرہ بہ نکلتا ہے۔ چنانچہ ملک الموت اس کو لے لیتے ہیں، جب ملک الموت اسے لے لیتے ہیں تو دوسرے فرشتے اس جان کو ملک الموت کے ہاتھ میں پلک جھپکنے کے بقدر بھی نہیں چھوڑتے یعنی غایت اشتیاق کی بنا پر فورا اس جان کو ملک الموت کے ہاتھوں سے (اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور اس کو اس کفن میں اور اس خوشبو میں (کہ جسے وہ اپنے ہاتھ میں لائے تھے) رکھ لیتے ہیں، اور اس جان سے بہترین وہ خوشبو نکلتی ہے جو روئے زمین پر (زمین کے پیدا ہونے سے لیکر اس کی فنا تک) پائی جانے والی مشک کی بہترین، خوشبوؤں کے مانند ہوتی ہے" آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ "پھر وہ فرشتے اس جان کو لے کر آسمان کی طرف

چلتے ہیں، چنانچہ جب وہ فرشتے اس جان کو لے کر آسمان کی طرف چلتے ہیں، تو (زمین و آسمان کے درمیان موجود) فرشتوں کی کسی بھی جماعت کے قریب سے گزرتے ہیں تو وہ جماعت پوچھتی ہے کہ "یہ پاک روح کون ہے؟" وہ فرشتے جو اس روح کو لے جارہے ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ "فلاں شخص فلاں کا بیٹا (یعنی اس کی روح) ہے" اور وہ فرشتے اس کو بہترین نام ولقب (اور اس کے اوصاف) بتاتے ہیں جن کے ذریعہ اہل دنیا اس کا ذکر کرتے ہیں اسی طرح سوال وجواب ہوتا رہتا ہے) یہاں تک کہ وہ فرشتے اس کو لے کر آسمان دنیا (یعنی پہلے آسمان) تک پہنچتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں جو ان کے لئے کھول دیا جاتا ہے (اسی طرح ہر آسمان کا دروازہ اس کے لئے کھولا جاتا ہے) اور ہر آسمان کے مقرب فرشتے دوسرے آسمان تک اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ساتوں آسمانوں تک (اسی اعزاز و اکرام کے ساتھ) پہنچا دیا جاتا ہے" پس اللہ عزوجل (فرشتوں سے) فرماتا ہے کہ "اس بندہ کا نامہ اعمال علیین میں رکھو اور اس جان کو زمین کی طرف (یعنی اس کے بدن میں جو زمین میں مدفون ہے واپس لے جاؤ (تاکہ یہ اپنے بدن میں پہنچ کر قبر کے سوال وجواب کے لئے تیار رہے) کیونکہ بیشک میں نے زمین ہی سے جسموں کو پیدا کیا ہے اور زمین ہی میں ان کو (یعنی اجسام و ارواح کو) واپس بھیجتا ہوں اور پھر زمین ہی سے ان کو دوبارہ نکالوں گا" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس کے بعد وہ جان اپنے جسم میں پہنچا دی جاتی ہے۔ پھر اس کے پاس دو فرشتے (یعنی منکر ونکیر) آتے ہیں جو اسے بٹھلاتے ہیں اور پھر سوال کرتے ہیں کہ "تیرا رب کون ہے؟ بندہ مؤمن جواب دیتا ہے "میرا رب اللہ ہے) پھر وہ پوچھتے ہیں کہ "تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میرا دین اسلام ہے" پھر وہ پوچھتے ہیں کہ یہ (یعنی رسول اللہ ﷺ) کون ہیں جو تمہارے درمیان بھیجے گئے تھے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں" وہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم نے کیسے جانا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں" وہ جواب میں کہتا ہے کہ "میں نے خدا کی کتاب کو پڑھا، اس پر ایمان لایا۔ اور دل سے اسے) سچ جانا (جس کی وجہ سے (مجھے آنحضرت ﷺ کا رسول ہونا معلوم ہوا) پھر ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے (یعنی خدا کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ) میرا بندہ سچا ہے اس کے لئے جنت کا بستر بچھاؤ اسے جنت کا لباس پہناؤ اور اس کے لئے جنت کی طرف دروازہ کھول دو" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "چنانچہ اس کی طرف جنت کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اسے جنت کی ہوا اور خوشبو آتی رہتی ہے۔ پھر اس کی قبر کو حد نظر تک کشادہ کر دیا جاتا ہے " آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اس کے بعد اس کے پاس ایک خوبصورت شخص اچھے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائے آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ "خوشخبری ہو تجھے اس چیز کی جو تجھے خوش کرنے والی ہے۔ یعنی تیرے لئے وہ نعمتیں تیار ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا) آج وہ دن ہے جس کا (دنیا میں) تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا" بندہ مؤمن اس سے پوچھتا ہے کہ "تم کون ہو؟ تمہارا چہرہ حسن وجمال میں کامل ہے، اور تم بھلائی کو لائے ہو، اور اس کی خوشخبری سناتے ہو، وہ شخص جواب دیتا ہے کہ "میں تیرا نیک عمل ہوں (جو اس شکل وصورت میں آیا ہوں) بندہ مؤمن (یہ سن کر) کہتا ہے "اے میرے پروردگار! قیامت قائم کر دے! اے میرے پروردگار قیامت قائم کر دے تاکہ میں اپنے اہل وعیال کی طرف جاؤں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اور جب بندہ کافر دنیا سے اپنا تعلق ختم کرنے اور آخرت کی طرف جانے کو ہوتا ہے (یعنی اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے) تو اس کے پاس سے آسمان سے (عذاب کے) کالے چہرے والے فرشتے آتے ہیں ان کے ساتھ ٹاٹ ہوتا ہے اور وہ اتنی دور کہ جہاں تک نگاہ پہنچ سکے بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آتا ہے اور اس کے سر کے قریب بیٹھ کر کہتا ہے کہ "اے خبیث جان! خدا کی طرف سے عذاب (مبتلا کئے جانے کے لئے جسم سے باہر) نکل"! آپ ﷺ نے فرمایا (کافر کی روح یہ سن کر) اس کے جسم میں پھیل جاتی ہے (یعنی روح کافر جب عذاب خداوندی کے آثار دیکھتی ہے تو اس کے خوف سے اپنے جسم سے نکلنے کے لئے تیار نہیں ہوتی بلکہ پورے جسم میں چھپی چھپی پھرتی ہے بخلاف مؤمن کی روح کے کہ وہ انوار الٰہی اور پروردگار کے کرم کے آثار دیکھ کر جسم سے خوشی خوشی نکل آتی ہے) چنانچہ ملک الموت اس روح کو سختی اور زور سے باہر نکالتا ہے جیسا کہ ترصوف سے آنکڑا کھینچا جاتا ہے (یعنی جس طرح ترصوف سے آنکڑا بڑی سختی اور مشکل سے کھینچا جاتا ہے اور اس سختی سے کھینچنے کی وجہ سے صوف کے کچھ اجزاء اس آنکڑا سے لگے ہوئے باہر آجاتے ہیں تو یہ حال ہوتا ہے کہ جیسے کہ روح کے ساتھ رگوں کے کچھ اجزاء لگے ہوئے باہر آگئے ہیں) جب ملک الموت اس روح کو پکڑ لیتا ہے

دوسرے فرشتے اس روح کو ملک الموت کے ہاتھ پلک جھپکنے کے بقدر بھی نہیں چھوڑتے بلکہ اسے لے کر ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں اس روح میں سے ایسے (سڑے ہوئے) مردار کی بدبو نکلتی ہے جو روئے زمین پر پایا جائے۔ وہ فرشتے اس روح کو لے کر آسمان کی طرف چلتے ہیں چنانچہ جب وہ فرشتوں کی کسی جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ جماعت پوچھتی ہے کہ "یہ کون ناپاک روح ہے؟ وہ فرشتے جو اسے لے جا رہے ہوتے ہیں جواب دیتے ہیں کہ "یہ فلاں شخص کا بیٹا ہے (یعنی فلاں شخص کی روح ہے) اور اس کے برے نام برے اوصاف کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ جن نام و اوصاف سے وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اسے آسمان سے دنیا تک پہنچا دیا جاتا ہے اور اس کے لئے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لئے کہا جاتا ہے تو ان کے واسطے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے (استدلال کے بطور پر) یہ آیت پڑھی: لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ان (کافروں) کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل کئے جائیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا) پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اس روح کا اعمال نامہ سجین میں لکھ دو جو سب سے نیچے کی زمین ہے" چنانچہ کافر کی روح (نیچے) پھینک دی جاتی ہے، پھر آنحضرت ﷺ نے (استدلال کے طور پر) یہ آیت تلاوت فرمائی وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ جس شخص نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ ایسا ہے جیسے آسمان سے (یعنی ایمان و توحید کی بلندی سے کفر و شرک کی پستی میں) گر پڑا۔ چنانچہ اسے پرندے اچک لیتے ہیں (یعنی وہ ہلاک ہو جاتا ہے) یا ہوا اسے (اڑا کر) دور پھینک دیتی ہے (یعنی رحمت خداوندی سے دور ہو جاتا ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسے شیطان نے گمراہی میں ڈال دیا جس کی وجہ سے وہ مقام قرب سے دور جا پڑا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا) اس کی روح اس کے جسم میں آجاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ "تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ "ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا" پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں کہ "تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا" پھر وہ فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں کہ "یہ شخص (یعنی آنحضرت ﷺ) جو تمہارے درمیان بھیجے گئے تھے کون ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا!" (اس سوال و جواب کے بعد) پکارنے والا آسمان کی طرف سے پکار کر کہتا ہے کہ "یہ جھوٹا ہے لہٰذا اس کے لئے آگ کا بچھونا بچھاؤ اور اس کیلئے دوزخ کی طرف دروازہ کھول دو!" چنانچہ (اس کیلئے دوزخ کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے) جس سے اس کے پاس دوزخ کی گرمی اور اس کی گرم ہوا آتی رہتی ہے اور اس کیلئے اس کی قبر اس پر اس قدر تنگ ہو جاتی ہے کہ (دونوں کنارے مل جانے سے) اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر نکل جاتی ہیں۔ پھر اس کے پاس ایک بدصورت شخص آتا ہے جو برے کپڑے پہنے ہوئے ہوتا ہے اور اس سے بدبو آتی رہتی ہے اور وہ اس سے کہتا ہے کہ "تو وہ بری خبر سن، جو تجھے رنج و غم میں مبتلا کر دے، آج وہ دن ہے جس کا تجھ سے (دنیا میں) وعدہ کیا گیا تھا۔" وہ پوچھتا ہے کہ "تو کون ہے؟ تیرا چہرہ انتہائی برا ہے جو برائی لئے ہوئے آیا ہے" وہ شخص کہتا ہے کہ تیرا برا عمل ہوں (یہ سن کر) مردہ کہتا ہے کہ "اے میرے پروردگار! تو قیامت قائم نہ کیجئے

ایک اور روایت میں اسی طرح منقول ہے مگر اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "جب مؤمن کی روح (اس کے جسم سے) نکلتی ہے تو ہر وہ فرشتہ جو آسمان و زمین کے درمیان ہے اور ہر وہ فرشتہ جو آسمان میں ہے اس پر رحمت بھیجتا ہے۔ اس لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور (ہر آسمان کا) ہر دروازہ والا (فرشتہ) اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرتا ہے کہ اس مؤمن کی روح اس کی طرف سے آسمان پر لے جائی جائے (تاکہ وہ اس مؤمن کی روح کے ساتھ چلنے کا شرف حاصل ہو سکے) اور کافر کی روح رگوں کے ساتھ نکالی جاتی ہے چنانچہ زمین و آسمان کے درمیان تمام فرشتے اور وہ فرشتے جو (پہلے آسمان کے) ہیں اس پر لعنت بھیجتے ہیں اس کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور پہلے آسمان کے) تمام دروازے والے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ (اس کافر) کی روح ان کی طرف سے نہ چڑھائی جائے۔"

(احمدؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ فتخرج تسیل کما تسیل القطرة من السقاء سے تو یہ معلوم ہوا کہ بندہ کی جان بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ نکلتی ہے جب کہ ایک اور روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جان نکلنے کے معاملہ میں مؤمن بھی بڑی سختی اور کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں روایتوں میں تطبیق پیدا کی جاتی ہے کہ مؤمن کی روح تو جسم سے نکلنے سے پہلے سختی میں مبتلا ہوتی ہے اور جسم سے نکلنے کے وقت آسانی و سہولت سے باہر آجاتی ہے مگر بخلاف کافر کی روح کے کہ اس کی روح جسم سے نکلتے وقت بھی بڑی سختی اور کرب میں مبتلا ہوتی ہے۔

اس حدیث میں بتایا ہے کہ مؤمن کی روح ساتویں آسمان تک پہنچائی جاتی ہے جب کہ ایک روایت دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ روح مؤمن عرش تک پہنچائی جاتی ہے لہٰذا ہوسکتا ہے کہ بعض روحیں ساتویں آسمان تک پہنچائی جاتی ہوں اور بعض روحوں کو عرش تک لے جایا جاتا ہو۔

"علیین" ایک جگہ کا نام ہے جو ساتویں آسمان پر واقع ہے اور جس میں نیک لوگوں کے اعمال نامے رہتے ہیں۔

حدیث میں منکر نکیر کا تیسرا سوال اس طرح نقل کیا گیا ہے، "(یعنی آنحضرت ﷺ) جو تمہارے درمیان بھیجے گئے تھے کون ہیں؟ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں سے تو اسی طرح سوال کیا جاتا ہو اور بعض لوگوں سے اس طرح پوچھا جاتا ہو کہ "تمہارا نبی کون ہے؟ جیسا کہ ایک دوسری روایت میں منقول ہے۔

حتی ارجع الی اهلی و مالی (تاکہ میں اپنے اہل و عیال کی طرف جاؤں) میں "اہل" سے مراد حوریں اور خدام ہیں اور "مال" سے "محل" جنت کے باغ اور وہاں کی از قسم مال دوسری چیزیں مراد ہیں، یا پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "اہل" سے مراد مؤمن کے اہل قرابت اور مال سے مراد حور و قصور وغیرہ ہیں۔ واللہ اعلم

"سجین" ساتویں زمین کے نیچے دوزخ کی گہرائیوں کا ایک جگہ کا نام ہے جہاں دوزخیوں کے نامہ اعمال رکھے جاتے ہیں چنانچہ حدیث کے الفاظ اکتبوا کتابه فی سجین فی الارض السفلی میں اس طرف اشارہ ہے کہ دوزخ ساتویں زمین کے نیچے ہے"۔

خدا کے باغی اور سرکش لوگوں کو اپنی آغوش میں قبر کس دردناک طریقہ سے بھینچتی ہے؟ یہ تو آپ کو اس حدیث سے معلوم ہوا لیکن بعض مؤمنین بلکہ اکابر موحدین یعنی اولیاء اللہ کے لئے بھی "ضغط" قبر کا بھینچنا) ثابت ہے مگر اس کی کیفیت یہ نہیں ہوتی بلکہ مؤمن کے لئے قبر اپنے دونوں کنارے اس طرح ملاتی ہے جیسے کوئی ماں انتہائی اشتیاق و محبت کے عالم میں اپنے بچے کو گلے لگاتی ہے۔

دوسری روایت کے الفاظ "کافر کی روح رگوں کے ساتھ نکالی جاتی ہے" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کافر کی روح اپنا جسم بہت مشکل اور بڑی سختی سے چھوڑتی ہے۔ چونکہ اسے اپنے جسم سے کمال تعلق ہوتا ہے اور وہ جسم سے نکلنا نہیں چاہتی اس لئے موت کا فرشتہ اسے کھینچ کر باہر نکالتا ہے۔

عالم برزخ میں مؤمن کی روح

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ كَعْبٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ لَمَّا حَضَرَتْ كَعْبًا الْوَفَاةُ اَتَتْهُ اُمُّ بِشْرٍ بِنْتُ الْبَرَاءِ ابْنِ مَعْرُوْرٍ فَقَالَتْ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اِنْ لَقِيْتَ فُلَانًا فَاقْرَأْ عَلَيْهِ مِنِّي السَّلَامَ فَقَالَ غَفَرَ اللّٰهُ لَكِ يَا اُمَّ بِشْرٍ نَحْنُ اَشْغَلُ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالَتْ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَمَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اَرْوَاحَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ طَيْرٍ خُضْرٍ تَعْلُقُ بِشَجَرِ الْجَنَّةِ قَالَ بَلٰى قَالَتْ فَهُوَ ذَاكَ (رواہ ابن ماجۃ والبیہقی فی کتاب البعث والنشور)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن کعب اپنے والد مکرم (حضرت کعبؓ) کے بارہ میں روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت کعبؓ کی موت کا وقت قریب آیا تو حضرت براءؓ ابن معرور کی صاجزادی حضرت اُمّ بشرؓ ان کے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ "اے ابو عبدالرحمٰن! (یہ حضرت

کعبؓ کی کنیت ہے) اگر آپ مرنے کے بعد عالم برزخ میں) فلاں شخص سے ملیں تو ان سے میرا اسلام کہئے گا! حضرت کعبؓ نے جواب دیا "اُمّ بشر! اللہ تجھے بخشے، وہاں ہماری مشغولیت اس سے زیادہ ہوگی" اُمّ بشر نے کہا کہ ابو عبد الرحمٰن! کیا آپ نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا کہ "(عالم برزخ میں) مؤمنین کی روحیں سبز جانوروں کے قالب میں ہوں گی اور جنت کے درختوں سے میوے کھاتی ہوں گی۔ حضرت کعبؓ نے کہا کہ "ہاں! (میں نے یہ ارشاد گرامی سنا ہے) اُمّ بشرؓ نے فرمایا "یہی وہ (فضل و کرامت) ہے (جس سے تمہارے نوازے جانے کی امید ہے)۔" (ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح: حضرت عبد الرحمٰن اجل تابعین میں سے ہیں اور ان کے والد مکرم حضرت کعبؓ کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے اسی طرح حضرت براءؓ ابن معرور بھی صحابی ہیں اور انصار میں سے ہیں حضرت اُمّ بشرؓ ان کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت کعبؓ جب دار آخرت کی سفر کی تیاری میں تھے اور ان کی اجل قریب تھی تو اُمّ بشرؓ نے اس بات کی درخواست کی کہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو کر عالم برزخ میں پہنچیں تو اگر فلاں شخص سے ملاقات ہو تو انہیں میرا اسلام کہہ دیں۔

بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "فلاں شخص" راوی کے الفاظ ہیں۔ اُمّ بشر نے اس موقع پر حضرت براءؓ یا حضرت بشر کا نام لیا ہوگا۔ حضرت کعبؓ نے اُمّ بشرؓ سے کہا کہ "اللہ تجھے بخشے" یہ الفاظ اس موقع پر بولے جاتے ہیں جب کہ متکلم اپنے مخاطب سے کوئی ایسی بات سنتا ہے جو اسے کہنی نہیں چاہئے تھی۔ گویا حضرت کعبؓ کا مطلب یہ تھا کہ "تم یہ کیا کہہ رہی ہو!؟ وہاں تو ہماری مشغولیت اس سے کہیں زیادہ ہوگی کہ وہاں پہنچ کر کسی کو پہچانیں اور ان تک کسی کا سلام و پیام پہنچائیں۔ یعنی وہاں پہنچ کر میں اپنے ہی حال میں گرفتار ہوں گا کہ اپنی بھی خبر نہ ہوگی چہ جائیکہ دوسروں کی خبر، اسی طرح وہاں سب ہی اپنے اپنے حال میں گرفتار ہوں گے حاصل یہ کہ وہاں کون آپ میں ہوگا اور کسے اپنے حال سے فرصت ملے گی کہ کسی کو کوئی سلام و پیام پہنچائے۔

ام بشرؓ نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کی روشنی میں ان کے اسی عذر کا یہ جواب دیا کہ آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہوں گے کہ جو گرفتار وحشت ہوں بلکہ آپ تو ان مؤمنین میں سے ہوں گے جن کے حق میں آنحضرت ﷺ نے یہ عظیم خوشخبری دی ہے گویا آپ بھی وہاں خوش حال و مطمئن ہوں گے اور اللہ رب العزت کے بے پایاں رحم و کرم سے بہرہ ور ہوں گے۔

ایک اور روایت میں عالم برزخ میں ارواح مؤمنین کا حال کچھ تفصیل سے اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ "مؤمنین کی ارواح سبز جانوروں کے قالب میں ہوں گی۔ جو جنت میں چرتی ہوں گی، وہاں کے میوے کھاتی ہوں گی وہاں کا پانی پیتی ہوں گی اور عرش کے نیچے سونے کے قندیلوں میں اپنا مسکن بنائے ہوئے ہوں گے۔

(۱۷) وَعَنْهُ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ كَانَ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا نَسَمَةُ الْمُؤْمِنِ طَيْرٌ تَعَلَّقُ فِيْ شَجَرِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يُرْجِعَهُ اللّٰهُ فِيْ جَسَدِهٖ يَوْمَ يَبْعَثُهٗ (رواہ مالک والنسائی والبیہقی فی کتاب البعث والنشور)

"اور حضرت عبد الرحمٰن اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ وہ (یعنی عبد الرحمٰن کے والد حضرت کعبؓ) رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بیان کرتے تھے کہ "عالم برزخ میں) مؤمن کی روح پرندہ کے قالب میں جنت کے درختوں سے میوے کھاتی رہتی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس دن کہ جب اسے اٹھائے گا (یعنی قیامت کے دن) اسے اس کے بدن میں واپس بھیج دے گا۔" (مالکؒ، نسائیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ "جب انسان کی روح کو جانور کا بدن ملا تو اس کا مرتبہ گھٹ گیا کیونکہ اس صورت میں وہ انسان سے جانور ہو گیا اور قلب حقیقت لازم آیا؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ روح مؤمن کو پرندہ کے جسم کے ساتھ ایسا تعلق نہیں ہوتا جیسا کہ اپنے حقیقی جسم کے ساتھ روح کا تعلق ہوتا ہے اور اس پر اپنا تصرف کرتی ہے بلکہ یہ تعلق ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی قیمتی چیز مثلاً لال یا جواہر کو اس کی حفاظت اور احتیاط کی خاطر صندوق میں رکھ دیا جائے۔ لہٰذا روح مؤمن کو پرندہ کے قالب میں کر دینے سے نہ تو اس کے رتبہ میں کمی ہوتی ہے اور نہ قلب حقیقت لازم آتا ہے بلکہ اس طرح اس کی تعظیم و تکریم ہی ہوتی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ حدیث میں روح مؤمن کے بارہ میں جو کیفیت بیان فرمائی گئی ہے اس کا تعلق شہداء کے ساتھ ہے جب کہ دوسرے بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس کا تعلق عام مؤمنین سے ہے جیسا کہ حدیث کے ظاہری مفہوم سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

(۱۸) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ وَهُوَ يَمُوْتُ فَقُلْتُ اِقْرَأْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّلَامَ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت محمد ابن منکدرؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت جابرؓ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب کہ وہ قریب المرگ تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ (عالم برزخ میں پہنچ کر) رسول کریم ﷺ سے میرا اسلام عرض کر دیں۔" (ابن ماجہ)

بَابُ غُسْلِ الْمَيِّتِ وَتَكْفِيْنِهٖ

میت کو نہلانے اور کفنانے کا بیان

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے مردہ کو نہلانے اور کفنانے کے احکام و مسائل اور آداب کا علم ہوگا۔ تمام علماء کے نزدیک میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے یعنی اگر کچھ لوگ نہلا دیں گے تو سب کے ذمہ سے فرض ادا ہو جائے گا اور اگر کوئی بھی شخص میت کو نہ نہلائے گا تو سب کے سب گنہ گار ہوں گے۔

اس بارہ میں علماء کے یہاں اختلاف ہے کہ غسل میت میں نیت شرط ہے یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک شرط ہے اور بعض کے نزدیک شرط نہیں ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ نیت شرط ہے جیسا کہ حضرت شیخ ابن ہمامؒ کا قول ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

غسل میت

(۱) عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ نَحْنُ نَغْسِلُ ابْنَتَهٗ فَقَالَ اغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا اَوْخَمْسًا اَوْاَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ اِنْ رَأَيْتُنَّ ذٰلِكَ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ وَاجْعَلْنَ فِى الْاٰخِرَةِ كَافُوْرًا اَوْشَيْئًا مِنْ كَافُوْرٍ فَاِذَا فَرَغْتُنَّ فَاٰذِنَّنِى فَلَمَّا فَرَغْنَا اٰذَنَّاهُ فَاَلْقٰى اِلَيْنَا حَقْوَهٗ فَقَالَ اَشْعِرْ نَهَا اِيَّاهُ وَفِىْ رِوَايَةٍ اِغْسِلْنَهَا وِتْرًا ثَلَاثًا اَوْخَمْسًا اَوْسَبْعًا وَابْدَاْنَ بِمَيَامِنِهَا وَ مَوَاضِعِ الْوُضُوْءِ مِنْهَا وَقَالَتْ فَضَفَرْنَا شَعْرَهَا ثَلَاثَةَ قُرُوْنٍ فَاَلْقَيْنَاهَا خَلْفَهَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت اُمّ عطیہؓ فرماتی ہیں کہ ہمارے پاس رسول کریم ﷺ تشریف لائے جب کہ ہم آپ کی بیٹی (حضرت زینبؓ) کو نہلا رہے تھے، آپ نے فرمایا "تم تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ اور اگر مناسب سمجھو (یعنی ضرورت ہو تو اس سے بھی زیادہ اسے پانی اور بیری کے پتوں سے (یعنی بیری کے پتے پانی میں جوش دے کر اس پانی سے) نہلاؤ (کیونکہ بیری کے پتوں کے جوش دیئے ہوئے پانی سے بہت زیادہ پاکی اور صفائی حاصل ہوتی ہے) اور آخری مرتبہ میں کافور۔ یا یہ فرمایا کہ کافور کا کچھ حصہ (پانی میں ڈال دینا۔ اور جب تم (نہلانے سے) فارغ ہو جاؤ تو مجھے خبر دینا، چنانچہ جب ہم فارغ ہو گئے تو آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی گئی، آپ نے اپنا تہ بند ہماری طرف بڑھا دیا اور فرمایا کہ اس تہ بند کو اس کے بدن سے لگا دو (یعنی اس تہ بند کو اس طرف کفن کے نیچے رکھ دو کہ وہ زینبؓ کے بدن سے لگا رہے) اور ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اسے طاق یعنی تین بار یا پانچ بار یا سات بار غسل دو اور غسل اس کی دائیں طرف سے اور اس کے اعضاء وضو سے شروع کرو۔ حضرت اُمّ عطیہؓ فرماتی ہیں کہ "ہم نے ان کے بالوں کی تین چوٹیاں گوندھ کر ان کے پیچھے ڈال دیں۔" (صحیح بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ اِغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا اَوْخَمْسًا اواكثر مِنْ ذٰلِكَ اور اِغْسِلْنَهَا وِتْرًا ثَلٰثًا اَوْخَمْسًا اَوْسَبْعًا میں حرف اَوْ

ترتیب کے لئے ہے تخییر کے لئے نہیں ہے کیونکہ اگر پہلے غسل میں پاکی حاصل ہو جائے تو تین مرتبہ نہلانا مستحب ہے اور اس سے تجاوز کرنا مکروہ ہے اور اگر پاکی دو بار یا تین بار میں حاصل ہو تو پھر پانچ مرتبہ نہلانا مستحب ہے یا زیادہ سے زیادہ سات مرتبہ، سات مرتبہ سے زیادہ نہلانا منقول نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ نہلانا مکروہ ہے۔

بیری کے پتوں اور کافور کے پانی سے غسل میت

میت کو بیری کے پتوں اور کافور کے پانی سے نہلانا چاہئے اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ دو دو مرتبہ تو بیری کے پتوں کے پانی سے نہلایا جائے جیسا کہ کتاب ہدایہ سے معلوم ہوتا ہے نیز ابوداؤد کی روایت ہے کہ ابن سیرین نے حضرت اُمّ عطیہ سے غسل میت سیکھا تھا۔ وہ بیری کے پتوں سے پانی سے دو مرتبہ غسل دیتی تھیں۔ اور تیسری مرتبہ کافور کے پانی سے غسل دیا جائے۔

کافور پانی میں ملایا جائے یا خوشبو میں؟

شیخ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ کافور اس پانی میں ملایا جائے جس سے میت کو نہلایا جا رہا ہو چنانچہ جمہور علماء کی بھی یہی رائے ہے، جب کہ کوفی کہتے ہیں کہ کافور حنوط میں یعنی اس خوشبو میں ملایا جائے جس سے میت کو معطر کیا جا رہا ہو اور میت کے نہلانے اور اس کے بدن کو خشک کرنے کے بعد بدن پر لگایا جائے۔ نیز علماء نے لکھا ہے کہ اگر کافور میسر نہ ہو تو پھر مشک اس کا قائم مقام قرار دیا جاتا ہے۔

بیری کے پتوں اور کافور کی خاصیت

علماء لکھتے ہیں کہ بیری کے پتوں اور کافور کے پانی سے میت کو غسل دینے اور میت کے بدن پر کافور ملنے کی وجہ یہ ہے کہ بیری کے پتوں سے تو بدن کا میل اچھی طرح صاف ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے مردہ جلدی بگڑتا نہیں۔ نیز بیری کے پتوں اور کافور کے استعمال کی وجہ سے موذی جانور پاس نہیں آتے۔

حصول برکت کے لئے بزرگوں کا کوئی کپڑا کفن میں شامل کیا جا سکتا ہے

آنحضرت ﷺ نے اپنا تہبند صاحبزادی کے کفن کے ساتھ لگانے کے لئے اس لئے عنایت فرمایا تاکہ اس کی برکت اسے پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کوئی شخص اہل اللہ اور بزرگان دین سے اس کے لباس کا کوئی کپڑا موت سے پہلے حاصل کر کے اپنے پاس برکت کے لئے رکھتا ہے یا اسے استعمال کرتا ہے اس طرح موت کے بعد بزرگوں کے لباس سے برکت حاصل کرنا مستحب ہے بایں طور کہ ان کا کوئی کپڑا لے کر کفن میں شامل کر دیا جائے لیکن اس سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رہے کہ وہ کپڑا کفن کے کپڑوں سے زیادہ نہ ہو۔

وابدان بمیامنھا کا مطلب یہ ہے کہ میت کو اس کے دائیں ہاتھ دائیں پہلو اور دائیں پاؤں کی طرف سے نہلانا شروع کرو اسی طرح مواضع الوضوء منھا میں حرف واو مطلق جمع کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غسل میت میں پہلے اعضاء وضو دھونے چاہیں۔ اس کے بعد دوسرے اعضاء دھوئے جائیں اور اعضاء وضو سے مراد وہ اعضاء ہیں کہ جن کا دھونا فرض ہے۔ چنانچہ غسل میت میں کلی اور ناک میں پانی دینا حنفیہ کے نزدیک مشروع نہیں ہے بعض علماء نے اس بات کو مستحب کہا ہے کہ میت کو نہلانے والا اپنی انگلیوں پر کپڑا لپیٹ لے۔ اور اس سے میت کے دانتوں کو، تالو کو، اندر سے دونوں کلوں کو اور نتھنوں کو ملے، چنانچہ اب یہی معمول بہ ہے۔

صحیح یہ ہے کہ غسل کے وقت میت کے سر پر مسح کیا جائے اور اس کے پاؤں غسل کے بعد نہ دھوئے جائیں بلکہ جب دوسرے اعضاء وضو دھوئے جاتے ہیں تو اسی وقت پیروں کو بھی دھویا جائے۔ نیز میت کے ہاتھ پہلے نہ دھوئے جائیں بلکہ غسل کی ابتداء منہ دھونے سے کرنی چاہئے بخلاف جنبی (ناپاک شخص) کے کہ وہ جب غسل کرتا ہے تو پہلے اپنے دونوں ہاتھ اس لئے دھوتا ہے تاکہ دوسرے اعضاء

دھونے کے لئے دونوں ہاتھ پاک ہوجائیں جب کہ میت دوسروں کے ہاتھوں نہلائی جاتی ہے اس لئے اس کے دونوں ہاتھوں کو دھلانے کی حاجت نہیں ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ اگر عورت کی میت ہو تو غسل کے بعد اس کے بال کھلے ہی رہنے دیئے جائیں انہیں گودھا نہ جائے۔

آنحضرت ﷺ کا کفن

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُفِّنَ فِيْ ثَلَاثَةِ اَثْوَابٍ يَمَانِيَّةٍ بِيْضٍ سُحُوْلِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ لَيْسَ فِيْهَا قَمِيْصٌ وَلَا عَمَامَةٌ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ تین کپڑوں میں کفنائے گئے تھے جو سفید یمنی اور سحول کی بنی ہوئی روئی کے تھے، نہ ان میں (سیا ہوا) کرتہ تھا نہ پگڑی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لیس فیہا قمیص و لا عمامۃ (نہ ان میں کرتہ تھا اور نہ پگڑی تھی) کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے کفن میں ان کپڑوں کے علاوہ کرتہ اور عمامہ بالکل نہ تھا۔

بعض حضرات نے اس جملہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ کرتہ اور عمامہ ان تین کپڑوں میں نہیں تھا بلکہ کرتہ اور عمامہ ان تین کپڑوں کے علاوہ تھا۔ اس صورت میں آنحضرت ﷺ کے کفن میں پانچ کپڑوں کا ہونا لازم آئے گا۔ حالانکہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے کفن میں تین کپڑے تھے، لہٰذا اس جملہ کا یہی مطلب صحیح ہے کہ آپ ﷺ کے کفن میں کرتہ و عمامہ بالکل نہیں تھا صرف تین کپڑے تھے۔

اس جملہ کے پیش نظر علماء کے مسلک میں بھی یہ اختلاف واقع ہوا ہے کہ آیا یہ مستحب ہے کہ کفن میں کرتہ اور عمامہ ہو یا یہ کہ نہ ہو؟ چنانچہ حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ، اور حضرت امام احمدؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ کفن میں تین لفافہ ہوں (یعنی صرف تین چادریں ہوں جن میں میت کو لپیٹا جاسکے) اور ان میں کرتہ و عمامہ نہ ہو۔

جب کہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ کفن میں تین کپڑے ہونے چاہئیں ① ازار یعنی لنگی ② قمیص یعنی کفن ③ لفافہ یعنی پوٹ کی چادر۔ لہٰذا حدیث میں قمیص کی جو نفی فرمائی گئی ہے اس کی تاویل حنفیہ یہ کرتے ہیں کہ "سیا ہوا قمیص نہیں تھا بلکہ بغیر سیا ہوا قمیص تھا جس کو کفنی کہا جاتا ہے۔

سُحُوْلِيَّةٌ سحول کی طرف منسوب ہے اور سحول یمن کی ایک بستی کا نام ہے۔

کفن اچھا دینا چاہئے

③ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَفَّنَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْيُحَسِّنْ كَفَنَهُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفنائے تو اسے چاہئے کہ وہ اچھا کفن دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: ابن عدیؒ کی روایت ہے کہ اپنے مردوں کو اچھا کفن دو اس لئے کہ وہ مردے اپنی قبروں میں آپس میں (ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں)

بہر حال "اچھے کفن" سے مراد یہ ہے کہ کفن کا کپڑا پورا ہو اور بغیر کسی اسراف کے لطیف و پاکیزہ ہو اور سفید ہو خواہ دھلا ہوا ہو یا نیا ہو۔

"اچھے کفن" سے وہ اعلیٰ و قیمتی کپڑوں کے کفن مراد نہیں ہیں جو بعض جاہل دنیادار ازراہ ناموری اور تکبر کے استعمال کرتے ہیں بلکہ ایسا کفن سخت حرام ہے۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ "اسراف کرنے والوں میں یہ جو طریقہ اختیار کیا ہوا ہے کہ بہت زیادہ قیمتی کپڑے کفن میں دیتے ہیں وہ شرعی اعتبار سے ممنوع ہے کیونکہ اس سے مال کا خواہ مخواہ ضائع ہونا لازم آتا ہے۔

محرم کے کفن کا مسئلہ

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا کَانَ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَوَقَصَتْہُ نَاقَتُہٗ وَھُوَ مُحْرِمٌ فَمَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِغْسِلُوْہُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ وَکَفِّنُوْہُ فِیْ ثَوْبَیْہِ وَلَا تَمَسُّوْہُ بِطِیْبٍ وَلَا تُخَمِّرُوْا رَأْسَہٗ فَاِنَّہٗ یُبْعَثُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مُلَبِّیًا۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص (سفر حج کے دوران) آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تھا، اس کی اونٹنی نے (اس کو گرا دیا اور) اس کی گردن توڑ دی، وہ شخص محرم (یعنی حج کی نیت سے اور احرام باندھے ہوئے) تھا اسی حال میں وہ مرگیا۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اسے پانی اور بیری کے پتوں سے نہلاؤ اسے اسی کے دونوں کپڑوں میں کفناؤ اور نہ اسے خوشبو لگاؤ اور نہ اس کا سر ڈھانکو کیونکہ وہ قیامت کے دن لبیک کہتا ہوا اٹھایا جائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں انتقال کر جائے تو اسے اسی کے لباس میں کہ جسے وہ بطور محرم استعمال کرتا تھا کفنا دیا جائے اور اس پر خوشبو نہ لگائی جائے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک کفن کے بارہ میں محرم اور غیر محرم دونوں برابر ہیں۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اسی کے دونوں کپڑوں میں کہ جسے وہ بطور محرم کے استعمال کرتا تھا کفنانے کا حکم دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس ان دونوں کپڑوں کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہ تھا کہ اسے علیحدہ سے پورا کفن دیا جاتا اسی طرح آپ نے اس کے سر کو ڈھانکنے سے جو منع فرمایا تو یہ ممانعت بھی صرف اس شخص کے لئے تھی عام طور پر سب کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ خَبَّابٍ قُتِلَ مُصْعَبُ بْنُ عُمَیْرٍ فِیْ بَابِ جَامِعِ الْمَنَاقِبِ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی

(اور خباب کی وہ حدیث کہ جس کے ابتداء یہ ہے قتل مصعب بن عمیر ہم ان شاء اللہ باب جامع المناقب میں نقل کریں گے۔)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

کفن کے لئے سفید کپڑا بہتر ہے

⑤ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْبِسُوْا مِنْ ثِیَابِکُمُ الْبَیَاضَ فَاِنَّھَا مِنْ خَیْرِ ثِیَابِکُمْ وَکَفِّنُوْا فِیْھَا مَوْتَاکُمْ وَمِنْ خَیْرِ اَکْحَالِکُمُ الْاِثْمِدُ فَاِنَّہٗ یُنْبِتُ الشَّعْرَ وَیَجْلُوا الْبَصَرَ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَرَوٰی ابْنُ مَاجَۃَ اِلٰی مَوْتَاکُمْ۔

"حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم سفید کپڑے پہنو اس لئے کہ تمہارے لئے وہ بہترین کپڑے ہیں اور اپنے مردوں کو سفید کپڑوں میں کفناؤ، نیز تمہارے لئے بہترین سرمہ "اثمد" ہے کیونکہ وہ تمہاری پلکوں کے بال اگاتا ہے اور آنکھ کی بینائی کو بڑھاتا ہے ابوداؤد۔ ترمذیؒ) ابن ماجہؒ نے اس روایت کو لفظ "موتاکم" تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: مردوں کو سفید کپڑے میں کفنانے کا حکم استحباب کے طور پر ہے چنانچہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ کفن کا کپڑا اگر سفید ہو تو اولیٰ بہتر

ہے ورنہ تو مردوں کے کفن کے لئے برد (یعنی دھاریدار کپڑا) اور کتان کے کپڑے اور عوتوں کے کفن کے لئے ریشمی، زعفرانی اور سرخ رنگ کے کپڑے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ مرد ہو یا عورت اس کے لئے اس کی زندگی میں جن کپڑوں کا استعمال جائز ہے مرنے کے بعد انہیں کپڑوں کا کفن دینا بھی جائز ہے۔

"اثمد" اسی سرمہ کو کہتے ہیں جو عام طور پر ہمارے یہاں استعمال ہوتا ہے، اس سرمہ کے استعمال کے بارہ میں یہ افضل ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اتباع کے پیش نظر اسے سوتے وقت لگایا جائے، پھر یہ کہ سوتے وقت سرمہ لگانا اپنے فوائد کے اعتبار سے بہت زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔

قیمتی کپڑے کے کفن کی ممانعت

(٦) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُغَالُوْا فِي الْكَفَنِ فَإِنَّهُ يُسْلَبُ سَلْبًا سَرِيْعًا (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت علیؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کفن میں زیادہ قیمتی کپڑا نہ لگاؤ اس لئے کہ وہ بہت جلد چھین لیا جاتا ہے۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: "جلد چھین لیا جاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ جلد ہی خراب اور پرانا ہو جاتا ہے پھر کیا ضرورت ہے کہ نفیس اور زیادہ قیمت کا کپڑا کفن میں لگایا جائے غرض کہ حدیث کا حاصل کفن کے بارہ میں اسراف کرنے سے منع کرنا ہے اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ کفن میں اوسط درجہ کا کپڑا لگانا مستحب ہے۔

قیامت میں مردہ کس حال میں اٹھے گا؟

(٧) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّهُ لَمَّا حَضَرَهُ الْمَوْتُ دَعَا بِثِيَابٍ جُدُدٍ فَلَبِسَهَا ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْمَيِّتُ يُبْعَثُ فِي ثِيَابِهِ الَّتِي يَمُوْتُ فِيْهَا (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے نئے کپڑے منگوائے اور انہیں زیب تن کیا پھر فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مردہ انہیں کپڑوں میں اٹھایا جاتا ہے جن میں وہ مرتا ہے۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابوسعیدؓ نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی پر عمل کرنے کے لئے نئے کپڑے منگوائے اور انہیں زیب تن کیا۔ بظاہر حدیث کی مراد یہ ہوئی کہ "قیامت میں جب مردوں کو دوبارہ زندگی بخشی جائے گی اور وہ اٹھ کر میدان حشر میں آئیں گے تو اس وقت ان کے بدن پر کپڑا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اگر یہی مفہوم حدیث کا مراد ہے تو مسئلہ بڑا نازک ہو جاتا ہے کیونکہ صحیح حدیث کے ذریعہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ "قیامت کے روز لوگ ننگے بدن اور ننگے پاؤں اٹھیں گے۔

اس لئے علماء نے اس حدیث کے معنی یہ لکھے ہیں کہ "حدیث میں کپڑوں سے مراد وہ اعمال ہیں جن پر زندگی ختم ہوتی ہے چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ اہل عرب کبھی کبھی لفظ ثیاب (یعنی کپڑے) بولتے ہیں اور اس سے اعمال مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح کپڑے بدن سے لگے رہتے ہیں اسی طرح اعمال بھی بدن سے متعلق ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ۔ ثیابک فطھر کی تاویل بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ "اپنے اعمال صحیح کرو"۔

حضرت ابوسعیدؓ نے اس وقت جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے محض صفائی و ستھرائی اور پاکیزگی کے لئے نئے کپڑے زیب تن

گئے، اتفاقاً یہ حدیث بھی ان کے ذہن میں آگئی جسے انہوں نے بیان کیا نہ یہ کہ حضرت ابوسعیدؓ نے اس وقت نئے کپڑے پہننے کی دلیل کے طور پر یہ حدیث بیان کی تھی۔

اس ارشاد گرامی کی مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ "جن کپڑوں میں موت واقع ہوگی۔ وہ اپنی قبر سے تو انہیں کپڑوں میں اٹھے گا مگر میدان حشر میں برہنہ حالت میں پہنچے گا۔

بہترین کفن کونسا ہے؟

(۸) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُ الْكَفَنِ الْحُلَّةُ وَخَيْرُ الْاُضْحِيَّةِ الْكَبْشُ الْاَقْرَنُ (رواہ ابوداؤد ورواہ الترمذی وابن ماجۃ عن ابی امامۃ)

"اور حضرت عبادہ ابن صامتؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "بہترین کفن حلہ ہے۔ اور بہترین قربانی سینگوں والا دنبہ ہے۔ ترمذی نے اور ابن ماجہ نے یہ روایت حضرت ابوامامہ سے نقل کی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حلہ سے چادر، لنگی اور اس کے نیچے کی قمیص یعنی کفنی مراد ہے۔ کفن میں یہ تینوں کپڑے مسنون ہیں یا پھر یہ کہ "حلہ" سے مراد قمیص (کفنی) کے علاوہ صرف چادر اور لنگی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کفن میں ایک کپڑے پر اکتفاء نہ کیا جائے گا بلکہ کم سے کم دو کپڑے ہونے بہتر ہیں کیونکہ یہ کفن کفایہ اور ادنی درجہ ہے اور اگر کفن میں تین کپڑے یعنی چادر، لنگی اور اس کے ساتھ قمیص بھی دیں تو یہ سُنّت اور درجہ کمال ہے۔

سینگوں والا دنبہ چونکہ اکثر فربہ اور قیمتی ہوتا ہے اس لئے اس کی قربانی کو بہتر فرمایا گیا ہے۔

شہداء کو انہیں کپڑوں میں دفن کیا جائے جن میں وہ شہید ہوئے ہوں

(۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلٰى اُحُدٍ اَنْ يُنْزَعَ عَنْهُمُ الْحَدِيْدُ وَالْجُلُوْدُ وَاَنْ يُدْفَنُوْا بِدِمَائِهِمْ وَثِيَابِهِمْ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جنگ احد کے شہدا کے بارہ میں فرمایا کہ ان کے لوہے (کے ہتھیار، زرہیں) اور چمڑے (کی پوستین وغیرہ یعنی وہ اشیاء جو خون آلود نہیں ہیں) ان کے بدن سے اتار لی جائیں پھر انہیں ان کے (خون آلودہ) کپڑوں اور خون سمیت دفن کر دیا جائے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ کے مسلک میں شہید کے لئے نہ تو غسل ہے اور نہ نماز جنازہ ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک شہداء کے لئے غسل تو نہیں ہے مگر نماز جنازہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت مصعبؓ اور حضرت امیر حمزہؓ کا کفن

(۱۰) عَنْ سَعْدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ عَوْفٍ اُتِيَ بِطَعَامٍ وَكَانَ صَائِمًا فَقَالَ قُتِلَ مُصْعَبُ بْنُ عُمَيْرٍ فَهُوَ خَيْرٌ مِنِّيْ كُفِّنَ فِيْ بُرْدَةٍ اِنْ غُطِّيَ رَأْسُهُ بَدَتْ رِجْلَاهُ وَاِنْ غُطِّيَ رِجْلَاهُ بَدَا رَأْسُهُ وَاُرَاهُ قَالَ وَقُتِلَ حَمْزَةُ وَهُوَ خَيْرٌ مِّنِّيْ ثُمَّ بُسِطَ لَنَا مِنَ الدُّنْيَا مَا بُسِطَ اَوْ قَالَ اُعْطِيْنَا مِنَ الدُّنْيَا مَا اُعْطِيْنَا وَلَقَدْ خَشِيْنَا اَنْ تَكُوْنَ حَسَنَاتُنَا عُجِّلَتْ لَنَا ثُمَّ جَعَلَ يَبْكِيْ حَتّٰى تَرَكَ الطَّعَامَ (رواہ البخاری)

"حضرت سعد ابن ابراہیم اپنے والد مکرم (حضرت ابراہیم) سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے پاس جب کہ وہ روزہ سے تھے (افطار کے لئے) کھانا لایا گیا، انہوں نے فرمایا کہ "حضرت مصعب ابن عمیرؓ جو شہید کر دیئے گئے تھے مجھ سے بہتر تھے مگر وہ صرف ایک چادر میں کفنائے گئے تھے۔ (جو اس قدر چھوٹی تھی) اگر ان کا سر ڈھانکا جاتا تھا تو ان کے پاؤں کھل جاتے تھے اور اگر ان کے پاؤں ڈھانک دیئے جاتے تھے تو اس کا سر کھل جاتا تھا (آخر کار ان کا سر تو اس چادر کے ساتھ ڈھک دیا گیا اور پیروں پر اذخر ڈال دی گئی جیسا کہ باب جامع المناقب کی حدیث میں یہ تفصیل ہے) حضرت ابراہیم حدیث (کے راوی ہیں) کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے یہ بھی فرمایا حضرت حمزہؓ جو شہید کر دیئے گئے تھے مجھ سے بہتر تھے (اور ان کو بھی ایسا ہی کفن نصیب ہوا جیسا کہ حضرت مصعب ابن عمیرؓ کو اور جب مسلمانوں کی تنگدستی و پریشانی کا یہ دور اللہ کے فضل سے ختم ہوا تو) پھر ہمارے لئے دنیا اس قدر فراخ کی گئی کہ جو ظاہر ہے، یا یہ فرمایا کہ۔ دنیا ہمیں اس قدر دی گئی جتنی کے دی گئی ہے، ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ کہیں ہماری نیکیوں کا صلہ ہمیں جلد ہی (یعنی دنیا ہی میں) نہ مل گیا ہو، پھر حضرت عبدالرحمٰن (اسی خوف کی وجہ سے) رونے لگے یہاں تک کہ انہوں نے کھانا چھوڑ دیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ بڑے باعظمت صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اسی طرح حضرت مصعب ابن عمیرؓ بھی جلیل القدر اور ذی شان و عظمت صحابہؓ میں سے ہیں، جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں۔ اور جنگ احد میں شہید ہوئے۔

حضرت مصعب ابن عمیرؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے بڑے مالدار تھے مگر جب ایمان و اسلام کی مقدس شعاعوں نے قلب و دماغ کو منور کیا اور غلامان رسالت میں شامل ہوئے تو مال و دولت سے منہ موڑ کر زہد و فقر کی زندگی اختیار کی منقول ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ کمر میں تسمہ بندھا ہوا تھا، آپ نے انہیں دیکھ کر صحابہؓ سے فرمایا کہ اس شخص کو دیکھو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی روشنی سے اس کے دل کو منور کر دیا ہے۔ میں نے اسے مکہ میں اس حال میں دیکھا ہے کہ اس کے ماں باپ اسے اچھا سے اچھا کھانا کھلاتے تھے اور میں دیکھتا تھا کہ اس کے جسم پر دو سو درہم کا لباس ہوتا تھا۔ مگر اب اس شخص نے خدا اور رسول (ﷺ) کی محبت میں اپنے آپ کو اس حال تک پہنچا دیا ہے۔

حضرت حمزہؓ ابن عبدالمطلب آنحضرت ﷺ کے محترم چچا ہیں۔ اہل بدر میں سے تھے اور جنگ احد میں شہید ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سید الشہداء فرمایا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ کے قول ولقد خشینا الخ (ہمیں اس بات کا خوف ہے الخ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کی نعمتوں نے جس فراخی سے اپنی آغوش ہمارے لئے کھول دی ہے اس کی وجہ سے ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم بھی ان لوگوں میں داخل نہ ہو جائیں جن کے بارہ میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا

"جو شخص دنیا (کی نعمتوں کے حصول) کا ارادہ کرتا ہے تو ہم ایسے شخص کو دنیا میں جو چیز چاہتے ہیں اور جس کے واسطے چاہتے ہیں جلدی ہی دیدیتے ہیں پھر ہم اس کے لئے جہنّم تجویز کرتے ہیں جس میں وہ بدحال اور راندہ (درگاہ) ہو کر داخل ہوگا۔"

چونکہ حضرت عبدالرحمٰنؓ پر خوف خداوندی غالب اور ان کا دل خشیت الٰہی سے لرزاں تھا اس لئے انہیں خیال ہوا کہ مبادا میں ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جن کے بارے میں حق تعالیٰ یہ سخت وعید بیان فرما رہے ہیں ورنہ تو ظاہر ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص صرف دنیا اور محض دنیا کی نعمتوں کا خواہش مند و طلب گار ہوتا ہے اور دنیا و دنیا کی نعمتوں کے علاوہ اس کے خواہش و طلب کا محور اور کوئی چیز نہیں ہوتی تو ہم دنیا میں اسے اپنے انعام سے نواز دیتے ہیں لیکن ہم اسے وہی دیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں نہ یہ کہ جو کچھ اس کی خواہش ہوتی ہے اسی طرح ہم اس شخص کو دنیا کی نعمتیں دیتے ہیں جسے ہم دینا چاہتے ہیں یہ نہ کہ ہر خواہش مند و طلب گار کو ہم دنیا کی نعمتیں دیتے

ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں ان لوگوں کے بارہ میں وعید بیان کی گئی ہے جو صرف دنیا کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن ان لوگوں میں سے نہیں تھے، مگر ان پر چونکہ خوف خدا غالب تھا اس لئے ڈرے کہ دنیا کی اس آسائش و فراخی کی وجہ سے کہیں ہمارا اشمار بھی انہیں لوگوں میں نہ ہو جائے۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ پر خوف خداوندی اور خشیت الٰہی کے غلبہ ہی کا یہ اثر تھا کہ روزہ دار ہونے کیوجہ سے باوجود شدید احتیاج اور ضرورت کے انہوں نے کھانا تک چھوڑ دیا اور کچھ کھایا نہیں کیونکہ جب کسی کا قلب خود خداوندی سے لرزاں ہوتا ہے تو وہ کسی بھی دنیاوی و جسمانی خواہش و لذت کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بوقت ضرورت جس قدر بھی کفن میسر آجائے وہی مسنون ہے۔

رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کے ساتھ اس کے انتقال کے بعد آنحضرت ﷺ کا معاملہ

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَبْدَاللّٰہِ بْنَ اُبَیٍّ بَعْدَ مَا اُدْخِلَ حُفْرَتَہٗ فَاَمَرَبِہٖ فَاُخْرِجَ فَوَضَعَہٗ عَلٰی رُکْبَتَیْہِ فَنَفَثَ فِیْہِ مِنْ رِیْقِہٖ وَاَلْبَسَہٗ قَمِیْصَہٗ قَالَ وَکَانَ کَسَا عَبَّاسًا قَمِیْصًا (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ عبداللہ ابن ابی کے پاس اس وقت تشریف لائے جب کہ وہ اپنی قبر میں اتارا جا چکا تھا۔ آپ ﷺ نے اسے (اس کی قبر) سے نکالنے کا حکم فرمایا جب وہ نکالا گیا تو آپ نے اسے اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اپنا مبارک لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا اور اسے اپنا کرتہ پہنایا" حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "عبداللہ ابن ابی نے حضرت عباسؓ کو اپنا کرتہ پہنایا تھا۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عبداللہ ابن ابی اسلامی تاریخ کا ایک جانا پہچانا شخص ہے، جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ فروکش ہوئے اور اس طرح اسلامی دعوت و تبلیغ کا مرکز مکہ سے مدینہ منورہ منتقل ہوا تو اسلام کی دعوت توحید و رسالت کے نتیجہ میں تین جماعتیں سامنے آئیں، ایک جماعت تو ان باسعادت و مقدس اور عظیم انسانوں پر مشتمل تھی جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا، خلوص اور صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور آنحضرت ﷺ کی رسالت پر ایمان لائے اور نبوت کے بعد نسل انسانی کے سب سے عظیم و باسعادت مرتبہ "صحابیت" سے نوازے گئے۔

دوسری جماعت، پہلی کے بالکل برعکس ان بدبخت و سیہ کار لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے علی الاعلان آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی اور جس کے نتیجہ میں نسل انسانی کے سب سے ذلیل و کمتر درجہ "کفر و شرک" پر قائم رہے۔

ان دونوں جماعتوں کے درمیان ایک تیسری جماعت تھی یہ تیسری جماعت ان خود غرض و مفاد پرست لوگوں پر مشتمل تھی جو اپنی اغراض و مقاصد کے تحت بظاہر تو مسلمان ہو گئے تھے اور مسلمانوں کو دکھانے کے لئے ان کے ہمنوا بھی ہوتے تھے مگر اندرونی طور پر ان کی ساری سرگرمیوں کا مرکز دعوت اسلامی کی مخالفت اور مسلمانوں کی بیخ کنی کا جذبہ ہوتا تھا۔ یہی وہ جماعت تھی جو انسانیت کی ارزل ترین اور قابل نفرین خصلت "نفاق" سے بھرپور تھی اور اسلامی تاریخ میں یہی جماعت "منافقین" کے نام سے یاد کی گئی۔ عبداللہ ابن ابی اسی جماعت کا سربراہ اور سردار تھا۔

حضرت عباسؓ (آنحضرت ﷺ کے عم محترم) اگرچہ غزوہ بدر سے بہت پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر نہیں کیا تھا، چنانچہ جب جنگ بدر ہوئی تو یہ کفار مکہ کی طرف سے بدر میں مجبوراً شریک ہوئے۔ مگر آنحضرت ﷺ کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ یہ مسلمان ہو چکے ہیں اس لئے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو آگاہ فرما دیا تھا کہ جنگ میں ان پر ہاتھ نہ

اٹھایا جائے۔

بہر حال جب جنگ ختم ہوئی اور حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح و غلبہ نصیب فرمایا تو اسلامی لشکر کفار مکہ کی ایک بڑی تعداد کو میدان جنگ سے اسیر بنا کر مدینہ لایا۔ انہیں قیدیوں میں حضرت عباسؓ بھی تھے، حضرت عباسؓ جب مدینہ لائے گئے تو ان کے بدن پر کپڑا نہیں تھا اور چونکہ وہ دراز قد تھے اس لئے کسی مسلمان کا لباس ان کے جسم پر نہیں آیا، اتفاق سے عبداللہ ابن ابی بھی دراز قد تھا اس نے اپنا کرتہ حضرت عباسؓ کے لئے پیش کیا جسے بدرجہ مجبوری قبول کر لیا گیا اس طرح حضرت عباسؓ نے عبداللہ ابن ابی کا کرتہ پہنا۔ چنانچہ جب عبداللہ ابن ابی مرا تو آنحضرت ﷺ نے اس کے کرتہ کا بدلہ اتارنے کے لئے اپنا مبارک کُرتہ اس کو پہنا دیا تاکہ آپ ﷺ پر ایک منافق کا احسان باقی نہ رہے۔

اس موقعہ پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ

"منافقین میں سے جو مر جائے اس کے لئے (مغفرت و بخشش کی) کبھی دعا نہ کیجئے اور نہ ہی اس کی قبر پر جایئے۔"

مگر اس کے باوجود آنحضرت ﷺ عبداللہ ابن ابی کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کو اپنا کرتہ پہنایا اور اس کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈالا؟

علماء نے اس اشکال کے بہت سارے جواب دیئے ہیں جو پوری تفصیل کے ساتھ دوسری شروح میں مذکور ہیں یہاں تو صرف یہ جواب نقل کر دینا کافی ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ مذکورہ بالا آیت نازل نہیں ہوئی تھی، پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ کا مقصد صرف اس کے ایک احسان کا بدلہ اتارنا تھا جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، نیز عبداللہ ابن ابی کا لڑکا چونکہ مخلص و صادق مؤمن تھا اور وہ نفاق سے پاک تھا اس لئے اس کی تالیف قلب اور خاطر داری بھی پیش نظر تھی۔

زندگی کے آخری لمحات اور میت کے غسل و تکفین کے کچھ احکام

چونکہ یہ باب ختم ہو رہا ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس موقع پر زندگی کے آخری لمحات اور میت کے غسل و تکفین کے بارہ میں کچھ احکام و مسائل بیان کر دیئے جائیں۔

جب کوئی شخص قریب المرگ ہو اور اس پر علامات موت ظاہر ہونے لگیں تو اسے قبلہ رخ کر دیا جائے بایں طور کہ اسے چت لٹا کر اس کے پاؤں قبلہ کی طرف کر دیئے جائیں اور سر کو اونچا کر دیا جائے تاکہ وہ قبلہ رخ ہو جائے، اور قریب المرگ کو تلقین کی جائے یعنی اس کے سامنے کلمہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ باواز بلند پڑھا جائے تاکہ قریب المرگ بھی سن کر پڑھنے لگے۔ مگر قریب المرگ کو کلمہ پڑھنے کا حکم نہ دیا جائے کیونکہ وہ وقت بڑا مشکل ہے نہ معلوم اس کے منہ سے کیا نکل جائے۔ جب روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے تو اس کے تمام اعضاء درست کر دیئے جائیں اور کپڑے سے اس کا منہ اس ترکیب سے باندھ دیا جائے کہ کپڑا ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر اس کے دونوں سرے سر کے اوپر لے جائیں اور گرہ لگا دی جائے تاکہ منہ بند ہو جائے اور منہ کے اندر کوئی کیڑا وغیرہ نہ داخل ہو سکے، آنکھیں بند کر دی جائیں اور پیر کے دونوں انگوٹھے ملا کر باندھ دیئے جائیں تاکہ دونوں ٹانگیں پھیلنے نہ پائیں۔

میت کو نہلانے، کفنانے اور دفنانے میں جہاں تک ہو سکے جلدی کرنی چاہئے۔ جب میت کو غسل دینے کا ارادہ کیا جائے تو پہلے کسی تخت یا بڑے تختہ کو لوبان یا اگربتی وغیرہ کی دھونی دینی چاہئے۔ تین دفعہ، پانچ دفعہ، یا سات دفعہ چاروں طرف دھونی دے کر میت کو اس پر لٹا دیا جائے اس کے کپڑے اتار کر کوئی کپڑا کہ جس کی لمبائی ڈیڑھ ہاتھ اور چوڑائی دو ہاتھ ہو ناف سے لے کر زانو تک ڈال دیا جائے تاکہ ستر چھپا رہے۔

غسل میت کا طریقہ

میت کو نہلانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مردہ کا استنجا کرایا جائے لیکن رانوں اور استنجے کی جگہ غسل دینے والا اپنے ہاتھ نہ لگائے اور نہ اس پر نگاہ ڈالے بلکہ اپنے ہاتھ میں کوئی کپڑا لپیٹ لے اور جو کپڑا ناف سے زانوں تک پڑا ہے اس کے اندر اندر دھلائے، پھر اسے وضو کرائی جائے لیکن نہ تو کلی کرائی جائے اور نہ ناک میں پانی ڈالا جائے اور نہ گٹے تک ہاتھ دھلائے جائیں۔ بلکہ منہ دھلایا جائے پھر ہاتھ کہنی سمیت، پھر سر کا مسح، پھر دونوں پیر اور اگر تین دفعہ روئی تر کر کے دانتوں اور مسوڑھوں پر اور ناک کے دونوں سوراخوں میں پھیر دی جائے تو بھی جائز ہے۔ ہاں اگر میت نہانے کی حاجت میں یا حیض و نفاس میں مرجائے تو اس طرح سے منہ اور ناک میں پانی پہنچانا ضروری ہے۔

میت کی ناک، منہ اور کانوں میں روئی بھر دی جائے تاکہ وضو کراتے اور نہلاتے وقت پانی اندر نہ جائے۔

جب وضو کرا دیا جائے تو سر اور داڑھی کو خطمی (گل خیرو) سے یا اور کسی چیز سے جیسے بیسن، کھلی اور یا صابون وغیرہ سے مل کر دھویا جائے۔

پھر میت کو بائیں کروٹ لٹا کر بیری کے پتے یا اشنان ڈال کر پکایا ہوا پانی نیم گرم تین دفعہ سر سے پیر تک ڈالا جائے یہاں تک کہ پانی اس کروٹ تک پہنچ جائے جو تختے سے لگی ہوئی ہے۔ پھر دائیں کروٹ لٹا کر اسی طرح سر سے پیر تک تین دفعہ پانی ڈالا جائے یہاں تک کہ پانی اس کروٹ تک پہنچ جائے جو تختے سے لگی ہوئی ہے۔

اس کے بعد میت کو اپنے بدن کی ٹیک لگا کر ذرا بٹھلایا جائے اور اس کے پیٹ کو آہستہ آہستہ ملا اور دبایا جائے اگر پیٹ سے کوئی پاخانہ وغیرہ نکلے تو اسے پونچھ کر دھو ڈالا جائے۔ لیکن اس صفائی کے بعد پھر دوبارہ وضو اور غسل کی ضرورت نہیں اس کے بعد پھر اس کو بائیں کروٹ پر لٹا کر کافور پڑا ہوا پانی سر سے پیر تک تین مرتبہ ڈالا جائے۔ اگر بیری کے پتے اشنان اور کافور میسر نہ آئے تو سادہ نیم گرم پانی کافی ہے۔ اسی سے اسی طرح تین دفعہ نہلایا جائے۔

نہلانے کے بعد سارے بدن کو کپڑے سے پونچھ دیا جائے اور پھر اس کے سر اور داڑھی پر عطر لگایا جائے اور ماتھے تک ناک، دونوں ہتھیلیوں، دونوں گھٹنوں اور دونوں پاؤں پر کافور مل دیا جائے میت کے بالوں اور داڑھی میں کنگھی نہ کی جائے اور نہ ناخن و بال کترے جائیں۔ اسی طرح جس میت کی ختنہ نہ ہوئی ہو اس کی ختنہ بھی نہ کی جائے۔ ان تمام چیزوں سے فارغ ہو کر کفنا دیا جائے۔

مسنون کفن

مرد میت کو تین کپڑے کفنانا سُنّت ہے۔

① کفنی یعنی کرتہ جو مونڈھے سے پیروں تک ہو ② ازار ③ لفافہ۔ یعنی چادر۔ ازار سر سے لے کر پاؤں تک اور چادر اس سے ایک ہاتھ بڑی ہونی چاہئے۔ یہ مسنون کفن ہے، اور کفن کفایہ دو کپڑے یعنی ایک ازار اور ایک لفافہ۔

عورت کی میت کو پانچ کپڑوں میں کفنانا سُنّت ہے۔

① کفنی یعنی کرتا ② اوڑھنی یعنی سفید سربند ③ ازار ④ لفافہ یعنی چادر ⑤ سینہ بند۔

سربند تین ہاتھ لمبا ہونا چاہئے اور سینہ بند بغلوں کے نیچے کے حصہ سے لے کر گھٹنوں تک چوڑا اور اتنا لمبا ہونا چاہئے کہ بندھ جائے، بقیہ تین کپڑے اسی مقدار میں ہونا چاہئیں۔ جتنے مرد کے کفن میں لگتے ہیں۔ کفن مسنون کی اس مقدار میں زیادتی یا کمی کرنا برا ہے۔

عورت کے لئے کفن کفایہ تین کپڑے ہیں۔

① ازار ② اوڑھنی ③ لفافہ۔ ضرورت و مجبوری کے وقت ایک کپڑا بھی کافی ہے۔ لیکن بلا ضرورت صرف، ایک کپڑے پر اکتفا نہ کرنا چاہئے۔

کفنانے کا طریقہ

کفنانے سے پہلے کفن کو تین یا پانچ یا سات مرتبہ خوشبو کی دھونی دینی چاہئے، پھر میت کو اگر وہ مرد ہو تو اس طریقہ سے کفنایا جائے کہ پہلے لفافہ یعنی پوٹ کی چادر بچھائی جائے۔ اس کے اوپر ازار اس کے اوپر کرتہ، پھر میت کو اس پر لے جا کر پہلے کرتہ پہنایا جائے اور اس کے دونوں ہاتھ سینہ پر نہ رکھے جائیں بلکہ دونوں طرف پھیلا دیئے جائیں اور پھر ازار لپیٹ دیا جائے پہلے بائیں طرف پھر دائیں طرف، پھر چادر لپیٹی جائے پہلے بائیں طرف پھر دائیں طرف۔

عورت کو کفنانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے چادر اور ازار بچھا کر اس پر کرتہ رکھا جائے اور میت کو اس پر لے جا کر پہلے کرتہ پہنایا جائے اور سر کے بالوں کو دو حصے کر کے کرتہ کے اوپر سینہ پر ڈال دیا جائے ایک حصہ دائیں طرف اور ایک حصہ بائیں طرف۔

اس کے بعد سربند سر پر اور بالوں پر ڈالا جائے اسے نہ باندھا جائے اور نہ لپیٹا جائے پھر اس کے اوپر ازار اور اس کے بعد لفافہ یعنی پوٹ کی چادر اسی ترتیب سے یعنی پہلے بائیں طرف سے پھر دائیں طرف سے لپیٹ دی جائے اور پھر سب سے اوپر سینہ بند لپیٹا جائے۔

کفن کے کپڑے لپیٹنے کے بعد کسی دھجی سے پیر اور سر کی طرف کفن باندھ دیا جائے اور ایک بند سے کمر کے پاس بھی باندھ دینا چاہئے تا کہ راستہ میں کہیں کھل نہ جائے۔

بَابُ الْمَشْیِ بِالْجَنَازَةِ وَالصَّلٰوةِ عَلَيْهَا

جنازہ کے ساتھ چلنے اور نماز جنازہ کا بیان

جنازہ کے ساتھ پیادہ چلنا افضل ہے

جنازہ کے ساتھ پیادہ چلنا اور سوار چلنا دونوں جائز ہیں لیکن پیادہ چلنا افضل ہے۔ اگر کوئی شخص جنازہ کے ساتھ سواری پر چلے تو اسے چاہئے کہ وہ جنازہ کے پیچھے پیچھے چلے ہاں پیادہ چلنے والے کے لئے جنازہ کے آگے چلنا بھی جائز ہے اور پیچھے بھی، لیکن اس کے لئے پیچھے ہی چلنا افضل ہے۔

نماز جنازہ فرض کفایہ ہے

جنازہ کی نماز فرض کفایہ ہے یعنی اگر کچھ لوگ نماز جنازہ پڑھ لیں تو سب کے ذمہ سے فرضیت ساقط ہو جائے گی، ورنہ تو بصورت دیگر سب ہی گناہگار ہوں گے۔

نماز جنازہ کی شرائط صحت

نماز جنازہ کے صحیح ہونے کی تین شرطیں ہیں ① میت کا مسلمان ہونا ② طہارت میت یعنی میت کا نہلایا ہوا ہونا ③ جنازہ کا نمازیوں کے آگے رکھا ہوا ہونا لہٰذا تیسری شرط کا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو جنازہ کی نماز غائبانہ پڑھنا جائز ہے اور نہ اس جنازہ کی نماز جائز ہے جو جانور کی پیٹھ پر یا لوگوں کے کاندھے پر ہو اسی طرح اس جنازہ کی نماز بھی جائز نہیں ہے جو نمازیوں کے پیچھے رکھا ہوا ہو۔

اگر کوئی میت بغیر نہلائے دفن کر دی جائے اور اسے قبر کھودے بغیر باہر نکالنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں طہارت کی شرط ساقط ہو جاتی ہے لہٰذا اس کی نماز جنازہ نہلائے بغیر ہی اس کی قبر پر ادا کی جائے اور اگر میت کو باہر نکالنا ممکن ہو تو پہلے اسے باہر نکال کر نہلایا جائے پھر اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے۔

اگر نادانستہ طور پر بغیر غسل کے کسی میت کی نماز جنازہ ادا کر دی گئی اور پھر قبر کھودے بغیر اسے باہر نکال کر غسل دیا گیا تو اس کی نماز جنازہ دوبارہ پڑھی جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جنازہ لے کر جلدی چلنا چاہئے

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَسْرِعُوْا بِالْجَنَازَةِ فَاِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَیْرٌ تُقَدِّمُوْنَهَا اِلَیْهِ وَاِنْ تَكُ سِوٰی ذٰلِكَ فَشَرٌّ تَضَعُوْنَهُ عَنْ رِقَابِكُمْ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جنازہ لے کر جلدی چلو، کیونکہ اگر وہ جنازہ نیک (آدمی کا) ہے تو (اس کے لئے) بھلائی ہے لہٰذا اسے نیکی و بھلائی کی طرف (جلد) پہنچا دو اور اگر وہ ایسا نہیں ہے تو برا ہے لہٰذا اسے (جلد سے جلد) اپنی گردنوں سے اتار کر رکھ دو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جنازہ لے کر جلدی چلو" کا مطلب یہ ہے کہ جب دفن کرنے کے لئے جنازہ کو لے کر چلو تو جلدی جلدی چلو، آہستہ آہستہ قدم نہ اٹھاؤ لیکن "جلدی" سے دوڑنا مراد نہیں ہے بلکہ متوسط چال مراد ہے کہ قدم جلد جلد اٹھیں اور پاس پاس رکھے جائیں جس کا حاصل یہ ہے کہ جنازہ لے کر چلنے کی چال معمولی چال سے تو بڑھی ہوئی ہو اور دوڑنے سے کم ہو۔

"اگر وہ جنازہ نیک (آدمی کا) ہے الخ" یہ جلدی چلنے کا فائدہ بیان کیا جا رہا ہے کہ تم جس شخص کا جنازہ لے کر چل رہے ہو اگر اس کی زندگی اچھے احوال اور اچھے اعمال کے ساتھ گزری ہے تو اسے جلد جلد لے کر چلو تاکہ وہ آخرت کے ثواب اور حق تعالیٰ کی رحمت تک جلد سے جلد پہنچ جائے اور اگر وہ جنازہ کسی ایسے شخص کا ہے جس کی زندگی برے احوال اور برے اعمال کے ساتھ گزری ہے تو بھی جلد جلد چلو تاکہ برے کو جلد اپنے کاندھوں سے اتار پھینکو۔

نیکوکار اور بدکار کا جنازہ

(۲) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَتِ الْجَنَازَةُ فَاحْتَمَلَهَا الرِّجَالُ عَلٰی اَعْنَاقِهِمْ فَاِنْ كَانَتْ صَالِحَةً قَالَتْ قَدِّمُوْنِیْ وَاِنْ كَانَتْ غَیْرَ صَالِحَةٍ قَالَتْ لِاَهْلِهَا یَا وَیْلَهَا اَیْنَ تَذْهَبُوْنَ بِهَا یَسْمَعُ صَوْتَهَا كُلُّ شَیْءٍ اِلَّا الْاِنْسَانَ وَلَوْ سَمِعَ الْاِنْسَانُ لَصَعِقَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب جنازہ تیار کیا جاتا ہے اور لوگ اسے اپنی گردنوں پر اٹھاتے ہیں تو اگر وہ جنازہ نیک بخت (آدمی کا) ہوتا ہے تو اپنے لوگوں سے کہتا ہے کہ (مجھے میری منزل کی طرف) جلد لے چلو اور اگر بدبخت (آدمی کا) جنازہ ہوتا ہے تو اپنے لوگوں سے کہتا ہے کہ "ہائے افسوس! مجھے کہاں لئے جاتے ہو!"؟ جنازہ کی اس آواز کو سوائے انسان کے ہر چیز سن سکتی ہے، اگر انسان اس آواز کو سن لے تو بے ہوش ہو کر گر پڑے یا مر جائے۔" (بخاریؒ)

تشریح: نیک بخت یعنی مؤمن جب مرتا ہے اور اس کا جنازہ تیار ہو جاتا ہے تو چونکہ جنت کی نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رحمتیں دیکھتا ہے اس لئے اپنے آپ کو جلدی لے چلنے کے لئے کہتا ہے اس کے برخلاف جب بدبخت انسان موت کی گود میں پہنچ جاتا ہے اور اسکا جنازہ تیار کیا جاتا ہے تو چونکہ وہ عذاب کو سامنے دیکھتا ہے اس لئے واویلا کرتا ہے اور اپنے لوگوں سے کہتا ہے کہ مجھے عذاب کی طرف کیوں لے جا رہے ہو۔

علماء لکھتے ہیں کہ مردہ اس وقت حقیقتاً کلام کرتا ہے اگرچہ اس کی روح نکل چکی ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ انسان اس کی آواز

کی سماعت نہیں کر سکتا جب کہ دوسری مخلوقات اس کی آواز سنتی ہیں، اور یہ چیز کوئی غیر ممکن نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ مردہ اپنی قبر میں سوال جواب کے لئے زندہ کیا جاتا ہے۔

جنازے کو دیکھ کر کھڑے ہو جانے کا حکم

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَأَيْتُمُ الْجَنَازَةَ فَقُوْمُوْا فَمَنْ تَبِعَهَا فَلَا يَقْعُدْ حَتّٰى تُوْضَعَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم جنازے کو دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ اور جو شخص جنازہ کے ساتھ رہے تو وہ اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک کہ جنازہ (لوگوں کے کاندھے سے زمین پر یا قبر میں) نہ رکھ دیا جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب جنازہ گھر میں سے نکلے تو میت کے احترام اور اس کے ایمان کی تعظیم کے پیش نظر کھڑا ہو جانا چاہئے گویا اس ارشاد گرامی میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے موقع پر بے پرواہ نہ ہو جانا چاہئے بلکہ جنازہ دیکھتے ہی بے قرار ہو کر اور ڈر کر اٹھ کھڑا ہونا چاہئے اور جب تک کہ جنازہ رکھ نہ دیا جائے زمین پر بیٹھا نہ جائے بلکہ کاندھا دینے کے لئے جنازہ کے ساتھ ساتھ رہے۔

بعض حنفی علماء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جنازہ کے ساتھ جانے کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو اکثر علماء کے نزدیک اس کے لئے جنازہ دیکھ کر اٹھ کر کھڑے رہنا مکروہ ہے۔ جب کہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اسے اختیار ہے کہ چاہے تو کھڑا رہے اور چاہے بیٹھا رہے۔ اسی طرح بعض علماء کا یہ بھی قول ہے کہ یہ دونوں ہی (یعنی کھڑے ہو جانا اور بیٹھے رہنا) مستحب ہیں جمہور علماء فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث اور اس کے بعد آنے والی حدیث دونوں ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت کی بنا پر جو آگے آرہی ہے منسوخ ہیں۔

④ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ مَرَّتْ جَنَازَةٌ فَقَامَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقُمْنَا مَعَهُ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهَا يَهُوْدِيَّةٌ فَقَالَ اِنَّ الْمَوْتَ فَزَعٌ فَاِذَا رَأَيْتُمُ الْجَنَازَةَ فَقُوْمُوْا (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ ایک جنازہ گزرا تو رسول کریم ﷺ اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، پھر ہم نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا! (کسی مسلمان کا جنازہ تو تھا نہیں کہ جس کی تعظیم و تکریم کے لئے اٹھا جاتا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "موت" خوف اور گھبراہٹ کی چیز ہے جب تم جنازہ دیکھو تو (اگرچہ وہ جنازہ کافر ہی کا کیوں نہ ہو اٹھ کھڑے ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

⑤ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ رَأَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ فَقُمْنَا وَقَعَدَ فَقَعَدْنَا يَعْنِيْ فِي الْجَنَازَةِ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةِ مَالِكٍ وَّاَبِيْ دَاوٗدَ قَامَ فِي الْجَنَازَةِ ثُمَّ قَعَدَ بَعْدُ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول کریم ﷺ کو جنازہ دیکھ کر کھڑے ہوئے دیکھا ہے چنانچہ ہم بھی کھڑے ہو گئے جب آپ بیٹھے ہم بیٹھ گئے" (مسلمؒ) اور حضرت امام مالکؒ اور حضرت ابوداؤدؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "آنحضرت ﷺ جنازہ دیکھ کر کھڑے ہوئے اور اس کے بعد بیٹھے۔"

تشریح: پہلی روایت کے جو امام مسلمؒ نے نقل کی ہے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ "آنحضرت ﷺ جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے ہم بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے جب جنازہ گزر گیا اور نظروں سے غائب ہو گیا تو آپ ﷺ بھی بیٹھ گئے اور آپ کے ساتھ ہم بھی بیٹھ گئے۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ "کچھ عرصہ تک تو آپ کا معمول یہ رہا کہ جب جنازہ دیکھتے تو کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ صورت رہی کہ آپ جنازہ دیکھ کر اٹھتے نہیں تھے بلکہ بیٹھے ہی رہا کرتے تھے۔

اسی طرح دوسری روایت کے بھی کہ جسے حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام ابوداؤد نے نقل کیا ہے یہی دونوں مطلب ہیں اور دوسرا

مطلب ہی زیادہ صحیح ہے۔

جنازہ کے ساتھ چلنے اور نماز جنازہ و تدفین میں شریک ہونیکا ثواب

⑥ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا وَّکَانَ مَعَهٗ حَتّٰی یُصَلّٰی عَلَیْهَا وَیَفْرُغَ مِنْ دَفْنِهَا فَاِنَّهٗ یَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِیْرَاطَیْنِ کُلُّ قِیْرَاطٍ مِّثْلُ اُحُدٍ وَّمَنْ صَلّٰی عَلَیْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ اَنْ تُدْفَنَ فَاِنَّهٗ یَرْجِعُ بِقِیْرَاطٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ مؤمن ہونے کی حیثیت سے (یعنی فرمان شریعت پر عمل کرنے کی غرض سے) اور طلب ثواب کی خاطر جائے اور جنازہ کے ساتھ ساتھ رہے یہاں تک کہ اس کی نماز جنازہ پڑھے اور اس کی تدفین سے فراغت پائے تو وہ شخص دو قیراط ثواب لے کر واپس ہوتا ہے جس میں سے ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے اور جو شخص صرف جنازہ کی نماز پڑھ کر آجائے اور تدفین میں شریک نہ ہو تو وہ ایک قیراط ثواب لے کر واپس ہوتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "قیراط" دینار کے بارھویں حصہ کو کہتے ہیں جس کا وزن تقریباً چار جو کے برابر ہوتا ہے یہاں قیراط سے مراد "حصہ عظیم" یعنی بہت بڑا انبار ہے جس کو احد پہاڑ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

نجاشی بادشاہ کی غائبانہ نماز جنازہ

⑦ وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَعٰی لِلنَّاسِ النَّجَاشِیَّ الْیَوْمَ الَّذِیْ مَاتَ فِیْهِ وَخَرَجَ بِهِمْ اِلَی الْمُصَلّٰی فَصَفَّ بِهِمْ وَکَبَّرَ اَرْبَعَ تَکْبِیْرَاتٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نجاشی کے انتقال کی خبر لوگوں کو اسی روز پہنچائی جس دن کہ اس کا انتقال ہوا تھا پھر صحابہؓ کے ہمراہ عیدگاہ تشریف لے گئے وہاں سب کے ہمراہ (نماز جنازہ کے لئے صف بندی فرمائی اور چار تکبیریں کہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "نجاشی" حبشہ کے بادشاہ کا لقب ہوا کرتا تھا، اس نجاشی بادشاہ کا نام کہ جس کے جنازہ کی آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ غائبانہ ادا فرمائی "اصحمہ" تھا۔ یہ پہلے تو دین نصاریٰ کے پیرو تھے مگر بعد میں آنحضرت ﷺ کی رسالت پر ایمان لائے۔ جب کفار مکہ نے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہؓ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے اور مکہ میں انکی زندگی اجیرن بنادی تو آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر جائیں چنانچہ صحابہؓ کی ایک بہت بڑی تعداد اپنا گھربار چھوڑ کر حبشہ کو ہجرت کر گئی مسلمانوں کی یہی سب سے پہلی ہجرت تھی حبشہ میں اس وقت یہی "اصحمہ" نامی نجاشی بادشاہ تخت سلطنت پر تھے۔ انہوں نے صحابہؓ کی بہت اعلیٰ پیمانہ پر پذیرائی کی اور ان کی خدمت کو اپنے لئے باعث سعادت جان کر حق میزبانی ادا کیا۔

چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو آنحضرت ﷺ کو بہت زیادہ صدمہ ہوا اور آپ ﷺ نے صحابہؓ کو ان کے انتقال کی خبر دی اور سب کو لے کر عیدگاہ تشریف لے گئے اور وہاں ان کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کا مسئلہ

ہدایہ میں لکھا ہے کہ مسجد میں جو جماعت پنجگانہ کے لئے بنائی گئی ہو جنازہ کی نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "جو شخص مسجد میں میت پر نماز پڑھے گا تو اسے ثواب نہیں ملے گا۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ "خلاصہ میں لکھا ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے خواہ جنازہ اور نمازی دونوں مسجد میں ہوں خواہ جنازہ مسجد کے اندر ہو اور سب نمازی یا تھوڑے نمازی مسجد کے باہر ہوں۔ ہاں البتہ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ "اس صورت میں

مکروہ نہیں ہے جب کہ جنازہ مسجد سے باہر رکھا ہوا ہو۔ پھر اس کے بعد کراہت کے بارہ میں بھی علماء کے اختلافی اقوال ہیں بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ کراہت تحریمی ہے۔ جب کہ بعض حضرات کا قول ہے کہ کراہت تنزیہی ہے۔

حدیث سے شوافع کا استدلال

حضرات شوافع اس حدیث کو اپنے مسلک کا مستدل قرار دیتے ہیں کہ نماز جنازہ غائبانہ جائز ہے چونکہ حنفیہ کے نزدیک نماز جنازہ غائبانہ جائز نہیں ہے اس لئے ان کی طرف سے اس حدیث کی تاویل کی جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ نجاشی کا جنازہ آنحضرت ﷺ کے سامنے کر دیا گیا ہو، کیونکہ حق تعالیٰ کی ذات اس پر قادر ہے کہ درمیان میں حائل پہاڑ و جنگلات اور در و دیوار ہٹا دیئے گئے ہوں اور آنحضرت ﷺ نجاشی کا جنازہ دیکھ رہے ہوں۔ لہٰذا یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہوئی دوسروں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ نماز جنازہ غائبانہ ادا کریں چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بغیر اسناد کے منقول ہے کہ "سریر یعنی نجاشی کا جنازہ کھولا گیا یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اسے دیکھا اور اس پر نماز پڑھی۔

نماز جنازہ کی تکبیرات

⑧ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ لَیْلٰی قَالَ کَانَ زَیْدُ بْنُ اَرْقَمَ یُکَبِّرُ عَلٰی جَنَآئِزِنَا اَرْبَعًا وَّاَنَّهٗ کَبَّرَ عَلٰی جَنَازَةٍ خَمْسًا فَسَأَلْنَاهُ فَقَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُکَبِّرُهَا (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلی کہتے ہیں کہ حضرت زید بن ارقم (صحابی) ہمارے جنازوں (کی نماز) میں چار تکبیریں کہا کرتے تھے۔ ایک جنازہ پر انہوں نے پانچ تکبیریں کہیں تو ہم نے ان سے پوچھا کہ "آپ تو ہمیشہ چار تکبیریں کہا کرتے تھے آج، پانچ تکبیریں کیوں کہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے۔" (مسلم)

تشریح: حضرت زید بن ارقم کے ارشاد کہ "آنحضرت ﷺ پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو آپ ابتدائی زمانہ میں پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے یا یہ کہ کبھی کبھی پانچ تکبیریں کہتے تھے۔

تمام علماء کا متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہے کہ نماز جنازہ میں چار ہی تکبیریں ہیں اگرچہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے چار سے زائد تکبیریں بھی منقول ہیں لیکن علماء لکھتے ہیں کہ آخر میں آپ ﷺ سے چار ہی تکبیریں ثابت ہیں لہٰذا جن روایتوں میں چار سے زائد تکبیریں منقول ہیں وہ منسوخ ہیں اگر حضرت زیدؓ ان روایتوں کے منسوخ ہونے کے قائل نہیں ہیں تو اس اتفاقی اور اجماعی فیصلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ

⑨ وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ صَلَّیْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلٰی جَنَازَةٍ فَقَرَأَ فَاتِحَةَ الْکِتَابِ فَقَالَ لِتَعْلَمُوْآ اَنَّهَا سُنَّةٌ (رواہ البخاری)

"اور حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کے پیچھے جنازہ کی نماز پڑھی چنانچہ انہوں نے (تکبیر اولیٰ کے بعد) سورہ فاتحہ پڑھی اور فرمایا کہ "میں نے سورۃ فاتحہ اس لئے پڑھی ہے تاکہ تم لوگ جان لو کہ یہ سُنّت ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ "یہ سُنّت ہے" سے مراد یہ ہے کہ نماز جنازہ میں سورت فاتحہ پڑھنا واجب نہیں ہے۔ یعنی اگر تکبیر اولیٰ کے بعد سبحانک اللّٰھم الخ کے بجائے سورت فاتحہ پڑھی جائے تو یہ سورت فاتحہ سُنّت (یعنی سبحانک اللّٰھم الخ پڑھنے) کے قائم ومقام ہو جاتی ہے۔

محقق امام ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ "نماز جنازہ میں سورت فاتحہ کی قرات نہ کی جائے ہاں بہ نیت ثنا سورہ فاتحہ پڑھی جاسکتی ہے چنانچہ

نماز جنازہ میں آنحضرت ﷺ سے سورہ فاتحہ پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ نیز موطا میں منقول ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نماز جنازہ میں سورت فاتحہ نہیں پڑھتے تھے۔

چونکہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کے الفاظ اِنَّھَا سُنَّۃٌ (یہ سُنّت ہے) میں سُنّت سے مراد ہے کہ "سورہ فاتحہ پڑھنا دین کا ایک مشروع طریقہ ہے" لہٰذا ان کی اس تاویل سے وجوب کی نفی نہیں ہوتی۔

نماز جنازہ میں میت کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعا

⑮ وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ صَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى جَنَازَةٍ فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَآئِهٖ وَهُوَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مَدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَآءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْاَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ دَارِهٖ وَاَهْلاً خَيْرًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَزَوْجًا خَيْرًا مِّنْ زَوْجِهٖ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ۔ وَفِىْ رِوَايَةٍ وَقِهٖ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَعَذَابَ النَّارِ قَالَ حَتّٰى تَمَنَّيْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَنَا ذٰلِكَ الْمَيِّتَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عوفؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے ایک جنازہ کی نماز پڑھی، میں نے آپ ﷺ کی وہ دعا یاد کرلی جو آپ (تیسری تکبیر کے بعد) فرماتے ہیں کہ (اور وہ یہ ہے) اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مَدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَآءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْاَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ دَارِهٖ وَاَهْلاً خَيْرًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَزَوْجًا خَيْرًا مِّنْ زَوْجِهٖ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ۔ (اے اللہ اس کے گناہ بخش دے، اس پر رحم فرما (یعنی اس کی عبادات وطاعات قبول فرما) اسے عافیت میں رکھ، اس کی (لغزشوں) سے درگزر فرما (جنت میں) اس کی اچھی مہمانی کر، اس کی قبر کشادہ فرما اس کو پانی سے برف سے اور اولے سے پاک کردے (یعنی طرح طرح کی مغفرتوں سے اس کے گناہ صاف کرادے اسے گناہوں سے پاکیزہ فرمادے) جیسا کہ سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے۔ اسے (دنیا کے) اس گھر سے (آخرت کا) بہتر گھر عطا فرما اس کے خادموں سے بہتر خادم عطا فرما اور اس بیوی سے بہتر بیوی عطا فرما، اسے (بغیر عذاب کے ابتداء ہی میں) جنت میں داخل کر اور اسے قبر کے عذاب سے یا فرمایا کہ دوزخ کے عذاب سے پناہ دے" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

(اس کے قبر کے فتنہ سے یعنی فرشتوں کے جواب میں متحیر ہونے سے اور آگ کے عذاب سے بچا) حضرت عوفؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے اس میت کے لئے یہ دعا سنی تو مجھے بڑا رشک آیا اور بے اختیار میرے دل سے یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش یہ میری میت ہوتی تاکہ آنحضرت ﷺ یہ دعا میرے لئے فرماتے۔"

تشریح: "اس کی بیوی سے بہتر بیوی" سے جس طرح جنت کی حوریں مراد ہیں اسی طرح دنیا کی عورتیں بھی مراد ہیں، لہٰذا اس بارے میں کوئی اشکال نہیں رہا کہ جنت میں دنیا کی عورتیں اپنے نماز روزے کی وجہ سے جنت میں حوروں سے افضل ہوں گی جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔

فقہ میں لکھا ہے کہ اس دعا کو آہستہ پڑھنا مستحب ہے آنحضرت ﷺ نے یہ دعا با آواز بلند اس لئے پڑھی تھی تاکہ اسے دوسرے سن کر یاد کرلیں۔ یہ دعا نسائیؒ اور ترمذیؒ نے بھی نقل کی ہے اور امام بخاریؒ نے فرمایا ہے کہ جنازہ کے سلسلہ میں میت کے لئے جو دعائیں منقول ہیں ان سب میں یہ دعا سب سے زیادہ صحیح ہے۔

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کا مسئلہ

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ سَلَمَۃَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ عَآئِشَۃَ لَمَّا تُوُفِّیَ سَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَتِ ادْخُلُوْا بِہِ الْمَسْجِدَ حَتّٰی اُصَلِّیَ عَلَیْہِ فَاُنْکِرَ ذٰلِکَ عَلَیْھَا فَقَالَتْ وَاللّٰہِ لَقَدْ صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی ابْنَیْ بَیْضَآءَ فِی الْمَسْجِدِ سُھَیْلٍ وَّ اَخِیْہِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابی سلمہ بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ جب حضرت سعد بن وقاصؓ کا انتقال ہوا (اور ان کا جنازہ ان کے مکان سے بقیع میں دفن کے لئے لایا گیا) تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ان کا جنازہ مسجد میں لاؤ تا کہ میں بھی نماز پڑھ سکوں لوگوں نے اس سے انکار کیا (کہ مسجد میں جنازہ کی نماز کیسے پڑھی جاسکتی ہے) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "خدا کی قسم! آنحضرت ﷺ نے بیضا کے دونوں لڑکوں سہیل اور ان کے بھائی کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: سہیل کے بھائی کا نام سہل تھا اور ان دونوں کی ماں کا نام بیضاء تھا۔

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو اس حدیث کے پیش نظر جنازہ کی نماز مسجد میں پڑھی جاسکتی ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔ حضرت امام اعظمؒ کی دلیل بھی یہی حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ کے کہنے پر صحابہؓ نے اس بات سے انکار کر دیا کہ سعد بن وقاصؓ کا جنازہ مسجد میں لایا جائے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ معمول نہیں تھا کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھتے ہوں بلکہ مسجد ہی کے قریب ایک جگہ مقرر تھی جہاں آپ ﷺ نماز جنازہ پڑھا کرتے تھے۔ پھر یہ کہ اس کے علاوہ ابوداؤد میں ایک حدیث بھی بایں مضمون منقول ہے کہ "جو شخص مسجد میں نماز جنازہ پڑھے گا اسے ثواب نہیں ملے گا۔

جہاں تک حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد کا تعلق ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسجد میں سہیل اور ان کے بھائی کی نماز جنازہ پڑھی ہے تو اسکے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ ایسا آپ نے عذر کی وجہ سے کیا کہ اس وقت یا تو بارش ہو رہی تھی یا یہ کہ آپ اعتکاف میں تھے اس لئے آپ ﷺ نے مسجد ہی میں نماز جنازہ ادا فرمائی، چنانچہ ایک روایت میں اس کی صراحت بھی کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ چونکہ اعتکاف میں تھے اس لئے آپ ﷺ نے مسجد میں نماز جنازہ پڑھی۔

نماز جنازہ میں امام کہاں کھڑا ہو؟

(۱۲) وَعَنْ سَمُرَۃَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ صَلَّیْتُ وَرَآءَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی امْرَاَۃٍ مَّاتَتْ فِیْ نِفَاسِھَا فَقَامَ وَسْطَھَا (متفق علیہ)

"اور حضرت سمرہؓ بن جندب فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کے پیچھے ایک عورت کے جنازہ کی نماز پڑھی جو حالت نفاس میں انتقال کر گئی تھی چنانچہ آپ ﷺ نماز کے لئے جنازہ کے درمیان کھڑے ہوئے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ کا مسلک تو یہ ہے کہ عورت کے جنازہ کی نماز میں امام میت کے کولہوں کے سامنے کھڑا ہو اور مرد کے جنازہ کی نماز میں میت کے سر کے سامنے کھڑا ہو، چنانچہ عورت کی نماز جنازہ کے بارہ میں تو حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی دلیل یہی حدیث ہے جب کہ مرد کی نماز جناہ کے بارہ میں وہ اپنا مسلک ایک دوسری حدیث سے ثابت کرتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ امام میت کے سینہ کے سامنے کھڑا ہو کر خواہ مرد کا ہو یا عورت کا جنازہ ہو۔ اس حدیث کے بارہ میں حضرت ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث میت کے سینہ کے سامنے کھڑے ہونے کی منافی نہیں ہے کیونکہ انسانی جسم اعضاء کے

اعتبار سے دراصل سینہ ہی وسط ہے بایں طور کہ سینہ کے اوپر سر اور ہاتھ ہیں اور سینہ کے نیچے پیٹ اور پاؤں ہیں اور ان سب کے درمیان سینہ ہے، نیز یہ احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ اس موقع پر سینہ کے سامنے کولہوں کی طرف تھوڑا مائل کھڑے ہوں گے اور چونکہ یہ دونوں حصے یعنی سینہ اور کولھے آپس میں بالکل قریب قریب ہیں اس لئے راوی نے یہ گمان کر لیا ہو کہ آپ کولہوں کے سامنے کھڑے تھے۔

شمنیؒ نے کہا ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسف کی روایت بھی یہ ہے کہ عورت کے جنازہ کی نماز میں امام میت کے کولہوں کے سامنے کھڑا ہو۔ واللہ اعلم۔

تدفین کے بعد قبر پر نماز جنازہ

(۱۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِقَبْرٍ دُفِنَ لَيْلًا فَقَالَ مَتٰى دُفِنَ هٰذَا قَالُوا الْبَارِحَةَ قَالَ اَفَلَا اٰذَنْتُمُوْنِيْ قَالُوْا دَفَنَّاهُ فِيْ ظُلْمَةِ اللَّيْلِ فَكَرِهْنَا اَنْ نُّوْقِظَكَ فَقَامَ فَصَفَفْنَا خَلْفَهٗ فَصَلّٰى عَلَيْهِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ کا ایک ایسی قبر پر گزر ہوا جس میں بوقت شب مردہ دفن کیا گیا تھا آپ نے پوچھا کہ یہ کب دفن کیا گیا ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ آج ہی رات میں آپ نے فرمایا کہ تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "ہم نے اسے اندھیری رات میں دفن کیا تھا اس وقت آپ کو جگانا ہمیں اچھا نہیں معلوم ہوا۔" پھر آنحضرت ﷺ کھڑے ہوئے ہم نے آپ کے پیچھے صف باندھی چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۱۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ امْرَاَةً سَوْدَاءَ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ اَوْشَابٌّ فَفَقَدَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَ عَنْهَا اَوْ عَنْهُ فَقَالُوْا مَاتَ قَالَ اَفَلَا كُنْتُمْ اٰذَنْتُمُوْنِيْ قَالَ فَكَاَنَّهُمْ صَغَّرُوْا اَمْرَهَا اَوْ اَمْرَهٗ فَقَالَ دُلُّوْنِيْ عَلٰى قَبْرِهٖ فَدَلُّوْهُ فَصَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ قَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰى اَهْلِهَا وَاِنَّ اللّٰهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِيْ عَلَيْهِمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَفْظُهٗ لِمُسْلِمٍ

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک کالی عورت تھی جو مسجد (نبوی ﷺ) میں جھاڑو دیا کرتی تھی یا راوی کہتے ہیں کہ ایک جوان مرد تھا جو جھاڑو دیا کرتا تھا، رسول کریم ﷺ نے ایک دن اسے غائب پایا تو اس عورت، یا مرد کے بارہ میں دریافت فرمایا کہ وہ کہاں ہے؟ بتایا گیا کہ وہ مر گئی یا وہ مر گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھے کیوں نہیں بتایا گیا؟" "تاکہ میں بھی اس کی نماز جنازہ پڑھتا، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس عورت یا اس مرد کی موت کو کوئی اہمیت نہیں دی (کہ جس کے لئے آنحضرت ﷺ کو تکلیف دی جاتی گویا آنحضرت ﷺ کی تعظیم مقصود تھی) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اچھا مجھے اس کی قبر بتادو کہ کہاں ہے؟ آپ کو جب اس کی قبر بتائی گئی تو (آپ وہاں تشریف لے گئے اور) اس کی قبر پر نماز پڑھی اور پھر فرمایا کہ "یہ قبریں اپنے مردوں کے لئے تاریکیوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں ان قبروں پر میرے نماز پڑھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں روشن کر دیتا ہے (اس روایت کو بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور الفاظ مسلمؒ کے ہیں۔"

تشریح: ایک کالی عورت تھی یا ایک جوان مرد تھا۔ یہ درحقیقت راوی کا شک ہے کہ صحیح طریقہ سے یہ بات یاد نہیں رہی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ فرمایا تھا کہ ایک کالی عورت تھی جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی یا یہ فرمایا کہ ایک جوان مرد تھا جو جھاڑو دیا کرتا تھا۔

"تاریکیوں سے بھری ہوئی قبروں" سے مراد صرف وہ قبریں ہیں جن پر آنحضرت ﷺ کا نماز پڑھنا ممکن تھا۔

اس مسئلہ میں کہ "قبروں پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟" علماء کا اختلاف ہے چنانچہ جمہور علماء کا فیصلہ تو یہ ہے کہ قبر پر نماز جنازہ پڑھنا مشروع ہے خواہ پہلے اس کی نماز جنازہ ادا کی جا چکی ہو یا نہ ادا کی گئی ہو۔

ابراہیم نخعیؒ، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ اگر پہلے نماز جنازہ ادا کی جا چکی ہے تو اب قبر پر نماز درست نہیں اور اگر پہلے نماز جنازہ ادا نہ کی گئی ہو تو پھر جائز ہے لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ کی شرط یہ بھی ہے کہ اگر مردہ اپنی قبر میں پھٹ نہ

گیا ہو تو نماز درست ہوگی ورنہ تو قبر میں مردہ کے پھٹ جانے کی صورت میں نماز درست نہیں ہوگی۔ قبر میں مردہ کے پھٹ جانے کا اندازہ بعض حضرات نے تین دن متعین کیا ہے یعنی اگر تدفین کو تین دن نہ گزرے ہوں تو سمجھا جائے گا کہ مردہ اپنی قبر میں ابھی پھٹا نہیں ہے اور اگر تدفین کو تین دن یا تین دن سے زائد کا عرصہ گزر گیا ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ مردہ اپنی قبر میں پھٹ گیا ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب احادیث میں آنحضرت ﷺ کے بارہ میں قبر پر نماز پڑھنا منقول ہے تو یہ صرف آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے کہ آپ قبروں کے منور اور روشن ہونے کے لئے ان پر نماز پڑھا کرتے تھے دوسروں کے لئے یہ مطلقاً جائز نہیں۔

نماز جنازہ میں چالیس آدمیوں کے شریک ہونے کا ثواب

⑮ وَعَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ مَاتَ لَهُ ابْنٌ بِقُدَيْدٍ اَوْ بِعُسْفَانَ فَقَالَ يَا كُرَيْبُ اُنْظُرْمَا اجْتَمَعَ لَهُ مِنَ النَّاسِ قَالَ فَخَرَجْتُ فَاِذَا نَاسٌ قَدِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ تَقُوْلُ هُمْ اَرْبَعُوْنَ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَخْرِجُوْهُ فَاِنِّىْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ فَيَقُوْمُ عَلٰى جَنَازَتِهٖ اَرْبَعُوْنَ رَجُلاً لَّا يُشْرِكُوْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا شَفَّعَهُمُ اللّٰهُ فِيْهِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت کریب حضرت عبداللہ بن عباس کے بارہ میں روایت کرتے ہیں کہ جب مقام قدید یا مقام عسفاء میں (کہ جو مکہ کے قریب جگہیں ہیں) ان کے صاحبزادے کا انتقال ہوا (اور جنازہ تیار ہوا) تو انہوں نے کہا کہ "کریب جا کر دیکھو کہ نماز جنازہ کے لئے کتنے آدمی جمع ہوگئے ہیں؟" حضرت کریب کہتے ہیں کہ میں (یہ دیکھنے کے لئے) نکلا تو میں نے یہ دیکھا کہ بہت کافی لوگ جمع ہو چکے ہیں، میں نے واپس آکر حضرت ابن عباسؓ سے بتایا" (کہ بہت کافی لوگ جمع ہوگئے ہیں) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تمہارے خیال میں ان لوگوں کی تعداد چالیس ہوگی؟ میں نے عرض کیا کہ "ہاں!" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "تو پھر جنازہ (نماز کے لئے) باہر نکالو کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کوئی مسلمان مرے اور اس کے جنازہ کی نماز ایسے چالیس آدمی پڑھیں جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوں تو اللہ تعالیٰ میت کے حق میں ان لوگوں کی شفاعت قبول کرتا ہے۔" (مسلمؒ)

نماز جنازہ میں سو آدمیوں کے شریک ہونے کا ثواب

⑯ وَعَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مَيِّتٍ تُصَلِّىْ عَلَيْهِ اُمَّةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ يَبْلُغُوْنَ مِائَةً كُلُّهُمْ يَشْفَعُوْنَ لَهٗ اِلَّا شُفِّعُوْا فِيْهِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس میت کی نماز جنازہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پڑھے جس کی تعداد سو تک پہنچ جائے اور یہ جماعت میت کے لئے شفاعت کرے (یعنی دعاء مغفرت کرے) تو اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے (یعنی میت کی مغفرت ہو جاتی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: پہلی حدیث میں چالیس آدمیوں کے نماز جنازہ پڑھنے کا ثواب بیان کیا گیا ہے جب کہ دوسری حدیث میں "سو آدمیوں کی جماعت" کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ چنانچہ علماء اس اختلاف کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ پہلے سو آدمیوں کی شرکت کی فضیلت نازل ہوئی ہوگی پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے حال پر رحم فرماتے ہوئے یہ تعداد کم کر کے چالیس آدمیوں کی شرکت کی فضیلت بیان فرمائی نیز یہ بھی احتمال ہے کہ ان حدیثوں میں چالیس اور سو سے خاص طور پر ہی دونوں عدد نہ ہوں بلکہ ان سے "کثرت جماعت" مراد ہو۔

زبان خلق نقارۂ خدا

⑰ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرُّوْا بِجَنَازَةٍ فَاَثْنَوْا عَلَيْهَا خَيْرًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَبَتْ ثُمَّ مَرُّوْا بِاُخْرٰى فَاَثْنَوْا عَلَيْهَا شَرًّا فَقَالَ وَجَبَتْ فَقَالَ عُمَرُ مَا وَجَبَتْ فَقَالَ هٰذَا اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ خَيْرًا فَوَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ وَهٰذَا اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ شَرًّا فَوَجَبَتْ لَهُ النَّارُ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ لِلّٰهِ فِى الْاَرْضِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِىْ رِوَايَةٍ اَلْمُؤْمِنُوْنَ شُهَدَآءُ اللّٰهِ فِى الْاَرْضِ۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کا ایک جنازہ پر گزر ہوا تو اس کی تعریف کرنے لگے، نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کی زبان میت کی تعریف سن کر) فرمایا کہ "واجب ہوگئی۔" اس طرح صحابہؓ کا ایک دوسرے جنازہ پر گزر ہوا تو اس کی برائی بیان کرنے لگے۔ نبی کریم ﷺ نے (صحابہ کی زبان سے میت کی برائی سن کر) فرمایا کہ "واجب ہوگئی" حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ "کیا چیز واجب ہوگئی؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جس شخص کی تم نے تعریف بیان کی اس کے لئے جنّت واجب ہوگئی اور اب جس شخص کی تم برائی بیان کر رہے ہو اس کے لئے دوزخ واجب ہوگئی اور (پھر فرمایا کہ) تم زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مؤمن اللہ تعالیٰ کے گواہ ہیں۔"

تشریح: "جنت واجب ہوگئی" کا مطلب یہ ہے کہ تم جس شخص کی تعریف بیان کر رہے ہو اگر اس کی وہ تعریف صحیح اور سچ ہے یا یہ کہ اس کی موت اسی خیر و بھلائی کی حالت میں ہوئی ہے جیسے تم بیان کر رہے ہو تو اس کے لئے جنّت کی سعادت ثابت ہوگئی۔ اسی طرح "دوزخ واجب ہوگئی" کا مطلب بھی یہی ہے کہ جس شخص کی تم برائی بیان کر رہے ہو "اگر اسکی وہ برائی صحیح اور واقعی ہے یا یہ کہ اس کی موت اسی برائی کی حالت میں ہوئی ہے جسے تم بیان کر رہے ہو تو اس کے لئے دوزخ کی سزا ثابت ہوگئی۔

مظہر کا قول ہے کہ یہ حکم عام طور پر ہر شخص کے لئے نہیں ہے کہ جس کسی بھی شخص کے بارہ میں لوگ خیر و بھلائی کا ذکر کریں تو اس کے لئے جنت لازم ہی ہو جائے بلکہ جس شخص کے بارہ میں لوگ اچھے اور نیک خیالات کے اظہار کریں اور اس کی تعریف بیان کریں تو اس کے لئے جنّت کی امید کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جس شخص کے بارہ میں لوگ برے خیالات کا اظہار کریں اور زبان خلق اس کی برائی میں مصروف ہو تو اس کے بارہ میں یہ خوف ہو سکتا ہے کہ وہ دوزخ میں جائے اب رہی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے شخص کے لئے جنّت اور دوسرے شخص کے لئے دوزخ کو واجب کیوں کہا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے پہلے شخص کے جنتی ہونے اور دوسرے شخص کے دوزخی ہونے کے فیصلہ سے مطلع کر دیا تھا۔

زین عرف فرماتے ہیں کہ کسی شخص کا خیر و بھلائی اور شر و برائی کے ساتھ ذکر کرنا اس کے لئے جنّت و دوزخ کو واجب نہیں کرتا بلکہ در حقیقت کسی شخص کے بارہ میں "زبان خلق کا بھلا یا برا تاثر صرف اس کے جنتی یا دوزخی ہونے کی علامت ہوتا ہے۔

پھر یہ کہ اس "تعریف" اور اس "برائی" کا اعتبار ہوگا جس کی نیک بخت لوگوں اور متقی و پرہیزگار بندوں کی زبانیں گواہی دیں کیونکہ خدا کے نیک بخت و متقی بندوں کی زبان اس کے قلب سلیم کی ہمنوا ہوتی ہے لہٰذا وہ جس شخص کی تعریف کریں گے یا جس شخص کی برائی کریں گے اس میں کسی خارج دباؤ یا نفس کے کسی غلط تقاضا کا قطعی دخل نہیں ہوگا بلکہ ان کے زبانی اثرات اور حقیقت کے صالح قلب کے صحیح فیصلہ کے غماز ہوں گے چنانچہ کسی شخص کے بارہ میں ان کی تعریف اس شخص کے جنتی ہونے کی علامت ہوگی اور کسی شخص کے بارہ میں ان کی بیان کی ہوئی برائی اس شخص کے دوزخی ہونے کی علامت ہوگی۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اگر کوئی فاسق اور دنیا دار شخص نفس کے غلط تقاضا اور اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر کسی برے اور بدکار شخص کی تعریف بیان کرے اور اس کے بارہ میں اچھے تاثرات کا اظہار کرے یا اسی طرح کسی نیک بخت اور مرد مؤمن کی برائی بیان کرے تو نہ اس کی تعریف کا اعتبار ہوگا اور نہ اس کی بیان کی ہوئی برائی کی کوئی حیثیت ہوگی بلکہ اس کے بارہ میں یہ کہا جائے گا کہ یہ اپنے

نفس کا غلام اور ضمیر فروش ہے جو محض اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر اس شخص کو تو اچھا کہہ رہا ہے جس کی برائی اور بدکاری عیاں تھی اور اس نیک بخت کو برا کہہ رہا ہے جس کی نیک بختی مثالی حیثیت رکھتی تھی۔

اَنْتُمْ شُهَدَآءُ اللّٰهِ تم (اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو) آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد اکثر کے اعتبار سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص جیسا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی زبان سے اسے ویسا ہی کہلواتا ہے یعنی اگر کوئی شخص نیک ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے بندوں کی زبان سے نیک ہی کہلواتا ہے۔ اور کوئی شخص بدکار ہوتا ہے تو خدا اپنے بندوں کی زبان سے اس کی بدکاری ہی کی شہادت دلواتا ہے چنانچہ بندہ کی یہ شہادت در حقیقت اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ جس کے بارہ میں جس تأثر کا اظہار کر رہے ہیں وہ واقعۃً ایسا ہی ہے۔

زبان خلق نقارہ خدا سمجھو

(۱۸) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا مُسْلِمٍ شَهِدَ لَهٗ اَرْبَعَةٌ بِخَيْرٍ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ قُلْنَا وَثَلَاثَةٌ قَالَ وَثَلَاثَةٌ قُلْنَا وَاثْنَانِ قَالَ وَاثْنَانِ ثُمَّ لَمْ نَسْأَلْهُ عَنِ الْوَاحِدِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو مسلمان کہ گواہی دیں واسطے اس کے چار شخص کے ساتھ بھلائی کے داخل کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ جنّت میں۔ کہا ہم نے اگر تین شخص گواہی دیں؟ فرمایا! اگر تین بھی گواہی دیں تو بھی۔ کہا ہم نے اگر دو گواہی دیں؟ فرمایا! اور دو بھی۔ پھر نہ پوچھا ہم نے ان سے حال ایک کا۔" (بخاری)

جو مر چکے ہیں انہیں برا مت کہو

(۱۹) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسُبُّوا الْاَمْوَاتَ فَاِنَّهُمْ قَدْ اَفْضَوْا اِلٰى مَا قَدَّمُوْا۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے نہ برا کہو مردوں کو اس لئے کہ تحقیق وہ پہنچے ساتھ جزا اس چیز کے کہ آگے بھیجی۔" (بخاری)

شہداء احد کی تکفین و تدفین کا معاملہ

(۲۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلٰى اُحُدٍ فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ ثُمَّ يَقُوْلُ اَيُّهُمْ اَكْثَرُ اَخْذًا لِلْقُرْاٰنِ فَاِذَا اُشِيْرَ لَهٗ اِلٰى اَحَدِهِمَا قَدَّمَهٗ فِي اللَّحْدِ وَقَالَ اَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَمَرَ بِدَفْنِهِمْ بِدِمَائِهِمْ وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ وَلَمْ يُغَسَّلُوْا (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ تھے جمع کرتے دو شخصوں کو شہداء احد میں بیچ ایک کپڑے کے پھر فرماتے تھے کس کو ان میں سے زیادہ قرآن یاد ہے پس جب اشارہ کیا جاتا واسطے اس کے آپ ﷺ کی طرف ان میں سے آگے کرتے اس کو قبر میں اور فرماتے کہ میں گواہی دوں گا دن قیامت کے اور حکم فرمایا ساتھ دفن کرنے ان کے خون سمیت اور نماز پڑھی ان پر اور نہ غسل دیئے گئے۔"

(بخاری)

تدفین کے بعد قبرستان سے سواری پر واپس آنے میں مضائقہ نہیں

(۲۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِفَرَسٍ مَعْرُوْرٍ فَرَكِبَهٗ حِيْنَ انْصَرَفَ مِنْ جَنَازَةِ ابْنِ

الدَّحْدَاحِ وَنَحْنُ نَمْشِیْ حَوْلَهٗ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ بن سمرہ سے روایت ہے کہ لایا گیا نبی ﷺ کے پاس گھوڑا بغیر زین کے پس سوار ہوئے اس پر اس وقت کے پھر جنازہ ابن داحداح کے سے اور ہم چلتے تھے گرد حضرت ﷺ کے۔" (مسلم)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جنازہ کے ساتھ چلنے کا طریقہ

(۲۲) وَعَنِ الْمُغِیْرَةِ ابْنِ شُعْبَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الرَّاکِبُ یَسِیْرُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِیْ یَمْشِیْ خَلْفَهَا وَاَمَامَهَا وَعَنْ یَّمِیْنِهَا وَعَنْ یَّسَارِهَا قَرِیْبًا مِنْهَا وَالسِّقْطُ یُصَلّٰی عَلَیْهِ وَیُدْعٰی لِوَالِدَیْهِ بِالْمَغْفِرَةِ وَالرَّحْمَةِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَفِیْ رِوَایَةِ اَحْمَدَ وَالتِّرْمِذِیِّ وَالنَّسَائِیِّ وَابْنِ مَاجَةَ قَالَ الرَّاکِبُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِیْ حَیْثُ شَآءَ مِنْهَا وَالطِّفْلُ یُصَلّٰی عَلَیْهِ وَفِی الْمَصَابِیْحِ عَنِ الْمُغِیْرَةِ ابْنِ زِیَادٍ۔

"حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے یہ کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سوار چلے پچھلے جنازہ کے اور پیادہ چلے پچھلے جنازہ کے اور آگے اس کے اور دائیں اور بائیں اس کے پاس پاس اس کے اور کچھا بچا نماز پڑھی جائے اس پر اور دعا کی جائے واسطے ماں باپ اس کے ساتھ بخشش اور رحمت کے (ابوداؤد) اور بیچ روایت احمد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ کے یوں ہے کہ فرمایا سوار چلے پیچھے جنازے کے اور پیادہ جس طرف چاہے جنازے کے چلے اور لڑکا کہ مرجائے نماز جنازے کی پڑھی جائے اس پر اور مصابیح میں یہ روایت مغیرہ بن زیاد سے ہے۔"

جنازہ کے آگے چلنے کا مسئلہ

(۲۳) وَعَنِ الزُّهْرِیِّ عَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَبَا بَکْرٍ وَّعُمَرَ یَمْشُوْنَ اَمَامَ الْجَنَازَةِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ وَاَهْلُ الْحَدِیْثِ کَاَنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ مُرْسَلًا۔

"اور زہری سے روایت ہے کہ روایت کی سالم سے اس نے اپنے باپ سے کہا کہ عبداللہ نے دیکھا میں نے رسول اللہ ﷺ کو اور ابوبکر اور عمر کو چلتے تھے آگے جنازے کے (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائی اور ابن ماجہ نے اور کہا ترمذی نے اور اہل حدیث گویا جانتے ہیں اس حدیث کو مرسل۔"

جنازہ کے پیچھے چلنا بہتر ہے

(۲۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْجَنَازَةُ مَتْبُوْعَةٌ وَّلَا تَتْبَعُ لَیْسَ مَعَهَا مَنْ تَقَدَّمَهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَةَ قَالَ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْمَاجِدِ الرَّاوِیْ رَجُلٌ مَّجْهُوْلٌ۔

"اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جنازہ متبوع ہے اور نہیں وہ تابع نہیں ہوتا ساتھ اس کے وہ شخص کہ آگے بڑھ گیا اس سے (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، کہا ترمذی نے ابوماجد راوی مجہول ہے۔"

جنازہ کو کاندھا دینا میت کے حق کی ادائیگی ہے

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَبِعَ جَنَازَةً وَّحَمَلَهَا ثَلَاثَ مِرَارٍ فَقَدْ قَضٰی مَا

عَلَيْهِ مِنْ حَقِّهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَ قَدْرُوِيَ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَمَلَ جَنَازَةَ سَعْدِبْنِ مُعَاذٍ بَيْنَ الْعَمُوْدَيْنِ۔

"اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو شخص ساتھ ہووے جنازے کے اور اٹھائے اس کو پس تحقیق ادا کیا حق اس کا اس پر تھا۔ (ترمذی) اور کہا یہ حدیث غریب ہے تحقیق روایت کی شرح السنۃ میں کہ نبی ﷺ نے اٹھایا جنازہ سعد بن معاذ کا درمیان دو لکڑیوں کے۔"

جنازہ کے ساتھ سواری پر چلنے والوں کو آنحضرت ﷺ کی تنبیہ

(۲۶) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جَنَازَةٍ فَرَاٰى نَاسًا رُكْبَانًا فَقَالَ اَلَا تَسْتَحْيُوْنَ اَنَّ مَلٰئِكَةَ اللّٰهِ عَلٰى اَقْدَامِهِمْ وَاَنْتُمْ عَلٰى ظُهُوْرِ الدَّوَابِّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوٰى اَبُوْدَاوٗدَ نَحْوَهٗ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ وَقَدْرُوِيَ عَنْ ثَوْبَانَ مَوْقُوْفًا۔

"اور ثوبان سے روایت ہے کہ نکلے ہم ساتھ نبی ﷺ کے بیچ جنازے کے پس لوگوں کو سوار دیکھا فرمایا کیا نہیں حیا کرتے تم کہ تحقیق فرشتے خدا کے اپنے قدموں پر ہیں اور تم اوپر پیٹھ جانوروں کے ہو (ترمذی، ابن ماجہ) اور روایت کی ابوداؤد نے مانند اس کی کہا ترمذی نے اور تحقیق روایت کی گئی یہ ثوبان سے موقوف۔"

جنازہ پر سورہ فاتحہ کی قرات

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَاَ عَلَى الْجَنَازَةِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ اَبُوْدَاوٗدَ وَ ابْنُ مَاجَةَ۔

"اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے پڑھی جنازہ پر سورہ فاتحہ۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

نماز جنازہ میں میت کے لئے خلوص دل سے دعا کرو

(۲۸) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَاَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جس وقت تم پڑھو نماز میت پر پس خالص کرو اس کے لئے دعا۔"

(ابوداؤد، ابن ماجہ)

نماز جنازہ کی دعا

(۲۹) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى عَلَى الْجَنَازَةِ قَالَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيْرِنَا وَكَبِيْرِنَا وَذَكَرِنَا وَاُنْثَانَا اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهٗ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَ اَبُوْدَاوٗدَ وَ التِّرْمِذِيُّ وَ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ عَنْ اَبِيْ اِبْرَاهِيْمَ الْاَشْهَلِيِّ عَنْ اَبِيْهِ وَانْتَهَتْ رِوَايَتُهٗ عِنْدَ قَوْلِهٖ وَاُنْثَانَا وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ دَاوٗدَ فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِيْمَانِ وَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِسْلَامِ وَفِيْ اٰخِرِهٖ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهٗ

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ تھے رسول اللہ ﷺ جب پڑھتے نماز جنازہ فرماتے یا الٰہی بخشش کر واسطے ہمارے زندوں کے

اور ہمارے مردوں کے اور حاضر ہمارے کے اور غائب ہمارے کے اور ہمارے چھوٹوں کے اور ہماری عورتوں کے یا الٰہی جس کو زندہ رکھے تو ہم میں سے پس زندہ رکھ اس کو اسلام پر اور جس کو مارے تو ہم میں سے پس مار اس کو ایمان پر۔ یا الٰہی نہ محروم رکھ ہم کو ثواب اس کے سے اور نہ فتنہ میں ڈال ہم کو پیچھے اس کے (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ) اور روایت کی نسائی نے ابی ابراہیم اشہلی سے کہ اس نے نقل کی اپنے باپ سے اور تمام ہوئی روایت اس کی "وانثانا" تک اور بیچ روایت ابی داؤد کے پس زندہ رکھ اس کو ایمان پر اور وفات دے اس کو اسلام پر اور اس حدیث کے آخر میں یوں ہے کہ نہ گمراہ کر ہم کو اس کے پیچھے۔"

ایک میت کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعا

(۳۰) وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنَّ فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ فِيْ ذِمَّتِكَ وَحَبْلِ جِوَارِكَ فَقِهٖ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ وَاَنْتَ اَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَقِّ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ نماز پڑھائی ہم کو رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص پر مسلمانوں میں سے پس سنا میں نے آپ ﷺ کو فرماتے تھے یا الٰہی تحقیق فلاں بیٹا فلانے کا بیچ امان تیری کے ہے اور تیری پناہ کے ہے پس بچا اس کو فتنہ قبر سے اور آگ کے عذاب سے اور تو صاحب وفا کا ہے اور تو صاحب حق کا ہے یا الٰہی بخشش کر واسطے اس کے اور رحم کر اس پر تحقیق تو بخشنے والا مہربان ہے۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: ملا علی قاریؒ نے "وحبل جوارک" میں لفظ "حبل" کے کئی معنی بیان کئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ اس جملہ کے سب سے بہتر معنی یہ ہیں کہ "وہ قرآن کریم سے تعلق رکھنے والا اور اسے مضبوطی سے پکڑنے والا تھا" لہٰذا یہاں لفظ "حبل" سے قرآن مراد ہے جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت (کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑو) میں "حبل" سے قرآن کریم مراد ہے "اسی طرح لفظ "جوار" سے امان مراد ہے اور اس جملہ "وحبل جوارک" میں اضافت بیانیہ ہے گویا اس جملہ کے وضاحتی معنی یہ ہوں گے کہ "وہ شخص قرآن کریم کو مضبوطی سے پکڑنے والا تھا، ایسا قرآن کریم کے جسے مضبوطی سے اختیار کرنا (یعنی اس پر پوری طرح عمل کرنا) امن و سلامتی ایمان و اسلام اور معرفت کا باعث اور ذریعہ ہے۔

مردوں کی برائیاں ذکر نہ کرو

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ وَكُفُّوْا عَنْ مَسَاوِيْهِمْ۔ (رواہ ابوداؤد و الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم اپنے مرے ہوئے لوگوں کی نیکیاں ہی ذکر کر لیا کرو اور ان کی برائیوں کے ذکر سے بچتے رہو۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: مرے ہوئے لوگوں کے نیک اعمال اور ان کی بھلائیوں کو اس لئے یاد اور بیان کرنا چاہئے کہ نیک اور نیکی کے ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔

مردوں کی نیکیوں کو ذکر کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے وہ استحباب کے طور پر ہے لیکن ان کی برائیوں کے ذکر سے بچنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے وہ وجوب کے طور پر ہے یعنی ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کی برائیاں ذکر نہ کرے اور اس فعل سے بچتا رہے چنانچہ حجۃ الاسلام نے لکھا ہے کہ مرے ہوئے لوگوں کی غیبت زندہ لوگوں کی غیبت سے کہیں زیادہ قابل نفریں ہے۔ کتاب ازہار میں علماء کا یہ قول لکھا ہوا ہے کہ "میت کو نہلانے والا اگر میت میں کوئی اچھی علامت دیکھے مثلاً میت کا چہرہ روشن اور منور ہو یا میت میں سے

خوشبو آتی ہو تو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرنا مستحب ہے اور اگر کوئی بری علامت دیکھے مثلاً (نعوذ باللہ) میت کا چہرہ یا بدن سیاہ ہو گیا ہو یا اس کی صورت مسخ ہو گئی ہو تو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرنا حرام ہے۔

نماز جنازہ میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کا مسئلہ

(۳۲) وَعَنْ نَافِعٍ اَبِیْ غَالِبٍ قَالَ صَلَّیْتُ مَعَ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَلٰی جَنَازَةِ رَجُلٍ فَقَامَ حِيَالَ رَأْسِهٖ ثُمَّ جَاءُوْا بِجَنَازَةِ امْرَأَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَقَالُوْا يَا اَبَا حَمْزَةَ صَلِّ عَلَيْهَا فَقَامَ حِيَالَ وَسْطِ السَّرِيْرِ فَقَالَ لَهُ الْعَلَاءُ بْنُ زِيَادٍ هٰكَذَا رَأَيْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ عَلَى الْجَنَازَةِ مَقَامَكَ مِنْهَا وَمِنَ الرَّجُلِ مَقَامَكَ مِنْهُ قَالَ نَعَمْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ ابْنُ مَاجَةَ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِیْ دَاوٗدَ نَحْوَهٗ مَعَ زِيَادَةٍ فَقَامَ عِنْدَ عَجِيْزَةِ الْمَرْأَةِ۔

"اور حضرت نافع جن کی کنیت ابوغالب ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس ابن مالک کے ساتھ ایک جنازہ (یعنی حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے جنازہ) کی نماز پڑھی، حضرت انسؓ جو امام تھے) جنازہ کے سر کے سامنے کھڑے ہوئے اور نماز پڑھائی) پھر لوگ قریش کی ایک عورت کا جنازہ لے کر آئے اور کہا اے ابوحمزہ! (یہ انسؓ کی کنیت ہے) اس جنازہ کی نماز پڑھا دیجئے چنانچہ حضرت انسؓ تخت (کہ جس پر جنازہ تھا) کے درمیانی حصہ کے سامنے کھڑے ہوئے (اور نماز پڑھائی یہ دیکھ کر علاء ابن زیاد نے کہا کہ "کیا آپ نے رسول کریم ﷺ کو (نماز جنازہ میں) اسی طرح کھڑے ہوتے دیکھا ہے جیسا کہ آپ اس عورت کے جنازہ کے درمیان اور مرد کے جنازہ کے سر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے؟ یعنی کیا آنحضرت ﷺ بھی نماز جنازہ پڑھاتے وقت عورت کے جنازہ پر اس کے درمیانی حصہ کے سامنے اور مرد کے جنازہ پر اس کے سر کے سامنے کھڑے ہوتے تھے؟) حضرت انسؓ نے فرمایا "ہاں" ابوداؤدؒ نے بھی اس روایت کو کچھ زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے اور ان کی روایت میں "فقام حیال وسط السریر" کے بجائے "فقام عند عجیزة المرئة" (عورت کے جنازہ پر اس کے کولھے کے قریب کھڑے ہوئے) کے الفاظ منقول ہیں۔" (ترمذیؒ و ابن ماجہؒ)

تشریح: اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ میں امام جنازہ کے پاس کہاں کھڑا ہو؟ جو اختلاف ہے اور ائمہ دین کے جو مسلک ہیں اس کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ گزشتہ صفحات میں پہلی فصل کی ایک حدیث کی تشریح کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہونے کا مسئلہ

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ لَيْلٰى قَالَ كَانَ سَهْلُ بْنُ حُنَيْفٍ وَقَيْسُ بْنُ سَعْدٍ قَاعِدَيْنِ بِالْقَادِسِيَّةِ فَمَرَّ عَلَيْهِمَا بِجَنَازَةٍ فَقَامَا فَقِيْلَ لَهُمَا اِنَّهَا مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ اَیْ مِنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ فَقَالَا اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّتْ بِهٖ جَنَازَةٌ فَقَامَ فَقِيْلَ لَهٗ اِنَّهَا جَنَازَةُ يَهُوْدِيٍّ فَقَالَ اَلَيْسَتْ نَفْسًا (متفق علیہ)

"حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت سہل ابن حنیف اور حضرت قیس ابن سعدؓ قادسیہ میں (ایک جگہ) بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا جسے دیکھ کر یہ دونوں صحابی رضؓ کھڑے ہو گئے ان سے کہا گیا کہ "یہ جنازہ اہل زمین یعنی ذمی کا ہے!؟" دونوں صحابہ نے فرمایا کہ (اسی طرح ایک دن) رسول کریم ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا، آپ (اسے دیکھ کر) کھڑے ہو گئے، آپ سے عرض کیا گیا کہ "یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے" آپ نے فرمایا کہ (تو کیا ہوا) کیا یہ جاندار نہیں ہے؟" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قادسیہ ایک جگہ کا نام ہے جو کوفہ سے پندرہ کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔

روایت میں ذمیوں کو "اہل زمین" سے تعبیر کیا گیا ہے یا تو ان کے کم رتبہ ہونے کی وجہ سے یا بایں وجہ کہ مسلمانوں نے انہیں زمین کی

کاشت پر مقرر کر رکھا تھا اور ان سے خراج لیتے تھے اس لئے انہیں اہل زمین کہا گیا۔
آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی "کیا یہ جاندار نہیں ہے؟" کا مطلب یہ ہے کہ کیا یہ کسی انسان کا جنازہ نہیں ہے جسے دیکھ کر عبرت نہ حاصل کی جائے؟ حاصل یہ کہ جنازہ کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا ہے اور عبرت حاصل ہوتی ہے خواہ مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا اس لئے اس میں اس جنازہ کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہو گیا۔
گزشتہ صفحات میں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہونا حضرت علیؓ کی روایت سے منسوخ ہو چکا ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ان دونوں صحابہ کو اس منسوخی کا علم نہ ہوا ہو اس لئے یہ حضرات جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے ہوں گے۔

آنحضرت کا معمول اور اس کی منسوخی

(۳۴) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَبِعَ جَنَازَةً لَّمْ يَقْعُدْ حَتّٰى تُوْضَعَ فِي اللَّحْدِ فَعَرَضَ لَهٗ حِبْرٌ مِنَ الْيَهُوْدِ فَقَالَ لَهٗ اِنَّا هٰكَذَا نَصْنَعُ يَا مُحَمَّدُ قَالَ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ خَالِفُوْهُمْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَبِشْرُ بْنُ رَافِعٍ الرَّاوِيْ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ۔

"اور حضرت عبادہ ابن صامتؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب جنازے کے ہمراہ چلتے تو اس وقت تک نہیں بیٹھتے تھے کہ جب تک کہ میت کو قبر میں نہیں رکھ دیا جاتا تھا (ایک مرتبہ) ایک یہودی عالم آپ کے سامنے پیش ہوا اور اس نے عرض کیا کہ "اے محمد (ﷺ) ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں (کہ جب تک مردہ قبر میں نہیں رکھ دیا جاتا کھڑے رہتے ہیں) حضرت عبادہؓ کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) آنحضرت ﷺ (دفن کرنے تک کھڑے نہیں رہتے تھے بلکہ) بیٹھ جایا کرتے تھے، نیز آپ نے یہ فرمایا کہ "تم یہودیوں کی مخالفت کرو" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور بشر ابن رافع جو اس روایت کا ایک راوی ہے قوی نہیں ہے۔"

جنازہ دیکھ کر کھڑا نہ ہونا چاہئے

(۳۵) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَنَا بِالْقِيَامِ فِي الْجَنَازَةِ ثُمَّ جَلَسَ بَعْدَ ذٰلِكَ وَاَمَرَنَا بِالْجُلُوْسِ (رواہ احمد)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (پہلے تو) ہمیں جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جانے کے لئے فرمایا کرتے تھے پھر (بعد میں) آپ بیٹھے رہتے تھے اور ہمیں بھی بیٹھے رہنے کے لئے فرمایا کرتے تھے۔" (احمدؒ)

تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ پہلے تو جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جانے کا حکم تھا مگر بعد میں یہ حکم منسوخ قرار دے دیا گیا لہٰذا اب اس کے بعد مسئلہ یہی ہے کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ نہ ہوں بلکہ کہیں بیٹھے ہوئے ہوں انہیں جنازہ دیکھ کر کھڑا نہ ہونا چاہئے۔

(۳۶) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ اِنَّ جَنَازَةً مَرَّتْ بِالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ وَابْنِ عَبَّاسٍ فَقَامَ الْحَسَنُ وَلَمْ يَقُمْ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ الْحَسَنُ اَلَيْسَ قَدْ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِجَنَازَةِ يَهُوْدِيٍّ قَالَ نَعَمْ ثُمَّ جَلَسَ (رواہ النسائی)

"اور حضرت محمد ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت حسن ابن علی اور حضرت ابن عباسؓ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو حضرت حسنؓ (اسے دیکھ کر) کھڑے ہو گئے مگر حضرت ابن عباسؓ کھڑے نہیں ہوئے حضرت حسنؓ نے (حضرت ابن عباسؓ کا یہ عمل دیکھ کر) ان سے فرمایا کہ "کیا رسول کریم ﷺ ایک یہودی کے جنازے کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہو گئے تھے؟" حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ

"ہاں! (بے شک آپ کھڑے ہوئے تھے) مگر بعد میں آپ (جنازہ دیکھ کر بیٹھے رہتے تھے۔" (نسائی)

تشریح: حضرت ابن عباسؓ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو بے شک آپ کا یہی معمول تھا کہ جناہ دیکھ کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے مگر بعد میں آپ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جنازہ دیکھ کر آپ کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ بیٹھے رہتے تھے لہٰذا جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جانے کا حکم منسوخ ہو گیا۔

حضرت حسنؓ کے عمل کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت حسنؓ کو اس حکم کے منسوخ ہو جانے کا علم نہیں ہو گا اس لئے وہ نہ صرف یہ کہ جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے بلکہ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کے کھڑے نہ ہونے پر اعتراض بھی کیا۔

آنحضرت ﷺ یہودی کا جنازہ دیکھ کر کیوں کھڑے ہوئے؟

(۳۷) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ الْحَسَنَ بْنَ عَلِیٍّ کَانَ جَالِسًا فَمُرَّ عَلَیْهِ بِجَنَازَۃٍ فَقَامَ النَّاسُ حَتّٰی جَاوَزَتِ الْجَنَازَۃُ فَقَالَ الْحَسَنُ اِنَّمَا مُرَّ بِجَنَازَۃِ یَهُوْدِیٍّ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی طَرِیْقِهَا جَالِسًا وَکَرِهَ اَنْ تَعْلُوَ رَأْسَهٗ جَنَازَۃُ یَهُوْدِیٍّ فَقَامَ (رواہ النسائی)

"اور حضرت جعفر ابن محمدؒ (یعنی حضرت جعفر صادق) اپنے والد مکرم (حضرت محمد باقرؒ) سے یہ روایت کرتے ہیں کہ "(ایک مرتبہ) حضرت علیؓ، (ایک جگہ) بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے سامنے سے جنازہ لے جایا گیا، وہ لوگ (جنہیں اس مسئلہ کی منسوخی کا علم نہیں ہوا تھا جنازہ دیکھ کر) کھڑے ہوئے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک کہ جنازہ گزر نہیں گیا، حضرت حسن نے ان سے فرمایا کہ "اصل بات یہ ہے کہ جب ایک یہودی کا جنازہ لے جایا جا رہا تھا تو اس وقت رسول کریم ﷺ راستہ پر بیٹھے ہوئے تھے آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں کیا کہ یہودی کا جنازہ آپ ﷺ کے سر مبارک سے اونچا ہو لہٰذا آپ ﷺ کھڑے ہو گئے۔" (نسائی)

تشریح: حضرت حسنؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ یہودی کے جنازہ کو دیکھ کر جو کھڑے ہوئے تھے تو اس کی وجہ میت کا احترام نہیں تھا بلکہ اصل حقیقت تو یہ تھی آپ ﷺ نے یہ بات پسند نہیں کی کہ ایک یہودی کا جنازہ آپ کے سر مبارک سے اونچا ہو گویا حضرت حسنؓ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ ان لوگوں پر اعتراض کیا جو جنازہ دیکھ کر کھڑے ہوئے تھے۔

ابھی اس سے پہلے جو حدیث گزری ہے اس سے تو معلوم ہوا کہ حضرت حسنؓ نہ صرف یہ کہ جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے بلکہ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ پر اس لئے اعتراض کیا کہ وہ جنازہ دیکھ کر کھڑے نہیں ہوئے تھے اور یہاں اس حدیث میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے حضرت حسنؓ نے ان پر اعتراض کیا۔

لہٰذا اس اختلاف کے بارہ میں محدثین لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ جو یہاں بیان کیا جا رہا ہے اس واقعہ کے بعد کا ہے جو اس سے پہلی حدیث میں بیان کیا گیا ہے پہلے چونکہ حضرت حسنؓ کو منسوخی کا علم نہیں ہوا تھا اس لئے انہوں نے حضرت عباسؓ پر اعتراض کیا۔ مگر جب بعد میں تحقیق و جستجو کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ مذکورہ بالا وجہ سے یہودی کا جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور یہ کہ جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جانے کا حکم اب منسوخ ہو گیا ہے تو انہوں نے اس موقع پر اعتراض کیا جو جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

بہر حال جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جانے کی اور بھی کئی وجوہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ ڈر اور عبرت کی وجہ سے جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے، کبھی ملائکہ کی تعظیم پیش نظر کھڑے ہو جاتے تھے جو جنازہ کے ساتھ ہوتے تھے کبھی آپ اس لئے بھی کھڑے ہو جاتے تھے کہ آپ جنازہ کو اپنے سر مبارک سے بلند ہونا پسند نہیں فرماتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ حضرت امام باقر حضرت حسنؓ کے زمانے میں نہیں تھے۔

(۳۸) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا مَرَّتْ بِكَ جَنَازَۃُ یَهُوْدِیٍّ اَوْنَصْرَانِیٍّ اَوْمُسْلِمٍ

فَقُوْمُوْا لَهَا فَلَسْتُمْ لَهَا تَقُوْمُوْنَ اِنَّمَا تَقُوْمُوْنَ لِمَنْ مَّعَهَا مِنَ الْمَلَائِكَةِ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تمہارے سامنے کسی یہودی یا نصرانی یا مسلمان کا جنازہ گزرے تو اسے دیکھ کر کھڑے ہو جاؤ اور تم جنازہ (کے ادب و احترام) کے لئے نہیں کھڑے ہوتے بلکہ ان فرشتوں (کی تعظیم) کے لئے کھڑے ہوتے جو جنازہ کے ساتھ ہوتے ہیں۔"

تشریح: جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے جنازہ دیکھ کر کھڑے ہونے کے وجود مختلف ہیں انہیں میں سے ایک وجہ یہاں بیان کی جا رہی ہے، نیز یہ کہ کھڑے ہو جانے کا یہ حکم پہلے تھا اب منسوخ ہو گیا ہے اسے بھی گذشتہ احادیث کی تشریح میں بیان کیا جا چکا ہے۔

(۳۹) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ جَنَازَةً مَرَّتْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ فَقِيْلَ اِنَّهَا جَنَازَةُ يَهُوْدِيٍّ فَقَالَ اِنَّمَا قُمْتُ لِلْمَلَائِكَةِ (رواہ النسائی)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک جنازہ گذرا تو رسول کریم ﷺ (اسے دیکھ کر) کھڑے ہو گئے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے" (اسے دیکھ کر کھڑے ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی) سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ "میں (جنازہ کے احترام میں کھڑا نہیں ہوا تھا بلکہ میں تو صرف ان) ملائکہ (کی تعظیم) کے لئے کھڑا ہوا تھا (جو جنازہ کے ہمراہ رہتے ہیں)۔" (نسائی)

نماز جنازہ میں تین صفیں ہونی چاہئیں

(۴۰) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ هُبَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ فَيُصَلِّيْ عَلَيْهِ ثَلَاثَةُ صُفُوْفٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا اَوْجَبَ فَكَانَ مَالِكٌ اِذَا اسْتَقَلَّ اَهْلَ الْجَنَازَةِ جَزَّاهُمْ ثَلَاثَةَ صُفُوْفٍ لِهٰذَا الْحَدِيْثِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَفِيْ رِوَايَةِ التِّرْمِذِيِّ قَالَ كَانَ مَالِكُ ابْنُ هُبَيْرَةَ اِذَا صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فَتَقَالَّ النَّاسَ عَلَيْهَا جَزَّاهُمْ ثَلَاثَةَ اَجْزَاءٍ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى عَلَيْهِ ثَلَاثَةُ صُفُوْفٍ اَوْجَبَ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ نَحْوَهٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت مالک ابن ہبیرہؓ راوی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جب کوئی مسلمان مرتا ہے اور اس پر مسلمانوں کی تین صفوں پر مشتمل جماعت نماز پڑھتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنّت اور مغفرت واجب کر دیتا ہے، چنانچہ حضرت مالکؓ (نماز جنازہ میں) تھوڑے آدمی (بھی) دیکھتے تو اس حدیث کے بموجب انہیں تین صفوں میں تقسیم کر دیتے تھے" (ابوداؤد)

ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرت مالک ابن ہبیرہ جب نماز جنازہ پڑھتے (یعنی نماز جنازہ پڑھنے کا ارادہ کرتے) اور لوگوں کی تعداد کم دیکھتے تو ان کو تین حصوں (یعنی تین صفوں) میں تقسیم کر دیتے تھے اور پھر فرماتے تھے کہ "رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کی نماز جنازہ تین صفیں پڑھتیں ہیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنّت کو واجب کر دیتا ہے" ابن ماجہؒ نے بھی اس قسم کی روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: اسلامی عقائد کا یہ ایک واضح مسئلہ ہے کہ ہر شخص کو یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ اللہ جلّ شانہ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے یعنی اس کی بزرگی و برتر ذات کسی چیز کے کرنے پر مجبور نہیں ہے لیکن یہاں حدیث میں چونکہ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنّت کو واجب کرتا ہے اس لئے علماء حدیث کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کی نماز جنازہ میں مسلمانوں کی تین صفیں شریک ہوں اس بشارت کی بموجب اللہ تعالیٰ اپنے اوپر یہ واجب کر لیتا ہے کہ اسے جنّت میں داخل کرے گویا یہاں حدیث میں جس وجوب کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے وعدہ کی مناسبت سے ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے ایسے شخص کو جنّت میں داخل کرنے کا وعدہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جو وعدہ کرے وہ ایفاء نہ ہو یہ ناممکن ہے اس لئے ایفاء عہد اور اپنے فضل و کرم کے اظہار کے طور پر حق تعالیٰ کسی مجبوری یا دباؤ کے تحت نہیں بلکہ از خود اپنے اوپر یہ واجب کر لیتا ہے کہ ایسے شخص کو جنت میں داخل کرے چنانچہ اسے اصطلاحًا

وجوب لغیرہ کہا جاتا ہے جو اس عقیدہ کے منافی نہیں ہے ہاں وجوب لذاتہ حق تعالیٰ کی ذات کے لئے ممتنع ہے جس کے بارہ میں مذکورہ بالا اسلامی عقیدہ بیان کیا گیا ہے، کرمانیؒ نے لکھا ہے نماز جنازہ میں سب صفوں سے زیادہ افضل سب سے پیچھے والی صف ہوتی ہے بخلاف دوسری نمازوں کے کہ ان میں سب سے آگے والی صف سب سے زیادہ افضل ہوتی ہے۔

نیز علماء یہ مسئلہ لکھتے ہیں کہ نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا نہ کی جائے (جیسا کہ دوسری نمازوں میں سلام پھیرنے کے بعد دعا مانگی جاتی ہے) کیونکہ اس سے نماز جنازہ میں اضافہ کا اشتباہ ہوتا ہے۔

نماز جنازہ میں آنحضرت ﷺ کی دعا

(۴۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الصَّلَاةِ عَلَی الْجَنَازَةِ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبُّهَا وَاَنْتَ خَلَقْتَهَا وَاَنْتَ هَدَیْتَهَا اِلَی الْاِسْلَامِ وَاَنْتَ قَبَضْتَ رُوْحَهَا وَاَنْتَ اَعْلَمُ بِسِرِّهَا وَعَلَانِیَتِهَا جِئْنَا شُفَعَاءَ فَاغْفِرْ لَهٗ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ کے بارہ میں یہ روایت کرتے تھے کہ آپ نماز جنازہ میں یہ دعا فرمایا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبُّهَا وَاَنْتَ خَلَقْتَهَا وَاَنْتَ هَدَیْتَهَا اِلَی الْاِسْلَامِ وَاَنْتَ قَبَضْتَ رُوْحَهَا وَاَنْتَ اَعْلَمُ بِسِرِّهَا وَعَلَانِیَتِهَا جِئْنَا شُفَعَاءَ فَاغْفِرْ لَهٗ اے الٰہی تو اس کا پروردگار ہے تو نے ہی اسے پیدا کیا ہے اور تو نے ہی اس کو اسلام کی ہدایت عطا فرمائی اور (اب) تو نے ہی اس کی روح قبض کی ہے (اے رب العلمین) تو اس کے باطن کو بھی سب سے زیادہ جاننے والا ہے اور اس کے ظاہر کو بھی (اے اللہ) ہم اس بندہ کی شفاعت کے لئے حاضر ہوئے ہیں تو اسے بخش دے۔" (ابوداؤد)

ایک بچہ کے جنازہ پر حضرت ابوہریرہؓ کی دعا

(۴۲) وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ قَالَ صَلَّیْتُ وَرَآءَ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَلٰی صَبِیٍّ لَمْ یَعْمَلْ خَطِیْئَةً قَطُّ فَسَمِعْتُهٗ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ (رواہ مالک)

"اور حضرت سعید ابن مسیب فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میں نے حضرت ابوہریرہؓ کے پیچھے ایک ایسے لڑکے کی نماز جنازہ پڑھی جس سے کبھی بھی کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا، چنانچہ میں نے حضرت ابوہریرہؓ کو (نماز میں) یہ دعا مانگتے سنا کہ "اے اللہ! اس بچہ کو عذاب قبر سے پناہ دے۔" (مالکؒ)

تشریح: علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ روایت کے الفاظ لم یعمل خطیئة قط یعنی کبھی بھی کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا) لفظ "صبی" (یعنی بچہ) کی صفت کاشفہ ہے کیونکہ غیر بالغ سے گناہ کا سرزد ہونا متصور نہیں ہے"

حضرت ابوہریرہؓ کی دعا "اے اللہ اس بچہ کو عذاب قبر سے پناہ دے" میں عذاب قبر سے عقوبت (یعنی سزا) اور قبر کا سوال وجواب مراد نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ! اس بچہ کو قبر میں حسرت وغم، قبر کی وحشت اور ضغطہ قبر (یعنی قبر کے بھینچنے) کے رنج و خوف سے محفوظ ومامون رکھ اور ظاہر ہے کہ ضغطہ قبر میں ہر شخص مبتلا ہو گا خواہ بالغ ہو یا نابالغ۔

قبر میں بچوں سے سوال وجواب ہو گا یا نہیں؟: اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ جس طرح قبر میں بالغ لوگوں سے سوال و جواب ہو گا اسی طرح نابالغ بچوں سے بھی سوال وجواب ہو گا یا نہیں؟ چنانچہ کچھ حضرات کا قول تو یہ ہے کہ بچوں سے بھی سوال وجواب ہو گا جب کہ دوسرے حضرات کا قول یہ ہے کہ بچے اس سے مستثنیٰ ہوں گے ان سے کوئی سوال وجواب نہیں ہو گا اور یہی قول صحیح ہے کیونکہ غیر مکلف کا عذاب میں مبتلا ہونا اصول شریعت کے خلاف ہے۔

بچہ کی نماز جنازہ کی دعا

(۴۳) وَعَنِ الْبُخَارِيِّ تَعْلِيْقًا قَالَ يَقْرَأُ الْحَسَنُ عَلَى الطِّفْلِ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَيَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا سَلَفًا وَّفَرَطًا وَذُخْرًا وَّاَجْرًا۔

"اور حضرت امام بخاریؒ نے بطریق تعلیق (یعنی صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب میں بغیر سند کے اس حدیث کو) نقل کیا ہے کہ "حضرت حسن بصریؒ بچہ کی نماز جنازہ میں تکبیر اولی کے بعد سُبحَانَكَ اللّٰهُمَّ الخ کی بجائے) سورہ فاتحہ پڑھا کرتے تھے اور (تیسری تکبیر کے بعد) یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا سَلَفًا وَّفَرَطًا وَذُخْرًا وَّاَجْرًا اے اللہ اس بچے کو (قیامت کے دن) ہمارا پیشوا، پیش رو اور ہمارے لئے ذخیرہ ثواب بنا۔"

تشریح: "سلف" اس مال کو کہتے ہیں کہ جسے آگے (منزل پر) بھیجد یا جائے تاکہ اسے بھیجنے والا (منزل پر پہنچ کر) اس سے فائدہ حاصل کرے۔ اسی طرح "فرط" لشکر کا وہ شخص کہلاتا ہے جو لشکر سے آگے پہنچ کر لشکر کے لئے سامان خورد ونوش وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔

یہاں دعا میں ان دونوں سے مراد یہ ہے کہ "یہ بچہ قیامت کے روز ہماری بہتری و بھلائی اور ہماری منفعت کا باعث بنے بایں طور کہ پروردگار سے ہماری شفاعت کرے۔ "ذخرہ" اس مال کو کہتے ہیں کو ذخیرہ کے طور پر رکھا جائے تاکہ حاجت وضرورت کے وقت کام آئے۔

ناتمام بچہ کی نماز نہ پڑھی جائے

(۴۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الطِّفْلُ لَا يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَلَا يَرِثُ وَلَا يُوْرَثُ حَتّٰى يَسْتَهِلَّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ وَلَا يُوْرَثُ۔

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "(ناتمام) بچہ کی نہ تو نماز پڑھی جائے اور نہ اسے کسی کا وارث قرار دیا جائے اور نہ ہی اس کا کوئی وارث ہو بشرطیکہ پیٹ سے باہر آتے وقت اس کی آواز نہ نکلے (یعنی اس وقت اس میں زندگی کے آثار نہ پائے جائیں جس کی تفصیل پیچھے گذر چکی ہے) اس روایت کو ترمذیؒ اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے مگر ابن ماجہ نے اپنی روایت میں لایورث نقل نہیں کیا ہے۔"

نماز جنازہ میں بھی امام اوپر اور مقتدی نیچے نہ کھڑے ہوں

(۴۵) وَعَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّقُوْمَ الْاِمَامُ فَوْقَ شَيْءٍ وَّالنَّاسُ خَلْفَهٗ يَعْنِيْ اَسْفَلَ مِنْهُ۔ رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ فِي الْمُجْتَبٰى فِيْ كِتَابِ الْجَنَائِزِ۔

"اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ امام (تنہا) کسی چیز کے اوپر کھڑا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے (اس سے نیچے) کھڑے ہوں۔" (دار قطنیؒ)

تشریح: نماز جنازہ میں امام کے لئے یہ ممنوع ہے کہ وہ تو کسی اونچی جگہ کھڑا ہو اور سب مقتدی اس سے نیچے ہوں لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات بطریق اولی ممنوع ہوگی کہ صرف امام تو نیچے کھڑا ہو اور مقتدی اوپر کھڑے ہوں۔ یہ مسئلہ سب نمازوں کا ہے نماز جنازہ ہی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ بھی مخصوص نہیں ہیں لیکن مصنف مشکوۃ نے اس حدیث کو نماز جنازہ پر محمول کر کے اس باب میں نقل کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ حدیث اس باب میں بھی وارد ہوئی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ نماز جنازہ میں یہ طریقہ اختیار کیئے ہوں گے لہٰذا اس سے منع کیا ہے۔

بَابُ دَفْنِ الْمَیِّتِ
مردہ کو دفن کرنے کا بیان
اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ
بغلی قبر بنانا مستحب ہے

① عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّ سَعْدَ بْنَ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ فِیْ مَرَضِهِ الَّذِیْ هَلَكَ فِیْهِ الْحَدُوْا لِیْ لَحْدًا وَانْصِبُوْا عَلَیَّ اللَّبِنَ نَصْبًا كَمَا صُنِعَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ مسلم)

"حضرت عامر بن سعد بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے اپنی اس بیماری میں کہ جس میں ان کی وفات ہوئی فرمایا کہ مجھے دفن کرنے کے لئے لحد بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں کھڑی کرنا جیسا کہ رسول کریم ﷺ کے لئے کیا گیا تھا۔" (مسلم)

تشریح: "لحد" قبر میں قبلہ کی طرف بنائے گئے اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں مردہ رکھا جاتا ہے جس قبر میں ایسا گڑھا بنایا جاتا ہے اسے بغلی قبر کہتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بغلی قبر بنانا مستحب ہے۔

حضرت ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک قبر میں لحد بنانا سنت ہے بشرطیکہ کوئی مجبوری نہ ہو یعنی اگر زمین نرم ہو اور لحد بنانے سے قبر کے بیٹھ جانے کا اندیشہ ہو تو پھر قبر میں لحد نہ بنائی جائے بلکہ صندوق قبر بنائی جائے۔

حضرت سعدؓ کے ارشاد "مجھ پر کچی اینٹیں کھڑی کرنا" کا مطلب یہ ہے کہ میری لحد کو کچی اینٹوں سے بند کرنا۔ علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی لحد کو نو اینٹوں سے بند کیا گیا تھا۔

قبر میں کپڑا بچھانے کا مسئلہ

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جُعِلَ فِیْ قَبْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطِیْفَةٌ حَمْرَاءُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی قبر میں ایک سرخ لوئی (چادر) ڈالی گئی تھی۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ایک خادم تھے جن کا نام "شعران" تھا انہوں نے صحابہ کرامؓ کی مرضی اور ان کی اجازت کے بغیر از خود اس چادر کو آنحضرت ﷺ کی قبر میں رکھ دیا تھا اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میں اسے قطعی ناپسند کرتا ہوں کہ جس چادر مبارک کو سرکار دو عالم ﷺ خود استعمال کر چکے ہوں اسے آپ کے بعد کوئی دوسرا شخص استعمال کرے۔

بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ قبر میں یہ چادر رکھنا آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے تھا (اب کسی دوسرے کے لئے اجازت نہیں کہ اس کی قبر میں چادر وغیرہ بچھائی جائے یا رکھی جائے) بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی قبر میں چادر رکھنے کے بارہ میں بھی صحابہؓ نے کسی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ چنانچہ حضرت علی اور حضرت عباسؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ ان دونوں نے شعران سے اس بات پر سخت معارضہ کیا کہ انہوں نے وہ چادر قبر مبارک میں کیوں رکھی؟ نیز علامہ ابن عبدالبرؒ نے تو "کتاب استیعاب" میں یہ لکھا ہے کہ "وہ لوئی (جو شعران نے آپ ﷺ کی قبر مبارک میں ڈالی تھی) مٹی ڈالنے سے پہلے قبر مبارک سے نکال لی گئی تھی۔

بہر حال علماء نے قبر میں مردہ کے نیچے کوئی کپڑا بچھانے کو مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس میں مال کا اسراف اور اس کا ضائع کرنا ہے۔"

اونٹ کے کوہان کی مانند قبر بنانا افضل ہے

④ وَعَنْ سُفْيَانَ التَّمَّارِ اَنَّهٗ رَاٰى قَبْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسَنَّمًا (رواہ البخاری)

"اور حضرت سفیان تمار سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی قبر کو دیکھا جو اونٹ کے کوہان کی طرح تھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ، اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے نہ صرف یہ کہ اس حدیث کو بلکہ اس کے علاوہ اور بھی صحیح احادیث کو اپنے اس مسلک کا مستدل قرار دیا ہے کہ قبر کو اونٹ کے کوہان کی طرح اٹھی ہوئی بنانا مسطح بنانے سے افضل ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک قبر کو مسطح بنانا افضل ہے۔

قبر کو اونچا کرنے کی ممانعت

④ وَعَنْ اَبِي الْهَيَّاجِ الْاَسَدِيِّ قَالَ قَالَ لِيْ عَلِيٌّ اَلَا اَبْعَثُكَ عَلٰى مَا بَعَثَنِيْ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ لَّا تَدَعَ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَهٗ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّيْتَهٗ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوالہیاج اسدی (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے مجھ سے فرمایا کہ "کیا میں تمہیں اس کام پر معمور نہ کروں جس کام پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے معمور کیا تھا؟ اور وہ کام یہ ہے کہ تم جو بھی تصویر دیکھو اسے چھوڑو نہیں بلکہ اسے مٹا دو اور جس قبر کو بلند دیکھو اسے برابر کردو۔" (مسلمؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ اپنے پاس تصویر کا رکھنا حرام ہے اور اسے مٹا دینا واجب ہے، نیز اس کے سامنے بیٹھنا جائز نہیں ہے "جس قبر کو بلند دیکھو اسے برابر کردو" کا مطلب یہ ہے کہ قبر اگر زیادہ اونچی اور بلند بنائی گئی ہو تو اسے اتنی نیچی کردو کہ زمین کی سطح سے قریب ہو جائے صرف اس کا نشان باقی رہے جس کی مقدار ایک بالشت ہے کیونکہ مسنون یہی ہے چنانچہ کتاب "ازہار" میں علماء کا یہ قول لکھا ہوا ہے کہ قبر کو بقدر ایک بالشت کے بلند کرنا مستحب ہے اور اس سے زیادہ مکروہ ہے نیز ایک بالشت سے زیادہ بلند قبر کو ڈھا دینا (یعنی صرف ایک بالشت کی بقدر باقی رہنے دینا مستحب ہے۔

قبر پر گچ کرنے، عمارت بنانے اور اس کے اوپر بیٹھنے کی ممانعت

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قبر پر گچ کرنے اور اس پر عمارت بنانے نیز قبر کے اوپر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: کتاب اظہار میں لکھا ہے کہ قبروں پر گچ کرنے کی ممانعت کراہت کے طور پر ہے یعنی قبروں پر گچ کرنا مکروہ ہے پھر ممانعت کا یہ حکم دونوں صورتوں کے لئے ہے یعنی خواہ قبر کی چنائی گچ سے کی جائے خواہ قبروں پر گچ کیا جائے دونوں ہی مکروہ ہیں، قبر کے اوپر کوئی عمارت مثلاً گنبد یا قبہ وغیرہ بنانا درست نہیں ہے بلکہ اگر کسی قبر پر کوئی عمارت بنی ہوئی ہو تو اسے ڈھا دینا واجب ہے اگر وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ "قبروں پر بناء (یعنی عمارت بنانا) دونوں چیزوں کو محتمل ہے خواہ قبر پر پتھر و اینٹ وغیرہ سے کوئی عمارت بنائی جائے خواہ قبر کے اوپر کوئی خیمہ وغیرہ کھڑا کیا جائے دونوں ہی صورتیں ممنوع ہیں کیونکہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے، علامہ تورپشتیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس ممانعت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ فعل جاہلیت ہے یعنی کفار میت کے اوپر دس دن تک سایہ رکھتے تھے اس لئے مشابہت سے بچانا بھی مقصود ہے۔

"قبر کے اوپر بیٹھنے" سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ یہ مؤمن کے اکرام و شرف کے منافی ہے بایں طور کہ قبر کے اوپر چڑھ کر بیٹھنے سے

صاحب قبر کی تحقیر اور بے وقعتی لازم آتی ہے۔
بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "قبر کے اوپر بیٹھنے" سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اظہار رنج و غم کے لئے قبر کے پاس مسلسل بیٹھا رہے جیسے کے بعض لوگ فقراور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے کسی محسن و متعلق ہی کی قبر کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں لہٰذا اس سے منع فرمایا گیا ہے۔

قبروں کے بارہ میں چند احکام

(۶) وَعَنْ اَبِیْ مَرْثَدِ الْغَنَوِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَجْلِسُوْا عَلَی الْقُبُوْرِ وَلَا تُصَلُّوْا اِلَیْھَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو مرثد غنوی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "نہ قبروں کے اوپر بیٹھو اور نہ قبروں کی طرف نماز پڑھو۔" (مسلمؒ)

تشریح: محقق ابن ہمام فرماتے ہیں کہ قبروں پر بیٹھنا اور ان کو روندنا مکروہ ہے لہٰذا بعض لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنے قبرستان میں اپنے کسی عزیز و متعلق کی قبر تک پہنچنے کے لئے درمیان کی قبروں کو بلا تکلف روندتے ہوئے چلتے ہیں یہ انتہائی غلط بات ہے۔ ہاں ضرورت و حاجت کے وقت مثلاً قبر کھودنے کے لئے یا میت کو دفن کرنے کے لئے قبروں پر پاؤں رکھ کر چلنا جائز ہے۔ قبرستان میں ننگے پاؤں چلنا مستحب ہے قبر کے نزدیک یا قبر کو تکیہ بنا کر سونا مکروہ ہے قبروں کے پاس استنجا کرنا تو انتہائی کراہت کی بات ہے، قبرستان آنے جانے کے بارہ میں ہر وہ چیز مکروہ ہے جو معہود یعنی سُنّت سے ثابت نہیں ہے اس بارہ میں صرف قبروں پر جانا اور وہاں کھڑے کھڑے دعا مانگنا سُنّت سے ثابت ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے بارہ میں منقول ہے کہ آپ ﷺ جب جنت البقیع تشریف لے جاتے تو وہاں یہ فرماتے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ وَاَسْأَلُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ یعنی اے مؤمنین کے گھر تجھ پر سلامتی ہو، اے مؤمنو! انشاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں، میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے امن و عافیت مانگتا ہوں۔ (ملا علی قاریؒ)

ملا علی قاری کے ان الفاظ سے اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ یہاں تو یہ ثابت ہوا کہ زیارت قبور کے سلسلے میں صرف "قبروں پر جانا اور وہاں دعا مانگنا سنت سے ثابت ہے جیسا کہ خود ملا علی قاریؒ نے ابھی اس باب کی تیسری فصل کی ایک حدیث کو جو حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے کی تشریح کے ضمن میں وہ احادیث نقل کی ہیں تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ قرآن کریم کی تلاوت دعا میں شامل ہے اس لئے کہ تلاوت قرآن کریم بھی حکماً دعا ہی ہے لہٰذا وہ مکروہ نہیں ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ و لا تصلوا الیھا (اور نہ قبروں کی طرف نماز پڑھو) کی روشنی میں علماء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص قبر یا صاحب قبر کی تعظیم کی خاطر قبر کی طرف نماز پڑھتا ہے تو یہ صریح کفر ہے اگر قبر یا صاحب قبر کی تعظیم پیش نظر نہ ہو تو تب بھی قبر کی طرف نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہی حکم جنازہ کا بھی ہے جب کہ وہ نمازی کے سامنے رکھا ہوا ہو بلکہ اس میں تو اور بھی زیادہ کراہت ہے حاصل یہ کہ نمازی کے سامنے قبر یا جنازہ نہ ہونا چاہئے۔

قبر کے اوپر بیٹھنے کی تہدید

(۷) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاَنْ یَّجْلِسَ اَحَدُکُمْ عَلٰی جَمْرَۃٍ فَتُحْرِقَ ثِیَابَہٗ فَتَخْلُصَ اِلٰی جِلْدِہٖ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یَّجْلِسَ عَلٰی قَبْرٍ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر تم میں سے کوئی شخص انگارے پر بیٹھ جائے اور وہ انگارہ اس کا کپڑا جلا کر اس کے جسم تک پہنچ جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ قبر کے اوپر بیٹھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آگ کے اوپر بیٹھ جائے اور وہ آگ اس شخص کے کپڑوں کو جلا کر اس کے جسم تک پہنچ جائے اور

جسم کے حصوں کو جلا ڈالے تو یہ تکلیف و مصیبت قبر کے اوپر بیٹھنے سے سہل و آسان ہے یعنی قبر کے اوپر بیٹھنے کا ضرر و نقصان اس کے ضرر و نقصان سے کہیں زیادہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

صندوقی قبر بھی مشروع ہے

⑧ وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا يَلْحَدُ وَالْاٰخَرُ لَا يَلْحَدُ فَقَالُوْا اَيُّهُمَا جَاءَ اَوَّلًا عَمِلَ عَمَلَهٗ فَجَاءَ الَّذِيْ يَلْحَدُ فَلَحَدَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں دو شخص تھے (جو قبریں کھودا کرتے تھے) ان میں سے ایک شخص (حضرت ابو طلحہؓ انصاری) تو بغلی قبر کھودا کرتے تھے اور دوسرے شخص (حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح) بغلی قبر نہیں کھودتے تھے (بلکہ صندوقی قبر کھودا کرتے تھے) چنانچہ (آنحضرت ﷺ کا جب وصال ہوا تو) صحابہؓ نے (متفقہ طور پر) یہ کہا کہ ان دونوں میں سے جو پہلے آجائے وہی قبر کھودے (یعنی اگر ابو طلحہؓ پہلے آگئے تو بغلی قبر کھودیں اور اگر ابو عبیدہؓ پہلے آجائیں تو صندوقی قبر کھودیں) آخر کار بغلی قبر کھودنے والے شخص (پہلے) آگئے اور انہوں نے رسول کریم ﷺ کے لئے بغلی قبر کھودی۔" (شرح السنۃ)

تشریح: حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ بڑی عظمت و فضیلت کے مالک صحابی ہیں آپ کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے آپ عشرہ مبشرہ یعنی ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ایک ہیں جنہیں آنحضرت ﷺ نے دنیا ہی میں جنتی ہونے کی بشارت دی تھی۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اگرچہ بغلی قبر افضل ہے لیکن صندوقی قبر بھی مشروع ہے اس لئے کہ اگر صندوقی قبر مشروع نہ ہوتی تو حضرت عبیدہؓ صندوقی قبر کیوں کھودا کرتے؟

بغلی قبر کی فضیلت

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّحْدُ لَنَا وَالشَّقُّ لِغَيْرِنَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "لحد" یعنی بغلی قبر، ہمارے لئے ہے اور شق (یعنی صندوقی قبر) دوسروں کے لئے ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ اور امام احمدؒ نے اس روایت کو جریر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے)

تشریح: علماء نے اس حدیث کے کئی معنی بیان کئے ہیں لیکن زیادہ صحیح معنی یہ ہیں کہ "لحد" یعنی بغلی قبر ہم انبیاء کی جماعت کے لئے ہے اور شق یعنی صندوقی قبر جماعت انبیاء کے علاوہ دوسروں کے لئے جائز ہے گویا لحد کی فضیلت بیان کی جارہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بغلی قبر کی نسبت جماعت انبیاء کی طرف کر کے اس کی فضیلت اور اولیت کا اظہار فرمایا جارہا ہے۔

قبر گہری کھودنی چاہئے

⑩ وَعَنْ هِشَامِ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَ اُحُدٍ احْفِرُوْا وَاَوْسِعُوْا وَاَعْمِقُوْا وَاَحْسِنُوْا وَادْفِنُوا الْاِثْنَيْنِ وَالثَّلَاثَةَ فِيْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ وَقَدِّمُوْا اَكْثَرَهُمْ قُرْاٰنًا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ اِلٰى قَوْلِهٖ وَاَحْسِنُوْا۔

"اور حضرت ہشام ابن عامرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے غزوہ احد کے دن فرمایا کہ "قبریں کھودو اور قبروں کو کشادہ و گہری کھودو اور

انہیں اچھی بناؤ (یعنی قبروں کو ہموار بناؤ اور اندر سے کوڑا کرکٹ و مٹی وغیرہ صاف کرو) اور ایک ایک قبر میں دو دو تین تین کو دفن کرو اور ان میں آگے (یعنی قبلہ کی طرف) اسے رکھو جسے قرآن زیادہ اچھا یاد تھا۔ (احمدؒ، ترمذیؒ) ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو لفظ "احسنو" تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: "غزوہ احد کے دن" سے مراد یہ ہے کہ جب احد ختم ہوئی اور شہداء کو دفن کرنے کا ارادہ کیا گیا تو اس وقت آپ نے فرمایا کہ قبریں کھودو، لہٰذا ارشاد گرامی میں قبریں کھودنے" کا حکم تو وجوب کے طور پر ہے بقیہ احکام یعنی قبروں کو کشادہ اور گہرا کھودنے اور اچھی بنانے کا حکم استحباب کے طور پر ہے۔

"قبروں کو گہری کھودو" اس سے معلوم ہوا کہ قبر کو گہرا کھودنا سُنّت ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے میت درندوں سے محفوظ رہتی ہے۔

مظہرؒ کا قول ہے کہ قبریں اتنی گہری کھودنی چاہیں کہ اگر آدمی اندر کھڑا ہو کر اپنے ہاتھ اٹھائے تو اس کی انگلیوں کے سرے قبر کے کنارے تک پہنچ جائیں۔

ایک ایک قبر میں دو دو اور تین تین مردوں کو دفن کرنا مجبوری اور ضرورت کے وقت تو جائز ہے لیکن بغیر کسی ضرورت اور مجبوری کے جائز نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی "اور ان میں آگے (یعنی قبلہ کی طرف) اسے رکھو جسے قرآن زیادہ اچھا یاد تھا" میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح عالم باعمل کی تعظیم و تکریم اس کی زندگی میں کی جاتی تھی اسی طرح مرنے کے بعد بھی اس کی تعظیم اور اس کے احترام کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

ایک سے زیادہ جنازوں کی بیک وقت نماز

جس طرح ایک جنازہ پر ایک نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے اسی طرح ایک وقت میں کئی جنازوں پر بھی ایک نماز جنازہ ادا کی جاسکتی ہے مطلب یہ ہے کہ بیک وقت کئی جنازے جمع ہو جائیں تو خواہ ہر جنازہ کی الگ الگ نماز پڑھی جائے تو خواہ تمام جنازوں کو رکھ کر سب کے لئے ایک ہی نماز پڑھ لی جائے دونوں صورتیں جائز ہیں۔ نیز اگر کئی جنازوں کی ایک ہی نماز بیک وقت پڑھی جائے تو جنازوں کو آگے ترتیب سے رکھنے میں بھی اختیار ہے کہ چاہے تو تمام جنازوں کو قبلہ کی طرف آگے پیچھے کر کے رکھا جائے اور چاہے طول میں قطار باندھ کر تمام جنازوں کو رکھ دیا جائے دونوں طرح جائز ہے البتہ امام کو چاہئے کہ وہ اس جنازہ کے پاس کھڑا ہو جو ان جنازوں میں سب سے افضل ہو۔

میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا مسئلہ

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ أُحُدٍ جَاءَتْ عَمَّتِيْ بِأَبِيْ لِتَدْفِنَهُ فِيْ مَقَابِرِنَا فَنَادٰى مُنَادِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُدُّوا الْقَتْلٰى إِلٰى مَضَاجِعِهِمْ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَلَفْظُهُ لِلتِّرْمِذِيِّ۔

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ جب غزوہ احد ہوا تو میری پھوپھی میرے والد (کی نعش) لے کر آئیں تاکہ انہیں اپنے قبرستان میں دفن کریں، لیکن رسول کریم ﷺ کی طرف سے ایک منادی کرنے والے نے اعلان کیا کہ "شہیدوں کو ان کے شہید ہونے کی جگہ پہنچا دیا جائے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ دارمیؒ) الفاظ ترمذیؒ کے ہیں۔

تشریح: حضرت جابرؓ کا ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب غزوہ احد اور بعض مسلمان شہید ہوئے تو میرے والد مکرم بھی ان شہیدوں میں تھے چنانچہ میری پھوپھی میرے والد کی نعش میدان کارزار سے شہر لائیں تاکہ انہیں اپنے قبرستان یعنی بقیع میں دفن کر دیا جائے لیکن آنحضرت ﷺ کی طرف سے ایک شخص نے اعلان کیا کہ شہداء جس جگہ شہید کیئے گئے ہیں انہیں وہی دفن کیا جائے۔

یہ تو حدیث کی وضاحت تھی اب مسئلہ کی طرف آیئے بعض علماء فرماتے ہیں کہ جیسا کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کا حکم نقل کیا گیا ہے، جو شخص جس شہر میں انتقال کرے اسے اسی شہر میں دفن کیا جائے اس کی نعش دوسرے شہر میں منتقل نہ کی جائے چنانچہ کتاب ازہار میں لکھا ہے کہ نقل میت کے عدم جواز کے سلسلہ میں یہ حدیث ایک مضبوط اور قوی تر دلیل ہے لیکن اس سلسلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ یہاں حدیث میں میت کو منتقل کرنے کی جو ممانعت فرمائی گئی ہے اسے صرف شہداء کے ساتھ مختص کیا جائے اور اس سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ممانعت میت کو دفن کرنے کے بعد بغیر کسی عذر کے منتقل کرنے پر محمول کی جائے یعنی اگر میت دفن کردی جائے تو اب اس کے بعد کسی صحیح عذر کے بغیر کسی دوسری جگہ اسے منتقل کرنا ممنوع ہے۔

علامہ یحییٰؒ اس مسئلہ میں یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی واقعی ضرورت پیش آجائے تو میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے لیکن بغیر ضرورت کے جائز نہیں ہے۔

محقق علامہ ابن ہمامؒ کا قول یہ ہے کہ اگر میت کو دفن کرنے اور قبر کی تیاری سے پہلے ایک دو کوس کے فاصلے پر منتقل کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ قبرستان اتنے فاصلہ پر ہوا کرتے ہیں۔

علماء لکھتے ہیں کہ میت کو اسی شہر کے قبرستان میں دفن کرنا مستحب ہے جہاں اس کا انتقال ہوا ہے چنانچہ منقول ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا انتقال مکہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ہوا تو ان کا جنازہ دفن کرنے کے لئے مکہ مکرمہ لایا گیا۔ جب حضرت عائشہؓ ان کی قبر پر تشریف لائیں تو فرمایا کہ "اگر میں تمہارے انتقال کے وقت موجود ہوتی تو تمہیں یہاں منتقل نہ کرتی بلکہ وہیں دفن کرتی جہاں انتقال ہوا تھا۔"

دفن کے بعد قبر کھودنے کا مسئلہ

میت کو دفن کرنے اور قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد (میت کو نکالنے کے لئے یا کسی اور مقصد کے تحت) قبر کو کھودنا جائز نہیں ہے خواہ دفن کیئے ہوئے بہت تھوڑا وقفہ ہوا ہو یا زیادہ عرصہ ہو گیا ہو ہاں عذر کی بناء پر جائز ہو گا مثلاً یہ اگر دفن کرنے کے بعد یہ ظاہر ہو کہ جس زمین پر قبر بنائی گئی ہے وہ زمین غصب کی ہے یا اس زمین کو کسی شخص نے بحق شفعہ لے کر اپنی ملکیت بنالی تو ان صورتوں میں مالک زمین کے مطالبہ پر قبر کھودنا جائز ہو گا علماء لکھتے ہیں کہ کتنے ہی صحابیؓ کافروں کے شہروں میں دفن کیئے گئے مگر انہیں وہاں سے منتقل نہیں کیا گیا۔

اگر اس زمین کا مالک کہ جس میں قبر بنائی گئی ہے یہ چاہے کہ زمین کو ہموار کرلے اور اس میں کھیتی باڑی کرے تو اسے حق پہنچتا ہے دفن کرنے کے بعد قبر کھودنے کا اعذار میں ایک عذر یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص کا کوئی مال یا کپڑا وغیرہ قبر میں رہ جائے تو اس کے لئے جائز ہے کہ قبر کھود کر وہ مال یا کپڑا نکال دیں۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ علماء اور مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی عورت کا بیٹا شہر کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں دفن کردیا جائے اور وہاں وہ عورت موجود نہ رہی ہو اور پھر اسے اس کی ممتا بے چین کرے اور وہ اس بات پر اصرار کرے کہ اس کے بیٹے کی نعش اس کے شہر میں منتقل کردی جائے تو اس صورت میں قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ نعش کو منتقل کردیا جائے چنانچہ اس بارہ میں بعد کے بعض علماء جس جواز کے قائل ہوئے ہیں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

صاحب ہدایہ نے (ہدایہ کے علاوہ اپنی کسی دوسری کتاب میں) لکھا ہے کہ "اگر کوئی شخص کسی شہر میں مرجائے تو اس کی نعش کو دوسرے شہر منتقل کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس طرح نہ صرف یہ کہ ایک بے فائدہ اور لاحاصل چیز میں وقت صرف ہوتا ہے بلکہ میت کو دفن کرنے میں بھی تاخیر ہوتی ہے، نیز علماء کا بالاتفاق یہ فیصلہ ہے کہ اگر کوئی میت بغیر نماز کے بھی دفن کردی جائے تب بھی اس قبر سے نکالنا جائز نہیں ہے۔

کسی شخص کو اس مکان میں دفن نہ کیا جائے جس میں وہ رہا کرتا تھا کیونکہ یہ صرف انبیاء کرام صلوات اللہ وسلام علیہم کے ساتھ مختص

ہے، دوسرے کے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں ہے۔

میت کو قبر میں کس طرح اتارا جائے؟

⑫ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سُلَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قِبَلِ رَاْسِهٖ۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو (قبر میں اتارتے وقت) سر کی طرف اتارا گیا۔" (شافعیؒ)

تشریح: اس کی صورت یہ تھی کہ جنازہ قبر کے پائنتی رکھا گیا پھر آپ کو سر مبارک کی طرف سے اٹھا کر قبر میں اتارا گیا چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کے ہاں میت کو اسی طریقہ سے قبر میں اتارا جاتا ہے۔

حنفیہ کے نزدیک اس سلسلہ میں مسنون طریقہ یہ ہے کہ جنازہ قبر کے قبلہ والی جانب رکھا جائے اور وہاں سے میت کو اٹھا کر قبر میں رکھا جائے چنانچہ آنحضرت ﷺ میت کو اسی طریقہ سے قبر میں اتارا کرتے تھے جیسا کہ اگلی حدیث سے واضح ہوگا۔

جہاں تک مذکورہ بالا روایت کا تعلق ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اس طریقہ سے قبر میں کیوں اتارا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ حجرۂ شریفہ میں اتنی وسعت نہ تھی کہ آپ کو قبلہ کی طرف سے قبر میں اتارا جاتا کیونکہ) آپ کی قبر حجرہ کی دیوار سے ملی ہوئی ہے حنفیہ کی طرف سے اس کا ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو قبر میں اتارنے کی کیفیت مضطرب منقول ہے یعنی یہاں اس روایت میں تو یہ بتایا جارہا ہے کہ آپ ﷺ کو سر کی طرف سے قبر میں اتارا گیا تھا جب کہ ابوداؤدؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو قبر میں قبلہ کی طرف اتارا گیا تھا سر کی طرف سے نہیں اٹھایا گیا تھا نیز اسی طرح کی روایت ابن ماجہؒ نے بھی نقل کی ہے۔ لہٰذا جب ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہوا تو دونوں حدیثیں ساقط ہوئیں۔

⑬ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ قَبْرًا لَيْلاً فَاُسْرِجَ لَهٗ بِسِرَاجٍ فَاَخَذَ مِنْ قِبَلِ الْقِبْلَةِ وَقَالَ رَحِمَكَ اللّٰهُ اِنْ كُنْتَ لَاَوَّاهًا تَلاَّءً لِّلْقُرْاٰنِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ اِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رات میں نبی کریم ﷺ (کسی میت کو رکھنے کے لئے) قبر میں اترے، آپ کے لئے چراغ جلادیا گیا چنانچہ آپ نے میت کو قبلہ کی طرف سے پکڑا (اور اسے قبر میں اتارا) اور یہ فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے تو (خوف خدا سے) بہت رونے والے اور قرآن کریم بہت زیادہ پڑھنے والے تھے (اور ان دونوں چیزوں کے سبب سے تم رحمت و مغفرت کے مستحق ہوا) یہ حدیث ترمذیؒ نے نقل کی ہے اور شرح السنۃ میں ہے کہ اس روایت کی اسناد ضعیف ہے۔"

تشریح: اس روایت کے بارہ میں امام ترمذیؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے نیز اس بارہ میں حضرت جابرؓ اور حضرت یزید بن ثابت کی روایتیں بھی منقول ہیں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ رات کے وقت مردہ کو دفن کرنا مکروہ نہیں جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے یہ حدیث حنفیہ کے مسلک کی دلیل ہے ان کے ہاں میت کو قبر میں قبلہ کی طرف سے اتارنا سنت ہے۔

میت کو قبر میں اتارتے وقت کیا پڑھا جائے؟

⑭ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اُدْخِلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَعَلٰى سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَى اَبُوْدَاؤدَ الثَّانِيَةَ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب میت کو قبر میں اتارتے تھے تو یہ فرماتے بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ (اس میت کو ہم) اللہ کے نام کے ساتھ اللہ کے حکم کے مطابق اور رسول اللہ ﷺ کی شریعت پر (قبر میں اتارتے ہیں) اور ایک روایت

میں وَعَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ کے بجائے وَعَلٰی سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ہے (یعنی یہاں تو رسول اللہ ﷺ کی شریعت پر" منقول ہے اور ایک دوسری روایت میں اس کے بجائے" رسول اللہ ﷺ کی سُنّت پر" نقل کیا گیا ہے، احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، اور ابوداؤد نے دوسری روایت (جس میں ملة کے بجائے سنة ہے) نقل کی ہے۔"

قبر پر مٹی ڈالنا اور پانی چھڑکنا سُنّت ہے

⑮ وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ مُرْسَلًا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَثٰى عَلَى الْمَيِّتِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ بِيَدَيْهِ جَمِيْعًا وَّاَنَّهٗ رَشَّ عَلٰى قَبْرِ ابْنِهٖ اِبْرَاهِيْمَ وَوَضَعَ عَلَيْهِ حَصْبَآءَ۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَى الشَّافِعِيُّ مِنْ قَوْلِهٖ رَشَّ

"اور حضرت امام جعفرؒ صادق بن محمد اپنے والد (حضرت امام باقرؒ) سے بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی قبر کے اوپر پانی چھڑکا اور علامت کے لئے) قبر پر سنگریزے رکھے۔ شرح السنۃ اور حضرت امام شافعیؒ نے اس حدیث کو "رش" پانی چھڑکا) سے "آخر تک) روایت کیا ہے۔"

تشریح: امام احمدؒ نے اسناد ضعیف کے ساتھ نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ قبر میں مٹی اس طرح ڈالتے تھے کہ جب پہلی مٹھی بھر کر مٹی ڈالتے تو پڑھتے منها خلقنكم اور جب دوسری مٹھی بھر کر ڈالتے تو پڑھتے وفيها نعيدكم اور اسی طرح جب تیسری مٹھی ڈالتے تو یہ پڑھتے ومنها نخرجكم۔

حضرت ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ "جو لوگ جنازہ کے ہمراہ قبر پر جائیں ان کے لئے سُنّت ہے کہ جب لحد یا شق بند کر دی جائے تو وہ مٹھی بھر کر مٹی قبر میں ڈالیں اسی طرح قبر جب بھر جائے اور اوپر سے مٹی برابر کر دی جائے تو قبر کے اوپر پانی چھڑکنا سُنّت ہے۔

ایک حکایت

منقول ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہوا تو اسے کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے کہا کہ جب میری نیکیاں اور برائیاں وزن کی گئیں تو برائیاں نیکیوں سے بڑھ گئیں اچانک ایک تھیلی نیکیوں کے پلڑے میں آکر گری جس کی وجہ سے نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو گیا، میں نے جب تھیلی کھولی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں ایک مٹھی مٹی تھی جو میں نے ایک مسلمان کی قبر میں ڈالی تھی (اس طرح میری یہ نیکی کام آگئی)

قبروں پر لکھنے اور انہیں روندنے کی ممانعت

⑯ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا وَاَنْ تُوْطَاَ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ قبریں گچ کی جائیں، ان پر لکھا جائے اور یہ کہ وہ روندی جائیں۔" (ترمذی)

تشریح: قبروں پر گچ کرنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس میں ایک طرف کی زینت اور تکلیف ہے ہاں بعض حضرات کے نزدیک قبروں پر مٹی لیپنا جائز ہے۔

قبروں پر اللہ و رسول کا نام اور قرآن کی آیتیں لکھنا مکروہ ہے تاکہ پیروں کے نیچے آنے سے یا جانور وغیرہ کے پیشاب کر دینے سے ان کی بے حرمتی نہ ہو۔ بعض حنفی علماء فرماتے ہیں کہ اسی طرح مساجد وغیرہ کی دیوار پر اللہ و رسول کا نام اور قرآن کی آیتیں لکھنا ممنوع ہے نیز یہ بھی مکروہ ہے کہ پتھر وغیرہ پر میت کا نام وغیرہ لکھ کر قبر پر کھڑا کیا جائے۔ البتہ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ پتھر وغیرہ پر میت کا اور خاص

طور پر علماء دین اور صلحاء امت کا نام وغیرہ لکھ کر قبر پر کھڑا کرنا جائز ہے تاکہ زمانہ گزرنے کے باوجود ان کی قبریں پہچانی جائیں۔

آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک پر پانی چھڑکا گیا تھا

⑰ وَعَنْهُ قَالَ رُشَّ قَبْرُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ الَّذِي رَشَّ الْمَآءَ عَلٰى قَبْرِهٖ بِلَالُ بْنُ رَبَاحٍ بِقِرْبَةٍ بَدَأَ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهٖ حَتّٰى انْتَهٰى اِلٰى رِجْلَيْهِ (رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قبر پر پانی چھڑکا گیا تھا اور وہ شخص کہ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک پر پانی چھڑکا تھا، حضرت بلال بن رباح تھے چنانچہ انہوں نے مشک لے کر سر کی طرف سے (قبر پر) پانی چھڑکنا شروع کیا اور پاؤں تک (چھڑکتے ہوئے) لے گئے۔" (بیہقیؒ)

علامت کے لئے قبر پر کوئی پتھر رکھ دینا جائز ہے

⑱ وَعَنِ الْمُطَّلِبِ بْنِ اَبِي وَدَاعَةَ قَالَ لَمَّا مَاتَ عُثْمَانُ بْنُ مَظْعُوْنٍ اُخْرِجَ بِجَنَازَتِهٖ فَدُفِنَ اَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا اَنْ يَّأْتِيَهٗ بِحَجَرٍ فَلَمْ يَسْتَطِعْ حَمْلَهَا فَقَامَ اِلَيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَسَرَ عَنْ ذِرَاعَيْهِ قَالَ الْمُطَّلِبُ قَالَ الَّذِي يُخْبِرُنِي عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنِّي اَنْظُرُ اِلٰى بَيَاضِ ذِرَاعَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ حَسَرَ عَنْهُمَا ثُمَّ حَمَلَهَا فَوَضَعَهَا عِنْدَ رَأْسِهٖ وَقَالَ اُعْلِمُ بِهَا قَبْرَ اَخِيْ وَاَدْفِنُ اِلَيْهِ مَنْ مَّاتَ مِنْ اَهْلِيْ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مطلبؓ بن ابوودا عہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ ابن مظعون کا انتقال ہوا تو ان کا جنازہ (باہر نکالا گیا اور دفن کیا گیا (جب تدفین سے فراغت ہوئی تو) نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ (ایک بڑا) پتھر لائے (تاکہ اسے قبر پر علامت کے لئے رکھ دیا جائے) اس شخص سے پتھر نہ اٹھ سکا تو آنحضرت ﷺ اسے اٹھانے کے لئے خود کھڑے ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھوں کی آستینیں چڑھائیں۔" حدیث کے راوی حضرت مطلبؓ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے مجھ سے رسول کریم ﷺ کی یہ حدیث بیان کی وہ کہتے تھے کہ "گویا اس وقت بھی آنحضرت ﷺ کے مبارک ہاتھوں کی سفیدی میری نظروں میں گھوم رہی ہے جب کہ آپ نے اسے کھولا تھا، بہر حال آنحضرت ﷺ نے وہ پتھر اٹھالیا اور اسے حضرت عثمانؓ کی قبر کے سرہانے رکھ دیا اور فرمایا کہ "میں نے اس کے ذریعہ اپنے بھائی کی قبر پر علامت کر دی ہے اب میرے گھر والوں میں سے جس کا انتقال ہوگا میں اسے اس کے پاس دفن کر دوں گا۔"

تشریح: حضرت مطلب بن ابوودا عہؓ صحابی اور فتح مکہ کے دن مشرف باسلام ہوئے تھے انہوں نے اس روایت کو ایک دوسرے صحابیؓ سے اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ خود اس موقع پر موجود نہ تھے۔

حضرت عثمانؓ بن مظعون آنحضرت ﷺ کے دودھ شریک بھائی تھے انہوں نے بالکل ابتدائی زمانہ ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا چنانچہ ان سے پہلے صرف تیرہ آدمی اسلام لا چکے تھے، غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے، مدینہ میں مہاجرین میں سے سب سے پہلے انہی کا انتقال ہوا تھا ان کی قبر کے قریب سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم دفن کیے گئے تھے۔

ازہار میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ قبر پر بطور علامت و نشانی کوئی پتھر وغیرہ رکھ دینا مستحب ہے تاکہ قبر پہچانی جا سکے نیز اہل خاندان اور اقربا کو ایک جگہ دفن کرنا بھی مستحب ہے۔

آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی قبریں

⑲ وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَقُلْتُ يَا اُمَّاهُ اكْشِفِيْ لِيْ عَنْ قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

وَصَاحِبَيْهِ فَكَشَفَتْ لِيْ عَنْ ثَلَاثَةِ قُبُوْرٍ لَا مُشْرِفَةٍ وَّلَا لَاطِئَةٍ مَبْطُوْحَةٍ بِبَطْحَآءِ الْعَرْصَةِ الْحَمْرَآءِ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت قاسم بن محمدؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "اے میری ماں! مجھے زیارت کرنے کے لئے رسول کریم ﷺ اور آپ کے دونوں رفقا (یعنی حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ) کی قبریں کھول دیجئے چنانچہ انہوں نے تینوں قبریں کھول دیں، میں نے دیکھا کہ وہ تینوں قبریں نہ تو بہت اونچی تھیں اور نہ بالکل زمین سے ملی ہوئی تھیں (بلکہ زمین سے ایک ایک بالشت بلند تھیں) اور ان پر (مدینہ مطہرہ کے گرد (جو) میدان (ہے اس) کی سرخ کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر و حضرت عمرؓ کی قبریں حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں تھیں، جب تک دروازہ کھلا ہوا تھا اس پر پردہ پڑا رہا کرتا تھا جب کوئی شخص قبروں کی زیارت سے مشرف ہونا چاہتا تو پردہ اٹھا کر اندر چلا جاتا تھا۔"

(۲۰) وَعَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جَنَازَةِ رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ فَانْتَهَيْنَآ اِلَى الْقَبْرِ وَلَمَّا يُلْحَدْ بَعْدُ فَجَلَسَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ وَ جَلَسْنَا مَعَهٗ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَآئِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَزَادَ فِيْ اٰخِرِهٖ كَاَنَّ عَلٰى رُؤُسِنَا الطَّيْرَ۔

"اور حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ انصار میں سے ایک شخص کے جنازہ کے ساتھ چلے جب ہم قبرستان پہنچے تو چونکہ ابھی تدفین عمل میں نہیں آئی تھی (یعنی قبر نہیں تیار ہوئی تھی) اس لئے رسول کریم ﷺ قبلہ کی طرف تشریف فرما ہو گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ (یعنی آپ کے گرد) بیٹھ گئے (ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ) اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی نقل کیئے ہیں کہ "گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے تھے یعنی انتہائی خاموش اور چپ چاپ سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے۔"

تشریح: باب ما یقال عند من حضرہ الموت کی تیسری فصل میں بھی یہ حدیث تفصیل کے ساتھ نقل کی جا چکی ہے یہاں اس حدیث کا صرف انتہائی خاموش اور چپ چاپ سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے۔"

میت کی تحقیر ممنوع ہے

(۲۱) وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهٖ حَيًّا (رواہ مالک وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مردہ کی ہڈیوں کو توڑنا (باعتبار گناہ کے) زندہ شخص کی ہڈیوں کے توڑنے کی مانند ہے۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح زندہ شخص کی تحقیر و بے عزتی ممنوع ہے اسی طرح میت کی تحقیر اور بے وقعتی بھی ممنوع ہے، نیز جس طرح زندہ شخص تکلیف پر ایذاء اور آرام پر سکون محسوس کرتا ہے اسی طرح مردہ بھی سکون اور ایذاء محسوس کرتا ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

صاحبزادی کے انتقال پر آنحضرت ﷺ کے آنسو

(۲۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ شَهِدْنَا بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُدْفَنُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ عَلَى الْقَبْرِ فَرَاَيْتُ عَيْنَيْهِ تَدْمَعَانِ فَقَالَ هَلْ فِيْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ لَّمْ يُقَارِفِ اللَّيْلَةَ فَقَالَ اَبُوْطَلْحَةَ اَنَا قَالَ فَانْزِلْ فِيْ قَبْرِهَا فَنَزَلَ فِيْ قَبْرِهَا (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت موجود تھا جب کہ رسول کریم ﷺ کی صاحبزادی (یعنی حضرت عثمان غنیؓ کی زوجہ محترمہ حضرت اُمّ کلثومؓ) سپرد خاک کی جارہی تھیں اور آنحضرت ﷺ قبر کے پاس تشریف فرما تھے، میں نے یہ دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کی آنکھیں آنسو بہارہی تھیں، بہرحال (اس وقت) آنحضرت ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ "کیا تم میں ایسا بھی کوئی شخص موجود ہے جو آج کی رات اپنی عورت سے ہم بستر نہ ہوا ہو؟ حضرت ابوطلحہؓ نے کہا کہ "ہاں! میں ہوں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا" (میت کو قبر میں رکھنے کے لئے) تم ہی قبر میں اترو۔" چنانچہ وہ قبر میں اترے۔" (بخاریؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے اپنی عورتوں سے صحبت نہ کرنے کے بارہ میں اس لئے دریافت فرمایا کہ اگرچہ اپنی عورتوں سے صحبت ممنوع نہیں ہے لیکن نہ کرنے میں اس طرح سے ملائکہ سے مشابہت ہوتی ہے لہٰذا آپ ﷺ نے چاہا کہ جس شخص نے آج صحبت نہ کی ہو اور اس طرح وہ ملائکہ کے مشابہ ہو وہی اُمّ کلثومؓ کو قبر میں اتارے۔"

اب یہاں ایک اشکال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابوطلحہؓ نے ام کلثومؓ کو قبر میں اتارا جو ان کے لئے اجنبی اور غیر محرم تھے؟ اس اشکال کی توجیہ یہ ہے کہ یا تو یہ ان کی خصوصیات میں سے تھا کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں بطور خاص قبر میں اترنے کا حکم فرمایا یا یہ کہ اس طرح آنحضرت ﷺ نے اس بارہ میں بیان جواز کی طرف اشارہ فرمایا۔"

عورت کی میت کو مرد ہی قبر میں اتاریں

محقق علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ عورت کی میت کو قبر میں اتارنے یا نکالنے کا کام صرف مرد ہی انجام دیں اور چونکہ جس طرح عورت کو اس کی زندگی میں کسی اجنبی مرد کا ضرورت کے وقت اس طرح چھونا جائز ہے کہ درمیان میں کپڑا وغیرہ حائل ہو اسی طرح مردو عورت کو بھی بوقت ضرورت اجنبی مرد کا چھونا جائز ہے۔ لہٰذا جب کوئی عورت مرجائے اور اس کا کوئی محرم نہ ہو تو اسے قبر میں اس کے وہ پڑوسی اتاریں جو نیک و صالح ضعیف موجود نہ ہوں تو پھر وہ پڑوسی جوان قبر میں اتاریں جو نیک و صالح ہوں ہاں اگر محرم موجود ہوں خواہ دودھ کے اعتبار سے محرم ہوں خواہ سسرال کی طرف سے تو وہی قبر میں اتر کر دفن کریں۔

اگر مذکورہ بالا حدیث کے بارہ میں یہ اشکال پیدا ہو کہ علماء تو یہ لکھتے ہیں کہ عورت کی میت کو قبر میں اتارنے کے لئے خاوند اور محارم اولیٰ ہیں تو حضرت اُمّ کلثومؓ کو حضرت عثمانؓ نے یا خود آنحضرت ﷺ نے قبر میں کیوں نہیں اتارا؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ احتمال ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ اور حضرت عثمانؓ کو کوئی عذر پیش آگیا ہوگا اس لئے نہ تو آنحضرت ﷺ ہی قبر میں اترے اور نہ حضرت عثمانؓ ہی نے قبر میں اتر کر حضرت ام کلثومؓ کو رکھا۔"

حضرت عمرو بن عاص کی وصیت

(۲۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ لِاِبْنِهٖ وَهُوَ فِيْ سِيَاقِ الْمَوْتِ اِذَا اَنَا مِتُّ فَلَا تَصْحَبْنِيْ نَائِحَةٌ وَّلَا نَارٌ فَاِذَا دَفَنْتُمُوْنِيْ فَشُنُّوْا عَلَيَّ التُّرَابَ شَنًّا ثُمَّ اَقِيْمُوْا حَوْلَ قَبْرِيْ قَدْرَ مَا يُنْحَرُ جَزُوْرٌ وَّيُقْسَمُ لَحْمُهَا حَتّٰى اَسْتَاْنِسَ بِكُمْ وَاَعْلَمَ مَاذَا اُرَاجِعُ بِهٖ رُسُلَ رَبِّيْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو بن عاصؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے اس وقت جب کہ وہ حالت نزع میں تھے اپنے صاحبزادے (حضرت عبداللہ) کو یہ وصیت کی کہ "جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے (جنازہ) کے ہمراہ نہ تو کوئی نوحہ کرنے والی ہو اور نہ آگ ہو اور جب مجھے دفن کرنے لگو تو میرے اوپر مٹی آہستہ آہستہ (یعنی تھوڑی تھوڑی کر کے) ڈالنا پھر (دفن کر دینے کے بعد) میری قبر کے پاس (دعائے استقامت و مغفرت اور ایصال ثواب کے لئے) اتنی دیر تک کھڑے رہنا جتنی دیر میں اونٹ کو ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے یہاں تک کہ میں تمہاری وجہ سے آرام پاجاؤں اور بغیر کسی وحشت و گھبراہٹ کے) جان لوں کہ میں اپنے پروردگار کے فرشتوں کو کیا جواب

دیتا ہوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: زمانہ جاہلیت میں یہ طریقہ تھا کہ فخرو بڑائی اور ریا کے طور پر میت کے ساتھ آگ لے کر چلتے تھے تاکہ اس کے ذریعہ خوشبو وغیرہ جلا سکیں یا کسی اور کام میں لا سکیں شریعت اسلام نے اس سے منع فرمایا اس لئے حضرت عمرو ابن عاصؓ نے یہ وصیت کی کہ میرے جنازہ کے ساتھ نہ تو نوحہ کرنے والی ہو کہ یہ خالص غیر اسلامی طریقہ ہے اور نہ آگ ہو کہ یہ بھی زمانہ جاہلیت کی ایک نشانی ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اگردان میں اگربتی جلا کر بلا ضرورت مشعلیں وپنچ وشاخ وغیرہ روشن کر کے جنازہ کے ساتھ لے کر چلنا یا جنازہ کے ہمراہ لکڑوالوں کا آگ لے کر چلنا ممنوع ہے۔

"یہاں تک کہ میں آرام پا جاؤں" کا مطلب یہ ہے کہ قبر پر تمہاری دعائے استقامت و مغفرت، ذکر و قرات قرآن کریم اور استغفار و ایصال ثواب کی وجہ سے سوال و جواب کے مرحلہ سے میں باآسانی گزر جاؤں اور قبر میں خدا کی رحمتوں سے ہمکنار ہو جاؤں، چنانچہ ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں منقول ہے کہ "آنحضرت ﷺ جب کسی مردہ کی تدفین سے فارغ ہو جاتے تو اس کی قبر پر کھڑے ہو جاتے اور (صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرماتے کہ اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے دعائے استقامت و اثبات مانگو، کیونکہ اس وقت (قبر میں) اس سے سوال و جواب ہو رہا ہے۔

تدفین میں جلدی کرنی چاہئے

(۲۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا مَاتَ اَحَدُكُمْ فَلَا تَحْبِسُوْهُ وَاَسْرِعُوْا بِهٖ اِلٰى قَبْرِهٖ وَلْيُقْرَأْ عِنْدَ رَاْسِهٖ فَاتِحَةُ الْبَقَرَةِ وَعِنْدَ رِجْلَيْهِ بِخَاتِمَةِ الْبَقَرَةِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ مَوْقُوْفٌ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو اسے محبوس نہ رکھو بلکہ اس کی قبر تک اسے جلد پہنچا دو نیز یہ بھی چاہئے کہ (قبر پر کھڑے ہو کر) اس کے سر کے قریب سورہ بقرہ کی ابتدائی آیتیں (یعنی شروع سے مفلحون تک) اور پاؤں کے قریب سورہ البقرہ کی آخری آیتیں یعنی آمن الرسول سے آخرت تک کی آیتیں) پڑھی جائیں۔" (بیہقی نے اس روایت کو شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت حضرت عبداللہؓ پر موقوف ہے)۔"

تشریح: "اسے محبوس نہ رکھو" بغیر کسی عذر کے میت کو دفن کرنے میں تاخیر نہ کرو بلکہ جہاں تک ہو سکے جلد سے جلد میت کو اس دنیا کی آخری آرام گاہ قبر تک پہنچا دو" چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص مرجائے تو اس کی تدفین و تکفین میں جلدی کرنا مستحب ہے۔ فلا تحبسو کے بعد کا جملہ واسرعوا بہ یا تو اس سے پہلے جملہ کی تاکید کے طور پر لایا گیا ہے جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے یا پھر اس جملہ سے اس طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ جب جنازہ لے کر چلیں تو جلدی چلنا سُنّت ہے یعنی جنازہ لے کر درمیانی چال کے ساتھ چلا جائے نہ تو دوڑنا ہی چاہئے اور نہ بالکل ہی آہستہ آہستہ چلنا چاہئے۔

ایصال ثواب کی فضیلت

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ "جب تم قبرستان جاؤ تو وہاں سورہ فاتحہ، معوذتین اور قل ھو اللہ احد پڑھ کر اس کا ثواب اہل قبرستان کو پہنچاؤ جو انہیں پہنچ جاتا ہے۔ ایصال ثواب کے لئے قبروں پر جانے سے اہل قبر (یعنی میت) کے لئے تو یہ مقصود ہے کہ وہ ایصال ثواب اور دعائے مغفرت وغیرہ سے فائدہ حاصل کرے اور قبر پر جانے والے کے لئے اس لئے بہتر ہے کہ وہاں پہنچ کر وہ عبرت حاصل کرے۔

حضرت علیؓ سے بطریق مرفوع روایت ہے کہ "جو شخص قبرستان جائے اور وہاں قل ہو اللہ احد گیارہ مرتبہ پڑھ کر اس کا ثواب اہل قبرستان کو بخشے تو اسے قبرستان میں مدفون مردوں کی تعداد کے بقدر ثواب ملتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جو شخص قبرستان جائے اور سورہ فاتحہ قل ہو اللہ احد اور الھکم التکاثر پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کرے کہ "میں نے تیرے کلام پاک میں سے جو کچھ اس وقت پڑھا ہے اس کا ثواب اس قبرستان میں مدفون مؤمنین اور مؤمنات کو پہنچاتا ہوں۔" تو قبرستان میں مدفون مردے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے شفاعت کرنے والے ہو جاتے ہیں۔

حضرت حماد مکیؒ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ "ایک رات مکہ کے ایک قبرستان جا پہنچا اور وہاں ایک قبر پر سر رکھ کر سو رہا اچانک (خواب میں) کیا دیکھتا ہوں کہ اہل قبرستان (یعنی مردے) مختلف ٹکڑیوں میں حلقہ بنائے بیٹھے ہیں میں نے کہا کہ "کیا قیامت قائم ہو گئی ہے؟ (جو تم سب قبروں سے باہر نکلے بیٹھے ہو) انہوں نے کہا کہ "نہیں" بلکہ ہمارے بھائیوں میں سے ایک شخص نے قل ھو اللہ احد پڑھ کر اس کا ثواب ہمیں بخشا ہے لہٰذا اب ہم لوگ ایک برس سے یہاں بیٹھے ہوئے اسی ثواب کو آپس میں تقسیم کر رہے ہیں۔"

حضرت انس راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص قبرستان جائے اور وہاں (بغرض ایصال ثواب) سورہ یٰسین تلاوت کرے تو اللہ تعالیٰ اہل قبرستان کے عذاب میں کمی کرتا ہے اور اس شخص کو قبرستان میں مدفون مردوں کی تعداد کے بقدر نیکیاں دی جاتی ہیں۔

حضرت امام شافعیؒ کا قول

علامہ سیوطیؒ جو شافعی المذہب ہیں، شرح الصدور میں لکھا ہے کہ یہ "مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ قرآن پڑھ کر اگر اس کا ثواب میت کو بخشا جائے تو آیا وہ ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ جمہور سلف یعنی صحابہؓ و تابعینؒ پہلے زمانہ کے علماء اور تینوں ائمہ تو یہ کہتے ہیں کہ میت کو اس کا ثواب پہنچتا ہے مگر ہمارے امام حضرت شافعیؒ نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے۔

پھر اس کے بعد سیوطیؒ نے امام شافعی کے دلائل کے کئی جواب لکھ کر یہ بات ثابت کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے بدنی اعمال و عبادات کا ثواب جیسے نماز روزہ اور قرآن مجید کی تلاوت وغیرہ کسی میت کو بخش دے تو اس میت کو اس کا ثواب ملتا ہے (اس بارہ میں مزید تحقیق کے لئے شرح الصدور یا مرقات دیکھی جا سکتی ہے۔

حضرت عائشہؓ اپنے بھائی کی قبر پر

(۲۵) وَعَنِ ابْنِ اَبِیْ مُلَیْکَةَ قَالَ لَمَّا تُوُفِّیَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اَبِیْ بَکْرٍ بِالْحُبْشِیِّ وَهُوَ مَوْضِعٌ فَحُمِلَ اِلٰی مَکَّةَ فَدُفِنَ بِهَا فَلَمَّا قَدِمَتْ عَائِشَةُ اَتَتْ قَبْرَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَکْرٍ فَقَالَتْ ؎

وَکُنَّا کَنَدْ مَانَیْ جُذَیْمَةَ حِقْبَةً مِنَ الدَّهْرِ حَتّٰی قِیْلَ لَنْ یَّتَصَدَّعَا

فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا کَاَنِّیْ وَمَالِکًا لِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَیْلَةً مَعًا

ثُمَّ قَالَتْ وَاللّٰهِ لَوْ حَضَرْتُکَ مَا دُفِنْتَ اِلَّا حَیْثُ مُتَّ وَلَوْ شَهِدْتُّکَ مَا زُرْتُکَ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ کا حبشی میں جو ایک مقام ہے انتقال ہوا تو ان کی نعش کو مکہ لایا گیا اور وہاں انہیں دفن کیا گیا، جب حضرت عائشہ صدیقہؓ (حج کے لئے مکہ) تشریف لائیں تو (اپنے بھائی) حضرت عبدالرحمن کی قبر پر بھی گئیں اور وہاں یہ شعر پڑھے ؎

وَکُنْ کَنَدْ مَانَیْ جُذَیْمَةَ حِقْبَةً مِنَ الدَّهْرِ حَتّٰی قِیْلَ لَنْ یَّتَصَدَّعَا

فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا كَاَنِّیْ وَمَالِكًا لِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَيْلَةً مَعًا

یعنی ہم دونوں جذیمہ کے دونوں، ہمنشینوں کی طرح ایک مدت دراز تک زمانہ سے جدا نہیں ہوئے یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا کہ یہ دونوں تو کبھی جدا نہیں ہونگے لیکن جب ہم دونوں یعنی میں اور مالک ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو طویل زمانہ تک ساتھ رہنے کے باوجود گویا ایک رات کے لئے بھی یکجانہ ہوئے اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "خدا کی قسم! اگر تمہارے انتقال کے وقت میں موجود ہوتی تو تم وہیں دفن کیے جاتے جہاں تمہارا انتقال ہوا تھا (کیونکہ میت کو اس جگہ سے کہ جہاں اس کا انتقال ہوا ہو دوسری جگہ منتقل نہ کرنا سُنّت اور افضل ہے) نیز یہ کہ اگر میں انتقال کے وقت تمہارے پاس موجود ہوتی تو اس وقت تمہاری قبر پر نہ آتی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حبشی، مکہ کے قریب ایک موضع کا نام تھا، بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ مکہ سے ایک منزل کا نام ہے۔

حضرت عائشہؓ جب اپنے بھائی کی قبر پر گئیں تو وہاں انہوں نے اپنے بھائی کے فراق میں حسب حال دو شعر پڑھے۔ یہ اشعار تمیم بن نویرہ نے اپنے بھائی مالک بن نویرہ کے مرثیہ میں کہے تھے جسے خالد بن ولیدؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے زمانہ میں قتل کر دیا تھا۔

ان اشعار میں تمیم بن نویرہ نے خود کو اور اپنے بھائی کو جذیمہ کے دو ہم نشینوں کے ساتھ مشابہت دی ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ کسی زمانہ میں عراق کا ایک بادشاہ تھا جس کا نام جذیمہ تھا۔ جزیرہ عرب بھی اس کے تصرف میں تھا، اس بادشاہ کے دو ہم نشین تھے جو دونوں بھائی تھے ان میں سے ایک کا نام مالک تھا اور دوسرے کا نام عقیل تھا۔ یہ دونوں بھائی چالیس سال کی طویل مدت تک جذیمہ بادشاہ کے ہم نشین اور ندیم رہے ان دونوں بھائیوں کو نعمان نے مار ڈالا۔ ان کے قتل کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے جو مقامات حریری میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

بہر حال تمیم اپنے بھائی کے مرثیہ میں کہہ رہا ہے کہ "میں اور تم دونوں ہم نشین اور آپس میں انتہائی گہرا تعلق اور محبت رکھنے والے تھے اور ہم دونوں میں ایک طویل زمانہ تک جدائی کی نوبت نہیں آئی تھی جیسا کہ جذیمہ کے دونوں ہمنشین آپس میں اتنے طویل عرصہ تک انتہائی گہرا اخلاص و محبت اور ہم نشینی رکھتے تھے کہ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔" پھر تمیم کہتا ہے کہ "جب مالک کی موت ہوئی اور اس طرح ہم دونوں میں دائمی جدائی ہوگئی تو اب اس کے باوجود کہ ہم دونوں ایک طویل زمانہ تک ایک ساتھ رہے مگر اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ گویا ہم دونوں ایک رات کے لئے بھی یکجا اور ایک ساتھ نہیں رہے یعنی محبت و یکجائی کا وہ طویل زمانہ چند لمحوں میں سمٹا ہوا یا کہ ایک خواب سا محسوس ہو رہا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے الفاظ "اگر میں انتقال کے وقت تمہارے پاس موجود ہوتی تو اس وقت تمہاری قبر پر نہ آتی" مطلب یہ ہے کہ چونکہ نبی کریم ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو قبروں پر جائیں اس لئے میں یہاں قبر پر ہرگز نہ آتی مگر انتقال کے وقت چونکہ تمہاری زیارت نصیب نہیں ہو سکی تھی اس لئے مجبورًا اب قبر پر آگئی ہوں تاکہ میرا قبر پر آجانا آخری وقت میں تمہاری ملاقات کا قائم مقام بن جائے۔

امام شافعیؒ کا مستدل

(۳۶) وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ سَلَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَعْدًا وَرَشَّ عَلٰى قَبْرِهٖ مَآءً (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت رافعؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت سعدؓ کو جنازہ میں سے سر کی طرف سے نکالا (یعنی انہیں سر کی طرف سے قبر میں اتارا) اور ان کی قبر پر پانی چھڑکا۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مردہ کو قبر میں اتارنے کے بارہ میں حضرت امام شافعیؒ کا مسلک بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ حدیث ان کے اسی مسلک کی دلیل ہے

حنفیہ کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یا تو یہ ضرورت پر یا پھر یہ کہ بیان جواز پر محمول ہے چنانچہ اس کی پوری تفصیل اسی باب کی دوسری فصل میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی تشریح کے ضمن میں دیکھی جاسکتی ہے۔

سرہانے کی طرف سے مٹی ڈالنے کی ابتداء کرنا

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ ثُمَّ اَتَى الْقَبْرَ فَحَثٰى عَلَيْهِ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهٖ ثَلَاثًا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی پھر اس کی قبر پر آئے اور سرہانے کی طرف سے قبر میں تین مٹھی مٹی ڈالی۔" (ابن ماجہؒ)

قبر پر سہارا دے کر لیٹنے یا بیٹھنے کی ممانعت

(۲۸) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ قَالَ رَاٰنِیَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئًا عَلٰى قَبْرٍ فَقَالَ لَا تُؤْذِ صَاحِبَ هٰذَا الْقَبْرِ اَوْ لَا تُؤْذِهٖ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عمرو بن حزمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے ایک قبر کے سہارے (لیٹے یا بیٹھے ہوئے) دیکھا تو فرمایا کہ "تم اس قبر والے کو ایذا نہ دو یا یہ فرمایا کہ اسے ایذا نہ دو۔" (احمدؒ)

تشریح: ایذا سے غالباً مراد یہ ہے کہ قبر پر سہارا دے کر لیٹنے یا بیٹھنے سے صاحب قبر کی روح ناخوش ہوتی ہے کیونکہ اس طرح اس کی حقارت لازم آتی ہے۔

بَابُ الْبُكَآءِ عَلَى الْمَيِّتِ

میت پر رونے کا بیان

کسی عزیز و رشتہ دار اور دوست و متعلق شخص کی دائمی جدائی پر رنج و غم اور حسرت و افسوس کا ہونا ایک فطری بات ہے مرنے والا جتنا زیادہ قریب اور عزیز ہوگا۔ رنج و غم کی گھٹائیں اتنی ہی مہیب ہوں گی یہ ناممکن ہے کہ اپنے عزیز و متعلقین میں سے کسی کا انتقال ہو جائے اور دل روئے نہیں، آنکھیں آنسو بہائیں نہیں اور چہرہ رنج و الم اور حسرت و غم کی تصویر نہ بن جائے پھر اس فطری رنج و غم کا دوسرا رخ اظہار غم بھی ہے، آنسو بہاتی آنکھیں اس کیفیت کا اظہار کرتی ہیں جو دل پر احساس جدائی کی سیاہ چادر تان دیتی ہے اور چہرہ پر رنج و غم کی برستی ہوئی گھٹا ان جذبات کی غمازی کرتی ہے جو رگ رگ میں دائمی فراق کی چنگاریاں بھر دیتے ہیں۔ اسلام نے چونکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال کی راہ دکھائی ہے اور پیغمبر اسلام نے کیا خوشی اور کیا غم ہر مرحلہ پر انسانی وقار اور رکھ رکھاؤ کا معیار برقرار رکھا ہے اس لئے کیسے ممکن تھا کہ انسانی برادری کے اس جذباتی و فطری نازک موڑ پر راہ نمائی نہ کی جاتی، لہٰذا یہاں یہ باب قائم کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس مرحلہ پر آنحضرت ﷺ کی مقدس تعلیم اور آپ کا عمل کیا تھا؟

باب سے متعلق کچھ احکام و مسائل

کسی کے انتقال پر نوحہ اور چلائے بغیر رونا مکروہ نہیں ہے چلا کر اور نوحہ کے ساتھ رونا نیز میت کی زائد اور دور از حقیقت تعریف توصیف بیان کرنا جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں مروج تھا مکروہ ہے البتہ میت کی واقعی اور حقیقی تعریف و توصیف بطور بیان کے ذکر کرنا مکروہ

نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص مرجائے تو اس کے لواحقین سے اس کی تعزیت کرنی مستحب اور بڑی اچھی بات ہے اور تعزیت کا مفہوم یہ ہے کہ لواحقین کو صبر سکون کی تلقین کی جائے اور انہیں تسلی و تشفی دی جائے۔ ایک سے زائد مرتبہ تعزیت نہ کی جائے انتقال کے تیسرے روز بطور خاص میت کے گھر جمع ہونا، کھانا پینا کرنا اور دوسری رسوم ادا کرنا کہ جسے ہمارے یہاں "تیجہ" کہتے ہیں قطعی طور پر بدعت اور حرام ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ شریعت میں ان باتوں کی حقیقت نہیں ہے بلکہ میت کی وصیت کے بغیر اس کا مال خرچ کرنا یتیموں اور ورثاء کے مال میں تصرف کرنا جو بالکل ناجائز ہے۔

قاموس کے مصنف مجد الدینؒ نے سفر السعادۃ میں لکھا ہے کہ "پہلے میت کے لئے صرف یہ طریقہ تھا کہ لوگ نماز جنازہ کے لئے جمع ہوتے تھے لہٰذا اب یہ طریقہ دن اور رات متعین کر کے اور غیر ضروری تکلفات کر کے قرآن خوانی اور ختم وغیرہ کے لئے قبر پر یا کسی دوسری جگہ لوگوں کو جمع کرنا بدعت ہے۔

تعزیت قبول کرنے کے لئے گھر میں یا مسجد میں بیٹھے رہنا جائز ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب حضرت جعفر، حضرت زید اور حضرت ابن رواحہؓ کے بارہ میں آنحضرت ﷺ کو یہ اطلاع ملی یہ تینوں حضرات غزوہ موتہ میں یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے ہیں تو آپ انتہائی رنج و غم کے ساتھ مسجد نبوی میں بیٹھ گئے وہیں تعزیت کرنے والے آتے اور آپ سے تعزیت کر کے چلے جاتے ہاں متعین دنوں اور متعین تاریخوں میں تعزیت کا وہ طور طریقہ جو بعد میں رائج ہو گیا اس وقت نہیں تھا۔

بعد کے بہت سے علماء لکھتے ہیں کہ (دفن کے بعد) میت کے گھر تعزیت کے لئے بطور خاص جمع ہونا مکروہ ہے اور یہ بات تو سخت مکروہ ہے کہ میت کے اہل و عیال صرف اسی مقصد کے لئے گھر کے دروازے پر بیٹھ جائیں اور لوگ وہاں جمع ہو کر تعزیت کریں کیونکہ یہ زمانہ جاہلیت کا طریقہ ہے۔ اس بارہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب لوگ میت کو دفن کر چکیں تو منتشر ہو جائیں اور اپنے اپنے کام کاج میں لگ جائیں۔ اسی طرح میت کے اہل و عیال کو چاہئے کہ وہ بھی اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو جائیں۔ اسی طرح قبر کے چاروں طرف حلقہ باندھ کر قرآن خوانی مکروہ ہے۔

تعزیت کرنے کا وقت مرنے کے بعد صرف تین دن تک ہے تین دن کے بعد تعزیت کرنا مکروہ ہے ہاں اگر تعزیت کرنے والا یا غمزدہ موجود نہ ہو تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جب بھی ملاقات ہو اسی وقت تعزیت ادا کی جائے۔

میت کو دفن کرنے کے بعد تعزیت کرنا دفن سے پہلے تعزیت کرنے سے اولیٰ ہے مگر یہ سلسلہ اس صورت میں ہے جب کہ میت کے اہل و عیال میں بہت زیادہ جزع و فزع اور اظہار رنج و غم زیادہ شدید نہ ہو۔ اگر اہل و عیال زیادہ جزع و فزع میں مبتلا ہوں تو پھر دفن سے پہلے ہی تعزیت اولیٰ ہوگی۔

عمومی طور پر میت کے تمام اقارب خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، مرد ہوں یا عورت سب ہی سے تعزیت کرنا مستحب ہے ہاں اگر عورت جوان ہو تو اس سے تعزیت نہ کی جائے، البتہ اس عورت کے محرم اس سے بھی تعزیت کر سکتے ہیں۔

تعزیت کے وقت کیا الفاظ کہے جائیں

مستحب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اہل میت سے تعزیت کرے تو اس سے صبر و تسلی کے اس قسم کے الفاظ کہے "اللہ تعالیٰ مرنے والے کو اپنی مغفرت و بخشش سے نوازے، اس کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اس پر اپنی رحمت کا سایہ کرے، سانحہ ارتحال کے اس سخت حادثہ پر تم سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے اور تم سب کو اس رنج و مصیبت کے بدلہ میں ثواب عطا فرمائے۔"

تعزیت کے لئے بہترین الفاظ وہی ہیں جو آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے تھے کہ:

اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔

"وہ چیز بھی اللہ ہی کی ملکیت ہے جو اس نے لے لی ہے اور وہ چیز بھی اسی کی ملکیت میں ہے جو اس نے دے رکھی ہے اور اس کے نزدیک ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔"

اگر کوئی غیر مسلم مرجائے اور اس کا قرابتی مسلمان ہو تو اس سے تعزیت اس طرح کی جائے کہ "اللہ تعالیٰ تمہیں بہت زیادہ ثواب عطا فرمائے اور تمہیں بہترین صبر و سکون کی دولت سے نوازے۔" اور اگر میت مسلمان ہو اور قرابتی غیر مسلمان تو اس سے اس طرح کہا جائے "اللہ تعالیٰ مرنے والے کو بخشش و مغفرت سے نوازے اور تمہیں صبر و سکون عطا فرمائے۔" اور اگر میت اور قرابتی دونوں ہی غیر مسلم ہوں تو تعزیت ان الفاظ کے ذریعہ کی جائے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائے اور تمہارے اہل و عیال میں کمی نہ فرمائے۔

احساس رنج و غم پر تین دن تک اپنے کاروبار چھوڑ کر گھر میں بیٹھے رہنا اگرچہ جائز ہے لیکن اس کا ترک اولی ہے۔ اظہار رنج و غم کے لئے مردوں کو سیاہ کپڑا پہننا، رنج و مصیبت کے وقت کپڑے پھاڑ ڈالنا، چاک گریباں ہو جانا یہ سب چیزیں ممنوع ہیں ہاں اگر عورتیں سیاہ کپڑے پہنیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

کسی کے انتقال پر حد سے زیادہ جزع و فزع کرنا اور خواہ مخواہ کے ہنگامے کرنا مثلاً منہ اور ہاتھوں کو کالا کرنا، چاک گریبان ہو جانا، منہ نوچنا، بالوں کو بکھیر ڈالنا، سر پر مٹی ڈالنا، رانوں کو پیٹنا، سینہ کوبی کرنا، اور قبروں پر آگ روشن کرنا یہ سب باتیں زمانہ جاہلیت کی رسوم اور انتہائی غلط و باطل ہیں ان سے بچنا بہت ضروری ہے۔

جس گھر میں میت ہو جائے وہاں کھانا پکا کر بھیجنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اسے اس طرح ضروری اور لازم جان لینا کہ خواہ اس کے لئے ادھار قرض ہی کیوں نہ کرنا پڑے انتہائی غلط بات ہے، اسی طرح تیسرے روز یعنی تیجہ میں لوگوں کو بطور خاص مدعو کرنا اور برادری والوں کو کھانا کھلانا بھی بڑی بری بات اور بے فائدہ چیز ہے۔

یہ بات بطور خاص یاد رکھئے کہ جو لوگ "تیجہ" کے نام پر جو کچھ خرافات اور واہیات حرکتیں کرتے ہیں وہ انتہائی گمراہی میں مبتلا ہیں مثلاً موت کے تیسرے دن اس طرح انتظامات کیئے جاتے ہیں کہ شادی بیاہ میں بھی کیا انتظامات ہوتے ہوں گے لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے برادری والے جمع ہوتے ہیں، فرش بچھتے ہیں، خیمے کھڑے کیئے جاتے ہیں، خوشبوئیں بانٹی جاتی ہیں یہ سب باتیں بدعت اور انتہائی گمراہ کن ہیں ان واہیات اور خرافات سے اجتناب ضروری ہے۔

نصاب میں لکھا ہے کہ جن جگہوں پر یہ رسم جاری ہے کہ مرد موت کے تیسرے دن خوشبو لگاتے ہیں وہ عورتوں کے ساتھ مشابہت میں مبتلا ہیں کیونکہ عورتیں تیسرے روز سوگ ختم کرنے کے لئے خوشبو لگاتی ہیں لہٰذا اس سے بھی پرہیز کرنا چاہئے لیکن یہ ممانعت خوشبو لگانے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس طرح اس وقت عورتوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے اور شریعت نے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔

آداب تعزیت یہ ہیں کہ "جب کوئی شخص میت کے گھر تعزیت کے لئے جائے تو وہاں اہل خانہ کو سلام کرے، مصافحہ کرے ان کے ساتھ انتہائی تواضع اور نرمی کے ساتھ بات چیت کرے، بے فائدہ اور زیادہ گفتگو نہ کرے بلکہ صرف تسلی اور اطمینان اور صبر و سکون کے الفاظ کہے اور ہنسنے اور مسکرانے سے پرہیز کرے۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

صاحبزادے کی وفات پر آنحضرت ﷺ کا غم

(۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ دَخَلْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اَبِیْ سَیْفِ الْقَیْنِ وَکَانَ ظِئْرًا لِاِبْرَاھِیْمَ فَاَخَذَ

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِبْرَاھِیْمَ فَقَبَّلَہٗ وَشَمَّہٗ ثُمَّ دَخَلْنَا عَلَیْہِ بَعْدَ ذٰلِكَ وَاِبْرَاھِیْمُ یَجُوْدُ بِنَفْسِہٖ فَجَعَلَتْ عَیْنَا رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَذْرِفَانِ فَقَالَ لَہٗ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَّاَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَقَالَ یَا ابْنَ عَوْفٍ اِنَّھَا رَحْمَۃٌ ثُمَّ اَتْبَعَھَا بِاُخْرٰی فَقَالَ اِنَّ الْعَیْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ یَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضٰی رَبُّنَا وَاِنَّا بِفِرَاقِكَ یَا اِبْرَاھِیْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ (متفق علیہ)

"حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ ابو سیف لوہار کے گھر گئے جو (آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے) حضرت ابراہیم کی دایہ کے شوہر تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابراہیم کو (گود میں) لے کر بوسہ لیا اور سونگھا (یعنی اپنا منہ اور ناک ان کے منہ پر اس طرح رکھی جیسے کوئی خوشبو سونگھتا ہے) اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد ہم پھر ابو سیف کے یہاں گئے جب کہ حضرت ابراہیم حالت نزع میں تھے چنانچہ (ان کی حالت دیکھ کر) آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، حضرت عبدالرحمن بن عوف نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! آپ رو رہے ہیں!؟ آپ نے فرمایا "اے ابن عوف! (آنسو کا بہنا) رحمت ہے۔" اس کے بعد پھر آپ ﷺ کی مبارک آنکھیں آنسو بہانے لگیں آپ نے فرمایا "آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں اور دل غمگین ہے مگر اس کے باوجود ہماری زبانوں پر وہی الفاظ ہیں جن سے ہمارا پروردگار راضی رہے، اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے بے شک غمگین ہیں۔"

تشریح: ابو سیف کا نام براء تھا اور ان کی بیوی کا نام خولہ منذر تھا جو انصاریہ اور آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی دایہ تھیں ان کا گھرانہ پیشہ کے لحاظ سے لوہار تھا۔ حضرت ابراہیم صرف سولہ سترہ مہینے کے تھے کہ انتقال کر گئے چنانچہ اس حدیث میں ان کی حالت بیماری و نزع کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کی دایہ کے گھر گئے اور انہیں گود میں لے کر پیار کیا اور جب ان کا آخری وقت دیکھا تو رونے لگے اسی وجہ سے حضرت عبدالرحمن ؓ نے عرض کیا کہ اس قسم کے رقت انگیز مواقع پر لوگ تو روتے ہی ہیں مگر آپ کی عظمت شان اور کمال معرفت سے یہ بعید ہے کہ آپ روئیں۔ اس کا جواب آنحضرت ﷺ نے یہ دیا کہ "یہ رحمت ہے" یعنی میری آنکھیں بے صبری کی وجہ سے آنسو نہیں بہا رہی ہیں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بچہ کو اس حالت میں دیکھ کر جذبہ رحم امنڈ رہا ہے جو آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔"

"دل غمگین ہے" میں اس طرح اشارہ ہے کہ جو شخص ایسے موقع پر بھی غمگین نہ ہو اور اس کا دل غم کی کسک محسوس نہ کرے اس کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل نہیں ہے بلکہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جب کہ نظروں کے سامنے لخت جگر دم توڑ رہا ہو ایسے نازک موقع پر بھی آنکھیں آنسو نہ بہائیں تو یہ صبر و ضبط نہیں ہے بلکہ اس احساس محبت و مروت اور جذبہ ترحم کا فقدان ہے لہٰذا یہ حال یعنی غمگین ہونا اہل کمال کے نزدیک کامل تر ہے بہ نسبت اس چیز کے کہ بچہ کی موت ہو جائے اور چہرہ پر بشاشت و اطمینان کی لہریں دوڑ رہی ہوں۔

نواسے کا انتقال پر آنحضرت ﷺ کے آنسو

(۲) وَعَنْ اُسَامَۃَ بْنِ زَیْدٍ قَالَ اَرْسَلَتِ ابْنَۃُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَیْہِ اَنَّ ابْنًا لِیْ قُبِضَ فَاْتِنَا فَاَرْسَلَ یَقْرَأُ السَّلَامَ وَیَقُوْلُ اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلٌّ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ فَاَرْسَلَتْ اِلَیْہِ تُقْسِمُ عَلَیْہِ لَیَاْتِیَنَّھَا فَقَامَ وَمَعَہٗ سَعْدُ بْنُ عُبَادَۃَ وَمُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَاُبَیُّ بْنُ کَعْبٍ وَّزَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَّرِجَالٌ فَرُفِعَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الصَّبِیُّ وَنَفْسُہٗ تَتَقَعْقَعُ فَفَاضَتْ عَیْنَاہُ فَقَالَ سَعْدٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا ھٰذَا فَقَالَ ھٰذِہٖ رَحْمَۃٌ جَعَلَھَا اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِ عِبَادِہٖ فَاِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مِنْ عِبَادِہِ الرُّحَمَآءَ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ بن زید ؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی (حضرت زینب ؓ) نے آپ ﷺ کے پاس کسی کے ذریعہ سے یہ پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا دم توڑ رہا ہے اس لئے (فوراً) آپ ﷺ میرے پاس تشریف لے آئیے۔ آنحضرت ﷺ نے (اس کے جواب میں) سلام کے

بعد کہ کہلا بھیجا کہ جو چیز (یعنی اولاد وغیرہ) خدا نے لے لی وہ بھی اسی کی تھی اور جو چیز اس نے دے رکھی ہے وہ بھی اسی کی ہے (لہٰذا ان کے اٹھ جانے پر جزع وفزع نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس کی امانت تھی جسے اس نے واپس لے لیا) اور اس (خدا) کے نزدیک ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے (یعنی تمہارے بیٹے کی زندگی اتنے ہی دنوں کے لئے لکھی گئی تھی جتنے دن کہ وہ زندہ رہا۔ پس تمہیں صبر کرنا اور خدا سے ثواب کا طلب گار رہنا چاہئے۔" حضرت زینبؓ نے دوبارہ آدمی بھیجا اور (اس مرتبہ) انہوں نے آنحضرت ﷺ کو قسم دی کہ ضرور ہی تشریف لائیے۔" چنانچہ آپ ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے حضرت سعد بن عبادہؓ حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور صحابہؓ میں سے دوسرے لوگ آپؐ کے ساتھ ہو لئے (جب آپ صاحبزادی کے ہاں پہنچے تو) بچہ آپ کی گود میں دے دیا گیا جو جان کنی کی حالت میں تھا (اسے دیکھ کر) آنحضرت ﷺ کی مبارک آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ حضرت سعدؓ نے کہا کہ "یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا ہے۔؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یہ رحمت ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرمایا ہے (اچھی طرح سن لو کہ) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف انہیں لوگوں پر رحمت (یعنی مہربانی) کرتا ہے جو جذبہ ترحم رکھنے والے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت سعدؓ نے چونکہ یہ گمان کیا کہ رونے کی تمام اقسام حرام و مکروہ ہیں اور آنحضرت ﷺ اس وقت سہوا رو رہے ہیں اس لئے آنحضرت ﷺ نے انہیں آگاہ کیا کہ اس طرح رونا کہ صرف آنکھیں آنسو بہا رہی ہوں حرام و مکروہ نہیں ہے بلکہ اس طرح رونا تو اس جذبہ ترحم کی علامت ہے جو دل میں امنڈ رہا ہوتا ہے ہاں نوحہ کے ساتھ رونا، چاک گریبان ہونا اور سینہ پیٹنا البتہ حرام و ممنوع ہے۔

با آواز بلند رونا برا ہے

(۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ اشْتَكٰى سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ شَكْوًى لَّهُ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُهُ مَعَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ عَوْفٍ وَّسَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ وَّعَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ فَلَمَّا دَخَلَ عَلَيْهِ وَجَدَهُ فِيْ غَاشِيَةٍ فَقَالَ قَدْ قُضِيَ قَالُوْا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَبَكَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا رَأَى الْقَوْمُ بُكَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكَوْا فَقَالَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ بِدَمْعِ الْعَيْنِ وَلَا بِحُزْنِ الْقَلْبِ وَلٰكِنْ يُّعَذِّبُ بِهٰذَا وَاَشَارَ اِلٰى لِسَانِهٖ اَوْ يَرْحَمُ وَاِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی آپ کے ساتھ تھے، جب آپ ﷺ ان کے پاس پہنچے تو انہیں بیہوشی کی حالت میں پایا آپ ﷺ نے پوچھا کہ "کیا ان کا انتقال ہو گیا ہے؟" صحابہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ (ﷺ)! نہیں۔" آپ ﷺ (سعدؓ کی حالت دیکھ کر) رونے لگے جب صحابہؓ نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی رونے لگے، پھر آپ نے فرمایا "اچھی طرح سن لو! کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو بہانے اور دل کے غمگین ہونے پر عذاب نہیں کرتا آپ نے اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا البتہ خدا اس کی وجہ سے عذاب بھی کرتا ہے اور رحم بھی (یعنی اگر کسی حادثہ و مصیبت کے وقت زبان سے ناشکری کے یا بارگاہ الوہیت میں بے ادبی کے الفاظ نکلیں یا نوحہ کر کے رویا جائے تو یہ مستحق عذاب ہے اور اگر ایسے موقع پر زبان حمد و شکر میں مشغول رہے اور انا للہ پڑھا جائے تو مستحق رحمت و ثواب ہے) نیز مردہ کو اپنے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر مردہ کے اہل و عیال اور اس کے گھر والے با آواز بلند یعنی پکار پکار کر روتے ہیں یا نوحہ کرتے ہیں تو اس مردہ کو عذاب ہوتا ہے، اس مسئلہ کی تحقیق تیسری فصل میں آئے گی انشاء اللہ۔

(۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جو شخص ہمارے راستے پر چلنے والوں میں سے نہیں ہے جو رخساروں کو پیٹے، گریبان چاک کرے اور ایام جاہلیت کی طرح آواز بلند کرے (یعنی رونے کے وقت زبان سے ایسے الفاظ اور ایسی آواز نکالے جو شرعاً ممنوع ہے جیسے نوحہ یا واویلا کرنا وغیرہ وغیرہ۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہاں رخساروں کو پیٹنے اور گریبان چاک کرنے والے کے لئے جو وعید فرمائی جارہی ہے یہی وعید اس شخص کے لئے بھی ہے جو سر سے پگڑی و ٹوپی اتار پھینکے یا سر اور داڑھی کے بال نوچنے لگے کیونکہ ان سب چیزوں کا ایک ہی حکم ہے۔

⑤ وَعَنْ اَبِيْ بُرْدَةَ قَالَ اُغْمِيَ عَلٰي اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ اُمُّ عَبْدِاللّٰهِ تَصِيْحُ بِرَنَّةٍ ثُمَّ اَفَاقَ فَقَالَ اَلَمْ تَعْلَمِيْ وَكَانَ يُحَدِّثُهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنَا بَرِئٌ مِّمَّنْ حَلَقَ وَصَلَقَ وَخَرَقَ (متفق علیہ ولفظہ لمسلم)

"اور حضرت ابی بردہؒ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ بیہوش ہوگئے تو ان کی عورت اُمّ عبد اللہ چلا چلا کر رونے لگی، جب حضرت ابوموسیٰ کو ہوش آیا تو انہوں نے کہا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم؟ کہ چلا چلا کر رونا کتنا برا ہے، چنانچہ راوی کہتے کہ) پھر ابوموسیٰؓ ان سے یہ حدیث بیان کرنے لگے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "میں اس شخص سے بیزار ہوں جو مصیبت وحادثہ کے وقت) سر کے بال منڈائے چلا چلا کر روئے اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ) حدیث کے الفاظ مسلمؒ کے ہیں۔

تشریح: زمانہ جاہلیت میں اس قسم کے افعال عورتوں سے سرزد ہوتے تھے لہٰذا مسلمانوں کو ان باتوں سے اچھی طرح پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ رسول کریم ﷺ ایسے شخص سے بیزار ہوتے ہیں جو ان غلط اور باطل چیزوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

نوحہ کی برائی

⑥ وَعَنْ اَبِيْ مَالِكِ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ فِيْ اُمَّتِيْ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يَتْرُكُوْنَهُنَّ الْفَخْرُ فِي الْاَحْسَابِ وَالطَّعْنُ فِي الْاَنْسَابِ وَالْاِسْتِسْقَاءُ بِالنُّجُوْمِ وَالنِّيَاحَةُ وَقَالَ النَّائِحَةُ اِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّدِرْعٌ مِّنْ جَرَبٍ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابومالک اشعریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" زمانہ جاہلیت کی چار باتیں ایسی ہیں جنہیں میری اُمت کے (کچھ) لوگ نہیں چھوڑیں گے ① حسب پر فخر کرنا ② نسب پر طعن کرنا ③ ستاروں کے ذریعہ پانی مانگنا ④ نوحہ کرنا" نیز آپ ﷺ نے فرمایا "نوحہ کرنے والی عورت نے اگر مرنے سے پہلے توبہ نہیں کی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس کے جسم پر قطران اور خارش کا کرتا ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "حسب" ان خصلتوں کو کہتے ہیں جو اگر کسی مسلمان کے اندر موجود ہوں تو وہ ان کی موجودگی کی وجہ سے اپنے کو بہتر و اچھا سمجھتا ہے جیسے شجاعت بہادری اور فصاحت وغیرہ۔ "نسب پر طعن کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے نسب میں اس طرح عیب جوئی کی جائے کہ فلاں شخص کا باپ برا تھا اور فلاں شخص کا دادا کمتر تھا" چونکہ حسب پر فخر کرنے اور نسب پر طعن کرنے کی وجہ سے اپنی تعظیم و بڑائی اور دوسرے لوگوں کی حقارت لازم آتی ہے اس لئے یہ دونوں چیزیں ہی مذموم ہیں ہاں اسلام و کفر کے امتیاز کی بناء پر ان دونوں میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یعنی اگر کوئی مسلمان اپنے ایمان و اسلام کی وجہ سے اپنے آپ کو بزرگ اور بڑا جانے اور کسی کافر کو اس کے کفر کی وجہ سے حقیر و کمتر سمجھے تو یہ جائز ہے۔ "ستاروں کے ذریعہ پانی مانگنے" سے مراد یہ ہے کہ ستاروں کی تاثیر پر بارش کی امید رکھنا یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ اگر فلاں ستارہ منزل میں داخل ہوجائے تو بارش ہوگی۔

اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ اعتقاد رکھنا کہ فلاں ستارے کے فلاں منزل میں داخل ہونے کی وجہ سے بارش ہوگی، حرام ہے بلکہ جب بارش ہو تو یہ کہنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ہمیں بارش سے سیراب کیا ہے۔

"نوحہ کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے تو اس پر واویلا کیا جائے اور میت کی اچھی خصلتیں رو رو کر اس طرح بیان کی جائے کہ ہائے وہ کتنا بہادر تھا، ہائے وہ ایسا تھا ہائے وہ ایسا تھا"

"قطران" کولتار کی مانند ایک دوا کا نام ہے جو سیاہ اور بدبودار ہوتی ہے اور "ابہل" درخت سے کہ جسے ہوبر بھی کہا جاتا ہے نکلتی ہے اسے اس اونٹ کے جسم پر ملتے ہیں جسے خارش ہو جاتی ہے چونکہ اس کے اندر حرارت اور گرمی زیادہ ہوتی ہے اس لئے اونٹ کی خارش کو جلا دیتی ہے اس کا ایک خاص اثر یہ بھی ہے کہ آگ کا اثر بہت جلد قبول کرتی ہے اور جلدی ہی بھڑک اٹھتی ہے۔ ارشاد گرامی کے اس آخری جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ نوحہ کرنے والی عورت اپنے برے فعل سے توبہ کیئے بغیر مرگئی تو قیامت کے روز اس کے جسم پر خارش مسلط کی جائے گی پھر اس پر قطران مل جائے گی تاکہ اس کی خارش میں اور زیادہ سوزش و جلن پیدا ہو اور وہ زیادہ ایذاء پائے۔

⑦ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِامْرَأَةٍ تَبْكِي عِنْدَ قَبْرٍ فَقَالَ اتَّقِي اللّٰهَ وَاصْبِرِيْ قَالَتْ اِلَيْكَ عَنِّي فَاِنَّكَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِيْبَتِيْ وَلَمْ تَعْرِفْهُ فَقِيْلَ لَهَا اِنَّهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَتْ بَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدَهُ بَوَّابِيْنَ فَقَالَتْ لَمْ اَعْرِفْكَ فَقَالَ اِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو ایک قبر کے قریب چلا چلا کر رو رہی تھی آپ ﷺ نے فرمایا "خدا کے عذاب سے ڈرو! (یعنی نوحہ نہ کرو ورنہ عذاب میں مبتلا کی جاؤ گی) اور صبر کرو!" اس عورت نے آنحضرت ﷺ کو پہچانا نہیں (آپ کا ارشاد سن کر) کہنے لگی کہ "میرے پاس سے دور ہٹو، (تم میرا غم کیا جانو) کیونکہ تم میری مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئے ہو۔" (جب آنحضرت ﷺ وہاں سے چلے آئے تو) اسے بتایا گیا کہ یہ نبی کریم ﷺ تھے (پھر کیا تھا) وہ (بھاگی ہوئی) آنحضرت ﷺ کے در دولت پر حاضر ہوئی اسے دروازہ پر کوئی دربان و پہرہ دار نہیں ملا (جیسا کہ بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر دربان و پہرہ دار ہوتے ہیں (پھر اس نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ "میری گستاخی معاف فرمائیے) میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔" آپ نے اس سے فرمایا کہ "صبر تو وہی کہلائے گا جو ابتداء مصیبت میں ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کتنا سچ اور مبنی بر حقیقت ہے کہ "جو بات کہی جا رہی ہے اسے دیکھو نہ دیکھو کہ بات کہنے والا کون ہے۔؟" اس قول پر عمل نہ صرف یہ کہ سچائی اور نیکی کی راہیں روشن کرتا چلا جاتا ہے بلکہ بسا اوقات خجالت و شرمندی سے بچاتا بھی ہے۔ اسی واقعہ پر نظر ڈالئے ایک عورت ایک غلط کام کر رہی ہے۔ آنحضرت ﷺ اسے نیکی و بھلائی کے راستہ پر لگانے کے لئے کچھ ارشاد فرما رہے ہیں وہ عورت اتفاق سے آپ کو پہچانتی نہیں نہ صرف یہ کہ وہ آپ ﷺ کے ارشاد سے اعراض کرتی ہے بلکہ ایک غلط جواب بھی دیتی ہے جب بعد میں اسے معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سے وہ قیمتی بات کہنے والا کوئی ایرا غیرا نہیں تھا بلکہ خود رسالتماب ﷺ کی ذات گرامی تھی تو اب اسے احساس ہوتا ہے کہ واقعی میں غلطی میں مبتلا تھی۔ پشیمان ہو کر بھاگی ہوئی در رسالت پر حاضر ہوتی ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہے۔"

اب دیکھئے اگر وہ اس عارفانہ قول کے مطابق آنحضرت ﷺ کو پہچانے بغیر آپ کے ارشاد گرامی کے سامنے سر اطاعت خم کر دیتی تو نہ صرف یہ کہ نیکی و بھلائی کے راستہ کو اسی وقت پا لیتی بلکہ بعد کی خجالت و شرمندگی سے بھی بچ جاتی۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ کامل اور پسندیدہ صبر کہ جس پر ثواب ملتا ہے وہی ہوتا ہے۔ جو ایذاء و مصیبت میں کیا جائے ورنہ آخر میں تو خود بخود صبر آجاتا ہے بعد میں کسی نے صبر کیا تو کیا صبر کیا۔؟

نوحہ کرنا حرام ہے

مذکورہ بالا حدیثوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نوحہ کرنا اور میت کی عمدہ خصلتوں کو رو رو کر بیان کرنا نیز چلا کر رونا، رخساروں کو پیٹنا، گریبان پھاڑنا، بالوں کو بکھیرنا، مونڈنا، اور نوچنا، منہ کالا کرنا، سر پر مٹی ڈالنا اور ایسی تمام چیزیں جو بے صبری پر دلالت کریں حرام ہیں۔

جس مسلمان کے تین بچے مرجائیں وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَمُوْتُ لِمُسْلِمٍ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ فَيَلِجُ النَّارَ اِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس مسلمان کے تین بچے اللہ کو پیارے ہوجائیں وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا ہاں قسم پوری کرنے کے لئے کیا جائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ "ہاں قسم پوری کرنے کے لئے جائے گا" سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا الآیۃ کی طرف اشارہ ہے گویا اصل میں یہ آیت یوں ہے۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ وَاللّٰهِ اِلَّا وَارِدُهَا الآیۃ یعنی خدا کی قسم! تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دوزخ میں داخل نہ ہو اگرچہ وہ بجلی یا ہوا کی طرح ایک ہی لمحہ کے لئے کیوں نہ داخل ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوزخ کے اوپر پل صراط قائم کیا جائے گا ظاہر ہے کہ اس کے اوپر سے ہر شخص گزرے گا خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر اور خواہ نیک ہو یا بد فرق صرف اتنا ہوگا کہ جو بدکار ہوں گے وہ اس کے ذریعہ ایذاء پائیں گے بایں طور کہ وہ پل صراط کے اوپر سے دوزخ میں گر پڑیں گے اور نیکوکار کوئی ایذاء نہیں پائیں گے بایں طور کے وہ اس کے اوپر سے گزر کر جنّت میں داخل ہوجائیں گے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس مسلمان کے تین بچے مرجائیں گے وہ دوزخ میں داخل کیا جائے گا ہاں صرف اتنے لمحہ کے لئے تو اس کا دوزخ تک جانا ممکن ہے کہ خدا کی قسم پوری ہو جائے اور وہ مختصر لمحہ بھی صرف پل صراط کے اوپر سے گزرنے کا وقفہ ہے یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دوزخ کے اندر داخل کیا جائے گا اور عذاب پائے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ کسی قسم کا عذاب نہیں پائے گا اور صرف پل صراط کے اوپر سے گزر جانا ہے اس آیت میں مذکور "دخول دوزخ" کا مصداق اور باری تعالیٰ کی قسم کے سچ اور پوری ہونے کے لئے کافی ہوگا۔

اہل عرف اپنی روزمرہ کی بول چال میں کہا کرتے ہیں کہ "میں نے یہ کام اپنی قسم پوری کرنے کے لئے کیا" یعنی اس کام کو صرف اس قدر کیا کہ اس کی وجہ سے قسم پوری ہوجائے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے اس کام کا ادنیٰ ترین حصہ جو ایک قلیل ترین لمحہ میں گزر جائے کافی ہے۔

⑨ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنِسْوَةٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ لَا يَمُوْتُ لِاِحْدَاكُنَّ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ فَتَحْتَسِبُهٗ اِلَّا دَخَلَتِ الْجَنَّةَ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ مِّنْهُنَّ اَوِاثْنَانِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَوِاثْنَانِ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَايَةٍ لَّهُمَا ثَلَاثَةٌ لَّمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کتنی ہی انصاری عورتوں سے فرمایا کہ "تم میں سے جس عورت کے بھی تین بچے مر جائیں اور وہ عورت ثواب کی طلبگار ہو تو وہ جنت میں داخل کی جائے گی۔" (یہ سن کر) ان میں سے کسی عورت نے عرض کیا کہ "یا دو بچے مر جائیں۔" (یعنی اس بشارت کو تین کے ساتھ خاص نہ کیجئے بلکہ یہ فرمایئے کہ تین مرجائیں یا دو مریں) آپ ﷺ نے فرمایا (ہاں) دو بچے بھی مر جائیں تو یہ بشارت ہے۔" "مسلمؒ۔ بخاریؒ و مسلمؒ دونوں کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا "ایسے تین بچے مریں جو حد بلوغ کو نہ پہنچے ہوئے ہوں (تو یہ بشارت ہے)۔"

تشریح: "ثواب کی طلبگار ہو" کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی عورت کے تین بچوں کو اپنے پاس بلالے تو وہ ان کے مرجانے پر نوع اور جزع فزع نہ کرے بلکہ صبر و شکر کا دامن پکڑے رہے اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھ کر خدا کی مرضی اور اس کی مصلحت کے آگے سر جھکا دے تو وہ بہشت میں داخل کی جائے گی۔

اب اس بارہ میں دونوں ہی احتمال ہیں کہ یا تو اسے ابتداء ہی میں بغیر عذاب میں مبتلا کیئے ہوئے جنّت میں داخل کردیا جائے گا یا پھر یہ

کہ ان بچوں کی سفارش و شفاعت کے بعد اسے جنّت کی سعادت سے نوازا جائے گا۔

عورت کے عرض کرنے پر آنحضرت ﷺ کے ارشاد "یا دو بچے مریں" کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ جب آپ نے تین بچوں کے بارہ میں ارشاد فرمایا تو عورتوں نے تین کی تخصیص کو ختم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو بارگاہ صمدیت کی طرف سے آنحضرت ﷺ کی توجہ کے اثر سے رحمت خداوندی نے اس خواہش کو قبول فرما کر فوراً ہی بذریعہ وحی مطلع کر دیا کہ اگر دو بچے بھی مر جائیں تب بھی یہ سعادت حاصل ہوگی یا پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اس بارہ میں بطور خاص دعا مانگی اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا قبول ہوگئی چنانچہ آپ ﷺ نے عورتوں کو وہ بشارت سنا دی۔

دوسری روایت میں غیر بالغ کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ چھوٹے بچوں سے عورتوں کو بہت زیادہ محبّت ہوتی ہے، بڑے بچوں کی بہ نسبت چھوٹے بچے اپنی ماں سے زیادہ قریب اور محبوب ہوتے ہیں اس لئے ان کے مرنے سے طبعی طور پر عورت کو بہت زیادہ رنج و غم ہوتا ہے۔"

عزیز و محبوب کی موت پر صبر کی جزاء جنّت ہے

⑩ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اللّٰهُ مَالِعَبْدِى الْمُؤْمِنِ عِنْدِىْ جَزَآءٌ اِذَا قَبَضْتُ صَفِيَّهٗ مِنْ اَهْلِ الدُّنْيَا ثُمَّ احْتَسَبَهٗ اِلَّا الْجَنَّةَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے کسی بندہ کے عزیز و محبوب کو جو اہل دنیا میں سے اٹھا لیتا ہوں اور وہ بندہ اس پر ثواب کا طلب گار ہوتا ہے (یعنی صبر کرتا ہے) تو میرے پاس اس کے لئے جنّت سے بہتر کوئی جزاء نہیں ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا اہل دنیا میں سے کوئی عزیز محبوب جیسے اولاد، باپ، ماں یا ان کے علاوہ کوئی بھی ایسا شخص جسے وہ عزیز و محبوب رکھتا تھا انتقال کر جائے اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کے اس صبر کی بناء پر اللہ تعالیٰ اسے جنّت عطا فرمائے گا۔ "اہل دنیا" کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر اہل آخرت میں سے کوئی عزیز و محبوب مر جائے اور اس پر صبر کیا جائے تو اس سے بھی بڑی سعادت ملتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا اور کسی بندہ سے اللہ تعالیٰ کا راضی ہو جانا اس کے حق میں دنیا و آخرت کی سب سے بڑی سعادت اور سب سے بڑی فضیلت ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

نوحہ کرنے اور نوحہ سننے پر آنحضرت ﷺ کی لعنت

⑪ وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ الْخُدْرِىِّ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّآئِحَةَ وَالْمُسْتَمِعَةَ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے نوحہ کرنے والی عورت اور نوحہ سننے والی عورت دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: نوحہ کرنے والی عورت سے مراد وہ عورت ہے۔ جو میت کے عمدہ خصلتوں کو رو رو کر بیان کرے، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ میت پر آواز کے ساتھ یعنی چلا چلا کر رونے کو نوحہ کہتے ہیں۔ "نوحہ سننے والی عورت" سے وہ عورت مراد ہے جو نوحہ کرنے والی عورت کے پاس بیٹھ کر قصداً اس کا نوحہ سنے اور اس کے نوحہ کو پسند کرے۔

مؤمن مصیبت و راحت ہر مرحلہ پر صابر و شاکر رہتا ہے

⑫ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَجَبٌ لِّلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَہٗ خَیْرٌ فَحَمِدَ اللّٰہَ وَشَکَرَ وَاِنْ اَصَابَتْہُ مُصِیْبَۃٌ حَمِدَ اللّٰہَ وَصَبَرَ فَالْمُؤْمِنُ یُؤْجَرُ فِیْ کُلِّ اَمْرِہٖ حَتّٰی فِی اللُّقْمَۃِ یَرْفَعُھَا اِلٰی فِیْ امْرَأَتِہٖ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمن (کامل) کا عجب حال ہے اگر اسے راحت و بھلائی پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے اور صبر کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ لہٰذا مؤمن کو اس کے ہر کام میں ثواب ملتا ہے یہاں تک کہ وہ جو لقمہ اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دیتا ہے (اس پر بھی ثواب ملتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ مؤمن کی فضیلت اور اس کے امتیاز کو بطور فخر بیان کیا جارہا ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ پر خدائے واحد کا سپاس و شکر گزار رہتا ہے اگر اسے کوئی نعمت و راحت حاصل ہوتی ہے تو خدا کی تعریف کرتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت و تکلیف اپنے بازوؤں میں جکڑ لیتی ہے تو اس وقت بھی اس کی زبان حال وقال سے خدا کا شکر ہی ادا ہوتا ہے اور اس کی تعریف و بڑائی بیان کر کے وہ اپنی عبودیت کا اظہار کرتا ہے چنانچہ اسی لئے خدا نے بھی مؤمن کو یہ سعادت عطا فرمائی ہے کہ اس کے ہر مباح کام پر ثواب عطا فرمایا جاتا ہے، بشرطیکہ اگر وہ خیر و بھلائی اور ثواب کی نیت کے ساتھ وہ کام کرے یعنی مؤمن کوئی بھی مباح کام کرے اگر اس کی نیت بخیر ہوگئی تو اسے اس کام پر ثواب دیا جائے گا مثال کے طور پر یہاں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ دے اور لقمہ دیتے وقت اس کی یہ نیت ہو کہ میں اپنے اس حق کی ادائیگی کے لئے جو میرے ذمہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر بیوی کے منہ میں لقمہ دے رہا ہوں تو اس کا یہ معمولی سا مباح کام اس کے حق میں ثواب کے اعتبار سے ایک عظیم سعادت بن جائے گا۔"

مؤمن کی موت پر زمین و آسمان روتے ہیں

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَامِنْ مُّؤْمِنٍ اِلَّا وَلَہٗ بَابَانِ بَابٌ یَّصْعَدُ مِنْہُ عَمَلُہٗ وَبَابٌ یَّنْزِلُ مِنْہُ رِزْقُہٗ فَاِذَا مَاتَ بَکَیَا عَلَیْہِ فَذٰلِکَ قَوْلُہٗ تَعَالٰی فَمَا بَکَتْ عَلَیْھِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر مسلمان کے لئے دو دروازے ہیں ایک دروازہ تو وہ ہے جس سے اس کے نیک اعمال اوپر آجاتے ہیں اور دوسرا دروازہ وہ ہے جس سے اس کا رزق اترتا ہے، چنانچہ جب کوئی مؤمن مرتا ہے تو اس کے لئے دونوں دروازے روتے ہیں اس بات کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا جاسکتا ہے کہ فَمَا بَکَتْ عَلَیْھِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ یعنی ان (کافروں) کے لئے نہ آسمان رویا نہ زمین روئی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ایک دروازہ تو وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ مؤمن کے نیک اعمال جو زمین پر اس کے نامۂ اعمال میں لکھے جاچکے ہیں آسمان پر جاتے ہیں اور پھر وہاں اعمال لکھنے کی وجہ دوبارہ اعمالنامہ میں لکھے جاتے ہیں، دوسرا دروازہ وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ رزق زمین پر اترتا ہے اور جس کے مقدر میں جتنا ہوتا ہے اتنا پہنچتا ہے۔

لہٰذا جب کوئی مؤمن مرتا ہے تو دونوں دروازے روتے ہیں کیونکہ ایک دروازہ سے تو نیک اعمال اوپر جاتے تھے اور دوسرے دروازہ سے رزق اترتا تھا کہ جو نیک اعمال کے لئے معاون ہوتا ہے اس طرح دونوں دروازے مؤمن کے انتقال سے اس سعادت سے

محروم ہو جاتے ہیں اور اپنی اس محرومی پر روتے ہیں۔

اس بات کو آیت کریمہ سے سمجھایا گیا ہے بایں طور کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے حق میں فرمایا ہے کہ ان کے لئے نہ تو آسمان رویا اور نہ زمین روتی ہے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ مؤمن کے لئے آسمان بھی روتا ہے اور زمین بھی روتی ہے۔

مر جانے والی چھوٹی اولاد ذخیرہ آخرت ہوتی ہے۔

(۱۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهٗ فَرَطَانِ مِنْ اُمَّتِيْ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ بِهِمَا الْجَنَّةَ فَقَالَتْ عَائِشَةُ فَمَنْ كَانَ لَهٗ فَرَطٌ مِنْ اُمَّتِكَ قَالَ وَمَنْ كَانَ لَهٗ فَرَطٌ يَّا مُوَفَّقَةُ فَقَالَتْ فَمَنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ فَرَطٌ مِّنْ اُمَّتِكَ قَالَ فَاَنَا فَرَطُ اُمَّتِيْ لَنْ يُّصَابُوْا بِمِثْلِيْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میری اُمت میں سے جس شخص کے دو بچے بالغ ہونے سے پہلے مر گئے اللہ تعالیٰ اسے ان دونوں بچوں کی وجہ سے جنّت میں داخل کرے گا۔" (یہ سن کر حضرت عائشہ نے پوچھا کہ "اور آپ کی اُمت میں سے جس شخص کا ایک ہی بچہ مرا ہو؟ آپ نے فرمایا "اے موفقہ! جس شخص کا ایک بچہ مرا ہو اس کے لئے بھی یہ بشارت ہے۔" حضرت عائشہ نے پھر پوچھا کہ "اچھا آپ ﷺ کی امت میں اگر جس شخص کا ایک بھی بچہ نہ مرا ہو؟ تو اس کے لئے کیا بشارت ہے) آپ ﷺ نے فرمایا" پھر میں تو اپنی اُمت کا میر منزل ہوں ہی کیونکہ میری (وفات کی) مصیبت جیسی کسی اور مصیبت سے دوچار نہ ہوئے ہوں گے۔" (ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "فرط" اس شخص کو کہتے ہیں جو قافلہ سے پہلے منزل پر پہنچ کر اہل قافلہ کے لئے سامان خورد و نوش تیار کرتا ہے، یہاں اس حدیث میں مذکور "فرط" سے مراد وہ بچہ ہے جو بالغ ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو جائے ایسے بچہ کو "فرط" اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ آخرت میں پہلے پہنچ کر اپنے والدین کے لئے جنّت کی نعمتوں کا انتظام کرتا ہے یعنی وہ اپنے ماں باپ کو اللہ رب العزت سے سفارش و شفاعت کر کے جنّت میں لے جائے گا۔ ہاں حدیث کے آخری جملہ فانا فرط امتی الخ میں فرط" سے فوت شدہ نابالغ بچے مراد نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کو کمال تعلق اور ان کی ذات خصوصیت نیز ان کے اوصاف و فضائل کی بناء پر "موفقہ" کہہ کر مخاطب کیا جو مجموعہ فضل و کمال لقب ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اے عائشہؓ! کہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و بھلائی اور اچھی باتوں کے پوچھنے کی توفیق عطا فرمائی گئی ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی اُمت کے لئے میر منزل ہوں بایں طور کہ میں ان سے پہلے آخرت میں پہنچ کر شفاعت کروں گا اور ان کو جنّت میں لے جاؤں گا کیونکہ ثواب مصیبت اور مشقّت کے بقدر ہوتا ہے یعنی مصیبت و مشقّت جتنی سخت و شدید ہوتی ہے اتنا ہی ثواب زیادہ ملتا ہے لہٰذا اس دنیا سے میرا اٹھ جانا اس کے لئے اتنی بڑی مصیبت اور اتنا بڑا حادثہ اور کوئی مصیبت ہو نہیں سکتی، لہٰذا میرے بعد میری اُمت کا ہر فرد حقیقۃً اور حکماً اس حادثہ مصیبت سے دوچار ہو گا اس لئے جن لوگوں کی چھوٹی اولاد فوت ہو کر ان کے لئے ذخیرہ آخرت نہ بھی ہوئی ہوگی تو میرے وصال کا یہ حادثہ ہی ان کے لئے مذکورہ بالا سعادت و بشارت کے طور پر کافی ہو گا۔

اولاد کے انتقال پر صبر و شکر کا اجر

(۱۵) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَاتَ وَلَدُ الْعَبْدِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِمَلَائِكَتِهٖ قَبَضْتُمْ وَلَدَ عَبْدِيْ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ فَيَقُوْلُ قَبَضْتُمْ ثَمَرَةَ فُؤَادِهٖ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ فَيَقُوْلُ مَاذَا قَالَ عَبْدِيْ فَيَقُوْلُوْنَ حَمِدَكَ وَاسْتَرْجَعَ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ ابْنُوْا لِعَبْدِيْ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَسَمُّوْهُ بَيْتَ الْحَمْدِ (رواہ احمد و الترمذی)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی "مؤمن) بندہ کا کوئی بچہ مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں (یعنی ملک الموت اور اس کے معاون فرشتوں) سے فرماتا ہے کہ "تم نے میرے بندہ کے بچہ کی روح قبض کی ہے۔" وہ عرض کرتے ہیں کہ "ہاں!" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا" وہ عرض کرتے ہیں کہ "جی ہاں!" پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ "(اس حادثہ پر) میرے بندہ نے کیا کہا؟" وہ عرض کرتے ہیں کہ اس نے تیری تعریف کی اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔" اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے کے لئے جنت میں ایک بڑا گھر بناؤ اور اس کا نام "بیت الحمد" رکھو۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: چونکہ بندہ مؤمن اپنے جگر گوشہ کے انتقال پر اللہ رب العزت کی تعریف و بڑائی بیان کر کے صبر و شکر کی راہ اختیار کرتا ہے اس لئے عبودیت و انقیاد کے اس جذبہ عظیم کے صلہ میں اسے بہشت میں ایک بڑا گھر "بیت الحمد" دیا جاتا ہے۔

اس گھر کا نام "بیت الحمد" اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مصیبت و حادثہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا تسلیم و انقیاد کے بدلہ میں دیا جاتا ہے اس مناسبت سے اس کا نام "بیت الحمد" (یعنی حمد و ثنا کا مکان) ہے۔

مصیبت زدہ کو تسلی دینے والے کا ثواب

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ عَزّٰی مُصَابًا فَلَہٗ مِثْلُ اَجْرِہٖ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَ ابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ لَا نَعْرِفُہٗ مَرْفُوْعًا اِلَّا مِنْ حَدِیْثِ عَلِیِّ ابْنِ عَاصِمٍ الرَّاوِیْ وَقَالَ وَرَوَاہُ بَعْضُھُمْ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سُوْقَۃَ بِھٰذَا الْاِسْنَادِ مَوْقُوْفًا۔

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مصیبت زدہ کو تسلی دیتا ہے تو اسے بھی مصیبت زدہ کے بقدر ثواب دیا جاتا ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے ہم اس روایت کو علی بن عاصم کے علاوہ کسی دوسرے ذریعہ سے مرفوع نہیں پاتے، نیز امام ترمذیؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ بعض محدثین نے اس روایت کو محمد ابن سوقہ سے اسی سند کے ساتھ ابن مسعودؓ (پر) موقوف نقل کیا ہے۔"

تشریح: "مصیبت زدہ" عام ہے خواہ کسی کے انتقال کی مصیبت میں مبتلا ہو یا اس کے علاوہ کسی دوسرے حادثہ یا مصیبت سے دوچار ہو بہرحال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کو اطمینان و سکون دلاتا ہے اور اسے تسلی و تشفی دیتا ہے جو اپنے کسی عزیز و اقارب کے انتقال پر یا کسی بھی مصیبت کی وجہ سے غم زدہ ہو تو اسے بھی اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا کہ اس مصیبت زدہ کو صبر کرنے سے ملتا ہے کیونکہ تسلی دینے والا جب مصیبت زدہ کو اطمینان و سکون دلاتا ہے بایں طور کہ اسے صبر کی تلقین کرتا ہے اور پھر وہ شخص صبر کرتا ہے تو گویا یہ شخص مصیبت زدہ کے صبر کا باعث بنتا ہے اس لئے الدال علی الخیر کفاعلہ (یعنی جو شخص اچھی بات کا راستہ بتاتا ہے اسے بھی اس راستہ پر چلنے والے کی مانند ثواب ملتا ہے) کے بمصداق اسے بھی اجر و سعادت سے نوازا جاتا ہے۔ اب اس بارہ میں عمومیت ہے کہ چاہے تو تسلی خود مصیبت زدہ کے پاس پہنچ کر دی جائے یا اگر اس پر قدرت نہ ہو تو پھر خط لکھ کر یا کسی بھی دوسرے ذریعہ سے اطمینان و سکون دلایا جائے دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔

حضرت امام ترمذیؒ کے قول کے مطابق اگرچہ یہ روایت ابن مسعود پر موقوف ہے لیکن مرفوع ہی کے حکم میں ہے پھر یہ کہ اس کو ابن ماجہؒ کی اس روایت سے تقویت ملتی ہے جس کی سند حسن اور مرفوع ہے کہ:

مَامِنْ مُسْلِمٍ یُعَزِّیْ اَخَاہُ بِمُصِیْبَۃٍ اِلَّا کَسَاہُ اللّٰہُ مِنْ حُلَلِ الْکَرَامَۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

"جو بھی مسلمان اپنے کسی (مسلمان) بھائی کی مصیبت میں اسے صبر و سکون کی تلقین کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے بزرگی کا خلعت

پہنائے گا۔"

(۱۷) وَعَنْ اَبِیْ بَرْزَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ عَزّٰی ثَکْلٰی کُسِیَ بُرْدًا فِی الْجَنَّۃِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابی برزہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اس عورت کو تسلی دے گا جس کا بچہ مرگیا ہو تو اسے جنت میں بہت عمدہ لباس پہنایا جائے گا۔" (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے)

میت کے گھر کھانا بھیجنا مستحب ہے

(۱۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ لَمَّا جَآءَ نَعْیُ جَعْفَرٍ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِصْنَعُوْا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَقَدْ اَتَاھُمْ مَّا یُشْغِلُھُمْ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت جعفرؓ کے انتقال کی خبر آئی تو نبی کریم ﷺ نے اہل بیت سے فرمایا کہ جعفر کے (اہل خانہ کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ انہیں ایک ایسا حادثہ پیش آیا ہے جو انہیں کھانا پکانے سے باز رکھتا ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب کوئی شخص مرجائے تو اس کے رشتہ داروں اور ہمسائیوں کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ اہل وعیال کے لئے کھانا پکا کر بھیجیں اور کھانا بھی اتنا ہو کہ میت کے گھر والے اسے ایک دن اور ایک رات پیٹ بھر کر کھاسکیں۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ میت کے گھر اس کے عزیزوں اور ہمسائیوں کی طرف سے تین دن تک کہ جو ایام تعزیت ہیں کھانا بھیجتے رہنا جائز ہے۔

میت کے گھر بھیجا جانے والا کھانا دوسرے لوگ بھی کھاسکتے ہیں یا نہیں

اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ وہ کھانا جو میت کے گھر اس کے عزیزوں اور ہمسائیوں کی طرف سے آتا ہے میت کے گھر والوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو کھانا جائز ہے یا نہیں، چنانچہ بعض علماء تو عدم جواز کے قائل ہیں جب کہ بعض حضرات مثلاً ابوالقاسمؒ کا قول یہ ہے کہ اس شخص کے کھالینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جو میت کی تجہیز وتکفین میں مشغول ہے۔

نیز علماء لکھتے ہیں کہ جب کسی میت کے گھر کھانا پکا کر بھیجا جائے تو اس موقع پر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ میت کے گھر والے کھانا کھا بھی لیں کیونکہ ایسے غمناک ماحول میں کھانے پینے کا کوئی دھیان نہیں رہتا خاص طور پر میت کے گھر والے غم والم کی وجہ سے کھانا وغیرہ کی خواہش نہیں رکھتے اس لئے مناسب اور بہتر یہ ہے کہ انہیں کہہ سن کر کھانا ضرور کھلا دیا جائے تاکہ غم والم کی زیادتی اور کھانا نہ کھانے کی وجہ سے ضعف وکمزوری میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

نوحہ کرنے والی عورتوں کے لئے کھانا تیار کرنا تاکہ لوگ جمع ہوں اور کھائیں بدعت ومکروہ ہے بلکہ اس کے بارہ میں حضرت جابرؓ سے تو یہ منقول ہے کہ "ہم اسے نیاحت یعنی نوحہ کرنے کی ایک قسم شمار کرتے تھے۔" لہٰذا اس ارشاد سے تو اس چیز کا صریح حرام ہونا معلوم ہوتا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اسی مقصد کے لئے میت کے گھر والوں کی طرف سے تیار کئے گئے کھانے میں شریک ہونا مکروہ ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ کراہت اس شکل میں ہے جب کہ وہ کھانا اس مال سے تیار نہ کیا گیا ہو جو یتیم کا ہو یا اس شخص کی ملکیت ہو جو موجود نہ ہو اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف کیا گیا ہو اور اگر کھانا ایسے مال سے تیار کیا گیا ہو جو یتیم یا غیر موجود شخص کی ملکیت میں ہو تو پھر اس کھانے میں شریک ہونا بغیر کسی اختلافی قول کے حرام ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

میت کو نوحہ اور اس پر رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے

(۱۹) عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ نِيحَ عَلَيْهِ فَإِنَّهُ يُعَذَّبُ بِمَا نِيحَ عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (متفق علیہ)

"اور حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جس میت کے لئے نوحہ کیا جاتا ہے اسے قیامت کے دن نوحہ کئے جانے کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا"۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۲۰) وَعَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ عَائِشَةَ وَذُكِرَ لَهَا اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ الْحَيِّ عَلَيْهِ تَقُوْلُ يَغْفِرُ اللّٰهُ لِاَبِيْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَمَا اِنَّهُ لَمْ يَكْذِبْ وَلٰكِنَّهُ نَسِيَ اَوْ اَخْطَأَ اِنَّمَا مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى يَهُوْدِيَّةٍ يُبْكٰى عَلَيْهَا فَقَالَ اِنَّهُمْ لَيَبْكُوْنَ عَلَيْهَا وَاِنَّهَا لَتُعَذَّبُ فِيْ قَبْرِهَا (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن کہتی ہیں کہ اس وقت حضرت عائشہؓ سے یہ کہا گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ یہ کہتے ہیں کہ "میت کو اس پر زندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے" تو میں نے حضرت عائشہؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "اللہ بخشے ابو عبدالرحمٰن (یہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی کنیت ہے) کو! جان لو کہ عبداللہ بن عمرؓ نے (خدانخواستہ) جھوٹ نہیں بولا ہے بلکہ وہ بھول گئے ہیں (آنحضرت ﷺ نے اس بارہ میں ایک خاص موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا یا یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اجتہادی خطا ہے کہ اس ارشاد سے عام حکم مراد لے رہے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ "آنحضرت ﷺ (ایک مرتبہ) ایک یہودی عورت کی قبر کے پاس سے گزرے تو (دیکھا کہ) وہاں (اس قبر) پر لوگ رو رہے تھے، (یہ دیکھ کر) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس کے عزیز و اقارب اس پر رو رہے ہیں اور وہ (عورت) اپنی قبر کے اندر عذاب میں مبتلا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اللہ بخشے" اہل عرب میں یہ جملہ ایسے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے جب کہ کوئی شخص اپنی کسی بات اور گفتگو میں خطا کرتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے اس موقع پر آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ، صحیح نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کہ "اس کے عزیز و اقارب رو رہے ہیں اور وہ اپنی قبر کے اندر عذاب میں مبتلا ہے۔" کا مطلب صرف یہ تھا کہ یہ لوگ کتنے جاہل اور نادان ہیں کہ وہ بدبخت عورت تو اپنی قبر کے اندر خدا کے عذاب میں مبتلا اور مطعون و خوار ہے جیسا کہ کافروں کا حال ہوتا ہے مگر یہ لوگ اسے مرحومہ سمجھ رہے ہیں اور اس سے محبّت و تعلق کا اظہار کر رہے ہیں۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے یہ بات بطور خاص اس یہودی عورت کے بارہ میں فرمائی تھی اس طرح دوسرے کافروں کے بارہ میں بھی یہی صورت حال ہوتی ہے کہ ان کے عزیز و اقارب انہیں مرحوم سمجھ کر اور ان سے اپنے قلبی تعلق و محبّت کا اظہار کر کے روتے ہیں پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ نے تو یہ بھی نہیں فرمایا تھا کہ وہ ان کے رونے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہے۔"

گویا حضرت عائشہؓ کے اعتراض کا حاصل یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے تو اس عورت کے کفر کی بناء پر فرمایا تھا کہ وہ اپنے کفر کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہے، اور عبداللہ بن عمرؓ یہ سمجھے کہ آنحضرت ﷺ نے بطور کلیہ کے یہ ارشاد فرمایا کہ میت اپنے اوپر زندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کی جاتی ہے۔"

یہ تو اس روایت کی وضاحت ہوگئی، جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے تو علماء لکھتے ہیں کہ اس بارہ میں حضرت عائشہؓ کا یہ اعتراض بھی ان کے لئے اپنے اجتہاد پر مبنی ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کا یہ اعتراض اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد خاص طور پر صرف اسی موقع سے متعلق منقول ہوا ہو حالانکہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی مختلف الفاظ کے ساتھ اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نیز

دوسرے صحابہؓ کی متعدد روایتوں سے منقول ہے لہٰذا حضرت عائشہؓ کا یہ فرمانا کہ یہ ارشاد اس خاص موقعہ پر اور صرف اس یہودی عورت کے بارہ میں تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا؟ بہرحال اس مسئلہ کی مزید وضاحت اگلی حدیث کی تشریح کے ضمن میں دیکھئے۔"

(۲۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِيْ مُلَيْكَةَ قَالَ تُوُفِّيَتْ بِنْتٌ لِعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ بِمَكَّةَ فَجِئْنَا لِنَشْهَدَهَا وَحَضَرَهَا ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ فَاِنِّيْ لَجَالِسٌ بَيْنَهُمَا فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لِعَمْرِو بْنِ عُثْمَانَ وَهُوَ مُوَاجِهُهٗ اَلَا تَنْهٰى عَنِ الْبُكَآءِ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَآءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَدْ كَانَ عُمَرُ يَقُوْلُ بَعْضَ ذٰلِكَ ثُمَّ حَدَّثَ فَقَالَ صَدَرْتُ مَعَ عُمَرَ مِنْ مَكَّةَ حَتّٰى اِذَا كُنَّا بِالْبَيْدَآءِ فَاِذَا هُوَ بِرَكْبٍ تَحْتَ ظِلِّ سَمُرَةٍ فَقَالَ اذْهَبْ فَانْظُرْ مَنْ هٰؤُلَآءِ الرَّكْبُ فَنَظَرْتُ فَاِذَا هُوَ صُهَيْبٌ قَالَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ ادْعُهٗ فَرَجَعْتُ اِلٰى صُهَيْبٍ فَقُلْتُ ارْتَحِلْ فَالْحَقْ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عُمَرَ فَلَمَّا اَنْ اُصِيْبَ عُمَرُ دَخَلَ صُهَيْبٌ يَبْكِيْ يَقُوْلُ وَا اَخَاهُ وَا صَاحِبَاهُ فَقَالَ عُمَرُ يَا صُهَيْبُ اَتَبْكِيْ عَلَيَّ وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبَعْضِ بُكَآءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَلَمَّا مَاتَ عُمَرُ ذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِعَآئِشَةَ فَقَالَتْ يَرْحَمُ اللّٰهُ عُمَرَ لَا وَاللّٰهِ مَا حَدَّثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَآءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ وَلٰكِنْ اِنَّ اللّٰهَ يَزِيْدُ الْكَافِرَ عَذَابًا بِبُكَآءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ وَقَالَتْ عَآئِشَةُ حَسْبُكُمُ الْقُرْاٰنُ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ عِنْدَ ذٰلِكَ وَاللّٰهُ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى قَالَ ابْنُ اَبِيْ مُلَيْكَةَ فَمَا قَالَ ابْنُ عُمَرَ شَيْئًا (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن ملیکہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی صاحبزادی کا مکہ میں انتقال ہوا تو ہم لوگ (ان کے یہاں) آئے تاکہ نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوں حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباسؓ بھی وہاں آئے میں ان دونوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا اتنے میں عبداللہ ابن عمرؓ نے حضرت عمرو بن عثمانؓ سے جو ان کی طرف منہ کیئے ہوئے بیٹھے تھے کہا کہ "تم (اپنے گھر والوں کو آواز اور نوحہ کے ساتھ) رونے سے منع کیوں نہیں کرتے؟ کیونکہ رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "میت اپنے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کی جاتی ہے۔" حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے (اس کے جواب میں) کہا کہ "حضرت عمرؓ اس میں سے کچھ کہتے تھے (یعنی آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے تو میت پر عام طور پر رونے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے لیکن حضرت عمرؓ اس ممانعت کو صرف قریب المرگ کے پاس آواز و نوحہ کے ساتھ رونے پر محمول کرتے تھے) چنانچہ انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ جب میں حضرت عمرؓ کے ساتھ مکہ سے واپس ہوا اور ہم بیداء میں پہنچے (جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک موضع ہے) تو اچانک حضرت عمرؓ نے ایک کیکر کے درخت کے نیچے ایک قافلہ کو دیکھا انہوں نے (مجھ سے) فرمایا کہ "تم وہاں جا کر دیکھو کہ قافلہ میں کون ہے؟ چنانچہ میں نے وہاں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت صہیبؓ (اور ان کے ہمراہ کچھ دوسرے لوگ) ہیں" حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے آ کر حضرت عمرؓ سے بتا دیا حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "انہیں بلا لاؤ۔" میں پھر صہیبؓ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ "چلئے اور امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ سے ملئے۔" اس کے بعد جب (مدینہ میں) حضرت عمرؓ زخمی کر دیئے گئے تو حضرت صہیب روتے ہوئے ان کے پاس آئے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ "اے میرے بھائی، اے میرے آقا (یہ کیا ہوا؟) حضرت عمرؓ نے (اسی حالت میں) صہیبؓ سے فرمایا کہ تم میرے پاس (آواز و بیان کے ساتھ) رو رہے ہو؟ جب کہ رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ مردہ (یعنی یا تو حقیقۃً مردہ یا قریب المرگ) اپنے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے (یعنی ایسے رونے کی وجہ سے جو آواز نوحہ کے ساتھ ہو)" حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر فاروقؓ کی وفات ہوئی تو میں نے ان کا یہ قول حضرت عائشہؓ کی خدمت میں عرض کیا وہ سن کر فرمانے لگیں کہ "اللہ تعالیٰ حضرت عمرؓ پر رحم کرے! یہ بات نہیں ہے اور نہ رسول کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ مردہ اپنے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے) یعنی نہ تو مطلقاً رونے کی وجہ سے اور نہ آواز و نوحہ کے ساتھ رونے کی وجہ سے میت کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے) ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کافر کے عذاب میں اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے زیادتی کر دیتا ہے۔" پھر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ (اس کے ثبوت میں) تمہارے لئے قرآن کریم کا یہ فیصلہ ہی کافی

ہے کہ ولا تزروازرۃوزر اخری "کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت کے مضمون کا مفہوم بھی تقریباً یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہنساتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی رلاتا ہے۔" حضرت ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ "حضرت ابن عمرؓ یہ (سن کر کچھ نہ بولے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ۲۳ھ ذی الحجہ کا مہینہ چھبیسویں تاریخ اور چہار شنبہ کا دن تھا، صبح کی نماز کے وقت حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں نماز پڑھانے کے لئے تشریف لائے حاضرین نے صفیں باندھ لیں آپؓ محراب مسجد میں کھڑے ہوگئے، ابھی آپ نے نماز شروع ہی کی تھی کہ مغیرہ ابن شعبہ کے غلام ابولؤلؤ لعین نے پیچھے سے جو گھات میں بیٹھا تھا دو دھاری خنجر سے آپؓ پر حملہ کیا، خنجر پہلو میں لگا، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ لعین نے چھ زخم لگائے حضرت عمرؓ گر گئے، انہیں اٹھا کر گھر لایا گیا، پورے مدینہ میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی لوگ جوق در جوق در خلافت پر حاضر ہونے لگے، انہیں میں حضرت صہیب بھی تھے، انہوں نے جب حضرت عمرؓ کو خون میں نہائے دیکھا تو بے اختیار رونے لگے اور یہ کہتے جاتے تھے "اے میرے بھائی، اے میرے آقا۔" حضرت ابن عباسؓ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں بہر حال حضرت صہیبؓ کے اس رونے اور ان کے اس کہنے کو نوحہ نہ سمجھ لیا جائے کیونکہ نوحہ وہ ہوتا ہے جو باآواز بلند اور بطریق بین ہو اور یہاں ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں پائی جاتی لیکن حضرت عمرؓ نے صہیبؓ کو اس سے بھی احتیاطاً منع فرما دیا کہ اظہار غم کا یہ مباح طریقہ کہیں حدود سے تجاوز کر کے اس مرحلہ پر پہنچ جائے جہاں شریعت مانع ہوتی ہے۔

حضرت عائشہؓ نے جو قسم کھا کر حدیث کی نفی کی تو وہاں حقیقت میں ان کی مراد حدیث کے نفی نہیں تھی بلکہ انہوں نے اس منہدم اور نتیجہ کی نفی کی جو حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کی حدیث سے اخذ کیا تھا ورنہ تو جہاں تک نفس حدیث کا تعلق ہے اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک اور شبہ نہیں ہے، اختلاف صرف اس حدیث کا مفہوم متعین کرنے میں ہے حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہؓ تو اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ میت کے عذاب کا تعلق اس کے گھر والوں کے رونے سے ہے یعنی اگر میت کے گھر والے میت پر روتے ہیں تو اسے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے خواہ میت مؤمن ہو یا کافر ہو۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کافر کے حق میں ہے اور وہ بہر صورت عذاب میں مبتلا رہتا ہے چاہے اس کے گھر والے اس پر روئیں یا نہ روئیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ گھر والوں کے رونے کی وجہ سے کافر میت کے عذاب میں زیادتی کر دی جاتی ہے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ کافر رونے سے خوش و راضی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض کافر تو مرتے وقت وصیت کر جاتے تھے کہ جب وہ مر جائیں تو اس پر رویا جائے اور نوحہ کیا جائے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے مسلک کہ "اہل میت کا رونا میت کے عذاب کا سبب نہیں ہوتا۔" پر اس آیت کریمہ سے استدلال کرتی ہیں کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی یعنی ایک شخص کا گناہ کسی دوسرے شخص کے نامۂ اعمال میں نہیں لکھا جاتا اور ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہوتا تو اس پر اس گناہ کی سزا کا ترتب بھی نہیں ہو سکتا، لہٰذا اگر میت کے گھر والے روتے ہیں یا نوحہ کرتے ہیں تو یہ ان کا فعل ہے ان کا گناہ میت کے نامۂ اعمال میں کیوں لکھے جانے لگے اور ان کے گناہ کی وجہ سے میت کو عذاب میں کیوں مبتلا کیا جانے لگا۔ اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے بھی یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کے مسلک کی نفی اور حضرت عائشہؓ کے قول کی تائید کی انسان کا رونا اور ہنسنا، اس کی خوشی اور غمی اللہ ہی کی طرف سے ہے کہ وہی ان چیزوں کو پیدا کرتا ہے اس لئے رونے کو عذاب میں کیا دخل؟

لیکن حضرت ابن عباسؓ کے اس قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس طرح تو بندوں کے تمام ہی افعال اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے بندہ تو صرف انہیں کرتا ہے جس پر ثواب اور عذاب کا ترتب ہوتا ہے اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے اور اگر کوئی بد اعمالی کرتا ہے تو اس پر عذاب دیا جاتا ہے اب ہنسنے ہی کو لے لیجئے اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو دیکھ کر فور مسرت سے ہنستا ہے تو وہ ثواب پاتا

ہے اور اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو دیکھ کر بطور تمسخر و استہزاء ہنستا ہے تو گناہ گار ہوتا ہے، اسی طرح غمی و خوشی کا معاملہ ہے بعض خوشی اور بعض غم ایسے ہوتے ہیں جن پر ثواب دیا جاتا ہے بعضے خوشی اور بعضے غم ایسے ہوتے ہیں جن پر عذاب دیا جاتا ہے اس لئے حضرت عائشہؓ کے قول کی تائید اور حضرت عمرؓ کے مسلک کی نفی میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ کہنا کہ "اللہ تعالیٰ ہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے۔" سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے ہاں ابن عباسؓ کا قول اس قید کے ساتھ تو صحیح ہو سکتا ہے کہ "ہنسنا اور رونا بے اختیاری ہوں۔" یعنی اگر ہنسنے اور رونے میں اختیار کو دخل ہوگا تو پھر ان پر ثواب اور عذاب کا ترتب ضرور ہوگا۔

حدیث کا یہ آخری جملہ "حضرت ابن عمرؓ (یہ سن کر) کچھ نہ بولے۔" اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ قصہ سن کر ابن عباسؓ کی بات مان لی بلکہ انہوں نے خاموشی اختیار کر کے بحث کو ختم کر دینا ہی مناسب سمجھا جیسا کہ اہل عرفان کی شان ہے۔

میت پر رونے کی ممانعت

(۲۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا جَاءَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَتْلُ ابْنِ حَارِثَةَ وَجَعْفَرٍ وَّابْنِ رَوَاحَةَ جَلَسَ يُعْرَفُ فِيْهِ الْحُزْنُ وَاَنَا اَنْظُرُ مِنْ صَائِرِ الْبَابِ تَعْنِي شَقَّ الْبَابِ فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنَّ نِسَآءَ جَعْفَرٍ وَّذَكَرَ بُكَآءَهُنَّ فَاَمَرَهٗ اَنْ يَّنْهَاهُنَّ فَذَهَبَ ثُمَّ اَتَاهُ الثَّانِيَةَ لَمْ يُطِعْنَهٗ فَقَالَ انْهَهُنَّ فَاَتَاهُ الثَّالِثَةَ قَالَ وَاللّٰهِ غَلَبْنَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَزَعَمَتْ اَنَّهٗ قَالَ فَاحْثُ فِيْ اَفْوَاهِهِنَّ التُّرَابَ فَقُلْتُ اَرْغَمَ اللّٰهُ اَنْفَكَ لَمْ تَفْعَلْ مَآ اَمَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ تَتْرُكْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْعَنَآءِ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کے پاس زید بن حارثہ، جعفر اور ابن رواحہؓ کے (غزوۂ موتہ میں) شہید کر دیئے جانے کی اطلاع آئی تو آپ ﷺ (مسجد نبوی ﷺ میں) بیٹھ گئے، آپ ﷺ کے چہرہ پر رنج و غم کے آثار نمایاں تھا اور میں (آپ کی کیفیت) دروازے کے سوراخ سے دیکھے جا رہی تھی کہ اتنے میں ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ "جعفرؓ کی گھر کی عورتیں اس اس طرح کر رہی ہیں (یعنی اس نے ان کے رونے کا ذکر کیا) آنحضرت ﷺ نے اسے حکم فرمایا کہ وہ جا کر انہیں منع کر دے۔ وہ چلا گیا (تھوڑی دیر کے بعد) دوسری مرتبہ واپس آ کر بتایا کہ عورتیں نہیں مان رہی ہیں، آنحضرت ﷺ نے پھر اس سے فرمایا کہ جا کر منع کر دو۔" وہ چلا گیا اور جا کر منع کیا اور کچھ دیر کے بعد) پھر تیسری مرتبہ آیا اور کہا کہ "یا رسول اللہ! خدا کی قسم وہ عورتیں ہم پر غالب آگئیں (یعنی وہ ہمارے کہنا نہیں مان رہی ہیں) حضرت عائشہؓ کا گمان ہے کہ (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ "ان کے منہ میں مٹی ڈالو" حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں (اس شخص سے) کہنے لگی کہ "خدا تمہاری ناک خاک آلود کرے تمہیں رسول کریم ﷺ نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟ اور تم رسول کریم ﷺ کو رنج پہنچانے کا سبب بنے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ان کے منہ میں مٹی ڈالو۔" بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو کیونکہ شدید رنج و غم کی وجہ سے جزع و فزع کی حالت میں نصیحت ان پر کارگر نہیں ہو رہی ہے۔

اَرْغَمَ اللّٰهُ سے آخر تک حضرت عائشہؓ کا ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "خدا تمہیں ذلیل کرے کیونکہ تم نے آنحضرت ﷺ کو ایذاء پہنچائی اور آپ ﷺ کو رنج پہنچانے کا سبب بنے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کو یہ سن کر شدید رنج پہنچا کہ وہ عورتیں گناہ کبیرہ میں مبتلا ہیں اور منع کرنے کے باوجود رونے سے باز نہیں آ رہی ہیں اگر تم ڈانٹ ڈپٹ کر اور سختی کے ساتھ ان عورتوں کو اس فعل سے منع کر دیتے تو آنحضرت ﷺ کو یہ شدید روحانی اذیت و کوفت نہ ہوتی۔"

(۲۳) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ لَمَّا مَاتَ اَبُوْسَلَمَةَ قُلْتُ غَرِيْبٌ وَّفِيْ اَرْضِ غُرْبَةٍ لَاَبْكِيَنَّهٗ بُكَآءً يُتَحَدَّثُ عَنْهُ فَكُنْتُ قَدْ تَهَيَّأْتُ لِلْبُكَآءِ عَلَيْهِ اِذْ اَقْبَلَتِ امْرَاَةٌ تُرِيْدُ اَنْ تُسْعِدَنِيْ فَاسْتَقْبَلَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتُرِيْدِيْنَ اَنْ

تُدْخِلِي الشَّيْطَانَ بَيْتًا اَخْرَجَهُ اللّٰهُ مِنْهُ مَرَّتَيْنِ وَكَفَفْتُ عَنِ الْبُكَآءِ فَلَمْ اَبْكِ (رواه مسلم)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ جب میرے پہلے خاوند) حضرت ابوسلمہؓ کا انتقال ہوا تو میں نے کہا کہ "ابوسلمہؓ مسافر تھے اور حالت مسافرت ہی میں مرے میں بھی ان کے لئے اس طرح رووں گی کہ میرا رونا بیان کیا جائے گا (یعنی لوگوں میں چرچا ہو گا کہ اُمّ سلمہ اس قدر روئی کہ اتنا کوئی بھی نہیں رویا) چنانچہ میں رونے کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ اچانک ایک عورت آئی جو (رونے میں) میرے ساتھ شریک ہونے کا ارادہ رکھتی تھی، اتنے میں رسول کریم ﷺ اس کے سامنے آگئے اور فرمانے لگے کہ "کیا تمہارا یہ ارادہ ہے کہ شیطان کو اس گھر میں داخل کرو جس گھر سے اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ نکالا ہے۔" آپ ﷺ کا یہ ارشاد سن کر) میں رونے سے رک گئی اور پھر میں (اس طرح) نہیں روئی (جس کی شریعت نے ممانعت کی ہے)۔" (مسلمؒ)

تشریح: "میں تو رونے کی تیاریوں میں مصروف تھی" کا مطلب یہ ہے کہ میں رونے کا ارادہ کر رہی تھی اور اس موقع پر رونے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جیسے سیاہ کپڑے وغیرہ انہیں مہیا کر رہی تھی۔"

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُمّ سلمہؓ کو اس وقت تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ چلا چلا کر رونا اور نوحہ کرنا حرام ہے اگر انہیں ایسا معلوم ہوتا تو یقینی بات ہے کہ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں جو شریعت کی رو سے ناجائز و حرام ہے۔

گھر میں سے دو مرتبہ شیطان کے نکلنے سے یا تو یہ مراد ہے کہ ایک مرتبہ تو اس وقت شیطان گھر سے نکال دیا گیا تھا جب کہ ابوسلمہؓ نے کفر و شرک کا سیاہ پیراہن اتار کر ایمان و اسلام کا نورانی خلعت زیب تن کیا تھا اور دوسری مرتبہ گھر سے اس وقت شیطان کو نکال دیا گیا جب کہ ابوسلمہؓ ظلم و جہل سے بھرپور اس دنیا سے ایمان و اسلام کے ساتھ رخصت ہو گئے تھے۔"

بین کرنے کی ممانعت

(۲۴) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ اُغْمِيَ عَلٰى عَبْدِاللّٰهِ بْنِ رَوَاحَةَ فَجَعَلَتْ اُخْتُهٗ عَمْرَةُ تَبْكِيْ وَاجَبَلَاهُ وَاكَذَا وَاكَذَا تُعَدِّدُ عَلَيْهِ فَقَالَ حِيْنَ اَفَاقَ مَا قُلْتِ شَيْئًا اِلَّا قِيْلَ لِيْ اَنْتَ كَذٰلِكَ زَادَ فِيْ رِوَايَةٍ فَلَمَّا مَاتَ لَمْ تَبْكِ عَلَيْهِ (رواه البخاری)

"اور حضرت نعمان بن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت عبداللہ بن رواحہ (اتنے سخت بیمار ہوئے کہ موت کے قریب پہنچ گئے اور ان) پر بیہوشی طاری ہوئی تو ان کی بہن عمرہ نے رونا اور یہ کہنا شروع کیا کہ "اے پہاڑ افسوس ہے اور اے ایسے اور ویسے، یعنی ان کی خوبیاں گن گن کر بیان کرنے لگیں، جب حضرت عبداللہ ہوش میں آئے تو (بہن سے) کہا کہ "جو کچھ تم نے کہا ہے وہی مجھ سے بطور تنبیہ کے کہا گیا ہے تم ایسے ہو (مثلاً جب تم نے کہا کہ واجبلاہ یعنی اے پہاڑ افسوس ہے تو مجھ سے کہا گیا تھا کہ تم پہاڑ کیوں ہو کہ لوگ تمہاری پناہ پکڑتے ہیں) ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "چنانچہ جب عبداللہ کا انتقال ہوا (یعنی غزوہ موتہ میں شہید ہوئے) تو ان کی بہن ان پر روئی نہیں۔" (بخاریؒ)

(۲۵) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ مَيِّتٍ يَمُوْتُ فَيَقُوْمُ بَاكِيْهِمْ فَيَقُوْلُ وَاجَبَلَاهُ وَاسَيِّدَاهُ وَنَحْوَ ذٰلِكَ اِلَّا وَكَّلَ اللّٰهُ بِهٖ مَلَكَيْنِ يَلْهَزَانِهٖ وَيَقُوْلَانِ اَهٰكَذَا كُنْتَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جب کوئی شخص مرتا ہے اور اس کے عزیزوں میں سے کوئی رونے والا یہ کہہ کر روتا ہے کہ "اے پہاڑ! اے سردار! وغیرہ وغیرہ" تو اللہ تعالیٰ میت پر دو فرشتے مقرر کر دیتا ہے جو اس کے سینہ میں مکے مار مار کر پوچھتے ہیں کہ "کیا تو ایسے ہی تھا؟ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب حسن

ہے۔"

تشریح: "میت" سے حقیقت یعنی مردہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور قریب المرگ بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

میت پر رونے اور اس کی وجہ سے میت کو عذاب میں مبتلا کیئے جانے کے بارہ میں کچھ باتیں گزشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہیں اس موقعہ پر بھی اس مسئلہ کے بارہ میں چند اور باتیں جانتے چلیئے۔

علامہ سیوطیؒ نے شرح الصدور میں اس حدیث ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ (یعنی میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے) کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ "اس بارہ میں اختلافی اقوال ہیں کہ آیا میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس سلسلہ میں جتنے مسلک ہیں ان کو علامہ موصوف نے اس طرح سلسلہ وار نقل کیا ہے۔ ① یہ حدیث اپنے ظاہری الفاظ و مفہوم کے مطابق مطلق ہے یعنی وصیت یا کافر کی قید نہیں ہے بلکہ میت پر چلا چلا کر رونے اور نوحہ کی وجہ سے میت کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن عمرؓ کی بھی یہی رائے ہے۔ ② میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے مطلقاً عذاب میں مبتلا نہیں کیا جاتا۔ ③ عذاب کا تعلق حالت سے ہے یعنی مردہ اس وقت عذاب میں مبتلا ہوتا ہے جب کہ اس کے گھر والے اس پر رو رہے ہوتے ہیں اور وہ عذاب ان کے رونے کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ مردہ کے اپنے گناہوں اور برے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ④ یہ حدیث مخصوص طور پر کافروں کے بارہ میں ہے یہ دونوں اقوال حضرت عائشہؓ کے ہیں۔ ⑤ یہ حدیث اور یہ وعید خاص طور پر اس شخص کے بارہ میں ہے جس کے یہاں نوحہ کا رسم و رواج ہو، امام بخاریؒ کا یہی مسلک ہے۔ ⑥ یہ وعید اس شخص کے بارہ میں ہے جو نوحہ کے لئے وصیت کر جائے یعنی جو شخص اپنے وارثوں سے کہہ جائے کہ میرے مرنے کے بعد نوحہ کیا جائے تو اسے اس کے گھر والوں کے رونے اور نوحہ کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے کیونکہ یہ اسی کا فعل ہے ⑦ یہ وعید اس شخص کے بارہ میں ہے جو نوحہ نہ کرنے کی وصیت نہ کر جائے، چنانچہ جس شخص کو اپنے گھر والوں کے بارے میں یہ خیال ہو کہ وہ میرے مرنے کے بعد نوحہ کریں گے۔ تو اسے اپنے گھر والوں کو نوحہ نہ کرنے کی وصیت کرنا واجب ہو گا۔ ⑧ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے اس وقت عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے جب کہ وہ میت کی ان باتوں کو بیان کر کر کے روئیں جو شرعی طور پر فی نفسہ بری اور انتہائی قابل نفرین ہو جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی مرجاتا تھا تو لوگ یہ کہہ کہہ کر روتے تھے کہ "اے عورتوں کو بیوہ کرنے والے، اے اولاد کو یتیم کرنے والے، اے گھر کو خراب کرنے والے۔" ⑨ عذاب سے مراد اہل میت کے مذکورہ بالا طریقہ سے بیان کر کے رونے کی وجہ سے میت پر ملائکہ کا غصہ ہونا ہے۔" ⑩ اہل میت جب نوحہ کرتے ہیں تو میت اپنی قبر کے اندر عذاب میں مبتلا کی جاتی ہے۔"

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "عذاب سے مراد یہ ہے کہ جب اہل میت غلط طریقہ سے روتے ہیں اور اس بارہ میں غیر شرعی روش اختیار کرتے ہیں تو اس کی وجہ سے میت کو شدید روحانی اذیت پہنچتی ہے اور اسے رنج ہوتا ہے جیسا کہ جب عالم برزخ میں دنیا سے کوئی روح آتی ہے اور وہاں پہلے سے موجود روحیں اسے اپنے اعزہ متعلقین کے بارہ میں پوچھتی ہیں اگر کسی روح کو اپنے متعلقین کے بارہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ برے اعمال اور گناہوں میں مبتلا ہیں تو اس روح کو رنج ہوتا ہے اور اگر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلقین نیکی اور بھلائی کی راہ پر گامزن ہیں تو اسے خوشی ہوتی ہے۔

بہر حال مسئلہ کی پوری بحث کا حاصل یہ ہوا کہ "اگر میت اس گناہ کا خود سبب ہو گا یعنی وہ اگر مرنے سے پہلے یہ وصیت کر جائے کہ میری میت پر نوحہ کیا جائے یا چلا چلا کر رویا جائے یا یہ کہ وہ وصیت تو نہ کر جائے مگر ان امور سے خوش و راضی ہوتا ہو تو اس صورت حدیث میں مذکورہ "عذاب" اپنے حقیقی معنی پر محمول ہو گا بایں طور کہ اگر میت پر اہل میت نوحہ وغیرہ کریں گے تو اسے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور اگر یہ صورت نہ ہو یعنی نہ تو میت نے وصیت کی ہو اور نہ وہ ان باتوں کو پسند کرتا ہو تو اس شکل میں "عذاب" اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہو گا بلکہ رنج اٹھانے" پر محمول ہو گا خواہ یہ رنج اٹھانا حالت نزع میں ہو یا موت کے بعد نیز خواہ کافر ہو خواہ مسلمان اس بارہ میں

سب برابر ہیں اس طرح اس آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اور ان احادیث کے درمیان کہ جو اس بارہ میں مطلق منقول ہوئی ہیں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔

نوحہ اور چلائے بغیر رونا ممنوع نہیں ہے

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ قَالَ مَاتَ مَیِّتٌ مِّنْ اٰلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاجْتَمَعَ النِّسَآءُ یَبْکِیْنَ عَلَیْہِ فَقَامَ عُمَرُ یَنْہَاھُنَّ وَیَطْرُدُھُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَعْھُنَّ یَا عُمَرُ فَاِنَّ الْعَیْنَ دَامِعَۃٌ وَالْقَلْبَ مُصَابٌ وَالْعَھْدَ قَرِیْبٌ (رواہ احمد و النسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں (جب) رسول کریم ﷺ کی اولاد میں سے کسی کا (یعنی حضرت زینبؓ کا جیسا کہ اگلی روایت میں تصریح ہے) انتقال ہوا تو عورتیں جمع ہوئی اور ان پر رونے لگیں (یہ دیکھ کر) حضرت عمر فاروقؓ کھڑے ہوئے اور (اقربا کو تو) رونے سے منع کیا اور (اجنبیوں کو) مار مار کر بھگانے لگے۔" آنحضرت ﷺ نے (جب یہ دیکھا تو) فرمایا کہ "عمر! انہیں (اپنے حال پر چھوڑ دو کیونکہ آنکھیں رو رہی ہیں اور دل مصیبت زدہ ہے نیز مرنے کا وقت قریب ہے۔" (احمدؒ، نسائیؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر عورتیں چلا چلا کر تو نہیں ہاں کچھ آواز سے رو رہی ہوں گے چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اس احتیاط کے پیش نظر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں اس سے آگے بڑھ جائیں اور نوحہ وغیرہ کرنے لگیں جو شریعت کی نظر میں ممنوع ہے ان عورتوں کو رونے سے منع کرنا چاہا مگر آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر فاروق کو اس سے روک دیا اور ان کا عذر بیان فرما کر اس طرح اشارہ فرما دیا کہ ایسے سخت حادثہ اور غمناک موقعہ پر عورتوں کو اظہار رنج و غم کی اتنی بھی اجازت نہ دینا احتیاط اور دور اندیشی کا تقاضا تو ہو سکتا ہے لیکن فطرت کے خلاف ہوگا۔"

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَاتَتْ زَیْنَبُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَبَکَتِ النِّسَآءُ فَجَعَلَ عُمَرُ یَضْرِبُھُنَّ بِسَوْطِہٖ فَاَخَّرَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِیَدِہٖ وَقَالَ مَھْلًا یَا عُمَرُ ثُمَّ قَالَ اِیَّاکُنَّ وَنَعِیْقَ الشَّیْطَانِ ثُمَّ قَالَ اِنَّہٗ مَھْمَا کَانَ مِنَ الْعَیْنِ وَمِنَ الْقَلْبِ فَمِنَ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَمِنَ الرَّحْمَۃِ وَمَا کَانَ مِنَ الْیَدِ وَمِنَ اللِّسَانِ فَمِنَ الشَّیْطَانِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب کا انتقال ہوا تو عورتیں رونے لگیں، حضرت عمرؓ (اس بات کو کب برداشت کرنے والے تھے وہ) اپنے کوڑے سے مارنے لگے، آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کو اپنے ہاتھوں سے الگ کیا اور فرمایا کہ "عمرؓ! نرمی اختیار کرو۔" پھر عورتوں سے فرمایا کہ "تم لوگ اپنے آپ کو شیطان کی آواز سے دور رکھو (یعنی چلا چلا کر اور بیان کر کے ہرگز نہ رونا) پھر فرمایا کہ "جو کچھ آنکھوں سے (یعنی آنسو) اور دل سے (یعنی رنج و غم) ظاہر ہو یہ خدا کی طرف سے ہے اور رحمت کا سبب ہے (یعنی یہ چیزیں خدا کی پسندیدہ ہیں) اور جو کچھ ہاتھ و زبان سے ظاہر ہو وہ شیطان کی طرف سے ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ اظہار رنج و غم کے وقت جو چیزیں ہاتھوں سے ظاہر ہوتی ہیں جیسے منہ پیٹنا، کپڑے پھاڑنے اور بال نوچنے کھسوٹنے یا جو چیزیں زبان سے سرزد ہوتی ہیں جیسے چلانا و چیخنا نوحہ یعنی بین کرنا، یا زبان سے ایسی باتیں نکالنی جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہ ہوں یہ سب چیزیں شیطان کی طرف سے ہیں بایں طور کہ جب شیطان بہکاتا ہے تو یہ چیزیں صادر ہوتی ہیں اور ان چیزوں کو شیطان پسند کرتا ہے۔

ایک خاص واقعہ

(۲۸) وَعَنِ الْبُخَارِیِّ تَعْلِیْقًا قَالَ لَمَّا مَاتَ الْحَسَنُ بْنُ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیٍّ ضَرَبَتِ امْرَأَتُہُ الْقُبَّۃَ عَلٰی قَبْرِہٖ سَنَۃً ثُمَّ رُفِعَتْ

فَسَمِعَتْ صَائِحًا يَقُوْلُ اَلَاهَلْ وَجَدُوْا مَافَقَدُوْا فَاَجَابَهُ اٰخَرُ بَلْ يَئِسُوْا فَانْقَلَبُوْا۔

"اور حضرت امام بخاریؒ بطریق تعلیق (یعنی بغیر سند کے) ذکر کرتے ہیں کہ "جب حضرت حسن بن علیؓ کے صاحب زادے کہ جن کا نام بھی حسن ہی تھا کا انتقال ہوا تو ان کی بیوی نے ان کی قبر پر ایک سال تک خیمہ کھڑا رکھا پھر جب انہوں نے اکھاڑا تو ہاتف غیبی کی ندا سنی کہ "کیا خیمہ کھڑا کر کے کھوئے ہوئے کو پالیا!؟ پھر اس کے جواب میں دوسرے ہاتف غیبی کی یہ ندا سنی کہ "ناامید ہوئی اور خیمہ اکھاڑ لیا۔""

تشریح: جب حسنؓ بن علیؓ کا انتقال ہوا تو ان کی بیوی نے ان کی قبر پر ایک خیمہ کھڑا کر دیا جو سال بھر تک وہاں قائم رہا اور خود بھی ایک سال تک وہیں پڑی رہیں اس طرح شوہر کے انتقال کی مصیبت اور احساس جدائی کا غم روز ان کے دل میں تازہ ہوتا رہا۔

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر کی قبر پر خیمہ اس لئے کھڑا کیا تھا کہ ان کے دوست اور احباب ایصال ثواب اور قرآن خوانی کے لئے جمع ہو جایا کریں اور لوگ دعائے مغفرت و رحمت کے لئے آیا کریں۔

زمانہ جاہلیت کی ایک رسم اور اس پر آنحضرت کی تنبیہ

(۲۹) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ وَّاَبِىْ بَرْزَةَ قَالَا خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ جَنَازَةٍ فَرَاٰى قَوْمًا قَدْ طَرَحُوْا اَرْدِيَتَهُمْ يَمْشُوْنَ فِىْ قُمُصٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبِفِعْلِ الْجَاهِلِيَّةِ تَاْخُذُوْنَ اَوْبِصَنِيْعِ الْجَاهِلِيَّةِ تَشَبَّهُوْنَ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اَدْعُوَ عَلَيْكُمْ دَعْوَةً تَرْجِعُوْنَ فِىْ غَيْرِ صُوَرِكُمْ قَالَ فَاَخَذُوْا اَرْدِيَتَهُمْ وَلَمْ يَعُوْدُوْا لِذٰلِكَ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عمران بن حصینؓ اور حضرت ابی برزہ دونوں روایت کرتے ہیں کہ (ایک روز) ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے ہمراہ ایک جنازے کے ساتھ چلے (چنانچہ) آپ ﷺ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جنہوں نے اپنی چادریں اتار پھینکی تھیں اور کرتوں میں چل رہے تھے آنحضرت ﷺ نے (انہیں اس حال میں دیکھ کر) فرمایا کہ "کیا تم لوگ جاہلیت کے فعل پر عمل کرتے ہو۔ یا جاہلیت کے کاموں کی مشابہت اختیار کرتے ہو! پھر آپ ﷺ نے فرمایا (تمہاری یہ انتہائی نازیبا حرکت دیکھ کر) میرا تو یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے لئے کوئی ایسی بد دعا کروں کہ تم اپنے گھروں کو دوسری شکلوں میں (یعنی بندر یا سور کی شکل ہو کر) واپس پہنچو۔" راوی کہتے ہیں کہ (یہ سن کر) ان لوگوں نے (فوراً) اپنی چادریں اوڑھ لیں اور پھر دوبارہ کبھی ایسا کام نہ کیا۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ لوگ کرتوں کے اوپر چادریں اوڑھا کرتے تھے۔

بہر حال زمانہ جاہلیت کی یہ ایک رسم تھی کہ جب لوگ جنازہ کے ساتھ چلتے تو اپنی چادریں اتار دیا کرتے تھے گویا اس سے "پریشان حالی" کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "جب اتنے ذرا سے تغیر یعنی چادر اتار کر چلنے پر آنحضرت ﷺ نے اتنی شدید تنبیہ اور وعید فرمائی تو ان لوگوں کا کیا حشر ہو گا جو اس سے کہیں زیادہ بڑی رسموں کا اختیار کیئے ہوئے ہیں؟

کسی خلاف شرع چیز کی موجودگی میں جنازہ کے ساتھ جانے کی ممانعت

(۳۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُتْبَعَ جَنَازَةٌ مَعَهَا رَانَّةٌ (رواہ احمد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس جنازہ کے ہمراہ جانے سے منع فرمایا جس کے ساتھ نوحہ کرنے والی ہو۔"

(احمدؒ ابن ماجہؒ)

تشریح: اگرچہ جنازہ کے ساتھ چلنا سنّت ہے لیکن اس فعل بد کی موجودگی کی وجہ سے اس سُنّت کو ترک کر دینا چاہئے اس طرح کسی بھی

خلاف شرع چیز کی موجودگی میں جنازہ کے ساتھ نہیں جانا چاہئے۔

یہ حدیث اس مسئلہ کی بنیاد ہے کہ جس دعوت میں خلاف شرع باتیں پائی جائیں وہاں نہیں جانا چاہئے کیونکہ اگرچہ دعوت قبول کرنا سُنّت ہے لیکن ایسے موقع پر غیر شرعی باتوں اور افعال بد کی وجہ سے اس سُنّت پر عمل نہ کرنا ہی بہتر اور اولی ہوگا۔

فوت شدہ چھوٹے بچے اپنے والدین کو جنّت میں لے جائیں گے

(۳۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لَهٗ مَاتَ ابْنٌ لِّیْ فَوَجَدْتُّ عَلَیْهِ هَلْ سَمِعْتَ مِنْ خَلِیْلِكَ صَلَوٰاتُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَامُهٗ شَیْئًا یُطَیِّبُ بِاَنْفُسِنَا عَنْ مَوْتَانَا قَالَ نَعَمْ سَمِعْتُهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صِغَارُهُمْ دَعَامِیْصُ الْجَنَّةِ یَلْقٰی اَحَدُهُمْ اَبَاهُ فَیَاْخُذُ بِنَاحِیَةِ ثَوْبِهٖ فَلَا یُفَارِقُهٗ حَتّٰی یُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَ اَحْمَدُ وَ اللَّفْظُ لَهٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ (ایک دن) ان سے ایک شخص ملا اور کہنے لگا کہ "میرا (چھوٹا) بچہ مرگیا جس کی وجہ سے میں بہت غمگین ہوں کیا آپ نے اپنے دوست یعنی آنحضرت ﷺ سے کہ ان پر اللہ کی رحمتیں اور اللہ کا سلام نازل ہو کوئی ایسی بات بھی سنی ہے جو ہمارے مردوں (یعنی فوت شدہ چھوٹے بچوں) کی طرف سے ہمارے دلوں کو خوش کردے (یعنی جس سے یہ معلوم ہوا کہ ہمارے چھوٹے بچے مرگئے ہیں وہ آخرت میں ہمارے کچھ کام آئیں گے) حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ ہاں! میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "مسلمانوں کے چھوٹے بچے جنّت میں دریا کے جانور کی طرح ہوں گے، جب ان میں سے کسی کا باپ اسے ملے گا تو وہ بچہ اپنے باپ کے کپڑے کا کونہ پکڑ لے گا اور اسے اس وقت تک نہ چھوڑے گا جب تک کہ اس باپ کو جنّت میں داخل نہ کرا دیگا۔" (مسلم، احمد الفاظ احمد کے ہیں)

تشریح: "دعامیص" "دعموص" کی جمع ہے "دعموص" پانی کے ایک چھوٹے سے سیاہ جانور، (کیڑے) کو کہتے ہیں جو عام طور پر تالابوں میں پانی کم ہو جانے پر ظاہر ہوتا ہے نیز یہ جانور مستقل پانی میں نہیں رہتا ہے بلکہ وہ غوطہ طور ہوتا ہے۔ یعنی غوطہ مارتا ہے اور باہر نکل آتا ہے۔ اس جانور کو بعض جگہ جولاہا بھی کہا جاتا ہے۔

دعموص اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو سلاطین و امراء کے معاملات میں بہت زیادہ دخیل ہوتا ہے اور ان کے قوائے فکر و عمل پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔

بہرحال فوت شدہ چھوٹے بچوں کو جنّت میں (دعموص) سے بایں معنی تشبیہ دی گئی ہے کہ یہ بچے جنّت میں سیر کرتے پھرتے ہیں جس طرح دنیا میں چھوٹے بچوں سے پردہ نہیں کیا جاتا اور کسی گھر میں جانے سے نہیں روکے جاتے اور نہ انہیں کہیں جانے سے منع کیا جاتا ہے اس طرح وہ چھوٹے بچے بھی جنّت میں جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں ان کے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

اس حدیث میں بطور خاص "باپ" ہی کا ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موقعہ پر صرف باپ ہی کے بارہ میں بات چل رہی ہوگی اس لئے اس کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ تو جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلّق ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح چھوٹا بچہ اپنے باپ کو جنّت میں لے جائے گا اسی طرح اپنی ماں کو بھی جنّت میں داخل کرائے گا چنانچہ بعض حدیثوں میں ماں باپ دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

بچوں کے مرنے کا اجر

(۳۲) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ جَآءَتِ امْرَاَةٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ذَهَبَ الرِّجَالُ بِحَدِیْثِكَ فَاجْعَلْ لَنَا مِنْ نَّفْسِكَ یَوْمًا نَّاْتِیْكَ فِیْهِ تُعَلِّمُنَا مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ فَقَالَ اجْتَمِعْنَ فِیْ یَوْمِ كَذَا وَ كَذَا فِیْ مَكَانِ كَذَا وَ كَذَا فَاجْتَمَعْنَ فَاَتَاهُنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَعَلَّمَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَهُ اللّٰهُ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْكُنَّ امْرَاَةٌ تُقَدِّمُ بَیْنَ یَدَیْهَا مِنْ وَلَدِهَا ثَلَاثَةً اِلَّا كَانَ لَهَا حِجَابًا مِّنَ النَّارِ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ مِّنْهُنَّ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوِ اثْنَیْنِ فَاَعَادَتْهَا مَرَّتَیْنِ ثُمَّ

قَالَ وَاثْنَيْنِ وَاثْنَيْنِ وَاثْنَيْنِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک عورت رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگی کہ "یا رسول اللہ! مردوں نے تو آپ ﷺ کے مقدس ارشادات سے استفادہ کیا اب آپ ﷺ ایک دن ہمارے لئے بھی مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اس دن آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں اور آپ ﷺ ہمیں وہ باتیں بتائیں جو خدا نے آپ ﷺ کو بتائیں ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اچھا تم عورتیں فلاں دن فلاں وقت اور فلاں مکان میں (یعنی مسجد میں یا کسی گھر میں) اور فلاں جگہ (یعنی مسجد یا مکان کے اگلے حصہ میں یا پچھلے حصہ میں) جمع ہو جانا، چنانچہ (جب آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق عورتیں جمع ہو گئیں تو رسول کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور آپ ﷺ نے انہیں وہ باتیں سکھائیں جو خدا تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سکھائی تھیں پھر آپ ﷺ نے (یہ بھی) فرمایا کہ "تم میں سے جس نے اپنی اولاد میں سے (تین لڑکیاں یا لڑکے) بھیج دی ہوں (یعنی اس کے تین بچے مر گئے ہوں) تو وہ بچے اس کے لئے آگ سے پردہ ہو جائیں گے (یعنی اسے دوزخ میں نہ جانے دیں گے) ان میں سے ایک عورت نے یہ الفاظ دو مرتبہ کہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یا جس عورت کے دو بچے مر گئے ہوں یا یا دو یا دو (یعنی جس عورت کے تین بچے مرے ہوں اس کے لئے بھی یہ ثواب ہے اور جس عورت کے دو ہی بچے مرے ہوں اس کے لئے بھی یہی بشارت ہے۔"

(۳۳) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ مُسْلِمَيْنِ يُتَوَفّٰى لَهُمَا ثَلَاثَةٌ اِلَّا اَدْخَلَهُمَا اللّٰهُ الْجَنَّةَ بِفَضْلِ رَحْمَتِهٖ اِيَّاهُمَا فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْثِنَانِ قَالَ اَوْثِنَانِ قَالُوْا اَوْ وَاحِدٌ قَالَ اَوْ وَاحِدٌ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّ السِّقْطَ لَيَجُرُّ اُمَّهٗ بِسَرَرِهٖ اِلَى الْجَنَّةِ اِذَا احْتَسَبَتْهُ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ مِنْ قَوْلِهٖ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ۔

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جن دو مسلمانوں کے (یعنی ماں اور باپ کے) تین بچے مر جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے ان دونوں یعنی ماں باپ کو جنت میں داخل کریگا۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! یہ بھی فرما دیجئے کہ یا جن کے دو بچے بھی مر گئے ہوں (ان کے لئے بھی یہ بشارت ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں جن کے دو بچے بھی مر جائیں۔" صحابہؓ نے یہ عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! یہ بھی فرما دیجئے کہ یا ایک " آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں ایک بچہ (بھی اگر مر جائے تو اس کے والدین کے لئے یہ بشارت ہے) پھر آپ ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر کسی عورت کا کچا حمل بھی گر جائے تو وہ اپنی ماں کو اپنی آنول نال کے ذریعہ بہشت کی طرف کھینچے گا بشرطیکہ اس کی ماں صبر کرے اور اس کے مرنے کو (اپنے حق میں) ثواب شمار کرے۔" (احمدؒ) ابن ماجہؒ نے اس روایت کو والذی نفسی بیدہ سے (آخر تک نقل کیا ہے)

تشریح: "آنول نال" اس جھلی کو کہتے ہیں جو پیدا ہونے کے وقت بچہ کی ناف سے لگی ہوتی ہے۔

ارشاد گرامی لَيَجُرُّ اُمَّهٗ بِسَرَرِهٖ میں "آنول نال" سے بچہ اور اس کے ماں کے درمیان تعلق و علاقہ کی طرف اشارہ گویا آنول نال رسی کی مانند ہو جائے گی کہ جس کے ذریعہ وہ بچہ اپنی ماں کو بہشت کی طرف کھینچے گا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب اس بچہ کے مر جانے کا اتنا زیادہ ثواب ہے جو ابھی ناتمام ہی تھا اور جس سے ماں کو کوئی تعلق و لگاؤ بھی پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ تو اس بچہ کے مر جانے پر ماں کو کتنا کچھ ثواب ملے گا، جو پلا پلایا اللہ کو پیارا ہو گیا ہو اور جس سے ماں کو کمال تعلق و لگاؤ بھی پیدا نہیں ہو سکا تھا۔

(۳۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَدَّمَ ثَلَاثَةً مِّنَ الْوَلَدِ لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ كَانُوْا لَهٗ حِصْنًا حَصِيْنًا مِّنَ النَّارِ فَقَالَ اَبُوْذَرٍّ قَدَّمْتُ اثْنَيْنِ قَالَ وَاثْنَيْنِ قَالَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ اَبُو الْمُنْذِرِ سَيِّدُ الْقُرَّاءِ قَدَّمْتُ وَاحِدًا قَالَ وَوَاحِدًا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اپنی اولاد میں سے ایسے تین بچے جو حد بلوغت کو نہ پہنچے ہوں آگے بھیجے ہوں (یعنی اس کے مرنے سے پہلے مرگئے ہوں) تو وہ اس کے لئے آگ سے مضبوط پناہ ہوں گے۔" (یہ سن کر) حضرت ابوذرؓ نے کہا کہ "میں نے تو دو بچے بھیجے ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اور دو بھی" حضرت ابی بن کعبؓ نے کہ جن کی کنیت ابوالمنذر ہے اور قاریوں کے سردار ہیں کہا کہ "میں نے تو ایک ہی بھیجا ہے۔؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اور ایک بھی" (آگ سے پناہ ہوگا)۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔)

(۳۵) وَعَنْ قُرَّةَ الْمُزَنِيِّ اَنَّ رَجُلًا كَانَ يَأْتِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَهُ ابْنٌ لَهُ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتُحِبُّهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَحَبَّكَ اللّٰهُ كَمَا اُحِبُّهُ فَفَقَدَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا فَعَلَ ابْنُ فُلَانٍ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا تُحِبُّ اَنْ لَّا تَأْتِيَ بَابًا مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ اِلَّا وَجَدْتَّهُ يَنْتَظِرُكَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُ خَاصَّةً اَمْ لِكُلِّنَا قَالَ بَلْ لِكُلِّكُمْ (رواہ احمد)

"اور حضرت قرہ مزنیؓ راوی ہیں کہ ایک شخص تھا جو نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں آیا کرتا تھا اور اس کا لڑکا بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "کیا تم اسے (بہت ہی) عزیز رکھتے ہو (جو ہر وقت تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہے) اس نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! (میں اس سے اپنی محبت کو کیا بتاؤں بس) اللہ تعالیٰ آپ سے ایسی ہی محبت کرے جیسا کہ میں اپنے اس بچہ سے کرتا ہوں۔" (کچھ عرصہ کے بعد) آنحضرت ﷺ نے اس بچہ کو (اپنے باپ کے ساتھ) نہیں پایا تو پوچھا کہ "فلاں شخص کا بیٹا کیا ہوا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! اس کا لڑکا تو مرگیا۔" (اس کے بعد جب وہ شخص حاضر ہوا تو اس سے) آپ نے فرمایا کہ "کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ (کل قیامت کے روز) تم جنت کے جس دروازہ پر بھی جاؤ وہاں اپنے لڑکے کو اپنا منتظر پاؤ (تاکہ وہ تمہاری سفارش کرے اور تمہیں اپنے ساتھ جنت میں لیجائے!) ایک شخص نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! یہ بشارت بطور خاص اسی شخص کے لئے ہے یا سب کے لئے؟" آپ ﷺ نے فرمایا تم سب کے لئے ہے۔" (احمدؒ)

ناتمام بچہ بھی اپنے والدین کو جنت میں لے جائے گا

(۳۶) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ السِّقْطَ لَيُرَاغِمُ رَبَّهُ اِذَا اَدْخَلَ اَبَوَيْهِ النَّارَ فَيُقَالُ اَيُّهَا السِّقْطُ الْمُرَاغِمُ رَبَّهُ اَدْخِلْ اَبَوَيْكَ الْجَنَّةَ فَيَجُرُّهُمَا بِسَرَرِهِ حَتّٰى يُدْخِلَهُمَا الْجَنَّةَ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت علیؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ "سقط (یعنی ناتمام بچہ جو ماں کے پیٹ سے وقت سے پہلے گر گیا ہو گا) کے والدین کو دوزخ میں داخل (کرنے کا ارادہ) کرے گا تو وہ اپنے پروردگار سے جھگڑے گا چنانچہ اس سے کہا جائے گا کہ "پروردگار سے جھگڑنے والے اے ناتمام بچے! اپنی ماں باپ کو جنت میں لے جاؤ۔" لہٰذا وہ ناتمام بچہ اپنے والدین کو اپنی آنول نال کے ذریعہ کھینچے گا، یہاں تک کہ انہیں جنت میں لے جائے گا۔" (ابن ماجہؒ)

مصیبت وحادثہ پر صبر کا اجر جنت

(۳۷) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَا ابْنَ اٰدَمَ اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰى لَمْ اَرْضَ لَكَ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّةِ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوامامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ (انسان کو مخاطب کرتے ہوئے) فرماتا ہے کہ "اے ابن آدم! اگر تو (کسی مصیبت کے وقت) صبر کرے اور صدمہ کی ابتدائی مرحلہ ہی پر ثواب کا طلبگار ہو تو میں تیرے لئے جنت سے کم کسی اجر و ثواب پر راضی

نہیں ہوتا (یعنی میں تجھے اس کے بدلہ میں جنت ہی میں داخل کروں گا)۔" (ابن ماجہؒ)

استرجاع کی فضیلت

(۳۸) وَعَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ وَلَا مُسْلِمَةٍ يُصَابُ بِمُصِيْبَةٍ فَيَذْكُرُهَا وَإِنْ طَالَ عَهْدُهَا فَيُحْدِثُ لِذٰلِكَ اِسْتِرْجَاعًا اِلَّا جَدَّدَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى لَهُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَاَعْطَاهُ مِثْلَ اَجْرِهَا يَوْمَ اُصِيْبَ بِهَا (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت حسین بن علیؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس مسلمان مرد و عورت کو کوئی مصیبت و صدمہ پہنچے اور خواہ کتنا ہی طویل زمانہ گزر جانے کے بعد وہ مصیبت و صدمہ یاد آجائے اور وہ اس وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ثواب ثابت کر دیتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اسے وہی اجر و ثواب عطا فرماتا ہے جو اس دن عطا کیا گیا تھا جب کہ وہ اس مصیبت و صدمہ سے دوچار ہوا تھا (اور اس پر صبر کیا تھا)۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

(۳۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْقَطَعَ شِسْعُ اَحَدِكُمْ فَلْيَسْتَرْجِعْ فَاِنَّهُ مِنَ الْمَصَائِبِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ "رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کسی شخص کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اسے چاہئے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھے کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہی ہے۔"

تشریح: غالباً جوتے کا تسمہ ٹوٹنے سے معمولی مصیبت و تکلیف مراد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی معمولی درجہ کی بھی تکلیف و مصیبت پہنچے تو انا للہ پڑھنی چاہئے چنانچہ ایک روایت میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ اچانک چراغ بجھ گیا تو آنحضرت ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی۔

نعمت پر شکر اور مصیبت پر صبر اُمّت مرحومہ کا وصف عظیم

(۴۰) وَعَنْ اُمِّ الدَّرْدَاءِ قَالَتْ سَمِعْتُ اَبَا الدَّرْدَاءِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ يَا عِيْسٰى اِنِّيْ بَاعِثٌ مِنْ بَعْدِكَ اُمَّةً اِذَا اَصَابَهُمْ مَا يُحِبُّوْنَ حَمِدُوا اللّٰهَ وَاِنْ اَصَابَهُمْ مَا يَكْرَهُوْنَ احْتَسَبُوْا وَصَبَرُوْا وَلَا حِلْمَ وَلَا عَقْلَ فَقَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ يَكُوْنُ هٰذَا لَهُمْ وَلَا حِلْمَ وَلَا عَقْلَ قَالَ اُعْطِيْهِمْ مِنْ حِلْمِيْ وَعِلْمِيْ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ

"اور حضرت اُم درداؓ کہتی ہیں کہ میں نے حضرت ابودرداؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت ابوالقاسم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ تبارک و تعالیٰ نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ اے عیسیٰ! میں تمہارے بعد ایک اُمت پیدا کروں گا جب انہیں کوئی پسندیدہ چیز (یعنی نعمت و راحت) ملے گی تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے اور جب کوئی ناپسندیدہ چیز (یعنی تکلیف و مصیبت) پہنچے گی تو ثواب کی امید رکھیں گے اور صبر کریں گے درانحالیکہ نہ تو (کسی یا کامل) عقل ہوگی اور نہ بردباری۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا "اے میرے پروردگار! یہ کیوں کر ہوگا جب کہ نہ عقل ہوگی نہ بردباری! پروردگار نے فرمایا "میں انہیں اپنی بردباری اور اپنے علم میں سے "کچھ حصہ) دے دوں گا۔" (یہ دونوں روایتیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں۔"

تشریح: "یہاں "امت" سے نبی کریم ﷺ کے نیک و فرمانبردار اور صلحا مراد ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد نہ عقل ہوگی نہ بردباری کا مطلب یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ مصیبت و تکلیف کی وجہ سے بردباری و عقل جاتی رہے گی، لیکن مصیبت و تکلیف پر صبر کریں گے اور ثواب

کے طلب گار ہوں گے یعنی بردباری اور عقل یہ دونوں ایسے وصف ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان مصیبت و حادثہ کے وقت جزع و فزع اور بے صبری اختیار کرنے سے باز رہتا ہے اور یہ جان کر صبر و سکون کے دامن کو پکڑے رہتا ہے کہ نفع و نقصان اور تکلیف و راحت سب کچھ اللہ رب العزت ہی کی طرف سے ہے لہٰذا ان دونوں اوصاف کے نہ ہونے کے باوجود صبر و سکون کے دامن کو پکڑے رہنا قابل تعجب بات ہے؟ چنانچہ اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ جب بردباری اور عقل ہی کا فقدان ہوگا تو پھر صبر کرنا کیسے ممکن؟ اور پھر ثواب کی امید کے کیا معنی؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس اشکال اور ان کی اس حیرت کا جواب بارگاہ الوہیت سے یہ دیا گیا کہ "ایسے مواقع پر اُمت مرحومہ کے افراد کی راہنمائی، عقل و دانش اور حلم و بردباری کا وہ نور کرے گا جو کسبی نہیں ہوگا بلکہ میں اپنے پاس سے عقل و بردباری کی دولت بلا کسب عطا کروں گا جس کی وجہ سے بڑی سے بڑی مصیبت پر وہ صبر کریں گے اور ثواب کے امیدوار ہوں گے۔

بَابُ زِیَارَةِ الْقُبُوْرِ

قبروں کی زیارت کرنے کا بیان

یہاں مذکورہ بالا عنوان قائم کر کے وہ احادیث و آثار نقل کیئے جا رہے ہیں جن سے قبروں پر جانے کی فضائل و آداب اور اس سے متعلق احکام و مسائل معلوم ہونگے نیز یہ بتایا جائے گا کہ قبروں پر جانے کا مقصد کیا ہے اور وہاں جانے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

زیارت قبور مستحب ہے

(۱) عَنْ بُرَیْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهَیْتُكُمْ عَنْ زِیَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا وَنَهَیْتُكُمْ عَنْ لُحُوْمِ الْاَضَاحِیِّ فَوْقَ ثَلَاثٍ فَاَمْسِكُوْا مَابَدَا لَكُمْ وَنَهَیْتُكُمْ عَنِ النَّبِیْذِ اِلَّا فِیْ سِقَآءٍ فَاشْرَبُوْا فِی الْاَسْقِیَةِ كُلِّهَا وَلَا تَشْرَبُوْا مُسْكِرًا (رواہ مسلم)

"حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "پہلے تو) میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھے مگر (اب) تم قبروں کی زیارت کر لیا کرو، اسی طرح میں نے قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ (رکھ کر) کھانے کو منع کیا تھا اور اب تم جب تک چاہو اسے کھاؤ نیز میں نے نبیذ کو سوائے مشک کے دوسرے برتنوں میں رکھ کر پینے سے منع کیا تھا، اب تم (جن برتنوں میں چاہو) سب میں پی لیا کرو لیکن نشہ کی کوئی چیز (کبھی نہ پینا۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے ابتداء اسلام میں قبروں پر جانے سے منع فرمایا دیا تھا کیونکہ زمانہ جاہلیت قریب تھا اس لئے یہ اندیشہ ہوا کہ شاید لوگ قبروں پر جا کر کفر و شرک کی باتیں نہ کرنے لگیں جب آپ نے دیکھ لیا کہ اسلام نے دلوں میں رسوخ حاصل کر لیا ہے تو آپ ﷺ نے زیارت قبور کی اجازت دیدی، لہٰذا تمام علماء کے نزدیک قبروں کی زیارت مستحب ہے کیونکہ قبروں پر جانے سے دل میں نرمی آتی ہے، موت یاد آتی ہے اور دل و دماغ اس عقیدہ پر پختہ ہوتے ہیں کہ دنیا فانی ہے اس کے علاوہ اور بہت سے فائدے ہیں پھر سب سے بہتر فائدہ یہ بھی ہے کہ قبروں پر جانے سے مردوں کے لئے رحمت و مغفرت کی دعا کا موقع ملتا ہے جو سُنّت ہے، چنانچہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ بقیع تشریف لے جاتے اور وہاں کے مردوں پر سلام پیش فرماتے نیز ان کے لئے دعائے مغفرت فرماتے۔

عورتوں کے لئے زیارت قبور کا مسئلہ

اس بارہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ ابتداء اسلام میں زیارت قبور کے بارہ میں جو ممانعت فرمائی گئی تھی وہ عورتوں کے حق میں اب بھی باقی ہے یا مردوں کی طرح ان کو یعنی قبروں پر جانے کی اجازت دی گئی ہے (بعض حضرات کی رائے ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی قبروں پر جانا درست ہے مگر دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کے لئے درست نہیں ہے لہٰذا اس سلسلہ میں صحیح مسئلہ یہ ہے کہ عورتوں کے لئے صرف نبی کریم ﷺ کے روزہ مطہرہ کی زیارت تو جائز ہے لیکن اس کے علاوہ دوسری قبروں پر جانا ان کے لئے درست نہیں ہے چنانچہ باب الصلوٰۃ کی حدیث لعن رسول اللہ زائرات القبور الخ کی تشریح کے ضمن میں تفصیلی طور یہ مسئلہ مع فقہی روایتوں کے بیان کیا جا چکا ہے۔

زیارت قبور کی قسمیں

مقصد کے اعتبار سے قبروں پر جانے کی کئی قسمیں ہیں۔ ① محض موت کو یاد کرنے اور آخرت کی طرف توجہ کے لئے اس مقصد کے تحت صرف قبروں کو دیکھ لینا ہی کافی ہے خواہ قبر کسی کی بھی ہو یہ ضروری نہیں ہے کہ صاحب قبر کے بارہ میں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون تھا اور کیسا تھا؟ ② دعاء مغفرت اور ایصال ثواب وغیرہ کے لئے یہ ہر مسلمان کے لئے مسنون ہے ③ حصول برکت وسعادت کی خاطر اس مقصد کے تحت اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کی جاتی ہے کیونکہ برزخ میں بزرگان دین اولیاء اللہ کے تصرفات اور ان کی برکتیں بے شمار ہیں۔ ④ عزیز و دوست کے ادائے حق کے لئے۔ یعنی کسی اپنے عزیز مثلاً والدین یا دوست کی قبر پر اس مقصد کے تحت جانا کہ وہاں پہنچ کر ان کے لئے دعاء مغفرت و ایصال ثواب کرنا اپنے اوپر ان کا حق ہے چنانچہ حدیث ابونعیم میں منقول ہے کہ جو شخص اپنے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک قبر کی زیارت جمعہ کے روز کرے تو اس کا یہ فعل حج کے برابر ہوتا ہے۔ ⑤ دینی اخوت و محبت اور انس و مہربانی کے تحت جیسا کہ ایک حدیث میں منقول ہے کہ "جب کوئی شخص اپنے کسی بھی مؤمن بھائی کی قبر پر گزرتا ہے اور وہاں سلام و دعاء مغفرت وغیرہ پیش کرتا ہے تو مردہ اس شخص کو پہچانتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

قبروں پر جانے کے آداب و احکام

قبروں پر جانے کے کچھ آداب و احکام میں جو شریعت نے بتائے ہیں مثلاً ① جب کوئی شخص دعاء مغفرت و ایصال ثواب کی خاطر کسی کی قبر پر جائے تو وہاں صاحب قبر کے منہ کے سامنے اس طرح کھڑا ہو کہ منہ تو قبر کی طرف پشت قبلہ کی طرف ہو۔ ② قبر پر پہنچ کر صاحب قبر کو سلام پیش کرے۔ ③ قبر کو ہاتھ نہ لگائے ④ قبر کو چومے نہیں۔ ⑤ قبر کے سامنے تعظیمانہ جھکے اور نہ قبر کو سجدہ کرے ⑥ قبر کی مٹی منہ پر نہ ملے کہ نصاری کی عادت ہے۔"

ان احکام و آداب کے علاوہ ایسی چیزیں اختیار کرنا جن کا شریعت میں کوئی وجود نہیں ہے انتہائی گمراہی اور ضلالت کی بات ہے۔

قبر کے پاس قرآن کریم کی تلاوت مکروہ نہیں ہے، نیز یہ مستحب ہے کہ جب کوئی شخص مرجائے تو وہاں صورت اخلاص سات مرتبہ پڑھ کر اس کا ثواب صاحب قبر کو بخش دے۔ دوسرے دنوں کی بنسبت جمعہ کے روز خصوصاً دن کے ابتدائی حصہ میں قبر پر جانا افضل ہے چنانچہ حرمین شریف میں یہی معمول رہا ہے کہ لوگ جمعہ کے دن کے ابتدائی حصہ میں معلّیٰ اور بقیع میں زیارت قبور کے لئے جایا کرتے تھے۔ نیز منقول ہے کہ دوسرے دنوں کی بنسبت جمعہ کے روز میت کو زیادہ علم اور ادراک دیا جاتا ہے اور وہ جمعہ کے روز اپنی قبر پر آنے والوں کو دوسرے دنوں کی بہ نسبت زیادہ پہچانتا ہے جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ قبروں کو بغیر ضرورت روندنا (یعنی انہیں پامال کرنا یا ان پر چلنا) مکروہ ہے یہ مستحب ہے کہ مرنے کے بعد سات دن تک میت کی طرف سے خدا کے نام پر کچھ خرچ کیا جاتا ہے۔

وَهَيْتُكُمْ عَنْ لُحُوْمِ الْاَضَاحِي کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں مسلمانوں کے پاس مال و دولت اور اسباب معیشت کی فراخی

نہیں تھی اکثر لوگ چونکہ تنگ دست تھے اس لئے ہر شخص قربانی نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے قربانی کرنے والوں سے فرمادیا تھا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھ کر نہ کھایا کریں بلکہ تنگ دست اور غریب لوگوں میں تقسیم کر دیا کریں مگر جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مال و دولت اور اسباب معیشت کی وسعت بخشی اور ان کی تنگدستی اور مفلسی کا دور ختم ہو گیا جس کی وجہ سے انہیں دوسروں کے قربانی کے گوشت کی ضرورت و حاجت نہ رہی تو پھر آپ ﷺ نے اجازت دے دی کہ قربانی کا گوشت جتنے دن بھی چاہیں رکھ سکتے ہیں۔

"نبیذ" ایک مخصوص قسم کا شراب ہوتا ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کھجور یا انگور پانی میں ڈال لیتے ہیں اور انہیں چند روز تک اسی طرح پانی میں رہنے دیا جاتا ہے جس کے بعد وہ ایک شراب سا بن جاتا ہے، یہ نبیذ اس وقت تک حلال ہے جب تک کہ اس میں نشہ نہ پیدا ہو جائے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ابتداء اسلام میں مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ نبیذ مشک میں رکھی جایا کرے کیونکہ مشک پتلی ہوتی ہے اس میں رکھی ہوئی نبیذ جلد ہی گرم ہو کر نشہ آور نہیں ہوتی۔ دوسرے برتنوں میں نبیذ رکھنے سے آپ ﷺ نے منع فرمادیا مثلاً لاکھ کیئے ہوئے برتنوں وغیرہ میں نبیذ نہ رکھی جائے کیونکہ اس قسم کے برتنوں میں رکھی ہوئی نبیذ جلد ہی گرم ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے اس میں نشہ پیدا ہو جاتا تھا اور چونکہ اس وقت کچھ عرصہ پہلے ہی شراب حرام ہوئی تھی اور لوگ ہنوز شراب کی لذت نہیں بھولے تھے اس لئے خدشہ تھا کہ کہیں لوگ اس طرح آہستہ آہستہ پھر شراب کی طرف متوجہ نہ ہونے لگیں اس کے بعد جب شراب کی حرمت کا حکم پوری طرح لوگوں کے دل میں بیٹھ گیا اور شراب سے کلیۃً اجتناب لازم ہو گیا نیز اس بات کا کوئی احتمال باقی نہیں رہا کہ اب لوگوں کی خواہشات پھر شراب کی طرف کسی بھی حیثیت سے مبذول ہو سکتی ہیں تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی کہ کسی بھی برتن میں نبیذ پی جا سکتی ہے تاہم آپ ﷺ نے پھر بھی تاکید فرمادی کہ نبیذ اس وقت تک پینی جائز ہو گی جب تک کہ اس میں نشہ کا شائبہ بھی نہ پایا جائے جیسا کہ حدیث کے آخری الفاظ ولا تشربوا مسکرا سے یہ بات واضح ہو رہی ہے اور جس کا حاصل یہی ہے کہ ممانعت کا تعلق نشہ سے ہے برتن سے نہیں ہے برتن سے ممانعت تو اس وقت صرف احتیاط کے پیش نظر کی گئی تھی اصل مقصد اس وقت بھی یہی تھا کہ لوگوں کا رجحان نشہ کی طرف دوبارہ مائل نہ ہونے پائے۔

آنحضرت ﷺ اپنی والدہ کی قبر پر

② وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ زَارَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَبْرَ اُمِّهٖ فَبَکٰی وَاَبْکٰی مَنْ حَوْلَهٗ فَقَالَ اسْتَاذَنْتُ رَبِّیْ فِیْ اَنْ اَسْتَغْفِرَ لَهَا فَلَمْ یُؤْذَنْ لِیْ وَاسْتَاذَنْتُهٗ فِیْ اَنْ اَزُوْرَ قَبْرَهَا فَاُذِنَ لِیْ فَزُوْرُوا الْقُبُوْرَ فَاِنَّهَا تُذَکِّرُ الْمَوْتَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ اپنی والدہ محترمہ کی قبر پر تشریف لے گئے تو آپ ﷺ روئے اور ان لوگوں کو بھی رلایا جو آپ ﷺ کے ہمراہ تھے پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے اپنے پروردگار سے اس بات کی اجازت چاہی تھی کہ اپنی والدہ کے لئے بخشش چاہوں مگر مجھے اس کی اجازت نہیں دی گئی پھر میں نے اپنے پروردگار سے اس بات کی اجازت مانگی کہ اپنی والدہ کی قبر پر حاضری دوں تو مجھے اس کی اجازت فرمادی گئی لہٰذا تم قبروں پر جایا کرو کیونکہ قبروں پر جانا موت کو یاد دلاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: سرکار دو عالم ﷺ کی والدہ محترمہ کا نام آمنہ تھا، جب نبی کریم ﷺ کی عمر صرف چھ سال کی تھی تو حضرت آمنہ آپ ﷺ کو لے کر اپنے ننھیال کے لوگوں سے ملاقات کرنے مدینہ منورہ تشریف لے گئیں جب وہ مدینہ سے مکہ واپس آنے لگیں اور "ابواء" پہنچیں جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے تو وہیں ان کا انتقال ہو گیا اور اسی جگہ انہیں دفن کر دیا گیا، چنانچہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ان کی قبر پر تشریف لے گئے تو اپنی والدہ کی جدائی کے غم میں اس قدر روئے کہ آپ کو روتا دیکھ کر وہ لوگ بھی ضبط نہ کر سکے جو آپ ﷺ کے ہمراہ تھے چنانچہ آپ ﷺ کے آنسوؤں نے انہیں اتنا متاثر کہ وہ سب لوگ بھی رونے لگے۔

آنحضرت ﷺ کے والدین

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی والدہ کا انتقال حالت کفر میں ہوا تھا چنانچہ پہلے زمانہ کے علماء کا یہی خیال ہے لیکن بعد کے علماء نے آنحضرت ﷺ کے والدین کا اسلام ثابت کیا ہے پھر اس کی بھی تین صورتیں بیان کی ہیں کہ یا تو وہ حضرت ابراہیم ﷺ کے دین پر قائم تھے یا انہیں اسلام کی دعوت ہی نہیں پہنچی اور وہ ایام فترت میں تھے اور اسی میں زمانہ نبوت سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا اور یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آنحضرت ﷺ کی دعا سے (معجزہ کے طور پر) اتنی دیر کے لئے زندہ کر دیا کہ وہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آئے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے والدین کے دوبارہ زندہ ہونے کے بارہ میں جو حدیث منقول ہے وہ بذاتہ ضعیف ہے لیکن تعدد طرق کے ذریعہ اس کی تصحیح و تحسین کی گئی ہے۔ یہ بات گویا پہلے زمانہ کے علماء سے چھپی ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے بعد کے علماء پر اسے ظاہر کر دیا چنانچہ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اس بارہ میں رسالے تصنیف کیئے ہیں اور اس مسئلہ کو دلائل سے ثابت کر کے مخالفین کے شبہات کے جواب دیئے ہیں۔

بہر حال! یہ مسئلہ چونکہ بہت زیادہ نازک ہے اس لئے علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ اس بارہ میں خاموشی اختیار کی جائے، یہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے وہی بہتر جانتا ہے۔"

قبرستان پہنچ کر کیا کہا جائے

(۴۳) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُهُمْ إِذَا خَرَجُوْا إِلَى الْمَقَابِرِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ مسلمانوں کو سکھایا کرتے تھے کہ وہ جب قبرستان جائیں تو وہاں یہ کہیں اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَلَاحِقُوْنَ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ سلامتی ہو تم پر اے گھر والے مؤمنین و مسلمین سے! یقیناً ہم بھی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تم سے ضرور ملیں گے ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے عافیت (یعنی مکروہات سے نجات) مانگتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے قبروں کو "گھر" اس لئے فرمایا ہے کہ جس طرح زندہ انسان اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں اسی طرح مردے اپنی اپنی قبروں میں رہتے ہیں۔

اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُسْلِمِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَهْلَ الدِّيَارِ کا بیان اور اس کی وضاحت ہے اسی طرح والمسلمین من المؤمنین کی تاکید کے لئے استعمال فرمایا گیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

(۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقُبُوْرٍ بِالْمَدِيْنَةِ فَاَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ

"حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ مدینہ کے قبرستان سے گزرے تو آپ ﷺ قبروں کی طرف روئے مبارک کر کے متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ اے قبر والو! تمہاری خدمت میں سلام پیش ہے اور اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے تم ہم میں سے پہلے پہنچے ہوئے ہو اور ہم بھی تمہارے پیچھے آنے ہی والے ہیں۔" (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے)

تشریح: حدیث کے الفاظ آپ ﷺ قبروں کی طرف اپنا روئے مبارک کر کے متوجہ ہوئے" میں اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی شخص اہل قبور پر سلام پیش کرے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ اس وقت اس کا منہ میت کے منہ کے سامنے ہو، اسی طرح جب دعاء مغفرت و فاتحہ خوانی وغیرہ کے لئے قبر پر کھڑا ہو تو اپنا منہ میت کے سامنے رکھے چنانچہ علماء و مجتہدین کا یہی مسلک ہے اور اسی کے مطابق تمام مسلمانوں کا عمل ہے صرف علامہ ابن حجرؒ اس کے خلاف ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک مستحب ہے کہ قبر پر حاضر ہونے والا دعائے مغفرت وفاتحہ خوانی کے وقت اپنا منہ قبلہ کی طرف رکھے۔"

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ کسی میت کی زیارت اس کی زندگی کی ملاقات کی طرح ہے لہٰذا جس طرح کسی شخص کی زندگی میں اس سے ملاقات کے وقت اپنا منہ اس کے منہ کی طرف متوجہ رکھا جاتا ہے اس طرح اس کے مرنے کے بعد اس کی میت یا اس کی قبر کی زیارت کے وقت بھی اپنا منہ اس کے منہ کے سامنے رکھا جائے پھر یہ کہ کسی بھی میت کے سامنے وہی طریقہ و آداب ملحوظ رہنے چاہئیں جو اس کی زندگی میں نشست و برخاست کے وقت ملحوظ ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کی ملاقات کے وقت جو اپنے کمالات و فضائل کی بنا پر عظیم المرتبت و رفیع القدر تھا ادب و احترام کے پیش نظر اس کے بالکل قریب نہیں بیٹھتا تھا بلکہ اس سے کچھ فاصلہ پر بیٹھتا تھا تو اب اس کی میت یا اس کی قبر کی زیارت کے وقت بھی وہ فاصلہ سے کھڑا رہے یا بیٹھے اور اگر اس کی زندگی میں بوقت ملاقات اس کے قریب بیٹھتا تھا تو جب اس کی میت یا قبر کی زیارت کرے تو اس کے قریب ہی کھڑا ہو یا بیٹھے۔"

جب کسی قبر کی زیارت کی جائے تو اس وقت سورہ فاتحہ اور قل ہو اللہ احد تین مرتبہ پڑھے اور اس کا ثواب میت کو بخش کر اس کے لئے دعائے مغفرت کرے، لیکن اتنی بات بہر صورت ملحوظ رہے کہ زیارت قبر کے وقت نہ تو قبر کو ہاتھ لگائے اور نہ بوسہ دے کیونکہ یہ نصاریٰ کی عادت ہے، اس طرح قبر کو سجدہ کرنا، قبر کے سامنے رکوع کرنا اور قبر کا طواف کرنا بھی انتہائی سخت گناہ ہے اور دعوی ایمان و اسلام کے خلاف ہے ان باتوں سے اجتناب ضروری ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ آخری شب میں قبرستان تشریف لے جاتے تھے

⑤ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلَّمَا كَانَ لَيْلَتُهَا مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ مِنْ اٰخِرِ اللَّيْلِ اِلَى الْبَقِيْعِ فَيَقُوْلُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَاَتَاكُمْ مَّا تُوْعَدُوْنَ غَدًا مُّؤَجَّلُوْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَهْلِ بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ (رواہ مسلم)

"ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جس رات کو نبی کریم ﷺ کی باری میرے یہاں ہوتی تھی آپ ﷺ آخری شب میں اٹھ کر (مدینہ کے قبرستان) بقیع تشریف لے جاتے اور وہاں فرماتے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَاَتَاكُمْ مَّا تُوْعَدُوْنَ غَدًا مُّؤَجَّلُوْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَهْلِ بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ سلامتی ہو تم پر اے مؤمنین! تمہارے پاس وہ چیز آئی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا (یعنی ثواب وعذاب) کل کو (یعنی قیامت کے دن کو) تمہیں (ایک معین مدت تک) مہلت دی گئی ہے اور یقیناً ہم بھی اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم سے ملنے ہی والے ہیں۔ اے اللہ! بقیع غرقد والوں کو بخش دے۔" (مسلم)

تشریح: مدینہ کی ایک جگہ کا نام بقیع ہے اس میں مدینہ والوں کی قبریں ہیں اسی قبرستان کو جنت البقیع بھی کہا جاتا ہے اس جگہ غرقد کے درخت بہت تھے۔ اس لئے اس کو دعائے مغفرت میں (بقیع غرقد) فرمایا گیا۔

قبرستان پہنچ کر کیا کہا جائے

(۶) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَيْفَ اَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تَعْنِىْ فِىْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ قَالَ قُوْلِىْ اَلسَّلَامُ عَلٰى اَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاخِرِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میں کس طرح کہوں؟ یعنی زیارت قبور کے وقت کیا کہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کہا کرو۔" اَلسَّلَامُ عَلٰى اَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاخِرِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ سلامتی ہو مؤمنین و مسلمین میں سے گھر والوں پر اللہ ان پر رحم کرے جو ہم میں سے پہلے تھے اور ان پر بھی اپنی رحمت کا سایہ کرے جو ہم میں سے بعد میں آنے والے ہیں یقیناً ہم بھی اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم سے ملنے والے ہی ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت منقول ہے کہ:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی اپنے ایسے مؤمن بھائی کی قبر پر پہنچے جسے وہ دنیا میں جانتا پہچانتا تھا پھر اس پر سلام پیش کرے تو صاحب قبر اسے پہچانتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔"

ماں باپ کی قبروں پر جانے کا حکم اور اس کی فضیلت

(۷) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ النُّعْمَانِ يَرْفَعُ الْحَدِيْثَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ زَارَ قَبْرَ اَبَوَيْهِ اَوْ اَحَدِهِمَا فِىْ كُلِّ جُمُعَةٍ غُفِرَلَهُ وَكُتِبَ بَرًّا۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت محمد بن نعمانؒ یہ حدیث نبی کریم ﷺ تک پہنچاتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص ہر جمعہ کے روز (یا ہفتہ میں کسی بھی دن) اپنے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کی قبر پر جائے (اور وہاں ان کے لئے دعاء مغفرت و ایصال ثواب کرے، تو اس کی مغفرت کی جاتی ہے اور اسے (نامۂ اعمال) اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے والا لکھا جاتا ہے۔" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

زیارت قبور کی اجازت اور اس کی علّت

(۸) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا تُزَهِّدُ فِى الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "میں نے (پہلے) تمہیں قبروں پر جانے سے منع کیا تھا (مگر اب) تم قبروں پر جایا کرو، کیونکہ قبروں پر جانا دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتا ہے اور آخرت کی یاد دلاتا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث میں گویا قبروں پر جانے کی علت بیان فرمائی جارہی ہے کہ قبروں پر کیوں جانا چاہئے؟ چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ قبروں پر جانا درحقیقت انسان کے دل و دماغ میں دنیا اور دنیا کی چیزوں سے بے رغبتی کا احساس پیدا کرتا ہے کہ جب انجام کار یہی ہے تو دنیا میں دل لگانا اور اپنی زندگی پر گھمنڈ کرنا بے کار ہے چنانچہ بڑے بڑے انسان اس دنیا میں پیدا ہوئے کسی نے اپنی سلطنت و حکومت کا سہارا لے کر خدائی دعویٰ کیا، کسی نے طاقت و دولت کے نشہ میں اپنی برتری و سطوت کا مظاہرہ کیا، کسی نے سائنس و ایجادات کے فریب میں قدرت سے مقابلہ کی ٹھانی اور کسی نے جاہ اقتدار کے بل بوتہ پر امن و سکون کے لالہ زاروں کو دہکتی ہوئی جہنم اور بہتے ہوئے خون کے دریا میں تبدیل کر دیا مگر انجام؟

ہاہ! جب انہیں مٹی کے تودوں میں دبایا گیا تو کوئی نام لیوا نہ رہا جب ان کی لاشوں کو دریا کی آغوش میں ڈال دیا گیا تو موجوں کے ایک ہی

تھپیڑے نے غرور نخوت کے مجسمہ کو دریائی جانوروں کے منہ میں پہنچادیا اور جب ان کے جسم کو آگ کے شعلوں کے حوالے کر دیا گیا تو بیچارگی وبے مائیگی بے اختیار مسکرا اٹھی۔

قبروں پر جانے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ "آخرت کی یاد دلاتا ہے" یعنی قبروں پر پہنچ کر یہ احساس پیدا ہوجاتا ہے کہ اس عالم کے علاوہ ایک عالم اور ہے جہاں جانا ہے اور وہاں جاکر اس عالم کے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قبرستان پہنچ کر قبروں کو عبرت کی نظروں سے دیکھا جائے اور موت کو یاد کیا جائے کہ موت کی یاد ہی درحقیقت دنیاوی لذتوں کے فریب کا پردہ چاک کرنے والی اور گناہوں و معصیت کی ہر کدورت کو صاف کرنے والی ہے۔

عورتوں کو قبروں پر جانے کی ممانعت

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ وَّقَالَ قَدْ رَاٰی بَعْضُ اَهْلِ الْعِلْمِ اَنَّ هٰذَا کَانَ قَبْلَ اَنْ یُّرَخِّصَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ زِیَارَةِ الْقُبُوْرِ فَلَمَّا رَخَّصَ دَخَلَ فِیْ رُخْصَتِهِ الرِّجَالُ وَالنِّسَآءُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّمَا کَرِهَ زِیَارَةَ الْقُبُوْرِ لِلنِّسَآءِ لِقِلَّةِ صَبْرِهِنَّ وَکَثْرَةِ جَزْعِهِنَّ تَمَّ کَلَامُهٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قبروں پر زیادہ جانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور حضرت امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے نیز انہوں نے فرمایا کہ "بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ یہ (یعنی قبروں پر جانے والی عورتوں پر آنحضرت ﷺ کا لعنت فرمانا) اس وقت تھا جب کہ آپ ﷺ نے قبروں پر جانے کی اجازت عطا فرمادی تو اس اجازت میں مرد و عورت دونوں شامل ہوگئے۔" اس کے برخلاف بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں میں صبر و تحمل کے مادہ کی کمی اور جزع و فزع یعنی رونے دھونے) کی زیادتی کی وجہ سے ان کے قبروں پر جانے کو ناپسند فرمایا ہے۔ (لہٰذا عورتوں کے لئے یہ ممانعت اب بھی باقی ہے) ترمذیؒ کی بات پوری ہوئی۔"

میت کا وہی لحاظ ہونا چاہئے جو اس کی زندگی میں ہوتا تھا

⑩ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کُنْتُ اَدْخُلُ بَیْتِیَ الَّذِیْ فِیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاِنِّیْ وَاضِعٌ ثَوْبِیْ وَاَقُوْلُ اِنَّمَا هُوَ زَوْجِیْ وَاَبِیْ فَلَمَّا دُفِنَ عُمَرُ مَعَهُمْ فَوَاللّٰهِ مَا دَخَلْتُهٗ اِلَّا وَاَنَا مَشْدُوْدَةٌ عَلَیَّ ثِیَابِیْ حَیَآءً مِّنْ عُمَرَ (رواہ احمد)

"اور حضرت عائشہ صدیقہ اُمّ المؤمنینؓ فرماتی ہیں کہ "جب میں اس حجرہ مبارک میں جایا کرتی تھی جس میں رسول کریم ﷺ (اور حضرت ابوبکر صدیقؓ) مدفون تھے تو میں (اپنے بدن سے) کپڑا (یعنی چادر) اتار کر رکھ دیتی تھی اور (دل میں) کہا کرتی تھی کہ یہاں میرے خاوند (آنحضرت ﷺ) اور میرے باپ (حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی تو مدفون ہیں (اور یہ دونوں میرے لئے اجنبی نہیں ہیں تو پھر حجاب کیسا؟) مگر جب (اس حجرہ میں) ان کے ساتھ حضرت عمر فاروقؓ کو دفن کر دیا گیا تو خدا کی قسم! میں اس حجرہ میں جب بھی داخل ہوتی تھی، حضرت عمرؓ سے حیا کی وجہ سے (کہ وہ اجنبی تھے) اپنے بدن پر کپڑے لپیٹے رکھتی۔" (احمدؒ)

تشریح: یہ حدیث بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات کی دلیل پیش کر رہی ہے کہ زیارت میت و قبور کے وقت وہی لحاظ ہونا چاہئے جو اس کی زندگی میں ہوتا تھا، چنانچہ اس بارہ میں ایک صحابی حضرت عقبہ بن عامرؓ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

"اگر میں آگ پر چلوں یا تلوار کی تیز دھار پر اپنا پیر رکھ دوں جس کے نتیجہ میں میرا پیر (جل) کٹ جائے تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے بہ نسبت اس چیز کے کہ میں کسی شخص کی قبر پر چلوں، اور میرے نزدیک قبروں پر پیشاب کرنے اور بھرے بازار میں لوگوں کی نظروں کے

سامنے پیشاب کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

اسی طرح حضرت ابن ابی الدینا نے حضرت سلیم بن غفیر کے بارہ میں یہ نقل کیا ہے کہ:

ایک مرتبہ وہ کسی قبرستان سے گزر رہے تھے کہ انہیں پیشاب کی شدید حاجت ہوئی (ان کی کیفیت دیکھ کر) لوگوں نے کہا کہ "سواری سے اتر کہ یہیں پیشاب کیوں نہیں کر لیتے!"؟ انہوں نے فرمایا کہ "سبحان اللہ! (کیسی غلط بات کہہ رہے ہو) خدا کی قسم! میں مردوں سے اسی طرح حیا کرتا ہوں جس طرح زندوں سے حیا کرتا ہوں۔"

الحمد للہ کتاب الصلوٰۃ اور کتاب الجنائز ختم ہوئیں۔

صلی اللّٰہ تعالٰی علی خیر خلقه محمد و اله و اصحابه اجمعین ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم

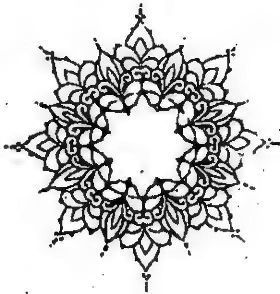

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الزکوۃ

زکوٰۃ کا بیان

"زکوٰۃ کے لفظی معنی ہیں "طہارت و برکت اور بڑھنا" اصطلاح شریعت میں زکوٰۃ کہتے ہیں اپنے مال کی مقدار متعیّن کے اس حصہ کا کہ جو شریعت نے مقرر کیا ہے کسی مستحق کو مالک بنا دینا" زکوٰۃ کے لغوی معنی اور اصطلاحی معنی دونوں کو سامنے رکھ کر یہ سمجھ لیجئے کہ یہ فعل (یعنی اپنے مال کی مقدار متعیّن کے ایک حصہ کا کسی مستحق کو مالک بنا دینا) مال کے باقی ماندہ حصے کو پاک کر دیتا ہے اس میں حق تعالےٰ کی طرف سے برکت عنایت فرمائی جاتی ہے اور اس کا وہ مال نہ صرف یہ کہ دنیا میں بڑھتا اور زیادہ ہوتا ہے بلکہ اخروی طور پر اللہ تعالیٰ اس کے ثواب میں اضافہ کرتا ہے اور اس کے مالک کو گناہوں اور دیگر بری خصلتوں مثلاً بخل وغیرہ سے پاک وصاف کرتا ہے اس لئے اس فعل کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

"زکوٰۃ" کو صدقہ بھی اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ فعل اپنے مال کا ایک حصہ نکالنے والے کے دعوائے ایمان کی صحت وصداقت پر دلیل ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کب فرض ہوئی: صدقہ فطر ۲ھ ہجری میں واجب کیا گیا تھا زکوٰۃ کی فرضیت کے بارہ میں اگرچہ علماء کے یہاں اختلافی اقوال ہیں مگر صحیح قول یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم ہجرت سے پہلے مکہ ہی میں نازل ہو گیا تھا مگر اس حکم کا نفاذ مدینہ میں ہجرت کے دوسرے سال رمضان کی پہلی تاریخ کو ہوا ہے گویا زکوٰۃ یکم رمضان ۲ھ ہجری میں فرض قرار دی گئی اور اس کا اعلان کیا گیا۔

زکوٰۃ تمام امتوں پر فرض تھی: اجتماعی طور پر یہ مسئلہ ہے کہ زکوٰۃ انبیاء کرامؑ پر فرض وواجب نہیں ہے البتہ جس طرح سابقہ تمام امتوں پر نماز فرض تھی اسی طرح اُمت محمدی سے پہلے ہر اُمت پر زکوٰۃ فرض تھی ہاں زکوٰۃ کی مقدار اور مال کی تحدید میں اختلاف ضرور رہا ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ زکوٰۃ کے بارے میں اسلامی شریعت کے احکام بہت آسان اور سہل ہیں جب کہ سابقہ انبیاء کی تشریعتوں میں اتنی آسانی نہیں تھی۔

زکوٰۃ کی اہمیت اور اس کی تاکید: قرآن مجید میں بتیس[1] جگہ زکوٰۃ کا ذکر نماز کے ساتھ فرمایا گیا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ نماز اور زکوٰۃ دونوں کے کمال اتصال کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ زکوٰۃ کی فضیلت وتاکید کی دلیل بھی ہے پھر یہ کہ قرآن کریم میں بہت سی جگہ زکوٰۃ کا علیحدہ بھی ذکر فرمایا گیا ہے خداوند قدوس نے زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو دنیاوی و اخروی اجر وثواب اور سعادت ونیک بختی کے دل کش وسچے

---

[1] مظاہر حق میں بتیس کی بجائے بیاسی کا عدد ہے لیکن یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا چنانچہ اس وقت علماء کی تحقیق یہ ہے کہ قرآن میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر بتیس جگہ ہے (ج)

وعدوں سے سرفراز فرمایا ہے اور اس کی ادائیگی سے باز رہنے والوں کو جیسے سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے کہ خدا شاہد اہل ایمان کے قلوب ان کے تصور سے بھی کانپ اٹھتے ہیں کیسے بد بخت ہیں وہ لوگ جو اس اہم فریضہ کی ادائیگی سے باز رہتے ہیں اور ان عذابوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

چونکہ زکوٰۃ اسلام کا ایک بڑا رکن ہے اور اس کی فرضیت قطعی ہے اس لئے زکوٰۃ کا انکار کرنے والا کافر اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے والا فاسق اور شدید ترین گنہ گار ہوتا ہے بلکہ علماء لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ نہ دینے والا اس قابل ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے (محیط السرخسی)

مال پر ایک سال کامل گزر جانے کے بعد صاحب نصاب پر علی الفور زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی ادائیگی میں تاخیر گناہ گار بناتی ہے بعض حضرات نے کہا ہے کہ سال پورا ہو جانے پر علی الفور زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی بلکہ علی التراخی واجب ہوتی ہے یہاں تک کہ موت کے وقت گناہ گار ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کن لوگوں پر فرض ہے: ہر اس آزاد عاقل اور بالغ مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہے جو نصاب (یعنی مال کی وہ خاص مقدار جس پر شریعت نے زکوٰۃ فرض کی ہے) کا مالک ہو اور مال کامل ایک سال تک اس کی ملکیت میں رہا ہو نیز وہ مال دین یعنی قرض اور ضرورت اصلیت سے فارغ ہو اور نامی (یعنی بڑھنے والا) ہو خواہ حقیقۃً خواہ تقدیرًا۔ اسی طرح مال میں اس کی ملکیت پوری طرح اور کامل ہو۔

کافر، غلام، دیوانے[1] اور نابالغ لڑکے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور نہ اس مالک نصاب پر زکوٰۃ واجب ہے جس کے نصاب پر پورا ایک سال نہ گزرا ہو، ہاں اگر کوئی شخص سال کی ابتدائی اور آخری حصوں میں مالک نصاب رہے اور درمیان مالک نصاب نہ رہے تو اسے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی کیونکہ یہ بھی پورے ایک سال ہی کے حکم میں ہوگا۔

قرض دار پر اس کے بقدر قرض مال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہاں جو مال قرض سے زائد ہو اور وہ حد نصاب کو پہنچتا ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہو گئی لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ وہ قرض زکوٰۃ کے لئے مانع وجوب ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو، چنانچہ نذر، کفارات فطرہ اور ان جیسے دوسرے مطالبات جن کا تعلق صرف اللہ جل شانہ کی ذات سے ہے اور کسی بندے کو ان کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا زکوٰۃ کے لئے مانع وجوب نہیں ہیں۔ ہاں ایسے قرض جن کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ ہی سے مگر ان کے مطالبہ وصول کرنے کا حق بندوں کو پہنچتا ہے جیسے زکوٰۃ، عشر، خراج وغیرہ کہ امام وقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کا مطالبہ کر سکتا ہے تو یہ بھی زکوٰۃ کے لئے مانع وجوب ہیں مگر امام وقت اور حاکم مال ظاہری میں مطالبہ کر سکتا ہے مثلاً مویشی وہ مال تجارت جو شہر میں لایا جائے یا شہر سے باہر لے جایا جائے اور نقدی لیکن وہ مال جس کی تجارت صرف شہر کے اندر اندر ہی محدود ہو اس میں حاکم کو مطالبہ کا حق نہیں ہے اگر بیوی مہر کا تقاضا کرتی ہو تو اس کے مہر کے بقدر مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

بحر الرائق میں ہے کہ معتمد مسلک یہ ہے کہ "قرض، زکوٰۃ اور صدقہ فطر کے لئے مانع وجوب ہے نیز مطلقاً قرض مانع ہے خواہ معجّل ہو یا مؤجل، اگرچہ بیوی کا مہر موجل ہی کیوں نہ ہو جس کی مدت تاجیل طلاق یا موت پر ختم ہو جاتی ہے لیکن بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مہر موجل زکوٰۃ کے لئے مانع وجوب نہیں ہے کیونکہ عام طور پر اس کا مطالبہ نہیں ہوا کرتا بخلاف مہر معجّل کے کہ اس کا مطالبہ ہوتا ہے مگر بعض علماء نے اس بارہ میں یہ لکھا ہے کہ اگر خاوند ادائیگی مہر کا ارادہ رکھتا ہو تو مہر موجل زکوٰۃ کے لئے مانع وجوب ہے ورنہ نہیں کیونکہ اس کا شمار قرض میں نہیں ہوتا۔"

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے درمیان اس بارہ میں اختلاف ہے کہ اگر کسی

---

[1] بشرطیکہ اس پر پورے سال دیوانگی اور جنون طاری رہے اگر مالک نصاب ہونے کے بعد سال کے کسی حصہ میں یعنی خواہ سال کے ابتدائی دنوں میں یا آخری دنوں میں اس کی دیوانگی اور جنون میں افاقہ کم ہو یا زیادہ تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے سال بھر میں دیوانگی ایک مرتبہ یا دو مرتبہ ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں رہتی بلکہ جس وقت سے اس کا جنون زائل ہوا ہے اسی وقت سے اس کے سال کی ابتداء سمجھی جائے گی۔

عورت کا خاوند تونگر یعنی مالدار ہو تو وہ اپنے مہر کی وجہ سے (کہ جو اس کے خاوند کے ذمہ باقی ہے) غنیہ[1] سمجھی جائے گی یا نہیں؟ صاحبین کا مسلک تو یہ ہے کہ ایسی عورت غنیہ معتبر ہوگی یعنی مستحق زکوٰۃ نہیں ہوگی حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا آخری قول یہ ہے کہ وہ غنیہ معتبر نہیں ہوگی، لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ اختلاف صرف مہر معجّل کے بارہ میں ہے۔ مہر موجل کی صورت میں تینوں حضرات کا متفقہ مسلک یہ ہے کہ ایسی عورت غنیہ معتبر نہیں ہوگی۔

ضرورت اصلیہ کا مطلب: ضرورت اصلیہ سے مراد یہ چیزیں ہیں رہائش کا مکان، پہننے کے کپڑے، خانہ داری کے اسباب، سواری کی چیزیں مثلاً گھوڑا گاڑی موٹر سائیکل وغیرہ خدمت کے غلام استعمال کے ہتھیار، اہل علم کے لئے ان کی کتابیں کاریگر کے واسطے اس کے پیشہ کے اوزار وغیرہ، لہٰذا مثال کے طور پر اگر کسی شخص نے کوئی مکان تجارت کی نیت سے لیا اور وہ مکان اس کی رہائش سے فارغ بھی ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اسی طرح دوسری چیزوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے اگر مکان و غلام وغیرہ اپنی ضرورت و حاجت سے فارغ ہوں اور ان کی تجارت کی نیت نہ ہو تو پھر ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

کامل ملکیت: ابھی پہلے زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط بیان کرتے ہوئے یہ شرط بھی بیان کی گئی تھی کہ "مال میں اس کی ملکیت پوری طرح اور کامل ہو۔" لہٰذا اس کامل ملکیت سے مراد یہ ہے کہ مال کا اصل مالک بھی ہو اور وہ مال اس کے قبضہ و قدرت میں بھی ہو جو مالک ملک اور قبضہ میں نہ ہو یا ملک میں ہو قبضے میں نہ ہو یا قبضہ میں ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ لہٰذا مکاتب[2] کے کمائے ہوئے مال میں زکوٰۃ نہیں نہ خود مکاتب پر نہ اس کے مولی پر اس لئے کہ وہ مال مکاتب کی ملکیت میں نہیں گو اس کے قبضہ میں ہے اسی طرح مولی کے قبضہ میں نہیں ہے گو ملک میں ہے۔

اسی طرح مال ضمار میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی کیونکہ وہ مال ملکیت میں تو ہوتا ہے مگر قبضہ میں نہیں ہوتا۔ مال ضمار اس کو کہتے ہیں جو اپنی رسائی سے باہر ہو اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ① وہ مال جو جاتا رہے یعنی گم ہو جائے۔ ② وہ مال جو جنگل میں دفن کر دیا گیا ہو مگر وہ جگہ کہ جہاں اسے دفن کیا گیا تھا بھول جائے۔ ③ وہ مال جو دریا میں غرق ہو گیا ④ وہ مال جسے کوئی شخص زبردستی چھین لے مگر اس کا کوئی گواہ نہ ہو ⑤ وہ مال جو کسی ظالم نے ڈنڈے کے طور لے لیا۔ ⑥ وہ مال جو کسی نے بطور قرض لیا اور بعد میں قرضدار قرض کا منکر ہو گیا اور کوئی تمسک یا گواہی اس کی نہ ہو۔"

پس مال ضمار کی یہ وہ قسمیں ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی مال ہاتھ لگ جائے تو اس مال میں پچھلے دنوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی ہاں اگر وہ مال ہاتھ لگ جائے جو جنگل میں نہیں بلکہ گھر میں دفن کر کے اس کی جگہ بھول گیا تھا تو جب بھی وہ مال نکلے گا اس میں پچھلے دنوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اسی طرح قرض کے اس مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی جس سے قرض دار انکار نہ کرتا ہو خواہ وہ قرضدار تونگر ہو یا مفلس اور یا اگر انکار کرتا ہو تو کوئی تمسک یا گواہی ہو یا خود قاضی یہ جانتا ہو کہ اس نے اتنا مال قرض لیا تھا لیکن اس مال میں زکوٰۃ اس تفصیل کے ساتھ واجب ہوگی کہ۔

① اگر وہ قرض مال تجارت کے بدلہ میں ہو تو جب نصاب کا پانچواں حصہ وصول ہو جائے تو پچھلے دنوں زکوٰۃ ادا کرے ② اگر وہ قرض مال تجارت کے بدلہ میں نہ ہو مثلاً گھر کے پہننے کے کپڑے فروخت کئے یا خدمت کا غلام فروخت کیا یا رہائش کا مکان فروخت کیا اور ان کی قیمت خریدنے والے کے ذمہ قرض رہی تو اس میں پچھلے دنوں کی زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب وصول ہو جائے ③ اگر قرض اس چیز کے بدلہ میں ہو جو مال نہیں ہے جیسے مہر، وصیت اور بدل خُلع وغیرہ تو اس میں زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب کہ بقدر

---

[1] غنیہ یعنی وہ عورت جسے زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی ۱۲۔

[2] مکاتب وہ غلام ہے جس کو اس کے آقا نے اس شرط پر آزاد کر دیا ہو کہ وہ اس قدر روپیہ کما کر اس کو دیدے جب تک وہ اس قدر روپیہ کما کر نہ دیدے غلام رہتا ہے اور دیدینے کے بعد آزاد ہو جاتا ہے۔

نصاب وصول ہو جائے اور اس پر پورا ایک سال گزر جائے یعنی اس میں پچھلے دنوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ صرف اسی سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی جس میں کہ وہ مال پر قابض رہا لیکن یہ حکم اسی شخص کے بارہ میں ہے جو پہلے سے صاحب نصاب نہ ہو اگر پہلے سے صاحب نصاب ہوگا تو یہ مال اس کے حق میں بمنزلہ مال مستفاد کے ہوگا، پہلے مال کے ساتھ اس مال کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی اور ایک سال کا گزرنا شرط نہیں ہوگا۔

ادائیگی زکوٰۃ کے لئے نیت شرط ہے: ادائیگی زکوٰۃ کے لئے یہ شرط ہے کہ زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ دیتے وقت نیت کرے یعنی دل میں یہ ارادہ کرے کہ "میرے اوپر جس قدر مال کا دینا فرض تھا میں محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے دیتا ہوں۔" یا جس وقت اپنے مال میں سے زکوٰۃ کا حصہ نکالے اسی وقت زکوٰۃ کی نیت کرے کہ "میں اس قدر جو زکوٰۃ دینے کے لئے ہے نکالتا ہوں۔

اگر کوئی شخص اپنا تمام مال خدا کی راہ میں خیرات کر دے اور زکوٰۃ کی نیت نہ کرے تو اس کے ذمہ زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے یعنی اس پر زکوٰۃ کا مطالبہ باقی نہیں رہتا بشرطیکہ اس نے وہ مال کسی اور واجب کی نیت سے نہ دیا ہو وہاں اگر کسی شخص نے پورا مال تو نہیں بلکہ تھوڑا سا بغیر نیت زکوٰۃ خدا کی راہ میں خیرات کر دیا تو حضرت امام محمدؒ کے نزدیک اس مال کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی مگر حضرت امام ابویوسفؒ کے ہاں اس مال کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول منقول ہے اور اسی قول پر فتویٰ بھی ہے۔

زکوٰۃ کو ساقط کرنے کے لئے حیلہ کرنا مکروہ ہے یعنی اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ مال زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچ جائے اور اس کی صورت یہ کرے کہ جب سال پورا ہونے کو ہو تو کچھ دن پہلے اپنا مال دوسرے کو ہبہ کر کے اسے قابض کر دے اور اس طرح زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچ جائے اگرچہ اس صورت سے زکوٰۃ تو ساقط ہو جاتی ہے مگر یہ کوئی اچھا فعل نہیں ہے۔

اگر کسی شخص نے کوئی غلام تجارت کے لئے خریدا مگر بعد میں اس سے خدمت لینے کی نیت ہو گئی تو وہ غلام تجارت کے لئے نہیں رہے گا بلکہ خدمت ہی کے لئے ہو جائے گا اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی غلام خدمت کی نیت سے خریدا پھر بعد میں اس نے تجارت کی نیت کر لی تو وہ غلام اس وقت تک تجارت کے حکم میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ شخص اسے فروخت نہ کرے۔ فروختگی کے بعد اس کی قیمت میں زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

نصاب کی تعریف: نصاب زکوٰۃ مال کی اس خاص مقدار کو کہتے ہیں جس پر شریعت نے زکوٰۃ فرض کی ہے اور جس مقدار سے کم مال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی مثلاً اونٹ کے لئے پانچ اور پچیس وغیرہ کا عدد، بکری کے لئے چالیس اور ایک اکیس وغیرہ کا عدد اور چاندی کے لئے دو سو درہم اور سونے کے لئے بیس مثقال۔

نصاب کی قسمیں: نصاب کی دو قسمیں ہیں "نامی" یعنی بڑھنے والا مال اور "غیر نامی" یعنی نہ بڑھنے والا مال" پھر نامی کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور تقدیری حقیقی کا اطلاق تو تجارت کے مال اور جانور پر ہوتا ہے کیونکہ تجارت کا مال نفع سے بڑھتا ہے اور جانور بچوں کی پیدائش سے بڑھتے ہیں۔ تقدیری کا اطلاق سونے چاندی پر ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بظاہر تو نہیں بڑھتیں لیکن بڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں "نصاب غیر نامی" کا اطلاق مکانات اور خانہ داری کے ان اسباب پر ہوتا ہے جو ضرورت اصلیہ کے علاوہ ہوں۔"

نصابی اور غیر نصابی میں فرق: نصاب نامی اور غیر نامی میں فرق یہ ہے کہ نصاب نامی کے مالک پر تو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے نیز اس کے لئے دوسرے زکوٰۃ، نذر اور صدقات واجبہ کا مال لینا درست نہیں ہوتا اور اس کے لئے صدقہ فطر دینا اور قربانی کرنا واجب ہوتا ہے۔ "نصاب غیر نامی" کے مالک پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی مگر اس کے لئے بھی زکوٰۃ نذر اور صدقہ واجبہ کا مال لینا درست نہیں ہوتا نیز اس پر بھی صدقہ فطر دینا اور قربانی کرنا واجب ہوتا ہے۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

زکوٰۃ کے بارہ میں آنحضرت ﷺ کے احکام

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا اِلَی الْیَمَنِ فَقَالَ اِنَّکَ تَأْتِیْ قَوْمًا اَھْلَ کِتَابٍ فَادْعُھُمْ اِلٰی شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ فَاِنْ ھُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاَعْلِمْھُمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْھِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِی الْیَوْمِ وَاللَّیْلَۃِ فَاِنْ ھُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاَعْلِمْھُمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْھِمْ صَدَقَۃً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِھِمْ فَاِنْ ھُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاِیَّاکَ وَکَرَائِمَ اَمْوَالِھِمْ وَاتَّقِ دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّہٗ لَیْسَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ اللّٰہِ حِجَابٌ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جب حضرت معاذؓ کو (امیر یا قاضی بنا کر) یمن بھیجا تو ان سے فرمایا کہ تم اہل کتاب میں سے ایک قوم (یہود و نصاریٰ) کے پاس جا رہے ہو لہٰذا (پہلے تو تم) انہیں اس بات کی گواہی دینے کی دعوت دینا کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بلاشبہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔" اگر وہ اس دعوت کو قبول کرلیں تو (پھر) تم انہیں بتانا کہ "اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔" اگر وہ اسے مان جائیں تو پھر (اس کے بعد) انہیں آگاہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے (یعنی ان لوگوں سے جو مالک نصاب ہوں) لی جائے گی اور ان کے فقراء کو دے دی جائے گی" اگر وہ اسے مان جائیں تو تم (یہ یاد رکھنا کہ ان سے زکوٰۃ میں) اچھا مال لینے سے پرہیز کرنا (یعنی چھانٹ کر اچھا مال نہ لینا بلکہ ان کے مال کو تین حصوں میں تقسیم کرنا، اچھا، برا اور میانہ لہٰذا، زکوٰۃ میں درمیانہ مال لینا نیز تم (زکوٰۃ لینے میں غیر قانونی سختی کر کے یا ان سے ایسی چیزوں کا مطالبہ کر کے جو ان پر واجب نہ ہوں اور یا انہیں زبان یا ہاتھ سے ایذاء پہنچا کر) ان کی بددعا نہ لینا کیونکہ مظلوم کی دعا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس دعا کی قبولیت کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اگرچہ یمن میں مشرک اور ذمی کافر بھی تھے مگر چونکہ تمام اقوام میں اہل کتاب ہی کی اکثریت تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے ہوئے وہاں کے لوگوں میں بطور خاص اہل کتاب ہی کا ذکر فرمایا۔

اعلان جنگ سے پہلے کفار کو اسلام کی دعوت دینا واجب ہے: ابن مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کفار کے مقابلہ پر اعلان جنگ سے پہلے کفار کو اسلام کی دعوت دینا واجب ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ کفار کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو اور انہیں خدا کے آخری دین کی طرف پہلے سے نہ بلایا گیا ہو اگر صورت حال یہ ہو کہ ان کے پاس اسلام کی دعوت پہلے سے پہنچ چکی ہو تو اب جنگ سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دینا واجب نہیں بلکہ مستحب ہوگا۔

مانعین زکوٰۃ پر عذاب کی تفصیل

② وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ صَاحِبِ ذَھَبٍ وَّلَا فِضَّۃٍ لَا یُؤَدِّیْ مِنْھَا حَقَّھَآ اِلَّآ اِذَا کَانَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ صُفِّحَتْ لَہٗ صَفَائِحُ مِنْ نَّارٍ فَاُحْمِیَ عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَیُکْوٰی بِھَا جَنْبُہٗ وَجَبِیْنُہٗ وَظَھْرُہٗ کُلَّمَا رُدَّتْ اُعِیْدَتْ لَہٗ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ حَتّٰی یُقْضٰی بَیْنَ الْعِبَادِ فَیَرٰی سَبِیْلَہٗ اِمَّا اِلَی الْجَنَّۃِ وَاِمَّا اِلَی النَّارِ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَالْاِبِلُ قَالَ وَلَا صَاحِبُ اِبِلٍ لَّا یُؤَدِّیْ مِنْھَا حَقَّھَا وَمِنْ حَقِّھَا حَلَبُھَا یَوْمَ وِرْدِھَا اِلَّا اِذَا کَانَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بُطِحَ لَھَا بِقَاعٍ قَرْقَرٍ اَوْفَرَ مَا کَانَتْ لَا یَفْقِدُ مِنْھَا فَصِیْلًا وَّاحِدًا تَطَؤُہٗ بِاَخْفَافِھَا وَتَعَضُّہٗ بِاَفْوَاھِھَا کُلَّمَا مَرَّ عَلَیْہِ اُوْلَاھَا رُدَّ عَلَیْہِ اُخْرَاھَا فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ حَتّٰی یُقْضٰی بَیْنَ الْعِبَادِ فَیَرٰی سَبِیْلَہٗ اِمَّا اِلٰی

الْجَنَّةِ وَإِمَّا إِلَى النَّارِ قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَالْبَقَرُ وَالْغَنَمُ قَالَ وَلَا صَاحِبُ بَقَرٍ وَّلَا غَنَمٍ لَا يُؤَدِّيْ مِنْهَا حَقَّهَا إِلَّا إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ بُطِحَ لَهَا بِقَاعٍ قَرْقَرٍ لَا يَفْقِدُ مِنْهَا شَيْئًا لَيْسَ فِيْهَا عَقْصَاءُ وَلَا جَلْحَاءُ وَلَا عَضْبَاءُ تَنْطَحُهُ بِقُرُوْنِهَا وَتَطَأُهُ بِأَظْلَافِهَا كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ أُوْلَاهَا رُدَّ عَلَيْهِ أُخْرَاهَا فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى يُقْضٰى بَيْنَ الْعِبَادِ فَيُرٰى سَبِيْلَهُ إِمَّا إِلَى الْجَنَّةِ وَإِمَّا إِلَى النَّارِ قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَالْخَيْلُ قَالَ فَالْخَيْلُ ثَلَاثَةٌ هِيَ لِرَجُلٍ وِزْرٌ وَّهِيَ لِرَجُلٍ سِتْرٌ وَّهِيَ لِرَجُلٍ أَجْرٌ فَأَمَّا الَّتِيْ هِيَ لَهُ وِزْرٌ فَرَجُلٌ رَبَطَهَا رِيَاءً وَّفَخْرًا وَّنِوَاءً عَلٰى أَهْلِ الْإِسْلَامِ فَهِيَ لَهُ وِزْرٌ وَّأَمَّا الَّتِيْ هِيَ لَهُ سِتْرٌ فَرَجُلٌ رَبَطَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَمْ يَنْسَ حَقَّ اللّٰهِ فِيْ ظُهُوْرِهَا وَلَا رِقَابِهَا فَهِيَ لَهُ سِتْرٌ أَمَّا الَّتِيْ هِيَ لَهُ أَجْرٌ فَرَجُلٌ رَبَطَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لِأَهْلِ الْإِسْلَامِ فِيْ مَرْجٍ وَّرَوْضَةٍ فَمَا أَكَلَتْ مِنْ ذٰلِكَ الْمَرْجِ أَوِ الرَّوْضَةِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا كُتِبَ لَهُ عَدَدَ مَا أَكَلَتْ حَسَنَاتٌ وَّكُتِبَ لَهُ عَدَدَ أَرْوَاثِهَا وَأَبْوَالِهَا حَسَنَاتٌ وَّلَا تَقْطَعُ طِوَلَهَا فَاسْتَنَّتْ شَرَفًا أَوْ شَرَفَيْنِ إِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ عَدَدَ آثَارِهَا وَأَرْوَاثِهَا حَسَنَاتٍ وَّلَا مَرَّ بِهَا صَاحِبُهَا عَلٰى نَهْرٍ فَشَرِبَتْ مِنْهُ وَلَا يُرِيْدُ أَنْ يَّسْقِيَهَا إِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ عَدَدَ مَا شَرِبَتْ حَسَنَاتٍ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَالْحُمُرُ قَالَ مَا أُنْزِلَ عَلَيَّ فِي الْحُمُرِ شَيْءٌ إِلَّا هٰذِهِ الْآيَةُ الْفَاذَّةُ الْجَامِعَةُ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص سونے اور چاندی (کے نصاب شرعی) کا مالک ہو اور اس کا حق (یعنی زکوٰۃ) ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کے لئے آگ کے تختے بنائے جائیں گے (یعنی تختے تو سونے اور چاندی کے ہوں گے مگر انہیں آگ میں اس قدر گرم کیا جائے گا کہ گویا وہ آگ ہی کے تختے ہوں گے اسی لئے آپ نے آگے فرمایا کہ) وہ تختے دوزخ کی آگ میں گرم کئے جائیں گے اور ان تختوں سے اس شخص کے پہلو، اس کی پیشانی اور اس کی پیٹھ داغی جائے گی پھر ان تختوں کو (اس کے بدن سے) جدا کیا جائے گا اور آگ میں گرم کر کے پھر لایا جائے گا (یعنی جب وہ تختے ٹھنڈے ہو جائیں گے تو انہیں دوبارہ گرم کرنے کے لئے آگ میں ڈالا جائے گا اور وہاں سے نکال کر اس شخص کے بدن کو داغا جائے گا) اور اس دن کی مقدار کہ جس میں یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا پچاس ہزار سال کی ہوگی یہاں تک کہ بندوں کا حساب کتاب ختم ہو جائے گا اور وہ شخص جنت یا دوزخ کی طرف اپنی راہ دیکھے گا۔" صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! (یہ عذاب تو نقدی یعنی سونے چاندی کے بارے میں ہوگا) اونٹ کی زکوٰۃ نہ دینے) والوں کا کیا حشر ہوگا؟" آپ نے فرمایا۔ "جو شخص اونٹ کا مالک ہو اور اس کا حق (یعنی زکوٰۃ) ادا نہ کرے، اور اونٹوں کا ایک حق یہ بھی ہے کہ جس روز انہیں پانی پلایا جائے ان کا دودھ دوہا جائے تو قیامت کے دن اس شخص کو اونٹوں کے سامنے ہموار میدان میں منہ کے بل اوندھا ڈال دیا جائے گا اور اس کے سارے اونٹ گنتی اور مٹاپے میں پورے ہوں گے مالک ان میں سے ایک بچہ بھی کم نہ پائے گا (یعنی اس شخص کے سب اونٹ وہاں موجود ہوں گے۔ حتیٰ کہ اونٹوں کے سب بچے بھی ان کے ساتھ ہوں گے پھر یہ کہ وہ اونٹ خوب فربہ اور موٹے تازے ہوں گے تاکہ اپنے مالک کو روندتے وقت خوب تکلیف پہنچائیں چنانچہ) وہ اونٹ اس شخص کو اپنے پیروں سے کچلیں گے اور اپنے دانتوں سے کاٹیں گے جب ان اونٹوں کی جماعت (روند کچل اور کاٹ کر) چلی جائے گی تو دوسری جماعت آئے گی (یعنی اونٹوں کی قطار روند کچل کر چلی جائے گی تو اس کے پیچھے دوسری قطار آئے گی اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا" اور جس دن یہ ہوگا اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی یہاں تک کہ بندوں کا حساب کتاب کر دیا جائے گا اور وہ شخص جنت یا دوزخ کی طرف اپنی راہ دیکھے گا صحابہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! گائے اور بکریوں کے مالک کا کیا حال ہوگا؟" آپ نے فرمایا "جو شخص گاؤں اور بکریوں کا مالک ہو اور ان کا حق (یعنی زکوٰۃ) ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اسے ہموار میدان میں اوندھے منہ ڈال دیا جائے گا اور اس کی گائیوں اور بکریوں (کو وہاں لایا جائے گا جن) میں سے کچھ کم نہیں ہوگا ان میں سے کسی گائے بکری کا سینگ نہ مڑے ہوں گے نہ ٹوٹے ہوں گے اور نہ وہ منڈی (یعنی بلا سینگ ہوں گی (یعنی ان سب کی سروں پر سینگ ہوں گے نہ ٹوٹے ہوں گے اور سالم ہوں گے۔ تاکہ وہ اپنے سینگوں سے خوب مار سکیں چنانچہ وہ گائیں اور بکریاں اپنے سینگوں سے اپنے

مالک کو ماریں گی اپنے کھروں سے کچلیں گی اور جب ایک قطار اسے مار کچل کر) چلی جائے گی تو دوسری قطار آئے گی (اور اپنا کام شروع کر دے گی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا) اور جس دن یہ ہو گا اس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی یہاں تک کہ بندوں کا حساب کتاب کیا جائے گا اور وہ شخص جنّت یا دوزخ کی طرف اپنی راہ دیکھے گا۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! گھوڑوں کے بارہ میں کیا حکم ہے" آپ نے فرمایا گھوڑے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ گھوڑے جو آدمی کے لئے گناہ کا سبب ہوتے ہیں، دوسرے وہ گھوڑے جو آدمی کے لئے پردہ ہوتے ہیں اور تیسرے وہ گھوڑے جو آدمی کے لئے ثواب کا سبب و ذریعہ بنتے ہیں، چنانچہ وہ گھوڑے جو گناہ کا سبب ہوتے ہیں اس شخص کے گھوڑے جنہیں اس کے مالک اظہار فخر و غرور اور مال دار اور ریاء کے لئے اور مسلمانوں سے دشمنی کے واسطے باندھے چنانچہ وہ گھوڑے اپنے مالک کے لئے گناہ کا سبب بنتے ہیں اور وہ گھوڑے جو آدمی کے لئے پردہ ہوتے ہیں اس شخص کے گھوڑے ہیں جنہیں اس کے مالک نے خدا کی راہ میں (کام لینے کے لئے) باندھا اور ان کی پیٹھ اور ان کی گردن کے بارہ میں وہ خدا کے حق کو نہیں بھولا چنانچہ وہ گھوڑے اپنے مالک کے لئے پردہ ہیں اور وہ گھوڑے جو آدمی کے لئے ثواب کا سبب و ذریعہ بنتے ہیں اس شخص کے گھوڑے ہیں جنہیں ان کا مالک خدا کی راہ میں (لڑنے کے لئے) مسلمانوں کے واسطے باندھے اور اسے چراہگاہ و سبزہ میں رکھے چنانچہ جب وہ گھوڑے چراگاہ و سبزہ سے کچھ کھاتے ہیں تو جو کچھ انہوں نے کھایا (یعنی گھاس وغیرہ کی تعداد کے بقدر اس کے لئے نیکیاں لکھی جاتی ہیں یہاں تک کہ ان گھوڑوں کی لید اور ان کے پیشاب کے بقدر بھی اس کے لئے نیکیاں لکھی جاتی ہیں (کیونکہ لید اور پیشاب بھی گھوڑے کی زندگی کا باعث ہیں) اور جو گھوڑے رسی توڑ کر ایک یا دو میدان دوڑتے پھرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے قدموں کے نشانات اور ان کی لید (جو وہ اس دوڑنے کی حالت میں کرتے ہیں) کی تعداد کے بقدر اس شخص کے لئے نیکیاں لکھتا ہے اور جب وہ شخص ان گھوڑوں کو نہر پر پانی پلانے کے لئے لے جاتا ہے اور وہ نہر سے پانی پیتے ہیں اگرچہ مالک کا ارادہ ان کو پانی پلانے کا نہ ہو، اللہ تعالیٰ گھوڑوں کے پانی پینے کے بقدر اس شخص کے لئے نیکیاں لکھتا ہے۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! اچھا گدھوں کے بارہ میں کیا حکم ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "گدھوں کے بارہ میں مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا لیکن تمام نیکیوں اور اعمال کے بارہ میں یہ آیت جامع ہے: فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ "یعنی جو شخص ایک ذرہ کے برابر نیکی کا عمل کرے گا اسے دیکھے گا اور جو شخص ایک ذرہ کے برابر برائی کا عمل کرے گا اسے دیکھے گا۔"

(یعنی مثلاً اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو نیک کام کے لئے جانے کے واسطے اپنا گدھا دیگا تو ثواب پائے گا اور اگر برے کام کے لئے دے گا تو گناہگار ہوگا)۔" (مسلمؒ)

تشریح: قیامت کے دن کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر بتائی گئی ہے لیکن اس کا تعلّق کافروں کے ساتھ ہے یعنی قیامت کا دن کافروں کو پچاس ہزار سال کی بقدر دراز معلوم ہوگا بقیہ گناہگاروں کو ان کے گناہ کے بقدر دراز محسوس ہوگا اگر کسی کے گناہ کم اور ہلکے ہوں گے تو اسے وہ دن اسی اعتبار سے کم دراز محسوس ہوگا اور اگر کسی کے گناہ زیادہ اور شدید نوعیت کے ہوں گے تو اسے وہ دن بھی اسی کے اعتبار سے دراز محسوس ہوگا یہاں تک کہ خدا کے نیک بندوں یعنی مؤمنین کاملین کو وہ پورا دن صرف دو رکعت نماز کے بقدر معلوم ہوگا۔ گویا جتنی دیر میں دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے انہیں وہ دن صرف اتنے عرصہ کے بقدر محسوس ہوگا۔

فیری سبیلہ اما الی الجنۃ الخ (اور وہ جنّت یا دوزخ کی طرف اپنی راہ دیکھے گا) اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس شخص کا نامہ اعمال میں اس (ترک زکوٰۃ) کے گناہ کے علاوہ اور کوئی گناہ نہیں ہوگا اور مذکورہ عذاب کہ جس میں اسے مبتلا کیا جائے گا اس کے اس گناہ کو دور کر دے گا تو اس کے بعد وہ جنّت میں چلا جائے گا اور خدانخواستہ اگر اس کا نامہ اعمال میں ترک زکوٰۃ کے علاوہ اور گناہ بھی ہوں گے یا یہ کہ مذکورہ عذاب کے بعد بھی ترک زکوٰۃ کا گناہ اس سے دور نہیں ہوگا تو پھر وہ دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

حتی یقضی بین العباد میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن میدان حشر میں دوسری مخلوق خدا تو حساب کتاب میں

مشغول ہوگی مگر وہ لوگ جنہوں نے زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

ومن حقھا حلبھا یوم وردھا (اونٹوں کا ایک حق یہ بھی ہے الخ) اونٹ والوں کا یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اونٹوں کو تیسرے دن یا چوتھے دن پانی کی جگہ پانی پلانے لے جاتے ہیں چنانچہ عرب میں ایک یہ معمول بھی تھا کہ جس جگہ پانی پلانے کے لئے اونٹ لائے جاتے تھے وہاں لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اونٹ والے اپنے اونٹوں کو وہاں پانی پلانے لاتے اور وہیں اونٹوں کا دودھ نکال کر وہاں جمع لوگوں کو پلا دیا کرتے، چنانچہ اس کے بارہ میں فرمایا جارہا ہے کہ اگرچہ اونٹوں کا واجب حق تو صرف یہی ہے کہ ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے مگر ان کے اور دوسرے حقوق میں سے ایک مستحب حق یہ بھی ہے کہ جس دن اونٹ پانی پینے جائیں اس دن کا دودھ وہ غرباء و مساکین کو پلایا جائے، لہٰذا یہ فعل اگرچہ مستحب ہے لیکن ازبارہ مروت و ہمدردی اور بر بنائے ادائے شکر حق گویا واجب کا حکم رکھتا ہے اسی لئے اس کے بارہ میں اتنی اہمیت کے ساتھ بیان فرمایا گیا چنانچہ حدیث کا ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حق کی عدم ادائیگی کی صورت میں عذاب بھی ہو سکتا ہے۔

ولا یرید ان یسقیھا (اگرچہ مالک کا ارادہ ان کو پانی پلانے کا نہ ہو) مطلب یہ ہے کہ مالک گھوڑے کو پانی پلانے کا ارادہ نہ رکھے بلکہ اس کے ارادہ و قصد کے بغیر گھوڑا پانی پیئے تو اس کے بارے میں مذکورہ ثواب بیان کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر مالک خود ارادہ و قصد کر کے گھوڑے کو پانی پلائے گا۔ تو اس کا کیا کچھ ثواب اسے ملے گا! گھوڑوں کے بارہ میں صحابہؓ کے سوال پر آنحضرت ﷺ نے جو جواب دیا اس کا اسلوب پہلے جوابات کے اسلوب سے مختلف ہے، اس موقعہ پر آپ ﷺ نے جواب کا جو اسلوب اختیار فرمایا ہے اسے "جواب علی اسلوب الحکیم کہتے ہیں گویا آنحضرت ﷺ نے سوال کرنے والے صحابہؓ سے فرمایا کہ گھوڑوں کا جو حق واجب ہے (یعنی زکوٰۃ وغیرہ) صرف اس کے بارہ میں مت پوچھو کہ ان گھوڑوں کی وجہ سے ان کے پالنے والے سعادت و نیک بختی اور بھلائی کے کیسے کیسے مقام حاصل کرتے ہیں اور انہیں ان گھوڑوں سے کیا نفع پہنچتا ہے اسی طرح دوسرا پہلو بھی کہ ان پالنے والوں کو کیسے کیسے گناہ ملتے ہیں اور انہیں کیا نقصان پہنچتا ہے؟

اسی بنیاد پر آپ ﷺ نے گھوڑوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں ① وہ گھوڑے جو اپنے مالک کے لئے گناہ کا سبب ہوتے ہیں۔" اس کی تشریح آپ ﷺ نے یہ فرمائی کہ اس سے وہ گھوڑے مراد ہیں جنہیں ان کے مالک نے اظہار فخر اور ریاء کے لئے باندھ رکھا ہو یعنی گھوڑے رکھنے سے اس کی غرض صرف یہ ہو کہ لوگ تاک اس کی حشمت و ثروت دیکھیں اور جانیں کہ یہ مجاہد ہے حالانکہ واقع میں وہ مجاہد نہیں ہے، نیز فخر سے یہی مراد ہے کہ وہ گھوڑا اس نیت سے پالے کہ میں اپنے سے کمتر لوگوں پر اپنی بڑائی جتاؤں اور ان کے سامنے فخر کا اظہار کروں ② وہ گھوڑے جو اپنے مالک کے لئے پردہ ہوتے ہیں اس کی وضاحت آپ ﷺ نے یہ فرمائی کہ اس سے وہ گھوڑے مراد ہیں جنہیں ان کے مالک نے اس لئے باندھا ہے تاکہ وہ خدا کی راہ میں کام آئیں۔ "یہاں خدا کی راہ" سے مراد جہاد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ گھوڑوں کو رکھنے اور باندھنے کا مقصد اظہار فخر و غرور اور ریاء نہ ہو بلکہ انہیں اچھی و نیک نیت سے رکھے مثلاً گھوڑے اس مقصد کے لئے پالے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اور اچھے و نیک مقاصد کے لئے کام آئیں یا ان سے اپنی سواری مقصود ہو کہ اپنی مشروع و مباح ضرورتوں کے وقت ان پر سوار ہو سکے نیز یہ کہ اپنے فقر و احتیاج کی پردہ پوشی کرے جیسا کہ روایت میں فرمایا گیا ہے کہ رَبَطَھَا تَغَنِّیًا وَّ تَعَفُّفًا یعنی دوسروں سے مستغنی رہنے اور دوسروں کے آگے اپنی احتیاج و ضرورت کے اظہار سے بچنے کے لئے گھوڑا رکھنا چاہئے، مثلاً تجارتی مقصد کے لئے، عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے یہاں جانے کے لئے کھیت کھلیان میں آنے جانے کے واسطے یا اسی قسم کے دوسرے مقاصد کے وقت اگر گھوڑے کی ضرورت ہو تو کسی دوسرے کی طرف دیکھنا نہ پڑے بلکہ اپنا گھوڑا ہو تو وہ کام آئے اور غیروں کے آگے اظہار ضرورت کی شرمندگی سے بچائے۔ اسی لئے اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے گھوڑے کو اپنے مالک کے لئے پردہ" قرار دیا ہے کہ ایک طرف تو گھوڑا اپنے مالک کے فقر و احتیاج کے لئے پردہ پوش ہوتا ہے بایں طور کہ گھوڑے کی وجہ سے دوسروں کی

نظروں میں اس کے مالک کا وقار اور بھرم قائم رہتا ہے اور اس کی عزت بنی رہتی ہے۔ دوسری طرف گھوڑی کا مالک اپنی ضرورت وحاجت کے وقت کسی دوسرے شخص کے آگے اظہار حاجت اور دست سوال دراز کرنے سے بچا رہتا ہے۔

اس موقع پر "راہ خدا" سے یہ مفہوم اس لئے مراد لیا گیا ہے تاکہ ایک ہی عبارت میں تکرار لازم نہ آئے کیونکہ تیسری قسم کے ضمن میں مذکورہ "راہ خدا" سے مراد جہاد ہی ہے۔

اسی ضمن میں آنحضرت ﷺ نے گھوڑے کے مالک کا ایک وصف یہ بھی بیان کیا ہے کہ "ان کی پیٹھ اور ان کی گردن کے بارہ میں وہ خدا کے حق کو نہیں بھولا۔

چنانچہ اس ارشاد گرامی میں "پیٹھ" کے بارہ میں اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس گھوڑے پر اچھے اور نیک کاموں کی خاطر سوار ہوا اور اگر کسی نے اس سے اپنی سواری کے لئے یا گھوڑ یوں پر چھوڑنے کے لئے اس کا گھوڑا مانگا تو اس نے اس کی ضرورت پوری کی۔ اسی طرح "گردن" کے بارہ میں حق یہ ہے کہ ان کی زکوٰۃ ادا کی۔" مگر حضرات شوافع کی طرف سے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مالک نے اپنے گھوڑے کی خبر گیری کی بایں طور کہ ان کے گھاس دانہ میں کوئی کمی نہیں کی انہیں ان کی پوری خوراک مہیا کی اور انہیں اگر کوئی مرض لاحق ہوا یا کوئی تکلیف ہوئی تو اسے فوراً دور کیا۔"

گھوڑوں میں زکوٰۃ ہے یا نہیں: دراصل اس عبارت کے مفہوم کے تعین میں یہ اختلاف اس لئے واقع ہوا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جو جنگل میں چرتے ہیں پھر گھوڑے کا مالک اس بارہ میں مختار ہے کہ چاہے تو وہ ان کی زکوٰۃ میں ہر گھوڑے پیچھے ایک دینار دے چاہے ان کی قیمت متعین کر کے ہر دو سو درہم میں سے پانچ درہم زکوٰۃ ادا کرے جیسا کہ زکوٰۃ کا حساب ہے۔

حضرت امام شافعیؒ اور صاحبینؒ کے ہاں گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ ان حضرات کی دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "مسلمانوں پر ان کے گھوڑے اور غلام میں صدقہ (واجب) نہیں ہے۔" حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ "ہر گھوڑے پیچھے کہ جو جنگل میں چرے ایک دینار ہے۔"

جہاں تک تعین قیمت پر زکوٰۃ کا تعلق ہے اس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت عمر فاروقؓ سے منقول ہے حضرت شافعیؒ بطور دلیل جو حدیث پیش کرتے ہیں اس کے بارہ میں حضرت امام اعظمؒ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق غازی و مجاہد کے گھوڑے سے ہے اسی طرح "غلام" سے وہ غلام مراد ہے جو خدمت کے لئے رکھ چھوڑا ہو۔

(۳) وہ گھوڑے جو اپنے مالک کے لئے ثواب کا سبب و ذریعہ بنتے ہیں۔ اس کی تشریح آپ نے یہ فرمائی کہ اس سے وہ گھوڑے مراد ہیں جسے اس کے مالک نے مسلمانوں کے لئے خدا کی راہ میں باندھا ہے۔ یہاں "راہ خدا" سے مراد جہاد ہی ہے یعنی اس نے اس مقصد کے لئے گھوڑے پال رکھے ہیں تاکہ جب جہاد کا وقت آئے تو اس پر سوار ہو کر دشمنان اسلام سے نبرد آزما ہو یا بوقت ضرورت دوسرے مسلمانوں کو دے تاکہ وہ اس پر سوار ہو کر جہاد کریں۔

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مُثِّلَ لَهُ مَالُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهُ زَبِيْبَتَانِ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يَاْخُذُ بِلِهْزِ مَتَيْهِ يَعْنِيْ شِدْقَيْهِ ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ ثُمَّ تَلاَ وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الْاٰيَةَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال و زر عطا فرمایا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو قیامت کے دن اس کا مال و زر گنجے سانپ کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے گا جس کی آنکھوں پر دو سیاہ نقطے ہوں گے پھر وہ سانپ اس شخص کے گلے میں بطور طوق ڈالا جائے گا اور وہ سانپ اس شخص کی دونوں باچھیں پکڑے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں تیرا مال

ہوں، تیرا خزانہ ہوں اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الاية وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں یہ گمان نہ کریں (آخر آیت تک)۔" (بخاریؒ)

تشریح: "گنجے سانپ" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سر پر بال نہیں ہوں گے اور یہ گنجاپن سانپ کے بہت زیادہ زہریلا اور دراز عمر ہونے کی علامت ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد گرامی کے بعد بطور استدلال آیت کریمہ کی تلاوت فرما کر آگاہ فرمایا کہ خوب اچھی طرح سن لو کہ اللہ تعالیٰ بھی یہی ارشاد فرماتا ہے چنانچہ پوری آیت یہ ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

"جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مال عطا فرمایا ہے اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں تو وہ اپنے اس مال کے بارہ میں یہ گمان نہ کریں کہ وہ ان کے لئے بہتر ہے بلکہ وہ مال تو ان کے حق میں سراسر وبال جان ہے اور (یاد رکھو) وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب قیامت کے دن وہ اس مال کا کہ جس میں بخل کرتے ہیں۔ طوق پہنائے جائیں (یعنی ان کا مال طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔"

④ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ لَهٗ اِبِلٌ اَوْ بَقَرٌ اَوْ غَنَمٌ لَا يُؤَدِّىْ حَقَّهَا اِلَّا اُتِیَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْظَمَ مَا تَكُوْنُ وَاَسْمَنَهٗ تَطَؤُهٗ بِاَخْفَافِهَا وَتَنْطَحُهٗ بِقُرُوْنِهَا كُلَّمَا جَازَتْ اُخْرَاهَا رُدَّتْ عَلَيْهِ اُوْلَاهَا حَتّٰى يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوذرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "جس شخص کے پاس اونٹ یا گائے یا بکریاں ہوں اور وہ ان کا حق (یعنی زکوٰۃ) نہ دے تو کل قیامت کے دن اس کے وہ مویشی اس حال میں لائے جائیں گے کہ بہت بڑے بڑے اور فربہ شکل میں ہوں گے اور پھر وہ اس شخص کو اپنے پیروں سے روندیں کچلیں گے اور اپنے سینگوں سے ماریں گے، جب اسے (مار کچل کر) آخری جماعت چلی جائے گی تو پھر پہلی جماعت لائی جائے گی یعنی اسی طرح سب جانور پھر پلٹ کر روندیں گے اور ماریں گے یہ سلسلہ ایسے ہی وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ لوگوں کا حساب کتاب لے کر ان کا فیصلہ نہ کر دیا جائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

عاملین کو خوش خوش واپس کرو

⑤ وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاكُمُ الْمُصَدِّقُ فَلْيَصْدُرْ عَنْكُمْ وَهُوَ عَنْكُمْ رَاضٍ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جریر ابن عبداللہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب (امام وقت کی طرف سے) زکوٰۃ وصول کرنے والا (کہ جسے اصطلاح شریعت میں "ساعی" اور عامل کہتے ہیں) آئے تو وہ (زکوٰۃ وصول کر کے) تمہارے پاس سے اس حال میں واپس جائے کہ وہ تم سے راضی وخوش ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب امام وقت یا اسلامی اداروں کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے والے آئیں تو ان کے ساتھ عزت و احترام کا معاملہ کیا جائے اور انہیں پوری پوری زکوٰۃ ادا کی جائے تاکہ وہ راضی اور خوش ہو کر واپس لوٹیں۔

زکوٰۃ لانے والوں کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعاء رحمت

⑥ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰى قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاهُ قَوْمٌ بِصَدَقَتِهِمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ فُلَانٍ فَاَتَاهُ اَبِیْ بِصَدَقَتِهٖ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ اَبِیْ اَوْفٰى۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ اِذَا اَتَى الرَّجُلُ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصَدَقَتِهٖ قَالَ اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن ابی اوفی کہتے ہیں کہ جب کوئی جماعت نبی کریم ﷺ کے پاس اپنی زکوٰۃ لے کر آتی (تاکہ آپ انہیں مستحقین میں تقسیم فرما دیں) تو فرماتے اللھم صل علی ال فلان اے اللہ! فلاں شخص کے خاندان پر رحمت نازل فرما چنانچہ جب میرے والد مکرم آنحضرت ﷺ کے پاس اپنی زکوٰۃ لے کر حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا اللھم صل علی ال ابی اوفی اے اللہ! اوفی کے خاندان پر رحمت نازل فرما (بخاری ومسلم) ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب کوئی شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنی زکوٰۃ لے کر حاضر ہوتا تو آپ فرماتے کہ اے اللہ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرما"۔

تشریح: کسی شخص کے بارہ میں تنہا اس کے لئے لفظ "صلوٰۃ" کے ساتھ دعا کرنا یعنی اس طرح کہنا کہ اللھم صل علی ال فلان درست نہیں ہے لفظ "صلوٰۃ" کے ساتھ دعا صرف انبیاء اکرام کے لئے مخصوص ہے۔ ہاں اگر کسی شخص کو انبیاء کے ساتھ متعلق کر کے لفظ صلوٰۃ کے ساتھ دعا کی جائے تو درست ہے جہاں تک آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے کہ آپ زکوٰۃ لانے والوں کے لئے لفظ "صلوٰۃ" کے ساتھ دعاء رحمت کرتے تھے تو اس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے ہے کسی اور کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔

(۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمَرَ عَلَى الصَّدَقَةِ فَقِيْلَ مَنَعَ ابْنُ جَمِيْلٍ وَخَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ وَالْعَبَّاسُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَنْقِمُ ابْنُ جَمِيْلٍ اِلَّا اَنَّهٗ كَانَ فَقِيْرًا فَاَغْنَاهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَاَمَّا خَالِدٌ فَاِنَّكُمْ تَظْلِمُوْنَ خَالِدًا قَدِ احْتَبَسَ اَدْرَاعَهٗ وَاَعْتَدَهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَمَّا الْعَبَّاسُ فَهِيَ عَلَيَّ وَمِثْلُهَا مَعَهَا ثُمَّ قَالَ يَا عُمَرُ اَمَا شَعَرْتَ اَنَّ عَمَّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِيْهِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو (زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے) مقرر فرمایا، کسی شخص نے آکر خبر دی کہ ابن جمیلؓ خالد ابن ولیدؓ اور حضرت عباسؓ نے زکوٰۃ ادا نہیں کی (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابن جمیل نے تو زکوٰۃ دینے سے اس لئے انکار کیا کہ وہ پہلے مفلس وقلاش تھا اور اب اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اسے دولت مند بنا دیا! خالد ابن ولید کی بات یہ ہے کہ ان پر تم لوگ ظلم کر رہے ہو (کہ اصل میں ان پر زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہے۔ مگر تم ان سے زکوٰۃ وصول کرنے کے خواہشمند ہو کیونکہ انہوں نے تو اپنی زرہیں اور سامان جنگ (یعنی ہتھیار، جانور، اور جنگ کا دوسرا سامان) خدا کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) وقف کر رکھا ہے (لہٰذا تم جو ان کے مال و اسباب کو تجارت کا مال سمجھتے ہو وہ غلط ہے) اور جہاں تک حضرت ابن عباسؓ کا تعلق ہے تو بات یہ ہے کہ ان کی زکوٰۃ مجھ پر ہے اور نہ صرف اسی سال کی بلکہ) اس کے مثل اور (آئندہ سال کی) بھی۔ پھر فرمایا کہ عمر! کیا تم نہیں جانتے کہ کسی شخص کا چچا اس کے باپ کی مانند ہوتا ہے (لہٰذا تم لوگ عباسؓ کو میرے باپ کی جگہ سمجھو، ان کی تعظیم و توقیر کرو اور انہیں کسی بھی طرح رنج و تکلیف نہ پہنچاؤ۔"

(بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: ابن جمیلؓ پہلے منافق تھے پھر بعد میں مسلمان ہو گئے یہ بہت زیادہ تنگ دست و محتاج تھے انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ میرے لئے ثروت و دولت کی دعا فرمائیں میں خدا کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کروں گا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی اور یہ صاحب ثروت و دولت ہو گئے لہٰذا ان کا فرض تھا کہ جب خدا تعالیٰ نے ان کی تنگ دستی و محتاجی کو مال و دولت میں تبدیل کر دیا تو خدا کا شکر ادا کرتے مگر انہوں نے کفران نعمت کیا یہاں تک کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے بھی انکار کیا اسی لئے اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ان کے بارے میں بطور زجر و تنبیہ مذکورہ کلمات ارشاد فرمایا۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد گرامی "اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے اسے دولت مند بنا دیا ہے" میں ابن جمیل کو دولت مند بنانے کی نسبت اپنی طرف اس اعتبار سے فرمایا کہ آپ ﷺ نے اس مقصد کے لئے بارگاہ الوہیت میں دعا فرمائی تھی اور آپ

ہی کی دعا کی وجہ سے ابن جمیل دولت مند بنے۔

یہ سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت عباسؓ آنحضرت ﷺ کے گرامی قدر چچا تھے، آپ ﷺ نے ان کی زکوٰۃ کو اپنے ذمہ اس لئے فرمایا کہ آپ ﷺ نے ان سے دو سالوں کی ایک ہی مرتبہ زکوٰۃ پہلے ہی سے وصول کرلی تھی یعنی ان کی طرف سے سال رواں کی زکوٰۃ بھی آپ کے پاس آچکی تھی کہ جس کا مطالبہ کیا جارہا تھا اور آئندہ سال کی زکوٰۃ بھی لے لی تھی جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنے ارشاد گرامی و مثلھا معھا کے ذریعہ واضح بھی فرمایا۔

عامل کسی سے ہدیہ و تحفہ قبول نہ کرے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ حُمَیْدِنِ السَّاعِدِیِّ قَالَ اسْتَعْمَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَجُلًا مِّنَ الْاَزْدِ یُقَالُ لَہُ ابْنُ اللُّتْبِیَّۃِ عَلَی الصَّدَقَۃِ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ ھٰذَا لَکُمْ وَھٰذَا اُھْدِیَ لِیْ فَخَطَبَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اَسْتَعْمِلُ رِجَالًا مِّنْکُمْ عَلٰی اُمُوْرٍ مِّمَّا وَلَّانِیَ اللّٰہُ فَیَاْتِیْ اَحَدُھُمْ فَیَقُوْلُ ھٰذَا لَکُمْ وَھٰذِہٖ ھَدِیَّۃٌ اُھْدِیَتْ لِیْ فَھَلَّا جَلَسَ فِیْ بَیْتِ اَبِیْہِ اَوْبَیْتِ اُمِّہٖ فَیَنْظُرَ اَیُھْدٰی لَہٗ اَمْ لَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یَاْخُذُ اَحَدٌ مِّنْہُ شَیْئًا اِلَّا جَآءَ بِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَحْمِلُہٗ عَلٰی رَقَبَتِہٖ اِنْ کَانَ بَعِیْرًا لَّہٗ رُغَآءٌ اَوْ بَقَرًا لَّہٗ خُوَارٌ اَوْ شَاۃً تَیْعَرُ ثُمَّ رَفَعَ یَدَیْہِ حَتّٰی رَاَیْنَا عُفْرَۃَ اِبْطَیْہِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ قَالَ الْخَطَّابِیُّ وَفِیْ قَوْلِہٖ ھَلَّا جَلَسَ فِیْ بَیْتِ اُمِّہٖ اَوْ اَبِیْہِ فَیَنْظُرَ اَیُھْدٰی اِلَیْہِ اَمْ لَا دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ کُلَّ اَمْرٍ یَّتَذَرَّعُ بِہٖ اِلٰی مَحْظُوْرٍ فَھُوَ مَحْظُوْرٌ وَکُلُّ دَخِیْلٍ فِی الْعُقُوْدِ یُنْظَرُ ھَلْ یَکُوْنُ حُکْمُہٗ عِنْدَ الْاِنْفِرَادِ کَحُکْمِہٖ عِنْدَ الْاِقْتِرَانِ اَمْ لَا ھٰکَذَا فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ۔

"اور حضرت ابوحمید ساعدیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قبیلۂ ازد کے ایک شخص کو کہ جس کا نام ابن لتبیہ تھا زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر فرمایا چنانچہ جب وہ شخص (زکوٰۃ وصول کر کے) مدینہ (واپس آیا (تو مسلمانوں سے) کہنے لگا کہ "اتنا مال تو تمہارا ہے (یعنی یہ مال زکوٰۃ میں وصول ہوا ہے۔ اس کے مستحق تم ہو) اور یہ اتنا مال تحفہ کے طور پر مجھے دیا گیا ہے (جب نبی کریم ﷺ نے (یہ سنا تو آپ ﷺ نے) لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا جس میں پہلے تو آپ نے خدا کی حمد و ثنا بیان کی اور اس کے بعد فرمایا کہ "بعد ازاں! میں تم میں سے چند آدمیوں کو ان امور کے لئے مقرر کرتا ہوں جن کے لئے خدا تعالیٰ نے مجھے حاکم بنایا ہے، چنانچہ تم میں سے ایک شخص (جسے میں نے زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر کیا ہے اپنا کام کر کے) آتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تمہارے لئے ہے اور یہ مال مجھے تحفہ میں دیا گیا ہے۔ (اور اس سے پوچھو تو وہ شخص اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر کیوں نہیں بیٹھا رہا (کہ تحفہ دینے والے اسے گھر ہی بیٹھے تحفہ بھیج دیتے) تب وہ دیکھتا کہ اس کے پاس تحفہ بھیجا جاتا ہے یا نہیں؟ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے! (یاد رکھو) تم میں سے جو شخص کوئی بھی چیز لے گا اسے وہ قیامت کے دن (رسوائی و ذلت کے طور پر) اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے لائے گا اگر وہ اونٹ ہوگا (کہ جس کو اس نے بغیر استحقاق لیا ہوگا) تو اس کی آواز ہوگی، اگر وہ بیل ہوگا تو اس کی آواز ہوگی اور اگر وہ بکری ہوگی تو اس کی آواز ہوگی (یعنی وہ دنیا میں جو بھی چیز بغیر استحقاق کے لے گا وہی چیز قیامت کے دن اس کی گردن پر سوار ہوگی اور بولتی ہوگی، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنے دونوں دست مبارک (اتنے اونچے) اٹھائے کہ ہم نے آپ ﷺ کی مبارک بغلوں کی سفیدی دیکھی پھر فرمایا "اے پروردگار! تو نے جو کچھ فرمایا تھا) میں نے لوگوں تک پہنچا دیا، اے پروردگار میں نے لوگوں تک پہنچا دیا" (بخاری، مسلمؒ) اور خطابیؒ نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی "وہ شخص اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر کیوں نہیں بیٹھا رہا اور تب وہ دیکھتا کہ اس کے پاس تحفہ بھیجا جاتا ہے یا نہیں؟" کے بارہ میں فرمایا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی حرام کام کے لئے جس چیز کو وسیلہ بنایا جائے گا تو وہ وسیلہ بھی حرام ہوگا، نیز اگر کسی ایک عقد (معاملہ) کو دوسرے عقد (مثلاً خرید و فروخت ہبہ اور نکاح وغیرہ) سے متعلق کیا جائے تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ آیا ان معاملوں کا علیحدہ علیحدہ حکم ان کے ایک

ساتھ متعلق ہونے کے حکم کے مطابق ہے یا نہیں! اگر ہے تو درست ہوگا اور اگر نہیں ہے تو درست نہیں ہوگا۔ (شرح السنۃ)

تشریح: ارشاد گرامی "وہ دیکھتا کہ اس کے پاس تحفہ بھیجا جاتا ہے یا نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو تحفہ و تحائف کی پیش کش اس کی ذات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کے عہدہ کی وجہ سے ہے، اگر وہ زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے عامل مقرر نہیں کیا جاتا بلکہ وہ اپنے گھر بیٹھا رہتا ہے تو اسے کوئی تحفہ کیوں دیتا؟۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر عامل کو اس کا کوئی عزیز و دوست تحفہ دے تو دیکھا جائے گا کہ اگر اس کے لئے اس تحفہ کی پیش کش اس کے عامل ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے تعلقات اور دیرینہ مراسم کی وجہ سے ہے اور یہ ہمیشہ کا معمول ہے تو وہ تحفہ اس کے لئے جائز ہوگا اور اگر تحفہ کی پیش کش محض اس کے عہدے کی وجہ سے ہوگی تو وہ تحفہ اس کے لئے جائز نہیں ہوگا جیسا کہ قاضی و دیگر حکام کے بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی قاضی و حاکم کی دعوت کی جائے یا اسے کوئی تحفہ دیا جائے تو وہ اسے اس وقت قبول کر سکتا ہے جب کہ وہ یہ جانے کہ یہ پیش کش میرے موجود عہدہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ذاتی تعلقات کی وجہ سے اور ہمیشہ کے معمول کے مطابق ہے۔

مگر ابن ملک یہ فرماتے ہیں کہ عامل (حاکم) کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کا تحفہ قبول کرے کیونکہ تحفہ کی پیش کش کا واحد پس منظر اس کی یہ خواہش ہی ہوتی ہے کہ عامل زکوٰۃ میں سے کچھ حصہ چھوڑ دے (اور حاکم اس کے ساتھ غیر قانونی رعایت کا معاملہ کرے) اور یہ مطلقاً جائز نہیں ہے۔

خطابی علیہ الرحمۃ اس حدیث سے دو قاعدے اور شرعی اصول ثابت کر رہے ہیں، پہلا قاعدہ اور شرعی اصول یہ بیان فرما رہے ہیں کہ اگر کسی حرام چیز کے حصول کی خاطر کسی مباح اور جائز چیز کو وسیلہ اور ذریعہ بنایا جائے گا تو وہ مباح و جائز چیز بھی ایک حرام مقصد کا وسیلہ ہونے کی وجہ سے حرام ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ کوئی شخص ناجائز نفع اور سود حاصل کرنے کے لئے کسی شخص کو قرض دیتا ہے ظاہر ہے کہ قرض دینا ایک جائز فعل ہے مگر چونکہ قرض دینے والے نے سود حاصل کرنے کے لئے قرض دیا ہے اس لئے اس کا قرض دینا بھی حرام ہو جائے، اسی

طرح گھر کہ کوئی شخص اسے اس لئے بطور رہن و گروی لے کہ اس میں بغیر کرایہ کے سکونت اختیار کرے یا جانور کہ اسے رہن لیا جائے اور پھر بغیر معاوضہ کے اس پر سواری کرے یا اس سے دوسرا فائدہ حاصل کرے۔

دوسرا قاعدہ اور شرعی اصول یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر دو الگ الگ عقود (معاملوں) کو ایک دوسرے کے ساتھ متعلق کیا جائے تو اس وقت یہ دیکھا جائے گا کہ ان دونوں معاملوں کا الگ الگ حکم ان دونوں کے ایک ساتھ متعلق ہونے کے حکم کے مطابق ہے یا نہیں؟ یعنی اگر وہ معاملے الگ الگ جائز ہو سکتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہو کر بھی جائز رہیں گے اور اگر دونوں معاملے الگ الگ درست نہیں ہوتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہو کر بھی درست نہیں ہوں گے۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے کو دس روپیہ کی چیز سو روپے میں فروخت کرے تا کہ وہ اسے ایک ہزار روپیہ قرض دے اور اس قرض کا نفع (سود) اس چیز کی قیمت کے طور پر وصول کرے یعنی جیسے اس صورت میں نوے روپے قرض دینے والے کو مل گئے جو اس کے قرض کا نفع (سود) ہو گیا یہ صورت جائز نہیں ہے کیونکہ اگر وہ دس روپیہ کی چیز سو روپیہ کو بیچتا اور خریدار کو قرض کا لالچ نہ ہوتا تو وہ ہرگز اتنی زائد قیمت پر نہ لیتا۔

اور جہاں دو معاملے ایسے ہوں کہ اگر ایک کو دوسرے سے الگ کر دیں تو بھی جائز اور درست ہوں جیسے اس صورت مذکورہ میں دس روپیہ کی چیز دس ہی روپیہ میں بیچی جاتی اور ایک ہزار روپیہ قرض بھی دیتا تو چونکہ یہ دونوں معاملے الگ الگ جائز ہوئے اس لئے ایک دوسرے سے متعلق ایک جا ہو کر بھی درست ہوں گے۔

خطابی نے حدیث سے جو یہ دو قاعدے مستنبط کئے ہیں ان میں سے پہلا قاعدہ تو بلا اختلاف سب کے ہاں قابل قبول ہے اس لئے کہ

تمام ائمہ کے مسلک میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ وسائل وذرائع چونکہ مقاصد ہی کے حکم میں ہوتے ہیں اس لئے نیکی کا وسیلہ بھی نیکی ہی ہوگا اور برائی کا وسیلہ بھی برائی ہوگا۔

لیکن دوسرا قاعدہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے ہاں تو قابل قبول ہے کیونکہ وہ ہر اس حیلہ (تدبیر) کو ناجائز قرار دیتے ہیں جس کے ذریعہ سے ربوا (سود) وغیرہ کی حرمت سے بچ جائے گا مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ اس دوسرے قاعدہ کو نہیں مانتے کیونکہ ان حضرات کے ہاں حیلہ مباح ہے۔ تاہم اتنی بات ملحوظ رہے کہ اگرچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اس قاعدہ کے قائل نہیں ہیں لیکن اس قاعدہ کی جو مثال بیان کی گئی ہے وہ صورت امام صاحبؒ کے نزدیک بھی ایک دوسرے شرعی قاعدہ کے مطابق جائز نہیں ہے۔ چونکہ امام صاحبؒ کے نزدیک حیلہ کی بعض صورتیں درست ہیں اس مناسبت سے کہا گیا ہے کہ وہ خطابی کے ذکر کردہ دوسرے قاعدہ کے قائل نہیں ہیں۔

عامل زکوٰۃ میں خیانت نہ کرے

(۹) وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ عُمَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ مِنْكُمْ عَلٰى عَمَلٍ فَكَتَمَنَا مِخْيَطًا فَمَا فَوْقَهُ كَانَ غُلُوْلًا يَّاتِيْ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عدی ابن عمیرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہم تم میں سے جس کسی کو کسی کام (یعنی زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنے) پر مقرر کریں اور وہ شخص ہم سے سوئی کے برابر یا اس سے کم وبیش کسی چیز کو چھپائے تو یہ خیانت میں شمار ہوگا جو اسے قیامت کے روز (رسوا کر کے) لائے گا۔" (مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

مانعین زکوٰۃ کو قرآن کی تنبیہ

(۱۰) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ كَبُرَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ عُمَرُ اَنَا اُفَرِّجُ عَنْكُمْ فَانْطَلَقَ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اِنَّهٗ كَبُرَ عَلٰى اَصْحَابِكَ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُفْرِضِ الزَّكَاةَ اِلَّا لِيُطَيِّبَ مَا بَقِيَ مِنْ اَمْوَالِكُمْ وَاِنَّمَا فَرَضَ الْمَوَارِيْثَ وَذَكَرَ كَلِمَةً لِتَكُوْنَ لِمَنْ بَعْدَكُمْ فَقَالَ فَكَبَّرَ عُمَرُ ثُمَّ قَالَ لَهٗ اَلَا اُخْبِرُكَ بِخَيْرِ مَا يَكْنِزُ الْمَرْءُ اَلْمَرْاَةُ الصَّالِحَةُ اِذَا نَظَرَ اِلَيْهَا سَرَّتْهُ وَاِذَا اَمَرَهَا اَطَاعَتْهُ وَاِذَا غَابَ عَنْهَا حَفِظَتْهُ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں (آخر تک) نازل ہوئی تو صحابہؓ بڑے متفکر ہوئے (ان کی حالت دیکھ) کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تمہارے اس فکر کو (ابھی) دور کئے دیتا ہوں چنانچہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! یہ آیت تو آپ ﷺ کے صحابہ پر بڑا بار ہو گئی ہے؟ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو اسی لئے فرض کیا ہے تاکہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے نیز اللہ تعالیٰ نے میراث کو اس لئے مقرر کیا ہے اور اس کے بعد آپ نے کلمہ ذکر فرمایا تاکہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں وہ ان کا حق ہو جائے" حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے (یہ سن کر اس جوش مسرت سے ایک مشکل آسان ہوگئی) اللہ اکبر کہا۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "کیا میں تمہیں ایک ایسی بہترین چیز نہ بتادوں جسے انسان اپنے پاس رکھ کر خوش ہو اور وہ نیک بخت عورت ہے کہ اس کی طرف مرد دیکھے تو اس کی طبیعت خوش ہو، جب وہ اسے کوئی حکم دے تو اس کی اطاعت کرے، اور جب وہ گھر میں موجود نہ ہو تو اس کے بچوں کی حفاظت کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: قرآن حکیم نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کو انتباہ فرمایا ہے وہ پوری آیت یوں ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور پھر اس میں سے خدا کی راہ میں کچھ خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔

یعنی جو لوگ مال و دولت جمع کرتے ہیں اور اس مال کا حق نہیں نکالتے بایں طور کہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور خدا نے اس مال کو جس جس طرح اور جن جگہوں پر خرچ کرنے کا حکم فرمایا ہے اس طرح خرچ نہیں کرتے تو انہیں آگاہ کر دیجئے کہ عنقریب وہ دن آنے والا ہے جب انہیں اس جرم کی سزا ملے گی اور وہ دردناک عذاب میں مبتلا کئے جائے گے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کے مال کو دوزخ کی آگ میں تپا تپا کر اس سے ان مالداروں کی پیشانیوں اور ان کے پہلو داغے جائیں گے (جیسا کہ پہلے ایک حدیث نے اس کی وضاحت کی ہے)۔

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہؓ بڑے متفکر ہوئے اور انہیں بڑا خوف معلوم ہوا کیونکہ وہ آیت کے ظاہری مفہوم سے یہ سمجھے کہ مطلقاً مال جمع کرنا شریعت کی نظر میں بڑا سخت جرم ہے جس کے بارہ میں یہ آیت آگاہ کر رہی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کی یہ کیفیت دیکھ کر آنحضرت ﷺ سے اس کے بارہ میں عرض کیا اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ زکوٰۃ تو اسی لئے فرض کی گئی ہے کہ اس کی ادائیگی سے بقیہ مال پاک ہو جائے، جب مال میں سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے گی تو جو مال باقی رہ گیا ہے وہ پاک ہو جائے گا اب اگر وہ مال جمع کیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لہٰذا آیت کریمہ میں جو وعید بیان فرمائی گئی ہے وہ مطلقاً مال جمع کرنے کے بارہ میں نہیں ہے بلکہ وہ اس صورت کے لئے ہے کہ مال جمع کیا ہے اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے، اگر کوئی شخص زکوٰۃ نکال کر مال جمع کرے تو اس کے لئے کوئی وعید نہیں ہے۔

وذکر کلمۃً (اور اس کے بعد آپ نے ایک اور کلمہ ذکر کیا) یہ جملہ حدیث کے راوی حضرت ابن عباسؓ کا ہے، یعنی حضرت ابن عباسؓ اس موقع پر یہ فرما رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے وانما فرض المواریث کے بعد ایک جملہ اور ارشاد فرمایا تھا مگر وہ جملہ کیا تھا؟ اب مجھے یاد نہیں رہا، اب تو مجھے صرف اسی قدر یاد ہے کہ آپ نے یہ فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے میراث کو اسی لئے فرض قرار دیا ہے تاکہ وہ (تمہارا مال) تمہارے بعد والوں (یعنی تمہارے وارثوں) کا حق ہو جائے۔ گویا اس بات سے بھی آنحضرت ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اگر مطلقاً مال جمع کرنا شریعت کی نظر میں قابل نفریں فعل ہوتا تو اللہ تعالیٰ نہ زکوٰۃ کو فرض قرار دیتا اور نہ میراث فرض قرار پاتی "زکوٰۃ اور میراث" کا فرض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جائز طریقوں سے جمع کرنا برا نہیں ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس مال کا حق (یعنی زکوٰۃ وصدقہ) ادا ہوتا رہنا چاہئے۔

جب آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے بتایا کہ جب تک زکوٰۃ ادا ہوتی رہے مال جمع کرنا ممنوع نہیں ہے اور صحابہؓ نے ایک الجھن اور خوف سے نکل کر اطمینان و خوشی محسوس کی تو آپ ﷺ نے ان کی کیفیت کے پیش نظر ان کو اس چیز کی طرف رغبت دلائی جو مال سے بہر صورت بہتر ہے یعنی عورت گویا اس بارہ میں آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ نیک بخت و خوبصورت بیوی مال سے بدرجہا بہتر اور افضل ہے کیونکہ روپیہ پیسہ اور سونا چاندی کسی کے پاس ٹھہرنے والی چیز نہیں ہے پھر یہ کہ سونے چاندی کو جمع کر کے اپنے خزانہ میں محفوظ رکھو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نہ اس سے کوئی نفع اور نہ راحت ہاں جب اپنی کسی ضرورت کے تحت اسے خرچ کرو اور وہ تمہارے سے جائے تو صرف اس وقت وہ تمہارے کام آئے بخلاف بیوی کے وہ جب تک تمہارے ساتھ ہے تمہاری رفیق حیات اور باعث راحت بنی رہتی ہے۔ جب تم اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہو تو تمہاری طبیعت خوش ہو جاتی ہے تمہیں کوئی ضرورت ہوتی ہے تو وہ فوراً اسے پورا کرتی ہے جب تم اسے کوئی حکم کرتے ہو تو فوراً اطاعت کرتی ہے، ہر وقت تمہاری نفسیاتی سکون و راحت کا ذریعہ بنی رہتی ہے جب تم گھر سے باہر نکلتے ہو تو تمہارے بچوں اور تمہارے مال و اسباب کی نگہبان ہوتی ہے اور اس سے تمہاری اولاد پیدا ہوتی ہے جو نہ صرف یہ کہ زندگی میں تمہاری قوت بازو بنتی ہے بلکہ مرنے کے بعد تمہاری جانشین ہو کر خاندان کا نام زندہ و روشن رکھتی ہے۔ اس

طرح عورت سے بہت زیادہ منفعت اور راحت حاصل ہوتی ہے پھر یہ کہ بیوی نہ صرف یہ کہ اپنے شوہر کی دنیاوی زندگی میں اطمینان و سکون اور خوشی مسرت کے سدا بہار پھول کھلاتی ہے بلکہ اخروی طور پر اس کو بہت برے افعال اور برے کاموں سے روکتی ہے یہی وجہ ہے کہ ایک مرفوع روایت میں یہ منقول ہے کہ "جس شخص نے نکاح کیا اس نے اپنا دو تہائی دین مضبوط کر لیا"۔

عاملین کو خوش رکھو

⑪ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَتِيْكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيَأْتِيْكُمْ رُكَيْبٌ مُبْغَضُوْنَ فَاِنْ جَآءُوْكُمْ فَرَحِّبُوْا بِهِمْ وَخَلُّوْا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَبْتَغُوْنَ فَاِنْ عَدَلُوْا فَلِاَنْفُسِهِمْ وَاِنْ ظَلَمُوْا فَعَلَيْهِمْ وَاَرْضُوْهُمْ فَاِنَّ تَمَامَ زَكَاتِكُمْ رِضَاهُمْ وَلْيَدْعُوْا لَكُمْ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابر بن عتیکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تمہارے پاس ایک چھوٹا سا قافلہ آئے گا (یعنی زکوٰۃ وصول کرنے کے عامل آئیں گے) جو مبغوض ہوں گے (یعنی طبعی طور پر لوگ ان سے متنفر ہوں گے کیونکہ وہ ان کا مال لینے آئیں گے) لہٰذا جب تمہارے پاس وہ قافلہ آئے تو تم انہیں مرحبا (خوش آمدید) کہو اور (ان کی خدمت میں زکوٰۃ کا مال حاضر کردو گویا) ان کے اور ان کی طلب کردہ چیز یعنی زکوٰۃ کے درمیان کوئی چیز حائل و مانع نہ رکھو، لہٰذا اگر وہ زکوٰۃ لینے کے بارہ میں عدل سے کام لیں گے تو یہ اپنے لئے کریں گے (کہ عدل کا ثواب پائیں گے) اور اگر ظلم کا معاملہ کریں گے تو اس کا وبال ان پر ہوگا، تم تو زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو راضی کرو اور (جان لو کہ) تمہاری طرف سے پوری زکوٰۃ کی ادائیگی ہی ان کی رضامندی ہے نیز عامل (وصول کرنے والے) کو چاہئے کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: وان ظلموا (اور اگر ظلم کا معاملہ کریں گے) کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے کے معاملہ میں اگرچہ تم اپنے گمان و طبیعت کے مطابق یہی کیوں نہ جانو کہ عامل تمہارے ساتھ ظلم کر رہا ہے پھر بھی ان کو راضی کرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر بفرض محال وہ ظلم بھی کریں تو تم ان کی رضا کا پھر بھی خیال کرو، اس صورت میں کہا جائے گا کہ آپ نے یہ جملہ بطور مبالغہ کے ارشاد فرمایا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ عامل کو راضی کرنے کی کتنی اہمیت ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص حقیقۃً اور واقعۃً ظلم ہی کرے تو اس کو راضی کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

وارضوھم کا مطلب جیسا کہ خود حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ تم زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو خوش و راضی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑو بایں طور کہ زکوٰۃ کا جو مال تم پر شرعی طور پر واجب ہے اس کی ادائیگی میں خیانت اور کوتاہی کا معاملہ نہ کرو بلکہ انہیں پوری زکوٰۃ ادا کرو۔

اگرچہ ادائیگی زکوٰۃ کا اصل فریضہ مال ادا کرتے ہی پورا ہو جاتا ہے پھر بھی زکوٰۃ وصول کرنے والے کو خوش کرنا ادائیگی زکوٰۃ کا جزو کمال ہے لہٰذا اس بارہ میں بھی احتیاط رکھنے کی ضرورت ہے۔

جو شخص زکوٰۃ وصول کرنے جائے اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ زکوٰۃ دینے والے کے حق میں رحمت و برکت اور خیر و بھلائی کی دعا کرے۔

⑫ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ جَآءَ نَاسٌ يَعْنِيْ مِنَ الْاَعْرَابِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا اِنَّ نَاسًا مِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ يَاْتُوْنَا فَيَظْلِمُوْنَا فَقَالَ اَرْضُوْا مُصَدِّقِيْكُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنْ ظَلَمُوْنَا قَالَ اَرْضُوْا مُصَدِّقِيْكُمْ وَاِنْ ظُلِمْتُمْ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ دیہات کے کچھ لوگ رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے کچھ لوگ ہمارے پاس آتے ہیں اور ہمارے ساتھ ظلم کا معاملہ کرتے ہیں" آپ نے ان سے فرمایا کہ زکوٰۃ وصول

کرنے والوں کو راضی کرو" انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگرچہ وہ ہم پر ظلم ہی کیوں نہ کریں؟ آپ نے فرمایا تم تو زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو راضی ہی کرو اگرچہ تمہارے ساتھ ظالم ہی کا معاملہ کیوں نہ کیا جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: نفسیاتی بات یہ ہے کہ جس شخص کے پاس سے مال جاتا ہے اس کے دل میں کچھ نہ کچھ تنگی ہوتی ہے اسی لئے زکوٰۃ وصول کرنے والوں کی طرف سے بھی زکوٰۃ دینے والوں کے دل میں کچھ اچھے خیالات نہیں ہوتے۔ اسی لئے آپ نے ان دیہاتیوں سے فرمایا کہ اپنے مال سے نفسیاتی اور طبعی طور پر محبت ہونے کی وجہ سے اگرچہ تم یہی سمجھو اور تمہارا گمان یہی ہو کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے ہمارے ساتھ ظلم کا معاملہ کر رہے ہیں مگر تم اس صورت میں بھی انہیں راضی اور خوش کرنے کی کوشش کرو۔

زکوٰۃ کا کچھ حصّہ چھپانا یا روکنا ناجائز ہے

(۱۳) وَعَنْ بَشِيْرِ بْنِ الْخَصَاصِيَّةِ قَالَ قُلْنَا اِنَّ اَهْلَ الصَّدَقَةِ يَعْتَدُوْنَ عَلَيْنَا اَفَنَكْتُمُ مِنْ اَمْوَالِنَا بِقَدْرِ مَا يَعْتَدُوْنَ قَالَ لَا (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت بشیر ابن خصاصیۃ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا کہ زکوٰۃ لینے والے ہمارے اوپر زیادتی کرتے ہیں (یعنی زکوٰۃ میں مقدار واجب سے زیادہ لیتے ہیں) تو کیا ہم اپنے مال میں سے اتنا حصہ چھپالیں جتنا کہ وہ ہم سے زائد وصول کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنے زکوٰۃ کے مال میں سے کسی قدر بھی چھپانے یا روکنے کی اجازت اس لئے عطا نہیں فرمائی کہ غالباً وہ لوگ تو اپنے گمان کے مطابق یہی سمجھتے تھے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے ان سے مقدار واجب سے بھی زیادہ زکوٰۃ وصول کرتے ہیں حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا بلکہ وہ مقدار واجب ہی وصول کرتے تھے۔

عامل کا اجر

(۱۴) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خُدَيْجٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعَامِلُ عَلَى الصَّدَقَةِ بِالْحَقِّ كَالْغَازِىْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلٰى بَيْتِهٖ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت رافع ابن خدیج راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حق کے ساتھ زکوٰۃ وصول کرنے والا عامل، خدا کی راہ میں (جہاد کرنے والے) غازی کی طرح ہے جب تک کہ وہ اپنے گھر لوٹ کر آئے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: حق کے ساتھ کا مطلب یہ ہے کہ عامل چونکہ طلب ثواب اور اللہ کی رضاء حاصل کرنے کی خاطر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے اس لئے اس کے صدق و اخلاص کی بناء پر اسے غازی کے ثواب کی مانند ثواب عنایت فرمایا جاتا ہے۔

زکوٰۃ لینے دینے والوں کے لئے ایک ہدایت

(۱۵) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا جَلَبَ وَلَا جَنَبَ وَلَا تُؤْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ اِلَّا فِىْ دُوْرِهِمْ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا زکوٰۃ وصول کرنے والا (زکوٰۃ کے لئے) مویشیوں کو نہ کھینچ منگوائے اور نہ مویشیوں کا مالک دور چلا جائے نیز مویشیوں کی زکوٰۃ ان کے مکان ہی میں لی جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: جلب کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا زکوٰۃ دینے والوں کے مکانوں سے دور کسی مقام پر مقیم ہو اور زکوٰۃ لینے کے لئے مویشیوں کو وہاں منگا بھیجے۔

جنب کا مطلب یہ ہے کہ مویشیوں کا مالک اپنے مکان سے دور چلا جائے اور زکوٰۃ وصول کرنے والا زکوٰۃ لینے کے لئے تکالیف و پریشانیاں برداشت کر کے وہاں پہنچے۔ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں باتوں سے منع کیا ہے کیونکہ پہلی صورت میں زکوٰۃ دینے والے کو تکالیف و پریشانی ہوتی ہے اور دوسری صورت میں زکوٰۃ وصول کرنے والا پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے حدیث کا آخری جملہ اس ممانعت کی تاکید کے طور پر استعمال فرمایا گیا ہے، گویا حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ نہ زکوٰۃ دینے والے دور چلے جائیں اور نہ زکوٰۃ وصول کرنے والے دور کسی مقام پر قیام کرے بلکہ زکوٰۃ دینے والوں کے قریب ہی اترتے اور ان کے گھروں میں باری باری جا کر زکوٰۃ لے لیا کرے۔

مال مستفاد کی زکوٰۃ کا مسئلہ

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَفَادَ مَالاً فَلاَ زَكٰوةَ فِيْهِ حَتّٰى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَذَكَرَ جَمَاعَةً اَنَّهُمْ وَقَفُوْهُ عَلَى ابْنِ عُمَرَ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس کسی کو مال حاصل ہوا تو اس پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی جب تک کہ ایک سال نہ گزر جائے" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور ایک جماعت کے بارہ میں کہا ہے کہ اس نے اس حدیث کو حضرت ابن عمرؓ پر موقوف کیا ہے (یعنی یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے بلکہ خود حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے۔"

تشریح: پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ "مال مستفاد" کسے کہتے ہیں؟ فرض کیجئے کہ آپ کے پاس اسی بکریاں موجود ہیں جن پر ابھی سال پورا نہیں ہوا ہے اسی درمیان میں اکتالیس بکریاں اور آپ کو حاصل ہو جاتی ہیں خواہ وہ میراث میں حاصل ہوئی ہوں یا تجارت سے منافع کی صورت میں اور خواہ کسی نے آپ ﷺ کو ہبہ کر دی ہوں بہر حال اس طرح بکریوں کی تعداد اسی کی بجائے ایک سو اکیس ہو گئی۔ چنانچہ یہ اکتالیس بکریاں۔ جو آپ کو درمیان سال حاصل ہوئی ہیں "مال مستفاد" کہلائیں گی۔ گویا مال مستفاد کی تعریف یہ ہوئی کہ وہ مال کی جنس سے ہو اور درمیان سال حاصل ہوا ہو۔

اب اس حدیث کی طرف آئیے! ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص پر مال کی وجہ سے زکوٰۃ فرض ہو اور سال کے درمیان اسے کچھ مزید مال پہلے سے موجود مال ہی کی جنس سے (مثلاً پہلے سے بکریاں موجود ہوں تو بکریاں ہی یا پہلے سے گائیں موجود ہوں تو گائیں ہی) ملے تو بعد میں حاصل ہونے والے اس مال پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی جب تک کہ اس مال پر پورا سال نہ گزر جائے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اصل (یعنی پہلے سے موجود) مال ہی پر پورا سال گزر جانا کافی ہے بعد میں حاصل ہونے والے مال پر پورے سال گزرے یا نہ گزرے زکوٰۃ مجموعہ مال پر واجب ہو جائے گی۔

اس اختلاف کو مثال کے طور پر یوں سمجھے کہ مثلاً ایک شخص کے پاس اسی بکریاں ہیں جن پر ابھی چھ مہینے ہی گزرے تھے کہ پھر اسے اکتالیس بکریاں حاصل ہو گئیں چاہے تو انہیں اس نے خریدا ہو چاہے اسے وراثت میں ملی ہوں یا کسی اور طرح اس نے حاصل کی ہوں تو ان بعد میں ملنے والی اکتالیس بکریوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ ہاں اگر ان بکریوں پر بھی ان کو خریدنے یا وراثت میں حاصل ہونے کے وقت سے ایک سال پورا ہو جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی حضرت امام شافعیؒ اور ان کے ساتھ ہی حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے۔ مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھ حضرت امام مالکؒ کے نزدیک وہ مال مستفاد (جو بعد میں حاصل ہوا ہے) اصل (یعنی پہلے سے موجود مال) کے تابع ہوگا، جب پہلے سے موجود اسی بکریوں پر ایک سال گزر جائے گا تو مجموعہ بکریوں پر زکوٰۃ میں دو بکریاں نکالنا واجب

ہو جائے گا کیونکہ بکریوں کی زکوٰۃ کا نصاب چالیس ہے یعنی چالیس سے کم بکریوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ بلکہ چالیس سے ایک سو بیس کی تعداد پر ایک بکری واجب ہوتی ہے۔ جب تعداد ایک سو اکیس ہو جاتی ہے تو دو بکریاں واجب ہو جاتی ہیں لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں پہلے اور بعد کی بکریوں کی مجموعی تعداد چونکہ ایک سو اکیس ہو گئی اس لئے دو بکریاں واجب ہوں گی۔

اب رہ گئی یہ بات کہ حدیث سے تو بظاہر حضرت امام شافعیؒ ہی کے مسلک کی تائید ہو رہی ہے تو اس بارہ میں حنفی علماء کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ اس حدیث کے وہ معنی ہیں ہی نہیں جو شافعی حضرات بیان کرتے ہیں بلکہ اس کا تو مفہوم یہ ہے کہ جو شخص ابتدائی طور پر مال پائے اور حاصل کرے تو اس پر زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب کہ مال پر ایک سال گزر جائے لہٰذا حدیث میں مال سے مستفاد مراد نہیں ہے۔

سال پورا ہونے سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کر دینا جائز ہے

(۱۷) وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ الْعَبَّاسَ سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي تَعْجِيْلِ صَدَقَةٍ قَبْلَ اَنْ تَحِلَّ فَرَخَّصَ لَهٗ فِي ذٰلِكَ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عباسؓ نے رسول کریم ﷺ سے سال پورا ہونے سے پہلے ہی زکوٰۃ جلدی ادا کر دینے کے بارہ میں پوچھا تو آپ ﷺ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔" (ابوداؤد، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: حنفیہ اور اکثر ائمہ کے نزدیک یہ بات جائز اور درست ہے کہ مال پر سال پورا ہونے سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کر دی جائے بشرطیکہ زکوٰۃ دینے والے نصاب شرعی کا مالک ہو۔

نابالغ کے مال کی زکوٰۃ کا مسئلہ

(۱۸) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ اَلَا مَنْ وَلِيَ يَتِيْمًا لَهٗ مَالٌ فَلْيَتَّجِرْ فِيْهِ وَلَا يَتْرُكْهُ حَتّٰى تَاْكُلَهُ الصَّدَقَةُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ فِيْ اِسْنَادِهٖ مَقَالٌ لِاَنَّ الْمُثَنَّى ابْنَ الصَّبَّاحِ ضَعِيْفٌ

"حضرت عمرو ابن شعب اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور وہ اپنے دادا (یعنی عبداللہؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد کرتے ہوئے فرمایا۔ خبردار! جو شخص کسی یتیم کا نگہبان ہو اور وہ یتیم (بقدر نصاب) مال کا مالک ہو تو اس نگہبان کو چاہئے کہ وہ اس مال سے تجارت کرے بغیر تجارت اس مال کو نہ رکھ چھوڑے کہ اسے زکوٰۃ ہی کھا جائے۔ (یعنی زکوٰۃ دیتے ہوئے پورا مال ہی صاف ہو جائے) اس روایت کو ابوداؤد و ترمذی نے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کی اسناد میں کلام کیا گیا ہے کیونکہ روایت کے ایک راوی "مثنیٰ ابن صباح" ضعیف ہیں۔"

تشریح: حضرت امام شافعیؒ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک تو یہ ہے کہ نابالغ کے مال میں بھی زکوٰۃ فرض ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ نابالغ خواہ یتیم نہ ہو بہر صورت اس کے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے کیونکہ ایک دوسری روایت میں یہ ارشاد گرامی ہے کہ "تین اشخاص کو مکلف کرنے سے قلم روک لیا گیا ہے (یعنی ان تینوں کو شریعت نے مکلف قرار نہیں دیا ہے) ایک تو سونے والا شخص جب تک کہ وہ جاگے نہیں۔ دوسرا نابالغ جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے اور تیسرا دیوانہ جب تک کہ اس کی دیوانگی ختم نہ ہو جائے"۔ اس روایت کو ابوداؤد و نسائی اور حاکم نے نقل کیا ہے۔ نیز حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مانعین زکوٰۃ سے حضرت ابوبکرؓ کا اقدام

(۱۹) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ لَمَّا تُوُفِّيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاسْتُخْلِفَ اَبُوْبَكْرٍ بَعْدَهُ وَكَفَرَ مَنْ كَفَرَ مِنَ الْعَرَبِ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِاَبِیْ بَكْرٍ كَيْفَ تُقَاتِلُ النَّاسَ وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَمَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عَصَمَ مِنِّي مَالَهُ وَنَفْسَهُ اِلَّا بِحَقِّهٖ وَحِسَابُهُ عَلَى اللّٰهِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَاللّٰهِ لَاُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّكَاةِ فَاِنَّ الزَّكَاةَ حَقُّ الْمَالِ وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُوْنِيْ عَنَاقًا كَانُوْا يُؤَدُّوْنَهَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰى مَنْعِهَا قَالَ عُمَرُ فَوَاللّٰهِ مَاهُوَ اِلَّا رَاَيْتُ اَنَّ اللّٰهَ شَرَحَ صَدْرَ اَبِیْ بَكْرٍ لِلْقِتَالِ فَعَرَفْتُ اَنَّهُ الْحَقُّ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا اور آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ قرار پائے تو اہل عرب میں سے جنہیں کافر ہو گئے (یعنی زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے ان سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا) حضرت عمر فاروقؓ نے (یہ فیصلہ سن کر) حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عرض کیا کہ "آپ لوگوں (یعنی اہل ایمان) سے کیونکر جنگ کریں گے! جب کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں (یعنی اسلام لے آئیں) لہٰذا جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا یعنی اسلام قبول کر لیا اس نے مجھ سے اپنی جان اور اپنا مال محفوظ کر لیا سوائے اسلام کے حق کے اور اس (کے باطن کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا خدا کی قسم میں اس شخص سے ضرور جنگ کروں گا جو نماز اور روزہ کے درمیان فرق کرے کیونکہ (جس طرح جان کا حق نماز ہے اسی طرح) بلاشبہ مال کا حق زکوٰۃ ہے اللہ کی قسم! اگر وہ لوگ (جو منکر زکوٰۃ ہو رہے ہیں مجھے بکری کا بچہ بھی نہ دیں گے جو وہ رسول کریم ﷺ کو دیتے تھے تو میں ان کے اس انکار کی وجہ سے ان سے جنگ کروں گا۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر کہنے لگے خدا کی قسم! اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے کہ میں نے جان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ کرنے کے لئے (الہام کے ذریعہ) حضرت ابوبکرؓ کا دل کھول دیا ہے (یعنی پر یقین کر دیا ہے) لہٰذا مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اب یہی (یعنی منکرین زکوٰۃ سے جنگ ہی حق اور درست ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: جب نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اول قرار پائے تو کچھ نئے فتنوں نے سر ابھارنا چاہا۔ اس بارے میں ہم نے دسویں قسط میں "تذکرہ صدیق" کے تحت کچھ روشنی ڈالی تھی اور وہاں ان فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت سے "فتنہ ارتداد" کو ذکر کیا تھا جس کے متعلق بتایا تھا کہ اس عظیم فتنہ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کتنی جرات اور تدبر کے ساتھ ختم کیا اور وہ موت کے گھاٹ اتر گیا۔

مذکورہ بالا حدیث میں اسی قسم کے ایک اور فتنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کی صورت یہ ہوئی کہ کچھ قبائل مثلاً غطفان اور بنی سلیم وغیرہ نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اس طرح انہوں نے اسلام کے اس اہم اور بنیادی فریضہ کا انکار کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ کسی فریضہ پر عمل نہ کرنا اور بات ہے مگر اس فریضہ کا سرے سے انکار ہی کر دینا ایک دوسرے معنی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین زکوٰۃ کے بارے میں کفر (وہ کافر ہو گئے) حقیقی معنی میں استعمال فرمائے گئے ہیں ویسے اس لفظ کے بارے میں یہ تفصیل کی جاتی ہے کہ یا تو ان لوگوں کے بارے میں لفظ "کفر" (وہ کافر ہو گئے) حقیقی معنی میں استعمال فرمایا گیا ہے کیونکہ زکوٰۃ کی فرضیت قطعی ہے اور فرضیت زکوٰۃ سے انکار کفر ہے، یا یہ کہ ان لوگوں کو کافر اس لئے کہا گیا کہ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا لہٰذا ان کے اس سخت جرم پر بطریق تغلیظ و تشدید کفر کا اطلاق کیا گیا۔

بہر حال جو معنی بھی متعین کئے جائیں ان کا یہ جرم اتنا سخت تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو ان لوگوں کے ظاہری احوال کے مطابق کہ وہ لوگ بظاہر تو مسلمان کہلاتے ہی تھے ان کے کفر میں تأمل کیا اور حضرت ابوبکرؓ کے اس فیصلہ پر اعتراض کیا۔ مگر جب حضرت ابوبکرؓ نے انہیں حقیقت حال بتائی تو نہ صرف یہ کہ وہ بھی حضرت ابوبکرؓ کے فیصلے کے ہمنوا ہو گئے بلکہ انہیں یقین کامل بھی ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ کی فراست ایمانی اور ان کے تدبر نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

بعض روایتوں میں منقول ہے کہ دوسرے صحابہؓ حتی کہ حضرت علیؓ نے بھی حضرت ابوبکرؓ کو جنگ کرنے سے منع کیا اور کہا کہ عہد خلافت کا ابتدائی دور ہے مخالف بہت زیادہ ہیں ایسا نہ ہو کہ فتنہ وفساد پھوٹ پڑے اور اسلام کو کسی طرح نقصان پہنچ جائے اس لئے اس معاملے میں ابھی توقف کرنا چاہئے مگر حضرت ابوبکرؓ نے نہایت جرات اور بہادری کے ساتھ انہیں یہ جواب دیا کہ اگر اس معاملے میں تمام لوگ ایک طرف ہو جائیں اور میں تنہا رہ جاؤں تو پھر بھی اپنے فیصلے میں کوئی لچک نہیں دکھاؤں گا اور شعائر دین کی حفاظت اور اسلام کے نظریات واعمال کے تحفظ کے لئے میں نے جو قدم اٹھایا ہے اس میں لغزش نہیں آئے گی اور میں پوری قوم سے تن تنہا جنگ کروں گا اس سے حضرت ابوبکرؓ کی اصابت رائے، جرات اور شجاعت وبہادری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی "جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا" میں لا الٰہ الا اللہ سے مراد پورا کلمہ توحید یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے کیونکہ اس بات پر اجماع اور اتفاق ہے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے صرف لا الٰہ الا اللہ کہہ لینا ہی معتبر نہیں ہے بلکہ خدا کی وحدانیت کے اقرار کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی رسالت کا اقرار بھی ضروری ہے۔

الا بحقه (سوائے اسلام کے حق کے) کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس پر دیت لازم ہو گی یا اور کسی قسم کا کوئی حق اس کے ذمے ہو تو اس کی ادائیگی بہر صورت ضروری ہو گی اسی طرح قصاص وغیرہ میں اسے قتل کیا جا سکے گا۔

وحسابه علی اللہ (اور اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے) کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہہ لے گا اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے گا تو ہم اس کے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیں گے اور اس سے جنگ نہیں کریں گے اور نہ ہم اس کے باطن کی تحقیق وتفتیش کریں گے کہ آیا وہ اپنے ایمان واسلام میں مخلص وصادق ہے یا نہیں؟ بلکہ اس کے باطن کا حال اللہ کے سپرد کر دیں گے، اگر وہ صرف ظاہری طور پر مسلمان ہوا ہو گا اور دل سے ایمان نہیں لایا ہو گا جیسا کہ منافقین کا حال ہے تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اپنے آپ اس سے نمٹ لے گا۔

مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّكَاةِ (جو شخص نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرے گا) یعنی نماز کے وجوب کا تو قائل ہو مگر زکوٰۃ کے وجوب کا منکر ہو یا نماز پڑھتا ہو مگر زکوٰۃ ادا نہ کرے۔

عناق بکری کے اس بچہ کو کہتے ہیں جو ایک برس سے کم عمر کا ہو۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ارشاد میں "بکری کا بچہ" فرض اور واجب حق کے طلب کرنے کا سلسلہ میں بطور مبالغہ فرمایا ہے۔ یہاں یہ حقیقت پر محمول نہیں ہے کیونکہ نہ تو بکری کا وہ بچہ جو ایک سال سے کم ہو زکوٰۃ ہی میں لیا جاتا ہے اور نہ بکری کے ایسے بچوں میں زکوٰۃ ہی واجب ہوتی ہے، زکوٰۃ میں لینے کے لئے ادنیٰ درجہ مسنّہ ہے (یعنی وہ بچہ جو ایک سال کا ہو) اگر بچے بکریوں کے ساتھ ہوں گے تو پھر ان میں زکوٰۃ واجب ہو گی لیکن بہر صورت زکوٰۃ میں مسنّہ ہی دیا جائے گا یہی حکم گائے اور اونٹوں کا ہے کہ زکوٰۃ کے طور پر بھی مسنّہ ہی دیا جائے گا پچھلی قسط میں غالباً بتایا جا چکا ہے کہ بکریوں کا مسنّہ تو وہ ہے جس کی عمر ایک سال ہو اور گائے کا مسنّہ وہ ہے جس کی عمر دو سال ہو اور اونٹ کا مسنّہ وہ ہے جو پانچ سال کا ہو۔

اب آخر میں اتنی بات اور جان لیجئے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو یہ فرمایا کہ "میں ان کے اس انکار کی وجہ سے ان سے جنگ کروں گا" تو ابھی اوپر "کفر" کے بارے میں جو تفصیل بیان کی گئی تھی اسی طرح اس قول کے بارے میں بھی یہ تفصیل ہو گی کہ وہ وجوب زکوٰۃ کے منکر

ہوگئے ہیں تو میں ان کے کفر اور ان کے ارتداد کی وجہ سے ان سے جنگ کروں گا اور اگر وہ منکر زکوٰۃ تو نہ ہوئے ہوں بلکہ زکوٰۃ ادا نہ کر رہے ہوں تو پھر ان سے میری جنگ شعائر اسلام کی حفاظت اور اس فتنہ کے سدباب کے لئے ہوگی۔

بغیر زکوٰۃ جمع کیا ہوا خزانہ روز قیامت وبال جان ہوگا

(۲۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ يَكُوْنُ كَنْزُ اَحَدِكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ يَفِرُّ مِنْهُ صَاحِبُهٗ وَيَطْلُبُهٗ حَتّٰى يُلْقِمَهٗ اَصَابِعَهٗ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تمہارا خزانہ قیامت کے دن گنجے سانپ کی صورت میں ہوگا، مالک اس سے بھاگے گا اور وہ اسے ڈھونڈھتا پھرے گا یہاں تک کہ وہ سانپ مالک کو کھا جائے گا اور اس کی انگلیوں کو لقمہ بنائے گا۔" (احمدؒ)

تشریح: "خزانہ" سے مراد وہ مال ہے جسے اس کا مالک جمع کر کے رکھے اور اس کی زکوٰۃ نہ ادا کرے یہی حکم ان تمام مالوں کا ہے جو ناجائز اور حرام طریقے سے جمع کئے گئے ہیں۔

حدیث کے آخری جملے حتی یلقمہ اصابعہ کے دو معنی ہوسکتے ہیں ایک تو یہی معنی جو ترجمہ میں ظاہر کئے گئے ہیں وہ سانپ مالک کی انگلیوں کو لقمہ بنائے گا کیونکہ اس نے ہاتھوں ہی سے مال کما کر جمع کیا تھا اور اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی اس صورت میں لفظ "اصابعہ" ضمیر کا بدل ہوگا۔

دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ مالک مال خود اپنی انگلیاں لقمہ کے طور پر سانپ کے منہ میں ڈے دے گا جیسا کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سانپ وغیرہ سے انتہائی خوف کے وقت بے اختیار اپنی انگلیاں اس کے منہ میں داخل کر دیتے ہیں لیکن دوسرے معنی نہ صرف یہ کہ کچھ دل کو نہیں لگتے بلکہ اس میں اشکال و اعتراضات بھی پیدا ہوسکتے ہیں اسی لئے زیادہ صحیح پہلے ہی معنی ہیں۔

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ رَّجُلٍ لَّا يُؤَدِّيْ زَكَاةَ مَالِهٖ اِلَّا جَعَلَ اللّٰہُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْ عُنُقِهٖ شُجَاعًا ثُمَّ قَرَأَ عَلَيْنَا مِصْدَاقَهٗ مِنْ كِتَابِ اللّٰہِ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتَاهُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِهٖ الْاٰيَة (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھی اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی گردن میں ایک سانپ لٹکائے گا پھر آپ نے یہ آیت پڑھی (جو پہلی فصل کی ایک حدیث میں پوری نقل کی جا چکی ہے۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتَاهُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِهٖ اور وہ لوگ جنہیں خدا نے اپنے فضل سے (مال) عطا فرمایا ہے اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں یہ گمان نہ کریں۔" (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حلال مال میں حرام مال کو ملانا مال کو ضائع کر دینا ہے

(۲۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا خَالَطَتِ الزَّكَاةُ مَالًا قَطُّ اِلَّا اَهْلَكَتْهُ۔ رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالْبُخَارِيُّ فِيْ تَارِيْخِهٖ وَالْحُمَيْدِيُّ وَزَادَ قَالَ يَكُوْنُ قَدْ وَجَبَ عَلَيْكَ صَدَقَةٌ فَلَا تُخْرِجُهَا فَيُهْلِكُ الْحَرَامُ الْحَلَالَ وَقَدِ احْتَجَّ بِهٖ مَنْ يَّرٰى تَعَلُّقَ الزَّكَاةِ بِالْعَيْنِ هٰكَذَا فِي الْمُنْتَقٰى وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ اَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ بِاِسْنَادِهٖ اِلٰى عَائِشَةَ وَقَالَ اَحْمَدُ فِيْ خَالَطَتْ تَفْسِيْرُهٗ اَنَّ الرَّجُلَ يَأْخُذُ الزَّكَاةَ وَهُوَ مُوْسِرٌ اَوْ غَنِيٌّ وَّاِنَّمَا هِيَ لِلْفُقَرَآءِ۔

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس مال میں زکوٰۃ رل مل جاتی ہے وہ مال

ضائع ہو جاتا ہے۔ (شافعیؒ، بخاریؒ، حمیدیؒ) حمیدی نے یہ مزید نقل کیا ہے (یعنی حدیث کی وضاحت بیان کی ہے) کہ بخاری نے فرمایا کہ جب تم پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور تم زکوٰۃ نہیں نکالتے (تو وہ زکوٰۃ مال میں رلی ملی ہوتی ہے) لہٰذا حرام مال حلال مال کو ضائع کر دیتا ہے جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ زکوٰۃ عین مال سے متعلق ہے نہ کہ ذمہ سے تو انہوں نے اسی حدیث کو (بخاری کی مذکورہ بالا وضاحت کے ساتھ اپنی دلیل قرار دیا ہے (منتقی) بیہقیؒ نے شعب الایمان میں اس روایت کو امام احمد بن حنبلؒ سے حضرت عائشہؓ تک سلسلہ سند کے ساتھ نقل کیا ہے چنانچہ امام احمدؒ نے حدیث کے لفظ "خالطت" کے معنی یا اس کی تاویل) کے سلسلے میں یہ وضاحت کی ہے کہ (مثلاً ایک شخص مالدار اور یا غنی[1] ہے مگر اس کے باوجود وہ زکوٰۃ لیتا ہے حالانکہ زکوٰۃ تو صرف فقراء و مساکین اور مستحقین کے لئے جائز ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں حضرت امام بخاریؒ تو اس کا مطلب یہ بیان فرما رہے ہیں کہ مثلاً ایک شخص صاحب نصاب ہے اور اس پر زکوٰۃ واجب ہے مگر وہ اپنے مال میں سے وہ حصہ نہیں نکالتا جو بطور زکوٰۃ اس پر نکالنا واجب ہے اس طرح مال کا وہ حصہ جو زکوٰۃ کے طور پر اسے نکالنا چاہئے تھا اور اب نہ نکالنے کی صورت میں وہ اس کے حق میں حرام مال ہے اس کے اصل مال میں مخلوط رہے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ اس حدیث کے یہ معنی بیان فرما رہے ہیں کہ مثلاً کوئی شخص مالدار یعنی صاحب نصاب ہے جس کی وجہ سے وہ کسی دوسرے سے زکوٰۃ لینے کا مستحق نہیں ہے مگر وہ دوسرے سے زکوٰۃ لیتا ہے اور اس زکوٰۃ کے مال کو جو اس کے حق میں حرام ہے اپنے اصل مال کے ساتھ مخلوط کر دیتا ہے۔

بہرحال ان میں سے کوئی بھی معنی متعین کر لئے جائیں دونوں اقوال کے پیش نظر حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حرام مال خواہ وہ مال میں سے بقدر واجب نہ نکالا جانے والا حصہ ہو خواہ صاحب نصاب کا کسی دوسرے سے زکوٰۃ میں حاصل کیا ہوا مال ہو، اصل اور حلال مال کو شائع اور تباہ کر دیتا ہے بایں طور کہ اس حرام مال کے ملنے کی وجہ سے پورا مال کسی نہ کسی طرح ضائع ہو جاتا ہے یا اس میں کوئی نقصان واقع ہو جاتا ہے یا مال میں سے برکت اٹھ جاتی ہے اور یا مال ناقابل انتفاع ہو جاتا ہے کیونکہ حرام مال سے نفع اٹھانا شرعاً جائز نہیں ہے۔

ادائیگی زکوٰۃ کا تعلق عین مال سے ہے یا ذمہ سے ہے: روایت کے آخر میں ایک اختلافی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ادائیگی زکوٰۃ کا تعلق عین مال سے ہے؟ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ مثلاً ایک شخص مالدار یعنی صاحب نصاب ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اب سوال یہ ہے کہ آیا وہ زکوٰۃ کے طور پر بقدر واجب مال اسی مال میں سے نکال کر دے جو اس کے پاس ہے یا یہ کہ اگر وہ اسی مال میں سے زکوٰۃ کے بقدر حصہ نہ نکالے بلکہ اس کی قیمت ادا کرے تو اس مسئلہ میں حضرت امام شافعیؒ اور دوسرے آئمہ کا مسلک تو یہ ہے کہ زکوٰۃ کا تعلق عین مال سے ہے یعنی جس مال پر زکوٰۃ واجب ہے اسی مال میں بقدر واجب مال نکال کر زکوٰۃ ادا کرے اور یہ بات انہوں نے حدیث کے لفظ "خالطت" سے مستنبط کی ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا تعلق ذمہ ہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر صاحب نصاب اسی مال سے کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہے، زکوٰۃ کے طور پر بقدر واجب مال نہ نکالے بلکہ اتنے ہی مال کی قیمت زکوٰۃ میں ادا کرے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے اور وہ بری الذمہ ہو جائے گا۔

مگر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ وغیرہ کے مذکورہ مسلک کی دلیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ حدیث کے انہیں معنی کو حدیث کا اصل مفہوم قرار دیا جائے جو حضرت امام بخاریؒ کی طرف سے بیان کئے گئے ہیں۔

حنفی مسلک کی دلیلیں ملا علی قاریؒ نے مرقات میں اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اشعۃ اللمعات میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔ طوالت کی وجہ سے انہیں یہاں نقل نہیں کیا گیا ہے۔ اہل علم ان کتابوں سے مراجعت کر سکتے ہیں۔

---

[1] یہ راوی کا شک ہے کہ روایت میں اصل لفظ مُوْسِرٌ تھا یا غَنِیٌّ۔

بَابُ مَا تَجِبُ فِیْهِ الزَّکٰوۃ

جن چیزوں میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ان کا بیان

شریعت نے چار قسم کے مالوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے۔ ① سائمہ جانوروں پر ② سونے چاندی پر ③ تجارتی مال پر خواہ وہ کسی قسم کا ہو ④ کھیتی اور درختوں کی پیداوار پر گو اس چوتھی قسم کو فقہاء "زکوٰۃ" کے لفظ سے ذکر نہیں کرتے بلکہ اسے "عشر" کہتے ہیں چنانچہ متفقہ طور پر تمام ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ چوپایہ جانوروں یعنی اونٹ، گائے، بکری، دنبہ، بھیڑ اور بھینس میں زکوٰۃ واجب ہے خواہ جانور نر ہوں یا مادہ، ان کے علاوہ اور جانوروں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ البتہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک گھوڑوں میں بھی زکوٰۃ واجب ہے اس کی تفصیل اگلے صفحات میں بیان کی جائے گی اسی طرح متفقہ طور پر تمام ائمہ کے نزدیک سونے چاندی اور تجارت کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے۔

جو چیزیں ایک سال تک قائم نہ رہتی ہوں جیسے لکڑی، کھیرا، خربوزہ اور دوسری ترکاریاں ساگ وغیرہ ان میں دوسرے ائمہ کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہے البتہ کھجوروں اور کشمش میں زکوٰۃ واجب ہے جب کہ ان کی مقدار پانچ وسق تک ہو پانچ وسق سے کم مقدار میں ان میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے ہاں ہر اس چیز میں عشر یعنی دسواں حصہ نکالنا واجب ہے جو زمین سے پیدا ہو خواہ پیداوار کم ہو یا زیادہ ہو لیکن بانس، لکڑی اور گھاس میں عشر واجب نہیں ہے اس بارے میں حضرت امام صاحب کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ:

مَا اَخْرَجَتْهُ الْاَرْضُ فَفِیْهِ الْعُشْرُ —— "زمین سے پیدا ہونے والی ہر چیز میں دسواں حصہ نکالنا واجب ہے۔"

زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہونے کے لئے کسی مقدار معین کی شرط نہیں ہے اسی طرح سال گزرنے کی بھی قید نہیں ہے بلکہ جس قدر اور جب بھی پیداوار ہوگی اسی وقت دسواں حصہ نکالنا واجب ہو جائے گا دوسرے مالوں کے برخلاف کہ ان میں زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوتی ہے جب کہ وہ بقدر نصاب ہوں اور ان پر ایک سال پورا گزر جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نصاب زکوٰۃ

① عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ مِّنَ التَّمْرِ صَدَقَةٌ وَّلَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسِ اَوَاقٍ مِّنَ الْوَرِقِ صَدَقَةٌ وَّلَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِّنَ الْاِبِلِ صَدَقَةٌ (متفق علیہ)

"حضرت ابوسعید خدری راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ پانچ وسق سے کم کھجوروں میں زکوٰۃ واجب نہیں پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ واجب نہیں اور پانچ راس سے کم اونٹوں میں زکوٰۃ واجب نہیں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ایک وسق آٹھ صاع کے برابر، ایک صاع آٹھ رطل کے برابر اور ایک رطل چونتیس تولہ ڈیڑھ ماشہ کے برابر ہوتا ہے اس حساب سے پانچ وسق انگریزی اسی تولہ کے سیر کے حساب پچیس من ساڑھے بارہ سیر (نو کوئنٹل چوالیس کلوگرام) کے برابر ہوتے ہیں گویا ۲۵ من ۱۲½ سیر یا اس سے زائد کھجوروں میں دسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر نکالا جائے گا اس مقدار سے کم اگر کھجوریں پیدا ہوں تو اس حدیث کے بموجب اس میں زکوٰۃ کے طور پر دسواں حصہ واجب نہیں ہوگا۔ چنانچہ حضرت امام شافعی اور حنفیہ میں سے حضرت امام ابویوسف

اور حضرت امام محمدؒ کا یہی مسلک ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زمین کی پیداوار میں کوئی نصاب مقرر نہیں ہے جس قدر بھی پیداوار ہو اس کا دسواں حصہ زکوٰۃ میں نکالنا واجب ہے۔ مثلاً اگر دس سیر پیداوار ہو تو اس میں سے ایک سیر زکوٰۃ کے طور پر نکالا جائے اور اگر دس ہی چھٹانک پیدا ہو تو اس سے بھی ایک چھٹانک نکالا جائے زمین کی دوسری پیداوار مثلاً گیہوں، جو، چنا وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔ زمین کی پیداوار کے عشر کے بارے میں حنفیہ کے یہاں فتویٰ امام اعظمؒ ہی کے قول پر ہے۔ یہ حدیث چونکہ حضرت امام اعظمؒ کے مسلک کے بظاہر خلاف معلوم ہوتی ہے اس لئے ان کی طرف سے اس حدیث کی توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ حدیث میں کھجور سے مراد وہ کھجوریں ہیں جو تجارت کے لئے ہوں کیونکہ اس وقت عام طور پر کھجوروں کی خرید و فروخت وسق کے حساب سے ہوتی تھی اور ایک وسق کھجور کی قیمت چالیس درہم ہوتی تھی اس حساب سے پانچ وسق کی قیمت دو سو درہم ہوئے جو مال تجارت میں زکوٰۃ کے لئے متعین نصاب ہے۔

اواق اوقیہ کی جمع ہے ایک اوقیہ چالیس درہم یعنی ساڑھے دس تولہ (۱۲۲ء۴۷ گرام) کے برابر ہوتا ہے اس طرح پانچ اوقیہ دو سو درہم یعنی ۵۲½ تولہ تقریباً ۶۱۲ گرام) کے برابر ہوئے جو چاندی کا نصاب زکوٰۃ ہے اس مقدار سے کم چاندی میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے گویا جو شخص دو سو درہم کا مالک ہو گا وہ بطور زکوٰۃ پانچ درہم ادا کرے گا۔

یہ تو درہم کا نصاب تھا چاندی اگر سکہ کے علاوہ کسی دوسری صورت میں ہو مثلاً چاندی کے زیورات و برتن ہوں یا چاندی کے سکے ہوں تو اس کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے اور اسی طرح اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ پھر بھی تفصیل سے چاندی کے نصاب کو یوں سمجھئے کہ۔

ایک درہم تین ماشہ ایک رتی اور پانچواں حصہ رتی کے برابر ہوتا ہے اس طرح دو سو میں چھ سو تیس ماشہ یعنی ۵۲½ تولہ تقریباً ۶۱۲ گرام چاندی ہوئی۔ لہٰذا دو سو درہم کی زکوٰۃ چالیسویں حصے کے مطابق پانچ درہم ہوئے جو پندرہ ماشہ چھ رتی یعنی ایک تولہ میں ماشہ چھ رتی کے برابر ہوتے ہیں۔ اسی طرح درہم کے علاوہ چاندی کے زیورات یا برتن وغیرہ کی صورت میں ۵۲½ تولہ (یعنی ۶۱۲ گرام) ہو تو اس کی زکوٰۃ کے طور پر چالیسواں حصہ ایک تولہ تین ماشہ چھ رتی (۱۵½ گرام) چاندی یا اتنی ہی چاندی کی قیمت زکوٰۃ کے طور پر ادا کی جائے گی اور اگر چاندی[1] سکے کی شکل میں ہو اور ایک سکہ بارہ ماشہ اور قیمت کے اعتبار سے ایک روپیہ کا ہو تو اس حساب سے ۵۲½ تولہ چاندی کے ۵۲½ روپے ہوئے لہٰذا ان کی زکوٰۃ کے طور پر اسی چاندی کے روپے کے حساب سے یعنی وہی بارہ ماشہ والا ایک روپیہ پانچ آنے واجب ہوں گے اور اگر سکہ ۱۱½ ماشہ اور قیمت کے اعتبار سے ایک روپیہ کا ہو تو اس حساب سے ۵۲½ تولہ چاندی کی قیمت چون روپے بارہ آنے ۶ ۶/۲۳ پائی کے برابر ہو گی جس پر زکوٰۃ واجب ہو گی لہٰذا اس میں سے اس چاندی کے روپے کے حساب سے یعنی وہی ۱۱½ ماشہ والا ایک روپیہ پانچ آنے دس پائی اور ۲۳/۳۲ پائی بطور زکوٰۃ نکالنا ہو گا۔ مذکورہ بالا تفصیل کو حسب ذیل جدول سے سمجھئے۔

تعداد درہم	تعین زکوٰۃ	وزن چاندی	تعین زکوٰۃ	سکہ بارہ ماشہ والا	زکوٰۃ	سکہ ۱۱½ ماشہ والا	زکوٰۃ
۲۰۰ درہم	۵ درہم	۵۲½ تولہ	۱ تولہ تین ماشہ چھ رتی	قیمتی عـہ صـہ ۵۲	۵ ؍	قیمتی ۱۲/۱۱ صـہ ۶ ۶/۲۳ پائی	۵ ۱۰ ۲۲/۲۳ پائی

نصاب کا یہ سارا حساب سمجھنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ اگر نصاب سے زیادہ روپے ہوں تو اس کا سیدھا حساب یہ ہے کہ ڈھائی روپیہ سیکڑہ یعنی ہر سو روپیہ میں سے ڈھائی روپے کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

---

[1] جس زمانہ میں چاندی کے روپے جاری تھے اس وقت اس حساب اور تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اب اگرچہ چاندی کے سکے نہیں ہیں تاہم چونکہ مظاہر حق قدیم میں یہ تفصیل لکھی گئی ہے اس لئے یہاں بھی اسے نقل کر دیا گیا ہے ویسے تو چاندی کی زکوٰۃ کا یہ بالکل صاف سکہ ہے موجود چاندی کا چالیسواں حصہ یا اس حصہ کی قیمت زکوٰۃ میں ادا کی جائے گی۔

اگرچہ حدیث میں سونے کا نصاب ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن اس کے بارے میں بھی جانتے چلئے کہ سونے کا نصاب بیس مثقال یعنی ساڑھے سات تولہ (تقریباً ۸۷٫۵ گرام) ہے اس سے کم میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اگر اس مقدار میں یا اس سے زائد مقدار میں سونا ہو تو موجودہ مقدار کا چالیسواں حصہ یا اس حصہ کی قیمت زکوٰۃ کے طور پر ادا کی جائے گی۔

اگر سونا اور چاندی دونوں مجموعی اعتبار سے بقدر نصاب ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی مثلاً کسی شخص کے پاس سوا چھبیس تولہ چاندی ہو اور اسی کے ساتھ سوا چھبیس تولہ چاندی کی قیمت کے بقدر سونا بھی ہو تو وہ شخص صاحب نصاب کہلائے گا اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس سوا چھبیس تولہ چاندی کی قیمت کے بقدر تجارت کا مال ہو اور اسی کے ساتھ سوا چھبیس تولہ چاندی کی قیمت کے بقدر نقد روپیہ ہو تو وہ بھی صاحب نصاب کہلائے گا اور اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

سونا اور چاندی کسی بھی شکل وصورت میں ہوں خواہ وہ گنی اور ڈلی کی صورت میں ہوں یا پترے ہوں خواہ زیورات کی شکل میں ہوں یا برتنوں کی صورت میں ہوں بہر صورت ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ گوٹہ کناری اور کمخواب وغیرہ میں جو چاندی ہوتی ہے اس کی مقدار کا بھی اندازہ کرایا جائے اگر وہ مقدار نصاب کو پہنچے تو اس کی زکوٰۃ بھی ادا کی جائے موتی، مونگا، یاقوت اور دوسرے جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی خواہ لاکھوں روپیہ کی قیمت ہی کے کیوں نہ موجود ہوں ہاں اگر جواہرات تجارت کے مقصد سے ہوں گے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

غلام اور گھوڑوں کی زکوٰۃ

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ صَدَقَةٌ فِیْ عَبْدِهٖ وَلَا فِیْ فَرَسِهٖ وَفِیْ رِوَايَةٍ قَالَ لَيْسَ فِیْ عَبْدِهٖ صَدَقَةٌ اِلَّا صَدَقَةَ الْفِطْرِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کسی مسلمان پر اس کے غلام اور اس کے گھوڑوں میں زکوٰۃ (واجب نہیں) ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ کسی مسلمان پر اس کے غلام میں زکوٰۃ تو واجب نہیں ہے ہاں صدقہ فطر واجب ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو غلام اور گھوڑے تجارت کے لئے نہ ہوں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام ابویوسف وامام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا مسلک یہی ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ جو گھوڑے اور گھوڑی ملی ہوئی سال کے اکثر حصہ میں جنگل اور چراگاہوں میں چریں ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہے جس کا نصاب یہ ہے کہ فی راس ایک دینار یا اس کی پوری قیمت متعین کر کے ہر دو سو درہم پر پانچ درہم کے حساب سے یعنی قیمت کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کیا جائے۔

فتاویٰ قاضی خان، درمختار اور فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ حنفیہ کے یہاں فتویٰ حضرت امام ابویوسفؒ وحضرت امام محمدؒ ہی کے قول پر ہے کہ گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

نصاب زکوٰۃ کی تفصیل

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ اَبَابَكْرٍ كَتَبَ لَهٗ هٰذَا الْكِتٰبَ لَمَّا وَجَّهَهٗ اِلَى الْبَحْرَيْنِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هٰذِهٖ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِیْ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ وَالَّتِیْ اَمَرَ اللّٰهُ بِهَا رَسُوْلَهٗ فَمَنْ سُئِلَهَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ عَلٰى وَجْهِهَا فَلْيُعْطِهَا وَمَنْ سُئِلَ فَوْقَهَا فَلَا يُعْطِ فِیْ اَرْبَعٍ وَّعِشْرِيْنَ مِنَ الْاِبِلِ فَمَا دُوْنَهَا مِنَ الْغَنَمِ مِنْ كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ فَاِذَا بَلَغَتْ خَمْسًا وَّعِشْرِيْنَ اِلٰى خَمْسٍ وَّثَلَاثِيْنَ فَفِيْهَا بِنْتُ مَخَاضٍ اُنْثٰى فَاِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَّثَلَاثِيْنَ اِلٰى خَمْسٍ وَّاَرْبَعِيْنَ فَفِيْهَا بِنْتُ لَبُوْنٍ اُنْثٰى فَاِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَّاَرْبَعِيْنَ اِلٰى سِتِّيْنَ فَفِيْهَا حِقَّةٌ طَرُوْقَةُ الْجَمَلِ فَاِذَا بَلَغَتْ وَاحِدَةً

وَّسِتِّيْنَ اِلٰى خَمْسٍ وَّسَبْعِيْنَ فَفِيْهَا جَذَعَةٌ فَاِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَّسَبْعِيْنَ اِلٰى تِسْعِيْنَ فَفِيْهَا بِنْتَا لَبُوْنٍ فَاِذَا بَلَغَتْ اِحْدٰى وَتِسْعِيْنَ اِلٰى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ فَفِيْهَا حِقَّتَانِ طَرُوْقَتَا الْجَمَلِ فَاِذَا زَادَتْ عَلٰى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ فَفِىْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ بِنْتُ لَبُوْنٍ وَّفِىْ كُلِّ خَمْسِيْنَ حِقَّةٌ وَّمَنْ لَّمْ يَكُنْ مَعَهٗ اِلَّا اَرْبَعٌ مِّنَ الْاِبِلِ فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ رَبُّهَا فَاِذَا بَلَغَتْ خَمْسًا فَفِيْهَا شَاةٌ وَّمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهٗ مِنَ الْاِبِلِ صَدَقَةُ الْجَذَعَةِ وَلَيْسَتْ عِنْدَهٗ جَذَعَةٌ وَّعِنْدَهٗ حِقَّةٌ فَاِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْحِقَّةُ وَيُجْعَلُ مَعَهَا شَاتَيْنِ اِنِ اسْتَيْسَرَتَا لَهٗ اَوْ عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا وَّمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهٗ صَدَقَةُ الْحِقَّةِ وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ الْحِقَّةُ وَعِنْدَهُ الْجَذَعَةُ فَاِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْجَذَعَةُ وَيُعْطِيْهِ الْمُصَدِّقُ عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا اَوْشَاتَيْنِ وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهٗ صَدَقَةُ الْحِقَّةِ وَلَيْسَتْ عِنْدَهٗ اِلَّا بِنْتُ لَبُوْنٍ فَاِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ بِنْتُ لَبُوْنٍ وَيُعْطِىْ شَاتَيْنِ اَوْ عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا وَّمَنْ بَلَغَتْ صَدَقَتُهٗ بِنْتَ لَبُوْنٍ وَعِنْدَهٗ حِقَّةٌ فَاِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْحِقَّةُ وَيُعْطِيْهِ الْمُصَدِّقُ عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا اَوْ شَاتَيْنِ وَمَنْ بَلَغَتْ صَدَقَتُهٗ بِنْتَ لَبُوْنٍ وَّلَيْسَتْ عِنْدَهٗ وَعِنْدَهٗ بِنْتُ مَخَاضٍ فَاِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ بِنْتُ مَخَاضٍ وَّيُعْطِىْ مَعَهَا عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا اَوْشَاتَيْنِ وَمَنْ بَلَغَتْ صَدَقَتُهٗ بِنْتَ مَخَاضٍ وَّلَيْسَتْ عِنْدَهٗ وَعِنْدَهٗ بِنْتُ لَبُوْنٍ فَاِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ وَيُعْطِيْهِ الْمُصَدِّقُ عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا اَوْشَاتَيْنِ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ عِنْدَهٗ بِنْتُ مَخَاضٍ عَلٰى وَجْهِهَا وَعِنْدَهُ ابْنُ لَبُوْنٍ فَاِنَّهٗ يُقْبَلُ مِنْهُ وَلَيْسَ مَعَهٗ شَىْءٌ وَّفِىْ صَدَقَةِ الْغَنَمِ فِىْ سَآئِمَتِهَا اِذَا كَانَتْ اَرْبَعِيْنَ اِلٰى عِشْرِيْنَ وَ مِائَةٍ شَاةٌ فَاِذَا زَادَتْ عَلٰى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ اِلٰى مِائَتَيْنِ فَفِيْهَا شَاتَانِ فَاِذَا زَادَتْ عَلٰى مِائَتَيْنِ اِلٰى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَفِيْهَا ثَلَاثُ شِيَاهٍ فَاِذَا زَادَتْ عَلٰى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَفِىْ كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ فَاِذَا كَانَتْ سَآئِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً مِّنْ اَرْبَعِيْنَ شَاةً وَّاحِدَةً فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ رَبُّهَا وَلَا تُخْرَجُ فِى الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ وَّلَا ذَاتُ عَوَارٍ وَّلَا تَيْسٌ اِلَّا مَاشَآءَ الْمُصَدِّقُ وَلَا يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ وَّلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيْطَيْنِ فَاِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ وَفِى الرِّقَةِ رُبْعُ الْعُشْرِ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ اِلَّا تِسْعِيْنَ وَمِائَةً فَلَيْسَ فِيْهَا شَىْءٌ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ رَبُّهَا (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کے بارے میں مروی ہے کہ جب امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں بحرین (جو بصرہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے) بھیجا تو انہیں یہ ہدایت نامہ تحریر فرمایا۔ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمن ورحیم ہے، یہ اس صدقہ فرض (زکوۃ) کے بارے میں ہدایت نامہ ہے جسے رسول کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مسلمانوں پر فرض کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے نافذ کرنے کے بارے میں اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا۔ لہٰذا جس شخص سے قاعدہ کے مطابق زکوۃ کا مطالبہ کیا جائے تو وہ ادائیگی کرے اور جس شخص سے (شرعی مقدار سے) زیادہ مطالبہ کیا جائے وہ (زائد مطالبہ کی) ادائیگی نہ کرے (زکوۃ کا نصاب یہ ہے کہ) چوبیس اور چوبیس سے کم اونٹوں کی زکوۃ میں بکری ہے اس طرح کہ ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری ہے (یعنی پانچ اونٹوں سے کم میں زکوۃ نہیں ہے اور پانچ سے نو تک ایک بکری دس سے چودہ تک دو بکری، پندرہ سے انیس تک تین بکری اور بیس سے چوبیس تک چار بکری واجب ہوگی) ۲۵ سے ۳۵ تک میں ایک ایسی اونٹنی جو ایک سال کی ہو چھتیس سے پینتالیس تک ایک ایسی اونٹنی جو دو سال کی ہو۔ چھیالیس سے ساٹھ تک میں ایک ایسی اونٹنی جو چار سال کی ہو اور اونٹ سے جفتی کے قابل ہو، اکسٹھ سے پچھتر تک میں ایک اونٹنی جو اپنی عمر کے چار سال ختم کر کے پانچویں سال میں داخل ہوگئی اور چھہتر سے نوے تک میں دو ایسی اونٹنیاں جو دو سال کی ہوں اکیانوے سے ایک سو بیس تک میں دو ایسی اونٹنیاں جو تین تین سال کی ہوں اور اونٹ سے جفتی کے قابل ہوں اور جب تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو تو اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ان زائد اونٹنیوں میں ہر چالیس کی زیادتی پر دو برس کی اونٹنی اور ہر پچاس کی زیادتی پر پورے تین برس کی اونٹنی واجب ہوگی اور جس کے پاس صرف چار ہی اونٹ ہوں تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہاں اگر وہ شخص چاہے تو صدقہ نفل کے طور پر کچھ دے دے جب پانچ اونٹ ہوں گے تو اس پر زکوۃ کے طور پر ایک بکری واجب ہو جائے گی۔ اور جس شخص کے پاس اتنے اونٹ ہوں کہ ان میں زکوۃ کے طور پر ایسی اونٹنی واجب ہوتی ہو جو چار برس پورے کر کے

پانچویں سال میں لگ گئی ہو (یعنی اکسٹھ سے پچھتر تک کی تعداد میں) اور اس کے پاس چار برس کی اونٹنی نہ ہو کہ جسے وہ زکوٰۃ کے طور پر دے سکے بلکہ تین برس کی اونٹنی موجود ہو تو اس سے تین ہی برس کی اونٹنی زکوٰۃ میں قبول کی جاسکتی ہے مگر زکوٰۃ دینے والا اس تین برس کی اونٹنی کے ساتھ ساتھ اگر اس کے پاس موجود ہوں تو دو بکریاں ورنہ بصورت دیگر تیس درہم ادا کرے اور کسی شخص کے پاس اونٹوں کی ایسی تعداد ہو جس میں تین برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہو (یعنی چھیالیس سے ساٹھ تک کی تعداد) اور اس کے پاس تین برس کی کوئی اونٹنی (زکوٰۃ میں دینے کے لئے) نہ ہو بلکہ چار برس کی اونٹنی ہو تو اس سے چار برس والی اونٹنی ہی لے لی جائے مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے دو بکریاں یا بیس درہم واپس کردے اور اگر کسی شخص کے پاس اونٹوں کی ایسی تعداد ہو جس میں تین برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہو اور اس کے پاس تین برس کی کوئی اونٹنی نہ ہو بلکہ دو برس کی اونٹنی ہو تو اس سے دو برس کی اونٹنی ہی لے لی جائے البتہ زکوٰۃ دینے والا دو بکریاں یا بیس درہم (بھی اس کے ساتھ) دیدے اور اگر کسی شخص کے پاس اتنی تعداد میں اونٹ ہوں کہ جن میں دو برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہو (جیسے چھتیس سے پینتالیس تک کی تعداد) اور اس کے پاس (دو برس کی اونٹنی کے بجائے) تین برس کی اونٹنی ہو تو اس سے تین برس کی اونٹنی ہی لے لی جائے مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے بیس درہم یا دو بکریاں واپس کردے اور اگر کسی شخص کے پاس اتنی تعداد میں اونٹ ہوں جن میں دو برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہو اور وہ اس کے پاس نہ ہو بلکہ ایک برس کی اونٹنی ہو تو اس سے ایک برس کی اونٹنی ہی لے لی جائے اور وہ زکوٰۃ دینے والا اس کے ساتھ بیس درہم یا دو بکریاں بھی دے اور اگر کسی شخص کے پاس اتنی تعداد میں اونٹ ہوں کہ جن میں ایک برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہو جیسے بیس سے پچیس تک کی تعداد، اور ایک برس کی اونٹنی اس کے پاس نہ ہو بلکہ دو برس کی اونٹنی اس کے پاس ہو تو اس سے وہی دو برس والی اونٹنی لے لی جائے مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اس کو دو بکریاں یا بیس درہم واپس کردے اور اگر اس کے پاس دینے کے قابل ایک برس کی اونٹنی نہ ہو اور نہ ہی دو برس کی اونٹنی ہو بلکہ دو برس کا اونٹ ہو تو وہ اونٹ ہی لے لیا جائے مگر اس صورت میں کوئی اور چیز واجب نہیں (نہ تو زکوٰۃ لینے والا کچھ واپس کرے گا اور نہ زکوٰۃ دینے والا کچھ دے گا اور چرنے والی بکریوں کی زکوٰۃ کا نصاب یہ ہے کہ جب بکریوں کی تعداد چالیس سے ایک سو بیس تک ہو تو ایک واجب ہوتی ہے اور ایک سو بیس سے زائد ہوں تو دو سو تک کی تعداد پر دو بکریاں واجب ہوتی ہیں اور جب دو سو سے زائد ہوں تو تین سو تک تین بکریاں واجب ہوتی ہیں اور جب تین سو سے زائد ہو جائیں تو پھر یہ حساب ہوگا کہ ہر سو بکریوں میں ایک بکری واجب ہوگی جس شخص کے پاس چرنے والی بکریاں چالیس سے ایک بھی کم ہوں گی تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی ہاں اگر بکریوں کا مالک چاہے تو صدقہ نفل کے طور پر کچھ دے سکتا ہے۔ (اس بات کا خیال رکھا جائے کہ) زکوٰۃ میں خواہ اونٹ ہو یا گائے اور بکری بڑھیا اور عیب دار نہ جائے اور نہ بوک (بکرا) دیا جائے ہاں اگر زکوٰۃ وصول کرنے والا (کسی مصلحت کے تحت) بوک لینا چاہے (تو درست ہے) اور متفرق جانوروں کو یکجا نہ کیا جائے اور نہ زکوٰۃ کے خوف سے جانوروں کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے، نیز جس نصاب میں دو آدمی شریک ہوں تو انہیں چاہئے کہ وہ دونوں برابر برابر تقسیم کرلیں اور چاندی میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر دینا فرض ہے اگر کسی کے پاس صرف ایک سو نوے درہم ہوں (یعنی نصاب شرعی کا مالک نہ ہو) تو اس پر کچھ فرض نہیں ہے ہاں اگر وہ صدقہ نفل کے طور پر کچھ دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔" (بخاری)

تشریح: گذشتہ صفحات میں ایک حدیث گزر چکی ہے جس میں یہ فرمایا گیا کہ تم زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو خوش کرو اگرچہ وہ تمہارے ساتھ ظلم ہی کا معاملہ کیوں نہ کریں۔ اسی طرح ایک حدیث اور گزر چکی ہے جس میں بیان کیا گیا تھا کہ کچھ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے زیادتی کرتے ہیں یعنی مقدار واجب سے زیادہ مال لیتے ہیں تو کیا ہم ان کی طرف سے زیادہ طلب کئے جانے والے مال کو چھپا دیں یعنی وہ انہیں نہ دیں تو اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرما دیا تھا۔

لیکن یہاں فرمایا گیا ہے کہ "جس شخص سے زیادہ مطالبہ کیا جائے وہ ادائیگی نہ کرے"۔ لہٰذا بظاہر ان روایتوں میں تعارض اور اختلاف معلوم ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت زکوٰۃ وصول کرنے والے صحابہ ؓ تھے ظاہر ہے کہ نہ تو وہ ظالم تھے اور نہ شرعی

مقدار سے زیادہ مال کا مطالبہ کرتے تھے اور نہ صحابہؓ کے بارے میں ایسا تصور کیا بھی جاسکتا تھا لوگ اپنے گمان اور خیال کے مطابق یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ ہوتا ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس حقیقت کے پیش نظر یہی حکم دیا کہ انہیں بہر صورت خوش کیا جائے اور وہ جو کچھ مانگیں اسے دینے میں تأمل نہ کیا جائے اور یہاں حضرت ابوبکرؓ کے ارشاد میں زکوٰۃ وصول کرنے والوں سے صحابہؓ مراد نہیں ہیں بلکہ دوسرے لوگ مراد ہیں اور ظاہر ہے کہ صحابہؓ کے علاوہ دوسرے لوگوں سے ایسی باتوں کا صدور ممکن تھا اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے یہ تحریر فرمایا کہ زائد مطالبہ کی ادائیگی نہ کی جائے۔ اس وضاحت سے احادیث میں جو بظاہر تعارض نظر آرہا تھا وہ ختم ہوگیا۔

فَاِذَا زَادَتْ عَلٰی عِشْرِیْنَ وَمِائَةٍ الخ (اور جب تعداد ایک سوبیس سے زائد ہو الخ) قاضیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث عدد مذکور سے متجاوز ہونے کی صورت میں استقرار اور حساب پر دلالت کرتی ہے یعنی جب اونٹ ایک سوبیس سے زائد ہوں تو ان کی زکوٰۃ کا حساب از سر نو شروع نہ کیا جائے بلکہ ایسی صورت میں ہر چالیس کی زیادتی پر دو برس کی اونٹنی اور ہر پچاس کی زیادتی پر تین برس کی اونٹنی کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جانی چاہئے، چنانچہ اکثر ائمہ کا یہی مسلک ہے، مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ از سر نو حساب شروع کیا جائے گا چنانچہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سوبیس سے تجاوز کر جائے گی تو اس وقت دو حقے (یعنی تین برس کی دو اونٹنیاں) اور ایک بکری واجب ہوگی اور اسی طرح چوبیس کی تعداد تک ہر پانچ پر ایک بکری واجب ہوتی چلی جائے گی پھر پچیس اور پچیس کے بعد بنت مخاض (ایک سال کی اونٹنی) واجب ہوجائے گی۔ اسی طرح آخر تک پہلی ترتیب کے مطابق حساب کیا جائے گا امام نخعیؒ اور امام ثوریؒ کا بھی یہی قول ہے ان حضرات کی دلیل یہ ارشاد گرامی ہے کہ "جب اونٹوں کی تعداد ایک سو سے زائد ہوجائے تو اس کا حساب از سر نو شروع کیا جائے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی اس طرح منقول ہے۔

اونٹوں کی زکوٰۃ کے بارے میں اتنی بات اور جان لیجئے کہ ان کی زکوٰۃ کے طور پر مادہ یعنی اونٹنی یا اس کی قیمت واجب ہوتی ہے جب کہ گائے اور بکری کی زکوٰۃ میں نر اور مادہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ ان کی زکوٰۃ کے طور پر نر یا اس کی قیمت اور مادہ یا اس کی قیمت دونوں ہی دیئے جاسکتے ہیں۔

مَالَمْ یَکُنْ عِنْدَہٗ بِنْتُ مَخَاضٍ عَلٰی وَجْھِھَا (اور اگر اس کے پاس دینے کے قابل ایک برس کی اونٹنی نہ ہو) ابن مالکؒ نے اس کی وضاحت کے سلسلے میں فرمایا ہے کہ اس کے تین معنی ہوسکتے ہیں۔ ① اس کے پاس سرے سے ایک برس کی اونٹنی موجود ہی نہ ہو ② ایک برس کی اونٹنی موجود تو ہو مگر تندرست نہ ہو بلکہ بیمار ہو اس صورت میں بھی گویا وہ نہ ہونے ہی کے درجہ میں ہوگی ③ ایک برس کی اونٹنی تو موجود ہو مگر اوسط درجہ کی نہ ہو بلکہ نہایت قیمتی اور اعلیٰ درجہ کی ہو (ملحوظ رہے کہ زکوٰۃ میں اوسط درجہ کا مال دینے کا حکم ہے)۔

بہرکیف ان میں سے کوئی صورت ہو اس کا حکم یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایسی صورت میں ابن لبون (یعنی دو برس کا اونٹ) زکوٰۃ کے طور پر دیا جائے گا پھر اس کی وضاحت بھی فرمادی کہ ابن لبون کے ساتھ مزید کچھ لینا دینا واجب نہیں ہے جیسا کہ اونٹنیوں کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص پر زکوٰۃ کے طور پر دینے کے لئے دو برس کی اونٹنی واجب ہو اور اس کے پاس دو برس کی اونٹنی موجود نہ ہو بلکہ تین برس کی اونٹنی ہو تو زکوٰۃ وصول کرنے والا اس سے وہی تین برس کی اونٹنی لے گا مگر وہ زکوٰۃ دینے والے کو دو بکریاں یا بیس درہم واپس کرے گا تاکہ زکوٰۃ دینے والے کو دو برس کی اونٹنی کی بجائے تین برس کی اونٹنی دینے کی صورت میں نقصان گھاٹا نہ ہو جیسے اس کے برعکس صورت بھی بیان کی گئی ہے کہ اگر زکوٰۃ دینے والا تین برس کی اونٹنی کی بجائے جو اس پر واجب ہے مگر موجود نہیں ہے دو برس کی اونٹنی دے تو اس کے ساتھ دو بکریاں یا بیس درہم مزید دے تاکہ زکوٰۃ کے مال میں نقصان نہ رہ جائے بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ فضیلت تانیث عمر کی زیادتی کا بدل ہوجاتی ہے۔

اگرچہ "چرنے والی" کی قید صرف بکری کے نصاب زکوٰۃ میں لگائی گئی ہے لیکن اس کا تعلق ہر جانور سے ہے یعنی خواہ بکری ہو یا اونٹ

اور یا گائے ان میں زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب کہ وہ سال کے اکثر حصے یعنی نصف سال سے زیادہ جنگل میں چریں اگر ان میں سے کوئی بھی جانور ایسا ہو جسے سال کے اکثر حصے میں گھر سے چارہ کھلایا جاتا ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

بکریوں کا نصاب چالیس بیان کیا گیا ہے یعنی اگر چالیس سے کم بکریاں ہوں گی تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جب چالیس بکریاں ہوں گی تو ایک بکری زکوٰۃ کے طور پر واجب ہو جائے گی اور اگر چالیس سے بھی زائد ہوں تو ایک سو بیس تک ایک ہی بکری واجب رہے گی اسی طرح تین سو تک کی تعداد کے نصاب زکوٰۃ کو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جب تعداد تین سو سے تجاوز ہو جائے تو پھر یہ حساب ہوگا کہ ہر سو بکری پر ایک واجب ہوگی یعنی تین سو تک تو تین بکریاں ہونگی تین سو کے بعد چار سو بکریاں اس وقت واجب ہوں گی جب کہ تعداد پورے چار سو ہو جائے چنانچہ اکثر ائمہ وعلماء کا یہی مسلک ہے لیکن حسن ابن صالح کا قول اس بارے میں یہ ہے کہ تین کے بعد اگر ایک بکری بھی زائد ہوگی تو چار بکریاں واجب ہو جائیں گی۔

ولا ذات عوار (اور عیب دار نہ دی جائے) زکوٰۃ میں عیب دار مال نہ لینے کا حکم اس صورت میں ہے جب کہ پورا مال یا کچھ مال ایسا ہو جس میں کوئی عیب وخرابی نہ ہو اگر پورا ہی مال عیب دار ہو تو پھر اس میں سے اوسط درجے کا دیکھ کر دیا جائے گا۔

زکوٰۃ میں بوک (بکرا) لینے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ بکریوں کے ساتھ بوک افزائش نسل کے لئے رکھا جاتا ہے اگر بوک لے لیا جائے گا تو بکریوں کے مالک کو نقصان ہوگا یا وہ اس کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا یا پھر بوک لینے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس کا گوشت بدمزہ اور بدبودار ہوتا ہے۔

ولا یجمع بین متفرق الخ (اور متفرق جانوروں کو یکجانہ کیا جائے الخ) اس جملے کا مطلب سمجھنے سے پہلے مسئلہ کی حقیقت جان لیجئے تاکہ مفہوم پوری طرح ذہن نشین ہو جائے، مسئلہ یہ ہے کہ آیا زکوٰۃ گلہ یعنی مجموعہ پر ہے یا اشخاص یعنی مال کے مالک کا اعتبار ہوتا ہے؟ حضرت امام شافعیؒ تو فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ گلہ کے اعتبار سے دینی ہوتی ہے ان کے ہاں مالک کا اعتبار نہیں ہوتا جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں گلہ کا اعتبار نہیں ہوتا مالک کا اعتبار ہوتا ہے اس مسئلہ کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص کے پاس اسی بکریاں ہیں مگر وہ بکریاں ایک جگہ یعنی ایک گلہ (ریوڑ) میں نہیں ہیں بلکہ الگ الگ دو گلوں میں ہیں تو چونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک زکوٰۃ گلہ پر واجب ہوتی ہے اس لئے ان کے مسلک کے مطابق ان دونوں گلوں میں سے دو بکریاں وصول کی جائیں گی لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق دونوں گلوں سے ایک ہی بکری وصول کی جائے گی کیونکہ اگرچہ وہ اسی بکریاں دو گلوں میں تقسیم ہیں مگر ملکیت میں چونکہ ایک ہی شخص کی ہیں اس لئے اس حساب کے مطابق کہ چالیس سے ایک سو بیس تک کی تعداد میں ایک ہی بکری واجب ہوتی ہے، اس شخص سے بھی ایک ہی بکری وصول کی جائے گی۔

دوسری مثال یہ ہے کہ دو اشخاص کی اسی بکریاں ہیں جو ایک ہی گلہ میں ہیں تو امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق اس گلہ میں سے ایک ہی بکری لی جائے گی اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق اس گلہ میں سے دو بکریاں لی جائیں گی کیونکہ وہ اسی بکریاں اگرچہ ایک ہی گلہ میں ہیں لیکن مالک اس کے دو الگ الگ اشخاص ہیں اور وہ دونوں اتنی اتنی بکریوں (یعنی چالیس چالیس) کے مالک ہیں کہ ان کی الگ الگ تعداد پر ایک بکری واجب ہوتی ہے۔

اس مسئلہ کو ذہن میں رکھ کر اب سمجھئے کہ حدیث کے اس جملے ولا یجمع بین متفرق الخ کا مطلب امام شافعیؒ کے ہاں تو یہ ہے کہ اس ممانعت کا تعلق مالک سے ہے کہ اگر مثال کے طور پر چالیس بکریاں اس کی ہوں اور چالیس بکریاں کسی دوسرے کی ہوں اور یہ دونوں تعداد الگ الگ ہوں تو ان بکریوں کو جو الگ الگ اور متفرق ہیں زکوٰۃ کم کرنے کے لئے یکجانہ کیا جائے یعنی مالک یہ سوچ کر کہ اگر یہ بکریاں الگ الگ دو گلوں میں ہوں گی تو ان میں سے دو بکریاں دینی ہوں گی اور اگر ان دونوں گلوں کو ملا کر ایک گلہ کر دیا جائے تو پھر ایک ہی بکری دینی ہوگی ان کو یکجانہ کرے۔

اسی طرح ولا یفرق بین مجتمع (اور نہ جانوروں کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے) میں اس ممانعت کا تعلق بھی مالک سے ہے کہ مثلاً اگر اس کے پاس بیس بکریاں ہوں جو کسی دوسرے شخص کی بکریوں کے گلے میں ملی ہوئی ہوں تو مالک اپنی ان بکریوں کو اس گلے سے الگ نہ کرے یہ سوچ کر کہ اگر یہ بکریاں اس گلے میں رہیں گی تو زکوٰۃ دینی ہوگی اور اگر ان بکریوں کو اس گلے سے الگ کر دیا جائے تو زکوٰۃ سے بچ جاؤں گا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس ممانعت کا تعلق ساعی یعنی زکوٰۃ وصول کرنے والے سے ہے کہ وہ زکوٰۃ لینے کے لئے متفرق بکریوں کو یکجانہ کرے، مثلاً دو الگ الگ اشخاص کے پاس اتنی اتنی بکریاں ہوں کہ جو علیحدہ علیحدہ تو حد نصاب کو نہ پہنچتی ہوں اور ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوتی ہو جیسے دونوں کے پاس بیس بیس بکریاں ہوں مگر جب دونوں کی بکریاں یکجا ہو جائیں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہو جائے لہٰذا زکوٰۃ وصول کرنے والے کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ لینے کی وجہ سے ان بکریوں کو یکجا کر دے اسی طرح دوسری ممانعت کا تعلق بھی زکوٰۃ وصول کرنے والے ہی سے ہے کہ زکوٰۃ لینے کے لئے علیحدہ علیحدہ جانوروں کو یکجانہ کرے مثلاً اگر کسی شخص کے پاس اسی بکریاں اس طرح ہوں کہ چالیس تو ایک جگہ ہیں اور چالیس دوسری جگہ ہیں تو زکوٰۃ وصول کرنے والا ان دونوں جگہوں کی بکریوں کو دو الگ الگ نصاب قرار دے، کر اس شخص سے دو بکریاں وصول نہ کرے بلکہ دونوں جگہوں کی بکریوں کو ایک ہی نصاب قرار دے اور قاعدہ کے مطابق ایک ہی بکری وصول کرے کیونکہ بکریاں اگرچہ الگ الگ ہیں لیکن ملکیت میں ایک ہی شخص کے ہیں لہٰذا دونوں جگہ کی مجموعہ بکریوں پر کہ جن کی تعداد اسی ہے ایک ہی بکری واجب ہوگی۔

وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيطَيْنِ (جس نصاب میں دو آدمی شریک ہوں) اس جملے کی وضاحت بھی ایک مسئلہ سمجھ لینے پر موقوف ہے مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً دو سو بکریاں ہیں جس میں دو آدمی شریک ہیں اس حساب سے کہ ایک آدمی کی تو ان میں سے چالیس بکریاں ہیں اور دوسرا آدمی ایک سو ساٹھ بکریوں کا مالک ہے اب سوال یہ ہے کہ ان بکریوں پر زکوٰۃ کے طور پر تو بکریاں واجب ہوں مگر وہ دو بکریاں ان دونوں سے وصول کس حساب سے ہوں گی، ظاہر ہے کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ پہلے شخص پر تو اس کے حصے کے پیش نظر ایک بکری کا دو خمس واجب ہو اور باقی دوسرے شخص پر واجب ہو بلکہ یہ ہوگا کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا تو قاعدہ کے مطابق دونوں شخصوں سے ایک ایک بکری وصول کرے گا مگر اس صورت میں پہلے شخص کو نقصان ہوگا کیونکہ ان مشترک بکریوں میں اس کا حصہ صرف چالیس بکریاں ہیں اسے بھی ایک ہی بکری دینی پڑی اور دوسرے شخص نے بھی ایک ہی بکری دی جس کا حصہ ایک سو ساٹھ بکریاں ہیں (اسی کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا تو دونوں سے ایک ایک بکری وصول کرے گا لیکن پھر بعد میں دونوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اپنے حصے کے مطابق حساب کر لیں یعنی پہلا شخص کہ جس کی چالیس بکریاں ہیں دوسرے شخص سے کہ جس کی ایک سو ساٹھ بکریاں ہیں اپنی دی ہوئی بکری کے تین خمس وصول کرے اس حساب سے چالیس بکریوں کے مالک پر اس کے حصہ کے مطابق دو خمس پڑیں گے اور باقی ایک سو ساٹھ بکریوں کے مالک پر اس کے حصے کے مطابق پڑ جائیں گے چنانچہ ارشاد گرامی فانهما يتراجعان بالسوية (انہیں چاہئے کہ وہ دونوں برابر برابر تقسیم کر لیں) کے یہ معنی ہیں۔

زمین کی پیداوار پر عشر دینے کا حکم

④ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيمَا سَقَتِ السَّمَآءُ وَالْعُيُوْنُ اَوْ كَانَ عَثَرِيًّا الْعُشْرُ وَمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس چیز کو آسمان نے یا چشموں نے سیراب کیا ہو یا خود زمین سر سبز و شاداب ہو تو اس میں دسواں حصہ واجب ہوتا ہے اور جس زمین کو بیلوں یا اونٹوں کے ذریعے کنویں سے سیراب کیا گیا ہو تو اس کی پیداوار

میں بیسواں حصہ واجب ہے۔" (بخاری)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو زمین بارش سے سیراب کی جاتی ہو یا چشموں، نہروں اور ندی نالوں کے ذریعے اس میں پانی آتا ہو تو ایسی زمین سے جو بھی غلہ وغیرہ پیدا ہو گا اس میں سے دسواں حصہ بطور زکوٰۃ دینا واجب ہو گا۔

عشری اس زمین کو کہتے ہیں جسے "عاثور" سیراب کیا جائے اور "عاثور" اس گڑھے کو کہتے ہیں جو زمین پر بطور تالاب کھودا جاتا ہے اور اس میں سے کھیتوں وغیرہ پانی لے جاتے ہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ "عشری" اس زمین کو کہتے ہیں جو پانی کے قریب ہونے کی وجہ سے ہمیشہ تروتازہ اور سرسبز و شاداب رہتی ہے۔

رکاز کی زکوٰۃ

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعَجْمَاءُ جُرْحُهَا جُبَارٌ وَالْبِئْرُ جُبَارٌ وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ وَفِی الرِّكَازِ الْخُمُسُ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر جانور کسی کو زخمی کر دے تو معاف ہے، اگر کنواں کھدوانے میں کوئی مر جائے تو معاف ہے، اگر کان کھدوانے میں کوئی مر جائے تو معاف ہے اور رکاز میں پانچواں حصہ واجب ہوتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: کوئی جانور یعنی گھوڑا، بیل اور بھینس وغیرہ اگر کسی شخص کو زخمی کر دے کوئی چیز ضائع کر دے یا کسی کو جان ہی سے مار ڈالے اور اس موقعہ پر جانور کے ساتھ کوئی یعنی اس کا مالک وغیرہ نہ ہو اور یہ کہ دن کا وقت ہو تو جانور کا زخمی کرنا یا کسی چیز کو ضائع کر دینا معاف ہے یعنی اس کے مالک پر اس کا کوئی بدلہ اور جرمانہ نہیں ہو گا۔ ہاں اگر جانور اس حال میں کسی کو زخمی کرے یا کوئی چیز ضائع کر دے کہ اس پر کوئی سوار ہو یا اس کے ساتھ کوئی ہانکنے والا اور کھینچنے والا ہو تو ایسی صورت میں جانور کے مالک پر بدلہ اور جرمانہ واجب ہو گا کیونکہ اس میں کوتاہی اور لاپرواہی کو دخل ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی جانور رات کے وقت چھوٹ کر کسی کو زخمی کر دے یا کوئی چیز تلف کر دے تو اس کے مالک پر اس کا تاوان آئے گا کیونکہ رات میں جانوروں کو باندھا جاتا ہے مگر اس نے جانور کو نہ باندھ کر لاپرواہی اور کوتاہی کا ثبوت دیا اس بارے میں مذکورہ حدیث اگرچہ عام ہے اور اس میں کوئی قید اور تخصیص نہیں ہے مگر دوسری احادیث اور دیگر دلائل کے پیش نظر مذکورہ قیود کو ذکر کیا گیا ہے۔

والبیر جبار (اگر کنواں کھدوانے میں کوئی مر جائے تو معاف ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کنواں کھدوانا چاہتا ہے اور اس نے کنواں کھودنے کے لئے کسی مزدور کی خدمات حاصل کی ہیں اب اگر وہ مزدور کنواں کھودتے ہوئے گر کر یا دب کر مر جائے تو کنواں کھدوانے والے پر کوئی تاوان یعنی خون بہا وغیرہ واجب نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی زمین میں یا کسی ایسی افتادہ زمین میں کہ جس کے مالک کا کوئی پتہ نہ ہو کنواں کھدوائے اور اس کنویں میں کوئی آدمی یا جانور گر کر مر جائے تو اس صورت میں بھی اس پر کوئی تاوان نہیں آئے گا، ہاں اگر کنواں راستے میں یا کسی دوسرے کی زمین میں مالک کی اجازت کے بغیر کھدوایا جائے اور اس کنویں میں کوئی آدمی یا کوئی جانور گر کر مر جائے تو اس صورت میں کنواں کھودنے والے کے عاقلہ پر تاوان یعنی خون بہا واجب ہو گا یہی حکم اس شخص کے بارے میں لاگو ہو گا جو سونا چاندی، فیروزہ یا مٹی نکلوانے کے لئے زمین کے کسی حصے کو کھدوائے گا۔

عاقلہ کسے کہتے ہیں: "عاقلہ" ایک فقہی اصطلاح ہے اس کے معنی مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ کسی شخص سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا ہے مثلاً وہ شکار پر بندوق چلاتا ہے اور اتفاق سے بغیر کسی قصد و ارادہ کے اس کی گولی شکار کی بجائے کسی انسان کو ہلاک کر دیتی ہے یا مذکورہ بالا صورت کے مطابق کوئی شخص راستہ میں کنواں کھدوا دیتا ہے اور اس کنویں میں گر کر کوئی مر جاتا ہے تو جس شخص کی گولی سے کوئی خون ہو جائے یا جس شخص کے کھودے ہوئے کنویں میں کوئی گر کر مر جائے اس کے ساتھی اور رفیق "عاقلہ" کہلاتے ہیں فرض کیجئے وہ شخص فوج

میں یا پولیس میں ملازم ہے تو اس کے ساتھی فوجی یا سپاہی عاقلہ کہلائیں گے اور اگر وہ کہیں ملازم نہ ہو تو پھر اس کے قبیلہ اور خاندان والے اس کے عاقلہ کہلائیں گے۔

عاقلہ پر تاوان کیوں: اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غلطی تو اس شخص کی ہے مگر جرمانہ اور تاوان اس کے ساتھیوں یا اس کے اہل خاندان اور قبیلہ والوں پر کیوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس شخص سے کسی غلطی کا ارتکاب ہو گیا اور اس غلطی میں بھی اس کے قصد و ارادہ کو داخل نہیں تھا تو اگرچہ اس پر کوئی جرمانہ کیوں نہ کر دیا جائے مگر ہو سکتا ہے کہ وہ اس غلطی پر پشیمان و نادام نہ ہو اور اس کی لاپرواہی اور کوتاہی آئندہ کسی اور بڑے حادثے کا ذریعہ بن جائے اس لئے ضروری ہوا کہ جرمانہ اور تاوان ان لوگوں پر لازم کیا جائے جو اس کے قریب رہنے والے اور اس سے متعلق ہوں تاکہ وہ اس پر پوری طرح کنٹرول کر سکیں اور آئندہ کے لئے اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے دیں۔

حدیث میں مذکور رکاز سے کیا مراد ہے: حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں جس رکاز کا ذکر کیا گیا ہے اس سے کان (معدن) مراد ہے لیکن اہل حجاز "رکاز" سے زمانہ جاہلیت کے دفینے (زمین دوز کئے ہوئے خزانے) مراد لیتے ہیں جہاں تک حدیث کا ظاہری مفہوم اور اس کا سیاق و سباق ہے اس کے پیش نظر وہی معنی زیادہ مناسب اور بہتر معلوم ہوتے ہیں جو حضرت امام اعظمؒ نے مراد لئے ہیں پھر یہ کہ خود آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد گرامی بھی "رکاز" کے اسی معنی کی وضاحت کرتا ہے چنانچہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ سے جب دریافت کیا گیا کہ رکاز وہ سونا اور چاندی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین میں اس کی تخلیق کے وقت ہی پیدا فرمایا ہے۔

کان میں سے نکلنے والی چیزوں کی قسمیں: اس موقع پر یہ بھی جان لیجئے کہ جو چیزیں کان سے برآمد ہوتی ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔

❶ وہ چیزیں جو منجمد ہوں اور آگ میں ڈالنے سے نرم ہو جائیں نیز منقش کئے جانے کے قابل ہوں یعنی جو سکے وغیرہ ڈھالنے کے کام آسکتی ہوں جیسے سونا، چاندی، لوہا اور رانگا وغیرہ۔

❷ وہ چیزیں جو منجمد نہیں ہوتیں جیسے پانی، تیل، رال اور گندھک وغیرہ۔

❸ وہ چیزیں جو آگ میں ڈالنے سے نرم نہ ہوتی ہوں اور نہ سکے وغیرہ کے لئے ڈھالی جاسکتی ہوں جیسے پتھر، چونا، ہڑتال اور یاقوت وغیرہ۔

چنانچہ ان تینوں اقسام میں سے صرف پہلی قسم میں زکوٰۃ کے طور پر خمس یعنی پانچواں حصہ نکالنا واجب ہے اور اس کے لئے ایک سال گزرنا شرط نہیں ہے حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک معدنیات میں سے صرف سونے چاندی میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے دوسری معدنیات مثلاً لوہے، رانگ وغیرہ میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

گائے اور بیل کی زکوٰۃ

⑥ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ عَفَوْتُ عَنِ الْخَيْلِ وَالرَّقِيْقِ فَهَاتُوْا صَدَقَةَ الرِّقَةِ مِنْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا دِرْهَمٌ وَّلَيْسَ فِيْ تِسْعِيْنَ وَمِائَةٍ شَيْءٌ فَاِذَا بَلَغَتْ مِائَتَيْنِ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْ دَاوُدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاوُدَ عَنِ الْحَارِثِ الْاَعْوَرِ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ زُهَيْرٌ اَحْسِبُهٗ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ هَاتُوْا رُبْعَ الْعُشْرِ مِنْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا دِرْهَمٌ وَّلَيْسَ عَلَيْكُمْ شَيْءٌ حَتّٰى تَتِمَّ مِائَتَيْ دِرْهَمٍ فَاِذَا كَانَتْ مِائَتَيْ دِرْهَمٍ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ فَمَا زَادَ فَعَلٰى حِسَابِ ذٰلِكَ وَفِي الْغَنَمِ فِيْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ شَاةً شَاةٌ اِلٰى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ فَاِنْ زَادَتْ وَاحِدَةٌ فَشَاتَانِ اِلٰى مِائَتَيْنِ فَاِنْ زَادَتْ فَثَلَاثُ شِيَاهٍ اِلٰى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَاِذَا زَادَتْ عَلٰى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَفِيْ كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ فَاِنْ

لَمْ تَكُنْ اِلَّا تِسْعٌ وَّثَلاثُوْنَ فَلَيْسَ عَلَيْكَ فِيْهَا شَيْءٌ وَّفِي الْبَقَرِ فِيْ كُلِّ ثَلاثِيْنَ تَبِيْعٌ وَّفِي الْاَرْبَعِيْنَ مُسِنَّةٌ وَّلَيْسَ عَلَى الْعَوَامِلِ شَيْءٌ۔

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ میں نے گھوڑوں اور غلاموں میں زکوٰۃ معاف رکھی ہے (یعنی اگر غلام تجارت کے لئے نہ ہوں تو ان میں نہیں ہے اور گھوڑوں کی زکوٰۃ کے بارے میں ائمہ کا جو اختلاف ہے اسے بیان کیا جا چکا ہے) تم چاندی کی زکوٰۃ ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم کے حساب سے ادا کرو (جب کہ چاندی بقدر نصاب یعنی دو سو درہم ہو کیونکہ) ایک سو نوے درہم (یعنی دو سو درہم سے کم) چاندی میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے جب دو سو درہم چاندی ہو تو اس میں سے پانچ درہم زکوٰۃ کے طور پر دینا واجب ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد) ابوداؤد نے حارث اعور سے حضرت علیؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ زہیرؒ نے (جو حارثؒ سے روایت نقل کرتے ہیں) کہا کہ میرا گمان ہے کہ حارثؒ نے یہ کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ تم (ہر سال) ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم (یعنی چالیسواں حصہ ادا کرو اور تم پر اس وقت تک کچھ واجب نہیں جب تک کہ تمہارے پاس دو سو درہم پورے نہ ہوں، جب دو سو درہم پورے ہوں تو ان میں (بطور زکوٰۃ) پانچ درہم واجب ہوں گے اور جب دو سو درہم سے زائد ہوں گے تو ان میں اسی حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی اور بکریوں کا نصاب یہ ہے کہ ہر چالیس بکریوں میں ایک بکری واجب ہوتی ہے (اور یہ ایک بکری) ایک سو بیس تک (کی تعداد کے لئے) ہے اور جب اس تعداد سے ایک بکری بھی زائد ہو جائے تو دو سو تک دو بکریاں واجب ہوں گی اور جب دو سو سے ایک بکری بھی زائد ہوگی تو تین سو تک تین بکریاں واجب ہوں گی اور جب تین سو سے زائد ہوں (یعنی چار سو ہو جائیں) تو ہر سو بکری میں ایک بکری واجب ہوگی اور اگر تمہارے پاس بقدر نصاب بکریاں نہ ہوں (یعنی انتالیس بکریاں ہوں) تو پھر ان میں تمہارے ذمہ کچھ بھی واجب نہیں ہوگا اور گائے کا نصاب یہ ہے کہ ہر تیس میں ایک سال کی عمر کا ایک بیل اور چالیس میں دو سال کی عمر کی ایک گائے واجب ہے نیز کام کاج کے جانوروں میں کچھ بھی (یعنی زکوٰۃ) واجب نہیں۔"

تشریح: فمازاد فعلی حساب ذالک (جب دو سو درہم سے زائد ہوں تو ان میں اسی حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی) حنفیہ میں سے صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا یہی مسلک ہے کہ دو سو درہم سے جو مقدار زائد ہوگی اس کا حساب کر کے چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کیا جائے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دو سو درہم سے زائد مقدار میں اسی وقت زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ وہ مقدار چالیس درہم تک ہو اور اگر زائد مقدار چالیس تک نہ پہنچے تو پھر اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ دو سو درہم ہی کی زکوٰۃ دی جائے گی حضرت امام صاحبؒ نے اس حدیث میں زائد مقدار کو چالیس درہم کی زائد مقدار پر محمول کیا ہے اور یہ انہوں نے اس لئے کہا ہے تاکہ احادیث میں تطبیق ہو جائے اور کوئی تعارض نظر نہ آئے۔

گائے کے نصاب میں زکوٰۃ کے طور پر "بیل" دینے کے لئے فرمایا گیا ہے، چنانچہ گائے کی زکوٰۃ کے طور پر نر اور مادہ دونوں برابر ہیں چاہے گائے دی جائے اور چاہے بیل دیدیا جائے جیسا کہ آگے آنے والی روایت میں اس کی وضاحت بھی ہے، چنانچہ گائے اور بکری کی زکوٰۃ کے طور پر مادہ ہی دینا ضروری نہیں ہے اونٹوں کے برخلاف کہ ان میں مادہ ہی دینا افضل ہے۔ لیکن گائے اور بکری میں اس کی کوئی قید اور تخصیص نہیں ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اگر گائے یا بیل چالیس سے زائد ہوں تو اس زائد مقدار میں اس وقت تک کوئی چیز واجب نہیں ہوتی جب تک کہ تعداد ساٹھ تک نہ پہنچ جائے جب تعداد ساٹھ ہو جائے گی تو ان میں دو تبیعے یعنی ایک ایک برس کے دو بیل یا اتنی ہی عمر کی دو گائیں دینی ہوں گی، پھر اس کے بعد ہر چالیس میں ایک مسنہ یعنی دو برس کی گائے یا دو برس کا بیل دینا ہوگا اور ہر تیس میں ایک ایک تبیعہ واجب ہوگا مثلاً ستر ہو جائیں تو ایک مسنہ اور ایک تبیعہ اسی ہو جائیں تو دو مسنہ نوے ہو جائیں تو تین تبیعے اور جب سو ہو جائیں تو دو تبیعے اور ایک مسنہ واجب ہو جائے گا۔ اسی طرح ہر تیس میں ایک تبیعہ اور ہر چالیس میں ایک مسنہ کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی

جائے گی۔

علامہ ابن حجرؒ کا قول "اگر گائے یا بیل چالیس سے زائد مقدار میں اس وقت تک کوئی چیز واجب نہیں ہوتی جب تک کہ تعداد ساٹھ تک نہ پہنچ جائے" حنفیہ میں سے صاحبین کا یہی مسلک ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ چالیس سے جو تعداد بھی زائد ہوگی اس کا بھی حساب کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی تا کہ تعداد ساٹھ تک پہنچ جائے جب تعداد ساٹھ تک پہنچ جائے گی تو دو تبیعے واجب ہو جائیں گے باقی حساب مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق ہوگا۔ لہٰذا اگر چالیس سے ایک بھی گائے یا بیل زائد ہوگا تو مسنّہ کا چالیسواں حصہ یا ایک تبیعہ کا تیسواں حصہ یعنی ان کی قیمت کا چالیسواں یا تیسواں حصہ دینا ضروری ہوگا اسی طرح جو مقدار بھی زائد ہوگی اس کا اسی کے مطابق حساب کیا جائے گا حنفیہ میں صاحب ہدایہ اور ان کے متبعین کی رائے میں حضرت امام صاحبؒ کا یہی قول معتبر ہے۔

حدیث کے آخری جملے وَلَيْسَ عَلَى الْعَوَامِلِ شَيْءٌ (کام کاج کے جانوروں میں کچھ بھی واجب نہیں ہے) کا مطلب یہ ہے کہ جو جانور کام کاج کے ہوں اور ضروریات میں استعمال ہوتے ہوں، جیسے بیل ہل جوتنے یا کنویں سے پانی کھینچنے یا بار برداری کے کام کے لئے ہوں تو اگرچہ ان کی تعداد بقدر نصاب ہی کیوں نہ ہو لیکن ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یہی حکم اونٹ وغیرہ کے بارے میں بھی ہے چنانچہ حضرت امام اعظمؒ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا یہی مسلک ہے۔ لیکن حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایسے جانوروں میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

⑦ وَعَنْ مُعَاذٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا وَجَّهَهٗ اِلَى الْيَمَنِ اَمَرَهٗ اَنْ يَّاْخُذَ مِنَ الْبَقَرِ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِيْنَ تَبِيْعًا اَوْ تَبِيْعَةً وَّمِنْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ مُسِنَّةً (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی والداری)

"اور حضرت معاذؓ کے بارے میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب انہیں (عامل بنا کر) یمن بھیجا تو انہیں یہ حکم دیا کہ وہ زکوٰۃ کے طور پر ہر تیس گائے میں سے ایک برس کا بیل یا ایک برس کی گائے لیں اور ہر چالیس گائے میں سے دو برس کی گائے یا دو برس کا بیل وصول کریں۔"

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دارمی)

زکوٰۃ میں مقدار واجب سے زیادہ وصول کرنا گناہ ہے

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُعْتَدِيْ فِي الصَّدَقَةِ كَمَانِعِهَا (رواہ ابوداؤد و الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا زکوٰۃ لینے میں (مقدار واجب سے) زیادتی کرنے والا زکوٰۃ نہ دینے والے کی مانند ہے (یعنی جس طرح زکوٰۃ نہ دینا گناہ ہے اسی طرح زکوٰۃ میں مقدار واجب سے زیادہ وصول کرنا بھی گناہ ہے۔" (ابوداؤد، ترمذیؒ)

غلہ و کھجور کی زکوٰۃ

⑨ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ فِيْ حَبٍّ وَّلَا تَمْرٍ صَدَقَةٌ حَتّٰى يَبْلُغَ خَمْسَةَ اَوْسُقٍ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا غلہ اور کھجور میں اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں جب تک کہ ان کی مقدار پانچ وسق (۲۵ من ۱۲½ سیر) نہ ہو۔" (نسائی)

تشریح: غلہ اور کھجوروں کی زکوٰۃ کے بارے میں گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے وہیں کسی موقع پر "وسق" کی توضیح بھی کی گئی ہے۔

⑩ وَعَنْ مُوْسَى بْنِ طَلْحَةَ قَالَ عِنْدَنَا كِتَابُ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّمَا اَمَرَهٗ اَنْ

يَاْخُذَ الصَّدَقَةَ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَالزَّبِيْبِ وَالتَّمْرِ مُرْسَلٌ (رواه فی شرح السنة)

"اور حضرت موسیٰ ابن طلحہ (تابعی) کہتے ہیں کہ ہمارے پاس حضرت معاذ ابن جبلؓ کا وہ مکتوب گرامی ہے جسے نبی کریم ﷺ نے ان کے پاس بھیجا تھا، چنانچہ حضرت معاذؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں گیہوں، جو، انگور اور کھجوروں کی زکوٰۃ وصول کروں۔" (یہ حدیث مرسل ہے اور شرح السنۃ میں نقل کی گئی ہے)

تشریح: اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زمین کی پیداوار میں سے صرف انہیں چار چیزوں میں زکوٰۃ واجب ہے بلکہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو زمین کی ہر اس پیداوار میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جو انسانی زندگی کے لئے غذا بن سکتی ہو اور حنفیہ کے نزدیک زمین کی ہر پیداوار میں زکوٰۃ ہے خواہ وہ انسانی زندگی کے لئے غذا ہو یا نہ ہو جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں صرف یہی چار چیزیں پیدا ہوتی تھیں اس لئے انہیں چار چیزوں کو بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔

انگور کی زکوٰۃ

(۱۱) وَعَنْ عَتَّابِ بْنِ اُسَيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ زَكَاةِ الْكُرُوْمِ اِنَّهَا تُخْرَصُ كَمَا تُخْرَصُ النَّخْلُ ثُمَّ تُؤَدِّى زَكَاتُهُ زَبِيْبًا كَمَا تُؤَدِّى زَكَاةُ النَّخْلِ تَمْرًا (رواه الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عتاب ابن اسیدؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انگور کی زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا کہ انگوروں کا اسی طرح اندازہ کیا جائے جیسے کھجوروں کا اندازہ کیا جاتا ہے پھر ان انگوروں کی زکوٰۃ اس وقت ادا کی جائے جب وہ خشک ہو جائیں جس طرح کہ خشک ہو جانے کے بعد کھجوروں کی زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب انگوروں اور کھجوروں میں شرینی پیدا ہو جائے تو کوئی ماہر شخص ان کے بارے میں یہ اندازہ لگائے کہ خشک ہونے کے بعد یہ کس قدر ہوں گی۔ پھر جب وہ خشک ہو جائیں تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق وہ جتنی بھی ہوں ان کا دسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کیا جائے۔ صاحبینؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق اگر ان کی مقدار حد نصاب یعنی پانچ وسق تک پہنچ جائے تو دسواں حصہ ادا کیا جائے۔

(۱۲) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِيْ حَثْمَةَ حَدَّثَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اِذَا خَرَصْتُمْ فَخُذُوْا وَدَعُوا الثُّلُثَ فَاِنْ لَّمْ تَدَعُوا الثُّلُثَ فَدَعُوا الرُّبُعَ (رواه الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت سہل ابن ابی حثمہؓ رسول کریم ﷺ کی یہ حدیث بیان کرتے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب تم انگوروں اور کھجوروں کی زکوٰۃ کا اندازہ کر لو تو اس میں سے (دو تہائی) لے لو اور ایک تہائی چھوڑ دو، اگر ایک تہائی نہ چھوڑ سکو تو چوتھائی تو چھوڑ ہی دو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: دراصل یہ زکوٰۃ وصول کرنے والوں سے خطاب ہے کہ جب تم زکوٰۃ کی مقدار متعین کر لو تو اس مقدار متعین میں سے دو تہائی تو لے لو اور ایک تہائی از راہ احسان و مروت مالک کے لئے چھوڑ دو تاکہ وہ اس میں سے اپنے ہمسایوں اور راہ گیروں کو کھلائے حضرت امام اعظمؒ اور حضرت امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے اگرچہ حضرت امام شافعیؒ کا پہلا قول بھی یہی ہے مگر ان کا بعد کا قول یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار واجب میں سے کچھ حصہ بھی نہ چھوڑا جائے۔

اس حدیث کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ اس کا تعلق خیبر کے یہودیوں سے تھا، چونکہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کے یہودیوں سے مساقات (بٹائی) پر معاملہ کر رکھا تھا کہ آدھی کھجوریں وہ رکھا کریں اور آدھی کھجوریں دربار نبوت میں بھیج دیا کریں اس لئے آپ نے وہاں کی

کھجوروں کا اندازہ کرنے والے کو یہ حکم دیا تھا کہ پہلے تمام کھجوروں میں سے ایک تہائی یا ایک چوتھائی ان یہودیوں کے لئے ازراہ احسان چھوڑ دیا جائے پھر باقی کھجوروں کو نصف تقسیم کر دیا جائے ایک حصہ یہودیوں کو دے دیا جائے اور ایک دربار نبوت میں بھیج دیا جائے۔

کھجوروں کا اندازہ

⑬ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَبْعَثُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ رَوَاحَةَ اِلَى يَهُوْدَ فَيَخْرُصُ النَّخْلَ حِيْنَ تَطِيْبُ قَبْلَ اَنْ يُّؤْكَلَ مِنْهُ (رواه ابوداؤد)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ نبی کریم ﷺ عبداللہ ابن رواحہ کو (خیبر کے) یہودیوں کے پاس بھیجا کرتے تھے وہاں جاکر کھجوروں کی مقدار کا اس وقت اندازہ کیا کرتے تھے جب کہ ان میں شیرینی پیدا ہو جاتی تھی مگر کھانے کے قابل نہیں ہوتی تھیں۔" (ابوداؤدؒ)

شہد کی زکوٰۃ

⑭ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى الْعَسَلِ فِىْ كُلِّ عَشْرَةِ اَزُقٍّ زِقٌّ رَّوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَقَالَ فِىْ اِسْنَادِهٖ مَقَالٌ وَّلَا يَصِحُّ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ هٰذَا الْبَابِ كَثِيْرُ شَىْءٍ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے شہد کی زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا کہ ہر دس مشک میں ایک مشک (بطور زکوٰۃ) واجب ہے۔ (ترمذی اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کی اسناد میں کلام کیا گیا ہے نیز اس بارے میں آنحضرت ﷺ کی اکثر احادیث (جو نقل کی جاتی ہیں) وہ صحیح نہیں ہیں۔"

تشریح: شہد کی زکوٰۃ کے بارے میں ائمہ کے ہاں اختلاف ہے حضرت امام شافعیؒ تو فرماتے ہیں کہ شہد میں زکوٰۃ نہیں ہے مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک شہد میں زکوٰۃ واجب ہے خواہ کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہو بشرطیکہ عشری زمین میں نکلا ہو ان کی دلیل یہ ارشاد گرامی ہے کہ:

"زمین کی ہر پیداوار میں عشر واجب ہے۔"

نیز جو شہد پہاڑوں میں ہو اس میں بھی امام اعظمؒ کے نزدیک دسواں حصہ نکالنا واجب ہے۔

زیور کی زکوٰۃ

⑮ وَعَنْ زَيْنَبَ امْرَاَةِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَتْ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ تَصَدَّقْنَ وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ فَاِنَّكُنَّ اَكْثَرُ اَهْلِ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (رواه الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمارے سامنے خطبہ ارشاد کرتے ہوئے فرمایا کہ اے عورتوں کی جماعت، تم اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو اگرچہ وہ زیور ہی کیوں نہ ہو اس لئے کہ قیامت کے دن تم میں اکثریت دوزخیوں کی ہوگی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اکثریت دوزخیوں کی ہوگی کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت چونکہ دنیا اور دنیا کی چیزوں کی محبت میں گرفتار ہوتی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی بلکہ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کا ان میں جذبہ بھی نہیں ہوتا اس لئے عورتوں کی اکثریت کو دوزخی فرمایا گیا ہے، چنانچہ عورتوں کو آگاہ فرمایا گیا کہ اگر تم دوزخ کی ہولناکیوں سے بچنا چاہتی ہو تو دنیا کی محبت اور دنیاوی عیش و عشرت کی طمع و حرص سے باز آؤ، خدا نے تمہیں جس قدر مال دیا ہے اسی پر قناعت کرو اور اس میں سے زکوٰۃ و صدقہ نکالتی رہو تاکہ قیامت

کے دن خدا کی رحمت تمہارے ساتھ ہو اور تم دوزخ میں جانے سے بچ جاؤ۔

عورتوں کے زیور کی زکوٰۃ کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تو مسلک یہ ہے کہ مطلقاً زیور میں زکوٰۃ واجب ہے جب کہ وہ حد نصاب کو پہنچتا ہو حضرت امام شافعیؒ کا پہلا قول بھی یہی ہے حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ عورتوں کے ان زیورات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے جن کا استعمال مباح ہے لہٰذا جن زیورات کا استعمال حرام ہے ان حضرات کے نزدیک بھی ان میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، حضرت امام شافعیؒ کا آخری قول بھی یہی ہے حضرت امام اعظمؒ کے مسلک کی دلیل بھی یہی حدیث ہے جس سے مطلقاً زیورات میں زکوٰۃ کا وجوب ثابت ہو رہا ہے۔

کون سے زیورات مباح ہیں اور کون سے زیورات غیر مباح و حرام ہیں؟ اس کی تفصیل جاننے کے لئے "محرر" اور شافعیؒ مسلک کی دوسری کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(۱۶) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ امْرَأَتَيْنِ اَتَتَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِىْ اَيْدِيْهِمَا سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ فَقَالَ لَهُمَا تُؤَدِّيَانِ زَكَاتَهٗ قَالَتَا لَا فَقَالَ لَهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتُحِبَّانِ اَنْ يُّسَوِّرَكُمَا اللّٰهُ بِسِوَارَيْنِ مِنْ نَّارٍ قَالَتَا لَا قَالَ فَاَدِّيَا زَكَاتَهٗ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ قَدْ رَوَى الْمُثَنَّى بْنُ الصَّبَّاحِ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ نَحْوَ هٰذَا وَالْمُثَنَّى بْنُ الصَّبَّاحِ وَابْنُ لَهِيْعَةَ يُضَعَّفَانِ فِى الْحَدِيْثِ وَلَا يَصِحُّ فِىْ هٰذَا الْبَابِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَىْءٌ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد مکرم سے اور وہ اپنے جد محترم سے نقل کرتے ہیں کہ (ایک دن) دو عورتیں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، ان دونوں نے اپنے ہاتھوں میں سونے کے کڑے پہنے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے (ان کڑوں کو دیکھ کر) فرمایا کہ کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو! ان دونوں نے کہا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا تم یہ بات پسند کرتی ہو کہ (کل قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ تمہیں آگ کے دو کڑے پہنائے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر اس (سونے) کی زکوٰۃ ادا کیا کرو۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کو اسی طرح مثنی ابن صباح نے عمرو ابن شعیب سے نقل کیا ہے اور مثنی ابن صباح نیز ابن لہیعہ (جو اس حدیث کے ایک دوسرے راوی ہیں) دونوں روایت حدیث کے بارے میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں اور اس بارے میں نبی کریم ﷺ کی کوئی صحیح حدیث منقول نہیں ہے۔"

تشریح: یہ حدیث بھی بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات کی دلیل ہے کہ زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے، امام ترمذیؒ کا یہ کہنا ہے کہ اس بارے میں آنحضرت ﷺ کی کوئی صحیح حدیث منقول نہیں ہے، سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کیونکہ احادیث کی دوسری کتابوں میں اس مسئلہ سے متعلق صحیح حدیثیں منقول ہیں جنہیں ملا علی قاریؒ نے بھی "مرقات" میں نقل کیا ہے۔

(۱۷) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَلْبَسُ اَوْضَاحًا مِّنْ ذَهَبٍ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَكَنْزٌ هُوَ فَقَالَ مَا بَلَغَ اَنْ تُؤَدّٰى زَكَاتُهٗ فَزُكِّىَ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ (رواہ مالک وابوداؤد)

"اور حضرت ام سلمہؓ راویہ ہیں کہ میں سونے کا وضح (جو ایک زیور کا نام ہے) پہنا کرتی تھی، ایک دن میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)۔ کیا اس کا شمار بھی "جمع کرنے میں ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "جو چیز اتنی مقدار میں ہو کہ اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے (یعنی حد نصاب کو پہنچتی ہو) تو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد اس کا شمار جمع کرنے میں نہیں ہوتا۔" (مالکؒ، ابوداؤد)

تشریح: حضرت ام سلمہؓ کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کریم نے مال جمع کرنے کے بارے میں جو یہ وعید بیان فرمائی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ الْاٰيَةَ

"جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس میں سے خدا کی راہ میں کچھ خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دیجئے۔"

تو کیا سونے کا میرا یہ زیور بھی اس وعید میں داخل ہے، اس کا جواب آنحضرت ﷺ نے یہ دیا کہ جو مال بقدر نصاب ہو اور اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے تو وہ مال اس وعید میں داخل نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم تو دردناک عذاب کی خبر اس مال کے مالک کے بارے میں دے رہا ہے جسے بغیر زکوٰۃ دیئے جمع کیا جائے۔

مال تجارت پر زکوٰۃ

⑱ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْمُرُنَا اَنْ نُّخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِى نُعِدُّ لِلْبَيْعِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم تجارت کے لئے جو مال تیار کریں اس کی زکوٰۃ نکالا کریں۔" (ابوداؤد)

کانوں کی زکوٰۃ کا مسئلہ

⑲ وَعَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ اَبِىْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ غَيْرِ وَاحِدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ لِبِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِىِّ مَعَادِنَ الْقَبَلِيَّةِ وَهِىَ مِنْ نَّاحِيَةِ الْفُرْعِ فَتِلْكَ الْمَعَادِنُ لَا تُؤْخَذُ مِنْهَا اِلَّا الزَّكَاةُ اِلَى الْيَوْمِ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ربیعہ ابن ابوعبدالرحمٰن (تابعی) بہت سے صحابہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت بلال ابن حارث مزنی کو نواح فرع میں قبل کی کانیں بطور جاگیر عطا فرمادی تھیں چنانچہ ان کانوں میں سے اب تک صرف زکوٰۃ لی جاتی ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: قبلیہ قبل کی طرف منسوب ہے جو نواح "فرع" میں ایک جگہ کا نام ہے اور فرع مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک علاقہ ہے قبل میں جو کانیں تھیں انہیں آنحضرت ﷺ نے حضرت بلال ابن حارث مزنیؓ کو عطا فرمادی تھیں تاکہ وہ ان کانوں میں سے جو کچھ برآمد کریں اس سے اپنی گذر بسر کا کام چلائیں۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ان کانوں میں سے زکوٰۃ یعنی چالیسواں حصہ لیا جاتا ہے، گویا کہ خمس نہیں لیا جاتا جیسا کہ کانوں کے متعلق حکم ہے، چنانچہ حضرت امام مالکؒ اور ایک قول کے مطابق حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے کہ کانوں میں بھی چالیسواں حصہ واجب ہوتا ہے۔ خمس واجب نہیں مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ کانوں میں خمس واجب ہوتا ہے چالیسواں حصہ واجب نہیں ہوتا، حضرت امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے حضرت امام شافعیؒ کا ایک تیسرا قول یہ بھی ہے کہ اگر کان میں سے برآمد ہونے والی چیز بڑی محنت اور مشقت کے نتیجے میں حاصل ہو تو چالیسواں حصہ واجب ہوگا ورنہ بصورت دیگر خمس ہی واجب ہوگا۔

بہرحال حدیث چونکہ حنفیہ کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حدیث کے مفہوم سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان کانوں میں سے خمس کے بجائے چالیسواں آنحضرت ﷺ کے کسی حکم کے مطابق لیا جاتا ہو بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت کے حکام نے اپنے ذاتی اجتہاد سے ان کانوں میں سے بجائے خمس کے چالیسواں حصہ نکالنا ضروری قرار دیا ہوگا اور ظاہر ہے کہ ہمارے مسلک کی بنیاد کتاب اللہ، سُنّت صحیحہ اور قیاس پر ہے، ملا علی قاریؒ نے مرقات میں اس بات کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اہل علم اس کتاب سے مراجعت کر سکتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ترکاریوں اور عاریت کے درختوں میں زکوٰۃ نہیں

(۲۰) عَنْ عَلِیٍّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیْسَ فِی الْخَضْرَاوَاتِ صَدَقَۃٌ وَلَا فِی الْعَرَایَا صَدَقَۃٌ وَلَا فِیْ اَقَلَّ مِنْ خَمْسَۃِ اَوْسُقٍ صَدَقَۃٌ وَلَا فِی الْعَوَامِلِ صَدَقَۃٌ وَلَا فِی الْجَبْھَۃِ صَدَقَۃٌ قَالَ الصَّقْرُ الْجَبْھَۃُ الْخَیْلُ وَ الْبِغَالُ وَ الْعَبِیْدُ۔

(رواہ الدار قطنی)

"حضرت علیؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ترکاریوں میں عاریت کے درختوں میں پانچ وسق سے کم میں، کام کاج کے جانوروں میں اور جبہہ میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے صقر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جبہہ سے گھوڑا، خچر اور غلام مراد ہے۔" (دار قطنیؒ)

تشریح: ترکاریوں اور سبزیوں کی زکوٰۃ کے بارے میں پوری تفصیل باب کے بالکل شروع میں بیان کی جاچکی ہے۔ عرایا عریۃ کی جمع ہے عریۃ کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جسے اس کا مالک کسی محتاج وضرورت مند کو بطور عاریت دے دیتا ہے اور پورے سال کی کھجوروں کو اس کی ملکیت بنا دیتا ہے تاکہ وہ ان کھجوروں سے اپنی احتیاج وضرورت کو ختم کر سکے چنانچہ ایسی کھجوروں کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیونکہ وہ وجوب زکوٰۃ سے پہلے ہی اپنے مالک کی ملکیت سے نکل جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ حدیث بالا میں جن چیزوں کی زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا گیا ہے ان سب کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں مختلف مقامات پر بیان کیا جاچکا ہے۔

وقص جانوروں کی زکوٰۃ کا مسئلہ

(۲۱) وَعَنْ طَاؤُسٍ اَنَّ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ اُتِیَ بِوَقْصِ الْبَقَرِ فَقَالَ لَمْ یَاْمُرْنِیْ فِیْہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِشَیْءٍ۔ رَوَاہُ الدَّارَ قُطْنِیُّ وَ الشَّافِعِیُّ وَقَالَ الْوَقْصُ مَالَمْ یَبْلُغِ الْفَرِیْضَۃَ۔

"اور حضرت طاؤسؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ کے پاس وقص گائیں لائی گئیں (تاکہ وہ اس میں سے زکوٰۃ وصول کریں) مگر انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ نے ان میں سے مجھے کچھ لینے کا حکم نہیں فرمایا (یعنی آپ ﷺ نے ان کی زکوٰۃ کے طور پر کچھ واجب نہیں فرمایا) دار قطنیؒ اور شافعیؒ اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ وقص وہ جانور کہلاتے ہیں جو (ابتدائی طور پر یا پہلے دوسرے نصاب کے بعد) حد نصاب کو نہ پہنچیں۔"

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "وقص" قاف کے زبر کے ساتھ جانوروں کی اس تعداد کو کہتے ہیں جو فرض حد نصاب کو نہ پہنچے خواہ ابتداء ایسی تعداد ہو خواہ دو نصابوں کے درمیان ہو۔

اس بات کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ گائے یا بیل اگر تیس سے کم تعداد میں ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں چنانچہ تیس سے کم وہ تعداد ہے جو ابتدائی طور پر ہی حد نصاب کو نہیں پہنچتی تیس سے کم یہ تعداد وقص کہلائے گی۔

دو نصابوں کے درمیان "وقص" یہ ہے کہ مثلاً تیس گائے یا بیل پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جب تعداد تیس سے بڑھ جائے گی مگر چالیس تک نہ پہنچے تو اس درمیانی تعداد یعنی اکتیس سے لے کر انتالیس تک میں زکوٰۃ کے طور پر کچھ دینا واجب نہیں ہوتا ہاں جب تعداد پوری چالیس ہو جاتی ہے تو زکوٰۃ کی مقدار بڑھ جاتی ہے لہٰذا اکتیس سے لے کر انتالیس تک کی تعداد بھی وقص کہلاتی ہے اسی طرح چالیس کے بعد زکوٰۃ کی مقدار اسی وقت بڑھتی ہے جب کہ تعداد پوری ساٹھ ہو جائے، ان دونوں عدد کی درمیانی تعداد کو وقص کہیں گے کیونکہ اس تعداد میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ پھر جب تعداد ساٹھ سے متجاوز ہوگی زکوٰۃ کی مقدار اسی وقت بڑھے گی جب تعداد ستر ہو جائے، ان دونوں

عدد کی درمیانی تعداد بھی وقص کہلائے گی کیونکہ اس تعداد میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اسی طرح ہر دہائی کے بعد حکم متغیر ہوتا چلا جاتا ہے بایں طور زکوٰۃ کی مقدار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے دو دہائیوں کے درمیان جتنے بیل اور گائے ہوں گی ان سب کو وقص کہیں گے اور ان میں زکوٰۃ معاف ہوگی۔

حدیث میں جس "وقص" کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے ابتدائی وقص یعنی تیس سے کم تعداد مراد ہے کیونکہ حضرت معاذؓ کے پاس جو گائیں لائی گئی تھیں ان کی تعداد تیس سے کم تھی۔

دو نصابوں کے درمیان کے "وقص" میں صاحبین کے نزدیک مطلقاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک چالیس سے ساٹھ تک کے درمیان "وقص" میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے مگر باقی "وقص" میں واجب نہیں ہوتی۔

اس مسئلے کی پوری تفصیل اس باب کی دوسری فصل کے شروع میں بیان کی جا چکی ہے اس حدیث کے بارے میں میرکؒ کہتے ہیں کہ اس کی اسناد منقطع ہے کیونکہ حضرت معاذؓ سے طاؤس کی ملاقات ثابت نہیں ہے۔

بَابُ صَدَقَةِ الْفِطْرِ

صدقۂ فطر کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

صدقۂ فطر واجب ہے یا فرض؟

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ اَوْصَاعًا مِّنْ شَعِيْرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى وَالصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَمَرَبِهَا اَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ اِلَى الصَّلٰوةِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مسلمانوں میں سے ہر غلام، آزاد، مرد، عورت اور چھوٹے بڑے پر زکوٰۃ فطر (صدقہ فطر) کے طور پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو فرض قرار دیا ہے نیز آپ ﷺ نے صدقہ فطر کے بارے میں یہ بھی حکم فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کو (عید الفطر کی نماز کے لئے جانے سے پہلے دے دیا جائے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک صدقہ فطر فرض ہے، حضرت امام مالکؒ کے ہاں سُنّت مؤکدہ ہے اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک میں واجب ہے حدیث میں مذکور لفظ "فرض" حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک اپنے ظاہری معنی ہی پر محمول ہے، حضرت امام مالکؒ فرض کے معنی بیان کرتے ہیں "مقرر کیا" حنفی حضرات فرماتے ہیں کہ صدقہ فطر چونکہ دلیل قطعی کے ذریعے ثابت نہیں ہے اس لئے صدقہ فطر "عمل" کے اعتبار سے تو فرض ہی کے برابر ہے لیکن اعتقادی طور پر اسے فرض نہیں کہا جاسکتا جس کا مطلب یہ ہے کہ واجب ہے فرض نہیں ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے مسلک میں ہر اس شخص پر صدقہ فطر واجب ہے جو اپنے لئے اور ان لوگوں کے لئے کہ جن کی طرف سے صدقہ فطر دینا اس کے ذمہ ہے ایک دن کا سامان خوراک رکھتا ہو اور وہ بقدر صدقہ فطر اس کی ضرورت سے زائد بھی ہو حضرت امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق صدقہ فطر اسی شخص پر واجب ہوگا جو غنی ہو یعنی وہ اپنی ضرورت اصلیہ کے علاوہ ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر اسباب وغیرہ کا مالک ہو، یا اس کے بقدر سونا چاندی اپنی ملکیت میں رکھتا ہو اور وہ قرض سے محفوظ ہو۔

صدقہ کا وجوب عید الفطر کی فجر طلوع ہونے کے وقت ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص طلوع فجر سے پہلے مرجائے اس پر صدقہ واجب نہیں ہوتا، اسی طرح جو شخص طلوع فجر کے بعد اسلام لائے اور مال پائے یا جو بچہ طلوع فجر کے بعد پیدا ہو اس پر بھی صدقہ فطر واجب نہیں ایک صاع ساڑھے تین سیر یعنی چودہ اوزان کے مطابق تین کلو ۲۶۶ گرام کے برابر ہوتا ہے گزشتہ صفحات میں بھی کچھ اوزان کے بارے میں تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

جو غلام خدمت کے لئے ہو اس کی طرف سے اس کے مالک پر صدقہ فطر دینا واجب ہے، ہاں جو غلام تجارت کے لئے ہو اس کی طرف سے صدقہ فطر دینا واجب نہیں ہے، اسی طرح جو غلام بھاگ جائے اس کی طرف سے بھی صدقہ فطر دینا واجب نہیں ہے ہاں جب وہ واپس آجائے تو اس وقت دینا واجب ہوگا۔

اولاد اگر چھوٹی ہو اور مالدار نہ ہو تو اس کی طرف سے اس کے باپ پر صدقہ فطر دینا واجب ہے ہاں اگر چھوٹی اولاد مالدار ہو تو پھر اس کا صدقہ فطر اس کے باپ پر واجب نہیں ہے بلکہ اس کے مال میں دیا جائے گا۔

بڑی اولاد جس پر دیوانگی طاری ہو اس کا حکم بھی چھوٹی اولاد کی طرح ہے، اسی طرح بڑی اولاد کی طرف سے باپ پر اور بیوی کی طرف سے خاوند پر ان کا صدقہ فطر دینا واجب نہیں ہے ہاں اگر کوئی باپ اپنی ہوشیار اولاد کی طرف سے یا کوئی خاوند اپنی بیوی کی طرف سے ان کا صدقہ ان کی اجازت سے از راہ احسان و مروت ادا کر دے تو جائز ہوگا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں لفظ من المسلمین لفظ "عبد" اور اس کے بعد کے الفاظ کا حال واقع ہو رہا ہے لہٰذا کسی مسلمان پر اپنے کافر غلام کی طرف سے صدقہ فطر واجب نہیں ہوگا۔ مگر صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ غلام کافر کا صدقہ فطر بھی اس کے مسلمان مالک پر واجب ہوتا ہے، انہوں نے اس کے ثبوت میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے جسے ہدایہ یا مرقات میں دیکھا جا سکتا ہے، حنفیہ کے یہاں صاحب ہدایہ ہی کے قول کے مطابق فتویٰ ہے۔ (علم الفقہ)

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ فطر نماز عید سے پہلے ہی ادا کر دینا مستحب ہے اگر کوئی شخص اس سے بھی پہلے خواہ ایک مہینے یا ایک مہینے سے بھی زیادہ پہلے دے دے تو جائز ہے۔ نماز عید کے بعد یا زیادہ تاخیر سے صدقہ فطر ساقط نہیں ہوتا بہر صورت دینا ضروری ہوتا ہے۔

صدقہ فطر کی مقدار

(۲) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کُنَّا نُخْرِجُ زَکَاۃَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ اَوْصَاعًا مِّنْ شَعِیْرٍ اَوْصَاعًا مِّنْ تَمْرٍ اَوْصَاعًا مِّنْ اَقِطٍ اَوْصَاعًا مِّنْ زَبِیْبٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ہم کھانے میں سے ایک صاع یا جو میں سے ایک صاع یا کھجوروں میں سے ایک صاع اور یا خشک انگوروں میں سے ایک صاع صدقہ فطر نکالا کرتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ طعام (کھانے) سے مراد گیہوں ہے لیکن حنفی علماء کہتے ہیں کہ طعام سے گیہوں کے علاوہ دوسرے غلے مراد ہیں، لہٰذا اس صورت میں "طعام" پر اس کے مابعد کا عطف خاص علی العام کی قسم سے ہوگا۔

"قروط" ایک خاص قسم کے "پنیر" کو کہتے تھے یہ پنیر اس طرح بنایا جاتا تھا کہ دہی کو کپڑے میں باندھ کر لٹکا دیتے تھے، دہی کا تمام پانی ٹپک ٹپک کر گر جاتا تھا اور اس کا باقی ماندہ حصہ "پنیر" کی طرح کپڑے میں رہ جاتا تھا وہی حصہ "قروط" کہلاتا تھا۔

خشک انگور چونکہ حضرت امام اعظمؒ کے ہاں گیہوں کی مانند ہے اس لئے اس میں سے صدقہ فطر کے طور پر نصف صاع یعنی ایک کلو ۶۳۳ گرام دینا چاہئے، البتہ صاحبینؒ خشک کھجوروں کو چونکہ جو کی مانند سمجھتے ہیں اس لئے ان حضرات کے نزدیک اس میں سے صدقہ فطر کے

طور پر ایک صاع یعنی تین کلو ۲۶۶ گرام دینا چاہئے۔ امام حسنؒ نے حضرت امام اعظمؒ کا بھی ایک قول یہی نقل کیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ فِیْ اٰخِرِ رَمَضَانَ اَخْرِجُوْا صَدَقَةَ صَوْمِكُمْ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ اَوْشَعِيْرٍ اَوْنِصْفَ صَاعٍ مِّنْ قَمْحٍ عَلٰى كُلِّ حُرٍّ اَوْ مَمْلُوْكٍ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى صَغِيْرٍ اَوْ كَبِيْرٍ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے رمضان کے آخری دنوں میں (لوگوں سے) کہا کہ تم اپنے روزوں کی زکوٰۃ نکالو یعنی صدقہ فطر ادا کرو رسول کریم ﷺ نے یہ صدقہ ہر (مسلمان، آزاد، غلام، لونڈی، مرد، عورت اور چھوٹے بڑے پر) کھجوروں اور جو میں سے ایک صاع اور گیہوں میں سے نصف صاع فرض (یعنی واجب قرار دیا گیا ہے۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اسی حدیث کے مطابق کہتے ہیں کہ صدقہ فطر کے طور پر اگر گیہوں دیا جائے تو اس کی مقدار نصف صاع یعنی ایک کلو ۶۳۳ گرام ہونی چاہئے۔

صدقہ فطر کا وجوب کیوں؟

(۴) وَعَنْهُ قَالَ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرَ الصِّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَ طُعْمَةً لِّلْمَسَاكِيْنِ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے روزوں کی بیہودہ باتوں اور لغو کلام سے پاک کرنے کے لئے نیز مساکین کو کھلانے کے لئے صدقہ فطر لازم قرار دیا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ صدقہ فطر کو اس لئے واجب کیا گیا ہے تاکہ تقصیرات و کوتاہی اور گناہوں کی وجہ سے روزوں میں جو خلل واقع ہو جائے وہ اس کی وجہ سے جاتا رہے نیز مساکین و غرباء عید کے دن لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بچ جائیں اور وہ صدقہ لے کر عید کی مسرتوں اور خوشیوں میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ دار قطنی نے اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ذکر کئے ہیں کہ:

"جو شخص صدقہ فطر نماز عید سے پہلے ادا کرے گا اس کا صدقہ "مقبول صدقہ" ہوگا اور جو شخص نماز عید کے بعد ادا کرے گا تو اس کا وہ صدقہ (بس) صدقوں میں سے ایک صدقہ ہوگا۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

صدقۂ فطر کی مقدار

(۵) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُنَادِيًا فِیْ فِجَاجِ مَكَّةَ اَلَا اِنَّ صَدَقَةَ الْفِطْرِ وَاجِبَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى حُرٍّ اَوْ عَبْدٍ صَغِيْرٍ اَوْ كَبِيْرٍ مُدَّانِ مِنْ قَمْحٍ اَوْ سِوَاهُ اَوْ صَاعٌ مِّنْ طَعَامٍ۔

(رواہ الترمذی)

"حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ کے گلی کوچوں میں یہ منادی کرائی کہ سن لو صدقہ فطر ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام اور چھوٹا ہو یا بڑا (اور اس کی مقدار) گیہوں یا اس کی مانند چیزوں

(مثلاً خشک انگور وغیرہ) میں سے دو مد اور (گیہوں کے علاوہ دوسرے غلوں میں سے ایک صاع۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "دو مد" سے مراد آدھا صاع ہے کیونکہ ایک مد غلہ کا وزن ۱۴ چھٹانک کے قریب ہوتا ہے اور ایک صاع ساڑھے تین سیر کے برابر ہوتا ہے، لہٰذا صدقہ فطر کے طور پر گیہوں پونے دو سیر یعنی ایک کلو ۶۳۳ گرام دینا چاہئے چونکہ گیہوں کا آٹا یا گیہوں کا ستو بھی گیہوں ہی کے مثل ہے اس لئے یہ دونوں چیزیں بھی اسی مقدار میں دینی چاہئیں۔

⑨ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ ثَعْلَبَةَ اَوْ ثَعْلَبَةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ صُعَيْرٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَاعٌ مِّنْ بُرٍّ اَوْ قَمْحٍ عَنْ كُلِّ اثْنَيْنِ صَغِيْرٍ اَوْ كَبِيْرٍ حُرٍّ اَوْ عَبْدٍ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى اَمَّا غَنِيُّكُمْ فَيُزَكِّيْهِ اللّٰهُ وَاَمَّا فَقِيْرُكُمْ فَيَرُدُّ عَلَيْهِ اَكْثَرَ مِمَّا اَعْطَاهُ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن ثعلبہ یا حضرت ثعلبہ ابن عبداللہ ابن ابی صعیر اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (صدقہ فطر واجب ہے) گیہوں میں سے ایک صاع دو آدمیوں کی طرف سے (کہ ہر ایک کی طرف سے نصف نصف صاع ہوگا) خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، آزاد ہوں یا غلام، مرد ہوں یا عورت، غنی کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (صدقہ فطر دینے کی وجہ سے) اسے پاکیزہ بنا دیتا ہے اور فقیر کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس سے زیادہ دیتا ہے جتنا اس نے صدقہ فطر کے طور پر دیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: مشکوٰۃ کے نسخوں میں حدیث کے راوی کا نام اگرچہ اسی طرح لکھا ہوا ہے لیکن صحیح اس طرح ہے عبداللہ ابن ثعلبہ ابن ابی صعیر یا ابن ابی صعیر عن ابیہ الخ۔ حضرت ثعلبہ صحابی ہیں جن سے ان کے صاحبزادے عبداللہ یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ غنی بھی صدقہ فطر ادا کرے اور فقیر بھی صدقہ فطر دے۔ ان دونوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ غنی کو تو اس کے صدقہ فطر دینے کی وجہ سے پاکیزہ بنا دیتا ہے اور فقیر[1] کو اس سے زیادہ دیتا ہے جتنا اس نے صدقہ فطر کے طور پر دیا ہے، یہ بشارت اگرچہ غنی کے لئے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مال میں بھی اس سے کہیں زیادہ برکت عطا فرماتا ہے جتنا کہ اس نے دیا ہے مگر اس بشارت کو فقیر کے ساتھ مخصوص اس لئے کیا تاکہ اس کی ہمت افزائی ہو اور وہ صدقہ فطر دینے میں پیچھے نہ رہے۔

بَابُ مَنْ لَّا تَحِلُّ لَهُ الصَّدَقَةُ

جن لوگوں کو زکوٰۃ کا مال لینا اور کھانا حلال نہیں ہے ان کا بیان

اس باب کے تحت وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ کا مال کن لوگوں کو لینا اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔ چونکہ اس باب سے متعلق بہت زیادہ مسائل ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے ان تمام مسائل کو تفصیلی طور پر نمبروار نقل کر دیا جائے۔

❶ جو شخص صاحب نصاب ہو اور اس پر زکوٰۃ واجب ہو تو وہ زکوٰۃ کا مال اپنی اصل کو نہ دے یعنی ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی اور ان سے اوپر کے بزرگوں کو خواہ وہ باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے ان میں سے کسی کو زکوٰۃ دینا درست اور جائز نہیں ہے اسی طرح اپنی فرع یعنی بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، پڑپوتا، پڑپوتی، نواسا، نواسی اور ان کی اولاد میں سے کسی کو بھی زکوٰۃ کا مال دینا درست نہیں ہے امام اعظمؒ کے قول کے مطابق شوہر، بیوی کو اور بیوی شوہر کو زکوٰۃ نہ دے، مگر صاحبین کا قول یہ ہے کہ اگر بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ دے تو درست ہے، ان

---

[1] زکوٰۃ و صدقات کے مسائل میں "فقیر" کا لفظ اپنے اصطلاحی معنی میں استعمال ہوتا ہے، اصطلاح شریعت میں فقیر اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی ایسے مال کے نصاب کا مالک نہ ہو جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے مگر بالکل تہیدست اور قلاش بھی نہ ہو حاصل یہ کہ فقیر سے موجودہ دور کے فقیر مراد نہ لئے جائیں کیونکہ آج کل تو فقیر بھیک مانگنے والے یا بالکل قلاش و تہی دست کو کہتے ہیں۔

کے علاوہ بقیہ رشتہ داروں کو زکوٰۃ کا مال دینا درست ہے بشرطیکہ وہ زکوٰۃ کے مستحق ہوں یعنی غنی، سید، ہاشمی اور کافر نہ ہوں بلکہ غیروں کے مقابلہ میں اپنے رشتہ داروں کو دینا بہتر ہے، اس بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ اگر زکوٰۃ اس ترتیب سے دی جائے تو بہت اچھا ہے کہ پہلے بہن، بھائی کو دے ان کے بعد ان کی اولاد کو، پھر چچا اور پھوپھی کو، ان کے بعد ان کی اولاد کو، پھر ماموں خالہ کو، ان کے بعد ان کی اولاد کو، پھر ان لوگوں کو جو ذوی الارحام ہوں پھر اپنے اجنبی ہمسایہ اور پڑوسی کو، پھر اپنے ہم پیشہ کو اور پھر اپنے ہم وطن کو یہی حکم صدقہ فطر اور نذر کا ہے کہ مذکورہ بالا ترتیب سے دینا افضل ہے، ویسے اگر کوئی شخص غیر اور اجنبی کو دیتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے مگر بہتر اور افضل یہی ہے کہ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو مقدم رکھا جائے۔

۲ اپنے غلام اور اپنی لونڈی کو زکوٰۃ دینی درست نہیں ہے، یہی حکم اُمّ ولد یعنی اس لونڈی کا ہے جس کے اپنے مالک سے کوئی اولاد ہو کہ اس کا مالک اسے بھی زکوٰۃ نہ دے۔

۳ سسرالی رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینی درست ہے مثلاً ساس سسر، سالا، سالی یا جن لوگوں سے ان کی وجہ سے رشتہ داری ہو اسی طرح داماد اور بہو کو زکوٰۃ دینی درست ہے، نیز سوتیلی ماں، سوتیلی نانی کو بھی زکوٰۃ کا مال دینا جائز ہے۔

۴ زکوٰۃ کا مال "غنی" کو دینا درست نہیں ہے، غنی اس شخص کو کہتے ہیں جو بقدر نصاب مال کا مالک ہو مال خواہ نامی ہو یا غیر نامی۔ "نامی مال" اس مال کو کہتے ہیں جس میں اضافہ اور بڑھوتری ہوتی ہے جیسے مال تجارت، نقد روپیہ، سونا، چاندی اور سونے چاندی کے زیورات، یہ مال شرعی قاعدہ کے مطابق نامی ہیں یعنی بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اسی طرح ایسے مویشی اور جانور بھی حقیقۃً نامی مال ہیں جو تجارت یا افزائش نسل کے لئے ہوں۔ "غیر نامی مال" اس مال کو کہتے ہیں جس میں اضافہ اور بڑھوتری نہ ہوتی ہو جیسے حویلی و مکانات، کپڑے اور برتن وغیرہ۔ یہ چیزیں بھی اگر ضرورت اصلیہ سے زائد ہوں اور بقدر نصاب ہوں، نیز قرض سے محفوظ ہوں تو بھی زکوٰۃ لینا درست نہیں ہے رہائش کا مکان استعمال کے کپڑے، کھانے پکانے کے برتن، اہل علم کی لکھنے پڑھنے کی کتابیں لڑنے والے ہتھیار و اسلحے اور کاریگروں کے اوزار۔ یہ وہ اشیاء ہیں جنہیں ضرورت اصلیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

۵ ہاشمی کو زکوٰۃ کا مال دینا جائز نہیں ہے پانچ لوگوں کی اولاد کو ہاشمی کہتے ہیں، اول حضرت علیؓ کی اولاد خواہ حضرت فاطمہ زہراؓ کے بطن مبارک سے ہو یا دوسری بیویوں سے، دوم حضرت جعفرؓ کی اولاد، سوم حضرت عقیلؓ کی اولاد، چہارم حضرت عباسؓ کی اولاد اور پنجم حارث ابن عبدالمطلب کی اولاد ان پانچوں کے سلسلے نسب سے تعلق رکھنے والے "ہاشمی" کہلاتے ہیں۔ ان کے غلام اور لونڈی کو بھی زکوٰۃ دینی جائز نہیں ہے اسی طرح اگر ان کے غلام لونڈی آزاد ہو گئے ہوں تب بھی انہیں زکوٰۃ کا مال لینا اور کھانا جائز نہیں۔

۶ کافر کو زکوٰۃ کا مال دینا درست نہیں ہے خواہ حربی ہو یا ذمی۔

۷ اگر کسی شخص نے غنی یا کافر یا اپنے باپ یا اپنے بیٹے یا اپنی بیوی کو مستحق زکوٰۃ سمجھ کر زکوٰۃ کا مال دے دیا یعنی زکوٰۃ دیتے وقت اسے معلوم نہیں ہوا کہ یہ ہاشمی ہے یا کافر ہے یا اپنا باپ یا بیٹا ہے اور یا اپنی بیوی ہے، پھر زکوٰۃ دینے کے بعد اسے حقیقت معلوم ہوئی تو اس کے ذمہ سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اب دوبارہ زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

۸ مسجد کی تعمیر و مرمت کے لئے یا کسی میت کے کفن کے لئے اور یا میت کے قرض کی ادائیگی کے لئے زکوٰۃ کا مال دینا جائز نہیں ہے اگر کسی شخص نے ان میں سے کسی بھی کام کے لئے زکوٰۃ کا مال دیا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

مستحقین زکوٰۃ: زکوٰۃ کے مستحق فقیر ہیں اور اصطلاح شریعت میں "فقیر" اس شخص کو کہتے ہیں جو نصاب سے کم مال کا مالک ہو، مساکین بھی مستحق زکوٰۃ ہیں۔ مساکین ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہ ہو، زکوٰۃ کا مستحق ہے جو حاکم وقت کی طرف سے لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر ہو اگرچہ وہ خود بھی غنی کیوں نہ ہو بر سبیل تذکرہ یہ بھی جان لیجئے کہ "ہاشمی" کے لئے وہ تنخواہ بھی جائز نہیں ہے جو زکوٰۃ وصول کرنے والے کو ملتی ہے وہ لوگ بھی زکوٰۃ کے مستحق ہیں جو جہاد یا سفر حج کے مسافر ہوں اور ان کے پاس روپیہ پیسہ نہ رہا ہو اگرچہ ان

کے وطن میں ان کا کتنا ہی زیادہ روپیہ پیسہ کیوں نہ موجود ہو۔ اسی طرح دوسرے مسافروں کو بھی زکوٰۃ کا مال دینا درست ہے خواہ کسی مسافر کا اپنے وطن میں کتنا ہی مال وزر کیوں نہ ہو لیکن آخر میں اتنی بات جان لیجئے جس شخص کو ایک دن بقدر بھی اسباب زندگی میسر ہوں اس کے لئے دست سوال دراز کرنا بالکل درست نہیں ہے۔ (مولانا محمد اسحق دہلوی)

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کو زکوٰۃ کا مال کھانا حرام تھا

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِتَمْرَۃٍ فِی الطَّرِیْقِ فَقَالَ لَوْلَآ اَنِّیْ اَخَافُ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الصَّدَقَۃِ لَاَکَلْتُھَا (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ ایک کھجور کے پاس سے گذرے جو راستے میں پڑی ہوئی تھی، آپ ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ یہ کھجور زکوٰۃ کی ہوگی تو میں اللہ کی نعمت کی تعظیم کے پیش نظر اسے اٹھا کر ضرور کھالیتا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے کئی مسئلے مستنبط ہوتے ہیں۔ ① آنحضرت ﷺ کو زکوٰۃ کا مال کھانا حرام تھا چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے حق میں مطلقاً صدقہ کا مال حرام تھا کہ خواہ صدقہ واجبہ (یعنی زکوٰۃ وغیرہ) کا مال ہو یا صدقہ نافلہ کا آپ ﷺ اسے اپنے استعمال میں نہیں لاسکتے تھے۔ ② بنی ہاشم کے لئے صدقہ واجبہ لینا اور اسے استعمال کرنا تو حرام ہے لیکن صدقہ نافلہ حرام نہیں ہے۔ ③ راستے میں پڑی ہوئی کسی ایسی چیز کو اٹھا کر کھالینا یا اسے اپنے استعمال میں لے آنا جائز ہے خواہ وہ مقدار و تعداد میں بہت تھوڑی ہو اور یہ گمان ہو کہ اس کا مالک اسے تلاش نہیں کرے گا۔ ④ بندۂ مؤمن کے لئے یہ بات اولیٰ اور افضل ہے کہ وہ ہر اس چیز سے اجتناب و پرہیز کرے جس میں حرمت کا ذرا بھی شبہ ہو۔

بنی ہاشم کے لئے صدقہ وزکوٰۃ کا مال کھانا حرام ہے

② وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ اَخَذَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ تَمْرَۃً مِّنْ تَمْرِ الصَّدَقَۃِ فَجَعَلَھَا فِیْ فِیْہِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَخْ کَخْ لِیَطْرَحَھَا ثُمَّ قَالَ اَمَا شَعَرْتَ اَنَّا لَا نَاْکُلُ الصَّدَقَۃَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حسن بن علیؓ نے زکوٰۃ کی رکھی ہوئی کھجوروں میں سے ایک کھجور اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لی (یہ دیکھ کر) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسے نکالو! نکالو (اور اس طرح فرمایا تاکہ) وہ اسے (منہ سے نکال کر) پھینک دیں پھر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ کیا تم جانتے نہیں کہ ہم (بنی ہاشم) صدقہ کا مال نہیں کھاتے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اما شعرت (کیا تم نہیں جانتے) اس جملے کا استعمال ایسے مواقع پر کیا جاتا ہے جب کہ مخاطب کسی واضح اور ظاہر امر کے برخلاف کوئی بات کہہ یا کر رہا ہو خواہ مخاطب اس واضح امر سے لاعلم ہی کیوں نہ ہو گویا اس جملے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ امر اتنا واضح اور ظاہر ہونے کے باوجود تم پر پوشیدہ کیسے ہے اور تم اس سے لاعلم کیسے ہو۔

بہرحال ظاہر ہے کہ حضرت حسنؓ تو اس وقت بالکل ہی کمسن تھے، انہیں ان سب باتوں کی کیا خبر تھی مگر آپ ﷺ نے اس کے باوجود انہیں اس انداز سے اس لئے خطاب کیا تاکہ دوسرے لوگ اس کے بارے میں مطلع ہو جائیں اور انہیں بنی ہاشم کے حق میں صدقہ زکوٰۃ کے مال کی حرمت کا علم ہو جائے۔

اس حدیث سے یہ نکتہ بھی ہاتھ لگا کہ والدین اور مربی پر واجب ہے کہ وہ اپنی اولاد کو خلاف شرع باتوں اور غلط حرکتوں سے روکیں اسی وجہ سے حنفی علماء فرماتے ہیں کہ والدین کے لئے یہ حرام ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو ریشم کے کپڑے (جو مردوں کے لئے ناجائز ہیں اور

سونے چاندی کا زیور پہنائیں۔

زکوٰۃ انسان کا میل ہے

③ وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ اِنَّمَا هِيَ اَوْسَاخُ النَّاسِ وَاِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَّلَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبدالمطلبؓ ابن ربیعہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ یہ صدقے یعنی زکوٰۃ تو انسانوں کے میل ہیں، صدقہ نہ تو محمد ﷺ کے لئے حلال ہے اور نہ آل محمد (بنی ہاشم) کے لئے حلال ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: زکوٰۃ کو میل اس لئے کہا گیا ہے کہ جس طرح انسان کا جسم میل اتارنے سے صاف ہو جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ نکالنے سے نہ صرف یہ کہ مال ہی پاک ہو جاتا ہے بلکہ زکوٰۃ دینے والے کے قلب و روح میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے لئے زکوٰۃ کا مال لینا حرام تھا اسی طرح آنحضرت ﷺ کی اولاد (بنی ہاشم) کو بھی زکوٰۃ لینی حرام ہے، خواہ وہ زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر ہوں یا محتاج و مفلس ہوں، چنانچہ حنفیہ کا صحیح مسلک یہی ہے۔

صدقہ کے مال سے آنحضرت ﷺ کی احتیاط

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِيَ بِطَعَامٍ سَاَلَ عَنْهُ اَهَدِيَّةٌ اَمْ صَدَقَةٌ فَاِنْ قِيْلَ صَدَقَةٌ قَالَ لِاَصْحَابِهٖ كُلُوْا وَلَمْ يَاْكُلْ وَاِنْ قِيْلَ هَدِيَّةٌ ضَرَبَ بِيَدِهٖ فَاَكَلَ مَعَهُمْ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب آپ ﷺ کے کھانے کی کوئی چیز لائی جاتی تو پہلے آپ ﷺ اس کے بارے میں پوچھتے کہ یہ ہدیہ (تحفہ) ہے یا صدقہ اگر بتایا جاتا کہ یہ صدقہ ہے تو آپ ﷺ (بنی ہاشم کے علاوہ اپنے دوسرے) صحابہؓ سے فرماتے کہ کھالو لیکن آپ ﷺ خود نہ کھاتے، اور اگر بتایا جاتا کہ یہ ہدیہ ہے تو آپ ﷺ اپنا دست مبارک بڑھاتے اور صحابہؓ کے ساتھ اسے تناول فرماتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "صدقہ" اس مال کو کہا جاتا ہے جو کسی محتاج و ضرورت مند کو ازراہ مہربانی دیا جاتا ہے اور اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا کی رضا حاصل ہو اور آخرت میں اس کا اجر و ثواب ملے چونکہ صدقہ کا مال لینے والے کی ایک طرح سے ذلت اور کمتری محسوس ہوتی ہے، اس لئے آنحضرت ﷺ کے لئے مطلقاً صدقہ لینا حرام تھا۔

"ہدیہ" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی بڑے اور عظیم المرتب شخص کی خدمت میں کوئی چیز ازراہ تعظیم و تکریم پیش کرے۔ ہدیہ کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ دنیاوی طور پر اس کا تعلق طرفین سے ہوتا ہے بایں طور کہ جو شخص کسی کو کوئی چیز ہدیہ کرتا ہے تو وہ دنیا ہی میں اس کا اس طرح بدلہ بھی پاتا ہے کہ جسے اس نے ہدیہ دیا ہے وہ کسی وقت اسے بھی کوئی چیز ہدیہ کے طور پر دیتا ہے جب کہ صدقہ میں اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تملیک کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ فِيْ بَرِيْرَةَ ثَلَاثُ سُنَنٍ اِحْدَى السُّنَنِ اَنَّهَا عَتَقَتْ فَخُيِّرَتْ فِيْ زَوْجِهَا وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ وَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْبُرْمَةُ تَفُوْرُ بِلَحْمٍ فَقُرِّبَ اِلَيْهِ خُبْزٌ وَّاُدْمٌ مِّنْ اُدْمِ الْبَيْتِ فَقَالَ اَلَمْ اَرَ بُرْمَةً فِيْهَا لَحْمٌ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّ ذٰلِكَ لَحْمٌ تُصُدِّقَ بِهٖ عَلٰى بَرِيْرَةَ وَاَنْتَ لَا تَاْكُلُ الصَّدَقَةَ قَالَ هُوَ عَلَيْهَا صَدَقَةٌ وَّلَنَا هَدِيَّةٌ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ بریرہ کے متعلق تین احکام سامنے آئے پہلا حکم تو یہ کہ جب وہ آزاد ہوئی تو اسے اپنے خاوند کے بارے میں اختیار دیا گیا (دوسرا حکم یہ کہ) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میراث کا حق اس شخص کے لئے ہے جس نے آزاد کیا (تیسرا حکم یہ کہ ایک دن) رسول کریم ﷺ گھر میں تشریف لائے تو گوشت کی ہانڈی پک رہی تھی، آپ ﷺ کے سامنے روٹی اور گھر کا سالن لایا گیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں نے وہ ہانڈی نہیں دیکھی جس میں گوشت ہے؟ (یعنی جب گوشت پک رہا ہے تو وہ مجھے کیوں نہیں دیا گیا ہے عرض کیا گیا کہ بے شک (ہانڈی میں گوشت پک رہا ہے) لیکن وہ گوشت بریرہ کو بطور صدقہ دیا گیا ہے اور آپ ﷺ تو صدقہ نہیں کھاتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ گوشت بریرہ کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے ابتدائی الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ "بریرہ" جو حضرت عائشہؓ کی آزاد کردہ لونڈی تھی اس کے سبب تین شرعی احکام نافذ ہوئے پہلا حکم تو یہ کہ جب بریرہ آزاد ہوئی تو اسے اختیار دے دیا گیا کہ چاہے تو وہ اپنے خاوند کہ جس کا نام مغیث تھا کے نکاح میں رہے یا اس سے جدائی اور علیحدگی اختیار کرلے۔

یہ علماء کے یہاں "خیار عتق" کہلاتا ہے یعنی جو لونڈی کسی کے نکاح میں ہو تو آزاد ہونے کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے تو خاوند کے نکاح میں رہے چاہے اس سے جدائی اختیار کرلے لیکن حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ لونڈی کو یہ اختیار اس وقت حاصل ہوگا جب کہ اس کا خاوند غلام ہو، حنفیہ کہتے ہیں کہ اس کا خاوند خواہ غلام ہو خواہ آزاد ہو وہ دونوں صورتوں میں مختار ہوگی۔

بریرہ کا خاوند مغیث غلام تھا جب بریرہ نے آزاد ہونے کے بعد اس سے جدائی اختیار کرلی گویا اسے قبول نہیں کیا تو مغیث بڑا پریشان ہوا یہاں تک کہ وہ بریرہ کے عشق و فراق میں روتا اور فریاد کرتا پھرتا رہا مگر بریرہ نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا اور اس سے علیحدہ ہی رہی۔

بریرہ کے سبب سے دوسرا حکم یہ نافذ ہوا کہ "ولاء یعنی لونڈی کی میراث اس شخص کے لئے ہے جس نے اسے آزاد کیا ہوگا اس کی تفصیل یہ ہے کہ بریرہ ایک یہودی کی لونڈی تھی جس نے اسے مکاتب کر دیا تھا یعنی یہودی نے اسے کہہ دیا تھا کہ جب تو اتنے درہم دے دے گی تو آزاد ہو جائے گی، جب بریرہ مطلوبہ تعداد میں درہم فراہم کرنے سے عاجز ہوگئی تو حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی تاکہ اگر وہ کچھ دے دیں تو اپنے مالک کو دے کر آزادی کا خلعت زیب تن کرے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اپنے مالک سے پوچھ اگر وہ تجھے بیچے تو میں خرید لیتی ہوں۔ بریرہ اپنے مالک کے پاس گئی اور اس سے حضرت عائشہؓ کی خواہش بیان کی وہ فروخت کرنے پر تیار ہو گیا مگر اس نے یہ بھی کہا کہ میں اس شرط پر فروخت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ ولاء یعنی بریرہ کی میراث کے ہم حقدار ہوں گے حضرت عائشہؓ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ یہودی اس طرح کہتے ہیں اور ان کی یہ شرط ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہودی غلط کہتے ہیں اور بکواس کرتے ہیں، میراث کا حق اسی کو ہوتا ہے جو آزاد کرتا ہے عائشہؓ تم اس سے خرید کر آزاد کر دو اس کی میراث تمہارے لئے ہوگی، یہودیوں کی یہ شرط باطل ہے۔

تیسرا حکم جو بریرہ کے سبب سے نافذ ہوا اس کا ذکر حدیث کے آخر میں کیا گیا ہے اس کا حاصل اور مطلب یہ ہے کہ اگر مستحق زکوٰۃ کو زکوٰۃ کا مال دیا جائے اور مستحق زکوٰۃ وہ مال لے کر ایسے شخص کو دے دے جو زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے تو اس کے لئے یہ مال حلال و جائز ہوگا کیونکہ زکوٰۃ دینے والے نے تو ایک صحیح شخص اور مستحق کو مال دے دیا اور وہ مال اس مستحق زکوٰۃ کی ملکیت ہوگا اب وہ جس شخص کو بھی اپنا مال دے گا جائز اور درست ہوگا اصطلاح میں اسے "تملیک" کہا جاتا ہے جو جائز اور حلال ہے۔

آنحضرت ﷺ تحفہ قبول کرتے اور اس کا بدلہ عطا فرماتے تھے

(۶) وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ وَيُثِيْبُ عَلَيْهَا (رواه البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ تحفہ قبول فرماتے تھے اور اس کا بدلہ دے دیا کرتے تھے۔" (بخاریؒ)

معمولی تحفہ بھی قبول کرنا چاہئے

⑦ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْدُعِیْتُ اِلٰی کُرَاعٍ لَاَجَبْتُ وَلَوْاُهْدِیَ اِلَیَّ ذِرَاعٌ لَقَبِلْتُ (رواه البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر میری کراع کی بھی دعوت کی جائے تو میں قبول کروں گا اور اگر میرے پاس بطور تحفہ ایک دست بھی بھیجا جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "کراع" بکری کی پنڈلی کو کہتے ہیں آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مجھے صرف بکری کی پنڈلی جو کہ ایک معمولی چیز ہے، کھانے کے لئے بلائے تو میں اس کی دعوت قبول کرلوں گا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص میرے پاس تحفہ کے طور پر بکری کا دست بھی بھیجے گا تو میں اسے بھی بڑی خوشی کے ساتھ قبول کروں گا۔

اس ارشاد میں اس طرف اشارہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مخلوق خدا کے ساتھ نہایت تواضع وانکساری اور شفقت و محبّت کے ساتھ پیش آتے تھے، آپ ﷺ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ ﷺ کی ذات کی وجہ سے کسی چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی درجے کے انسان کا دل بھی دکھے یا وہ کسی بھی طرح کے احساس کمتری میں مبتلا ہو، گویا آپ ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعے اس بات کی ترغیب بھی دلائی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے پاس انتہائی معمولی درجہ کا بھی کوئی تحفہ لے کر آئے تو اسے خوشی ورغبت کے ساتھ قبول کرو۔

مسکین کون ہے؟

⑧ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الْمِسْکِیْنُ الَّذِیْ یَطُوْفُ عَلَی النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلٰکِنَّ الْمِسْکِیْنَ الَّذِیْ لَایَجِدُ غِنًی یُّغْنِیْهِ وَلَا یُفْطَنُ بِهٖ فَیُتَصَدَّقُ عَلَیْهِ وَلَا یَقُوْمُ فَیَسْأَلُ النَّاسَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مسکین وہ شخص نہیں ہے جو لوگوں سے مانگتا پھرتا ہے اور لوگ اسے ایک لقمہ یا دو لقمہ اور کھجوریں دے دیتے ہیں، بلکہ مسکین شخص وہ ہے جو اتنا بھی مال نہیں رکھتا کہ وہ اس کی وجہ سے مستغنی ہو اور اس کے ظاہری حالات کی وجہ سے لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ محتاج وضرورت مند ہے اسے صدقہ دیا جائے نیز لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنے کے لئے گھر سے نہیں نکلتا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: قرآن کریم میں جس طرح زکوٰۃ وصدقات کی اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زکوٰۃ کے مصارف اور زکوٰۃ کے مستحقین کو بھی بیان فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاکِیْنِ وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔

"صدقہ کے مال صرف فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور عمّال کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جن کی تالیف قلب کی جائے اور غلاموں کی آزادی میں خرچ کرنے کے لئے اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے کے لئے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے اور مسافر کے لئے۔"

اس آیت میں آٹھ قسم کے لوگ بیان کئے گئے ہیں جو صدقات واجبہ مثلاً زکوٰۃ وغیرہ کا مال لینے کے مستحق ہیں ان کے سوا کسی دوسرے کو

زکوٰۃ کا مال دینا جائز نہیں ہے، ان میں سے بھی حنفیہ کے نزدیک "مؤلفۃ القلوب[1]" کا حصہ ساقط ہو گیا ہے اس لئے ان کے ہاں مستحقین زکوٰۃ کی سات قسمیں باقی رہ گئیں ہیں۔

بہر حال حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جن مسکینوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے وہ مسکین مراد نہیں ہیں جو عرف عام میں مسکین کہلاتے ہیں اور جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ مانگنے کے لئے ہر در پر مارے مارے پھرتے ہیں، جس دروازے پر پہنچ جاتے ہیں روٹی کا ایک آدھ ٹکڑا یا آٹے کی ایک آدھ چٹکی اپنی جھولی میں ڈلوا کر رخصت کر دیئے جاتے ہیں، بلکہ حقیقی مسکین تو وہ لوگ ہیں جنہیں نان جویں بھی میسر نہیں ہوتی مگر ان کی شرافت و خودداری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کی بغل میں رہنے والا ہمسایہ بھی ان کی اصل حقیقت نہیں جانتا، وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے، اپنے احتیاج و ضرورت کی جھولی پھیلا کر گھر گھر نہیں پھرتے بلکہ وہ اپنے خدا پر اعتماد و بھروسہ کئے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بنی ہاشم کے غلاموں کو بھی صدقہ کا مال لینا حلال نہیں

(۹) عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعَثَ رَجُلاً مِّنْ بَنِیْ مَخْزُوْمٍ عَلَی الصَّدَقَۃِ فَقَالَ لِاَبِیْ رَافِعٍ اَصْحِبْنِیْ کَیْ مَا تُصِیْبَ مِنْھَا فَقَالَ لَا حَتّٰی اٰتِیَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَسْأَلَہٗ فَانْطَلَقَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَہٗ فَقَالَ اِنَّ الصَّدَقَۃَ لَا تَحِلُّ لَنَا وَاِنَّ مَوَالِی الْقَوْمِ مِنْ اَنْفُسِھِمْ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"حضرت ابورافع راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بنی مخزوم کے ایک شخص کو زکوٰۃ لینے کے لئے بھیجا۔ اس نے ابورافع سے کہا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو تاکہ اس میں سے تمہیں بھی کچھ حصہ مل جائے ابورافع نے کہا کہ میں ابھی نہیں جاؤں گا پہلے رسول کریم ﷺ سے جا کر پوچھتا ہوں کہ میں اس شخص کے ساتھ زکوٰۃ لینے جاؤں یا نہیں! چنانچہ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اپنے جانے کے بارے میں پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ ہمارے (یعنی بنی ہاشم) کے لئے حلال نہیں ہے اور مولیٰ (یعنی آزاد کردہ غلام زکوٰۃ لینے کے معاملے میں) اسی آزاد قوم کے حکم میں ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: حضرت ابورافع آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں زکوٰۃ کا مال لینے سے منع فرمایا کہ جس طرح ہمیں زکوٰۃ کا مال لینا درست نہیں ہے اسی طرح تمہارے لئے بھی زکوٰۃ کا مال حلال نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ بنی ہاشم کے غلاموں کو بھی زکوٰۃ کا مال لینا درست نہیں ہے خواہ غلام ان کی ملکیت میں ہوں خواہ آزاد ہو گئے ہوں۔

کن لوگوں کو زکوٰۃ کا مال لینا درست نہیں ہے؟

(۱۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَحِلُّ الصَّدَقَۃُ لِغَنِیٍّ وَّلَا لِذِیْ مِرَّۃٍ سَوِیٍّ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالدَّارِمِیُّ وَرَوَاہُ اَحْمَدُ وَالنَّسَآئِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ نہ تو غنی کے لئے زکوٰۃ کا مال لینا حلال ہے اور نہ تندرست و توانا

---

[1] اسلام کے ابتدائی دور میں آنحضرت کچھ لوگوں کو تالیف قلب کے لئے صدقات کا مال دیدیا کرتے تھے ان میں سے کچھ تو کافر ہوتے تھے جن کے دینے سے مقصود یہ تھا کہ ان کے دل میں اسلام کی محبت پیدا ہو اور وہ مسلمان ہو جائیں کچھ کافروں کو اس غرض سے بھی دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی سازشوں اور تخریبی کاروائیوں سے باز رہیں نیز شرو فساد کا بیج بو کر مسلمانوں کو پریشان نہ کریں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے ان کو اس لئے دیا جاتا تھا کہ ان کے دل میں اسلام کی جڑ مظبوط ہو جائے۔

کے لئے (جو محنت مزدوری کرنے کے قابل ہو) ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ اور احمدؒ، نسائیؒ، وابن ماجہؒ نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: غنی تین طرح کے ہوتے ہیں، اول تو وہ شخص جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے گویا وہ شخص نصاب نامی کا مالک ہو اور اس کے نصاب پر ایک سال گزر گیا ہو دوم وہ شخص جو مستحق زکوٰۃ نہیں ہوتا اور اس پر صدقہ فطر و قربانی کرنا واجب ہوتا ہے گویا وہ شخص کہ جس کے پاس ضرورت اصلیہ کے علاوہ بقدر نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر مال ہو، سوم وہ شخص جس کے لئے صدقہ کا مال تو حلال ہو لیکن اسے دست سوال دراز کرنا حرام ہو، گویا وہ شخص جو ایک دن کے کھانے اور بقدر ستر پوشی کپڑے کا مالک ہو۔

"تندرست و توانا" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح غنی کے لئے زکوٰۃ کا مال حلال نہیں ہے اسی طرح اس شخص کے لئے زکوٰۃ حلال و جائز نہیں ہے جو تندرست و توانا ہو یعنی اس کے اعضاء صحیح وسالم اور قوی ہوں نیز وہ اتنا کمانے پر قادر ہو کہ اس کے ذریعے اپنا اہل وعیال کا پیٹ پال سکے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک اسی حدیث کے مطابق ہے کہ ان کے نزدیک کسی ایسے شخص کے لئے زکوٰۃ کا مال لینا حلال نہیں ہے جو کمانے کے قابل ہو لیکن حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو زکوٰۃ لینی حلال ہے جو نصاب مذکورہ کا مالک نہ ہو اگرچہ وہ تندرست و توانا اور کمانے کے قابل ہی کیوں نہ ہو کیونکہ آنحضرت ﷺ ان ضرورت مند صحابہؓ کو صدقات وزکوٰۃ کا مال دیتے تھے جو توانا و تندرست بھی تھے اور کمانے کے قابل بھی تھے اور آخر تک آپ ﷺ کا یہی معمول رہا لہٰذا اس حدیث کے بارے میں کہا جائے گا یا تو یہ منسوخ ہے یا پھر یہ کہ اس حدیث کی مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو شخص تندرست و توانا ہو اور محنت و مزدوری کر کے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے اسباب معیشت فراہم کرنے کی قدرت وطاقت رکھتا ہو اس کے لئے یہ بہتر اور مناسب نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ وصدقات کا مال لے کر اس ذلت و کمتری پر مطمئن وراضی ہو اور معاشرے کا ایک ناکارہ شخص بن جائے بلکہ اس کے لئے تو بہتر اور اولیٰ یہ ہے کہ وہ اپنے بازوؤں کے سہارے خود کمائے، محنت کرے اور اس طرح سماج و سوسائٹی میں باوقار زندگی بسر کرے۔

تندرست و توانا کو زکوٰۃ کا مال لینا مناسب نہیں

(۱۱) وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الْخِيَارِ قَالَ اَخْبَرَنِيْ رَجُلَانِ اَنَّهُمَا اَتَيَا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ وَهُوَ يَقْسِمُ الصَّدَقَةَ فَسَأَلَاهُ مِنْهَا فَرَفَعَ فِيْنَا النَّظْرَ وَخَفَضَهُ فَرَاٰنَا جَلْدَيْنِ فَقَالَ اِنْ شِئْتُمَا اَعْطَيْتُكُمَا وَلَا حَظَّ فِيْهَا لِغَنِيٍّ وَّلَا لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبید اللہ بن عدی بن خیار کہتے ہیں کہ مجھے دو آدمیوں نے بتایا کہ وہ دونوں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب کہ آپ ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر لوگوں کو زکوٰۃ کا مال تقسیم فرما رہے تھے ان دونوں نے بھی آپ ﷺ کے سامنے اس مال میں سے کچھ لینے کی خواہش کا اظہار کیا، وہ دونوں کہتے تھے کہ آپ ﷺ نے (ہماری خواہش طلب کو دیکھ کر) ہم پر سر سے پاؤں تک نظر دوڑائی اور ہمیں تندرست و توانا دیکھ کر فرمایا کہ اگر تم لینا ہی چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دوں لیکن یاد رکھو کہ صدقات وزکوٰۃ کے اس میں سے نہ تو غنی کا کوئی حصہ ہے اور نہ اس شخص کا جو تندرست و توانا ہو اور کمانے پر قادر ہو۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "حجۃ الوداع" آنحضرت ﷺ کے آخری حج کو کہتے ہیں جس میں آپ ﷺ نے احکام خداوندی کی وضاحت فرمائی اور لوگوں کو وداع کہا اور پھر اس کے چند مہینوں کے بعد ہی "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے۔

حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق حدیث کے آخری جملوں کا مطلب یہ ہوگا کہ تم لوگوں کے لئے صدقہ کا مال کھانا حرام ہے لیکن تم اگر حرام مال کھانا ہی چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں، گویا آپ ﷺ نے زجر و توبیخ کے طور پر اس طرح ارشاد فرمایا۔

حنفیہ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "اگر تم اس مال میں سے لینا چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں لیکن یہ سمجھ لو کہ جو شخص

تندرست و توانا ہو اور کمانے پر قدرت رکھتا ہو اس کے لئے صدقہ کا مال کھانا کچھ زیب نہیں دیتا۔

بعض صورتوں میں غنی کے لئے بھی زکوٰۃ کا مال حلال ہوتا ہے

⑫ وَعَنْ عَطَآءِ بْنِ يَسَارٍ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ اِلَّا لِخَمْسَةٍ لِغَازٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْلِعَامِلٍ عَلَيْهَا اَوْلِغَارِمٍ اَوْلِرَجُلٍ اِشْتَرَاهَا بِمَالِهٖ اَوْلِرَجُلٍ كَانَ لَهٗ جَارٌ مِّسْكِيْنٌ فَتُصُدِّقَ عَلَى الْمِسْكِيْنِ فَاَهْدَى الْمِسْكِيْنُ لِلْغَنِيِّ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاوٗدَ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ اَوِابْنِ السَّبِيْلِ۔

"اور حضرت عطاء ابن یسار بطریق ارسال روایت کرتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ غنی کے لئے زکوٰۃ کا مال حلال نہیں ہے ہاں پانچ صورتوں میں غنی کے لئے بھی زکوٰۃ کا مال حلال ہوتا ہے۔ ① خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے غنی کے لئے جب کہ اس کے پاس سامان جہاد نہ ہو ② زکوٰۃ وصول کرنے والے غنی کے لئے ③ تاوان بھرنے والے غنی کے لئے ④ زکوٰۃ کا مال اپنے مال کے بدلے میں خریدنے والے غنی کے لئے یعنی کسی شخص نے ایک مفلس کو زکوٰۃ کا کوئی مال دیا اور غنی اس مفلس سے زکوٰۃ کے مال کو خریدے اور اسے اس کا بدل دے دے تو اس صورت میں غنی کے لئے وہ مال جائز و حلال ہوگا۔ ⑤ اور اس غنی کے لئے کہ جس کے پڑوس میں کوئی مفلس رہتا ہو اور کسی شخص نے اسے زکوٰۃ کا کوئی مال دیا اور وہ مفلس اپنے پڑوسی مال دار غنی کو اس میں سے کچھ حصہ تحفہ کے طور پر بھیجے تو وہ غنی کے لئے جائز وحلال ہوگا۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ) اور ابوداؤد کی ایک روایت جو ابوسعیدؓ سے منقول ہے لفظ او ابن السبیل (یعنی اس غنی کے لئے بھی کہ جو مسافر ہو زکوٰۃ کا مال حلال ہے مذکور ہے۔"

تشریح: تاوان بھرنے والے غنی سے وہ مال دار اور غنی مراد ہے جسے کسی تاوان و جرمانے کے طور پر ایک بڑی رقم یا کسی مال کا ایک بڑا حصہ ادا کرنا ہے اگرچہ وہ مالدار ہے مگر اس کے ذمہ تاوان اور جرمانے کی جو رقم یا جو مال ہے وہ اس کے موجودہ مال و رقم سے بھی زیادہ ہے تو اس کے لئے جائز اور حلال ہے کہ وہ زکوٰۃ لے کر اس سے وہ تاوان پورا کرے اب وہ تاوان خواہ "دیت" کی صورت میں ہو یا یہ شکل ہو کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا قرضدار تھا اس نے طرفین کو لڑائی جھگڑے سے بچانے کے لئے یا کسی اور وجہ سے اس شخص کا قرض اپنے ذمہ لے لیا کہ اس کی طرف سے اس قرض کو میں ادا کروں گا اس کی وجہ سے وہ قرض دار ہو گیا یا پھر یہ شکل بھی مراد ہو سکتی ہے کہ وہ خود کسی کا قرض دار ہو اپنا قرض ادا کرنے کے لئے اسے رقم و مال کی ضرورت ہو امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق وہ غازی (جہاد کرنے والا) جو غنی اور مالدار ہو زکوٰۃ لے سکتا ہے اور اسے زکوٰۃ لینی درست ہے۔ لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اسے زکوٰۃ دینی جائز نہیں ہے کیونکہ دوسری احادیث میں مطلقاً غنی کو زکوٰۃ دینے سے منع فرمایا گیا ہے کہ غنی کے لئے صدقات کا مال حلال نہیں ہے پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کو جو حکم تحریر فرمایا تھا اس میں آپ نے مطلقاً یہی ارشاد فرمایا تھا کہ (جس قوم میں تم گئے ہو) اس قوم کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کر و اسے ان کے فقراء و مساکین پر صرف کرو، چنانچہ وہ حدیث کہ جس میں حضرت معاذؓ کے بارے میں مذکورہ حکم منقول ہے یہاں ذکر کی گئی حدیث سے زیادہ قوی ہے۔

ان کے علاوہ حدیث میں جو ذکر کی گئی ہیں وہ سب صورتیں متفقہ طور پر تمام ائمہ کے درست ہیں کیونکہ زکوٰۃ وصول کرنے والے کو تو زکوٰۃ کا مال اس لئے لینا درست ہے کہ وہ اپنی محنت اور اپنے عمل کی اجرت لیتا ہے اس صورت میں اس کا فقر و غنا دونوں برابر ہیں۔ تاوان بھرنے والا اگرچہ غنی ہے لیکن اس پر جو قرض یا مطالبہ ہے وہ اس کے موجودہ مال سے زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کا مال نہ ہونے کے برابر ہے، اسی طرح باقی دونوں صورتوں کا معاملہ بھی ظاہر ہی ہے کہ زکوٰۃ جب مستحق زکوٰۃ کو مل گئی تو گویا وہ اپنے محل اور اپنے مصرف میں پہنچ گئی اور وہ مستحق زکوٰۃ اس مال کا مالک ہو گیا اب چاہے وہ اسے فروخت کر دے چاہے کسی کو تحفہ کے طور پر دے دے۔

زکوٰۃ کے مستحق وہی لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے

⑬ وَعَنْ زِيَادِبْنِ الْحَارِثِ الصُّدَائِيِّ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَايَعْتُهُ فَذَكَرَ حَدِيْثًا طَوِيْلاً فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ اَعْطِنِيْ مِنَ الصَّدَقَةِ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَرْضَ بِحُكْمِ نَبِيٍّ وَّلَا غَيْرِهِ فِي الصَّدَقَاتِ حَتّٰى حَكَمَ فِيْهَا هُوَ فَجَزَّاهَا ثَمَانِيَةَ اَجْزَاءٍ فَاِنْ كُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْاَجْزَاءِ اَعْطَيْتُكَ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت زیادؓ ابن حارث صدائی کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد زیادؓ نے ایک طویل حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے زکوٰۃ کا مال عطا فرمائیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ زکوٰۃ تقسیم کرنے کے بارے میں کہ کسے کسے زکوٰۃ دی جائے اللہ تعالیٰ نے تو کسی نبی کے علاوہ کسی دوسرے یعنی علماء و مجتہدین کے حکم پر راضی ہوا بلکہ اس کا حکم حق تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا (یعنی اللہ تعالیٰ نے مستحقین زکوٰۃ کے تعین کی ذمہ داری نبی یا علماء مجتہدین پر نہیں ڈالی بلکہ اس کا تعین خود فرمایا) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے آٹھ مصرف (مستحقین) ذکر کئے ہیں اگر تم ان آٹھ میں سے ہوگے تو میں تمہیں زکوٰۃ کا مال دوں گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آیت کریمہ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ الایة کہ جس میں مستحقین زکوٰۃ اور مصرف زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے ابھی پچھلے صفحات میں نقل کی جاچکی ہے اس آیت کے مطابق مستحقین زکوٰۃ کی تعداد آٹھ اس طرح ہے ① فقیر ② مسکین ③ عاملین زکوٰۃ ④ مولفة القلوب (اس کے بارے میں بتایا جاچکا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تالیف قلب کا مصرف اب باقی نہیں رہا ⑤ غلام ⑥ قرض دار یا تاوان دینے والا ⑦ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا اسفر حج کا مسافر اور طالب علم ⑧ مسافرین۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ

⑭ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ قَالَ شَرِبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَبَنًا فَاَعْجَبَهُ فَسَأَلَ الَّذِيْ سَقَاهُ مِنْ اَيْنَ هٰذَا اللَّبَنُ فَاَخْبَرَهُ اَنَّهُ وَرَدَ عَلٰى مَآءٍ قَدْ سَمَّاهُ فَاِذَا نَعَمٌ مِّنْ نَّعَمِ الصَّدَقَةِ وَهُمْ يَسْقُوْنَ فَحَلَبُوْا مِنْ اَلْبَانِهَا فَجَعَلْتُهُ فِيْ سِقَائِيْ فَهُوَ هٰذَا فَاَدْخَلَ عُمَرُ يَدَهُ فَاسْتَقَآءَ (رواہ مالک والبیہقی فی شعب الایمان)

"حضرت زید ابن اسلمؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے دودھ نوش فرمایا تو انہیں بہت اچھا لگا، جس شخص نے انہیں دودھ پلایا تھا اس سے انہوں نے پوچھا کہ یہ دودھ کہاں کا ہے، اس نے انہیں بتایا کہ ایک پانی پر (یعنی نام لے کر بتایا کہ فلاں جگہ جہاں پانی تھا) میں گیا، وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ زکوٰۃ کے بہت سے اونٹ موجود ہیں اور انہیں پانی پلایا جارہا ہے، پھر اونٹ والوں سے اونٹوں کا تھوڑا سا دودھ نکالا اس میں سے تھوڑا سا دودھ میں نے (بھی لے کر) اپنی مشک میں ڈال لیا یہ وہی دودھ ہے یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے اپنا ہاتھ اپنے منہ میں ڈالا اور قے کردی۔" (مالکؒ، بیہقیؒ)

تشریح: حضرت عمرؓ کا یہ عمل کمال تقویٰ اور انتہائی ورع کی بناء پر تھا ورنہ تو جہاں تک مسئلے کی بات ہے یہ تو بتایا ہی جاچکا ہے کہ اگر مستحق زکوٰۃ کے مال کا مالک ہوجانے کے بعد اسے کسی غیر مستحق زکوٰۃ کو ہبہ کردے یا اسے تحفہ کے طور پر دے دے تو اسے استعمال میں لانا اور اسے کھانا جائز ہے چنانچہ ابھی گذشتہ صفحات میں بریرہ کا جو واقعہ گزرا ہے اس میں آنحضرت ﷺ نے اس مسئلہ کے جواز ہی کو بیان فرمایا تھا۔

بَابُ مَنْ لَا تَحِلُّ لَهُ الْمَسْئَلَةُ وَمَنْ تَحِلُّ لَهُ

جن لوگوں کو سوال کرنا جائز ہے اور جن کو جائز نہیں ہے ان کا بیان

علماء لکھتے ہیں کہ جس شخص کے پاس ایک دن کے بقدر بھی غذا اور ستر چھپانے کے بقدر کپڑا ہو تو اسے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرنا چاہئے کیونکہ بغیر ضرورت و حاجت مانگنا حرام ہے ہاں جس شخص کے پاس ایک دن کی بھی غذا اور ستر چھپانے کے بقدر بھی کپڑا نہ ہو تو اس کے لئے دست سوال دراز کرنا حلال ہے جو محتاج و فقیر ایک دن کی غذا کا مالک ہو اور وہ کمانے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے لئے زکوٰۃ لینا تو حلال ہے مگر لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنا حرام ہے جس مسکین و محتاج کو ایک دن کی غذا بھی میسر نہ ہو اور وہ کمانے کی قدرت بھی نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے سوال کرنا حلال ہے۔

نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بغیر ضرورت و احتیاج لوگوں سے مانگنا ممنوع ہے البتہ جو شخص کمانے کی قدرت رکھتا ہو اس کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں۔ چنانچہ زیادہ صحیح قول تو یہ ہے کہ ایسے شخص کو کہ جو کما کر اپنا گزارہ کر سکتا ہو لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنا حرام ہے لیکن بعض حضرات مکروہ کہتے ہیں وہ بھی تین شرطوں کے ساتھ، اول یہ کہ دست سوال، دراز کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہ ہونے دے، دوم الحاح یعنی مانگنے میں مبالغہ سے کام نہ لے، سوم یہ کہ جس شخص کے آگے دست سوال دراز کر رہا ہے اسے تکلیف و ایذاء نہ پہنچائے اگر ان تین شرطوں میں سے ایک بھی پوری نہ ہو تو پھر سوال کرنا بالاتفاق حرام ہوگا۔

ابن مبارکؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "جو سائل" لوجہ اللہ کہہ کر سوال کرے تو مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اسے کچھ دیا جائے کیونکہ دنیا اور دنیا کی چیزیں کمتر و حقیر ہیں، جب اس نے دنیا کی کسی چیز کے لئے "لوجہ اللہ" کہہ کر سوال کیا تو گویا اس نے اس چیز (یعنی دنیا) کی تعظیم و توقیر کی جسے اللہ تعالیٰ نے کمتر و حقیر قرار دیا ہے، لہٰذا ایسے شخص کو از راہ زجر و تنبیہ کچھ نہ دیا جائے اور اگر کوئی شخص یہ کہہ کر سوال کرے کہ "بحق خدا یا بحق محمد دو" تو اسے کچھ دینا واجب نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اپنی کوئی غلط اور جھوٹی حاجت و ضرورت ظاہر کر کے کسی سے کوئی چیز لے تو وہ اس چیز کا مالک نہیں ہوتا (گویا وہ چیز اس کے حق میں ناجائز و حرام ہوتی ہے) اسی طرح کوئی شخص کسی سے یہ کہے کہ میں سید ہوں اور مجھے فلاں چیز کی یا اتنے روپیہ کی ضرورت ہے اور وہ شخص سائل کو سید سمجھ کر اس کا سوال پورا کر دے مگر حقیقت میں وہ سید نہ ہو تو وہ بھی (اس مانگی ہوئی چیز) کا مالک نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں وہ چیز اس کے حق میں ناجائز و حرام ہوتی ہے۔

ایسے ہی اگر کوئی شخص کسی سائل کو نیک بخت و صالح سمجھ کر کوئی چیز دے دے حالانکہ وہ سائل باطنی طور پر ایسا گنہگار ہے کہ اگر دینے والے کو اس کے گناہ کا پتہ چل جاتا تو اسے وہ چیز نہ دیتا تو اس صورت میں بھی سائل اس چیز کا مالک نہیں ہوتا وہ چیز اس کے لئے حرام ہے اور اس چیز کو اس کے مالک کو واپس کر دینا اس پر واجب ہوگا اگر کوئی شخص کسی کو اس کی بد زبانی یا اس کی چغل خوری کے مضر اثرات سے بچنے کے لئے کوئی چیز دے تو وہ چیز اس کے حق میں حرام ہوگی۔

اگر کوئی فقیر کسی شخص کے پاس مانگنے کے لئے آئے اور وہ اس کے ہاتھ پیر چومے تاکہ وہ اس کی وجہ سے اس کا سوال پورا کر دے تو یہ مکروہ ہے بلکہ اس شخص کو چاہئے کہ وہ فقیر کو ہاتھ پیر نہ چومنے دے۔

ان سائل اور فقیروں کو کچھ بھی نہ دینا چاہئے جو نقارہ، ڈھول یا ہار مونیم وغیرہ بجاتے ہوئے دروازوں پر مانگتے پھرتے ہیں اور مطرب یعنی ڈوم تو سب سے بد تر ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کن لوگوں کو سوال کرنا جائز ہے

① عَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ قَالَ تَحَمَّلْتُ حَمَالَةً فَاَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْأَلُهُ فِيْهَا فَقَالَ اَقِمْ حَتّٰى تَأْتِيَنَا الصَّدَقَةُ فَنَأْمُرَلَكَ بِهَا ثُمَّ قَالَ يَا قَبِيْصَةُ اِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ اِلَّا لِاَحَدِ ثَلَاثَةٍ رَجُلٍ تَحَمَّلَ حَمَالَةً فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيْبَهَا ثُمَّ يُمْسِكُ وَرَجُلٍ اَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اُجْتَاحَتْ مَالَهُ فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيْبَ قِوَامًا مِّنْ عَيْشٍ اَوْ قَالَ سِدَادًا مِّنْ عَيْشٍ وَّرَجُلٍ اَصَابَتْهُ فَاقَةٌ حَتّٰى يَقُوْمَ ثَلَاثَةٌ مِّنْ ذَوِى الْحِجٰى مِنْ قَوْمِهٖ لَقَدْ اَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيْبَ قِوَامًا مِّنْ عَيْشٍ اَوْ قَالَ سِدَادًا مِّنْ عَيْشٍ فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ يَا قَبِيْصَةُ سُحْتٌ يَّأْكُلُهَا صَاحِبُهَا سُحْتًا (رواہ مسلم)

"حضرت قبیصہؓ ابن مخارق کہتے ہیں کہ میں نے ایک ایسے قرضہ کی ضمانت لی جو دیت کی وجہ سے تھا چنانچہ میں رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے ادائیگی قرض کے لئے کچھ رقم یا مال کا سوال کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ دن ٹھہرے رہو، جب ہمارے پاس زکوٰۃ کا مال آئے گا تو اس میں سے تمہیں دینے کے لئے کہہ دیں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ قبیصہ! صرف تین طرح کے لوگوں کے لئے سوال کرنا جائز ہے، ایک تو اس شخص کے لئے جو کسی کے قرض کا ضامن بن گیا ہو (بشرطیکہ مانگنے میں مبالغہ نہ کرے بلکہ اتنے ہی مال یا رقم کا سوال کرے کہ اس سے قرضہ کو ادا کر دے اور اس کے بعد پھر نہ مانگے، دوسرے اس شخص کے لئے جو کسی آفت و مصیبت (مثلاً قحط و سیلاب وغیرہ) میں مبتلا ہو جائے اور اس کا تمام مال ہلاک و ضائع ہو جائے، چنانچہ اس کو صرف اس قدر مانگنا جائز ہے جس سے اس کی (غذا و لباس) کی ضرورت پوری ہو جائے یا فرمایا کہ (اس قدر مانگے کہ) اس کی محتاجگی دور ہو جائے اور اس کی زندگی کے لئے سہارا ہو جائے، تیسرے اس شخص کے لئے کہ جو غنی ہو مگر اس کو کوئی ایسی سخت حاجت پیش آجائے جسے اہل محلہ بھی جانتے ہوں مثلاً گھر کا تمام مال و اسباب چوری ہو جائے یا اور کسی مصیبت و حادثے سے دوچار ہونے کی وجہ سے ضرورت مند بن جائے اور قوم (محلہ و بستی) کے تین صاحب عقل و فراست لوگ اس بات کی شہادت دیں کہ واقعی اسے سخت حاجت پیش آگئی ہے تو اس کے لئے اس قدر مانگنا جائز ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ یا فرمایا کہ اس کی وجہ سے اس کی محتاجگی دور ہو جائے اور اسکی زندگی کا سہارا ہو جائے۔ قبیصہ ان تین کے علاوہ کسی اور کو سوال کرنا حرام ہے اگر کوئی شخص ان تین مجبوریوں کے علاوہ دست سوال دراز کر کے کسی سے کچھ لے کر کھاتا ہے تو وہ حرام کھاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "حمالہ" اس مال کو کہتے ہیں جو کسی شخص پر دیت کے طور پر کچھ لوگوں کو دینا ضروری ہو اور کوئی دوسرا شخص اس مال کی عدم ادائیگی کی بناء پر آپس کے لڑائی جھگڑے کو نمٹانے کے لئے درمیان میں پڑ جائے اور وہ مال اپنے ذمہ لے لے اور اس کی وجہ سے قرض دار ہو جائے۔

حدیث کے آخر میں "تین صاحب عقل و فراست لوگوں کی شہادت" کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ احتیاج و ضرورت کے واقعی اور حقیقی ہونے کے لئے بطور مبالغہ ہے، نیز اس بات کا احساس پیدا کرنے کے لئے ہے کہ لوگ دست سوال دراز کرنے کو آسان نہ سمجھیں اور اس برے فعل سے بچتے رہیں۔

محض اضافہ مال کی خاطر دست سوال دراز کرنے پر وعید

② وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَأَلَ النَّاسَ اَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا فَاِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا

فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْلِيَسْتَكْثِرْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص محض اضافہ مال کی خاطر لوگوں کے مال میں سے کچھ مانگتا ہے تو وہ گویا آگ کا انگارا مانگتا ہے اب وہ چاہے کم مانگے یا زیادہ مانگے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اضافہ مال کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی احتیاج وضرورت کی بناء پر نہیں بلکہ محض اس لئے لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرتا ہے تاکہ اس کا مال زیادہ ہو جائے۔

"آگ کے انگارے" سے مراد دوزخ کی آگ کا انگارہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جو اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض اضافہ مال کی خاطر کسی سے کچھ مانگتا ہے تو وہ اپنی اس ہوسناکی اور حرص وطمع کی وجہ سے دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ کم یا زیادہ آپ ﷺ نے بطور تنبیہ ارشاد فرمایا اس کی وضاحت یہ ہے کہ بلاضرورت لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا دنیاوی اور اخروی اعتبار سے بہر صورت نقصان دہ اور باعث ذلت ورسوائی ہے خواہ وہ کسی حقیر وکمتر چیز کے لئے ہاتھ پھیلائے خواہ کسی قیمتی اور اعلیٰ چیز کے لئے دست سوال دراز کرے۔

روز قیامت بھیک مانگنے والوں کا حشر

③ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَايَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ حَتّٰى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِيْ وَجْهِهٖ مُزْعَةُ لَحْمٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص ہمیشہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا رہے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں ہوگا کہ اس کے منہ پر گوشت کی بوٹی نہ ہوگی۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بلاضرورت محض پیشے کے طور پر بھیک مانگتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرتے ہیں وہ قیامت کے روز میدان حشر میں ذلیل ورسوا کر کے لائے جائیں گے یا حقیقۃً ان کا یہ حال ہوگا کہ ان کی اس برائی اور غلط فعل کی سزا کے طور پر ان کے منہ پر گوشت نہیں ہوگا اس طرح وہ لوگ میدان حشر میں مخلوق خدا کے درمیان یہ کہہ کر بے آبرو اور رسوا کئے جائیں گے کہ یہ دنیا میں بھیک مانگتے پھرا کرتے تھے، آج انہیں اس کی یہ سزا مل رہی ہے۔

مانگنے میں مبالغہ نہ کرنا چاہئے

④ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُلْحِفُوْا فِي الْمَسْئَلَةِ فَوَاللّٰهِ لَايَسْأَلُنِيْ اَحَدٌ مِّنْكُمْ شَيْئًا فَتُخْرِجُ لَهٗ مَسْأَلَتُهٗ مِنِّيْ شَيْئًا وَاَنَا لَهٗ كَارِهٌ فَيُبَارَكُ لَهٗ فِيْمَا اَعْطَيْتُهٗ (رواہ مسلم)

"اور حضرت معاویہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مانگنے میں مبالغہ نہ کرو، خدا کی قسم! تم میں سے جو بھی شخص مجھ سے (مبالغہ کے ساتھ) کچھ مانگتا ہے تو میں اسے اس حال میں کچھ نکال کر دیتا ہوں کہ میں اسے دینا برا سمجھتا ہوں اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ جو چیز میں نے اسے دی ہے اس میں برکت ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص انتہائی مبالغہ کے ساتھ میرے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے تو اگرچہ مجھ سے اس کا سوال ٹھکرایا نہیں جاتا اور میں اسے دے دیتا ہوں مگر میری طرف سے ناخوشی کے ساتھ دی گئی چیز اور برکت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوتے لہٰذا میں ناخوشی کے ساتھ جو چیز دیتا ہوں اس میں برکت نہیں ہوتی۔

محنت مزدوری کرنا ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے

⑤ وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ يَّاْخُذَ اَحَدُكُمْ حَبْلَهٗ فَيَاْتِيَ بِحُزْمَةِ حَطَبٍ عَلٰى ظَهْرِهٖ فَيَبِيْعَهَا فَيَكُفَّ اللّٰهُ بِهَا وَجْهَهٗ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّسْاَلَ النَّاسَ اَعْطَوْهُ اَوْ مَنَعُوْهُ (رواہ البخاری)

"اور حضرت زبیر بن عوامؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص ایک رسی اور لکڑیوں کا ایک گٹھا (باندھ کر) پشت پر لاد کر لائے اور اسے فروخت کرے اور اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی عزت و آبرو کو برقرار رکھے جو مانگنے سے جاتی تھی تو یہ اس کے لئے اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور لوگ اسے دیں یا نہ دیں۔" (بخاریؒ)

اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے

⑥ وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَعْطَانِيْ ثُمَّ سَاَلْتُهٗ فَاَعْطَانِيْ ثُمَّ قَالَ لِيْ يَا حَكِيْمُ اِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرٌ حُلْوٌ فَمَنْ اَخَذَهٗ بِسَخَاوَةِ نَفْسٍ بُوْرِكَ لَهٗ فِيْهِ وَمَنْ اَخَذَهٗ بِاِشْرَافِ نَفْسٍ لَّمْ يُبَارَكْ لَهٗ فِيْهِ وَكَانَ كَالَّذِيْ يَاْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى قَالَ حَكِيْمٌ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا اَرْزَاُ اَحَدًا بَعْدَكَ شَيْئًا حَتّٰى اُفَارِقَ الدُّنْيَا (متفق علیہ)

"اور حضرت حکیم ابن حزامؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ سے کچھ مانگا تو آپ ﷺ نے عنایت فرمادیا، میں نے پھر دوبارہ مانگا تو آپ ﷺ نے اس وقت بھی عطا کیا اور پھر مجھ سے فرمایا کہ حکیم! یہ مال سبز و شیریں ہے (یعنی نظر میں خوشنما اور دل کو لذت دینے والا ہے) لہٰذا جو شخص اس مال کو بے پروائی سے (یعنی بغیر ہاتھ پھیلائے اور بغیر طمع و حرص کے) حاصل کرتا ہے تو اس میں برکت عطا فرمائی جاتی ہے اور جو شخص اسے نفس کے طمع و حرص کے ساتھ حاصل کرتا ہے تو اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس کی حالت اس شخص کی مانند ہوتی ہے جو کھاتا تو کھاتا ہے مگر اس کا پیٹ نہیں بھرتا (گویا بے برکتی اور کثرت حرص کی وجہ سے یہ حال ہوتا ہے) اور یاد رکھو کہ اوپر کا ہاتھ یعنی دوسروں کو دینے والا نیچے کے ہاتھ یعنی دوسروں سے مانگنے والے سے بہتر ہوتا ہے حکیمؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اب کسی کے مال میں سے کچھ کم نہیں کروں گا (یعنی آج آپ سے سوال کے بعد آئندہ کبھی بھی کسی سے سوال نہیں کروں گا) یہاں تک کہ میں اس دنیا سے جدا ہوں (یعنی موت کی آغوش میں پہنچ جاؤں۔" (بخاری و مسلم)

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَذْكُرُ الصَّدَقَةَ وَالتَّعَفُّفَ عَنِ الْمَسْاَلَةِ الْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى وَالْيَدُ الْعُلْيَا هِيَ الْمُنْفِقَةُ وَالسُّفْلٰى هِيَ السَّائِلَةُ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس موقع پر جب کہ آپ ﷺ منبر پر تھے اور صدقہ کا ذکر بیان کر رہے تھے اور سوال سے بچنے کے بارے میں خطبہ دے رہے تھے یہ ارشاد فرمایا کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، اوپر کا ہاتھ خرچ کرنے والا اور لوگوں کو دینے والا ہاتھ ہے اور نیچے کا ہاتھ مانگنے والا یعنی سائل کا ہاتھ ہے۔" (بخاری و مسلمؒ)

سوال نہ کرنے والے کی فضیلت

⑧ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ اِنَّ اُنَاسًا مِّنَ الْاَنْصَارِ سَاَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَعْطَاهُمْ ثُمَّ سَاَلُوْهُ فَاَعْطَاهُمْ حَتّٰى نَفِدَ مَا عِنْدَهٗ فَقَالَ مَا يَكُوْنُ عِنْدِيْ مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ اَدَّخِرَهٗ عَنْكُمْ وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ وَمَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ وَمَا اُعْطِيَ اَحَدٌ عَطَاءً هُوَ خَيْرٌ وَّاَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک دن انصار میں سے چند لوگوں نے رسول کریم ﷺ سے کچھ مانگا، آپ ﷺ نے انہیں عطا فرما دیا۔ انہوں نے پھر مانگا تو آپ ﷺ نے جب بھی دے دیا یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاس جو کچھ تھا سب ختم ہو گیا، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ بھی مال ہو گا میں تم سے بچا کر اس کا ذخیرہ نہیں کروں گا اور یاد رکھو کہ جو شخص لوگوں سے سوال کرنے سے بچتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بری باتوں سے بچاتا ہے اور اسے لوگوں کا محتاج نہیں کرتا اس طرح اس کی خودداری کو باقی رکھتا ہے، نیز جو شخص انتہائی معمولی چیز پر بھی قناعت کرتا ہے اور کسی سے سوال نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے قناعت آسان کر دیتا ہے اور جو شخص بے پروائی ظاہر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بے پروا بنا دیتا ہے یعنی جو شخص دوسروں کے مال وزر سے بے پروا ہوتا ہے اور ہاتھ پھیلانے سے بچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی کر دیتا ہے اور جو شخص صبر کا طالب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے صبر عطا فرماتا ہے یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے صبر کی توفیق طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے صبر آسان کر دیتا ہے اور یاد رکھو کہ صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع کوئی دوسری چیز عطا نہیں کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی تمام عطاء و بخشش میں صبر سب سے بہتر عطاء ہے۔" (بخاری و مسلمؒ)

جو چیز بغیر طمع و حرص کے ملے اسے قبول کرنا چاہئے

⑨ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِيْنِي الْعَطَآءَ فَاَقُوْلُ اَعْطِهٖ اَفْقَرَ اِلَيْهِ مِنِّيْ فَقَالَ خُذْهُ فَتَمَوَّلْهُ وَتَصَدَّقْ بِهٖ فَمَا جَآءَكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ وَاَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَّلَا سَآئِلٍ فَخُذْهُ وَمَالَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت عمر ابن خطابؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ مجھے زکوٰۃ وصول کرنے کی اجرت عطا فرماتے تو میں عرض کرتا کہ یہ اس شخص کو دے دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو۔ آپ ﷺ اس کے جواب میں فرماتے کہ اگر تمہیں حاجت و ضرورت ہو تو اسے لے کر اپنے مال میں شامل کر لو اور اگر حاجت و ضرورت سے زیادہ ہو تو خود خدا کی راہ میں خیرات کر دو نیز یہ بھی فرماتے کہ جو چیز تمہیں بغیر طمع و حرص اور بغیر مانگے حاصل ہو اسے قبول کر لو اور جو چیز اس طرح یعنی بغیر طمع و حرص اور بغیر سوال کے ہاتھ نہ لگے تو اس کے پیچھے مت پڑو۔"

(بخاری و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز بغیر طمع و حرص اور بغیر مانگے حاصل نہ ہو اس کو حاصل کرنے کے لئے طمع نہ کرو اور نہ اس کے منتظر رہو جیسا کہ کہہ دیا جاتا ہے کہ لا ردو لا کد۔

ایک دوسری حدیث میں منقول ہے کہ "جس شخص کو کوئی مال یا کوئی چیز بغیر طمع و حرص کے حاصل ہو اور وہ اسے واپس کر دے تو گویا اس نے اس چیز کو اللہ کو واپس کر دیا یعنی خدا کی ایک نعمت کو ٹھکرایا۔"

ایک سبق آموز واقعہ: منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام احمدؒ بازار گئے اور وہاں سے انہوں نے کچھ سامان خریدا جسے بنان جلال اٹھا کر احمدؒ کے ساتھ ان کے گھر لائے جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں روٹیاں ٹھنڈی ہونے کے لئے کھلی ہوئی رکھی تھیں، حضرت امامؒ نے اپنے صاحبزادے کو حکم دیا کہ ایک روٹی بنان کو دے دیں، صاحبزادے نے جب بنان کو روٹی دی تو انہوں نے انکار کر دیا، بنان جب گھر سے باہر نکل گئے اور واپس چل دیئے تو امام احمدؒ نے صاحبزادے سے کہا کہ اب ان کے پاس جاؤ اور انہیں روٹی دے دو صاحبزادے نے باہر جا کر بنان کو روٹی دی تو انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ انہیں بڑا تعجب ہوا کہ پہلے تو روٹی لینے سے صاف انکار کر دیا اور اب فوراً قبول کر لیا آخر یہ ماجرا کیا ہے! انہوں نے حضرت امام احمدؒ سے اس کا سبب پوچھا تو امام صاحب نے فرمایا کہ "بنان جب گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے کھانے کی ایک عمدہ چیز دیکھی بتقاضائے طبیعت بشری انہیں اس کی خواہش ہوئی اور دل میں اس کی طمع پیدا ہو گئی اس لئے جب تم نے انہیں روٹی دی تو انہوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی طمع و خواہش کے تابع بن جائیں انہوں نے روٹی لینے

سے انکار کردیا مگر جب وہ باہر چلے گئے اور اس روٹی سے قطع نظر کر کے اپنا راستہ پکڑا اور پھر تم نے جا کر وہ روٹی دی تو اب چونکہ وہ روٹی انہیں بغیر طمع و خواہش اور غیر متوقع طریقے پر حاصل ہو رہی تھی اس لئے انہوں نے اسے خدا کی نعمت سمجھ کر فوراً قبول کر لیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

سوال کرنے والے کے لئے تہدید

⑩ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَسَائِلُ كُدُوْحٌ يَكْدَحُ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ فَمَنْ شَآءَ اَبْقٰى عَلٰى وَجْهِهٖ وَمَنْ شَآءَ تَرَكَهٗ اِلَّا اَنْ يَّسْاَلَ الرَّجُلُ ذَا سُلْطَانٍ اَوْ فِىْ اَمْرٍ لَّا يَجِدُ مِنْهُ بُدًّا۔

(رواہ ابوداؤد و الترمذی والنسائی)

"حضرت سمرہ ابن جندب راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سوال کرنا ایک زخم ہے کہ جس کے ذریعے انسان اپنا منہ زخمی کرتا ہے بایں طور کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اپنی عزت و آبرو کو خاک میں ملاتا ہے کہ یہ اپنے منہ کو زخمی کرنے ہی کے مترادف ہے لہٰذا جو شخص اپنی عزت و آبرو باقی رکھنا چاہے کہ وہ سوال سے شرم کرے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا کر اپنی عزت و آبرو کو باقی رکھے اور کوئی شخص اپنی آبرو باقی رکھنا ہی نہیں چاہتا تو وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر اپنی عزت خاک میں ملا لے یعنی اسے باقی نہ رکھے یہ گویا سوال کرنے والے کے لئے تہدید اور تنبیہ ہے کہ کسی سے سوال نہ کرنا چاہئے۔ ہاں! اگر سوال ہی کرتا ہے تو پھر حاکم سے سوال کرے یا ایسی صورت میں سوال کرے کہ اس کے لئے کوئی واقعی ضرورت اور مجبوری ہو۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر تم سوال ہی کرو تو کم سے کم ایسے شخص سے تو کرو جس پر تمہارا حق بھی ہے اور وہ حاکم یا بادشاہ ہے کہ جس کے تصرف میں بیت المال اور خزانہ ہو تم ان سے اپنا حق مانگو، اگر تم مستحق ہو گے وہ تمہیں بیت المال سے دیں گے۔

عطاء سلطانی کو قبول کرنے کا مسئلہ

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں اختلافی اقوال ہیں کہ آیا عطاء سلطانی بادشاہ و حاکم کا عطیہ قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس بارے میں صحیح قول یہی ہے کہ اگر بیت المال اور خزانے میں حرام مال زیادہ ہو تو اس میں سے کچھ مانگنا یا اس سے عطیہ سلطانی قبول کرنا حرام ہے اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر حلال ہے۔

حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی واقعی مجبوری اور ضرورت ہو کہ کسی سے مانگے بغیر چارہ کار نہ ہو مثلاً کسی کا ضامن بن گیا ہو، طوفان و سیلاب کی وجہ سے کھیتی باڑی تباہ ہو گئی ہو، یا کسی حادثے و مصیبت کی وجہ سے نوبت فاقوں تک پہنچ گئی تو ایسی صورتوں میں سوال کرنے کی اجازت ہے بلکہ اگر کوئی شخص حالت اضطراری کو پہنچ گیا ہو خواہ وہ اضطراری حالت کپڑے کی طرف سے ہو کہ ستر چھپانے کو کپڑا نہ ہو یا کھانے کی طرف سے ہو کہ شدت بھوک سے جان نکلی جاتی ہو تو پھر ایسی صورت میں کسی سے مانگ کر اپنی اضطراری حالت کو دور کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اسی طرح اس شخص کے لئے بھی سوال کرنا واجب ہوتا ہے جو حج کی استطاعت رکھتا تھا مگر حج نہیں کیا یہاں تک کہ مفلس ہو گیا تو اب اسے چاہئے کہ وہ لوگوں سے سفر خرچ مانگ کر حج کے لئے جائے۔

مستغنی سائل کے لئے وعید

⑪ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَاَلَ النَّاسَ وَلَهٗ مَا يُغْنِيْهِ جَآءَ يَوْمَ

الْقِيَامَةِ وَمَسْأَلَتُهُ فِي وَجْهِهِ خُمُوْشٌ اَوْ خُدُوْشٌ اَوْ كُدُوْحٌ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا يُغْنِيْهِ قَالَ خَمْسُوْنَ دِرْهَمًا اَوْ قِيْمَتُهَا مِنَ الذَّهَبِ (رواه ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص لوگوں سے ایسی چیز کی موجودگی میں سوال کرے جو اسے مستغنی بنا دینے والی ہو تو وہ قیامت کے دن اس حال میں پیش ہوگا کہ اس کے منہ پر اس کا سوال بصورت خموش یا خدوش یا کدوح ہوگا۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! مستغنی بنانے والی کیا چیز ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا پچاس درہم یا اس قیمت کا سونا۔"

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمیؒ)

تشریح: "خموش"، جمع ہے "خمش" کی، "خدوش" جمع ہے "خدش" کی اور کدوح جمع ہے "کدح" کی بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ تمام الفاظ قریب المعنی ہیں بایں طور کی ان سب کے معنی کا حاصل "زخم" ہے گویا حدیث میں لفظ "او" راوی کا شک ظاہر کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان تینوں میں سے کوئی ایک لفظ ارشاد فرمایا ہے۔

لیکن دوسرے بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ تینوں الفاظ متبائن ہیں یعنی ان تینوں کے الگ الگ معنی ہیں خموش کے معنی ہیں لکڑی کے ذریعے کھال چھیلنا، خمش کے معنی ہیں ناخن کے ذریعے کھال چھیلنا اور کدح کے معنی ہیں دانتوں کے ذریعے کھال اتارنا۔ گویا اس طرح قیامت کے روز سائلین کے تفاوت احوال کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص کم سوال کرے گا اس کے منہ پر ہلکا زخم ہوگا، جو شخص بہت زیادہ سوال کرے گا اس کے منہ پر بہت گہرا زخم ہوگا جو شخص سوال کرنے میں درمیانی درجہ اختیار کرے گا اس کے منہ پر زخم بھی درمیانی درجے کا ہوگا۔

(۱۲) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ الْحَنْظَلِيَّةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَأَلَ وَعِنْدَهُ مَا يُغْنِيْهِ فَاِنَّمَا يَسْتَكْثِرُ مِنَ النَّارِ قَالَ النُّفَيْلِيُّ وَهُوَ اَحَدُ رُوَاتِهِ فِي مَوْضِعٍ اٰخَرَ وَمَا الْغِنَى الَّذِيْ لَا تَنْبَغِي مَعَهُ الْمَسْأَلَةُ قَالَ قَدْرَ مَا يُغَدِّيْهِ وَيُعَشِّيْهِ وَقَالَ فِي مَوْضِعٍ اٰخَرَ اَنْ يَكُوْنَ لَهُ شِبْعُ يَوْمٍ اَوْ لَيْلَةٍ وَيَوْمٍ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سہل ابن حنظلیہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کے پاس اتنا مال ہو جو اس کو مستغنی کر دے مگر وہ اس کے باوجود لوگوں سے سوال کرتا ہے تو گویا وہ زیادہ آگ مانگتا ہے یعنی جو شخص بغیر ضرورت وحاجت کے لوگوں سے مانگ مانگ کر مال وزر جمع کرتا ہے تو وہ گویا دوزخ کی آگ جمع کرتا ہے۔ نفیلیؒ جو اس حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی ہیں ایک اور جگہ یعنی ایک دوسری روایت میں نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ مستغنی ہونے کی کیا حد ہے کہ اس کی موجودگی میں دوسرے لوگوں سے مانگنا ممنوع ہے آپ ﷺ نے فرمایا صبح اور شام کے بقدر۔ نفیلیؒ نے ایک اور جگہ آنحضرت ﷺ کا جواب اس طرح نقل کیا ہے کہ اس کے پاس ایک دن یا ایک رات وایک دن کے بقدر خوراک ہو (راوی کو شک ہو رہا ہے کہ) آپ ﷺ نے صرف ایک دن فرمایا ہے یا ایک رات و ایک دن فرمایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "صبح اور شام کے کھانے کے بقدر" مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اتنی مقدار میں غذائی ضروریات موجود ہوں کہ وہ ایک دن ورات اپنا پیٹ بھر سکے تو وہ غنی کہلائے گا یعنی اس کے لئے اب جائز نہیں ہوگا کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔

ابھی اس سے پہلے حضرت ابن مسعودؓ کی جو روایت گزری ہے اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ مال کی تعداد کہ جس کی وجہ سے آدمی مستغنی ہو جائے اور کسی سے سوال نہ کرے، پچاس درہم ہے یعنی جو شخص پچاس درہم کا مالک ہوگا اس کے لئے کسی سے سوال کرنا حرام ہوگا یہاں جو یہ روایت نقل کی گئی ہے اس میں یہ مقدار "صبح وشام کے کھانے کے بقدر" بیان کی گئی ہے، اور اس کے بعد حضرت عطاء ابن یسارؒ کی جو روایت آرہی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو شخص ایک اوقیہ یعنی چالیس درہم کا مالک ہو وہ مستغنی کہلائے گا اس کے

لئے کسی سے سوال کرنا مطلقاً جائز نہیں ہوگا۔

گویا یہ تین روایتیں ہیں جن میں باہم اختلاف ہے لہٰذا حضرت امام احمدؒ، ابن مبارکؒ اور اسحاقؒ کا عمل تو پہلی روایت پر ہے جو ابن مسعودؓ سے منقول ہے، بعض علماء نے تیسری روایت کو معمول بر قرار دیا ہے۔ جو عطاء ابن یسار سے منقول ہے اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ نے دوسری روایت کو اپنے مسلک کی بنیاد قرار دیا ہے جو سہیل ابن حنظلیہ سے منقول ہے لہٰذا حضرت امام اعظمؒ کا یہی مسلک ہے کہ جو شخص ایک دن کی غذائی ضروریات کا مالک ہوگا وہ مستغنی کہلائے گا اور اس کے لئے کسی سے سوال کرنا حرام ہوگا، گویا حضرت امام صاحبؒ کے نزدیک یہ حدیث دوسری احادیث کے لئے ناسخ ہے۔ (واللہ اعلم)

⑬ وَعَنْ عَطَآءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ رَّجُلٍ مِّنْ بَنِیْ اَسَدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَاَلَ مِنْكُمْ وَلَهٗ اُوْقِيَّةٌ اَوْعِدْلُهَا فَقَدْ سَاَلَ اِلْحَافًا (رواہ مالک وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عطاء ابن یسار قبیلہ بنی اسد کے ایک شخص سے نقل کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ تم میں سے جو شخص ایک اوقیہ (یعنی چالیس درہم) کا یا اس کی قیمت کے بقدر سونا وغیرہ کا مالک ہو اور اس کے باوجود وہ لوگوں سے مانگے تو اس نے گویا بطریق الحاح سوال کیا۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: بطریق الحاح کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اضطراری کیفیت کے علاوہ اور بلا ضرورت نیز انتہائی مبالغہ کے ساتھ لوگوں سے مانگا جو ممنوع اور برا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں فقراء کی بایں طور تعریف کی گئی ہے کہ:

وَلَا يَسْاَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا —— "وہ لوگوں سے بطریق الحاح نہیں مانگتے۔"

کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا انتہائی محتاجگی کے وقت جائز ہے

⑭ وَعَنْ حُبْشِیِّ بْنِ جُنَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَسْاَلَةَ لَا تَحِلُّ لِغَنِیٍّ وَّلَا لِذِیْ مِرَّةٍ سَوِیٍّ اِلَّا لِذِیْ فَقْرٍ مُّدْقِعٍ اَوْ غُرْمٍ مُّفْظِعٍ وَّمَنْ سَاَلَ النَّاسَ لِيُثْرِیَ بِهٖ مَالَهٗ كَانَ خُمُوْشًا فِیْ وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَرَضْفًا يَّاْكُلُهٗ مِنْ جَهَنَّمَ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُقِلَّ وَمَنْ شَآءَ فَلْيُكْثِرْ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت حبشی ابن جنادہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا نہ تو غنی کے لئے (یعنی اس شخص کے لئے جو ایک دن کی خوراک کا مالک ہو) اور نہ تندرست و توانا اور صحیح الاعضاء کے لئے مانگنا حلال ہے، ہاں اس فقیر کے لئے مانگنا حلال ہے جسے (فقر و فاقہ نے) زمین پر ڈال دیا ہو، اسی طرح اس قرض دار کے لئے بھی مانگنا حلال ہے جو بھاری قرض کے نیچے دبا ہو (یاد رکھو) جو شخص صرف اس لئے لوگوں سے مانگے کہ اپنے مال و زر میں زیادتی ہو تو قیامت کے دن اس کا مانگنا اس کے منہ پر زخم کی صورت میں ہوگا۔ نیز دوزخ میں اسے گرم پتھر اپنی خوراک بنائے گا، اب چاہے کوئی کم سوال کرے چاہے کوئی زیادہ سوال کرے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "زمین پر ڈال دیا ہو" یہ کنایہ ہے شدت محتاجگی اور مفلسی نے زمین پر ڈال رکھا ہے کہ اٹھنے کی بھی سکت نہیں رکھتا۔ گویا مطلب یہ ہے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا صرف انتہائی محتاجگی ہی کے وقت جائز ہے حدیث کا آخری جملہ بطور تنبیہ و تہدید ارشاد فرمایا گیا ہے جیسا کہ کافروں، ظالموں اور خدا کے باغیوں کے بارے میں بطور تہدید قرآن کریم کی یہ آیت ہے کہ:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا۔

"جو چاہے مؤمن ہو جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے، ہم نے تو ظالموں کے لئے دوزخ کی آگ تیار کر رکھی ہے۔"

⑮ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْاَنْصَارِ اَتَى النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْاَلُهٗ فَقَالَ اَمَا فِیْ بَيْتِكَ شَیْءٌ فَقَالَ بَلٰی

حِلْسٌ نَلْبَسُ بَعْضَهُ وَنَبْسُطُ بَعْضَهُ وَقَعْبٌ نَشْرَبُ فِيْهِ مِنَ الْمَآءِ قَالَ ائْتِنِيْ بِهِمَا فَاَتَاهُ بِهِمَا فَاَخَذَهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ وَقَالَ مَنْ يَّشْتَرِيْ هٰذَيْنِ قَالَ رَجُلٌ اَنَا اٰخُذُهُمَا بِدِرْهَمٍ قَالَ مَنْ يَّزِيْدُ عَلٰى دِرْهَمٍ مَّرَّتَيْنِ اَوْثَلَاثًا قَالَ رَجُلٌ اَنَا اٰخُذُهُمَا بِدِرْهَمَيْنِ فَاَعْطَاهُمَا اِيَّاهُ فَاَخَذَ الدِّرْهَمَيْنِ فَاَعْطَاهُمَا الْاَنْصَارِيَّ وَقَالَ اشْتَرِ بِاَحَدِهِمَا طَعَامًا فَانْبِذْهُ اِلٰى اَهْلِكَ وَاشْتَرِ بِالْاٰخَرِ قَدُوْمًا فَأْتِنِيْ بِهٖ فَاَتَاهُ بِهٖ فَشَدَّ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُوْدًا بِيَدِهٖ ثُمَّ قَالَ اذْهَبْ فَاحْتَطِبْ وَبِعْ وَلَا اَرَيَنَّكَ خَمْسَةَ عَشَرَ يَوْمًا فَذَهَبَ الرَّجُلُ يَحْتَطِبُ وَيَبِيْعُ فَجَآءَهُ وَقَدْ اَصَابَ عَشْرَةَ دَرَاهِمَ فَاشْتَرٰى بِبَعْضِهَا ثَوْبًا وَّبِبَعْضِهَا طَعَامًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ تَجِيْءَ الْمَسْأَلَةُ نُكْتَةً فِيْ وَجْهِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَصْلُحُ اِلَّا لِثَلَاثَةٍ لِذِيْ فَقْرٍ مُّدْقِعٍ اَوْلِذِيْ غُرْمٍ مُّفْظِعٍ اَوْلِذِيْ دَمٍ مُّوْجِعٍ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ اِلٰى قَوْلِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن انصار میں سے ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور کسی چیز کا سوال کیا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ کیا تمہارے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے؟ اس نے عرض کیا کہ صرف ایک موٹی سی کملی ہے جس میں سے کچھ حصہ اوڑھتا ہوں اور کچھ حصہ بچھالیتا ہوں، اس کے علاوہ ایک پیالہ بھی ہے جس میں پانی پیتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا ان دونوں چیزوں کو لے آؤ۔ وہ دونوں چیزیں لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آنحضرت ﷺ نے دونوں چیزیں اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ ان چیزوں کو کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے کہا کہ میں ان دونوں چیزوں کو ایک درہم میں خریدنے کے لئے تیار ہوں! آپ ﷺ نے فرمایا "ان چیزوں کو ایک درہم سے زیادہ میں کون خریدنے والا ہے؟ آپ ﷺ نے یہ دو یا تین بار فرمایا، ایک شخص نے کہا کہ میں ان چیزوں کو دو درہم میں خریدتا ہوں! آپ ﷺ نے وہ دونوں چیزیں اس شخص کو دے دیں اور اس سے دو درہم لے کر انصاری کو دیئے اور اس سے فرمایا کہ اس میں سے ایک درہم کا کھانے کا سامان خرید کر اپنے گھر والوں کو دے دو اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آؤ، وہ شخص کلہاڑی خرید کر آپ ﷺ کے پاس لایا۔ آپ ﷺ نے اس کلہاڑی میں اپنے دست مبارک سے ایک مضبوط لکڑی لگادی اور پھر اس سے فرمایا کہ اسے لے کر جاؤ، لکڑیاں کاٹ کر جمع کرو اور انہیں فروخت کرو، اب اس کے بعد میں تمہیں پندرہ دن تک یہاں نہ دیکھوں (یعنی اب یہاں نہ رہو جاکر اپنے کام میں مشغول ہو جاؤ اور محنت کرو) چنانچہ وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں جمع کر کر کے فروخت کرنے لگا (کچھ دنوں کے بعد) جب وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں آیا تو کہاں وہ پہلے آپ ﷺ سے مانگنے آیا تھا درہم اب وہ دس درہم کا مالک تھا، اس نے ان درہموں میں سے کچھ کا کپڑا خریدا اور کچھ کا غلہ خرید لیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی حالت کی اس تبدیلی کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ صورتحال تمہارے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس چیز کہ کل قیامت کے دن تم اس حالت میں آؤ کہ تمہارے سوال تمہارے منہ پر برے نشان یعنی زخم کی صورت میں ہو اور یہ یاد رکھو کہ صرف تین طرح کے لوگوں کو سوال کرنا مناسب ہے ایک تو اس محتاج کے لئے کہ جس کو مفلسی نے زمین پر گرادیا ہو، دوسرے اس قرض دار کے لئے جو بھاری اور عدم ادائیگی کی صورت میں ذلیل کرنے والے قرض کے بوجھ سے دبا ہو اور تیسرے صاحب خون کے لئے جو درد پہنچائے (یعنی اس شخص کے لئے جس پر دیت واجب ہو خواہ اس نے خود کسی کا ناحق خون کیا ہو اور اس کا خون بہا اس کے ذمہ ہو یا کسی دوسرے شخص نے کوئی خون کر دیا ہو اور اس کی دیت اس نے اپنے ذمہ لی ہو مگر اس کی ادائیگی کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے بھی جائز ہے کہ اس خون بہا کے بقدر کسی سے مانگ کر ادائیگی کر دے۔ ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو یوم القیامۃ تک نقل کیا ہے۔"

صرف خدا سے اپنی حاجت بیان کرنی چاہئے

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصَابَتْهُ فَاقَةٌ فَاَنْزَلَهَا بِالنَّاسِ لَمْ تُسَدَّ فَاقَتُهُ وَمَنْ

اَنْزَلَهَا بِاللّٰهِ اَوْشَكَ اللّٰهُ لَهٗ بِالْغِنٰى اِمَّا بِمَوْتٍ عَاجِلٍ اَوْغِنًى اٰجِلٍ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص فاقہ (یعنی سخت حاجت) سے دوچار ہو اور اس کو لوگوں کے سامنے (بطور شکایت) بیان کر کے ان سے حاجت روائی کی خواہش کرے تو اس کی حاجت پوری نہیں کی جائے گی اور جس شخص نے صرف اپنے اللہ سے اپنی حاجت کو بیان کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو جلد فائدہ اور اطمینان عطا فرمائے گا بایں طور کہ اسے جلد ہی یا تو موت سے ہمکنار کر دے گا (تاکہ وہ دنیا کی مشقتوں اور تکلیفوں سے نجات پا کر رحمت خداوندی سے ہمکنار ہو) یا اسے کچھ دنوں میں مالدار بنا دے گا (تاکہ وہ اپنی حاجت پوری کر کے اطمینان محسوس کرے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملے اوغنی اجل میں لفظ اٰجل مصابیح کے اکثر نسخوں اور جامع الاصول میں "عین" سے یعنی عاجل مرقوم ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو جلد فائدہ و اطمینان عطا فرمائے گا بایں طور کہ اسے جلد ہی دولت مند و مالدار بنا دے گا۔ مگر خود سنن ابوداؤد اور ترمذی میں کہ جہاں سے یہ روایت نقل کی گئی ہے یہ لفظ "اٰجل" ہی ہے اور صحیح بھی یہی ہے، چنانچہ ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ حدیث قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی روشنی میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

"جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے نکلنے کی جگہ پیدا فرما دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتا ہے کہ جس کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوتا ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اگر ضرورت ہی ہو تو نیک بختوں سے سوال کرو

⑰ عَنِ ابْنِ الْفِرَاسِيِّ اَنَّ الْفِرَاسِيَّ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْاَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا وَاِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَسَلِ الصَّالِحِيْنَ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن فراسیؒ کہتے ہیں کہ میرے والد مکرم حضرت فراسیؓ نے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا میں لوگوں سے مانگ سکتا ہوں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ ہر حالت میں خدا ہی پر بھروسہ رکھو ہاں اگر کسی شدید ضرورت اور سخت حاجت کی وجہ سے مانگنا ضروری ہے تو پھر نیک بختوں سے مانگو۔" (ابوداؤد، نسائیؒ)

تشریح: ضرورت و حاجت کے وقت نیک بختوں سے مانگنے کے لئے اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ ان کے پاس حلال مال ہوتا وہ بردبار اور مہربان ہوتے ہیں مانگنے والوں کی پردہ دری نہیں کرتے اور ان کے ناموں کو اچھالتے نہیں، یہی وجہ ہے کہ بغداد کے فقراء و مساکین اپنی ضرورت و احتیاج کے وقت حضرت امام احمد ابن حنبلؒ ہی کے دروازے پر جاتے تھے اور ان سے اپنی ضرورت و حاجت بیان کرتے تھے۔

حضرت امام موصوفؒ کے تقویٰ و احتیاط کا کیا عالم تھا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے گھر والوں کو خمیر کی ضرورت ہوئی جسے انہوں نے حضرت امام احمدؒ کے صاحبزادے ہی کے گھر سے منگوا لیا، حضرت امام احمدؒ کے صاحبزادے قاضی کے عہدہ پر فائز تھے اور ان کی سعادت و بھلائی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے گھر کے دروازے ہی کے پاس سوتے تھے تاکہ کوئی محتاج و ضرورت مند واپس نہ ہو جائے، بہر حال امام احمدؒ کے گھر والوں نے اس خمیر سے روٹی پکائی اور جب حضرت امام موصوف کے سامنے کھانا آیا تو

انہیں بذریعہ کشف روٹی کے بارے میں کوئی شبہ گزرا انہوں نے گھر والوں سے پوچھا تو انہوں نے صورت حال بتائی، حضرت امام موصوف نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا ان کی وجہ سے گھر والوں نے بھی نہیں کھایا اور پوچھا کہ یہ کھانا فقراء کو دے دیا جائے، انہوں نے فرمایا کہ دے دو مگر اس شرط کے ساتھ کہ انہیں بھی صورت حال سے مطلع کر دینا، چنانچہ فقراء نے بھی اسے لینے سے انکار کر دیا آخر کار گھر والوں نے پورے گھر کا کھانا امام موصوف کی اجازت کے بغیر ہی دریا میں ڈلوا دیا۔

کام کی اجرت بیت المال سے لینی جائز ہے

(۱۸) وَعَنِ ابْنِ السَّاعِدِيِّ قَالَ اسْتَعْمَلَنِيْ عُمَرُ عَلَى الصَّدَقَةِ فَلَمَّا فَرَغْتُ مِنْهَا وَاَدَّيْتُهَا اِلَيْهِ اَمَرَلِيْ بِعُمَالَةٍ فَقُلْتُ اِنَّمَا عَمِلْتُ لِلّٰهِ وَاَجْرِيْ عَلَى اللّٰهِ قَالَ خُذْمَآ اُعْطِيْتَ فَاِنِّيْ قَدْعَمِلْتُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَمَّلَنِيْ فَقُلْتُ مِثْلَ قَوْلِكَ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَآ اُعْطِيْتَ شَيْئًا مِنْ غَيْرِ اَنْ تَسْأَلَهُ فَكُلْ وَتَصَدَّقْ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن ساعدی کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے مجھے زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر فرمایا چنانچہ جب میں زکوٰۃ کی وصولی سے فارغ ہو گیا اور زکوٰۃ کا مال حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا دیا تو انہوں نے مجھے زکوٰۃ وصول کرنے کی اجرت دیئے جانے کا حکم فرمایا میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے کیا ہے لہٰذا میرے لئے اس کا ثواب بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ذمہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جو چیز تمہیں مل رہی ہے اسے قبول کر لو، کیونکہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ مبارک میں جب میں نے زکوٰۃ وصول کرنے کا کام کیا اور آنحضرت ﷺ نے مجھے اس کی اجرت عطا فرمانی چاہی تو میں نے بھی یہی عرض کیا جواب تم کہہ رہے ہو، چنانچہ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ جب تمہیں کوئی چیز بغیر طلب اور بغیر طمع دی جائے تو تم اسے لے کر کھاؤ اور جو کچھ تمہاری ضرورت و حاجت سے زائد ہو اسے خدا کی راہ میں خیرات کر دو۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنے کسی بھی کام اور کسی بھی خدمت کی اجرت بیت المال سے لینی جائز ہے خواہ وہ خدمت فرض ہی کیوں نہ ہو، جیسے قضاء، احتساب اور درس و تدریس وغیرہ بلکہ امام وقت کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کی بلکہ ان لوگوں کو بھی جو بیت المال کے معاملے میں انہی کے حکم میں شامل ہیں خبر گیری رکھے۔

یہ حدیث اور وہ حدیث جو اسی کے مثل حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں پہلے گزر چکی ہے بظاہر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس کے سوال اور اس کی طمع کے بغیر کوئی چیز دے تو اس کو قبول کرنا واجب ہے، چنانچہ حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے لیکن جمہور علماء اس امر کو استحباب یا اباحت پر محمول کرتے ہیں۔

کن مقامات پر سوال کرنا نامناسب ہے

(۱۹) وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهٗ سَمِعَ يَوْمَ عَرَفَةَ رَجُلًا يَّسْأَلُ النَّاسَ فَقَالَ اَفِيْ هٰذَا الْيَوْمِ وَفِيْ هٰذَا الْمَكَانِ تَسْأَلُ مِنْ غَيْرِ اللّٰهِ فَخَفَقَهٗ بِالدِّرَّةِ (رواہ رزین)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے عرفہ کے دن ایک شخص کو لوگوں سے مانگتے دیکھا تو اس سے فرمایا کہ (بدنصیب) آج کے روز اس جگہ پر تو خدا کے علاوہ دوسروں سے مانگ رہا ہے، پھر انہوں نے اس شخص کو درہ سے مارا۔" (رزینؒ)

تشریح: حضرت علیؓ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ یہ تیری کتنی حرماں نصیبی اور بدبختی ہے کہ آج کے دن کہ جو قبولیت دعا کا دن ہے اور اس جگہ یعنی میدان عرفات میں کہ جو مقدس و بابرکت جگہ ہے تو خدا سے صرف نظر کر کے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھر رہا ہے؟ اس سے

معلوم ہوا کہ مقدس وبابرکت مقامات مثلاً مساجد وغیرہ میں لوگوں سے مانگنا نامناسب بات ہے۔

طمع افلاس اور محتاجگی ہے

(۲۰) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ تَعْلَمُوْنَ اَيُّهَا النَّاسُ اَنَّ الطَّمَعَ فَقْرٌ وَّاَنَّ الْاِيَاسَ غِنًى وَّاَنَّ الْمَرْءَ اِذَا يَئِسَ عَنْ شَيْءٍ اسْتَغْنٰى عَنْهُ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگو! جان لو، طمع محتاجگی ہے اور آدمیوں سے ناامید ہونا تونگری وبے پروائی ہے، انسان جب کسی چیز سے مایوس ہوجاتا ہے تو اس سے بے پرواہ ہوجاتا ہے۔" (رزینؒ)

تشریح: طمع "محتاجگی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ طمع محتاجگی کی ایک صورت ہے یا مطلب یہ ہے کہ طمع محتاجگی کا ذریعہ ہے یعنی طمع کی وجہ سے انسان محتاج بنتا ہے بایں طور کہ اپنی طمع پوری کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے "ناامید ہونا تونگری وبے پروائی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ انسان سے ناامیدی مستغنی اور بے پرواہ بنادیتی ہے حضرت ابوالحسن شاذلیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے کسی نے علم کیمیا جو صرف دو لفظوں میں منحصر ہے طلب کیا تو انہوں نے اس سے فرمایا کہ مخلوق خدا سے صرف نظر کرو یعنی کسی انسان سے امیدیں قائم نہ کرو اور اللہ سے اس چیز کے بارے میں اپنی طمع منقطع کرلو جو تمہاری قسمت میں لکھی ہوئی چیزوں کے علاوہ ہے یعنی خدا نے جو چیزیں تمہارے مقدر میں لکھ دی ہیں، اس کے علاوہ دوسری چیزوں کی امید نہ رکھو۔

"طمع" کے معنی ہیں اس چیز پر نظر رکھنا (یعنی اسے حاصل کرنے کی خواہش کرنا) کہ جس کے حاصل ہونے میں شک ہو یعنی کسی چیز کے بارے میں یہ خیال ہو کہ اس کا مالک دے گا یا نہیں ہاں اگر کسی ایسی چیز کی کسی ایسے شخص سے حصول کی خواہش ہو جس پر اس کا ہویا اس شخص سے کمال تعلق اور محبت ومروت کی بنا پر یقین ہو کہ وہ چیز مل جائے گی تو یہ اسے طمع نہیں کہیں گے۔

سوال نہ کرنے والے کے لئے آنحضرت ﷺ کی بشارت

(۲۱) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّكْفُلُ لِيْ اَنْ لَّا يَسْأَلَ النَّاسَ شَيْئًا فَاَتَكَفَّلُ لَهٗ بِالْجَنَّةِ فَقَالَ ثَوْبَانُ اَنَا فَكَانَ لَا يَسْأَلُ اَحَدًا شَيْئًا (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ثوبانؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص میرے ساتھ اس بات کا عہد کرے کہ وہ لوگوں کے آگے دست سوال دراز نہیں کرے گا تو میں اس کے لئے جنّت کا ضامن ہوں (ثوبان کہتے ہیں کہ) میں نے عہد کیا کہ میں کبھی بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا چنانچہ ثوبانؓ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے (خواہ وہ کتنی ہی تنگیوں میں) کیوں نہ مبتلا رہے ہوں۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میں اس شخص کے لئے اس بات کی ضمانت لوں گا کہ وہ بغیر کسی عذاب کے ابتداء ہی میں جنّت میں داخل کیا جائے گا گویا اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کرنے والا ان شاءاللہ خاتمہ بالخیر کی سعادت سے نوازا جائے گا۔

لیکن اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ اس بارے میں وہ صورت مستثنیٰ ہے جب کہ موت کا خوف ہو کیونکہ انتہائی شدید ضرورت ممنوع چیزوں کو بھی مباح کردیتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ایسی پوزیشن میں ہو کہ اگر کسی سے کچھ نہ مانگے تو جان کے لالے پڑجائیں تو اس کے لئے مانگنا اور اپنی جان کو بچانا ہی ضروری ہوگا۔ بلکہ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سخت بھوک میں مبتلا ہو اور وہ کسی سے کچھ مانگ کر نہ کھائے اور اسی حالت میں وہ مرجائے تو گنہگار مرے گا۔

سوال نہ کرنے کا حکم

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ دَعَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ یَشْتَرِطُ عَلَیَّ اَنْ لَّا تَسْأَلَ النَّاسَ شَیْئًا قُلْتُ نَعَمْ قَالَ وَلَا سَوْطَکَ اِنْ سَقَطَ مِنْکَ حَتّٰی تَنْزِلَ اِلَیْہِ فَتَاْخُذَہٗ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے بلایا اور اس بات کا اقرار کرایا کہ کبھی بھی کسی سے کوئی چیز نہیں مانگو گے چنانچہ میں نے اس بات کا اقرار کیا، پھر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ اگر تمہارا کوڑا بھی گر جائے تو کسی سے نہ مانگو (یعنی کسی سے اٹھانے کے لئے بھی نہ کہو) بلکہ تم خود سواری سے اتر کر اسے اٹھالو۔" (احمدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا آخری ارشاد ترک سوال کے بارے میں بطور مبالغہ ہے کیونکہ اگر کسی کا کوڑا گر جائے اور وہ اسے اٹھانے کے لئے کسی سے کہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلا رہا ہے بلکہ حقیقت میں تو وہ اسی کی چیز ہے جسے وہ صرف اٹھا کر دینے کے لئے کہہ رہا ہے لیکن چونکہ اس میں بھی ایک طرح کا سوال ہوتا ہے اس لئے آپ ﷺ نے بطور مبالغہ اس سے بھی منع فرمایا۔

باب الانفاق و کراھیۃ الامساک

خرچ کرنے کی فضیلت و بخل کی کراہیت کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مال و زر کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا جذبہ

(۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ کَانَ لِیْ مِثْلُ اُحُدٍ ذَھَبًا لَسَرَّنِیْ اَنْ لَّا یَمُرَّ عَلَیَّ ثَلَاثُ لَیَالٍ وَعِنْدِیْ مِنْہُ شَیْءٌ اِلَّا شَیْءٌ اُرْصِدُہٗ لِدَیْنٍ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر میرے پاس احد کے پہاڑ کے برابر بھی سونا ہوتا تو مجھے یہ گوارا نہ ہوتا کہ تین راتیں گذر جاتیں اور وہ تمام سونا یا اس کا کچھ حصہ علاوہ بقدر ادائے قرض کے میرے پاس موجود رہتا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہوتا تو میرے لئے سب سے زیادہ پسندیدہ بات یہ ہوتی کہ میں وہ تمام سونا تین رات کے اندر اندر ہی لوگوں میں تقسیم کر دیتا، اس میں سے اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھتا ہاں اتنا سونا ضرور بچا لیتا جس سے میں اپنا قرض ادا کر سکتا کیونکہ قرض ادا کرنا صدقہ سے مقدم ہے۔

اس ارشاد گرامی سے جہاں آنحضرت ﷺ کی انتہائی سخاوت و فیاضی کا وصف سامنے آتا ہے وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ اپنے مال و زر کی خیرات نکالتے ہیں خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اپنی آسائش و راحت کے ذرائع مہیا کرتے ہیں۔ مثلاً عالی شان بلڈنگیں بناتے ہیں، کوٹھیاں تعمیر کرتے ہیں یا اسی قسم کی دوسری آسائش زندگی کے لئے بے تحاشا مال خرچ کرتے ہیں مگر ان کے اوپر دوسرے لوگوں کے حقوق ہوتے ہیں وہ ان کے حقوق کی ادائیگی تو کیا کرتے ان کی طرف ان کا دھیان بھی کبھی نہیں جاتا تو یہ کوئی اچھی اور پسندیدہ بات نہیں ہے بلکہ شرعی طور پر انتہائی غلط ہے۔

شریعت و اخلاق ہی نہیں بلکہ محض عقل و دانش اور انسانی ہمدردی کے نقطہ نظر سے بھی کیا یہ بات گوارا کی جاسکتی ہے کہ ایک شخص تو حرص و ہوس کا پتلا بن کر اپنی تجوریاں بھرے بیٹھا ہوا بے مصرف مال و زر کے انبار لگائے ہوئے ہو اور سونے چاندی کے خزانے جمع کئے

ہو مگر ایک دوسرا شخص اس کی آنکھوں کے سامنے نان جویں کے لئے بھی محتاج ہو اور اس کی تجوری کا منہ نہ کھلے، ایک غریب بھوک وافلاس کے مارے دم توڑ رہا ہو مگر اس کے اندر اتنی بھی ہمدردی نہ ہو کہ اس غریب کو کھانا کھلا کر اس کی زندگی کے چراغ کو بجھنے سے بچائے؟

جی ہاں! آج کے اس دور میں بھی جب کہ سوشلزم، مساوات اور انسانی بھائی چارگی وہمدردی کے نعرے ہمہ وقت فضا میں گونجتے رہتے ہیں، کون نہیں دیکھتا کہ مال وزر کے بندے اپنی ادنیٰ سی خواہش کے لئے تجوریوں کے منہ کھول دیتے ہیں اپنی دنیاوی آسائش وراحت کی خاطر مال وزر کے تختے بچھا دیتے ہیں مگر جب بھوک وپیاس سے بلکتا کوئی انہیں جیسا ان کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو ان کی جبین پر بل پڑ جاتے ہیں، اور ان کے منہ سے نفرت وحقارت کے الفاظ ابلنے لگتے ہیں۔ وہ شقی القلب یہ نہیں سوچتے کہ اگر معاملہ برعکس ہوتا تو ان کے جذبات واحساسات کیا ہوتے؟ لہٰذا "جنگ زرگری" کے موجودہ دور میں مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری انسانی برادری کے لئے یہ ارشاد گرامی ایک دعوت عمل اور مینارۂ نور ہے۔

سخی کے لئے فرشتوں کی دعا اور بخیل کے لئے بددعا

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ اِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَّيَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا روزانہ صبح کے وقت دو فرشتے اترتے ہیں ان میں سے ایک فرشتہ تو (سخی کے لئے) یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما (یعنی جو شخص جائز جگہ اپنا مال خرچ کرتا ہے اس کو بہت زیادہ بدلہ عطا فرما باایں طور کہ یا تو دنیا میں اسے خرچ کرنے سے کہیں زیادہ مال دے یا آخرت میں اجر وثواب عطا فرما) اور دوسرا فرشتہ (بخیل کے لئے) بددعا کرتا ہے کہ اے اللہ! بخیل کو تلف (نقصان) دے (یعنی جو شخص مال ودولت جمع کرتا ہے اور جائز جگہ خرچ نہیں کرتا بلکہ بے محل اور بے مصرف خرچ کرتا ہے تو اس کا مال تلف وضائع کر دے۔" (بخاری ومسلمؒ)

سخاوت کا حکم

(۳) وَعَنْ اَسْمَاءَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْفِقِيْ وَلَا تُحْصِيْ فَيُحْصِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَلَا تُوْعِيْ فَيُوْعِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ اِرْضَخِيْ مَا اسْتَطَعْتِ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس جگہ مال خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہو وہاں اپنا مال خرچ کرو اور یہ شمار نہ کرو کہ کتنا خرچ کروں اور کیا خرچ کروں نہیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں شمار کرے گا (یعنی اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تو تمہارے مال میں برکت ختم کر کے تمہارا رزق کم کر دے گا بایں طور کہ اسے ایک معدود ومحدود چیز کی مانند کر دے گا یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے مال وزر کے بارے میں قیامت کے روز تم سے محاسبہ کرے گا۔ اور جو مال تمہاری حاجت وضرورت سے زائد ہو اسے حاجت مندوں سے روک کر نہ رکھو نہیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں اپنی زائد (عطاء وبخشش) روک لے گا، نیز یہ کہ تم سے جو کچھ بھی ہو سکے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: لفظ لا تحصی (اور یہ شمار نہ کرو الخ) کے ایک معنی تو وہی ہیں جو اوپر ترجمے میں مذکور ہوئے ہیں اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ "مال کو جمع کرنے کے لئے نہ شمار کرو اور اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ترک نہ کرو"۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی حیثیت وقدرت کے مطابق جو کچھ بھی خرچ کر سکو اسے خدا کی راہ میں ضرور خرچ

کرو خواہ وہ مقدار و تعداد کے اعتبار سے کتنا ہی کم کیوں نہ ہو بلکہ اسے حقیر بھی نہ سمجھو کیونکہ خلوص نیت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کیا جانے والا ایک ذرہ بھی خدا کے نزدیک بہت وقیع اور میزان عمل میں بہت وزنی ہے۔

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنْفِقْ یَا ابْنَ آدَمَ اُنْفِقْ عَلَیْكَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے اولاد آدم میری راہ میں اپنا مال خرچ کر، میں تیرے اوپر خرچ کروں گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اے اولاد آدم! تو دنیا کے فانی مال کو میری راہ میں خرچ کر تاکہ آخرت میں تجھے اموال عالیہ حاصل ہوں۔

بعض حضرات نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جو کچھ میں نے تجھے عطا کیا ہے اس میں سے تو لوگوں کو دے تاکہ میں تجھے دنیا و عقبی میں اس سے زیادہ عطا کروں گویا اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے کہ:

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ــــ "تم جو کچھ بھی خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ کرتے ہو خدا تمہیں اس کا بدلہ عطا کرتا ہے۔"

ضرورت سے زائد مال کو خرچ کرنے کا حکم

⑤ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا ابْنَ اٰدَمَ اَنْ تَبْذُلِ الْفَضْلَ خَیْرٌ لَّكَ وَاَنْ تُمْسِكَهٗ شَرٌّ لَّكَ وَلَا تُلَامُ عَلٰی كَفَافٍ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اے اولاد آدم! جو مال تمہاری حاجت و ضرورت سے زائد ہو اسے خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ کرنا تمہارے لئے دنیا و آخرت میں بہتر ہے اور اسے روکے رکھنا (یعنی خرچ نہ کرنا) اللہ کے نزدیک بھی اور بندوں کے نزدیک بھی تمہارے لئے برا ہے! بقدر کفایت مال پر کوئی ملامت نہیں ہے اور جو مال تمہاری حاجت سے زائد ہو اسے خرچ کرنے کے سلسلے میں اپنے اہل و عیال سے ابتداء کرو۔" (مسلمؒ)

تشریح: وَلَا تُلَامُ عَلٰی كَفَافٍ (بقدر کفایت مال پر کوئی ملامت نہیں ہے) کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اتنا مال اپنے پاس بچائے رکھو جو تمہاری زندگی کی بقاء کے لئے ضروری ہو بایں طور کہ اس کی وجہ سے تمہاری غذائی ضرورت پوری ہو اور تم کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بچے رہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ "بقاء زندگی" کے بقدر مال کا تعین اشخاص و احوال اور زمانہ کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی بعض اشخاص کے لئے "بقاء زندگی کے بقدر" مال کی مقدار کم ہوتی ہے اور بعضوں کے لئے زیادہ، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی واقعی ضروریات زندگی کے لئے کم مال درکار ہوتا ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے زیادہ مقدار ضروری ہوتی ہے، اسی طرح بعض دنوں میں بقاء زندگی کے لئے کم مال درکار ہوتا ہے اور بعض دنوں میں زیادہ مقدار میں ضروری ہوتا ہے، نیز بعض حالات میں تھوڑا مال کفایت کر جاتا ہے۔ اور بعض حالات میں زیادہ مال کی ضرورت ہوتی ہے، حاصل یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی حیثیت کے مطابق کسی واقعی ضرورت و حاجت کے بقدر مال و زر بچائے رکھتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ وابدابمن تعول کا مفہوم یہ ہے کہ سخاوت و خرچ کے معاملے میں اپنے اہل و عیال اور ان لوگوں کو مقدم رکھنا چاہئے جن کا نفقہ اپنے اوپر واجب ہو یعنی ان لوگوں کو دو، جب ان سے بچ رہے تو دوسرے لوگوں کو دینا چاہئے اور اس انداز سے خرچ کرنا کوئی مستحسن بات نہیں ہے کہ اپنے اہل و عیال تو ضرورت مند و محتاج رہیں اور دوسروں کو دیا جائے۔

حدیث کے ظاہری الفاظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد بھی حدیث قدسی (اللہ تعالیٰ کا ارشاد) ہے۔ اگرچہ حدیث میں صراحتاً ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ شاید آنحضرت ﷺ نے اپنے ہی ارشاد کے لئے یہ اسلوب اختیار فرمایا ہو۔ واللہ اعلم

صدقہ دینے والے اور بخیل کی مثال

⑥ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْبَخِیْلِ وَالْمُتَصَدِّقِ كَمَثَلِ الرَّجُلَیْنِ عَلَیْهِمَا جُنَّتَانِ مِنْ حَدِیْدٍ قَدِ اضْطُرَّتْ اَیْدِیْهِمَا اِلٰی ثَدِیِّهِمَا وَتَرَاقِیْهِمَا فَجَعَلَ الْمُتَصَدِّقُ كُلَّمَا تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ انْبَسَطَتْ عَنْهُ وَجَعَلَ الْبَخِیْلُ كُلَّمَا هَمَّ بِصَدَقَةٍ قَلَصَتْ وَاَخَذَتْ كُلُّ حَلْقَةٍ بِمَكَانِهَا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بخیل اور صدقہ دینے والے کی مثال ایسے دو شخصوں کی سی ہے جن کے جسم پر لوہے کی زرہیں ہوں اور ان زرہوں کے تنگ ہونے کی وجہ سے ان دونوں کے ہاتھ ان کی چھاتیوں اور گردن کی (ہنسلی کی) طرف چمٹے ہوئے ہوں چنانچہ جب صدقہ دینے والا صدقہ دینے کا قصد کرتا ہے تو اس کی زرہ کھل جاتی ہے۔ اور جب بخیل صدقہ دینے کا قصد کرتا ہے تو اس کی زرہ کے حلقے اور تنگ ہو جاتے ہیں اور اپنی جگہ پر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ سخی انسان جب خدا کی خوشنودی کے لئے اپنا مال خرچ کرنے کا قصد کرتا ہے تو اس جذبہ صدق کی بنا پر اس کا سینہ کشادہ ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ اس کے قلب واحساسات کے تابع ہوتے ہیں بایں طور کہ وہ مال خرچ کرنے کے لئے دراز ہوتے ہیں اس کے برخلاف ایسے مواقع پر بخیل انسان کا سینہ تنگ ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ سمٹ جاتے ہیں۔

اس مثال کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ جب سخی انسان خیر و بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو توفیق الٰہی اس کے شامل حال ہوتی ہے بایں طور کہ اس کے لئے خیر و بھلائی اور نیکی کا راستہ آسان کر دیا جاتا ہے۔ اور بخیل کے لئے نیکی و بھلائی کا راستہ دشوار گذار ہو جاتا ہے۔

بخل کی مذمت اور اس سے بچنے کی تاکید

⑦ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اتَّقُوا الظُّلْمَ فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَاتَّقُوا الشُّحَّ فَاِنَّ الشُّحَّ اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَمَلَهُمْ عَلٰی اَنْ سَفَكُوْا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ظلم سے بچو کیونکہ قیامت کے روز ظلم اندھیروں کی شکل میں ہوگا (جس میں ظالم بھٹکتا پھرے گا) اور بخل سے بچو کیونکہ بخل نے ان لوگوں کو ہلاک کیا ہے جو تم سے پہلے گذرے ہیں، بخل ہی کے باعث انہوں نے خونریزی کی اور حرام کو حلال جانا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ظلم" کا اصل مفہوم ہے کسی چیز کو اس کی غیر جگہ استعمال کرنا۔ مثلاً انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے خدا کی عبادت و اطاعت کرنا اور نیک راہ پر چلنا اب اگر انسان کا نفس امارہ اسے اس کی تخلیق کے اصل مقصد سے ہٹا کر خدا سے بغاوت و سرکشی اور برائی کے راستے پر چلاتا ہے تو یہ ظلم کہلائے گا۔ لہٰذا ظلم کا مفہوم تمام گناہوں کو شامل ہے یعنی جو بھی گنہگار ہوگا۔ وہ ظالم کہلائے گا۔ "ظلم اندھیروں کی شکل میں ہوگا" کے بارے میں علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے یعنی قیامت کے روز ظلم (گناہ) ظالم (گناہگار) کے سامنے اندھیروں کی صورت میں ہوگا جس میں ظالم بھٹکتا پھرے گا اور ان کی وجہ سے نجات کا راستہ نہیں پائے گا جس طرح کہ مؤمن صالح کے بارے میں منقول ہے کہ وہ قیامت کے روز نجات کی راہ اس طرح پائیں گے کہ ان سب کی سعادت و نیک بختی کا نور ان کے آگے آگے دوڑتا ہوگا جس کی روشنی میں جنت کی ابدی سعادتوں کا راستہ ان کے سامنے ہوگا اور وہ اس پر اطمینان و آسانی سے چل کر اپنے مولا کی خوشنودی اور رحمت کو پالیں گے۔

یا پھر یہ بھی احتمال ہے کہ "اندھیروں" سے قیامت کے دن کی ہولناکیاں اور شدائد مراد ہوں یعنی ایک ظلم قیامت کی بہت سے ہولناکیوں اور سختیوں کا باعث ہوگا۔

"بخل" سے بچنے کے لئے اس لئے فرمایا گیا ہے کہ بخل بھی نہ صرف یہ کہ ظلم ہی کی ایک قسم ہے بلکہ ظلم کی ایک بہت بڑی قسم ہے یہی وجہ ہے کہ "ظلم سے بچنے" کا حکم عمومی طور پر فرمانے کے بعد پھر بھی بعد میں بطور خاص "بخل سے بچنے" کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

"بخل" کو خونریزی اور حرام کو حلال جاننے کا باعث بتایا گیا ہے کیونکہ اپنے مال و زر کو دوسروں کی راحت و بھلائی کے لئے خرچ کرنا اور اس طرح اپنے مسلمان بھائیوں کی خبر گیری در حقیقت آپس کی محبت و ملاپ کا ذریعہ اور سبب ہے اس کے برعکس "بخل" ترک ملاقات اور انقطاع تعلقات کا سبب ہے جس کا آخری نتیجہ آپس کی دشمنی اور مخاصمت ہے۔ اور یہ بالکل ظاہری بات ہے کہ جب ایک دوسرے سے دشمنی اور مخاصمت ہوتی ہے تو پھر خونریزی بھی ہوتی ہے اسی دشمنی اور مخاصمت کا ایک دوسرا پہلو حرام باتوں کو مباح و حلال سمجھ لینا بھی ہوتا ہے کیونکہ کوئی بھی شخص ہو وہ دشمنی کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے دشمن کی عورتوں کو، اس کے مال و زر کو اور اس کی آبرو ریزی وغیرہ کو حلال جانتا ہے اسی لئے جہاں ایک طرف بخل کو خونریزی کا سبب بتایا گیا ہے وہیں دوسری طرف اسے حرام کو حلال سمجھ لینے کا باعث بھی فرمایا گیا ہے۔

ایک ایسا زمانہ آئے گا جب کوئی صدقہ لینے والا نہیں ملے گا

⑧ وَعَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقُوْا فَاِنَّهٗ يَأْتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ يَمْشِي الرَّجُلُ بِصَدَقَتِهٖ فَلَا يَجِدُ مَنْ يَقْبَلُهَا يَقُوْلُ الرَّجُلُ لَوْ جِئْتَ بِهَا بِالْاَمْسِ لَقَبِلْتُهَا فَاَمَّا الْيَوْمَ فَلَا حَاجَةَ لِيْ بِهَا (متفق علیہ)

"اور حضرت حارثہ ابن وہبؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ خدا کی خوشنودی کے لئے اپنا مال خرچ کرو، کیونکہ انسانی زندگی میں ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب ایک شخص صدقہ کا مال لے کر نکلے گا مگر وہ کسی ایسے شخص کو نہ پائے گا جو اس کا صدقہ قبول کر لے بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ اگر تم صدقہ کے اس مال کو کل لے کر آتے تو میں قبول کر لیتا، آج تو مجھے اس کی حاجت و ضرورت نہیں ہے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "خدا کی خوشنودی کے لئے اپنا مال خرچ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تو خدا کی راہ میں اپنا مال و زر خرچ کرنے کو غنیمت اور اپنے حق میں باعث سعادت جانو کیونکہ ابھی تو صدقہ کے مال کو قبول کرنے والے بہت مل جاتے ہیں لیکن ایک ایسا وقت آنے والا ہے کہ صدقہ کے مال کو قبول کرنے والا کوئی شخص ڈھونڈھے سے نہیں ملے گا کیونکہ یا تو اس وقت سب ہی لوگ مال دار ہوں گے یا پھر یہ کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طرف میلان و رغبت کی وجہ سے ان کے دل غنی و بے پرواہ ہوں گے۔ علماء لکھتے ہیں کہ یہ اس زمانے کی طرف اشارہ ہے جب کہ یہ فانی دنیا اپنی عمر کی آخری حدوں کو پہنچ چکی ہوگی اور حضرت امام مہدیؓ اس عالم میں تشریف فرما ہوں گے۔

افضل صدقہ

⑨ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الصَّدَقَةِ اَعْظَمُ اَجْرًا قَالَ اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِيْحٌ شَحِيْحٌ تَخْشَى الْفَقْرَ وَتَأْمُلُ الْغِنٰى وَلَا تُمْهِلْ حَتّٰى اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ قُلْتَ لِفُلَانٍ كَذَا وَلِفُلَانٍ كَذَا وَقَدْ كَانَ لِفُلَانٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ثواب کے اعتبار سے کونسا بڑا صدقہ اور افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا (افضل صدقہ وہ ہے کہ) تم خدا کی راہ میں اس وقت اپنا مال خرچ کرو جب کہ تم تندرست و توانا ہو اور مال جمع کرنے کی حرص رکھتے ہو، فقر و افلاس سے ڈرتے رہو، اور حصول دولت کے امیدوار رہو یاد رکھو صدقہ خیرات کے معاملے میں ڈھیل نہ دو، یہاں تک کہ جب تمہاری جان حلق میں آجائے تو کہنے لگو کہ اتنا مال فلاں کے لئے ہے اور اتنا مال فلاں کے لئے ہے۔ درآنحالیکہ اس مال کا مالک فلاں (وارث) ہو جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ افضل اور بہت زیادہ ثواب کا باعث وہ صدقہ ہوتا ہے جو زندگی کے اس دور میں ادا ہو جب کہ صحت و تندرستی رفیق جان ہو۔ کیونکہ زندگی کے اس حصہ میں درازی عمر کی امید مال جمع کرنے کی حرص کا باعث ہوتی ہے صحت مند و تندرست انسان نہ صرف یہ کہ "جنگ زرگری" کے میدان میں آگے رہنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اس کی جبلت طبعی، بخل کی طرف مائل ہوتی ہے، اندر کا چھپا ہوا شیطان اسے فقر و محتاجگی سے ڈراتا رہتا ہے اور اس کے دل میں یہ وسوسہ و خیال پیدا کراتا ہے کہ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کی وجہ سے کہیں مفلس قلاش نہ بن جاؤں نیز زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی آرزو بسا اوقات حرص و ہوس کا روپ اختیار کر لیتی ہے لہٰذا زندگی کے اس حصے میں خدا کی خوشنودی کے لئے مال خرچ کرنا درحقیقت نیک بختی و سعادت کی معراج ہے۔

حدیث کے آخری جملے ولا تمهل الخ کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ دینے اور خیرات کرنے میں اتنی تاخیر، سستی اور غفلت نہ کرو کہ جب زندگی کا پیمانہ لبریز ہونے لگے جان نکل کر حلق میں آجائے تو کہنے لگو کہ اتنا مال فلاں شخص کے لئے ہے اور اتنا مال فلاں نیک کام کے لئے ہے حالانکہ اس وقت وہ مال وارثوں کا ہو جاتا ہے بایں طور کہ وارثوں کا حق متعلق ہو جاتا ہے۔

بہرحال اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ صحت و تندرستی کی حالت میں اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنا بڑی فضیلت اور ثواب کی بات ہے۔ مگر جب مرنے کا وقت آئے تو اس وقت اپنے مال کو نیک کاموں میں خرچ کرنے کی وصیت کرنا یا اسے اس وقت خدا کی راہ میں خرچ کرنا زیادہ ثواب کا باعث نہیں ہے۔

خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنے والے سرمایہ دار ٹوٹے میں ہیں

⑩ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ انْتَهَیْتُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ جَالِسٌ فِیْ ظِلِّ الْكَعْبَةِ فَلَمَّا رَاٰنِیْ قَالَ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ فَقُلْتُ فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ مَنْ هُمْ قَالَ هُمُ الْاَكْثَرُوْنَ اَمْوَالًا اِلَّا مَنْ قَالَ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ وَعَنْ یَمِیْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس وقت پہنچا جب کہ آپ ﷺ کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ جب آپ ﷺ کی نظر مبارک مجھ پر پڑی تو فرمایا۔ رب کعبہ کی قسم وہ لوگ بہت ٹوٹے میں ہیں، میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ (ﷺ) پر قربان ہوں کون ہیں وہ لوگ؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ وہ لوگ جو زیادہ مال جمع کرتے ہیں، ہاں! (وہ لوگ مستثنیٰ ہیں) جو اپنے ادھر ادھر اور اس طرف یعنی اپنے آگے اپنے پیچھے، اپنے دائیں، اپنے بائیں (غرض یہ کہ ہر طرح اور ہر جگہ خدا کی خوشنودی کی خاطر) اپنا مال خرچ کرتے ہیں مگر ایسے لوگ کم ہی ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابوذر غفاریؓ نے چونکہ فقر و افلاس کو اپنی زندگی کا امتیاز بنا لیا تھا اور اس طرح انہوں نے دنیا اور دنیا کی آسائشوں سے منہ موڑ کر غنا و تونگری پر فقر و افلاس کو ترجیح دے رکھی تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کی تسلی اور ان کے اطمینان قلب کی خاطر یہ حدیث ارشاد فرمائی۔ گویا اس ارشاد گرامی میں دنیا سے بے رغبتی اور فقر کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

عابد بخیل پر جاہل سخی کی فضیلت

⑪ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ السَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّاسِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰهِ بَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ وَلَجَاهِلٌ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ سخی اللہ کی رحمت کے نزدیک ہے، بہشت کے قریب ہے، لوگوں کے قریب ہے (یعنی سب ہی اسے عزیز ودوست رکھتے ہیں) اور آگ سے دور ہے، مگر بخیل جو کہ اپنے اوپر واجب حقوق کی بھی ادائیگی نہ کرے اللہ کی رحمت سے دور ہے، بہشت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے اور آگ سے نزدیک ہے، بلاشک اللہ کے نزدیک عابد بخیل سے جاہل سخی بہت پیارا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جاہل سخی سے عابد کی ضد یعنی وہ سخی مراد ہے جو فرائض تو ادا کرتا ہو مگر نوافل کا پابند نہ ہو اسی طرح عابد بخیل سے مراد وہ بخیل ہے جو نوافل بہت زیادہ ادا کرتا ہو خواہ وہ عالم ہو یا عالم نہ ہو۔

بحالت تندرستی صدقہ دینے کی فضیلت

⑫ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاَنْ یَّتَصَدَّقَ الْمَرْءُ فِیْ حَیَاتِہٖ بِدِرْھَمٍ خَیْرٌلَّہٗ مِنْ اَنْ یَّتَصَدَّقَ بِمِائَۃٍ عِنْدَ مَوْتِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کسی شخص کا اپنی تندرستی کی حالت میں ایک درہم خدا کی راہ میں خرچ کرنا اپنے مرنے کے وقت راہ خدا میں ایک سو درہم خرچ کرنے سے بہتر ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ صحت وتندرستی کی حالت میں اپنا مال کم تعداد اور کم مقدار میں بھی خدا کی راہ میں خرچ کرنا مرتے وقت بہت زیادہ مال خرچ کرنے سے بہتر ہے اور اسکے مقابلے میں بہت زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

موت کے وقت خیرات کرنے والے کی مثال

⑬ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الَّذِیْ یَتَصَدَّقُ عِنْدَ مَوْتِہٖ اَوْیُعْتِقُ کَالَّذِیْ یُھْدِیْ اِذَا شَبِعَ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَالتِّرْمِذِیُّ وَصَحَّحَہٗ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اس شخص کی مثال جو اپنی موت کے وقت خیرات کرتا ہے یا (غلام) آزاد کرتا ہے اس شخص کی مانند ہے جو کسی کو ایسے وقت تحفہ (یعنی کھانا) بھیجتا ہے جب کہ اس کا پیٹ بھر چکا ہوتا ہے۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ، دارمیؒ اور امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مفہوم بھی یہی ہے کہ مرتے وقت خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا یا غلام کو آزاد کرنا کم ثواب کا باعث ہوتا ہے جس طرح کہ کسی ضرورت مند کو ایسے وقت کھانا دینا کم ثواب کا باعث ہوتا ہے جب کہ اس کا پیٹ بھر چکا ہو، لہٰذا جس طرح کسی شخص کو اس کی بھوک کی حالت میں کھانا کھلانا یا اس کے ساتھ سخاوت کرنا زیادہ افضل اور زیادہ ثواب کا باعث ہے اسی طرح صحت وتندرستی کی حالت میں اپنا مال خدا کی خوشنودی میں خرچ کرنا یا غلام کو آزاد کرنا زیادہ افضل اور زیادہ ثواب کی بات ہے۔

ایمان اور بخل دو متضاد صفتیں ہیں

⑭ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ اَلْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مؤمن میں دو خصلتیں جمع نہیں ہوتیں ایک تو بخل دوسری بد خلقی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ مناسب اور لائق نہیں ہے کہ مؤمن کامل میں یہ دونوں بری خصلتیں جمع ہوں یا مراد یہ ہے کہ کسی

مؤمن کامل میں یہ دونوں بری خصلتیں اس درجے کی نہیں ہوتیں کہ وہ کبھی اس سے جدا ہی نہ ہوں اور وہ ان کی موجودگی سے مطمئن اور راضی ہو ہاں اگر کبھی بمقتضائے طبیعت بشری کوئی مؤمن کامل بد خلقی کرے یا اس میں بخل پیدا ہو جائے پھر بعد میں اسے ندامت و شرمندگی ہو اور ان کی وجہ سے وہ پشیمان ہو نیز اپنے نفس کو ملامت کرے تو یہ کمال ایمان کے منافی نہیں ہوگا۔

"خلق" ان امور پر عمل کرنے کا نام ہے جن کی شریعت نے تعلیم دی ہے۔ "خلق یا اخلاق" دوسروں سے جھک کر خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنے یا تمام معاملات میں نرمی برتنے ہی کا نام نہیں ہے جیسا کہ عام لوگوں میں مشہور ہے اس لئے کہ بعض امور میں شدت اور سختی اختیار کرنا ہی تقاضائے ایمان ہے۔ لہٰذا یہاں حدیث میں مذکور "بد خلقی" سے مراد یہ ہے کہ ان امور کی خلاف ورزی کرنا جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔

بخل کے لئے وعید

⑮ وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ خَبٌّ وَلَا بَخِیْلٌ وَلَا مَنَّانٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیقؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ جنت میں نہ تو مکار داخل ہوگا نہ بخیل نہ خدا کی راہ میں کسی کو مال دے کر احسان جتانے والا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں جنت میں ابتداء بغیر عذاب کے داخل نہیں ہوں گے۔ بلکہ یہ اپنے اپنے جرم کی سزا پالیں گے تو عذاب کے بعد جنت میں داخل ہوں گے۔

"بخیل" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے مال میں سے حق واجب ادا نہ کرے۔ "منان" کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ترجمے میں مذکور ہوئے ہیں اس کے دوسرے معنی "کاٹنے والا" ہیں یعنی وہ شخص جو اپنے اعزا اور رشتہ داروں سے ترک تعلقات کرے اور مسلمانوں سے محبت و مروت کا معاملہ نہ کرے۔

بدترین خصلتیں کیا ہیں؟

⑯ وَعَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَرُّ مَا فِی الرَّجُلِ شُحٌّ ہَالِعٌ وَجُبْنٌ خَالِعٌ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ انسان میں جو خصلتیں ہوتی ہیں ان میں سے دو خصلتیں سب سے بدترین ہیں۔ ایک تو انتہائی درجہ کا بخل اور دوسری انتہائی درجہ کی نامردی۔" (ابوداؤدؒ)

وسنذکر حدیث ابی ہریرۃ لا یجتمع الشح والایمان فِیْ کتاب الجہاد ان شاء اللّٰہ تعالیٰ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت

⑰ وَعَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ بَعْضَ اَزْوَاجِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُلْنَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّنَا اَسْرَعُ بِکَ لُحُوْقًا قَالَ اَطْوَلُکُنَّ یَدًا فَاَخَذُوْا قَصَبَۃً یَذْرَعُوْنَہَا وَکَانَتْ سَوْدَۃُ اَطْوَلَہُنَّ یَدًا فَعَلِمْنَا بَعْدُ اِنَّمَا کَانَ طُوْلُ یَدِہَا الصَّدَقَۃَ وَکَانَتْ اَسْرَعَنَا لُحُوْقًا بِہٖ زَیْنَبُ وَکَانَتْ تُحِبُّ الصَّدَقَۃَ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃِ مُسْلِمٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَسْرَعُکُنَّ لُحُوْقًا بِیْ اَطْوَلُکُنَّ یَدًا قَالَتْ وَکَانَتْ یَتَطَاوَلْنَ اَیَّتُہُنَّ اَطْوَلُ یَدًا قَالَتْ فَکَانَتْ

اَطْوَلُنَایَدًا زَیْنَبَ لِاَنَّھَا کَانَتْ تَعْمَلُ بِیَدِھَا وَ تَتَصَدَّقُ۔

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے بعض نے آپ ﷺ سے کہا کہ ہم میں کون سی بیوی آپ ﷺ سے جلد ملاقات کرے گی؟ (یعنی آپ ﷺ کے وصال کے بعد ہم میں سب سے پہلے کس بیوی کا انتقال ہوگا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہوں گے۔ (حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سن کر) آپ ﷺ کی ازواج مطہرات نے بانس یا سرکنڈے کا ایک ٹکڑا لے کر اپنے ہاتھ ناپنے شروع کئے (ان سب میں) حضرت سودہؓ کے ہاتھ (جو آپ ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ تھیں) سب سے لمبے تھے مگر پھر بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ہاتھ کی لمبائی سے مراد "صدقہ" تھا اور ہم میں سے جس نے سب سے پہلے آپ ﷺ سے ملاقات کی (یعنی آپ ﷺ کے بعد سب سے پہلے جس کا انتقال ہوا وہ حضرت زینبؓ تھیں اور وہ صدقہ وخیرات کرنے کو بہت پسند کرتی تھیں۔ (بخاریؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے (ازواج مطہرات کے سوال کے جواب میں) فرمایا کہ تم میں سے مجھ سے جلد ملنے والی وہ ہوگی جس کے ہاتھ لمبے ہوں گے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات آپس میں اپنے ہاتھوں کی لمبائی ناپتی تھیں کہ ان میں سے کون سی لمبے ہاتھوں والی ہے، چنانچہ ہم میں سب سے لمبے ہاتھ والی حضرت زینبؓ تھیں کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے سب کام کرتی تھیں اور صدقہ وخیرات کیا کرتی تھیں۔"

تشریح: فعلمنابعد (مگر پھر بعد میں ہمیں معلوم ہوا الخ) کا مطلب یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تو ہم نے پہلے تو "ہاتھ کی لمبائی" کو اس کے ظاہری معنی ہی پر محمول کیا کہ واقعۃً جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہوں گے وہی آپ ﷺ سے جلد ملاقات کرے گی لیکن آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کی ازواج مطہرات میں سب سے پہلے جب حضرت زینبؓ کا انتقال ہوا تو معلوم ہوا کہ "ہاتھ کی لمبائی" سے مراد صدقہ وخیرات کی کثرت تھی گویا آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم میں سب سے لمبے ہاتھ والی وہ ہے جو سب سے زیادہ صدقہ وخیرات کرتی ہے۔

حضرت زینبؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے چمڑے کی دباغت کا کام انجام دیتی تھیں پھر اس کو فروخت کرتی اور جو قیمت ملتی اسے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لئے اس کی راہ میں خرچ کر دیا کرتی تھیں۔

بنی اسرائیل کا ایک واقعہ

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لَاَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَۃٍ فَخَرَجَ بِصَدَقَتِہٖ فَوَضَعَھَا فِیْ یَدِ سَارِقٍ فَاَصْبَحُوْا یَتَحَدَّثُوْنَ تُصُدِّقَ اللَّیْلَۃَ عَلٰی سَارِقٍ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰی سَارِقٍ لَاَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَۃٍ فَخَرَجَ بِصَدَقَتِہٖ فَوَضَعَھَا فِیْ یَدِ زَانِیَۃٍ فَاَصْبَحُوْا یَتَحَدَّثُوْنَ تُصُدِّقَ اللَّیْلَۃَ عَلٰی زَانِیَۃٍ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰی زَانِیَۃٍ لَاَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَۃٍ فَخَرَجَ بِصَدَقَتِہٖ فَوَضَعَھَا فِیْ یَدِ غَنِیٍّ فَاَصْبَحُوْا یَتَحَدَّثُوْنَ تُصُدِّقَ اللَّیْلَۃَ عَلٰی غَنِیٍّ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰی سَارِقٍ وَزَانِیَۃٍ وَغَنِیٍّ فَاُتِیَ فَقِیْلَ لَہٗ اَمَّا صَدَقَتُکَ عَلٰی سَارِقٍ فَلَعَلَّہٗ اَنْ یَسْتَعِفَّ عَنْ سَرِقَتِہٖ وَاَمَّا الزَّانِیَۃُ فَلَعَلَّھَا اَنْ تَسْتَعِفَّ عَنْ زِنَاھَا وَاَمَّا الْغَنِیُّ فَلَعَلَّہٗ یَعْتَبِرُ فَیُنْفِقُ مِمَّا اَعْطَاہُ اللّٰہُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَلَفْظُہٗ لِلْبُخَارِیِّ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (ایک مرتبہ بنی اسرائیل میں سے) ایک شخص نے اپنے دل میں یا کسی اپنے دوست سے کہا کہ میں آج رات میں خدا کی راہ میں کچھ مال خرچ کروں گا چنانچہ اس نے اپنے قصد وارادہ کے مطابق خیرات کے لئے کچھ مال نکالا۔ تاکہ اسے کسی مستحق کو دے دے اور وہ مال اس نے ایک چور کے ہاتھ میں دے دیا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ چور ہے کہ جس کی وجہ سے خیرات کے مال کا مستحق نہیں ہے۔ جب صبح ہوئی اور لوگوں کو الہام خداوندی کے سبب یا خود اس چور کی زبانی معلوم ہوا تو بطریق تعجب لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ آج کی رات ایک چور کو صدقہ کا مال دیا گیا ہے۔ جب صدقہ دینے والے کو بھی صورتحال معلوم

ہوئی تو وہ کہنے لگا کہ اے اللہ! تیرے ہی لئے تعریف ہے۔ باوجویکہ صدقہ کا مال ایک چور کے ہاتھ لگا اور پھر کہنے لگا کہ آج کی رات پھر صدقہ دوں گا تاکہ وہ مستحق کو مل جائے چنانچہ اس نے صدقہ کی نیت سے پھر کچھ مال نکالا اور اس مرتبہ بھی غلط فہمی میں وہ مال ایک زانیہ کے ہاتھ میں دے دیا، جب صبح ہوئی تو پھر لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ آج تو ایک زانیہ صدقہ کا مال لے اڑی وہ شخص کہنے لگا کہ اے اللہ! تیرے ہی لئے تعریف ہے اگرچہ اس مرتبہ صدقہ کا مال ایک زانیہ کے ہاتھ لگ گیا اور پھر کہنے لگا کہ آج کی رات پھر صدقہ دوں گا، چنانچہ اس نے پھر کچھ مال صدقہ کی نیت سے نکالا اور اس مرتبہ پھر غلط فہمی میں وہ مال ایک غنی کے ہاتھ میں دے دیا، جب صبح ہوئی تو پھر لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ آج کی رات تو ایک دولت مند ہی کو صدقہ کا مال مل گیا۔ وہ شخص کہنے لگا اے اللہ! تیرے ہی لئے تعریف ہے اگرچہ صدقہ کا مال چور، زانیہ اور دولت مند کو مل گیا۔ جب وہ شخص سویا تو خواب میں اس سے کہا گیا کہ تو نے جتنے صدقے دیئے ہیں سب قبول ہوگئے۔ کیونکہ صدقہ کا جو مال تو نے چور کو دیا ہے۔ وہ بے فائدہ اور خالی از ثواب نہیں ہے ممکن ہے وہ اس کی وجہ سے چوری سے باز رہے، اور صدقہ کا جو مال تو نے زانیہ کو دیا ہے ممکن ہے وہ اس کی وجہ سے زنا سے باز رہے اور صدقے کا جو مال تو نے دولت مند کو دیا ہے ممکن ہے وہ اس کی وجہ سے عبرت حاصل کرلے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو کچھ دیا ہے۔ اس میں سے خرچ کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ الفاظ بخاری کے ہیں)

تشریح: صدقہ دینے والے نے خدا کی تعریف یا بطریق شکر کی کہ خدا کا شکر ہے کہ میں نے صدقہ تو دیا اگرچہ وہ غیر مستحق ہی کے ہاتھ لگا یا پھر بطریق تعجب یا اپنے دل کے اطمینان کے لئے اس نے خدا کی تعریف کی۔

بہر کیف آنحضرت ﷺ نے بنی اسرائیل کے اس شخص کا یہ واقعہ اس لئے بیان فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ خدا کی خوشنودی کی خاطر صدقہ وخیرات بہر نوع بہتر اور باعث ثواب ہے جس کسی کو بھی صدقہ دیا جائے گا ثواب ضرور پائے گا۔

خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی برکت

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَا رَجُلٌ بِفَلَاةٍ مِنَ الْاَرْضِ فَسَمِعَ صَوْتًا فِيْ سَحَابَةٍ اَسْقِ حَدِيْقَةَ فُلَانٍ فَتَنَحّٰى ذٰلِكَ السَّحَابُ فَاَفْرَغَ مَاءَهُ فِيْ حَرَّةٍ فَاِذَا شَرْجَةٌ مِنْ تِلْكَ الشِّرَاجِ قَدِ اسْتَوْعَبَتْ ذٰلِكَ الْمَاءَ كُلَّهُ فَتَتَبَّعَ الْمَاءَ فَاِذَا رَجُلٌ صَائِمٌ فِيْ حَدِيْقَتِهِ يُحَوِّلُ الْمَاءَ بِمِسْحَاتِهِ فَقَالَ لَهُ يَا عَبْدَ اللّٰهِ مَا اسْمُكَ قَالَ فُلَانٌ اَلْاِسْمُ الَّذِيْ سَمِعَ فِي السَّحَابَةِ فَقَالَ لَهُ يَا عَبْدَ اللّٰهِ لِمَ تَسْاَلُنِيْ عَنِ اسْمِيْ فَقَالَ اِنِّيْ سَمِعْتُ صَوْتًا فِي السَّحَابِ الَّذِيْ هٰذَا مَاءُهُ وَيَقُوْلُ اَسْقِ حَدِيْقَةَ فُلَانٍ لِاسْمِكَ فَمَا تَصْنَعُ فِيْهَا قَالَ اَمَّا اِذْ قُلْتَ هٰذَا فَاِنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى مَا يَخْرُجُ مِنْهَا فَاَتَصَدَّقُ بِثُلُثِهٖ وَاٰكُلُ اَنَا وَعِيَالِيْ ثُلُثًا وَاَرُدُّ فِيْهَا ثُلُثَهُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایک شخص زمین کے ایک حصے جنگل میں کھڑا تھا کہ اس نے ابر میں سے ایک آواز سنی کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ فلاں شخص کے باغ کو سیراب کر پھر وہ ابر ایک طرف چلا اور ایک جگہ پتھریلی زمین پر پانی برسانے لگا۔ اور وہ تمام پانی ان نالیوں میں سے کہ جو اس زمین میں تھیں ایک نالی میں جمع ہونے لگا پھر وہ پانی اس نالی کے ذریعے ایک طرف بہنے لگا تو وہ شخص بھی اس پانی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تاکہ یہ دیکھے کہ جس شخص کے باغ میں یہ پانی جا رہا ہے وہ کون ہے؟ ناگہاں اس شخص نے ایک آدمی کو دیکھا جو اپنے کھیت میں کھڑا بیلچہ کے ذریعے اس پانی کو باغ کے درختوں میں پھیلا رہا تھا اس شخص نے باغ والے سے پوچھا کہ اے خدا کے بندے تمہارا کیا نام ہے؟ اس نے کہا کہ میرا فلاں نام ہے اور اس نے وہی نام بتایا جو اس ابر میں سے سنا تھا۔ پھر باغ والے نے اس شخص سے پوچھا کہ بندۂ خدا! تم میرا نام کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس شخص نے کہا کہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ جس ابر کا یہ پانی ہے اس ابر میں میں نے ایک آواز سنی کہ کوئی کہنے والا اس ابر سے کہہ رہا تھا کہ فلاں شخص کے باغ کو سیراب کر اور وہ نام

تمہارا ہی تھا اور اب مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس باغ میں کیا (بھلائی) کرتے ہو جس کی وجہ سے تم اس فضیلت اور بزرگی سے نوازے گئے ہو باغ والے نے کہا کہ چونکہ اس وقت تم پوچھ رہے ہو اس لئے میں بھی تم سے بتائے دیتا ہوں کہ اس باغ کی جو کچھ پیداوار ہوتی ہے (پہلے) میں اسے دیکھتا ہوں پھر اس میں سے ایک تہائی تو خدا کی راہ میں خرچ کر دیتا ہوں، ایک تہائی میں اور میرے اہل و عیال کھاتے ہیں اور ایک تہائی اسی باغ میں لگا دیتا ہوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگرچہ ابر کی آواز نے باغ والے کا نام صراحۃً لیا تھا جیسا کہ بعد میں ذکر بھی کیا گیا مگر آپ ﷺ نے یہ قصہ سناتے ہوئے ابتداء میں اس کا صراحۃً نام نہیں لیا بلکہ لفظ "فلاں" سے اس کے نام کو کنایۃً ذکر کیا۔

اسی طرح ابر کی آواز سننے والے شخص نے بھی ابر میں باغ والے کا نام صراحۃً سنا تھا مگر پھر اس نے باغ والے سے اس کا نام اس لئے پوچھا تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ واقعی یہ وہی شخص ہے جس کا نام ابر کی آواز نے لیا تھا، نیز جب باغ والے نے اس سے اپنا نام دریافت کرنے کا سبب پوچھا تو اس ابر کی آواز کی نقل کرتے ہوئے بھی اس کا نام نہیں لیا بلکہ لفظ "فلاں" کہا گویا اس نے ظاہر کیا کہ اگرچہ ابر کی آواز نے تمہارا نام صراحۃً لیا تھا مگر میں اس وقت تمہارے متعین نام کی بجائے لفظ "فلاں" ذکر کر رہا ہوں حاصل یہ کہ ہاتف غیبی نے باغ والے کا نام صراحۃً ذکر کیا تھا مگر سامع نے اس کے نام کو لفظ "فلاں" سے کنایۃً تعبیر کیا اور اسے بتا دیا کہ تمہارا نام میں نے سنا تھا۔ مگر اب اس کو لفظ "فلاں" سے تعبیر کیا ہے۔

ادائیگی شکر کا اجر اور ناشکری کی سزا

(۲۰) وَعَنْهُ اَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ ثَلَاثَةً مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اَبْرَصَ وَاَقْرَعَ وَاَعْمٰى فَاَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَبْتَلِيَهُمْ فَبَعَثَ اِلَيْهِمْ مَلَكًا فَاَتَى الْاَبْرَصَ فَقَالَ اَيُّ شَيْءٍ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ لَوْنٌ حَسَنٌ وَجِلْدٌ حَسَنٌ وَيَذْهَبُ عَنِّي الَّذِيْ قَدْ قَذِرَنِي النَّاسُ قَالَ فَمَسَحَهُ فَذَهَبَ عَنْهُ قَذَرُهُ وَاُعْطِيَ لَوْنًا حَسَنًا وَجِلْدًا حَسَنًا قَالَ فَاَيُّ الْمَالِ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ الْاِبِلُ اَوْقَالَ الْبَقَرُ شَكَّ اِسْحَاقُ اِلَّا اَنَّ الْاَبْرَصَ اَوِالْاَقْرَعَ قَالَ اَحَدُهُمَا الْاِبِلُ وَقَالَ الْاٰخَرُ الْبَقَرُ قَالَ فَاُعْطِيَ نَاقَةً عُشَرَاءَ فَقَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْهَا قَالَ فَاَتَى الْاَقْرَعَ فَقَالَ اَيُّ شَيْءٍ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ شَعْرٌ حَسَنٌ وَيَذْهَبُ عَنِّيْ هٰذَا الَّذِيْ قَدْ قَذِرَنِي النَّاسُ قَالَ فَمَسَحَهُ فَذَهَبَ عَنْهُ قَالَ وَاُعْطِيَ شَعْرًا حَسَنًا قَالَ فَاَيُّ الْمَالِ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ الْبَقَرُ فَاُعْطِيَ بَقَرَةً حَامِلًا قَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْهَا قَالَ فَاَتَى الْاَعْمٰى فَقَالَ اَيُّ شَيْءٍ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ اَنْ يَرُدَّ اللّٰهُ اِلَيَّ بَصَرِيْ فَاُبْصِرَ بِهِ النَّاسَ قَالَ فَمَسَحَهُ فَرَدَّ اللّٰهُ اِلَيْهِ بَصَرَهُ قَالَ فَاَيُّ الْمَالِ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ الْغَنَمُ فَاُعْطِيَ شَاةً وَالِدًا فَاُنْتِجَ هٰذَانِ وَوَلَّدَ هٰذَا فَكَانَ لِهٰذَا وَادٍ مِنَ الْاِبِلِ وَلِهٰذَا وَادٍ مِنَ الْبَقَرِ وَلِهٰذَا وَادٍ مِنَ الْغَنَمِ قَالَ ثُمَّ اِنَّهُ اَتَى الْاَبْرَصَ فِيْ صُوْرَتِهِ وَهَيْئَتِهِ فَقَالَ رَجُلٌ مِسْكِيْنٌ قَدِ انْقَطَعَتْ بِيَ الْحِبَالُ فِيْ سَفَرِيْ فَلَا بَلَاغَ لِيَ الْيَوْمَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ بِكَ اَسْاَلُكَ بِالَّذِيْ اَعْطَاكَ اللَّوْنَ الْحَسَنَ وَالْجِلْدَ الْحَسَنَ وَالْمَالَ بَعِيْرًا اَتَبَلَّغُ بِهِ فِيْ سَفَرِيْ فَقَالَ الْحُقُوْقُ كَثِيْرَةٌ فَقَالَ اِنَّهُ كَاَنِّيْ اَعْرِفُكَ اَلَمْ تَكُنْ اَبْرَصَ يَقْذَرُكَ النَّاسُ فَقِيْرًا فَاَعْطَاكَ اللّٰهُ مَالًا فَقَالَ اِنَّمَا وَرِثْتُ هٰذَا الْمَالَ كَابِرًا عَنْ كَابِرٍ فَقَالَ اِنْ كُنْتَ كَاذِبًا فَصَيَّرَكَ اللّٰهُ اِلٰى مَا كُنْتَ قَالَ وَاَتَى الْاَقْرَعَ فِيْ صُوْرَتِهِ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ مَا قَالَ لِهٰذَا وَرَدَّ عَلَيْهِ مِثْلَ مَا رَدَّ عَلٰى هٰذَا فَقَالَ اِنْ كُنْتَ كَاذِبًا فَصَيَّرَكَ اللّٰهُ اِلٰى مَا كُنْتَ قَالَ وَاَتَى الْاَعْمٰى فِيْ صُوْرَتِهِ وَهَيْئَتِهِ فَقَالَ رَجُلٌ مِسْكِيْنٌ وَابْنُ سَبِيْلٍ انْقَطَعَتْ بِيَ الْحِبَالُ فِيْ سَفَرِيْ فَلَا بَلَاغَ لِيَ الْيَوْمَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ بِكَ اَسْاَلُكَ بِالَّذِيْ رَدَّ عَلَيْكَ بَصَرَكَ شَاةً اَتَبَلَّغُ بِهَا فِيْ سَفَرِيْ فَقَالَ قَدْ كُنْتُ اَعْمٰى فَرَدَّ اللّٰهُ اِلَيَّ بَصَرِيْ فَخُذْ مَا شِئْتَ وَدَعْ مَا شِئْتَ فَوَاللّٰهِ لَا اَجْهَدُكَ الْيَوْمَ بِشَيْءٍ اَخَذْتَهُ لِلّٰهِ فَقَالَ اَمْسِكْ مَالَكَ فَاِنَّمَا ابْتُلِيْتُمْ فَقَدْ رَضِيَ عَنْكَ وَسُخِطَ عَلٰى صَاحِبَيْكَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بنی اسرائیل میں تین شخص تھے ان میں سے ایک تو کوڑھی تھا دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمانا چاہا (کہ یہ نعمت الٰہی کا شکر ادا کرتے ہیں یا نہیں؟) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس ایک فرشتہ (مسکین و فقیر) کی صورت میں بھیجا، وہ فرشتہ پہلے کوڑھی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ تمہیں کون سی چیز سب سے زیادہ پسند ہے؟ کوڑھی نے کہا کہ اچھا رنگ اور جسم کی بہترین جلد نیز یہ کہ مجھے اس چیز (یعنی کوڑھ) سے نجات مل جائے جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ یہ سن کر فرشتہ نے کوڑھی کے بدن پر ہاتھ پھیرا، چنانچہ اس کا کوڑھ جاتا رہا۔ اسے بہترین رنگ و روپ اور بہترین جلد عطا کر دی گئی۔ پھر فرشتہ نے پوچھا کہ اب تمہیں کونسا مال سب سے زیادہ پسند ہے؟ اس شخص نے کہا کہ "اونٹ" یا کہا "گائیں" (حدیث کے ایک راوی اسحٰق" کو شک ہے کہ) گائے کے لئے کوڑھی نے کہا تھا یا گنجے نے کہا تھا (بہر حال یہ طے ہے کہ ان میں سے ایک نے تو اونٹ کے لئے کہا تھا اور دوسرے نے گائے کے لئے، آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ اس شخص کو حاملہ اونٹنیاں عطا کر دی گئیں، پھر فرشتے نے یہ دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اس مال میں برکت عطا فرمائے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا پھر فرشتہ گنجے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ تمہیں کون سی چیز سب سے زیادہ پسند ہے؟ گنجے نے کہا کہ بہترین قسم کے بال، اور یہ کہ یہ چیز (یعنی گنج) سے میں نجات پا جاؤں جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا گنج جاتا رہا، نیز اسے بہترین قسم کے بال عطا کر دیئے گئے۔ پھر فرشتہ نے اس سے پوچھا کہ (اب) تمہیں کونسا مال سب سے زیادہ پسند ہے؟ اس شخص نے کہا کہ "گائیں" چنانچہ اسے حاملہ گائیں عطا کر دی گئیں اور فرشتہ نے اسے بھی دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اس مال میں برکت عطا فرمائے۔ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ اس کے بعد پھر فرشتہ اندھے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ تمہیں کون سی چیز سب سے زیادہ پسند ہے؟ اندھے نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے میری بینائی دے دے تا کہ میں اس کے ذریعے لوگوں کو دیکھوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا فرشتہ نے اس پر ہاتھ پھرا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی بینائی عطا فرما دی، پھر فرشتے نے اس سے پوچھا کہ اب تمہیں کون سا مال سب سے زیادہ پسند ہے؟ اس نے کہا "بکریاں" چنانچہ اسے بہت سی بچے دینے والی بکریاں عنایت فرما دی گئیں (اس کے کچھ عرصے کے بعد) کوڑھی اور گنجے نے اونٹنیوں اور گائیوں کے ذریعے اور اندھے نے بکریوں کے ذریعے بچے حاصل کئے (گویا خدا نے تینوں کے مال میں بے انتہا برکت دی) یہاں تک کہ کوڑھی کے اونٹوں سے ایک جنگل بھر گیا گنجے کی گائیوں سے ایک جنگل بھر گیا، اور اندھے کی بکریوں سے ایک جنگل بھر گیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا (اس کے بعد) فرشتہ پھر کوڑھی کے پاس اپنی اسی (پہلی) شکل و صورت میں آیا۔ اور اس سے کہنے لگا کہ میں ایک مسکین شخص ہوں، میرا تمام سامان سفر کے دوران جاتا رہا ہے اس لئے آج (منزل مقصود تک) میرا پہنچنا ممکن نہیں ہے ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی ہو جائے اور اس کے بعد تم ذریعہ بن جاؤ (تو یہ میری مشکل آسان ہو جائے گی) لہٰذا میں تم سے اس ذات کا واسطہ دے کر جس نے تمہیں اچھا رنگ، بہترین جلد، اور مال عطا کیا ہے ایک اونٹ مانگتا ہوں تا کہ اس کے ذریعے میرا سفر پورا ہو جائے اور میں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاؤں اس کوڑھی نے کہا کہ میرے اوپر حق بہت زیادہ ہیں (یعنی اس نے فرشتے کو ٹالنے کے لئے جھوٹ کہا کہ میرے اس مال کے حقدار بہت ہیں اس لئے تمہیں کوئی اونٹ نہیں مل سکتا) فرشتے نے کہا کہ میں تمہیں پہچانتا ہوں، کیا تم وہی کوڑھی نہیں ہو جس سے لوگوں کو گھن آتی تھی؟ اور تم محتاج و قلاش تھے مگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں (بہترین رنگ و روپ کے ساتھ) صحت عطا فرمائی اور مال سے نوازا۔ کوڑھی نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے، بلکہ یہ مال تو مجھے اپنے باپ دادا کی طرف سے وراثت میں ملا ہے۔ فرشتے نے کہا کہ تم جھوٹے ہو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اسی حالت کی طرف پھیر دے جس میں تم پہلے مبتلا تھے، (یعنی تمہیں پھر کوڑھی اور مفلس بنا دے)۔ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ پھر فرشتہ گنجے کے پاس اپنی اس پہلی شکل و صورت میں آیا اور اس سے بھی وہی کہا جو اس نے کوڑھی سے کہا تھا، چنانچہ گنجے نے بھی وہی جواب دیا جو جواب کوڑھی نے دیا تھا فرشتے نے گنجے سے بھی یہی کہا کہ اگر تم جھوٹے ہو تو خدا تمہیں ویسا ہی کر دے جیسا کہ تم پہلے (گنجے اور محتاج) تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اس کے بعد فرشتہ اندھے کے پاس اپنی اسی پہلی شکل و صورت میں آیا اور اس سے بھی یہی کہا کہ میں ایک

مسکین انسان اور مسافر ہوں میرا تمام سامان سفر کے دوران جاتا رہا ہے۔ اس لئے آج (منزل مقصود تک) پہنچنا اس شکل میں ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی میرے شامل حال ہو جائے اور اس کے بعد تم اس کا ذریعہ بن جاؤ۔ لہٰذا میں اس ذات کا واسطہ دے کر جس نے تمہاری بینائی واپس کر دی تم سے ایک بکری مانگتا ہوں تاکہ اس کے ذریعے میں اپنا سفر پورا کر سکوں۔ اندھے نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کہا کہ بے شک پہلے میں ایک اندھا تھا اللہ تعالیٰ نے میری بینائی واپس کر دی ہے لہٰذا میری تمام بکریاں حاضر ہیں اس میں تم جو چاہو لے لو اور جو نہ چاہو اسے چھوڑ دو، تم جو کچھ بھی لوگے خدا کی قسم میں تمہیں اس کو واپس کرنے کی تکلیف نہیں دوں گا۔ یہ سن کر فرشتے نے کہا کہ تمہیں تمہارا مال مبارک تم اپنا مال اپنے پاس رکھو مجھے تمہارے مال کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت تو صرف تمہیں آزمائش میں مبتلا کیا گیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارا امتحان لیا تھا کہ آیا تمہیں اپنا پرانا حال یاد بھی ہے یا نہیں؟ اور تم خدا کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہو یا نہیں؟ سو تم آزمائش میں پورے اترے چنانچہ اللہ تعالیٰ تم سے راضی اور خوش ہو اور تمہارے وہ دونوں (بدبخت) ساتھی (یعنی کوڑھی اور گنجا ناشکرے ثابت ہوئے اس لئے وہ) اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض قرار پائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی ہو جائے اور اس کے بعد تم ذریعہ بن جاؤ" علماء کہتے ہیں کہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کے موقع پر یہ اسلوب اختیار کرنا جائز ہے کیونکہ اس طرح اصل سوال تو اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ مگر بندہ کو اس کا ذریعہ اور سبب بنایا جاتا ہے ایسا اسلوب اختیار کرنا کہ جس میں خدا کے ساتھ بندہ بھی حاجت روائی کا درجہ دیا جائے مثلاً یوں کہا جائے کہ "میں خدا سے اور تم سے سوال کرتا ہوں، قطعاً درست نہیں ہے۔

کسی سائل کو واپس لوٹانے سے بہتر ہے کہ اسے کچھ نہ کچھ دے دیا جائے

(۲۱) وَعَنْ اُمِّ بُجَيْدٍ قَالَتْ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْمِسْكِيْنَ لَيَقِفُ عَلٰى بَابِيْ حَتّٰى اَسْتَحْيِيَ فَلَا اَجِدُ فِيْ بَيْتِيْ مَا اَدْفَعُ فِيْ يَدِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِدْفَعِيْ فِيْ يَدِهٖ وَلَوْ ظِلْفًا مُحَرَّقًا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت اُمّ مجیدؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جب کوئی سائل میرے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو مجھے بڑی شرم محسوس ہوتی ہے کیونکہ میں اپنے گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتی جو اس کے ہاتھ میں دے دوں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ دے دو خواہ وہ جلا ہوا کھر ہی کیوں نہ ہو۔ (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ) اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے صدقہ وخیرات کے بارے میں یہ حکم گویا بطور مبالغہ ارشاد فرمایا کہ سائل کو خالی ہاتھ واپس کرنے سے بہتر ہے کہ اس کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ضرور دے دیا جائے خواہ وہ کتنی ہی حقیر اور کم تر چیز کیوں نہ ہو۔

ایک سبق آموز واقعہ

(۲۲) وَعَنْ مَوْلٰى لِعُثْمَانَ قَالَ اُهْدِيَ لِاُمِّ سَلَمَةَ بُضْعَةٌ مِنْ لَحْمٍ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهُ اللَّحْمُ فَقَالَتْ لِلْخَادِمِ ضَعِيْهِ فِي الْبَيْتِ لَعَلَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْكُلُهُ فَوَضَعَتْهُ فِيْ كُوَّةِ الْبَيْتِ وَجَاءَ سَائِلٌ فَقَامَ عَلَى الْبَابِ فَقَالَ تَصَدَّقُوْا بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكُمْ فَقَالُوْا بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ فَذَهَبَ السَّائِلُ فَدَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا اُمَّ سَلَمَةَ هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ اَطْعَمُهُ فَقَالَتْ نَعَمْ قَالَتْ لِلْخَادِمِ اِذْهَبِيْ فَاْتِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذَالِكَ اللَّحْمِ فَذَهَبَتْ فَلَمْ تَجِدْ فِي الْكُوَّةِ اِلَّا قِطْعَةَ مَرْوَةٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّ ذَالِكَ اللَّحْمَ عَادَ

مَرْوَةً لِمَالَمْ تُعْطُوْهُ السَّائِلَ- رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلام کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ کی خدمت میں (پکے ہوئے) گوشت کا ٹکڑا تحفہ کے طور پر آیا، نبی کریم ﷺ کو چونکہ گوشت بہت مرغوب تھا۔ اس لئے حضرت اُمّ سلمہؓ نے اپنی لونڈی سے فرمایا۔ کہ اس گوشت کو گھر میں (حفاظت سے) رکھ دو، شائد نبی کریم ﷺ اسے تناول فرمائیں، چنانچہ لونڈی نے وہ گوشت گھر کے ایک طاق میں رکھ دیا (اتفاق کہ اسی وقت) ایک سائل نے دروازے پر کھڑے ہو کر صدا بلند کی کہ اے گھر والو، خدا کی راہ میں کچھ عنایت کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دے گھر والوں نے کہا کہ اللہ تمہیں برکت دے (یعنی سائل کو جواب دیا، جیسا کہ ہمارے یہاں جب کسی سائل کو کچھ دینا نہیں ہوتا تو کہہ دیتے ہیں کہ بابا معاف کرو سائل واپس چلا گیا جب نبی کریم ﷺ (گھر میں) تشریف لائے تو فرمایا کہ اُمّ سلمہؓ تمہارے پاس کھانے کے لئے کوئی چیز بھی ہے؟ اُمّ سلمہؓ نے کہا کہ ہاں پھر انہوں نے لونڈی سے کہا کہ جاؤ رسول اللہ ﷺ کے واسطے وہ گوشت لے آؤ، لونڈی (گوشت لانے) چلی گئی، مگر طاق کے پاس پہنچ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہاں گوشت کا کہیں نام نہیں تھا۔ بلکہ (گوشت کی جگہ) سفید پتھر کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا تھا، آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا کہ تم نے سائل کو کچھ نہ دیا (اور اسے خالی ہاتھ واپس کر دیا) اس لئے یہ گوشت، سفید پتھر کی شکل اختیار کر گیا۔ بیہقیؒ نے اس روایت کو دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

خدا کے نام پر سوال کرنے والے کا سوال پورا نہ کرنے والوں کی مذمت

(۲۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِشَرِّ النَّاسِ مَنْزِلاً قِيْلَ نَعَمْ قَالَ الَّذِيْ يُسْئَلُ بِاللّٰهِ وَلَا يُعْطِيْ بِهٖ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، کیا میں تمہیں یہ بتلاؤں کہ خدا کے نزدیک باعتبار مرتبہ کے بدترین شخص کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ! (ضرور بتائیے) آپ ﷺ نے فرمایا وہ شخص جس سے خدا کے نام پر سوال کیا جائے اور وہ اس سوال کو پورا نہ کرے۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کوئی سائل کسی شخص سے خدا کے نام پر خدا کے واسطے سے بایں طور سوال کرے کہ "خدا کے نام پر مجھے کچھ عطا کرو اور اس کے باوجود وہ شخص سائل کو کچھ نہ دے تو وہ خدا کے نزدیک تمام لوگوں میں باعتبار مرتبہ کے برا ہے ہاں اگر سائل مستحق نہ ہو یا سائل نے جس شخص سے سوال کیا اس کے پاس اس کی اپنی ضرورت وحاجت اور اس کے اہل وعیال کی ضرورت وحاجت سے زائد مال نہ ہو تو پھر اس سائل کا سوال پورا نہ کرنے کی صورت میں نہ تو وہ گنہگار ہوگا اور نہ وہ اس حدیث کے مطابق قابل مذمت ہوگا حاصل یہ کہ خدا کے نام پر سوال کرنے والے کا سوال پورا نہ کرنے والا اسی صورت میں قابل مذمت اور گنہگار ہوگا جب کہ سائل اس کے مال کا مستحق ہو نیز یہ کہ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اس کی ضروریات سے زائد ہو۔

مال وزر کے بارے میں حضرت ابوذرؓ کا مسلک اور ان کا جذبۂ زہد

(۲۴) وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ اَنَّهٗ اسْتَاْذَنَ عَلٰى عُثْمَانَ فَاَذِنَ لَهٗ وَبِيَدِهٖ عَصَاهُ فَقَالَ عُثْمَانُ يَا كَعْبُ اِنَّ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ تُوُفِّيَ وَتَرَكَ مَالاً فَمَا تَرٰى فِيْهِ فَقَالَ اِنْ كَانَ يَصِلُ فِيْهِ حَقَّ اللّٰهِ فَلَا بَاْسَ عَلَيْهِ فَرَفَعَ اَبُوْذَرٍّ عَصَاهُ فَضَرَبَ كَعْبًا وَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا اُحِبُّ لَوْاَنَّ لِيْ هٰذَا الْجَبَلَ ذَهَبًا اُنْفِقُهٗ وَيُتَقَبَّلُ مِنِّيْ اَذَرُ خَلْفِيْ مِنْهُ سِتَّ اَوَاقِيَّ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ يَا عُثْمَانُ اَسَمِعْتَهٗ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَ نَعَمْ (رواہ احمد)

"حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارے میں مروی ہے کہ (ایک مرتبہ) انہوں نے حضرت عثمان غنیؓ سے حاضری کی اجازت چاہی تو حضرت

عثمانؓ نے انہیں اجازت دی، جب وہ حاضر ہوئے تو اس وقت ان کے ہاتھ میں عصا تھا (اسی موقع پر) حضرت عثمانؓ نے (حضرت کعبؓ سے جو اس وقت وہاں موجود تھا) فرمایا کہ کعب! حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے (اپنے پیچھے) بہت زیادہ مال چھوڑا ہے آپ رضی ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آیا ان کے مال کی بے انتہا کثرت وزیادتی ان کے کمال ایمان کے لئے مضر تھی یا نہیں؟ حضرت کعبؓ نے کہا کہ اگر حضرت عبدالرحمٰن اس مال میں سے اللہ تعالیٰ کا حق یعنی زکوٰۃ صدقات وغیرہ ادا کرتے تھے تو ان کے بارے میں کسی خوف کی گنجائش نہیں۔ (یہ سنتے ہی) حضرت ابوذرؓ نے اپنا عصا اٹھا کر حضرت کعبؓ کو مارا اور کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر میرے پاس سونے کا یہ پہاڑ (احد) ہو اور میں اسے خدا کی راہ میں خرچ کروں تو باوجودیکہ وہ مقبول بھی ہو جائے میں اسے پسند نہیں کروں گا کہ میں اس میں چھ اوقیہ (یعنی دو سو چالیس درہم) بھی اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں۔ پھر حضرت ابوذرؓ نے حضرت عثمانؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ عثمانؓ! میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے یہ ارشاد گرامی نہیں سنا ہے؟ حضرت ابوذرؓ نے یہ تین مرتبہ فرمایا، حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ہاں میں نے بھی یہ ارشاد گرامی سنا ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: حضرت ابوذر غفاریؓ صحابہؓ کی ایک جماعت میں سے تھے۔ جس کا فقر وزہد امتیازی شان رکھتا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی ذات گرامی فقر وزہد اور استغنا کے بارے میں پوری اُمت میں ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ رجحان ونظریہ یہ تھا کہ اپنے پاس مال وزر کا ادنیٰ ترین حصہ بھی جمع نہ کیا جائے بلکہ جو کچھ بھی اپنے قبضے وقدرت میں آئے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دیا جائے چنانچہ اس موقع پر بھی ان کا یہ جذبہ ان پر غالب آ گیا اور جب انہوں نے حضرت کعبؓ سے اپنے مزاج اور رجحان کے خلاف بات سنی تو انہیں مار بیٹھے۔

اس بارے میں جہاں تک مسئلے کا تعلق ہے وہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ جمہور علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر مال کی زکوٰۃ ادا ہوتی ہے تو اس کو جمع کرنے میں مضائقہ نہیں ہے خواہ وہ مال کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی میں جملہ وَيُتَقَبَّلُ مِنِّي بطور مبالغہ استعمال فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا زیادہ مال وزر خدا کی راہ میں خرچ کروں اُس کے باوجود بھی کاش کہ قبول ہو جائے۔

لفظ "اَذَرُ" حذف ان کے ساتھ احب کا مفعول ہے گویا اس پورے جملے کے معنی یہ ہوں گے کہ "اگر خدا اتنا زیادہ مال عطا فرما دے اور میں اسے خدا کی راہ میں خرچ کر دوں اور پھر وہ بارگاہ الوہیت میں قبول بھی ہو جائے تو جب بھی میں یہ گوارہ نہیں کروں گا کہ اس مال میں سے کم از کم چھ اوقیہ ہی اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں۔

ماسوا اللہ کی طرف التفات مقام قرب سے باز رکھتا ہے

(۲۵) وَعَنْ عُقْبَةَ ابْنِ الْحَارِثِ قَالَ صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ الْعَصْرَ فَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ مُسْرِعًا فَتَخَطّٰى رِقَابَ النَّاسِ اِلٰى بَعْضِ حُجَرِ نِسَائِهٖ فَفَزِعَ النَّاسُ مِنْ سُرْعَتِهٖ فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ فَرَاٰى اَنَّهُمْ قَدْ عَجِبُوْا مِنْ سُرْعَتِهٖ قَالَ ذَكَرْتُ شَيْئًا مِنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا فَكَرِهْتُ اَنْ يَّحْبِسَنِيْ فَاَمَرْتُ بِقِسْمَتِهٖ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهٗ قَالَ كُنْتُ خَلَّفْتُ فِي الْبَيْتِ تِبْرًا مِنَ الصَّدَقَةِ فَكَرِهْتُ اَنْ اُبَيِّتَهٗ۔

"اور حضرت عقبہؓ ابن حارث بیان کرتے ہیں کہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں نے مدینہ میں نبی کریم ﷺ کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی چنانچہ جب آنحضرت ﷺ سلام پھیر چکے تو بڑی سرعت کے ساتھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اپنی ازواج مطہراتؓ کے بعض حجروں کی طرف چلے گئے۔ صحابہؓ آپ ﷺ کی اس سرعت سے گھبرا گئے، پھر جب آپ ﷺ حجرے سے باہر تشریف لائے اور صحابہؓ کو اپنی سرعت پر متعجب دیکھا تو فرمایا کہ (اچانک) مجھے یاد آیا کہ ہمارے پاس سونے کی ایک چیز موجود ہے اور میں نے اسے ناپسند کیا کہ وہ

مجھے (مقام قرب سے) روکے لہٰذا (فوراً جا کر اہل بیت کو) میں نے حکم دیا کہ سونے کی وہ چیز تقسیم کر دی جائے۔" (بخاریؒ)

"اور بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ میں زکوٰۃ میں آیا ہوا سونے کا ایک ڈلا گھر میں چھوڑ آیا تھا (جو تقسیم کرنے کے بعد بچ گیا تھا) لہٰذا میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ میں اسے ایک رات کے لئے بھی اپنے پاس رکھوں۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ماسوا اللہ (اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں) کی طرف التفات کرنا ان بندگان خدا کو بھی کہ جو مقربین بارگاہ الوہیت ہوتے ہیں مقام قرب سے باز رکھتا ہے یا پھر یہ کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اُمت کے لئے بطور تعلیم و تنبیہ ہے کہ دنیا اور دنیا کی چیزوں کی رغبت اور خواہش نہیں ہونی چاہئے۔

نبی اپنے پیچھے مال نہیں چھوڑتا

(۲۶) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ كَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدِيْ فِيْ مَرَضِهٖ سِتَّةُ دَنَانِيْرَ اَوْسَبْعَةٌ فَاَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اُفَرِّقَهَا فَشَغَلَنِيْ وَجَعُ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ سَاَلَنِيْ عَنْهَا مَافَعَلَتِ السِّتَّةُ اَوِالسَّبْعَةُ قُلْتُ لَا وَاللّٰهِ لَقَدْ كَانَ شَغَلَنِيْ وَجَعُكَ فَدَعَا بِهَا ثُمَّ وَضَعَهَا فِيْ كَفِّهٖ فَقَالَ مَا ظَنُّ نَبِيِّ اللّٰهِ لَوْ لَقِيَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَهٰذِهٖ عِنْدَهٗ (رواہ احمد)

"اور اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی بیماری کے دوران میرے پاس آپ ﷺ کی (عرب میں اس وقت کی رائج) چھ یا سات اشرفیاں تھیں، لہٰذا آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں انہیں تقسیم کر دوں لیکن آپ ﷺ کی بیماری نے ان کو تقسیم کرنے سے باز رکھا (یعنی آپ ﷺ کی بیماری کی وجہ سے مجھے ان کو تقسیم کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی) چنانچہ مجھ سے آنحضرت ﷺ نے پھر دریافت فرمایا کہ ان چھ یا سات اشرفیوں کا کیا ہوا؟ حضرت عائشہؓ (کہتی ہیں کہ میں) نے عرض کیا کہ میں نے انہیں ابھی تقسیم نہیں کیا ہے، خدا کی قسم (آپ ﷺ) کی بیماری نے اسے تقسیم کرنے سے) مجھے باز رکھا ہے (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے ان اشرفیوں کو منگوایا اور انہیں اپنے ہاتھوں پر رکھ کر فرمایا کہ کیا یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ خدا کا نبی اللہ عزوجل سے اس حال میں ملاقات کرے کہ یہ اشرفیاں اس کے پاس ہوں!۔" (احمدؒ)

تشریح: حدیث کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات مقام نبوت کے منافی ہے کہ خدا کا نبی جب اس دنیا سے رخصت ہو کر اپنے مالک حقیقی سے ملے تو اس کے گھر میں مال و زر موجود ہو، آپ ﷺ نے اس انداز سے حضرت عائشہؓ کو تنبیہ فرمائی کہ ان اشرفیوں کا گھر میں پڑے رہنا مجھے قطعی پسند نہیں ہے انہیں فوراً تقسیم کر دو۔

ذخیرہ اندوزی کی بجائے توکل علی اللہ کی تعلیم

(۲۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰى بِلَالٍ وَعِنْدَهٗ صُبْرَةٌ مِنْ تَمْرٍ فَقَالَ مَا هٰذَا يَا بِلَالُ قَالَ شَيْءٌ اِدَّخَرْتُهٗ لِغَدٍ فَقَالَ اَمَا تَخْشٰى اَنْ تَرٰى لَهٗ غَدًا بُخَارًا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنْفِقْ بِلَالُ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ اِقْلَالًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ حضرت بلالؓ کے پاس تشریف لائے تو (دیکھا کہ) ان کے نزدیک کھجوروں کا ڈھیر پڑا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ بلال! یہ کیا ہے؟ حضرت بلال نے کہا کہ وہ چیز ہے جسے میں نے کل (یعنی آئندہ پیش آنے والی اپنی ضرورت) کے لئے جمع کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ کل قیامت کے دن دوزخ کی آگ میں تم اس کا بخار دیکھو، (پھر فرمایا) بلال اس ذخیرہ کو (خدا کی راہ میں) خرچ کر دو اور صاحب عرش سے فقر و افلاس کا خوف نہ کرو۔"

تشریح: ارشاد گرامی "اما تخشی ان تری لہ غدا الخ میں "غد" (کل) سے مراد قیامت کا دن ہے لہٰذا کہا جائے گا کہ اس جملے میں "یوم القیامۃ" کے الفاظ عند کی تاکید کے طور پر ارشاد فرمائے گئے ہیں، "بخار" سے مراد "اثر" ہے، مطلب یہ ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ قیامت کے دن اس کے سبب دوزخ کی آگ کا اثر تمہیں پہنچے، گویا یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی دوزخ سے قریب ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر تم خدا پر توکل نہیں کرو گے اور فقر و افلاس کے خوف سے ذخیرہ اندوزی کرو گے تو اس کی وجہ سے دوزخ کے قریب ہو جاؤ گے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی نہ کرو، بلکہ جو جمع کیا ہے اسے خدا کے نام پر خرچ کر ڈالو۔ فقر و افلاس کا خوف نہ کرو بلکہ خدا پر اعتماد اور بھروسہ رکھو کیونکہ جس قادر مطلق نے عرش عظیم کو پیدا کیا ہے اور تمہاری تخلیق کی ہے وہی تمہیں روزی بھی پہنچائے گا۔

گویا آنحضرت ﷺ نے حضرت بلال کو یہ حکم بطور تعلیم دیا کہ مقام کمال حاصل کرو جو توکل اور ذات حق پر کامل اعتماد ہے، ورنہ تو جہاں تک مسئلے کا تعلق ہے علماء لکھتے ہیں کہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی کے بقدر ذخیرہ کرنا جائز ہے۔

سخاوت کی فضیلت

(۲۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّخَاءُ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ فَمَنْ كَانَ سَخِيًّا اَخَذَ بِغُصْنٍ مِنْهَا فَلَمْ يَتْرُكْهُ الْغُصْنُ حَتّٰى يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَالشُّحُّ شَجَرَةٌ فِي النَّارِ فَمَنْ كَانَ شَحِيْحًا اَخَذَ بِغُصْنٍ مِنْهَا فَلَمْ يَتْرُكْهُ الْغُصْنُ حَتّٰى يُدْخِلَهُ النَّارَ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "سخاوت" بہشت میں ایک درخت ہے لہٰذا جو شخص سخی ہو گا وہ اس کی ٹہنی پکڑ لے گا چنانچہ وہ ٹہنی اسے نہیں چھوڑے گی یہاں تک کہ اسے بہشت میں داخل نہ کرا دے (اگرچہ وہ آخر الامر ہو) اسی طرح "بخل" دوزخ میں ایک درخت ہے لہٰذا جو شخص بخیل ہو گا وہ اس کی ٹہنی پکڑ لے گا چنانچہ وہ ٹہنی اسے نہیں چھوڑے گی۔ یہاں تک کہ اسے دوزخ میں داخل نہ کرا دے یہ دونوں روایتیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ سخاوت درخت کی مانند ہے گویا اس وصف کو درخت کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے کہ جس طرح درخت بڑا ہوتا ہے اور اس کی کتنی ہی شاخیں اور ٹہنیاں ہوتی ہیں اسی طرح سخاوت بھی ایک وصف عظیم ہے جس کی بہت زیادہ شاخیں اور قسمیں ہیں۔ "وہ اس کی ٹہنی پکڑ لے گا" کا مطلب یہ ہے کہ سخاوت کی جو قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم پکڑ لے گا۔

صدقہ دافع بلا ہے

(۲۹) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَادِرُوْا بِالصَّدَقَةِ فَاِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا (رواہ رزین)

"اور حضرت علیؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے میں جلدی کرو (یعنی موت یا بیماری سے پہلے صدقہ دو) کیونکہ صدقہ دینے سے بلا نہیں بڑھتی (یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے بلائیں ٹلتی ہیں۔" (رزینؒ)

بَابُ فَضْلِ الصَّدَقَةِ

صدقہ کی فضیلت کا بیان

"صدقہ" مال کا وہ حصّہ کہلاتا ہے جسے کوئی شخص اپنے مال میں سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے

نکالے خواہ وہ واجب ہو یا نفل۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خدا کی راہ میں خرچ کیا جانے والا غیر حلال مال قبول نہیں ہوتا

① عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَیِّبٍ وَلَا یَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا الطَّیِّبَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتَقَبَّلُهَا بِیَمِیْنِهٖ ثُمَّ یُرَبِّیْهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا یُرَبِّیْ اَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ حَتّٰی تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص کھجور برابر (خواہ صورت میں خواہ قیمت میں) حلال کمائی میں خرچ کرے (اور یہ جان لو) کہ اللہ تعالیٰ صرف مال حلال قبول کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے اور پھر اس صدقہ کو صدقہ دینے والے کے لئے اسی طرح پالتا ہے۔ جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنا بچھڑا پالتا ہے یہاں تک کہ وہ (صدقہ یا اس کا ثواب) پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کسب" کے معنی ہیں جمع کرنا یہاں "کسب طیب" سے مراد وہ مال ہے جسے حلال ذریعوں سے جمع کیا جائے یعنی شرعی اصولوں کے تحت ہونے والی تجارت و صنعت، زراعت و ملازمت اور وراثت یا حصہ میں حاصل ہونے والا مال۔

"ولا یقبل اللہ الا الطیب" (اللہ تعالیٰ صرف حلال مال قبول کرتا ہے) میں اسی طرف اشارہ ہے کہ بارگاہ الوہیت میں صرف وہی صدقہ قبول ہوتا ہے جو حلال مال کا ہو، غیر حلال مال قبول نہیں ہوتا نیز اس سے یہ نکتہ بھی پیدا ہوا کہ حلال مال اچھی اور نیک جگہ ہی خرچ ہوتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کیا جانے والا حلال مال بارگاہ الوہیت میں کمال قبول کو پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ حلال مال خرچ کرنے والے سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے اسی مفہوم کو یہاں "داہنے سے لینے" سے اس لئے محاورۃً اور عرفاً تعبیر کیا گیا ہے کہ پسندیدہ اور محبوب چیز داہنے ہاتھ ہی سے لی جاتی ہے۔

"پالتا ہے" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس صدقے کے ثواب کو بڑھاتا جاتا ہے تاکہ وہ قیامت کے روز میزان عمل میں گراں ثابت ہو۔

ایک سبق آموز حکایت: حدیث بالا کی روشنی میں جو یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ حلال مال اچھی جگہ ہی خرچ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک سبق آموز حکایت سنئے:

شیخ علی متقی عارف باللہؒ فرماتے ہیں کہ ایک متقی و صالح شخص کسب معاش کرتے تھے اور ان کا معمول تھا کہ جو کچھ کماتے پہلے تو اس میں سے ایک تہائی خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے پھر ایک تہائی اپنی ضروریات پر صرف کرتے اور ایک تہائی اپنی کسب معاش کے ذریعے میں لگا دیتے ایک دن ان کے پاس ایک دنیادار شخص آیا اور کہنے لگا کہ شیخ! میں چاہتا ہوں کہ کچھ مال خدا کی راہ میں خرچ کروں، لہٰذا آپ مجھے کسی مستحق کا پتہ دیجئے انہوں نے کہا کہ "پہلے تو حلال مال حاصل کرو اور پھر اس میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرو، وہ مستحق شخص ہی کے پاس پہنچے گا"۔ دنیادار شخص نے اسے مبالغہ پر محمول کیا، شیخ نے کہا اچھا تم جاؤ تمہیں جو شخص بھی ایسا ملے جس کے لئے تمہارے دل میں جذبہ ترحم پیدا ہو اسے صدقہ کا مال دے دینا، چنانچہ وہ شخص جب شیخ کے پاس سے اٹھ کر آیا تو اس نے ایک بوڑھے اندھے کو دیکھا جس کے لئے اس کے دل میں جذبہ ترحم پیدا ہوا اور یہ سمجھ کر کہ صدقہ کے مال کا اس بے چارے سے زیادہ کون مستحق ہو سکتا ہے؟ اپنے کمائے ہوئے مال میں سے اسے کچھ حصہ خیرات کر دیا۔ جب دوسرے دن وہ ضعیف و نابینا شخص کے پاس سے گزرا تو اس نے سنا کہ وہ اپنے پاس

کھڑے ہوئے ایک دوسرے شخص سے کل کا واقعہ بیان کر رہا تھا کہ کل میرے پاس سے ایک مالدار شخص گزرا اس نے (مجھ پر ترس کھا کر) اتنا مال مجھے دیا جسے میں نے فلاں بدکار شخص کے ساتھ شراب نوشی میں لٹا دیا۔ وہ دنیادار یہ سنتے ہی شیخ ؒ کے پاس آیا اور ان سے پورا ماجرا بیان کیا، شیخ ؒ نے یہ واقعہ سن کر اپنی کمائی میں سے ایک درہم اسے دیا اور کہا کہ اسے رکھو، اور یہاں سے نکلتے ہی سب سے پہلے تمہاری نظر جس پر پڑے اسے یہ درہم بطور خیرات دے دینا چنانچہ وہ شیخ ؒ کا دیا ہوا درہم لے کر گھر سے باہر نکلا تو اس کی نظر سب سے پہلے ایک اچھے خاصے شخص پر پڑی، جو بظاہر کھاتا پیتا معلوم ہو رہا تھا پہلے تو وہ دیتے ہوئے جھجکا مگر چونکہ شیخ کا حکم تھا اس لئے اس نے مجبوراً وہ درہم اس شخص کو دے دیا۔ اس شخص نے وہ درہم لے لیا، اور اپنے پیچھے کی طرف مڑ کر چل دیا، اس کے ساتھ ساتھ وہ مالدار بھی چلا، اس نے دیکھا کہ وہ شخص ایک کھنڈر میں داخل ہوا اور وہاں سے دوسری طرف نکل کر شہر کی راہ پکڑی، مالدار بھی اس کے پیچھے کھنڈر میں داخل ہوا وہاں اسے کوئی چیز نظر نہ آئی البتہ اس نے ایک مرا ہوا کبوتر دیکھا وہ پھر اس شخص کے پیچھے پیچھے ہو لیا، پھر اسے قسم دے کر پوچھا کہ بتاؤ تم کون ہو؟ اور کس حال میں ہو؟ اس نے کہا کہ میں ایک غریب انسان ہوں، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں وہ بہت بھوکے تھے جب مجھ سے ان کی بھوک کی شدت دیکھی نہ گئی اور انتہائی اضطراب و پریشانی کے عالم میں ان کے لئے کچھ انتظام کرنے کی خاطر گھر سے نکل کھڑا ہوا تو میں سرگرداں پھر رہا تھا کہ یہ مرا ہوا کبوتر مجھے نظر آیا مرتا کیا نہ کرتا؟ میں نے یہ کبوتر اٹھا لیا اور اسے لے کر اپنے گھر کی طرف چلا تاکہ اس کے ذریعے بھوک سے بلکتے بچوں کو کچھ تسکین دلاؤں مگر جب خدا نے تمہارے ذریعے یہ درہم مجھے عنایت فرما دیا تو یہ کبوتر جہاں سے اٹھایا تھا وہیں پھینک دیا۔

اب اس مالدار کی آنکھ کھلی اور اسے معلوم ہوا کہ شیخ ؒ کا وہ قول مبالغہ پر محمول نہیں تھا بلکہ حقیقت یہی ہے کہ حلال مال اچھی جگہ اور حرام مال بری جگہ خرچ ہوتا ہے۔

صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَانَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَازَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّاعِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ صدقہ دینا مال میں کمی نہیں کرتا، اور جو شخص کسی کی خطا معاف کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ کرتا ہے نیز جو شخص محض خدا کے لئے تواضع و عاجزی اختیار کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: یہاں تین باتیں بتائی جا رہی ہیں ایک تو یہ کہ اپنے مال میں سے کچھ حصہ خدا کی راہ میں خرچ کرنا اگرچہ ظاہری طور پر مال میں کمی و نقصان کا سبب ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں صدقہ و خیرات مال میں زیادتی کا سبب ہوتا ہے بایں طور کہ صدقہ و خیرات کرنے والے کے مال میں برکت عطا فرمائی جاتی ہے وہ اور اس کا مال آفت و بلا سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے نامہ اعمال میں ثواب کی زیادتی ہوتی ہے بلکہ دنیا میں بھی اسے اس طرح نعم البدل عطا فرمایا جاتا ہے کہ اس کا مال بڑھتا رہتا ہے۔

دوسری بات یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ جو شخص کسی دوسرے کا قصور لینے پر قادر ہونے کے باوجود معاف کر دیتا ہے اور اس کی خطا سے درگزر کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی عزت بڑھاتا ہے چنانچہ ایک عارف کا قول منقول ہے کہ "کوئی بھی انتقام عفو و درگزر کے برابر نہیں ہے"۔

تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ جو شخص کسی غرض و منفعت کی خاطر نہیں بلکہ صرف اللہ جل شانہ کی رضاء و خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کرنے کے جذبے سے تواضع و عاجزی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے۔

اعمال خیر سے منسوب جنّت کے دروازے

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَنْفَقَ زَوْجَيْنِ مِنْ شَيْءٍ مِنَ الْاَشْيَاءِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ دُعِيَ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ وَلِلْجَنَّةِ اَبْوَابٌ فَمَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الصَّلَاةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّلَاةِ وَمَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْجِهَادِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الْجِهَادِ وَمَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الصَّدَقَةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّدَقَةِ وَمَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الصِّيَامِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الرَّيَّانِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ مَا عَلٰى مَنْ دُعِيَ مِنْ تِلْكَ الْاَبْوَابِ مِنْ ضَرُوْرَةٍ فَهَلْ يُدْعٰى اَحَدٌ مِنْ تِلْكَ الْاَبْوَابِ كُلِّهَا قَالَ نَعَمْ وَاَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنَ مِنْهُمْ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص اپنی چیزوں میں دوہری (دوگنی) چیز اللہ کی راہ میں (یعنی اس کی رضاء وخوشنودی کی خاطر) خرچ کرے گا تو اسے جنّت کے دروازوں سے بلایا جائے گا، اور جنّت کے کئی (یعنی آٹھ) دروازے ہیں، چنانچہ جو شخص اہل نماز (یعنی بہت زیادہ نماز پڑھنے والا) ہوگا اسے جنّت کے "باب الصلاۃ" (نماز کے دروازے) سے بلایا جائے گا (جو اہل نماز ہی کے لئے مخصوص ہوگا اور اس سے کہا جائے گا کہ اے بندے! اس دروازے کے ذریعے جنت میں داخل ہو جاؤ اور جو شخص جہاد کرنے والا (یعنی خدا کی راہ میں بہت زیادہ لڑنے والا) ہوگا اسے "باب الجہاد" (جہاد کے دروازے) سے بلایا جائے گا۔ جو شخص صدقہ دینے والا (یعنی خدا کی راہ میں بہت زیادہ اپنا مال خرچ کرنے والا) ہوگا اسے "باب الصدقہ" (یعنی صدقہ کے دروازے) سے بلایا جائے گا۔ اور جو شخص (بہت زیادہ) روزے رکھنے والا ہوگا اسے "باب الریان" (یعنی باب الصیام سے کہ جنّت میں روزہ کے دروازے کا یہی نام ہے) بلایا جائے گا (یہ سن کر) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا (اگرچہ) جو شخص ان دروازوں میں سے کسی ایک دروازے سے بھی بلایا جائے گا اس کو تمام دروازوں سے بلائے جانے کی ضرورت نہیں ہے (کیونکہ ایک دروازے سے بلایا جانا بھی کافی ہوگا)۔ بایں طور کہ مقصد تو جنّت میں داخل ہونا ہوگا اور یہ ایک ہی دروازے سے بھی حاصل ہو جائے گا پھر میں صرف علم کی خاطر جاننا چاہتا ہوں کہ کیا کوئی ایسا (خوش نصیب وباسعادت) شخص بھی ہوگا، جسے ان تمام دروازوں سے بلایا جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں! اور مجھے امید ہے کہ تم انہیں لوگوں میں سے ہوگے (جنہیں تمام دروازوں سے بلایا جائے گا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: دوہری چیز مثلاً دو درہم، دو روپے، دو غلام، دو گھوڑے اور یا دو کپڑے وغیرہ۔

"دُعِيَ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ" (تو اسے جنّت کے دروازوں سے بلایا جائے گا) کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جس نے دنیا میں دوہری (دوگنی) چیزیں خدا کی راہ میں خرچ کی تھیں، جب جنّت میں داخل ہونے جائے گا۔ تو جنّت کے تمام دروازوں کے داروغہ اسے بلائیں گے اور ہر ایک کی یہ خواہش ہوگی کہ یہ خوش نصیب شخص اس کے دروازے سے جنّت میں داخل ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک عمل ان اعمال کے برابر ہے جن کے سبب جنّت کے تمام دروازوں میں داخل ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

"ریان" کے معنی ہیں "سیراب" چنانچہ منقول ہے کہ "باب الریان" کہ جس کے ذریعے زیادہ روزے رکھنے والے جنّت میں داخل ہوں گے، وہ دروازہ ہے جہاں روزہ دار کو جنّت میں اپنے مستقر پر پہنچنے سے پہلے شراب طہور پلائی جاتی ہے گویا جو شخص یہاں دنیا میں خدا کی خوشنودی کی خاطر روزے رکھ کر پیاسا رہا وہ اس عظیم فعل کے بدلے میں مذکورہ دروازے سے سیراب ہونے کے بعد جنّت میں داخل ہوگا۔

ایک روایت میں منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جنّت کا ایک دروازہ ہے، جسے "باب الضحیٰ" کہا جاتا ہے، چنانچہ قیامت کے دن پکارنے والا (فرشتہ) پکارے گا کہ "کہاں ہیں وہ لوگ جو نماز ضحی (یعنی چاشت یا اشراق کی نماز) پر مداومت کرتے تھے؟ (سن لو) یہ دروازہ تمہارے ہی لئے ہے، لہٰذا تم لوگ خدا کی رحمت کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ"۔

ایک حدیث میں منقول ہے کہ جنّت کے ایک دروازے کا نام "باب التوبہ" ہے کہ توبہ کرنے والے اس دروازے کے ذریعے جنّت میں داخل ہوں گے ایک دروازہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو غصہ کو ضبط اور دوسروں کی خطاؤں کو معاف کرنے والے ہوں گے ایسے لوگ اس دروازے سے جنّت میں داخل ہوں گے، اسی طرح ایک دروازہ ایسا ہوگا جس کے ذریعے خدا کی رضا پر راضی رہنے والوں کا داخلہ ہوگا۔

حضرت ابوبکرؓ کے ارشاد میں "فهل يدعى" سے ماقبل جملہ "ماعلى من دعى" ان کے سوال فهل يدعى الخ کی تمہید کے طور پر ہے۔

آخر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امتیازی شان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ چونکہ ان میں یہ تمام اوصاف اور خوبیاں پائی جاتی تھیں اس لئے انہیں جنّت کے تمام دروازوں سے بلایا جائے گا۔

حضرت ابوبکرؓ کا مرتبہ عبودیت

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ صَائِمًا قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَنَا قَالَ فَمَنْ تَبِعَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ جَنَازَةً قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَنَا قَالَ فَمَنْ اَطْعَمَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ مِسْكِيْنًا قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَنَا قَالَ فَمَنْ عَادَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ مَرِيْضًا قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اجْتَمَعْنَ فِيْ اَمْرِئٍ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ (ایک دن صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ آج تم میں سے کون شخص روزہ سے ہے؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ "میں روزے سے ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا "آج تم میں سے کون شخص جنازہ کے ساتھ (نماز جنازہ کے لئے یا قبرستان) گیا ہے؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ "میں" آپ ﷺ نے فرمایا "آج تم میں سے کس شخص نے مسکین کو کھانا کھلایا ہے" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "میں نے" پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "آج تم میں سے کس شخص نے بیمار کی عیادت کی ہے؟" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "میں نے" پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (سن لو) جس شخص میں یہ باتیں جمع ہوتی ہیں۔ وہ جنت میں داخل ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ہی دن روزہ بھی رکھے، نماز جنازہ میں بھی شریک ہوا اور جنازہ کے ساتھ قبرستان جائے، کسی مسکین کو کھانا بھی کھلائے، اور کسی بیمار کی عیادت کرنے بھی جائے تو ایسا شخص جنّت میں داخل ہوگا اس طرح جنت میں داخل ہوگا، کا مطلب یہ ہے کہ وہ بغیر حساب کے جنّت میں جائے گا۔ کیونکہ ویسے تو مطلقاً دخول جنّت کے لئے صرف ایمان ہی کافی ہے یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جس دروازے سے چاہے گا جنّت میں داخل ہو جائے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایسے مواقع پر "انا" (میں) کہنا اور حصول ثواب کی غرض، نیز اپنے احوال کی خبر دینے کے طور پر اپنی فضیلت بیان کرنا منع نہیں ہے چنانچہ بعض صوفیہؒ اور مشائخؒ نے جو سالکین کو منع کیا ہے کہ اپنی زبان پر "انا" جاری نہ کیا جائے تو اس سے ان کی مراد یہ ہے۔ کہ بقصد تکبر اور دعویٰ ہستی وانانیت کے طور پر "انا" کہا جائے جیسا کہ ابلیس ملعون نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے حکم کے وقت ازراہ غرور و تکبر اور بطور انانیت کہا تھا کہ "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ"

کم تر چیز کے تحفے کو حقیر نہ سمجھا جائے

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَانِسَاءَ الْمُسْلِمَاتِ لَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ فِرْسِنَ شَاةٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے مسلمان عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو (تحفہ بھیجنے یا صدقہ دینے کو) حقیر نہ جانے اگرچہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اپنی پڑوسن کے پاس وہ چیز جو تمہارے پاس موجود ہے بطور تحفہ وصدقہ بھیجنے کو حقیر نہ جانو، گویا تمہارے پاس جو بھی چیز موجود ہو اور جو کچھ بھی ہو سکے خواہ وہ کتنی کم تر کیوں نہ ہو اپنی پڑوسن کو بھیجتی رہا کرو۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی میں ان عورتوں کو خطاب کیا گیا ہے جن کے پاس تحفہ بھیجا جائے لہٰذا اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "تم میں سے کوئی اپنے ہمسایہ کے تحفے کو حقیر نہ جانے بلکہ اسے برضاء رغبت قبول کرے"۔ اگرچہ وہ کتنا ہی کم تر کیوں نہ ہو۔

"بکری کا کھر" ظاہر ہے کہ نہ تو تحفہ میں لینے دینے کے قابل ہوتا ہے اور نہ اس کو بطور صدقہ کسی کو دیا جاسکتا ہے، لہٰذا کہا جائے گا کہ یہاں اسے مبالغہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ "تحفے میں بھیجی جانے والی یا آنے والی چیز کتنی ہی حقیر اور کم تر کیوں نہ ہو"

یہاں بطور خاص عورتوں کو اس لئے خطاب کیا گیا ہے کہ ان کے مزاج میں غصہ اور کم تر و حقیر چیزوں کو واپس کر دینے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔

ہر نیک عمل، صدقہ ہے

(۶) وَعَنْ جَابِرٍ وَحُذَيْفَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ و حضرت حذیفہؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر نیکی صدقہ ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نیکی کے جو بھی عمل ہیں خواہ ان کا تعلق زبان سے ہو یا فعل سے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہوں تو ان کا ثواب ایسا ہی ہے جیسا کہ خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ثواب ہوتا ہے۔

کسی بھی نیک کام کو کمتر نہ جانو

(۷) وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا وَلَوْ اَنْ تَلْقٰى اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذر غفاریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم کسی بھی نیک کام کو حقیر (کم تر) نہ جانو اگرچہ تم اپنے بھائی سے خوش روئی کے ساتھ ملو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگر کوئی شخص کسی سے خوش خلقی اور خوش روئی کے ساتھ ملتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے لہٰذا کسی مسلمان کا دل خوش کرنا چونکہ اچھا اور پسندیدہ ہے اس لئے یہ بھی نیک کام ہے اور اگرچہ خوش روئی کے ساتھ کسی سے ملنا کوئی عظیم الشان کام نہیں ہے مگر اسے بھی کم تر درجے کی نیکی نہ سمجھنا چاہئے۔

کماؤ اور خیرات کرو

(۸) وَعَنْ اَبِىْ مُوْسَى الْاَشْعَرِىِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَةٌ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ قَالَ فَلْيَعْمَلْ بِيَدَيْهِ فَيَنْفَعُ نَفْسَهٗ وَيَتَصَدَّقُ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ اَوْلَمْ يَفْعَلْ قَالَ فَيُعِيْنُ ذَاالْحَاجَةِ الْمَلْهُوْفَ قَالُوْا فَاِنْ

لَمْ يَفْعَلْهُ قَالَ فَيَأْمُرُ بِالْخَيْرِ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ يَفْعَلْ قَالَ فَيُمْسِكُ عَنِ الشَّرِّ فَاِنَّهُ لَهُ صَدَقَةٌ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "نعمت الٰہی کے شکر کے پیش نظر ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے" صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "اگر کسی کے پاس صدقہ کرنے کے لئے کچھ ہو ہی نہ؟ (تو وہ کیا کرے) آپ ﷺ نے فرمایا "ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے ذریعے مال وزر کمائے اور (اس طرح) اپنی ذات کو بھی فائدہ پہنچائے اور صدقہ وخیرات بھی کرے۔ صحابہؓ نے کہا "اگر وہ اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو (کہ محنت مزدوری کر کے کما ہی سکے) یا کہا کہ اگر وہ یہ بھی نہ کر سکتا ہو" آپ ﷺ نے فرمایا "اسے چاہئے کہ وہ (جس طرح بھی ہو سکے) غمگین وحاجت مند داد خواہ کی مدد کرے"۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اسے چاہئے کہ وہ (دوسروں کو) نیکی و بھلائی کی ہدایت کرے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "پھر اسے چاہئے کہ وہ (خود اپنے تئیں یا دوسروں کو) برائی (تکلیف) پہنچانے سے روکے اس کے لئے یہی صدقہ ہے (یعنی اسے صدقہ کا ثواب ملے گا)۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "برائی پہنچانے" سے مراد یہ ہے کہ نہ تو خود کسی کو اپنی زبان اور اپنے ہاتھوں سے تکلیف اور ایذا پہنچائے اور اگر اس کے امکان میں ہو تو ان لوگوں کو بھی روکے جو دوسروں کو ایذاء اور تکلیف پہنچاتے ہیں اسی مضمون کو کسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے ع

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

اپنے جسم کے مفاصل کی طرف سے بطور شکر صدقہ دینا چاہئے

(۹) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ سُلَامٰى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيْهِ الشَّمْسُ يَعْدِلُ بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ صَدَقَةٌ وَيُعِيْنُ الرَّجُلَ عَلٰى دَابَّتِهٖ فَيَحْمِلُ عَلَيْهَا اَوْيَرْفَعُ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ وَكُلُّ خَطْوَةٍ يَخْطُوْهَا اِلَى الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ وَيُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا انسان کے بدن میں جو مفاصل (جوڑ) ہیں ان پر (یعنی ان کی طرف سے) ہر روز صدقہ دینا لازم ہے اور دو آدمیوں کے درمیان عدل کرنا بھی صدقہ ہے کسی انسان کی بایں طور مدد کرنی کہ اس کے جانور پر اسے سوار کرا دینا یا اس کا مال واسباب رکھوا دینا بھی صدقہ ہے، اچھی بات بھی صدقہ ہے ہر وہ قدم جو نماز کے لئے رکھا جائے وہ بھی صدقہ ہے اور راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جو مفاصل (جوڑ) پیدا کئے ہیں اس میں بھی چونکہ اس کی حکمتیں اور اس کی بے شمار نعمتیں پنہاں ہیں لہٰذا ان کے شکرانے میں ہر روز انسان پر صدقہ لازم ہے۔

"یعدل بین الاثنین الخ" سے یہ بات بیان فرمائی جارہی ہے کہ "صدقہ" محض اسی کا نام نہیں ہے کہ کسی شخص کو راہ خدا میں مال وزر دے دیا جائے بلکہ یہ چیزیں (یعنی دو آدمیوں کے درمیان عدل کرنا وغیرہ) بھی صدقہ ہی ہے کہ جس طرح راہ خدا میں مال خرچ کرنے سے ثواب ملتا ہے اسی طرح ان چیزوں کا بہت زیادہ ثواب ملتا ہے لہٰذا جو انسان روزانہ ان میں سے کوئی بھی نیک کام کر لیتا ہے تو گویا اس نے وہ صدقہ ادا کیا جو خدا نے اس پر اس کے جوڑوں کی طرف سے شکرانہ کے طور پر لازم کیا ہے۔

اچھی بات سے مراد وہ بات اور کلام ہے جس سے ثواب حاصل ہو یا سائل وغیرہ سے نرم لہجہ میں گفتگو بھی ہو سکتی ہے۔

وَكُلُّ خَطْوَةٍ سے صرف وہی قدم مراد نہیں ہیں جو نماز میں جانے کے لئے رکھے جاتے ہوں بلکہ ہر وہ قدم مراد ہے جو نیک راہ میں اور نیک مقصد کے لئے اٹھتے ہیں، مثلاً طواف کے لئے، بیمار کی عیادت کے لئے، جنازے میں شریک ہونے کے لئے اور علم کی طلب کے لئے۔

"تکلیف دہ چیز" سے ہر وہ چیز مراد ہے جس سے راہ گیر کو تکلیف پہنچنے کا خدشہ ہو. جیسے کانٹے، ہڈی، پتھر، اینٹ اور نجاست وغیرہ۔

مفاصل جسم کی تعداد اور ان کی نار دوزخ سے حفاظت

(۱۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُلِقَ كُلُّ اِنْسَانٍ مِنْ بَنِىْ اٰدَمَ عَلٰى سِتِّيْنَ وَثَلَاثِمِائَةِ مَفْصِلٍ فَمَنْ كَبَّرَ اللّٰهَ وَحَمِدَ اللّٰهَ وَهَلَّلَ اللّٰهَ وَسَبَّحَ اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ اللّٰهَ وَعَزَلَ حَجَرًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ اَوْشَوْكَةً اَوْعَظْمًا اَوْاَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ اَوْنَهٰى عَنْ مُنْكَرٍ عَدَدَ تِلْكَ السِّتِّيْنَ وَالثَّلَاثِ مِائَةٍ فَاِنَّهٗ يَمْشِىْ يَوْمَئِذٍ وَقَدْ زَحْزَحَ نَفْسَهٗ عَنِ النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اولاد آدم میں سے ہر انسان تین سو ساٹھ مفاصل (جوڑوں) کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ لہذا جو کوئی اللہ اکبر الحمد للہ، لا الہ الا اللہ اور سبحان اللہ کہے اور خدا سے استغفار کرے نیز لوگوں کے راستے سے پتھر، کانٹا اور ہڈی (یعنی ہر تکلیف دہ چیز) ہٹا دے یا نیک کام کرنے کا حکم دے یا برے افعال و اقوال سے روکے اور یہ (سب یا بعض اقوال و افعال) جوڑوں کی تین سو ساٹھ تعداد کے مطابق کرے تو وہ اس دن اس حالت میں چلتا ہے گویا اس نے اپنے آپ کو آگ سے بچا رکھا ہے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مذکورہ افعال کرنا اور اپنے جسم کے جوڑوں کے بقدر مذکورہ کلمات کا ورد در حقیقت اپنے جسم کو اور جسم کے جوڑوں کو دوزخ کی آگ سے بچانا ہے۔

لفظ "يَوْمَئِذٍ" (اس دن) سے اس طرف اشارہ ہے کہ ان باتوں پر عمل اور ان کلمات کا ورد روزانہ کرنا چاہئے تاکہ اس کے گناہوں کا کفارہ ادا ہوتا رہے۔

صدقات معنوی

(۱۱) وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ وَنَهْىٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَفِىْ بُضْعِ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيَاْتِىْ اَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَيَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا اَجْرٌ قَالَ اَرَاَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِىْ حَرَامٍ اَكَانَ عَلَيْهِ فِيْهِ وِزْرٌ فَكَذٰلِكَ اِذَا وَضَعَهَا فِى الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ اَجْرٌ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہر تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے ہر تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے ہر تحمید یعنی "الحمد للہ" کہنا صدقہ ہے، ہر تہلیل یعنی "لا الہ الا اللہ" کہنا صدقہ ہے، نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے ہر برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے اور اپنی بیوی یا لونڈی سے صحبت کرنا صدقہ ہے، صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ہم میں سے کوئی اپنی شہوت پوری کرے اور اسے اس میں ثواب ملے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ مجھے بتاؤ کہ اگر کوئی شخص حرام ذریعے (یعنی زنا) سے اپنی شہوت پوری کرے تو آیا اسے گناہ ملے گا یا نہیں؟ (ظاہر ہے کہ یقیناً اسے گناہ ملے گا) لہذا اسی طرح جب وہ حلال ذریعہ (یعنی اپنی بیوی اور اپنی لونڈی) سے شہوت پوری کرے گا۔ تو اسے ثواب ملے گا۔" (مسلم)

تشریح: جیسے ظاہری طور پر صدقہ خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کو کہتے ہیں اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرماتا ہے اسی طرح مذکورہ کلمات کا ورد اور مذکورہ اعمال کو معنوی طور پر صدقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے بایں طور کہ ان کی وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ وہی ثواب عطا فرماتا ہے جو صدقہ کے طور پر مال دینے والوں کو ملتا ہے۔

اپنی بیوی اور اپنی لونڈی سے صحبت اگرچہ بذات خود عبادت اور صدقہ نہیں ہے اسی لئے صحابہؓ کو بھی اشکال ہوا لیکن چونکہ اس طرح

بیوی کے حق کی ادائیگی ہوتی ہے اور نفس کے حرام کاری کی طرف بہت زیادہ مائل ہونے اور شیطان کی ترغیب و تحریص کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حکم کے پیش نظر اپنے آپ کو حرام ذریعے سے بچا کر حلال اور جائز ذریعے کی طرف مائل کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی بیوی اور اپنی لونڈی سے صحبت کرنے والا صدقہ کا ثواب پاتا ہے۔

بہترین صدقہ

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ الصَّدَقَةُ اللِّقْحَةُ الصَّفِیُّ مِنْحَةً وَالشَّاةُ الصَّفِیُّ مِنْحَةً تَغْدُوْ بِاِنَاءٍ وَتَرُوْحُ بِاٰخَرَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بہت دودھ والی اونٹنی کسی کو دودھ پینے کے لئے عاریۃً دینا بہترین صدقہ ہے۔ بہت دودھ دینے والی بکری کسی کو دودھ پینے کے لئے عاریۃً دینا بہترین صدقہ ہے۔ وہ صبح کو باسن بھر دودھ دیتی ہے اور شام کو باسن بھر دودھ دیتی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عرب میں یہ معمول تھا کہ جسے اللہ تعالیٰ توفیق دیتا تھا وہ اپنی دودھ دینے والی اونٹنی یا بکری کسی ضرورت مند و محتاج کو عاریۃً دے دیتا تھا۔ جس کے ذریعے وہ ضرورت مند اپنی حاجت و ضرورت پوری کرنے کے بعد اسے اس کے مالک کو واپس کر دیتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اسی طرز عمل کی تعریف فرمائی ہے کہ یہ عمل بہترین صدقہ ہے۔

کھیتی کا نقصان اور اس پر ثواب

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ مُسْلِمٍ یَغْرِسُ غَرْسًا اَوْیَزْرَعُ زَرْعًا فَیَاْكُلُ مِنْهُ اِنْسَانٌ اَوْطَیْرٌ اَوْبَهِیْمَةٌ اِلَّا كَانَتْ لَهٗ صَدَقَةٌ متفق علیه- وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ جَابِرٍ وَمَاسُرِقَ مِنْهُ لَهٗ صَدَقَةٌ-

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیت بوتا ہے اور پھر انسان یا پرند اور چرند (مالک کی مرضی کے بغیر) اس میں سے کچھ کھاتے ہیں تو (یہ نقصان) مالک کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

"اور مسلمؒ کی ایک روایت میں، حضرت جابرؓ سے منقول ہے، یہ الفاظ بھی ہیں کہ اور اس میں سے جو کچھ چوری ہو جاتا ہے وہ مالک کے لئے صدقہ ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے درخت کا پھل وغیرہ یا اس کی کھیتی میں سے اگر کوئی انسان یا چرند پرند کسی بھی طرح یا کسی بھی سبب سے کچھ کھا لیتے ہیں تو مالک کو وہی ثواب ملتا ہے جو خدا کی راہ میں اپنا مال خیرات کرنے کا ثواب ہوتا ہے، گویا اس ارشاد گرامی کے ذریعے مالک کو نقصان مال پر تسلی دلائی جارہی ہے کہ وہ ایسے موقع پر صبر کرے کیونکہ اس نقصان کے بدلے میں اسے بہت زیادہ ثواب ملتا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب: اس موقع پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اعمال کا ثواب تو نیت پر موقوف ہے اور ظاہر ہے کہ صورت مذکورہ میں مالک کی طرف سے نیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو پھر ثواب کیسے ملتا ہے؟ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ کھیتی کا مقصود اصلی مطلقاً نوع انسانی و حیوانی کی حیات و بقاء ہے یعنی کاشتکار و کسان جب کھیت میں بیج ڈالتا ہے۔ یا درخت کا کوئی پودا لگاتا ہے تو اس کے پیش نظر کسی فرد کی تخصیص کے بغیر مطلقاً نوع انسانی و حیوانی کی ضروریات زندگی کی تکمیل کی نیت ہوتی ہے۔ اب اس کھیت یا درخت سے انسان و حیوان کا جو فرد بھی فائدہ اٹھائے گا خواہ وہ ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھائے یا جائز طریقے سے اس کی اجمالی نیت کا تعلق اس سے ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ جو شخص ناجائز طریقے سے فائدہ اٹھائے گا۔ وہ اپنے جرم کی سزا پائے گا۔ مگر

مالک کے حق میں اس کی اجمالی نیت کافی ہو جائے گی کیونکہ حصول ثواب کے لئے اجمالی نیت کافی ہے اس کے مالک کو نقصان کے بدلے میں صدقہ کا ثواب مل جائے گا۔

جانوروں کے ساتھ حسن سلوک ثواب کا باعث ہوتا ہے

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غُفِرَ لِامْرَأَةٍ مُوْمِسَةٍ مَرَّتْ بِكَلْبٍ عَلٰى رَأْسِ رَكِیٍّ یَلْهَثُ كَادَ یَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَاَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهٗ مِنَ الْمَآءِ فَغُفِرَ لَهَا بِذَالِكَ قِیْلَ اِنَّ لَنَا فِی الْبَهَائِمِ اَجْرًا قَالَ فِیْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک دن فرمایا کہ ایک بدکار عورت کی بخشش کردی گئی کیونکہ (ایک مرتبہ) اس کا گزر ایک ایسے کتے پر ہوا جو کنوئیں کے قریب کھڑا پیاس کی وجہ سے اپنی زبان نکال رہا تھا کہ پیاس کی شدت اسے ہلاک کردے، چنانچہ اس عورت نے اپنا چرمی موزہ اتار کر اسے اپنی اوڑھنی سے باندھا اور (اس کے ذریعے) کتے کے لئے پانی نکالا (اور اسے پلادیا) چنانچہ اس کے اس فعل کی بنا پر اس کی بخشش کردی گئی۔ صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ کیا جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں ہمارے لئے ثواب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں، ہر صاحب جگر تر (یعنی ہر جاندار) کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں ثواب ہے (خواہ انسان ہو یا جانور)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت مظہرؒ فرماتے ہیں کہ ہر جانور کے ساتھ حسن سلوک کرنے یعنی انہیں کھلانے پلانے کا ثواب ملتا ہے ہاں موذی جانور کہ جنہیں مار ڈالنے کا حکم ہے اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے سانپ اور بچھو وغیرہ۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو کسی شخص کے کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے بھی بخش دیتا ہے چنانچہ اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے۔

جانوروں کے ساتھ بے رحمی باعث گناہ ہے

(۱۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عُذِّبَتْ اِمْرَاَةٌ فِیْ هِرَّةٍ اَمْسَكَتْهَا حَتّٰی مَاتَتْ مِنَ الْجُوْعِ فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَا تُرْسِلُهَا فَتَاْكُلَ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمر اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ایک عورت کو (محض) اس لئے عذاب میں مبتلا کیا گیا کہ اس نے ایک بلی باندھے رکھی یہاں تک کہ وہ بھوک کی وجہ سے مر گئی، وہ عورت نہ تو اس بلی کو کچھ کھلاتی تھی اور نہ ہی اسے چھوڑتی تھی کہ وہ زمین کے جانوروں میں سے کچھ (یعنی چوہا وغیرہ) کھاتی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ جانوروں کے ساتھ بدسلوکی و بے رحمی کا معاملہ کرنا خدا کے عذاب میں اپنے آپ کو گرفتار کرنا ہے وہیں یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ صغیرہ گناہ پر بھی عذاب ہو سکتا ہے، اس عورت کا یہ فعل ظاہر ہے کہ صغیرہ گناہ ہی تھا چنانچہ عقائد کا یہ ایک مسئلہ ہے کہ صغیرہ گناہ پر عذاب ہونا خلاف امکان نہیں ہے۔

راستے سے تکلیف دہ چیز دور کرنے کا اجر

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ رَجُلٌ بِغُصْنِ شَجَرَةٍ عَلٰى ظَهْرِ طَرِیْقٍ فَقَالَ لَاُنَحِّیَنَّ هٰذَا عَنْ طَرِیْقِ الْمُسْلِمِیْنَ لَا یُؤْذِیْهِمْ فَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ایک شخص درخت کی ایک ٹہنی کے پاس سے گزرا جو راستے کے اوپر تھی (اور وہ راہ گیروں کو تکلیف پہنچاتی تھی) اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ میں اس ٹہنی کو مسلمانوں کے راستے سے صاف کردوں گا تاکہ انہیں تکلیف نہ پہنچے، چنانچہ وہ شخص جنت میں داخل کیا گیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے اس ٹہنی کو راستہ صاف کرنے کا ارادہ کیا اور پھر اسے صاف کردیا چنانچہ اسے جنت میں داخل کردیا گیا۔ یا یہ کہ وہ شخص اپنی نیک و باخلوص نیت ہی کی بناء پر جنت کا مستحق قرار پایا۔

(۱۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ رَأَيْتُ رَجُلاً يَتَقَلَّبُ فِي الْجَنَّةِ فِيْ شَجَرَةٍ قَطَعَهَا مِنْ ظَهْرِ الطَّرِيْقِ كَانَتْ تُؤْذِي النَّاسَ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم نے فرمایا میں نے ایک شخص کو دیکھا جو جنت میں پھرتا تھا اور چین کرتا تھا کیونکہ اس نے ایک ایسے درخت کو کاٹ ڈالا تھا جو راستے پر تھا اور لوگوں کو تکلیف پہنچاتا تھا۔" (مسلمؒ)

(۱۸) وَعَنْ اَبِيْ بَرْزَةَ قَالَ قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ عَلِّمْنِيْ شَيْئًا اَنْتَفِعُ بِهٖ قَالَ اِعْزِلِ الْاَذٰى عَنْ طَرِيْقِ الْمُسْلِمِيْنَ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ اِتَّقُوا النَّارَ فِيْ بَابِ عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ اِنْشَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت ابوبرزہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجئے جس کی وجہ سے میں (آخرت میں) فائدہ حاصل کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دہ چیزیں ہٹا دیا کرو۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور عدی بن حاتم کی روایت "اتقوا النار الخ" انشاء اللہ تعالیٰ ہم باب علامات النبوۃ میں نقل کریں گے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

رشتہ داروں سے حسن سلوک کا حکم

(۱۹) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ جِئْتُ فَلَمَّا تَبَيَّنْتُ وَجْهَهٗ عَرَفْتُ اَنَّ وَجْهَهٗ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ فَكَانَ اَوَّلُ مَاقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (رواه الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، چنانچہ میں نے آپ ﷺ کا روئے منور دیکھا، تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ ﷺ کا یہ چہرہ اقدس کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا، پھر آپ ﷺ کا ارشاد، جو سب سے پہلے آپ ﷺ نے فرمایا، یہ تھا کہ لوگو! سلام کو ظاہر کرو، (یعنی السلام علیکم بآواز بلند کہو تاکہ جس کو سلام کیا جا رہا ہے وہ سن لے نیز یہ کہ ہر ایک سے سلام کرو چاہے وہ آشنا ہو یا بے گانہ) اور (بھوکوں کو) کھانا کھلاؤ، رشتہ داروں سے حسن سلوک کرو، نیز رات میں اس وقت (تہجد) کی نماز پڑھو جب کہ لوگ سوتے ہوں (اگر یہ کرو گے) تو جنت میں سلامتی کے ساتھ (یعنی بغیر عذاب کے) داخل ہو گے۔"

(ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

غریبوں کو کھانا کھلانے کا حکم

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُعْبُدُوا الرَّحْمٰنَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَاَفْشُوا السَّلَامَ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (رواه الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ ؓبن عمرو ؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ رب العزت کی بندگی کرو (غریبوں کو) کھانا کھلاؤ، اور سلام کو ظاہر کرو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہوگے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

صدقہ، خاتمہ بخیر کی سعادت سے نوازتا ہے

(۲۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انس ؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا صدقہ کرنا، اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ دنیا میں عافیت و سکون کے ساتھ رکھتا ہے اور اس پر بلائیں نازل نہیں کرتا۔

"بری موت سے بچاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ و خیرات کرنے والا مرنے کے وقت بری حالت سے محفوظ رہتا ہے یعنی نہ تو اسے شیطان اپنے وسوسوں میں مبتلا کرپاتا ہے اور نہ وہ شخص کسی ایسی سخت بیماری و تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ضبط کا دامن چھوڑ کر کفر و کفران کی دلدل میں پھنس جائے، حاصل یہ کہ خدا کی خوشنودی و رضا کی خاطر اپنا مال و زر خرچ کرنے والا "خاتمہ بخیر" کی ابدی سعادت سے نوازا جاتا ہے۔

ہر نیکی صدقہ ہے

(۲۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ وَاِنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ اَنْ تَلْقٰى اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ وَاَنْ تُفْرِغَ مِنْ دَلْوِكَ فِيْ اِنَاءِ اَخِيْكَ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت جابر راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکیوں میں سے ایک نیکی یہ بھی ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی سے چہرہ کی بشاشت کے ساتھ ملاقات کرو اور اپنے کسی بھائی کے برتن میں اپنے ڈول سے پانی ڈال دو۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

(۲۳) وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَبَسُّمُكَ فِيْ وَجْهِ اَخِيْكَ صَدَقَةٌ وَاَمْرُكَ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ وَنَهْيُكَ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَاِرْشَادُكَ الرَّجُلَ فِيْ اَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ وَنَصْرُكَ الرَّجُلَ الرَّدِيْءَ الْبَصَرِ لَكَ صَدَقَةٌ وَاِمَاطَتُكَ الْحَجَرَ وَالشَّوْكَ وَالْعَظْمَ عَنِ الطَّرِيْقِ لَكَ صَدَقَةٌ وَاِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِيْ دَلْوِ اَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوذر غفاری ؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے مسلمان بھائی کے سامنے مسکرانا (یعنی کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا) صدقہ ہے۔ نیک کام کے لئے حکم کرنا صدقہ ہے۔ بری بات سے روکنا صدقہ ہے بے نشان زمین میں کسی کو راستہ بتانا صدقہ ہے (یعنی جہاں راستے کا کوئی نشان اور کوئی علامت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اپنا راستہ بھول جاتے ہیں) وہاں کسی راستہ بھولے ہوئے مسافر کو اس کا راستہ بتادینے سے صدقہ جیسا ثواب ملتا ہے کسی اندھے یا کمزور نظر شخص کی مدد کرنی، (بایں طور کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے لے جانا) صدقہ ہے، راستے سے پتھر، کانٹا اور ہڈی ہٹادینا صدقہ ہے اور اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی بھر دینا صدقہ ہے۔ (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ سے معلوم ہوا کہ جب اپنے ڈول میں پانی بھر دینا صدقہ جیسے ثواب کا باعث ہے تو اس شکل میں جب کہ

کسی کے پاس ڈول ہی موجود نہ ہو اسے اپنے ڈول سے پانی دینا اس سے کہیں زیادہ ثواب کا باعث ہو گا۔

کنواں کھدوانا بہترین صدقہ ہے

(۲۴) وَعَنْ سَعْدِبْنِ عُبَادَةَ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ فَاَيُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ قَالَ الْمَاءُ فَحَفَرَ بِئْرًا وَقَالَ هٰذِهٖ لِاُمِّ سَعْدٍ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت سعد بن عبادہؓ راوی ہیں کہ (میں نے) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اُم سعد (یعنی میری ماں) کا انتقال ہو گیا ہے (ان کے ایصال ثواب کے لئے) کونسا صدقہ بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "پانی" چنانچہ حضرت سعدؓ نے (آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سن کر) کنواں کھودا اور کہا کہ یہ اُم سعد (یعنی میری ماں) کے لئے صدقہ ہے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: یوں تو خدا نے جو بھی چیز پیدا کی ہے وہ بندہ کے حق میں خدا کی نعمت ہے لیکن انسانی زندگی میں پانی کو جو اہمیت ہے اس کے پیش نظر بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ خدا کی ان بڑی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے جن کے بغیر انسانی زندگی کی بقاء ممکن نہیں پھر مخلوق خدا کے لئے اس کی ضرورت اتنی وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ قدم قدم پر انسانی زندگی اس کے وجود اور اس کی فراہمی کی محتاج ہوتی ہے، چنانچہ کیا دنیا اور کیا آخرت سب ہی امور کے لئے اس کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے خاص طور پر ان شہروں اور علاقوں میں پانی کی اہمیت کہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے جو گرم ہوتے ہیں جہاں پانی کی فراہمی آسانی سے نہیں ہوتی، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے "پانی" کو بہتر صدقہ ارشاد فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا ہے کہ پانی کے حصول کا ہر ذریعہ خواہ کنواں ہو یا نل و تالاب، بہترین صدقہ جاریہ ہے کہ جب تک وہ ذریعہ موجود رہتا ہے اس کو قائم کرنے والا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے نوازا جاتا ہے۔

غرباء و مساکین کو کپڑا پہنانے کی فضیلت

(۲۵) وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلٰى عُرًى كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ اَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰى جُوْعٍ اَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰى مُسْلِمًا عَلٰى ظَمَاءٍ سَقَاهُ اللّٰهُ مِنَ الرَّحِيْقِ الْمَخْتُوْمِ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو مسلمان کسی ننگے مسلمان کو کپڑا پہنائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے سبز لباسوں میں سے لباس پہنائے گا، جو مسلمان کسی بھوکے مسلمان کو کھانا کھلائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے میوے کھلائے گا اور جو مسلمان کسی پیاسے مسلمان کی پیاس بجھائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے مہر بند شراب سے سیراب کرے گا۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: "مہر بند شراب" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت کی وہ شراب پلائے گا جو سیل و مہر کے ذریعے تغیر و تبدل سے محفوظ اور اس شخص کے لئے مخصوص ہے جس کے علاوہ اسے اور کوئی نہیں پی سکتا، گویا اس سے شراب کی عمدگی و نفاست کی طرف اشارہ فرمایا جارہا ہے کہ جس طرح جو چیز نہایت اعلیٰ و نفیس اور عمدہ ہوتی ہے، اس کو مہر بند کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ زمانہ کی سرد گرم ہوا اور دوسروں کی دستبرد سے محفوظ رہے اسی طرح وہ شراب بھی نہایت اعلیٰ و نفیس اور عمدہ ہے کہ اس دنیا میں اس کے ذائقے اور اس کی نفاست کا صحیح ادراک بھی نہیں کیا جاسکتا پھر یہ کہ اس پر مہر بھی مشک کی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتَامُهٗ مِسْكٌ

"ان کو شراب خالص سربمہر پلائی جائے گی جس کی مہر مشک کی ہو گی۔"

یعنی اس مشروب کو موم اور لاکھ وغیرہ کے ذریعے نہیں بلکہ مشک کے ذریعے مہر بند کیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات بھی ہیں

(۲۶) وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِى الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ ثُمَّ تَلَا لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ الْآيَةِ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت فاطمہؓ بنت قیس کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مال وزر میں زکوٰۃ کے علاوہ اور "حق" بھی ہیں، پھر آپ ﷺ نے یہ پوری آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ نیکی یہی نہیں ہے کہ اپنے منہ کو مشرق و مغرب کی طرف متوجہ کرو الخ۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مال کی زکوٰۃ دینا تو فرض ہے ہی کہ وہ ضرور دینی چاہئے۔ مگر زکوٰۃ کے علاوہ کچھ اور نفل صدقات بھی مستحب ہیں کہ ان کا دیا جانا بھی بہت زیادہ ثواب کا باعث ہے اور وہ صدقات یہ ہیں کہ سائل اور قرض مانگنے والے کو محروم ومایوس نہ کیا جائے گھر گرہستی کا سامان مثلاً ہانڈی ودیگچی اور پیالہ وغیرہ یا اور ایسا وہ سامان جو اپنے قبضے وملکیت میں ہو اگر کوئی عاریۃً مانگے تو اسے دینے میں دریغ نہ کیا جائے کسی کو پانی، نمک، اور آگ لینے سے منع نہ کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

"حق" سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو مذکورہ آیت میں بیان کیا گیا، یعنی اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافر کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا معاملہ کرنا، اور غلام کو آزاد کرنے کے لئے مال خرچ کرنا وغیرہ، مذکورہ بالا آیت پوری یوں ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ۔

"نیکی یہی نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور فرشتوں پر، اور (خدا کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں۔ اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔"

آنحضرت ﷺ نے یہ آیت اس لئے بطور استناد تلاوت فرمائی کہ اس میں حق تعالیٰ نے پہلے تو ان مؤمنین کی تعریف بیان فرمائی ہے جو اپنے رشتہ داروں، یتیموں اور مساکین وغیرہ پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں اس کے بعد نماز پڑھنے والوں اور زکوٰۃ دینے والوں کی تعریف بیان کی لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ "مال خرچ کرنا" زکوٰۃ دینے کے علاوہ ہے جو صدقہ نفل کہلاتا ہے، گویا آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا تھا کہ مال وزر کے بارے میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حق (یعنی صدقات نافلہ) ہیں وہ اس آیت سے ثابت ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے صدقات نافلہ کو ذکر کیا، اس کے بعد صدقہ واجب یعنی زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا۔

پانی و نمک دینے سے انکار نامناسب ہے

(۲۷) وَعَنْ بُهَيْسَةَ عَنْ اَبِيْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الشَّيْءُ الَّذِىْ لَا يَحِلُّ مَنْعُهٗ قَالَ الْمَاءُ قَالَ يَانَبِيَّ اللّٰهِ مَا الشَّيْءُ الَّذِىْ لَا يَحِلُّ مَنْعُهٗ قَالَ الْمِلْحُ قَالَ يَانَبِيَّ اللّٰهِ مَا الشَّيْءُ الَّذِىْ يَحِلُّ مَنْعُهٗ قَالَ اَنْ تَفْعَلَ الْخَيْرَ خَيْرٌ لَّكَ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت بہیسہؓ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ انہوں نے (یعنی ان کے والد نے) عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! وہ کونسی چیز ہے جس سے منع کرنا اور اس کے دینے سے انکار کرنا حلال نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "پانی" انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اور کونسی چیز ہے جس کو دینے سے انکار کرنا حلال نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "نمک" انہوں نے پھر عرض کیا کہ

یارسول اللہ ﷺ! وہ کونسی چیز ہے جس سے منع کرنا حلال ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ بھلائی کرنا، جو تمہارے لئے بہتر ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "پانی" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری زمین میں کنواں و تالاب ہے یا تمہارے گھر میں نل وغیرہ ہے اس سے کوئی شخص پانی لیتا ہے تو اسے پانی لینے سے روکنا مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح اگر تم میں سے کوئی شخص پانی مانگتا ہے اور تمہارے پاس تمہاری ضرورت سے زائد پانی موجود ہے تو اسے دینے سے انکار نہ کرو، اسی طرح نمک دینے سے انکار نہ کرو۔ اسی طرح نمک دینے سے انکار کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر کوئی شخص تم سے نمک مانگے تو اس کے دینے سے انکار نہ کرو، کیونکہ لوگوں کو نمک کی بہت زیادہ احتیاج و ضرورت رہتی ہے اور لوگ اسے لیتے دیتے ہی رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ نمک جیسی چیز سے انکار کرنا ویسے بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ انتہائی عام اور سستی چیز ہے جس کی کوئی وقعت و قدر نہیں ہوتی۔

حدیث کا آخری جملہ تمام بھلائیوں اور نیکیوں پر حاوی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم سے جو کچھ بھی ہو سکے دیتے رہو، اور جو نیکی بھلائی کر سکو کرو، نیکی و بھلائی کے کاموں سے نہ تو اپنے آپ کو باز رکھنا درست ہے اور نہ دوسروں کو نیکی و بھلائی سے روکنا حلال ہے، گویا حدیث میں پہلے چند بھلائیوں کو بطور خاص ذکر کرنے کے بعد یہ جملہ ارشاد فرمانا "تعمیم بعد تخصیص" ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ "لایحل" مفہوم کے اعتبار سے "لاینبغی" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اس طرح حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان چیزوں سے منع کرنا اور ان کے دینے سے انکار کرنا مناسب نہیں ہے۔

بنجر زمین کو قابل کاشت بنانا کارِ ثواب ہے

(۲۸) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا مَيْتَةً فَلَهٗ فِيْهَا اَجْرٌ وَ مَا اَكَلَتِ الْعَافِيَةُ مِنْهُ فَهُوَ لَهٗ صَدَقَةٌ (رواہ النسائی والدارمی)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص خشک زمین کو آباد کرے (یعنی افتادہ و بنجر زمین کو قابل کاشت بنائے) تو اس کے لئے اس کام میں ثواب ہے اور اگر اس کی کھیتی میں سے جانور یا آدمی کچھ کھالیں تو اس کے لئے وہ صدقہ ہے (بشرطیکہ وہ اس پر صابر و شاکر ہو)۔" (دارمیؒ)

کوئی چیز عاریۃً یا قرض دینے کی فضیلت

(۲۹) وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَنَحَ مِنْحَةَ لَبَنٍ اَوْ وَرِقٍ اَوْ هَدٰى زُقَاقًا كَانَ لَهٗ مِثْلُ عِتْقِ رَقَبَةٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت براءؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص دودھ کا جانور عاریۃً دے یا چاندی (یعنی روپیہ وغیرہ) قرض دے یا کسی راستہ بھولے ہوئے اور اندھے کو کوچہ و راستہ میں راہ بتائے تو اس کو ایک غلام آزاد کرنے کی مانند ثواب ہوگا۔" (ترمذیؒ)

نصائح نبوی ﷺ

(۳۰) وَعَنْ اَبِيْ جُرَيٍّ جَابِرِ بْنِ سُلَيْمٍ قَالَ أَتَيْتُ الْمَدِيْنَةَ فَرَاَيْتُ رَجُلًا يَصْدُرُ النَّاسُ عَنْ رَاْيِهٖ لَا يَقُوْلُ شَيْئًا اِلَّا صَدَرُوْا عَنْهُ قُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالُوْا هٰذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ قُلْتُ عَلَيْكَ السَّلَامُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَّتَيْنِ قَالَ لَا تَقُلْ عَلَيْكَ السَّلَامُ عَلَيْكَ السَّلَامُ تَحِيَّةُ الْمَيِّتِ قُلِ السَّلَامُ عَلَيْكَ قُلْتُ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ الَّذِيْ اِنْ اَصَابَكَ ضُرٌّ فَدَعَوْتَهٗ كَشَفَهٗ عَنْكَ وَاِنْ اَصَابَكَ عَامٌ سَنَةٍ فَدَعَوْتَهٗ اَنْبَتَهَا لَكَ وَاِذَا كُنْتَ بِاَرْضٍ قَفْرٍ اَوْ فَلَاةٍ فَضَلَّتْ رَاحِلَتُكَ فَدَعَوْتَهٗ رَدَّهَا عَلَيْكَ قُلْتُ اِعْهَدْ اِلَيَّ قَالَ لَا تَسُبَّنَّ اَحَدًا قَالَ فَمَا سَبَبْتُ بَعْدَهٗ حُرًّا وَلَا عَبْدًا وَلَا بَعِيْرًا وَلَا شَاةً قَالَ وَلَا تَحْقِرَنَّ شَيْئًا

مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَاَنْ تُكَلِّمَ اَخَاكَ وَاَنْتَ مُنْبَسِطٌ اِلَيْهِ وَجْهُكَ اِنَّ ذَالِكَ مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَارْفَعْ اِزَارَكَ اِلٰى نِصْفِ السَّاقِ فَاِنْ اَبَيْتَ فَاِلَى الْكَعْبَيْنِ وَاِيَّاكَ وَاِسْبَالَ الْاِزَارِ فَاِنَّهَا مِنَ الْمَخِيْلَةِ وَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمَخِيْلَةَ وَاِنِ امْرُءٌ شَتَمَكَ وَعَيَّرَكَ بِمَا يَعْلَمُ فِيْكَ فَلَا تُعَيِّرْهُ بِمَا تَعْلَمُ فِيْهِ فَاِنَّمَا وَبَالُ ذٰلِكَ عَلَيْهِ۔ رَوَاهُ اَبُوْ دَاوُدَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ مِنْهُ حَدِيْثَ السَّلَامِ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَيَكُوْنُ لَكَ اَجْرُ ذَالِكَ وَوَبَالُهُ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت ابی جری کہ جن کا نام، جابر ابن سلیم ہے کہتے ہیں کہ جب میں مدینہ آیا تو میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ لوگ ان کی عقل پر بھروسہ کرتے ہیں (یعنی ان کے کہنے پر لوگ عمل کرتے ہیں) چنانچہ خود راوی اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ) وہ جو کچھ بھی فرماتے ہیں لوگ اس پر عمل کرتے ہیں میں نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے (آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر) دو مرتبہ یہ کہا "علیک السلام" آپ (ﷺ) پر سلام ہو۔ اے رسول خدا (ﷺ)۔ رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ "علیک السلام" نہ کہو، کیونکہ "علیک السلام" کہنا میت کے لئے دعا ہے البتہ "السلام علیک" کہو! (کیونکہ اس طرح افضل ہے) اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ آپ (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں اللہ کا رسول ہوں، وہ اللہ کہ اگر تمہیں کوئی تکلیف و مصیبت پہنچے اور تم اسے پکارو تو وہ تمہاری تکلیف و مصیبت کو دور کرے اگر تمہیں قحط سالی اپنی لپیٹ میں لے اور تم اسے پکارو تو زمین میں تمہارے لئے سبزہ (غلہ وغیرہ) اگا دے اور اگر تم زمین کے کسی ایسے حصے میں اپنی سواری گم کر بیٹھو کہ جہاں نہ پانی کا نام و نشان ہو نہ درخت کا، یا کہ کوئی ایسا جنگل ہو جو آبادی سے دور ہو اور پھر تم اسے پکارو تو وہ تمہاری سواری تمہارے پاس واپس بھیج دے۔ جابر رضی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرما دیجئے! آپ ﷺ نے فرمایا کسی کو برا نہ کہو۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کسی کو برا نہیں کہا، نہ آزاد کو، نہ غلام کو، نہ اونٹ کو اور نہ بکری کو (یعنی کسی انسان کو برا کہنا کیسا، حیوانات کو بھی کبھی برا نہ کہا جیسا کہ عام لوگوں کی عادت ہوتی ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ کسی بھی نیکی کو حقیر نہ جانو، (یعنی اگر تم کسی کے ساتھ نیکی کرو یا کوئی دوسرا تمہارے ساتھ کوئی نیکی کرے اور وہ نیکی کتنے ہی کم تر درجے کی کیوں نہ ہو اسے حقیر نہ جانو بلکہ اگر کوئی تمہارے ساتھ کم تر درجے کی بھی نیکی کرے تو اسے بہت جانو اور اس کا شکریہ ادا کرو اور خود تم سے جو بھی نیکی ہو سکے اس کے کرنے کو غنیمت جانو اور جب تم اپنے کسی بھائی سے ملاقات کرو تو خندہ پیشانی اختیار کرو (یعنی جب تم کسی سے ملو، تو اس سے تواضع اور خوش کلامی سے پیش آؤ تا کہ تمہارے اس حسن خلق کی وجہ سے اس کا دل خوش ہو) کیونکہ یہ بھی ایک نیکی ہے اور تم اپنی ازار (یعنی پاجامہ و لنگی وغیرہ) کو نصف پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر اتنا اونچا رکھنا تم پسند نہ کر سکو تو ٹخنوں تک رکھو مگر (ٹخنوں سے نیچے) لٹکانے سے بچو! اس لئے کہ (ٹخنوں سے نیچے) ازار لٹکانا تکبر کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔ نیز اگر کوئی شخص تمہیں گالی دے اور تمہارے کسی ایسے عیب پر تمہیں عار دلائے جسے وہ جانتا ہے تو تم (انتقاماً) اس کے کسی عیب پر کہ جسے تم جانتے ہو اسے عار نہ دلاؤ کیونکہ اس کا گناہ اسے ہی ملے گا۔ (ابوداؤد) ترمذی نے اس روایت کا صرف ابتدائی حصہ نقل کیا ہے جس میں "سلام" کا ذکر ہے (باقی روایت نقل نہیں کی ہے) اور (ترمذی کی) ایک دوسری روایت میں "اس کا گناہ اسے ہی ملے گا" کے بجائے یہ الفاظ ہیں کہ تمہارے لئے اس کا ثواب ہو گا اور اس کے لئے اس کا گناہ۔"

تشریح: حضرت جابر نے دو مرتبہ سلام اس لئے کیا کہ یا تو آنحضرت ﷺ نے پہلا سلام سنا نہیں ہو گا یا پھر یہ کہ آپ ﷺ نے ان کو سلام کا طریقہ سکھانے کی غرض سے پہلے سلام کا جواب نہیں دیا ہو گا۔

ارشاد گرامی "علیک السلام" نہ کہو نہی تنزیہی کے طور پر ہے، نیز حدیث کے الفاظ "علیک السلام کہنا میت کے لئے دعا ہے، سے بظاہر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص میت کے پاس جائے تو علیک السلام کہے، السلام علیک نہ کہے جیسا کہ کسی زندہ شخص کے لئے کہا جاتا ہے، حالانکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ میت کے لئے بھی "السلام علیک" کہنا ہی مسنون ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب زیارت موتی کے لئے تشریف لے جاتے تو "السلام علیکم" فرماتے تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ کے ارشاد "علیک

السلام کہنا میت کے لئے دعا ہے" کے معنی یہ بیان کئے جائیں گے کہ ایام جاہلیت میں "علیک السلام" میت کے لئے دعا تھی۔ چنانچہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ عرب میں پہلے یہ معمول تھا کہ جب کوئی قبر پر جاتا تو وہاں سلام کے لئے یہی کہتا تھا کہ "علیک السلام" لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعے اسی طرف اشارہ فرمایا کہ "علیک السلام" کہنا اہل عرب کے معمول وعادت کے مطابق مردہ کے لئے دعا ہے نہ یہ کہ اس ارشاد سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ میت کو اس طرح سلام کیا جائے۔

حضرت جابرؓ کا یہ کہنا ہے کہ اس کے بعد میں نے کسی کو برا نہیں کہا۔ سدباب اور احتیاط کے طور پر ہے ورنہ تو جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے علماء لکھتے ہیں کہ کسی ایسے شخص کو برا کہنا کہ جس کا کفر کی حالت میں مرنا یقینی طور پر معلوم ہو، جائز ہے، تاہم افضل اور بہتر یہی ہے کہ اپنی زبان کو اللہ رب العزت کے ذکر ہی میں مشغول رکھا جائے۔ کسی کو برا نہ کہا جائے اس لئے کہ ماسوی اللہ میں مشغول ہونا نقصان ہی کا باعث ہے جب کہ کسی کو برا نہ کہنے میں کوئی حرج و نقصان نہیں ہے بلکہ علماء تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ شیطان کو بھی لعنت نہ کرنے میں کوئی ضرر نہیں ہے۔

جس طرح پائجامہ اور لنگی وغیرہ ٹخنوں کے نیچے لٹکانا ممنوع ہے اسی طرح کرتہ وغیرہ بھی ٹخنوں سے نیچے کرنا ممنوع ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہیں گالی دیتا ہے یا تمہارے کسی عیب سے تمہیں عار دلا کر شرمندہ و ذلیل کرنا چاہتا ہے تو تمہارا اس میں کیا نقصان ہے؟ وہ خود ہی گناہ گار ہو گا، لہٰذا تم بھی اس کی طرح اپنی زبان خراب کر لے اور اسے برا بھلا کہہ کر خواہ مخواہ کے لئے اپنے ذمہ کیوں وبال لیتے ہو۔

بدی رابدی سہل باشد جزاء
اگر مردی اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَا

روایت کے آخر میں وَفِیْ رِوَایَۃٍ الخ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترمذیؒ نے بھی یہ پوری روایت نقل کی ہے چنانچہ بعض حواشی میں لکھا ہوا ہے کہ ترمذیؒ نے بھی پوری روایت نقل کی ہے کہ اگرچہ اس کے الفاظ مختلف ہیں یہاں جو روایت نقل کی گئی ہے وہ ابوداؤدؒ کی نقل کردہ روایت کے الفاظ ہیں۔

جو خدا کی راہ میں کر دیا، وہ باقی ہے اور جو موجود رہا وہ فانی ہے

(۳۱) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهُمْ ذَبَحُوْا شَاةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَابَقِيَ مِنْهَا قَالَتْ مَابَقِيَ اِلَّا كَتِفُهَا قَالَ بَقِيَ كُلُّهَا غَيْرُ كَتِفِهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ۔

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ صحابہؓ نے یا اہل بیتؓ نے) ایک بکری ذبح کی، (جب اس کا گوشت تقسیم ہو چکا تو) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس میں سے کیا باقی رہ گیا ہے؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ بجز شانہ کے اور کچھ باقی نہیں رہا (یعنی اس کا سب گوشت تقسیم کر دیا ہے صرف شانہ باقی رہ گیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا۔ بجز شانہ کے اور سب باقی ہے۔ (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے)۔"

تشریح: "بجز شانہ کے اور سب باقی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اصل میں تو گوشت کا وہی حصہ باقی ہے جو لوگوں کو تقسیم کر دیا گیا ہے بایں طور کہ آخرت میں انہی کا ثواب محفوظ اور ثابت ہو گیا اس کے برخلاف جو حصہ گھر میں موجود رہ گیا ہے وہ فانی ہے، گویا اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ۔

"جو کچھ تمہارے پاس ہے فانی ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔"

دوسروں کی ستر پوشی کرنے والے کا خدا محافظ

(۳۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ مُسْلِمٍ كَسَامُسْلِمًا ثَوْبًا اِلَّا كَانَ فِيْ حِفْظٍ مِنَ اللّٰهِ مَادَامَ عَلَيْهِ مِنْهُ خِرْقَةٌ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کپڑا (یعنی پاجامہ، کرتہ اور چادر وغیرہ) پہناتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زبردست حفاظت میں رہتا ہے۔ جب تک کہ اس مسلمان کے بدن پر اس کے کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی ہوتا ہے۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: یہ دنیا کا فائدہ ہے کہ اس کے دیئے ہوئے کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی جب تک اس مسلمان کے بدن پر رہتا ہے وہ اللہ رب العزت کی حفاظت و امان میں رہتا ہے مگر آخرت میں جو اس کو ثواب ملے گا وہ ان گنت ہے۔

پوشیدہ طور پر صدقہ دینے کی فضیلت

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ يَرْفَعُهُ قَالَ ثَلَاثَةٌ يُحِبُّهُمُ اللّٰهُ رَجُلٌ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَتْلُوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَرَجُلٌ يَتَصَدَّقُ بِصَدَقَةٍ بِيَمِيْنِهِ يُخْفِيْهَا أُرَاهُ قَالَ مِنْ شِمَالِهِ وَرَجُلٌ كَانَ فِيْ سَرِيَّةٍ فَانْهَزَمَ اَصْحَابُهُ فَاسْتَقْبَلَ الْعَدُوَّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَيْرُ مَحْفُوْظٍ اَحَدُ رُوَاتِهِ اَبُوْبَكْرِ بْنُ عَيَّاشٍ كَثِيْرُ الْغَلَطِ

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بطریق مرفوع (یعنی آنحضرت ﷺ سے) نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ تین شخص ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے ایک تو وہ شخص جو رات کے وقت کھڑا ہوتا ہے اور کتاب اللہ کی تلاوت کرتا ہے، اور دوسرا وہ شخص جو (نفل) صدقہ اپنے داہنے ہاتھ سے دے اور اسے چھپائے، راوی کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا (اور اسے) بائیں ہاتھ سے (چھپائے) اور تیسرا وہ شخص جو میدان جنگ میں اس وقت دشمن کے سامنے ڈٹ گیا جب کہ اس کے ساتھیوں کو شکست ہوگئی۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ روایت غیر محفوظ (ضعیف) ہے۔ اس کے ایک راوی ابوبکر ابن عیاش ہیں جو بہت زیادہ غلطی کرتے ہیں۔"

تشریح: "بیمینہ" سے صدقہ دینے کے ادب کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ صدقہ کا مال اپنے داہنے ہاتھ سے دیا جائے یا یہ کہ پہلے اس شخص کو صدقہ و خیرات کا مال دے جو اپنے دائیں طرف ہو۔

"بائیں ہاتھ سے چھپائے" کا مطلب یہ ہے کہ جب دائیں ہاتھ سے صدقہ کا مال دے تو بائیں ہاتھ کو بھی اس کی خبر نہ ہو یہ دراصل کمال پوشیدگی کے لئے مبالغہ کے طور پر فرمایا گیا ہے یعنی صدقہ کا مال انتہائی پوشیدگی کے ساتھ دیا جائے تاکہ صدقہ کا مال لینے والا عام نظروں میں اپنی کمتری محسوس نہ کرے، یا پھر ان الفاظ کے یہ معنی ہوں گے کہ صدقہ کا مال جب دائیں طرف والے کو دے تو اس کی خبر بائیں طرف والے کو بھی نہ ہونی چاہئے۔ حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء و خوشنودی کی خاطر اور ریاء و نمائش سے بچنے کے لئے اس طرح چھپا کر دینا بہت زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

(۳۴) وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ يُحِبُّهُمُ اللّٰهُ وَثَلَاثَةٌ يُبْغِضُهُمُ اللّٰهُ فَاَمَّا الَّذِيْنَ يُحِبُّهُمُ اللّٰهُ فَرَجُلٌ اَتٰى قَوْمًا فَسَاَلَهُمْ بِاللّٰهِ وَلَمْ يَسْاَلْهُمْ لِقَرَابَةٍ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُمْ فَمَنَعُوْهُ فَتَخَلَّفَ رَجُلٌ بِاَعْيَانِهِمْ فَاَعْطَاهُ سِرًّا لَا يَعْلَمُ بِعَطِيَّتِهِ اِلَّا اللّٰهُ وَالَّذِيْ اَعْطَاهُ وَقَوْمٌ سَارُوْا لَيْلَتَهُمْ حَتّٰى اِذَا كَانَ النَّوْمُ اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِمَّا يُعْدَلُ بِهِ فَوَضَعُوْا

رُؤُوْسَهُمْ فَقَامَ يَتَمَلَّقُنِىْ وَيَتْلُوْا اٰيَاتِىْ وَرَجُلٌ كَانَ فِىْ سَرِيَّةٍ فَلَقِىَ الْعَدُوَّ فَهُزِمُوْا فَاَقْبَلَ بِصَدْرِهٖ حَتّٰى يُقْتَلَ اَوْيُفْتَحَ لَهٗ وَالثَّلَاثَةُ الَّذِيْنَ يُبْغِضُهُمُ اللّٰهُ الشَّيْخُ الزَّانِىْ وَالْفَقِيْرُ الْمُخْتَالُ وَالْغَنِىُّ الظَّلُوْمُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَالنَّسَائِىُّ۔

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تین شخص ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے اور تین شخص ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ دشمن رکھتا ہے، چنانچہ وہ اشخاص کہ جنہیں اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے ان میں سے ایک تو وہ شخص ہے کہ جس نے ایسے شخص کو صدقہ دیا جو ایک جماعت کے پاس آیا اور اس سے خدا کی قسم دے کر کچھ مانگا (یعنی یوں کہا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ مجھے اتنا مال یا اتنی چیز دو) اس نے جماعت والوں سے حق قرابت کی وجہ سے دیا جو اس کے اور جماعت کے درمیان تھا۔ مگر جماعت والوں نے اسے کچھ بھی نہیں دیا، چنانچہ ایک شخص نے (یعنی صدقہ دینے والے نے) جماعت کو (کہ وہ بھی اسی جماعت کا ایک فرد تھا) پس پشت ڈالا اور آگے بڑھ کر سائل کو پوشیدہ طور پر دے دیا، سوائے خدا کے اور اس شخص کے کہ جسے اس نے دیا اور کسی نے اس کے عطیہ کو نہیں جانا، اور دوسرا وہ شخص ہے، جو جماعت کے ساتھ تمام رات چلا یہاں تک کہ جب ان کے لئے نیند ان تمام چیزوں سے زیادہ جو نیند کے برابر ہیں پیاری ہوئی تو جماعت کے تمام فرد سو گئے، مگر وہ شخص کھڑا ہوا (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) اور میرے سامنے گڑگڑانے لگا اور میری آیتیں (یعنی قرآن کریم پڑھنے لگا (یعنی میری عبادت و مناجات میں مشغول ہو گیا) اور تیسرا وہ شخص ہے جو لشکر میں شامل تھا، جب دشمن سے مقابلہ ہوا تو اس کے لشکر کو شکست ہو گئی مگر وہ شخص دشمن کے مقابلے پر سینہ سپر ہو گیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا یا فتح یاب اور وہ تین شخص جو اللہ کے نزدیک مبغوض ہیں ان میں سے ایک تو وہ شخص ہے جو بوڑھا ہونے کے باوجود زنا کرے، دوسرا شخص تکبر کرنے والا فقیر ہے اور تیسرا شخص دولت مند ظلم کرنے والا ہے (یعنی وہ شخص دولت مند ہوتے ہوئے قرض دینے والے کو قرض کی ادائیگی نہ کرے یا دوسروں کے ساتھ اور کسی ظلم کا معاملہ کرے)۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حدیث کی ابتداء جس اسلوب سے ہوئی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے مگر بعد کے اسلوب یعنی حدیث کے الفاظ يَتَمَلَّقُنِىْ (اور میرے سامنے گڑگڑانے لگا) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ ارشاد نبوی نہیں ہے بلکہ کلام الٰہی (یعنی حدیث قدسی) ہے اسلوب کے اس اختلاف کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ یہ حدیث حقیقت میں تو ارشاد نبوی ﷺ ہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے نبی ﷺ سے وہ کیفیت بیان کی جو اس کے اور اس کے بندے کے درمیان واقع ہوتی ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر اس اصل کیفیت کو بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا بعینہٖ قول نقل فرما دیا۔

اَلشَّيْخُ الزَّانِىْ (جو بوڑھا ہونے کے باوجود زنا کرے) میں لفظ "شیخ" سے یا تو اس کے اصل معنی یعنی "بوڑھا" ہی مراد ہے یا پھر کہا جائے گا کہ یہاں "شیخ" سے "بکر" (کنوارے) کی ضد محصن (شادی شدہ) مراد ہے خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان، جیسا کہ اس آیت منسوخ میں ہے:

اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔

"شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت جب دونوں زنا کریں تو دونوں کو سنگسار کر دو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سزا ضروری ہے اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔"

میں "شیخ" سے "شادی شدہ" مراد ہے خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا۔

"تکبر کرنے والے فقیر" کو بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض قرار دیا گیا ہے، لیکن فقیر کا وہ تکبر مستثنیٰ ہے جو کسی متکبر کے ساتھ ہو، بلکہ ایسے تکبر کو تو "صدقہ" قرار دیا گیا ہے یعنی اگر کوئی فقیر کسی متکبر کے ساتھ تکبر کرے تو وہ خدا کے نزدیک مبغوض نہیں ہو گا۔ بلکہ اسے صدقہ کا ثواب ملے گا، چنانچہ حضرت بشیر ابن حارث کے بارے میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ

کو خواب میں دیکھا تو ان سے عرض کیا کہ "اے امیر المؤمنین! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے"۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "مالداروں کو ثواب خداوندی کے حصول کی خاطر فقیروں سے مہربانی کا معاملہ کرنا بہت ہی بہتر ہے اور فقیروں کو خدا پر توکل و اعتماد کے جذبے سے مالداروں سے تکبر کا معاملہ کرنا بہت بہتر ہے۔

اوپر جن بری خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وہ سب ہی کے حق میں بری ہیں، لیکن ان تینوں کے حق میں چونکہ بہت ہی زیادہ بری ہیں جس کا سبب ظاہر ہے اس لئے یہ خدا کے دشمن قرار دیئے گئے ہیں۔

(۳۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْاَرْضَ جَعَلَتْ تَمِيْدُ فَخَلَقَ الْجِبَالَ فَقَالَ بِهَا عَلَيْهَا فَاسْتَقَرَّتْ فَعَجِبَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ شِدَّةِ الْجِبَالِ فَقَالُوْا يَا رَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ قَالَ نَعَمْ اَلْحَدِيْدُ فَقَالُوْا يَا رَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْحَدِيْدِ قَالَ نَعَمْ اَلنَّارُ فَقَالُوْا يَا رَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ النَّارِ قَالَ نَعَمِ الْمَاءُ فَقَالُوْا يَا رَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْمَاءِ قَالَ نَعَمِ الرِّيْحُ فَقَالُوْا يَا رَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الرِّيْحِ قَالَ نَعَمِ ابْنُ اٰدَمَ تَصَدَّقَ صَدَقَةً بِيَمِيْنِهٖ يُخْفِيْهَا مِنْ شِمَالِهٖ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ مُعَاذٍ الصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ فِيْ كِتَابِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کی تو وہ ہلنے لگی پھر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا فرما کر انہیں زمین پر کھڑا کیا، چنانچہ زمین ٹھہر گئی فرشتوں کو پہاڑ کی سختی سے بڑا تعجب ہوا، وہ کہنے لگے کہ ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ پروردگار، نے فرمایا ہاں لوہا ہے (کہ وہ پتھر کو بھی توڑ ڈالتا ہے) انہوں نے پوچھا کہ ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے؟ پروردگار نے فرمایا ہاں! آگ ہے (کہ وہ لوہے کو بھی پگھلا دیتی ہے) پھر انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز آگ سے بھی زیادہ سخت ہے؟ پروردگار نے فرمایا ہاں پانی ہے (کہ وہ آگ کو بھی بجھا دیتا ہے) پھر انہوں نے پوچھا کہ ہمارے پروردگار کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز پانی سے بھی زیادہ سخت ہے؟ پروردگار نے فرمایا ہاں! ہوا ہے (کہ وہ پانی کو بھی خشک کر دیتی ہے) پھر انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز ہوا سے بھی زیادہ سخت ہے؟ پروردگار نے فرمایا ہاں! اور وہ ابن آدم کا صدقہ دینا ہے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنے دائیں ہاتھ سے (اس طرح) مال خرچ کرتا ہے کہ اسے بائیں ہاتھ سے بھی چھپاتا ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "ابن آدم کا صدقہ دینا" اس فعل کو اس لئے سب سے زیادہ سخت فرمایا ہے کہ انتہائی پوشیدگی کے ساتھ کسی کو صدقہ دینے میں نفس امارہ کی مخالفت، طبیعت و مزاج پر جبر، اور شیطان ملعون کی مدافعت لازم آتی ہے جب کہ اس کے علاوہ مذکورہ بالا چیزوں یعنی پہاڑ، لوہا اور آگ وغیرہ میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

چھپا کر صدقہ دینے میں نفس کی مخالفت اور شیطان کی مدافعت بایں طور لازم آتی ہے کہ فطری طور پر نفس یہ چاہتا ہے کہ جب میں کسی کو مال دوں تو لوگ دیکھیں اور میری تعریف کریں تاکہ مجھے دوسرے لوگوں پر فخر و امتیاز حاصل ہو لہٰذا جب اس نے عام نظروں سے چھپا کر اپنا مال کسی کو دیا تو اس نے گویا نفس امارہ کی مخالفت کی اور شیطان کو اپنے سے دور کیا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ زیادہ سخت اس لئے ہے کہ اس کی وجہ سے رضاء مولیٰ حاصل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ رضاء مولیٰ سب سے بڑی چیز ہے۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ مُعَاذٍ الصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ فِيْ كِتَابِ الْاِيْمَانِ اور حضرت معاذؓ کی روایت تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ کتاب الایمان میں نقل کی جا چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

دو دو چیزیں خیرات کرنے کی فضیلت

(۳۶) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَامِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ یُنْفِقُ مِنْ کُلِّ مَالٍ لَہٗ زَوْجَیْنِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِلَّا اسْتَقْبَلَتْہُ حَجَبَۃُ الْجَنَّۃِ کُلُّھُمْ یَدْعُوْہُ اِلٰی مَاعِنْدَہٗ قُلْتُ وَکَیْفَ ذَالِکَ قَالَ اِنْ کَانَتْ اِبِلًا فَبَعِیْرَیْنِ وَاِنْ کَانَتْ بَقَرَۃً فَبَقَرَتَیْنِ (رواہ النسائی)

"حضرت ابوذرؓ راوی ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو مسلمان بندہ اپنے ہر مال میں سے دو دو چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو بہشت کے تمام دربان اس کا استقبال کریں گے اور اسے اپنے پاس کی چیزوں کی طرف بلائیں گے۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ دو دو چیزیں خرچ کرنے کا مطلب کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اگر اس کے پاس اونٹ ہوں (اور وہ ان میں سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا ارادہ کرے) تو دو اونٹ دے اور اگر گائیں ہوں تو دو گائیں دے۔" (نسائیؒ)

تشریح: "اللہ کی راہ میں خرچ کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اپنا مال اس جگہ خرچ کرے جہاں خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش و راضی ہوتا ہے جیسے حج، جہاد، طلب علم، غریبوں اور محتاجوں کی امداد و اعانت وغیرہ وغیرہ۔ اپنے پاس کی چیزوں سے مراد جنت کی اچھی اچھی چیزیں اور وہاں کی نعمتیں ہیں، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے دربان اسے جنت کے ہر دروازہ کی طرف بلائیں گے۔

قیامت کے دن مؤمن کا سایہ اس کا صدقہ ہوگا

(۳۷) وَعَنْ مَرْثَدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ حَدَّثَنِیْ بَعْضُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ صَدَقَتُہٗ (رواہ احمد)

"اور حضرت مرثد بن عبداللہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعض صحابہؓ نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا قیامت کے دن مؤمن کا سایہ اس کا صدقہ ہوگا۔" (احمدؒ)

تشریح: جس طرح سائبان دھوپ کی گرمی اور تپش سے بچاتا ہے اسی طرح قیامت کے دن صدقہ، نجات اور آرام و راحت کا سبب ہوگا یا یہ کہ قیامت کے دن صدقہ گویا اس کے ثواب کو سائبان کی شکل دے کر صدقہ دینے والے کے سر پر تان دیا جائے گا تاکہ وہ اس دن کی گرمی سے بچ جائے۔

عاشورہ کے دن زیادہ خرچ کرو

(۳۸) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ وَسَّعَ عَلٰی عِیَالِہٖ فِی النَّفَقَۃِ یَوْمَ عَاشُوْرَاءِ وَسَّعَ اللّٰہُ عَلَیْہِ سَائِرَ سَنَۃٍ قَالَ سُفْیَانُ اِنَّا قَدْ جَرَّبْنَاہُ فَوَجَدْنَا کَذَالِکَ۔ رَوَاہُ رَزِیْنٌ وَرَوَی الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ عَنْہُ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ وَاَبِیْ سَعِیْدٍ وَجَابِرٍ وَضَعَّفَہٗ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص عاشورہ کے دن اپنے اہل و عیال کے خرچ میں وسعت اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ سارے سال (اس کے مال و زر میں) وسعت عطا فرمائے گا۔ حضرت سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کا تجربہ کیا تو ایسا ہی پایا۔ (رزینؒ) اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں، ابن مسعودؓ، ابوہریرہؓ، ابوسعیدؓ اور جابرؓ سے نقل کیا ہے۔ نیز انہوں نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔"

تشریح: بیہقیؒ نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے لیکن انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگرچہ اس کے طرق ضعیف ہیں مگر ایک کو دوسرے سے تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔

بعض لوگوں نے عاشورہ کے دن سرمہ لگانے کے بارے میں جو حدیث نقل کی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اسی طرح عاشورہ کے دن اور دس افعال کے سلسلے میں جو حدیث نقل کی جاتی ہے اس کی بھی کوئی اصل نہیں ہے، البتہ عاشورہ کے دن صحیح احادیث کے ذریعے صرف روزہ رکھنا اور کھانے میں وسعت اختیار کرنا ثابت ہے۔

صدقہ کا ثواب چند در چند ہے

(۳۹) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ اَبُوْذَرٍّ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ اَرَاَیْتَ الصَّدَقَةَ مَاذَا هِیَ قَالَ اَضْعَافٌ مُضَاعَفَةٌ وَعِنْدَ اللّٰهِ الْمَزِیْدُ۔

(رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بتائیے کہ صدقہ کا ثواب کتنا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اس کا ثواب چند در چند (یعنی کئی کئی گناہ) ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: احادیث سے چند در چند کی مقدار دس گنا سے سات سو گنا تک معلوم ہوتی ہے، بلکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کی رحمت خاص شامل حال ہو تو ثواب کی مقدار سات سو گنا سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے، جیسا کہ خود باری تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاللّٰهُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَّشَاءُ۔

"جس کے لئے اللہ چاہتا ہے اس کا ثواب (لاتعداد) بڑھاتا ہے۔"

بَابُ اَفْضَلِ الصَّدَقَةِ

بہترین صدقہ کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بہترین صدقہ

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَحَكِیْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًی وَابْدَاْ بِمَنْ تَعُوْلُ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ حَكِیْمٍ وَحْدَهٗ۔

"حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت حکیم بن حزام دونوں راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بہتر صدقہ وہ ہے جو بے پروائی کے ساتھ دیا ہے اور صدقہ دینے کی ابتداء اس شخص سے کرو جس کا نفقہ تم پر لازم ہے (بخاریؒ) اور امام مسلمؒ نے اس روایت کو صرف حضرت حکیمؓ بن حزام سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "بے پروائی" کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ کا مال اس انداز سے دو کہ تم خود فقیر و مفلس نہ بن جاؤ بلکہ غنا باقی رہے یعنی اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی کے بقدر مال و اسباب رکھ لو۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہے اسے خدا کے نام پر خیرات کر دو، ایسا نہ ہو کہ تمام ہی مال و زر خدا کی راہ میں خرچ کر دو اور اپنے اہل و عیال کو محتاجگی اور بھوک سے بلکنے کے لئے چھوڑ دو، چنانچہ آپ ﷺ نے بعد میں اسی

بات کی وضاحت فرمائی کہ صدقہ کا مال پہلے تو ان لوگوں کو دو جن کی ضروریات زندگی تمہاری ذات سے وابستہ ہوں جب ان سے بچ رہے تو پھر بعد میں دوسروں کو دو۔

صدقہ دینے کے بعد غنائے نفس یا غنائے مال ہونا ضروری ہے: اس بارے میں تحقیقی مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص خدا کی راہ میں اپنا مال و زر خرچ کرنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے یا تو غنائے نفس حاصل ہو بایں طور کہ از راہ سخاوت نفس وہ اپنا مال و زر خدا کی راہ میں خرچ کرتا رہے تو اسے خدا کی ذات پر اس درجہ کامل اعتماد اور توکل ہو کہ اس کا دل بالکل مستغنی ہو اور اسے اس بات کی پرواہ نہ ہو کہ میرے اہل و عیال کل کیا کھائیں گے، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک موقع پر اپنا تمام مال و اسباب خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کے قدموں میں لاڈالا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "ابوبکرؓ گھر والوں کے لئے کیا رکھ چھوڑا؟" انہوں نے عرض کیا "اللہ" (یعنی اہل و عیال کے لئے اللہ کی ذات پر کامل اعتماد اور توکل چھوڑ آیا ہوں کہ جس نے اب تک مجھے اتنا مال و زر دیا ہے وہی کل کو بھی ان کی ضروریات زندگی پوری کرے گا) آنحضرت ﷺ نے ان کی سخاوت اور ان کے اس عظیم جذبے کو بہت سراہا۔ یہ تو پہلا درجہ ہوا دوسرا درجہ یہ ہے کہ اگر غنائے نفس حاصل نہ ہو پھر غنائے مال ہونا ضروری ہے یعنی خدا کی راہ میں اتنا ہی مال خرچ کرے کہ خود مفلس و فقیر نہ ہو جائے بلکہ اتنا مال باقی رکھ چھوڑنا ضروری ہے کہ اہل و عیال کی ضروریات زندگی پوری ہو سکیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

حاصل یہ کہ اگر "توکل" کی دولت نصیب ہو تو پھر جو کچھ چاہے خدا کی راہ میں خرچ کردے، اگر یہ مرتبہ حاصل نہ ہو تو اپنے اہل و عیال کو مقدم رکھے، صدقہ و خیرات میں اتنا مال نہ دے دے کہ خود اور اہل و عیال ضروریات زندگی کے لئے محتاج ہو جائیں۔

اہل و عیال پر خرچ کرنا صدقہ ہے

(۲) وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَةً عَلٰی اَهْلِهٖ وَهُوَ یَحْتَسِبُهَا کَانَتْ لَهٗ صَدَقَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابومسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو مسلمان اپنے اہل (یعنی بیوی اور اقرباء) پر کچھ خرچ کرتا ہے اور اس میں ثواب کی توقع رکھتا ہے تو اس کا یہ خرچ اس کے حق میں (بڑا مقبول) صدقہ ہو جاتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَدِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ رَقَبَةٍ وَدِیْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰی مِسْکِیْنٍ وَدِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ اَعْظَمُهَا اَجْرًا الَّذِیْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ایک دینار تو وہ ہے جسے تم خدا کی راہ میں (یعنی حج یا جہاد، یا طالب علم) میں خرچ کرو، ایک دینار تو وہ ہے جسے تم غلام کو آزاد کرنے میں خرچ کرو، تو ان تمام دیناروں میں از روئے ثواب سب سے بڑا دینار وہ ہے جسے تم نے اپنے اہل و عیال پر خرچ کیا ہے۔" (مسلمؒ)

بہترین مصرف

(۴) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ دِیْنَارٍ یُنْفِقُهُ الرَّجُلُ دِیْنَارٌ یُنْفِقُهٗ عَلٰی عِیَالِهٖ وَدِیْنَارٌ یُنْفِقُهٗ عَلٰی دَابَّتِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَدِیْنَارٌ یُنْفِقُهٗ عَلٰی اَصْحَابِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ثوبانؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بہتر دینار وہ ہے جو کوئی شخص اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے بہتر دینار وہ ہے جو کوئی شخص اپنے اس جانور پر خرچ کرے جو جہاد کے لئے پالا گیا ہو اور بہتر دینار وہ ہے جو کوئی شخص اپنے ان دوستوں پر خرچ کرے جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہاں مال وزر کے تین بہترین مصرف بیان فرمائے گئے ہیں کہ ان تینوں پر اپنا مال وزر خرچ کرنا ان کے علاوہ دوسروں پر خرچ کرنے سے بہتر ہے۔

اولاد پر خرچ کرنا ثواب ہے

⑤ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَلِیَ اَجْرٌ اَنْ اُنْفِقَ عَلٰی بَنِیْ اَبِیْ سَلَمَةَ اِنَّمَاھُمْ بَنِیَّ فَقَالَ اَنْفِقِیْ عَلَیْھِمْ فَلَكِ اَجْرُمَا اَنْفَقْتِ عَلَیْھِمْ (متفق علیہ)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! ابوسلمہؓ کے بیٹوں پر خرچ کرنے میں میرے لئے ثواب ہے کہ نہیں، درآنحالیکہ وہ میرے ہی بیٹے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ان پر خرچ کرو، جو چیز تم ان پر خرچ کرو گی اس کا تمہیں ثواب ملے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابوسلمہؓ ایک صحابی تھے، حضرت اُمّ سلمہؓ پہلے ان کے عقد میں تھیں، ابوسلمہؓ سے ان کے کئی بچے ہوئے، عمر، زینب اور درہ، جب ابوسلمہؓ کا انتقال ہوگیا، تو اُمّ سلمہؓ کو نبی کریم ﷺ کی زوجیت میں آنے کا شرف حاصل ہوا۔ ابوسلمہؓ سے ان کے جو بچے تھے وہ ان کے اخراجات انہیں کچھ دیا کرتی تھیں۔ چنانچہ اسی کو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ان کو میں جو کچھ دیتی ہوں آیا اس کا ثواب بھی مجھے ملتا ہے یا نہیں؟ لہٰذا اس صورت میں "بیٹوں" سے حضرت اُمّ سلمہؓ کے حقیقی بیٹے مراد ہونگے جو ابوسلمہؓ سے تھے، یا یہ بھی احتمال ہے کہ ابوسلمہؓ کی دوسری بیوی کے کچھ بچے ہوں گے اُمّ سلمہؓ نے ان پر مال خرچ کرنے کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے پوچھا اس صورت میں "بیٹوں" سے اُمّ سلمہؓ کے سوتیلے بیٹے مراد ہوں گے۔

اپنی بیوی یا اپنے شوہر کو صدقہ دینے کا مسئلہ

⑥ وَعَنْ زَیْنَبَ امْرَأَةِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقْنَ یَامَعْشَرَ النِّسَاءِ وَلَوْ مِنْ حُلِیِّکُنَّ قَالَتْ فَرَجَعْتُ اِلٰی عَبْدِاللّٰہِ فَقُلْتُ اِنَّكَ رَجُلٌ خَفِیْفُ ذَاتِ الْیَدِ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْاَمَرَنَا بِالصَّدَقَةِ فَأْتِہٖ فَاسْأَلْہُ فَاِنْ کَانَ ذَالِكَ یُجْزِئُ عَنِّیْ وَاِلَّا صَرَفْتُھَا اِلٰی غَیْرِکُمْ قَالَتْ فَقَالَ لِیْ عَبْدُاللّٰہِ بَلِ ائْتِیْہِ اَنْتِ قَالَتْ فَانْطَلَقْتُ فَاِذَا امْرَأَةٌ مِنَ الْاَنْصَارِ بِبَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَاجَتِیْ حَاجَتُھَا قَالَتْ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ اُلْقِیَتْ عَلَیْہِ الْمَھَابَةُ فَقَالَتْ فَخَرَجَ عَلَیْنَا بِلَالٌ فَقُلْنَالَہٗ ائْتِ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَخْبِرْہُ اِنَّ امْرَأَتَیْنِ بِالْبَابِ تَسْاَلَانِكَ اَتُجْزِئُ الصَّدَقَةُ عَنْھُمَا عَلٰی اَزْوَاجِھِمَا وَعَلٰی اَیْتَامٍ فِیْ حُجُوْرِھِمَا وَلَا تُخْبِرْہُ مَنْ نَحْنُ قَالَتْ فَدَخَلَ بِلَالٌ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَہٗ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ ھُمَا قَالَ امْرَأَةٌ مِنَ الْاَنْصَارِ وَزَیْنَبُ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الزَّیَانِبِ قَالَ امْرَأَةُ عَبْدِاللّٰہِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَھُمَا اَجْرَانِ اَجْرُ الْقَرَابَةِ وَاَجْرُ الصَّدَقَةِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ۔

"اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی زوجہ محترمہ حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس ذکر و نصیحت میں عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اے عورتوں کی جماعت! صدقہ و خیرات کرو، اگرچہ وہ تمہارے زیورات ہی میں سے کیوں نہ ہو! حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ (یہ سن کر) میں (آنحضرت ﷺ کی مجلس سے) عبداللہؓ ابن مسعودؓ کے پاس آئی اور ان سے کہنے لگی کہ آپ خالی ہاتھ (یعنی مفلس) مرد ہیں اور چونکہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں صدقہ و خیرات کرنے کا حکم فرمایا ہے، اس لئے آپ رسول اللہ ﷺ کی

خدمت میں جاکر یہ معلوم کریں کہ اگر میں آپ پر اور آپ کی اولاد پر بطور صدقہ خرچ کروں تو آیا یہ صدقہ میرے لئے کافی ہو گیا نہیں؟ اگر آپ کو اور آپ کی اولاد کو میرا صدقہ دینا میرے لئے کافی ہو جائے تو پھر آپ ہی کو صدقہ دے دوں اور اگر یہ میرے لئے کافی نہ ہو تو پھر آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بطور صدقہ خرچ کروں! حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مجھ سے کہا کہ تم ہی جاؤ (اور رسول کریم ﷺ سے اس بارے میں پوچھ لو) چنانچہ میں خود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، میں وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ رسول کریم ﷺ کے دروازے پر انصار میں کی ایک عورت کھڑی ہے اور (وہاں آنے کی) ہماری دونوں کی حاجت یکساں تھی۔ (یعنی وہ بھی معلوم کرنے آئی تھی کہ آیا میں اپنے صدقہ کا مال اپنے خاوند اور اس کے متعلقین کو دے سکتی ہوں یا نہیں؟ حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ (چونکہ) رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس ہیبت و عظمت کا پیکر تھی اس لئے (ہمیں آپ ﷺ کے پاس جانے کی جرات نہ ہوئی اور) ہم وہاں سے نکل کر حضرت بلالؓ کے پاس آئیں اور ان سے کہا کہ آپ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں جاکر کہئے کہ دروازے پر کھڑی ہوئی دو عورتیں آپ ﷺ سے پوچھتی ہیں کہ کیا اپنے شوہروں اور ان یتیموں کو جو ان کی پرورش میں ہیں ان کا صدقہ دینا ان کے لئے کافی ہو جائے گا، مگر دیکھئے آنحضرت ﷺ کو یہ نہ بتائیے گا کہ ہم کون ہیں؟ یعنی انہوں نے اپنے آپ کو ظاہر کر کے ریا سے بچنے میں مبالغہ کیا کہ اس بارے میں ریا کا کیا کام؟ حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ حضرت بلالؓ آنحضرت ﷺ کے پاس گئے اور آپ ﷺ سے وہ مسئلہ دریافت کیا (پہلے تو) آنحضرت ﷺ نے بلالؓ سے پوچھا کہ دو عورتیں کون ہیں؟ حضرت بلالؓ نے کہا کہ ایک تو انصار میں کی کوئی عورت ہے، اور دوسری زینبؓ ہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کون سی زینب؟ (کیونکہ زینب نام کی کئی عورتیں ہیں) حضرت بلالؓ نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی بیوی! پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ (ان سے جاکر کہہ دو کہ اس صورت میں) ان کے لئے دوہرا ثواب ہے، ایک تو حق قربت (کی ادائیگی) کا اور دوسرا صدقہ دینے کا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ الفاظ مسلمؒ کے ہیں)

تشریح: "قد القیت علیه المهابه" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس کو ہیبت و عظمت کا ایسا پیکر بنایا تھا کہ لوگ آپ ﷺ سے مرعوب ہوتے، ڈرتے اور آپ ﷺ کی بے انتہا تعظیم کرتے تھے، اسی وجہ سے کسی کو بھی جرات نہیں ہوتی تھی کہ وہ اچانک آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچ جائے اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی یہ عظمت و ہیبت (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کی کسی بد خلقی اور خشونت کی وجہ سے نہیں تھی۔ بلکہ یہ تو خداداد تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس عظمت و ہیبت کو آپ ﷺ کی عزت و تعظیم کا سبب بنایا تھا۔

جب حضرت زینبؓ نے حضرت بلالؓ کو منع کر دیا تھا کہ وہ ان کے نام آنحضرت ﷺ کو نہ بتائیں تو انہیں ان کی اس خواہش کا احترام کرنا چاہئے تھا مگر آنحضرت ﷺ نے چونکہ ان سے ان عورتوں کا نام پوچھا اس لئے آنحضرت ﷺ کے حکم کی بناء پر ان کے لئے یہ ہی ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ان کا نام بتا دیں چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل کی۔

یہ تو حدیث کی وضاحت تھی۔ اب اصل مسئلہ کی طرف آئیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آیا کوئی عورت اپنے خاوند یا کوئی مرد اپنی بیوی کو اپنی زکوٰۃ کا مال دے سکتا ہے یا نہیں۔ لہٰذا اس بارے میں تو بالاتفاق تمام علماء کا یہ مسلک ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی کو اپنی زکوٰۃ کا مال نہ دے، مگر اس کے برعکس صورت میں امام ابوحنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ کوئی عورت اپنے خاوند کو اپنی زکوٰۃ کا مال نہ دے کیونکہ (مرد کے) منافع اور مال میں عادۃ (اکثر) دونوں ہی شریک ہوتے ہیں (اس طرح کوئی عورت اپنے خاوند کو اپنی زکوٰۃ کا مال دے گی تو اس مال سے خود بھی فائدہ حاصل کرے گی جو جائز نہیں ہوگا) صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح مرد کا اپنی بیوی کو زکوٰۃ کا مال دینا جائز ہے اسی طرح بیوی بھی اپنی زکوٰۃ کا مال اپنے خاوند کو دے سکتی ہے آئمہؒ کے اس اختلاف کی بنا پر کہا جائے گا کہ حضرت امام اعظمؒ ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس مذکور "صدقہ" سے صدقہ نفل مراد ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک اس سے صدقہ نفل بھی مراد ہو سکتا ہے اور صدقہ فرض یعنی زکوٰۃ کو بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

اپنے اقرباء کو صدقہ دینا بڑے ثواب کی بات ہے

(۷) وَعَنْ مَیْمُوْنَۃَ بِنْتِ الْحَارِثِ اَنَّھَا اَعْتَقَتْ وَلِیْدَۃً فِیْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَتْ ذَالِکَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَوْ اَعْطَیْتِھَا اَخْوَالَکِ کَانَ اَعْظَمَ لِاَجْرِکِ (متفق علیہ)

"اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ بنت حارث کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں ایک لونڈی آزاد کی اور سرکار دو عالم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم وہ لونڈی اپنے ماموں کو دے دیتیں تو تمہیں بہت زیادہ ثواب ملتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تمہارے ماموں کو چونکہ ایک خدمت گار کی ضرورت تھی اس لئے اگر تم وہ لونڈی انہیں دے دیتیں تو تمہیں صدقہ کا ثواب تو ملتا ہی اس کے ساتھ ہی صلہ رحمی کا ثواب بھی ملتا۔

ہمسایہ کا خیال رکھو

(۸) وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ لِیْ جَارَیْنِ فَاِلٰی اَیِّھِمَا اُھْدِیْ قَالَ اِلٰی اَقْرَبِھِمَا مِنْکِ بَابًا۔ (رواہ البخاری)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ (ﷺ)! میرے دو پڑوسی ہیں ان میں سے کسے تحفہ بھیجوں؟ (یعنی پہلے یا زیادہ کسے دوں؟) آپ ﷺ نے فرمایا۔ اس پڑوسی کو جس کا دروازہ تم سے زیادہ قریب ہو۔" (بخاریؒ)

تشریح: اگر کسی کے دو پڑوسی ہوں اس طرح کہ ان میں ایک پڑوسی کی دیوار اپنے سے زیادہ قریب ہو اور دوسرے پڑوسی کا دروازہ زیادہ قریب ہو تو قریبی دروازہ والے ہی کو مقدم رکھا جائے۔

لیکن اتنی بات سمجھ لیجئے کہ یہاں حدیث میں "حصر" مراد نہیں ہے، یعنی آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف اسی کو دیا جائے دوسرے کو نہ دیا جائے، بلکہ مراد یہ ہے کہ پہلے یا زیادہ اس پڑوسی کو بھیجا جائے جس کا دروازہ قریب ہو اور اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس پڑوسی کا دروازہ زیادہ قریب ہوتا ہے اور اس سے ملنا جلنا اور اس کے یہاں آنا جانا زیادہ رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کے حالات کا بھی زیادہ علم رہتا ہے لہٰذا اس کے ساتھ محبّت و سلوک کا معاملہ کرنا اولیٰ ہے۔

(۹) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا طَبَخْتَ مَرَقَۃً فَاَکْثِرْ مَاءَھَا وَتَعَاھَدْ جِیْرَانَکَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذر غفاریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم شوربا پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ ڈالو اور اپنے ہمسایہ کا خیال رکھو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا منشاء یہ ہے کہ جب سالن پکاؤ تو اپنی لذت و خواہش ہی کو مقدم نہ رکھو بلکہ ہمسایہ اور پڑوسی کی ضرورت کا بھی خیال رکھو اور اس کی شکل یہ ہے کہ سالن میں پانی زیادہ ڈالو تاکہ شوربا زیادہ ہو اور تم اسے اپنے ہمسایہ میں ضرورت مند لوگوں کو بانٹ سکو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

کم مال رکھنے والے کا صدقہ افضل ہے

(۱۰) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الصَّدَقَۃِ اَفْضَلُ؟ قَالَ جُھْدُ الْمُقِلِّ وَابْدَاْ بِمَنْ تَعُوْلُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! کونسا صدقہ زیادہ ثواب کا باعث ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ کم مال رکھنے والے کی زیادہ سعی و کوشش اور صدقہ کا مال پہلے اس شخص کو دو جس کی ضروریات زندگی تمہاری ذات سے وابستہ ہوں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: کم مال رکھنے والے کی زیادہ سعی و کوشش کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا صدقہ زیادہ افضل ہے جو اگرچہ بہت کم مال کا مالک ہے لیکن صدقہ دینے کے معاملے میں اپنی پوری سعی و کوشش اور مشقت کرتا ہے اور جو کچھ اس کے بس میں ہوتا ہے اسے خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔

اسی باب کی جو پہلی حدیث گزری ہے اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو حالت غنا میں دیا جائے جب کہ یہ حدیث اس صدقہ کو افضل قرار دے رہی ہے جو مال کی کمی کی حالت میں دیا جائے، لہٰذا ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہوگی کہ صدقہ کی فضیلت کا تعلق اشخاص و حالات اور قوت توکل و ضعف یقین کے تفاوت سے ہے پہلی حدیث ان لوگوں کے بارے میں ہے جو توکل کے معیار پر پورے نہ اترتے ہوں اور یہ حدیث ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہیں کامل توقع و یقین کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں حدیث میں "مقل" یعنی کم مال والے سے "غنی القلب" یعنی وہ شخص مراد ہے جس کا دل غنی و بے پرواہ ہو اس صورت میں یہ حدیث پہلی حدیث کے الفاظ "خیر الصدقة ما کان عن ظھر غنی" کے موافق ہو جائے گی۔ اس طرح حاصل یہ نکلے گا کہ اس شخص کا تھوڑا سا صدقہ بھی کہ جو کم مال دار مگر غنی دل ہو مال دار کے صدقہ سے افضل ہے خواہ اس کا صدقہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

اپنے اقرباء کو صدقہ دینا دوہرے ثواب کا باعث ہے

⑪ وَعَنْ سُلَیْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الصَّدَقَةُ عَلَی الْمِسْکِیْنِ صَدَقَةٌ وَھِیَ عَلٰی ذِی الرَّحِمِ ثِنْتَانِ صَدَقَةٌ وَّصِلَةٌ (رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت سلیمان بن عامرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کسی مسکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے (یعنی اس کو دینے میں صرف صدقہ ہی کا ثواب ملتا ہے) مگر اپنے اقرباء میں سے کسی کو صدقہ دینا دوہرے ثواب کا باعث ہے، ایک ثواب تو صدقہ کا اور دوسرا ثواب صلہ رحمی (رشتہ داروں سے حسن سلوک) کا ہوتا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ و دارمیؒ)

خرچ کرنے کی ترتیب

⑫ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِنْدِیْ دِیْنَارٌ قَالَ اَنْفِقْہُ عَلٰی نَفْسِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْہُ عَلٰی وَلَدِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْہُ عَلٰی اَھْلِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْہُ عَلٰی خَادِمِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْتَ اَعْلَمُ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میرے پاس ایک دینار ہے (جسے میں خرچ کرنا چاہتا ہوں سو اسے کہاں خرچ کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اسے اپنی اولاد پر خرچ کرو۔ اس نے عرض کیا میرے پاس ایک اور دینار ہے، آپ ﷺ نے فرمایا۔ اسے اپنے اہل (یعنی بیوی، ماں، باپ اور دوسرے اقرباء) پر خرچ کرو اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے۔ فرمایا کہ اسے اپنے خادم پر خرچ کرو پھر اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے۔ فرمایا کہ اب تم اس بارے میں زیادہ جان سکتے ہو! (یعنی اب اس کے بعد کے مستحق کو تم ہی بہتر جان سکتے ہو جسے اس کا مستحق سمجھو اسے دے

دو۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

بہترین اور بدترین لوگوں میں چند

⑬ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ النَّاسِ رَجُلٌ مُمْسِكٌ بِعِنَانِ فَرَسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِالَّذِيْ يَتْلُوْهُ رَجُلٌ مُعْتَزِلٌ فِيْ غُنَيْمَةٍ لَهٗ يُؤَدِّيْ حَقَّ اللّٰهِ فِيْهَا اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِشَرِّ النَّاسِ رَجُلٌ يُسْئَلُ بِاللّٰهِ وَلَا يُعْطِيْ بِهٖ (رواہ الترمذی والنسائی والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ بہتر آدمی کون ہے؟ وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے کھڑا ہے (یعنی میدان جنگ میں گھوڑے پر سوار ہو کر کافروں کے ساتھ جنگ کا منتظر ہے) کیا میں تمہیں بتاؤں کہ وہ کون شخص ہے جو مذکورہ بالا شخص (یعنی مجاہد) کے مرتبہ کے قریب ہے؟ وہ شخص ہے جس نے اپنی چند بکریوں کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے اور اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرتا ہے (یعنی وہ چند بکریاں لے کر لوگوں سے دور ہو کر جنگل میں جا بسا اور وہاں اپنی بکریوں پر گزر بسر کرتا ہے اور ان کی بروقت زکوٰۃ ادا کرتا رہتا ہے) کیا میں تمہیں بتاؤں کہ بدترین آدمی کون ہے؟ وہ شخص ہے جس سے خدا کی قسم کے ساتھ سوال کیا جاتا ہے (یعنی کوئی سائل اس سے اس طرح مانگتا ہے کہ تمہیں خدا کی قسم! مجھے عطا کرو) مگر وہ سائل کا سوال پورا نہیں کرتا۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بہترین اور اچھے لوگوں میں سے ایک وہ شخص بھی ہے جو خدا کی راہ میں کافروں کے ساتھ جنگ کا منتظر ہوتا ہے یہ مفہوم اس لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ غازی یا مجاہد سب لوگوں سے افضل نہیں ہے۔

اسی طرح "بدترین" سے بھی یہ مراد ہے کہ بد اور برے لوگوں میں سے ایک وہ شخص بھی ہے جس سے کوئی سائل خدا کی قسم دے کر سوال کرے مگر وہ اس کا سوال پورا نہ کرے۔

سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ جانے دو

⑭ وَعَنْ اُمِّ بُجَيْدٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُدُّوا السَّائِلَ وَلَوْ بِظِلْفٍ مُحْرَقٍ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ مَعْنَاهُ۔

"اور حضرت ام بجیدؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ سائل کو کچھ دے کر واپس کرو۔ اگرچہ وہ جلا ہوا کھر ہی کیوں نہ ہو۔ (مالکؒ ونسائیؒ) ترمذی اور ابوداؤدؒ نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: بظلف محرق اپنے اصل معنی کے لئے استعمال نہیں کیا گیا ہے یعنی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سائل کو جلا ہوا کھر ہی دے دیا جائے کیونکہ یہ کوئی قابل انتفاع چیز نہیں ہے بلکہ یہ لفظ بطور مبالغہ استعمال فرمایا گیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی سائل تمہارے پاس آئے تو اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو۔ بلکہ تمہیں اس وقت جو بھی ادنیٰ سے ادنیٰ اور کمتر چیز میسر ہو وہ سائل کو دے دو۔

دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَعَاذَ مِنْكُمْ بِاللّٰهِ فَاَعِيْذُوْهُ وَمَنْ سَاَلَ بِاللّٰهِ فَاَعْطُوْهُ وَمَنْ دَعَاكُمْ فَاَجِيْبُوْهُ وَمَنْ صَنَعَ اِلَيْكُمْ مَعْرُوْفًا فَكَافِئُوْهُ فَاِنْ لَمْ تَجِدُوْا مَا تُكَافِئُوْهُ فَادْعُوْا لَهٗ حَتّٰى تَرَوْا اَنْ قَدْ كَافَأْتُمُوْهُ۔ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص تم سے بواسطہ خدا پناہ مانگے اسے پناہ دو۔ جو شخص تم سے خدا کے نام پر کچھ مانگے اس کا سوال پورا کرو۔ جو شخص تمہیں (کھانے) کے لئے بلائے (یعنی تمہاری دعوت کرے) تو اس کی دعوت قبول کرو (بشرطیکہ کوئی حسی یا شرعی مانع نہ ہو) جو شخص تمہارے ساتھ (قولی یا فعلی) احسان کرے تو تم بھی اس کا بدلہ دو (یعنی تم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی احسان کرو) اور اگر تم مال و زر نہ پاؤ کہ اس کا بدلہ چکا سکو تو اپنے محسن کے لئے دعا کرو جب تک کہ تم یہ جان لو کہ تم نے اس کا بدلہ چکا دیا ہے۔"

(احمدؒ، ابوداؤدؒ والنسائیؒ)

تشریح: "جو شخص تم سے بواسطہ خدا پناہ مانگے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خود تمہاری ذات کی وجہ سے یا کسی دوسرے کی طرف سے کسی حادثے و شر میں مبتلا ہو اور وہ اس وقت خدا کا واسطہ دے کر تم سے پناہ مانگے یعنی اس وقت یوں کہے کہ میں خدا کا واسطہ دے کر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلاؤ تو تمہیں چاہئے کہ تم اس کی درخواست قبول کرو۔ اور خدا تعالیٰ کے نام کی تعظیم کے پیش نظر اس کو اس آفت و مصیبت سے بچاؤ۔ مَنِ اسْتَعَاذَ مِنْكُمْ بِاللّٰهِ میں باللہ کے حرف با کے بارے میں یہ بھی احتمال ہے کہ لفظ استعاذ کا صلہ واقع ہو رہا ہو اس صورت میں اس جملے کے یہ معنی ہوں گے کہ "جو شخص کسی آفت و مصیبت کے وقت خدا سے پناہ مانگ رہا ہو تم اس سے تعرض نہ کرو بلکہ اسے پناہ دو اور اس کو آفت و مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش کرو"۔

حدیث کے آخری الفاظ حتی ترد الخ (جب تک تم یہ نہ جان لو) کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کے لئے اس وقت تک مکرر سہ کرر دعا کرتے رہو جب تک کہ تمہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ تم نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ارشاد گرامی منقول ہے کہ "جس شخص کے ساتھ احسان کیا گیا اور اس نے احسان کرنے والے سے کہا جزاک اللہ خیرا تو اس نے (اپنے محسن کی) تعریف (اور اس کے احسان کے بدلے میں) مبالغہ کیا۔

لہٰذا یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس شخص نے اپنے کسی محسن کے لئے ایک مرتبہ جزاک اللہ خیرا کہا تو اس نے اس کے احسان کا بدلہ چکا دیا بلکہ حق سے بھی زیادہ بدلہ دیا، کیونکہ یہ جملہ کہہ کر گویا اس نے اپنے نفس کو بدلہ چکانے میں عاجز جانا اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا کہ سب سے بہتر اجر اور بدلہ وہی دے سکتا ہے، لہٰذا یہ جملہ ایک بار کہنا مکرر سہ کرر دعا کرنے کے برابر ہے۔

حضرت عائشہؓ کا معمول: حضرت عائشہؓ کا معمول تھا کہ جب کوئی سائل ان کے لئے دعا کرتا تو وہ بھی پہلے اسی طرح اس کے لئے دعا کرتیں پھر اسے صدقہ دیتیں، لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ "اگر میں اس کے لئے دعا نہ کروں تو اس کا حق اور میرا حق برابر ہو جائے گا کیونکہ جب اس نے میرے لئے دعا کی اور میں نے اسے صرف صدقہ دے دیا (تو اس طرح دونوں کے حسنات برابر ہو گئے) لہٰذا میں بھی اس کے لئے دعا کر دیتی ہوں تاکہ میری دعا تو اس کی دعا کا بدلہ ہو جائے اور جو صدقہ میں نے دیا ہے وہ خالص رہے (اس طرح دونوں کا حق برابر نہیں رہتا بلکہ میری نیکیاں بڑھ جاتی ہیں)۔

خدا کے نام پر سوال نہ کرو

(۱٦) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُسْئَلُ بِوَجْهِ اللّٰهِ اِلَّا الْجَنَّةُ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ خدا کی ذات کے واسطے سے جنت کے علاوہ اور کوئی چیز نہ مانگو" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات کے واسطے سے لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگو یعنی کسی کے سامنے ان الفاظ کے ساتھ دست سوال دراز نہ کرو کہ "ذات خداوندی کے واسطے سے یا بالواسطہ خدا مجھے فلاں چیز دو" کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نام بہت بڑا ہے اور اس کی ذات واس کے اسم کی یہ شان نہیں ہے۔ کہ اس کو واسطہ بنا کر دنیا کی حقیر چیزیں مانگی جائیں ہاں اس کے واسطہ سے جنت مانگو یعنی یوں کہو کہ "اے اللہ! ہم تیری ذات کریم کے واسطہ سے تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں جنت میں داخل کیجئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ابوطلحہؓ کا جذبۂ سخاوت

⑰ عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَکْثَرَ الْاَنْصَارِ بِالْمَدِیْنَةِ مَالاً مِنْ نَخْلٍ وَکَانَ اَحَبُّ اَمْوَالِهِ اِلَیْهِ بَیْرُحَاءَ وَکَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدْخُلُهَا وَیَشْرَبُ مِنْ مَّاءٍ فِیْهَا طَیِّبٌ قَالَ اَنَسٌ فَلَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰیَةُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ قَامَ اَبُوْ طَلْحَةَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَاِنَّ اَحَبَّ مَالِیْ اِلَیَّ بَیْرُحَاءَ وَاِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالٰی اَرْجُوْبِرَّ هَا وَذُخْرَهَا عِنْدَ اللّٰهِ فَضَعْهَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَیْثُ اَرَاكَ اللّٰهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ ذَالِكَ مَالٌ رَابِحٌ وَقَدْ سَمِعْتُ مَاقُلْتَ وَاِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَجْعَلَهَا فِی الْاَقْرَبِیْنَ فَقَالَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَفْعَلُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَسَمَهَا اَبُوْ طَلْحَةَ فِیْ اَقَارِبِهٖ وَبَنِیْ عَمِّهٖ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہؓ مدینہ کے انصار میں کھجوروں کے اعتبار سے بہت زیادہ مال دار تھے، اپنے مال میں انہیں سب سے زیادہ پسند اپنا باغ بیرحاء (نامی) تھا جو مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا، رسول کریم ﷺ بھی اکثر اس باغ میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کا پانی پیتے تھے جو بہت اچھا (یعنی شیریں یا یہ کہ بلا کسی شک وشبہ کے حلال وپاک تھا) حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی" "نیکی (یعنی جنت) کو اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم وہ چیز (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمہارے نزدیک پسندیدہ ہے۔ تو حضرت ابوطلحہؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) چونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نیکی یعنی جنت تک نہیں پہنچ سکتے تاوقتیکہ اپنی اس چیز کو خرچ نہ کرو جو تمہارے نزدیک پسندیدہ ہے لہٰذا بیرحاء جو تمام مال میں مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ ہے میں اسے اللہ واسطے صدقہ کرتا ہوں اور (اس آیت کریمہ کے پیش نظر) اس سے نیکی کی امید رکھتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ خدا کے نزدیک میرے لئے ذخیرہ آخرت ہوگا۔ پس یارسول اللہ (ﷺ) اسے قبول فرمائیے (اور) جہاں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو بتائے (یعنی جس جگہ آپ ﷺ مناسب سمجھیں اسے خرچ فرمائیے) رسول کریم ﷺ نے فرمایا "شاباش، شاباش! " یہ باغ نفع پہنچانے والا مال ہے، جو کچھ تم نے کہا ہے میں نے سن لیا ہے، میرے نزدیک مناسب ہے کہ تم اس باغ کو اپنے (محتاج) اقرباء میں تقسیم کردو (تاکہ صدقہ کے ثواب کے ساتھ صلہ رحمی کا ثواب بھی مل جائے) ابوطلحہؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ) آپ کے ارشاد کے مطابق ہی عمل کروں گا، چنانچہ ابوطلحہؓ نے اس باغ کو اپنے اقرباء اور چچا کے بیٹوں میں تقسیم کردیا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: جہاں یہ احتمال ہے کہ "بنی عمہ" (چچا کے بیٹے) "اقاربہ" کا بیان ہو وہیں یہ احتمال بھی ہے کہ اقارب سے چچا کے بیٹوں کے علاوہ دوسرے اقرباء مراد ہوں۔

ہر جاندار کا پیٹ بھرنا بہترین صدقہ ہے

⑱ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ اَنْ تُشْبِعَ کَبِدًا جَائِعًا۔ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ایک بہترین صدقہ یہ بھی ہے کہ کسی جاندار کا جو بھوکا ہو پیٹ بھرا جائے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کوئی جاندار، خواہ مسلمان ہو، یا کافر اور خواہ جانور ہو اگر بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھلانا ایک بہترین صدقہ ہے، ہاں

اس حکم سے وہ موذی جانور مستثنیٰ ہیں جن کو مار ڈالنے ہی کا حکم دیا گیا ہے یعنی سانپ وغیرہ کو کھلانا پلانا اچھا اور مناسب نہیں ہے۔

باب صدقة المرأة من مال الزوج

بیوی اپنے شوہر کے مال میں سے جو چیز خرچ کر سکتی ہے اس کا بیان

مشکوٰۃ کے مؤلف علیہ الرحمۃ بعض مقامات پر کوئی عنوان متعین نہیں کرتے بلکہ صرف باب لکھ کر اگلا باب شروع کر دیتے ہیں اور اس کے تحت وہ احادیث نقل کر دیتے ہیں جو پچھلے ابواب کی متمات اور ملحقات ہوتی ہیں، چنانچہ یہاں بھی موصوف نے صرف باب لکھ کر باب شروع کیا ہے کوئی متعین عنوان نہیں لکھا ہے۔

مگر مشکوٰۃ کے بعض دوسرے نسخوں میں اس موقع پر یہ عنوان لکھا ہوا ہے بَابُ مَا یُنْفِقُ الْمَرْأَۃُ مِنْ مَالِ بَعْلِھَا یعنی بیوی اپنے شوہر کے مال میں سے جو چیز خرچ کر سکتی ہے اس کا بیان۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بیوی اپنے شوہر کے مال میں سے خرچ کر سکتی ہے

(۱) عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْفَقَتِ الْمَرْأَۃُ مِنْ طَعَامِ بَیْتِھَا غَیْرَ مُفْسِدَۃٍ کَانَ لَھَا اَجْرُھَا بِمَا اَنْفَقَتْ وَلِزَوْجِھَا اَجْرُہٗ بِمَا کَسَبَ وَلِلْخَازِنِ مِثْلُ ذَالِکَ لَا یَنْقُصُ بَعْضُھُمْ اَجْرَ بَعْضٍ شَیْئًا (متفق علیہ)

"اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی عورت اپنے گھر کھانے میں سے صدقہ دیتی ہے بشرطیکہ وہ اسراف نہیں کرتی تو اسے اس کے خرچ کرنے سے ثواب ملتا ہے اور اس کے شوہر کو مال کمانے کی وجہ سے ثواب ملتا ہے اور داروغہ (مطبخ کے نگران) کو بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے (جیسا کہ مالک کو ثواب ملتا ہے) اور ان میں سے کسی کے ثواب میں دوسرے کے ثواب کی وجہ سے کمی نہیں ہوتی (یعنی ہر ایک کو پورا پورا ثواب ملتا ہے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ شوہر نے بیوی کو اپنے مال سے صدقہ و خیرات کرنے کی اجازت دے رکھی ہو خواہ اس نے صراحۃً اجازت دی ہو یا دلالۃً۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اہل حجاز کا یہ معمول تھا کہ انہوں نے اپنی مہمان نوازی اور سخاوت کے پیش نظر اپنی بیویوں اور اپنے خدمت گاروں (مثلاً داروغہ مطبخ وغیرہ) کو یہ اجازت دے رکھی تھی کہ وہ مہمانوں کی بھرپور ضیافت کریں اور فقراء و مساکین نیز پڑوس کے لوگوں کو کھانا وغیرہ کھلا دیا کریں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعے اپنی اُمّت کو ترغیب دلائی کہ یہ نیک اور اچھی عادت اختیار کریں۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْفَقَتِ الْمَرْأَۃُ مِنْ کَسْبِ زَوْجِھَا مِنْ غَیْرِ اَمْرِہٖ فَلَھَا نِصْفُ اَجْرِہٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب کوئی عورت اپنے شوہر کی کمائی (کے مال) میں سے اس کی اجازت کے بغیر صدقہ و خیرات دیتی ہے تو اسے آدھا ثواب ملتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اس کی اجازت کے بغیر" کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز وہ صدقہ میں دے رہی ہے خاص طور پر اس کی اجازت شوہر نے نہیں دی ہوئی ہے لیکن وہ شوہر کی صراحۃً یا دلالۃً اجمالی رضا جانتی ہو اور وہ چیز تھوڑی اور کمتر ہو کہ اس کو دینے کو کوئی منع نہیں کرتا۔ جیسے ہمارے

یہاں عام طور پر عورتیں دروازوں پر مانگنے والوں کو آٹے کی چٹکی روٹی کا ٹکڑا یا ایک آدھ پیسہ دے دیتی ہیں۔

آقا کے حکم سے صدقہ دینے والے خدمت گار کا ثواب

(۳) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْخَازِنُ الْمُسْلِمُ الْاَمِیْنُ الَّذِیْ یُعْطِیْ مَا اُمِرَ بِہٖ کَامِلاً مُوَفَّرًا طَیِّبَۃً بِہٖ نَفْسُہٗ فَیَدْفَعُہٗ اِلَی الَّذِیْ اُمِرَ لَہٗ بِہٖ اَحَدُ الْمُتَصَدِّقِیْنَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسی اشعریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو دیانت دار مسلمان داروغہ (یعنی ملازم جیسے خزانچی وغیرہ) وہ چیز کہ جسے دینے کا مالک نے حکم کیا ہو بغیر کسی نقصان کے خوشدلی کے ساتھ اس شخص کو دے کہ جس کے لئے مالک نے حکم دیا ہے تو وہ صدقہ کرنے والے دو اشخاص میں سے ایک ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اپنے آقا و مالک کے مال میں سے صدقہ و خیرات دینے والے ملازم کے لئے اس حدیث میں چار شرطیں مذکور ہوئی ہیں۔ (۱) صدقہ و خیرات کے لئے مالک کا حکم ہونا (۲) مالک نے جتنا مال صدقہ میں دینے کا حکم دیا ہو وہ بغیر کسی کمی کے پورا دینا (۳) خوشدلی کے ساتھ دینا اس شرط کا اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ مالک جو مال صدقہ میں دینے کا حکم دیتا ہے بعض ملازم اسے خوش دلی کے ساتھ نہیں دیتے (۴) مالک نے جس شخص کو مال دینے کا حکم دیا ہے اسی کو دینا اس کے علاوہ کسی دوسرے فقیر و مسکین کو نہ دینا۔

لفظ "متصدقین" (صدقہ دینے والے دو اشخاص) تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے یعنی ایک تو مالک کہ جس کا مال صدقہ میں دیا گیا اور دوسرا ملازم جس کے ذریعے صدقہ دیا گیا اس طرح ملازم ان دونوں میں ایک ہوا۔

مشکوٰۃ کے ایک اور صحیح نسخہ میں متصدقین جمع کے صیغے کے ساتھ یعنی مُتَصَدِّقِیْنَ منقول ہے اس طرح اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ملازم بھی صدقہ دینے والوں میں سے ایک ہے۔

بہرحال حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ جو ملازم مسلمان اور امانت دار ہو کہ اس کا مالک صدقہ میں جو کچھ دینے کا حکم کرتا ہو وہ پورا پورا اور خوش دلی کے ساتھ دیتا ہو، نیز صدقہ کا مال اسی شخص کو دیتا ہو جس کو دینے کے لئے مالک نے حکم دیا ہو تو اس ملازم کو بھی اس کے مالک کے ثواب کی مانند ثواب ملتا ہے۔

میت کے لئے صدقہ کا ایصال ثواب

(۴) وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ اِنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمِّی اُفْتُلِتَتْ نَفْسُھَا وَاَظُنُّھَا لَوْ تَکَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ فَھَلْ لَھَا اَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْھَا قَالَ نَعَمْ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میری والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا اور میرا خیال ہے کہ اگر (وہ مرنے سے پہلے) کچھ کہنے پاتیں تو صدقہ دینے کی (ضرور) وصیت کرتیں لہٰذا اگر میں ان کی طرف سے صدقہ دوں تو انہیں اس صدقہ کا ثواب مل جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں"۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی مرحوم عزیز کی طرف سے بطور صدقہ کچھ مال وغیرہ دے تو اس میت کو ثواب ملتا ہے، اسی طرح میت کے لئے دعاء استغفار وغیرہ بھی کارآمد ہے چنانچہ اہل سُنّت والجماعت کے متفقہ طور پر یہی مسلک ہے، ہاں بدنی عبادت نماز و روزہ اور تلاوت قرآنی وغیرہ کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں لیکن اس بارے میں بھی قابل اعتماد اور زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ میت کو عبادت بدنی کا بھی ثواب پہنچتا ہے۔

چنانچہ امام عبداللہ یافعیؒ نے لکھا ہے کہ ایک عالی بزرگ شیخ عبدالسلامؒ کو ان کے انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا تو شیخ

مرحوم نے فرمایا کہ ہم تو دنیا میں کہا کرتے تھے کہ تلاوت قرآن کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا مگر اس عالم میں آکر ہم نے معاملہ برعکس دیکھا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ نہ کرے

⑤ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ خُطْبَتِہٖ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ لَا تُنْفِقُ امْرَاَةٌ شَیْئًا مِنْ بَیْتِ زَوْجِھَا اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِھَا قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَلَا الطَّعَامَ قَالَ ذَالِكَ اَفْضَلُ اَمْوَالِنَا (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا رسول کریم ﷺ حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبہ میں فرماتے تھے کوئی عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر میں سے کچھ خرچ نہ کرے۔ (خواہ صراحۃً اجازت ہو یا دلالۃً) عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! کیا کھانے میں سے بھی خرچ نہ کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کھانا ہمارے اموال میں نفیس ترین چیز ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: آپ ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ جب شوہر کی اجازت کے بغیر ان چیزوں کو خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ جو کھانے سے کم تر درجہ کی ہیں تو کھانا خرچ کرنا کیسے درست ہوگا، جب کہ یہ افضل ترین چیز ہے۔

بظاہر اس حدیث میں اور اس بارے میں ذکر کی گئی گذشتہ احادیث میں تعارض نظر آتا ہے لیکن ان احادیث کی تشریحات اگر سامنے ہوں تو پھر کوئی تعارض نظر نہیں آئے گا کیونکہ ان تشریحات کے ذریعے احادیث میں تطبیق بیان کردی گئی ہے۔

⑥ وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ لَمَّا بَایَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ النِّسَاءَ قَامَتِ امْرَاَةٌ جَلِیْلَةٌ کَاَنَّھَا مِنْ نِسَاءِ مُضَرَ فَقَالَتْ یَانَبِیَّ اللّٰہِ اِنَّا کَلٌّ عَلٰی اٰبَائِنَا وَاَبْنَائِنَا وَاَزْوَاجِنَا فَمَا یَحِلُّ لَنَا مِنْ اَمْوَالِھِمْ قَالَ الرَّطْبُ تَاْکُلْنَہٗ وَتُھْدِیْنَہٗ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ نے عورتوں سے بیعت لی (یعنی ان سے احکام شریعت پر عمل کرنے کا عہد لیا) تو ان میں سے ایک بڑے قد کی یا بڑے مرتبہ کی عورت کھڑی ہوئی جو غالباً قبیلہ مضر سے معلوم ہوتی تھی اور اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ہمارا بار اپنے والدین، اپنی اولاد اور اپنے شوہروں پر ہے، کیا ان کا مال ہمارے لئے (ان کی اجازت کے بغیر) حلال ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جو تازہ مال ہو اسے کھاؤ اور بطور تحفہ کے بھیجو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "تازہ مال" سے وہ چیزیں مراد ہیں جو دیرپا نہ ہوں بلکہ جلدی خراب ہوجاتی ہوں جیسے سالن ترکاری اور دودھ وغیرہ۔ لہٰذا ان چیزوں کے استعمال میں اجازت کی ضرورت نہیں کیونکہ عام طور سے لوگ ان کو خرچ کرنے سے منع نہیں کرتے گویا اس طرح ان چیزوں کے خرچ کرنے کے لئے دلالۃً اجازت حاصل ہوتی ہے بخلاف ان چیزوں کے جو خشک اور خراب نہ ہونے والی ہوں کہ ان کے خرچ کرنے کے لئے اجازت ورضاء کا حاصل ہونا ضروری ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مالک کی اجازت کے بغیر خرچ کرنا مناسب نہیں ہے

⑦ عَنْ عُمَیْرٍ مَوْلٰی اَبِی اللَّحْمِ قَالَ اَمَرَنِیْ مَوْلَایَ اَنْ اُقَدِّدَ لَحْمًا فَجَاءَنِیْ مِسْکِیْنٌ فَاَطْعَمْتُہٗ مِنْہُ فَعَلِمَ بِذَالِكَ مَوْلَایَ فَضَرَبَنِیْ فَاَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرْتُ ذَالِكَ لَہٗ فَدَعَاہُ فَقَالَ لِمَ ضَرَبْتَہٗ قَالَ یُعْطِیْ طَعَامِیْ

بِغَیْرِ اَنْ اٰمُرَہٗ فَقَالَ الْاَجْرُ بَیْنَکُمَا وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ کُنْتُ مَمْلُوْکًا فَسَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتَصَدَّقُ مِنْ مَالِ مَوَالِیَّ بِشَیْءٍ قَالَ نَعَمْ وَالْاَجْرُ بَیْنَکُمَا نِصْفَانِ (رواہ مسلم)

"حضرت ابواللحمؓ کے آزاد کردہ غلام عمیرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے آقا (ابواللحمؓ) کے حکم کے مطابق گوشت (کو سکھانے کے لئے اس کے پارچے بنا رہا تھا کہ میرے پاس ایک مسکین وفقیر آیا میں نے اسے اس میں سے کھانے کے لئے دے دیا۔ جب میرے آقا کو اس کا علم ہوا تو اس نے مجھے مارا میں رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے پورا ماجرا کہہ سنایا۔ آپ ﷺ نے میرے آقا کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ تم نے اسے کیوں مارا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ میرے کھانے میں سے بغیر میری اجازت کے دے دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ (اگر تم صدقہ کرنے کا حکم دے دیتے یا اس کے صدقہ کرنے سے تم راضی وخوش ہوتے تو) تم دونوں ثواب کے حق دار ہوتے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ عمیرؓ نے کہا کہ میں ایک شخص کا غلام تھا چنانچہ میں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں اپنے مالک کے مال میں کچھ (یعنی کوئی قلیل وکمتر درجہ کی چیز جس کے خرچ کرنے کی عام طور پر اجازت ہوتی ہے) بطور صدقہ خرچ کر سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اور اس کا ثواب تم دونوں کو آدھا آدھا ملے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے عمیرؓ کی شکایت پر ان کے آقا ابواللحمؓ سے جو کچھ کہا یا عمیرؓ کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مالک کے مال میں غلام وملازم کو مطلقاً تصرف کا حق حاصل ہے بلکہ آپ ﷺ نے تو صرف اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا کہ غلام وملازم کو کسی ایسی بات پر مارا جائے جسے مالک تو غلطی یا اپنا نقصان تصور کرتا ہے مگر حقیقت میں وہ مالک کے حق میں غلطی یا نقصان نہیں ہے بلکہ اس کے لئے اس میں بہتری وبھلائی ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے ابواللحمؓ کو ترغیب دلائی کہ ان کے غلام نے ان کے حق میں چونکہ بہتر اور نیک کام ہی کیا ہے۔ اس لئے اس سے درگزر کریں اور اس ثواب کو غنیمت جانیں جو ان کا مال خرچ ہونے کی وجہ سے انہیں ملا ہے۔ گویا یہ ابواللحمؓ کے لئے آپ ﷺ کی رہنمائی اور تعلیم تھی نہ کہ عمیرؓ کے فعل کی تقریر یعنی عمیرؓ کے فعل کو آپ ﷺ نے جائز قرار نہیں دیا۔

بَابُ مَنْ لَّا یَعُوْدُ فِی الصَّدَقَۃِ

جو شخص صدقہ دے کر (حقیقۃً یا صورۃً) واپس نہ لے اس کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

صدقہ دے کر اسے واپس لینے یا خریدنے کی ممانعت

① عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ حَمَلْتُ عَلٰی فَرَسٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاَضَاعَہُ الَّذِیْ کَانَ عِنْدَہٗ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَشْتَرِیَہٗ وَظَنَنْتُ اَنَّہٗ یَبِیْعُہٗ بِرُخْصٍ فَسَأَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا تَشْتَرِہٖ وَلَا تَعُدْ فِیْ صَدَقَتِكَ وَاِنْ اَعْطَاکَہٗ بِدِرْھَمٍ فَاِنَّ الْعَائِدَ فِیْ صَدَقَتِہٖ کَالْکَلْبِ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَا تَعُدْ فِیْ صَدَقَتِكَ فَاِنَّ الْعَائِدَ فِیْ صَدَقَتِہٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِہٖ (متفق علیہ)

"امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطابؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا ایک مرتبہ میں نے ایک شخص کو خدا کی راہ میں سواری کے لئے گھوڑا دیا (یعنی ایک مجاہد کے پاس گھوڑا نہیں تھا اس لئے میں نے اسے گھوڑا دے دیا) اس شخص نے اس گھوڑے کو جو اس کے پاس تھا ضائع کر دیا (یعنی اس نے گھوڑے کی دیکھ بھال نہیں کی جس کی وجہ سے گھوڑا دبلا ہو گیا) میں نے سوچا کہ میں وہ گھوڑا اس سے خرید لوں

اور خیال تھا کہ وہ اس گھوڑے کو سستے داموں بیچ دے گا، مگر (خریدنے سے پہلے) میں نے اس بارے میں رسول کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اسے نہ خریدو اور نہ اپنا دیا ہوا صدقہ واپس لو اگرچہ وہ تمہیں ایک درہم ہی میں کیوں نہ دے (گویا یہ حقیقۃً نہیں بلکہ صورۃً اپنا صدقہ واپس لینا ہے) کیونکہ اپنا دیا ہوا صدقہ واپس لینے والا شخص کتے کی مانند ہے جو اپنی قے چاٹتا ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اپنا دیا ہوا صدقہ واپس نہ لو (خواہ واپس لینا صورۃً ہی کیوں نہ ہو) کیونکہ اپنا دیا ہوا صدقہ واپس لینے والا اس شخص کی مانند ہے جو قے کرے اور اسے چاٹ لے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عمرؓ کے ذہن میں گھوڑے کا سستے داموں حاصل ہو جانے کا خیال اس لئے پیدا ہوا کہ گھوڑا چونکہ دبلا ہو گیا تھا اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس کی اصلی قیمت نہیں لگتی یا پھر انہوں نے ایسا خیال اس لئے قائم کیا کہ میں نے چونکہ اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اس وقت میرے ساتھ رعایت و مروت کا معاملہ کرے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے ظاہری الفاظ و مفہوم کے پیش نظر بعض حضرات کا مسلک یہ ہے کہ اپنا دیا ہوا صدقہ خریدنا حرام ہے لیکن اکثر علماء کہتے ہیں کہ یہ مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ اس طرح صرف "قبح لغیرہ" لازم آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جس شخص کو صدقہ کا مال دیا جاتا ہے وہ اس مال کو جب صدقہ دینے والے ہی کے ہاتھوں بیچتا ہے تو اس بناء پر کہ اس نے اس کو صدقہ دے کر اس کے ساتھ احسان کیا ہے وہ اسے سستے داموں ہی بیچ دیتا ہے لہٰذا صدقہ دینے والا اس صورت میں بقدر رعایت مال جو اس صدقہ ہی کا حصہ تھا، واپس لینے والوں میں شمار ہوتا ہے۔

بہرحال صحیح اور قابل اعتماد قول یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد لاتشتریہ (اسے نہ خریدو) نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔

صدقہ میں دیا ہوا مال واپس ہو جانے کی ایک صورت

(۴) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ أَتَتْهُ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ إِنِّي تَصَدَّقْتُ عَلٰى أُمِّيْ بِجَارِيَةٍ وَإِنَّهَا مَاتَتْ قَالَ وَجَبَ أَجْرُكِ وَرَدَّهَا عَلَيْكِ الْمِيْرَاثُ قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّهُ كَانَ عَلَيْهَا صَوْمُ شَهْرٍ أَفَأَصُوْمُ عَنْهَا قَالَ صُوْمِيْ عَنْهَا قَالَتْ إِنَّهَا لَمْ تَحُجَّ قَطُّ أَفَأَحُجُّ عَنْهَا قَالَ نَعَمْ حُجِّيْ عَنْهَا (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ ایک دن میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ایک عورت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی کہ یارسول اللہ (ﷺ)! میں نے ایک لونڈی اپنی ماں کو بطور صدقہ دی تھی اب میری ماں مر گئی ہے (کیا میں اسے واپس لے لوں اور اس طرح وہ لونڈی دوبارہ میری ملکیت میں آجائے گی یا نہیں؟) آپ ﷺ نے فرمایا (صدقہ دینے کی وجہ سے) تمہارا ثواب تو ثابت ہو گیا (یعنی اس کا ثواب تمہیں یقیناً مل گیا) اور اب میراث نے اس لونڈی کو تمہیں واپس کر دیا۔ اس عورت نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! میری ماں کے ذمہ مہینہ بھر کے روزے تھے تو میں اس کی طرف سے (حقیقۃً یا حکماً) روزے رکھ سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس کی طرف سے روزے رکھ لو۔ پھر اس عورت نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! میری ماں نے کبھی حج نہیں کیا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اس کی طرف سے حج کر لو۔" (مسلمؒ)

تشریح: وَرَدَّهَا عَلَيْكِ الْمِيْرَاثُ (میراث نے اس لونڈی کو تمہیں واپس کر دیا) میں "میراث" کی طرف "واپس کرنے" کی نسبت مجازی ہے چنانچہ اس جملے کے حقیقی معنی یہ ہوں گے کہ "اللہ تعالیٰ نے اس لونڈی کو میراث کے ذریعے تمہیں واپس کر دیا اور وہ لونڈی بسبب ارث کے تمہاری ملکیت ہو گئی گویا وہ تمہارے پاس حلال ذریعے اور حلال طریقے سے آئی"۔

اس مفہوم کا حاصل یہ ہے کہ صدقہ میں دیا ہوا مال واپس لینے کی جو ممانعت کی گئی ہے صورت مذکورہ کا تعلق اس ممانعت سے نہیں ہے، کیونکہ یہ امر اختیاری نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ صورت ہے کہ صدقہ میں دیا ہوا مال بطور میراث ملکیت میں آیا ہے جو ظاہر ہے کہ بالکل

جائز ہے۔

سائلہ کو روزے رکھنے کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی اجازت کا مطلب یہ تھا کہ حقیقۃً روزہ نہ رکھو بلکہ حکماً رکھو اور وہ فدیہ کی ادائیگی ہے۔ چنانچہ جمہور علماء کا مسلک یہی ہے کہ اگر کسی شخص کا انتقال اس حالت میں ہو جائے۔ کہ اس کے ذمہ فرض روزے ہوں تو یہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مرنے والے کی طرف سے روزے رکھے بلکہ اس صورت میں حکم یہ ہے کہ اس کے ورثاء اس کی طرف سے فدیہ ادا کر دیں۔

اس مسئلے کو تفصیل کے ساتھ مع اختلاف مذاہب ان شاء اللہ "روزہ کی قضاء کے بیان" کے ضمن میں بیان کیا جائے گا تاہم اس موقع پر اصولی طور پر یہ جان لیجئے کہ "عبادت" کی کئی قسمیں ہیں، اول "عبادت مالی" جس کا تعلق صرف مال کی ادائیگی سے ہو جیسے زکوٰۃ۔ دوم "عبادت بدنی" کہ جس کا تعلق صرف نفس و بدن کی مشقت و محنت سے ہو جیسے نماز اور سوم "مرکب" یعنی وہ عبادت جس کا تعلق مال اور نفس و بدن دونوں سے ہو جیسے "حج"۔

لہٰذا "عبادت مالی" میں تو نیابت جائز ہے خواہ حالت اختیار ہو یا حالت اضطرار و ضرورت، کیونکہ اس کا مقصود فقیر و مفلس کی حاجت روائی ہے سو وہ نائب کے ادا کرنے سے بھی ادا ہو جاتا ہے۔ "عبادت بدنی" میں نیابت کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے کیونکہ عبادت بدنی کا مقصود اپنے نفس کو محنت و مشقت میں مبتلا کرنا ہوتا ہے جو نائب کے کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ "مرکب" میں نیابت کسی مجبوری و ضرورت کے وقت تو جائز ہے لیکن حالت قدرت و اختیار میں جائز نہیں ہے البتہ "نفلی حج" کی صورت میں حالت قدرت و اختیار میں بھی نیابت جائز ہے کیونکہ نفل کا دائرہ وسیع تر ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ نعم حجی عنھا (ہاں اس کی طرف سے حج کرو) کا مفہوم دونوں صورتوں سے تعلق ہے کہ خواہ اس پر حج واجب تھا یا نہیں، اسی طرح اس نے حج کی وصیت کی تھی یا نہیں؟ چنانچہ وارث کے لئے یہ جائز اور درست ہے کہ وہ مورث کی طرف سے چاہے تو کسی دوسرے کو حج کرا دے اور چاہے خود ہی حج کرے، خود حج کرنے کی صورت میں مورث کی اجازت شرط نہیں ہے جب کہ اگر کسی دوسرے سے حج کرائے تو اس کے لئے مورث کی اجازت شرط ہوگی۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد سے "کتاب الزکوٰۃ" پوری ہوئی اب "کتاب الصوم" شروع ہوتی ہے رب العزت اس کی تکمیل کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

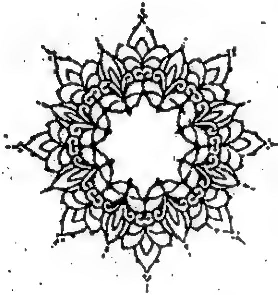

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الصوم

روزے کا بیان

صوم کے معنی: لغت میں "صوم اور صیام" کے معنی ہیں "امساک" یعنی مطلقاً رکنا! اصطلاح شریعت میں ان الفاظ کا مفہوم ہے "فجر سے غروب آفتاب تک روزہ کی نیت کے ساتھ کھانے پینے، جماع کرنے اور بدن کے اس حصے میں کہ وہ "اندر" کے حکم میں ہو کسی چیز کے داخل کرنے سے رکے رہنا نیز روزہ دار کا مسلمان اور حیض و نفاس سے پاک ہونا اس کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ہے۔

روزہ کب فرض ہوا؟: ماہ رمضان کے روزے ہجرت کے اٹھارہ ماہ بعد شعبان کے مہینے میں تحویل قبلہ کے دس روز بعد فرض کئے گئے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے قبل کوئی روزہ فرض نہیں تھا جب کہ بعض حضرات کا قول ہے کہ اس سے قبل بھی کچھ ایام کے روزے فرض تھے جو اس ماہ رمضان کے روزے کی فرضیت کے بعد منسوخ ہوگئے۔ چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک تو عاشورا محرم کی دسویں تاریخ کا روزہ فرض تھا اور بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ ایام بیض (قمری مہینے کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں راتوں کے دن) کے روزے فرض تھے۔ رمضان کے روزے کی فرضیت کے ابتدائی دنوں میں بعض احکام بہت سخت تھے مثلاً غروب آفتاب کے بعد سونے سے پہلے کھانے، پینے کی اجازت تھی مگر سونے کے بعد کچھ بھی کھانے پینے کی اجازت نہیں تھی۔ چاہے کوئی شخص بغیر کھائے پیئے ہی کیوں نہ سو گیا ہو، اسی طرح جماع کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں جائز نہ تھا۔ مگر جب یہ احکام مسلمانوں پر بہت شاق گزرے اور ان احکام کی وجہ سے کئی واقعات بھی پیش آئے تو یہ احکام منسوخ کر دیئے گئے اور کوئی سختی باقی نہ رہی۔

روزے کی اہمیت و فضیلت: اسلام کے جو پانچ بنیادی ارکان ہیں ان میں روزے کا تیسرا درجہ ہے گویا روزہ اسلام کا تیسرا رکن ہے اس اہم رکن کی جو تاکید اور بیش از بیش اہمیت ہے اسے ماہرین شریعت ہی بخوبی جان سکتے ہیں، روزہ کا انکار کرنے والا کافر اور اس کا تارک فاسق اور اشد گنہگار ہوتا ہے، چنانچہ درمختار کے "باب مایفسد الصوم" میں یہ مسئلہ اور حکم نقل کیا گیا ہے کہ:

وَلَوْ اَكَلَ عَمَدًا اَشْهُرَةً بِلَا عُذْرٍ يُقْتَلُ

"جو شخص رمضان میں بلا عذر علی الاعلان کھاتا پیتا نظر آئے اسے قتل کر دیا جائے۔"

روزہ کی فضیلت کے بارے میں صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ بعض علماء نے اس اہم ترین اور باعظمت رکن کے بے انتہا فضائل دیکھ کر اس کو نماز جیسی عظیم الشان عبادت پر ترجیح اور فضیلت دی ہے اگرچہ یہ بعض ہی علماء کا قول ہے جب کہ اکثر علماء کا مسلک یہی ہے کہ نماز تمام اعمال سے افضل ہے اور اسے روزہ پر بھی ترجیح و فضیلت حاصل ہے۔ مگر بتانا تو صرف یہ ہے کہ جب اس بات میں علماء کے ہاں اختلاف ہے کہ نماز افضل ہے یا روزہ؟ تو اب ظاہر ہے کہ نماز کے علاوہ اور کوئی بھی دوسرا عمل اور دوسرا رکن روزے کی ہمسری نہیں

کر سکتا۔

روزہ کے فوائد: کسی بھی عبادت اور کسی بھی عمل کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کی خوشنودی حاصل ہو جائے اور پروردگار کی رحمت کاملہ اس عمل اور عبادت کرنے والے کو دین اور دنیا دونوں جگہ اپنی آغوش میں چھپالے۔ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے روزہ کا فائدہ بھی بڑا ہی عظیم الشان ہوگا۔ مگر اس کے علاوہ روزے کے کچھ اور بھی روحانی اور دینی فوائد ہیں جو اپنی اہمیت و عظمت کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں لہٰذا ان میں سے کچھ فائدے بیان کئے جاتے ہیں۔

① روزہ کی وجہ سے خاطر جمعی اور قلبی سکون حاصل ہوتا ہے، نفس امارہ کی تیزی و تندی جاتی رہتی ہے، اعضاء جسمانی اور بطور خاص وہ اعضاء جن کا نیکی اور بدی سے براہ راست تعلق ہوتا ہے جیسے ہاتھ، آنکھ، زبان، کان اور ستر وغیرہ سست ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے گناہ کی خواہش کم ہو جاتی ہے اور معصیت کی طرف رجحان ہلکا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جب نفس بھوکا ہوتا ہے تو تمام اعضاء سیر ہوتے ہیں یعنی انہیں اپنے کام کی رغبت نہیں ہوتی اور جب نفس سیر ہوتا ہے تو تمام اعضاء بھوکے ہوتے ہیں انہیں اپنے کام کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ اس قول کو وضاحت کے ساتھ یوں سمجھ لیجئے کہ جسم کے جتنے اعضاء ہیں قدرت نے انہیں اپنے مخصوص کاموں کے لئے پیدا کیا ہے مثلاً آنکھ کی تخلیق دیکھنے کے لئے ہوئی ہے گویا آنکھ کا کام دیکھنا ہے لہٰذا بھوک کی حالت میں کسی بھی چیز کو دیکھنے کی طرف راغب نہیں ہوتی ہاں جب پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے تو آنکھ اپنا کام بڑی رغبت کے ساتھ کرتی ہے اور وہ ہر جائز و ناجائز چیز کو دیکھنے کی خواہش کرتی ہے۔ اسی پر بقیہ اعضاء کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

② روزہ کی وجہ سے دل کدورتوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے کیونکہ دل کی کدورت آنکھ، زبان اور دوسرے اعضاء کے فضول کاموں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی زبان کا ضرورت و حاجت سے زیادہ کلام کرنا، آنکھوں کا بلا ضرورت دیکھنا، اسی طرح دوسرے اعضاء کا ضرورت سے زیادہ اپنے کام میں مشغول رہنا افسردگی دل اور رنجش قلب کا باعث ہے اور ظاہر ہے کہ روزہ دار فضول گوئی اور فضول کام سے بچا رہتا ہے بدیں وجہ اس کا دل صاف اور مطمئن رہتا ہے۔ اس طرح پاکیزگی دل اور اطمینان قلب اچھے و نیک کاموں کی طرف میلان و رغبت اور درجات عالیہ کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے۔

③ روزہ مساکین و غرباء کے ساتھ حسن سلوک اور ترحم کا سبب ہوتا ہے کیونکہ جو شخص کسی وقت بھوک کا غم جھیل چکا ہوتا ہے اسے اکثر و بیشتر وہ کربناک حالت یاد آتی ہے۔ چنانچہ وہ جب کسی شخص کو بھوکا دیکھتا ہے تو اسے خود اپنی بھوک کی وہ حالت یاد آجاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا جذبہ ترحم امنڈ آتا ہے۔

④ روزہ دار اپنے روزہ کی حالت میں گویا فقراء و مساکین کی حالت بھوک کی مطابقت کرتا ہے بایں طور کہ جس اذیت اور تکلیف میں وہ مبتلا ہوتے ہیں۔ اسی تکلیف اور مشقت کو روزہ دار بھی برداشت کرتا ہے، اس وجہ سے اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے جیسا کہ ایک بزرگ بشر حافی کے بارے میں منقول ہے کہ ایک شخص ان کی خدمت میں جاڑے کے موسم میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ بیٹھے ہوئے کانپ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس اتنے کپڑے موجود تھے جو ان کو سردی سے بچا سکتے تھے۔ مگر وہ کپڑے الگ رکھے ہوئے تھے۔ اس شخص نے یہ صورت حال دیکھ کر ان سے بڑے تعجب سے پوچھا کہ "آپ نے سردی کی اس حالت میں اپنے کپڑے الگ رکھ چھوڑے ہیں؟" انہوں نے فرمایا کہ "میرے بھائی! فقراء و مساکین کی تعداد بہت زیادہ ہے مجھ میں اتنی استطاعت نہیں ہے کہ میں ان کے کپڑوں کا انتظام کروں لہٰذا (جو چیز میرے اختیار میں ہے اسی کو غنیمت جانتا ہوں کہ) جس طرح وہ لوگ سردی کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں اسی طرح میں بھی سردی کی تکلیف برداشت کر رہا ہوں اس طرح میں ان کی مطابقت کر رہا ہوں۔

یہی جذبہ ہمیں ان اولیاء عارفین کی زندگیوں میں بھی ملتا ہے جن کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کھانے کے وقت ہر ہر لقمہ پر یہ دعائیہ کلمات کہا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَاتُؤَاخِذْنِیْ بِحَقِّ الْجَائِعِیْنَ

"اے اللہ! مجھ سے بھوکوں کے حق کے بارے میں مواخذہ نہ کیجئے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے کہ جب قحط سالی نے پورے ملک کو اپنے مہیب سایہ میں لے لیا باوجودیکہ خود ان کے پاس بے انتہا غلہ کا ذخیرہ تھا مگر وہ صرف اس لئے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتے تھے کہ کہیں بھوکوں کا خیال دل سے اتر نہ جائے نیز یہ کہ انہیں اس طرح بھوکوں اور قحط زدہ عوام کی تکلیف و مصیبت سے مشابہت اور مطابقت حاصل رہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ماہ رمضان میں شیطان قید کر دیئے جاتے ہیں

① عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَھَنَّمَ وَسُلْسِلَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الرَّحْمَۃِ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب ماہ رمضان شروع ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں نیز شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ (آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کی بجائے) یہ ہیں کہ رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں" سے اس بات کی طرف کنایہ مقصود ہے کہ اس ماہ مقدس کے شروع ہوتے ہی باری تعالیٰ کی پے در پے رحمت کا نزول شروع ہو جاتا ہے اور بندوں کے اعمال بغیر کسی مانع اور رکاوٹ کے صعود کرتے ہیں نیز باب قبولیت وا ہو جاتا ہے کہ بندہ جو دعا مانگتا ہے بارگاہ الوہیت میں شرف قبولیت سے سرفراز ہوتی ہے۔

"جنّت کے دروازے کھولے جاتے ہیں" سے اس طرف کنایہ مقصود ہے کہ بندہ کو ان نیک اور اچھے کاموں کی توفیق عطا فرمائی جاتی ہے، جو دخول جنّت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

"دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں" اس بات کی طرف کنایہ مقصود ہے کہ روزہ دار ایسے کاموں سے بچا رہتا ہے جو دوزخ میں داخل ہونے کا باعث ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہی ہے کہ روزہ دار کبیرہ گناہوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے اور اس کے جو صغیرہ گناہ ہوتے ہیں، وہ اس کے روزے کی برکت سے بخش دیئے جاتے ہیں۔

"شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ان شیاطین کو جو سرکش اور سرغنہ ہوتے ہیں زنجیروں میں باندھ دیا جاتا ہے اور ان کی وہ قوت سلب کر لی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ بندوں کو بہکانے پر قادر ہوتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ جملہ دراصل اس بات کی طرف کنایہ ہے کہ ماہ رمضان میں شیاطین لوگوں کو بہکانے سے باز رہتے ہیں اور بندے نہ صرف یہ کہ ان کے وسوسوں اور ان کے اوہام کو قبول نہیں کرتے بلکہ ان کے مکر و فریب کے جال میں پھنستے بھی نہیں اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ روزہ کی وجہ سے انسان کی قوت حیوانیہ مغلوب ہو جاتی ہے جو غیظ و غضب اور شہوت کی جڑ ہے اور طرح طرح کے گناہوں کا باعث ہوتی ہے اس کے برخلاف قوت عقلیہ غالب اور قوی ہو جاتی ہے جو طاعات اور نیکی کا باعث ہوتی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ رمضان میں دوسرے مہینوں کی بہ نسبت گناہ کم صادر ہوتے ہیں اور عبادات و اطاعات میں زیادتی ہوتی ہے۔

جنّت میں داخل ہونے کے لئے روزہ داروں کا مخصوص دروازہ

(۲) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْجَنَّةِ ثَمَانِيَةُ اَبْوَابٍ مِنْهَا بَابٌ يُسَمَّى الرَّيَّانُ لَا يَدْخُلُهُ اِلَّا الصَّائِمُوْنَ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنت کے آٹھ دروازے جن میں سے ایک وہ دروازہ ہے جس کا نام "ریان" رکھا گیا اور اس دروازے سے صرف روزہ داروں ہی کا داخلہ ہو سکے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ریان" کے معنی ہیں "سیراب" اس کی پوری وضاحت اور تفصیل "باب افضل الصدقہ" کی حدیث نمبر ۳ کی تشریح میں گزر چکی ہے۔

ماہ رمضان کی فضیلت

(۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ایمان کے ساتھ (یعنی شریعت کو سچ جانتے ہوئے اور فرضیت رمضان کا اعتقاد رکھتے ہوئے) اور طلب ثواب کی خاطر (یعنی کسی خوف یا ریاء کے طور پر نہیں بلکہ خالصۃ للہ) رمضان کا روزہ رکھا تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے جو اس نے پہلے کئے تھے نیز جو شخص ایمان کے ساتھ اور طلب ثواب کی خاطر رمضان میں کھڑا ہوا تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے جو اس نے پہلے کئے تھے اسی طرح جو شخص شب قدر میں ایمان کے ساتھ (یعنی شب قدر کی حقیقت کا ایمان واعتقاد رکھتے ہوئے) اور طلب ثواب کی خاطر کھڑا ہوا تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے، جو اس نے پہلے کئے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "رمضان میں کھڑا ہونے" سے مراد یہ ہے کہ رمضان کی راتوں میں تراویح پڑھے، تلاوت قرآن کریم اور ذکر اللہ وغیرہ میں مشغول رہے، نیز اگر حرم شریف میں ہو تو طواف و عمرہ کرے یا اسی طرح کی دوسری عبادات میں اپنے آپ کو مصروف رکھے۔

"شب قدر میں کھڑا ہونے" کا مطلب یہ ہے کہ شب قدر عبادت خداوندی اور ذکر اللہ میں مشغول رہے خواہ اس رات کے شب قدر ہونے کا اسے علم ہو یا نہ ہو۔

غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے جو اس نے پہلے کئے تھے) کے بارے میں علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ "مکفرات" (یعنی وہ اعمال خیر جو گناہوں کو ختم کرنے والے ہوتے ہیں) صغیرہ گناہوں کو تو مٹا ڈالتے ہیں اور کبیرہ گناہوں کو ہلکا کر دیتے ہیں اور اگر کسی خوش نصیب کے نامہ اعمال میں گناہ کا وجود نہیں ہوتا۔ تو پھر "مکفرات" کی وجہ سے جنت میں اس کے درجات بلند کر دیئے جاتے ہیں۔

روزہ کا ثواب

(۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهِ يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ اَجْلِيْ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ وَلَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِيْحِ الْمِسْكِ وَالصِّيَامُ جُنَّةٌ وَاِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهُ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهُ فَلْيَقُلْ اِنِّيْ امْرُءٌ صَائِمٌ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بنی آدم کے ہر نیک عمل کا ثواب زیادہ کیا جاتا ہے بایں طور کہ ایک نیکی کا ثواب دس سے سات سو گنا تک ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مگر روزہ کہ وہ میرے ہی لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا (یعنی روزہ کی جو جزا ہے اسے میں ہی جانتا ہوں اور وہ روزہ دار کو میں خود ہی دوں گا اس بارے میں کوئی دوسرا یعنی فرشتہ بھی واسطہ نہیں ہوگا کیونکہ روزہ دار) اپنی خواہش اور اپنا کھانا صرف میرے ہی لئے چھوڑتا ہے (یعنی وہ میرے حکم کی بجا آوری میری رضاء وخوشنودی کی خاطر اور میرے ثواب کی طلب کے لئے روزہ رکھتا ہے)۔ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی تو روزہ کھولنے کے وقت اور دوسری خوشی (ثواب ملنے کی وجہ سے) اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت، یاد رکھو روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ لطیف اور پسندیدہ ہے۔ اور روزہ سپر ہے (کہ اس کی وجہ سے بندہ دنیا میں شیطان کے شر وفریب سے اور آخرت میں دوزخ کی آگ سے محفوظ رہتا ہے) لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص روزہ دار ہو تو وہ نہ فحش باتیں کرے اور نہ بیہودگی کے ساتھ اپنی آواز بلند کرے اور اگر کوئی (نادان جاہل) اسے برا کہے یا اس سے لڑنے جھگڑنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ کہہ دے "میں روزہ دار ہوں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: نیک عمل کے اجر کے سلسلے میں ادنی درجہ دس ہے کہ نیکی تو ایک ہو مگر ثواب اس کا دس گنا ملے، پھر اس کے بعد نیک عمل کرنے والے کے صدق وخلوص پر انحصار ہوتا ہے کہ اس کی ریاضت ومجاہدہ اور اس کے خلوص وصدق نیت میں جتنی پختگی اور کمال بڑھتا رہتا ہے اسی طرح اس کے ثواب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض حالات میں ایک نیکی پر سات سو گنا ثواب ملتا ہے گویا یہ آخری درجہ ہے لیکن بعض مقامات واوقات ایسے بھی ہیں جہاں کی جانے والی ایک نیکی اس سے بھی زیادہ اجر وثواب سے نوازی جاتی ہے، چنانچہ منقول ہے کہ مکہ میں ایک نیک عمل کے بدلے میں ایک لاکھ نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ الا الصوم (مگر روزہ) سے روزہ کے ثواب کی اہمیت وفضیلت کی طرف اشارہ ہے کہ روزہ کا ثواب بے انتہاء اور لامحدود ہے جس کی مقدار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

روزہ کی بے انتہاء فضیلت کیوں؟ روزہ اور اس کے ثواب کی اس فضیلت کے دو سبب ہیں، اول تو یہ کہ روزہ دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے، دوسری عبادتوں کے برخلاف کہ ان میں یہ وصف نہیں ہے جتنی بھی عبادات ہیں وہ کسی نہ کسی طرح دوسرے لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں جب کہ روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ صرف روزہ دار ہی کو ہوتا ہے، لہٰذا روزہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہوتا ہے کہ اس میں ریاء اور نمائش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد فانہ لی کے ذریعے اسی طرف اشارہ فرمایا کہ روزہ خاص میرے ہی لئے ہے کیونکہ روزہ تو صورۃً اپنے لئے وجود نہیں رکھتا جب کہ دوسری عبادتیں صورتاً اپنے لئے وجود رکھتی ہیں۔

دوم یہ کہ روزہ میں نفس کشی اور جسم وبدن کا ہلکان ونقصان ہے نیز روزہ کی حالت میں انتہائی کرب وتکلیف کی صورتیں بھوک وپیاس پیش آتی ہیں اور ان پر صبر کرنا پڑتا ہے جب کہ دوسری عبادتوں میں نہ اتنی تکلیف ومشقت ہوتی ہے اور نہ اپنی خواہش وطبیعت پر اتنا جبر چنانچہ باری تعالیٰ نے اپنے ارشاد یدع شھوتہ کے ذریعے اسی طرف اشارہ فرمایا کہ روزہ دار اپنی خواہش کو چھوڑ دیتا ہے یعنی روزہ کی حالت میں جو چیزیں ممنوع ہیں وہ ان سب سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔

لفظ شھوتہ کے بعد لفظ طعامہ کا ذکر کیا تو "تخصیص بعد تعمیم" کے طور پر ہے یا پھر "شہوت" سے مراد تو جماع ہے اور طعام سے جماع کے علاوہ وہ دوسری چیزیں مراد ہیں جو روزہ کو توڑنے والی ہوتی ہیں۔

افطار کے وقت روزہ دار کو خوشی دو وجہ سے ہو سکتی ہے یا تو اس لئے کہ وہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ روزہ دار اپنے آپ کو اللہ رب العزت کے حکم اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ محسوس کرتا ہے، یا پھر یہ کہ وہ عبادت کی توفیق اور اس کی نورانیت کی وجہ سے اپنے آپ کو مطمئن ومسرور محسوس کرتا ہے، جو ظاہر ہے کہ خوشی کا سبب ہے اس کے علاوہ دنیاوی اور جسمانی طور پر بھی یوں خوشی محسوس ہوتی ہے کہ

دن بھر کی بھوک و پیاس کے بعد اسے کھانے پینے کو ملتا ہے۔

حدیث کے آخری جملے کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص روزہ دار کو برا بھلا کہے یا اس سے لڑنے کا ارادہ کرے تو وہ اس شخص کو انتقاما برا بھلا نہ کہے اور نہ اس سے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو جائے بلکہ اس شخص سے یہ کہے کہ میں روزہ دار ہوں اور یہ بات یا تو زبان سے کہے تاکہ دشمن اپنے ناپاک ارادوں سے باز رہے۔ کیونکہ جب روزہ دار اپنے مقابل سے یہ کہے گا کہ میں روزہ دار ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں چونکہ روزہ دار ہوں اس لئے میرے لئے تو یہ جائز نہیں ہے کہ میں تم سے لڑوں جھگڑوں اور جب میں خود لڑنے جھگڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں تو تمہارے لئے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ ایسی صورت میں تم مجھ سے لڑائی جھگڑے کا ارادہ کرو کیونکہ یہ اصول و مروت کے خلاف ہے، ظاہر ہے کہ یہ انداز اور پیرایہ دشمن کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے غلط ارادوں سے باز رہے۔

یا اس کے یہ معنی ہوں کہ میں چونکہ روزہ دار ہوں اس لئے اس وقت تمہارے لئے زبان درازی مناسب اور لائق نہیں ہے کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور اس کی حفاظت میں ہوں۔

یا پھر یہ کہ ایسے موقع پر روزہ دار اپنے دل میں یہ کہہ لے کہ میں روزہ دار ہوں میرے لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ میں روزہ کی حالت میں کسی سے لڑائی جھگڑا کروں یا کسی کو اپنی زبان سے برا کہوں۔

لفظ "الا الصوم" کے سلسلے میں حضرت مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ "حدیث کے بعض شارحین اس موقع پر کہتے ہیں کہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ روزہ کی یہ خصوصیت کس وجہ سے ہے؟ تاہم ہمارے اوپر یہ بات واجب اور لازم ہے کہ بغیر کسی شک و شبہہ کے ہم اس کی تصدیق کریں۔ ہاں بعض محققین علماء نے اس خصوصیت کے کچھ اسباب بیان کئے ہیں، چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ روزہ ہی وہ عبادت ہے جو ایام جاہلیت میں بھی اہل عرب کے یہاں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص تھی یعنی جس طرح کفار و مشرکین سجدہ و غیرہ اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کے لئے بھی کرتے تھے، اسی طرح وہ روزہ میں بھی اللہ کے علاوہ کسی کو شریک نہیں کرتے تھے بلکہ روزہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے رکھتے تھے۔

اس طرح اس نکتہ کے ذریعے بھی اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ در حقیقت جو شخص روزہ رکھتا ہے اور اس طرح وہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضاء کی خاطر اپنا کھانا پینا اور دوسری خواہشات کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ ایک طرح کی لطافت و پاکیزگی حاصل کرتا ہے اور گویا وہ اس بارے میں باری تعالیٰ کے اوصاف و خلق کے ساتھ مشابہت اختیار کرتا ہے بایں طور کہ جس طرح اللہ رب العزت کھانے پینے سے منزہ اور پاک ہے اسی طرح وہ بھی دن میں اپنے آپ کو دنیاوی خواہشات و علائق سے منزہ رکھتا ہے لہٰذا اس سبب سے روزہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔

عبرت خیز و عبرت آموز!: ابھی آپ نے اوپر پڑھا ہے کہ عرب کے مشرکین تک روزہ میں کسی کو اللہ کا شریک نہیں کرتے تھے ان کا روزہ بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص قرار دیتے تھے۔ لیکن اب روزہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں رہ گیا ہے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اب بعض بزرگوں کے نام پر اور ان کے لئے بھی روزہ رکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو گمراہی و ضلالت کے اس راستے سے بچائے اور صرف اپنی مرضیات کا تابع و پابند بنائے آمین۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

ماہ رمضان کے فضائل و برکات

⑤ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا کَانَ اَوَّلُ لَیْلَةٍ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَمَرَدَةُ الْجِنِّ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ یُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَفُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ یُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَیُنَادِیْ مُنَادٍ یَا

بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ وَیَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَقْصِرْ وَ لِلّٰہِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذَالِکَ کُلَّ لَیْلَۃٍ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَرَوَاہُ اَحْمَدُ عَنْ رَجُلٍ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب ماہ رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنات قید کر دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں پھر اس کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں پھر اس کا کوئی دروازہ بند نہیں رہتا اور اعلان کرنے والا (فرشتہ) یہ اعلان کرتا ہے کہ اے بھلائی (یعنی نیکی و ثواب) کے طلب گار! (اللہ کی طرف) متوجہ ہو جا اور اے برائی کا ارادہ رکھنے والے! برائی سے باز آجا کیونکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو آگ سے آزاد کرتا ہے (یعنی اللہ رب العزت اس ماہ مبارک کے وسیلے میں بہت لوگوں کو دوزخ کی آگ سے آزاد کرتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ تو بھی ان لوگوں میں شامل ہو جائے) اور یہ اعلان (رمضان کی) ہر رات میں ہوتا ہے۔ (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) امام احمدؒ نے بھی اس روایت کو ایک شخص سے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: ماہ رمضان کے شروع ہوتے ہی شیاطین کو اس لئے قید کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ روزہ داروں کو نہ بہکائیں اور ان کے دلوں میں وسوسوں اور گندے خیالات کا بیج نہ بوئیں، چنانچہ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ماہ رمضان میں اکثر گناہ گار گناہوں سے بچتے ہیں۔ اور اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ البتہ بعض بدبخت ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس ماہ مبارک میں بھی گناہ و معصیت سے باز نہیں آتے تو اس کی وجہ وہ اثرات ہوتے ہیں جو رمضان سے قبل ایام میں شیطان کے بہکانے کی وجہ سے ان کے طبائع بد میں راسخ ہو جاتے ہیں یعنی چونکہ ان کے ذہن و فکر اور ان کی عملی قوت پہلے ہی سے شیطان کے زیر اثر ہوتی ہے اور ان کا نفس اس کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے لوگ اپنی عادت سے مجبور ہو کر رمضان میں بھی گناہ و معصیت سے نہیں بچ پاتے۔

"اللہ کی طرف متوجہ ہو جا" کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی بندگی، اس کی عبادت اور اس کی رضاء و خوشنودی کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہنے کی کوشش کر کیونکہ یہ وقت ایسا ہے کہ اگر تھوڑا بھی نیک عمل کیا جائے گا تو اس کا ثواب ملے گا اور معمولی درجہ کی نیکی بھی سعادت و نیک بختی کے اونچے درجے پر پہنچائے گی۔

اسی طرح "برائی سے باز آجا" کا مطلب یہ ہے کہ گناہ و معصیت کے راستے کو چھوڑ دے، نیکی و بہتری کی راہ اپنا لے، اپنے کئے ہوئے گناہوں سے توبہ کر اور خدا کی طرف اپنی توجہ لگا دے کیونکہ قبولیت دعا اور مغفرت کا یہ بہترین وقت ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(٦) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتَاکُمْ رَمَضَانُ شَھْرٌ مُبَارَکٌ فَرَضَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ صِیَامَہٗ تُفْتَحُ فِیْہِ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَتُغْلَقُ فِیْہِ اَبْوَابُ الْجَحِیْمِ وَتُغَلُّ فِیْہِ مَرَدَۃُ الشَّیَاطِیْنِ لِلّٰہِ فِیْہِ لَیْلَۃٌ خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ شَھْرٍ مَنْ حُرِمَ خَیْرَھَا فَقَدْ حُرِمَ (رواہ احمد والنسائی)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے رمضان کا بابرکت مہینہ آگیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر روزے فرض کئے ہیں اس مہینے میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، نیز اسی مہینے میں سرکش شیطانوں کو طوق پہنایا جاتا ہے اور اس میں (یعنی پورے ماہ رمضان کی راتوں میں یا آخری عشرۂ رمضان کی راتوں میں) خدا کی ایک خاص رات ہے جو (باعتبار ثواب کے) ہزار مہینوں سے بہتر ہے (یعنی اس ایک رات میں عمل کرنا ان ہزار مہینوں میں عمل کرنے سے کہ جن میں لیلۃ القدر نہ ہو، کہیں زیادہ افضل و بہتر ہے)۔ لہٰذا جو شخص اس رات کی بھلائی سے محروم رہا وہ ہر بھلائی سے محروم رہا۔"

(احمدؒ ونسائیؒ)

تشریح: ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے الفاظ وَتُغَلُّ فِيهِ مَرَدَةُ الشَّيَاطِينِ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ماہ رمضان میں صرف وہی شیطان قید کئے جاتے ہیں جو سرکش اور سرغنہ ہیں گویا اس طرح وہ اشکال خود بخود رفع ہو جاتا ہے جو ابھی اس سے پہلی حدیث کی تشریح کے ضمن میں گزرا ہے۔ اس صورت میں اس حدیث (نمبر ۵) کے الفاظ صفدت الشیاطین و مردة کا عطف شیطان پر "عطف تفسیر وبیان" کی نوعیت سے ہوگا۔

ملا علی قاریؒ کے اس قول کی وضاحت یہ ہے کہ اس سے پہلے حدیث کی تشریح میں اس اشکال کی طرف جو یہ اشارہ کیا گیا تھا کہ شیاطین کے مقید ہو جانے کے باوجود بھی جو لوگ اس ماہ مبارک میں گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا تھا کہ "اس کی وجہ وہ اثرات ہوتے ہیں جو رمضان سے قبل ایام میں شیطان کے بہکانے کی وجہ سے ان کی طبائع بد میں راسخ ہوتے ہیں"۔

اسی اشکال کا ایک دوسرا جواب ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کے مفہوم کی روشنی میں دیا ہے کہ رمضان میں دراصل وہی شیطان مقید ہوتے ہیں، جو سرکش اور سرغنہ ہوتے ہیں۔ چھوٹے موٹے قسم کے شیطان چونکہ آزاد رہتے ہیں اس لئے ایسے لوگوں کو بہکاتے ہیں جن کی وجہ سے رمضان میں بھی گناہوں کا صدور بند نہیں ہوتا۔

مگر اسی باب کی پہلی حدیث سے چونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مطلقاً شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں اس میں سرکش شیطان کی کوئی تخصیص نہیں ہے لہٰذا ملا علی قاریؒ کا یہ جواب کچھ زیادہ جاندار معلوم نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ کی تقریر سب سے بہتر ہے جس سے نہ صرف یہ کہ مسئلہ مذکور میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا بلکہ اس بارے میں منقول تمام احادیث میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ حضرت موصوفؒ فرماتے ہیں کہ "سرکش شیطانوں کا قید ہونا جیسا کہ یہ حدیث بتا رہی ہے۔ مخصوص افراد کی نسبت سے ہے اسی طرح مطلقاً شیاطین کا قید ہونا جیسا کہ اس باب کی پہلی حدیث سے ثابت ہوا دوسرے مخصوص افراد کی نسبت سے ہے مطلب یہ ہے کہ سرکش شیاطین کو تو فاسق لوگوں کو بہکانے سے روک دیا جاتا ہے چنانچہ ایسے لوگ رمضان میں گناہ کم کرتے ہیں البتہ چھوٹے موٹے شیطان انہیں بہکاتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کچھ نہ کچھ گناہ ان سے سرزد ہوتے رہتے ہیں اور مطلقاً شیاطین صلحاء اور نیک لوگوں کو بہکانے سے روک دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ کبیرہ گناہوں سے باز رہتے ہیں اور اگر بتقاضائے بشریت ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو وہ توبہ اور استغفار کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا اشکال کا ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ کچھ گناہ تو ایسے ہوتے ہیں جو شیاطین کے بہکانے سے سرزد ہوتے ہیں اور کچھ گناہ ایسے ہوتے ہیں جو خود اپنے نفس کے تقاضہ سے صادر ہوتے ہیں چنانچہ جو گناہ شیطان کے بہکانے سے سرزد ہوتے ہیں ان گناہوں سے تو لوگ رمضان میں محفوظ رہتے ہیں اور جو گناہ خود اپنے نفس کے تقاضہ سے ہوتے ہیں وہ رمضان میں بھی صادر ہوتے رہتے ہیں۔

من حرم خیرھا (جو شخص اس رات کی بھلائی سے محروم رہا) کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس مقدس رات میں عبادت خداوندی کے لئے شب بیداری کی توفیق نہیں ہوتی اگر وہ کم سے کم رات کے ابتدائی اور آخری حصوں ہی میں جاگ لیتا اور خدا کی بندگی کرتا جب بھی اسے اس رات میں عبادت کی فضیلت حاصل ہو جاتی کیونکہ منقول ہے کہ جس شخص نے (کم سے کم) عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لی تو اسے (بھی) "لیلۃ القدر" کی سعادتوں سے اپنا حصہ مل جائے گا۔

فقد حرم (وہ ہر بھلائی سے محروم رہا) بطور مبالغہ ارشاد فرمایا گیا ہے اور اس سے مراد "کامل ثواب سے محروم رہنا" ہے۔

روزہ قیامت کے روز پروردگار سے شفاعت کرے گا

(۷) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ اَىْ رَبِّ اِنِّىْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عبد اللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ روزہ اور قرآن دونوں بندہ کے لئے شفاعت کریں گے۔ چنانچہ روزہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! میں نے اس کو کھانے اور دوسری خواہشات (مثلاً پانی، جماع اور غیبت وغیرہ) سے دن میں روکے رکھا لہٰذا میری طرف سے بھی اس کے حق میں شفاعت قبول فرما۔ قرآن کہے گا کہ میں نے اسے رات میں سونے سے روکے رکھا، لہٰذا میری طرف سے بھی اس کے حق میں شفاعت قبول فرما۔ چنانچہ ان دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "قرآن" سے مراد "تلاوت قرآن" ہے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "قرآن سے" تہجد اور (تلاوت قرآن وعبادت وغیرہ کے لئے) شب بیداری مراد ہے۔ روزہ اور قرآن دونوں کی شفاعت کا ثمرہ یہ ہوگا کہ غالباً روزہ کی شفاعت سے تو گناہ ختم کر دیئے جائیں گے اور قرآن کی شفاعت سے درجات عالیہ نصیب ہوں گے۔

شب قدر سے محرومی حرمان نصیبی

⑧ وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ دَخَلَ رَمَضَانُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذَا الشَّهْرَ قَدْ حَضَرَكُمْ وَفِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ مَنْ حُرِمَهَا فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهُ وَلَا يُحْرَمُ خَيْرَهَا اِلَّا كُلُّ مَحْرُوْمٍ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت انس ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ جب رمضان کا مہینہ آیا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تمہارے لئے یہ مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات (یعنی شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے، لہٰذا جو شخص اس رات (کی سعادت) سے محروم رہا (کہ اسے پوری رات یا کم سے کم رات کے کچھ حصوں میں بھی جاگنے اور عبادت خداوندی میں مشغول ہونے کی توفیق نہ ہوئی) تو وہ ہر سعادت و بھلائی سے محروم رہا۔ اور یاد رکھو شب قدر کی سعادت سے حرمان نصیب ہی محروم ہوتا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: ارشاد گرامی "تمہارے لئے یہ مہینہ آیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کا مقدس وبابرکت مہینہ دین ودنیا کی سعادتیں اور بھلائیاں اپنے دامن میں لئے آگیا ہے لہٰذا اس کے آنے کو غنیمت جانو، دن میں روزے رکھ کر اور رات میں عبادت خداوندی یعنی تراویح وتلاوت قرآن اور تہجد وغیرہ میں مشغول ہو کر اس مہینے کی برکتیں اور سعادتیں حاصل کرو، حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ "لیلۃ القدر" کی سعادتوں سے وہی شخص محروم رہتا ہے جو سعادت و بھلائی کے معاملے میں بد نصیب ہوتا ہے اور جسے عبادت کا ذوق نہیں ہوتا۔

رمضان، برکات وسعادت کا مہینہ

⑨ وَعَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اٰخِرِ يَوْمٍ مِنْ شَعْبَانَ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهُ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيْهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةً لِذُنُوْبِهِ وَعِتْقَ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهُ مِثْلُ اَجْرِهِ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِهِ شَيْءٌ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَيْسَ كُلُّنَا نَجِدُ مَا نُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِي اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰى مَذْقَةِ لَبَنٍ اَوْ تَمْرَةٍ اَوْ شَرْبَةٍ مِنْ مَاءٍ وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِيْ شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهُ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَاٰخِرُهُ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوْكِهِ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَاَعْتَقَهُ مِنَ النَّارِ۔

"اور حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے شعبان کے آخری دن ہمارے سامنے (جمعہ کا یا بطور تذکیر ونصیحت) خطبہ دیتے

ہوئے فرمایا کہ لوگو! باعظمت مہینہ تمہارے اوپر سایہ فگن ہورہا ہے (یعنی ماہ رمضان آیا ہی چاہتا ہے) یہ بڑا ہی بابرکت اور مقدس مہینہ ہے، یہ وہ مہینہ ہے جس میں وہ رات (لیلۃ القدر) ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں قیام (عبادت خداوندی کے لئے جاگنا) نفل قرار دیا ہے، جو شخص اس ماہ مبارک میں نیکی (یعنی نفل) کے طریقے اور عمل کے ذریعے بارگاہ حق میں تقرب کا طلبگار ہوتا ہے تو وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس نے رمضان کے علاوہ کسی دوسرے مہینے میں فرض ادا کیا ہو (یعنی ماہ رمضان میں نفل اعمال کا ثواب رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں فرض اعمال کے ثواب کے برابر ہوتا ہے) اور جس شخص نے ماہ رمضان میں (بدنی یا مالی) فرض ادا کیا تو وہ اس شخص کی مانند ہوگا جس نے رمضان کے علاوہ کسی دوسرے مہینے میں ستر فرض ادا کئے ہوں (یعنی رمضان میں کسی ایک فرض کی ادائیگی کا ثواب دوسرے دنوں میں ستر فرض کی ادائیگی کے ثواب کے برابر ہوتا ہے) اور ماہ رمضان صبر کا مہینہ ہے (کہ روزہ دار کھانے پینے اور دوسری خواہشات سے رکا رہتا ہے) وہ صبر جس کا ثواب بہشت ہے ماہ رمضان غم خواری کا مہینہ ہے (لہٰذا اس ماہ میں محتاج وفقراء کی خبر گیری کرنی چاہئے) اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں (دولت مند اور مفلس ہر طرح کے) مؤمن کا (ظاہری اور معنوی) رزق زیادہ کیا جاتا ہے۔ جو شخص رمضان میں کسی روزہ دار کو (اپنی حلال کمائی سے) افطار کرائے گا تو اس کا یہ عمل اس کے گناہوں کی بخشش ومغفرت کا ذریعہ اور دوزخ کی آگ سے اس کی حفاظت کا سبب ہوگا اور اس کو روزہ دار کے ثواب کی مانند ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم میں سب تو ایسے نہیں ہیں جو روزہ دار کی افطاری کے بقدر انتظام کرنے کی قدر رکھتے ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ یہ ثواب اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی عنایت فرماتا ہے جو کسی روزہ دار کو ایک گھونٹ لسی یا کھجور اور یا ایک گھونٹ پانی ہی کے ذریعے افطار کرادے اور جو شخص کسی روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھلائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض (یعنی حوض کوثر) سے اس طرح سیراب کرے گا کہ وہ (اس کے بعد) پیاسا نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ بہشت میں داخل ہوجائے۔ اور ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس کا ابتدائی حصہ رحمت ہے، درمیانی حصہ میں بخشش ہے (یعنی وہ مغفرت کا زمانہ ہے) اور اس کے آخری حصے میں دوزخ کی آگ سے نجات ہے (مگر تینوں چیزیں مؤمنین ہی کے لئے مخصوص ہیں کافروں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے)۔ اور جو شخص اس مہینے میں اپنے غلام ولونڈی کا بوجھ ہلکا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور اسے آگ سے نجات دے گا۔"

تشریح: "اور اس کی راتوں میں قیام نفل قرار دیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کی راتوں میں نماز تراویح اور اسی قسم کی دوسری سُنّت مؤکدہ عبادتوں کے لئے شب بیداری کو نفل قرار دیا ہے لہٰذا جس نے شب بیداری کی اور نماز تراویح وغیرہ پڑھی وہ عظیم اجر وثواب سے نوازا جائے گا اور جو شخص اسے ترک کرے گا وہ نہ صرف یہ کہ خیر وبھلائی کی سعادتوں سے محروم رہے گا، بلکہ حق تعالیٰ کے عتاب میں گرفتار بھی ہوگا۔

اس جملے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نماز تراویح کو نفل قرار دیا ہے کیونکہ نماز تراویح تو سُنّت مؤکدہ ہے اور اس کی بڑی تاکید ہے، چنانچہ ابوداؤد کی باب فی شهادة الواحد علی رؤية هلال رمضان میں ایک روایت منقول ہے جس کے یہ الفاظ ہیں فامر بلالا فنادی فی الناس ان یقوموا وان یصوموا (یعنی جب رمضان کے چاندی کی گواہی گزر چکی تو آپ ﷺ نے بلال ؓ کو اعلان کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کیا کہ قیام کیا جائے یعنی نماز تراویح پڑھی جائے اور روزہ رکھا جائے۔

"یہاں تک کہ وہ جنّت میں داخل ہوجائے" اس لئے فرمایا کہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ جنّت میں داخل ہونے کے بعد پیاس کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہے گا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِیْهَا۔

"بیشک تم جنّت میں پیاسے نہیں ہوگے۔"

لہٰذا آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص اس کے بعد کبھی بھی پیاسا نہیں ہوگا۔

رمضان کے ابتدائی یعنی اول عشرہ کو "رحمت" فرمایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب کہ باری تعالیٰ کی رحمت عام کا نزول ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اگر اس کی رحمت نہ ہو تو پھر نہ کوئی روزہ رکھے اور نہ کوئی تراویح وغیرہ پڑھے۔

"اپنے غلام و لونڈی کا بوجھ ہلکا کیا" کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے مہینے میں روزہ دار اپنے خدمت گار اور ملازم کے ساتھ انتہائی مروت اور محبت و رحمت کا معاملہ کرے اور ان کے فرائض خدمت میں آسانی اور رعایت کرے اس طرح عام دنوں کی بہ نسبت روزہ کی حالت میں ان پر اپنی خدمت اور دوسرے کاموں کا بوجھ نہ ڈالے۔

رمضان میں اسیروں کی رہائی

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمَضَانَ اَطْلَقَ كُلَّ اَسِيْرٍ وَاَعْطٰى كُلَّ سَائِلٍ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب رمضان کا ماہ مقدس شروع ہوتا تو رسول کریم ﷺ ہر قیدی کو رہائی بخشتے اور ہر سائل کی مراد پوری فرماتے۔"

تشریح: "قیدی" سے مراد وہ لوگ بھی ہوسکتے ہیں جو حقوق اللہ کے لئے قید ہوتے تھے اور وہ لوگ بھی مراد لئے جاسکتے ہیں جو حقوق العباد (بندوں کے مطالبات) کی خاطر قید کئے جاتے تھے، جو لوگ حقوق العباد کی خاطر قید ہوتے تھے ان کی رہائی سے مراد یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ایسے قیدیوں کو صاحب حقوق سے کہہ کر آزاد کرایا کرتے تھے ایک احتمال یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ صرف انہیں قیدیوں کو چھوڑ دیتے تھے جو خود آپ ﷺ کے حقوق کی خاطر قید ہوتے تھے یوں تو "جود و سخا" آنحضرت ﷺ کا امتیازی وصف تھا اور آپ ﷺ رمضان کے علاوہ دوسرے ایام میں بھی ہر سائل کا پورا کیا کرتے تھے مگر ماہ رمضان میں آپ ﷺ کے وصف جود و سخا کی کچھ اور ہی کیفیت ہوا کرتی تھی چنانچہ حدیث کے آخری الفاظ "اور ہر سائل کی مراد پوری فرماتے" کی مراد یہ ہوگی کہ آپ ﷺ رمضان میں اپنی عادت اور اپنے معمول سے بھی زیادہ عطاء و سخاوت فرمایا کرتے تھے۔

استقبال رمضان کے لئے بہشت کی زینت

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْجَنَّةَ تُزَخْرَفُ لِرَمَضَانَ مِنْ رَأْسِ الْحَوْلِ اِلٰى حَوْلٍ قَابِلٍ قَالَ فَاِذَا كَانَ اَوَّلُ يَوْمٍ مِنْ رَمَضَانَ هَبَّتْ رِيْحٌ تَحْتَ الْعَرْشِ مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ عَلَى الْحُوْرِ الْعِيْنِ فَيَقُلْنَ يَارَبِّ اجْعَلْ لَنَا مِنْ عِبَادِكَ اَزْوَاجًا تَقَرُّ بِهِمْ اَعْيُنُنَا وَتَقَرُّ اَعْيُنُهُمْ بِنَا۔ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ رمضان کے استقبال کے لئے جنّت شروع سال سے آخر سال تک اپنی زیب و زینت کرتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا۔ چنانچہ جب رمضان کا پہلا دن ہوتا ہے تو عرش کے نیچے جنّت کے درختوں کے پتوں سے حور عین کے سر پر ہوا چلتی ہے، پھر حوریں کہتی ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! اپنے بندوں میں سے ہمارے لئے شوہر بنا دے کہ ان (کی صحبت و ہم نشینی کے سرور و کیف) سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ان کی آنکھیں ہمارے (دیدار و وصل) سے ٹھنڈک پائیں۔" (یہ تینوں روائتیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں)

تشریح: "شروع سال" سے مراد محرم کا ابتدائی دن ہے لیکن یہ بھی بعید نہیں ہے کہ جنّت و رمضان کے اعتبار سے "شروع سال" سے شوال کا ابتدائی دن مراد ہو۔ حاصل یہ کہ رمضان اور رمضان کی برکات یعنی کثرت و مغفرت اور بلندی درجات وغیرہ کے آنے کی خوشی

میں جنت تمام سال اپنا بناؤ سنگار کرتی ہے۔

"اپنے بندوں میں سے ہمارے لئے شوہر بنادے" میں بندوں سے خدا کے وہ نیک وفرمانبردار بندے مراد ہیں جو رمضان کے دنوں میں روزہ رکھتے ہیں اور راتوں میں نماز تراویح میں مشغول رہتے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے کہ "جو بندہ رمضان میں روزہ رکھتا ہے تو اس کے ہر دن کے روزہ کے بدلے میں اسے موتیوں کے خیمے میں حور عین میں سے ایک زوجہ عطا کی جاتی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ۔

روزہ دار کو رمضان کی آخری رات میں مغفرت عطا ہوتی ہے

⑫ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ يُغْفَرُ لِاُمَّتِهٖ فِيْ اٰخِرِ لَيْلَةٍ فِيْ رَمَضَانَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَهِيَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ قَالَ لَا وَلٰكِنَّ الْعَامِلَ اِنَّمَا يُوَفّٰى اَجْرَهٗ اِذَا قَضٰى عَمَلَهٗ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ان کی (یعنی میری) اُمت کے روزہ دار افراد کی رمضان کی آخری رات میں بخشش ہو جاتی ہے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! کیا وہ لیلۃ القدر ہے؟ (جس میں بخشش کی جاتی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! بلکہ کام کرنے والا جب اپنا کام کر چکتا ہے تو اسے اسی وقت اس کی پوری مزدوری دے دی جاتی ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: آپ ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ مغفرت کی یہ سعادت لیلۃ القدر کی وجہ سے عطا نہیں ہوتی بلکہ اس عظیم فریضہ کی تکمیل کی وجہ سے ملتی ہے جس کی ادائیگی کا حکم اللہ تعالیٰ نے بندوں کو دیا ہے اور وہ "روزہ رکھنا" ہے، روایت کے الفاظ یغفر لامتہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے بلکہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کے اپنے الفاظ ہیں جس کے ذریعے انہوں نے آپ ﷺ کے الفاظ کا مفہوم ادا کیا ہے اور بعینہ آپ ﷺ کے الفاظ نقل نہیں کئے کہ وہ یہ ہیں یغفر لامتی۔

بَابُ رُؤْيَةِ الْهِلَالِ

رؤیت ہلال کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بغیر چاند ہوئے نہ روزہ شروع کرو اور نہ ختم کرو

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوْا لَهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ الشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ لَيْلَةً فَلَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِيْنَ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ (شعبان کی تیسویں تاریخ کو رمضان کی نیت سے) روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، اسی طرح روزہ اس وقت ختم نہ کرو جب تک کہ (عید کا) چاند نہ دیکھ لو لہٰذا (تیسویں شب یعنی انتیسویں تاریخ کو) اگر گرد و غبار اور ابر وغیرہ یا کسی اور سبب سے) چاند نظر نہ آئے تو اس کا اعتبار کرو (یعنی اس مہینے کو تیس دن کا سمجھ لو) ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مہینہ کبھی تیس رات کا بھی ہوتا ہے اس لئے جب تک چاند نہ دیکھ لو (رمضان کی نیت سے) روزہ نہ رکھو اور اگر (انتیس تاریخ کو ابر وغیرہ ہو) اور چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرو (یعنی تیس دن کا مہینہ سمجھو۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح : مطلب یہ ہے کہ جب تک چاند نہ دیکھ لو یا معتبر شہادت اور معتبر ذرائع سے جب تک رویئت ہلال ثابت نہ ہو جائے نہ تو روزہ رکھو اور نہ روزہ ختم کر کے عید مناؤ۔

"مہینہ کبھی انتیس رات کا بھی ہوتا ہے" سے در اصل اس بات کی ترغیب دلانا مقصود ہے کہ تیسویں شب یعنی انتیس تاریخ کو چاند تلاش کیا جائے، چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ شعبان کی انتیسویں تاریخ کو لوگوں پر واجب کفایہ ہے کہ رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کریں۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا الرُّؤْيَتِهٖ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوْا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِيْنَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ چاند دیکھنے کے بعد روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی افطار (یعنی عید) کرو، لہٰذا (انتیسویں تاریخ کو) اگر ابر وغیرہ ہو جائے (اور رویت ہلال ثابت نہ ہو) تو شعبان کے مہینے کو تیس دن کا قرار دو (اسی طرح رمضان کے مہینے کا بھی اعتبار کرو)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

نجوم کے قواعد سے چاند کا ثبوت معتبر نہیں ہوتا

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ الشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا وَعَقَدَ الْاِبْهَامَ فِي الثَّالِثَةِ ثُمَّ قَالَ الشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا يَعْنِيْ تَمَامَ الثَّلَاثِيْنَ يَعْنِيْ مَرَّةً تِسْعًا وَّعِشْرِيْنَ وَمَرَّةً ثَلَاثِيْنَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ہم (اہل عرب) امی قوم ہیں کہ حساب کتاب نہیں جانتے، مہینہ اتنا اور اتنا اور اتنا ہوتا ہے (لفظ "اتنا" تین مرتبہ کہتے ہوئے آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں دو مرتبہ بند کیں اور پھر کھول دیں) اور تیسری مرتبہ میں (ہاتھوں کی انگلیاں بند کر کے پھر نو انگلیاں تو کھول دیں اور) انگوٹھا بند کئے رکھا (جس کا مطلب یہ تھا کہ کبھی تو مہینے میں ایک کم تیس دن ہوتے ہیں، یعنی انتیس کا مہینہ ہوتا ہے) اور پھر فرمایا مہینہ اتنا اور اتنا اور اتنا (اور اس مرتبہ آپ ﷺ نے تیس کا عدد بتانے کے لئے پہلے کی طرح تیسری مرتبہ میں انگوٹھا بند نہیں رکھا) یعنی پورے تیس دن کا ہوتا ہے آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ کبھی تو مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس دن کا ہوتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح : اہل عرب کو "امی" اس لئے فرمایا گیا کہ وہ جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے تھے ویسے ہی رہتے تھے پڑھتے لکھتے نہیں تھے۔ مگر آپ ﷺ نے یہ اکثر کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ کیونکہ اگرچہ عرب میں تعلیم عام نہیں تھی اور اکثریت بے پڑھے لکھے لوگوں کی تھی مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ لوگ علم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہی تھے یا اس جملے سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اہل عرب حساب کتاب اچھی طرح نہیں جانتے۔

بہر حال حدیث کے معنی یہ ہیں کہ نجوم کے قواعد پر عمل کرنا ہمارا شیوہ اور طریقہ نہیں ہے اور نہ نجوم کے قواعد و حساب سے (جیسا کہ جنتری وغیرہ میں لکھا ہوتا ہے) چاند کا ثبوت معتبر ہو سکتا ہے بلکہ اس بارے میں ہمارا علم صرف رویئت ہلال سے متعلق ہے کہ اگر چاند دیکھا جائے گا یا چاند کی رویئت شرعی قواعد و ضوابط کے تحت ثابت ہو جائے گی تو روزہ شروع ہو گا یا اس کا اختتام ہو گا اسی بات کی آخر میں وضاحت کی گئی کہ کسی مہینے میں چاند انتیس تاریخ کو ہوتا ہے اور کسی مہینے میں تیس تاریخ کو۔

روایت کی آخری عبارت کے دونوں جملے یعنی تمام الثلثین اور یعنی مرة تسعا الخ راوی کے الفاظ ہیں پہلے جملہ سے تو راوی نے آنحضرت ﷺ کے آخری اشارے کو بیان کیا ہے اور دوسرے جملے کے ذریعے دونوں چیزوں کی وضاحت کر دی ہے۔

رمضان اور ذی الحجہ کے مہینے

④ وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَھْرَا عِیْدٍ لَا یَنْقُصَانِ رَمَضَانُ وَذُو الْحِجَّۃِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابی بکرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ عید کے دونوں مہینے یعنی رمضان اور ذی الحجہ ناقص نہیں ہوتے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: رمضان کو "عید" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ یہ عید کے قریب ہوتا ہے۔ بہر حال حدیث کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ایک سال میں رمضان اور ذی الحجہ دونوں مہینے ناقص یعنی انتیس انتیس دن کے نہیں ہوتے۔ یا اس کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں یہ دونوں مہینے ناقص نہیں ہوئے ہوں گے۔

یا پھر اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دونوں مہینے حکم اور ثواب کے اعتبار سے ناقص نہیں ہوتے اگرچہ ان میں سے ایک انتیس دن کا اور دوسرا تیس دن کا ہو یا دونوں ہی انتیس انتیس دن کے ہوں، مگر ثواب پورے تیس دن کا ہی ملتا ہے۔

رمضان سے ایک دو دن قبل روزہ رکھنے کی ممانعت

⑤ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَتَقَدَّمَنَّ اَحَدُکُمْ رَمَضَانَ بِصَوْمِ یَوْمٍ اَوْیَوْمَیْنِ اِلَّا اَنْ یَکُوْنَ رَجُلٌ کَانَ یَصُوْمُ صَوْمًا فَلْیَصُمْ ذَالِکَ الْیَوْمَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص رمضان سے ایک دن یا دو دن قبل روزہ نہ رکھے ہاں جو شخص روزہ رکھنے کا عادی ہو وہ اس دن روزہ رکھ سکتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جز کا مطلب یہ ہے کہ یہ ممانعت اس شخص کے حق میں نہیں ہے جو ان ایام میں روزہ رکھنے کا عادی ہو، مثلاً کوئی شخص پیر یا جمعرات کے دن نفل روزہ رکھنے کا عادی ہو اور اتفاق سے شعبان کی انتیس یا تیس تاریخ اسی دن ہو جائے تو اس کے لئے اس دن روزہ رکھنا ممنوع نہیں ہے، ہاں جو شخص ان دنوں میں روزہ رکھنے کا عادی نہ ہو وہ نہ رکھے، تاہم اتنی بات ملحوظ رہے کہ یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ رمضان سے ایک دن یا دو دن قبل روزہ رکھنے کی ممانعت اس لئے ہے تاکہ نفل اور فرض دونوں روزوں کا اختلاط نہ ہو جائے اور اہل کتاب کے ساتھ مشابہت نہ ہو کیونکہ وہ فرض روزوں کے ساتھ دوسرے روزے بھی ملا لیتے تھے۔ مظہرؒ کا قول ہے کہ شعبان کے آخری ایام میں رمضان سے صرف ایک دن یا دو دن قبل روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ مولانا اسحٰقؒ فرماتے ہیں کہ "یہاں جس روزے سے منع کیا جا رہا ہے" وہ "یوم الشک" کا روزہ نہیں ہے بلکہ مطلقاً شعبان کے آخری ایام میں رمضان سے ایک دو دن قبل روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے البتہ جو شخص ان ایام میں روزہ رکھنے کا عادی ہو وہ اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

شعبان کے آخری نصف مہینے میں روزہ رکھنے کی ممانعت

⑥ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا تَصُوْمُوْا۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب شعبان کا آدھا مہینہ گزر جائے تو روزے نہ رکھو۔"

(ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ شعبان کے آخری نصف مہینے میں قضا یا کسی واجب روزہ کے علاوہ اور روزے نہ رکھے جائیں مگر یہ ممانعت "نہی تنزیہی" کے طور پر ہے اور اس کا تعلق اُمت کی آسانی و شفقت سے ہے، یعنی آپ ﷺ نے رمضان کے بالکل قریبی ایام میں روزے رکھنے سے اس لئے منع فرمایا ہے تاکہ ان روزوں کی وجہ سے لوگوں کو ضعف و ناتوانی لاحق نہ ہو جائے کہ جس کی وجہ سے رمضان کے روزے دشوار اور بھاری ہو جائیں۔

قاضیؒ کا قول ہے کہ اس ممانعت کا تعلق اس شخص سے ہے کہ جس کو پے در پے (متواتر) روزے رکھنے کی طاقت میسر نہ ہو لہٰذا اس کے لئے ان دنوں میں روزے نہ رکھنا ہی مستحب ہے جیسا کہ ان لوگوں کو جو قوت برداشت نہ رکھتے ہوں عرفہ کے دن روزہ نہ رکھنا مستحب ہے تاکہ وہ روزہ کی غیر متحمل مشقت سے بچ کر اس دن ذکر و دعاء میں مشغول رہیں ہاں جن لوگوں کے اندر قوت برداشت ہو ان کے لئے شعبان کے آخری نصف مہینے میں روزے رکھنے ممنوع نہیں ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ شعبان میں پورے مہینے میں روزے رکھا کرتے تھے۔

شعبان کے دنوں کو یاد رکھو

⑦ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْصُوْا هِلَالَ شَعْبَانَ لِرَمَضَانَ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ رمضان کے لئے شعبان کا مہینہ شمار کرو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ماہ شعبان کے دنوں کو گنتے رہو اور انہیں یاد رکھو تاکہ رمضان کی آمد کا علم ہے۔

آنحضرت ﷺ شعبان کے پورے مہینے میں روزے رکھتے تھے

⑧ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ مَارَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ اِلَّا شَعْبَانَ وَرَمَضَانَ۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو صرف دو مہینوں یعنی شعبان اور رمضان میں متواتر روزے رکھتے دیکھا ہے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یعنی نبی کریم ﷺ جس طرح رمضان کے پورے مہینے میں روزے رکھا کرتے تھے۔ ایسے ہی شعبان کے پورے مہینے میں بھی روزے سے رہتے تھے اس حدیث کی مفصّل وضاحت انشاء اللہ "باب صیام التطوع" میں مذکور ہوگی۔

یوم الشک کے روزہ کا مسئلہ

⑨ وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ مَنْ صَامَ الْيَوْمَ الَّذِیْ يُشَكُّ فِيْهِ فَقَدْ عَصٰى اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عمار بن یاسرؓ کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے (یوم الشک) کو روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔"

(ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: شعبان کی تیسویں شب یعنی انتیس تاریخ کو ابر وغیرہ کی وجہ سے چاند نہیں دیکھا گیا مگر ایک شخص نے چاند دیکھنے کی شہادت دی اور

اس کی شہادت قبول نہیں کی گئی اسی طرح دو فاسق لوگوں نے چاند دیکھنے کی گواہی دی اور ان کی گواہی قبول نہیں کی گئی، اس کی صبح کو جو دن ہو گا یعنی تیس تاریخ کو "یوم الشک" (شک کا دن) کہلائے گا کیونکہ اس دن کے بارے میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ رمضان شروع ہو گیا ہو اور یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ رمضان شروع نہ ہوا ہو لہٰذا اس غیر یقینی صورت کی وجہ سے اسے شک کا دن کہا جاتا ہے ہاں اگر انتیس تاریخ کو ابر وغیرہ نہ ہوا اور کوئی بھی شخص چاند نہ دیکھے تو تیس تاریخ کو یوم الشک نہ کہیں گے۔

اس حدیث میں اسی دن کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "یوم الشک" کو رمضان یا کسی واجب کی نیت سے روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ البتہ اس دن نفل روزہ رکھنے کے بارے میں کچھ تفصیل ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص شعبان کی پہلی ہی تاریخ سے نفل روزہ رکھتا چلا آرہا ہو یا تیس تاریخ اتفاق سے اس دن ہو جائے کہ جس میں کوئی شخص روزہ رکھنے کا عادی ہو (جس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے) تو اس کے لئے اس دن روزہ رکھنا افضل ہو گا۔

اسی طرح یوم الشک کو روزہ رکھنا اس شخص کے لئے بھی افضل ہے جو شعبان کے آخری تین دنوں میں روزے رکھتا ہو اور اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو پھر یوم الشک کا مسئلہ یہ ہے کہ "خواص" تو اس دن نفل کی نیت کے ساتھ روزہ رکھ لیں اور "عوام" دوپہر تک کچھ کھائے پئے بغیر انتظار کریں اگر چاند کی کوئی قابل قبول شہادت نہ آئے تو دوپہر کے بعد افطار کرلیں۔

حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کا یہ معمول نقل کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات شعبان کی انتیس تاریخ کو چاند تلاش کرتے اگر چاند دیکھ لیتے یا معتبر شہادت کے ذریعے رویت ہلال کا ثبوت ہو جاتا تو اگلے روز روزہ رکھتے ورنہ بصورت دیگر ابر و غبار وغیرہ سے مطلع صاف ہونے کی صورت میں روزہ نہ رکھتے ہاں اگر مطلع صاف نہ ہوتا تو روزہ رکھ لیتے تھے اور علماء فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ان کا یہ روزہ نفل ہوتا تھا۔

"خواص" سے مراد وہ لوگ ہیں جو "شک کے دن" کے روزے کی نیت کرنا جانتے ہوں اور جو لوگ اس دن کے روزے کی نیت کرنا نہ جانتے ہوں انہیں "عوام" کہا جاتا ہے، چنانچہ اس دن روزہ کی نیت یہ ہے کہ جو شخص اس دن (کہ جس میں رمضان کے بارے میں شک واقع ہو رہا ہے) روزہ رکھنے کا عادی نہ ہو وہ یہ نیت کرے کہ میں آج کے دن نفل روزے کی نیت کرتا ہوں اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اگر آج رمضان کا دن ہو تو یہ روزہ رمضان کا بھی ہے اس طرح نیت کرنی مکروہ ہے۔ کہ "اگر کل رمضان کا دن ہو تو یہ روزہ رمضان میں محسوب ہو اور اگر رمضان کا دن نہ ہو تو نفل یا کسی اور واجب میں محسوب ہو"۔ تاہم اگر کسی نے اس طرح نیت کر لی اور اس دن رمضان کا ہونا ثابت ہو گیا تو وہ روزہ رمضان ہی میں محسوب ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اس نیت کے ساتھ روزہ رکھے کہ اگر آج رمضان کا دن ہو گا تو میرا بھی روزہ ہو گا اور اگر رمضان کا دن نہیں ہو گا تو میرا روزہ بھی نہیں ہو گا۔ تو اس طرح نہ نفل کا روزہ ہو گا اور نہ رمضان ہی کا ہو گا چاہے اس دن رمضان کا ہونا ہی ثابت کیوں نہ ہو جائے۔

شہادت ہلال

(۱۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّی رَاَیْتُ الْھِلَالَ یَعْنِیْ ھِلَالَ رَمَضَانَ فَقَالَ اَتَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَتَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ قَالَ نَعَمْ قَالَ یَا بِلَالُ اَذِّنْ فِی النَّاسِ اَنْ یَّصُوْمُوْا غَدًا (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم کیا اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے "اس نے کہا کہ ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں؟ اس نے کہا ہاں! (اس کے بعد) آنحضرت ﷺ نے (حضرت

بلالؓ سے) فرمایا کہ بلال لوگوں میں اعلان کردو کہ کل روزہ رکھیں۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص مستور الحال ہو یعنی اس کا فاسق ہونا معلوم نہ ہو تو رمضان کے چاند کے بارے میں اس کی شہادت معتبر اور قابل قبول ہوگی نیز یہ کہ رمضان کے چاند کی گواہی دیتے ہوئے لفظ "شہادت" کا استعمال شرط نہیں ہے۔

نیز اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ہلال رمضان کی شہادت میں صرف ایک شخص کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے، چنانچہ حنفی مسلک میں صحیح مسئلہ یہی ہے کہ ہلال رمضان کی رؤیت ایک عادل یا مستور الحال شخص کی شہادت سے ثابت ہو جاتی ہے نیز یہ کہ ہلال رمضان کی شہادت میں لفظ "شہادت" کا استعمال شرط نہیں ہے مگر ایک شخص کی گواہی اسی صورت میں معتبر ہوگی جب کہ مطلع ابر و غبار آلود ہو اگر عید کی چاند رات کو ابر و غبار ہو تو پھر دو مرد یا ایک مرد اور دو عادل و آزاد عورتوں کی شہادت ہی معتبر ہوگی نیز یہ کہ اس موقع پر لفظ "شہادت" کا استعمال بھی شرط ہوگا۔ پھر موقع و محل کے پیش نظر شہادت کی صورت بھی بدلتی رہتی ہے۔ مطلع صاف ہو تو "جماعت کثیرہ" کی شہادت ضروری ہوگی۔

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ فَاَخْبَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي رَأَيْتُهُ فَصَامَ وَاَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ (رواه ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) چاند دیکھنے کے لئے لوگ جمع ہوئے، چنانچہ میں نے رسول کریم ﷺ کو بتایا کہ میں نے چاند دیکھا ہے، آپ ﷺ نے روزہ رکھ لیا اور دوسرے لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ شعبان کے دنوں کو بڑی احتیاط سے شمار کرتے تھے

(۱۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَحَفَّظُ مِنْ شَعْبَانَ مَالَا يَتَحَفَّظُ مِنْ غَيْرِهٖ ثُمَّ يَصُوْمُ لِرُؤْيَةِ رَمَضَانَ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْهِ عَدَّ ثَلَاثِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ صَامَ (رواه ابوداؤد)

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ شعبان کے دنوں کو اس قدر احتیاط سے شمار کرتے تھے کہ اور کسی مہینے پر اتنی توجہ مبذول نہیں فرماتے تھے۔ پھر آپ ﷺ رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ رکھتے، اگر (انتیس تاریخ کو) مطلع ابر آلود ہوتا (اور چاند کی رویت ثابت نہ ہوتی) تو تیس دن پورے کرنے کے بعد روزہ شروع کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آپ ﷺ کا معمول تھا کہ شعبان کے مہینے پر آپ ﷺ کی خاص توجہ رہتی تھی اور اس کے دنوں کو بڑی احتیاط اور محافظت کے ساتھ شمار کرتے رہتے تھے تاکہ رمضان کے چاند کے بارے میں کوئی خربطہ پیدا نہ ہو۔ شعبان کے علاوہ اور کسی مہینے پر آپ ﷺ کی اس قدر توجہ مبذول نہیں ہوتی تھی کیونکہ کسی دوسرے مہینے سے کوئی شرعی امر متعلق نہیں تھا البتہ حج کا مہینہ ایسا ہوتا تھا جس سے ایک شرعی فریضہ متعلق تھا سو وہ نادر ہے کہ نہ تو اس کا تعلق ہر شخص سے ہے اور نہ ہر سال فرض ہے۔

چاند دیکھ کر روزہ رکھنا چاہئے

(۱۳) وَعَنْ اَبِي الْبَخْتَرِيِّ قَالَ خَرَجْنَا لِلْعُمْرَةِ فَلَمَّا نَزَلْنَا بِبَطْنِ نَخْلَةَ تَرَاءَيْنَا الْهِلَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ لَيْلَتَيْنِ فَلَقِيْنَا ابْنَ عَبَّاسٍ فَقُلْنَا اِنَّا رَأَيْنَا الْهِلَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ لَيْلَتَيْنِ فَقَالَ اَيَّ لَيْلَةٍ رَأَيْتُمُوْهُ قُلْنَا لَيْلَةَ كَذَا وَكَذَا فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَدَّهُ لِلرُّؤْيَةِ فَهُوَ لَيْلَةَ رَأَيْتُمُوْهُ وَفِي رِوَايَةٍ عَنْهُ قَالَ اَهْلَلْنَا رَمَضَانَ وَنَحْنُ بِذَاتِ عِرْقٍ فَاَرْسَلْنَا رَجُلًا اِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ يَسْأَلُهُ فَقَالَ

ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَدْ اَمَدَّهٗ لِرُؤْيَتِهٖ فَاِنْ اُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوا الْعِدَّةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوالبختری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ عمرہ کرنے کی غرض سے اپنے شہر کوفہ سے نکلے جب ہم لوگ بطن نخلہ میں (جو مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے) ٹھہرے تو چاند دیکھنے کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے (چاند دیکھنے کے بعد) بعض لوگوں نے کہا کہ یہ چاند تیسری شب کا ہے اور دوسرے بعض لوگوں نے کہا کہ دوسری شب کا ہے، اس کے جب ابن عباسؓ سے ہماری ملاقات ہوئی تو ہم نے اس سے لوگوں کا بیان عرض کیا تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تم نے چاند کس رات دیکھا تھا؟ ہم نے کہا کہ ایسی اور ایسی رات (یعنی فلاں مثلاً پیر یا منگل کی رات) میں دیکھا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان کی مدت کو چاند دیکھنے پر موقوف کیا ہے (یعنی جب چاند دیکھا جائے گا تو رمضان کی ابتداء ہوگی) لہٰذا چاند اسی رات کا ہے کہ جس رات میں تم نے اسے دیکھا ہے۔ ابوالبختری ہی کی ایک روایت یوں ہے کہ ہم نے ذات عرق میں کہ (جو مذکورہ بالا بطن نخلہ کے قریب ایک مقام ہے) چاند دیکھا، چنانچہ ہم نے ایک شخص کو حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں ان سے یہ پوچھنے کے لئے بھیجا کہ یہ چاند کس رات کا ہے؟ کیونکہ ہمارے درمیان مذکورہ بالا اختلاف پیدا ہو گیا تھا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شعبان کی مدت کو رمضان کا چاند دیکھنے کے وقت تک دراز کیا ہے۔ لہٰذا اگر (انتیس تاریخ کو) مطلع ابر آلود ہو تو گنتی پوری کرو۔ (یعنی شعبان کے تیس دن پورے کرو) اور اس کے بعد روزہ رکھو۔" (مسلمؒ)

تشریح: حاصل یہ ہے کہ رمضان کا مدار چاند دیکھنے پر ہے چاند کے بڑا ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ منقول ہے کہ چاند رات میں چاند کا بڑا ہونا قرب قیامت کی علامت ہے۔ یہاں جو روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ وہ اگرچہ بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں مگر درحقیقت اس احتمال کے پیش نظر ان میں کوئی منافات نہیں ہے کہ ان لوگوں نے ذات عرق میں جمع ہو کر چاند دیکھا ہو پھر ان میں اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں ایک آدمی حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں بھیجا گیا ہو، انہوں نے اس وقت آنحضرت ﷺ کا ارشاد نقل فرمادیا، پھر جب سب لوگ بطن نخلہ میں پہنچے، تو اس بارے میں حضرت ابن عباسؓ سے بالمشافہ سوال کیا، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے انہیں آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کی روشنی میں مذکورہ بالا جواب دیا، چاند دیکھنے کے بارے میں کچھ مسائل ذہن نشین کر لیجئے۔

اگر شعبان کی تیس تاریخ کو دن میں زوال سے پہلے یا زوال کے بعد چاند نظر آئے تو وہ شب آئندہ کا چاند سمجھا جائے گا، لہٰذا اس دن نہ تو رمضان کی ابتداء کا حکم دیا جائے گا۔ اور نہ اس دن روزہ رکھنے کے لئے کہا جائے گا، اسی طرح اگر رمضان کی تیس تاریخ کو چاند نظر آئے تو نہ اس دن روزہ افطار کیا جائے گا اور نہ اس دن کو یوم عید قرار دیا جائے گا۔ شعبان کی تیسویں شب یعنی انتیس تاریخ کو چاند تلاش کرنا واجب علی الکفایہ ہے۔ اگر کسی ایک جگہ چاند کی رویت ثابت ہو جائے تو تمام جگہوں کے لوگوں کو اگلے روز روزہ رکھنا واجب ہوگا اس سلسلے میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہ ہوگا۔ مثلاً اگر دہلی میں جمعہ کی شب میں چاند کی رویت ہو جائے اور دوسرے شہروں میں ہفتہ کی شب میں چاند دیکھا جائے تو ہفتہ کی شب میں چاند دیکھنے کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ تمام شہروں میں دہلی کی رویت معتبر ہوگی اور سب جگہ جمعہ کے روز سے روزہ رکھنا لازم ہوگا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ظاہری روایت یہی ہے اور حنفیہ کے جمہور علماء کا اسی پر اعتماد و فتویٰ ہے جب کہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے مسلک میں اختلاف مطالع کا اعتبار ہے، ان حضرات کے ہاں ایک شہر والوں کا چاند دیکھنا دوسرے شہر والوں کے لئے کافی نہیں ہے۔

جس شخص نے رمضان کا چاند دیکھا ہو اور اس کی شہادت و خبر کسی وجہ سے قابل قبول نہ ہو تو خود اس کو اپنی رویت کے مطابق روزہ رکھنا چاہئے۔ اگر وہ خود بھی روزہ نہیں رکھے گا تو اس پر قضا لازم آئے گی۔

باب
روزہ کے متفرق مسائل کا بیان
اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ
سحری کھانے کا حکم

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السَّحُوْرِ بَرَکَۃً (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سحری کھاؤ، کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھنے کے لئے سحر کے وقت کچھ نہ کچھ کھالینا چاہئے، چنانچہ ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ سحری کھاؤ، چاہے وہ ایک گھونٹ پانی ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو۔ یہ حکم وجوب کے طور پر نہیں ہے بلکہ بطور استحباب ہے۔ "سحر" رات کے آخری حصے کو کہتے ہیں "سحور" سین کے زبر کے ساتھ اسم ہے یعنی سحور طعام سحر کو کہتے ہیں اور سین کے پیش کے ساتھ "مصدر" ہے جس کے معنی ہیں "سحر کے وقت کھانا" یہاں اس روایت میں یہ لفظ "سحور" (اسم) نقل کیا گیا ہے، چنانچہ محدثین کے نزدیک روایت محفوظ میں یہ لفظ یوں ہی ہے البتہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ بہتر اور مناسب سحور (مصدر) ہی ہے کیونکہ حدیث کے مفہوم کے پیش نظر برکت کا تعلق "فعل" یعنی سحر کے وقت کھانے سے ہے نہ کہ اس کا تعلق اسم یعنی طعام سے ہے۔

"برکت" سے مراد یہ ہے کہ سحری کھانا چونکہ دراصل سُنّت نبوی پر عمل کرنا ہے اس لئے اس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اجر عظیم حاصل ہوتا ہے بلکہ روزہ رکھنے کی قوت بھی آتی ہے۔

سحر کے وقت کھانا اہل ایمان اور اہل کتاب کے درمیان ایک امتیاز ہے

② وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَصْلُ مَابَیْنَ صِیَامِنَا وَصِیَامِ اَھْلِ الْکِتَابِ اَکْلَۃُ السَّحَرِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو بن عاصؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ہمارے روزے اور اہل کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) کے روزے کے درمیان فرق سحری کھانا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اہل کتاب کے ہاں رات میں سو رہنے کے بعد کھانا حرام تھا، اسی طرح مسلمانوں کے ہاں بھی ابتداء اسلام میں یہی حکم تھا مگر بعد میں مباح ہو گیا، لہٰذا سحری کھانے سے اہل کتاب کی مخالفت لازم آتی ہے جو اس عظیم نعمت کی شکر گذاری کا ایک ذریعہ ہے۔

افطار میں جلدی بھلائی ہے

③ وَعَنْ سَھْلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَزَالُ النَّاسُ بِخَیْرٍ مَّا عَجَّلُوا الْفِطْرَ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہلؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے، بھلائی کے ساتھ رہیں گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "افطار میں جلدی" کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کے غروب ہو جانے کے بعد افطار میں دیر نہ لگائی جائے، شہروں میں غروب

آفتاب کی علامت یہ ہے کہ مشرق کی جانب سیاہی بلند ہو جائے یعنی جہاں سے صبح صادق شروع ہوتی ہے وہاں تک پہنچ جائے آسمان کے بیچوں بیچ سیاہی کا پہنچنا شرط نہیں ہے۔

غروب آفتاب کے بعد افطار میں جلدی کرنے سے اہل کتاب کی مخالفت بھی ہوتی ہے کیونکہ وہ افطار میں اس وقت تک تاخیر کرتے ہیں جب کہ ستارے خوب اچھی طرح نہیں نکل آتے مسلمانوں میں اہل بدعت یعنی روافض کے یہاں بھی اسی پر عمل ہے لہٰذا ان کی مخالفت بھی ہو جاتی ہے۔

صحیح احادیث کے بموجب مغرب کی نماز پڑھنے سے پہلے افطار کرنا سُنّت ہے۔

افطار کا وقت

④ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هٰهُنَا وَاَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هٰهُنَا وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ اَفْطَرَ الصَّائِمُ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب ادھر سے رات آئے (یعنی مشرق کی جانب سے رات کی سیاہی بلند ہو) اور ادھر (مغرب) سے دن جائے اور سورج (پورا) ڈوب جائے تو (سمجھو کہ) روزہ دار نے افطار کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: وغربت الشمس (اور سورج ڈوب جائے) دراصل اپنے ماقبل کے جملوں کی تاکید کے طور پر استعمال فرمایا گیا، حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ جب افطار کا وقت ہو گیا تو گویا روزہ دار نے افطار کر لیا چاہے اس نے کچھ کھایا پیا نہ ہو بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ "روزہ دار افطار کے وقت میں داخل ہو گیا"۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملے کے معنی مراد ہوں کہ "جب مذکورہ وقت آجائے تو روزہ کو افطار کر لینا چاہئے"۔

روزہ پر روزہ رکھنے کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ فِی الصَّوْمِ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ اِنَّكَ تُوَاصِلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاَيُّكُمْ مِثْلِیْ اِنِّیْ اَبِيْتُ يُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَيَسْقِيْنِیْ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے روزہ پر روزہ رکھنے سے منع فرمایا تو ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) تو روزہ پر روزہ رکھتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا۔ تم میں سے کون شخص میری طرح ہے، میں تو اس طرح رات گذارتا ہوں کہ مجھے میرا پروردگار کھلاتا ہے اور میری پیاس بجھاتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "روزہ پر روزہ" کا مطلب یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد روزے اس طرح مسلسل رکھے جائیں کہ درمیان میں افطار نہ ہو۔ روزہ پر روزہ رکھنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ یہ ضعف کا سبب ہوتا ہے جس کی وجہ سے دوسری عبادات و طاعات میں نقصان و حرج واقع ہوتا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کے ہاں اختلاف ہے کہ آیا آنحضرت ﷺ کے علاوہ اور لوگوں کے لئے روزہ پر روزہ رکھنا جائز ہے یا حرام اور یا مکروہ؟ چنانچہ بعض حضرات تو اس شخص کے لئے جواز کے قائل ہیں جو اس پر قادر ہو، یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس صورت میں حدیث بالا میں مذکورہ ممانعت صرف رحمت و شفقت کے طور پر ہے ان کی دلیل حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو وصال (یعنی روزہ پر روزہ رکھنے) سے ان پر رحمت و شفقت کے پیش نظر منع فرمایا ہے۔ نیز بعض صحابہ مثلاً حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ وغیرہ اور بعض تابعین مثلاً حضرت عبد اللہ بن ابی معمر، عامر بن عبد اللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابراہیم تیمی کے بارے میں منقول ہے کہ یہ حضرات روزہ پر روزہ رکھتے تھے۔ اکثر علماء کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے اسے مکروہ

کہا ہے اگرچہ اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا مکروہ تحریمی ہے یا مکروہ تنزیہی؟ زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ مکروہ تحریمی ہے جمہور علماء کا کہنا یہ ہے کہ روزہ پر روزہ رکھنا آنحضرت ﷺ کے خصاص میں سے ہے اور حدیث کے ظاہری مفہوم سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے اس بنا پر اہل سلوک کہ جو ریاضت و مجاہدہ اور نفس کشی کا زیادہ شوق اور ذوق رکھتے ہیں ایک چلو پانی سے ہر روزہ کا افطار کرلیا کرتے تھے تاکہ روزہ پر روزہ رکھنے کا اطلاق نہ ہوسکے۔

یطعمنی ربی ویسقینی کی مراد کے بارے میں کئی اقوال ہیں مختار اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اس سے "ظاہری کھلاپلانا" مراد نہیں ہے، آپ ﷺ غذائے جسمانی سے قطعاً مستغنی تھے اور جب دنیاوی طور پر محبت مجازی اور مسرت حسی میں اس کا تجربہ ہے تو محبت حقیقی اور مسرت معنوی کا کیا کہنا کہ اس کی وجہ سے علائق دنیا سے جتنا بھی استغنا ہو کم ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

روزہ کی نیت کب کی جائے

(۶) عَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَّمْ یُجْمِعِ الصِّیَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَاصِیَامَ لَهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ اَبُوْدَاوٗدَ وَقَفَهٗ عَلٰی حَفْصَةَ مَعْمَرٌ وَّالزُّبَیْدِیُّ وَابْنُ عُیَیْنَةَ وَیُوْنُسُ الْاَیْلِیُّ کُلُّهُمْ عَنِ الزُّهْرِیِّ۔

"حضرت حفصہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص روزے کی نیت فجر کے پہلے نہ کرے تو اس کا روزہ (کامل) نہیں ہوتا۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) اور امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ معمرؒ، زبیدیؒ، ابن عیینہؒ اور یونس ایلیؒ ان تمام نے اس روایت کو زہری سے نقل کیا ہے اور حضرت حفصہؓ پر موقوف کیا ہے یعنی اس حدیث کو حضرت حفصہؓ کا قول کہا ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر روزہ کی نیت رات ہی سے نہ کی جائے تو روزہ درست نہیں ہوتا خواہ روزہ فرض ہو یا واجب یا نفل۔ لیکن اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، چنانچہ حضرت امام مالکؒ کا تو یہی مسلک ہے کہ روزہ میں نیت رات ہی سے کرنی شرط ہے خواہ روزہ کسی نوعیت کا ہو، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے لیکن نفل کے معاملے میں ان دونوں کے یہاں اتنا فرق ہے کہ اگر روزہ نفل ہو تو امام احمدؒ کے ہاں زوال سے پہلے بھی نیت کی جاسکتی ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک آفتاب غروب ہونے سے پہلے تک بھی نیت کرلینی جائز ہے۔ حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ رمضان، نفل اور نذر معین کے روزہ میں آدھے دن شرعی یعنی زوال آفتاب سے پہلے پہلے نیت کرلینی جائز ہے لیکن قضاء کفارہ اور نذر مطلق میں حنفیہ کے یہاں بھی رات ہی سے نیت کرنی شرط ہے ان تمام حضرات کی دلیلیں فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

سحری کا آخری وقت

(۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعَ النِّدَاءَ اَحَدُکُمْ وَالْاِنَاءُ فِیْ یَدِهٖ فَلَایَضَعْهُ حَتّٰی یَقْضِیَ حَاجَتَهٗ مِنْهُ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اگر تم میں سے کوئی شخص (فجر کی) اذان سنے اور اس کے ہاتھوں میں برتن ہو (کہ جس سے وہ پینے یا کچھ کھانے کا ارادہ رکھتا ہو) تو برتن نہ رکھ دے بلکہ اپنی ضرورت پوری کرلے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر سحر کے وقت کوئی شخص کھانا پینا چاہتا ہو مگر فجر کی اذان شروع ہوگئی تو وہ محض اذان کی آواز سن کر اپنا کھانا نہ چھوڑ دے، لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ حکم اس صورت کے لئے ہے جب کہ یہ یقین یا گمان غالب ہو کہ صبح نہیں ہوئی ہے اور سحر کا وقت

باقی ہے اور اگر اس بات کا یقین یا گمان غالب ہو کہ صبح ہو گئی ہے اور سحر کا وقت باقی نہیں رہا ہے تو پھر کھانا پینا چھوڑ دینا چاہئے۔ ابن مالک فرماتے ہیں کہ اگر طلوع صبح کا علم نہ ہو تو کھانا پینا موقوف نہ کرے اور اگر یہ معلوم ہو کہ صبح طلوع ہو گئی ہے یا طلوع صبح کا شک بھی ہو تو کھانا پینا چھوڑ دے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حدیث میں مذکور "اذان" سے مراد "مغرب کی اذان" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اذان سن کر کھانا پینا چھوڑ دینا مسنون ہے مگر افطار کے وقت اگر کوئی شخص مغرب کی اذان سنے اور وہ کچھ پی رہا ہو تو اس صورت میں پینا نہ چھوڑے بلکہ پہلے پی لے پھر نماز کے لئے جائے۔

وقت ہو جانے پر افطار میں جلدی کرنے کی فضیلت

(۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَحَبُّ عِبَادِیْ اِلَیَّ اَعْجَلُهُمْ فِطْرًا۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرے بندوں میں مجھے سب سے زیادہ پیارا وہ بندہ ہے جو (وقت ہو جانے پر) افطار میں جلدی کرے۔" (ترمذی)

تشریح: جلد افطار کرنے والے کو خدا کی نظر میں سب سے زیادہ پسندیدہ ہونے کی فضیلت اس لئے حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس عمل کے ذریعے نہ صرف یہ کہ سُنّت کی اتباع کرتا بلکہ اہل کتاب اور روافض کی مخالفت بھی کرتا ہے۔

کھجور اور پانی سے افطار باعث برکت ہے

(۹) وَعَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَفْطَرَ اَحَدُکُمْ فَلْیُفْطِرْ عَلٰی تَمْرٍ فَاِنَّهٗ بَرَکَةٌ فَاِنْ لَّمْ یَجِدْ فَلْیُفْطِرْ عَلٰی مَاءٍ فَاِنَّهٗ طَهُوْرٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْ دَاؤدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ وَلَمْ یَذْکُرْ فَاِنَّهٗ بَرَکَةٌ غَیْرُ التِّرْمِذِیُّ۔

"اور حضرت سلمان بن عامرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تم میں سے جو شخص روزہ افطار کرے تو اسے چاہئے کہ وہ کھجور سے افطار کرے کیونکہ کھجور باعث برکت ہے اور اگر کوئی شخص کھجور نہ پائے تو پانی سے افطار کرے کیونکہ پانی پاک کرنے والا ہے۔ اس روایت کو احمدؒ و ترمذیؒ و ابن ماجہؒ و دارمیؒ نے نقل کیا ہے مگر لفظ فانہ برکۃ ترمذیؒ کے علاوہ کسی اور نے ذکر نہیں کیا ہے۔"

تشریح: کھجور اور پانی سے افطار کرنے کا حکم استحباب کے طور پر ہے اور کھجور سے افطار کرنے میں بظاہر حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب معدہ خالی ہوتا ہے اور کھانے کی خواہش پوری طرح ہوتی ہے تو اس صورت میں جو چیز کھائی جاتی ہے اسے معدہ اچھی طرح قبول و ہضم کرتا ہے، لہٰذا ایسی حالت میں جب شیرینی معدہ میں پہنچتی ہے تو بدن کو بہت زیادہ فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ شیرینی کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے قوائے جسمانی میں قوت جلدی سرایت کرتی ہے، خصوصاً قوت باصرہ کو شیرینی سے بہت فائدہ پہنچتا ہے اور چونکہ عرب میں شیرینی اکثر کھجور ہی کی ہوتی ہے اور اہل عرب کے مزاج اس سے بہت زیادہ مانوس ہیں اس لئے کھجور سے افطار کرنے کے لئے فرمایا گیا، کھجور نہ پانے کی صورت میں پانی سے افطار کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ ظاہری و باطنی طہارت و پاکیزگی کے لئے فال نیک ہے۔

آنحضرت ﷺ کی افطاری

(۱۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُفْطِرُ قَبْلَ اَنْ یُّصَلِّیَ عَلٰی رُطَبَاتٍ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ رُطَبَاتٌ فَتُمَیْرَاتٌ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تُمَیْرَاتٌ حَسَا حَسَوَاتٍ مِنْ مَاءٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْ دَاؤدَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ

غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز مغرب سے پہلے چند تازہ کھجوروں سے افطار فرمایا کرتے تھے اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں تو خشک کھجوروں سے روزہ افطار فرماتے اور اگر خشک کھجوریں بھی نہ ہوتیں تو چند (یعنی تین) چلو پانی پی لیتے۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: ایک روایت میں جو ابویعلی سے منقول ہے یہ ہے کہ "رسول کریم ﷺ تین کھجوروں سے یا کسی ایسی چیز سے جو آگ کی پکی ہوئی نہ ہوتی تھی۔ روزہ کھولنا پسند فرماتے تھے"۔

بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ مکہ مکرمہ میں مقیم لوگوں کے لئے یہ مسنون ہے کہ وہ کھجوروں سے پہلے آب زمزم پی کر روزہ افطار یں یا ان دونوں کو ملا کر ان سے روزہ افطار یں تو یہ بالکل غلط بلکہ اتباع سُنت نبوی کے بھی خلاف ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں بہت دنوں تک مقیم رہے مگر آپ ﷺ سے ایسا کوئی عمل منقول نہیں ہے۔

روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار جیسا ثواب ملتا ہے

⑪ وَعَنْ زَیْدِبْنِ خَالِدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا اَوْجَھَّزَ غَازِیًا فَلَہٗ مِثْلُ اَجْرِہٖ۔ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَمُحْیُ السُّنَّۃِ فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ وَقَالَ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت زید ابن خالدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص روزہ دار کو افطار کراتا ہے یا کسی غازی کا سامان درست کرتا ہے تو اس کو اسی کے ثواب جیسا ثواب ملتا ہے۔ (اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے، نیز محی السنۃ نے بھی اسے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ روزہ دار کو اس کے روزے کی وجہ سے اور غازی کو اس کے جہاد کا جیسا ثواب ملتا ہے ویسا ہی ثواب کسی کو روزہ افطار کرانے والے اور کسی مجاہد کا سامان جہاد درست کرنے والے کو بھی ملتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اس عمل کے ذریعے ایک نیک کام میں مددگار ہوتا ہے۔

افطار پر ارشاد گرامی

⑫ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَفْطَرَ قَالَ ذَھَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ افطار کرتے تو یہ فرماتے۔ پیاس چلی گئی، رگیں تر ہوگئیں اور اللہ نے چاہا تو ثواب ثابت ہوگیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں اُمت کے لئے عبادات کی ترغیب ہے کہ عبادات میں مشقت تو بہت تھوڑی ہے کیونکہ وہ ختم ہو جاتی ہے مگر اجر و ثواب زیادہ ہے اس لئے کہ وہ باقی و ثابت رہنے والا ہے۔

افطار کی دعا

⑬ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ زُھْرَۃَ قَالَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا اَفْطَرَ قَالَ اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت معاذ بن زہرہ (تابعی) کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب افطار کرتے تو یہ فرماتے۔ اے اللہ میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا اور اب تیرے ہی رزق سے افطار کرتا ہوں۔ (اس روایت کو ابوداؤد نے بطریق ارسال نقل کیا ہے)۔"

تشریح: ابن ملک کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ یہ دعا افطار کے بعد پڑھا کرتے تھے اس دعا میں وَلَكَ صُمْتُ کے بعد یہ الفاظ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ عام طور سے پڑھے جاتے ہیں، یہ الفاظ اگرچہ حدیث سے ثابت نہیں ہیں مگر معنی کے اعتبار سے صحیح ہیں، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ روزہ دار افطار کے وقت جو دعا مانگتا ہے وہ رد نہیں کی جاتی بلکہ قبول ہوتی ہے، افطار کے وقت آپ ﷺ سے یہ پڑھنا بھی منقول ہے یَا وَاسِعَ الْفَضْلِ اغْفِرْلِیْ نیز یہ بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ یہ بھی پڑھا کرتے تھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَعَانَنِیْ فَصُمْتُ وَرَزَقَنِیْ فَاَفْطَرْتُ

"تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے میری مدد کی کہ میں نے روزہ رکھا اور مجھے رزق عطا فرمایا کہ میں نے افطار کیا۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جلدی افطار کرنے کا ثمرہ

(۱۴) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ الدِّيْنُ ظَاهِرًا مَا عَجَّلَ النَّاسُ الْفِطْرَ لِاَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى يُؤَخِّرُوْنَ۔ (رواه ابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ دین اسلام ہمیشہ غالب رہے گا جب تک کہ لوگ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے کیونکہ یہود و نصاریٰ افطار میں دیر کرتے ہیں۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہود و نصاریٰ افطار میں اتنی تاخیر کرتے ہیں کہ ستارے گنجان یعنی پوری طرح نکل آتے ہیں اور اس زمانہ میں روافض بھی ان کی پیروی کرتے ہیں، لہٰذا وقت ہو جانے پر جلدی افطار کرنے میں اہل باطل کی مخالفت ہوتی ہے جس سے دین کا غلبہ اور دین کی شوکت ظاہر ہوتی ہے یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دین کے دشمنوں کی مخالفت درحقیقت دین کی مضبوطی اور غلبہ کا باعث ہے اور ان کی موافقت دین کے نقصان کا ذریعہ ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَّمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ

"اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ ان میں سے بعض بعض لوگوں کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو شخص ان سے دوستی کرے گا وہ ان ہی میں سے ہوگا۔"

جلدی افطار کرنا مسنون ہے

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ عَطِيَّةَ قَالَ دَخَلْتُ اَنَا وَمَسْرُوْقٌ عَلٰى عَائِشَةَ فَقُلْنَا يَا اُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ رَجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَدُهُمَا يُعَجِّلُ الْاِفْطَارَ وَيُعَجِّلُ الصَّلٰوةَ وَالْاٰخَرُ يُؤَخِّرُ الْاِفْطَارَ وَيُؤَخِّرُ الصَّلَاةَ قَالَتْ اَيُّهُمَا يُعَجِّلُ الْاِفْطَارَ وَيُعَجِّلُ الصَّلَاةَ قُلْنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ هٰكَذَا صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ اَبُوْ مُوْسٰى (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوعطیہ کہتے ہیں کہ میں اور مسروق دونوں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے ام المؤمنین! آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ میں دو اشخاص ہیں ان میں سے ایک صاحب تو جلدی افطار کرتے ہیں اور جلدی نماز پڑھتے ہیں دوسرے

صاحب دیر کر کے افطار کرتے ہیں دیر کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ جلدی افطار کرنے والے اور نماز پڑھنے والے کون صاحب ہیں؟ ہم نے کہا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا یہی معمول تھا اور دوسرے صاحب جو افطار اور نماز میں دیر کرتے تھے حضرت ابوموسیٰؓ تھے۔" (مسلم)

تشریح: حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ بڑے اونچے درجے کے عالم اور فقیہ تھے اس لئے انہوں نے سنت کے مطابق عمل کیا۔ حضرت ابوموسیٰؓ بھی بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ ان کا عمل بیان جواز کی خاطر تھا یا انہیں کوئی عذر لاحق ہو گا یہ بھی احتمال ہے کہ وہ ایسا کبھی کبھی، (کسی مصلحت و مجبوری کی خاطر) کرتے ہوں گے۔

سحری بابرکت ہے

(۱۶) وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ دَعَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى السُّحُوْرِ فِيْ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلُمَّ اِلَى الْغَدَاءِ الْمُبَارَكِ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عرباض ابن ساریہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے رمضان میں سحری کھانے کے لئے بلایا اور فرمایا کہ بابرکت کھانے کے لئے آؤ۔" (ابوداؤدؒ والنسائیؒ)

بہترین سحری

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ سُحُوْرُ الْمُؤْمِنِ التَّمْرُ (رواہ ابوداؤد)

"اور ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مؤمن کے لئے سحری کا بہترین کھانا کھجور ہے۔" (ابوداؤدؒ)

بَابُ تَنْزِيْهِ الصَّوْمِ
روزہ کو پاک کرنے کا بیان

اس باب میں یہ بیان کیا جائے گا کہ کن چیزوں سے روزہ جاتا رہتا ہے اور کن چیزوں سے روزہ کا ثواب باطل ہو جاتا ہے نیز یہ کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے روزہ کا ثواب کم ہو جاتا ہے لہٰذا ان تمام چیزوں سے اجتناب اور پرہیز ضروری ہے جن سے روزہ پر کسی بھی حیثیت سے اثر پڑتا ہو۔

اگرچہ روزہ کے مفسدات وغیرہ آئندہ صفحات میں مذکور احادیث کے ضمن میں متفرق طور پر آئیں گے لیکن مناسب معلوم ہوا کہ اس موقع پر ایسے تمام مسائل یکجا طور پر فقہ کی معتبر کتابوں کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے جائیں تاکہ قارئین کو فائدہ اور آسانی ہو اس لئے "امداد الفتاح شرح نور الایضاح" سے ماخوذ مسائل یہاں نقل کئے جاتے ہیں، یہ کتاب عرب میں بھی معتبر اور مروج ہے نیز اس کتاب میں یہ مسائل بڑی ترتیب کے ساتھ مذکور ہیں، بعض مسائل در مختار سے بھی اخذ کئے گئے ہیں۔

وہ چیزیں جن سے روزہ فاسد نہیں ہوتا

کسی شخص کو روزے کا خیال نہ رہا اور اس وجہ سے اس نے کچھ کھا پی لیا یا جماع کر لیا تو روزہ فاسد نہیں ہوگا، خواہ روزہ فرض ہو یا نفل۔ کسی شخص نے بھول کر جماع شروع کیا پھر فوراً ہی یاد آ گیا کہ روزہ دار ہوں تو اگر اس نے یاد آتے ہی فوراً اپنا عضو مخصوص شرمگاہ سے باہر نکال لیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اور اگر نہ نکالا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اس صورت میں اس روزے کی قضا لازم ہوگی۔ کفارہ ضروری نہیں

ہو گا مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ کفارہ کا ضروری نہ ہونا اس صورت سے متعلق ہے جب کہ اپنے بدن کو حرکت نہ دے یعنی یاد آجانے کے بعد دھکا نہ لگائے۔ جس سے کہ انزال ہو جائے کیونکہ اگر دھکا لگائے گا تو کفارہ لازم ہو گا جیسا کہ اگر کوئی شخص یاد آجانے کے بعد عضو مخصوص باہر نکال کر پھر داخل کر دے تو اس پر کفارہ لازم ہو گا اگر کوئی شخص طلوع فجر سے پہلے قصداً جماع میں مشغول ہو گیا اور اسی دوران فجر طلوع ہو گئی تو اسے فوراً علیحدہ ہو جانا ضروری ہو گا اگر نہ صرف یہ کہ فوراً علیحدہ نہ ہو بلکہ بدن کو حرکت بھی دے تو اس صورت میں کفارہ لازم ہو گا۔ ہاں بدن کو حرکت نہ دے اور علیحدہ بھی نہ ہو تو صرف روزہ فاسد ہو جائے گا، اگر کوئی شخص طلوع فجر کے خوف سے جماع سے علیحدہ ہو جائے اور پھر طلوع فجر کے بعد جماع سے علیحدہ ہو جانے کی صورت میں انزال ہو جائے تو اس سے روزہ پر اثر نہیں پڑے گا۔

اگر کوئی شخص بھول کر کچھ کھا پی رہا ہو تو دوسرے لوگوں کو اسے یاد دلانا چاہئے کیونکہ ایسی حالت میں اسے یاد نہ دلانا مکروہ ہے بشرطیکہ اس شخص میں روزہ رکھنے کی قوت ہو اور وہ بغیر کسی مشقت کے رات تک اپنا روزہ پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہو، اگر کوئی شخص اسے یاد دلا دے اور پھر بھی اسے یاد نہ آئے اور وہ کھا پی لے تو اس صورت میں اس پر قضا لازم ہو گی، اگر اس شخص میں روزہ رکھنے کی قوت نہ ہو تو اسے یاد نہ دلانا ہی اولیٰ ہے۔

عورت کی شرمگاہ کی طرف نظر ڈالنے کی وجہ سے انزال ہونے کی صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ جانور کے ساتھ فعل بد کرنے سے انزال ہو جانے کی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے جب کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ روزہ نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر انزال نہ ہو تو متفقہ طور پر مسئلہ یہ ہے کہ صرف فعل بد کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

جلق کے ذریعے انزال ہو جانے کی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا لازم آتی ہے کفارہ ضروری نہیں ہوتا اس بارے میں یہ بات جان لینی ضروری ہے کہ یہ فعل قبیح (جلق) غیر رمضان میں بھی حلال نہیں ہے جب کہ اسے قضاء شہوت مقصود ہو، ہاں اگر تسکین شہوت مقصود ہو تو پھر امید ہے کہ اس صورت میں اس پر کوئی وبال نہیں ہو گا، یعنی اگر کوئی شخص محض لذت حاصل کرنے کے لئے اس فعل میں مبتلا ہو تو اس کے لئے یہ قطعاً حلال نہیں ہے اور اگر اضطراب و بیقراری کی یہ حالت ہو کہ اس فعل کے ذریعے منی خارج نہ کرنے کی صورت میں زنا میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہو اور وہ جلق کرے تو پھر امید ہے کہ وہ گنہگار نہ ہو لیکن اس پر مداومت بہر صورت گناہ کا باعث ہے۔

کسی عورت کا تصور کرنے سے انزال ہو جائے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، اسی طرح دو عورتوں کا آپس میں فعل بد کرنا جسے چپٹی لگانا بھی کہا جاتا ہے روزہ کو نہیں توڑتا بشرطیکہ انزال نہ ہو اگر انزال ہو گا تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا لازم آئے گی، تیل لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ مسامات کے ذریعے کسی چیز کا بدن میں داخل ہونا روزے کے منافی نہیں ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص نہائے اور اس کے جگر کو ٹھنڈک پہنچے، اسی طرح سرمہ لگانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، اگرچہ اس کا مزہ حلق میں محسوس ہو یا اس کا رنگ رینٹ اور تھوک میں ظاہر ہو کیونکہ آنکھ اور دماغ کے درمیان کوئی راستہ نہیں ہے اسی لئے آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک کر نکلتے ہیں جیسا کہ کسی چیز کا عرق کشید ہوتا ہے اور یہ بتایا ہی جا چکا ہے کہ جو چیز مسامات کے ذریعے بدن میں داخل ہوتی ہے وہ روزہ کے منافی نہیں ہے پھر یہ کہ سرمہ کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ "آنحضرت ﷺ روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا کرتے تھے، اسی طرح اگر آنکھ میں دوا یا دودھ تیل کے ساتھ ڈالا جائے اور اس کا مزہ یا اس کی تلخی حلق میں محسوس ہو تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

اگر کوئی شخص کوئی چیز یعنی روئی وغیرہ نگل جائے درانحالیکہ وہ کسی ڈورے میں بندھی ہو اور ڈورہ اس کے ہاتھ میں ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا جب تک وہ ڈورے سے کھل کر پیٹ میں نہ گر جائے اگر ڈورے سے کھل کر گر پڑے گی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اور اگر کوئی اپنے

حلق میں لکڑی یا اسی کی مانند کوئی اور چیز داخل کرے اور اس کا دوسرا سرا اس کے ہاتھ میں ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی انگلی مقعد میں داخل کرے یا کوئی عورت اپنی انگلی شرم گاہ میں داخل کرے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ ہاں اگر انگلی پانی یا تیل سے تر ہو گی تو ٹوٹ جائے گا۔ سینگی اور غیبت سے روزہ فاسد نہیں ہوتا البتہ روزہ کا ثواب جاتا رہتا ہے محض افطار کی نیت کرنے سے جب کہ کچھ کھائے پئے نہیں روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کسی شخص کے حلق میں بے قصد و اختیار دھواں چلا جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا کیونکہ اس سے بچنا قطعا ناممکن ہے، اگر کوئی شخص احتیاط کے پیش نظر ایسے موقعہ پر اپنا منہ بند بھی کرلے گا تو دھواں ناک کے ذریعے داخل ہوگا، لہٰذا یہ تری کی قسم سے ہے جو کلی کے بعد منہ میں باقی رہتی ہے اور جس سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ہاں اگر قصداً کوئی شخص اپنے حلق میں دھواں داخل کرے گا اور داخل کرنا کسی بھی صورت سے ہو تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا خواہ دھواں عنبر کا ہو یا اگرتی کا یا ان کے علاوہ کسی بھی چیز کا، لہٰذا اگر کوئی شخص خوشبو کی کوئی چیز جلا کر اس کا دھواں اپنی طرف لے گا، اور اس کو سونگھے گا باوجودیکہ اسے یہ یاد ہو کہ میں روزہ دار ہوں تو اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا کیونکہ اس کے لئے اس سے بچنا ممکن ہے اس مسئلہ سے اکثر لوگ غافل ہیں اس بارے میں احتیاط پیش نظر رہنی چاہئے یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ اس مسئلے کو مشک وگلاب اور دیگر خوشبو کے سونگھنے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ محض خوشبودار دھوئیں کے اس جوہر میں جو قصداً حلق میں داخل کیا جائے، جو فرق ہے وہ سب ہی جانتے ہیں اسی طرح حقہ کے دھوئیں سے بھی روزہ جاتا رہتا ہے کیونکہ وہ قصداً کھینچا جاتا ہے اور اس سے نفس کو تسکین ہوتی ہے اور اکثر حالت میں بطور دوا استعمال کیا جاتا ہے۔

پسینہ اور آنسو حلق میں جانے سے روزہ پر اثر نہیں پڑتا جب کہ وہ تھوڑی مقدار میں ہوں ہاں اگر وہ زیادہ مقدار میں جائیں کہ جس سے حلق میں نمکینی محسوس ہو تو روزہ ٹوٹ جائے گا کسی خوشبو کی چیز مثلاً پھول وعطر وغیرہ سونگھنے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔

کسی شخص کے حلق میں غبار یا چکی پیستے ہوئے آٹا یا مکھی جائے یا دوائیں کوٹتے ہوئے یا ان کی پڑیا باندھتے ہوئے اس میں سے کچھ اڑ کر حلق میں چلا جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ ان چیزوں سے بچنا ناممکن ہے۔

کوئی روزہ دار حالت جنابت میں صبح کو اٹھے تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا اگرچہ وہ پورے دن یا کئی دن تک اسی طرح رہے اور غسل پاکی نہ کرے البتہ نجس رہنے اور نماز وغیرہ نہ پڑھنے کی وجہ سے ثواب سے محروم رہے گا۔

اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں اپنے عضو مخصوص کے سوراخ میں دوا یا تیل وغیرہ ڈالے یا اسی طرح سلائی وغیرہ داخل کرائے تو اگرچہ یہ چیزیں مثانہ تک پہنچ جائیں، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کے قول کے مطابق روزہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ مثانہ نہ صرف یہ کہ جوف سے خارج ہے بلکہ مثانہ میں سے اندر کو راستہ نہیں ہے، اسی لئے پیشاب بھی ٹپک کر نکلتا ہے البتہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک مذکورہ بالا صورت میں روزہ جاتا رہتا ہے ہاں اگر یہ چیزیں مثانہ تک نہ پہنچیں بلکہ عضو مخصوص کی اندرونی نالی تک ہی محدود رہیں تو تینوں حضرات کے نزدیک روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

کوئی شخص پانی میں بیٹھ جائے اور پانی اس کے کان میں چلا جائے یا وہ تنکے سے اپنا کان کھجلائے اور تنکے پر کان کا میل ظاہر ہو اور پھر وہ اس تنکے کو کان میں ڈالے اور اس طرح کئی مرتبہ کرے تب بھی روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

کسی شخص کی ناک میں دماغ سے اتر کر بلغم آجائے اور وہ اس کو چڑھا جائے یا نگل جائے جیسا کہ اکثر بے تمیز اور کثیف الطبع لوگ کرتے ہیں تو روزہ نہیں ٹوٹتا، کسی کے منہ سے لعاب نکلے اور وہ منقطع نہ ہو بلکہ مثل تار کے لٹک کر ٹھوڑی تک پہنچ جائے، اور پھر وہ اس لعاب کو اوپر کھینچ کر نگل جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر لعاب لٹکتا نہ رہے بلکہ منقطع ہو کر گر جائے، اور پھر وہ اسے منہ میں ڈال لے تو روزہ جاتا رہے گا، منہ بھر بلغم نگل جانے سے امام ابویوسفؒ کے نزدیک روزہ جاتا رہتا ہے مگر امام اعظمؒ کے نزدیک اس سے روزہ نہیں جاتا، امام شافعیؒ کے نزدیک جب کہ بلغم وغیرہ کے تھوک دینے پر قادر ہو اور اس کے باوجود نگل جائے تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔

بے اختیار قے ہو جانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا خواہ قے کسی قدر ہو منہ بھر کر یا اس سے زیادہ اسی طرح صورت میں بھی روزہ فاسد

نہیں ہوتا جب کہ آئی ہوئی قے بے اختیار حلق کے نیچے اتر جائے خواہ وہ کسی قدر ہو لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں روزہ جاتا رہتا ہے ہاں اگر وہ قصداً نگل جائے اور منہ بھر کر ہو تو سب ہی کے نزدیک روزہ جاتا رہے گا، البتہ کفارہ لازم نہیں آئے گا اور اگر منہ بھر کر نہیں ہوگی تو روزہ فاسد نہیں ہوگا اگر کوئی شخص قصداً قے کرے اور منہ بھر کر ہو تو متفقہ طور پر مسئلہ یہ ہے کہ روزہ جاتا رہے گا اور اگر منہ بھر کر نہ ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک روزہ فاسد نہیں ہوگا اور صحیح یہی ہے۔ حضرت امام محمدؒ کا قول ہے کہ منہ بھر کر نہ ہونے کی صورت میں بھی روزہ جاتا رہتا ہے۔ جو قے عمداً کی جائے اور منہ بھر کر نہ ہو اور وہ بے اختیار حلق کے نیچے اتر جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا، قصداً نگل جانے کے بارے میں دو قول ہیں صحیح قول یہ ہے کہ اس صورت میں بھی روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

کوئی چیز جو غذا وغیرہ کی قسم سے ہو اور رات میں دانتوں کے درمیان باقی رہ گئی ہو تو دن میں اسے نگل جانے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا بشرطیکہ وہ چنے کی مقدار سے کم ہو اور منہ سے باہر نکال کر نہ کھائی جائے، اسی طرح کسی کے دانتوں سے یا منہ کے کسی دوسرے اندرونی حصے سے خون نکلے اور حلق میں چلا جائے تو روزہ نہیں جاتا بشرطیکہ وہ پیٹ تک نہ پہنچے یا پیٹ میں پہنچ جائے، مگر تھوک کے ساتھ مخلوط ہو کر اور تھوک سے کم اور اس کا مزہ حلق میں محسوس نہ ہو اگر خون پیٹ تک پہنچ جائے گا اور وہ تھوک پر غالب ہوگا یا تھوک کے برابر ہوگا تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

اگر کوئی شخص بقدر تل کوئی چیز باہر سے منہ میں ڈال کر چبائے اور وہ منہ میں پھیل بھی جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا بشرطیکہ حلق میں اس کا مزہ محسوس نہ ہو، ہاں اگر وہ چیز منہ میں پھیلے نہیں نیز اس کا مزہ حلق میں محسوس ہو یا یہ کہ بغیر چبائے ہی اس چیز کو نگل جائے اور حلق میں اس کا مزہ محسوس نہ ہو تب بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر وہ چیز ان چیزوں میں سے ہوگی جن سے کفارہ لازم آتا ہے تو کفارہ ضروری ہوگا نہیں تو قضاء لازم آئے گی۔

وہ چیزیں جن سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور جن سے کفارہ اور قضا دونوں لازم آتے ہیں

سب سے پہلے یہ بات جان لینی ضروری ہے کہ روزہ فاسد ہو جانے کی صورت میں کفارہ کن لوگوں پر اور کن حالات میں لازم ہوگا۔ کفارہ اس وقت لازم ہوتا ہے جب کہ روزہ رکھنے والا مکلف یعنی عاقل وبالغ ہو، روزہ رمضان کا ہو اور رمضان ہی کے مہینے میں ہو یعنی رمضان کے قضاء روزوں میں بھی کفارہ لازم نہیں ہوتا، نیت رات ہی سے کئے ہوئے ہو اگر طلوع فجر کے بعد نیت کی ہوگی، تو روزہ توڑنے پر کفارہ لازم نہیں ہوگا، روزہ توڑنے کے بعد ایسا کوئی امر پیش نہ آئے جو کفارہ کو ساقط کر دینے والا ہو جیسے حیض ونفاس، اگر روزہ توڑنے کے بعد ان میں سے کوئی چیز پیش آجائے گی تو کفارہ لازم نہیں ہوگا، چنانچہ اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا، اسی طرح روزہ توڑنے سے پہلے ایسی کوئی چیز پیش نہ آئے جس سے کفارہ ساقط ہو جاتا ہے، جیسے سفر کہ اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں روزہ توڑے گا تو کفارہ لازم نہیں آئے گا ہاں اگر کوئی شخص سفر سے پہلے روزہ توڑ دے گا تو کفارہ ساقط نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب یہ تمام شرائط پائی جائیں گی اور مندرجہ ذیل مضرات صوم (روزہ کو توڑنے والی چیزوں) میں سے کوئی صورت پیش آئے گی تو کفارہ اور قضا دونوں لازم ہوں گے۔

اس کے بعد اب دیکھئے کہ وہ کون سی چیزیں اور صورتیں ہیں جن سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور جن کی وجہ سے کفارہ اور قضا دونوں لازم ہوتے ہیں۔ جماع کرنا، اغلام کرنا ان دونوں صورتوں میں فاعل اور مفعول دونوں پر کفارہ اور قضا لازم آتی ہے کھانا پینا خواہ بطور غذا یا بطور دوا۔ غذائیت کے معنی اور محمول میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ غذا کا محمول اس چیز پر ہوگا جس کو کھانے کے لئے طبیعت خواہش کرے اور اس کے کھانے سے پیٹ کی خواہش کا تقاضہ پورا ہوتا ہو۔ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ "غذا کی چیز" وہ کہلائے گی جس کے کھانے سے بدن کی اصلاح ہو اور بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ "غذا" انہیں چیزوں کو کہیں گے جو عادۃً کھائی جاتی ہوں۔

لہٰذا اگر کوئی شخص بارش کا پانی، اولہ اور برف نگل جائے یا کچا گوشت کھائے خواہ وہ مردار ہی کا کیوں نہ ہو تو کفارہ لازم ہوگا اسی طرح

چربی، خشک کیا ہوا گوشت اور گیہوں کھانے سے بھی کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر ایک آدھ گیہوں منہ میں ڈال کر چبایا جائے اور وہ منہ میں پھیل جائے تو کفارہ لازم نہیں ہوتا۔ اپنی بیوی یا محبوب کا تھوک نگل جائے سے بھی کفارہ واجب ہوتا ہے کیونکہ اس میں بھی طبیعت کی خواہش کا دخل ہوتا ہے۔ ہاں ان کے علاوہ دوسروں کا تھوک نگلنے کی صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوتا، البتہ روزہ جاتا رہتا ہے اور قضا لازم آتی ہے۔ نمک کو کم مقدار میں کھانے سے تو کفارہ لازم ہوتا ہے زیادہ مقدار میں کھانے سے نہیں۔ مستغنی میں اس قول کو روایت مختار کہا گیا ہے لیکن خلاصہ اور بزاریہ میں لکھا ہے کہ مختار (یعنی قابل قبول اور لائق اعتماد) مسئلہ یہ ہے کہ مطلقاً نمک کھانے سے کفارہ واجب ہوتا ہے یعنی خواہ نمک زیادہ یا کم ہو۔ اگر بغیر بھنا جو کھایا جائے گا تو کفارہ لازم نہیں ہو گا۔ کیونکہ کچا جو کھایا نہیں جاتا، لیکن یہ خشک جو کا مسئلہ ہے۔ اگر تازہ خوشہ میں سے جو نکال کر بغیر بھنا ہوا بھی کھایا جائے گا تو کفارہ لازم آئے گا۔ گل ارمنی کے علاوہ وہ مٹی مثلاً ملتانی وغیرہ کھانے کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ عادۃ کھائی جاتی ہو تو اس پر بھی کفارہ لازم آئے گا اور اگر نہ کھائی جاتی ہو تو پھر کفارہ لازم نہیں ہو گا۔

ایک حدیث ہے جس کے الفاظ ہیں اَلْغِیْبَۃُ تفطر الصیام (غیبت روزہ کو ختم کر دیتی ہے) بظاہر تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار غیبت کرے گا تو اس کا روزہ جاتا رہے گا لیکن علماء اُمّت نے اجتماعی طریقے پر اس حدیث کی تاویل یہ کی ہے کہ حدیث کی مراد یہ نہیں ہے کہ غیبت کرنے سے روزہ جاتا رہتا ہے بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ جو روزہ دار غیبت میں مشغول ہو گا اس کے روزے کا ثواب جاتا رہے گا۔

حدیث اور اس کی اس تاویل کو ذہن میں رکھئے اور اب یہ مسئلہ سنئے کہ اگر کسی شخص نے کسی کی غیبت کی اور اس کے بعد قصداً کھانا کھا لیا تو اس پر کفارہ لازم آئے گا خواہ اسے یہ حدیث معلوم ہو یا معلوم نہ ہو اور خواہ حدیث کی مذکورہ بالا تاویل اس کے علم میں ہو یا علم میں نہ ہو نیز یہ کہ مفتی نے کفارہ لازم ہونے کا فتوی دیا ہو یا نہ دیا ہو کیونکہ حدیث اور اس کی تاویل سے قطع نظر غیبت کے بعد روزہ کا ختم ہو جانا قطعاً خلاف قیاس ہے۔

اسی طرح ایک حدیث ہے افطر الحاجم والمحجوم (پچھنے لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اس حدیث کی بھی یہ تاویل کی گئی ہے کہ پچھنے لگوانے سے چونکہ روزہ دار کو کمزوری لاحق ہو جاتی ہے اور زیادہ خون نکلنے کی صورت میں روزہ توڑ دینے کا خوف ہو سکتا ہے اسی طرح پچھنے لگانے والے کے بارے میں بھی یہ امکان ہوتا ہے کہ خون کا کوئی قطرہ اس کے پیٹ میں پہنچ جائے۔ اس لئے آپ ﷺ نے احتیاط کے پیش نظر یہ فرمایا کہ روزہ جاتا رہتا ہے ورنہ حقیقت میں پچھنے لگانے یا لگوانے سے روزہ ٹوٹتا نہیں۔

حدیث الغیبۃ تفطر الصیام کے برخلاف اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پچھنے لگانے یا لگوانے کے بعد اس حدیث کے پیش نظر اس گمان کے ساتھ کہ روزہ جاتا رہا ہے۔ قصداً کچھ کھا پی لے تو اس پر کفارہ صرف اسی صورت میں لازم آئے گا جب کہ وہ اس حدیث کی مذکورہ بالا تاویل سے جو جمہور علماء سے منقول ہے واقف ہو یا یہ کہ کسی فقیہ اور مفتی نے یہ فتوی دیا ہے کہ پچھنے لگوانے یا لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اگرچہ اس کا یہ فتوی حقیقت کے خلاف ہو گا اور اس کی ذمہ داری اسی پر ہو گی اور اگر اسے حدیث کی تاویل معلوم نہ ہو گی تو کفارہ لازم نہیں ہو گا الغیبۃ تفطر الصیام و افطر الحاجم والمحجوم دونوں حدیثوں کے احکام میں مذکورہ بالا فرق اس لئے ہے کہ غیبت سے روزہ کا ٹوٹنا نہ صرف یہ کہ خلاف قیاس ہے بلکہ اس حدیث کی مذکورہ بالا تفریق تمام علماء اُمّت کا اتفاق ہے جب کہ پچھنے سے روزہ کا ٹوٹ جانا نہ صرف یہ کہ خلاف قیاس نہیں ہے بلکہ اس حدیث کی مذکورہ بالا تاویل پر تمام علماء اُمّت کا اتفاق نہیں ہے کیونکہ بعض علماء مثلاً امام اوزاعی وغیرہ اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پچھنے لگانے یا لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، ایسے ہی کسی شخص نے شہوت کے ساتھ کسی عورت کو ہاتھ لگایا، یا کسی عورت کا بوسہ لیا، یا کسی عورت کے ساتھ، ہم خواب ہوا، یا کسی

عورت کے ساتھ بغیر انزال کے مباشرت فاحشہ کی یا سرمہ لگایا، یا فصد کھلوائی یا کسی جانور سے بد فعلی کی مگر انزال نہیں ہوا یا اپنی دبر میں انگلی داخل کی اور یہ گمان کر کے کہ روزہ جاتا رہے گا۔ اس نے قصداً کچھ کھا پی لیا تو اس صورت میں بھی کفارہ اسی وقت لازم ہوگا جب کہ کسی فقیہ یا مفتی نے مذکورہ بالا چیزوں کے بارے میں یہ فتوی دیا ہو کہ ان سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اگرچہ اس کا یہ فتویٰ غلط اور حقیقت کے خلاف ہوگا اگر مفتی فتوی نہیں دے گا تو کفارہ لازم نہیں ہوگا کیونکہ مذکورہ بالا چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

اس عورت پر کفارہ واجب ہوگا جس نے روزہ کی حالت میں کسی ایسے مرد سے برضا ورغبت اور بخوشی جماع کرایا جو جماع کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا چنانچہ کفارہ صرف عورت پر واجب ہوگا اس مرد پر نہیں۔

کسی عورت نے یہ جانتے ہوئے کہ فجر طلوع ہوگئی ہے اسے اپنے خاوند سے چھپایا، چنانچہ اس کے خاوند نے اس سے صحبت کر لی اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ فجر طلوع ہوگئی ہے تو اس صورت میں بھی صرف عورت پر کفارہ واجب ہوا اور مرد پر واجب نہیں ہوگا۔

جن چیزوں سے کفارہ لازم آتا ہے

ایک عورت نے قصداً کھانا کھایا، یا برضاء ورغبت جماع کرایا اور اسی دن اس کے ایام شروع ہوگئے یا نفاس میں مبتلا ہوگئی تو اس کے ذمہ سے کفارہ ساقط ہو جائے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص اس دن کسی ایسے مرض اور ایسی تکلیف میں مبتلا ہو گیا جس میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور یہ کہ وہ مرض و تکلیف قدرتی ہو تو کفارہ ساقط ہو جائے گا۔ قدرتی کی قید اس لئے ہے کہ فرض کیجئے کسی شخص نے قصداً روزہ توڑ ڈالا اور پھر اپنے آپ کو اس طرح زخمی کر لیا کہ اس حالت میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے یا اپنے آپ کو چھت یا پہاڑ سے گرا لیا تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ تکلیف اور مرض اس کا خود اپنا پیدا کیا ہوا ہوگا۔ ایسی صورت میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی کفارہ ساقط ہو جائے گا جب کہ دوسرے حضرات کا قول ہے کہ کفارہ ساقط نہیں ہوگا اور کمال کے قول کے مطابق مختار اور زیادہ صحیح یہی ہے کہ کفارہ ساقط نہیں ہوتا۔

جمع العلوم میں منقول ہے کہ اگر کسی شخص نے زیادہ چلنے یا کوئی کام کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تکلیف و مشقت میں مبتلا کیا یہاں تک کہ اسے بہت زیادہ اور شدید پیاس لگی اور اس نے روزہ توڑ ڈالا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ کفارہ لازم نہیں ہوگا اور اسی قول کو بقائیؒ نے بھی اختیار کیا ہے جیسا کہ تاتارخانیہ میں منقول ہے۔

کفارہ کے مسائل

ایک روزے کے کفارے میں ایک غلام آزاد کرنا چاہیے خواہ وہ غلام کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اگر عدم استطاعت کے سبب غلام آزاد کرنا ممکن نہ ہو یا کسی جگہ غلام نہ ملتا ہو تو پھر دو مہینے یعنی پورے ساٹھ دن پے در پے روزے رکھنا واجب ہے، ان روزوں کا علی الاتصال اور ایسے دنوں میں رکھنا ضروری ہے جن میں عیدین کے دن اور ایام تشریق (ذی الحجہ کی گیارہ، بارہ، تیرہ تاریخیں) واقع نہ ہوں کیونکہ ان دنوں میں کسی بھی طرح کے روزے رکھنا منع ہیں، اگر درمیان میں کسی عذر کی وجہ سے یا بلا عذر کسی دن کا روزہ فوت ہو جائے تو پھر نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا ناغہ سے پہلے جس قدر روزے ہو چکے ہوں گے ان کا کوئی حساب نہیں ہوگا ہاں اگر کسی عورت کو حیض آ جائے اور اس سبب سے درمیان کے روزے ناغہ ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر نفاس کی وجہ سے ناغہ ہو جانے کی صورت میں نئے سرے سے روزے شروع کئے جائیں گے۔ اور اگر مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے ساٹھ روزے رکھنے کی بھی قدرت نہ ہو تو پھر ساٹھ محتاجوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلانا واجب ہے اس طرح کہ چاہے تو انہیں ایک ہی دن دو وقت یعنی صبح و شام کھلا دے چاہے دو دن صبح کے وقت یا دو دن شام کے وقت یا عشاء و سحر کے وقت کھلا دے مگر شرط یہ ہے کہ اول وقت جن محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے تو دوسرے وقت بھی انہیں محتاجوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ چنانچہ اگر کسی نے ایک وقت ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلا دیا اور پھر دوسرے وقت ان کے علاوہ دوسرے ساٹھ محتاجوں کو

کھلایا تو یہ کافی نہیں بلکہ کفارہ اسی وقت ادا ہوگا جب کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت کو پھر دوبارہ ایک وقت کا کھانا کھلائے۔ ہاں اگر کوئی شخص ایک ہی محتاج کو مسلسل ساٹھ روز تک کھانا کھلائے یا مسلسل ساٹھ روز تک ہر روز نئے محتاج کو کھلائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس طرح کفارہ ادا ہو جائے گا، ایک بات اور، اگر کوئی شخص ایک ہی روز ساٹھ یا ان سے کچھ کم محتاجوں کے کھانے کے بقدر صدقہ کسی ایک محتاج کو دے دے گا تو وہ سب کے لئے ادا نہیں ہوگا بلکہ ایک ہی محتاج کے لئے ادا ہوگا۔

ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلانے کے سلسلہ میں گیہوں کی روٹی بغیر سالن کے کافی ہو جاتی ہے یعنی اگر ساٹھ محتاجوں کو صرف گیہوں کی روٹی ہی بغیر سالن کے پیٹ بھر کر کھلا دی جائے تو حکم پورا ہو جائے گا، بخلاف جو کی روٹی کے کہ اس کے ساتھ سالن ضروری ہے کیونکہ جو کی روٹی سخت ہونے کی وجہ سے عادۃً بغیر سالن کے پیٹ بھر کر نہیں کھائی جاسکتی جب کہ گیہوں کی روٹی بغیر سالن کے بھی پیٹ بھر کر کھائی جاسکتی ہے اسی لئے کہا گیا ہے۔ کہ گیہوں کی روٹی اپنی سالن خود اپنے اندر رکھتی ہے۔ لہٰذا جس شخص نے گیہوں کی روٹی کے ساتھ سالن مانگا وہ بھوکا نہیں ہے۔

ایک شرط یہ بھی ہے کہ جن ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے وہ سب بھوکے ہوں، ان میں سے کوئی پیٹ بھرا نہ ہو اگر کوئی پیٹ بھرا ہوگا، اور بھوکے کی مانند نہیں کھائے گا تو اس کی بجائے کسی دوسرے بھوکے کو کھانا کھلانا ضروری ہوگا۔

بہرکیف یا تو مندرجہ بالا طریقے اور شرائط کے مطابق محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے یا پھر یہ کہ چاہے تو ہر محتاج کو نصف صاع یعنی ایک کلو گرام ۶۳۳ گرام گیہوں یا اس کا آٹا یا اس کا ستو دے دیا جائے چاہے ایک صاع یعنی تین کلو ۲۶۶ گرام جو یا انگور یا کھجور یا اس کی قیمت دی جائے، اور چاہے اس طرح تمام محتاجوں کو ایک ہی وقت میں دے دیا جائے اور چاہے مختلف اوقات میں دیا جائے۔

اگر کسی شخص نے قصداً جماع کر کے یا قصداً کھا کر کئی روزے توڑے تو ان سب کے لئے ایک ہی کفارہ کافی ہوگا بشرطیکہ ان کے درمیان کفارہ ادا نہ کیا ہو مثلاً کسی شخص نے دس روزے توڑے اور ان کے درمیان کفارہ ادا نہ کیا تو ان دس روزوں کے لئے ایک کفارہ کافی ہو جائے گا اگر درمیان میں کوئی کفارہ ادا کیا تو پھر بعد کے روزوں کے لئے دوسرا کفارہ ضروری ہوگا پھر یہ کہ وہ توڑے ہوئے کئی روزے چاہے ایک رمضان کے ہوں اور چاہے دو رمضان کے ہوں اس بارے میں صحیح مسئلہ یہی ہے جیسا کہ درمختار میں مذکور ہے مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا حکم اس صورت کے لئے ہے جب کہ وہ روزے ایک ہی رمضان کے ہوں اگر وہ روزے کئی رمضان کے ہوں گے تو ہر رمضان کے لئے علیحدہ علیحدہ کفارہ ضروری ہوگا چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں اسی قول کو اختیار کیا گیا ہے۔

وہ چیزیں جن سے صرف قضا لازم ہوتی ہے کفارہ نہیں لازم ہوتا

اس بارہ میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر کسی ایسی چیز سے روزہ فاسد ہو جو غذا کی قسم سے نہ ہو یا اگر ہو تو کسی شرعی عذر کی بناء پر اسے پیٹ یا دماغ میں پہنچایا گیا ہو یا کوئی ایسی چیز ہو جس سے شرمگاہ کی شہوت پوری طرح ختم نہ ہوتی ہو جیسے جلق وغیرہ تو ایسی چیزوں سے کفارہ لازم نہیں ہوتا بلکہ صرف قضا ضروری ہے لہٰذا اگر روزہ دار رمضان میں کچے چاول اور خشک یا گندھا ہوا آٹا کھائے تو روزہ جاتا رہتا ہے اور قضا واجب ہوتی ہے اور اگر کوئی جو یا گیہوں کا آٹا پانی میں گوندھ کر اور اس میں شکر ملا کر کھائے گا تو اس صورت میں کفارہ لازم ہو جائے گا۔

اگر کوئی شخص یکبارگی بہت زیادہ نمک کھائے یا گل ارمنی کے علاوہ کوئی ایسی مٹی کھائے جس کو عادۃً کھایا نہیں جاتا یا گٹھلی یا روئی یا اپنا تھوک نگل لے جو ریشم و کپڑے وغیرہ کے رنگ مثلاً زرد، سبزہ وغیرہ سے متغیر تھا اور اسے اپنا روزہ بھی یاد تھا یا کاغذ یا اس کے مانند ایسی کوئی چیز کھائی جو عادۃً کھائی نہیں جاتی، یا کچی ہی یا اس کے مانند ایسا کوئی پھل کھائے جو پکنے سے پہلے عادۃً کھائے نہیں جاتے اور انہیں پکا کر یا نمک ملا کر نہیں کھایا، یا ایسا تازہ اخروٹ کھایا جس میں مغز نہ ہو یا کنکر، لوہا، تانبا، سونا، چاندی، اور یا پتھر خواہ وہ زمرد وغیرہ ہی ہو نگل گیا تو ان صورتوں میں کفارہ واجب نہیں ہوگا، صرف قضا لازم ہوگی، اسی طرح اگر کسی نے حقنہ کرایا، یا ناک میں دوا ڈالی یا منہ میں دوا رکھی اور اس میں سے کچھ حلق میں اتر گئی اور یا کانوں میں تیل ڈالا تو ان صورتوں میں بھی صرف قضا لازم آئے گی کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

کان میں قصدًا پانی ڈالنے کے بارہ میں مختلف اقوال ہیں ہدایہ ملتقی، در مختار، شرح وقایہ اور اکثر متون میں مذکور ہے کہ اس صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا مگر قاضی خان اور فتح القدیر میں لکھا ہے کہ اس بارہ میں صحیح مسئلہ یہ ہے کہ روزہ جاتا رہتا ہے اور قضا لازم آتی ہے۔

کسی شخص نے پیٹ کے زخم میں دوا ڈالی اور وہ پیٹ میں پہنچ گئی، یا سر کے زخم میں دوا ڈالی اور وہ دماغ میں پہنچ گئی، یا حلق میں بارش کا پانی یا برف چلا گیا اور اسے قصدًا نہیں نگلا بلکہ از خود حلق سے نیچے اتر گیا، یا چوک میں روزہ جاتا رہا مثلاً کلی کرتے ہوئے پانی حلق کے نیچے اتر گیا، یا ناک میں پانی دیتے ہوئے دماغ کو چڑھ گیا، یا کسی نے زبردستی روزہ تڑوا دیا خواہ جماع ہی کے سبب ہے یعنی خاوند نے زبردستی بیوی سے جماع کیا، یا بیوی نے زبردستی خاوند سے جماع کرایا تو ان سب صورتوں میں بھی کفارہ لازم نہیں ہوگا بلکہ صرف قضا لازم ہوگی ہاں جماع کے سلسلہ میں زبردستی کرنے والے پر کفارہ بھی لازم ہوگا اور جس کے ساتھ زبردستی کی گئی اس پر صرف قضا واجب ہوگی۔

اگر کوئی عورت جو لونڈی ہو (خواہ حرم یا منکوحہ) خدمت و کام کاج کی وجہ سے بیمار ہو جانے کے خوف سے روزہ توڑ ڈالے تو اس پر قضا لازم ہوگی، اسی طرح اگر لونڈی اس صورت میں روزہ توڑ ڈالے جب کہ کام کاج مثلاً کھانا پکانا یا کپڑا وغیرہ دھونے کی وجہ سے ضعف و توانائی لاحق ہوگئی تو اس صورت میں بھی قضا واجب ہوگی اس ضمن میں یہ مسئلہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ اگر کسی لونڈی کو اس کا آقا کسی ایسے کام کے لئے کہے جو ادائے فرض سے مانع ہو تو اس کا کہنا ماننے سے انکار کر دینا چاہئے۔

کسی شخص نے روزہ دار کے منہ میں سونے کی حالت میں پانی ڈال دیا یا خود روزہ دار نے سونے کی حالت میں پانی پی لیا تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس پر قضا واجب ہوگی، اس مسئلہ کو بھول کر کھا پی لینے کی صورت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ اگر سونے والا یا وہ شخص کہ جس کی عقل جاتی رہی ہو کوئی جانور ذبح کرے تو اس کا مذبوحہ کھانا حلال نہیں ہے اس کے برخلاف اگر کوئی ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو اس کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا جائز ہے اسی طرح یہاں بھی مسئلہ یہ ہے کہ بھول کی حالت میں کھانے پینے والے کا روزہ نہیں ٹوٹے گا، ہاں کوئی شخص سونے کی حالت میں کھا پی لے تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔

ایک شخص نے بھول کر روزے میں کچھ کھا لیا پھر اس کے بعد قصدًا کھایا، یا بھول کر جماع کر لیا اور اس کے بعد پھر قصدًا جماع کیا یا دن میں روزہ کی نیت کی پھر قصدًا کھا پی لیا یا جماع کیا، یا رات ہی سے روزہ کی نیت کی پھر صبح ہو کر سفر کیا اور پھر اس کے بعد اقامت کی نیت کر لی اور کچھ کھا پی لیا اگرچہ اس صورت میں اس کے لئے روزہ توڑنا جائز نہیں تھا، یا رات سے روزہ کی نیت کی، صبح کو مقیم تھا، پھر سفر کیا اور مسافر ہو گیا اور حالت سفر میں قصدًا کھایا یا جماع کیا اگرچہ اس صورت میں اس کے لئے روزہ توڑنا جائز نہیں تھا تو ان تمام صورتوں میں صرف قضا لازم ہوگی کفارہ واجب نہیں ہوگا مسئلہ مذکورہ میں "حالت سفر میں کھانے" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص سفر شروع کر دینے کے بعد پھر اپنی کوئی بھولی ہوئی چیز لینے کے لئے اپنے گھر واپس آئے اور اپنے مکان میں یا اپنے شہر و اپنی آبادی سے جدا ہونے سے پہلے قصدًا کھالے تو اس صورت میں قضا اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔

اگر کوئی شخص تمام دن کھانے پینے اور دوسری ممنوعات روزہ سے رکا رہا مگر نہ تو اس نے روزہ کی نیت کی اور نہ افطار کیا، یا کسی شخص نے سحری کھائی یا جماع کیا اس حالت میں کہ طلوع فجر کے بارہ میں اسے شک تھا حالانکہ اس وقت فجر طلوع ہو چکی تھی، یا کسی شخص نے غروب آفتاب کے ظن غالب کے ساتھ افطار کیا حالانکہ اس وقت تک سورج غروب نہیں ہوا تھا تو ان صورتوں میں صرف قضا واجب ہوگی کفارہ لازم نہیں ہوگا، اور اگر غروب آفتاب میں شک ہونے کی صورت میں افطار کیا اور حالانکہ اس وقت تک سورج غروب نہیں ہوا تھا تو اس صورت میں کفارہ لازم ہونے کے بارہ میں دو قول ہیں جس میں سے فقیہ ابو جعفر کا مختار یہ ہے کہ غروب آفتاب کے شک کی صورت میں کفارہ لازم ہوگا اس طرح اگر کسی شخص کا ظن غالب یہ ہو کہ آفتاب غروب نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ روزہ افطار کرے اور حقیقت میں بھی سورج غروب نہ ہوا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا۔

کسی شخص کو جانور کے ساتھ یا میت کے ساتھ فعل بد کرنے کے سبب انزال ہو گیا یا کسی کی ران یا ناف یا ہاتھ کی رگڑ سے منی گرائی یا کسی

کو چھونے یا اس کا بوسہ لینے کی وجہ سے انزال ہو گیا یا غیر ادائے رمضان کا روزہ توڑا تو ان سب صورتوں میں کفارہ واجب نہیں ہو گا بلکہ قضا لازم ہو گی، اسی طرح اگر کسی نے روزہ دار عورت کے ساتھ اس کے سونے کی حالت میں جماع کیا تو اس عورت کا روزہ جاتا رہے گا اور اس پر صرف قضا لازم ہو گی کفارہ واجب نہیں ہو گا، یا کسی عورت نے رات سے روزہ کی نیت کی اور جب دن ہوا تو دیوانی ہو گئی اور اس کی دیوانگی کی حالت میں کسی نے اس سے جماع کیا تو اس صورت میں اس عورت پر اس روزہ کی قضا لازم ہو گی۔

اگر کسی عورت نے اپنی شرمگاہ میں پانی یا دوائی ٹپکائی، یا کسی نے تیل یا پانی سے بھیگی ہوئی انگلی اپنے مقعد میں داخل کی یا کسی نے اس طرح استنجاء کیا کہ پانی حقنہ کی جگہ تک پہنچ گیا اگرچہ ایسا کم ہوتا ہے یا استنجاء کرنے میں زیادتی و مبالغہ کی وجہ سے پانی فرج داخل تک پہنچ گیا تو قضا واجب ہو گی۔

کسی شخص کو بواسیر ہو اور اس کے مسے باہر نکل آئیں اور وہ ان کو دھوئے تو اگر ان مسوں کو اوپر اٹھنے سے پہلے خشک کر لیا جائے گا تو ان کے اوپر چڑھ جانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ کیونکہ اس طرح پانی بدن کے ایک ظاہری حصہ پر پہنچا تھا اور پھر بدن کے اندرونی حصہ میں پہنچنے سے پہلے زائل ہو گیا ہاں اگر مسے اوپر چڑھنے سے پہلے خشک نہ ہوں گے تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

اگر کوئی عورت تیل یا پانی سے تر کی ہوئی انگلی اپنی شرم گاہ کے اندرونی حصے میں داخل کرے گی یا کوئی شخص روئی یا کپڑا یا پتھر اپنی دبر میں داخل کرے گا یا کوئی عورت ان چیزوں کو اپنی شرمگاہ کے اندرونی حصہ میں داخل کرے گی اور یہ چیزیں اندر غائب ہو جائیں گی تو روزہ جاتا رہے گا اور قضا لازم ہو گی۔ ہاں اگر لکڑی وغیرہ کا ایک سرا ہاتھ میں رہے یا یہ چیزیں عورت کی شرمگاہ کے بیرونی حصہ ہی تک پہنچیں تو روزہ فاسد نہیں ہو گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے ڈورا نگل لیا بایں طور کہ اس کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں ہو اور پھر وہ اس ڈورے کو باہر نکالے تو روزہ فاسد نہیں ہو گا اور اگر اس کا ایک سرا ہاتھ میں نہ ہو بلکہ سب نگل جائے تو یہ روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا لازم ہو گی۔

جو شخص قصداً اپنے فعل سے کسی چیز کا دھواں اپنے دماغ یا اپنے پیٹ میں داخل کرے گا تو بعید نہیں کہ کفارہ بھی لازم ہو جائے کیونکہ ان کا دھواں نہ صرف یہ کہ قابل انتفاع ہے بلکہ اکثر دواءً بھی استعمال ہوتا ہے اسی طرح سگریٹ بیڑی اور حقہ کا دھواں داخل کرنے کی صورت میں بھی کفارہ لازم ہو سکتا ہے۔

اگر کسی شخص نے قصداً قے کی خواہ وہ منہ بھر کر نہ آئی ہو تو اس کا روزہ جاتا رہے گا اور قضا لازم آئے گی، اس بارہ میں روایت یہی ہے لیکن حضرت امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ قصداً قے کرنے کی صورت میں روزہ اسی وقت فاسد ہو گا اور قضا لازم ہو گی جب کہ قے منہ بھر کر آئی ہو اگر منہ بھر کر نہ آئی ہو گی تو نہ روزہ فاسد ہو گا اور نہ قضاء لازم ہو گی۔ چنانچہ زیادہ صحیح اور مختار یہی قول ہے۔

کسی شخص کو از خود منہ بھر کر قے آئی اور وہ اسے نگل گیا، یا کسی شخص نے دانتوں میں اٹکی ہوئی کوئی چیز جو ایک چنے کے بقدر یا اس سے زیادہ تھی کھالی یا کسی شخص نے رات سے نیت نہیں کی، دن میں بھی اس نے نیت نہیں کی تھی کہ بھول کر کچھ کھا لیا پی لیا اور اس کے بعد اس نے روزہ کی نیت کی تو ان سب صورتوں میں روزہ نہیں ہو گا اور قضا لازم ہو گی، یا اسی طرح کوئی روزہ دار بے ہوش ہو جائے اور خواہ وہ مہینہ بھر تک بیہوش رہے تو اس پر قضا لازم ہو گی ہاں اس دن کے روزہ کی قضا لازم نہیں ہو گی۔ جس دن میں یا جس کی رات سے بیہوشی شروع ہوئی ہو کیونکہ مسلمان کے بارہ میں نیک گمان ہی کرنا چاہیے اس لئے ہو سکتا ہے اس نے رات میں نیت کر لی ہو اور اس طرح اس دن کا روزہ پورا ہو جائے گا اب اس کے بعد جتنے دنوں بیہوش رہے گا ان کی قضا کرے گا۔ بیہوشی شروع ہونے والے دن کے بارہ میں بھی اگر یہ یقین ہو کہ نیت کی تھی تو اس دن کے روزہ کی بھی قضا ضروری ہو گی۔ بیہوشی کے دنوں کے روزوں کی قضا اس لئے ضروری ہو گی کہ اگرچہ اس نے کچھ کھایا پیا نہیں مگر چونکہ روزہ کی نیت نہیں پائی گئی اس لئے بیہوشی کی حالت میں اس کا بغیر نیت کچھ نہ کھانا پینا اور تمام چیزوں سے رکے رہنا کافی و کار آمد نہیں ہو گا اگر کسی شخص پر رمضان کے پورے مہینہ میں دیوانگی طاری رہی تو اس پر قضا واجب نہیں ہو گی ہاں اگر پورے مہینہ دیوانگی طاری نہ رہی تو پھر قضا ضروری ہو گی اور اگر کسی شخص پر پورے مہینہ بایں طور دیوانگی طاری رہی کہ دن میں یا

رات میں نیت کا وقت ختم ہو جانے کے بعد اچھا ہو جاتا تو جب بھی قضا ضروری نہیں ہوگی بلکہ یہ پورے مہینہ دیوانگی طاری رہنے کے حکم میں ہوگا۔

اگر کسی شخص نے رمضان میں روزے کی نیت نہیں کی اور پھر اس نے دن میں کھایا پیا تو امام اعظم ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق اس صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوگا صرف قضا لازم ہوگی مگر صاحبینؒ کا قول یہ ہے کہ کفارہ واجب ہوگا۔

کسی شخص کا روزہ ٹوٹ گیا خواہ وہ کسی عذر ہی کی بناء پر ٹوٹا ہو پھر وہ عذر بھی ختم ہو گیا ہو تو اب اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دن کے بقیہ حصہ میں رمضان کے احترام کے طور پر کھانے پینے میں ممنوع دوسری چیزوں سے اجتناب کرے، اسی طرح اس عورت کو بھی دن کے بقیہ حصہ میں روزہ میں ممنوع چیزوں سے اجتناب ضروری ہے جو حیض یا نفاس میں مبتلا تھی اور طلوع فجر کے بعد پاک ہو گئی ہو، نیز مسافر جو دن میں کسی وقت مقیم ہو گیا ہو بیمار جو اچھا ہو گیا ہو، دیوانہ شخص جس کی دیوانگی جاتی رہی ہو، لڑکا جو بالغ ہوا ور کافر جو اسلام قبول کر لے ان سب لوگوں کو بھی دن کے بقیہ حصہ میں کھانے پینے اور دوسری ممنوع چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے ان سب پر اس دن کے روزہ کی قضا لازم ہوگی البتہ موخر الذکر دونوں پر قضا لازم نہیں ہوگی۔

جو عورت حیض و نفاس میں مبتلا ہو، یا جو شخص بیماری کی حالت میں ہو، یا جو شخص حالت سفر میں ہو ان کے لئے کھانے پینے سے اجتناب ضروری نہیں ہے تاہم ان کے لئے بھی یہ حکم ہے کہ عام نگاہوں سے بچ کر پوشیدہ طور پر کھائیں پئیں۔

روزہ دار کے لئے مکروہ اور غیر مکروہ چیزیں

روزہ دار کے لئے کسی چیز کا چکھنا (یعنی چکھ کر تھوک دینا) ذخیرہ میں منقول ہے کہ روزہ دار کے لئے بلا ضرورت کسی چیز کا چکھنا مکروہ ہے ہاں عذر کی صورت میں مکروہ نہیں ہے مثلاً کوئی شخص کھانے پینے کی کوئی چیز خریدے اور یہ خوف ہو کہ اگر اسے چکھ کر نہیں دیکھوں گا تو دھوکہ کھا جاؤں گا یا یہ چیز میری مرضی کے مطابق نہیں ہوگی تو اس صورت میں اگر وہ اس چیز کو چکھ لے تو مکروہ نہیں ہوگا۔

فتاوی نسفی میں منقول ہے کہ اگر کسی عورت کا خاوند بد خلق اور ظالم ہو اور جو کھانے میں نمک کی کمی و بیشی پر اس کے ساتھ سختی کا معاملہ کرتا ہو تو اس کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ کھانا چکھ لے تا کہ اپنے خاوند کے ظلم و تشدد سے بچ سکے، اور اگر خاوند نیک خلق و نیک مزاج ہو تو پھر عورت کے لئے چکھنا جائز نہیں ہوگا یہی حکم لونڈی کا بھی ہے بلکہ وہ نوکر و ملازم بھی اس حکم میں شامل ہیں جو کھانا پکانے پر مقرر ہوتے ہیں۔

بلا عذر کسی چیز کا چبانا مکروہ ہے مثلاً کوئی عورت چاہے کہ روٹی وغیرہ چبا کر اپنے چھوٹے بچے کو دیدے تو اگر اس کے پاس کوئی ہوشیار بچی یا کوئی حائضہ ہو تو اس سے چبوا کر بچے کو دیدے خود نہ چبائے اس صورت میں خود چبا کر دینا مکروہ ہے ہاں اگر غیر روزہ دار ہاتھ نہ لگے تو پھر خود چبا کر دیدے اس صورت میں مکروہ نہیں ہوگا۔

روزہ دار کو مصطگی چبانا مکروہ ہے خواہ مرد ہو یا عورت کیونکہ اس کے چبانے سے روزہ ختم کرنے یا روزہ نہ رکھنے کا اشتباہ ہوتا ہے ویسے تو مصطگی مرد کو غیر روزہ کی حالت میں بھی چبانا مکروہ ہے ہاں کسی عذر کی بناء پر اور وہ بھی خلوت میں چبانا جائز ہے بعض حضرات نے کہا ہے کہ مصطگی چبانا مردوں کے لئے مباح ہے جب کہ عورتوں کے لئے مستحب ہے کیونکہ وہ ان کے حق میں مسواک کے قائم مقام ہے۔

روزہ کی حالت میں بوسہ لینا اور عورتوں کے ساتھ مباشرت یعنی ان کو گلے لگانا اور چمٹانا وغیرہ مکروہ ہے بشرطیکہ انزال کا خوف ہو یا اپنے نفس و جذبات کے بے اختیار ہو جانے کا اور اس حالت میں جماع کر لینے کا اندیشہ ہو، اگر یہ خوف و اندیشہ نہ ہو تو پھر مکروہ نہیں۔

قصداً منہ میں تھوک جمع کرنا اور اسے نگل جانا مکروہ ہے، اسی طرح روزہ دار کو وہ چیزیں اختیار کرنا بھی مکروہ ہے جس کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جانے کا خوف ہو جیسے فصد و پچھنے وغیرہ ہاں اگر فصد اور پچھنے کی وجہ سے ضعف ہو جانے کا احتمال نہ ہو تو پھر مکروہ نہیں ہے۔

روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا، موچھوں کو تیل لگانا اور مسواک کرنا خواہ زوال کے بعد ہی مسواک کی جائے اور یہ کہ خواہ مسواک تازی ہو یا پانی میں بھیگی ہوئی ہو مکروہ نہیں ہے۔

وضو کے علاوہ بھی کلی کرنی اور ناک میں پانی دینا مکروہ نہیں ہے اسی طرح غسل کرنا اور تراوٹ و ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے بھیگا ہوا کپڑا بدن پر لپیٹنا مکروہ نہیں ہے، مفتی بہ قول یہی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے یہ بات ثابت ہے چنانچہ یہ روایت آئندہ صفحات میں آئے گی۔

روزہ دار کے لئے جو چیزیں مستحب ہیں، سحری کھانا، سحری کو دیر سے کھانا اور وقت ہو جانے پر افطار میں جلدی کرنا جب کہ فضا ابر آلود نہ ہو، جس دن فضا ابر آلود ہو اس دن افطار میں احتیاط یعنی دو تین منٹ کی تاخیر ضروری ہے۔

وہ اعذار جن کی بنا پر روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے

ایسے اعذار کہ جن کی بنا پر روزہ نہ رکھنا مباح ہے دس ہیں۔

① مرض۔ ② سفر۔ ③ اکراہ یعنی زبردستی۔ ④ حمل۔ ⑤ ارضاع یعنی دودھ پلانا۔ ⑥ بھوک۔ ⑦ پیاس۔ ⑧ بہت زیادہ بڑھاپا۔ ⑨ حیض۔ ⑩ نفاس۔ ان عوارض اور اعذار کو بتفصیل ذیل بیان کیا جاسکتا ہے۔

مرض: اگر روزہ رکھنے سے کسی نئے مرض کے پیدا ہو جانے یا موجودہ مرض کے بڑھ جانے کا خوف ہو، تو اس صورت میں روزہ نہ رکھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر یہ گمان ہو کہ روزہ رکھنے سے صحت و تندرستی دیر میں حاصل ہوگی تو بھی روزہ نہ رکھنا چاہیے کیونکہ بسا اوقات مرض کی زیادتی اور اس میں طوالت ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے اس لئے ان سے اجتناب ضروری ہے۔

مرض چونکہ نام ہے اس چیز کا جو طبیعت کے تغیر کا باعث ہوتی ہے اور جس کے سبب طبیعت کا سکون کرب و بے چینی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت پہلے اندرونی طور پر محسوس ہوتی ہے پھر اس کا اثر جسم پر ظاہر ہوتا ہے لہٰذا مرض کسی بھی قسم کا ہو خواہ وہ آنکھ دکھنے اور جسم وبدن کے کسی زخم کی صورت میں ہو یا درد سر و بخار وغیرہ کی شکل میں، جب اس میں زیادتی یا اس کے طول پکڑ جانے کا اندیشہ ہوگا تو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوگی، بلکہ روزہ کی نیت کرنے کے بعد بھی اگر کوئی مرض پیدا ہو جائے مثلاً کسی کو سانپ بچھو کاٹ لے یا بخار چڑھ آئے یا درد سر ہونے لگے تو اس کو اس دن کا روزہ رکھنا بھی ضروری نہیں ہے بلکہ بہتر یہی ہے کہ روزہ توڑ دیا جائے۔

علماء لکھتے ہیں کہ اگر کسی غازی اور مجاہد کو رمضان کے مہینہ میں دشمنان دین سے لڑنا ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ روزہ کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جائے گا جس کی بناء پر لڑائی میں نقصان پیدا ہوگا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے خواہ مسافر ہو یا مقیم۔ اسی پر علماء نے اس مسئلہ کو بھی قیاس کیا ہے کہ جس شخص کو باری کا بخار آتا ہو اور وہ باری کے دن بخار چڑھنے سے پہلے اپنا روزہ ختم کر دے اس خوف کی بناء پر کہ آج بخار چڑھے گا جس کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جائے گا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور اس دن بخار نہ بھی آئے تو صحیح مسئلہ یہ ہے کہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا جب کہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ دونوں صورتوں میں کفارہ لازم ہوگا۔

ایسے ہی اگر بازار والے رمضان کی تیس تاریخ کو طبل و نقارہ یا گولے وغیرہ کی آوازیں اور یہ گمان کر کے کہ یہ آج عید کا دن ہونے کا اعلان ہے روزہ توڑ ڈالیں اور پھر بعد میں معلوم ہو کہ یہ آج عید کا دن ہونے کا اعلان نہیں تھا بلکہ کسی اور سبب سے طبل و نقارہ بجایا گیا تھا یا گولا داغا گیا تھا تو اس صورت میں بھی ان پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

سفر: سفر خواہ جائز ہو یا ناجائز، بے مشقت ہو جیسے پیادہ پا یا گھوڑے وغیرہ کی سواری پر، ہر حال میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر بے مشقت سفر میں مستحب یہی ہے کہ روزہ رکھا جائے۔ بشرطیکہ اس کے تمام رفقاء سفر بغیر روزہ نہ ہوں اور سب کا خرچ مشترک نہ ہو، ہاں اگر اس کے تمام رفقاء سفر روزہ نہ رکھیں اور سب کا خرچ بھی مشترک ہو تو پھر روزہ نہ رکھنا ہی افضل ہوگا تاکہ پوری جماعت کی موافقت رہے۔

اگر کوئی شخص طلوع فجر سے پہلے سفر شروع کر کے مسافر ہو جائے تو اس دن کا روزہ نہ رکھنا اس کے لئے مباح ہے ہاں اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں طلوع فجر کے بعد سفر شروع کرے تو اب اس کے لئے روزہ نہ رکھنا مباح نہیں ہوگا البتہ بیمار ہو جانے کی صورت میں طلوع فجر کے بعد سفر شروع کرنے والے کے لئے روزہ نہ رکھنا مباح ہوگا اور بہر صورت کفارہ لازم نہیں ہوگا بلکہ صرف قضا واجب ہوگی خواہ سفر کی حالت میں بیماری کی وجہ سے روزہ توڑے یا بغیر بیماری کے۔

اکراہ: (یعنی زبردستی) جو شخص روزہ نہ رکھنے پر مجبور کیا جائے اس کو بھی شریعت نے روزہ نہ رکھنے یا روزہ توڑنے کی اجازت دی ہے، مثلاً کوئی شخص کسی روزہ دار کو زبردستی پچھاڑ کر اس کے منہ میں کوئی چیز ڈال دے، یا کوئی شخص روزہ دار کو مجبور کرے کہ اگر تم نے روزہ رکھا تو تمہیں جان سے مار دیا جائے گا یا تمہیں ضرب شدید پہنچائی جائے گی، یا تمہارے جسم کا کوئی عضو کاٹ ڈالا جائے گا تو اس صورت میں اس کے لئے روزہ توڑنا یا روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔

حمل: حاملہ عورت کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے بشرطیکہ اپنی یا اپنے بچے کی مضرت کا خوف ہو، یا عقل میں فتور آجانے کا اندیشہ ہو مثلاً اگر حاملہ یا خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے خود اپنی دماغی و جسمانی کمزوری انتہاء کو پہنچ جائے گی یا ہونے والے بچہ کی زندگی اور صحت پر اس کا برا اثر پڑے گا یا خود کسی بیماری و ہلاکت میں مبتلا ہو جائے گی تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ قضا کر دے۔

ارضاع: (یعنی دودھ پلانا) جس طرح حاملہ عورت کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے، اسی طرح دودھ پلانے والی عورت کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے خواہ وہ بچہ اسی کا ہو یا کسی دوسرے کے بچہ کو باجرت یا مفت دودھ پلاتی ہو بشرطیکہ اپنی صحت و تندرستی کی خرابی یا بچے کی مضرت کا خوف ہو۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اس بارہ میں "دودھ پلانے والی عورت" سے صرف دایہ ہی مراد ہے غلط ہے، کیونکہ حدیث میں مطلقاً دودھ پلانے والی عورت کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے چاہے وہ ماں ہو یا دایہ، چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنِ الْمُسَافِرِ الصَّوْمَ وَشَطْرَ الصَّلٰوةِ وَعَنِ الْحُبْلٰى وَالْمُرْضِعِ الصَّوْمَ۔

"اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لئے روزہ اور آدھی نماز معاف کی ہے اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے بھی روزہ معاف کیا ہے۔"

پھر یہ کہ اگر اس بارہ میں کوئی تخصیص ہوتی تو قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ تخصیص "دایہ" کی بجائے "ماں" کے لئے ہوتی کیونکہ دایہ کے لئے کسی بچہ کو دودھ پلانا واجب اور ضروری نہیں ہے وہ تو صرف اجرت کے لئے دودھ پلاتی ہے اگر وہ چاہے تو اس کام کو چھوڑ سکتی ہے۔ جب کہ ماں کا معاملہ برعکس ہے اپنے بچہ کو دودھ پلانا اس پر دیانۃً واجب ہے خصوصاً جب کہ باپ مفلس ہو۔

دودھ پلانے والی عورت کو دوا پینا جائز ہے جب کہ طبیب و ڈاکٹر کہے کہ یہ دوا بچے کو فائدہ کرے گی، مسئلہ بالا میں بتایا گیا ہے کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے جب کہ اسے اپنی یا اپنے بچہ کی مضرت کا خوف ہو تو اس بارہ میں جان لیجئے کہ "خوف" سے مراد یہ ہے کہ یا تو کسی سابقہ تجربہ کی بناء پر اپنی یا اپنے بچہ کی مضرت کا گمان غالب ہو یا یہ کہ مسلمان طبیب حاذق جس کا کردار عقیدہ و عمل کے اعتبار سے قابل اعتماد ہو یہ بات کہے کہ روزہ کی وجہ سے ضرر پہنچے گا۔

بھوک اور پیاس: جس شخص کو بھوک یا پیاس کا اس قدر غلبہ ہو کہ اگر کچھ نہ کھائے یا پانی نہ پیئے تو جان جاتی رہے یا عقل میں فتور آجائے یا ہوش و حواس ختم ہو جائے تو اس کے لئے بھی روزہ رکھنا جائز ہے اور روزہ کی نیت کر لینے کے بعد اگر اسی حالت پیدا ہو جائے تب بھی اس کو اختیار ہے، اگر روزہ توڑ دے گا تو کفارہ لازم نہ ہوگا صرف قضا واجب ہوگی مگر شرط یہ ہے کہ روزہ دار نے از خود اپنے نفس کو اس قدر مشقت میں مبتلا کر کے یہ حالت پیدا نہ کر دی ہو مثلاً کسی شخص نے از خود اپنے نفس کو بایں طور مشقت میں مبتلا کیا کہ بغیر کسی شدید ضرورت کے کوئی لمبی چوڑی دوڑ لگائی جس کی وجہ سے پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر روزہ توڑ ڈالا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا اگرچہ بعض حضرات نے

کہا ہے کہ کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

حضرت علی بن احمدؒ سے پیشہ و مزدوری کرنے والوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ کوئی مزدور یہ جانے کہ اگر میں اپنے اس کام میں مشغول ہوں گا تو ایسی بیماری میں مبتلا ہو جاؤں گا جس میں روزہ نہ رکھنا مباح ہے درانحالیکہ وہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے لئے اس کام کے کرنے پر مجبور ہے تو آیا بیماری میں مبتلا ہونے سے پہلے اس کے لئے کھانا مباح ہے یا نہیں؟ تو علی بن احمدؒ نے اس بات سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔

لیکن اس بارہ میں جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو در مختار میں لکھا ہے کہ اس صورت میں اگر اسے مذکورہ بالا خوف ہو تو اسے چاہیے کہ وہ آدھے دن تو محنت و مزدوری کرے اور آدھے دن آرام کرے تاکہ اسباب معیشت بھی فراہم ہو جائیں اور روزہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

بڑھاپا: "شیخ فانی اور بڑھیا فانیہ" کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں "شیخ فانی اور بڑھیا فانیہ" اس مرد اور عورت کو کہتے ہیں جو زندگی کے آخری اسٹیج پر پہنچ چکے ہوں، ادائیگی فرض قطعاً مجبور اور عاجز ہوں اور جسمانی طاقت و قوت روز بروز گھٹتی چلی جارہی ہو یہاں تک کہ ضعف و ناتوانی کے سبب انہیں یہ قطعاً امید نہ ہو کہ آئندہ بھی کبھی روزہ رکھ سکیں گے۔

حیض و نفاس: جو عورت حیض یا نفاس میں مبتلا ہو تو اس کے لئے بھی جائز ہے۔ کہ وہ روزہ نہ رکھے۔

فدیہ: مذکورہ بالا اعذار میں صرف شیخ فانی اور بڑھیا فانیہ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے روزوں کا فدیہ ادا کریں ہاں اس شخص کے لئے بھی فدیہ دینا جائز ہے جس نے ہمیشہ روزے رکھنے کی نذر مانی ہو مگر اس سے عاجز ہو یعنی کوئی شخص یہ نذر مانے کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا مگر بعد میں وہ اسباب معیشت کے حصول یا کسی اور عذر کی وجہ سے اپنی نذر کو پورا نہ کر سکے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزے نہ رکھے البتہ ہر دن فدیہ دے دیا کرے، ان کے علاوہ اور تمام اعذار کا مسئلہ یہ ہے کہ عذر زائل ہو جانے کے بعد روزوں کی قضا ضروری ہے فدیہ دینا درست نہیں یعنی فدیہ دینے سے روزہ معاف نہیں ہوگا اسی لئے اگر کوئی معذور اپنے عذر کی حالت میں مرجائے۔ تو اس پر ان روزوں کے فدیہ کی وصیت کر جانا واجب نہیں ہے جو اس کے عذر کی وجہ سے فوت ہوئے ہوں اور نہ اس کے وارثوں پر یہ واجب ہوگا کہ وہ فدیہ ادا کریں خواہ عذر بیماری کا ہو یا سفر کا، یا مذکورہ بالا اعذار میں سے کوئی اور عذر۔ ہاں اگر کوئی شخص اس حالت میں انتقال کرے کہ اس کا عذر زائل ہو چکا تھا اور وہ قضا روزے رکھ سکتا تھا مگر اس نے قضا روزے نہیں رکھے تو اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ ان ایام کے روزوں کے فدیہ کی وصیت کر جائے جن میں مرض سے نجات پا کر صحت مند رہا تھا، یا سفر پورا کر کے مقیم تھا اور یا جو بھی عذر رہا ہو وہ زائل ہو چکا تھا۔

اگر کوئی شیخ فانی سفر کی حالت میں انتقال کر جائے تو اس کی طرف اسے ان ایام کے روزوں کا فدیہ دینا ضروری نہیں ہوگا۔ جن میں وہ مسافر رہا کیونکہ جس طرح اگر کوئی دوسرا شخص سفر کی حالت میں مرجائے تو اس کے لئے ایام سفر کے روزے معاف ہوتے ہیں اسی طرح اس کے لئے بھی ان ایام کے روزے معاف ہوں گے۔

جس شخص پر فدیہ لازم ہوا اور وہ فدیہ دینے پر قادر نہ ہو تو پھر آخری صورت یہی ہے کہ وہ اللہ رب العزت سے استغفار کرے عجب نہیں کہ ارحم الرحمین اسے معاف کر دے۔

فدیہ کی مقدار: ہر دن کے روزے کے بدلے فدیہ کی مقدار نصف صاع یعنی ایک کلو ۶۳۳ گرام گیہوں یا اس کی مقدار ہے فدیہ اور کفارہ میں جس طرح تملیک جائز ہے اسی طرح اباحت طعام بھی جائز ہے یعنی چاہے تو ہر دن کے بدلے مذکورہ بالا مقدار کسی محتاج کو دے دی جائے اور چاہے ہر دن دونوں وقت بھوکے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیا جائے دونوں صورتیں جائز ہیں۔ صدقہ فطر کے برخلاف کہ اس

میں زکوٰۃ کی طرح تملیک ہی ضروری ہے اس بارہ میں یہ اصول سمجھ لیجئے کہ جو صدقہ لفظ اطعام یا طعام (کھلانے) کے ساتھ مشروع ہے اس میں تملیک اور اباحت دونوں جائز ہیں اور جو صدقہ لفظ "ایتاء یا ادا" (دینے) کے ساتھ مشروع ہے اس میں تملیک شرط اور ضروری ہے اباحت قطعاً جائز نہیں ہے۔

قضاء روزے: قضاء روزے پے در پے رکھنا شرط اور ضروری نہیں ہے تاہم مستحب ضرور ہے تاکہ واجب ذمہ سے جلد اتر جائے اسی طرح یہ بھی مستحب ہے کہ جس شخص کا عذر زائل ہو جائے وہ فوراً روزے شروع کر دے کیونکہ اس میں تاخیر مناسب نہیں ہے، ویسے مسئلہ یہ ہے کہ قضاء روزوں کا معاً عذر زائل ہوتے ہی رکھنا بھی ضروری نہیں ہے اختیار ہے کہ جب چاہے رکھے۔ نماز کی طرح اس میں ترتیب بھی فرض نہیں ہے قضا روزے رکھے بغیر ادا کے روزے رکھے جاسکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بات بھی جان لیجئے کہ شریعت میں تیرہ قسم کے روزے ہیں جن میں سے سات قسم کے روزے تو وہ ہیں جو علی الاتصال یعنی پے در پے رکھے جاتے ہیں۔ ① رمضان کے مہینے کے روزے۔ ② کفارۂ ظہار کے روزے۔ ③ کفارۂ قتل کے روزے۔ ④ کفارۂ یمین کے روزے۔ ⑤ رمضان میں قصداً توڑے ہوئے روزوں کے کفارہ کے روزے۔ ⑥ نذر معین کے روزے۔ ⑦ اعتکاف واجب کے روزے۔

اور چھ قسم کے روزے ایسے ہیں جن میں اختیار ہے چاہے تو پے در پے رکھے جائیں چاہے متفرق طور پر یعنی ناغہ کے ساتھ۔ ① نفل روزے۔ ② رمضان کے قضا روزے۔ ③ متعہ کے روزے۔ ④ فدیۂ حلق کے روزے۔ ⑤ جزاء عید کے روزے۔ ⑥ نذر مطلق کے روزے۔

صحیح یہ ہے کہ نفل روزے کا بھی بغیر کسی عذر کے توڑ ڈالنا جائز نہیں ہاں اتنی بات ہے کہ نفل روزہ شروع ہو جانے کے بعد واجب ہو جاتا ہے لہٰذا وہ کسی بھی حالت میں توڑا جائے گا تو اس کی قضا ضروری ہوگی ہاں پانچ ایام ایسے ہیں جن میں اگر نفل روزہ بعد شروع کر چکنے کے توڑ دیا جائے تو قضا واجب نہیں ہوتی، دو دن تو عید و بقر عید کے اور تین دن تشریق (ذی الحجہ کی ۱۱، ۱۲، ۱۳ تاریخ) کے چونکہ ان ایام میں روزے رکھنے ممنوع ہیں لہٰذا ان ایام میں جب روزہ شروع ہی سے واجب نہیں ہوگا تو اس کے توڑنے پر قضا بھی واجب نہیں ہوگی۔

اگر کوئی شخص ان پانچوں ایام کے روزے کی نذر مانے یا پورے سال کے روزے کی نذر مانے تو ان دونوں صورتوں میں ان ایام میں روزے نہ رکھے جائیں بلکہ دوسرے دنوں میں ان کے بدلے قضا روزے رکھے جائیں۔

آخر میں ایک مسئلہ یہ بھی جان لیجئے کہ جب بچہ میں روزے رکھنے کی طاقت آجائے تو اسے روزہ رکھنے کے لئے کہا جائے اور جب وہ دس برس کا ہو جائے تو روزہ نہ رکھنے کی صورت میں اس پر سختی کی جائے اور اسے روزہ رکھنے پر مجبور کیا جائے جیسا کہ نماز کے بارے میں حکم ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

لغو و باطل کلام اور بے ہودہ افعال روزہ کے منافی ہیں

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص (روزے کی حالت میں) لغو و باطل کلام اور بیہودہ افعال نہ چھوڑے گا تو اللہ کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوگی کہ اس نے اپنا کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔" (بخاری)

تشریح: "لغو و باطل کلام" سے مراد وہ باتیں ہیں جن کو اپنی زبان سے نکالنے میں گناہ لازم آتا ہے جیسے کفریات بکنا جھوٹی گواہی دینا، افتراء پردازی، غیبت کرنا، بہتان تراشی خواہ زنا کا بہتان ہو یا کسی برائی کا اور لعنت کرنا، یا اسی قسم کی وہ باتیں جن سے بچنا ضروری ہے۔ لہٰذا حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس روزہ دار نے نہ تو لغو و باطل کلام سے اپنی زبان کو بچالیا اور نہ برے افعال کی غلاظت سے اپنے دامن کی حفاظت کی تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی کہ اس نے اپنا کھانا پینا اور دوسری خواہشات چھوڑ رکھی ہیں۔

اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں سمجھئے کہ روزے کا اصل مقصد کیا ہے؟ یہی نا کہ انسان اپنی خواہشات نفسانی کو موت کے گھاٹ اتار دے اور اپنے نفس امارہ کو حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا تابعدار بنادے، مگر جب یہ مقصد ہی حاصل نہ ہوا کہ نہ تو روزہ دار نے بری باتیں ہی چھوڑیں اور نہ برے کام ہی چھوڑے جو روزے کے منافی ہیں تو خدا کو کیا ضرورت ہے۔ کہ وہ روزہ دار کے محض بھوکا پیاسا ہونے کی کوئی پرواہ کرے یا اس طرف نظر عنایت کرے۔

گویا "پرواہ نہ کرنے" سے مراد ہے اس کی طرف التفات نہ کرنا اور اس کے روزہ کو شرف قبولیت سے نہ نوازنا اور ظاہر ہے کہ ایسے روزہ دار کی طرف خدا التفات کرے بھی کیوں؟ اس نادان نے بیشک ان چیزوں کو تو ترک کیا جن کو رمضان کے مہینہ میں ترک کرنے ہی کا حکم ہے اگرچہ وہ دوسرے دنوں میں مباح ہیں مثلاً کھانا پینا اور جماع وغیرہ مگر ان چیزوں کو اختیار کیا جنہیں روزہ کیا کسی بھی حالت میں اختیار کرنا حرام ہے۔

مشائخ لکھتے ہیں کہ روزہ کی تین قسمیں ہیں۔ ایک روزہ تو عوام کا ہے جس میں کھانے پینے اور جماع سے اپنے کو باز رکھا جاتا ہے۔ دوسرا روزہ وہ خواص کا ہے کہ جس میں تمام اعضاء اور حسیات کو حرام و مکروہ خواہشات و لذات سے بچایا جاتا ہے بلکہ ایسی مباح چیزوں سے بھی اجتناب ہوتا ہے جو کسر نفسی کے منافی ہیں۔ اور تیسرا روزہ اخص الخواص کا ہوتا ہے کہ جس میں سوائے حق کے ہر چیز سے کلیۃً اجتناب ہوتا ہے بلکہ غیر حق کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا۔

روزہ میں بوسہ اور مساس وغیرہ کا مسئلہ

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُ وَيُبَاشِرُ وَهُوَ صَائِمٌ وَكَانَ اَمْلَكَكُمْ لِاَرَبِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے روزہ کی حالت میں (اپنی ازواج کا) بوسہ لیتے تھے اور (انہیں) اپنے بدن سے لپٹاتے تھے (کیونکہ آنحضرت ﷺ اپنی حاجت پر تم سے زیادہ قابو یافتہ تھے)۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حاجت سے مراد "شہوت" ہے مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اور لوگوں کی بہ نسبت اپنی خواہشات اور شہوت پر بہت زیادہ قابو یافتہ تھے کہ آپ ﷺ باوجودیکہ اپنی ازواج مطہرات کا بوسہ لیتے تھے اور ان کو اپنے بدن مبارک سے لپٹاتے تھے مگر صحبت سے بچے رہتے تھے ظاہر ہے کہ دوسرے لوگوں کا ایسی صورت میں اپنی شہوت پر قابو یافتہ ہونا بہت مشکل ہے۔

مذکورہ بالا مسئلہ میں اہل علم کے ہاں اختلاف ہے، حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ بوسہ لینا، مساس کرنا اور عورت کے بدن کو اپنے سے لپٹانا روزہ دار کے لئے مکروہ ہے جب کہ ایسی صورت میں جماع میں مشغول ہو جانے یا انزال ہو جانے کا خوف ہو اگر یہ خوف نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے۔

حالت جنابت میں روزہ کی نیت کرنا

(۳) وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُدْرِكُهُ الْفَجْرُ فِيْ رَمَضَانَ وَهُوَ جُنُبٌ مِنْ غَيْرِ حُلُمٍ فَيَغْتَسِلُ وَيَصُوْمُ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (کبھی ایسا ہوتا کہ) آنحضرت ﷺ جنابت (ناپاکی) کی حالت میں صبح کرتے اور یہ جنابت احتلام کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی چنانچہ (ایسی صورت میں) آپ ﷺ نہاتے اور روزہ رکھتے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو احتلام کی وجہ سے نہیں بلکہ جماع کی وجہ سے نہانے کی ضرورت ہوتی تھی اور آپ ﷺ اسی حالت میں روزہ رکھتے اور پھر نہاتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ جنابت کی حالت میں طلوع فجر سے پہلے نہانا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ایسی حالت میں روزہ کی نیت کی جاسکتی ہے اور پھر صبح اٹھ کر نہانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور چونکہ جماع کے سبب ناپاکی اختیاری ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ایسی صورت میں بغیر نہائے روزہ رکھنا جائز ہے تو احتلام کے سبب ناپاکی کی حالت میں روزہ رکھنا بدرجہ اولیٰ درست ہوگا بلکہ اگر روزہ کی حالت میں ہی احتلام ہوجائے تو روزہ پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

من غیر حُلُمٍ (اور یہ جنابت احتلام کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی) کو بطور خاص اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ انبیاء کرام صلوات اللہ وسلامہ علیہم کو احتلام نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ خواب میں شیطان کے آنے کا اثر ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ اس سے قطعی محفوظ تھے۔

روزہ کی حالت میں سینگی کھچوانا جائز ہے

(۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَمَ وَھُوَ مُحْرِمٌ وَاحْتَجَمَ وَھُوَ صَائِمٌ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے احرام کی حالت میں بھری ہوئی سینگی کھنچوائی، نیز آپ ﷺ نے روزہ کی حالت میں (بھی) بھری ہوئی سینگی کھنچوائی ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حضرت شیخ جزریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کی مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ احرام کی حالت میں روزے سے تھے اس وقت آپ ﷺ نے بھری ہوئی سینگی کھنچوائی اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کی یہ مراد ابوداؤد کی ایک روایت کی روشنی میں اخذ کی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

اِنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَمَ ھُوَ صَائِمًا مُّحْرِمًا۔

"نبی کریم ﷺ نے اس وقت بھری ہوئی سینگی کھنچوائی جب کہ آپ ﷺ حالت احرام میں روزہ سے تھے۔"

بہر حال حضرت مظہرؒ فرماتے ہیں کہ احرام کی حالت میں سینگی کھنچوانی جائز ہے بشرطیکہ کوئی بال نہ ٹوٹے، اسی طرح حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام شافعیؒ، اور حضرت امام مالکؒ کا متفقہ طور پر مسلک یہ ہے کہ روزہ دار کو سینگی کھنچوانا بلا کراہت جائز ہے لیکن حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بھری ہوئی سینگی کھینچنے اور کھنچوانے والا دونوں کا روزہ باطل ہوجاتا ہے مگر کفارہ واجب نہیں ہوتا۔

بھول چوک سے کھانا پینا معاف ہے

(۵) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ نَسِیَ وَھُوَ صَائِمٌ فَاَکَلَ اَوْشَرِبَ فَلْیُتِمَّ صَوْمَہٗ فَاِنَّمَا اَطْعَمَہُ اللّٰہُ وَسَقَاہُ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص روزہ دار ہو اور وہ بھول چوک سے کچھ کھا پی لے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا روزہ پورا کرے کیونکہ وہ کھلانا پلانا اللہ کی طرف سے ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: یہ حکم علی الاطلاق ہر روزہ کے لئے ہے خواہ فرض روزہ ہو یا نفل وغیرہ کہ اگر کوئی روزہ دار بھول کر کچھ کھالے یا پی لے تو اس کا روزہ نہیں جاتا چنانچہ تمام ائمہ کا مسلک یہی ہے البتہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ صورت رمضان میں پیش آئے تو اس کی قضا ضروری

ہوگی۔

ہدایہ میں لکھا ہے کہ جب کھانے پینے کے بارہ میں یہ حکم ثابت ہوا تو جماع کے بارہ میں بھی یہی حکم ہوگا یعنی اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں بھول کر جماع کرلے تو اس کے روزہ پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

کفارہ اپنے اہل وعیال کو دینے کا مسئلہ

(۶) وَعَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلَكْتُ قَالَ مَالَكَ قَالَ وَقَعْتُ عَلٰى امْرَأَتِىْ وَاَنَا صَائِمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَجِدُ رَقَبَةً تُعْتِقُهَا قَالَ لَا قَالَ فَهَلْ تَسْتَطِيْعُ اَنْ تَصُوْمَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ قَالَ لَا قَالَ هَلْ تَجِدُ اِطْعَامَ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا قَالَ لَا قَالَ اِجْلِسْ وَمَكَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَيْنَا نَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ اُتِىَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَرَقٍ فِيْهِ تَمْرٌ وَالْعَرَقُ الْمِكْتَلُ الضَّخْمُ قَالَ اَيْنَ السَّائِلُ قَالَ اَنَا قَالَ خُذْ هٰذَا فَتَصَدَّقْ بِهٖ فَقَالَ الرَّجُلُ اَعَلٰى اَفْقَرَ مِنِّىْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَاللّٰهِ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا يُرِيْدُ الْحَرَّتَيْنِ اَهْلُ بَيْتٍ اَفْقَرُ مِنْ اَهْلِ بَيْتِىْ فَضَحِكَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى بَدَتْ اَنْيَابُهٗ ثُمَّ قَالَ اَطْعِمْهُ اَهْلَكَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص (کہ جس کا نام سلمہ بن فخر الانصاری البیاضی تھا) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ (ایک گناہ سرزد ہوجانے کی وجہ سے) میں تباہ ہوگیا! آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ میں روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کر بیٹھا، آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہارے پاس غلام ہے جسے تم (بطور کفارہ) آزاد کرسکو؟ اس نے کہا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھ سکو! اس نے کہا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا، کیا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی استطاعت رکھتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا اچھا تم بیٹھ جاؤ (اور آپ ﷺ اس انتظار میں رہے کہ کوئی شخص کچھ لائے تو اسے دے دیں تاکہ وہ بطور کفارہ صدقہ کردے) چنانچہ ہم اسی طرح بیٹھے رہے کہ اسی وقت آپ ﷺ کی خدمت میں ایک عرق آیا جس میں کھجوریں تھیں اور عرق ایک بڑے تھیلے کو کہتے تھے (جو کھجور کے پٹھے کا بنا ہوا ہوتا تھا اور جس میں ساٹھ سیر سے لے کر اسی سیر تک کھجوریں آتی تھیں) آپ ﷺ نے (اسے دیکھ کر) فرمایا کہ سائل کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہیں حاضر ہوں! آپ ﷺ نے فرمایا، لو یہ کھجوریں پکڑو اور انہیں خدا کی راہ میں (محتاجوں کو) تقسیم کردو! اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا میں یہ کسی ایسے شخص کو دوں جو مجھ سے بھی زیادہ محتاج ہو؟ (یعنی میں تو خود سب سے زیادہ محتاج ہوں دوسرے لوگوں کو کیسے دوں؟) خدا کی قسم! مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان کوئی ایسا گھرانہ نہیں ہے جو میرے گھرانے سے زیادہ محتاج ہو، اور مدینہ کے دونوں کناروں سے اس کی مراد وہ دونوں پہاڑیاں تھیں (جو مدینہ کے جانب شرق اور جانب غرب واقع ہیں) نبی کریم ﷺ (اس کی بات سن کر) ہنسے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی کچلیاں ظاہر ہوئیں، پھر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اچھا یہ کھجوریں اپنے اہل وعیال کو کھلاؤ!۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: جو شخص رمضان کا روزہ رمضان ہی کے مہینہ میں قصداً توڑ دے خواہ کچھ کھاپی کر یا جماع میں مشغول ہوکر تو اس پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور کفارہ کی ترتیب وہی ہے جو حدیث بالا میں ذکر کی گئی ہے یعنی ایک غلام آزاد کرے اگر یہ نہ ہوسکے تو دو مہینہ کے روزے پے در پے رکھے اور اگر یہ بھی بس سے باہر ہو تو پھر آخری درجہ یہ ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے اس میں اختیار ہے۔ چاہے تو ہر مسکین کو کچا اناج دیدے اس صورت میں ہر مسکین کو پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جو دیا جائے گا، اور چاہے کھانا پکا کر دے، اس صورت میں ان ساٹھ مسکینوں کو ایک دن دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے گا۔

اپنے اہل و عیال کو کفارہ دینے سے کفارہ ادا نہیں ہوتا خواہ اصول میں سے یعنی باپ دادا وغیرہ ہوں یا فروع میں سے یعنی بیٹا و پوتا وغیرہ ہوں جہاں تک حدیث بالا کا تعلق ہے کہ اس سے اپنے اہل و عیال کو کفارہ دینے کا جواز ثابت ہوتا ہے تو اس کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا اس شخص کے ذمہ سے کفارہ ادا ہو گیا تھا یا نہیں؟ چنانچہ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ کفارہ ادا ہو گیا تھا اور یہ حکم صرف اسی کے ساتھ مخصوص تھا کہ آنحضرت ﷺ نے بطور خاص اس کو اجازت عطا فرما دی تھی کہ وہ کھجوریں جو کفارہ کے طور پر اس کی طرف سے دی جاتی تھیں اپنے اہل و عیال کو کھلانے پر صرف کر دے۔ اور چونکہ یہ ایک مخصوص معاملہ تھا اس لئے کسی دوسرے کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس وقت اس کے ذمہ سے کفارہ ادا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے ذمہ باقی رہا تھا اور وجہ اس کی یہ بیان کرتے ہیں کہ کفارہ کی ادائیگی بالفعل (وقتی طور پر) اس وقت ضروری ہوتی ہے جب کہ کفارہ دینے والے کے پاس اس کے اور اس کے اہل و عیال کے کھانے سے بچ کر اتنا مال موجود ہو وہ بطور کفارہ دے سکے، ورنہ بصورت دیگر وہ کفارہ اس کے ذمہ باقی رہتا ہے کہ جب بھی اس میں استطاعت ہو کفارہ ادا کر دے، لہٰذا اسلمہ بن صخر الانصاری البیاضی بہت زیادہ محتاج تھے اس لئے آپ ﷺ نے ان کو اجازت عطا فرمائی کہ اس وقت تو یہ کھجوریں اپنے اہل و عیال کو کھلاؤ مگر جب بعد میں استطاعت ہو تو کفارہ ادا کر دینا۔

کچھ حضرات کا کہنا یہ ہے کہ پہلے یہ حکم تھا کہ کفارہ اپنے اہل و عیال کو دیا جا سکتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے سلمہؓ سے کہا کہ وہ ان کھجوروں کو اپنے اہل و عیال پر خرچ کر دیں، مگر بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اس لئے اب مسئلہ یہی ہے کہ کسی بھی طرح کفارہ اپنے اہل و عیال کو نہ دیا جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

روزہ میں بیوی کی زبان اپنے منہ میں لینے کا مسئلہ

⑦ عَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُقَبِّلُھَا وَھُوَ صَائِمٌ وَیَمُصُّ لِسَانَھَا (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارہ میں منقول ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ روزہ کی حالت میں ان کا بوسہ لیتے تھے۔ اور ان کی زبان اپنے دہن مبارک میں لیتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اگرچہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن تمام ہی ائمہ کے نزدیک چونکہ کسی غیر (یعنی اپنی بیوی) کا تھوک نگلنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اس لئے اگر اس حدیث کو بدرجہ احتمال صحیح مان بھی لیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کی زبان اپنے منہ میں لے کر تھوک منہ سے باہر پھینک دیتے ہوں گے یا اسے نگلتے نہ ہوں گے۔

روزہ کی حالت میں مباشرت

⑧ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُبَاشَرَةِ لِلصَّائِمِ فَرَخَّصَ لَہٗ وَاَتَاہُ اٰخَرُ فَسَأَلَہٗ فَنَھَاہُ وَاِذَا الَّذِیْ رَخَّصَ لَہٗ شَیْخٌ وَاِذَا الَّذِیْ نَھَاہُ شَابٌّ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے روزہ کی حالت میں مباشرت کے بارہ میں پوچھا (کہ آیا میں اپنی بیوی کو اپنے بدن سے لپٹا سکتا ہوں یا نہیں؟) تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی، اس کے بعد ایک اور شخص نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مباشرت کے بارہ میں پوچھا تو آپ ﷺ نے اسے منع فرمایا جس شخص کو آپ ﷺ نے مباشرت کی اجازت دی تھی وہ بوڑھا تھا اور جسے منع فرمایا تھا وہ جوان تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: چونکہ ضعیف شخص کے جذبات زیادہ برانگیختہ نہیں ہوتے اور اس کے بارہ میں یہ خوف نہیں ہوتا کہ وہ محض مباشرت کے نتیجہ میں جماع کی خواہش پر کنٹرول نہیں کر سکے گا اس لئے آپ نے بڈھے کو تو اجازت دے دی اس کے برخلاف جوان شخص کے جذبات چونکہ انتہائی ہیجانی اور برانگیختہ ہوتے ہیں اور اس کے بارہ میں یہ خوف بھی ہوتا ہے کہ وہ مباشرت کے نتیجہ میں کہیں اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکے اور از خود رفتہ ہو کر جماع کر بیٹھے اس لئے آپ ﷺ نے اسے روزہ کی حالت میں مباشرت سے منع فرمایا اب اس بارہ میں اختلاف ہے بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ یہ نہی تحریمی ہے جب کہ بعض حضرات نہی تنزیہی کے قائل ہیں۔

روزہ کی حالت میں قے ہونے کا مسئلہ

(۹) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ وَهُوَ صَائِمٌ فَلَيْسَ عَلَيْهِ قَضَاءٌ وَمَنِ اسْتَقَاءَ عَمَدًا فَلْيَقْضِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْ دَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ عِيْسَى بْنِ يُوْنُسَ وَقَالَ مُحَمَّدٌ يَعْنِي الْبُخَارِيَّ لَا اَرَاهُ مَحْفُوْظًا

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص پر قے غالب آجائے (یعنی خود بخود قے آئے) اور وہ روزہ سے ہو تو اس پر قضا نہیں ہے اور جو شخص (حلق میں انگلی وغیرہ ڈال کر) قصداً قے کرے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے روزے کی قضا کرے (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ ہم اس حدیث کو عیسی بن یونس کے علاوہ اور کسی سند سے نہیں جانتے، نیز محمد (یعنی امام بخاری) فرماتے ہیں کہ میں اس حدیث کو محفوظ نہیں سمجھتا (یعنی یہ حدیث منکر ہے)۔"

تشریح: ومن استقاء عمدا (اور جو شخص قے کرے) میں قصداً کی قید لگا کر گویا بھول چوک کا استثناء فرمایا گیا ہے یعنی اگر کوئی روزہ دار اس حالت میں قصداً قے کرے کہ اسے اپنا روزہ یاد ہو تو اس کا روزہ جاتا رہے گا اور اس پر قضا واجب ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی روزہ دار قصداً قے کرے مگر اسے یہ یاد نہ رہا ہو کہ میں روزہ سے ہوں تو اس پر قضا واجب نہیں ہوگی۔ قے کے سلسلے میں پوری وضاحت ابتداء باب میں کی جا چکی ہے۔ اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ اس موقع دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱۰) وَعَنْ مَعْدَانَ ابْنِ طَلْحَةَ اَنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ حَدَّثَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاءَ فَاَفْطَرَ قَالَ فَلَقِيْتُ ثَوْبَانَ فِيْ مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَقُلْتُ اِنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ حَدَّثَنِيْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاءَ فَاَفْطَرَ قَالَ صَدَقَ وَاَنَا صَبَبْتُ لَهٗ وَضُوْءَهٗ (رواہ ابوداؤد والترمذی والدارمی)

"اور حضرت معدان بن طلحہ کے بارہ میں منقول ہے کہ حضرت ابودرداء نے ان سے یہ حدیث بیان کی کہ رسول کریم ﷺ نے (روزہ کی حالت میں) قے کی اور پھر روزہ توڑ ڈالا، معدان کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں دمشق کی مسجد میں حضرت ثوبانؓ سے ملا اور ان سے کہا کہ حضرت ابودرداء نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ، نبی کریم ﷺ نے قے کی اور پھر روزہ توڑ ڈالا، حضرت ثوبانؓ نے فرمایا کہ ابودرداء نے بالکل سچ کہا اور (اس موقع پر) میں نے ہی آپ کے وضو کے لئے پانی کا انتظام کیا تھا۔" (ابوداؤد، ترمذی، دارمی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی عذر کی وجہ سے اپنا نفل روزہ قصداً قے کر کے توڑ ڈالا تھا چاہے عذر بیماری کا رہا ہو یا ضعف و ناتوانی کا، بہر کیف عذر، کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ بغیر عذر کے نفل روزہ بھی نہیں توڑتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ

"یعنی اپنے اعمال کو باطل نہ کرو (یعنی انہیں شروع کر کے نامکمل نہ ختم کر ڈالو)۔"

حدیث کے آخری الفاظ وانا صببت لہٗ وضوءہ سے حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ وغیرہما نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ قے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے حضرت امام شافعیؒ اور دیگر علماء جو قے سے وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں ہیں فرماتے ہیں کہ یہاں سے وضو کرنے سے کلی کرنا اور منہ دھونا مراد ہے واللہ اعلم۔

روزہ کی حالت میں مسواک کرنی جائز ہے

(۱۱) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالاَ أُحْصِيْ يَتَسَوَّكُ وَهُوَ صَائِمٌ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عامر ابن ربیعہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو روزہ کی حالت میں اس قدر مسواک کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کہ میں اس کو شمار نہیں کر سکتا۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ روزہ دار کے لئے کسی بھی وقت اور کسی بھی طرح کی مسواک کرنا جائز ہے چنانچہ اس بارہ میں اس حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث منقول ہیں جو مرقات میں تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں۔

روزہ کی حالت میں مسواک کرنے کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال بھی ہیں چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ تو فرماتے ہیں کہ روزہ کی حالت میں ہر طرح کی مسواک کرنا جائز ہے خواہ وہ سبز یعنی تازی ہو یا پانی میں بھگوئی ہوئی ہو اسی طرح کسی بھی وقت کی جاسکتی ہے خواہ زوال آفتاب سے پہلے کا وقت ہو یا زوال آفتاب کے بعد کا، جب کہ حضرت امام ابویوسفؒ کا قول یہ ہے کہ روزہ دار کے لئے تازی اور بھگوئی ہوئی مسواک مکروہ ہے نیز حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ زوال آفتاب کے بعد مسواک کرنا مکروہ ہے۔

روزہ میں سرمہ لگانا جائز ہے

(۱۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اشْتَكَيْتُ عَيْنَيَّ اَفَاَكْتَحِلُ وَاَنَا صَائِمٌ قَالَ نَعَمْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ لَيْسَ اِسْنَادُهُ بِالْقَوِيِّ وَاَبُوْعَاتِكَةَ الرَّاوِيْ يُضَعَّفُ

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میری آنکھیں دکھتی ہیں کیا میں روزہ کی حالت میں سرمہ لگا سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے اور اس کے ایک راوی ابوعاتکہ ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔"

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے چنانچہ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا مکروہ نہیں ہے اگرچہ اس کا مزہ حلق میں محسوس ہو جب کہ حضرت امام احمدؒ اسحٰقؒ اور سفیانؒ کے نزدیک مکروہ ہے امام مالکؒ سے بعض لوگوں نے کراہت کا قول نقل کیا ہے اور بعض لوگوں نے عدم کراہت کا یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس بارہ میں چونکہ اور بھی احادیث منقول ہیں اس لئے یہ سب مل کر قابل استناد و استدلال ہو جاتی ہیں۔

روزہ کی حالت میں سر پر پانی ڈالنا مکروہ نہیں ہے

(۱۳) وَعَنْ بَعْضِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ يَصُبُّ عَلٰى رَأْسِهِ الْمَاءَ وَهُوَ صَائِمٌ مِنَ الْعَطَشِ اَوْ مِنَ الْحَرِّ (رواہ مالک و ابوداؤد)

"اور نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں عرج میں نبی کریم ﷺ کو روزہ کی حالت میں پیاس کے دفعیہ کے لئے یا کہا کہ گرمی کے

دفعیہ کے لئے اپنے سر پر پانی ڈالتے ہوئے دیکھا ہے۔" (مالک، ابوداؤد)

تشریح : عرج مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے حضرت ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ روزہ کی حالت میں اپنے سر پر پانی ڈالنا یا پانی میں گھسنا مکروہ نہیں ہے۔

نورالایضاح میں جو فقہ حنفی کی ایک معتبر کتاب ہے لکھا ہے کہ مفتی بہ قول کے مطابق صحیح مسئلہ یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں ٹھنڈک حاصل کرنے اور گرمی کے دفعیہ کے لئے نہانا اور بدن کو پانی سے تر کپڑا لپیٹنا مکروہ نہیں ہے نیز در مختار میں بھی یہی منقول ہے۔

روزہ میں پچھنے لگوانے کا مسئلہ

⑭ وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتٰى رَجُلًا بِالْبَقِيْعِ وَهُوَ يَحْتَجِمُ وَهُوَ اٰخِذٌ بِيَدِيْ لِثَمَانِيْ عَشْرَةَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ فَقَالَ اَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُوْمُ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ قَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ مُحْيُ السُّنَّةِ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَتَأَوَّلَهُ بَعْضُ مَنْ رَخَّصَ فِي الْحِجَامَةِ اَيْ تَعَرَّضَا لِلْاِفْطَارِ الْمَحْجُوْمُ لِلضُّعْفِ وَالْحَاجِمُ لِاَنَّهُ لَا يَأْمَنُ مِنْ اَنْ يَصِلَ شَيْئٌ اِلٰى جَوْفِهِ بِمَصِّ الْمَلَازِمِ

"اور حضرت شداد بن اوس کہتے ہیں کہ رمضان کی اٹھارہ تاریخ کو رسول کریم ﷺ (مدینہ کے قبرستان) جنت البقیع میں ایک ایسے شخص کے پاس تشریف لائے جو بھری ہوئی سینگی کھنچوا رہا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے آپ نے فرمایا کہ سینگی کھینچنے اور کھنچوانے والے نے اپنا روزہ توڑ ڈالا (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی) امام محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو علماء روزہ کی حالت میں سینگی کھینچنے اور کھنچوانے کی اجازت دیتے ہیں انہوں نے اس حدیث کی تاویل کی ہے یعنی یہ کہ (اس ارشاد گرامی میں آپ ﷺ کی مراد یہ ہے کہ) سینگی کھنچوانے والا تو ضعف کی وجہ سے روزہ توڑنے کے قریب ہو جاتا ہے اور سینگی کھینچنے والا اس سبب سے افطار کے قریب ہو جاتا ہے۔ کہ ہو سکتا ہے کہ سینگی کھینچنے کے عمل سے (خون کا) کوئی حصہ اس کے پیٹ میں پہنچ گیا ہو۔"

تشریح : بعض من رخص میں بعض سے مراد جمہور یعنی اکثر علماء ہیں چنانچہ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے کہ روزہ کی حالت میں پچھنے لگوانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عباس کی صحیح روایت منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ نے احرام اور روزہ کی حالت میں بھری ہوئی سینگی کھنچوائی، حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام شافعی، اور حضرت امام مالک کا بھی یہی مسلک ہے ان حضرات کی طرف سے حدیث کی وہی مراد بیان کی جاتی ہے جو امام محی السنۃ نے نقل کی ہے روزہ توڑنے کے قریب ہو جاتا ہے، یعنی بھری ہوئی سینگی کھنچوانے والے کا خون چونکہ زیادہ نکل جاتا ہے جس کی وجہ سے ضعف و سستی اور ناتوانی اتنی زیادہ لاحق ہو جاتی ہے کہ اس کے بارہ میں یہ خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ اپنی جان بچانے کے لئے روزہ نہ توڑ ڈالے اور سینگی کھینچنے والے کے بارہ میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ سینگی چونکہ منہ سے کھینچنی پڑتی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس عمل کے وقت خون کا کوئی قطرہ اس کے پیٹ میں چلا گیا ہو۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ بھری ہوئی سینگی کھنچوانے سے ٹوٹتا تو نہیں البتہ ضعف لاحق ہونے اور جان کی ہلاکت کے خوف سے مکروہ ہو جاتا ہے بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ ارشاد گرامی بطور خاص دو اشخاص کے بارہ میں ہے کہ وہ سینگی کھینچتے اور کھنچواتے وقت غیبت میں مشغول تھے لہٰذا ان دونوں کو غیبت میں مشغول دیکھ کر آپ ﷺ نے (بطور تنبیہ) فرمایا کہ دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا ہے، بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ حکم پہلے تھا۔ بعد میں منسوخ ہو گیا۔

بلا عذر روزہ نہ رکھنا

⑮ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَفْطَرَ يَوْمًا مِنْ رَمَضَانَ مِنْ غَيْرِ رُخْصَةٍ وَلَا مَرَضٍ

لَمْ يَقْضِ عَنْهُ صَوْمَ الدَّهْرِ كُلِّهٖ وَاِنْ صَامَهٗ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَالْبُخَارِيُّ فِيْ تَرْجَمَةِ بَابٍ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ سَمِعْتُ مُحَمَّدًا يَعْنِي الْبُخَارِيَّ يَقُوْلُ اَبُو الْمُطَوِّسِ الرَّاوِيْ لَا اَعْرِفُ لَهٗ غَيْرَ هٰذَا الْحَدِيْثِ

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بلا رخصت اور بلا مرض رمضان کا کوئی روزہ قصداً نہ رکھے تو تمام عمر روزہ رکھنا بھی اس کا بدلہ نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ تمام عمر روزہ رکھے۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، داری) امام بخاریؒ نے اس روایت کو (بخاری کے) ترجمۃ الباب میں نقل کیا ہے نیز امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ میں نے حضرت امام بخاریؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں (اس روایت کے ایک راوی) ابوالمطوس کو اس حدیث کے علاوہ اور کسی حدیث کا راوی نہیں جانتا۔"

تشریح: بلا رخصت قصداً روزہ نہ رکھنے سے مراد یہ ہے کہ شریعت نے روزہ نہ رکھنے کے لئے حالت سفر وغیرہ میں جو رخصت یعنی اجازت عطا فرمائی ہے اس کے علاوہ اس حالت جب کہ روزہ رکھنا ضروری ہے قصداً روزہ نہ رکھے چنانچہ اس کے بارہ میں ابتداء باب میں تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ حدیث کے آخری الفاظ وان صامہ ماقبل جملہ کی تاکید کے طور پر ارشاد فرمائے گئے ہیں۔

یہ حدیث رمضان کے روزہ کی اہمیت و عظمت کے اظہار کے لئے بطور مبالغہ ارشاد فرمائی گئی ہے، لہٰذا حدیث کی مراد یہ ہے کہ فرض روزہ کا ثواب اس قدر اور اتنا زیادہ ہے کہ وہ نفل روزہ سے میسر نہیں آتا چاہے کوئی تمام عمر ہی نفل روزہ کیوں نہ رکھے۔ اس بارہ میں جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے علماء لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے رمضان کا کوئی روزہ نہیں رکھا اور پھر بعد میں قضا روزہ رکھ لیا تو اس کے ذمہ سے فرض ادا ہو جائے گا اسی طرح اگر کسی شخص نے رمضان کا کوئی روزہ قصداً توڑ ڈالا اور پھر اس کے کفاہ کے طور پر دو مہینے کے روزے رکھ لئے تو وہ بری الذمہ ہو جائے گا۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص رمضان کا روزہ نہ رکھے اور اس کے بدلے تمام عمر بھی روزے رکھے تو وہ بری الذمہ نہیں ہوگا چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا یہی مسلک تھا لیکن اکثر صحابہؓ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ ایک دن کے روزے کا بدل دوسرے دن کا روزہ ہو جاتا ہے یعنی اگر رمضان میں ایک دن کا روزہ نہ رکھا جائے اور اس کی قضا کے طور پر کسی دوسرے دن روزہ رکھ لیا جائے تو فرض ادا ہو جاتا ہے چاہے یہی صورت کیوں نہ ہو کہ رمضان کا وہ روزہ جو نہیں رکھا گیا ہے گرمی کے کسی سخت اور بڑے دن میں رہا ہو اور اس کی قضا کے طور پر سردی میں اور چھوٹے دن روزہ رکھا جائے۔ اسی طرح صحیح مسئلہ یہ ہے۔ کہ نماز بھی روزے کے حکم میں ہے کہ اگر کسی وقت نماز نہ پڑھے تو دوسرے وقت اس کی قضا پڑھنے سے فرض ادا ہو جاتا ہے کیونکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ تمام علماء کے نزدیک نماز روزہ سے افضل ہے۔

بلاروح روزہ

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الظَّمَأُ وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ قِيَامِهٖ اِلَّا السَّهَرُ۔ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ وَذُكِرَ حَدِيْثُ لَقِيْطِ بْنِ صَبِرَةَ فِيْ بَابِ سُنَنِ الْوُضُوْءِ

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں جنہیں ان کے روزے سے سوائے پیاسا رہنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اور رات میں عبادت میں مشغول رہنے والے بہت سے ایسے ہیں۔ جنہیں ان کی عبادت سے سوائے بے خوابی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" (داریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص روزہ رکھے مگر نہ تو اس کی نیت میں اخلاص و للّٰہیت ہو اور نہ وہ جھوٹ، جھوٹی گواہی، بہتان تراشی غیبت اور ان کے علاوہ دیگر ممنوعات سے اجتناب و پرہیز کرے تو اس کا روزہ بلاروح ہے کہ وہ بھوکا اور پیاسا تو رہتا ہے مگر اسے روزہ کا

کمال اور ثواب حاصل نہیں ہوتا اگرچہ اس کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص رات میں عبادت میں مشغول رہتا ہے اور اسے حضوریٔ قلب اور صدق نیت کی دولت میسر نہیں ہوتی یا اس کی وہ عبادت دنیا کے فائدہ اور ریاء و نمائش کے جذبہ کے تحت ہوتی ہے تو اسے کچھ ثواب نہیں ملتا اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی غصب کردہ مکان میں نماز پڑھے تو اسے ثواب نہیں ملتا اگرچہ اس کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے یا جو شخص بغیر عذر جماعت سے محروم رہتا ہے ایسے ہی دیگر عبادات مثلاً حج و زکوٰۃ وغیرہ کا بھی مسئلہ یہ ہے کہ اگر اخلاص نیت حاصل نہ ہو تو تضییع مال اور جسمانی مشقت و محنت کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔

حاصل یہ کہ کوئی بھی عبادت ہو جب تک اخلاص نیت، حضوریٔ قلب اور محض اللہ تعالیٰ کی رضاء و خوشنودی کا جذبہ میسر نہ ہو وہ بلا روح ہوتی ہے کہ جس سے نہ تو قرب الٰہی کی سعادت میسر آتی ہے اور نہ اجر و ثواب کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

وذكر حديث لقيط بن صبرة في باب سنن الوضوء

"اور لقیط بن صبرہ کی روایت (جو صاحب مصابیح نے یہاں نقل کی تھی) باب سنن الوضوء میں ذکر کی جاچکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سینگی، قے اور احتلام سے روزہ نہیں ٹوٹتا

(۱۷) عَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ لَا یُفَطِّرْنَ الصَّائِمَ الْحِجَامَةُ وَالْقَیْءُ وَالْاِحْتِلَامُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَیْرُ مَحْفُوْظٍ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ ابْنُ زَیْدِ الرَّاوِیُ یُضَعَّفُ فِی الْحَدِیْثِ

"حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، تین چیزیں روزہ دار کے روزہ کو نہیں توڑتیں سینگی، قے (جو از خود آئے) اور احتلام، امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث محفوظ نہیں ہے۔ اس کے ایک راوی عبد الرحمن ابن زید روایت حدیث کے سلسلہ میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔"

تشریح: اس روایت کو دار قطنی بیہقی اور ابو داؤد نے بھی نقل کیا ہے نیز ابو داؤد کی روایت کے بارہ میں محدثین نے لکھا ہے کہ وہ اشبہ بالصواب (یعنی صحت کے زیادہ قریب) ہے۔

(۱۸) وَعَنْ ثَابِتِ الْبُنَانِیِّ قَالَ سُئِلَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ كُنْتُمْ تَكْرَهُوْنَ الْحِجَامَةَ لِلصَّائِمِ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا اِلَّا مِنْ اَجْلِ الضُّعْفِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ لوگ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں روزے دار کے لئے سینگی کو مکروہ سمجھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ نہیں علاوہ خوف کی صورت کے۔" (بخاریؒ)

تشریح: یعنی اس اعتبار سے سینگی کو مکروہ سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف و ناتوانی لاحق ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے روزہ پر اثر پڑ سکتا ہے نہ کہ اس اعتبار سے کہ اس کی وجہ سے روزہ جاتا رہتا ہو۔

(۱۹) وَعَنِ الْبُخَارِیِّ تَعْلِیْقًا قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ یَحْتَجِمُ وَهُوَ صَائِمٌ ثُمَّ تَرَكَهٗ فَكَانَ یَحْتَجِمُ بِاللَّیْلِ

"اور حضرت امام بخاریؒ بطریق تعلیق نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ (پہلے تو) روزہ کی حالت میں سینگی لگوا لیا کرتے تھے مگر بعد میں انہوں نے اسے ترک کر دیا البتہ رات میں سینگی لگوا لیتے تھے۔"

تشریح: اور حضرت ابن عمرؓ دن میں بحالت روزہ سینگی لگوانا یا تو احتیاط کے پیش نظر ترک کر دیا تھا یا پھر یہ کہ ضعف کے خوف سے

اجتناب کرنے لگے تھے۔
امام بخاریؒ نے بعض احادیث کو سند کے بغیر ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ یہ مذکورہ بالا حدیث ہے چنانچہ بغیر سند روایت کے نقل کرنے کو بطریق تعلیق نقل کرنا کہا جاتا ہے، مذکورہ بالا روایت کے نقل کے سلسلہ میں مناسب یہ تھا کہ مصنف مشکوٰۃ حسب قاعدہ و معمول پہلے تو کہتے عن ابن عمرؓ الخ پھر بعد میں رواہ البخاری تعلیقا کے الفاظ نقل کرتے۔

کلی کی تری اور تھوک نگلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

(۲۰) وَعَنْ عَطَاءٍ قَالَ اِنْ مَضْمَضَ ثُمَّ اَفْرَغَ مَا فِيْ فِيْهِ مِنَ الْمَاءِ لَا يَضِيْرُهُ اَنْ يَزْدَرِدَ رِيْقَهُ وَمَا بَقِيَ فِيْ فِيْهِ وَلَا يَمْضَغُ الْعِلْكَ فَاِنِ ازْدَرَدَ رِيْقَ الْعِلْكِ لَا اَقُوْلُ اِنَّهُ يُفَطِّرُ وَلٰكِنْ يُنْهٰى عَنْهُ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِيْ تَرْجَمَةِ بَابٍ

"اور حضرت عطاء (تابعی) کہتے ہیں کہ اگر روزہ دار کلی کرے اور پھر پانی کو منہ سے (بالکل) نکال دے تو اس کے روزہ کو اس بات سے نقصان نہیں پہنچے گا کہ وہ اپنا تھوک اور وہ چیز جو منہ کے اندر باقی ہے نگل جائے اور روزہ دار مصطگی نہ چبائے اور اگر روزہ دار مصطگی کا تھوک نگل جائے تو میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا لیکن اس سے منع کیا جاتا ہے۔ (یہ روایت بخاری کے ترجمۃ الباب میں نقل کی گئی ہے)۔"

تشریح: لفظ مابقي میں حرف ما موصولہ ہے اور اس کا عطف لفظ ریقہ پر ہے اسی پورے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی روزہ دار کلی کرنے کے بعد اپنا تھوک یا پانی کی وہ تری جو کلی کے بعد منہ میں باقی رہ گئی ہے نگل لے تو اس کے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ اس سے اجتناب قطعاً ممکن نہیں ہے۔
مصطگی۔ علک کا ترجمہ ہے یہ گوند کی قسم سے ایک دوا ہے جو دانت کے امراض میں اور دانتوں کی تقویت کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے پہلے زمانہ میں بھی لوگ اسے دانت کی تقویت کے لئے منہ میں رکھ لیا کرتے تھے اور چباتے تھے چنانچہ روزہ کی حالت میں اسے چبانے سے منع فرمایا گیا ہے البتہ مذکورہ بالا حدیث میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مصطگی کو چباتے ہوئے جو تھوک منہ میں جمع ہو جائے، اس کو نگلنے سے روزہ نہیں جاتا کیونکہ وہ تو منہ میں چپک کر رہ جاتی ہے اس کا کوئی جز علیحدہ نہیں ہوتا کہ وہ حلق میں اتر جائے اور اس سے روزہ ٹوٹ جائے تاہم بطور احتیاط اس کے تھوک کو بھی نگلنے سے منع فرمایا گیا ہے لہٰذا حدیث کے الفاظ ولکن ینھی عنه میں مذکورہ نہی تنزیہی ہے۔ کیونکہ علماء فرماتے ہیں کہ کسی بھی چیز کو چبانا خواہ وہ مصطگی ہو یا اور کوئی چیز مکروہ ہے ہاں ضرورت کے وقت کسی بچہ کے منہ میں دینے کے لئے اس کا کوئی ٹکڑا چبانا جائز ہے۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ مصطگی وغیرہ چبانے کی کراہت اس صورت میں ہے جب کہ یہ یقین ہو کہ اس کا کوئی جز حلق کے نیچے نہیں اترا ہے اور اگر حلق کے نیچے اتر جانے کا یقین ہو تو پھر روزہ ٹوٹ جائے گا۔
اگر کوئی درزی یا کوئی بھی شخص رنگا ہوا ڈور منہ میں لے اور اس کا تھوک ڈورے کے رنگ جیسا ہو جائے اور پھر وہ اس تھوک کو نگل جائے تو روزہ فاسد ہو جائے گا اور اگر تھوک پر رنگ غالب نہ آئے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

بَابُ صَوْمِ الْمُسَافِرِ

مسافر کے روزہ کا بیان

اس باب کے تحت وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے مسافر کے روزہ کے بارے میں احکام و مسائل کا استنباط ہوگا کہ آیا سفر کی حالت میں روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ مسافر کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے یا روزہ نہ رکھنا افضل ہے؟۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

سفر کی حالت میں روزہ رکھنا اور روزہ نہ رکھنا دونوں جائز ہیں

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍ و الْاَسْلَمِيَّ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصُوْمُ فِي السَّفَرِ وَكَانَ كَثِيْرَ الصِّيَامِ فَقَالَ اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَاِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حمزہ ابن عمرو اسلمیؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں سفر کی حالت میں روزہ رکھوں؟ (یعنی اگر میں رمضان میں سفر کروں تو روزہ رکھوں یا نہ رکھوں اس بارہ میں کیا حکم ہے؟) اور حمزہؓ بہت زیادہ روزے رکھا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ، یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے چاہے رکھو اور چاہے نہ رکھو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سفر کی حالت میں روزہ رکھنا اور نہ رکھنا دونوں جائز ہیں خواہ سفر صعوبت و مشقت کے ساتھ ہو یا راحت و آرام کے ساتھ، تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ اگر سفر میں کوئی صعوبت و مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا ہی بہتر ہے اور اگر صعوبت و مشقت ہو تو پھر نہ رکھنا بہتر ہوگا، نیز حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے یہاں یہ مسئلہ ہر سفر کے لئے ہے خواہ مباح اور جائز امور کے لئے سفر ہو یا معصیت و برائی کے لئے، جب کہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ روزہ نہ رکھنے کی اجازت کا تعلق صرف مباح اور جائز سفر سے ہے اگر معصیت و برائی کے لئے سفر ہوگا تو اس صورت میں رمضان کا روزہ نہ رکھنا جائز نہیں ہوگا۔

② وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِسِتَّ عَشْرَةَ مَضَتْ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ فَمِنَّا مَنْ صَامَ وَمِنَّا مَنْ اَفْطَرَ فَلَمْ يَعِبِ الصَّائِمُ عَلَى الْمُفْطِرِ وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَى الصَّائِمِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ جہاد کے لئے روانہ ہوئے تو رمضان کی سولہویں تاریخ تھی، ہم میں سے کچھ لوگوں نے (جو قوی تھے) روزہ رکھا اور کچھ لوگوں نے (جو ضعیف تھے یا یہ کہ دوسروں کے خدمت گار تھے) روزہ نہ رکھا چنانچہ نہ تو روزہ داروں نے روزہ نہ رکھنے والوں کو معیوب جانا (کیونکہ انہوں نے رخصت یعنی اجازت پر عمل کیا تھا) اور نہ روزہ نہ رکھنے والوں نے روزہ داروں کو معیوب سمجھا (کیونکہ انہوں نے عزیمت پر عمل کیا تھا)۔" (مسلمؒ)

ضعف اور مشقت کی حالت روزہ نہ رکھنا ہی مسافر کے لئے بہتر ہے

③ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَرَاٰى زِحَامًا وَرَجُلًا قَدْ ظُلِّلَ عَلَيْهِ فَقَالَ مَا هٰذَا قَالُوْا صَائِمٌ فَقَالَ لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ حالت سفر میں تھے کہ (ایک جگہ) آپ ﷺ نے مجمع دیکھا اور ایک شخص کو دیکھا جس پر (دھوپ سے بچاؤ کے لئے) سایہ کیا گیا تھا، آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے کہا، یہ شخص روزہ دار ہے (جو ضعف کی وجہ سے گر پڑا ہے) آپ نے فرمایا، سفر کی حالت میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر روزہ رکھنے کی صورت میں ضعف و ناتوانی کی وجہ سے روزہ دار کی اتنی خستہ حالت ہو جائے تو اس کے لئے سفر میں روزہ رکھنا کوئی زیادہ بہتر بات نہیں ہے۔ بلکہ افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي السَّفَرِ فَمِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَنَزَلْنَا مَنْزِلًا فِيْ يَوْمٍ حَارٍّ فَسَقَطَ الصَّوَّامُوْنَ وَقَامَ الْمُفْطِرُوْنَ فَضَرَبُوا الْاَبْنِيَةَ وَسَقَوُا الرِّكَابَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْيَوْمَ بِالْاَجْرِ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں (ایک مرتبہ) ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھے، ہم میں سے کچھ لوگ تو روزہ دار تھے اور کچھ لوگ بغیر روزہ کے تھے، جب ہم ایک منزل پر اترے تو گرمی کا دن تھا جو لوگ روزہ سے تھے وہ تو گر پڑے (یعنی ضعف و ناتوانی کی وجہ سے کسی کام کے لائق نہیں رہے) اور جو لوگ روزہ سے نہیں تھے وہ مستعد رہے۔ (یعنی اپنے کام کاج میں مشغول ہو گئے) چنانچہ انہوں نے خیمے کھڑے کئے اور اونٹوں کو پانی پلایا آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا کہ روزہ نہ رکھنے والوں نے آج ثواب کا میدان جیت لیا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: یعنی جن لوگوں نے آج روزہ نہیں رکھا زیادہ کامل ثواب انہیں لوگوں کے حصہ میں آیا کیونکہ ایسے وقت میں ان کے لئے روزہ نہ رکھنا ہی بہتر تھا۔

لفظ "الیوم" (آج) سے اس طرف اشارہ ہے کہ روزہ نہ رکھنے کی یہ فضیلت روزہ داروں کی خدمت گاری کی وجہ سے حاصل ہوئی نہ کہ مطلقاً، نیز یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کے نیک و صالح بندوں کی خدمت نوافل سے افضل ہے۔

سفر میں روزہ توڑنے کی اجازت ہے

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ اِلٰى مَكَّةَ فَصَامَ حَتّٰى بَلَغَ عُسْفَانَ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَرَفَعَهُ اِلٰى يَدِهٖ لِيَرَاهُ النَّاسُ فَاَفْطَرَ حَتّٰى قَدِمَ مَكَّةَ وَذٰلِكَ فِيْ رَمَضَانَ فَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ قَدْ صَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَفْطَرَ فَمَنْ شَاءَ صَامَ وَمَنْ شَاءَ اَفْطَرَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ شَرِبَ بَعْدَ الْعَصْرِ

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (فتح مکہ کے سال) نبی کریم ﷺ مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے چنانچہ آپ ﷺ نے (اس سفر میں) روزہ رکھا یہاں تک کہ جب عسفان (جو مکہ سے دو منزل کے فاصلہ پر ایک جگہ کا نام ہے) پہنچے تو پانی منگوایا، پہلے تو آپ ﷺ نے اس پانی کو ہاتھ میں (لے کر بہت اونچا) اٹھایا (تاکہ لوگ دیکھ لیں) اور پھر آپ ﷺ نے روزہ توڑ ڈالا، اس طرح آپ مکہ تشریف لائے اور یہ سفر رمضان میں ہوا تھا، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کہا کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے (سفر کی حالت میں) روزہ رکھا بھی اور نہیں بھی رکھا، لہٰذا جو چاہے (سفر کی حالت میں) روزہ رکھے اور جو نہ چاہے نہ رکھے، (بخاری و مسلم) اور مسلمؒ کی ایک اور روایت جو حضرت جابرؓ سے منقول ہے یہ الفاظ بھی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے عصر کے بعد پانی پیا۔"

تشریح: آپ ﷺ نے پانی کو ہاتھ میں لے کر یا تو اونچا اس لئے اٹھایا تاکہ لوگ جان لیں کہ سفر کی حالت میں روزہ توڑ دینا جائز ہے یا پھر یہ کہ مقصد تھا کہ دوسرے لوگ بھی آپ کی متابعت میں اپنا اپنا روزہ افطار کر لیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

حالت سفر میں روزہ کی معافی

⑥ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ الْكَعْبِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنِ الْمُسَافِرِ شَطْرَ الصَّلٰوةِ وَالصَّوْمَ عَنِ الْمُسَافِرِ وَعَنِ الْمُرْضِعِ وَالْحُبْلٰى (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت انس بن مالک کعبیؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لئے آدھی نماز موقوف کر دی ہے اسی طرح، مسافر، دودھ پلانے والی اور حاملہ عورت کے لئے روزہ معاف کر دیا ہے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: آدھی نماز موقوف کر دی ہے، کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ مسافر کے لئے بھی پہلے چار رکعت نماز فرض تھی پھر بعد میں دو رکعت رہ گئی

بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لئے ابتداء ہی سے آدھی نماز فرض فرمائی ہے کہ وہ چار رکعت والی نماز دو رکعت پڑھے اور دو رکعت کی قضا واجب نہیں ہے اسی طرح روزہ کی معافی، کا مطلب یہ ہے کہ حالت سفر میں روزہ رکھنا واجب نہیں ہے۔ مگر سفر پورا ہونے کے بعد مسافر جب مقیم ہو جائے گا تو اس روزہ کی قضا اس پر ضروری ہوگی۔

دودھ پلانے والی اور حاملہ عورت کے بارہ میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان کے لئے بھی جائز ہے کہ اگر روزہ کی وجہ سے بچہ یا خود ان کو تکلیف و نقصان پہنچنے کا گمان غالب ہو تو وہ روزہ نہ رکھیں لیکن عذر ختم ہو جانے کے بعد ان پر بھی قضا واجب ہوگی فدیہ لازم نہیں ہوگا حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے مسلک کے مطابق ان پر فدیہ بھی واجب ہے۔

اگر سفر میں آسانی اور آرام ہو تو روزہ رکھ لینا مستحب ہے

⑦ وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبَّقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهٗ حَمُوْلَةٌ تَأْوِىْ اِلٰى شِبْعٍ فَلْيَصُمْ رَمَضَانَ حَيْثُ اَدْرَكَهٗ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سلمہ ابن محبقؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کے پاس ایسی سواری ہو جو اسے منزل تک آسانی اور آرام کے ساتھ پہنچا دے (یعنی اس کا سفر بامشقت نہ ہو بلکہ پر سکون اور پر راحت ہو) تو اسے چاہئے کہ جہاں بھی رمضان آئے روزہ رکھ لے۔"

(ابوداؤد)

تشریح: یہ حکم استحباب اور فضیلت کے طور پر ہے ورنہ تمام علماء کے نزدیک متفقہ طور پر مسئلہ یہی ہے کہ حالت سفر میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے خواہ سفر کتنا ہی پر سکون اور پر راحت کیوں نہ ہو ویسے بھی یہ حدیث ضعیف ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سفر میں روزہ جاری رکھنے اور آنحضرت ﷺ کی متابعت نہ کرنے پر آپ کی برہمی

⑧ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ اِلٰى مَكَّةَ فِىْ رَمَضَانَ فَصَامَ حَتّٰى بَلَغَ كُرَاعَ الْغَمِيْمِ فَصَامَ النَّاسُ ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ فَرَفَعَهٗ حَتّٰى نَظَرَ النَّاسُ اِلَيْهِ ثُمَّ شَرِبَ فَقِيْلَ لَهٗ بَعْدَ ذٰلِكَ اِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ فَقَالَ اُولٰئِكَ الْعُصَاةُ اُولٰئِكَ الْعُصَاةُ (رواہ مسلم)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ فتح مکہ کے سال رمضان کے مہینہ میں مکہ کی طرف چلے تو آپ ﷺ نے روزہ رکھا۔ یہاں تک کہ کراع الغمیم (جو مکہ اور مدینہ کے درمیان عسفان کے قریب ایک جگہ کا نام ہے) پہنچے دوسرے لوگ بھی روزہ سے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے پیالہ میں پانی منگوایا اور اسے (ہاتھ میں لے کر اتنا) اونچا اٹھایا کہ لوگوں نے دیکھ لیا پھر آپ ﷺ نے وہ پانی پی لیا، اس کے بعد آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ بعض لوگوں نے روزہ رکھا (یعنی انہوں نے آنحضرت ﷺ کی متابعت میں روزہ توڑا نہیں) آپ ﷺ نے فرمایا وہ لوگ پکے گنہگار ہیں۔ وہ لوگ پکے گنہگار ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: وہ لوگ پکے گنہگار ہیں، آپ ﷺ نے اپنی انتہائی ناراضگی کے اظہار کے طور پر یہ الفاظ دو مرتبہ ارشاد فرمائے کیونکہ آپ ﷺ نے پانی کو اپنے ہاتھوں میں اونچا اٹھا کر اس لئے پیا تھا تاکہ دوسرے لوگ بھی مطلع ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ نے سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھنے کی جو اجازت عطا فرمائی ہے اس بارہ میں آنحضرت ﷺ کی پیروی و متابعت کریں مگر انہوں نے روزہ رکھ کر گویا آنحضرت کے فعل کی مخالفت کی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی گئی رخصت (اجازت و آسانی) کو قبول نہیں کیا اس لئے آپ ﷺ نے ان کے اس طرز عمل پر

برہمی کا اظہار فرماتے ہوئے اس طرح فرمایا کہ گویا سفر کی حالت میں روزہ رکھنا حرام ہے۔

سفر میں روزہ رکھنا اور حضر میں روزہ نہ رکھنا، دونوں میں مشابہت

⑨ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَائِمُ رَمَضَانَ فِي السَّفَرِ كَالْمُفْطِرِ فِي الْحَضَرِ (رواه ابن ماجة)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سفر میں رمضان کا روزہ رکھنے والا حضر میں (یعنی اپنے مستقر پر) روزہ نہ رکھنے والے کی طرح ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح حالت حضر میں روزہ نہ رکھنا بڑے گناہ کی بات ہے اسی طرح سفر کی حالت میں روزہ رکھنا ایک بہت بڑا گناہ ہے لیکن اکثر علماء فرماتے ہیں کہ یا تو یہ حدیث منسوخ ہے یا پھر اس حالت پر محمول ہے جب کہ سفر میں روزہ کی تکلیف و نقصان کا باعث بنے یا روزہ دار کی ہلاکت کا اندیشہ ہو۔

سفر میں روزہ نہ رکھنا ہی اولیٰ ہے

⑩ وَعَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرٍو الْاَسْلَمِيِّ اَنَّهُ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي اَجِدُ بِيْ قُوَّةً عَلَى الصِّيَامِ فِي السَّفَرِ فَهَلْ عَلَيَّ جُنَاحٌ قَالَ هِيَ رُخْصَةٌ مِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَمَنْ اَخَذَ بِهَا فَحَسَنٌ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يَصُوْمَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ (رواه مسلم)

"اور حضرت حمزہ ابن عمرو اسلمیؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں سفر کی حالت میں اپنے اندر روزہ رکھنے کی قوت پاتا ہوں کیا (روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کی صورت میں) مجھ پر گناہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، یہ (یعنی سفر میں روزہ نہ رکھنا) اللہ رب العزت کی طرف سے رخصت (آسانی) ہے لہٰذا جس شخص نے یہ رخصت قبول کی اس نے اچھا کیا اور جو شخص روزہ رکھنا ہی چاہے تو اس پر کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ سفر کی حالت میں روزہ رکھنا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، لیکن بہتر اور اولیٰ یہی ہے کہ روزہ نہ رکھا جائے۔

باب القضاء

قضا روزہ کا مفصّل بیان

روزہ نہ رکھنے یا روزہ توڑ ڈالنے کے بارہ میں تین حکم ہیں۔ ① بھول چوک میں روزہ افطار کر لینے کی صورت میں نہ کفارہ واجب ہوتا ہے اور نہ قضا۔ ② بغیر کسی عذر کے قصداً روزہ افطار کر لینے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ ③ بغیر کسی عذر مثلاً مرض یا سفر وغیرہ کی بناء پر روزہ نہ رکھنے یا افطار کر لینے کی صورت میں قضا واجب ہوتی ہے، چنانچہ اس باب کے تحت قضا روزہ کے احکام و آداب بیان کئے جائیں گے اور صحیح یہ ہے کہ یہاں "قضا روزہ" سے مراد رمضان کے قضا روزے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضرت عائشہؓ کے قضا روزے

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ يَكُوْنُ عَلَيَّ الصَّوْمُ مِنْ رَمَضَانَ فَمَا اسْتَطِيْعُ اَنْ اَقْضِيَ اِلَّا فِيْ شَعْبَانَ قَالَ يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ

تَعْنِي الشُّغُلُ مِنَ النَّبِيِّ اَوْ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے ذمہ رمضان کے جو روزے ہوتے ان کی قضائیں صرف شعبان ہی کے مہینہ میں رکھ سکتی تھی، یحیٰ ابن سعید کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مشغولیت یا کہا کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت کے ساتھ مشغولیت حضرت عائشہ کو (شعبان کے علاوہ اور کسی مہینہ میں) رمضان کے قضا روزے رکھنے سے باز رکھتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ رمضان کے اپنے وہ روزے جو حیض کی وجہ سے قضا ہوتے تھے، شعبان کے علاوہ اور کسی مہینہ میں رکھنے کی فرصت نہیں پاتی تھیں کیونکہ اور دنوں میں وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ہمہ وقت مشغول رہا کرتی تھیں اور اس طرح مستعد رہا کرتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ جس وقت بھی خدمت و صحبت کے لئے بلائیں حاضر ہو جائیں، آنحضرت ﷺ چونکہ شعبان کے مہینے میں اکثر روزے سے رہا کرتے تھے اس لئے اس مہینہ میں حضرت عائشہؓ کو مہلت مل جاتی تو ان کے ذمہ رمضان کے جو روزے ہوتے تھے ان کی قضا رکھتیں۔

عورت اپنے خاوند کی مرضی کے بغیر نفل روزے نہ رکھے

(۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ اَنْ تَصُوْمَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ وَلَا تَأْذَنَ فِيْ بَيْتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، کسی عورت کے لئے اپنے خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفل روزے رکھنا درست نہیں ہے۔ نیز کوئی عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر کسی کو اپنے گھر میں گھسنے کی اجازت نہ دے۔" (مسلم)

تشریح: پہلے حکم کا مطلب یہ ہے کہ جس عورت کا خاوند اس کے پاس موجود ہو تو اس کی اجازت کے بغیر عورت کے لئے نفل روزہ رکھنا جائز نہیں ہے اجازت خواہ دلالۃ ہو یا صراحۃ اور اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں مرد صحبت وغیرہ کے سلسلہ میں دقت و پریشانی محسوس کرے گا۔

اس حدیث سے مطلقاً نفل روزے رکھنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے چنانچہ یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی نفی کرتی ہے کیونکہ حضرات شوافع کہتے ہیں کہ عورت، عرفہ اور عاشورہ کے روزے اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر بھی رکھ سکتی ہے۔

دوسرے حکم کا مطلب یہ ہے کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر کسی بھی شخص کو اپنے گھر میں آنے دے خواہ آنے والا اپنا کوئی عزیز و رشتہ دار ہو یا اجنبی، حتیٰ کہ اگر کوئی عورت آئے تو اسے بھی اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر میں نہ گھسنے دے۔ اس بارہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ خاوند کی رضا کا علم بھی اس کی اجازت ہی کے حکم میں ہے یعنی کسی شخص کے بارہ میں اگرچہ مرد نے زبانی طور پر اجازت نہیں دی ہے لیکن عورت اگر یہ جانتی ہے کہ اس شخص کے آنے سے شوہر کو کوئی ناگواری نہیں ہوگی تو اس صورت میں وہ اس شخص کو اپنے گھر میں آنے دے سکتی ہے کیونکہ یہ بھی دلالۃ اجازت ہے۔

حائضہ پر روزہ کی قضا واجب ہے نماز کی قضا واجب نہیں

(۳) وَعَنْ مُعَاذَةَ الْعَدَوِيَّةِ اَنَّهَا قَالَتْ لِعَائِشَةَ مَا بَالُ الْحَائِضِ تَقْضِي الصَّوْمَ وَلَا تَقْضِي الصَّلٰوةَ قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ يُصِيْبُنَا ذٰلِكَ فَنُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلٰوةِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت معاذہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا (جن کی کنیت ام الصہبا ہے اور جلیل القدر تابعیہ ہیں) کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ یہ کیا وجہ ہے کہ حائضہ عورت پر روزہ کی قضاء واجب مگر نماز کی قضاء واجب نہیں ہے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ نبی

کریم ﷺ کے زمانہ مبارک میں جب ہمیں حیض آتا تو ہمیں روزہ کی قضاء کا حکم دیا جاتا تھا لیکن نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔" (مسلم)

تشریح: سائلہ نے حضرت عائشہؓ سے حائضہ عورت کے بارہ میں نماز اور روزہ کی تفریق کی وجہ دریافت کی مگر حضرت عائشہؓ نے اس کی وجہ بیان کرنے کی بجائے مذکورہ بالا جواب دے کر گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ ہر مسئلہ کی وجہ دریافت کرنا یا اس کی علت کی جستجو کرنا کوئی اعلیٰ مقصد نہیں ہے بلکہ شان عبودیت کا تقاضہ صرف یہ ہونا چاہئے کہ شارع نے جو حکم دے دیا ہے اس کی علت پوچھے بغیر اس پر عمل کیا جائے چنانچہ یہ ممکن تھا کہ حضرت عائشہؓ سوال کے پس نظریہ فرماتیں کہ اگر نماز کی قضا کا حکم دیا جاتا تو حائضہ عورت بہت زیادہ دقت و مشقت اور حرج میں مبتلا ہو جاتی کیونکہ ایام کے دنوں میں بہت زیادہ نمازیں ترک ہوتی ہیں ان سب کو ہر مہینہ قضا کرنا عورت پر بہت زیادہ بار ہو جاتا ہے اس لئے اس میں یہ آسانی عطا فرمائی گئی کہ ایام کے دنوں کی نمازیں حائضہ کے حق میں معاف فرما دی گئیں جب کہ روزہ سے واسطہ سال بھر میں صرف ایک مرتبہ پڑتا ہے ان کی قضا میں اتنی زیادہ مشقت اور حرج نہیں ہوتا اس لئے حائضہ پر ان کی قضا واجب قرار پائی لیکن حضرت عائشہؓ نے اس جواب سے احتراز فرما کر مذکورہ بالا اسلوب اختیار فرمایا اور بحث و مباحثہ کی راہ بند کر دی کیونکہ ممکن تھا کہ سائلہ اس علت کو سن کر کہتی کہ میں تو نماز کی قضا میں حرج و مشقت محسوس نہیں کرتی پھر کیوں نہ نماز کی بھی قضا واجب ہو؟۔

میت کے ذمہ روزوں کا فدیہ

(۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صَوْمٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے ذمہ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کے ورثاء، روزہ رکھیں (یعنی فدیہ دیں)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جس شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے ذمہ روزے واجب ہوں تو اس کے بارہ میں بھی علماء کے اختلافی مسلک ہیں چنانچہ اکثر علماء کہ جن میں حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، اور حضرت امام شافعیؒ بھی شامل ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی طرف سے کوئی دوسرا روزہ نہ رکھے بلکہ اس کے ورثاء اس کے ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کو فدیہ دیں چنانچہ ان حضرات کی طرف سے اس حدیث کی یہی تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں "روزہ رکھنے" سے مراد "فدیہ دینا" ہے کیونکہ فدیہ دینا بھی بمنزلہ روزہ رکھنے کے ہے اور اگلی حدیث اس توجیہ و تاویل کی بنیاد ہے۔

میت کی طرف سے روزہ رکھنے سے اس لئے منع کیا جاتا ہے کہ ایک حدیث میں جو اس باب کے آخر میں آرہی ہے صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے حضرت امام احمدؒ حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سے اس کا وارث روزے رکھے۔

مذکورہ بالا مسئلہ کے سلسلہ میں حنفیہ کا یہ مسلک بھی ہے کہ اگر مرنے والے فدیہ کے بارہ میں وصیت کر جائے تو وارث پر میت کی طرف سے فدیہ مذکور ادا کرنا واجب ہے۔ جب کہ وہ فدیہ میت کی تہائی مال میں سے نکل سکتا ہو لہٰذا اگر فدیہ کی مقدار اس کے تہائی مال کے مقدار سے زائد ہوگی تو وارث پر فدیہ کی اس مقدار کی ادائیگی واجب نہیں ہوگی جو تہائی مال سے زائد ہو۔ ہاں اگر وارث اس زائد مقدار کو بھی ادا کر دے گا تو نہ صرف یہ کہ وارث کا یہ عمل جائز شمار ہوگا بلکہ میت پر اس کا احسان بھی ہوگا، لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ پورا مسئلہ اس صورت سے متعلق ہے جب کہ مرنے والے کے ذمہ وہ روزے ہوں جن کی قضا اس کے مرنے سے پہلے ممکن رہی ہو۔ مثلاً رمضان کا مہینہ گزر جانے کے بعد کسی ایسے مہینہ میں اس کا انتقال ہو جس میں وہ مرنے سے پہلے رمضان کے وہ روزے جو بیماری وغیرہ کی وجہ سے رکھنے سے رہ گئے تھے ان کی وہ قضا کر سکتا تھا، اور اگر رمضان کے کچھ روزے فوت ہو گئے ہوں (مثلاً رمضان ہی کے مہینہ میں اس کا انتقال ہوا ہو اور انتقال سے پہلے کچھ روزے رکھنے سے رہ گئے ہوں) کہ جن کی قضا ممکن نہیں تھی تو پھر نہ تو ان کا تدارک یعنی ان

روزوں کے بدلہ فدیہ دینا لازم ہے اور نہ مرنے والے پر فوت شدہ روزوں کا کوئی گناہ ہوگا چنانچہ تمام علماء کا یہی مسلک ہے البتہ طاؤس اور قتادہ کہتے ہیں کہ ان روزوں کا تدارک اور فدیہ بھی لازم ہوگا جن کی قضا کے ممکن ہونے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا ہوگا۔

امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ مرنے والا وصیت کرے یا نہ کرے۔ اس کے فوت شدہ روزوں کے بدلہ اس کے کل مال میں سے فدیہ ادا کرنا ضروری ہے، مذکورہ بالا مسئلہ میں حضرت امام احمد کا جو مسلک ہے وہ پہلی حدیث کی تشریح میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

⑤ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ مَاتَ وَعَلَیْہِ صِیَامُ شَھْرِ رَمَضَانَ فَلْیُطْعَمْ عَنْہُ مَکَانَ کُلِّ یَوْمٍ مِسْکِیْنٌ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ وَالصَّحِیْحُ اَنَّہٗ مَوْقُوْفٌ عَلَی ابْنِ عُمَرَ

"حضرت نافع (تابعی) حضرت ابن عمر سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے ذمہ رمضان کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے ہر روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا چاہئے۔ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت ابن عمر پر موقوف ہے یعنی یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے بلکہ حضرت ابن عمر کا قول ہے۔"

تشریح: ہر روزہ کے بدلہ مسکین کو کھلانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر روزہ کے بدلہ میں پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جو۔ یا اتنی ہی مقدار کی قیمت ادا کی جائے اور یہی مقدار نماز کے فدیہ کی بھی ہے کہ ہر نماز کے بدلہ اسی قدر فدیہ ادا کیا جائے۔ یہ حدیث جمہور علماء کی دلیل ہے جن کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی مرنے والے کے ذمہ رمضان کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے کوئی دوسرا شخص روزہ نہ رکھے بلکہ ورثاء اس کے بدلہ فدیہ ادا کریں، اس سے پہلے جو حدیث گزری ہے غالب امکان ہے کہ وہ منسوخ ہو، اور یہ حدیث ناسخ ہو، لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اس حدیث کو منسوخ نہ قرار دے کر اس کی جو تاویل کی جاتی ہے اس کی بنیاد یہی حدیث ہے۔

یہ روایت اگرچہ موقوف ہے جیسا کہ امام ترمذی نے فرمایا لیکن حکم میں مرفوع (ارشاد رسول) ہی کے ہے کیونکہ اس قسم کے تشریعی امور کوئی بھی صحابی اپنی عقل سے بیان نہیں کر سکتا لہٰذا حضرت ابن عمر نے یہ مضمون آنحضرت ﷺ سے ضرور سنا ہوگا جب ہی انہوں نے اسے نقل کیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

نہ کسی کی طرف سے نماز پڑھی جا سکتی ہے نہ روزہ رکھا جا سکتا ہے

⑥ عَنْ مَالِکٍ بَلَغَہٗ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ کَانَ یُسْئَلُ ھَلْ یَصُوْمُ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ اَوْیُصَلِّی اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ فَقَالَ لَا یَصُوْمُ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ وَلَا یُصَلِّیْ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ (رواہ فی الموطأ)

"حضرت امام مالک کے بارہ میں مروی ہے کہ ان تک یہ روایت پہنچی ہے کہ، حضرت ابن عمر سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے نماز پڑھ سکتا ہے یا کسی دوسرے کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے؟ حضرت ابن عمر اس کے جواب میں فرمایا کرتے تھے کہ نہ تو کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے نماز پڑھے اور نہ کسی دوسرے کی طرف سے روزے رکھے۔" (موطأ)

تشریح: حضرت امام مالک، ابوحنیفہ اور حضرت امام شافعی کا مسلک یہی ہے کہ نماز روزہ کسی کی طرف سے کرنا تاکہ وہ بری الذمہ ہو جائے درست نہیں ہے۔ ہاں حنفیہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی بھی عمل کا ثواب خواہ وہ نماز ہو یا روزہ وغیرہ کسی دوسرے کو بخش سکتا ہے۔

بَابُ صِيَامِ التَّطَوُّعِ

نفل روزہ کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نفل روزہ کے بارے میں آپؐ کا معمول

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ حَتّٰى نَقُوْلَ لَا يُفْطِرُ وَيُفْطِرُ حَتّٰى نَقُوْلَ لَا يَصُوْمُ وَمَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ اِلَّا رَمَضَانَ وَمَا رَأَيْتُهُ فِيْ شَهْرٍ اَكْثَرَ مِنْهُ صِيَامًا فِيْ شَعْبَانَ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَتْ كَانَ يَصُوْمُ شَعْبَانَ كُلَّهُ كَانَ يَصُوْمُ شَعْبَانَ اِلَّا قَلِيْلًا (متفق علیہ)

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب (نفل) روزے رکھنے شروع کرتے تو ہم کہتے کہ اب آپ روزے رکھنا ختم نہیں کریں گے اور جب روزے نہ رکھنے پر آتے تو ہم کہتے کہ اب آپ ﷺ کبھی روزہ نہیں رکھیں گے، میں نے آنحضرت ﷺ کو رمضان کے علاوہ اور کسی مہینہ میں پورے ماہ روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں نے آپ ﷺ کو شعبان کے علاوہ اور کسی مہینہ میں زیادہ روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا (یعنی آپ ﷺ شعبان کے مہینے میں جتنے زیادہ روزے رکھتے تھے اتنے اور کسی مہینہ میں علاوہ رمضان کے نہیں رکھتے تھے) ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، آنحضرت ﷺ شعبان کے پورے ماہ روزے رکھا کرتے تھے (یعنی) ماہ شعبان میں چند دن چھوڑ کر بقیہ دنوں میں روزے سے رہا کرتے تھے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نفل روزے نہیں رکھتے تھے بلکہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا معمول مبارک یہ تھا کہ کبھی تو مسلسل کافی عرصہ تک روزے رکھتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے روزوں کی اس کثرت اور تسلسل کو دیکھ کر لوگ گمان کرنے لگتے تھے کہ اب روزہ کا یہ سلسلہ شائد آپ ﷺ کبھی ختم نہ کریں، اور کبھی ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ مسلسل کافی عرصہ تک روزہ رکھتے ہی نہیں تھے یہاں تک کہ لوگ سوچتے کہ شائد اب آپ ﷺ نفل روزہ رکھیں گے ہی نہیں۔

دوسری روایت کے الفاظ کَانَ یَصُوْمُ الخ میں جملہ آخر یعنی دوسرے لفظ کان سے جملہ اول کی وضاحت مقصود ہے کہ شعبان کے پورے ماہ سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ شعبان کے اکثر دنوں میں روزہ رکھا کرتے تھے، بعض حضرات کے نزدیک مراد یہ ہے۔ کہ آپ ﷺ ایک سال تو شعبان کے پورے ماہ اور دوسرے سال شعبان کے اکثر دنوں میں روزہ رکھا کرتے تھے۔

② وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَقِيْقٍ قَالَ قُلْتُ لِعَائِشَةَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ شَهْرًا كُلَّهُ قَالَتْ مَا عَلِمْتُهُ صَامَ شَهْرًا كُلَّهُ اِلَّا رَمَضَانَ وَلَا اَفْطَرَهُ كُلَّهُ حَتّٰى يَصُوْمَ مِنْهُ حَتّٰى مَضٰى لِسَبِيْلِهِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن شقیقؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ پورے مہینہ روزہ رکھا کرتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتی کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی مہینہ میں پورے ماہ روزے رکھے ہوں علاوہ رمضان کے اور میں ایسا کوئی مہینہ بھی نہیں جانتی جس میں آپ ﷺ نے بالکل روزے نہ رکھے ہوں کیونکہ آپ ﷺ ہر مہینہ میں کچھ دن روزے سے رہا کرتے تھے (آپ ﷺ کا یہی معمول رہا) یہاں تک کہ آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔" (مسلم)

شعبان کے آخری دنوں کے روزے

(۳) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ سَأَلَهُ اَوْسَأَلَ رَجُلًا وَعِمْرَانُ يَسْمَعُ فَقَالَ يَا اَبَا فُلَانٍ اَمَا صُمْتَ مِنْ سَرَرِ شَعْبَانَ قَالَ لَا قَالَ فَاِذَا اَفْطَرْتَ فَصُمْ يَوْمَيْنِ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے عمران سے پوچھا یا کسی دوسرے شخص سے پوچھا اور عمران سنتے تھے کہ اے فلاں شخص کے باپ! کیا تم نے شعبان کے آخری دنوں کے روزے نہیں رکھے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں؟ آپ نے فرمایا جب تم رمضان کے روزوں سے فارغ ہو جاؤ تو دو دن روزے رکھ لینا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: جن صاحب سے آنحضرت ﷺ نے شعبان کے آخری دنوں کے بارہ میں پوچھا تھا خواہ وہ عمران رہے ہوں یا کوئی دوسرے شخص، انہوں نے بطریق نذر اپنے اوپر ہر مہینے کے آخری دو دنوں کے روزے واجب قرار دے رکھے تھے چنانچہ ایک مرتبہ شعبان کے آخری دو دنوں کے انہوں نے روزے نہیں رکھے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ جب رمضان کا مہینہ ختم ہو جائے تو شعبان کے آخری دو دنوں کے بدلے دو روزے رکھ لینا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر مہینہ کے آخری دو دن نفل روزے رکھا کرتے تھے ایک مرتبہ شعبان کے آخری دو دنوں میں اتفاق سے انہوں نے روزے نہیں رکھے تو آپ ﷺ نے ان سے بطور استحباب فرمایا کہ رمضان کے روزے ختم ہو جانے کے ان دو دنوں کے بدلے دو روزے رکھ لینا۔

محرم میں نفل روزہ کی فضیلت

(۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَهْرُ اللّٰهِ الْمُحَرَّمِ وَاَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ صَلَاةُ اللَّيْلِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا رمضان کے روزے کے بعد بہترین روزے اللہ کے مہینہ کہ وہ ماہ محرم ہے کے روزے ہیں اور فرض نماز کے بعد سب سے بہتر نماز رات کی نماز ہے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ماہ محرم میں نفل روزے رکھنے بڑی فضیلت اور سعادت کی بات ہے بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں "ماہ محرم" سے مراد "یوم عاشورہ" ہے جس کے روزے کی بہت زیادہ فضیلت منقول ہے اور اس کی تائید اس کے بعد آنے والے حدیث سے بھی ہوتی ہے بعض حفاظ حدیث فرماتے ہیں کہ رجب کے مہینہ میں روزے کے بارہ میں احادیث منقول ہیں ان میں سے اکثر موضوع (دوسروں کی اختراع) ہیں۔

اس حدیث میں ماہ محرم کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف کی گئی ہے چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ یہ نسبت تخصیص کی بناء پر نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ صرف محرم ہی اللہ کا مہینہ ہے بلکہ چونکہ تمام مہینے اللہ ہی کے ہیں اس لئے اس موقع پر بطور خاص اللہ کی طرف محرم کے مہینہ کی نسبت اس ماہ مبارک کے شرف وفضیلت کے اظہار کے طور پر ہے۔

حدیث کے دوسرے جزء سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ رات کی نماز (یعنی نماز تہجد) سُنّت مؤکدہ نمازوں سے افضل ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے اس لئے کہا جائے گا کہ یہاں پوری عبادت اس طرح ہے، فرض نماز اور اس کی سُنّت مؤکدہ نماز کے بعد سب سے بہتر نماز رات کی نماز ہے، یا پھر اس کی تاویل یہ کی جائے گی کہ اس اعتبار سے تو نماز تہجد، سُنّت مؤکدہ، نماز سے افضل ہے کہ تہجد کی نماز میں مشقت ومحنت زیادہ ہوتی ہے نیز یہ کہ نماز تہجد ریاء ونمائش سے پاک اور محفوظ ہوتی ہے اور سُنّت مؤکدہ نمازیں اس اعتبار سے افضل ہیں کہ ان کو پڑھنے کی

بہت زیادہ تاکید فرمائی گئی ہے نیز یہ کہ وہ فرض نماز کے تابع ہوتی ہیں۔ آخر میں اتنی بات بھی ملحوظ رہے کہ "وتر" بھی فرض نماز کے حکم میں داخل ہے۔

یوم عاشوراء کے روزے کی فضیلت

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَارَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَحَرّٰى صِيَامَ يَوْمٍ فَضَّلَهٗ عَلٰى غَيْرِهٖ اِلَّا هٰذَا الْيَوْمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَهٰذَا الشَّهْرَ يَعْنِى شَهْرَ رَمَضَانَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ رسول کریم ﷺ کسی دن روزہ کا ارادہ کرتے ہوں اور اس دن کو کسی دوسرے دن پر فضیلت دیتے ہوں۔ مگر اس دن یعنی یوم عاشوراء کو اور اس مہینہ یعنی ماہ رمضان (کو دوسرے دن اور دوسرے مہینہ پر فضیلت دیتے تھے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کسی دن روزہ کو دوسرے دنوں کے روزوں سے افضل قرار نہیں دیتے تھے البتہ یوم عاشوراء کے روزے کو دوسرے دنوں کے روزوں پر فضیلت دیتے تھے اسی طرح رمضان کے روزوں کو اور سب روزوں سے افضل قرار دیتے تھے۔

علماء لکھتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عباسؓ کا فہم وگمان ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے احوال و اقوال سے ایسا سمجھ لیا ہو ورنہ تو جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے یوم عرفہ اور اس دن کا روزہ یوم عاشوراء اور اس دن کے روزہ سے افضل ہے۔

یوم عاشوراء کے روزہ کا مسئلہ

⑥ وَعَنْهُ قَالَ حِيْنَ صَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَاَمَرَ بِصِيَامِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهٗ يَوْمٌ يُعَظِّمُهُ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَئِنْ بَقِيْتُ اِلٰى قَابِلٍ لَاَصُوْمَنَّ التَّاسِعَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت رسول کریم ﷺ نے عاشوراء کے دن روزہ رکھا اور صحابہؓ کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ تو وہ دن ہے جو یہود ونصاریٰ کے ہاں بڑا باعظمت ہے (اور چونکہ یہود ونصاریٰ کی مخالفت ہمارا شیوہ ہے۔ لہٰذا ہم روزہ رکھ کر اس دن کی عظمت کرنے میں یہود ونصاریٰ کی موافقت کیسے کریں) آپ ﷺ نے فرمایا "اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں تاریخ کو ضرور روزہ رکھوں گا"۔ (مسلمؒ)

تشریح: عاشوراء کے دن روزہ رکھنے کا سلسلہ کیسے شروع ہوا؟ اس کی وضاحت اسی باب کی تیسری فصل کی پہلی حدیث میں آئے گی جس کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے یہودیوں کو عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہوئے دیکھا آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اس دن کی کیا خصوصیت ہے کہ تم روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ بڑا عظیم دن ہے اسی دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات دی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا چونکہ موسیٰ علیہ السلام نے بطور شکر اس دن روزہ رکھا تھا اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری بہ نسبت ہم موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قریب ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد آپ ﷺ نے یوم عاشوراء کو روزہ رکھا اور صحابہؓ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔

یہ واقعہ ہجرت کے ابتدائی دنوں کا ہے گویا اس وقت آپ ﷺ نے صحابہؓ کو عاشوراء کے دن روزہ رکھنے کا جو حکم دیا وہ بطور وجوب تھا۔ یہاں جو صورت ذکر کی گئی ہے وہ آپ ﷺ کی دنیاوی زندگی کے آخری سال میں پیش آئی ہے اس موقع پر آپ ﷺ نے جو حکم دیا وہ بطور استحباب کے ہے کیونکہ اس بارہ میں وجوب کا حکم منسوخ ہو گیا تھا اور اس کی جگہ استحباب نے لے لی اس موقع پر صحابہؓ نے مذکورہ بالا عرضداشت پیش کی جس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال اس دنیا میں رہا تو نویں تاریخ کو روزہ رکھوں گا۔

اب اس میں احتمال ہے کہ یا تو آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ محرم کی دسویں تاریخ (عاشوراء) کی بجائے صرف نویں تاریخ کو روزہ رکھوں گا۔ یا یہ کہ دسویں اور نویں تاریخ کو روزہ رکھوں گا اور پہلا احتمال ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس ترمیم سے مقصد یہ تھا کہ یہود ونصاریٰ کی مخالفت ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، آپ ﷺ آئندہ سال تک اس دنیا میں تشریف فرما نہیں رہے بلکہ اسی سال ربیع الاول کے مہینہ میں واصل بحق ہو گئے اس طرح اگر آپ ﷺ نے نویں کا روزہ نہیں رکھا مگر علماء لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس عزم و ارادہ کی بناء پر اُمت کے لئے محرم کی نویں تاریخ کا روزہ رکھنا سُنّت قرار پا گیا ہے۔

محقق علام ابن ہمام فرماتے ہیں کہ عاشورے کے دن روزہ رکھنا مستحب ہے مگر اس کے ساتھ ہی عاشورہ سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھنا مستحب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف عاشورہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ اس سے یہود کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے۔

یوم عرفہ کا روزہ

⑦ وَعَنْ اُمِّ الْفَضْلِ بِنْتِ الْحَارِثِ اَنَّ نَاسًا تَمَارَوْا عِنْدَهَا يَوْمَ عَرَفَةَ فِيْ صِيَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ بَعْضُهُمْ هُوَ صَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَيْسَ بِصَائِمٍ فَاَرْسَلْتُ اِلَيْهِ بِقَدَحِ لَبَنٍ وَهُوَ وَاقِفٌ عَلٰى بَعِيْرِهٖ بِعَرَفَةَ فَشَرِبَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ فضل بنت حارث۔ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) عرفہ کے روز میرے سامنے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے روزہ کے بارہ میں بحث کرنے لگے بعض لوگ تو کہہ رہے تھے کہ آپ ﷺ (آج) روزہ سے ہیں۔ اور بعض لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ آپ ﷺ روزہ سے نہیں ہیں (یہ دیکھ کر) میں نے دودھ کا ایک پیالہ آپ ﷺ کے پاس بھیجا آپ اس وقت میدان عرفات میں اپنے اونٹ پر کھڑے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے وہ دودھ (لے کر) پی لیا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حضرت اُمّ فضل حضرت عباس کی زوجہ محترمہ اور نبی کریم ﷺ کی چچی تھیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عرفہ کے دن روزہ رکھنا حج کرنے والے کے لئے تو مسنون نہیں ہے البتہ دوسرے لوگوں کے لئے مسنون ہے۔

ذی الحجہ کے عشر اول میں روزہ رکھنے کا مسئلہ

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَارَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَائِمًا فِي الْعَشْرِ قَطُّ (رواہ مسلم)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو عشرہ میں روزہ رکھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔" (مسلم)

تشریح: "عشرہ" سے ذی الحجہ کا عشرہ اول (یعنی یکم تاریخ سے دس تاریخ تک کا عرصہ) مراد ہے اس حدیث سے تو بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عشرہ میں کبھی روزہ نہیں رکھا ہے، جب کہ ایک روایت میں منقول ہے کہ "اس عشرہ میں ہر دن (علاوہ دسویں تاریخ کے یعنی پہلی تاریخ سے نویں تاریخ تک) کے روزے کا ثواب ایک سال کے روزہ کے ثواب کے برابر ہے اور اس عشرہ کی ہر رات میں عبادت خداوندی کے لئے جاگنا شب قدر میں عبادت کے لئے جاگنے کے ثواب کے برابر ہے لہٰذا حضرت عائشہ کی مذکورہ بالا روایت کی مراد کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ یہاں حضرت عائشہ نے اپنے علم کی نفی کی ہے کہ میں نے آپ کو روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ کا نہ دیکھنا اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ ﷺ نے روزہ نہیں رکھا، ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عشرہ میں روزہ رکھا ہو اور حضرت عائشہ کو اس کا علم نہ ہوا ہو، یا پھر آخری درجہ میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عشرہ کے روزے کا مذکورہ بالا ثواب تو بیان فرمایا مگر خود آپ ﷺ کو اس عشرہ میں روزہ رکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔

نفل روزے

(۹) وَعَنْ اَبِی قَتَادَةَ اَنَّ رَجُلًا اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ کَیْفَ تَصُوْمُ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهٖ فَلَمَّا رَأٰی عُمَرُ غَضَبَهٗ قَالَ رَضِیْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُوْلِهٖ فَجَعَلَ عُمَرُ یُرَدِّدُ هٰذَا الْکَلَامَ حَتّٰی سَکَنَ غَضَبُهٗ فَقَالَ عُمَرُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کَیْفَ مَنْ یَصُوْمُ الدَّهْرَ کُلَّهٗ قَالَ لَا صَامَ وَلَا اَفْطَرَ اَوْقَالَ لَمْ یَصُمْ وَلَمْ یُفْطِرْ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَصُوْمُ یَوْمَیْنِ وَیُفْطِرُ یَوْمًا قَالَ وَیُطِیْقُ ذٰلِكَ اَحَدٌ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَصُوْمُ یَوْمًا وَیُفْطِرُ یَوْمًا قَالَ ذٰلِكَ صَوْمُ دَاوٗدَ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَصُوْمُ یَوْمًا وَیُفْطِرُ یَوْمَیْنِ قَالَ وَدِدْتُ اَنِّیْ طُوِّقْتُ ذٰلِكَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ مِنْ کُلِّ شَهْرٍ وَرَمَضَانُ اِلٰی رَمَضَانَ فَهٰذَا صِیَامُ الدَّهْرِ کُلِّهٖ۔ صِیَامُ یَوْمِ عَرَفَةَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰهِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِیْ قَبْلَهٗ وَالسَّنَةَ الَّتِیْ بَعْدَهٗ وَصِیَامُ یَوْمِ عَاشُوْرَاءَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰهِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِیْ قَبْلَهٗ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھنے لگا کہ آپ ﷺ روزہ کس طرح رکھتے ہیں؟ یہ (سن کر) رسول کریم ﷺ (کے چہرۂ مبارک پر) غصہ (کے آثار ظاہر) ہوگئے، حضرت عمرؓ نے (جو اس وقت مجلس میں حاضر تھے) جب آپ ﷺ کے غصہ کی یہ کیفیت دیکھی تو فوراً بول اٹھے کہ ہم راضی ہوئے اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد (ﷺ) کے نبی ہونے پر اور ہم اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے غضب سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ یہ جملے بار بار کہتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کا غصہ ٹھنڈا ہوا اس کے بعد حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ "یارسول اللہ! اس شخص کے بارہ میں کیا حکم ہے جو ہمیشہ روزہ رکھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا" اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ وہ بغیر روزہ رہا۔ یا فرمایا۔ نہ روزہ رکھا اور نہ بغیر روزہ رہا۔ (اس موقع پر راوی کو شک ہے کہ آپ ﷺ نے لاصام ولا افطر فرمایا یا لم یصم ولم یفطر) پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس شخص کے بارہ میں کیا حکم ہے جو دو دن تو روزہ سے رہے اور ایک دن بغیر روزہ رہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "کوئی اس کی طاقت رکھتا ہے؟" پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ "اس شخص کے بارہ میں کیا حکم ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن روزہ نہ رکھے؟ فرمایا یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے اس کے بعد حضرت عمرؓ نے پوچھا، کہ اچھا اس شخص کے بارہ میں کیا حکم ہے جو ایک دن تو روزہ رکھے اور دو دن بغیر روزہ رہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "میں اسے پسند کرتا ہوں کہ مجھے اتنی طاقت میسر آجائے" اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک ہر مہینہ کے تین روزے ہمیشہ کے روزے کے برابر ہیں (یعنی ان کا ثواب ہمیشہ روزہ رکھنے کے ثواب کے برابر ہوتا ہے) اور (غیر حج کی حالت میں) عرفہ کا روزہ تو مجھے خدا سے امید ہے کہ وہ (اس روزہ کی وجہ سے) اس سے پہلے سال کے گناہ دور کردے گا اور اس کے بعد والے سال کے گناہ بھی دور کردے گا (یعنی یا تو اللہ تعالیٰ آئندہ سال گناہوں سے محفوظ رکھے گا یا یہ کہ اگر گناہ سرزد ہوں گے تو معاف کردیئے جائیں گے، اور یوم عاشوراء کے روزے کے بارہ میں بھی مجھے خدا سے امید ہے کہ وہ (اس روزہ کی بناء پر) ایک سال پہلے کے گناہ دور کردے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: سائل کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے اپنے بارہ میں سوال کرتا کہ میں نفل روزہ کیونکر اور کب کب رکھوں؟ تاکہ آپ ﷺ اس کے احوال و کوائف کے مطابق اسے کوئی جواب دیتے مگر وہ اپنے بارہ میں پوچھنے کے بجائے نبی کریم ﷺ ہی کے بارہ میں پوچھ بیٹھا جو ظاہر ہے کہ آداب نبوت کے نہ صرف خلاف ہی تھا بلکہ یہ ایک حد تک گستاخی بھی تھی اس لئے آپ ﷺ پر غصہ کے آثار ظاہر ہوگئے پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ کے احوال و کوائف بالکل دوسری نوعیت کے تھے، آپ ﷺ کے افعال اور آپ ﷺ کی عبادات میں کثرت و قلت کے بھی اسرار و مصالح تھے اور ظاہر ہے کہ اسرار و مصالح ہر شخص کے افعال و عبادات میں نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ

آنحضرت ﷺ بہت زیادہ روزے نہیں رکھتے تھے کیونکہ آپ ﷺ مسلمانوں کے مسائل و مصالح، ازواج مطہرات کے حقوق کی ادائیگی اور باہر سے آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات اور ان کی دیکھ بھال میں مشغول رہا کرتے تھے، ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ ﷺ نفل روزہ کثرت سے رکھتے۔

من یصوم الدھر کلہ (جو شخص ہمیشہ روزہ رکھے اس کے بارہ میں کیا حکم ہے؟) سائل در حقیقت یہی آنحضرت ﷺ سے پوچھنا چاہتا تھا مگر چونکہ اس نے اسلوب غلط اختیار کیا اس لئے اسی سوال کو حضرت عمرؓ نے اس انداز سے نہایت ہی ادب و عاجزی کے ساتھ پوچھا کہ جو شخص ہمیشہ نفل روزہ رکھتا ہے اس کے بارہ میں شریعت کیا کہتی ہے؟ آیا وہ شخص اپنے اس عمل کی وجہ سے شریعت کی نظر میں پسندیدہ ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے جو جملہ لا صام ولا افطر ارشاد فرمایا اس کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ یہ جملہ یا تو ایسے شخص کے لئے بطور تنبیہ وعابد ہے یا پھر یہ کہ اس شخص کے حال کی خبر ہے کہ نہ تو اس شخص نے روزہ رکھا کیونکہ اس طرح روزہ رکھنا شریعت کے حکم کے مطابق نہیں ہے اور نہ ہی وہ بغیر روزہ رہا کیونکہ کھانا پینا اور تمام چیزیں اس نے ترک کئے رکھیں۔

حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد اس شخص کے حق میں ہے جو ممنوع روزے بھی رکھے یعنی تمام سال روزے رکھے حتی کی عیدین اور ایام تشریق میں بھی روزے رکھنا چھوڑے ہاں اگر کوئی شخص ان ممنوع ایام میں روزے نہ رکھے تو یہ ارشاد اس کے حق میں نہیں ہوگا اور وہ ان ایام کے علاوہ بقیہ تمام دنوں میں روزے رکھے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اور حضرت حمزہ بن عمرو اسلمیؓ ان ممنوع ایام کے علاوہ بقیہ تمام دنوں میں روزے رکھتے تھے اور آنحضرت ﷺ انہیں منع نہیں فرماتے تھے، یا پھر یہ کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کی اس ممانعت کی علت یہ ہے کہ اس طرح روزے رکھنا، جسم انسانی کو ضعیف و ناتواں کر دیتا ہے جس کی بناء پر ایسا شخص جہاد اور دوسرے حقوق کی ادائیگی سے عاجز ہو جاتا ہے لہٰذا ہمیشہ روزہ رکھنا اگر کسی شخص کو ضعف و ناتوانی میں مبتلا نہ کرے تو اس کے لئے ہمیشہ روزے رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ حنفی محققؒ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ہمیشہ روزہ رکھنا مکروہ (تنزیہی) ہے کیونکہ اس سے ضعف و ناتوانی لاحق ہو جاتی ہے اسی طرح فتاویٰ عالمگیری اور در مختار میں بھی یہی لکھا ہے کہ صوم دہر (ہمیشہ روزہ رکھنا) مکروہ ہے۔

ویطیق ذٰلِکَ احد (کوئی اس کی طاقت رکھتا ہے؟) کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دو دن روزہ سے اور ایک دن بغیر روزہ رہنے پر قادر ہو اور اس میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اس طرح روزہ رکھ سکے تو اس کے لئے کوئی مضائقہ نہیں، یا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح روزہ رکھنا افضل ہے۔

ذالک صوم داؤد (یہ حضرت داؤد کا روزہ ہے) کا مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھنے کا یہ طریقہ نہایت معتدل ہے اور اس میں عبادت و عادت کی رعایت بھی ہے۔ اسلام چونکہ تمام مذاہب آسمانی کا ایک حسین سنگم ہے اس لئے مذہب نے ہر معاملہ میں توازن اور اعتدال کی راہ دکھائی ہے، اس کے نظریات و اعمال میں نہ افراط ہے نہ تفریط، چنانچہ اس لئے بعض مفکرین اسلام نے یہ کلیہ بیان کیا ہے کہ "حصول علم میں اس انداز سے سعی و کوشش کرنی چاہئے کہ اس کی وجہ سے عمل کی راہیں مسدود نہ ہو جائیں اور اعمال میں بھی اس طریقہ سے مشغولیت نہ ہو کہ اس کی وجہ سے علم کی روشنی حاصل نہ ہو سکے حاصل اس کلیہ کا یہ ہے کہ حصول علم کی بہت زیادہ سعی و کوشش عمل سے نہ روک دے اور عمل میں بے پناہ مشغولیت علم سے بے بہرہ نہ کر دے بلکہ اعتدال اور توازن کے ساتھ دونوں راہوں کو اپنایا جائے اسی لئے کہا گیا ہے کہ خیر الامور اَوْسَطُھَا وَشَرُّھَا تَفرِیْطُھَا و افراطھا یعنی کسی چیز کی بھلائی و بہتری اس کی درمیانی راہ میں پوشیدہ ہے اور اس کی برائی حد سے زیادہ زیادتی اور حد سے زیادہ کمی کو اختیار کرنے میں ہے نیز اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ:

افضل الصیام صوم داؤد علی نبینا و علیہ السلام

"یعنی (نفل) روزوں میں سب سے بہتر روزہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہے۔"

وَدِدْتُ اِنِّی طُوِّقْتُ (میں اسے پسند کرتا ہوں کہ مجھے اتنی طاقت میسر آجائے) یعنی یہ میری عین پسند ہے کہ حق تعالیٰ مجھے اتنی طاقت اور قوت عطا فرمائے کہ ہر چوتھے دن روزہ رکھوں یعنی ایک دن تو روزہ رکھوں اور دو دن بغیر روزہ رہوں۔ اور اس سلسلہ میں دوسرے حقوق اور مسلمانوں کے مصالح رکاوٹ نہ ڈالیں۔ گویا اس ارشاد سے اس طرف اشارہ ہے کہ میں اس کی طاقت نہیں رکھتا الا یہ کہ حق تعالیٰ کی طرف سے میرے اندر یہ طاقت وقوت ودیعت فرمادی جائے۔ حاصل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے نفل روزہ رکھنے کے سلسلہ میں اس صورت کو بھی پسند فرمایا اگرچہ آپ ﷺ نے بسبب عدم طاقت اس پر عمل نہیں فرمایا۔

"ہر مہینہ کے تین روزے" سے مراد ایام بیض یعنی ہر مہینہ کی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں تاریخ کے روزے ہیں، مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہر مہینہ کی کسی بھی تین تاریخوں کے روزے مذکورہ ثواب کے حامل ہیں اور یہی قول صحیح بھی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت نے جو آگے آرہی ہے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔

پیر کے دن روزہ کی فضیلت

⑩ وَعَنْ اَبِی قَتَادَةَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمِ الْاِثْنَيْنِ فَقَالَ فِيْهِ وُلِدْتُّ وَفِيْهِ اُنْزِلَ عَلَیَّ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے پیر (دوشنبہ) کے دن روزہ رکھنے کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس دن میری پیدائش ہوئی اور اسی دن مجھ پر کتاب (قرآن) کا نزول شروع ہوا۔" (مسلمؒ)

تشریح: سوال کا مقصد یا تو پیر کے روز آنحضرت ﷺ کے روزہ رکھنے کا سبب معلوم کرنا تھا یا یہ مقصد تھا کہ پیر کے روز روزہ رکھنا مستحب کیوں ہے؟ بہر صورت پیر کے روزہ رکھنے اور اس کی فضیلت کا سبب یہ ہے کہ چونکہ اسی دن رسول کریم ﷺ کی پیدائش ہوئی اور اسی دن دین فطرت دنیا میں نازل ہونا شروع ہوا اور اس طرح دنیا والوں کو ایک عظیم نعمت حاصل ہوئی اس لئے اس کے شکرانہ کے طور پر پیر کے دن روزہ رکھا جاتا ہے۔

ہر مہینہ میں تین دن نفل روزے

⑪ وَعَنْ مُعَاذَةَ الْعَدَوِيَّةِ اَنَّهَا سَاَلَتْ عَائِشَةَ اَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ قَالَتْ نَعَمْ فَقُلْتُ لَهَا مِنْ اَیِّ اَيَّامِ الشَّهْرِ كَانَ يَصُوْمُ قَالَتْ لَمْ يَكُنْ يُبَالِیْ مِنْ اَیِّ اَيَّامِ الشَّهْرِ يَصُوْمُ (رواه مسلم)

"اور حضرت معاذہ عدویہ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کیا رسول کریم ﷺ ہر مہینہ میں تین دن (نفل روزے) رکھا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ "ہاں" (معاذہ کہتی ہیں کہ) پھر میں نے ان سے پوچھا کہ "آپ ﷺ مہینہ کے کون سے دنوں میں روزہ رکھتے تھے؟" انہوں نے فرمایا آپ ﷺ مہینہ کے کسی خاص دن روزہ رکھنے کا اہتمام نہیں کرتے تھے (یعنی جس دن چاہتے روزہ رکھ لیتے کوئی خاص دن متعین نہیں تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مہینہ میں کسی بھی تین دن روزے رکھ لینے کافی ہیں جس دن چاہے روزہ رکھ لیا جائے، تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں تاریخ کی قید نہیں ہے تاہم اکثر احادیث اور آثار میں چونکہ یہ تین تاریخیں مذکور ہیں اس لئے ان تین تاریخوں میں روزہ رکھنا افضل ہوگا ہر مہینے میں تین روزے رکھنے کی اور بھی کئی صورتیں منقول ہیں جو آگے مذکور ہوں گی۔

شش عید کے روزے

⑫ وَعَنْ اَبِی اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّهٗ حَدَّثَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهٗ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے (اپنے راوی سے کہ جن کا نام عمرو بن ثابت ہے) یہ حدیث بیان کی کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور پھر اس کے بعد شوال کے مہینہ میں چھ روزے (بھی) رکھے تو وہ ہمیشہ روزہ رکھنے والے کے مانند ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا رمضان کے بعد شوال کے مہینہ میں چھ دن روزے رکھنے کی جنہیں شش عید کے روزے بھی کہا جاتا ہے بڑے ثواب اور فضیلت کی بات ہے ان روزوں کے سلسلہ میں حضرت امام شافعی کے ہاں اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ رمضان کے فوراً بعد یعنی دوسری تاریخ سے ساتویں تاریخ تک مسلسل یہ روزے رکھے جائیں جب کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک متفرق طور پر یہ روزے رکھنے افضل ہیں کہ پورے مہینہ میں جب بھی چاہے چھ روزے رکھ لے۔

ممنوع روزے

⑬ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمِ یَوْمِ الْفِطْرِ وَالنَّحْرِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فطر (عید) اور نحر (بقر عید) کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔"
(بخاری و مسلم)

تشریح: "نحر" سے جنس یعنی نحر کے سب دن مراد ہیں اور یہاں یہ لفظ تغلیباً ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ایام تشریق میں بھی روزے رکھنے حرام ہیں اس مسئلہ کی وضاحت یہ ہے کہ یوں تو نحر کے تین دن ہیں اور تشریق کے بھی تین دن ہیں مگر سب کا مجموعہ چار دن ہوتا ہے اسی طرح کہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ صرف نحر کا دن ہے اور اس کے بعد دو دن یعنی گیارہویں اور بارہویں تاریخ ایام نحر بھی ہیں اور ایام تشریق بھی اور ان دونوں تاریخوں کے بعد ایک دن یعنی تیرہویں تاریخ صرف یوم تشریق ہے۔ حاصل یہ کہ پانچ دن ایسے ہیں جن میں روزے رکھنے حرام ہیں ایک تو عید کا دن، دوسرا بقر عید کا دن اور تین دن بقر عید کے بعد یعنی گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں تاریخ۔

⑭ وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا صَوْمَ فِیْ یَوْمَیْنِ الْفِطْرِ وَالْاَضْحٰی (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا دو دن (یعنی دو موقعے) ایسے ہیں جن میں روزہ (جائز) نہیں ہے۔ عید کے دن اور بقر عید کے (چار) دن (یعنی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ سے تیرہویں تاریخ تک)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

ایام تشریق

⑮ وَعَنْ نُبَیْشَةَ الْھُذَلِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیَّامُ التَّشْرِیْقِ اَیَّامُ اَکْلٍ وَشُرْبٍ وَذِکْرِ اللّٰہِ۔
(رواہ مسلم)

"اور حضرت نبیشہ ہذلی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایام تشریق کھانے پینے اور اللہ کو یاد کرنے کے دن ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: ایام تشریق تین دن ہیں ذی الحجہ کی گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں تاریخ، یہاں ایام تشریق کا لفظ تغلیباً ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یوم نحر (بقر عید کا دن) بھی کھانے پینے کا دن ہے بلکہ اصل تو وہی دن ہے اور یہ تین دن اس کے تابع ہیں۔ لہٰذا ان چار دنوں میں روزے رکھنے حرام ہیں۔

حضرت ابن ہمام فرماتے ہیں کہ نوروز اور مہرجان کو روزہ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ ان دنوں میں روزہ رکھنے سے ان ایام کی تعظیم لازم آئے گی جو شریعت اسلامی میں ممنوع ہے ہاں اگر کوئی شخص اپنے معمول کے مطابق پہلے سے روزہ رکھتا چلا آرہا ہو اور اتفاق سے یہ ایام بھی اس کے معمول کے درمیان آجائیں تو پھر ان دنوں کے روزے ممنوع نہیں ہوں گے۔

وَذِکْرِ اللّٰہِ اس جملہ سے یہ انتباہ مقصود ہے کہ یہ ایام اگرچہ خوشی و مسرت اور کھانے پینے کے دن ہیں مگر ان امور میں مشغولیت کے باوجود خدا کی یاد اور عبادت سے غافل نہ ہونا چاہئے گویا اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ:

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ۔ — "اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کو گنتی کے چند دنوں میں۔"

اور ذکر اللہ سے مراد ایام تشریق میں نمازوں کے بعد پڑھی جانے والی تکبیرات، قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت تکبیرات اور حج کرنے والوں کے لئے رمی جمار وغیرہ ہیں۔

جمعہ کے دن روزہ

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَصُوْمُ اَحَدُکُمْ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ اِلَّا اَنْ یَّصُوْمَ قَبْلَہٗ اَوْ یَصُوْمَ بَعْدَہٗ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے روز روزہ نہ رکھے، ہاں اس طرح رکھ سکتا ہے کہ اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ صرف جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے بلکہ جمعہ کے روزہ کے ساتھ پنجشنبہ یا ہفتہ کے دن بھی روزہ رکھ لے اور اگر دونوں دنوں (یعنی پنجشنبہ و ہفتہ کے دن) اور اس کے ساتھ جمعہ کے دن (گویا تینوں دن) روزہ رکھے تو بہتر ہے حدیث میں صرف جمعہ کے روز روزہ رکھنے کی ممانعت ذکر فرمائی گئی ہے وہ نہی تنزیہی کے طور پر ہے علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک صرف جمعہ کے روزہ رکھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(۱۷) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَخْتَصُّوْا لَیْلَۃَ الْجُمُعَۃِ بِقِیَامٍ مِّنْ بَیْنِ اللَّیَالِیْ وَلَا تَخْتَصُّوْا یَوْمَ الْجُمُعَۃِ بِصِیَامٍ مِّنْ بَیْنِ الْاَیَّامِ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ فِیْ صَوْمٍ یَّصُوْمُہٗ اَحَدُکُمْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تمام دنوں میں صرف جمعہ کی رات کو عبادت خداوندی کے لئے مخصوص نہ کرو اسی طرح تمام دنوں میں صرف جمعہ کے دن کو روزہ رکھنے کے لئے مخصوص نہ کرو ہاں اگر تم میں سے کسی کے روزہ کے درمیان کہ جو وہ پہلے سے رکھتا چلا آ رہا ہے جمعہ پڑ جائے (تو پھر صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔" (مسلم)

تشریح: یہود نے ہفتہ کے دن کو عبادت کے لئے مخصوص کر لیا اور وہ صرف اسی دن کی تعظیم کرتے ہیں اور اسی طرح عیسائیوں نے اتوار کے دن کو عبادت کے لئے مخصوص کر لیا اور وہ صرف اسی دن کی بے انتہا تعظیم کرتے ہیں اور اسی دن مشغول رہتے ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو اس غلط طریقہ سے روک دیا کہ تم بھی ان دونوں فرقوں کی طرح صرف جمعہ کی شب اور جمعہ کے دن کی جو اہمیت و فضیلت بیان کی ہے وہ تو برحق ہے اور اس دن کی اتنی ہی اہمیت و عظمت پیش نظر رہنی چاہئے اس میں کسی فرقہ کی مشابہت ہی کیوں نہ ہو مگر اپنی طرف سے اس کی تعظیم و تخصیص میں اضافہ نہ کرو، یا پھر اس کی مخالفت کا مقصد یہ ہے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ تمام اوقات میں عبادات و طاعات میں مشغول رہے، اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار رہے کسی خاص وقت کو عبادت کے لئے مخصوص کر لینا اور بقیہ اوقات میں معطل پڑے رہنا قطعاً کارآمد نہیں ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ الا ان یکون فی صوم الخ کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص کا معمول تھا کہ وہ ہر دسویں یا گیارہویں دن روزہ رکھتا تھا اور اتفاق سے اسی دن جمعہ آ پڑا، یا کسی شخص نے نذر مانی کہ میں فلاں تاریخ کو روزہ رکھوں گا اور وہ تاریخ جمعہ کے پڑ گئی تو ان اعذار کی وجہ سے صرف جمعہ کے روز روزہ رکھنا ممنوع نہیں ہو گا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ نماز (تہجد) کے لئے جمعہ کی شب کو مخصوص کر دینے کی اس حدیث میں صراحت کے ساتھ ممانعت ہے

چنانچہ اس مسئلہ پر تمام علماء کا اتفاق ہے، نیز علماء نے "صلوٰۃ الرغائب" کو بدعت اور مکروہ قرار دینے کے سلسلے میں اس حدیث کو بطور دلیل اختیار کیا ہے "صلوۃ الرغائب" وہ نماز کہلاتی تھی جو بطور خاص ماہ رجب کے پہلے جمعہ کی شب میں پڑھی جاتی تھی چنانچہ علماء نے اس نماز کی بدعت و برائی اور اس نماز کو اختراع کرنے والے کی گمراہی وضلالت کی وضاحت کے لئے مستقل طور پر بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

مولانا اسحٰقؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس حدیث کے سلسلے میں شارحین نے جو مذکورہ بالا توجیہات بیان کی ہیں تو یہ ان حضرات کے مسلک کے مطابق ہیں جن کے نزدیک صرف جمعہ کا روزہ رکھنا مکروہ ہے مگر حنفی مسلک کے مطابق اس حدیث کی ان توجیہات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حنفیہ کے ہاں صرف جمعہ کے روزہ رکھنا مکروہ نہیں ہے چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ صرف جمعہ کے روز رکھنا جائز ہے بلکہ درمختار میں تو اسے مستحب بیان کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں حنفیہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے اور دوسری فصل میں آئے گی، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ان تمام احادیث کے لئے ناسخ ہو جن سے صرف جمعہ کے روز روزہ رکھنا ممنوع معلوم ہوتا ہے۔

خدا کی راہ میں ایک دن نفل روزہ رکھنے کا اجر

⑱ وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ یَوْمًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بَعَّدَ اللّٰہُ وَجْھَہٗ عَنِ النَّارِ سَبْعِیْنَ خَرِیْفًا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے خدا کی راہ میں (یعنی جہاد کے وقت یا یہ کہ خالص اللہ رب العزت کے لئے) ایک دن روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس کا منہ یعنی اس کی ذات کو (دوزخ کی) آگ سے ستر برس کی مسافت کے بقدر دور کر دیگا۔" (بخاری و مسلم)

اعمال میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم

⑲ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عَبْدَاللّٰہِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّکَ تَصُوْمُ النَّھَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ فَقُلْتُ بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَیْكَ حَقًّا لَا صَامَ مَنْ صَامَ الدَّھْرَ صَوْمُ ثَلَاثَۃِ اَیَّامٍ مِنْ کُلِّ شَھْرٍ صَوْمُ الدَّھْرِ کُلِّہٖ صُمْ کُلَّ شَھْرٍ ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ وَاِقْرَاءِ الْقُرْاٰنَ فِیْ کُلِّ شَھْرٍ قُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَکْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ صُمْ اَفْضَلَ الصَّوْمِ صَوْمَ دَاوٗدَ صِیَامُ یَوْمٍ وَاِفْطَارُ یَوْمٍ وَاقْرَاْ فِیْ کُلِّ سَبْعِ لَیَالٍ مَرَّۃً وَلَا تَزِدْ عَلٰی ذٰلِكَ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ عبداللہ کیا مجھے یہ اطلاع نہیں ملی ہے (یعنی مجھے یہ معلوم ہوا ہے) کہ تم (روزانہ) دن میں تو روزے رکھتے ہو اور (ہر رات میں) پوری شب اللہ کی عبادت اور ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے ہو؟" میں نے عرض کیا کہ جی ہاں یا رسول اللہ! ایسا ہی ہے" آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو (بلکہ) روزہ بھی رکھو اور بغیر روزہ بھی رہو، رات میں عبادت خداوندی بھی کرو اور سویا بھی کرو کیونکہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے (لہٰذا اپنے بدن کو زیادہ مشقت اور ریاضت میں مبتلا نہ کرو تا کہ بیماری یا ہلاکت میں نہ پڑ جاؤ) تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے (اس لئے رات میں سویا بھی کرو تا کہ آنکھیں آرام و سکون پائیں) تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے (اس لئے اس کے ساتھ شب باشی اور صحبت و مباشرت کرو) اور تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے، (لہٰذا ان کے ساتھ کلام و گفتگو کرو، ان کی خاطر و مہمانداری کرو اور ان کے ساتھ کھانے پینے میں شریک رہو) جس شخص نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے (گویا) روزہ نہیں رکھا (البتہ) ہر مہینہ میں تین دن کے روزے ہمیشہ کے روزہ کے برابر ہیں لہٰذا ہر مہینہ میں تین دن (یعنی ایام بیض کے

یا مطلقاً کسی بھی تین دن کے) روزے رکھ لیا کرو اور اسی طرح ہر مہینہ میں قرآن پڑھا کرو (یعنی ایک مہینہ میں ایک قرآن ختم کر لیا کرو) میں نے عرض کیا کہ "میں تو اس سے بھی زیادہ کی ہمت رکھتا ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا (تو پھر) بہترین روزہ جو روزۂ داؤد ہے رکھ لیا کرو (جس کا طریقہ یہ ہے کہ) ایک دن تو روزہ رکھو اور ایک دن افطار کرو اور سات راتوں میں ایک قرآن ختم کرو اور اس میں اضافہ نہ کرو (یعنی نفل روزے رکھنے اور قرآن شریف ختم کرنے کی مذکورہ بالا تعداد و مقدار میں زیادتی نہ کرو)۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: شریعت نے اعمال میں میانہ روی اور اعتدال اختیار کرنے پر بڑا زور دیا ہے چنانچہ نفل عبادات اور اعمال میں نہ اتنی کمی اور کوتاہی کرنی چاہئے جس سے روحانی بالیدگی اور ترقی میں اضمحلال اور درجات عالیہ کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہو جائے اور نہ اتنی زیادتی کرنی چاہئے جس سے جسمانی قوت و طاقت بالکل ہی پژمردہ ہو جائے اور دنیاوی مباح امور میں تعطل رونما ہو جائے اسی لئے آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ ؓ کو منع فرمایا کہ نہ تو اتنے زیادہ روزے رکھو اور نہ اتنی زیادہ شب بیداری کرو تاکہ اس کی وجہ سے دوسری ضروری اور فرض عبادتوں میں نہ خلل واقع ہو اور نہ دوسرے انسانی و معاشرتی حقوق پس پشت پڑ جائیں۔ ہر مہینہ میں تین روزے رکھنے سے ہمیشہ کے روزے کا ثواب اس لئے لکھا جاتا ہے کہ ہر نیکی کی دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں جیسا کہ کئی موقعوں پر بتایا جا چکا ہے لہٰذا اس حساب سے تین روزے باعتبار ثواب اور اجزاء کے تیس روزے کے برابر ہوئے اور مہینہ میں تین روزے رکھنے والا گویا پورے مہینہ روزہ سے رہا!۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

پیر اور جمعرات کے روزے

(۲۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسَ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ پیر اور جمعرات کے دن نفل روزے رکھا کرتے تھے۔" (ترمذی، نسائی)

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُعْرَضُ الْاَعْمَالُ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسِ فَاُحِبُّ اَنْ يُعْرَضَ عَمَلِیْ وَاَنَا صَائِمٌ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ پیر اور جمعرات کے دن (اللہ رب العزت کی بارگاہ میں) عمل پیش کئے جاتے ہیں اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ میرے عمل پیش کئے جائیں تو میں روزہ سے ہوں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: بندوں کے جو بھی اعمال ہوتے ہیں ملائکہ ہر صبح و شام اوپر لے جاتے ہیں اور پھر وہ بارگاہ رب العزت میں ان دو دنوں میں پیش ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس وضاحت کے پیش نظر اس حدیث اور اس حدیث میں کوئی تعارض باقی نہیں رہا جس سے ثابت ہوا تھا کہ بندوں کے صبح کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے اور رات کے اعمال صبح کے اعمال سے پہلے (ہر روز) اوپر لے جائے جاتے ہیں، یا پھر یہ کہا جائے گا کہ روزانہ ہر عمل تفصیلی طور پر پیش کیا جاتا ہے اور پھر ان دونوں میں تمام اعمال اجمالی طور پر پیش ہوتے ہیں۔

ایام بیض کے روزے

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا صُمْتَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَصُمْ ثَلَاثَ عَشْرَةَ وَاَرْبَعَ عَشْرَةَ وَخَمْسَ عَشْرَةَ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت ابوذر ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ابوذر! اگر تم مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا چاہو تو تیرہویں، چودھویں اور پندرھویں کو روزہ رکھو۔" (ترمذی و نسائی)

تشریح: ہر مہینہ میں تین دن نفل روزے رکھنے کے سلسلے میں کئی طریقے منقول ہیں لیکن بہتر اور افضل یہی ہے کہ مذکورہ بالا تین تاریخوں میں کہ انہیں "ایام بیض" کہا جاتا ہے روزے رکھے جائیں۔

جمعہ کے دن نفل روزے رکھنا جائز ہے

(۲۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ مِنْ غُرَّةِ كُلِّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ وَقَلَّمَا كَانَ يُفْطِرُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ اِلٰى ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (کبھی) مہینہ کے شروع کے تین دنوں میں (بھی) روزہ رکھا کرتے تھے اور ایسا کم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ جمعہ کے دن روزہ نہ رکھتے ہوں" (ترمذی، نسائی) ابوداؤدؒ نے اس روایت کو ثلثة ایام تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: پہلے کچھ احادیث گزری ہیں جن سے معلوم ہوا کہ صرف جمعہ کے روز نفل روزہ نہیں رکھنا چاہئے جب کہ یہ حدیث ان احادیث کے برعکس معلوم ہوتی ہے لہٰذا اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ آپ ﷺ جمعہ کے ساتھ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھا کرتے تھے یا یہ کہ صرف جمعہ کے روز، روزہ رکھنا آنحضرت ﷺ کے ساتھ خاص تھا جیسا کہ وصال کے روزے صرف آپ ﷺ کے لئے مخصوص تھے لیکن یہ تاویل ان حضرات کے مسلک کے پیش نظر ہے جو صرف جمعہ کے روز نفل روزہ رکھنے کو مکروہ قرار دیتے ہیں، حنفی مسلک کے مطابق چونکہ جمعہ کے روز، روزہ رکھنا جائز ہے اس لئے حنفیہ کے ہاں اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ تو جمعہ کے دن روزہ کے جواز کو اسی حدیث سے ثابت کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ ہفتہ کے سب دنوں میں روزہ رکھتے تھے

(۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ مِنَ الشَّهْرِ السَّبْتَ وَالْاَحَدَ وَالْاِثْنَيْنِ وَمِنَ الشَّهْرِ الْاٰخَرِ الثَّلَاثَاءَ وَالْاَرْبِعَاءَ وَالْخَمِيْسَ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کسی مہینہ میں ہفتہ، اتوار، پیر کے دن اور کسی مہینہ میں منگل، بدھ، جمعرات کے دن روزہ رکھا کرتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: پہلی حدیث میں جمعہ کے دن روزہ رکھنے کا ذکر تھا اور اس حدیث میں ہفتہ کے بقیہ دنوں کے بارہ میں ذکر کیا گیا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ ہفتہ کے تمام دنوں میں روزہ رکھا کرتے تھے چونکہ تمام دن اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں اس لئے آپ اسے مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ بعض دنوں میں روزہ رکھیں اور بعض دنوں میں نہ رکھیں، گویا اس بارہ میں بھی آپ ﷺ نے عدل و اعتدال کی راہ اختیار کی ہوئی تھی۔

نفل روزوں کی ابتداء پیر یا جمعرات سے

(۲۵) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُنِىْ اَنْ اَصُوْمَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ اَوَّلُهَا الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسُ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت امّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ مجھے حکم فرماتے تھے کہ میں ہر مہینہ میں تین دن نفل روزے رکھوں اور ان کی ابتداء پیر یا جمعرات سے کروں۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: لفظ والخمیس میں واؤ، او کے معنی میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "ہر مہینہ میں تین دن روزے رکھو، اس طرح کہ پہلا روزہ

توپیر کے دن اور دوسرا تیسرا روزہ منگل اور بدھ کے دن ہو یا پہلے روزہ جمعرات کا ہو اور بقیہ دو روزے جمعہ اور ہفتہ کے ہوں چنانچہ طبرانی میں او یعنی "او الخمیس" ہی مذکور ہے، بہرکیف روزہ رکھنے والا اختیار رکھتا ہے کہ ابتداء چاہے پیر کے دن سے کرے یا جمعرات کے دن سے دونوں متبرک ہیں۔

ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت کی وجہ

(۲۶) وَعَنْ مُسْلِمٍ الْقُرَشِيِّ قَالَ سَأَلْتُ اَوْسُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صِيَامِ الدَّهْرِ فَقَالَ اِنَّ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا صُمْ رَمَضَانَ وَالَّذِيْ يَلِيْهِ وَكُلَّ اَرْبَعَاءَ وَخَمِيْسٍ فَاِذَا اَنْتَ قَدْ صُمْتَ الدَّهْرَ كُلَّهُ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت مسلم قرشیؓ کہتے ہیں کہ میں نے یا کسی اور شخص نے رسول کریم ﷺ سے ہمیشہ روزہ رکھنے کے بارہ میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر تمہارے اہل وعیال کا بھی حق ہے (اس لئے) رمضان میں اور ان ایام میں جو رمضان۔ سے متصل ہیں یعنی شش عید کے روزے رکھو نیز (زیادہ سے زیادہ) ہر بدھ اور جمعرات کو روزہ رکھ لیا کرو، اگر تم نے یہ روزے رکھ لئے تو سمجھو کہ ہمیشہ روزے رکھے۔"

(ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ روزے رکھنے کی وجہ سے چونکہ ضعف لاحق ہو جاتا ہے جس کی بناء پر نہ صرف یہ کہ ادائیگی حقوق میں خلل پڑتا ہے بلکہ دوسری عبادات میں بھی نقصان اور حرج واقع ہوتا ہے لہٰذا اسی سبب سے ہمیشہ روزہ رکھنا مکروہ ہے ہاں جس شخص کو اس کی وجہ سے ضعف لاحق نہ ہو تو اس کے لئے ہمیشہ روزہ رکھنا مکروہ نہیں ہوگا بلکہ مستحب ہوگا اسی طرح دائمی روزے کی ممانعت کے سلسلہ میں منقول احادیث میں اور ان مشائخ وسلف کے عمل میں کہ جو ہمیشہ روزہ رکھتے تھے مذکورہ بالا وضاحت سے تطبیق بھی ہو جاتی ہے نیز ہو سکتا ہے کہ یہاں جو حدیث ذکر کی گئی ہے وہ آپ ﷺ نے اس حدیث سے پہلے ارشاد فرمائی ہوگی جس میں بتایا گیا تھا کہ ہر مہینہ میں تین روزے رکھنے سے ہمیشہ روزہ رکھنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

ایک بات اور سمجھ لیجئے گزشتہ صفحات میں تشریحات کے ضمن میں علامہ ابن ہمامؒ وغیرہ کے وہ اقوال نقل کئے گئے تھے جن سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ ہمیشہ کے روزے رکھنے مستقلاً مکروہ ہیں اور در مختار میں بھی یہی منقول ہے کہ دائمی طور پر روزہ رکھنا مکروہ تنزیہی ہے جب کہ یہاں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنا اسی وقت مکروہ ہے جب کہ روزہ دار کے ضعف و ناتوانی میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہو اگر ضعف کا خوف نہ ہو تو پھر مکروہ نہیں ہوگا، لہٰذا ان تمام اقوال میں مطابقت پیدا کی جائے کہ جن اقوال سے دائمی روزوں کا مطلقاً مکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے در حقیقت ان کا محمول بھی خوف ضعف ہے یعنی ان اقوال کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر ضعف کا خوف ہو تو دائمی روزے مکروہ ہوں گے ورنہ نہیں!۔

عرفات میں عرفہ کے دن روزہ مکروہ ہے

(۲۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے عرفات میں عرفہ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حج کرنے والا اگر عرفہ کے دن روزہ رکھے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جائے جس کی بناء پر عرفات میں دوسرے افعال و ارکان میں نقصان و خلل واقع ہو اس لئے ایسے شخص کے لئے عرفہ کا روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی گئی لیکن یہ ممانعت نہی تحریمی کے طور پر نہیں ہے بلکہ یہ نہی تنزیہی ہے۔

صرف ہفتہ کے دن روزہ رکھنے کی ممانعت

(۲۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ عَنْ اُخْتِهِ الصَّمَّاءِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَصُوْمُوْا يَوْمَ السَّبْتِ اِلَّا فِيْمَا افْتُرِضَ عَلَيْكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ اَحَدُكُمْ اِلَّا لِحَاءَ عِنَبَةٍ اَوْ عُوْدَ شَجَرَةٍ فَلْيَمْضَغْهُ۔

(رواہ احمد والبوداود والترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عبداللہؓ بن بسر اپنی ہمشیرہ عزیزہ سے کہ جن کا نام صماءؓ تھا نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، تم لوگ (تنہا) ہفتہ کے دن روزہ نہ رکھو الا یہ کہ اس دن روزہ رکھنا ضروری ہی ہو، لہٰذا اگر تم میں سے کوئی شخص انگور کے درخت کی چھال یا درخت کی لکڑی کے علاوہ کچھ نہ پائے تو وہی چبائے۔" (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: "اس دن روزہ رکھنا ضروری ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ضروری روزہ ہو مثلاً فرض یعنی رمضان کا روزہ ہو یا کفارہ یا نذر یا قضا کا ہو، ایسے ہی سُنّت مؤکدہ روزہ جیسے عرفہ اور عاشوراء کا روزہ ہو کہ یہ بھی ضروری روزہ ہی کے حکم میں ہیں یا اور کوئی مسنون و مستحب روزہ ہو تو اگر ان میں سے کوئی روزہ ہفتہ کے دن پڑ جائے تو اس کو ہفتہ کے دن رکھنا ممنوع نہیں ہوگا۔

فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ اَحَدُكُمْ الخ (اگر کوئی شخص تم میں سے الخ) کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ہفتہ کے دن روزہ رکھ لیا تو اسے چاہئے کہ اگر اسے کچھ نہ ملے تو انگور کے درخت کی چھال یا درخت کی لکڑی چبا کر افطار کر دے اور روزہ توڑ ڈالے اور اگر اس قسم کی بھی کوئی چیز نہ ملے تو بھی کسی نہ کسی طرح روزہ توڑ ڈالے۔

ہفتہ کے دن روزہ رکھنا اس لئے منع ہے کہ اس طرح اس دن کی تعظیم لازم آتی ہے اور اس تعظیم میں یہود کی مشابہت ہوتی ہے اگرچہ یہود اس دن روزہ نہیں رکھتے کیونکہ ان کے ہاں یہ یوم عید ہے تاہم وہ اس دن کی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں لیکن اکثر علماء کے نزدیک ہفتہ کے دن کے روزہ کی ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔

خدا کی راہ میں ایک دن روزہ رکھنے کی فضیلت

(۲۹) وَعَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ يَوْمًا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ جَعَلَ اللّٰهُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّارِ خَنْدَقًا كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص خدا کی راہ میں ایک دن روزہ رکھے گا، اللہ تعالیٰ اس کے اور (دوزخ کی) آگ کے درمیان ایک ایسی خندق حائل کر دے گا جو آسمان و زمین کے درمیانی فاصلہ کی برابر ہوگی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں) کا یہ مطلب ہے کہ جہاد میں یا حج کے راستہ میں یا عمرہ میں طلب علم کے عرصہ میں اور یا محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر ایک دن روزہ رکھے "خندق" سے مراد ہے بڑی زبردست رکاوٹ اور سخت پردہ و حصار۔

جاڑے میں روزہ رکھنا بلا مشقت ثواب حاصل کرنا ہے

(۳۰) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْغَنِيْمَةُ الْبَارِدَةُ الصَّوْمُ فِى الشِّتَاءِ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِىُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ مُرْسَلٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِىْ هُرَيْرَةَ مَامِنْ اَيَّامٍ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ فِىْ بَابِ الْاُضْحِيَةِ

"اور حضرت عامر ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ٹھنڈی غنیمت (یعنی بلا تعب و مشقت ثواب پانا) جاڑے میں روزہ رکھنا ہے (احمد، ترمذی) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہے، (کیونکہ بعض حضرات کے نزدیک حضرت عامر ابن مسعود صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں) اور حضرت ابوہریرہ کی روایت مامن ایام احب الی اللہ قربانی کے باب میں ذکر کی جا چکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

یوم عاشورہ کا روزہ کیوں؟

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَوَجَدَ الْيَهُوْدَ صِيَامًا يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا هٰذَا الْيَوْمُ الَّذِىْ تَصُوْمُوْنَهُ فَقَالُوْا هٰذَا يَوْمٌ عَظِيْمٌ اَنْجَى اللّٰهُ فِيْهِ مُوْسٰى وَقَوْمَهُ وَغَرَّقَ فِرْعَوْنَ وَقَوْمَهُ فَصَامَهُ مُوْسٰى شُكْرًا فَنَحْنُ نَصُوْمُهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَحْنُ اَحَقُّ وَاَوْلٰى بِمُوْسٰى مِنْكُمْ فَصَامَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَمَرَ بِصِيَامِهِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (جب) مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے یہودیوں کو عاشورہ کے دن کا روزہ رکھتے ہوئے دیکھا، رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اس دن کی کیا خصوصیت ہے کہ تم روزہ رکھتے ہو؟ یہودیوں نے کہا کہ یہ بڑا عظیم دن ہے اسی دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی جماعت کو نجات دی اور فرعون اور اس کی قوم کو ڈبویا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بطور شکر اس دن روزہ رکھا اس لئے ہم بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا" تمہارے مقابلہ میں ہم موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قریب اور (ان کی طرف سے بطور شکر روزہ رکھنے کے) زیادہ حقدار ہیں چنانچہ آپ ﷺ نے یوم عاشوراء کو خود بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

ہفتہ و اتوار کے دن روزہ رکھنے میں یہود و نصاریٰ کی مخالفت

(۳۲) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ يَوْمَ السَّبْتِ وَيَوْمَ الْاَحَدِ اَكْثَرَ مَا يَصُوْمُ مِنَ الْاَيَّامِ وَيَقُوْلُ اِنَّهُمَا يَوْمَا عِيْدٍ لِلْمُشْرِكِيْنَ فَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اُخَالِفَهُمْ (رواہ احمد)

"اور حضرت اُم سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ دوسرے دنوں میں روزہ رکھنے کی بہ نسبت ہفتہ و اتوار کے دن زیادہ روزہ رکھا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ دو دن مشرکین کے لئے عید ہیں (کہ جن میں وہ روزہ نہیں رکھتے) لہٰذا میں اسے پسند کرتا ہوں کہ (میں ان دنوں میں روزہ رکھ کر) ان کی مخالفت کروں۔" (احمدؒ)

تشریح: "مشرکین" سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور انہیں مشرک اس لئے فرمایا کہ یہود تو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور نصاریٰ (عیسائی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔

پہلے ایک حدیث گزری ہے جس میں ہفتہ کے دن روزہ رکھنے کے لئے منع فرمایا گیا ہے جب کہ یہ حدیث اس کے بالکل برعکس ہے لہٰذا ان دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ اس کا تعلق تو صرف آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی سے ہے یعنی یہ آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے اور گزشتہ حدیث کا تعلق صرف اُمت سے ہے۔ یعنی وہ ممانعت اُمت کی خصوصیات میں سے ہے یا پھر یہ کہا جائے گا کہ جس روزہ سے منع کیا گیا ہے وہ روزہ وہ ہے جو اس دن کی تعظیم کے طور پر رکھا جائے اور پسندیدہ روزہ وہ ہے جو یہود و نصاریٰ کی مخالفت کے پیش نظر رکھا جائے۔

فرضیت رمضان سے قبل عاشوراء کے روزے کی زیادہ تاکید تھی۔

(۳۳) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُ بِصِيَامِ يَوْمِ عَاشُوْرَاءَ وَيَحُثُّنَا عَلَيْهِ وَيَتَعَاهَدُنَا عِنْدَهُ فَلَمَّا فُرِضَ رَمَضَانُ لَمْ يَأْمُرْنَا وَلَمْ يَنْهَنَا عَنْهُ وَلَمْ يَتَعَاهَدْنَا عِنْدَهُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (پہلے) ہمیں یوم عاشوراء کا روزہ رکھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ اس کی ترغیب دلاتے تھے اور اس دن کے آنے کے وقت ہماری خبر گیری کرتے تھے (یعنی عاشوراء کا دن جب نزدیک آتا تو اس کے روزہ رکھنے کی نصیحت فرمایا کرتے تھے) مگر جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو نہ آپ ﷺ نے ہمیں اس دن روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ اور نہ اس سے منع کیا۔ اور نہ ہی اس دن کے آنے کے وقت ہماری خبر گیری کی۔" (مسلمؒ)

تشریح: لفظ یامرنا مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں نا کے بغیر یعنی صرف یامر ہے مگر صحیح مسلم میں یامرنا ہی منقول ہے۔

سُنّت مؤکدہ روزے

(۳۴) وَعَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ اَرْبَعٌ لَمْ يَكُنْ يَدَعُهُنَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صِيَامُ عَاشُوْرَاءَ وَالْعَشْرِ وَثَلَاثَةِ اَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ (رواہ النسائی)

"اور حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ جنہیں رسول کریم ﷺ ترک نہیں فرماتے تھے (کیونکہ سُنّت مؤکدہ ہیں) اول یوم عاشوراء کا روزہ، دوم عشرہ ذی الحجہ (یعنی ذی الحجہ کے ابتدائی نو دنوں کے) روزے، سوم ہر مہینہ میں تین دن کے روزے، چہارم فجر سے پہلے دو رکعتیں (فجر کی دو سنتیں)۔" (نسائی)

ایام بیض کے روزے

(۳۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُفْطِرُ اَيَّامَ الْبِيْضِ فِيْ حَضَرٍ وَلَا سَفَرٍ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ایام بیض میں بغیر روزہ نہیں رہا کرتے تھے، نہ گھر میں اور نہ سفر میں۔" (نسائی)

تشریح: "ایام بیض" سے مراد چاندنی راتوں کے دن ہیں یعنی قمری مہینوں کی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں تاریخ لہٰذا "ایام بیض" میں "بیض" (سفید، روشن) لیالی یعنی ان راتوں کی صفت ہے جن کے دنوں کو ایام بیض کہا جاتا ہے، ان راتوں کو "بیض" اس لئے کہتے ہیں کہ ان راتوں میں چاندنی اول سے آخر تک رہتی ہے گویا پوری رات روشن و چمکدار رہتی ہے، یا پھر کہا جائے گا کہ "بیض" ایام ہی یعنی دنوں کی صفت ہے۔ اور ان دنوں کو بیض اس لئے کہتے ہیں کہ ان ایام کے روزے گناہوں کی تاریکی کو دور کرتے ہیں اور قلوب کو روشن و مجلا کرتے ہیں یا یہ دن "ایام بیض" اس لئے کہلاتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جنّت سے زمین پر اتارا گیا تو ان کا تمام بدن سیاہ ہو گیا تھا جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو انہیں حکم دیا گیا کہ ان دنوں میں تین روزے رکھو چنانچہ انہوں نے تیرہویں کو روزہ رکھا تو ان کا تہائی بدن سفید اور روشن ہو گیا، چودہویں کو روزہ رکھا تو دو تہائی بدن سفید و روشن ہو گیا اور جب پندرہویں کو روزہ رکھا تو تمام بدن سفید روشن ہو گیا۔

ہر مہینہ میں تین روزے رکھنے کی ترتیب

اس موقع پر یہ بات جان لینی چاہئے کہ وہ تین روزے جو ہر مہینہ میں رکھنے مسنون ہیں بارہ طرح سے منقول ہیں، ایک تو غیر معین کہ پورے مہینہ میں جب چاہے تین روزے رکھ لے، دوسرے یہ کہ مہینہ کے ابتدائی تین دنوں میں یعنی پہلی تاریخ سے تیسری تاریخ تک تیسرے یہ کہ مہینہ کے کسی بھی سنیچر، اتوار، پیر کے دن، چوتھے یہ کہ مہینہ کے کسی بھی منگل، بدھ جمعرات کے دن، پانچویں یہ کہ ایام بیض یعنی تیرہویں، چودہویں، پندرہویں، تاریخ کو چھٹے یہ کہ ان روزوں میں پہلا روزہ پیر کے دن اور دو منگل اور بدھ کے دن، ساتویں یہ کہ ان روزوں میں پہلا روزہ جمعرات کے دن ہو، اور دو روزے جمعہ اور ہفتہ کے دن، آٹھویں یہ کہ پہلا روزہ نوچندا پیر کو اور دو روزے دو جمعراتوں کو، نویں ایک نوچندی جمعرات کو اور دو دو شنبے کو، دسویں پیر اور جمعرات اور پھر اگلے ہفتے کا پیر، گیارہویں ہر عشرہ میں ایک

روزہ۔ بارہویں مہینہ کے آخری دنوں میں تین روزے۔ یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ بہتر اور اولیٰ یہی ہے کہ ایام بیض یعنی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں تاریخ کو یہ روزے رکھے جائیں ویسے اختیار ہے کہ جب بھی اور جس طرح بھی یہ روزے رکھے جائیں گے ثواب بہر صورت حاصل ہوگا۔

ایک بات اور۔ پورے سال میں مسنون روزوں کی تعداد اکیاون ہے تینتیس روزے تو یہی ہیں یعنی بحساب تین روزے فی مہینہ، نو روزے ذی الحجہ کے مہینہ میں پہلی تاریخ سے نویں تاریخ تک، ایک دن یوم عاشوراء کا ایک روزہ عاشورہ سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا ایک روز شعبان کی پندرہویں تاریخ کا، اور چھ روزے شوال کے جو شش عید کے روزے کہلاتے ہیں۔

بدن کی زکوٰۃ روزہ رکھنا ہے

(۳۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِكُلِّ شَیْءٍ زَكَاةٌ وَزَكَاةُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہر چیز کے لئے زکوٰۃ ہے، اور بدن کی زکوٰۃ روزہ رکھنا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: چونکہ زکوٰۃ کا مفہوم ہے "بڑھنا اور طہارت" اس لئے "ہر چیز کے لئے زکوٰۃ ہے" کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر چیز کے لئے بڑھوتری ہے جو اس چیز میں سے کچھ حصہ دے کر حاصل ہوتی ہے یا ہر چیز کے لئے پاکیزگی وطہارت کا ایک ذریعہ مقرر ہے جس کی وجہ سے وہ چیز پاکیزہ وطاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا "بدن کی زکوٰۃ" یعنی بدن کی جسمانی صحت وتندرستی اور بدن کی روحانی پاکیزگی وطہارت کا ذریعہ روزہ ہے کہ روزہ کی وجہ سے اگرچہ بظاہر جسم کی طاقت وقوت کا کچھ حصہ گھلتا اور ناقص ہوتا ہے مگر حقیقت میں روزہ جسم کے نشوونما اور صحت وتندرستی میں برکت و اضافہ کا ایک ذریعہ بنتا ہے نیز اس کی وجہ سے بدن گناہوں سے پاک ہوتا ہے لہٰذا زکوٰۃ عبادت مالیہ ہے اور روزہ طاعت بدنیہ۔

پیر اور جمعرات کی فضیلت کیوں؟

(۳۷) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَصُوْمُ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسِ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ تَصُوْمُ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسِ فَقَالَ اِنَّ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسِ يَغْفِرُ اللّٰهُ فِيْهِمَا لِكُلِّ مُسْلِمٍ اِلَّا ذَاهَا جِرَيْنِ يَقُوْلُ دَعْهُمَا حَتّٰى يَصْطَلِحَا (رواہ احمد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ پیر اور جمعرات کے دن روزہ رکھا کرتے تھے چنانچہ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) پیر اور جمعرات کے دن (اکثر) روزے رکھتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "پیر اور جمعرات وہ دن ہیں جس میں اللہ رب العزت ہر مسلمان کی بخشش کرتا ہے علاوہ ان دو لوگوں کے جو ترک تعلقات کئے ہوئے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ (ان کے بارہ میں ان فرشتوں سے جو آثار مغفرت ظاہر ہونے کے وقت برائیوں کو مٹانے پر مامور ہوتے ہیں) فرماتا ہے کہ انہیں چھوڑ دو تاوقتیکہ یہ (آپس میں) صلح کرلیں اس کے بعد ان کی مغفرت ہوگی)۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: گویا آپ ﷺ نے سوال کے پیش نظر ان دونوں دنوں کی بزرگی وفضیلت ظاہر فرمائی کہ میں اس بزرگی وفضیلت کے پیش نظر اور اللہ تعالیٰ کی رحمت عام اور اس کی طرف سے مغفرت وبخشش کی نعمت عظمیٰ کے شکر کے طور پر ان دونوں دنوں میں روزہ رکھتا ہوں۔

اللہ کی خوشنودی کے پیش نظر روزہ رکھنے والے کی فضیلت

(۳۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ يَوْمًا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ بَعَّدَهُ اللّٰهُ مِنْ جَهَنَّمَ كَبُعْدِ غُرَابٍ طَائِرٍ وَهُوَ فَرْخٌ حَتّٰى مَاتَ هَرِمًا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَرَوَى الْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ قَيْسٍ

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ رب العزت کی رضا و خوشنودی کی خاطر ایک دن روزہ رکھتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ سے اڑتے ہوئے کوے کی مسافت کے بقدر دور رکھتا ہے جو بچہ ہو اور بوڑھا ہو کر مرے۔" (احمدؒ ۔ بیہقیؒ)

تشریح: کہا جاتا ہے کہ کوے کی عمر ہزار ہزار برس کی ہوتی ہے لہٰذا فرمایا کہ اگر کوا ابتداء عمر سے اپنی عمر کے آخری حصہ تک اڑتا رہے تو غور کرو وہ کتنی زیادہ مسافت طے کرے گا جتنی مسافت وہ طے کرے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ روزہ دار کو دوزخ سے دور رکھتا ہے۔ بیہقیؒ سے منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا روزہ دار کا سونا عبادت اس کی خاموشی تسبیح ہے، اس کا عمل مضاعف ہے، اس کی دعا مقبول ہے اور اس کے گناہ بخشے ہوئے ہیں۔

بیہقیؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ "آپ ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک نبی کے پاس یہ وحی بھیجی کہ اپنی قوم کو خبر دو کہ جو بھی بندہ محض میری خوشنودی کے حصول کی خاطر کسی دن روزہ رکھتا ہے تو میں نہ صرف یہ کہ اس کے جسم و بدن کو تندرست و توانا کرتا ہوں بلکہ اسے بہت زیادہ ثواب بھی دیتا ہوں۔

خطیبؒ سے منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو شخص اس طرح نفل روزے رکھتا ہے کہ کسی کو بھی اس کے روزہ کی خبر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کے علاوہ اور کسی ثواب پر راضی نہیں ہوتا یعنی اس کا ثواب یہی ہے کہ اسے جنت میں داخل کرتا ہے۔

عبرانیؒ سے منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ رب العزت کے پاس ایک خوان ہے جس پر ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ ویسی نعمتیں نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہیں اور نہ کسی کان نے سنی ہیں اور نہ کسی کے دل میں ان کا خیال بھی گزرتا ہے، اس خوان پر صرف روزے دار بیٹھیں گے۔

باب
گزشتہ ابواب سے متعلّق متفرق مسائل کا بیان
اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ
نفل روزہ کی نیت دن میں کی جاسکتی ہے۔

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ فَقُلْنَا لَا قَالَ فَإِنِّي إِذًا صَائِمٌ ثُمَّ أَتَانَا يَوْمًا آخَرَ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أُهْدِيَ لَنَا حَيْسٌ فَقَالَ أَرِيْنِيْهِ فَلَقَدْ أَصْبَحْتُ صَائِمًا فَأَكَلَ (رواہ مسلم)

"اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے، اور فرمانے لگے کہ کیا تمہارے پاس (کھانے کی) کوئی چیز ہے؟ میں نے عرض کیا کہ "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا میں نے اب روزہ رکھ لیا ہے، پھر اس کے بعد ایک دن اور آپ ﷺ تشریف لائے (اور پوچھا کہ تمہارے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے؟) تو میں نے کہا کہ "یا رسول اللہ" ہمارے لئے حیس ہدیہ میں آیا ہے آپ نے فرمایا کہ لاؤ مجھے وہ دکھاؤ میں نے صبح روزہ رکھ لیا تھا پھر آپ ﷺ نے وہ حیس کھالیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "میں نے اب روزہ رکھ لیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ میں نے روزہ کی نیت کرلی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نفل روزہ کی نیت دن میں کرنی چاہیے چنانچہ اکثر ائمہ کا یہی مسلک ہے مگر حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ روزہ کسی بھی قسم کا ہو خواہ فرض ہو یا نفل، اس کی نیت رات ہی سے کرنی واجب ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کی جاچکی ہے۔

"حیس" ایک کھانے کا نام ہے جو مالیدہ کی طرح ہوتا تھا اور کھجور، گھی اور قروت سے بنایا جاتا تھا، بہر کیف حدیث کے آخری الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے روزہ کی حالت میں حضرت عائشہؓ سے حیس لے کر تناول فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بغیر عذر کے بھی نفل روزہ توڑ ڈالنا جائز ہے چنانچہ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین علماء فرماتے ہیں کہ نفل روزہ شروع کر دینے کے بعد اسے پورا کرنا واجب ہے اس کو توڑ ڈالنا جائز نہیں ہے ہاں کسی عذر کی بناء پر مثلاً مہمانداری وغیرہ کے پیش نظر نفل روزہ توڑا جا سکتا ہے، تاہم اس صورت میں بھی اس کی قضا واجب ہوتی ہے، چونکہ یہ حدیث اس بارہ میں حنفیہ کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے اس کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے بلا عذر روزہ نہیں توڑا تھا۔ بلکہ آپ ﷺ کو کوئی ایسا عذر لاحق تھا جس کی بناء پر آپ ﷺ نے روزہ توڑ ڈالا جس کو یہاں ذکر نہیں کیا گیا، اس مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل آگے آرہی ہے۔

نفل روزہ توڑنے کے سلسلہ میں ضیافت عذر ہے یا نہیں؟

(۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اُمِّ سُلَيْمٍ فَاَتَتْهُ بِتَمْرٍ وَسَمْنٍ فَقَالَ اَعِيْدُوْا سَمْنَكُمْ فِيْ سِقَائِهٖ وَتَمْرَكُمْ فِيْ وِعَائِهٖ فَاِنِّيْ صَائِمٌ ثُمَّ قَامَ اِلٰى نَاحِيَةٍ مِنَ الْبَيْتِ فَصَلّٰى غَيْرَ الْمَكْتُوْبَةِ فَدَعَا لِاُمِّ سُلَيْمٍ وَاَهْلِ بَيْتِهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ حضرت اُمِّ سلیمؓ کے پاس تشریف لے گئے تو وہ آپ ﷺ کے لئے گھی اور کھجور لائیں (تاکہ آپ ﷺ تناول فرمائیں) آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اپنے گھی کو اس کی مشک میں اور کھجور کو اس کے برتن میں رکھ دو۔ کیونکہ میں روزہ سے ہوں" پھر آپ ﷺ گھر کے ایک کونہ میں کھڑے ہو کر فرض کے علاوہ نماز پڑھنے لگے اور اُمِّ سلیمؓ اور ان کے گھر والوں کے لئے دعا فرمائی۔" (بخاریؒ)

تشریح: بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اُمِّ سلیمؓ کی ضیافت کے باوجود اس لئے روزہ نہیں توڑا کہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اس سے اُمِّ سلیمؓ رنجیدہ نہیں ہوں گی۔

اس بارہ میں کہ آیا ضیافت نفل روزہ رکھنے والے کے لئے عذر ہے یا نہیں؟ اگرچہ مشائخ کے ہاں اختلاف ہے لیکن صحیح بات یہی ہے کہ مہمان اور میزبان دونوں کے لئے ضیافت عذر ہے بشرطیکہ میزبان محض مہمان کے آنے اور اپنے ساتھ کھانا نہ کھانے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ خوش نہ ہو بلکہ ملول بھی ہو اسی طرح کھانے میں میزبان کی عدم شرکت سے مہمان کی دلشکنی اور اس کو ناگواری اور تنگی ہو، حاصل یہ کہ اگر کھانے میں شرکت نہ کرنے سے دلشکنی ہوتی ہو تو ضیافت عذر ہے لہٰذا نفل روزہ توڑ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر بعد میں اس روزہ کی قضا ضروری ہوگی اور اگر یہ معلوم ہو کہ دلشکنی نہیں ہوگی تو روزہ نہ توڑنا چاہئے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ روزہ دار مہمان کے لئے مستحب ہے کہ وہ میزبان اور اس کے اہل و عیال کے حق میں دعاء خیر کرے۔

(۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ اِلٰى طَعَامٍ وَهُوَ صَائِمٌ فَلْيَقُلْ اِنِّيْ صَائِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ فَلْيُجِبْ فَاِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ وَاِنْ كَانَ مُفْطِرًا فَلْيَطْعَمْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو کھانے پر بلایا جائے اور وہ روزہ دار ہو تو اسے چاہئے کہ یہ کہدے کہ میں روزے سے ہوں۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا اگر تم میں سے کسی کو دعوت دی جائے۔ تو اسے چاہئے کہ وہ دعوت قبول کرلے اور اگر وہ روزہ دار ہو تو دو رکعت نماز (نفل) پڑھ لے اور اگر روزہ دار نہ ہو تو اسے چاہئے کہ کھانے میں شریک ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگر روزہ دار مہمان کے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے میزبان کسی تشویش و پریشانی میں مبتلا ہو جائے یا کھانا نہ کھانے کی وجہ سے دشمنی و

نفرت پیدا ہو جانے کا خوف ہو تو اس صورت میں نفل روزہ توڑ دینا ہی واجب ہے۔ اور اگر مہمان یہ جانے کہ میزبان کھانا کھانے کی وجہ سے خوش تو ہوگا اور کھانا کھانے کی صورت میں وہ کسی تشویش و پریشانی میں مبتلا بھی نہیں ہوگا۔ تو اس صورت میں نفل روزہ توڑنا مستحب ہے اور اگر اس کے نزدیک دونوں امر برابر ہوں تو اس کے لئے افضل یہی ہے کہ وہ کہہ دے کہ انی صائم میں روزہ دار ہوں، خواہ داعی کے یہاں جائے یا نہ جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

④ عَنْ اُمِّ هَانِئٍ قَالَتْ لَمَّا كَانَ يَوْمُ الْفَتْحِ فَتْحِ مَكَّةَ جَاءَتْ فَاطِمَةُ فَجَلَسَتْ عَلٰى يَسَارِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاُمُّ هَانِئٍ عَنْ يَمِيْنِهٖ فَجَاءَتِ الْوَلِيْدَةُ بِاِنَاءٍ فِيْهِ شَرَابٌ فَنَاوَلَتْهُ فَشَرِبَ مِنْهُ ثُمَّ نَاوَلَهٗ اُمَّ هَانِئٍ فَشَرِبَتْ مِنْهُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَقَدْ اَفْطَرْتُ وَكُنْتُ صَائِمَةً فَقَالَ لَهَا اَكُنْتِ تَقْضِيْنَ شَيْئًا قَالَتْ لَا قَالَ لَا فَلَا يَضُرُّكِ اِنْ كَانَ تَطَوُّعًا۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَحْمَدَ وَالتِّرْمِذِيِّ نَحْوُهٗ وَفِيْهِ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمَا اِنِّيْ كُنْتُ صَائِمَةً فَقَالَ الصَّائِمُ الْمُتَطَوِّعُ اَمِيْرُ نَفْسِهٖ اِنْ شَاءَ صَامَ وَاِنْ شَاءَ اَفْطَرَ۔

"حضرت اُمّ ہانی ؓ سے مروی ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو اس دن حضرت فاطمہ ؓ آئیں اور نبی کریم ﷺ کے بائیں طرف بیٹھ گئیں اور اُمّ ہانی ؓ آپ ﷺ کے دائیں طرف بیٹھی ہوئی تھیں اتنے میں ایک لونڈی ایک برتن لے کر آئی جس میں پینے کی کوئی چیز تھی لونڈی نے وہ برتن آنحضرت ﷺ کو دیا آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ پی کر وہ برتن اُمّ ہانی ؓ کو عنایت فرمایا۔ اُمّ ہانی ؓ نے بھی اس میں سے پیا اور کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ! میں نے افطار کر لیا کیونکہ میں روزے سے تھی آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ کیا تم نے (رمضان کا) کوئی قضا (یا نذر کا) روزہ رکھا تھا؟ انہوں نے کہا نہیں! (بلکہ نفل روزہ رکھا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا "اگر یہ نفل روزہ تھا تو کوئی حرج نہیں" (ابوداؤد ؒ، ترمذی ؒ، دارمی ؒ) ایک اور روایت میں جو احمد ؒ اور ترمذی ؒ نے اسی کے مانند نقل کیا ہے یہ الفاظ بھی ہیں کہ اُمّ ہانی ؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ ﷺ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں روزہ سے تھی "آپ ﷺ نے فرمایا" نفل روزہ رکھنے والا اپنے نفس کا مالک ہے چاہے روزہ رکھے چاہے افطار کرے۔"

تشریح: "اپنے نفس کا مالک ہے" کا مطلب یہ ہے کہ نفل روزہ رکھنے والا خود مختار ہے کہ ابتدا چاہے تو روزہ رکھے یعنی روزہ کی نیت کرے، چاہے افطار کرے یعنی روزہ نہ رکھنے کو اختیار کرے، یا پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نفل روزہ رکھنے والا روزہ رکھنے کے بعد بھی مختار ہے کہ چاہے تو اپنا روزہ پورا کرے چاہے تو توڑ ڈالے، اس صورت میں اس کی تاویل یہ ہوگی کہ نفل روزہ دار کو اس بات کا اختیار ہے کہ اگر اس کے پیش نظر کوئی مصلحت ہو مثلاً کوئی شخص اس کی ضیافت کرے یا کسی جماعت کے پاس جائے جس کے بارہ میں یہ معلوم ہو کہ اگر روزہ توڑ کر ان کے ساتھ کھانے پینے میں شریک نہیں ہوگا تو لوگ وحشت و پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے تو اس صورت میں وہ روزہ توڑ سکتا ہے تاکہ آپس میں میل ملاپ اور محبت و الفت کی فضا برقرار رہے۔ لہٰذا ان الفاظ و معانی سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ نفل روزہ توڑنے کے بعد اس کی قضا ضروری نہیں ہے جب کہ اس کے بعد آنے والی حدیث بڑی وضاحت کے ساتھ قضا کے ضروری ہونے کو ثابت کر رہی ہے۔

ام ہانی ؓ کی اس روایت کے بارہ میں محدثین کے ہاں کلام ہے چنانچہ امام ترمذی ؒ فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد محل بحث ہے اور منذری ؒ نے کہا ہے کہ یہ ثابت نہیں ہے اور اس کی اسناد میں بہت اختلاف ہے۔

⑤ وَعَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَنَا وَحَفْصَةُ صَائِمَتَيْنِ فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اِشْتَهَيْنَاهُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ فَقَالَتْ حَفْصَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا كُنَّا صَائِمَتَيْنِ فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اِشْتَهَيْنَاهُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ قَالَ اِقْضِيَا يَوْمًا اٰخَرَ مَكَانَهٗ۔ رَوَاهُ

التِّرْمِذِيُّ وَذَكَرَ جَمَاعَةٌ مِنَ الْحُفَّاظِ رَوَوْاعَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عَائِشَةَ مُرْسَلًا وَلَمْ يَذْكُرُوا فِيهِ عَنْ عُرْوَةَ وَهٰذَا اَصَحُّ وَرَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ عَنْ زُمَيْلٍ مَوْلٰى عُرْوَةَ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ

"اور حضرت زہریؒ حضرت عروہؒ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا (ایک دن) میں اور حفصہؓ دونوں روزے سے تھیں کہ ہمارے سامنے کھانا لایا گیا ہمیں اس کو کھانے کی خواہش ہوئی چنانچہ ہم نے کھالیا اس کے بعد حفصہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم روزہ سے تھیں کہ ہمارے سامنے کھانا لایا گیا ہمیں اس کو کھانے کی خواہش ہوئی چنانچہ ہم نے کھالیا (اب ہمارے بارہ میں کیا حکم ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا اس کے بدلہ بطور قضا ایک دن روزہ رکھو۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور حفاظ حدیث کی ایک ایسی جماعت کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس روایت کو زہریؒ سے اور زہریؒ نے حضرت عائشہؓ سے بطریق ارسال نقل کیا ہے اس میں عروہؒ کا واسطہ مذکور نہیں ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ نیز اس روایت کو امام ابوداؤدؒ نے زمیلؒ سے نقل کیا ہے جو حضرت عروہؒ کے آزاد کردہ غلام تھے زمیلؒ نے عروہؒ سے اور عروہ نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: چونکہ حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا نفل روزہ توڑ دے تو اس کی قضا ضروری ہے اس لئے ان حضرات کی دلیل یہی حدیث ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ حکم کہ "اس کے بدلہ بطور قضا ایک دن روزہ رکھو" بطور وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن شوافع کے ہاں چونکہ نفل روزہ کی قضا واجب نہیں ہے اس لئے ان کے نزدیک یہ حکم بطور استحباب ہے۔ روایت کے آخری جزء زہری نے حضرت عائشہؓ سے بطریق ارسال نقل کیا ہے لفظ "ارسال" اسناد سے "سقوط راوی" کے معنی میں ہے جس کا مطلب ہے "انقطاع واسطہ" یعنی پہلی روایت کے سلسلہ اسناد میں زہری اور عائشہؓ کے درمیان عروہؒ کا جو واسطہ تھا وہ اس روایت میں نہیں ہے اگرچہ یہ اصطلاح اس معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے مگر مشہور یہی ہے کہ "مرسل" اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جسے تابعی صحابیؓ کا واسطہ ذکر کئے بغیر نقل کرے۔

روزہ دار کے سامنے کھانا

(۶) وَعَنْ اُمِّ عُمَارَةَ بِنْتِ كَعْبٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا فَدَعَتْ لَهٗ بِطَعَامٍ فَقَالَ لَهَا كُلِيْ فَقَالَتْ اِنِّيْ صَائِمَةٌ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الصَّائِمَ اِذَا اُكِلَ عِنْدَهٗ صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى يَفْرُغُوْا۔

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت اُمّ عمارہ بنت کعب کے بارہ میں مروی ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے لئے کھانا منگوایا، آپ ﷺ نے اُمّ عمارہؓ سے فرمایا کہ تم بھی کھاؤ، "انہوں نے عرض کیا کہ میں روزہ سے ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ" جب کسی روزہ دار کے سامنے کھانا کھایا جاتا ہے (اور اس کا دل کھانے کی خواہش کرتا ہے جس کی بناء پر اس کے لئے روزہ بڑا سخت ہو جاتا ہے) تو جب تک کھانے والے کھانے سے فارغ نہیں ہو جاتے فرشتے اس پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۷) عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ دَخَلَ بِلَالٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَتَغَدّٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغَدَاءَ يَا بِلَالُ قَالَ اِنِّيْ صَائِمٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاْكُلُ رِزْقَنَا وَفَضْلُ رِزْقِ بِلَالٍ فِي الْجَنَّةِ اَشَعَرْتَ يَا بِلَالُ اَنَّ الصَّائِمَ يُسَبِّحُ عِظَامُهٗ وَيَسْتَغْفِرُ لَهُ الْمَلَائِكَةُ مَا اُكِلَ عِنْدَهٗ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت بلالؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ صبح کا کھانا کھا رہے تھے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ "بلال آؤ کھانا کھاؤ!" حضرت بلالؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں روزہ سے ہوں آپ ﷺ نے فرمایا ہم تو اپنا رزق (یہاں) کھا رہے ہیں اور بلالؓ کا بہترین رزق جنت میں ہے، بلالؓ کیا تم جانتے ہو کہ جب روزہ دار کے سامنے کھانا کھایا جاتا ہے تو) روزہ دار کی ہڈیاں تسبیح کرتی ہیں۔ اور فرشتے اس کے لئے بخشش چاہتے ہیں جب تک کہ اس کے سامنے کھایا جاتا ہے۔" (بیہقی)

بَابُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ

لیلۃ القدر کا بیان

اس باب میں لیلۃ القدر کی عظمت و فضیلت اور ان اوقات کا بیان ہو گا جن میں اس مقدس رات کے آنے کی قوی امید ہوتی ہے یہ شب "لیلۃ القدر" اس لئے کہلاتی ہے کہ بندوں کے رزق ان کی زندگی و موت اور وہ واقعات و امور جو پورے سال رونما ہونے والے ہوتے ہیں وہ اسی رات میں لکھ دیئے جاتے ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس شب کے عظیم القدر ہونے کی وجہ سے اس کا نام لیلۃ القدر ہے۔

اس شب کے تعین میں بہت زیادہ اقوال ہیں، اکثر احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ مقدس رات رمضان کے مبارک ماہ میں آتی ہے خصوصاً رمضان کے آخر عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی رات اور بالخصوص ستائیسویں شب لیلۃ القدر ہوتی ہے چنانچہ اکثر علماء ستائیسویں شب ہی کو لیلۃ القدر مانتے ہیں۔

"لیلۃ القدر" کی سعادت خاص طور پر اُمت محمدیہ کے لئے مخصوص ہوئی ہے تاکہ اس اُمت کے لوگ اپنی چھوٹی عمروں کے باوجود بہت زیادہ ثواب پائیں چنانچہ اس بارہ میں ایک روایت بھی منقول ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو پچھلی امتوں کے لوگوں کی عمروں کی زیادتی کے بارہ میں معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے افسوس کا اظہار کیا کہ میری اُمت کے لوگ اپنی ان چھوٹی عمروں میں ان لوگوں کی طرح زیادہ نیک کام نہیں کر سکتے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے واسطہ سے پوری اُمت کو لیلۃ القدر کی عظیم سعادت عطا فرمائی جو ہزار مہینہ سے بہتر ہے۔

ایک اور روایت میں جو ابن ابی حاتم سے منقول ہے بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے بنی اسرائیل کے چار اشخاص کا ذکر کیا کہ انہوں نے اسی اسی برس تک اللہ رب العزت کی عبادت کی اور ان کا ایک لمحہ بھی خدا کی نافرمانی میں نہیں گزرا اور وہ اشخاص یہ تھے۔ (۱) حضرت ایوب علیہ السلام۔ (۲) حضرت زکریا علیہ السلام۔ (۳) حضرت حزقیل علیہ السلام۔ (۴) حضرت یوشع ابن نون علیہ السلام۔ یہ سن کر صحابہ کرامؓ بہت زیادہ تعجب کرنے لگے اور (متمنی ہوئے کہ کاش ہماری بھی اتنی ہی عمریں ہوتیں کہ ہم بھی اتنی طویل مدت تک اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے) پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ اے محمد! آپ (ﷺ) کی اُمت ان لوگوں کی اسی اسی برس کی عبادت پر متعجب ہوتی ہے (تو سنئے کہ) اللہ تعالیٰ نے خیر و بھلائی عطا فرمائی، چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے انا انزلناه فی لیلۃ القدر (پوری سورت پڑھی جس کے ذریعہ یہ عظیم بشارت عطا فرمائی گئی ہے کہ لیلۃ القدر جو آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی اُمت کو عطا فرمائی گئی ہے اس چیز سے بہتر ہے جس کے لئے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی اُمت متعجب و متمنی ہیں اس عظیم سعادت و خوش بختی پر سرکار دو عالم ﷺ بہت زیادہ خوش ہوئے۔

اس موقع پر یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ ہزار مہینہ کے تراسی برس اور چار مہینے ہوتے ہیں اسی لئے فرمایا کہ لیلۃ القدر خیر من الف

شہر یعنی لیلۃ القدر ہزار مہینہ سے بہتر ہے کہ جس سے تراسی برس اور چار مہینے ہوئے۔

لیلۃ القدر میں اللہ رب العزت کی رحمت خاص کی تجلی آسمان دنیا پر غروب آفتاب کے وقت سے صبح تک ہوتی ہے۔ اس شب میں ملائکہ اور ارواح طیبہ صلحاء اور عابدین سے ملاقات کے لئے اترتی ہیں اسی مقدس رات میں قرآن کریم کا نزول شروع ہوا، یہی وہ شب ہے جس میں ملائکہ کی پیدائش ہوئی، اسی شب میں آدم علیہ السلام کا مادہ جمع ہونا شروع ہوا اسی شب میں جنت میں درخت لگائے گئے اس شب میں عبادت کا ثواب دوسرے اوقات کی عبادت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہی وہ مقدس شب ہے جس میں بندہ کی زبان و قلب سے نکلی ہوئی دعا بارگاہ رب العزت میں قبولیت سے نوازی جاتی ہے۔

شریعت نے واضح طور پر کسی شب کو متعین کر کے نہیں بتایا ہے کہ لیلۃ القدر فلاں شب ہے گویا اس شب کو پوشیدہ رکھا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر واضح طور پر اس شب کی نشان دہی کر دی جاتی تو عبادات و طاعات کی طرف لوگوں کا میلان نہ رہتا بلکہ صرف اسی شب میں عبادت کر کے یہ سمجھ لیتے کہ ہم نے پورے سال کی عبادت سے بھی زیادہ ثواب حاصل کر لیا اس لئے اس شب کو متعین نہیں کیا گیا تاکہ لوگ عبادات و طاعات میں ہمہ وقت مصروف رہیں صرف اسی شب پر اعتماد کر کے نہ بیٹھ جائیں۔

علماء لکھتے ہیں کہ جو شخص پورے سال عبادت خداوندی کے لئے شب بیداری کو اختیار کرے گا تو انشاء اللہ اسے شب قدر کی سعادت ضرور حاصل ہوگی اسی لئے کہا گیا ہے من لم یعرف قدر اللیلۃ لم یعرف لیلۃ القدر (جس شخص نے رات کی قدر نہ پہچانی یعنی عبادت خداوندی کے لئے شب بیداری نہیں کی وہ لیلۃ القدر کی عظمت و سعادت کو کیا پہچان پائے گے؟)۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس رات کی کچھ ایسی علامتیں ہیں جو احادیث و آثار سے منقول ہیں اور بعض علامتیں اہل کشف نے پہچانی ہیں چنانچہ طبریؒ نے ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ اس رات میں درخت بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور زمین پر گر پڑتے ہیں پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتے ہیں اسی طرح اس رات میں ہر چیز سجدہ کرتی ہے۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس شب کے تعین کے سلسلہ میں ان چیزوں کا دیکھنا شرط نہیں ہے کیونکہ اکثر لوگ اس مقدس شب کو پا لیتے ہیں مگر نہ تو وہ درختوں کو سجدہ ریز دیکھتے ہیں اور نہ تمام چیزیں سجدہ کرتی نظر آتی ہیں اس لئے ہو سکتا ہے ایک ہی جگہ دو آدمی موجود ہوں وہ دونوں شب قدر کو پالیں ان میں سے ایک کو تو یہ علامتیں نظر آئیں مگر دوسرے کو ان میں سے کچھ بھی محسوس نہ ہو، بہر کیف سب سے بڑی علامت تو یہی ہے کہ اس مقدس رات میں عبادت خداوندی و ذکر و مناجات خضوع و خشوع اور حضور و اخلاص کی توفیق حاصل ہو جائے تو جانئے کہ یہ عظیم سعادت حاصل ہو گئی۔

اس رات میں شب بیداری کے سلسلہ میں صحیح مسئلہ یہ ہے کہ رات کے اکثر حصہ میں عبادت خداوندی کے لئے جاگتے رہنا معتبر ہے ہاں اگر کوئی شخص پوری شب جاگتا رہے تو افضل ہے بشرطیکہ اس کی وجہ سے کسی مرض و تکلیف میں مبتلا نہ ہو جائے یا فرائض و سنن مؤکدہ میں نقص و خلل واقع ہو جانے کا خوف نہ ہو، ورنہ تو رات کے جس قدر حصے میں جاگنے اور عبادت و ذکر میں مشغول رہنے کی توفیق حاصل ہو جائے انشاء اللہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ (وَلَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی وَکَانَ سَعْیُہٗ مَشْکُوْرًا)۔ رزقنا اللہ۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

شب قدر کب آتی ہے؟

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ (رواہ البخاری)

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش

کرو"۔" (بخاریؒ)

تشریح: رمضان کے آخری عشرہ کی طاق "راتوں" سے مراد ہیں اکیسویں تئیسویں شب، پچیسویں شب، ستائیسویں شب، اور انتیسویں شب۔

② وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اِنَّ رِجَالاً مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُرُوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْمَنَامِ فِي السَّبْعِ الْاَوَاخِرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِي السَّبْعِ الْاَوَاخِرِ فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيْهَا فَلْيَتَحَرَّهَا فِي السَّبْعِ الْاَوَاخِرِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے کتنے ہی صحابہؓ کو خواب میں شب قدر (رمضان کی) آخری سات راتوں میں دکھلائی گئی چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میں یہ بات دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سب کے خواب آخری سات راتوں پر متفق ہیں لہٰذا جو شخص شب قدر پانا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے آخری سات راتوں میں تلاش کرے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: احتمال ہے کہ آخری سات راتوں سے وہ راتیں مراد ہیں جو بیس کے فوراً بعد ہیں یعنی اکیسویں شب سے ستائیسویں شب تک یا سب سے آخری سات راتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں یعنی تئیسویں شب سے انتیسویں شب تک اور چونکہ انتیسویں تاریخ یقینی ہوتی ہے اس لئے اسی کے مطابق حساب کیا جائے گا۔ اس بارہ میں آخری احتمال یعنی یہ کہ تئیسویں شب سے انتیسویں شب تک مراد ہو زیادہ صحیح ہے۔

③ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِلْتَمِسُوْهَا فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي تَاسِعَةٍ تَبْقٰى فِي سَابِعَةٍ تَبْقٰى فِي خَامِسَةٍ تَبْقٰى (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو، یعنی لیلۃ القدر کو (تلاش کرو) باقی ماندہ نویں شب میں (کہ وہ اکیسویں شب ہے) باقی ماندہ ساتویں شب میں (کہ وہ تئیسویں شب ہے) اور باقی ماندہ پانچویں شب میں (کہ وہ پچیسویں شب ہے)۔" (بخاریؒ)

تشریح: لیلۃ القدر کو پانے کے لئے رمضان کے آخری عشرہ کی کچھ راتوں کو یہاں ذکر کیا گیا ہے کہ ان راتوں میں عبادت اور ذکر و تلاوت میں مشغولیت اختیار کی جائے تاکہ لیلۃ القدر ان میں سے جس شب میں بھی آئے اس کی سعادت حاصل ہو جائے۔ حدیث میں راتوں کی ترتیب کے سلسلہ میں جو اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے اس کی وضاحت ترجمہ میں بین القوسین کی گئی ہے کہ اس ترتیب سے مراد اکیسویں، تئیسویں اور پچیسویں شب ہے لیکن اس سلسلہ میں حدیث میں ذکر کردہ راتوں کو اس طرح آخر سے بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ لیلۃ القدر کو تلاش کرو بیسویں شب کے بعد نویں رات میں کہ وہ انتیسویں شب ہے اور بیسویں شب کے بعد ساتویں رات میں وہ ستائیسویں رات ہے اور بیسویں شب کے بعد پانچویں رات میں کہ وہ پچیسویں شب ہے، یہ وضاحت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن علامہ یحییٰؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں جو راتیں ذکر کی گئی ہیں ان سے مراد ہے بائیسویں شب، چوبیسویں شب اور چھبیسویں شب۔

④ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اعْتَكَفَ الْعَشْرَ الْاَوَّلَ مِنْ رَمَضَانَ ثُمَّ اعْتَكَفَ الْعَشْرَ الْاَوْسَطَ فِي قُبَّةٍ تُرْكِيَّةٍ ثُمَّ اَطْلَعَ رَاْسَهٗ فَقَالَ اِنِّي اعْتَكَفْتُ الْعَشْرَ الْاَوَّلَ اَلْتَمِسُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ ثُمَّ اعْتَكَفْتُ الْعَشْرَ الْاَوْسَطَ ثُمَّ اُتِيْتُ فَقِيْلَ لِيْ اِنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ فَمَنْ كَانَ اعْتَكَفَ مَعِيَ فَلْيَعْتَكِفِ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ فَقَدْ اُرِيْتُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ ثُمَّ اُنْسِيْتُهَا وَقَدْ رَاَيْتُنِيْ اَسْجُدُ فِيْ مَاءٍ وَطِيْنٍ مِنْ صَبِيْحَتِهَا فَالْتَمِسُوْهَا فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ وَالْتَمِسُوْهَا فِيْ كُلِّ وِتْرٍ قَالَ فَمَطَرَتِ السَّمَاءُ تِلْكَ اللَّيْلَةَ وَكَانَ الْمَسْجِدُ عَلٰى عَرِيْشٍ فَوَكَفَ الْمَسْجِدُ فَبَصُرَتْ عَيْنَايَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى جَبْهَتِهٖ اَثَرُ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ مِنْ صَبِيْحَةِ اِحْدٰى وَعِشْرِيْنَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي الْمَعْنٰى وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ اِلٰى قَوْلِهٖ فَقِيْلَ لِيْ اِنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ وَالْبَاقِي

لِلْبُخَارِیِّ وَفِیْ رِوَایَةِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اُنَیْسٍ قَالَ لَیْلَةَ ثَلَاثٍ وَّعِشْرِیْنَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے رمضان کے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا پھر آپ ﷺ نے ایک ترکی خیمہ کے اندر درمیانی عشرہ میں اعتکاف کیا اس کے بعد آپ نے اپنا سر مبارک (خیمہ سے) باہر نکال کر فرمایا کہ میں نے شب قدر کو تلاش کرنے کے لئے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا، پھر میں نے درمیانی عشرہ میں اعتکاف کیا، اس کے بعد میرے پاس فرشتہ آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ میں آتی ہے لہٰذا جو شخص میرے ساتھ اعتکاف کرنا چاہے اسے چاہئے کہ وہ آخری عشرہ میں اعتکاف کرے، اور مجھے خواب میں شب قدر کو متعین کر کے بتایا گیا مگر بعد میں اسے میرے ذہن سے محو کر دیا گیا (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مجھے بتایا کہ فلاں رات شب قدر ہے مگر پھر میں بھول گیا، کہ انہوں نے کس رات کا تعین کیا تھا) اور میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا کہ میں اس کی صبح (یعنی لیلۃ القدر کی صبح کو) کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں اور چونکہ میں یہ بھول گیا ہوں کہ وہ کون سی رات تھی لہٰذا اسے (رمضان کے) آخری عشرہ میں تلاش کرو، نیز لیلۃ القدر کو طاق راتوں میں (یعنی آخری عشرہ کی طاق راتوں میں) تلاش کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ (جس رات کو آنحضرت ﷺ نے خواب دیکھا تھا) اس رات میں بارش ہوئی تھی اور چونکہ مسجد کی چھت کھجور کی شاخوں کی بنی ہوئی تھی اس لئے مسجد ٹپکی چنانچہ میری آنکھوں نے دیکھا کہ اکیسویں شب کی صبح کو آنحضرت ﷺ کی پیشانی پر پانی اور مٹی کا نشان تھا۔ اس حدیث کے نقل کے سلسلہ میں معنوی طور پر بخاری و مسلم دونوں متفق ہیں البتہ فَقِیْلَ لِیْ اَنَّھَا فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ تک اس روایت کے الفاظ تو مسلم نے نقل کئے ہیں اور روایت کے باقی الفاظ بخاری نے نقل کئے ہیں، نیز ایک دوسری روایت میں جو عبداللہ بن انیس سے منقول ہے (اکیسویں شب کی صبح کی بجائے) "تیئسویں شب کی صبح" کے الفاظ ہیں۔ اس روایت کو مسلم نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ترکی خیمہ" خیمہ کی ایک قسم کا نام تھا جو نمدہ سے بنتا تھا اور سائز میں چھوٹا ہوتا تھا اس خیمہ کو فارسی میں "خرگاہ" کہتے ہیں۔ روایت کے آخر میں لفظ من صبیحة میں من معنی کے اعتبار سے "فی" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے اور یہ بصرت کا متعلق ہے۔

بہر کیف روایت کے آخر میں راوی نے کچھ بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس رات میں لیلۃ القدر کو خواب میں دیکھا تھا تو آپ ﷺ نے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ میں لیلۃ القدر کی صبح کو پانی اور مٹی میں سجدہ کرتا ہوں چنانچہ اسی رات میں بارش ہوئی تھی، آپ ﷺ نے صبح کو جب مسجد میں نماز پڑھی تو اس حال میں سجدہ کیا کہ مسجد کی زمین پر چھت ٹپکنے کی وجہ سے پانی اور گارا تھا جس کا نشان آپ ﷺ کی پیشانی پر نمایاں تھا گویا راوی نے اس بارش کو آپ ﷺ کے خواب کی رات کی علامت قرار دیا اور چونکہ یہ واقعہ اکیسویں یا تیئسویں شب کا تھا اس لئے راوی نے اس علامت کے ذریعہ معلوم کیا کہ لیلۃ القدر اکیسویں یا تیئسویں شب ہے کیونکہ اسی شب میں آپ ﷺ نے لیلۃ القدر کو دیکھا۔

شب قدر کی ایک علامت

⑤ وَعَنْ زِرِّبْنِ حُبَیْشٍ قَالَ سَاَلْتُ اُبَیَّ بْنَ کَعْبٍ فَقُلْتُ اِنَّ اَخَاکَ ابْنَ مَسْعُوْدٍ یَقُوْلُ مَنْ یَقُمِ الْحَوْلَ یُصِبْ لَیْلَةَ الْقَدْرِ فَقَالَ رَحِمَهُ اللّٰہُ اَرَادَ اَنْ لَا یَتَّکِلَ النَّاسُ اَمَا اِنَّهُ قَدْ عَلِمَ اَنَّھَا فِیْ رَمَضَانَ وَاَنَّھَا فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ وَاَنَّھَا لَیْلَةُ سَبْعٍ وَّعِشْرِیْنَ ثُمَّ حَلَفَ لَا یَسْتَثْنِیْ اَنَّھَا لَیْلَةُ سَبْعٍ وَعِشْرِیْنَ فَقُلْتُ بِاَیِّ شَیْءٍ تَقُوْلُ ذٰلِکَ یَا اَبَا الْمُنْذِرِ قَالَ بِالْعَلَامَةِ اَوْ بِالْاٰیَةِ الَّتِیْ اَخْبَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّھَا تَطْلُعُ یَوْمَئِذٍ لَا شُعَاعَ لَھَا (رواہ مسلم)

"اور حضرت زر بن حبیش (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی بن کعب سے سوال کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے (دینی) بھائی حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ جو شخص تمام سال عبادت کے لئے شب بیداری کرے تو وہ شب قدر کو پالے گا؟ حضرت ابی بن کعب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ابن مسعود پر رحم کرے، انہوں نے یہ بات اس بناء پر کہی ہے کہ لوگ بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں ورنہ تو جہاں تک حقیقت کا

تعلق ہے ابن مسعودؓ جانتے تھے کہ شب قدر رمضان میں آتی ہے اور رمضان کے آخری عشرہ کی ایک رات شب قدر ہوتی ہے اور وہ رات ستائیسویں شب ہے، پھر ابن مسعودؓ نے ایسی قسم کھائی جس کے ساتھ انشاء اللہ نہ کہا کہ "بلاشبہ لیلۃ القدر ستائیسویں شب ہے" میں نے عرض کیا ابومنذرؓ! (یہ ابی بن کعب کی کنیت ہے) آپ یہ بات کس دلیل کی بنا پر کہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ اس علامت یا نشانی کی بناء پر جو ہمیں رسول کریم ﷺ نے بتائی ہے کہ اس رات کی صبح آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس میں روشنی نہیں ہوتی (چنانچہ میں نے دیکھا ہے کہ ستائیسویں شب کی صبح آفتاب طلوع ہوا تو اس میں روشنی نہیں تھی)۔" (مسلمؒ)

تشریح: ان لا یتکل الناس (تاکہ لوگ بھروسہ کرکے نہ بیٹھ جائیں) کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ قول صحیح ہے کہ لیلۃ القدر ستائیسویں شب ہے اور ظن غالب کے اعتبار سے اس پر فتویٰ بھی ہے مگر ابن مسعودؓ نے اس کو متعین اس لئے نہیں کیا کہ کہیں لوگ اس قول پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں اور یہ جان کر کہ لیلۃ القدر ستائیسویں شب ہی ہے صرف اسی رات میں عبادت کے لئے شب بیداری کریں اور بقیہ راتوں کی شب بیداری ترک کردیں چنانچہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ راتوں میں لوگوں کو شب بیداری کی طرف راغب کرنے کے لئے کہا کہ لیلۃ القدر سال کی کسی شب میں بھی آسکتی ہے۔

ستائیسویں شب کو لیلۃ القدر قرار دینے کے سلسلہ میں ابی بن کعبؓ کا قسم کھانا ظن غالب کی بنا پر تھا اسی لئے انہوں نے قسم کھاتے ہوئے انشاء اللہ نہیں کہا، کیونکہ اگر کوئی شخص قسم کھاتے ہوئے انشاء اللہ بھی کہہ دے تو نہ صرف یہ کہ قسم جزماً (یقینی) نہیں ہوتی بلکہ شرعی طور پر وہ منعقد بھی نہیں ہوتی، لہٰذا حضرت ابی ابن کعبؓ نے قسم کھائی اور انشاء اللہ نہیں کہا تاکہ قسم جزماً ہو۔

اس حدیث میں شب قدر کی ایک علامت بتائی گئی ہے اور وہ یہ کہ جس رات میں شب قدر ہوتی ہے اس کی صبح سورج جب طلوع ہوتا ہے تو کچھ دیر تک اس میں شعاعیں نہیں ہوتیں چنانچہ بعض ارباب نظر فرماتے ہیں کہ یہ علامت ایسی ہے جس کے واقع ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں مجاہدہ

(۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِيْ غَيْرِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں جس قدر ریاضت و مجاہدہ کرتے اتنا مجاہدہ اور کسی مہینہ میں نہیں کرتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت و اطاعت بہت زیادہ کرتے تھے کیونکہ اسی عشرہ میں لیلۃ القدر کی عظیم سعادت حاصل ہوتی ہے۔

(۷) وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ شَدَّ مِئْزَرَهٗ وَاَحْيٰى لَيْلَهٗ وَاَيْقَظَ اَهْلَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب (رمضان) کا آخری عشرہ آتا تو نبی کریم ﷺ اپنا تہبند مضبوط باندھتے، رات کو زندہ کرتے اور اپنے اہل و عیال کو جگاتے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "تہبند مضبوط باندھتے" یہ دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ آپ ﷺ آخری عشرہ میں اپنی عادت اور اپنے معمول سے بھی بہت زیادہ عبادت و مجاہدہ کیا کرتے تھے، یا یہ اس بات سے بھی کنایہ ہوسکتا ہے، کہ اس عشرہ میں آپ ﷺ اپنی عورتوں سے الگ رہتے تھے یعنی صحبت و مباشرت سے اجتناب فرماتے تھے۔

"رات کو زندہ کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ رات کے اکثر حصہ میں یا پوری رات نماز، ذکر اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے تھے۔ اس موقع پر یہ بات ملحوظ رہے کہ ایک روایت میں جو یہ منقول ہے کہ انَّهُ عَلَيْهِ السَّلَام ماسهر جميع الليل كله (آنحضرت ﷺ پوری رات شب بیداری نہیں فرماتے) تو اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ اکثر پوری رات شب بیداری نہیں فرماتے تھے، لہٰذا ایک دو رات یا دس راتیں پوری طرح شب بیداری میں گزار دینا اس روایت کے منافی نہیں ہے۔

"اور اپنے اہل و عیال کو جگاتے" یعنی آپ ﷺ اپنی ازواج مطہرات، صاحبزادیوں، لونڈیوں اور غلاموں کو آخری عشرہ کی بعض راتوں میں شب بیداری کی تلقین فرماتے اور انہیں عبادت خداوندی میں مشغول رکھتے تاکہ لیلۃ القدر کی سعادت انہیں بھی حاصل ہو جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

لیلۃ القدر کی دعا

(۸) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِنْ عَلِمْتُ اَیَّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدْرِ مَا اَقُوْلُ فِيْهَا قَالَ قُوْلِیْ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَصَحَّحَهٗ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ۔

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے بتائیے کہ اگر میں شب قدر کو پالوں، تو اس میں کیا دعا مانگوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ یہ دعا مانگو، اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے لہٰذا تو مجھے معاف فرما دے۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ، ترمذیؒ)

تشریح: علماء لکھتے ہیں کہ یہ دعا دنیا اور آخرت کی تمام خیر و بھلائی کے لئے جامع ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے معاملہ میں عفو و درگزر اور مغفرت و بخشش ہی وہ سب سے عظیم سعادت ہے جو ہر خیر و بھلائی کا نقطۂ عروج ہے چنانچہ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے۔ کہ بندہ کی طرف سے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی سوال طلب عافیت و بخشش سے افضل نہیں ہے۔

شب قدر کی راتیں

(۹) وَعَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِلْتَمِسُوْهَا يَعْنِیْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِیْ تِسْعٍ يَبْقَيْنَ اَوْ فِیْ سَبْعٍ يَبْقَيْنَ اَوْ فِیْ خَمْسٍ يَبْقَيْنَ اَوْ ثَلَاثٍ اَوْ اٰخِرِ لَيْلَةٍ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوبکرؓ راوی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شب قدر کو (رمضان کی) باقی ماندہ نویں رات (یعنی انتیسویں شب میں) تلاش کرو باقی ماندہ ساتویں رات (یعنی ستائیسویں شب) میں یا باقی ماندہ پانچویں رات (یعنی پچیسویں شب) میں یا باقی ماندہ تیسری رات (تئیسویں شب) میں اور یا آخری شب میں۔" (ترمذیؒ)

شب قدر رمضان میں آتی ہے

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ فَقَالَ هِیَ فِیْ كُلِّ رَمَضَانَ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَقَالَ رَوَاهُ سُفْيَانُ وَشُعْبَةُ عَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ مَوْقُوْفًا عَلَى ابْنِ عُمَرَ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے شب قدر کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ ہر رمضان میں آتی

ہے" امام ابوداؤدؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کو سفیان اور شعبہ نے ابی اسحٰق سے اور انہوں نے ابن عمرؓ سے موقوفاً نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ہر رمضان" کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ کوئی رمضان شب قدر سے خالی نہیں جاتا یعنی ہر سال جب رمضان آتا ہے تو اس میں شب قدر بھی آتی ہے، دوسرے معنی یہ ہیں کہ شب قدر رمضان کے پورے مہینہ میں کسی بھی رات میں آسکتی ہے، آخری عشرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے لیکن اس معنی کے پیش نظر یہ تاویل کی جائے گی کہ پہلے تو آنحضرت ﷺ کو یہی معلوم ہوا تھا کہ شب قدر پورے رمضان میں کسی بھی رات میں آسکتی ہے مگر بعد میں یہ ثابت ہو گیا کہ اس مقدس شب کا حامل صرف آخری عشرہ ہی ہے۔ آخری عشرہ کے علاوہ اور کسی حصہ میں شب قدر نہیں آتی۔

شب قدر تئیسویں شب

(۱۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اُنَيْسٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ بَادِيَةً اَكُوْنُ فِيْهَا وَاَنَا اُصَلِّيْ فِيْهَا بِحَمْدِ اللّٰهِ فَمُرْنِيْ بِلَيْلَةٍ اَنْزِلُهَا اِلٰى هٰذَا الْمَسْجِدِ فَقَالَ اَنْزِلْ لَيْلَةَ ثَلَاثٍ وَعِشْرِيْنَ قِيْلَ لِابْنِهٖ كَيْفَ كَانَ اَبُوْكَ يَصْنَعُ قَالَ كَانَ يَدْخُلُ الْمَسْجِدَ اِذَا صَلَّى الْعَصْرَ فَلَا يَخْرُجُ مِنْهُ لِحَاجَةٍ حَتّٰى يُصَلِّيَ الصُّبْحَ فَاِذَا صَلَّى الصُّبْحَ وَجَدَ دَابَّتَهٗ عَلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ فَجَلَسَ عَلَيْهَا وَلَحِقَ بِبَادِيَتِهٖ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن انیسؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا مکان جنگل میں ہے میں وہیں رہتا ہوں اور وہیں نماز پڑھتا ہوں خدا کا شکر ہے، لہٰذا آپ ﷺ مجھے اس رات کے بارہ میں بتائیے جس میں میں اس مسجد میں آؤں (یعنی بتائیے کہ شب قدر کون سی ہے تاکہ میں اس رات میں مسجد نبوی ﷺ آکر عبادت کروں) آپ ﷺ نے فرمایا (رمضان کی) تئیسویں شب میں آؤ (اس کے بعد حضرت عبداللہؓ کے صاحبزادے سے (کہ جن کا نام ضمرہ تھا) پوچھا گیا کہ اس سلسلہ میں آپ کے والد مکرم کا کیا معمول تھا، تو انہوں نے کہا کہ (رمضان کی بائیسویں تاریخ کو) میرے والد عصر کی نماز پڑھ کے مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوتے اور صبح کی نماز تک کسی بھی کام سے (جو اعتکاف کے منافی ہوتا) مسجد سے باہر نہ نکلتے چنانچہ جب فجر کی نماز پڑھ لیتے تو مسجد کے دروازے پر اپنی سواری کا جانور موجود پاتے اس پر سوار ہوتے اور اپنے جنگل میں چلے جاتے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس موقع پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس روایت سے لیلۃ القدر کا تعیّن لازم آتا ہے جب کہ وہ متعیّن نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کو جس سال یہ بات بتائی تھی اس سال لیلۃ القدر تئیسویں شب میں آئی ہوگی جس کا علم آنحضرت ﷺ کو ہو گیا چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے فرمادیا کہ تئیسویں شب میں مسجد نبوی میں آجانا مگر حضرت عبداللہؓ اس سے یہ سمجھے کہ شب قدر ہر سال اسی تاریخ میں آتی ہے۔ اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بھی شب قدر متعیّن طور پر معلوم نہیں تھی تو اس سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ہر سال کی شب قدر کی تعیّن معلوم نہیں تھی لہٰذا آپ ﷺ کو کبھی کبھی شب قدر کا متعیّن طور پر معلوم ہو جانا اس کے منافی نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت کو شب قدر کا علم اور اس کا نسیان

(۱۲) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُخْبِرَنَا بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ خَرَجْتُ لِاُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسٰى اَنْ يَكُوْنَ خَيْرًا لَّكُمْ

فَالْتَمِسُوْهَا فِي التَّاسِعَةِ وَالسَّابِعَةِ وَالْخَامِسَةِ (رواہ البخاری)

"حضرت عبادہ ابن صامتؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ باہر تشریف لائے تاکہ ہمیں شب قدر کے بارہ میں بتائیں کہ مسلمانوں میں سے دو شخص جھگڑنے لگے آپ ﷺ نے فرمایا میں باہر آیا تھا کہ تمہیں شب قدر کے بارہ میں بتاؤں (کہ وہ کون سی شب ہے) مگر فلاں اور فلاں جھگڑنے لگے۔ چنانچہ شب قدر کی تعیّن اٹھالی گئی، اور شاید تمہارے لئے یہی بہتر ہو۔ لہٰذا تم شب قدر کو انتیسویں، ستائیسویں اور پچیسویں شب میں تلاش کرو۔" (بخاریؒ)

تشریح: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ وہ دو اشخاص جو اس موقع پر جھگڑنے لگے تھے ان میں سے ایک کا نام عبداللہ ابن ابی حدرد اور دوسرے کا نام کعب ابن مالک تھا۔

"شب قدر کی تعیّن اٹھالی گئی" کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں اشخاص کے جھگڑنے کی وجہ سے شب قدر کے تعیّن کا علم میرے ذہن سے محو کر دیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ آپس میں جھگڑنا اور منافرت و دشمنی اختیار کرنا بہت بری بات ہے اس کی وجہ سے آدمی برکات اور بھلائیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

"شاید تمہارے لئے یہی بہتر ہوگا" کا مطلب یہ ہے شب قدر کے بارہ میں جو متعیّن طور پر مجھے بتادی گئی تھی اور اب وہ بھلادی گئی ہے اگر میں تمہیں بتادیتا تو تم لوگ صرف اسی شب پر بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے، اب اس کے تعیّن کا علم نہ ہونے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ تم لوگ اسے پانے میں بہت زیادہ سعی و کوشش کرو گے بلکہ عبادات و طاعت میں زیادتی بھی ہوگی جو ظاہر ہے کہ تمہارے حق میں بہتر ہی بہتر ہے۔

شب قدر کی فضیلت

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ نَزَلَ جِبْرِيْلُ فِيْ كَبْكَبَةٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ يُصَلُّوْنَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ اَوْقَاعِدٍ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدِهِمْ يَعْنِيْ يَوْمَ فِطْرِهِمْ بَاهٰى بِهِمْ مَلَائِكَتَهٗ فَقَالَ يَا مَلَائِكَتِيْ مَا جَزَاءُ اَجِيْرٍ وَفّٰى عَمَلَهٗ قَالُوا رَبَّنَا جَزَاؤُهٗ اَنْ يُوَفّٰى اَجْرُهٗ قَالَ مَلَائِكَتِيْ عَبِيْدِيْ وَاِمَائِيْ قَضَوْا فَرِيْضَتِيْ عَلَيْهِمْ ثُمَّ خَرَجُوْا يَعُجُّوْنَ اِلَى الدُّعَاءِ وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ وَكَرَمِيْ وَعُلُوِّيْ وَارْتِفَاعِ مَكَانِيْ لَاُجِيْبَنَّهُمْ فَيَقُوْلُ ارْجِعُوْا قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ وَبَدَّلْتُ سَيِّئَاتِكُمْ حَسَنَاتٍ قَالَ فَيَرْجِعُوْنَ مَغْفُوْرًا لَهُمْ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جب شب قدر آتی ہے تو (اس رات میں) حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی جماعت کے جلو میں اترتے ہیں اور ہر اس بندے کے لئے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو کھڑا ہوا (نماز پڑھتا، طواف کرتا یا اور کوئی عبادت کرتا) ہوتا ہے یا بیٹھا ہوا (اللہ عزوجل کی یاد اور اس کے ذکر میں مشغول) ہوتا ہے، پھر جب ان (مسلمانوں) کا عید (یعنی عید الفطر) کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کی وجہ سے اپنے (ان) فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے (جنہوں نے آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت بنی آدم کو مطعون کیا تھا) اور فرماتا ہے کہ "اے میرے فرشتو! اس مزدور کے لئے کیا اجر ہے جس نے اپنا کام پورا کر لیا ہو؟" فرشتے عرض کرتے ہیں کہ "اے ہمارے پروردگار اس کا اجر یہ ہے کہ اسے اس کے کام کی پوری پوری اجرت دی جائے! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فرشتو! (تو سنو کہ) میرے بندے اور میری بندیوں نے میرا وہ فرض ادا کیا جو ان پر تھا (یعنی روزہ) پھر وہ (اپنے گھروں سے عید گاہ کی طرف) دعا کے لئے گڑگڑاتے چلاتے نکلے، قسم ہے اپنی عزت اور اپنے جلال کی، اپنے کرم اور اپنی بلند قدری کی اور اپنی بلند مرتبہ کی، میں ان کی دعا ضرور قبول کروں گا، پھر اللہ تعالیٰ (بندوں سے) فرماتا ہے کہ وہ (اپنے گھروں کو) واپس ہو جاؤ میں نے تمہیں بخش دیا اور میں نے تمہاری برائیاں نیکیوں میں بدل دی ہیں تمہارے نامۂ اعمال میں ہر برائی کے بدلہ ایک نیکی لکھ دی گئی ہے "اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا چنانچہ

مسلمان عید گاہ سے اپنے گھروں کو اس حالت میں واپس ہوتے ہیں کہ ان کے گناہ بخشے جاچکے ہوتے ہیں۔" (بیہقی)

بَابُ الْاِعْتِكَافِ

اعتکاف کا بیان

لغوی طور پر اعتکاف کے معنی ہیں "ایک جگہ ٹھہرنا اور کسی مکان میں بند رہنا" اور اصطلاح شریعت میں اعتکاف کا مفہوم ہے "اللہ رب العزت کی رضاو خوشنودی کی خاطر اعتکاف کی نیت کے ساتھ کسی جماعت والی مسجد میں ٹھہرنا"۔

اعتکاف کے لئے نیت اسی مسلمان کی معتبر ہے جو عاقل ہو اور جنابت اور حیض و نفاس سے پاک و صاف ہو، رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنت مؤکدہ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں ہمیشہ اعتکاف فرماتے تھے، در مختار میں لکھا ہے سُنّت مؤکدہ علی الکفایہ ہے یعنی اگر ایک شخص بھی اعتکاف کرلے تو سب کی طرف سے حکم ادا ہوجاتا ہے اور اس صورت میں اعتکاف نہ کرنے والوں پر کوئی ملامت نہیں۔

اعتکاف کے لئے زبان سے نذر ماننے سے اعتکاف واجب ہوجاتا ہے خواہ فی الحال ہو جیسے کہ کوئی کہے میں اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے اوپر اتنے دنوں کا اعتکاف لازم کرتا ہوں، اور خواہ معلق ہو جیسے کوئی کہے کہ میں یہ نذر مانتا ہوں کہ اگر میرا کام ہوجائے گا تو میں اتنے دنوں اعتکاف کروں گا۔ گویا اعتکاف کی یہ دو قسمیں ہوئیں یعنی ایک تو سُنّت مؤکدہ جو رمضان کے آخری عشرہ میں ہے اور دوسرا واجب جس کا تعلق نذر سے ہے، ان دو قسموں کے علاوہ تیسری قسم "مستحب" ہے یعنی رمضان کے آخری عشرہ کے سوا اور کسی زمانہ میں خواہ رمضان کا پہلا، دوسرا عشرہ ہو یا اور کوئی مہینہ ہو اعتکاف کرنا مستحب ہے۔

اعتکاف مستحب کے لئے اکثر (زیادہ سے زیادہ) مدت کوئی مقدار متعین نہیں ہے، اگر کوئی شخص تمام عمر کے اعتکاف کی بھی نیت کرلے تو جائز ہے البتہ اقل "کم سے کم" مدت کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، امام محمدؒ کے نزدیک اعتکاف مستحب کے لئے کم سے کم مدت کی بھی کوئی مقدار متعین نہیں ہے، دن ورات کے کسی بھی حصہ میں ایک منٹ بلکہ اس سے بھی کم مدت کے لئے اعتکاف کی نیت کی جاسکتی ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ظاہری روایت بھی یہی ہے اور حنفیہ کے یہاں اسی قول پر فتویٰ ہے لہٰذا ہر مسلمان کے لئے مناسب ہے کہ وہ جب بھی مسجد میں داخل ہو، (خواہ نماز کے لئے یا اور کسی مقصد کے لئے) تو اس طرح اعتکاف کی نیت کرلے کہ "میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں جب تک کہ مسجد میں ہوں"۔

اسی طرح بلا کسی مشقت و محنت کے دن میں کئی مرتبہ اعتکاف کی سعادت و فضیلت حاصل ہوجایا کرے گی، حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اقل مدت دن کا اکثر حصہ یعنی نصف دن سے زیادہ ہے، نیز حضرت امام اعظمؒ کا ایک اور قول یہ ہے کہ اعتکاف کی اقل مدت ایک دن ہے، یہ قول حضرت امام اعظمؒ کی مذکورہ بالا ظاہری روایت کے علاوہ ہے جس پر فتویٰ نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عورتیں اپنے گھروں میں اعتکاف کریں

① عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ثُمَّ اعْتَكَفَ اَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهٖ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس

دنیا سے اٹھایا، پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات نے اعتکاف کیا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کی ازواج مطہرات اپنے گھروں میں اعتکاف کیا کرتی تھیں اسی لئے فقہائ نے لکھا ہے کہ عورتوں کے لئے مستحب ہے کہ وہ مسجد البیت (گھر کی مسجد) میں اعتکاف کریں اگر مسجد البیت نہ ہو تو مکان کے کسی حصہ کو مسجد قرار دے کر اس میں اعتکاف کریں بلاضرورت اس حصہ سے باہر نہ نکلیں، مکان کا وہ حصہ ہی ان کے حق میں مسجد کے حکم میں ہو جائے گا چنانچہ عورتوں کو مسجد میں اعتکاف کرنا مکروہ ہے۔

رمضان میں خیر و بھلائی میں اضافہ فرماتے

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَيْرِ وَكَانَ اَجْوَدُ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ كَانَ جِبْرِيْلُ يَلْقَاهُ كُلَّ لَيْلَةٍ فِيْ رَمَضَانَ يَعْرِضُ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْاٰنَ فَاِذَا لَقِيَهُ جِبْرِيْلُ كَانَ اَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ تمام لوگوں میں خیر و بھلائی کے معاملہ میں بہت سخی تھے اور (خصوصاً) رمضان میں تو بہت سخاوت کرتے تھے، رمضان کی ہر شب میں حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے پاس آتے اور آپ ﷺ ان کے سامنے (تجوید کے ساتھ) قرآن کریم پڑھتے چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات کے وقت آپ ﷺ کی سخاوت ہوا کے جھونکوں سے بھی بڑھ جاتی تھی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَيْرِ کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مخلوق خدا کو اوروں کی بہ نسبت بہت زیادہ نفع پہنچاتے تھے اور لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ بھلائی کرتے تھے خاص طور پر رمضان کے مقدس ماہ آپ ﷺ کا یہ وصف معمول سے بھی زیادہ عروج پر ہوتا تھا کیونکہ یہ ماہ "ایام برکت" ہیں ان میں ہر نیکی اور دنوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اجر و ثواب سے نوازی جاتی ہے۔

"ہوا کے جھونکوں" سے مراد وہ ہوا ہے جو بارش اور مینہ لے کر آتی ہے اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ بارش لانے والی ہوا کا نفع عام ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے مگر حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات کے وقت دوسروں کو نفع پہنچانے اور دوسروں کو بھلائی کا آپ ﷺ کا جذبہ اور آپ کا عمل اس ہوا سے بھی بڑھ جاتا تھا گویا یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ بابرکت اور افضل اوقات میں نیز مقدس و نیک لوگوں کو صحبت کے وقت انسان کو خیر و بھلائی کرنے میں زیادہ کوشش کرنی چاہئے۔

بظاہر یہ حدیث "باب الاعتکاف" سے متعلق نظر نہیں آتی لیکن اس باب میں اس حدیث کو اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ رمضان میں اعتکاف بھی کرتے تھے جو ایک بڑے درجہ کی نیکی ہے اور اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ رمضان میں بہت زیادہ نیکی و بھلائی کرتے تھے۔

رمضان میں حضرت جبرئیل کے ساتھ آنحضرت کا دور

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ يُعْرَضُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْاٰنُ كُلَّ عَامٍ مَرَّةً فَعُرِضَ عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ فِي الْعَامِ الَّذِيْ قُبِضَ وَكَانَ يَعْتَكِفُ كُلَّ عَامٍ عَشْرًا فَاعْتَكَفَ عِشْرِيْنَ فِي الْعَامِ الَّذِيْ قُبِضَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہر سال ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے سامنے قرآن کریم پڑھا جاتا تھا (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام پڑھتے تھے) لیکن جس سال کہ آنحضرت ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے آپ کے سامنے دو مرتبہ قرآن کریم پڑھا گیا، اسی طرح آنحضرت ﷺ ہر سال دس دن اعتکاف فرماتے تھے لیکن جس سال کہ آپ کا وصال ہوا آپ نے بیس دن اعتکاف کیا۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: اس سے پہلے کی حدیث سے تو معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سامنے قرآن پڑھا کرتے تھے اور یہ حدیث یہ بتا رہی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے سامنے قرآن پڑھتے تھے مگر ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ ایک مرتبہ تو حضرت جبرئیلؑ قرآن پڑھتے ہوں گے اور پھر اس کے بعد آنحضرت ﷺ حضرت جبرائیلؑ کے سامنے تلاوت فرماتے ہوں گے جیسا کہ دو حافظ دور کرتے (آپس میں ایک دوسرے کو قرآن سناتے) ہیں گویا اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ دور کرنا بھی سُنّت ہے۔

آپ نے اپنی زندگی کے آخری سال میں خلاف معمول دو مرتبہ قرآن کریم کا دور کیا اور بیس دن اعتکاف میں گزارے کیونکہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں حاضری کا وقت قریب تھا اور منزل شوق سامنے! پھر وہ عشق کی ساری بے تابیاں اور وصال محبوب کا شوق کچھ اور فزوں کیوں نہ ہو جاتا سچ کہا ہے کہنے والے نے ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

(محبوب سے ملاقات کا وعدہ جب پورا ہونے کو ہوتا ہے تو آتش شوق زیادہ سے زیادہ بھڑک اٹھتی ہے)۔

آپ ﷺ کے اس عمل میں اُمت کے لئے ایک لطیف انتباہ ہے کہ وہ ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں پہنچے تو نیکی و بھلائی کے راستہ پر معمول سے بھی زیادہ تیز گام ہو جائے اور اللہ رب العزت کی ملاقات اور اس کے سامنے اپنی پیشی کے لئے اطاعت و فرمانبرداری اور نیکو کاری کے ذریعہ پوری پوری تیاری کرے۔

آداب و شرائط اعتکاف

④ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِذَا اعْتَكَفَ اَدْنٰى اِلَيَّ رَأْسَهٗ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ فَأُرَجِّلُهٗ وَكَانَ لَا يَدْخُلُ الْبَيْتَ اِلَّا لِحَاجَةِ الْاِنْسَانِ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب اعتکاف کی حالت میں ہوتے تو مسجد میں بیٹھے بیٹھے اپنا سر مبارک میری طرف کر دیتے اور میں (آپ ﷺ کے بالوں میں) کنگھی کر دیتی نیز آپ ﷺ حاجت انسانی کے علاوہ گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر معتکف (اعتکاف کرنے والا) اپنا کوئی عضو مسجد سے باہر نکالے تو اس سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا نیز اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ معتکف کے لئے کنگھی کرنا جائز ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر معتکف اپنے جسم کا کوئی عضو مسجد کے اندر کسی برتن میں دھوئے تو کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس سے مسجد آلودہ نہ ہو۔

"حاجت انسانی" کے ضمن میں حضرت امام اعظمؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر معتکف (اعتکاف کرنے والا) بغیر حاجت (ضرورت) ایک منٹ کے لئے بھی معتکف (اعتکاف کی جگہ) سے نکلے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

"حاجت یا ضرورت" کی دو قسمیں ہیں اول طبعی جیسے پاخانہ پیشاب اور غسل جنابت (یعنی احتلام ہو جانے کی صورت میں غسل پاکی) البتہ جمعہ کے غسل کے بارہ میں کوئی صریح روایت منقول نہیں ہے مگر "شرح اوراد" میں لکھا ہے کہ غسل کے لئے معتکف سے باہر نکلنا جائز ہے غسل خواہ واجب ہو (جیسے غسل جنابت) یا نفل ہو (جیسے غسل جمعہ وغیرہ)۔

دوم "شرعی" جیسے نماز عیدین اور آذان، یعنی اگر اذان کہنے کی جگہ مسجد سے باہر ہو تو وہاں جانا بھی "حاجت" کے ضمن میں آتا ہے اس سے اعتکاف باطل نہیں ہو گا پھر یہ کہ صحیح روایت کے بموجب اس حکم میں مؤذن اور غیر مؤذن دونوں شامل ہیں نماز جمعہ کے لئے باہر نکلنا بھی "حاجت یا ضرورت" کے تحت آتا ہے۔

لیکن اس بارہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ نماز جمعہ کے لئے اپنے معتکف سے زوال آفتاب کے وقت نکلے یا اگر جامع مسجد دور ہو تو ایسے

وقت نکلے کہ جامع مسجد پہنچ کر جمعہ کی نماز تحیۃ المسجد جمعہ کی سُنت کے ساتھ پڑھ سکے، نماز کے بعد کی سُنت پڑھنے کے لئے جامع مسجد میں ٹھہرنا جائز ہے اور اگر کوئی شخص نماز سے زیادہ وقت کے لئے جامع مسجد میں ٹھہرے گا تو اگرچہ اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا مگر یہ مکروہ تنزیہی ہے اسی طرح اگر کسی معتکف کے ہاں خادم و ملازم وغیرہ نہ ہو تو کھانا کھانے یا کھانا لانے کے لئے گھر جانا بھی "ضرورت میں داخل ہے۔

اگر مسجد گرنے لگے، یا کوئی شخص زبردستی مسجد سے باہر نکالے اور معتکف اسی وقت اپنے معتکف سے نکل کر فوراً ہی کسی دوسری مسجد میں داخل ہو جائے تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا استحساناً (بدائع) ایسے ہی اگر کوئی معتکف جان یا مال کے خوف سے کسی دوسری مسجد میں چلا جائے تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔

کوئی معتکف پیشاب و پاخانہ یا اپنی کسی دوسری طبعی و شرعی ضرورت کے تحت معتکف سے باہر نکلا اور وہاں اس کے قرض خواہ مل گیا جس نے اسے ایک منٹ کے لئے بھی روک لیا تو حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا جب کہ صاحبینؒ حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ فاسد نہیں ہوگا۔

کوئی شخص پانی میں ڈوب رہا ہو یا کوئی آگ میں جل رہا ہو اور معتکف اسے بچانے کے لئے باہر نکلے یا جہاد کے لئے جب کہ نفیر عام ہو اور یا گواہی و شہادت دینے کے لئے اپنا معتکف چھوڑ کر باہر آجائے تو ان صورتوں میں اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ غرضیکہ طبعی و شرعی حاجت و ضرورت کے تحت مذکورہ بالا جو عذر بیان کیے گئے ہیں ان کے علاوہ اگر کوئی معتکف ایک منٹ کے لئے بھی باہر نکلے گا اگرچہ اس کا نکلنا سہواً ہی کیوں نہ ہو تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا البتہ صاحبینؒ کے ہاں اتنی آسانی ہے کہ اس کا اعتکاف اسی وقت فاسد ہوگا جب کہ وہ دن کا اکثر حصہ باہر نکلا رہے۔

مذکورہ بالا حدیث سے ایک مسئلہ یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ معتکف کے لئے مسجد میں حجامت بنوانی جائز ہے بشرطیکہ مسجد میں بال وغیرہ نہ گریں۔

بحالت جاہلیت مانی گئی نذر کو پورا کرنے کا مسئلہ

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ نَذَرْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ اَنْ اَعْتَكِفَ لَيْلَةً فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ قَالَ فَاَوْفِ بِنَذْرِكَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ، میں نے جاہلیت میں یہ نذر مانی تھی کہ ایک رات (اور ایک دن جیسا کہ دوسری روایت میں وضاحت ہے) مسجد حرام میں اعتکاف کروں گا (تو کیا وہ نذر پوری کرنی میرے لئے ضروری ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اپنی نذر پوری کرو"۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جاہلیت" اس حالت کو کہتے ہیں جس میں اہل عرب آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے تھے بعض حضرات کہتے ہیں کہ "جاہلیت" سے مراد وہ حالت ہے جو اسلام کی تبلیغ عام اور اس کے ظہور سے پہلے تھی، حاصل یہ کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت اور اسلام کے ظہور سے قبل عرب میں جو معاشرہ تھا اسے "جاہلیت" اور اس وقت جو دور تھا اسے "زمانہ جاہلیت" کہا جاتا ہے۔

ارشاد گرامی "اپنی نذر پوری کرو" میں یہ حکم بطور استحباب تھا اگر حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کرنے سے قبل نذر مانی تھی اور اگر اسلام قبول کرنے کے بعد یہ نذر مانی تھی تو پھر یہ حکم بطور وجوب تھا۔

علامہ طیبیؒ کے مطابق یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ "بحالت جاہلیت" مانی گئی نذر اگر اسلام کے احکام کے موافق ہوگی تو اسلام قبول کرنے کے بعد اس نذر کو پورا کرنا واجب ہوگا، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے مگر حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ

فرماتے ہیں کہ وہ نذر صحیح ہی نہیں ہوگی چہ جائیکہ اسلام کے بعد اس کا پورا کرنا ضروری ہو؟ امام اعظمؒ کی دلیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اس حدیث کے وہ ہی معنی مراد لیتے ہیں جو اوپر ذکر کئے گئے ہیں۔

اعتکاف واجب کے لئے روزہ شرط ہے

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کے صحیح ہونے کے لئے روزہ شرط نہیں ہے جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک بروایت ظاہریہ ہے کہ نفل اعتکاف کے لئے تو روزہ شرط نہیں ہے لیکن اعتکاف واجب کے لئے واجب ہے، صاحبینؒ کا بھی یہی قول ہے اور حنفیہ کے یہاں اسی پر فتوٰی ہے حضرت امام مالکؒ اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت امام اعظمؒ بھی یہ فرماتے ہیں کہ مطلقاً اعتکاف کے لئے روزہ شرط ہے خواہ واجب ہو یا نفل۔

حنفیہ کی طرف سے اس حدیث کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اعتکاف کے سلسلہ میں اس کے علاوہ جو اور روایتیں منقول ہیں ان میں اعتکاف کے ساتھ روزہ بھی ذکر ہے چنانچہ ابوداؤد نسائی اور دار قطنیؒ نے جو روایت نقل کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے "جاہلیت" میں اپنے اوپر یہ لازم کیا کہ ایک رات (اور ایک دن یا صرف ایک دن) کعبہ کے اندر اعتکاف کریں گے پھر جب انہوں نے اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اعتکاف کرو اور روزہ رکھو" یہ تو گویا اس حدیث کا جواب تھا جہاں تک حنفیہ کی دلیل کا تعلق ہے تو ابھی آگے حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث ولا اعتکاف الابصوم آرہی ہے جس سے یہ بات وضاحت کے ساتھ ثابت ہو جائے گی کہ اعتکاف واجب بغیر روزہ کے صحیح نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کوئی شخص نذر مان کر صرف رات کے اعتکاف کی نیت کرے تو وہ لغو سمجھی جائے گی کیونکہ رات روزے کا محل نہیں ہے ہاں اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ میں رمضان میں اعتکاف کروں گا تو رمضان کے روزے اعتکاف کے صحیح ہونے کے لئے کافی ہو جائیں گے، اسی طرح اگر کسی شخص نے نفل روزہ رکھا اور پھر اس دن اعتکاف کی نذر کی تو یہ صحیح نہیں ہوگا۔

اگر کسی شخص نے نذر مانی کہ فلاں رمضان میں اعتکاف کروں گا مگر اس نے اس متعین رمضان میں اعتکاف نہیں کیا تو اب اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ بطور قضا دوسرے دنوں میں اعتکاف کرے اور مستقل طور پر اعتکاف کے لئے روزے رکھے، چنانچہ یہ قضا نہ کسی دوسرے رمضان میں صحیح ہوگی اور نہ ایسے دنوں میں جس میں کوئی اور واجب روزہ رکھ رہا ہو خواہ وہ واجب روزے رمضان کے قضا روزے ہوں یا کسی اور طرح کے۔

اگر کوئی شخص کئی دنوں کے اعتکاف کی نیت کرے تو ان دنوں کی راتوں کا اعتکاف بھی لازم ہو جاتا ہے اسی طرح دو دنوں کے اعتکاف کی نذر ماننے سے ان کی دو راتوں کا اعتکاف بھی لازم ہو جاتا ہے لیکن حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں صرف ایک رات ہی کا اعتکاف لازم ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص نذر مانے کہ میں ایک مہینہ کا اعتکاف کروں گا تو اس پر ایک مہینہ کا اعتکاف علی الاتصال لازم ہوگا، چاہے اس نے نذر مانتے وقت "علی الاتصال" نہ کہا ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

سُنّت مؤکدہ کی قضا

(٦) عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعْتَکِفُ فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ فَلَمْ یَعْتَکِفْ عَامًا فَلَمَّا کَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ اعْتَکَفَ عِشْرِیْنَ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَابْنُ مَاجَۃَ عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے، ایک سال (غالباً کسی عذر کی بناء پر) آپ نے اعتکاف نہیں کیا، جب دوسرا سال آیا تو آپ ﷺ نے (اس رمضان میں) بیس دن اعتکاف کیا (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو ابی بن کعب سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: غالباً یہ حدیث اس گزشتہ روایت کی وضاحت ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری سال میں بیس دن اعتکاف فرمایا علامہ طیبیؒ کے مطابق یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر سُنّت مؤکدہ فوت ہو جائیں تو ان کی بھی قضا کی جائے جیسا کہ فرائض کی قضا کی جاتی ہے، لیکن اس بارہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ تشبیہ صرف "قضا" کے بارہ میں ہے ورنہ تو فرائض کی قضا بھی فرض ہے اور سنن مؤکدہ کی قضا سُنّت ہے فرض یا واجب نہیں ہے۔

اعتکاف کی ابتداء

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَعْتَكِفَ صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ فِيْ مُعْتَكَفِهِ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ فرماتے تو فجر کی نماز پڑھتے اس کے بعد اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جاتے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: امام اوزاعیؒ اور امام ثوریؒ نے اس حدیث کو اپنے اس مسلک کی دلیل قرار دیا ہے کہ اعتکاف کی ابتداء دن کے ابتدائی حصہ سے ہونی چاہئے جب کہ چاروں ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مہینہ یا ایک عشرہ وغیرہ کا اعتکاف کرے تو اعتکاف کی ابتداء دن کے آخر حصہ یعنی غروب آفتاب سے پہلے کرے اور اعتکاف کے آخری دن غروب آفتاب کے بعد اعتکاف سے باہر آئے اس لئے اس حدیث کی تاویل کی جاتی ہے، کہ آنحضرت ﷺ اعتکاف کی نیت کے ساتھ غروب آفتاب سے پہلے مسجد میں آجاتے تھے، رات بھر مسجد میں رہتے اس کے بعد جب فجر کی نماز پڑھ لیتے تو مسجد کے اس حصہ میں داخل ہو جاتے جو بوریے وغیرہ سے گھیر کر ایک حجرہ کی شکل میں بنا دیا جاتا تھا تاکہ لوگوں سے الگ رہیں، لہٰذا آپ ﷺ کے اعتکاف کی ابتداء تو مغرب کے وقت ہی سے ہوتی تھی، اور معتکف میں صبح کو داخل ہوتے تھے۔

اعتکاف کی حالت میں مریض کی عیادت

⑧ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُ الْمَرِيْضَ وَهُوَ مُعْتَكِفٌ فَيَمُرُّ كَمَا هُوَ فَلَا يُعَرِّجُ يَسْأَلُ عَنْهُ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اعتکاف کی حالت میں (جب حاجت کے لئے باہر نکلتے) تو مریض کی عیادت فرماتے (جو مسجد سے باہر کسی جگہ ہوتا) چنانچہ آپ ﷺ جس طرح ہوتے ویسے ہی گزرتے اس کے پاس ٹھہرتے نہیں تھے (صرف) اس کو پوچھ لیتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "آپ ﷺ جس طرح ہوتے ویسے ہی گزرتے" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ جس ہیئت کذائی پر ہوتے اسی طرح مریض کے پاس سے گزر جاتے نہ تو آپ ﷺ کسی اور طرف میلان کرتے تھے اور نہ ٹھہرتے تھے بلکہ سیدھے پوچھتے ہوئے چلے جاتے تھے۔

لفظ فَلَا یُعَرِّجُ ماقبل کے اجمال کی وضاحت ہے چنانچہ اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو آپ ﷺ مریض کے پاس ٹھہرتے اور نہ اپنے راستہ سے ہٹ کر کسی اور طرف متوجہ ہوتے۔ اسی طرح لفظ یسال بطریق استیناف بیان ہے لفظ یعود کا۔

حسنؒ اور نخعیؒ کہتے ہیں کہ نماز جمعہ اور کسی مریض کی عیادت کے لئے معتکف سے نکلنا جائز ہے۔ مگر چاروں ائمہ کے یہاں اس سلسلہ میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی طبعی یا شرعی ضرورت کے لئے باہر نکلے اور اس درمیان میں خواہ ضرورت رفع ہونے سے پہلے یا اس کے بعد کسی مریض کی عیادت کرے یا نماز جنازہ میں شریک ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ ان امور کے وقت نہ تو اپنے راستہ سے جدا ہو اور نہ نماز سے زیادہ ٹھہرے، اگر ان امور کے لئے اپنا راستہ چھوڑ دے گا یا نماز سے زیادہ ٹھہرے گا تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔

اسی طرح بطور خاص صرف عیادت کے لئے یا نماز جنازہ کے لئے اپنے معتکف سے باہر نکلے گا تو اعتکاف ختم ہو جائے گا ہاں اگر کسی شخص نے اعتکاف کی نذر کو اس التزام کے ساتھ مشروط کیا ہو کہ میں اعتکاف کی حالت میں مریض کی عیادت، نماز جنازہ میں شرکت اور مجلس وعظ و نصیحت میں حاضری کے لئے اپنے معتکف سے نکلا کروں گا تو یہ جائز ہوگا۔

اعتکاف کے آداب

(۹) وَعَنْهَا قَالَتِ السُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ اَنْ لَا يَعُوْدَ مَرِيْضًا وَلَا يَشْهَدَ جَنَازَةً وَلَا يَمَسَّ الْمَرْأَةَ وَلَا يُبَاشِرَهَا وَلَا يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ اِلَّا لِمَا لَا بُدَّ مِنْهُ وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا بِصَوْمٍ وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا فِيْ مَسْجِدٍ جَامِعٍ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اعتکاف کرنے والے کے لئے یہ سُنّت (یعنی ضروری) ہے کہ وہ نہ تو (بالقصد اور ٹھہر کر) مریض کی عیادت کرے اور نہ (مسجد سے باہر مطلقاً) نماز جنازہ میں شریک ہو نیز نہ عورت سے صحبت کرے نہ عورت سے مباشرت کرے اور نہ علاوہ ضروریات کے (مثلاً پیشاب و پاخانہ کے علاوہ) کسی دوسرے کام سے باہر نکلے اور روزہ اعتکاف کے لئے ضروری ہے اور اعتکاف مسجد جامع ہی میں صحیح ہوتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "مباشرت" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو جماع کا ذریعہ اور باعث بنتی ہیں جیسے بوسہ لینا، بدن سے لپٹانا اور اسی قسم کی دوسری حرکات۔ لہٰذا ہم بستری اور مباشرت معتکف کے لئے حرام ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ہمبستری سے اعتکاف باطل بھی ہو جاتا ہے، خواہ عمداً کی جائے، یا سہوا اور خواہ دن میں ہو یا رات میں، جب کہ مباشرت سے اعتکاف اسی وقت باطل ہوگا جب کہ انزال ہو جائے گا اگر انزال نہیں ہوگا تو اعتکاف باطل نہیں ہوگا۔

معتکف کے لئے مسجد میں کھانا پینا اور سونا جائز ہے اسی طرح خرید و فروخت بھی جائز ہے بشرطیکہ اشیاء خرید و فروخت مسجد میں نہ لائی جائیں کیونکہ اشیاء خرید و فروخت کو مسجد میں لانا مکروہ تحریمی ہے نیز یہ کہ معتکف خرید و فروخت صرف اپنی ذات یا اپنے اہل و عیال کی ضرورت کے لئے کرے گا تو جائز ہوگا اور اگر تجارت وغیرہ کے لئے کرے گا تو جائز نہیں ہوگا۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ مسجد میں خرید و فروخت غیر معتکف کے لئے کسی بھی طرح جائز نہیں ہے حالت اعتکاف میں بالکل چپ بیٹھنا بھی مکروہ تحریمی ہے جب کہ معتکف مکمل خاموشی کو عبادت جانے، ہاں بری باتیں زبان سے نہ نکالے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے بلکہ قرآن مجید کی تلاوت نیک کام، حدیث و تفسیر اور انبیاء و صالحین کے سوانح پر مشتمل کتابیں یا دوسرے دینی لٹریچر کے مطالعہ، خدا تعالیٰ کے ذکر یا کسی دینی علم کے پڑھنے پڑھانے اور تصنیف و تالیف میں اپنے اوقات صرف کر دے۔

حاصل یہ ہے کہ چپ بیٹھنا کوئی عبادت نہیں ہے مباح کلام و گفتگو بھی بلا ضرورت مکروہ ہے اور اگر ضرورت کے تحت ہو تو وہ خیر میں داخل ہے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ مسجد میں بے ضرورت کلام کرنا حسنات کو اس طرح کھا جاتا ہے (یعنی نیست و نابود کر دیتا ہے) جیسے آگ خشک لکڑیوں کو۔

حدیث کے الفاظ "اعتکاف کے لئے روزہ ضروری ہے" یہ بات وضاحت کے ساتھ ثابت ہوگئی کہ اعتکاف بغیر روزہ کے صحیح نہیں ہوتا چنانچہ اس بارہ میں حنفیہ کے مسلک کی دلیل یہی حدیث ہے "مسجد جامع" سے مراد وہ مسجد ہے جس میں لوگ باجماعت نماز پڑھتے

ہوں چنانچہ حضرت امام اعظمؒ سے منقول ہے کہ اعتکاف اسی مسجد میں صحیح ہوتا ہے جس میں پانچوں وقت کی نمازیں جماعت سے پڑھی جاتی ہوں، امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور صاحبین کے نزدیک ہر مسجد میں اعتکاف درست ہے۔ اگر "مسجد جامع" سے جمعہ مسجد مراد لی جائے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اعتکاف جمعہ مسجد میں افضل ہے، چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ افضل اعتکاف وہ ہے جو مسجد حرام میں ہو پھر وہ مسجد نبوی میں ہو پھر وہ مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس میں ہو پھر وہ جامع مسجد میں ہو پھر وہ جو اس مسجد میں ہو جس میں نمازی بہت ہوں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت کا معتکف

⑩ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا اعْتَكَفَ طُرِحَ لَهٗ فِرَاشُهٗ اَوْيُوْضَعُ لَهٗ سَرِيْرُهٗ وَرَاءَ اُسْطُوَانَةِ التَّوْبَةِ (رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت ابن عمرؓ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف فرماتے تو آپ ﷺ کے لئے (مسجد نبوی میں) ستون توبہ کے آگے یا پیچھے آپ کا بچھونا بچھایا جاتا تھا یا آپ ﷺ کی چارپائی رکھ دی جاتی تھی۔" (ابن ماجہ)

تشریح: مسجد نبوی کے ستونوں میں سے ایک ستون کا نام ہے "ستون توبہ" اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک صحابی حضرت ابولبابہ انصاریؓ سے ایک تقصیر ہو گئی تھی جس کی بناء پر انہوں نے اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ دیا اور کئی دن تک اسی طرح بندھے رہے اس کے بعد جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے ان کو اس ستون سے کھولا۔

معتکف کے لئے اجر

⑪ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي الْمُعْتَكِفِ هُوَ يَعْتَكِفُ الذُّنُوْبَ وَيُجْرٰى لَهٗ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اعتکاف کرنے والے کے بارہ میں فرمایا کہ وہ گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے لئے نیکیوں کا سلسلہ تمام نیکی کرنے والوں کی مانند جاری رہتا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "گناہوں سے محفوظ رہتا ہے" یعنی جو شخص اعلی اور نیک مقاصد (مثلاً اعتکاف کی نیت) کے لئے مسجد میں ٹھہرا رہتا ہے، اس کی شان یہ ہے کہ وہ اکثر گناہوں سے بچا رہتا ہے۔ لفظ یجری راء مہملہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ صیغہ معروف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اعتکاف کی حالت میں ہوتا ہے اور وہ اس اعتکاف کی وجہ سے جن نیک اعمال مثلاً عیادت اور نماز جنازہ وغیرہ سے باز رہتا ہے، تو اس کے لئے ان نیک اعمال کے ثواب کے سلسلہ جاری کر دیا جاتا ہے جس طرح ان نیکیوں کے کرنے والوں کے لئے۔" اور مشکوٰۃ کے ایک صحیح نسخہ میں یہ لفظ راء معجمہ کے ساتھ بصیغہ معروف یعنی یَجْزِیْ منقول ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اعتکاف کرنے والا اپنے اعتکاف کی وجہ سے جن نیک اعمال مثلاً عیادت مریض، نماز جنازہ، کے ساتھ جانا مسلمانوں کے ساتھ ملاقات و نیک معاملات یا اسی قسم کے دوسرے امور تو اسے ان نیک اعمال کا اسی طرح ثواب دیا جاتا ہے جس طرح ان اعمال کے کرنے والوں کو"۔ بہر کیف صرف الفاظ کا فرق ہے ورنہ تو جہاں تک معنی کا تعلق ہے مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔ اعتکاف کے فوائد و برکات یہ ہیں کہ معتکف کا دل امور دنیا کی غلاظت سے پاک رہتا ہے۔ وہ اپنا نفس اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے مسلسل عبادت اور خانۂ خدا میں رہتا ہے اللہ کا قرب اسے بہت زیادہ حاصل ہوتا ہے اور رحمت الٰہی اس پر نازل ہوتی رہتی ہے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قلعہ اور اس کی پناہ میں

رہتا ہے کہ شیطان کے مکرو فریب سے بچا رہتا ہے۔

معتکف کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بادشاہ کے دروازے پر پڑ جائے اور اپنی درخواست حاجت پیش کرتا رہے اسی طرح معتکف بھی گویا زبان حال سے کہتا ہے کہ "اے میرے مولیٰ، اے میرے پروردگار! میں تیرے دروازہ پر پڑا ہوں یہاں سے اس وقت ٹلوں گا نہیں جب تک کہ تو میری بخشش نہیں کرے گا، میرے مقاصد پورے نہیں کرے گا اور میرے دینی و دنیاوی غم و آلام دور نہیں کرے گا۔

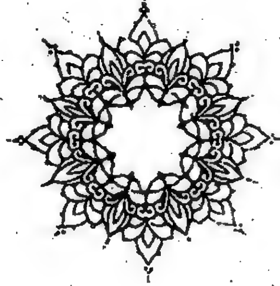

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب فضائل القران

قرآن کے فضائل کا بیان

قرآن مجید کیا ہے؟ یہ وہ سب سے مقدس اور سب سے عظیم کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کاروان انسانیت کے سب سے آخری اور سب سے عظیم راہنما رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئی جو ظلم وجہل کی تاریکیوں میں مینارۂ نور، کفروشرک کے تابوت کی آخری کیل اور پوری انسانی برادری کے لئے خدا کی طرف سے اتارا ہوا سب سے آخری اور سب سے جامع قانون ہے۔ اور جسے "حبل متین" کہا گیا ہے۔

قرآن مجید کی عظمت و بزرگی اور اس کی فضیلت و رفعت کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ وہ خداوند عالم، مالک ارض و سماء اور خالق لوح و قلم کا کلام ہے تمام عیوب اور تمام نقائص سے بری اور پاک ہے، فصاحت وبلاغت کا وہ آخری نقطہ عروج کہ بڑے بڑے عرب فصیح و بلیغ اس کے سامنے طفل مکتب علوم و معارف اور فکر و دانش کا وہ کوہ ہمالہ کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکر، فلسفی، دانشور اور ارباب فکر و نظر اس سے سر ٹکرائیں۔

قرآن مجید کی تلاوت اور پڑھنے پڑھانے کا ثواب محتاج بیان نہیں، تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ کوئی ذکر، تلاوتِ کلام مجید سے زیادہ ثواب نہیں رکھتا، خصوصاً نماز میں اس کی قرأت کا ثواب اور اس کی فضیلت اتنی ہے کہ وہ دائرہ تحریر سے باہر ہے، قرآن کریم کی تلاوت کے وقت اس کے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں اور نماز میں اس کی قرأت کے وقت اس کے ہر حرف کے عوض پچیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

قرآن کا پڑھنا بندہ کو خدا کا قرب بخشتا ہے، قلب کو عرفان الٰہی اور ذکر اللہ کے نور سے روشن کرتا ہے اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کرے گا۔

تلاوت قرآن کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ تفکر اور تذکر یعنی امور دین کو دلانے اور آخرت کی طرف توجہ کا باعث ہو اور کثرت تلاوت کی وجہ سے احکام الٰہی یاد اور مستحضر ہوں تاکہ احکام الٰہی پر عمل کیا جائے اور عبرت حاصل کی جائے "تلاوت" کا یہ مقصد نہیں کہ محض آواز و حروف کو آراستہ کیا جائے اور دل غفلت کے اندھیروں میں پڑا رہے، چنانچہ جو شخص قرآن پڑھے مگر اس پر عمل نہ کرے تو قرآن ایسے شخص کا دشمن ہوتا ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے کیونکہ قرآن صرف پڑھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنا ہے اور جو شخص قرآن پڑھتا تو ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا وہ گویا قرآن کی اہانت کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن پڑھنا اور اس پر عمل کرنا اس کے حق میں آخرت کے نقصان و خسران کی دلیل ہوگا۔

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ تفکر و تذکر اور فہم معانی اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ آہستگی، وقار، ترتیل اور حضور دل کے ساتھ قرآن پڑھا جائے اسی لئے قرآن کی تجوید لازم ہے اور قرآن کا کم پڑھنا مشروع ہوا ہے چنانچہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ قرآن کے حق کی ادائیگی کے لئے یہ کافی ہے کہ چالیس دن میں ایک قرآن ختم کیا جائے، بلکہ ایک سال میں قرآن ختم کرنا بھی کافی ہے، نیز عبادت (مثلاً تراویح وغیرہ) میں بھی ایک قرآن کم سے کم سات دن میں ختم کرنا چاہئے اور جس قدر اس سے زیادہ عرصہ میں ختم کرے افضل ہے۔

جو شخص عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے قرآن کے معانی نہ جانتا ہو اس کو بھی چاہئے کہ وہ حضور دل کے ساتھ قرآن کی تلاوت شروع کرے اور اپنے ذہن میں یہ خیال جمائے کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کے وہ احکام ہیں جو اس نے دنیا پر نازل فرمائے ہیں، نیز وہ اس عاجزی اور فروتنی کے ساتھ بیٹھ کر تلاوت کرے گا کہ گویا وہ قرآن پڑھ نہیں رہا ہے بلکہ احکم الحاکمین کا کلام براہ راست سن رہا ہے۔

آداب تلاوت: قرآن کریم اللہ رب العزت کا براہ راست کلام اور بارگاہ الوہیت سے اترے ہوئے الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اس کلام کی نسبت جس ذات کی طرف ہے وہ حاکموں کا حاکم، بادشاہوں کا بادشاہ اور پوری کائنات کا بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ لہٰذا اس کی تلاوت کے وقت وہی آداب ملحوظ ہونے چاہئیں جو کلام اور صاحب کلام کی عظمت شان کے مطابق ہوں، اس لئے مناسب ہے کہ اس موقع پر "آداب تلاوت" کا ذکر وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔

سب سے پہلے مسواک کے ساتھ وضو کیجئے اس کے بعد کسی اچھی جگہ متواضع اور رو بقبلہ بیٹھے اپنے آپ کو کمتر و ذلیل اور عاجز جان کر اور قلب و دماغ کو حضور کے ساتھ بیٹھئے کہ گویا اللہ رب العزت کے سامنے بیٹھ کر عرض و نیاز اور التجا کر رہے ہیں پھر اعوذ باللّٰہِ اور بسم اللّٰہ پڑھ کر تلاوت کیجئے، دل میں یہ تصور جمائیے کہ میں خدا کا کلام بغیر کسی واسطہ کے سن رہا ہوں، قرآن کی آیتوں کو آہستہ آہستہ تدبر، تفکر اور ترتیل کے ساتھ پڑھئے۔ جہاں بندوں کے حق میں وعدہ و رحمت کی آیت آئے تو تسبیح کیجئے، جہاد و عید و عذاب کے متعلق آیت آئے خدا سے پناہ مانگئے، جب اللہ رب العزت کی تنزیہ اور تقدیس پر مشتمل آیت آئے تو تسبیح کیجئے، یعنی جس آیت میں اللہ کی پاکی اور اس کی بڑائی و بزرگی کا بیان ہو اسے پڑھ کر سبحان اللہ کہئے، تلاوت کے درمیان الحاح و زاری اختیار کیجئے اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بنا لیجئے۔ حاصل یہ کہ تلاوت قرآن گویا بارگاہ الوہیت میں حاضری کا وقت ہے اس لئے اس موقع پر اللہ رب العزت کی عظمت و رفعت کے احساس سے اپنے اوپر مکمل عاجزی، ذلت اور فروتنی طاری کیجئے، اس بات کی کوشش نہ کیجئے کہ قرآن جلد ختم ہو اور اس کی وجہ سے تیز تیز پڑھنا شروع کر دیا جائے کیونکہ غور و فکر کے ساتھ کم پڑھنا آداب تلاوت کا لحاظ کئے بغیر زیادہ پڑھنے سے بہتر ہے۔ پھر یہ کہ زیادہ سے زیادہ پڑھنے سے ختم شماری کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ امر ممنوع ہے لہٰذا آج کل جو یہ رسم چل گئی ہے کہ لوگ پورا قرآن ایک دن میں ختم کرنے یا زیادہ تیز پڑھنے کو فخر یا کمال کی بات سمجھتے ہیں۔ یہ نہایت بری اور غفلت و نادانی کی بات ہے ؎

خواجہ پندارد کہ طاعت می کند   بے خبر کز معصیت جان می کند

بعض بزرگوں سے جو زیادہ سے زیادہ پڑھنا ثابت ہے تو وہ ان کی کرامت ہے اس بارہ میں ان کی پیروی نہ کیجئے، حاصل یہ کہ تدبر، ذوق، حضور قلب اور آداب تلاوت کی رعایت کے ساتھ جس قدر بھی تلاوت کر پائیں اسی کو غنیمت سمجھئے۔

جس مجلس میں لوگ کسی دوسرے کام میں مشغول ہوں یا شور و غوغا ہو وہاں تلاوت نہ کیجئے۔ ہاں اگر تلاوت ضروری ہی ہو اور کوئی دوسری جگہ میسر نہ ہو تو تلاوت کیجئے، مگر آہستہ آواز کے ساتھ، البتہ اگر لوگ تلاوت سننے کے مشتاق ہوں اور خاموش و پر سکون ہوں تو باآواز بلند تلاوت افضل ہوگی کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ تلاوت سننے والا اور تلاوت کرنے والا دونوں اجر و ثواب میں یکساں شریک ہیں۔ اسی طرح مصحف (قرآن) میں دیکھ کر پڑھنا بغیر دیکھے پڑھنے سے افضل ہے کیونکہ اس طرح آنکھیں اور دوسرے اعصاب بھی عبادت میں شریک ہوتے ہیں اور حضور قلب بھی زیادہ میسر ہوتا ہے۔

قرآن کریم کو رحل یا کسی دوسری بلند چیز (مثلاً تکیہ) پر رکھئے تاکہ قرآن کی تعظیم و تکریم آشکارا ہو، تلاوت کے دوران دنیوی کلام و گفتگو، کھانے پینے اور دوسرے سب کاموں سے باز رہئے۔ اگر کوئی ضرورت پیش آ جائے تو قرآن کو بند کر کے کلام و گفتگو کیجئے اس کے بعد پھر اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر تلاوت شروع کیجئے، غلط پڑھنے سے احتراز کیجئے۔ ترتیل و تجوید کے ساتھ بے تکلف اور بے ساختہ پڑھئے۔ غلط طریقہ سے آواز و لہجہ بنانے کی ضرورت نہیں، تلاوت کے وقت کسی کی تعظیم نہ کیجئے۔ ہاں اگر عالم باعمل، استاد یا والدین کے لئے کھڑے

ہو جانا اور ان کی تعظیم جائز ہے۔ جب قرآن ختم ہونے کو ہو تو اپنے عزیز و اقارب اور محبین و متعلقین کو جمع کیجئے۔ ان کی مجلس میں قرآن ختم کیجئے۔ اور ان سب کو دعا میں شامل کیجئے۔ کیونکہ وہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے۔ قرآن ختم کرنے کے بعد پھر سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ مُفْلِحُوْنَ تک پڑھ کر قرآن بند کیجئے کیونکہ یہ افضل ہے۔

تکیہ لگا کر یا لیٹ کر قرآن پڑھنا اگرچہ جائز ہے لیکن افضل یہی ہے کہ مودب بیٹھ کر پڑھا جائے، اسی طرح راستہ چلتے قرآن پڑھنا جائز ہے اگر جنگل ہو تو باآواز بلند پڑھا جائے ورنہ بصورت دیگر باآواز آہستہ نجس اور مکروہ جگہوں مثلاً حمام اور کمیلے وغیرہ میں قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔

قرآن کی تقطیع بہت چھوٹی نہ رکھی جائے اور نہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے متفرق کیا جائے تاکہ اس کے احترام و عظمت میں کمی واقع نہ ہو ہاں ضرورت کے تحت مثلاً بچوں کے پڑھنے کے لئے یا کسی مناسب آسانی و سہولت کے پیش نظر پارہ پارہ یا ہفت سورہ وغیرہ کی شکل میں کرنا جائز ہے۔

قرآن کو ایسے لشکر میں لے جانا جہاں "امن" پر اعتماد نہ ہو مناسب نہیں ہے اسی طرح دار الحرب میں بھی قرآن نہ لے جانا چاہئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ کافروں کے ہاتھ میں پڑ جائے اور وہ اس کی بے حرمتی کریں۔

قرآن کی اتنی آیتوں کا یاد کرنا کہ جن سے نماز ہو جائے ہر مسلمان پر عین فرض ہے اور پورا قرآن شریف یاد کرنا فرض کفایہ ہے کہ اگر ایک شخص حفظ کرے تو سب کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ اور کوئی ایک سورۃ یاد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے اور باقی قرآن کا یاد کرنا اور اس کے احکام کو جاننا اور سیکھنا نفل نماز سے اولیٰ ہے۔

مصحف کی طرف پاؤں پھیلانے مکروہ نہیں بشرطیکہ وہ پاؤں کے برابر نہ ہو، اسی طرح مصحف اگر کھونٹی پر لٹکا ہوا ہو یا طاق میں رکھا ہوا ہو تو ادھر پاؤں پھیلانے مکروہ نہیں ہے۔

سفر میں حفاظت کی خاطر مصحف کو خرجی (بیگ زنبیل اور جھولا) میں رکھ کر اس پر سوار ہونا یا تکیہ کے نیچے رکھ کر سونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، جس مکان میں یا کمرہ میں مصحف رکھا ہو اس میں جماع کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جب قرآن شروع ہو تو پہلے یہ دعاء پڑھئے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَشْھَدُ اَنَّ ھٰذَا کِتَابُكَ الْمُنَزَّلُ مِنْ عِنْدِكَ عَلٰی رَسُوْلِكَ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَکَلَامُكَ النَّاطِقُ عَلٰی لِسَانِ نَبِیِّكَ جَعَلْتَہٗ ھَادِیًا مِّنْكَ لِخَلْقِكَ وَحَبْلًا مُّتَّصِلًا فِیْمَا بَیْنَكَ وَبَیْنَ عِبَادِكَ اَللّٰھُمَّ فَاجْعَلْ نَظَرِیْ فِیْہِ عِبَادَةً وَّقِرَاءَتِیْ فِکْرًا وَّفِکْرِیْ فِیْہِ اِعْتِبَارًا اِنَّكَ اَنْتَ الرَّءُوْفُ الرَّحِیْمُ رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنَ۔

"اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری یہ کتاب تیری طرف سے تیرے رسول پر اتاری گئی ہے۔ جن کا نام نامی محمد ابن عبداللہ ہے، رحمت ہو اللہ کی ان پر، ان کی اولاد پر، ان کے اصحاب پر اور ان کے تمام تابعداروں پر اور میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ تیرا کلام ناطق ہے تیرے رسول کی زبان پر، اس کلام کو تو نے اپنی طرف سے اپنی مخلوق کے لئے ہدایت کرنے والا بنایا ہے اور اس کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان واسطہ متصل بنایا ہے۔ لہٰذا اے اللہ! تو میری نظر کو اس میں عبادت گزار میری قرأت کو اس میں بافکر اور میرے بافکر کو اس میں عبرت پذیر بنا، بلاشبہ تیری ذات بڑی مہربان ہے اور تو بڑا رحم کرنے والا ہے، اے میرے رب! میں شیاطین کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اے میرے رب! میں اس بات سے تیری پناہ کا طلبگار ہوں کہ میرے پاس شیاطین آئیں۔"

اس دعا کے بعد قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھئے اور پھر یہ دعا مانگئے۔

اَللّٰهُمَّ بِالْحَقِّ اَنْزَلْتَهٗ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ اَللّٰهُمَّ عَظِّمْ رَغْبَتِيْ فِيْهِ وَاجْعَلْهُ نُوْرًا لِبَصَرِيْ وَشِفَاءً لِصَدْرِيْ وَذِهَابًا لِهَمِّيْ وَحُزْنِيْ وَبَيِّضْ بِهٖ وَجْهِيْ وَارْزُقْنِيْ تِلَاوَتَهٗ وَفَهْمَ مَعَانِيْهِ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

"اے اللہ! تو نے قرآن کو حق کے ساتھ اتارا اور یہ حق کے ساتھ اترا، اے اللہ! قرآن میں میری رغبت بڑی بنا، اسے میری آنکھوں کا نور، میرے سینے کے لئے شفاء اور میرے فکر و غم کے دو. ہونے کا سبب بنا، اس کے ذریعہ میرے چہرہ کو روشن و منور فرما اور اپنی رحمت کے صدقہ اے ارحم الراحمین! اس کی تلاوت مجھے نصیب کر اور اس کے معنی کی سمجھ مجھے عطا فرما۔"

ہر روز تلاوت کے بعد ہاتھ اٹھا کر یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ لَنَا فِي الدُّنْيَا قَرِيْنًا وَّفِي الْاٰخِرَةِ شَافِعًا وَّفِي الْقَبْرِ مُؤْنِسًا وَّفِي الْقِيَامَةِ صَاحِبًا وَعَلَى الصِّرَاطِ نُوْرًا وَفِي الْجَنَّةِ رَفِيْقًا وَمِنَ النَّارِ سِتْرًا۔

"اے اللہ! قرآن پاک کو میرے لئے دنیا میں ہمنشین، آخرت میں شافع، قبر میں غم خوار، قیامت میں مونس، پل صراط پر نور، جنت میں رفیق اور آگ سے پردہ بنا۔"

پھر آپ نے دینی اور دنیوی مقاصد و عزائم کے لئے جو بھی دعا چاہیں مانگیں انشاء اللہ آپ کی ہر درخواست مجیب الدعوات کی بارگاہ میں شرف قبولیت کے ساتھ نوازی جائے گی۔

ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ "نبی کریم ﷺ جب قرآن ختم کرتے تو کھڑے ہو کر دعا مانگتے، اسی طرح بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت ابوہریرہؓ ہی سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص قرآن پڑھے، اللہ کی حمد و ثنا کرے، محمد (ﷺ) پر درود بھیجے اور پھر اپنے رب سے اپنی بخشش چاہے تو بلاشبہ اس نے بہتر طریقہ سے خیر و بھلائی مانگی۔

بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب قرآن ختم فرماتے تو کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ حمد و ثنا کرتے چنانچہ حمد و ثنا اور دعا کے کلمات یہ ہوتے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَكَذَبَ الْعَادِلُوْنَ بِاللّٰهِ وَضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَكَذَبَ الْمُشْرِكُوْنَ بِاللّٰهِ مِنَ الْعَرَبِ وَالْمَجُوْسِ وَالْيَهُوْدِ وَالنَّصٰرٰى وَالصَّابِئِيْنَ وَمَنْ دَعَا لِلّٰهِ وَلَدًا وَصَاحِبَةً اَوْنِدًّا اَوْشَبْهًا اَوْمِثْلًا اَوْسَمِيًّا اَوْعَدْلًا فَاَنْتَ رَبُّنَا اَعْظَمُ مِنْ اَنْ نَتَّخِذَ فِيْمَا خَلَقْتَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَّالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَّسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَائِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ بَلِ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى وَاَحْكَمُ وَاَكْرَمُ وَاَعْظَمُ مِمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ صَدَقَ

اللّٰہُ وَبَلَّغَتْ رُسُلُهُ الْكِرَامُ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ ۝ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى جَمِيْعِ الْمَلَائِكَةِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَارْحَمْ عِبَادَكَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَهْلِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِمْ لَنَا بِخَيْرٍ وَافْتَحْ لَنَا بِخَيْرٍ وَّبَارِكْ لَنَا فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَانْفَعْنَا بِالْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۔

"تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رب ہے، تمام عالم کا، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے۔ اور اندھیرا اور اجالا بنایا پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر کر دیتے ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور جھوٹے ہیں وہ لوگ جو برابر کیے دیتے ہیں دوسروں کو اللہ کے ساتھ اور گمراہ ہیں وہ لوگ اور بھٹک گئے ہیں وہ صحیح راستہ سے کامل بھٹک جانا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور جھوٹے ہیں وہ لوگ جو اہل عرب میں سے ہیں اور آتش پرست، یہود نصاریٰ اور کوکب پرست وہ دوسروں کو اللہ کا شریک مان رہے ہیں اور جو شخص ثابت کرتا ہے۔ اللہ کے لئے اولاد کو یا بیوی کو یا ہمسر کو یا مشابہ کو، یا مثیل کو اس کے ہمنام کو یا اس کی ذات وصفات میں برابر ہو، تو وہ کیا کرے کیونکہ وہ بھی جھوٹا ہے اور آپ تو اے ہمارے پروردگار اس سے برتر و بلند ہیں کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو اپنا شریک و ساجھی بنائیں تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں بنایا اور نہ بنایا اپنے لئے بیوی کو اور بیٹا کو اور نہیں ہے کوئی اس کا ساجھی سلطنت میں اور نہ کوئی اس کا مددگار ہے ذلت کے وقت پر اور اس کی بڑائی بیان کرو بڑا جان کر اللہ سب سے بڑا ہے بہت بڑا اور بے انتہاء بے شمار تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور تمام چیزیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندہ (محمد) پر کتاب اتاری جس میں کوئی کجی نہیں رکھی، بالکل ٹھیک ٹھیک اتاری تاکہ خوف دلائے ایک سخت آفت کا اللہ کی طرف سے اور خوشخبری دے ایمان لانے والوں کو جو نیکیاں کرتے ہیں، اس بات کی کہ ان کے لئے اچھا بدلہ (جنت) ہے جس میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اور ان کو متنبہ کر دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنے لئے اولاد بنائی ہے، کچھ خبر نہیں ان کو اس بات کی نہ ان کے باپ دادوں کو، کیا بری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، سب کچھ جھوٹ ہے، جس کو وہ کہہ رہے ہیں، تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس کی مملوک میں وہ تمام چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور تمام تعریفیں اس کے لئے ہیں عالم آخرت میں اور وہ بڑی حکمت والا اور ہر بات کی خبر رکھنے والا ہے وہ جانتا ہے ان تمام چیزوں کو جو زمین میں داخل ہوتی ہیں اور اس سے باہر نکلتی ہیں اور جو آسمانوں سے اترتی ہیں اور آسمانوں پر چڑھتی ہیں وہ بڑا رحم کرنے والا اور بہت زیادہ مغفرت کرنے والا ہے، تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو پیدا کرنے والا ہے تمام آسمانوں کو اور زمین کو اور بنانے والا ہے فرشتوں کو اپنا پیغام پہنچانے والا جو بازوؤں والے ہیں کسی کے دو بازو ہیں کسی کے تین اور کسی کے چار، اپنی مخلوق میں وہ زیادتی کرتا ہے جتنا چاہے یقیناً اللہ تمام چیزوں پر بڑی قدرت رکھنے والا ہے جو کچھ کہ کھول دے، اللہ تعالیٰ لوگوں پر اپنی رحمت میں سے تو کوئی نہیں اس کو روکنے والا اور جو کچھ کہ روک رکھے تو کوئی نہیں اس کو بھیجنے والا اس کے سوا اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور سلامتی ہو اللہ کی اللہ کے ان بندوں پر جن کو اس نے پسند فرمالیا ہے، کیا اللہ سب سے بہتر ہے یا وہ (بت) جن کو وہ (کافر و مشرک) اللہ کا ساجھی ٹھہرا رہے ہیں (یہ بات نہیں ہے) بلکہ اللہ ہی سب سے بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے، وہی مضبوط حکم والا ہے اور وہی عزت والا ہے وہ ان تمام چیزوں سے جن کو یہ کافر شریک ٹھہرا رہے ہیں سب سے عظمت والا ہے، پس تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے، اللہ نے سچ فرمایا ہے اور اس کے کریم رسولوں نے اس کا پیغام (صحیح صحیح) پہنچایا ہے، اور میں ان تمام باتوں پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں، اے اللہ! اپنی رحمت نازل فرما، تمام فرشتوں پر، تمام پیغمبروں پر اور رحم فرما اپنے مؤمن بندوں پر آسمان کے رہنے والوں اور زمین پر بسنے والوں سے ہمارا خاتمہ کیجئے خیر کے ساتھ اور کھول دیجئے ہمارے لئے خیر (کے دروازہ) کو اور برکت دیجئے، ہمارے لئے قرآن عظیم کے علوم میں اور نفع دیجئے ہم کو آیات قرآنی سے اور اپنے مستحکم ذکر سے، اے ہمارے رب! ہماری یہ دعا قبول فرمالے یقیناً آپ ہماری دعاؤں کو سننے والے اور ہماری دلی باتوں کو جاننے والے ہیں۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قرآن سیکھنے اور سکھانے والا سب سے بہتر ہے

(۱) عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ (رواہ البخاری)

"حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا۔" (بخاری)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن سیکھے جیسا کہ سیکھنے کا حق ہے اور پھر دوسروں کو سکھائے تو وہ سب سے بہتر ہے کیونکہ جس طرح قرآن اور اس کے علوم دنیا کی تمام کتابوں اور علوم سے افضل اور اعلیٰ وارفع ہیں اسی طرح قرآنی علوم کو جاننے والا بھی دنیا کے افراد میں سب سے ممتاز اور کسی بھی علم کے جاننے والے سے افضل و اعلیٰ ہے۔

"سیکھنے کا حق" سے مراد یہ ہے کہ قرآنی علوم میں غور و فکر کرے اور اس کے احکام و معنی اور اس کے حقائق و دقائق کو پوری توجہ اور ذہنی و قلبی بیداری کے ساتھ سیکھے۔

قرآن پڑھنے کی فضیلت

(۲) وَعَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فِی الصُّفَّۃِ فَقَالَ اَیُّکُمْ یُحِبُّ اَنْ یَغْدُوَ کُلَّ یَوْمٍ اِلٰی بُطْحَانَ اَوِ الْعَقِیْقِ فَیَأْتِیَ بِنَاقَتَیْنِ کَوْمَاوَیْنِ فِیْ غَیْرِ اِثْمٍ وَلَا قَطْعِ رَحِمٍ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کُلُّنَا نُحِبُّ ذٰلِکَ فَقَالَ اَفَلَا یَغْدُوْ اَحَدُکُمْ اِلَی الْمَسْجِدِ فَیُعَلِّمُ اَوْ یَقْرَأُ اٰیَتَیْنِ مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ نَاقَتَیْنِ وَثَلَاثٌ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ ثَلَاثٍ وَاَرْبَعٌ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَرْبَعٍ وَمِنْ اَعْدَادِھِنَّ مِنَ الْاِبِلِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عقبہ ابن عامر کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ باہر تشریف لائے۔ تو ہم "صفہ" پر بیٹھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے کون شخص یہ پسند کرتا ہے کہ وہ ہر روز بطحان یا عقیق کی طرف جائے اور وہاں سے دو اونٹنیاں بڑے کوہان والی بغیر کسی گناہ کے اور بغیر انقطاع صلہ رحمی کے لائے؟ ہم نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہم سب پسند کرتے ہیں" آپ نے فرمایا (تو پھر سن لو کہ) تم میں سے جو شخص مسجد میں جاتا ہے اور وہاں کتاب اللہ کی دو آیتیں کسی کو سکھاتا ہے یا خود پڑھتا ہے تو وہ اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہے، تین آیتیں اس کے لئے تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چار آیتیں اس کے لئے چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔ حاصل یہ کہ آیتوں کی تعداد اونٹنیوں کی تعداد سے بہتر ہے (یعنی پانچ آیتیں پانچ اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چھ آیتیں چھ اونٹنیوں سے بہتر ہیں اسی طرح آگے تک قیاس کیا جائے۔" (مسلم)

تشریح: "صفہ" وہ سایہ دار چبوترہ تھا جو مسجد نبوی کے سامنے بنا ہوا تھا اور وہ مہاجرین صحابہ جن کے نہ گھربار تھا اور نہ بیوی بچے اور عبادت و زہد کے انتہائی بلند مقام پر تھے وہ اسی چبوترہ پر رہا کرتے اور ہمہ وقت بارگاہ نبوت سے اکتساب فیض کرتے رہتے تھے گویا وہ اسلام کی سب سے پہلی اقامتی اور تربیتی درگاہ تھی جس کے معلم اول خود سرکار رسالتمآب ﷺ تھے اور طلباء کی جماعت صحابہؓ پر مشتمل تھی۔

"بطحان" مدینہ کے قریب ایک نالہ تھا اسی طرح "عقیق" بھی ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ کے مضافات میں تقریباً تین چار میل کے فاصلہ پر ہے ان دونوں جگہوں پر اس زمانہ میں بازار لگا کرتے تھے جس میں اونٹوں کی خرید و فروخت ہوا کرتی تھی اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ اہل عرب کے ہاں اونٹ ایک متاع گرانمایہ کے درجہ کی چیز تھی خصوصاً بڑے کوہان کے اونٹ کی قدر و قیمت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بڑے بلیغ اسلوب میں صحابہؓ سے مذکورہ سوال کر کے اس چیز کی طرف رغبت دلائی جو باقی رہنے والی ہے اور اس چیز سے نفرت دلائی جو دنیاوی اعتبار سے کتنی ہی قدر و قیمت کی کیوں نہ ہو لیکن مآل کار فانی اور ختم ہو جانے والی ہے۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ آپ نے اونٹ کا ذکر ان کو سمجھانے کے لئے صرف بطریق تمثیل فرمایا ورنہ تو دنیا کی تمام چیزیں بھی ایک آیت کے مقابلہ پر کوئی حقیقت اور کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔

③ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اِذَا رَجَعَ اِلٰی اَهْلِهٖ اَنْ یَّجِدَ فِیْهِ ثَلَاثَ خَلِفَاتٍ عِظَامٍ سِمَانٍ قُلْنَا نَعَمْ قَالَ فَثَلَاثُ اٰیَاتٍ یَقْرَأُبِهِنَّ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلَاتِهٖ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ ثَلَاثِ خَلِفَاتٍ عِظَامٍ سِمَانٍ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ جب گھر میں لوٹ جائے تو وہاں تین حاملہ اور فربہ وبڑی اونٹنیاں پائے؟" ہم نے عرض کیا کہ "جی ہاں" آپ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص اپنی نماز میں قرآن کی تین آیتیں پڑھتا ہے تو وہ اس کے لئے تین حاملہ اور بڑی موٹی اونٹنیوں سے بہتر ہے۔" (مسلم)

ماہر قرآن کی فضیلت

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْکِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَیَتَتَعْتَعُ فِیْهِ وَهُوَ عَلَیْهِ شَاقٌّ لَهٗ اَجْرَانِ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ماہر قرآن ان فرشتوں کے ساتھ ہے جو لکھنے والے اور بزرگ و نیکوکار ہیں اور وہ شخص کہ جو قرآن کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور قرآن (پڑھنا) اس کے لئے مشکل ہوتا ہے تو اس کے لئے دو ثواب ہیں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "ماہر قرآن" وہ شخص ہے جس کو قرآن خوب یاد ہو، اٹکے بغیر پوری روانی سے پڑھتا ہو اور اس کے لئے قرآن پڑھنا کوئی مشکل اور دشوار امر نہ ہو۔ اسی طرح "فرشتوں" سے وہ فرشتے مراد ہیں جو لوح محفوظ سے اللہ تعالیٰ کی کتابیں نقل کرتے ہیں یا وہ فرشتے بھی مراد ہو سکتے ہیں جو بندوں کے اعمال لکھنے پر مامور ہیں۔

اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ ماہر قرآن ان عظیم فرشتوں کے ساتھ ہے بایں طور کہ وہ دنیا میں ان ہی جیسا عمل کرتا ہے اور آخرت میں اسے جو منازل اور درجات عالیہ حاصل ہوں گے ان میں وہ فرشتوں کا رفیق ہوگا۔

جس شخص کو قرآن اچھی طرح یاد نہ ہو اور اٹک اٹک کر پڑھتا ہو تو اسے دو ثواب کی بشارت دی گئی ہے ایک ثواب تو پڑھنے کا اور دوسرا ثواب اس مشقت کا جو اسے قرآن پڑھنے میں ہوتی ہے اس طرح گویا قرآن شریف پڑھنے کی ترغیب دلائی گئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو شخص اٹک اٹک کر قرآن پڑھتا ہے وہ "ماہر قرآن" سے زیادہ ثواب پاتا ہے۔ کیونکہ ماہر قرآن کو تو بہت زیادہ ثواب ملتا ہے۔ بایں طور کہ اسے ملائکہ مذکورین کی رفاقت جیسی عظیم سعادت کی بشارت دی گئی ہے۔ بہرحال حاصل یہ کہ افضل تو "ماہر قرآن" ہی ہے لیکن اٹک اٹک کر کے پڑھنے کے لئے بھی باعتبار مشقت کے ایک طرح کی فضیلت اور ثواب ثابت ہے۔

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا حَسَدَ اِلَّا عَلَی اثْنَیْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْاٰنَ فَهُوَ یَقُوْمُ بِهٖ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ یُنْفِقُ مِنْهُ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا صرف دو اشخاص کے بارہ میں حسد (جائز) ہے ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی نعمت عطا فرمائی اور وہ شخص (بعض اوقات کے علاوہ) دن رات کے اکثر حصہ میں اس قرآن میں مشغول رہتا ہے، دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو اور وہ اس کو دن ورات کے اکثر حصہ میں خرچ کرتا ہو" (بخاری ومسلم)

تشریح: حسد کے معنی ہیں "دوسرے سے نعمت کے زوال اور اپنے لئے اس نعمت کے حصول کی تمنا کرنا" چنانچہ حضرت میرکؒ فرماتے ہیں کی حسد کی دو قسمیں ہیں۔ ① حقیقی۔ ② مجازی۔ حقیقی کا مطلب تو یہی ہے کہ کسی شخص سے نعمت کے زائل ہو جانے کی

خواہش و تمنا کرنا حسد کی یہ قسم احکام قرآنی اور تعلیمات حدیث کے پیش نظر تمام علماء اُمت کے نزدیک متفقہ طور پر حرام ہے، مجازی کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر اپنے لئے اس کے حصول کی خواہش و تمنا کرنا بغیر اس آرزو کے کہ وہ دوسرے شخص سے زائل ہو مجازی حسد کی قسم غبطہ کہلاتی ہے جسے رشک بھی کہا جاتا ہے۔ حسد مجازی یعنی غبطہ (رشک) اگر دنیاوی امور کے سلسلہ میں ہو تو مباح ہے اور اگر دینی امور کے سلسلہ میں ہو تو پھر وہ مستحب ہوگا۔ مثلاً کسی شخص کو مسجد بناتا ہوا دیکھ کر یہ آرزو و خواہش کرے کہ کاش اگر میرے پاس بھی روپیہ ہو تو میں بھی ایسی مسجد بناؤں۔ یہ رشک پسندیدہ ہے اور اس پر ثواب بھی ملتا ہے۔

بہرکیف یہاں حدیث میں "حسد" سے مراد غبطہ ہے مگر اس حدیث میں غبطہ کی اجازت صرف انہیں دو چیزوں میں منحصر کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کوئی نعمت ان دو نعمتوں سے بڑھ کر نہیں ہے کہ جس کے حاصل ہونے کی خواہش کی جائے چنانچہ اسی لئے مظہرؒ فرماتے ہیں کہ کسی کے لئے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر ویسی ہی نعمت حاصل ہو جانے کی آرزو و خواہش کرے۔ ہاں اگر وہ نعمت ایسی ہو کہ قرب الٰہی کا ذریعہ بنتی ہو جیسے تلاوت قرآن، صدقہ و خیرات اور ان کے علاوہ دوسری نیکیاں و بھلائیاں تو ایسی نعمت کے حصول کی خواہش و آرزو پسندیدہ ہوگی۔

"قرآن کی نعمت عطا فرمائی" سے مراد یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پڑھنے اور یاد کرنے کی توفیق عطا فرمائی چنانچہ اس کو قرآن اس طرح یاد ہو جیسا کہ ہونا چاہئے اس طرح "قرآن میں مشغول رہنے" سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کرتا ہو، اس کے مفہوم و معنی کو یاد کرتا ہو اس کے علوم و احکام میں غور و فکر کرتا ہو، یا پھر یہ کہ اس کے امر و نواہی پر عمل کرتا ہو یا اس کو نماز میں پڑھتا ہو۔

قرآن پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے کی مثال

⑥ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِیْ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ الْاُتْرُجَّةِ رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَّطَعْمُهَا طَيِّبٌ وَّمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِیْ لَا يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ التَّمْرَةِ لَا رِيْحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلْوٌ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ لَا يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ كَمَثَلِ الْحَنْظَلَةِ لَيْسَ لَهَا رِيْحٌ وَّطَعْمُهَا مُرٌّ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ الرَّيْحَانَةِ رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَّطَعْمُهَا مُرٌّ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ الْمُؤْمِنُ الَّذِیْ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَيَعْمَلُ بِهٖ كَالْاُتْرُجَّةِ وَالْمُؤْمِنُ الَّذِیْ لَا يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَيَعْمَلُ بِهٖ كَالتَّمْرَةِ۔

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ مسلمان جو قرآن کریم پڑھتا ہے اس کی مثال سنگترے کی سی ہے کہ اسکی خوشبو بھی بہت لطیف اور اس کا مزہ بھی بہت اچھا اور وہ مسلمان جو قرآن کریم نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ اس میں خوشبو نہیں ہوتی اور اس کا مزہ شیریں ہوتا ہے اور وہ منافق جو قرآن کریم نہیں پڑھتا اس کی مثال اندرائن کے پھول کی سی ہے جس میں نہ خوشبو ہے اور اس کا مزہ نہایت تلخ"۔ (بخاری و مسلم) ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ وہ مسلمان جو قرآن کریم پڑھتا بھی ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے تو اس کی مثال سنگترے کی سی ہے اور وہ مسلمان جو قرآن پڑھتا تو نہیں مگر اس پر عمل کرتا ہے اس کی مثال کھجور کی سی ہے۔"

تشریح: قرآن کریم پڑھنے والا مسلمان سنگترے کی مانند یوں ہوا کہ وہ خوش مزہ اور لطیف تو اس وجہ سے ہے کہ اس میں ایمان کی چاشنی جاگزیں ہوتی ہے اور خوشبو صفت اس لئے ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ لوگ اس کی قرأت و تلاوت سن کر ثواب پاتے ہیں بلکہ اس سے قرآن سیکھتے بھی ہیں۔

قرآن پڑھنے اور نہ پڑھنے والے کے درجہ کی بلندی اور پستی

⑦ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمر ابن خطابؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "یقیناً اللہ تعالیٰ اس کتاب یعنی کلام اللہ کے ذریعہ کتنے لوگوں کو بلند کرتا ہے اور اس کے ذریعہ کتنے لوگوں کو پست کرتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا درجہ بلند کرتا ہے بایں طور کہ دنیا میں تو اسے عزت و وقار کی زندگی عطا فرماتا ہے اور عقبیٰ میں ان لوگوں کے ساتھ رکھتا ہے جن پر اس نے اپنا انعام کیا ہے۔ اس طرح جو شخص نہ قرآن پڑھتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے اس کا درجہ پست کر دیتا ہے۔

قرآن سننے کے لئے فرشتوں کا اشتیاق و اژدحام

⑧ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ اُسَیْدَ بْنَ حُضَیْرٍ قَالَ بَیْنَمَا هُوَ یَقْرَأُ بِاللَّیْلِ سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ وَفَرَسُهٗ مَرْبُوْطَةٌ عِنْدَهٗ اِذَا جَالَتِ الْفَرَسُ فَسَکَتَ فَسَکَنَتْ فَقَرَأَ فَجَالَتْ فَسَکَتَ فَسَکَنَتْ ثُمَّ قَرَأَ فَجَالَتِ الْفَرَسُ فَانْصَرَفَ وَکَانَ ابْنُهٗ یَحْیٰی قَرِیْبًا مِنْهَا فَاَشْفَقَ اَنْ تُصِیْبَهٗ وَلَمَّا اَخَّرَهٗ رَفَعَ رَأْسَهٗ اِلَی السَّمَاءِ فَاِذَا مِثْلُ الظُّلَّةِ فِیْهَا اَمْثَالُ الْمَصَابِیْحِ فَلَمَّا اَصْبَحَ حَدَّثَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اقْرَأْ یَا ابْنَ حُضَیْرٍ قَالَ فَاَشْفَقْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنْ تَطَأَ یَحْیٰی وَکَانَ مِنْهَا قَرِیْبًا فَانْصَرَفْتُ اِلَیْهِ وَرَفَعْتُ رَأْسِیْ اِلَی السَّمَاءِ فَاِذَا مِثْلُ الظُّلَّةِ فِیْهَا اَمْثَالُ الْمَصَابِیْحِ فَخَرَجْتُ حَتّٰی لَا اَرَاهَا قَالَ وَتَدْرِیْ مَا ذَاكَ قَالَ لَا قَالَ تِلْكَ الْمَلَائِکَةُ دَنَتْ بِصَوْتِكَ وَلَوْ قَرَأْتَ لَاَصْبَحَتْ یَنْظُرُ النَّاسُ اِلَیْهَا لَا تَتَوَارٰی مِنْهُمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِیِّ وَفِیْ مُسْلِمٍ عَرَجَتْ فِی الْجَوِّ بَدَلَ فَخَرَجْتُ عَلٰی صِیْغَةِ الْمُتَکَلِّمِ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ حضرت اسید ابن حضیرؓ کے بارہ میں روایت کرتے تھے کہ "(ایک دن) جب کہ وہ (یعنی اسیدؓ) رات میں سورۂ بقرہ پڑھ رہے تھے ان کا گھوڑا جو ان کے قریب ہی بندھا تھا اچانک اچھلنے کودنے لگا چنانچہ انہوں نے پڑھنا بند کر دیا (تاکہ دیکھیں وہ کیوں اچھل کود رہا ہے) گھوڑے نے بھی اچھل کود بند کر دی۔ (اسیدؓ نے یہ سوچ کر کہ یونہی اچھل کود رہا ہوگا) پھر پڑھنا شروع کر دیا، گھوڑا بھی پھر اچھلنے کودنے لگا وہ پھر رک گئے تو گھوڑا بھی رک گیا، پھر جب انہوں نے پڑھنا شروع کیا تو گھوڑے نے اچھل کود شروع کی (اب انہیں احساس ہوا کہ گھوڑے کو اچھل کود یوں ہی نہیں ہے بلکہ اس کی خاص وجہ ہے) چنانچہ انہوں نے پڑھنا موقوف کر دیا (اتفاق سے) ان کا بچہ جس کا نام یحییٰ تھا گھوڑے کے قریب ہی انہیں خوف ہوا کہ کہیں گھوڑا (اس اچھل کود میں) اس بچہ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا دے (اس لئے وہ اٹھ کر گھوڑے کے پاس گئے تاکہ بچہ کو وہاں سے ہٹا دیں) جب انہوں نے بچہ کو وہاں سے ہٹایا اور ان کی نظر آسمان کی طرف اٹھی تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ بادل کی مانند کوئی چیز ہے، جس میں چراغ سے جل رہے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو اسیدؓ نے یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کے سامنے بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ابن حضیرؓ تم پڑھتے رہتے" اسید نے عرض کیا "یا رسول اللہ! میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں گھوڑا یحییٰ کو کچل نہ ڈالے کیونکہ یحییٰ گھوڑے کے قریب ہی تھا، چنانچہ جب میں یحییٰ کی طرف پھرا اور اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی چیز بادل کی مانند ہے۔ جس میں چراغ سے جل رہے ہیں پھر میں (تحقیق حال کے لئے اپنے گھر سے) باہر نکلا مگر وہ (چراغاں) مجھے پھر نظر نہیں آیا۔ "آنحضرت ﷺ نے فرمایا" جانتے ہو وہ کیا تھا؟ "انہوں نے کہا کہ "نہیں! فرمایا "وہ فرشتے تھے جو تمہاری قرأت کی آواز (سننے) کے لئے قریب آ گئے تھے اگر تم اسی طرح پڑھتے رہتے تو اسی طرح صبح ہو جاتی اور لوگ فرشتوں کو دیکھتے اور وہ فرشتے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتے" اس روایت کو بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کیا ہے مگر الفاظ بخاریؒ کے ہیں۔ مسلمؒ کی روایت میں فخرجت کے بجائے عرجت فی الجو (یعنی وہ چیز جو زمین و آسمان کے درمیان ہوا میں چڑھ گئی) کے الفاظ ہیں۔"

تشریح: گھوڑے کی اچھل کود کی وجہ یہ تھی کہ جب حضرت اسیدؓ قرآن کریم پڑھ رہے تھے تو قرأت سننے کے لئے فرشتے نیچے آئے تھے اور ان کو دیکھ کر گھوڑا بدکتا اور اچھلتا کودتا تھا اسی وجہ سے جب حضرت اسیدؓ تلاوت بند کر دیتے تھے اور فرشتے اوپر چلے جاتے تھے تو گھوڑا بھی

اچھل کود سے رک جاتا تھا۔
آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی اقرأیا ابن حضیر (ابن حضیر تم پڑھتے رہتے) میں لفظ اقراء کے معنی ابن حجرؒ نے یہ لکھے ہیں کہ اس سورۃ (بقرہ) کو ہمیشہ پڑھتے رہو جو ایسی عجیب و غریب حالت کے پیش آنے کا سبب ہے، اگر آئندہ بھی کبھی اس سورۃ کو پڑھنے کے دوران ایسی صورت پیش آئے تو چھوڑنا مت بلکہ پڑھتے رہنا۔
علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس لفظ کا مقصد "زمانہ ماضی میں طلب زیادتی ہے" یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا مقصد گویا یہ تھا کہ تم نے اس وقت پڑھنا کیوں چھوڑ دیا بلکہ پڑھنے میں اور زیادتی کیوں نہ کی تمہیں چاہئے تھا کہ تم اس صورت میں زیادہ سے زیادہ پڑھتے رہتے" آنحضرت کے اس ارشاد کے جواب میں حضرت اسیدؓ نے جو کچھ کہا (یعنی یارسول اللہ! میں اس بات سے ڈرا الخ) اس سے بھی یہی مفہوم واضح ہوتا ہے چنانچہ یہاں ترجمہ علامہ طیبیؒ کی وضاحت کے تحت ہی کیا گیا ہے۔
"بادل کی مانند کوئی چیز ہے" وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ملائکہ قرآن سننے کے لئے اتنا اژدحام کرتے ہیں کہ کوئی اگر انہیں دیکھے تو ایسا محسوس ہو کہ پردہ کی مانند کوئی چیز ہے جو دیکھنے والے اور آسمان کے درمیان حائل ہو گئی ہے حضرت اسیدؓ نے اسی چیز کو بادل سے تعبیر کیا اور اس میں جو چراغ سے جل رہے تھے وہ دراصل ان فرشتوں کے منہ تھے جو چراغ کی مانند روشن و منور تھے۔

تلاوت قرآن، رحمت کے نزول کا باعث

⑨ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَجُلٌ يَقْرَأُ سُوْرَةَ الْكَهْفِ وَإِلَى جَانِبِهِ حِصَانٌ مَرْبُوْطٌ بِشَطَنَيْنِ فَتَغَشَّتْهُ سَحَابَةٌ فَجَعَلَتْ تَدْنُوْ وَتَدْنُوْ وَجَعَلَ فَرَسُهٗ يَنْفِرُ فَلَمَّا أَصْبَحَ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ تِلْكَ السَّكِيْنَةُ تَنَزَّلَتْ بِالْقُرْاٰنِ (متفق علیہ)

"اور حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک شخص سورۃ کہف پڑھ رہا تھا اس کے قریب ہی اس کا گھوڑا دو رسوں سے بندھا تھا کہ اسے ایک ابر (کے ٹکڑے نے ڈھانک لیا وہ قریب سے قریب ہونے لگا یہاں تک کہ گھوڑے نے اچھل کود شروع کی، جب صبح ہوئی تو وہ شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے پورا ماجرا کہہ سنایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ سکینہ تھی جو قرآن پڑھے جانے کی وجہ سے اتری تھی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "سکینہ" کہتے ہیں خاطر جمعی تسکین قلب اور رحمت کو جس کے سبب دل پاکیزہ اور نورانی ہوتا ہے، نفس کی ظلمت ختم ہو جاتی ہے اور حضور و ذوق پیدا ہوتا ہے "سکینہ" اگرچہ غیر مشاہد چیز ہے مگر کبھی کبھی ابر وغیرہ کی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔

سورۃ فاتحہ کی اہمیت و فضیلت

⑩ وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُعَلّٰى قَالَ كُنْتُ أُصَلِّيْ فِي الْمَسْجِدِ فَدَعَانِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ أُجِبْهُ ثُمَّ أَتَيْتُهٗ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنِّيْ كُنْتُ أُصَلِّيْ قَالَ أَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ ثُمَّ قَالَ أَلَا أُعَلِّمُكَ أَعْظَمَ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَأَخَذَ بِيَدِيْ فَلَمَّا أَرَدْنَا أَنْ نَخْرُجَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّكَ قُلْتَ لَأُعَلِّمَنَّكَ أَعْظَمَ سُوْرَةٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ أُوْتِيْتُهٗ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سعید ابن معلی کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے بلایا، اس وقت میں نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر (نماز سے فارغ ہو کر) جب میں آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا کہ "یارسول اللہ! (اس وقت) میں نماز پڑھ

رہا تھا (اس لئے میں نے آپ ﷺ کا جواب نہیں دیا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا کہ (کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اللہ اور رسول کا جواب دو جب کہ رسول اللہ تمہیں بلائیں اور ان کے حکم کی اطاعت کرو؟" پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "قبل اس کے کہ ہم اس مسجد سے نکلیں کیا میں تمہیں قرآن کی ایک بہت بڑی (یعنی افضل) سورت نہ سکھلاؤں؟" پھر آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور جب ہم مسجد سے نکلنے کو ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ کیا میں تمہیں قرآن کی ایک بہت بڑی سورت نہ سکھلاؤں؟" آپ نے فرمایا "وہ سورت الحمد للہ رب العالمین ہے وہ سات آیتیں ہیں جو نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہیں اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا فرمایا گیا ہے۔"

تشریح: ارشاد گرامی استجیبوا (جواب دو) سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو نماز کی حالت میں جواب دینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی تھی جیسا کہ نماز میں آپ ﷺ کو خطاب کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوئی۔

سورۂ فاتحہ کو "ایک بہت بڑی سورت" اس لئے فرمایا کہ وہ اللہ رب العزت کے نزدیک بڑی قدرت رکھتی ہے اور الفاظ کے اختصار کے باوجود اس کے فوائد و معانی بہت زیادہ ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے صرف ایک جزء کے تحت دین و دنیا کے تمام مقاصد آجاتے ہیں بلکہ بعض عارفین نے تو یہ کہا ہے کہ جو کچھ سابق آسمانی کتابوں میں ہے وہ سب قرآن مجید میں ہے اور جو کچھ قرآن مجید میں ہے وہ سب سورۂ فاتحہ میں ہے اور جو کچھ سورہ فاتحہ میں ہے وہ سب بسم اللہ میں ہے۔

"وہ سات آیتیں ہیں" جن سے دراصل قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ ولقد اتیناک سبعا من المثانی و القران العظیم (یعنی اے محمد ﷺ) ہم نے آپ (ﷺ) کو وہ سات آیتیں عطا کی ہیں جو نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہیں (یا یہ کہ ان سات آیتوں کی ثنا کی گئی ہے ساتھ فصاحت اور اعجاز کے اور ان سات آیتوں سے مراد سورۂ فاتحہ ہے) اور دیا ہے ہم نے آپ کو قرآن عظیم یہاں "قرآن عظیم" سے بھی "سورۂ فاتحہ" مراد ہے، کیونکہ سورۂ فاتحہ باعتبار معانی و فوائد کے قرآن کا "جزو اعظم" ہے اس لئے مبالغۃ فرمایا کہ یہ قرآن عظیم ہے۔

سورۂ بقرہ کی فضیلت

⑪ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ مَقَابِرَ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْفِرُ مِنَ الْبَیْتِ الَّذِیْ یُقْرَأُ فِیْہِ سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اپنے گھروں کو مقبرے نہ بناؤ (یاد رکھو) شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے۔ جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "مقبرے نہ بناؤ" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مقبرے ذکر اللہ عبادت اور تلاوت قرآن سے خالی ہوتے ہیں اس طرح اپنے گھروں کو ان چیزوں سے خالی نہ رکھو ان میں مردوں کی مانند پڑے رہو اور ذکر اللہ وغیرہ نہ کرو بلکہ اپنے گھروں میں نماز بھی پڑھو اور ذکر اللہ میں بھی مشغول رہو اور تلاوت قرآن بھی کرتے رہو، چنانچہ آپ ﷺ نے اس چیز کی طرف بھی راہنمائی فرمائی جو ذکر و شغل میں افضل اور گھر و گھر والوں کے لئے بہت فائدہ مند ہے کہ وہ تلاوت قرآن کریم ہے، فرمایا "شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے" اس کا مطلب یہی ہے کہ تلاوت قرآن کریم خصوصاً سورۂ بقرہ کی تلاوت نہ صرف یہ کہ گھر میں رحمت و برکت کے دروازے کھلنے کا باعث ہے بلکہ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ایسا گھر شیطان کی نحوست اور اس کے مکر و فریب کے سایہ سے محفوظ رہتا ہے۔ ویسے تو عمومی طور پر تلاوت قرآن کریم باعث رحمت و برکت ہے، مگر اس موقع پر سورۂ بقرہ کو بطور خاص اس لئے ذکر فرمایا کہ اس سورت میں اللہ رب العزت کے اسماء اور احکام بہت مذکور ہیں۔

قیامت کے دن قرآن کریم کی سفارش

⑫ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اقْرَؤُا الْقُرْاٰنَ فَاِنَّهٗ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ شَفِیْعًا لِاَصْحَابِهٖ اقْرَؤُا الزَّهْرَاوَیْنِ الْبَقَرَةَ وَسُوْرَةَ اٰلِ عِمْرَانَ فَاِنَّهُمَا تَاْتِیَانِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ کَاَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ اَوْغَیَایَتَانِ اَوْفِرْقَانِ مِنْ طَیْرٍ صَوَافَّ تُحَاجَّانِ عَنْ اَصْحَابِهِمَا اقْرَؤُا سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ فَاِنَّ اَخْذَهَا بَرَکَةٌ وَتَرْکَهَا حَسْرَةٌ وَلَا یَسْتَطِیْعُهَا الْبَطَلَةُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "قرآن کریم پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی سفارش کرے گا اور (خاص طور پر) جگمگاتی ہوئی دو سورتیں کہ وہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران ہیں، پڑھو کیونکہ یہ دونوں قیامت کے دن اس طرح ظاہر ہوں گی گویا کہ وہ ابر کی دو ٹکڑیاں ہیں یا دو سایہ کرنے والی چیزیں ہیں یا پرندوں کی صف باندھے ہوئے دو ٹکڑیاں ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف جھگڑیں گے، اور سورۂ بقرہ پڑھو کیونکہ اس کے پڑھنے پر مداوت اس کے مفہوم و معانی میں غور و فکر اور اس (کے احکام) پر عمل کرنا برکت (نفع عظیم) ہے اور اس کو ترک کرنا (قیامت کے دن حسرت (یعنی ندامت کا باعث) ہوگا اور (یاد رکھو سورہ بقرہ کے طویل ہونے کی وجہ سے) اس کے پڑھنے کی طاقت وہی لوگ نہیں رکھتے جو اہل باطل اور کسلمند ہوتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "قرآن کریم پڑھا کرو" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے مفہوم و معانی میں غور و فکر کرنے کو نعمت اور اپنے حق میں باعث سعادت جانو اور اس کے پڑھنے پر مداومت اختیار کرو۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کو جگمگاتی ہوئی سورتیں فرمایا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں سورتیں نور و ہدایت اور ثواب کی زیادتی کی وجہ سے روشن ہیں گویا اللہ رب العزت کے نزدیک ان دونوں سورتوں میں اور بقیہ تمام سورتوں میں چاند اور ستاروں کی نسبت ہے کہ یہ سورتیں تو بمنزلہ چاند کے ہیں بہ نسبت تمام سورتوں کے وہ بمنزلہ تمام ستاروں کے ہیں۔

قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے حق میں ان سورتوں کی برکات کو متشکل طور پر ظاہر ہونے کو تین صورتوں میں بیان کیا گیا ہے پہلی صورت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ سورتیں قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لئے گویا ابر کی دو ٹکڑیاں ہوں گی۔ جو میدان حشر میں کھڑے ہوئے ان پر آفتاب کی تمازت اور گرمی سے بچاؤ کے لئے سایہ کریں گی، دوسری صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ یا وہ سایہ کرنے والی دو چیزیں ہوں گی یعنی خواہ وہ ابر کی صورت میں ہوں یا کسی اور شکل میں مفہوم اس کا بھی یہی ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں پر سایہ فگن ہوں گی، فرق صرف اتنا ہے کہ اس صورت میں ان سایہ دار چیزوں کا دل پہلی صورت کی بہ نسبت کم ہوگا اور وہ اپنے پڑھنے والوں کے سر سے بالکل قریب ہوں گی جیسا کہ امراء و سلاطین کے سروں پر چھتری وغیرہ کا سایہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس صورت میں ان کے سروں پر سایہ بھی ہوگا اور روشنی بھی ہوگی۔

تیسری صورت یہ بتائی گئی ہے کہ یا وہ پرندوں کی صف باندھے ہوئے دو ٹکڑیاں ہوں گی جن کا سایہ بھی ہوگا اور جو اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے اس بات کی وکالت و سفارش کریں گی کہ انہیں آخرت کی تمام ابدی سعادتوں سے نوازا جائے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ کان هما غمامتان او غیایتان او فرقان من طیر صواف میں حرف او تنویع (اظہار اقسام) کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تین صورتیں بیک وقت ہوں گی جن کا تعلق اپنے پڑھنے والوں کے حال کی مناسبت سے ہوگا لہٰذا اول یعنی ابر کی صورت کا تعلق اس شخص سے ہوگا جس نے یہ سورتیں پڑھیں مگر ان کے مفہوم و معانی کو نہ سمجھا۔ دوم یعنی سایہ کی چیز کا تعلق اس شخص سے ہوگا جس نے ان سورتوں کو پڑھا بھی اور ان کے معنی سمجھے اور دوسروں کو ان سورتوں کی تعلیم بھی دی۔

⑬ وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ یُؤْتٰی بِالْقُرْاٰنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَاَهْلُهُ الَّذِیْنَ

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ بِهٖ تَقْدُمُهٗ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ وَاٰلِ عِمْرَانَ كَاَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ اَوْ ظُلَّتَانِ سَوْدَاوَانِ بَيْنَهُمَا شَرْقٌ اَوْ كَاَنَّهُمَا فِرْقَانِ مِنْ طَيْرٍ صَوَافَّ تُحَاجَّانِ عَنْ صَاحِبِهِمَا (رواہ مسلم)

"اور حضرت نواس ؓ ابن سمعان کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن لایا جائے گا قرآن کو اور ان لوگوں کو جو قرآن پڑھتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے سارے قرآن کے آگے دو سورتیں سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران ہوں گی، اس طرح گویا کہ وہ ابر کے دو ٹکڑے ہیں یا ابر کے دو سیاہ ٹکڑے ہیں اور ان میں ایک چمک ہے، یا گویا دو ٹکڑیاں صف بستہ پرندوں کی ہیں جو پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑیں گی (یعنی اپنے پڑھنے والوں کی سفارش کریں گی)۔" (رواہ مسلم)

تشریح: یوتی بالقران (لایا جائے گا قرآن کو) کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن یا تو قرآن ہی کو صورت و شکل دے کر میدان حشر میں لایا جائے گا یا اس کا ثواب لایا جائے گا۔

کانوا یعملون به (اور اس پر عمل کرتے تھے) سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جو شخص قرآن پڑھتا تو ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا تو وہ "اہل قرآن" میں سے نہیں ہے اور نہ ہی قرآن کریم ایسے شخص کی شفاعت و سفارش کرے گا بلکہ ایسے شخص کے حق میں قرآن خسران کا باعث ہوگا تقدمہ الخ کا مطلب یہ ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا ثواب سارے قرآن کے ثواب کے آگے ہوگا، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن میدان حشر میں سارے قرآن کو ظاہری صورت و شکل دی جائے گی جسے تمام لوگ دیکھیں گے جیسا کہ میدان میں تولنے کے لئے اور تمام اعمال کو صورت دی جائے گی۔

ظلتان سوداوان (ابر کے دو سیاہ ٹکڑے ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ دل دار اور تہ بتہ ہونے کی وجہ سے وہ ٹکڑے سیاہ ہوں گے ایسے ابر کا سایہ بہت فرحت بخش اور باعث سکون ہوتا ہے۔

بینهما شرق (اور ان میں ایک چمک ہے) سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اگرچہ ابر کے وہ ٹکڑے، بہت زیادہ دلدار ہوں گے مگر اس کے باوجود وہ روشنی سے مانع نہیں ہوں گے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں "شرق" کے معنی ہیں درز (یعنی دراڑ) جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں کے درمیان جو ابر کی دو ٹکڑیوں کی صورت میں ہوں گی بسملہ کے ذریعہ فرق ہوگا تاکہ دونوں سورتوں میں امتیاز رہے۔

آیت الکرسی سب سے عظیم آیت ہے

⑭ وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا الْمُنْذِرِ اَتَدْرِيْ اَيُّ اٰيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى مَعَكَ اَعْظَمُ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ يَا اَبَا الْمُنْذِرِ اَتَدْرِيْ اَيُّ اٰيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى مَعَكَ اَعْظَمُ قُلْتُ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ قَالَ فَضَرَبَ فِيْ صَدْرِيْ وَقَالَ لِيَهْنِكَ الْعِلْمُ يَا اَبَا الْمُنْذِرِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابی ابن کعب ؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ مجھ سے) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "ابوالمنذر ؓ (یہ حضرت ابی ابن کعب ؓ کی کنیت ہے) کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نزدیک کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے" میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی سب سے زیادہ جاننے والے ہیں (کہ وہ کون سی آیت ہے) آنحضرت ﷺ نے (پھر) پوچھا کہ "ابوالمنذر! تم جانتے ہو کہ تمہارے نزدیک کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟ میں نے کہا کہ اللّٰہ لا الٰہ الا هو الحی القیوم (یعنی پوری آیت کرسی) حضرت ابی ابن کعب ؓ کہتے ہیں کہ (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور فرمایا کہ ابوالمنذر! خدا کرے تمہارا علم خوشگوار ہو۔" (مسلم)

تشریح: جب پہلی مرتبہ آپ ﷺ نے سوال کیا تو حضرت ابی ابن کعب ؓ نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کر دیا پھر جب دوسری مرتبہ آپ نے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا اس بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ حضرت ابی ؓ نے پہلی مرتبہ تو از راہ

ادب جواب نہیں دیا دوسری مرتبہ جب آپ نے پھر پوچھا تو انہوں نے آپ ﷺ کے سوال کے پیش نظر جواب دیا گویا اس طرح انہوں نے بڑے لطیف انداز میں ادب اور فرمانبرداری دونوں کو جمع کر دیا۔ جیسا کہ اہل کمال کا طریقہ ہے مگر بعض حضرات فرماتے ہیں کہ پہلی مرتبہ آپ ﷺ نے سوال کیا تو حضرت ابی ؓ کو جواب کا علم نہیں تھا، مگر دوسری مرتبہ جب آپ ﷺ نے پھر سوال کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا اس کے سوال کی مدد سے تفویض کی برکت اور حسن ادب کے سبب سوال کا جواب ان پر منکشف کر دیا گیا چنانچہ انہوں نے جواب دیا۔

آیۃ الکرسی کو سب سے عظیم اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس میں توحید، تعظیم الٰہی، اسماء حسنیٰ اور صفات باری تعالیٰ جیسے عظیم و عالی مضامین کا بیان ہے۔

⑮ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ وَكَّلَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِحِفْظِ زَكَاةِ رَمَضَانَ فَاَتَانِیْ اٰتٍ فَجَعَلَ يَحْثُوْ مِنَ الطَّعَامِ فَاَخَذْتُهٗ وَقُلْتُ لَاَرْفَعَنَّكَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّیْ مُحْتَاجٌ وَعَلَیَّ عِيَالٌ وَلِیْ حَاجَةٌ شَدِيْدَةٌ قَالَ فَخَلَّيْتُ عَنْهُ فَاَصْبَحْتُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ مَا فَعَلَ اَسِيْرُكَ الْبَارِحَةَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ شَكَا حَاجَةً شَدِيْدَةً وَعِيَالًا فَرَحِمْتُهٗ فَخَلَّيْتُ سَبِيْلَهٗ قَالَ اَمَا اِنَّهٗ قَدْ كَذَبَكَ وَسَيَعُوْدُ فَعَرَفْتُ اَنَّهٗ سَيَعُوْدُ لِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ سَيَعُوْدُ فَرَصَدْتُهٗ فَجَاءَ يَحْثُوْ مِنَ الطَّعَامِ فَاَخَذْتُهٗ فَقُلْتُ لَاَرْفَعَنَّكَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ دَعْنِیْ فَاِنِّیْ مُحْتَاجٌ وَعَلَیَّ عِيَالٌ لَا اَعُوْدُ فَرَحِمْتُهٗ فَخَلَّيْتُ سَبِيْلَهٗ فَاَصْبَحْتُ فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ مَا فَعَلَ اَسِيْرُكَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ شَكَا حَاجَةً شَدِيْدَةً وَعِيَالًا فَرَحِمْتُهٗ فَخَلَّيْتُ سَبِيْلَهٗ فَقَالَ اَمَا اِنَّهٗ قَدْ كَذَبَكَ وَسَيَعُوْدُ فَرَصَدْتُهٗ فَجَاءَ يَحْثُوْ مِنَ الطَّعَامِ فَاَخَذْتُهٗ فَقُلْتُ لَاَرْفَعَنَّكَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهٰذَا اٰخِرُ ثَلَاثِ مَرَّاتٍ اِنَّكَ تَزْعَمُ لَا تَعُوْدُ ثُمَّ تَعُوْدُ قَالَ دَعْنِیْ اُعَلِّمْكَ كَلِمَاتٍ يَنْفَعُكَ اللّٰهُ بِهَا اِذَا اَوَيْتَ اِلٰى فِرَاشِكَ فَاقْرَأْ اٰيَةَ الْكُرْسِیِّ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ حَتّٰى تَخْتِمَ الْاٰيَةَ فَاِنَّكَ لَنْ يَزَالَ عَلَيْكَ مِنَ اللّٰهِ حَافِظٌ وَلَا يَقْرَبُكَ شَيْطَانٌ حَتّٰى تُصْبِحَ فَخَلَّيْتُ سَبِيْلَهٗ فَاَصْبَحْتُ فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا فَعَلَ اَسِيْرُكَ قُلْتُ زَعَمَ اَنَّهٗ يُعَلِّمُنِیْ كَلِمَاتٍ يَنْفَعُنِی اللّٰهُ بِهَا قَالَ اَمَا اِنَّهٗ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوْبٌ وَتَعْلَمُ مَنْ تُخَاطِبُ مُنْذُ ثَلَاثِ لَيَالٍ قُلْتُ لَا قَالَ ذَاكَ شَيْطَانٌ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے رمضان کی زکوۃ (یعنی صدقہ عید الفطر) کی نگہبانی اور جمع کرنے پر مجھے مامور فرمایا (تاکہ جمع ہونے کے بعد آپ اسے فقراء میں تقسیم فرمادیں) چنانچہ (اس دوران میں) ایک شخص میرے پاس آیا اور اپنے ہاتھوں سے (اپنے دامن اور اپنے برتن میں) غلہ بھرنا شروع کر دیا، میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تجھے رسول کریم ﷺ کے پاس لے چلوں گا، (اور تجھے اس غلط حرکت کی سزا دلواؤں گا) اس نے کہا کہ "میں ایک محتاج ہوں، میرے اوپر میرے اہل و عیال کا نفقہ ہے اور میں سخت حاجتمند ہوں (یعنی میرے ذمہ قرض وغیرہ بھی ہے) حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ میں نے (اس کی یہ خستہ حالت سن کر) اسے چھوڑ دیا، جب صبح ہوئی تو رسول کریم ﷺ مجھ سے فرمانے لگے، کہ "ابوہریرہ ؓ تمہارے گزشتہ رات کے قیدی کا کیا ہوا؟ (اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس واقعہ کی خبر دے دی تھی) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ مجھ سے اپنی سخت حاجت اور عیال داری کا رونا رونے لگا اس لئے مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا" آپ ﷺ نے فرمایا "خبردار رہنا! اس نے (اپنے حالات کے اظہار میں) تم سے جھوٹ بولا ہے، وہ پھر آئے گا (اس لئے آئندہ احتیاط رکھنا) میں سمجھ گیا کہ ضرور آئے گا چنانچہ میں اس کا منتظر رہا، وہ آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے غلہ بھرنا شروع کر دیا، میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ (اب تو) میں تجھے رسول کریم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا" اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دیجئے، میں ضرور تمند ہوں میرے اوپر کنبہ کا نفقہ ہے اب آئندہ میں نہیں آؤں گا" مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا (اور اس مرتبہ میں نے یہ سلوک

اس لئے کیا کہ اس نے آئندہ نہ آنے کا وعدہ کیا تھا اور نہ تو اپنی حاجت وضرورت کے بارہ میں اس کا جھوٹ مخبر صادق یعنی آنحضرت ﷺ کی زبانی معلوم ہی ہو چکا تھا) جب صبح ہوئی تو رسول کریم ﷺ نے مجھ سے پھر فرمایا کہ "ابوہریرہؓ! تمہارا قیدی کیا ہوا" میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ میرے سامنے اپنی شدید ضرورت وحاجت اور عیالداری کا دکھڑا رونے لگا، اس لئے مجھے اس پر رحم آگیا اور میں نے (اس کے اس وعدہ پر کہ آئندہ پھر کبھی نہیں آؤں گا) اس کو چھوڑ دیا،" آپ ﷺ نے فرمایا "ہوشیار رہنا! اس نے (اس مرتبہ بھی) جھوٹ بولا ہے (کہ میں آئندہ نہیں آؤں گا) وہ پھر آئے گا۔" چنانچہ میں اس کا منتظر رہا اور وہ پھر آیا، جب اس نے غلہ بھرنا شروع کیا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ "میں آج تو تجھے ضرور ہی رسول کریم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا یہ آخری تیسرا موقع ہے تو نے تو کہا تھا آئندہ نہیں آؤں گا (اسی لئے میں نے تجھے اس مرتبہ چھوڑ دیا تھا) مگر تو پھر آگیا" اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں تمہیں ایسے کلمات سکھاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے نفع پہنچائے گا (اور وہ یہ کہ) جب تم (سونے کے لئے) اپنے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی لا الله الا هو الحی القیوم آخر آیت (یعنی وهو العلی العظیم) تک پڑھو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ہمیشہ ایک نگہبان (فرشتہ) رہا کرے گا اور صبح تک تمہارے پاس کوئی شیطان (خواہ وہ انسان میں سے ہو یا جنات میں سے دنیوی تکلیف و اذیت پہنچانے کے لئے) نہیں آئے گا" میں نے (یہ سن کر) اسے اس مرتبہ بھی چھوڑ دیا، جب صبح ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے مجھ سے پھر فرمایا کہ تمہارا قیدی کیا ہوا، میں نے عرض کیا کہ "قیدی نے (جب) مجھ سے یہ کہا کہ وہ مجھے کچھ کلمات سکھائے گا، جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے گا (تو میں نے اس مرتبہ بھی اس کو چھوڑ دیا) آپ ﷺ نے فرمایا" آگاہ رہو (اگرچہ) اس نے تم سے (ان کلمات کے بارہ میں) سچ کہا ہے (مگر) وہ (دوسری باتوں میں) جھوٹا ہے، اور تم جانتے ہو کہ تم ان تین راتوں میں کس سے مخاطب تھے؟" میں نے کہا کہ نہیں!" آپ ﷺ نے فرمایا وہ شیطان تھا (جو اس طرح مکروفریب سے صدقات کے مال میں کمی کرنے آیا تھا۔" (بخاریؒ)

سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتوں کی فضیلت

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَيْنَمَا جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَاعِدٌ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ نَقِيْضًا مِنْ فَوْقِهٖ فَرَفَعَ رَأْسَهٗ فَقَالَ هٰذَا بَابٌ مِنَ السَّمَاءِ فُتِحَ الْيَوْمَ لَمْ يُفْتَحْ اِلَّا الْيَوْمَ فَنَزَلَ مِنْهُ مَلَكٌ فَقَالَ هٰذَا مَلَكٌ نَزَلَ اِلَى الْاَرْضِ لَمْ يَنْزِلْ قَطُّ اِلَّا الْيَوْمَ فَسَلَّمَ فَقَالَ اَبْشِرْ بِنُوْرَيْنِ اُوْتِيْتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيْمُ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ لَنْ تَقْرَأَ بِحَرْفٍ مِنْهُمَا اِلَّا اُعْطِيْتَهٗ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) جب جبرئیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ تو انہوں نے (یعنی جبرئیل نے) اوپر کی طرف دروازہ کھلنے کی سی آواز سنی چنانچہ انہوں نے اپنا سر اوپر اٹھا لیا اور کہا کہ "یہ آسمان کا دروازہ کھولا گیا ہے آج کے علاوہ اور کبھی یہ نہیں کھولا گیا ہے" جب ہی اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا، حضرت جبرئیل نے کہا کہ "یہ فرشتہ آج سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اترا ہے" پھر اس فرشتے نے (آنحضرت کو) سلام کیا اور کہا کہ "خوشخبری ہو کہ آپ کو وہ دو نور عطا فرمائے گئے ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے اور کسی نبی کو نہیں دیئے گئے اور وہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کا آخری حصہ ہیں، ان میں سے آپ (ﷺ) کی طرف پڑھے گئے ایک ایک حرف کے عوض آپ (ﷺ) کو ثواب ملے گا یا آپ (ﷺ) کی دعا قبول کی جائے گی۔" (مسلمؒ)

تشریح: فَنَزَلَ مِنْهُ (اس دروازہ سے ایک فرشتہ اترا) یہ راوی کے الفاظ ہیں کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ سے اس طرح سنا۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے آخری حصہ کو "دو نور" سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کو نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورۃ اور آیتیں قیامت کے روز روشنی کی شکل میں ہوں گی جو اپنے پڑھنے والوں کے آگے چلیں گی۔

"سورۂ بقرہ کا آخری حصہ" سے کہاں سے کہاں تک کی آیتیں مراد ہیں؟ تو اس سلسلہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لِلّٰهِ مَا فِي

السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ آخر سورہ تک سورہ بقرہ کا آخری حصہ ہے چنانچہ حضرت کعب ؓ سے بھی یہی منقول ہے۔
ایک ایک حرف میں حرف سے مراد کلمہ (آیت یا آیت کا ٹکڑا) ہے سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتوں میں دو قسم کے کلمات ہیں ایک قسم تو وہ جو دعا پر مشتمل ہیں جیسے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ یا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا اور دوسری قسم وہ ہے جو فقط حمد و ثناء پر مشتمل ہیں لہٰذا جب وہ کلمہ (یعنی آیت یا آیت کا وہ ٹکڑا) پڑھا جائے گا جو دعائیہ ہے تو پڑھنے والے کو وہ چیز ضرور عطا کی جائے گی جو اس کلمہ میں مذکور ہے اسی طرح جب وہ کلمہ پڑھا جائے گا جو حمد و ثناء پر مشتمل ہے تو اس کو وہی ثواب دیا جائے گا جو قرآن کے حرفوں پر ملتا ہے۔

(۱۷) وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاٰیَتَانِ مِنْ اٰخِرِ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ مَنْ قَرَأَ بِھِمَا فِیْ لَیْلَۃٍ کَفَتَاہُ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو مسعود ؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص رات میں سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں یعنی اٰمن الرسول سے آخر تک پڑھتا ہے تو اس کے لئے وہ کافی ہیں۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: "کافی ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ وہ رات میں ان آیتوں کے پڑھنے کی وجہ سے انسان و جنات کے شرارت و ایذاء سے محفوظ رہتا ہے گویا یہ آیتیں اس کے لئے دافع شر و بلا ہو جاتی ہیں یا یہ مطلب ہے کہ یہ دو آیتیں اس کے حق میں قیام لیل و عبادت و ذکر کے لئے شب بیداری کا قائم مقام بن جاتی ہیں۔

سورۂ کہف کی پہلی دس آیتوں کو یاد کر لینے کا اثر

(۱۸) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ حَفِظَ عَشْرَ اٰیَاتٍ مِنْ اَوَّلِ سُوْرَۃِ الْکَھْفِ عُصِمَ مِنَ الدَّجَّالِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو درداء ؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں یاد کرے تو وہ دجال کے شر سے بچایا جائے گا"۔" (مسلم)

تشریح: دجال سے مراد یا تو وہ دجال ہے جو آخری زمانہ میں قیامت کے قریب پیدا ہو گا اور لوگوں کو اپنے مکر و فریب میں پھانسے گا، یا پھر ہر وہ جھوٹا اور فریبی مراد ہے جو اپنے جھوٹ و فریب سے لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔
ترمذی ؒ کی روایت میں جو آگے دوسری فصل میں آئے گی یہ منقول ہے کہ "جس شخص نے سورہ کہف کی اول تین آیتیں پڑھیں تو وہ فتنۂ دجال سے بچایا جائے گا"، بعض حضرات نے ان دونوں روایتوں میں یہ مطابقت پیدا کی ہے کہ جو شخص دس آیتیں یاد کرے گا تو وہ دجال کے شر سے بچایا جائے گا اگر وہ اس سے ملے گا اور جو شخص تین آیتیں پڑھے گا تو وہ دجال کے فتنہ سے بچایا جائے گا اگر وہ اس سے نہیں ملے گا۔

حاصل یہ کہ دجال کا فتنہ اس کی ملاقات کی صورت میں زیادہ سخت ہو گا بہ نسبت اس فتنہ کے جو عدم ملاقات کی صورت میں ہو گا، لہٰذا جو شخص دس آیتیں یاد کرے گا تو وہ فتنۂ ملاقات سے محفوظ ہو گا جو شخص تین آیتیں پڑھے گا تو وہ اس فتنہ سے محفوظ رہے گا جس میں لوگ دجال سے ملے بغیر گرفتار ہوں گے۔

قل ھو اللہ کی فضیلت

(۱۹) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیَعْجِزُ اَحَدُکُمْ اَنْ یَقْرَأَ فِیْ لَیْلَۃٍ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ قَالُوْا وَکَیْفَ یَقْرَأُ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ قَالَ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ۔ رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَرَوَاہُ الْبُخَارِیُّ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کیا تم میں سے کوئی شخص ایک رات میں تہائی قرآن پڑھنے سے عاجز ہے؟" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "تہائی قرآن کیسے پڑھا جائے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "قل ھو اللہ احد تہائی قرآن کے برابر ہے (جس شخص نے رات میں یہ سورۃ پڑھ لی گویا اس نے تہائی قرآن پڑھ لیا) مسلمؒ امام بخاری نے اس روایت کو ابوسعید سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: قرآن کریم میں بنیادی طور پر تین قسم کے مضمون مذکور ہیں ① قصص۔ ② احکام۔ ③ توحید۔ چونکہ سورہ قل ھو اللہ احد میں باری تعالیٰ کی توحید نہایت اونچے اور بلیغ انداز میں بیان ہے یا یوں کہئے کہ پورے قرآن مجید میں توحید کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے سورہ قل ھو اللہ احد اس کا خلاصہ اور حاصل ہے اس لئے سورہ قل ھو اللہ پڑھنا تہائی قرآن پڑھنے کے برابر ہے۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ قل ھو اللہ کا ثواب تہائی قرآن کے اصل ثواب کے بقدر مضاعف کیا جاتا ہے (یعنی بڑھایا جاتا ہے) اس طرح ان دونوں اقوال میں ایک لطیف فرق پیدا ہو گیا ہے، پہلے قول اور پہلی وضاحت کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص سورہ قل ھو اللہ تین مرتبہ پڑھے تو یہ لازم نہیں آتا کہ اسے پورے قرآن کا ثواب ملے، جب کہ دوسرے قول کے مطابق قل ھو اللہ تین مرتبہ پڑھنے سے ایک پورے قرآن کا اصل ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔

⑳ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ رَجُلًا عَلٰى سَرِيَّةٍ وَكَانَ يَقْرَأُ لِاَصْحَابِهٖ فِيْ صَلَاتِهِمْ فَيَخْتِمُ بِقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ فَلَمَّا رَجَعُوْا ذَكَرُوْا ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ سَلُوْهُ لِاَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذٰلِكَ فَسَأَلُوْهُ فَقَالَ لِاَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ وَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اَقْرَأَهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخْبِرُوْهُ اَنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهٗ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو امیر بنا کر ایک لشکر کے ساتھ بھیجا وہ شخص نماز میں اپنے رفقاء کی امامت بھی کرتا تھا اور (اس کا معمول تھا کہ اپنی قرأت) قل ھو اللہ پر ختم کرتا تھا، جب وہ (لشکر کے لوگ) واپس آئے تو انہوں نے اس کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اس شخص سے دریافت کرو کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ "یہ اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورۃ میں رحمٰن اللہ تعالیٰ کی صفت (وحدانیت) بیان کی گئی ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں کہ (اللہ کی صفت وحدانیت کے اظہار کے پیش نظر) اس سورۃ کو (ہمیشہ) پڑھتا رہوں، نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "اس شخص کو خبر دو کہ اللہ تعالیٰ کو دوست رکھتا ہے (کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو دوست رکھتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "قل ھو اللہ پر ختم کرتا تھا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر نماز کی آخری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ قل ھو اللہ پڑھا کرتا تھا، لیکن علامہ ابن حجرؒ نے اس کی وضاحت یہ کی ہے کہ وہ شخص ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ یا سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت کے بعد قل ھو اللہ پڑھتا تھا، اس سلسلہ میں پہلی وضاحت ہی زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں تمام علماء کے نزدیک نماز بلا کراہت ادا ہو جاتی ہے۔

㉑ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اُحِبُّ هٰذِهِ السُّوْرَةَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ قَالَ اِنَّ حُبَّكَ اِيَّاهَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَى الْبُخَارِيُّ معناه۔

"اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا ہے کہ یا رسول اللہ! میں اس سورۃ یعنی قل ھو اللہ کو دوست رکھتا ہوں (یعنی اسے اکثر پڑھتا رہتا ہوں) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس سورۃ سے تمہاری دوستی تمہیں جنت میں داخل کرے گی" (ترمذی) امام بخاریؒ نے اس روایت کو بالمعنی نقل کیا ہے۔"

معوذتین کی فضیلت

㉒ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَمْ تَرَ اٰيَاتٍ اُنْزِلَتِ اللَّيْلَةَ لَمْ يُرَ مِثْلُهُنَّ قَطُّ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (رواه مسلم)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "آج کی رات ایسی عجیب آیتیں اتاری گئی ہیں کہ (پناہ طلب کرنے کے سلسلہ میں) ان کا کوئی جواب نہیں ہے اور وہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ہیں۔" (مسلمؒ)

آنحضرت ﷺ رات میں قل ھو اللہ اور معوذتین پڑھ کر اپنے بدن پر دم کرتے تھے

(۲۳) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ كُلَّ لَيْلَةٍ جَمَعَ كَفَّيْهِ ثُمَّ نَفَثَ فِيْهِمَا فَقَرَأَ فِيْهِمَا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ثُمَّ يَمْسَحُ بِهِمَا مَا اسْتَطَاعَ مِنْ جَسَدِهٖ يَبْدَأُ بِهِمَا عَلٰى رَأْسِهٖ وَوَجْهِهٖ وَمَا اَقْبَلَ مِنْ جَسَدِهٖ يَفْعَلُ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ لَمَّا اُسْرِيَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَابِ الْمِعْرَاجِ اِنْشَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ روزانہ رات میں جب اپنے بستر پر تشریف لے جاتے تو (سونے سے پہلے) اپنے دونوں ہاتھ ملا کر ان پر دم کرتے اور پھر ان پر قل ھو اللہ، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے جسم پر جہاں تک ہو سکتا پھیرتے پہلے آپ ﷺ ہاتھ پھیرنا، اپنے سر، منہ اور بدن کے آگے حصہ سے شروع کرتے (اس کے بعد بدن کے دوسروں پر پھیرتے) آپ ﷺ یہ عمل (یعنی پڑھنا، دم کرنا اور بدن پر دونوں ہاتھوں کا پھیرنا) تین مرتبہ کرتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے ہاتھوں پر دم تو پہلے کرتے تھے اور پڑھتے بعد میں تھے، چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ ﷺ یہ طریقہ اس لئے اختیار فرماتے تھے تاکہ ساحروں کی مخالفت ظاہر ہو کیونکہ وہ پہلے پڑھتے ہیں اور بعد میں دم کرتے ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دم کرنے کا ارادہ کرتے پھر پڑھتے اور اس کے بعد دم کرتے وسنذکر حدیث ابن مسعود لما اسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی باب المعراج ان شاء اللہ تعالیٰ اور ابن مسعودؓ کی حدیث لما اسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انشاء اللہ تعالیٰ ہم معراج کے باب میں ذکر کریں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

قیامت کے دن عرش کے نیچے تین چیزیں ہوں گی

(۲۴) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثَةٌ تَحْتَ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْقُرْاٰنُ يُحَاجُّ الْعِبَادَ لَهٗ ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَالْاَمَانَةُ وَالرَّحِمُ تُنَادِيْ اَلَا مَنْ وَصَلَنِيْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِيْ قَطَعَهُ اللّٰهُ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت عبدالرحمن ابن عوف، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن عرش کے نیچے تین چیزیں ہوں گی ایک تو قرآن جو بندوں سے جھگڑے گا اور قرآن کے لئے ظاہر بھی ہے اور باطن بھی عرش کے نیچے دوسری چیز امانت ہوگی تیسری چیز جو پکارے گی، خبردار! جس شخص نے مجھے ملایا (یعنی میرے حق کی رعایت کی بایں طور کہ میرے احکام کی فرمانبرداری کا جو حق اس پر ہے اسے ادا کیا، تو اللہ تعالیٰ اسے بھی (اپنی رحمت کے ساتھ) ملائے گا اور جس شخص نے مجھے توڑا (یعنی میرے حق کو ادا نہیں کیا) تو اللہ تعالیٰ بھی اس شخص کو توڑے گا (یعنی اس پر رحمت خاص متوجہ نہ ہوگی۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "عرش کے نیچے تین چیزیں ہوں گی" سے دراصل اس بات کی طرف کنایہ ہے کہ قیامت کے روز ان تین چیزوں کو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں کمال قرب و اعتبار حاصل ہوگا اور حق سبحانہ تعالیٰ ان کے حق کو اور ان کے ثواب کو جو ان کے اختیار کرنے والوں کو ملے گا ضائع نہیں کرے گا۔

"بندوں سے جھگڑے گا" کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی دنیاوی زندگی میں قرآن کی تعظیم نہ کی ہوگی اور اس پر عمل نہ کیا ہوگا

قیامت کے روز قرآن کریم ان سے جھگڑے گا یعنی ان کو سزا دلوائے گا اور جن لوگوں نے اپنی دنیاوی زندگی میں قرآن کریم کی تعظیم بھی کی ہوگی اور اس پر عمل بھی کیا ہوگا تو قرآن ان کی طرف سے جھگڑے گا یعنی بارگاہ رب العزت میں ان کی طرف سے وکالت اور اس کی شفاعت کرے گا۔

"قرآن کے لئے ظاہر بھی ہے" کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں احکام وغیرہ بیان کئے گئے ہیں ان کے معنی بالکل ظاہر اور واضح ہیں جن کو اکثر لوگ سمجھتے ہیں ان میں کسی غور و فکر اور تامل کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح "باطن" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے کچھ معنی ایسے ہیں جنہیں سمجھنے کے لئے غور و فکر اور تفسیر و تامل کی ضرورت ہوتی ہے، یا یوں کہئے کہ ان معنی کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ خواص اور علماء ہی سمجھتے ہیں اس ارشاد گرامی سے گویا اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ قرآن پر عمل نہیں کرتے ان سے قیامت کے روز قرآن کے بارہ میں ہر شخص کی سمجھ اور اس کے علم کے بقدر ہی مواخذہ ہوگا "امانت" سے حقوق اللہ اور حقوق العباد مراد ہیں کہ جن کی ادائیگی لازم ہے۔

قرآن کو ترتیل سے پڑھنے کی فضیلت

(۲۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْاٰنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ کَمَا کُنْتَ تُرَتِّلُ فِی الدُّنْیَا فَاِنَّ مَنْزِلَکَ عِنْدَ اٰخِرِ اٰیَۃٍ تَقْرَؤُھَا (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ پڑھتا جا اور (بہشت کے درجوں پر) چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا پس تیری منزل اس آخری آیت پر ہوگی جسے تو پڑھے گا۔" (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "صاحب قرآن" سے وہ شخص مراد ہے جو قرآن کریم کی ہمیشہ تلاوت بھی کرتا رہے اور اس پر عمل پیرا بھی ہو، وہ شخص مراد نہیں ہے جو تلاوت تو کرتا ہے مگر اس پر عمل نہ کرے بلکہ پہلے بتایا بھی جا چکا ہے کہ ایسا شخص کسی جزاء اور انعام کا مستحق تو کیا ہوگا، الٹا قرآن کی لعنت میں گرفتار ہوگا کیونکہ جو شخص قرآن پڑھتا ہے، مگر اس پر عمل نہیں کرتا قرآن اس پر لعنت کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک یہ روایت پیش نظر رہنی چاہئے کہ جس شخص نے قرآن پر عمل کیا اس نے گویا ہمیشہ قرآن پڑھا اگرچہ حقیقت میں نہ پڑھا ہو اور جس شخص نے قرآن پر عمل نہیں کیا اس نے گویا قرآن پڑھا ہی نہیں اگرچہ حقیقت میں پڑھا ہو، حاصل یہ کہ قرآن کی محض تلاوت ہی کافی نہیں ہے، بلکہ بنیادی چیز قرآن پر عمل کرنا ہے۔

"پڑھتا جا اور چڑھتا جا" یعنی قرآن کریم پڑھتا جا اور پڑھی ہوئی آیتوں کے بقدر جنت کے درجات پر چڑھتا جا، جتنی آیتیں تو پڑھے گا اتنے ہی درجات تک تیری رسائی ہوگی، ایک روایت میں منقول ہے کہ قرآن کریم کی جتنی آیتیں ہیں جنت کے اتنے ہی درجات ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص پورا قرآن پڑھے گا تو وہ جنت کے سب سے اونچے درجات میں سے اس درجہ پر پہنچے گا جس کا وہ اہل اور جو اس کے لائق ہوگا۔

یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ آداب تلاوت قرآن کریم میں سے ایک سب سے اعلیٰ ادب یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کر اور لب و لہجہ کے پورے سکون وقار کے ساتھ پڑھا جائے، چنانچہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو حافظ قرآن کریم ترتیل کے ساتھ پڑھتے ہیں جنت میں ان کا بڑا مرتبہ ہوگا۔

قرآن کریم کی آیتوں کی تعداد کوفیوں کے اصول کے اعتبار سے جن کا فن قرأت اور اصول ہمارے اطراف میں مروج ہے چھ ہزار دو سو چھتیس ہے، اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں، مزید تفصیل و وضاحت کے لئے تجوید و قرأت کی کتابوں سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

قرآن سے خالی دل ویران گھر کی مانند ہے

(۲۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِهٖ شَیْءٌ مِنَ الْقُرْاٰنِ كَالْبَیْتِ الْخَرِبِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کا دل قرآن سے خالی ہو تو وہ (یا اس کا دل) ویران گھر کی طرح ہے" (ترمذیؒ، دارمیؒ) امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: گھر کی رونق مکین سے ہے، گھر کتنا ہی خوبصورت اور وسیع ہو اگر اس میں کوئی رہنے والا نہ ہو تو اس کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ گھر کی ویرانی، گھر کی قیمت اور اس کی اہمیت کو عام نظروں سے گرا دیتی ہے، اسی طرح انسان کا معاملہ ہے اگر انسان کا دل ایمان و قرآن کے نور سے خالی ہو تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، چنانچہ مذکورہ بالا ارشاد گرامی کا مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن بالکل نہیں جانتا اور نہ اس پر ایمان رکھتا ہے یا قرآن تو جانتا ہو مگر اس پر ایمان نہ رکھتا ہو تو وہ ویران گھر کی طرح ہے، اور جو شخص قرآن پڑھنا جانتا ہے اسے پڑھتا ہے اور سمجھتا ہے نیز اس پر ایمان بھی رکھتا ہے تو اس کا باطن ایمان کے نور سے آباد ہے، اب یہ فرق الگ رہا کہ جو شخص تھوڑا جانتا ہو گا اس کا باطن ایمان کی دولت سے تھوڑا آباد ہو گا اور جو شخص بہت جانتا ہو گا اس کا باطن بھی بہت آباد ہو گا۔

مشغولیت قرآن کا اثر

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْاٰنُ عَنْ ذِكْرِیْ وَمَسْاَلَتِیْ اَعْطَیْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِی السَّائِلِیْنَ وَفَضْلُ كَلَامِ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلٰی سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰی خَلْقِهٖ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ بزرگ و برتر فرماتا ہے کہ جس شخص کو قرآن کریم میرے ذکر اور مجھ سے مانگنے سے باز رکھتا ہے تو میں اس کو اس چیز سے بہتر عطا کرتا ہوں جو مانگنے والوں کو دیتا ہوں، اور تمام کلاموں کے مقابلہ میں کلام اللہ کو وہی عظمت و بزرگی حاصل ہے جو اللہ رب العزت کو اس کی تمام مخلوقات پر بزرگی اور برتری حاصل ہے (لہٰذا قرآن کریم میں مشغول رہنے والے کو دوسری چیزوں میں مشغول رہنے والوں پر بھی اسی طرح برتری و بزرگی حاصل ہوتی ہے) ترمذی، دارمی، بیہقی نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: اللہ رب العزت کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن یاد کرنے، اس کے مفہوم و معنی کے سمجھنے اور جاننے اور قرآن کریم میں مذکورہ احکام وہدایات پر عمل کرنے میں مشغول رہتا ہے اور اس کی یہ مشغولیت اس کو ان افکار و اوراد اور دعا سے جو کلام اللہ کے علاوہ باز رکھتی ہیں یعنی وہ قرآن میں مشغولیت کی وجہ سے نہ تو مجھے یاد کرتا ہے اور نہ ہی مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے مانگنے والوں سے بھی زیادہ دیتا ہوں کیونکہ قرآن کے ساتھ اس درجہ کی مشغولیت اور انہماک در حقیقت اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ شخص اپنی ہر خواہش اور اپنی ہر طلب کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اس کے کلام پاک ہی سے تعلق قائم کئے ہوئے ہے۔ لہٰذا اس کے اس عظیم جذبہ کے تحت اسے یہ اجر دیا جائے گا۔

اس موقع پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ حدیث قدسی کے شروع کے الفاظ تو یہ ہیں کہ من شغلہ القرآن عن ذکری لہٰذا اس کا تقاضا یہ تھا کہ آخر میں بھی "ذکر کرنے اور مانگنے" والوں کو بیان کیا جاتا کہ "میں اس چیز سے بہتر عطا کرتا ہوں جو ذکر کرنے والوں اور مانگنے والوں کو دیتا ہوں" مگر یہاں صرف "مانگنے والوں" کا ذکر کیا گیا ہے "ذکر کرنے والوں" کا ذکر نہیں کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ "ذکر" بھی

در حقیقت دعا (مانگنا) ہی ہے، کیونکہ کریم کی حمد و ثناء اور اس کے ذکر کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ مجھے کچھ عطا ہو اس لئے اس ارشاد کے آخر میں بھی "مانگنے والوں" کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔

حدیث کے آخری جملہ و فضل کلام اللہ الخ کے بارہ میں یہاں یہ احتمال ہے کہ یہ جملہ قدسی ہی کا تتمہ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے وہیں یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے بلکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اور یہی احتمال زیادہ صحیح ہے۔

قرآن کے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں

(۲۸) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلَهٗ بِهٖ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا لَا اَقُوْلُ الٓمّٓ حَرْفٌ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادًا۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص قرآن کا ایک حرف پڑھے تو اس کے لئے ہر حرف کے عوض ایک نیکی ہے جو دس نیکیوں کے برابر ہے (یعنی قرآن کے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں ملتی ہیں) میں یہ نہیں کہتا کہ سارا الم ایک حرف ہے (بلکہ) الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے (یعنی الم کہنے میں تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں) (ترمذیؒ، دارمیؒ) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے حسن صحیح غریب ہے۔"

قرآن سرچشمۂ ہدایت ہے

(۲۹) وَعَنِ الْحَارِثِ الْاَعْوَرِ قَالَ مَرَرْتُ فِي الْمَسْجِدِ فَاِذَا النَّاسُ يَخُوْضُوْنَ فِي الْاَحَادِيْثِ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَلِيٍّ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اَوَقَدْ فَعَلُوْهَا قُلْتُ نَعَمْ قَالَ اَمَا اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلَا اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ قُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كِتَابُ اللّٰهِ فِيْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ ذِكْرُ الْحَكِيْمِ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ هُوَ الَّذِيْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا يَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ هُوَ الَّذِيْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذَا سَمِعَتْهُ حَتّٰى قَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَهْدِيْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ وَمَنْ دَعَا اِلَيْهِ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطِ الْمُسْتَقِيْمِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ اِسْنَادُهٗ مَجْهُوْلٌ وَفِي الْحَارِثِ مَقَالٌ۔

"اور حضرت حارثؒ جو اعور (یعنی کانی آنکھ والے) تھے راوی ہیں کہ میں (ایک دن کوفہ کی) مسجد میں (بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس) گیا (تو میں نے دیکھا کہ وہ) لوگ بیکار و لایعنی گفتگو (یعنی قصے کہانیوں) میں مصروف ہیں (اور انہوں نے قرآن مجید کی تلاوت وغیرہ ترک کی ہوئی ہے) چنانچہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اس کے بارہ میں بتایا، انہوں نے فرمایا "کیا انہوں نے واقعی ایسا کیا ہے (کہ تلاوت قرآن وغیرہ چھوڑ کر بیکار باتوں میں مصروف ہیں؟) میں نے کہا کہ "جی ہاں!" انہوں نے فرمایا "تو پھر سن لو! میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خبردار! فتنہ واقع ہوگا (یعنی لوگوں کے دینی افکار و عقائد میں اختلاف ہوگا، اعمال میں سُست روی اور گمراہی پیدا ہوگی اور وہ گمراہ لوگ اسلام کے نام پر نت نئے مذاہب و نظریات کی داغ بیل ڈالیں گے) میں نے عرض کیا کہ "حضرت ﷺ! پھر اس سے نجات پانے کا کیا راستہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "کتاب اللہ (یعنی نجات کا راستہ قرآن پر عمل کرنے ہی سے ہاتھ لگے گا) جس میں تم سے پہلے لوگوں (یعنی پچھلی امتوں کے حالات بھی ہیں اور ان باتوں کی بھی خبر دی گئی ہے جو تمہارے بعد واقع ہونے والی ہیں (یعنی قیامت کی علامات و احوال) اور اس قرآن میں وہ احکام بھی مذکور ہیں جو تمہارے درمیان (ضروری) ہیں (یعنی) ایمان کفر،

اطاعت وگناہ حلال وحرام اور اسلام کے شرائع نیز آپس کے تمام معاملات وغیرہ کے بارہ میں احکام بیان کئے گئے ہیں جو پوری انسانی برادری کے لئے ضروری ہیں) اور (یاد رکھو) وہ قرآن حق و باطل کے درمیان (اپنے احکام کے ذریعہ) فرق کرنے والا ہے وہ کوئی بیکار ولایعنی چیز نہیں ہے اور (یہ بھی کان کھول کر سن لو کہ) جس متکبر نے قرآن کو چھوڑ دیا اس کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر ڈالے گا اور جو شخص اس قرآن کے علاوہ (کسی ایسی کتاب وعلم سے کہ جو نہ قرآن سے مستنبط ہے اور اسلامی شرائع ونظریات کے مطابق ہے) ہدایت وروشنی چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دے گا وہ قرآن اللہ کی مضبوط سیدھی رسی ہے (یعنی خدا کے قرب اور اس کی معرفت کا سب سے قوی وسیلہ ہے) قرآن باحکمت ذکر اور بیان ہے، قرآن بالکل سیدھا اور صاف راستہ ہے (جس پر چل کر انسان اپنی تخلیق کا حقیقی مقصد پاتا ہے) قرآن وہ سرچشمہ ہدایت ہے جس کی اتباع کے نتیجہ میں خواہشات انسانی حق سے باطل کی طرف مائل نہیں ہوتیں، اس کی زبان سے اور زبانیں نہیں ملتیں، علماء اس سے (کبھی) سیر نہیں ہوتے (یعنی علماء ومفسرین اس کے تمام علوم معارف پر حاوی نہیں ہوتے) اور قرآن مجید مزاولت (کثرت تلاوت) سے پرانا نہیں ہوتا اور نہ اس کے عجائب تمام ہوتے ہیں، قرآن کریم وہ کلام ہے جس کو جنات نے سنا تو وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر کہہ اٹھے کہ ہم نے قرآن سنا جو ہدایت کی عجیب راہ دکھاتا ہے لہٰذا ہم اس پر ایمان لائے (یاد رکھو) جس شخص نے قرآن کے مطابق کہا اس نے سچ کہا اور جس نے اس پر عمل کیا اسے ثواب دیا جائے گا (یعنی وہی اقوال ونظریات صحیح اور قابل قبول ہیں جو قرآن کے عین مطابق ہیں اسی طرح ہدایت یافتہ بھی وہی شخص ہے جس نے قرآن کو سرچشمہ ہدایت جان کر اس پر عمل کیا) جس شخص نے (لوگوں کے درمیان) قرآن کے مطابق فیصلہ وانصاف کیا اور جس نے (لوگوں کو) اس (پر ایمان لانے اور اس پر عمل کرنے) کی طرف بلایا اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی ہے (یعنی وہ ہدایت یافتہ ہے) ترمذیؒ، دارمیؒ اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند مجہول ہے اور اس کے راوی حارث اعور کے بارہ میں کلام ہے (یعنی ان کے سچا ہونے میں شبہ کیا جاتا ہے)۔"

تشریح: "متکبر سے مراد" منکر قرآن ہے یعنی وہ شخص جو قرآن پر ایمان نہیں لایا اور نہ اس نے قرآن پر عمل کیا اور ظاہر ہے کہ ایسا بدبخت شخص وہی ہو سکتا ہے جس کے قلب میں غرور وتکبر اور تعصب کے جراثیم موجود ہوں۔

حدیث میں لفظ "قصم" کے معنی ہیں توڑ ڈالنا اور جدا کر دینا اس لئے اس جملہ کا لفظی ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس متکبر نے قرآن چھوڑ دیا اللہ تعالیٰ اس کی گردن توڑ ڈالے گا لیکن عام طور پر اس کا ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کر ڈالے گا۔ کیونکہ مفہوم وحقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں کا مطلب یہی ہے کہ جو شخص قرآن کا انکار کرے گا یا اس پر عمل نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے دور کر دے گا جس کا مآل کار ہلاکت وتباہی ہے بخلاف اس شخص کے کہ جو قرآن پر ایمان بھی لائے اور اس پر عمل بھی کرے اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے قریب کر دے گا اور اسے اعلیٰ مراتب ودرجات عطا فرمائے گا۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ جس شخص نے قرآن کی کسی ایسی ایک آیت یا ایک کلمہ پر بھی عمل[1] کرنا چھوڑ دیا جس پر عمل کرنا واجب ہے یا ازراہ تکبر اس آیت یا کلمہ کی قرأت نہیں کی تو وہ شخص کافر ہو جاتا ہے، ہاں اگر کوئی محض کسل وضعف یا عجز کی وجہ سے قرآن کی تلاوت چھوڑ دے مگر اس کا قلب قرآن کی عظمت وحرمت کے اعتقاد سے پر ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں البتہ وہ ثواب سے محروم رہتا ہے۔

"خواہشات انسانی حق سے باطل کی طرف مائل نہیں ہوتیں" اس پورے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن کی اتباع کرتا ہے اس کے احکام پر عمل کرتا ہے اور اپنی زندگی کے ہر موڑ پر قرآن کی رہنمائی وہدایت کا طلب گار ہوتا ہے تو وہ ہر گمراہی اور ہر ضلالت سے محفوظ رہتا ہے، توفیق الٰہی اسے اسی راستہ پر گامزن رکھتی ہے جو حق وہدایت کی شاہراہ ہوتی ہے۔

اگر اس موقع پر یہ اشکال پیدا ہو کہ اہل بدعت اور روافض وخوارج یا موجودہ دور کے دوسرے فرقے وغیرہ بھی تو قرآن ہی سے استدلال کرتے ہیں اور قرآن ہی کی رہنمائی ہی کا دم بھرتے ہیں، مگر اس کے باوجود وہ گمراہی سے محفوظ نہیں ہوتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو

---

[1] یعنی ازراہ انکار و ازراہ تکبر عمل کرنا چھوڑ دیا۔

یہی بات محل نظر ہے کہ قرآن سے ان کا استدلال اور قرآن کی رہنمائی کا ان کا دعویٰ حقیقت پر مبنی بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ قرآن سے اس کا استدلال بالکل غلط زاویہ فکر سے ہوتا ہے وہ پہلے تو اپنے خیالات و نظریات کی ایک عمارت بنا لیتے ہیں پھر اس کی مضبوطی و استواری کے لئے قرآن کا سہارا لیتے ہیں اس طرح وہ قرآنی آیات کو ان کے حقیقی مفہوم و معانی سے الگ کر کے اپنے خیالات و نظریات پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اہل حق اپنے خیالات و عقائد کو قرآن کے تابع بناتے ہیں، قرآن کی جو واضح ہدایات ہیں ان کی روشنی میں وہ اپنے اعتقادات کو آراستہ کرتے ہیں اس کے برخلاف گمراہ ذہن و فکر کے لوگ قرآن کو اپنے خیالات و نظریات کا تابع بناتے ہیں اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں قرآن سے استدلال کر کے ہی کہتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی دلیلیں بایں طور بھی کامل نہیں ہوتیں کہ وہ اپنے ذہن میں یہ گمراہ کن تصور قائم کر کے کہ اصل اور کامل راہنمائی صرف قرآن ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے احادیث اور دیگر ذرائع کو جو قرآن فہمی کے لئے ضروری ہیں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ قرآن کا حقیقی مفہوم اور اس کا اصل مقصد منشاء احادیث نبوی ﷺ، اقوال صحابہؓ اور ارشادات علماء حقانین ہی سے واضح ہو سکتا ہے مگروہ کرتے یہ ہیں کہ نہ تو ان احادیث کو پیش نظر رکھتے ہیں جن سے کلام اللہ کا مقصد واضح ہوتا ہے اور نہ ان حضرات کے فیوض و اقوال سے استفادہ اور ان کی تقلید کرتے ہیں جو کلام اللہ کے سمجھنے اور اس کے اصل مقصد و منشاء تک پہنچنے میں کامل سمجھے جاتے ہیں مثلاً صحابہ کرام، تابعین اور دیگر علماء امت۔

لہٰذا یہ بات معلوم ہو جانی چاہئے کہ وہ قرآن سے استدلال کرنے اور بزعم خود قرآن کی راہنمائی کرنے کے باوجود گمراہ نہیں ہیں بلکہ ان کی گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ قرآن کی صحیح راہنمائی اختیار نہیں کرتے یا یوں کہئے کہ وہ قرآن کو راہنما اور سرچشمہ ہدایت سمجھ کر نہیں بلکہ اس کو اپنے نظریات و اعتقادات کا تابع بنا کر اختیار کرتے ہیں لہٰذا قرآن کو اختیار کرنے کے باوجود قرآن کی حقیقی منشاء و مقصد اور اس کے اصل مفہوم و معانی تک ان کی رسائی ہی نہیں ہوتی۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت اسی وقت کارآمد ہوتی ہے جب کہ ان ذرائع اور وسائل کو پورے قلبی اعتقاد کے ساتھ اختیار کیا جائے جن پر قرآن فہمی موقوف ہے کہ ان کے بغیر نہ تو قرآن کی حقیقی سمجھ میسر آتی ہے اور نہ قرآن کے اصل مفہوم و منشاء تک رسائی ممکن ہوتی ہے اور وہ احادیث نبوی ﷺ ہیں، اقوال صحابہؓ ہیں اور ارشادات ائمہ و علماء ہیں اسی لئے حضرت جنیدؒ نے کہا ہے کہ:

"جو شخص قرآن یاد نہ کرے اور احادیث نہ سیکھے اور نہ جانے تو اس کی پیروی نہ کی جائے اور جو شخص ہمارے زمرہ اور ہمارے مسلک میں بغیر علم کے داخل ہوا اور اس نے ہمیشہ اپنے جہل پر قناعت کی تو وہ مسخرہ شیطان ہے کیونکہ ہمارا علم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے ساتھ مقید ہے۔"

علامہ طیبیؒ نے حدیث کے مذکورہ بالا جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ہوس یعنی بدعتی اور گمراہ لوگ اس بات پر قادر نہیں ہوتے کہ وہ قرآن کے اصلی معنی و مفہوم میں تغیر و تبدل کر دیں یا اس میں کوئی کجی پیدا کر دیں، اس صورت میں لا یزیغ بہ الاھواء میں بہ کا حرف باء تعدیہ کے لئے ہوگا۔

"اس زبان سے اور زبانیں نہیں ملتیں" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم باعتبار الفاظ کے بھی فصاحت و بلاغت کا وہ نقطہ عروج ہے کہ دنیا کی کوئی بھی بڑی سے بڑی فصیح و بلیغ عبارت قرآن کی آیات کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یا اس جملہ کی مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت مؤمنین کی زبانوں پر دشوار و مشکل نہیں ہوتی اگرچہ ان کی زبان عربی نہ بھی ہو کیونکہ قرآن کی تلاوت اور اس کی آیات کی قرأت دلوں پر کیف و انبساط کی وہ فضا طاری کر دیتی ہے کہ زبان عربی سے ناآشنا ہونے کے باوجود الفاظ قرآنی ادائیگی میں ذرا بھی ثقل محسوس نہیں کرتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ — "اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا۔"

"علماء اس سے سیر نہیں ہوتے" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے علوم و معارف اتنے وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی اس کے تمام علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا اور نہ اس کے نکات و حقائق کا اس انداز سے ادراک کر سکتا ہے کہ اس کی طلب تحقیق و جستجو کسی مرحلہ پر پہنچ کر رک جائے اور اس کا ادراک سیر ہو جائے جیسا کہ جب کوئی شخص کھانے سے سیر ہو جاتا ہے تو اس کی طلب رک جاتی ہے اور خواہش مزید قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے اس کے برخلاف جب علماء قرآنی حقائق و معارف میں سے کسی مفہوم پر مطلع ہو جاتے ہیں تو ان کا اشتیاق اور بڑھ جاتا ہے اور ان کی خواہش تلاش و جستجو اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ حاصل شدہ مفہوم سے بھی زیادہ کوئی بات معلوم ہو جائے اس طرح اس طلب، خواہش اور تلاش و جستجو کی کوئی حد قائم نہیں ہوتی۔

"پرانا نہیں ہوتا" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو بار بار پڑھنے اور کثرت تلاوت کی وجہ سے قرأت قرآن اور اس میں مذکور احوال و احکام سننے کی لذت اور اس کے کیف میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ کوئی شخص جب بھی قرآن پڑھتا ہے یا اس کی قرأت سنتا ہے تو ہر مرتبہ اسے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ حلاوت و کیف محسوس ہوتا ہے خواہ اس کے معنی و مفہوم کو سمجھے یا نہ سمجھے۔

قیامت کے دن حافظ و عامل قرآن کے والدین کی تاج پوشی

(۳۰) وَعَنْ مُعَاذِ الْجُهَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيْهِ اُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءُهُ اَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِيْ بُيُوْتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيْكُمْ فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِيْ عَمِلَ بِهٰذَا۔

(رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت معاذ جہنیؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص قرآن پڑھے اور جو کچھ اس میں مذکور ہے اس پر عمل کرے تو قیامت کے دن اس کے ماں باپ کو تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی دنیا کے گھروں میں چمکنے والے آفتاب کی روشنی سے اعلیٰ ہوگی اگر (بفرض محال) تمہارے گھروں میں آفتاب ہو، اب تو خود اس شخص کا مرتبہ سمجھ سکتے ہو جس نے قرآن پر عمل کیا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ کا مطلب یہ ہے کہ "جس شخص نے خوب اچھی طرح قرآن پڑھا" لیکن عطاء طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے قرآن کو یاد کیا۔ گویا ان کے نزدیک یہاں حافظ قرآن مراد ہے۔

لو کانت فیکم (اگر تمہارے گھروں میں آفتاب ہو) کا مطلب یہ ہے کہ اگر بفرض محال آفتاب آسمان کی بلندیوں سے اتر کر تمہارے گھروں میں آجائے تو اس کی روشنی بھی قیامت کے دن پہنائے جانے والے تاج کی روشنی کے سامنے ماند ہوگی۔ یہ گویا آفتاب کی روشنی کو بطور مبالغہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر آفتاب اپنی موجودہ روشنی کے ساتھ تمہارے گھروں کے اندر ہو تو ظاہر ہے کہ اس وقت کی روشنی زیادہ معلوم ہوگی یہ نسبت موجودہ صورت کی روشنی کے جب کہ آفتاب گھر سے باہر اور بہت زیادہ بلند ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن پڑھنے (والے یا حافظ قرآن) اور قرآن پر عمل کرنے والے کے والدین کو اس عظیم مرتبہ اور نعمت سے نوازا جائے گا تو پھر خود اس شخص کے مرتبہ اور سعادت کا کیا کہنا جس نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا؟

قرآن کا ایک معجزہ

(۳۱) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَوْ جُعِلَ الْقُرْاٰنُ فِيْ اِهَابٍ ثُمَّ اُلْقِيَ فِي النَّارِ مَا احْتَرَقَ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اگر قرآن کو کسی کھال (وغیرہ) میں رکھ کر

اسے (بفرض محال) آگ میں ڈال دیا جائے تو اس پر آگ اثر انداز نہیں ہوگی۔" (دارمی)

تشریح: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ در حقیقت آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں قرآن مجید کا ایک معجزہ تھا کہ اسے اگر کسی کھال وغیرہ میں لپیٹ کر آگ میں ڈالتے تھے تو اس پر آگ اثر انداز نہ ہوتی، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے انبیاء کرام کے زمانہ میں ان کے معجزے ہوا کرتے تھے۔

مگر دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں "کھال" سے مراد انسان کا قلب اور اس کی کھال و بدن ہے کہ جس شخص کے قلب میں قرآن کی روشنی فروزاں ہو اور وہ قرآن پڑھتا اور اس پر عمل کرتا ہو تو وہ دوزخ کی آگ و عذاب سے محفوظ رہے گا۔

دس عزیزوں کے حق میں حافظ قرآن کی سفارش

(۳۲) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَظْهَرَهٗ فَاَحَلَّ حَلَالَهٗ وَحَرَّمَ حَرَامَهٗ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ وَشَفَّعَهٗ فِيْ عَشْرَةٍ مِّنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَحَفْصُ بْنُ سُلَيْمَانَ الرَّاوِيْ لَيْسَ هُوَ بِالْقَوِيِّ يُضَعَّفُ فِي الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت علیؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے قرآن مجید پڑھا پھر اسے یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام جانا تو اللہ تعالیٰ اسے (ابتداء ہی میں) داخل فرمائے گا اور اس کے ان دس عزیزوں کے حق میں اس کی سفارش قبول فرمائے گا جو مستوجب دوزخ (یعنی فاسق اور مستحق عذاب) ہوں گے" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اس کے ایک راوی قوی نہیں ہیں بلکہ (روایت حدیث میں) ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔"

سورۂ فاتحہ لامثال سورۃ ہے

(۳۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ كَيْفَ تَقْرَأُ فِي الصَّلٰوةِ فَقَرَأَ اُمَّ الْقُرْاٰنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَآ اُنْزِلَتْ فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْاِنْجِيْلِ وَلَا فِي الزَّبُوْرِ وَلَا فِي الْقُرْاٰنِ مِثْلُهَا وَاِنَّهَا سَبْعٌ مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ اُعْطِيْتُهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ مِنْ قَوْلِهٖ مَا اُنْزِلَتْ وَلَمْ يَذْكُرْ اُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے فرمایا کہ "(نماز میں) تم کس طرح (یعنی کیا پڑھتے ہو؟ انہوں نے سورۂ فاتحہ پڑھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ایسی سورۃ نہ تو توریت، انجیل اور زبور میں اتاری گئی ہے اور نہ ہی قرآن میں نازل کی گئی ہے، سورۂ فاتحہ سبع مثانی ہے (یعنی سات آیتیں ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں) اور یہ "قرآن عظیم" ہے جو مجھے دیا گیا ہے" ترمذیؒ، دارمیؒ نے اس روایت کو ما انزلت سے نقل کیا ہے اور ان کی روایت میں ابی بن کعبؓ کا ذکر نہیں ہے، نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: "سبع مثانی" اور قرآن عظیم کے بارہ میں پہلی فصل کی ایک حدیث کی تشریح میں بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان سے سورۂ فاتحہ مراد ہے اس موقع پر ان الفاظ کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔

قرآن سیکھنے، پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا بیان

(۳۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْقُرْاٰنَ فَاقْرَءُوْهُ فَاِنَّ مَثَلَ الْقُرْاٰنِ لِمَنْ تَعَلَّمَ فَقَرَأَ وَقَامَ بِهٖ كَمَثَلِ جِرَابٍ مَحْشُوٍّ مِّسْكًا تَفُوْحُ رِيْحُهٗ كُلَّ مَكَانٍ وَمَثَلُ مَنْ تَعَلَّمَهٗ فَرَقَدَ وَهُوَ فِيْ جَوْفِهٖ كَمَثَلِ جِرَابٍ

اُوْكِئَ عَلٰى مِسْكٍ (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قرآن سیکھو اور پھر اسے پڑھو، اور (یہ یاد رکھو کہ) اس شخص کی مثال جو قرآن سیکھتا ہے پھر اسے (ہمیشہ) پڑھتا (رہتا) ہے (اس پر عمل کرتا ہے) اور اس میں مشغولیت (یعنی تلاوت وغیرہ) کے لئے شب بیداری کرتا ہے اس تھیلی کی سی ہے جو مشک سے بھری ہو جس کی خوشبو تمام مکان میں پھیلتی ہے اور اس شخص کی مثال جس نے قرآن سیکھا اور سو رہا (یعنی وہ قرآن کی تلاوت قرأت شب بیداری سے غافل رہا یا اس پر عمل نہ کیا) اس تھیلی کی سی ہے جسے مشک پر باندھ دیا گیا ہو۔"

(ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ (قرآن سیکھو) کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پڑھنا سیکھو نہ صرف یہ کہ اس کے الفاظ کی ادائیگی سیکھو بلکہ اس کے مفہوم و معانی اور تفسیر کا علم بھی حاصل کرو۔

حضرت ابومحمد جونی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن سیکھنا اور دوسروں کو سکھانا فرض کفایہ ہے، نیز مسئلہ یہ ہے کہ نماز میں فرض قرأت کی بقدر سورتوں یا آیتوں کا سیکھنا ہر مسلمان کے لئے فرض عین ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ (یا بقدر فرض قرأت نماز) سے زیادہ قرآن کی آیتوں یا سورتوں کو یاد کرنے میں مشغول ہونا نفل نماز میں مشغولیت سے افضل ہے کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے جو نفل نماز سے زیادہ اہم ہے۔ بعض متاخرین علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ حفظ قرآن میں مشغول ہونا، ان علوم میں مشغول ہونے سے افضل ہے۔ جو فرض کفایہ ہیں یعنی جن علوم کو حاصل کرنا فرض عین ہے، حفظ قرآن میں مشغول ہونا ان کی مشغولیت سے افضل نہیں ہے۔

"مشک سے بھری ہوئی تھیلی" کی مثال بایں طور دی گئی ہے کہ قرآن سیکھنے اور پڑھنے والے کا سینہ ایک تھیلی کے مانند ہے جس میں قرآن کریم مشک کی مانند ہے لہٰذا جب وہ قرآن پڑھتا ہے تو اس کی برکت اس کے گھر میں پھیلتی اور اس کے سننے والوں کو پہنچتی ہے حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے قرآن سیکھا مگر نہ تو اس نے اسے پڑھا اور نہ اس پر عمل کیا تو قرآن کریم کی برکت نہ اسے پہنچتی ہے نہ دوسروں کو اس لئے وہ مشک کی اس تھیلی کے مانند ہوا کہ جس کا منہ بند کر دیا گیا ہو اور جس کی وجہ سے نہ تو مشک کی خوشبو پھیلتی ہے اور نہ اس سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔

آیت الکرسی اور سورۂ مؤمن کی ابتداء آیت کی برکت

(۳۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ حٰمٓ اَلْمُؤْمِنَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ وَاٰيَةَ الْكُرْسِيِّ حِيْنَ يُصْبِحُ حُفِظَ بِهِمَا حَتّٰى يُمْسِيَ وَمَنْ قَرَأَ بِهِمَا حِيْنَ يُمْسِيْ حُفِظَ بِهِمَا حَتّٰى يُصْبِحَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص صبح کے وقت حم (سے) کہ وہ سورۂ مؤمن ہے الیہ المصیر۔ تک اور آیت الکرسی پڑھے تو وہ ان کی برکت سے شام تک (ظاہری و باطنی آفات و بلاؤں سے) محفوظ رہتا ہے اور جو شخص ان کو شام کے وقت پڑھے تو وہ ان کی برکت سے صبح تک محفوظ رہتا ہے۔ ترمذیؒ، دارمیؒ) اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حم سے الیہ المصیر تک سورۂ مؤمن کی یہ ابتدائی آیت یوں ہے حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ اس کتاب کا اتارا جانا خدائے غالب و دانا خدا کی طرف سے ہے۔ جو گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا اور سخت عذاب دینے والا ہے (اور) صاحب کرم ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

قرآن لوح محفوظ میں کب لکھا گیا؟

(۳۶) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ كِتَابًا قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ بِاَلْفَيْ عَامٍ اَنْزَلَ مِنْهُ اٰيَتَيْنِ خَتَمَ بِهِمَا سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ وَلَا تُقْرَاٰنِ فِيْ دَارٍ ثَلَاثَ لَيَالٍ فَيَقْرَبُهَا الشَّيْطَانُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار برس پہلے کتاب لکھی (یعنی لوح محفوظ میں فرشتوں کو لکھنے کا حکم دیا) اس کتاب میں سے وہ دونوں آیتیں نازل فرمائیں جن پر سورۂ بقرہ کا اختتام ہوتا ہے یعنی اٰمن الرسول سے آخری سورۂ تک) یہ آیتیں جس مکان میں تین رات تک پڑھی جاتی ہیں شیطان اس کے نزدیک بھی نہیں بھٹکتا۔ ترمذیؒ، دارمیؒ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

سورۂ کہف کی ابتدائی تین آیتوں کی برکت

(۳۷) وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ ثَلَاثَ اٰيَاتٍ مِنْ اَوَّلِ الْكَهْفِ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی تین آیتیں پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے بچایا جائے گا" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: پہلی فصل میں ایک حدیث حضرت ابودرداءؓ ہی سے نمبر (۱۸) گزری ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتیں یاد کرے گا وہ دجال کے فتنہ سے بچایا جائے گا جب کہ یہاں تین آیتوں کا ذکر کیا جارہا ہے اس حدیث کی تشریح میں اس حدیث کو ذکر کرتے ہوئے ان دونوں حدیثوں میں ایک مطابقت تو اس موقع پر بیان کی گئی تھی، اس سلسلہ میں ایک دوسری وجہ مطابقت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے تو دس آیتوں کو یاد کرنے پر مذکورہ بالا خاصیت و برکت کی بشارت دی گئی ہوگی پھر بعد میں از راہ وسعت فضل تین آیتوں کے پڑھنے ہی پر یہ بشارت عطا فرمائی گئی۔

قرآن کا دل، سورۂ یٰسین

(۳۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ قَلْبًا وَّقَلْبُ الْقُرْاٰنِ يٰسٓ وَمَنْ قَرَأَ يٰسٓ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِقِرَاءَتِهَا قِرَاءَةَ الْقُرْاٰنِ عَشْرَ مَرَّاتٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل سورۂ یٰس ہے، جو شخص یٰس پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے پڑھنے کی وجہ سے (اس کے نامۂ اعمال میں) دس مرتبہ قرآن پڑھنے کا ثواب لکھتا ہے" (ترمذیؒ، دارمیؒ) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: قرآن کا دل سورۂ یٰس ہے یعنی قرآن کے علوم و معارف خلاصہ اور اس کا حاصل سورۂ یٰس ہے بایں طور کہ اس سورۃ میں قیامت کے احوال اور قرآن کے مقاصد اعلیٰ مذکور ہیں۔

سورۂ طٰہٰ اور یٰسین کی عظمت

(۳۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَرَأَ طٰهٰ وَيٰسٓ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوَاتِ

وَالْاَرْضَ بِاَلْفِ عَامٍ فَلَمَّا سَمِعَتِ الْمَلَائِکَۃُ الْقُرْاٰنَ قَالَتْ طُوْبٰی لِاُمَّۃٍ یَّنْزِلُ ھٰذَا عَلَیْھَا وَطُوْبٰی لِاَجْوَافٍ تَحْمِلُ ھٰذَا وَطُوْبٰی لِاَلْسِنَۃٍ تَتَکَلَّمُ بِھٰذَا (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کرنے سے ہزار برس پہلے سورۂ طٰہٰ اور سورۂ یٰسین پڑھی جب فرشتوں نے قرآن (یعنی ان دونوں سورتوں کا پڑھنا) سنا تو کہنے لگے کہ خوش بختی ہو اس اُمت کے لئے جس پر یہ قرآن (یعنی دونوں سورتیں) اتاری جائیں گی، خوش بختی ہو ان دلوں کے لئے جو انہیں قبول کریں گے (یعنی ان کو یاد کریں گے اور ان کی محافظت کریں گے) اور خوش بختی ہو ان زبانوں کے لئے جو انہیں پڑھیں گی۔" (دارمیؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں کو پڑھا کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان سورتوں کو فرشتوں کے سامنے ظاہر کیا اور ان کے سامنے ان سورتوں کی تلاوت کا ثواب بھی بیان کیا یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو یہ سورتیں سکھائیں اور سمجھائیں نیز مذکورہ سورتوں کے معانی و مطالب ان کو الہام کئے۔

علامہ ابن حجرؒ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ باقی تمام فرشتوں کے سامنے ان سورتوں اور ان کی فضیلت و عظمت جانیں۔

فلما سمعت الملائکۃ القراٰن میں قرآن سے مراد قرأت ہے یعنی ان فرشتوں نے ان سورتوں کا پڑھنا سنا یا کہ "قرآن" سے مراد بھی سورۂ طٰہٰ اور سورۂ یٰسین ہیں کیونکہ جس طرح کلام اللہ کے پورے مجموعہ کا نام "قرآن" ہے اسی طرح اس کے کسی جزء و حصّہ کو بھی "قرآن" ہی کہا جاتا ہے لہٰذا قرآن جز اور کلی دونوں کا نام ہے۔

حٰم الدخان کی برکت

(۴۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ حٰمٓ الدُّخَانَ فِیْ لَيْلَةٍ اَصْبَحَ يَسْتَغْفِرُ لَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَعُمَرُ بْنُ اَبِیْ خَثْعَمٍ الرَّاوِیْ يُضَعَّفُ وَقَالَ مُحَمَّدٌ يَعْنِی الْبُخَارِیَّ هُوَ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص رات میں حٰم الدخان (یعنی سورۂ دخان) پڑھتا ہے تو وہ اس حالت میں صبح کرتا ہے کہ ستر ہزار فرشتے اس کے لئے بخشش کی دعا مانگتے ہیں" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس حدیث کے راوی عمر ابن ابی خثعم (روایت حدیث میں) ضعیف شمار کئے جاتے ہیں، نیز محمد یعنی امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ وہ (عمر ابن ابی خثعم) منکر الحدیث ہیں۔"

(۴۱) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ حٰمٓ الدُّخَانَ فِیْ لَيْلَةِ الْجُمُعَةِ غُفِرَ لَهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ ضَعِيْفٌ وَهِشَامٌ اَبُو الْمِقْدَامِ الرَّاوِیُّ يُضَعَّفُ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص جمعہ کی رات میں حم الدخان پڑھتا ہے اس کی بخشش کی جاتی ہے" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور ہشام ابوالمقدام روایت حدیث میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔"

مسبحات کی فضیلت

(۴۲) وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقْرَأُ الْمُسَبِّحَاتِ قَبْلَ اَنْ يَّرْقُدَ يَقُوْلُ اِنَّ فِيْهِنَّ اٰيَةً

خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ اٰيَةٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ خَالِدِ ابْنِ مَعْدَانَ مُرْسَلًا وَّقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عرباض ابن ساریہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سونے سے پہلے مسبحات پڑھتے تھے کہ ان میں ایک آیت ہے جو ہزار آیتوں سے بہتر ہے ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نیز دارمیؒ نے اس روایت کو خالد بن معدان سے بطریق ارسال نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: "مسبحات" ان سورتوں کو کہتے ہیں کہ جن کی ابتداء لفظ سُبْحَانَ یا سَبَّحَ یا یُسَبِّحُ یا سَبِّحْ سے ہوتی ہے اور وہ سات سورتیں ہیں۔ ① سُبْحَانَ الَّذِيْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ الآیۃ یعنی سورۂ بنی اسرائیل۔ ② سورۂ حدید۔ ③ سورۂ حشر۔ ④ سورۂ صف۔ ⑤ سورۂ جمعہ۔ ⑥ سورۂ تغابن۔ ⑦ سورۂ اعلیٰ۔

"ان میں ایک آیت ہے جو ہزار آیتوں سے بہتر ہے" کے بارہ میں بعض فرماتے ہیں کہ وہ آیت لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ ہے، دوسرے بعض حضرات کہتے ہیں وہ آیت یہ ہے هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ لیکن حضرت علامہ طیبیؒ کے نزدیک ان سورتوں میں کسی آیت کو متعین کر کے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ وہ فلاں آیت ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح لیلۃ القدر یا ساعت جمعہ (یعنی جمعہ کے دن ساعت قبولیت) کے بارہ میں کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا اسی طرح یہ آیت بھی پوشیدہ ہے لہٰذا علماء لکھتے ہیں کہ علامہ طیبیؒ کی بات ہی زیادہ صحیح ہے۔

سورۂ ملک کی فضیلت

④③ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ سُوْرَةً فِي الْقُرْاٰنِ ثَلَاثُوْنَ اٰيَةً شَفَعَتْ لِرَجُلٍ حَتّٰى غُفِرَ لَهٗ وَهِيَ تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قرآن کریم میں ایک سورۃ ہے جس میں تیس آیتیں ہیں، اس سورۃ نے ایک شخص کی شفاعت کی یہاں تک کہ اس کی بخشش کی گئی اور وہ سورۂ ملک تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ہے۔"

(احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: لفظ شَفَعَتْ (اس سورۃ نے شفاعت کی) کے معنی میں دو احتمال ہیں ایک تو یہ کہ اس لفظ کے ذریعہ زمانہ ماضی کی خبر دی گئی ہے کہ ایک شخص سورۂ تبارک الذی پڑھا کرتا تھا اور اس سورۃ کی بہت زیادہ قدر کیا کرتا تھا چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو اس سورۃ نے بارگاہ حق میں سفارش کی جس کے نتیجہ میں اس شخص کو عذاب سے بچایا گیا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ شفعت مستقبل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یہ سورۃ پڑھے گا اس کے بارہ میں یہ قیامت کے دن شفاعت وسفارش کرے گی اور حق تعالیٰ اس کی سفارش کو قبول فرمائے گا۔

④④ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ضَرَبَ بَعْضُ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خِبَاءَهٗ عَلٰى قَبْرٍ وَّهُوَ لَا يَحْسَبُ اَنَّهٗ قَبْرٌ فَاِذَا فِيْهِ اِنْسَانٌ يَقْرَأُ سُوْرَةَ تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ حَتّٰى خَتَمَهَا فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهٗ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هِيَ الْمَانِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ تُنْجِيْهِ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص نے اپنا خیمہ ایک قبر پر کھڑا کر لیا مگر انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہاں قبر ہے چنانچہ ناگہاں انہوں نے سنا کہ اس (قبر) میں ایک شخص تبارک الذی بیدہ الملک پڑھ رہا ہے یہاں تک کہ اس نے

وہ سورۃ ختم کی، اس کے بعد خیمہ کھڑا کرنے والا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو یہ واقعہ بتایا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "سورۂ ملک منع کرنے والی اور نجات دینے والی ہے یہ سورۃ اپنے پڑھنے والے کو اللہ کے عذاب سے چھٹکارا دلاتی ہے" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: جہاں یہ احتمال ہے کہ خیمہ کھڑا کرنے والے نے اس قبر میں مردے کو سورہ ملک پڑھتے ہوئے نیند کی حالت میں سنا ہو وہیں یہ احتمال بھی ہے کہ جاگنے کی حالت میں سنا ہو بلکہ زیادہ صحیح یہی ہے۔

"سورۂ ملک منع کرنے والی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورۃ اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے یا گناہوں سے کہ جو عذاب قبر کا باعث بنتے ہیں بچانے والی ہے یا یہ کہ اپنے پڑھنے والے کو اس بات سے محفوظ رکھتی ہے کہ اسے یوم حشر میں کوئی اذیت ورنج پہنچے۔

سونے سے پہلے آنحضرت ﷺ کا معمول کا وظیفہ

(۴۵) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَنَامُ حَتّٰى يَقْرَأَ آلٓمّٓ تَنْزِيْلُ وَتَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ وَكَذَا فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَفِي الْمَصَابِيْحِ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ الم تنزیل السجدہ اور تبارک الذی بیدہ الملک پڑھے بغیر نہیں سوتے تھے۔ (احمدؒ، ترمذیؒ، دارمیؒ) امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، اسی طرح محی السنۃ نے تو کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے لیکن مصابیح میں کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: امام ترمذیؒ کے نزدیک تو یہ حدیث صحیح ہے اسی طرح امام محی السنۃ نے شرح السنۃ میں تو اسے صحیح کہا ہے لیکن مصابیح میں کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے گویا بظاہر ان کے قول میں تضاد نظر آتا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان کے قول میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ کسی حدیث کا غریب ہونا اس کے صحیح ہونے کے منافی نہیں ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی حدیث فنی اور اصطلاحی طور پر "غریب" ہوتی ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ "صحیح" ہی ہوتی ہے۔

سورۂ اذا زلزلت، قل ھو اللہ اور قل یاایھا الکفرون کی فضیلت

(۴۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَّاَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا زُلْزِلَتْ تَعْدِلُ نِصْفَ الْقُرْاٰنِ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ وَقُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ تَعْدِلُ رُبُعَ الْقُرْاٰنِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انس بن مالکؓ دونوں راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سورۂ اذا زلزلت آدھے قرآن کے برابر ہے، سورۃ قل ھو اللہ تہائی قرآن کے برابر ہے اور سورۃ قل یاایھا الکافرون چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "قرآن کریم میں مبدا اور معاد" کو بیان کیا گیا ہے اور چونکہ اذا زلزلت میں معاد کا بہت عمدہ پیرایہ اور مؤثر انداز میں ذکر کیا گیا ہے اس لئے یہ سورۃ آدھے قرآن کے برابر ہوئی "قل ھو اللہ" کے تہائی قرآن کے برابر ہونے کی وجہ پہلی فصل کی حدیث ۱۹ کی تشریح میں بیان ہو چکی ہے۔

"قل یا ایھا الکافرون" چوتھائی قرآن کے برابر بایں طور ہے کہ قرآن کریم میں توحید، نبوت احکام اور قصص یہ چار مضمون مذکور ہیں اور قل یا ایھا الکافرون میں توحید کا بہت اعلیٰ بیان ہے اس لئے یہ سورۃ چوتھائی قرآن کے برابر ہوئی۔

سورۂ حشر کی آخری تین آیتوں کی برکت

(۴۷) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ فَقَرَأَ ثَلَاثَ اٰيَاتٍ مِّنْ اٰخِرِ سُوْرَةِ الْحَشْرِ وَكَّلَ اللّٰهُ بِهٖ سَبْعِيْنَ اَلْفَ مَلَكٍ يُّصَلُّوْنَ عَلَيْهِ حَتّٰى يُمْسِيَ وَاِنْ مَاتَ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مَاتَ شَهِيْدًا وَمَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُمْسِيْ كَانَ بِتِلْكَ الْمَنْزِلَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ

"اور حضرت معقل ابن یسارؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص صبح کے وقت تین مرتبہ یہ کہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ (میں اللہ تعالیٰ کی جو سننے والا اجاننے والا ہے پناہ پکڑتا ہوں مردود شیطان سے) اور پھر سورۂ حشر کی آخری تین آتیں (یعنی هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سے آخر سورۂ تک) پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے متعین کرتا ہے جو اس کے لئے شام تک (خیر و بھلائی کی توفیق کی) دعا مانگتے ہیں اور اس کے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں اور اگر وہ شخص اس دن میں مر جاتا ہے تو شہادت کی موت پاتا ہے اور جو شخص ان کو یعنی اعوذ باللہ الخ اور ان آیتوں کو) شام کے وقت پڑھے تو اس صبح تک یہ (مذکورہ بالا) سعادت حاصل ہوتی ہے۔ (ترمذی، دارمی) امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

ہر روز دو سو مرتبہ قل ھو اللہ پڑھنے کی تاثیر

(۴۸) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَأَ كُلَّ يَوْمٍ مِّائَتَيْ مَرَّةٍ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ مُحِيَ عَنْهُ ذُنُوْبُ خَمْسِيْنَ سَنَةً اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ عَلَيْهِ دَيْنٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ خَمْسِيْنَ مَرَّةً وَلَمْ يَذْكُرْ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ عَلَيْهِ دَيْنٌ۔

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص ہر روز دو سو مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھے تو اس (نامۂ اعمال میں) سے پچاس برس کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں الا یہ کہ اس پر دین ہو (ترمذیؒ، دارمیؒ) ایک اور روایت میں (دو سو مرتبہ کی بجائے) پچاس مرتبہ ذکر ہے نیز اس روایت میں الا یہ کہ اس پر دین ہو کے الفاظ مذکور نہیں ہیں۔"

تشریح: اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ عَلَيْهِ دَيْنٌ (الا یہ کہ اس پر دین ہو) کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہی کہ دین کا گناہ نہیں مٹایا جائے گا، دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے ذمہ دین کی عدم ادائیگی کا گناہ ہو گا تو اس کے دوسرے گناہ بھی نہیں مٹائے جائیں گے یعنی اس صورت میں اس سورت کی قرأت تاثیر نہیں کرے گی۔ دین سے مراد حقوق العباد (بندوں کے حقوق) ہیں۔

سونے سے پہلے قل ھو اللہ پڑھنے کی برکت

(۴۹) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَرَادَ اَنْ يَّنَامَ عَلٰى فِرَاشِهٖ فَنَامَ عَلٰى يَمِيْنِهٖ ثُمَّ قَرَأَ مِائَةَ مَرَّةٍ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ يَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ يَا عَبْدِيْ اُدْخُلْ عَلٰى يَمِيْنِكَ الْجَنَّةَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے بستر پر سونے کا ارادہ کرے اور پھر اپنی داہنی کروٹ پہ لیٹ کر سو مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھے تو قیامت کے دن پروردگار اس سے فرمائے گا کہ اے میرے بندے جنت میں اپنی دائیں طرف داخل ہو جا" (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: "دائیں طرف کروٹ لیٹنا" سنت ہے لہٰذا جس شخص نے سوتے وقت دائیں طرف کروٹ پر لیٹ کر قل ھو اللہ احد پڑھی تو ایک

تو اس نے آنحضرت ﷺ کی اطاعت کی دوسرے اس نے ایسی سورت پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں اس بنا پر ایسے شخص کو مذکورہ بالا سعادت کی بشارت دی گئی ہے۔

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جنت میں جو باغات اور محلات جنت کی دائیں طرف ہیں وہ ان باغات و محلات سے افضل ہوں گے جو جنت کی بائیں طرف ہیں۔

قل ھو اللہ احد کی فضیلت

(۵۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلًا یَقْرَأُ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ فَقَالَ وَجَبَتْ قُلْتُ وَمَا وَجَبَتْ؟ قَالَ الْجَنَّةُ (رواہ مالک والترمذی والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو قل ھو اللہ احد پڑھتے سنا تو فرمایا کہ "(اس کے لئے واجب ہوگئی؟ میں نے عرض کیا کہ کیا چیز واجب ہوگئی؟ فرمایا جنت۔" (مالکؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: جنت کا واجب ہونا محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے اس وعدے کے سبب ہے جو اس نے اپنے نیک اور اطاعت گزار بندوں کے بارہ میں فرمایا ہے۔

قل یاایھا الکافرون کی فضیلت

(۵۱) وَعَنْ فَرْوَةَ بْنِ نَوْفَلٍ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّهٗ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِّمْنِیْ شَیْئًا اَقُوْلُهٗ اِذَا اَوَیْتُ اِلٰى فِرَاشِیْ فَقَالَ اقْرَأْ قُلْ یَا اَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ فَاِنَّهَا بَرَآءَةٌ مِّنَ الشِّرْكِ (رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت فروہ ابن نوفل اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے (نبی کریم ﷺ سے) عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز (یعنی آیت یا سورت) سکھلا دیجئے جسے میں اپنے بستر پر جا کر (یعنی سونے سے پہلے) پڑھ لیا کروں آپ نے فرمایا قل یاایھا الکافرون پڑھ لیا کرو کیونکہ یہ سورۃ شرک سے بیزاری ہے (لہٰذا اسے پڑھ کر سوؤ گے تو گویا شرک سے پاک ہو کر سوؤ گے اور مرو گے تو توحید پر مرو گے)۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤد، دارمی)

معوذتین کی فضیلت

(۵۲) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ بَیْنَا اَنَا اَسِیْرُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَیْنَ الْجُحْفَةِ وَالْاَبْوَاءِ اِذْ غَشِیَتْنَا رِیْحٌ وَّظُلْمَةٌ شَدِیْدَةٌ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَعَوَّذُ بِاَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَاَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ وَیَقُوْلُ یَا عُقْبَةُ تَعَوَّذْ بِهِمَا فَمَا تَعَوَّذَ مُتَعَوِّذٌ بِمِثْلِهِمَا (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) جب کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جحفہ اور ابواء (جو کہ مکہ اور مدینہ کے راستہ میں دو مقام ہیں) کے درمیان چلے جارہے تھے کہ اچانک سخت آندھی اور شدید اندھیرے نے ہمیں آگھیرا چنانچہ نبی ﷺ نے اعوذ برب الفلق اور اعوذ برب الناس کے ذریعہ پناہ مانگنی شروع کی (یعنی یہ سورتیں پڑھنے لگے) اور مجھ سے (بھی) فرماتے کہ "عقبہ" ان دونوں سورتوں کے ذریعہ پناہ چاہو، جان لو کہ کسی پناہ چاہنے والے نے ان دونوں (سورتوں) کی مانند کسی چیز کے ذریعہ پناہ نہیں چاہی ہے (کیونکہ آفات و بلاؤں کے وقت اللہ کی پناہ طلب کرنے کے سلسلے میں یہ دونوں سورتیں سب سے افضل ہیں)۔" (ابوداؤد)

(۵۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ خُبَیْبٍ قَالَ خَرَجْنَا فِیْ لَیْلَةِ مَطَرٍ وَّظُلْمَةٍ شَدِیْدَةٍ نَطْلُبُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَدْرَكْنَاهُ فَقَالَ قُلْ قُلْتُ مَا اَقُوْلُ؟ قَالَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَالْمُعَوِّذَتَیْنِ حِیْنَ تُصْبِحُ وَحِیْنَ تُمْسِیْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تَكْفِیْكَ

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبداللہ ابن خبیبؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سخت اندھیری اور بارش کی رات میں رسول کریم ﷺ کو ڈھونڈھتے ہوئے نکلے (یعنی آپ ﷺ کہیں تشریف لے جارہے تھے ہم بھی آپ کو ڈھونڈھتے ہوئے نکلے تاکہ آپ ﷺ کے ہمراہ جائیں) چنانچہ ہم نے آپ کو پا لیا، آپ نے (اس وقت) فرمایا کہ پڑھو "میں نے عرض کیا کہ "کیا پڑھوں!" آپ نے فرمایا "صبح اور شام کے وقت تین مرتبہ قل ھو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ لیا کرو یہ تمہیں ہر چیز سے کفایت کریں گی (یعنی ہر آفت وبلاء کو دفع کریں گی)۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

۵۴ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَقْرَأُ سُوْرَةَ هُوْدٍ اَوْ سُوْرَةَ يُوْسُفَ قَالَ لَنْ تَقْرَأَ شَيْئًا اَبْلَغَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (رواہ احمد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یارسول اللہ کیا میں (پناہ چاہنے اور شرو برائی کے (دفعیہ کے لئے) سورۂ ہود یا سورۂ یوسف پڑھ لیا کروں آپ ﷺ نے فرمایا "تم اللہ کے نزدیک قل اعوذ برب الفلق سے زیادہ بہتر کوئی چیز (یعنی کوئی سورۃ یا آیت) ہرگز نہیں پڑھ سکتے۔" (احمد، نسائی، دارمی)

تشریح: لن تقرأ شیئًا ابلغ عند اللہ کا مطلب یہ ہے کہ آفات وبلاؤں اور برائیوں سے پناہ چاہنے کے سلسلہ میں اس سورۃ یعنی قل اعوذ برب الفلق سے زیادہ کامل اور بہتر دوسری کوئی سورۃ نہیں ہے کیونکہ یہ سورۃ سب سے زیادہ کامل ہے جس میں ہر مخلوق کی برائی اور شر سے پناہ مانگی گئی ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (آپ کہئے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں تمام مخلوقات کے شر سے)۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پناہ چاہنے کے سلسلہ میں دونوں سورتیں یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس سے زیادہ کامل اور کوئی سورۃ نہیں ہے۔

ابن مالکؒ کہتے ہیں کہ اس جملہ سے مقصود ان دونوں سورتوں کے ذریعہ پناہ طلب کرنے کی رغبت دلاتا ہے، گویا علامہ طیبیؒ اور ابن مالکؒ دونوں کے قول کا حاصل یہ ہے کہ اس ارشاد گرامی میں صرف ایک سورۃ یعنی قل اعوذ برب الفلق ذکر کی گئی ہے اور چونکہ قرینہ سے دوسری سورۃ یعنی قل اعوذ برب الناس بھی مفہوم ہوتی ہے اس لئے یہاں دونوں سورتیں مراد ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قرآن کی پیروی کرنے کا حکم

۵۵ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْرِبُوا الْقُرْاٰنَ وَاتَّبِعُوْا غَرَآئِبَهٗ وَغَرَآئِبُهٗ فَرَآئِضُهٗ وَحُدُوْدُهٗ۔

"حضرت ابوہریرۃؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قرآن کے معانی بیان کرو اور اس کے غرائب کی پیروی کرو اس کے غرائب، اس کے فرائض اور اس کی حدود ہیں۔"

تشریح: اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن کے غرائب کیا ہیں؟ چنانچہ فرمایا کہ قرآن کے فرائض اور اس کی حدود، قرآن کے غرائب ہیں اب اس بات کو بھی سمجھ لیجئے کہ "فرائض اور حدود" سے مراد ہیں منہیات! یعنی وہ چیزیں جن کو کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، حاصل یہ کہ قرآن کی اطاعت وپیروی کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے جن چیزوں کو کرنے کا حکم دیا ہے ان کو کیا جائے اور جن چیزوں سے روکا ہے ان سے اجتناب کیا جائے۔

قرآن پڑھنے کی فضیلت

(۵۶) وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قِرَآءَةُ الْقُرْاٰنِ فِی الصَّلٰوةِ اَفْضَلُ مِنْ قِرَآءَةِ الْقُرْاٰنِ فِیْ غَیْرِ الصَّلَاةِ وَقِرَآءَةُ الْقُرْاٰنِ فِیْ غَیْرِ الصَّلٰوةِ اَفْضَلُ مِنَ التَّسْبِیْحِ وَالتَّکْبِیْرِ وَالتَّسْبِیْحُ اَفْضَلُ مِنَ الصَّدَقَةِ وَالصَّدَقَةُ اَفْضَلُ مِنَ الصَّوْمِ وَالصَّوْمُ جُنَّةٌ مِّنَ النَّارِ۔

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نماز میں قرآن کی قرأت نماز کے علاوہ قرآن پڑھنے سے افضل ہے اور نماز کے علاوہ قرآن کا پڑھنا تسبیح و تکبیر سے زیادہ ثواب رکھتا ہے اور تسبیح صدقہ (خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے) زیادہ ثواب رکھتی ہے اور صدقہ روزہ سے زیادہ ثواب رکھتا ہے اور روزہ دوزخ کی آگ سے ڈھال ہے۔"

تشریح: جس طرح حالت نماز میں قرآن پڑھنا نماز کے علاوہ تلاوت قرآن سے افضل ہے اسی طرح جو نماز کھڑے ہو کر پڑھی جاتی ہے اس کی قرأت قرآن اس نماز کی قرأت قرآن سے افضل ہے جو بیٹھ کر پڑھی جاتی ہے نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں تلاوت قرآن تسبیح و تکبیر اور دیگر اور ادو اذکار سے افضل ہے کیونکہ قرآن کریم نہ صرف یہ کہ کلام الٰہی ہے بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام بھی مذکور ہیں۔

تسبیح و تکبیر اور دیگر اور ادو اذکار خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے سے افضل ہے اگرچہ مشہور یہ ہے کہ عبادت متعدی کہ جس کا فائدہ اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کو بھی پہنچے (مثلاً صدقہ) افضل ہے عبادت لازم (مثلاً تسبیح اور اذکار) سے کہ جس کا فائدہ صرف اپنی ذات تک محدود رہتا ہے لیکن یہ بات ذکر کے علاوہ دوسری عبادات کے ساتھ مخصوص ہے ذکر اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اللہ کا ذکر سب سے بڑا اور سب سے افضل[1] ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں فرمایا گیا ہے کہ "ذکر" خدا کی راہ میں سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بہتر اور افضل ہے۔

"صدقہ روزہ سے زیادہ ثواب رکھتا ہے" یعنی خدا کی راہ میں اور خدا کی خوشنودی کے لئے اپنا مال خرچ کرنا نفل روزہ سے افضل ہے کیونکہ صدقہ کا فائدہ متعدی ہے یعنی اس سے دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے جب کہ روزہ کا فائدہ صرف اپنی ذات تک محدود رہتا ہے لیکن روزہ کے سلسلہ میں یہ حدیث بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "بنی آدم کے ہر عمل پر دس گنا ثواب ملتا ہے مگر روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا (یعنی روزہ کا ثواب لامحدود ہے)"۔

اس طرح ان دونوں روایتوں میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے کیونکہ پہلی روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ روزہ سے افضل ہے جب کہ اس دوسری روایت کا حاصل یہ ہے کہ روزہ صدقہ سے افضل ہے علماء لکھتے ہیں کہ اس وجہ مطابقت سے یہ ظاہر تضاد ختم ہو جاتا ہے کہ افضلیت بایں اعتبار ہے کہ روزہ دار اللہ رب العزت کی صفت اختیار کرتا ہے بایں طور کہ وہ کھانے پینے وغیرہ سے باز رہتا ہے۔

ناظرہ تلاوت، زبانی تلاوت سے افضل ہے

(۵۷) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَوْسِ الثَّقَفِیِّ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قِرَآءَةُ الرَّجُلِ الْقُرْاٰنَ فِیْ غَیْرِ الْمُصْحَفِ اَلْفُ دَرَجَةٍ وَقِرَآءَتُهٗ فِی الْمُصْحَفِ تُضَعَّفُ عَلٰی ذٰلِكَ اِلٰی اَلْفَیْ دَرَجَةٍ۔

"اور حضرت عثمان ابن عبداللہ بن اوس ثقفی اپنے دادا (حضرت اوس) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "آدمی کا بغیر مصحف (یعنی زبانی) قرآن پڑھنا ہزار درجہ ثواب رکھتا ہے اور مصحف میں (دیکھ کر) پڑھنے کا ثواب بغیر مصحف (یعنی زبانی) پڑھنے کے

---

[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذکر اللہ تمام عبادات متعدیہ سے افضل ہے لیکن اس بارے میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ دین کی تعلیم اس حکم سے مستثنیٰ ہے کیونکہ محض ذکر، دین کی تعلیم و تعلم سے افضل نہیں ہے چنانچہ کتاب العلم میں جو احادیث گزری ہیں ان سے یہ بات بصراحت معلوم ہوتی ہے کہ علم دین کی تعلیم و تعلم، ذکر سے افضل ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ علم دین بھی از قسم ذکر ہی ہے۔

ثواب سے دو ہزار درجہ تک زیادہ کیا جاتا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مصحف (قرآن مجید) میں دیکھ کر تلاوت کا ثواب زبانی تلاوت کے ثواب سے زیادہ ہوتا ہے اور اس میں ثواب کی زیادتی کی وجہ یہ ہے کہ مصحف میں دیکھ کر کی جانے والی تلاوت میں غور و فکر اور خشوع و خضوع زیادہ حاصل ہوتا ہے مصحف شریف کی زیارت نصیب ہوتی ہے اور مصحف کو ہاتھ لگایا جاتا ہے اسے اوپر اٹھایا جاتا ہے اس طرح نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کی عظمت و احترام کا اظہار ہوتا ہے بلکہ جیسا کہ منقول ہے کہ قرآن کریم کی زیارت بھی عبادت ہے چنانچہ اکثر صحابہؓ و تابعینؒ مصحف میں دیکھ کر ہی تلاوت کیا کرتے تھے حضرت عثمانؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ ناظرہ تلاوت کی کثرت کی وجہ سے ان کے پاس دو قرآن خستگی کی حالت کو پہنچ گئے تھے۔

موت کی یاد اور قرآن کی تلاوت دل کی جلا کا باعث ہے

۵۸ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَآ اَصَابَهُ الْمَآءُ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاؤُهَا قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الْاَرْبَعَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "یاد رکھو، یہ دل زنگ پکڑتے ہیں جیسا کہ پانی پہنچنے سے لوہا زنگ پکڑتا ہے" عرض کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! اس کی جلا کا کیا ذریعہ ہے!" آپ ﷺ نے فرمایا "موت کو زیادہ یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت (یہ چاروں روایتیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں)۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ گناہ و معصیت کے صدور اور نیکیوں میں غفلت کیوجہ سے دل زنگ آلود ہو جاتا ہے لہٰذا دل کے جلا کا ذریعہ بتایا گیا ہے کہ موت کو کثرت سے یاد کرنے اور قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول رہنے سے دل کو جلا یعنی صفائی حاصل ہو جاتی ہے۔

سب سے عظیم الشان سورت

۵۹ وَعَنْ اَيْفَعَ ابْنِ عَبْدِ الْكَلَاعِيِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ سُوْرَةِ الْقُرْاٰنِ اَعْظَمُ قَالَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ قَالَ فَاَيُّ اٰيَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ اَعْظَمُ قَالَ اٰيَةُ الْكُرْسِيِّ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ قَالَ فَاَيُّ اٰيَةٍ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ تُحِبُّ اَنْ تُصِيْبَكَ وَاُمَّتَكَ قَالَ خَاتِمَةُ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فَاِنَّهَا مِنْ خَزَآئِنِ رَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ تَحْتِ عَرْشِهٖ اَعْطَاهَا هٰذِهِ الْاُمَّةَ لَمْ تَتْرُكْ خَيْرًا مِّنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِلَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ایفع ابن عبد الکلاعی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے (نبی کریم ﷺ) سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! قرآن مجید میں (صفات باری تعالیٰ کے بیان کے سلسلہ میں) سب سے عظیم الشان سورہ کون سی ہے؟" آپ نے فرمایا "قل ھو اللہ احد"! اس نے عرض کیا کہ "قرآن کریم میں سب سے عظیم الشان آیت کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا آیت الکرسی اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اس نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! وہ کون سی آیت ہے جس کے بارہ میں آپ ﷺ پسند کرتے ہیں کہ وہ (یعنی اس کا ثواب اور اس کا فائدہ) آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی اُمت کو پہنچے" آپ نے فرمایا سورۃ بقرہ کا آخری حصہ، بیشک وہ آخری (آیتیں) خدا کی رحمت کے خزانوں میں عرش کے نیچے سے اتری ہیں اور جو اس امت کو عطا کی گئی ہیں اور دنیا و آخرت کی ایسی بھلائی نہیں ہے جو اس میں نہ ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: گزشتہ صفحات میں ایک حدیث گزری ہے جس میں سورۂ فاتحہ کو بہت بڑی اور سب سے عظیم الشان سورت فرمایا گیا ہے جب کہ یہاں قل ھو اللہ احد کو سب سے عظیم الشان سورۃ فرمایا جا رہا ہے۔ اگرچہ ان دونوں حدیثوں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے حالانکہ حقیقت میں

دونوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں ہے کیونکہ سورۂ فاتحہ اس اعتبار سے عظیم الشان ہے کہ وہ خدا کی حمد، دعا اور عبادت پر مشتمل ہے نیز وہ قرآن کا خلاصہ ہے اور سورۂ قل ھو اللہ اس اعتبار سے سب سے عظیم الشان ہے کہ اس میں اللہ رب العزت کی صفت وحدانیت بہت عمدہ ہے اور بلیغ انداز میں بیان کی گئی ہے۔

"سورۂ بقرہ کا آخری حصہ" سے اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخری سورۃ تک کی آیتیں مراد ہیں، اسی موقع پر سائل کے جواب میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں اور میرے نزدیک یہ چیز محبوب ہے کہ سورۂ بقرہ کے آخری حصہ کی ان آیتوں کا ثواب اور ان کی برکت مجھے اور میری اُمت کو باقی تمام قرآن کی برکت وفائدہ سے پہلے پہنچے کیونکہ یہ آیتیں دین ودنیا کی تمام بھلائیوں پر حاوی ہیں چنانچہ ان تمام آیتوں میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے اشارہ ہے اسلام و احکام کی اطاعت وپابندی کی طرف وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ سے اشارہ ہے آخرت میں جزائے عمل کی طرف اور لا یکلف اللہ نفسا الخ سے اشارہ ہے منافع دنیوی و اخروی کی طرف۔

سورۂ فاتحہ شفاء ہے

(۶۰) وَعَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ مُّرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِّنْ كُلِّ دَاءٍ۔ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عبدالملک ابن عمیر بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سورۂ فاتحہ ہر بیماری کے لئے شفاء ہے"۔" (دارمی، بیہقی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سورۂ فاتحہ کو ایمان ویقین اور اعتقاد کے ساتھ پڑھے تو اس کی برکت سے دینی دنیاوی، ظاہری، باطنی غرض کی ہر قسم کی بیماری ومصیبت سے شفاونجات حاصل ہوتی ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ کسی بھی قسم کے جسمانی وروحانی مرض میں سورۂ فاتحہ لکھ کر اسے چاٹنا، پینایا لٹکانا فائدہ پہنچاتا ہے اور مریض کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

آل عمران کی آخری آیتوں کی فضیلت وبرکت

(۶۱) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ مَنْ قَرَأَ اٰخِرَ اٰلِ عِمْرَانَ فِيْ لَيْلَةٍ كُتِبَ لَهٗ قِيَامُ لَيْلَةٍ۔

"اور حضرت عثمان ابن عفانؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص رات میں آل عمران کا آخری حصہ پڑھے تو اس کے لئے قیام لیل (یعنی شب بیداری) کا ثواب لکھا جاتا ہے۔"

تشریح: آل عمران کے آخری حصہ سے اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے آخری سورۃ تک کی آیتیں مراد ہیں "رات" کا مطلب رات کا ابتدائی حصہ بھی ہوسکتا ہے اور آخری حصہ بھی، یعنی چاہئے تو ابتداء شب میں ہی آیتیں پڑھے چاہے شب کے آخری حصہ میں، آنحضرت ﷺ کے بارہ میں منقول ہے کہ آپ ﷺ جب نماز تہجد کے لئے اٹھتے تو اس وقت وضو وغیرہ سے پہلے یہ آیتیں پڑھا کرتے تھے۔

آل عمران جمعہ کے دن پڑھنے کی برکت

(۶۲) وَعَنْ مَكْحُوْلٍ قَالَ مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ اٰلِ عِمْرَانَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ اِلَى اللَّيْلِ۔ رَوَاهُمَا الدَّارِمِيُّ۔

"اور حضرت مکحولؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ آل عمران پڑھتا ہے تو اس کے لئے رات تک فرشتے دعا اور استغفار کرتے

ہیں (یہ دونوں روایتیں دارمیؒ نے نقل کی ہیں۔"

سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں عورتوں کو سکھانے کا حکم

(۶۳) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَتَمَ سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ بِاٰيَتَيْنِ اُعْطِيْتُهُمَا مِنْ كَنْزِهِ الَّذِيْ تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَعَلَّمُوْهُنَّ وَعَلِّمُوْهُنَّ نِسَآءَكُمْ فَاِنَّهَا صَلَاةٌ وَّقُرْبَانٌ وَّدُعَاءٌ۔ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ مُرْسَلًا

"اور حضرت جبیر ابن نفیرؒ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کو دو آیتوں (یعنی اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر تک) پر ختم فرمایا ہے یہ دو آیتیں مجھے اس خزانے سے عطا فرمائی گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے لہٰذا ان آیتوں کو تم سیکھو اور اپنی عورتوں کو سکھلاؤ کیونکہ وہ آیتیں رحمت ہیں (خدا کے) قرب کا ذریعہ ہیں اور تمام دینی و دنیاوی بھلائیوں کے حصول کے لئے دعا ہیں (اس روایت کو دارمیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

جمعہ کے دن سورۂ ہود پڑھنے کا حکم

(۶۴) وَعَنْ كَعْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اقْرَءُوْا سُوْرَةَ هُوْدٍ يَوْمَ الْجُمُعَةِ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت کعبؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جمعہ کے دن سورۂ ہود پڑھا کرو۔" (دارمیؒ)

جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے کی برکت

(۶۵) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَاَ سُوْرَةَ الْكَهْفِ فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ اَضَاءَ لَهُ النُّوْرُ مَا بَيْنَ الْجُمُعَتَيْنِ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھتا ہے تو اس کے لئے (یعنی اس کے دل میں ایمان وہدایت کا) نور دوسرے جمعہ تک روشن رہتا ہے بیہقیؒ نے اس روایت کو دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔"

الم تنزیل پڑھنے کی برکت

(۶۶) وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ قَالَ اقْرَءُوا الْمُنْجِيَةَ وَهِيَ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ فَاِنَّهُ بَلَغَنِيْ اَنَّ رَجُلًا كَانَ يَقْرَاُهَا مَا يَقْرَاُ شَيْئًا غَيْرَهَا وَكَانَ كَثِيْرَ الْخَطَايَا فَنَشَرَتْ جَنَاحَهَا عَلَيْهِ قَالَتْ رَبِّ اغْفِرْ لَهُ فَاِنَّهُ كَانَ يُكْثِرُ قِرَاءَتِيْ فَشَفَّعَهَا الرَّبُّ تَعَالٰى فِيْهِ وَقَالَ اكْتُبُوْا لَهُ بِكُلِّ خَطِيْئَةٍ حَسَنَةً وَّارْفَعُوْا لَهُ دَرَجَةً وَّقَالَ اَيْضًا اِنَّهَا تُجَادِلُ عَنْ صَاحِبِهَا فِي الْقَبْرِ تَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتُ مِنْ كِتَابِكَ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ وَاِنْ لَّمْ اَكُنْ مِنْ كِتَابِكَ فَامْحُنِيْ عَنْهُ وَاِنَّهَا تَكُوْنُ كَالطَّيْرِ تَجْعَلُ جَنَاحَهَا عَلَيْهِ فَتَشْفَعُ لَهٗ فَتَمْنَعُهٗ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَقَالَ فِيْ تَبَارَكَ مِثْلَهٗ وَكَانَ خَالِدٌ لَّا يَبِيْتُ حَتّٰى يَقْرَاَهُمَا وَقَالَ طَاءُوْسٌ فُضِّلَتَا عَلٰى كُلِّ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ بِسِتِّيْنَ حَسَنَةً (رواہ الدارمی)

"اور حضرت خالد ابن معدان سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا (رات کے ابتدائی حصہ میں) اس سورۃ کو پڑھا کرو جو (قبر و حشر کے) عذاب سے نجات دینے والی ہے اور سورہ الم تنزیل ہے کیونکہ (صحابہ سے) مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ ایک شخص تھا جو یہی سورۃ پڑھا کرتا تھا وہ اس سورۃ کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھتا تھا (یعنی اس نے اس سورۃ کے علاوہ اور کسی چیز کو ورد قرار نہیں دیا تھا) اور وہ شخص بہت زیادہ گنہگار تھا، چنانچہ (جب اس شخص کا انتقال ہوا تو) اس سورۃ نے اس پر اپنے بازو پھلا دیئے اور فریاد کی اے میرے پروردگار! اس شخص کی بخشش فرما کیونکہ یہ مجھے بہت زیادہ پڑھا کرتا تھا۔" حق تعالیٰ نے اس شخص کے حق میں اس سورۃ کی شفاعت قبول فرمائی اور فرشتوں کو) حکم

دیا کہ (اس کے نامۂ اعمال میں) اس کے ہر گناہ کے بدلہ نیکی لکھ دو اور اس کے درجات بلند کر دو" آنحضرت ﷺ یہ بھی فرماتے تھے کہ "بے شک یہ سورت اپنے پڑھنے والے کی طرف سے قبر میں جھگڑتی ہے کہ
یا الٰہی اگر میں تیری کتاب (قرآن کریم) میں سے ہوں جو لوح محفوظ میں لکھا ہے تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما اور اگر (بفرض محال) میں تیری کتاب میں سے نہیں ہوں تو مجھے اس میں مٹا دے" نیز حضرت خالدؒ نے فرمایا" یہ سورۃ (قبر میں) ایک پرندہ کی مانند آئے گی اور اس پر اپنے بازو پھیلا کر اس کے لئے (اللہ تعالیٰ سے) شفاعت کرے گی۔" حضرت خالدؒ نے سورۃ تبارک الذی بیدہ الملک کے بارہ میں بھی یہی کہا ہے کہ (اس سورۃ کی بھی یہی تاثیر اور برکت ہے) حضرت خالدؒ کا معمول یہ تھا کہ وہ یہ دونوں سورتیں پڑھے بغیر نہیں سوتے تھے" حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں سورتوں کو قرآن کریم کی ہر سورۃ پر ساٹھ نیکیوں کے ساتھ فضیلت بخشی گئی ہے۔ (دارمی) یعنی ان دونوں روایتوں کو ایک حضرت خالدؒ سے اور دوسری حضرت طاؤسؒ سے منقول ہے، دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت خالدؒ ایک جلیل القدر تابعی ہیں ستر صحابہ سے ملاقات اور صحبت کا شرف حاصل ہے اسی طرح حضرت طاؤسؒ بھی مشاہیر تابعین میں سے ہیں لہٰذا حضرت خالدؒ اور حضرت طاؤسؒ دونوں سے منقول مذکورہ بالا روایتیں اگرچہ مرسل ہیں (کہ یہاں صحابی کا واسطہ ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن حکم میں مرفوع ہی کے ہیں کیونکہ اس قسم کی باتیں صرف آنحضرت ﷺ ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں جو صحابہؓ کے ذریعہ تابعین تک پہنچتی ہیں، اس لئے یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ یہ دونوں حضرات کے اپنے اقوال نہیں بلکہ مرفوع روایتیں ہیں۔

"اس پر اپنے بازو پھیلا دیئے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ یا اس کا ثواب پرندہ کی صورت اختیار کر گیا اور اپنے بازو اپنے پڑھنے والے پر پھیلا دیئے تاکہ اس پر سایہ کرلے یا یہ کہ اس نے اپنی رحمت کے بازو پھیلا دیئے یعنی اسے اپنی پناہ میں لے لیا اور اس کی طرف شفاعت و وکالت کی۔

"قبر میں جھگڑتی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس سورۃ کو پڑھتا ہے مداومت کے ساتھ تو یہ سورۃ اس کے لئے عذاب کی تخفیف یا قبر میں فراخی و وسعت یا اسی قسم کی دوسری آسانی و سہولت کی شفاعت و سفارش کرتی ہے۔

حضرت طاؤسؒ کی روایت کے یہ الفاظ "ان دونوں سورتوں کو قرآن کریم کی ہر سورۃ پر فضیلت دی گئی ہے" اس صحیح روایت کے منافی نہیں ہے کہ سورۂ بقرہ، سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی تمام سورتوں سے افضل ہے۔ کیونکہ سورۂ بقرہ کی فضیلت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں بہت عمدہ اور اعلیٰ مضامین مذکور ہیں اور ان دونوں سورتوں کو اس جہت و اعتبار سے فضیلت حاصل ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے بچاتی ہیں۔

سورۃ یٰسین پڑھنے کی فضیلت

(۶۷) وَعَنْ عَطَآءِ بْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَأَ يٰسٓ فِیْ صَدْرِ النَّهَارِ قُضِيَتْ حَوَائِجُهٗ۔ رَوَاهُ الدَّارِمِیُّ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت عطاء ابن ابی رباحؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص دن کے ابتدائی حصہ میں سورۂ یٰس پڑھتا ہے تو اس کی (دینی و دنیوی حاجتیں پوری کی جاتی ہیں) دارمیؒ نے اس روایت کو بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

قریب المرگ کے سامنے یٰس کا پڑھنا

(۶۸) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ الْمُزَنِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَأَ يٰسٓ ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰی غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ فَاقْرَءُوْهَا عِنْدَ مَوْتَاكُمْ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت معقل ابن یسارؓ مزنی راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ رب العزت کی رضا و خوشنودی کی طلب میں سورۂ یٰس

پڑھتا ہے تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں جو اس نے پہلے کئے ہیں لہٰذا اس سورۃ کو اپنے مردوں کے سامنے پڑھو۔" (بیہقیؒ)

تشریح: گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں کہ وہ اس سورۃ کی برکت سے بخش دیئے جاتے ہیں اسی طرح کبیرہ گناہ بھی بخشے جاتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ فضل و کرم اور اس کی بے پایاں رحمت شامل حال ہو۔

"مردوں" سے مراد "قریب المرگ" ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو شخص قریب المرگ ہو اس کے سامنے سورۂ یٰسٓ پڑھنی چاہئے تاکہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اس کو سنے اور اس کے معانی کی طرف اس کی توجہ ہو اس طرح اس کا سننا اس کے پڑھنے کے حکم میں ہو جائے گا جو اس کی مغفرت و بخشش کا سبب ہوگا۔ یا پھر "مردوں" سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سورت کو اپنی میت کو مغفرت و بخشش کی زیادہ احتیاج ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ قرآن کی رفعت ہے

(۶۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ لِكُلِّ شَیْءٍ سَنَامًا وَاِنَّ سَنَامَ الْقُرْاٰنِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ وَاِنَّ لِكُلِّ شَیْءٍ لُبَابًا وَّاِنَّ لُبَابَ الْقُرْاٰنِ الْمُفَصَّلُ۔ (رواه الدارمی)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا "ہر چیز کے لئے رفعت و بلندی ہوتی ہے اور قرآن کی رفعت و بلندی سورۂ بقرہ ہے، ہر چیز کا خلاصہ (حاصل مقصد) ہوتا ہے اور قرآن کا خلاصہ مفصّل ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: سورۂ بقرہ قرآن کریم کی رفعت و بلندی اس لئے ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ قرآن کی سورتوں میں سب سے بڑی ہے بلکہ اس سورۃ میں بہت زیادہ احکام مذکور ہیں۔

پہلے بھی کئی مقامات پر بتایا جا چکا ہے، مفصّل یا مفصلات سورۂ حجرات سے ختم قرآن یعنی سورۂ ناس تک کی سورتوں کو کہا جاتا ہے یہ سورتیں پورے قرآن کا خلاصہ اس طور پر ہیں کہ قرآن کریم کے جو مضامین اختصار اور اجمالی طور پر متفرق سورتوں میں ہیں وہ ان سورتوں میں یکجائی اور تفصیلی طور پر بیان فرمائے گئے ہیں اسی لئے ان سورتوں کو "مفصّل" کہنے کی وجہ تسمیہ بھی بہت خوب ہے۔

قرآن کی زینت، سورۂ رحمٰن

(۷۰) وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لِكُلِّ شَیْءٍ عَرُوْسٌ وَعَرُوْسُ الْقُرْاٰنِ الرَّحْمٰنُ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر چیز کے لئے زینت ہوتی ہے اور قرآن کریم کی زینت سورۂ رحمٰن ہے۔"

تشریح: سورۂ رحمٰن کو قرآن کریم کی زینت اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اس میں دنیا و آخرت کی نعمتوں کا بیان ہے، حوروں کے اوصاف کا بیان ہے جو جنت کی دلہنیں ہیں اور ان حوروں کے زیورات وغیرہ کا بیان ہے۔

سورۂ واقعہ کی تاثیر

(۷۱) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْوَاقِعَةِ فِیْ كُلِّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ اَبَدًا وَّكَانَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ يَاْمُرُ بَنَاتِهٖ يَقْرَأْنَ بِهَا فِیْ كُلِّ لَيْلَةٍ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص شب میں سورہ واقعہ پڑھتا ہے وہ کبھی فاقہ کی حالت کو نہیں پہنچتا، حضرت ابن مسعودؓ اپنی صاحبزادیوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ ہر شب میں یہ سورۃ پڑھا کریں" (ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے

شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: فاقہ کے معنی ہیں "محتاجگی اور حاجت مندی" لہٰذا اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص روزانہ رات میں سورۂ واقعہ پڑھتا ہے اس کے لئے محتاجگی، نقصان و پریشانی کا باعث نہیں بنتی اس وجہ سے کہ اسے صبر و قناعت کی دولت فرمادی جاتی ہے یا یہ کہ ایسے شخص کو دل کی محتاجگی نہیں ہوتی یعنی ظاہری محتاجگی کے باوجود اس کا دل مستغنی ہوتا ہے کیونکہ اس کے قلب میں وسعت و فراخی عطا کی جاتی ہے، معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے اور توکل و اعتماد کا سرمایہ اس کے قلب و روح میں طمانیت پیدا کر دیتا ہے اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص اس سورۃ کے معانی و مفہوم سے استفادہ کرتا ہے۔

بہرکیف اتنی بات جان لینی چاہئے کہ شارع نے بعض ان عبادات و نیکیوں کی طرف رغبت دلائی ہے جو نہ صرف یہ کہ اخروی طور پر باعث فلاح و سعادت ہوتی ہیں بلکہ ان دنیاوی امور میں بھی نفع اور موثر بنتی ہیں جن کا حصول دین کے لئے ممد و معاون ہوتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ بہر صورت کسی نہ کسی طرح عبادت اور نیک کاموں میں مصروف رہیں۔

سورۂ اعلیٰ کی فضیلت

⑦ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ هٰذِهِ السُّوْرَةَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى (رواہ احمد)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اس سورۃ یعنی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى کو بہت محبوب رکھتے تھے۔" (احمدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ سورۂ اعلیٰ یعنی سبح اسم ربک الاعلی کو اس لئے بہت زیادہ محبوب رکھتے تھے کہ اس میں یہ آیت اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ہے جو قرآن کریم کی حقانیت و صداقت پر شاہد اور مشرکین و اہل کتاب کے خیالات و اعتقادات کی بہت مضبوط تردید ہے۔

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں میں کیا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس میں تمام مثالیں بیان کی گئی ہیں مثلاً کہا گیا ہے کہ "اے مسلّط، گرفتار نفس اور فریب خوردہ بادشاہ میں نے تجھے دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ تو دنیا جمع کرنے لگے بلکہ میں نے تجھے دنیا میں اس لئے بھیجا تھا کہ تو مظلوموں کی بددعا سے بچے کیونکہ میں مظلوموں کی بددعا رد نہیں کرتا خواہ مظلوم کافر ہی کیوں نہ ہو سلیم الطبع اور عقل مند انسان کے لئے لازم ہے کہ جب تک اس میں عقل ہو وہ اپنے لئے چار اوقات مقرر کرے، ایک وقت میں تو وہ اپنے رب سے مناجات کرے، دوسرے وقت میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے، تیسرے وقت میں خدا کی صفت و قدرت میں غور و فکر کرے اور چوتھے وقت میں اپنی حاجت (مثلاً کھانے پینے) میں مشغول رہے۔ عقل مند کے لئے لازم ہے کہ وہ صرف تین چیزوں کی طمع کرے ① معاد (آخرت) کے لئے زاد راہ تیار کرنے کی۔ ② یا اپنی معاش کی اصلاح کی۔ ③ یا غیر حرام سے لذت و نفع حاصل کرنے کی۔ عقلمند کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے زمانہ پر نظر رکھنے والا ہو، اپنے حال کی طرف متوجہ ہو اور اپنی زبان کی حفاظت کرنے والا ہو (یاد رکھو) جس شخص نے اپنے کلام کا اپنے اعمال سے محاسبہ کیا اس کا کلام زیادہ نہیں ہو گا وہ صرف وہی کلام کرے گا جو ضروری ہو۔

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اچھا حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں کیا تھا؟ آپ نے فرمایا "اس میں عبرتیں یعنی ڈرانے والی باتیں تھیں مثلاً اس میں کہا گیا ہے کہ "مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو موت پر یقین رکھتا ہے مگر اس کے باوجود (وہ اپنی دنیاوی زندگی کے عیش و عشرت پر) خوش بھی ہوتا ہے، مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو (دوزخ کی آگ پر یقین رکھتا ہے مگر وہ پھر بھی ہنستا ہے، مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو تقدیر پر یقین رکھتا ہے مگر وہ پھر بھی (طلب معاش کے سلسلہ میں) رنج و غم اٹھاتا ہے مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو دنیا اور اس کے انقلابات کو دیکھتا ہے اور پھر بھی اس سے مطمئن رہتا ہے اور مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو کل (قیامت) کے

دن کے حساب پر یقین رکھتا ہے اور پھر بھی عمل نہیں کرتا۔

جامع سورت

(۷۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ اَتٰى رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَقْرِئْنِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اقْرَأْ ثَلَاثًا مِّنْ ذَوَاتِ الٓرٰ فَقَالَ كَبُرَتْ سِنِّيْ وَاشْتَدَّ قَلْبِيْ وَغَلُظَ لِسَانِيْ قَالَ فَاقْرَأْ ثَلَاثًا مِّنْ ذَوَاتِ حٰمٓ فَقَالَ مِثْلَ مَقَالَتِهٖ قَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَقْرِئْنِيْ سُوْرَةً جَامِعَةً فَاَقْرَأَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا زُلْزِلَتْ حَتّٰى فَرَغَ مِنْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا اَزِيْدُ عَلَيْهِ اَبَدًا ثُمَّ اَدْبَرَ الرَّجُلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْلَحَ الرُّوَيْجِلُ مَرَّتَيْنِ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) مجھے پڑھائیے! آپ ﷺ نے فرمایا "قرآن کریم کی ان سورتوں میں سے کہ جن کے شروع میں الرٰ ہے پڑھو، اس نے عرض کیا، میری عمر زیادہ ہو چکی ہے اور دل میرا سخت ہو گیا ہے (یعنی میرے قلب پر حافظہ کی کمی اور نسیان کا غلبہ ہے) نیز میری زبان موٹی ہے (یعنی کلام اللہ خصوصاً بڑی سورتیں میں یاد نہیں کر سکتا) آپ نے فرمایا "اگر تم وہ سورتیں نہیں پڑھ سکتے تو ان سورتوں میں سے تین سورتیں پڑھو جن کے شروع میں حٰمٓ ہے (کیونکہ یہ سورتیں ان سورتوں کی نسبت چھوٹی ہیں) اس شخص نے پھر وہی کہا کہ یارسول اللہ مجھے کوئی جامع سورت پڑھائیے (یعنی کوئی ایسی بتائیے جس میں بہت سی باتیں جمع ہوں) چنانچہ آپ ﷺ نے اسے "سورۂ اذا زلزلت" پڑھائی، جب آپ ﷺ (پوری سورۃ پڑھا کر) اس سے فارغ ہوئے تو اس شخص نے کہا کہ "قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں (اس سورۃ پر عمل کرنے کے سلسلہ میں) اس پر کبھی بھی زیادتی نہیں کروں گا" پھر اس شخص نے پیٹھ پھیری (یعنی جب واپس ہو گیا) تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اس شخص نے مراد حاصل کرلی" یہ آپؐ نے دو مرتبہ فرمائی۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: جن سورتوں کی ابتداء لفظ الرٰ سے ہوتی ہے ان کی تعداد پانچ ہے ان سورتوں کے بارہ میں آپ ﷺ نے سائل سے فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی تین سورتیں پڑھ لیا کرو۔

سورۃ اذا زلزلت کو سورۃ جامعۃ (جامع سورت) اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اس سورۃ میں یہ ایک آیت فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔

اس آیت میں وہ تمام چیزیں آگئی ہیں جن کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جن کے مجموعہ کا نام ہے خیر و بھلائی اور وہ تمام چیزیں بھی اس میں شامل ہیں جن سے بچنے کا حکم دیا ہے جن کے مجموعہ کا نام ہے شر و برائی۔

الھٰکم التکاثر کی فضیلت

(۷۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا يَسْتَطِيْعُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّقْرَأَ اَلْفَ اٰيَةٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَالُوْا وَمَنْ يَّسْتَطِيْعُ اَنْ يَّقْرَأَ اَلْفَ اٰيَةٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَالَ اَمَا يَسْتَطِيْعُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّقْرَأَ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ روزانہ ایک ہزار آیتیں پڑھا کرے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ "کون شخص اس بات پر قادر ہو سکتا ہے کہ وہ (ہمیشہ) روزانہ ایک ہزار آیتیں پڑھتا رہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "کیا کوئی شخص اس بات پر قادر نہیں ہو سکتا کہ وہ (روزانہ) الھٰکم التکاثر پڑھ لیا کرے"۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص روزانہ یہ سورۃ پڑھ لیا کرے تو اسے ایک ہزار آیتوں کا ثواب ملے گا کیونکہ اس سورت میں دنیا سے بے رغبتی دلائی گئی ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دی گئی ہے۔

قل ھو اللہ احد پڑھنے کی تاثیر

(۷۵) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ مُرْسَلاً عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَأَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ عَشْرَ مَرَّاتٍ بُنِيَ لَهُ بِهَا قَصْرٌ فِي الْجَنَّةِ وَمَنْ قَرَأَ عِشْرِيْنَ مَرَّةً بُنِيَ لَهُ بِهَا قَصْرَانِ فِي الْجَنَّةِ وَمَنْ قَرَأَهَا ثَلَاثِيْنَ مَرَّةً بُنِيَ لَهُ بِهَا ثَلَاثَةُ قُصُوْرٍ فِي الْجَنَّةِ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِذًا لَّنُكْثِرَنَّ قُصُوْرَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُ اَوْسَعُ مِنْ ذٰلِكَ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت سعید ابن مسیبؒ بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص سورۃ قل ھو اللہ احد دس بار پڑھے تو اس کی وجہ سے جنت میں اس کے لئے ایک محل بنایا جاتا ہے، جو شخص اس کو بیس مرتبہ پڑھے تو اس کی وجہ سے جنت میں اس کے لئے دو محل بنائے جاتے ہیں اور جو شخص اس کو تیس مرتبہ پڑھے تو اس کی وجہ سے جنت میں اس کے لئے تین محل بنائے جاتے ہیں" (لسان نبوت سے یہ بشارت سن کر) حضرت عمر ابن خطابؓ کہنے لگے کہ "خدا کی قسم! اے اللہ کے رسول (ﷺ)! پھر تو اب ہم (جنت میں) اپنے بہت زیادہ محل بنالیں گے (یعنی جب اس سورۃ کو پڑھنے کی یہ برکت اور اس کا یہ ثواب ہے تو پھر ہم اب اس سورۃ کو بہت زیادہ پڑھیں گے تاکہ اس کی وجہ سے جنت میں ہمارے لئے بہت زیادہ محل بنیں) رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس سے بھی بہت زیادہ فراخ ہے" یعنی اس سورۃ کی فضیلت اور اس کا ثواب بہت عظیم اور بہت وسیع ہے لہٰذا اس بشارت پر تعجب نہ کرو بلکہ اس کے حصول کی کوشش کرو اور اس کی طرف راغب ہو)۔" (دارمیؒ)

رات میں قرآن پڑھنے کا اثر

(۷۶) وَعَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلاً اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَأَ فِي لَيْلَةٍ مِائَةَ اٰيَةٍ لَمْ يُحَاجَّهُ الْقُرْاٰنُ تِلْكَ اللَّيْلَةَ وَمَنْ قَرَأَ فِي لَيْلَةٍ مِائَتَيْ اٰيَةٍ كُتِبَ لَهُ قُنُوْتُ لَيْلَةٍ وَمَنْ قَرَأَ فِي لَيْلَةٍ خَمْسَ مِائَةٍ اِلَى الْاَلْفِ اَصْبَحَ وَلَهُ قِنْطَارٌ مِنَ الْاَجْرِ قَالُوْا وَمَا الْقِنْطَارُ قَالَ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا (رواہ الدارمی)

"اور حضرت حسن بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص رات میں (قرآن کی) سو آیتیں پڑھے تو رات میں قرآن اس سے نہیں جھگڑے گا، جو رات میں دو سو آیتیں پڑھے تو اس کے لئے شب بیداری کا ثواب لکھا جاتا ہے اور جو شخص رات میں پانچ سو سے ہزار تک آیتیں پڑھے تو وہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کے لئے قنطار کے بقدر ثواب (لکھا جا چکا) ہوتا ہے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "قنطار کیا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "بارہ ہزار (درہم یا دینار)۔" (دارمیؒ)

تشریح: "قرآن اس سے نہیں جھگڑے گا" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن نہیں پڑھتا اور اس سے تعلق نہیں رکھتا تو قرآن اس کا دشمن ہو جاتا ہے اور اس پر لعنت و ملامت کرتا ہے لہٰذا رات میں قرآن کی سو آیتیں پڑھنا اس رات میں قرآن کی دشمنی کے دفعیہ اور اس کے حق کی ادائیگی کے لئے کافی ہے۔

اس موقع پر اتنی بات بھی جان لینی چاہئے کہ قرآن کا جھگڑنا یعنی قرآن کی لعنت و ملامت دو سبب سے ہے ایک تو قرآن نہ پڑھنے کے سبب سے اور دوسرے قرآن پر عمل نہ کرنے کے سبب سے، پس اگر قرآن کی لعنت و ملامت قرآن نہ پڑھنے کی وجہ سے ہوگی تو وہ پڑھنے سے رفع ہو جائے گی اور اگر قرآن کی لعنت و ملامت قرآن پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہوگی تو وہ لعنت و ملامت باقی رہے گی جب تک کہ وہ

عمل نہ کرے جب قرآن پر عمل کرے گا تو اس کی لعنت و ملامت بھی ختم ہو جائے گی، حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن پڑھے گا اور اس پر عمل بھی کرے گا تو وہ قرآن کی دشمنی اور اس کی لعنت ملامت سے کلیۃً محفوظ رہے گا بلکہ قرآن ایسے شخص کے حق میں شفاعت و شفارش بھی کرے گا اور اگر ایک بات میں بھی قصور و کوتاہی ہوگی تو قرآن کی دشمنی بھی باقی رہے گی اور لعنت ملامت بھی ختم نہیں ہوگی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قراءت قرآن ہر شخص پر واجب ہے اگر کوئی شخص قرآن نہیں پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے جھگڑے گا، لہٰذا جھگڑنے کی نسبت قرآن کی طرف مجازی ہے حقیقت میں وہ خدا کا جھگڑنا ہوگا یعنی قرآن نہ پڑھنے والے پر براہ راست خدا کی لعنت ہوگی۔

"قنطار کے بقدر" کا مطلب ہے قنطار کی تعداد کے برابر یا قنطار کے وزن کے برابر بہر کیف یہاں مراد یہ ہے کہ حدیث میں مذکور تعداد میں قرآن کی آیتیں پڑھنے والا شخص بہت ہی زیادہ ثواب پاتا ہے۔

کچھ سورتوں کے فضائل

گزشتہ صفحات میں جو احادیث گزری ہیں ان میں کچھ سورتوں اور آیتوں کے فضائل بیان کئے جا چکے ہیں یہ باب ختم ہو رہا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان بعض سورتوں کے فضائل تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے جائیں جنہیں تفسیر عزیزی اور درمنثور نے نقل کیا ہے تاکہ ان فضائل کو پڑھنے کے بعد مسلمانوں کا دل خوش ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ راغب اور سرگرم ہو کر اس عظیم نعمت کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اس طرح وہ دنیا کی فلاح و سعادت سے بہرہ ور ہو سکیں۔

بسم اللہ کی برکت

حضرت مولانا عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں کہ مفسرین نے کہا جب طوفان نوح نے اس دنیا کو اپنے خوفناک عذاب کے چنگل میں گھیر لیا اور حضرت نوح علیہ السلام اپنی کشتی میں سوار ہوئے تو وہ بھی خوف غرق سے ہراساں اور لرزاں تھے انہوں نے غرق سے نجات پانے اور اس عذاب خداوندی سے محفوظ رہنے کے لئے بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖیھَا وَمُرْسٰھَا کہا اس کلمہ کی برکت سے ان کی کشتی غرقابی سے محفوظ و سالم رہی مفسرین کہتے ہیں کہ جب اس آدھے کلمہ کی وجہ سے اتنے ہیبت ناک طوفان سے نجات حاصل ہوئی تو جو شخص اپنی پوری عمر اس پورے کلمہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے اپنے ہر کام کی ابتداء کرنے کا التزام کرے وہ نجات سے کیونکہ محروم رہ سکتا ہے؟

علماء لکھتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں انیس حروف ہیں دوزخ کے موکل بھی انیس ہیں لہٰذا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ہر حرف کے ذریعہ ان میں سے ہر ایک کی بلا دفع ہو سکتی ہے، نیز علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ دن رات کو چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں پانچ گھنٹوں کے لئے تو پانچ وقت کی نمازیں مقرر فرمائی گئیں اور بقیہ انیس گھنٹوں کے لئے یہ انیس حروف عطا فرمائے گئے تاکہ ان انیس گھنٹوں میں ہر نشست و برخاست، ہر حرکت و سکون اور ہر کام کے وقت ان انیس حروف کے ذریعہ برکت و عبادت حاصل ہو یعنی ان حروف (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے) کی برکت سے یہ انیس گھنٹے بھی عبادت میں لکھے جائیں۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ سورۂ برأت کو جو قتل کفار کے حکم پر مشتمل ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے خالی رکھا گیا ہے کیونکہ یہ کلمہ رحمت ہے جو موقع کا مقتضی نہیں ہے، اسی طرح جانور کو ذبح کرتے وقت بھی صرف بسم اللہ اللہ اکبر کہنا مقرر فرمایا گیا ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے کیونکہ ذبح کی صورت قہر و عذاب کی شکل ہے اور یہ کلمہ رحمت (یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کا محل اور اس کا مقتضی نہیں لہٰذا جو شخص اس کلمہ رحمت (یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) پر ہر وقت اور ہر آن مداومت کرتا ہے جس کا اولیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ ہر روز سترہ مرتبہ فرض نماز میں یہ کلمہ اپنی زبان پر جاری کرتا ہے کہ وہ شخص غضب و عذاب سے محفوظ اور ثواب سے محظوظ ہوگا۔

اس آیت (یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کے خواص میں سے یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص بیت الخلاء جائے تو

چاہئے کہ وہ بسم اللہ کہہ کر جائے تاکہ (اس کی وجہ سے) اس کی شرم گاہ اور جنات کے درمیان پردہ واقع ہو جائے کوئی شخص بسم اللہ کہہ کر بیت الخلاء جاتا ہے تو اس کا خاصہ یہ ہے کہ جنات کی نظر اس کی شرم گاہ کی طرف نہیں جاتی، لہٰذا جب اس کی تاثیر یہ ہے کہ یہ آیت انسان اور اس کے دنیاوی دشمن (جنات) کے درمیان پردہ بن جاتی ہے تو امید ہے کہ یہ ایک مسلمان اور عذاب عقبیٰ کے درمیان بھی یقیناً پردہ بن کر حائل ہوگی۔

سورۂ فاتحہ کے فضائل اور اس کی تاثیر

صحاح ستہ میں یہ روایت آتی ہے کہ جب کسی شخص کو بچھو یا سانپ کاٹ لیتا تھا یا کوئی مرگی میں مبتلا ہوتا تھا یا کوئی دیوانہ ہو جاتا تھا تو نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ سورہ فاتحہ پڑھ کر اس شخص پر دم کیا کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ اس عمل کو پسند فرماتے تھے۔

دار قطنی اور ابن عساکر حضرت زید ابن سائبؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر ان پر دم کیا اور یہ سورہ پڑھنے کے بعد اپنے دہن مبارک کا لعاب ان کے جسم کے اس حصہ پر ملا جہاں درد تھا۔

بزارؒ نے اپنی مسند میں حضرت انس ابن مالکؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اپنا پہلو اپنے بچھونے پر رکھا (یعنی سونے کے لئے اپنے بستر پر گیا) اور پھر اس نے سورہ فاتحہ اور قل ھو اللہ احد پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا تو وہ ہر آفت و بلاء سے محفوظ ہو گیا الا یہ کہ اس کی موت کا وقت آپہنچا ہو یعنی موت سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

عبد حمیدؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابن عباسؓ سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ فاتحۃ الکتاب (سورۂ فاتحہ) باعتبار ثواب کے دو تہائی قرآن کے برابر ہے، ابو الشیخ طبرانی، ابن مردویہ، دیلمی اور ضیاء مقدسی روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "مجھے کنج العرش (عرش کے خزانہ) سے چار چیزیں عطا کی گئی ہیں، اس خزانہ سے ان چار چیزوں کے علاوہ اور کوئی چیز دوسرے کو نہیں دی گئی ہے اور وہ چار چیزیں ہیں۔ ① اُمّ الکتاب (سورہ فاتحہ) ② آیۃ الکرسی۔ ③ سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں۔ ④ اور سورۂ کوثر۔

ابو نعیمؒ اور دیلمیؒ نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "سورۂ فاتحہ اس چیز سے کفایت کرتی ہے کہ قرآن کی اور کوئی سورت و آیت کفایت نہیں کرتی اور اگر سورۂ فاتحہ کو ترازوں کے ایک پلڑے میں رکھیں اور باقی تمام قرآن کو دوسرے پلڑے میں رکھیں تو یقیناً سورۂ فاتحہ سات قرآن کے برابر ہو۔

حضرت ابو عبیدؒ فضائل قرآن میں حسن بصریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے سورہ فاتحہ پڑھی اس نے گویا توریت و انجیل، زبور اور قرآن کو پڑھا"۔

تفسیر وکیع، کتاب، المصاحف ابن انباری، کتاب، العظمہ، ابو الشیخ اور حلیۃ الاولیاء ابو نعیم میں منقول ہے کہ "ابلیس ملعون کو نوحہ و آہ وزاری کرنے اور اپنے سر پر خاک ڈالنے کا چار مرتبہ اتفاق ہوا ہے اول تو اس وقت جب کہ اس کو ملعون قرار دیا گیا، دوسرے اس وقت جب کہ اسے آسمان سے زمین پر ڈالا گیا، تیسرے اس وقت جب کہ نبی کریم ﷺ کو خلعت نبوت سے نوازا گیا اور چوتھے اس وقت جب کہ سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔

ابو الشیخؒ نے کتاب الثواب میں لکھا ہے کہ جس شخص کو کوئی حاجت درپیش ہو تو اسے چاہئے کہ وہ سورۂ فاتحہ پڑھے اور اس کے بعد اپنی حاجت کے لئے دعاء کرے (انشاء اللہ اس کی حاجت پوری ہوگی)۔

ثعلبیؒ حضرت شعبیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے درد گردہ کی شکایت کی انہوں نے اس شخص سے کہا کہ تمہیں چاہئے کہ "اساس القران" پڑھ کر درد کی جگہ دم کرو (انشاء اللہ شفا ہوگی) اس شخص نے پوچھا کہ اساس القرآن کیا ہے؟ شعبیؒ نے فرمایا کہ "فاتحۃ الکتاب یعنی سورۂ فاتحہ"۔

مشائخ کے مجرب اعمال میں یہ مذکور ہے کہ سورۂ فاتحہ اسم اعظم ہے، اس سورۃ کو ہر مطلب و حاجت کے لئے پڑھنا چاہئے، اس سلسلے

میں اس سورۃ کو پڑھنے کے دو طریقے منقول ہیں اول یہ کہ اس سورۃ کو فجر کی سُنت و فرض نماز کے درمیان چالیس دن تک اکتالیس مرتبہ اس طرح پڑھا جائے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے میم کو الحمد کے لام کے ساتھ ملایا جائے یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمدللہ رب العٰلمین الآیۃ اس سورت کو مقررہ بالا دن تک مذکورہ بالا طریقہ سے پڑھنے کے بعد مطلوب انشاء اللہ حاصل ہوگا، اگر کسی مریض یا سحرزدہ کی شفا منظور ہو تو مذکورہ بالا طریقہ سے یہ سورت پڑھ کر پانی پر دم کر کے اس مریض یا سحرزدہ کو پلایا جائے انشاء اللہ شفا حاصل ہوگی۔

دوم یہ کہ نوچندی اتوار کو فجر کی سنت و فرض نماز کے درمیان میم کو لام کے ساتھ ملانے کی قید کے بغیر ستر مرتبہ یہ سورت پڑھے بعد ازاں ہر روز اسی وقت پڑھے مگر اس طرح کہ ہر روز مذکورہ تعداد میں سے دس مرتبہ کم کردے یعنی نوچندی اتوار کو ستر مرتبہ، دوسرے روز ساٹھ مرتبہ تیسرے روز پچاس مرتبہ، اس طرح دس دس بار کم کرتا جائے تاآنکہ ہفتہ کے روز ختم ہوجائے اگر پہلے مہینہ میں مطلب حاصل ہوجائے تو فبہا ورنہ دوسرے اور تیسرے مہینہ میں اسی طرح پڑھے۔

امراض مزمنہ اپرانے امراض کی شفاء کے لئے اس سورۃ کو چینی کے پیالے یا پلیٹ پر گلاب، مشک اور زعفران سے لکھ کر پلانا ایک مجرب عمل ہے اسی طرح دانتوں کے درد ، شکم اور دوسرے دردوں میں سات مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرنا بھی مجرب ہے۔

فضائل سورۂ بقرہ

سورۂ بقرہ کی فضیلت بھی بہت زیادہ منقول ہے صحیح مسلم میں حضرت انس ابن مالکؓ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ہم میں سے جو شخص سورۃ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھ لیتا تھا تو ہم میں اس کا مرتبہ باعتبار جاہ وعظمت کے بہت بلند ہوجاتا تھا چنانچہ اس بات کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک لشکر کہیں بھیجنا چاہتے تھے اس لشکر کے امیر کے تعین میں تردد پیدا ہو رہا تھا آپ ﷺ اس مقررہ لشکر کے ہر فرد کو بلا کر اس سے پوچھتے تھے کہ تم قرآن کی کون سی سورۃ یاد رکھتے ہو ؟ اسے جو سورت یاد ہوتی وہ بتادیتا یہاں تک کہ نوبت ایک جوان تک پہنچی جو عمر میں سب سے چھوٹا تھا آپ ﷺ نے اس سے بھی دریافت فرمایا کہ "تم قرآن کی کون سی سورۃ یاد رکھتے ہو" اس نے عرض کیا کہ "فلاں فلاں سورۃ اور سورۃ بقرہ" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "کیا تم سورۃ بقرہ بھی یاد رکھتے ہو" اس نوجوان نے عرض کیا کہ "ہاں یا رسول اللہ" آپ ﷺ نے فرمایا "تو جاؤ! اس لشکر کے تم ہی امیر مقرر کئے گئے"۔

بیہقیؒ نے شعب الایمان میں یہ روایت نقل کی ہے کہ "امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے سورۂ بقرہ کو اس کے حقائق ونکات کے ساتھ بارہ برس کے عرصہ میں پڑھا اور جس روز انہوں نے یہ سورت ختم کی اس دن ایک اونٹ ذبح کیا اور بہت زیادہ کھانا لا کر آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کو کھلایا۔

اس سلسلہ میں حضرت ابن عمرؓ سے بھی منقول ہے کہ انہوں نے آٹھ برس تک اس سورۃ کو پڑھنے میں اپنے آپ کو منہمک رکھا آٹھ برس کے بعد انہوں نے یہ سورت ختم کی۔ غرضکہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے نزدیک اس سورۃ کو جو عظمت وفضیلت حاصل تھی وہ کسی اور سورت کو حاصل نہیں تھی۔

اس سورۃ کے مجرب خواص میں سے یہ ہے کہ جس موسم میں بچوں کو چیچک نکلتی ہے اس وقت جس بچے کی عافیت منظور ہو تو اس بچہ کو روبرو نہار منہ اس سورۃ کو تجوید کے ساتھ پڑھ کر اس پر دم کیا جائے وہ بچہ بھی نہار منہ ہونا چاہئے انشاء اللہ اس سال اس بچہ کو چیچک نہیں نکلے گی اگر نکلے گی بھی تو انجام بخیر ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ جس وقت اس سورۃ کو پڑھنا شروع کیا جائے تو اڑھائی پاؤ چاول اور اس پر دہی و کھانڈ ڈال کر اسے اسی مجلس میں کسی مستحق کو کھانے کے لئے دے دیا جائے۔

فضائل آیات سورۂ کہف

درمنثور میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتیں یاد کرے گا وہ دجال کے فتنہ سے بچایا

جائے گا، اسی طرح وہ شخص بھی فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا جو اس سورۃ کی آخری دس آیتیں یاد کرے گا جو شخص سوتے وقت سورۃ کہف کی دس آیتیں پڑھ لیا کرے گا وہ فتنہ دجال سے بچایا جائے گا اور جو شخص سوتے وقت اس سورۃ کا آخری حصہ پڑھے گا تو اس کے لئے قیامت کے دن اس کی قرأت[1] کے نزدیک سے اس کے قدم تک نور ہی نور ہو گا۔

ایک اور روایت میں یہ ہے کہ "جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھتا ہے تو اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک (کے صغیرہ گناہوں) کا کفارہ ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک روایت میں یہ ہے کہ "جس گھر میں سورۂ کہف پڑھی جاتی ہے اس رات کو اس گھر میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔

فضائل سورۂ ملک اور سورۂ یٰسٓ وغیرہ

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جس شخص نے عشاء کے بعد چار رکعتیں پڑھیں اس طرح کہ پہلے دو رکعتوں میں قل یا ایہا الکافرون اور قل ھو اللہ احد پڑھے اور اس کے بعد دو رکعتوں میں تبارک الذی اور الم تنزیل السجدہ تو اس کے لئے ان چار رکعتوں کا ثواب ایسی چار رکعتوں کے ثواب کے برابر لکھا جاتا ہے جو لیلۃ القدر میں پڑھی جائیں اسی طرح ایک اور روایت مین ہے کہ "جس شخص نے مغرب و عشاء کے درمیان سورۂ تبارک الذی اور الم تنزیل السجدہ پڑھی تو گویا اس نے لیلۃ القدر میں شب بیداری کی۔

ایک اور روایت میں حضرت کعبؓ سے منقول ہے کہ "جس شخص نے رات میں الم تنزیل السجدہ اور تبارک الذی پڑھی اس کے لئے ستر نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اس کی ستر برائیاں دور کی جاتی ہیں اور اس کے ستر درجات بلند کئے جاتے ہیں ایک اور روایت میں ہے کہ جس شخص نے رات میں الم تنزیل اور تبارک الذی پڑھی اللہ تعالیٰ اس کے لئے لیلۃ القدر کے ثواب کی مانند ثواب لکھتا ہے۔

ابن خریس، ابن مردویہ، خطیب اور بیہقی حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تورات میں سورۂ یٰسٓ کا نام معمہ رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورۃ اپنے پڑھنے والے کے لئے دنیا و آخرت کی تمام نیکیوں اور بھلائیوں پر مشتمل ہے، اپنے پڑھنے والے سے دنیا و آخرت کی مصیبت دفع کرتی ہے اور اس سے آخرت کی ہولناکی دور کرے گی۔ اور اس کا نام رافعہ (یا دافعہ) خافضہ (یا قاضیہ) بھی رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورۃ مؤمنین کو بلند مرتبہ بناتی ہے اور کافروں کو پست کرتی ہے نیز اپنے پڑھنے والے سے ہر برائی دفع کرتی ہے اور اس کی ہر حاجت پوری کرتی ہے جو شخص اسے پڑھتا ہے تو وہ اس کے حق میں بیس حج کے برابر ہوتی ہے جو شخص اسے سنتا ہے تو وہ اس کے حق میں ایسے دینار کے برابر ہوتی ہے جسے وہ اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں خرچ کرے اور جو شخص اسے لکھ کر پیتا ہے تو وہ اس کے پیٹ میں ہزار دوائیں ہزار نور، ہزار برکتیں اور ہزار رحمتیں داخل کرتی ہے اور اس میں سے ہر کینہ اور ہر دکھ دور نکال باہر کرتی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میں اس بات کو پسند کرتا ہوں اور دوست رکھتا ہوں کہ سورۂ یٰسٓ میری اُمت کے ہر فرد بشر کے دل میں ہو (یعنی ہر شخص کو یاد ہو) اور آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے ہر رات میں سورۂ یٰسٓ پڑھنے پر مداومت کی (یعنی وہ روزانہ رات میں اسے پڑھتا رہے) اور پھر وہ مرجائے تو اسے شہادت کی موت نصیب ہوتی ہے۔ نیز رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے دن کے ابتدائی حصہ میں سورۂ یٰسٓ پڑھی اس کی حاجتیں پوری کی جاتی ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "جو شخص سورۂ یٰسٓ صبح کے وقت پڑھتا ہے اسے شام تک اس دن کی آسانیاں عنایت کی جاتی ہیں اور جس شخص نے شب کے ابتدائی حصہ میں اس کو پڑھا اسے صبح تک اس رات کی آسانیاں عطا کی جاتی ہیں۔ بیہقیؒ نے حضرت ابوقلابہؒ

---

[1] اس جملہ کے معنی میں دو احتمال ہیں یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ پڑھے گا وہاں سے اس جگہ تک کہ جہاں وہ قیامت کے دن کھڑا ہو گا قیامت کے دن اس کے لئے نور ہی نور ہو گا یا پھر یہاں "قرأت کے نزدیک" سے مراد پڑھنے والے کا منہ ہے یعنی قیامت کے دن اس کے لئے اس کے منہ سے اس کے پیروں تک نور ہی نور ہو گا۔

سے جو جلیل القدر اور کبار تابعین میں سے ہیں ان کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جس شخص نے سورۂ یٰسٓ پڑھی اس کی مغفرت کی جاتی ہے جس شخص نے یہ سورۃ بھوک کی حالت میں پڑھی وہ سیر ہو جاتا ہے جس شخص نے اس حالت میں پڑھی کہ وہ راستہ بھول گیا ہے تو اپنا راستہ پالیتا ہے جس شخص نے اس حالت میں پڑھی کہ اس کا جانور جاتا رہا تو وہ اپنا جانور پالیتا ہے جس شخص نے کھانے کے وقت اس حالت میں پڑھی کہ اسے کھانے کی کمی کا خوف ہے تو اس کا کھانا کافی ہو جاتا ہے، جس شخص نے اسے میت (یا قریب المرگ) کے پاس پڑھا تو اس (میت یا قریب المرگ) پر آسانی ہو جاتی ہے، جس شخص نے اسے کسی ایسی عورت کے سامنے پڑھا جو ولادت کی شدید تکلیف میں مبتلا ہے تو اس کے لئے ولادت میں آسانی عطا کی جاتی ہے اور جس شخص نے یہ سورت پڑھی اس نے گویا پورا قرآن گیارہ مرتبہ پڑھا اور (یاد رکھو) ہر چیز کا دل ہوتا ہے قرآن کا دل یٰسٓ ہے۔

مقبریؒ کہتے ہیں کہ اگر کسی قسم کا کوئی خوف ہو حکومت وقت کا کوئی (ناقابل برداشت یا غلط) مطالبہ ہو یا کسی دشمن کی طرف سے ایذاء رسانی کا اندیشہ ہو تو سورۂ یٰسٓ پڑھو انشاء اللہ اس کی برکت کی وجہ سے تم ہر قسم کے خوف و اندیشہ سے محفوظ رہو گے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جس نے جمعہ کے دن سورۂ یٰسٓ اور الصافات پڑھی اور پھر خدا سے کوئی چیز مانگی تو اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز عنایت فرمائے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کا نماز سے فارغ ہونا اس بات سے پہچانتے تھے کہ آپ ﷺ نماز کے بعد یہ آیت سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ آخر آیت تک پڑھتے تھے۔ نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے نماز کے بعد یہ آیت سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ آخر آیت تک تین مرتبہ پڑھی تو بلاشک اس نے پورے پیمانہ کے ساتھ (یعنی بھرپور) ثواب حاصل کیا۔ آپ ﷺ یہ بھی فرماتے تھے کہ جس شخص کے لئے یہ بات خوش کن ہو کہ وہ قیامت کے روز بھرپور ثواب کا حقدار ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی مجلس کے آخر میں جب کہ وہ اٹھنے کا ارادہ کرے یہ آیت یعنی سُبْحَانَ رَبِّكَ الخ پڑھے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے مجھے سبع طول (یعنی وہ سات بڑی سورتیں جو ابتداء قرآن میں ہیں) تورات کی جگہ دی ہیں، الرآتؔ[1] سے طواسینؔ[2] تک انجیل کی جگہ دی ہیں، طواسین اور حامیمونؔ[3] کے درمیان کی سورتیں زبور کی جگہ دی ہیں اور حامیمون و مفصل (قرآن کی آخری سورتوں کے ذریعہ مجھے امتیاز و فضیلت بخشی ہے، مجھ سے پہلے کسی نبی نے ان سورتوں کو نہیں پڑھا، (یعنی ان سورتوں کے مضامین صرف مجھے ہی عنایت فرمائے گئے ہیں اور کسی نبی کو اس سے سرفراز نہیں کیا گیا ہے)۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کا خلاصہ ہوا کرتا ہے قرآن کا خلاصہ حامیمون ہیں "حضرت سمرہ ابن جندب سے بطریق مرفوع منقول ہے کہ "حامیمون" جنّت کے باغات میں سے باغ ہیں"۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "حامیمون سات ہیں (یعنی ایسی سورتوں کی تعداد سات ہے جن کے شروع میں حٰم ہے) اور دوزخ کے دروازے بھی سات ہیں ان میں سے ہر حٰم (قیامت میں) دوزخ کے ہر ایک دروازے پر کھڑی رہے گی اور ہر ایک عرض کرے گی کہ اے پروردگار! اس دروازہ کے ذریعہ اس شخص کو دوزخ میں داخل نہ کر جو مجھ پر ایمان رکھتا تھا اور مجھ کو پڑھتا تھا" نیز آپ ﷺ نے فرمایا "جس طرح ہر درخت کا پھل ہوتا ہے اسی طرح قرآن کا پھل حامیمون ہیں وہ باغ ہیں ارزانی کرنے والے، سیر کرنے والے، تجارت کی جگہ، لہٰذا جس شخص کو یہ بات پسندیدہ اور محبوب ہو کہ وہ جنّت کے باغات میں خوشہ چینی کرے تو اسے چاہئے کہ وہ حامیمون پڑھے"۔

بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب تک تَبَارَكَ الَّذِیْ اور حٰمٓ السجدہ نہ پڑھ لیتے تھے سوتے نہیں تھے "ایک اور روایت ہے کہ "جو شخص جمعہ کی شب میں حٰم الدخان اور یٰس پڑھتا ہے تو وہ اس حالت میں صبح کرتا ہے کہ اس کی بخشش ہو

---

[1] یعنی وہ سورتیں جن کے شروع میں "الر" یا "المر" ہے ۱۲۔

[2] یعنی وہ سورتیں جن کے شروع میں "طس" یا "طسم" ہے۔

[3] یعنی وہ سورتیں جن کے شروع میں "حم" ہے۔

چکی ہوتی ہے۔" ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا ہے" جو شخص جمعہ کی شب میں یا جمعہ کے دن حم الدخان پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بناتا ہے نیز ایک روایت یہ ہے کہ جو شخص جمعہ کی رات میں سورۂ دخان پڑھتا ہے تو وہ اس حالت میں صبح کرتا ہے۔ کہ اس کی مغفرت ہو چکی ہوتی ہے۔ اور اس کا نکاح حور عین سے کیا جائے گا۔ اور جو شخص رات میں سورۂ دخان پڑھتا ہے اس کے پہلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے الٓمٓ تَنْزِیْلُ. یٰسٓ. اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور تَبَارَكَ الَّذِیْ پڑھی یہ سورتیں اس کے لئے نور ہوں گی اور شیطان و شرک سے پناہ بن جائیں گی نیز قیامت کے دن اس کے درجات بلند کئے جائیں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا" جو شخص ہر رات میں اقتربت الساعۃ پڑھے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس حال میں اٹھائے گا کہ اس کا منہ چودھویں رات کے چاند کی مانند (روشن) ہوگا" نیز رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ سورۂ اذا وقعت اور رحمٰن۔ پڑھنے والا زمین و آسمان میں رہنے والوں کے درمیان" ساکن الفردوس" کے نام سے پکارا جاتا ہے یعنی وہ خوش نصیب جنت الفردوس میں (کہ جو سب سے اعلیٰ جنت ہے) رہے گا۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا" سورۃ الواقعہ" سورۃ الغنٰی ہے لہٰذا اسے پڑھو اور اپنی اولاد کو سکھاؤ اور ایک روایت میں ہے کہ" اسے اپنی بیویوں کو سکھلاؤ"۔

حضرت عائشہؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ عورتوں سے کہا کرتی تھیں کہ، تم میں سے کسی کو سورۂ واقعہ پڑھنے سے کوئی چیز روک نہ دے۔

منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا کہ وہ جب (سونے کے لئے) اپنے بستر پر جائے تو سورۃ حشر پڑھے۔ ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شیطان سے پناہ مانگے اور پھر تین مرتبہ سورۂ حشر کا آخری حصہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے بھیجتا ہے جو اس شخص سے جن و انس کے شیاطین کو دور رکھتے ہیں اگر وہ یہ رات میں پڑھتا ہے تو وہ فرشتے (ان شیاطین کو) شام تک دور رکھتے ہیں" نیز آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ" جس شخص نے سورۃ حشر کی آخری آیتیں دن میں یا رات میں پڑھیں اور اس دن میں یا رات میں مر گیا تو اس کے لئے جنت واجب ہوگی۔

آپ ﷺ نے فرمایا، میں اس بات کو پسندیدہ اور محبوب رکھتا ہوں کہ میری امت کے ہر فرد و بشر کے دل میں تبارک الذی ہو (یعنی ہر شخص کو یہ سورت یاد ہو)۔

اور حضرت عکرمہ ابن سیان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت اسمٰعیلؒ کے سامنے قرآن پڑھا، جب میں سورۂ والضحیٰ پر پہنچا تو انہوں نے فرمایا کہ سورۂ والضحیٰ کے بعد آخر تک ہر سورت کے ختم ہونے کے بعد اللہ اکبر کہو اس لئے کہ جب میں نے حضرت عبداللہ ابن کثیرؒ کے سامنے قرآن کریم پڑھا اور میں سورۂ والضحیٰ پر پہنچا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس سورۃ کے بعد قرآن کریم کے آخر تک ہر سورۃ کے ختم ہونے کے بعد اللہ اکبر کہو، نیز حضرت ابن عباسؓ نے بھی اس بات کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں مجھے اس بات کا حکم حضرت ابی بن کعبؓ نے دیا اور حضرت ابیؓ نے مجھے بتایا کہ انہیں رسول کریم ﷺ نے اس بات کا حکم دیا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا اِذَا زُلْزِلَتْ آدھے قرآن کے برابر ہے اور وَالْعٰدِیٰتِ بھی آدھے قرآن کے برابر ہے، نیز آپ ﷺ نے فرمایا" جو شخص رات میں ہزار آیتیں پڑھا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ ہنستا ہوگا عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ہزار آیتیں پڑھنے کی کون طاقت رکھتا ہے۔" آپ نے فرمایا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر الھٰکم التکاثر آخر سورۃ تک پڑھے اور پھر فرمایا کہ، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یہ سورت ہزار آیتوں کے برابر ہے۔

ابوالشیخ نے عظمت میں اور ابو محمد سمرقندیؒ نے قل ھو اللہ احد کے فضائل میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ" خیبر کے یہود (نبی

کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ "اے ابوالقاسم (ﷺ) اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو نور حجاب سے آدمؑ کو حماء مسنون یعنی سڑی ہوئی کیچڑ سے، ابلیس کو شعلۂ آگ سے، آسمان کو دھوئیں سے اور زمین کو پانی کے جھاگ سے پیدا کیا لہٰذا اب آپ ﷺ ہمیں اپنے رب کے بارہ میں بتائیے (کہ اللہ تعالیٰ کس چیز سے پیدا ہوا؟) نبی کریم ﷺ نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا، تاآنکہ حضرت جبرئیلؑ آپ کے پاس یہ سورۃ یعنی قل ھو اللہ احد لائے جس کا مطلب یہ ہے کہ (اے محمد ﷺ) آپ ان سے کہہ دیجئے اللہ ایک ہے نہ اس کے اصول ہیں نہ فروع اور نہ اس کا کوئی شریک ہے اَللّٰہُ الصَّمَدُ اللہ تعالیٰ بالکل بے پرواہ اور مستغنی ہے نہ تو وہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور نہ اسے کسی چیز کی حاجت وضرورت ہے یہ ساری سورۃ آپ نے پڑھ کر سنادی، چنانچہ اس سورۃ میں نہ جنّت کا ذکر ہے اور نہ دوزخ کا، نہ حلال چیزوں کا ذکر ہے اور نہ حرام کا بلکہ اس سورۃ کو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی طرف منسوب کیا ہے، لہٰذا یہ سورۃ خاص طور پر اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے یعنی اس سورۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات اور وحدانیت کی حقیقت بتائی ہے، اس لئے جس شخص نے اس سورۃ کو تین مرتبہ پڑھا گویا اس نے تمام وحی (یعنی پورا قرآن) پڑھ لیا، جس شخص نے اس سورت کو تیس مرتبہ پڑھا ہو اس دن میں دنیا میں کوئی شخص اس کی فضیلت کے برابر نہیں ہو گا علاوہ اس شخص کے جس نے اس سے بھی زیادہ پڑھا ہو، جس شخص نے اس سورۃ کو دوبار پڑھا ہو وہ جنّت الفردوس میں رہے گا اور جو شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اسے تین مرتبہ پڑھے تو اس سے فقر ومحتاجگی دور رہتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک رات رسول کریم ﷺ نے اس طرح گزاری کہ تمام رات صبح تک اس سورۃ کو بار بار پڑھتے تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ "جس شخص نے قل ھو اللہ احد پڑھی اس نے گویا تہائی قرآن پڑھا" ایک اور روایت میں ہے کہ "جس شخص نے سورت کو دو سو مرتبہ پڑھا اس کے دو سو برسوں کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں (یعنی اس کے بہت ہی زیادہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں)۔

اور ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے قل ھو اللہ احد پچاس مرتبہ پڑھی اس کے پچاس برس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے ہر روز دو مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھی اس کے لئے ڈیڑھ ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس سے پچاس برس کے گناہ دور کئے جاتے ہیں الا یہ کہ اس پر دین (کوئی قرض) ہو۔

ابن سعدؒ، ابن خریسؒ، ابویعلیؒ اور بیہقیؒ دلائل میں حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ملک شام میں تھے کہ حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور عرض کیا کہ اے محمد (ﷺ)! معاویہؓ ابن معاویہ مزنی (صحابی) کا انتقال ہو گیا ہے، کیا آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ ان کی نماز جنازہ پڑھیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں! چنانچہ حضرت جبرئیلؑ نے اپنا بازو زمین پر مارا جس سے ان کے لئے ہر چیز پست ہو کر زمین کی سطح سے مل گئی یہاں تک کہ معاویہ کا جنازہ بلند ہو کر سامنے نظر آنے لگا اور نبی کریم ﷺ نے ان کی نماز جنازہ فرشتوں کی دو صفوں میں پڑھی اور ہر صف میں چھ لاکھ فرشتے تھے۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا کہ قل ھو اللہ احد کے پڑھنے نے، وہ اس سورۃ کو (ہر وقت) کھڑے بیٹھے، آتے جاتے اور سوتے (یعنی لیٹے لیٹے) پڑھا کرتے تھے۔

ایک اور روایت میں حضرت انسؓ ہی سے اس طرح منقول ہے کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ تبوک میں تھے ایک دن آفتاب طلوع ہوا تو اس میں ایسی روشنی وشعاع اور ایسا نور تھا کہ ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، چنانچہ نبی کریم ﷺ سورج کی اس روشنی ونور کے بارہ میں اظہار تعجب ہی فرما رہے تھے کہ اچانک حضرت جبرئیلؑ تشریف لے آئے ان سے پوچھا کہ سورج کے لئے ایسا کیا سبب پیش آیا کہ میں اس کو ایسی روشنی ونور کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ پہلے کبھی اس طرح طلوع ہوتے نہیں دیکھا؟ انہوں نے کہا کہ "اس کا سبب یہ ہے کہ آج مدینہ میں معاویہ ابن معاویہ لیثی[1] کا انتقال ہو گیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ستر ہزار فرشتے بھیجے تاکہ وہ ان کی

---

[1] یہ وہی معاویہ ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا مزن ان کے عام قبیلہ کا نام ہے جب کہ لیث ان کے خاص قبیلہ کا نام ہے اس لئے انہیں مزنی بھی کہا جاتا ہے اور لیثی بھی۔

نماز جنازہ پڑھیں، آپ نے پوچھا کہ اے جبرئیل! اس فضیلت و کرامت کا سبب کیا ہے حضرت جبرئیلؑ نے کہا کہ "اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قل ھو اللہ احد بہت زیادہ پڑھتے تھے کھڑے بیٹھے چلتے اور دن و رات کے دوسرے اوقات میں اس سورۃ کو بہت زیادہ پڑھتے تھے کیونکہ یہ سورۃ آپ کے رب کی نسبت ہے جو شخص اس سورۃ کو پچاس مرتبہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پچاس ہزار درجے بلند کرتا ہے اور اس سے پچاس ہزار برائیاں دور کرتا ہے نیز اس کے لئے پچاس ہزار نیکیاں لکھتا ہے اور جو شخص اس سے بھی زیادہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے۔ پھر جبرئیلؑ نے کہا کہ۔ کیا میں آپ کے لئے زمین سمیٹ لوں تا کہ آپ (ﷺ) ان کی نماز جنازہ پڑھ سکیں؟ آپ نے کہا "ہاں" چنانچہ آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جن کو جو شخص تکمیل ایمان کی خاطر اختیار کرے تو وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے گا داخل ہوگا اور جس بھی حور عین سے چاہے گا نکاح کرے گا۔ ① اپنے قاتل کو معاف کرے۔ ② دین خفیہ ادا کرے۔ ③ ہر فرض نماز کے بعد دس مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھے۔ (یہ سن کر) حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ، اگر کوئی ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اختیار کرے گا تو مذکورہ بالا ثواب و سعادت کا حقدار ہوگا۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ جو شخص روزانہ پچاس مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھے تو اسے قیامت کے دن اس کی قبر سے اس طرح بلایا جائے گا کہ "اے اللہ کے مدح کرنے والے جنت میں داخل ہوجا"۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، جو شخص کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ کہنا بھول جائے تو اسے چاہئے کہ جب وہ کھانے سے فارغ ہو تو قل ھو اللہ احد پڑھ لے نیز رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت قل ھو اللہ احد پڑھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کے گھر والوں سے بلکہ ہمسایوں سے بھی فقر و محتاجگی دور ہوتی ہے، ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(ایک دن) حضرت جبرئیلؑ بڑی اچھی صورت میں شاداں و فرحاں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اے محمد (ﷺ)! علیّ اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) آپ کو سلام فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہر ذات کے لئے سلسلہ نسب ہوتا ہے میرا نسب قل ھو اللہ احد ہے لہٰذا آپ کی اُمت میں سے جو شخص میرے پاس اس حال میں آئے گا کہ اس نے کبھی قل ھو اللہ احد ہزار بار پڑھی ہوگی تو میں اسے اپنا نشان عطا کروں گا، اسے اپنے عرش کے قریب رکھوں گا اور ایسے ستر آدمیوں کے حق اس کی شفاعت قبول کروں گا جو مستوجب عذاب ہوں گے اور اگر میں نے اپنے اوپر یہ واجب نہ کر لیا ہوتا کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (یعنی میں نے یہ کلیہ نہ بنادیا ہوتا کہ ہر جاندار موت کا مزہ ضرور چکھے گا) تو میں اس کی روح قبض نہ کرتا۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص نماز جمعہ کے بعد قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ سات سات مرتبہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسے دوسرے جمعہ تک برائیوں سے پناہ میں رکھتا ہے۔

ایک روایت یہ ہے کہ "جس شخص نے قل ھو اللہ احد ہزار مرتبہ پڑھی تو اس کا یہ پڑھنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس بات سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے کہ وہ فی سبیل اللہ (یعنی جہاد میں) ایک ہزار گھوڑے مع لگام و زین کے دے۔

حضرت کعبؓ احبار کہتے ہیں کہ جو شخص قل ھو اللہ احد پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گوشت کو آگ پر حرام کر دیتا ہے، نیز کعب احبارؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ جو شخص روزانہ رات و دن میں دس بار قل ھو اللہ احد اور آیۃ الکرسی پڑھنے پر مواظبت کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو واجب کرتا ہے اور وہ انبیاء کے ساتھ ہوگا۔ نیز شیطان سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ "جو شخص عرفہ کے دن زوال آفتاب کے بعد ہزار مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ عطا فرماتا ہے" ایک روایت میں یہ ہے کہ جس شخص نے اس سورت کو ہزار مرتبہ پڑھا اس نے اپنا نفس اللہ تعالیٰ سے خرید لیا یعنی وہ آگ سے محفوظ ہوگیا، اسی طرح ایک روایت میں یوں ہے کہ "جو شخص اس سورت کو دو سو مرتبہ پڑھتا ہے

اسے پانچ سو برس کی عبادت کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

ایک روایت میں نبی کریم ﷺ کے بارہ میں منقول ہے کہ جب آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ کے ساتھ کیا تو آپ ﷺ نے پانی منگا کر اس میں کلی کی پھر اسے (اپنے گھر میں) لے گئے اور اس پانی کو ان کے گریبان میں اور ان کے دونوں مونڈھوں کے درمیان چھڑکا نیز قل ھو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق، اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر انہیں خدا کی پناہ میں دیا" ایک روایت میں ہے کہ "جس شخص نے فجر کی نماز کے بعد کسی سے بات چیت کرنے سے پہلے ستر مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھی تو اس دن اس کی طرف سے پچاس صدیقین کے عمل اوپر پہنچائے جاتے ہیں۔

بَابٌ

گزشتہ باب سے متعلق باتوں کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قرآن کی خبرگیری کرو

① عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَعَاھَدُوا الْقُرْاٰنَ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَھُوَ اَشَدُّ تَفَصِّیًا مِنَ الْاِبِلِ فِیْ عُقُلِھَا (متفق علیہ)

"حضرت ابوموسی اشعریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قرآن کی خبرگیری کرو (یعنی قرآن برابر پڑھتے رہو تاکہ بھولو نہیں) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے قرآن سینوں سے اتنی جلدی نکل جاتا ہے کہ اونٹ بھی اتنی جلدی اپنی رسی سے نہیں نکلتا۔"
(بخاری ومسلم)

تشریح: یعنی اگر اونٹ کا نگہبان و مالک اپنے اونٹ کی طرف سے غفلت برتے تو اونٹ رسی سے نکل بھاگتا ہے اسی طرح اگر قرآن کریم برابر نہ پڑھا جاتا رہا تو وہ اونٹ سے بھی جلدی سینہ سے نکل جاتا ہے یعنی جلدی بھول جاتا ہے۔

قرآن کے بارہ میں ایک ادب

② وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِئْسَ مَا لِاَحَدِھِمْ اَنْ یَّقُوْلَ نَسِیْتُ اٰیَۃَ کَیْتَ وَکَیْتَ بَلْ نُسِّیَ وَاسْتَذْکِرُوا الْقُرْاٰنَ فَاِنَّہٗ اَشَدُّ تَفَصِّیًا مِّنْ صُدُوْرِ الرِّجَالِ مِنَ النَّعَمِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَزَادَ مُسْلِمٌ بِعُقُلِھَا

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، کسی شخص کے لئے یہ بات بری ہے کہ وہ یوں کہئے کہ میں فلاں فلاں آیت بھول گیا ہوں بلکہ وہ اس طرح کہے کہ بھلایا گیا، اور قرآن کریم (برابر) یاد کرتے رہا کرو کیونکہ وہ لوگوں کے دل سے جانوروں سے بھی جلد نکل جاتا ہے (بخاری ومسلم) مسلم کی روایت میں لفظ بِعُقُلِھَا بھی ہے یعنی (ان جانوروں سے بھی جلد) جو اپنی رسی میں بندھے ہوئے ہوں۔"

تشریح: یہاں ایک ادب سکھایا جا رہا ہے کہ اگر کسی شخص کو قرآن کریم کی کوئی سورت یا آیت یاد نہ رہے تو وہ اس کا اظہار کیونکر کرے؟ ایسے موقع پر یہ کہنا کہ "میں بھول گیا ہوں" اس لئے منع ہے کہ اس طرح کہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے قرآن پڑھنا چھوڑ دیا اور بے پروائی کے سبب بھول گیا جو ظاہر ہے کہ قرآن کی شان عظمت کے منافی ہے، اس طرح کہنا کہ "بھلایا گیا ہوں" گویا اس سعادت

ونعمت کے حصول میں اپنی تقصیر وکوتاہی اور حسرت کا اظہار ہے جو صحیح ہے۔

صاحب قرآن کی مثال

③ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا مَثَلُ صَاحِبِ الْقُرْاٰنِ کَمَثَلِ صَاحِبِ الْاِبِلِ الْمُعَلَّقَۃِ اِنْ عَاھَدَ عَلَیْھَا اَمْسَکَھَا وَاِنْ اَطْلَقَھَا ذَھَبَتْ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا صاحب قرآن (قرآن پڑھنے والے) کی مثال بندھے ہوئے اونٹ کے مالک کی سی ہے اگر وہ اس اونٹ کی خبر گیری کرتا ہے تو وہ بندھا اور رکا رہتا ہے اور اگر اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ جاتا رہتا ہے (اسی طرح) اگر کوئی شخص قرآن کریم برابر نہ پڑھے اور یاد نہ کرتا رہے تو قرآن اس کے سینہ سے نکل جاتا ہے)۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

جب تک دل لگے قرآن پڑھو

④ وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِقْرَأُوا الْقُرْاٰنَ مَا ائْتَلَفَتْ عَلَیْہِ قُلُوْبُکُمْ فَاِذَا اخْتَلَفْتُمْ فَقُوْمُوْا عَنْہُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جندب ابن عبداللہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قرآن اس وقت تک پڑھو جب تک کہ تمہارے دل کی خواہش ہو، جب آپس میں اختلاف ہو (یعنی زیادہ پڑھنے سے ملال اور دل گرفتگی محسوس ہو) تو کھڑے ہو جاؤ (یعنی قرآن پڑھنا موقوف کر دو)۔"

(بخاری ومسلم)

تشریح: ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت وقرأت میں اسی وقت تک مصروف رہنا چاہئے جب تک دل لگے دل نہ لگنے کی صورت میں قرآن کریم نہ پڑھنا بغیر حضور دل کے پڑھنے سے افضل ہے، لیکن یہاں اس حدیث سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ عادی بنے اور اپنے نفس کو ریاضت میں ڈالے تاکہ زیادہ سے زیادہ دیر تک پڑھنے سے طبیعت ملول نہ ہو بلکہ زیادہ خوشی وفرحت محسوس ہو کیونکہ کاہل اور آسودہ دل جو ریاضت کی عادت نہیں ڈالتے جلدی ہی ملول ہو جاتے ہیں چنانچہ بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ایک ہی سیپارہ پڑھنے میں اپنی طبیعت پر بار محسوس کرنے لگتے ہیں اور ملول ہو جاتے ہیں جب کہ وہ لوگ جو ریاضت کے عادی ہوتے ہیں ایک سیپارہ بلکہ اس سے بھی زیادہ اتنے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے ہیں جب کہ نہ تو ان کی طبیعت پر ذرا سا بھی بار ہوتا ہے اور نہ وہ ملول ہوتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی قرأت

⑤ وَعَنْ قَتَادَۃَ قَالَ سُئِلَ اَنَسٌ کَیْفَ کَانَتْ قِرَاءَۃُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ کَانَتْ مَدًّا مَدًّا ثُمَّ قَرَأَ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یَمُدُّ بِبِسْمِ اللّٰہِ وَیَمُدُّ بِالرَّحْمٰنِ وَیَمُدُّ بِالرَّحِیْمِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابو قتادہ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ کی قرأت کیسی ہوتی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ کی قرأت درازی کے ساتھ ہوتی تھی پھر انہوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ اس طرح بسم اللہ کو دراز کرتے تھے (یعنی بسم اللہ میں اللہ کے الف کو الف کے مقصود کے بقدر کھینچتے تھے، رحمٰن کو دراز کرتے تھے (یعنی اس کے الف کو بھی کھینچتے تھے) اور رحیم کو دراز کرتے تھے (یعنی رحیم کی یاء کو اصلی[1] یا عرضی مد کرتے تھے۔" (بخاریؒ)

---

[1] اصلی سے مراد یہ ہے کہ یاء کو کھینچے بغیر اظہار کرتے تھے اور عارضی سے مراد یہ ہے کہ اس کو کھینچ کر پڑھتے تھے یہ دونوں ٹھیک ہیں۔

تشریح: "آپ کی قرأت درازی کے ساتھ ہوتی تھی" کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ حروف مد اور لین کو بقدر معروف مد کرتے تھے جو ارباب وقوف (یعنی ارباب تجوید) کے قوائد و شرائط کے مطابق ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حروف مدتین ہیں "واؤ، الف، یا" چنانچہ اس بارہ میں یہ قاعدہ ہے کہ جب ان کے بقدر ہمزہ ہو تو الف کے بقدر ان کو مد کرنا چاہئے بعض حضرات کہتے ہیں کہ دو الف سے پانچ الف تک کے بقدر مد کرنا چاہئے۔

"بقدر الف" سے بقدر "دازگی آواز" مراد ہے جب کہ کہا جائے بایاتا۔ اور اگر حروف مد کے تشدید ہو تو بقدر چار الفوں کے مد کرنا چاہئے اتفاقاً جیسے دابۃ اور ان کے بعد حرف ساکن ہو تو بقدر دو الفوں کے مد کرنا چاہئے اتفاقاً جیسے مار اور یعلمون اور ان کے بعد مذکورہ بالا حروف کے علاوہ حرف ہو تو مد نہیں کرنا چاہئے صرف اسی آواز پر اکتفاء کرنا چاہئے جو اس حرف کے نکلنے کے بقدر ہو جیسے ایاک یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ بسم اللہ میں جو مد ہوتے ہیں وہ سب اسی قبیل سے ہیں۔

خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ آواز

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَذِنَ اللّٰهُ لِشَیْءٍ مَّا اَذِنَ لِنَبِیٍّ يَتَغَنّٰى بِالْقُرْاٰنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ جس طرح (پسندیدگی کے ساتھ) نبی ﷺ کی آواز کو سنتا ہے جب کہ وہ قرآن کریم کو خوش گلوئی کے ساتھ پڑھتے ہیں اس طرح اور کوئی آواز نہیں سنتا۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یوں تو نبی ﷺ کی آواز بذات خود ہر فرد بشر کی آواز سے عمدہ اور شیریں ہوتی ہے مگر جب نبی ﷺ قرآن کریم خوش گلوئی یعنی تجوید و ترتیل کے ساتھ پڑھتے ہیں تو اس وقت ان کی آواز کائنات کی ہر آواز سے لطیف و شیریں ہوتی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو؟ خدا کا کلام اور خدا کا رسول اسے پڑھ رہا ہو تو ظاہر ہے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ جاندار ہی نہیں غیر جاندار بھی وجد میں آجاتا ہے اسی بات کو فرمایا جارہا ہے کہ اللہ رب العزت اس آواز کو جتنا پسند کرتا ہے اور اسے جس طرح قبول کرتا ہے اس کی یہ پسندیدگی اور مقبولیت کائنات کو کسی بھی ایسی چیز کو حاصل نہیں ہوتی جس میں آواز ہوتی ہے اور جو سنی جاتی ہے۔

(۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَذِنَ اللّٰهُ لِشَیْءٍ مَّا اَذِنَ لِنَبِیٍّ حَسَنِ الصَّوْتِ بِالْقُرْاٰنِ یَجْهَرُ بِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز کے لئے کان نہیں رکھتا یعنی کسی بھی چیز کی آواز کو قبول نہیں کرتا جیسا کہ وہ قرآن پڑھتے وقت نبی ﷺ کی خوش گلوئی کے لئے کان رکھتا ہے یعنی اسے پسند و قبول کرتا ہے جب کہ نبی باآواز بلند قرآن کریم پڑھتے ہیں۔" (بخاری و مسلمؒ)

قرآن کریم اور خوش گلوئی

(۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ شخص ہمارے کامل طریقہ پر چلنے والا نہیں ہے جو قرآن کریم خوش گلوئی کے ساتھ نہ پڑھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کو خوش گلوئی اور خوش آوازی کے ساتھ پڑھنا چاہئے بشرطیکہ حروف، حرکات، مد، تشدید یا اسی طرح اور کسی چیز میں تغیر پیدا نہ ہو، اسی طرح راگ کے طور پر بھی نہ ہو، بلکہ اس بارہ میں تو مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص قصداً قرآن کریم راگ کے

انداز میں پڑھے گا وہ فعل حرام کا مرتکب ہوگا اس سے اجتناب ضروری ہے۔

قرآن کریم کی سماعت

⑨ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ عَلَی الْمِنْبَرِ اِقْرَأْ عَلَیَّ قُلْتُ اَقْرَأُ عَلَیْكَ وَعَلَیْكَ اُنْزِلَ قَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَسْمَعَہٗ مِنْ غَیْرِیْ فَقَرَأْتُ سُوْرَۃَ النِّسَآءِ حَتّٰی اَتَیْتُ اِلٰی ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا قَالَ حَسْبُكَ الْاٰنَ فَالْتَفَتُّ اِلَیْہِ فَاِذَا عَیْنَاہُ تَذْرِفَانِ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے اس وقت جب کہ آپ ﷺ منبر پر تھے مجھ سے فرمایا کہ "میرے سامنے قرآن کریم پڑھو" میں نے عرض کیا کہ "آپ ﷺ کے سامنے میں قرآن کریم پڑھوں؟ حالانکہ قرآن کریم آپ ﷺ پر اتارا گیا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں اسے پسند کرتا ہوں کہ اپنے علاوہ کسی دوسرے سے قرآن سنوں!" حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ چنانچہ میں نے سورۂ نساء پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا بھلا اس (قیامت کے) دن یہود وغیرہ کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ بلائیں گے (یعنی ہر اُمّت کا نبی اس دن اپنی اُمّت کے افعال و احوال کی گواہی دے گا) اور ہم آپ ﷺ کو اس اُمّت کا گواہ بنا کر بلائیں گے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بس اب رک جاؤ (کیونکہ میں اس آیت میں مستغرق ہوتا ہوں) پھر جب میں آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوا تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ کی مقدار میں آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابن مسعودؓ کی عرض کہ قرآن کریم آپ پر اتارا گیا، کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ خود آپ ﷺ پر نازل ہوا ہے اس لئے قرآن کریم پڑھنا بھی آپ ﷺ ہی کا حق ہے اور یہ جس طرح اتارا گیا ہے اسی طرح اسے آپ ﷺ ہی پڑھ سکتے ہیں کسی اور کی کیا مجال کہ وہ آپ ﷺ کے سامنے قرآن کریم پڑھے۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ کے ارشاد گرامی "میں اسے پسند کرتا ہوں الخ" کا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے جب کہ میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ میں کسی دوسرے سے قرآن سنوں اور یہ وقت وہ ہوتا ہے جس میں عارف پر حالت سکون طاری ہوتی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے مَنْ عَرَفَ اللّٰہَ کَلَّ لِسَانُہٗ (یعنی جس نے اللہ کو پہچانا اس کی زبان خاموش ہوگئی) اس کے برخلاف عارف کی ایک اور حالت ہوتی ہے جس کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ مَنْ عَرَفَ اللّٰہَ طَالَ لِسَانُہٗ (یعنی جس نے اللہ کو پہچانا اس کی زبان کھل جاتی ہے)۔

حاصل یہ ہے کہ بعض وقت تو عارف حالت تحیر و استغراق میں ہوتا ہے کہ سکوت اختیار کرتا ہے اور بعض ہوشیار رہتا ہے کہ اس وقت وہ حقائق و معارف وغیرہ بیان کرتا ہے۔

دوسرے سے قرآن سننے میں ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کے مفہوم و معانی خوب اچھی طرح سمجھ میں آتے ہیں غور و فکر اور محویت کمال درجہ کی حاصل ہوتی ہے۔

سورۂ نساء کی حدیث میں مذکورہ آیت کا مقصد چونکہ قیامت کے دن کو یاد دلانا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ اس دن کی ہولناکی اور اپنی اُمّت کے ضعف کا خیال کر کے روئے، یہ اس بات کی بیّن علامت اور دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی اُمّت پر بڑے شفیق و عنایت فرما ہیں صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ اَلْفَ اَلْفَ صَلٰوۃٍ کُلَّمَا ذَکَرَہُ الذّٰکِرُوْنَ وَکُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِہِ الْغَافِلُوْنَ۔

حضرت ابی بن کعبؓ کی سعادت

⑩ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیْ اَنْ اَقْرَأَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ قَالَ اٰللّٰہُ سَمَّانِیْ لَكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَقَدْ ذُکِرْتُ عِنْدَ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ نَعَمْ فَذَرَفَتْ عَیْنَاہُ وَفِیْ رِوَایَۃٍ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیْ اَنْ اَقْرَأَ

عَلَيْكَ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قَالَ وَسَمَّانِيْ قَالَ نَعَمْ فَبَكٰى (متفق علیہ)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے حضرت ابی بن کعب ؓ سے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے سامنے قرآن پڑھوں؟ حضرت ابی ؓ نے عرض کیا کہ "کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے میرا نام لیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں! حضرت ابی ؓ نے کہا کہ" دونوں جہان کے پروردگار کے ہاں میرا ذکر کیا گیا؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں (سنتے ہی) حضرت ابی ؓ کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابی ؓ سے فرمایا کہ "مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہارے سامنے سورۂ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پڑھوں" حضرت ابی نے عرض کیا کہ "اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟" آپ نے فرمایا کہ "ہاں؟" (یہ سنتے ہی) حضرت ابی رو پڑے۔" (بخاری ؒ مسلم)

تشریح: حضرت ابی بن کعب ؓ تمام صحابہ میں سب سے بڑے قاری تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کے اسی امتیاز و شرف کو صحابہ ؓ کے سامنے اسی طرح بیان کیا کہ اَقْرَءُ اُكُمْ اُبَيٌّ (تم میں سب سے بڑے قاری ابی ہیں)۔

حضرت ابی کے قول آللّٰهُ سَمَّانِيْ لَكَ کا مطلب یہ تھا کہ "کیا خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے میرا ہی نام لیا ہے" اور انہوں نے یہ بات اپنی عاجزی و انکساری کے اظہار اور اپنی گمنامی کی وجہ سے کہی کہ میں اس لائق کہاں ہوں کہ پروردگار بطور خاص میرا نام لے کر آپ کو حکم دے یا پھر انہوں نے یہ بات ازراہ ذوق ولذت کے کہی اور اپنی اس عظیم سعادت و شرف کا اظہار کیا کہ خدا نے مجھے یہ عظیم مرتبہ بخشا۔

یہ عظیم شرف سن کر حضرت ابی ؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جانا خوشی کی وجہ سے تھا ایسی خوشی جو حقیقی عاشق کو محبوب کے وصال اور محبوب کی کرم فرمائی کے وقت حاصل ہوتی ہے ایسی صورت میں قلب کا حزن و ملال سکون پا کر آنکھوں کی راہ سے نکل پڑتا ہے۔

خاص طور پر سورۂ لم یکن ہی کو پڑھنے کا حکم اس لئے ہوا کہ یہ سورۃ الفاظ کے اعتبار سے بہت مختصر بھی ہے اور اس میں فوائد بھی بہت زیادہ ہیں کیونکہ اس سورۃ میں دین کے اصول، وعد وعید اور اخلاص وغیرہ کے اعلیٰ مضامین مذکور ہیں۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ماہر قرآن اور اہل علم و فضل کے سامنے قرآن پڑھنا مستحب ہے اگرچہ قاری سننے والے سے افضل نہ ہو۔

دارالحرب میں قرآن کے لے جانے کی ممانعت

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّسَافَرَ بِالْقُرْاٰنِ اِلٰى اَرْضِ الْعَدُوِّ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ لَا تُسَافِرُوْا بِالْقُرْاٰنِ فَاِنِّيْ لَا اٰمَنُ اَنْ يَّنَالَهُ الْعَدُوُّ۔

"اور حضرت ابن عمر ؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دشمن ملک (یعنی دارالحرب) کی طرف قرآن لے کر سفر کرنے سے منع فرمایا ہے (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ فرمایا، قرآن لے کر سفر نہ کرو اس لئے کہ مجھے یہ اطمینان نہیں ہے کہ دشمن اسے چھین لے (اور پھر وہ اس کی بے حرمتی کرے)۔"

تشریح: یہاں ایک بڑا لطیف اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ قرآن کریم مصحف میں تو لکھا ہوا تھا نہیں پھر آپ ﷺ نے یہ کیسے فرمایا کہ قرآن لے کر سفر نہ کیا جائے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں اگرچہ پورا قرآن مصحف میں لکھا ہوا نہیں تھا مگر پھر بھی جو کچھ نازل ہوتا تھا اسے لوگ اپنے اپنے صحیفوں میں لکھ لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ قرآن ہی کے حکم میں تھا۔ یا یہ کہ آپ ﷺ نے یہ بات بطور پیش گوئی فرمائی کہ میرے بعد جب قرآن کریم کو مکمل طور پر یک جا جمع کر کے مصحف کی شکل دے دی جائے تو اسے لوگ لے کر کفار کے ملک میں نہ جائیں کہ

مبادا وہ کفار کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اس کی بے حرمتی کریں۔
بعض علماء فرماتے ہیں کہ دار الکفر میں اپنے ساتھ قرآن لے جانا مکروہ ہے۔ نیز مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کافر کو کوئی خط وغیرہ لکھے تو اس میں آیت لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ہرقل کو جو مکتوب بھیجا تھا اس میں یہ آیت تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ الخ لکھی تھی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

غرباء مہاجرین کو بشارت

(۱۲) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ جَلَسْتُ فِیْ عِصَابَةٍ مِنْ ضُعَفَآءِ الْمُهَاجِرِیْنَ وَاِنَّ بَعْضَهُمْ لَیَسْتَتِرُ بِبَعْضٍ مِّنَ الْعُرْیِ وَقَارِیٌّ یَقْرَأُ عَلَیْنَا اِذْ جَآءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ عَلَیْنَا فَلَمَّا قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَکَتَ الْقَارِیُّ فَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ مَاکُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ قُلْنَا کُنَّا نَسْتَمِعُ اِلٰی کِتَابِ اللّٰهِ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ اُمِرْتُ اَنْ اَصْبِرَ نَفْسِیْ مَعَهُمْ قَالَ فَجَلَسَ وَسْطَنَا لِیَعْدِلَ بِنَفْسِهٖ فِیْنَا ثُمَّ قَالَ بِیَدِهٖ هٰکَذَا فَتَحَلَّقُوْا وَبَرَزَتْ وُجُوْهُهُمْ لَهٗ فَقَالَ اَبْشِرُوْا یَا مَعْشَرَ صَعَالِیْكَ الْمُهَاجِرِیْنَ بِالنُّوْرِ التَّامِّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ اَغْنِیَآءِ النَّاسِ بِنِصْفِ یَوْمٍ وَذٰلِكَ خَمْسُ مِائَةِ سَنَةٍ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ میں (ایک دن) غرباء مہاجرین (یعنی اصحاب صفہ) کی ایک جماعت کے درمیان بیٹھا تھا ان میں سے کچھ ننگے بدن ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے تھے اور ایک شخص ہمارے سامنے قرآن پڑھ رہا تھا کہ اچانک نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور ہمارے پاس کھڑے ہوگئے، پڑھنے والے نے جب نبی کریم ﷺ کو کھڑے ہوئے دیکھا تو وہ چپ ہوگیا اس وقت آپ نے ہمیں سلام کیا اور فرمایا کہ "تم لوگ کیا کر رہے ہو" ہم نے عرض کیا کہ ہم کتاب اللہ سن رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا "تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے میری اُمت میں وہ لوگ پیدا کئے جن کے بارہ میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں" راوی کہتے ہیں کہ (یہ فرما کر) آپ ﷺ ہمارے درمیان بیٹھ گئے (یعنی کسی خاص شخص کے پہلو میں نہیں بیٹھے) تاکہ آپ ﷺ کی ذات اقدس کا تعلق ہمارے سب کے ساتھ یکساں رہے پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلی سے اس طرح اشارہ کیا (کہ حلقہ بنا کر بیٹھ جاؤ) سب لوگ حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور ان سب کے منہ آپ کی طرف ہوگئے، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "اے مہاجرین کے مفلس گروہ تمہیں خوش خبری ہو اس بات کی کہ قیامت کے دن تمہیں بھرپور نور حاصل ہوگا اور تم دولت مند طبقے سے آدھے دن پہلے جنت میں داخل ہوگئے اور یہ آدھا دن پانچ سو برس کے برابر ہوگا۔" (ابوداؤد)

تشریح: وَاِنَّ بَعْضَهُمْ الخ کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس اپنے ساتھی کی بہ نسبت کم کپڑا تھا وہ اپنے اس ساتھی کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا تاکہ کپڑا کم ہونے کی وجہ سے اس کا بدن نظر نہ آسکے، چنانچہ "ننگے بدن" سے مراد ستر کے علاوہ جسم کے بقیہ حصہ کا کپڑے سے عاری ہونا ہے اور ستر کے علاوہ جسم کے بقیہ حصہ کو بھی عام نظروں سے بچانے کی وجہ نہ صرف یہ کہ ان مقدس ہستیوں کا کمال شرم وحیاء کے درجہ پر ہونا تھا بلکہ یہ بات انسانی آداب و معاشرت کے خلاف ہے کہ جسم کے اس حصہ کو عام نظروں میں کھلا رہنے دیا جائے جو عام طور پر کھلا نہیں رہتا۔

اس صورت حال کو یہاں بیان کرنے کا مقصد صحابہ کی اس مقدس جماعت کے فقر و افلاس کا اظہار ہے کہ وہ اپنے بدن کو چھپانے کے لئے پورے طور پر کپڑا بھی نہیں رکھتے تھے اسی لئے وہ مجلس میں ایک دوسرے سے مل کر بیٹھتے تھے تاکہ ایک طرح کی پوشیدگی حاصل ہو جائے۔

"اس وقت آپ نے ہمیں سلام کیا" سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جو شخص قرآن پڑھ رہا ہو اسے سلام نہ کرنا چاہئے جب وہ خاموش ہو جائے اس وقت سلام کیا جائے جیسا کہ فقہ کا مسئلہ ہے، اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص قرآن پڑھنے والے کو سلام کرے تو اس کے سلام کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔

صحابہؓ کو قرآن کی سماعت میں مشغول دیکھنے کے باوجود آپ ﷺ نے ان سے یہ بات کہ "تم کیا کر رہے ہو" جان بوجھ کر اس لئے پوچھی تاکہ ان کا جواب سن کر انہیں یہ عظیم بشارت و خوشخبری سنائیں۔

اُمِرْتُ اَنْ اَصْبِرَ نَفْسِیْ الخ اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (پ ۱۶، ع ۱۵)

"اور آپ ﷺ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ (بیٹھنے میں) مقید[1] رکھ لیجئے جو صبح و شام (یعنی ہمیشہ) اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیوی زندگانی کی رونق کے خیال سے آپ ﷺ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان سے ہٹنے نہ پائیں اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا یہ (حال) حد سے گزر گیا ہے

راویؓ کے یہ الفاظ لیعدل الخ کا مطلب یہ ہے کہ "تاکہ آپ ﷺ اپنے آپ کو ہمارے درمیان بٹھانے کے معاملہ میں ہم سب کے ساتھ عدل کا معاملہ کریں تاکہ آپ ﷺ کا قرب سب کے ساتھ یکساں رہے" یعنی اگر آپ ﷺ کسی شخص کے پاس بیٹھ جاتے تو بقیہ لوگوں کو اس کی خوش بختی پر رشک آتا اور سب کی خواہش یہی ہوتی کہ آپ میرے ہی پاس بیٹھیں اس لئے آپ ﷺ کسی ایک شخص کے پاس بیٹھنے کی بجائے درمیان میں بیٹھے تاکہ قرب کی سعادت سب کو یکساں طور پر حاصل ہو۔"

علامہ طیبیؒ نے اس جملہ کے معنی یہ لکھے ہیں کہ آپ ہمارے درمیان اس لئے بیٹھے تاکہ آپ ﷺ ہمارے درمیان برابری کریں اور اپنی ذات اقدس کو ہم سب سے ممتاز و نمایاں کریں۔

"سب لوگ حلقہ بنا کر بیٹھ گئے" کا مطلب یہ ہے کہ سب آنحضرت ﷺ کے چہرۂ مبارک کے سامنے حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اسی طرح ان سب کے منہ آپ ﷺ کی طرف ہو گئے کا مطلب یہ ہے کہ سب لوگ آپ کے سامنے اس طرح بیٹھے کہ آنحضرت ﷺ سب کا چہرہ دیکھتے ہیں۔

"قیامت کے دن تمہیں بھرپور نور حاصل ہو گا" سے اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن سرمایہ دار اور دولتمند طبقہ (دنیا دار) کو بھرپور نور حاصل نہیں ہو گا کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ جس نے آخرت کو درست رکھا اس نے اپنی دنیا کو نقصان پہنچایا اور جس نے اپنی دنیا کو دوست رکھا اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا لہٰذا جو چیز فنا ہو جانے والی ہے (یعنی دنیا) اس کے مقابلہ میں اس چیز (یعنی آخرت) کو اختیار کرو جو باقی رہنے والی ہے۔

"اور تم دولت مند طبقہ سے آدھے دن پہلے جنت میں داخل ہو گے" اس بارہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہاں فقراء سے وہ فقراء مراد ہیں جو صالح اور صابر ہوں، اسی طرح دولتمند سے وہ دولتمند مراد ہیں جو صالح و شاکر اور اپنے مال کا حق (یعنی صدقات و زکوٰۃ وغیرہ) ادا کرنے والے ہوں انہیں میدان حشر میں کھڑا کیا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے مال کہاں سے اور کن ذریعوں سے حاصل کیا، اور تم نے اس مال کو کہاں کہاں خرچ کیا، وہ اس حساب کتاب میں مصروف ہوں گے کہ فقراء جنت میں داخل بھی ہو جائیں گے۔

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب تک یہ لوگ نہ اٹھیں گے آپ بیٹھے رہا کیجئے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ان کو اپنی مجالست سے مشرف رکھیں۔

اس سے ایک بات معلوم ہوئی کہ قیامت کے روز خدا کے فضل و کرم اور اس کی رحمت میں فقراء کا حصہ دولتمند طبقہ کے حصے سے زیادہ ہوگا کیونکہ دولتمند طبقہ نے تو دنیا میں راحت و نصرت پائی تھی جب کہ فقراء محروم رہے تھے۔

تجوید و ترتیل سے قرآن پڑھنے کا حکم

⑬ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَيِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ۔

(رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قرآن کو اپنی آواز کے ذریعہ زینت دو۔" (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: "زینت دینے" سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کو تجوید و ترتیل اور آواز کی نرمی و لطافت کے ساتھ پڑھا جائے یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے اور اب پھر جان لیجئے کہ راگ میں قرآن کو اس طرح پڑھنا کہ حروف یا حرکات میں کمی و زیادتی ہو حرام ہے اسی طرح قرآن پڑھنے والا شخص فاسق ہوتا ہے اور سننے والا گنہگار نیز ایسے شخص کو اس طرح قرآن پڑھنے سے منع کرنا واجب ہے کیونکہ یہ ایک بہت بری بدعت ہے۔

قرآن بھول جانے پر وعید

⑭ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنِ امْرِءٍ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ ثُمَّ يَنْسَاهُ اِلَّا لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَجْذَمَ (رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت سعد ابن عبادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص قرآن پڑھ کر بھول جائے تو وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کریگا کہ اس کا ہاتھ کٹا ہوگا۔" (ابوداؤد، دارمی)

تشریح: حنفیہ کے ہاں "بھول جانے" سے مراد یہ ہے کہ دیکھ کر بھی نہ پڑھ سکے، جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے ہاں اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے قرآن حفظ کیا پھر اسے بھول گیا کہ حفظ نہ پڑھ سکے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پڑھنا چھوڑ دے خواہ بھولے یا نہ بھولے۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰقؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ استعداد والے کا بھولنا تو یہ ہے۔ یاد کئے ہوئے کو بغیر دیکھے نہ پڑھ سکے اور غیر استعداد والے کا بھولنا یہ ہے کہ دیکھ کر بھی نہ پڑھ سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو سیکھنے اور یاد کرنے کے بعد بھولنا بہت گناہ ہے لہٰذا چاہئے کہ قرآن کے بارہ میں تغافل و کوتاہی کا راستہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ قرآن کو ہمیشہ اور بہت پڑھتے رہنا چاہئے۔

تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کا مسئلہ

⑮ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمْ يَفْقَهْ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فِيْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تین رات سے کم میں قرآن پڑھا (یعنی ختم کیا) اس نے قرآن کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤد، دارمیؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں مراد ہے کہ جس شخص نے تین دن یا تین رات سے کم میں قرآن ختم کیا وہ قرآن کے ظاہری معنی تو

سمجھ سکتا ہے لیکن قرآن کے حقائق و معارف اور دقائق و نکات تک اس کو رسائی بھی نہیں ہوتی کیونکہ ان چیزوں کو سمجھنے کے لئے تین دن تو بہت دور کی چیز ہے بڑی سے بڑی عمریں ناکافی ہوتی ہے، نہ صرف یہ بلکہ اس مختصر سے عرصہ میں تو کسی ایک آیت یا ایک کلمہ کے دقائق و نکات بھی سمجھ میں نہیں آسکتے، نیز یہاں نفی سے مراد سمجھنے کی نفی ہے نہ کہ ثواب کی نفی یعنی ثواب تو ہر صورت میں ملتا ہے پھر یہ کہ لوگوں کی سمجھ میں بھی تفاوت و فرق ہے بعض لوگوں کی سمجھ زیادہ پختہ ہوتی ہے وہ کم عرصہ میں بھی قرآنی حقائق و دقائق سمجھ لیتے ہیں جب کہ بعض لوگوں کی سمجھ بہت ہی کم ہوتی ہے جن کے لئے طویل عرصہ بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

سلف میں سے بعض لوگوں نے اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا ہے چنانچہ ان لوگوں کا معمول تھا کہ وہ ہمیشہ تین ہی دن میں قرآن ختم کرتے تین دن سے کم میں ختم کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے جب کہ دوسرے لوگ اس کے برخلاف عمل کرتے تھے چنانچہ بعض لوگ تو ایک رات دن میں ایک بار اور بعض لوگ دو دو بار اور بعض لوگ تین تین بار قرآن ختم کرتے تھے، بلکہ بعض لوگوں کے بارہ میں تو یہاں تک ثابت ہے کہ وہ ایک رکعت میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔

ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے یا تو اس حدیث کے بارہ میں یہ خیال کیا ہو کہ اس کا تعلق باعتبار اشخاص کے مختلف ہے یعنی اس حدیث کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو کم فہم ہوتے ہیں اور جو اگر تین دن سے کم میں قرآن ختم کریں تو اس کے ظاہری معنی بھی نہ سمجھ سکتے ہوں یا پھر ان کے نزدیک یہ بات ہو کہ اس حدیث میں فہم کی نفی ہے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ جتنی بھی کم سے کم مدت میں قرآن ختم کیا جائے ثواب ملے گا۔

بعض لوگ دو مہینے میں ایک قرآن ختم کرتے تھے بعض لوگ ہر مہینے میں بعض لوگ دس دن میں اور بعض لوگ سات دن میں ایک قرآن ختم کردیتے تھے چنانچہ اکثر صحابہؓ وغیرہم کا یہی معمول تھا کہ وہ سات دن میں قرآن ختم کرتے تھے بخاری و مسلم کی ایک روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے فرمایا کہ قرآن سات میں ختم کرو اور اس پر زیادتی نہ کرو۔

ختم الاحزاب کیا ہے

مشائخ و عارفین کی اصطلاح میں سات دن میں قرآن ختم کرنے کو ختم الاحزاب کہتے ہیں ملا علی قاریؒ وضاحت کے پیش نظر ختم الاحزاب کی سب سے صحیح ترتیب "فمی بشوق" ہے۔ ملا علی قاریؒ نے فمی بشوق کو ختم الاحزاب کی صحیح ترتیب اس لیے کہا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ختم الاحزاب (سات دن میں قرآن ختم کرنے کا طریقہ) یہ ہے کہ جمعہ کے روز ابتداء قرآن سے سورۂ مائدہ کے آخر تک پڑھا جائے، شنبہ کے روز سورۂ انعام سے سورۂ توبہ کے آخر تک، اتوار کو سورۂ یونس سے سورۂ مریم کے آخر تک، پیر کو سورۂ طہ سے سورۂ قصص کے آخر تک، منگل کو سورۂ عنکبوت سے سورۂ ص کے آخر تک بدھ کو سوہ زمر سے سورۂ رحمٰن کے آخر تک اور جمعرات کو سورۂ واقعہ سے آخر قرآن تک پڑھا جائے۔ اکثر حاجات کی تکمیل کے لئے اس ختم کو مجرب کہا گیا ہے اسی طرح فمی بشوق کی ترتیب کے ساتھ ختم قرآن کو بھی کشادگی رزق اور دوسری حاجات کی تکمیل کے لئے مجرب بتایا گیا ہے۔ نیز اس ترتیب کے ساتھ قرآن پڑھنے کے بارہ میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ ابتداء جمعہ کے روز سے کی جائے۔ بہرکیف مذکورہ بالا بحث کا حاصل یہ ہوا کہ "فمی بشوق" کی ترتیب کے ساتھ ختم قرآن اور چیز ہے اور "ختم الاحزاب" دوسری چیز ہے جب کہ ملا علی قاریؒ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ علماء نے ختم الاحزاب کی کئی ترتیب بیان کی ہیں لیکن سب سے زیادہ صحیح ترتیب "فمی بشوق" ہے لہذا ملا علی قاریؒ کے قول کے مطابق ختم الاحزاب اور فمی بشوق کی ترتیب دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔

اب یہ سمجھئے کہ "فمی بشوق" اور اس کی ترتیب کیا ہے؟ فمی بشوق کی ترتیب کے ساتھ قرآن ختم کرنے کا مطلب یہ ہے قرآن کریم کی سات منزلیں سات دن میں اس طرح پڑھی جائیں کہ ان کے شروع میں "فمی بشوق" کے حروف واقع ہوں یعنی ف سے سورہ فاتحہ کی طرف اشارہ ہے میم سے سورۂ مائدہ کی طرف، ی سے سورۂ یونس کی طرف، ب سے سورۂ بنی اسرائیل کی طرف، ش سے سورۂ شعراء کی

طرف، واؤ سے سورۂ والصفات کی طرف اور ق سے سورۂ ق کی طرف اشارہ ہے اس طرح ان حروف کے مجموعہ کا نام ہے "فمی بشوق" قرآن ختم کرنے کی یہ ترتیب حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے کہ وہ اسی ترتیب سے قرآن ختم کرتے تھے۔

اب پھر حدیث کے مفہوم کی طرف آئیے اس بارہ میں نوویؒ کا قول یہ ہے کہ حدیث کا حکم باعتبار اشخاص کے مختلف ہے یعنی وہی بات کہ اس کا تعلق کم فہم اور کم علم لوگوں سے ہے لہٰذا جو لوگ قرآنی علوم و معارف پر نظر رکھتے ہوں اور قرآن کے دقائق و معارف سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو وہ اسی قدر اقتصار کر سکتے ہیں کہ جب وہ قرآن پڑھیں تو پڑھتے وقت قرآن کی آیات کا کمال فہم بھی انہیں حاصل ہوتا رہے، جو شخص علم کی توسیع و اشاعت یا لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے یا اسی قسم کے دوسرے کاموں میں مشغول رہتا ہو تو وہ اتنا ہی پڑھنے پر اکتفاء کرے جس سے اس کے اصل کاموں میں حرج واقع نہ ہوتا ہو، اسی طرح جو شخص تحصیل علم یا اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی فراہم کرنے میں منہمک رہتا ہو اس کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ مذکورہ بالا لوگوں کے علاوہ اشخاص کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ جتنا زیادہ پڑھ سکیں پڑھیں بشرطیکہ زیادہ پڑھنا اکتاہٹ اور الفاظ کی تیز ادائیگی کی حد تک نہ پہنچ جائے۔

قرآن باآواز بلند پڑھنا افضل ہے یا آہستہ

(۱۶) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ كَالْجَاهِرِ بِالصَّدَقَةِ وَالْمُسِرُّ بِالْقُرْاٰنِ كَالْمُسِرِّ بِالصَّدَقَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "باآواز بلند قرآن کریم پڑھنے والا شخص ظاہری صدقہ دینے والے کی طرح ہے اور آہستہ قرآن پڑھنے والا شخص چھپا کر صدقہ دینے والے کی طرح ہے" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: چھپا کر صدقہ دینا ظاہری طور پر صدقہ دینے سے افضل ہے، لہٰذا حدیث کا مفہوم یہ ہوا کہ اسی طرح قرآن کریم آہستہ پڑھنا باآواز بلند پڑھنے سے افضل ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح آہستہ قرآن پڑھنے کی فضیلت کے بارہ میں احادیث منقول ہیں اسی طرح باآواز بلند قرآن پڑھنے کی فضیلت کے سلسلہ میں احادیث منقول ہیں لہٰذا دونوں طرح کی احادیث میں مطابقت یہ ہے کہ آہستہ آواز سے پڑھنا تو اس شخص کے حق میں افضل ہے جو ریاء سے بچنا چاہتا ہو اور باآواز بلند پڑھنا اس شخص کے حق میں افضل ہے جو ریاء میں مبتلا ہونے کا خوف نہ رکھتا ہو بشرطیکہ اس کے باآواز بلند پڑھنے کی وجہ سے نمازیوں، سونے والوں یا اور کسی کو تکلیف و ایذاء نہ پہنچے۔ باآواز بلند قرآن پڑھنا اس لئے افضل ہے کہ اس طرح دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے بایں طور کہ لوگ سنتے ہیں جس سے انہیں ثواب ملتا ہے یا دوسرے لوگ قرآن سن سن کر سیکھتے ہیں یا یہ کہ دوسروں کو پہنچتا ہے بایں طور کہ لوگ سنتے ہیں جس سے انہیں ثواب ملتا ہے کہ باآواز قرآن پڑھنا شعار دین اور اللہ کے کلام کا برملا اظہار ہے، پڑھنے والے کے دل کو بیداری حاصل ہوتی ہے اس کا دھیان کسی اور طرف نہیں بٹتا، اس کے دل کی غفلت کو دور کرتا ہے، نیند کا غلبہ کم کرتا ہے اور یہ کہ دوسروں کو عبادت کا شوق دلاتا ہے، بہرکیف ان فوائد میں سے ایک فائدہ بھی پیش نظر ہو تو پھر اس صورت میں باآواز بلند پڑھنا ہی افضل ہوگا۔

قرآن کی کامل پیروی کی تاکید

(۱۷) وَعَنْ صُهَيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اٰمَنَ بِالْقُرْاٰنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَيْسَ اِسْنَادُهُ بِالْقَوِيِّ۔

"اور صہیبؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں لایا جو اس کے حرام کو حلال جانے" امام ترمذیؒ نے

اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی اسناد قوی نہیں ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جس چیز کو حرام کہا ہے اگر کوئی شخص اسے حلال جانے تو وہ کھلم کھلا کافر ہو گیا، جب وہ کافر ہو گیا تو پھر قرآن پر اس کا ایمان کیسا، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص قرآن پر کامل ایمان نہیں لایا، جو ان چیز کے ساتھ حلال کا سا معاملہ کرے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے یعنی وہ قرآن میں مذکور حرام و ممنوع چیزوں کا ارتکاب کرے۔

آنحضرت ﷺ کی قرأت

⑱ وَعَنِ اللَّيْثِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ اَبِيْ مُلَيْكَةَ عَنْ يَعْلَى بْنِ مَمْلَكٍ اَنَّهُ سَاَلَ اُمَّ سَلَمَةَ عَنْ قِرَآءَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا هِيَ تَنْعَتُ قِرَآءَةً مُّفَسَّرَةً حَرْفًا حَرْفًا (رواه الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت لیث ابن سعدؒ حضرت ابن ابی ملیکہؒ سے نقل کرتے ہیں اور وہ حضرت یعلی ابن مملکؒ کے بارہ میں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہؓ سے نبی کریم ﷺ کی قرأت کے بارہ میں پوچھا (کہ آپ ﷺ قرآن کریم کس طرح پڑھتے تھے! حضرت ام سلمہؓ نے آپ ﷺ کی قرأت کو واضح طور پر اور ایک ایک حرف کر کے بیان کیا)۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ قرآن کریم اس طرح پڑھتے تھے کہ آپ ﷺ کی قرأت کے حروف کو اگر کوئی شمار کرنا چاہتا تو یہ ممکن تھا گویا آپ ﷺ قرآن کریم خوب ترتیل سے تجوید کے طور پڑھتے تھے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت اُم سلمہ کے بارہ میں منقول الفاظ دونوں احتمال رکھتے ہیں یا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کی قرأت کی کیفیت کو الفاظ میں بیان کیا یا یہ کہ انہوں نے قرآن کریم اسی طرح پڑھ کر سنایا جس طرح کہ آپ ﷺ پڑھا کرتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے، بغیر ترتیل کے سارے قرآن کو پڑھنے کی بہ نسبت صرف ایک سورۃ ترتیل کے ساتھ پڑھنا میرے نزدیک زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے۔

⑲ وَعَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ عَنِ ابْنِ اَبِيْ مُلَيْكَةَ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَطِّعُ قِرَآءَتَهُ يَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ثُمَّ يَقِفُ ثُمَّ يَقُوْلُ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ثُمَّ يَقِفُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ لَيْسَ اِسْنَادُهُ بِمُتَّصِلٍ لِاَنَّ اللَّيْثَ رَوٰى هٰذَا الْحَدِيْثَ عَنِ ابْنِ اَبِيْ مُلَيْكَةَ عَنْ يَعْلَى بْنِ مَمْلَكٍ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ وَحَدِيْثُ اللَّيْثِ اَصَحُّ

"اور ابن جریجؒ حضرت ابن ملیکہ سے اور وہ حضرت اُم سلمہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قرأت علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی الحمد اللہ رب العلمین پڑھتے اور پھر ٹھہرتے پھر الرحمن الرحیم پڑھتے اور ٹھہرتے امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ اس کا (اصل) سلسلہ سند یہ ہے، حضرت ابن ملیکہ نے نقل کیا حضرت یعلی ابن مملک سے اور انہوں نے نقل کیا حضرت اُم سلمہؓ سے (جیسا کہ اس سے پہلی حدیث کا سلسلہ سند ہے) اور حضرت لیث کی حدیث (جو پہلے گزری) زیادہ صحیح ہے۔"

تشریح: بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے اہل بلاغت اس روایت کو قبول نہیں کرتے کیونکہ از روئے قاعدہ وقف تام مالک یوم الدین پر ہے اسی لئے امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ اس بارہ میں زیادہ صحیح حدیث حضرت لیثؒ کی ہے۔

جمہور[1] علماء کے نزدیک اس قسم کی آیتوں میں کہ جو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط و متعلق ہیں وصل اولیٰ ہے جب کہ جزریؒ کا قول ہے کہ وقف مستحب ہے ان کی دلیل یہی حدیث ہے، دیگر شوافع کا مسلک بھی یہی ہے اس حدیث کے بارہ میں جمہور کی طرف سے یہ جواب دیا ہے کہ وقف اس لئے تھا کہ آپ ﷺ سننے والوں کو یہ بتا دیں کہ ان آیتوں کی ابتداء کہاں سے ہے۔

---

[1] حنفیہ بھی اس میں شامل ہیں ان کے نزدیک بھی ملک یوم الدین ہی پر وقف ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قرآن محض خوش آوازی کا نام نہیں

(۲۰) عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَفِيْنَا الْاَعْرَابِيُّ وَالْاَعْجَمِيُّ فَقَالَ اِقْرَأُ فَكُلٌّ حَسَنٌ وَسَيَجِيْئُ اَقْوَامٌ يُقِيْمُوْنَهٗ كَمَا يُقَامُ الْقِدْحُ يَتَعَجَّلُوْنَهٗ وَلَا يَتَأَجَّلُوْنَهٗ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ ہمارے درمیان تشریف لائے جب کہ ہم قرآن کریم پڑھ رہے تھے ہم میں دیہاتی لوگ اور عجمی بھی تھے آپ نے ہم سے فرمایا کہ "پڑھو! تم میں سے ہر شخص اچھا پڑھتا ہے (یاد رکھو) ایک ایسی جماعت پیدا ہونے والی ہے جس کے افراد قرآن کریم کو اس طرح سیدھا کریں گے جس طرح تیر سیدھا کیا جاتا ہے اور اس کا بدلہ جلدی ہی (دنیا ہی میں) حاصل کرنا چاہیں گے آخرت کے لئے کچھ نہ چھوڑیں گے۔" (ابوداؤد، بیہقی)

تشریح: "عجمی" ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اہل عرب میں سے نہ ہوں، چنانچہ حضرت جابرؓ جس مجلس کا ذکر کر رہے ہیں اس میں ایسے صحابہؓ بھی تھے جن کا تعلق عرب سے نہیں تھا بلکہ وہ فارسی، رومی و حبشی تھے جیسے حضرت سلمان، حضرت صہیبؓ اور حضرت بلالؓ۔

اگرچہ اس مجلس میں موجود دیہاتی لوگوں کی قرأت عجمی لوگوں کی قرأت کی مانند نہیں تھی مگر اس کے باوجود آنحضرت ﷺ نے ان سے کہا کہ تم میں سے سب کی قرأت اچھی اور لائق ثواب ہے کیونکہ تم نے دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دی ہے اگر تم نے اپنی زبانوں اور اپنی آوازوں کو آراستہ نہیں کیا ہے تو اس میں تمہارے لئے کوئی ضرر نہیں۔ جب کہ تمہارے بعد ایک ایسی جماعت پیدا ہونے والی ہے جس کے افراد قرآن کو اس طرح سیدھا کریں گے جس طرح تیر سیدھا کیا جاتا ہے یعنی اپنی آوازوں کو اور قرآنی کلمات و الفاظ کو خوب سنواریں گے اور مخارج کی ادائیگی میں بہت زیادہ تکلف سے کام لیں گے اور ان کی یہ تمام سعی و کوشش آخرت کے لئے نہیں ہوگی بلکہ اپنی شہرت، اپنی عزت و فخر اور دنیا کو دکھانے سنانے کے لئے ایسا کریں گے۔

لہٰذا حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہی ہے کہ ایسے لوگ محض دنیاوی فائدہ کے لئے قرآن پڑھیں گے، آخرت کے ثواب سے کچھ غرض نہیں رکھیں گے اس طرح دنیا کو آخرت پر ترجیح دیں گے، یا یوں کہئے کہ دین کو دنیا کے بدلے میں بیچیں گے۔

حاصل یہ کہ قرآن پڑھنے کے بارہ میں خلوص، غور و فکر اور معانی آیات میں استغراق ہی کو اولیت کا مقام حاصل ہونا چاہئے محض مخارج و الفاظ کی صحیح ادائیگی اور خوش آوازی و خوش گلوئی کے ساتھ پڑھنا ہی کچھ کام نہیں آئے گا۔

(۲۱) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِقْرَأُوا الْقُرْاٰنَ بِلُحُوْنِ الْعَرَبِ وَاَصْوَاتِهَا وَاِيَّاكُمْ وَلُحُوْنَ اَهْلِ الْعِشْقِ وَلُحُوْنَ اَهْلِ الْكِتَابَيْنِ وَسَيَجِيْءُ بَعْدِيْ قَوْمٌ يُرَجِّعُوْنَ بِالْقُرْاٰنِ تَرْجِيْعَ الْغِنَاءِ وَالنَّوْحِ لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ مَفْتُوْنَةٌ قُلُوْبُهُمْ وَقُلُوْبُ الَّذِيْنَ يُعْجِبُهُمْ شَاْنُهُمْ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَرَزِيْنٌ فِيْ كِتَابِهٖ۔

"اور حضرت حذیفہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم قرآن کریم اہل عرب کی طرح اور ان کی آوازوں کے مطابق پڑھو، اہل عشق اور اہل کتاب کے طریقہ کے مطابق پڑھنے سے بچو میرے بعد ایک جماعت پیدا ہوگی جس کے افراد راگ اور نوحہ کی طرح آواز بنا کر قرآن پڑھیں گے۔ ان کا حال یہ ہوگا کہ قرآن ان کے حلق سے آگے نہیں بڑھے گا (یعنی ان کا پڑھنا قبول نہیں ہوگا) نیز ان کی قرأت سن کر خوش ہونے والوں کے قلوب فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔" (بیہقی، رزین)

تشریح: اہل عرب بلا تکلف اور برجستہ قرآن کریم پڑھتے ہیں، ان کی آواز ان کے دل کی امنگ سے ہم آہنگ ہوتی ہے ان کے سامنے

موسیقی وغیرہ کی طرح کے قواعد نہیں ہوتے، نہ وہ خواہ مخواہ کا تکلف کر کے اپنی آواز اور اپنا لہجہ بنا کر کوشش کرتے ہیں اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ ہر مسلمان کو چاہئے وہ قرآن کریم اسی خالص لہجہ اور آواز میں پڑھے جو قرآن کی عظمت شان اور حقیقت کے مطابق ہے اور وہ اہل عرب کا لہجہ ہے۔ اس جملہ بلحون العرب و اصواتھا میں لفظ اصواتھا عطف تفسیری کے طور پر ہے۔

"اہل عشق اور اہل کتاب کے طریقہ کے مطابق الخ" سے یہ مراد ہے کہ جس طرح عشاق اور شعراء اپنی نظمیں و غزلیں اور اشعار آواز بنا کر اور ترنم و سر کے ساتھ پڑھتے ہیں اور موسیقی اور راگ کے قواعد کی رعایت کرتے ہیں تم اس طرح قرآن کریم نہ پڑھو چونکہ یہود و نصاریٰ بھی اپنی کتابوں کو اسی طرح غلط طریقوں سے پڑھتے تھے اس لئے ان کی مانند پڑھنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔

ان کے قلوب فتنہ میں مبتلا ہوں گے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ حب دنیا میں مبتلا ہوں گے اور لوگ چونکہ ان کی آوازوں کو اچھا کہیں گے اس لئے وہ اور زیادہ گمراہی میں پھنسے ہوں گے اسی طرح ان کی آوازوں کو سن کر خوش ہونے والے اور ان کو اچھا کہنے والے بھی ایک غلط بات اور غلط کام کو اچھا سمجھنے کی وجہ ضلالت میں مبتلا ہوں گے۔

قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم

(۲۲) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ حَسِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ يَزِيْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا (رواہ الدارمی)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ راوی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ "قرآن کو اپنی اچھی آواز (یعنی ترتیل و خوش آوازی) کے ساتھ پڑھو کیونکہ اچھی آواز قرآن کا حسن زیادہ کرتی ہے۔" (دارمی)

حسن قرأت کا معیار

(۲۳) وَعَنْ طَاؤُوْسٍ مُرْسَلًا قَالَ سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ النَّاسِ اَحْسَنُ صَوْتًا لِلْقُرْاٰنِ وَ اَحْسَنُ قِرَآءَةً قَالَ مَنْ اِذَا سَمِعْتَهُ يَقْرَأُ اُرِيْتَ اَنَّهُ يَخْشَى اللّٰهَ قَالَ طَاؤُوْسٌ وَكَانَ طَلْقٌ كَذٰلِكَ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت طاؤسؒ بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ قرآن پڑھنے کے سلسلہ میں ازروئے آواز کون شخص سب سے بہتر ہے اور پڑھنے میں بھی (یعنی ازروئے ترتیل و ادائیگی) الفاظ کون شخص سب سے بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا" وہ شخص کہ جس کو تم پڑھتے ہوئے سنو تو تمہارا گمان ہو کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہے" حضرت طاؤسؒ کہتے ہیں کہ حضرت طلق میں یہی بات تھی کہ قرآن پڑھتے تو محسوس ہوتا کہ خشیت الٰہی ان پر غالب ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن کریم پڑھ رہا ہو اور اس کے پڑھنے سے تمہارے دل پر اثر ہو رہا ہو یا یہ کہ اس شخص کے بارہ میں یہ ظاہر ہو کہ وہ قرآن کریم پڑھتے وقت خدا سے ڈر رہا ہے مثلاً اس کے چہرہ کا رنگ خوف الٰہی سے متغیر ہو یا وہ زیادہ رو رہا ہو تو سمجھو کہ قرآن پڑھنے والوں میں اپنی آواز اور اپنی قرأت کے مؤثر ہونے کے اعتبار سے سب سے بہتر وہی ہے۔

حضرت طلقؒ ایک جلیل القدر تابعی ہیں جب وہ قرآن کریم پڑھتے تھے تو خوف الٰہی ان پر طاری رہتا تھا۔ ان کے بارہ میں مؤلف مشکوٰۃ نے لکھا ہے کہ صحابی ہیں۔

قرآن کے بارہ میں چند احکام

(۲۴) وَعَنْ عَبِيْدَةَ الْمُلَيْكِيِّ وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ مِنْ اٰنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَاَفْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا مَافِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ وَلَا تَعْجَلُوْا ثَوَابَهُ فَاِنَّ

لَهُ ثَوَابًا۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عبیدہ ملیکی ؓ جو آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی تھے راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اے اہل قرآن! قرآن سے تکیہ نہ کرو اور رات ودن میں پڑھتے رہا کرو جیسا کہ اس کو پڑھنے کا حق ہے قرآن کو ظاہر کرو، اسے خوش آوازی کے ساتھ پڑھو جو کچھ اس میں مذکور ہے اس میں غور و فکر کرو تاکہ تمہارا مطلوب (آخرت) حاصل ہو اور اس کا ثواب حاصل ہونے میں جلد بازی نہ کرو (یعنی دنیا ہی میں اس کا اجر حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو) کیونکہ آخرت میں اس کا بڑا اجر ہے۔" (بیہقی)

تشریح: "قرآن سے تکیہ نہ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پڑھنے اور اس کے حقوق کی ادائیگی سے غفلت نہ برتو بلکہ برابر قرآن پڑھتے رہا کرو اور اس کا حق بھی ادا کرو باپں طور کہ اس کے حروف اچھی طرح ادا کرو اور اس کے معانی سمجھو اور اس پر عمل کرو۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پر تکیہ لگانا یعنی اس پر سہارا دے کر بیٹھنا یا لیٹنا! اس کی طرف پاؤں پھیلانا، اس پر کوئی چیز رکھنا اس کی طرف پیٹھ کرنا، اس کو روندنا اور اس کو پھینکنا یہ سب چیزیں حرام ہیں، قرآن سے فال نکالنا مکروہ ہے بعض مالکیہ کے نزدیک یہ بھی حرام ہے۔

"جیسا کہ اس کو پڑھنے کا حق ہے" قرآن کریم پڑھتے وقت چار باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے اول تو یہ کہ الفاظ کو درست اور صحیح ادا کیا جائے دوسری بات یہ کہ مفہوم و معانی سمجھنا چاہئے تیسری بات یہ کہ مفہوم و معانی کا مقصد سمجھنا چاہئے اور چوتھی بات یہ کہ جو کچھ پڑھا جائے اس پر عمل کیا جائے۔

"قرآن کو ظاہر کرو" یعنی قرآن کریم باآواز بلند پڑھو تاکہ دوسرے لوگ سنیں اور انہیں قرآن پڑھنے کا شوق ہو، قرآن کریم دوسرے لوگوں کو پڑھاؤ اور سکھاؤ۔ قرآن کریم پر عمل کرو اور اپنی زندگی اسی کے مطابق سنوارو، قرآن کریم لکھو اور اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرو اور قرآن کریم کی تعظیم کرو۔ جو کچھ اس میں مذکور ہے اس میں غور و فکر کرو" کا مطلب یہ ہے کہ جو آیتیں تنبیہ، وعید، اور آخرت کی ہولناکی کے بارہ میں ہیں ان آیتوں میں خوب غور و فکر کرو تاکہ دنیا سے بے رغبتی ہو اور آخرت کی طرف میلان ہو۔

باب

اختلاف قرآت ولغات اور قرآن جمع کرنے کا بیان

مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں یہاں صرف "باب" لکھ کر عنوان قائم کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ باب متعلقات قرآن کے بیان میں ہے، مگر بعض نسخوں میں اس موقع پر یہ عنوان لکھا ہوا ہے "باب اختلاف القران وجمع القران" یعنی "اختلافات قرأت ولغات اور قرآن جمع کرنے سے مراد ہے کتابت قرآن یعنی اس کا مصحف میں لکھا جانا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اختلافات قرأت

① عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ يَقْرَأُ سُوْرَةَ الْفُرْقَانِ عَلٰى غَيْرِ مَا اَقْرَأُ هَا وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْرَأَنِيْهَا فَكِدْتُ اَنْ اَعْجَلَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَمْهَلْتُهُ حَتّٰى انْصَرَفَ ثُمَّ لَبَّبْتُهُ بِرِدَائِهٖ فَجِئْتُ بِهٖ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ سَمِعْتُ هٰذَا يَقْرَأُ سُوْرَةَ الْفُرْقَانِ عَلٰى غَيْرِ مَا اَقْرَأْتَنِيْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْسِلْهُ اِقْرَأْ فَقَرَأَ الْقِرَاءَةَ الَّتِيْ سَمِعْتُهٗ يَقْرَأُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ هٰكَذَا اُنْزِلَتْ ثُمَّ قَالَ لِيْ اِقْرَأْ فَقَرَأْتُ فَقَالَ هٰكَذَا اُنْزِلَتْ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَأُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنْهُ (متفق علیہ واللفظ لمسلم)

"امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن جب) میں نے ہشامؓ بن حکیم بن حزام کو سنا کہ وہ سورہ فرقان اس طریقہ کے خلاف پڑھ رہے ہیں جس طریقہ کے مطابق میں پڑھتا ہوں اور جس طریقہ سے مجھے رسول کریم ﷺ نے وہ سورت پڑھائی تھی تو قریب تھا کہ میں ان کی طرف جھپٹ پڑوں یعنی قرأت ختم کرنے سے پہلے ہی میں ان سے لڑ پڑوں مگر پھر میں نے ان کو اتنی مہلت دی کہ وہ پڑھنے سے فارغ ہوئے اس کے بعد میں نے ان کی چادر ان کی گردن میں ڈالی اور انہیں کھینچتا ہوا رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لایا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ" میں نے سنا ہے کہ یہ سورت فرقان اس طریقہ کے خلاف پڑھتے ہیں جس طریقہ سے آپ (ﷺ) نے مجھے وہ سورت پڑھائی ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "عمر! انہیں چھوڑ دو" پھر ہشامؓ سے کہا کہ تم پڑھو، پھر ہشام نے اسی طریقے سے پڑھا جس طریقے سے میں نے انہیں پڑھتے سنا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی قراءت سن کر فرمایا کہ "یہ سورت اس طرح اتاری گئی ہے" پھر مجھ سے فرمایا کہ "اب تم پڑھو" چنانچہ میں نے پڑھا تو (آپ ﷺ نے میری قرأت بھی سن کر) فرمایا کہ "یہ سورت اس طرح اتاری گئی ہے یاد رکھو کہ یہ قرآن سات طریقہ پر اتارا گیا ہے لہٰذا ان میں سے جس طریقہ سے ہو سکے پڑھو!" (اس روایت کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔ مگر الفاظ مسلمؒ کے ہیں)

تشریح: اس حدیث کے معنی و مفہوم میں علماء کا بہت زیادہ اختلاف ہے چنانچہ اس کی تشریح و وضاحت کے سلسلے میں تقریباً چالیس اقوال منقول ہیں ان میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے جس کے معنی حقیقی معنی پورے بسط کے ساتھ کسی کو بھی معلوم نہیں ہیں۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اختلاف قرأت اگرچہ سات طریقوں سے زائد منقول ہے لیکن وہ تمام اختلاف سات وجہوں کی طرف راجع ہیں اور سات وجہیں یہ ہیں۔ ① اختلاف کی پہلی وجہ کلمہ کی ذات میں یعنی کلمہ کی کمی وزیادتی کا اختلاف ہونا ② دوسری وجہ صیغہ جمع وواحد کے ساتھ تغیر ہونا۔ ③ تیسری وجہ مذکر و مؤنث کا اختلاف ④ چوتھی وجہ حروف کا صرفی اختلاف یعنی تخفیف و تشدید، فتح و کسرہ اور ضمہ کا اختلاف جیسے مَيِّت بھی پڑھا جاتا ہے اور مَيْتٌ بھی ایسے ہی يَقْنِطُ اور يَقْنُطُ یا يَعْرِشُ اور يَعْرُشُ وغیرہ ⑤ پانچویں وجہ حرکات کا اختلاف ⑥ چھٹی وجہ حروف کا اختلاف جیسے لکن الشیاطین کہ بعض تو اسے نون کی تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں اور بعض نون کی تخفیف کے ساتھ ⑦ ساتویں وجہ ادائیگی لغات کا اختلاف جیسے تفخیم اور امالہ۔

کتاب العلم (مظاہر حق جدید جلد اول باب علم) میں اس باب کو یہاں کی بہ نسبت زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ہر قرأت صحیح ہے

② وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَجُلاً قَرَأَ وَسَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ خِلَافَهَا فَجِئْتُ بِهِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرْتُهُ فَعَرَفْتُ فِيْ وَجْهِهِ الْكَرَاهِيَةَ فَقَالَ كِلَاكُمَا مُحْسِنٌ فَلَا تَخْتَلِفُوْا فَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اخْتَلَفُوْا فَهَلَكُوْا (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا اور رسول کریم ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ کی قرأت اس شخص کی قراءت سے مختلف تھی چنانچہ میں اس شخص کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا اور آپ ﷺ سے صورت حال بیان کی (کہ اس شخص کی قرأت آپ ﷺ کی قرأت سے مختلف ہے) پھر میں نے محسوس کیا کہ (میرے جھگڑے اور اختلاف کی وجہ سے) آپ ﷺ کے چہرہ اقدس پر ناگواری کے آثار نمایاں ہیں، بہرکیف آپ ﷺ نے فرمایا تم دونوں صحیح اور اچھا پڑھتے ہو (دیکھو) آپس میں اختلاف نہ کرو کیونکہ وہ لوگ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں یعنی پہلی امتوں کے لوگ) وہ آپس کے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے یعنی وہ لوگ آپس میں ایک

"دوسرے کو جھٹلایا کرتے تھے۔" (بخاری)

تشریح: یہاں "اختلاف" سے مراد قرآن کے ان وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کا انکار ہے کہ جن کے مطابق قرآن کریم نازل کیا گیا ہے۔
جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے قرآن کریم کی جتنی بھی قرأتیں منقول اور رائج ہیں وہ سب برحق ہیں ان میں سے کسی ایک قرأت کا بھی انکار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اگر کسی شخص نے ان میں سے کسی ایک قرأت کا بھی انکار کیا تو گویا اس نے قرآن کریم ہی کا انکار کیا اس موقع پر یہ تفصیل بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ بعض قرأتیں تو متواتر ہیں اور بعض احاد۔ متواتر وہ سات قرأتیں ہیں جو پڑھی جاتی ہیں۔

(۴) وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ کُنْتُ فِی الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ یُصَلِّیْ فَقَرَأَ قِرَاءَۃً اَنْکَرْتُھَا عَلَیْهِ ثُمَّ دَخَلَ اٰخَرُ فَقَرَأَ قِرَاءَۃً سِوَای قِرَاءَۃِ صَاحِبِهٖ فَلَمَّا قَضَیْنَا الصَّلٰوۃَ دَخَلْنَا جَمِیْعًا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اِنَّ هٰذَا قَرَأَ قِرَاءَۃً اَنْکَرْتُھَا عَلَیْهِ وَدَخَلَ اٰخَرُ فَقَرَأَ سِوٰی قِرَاءَۃِ صَاحِبِهٖ وَاَمَرَهُمَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَءَ اَفَحَسَّنَ شَانَهُمَا فَسَقَطَ فِیْ نَفْسِیْ مِنَ التَّکْذِیْبِ وَلَا اِذْ کُنْتُ فِی الْجَاهِلِیَّةِ فَلَمَّا رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا قَدْ غَشِیَنِیْ ضَرَبَ فِیْ صَدْرِیْ فَفِضْتُ عَرَقًا وَکَاَنَّمَا اَنْظُرُ اِلَی اللّٰهِ فَرَقًا فَقَالَ لِیْ یَا اُبَیُّ اُرْسِلَ اِلَیَّ اَنِ اقْرَاِ الْقُرْاٰنَ عَلٰی حَرْفٍ فَرَدَدْتُ اِلَیْهِ اَنْ هَوِّنْ عَلٰی اُمَّتِیْ فَرَدَّ اِلَیَّ الثَّانِیَةَ اِقْرَأْهُ عَلٰی اُمَّتِیْ فَرَدَّ اِلَیَّ الثَّالِثَةَ اِقْرَأْهُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ وَلَكَ بِکُلِّ رَدَّةٍ رَدَدْتُھَا مَسْاَلَةٌ تَسْاَلُنِیْهَا فَقُلْتُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاُمَّتِیْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاُمَّتِیْ وَاَخَّرْتُ الثَّالِثَةَ لِیَوْمٍ یَرْغَبُ اِلَیَّ الْخَلْقُ کُلُّهُمْ حَتّٰی اِبْرَاهِیْمُ عَلَیْهِ السَّلَامُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص وہاں آیا اور نماز پڑھنے لگا اس نے نماز ہی میں یا نماز کے بعد ایسی قرأت پڑھی (یعنی ایسے لہجے میں قرآن شریف پڑھا) کہ میں نے اسے درست نہیں سمجھا پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے پہلے شخص کے خلاف طریقہ سے قرأت پڑھی جب ہم سب نماز سے فارغ ہو چکے تو رسول کریم ﷺ کے پاس (مسجد ہی میں آپ ﷺ کی نماز کی جگہ یا آپ کے حجرہ مبارک میں) حاضر ہوئے میں نے عرض کیا کہ حضرت "اس شخص نے ایسی قرأت پڑھی جسے میں نے درست نہیں سمجھا اس کے بعد یہ دوسرا شخص آیا اس نے پہلے شخص کے خلاف طریقہ سے قرأت پڑھی! نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر دونوں کو اپنے سامنے قرآن پڑھنے کا حکم دیا ان دونوں نے پڑھا آپ ﷺ نے ان دونوں کی قرأت کی تحسین و توثیق کی یہ دیکھ کر میرے دل میں اس بات کی تکذیب کا وسوسہ پیدا ہو گیا ایسا وسوسہ اور شبہ جو ایام جاہلیت میں پیدا نہیں ہوا تھا جب آنحضرت ﷺ نے میری یہ کیفیت دیکھی جو مجھ پر طاری تھی یعنی جب آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا کہ میرے دل میں تردد و شبہ پیدا ہو گیا ہے) تو آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا تاکہ اس کی برکت سے وسوسہ ختم ہو جائے) چنانچہ میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور خوف کی وجہ سے میری ایسی حالت ہو گئی کہ گویا میں خدا کو دیکھ رہا ہوں اس کے بعد آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ابی! جب قرآن نازل ہوا تو میرے پاس حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ یہ حکم بھیجا گیا کہ میں ایک طریقہ یعنی ایک قرأت یا ایک لغت پر قرآن پڑھوں میں نے بارگاہ الوہیت میں درخواست پیش کی کہ میری اُمت پر آسانی عطا فرمائی جائے تاکہ آسانی ہو) بایں طور کہ ایک ہی قرأت میں قرآن پڑھنا مشکل ہے اس لئے کئی قرأتوں کے مطابق پڑھنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ آسانی ہو) چنانچہ دوسری مرتبہ مجھے یہ حکم دیا گیا کہ میں دو قرأتوں پر قرآن پڑھوں! میں نے پھر درخواست پیش کی کہ میری اُمت کو مزید آسانی عطا فرمائی جائے چنانچہ تیسری مرتبہ مجھے یہ حکم دیا گیا کہ میں قرآن کریم کو سات طریقوں سے یعنی سات لغات یا سات قرأت کے مطابق پڑھوں اور یہ بھی فرمایا گیا کہ جتنی مرتبہ ہم نے آپ ﷺ کو حکم دیا ہے اتنی ہی مرتبہ آپ ﷺ ہم سے دعا مانگئے ہم اسے قبول کریں گے چنانچہ میں نے بارگاہ الوہیت میں دو مرتبہ یہ دعا کی کہ اے اللہ میری اُمت میں سے کبیرہ گناہ کرنے والوں کو بخش دے اے اللہ میری اُمت میں سے صغیرہ گناہ کرنے والوں کو بخش دے) اور تیسری دعا میں نے اس دن کے لئے رکھ چھوڑی ہے جس دن مخلوق مجھ سے سفارش و شفاعت کی خواہش کرے گی یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ بھی مجھ سے شفاعت کی خواہش کریں گے۔" (مسلمؒ)

تشریح: میرے دل میں تکذیب کا وسوسہ پیدا ہو گیا" جب آنحضرت ﷺ نے دونوں قرأتوں کی تحسین و توثیق کی تو حضرت ابی کے دل میں اس بات کی تکذیب کا وسوسہ اور شبہ اس لئے پیدا ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے تو دونوں قرأتوں کو اچھا کہا حالانکہ قرآن کریم چونکہ اللہ رب العزت کا کلام ہے اس لئے وہ کسی ایک خاص طریقہ کے مطابق ہی پڑھا جانا چاہئے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی کلام کو کئی شخص کئی طریقہ سے پڑھیں اور ان سب کا پڑھنا درست ہو؟۔

"ایسا وسوسہ اور شبہ جو ایام جاہلیت میں بھی پیدا نہیں ہوا تھا" کا مطلب یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں چونکہ میرا قلب و دماغ ایمان و یقین کی روشنی سے منور نہیں تھا۔ اس لئے اس حالت میں بڑے سے بڑا وسوسہ اور شبہ بھی اتنا بعید اور بڑا معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن اب جب خدا کے فضل سے قلب و دماغ ایمان و اسلام کے نور سے منور ہیں اور یقین و معرفت کی دولت حاصل ہے تو یہ وسوسہ اور شبہ بھی بہت ہی زیادہ بڑا اور سنگین معلوم ہوا۔

"جتنی مرتبہ ہم نے آپ ﷺ کو حکم دیا الخ" اس ارشاد ربانی کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے آپ ﷺ کو تین مرتبہ حکم دیا یعنی ایک مرتبہ تو ایک قرأت کے مطابق دوسری مرتبہ دو قرأت کے مطابق اور تیسری مرتبہ سات قرأت کے مطابق قرآن پڑھنے کا حکم دیا اب آپ ﷺ ان تینوں مرتبہ کے عوض ہم سے تین سوال کیجئے تاکہ ہم تینوں کو پورا کریں۔ چنانچہ رحمت عالم ﷺ نے تینوں سوال اپنی امت کی مغفرت کے لئے ہی کئے کیونکہ اصل چیز تو مغفرت ہی ہے اگر مغفرت نہ ہو تو کسی کی نجات ممکن ہی نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔

"(اے اللہ) تو اگر ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو بلاشبہ ہم ٹوٹا پانے والوں میں سے ہوں گے۔"

لیکن آپ ﷺ نے اس موقع پر مغفرت کو تین زمروں میں تقسیم کیا دو مغفرت تو آپ ﷺ نے اپنی اُمت کے لئے یعنی گناہ کبیرہ اور صغیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے چاہی اور تیسری مغفرت کو تمام ہی مخلوق کے لئے قیامت کے دن پر چھوڑا اسی کو شفاعت کبریٰ کہتے ہیں یعنی قیامت کے دن جب سب ہی نفسی نفسی کہتے ہوں گے اور کوئی بھی نبی و پیغمبر مخلوق خدا کی شفاعت کی جرأت نہیں کر پائے گا تو آخر کار شافع محشر سرکار دو عالم ﷺ سے درخواست کی جائے گی کہ آپ ﷺ پروردگار کے حضور مخلوق خدا کی شفاعت کیجئے نبی کریم ﷺ سب کی شفاعت کریں گے اسی طرح وہ تیسری دعا جس کی قبولیت کا وعدہ بارگاہ رب العزت سے اس وقت کیا گیا تھا اور جسے سرکار دو عالم ﷺ نے آج کے لئے رکھ چھوڑا تھا وہ اس موقع پر کام آئے گا۔

اگرچہ پوری مخلوق یہاں تک کہ تمام ہی انبیاء آنحضرت ﷺ سے شفاعت کی آرزو و خواہش کریں گے لیکن اس جگہ حضرت ابراہیمؑ کا نام بطور خاص اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تمام انبیاء میں آنحضرت ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں۔

اختلاف قرأت سے دینی احکام پر اثر نہیں پڑتا

④ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَقْرَأَنِيْ جِبْرِيْلُ عَلٰى حَرْفٍ فَرَاجَعْتُهٗ فَلَمْ اَزَلْ اَسْتَزِيْدُهٗ وَيَزِيْدُنِيْ حَتّٰى انْتَهٰى اِلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ بَلَغَنِيْ اَنَّ تِلْكَ السَّبْعَةَ الْاَحْرُفَ اِنَّمَا هِيَ فِي الْاَمْرِ تَكُوْنُ وَاحِدًا لَا تَخْتَلِفُ فِيْ حَلَالٍ وَلَا حَرَامٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "حضرت جبرئیلؑ نے پہلی مرتبہ مجھے ایک قرأت یعنی ایک لہجہ پر قرآن پڑھایا پھر میں نے اپنی اُمت کی آسانی کے لئے خدا کی طرف مراجعت کی اور میں آسانی میں برابر زیادتی طلب کرتا رہا جس کے نتیجہ میں مجھے زیادہ آسانی حاصل ہوتی رہی یہاں تک کہ سات قرأتوں تک نوبت پہنچ گئی اور یہ آخری فیصلہ دے دیا گیا کہ قرآن کریم سات لغات پر پڑھا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابن شہاب زہریؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ یہ بات مجھ تک تحقیقی طور پر پہنچی ہے کہ قرأت کے یہ سات

طریقے دینی احکام و امور میں متفق و متحد ہیں حلال و حرام میں ان سے کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اختلاف قرأت سے قرآن کریم میں مذکور احکام و مسائل میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ قرآن کی اگر کوئی آیت ایک قرأت سے پڑھی جائے اور اس آیت میں کسی چیز کے حلال ہونے کا ذکر موجود ہو اور پھر جب وہی آیت دوسری قرأت سے پڑھی جائے تو اس اختلاف قرأت سے حکم میں تغیر ہو جائے اور وہی چیز جو پہلی قرأت سے حلال ثابت ہو رہی تھی اب دوسری قرأت کی بنا پر حرام ہو جائے ایسا نہیں بلکہ ایک قرأت سے کسی چیز کے حلال ہونے کا حکم ثابت ہوتا ہے تو دوسری قرأت سے بھی اس چیز کے حلال ہونے ہی کا حکم ثابت ہوتا ہے حاصل یہ کہ اختلاف قرأت کا تعلق صرف الفاظ لہجہ اور صوت سے ہے احکام و معانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

قرأت قرآن میں آسانی کے لئے آنحضرت ﷺ کی خواہش

⑤ عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ لَقِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جِبْرِيْلَ فَقَالَ يَا جِبْرِيْلُ اِنِّيْ بُعِثْتُ اِلٰى اُمَّةٍ اُمِّيِّيْنَ مِنْهُمُ الْعَجُوْزُ وَالشَّيْخُ الْكَبِيْرُ وَالْغُلَامُ وَالْجَارِيَةُ وَالرَّجُلُ الَّذِيْ لَمْ يَقْرَأْ كِتَابًا قَطُّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَحْمَدَ وَاَبِيْ دَاؤُدَ قَالَ لَيْسَ مِنْهَا اِلَّا شَافٍ كَافٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلنَّسَائِيِّ قَالَ اِنَّ جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ اَتَيَانِيْ فَقَعَدَ جِبْرِيْلُ عَنْ يَمِيْنِيْ وَمِيْكَائِيْلُ عَنْ يَسَارِيْ فَقَالَ جِبْرِيْلُ اِقْرَإِ الْقُرْاٰنَ عَلٰى حَرْفٍ قَالَ مِيْكَائِيْلُ اسْتَزِدْهُ حَتّٰى بَلَغَ سَبْعَةَ اَحْرُفٍ فَكُلُّ حَرْفٍ شَافٍ كَافٍ۔

"حضرت ابی بن کعب ؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرئیل ؑ سے ملاقات کی اور ان سے فرمایا کہ جبریل! میں ایک ناخواندہ قوم کی طرف بھیجا گیا ہوں میری قوم میں بوڑھی عورتیں اور بڑے بوڑھے مرد ہیں لڑکے اور لڑکیاں ہیں اور اس قوم میں ایسا شخص بھی ہے جس نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی، حضرت جبرئیل ؑ نے کہا اے محمد! (ﷺ) قرآن کریم سات طرح پر یعنی سات لغات یا سات قرأت پر اتارا گیا ہے لہٰذا جسے جو قرأت آسان معلوم ہو اس کے مطابق قرآن کریم پڑھے، (ترمذی)

اور احمد و ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ "حضرت جبرئیل نے (لفظ احرف کے بعد آخر میں یہ بھی کہا کہ "ان سات میں سے ہر قرأت شافی ہے (یعنی کفر و شرک اور ظلم و جہل کے روگ کو دفع کرتی ہے) اور کافی ہے یعنی نبی کی صداقت دین اسلام کی حقانیت اور منکرین دین کے رد کے لئے کافی ہے) نسائی ؒ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل و میکائیل میرے پاس آئے جبریل تو میرے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ اور میکائیل میرے بائیں طرف۔ اس کے بعد جبریل نے کہا کہ "ایک قرأت کے مطابق قرآن پڑھو۔ یہ سن کر میکائیل نے مجھ سے کہا کہ "ایک قرأت سے زیادہ کی طلب کیجئے یعنی اللہ تعالیٰ سے درخواست کیجئے کہ اور قرأتوں کے مطابق بھی پڑھنے کا حکم دیا جائے یا جبریل سے کہئے کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عرض کر کے آسانی دلائیں چنانچہ میں زیادتی کرتا رہا اور مجھے زیادہ قرأتوں کی اجازت حاصل ہوتی رہی یہاں تک کہ سات قرأتوں تک نوبت پہنچ گئی لہٰذا ان میں سے ہر قرأت شافی اور کافی ہے۔"

تشریح: "ناخواندہ قوم کی طرف" کا مطلب یہ ہے کہ میں ایک ایسی قوم میں بھیجا گیا ہوں جس میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اچھی طرح پڑھنا نہیں جانتے اگر میں ان کو کسی ایک کے مطابق قرآن کریم پڑھاؤں تو وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتے کیونکہ مثال کے طور پر ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی زبان صرف امالہ یا فتح پر چلتی ہے اور بعض لوگ ایسے ہیں جن کی زبان پر ادغام یا اظہار غالب ہوتا ہے پھر یہ کہ قوم میں بوڑھی عورتیں بھی ہیں اور بوڑھے مرد بھی ہیں اور صغیر السن بچے بھی ہیں ان کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنے بڑھاپے یا اپنی کم عمری کی

وجہ سے کوئی مخصوص قرأت سیکھ سکیں لہٰذا ان کے لئے ضروری ہے کہ کئی قرأتیں ہوں تاکہ جسے جو آسان معلوم ہو اور جو جس قرأت پر قادر ہو اس کے مطابق قرآن کریم پڑھا کرے۔

قرآن کو بھیک مانگنے کا ذریعہ نہ بناؤ

(۶) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّهُ مَرَّ عَلٰى قَاصٍ يَقْرَأُ ثُمَّ يَسْأَلُ فَاسْتَرْجَعَ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَلْيَسْأَلِ اللّٰهَ بِهٖ فَاِنَّهٗ سَيَجِيْئُ اَقْوَامٌ يَقْرَأُوْنَ الْقُرْاٰنَ يَسْأَلُوْنَ بِهِ النَّاسَ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت عمران بن حصینؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ ایک مرتبہ ایک قصّہ گو کے پاس سے گزرے جو قرآن کریم پڑھتا تھا اور لوگوں سے بھیک مانگتا تھا حضرت عمرانؓ نے یہ سن کر انتہائی تکلیف کے ساتھ کہا۔ اِنَّ لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کیونکہ یہ بدعت اور علامت قیامت میں سے ہے پھر انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے ذریعہ اللہ ہی سے مانگے اور وہ وقت آنے والا ہے جب لوگ قرآن کریم پڑھیں گے اور اس کے ذریعہ دوسروں کے آگے دست سوال دراز کریں گے۔" (احمد و ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں ان لوگوں کے لئے تنبیہ اور وعید ہے جو قرآن کریم کو بھیک مانگنے کا ذریعہ بناتے ہیں یوں تو یہ بات بطور خود انسانی شرف کے خلاف ہے کہ کوئی شخص اپنے خدا کو چھوڑ کر اپنے ہی جیسے ایک انسان کے سامنے دست سوال دراز کرے اور اسے حاجت رو اقرار دے چہ جائیکہ اس قبیح فعل کے لئے قرآن کریم کو ذریعہ بنایا جائے اسی لئے فرمایا جارہا ہے کہ قرآن پڑھ کر صرف اللہ کے آگے دست سوال دراز کرو۔ اپنے اخروی و دنیاوی امور میں سے جو چاہو صرف اسی سے مانگو لوگوں کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ کیونکہ وہ خود اسی ذات کے محتاج ہیں وہ تمہاری کیا حاجت پوری کریں گے تلاوت قرآن کے وقت خدا سے مانگنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب آیت رحمت یا جنّت کے ذکر پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت اور جنّت کا طلب گار ہو اور جب آیت عذاب اور ذکر دوزخ پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔

یا پھر یہ کہ قرأت سے فارغ ہونے کے بعد وہ دعائیں مانگے جو ماثورہ ہیں نیز اس موقع پر ایسی دعا مانگنا لائق ہے جس کا تعلق آخرت کی باتوں اور دین و دنیا میں مومنین کی بہتری و بھلائی سے ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

دنیاوی منفعت کے لئے قرآن کو وسیلہ بنانے والوں کو تنبیہ و آگاہی

(۷) عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ يَتَاَكَّلُ بِهِ النَّاسَ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهٗ عَظْمٌ لَيْسَ عَلَيْهِ لَحْمٌ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص قرآن کریم اس لئے پڑھے کہ اس کے ذریعہ لوگوں سے کمائے (یعنی قرآن کریم کو دنیاوی فائدہ کے لئے وسیلہ بنائے) تو وہ قیامت کے دن اس حالت میں اٹھ کر آئے گا کہ اس کا چہرہ صرف ہڈی ہوگا اس پر گوشت نہیں ہوگا۔" (بیہقیؒ)

بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے۔

(۸) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَعْرِفُ فَصْلَ السُّوْرَةِ حَتّٰى يَنْزِلَ عَلَيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک سورت سے دوسری سورت کا فرق نہیں کر پاتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی۔" (ابوداؤد)

تشریح: یہ حدیث وضاحت کے ساتھ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کی ایک آیت ہے جو دو سورتوں کے درمیان فرق و امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے نازل فرمائی گئی جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے ساتھ ایک واقعہ

(۹) وَعَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ كُنَّا بِحِمْصَ فَقَرَأَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ سُوْرَةَ يُوْسُفَ فَقَالَ رَجُلٌ مَا هٰكَذَا اُنْزِلَتْ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ وَاللّٰهِ لَقَرَأْتُهَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَحْسَنْتَ فَبَيْنَا هُوَ يُكَلِّمُهُ اِذْ وَجَدَ مِنْهُ رِيْحَ الْخَمْرِ فَقَالَ اَتَشْرَبُ الْخَمْرَ وَتُكَذِّبُ بِالْكِتَابِ فَضَرَبَهُ الْحَدَّ (متفق علیہ)

"اور حضرت علقمہؓ کہتے ہیں کہ ہم "حمص" میں (کہ جو ایک شہر کا نام ہے) مقیم تھے وہیں ایک مرتبہ ابن مسعودؓ نے سورت یوسف کی قرأت کی تو ایک شخص نے ان کی قرأت سن کر کہا کہ یہ سورت اس طرح نازل نہیں کی گئی ہے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ! خدا کی قسم! میں نے یہ سورۃ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں پڑھی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے اسے سن کر فرمایا کہ تم نے خوب پڑھا" وہ شخص جب حضرت ابن مسعودؓ سے گفتگو کر رہا تھا تو اچانک حضرت ابن مسعودؓ نے اس کے منہ سے آتی ہوئی شراب کی بو محسوس کی حضرت ابن مسعودؓ نے اس سے فرمایا تم شراب پیتے ہو؟ یعنی قرآن کے خلاف عمل کرتے ہو اور اس پر طرہ یہ کہ قرآن کریم کو یعنی اس کی قرأت کو یا قرأت کے لہجہ و طرز ادائیگی کو جھٹلاتے بھی ہو" پھر حضرت ابن مسعودؓ نے اس پر حد جاری کی یعنی شراب پینے کی سزا کے طور پر اسے کوڑے مارے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اگر حضرت ابن مسعود کی قرأت، قرأت مشہورہ (یعنی متواترہ) تھی تو اس شخص نے اس قرأت کی تکذیب کر کے کتاب اللہ کی تکذیب کی لہٰذا اس کے اس انکار اور تکذیب نے یقیناً اسے کفر کی حد میں داخل کر دیا تھا اور اگر ابن مسعودؓ کی قرأت قرأت شاذ تھی تو ان کی اس قرأت کی تکذیب کتاب اللہ کی تکذیب کو مستلزم نہیں تھی اس لئے کہا جائے گا کہ اس صورت میں ابن مسعودؓ کا اس شخص سے یہ کہنا کہ تم کتاب اللہ کی تکذیب کرتے ہو۔ تغلیظا اور تہدیداً تھا اور بظاہر یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس موقع پر حضرت ابن مسعودؓ کسی قرأت شاذ کے مطابق سورت یوسف پڑھ رہے تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اس شخص کے مرتد ہو جانے کا حکم نہیں لگایا تھا بلکہ صرف شراب کی حد جاری کر دینے ہی پر اکتفا کیا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اس شخص سے یہ بات تغلیظا ہی کہی کیونکہ قرأت و قرآن کے اصل کلمہ کا انکار اور جھٹلانا کفر ہے نہ کہ لہجہ اور ادائیگی کلمات کا انکار کفر کو مستلزم ہے۔

حاصل یہ کہ اس شخص نے لہجہ اور ادائیگی کلمات کا انکار کیا تھا اصل قرآن یا اصل قرأت کا انکار نہیں کیا تھا اسی لئے حضرت ابن مسعودؓ نے اس پر صرف شراب کی حد جاری کی مرتد ہونے کی حد جاری نہیں کی۔

حدیث کے ظاہری مفہوم سے ایک اور مسئلہ پر روشنی پڑ رہی ہے اور وہ یہ کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے اس شخص کو شراب پینے کی سزا دی یعنی اس پر حد جاری کر دی جب کہ شراب نوشی کا بظاہر واحد ثبوت اس کے منہ سے آنے والی بو تھی چنانچہ علماء کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے یعنی ان کے نزدیک شراب نوشی کا جرم منہ سے شراب کی بو آنے سے بھی ثابت ہو جاتا ہے لیکن حنفیہ اور شوافع دونوں ہی کا مسلک یہ ہے کہ شراب نوشی کا جرم محض منہ سے شراب کی بو آنے سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ کسی ایسے شخص پر شراب کی حد جاری کی

جاسکتی ہے جس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہو اور اس کے علاوہ اس کی شراب نوشی کا اور کوئی ثبوت نہ ہو کیونکہ بسا اوقات ترش سیب اور امرود کی بو بعض شراب کی بو کے مشابہ ہوتی ہے۔

جہاں تک حضرت ابن مسعودؓ کے اس واقعہ کا تعلق ہے اس کے بارہ میں ان حضرات کی طرف سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے خود شراب نوشی کا اقرار کیا ہو گا یا اس کی شراب نوشی پر گواہ قائم ہو گئے ہوں گے اس وجہ سے انہوں نے حد جاری کی۔

قرآن جمع کرنے کی ابتداء

⑩ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ اَرْسَلَ اِلَيَّ اَبُوْبَكْرٍ مَقْتَلَ اَهْلِ الْيَمَامَةِ فَاِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عِنْدَهُ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّ عُمَرَ اَتَانِي فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِقُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّي اَخْشٰى اِنِ اسْتَحَرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاءِ بِالْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبُ كَثِيْرٌ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّي اَرٰى اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ قُلْتُ لِعُمَرَ كَيْفَ تَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عُمَرُ هٰذَا وَاللّٰهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِي حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِي لِذٰلِكَ وَرَاَيْتُ فِي ذٰلِكَ الَّذِي رَاٰى عُمَرُ قَالَ زَيْدٌ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌّ عَاقِلٌ لَا نَتَّهِمُكَ وَقَدْ كُنْتَ تَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَتَبَّعِ الْقُرْاٰنَ فَاجْمَعْهُ فَوَاللّٰهِ لَوْ كَلَّفُوْنِي نَقْلَ جَبَلٍ مِنَ الْجِبَالِ مَا كَانَ اَثْقَلَ عَلَيَّ مِمَّا اَمَرَنِي بِهٖ مِنْ جَمْعِ الْقُرْاٰنِ قَالَ قُلْتُ كَيْفَ تَفْعَلُوْنَ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هُوَ وَاللّٰهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ اَبُوْبَكْرٍ يُرَاجِعُنِي حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ لَهٗ صَدْرَ اَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْاٰنَ اَجْمَعُهٗ مِنَ الْعُسُبِ وَاللِّخَافِ وَصُدُوْرِ الرِّجَالِ حَتّٰى وَجَدْتُّ اٰخِرَ سُوْرَةِ التَّوْبَةِ مَعَ اَبِيْ خُزَيْمَةَ الْاَنْصَارِيِّ لَمْ اَجِدْهَا مَعَ اَحَدٍ غَيْرِهٖ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِنْ اَنْفُسِكُمْ حَتّٰى خَاتِمَةِ بَرَاءَةَ فَكَانَتِ الصُّحُفُ عِنْدَ اَبِيْ بَكْرٍ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ حَيَاتَهٗ ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ جن دنوں اہل یمامہ کا قتل ہوا انہیں دنوں کی بات ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی شخص کو میرے پاس مجھے بلانے کے لئے بھیجا میں ان کے پاس حاضر ہوا اور وہاں پہنچ کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس حضرت عمر فاروقؓ بیٹھے ہوئے ہیں حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ عمرؓ "میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کے قاریوں کی شہادت کا حادثہ یمامہ کے دن گرم ہو گیا (یعنی یمامہ کی لڑائی میں بہت سے قاری شہید ہو گئے ہیں) مجھے خدشہ ہے کہ اگر اسی کثرت سے مختلف جنگوں میں قاریوں کی شہادت ہوتی رہی تو قرآن کا بہت بڑا حصہ جاتا رہے گا لہٰذا مجھے اسی میں بہتری اور مصلحت نظر آتی ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دے دیں (حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں نے یہ سن کر حضرت عمرؓ سے کہا کہ تم اس کام کو کس طرح کرو گے جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم! اس کام میں بھلائی اور بہتری ہے۔ عمرؓ نے اس مسئلہ میں برابر مجھ سے گفتگو کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام (یعنی قرآن کو جمع کرنے) کے لئے میرا سینہ کھول دیا۔ اور مجھے بھی اس میں وہی مصلحت نظر آئی جو عمرؓ نے دیکھی ہے حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تم ایک سمجھ دار نوجوان مرد ہو تمہاری نیک بختی اور سعادت کی وجہ سے قرآن کو جمع کرنے اور نقل کرنے کے سلسلے میں جھوٹ وغیرہ کا تم پر کوئی اتہام نہیں لگا سکتا کیونکہ تم رسول کریم کی وحی لکھا کرتے تھے۔ لہٰذا تم قرآن کو تلاش کرو اور اس کو (مصحف) میں جمع کرو۔" حضرت زیدؓ کا بیان ہے کہ) خدا کی قسم! اگر پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کو اٹھا کر منتقل کرنے کی خدمت میرے سپرد کی جاتی تو یہ خدمت میرے لئے اس خدمت سے زیادہ سخت اور بھاری نہ ہوتی جو ابوبکرؓ نے قرآن جمع کرنے کی میرے سپرد فرمائی تھی۔

حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ بہرکیف میں نے یہ حکم سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عرض کیا!؟ کہ آپ وہ کام کس طرح کریں گے۔ جو

رسول کریم ﷺ نے کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم! اس کام میں بھلائی اور بہتری ہے" حضرت ابوبکرؓ مجھ سے اس سلسلہ میں گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے میرا بھی سینہ اس طرح کھول دیا جس طرح حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سینہ کھولا تھا۔ چنانچہ میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا اس طرح کہ میں اس کو جمع کرتا تھا کھجور کی شاخوں میں سفید پتھروں میں سے اور لوگوں میں سے (یعنی حافظوں کے سینوں میں سے۔) یہاں تک کہ میں نے سورت توبہ کا آخری حصہ ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس پایا اور یہ حصہ مجھے ان کے سوا اور کسی کے پاس سے نہیں ملا اور وہ حصہ یہ ہے۔ لَقَدْ جَاءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِنْ اَنْفُسِکُمْ آخر سورہ برات تک وہ صحیفے جو میں نے جمع اور نقل کئے تھے) ان کی زندگی تک رہے اور پھر ان کے بعد حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے پاس رہے۔" (بخاری)

تشریح: "یمامہ" ایک شہر کا نام ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں ایک لشکر وہاں بھیجا۔ اور وہاں کے لوگوں سے خوب زوردار جنگ ہوئی جس میں مسیلمہ کذاب بھی مارا گیا مسلمانوں کے لشکر کا بھی بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ لشکر اسلام کے شہداء میں ان مقدس نفوس کی اکثریت بھی شامل تھی جن کے سینوں میں قرآن کریم محفوظ تھا۔ یعنی حفاظ اور قراء چنانچہ بعض حضرات کی تحقیق تو یہ ہے کہ اس جنگ میں شہداء کی تعداد سات سو تھی اور بعضوں نے بارہ سو تک بتائی ہے۔

اس تشویش ناک صورت حال کے پیش نظر حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ قرآن کریم کی حفاظت کے معاملہ میں صرف ایک ہی ذریعہ یعنی "حفاظ" پر اعتماد اور بھروسہ کر لینا مناسب نہیں ہے بلکہ اس عظیم امانت کو حفاظ کے سینوں کے ساتھ ساتھ صفحہ قرطاس پر بھی محفوظ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا تذکرہ امیر المومنین حضرت ابوبکرؓ سے کیا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ نے کچھ تامل کے بعد اس رائے سے اتفاق کیا اور حضرت زیدؓ کو بلا کر اس عظیم خدمت پر معمور کیا۔

"تم رسول کریم ﷺ کی وحی لکھا کرتے تھے" کا مطلب یہ ہے کہ تم اکثر رسول کریم ﷺ کی وحی لکھا کرتے تھے "اکثر" کی قید اس لئے لگائی گئی کہ آنحضرت ﷺ کے پاس نازل ہونے والی وحی لکھنے والے چوبیس صحابہ تھے جن میں خلفاء اربعہ بھی تھے لہذا ابوبکرؓ کے ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ چونکہ تم کاتب وحی ہو اس لئے قرآن کو جمع کرنے اور لکھنے کے سلسلہ میں تمہاری امانت داری اور فرض شناسی مسلم اور متیقن ہے۔

زمانہ رسالت میں قرآن کریم کس شکل میں تھا

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں قرآن کریم یوں تو پورا لکھا ہوا تھا لیکن مصحف میں اور یک جا نہیں تھا بلکہ متفرق طور پر لکھا ہوا تھا چنانچہ کچھ حصہ کسی کے پاس کھجور کی شاخوں پر کچھ حصہ کسی کے پاس پتھروں کے ٹکڑوں پر کچھ حصہ کسی کے پاس جھلی کے ٹکڑوں پر اور کچھ حصہ کسی کے پاس چوڑی ہڈیوں پر لکھا ہوا تھا کیونکہ قرآن کریم جیسے جیسے نازل ہوتا آنحضرت ﷺ اپنے کاتبوں سے مذکورہ بالا چیزوں میں سے جو چیز بھی دستیاب ہوتی اس پر قلم بند کرا لیا کرتے تھے آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروق کے مشورہ سے جیسا کہ اوپر تفصیل بیان کی گئی قرآن کے ان متفرق حصوں کو یکجا اور جمع کیا لہذا یہ ایسا ہی ہوا کہ وہ اوراق کہ جن میں قرآن لکھا ہوا ہو متفرق طور پر پائے جائیں اور پھر انہیں جمع کر دیا جائے۔

اسی طرح آج کل قرآن کریم سورتوں کی جس ترتیب کے ساتھ ہمارے سامنے ہے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں سورتوں کی ترتیب یہ نہیں تھی بلکہ سورتوں کی یہ ترتیب آنحضرت ﷺ کے بعد صحابہؓ کے اجتہاد سے عمل میں آئی ہے۔ ہاں آیتوں کی ترتیب آنحضرت ﷺ کے سامنے ہی اور آپ ﷺ کے حکم کے مطابق ہی عمل میں آ گئی تھی اور اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ جب حضرت جبرئیلؑ حسب موقع کوئی آیت لاتے تو یہ بھی فرما دیتے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں آیت سے پہلے یا فلاں آیت کے بعد رکھا جائے چنانچہ لوح محفوظ

میں بھی قرآن کریم آیتوں کی اس ترتیب کے مطابق لکھا ہوا ہے۔ وہاں سے قرآن کریم آسمان دنیا پر لایا گیا۔ پھر وہاں سے حسب موقع اور حسب ضرورت حضرت جبرئیل سورتیں اور آیتیں آنحضرت ﷺ کے پاس لاتے تھے۔ حاصل یہ کہ نزول قرآن کی ترتیب وہ نہیں تھی جو موجودہ ترتیب تلاوت ہے حضرت جبرئیلؑ ہر سال رمضان میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک مرتبہ پورے قرآن کا دور ترتیب نزول کے مطابق کیا کرتے تھے اور جس سال آنحضرت ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اس سال کے رمضان میں انہوں نے دو مرتبہ دور کیا۔

لم اجدھا مع احد غیرہ کا مطلب یہ ہے کہ سورہ براۃ کا آخری حصہ میں نے ابو خزیمہؓ کے علاوہ اور کسی کے پاس لکھا ہوا نہیں پایا، ویسے تو جس طرح پورا پورا قرآن حفاظ صحابہؓ کے سینوں میں محفوظ تھا اسی طرح سورۃ براۃ کا یہ آخری حصہ بھی ان کے سینوں میں محفوظ تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہی صحابہ مثلاً ابی بن کعبؓ معاذ ابن جبلؓ زید ابن ثابتؓ اور ابی دردأؓ وغیرہ نے پورا کلام اللہ یاد کر لیا تھا۔

حدیث کے آخری جملوں کا مطلب یہ ہے کہ حضرت زید ابن ثابتؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے حکم کے مطابق جب قرآن کریم کو جمع کر لیا اور اس پر تمام صحابہؓ کا اتفاق بھی ہو گیا تو اسے متعدد صحیفوں یعنی اجزاء کی شکل میں منتقل کیا گیا ابھی تک وہ ایک مصحف کی شکل اختیار نہیں کر پایا تھا چنانچہ وہ صحیفے یا اجزاء حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہتے تھے حضرت ابوبکرؓ کے بعد یہ صحیفے حضرت عمرؓ کے پاس ان کی زندگی بھر رہے پھر ان کے بعد ان کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے پاس آ گئے۔ اب حضرت عثمانؓ نے ان صحیفوں یعنی پورے قرآن کریم کو ایک مصحف میں جمع کیا اور کئی مصحف لکھا کر مملکت اسلام کے کئی شہروں میں بھیجے جیسا کہ آئندہ حدیث میں اس کا ذکر آئے گا۔

حضرت عثمان کے ذریعہ قرآن کی ترتیب و جمع

(۱۱) وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ قَدِمَ عَلٰى عُثْمَانَ وَكَانَ يُغَازِىْ اَهْلَ الشَّامِ فِىْ فَتْحِ اَرْمِيْنِيَةَ وَ اَذْرَبِيْجَانَ مَعَ اَهْلِ الْعِرَاقِ فَاَفْزَعَ حُذَيْفَةَ اِخْتِلَافُهُمْ فِى الْقِرَاءَةِ فَقَالَ حُذَيْفَةُ لِعُثْمَانَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَدْرِكْ هٰذِهِ الْاُمَّةَ قَبْلَ اَنْ يَخْتَلِفُوْا فِى الْكِتَابِ اخْتِلَافَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى فَاَرْسَلَ عُثْمَانُ اِلٰى حَفْصَةَ اَنْ اَرْسِلِىْ اِلَيْنَا بِالصُّحُفِ نَنْسَخُهَا فِى الْمَصَاحِفِ ثُمَّ نَرُدُّهَا اِلَيْكِ فَاَرْسَلَتْ بِهَا حَفْصَةُ اِلٰى عُثْمَانَ فَاَمَرَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ وَعَبْدَاللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ وَسَعِيْدَ بْنَ الْعَاصِ وَعَبْدَاللّٰهِ بْنَ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ فَنَسَخُوْهَا فِى الْمَصَاحِفِ وَقَالَ عُثْمَانُ لِلرَّهْطِ الْقُرَشِيِّيْنَ الثَّلَاثِ اِذَا اخْتَلَفْتُمْ اَنْتُمْ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فِىْ شَىْءٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ فَاكْتُبُوْهُ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ فَاِنَّمَا نَزَلَ بِلِسَانِهِمْ فَفَعَلُوْا حَتّٰى اِذَا نَسَخُوا الصُّحُفَ فِى الْمَصَاحِفِ رَدَّ عُثْمَانُ الصُّحُفَ اِلٰى حَفْصَةَ وَاَرْسَلَ اِلٰى كُلِّ اُفُقٍ بِمُصْحَفٍ مِمَّا نَسَخُوْا وَاَمَرَ بِمَا سِوَاهُ مِنَ الْقُرْاٰنِ فِىْ كُلِّ صَحِيْفَةٍ اَوْ مُصْحَفٍ اَنْ يُحْرَقَ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَاَخْبَرَنِىْ خَارِجَةُ بْنُ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّهٗ سَمِعَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ قَالَ فَقَدْتُ اٰيَةً مِنَ الْاَحْزَابِ حِيْنَ نَسَخْنَا الْمُصْحَفَ قَدْ كُنْتُ اَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ بِهَا فَالْتَمَسْنَاهَا فَوَجَدْنَاهَا مَعَ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ الْاَنْصَارِىِّ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَاَلْحَقْنَاهَا فِىْ سُوْرَتِهَا فِى الْمُصْحَفِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حذیفہ ابن یمانؓ حضرت عثمان غنیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت حضرت عثمانؓ شام و عراق کے آرمینیہ اور آذربائیجان کی جنگوں کی غرض سے سامان جہاد کی فراہمی اور تیاری میں مصروف تھے حذیفہؓ کی قرأت کے بارے میں لوگوں کے اختلاف نے اضطراب میں اور خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ لوگ بے محابا آپس میں ایک دوسرے کی قرأت کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ "امیر المؤمنین! اس اُمت کے بارہ میں تدارک کی کوئی راہ نکالئے قبل اس کے کہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح کلام اللہ میں اختلاف کرنے لگیں۔" حضرت عثمانؓ نے ان کی بات سن کر حضرت حفصہؓ کے پاس یہ

پیغام بھیجا کہ آپ وہ صحیفے جو حضرت ابوبکرؓ نے جمع کئے تھے) ہمارے پاس بھیج دیجئے ہم ان کو نقل کرا کر یہ مصاحف آپ کے پاس بھیج دیں گے حضرت حفصہؓ نے وہ تمام صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے حضرت عثمانؓ نے انصار میں سے زید بن ثابتؓ کو اور قریش میں عبداللہ ابن زبیرؓ سعید بن عاصؓ اور عبداللہ بن حارث بن ہشامؓ کو ان صحیفوں کو نقل کرنے پر مامور کیا چنانچہ ان سب نے ان صحیفوں کو مصاحف میں نقل کیا حضرت عثمانؓ نے قریش کے تینوں حضرات سے فرمایا کہ اگر قرآن کے لغات میں کسی جگہ تم میں اور زید بن ثابت میں اختلاف ہو جائے تو وہاں لغت قریش کے مطابق لکھو کیونکہ کلام اللہ لغت قریش کے مطابق ہی نازل ہوا ہے چنانچہ ان سب نے اس پر عمل کیا اور جب مصاحف میں صحیفے نقل کئے جاچکے تو حضرت عثمانؓ نے ان صحیفوں کو تو حضرت حفصہؓ کے پاس بھیج دیا اور ان مصاحف میں جو نقل کے لئے تھے ایک ایک مصحف (اسلامی مملکت میں) ہر جگہ بھیج (دیا اس کے ساتھ ہی یہ حکم جاری فرمایا کہ ان مصاحف کے علاوہ ہر اس صحیفے یا مصحف کو جلا دیا جائے جس میں قرآن لکھا ہوا ہے۔"

(حدیث کے ایک راوی) حضرت ابن شہابؒ فرماتے ہیں کہ زید بن ثابتؓ کے صاحبزادے خارجہؒ نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنے والد حضرت زید بن ثابتؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس وقت کہ ہم (یعنی میں اور دونوں قریشی صحابہؓ سعید بن عاصؓ اور عبداللہ بن حارثؓ) قرآن کریم (مصحف عثمانی میں) نقل کر رہے تھے مجھے سورۂ احزاب کی ایک آیت نہیں مل رہی تھی۔ حالانکہ میں رسول کریم ﷺ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ چنانچہ تلاش و جستجو کے بعد مجھے یہ آیت حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس سے لکھی ہوئی ملی۔

اور وہ آیت یہ ہے مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ۔ پھر میں نے یہ آیت مصحف میں اس کی سورت (یعنی سورہ احزاب کے ساتھ ملا دی۔" (بخاریؒ)

تشریح: کرمانیؒ نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ لفظ "یغازی معنی کے اعتبار سے "یغزی" کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے گویا اس لفظ کا مطلب یہ ہے کہ:

كَانَ عُثْمَانُ يُجَهِّزُ اَهْلَ الشَّامِ وَاَهْلَ الْعِرَاقِ لِغَزْوَةِ هَاتَيْنِ النَّاحِيَتَيْنِ وَفَتْحِهِمَا۔

"حضرت عثمانؓ ان دنوں اہل شام و اہل عراق کے لئے ان دونوں ملکوں کی جنگ اور ان کی فتح کی غرض سے سامان جہاد کی فراہمی میں مصروف تھے۔"

لہٰذا حدیث میں اس لفظ کا ترجمہ بھی اسی وضاحت کے مطابق کیا گیا ہے۔ نیز کرمانیؒ نے بھی یہ لکھا ہے کہ آرمینیہ نواح روم (بیزنطین) میں ایک علاقہ کا نام تھا اور آزربائیجان تبریز کے علاقوں میں سے ایک علاقہ تھا۔

ملا علی قاریؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے "کان" کا اسم اور "یغازی" کا فاعل حذیفہ کو لکھا ہے نیز ملا علی قاریؒ نے قاموس کے حوالہ سے بھی لکھا ہے کہ آرمینیہ اور آزربائیجان کا ایک علاقہ تھا لہٰذا اس طرح حدیث میں آزربائیجان تعمیم بعد تخصیص کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح کلام اللہ میں اختلاف کرنے لگیں کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ نے توریت و انجیل میں تغیر و تبدل کیا اور اس طرح اپنی خواہشات کے مطابق کلام اللہ میں کمی و زیادتی کی کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان بھی ایسا ہی کرنے لگیں۔ اور وہ اس فتنہ میں مبتلا ہو جائیں اس لئے اس فتنہ کے برپا ہونے سے پہلے ہی آپ کچھ تدبیر کیجئے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ نے حضرت عثمانؓ کے سامنے اپنے اس خدشہ کا اظہار کیا تو حضرت عثمانؓ نے تو اس اہم مسئلہ پر غور کرنے کے لئے لوگوں کو جمع کیا جن کی تعداد اس وقت پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ حضرت عثمانؓ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ قرآن پڑھنے والوں میں سے کچھ لوگ ایک دوسرے سے یہ کہتے ہیں کہ میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے۔ یعنی وہ ایک دوسرے کی قرأت سے اختلاف کرتے ہیں حالانکہ ایسا کرنا کفر کے بالکل قریب ہے!؟ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر آپ کی کیا رائے ہے اور

اس کے سد باب کے لئے آپ کیا چیز مناسب سمجھتے ہیں؟" حضرت عثمان نے کہا کہ میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دوں تاکہ کوئی اختلاف ہی پیدا نہ ہو، لوگوں نے کہا کہ آپ جس چیز کو مناسب سمجھتے ہیں وہ بہت بہتر ہے اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے یہ ارادہ کیا کہ لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کریں گے۔ چنانچہ حدیث میں فارسل عثمان الخ (حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا) سے اسی بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

کلام اللہ لغت قریش کے مطابق ہی نازل ہوا ہے یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ اصل میں تو قرآن کریم لغت قریش کے مطابق ہی نازل ہوا تھا۔ پھر آنحضرت ﷺ کی درخواست پر اس بات میں وسعت و فراخی عطا فرمائی گئی یعنی یہ اجازت دے دی گئی کہ ہر شخص اپنی لغت کے مطابق پڑھ سکتا ہے۔ اب حضرت عثمان نے جب یہ دیکھا کہ یہ اختلاف لغت اُمت میں ایک زبردست انتشار اور دین میں ایک بڑے فتنہ کا باعث ہو رہا ہے تو انہوں نے حکم دیا کہ لغت قریش کے علاوہ اور تمام لغات منسوخ کر دی جائیں اور سب لوگ قرآن کریم لغت قریش کے مطابق پڑھیں چنانچہ حدیث میں مذکور حضرت عثمانؓ کے الفاظ۔ فاکتبو بلسان قریش کا یہی مطلب ہے۔

سخاویؒ نے مصحف عثمانی میں قرآن کریم نقل کرتے وقت مذکورہ ناقلین کے درمیان واقع ہونے والے کچھ اختلافات کو بیان بھی کیا ہے، چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر لفظ "تابوت" کے بارہ میں اختلاف پیدا ہو گیا ۔ حضرت زیدؓ نے تو کہا کہ اسے "التابوہ" لکھا جائے۔ مگر دوسرے حضرات کا کہنا تھا کہ "التابوت" لکھنا چاہئے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس کو "ت" کے ساتھ یعنی التابوت ہی لکھو۔ کیونکہ لغت قریش میں یہ لفظ یوں ہی ہے۔ اسی طرح اس موقع پر ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ سے "لم یتسن" کے بارہ میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں "ہ" لکھو۔ اس مصحف کے علاوہ ہر اس صحیفہ یا مصحف کو جلا دیا جائے "الخ" بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ہر "صحیفہ" سے مراد تو وہ صحیفے ہیں۔ جو حضرت حفصہؓ کے پاس تھے اور "مصحف" سے مراد وہ صحیفے ہیں جو دیگر لوگوں نے جمع کئے تھے اور وہ ان کے پاس تھے۔ تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملہ فی کل صحیفة او مصحف میں لفظ او" راوی کے شک کے اظہار کے لئے ہو۔

حدیث کے ظاہری مفہوم میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حفصہؓ کے پاس جو صحیفے تھے انہیں حضرت عثمانؓ نے ایفاء وعدہ کے پیش نظر حضرت حفصہؓ کے پاس واپس بھیج دیا تھا مگر پھر انہیں بھی دوبارہ حاصل کر کے جلا ڈالا تھا۔ لیکن سخاویؒ نے اس بارے میں تفصیل لکھی ہے کہ حضرت عثمانؓ جب مصحف عثمانی کی تکمیل سے فارغ ہوئے تو حضرت حفصہؓ کے پاس ان کے صحیفے واپس بھجوا دیئے ان صحیفوں اور اپنے مصحف کے علاوہ بقیہ تمام صحیفے انہوں نے نذر آتش کرا دیئے چنانچہ وہ صحیفے حضرت حفصہؓ کے پاس رہے جب مروان مدینہ کا حاکم ہوا تو اس نے وہ صحیفے جلانے کے لئے حضرت حفصہؓ سے منگوا بھیجے مگر انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت حفصہؓ کے انتقال کے بعد مروان نے وہ صحیفے ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منگا کر اس خوف سے جلا دیئے کہ یہ صحیفے اگر کبھی باہر آگئے اور لوگوں نے دیکھا تو پھر اختلاف کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

حضرت عثمانؓ نے جو مصحف تیار کرا کر اطراف عالم میں بھیجے تھے ان کی تعداد کے بارہ میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ ان مصاحف کی تعداد پانچ تھی۔ لیکن ابوداؤد کہتے ہیں کہ میں نے ابوحاتم سجستانی سے سنا کہ ان کی تعداد سات تھی۔ ان میں سے ایک مکہ بھیجا گیا (ایک شام ایک یمن ایک بحرین ایک بصرہ ایک کوفہ اور ایک مدینہ میں رکھا گیا۔

مصحف کے بوسیدہ اوراق کا مسئلہ

اس بارہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ مصحف (قرآن کریم) کے ان پرانے اور بوسیدہ اوراق کا کیا جائے جن سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو یعنی ان میں پڑھنا اور تلاوت کرنا ممکن نہ رہا ہو۔ آیا انہیں جلا دینا اولیٰ ہے یا دھو ڈالنا۔ چنانچہ بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ ان اوراق کو جلا دینا بہتر ہے کیونکہ جلا دینے کی صورت میں کلام اللہ کی ذلت و بے حرمتی کی کسی بھی صورت کے واقع ہونے کا امکان نہیں رہتا۔

بخلاف دھونے کے کہ اس کا دھون زمین پر بہتا ہے اور پیروں کے نیچے پڑتا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ دھونا اولی ہے اور اس کا دھون پاک جگہ میں ڈالا جائے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس کا پانی پی لیا جائے کیونکہ وہ ہر مرض کی دوا اور سینہ کی علتوں کی شفاء ہے۔

حضرت عثمانؓ کا فعل

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصحف عثمانی کے علاوہ وہ بقیہ تمام صحیفوں کو جلا کیوں دیا۔ اس کا سیدھا سادھا سا جواب یہ ہے کہ اگر ان صحیفوں کو جلایا نہ جاتا اور اس طرح باقی رہنے دیا جاتا تو ہوسکتا تھا کہ پھر بعد میں لوگوں کے اختلاف و فتنہ کا باعث بن جاتا؟ لہٰذا حضرت عثمانؓ نے اس مصلحت کی بنا پر کہ اختلاف باقی نہ رہے ان صحیفوں کو جلا ڈالا۔ اس طرح حضرت عثمانؓ کے اس فعل کو مورد طعن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ ان پر طعن تو اس وقت وارد ہو جب کہیں بھی شریعت سے یہ ثابت ہو کہ قرآن کے اوراق کو جلانا بے ادبی ہے۔ جب یہ بات ثابت ہی نہیں ہے اور پھر یہ کہ ان کا یہ فعل مصلحت پر مبنی تھا تو ان پر کوئی الزام وارد ہی نہیں ہوسکتا۔

اول جامع قرآن

علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کا جمع ہونا تین مرتبہ واقع ہوا ہے ایک مرتبہ تو خود سرکار دوعالم ﷺ کے زمانہ میں لیکن اس وقت پورا قرآن کریم ایک مصحف میں مرتب طریقہ سے جمع نہیں ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جمع ہوا گویا اول جامع قرآن حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی ہیں اللہ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ اور وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے کتاب اللہ کو جمع کیا۔ تیسری مرتبہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جمع ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور ان کے مشورہ سے قرآن کریم مصاحف میں مرتب طور پر لغت قریش کے مطابق نقل کرایا اور پھر وہ مصاحف اطراف و جوانب میں بھیجے یہ بات ۲۵ ھجری کی ہے۔

لہٰذا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں کے قرآن جمع کرنے میں فرق یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تو قرآن اس خوف سے جمع کیا کہ کہیں اس کے بغیر قرآن کا کچھ حصہ جاتا نہ رہے اور حضرت عثمانؓ نے اس لئے جمع کیا کہ اُمت میں اختلاف و انتشار کا فتنہ نہ پیدا کیا جائے اس طرح کہا جائے گا کہ حضرت عثمانؓ نے حقیقت میں قرآن جمع نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے اُمت کو اختلاف و انتشار کی راہ سے بچا کر ایک لغت (لغتِ قریش) پر قائم و جمع کیا ہے۔"

سورہ براۃ کے شروع میں بسملہ نہ ہونے کی ایک وجہ

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قُلْتُ لِعُثْمَانَ مَاحَمَلَكُمْ عَلَى اَنْ عَمَدْتُمْ اِلَى الْاَنْفَالِ وَهِيَ مِنَ الْمَثَانِيْ وَاِلَى بَرَاءَةَ وَهِيَ مِنَ الْمِئِيْنِ فَقَرَنْتُمْ بَيْنَهُمَا وَلَمْ تَكْتُبُوْا سَطْرَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَوَضَعْتُمُوْهَا فِي السَّبْعِ الطُّوَلِ مَاحَمَلَكُمْ عَلَى ذٰلِكَ قَالَ عُثْمَانُ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا يَأْتِي عَلَيْهِ الزَّمَانُ وَهُوَ يُنْزَلُ عَلَيْهِ السُّوَرُ ذَوَاتُ الْعَدَدِ وَكَانَ اِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ شَيْءٌ دَعَا بَعْضَ مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَيَقُوْلُ ضَعُوْا هٰؤُلَاءِ الْاٰيَاتِ فِي السُّوْرَةِ الَّتِيْ يُذْكَرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا فَاِذَا نَزَلَتْ عَلَيْهِ الْاٰيَةُ فَيَقُوْلُ ضَعُوْا هٰذِهِ الْاٰيَةَ فِي السُّوْرَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا وَكَانَتِ الْاَنْفَالُ مِنْ اَوَائِلِ مَانَزَلَتْ بِالْمَدِيْنَةِ وَكَانَتْ بَرَاءَةُ مِنْ اٰخِرِ الْقُرْاٰنِ نُزُوْلًا وَكَانَتْ قِصَّتُهَا شَبِيْهَةً بِقِصَّتِهَا فَقُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يُبَيِّنْ لَنَا اَنَّهَا مِنْهَا فَمِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ قَرَنْتُ بَيْنَهُمَا وَلَمْ اَكْتُبْ سَطْرَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَوَضَعْتُهَا فِي السَّبْعِ الطُّوَلِ (رواہ احمد و الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے سورۂ انفال کی جو "مثانی" میں سے ہے اور سورت براءت کو جو "مِیئین" میں سے ہے پاس پاس رکھا ہے اور دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر امتیاز بھی

قائم نہیں کیا ہے پھر یہ کہ آپ نے سورہ انفال کو سات لمبی سورتوں کے درمیان رکھا ہے آخر اس کا سبب کیا ہے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں وقت گزرتا رہتا تھا اور آیتوں والی سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں (یعنی قرآن کی آیتیں حسب موقع اور حسب ضرورت بتدریج اترتی تھیں) چنانچہ آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کی کوئی آیت یا اس کا کچھ حصہ آپ ﷺ پر نازل ہوتا تو آپ ﷺ کاتبان (وحی) میں سے کسی کو یعنی زید بن ثابت وغیرہ کو بلاتے اور فرماتے کہ اس آیت کو سورت میں شامل کر دو۔ جس میں ایسا اور ایسا ذکر ہے (یعنی کسی خاص موضوع مثلاً حج وطلاق وغیرہ کا نام لیتے اور فرماتے کہ جس سورت میں اس کے بارہ میں ذکر ہے اس آیت کو اسی میں شامل کر دو) اس کے بعد پھر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو اس کے بارہ میں فرماتے کہ اسے اس سورت میں شامل کر دو اور جس میں ایسا اور ایسا ذکر ہے اور سورہ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جب کہ سورت برات قرآن کا وہ حصہ ہے جو آخر میں نازل ہوا ہے لیکن سورہ انفال میں مذکورہ باتیں سورۃ برائت میں مذکور باتوں کے مشابہ ہیں یعنی دونوں سورتوں میں کافروں سے برسرپیکار ہونے اور عہد ختم کرنے کا بیان ہے۔ رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن ہمیں یہ نہیں بتا گئے کہ سورۃ برائت انفال کا ہی حصہ ہے یا نہیں؟ لہٰذا نبی کریم ﷺ کے نہ بتانے کے سبب اور دونوں سورتوں میں از روئے مفہوم معنی مماثلت و مشابہت ہونے کے باعث ہم نے دونوں سورتوں کو پاس پاس رکھا لیکن ہم نے دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر امتیاز قائم نہیں کیا۔ اور پھر ہم نے ان دونوں سورتوں کو پاس پاس سات بڑی سورتوں کے درمیان رکھا لیکن ان دونوں کے درمیان فاصلہ رکھا یعنی دونوں کو الگ الگ رکھا کیونکہ جس طرح دونوں کے دو ہونے میں شبہ تھا اسی طرح دونوں کے ایک ہونے میں بھی شبہ تھا۔" (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: قرآن مجید کی سورتوں کو اسی طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ سورت بقرہ سے سورہ یونس تک کو "طوال" کہتے ہیں عربی میں طوال لمبے کو کہتے ہیں۔ اور قرآن کی ابتدائی سات سورتیں چونکہ لمبی ہیں اس لئے اس مناسبت سے ان کا نام "سبع طوال" سات لمبی سورتیں ہوا۔ سورہ یونس سے سورہ شعراء تک کی سورتوں کو مئین کہا جاتا ہے۔ مئین مائۃ کی جمع ہے اور عربی میں مائۃ سو کو کہتے ہیں اور یہ سورتیں چونکہ سو سو آیتوں سے زیادہ پر مشتمل ہیں یا سو کے قریب ہیں اس لئے ان سورتوں کو مئین کہتے ہیں اور سورت شعراء سے سورہ حجرات تک کی سورتیں "مثانی" کہلاتی ہیں یہ سورتیں سو سو آیتوں سے کم ہیں اور پھر یہ کہ ان سورتوں کے مضمون اور قصے مقرر ہیں اس لئے ان کو "مثانی کہا جاتا ہے۔ سورہ حجرات سے آخر قرآن تک کی سورتوں کو مفصّل کہتے ہیں کیونکہ ان سورتوں کے درمیان بسم اللہ کا فاصلہ اتنا قریب ہے۔ یہ گویا تین قسمیں ہوئیں پھر ان میں سے آخری قسم یعنی "مفصّل" کی بھی تین قسمیں ہیں ① طوال۔ ② اوساط۔ ③ قصار۔

سورۂ حجرات سے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ تک کی سورتیں طوال مفصّل "کہلاتی ہیں۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ سے لم یکن تک کی سورتوں کو اوساط مفصّل کہتے ہیں اور سورہ لم یکن سے آخر قرآن تک کی سورتوں کو قصار مفصّل کہا جاتا ہے۔ اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر اب حدیث کے مفہوم کی طرف آیئے۔ حضرت عثمانؓ سے حضرت عباسؓ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ سورت انفال "مثانی" میں سے ہے کیونکہ وہ سو آیتوں سے کم ہے۔ اور سورت براۃ "مئین" میں سے ہے کیونکہ وہ سو آیتوں سے زیادہ ہے لہٰذا آپ نے قرآن کو جمع اور نقل کراتے وقت ان دونوں سورتوں کو نزدیک نزدیک "طوال" میں کیوں رکھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ "انفال مثانی" میں رکھتے اور براۃ کو مئین میں آخر میں بھی ایک خلش کی بات یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں کے درمیان "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نہیں لکھی۔

حضرت عثمانؓ نے ان کی اس بات کا جواب دیا اس کا حاصل یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں کے درمیان اشتباہ پیدا ہو گیا ہے ایک وجہ تو یہ دونوں سورتیں ایک ہی سورۃ ہیں (جیسا کہ ترجمہ میں بیان کیا گیا) اس سبب سے ان کو طوال میں رکھنا اور ان دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھنا درست ہوا اور ایک وجہ سے یہ دونوں سورتیں الگ الگ دو سورتیں ہیں اس لئے ان کے درمیان فاصلہ رکھا گیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الدعوات

دعاؤں کا بیان

دعا کے معنی ہیں کہ "اعلیٰ ذات سے ادنیٰ چیزوں میں سے کچھ بطریق عاجزی طلب کرنا" امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ کے علماء اس بات پر متفق رہے ہیں۔ کہ دعا مانگنا مستحب ہے ان کی دلیل قرآن و حدیث کے ظاہری اور واضح مفہوم کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کا فعل بھی ہے کیونکہ تمام انبیاء کرام دعا مانگا کرتے تھے۔

لیکن بعض زہاد اور اہل معارف کا یہ بھی کہنا ہے کہ ترک دعا (یعنی دعا نہ مانگنا) افضل ہے کیونکہ اس طرح رضاء مولیٰ اور اپنی قسمت اور تقدیر کے ساتھ راضی ہونے کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔ مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے ان زہاد و اہل معارف کے اس قول کے بارہ میں کہا ہے کہ یہ قول اس خاص کیفیت پر محمول ہے جو بعض وقت بعض مردان حق پر طاری ہوتی ہے اور جس میں رضاء بقضاء ہی غالب ہوتی ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ پیش آیا کہ جب انہیں آگ میں ڈالا گیا تو حضرت جبرئیلؑ نے ان سے کہا کہ آپ دعا کیجئے اور اپنے پروردگار سے اپنی نجات و سلامتی کے لئے درخواست کیجئے تو انہوں نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جل شانہ میرا حال جانتا ہے مجھے کوئی درخواست کرنے اور دعا مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی شانِ رحمت

① عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِکُلِّ نَبِیٍّ دَعْوَۃٌ مُسْتَجَابَۃٌ فَتَعَجَّلَ کُلُّ نَبِیٍّ دَعْوَتَہٗ وَاِنِّی اخْتَبَاْتُ دَعْوَتِیْ شَفَاعَۃً لِاُمَّتِیْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ فَھِیَ نَائِلَۃٌ اِنْشَاءَ اللّٰہُ مَنْ مَاتَ مِنْ اُمَّتِیْ لَا یُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْئًا۔

(رواہ مسلم و للبخاری اقصر منہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر ایک نبی کے لئے ایک دعا ہے جو قبول کی جاتی ہے چنانچہ ہر نبی نے اپنی دعا کے بارہ میں جلدی کی لیکن میں نے اپنی دعا اپنی اُمت کی شفاعت کی خاطر قیامت کے دن تک کے لئے محفوظ رکھی ہے پس میری یہ دعا اگر خدا نے چاہا تو میری اُمت کے ہر اس شخص کو فائدہ پہنچائیگی۔ جو اس حال میں مرا ہو کہ اس نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو۔" (مسلمؒ اور بخاری نے اس روایت کو اس سے کم نقل کیا ہے)

تشریح: "ہر نبی کے لئے ایک دعا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو حکم فرمایا تھا کہ اپنے مخالفین کی تباہی کے لئے بددعا کرو

لہٰذا وہ بددعا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ اسے منظور فرماتا تھا چنانچہ اسی دعا کے بارہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو دعا مانگنے کا جو حق دیا تھا اور پھر اس کی قبولیت کا یقین بھی عطا فرمایا تھا تو ہر نبی نے اپنے اس حق کے استعمال میں جلدی کی جیسا کہ حضرت نوحؑ نے اپنی اُمت کی ہلاکت و تباہی کے لئے بددعا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پوری اُمت طوفان میں غرق کر دی گئی۔ یا اسی طرح حضرت صالحؑ نے بھی اپنی اُمت کی تباہی کے لئے بددعا کی اور امت ان کی حضرت جبرئیلؑ کی ایک آواز کے ذریعہ ہلاکت کی وادیوں میں ہمیشہ کے لئے چھپ گئی لیکن میں نے اپنی دعا کو محفوظ رکھا یعنی اپنے مخالفین کی ایزا پر صبر کیا اور ان کے لئے بددعا نہ کی۔ کیونکہ میں رحمۃ للعٰلمین ہوں میری شان یہ نہیں ہے کہ میں بددعا کروں اور لوگوں کے لئے تباہی و بربادی کا سامان فراہم کروں میں نے اپنے اس حق کو جو مجھے بھی ملا تھا قیامت تک کے لئے اٹھا رکھا ہے، قیامت کے دن میں اس دنیا میں بددعا کے بجائے ہر اس اُمتی کے حق میں شفاعت کروں گا جو ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا ہو اگرچہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ رہا ہو۔"

اس موقع پر اتنی بات اور جان لیجئے کہ شفاعت کئی قسم کی ہوگی بعض لوگ تو آنحضرت ﷺ کی شفاعت کے نتیجہ میں دوزخ میں داخل ہی نہیں ہوں گے بعض دوزخ سے جلدی نکل آئیں گے بعض جنّت میں جلدی داخل ہوں گے اور بعض کے جنّت میں درجے بلند ہوں گے۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا شَفَاعَۃَ نَبِیِّنَا عَلَیْہِ اَلْفُ اَلْفُ صَلٰوۃٍ۔

(۲) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اتَّخَذْتُ عِنْدَکَ عَھْدًا لَنْ تُخْلِفَنِیْہِ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ اٰذَیْتُہٗ شَتَمْتُہٗ لَعَنْتُہٗ جَلَدْتُّہٗ فَاجْعَلْھَا لَہٗ صَلٰوۃً وَّزَکٰوۃً وَّقُرْبَۃً تُقَرِّبُہٗ بِھَا اِلَیْکَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بارگاہ حق میں یوں دعا کی کہ "اے میرے پروردگار! میں نے تیری خدمت میں ایک درخواست پیش کی ہے تو مجھے اس کی قبولیت سے نواز اور مجھے ناامید نہ کر۔ یعنی میں امیدوار کرم ہوں کہ میری درخواست ضروری ہی منظور ہوگی اور وہ درخواست یہ ہے کہ میں ایک انسان ہوں لہٰذا جس مؤمن کو میں نے کوئی ایذا پہنچائی ہو بایں طور کہ میں نے اسے برا بھلا کہا ہو میں نے اس پر لعنت کی ہو میں نے اسے مارا ہو تو ان سب چیزوں کو تو اس مؤمن کے حق میں رحمت کا سبب گناہوں سے پاکی کا ذریعہ اور اپنے قرب کا باعث بنادے کہ تو ان چیزوں کے سبب اس کو قیامت کے دن اپنا قرب بخشے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لفظ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ تمہید ہے عذر کی کہ میں بھی ایک انسان ہوں کبھی کبھی بتقضائے بشریت کسی پر خفا بھی ہو جاتا ہوں۔

لفظ فَاَیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ اس چیز کی تفصیل اور بیان ہے جس کے لئے آپ ﷺ نے اپنے ارشاد اَللّٰھُمَّ اتَّخَذْتُ الخ کے ذریعہ بارگاہ حق جل شانہ میں درخواست پیش کی بہرکیف آنحضرت ﷺ کی اس دعا کا حاصل یہ ہے کہ جس مؤمن کو مجھ سے کوئی بھی ایذا پہنچ جائے تو اس ایذا کو اس کے حق میں رحمت وغیرہ کا سبب بنادے۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے اس چیز کی طلب میں بہت مبالغہ سے کام لیا یہاں تک کہ آپ ﷺ کا دامن پکڑ کر کھڑی ہوگئیں آنحضرت ﷺ نے ان کے اس طرز عمل پر فرمایا کہ:

قَطَعَ اللّٰہُ یَدَکِ ـــــ "اللہ تعالیٰ تیرا ہاتھ کاٹے۔"

حضرت عائشہؓ کو یہ بات بہت محسوس ہوئی۔ وہ فوراً آپ ﷺ کا دامن چھوڑ کر ہٹ گئیں اور اپنے ہجرہ میں آکر بہت ہی رنجیدہ، ملول اور غصہ میں بھر کر بیٹھ گئیں۔ جب آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کی یہ کیفیت دیکھی تو اس وقت آپ ﷺ نے ان کو خوش کرنے کے لئے یہ کہا۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اتَّخَذْتُ عِنْدَکَ عَھْدًا الخ۔

لہٰذا علماء لکھتے ہیں کہ جو شخص کسی کے لئے بددعا کر بیٹھے تو اس کے لئے مسنون یہ ہے کہ وہ اس بددعا کے بدلہ میں مذکورہ بالا دعا بھی ضرور کرے۔

دعا جزم و یقین کے ساتھ مانگو

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَعَا اَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلِ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي اِنْ شِئْتَ ارْحَمْنِي اِنْ شِئْتَ اُرْزُقْنِي اِنْ شِئْتَ وَلِيَعْزِمْ مَسْاَلَتَهٗ اِنَّهٗ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَلَا مُكْرِهَ لَهٗ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص دعا مانگے۔ اے اللہ مجھے بخش دے اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر اگر تو چاہے تو مجھے رزق عطا فرما اگر تو چاہے۔" بلکہ چاہئے "یہ کہ وہ عزم بالجزم اور یقین و اعتماد کے ساتھ دعا مانگے (شک و شبہ کا کلمہ مثلاً اگر تو چاہے" وغیرہ کا استعمال نہ کرے) کیونکہ اللہ تعالیٰ تو خود وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے اس پر کوئی زور زبردستی کرنے والا نہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگو جزم و یقین کے ساتھ مانگو یعنی "یہی کہو کہ" اے اللہ ہمارا افلاں مطلب پورا کر" جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اس لئے یہ نہ کہو "کہ اگر تو چاہے تو ہمارا افلاں مطلب پورا کر دے۔" کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت دعا میں شک پیدا کرنا ہے حالانکہ قبولیت دعا میں یقین ہونا چاہئے کیونکہ اس نے قبولیت دعا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کیا کرتا اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ بے پروا اور مستغنی ہے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں اس پر کسی کا کوئی زور نہیں ہے بلکہ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اس لئے اپنی دعا کے ساتھ یہ کہنا کہ "اگر تو چاہے" بالکل بے فائدہ اور لاحاصل ہے۔

تھک کر دعا مانگنا نہ چھوڑو

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَعَا اَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلِ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي اِنْ شِئْتَ وَلٰكِنْ لِيَعْزِمْ وَلْيُعْزِمِ الرَّغْبَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَتَعَاظَمُهٗ شَيْءٌ اَعْطَاهُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جب تم میں سے کوئی شخص دعا مانگے تو اس طرح نہ کہے کہ "اے خدا مجھے بخش دے اگر تو چاہے۔ بلکہ بلا کسی شک کے جزم و یقین کے ساتھ اور پوری رغبت کے ساتھ دعا مانگے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جو چیز عطا کرتا ہے۔ وہ اس کے لئے مشکل نہیں ہوتی۔" (مسلمؒ)

تھک کر دعا مانگنا نہ چھوڑو

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ مَالَمْ يَسْتَعْجِلْ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِسْتِعْجَالُ؟ قَالَ يَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَ يُسْتَجَابُ لِي فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِكَ وَيَدَعُ الدُّعَاءَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بندے کی دعا شرائط قبولیت کے بعد قبول کی جاتی ہے جب تک وہ گناہ کی یا ناتہ توڑنے کی دعا نہیں مانگتا اور جب تک کہ جلدی نہیں کرتا" عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ جلدی کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا دعا مانگنے والا بار بار یوں کہنے لگے کہ میں نے دعا مانگی یعنی اکثر میں نے دعا مانگی) لیکن میں نے اسے قبول ہوتے نہیں دیکھا۔" اور پھر وہ تھک کر بیٹھ جائے اور دعا مانگنی ہی چھوڑ دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قبولیت دعا کے لئے جہاں جزم و یقین اور خدا کی ذات پر پورا بھروسہ شرط ہے وہیں یہ بات بھی ضروری ہے کہ دعا ان ہی چیزوں کے لئے مانگی جائے جو عادتاً مانگی جاتی ہوں اور مباح ہوں، لہٰذا یہاں یہ بھی بتایا جارہا ہے کہ مؤمن کی دعا اسی وقت قبول ہوتی ہے جب کہ وہ نہ گناہ کی کوئی چیز طلب کرے اور نہ ناتہ توڑنے کی دعا کرے اور نہ جلد بازی سے کام لے۔

گناہ کی چیز مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یہ دعا مانگنے لگے "اے اللہ"! مجھے فلاں شخص کو (جو مسلمان ہے) قتل کر دینے کی طاقت عطا فرما، یا یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شراب یا کوئی حرام وغیر حلال چیز عطا کر یا یہ کہے کہ "اے اللہ فلاں شخص کو بخش دے درانحالیکہ اس بارہ میں یقین ہے کہ وہ کافر مرا ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کی دعا مانگنا اور پھر ان کی قبولیت کی توقع ہی رکھنا دیدہ دلیری ہی کہا جاسکتا ہے اس طرح محال اور غیر ممکن الوقوع چیزوں کی دعا مانگنا اور ان کی قبولیت کی امید رکھنا بھی انتہائی حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے مثلاً کوئی عقل کا اندھا یہ دعا مانگے کہ اے اللہ! تو مجھے دنیا ہی میں حالت بیداری میں اپنا دیدار عطا فرما۔ "ناتہ توڑنے کی دعا" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بدباطن شخص یہ دعا مانگنے لگے کہ "اے اللہ! مجھ میں اور میرے باپ میں جدائی اور تفریق کر دے" یہ حدیث کا مفہوم کے مطابق مؤمن کی ایسی غیر ایمانی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات بندہ مؤمن کی... شان کے لائق نہیں ہے کہ اگر قبولیت دعا میں تاخیر محسوس ہو تو تھک کر بیٹھ جائے اور دعا مانگنا ہی چھوڑ دے۔ کیونکہ دعا بھی عبادت ہے اور عبادت سے اس طرح اکتاہٹ یا دل گرفتگی مؤمن کے لئے کسی بھی حال میں مناسب نہیں ہے۔ پھر یہ کہ قبولیت دعا میں تاخیر یا تو اس لئے ہوتی ہے کہ اس کا وقت نہیں آتا کیونکہ ازل ہی میں ہر چیز کے وقوع اور تکمیل کا ایک وقت مقرر ہے جب تک وہ وقت نہیں آتا وہ چیز بھی وقوع پذیر نہیں ہوتی یا یہ دعا مانگنے والا جو دعا مانگتا ہے اس کی تقدیر میں اس کی دعا کا اس دنیا میں قبول ہونا لکھا نہیں ہوتا اس صورت میں اسے اس کے بدلہ میں آخرت کا ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ یا پھر قبولیت میں تاخیر اس لئے ہوتی ہے تاکہ دعا مانگنے میں پوری عاجزی و انکساری، سچی لگن اور تڑپ اور کمال عبودیت کا اظہار کرتا رہے کیونکہ دعا میں ان چیزوں کو اختیار کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بہت پسند کرتا ہے۔

غائبانہ دعا قبول ہوتی ہے

(۶) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَعْوَۃُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ لِاَخِیْہِ بِظَھْرِ الْغَیْبِ مُسْتَجَابَۃٌ عِنْدَ رَأْسِہٖ مَلَکٌ مُّوَکَّلٌ کُلَّمَا دَعَا لِاَخِیْہِ بِخَیْرٍ قَالَ الْمَلَکُ الْمُوَکَّلُ بِہٖ اٰمِیْنَ وَلَکَ بِمِثْلٍ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو مسلم بندہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے غائبانہ دعا کرتا ہے تو وہ قبول کی جاتی ہے۔ دعا کرنے والے کے سر کے قریب ایک فرشتہ متعین کر دیا جاتا ہے جب وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھلائی کی دعا کرتا ہے تو وہ متعین شدہ فرشتہ کہتا ہے کہ اے اللہ اس کی دعا قبول کر اور (یہ بھی کہتا ہے کہ) تیرے لئے بھی ایسا ہی ہو۔" (مسلم)

تشریح: یہاں تو بطور خاص اس دعا کی قبولیت کی بشارت دی گئی ہے جو اپنے مسلمان بھائی کے لئے اس کی عدم موجودگی میں زبان سے نکلے لیکن ایسے ہی اگر کوئی کسی مسلمان کے لئے اس کے سامنے اپنے دل میں چپکے سے دعا کرے تو وہ دعا بھی اس بشارت کے تحت آتی ہے کیونکہ جس طرح غائبانہ دعا میں خلوص کار فرما ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں دعا قبول ہوتی ہے اسی طرح اس کی موجودگی میں اپنے دل میں یا چپکے سے دعا کرتے وقت بھی پوری طرح خلوص ہی کی کار فرمائی ہوتی ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کے مطلب یہ ہے کہ دعا قبول کرنے والے کے ساتھ جو فرشتہ متعین کیا جاتا ہے کہ وہ دعا کے وقت بارگاہ حق شانہ میں یہ سفارش پیش کرتا ہے کہ الٰہی اس شخص کی دعا اس کے بھائی کے حق میں قبول فرما اور پھر وہ دعا کرنے والے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "جس طرح اس دعا کے نتیجہ میں تیرا بھائی خیر و بھلائی کو پہنچے گا۔ اسی طرح خدا کرے کہ تجھے بھی خیر و بھلائی حاصل ہو۔

بددعا کرنے کی ممانعت

(۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَدْعُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰی اَوْلَادِکُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰی اَمْوَالِکُمْ لَا تُوَافِقُوْا مِنَ اللّٰہِ سَاعَۃً یُّسْئَلُ فِیْھَا عَطَاءً فَیَسْتَجِیْبُ لَکُمْ (رواہ مسلم)

"اور جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اپنے لئے بددعا نہ کرو اپنی اولاد کے لئے بددعا نہ کرو اور نہ اپنے مال غلام لونڈیوں جانوروں اور دوسرے مال و اسباب کے لئے بددعا کرو تاکہ "تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ ساعت حاصل نہ ہو جائے جس میں خدا ہر سوال پورا کرتا ہے اور پھر تمہاری بددعا قبول ہو جائے گی۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ کچھ اوقات ایسے ہوتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ہر دعا کو شرف قبولیت سے نوازا جاتا ہے اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم جس وقت اپنے لئے یا اپنی اولاد یا اپنے مال کے لئے بددعا کر رہے ہو وہی وقت قبولیت دعا کا ہو اور پھر تمہاری بددعا قبول ہو جائے جس کے نتیجے میں نقصان و خسران بھی ہو اور پشیمانی بھی ہو لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ جو نادان کسی مصیبت و تکلیف یا غصہ کے وقت اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے اپنے اموال کے لئے بددعا کرتے ہیں وہ مناسب نہیں ہے۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ ابْنِ عَبَّاسٍ اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فِيْ كِتَابِ الزَّكٰوةِ۔

"اور ابن عباسؓ کی حدیث "مظلوم کی دعا سے ڈرو الخ" کتاب الزکوٰۃ میں نقل کی جا چکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

دعا عبادت ہے

⑧ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ)

"حضرت نعمان ابن بشیرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "دعا ہی عبادت ہے" اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اور تمہارے پروردگار نے کہہ دیا ہے کہ مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: گویا آپ ﷺ نے بطور مبالغہ فرمایا کہ "دعا ہی عبادت ہے" کیونکہ دعا وہ عبادت ہے جس میں بندہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اللہ کی ذات کے علاوہ ہر ایک ذات سے استغنا برتتا ہے اللہ کی ذات کے علاوہ اور کسی سے نہ ڈرتا ہے نہ امید رکھتا ہے اور پھر یہ کہ دعا میں اخلاص ہوتا ہے خدا کی حمد و شکر گزاری ہوتی ہے خدا سے سوال کیا جاتا ہے خدا کی وحدانیت کا اظہار کیا جاتا ہے اپنے مقصد اور مطلب کے حصول کے لئے خدا ہی کی طرف توجہ اور رغبت ہوتی ہے خدا کی مناجات کی جاتی ہے خدا کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل و کمتر و عاجز کر کے کمال عبودیت کا اظہار کیا جاتا ہے اور خدا سے فریاد کی جاتی ہے اور اس سے مدد مانگی جاتی ہے۔

آپ ﷺ نے اپنے ارشاد کی توثیق کے سلسلہ میں بطور دلیل قرآن کریم کی آیت اس لئے پڑھی کہ اس سے معلوم ہو جائے کہ دعا مامور بہ ہے یعنی دعا کرنے کا حکم دیا گیا اور اس حکم کی تعمیل یعنی دعا مانگنے پر ثواب دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز اس درجہ کی ہوتی ہے اسے ہی عبادت کہتے ہیں کہ اس آیت کا آخری حصہ بھی دلالت کرتا ہے کہ دعا عبادت ہے چنانچہ آگے فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ۔

"جو لوگ میری عبادت یعنی دعا کے سلسلہ میں تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل و خوار ہو کر دوزخ میں داخل ہوں گے۔"

دعا عبادت کا خلاصہ ہے

⑨ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "دعا عبادت کا مغز ہے"۔ (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دعا عبادت کا خلاصہ ہے اور اس کا مقصود بالذات ہے کیونکہ عبادت کی حقیقت اور اس کا خلاصہ عاجزی اور اپنے آپ کو ذلیل و کمتر سمجھنا ہے اور یہی چیز دعا میں حاصل ہوتی ہیں۔

دعا کی فضیلت اور برتری

⑩ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ شَیْءٌ اَکْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَاءِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَ ابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے نزدیک "دعا سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی چیز نہیں ہے۔" (ترمذی، ابن ماجہ، اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: "دعا سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی چیز نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اذکار و عبادات میں کوئی چیز دعا کے برابر نہیں ہے" لہٰذا آپ کا یہ ارشاد قرآن کریم کی اس آیت:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ۔

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں بہت زیادہ بلند مرتبہ وہی شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔" (کے منافی نہیں ہے)

دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے

⑪ وَعَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا یَزِیْدُ فِی الْعُمَرِ اِلَّا الْبِرُّ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت سلمان فارسیؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تقدیر کو دعا کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بدلتی اور عمر کو نیکی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بڑھاتی۔" (ترمذی)

تشریح: تقدیر سے مراد ہے ایسی ناپسندیدہ چیز کا پیش آنا جس سے انسان ڈرتا ہے" لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جب بندہ کو دعا کرنے کی توفیق دی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے ایسی چیز کو دور کرتا ہے۔

تقدیر کی قسمیں: خوب سمجھ لیجئے کہ تقدیر کی دو قسمیں ہیں ایک تو "مبرم" اور دوسری "معلق"۔ تقدیر مبرم تو حق تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہوتا ہے جو چیز پیش آنے والی ہوتی ہے اس میں کچھ بھی تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے مگر تقدیر معلق میں بعض اسباب کی بنا پر تغیر و تبدل بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں حدیث میں جس تقدیر کے بارہ میں کہا ہے کہ وہ دعا سے بدل جاتی ہے وہ تقدیر معلق ہی ہے یہاں تقدیر مبرم مراد نہیں ہے۔

نیکی سے عمر میں اضافہ کا مطلب

حدیث سے جو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نیکی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کے بارہ میں بھی سمجھ لیجئے کہ یہاں بھی عمر کی کمی و زیادتی تقدیر معلق کے اعتبار سے ہے یعنی تقدیر میں یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص اگر نیکی کرے گا تو اتنی عمر ہوگی اور اگر نیکی نہ کرے گا تو اتنی عمر ہوگی۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لوح محفوظ میں اس طرح لکھا جاتا ہے کہ مثلاً اگر فلاں شخص حج کرے گا یا جہاد کرے گا تو اس کی عمر چالیس سال کی ہوگی اور اگر حج و جہاد دونوں کرے گا تو اس کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی لہٰذا اگر اس شخص نے حج بھی کیا اور جہاد بھی کیا تو اس کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی اس طرح اس کی عمر بڑھ گئی۔ اور اگر اس نے صرف جہاد ہی کیا یا صرف حج ہی کیا تو اس کی عمر چالیس ہوگی اس طرح اس کی عمر انتہاء عمر سے کہ وہ ساٹھ سال تھی کم ہوئی۔

بعض حضرات نے حدیث کے اس جملہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جس شخص نے نیکی کی اس کی عمر ضائع نہیں ہوئی پس گویا اس کی عمر زیادہ ہوئی اس اعتبار سے یہاں فرمایا گیا ہے کہ نیکی انسان کی عمر میں اضافہ کر دیتی ہے۔

دعا دافع بلا ہے

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِالدُّعَاءِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بلاشبہ دعا اس چیز کے لئے بھی نافع ہے جو پیش آ چکی ہے اور اس چیز کے لئے بھی نافع ہے جو پیش نہیں آئی ہے لہٰذا اے اللہ کے بندو! دعا کو اپنے لئے ضروری سمجھو۔" (ترمذی)

اس روایت کو احمدؒ نے معاذ بن جبل سے نقل کیا ہے نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: جو چیز پیش آ چکی ہے اس کے لئے دعا کے نافع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو مصیبت و بلا نازل ہو چکی ہے اگر وہ معلق ہوتی ہے تو دعا کرنے سے دفع ہو جاتی ہے اور انسان سکون و اطمینان پا لیتا ہے اور اگر وہ مبرم ہوتی ہے تو بھی دعا کا نفع ظاہر ہوتا ہے بایں طور کہ اللہ تعالیٰ اسے صبر کی طاقت عطا فرما دیتا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اس مصیبت و بلا کا تحمل اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور وہ اس پر راضی بھی ہو جاتا ہے بلکہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ وہ مصیبت و بلا میں مبتلا نہ ہو۔ کیونکہ صبر کی دولت حاصل ہو جانے کے بعد اس کا جذبہ اطاعت اتنا قوی ہو جاتا ہے اور مضبوط ہو جاتا ہے کہ وہ اس مصیبت و بلا میں بھی اسی طرح لذت و کیفیت محسوس کرتا ہے جیسا کہ خالص دنیا دار قسم کے لوگ نعمتوں اور راحتوں میں لذت و کیف پاتے ہیں۔

جو چیز پیش نہیں آئی اس کے لئے دعا بایں طور نافع ہوتی ہے کہ اس کو نازل ہونے سے روک دیتی ہے بشرطیکہ اس کا تعلق بھی تقدیر معلق سے ہو۔

(۱۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ اَحَدٍ يَدْعُوْا بِدُعَاءٍ اِلَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ مَا سَأَلَ اَوْكَفَّ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهُ مَالَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو بھی شخص دعا مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ یا تو اسے وہ چیز عطا فرما دیتا ہے جو وہ مانگتا ہے بشرطیکہ اس چیز کا دینا ازل میں اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہو) یا اس کے عوض میں اس سے برائی کو روک دیتا ہے یعنی اس چیز کا اگر دینا اس کے مقدر میں لکھا نہیں ہوتا تو اس کے عوض میں اللہ تعالیٰ اس کے مانگنے کے بقدر اس سے مصیبت و بلا کو دور کر دیتا ہے) جب تک وہ گناہ کی کوئی چیز یا ناتہ توڑنے کی دعا نہیں مانگتا۔" (ترمذی)

اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو

(۱۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّسْأَلَ وَاَفْضَلُ الْعِبَادَةِ اِنْتِظَارُ الْفَرَجِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگا جائے اور عبادت (یعنی دعا) کی سب سے بہتر چیز کشادگی کا انتظار کرنا ہے۔" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "کشادگی کا انتظار کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ دعا مانگنے والا غیر اللہ سے شکوہ و شکایت اور مایوسی کا اظہار کئے بغیر اس بات کا امیدوار رہے کہ وہ جس بلاء و غم کے دور ہونے کی دعا مانگ رہا ہے وہ انشاء اللہ ضرور دور ہو گا قبولیت دعا میں بظاہر چاہے کتنی ہی تاخیر ہو مگر وہ

امید و آس کا دامن ہرگز نہ چھوڑے اور کسی بھی مرحلہ پر خدا کی ذات اور اس کے فضل سے ایک لمحہ کے لئے بھی مایوس نہ ہو۔ گویا یہ اشارہ ہے صبر کی طرف کہ صبر کی طاقت نہ صرف یہ کہ انسان قوت ارادی میں زبردست اضافہ کا سبب بنتی ہے بلکہ اللہ کی ذات پر مکمل اعتماد و یقین اور بھروسہ کی اسپرٹ پیدا کرتی ہے اور ویسے بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ صبر کی جزاء اور اس کا انعام بے حد و بے حساب ہے۔

اللہ سے نہ مانگنا اللہ کی ناراضگی کا سبب

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ لَّمْ یَسْأَلِ اللّٰہَ یَغْضَبْ عَلَیْہِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے کیونکہ ترک دعا اللہ سے تکبر اور استغناء کی علامت ہے۔" (ترمذیؒ)

اللہ تعالیٰ عافیت مانگنے کو بہت پسند کرتا ہے

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ فُتِحَ لَہٗ مِنْکُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فُتِحَتْ لَہٗ اَبْوَابُ الرَّحْمَۃِ وَمَاسُئِلَ اللّٰہُ شَیْئًا یَعْنِی اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ اَنْ یُسْأَلَ الْعَافِیَۃَ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھولا گیا (یعنی جس شخص کو پورے آداب و شرائط کے ساتھ بہت دعا مانگنے کی توفیق عطا کی گئی تو سمجھو کہ اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دیئے گئے کیونکہ اس کی دعا کے نتیجے میں کبھی تو اس کی مانگی ہوئی چیز ملتی ہے اور کبھی مانگی ہوئی چیز کے بدلہ میں اس سے شر و برائی کو دور کر دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز نہیں مانگی جاتی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب بات یہ ہے کہ اس سے عافیت مانگی جائے۔" (ترمذی)

تشریح: حدیث کے آخری جز کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عافیت مانگنے کو بہت پسند کرتا ہے اس کے برابر اور کسی چیز کے مانگنے کو پسند نہیں کرتا۔

"عافیت کی معنی ہیں دنیا و آخرت کی تمام ظاہری و باطنی غیر پسندیدہ چیزوں تمام آفات و مصائب، تمام بیماریوں اور تمام بلاؤں سے سلامتی و حفاظت" لہٰذا عافیت، دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں پر حاوی ہے جس نے عافیت مانگی اس نے گویا دنیا و آخرت کی تمام ہی بھلائیاں مانگ لیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ عافیت مانگنے کو پسند کرتا ہے۔ نسال اللّٰہ العافیہ۔

سختیوں میں قبولیت دعا کا خواہشمند فراخی کے وقت زیادہ دعا مانگے

(۱۷) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَسْتَجِیْبَ اللّٰہُ لَہٗ عِنْدَ الشَّدَائِدِ فَلْیُکْثِرِ الدُّعَاءَ فِی الرَّخَاءِ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کے لئے یہ بات پسندیدگی اور خوشی کا باعث ہو کہ تنگی اور سختی کے وقت اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرے تو اسے چاہئے کہ وہ وسعت و فراخی کے زمانہ میں بہت دعا کرتا رہے۔" اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

دعا مانگتے وقت قبولیت کا یقین رکھو

(۱۸) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قبولیت دعا کا یقین رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ غافل اور کھیلنے والے دل کی دعا قبول نہیں کرتا یعنی اس شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی جس کا دل دعا مانگتے وقت اللہ تعالیٰ سے غافل اور غیر اللہ میں مشغول ہو امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ دعا کے وقت تمہیں ایسی حالت میں ہونا چاہئے جس کے سبب تم قبولیت دعا کے مستحق قرار پاؤ مثلاً اچھے کام میں مشغولیت اور برے کاموں سے اجتناب ہو دعا کی جو شرائط ہیں ان کی رعایت ہو رہی ہو مثلاً توجہ الی اللہ، حضور قلب اور اخلاص حاصل ہو۔ آخری بات یہ کہ تمہارے قلب پر قبولیت کا یقین و اعتماد، عدم قبولیت کی مایوسی پر غالب ہو۔ یا پھر مراد یہ ہے کہ دعا کے وقت تمہیں یہ کامل اعتماد حاصل ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وسیع و لامحدود فضل کی بناء پر تمہیں مایوس اور نا امید نہیں کرے گا اور تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔

دعا کے وقت ہاتھوں کا رخ

(۱۹) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوْهُ بِبُطُوْنِ اَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْاَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَلُوا اللّٰهَ بِبُطُوْنِ اَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْأَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا فَاِذَا فَرَغْتُمْ فَامْسَحُوْا بِهَا وُجُوْهَكُمْ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مالک بن یسارؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس وقت تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو اس سے اپنے ہاتھوں کے اندرونی رخ کے ذریعے مانگو اس سے اپنے ہاتھوں کے اوپر کے رخ کے ذریعہ نہ مانگو۔" ایک اور روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے ہاتھوں کے اندرونی رخ کے ذریعہ مانگو اور جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھوں کو اپنے منہ پر پھیر لو تاکہ وہ برکت جو ہاتھوں پر اترتی ہے منہ کو بھی پہنچ جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دعا مانگتے وقت جب ہاتھوں کو اٹھاؤ تو ان کو اس طرح رکھو کہ ہاتھوں کے اندر کا رخ یعنی ہتھیلیاں منہ کے سامنے رہیں جیسا کہ دعا کے وقت کا معمول ہے ہاتھوں کو الٹ کر دعا نہ مانگو حالت استسقاء اس حکم سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس وقت ہاتھوں کو الٹ کر ہی دعا مانگنا منقول ہے چنانچہ اسے باب الاستسقاء میں بیان کیا جا چکا ہے۔

ہاتھوں کی لاج رکھتا ہے

(۲۰) وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِيْ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اَنْ يَّرُدَّهُمَا صِفْرًا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت سلمانؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تمہارا پروردگار بہت حیا مند ہے یعنی وہ حاجت مندوں کا سا معاملہ کرتا ہے) وہ بغیر مانگے دینے والا ہے اور وہ اپنے بندہ سے حیا کرتا ہے کہ اسے خالی ہاتھ واپس کرے جب کہ اس کا بندہ اس کی طرف (دعا کے لئے) اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤدؒ، بیہقی)

دعا کے بعد اٹھے ہوئے ہاتھوں کو اپنے منہ پر پھیرنا سنّت ہے

(۲۱) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ لَمْ يَحُطَّهُمَا حَتّٰى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب دعا میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تو انہیں اس وقت تک نہ رکھتے جب تک کہ اپنے منہ پر نہ پھیر لیتے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: ان احادیث سے معلوم ہوا کہ دعا کے وقت اپنے ہاتھوں کو اٹھانا اور پھر دعا کے بعد انہیں اپنے منہ پر پھیرنا سُنّت ہے۔

آنحضرت ﷺ جامع دعائیں پسند کرتے تھے

(۲۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَحِبُّ الْجَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ وَيَدَعُ مَاسِوٰى ذٰلِكَ. (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ ان دعاؤں کو پسند فرماتے تھے جو جامع ہیں اور ان دعاؤں کو چھوڑ دیتے تھے جو جامع نہیں ہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: "جامع دعا" اس کو کہتے ہیں جس میں الفاظ تو کم ہوں مگر وہ دنیاوی اور اخروی امور کے بہت زیادہ معنی و مقصد پر حاوی ہو جیسے یہ دعائیں ہیں:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

"اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھلائی عطا کر اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔"

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِی الدِّيْنِ وَالدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

"اے اللہ! میں تجھ سے دین میں دنیا میں اور آخرت میں عفو و عافیت مانگتا ہوں۔"

اسی قسم کی اور بھی بہت سی جامع دعائیں ہیں جو احادیث میں منقول ہوئی ہیں۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ایسی دعاؤں کو ترک کئے ہوئے تھے جو جامع نہیں ہیں بلکہ کسی خاص مطلب و مقصد ہی کے بارہ میں ہیں مثلاً یہ دعا۔ اُرْزُقْنِی زَوْجَةً حَسَنَةً (اے اللہ) مجھے اچھی بیوی عطا فرما۔ لیکن اتنی بات ملحوظ رہے کہ یہ آپ ﷺ کی اکثر عادت کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ اکثر اور بہت زیادہ وہی دعائیں مانگتے تھے جو جامع ہیں ورنہ تو کبھی کبھی کسی خاص مطلب کے لئے بھی آپ ﷺ کا دعا مانگنا ثابت ہے۔

غائبانہ دعا جلد قبول ہوتی ہے

(۲۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَسْرَعَ الدُّعَاءِ اِجَابَةً دَعْوَةُ غَائِبٍ لِغَائِبٍ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بہت جلد قبول ہونے والی وہ دعا ہے جو غائب غائب کے لئے کرے۔" (ترمذی و ابوداؤد)

تشریح: جو شخص کسی کے لئے اس کی عدم موجودگی میں یعنی غائبانہ دعا کرتا ہے تو وہ دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے کیونکہ ایسی دعائیں کسی کو دکھانے سنانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ خلوص ہی خلوص ہوتا ہے۔

اچھے لوگوں سے طلب دعا

(۲۴) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ اِسْتَاذَنْتُ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِی الْعُمْرَةِ فَاَذِنَ لِیْ وَقَالَ اَشْرِكْنَا يَا اُخَیَّ فِیْ

دُعَائِكَ وَلاَ تَنْسَنَا فَقَالَ كَلِمَةً مَايَسُرُّنِيْ اَنَّ لِيْ بِهَا الدُّنْيَا۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَ التِّرْمِذِيُّ وَانْتَهَتْ رِوَايَتُهُ عِنْدَ قَوْلِهٖ وَلاَ تَنْسَنَا۔

"اور حضرت عمر بن خطاب راوی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے نبی کریم ﷺ سے ادائیگی عمرہ کے لئے اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے مجھے اجازت عطا فرمائی اور فرمایا کہ "اے میرے چھوٹے بھائی اپنی دعا میں ہمیں بھی شریک کر لینا اور دعا کے وقت مجھے نہ بھولنا! حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ اگر اس کے بدلہ میں مجھے تمام دنیا بھی دے دی جائے تو مجھے خوشی نہ ہوگی ابوداؤد (امام ترمذی) نے اس روایت کو لفظ وَلاَ تَنْسَنَا پر ختم کر دیا ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کا ارشاد فرمودہ وہ کلمہ جس کے بدلہ میں پوری دنیا حاصل کرنا بھی حضرت عمرؓ کے لئے باعث خوشی نہ ہوتا کیا تھا؟ اس بارہ میں دو احتمال ہیں ہو سکتا ہے کہ اس کلمہ سے مراد آنحضرت ﷺ کا یہی ارشاد ہو سکتا ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ سے ان کی عمرہ کے لئے روانگی کے وقت فرمایا "یعنی دعا میں شریک کرنا اور دعا کے وقت نہ بھولنا" لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر کوئی اور بات ارشاد فرمائی ہوگی۔ جو حضرت عمرؓ کے نزدیک تمام دنیا سے بھی زیادہ قیمتی اور گرانمایہ تھی اور اس بات کو یہاں حدیث میں نقل نہیں کیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے دعا کے لئے جو درخواست کی اس سے نہ صرف یہ کہ ذات نبوت کی طرف سے مرتبہ عبودیت اور مقام بندگی میں اپنے عجز اور اپنی مسکینی کا اظہار ہے بلکہ اس طرح اُمت کے لوگوں کو اس بات کی ترغیب بھی دلائی گئی ہے کہ خدا کے نیک اور عابد بندوں اور اچھے لوگوں سے دعاء خیر کی جائے چاہے کہ وہ مرتبہ کے لحاظ سے اپنے سے کم تر ہی کیوں نہ ہوں نیز اس موقع پر آپ ﷺ نے اس لطیف انداز میں گویا اُمت کو اس بات سے بھی آگاہ کر دیا کہ اپنی دعا کو صرف اپنی ذات ہی کے لئے مخصوص نہ کیا جائے بلکہ اپنی دعاؤں میں اور خاص طور پر ان دعاؤں میں جو مقام قبولیت پر مانگی جائیں اپنے عزیز و اقرباء اور اپنے دوستوں کو بھی شامل کیا جائے۔"

اور آخر میں ایک بات یہ بھی کہ اس حدیث سے حضرت عمر فاروقؓ کی عظمت و بزرگی کا اظہار ہوتا ہے آپ ﷺ نے ان سے دعا کی درخواست کر کے گویا ان کی عظمت و بزرگی اور ان کی فضیلت کی تصدیق کی۔

وہ خوش قسمت جن کی دعائیں رد نہیں ہوتیں

(۲۵) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلاَثَةٌ لاَ تُرَدُّ دَعْوَتُهُمُ الصَّائِمُ حِيْنَ يُفْطِرُ وَ الْاِمَامُ الْعَادِلُ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ فَوْقَ الْغَمَامِ وَيَفْتَحُ لَهَا اَبْوَابَ السَّمَاءِ وَيَقُوْلُ الرَّبُّ وَعِزَّتِيْ لَاَنْصُرَنَّكَ وَلَوْ بَعْدَ حِيْنٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرۃ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تین شخص ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی (۱) روزہ دار جب وہ افطار کرتا ہے (یعنی روزہ دار جب افطار کرتے وقت دعا کرتا ہے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے کیونکہ وہ عبادت کی ادئیگی کے بعد ہوتی ہے اور یہ کہ اس وقت عاجزی اور مسکینی کا پیکر ہوتا ہے (۲) لوگوں کا سردار حاکم جو عدل و انصاف کرے (کیونکہ حدیث میں منقول ہے ایک ساعت کا عدل ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے اس لئے اس فضیلت و شرف کی وجہ سے عادل سردار و حاکم کی دعا قبول ہوتی ہے (۳) مظلوم کی دعا جب مظلوم دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو بادلوں کے اوپر اٹھاتا ہے اور اس دعا کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور پروردگار فرماتا ہے کہ "قسم ہے مجھے اپنی عزت کی" میں تیری مدد ضرور کروں گا اگرچہ وہ کچھ مدت بعد ہی ہو (یعنی تیرا حق ضائع نہیں کروں گا اور تیری دعا کو رد نہیں کروں گا اگر مدت دراز گزر جائے۔" (ترمذی)

تشریح: مظلوم کی دعا کو بادلوں کے اوپر اٹھانا اور اس کے لئے آسمانوں کے دروازوں کا کھلنا دراصل کنایہ ہے اس بات سے کہ مظلوم کی

دعا اوپر پہنچتی ہے اور جلد قبول ہوتی ہے۔

(۲۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَكَّ فِيْهِنَّ دَعْوَةُ الْوَالِدِ وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں تین دعائیں قبول کی جاتی ہیں ان کی قبولیت میں کوئی شک نہیں ایک تو باپ کی دعا، دوسری مسافر کی دعا اور تیسری مظلوم کی دعا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: باپ کی دعا کا مطلب یہ ہے کہ باپ اپنی اولاد کے حق میں خواہ دعا کرے یا بددعا دونوں جلد قبول ہو جاتی ہیں اور جب باپ کی دعا قبول ہوتی ہے تو ماں کی دعا بطریق اولیٰ قبول ہوتی ہے اگرچہ یہاں حدیث میں ماں کی دعا کے بارہ میں ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن بات یہی ہے کیونکہ ماں اپنی اولاد کے حق میں باپ کی بہ نسبت بہت زیادہ شفیق ہوتی ہے۔

"مسافر کی دعا" کے بارہ میں دو احتمال ہیں یا تو یہ کہ مسافر کی دعا اس شخص کے حق میں قبول ہوتی ہے جو اس کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرتا ہے اور اس کی بددعا اس شخص کے حق میں قبول ہوتی ہے جو اسے تکلیف و ایذاء پہنچاتا ہے اور اس کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے، یا پھر یہ کہ مسافر کی دعا مطلقاً قبول ہوتی ہے خواہ وہ اپنے لئے کرے یا دوسرے کے لئے "مظلوم کی دعا" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مظلوم کی مدد کرتا ہے یا اس کو تسلی و تسکین دلاتا ہے اور مظلوم اس کے حق میں دعا کرتا ہے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے اسی طرح جو شخص مظلوم پر ظلم کرتا ہے یا جو شخص ظالم کی حمایت و تائید کر کے مظلوم کی ذہنی، روحانی اور جسمانی تکلیف و مصیبت میں اضافہ کرتا ہے اور مظلوم اس شخص کے حق میں بددعا کرتا ہے تو اس کی بددعا قبول ہوتی ہے۔ اسی طرح جو شخص ظالم کی حمایت و تائید کر کے مظلوم کی ذہنی روحانی اور جسمانی تکلیف و مصیبت میں اضافہ کرتا ہے اور مظلوم اس کے حق میں بددعا کرتا ہے تو اس کی بددعا قبول ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ حاجت بھی خدا ہی کے سامنے پیش کرو

(۲۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَسْأَلْ اَحَدُكُمْ رَبَّهٗ حَاجَتَهٗ كُلَّهَا حَتّٰى يَسْأَلَهٗ شِسْعَ نَعْلِهٖ اِذَا انْقَطَعَ زَادَ فِيْ رِوَايَةٍ عَنْ ثَابِتِ الْبُنَانِيِّ مُرْسَلًا حَتّٰى يَسْأَلَهُ الْمِلْحَ وَحَتّٰى يَسْأَلَهٗ شِسْعَهٗ اِذَا انْقَطَعَ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی تمام حاجتیں اپنے پروردگار سے مانگے یہاں تک کہ اگر اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اسے بھی خدا سے مانگو۔" ترمذیؒ نے ایک اور روایت میں جو ثابت بنانی سے بطریق ارسال نقل کی ہے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ یہاں تک کہ نمک بھی اس سے مانگے اور اگر جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اس سے مانگے۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: مصنف مشکوٰۃ کو چاہئے تھا۔ کہ وہ زادفی روایۃ کے بجائے یوں کہتے کہ رواہ الترمذی و زاد فی روایۃ دوسری روایت میں یہ جملہ حَتّٰى يَسْأَلَهٗ شِسْعَهٗ الخ اگر اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اسے بھی خدا ہی سے مانگے) مکرر ذکر کیا گیا ہے اور وہ اس لئے کہ یہ مکرر ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرے کہ خدا سے مانگنے میں کسی بھی مرحلہ پر سائل کے لئے کوئی رکاوٹ اور کسی بھی قسم کی کوئی محرومی نہیں ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے وہ جو کچھ بھی مانگتے ہیں خدا ان کو عطا کرتا ہے لہٰذا بندوں کو چاہئے کہ وہ اپنی ہر حاجت خواہ وہ کتنی ہی ادنی سے ادنی کیوں نہ ہو خدا ہی کے سامنے پیش کریں اسی سے اپنی ہر مراد مانگیں اسی کی اور صرف اسی کی ذات پر اعتماد کریں۔

ابو علیؒ دقاق فرماتے ہیں کہ یہ بات معرفت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اپنی ہر حاجت خواہ وہ بڑی سے بڑی ہو یا چھوٹی سے چھوٹی ہو اللہ تعالیٰ سے مانگی جائے اس موقع پر انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی بڑی عمدہ مثال پیش کی ہے کہ ایک طرف تو جب وہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے مشتاق ہوئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ سب سے بڑی اور سب سے عظیم الشان درخواست پیش کی کہ:

رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ — "اے میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تیری طرف (یعنی تجھے) دیکھوں۔"

دوسری طرف جب وہ نان جویں کے بھی محتاج ہوئے تو پروردگار ہی سے عرض کیا:

رَبِّ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ — "میرے پروردگار! تو نے میری طرف از قسم مال و رزق جو کچھ اتارے میں اس کے لئے محتاج ہوں۔"

دعا میں ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں؟

(۲۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَرْفَعُ یَدَیْہِ فِی الدُّعَاءِ حَتّٰی یُرٰی بَیَاضُ اِبْطَیْہِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ دعا کے وقت اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے تھے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔"

(۲۹) وَعَنْ سَھْلِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کَانَ یَجْعَلُ اِصْبَعَیْہِ حِذَاءَ مَنْکِبَیْہِ وَیَدْعُوْ۔

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنی دونوں انگلیوں یعنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے اپنے مونڈھوں کے برابر لے جاتے اور پھر دعا مانگتے۔"

تشریح: اس حدیث میں دعا کے وقت ہاتھوں کو اٹھانے کی جو مقدار بیان کی گئی ہے ہاتھوں کو اٹھانے کا یہی اوسط درجہ ہے اور آنحضرت ﷺ دعا کے وقت اکثر اپنے ہاتھوں کو اتنا ہی اٹھاتے تھے جہاں تک اس سے پہلی حدیث کا تعلق ہے کہ جس سے ہاتھوں کو زیادہ اوپر اٹھانا معلوم ہوتا ہے تو یہ صورت بعض اوقات پر محمول ہے یعنی جب دعا میں بہت ہی زیادہ استغراق، مبالغہ اور محویت منظور ہوتی تھی مثلاً استسقاء یا سخت آفات پر مصائب کے وقت تو آپ ﷺ اس موقع پر اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے تھے کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔

آپ دعا کے بعد منہ پر ہاتھ اسی وقت پھیرتے جب ہاتھوں کو اٹھاتے

(۳۰) وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ یَزِیْدَ عَنْ اَبِیْہِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا دَعَا فَرَفَعَ یَدَیْہِ مَسَحَ وَجْھَہٗ بِیَدَیْہِ۔ رَوَی الْبَیْھَقِیُّ الْاَحَادِیْثَ الثَّلَاثَۃَ فِی الدَّعْوَاتِ الْکَبِیْرِ۔

"اور سائب ابن یزید اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب دعا مانگتے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تو اپنے منہ پر دونوں ہاتھوں کو پھیرتے۔" (مذکورہ بالا تینوں حدیثیں بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہیں۔"

تشریح: علامہ طیبی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ دعا کے بعد ہاتھوں کو منہ پر اسی وقت پھیرتے جب کہ دعا کے وقت ہاتھوں کو اٹھاتے اگر دعا کے وقت آپ ﷺ ہاتھوں کو نہ اٹھاتے تو انہیں منہ پر پھیرتے بھی نہیں تھے لہٰذا نماز کی حالت میں طواف میں، سونے کے وقت، کھانے کے بعد اور اسی طرح دیگر مواقع پر آپ ﷺ سے جو دعائیں اور دعاؤں کے وقت ہاتھوں کو نہ اٹھانا منقول ہے تو آپ ﷺ ان مواقع پر ہاتھوں کو منہ پر پھیرتے بھی نہیں تھے۔

دعا کا ادب

(۳۱) وَعَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ الْمَسْأَلَةُ اَنْ تَرْفَعَ يَدَيْكَ حَذْوَ مَنْكِبَيْكَ اَوْنَحْوَهُمَا وَالْاِسْتِغْفَارُ اَنْ تُشِيْرَ بِاِصْبَعٍ وَاحِدَةٍ وَالْاِبْتِهَالُ اَنْ تَمُدَّ يَدَيْكَ جَمِيْعًا وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ وَالْاِبْتِهَالُ هٰكَذَا وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَجَعَلَ ظُهُوْرَهُمَا مِمَّا يَلِيْ وَجْهَهُ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "سوال (دعا) کرنے کا ادب طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں کے برابر یا ان کے قریب تک اٹھاؤ استغفار کا ادب یہ ہے کہ تم اپنی انگلی کے ذریعہ اشارہ کرو اور دعا میں انتہائی عجز و مبالغہ اختیار کرنا یہ ہے کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں کو اکٹھے دراز کرو یعنی اتنے اٹھاؤ کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگے۔" (ابوداؤدؒ)

ایک روایت میں یوں ہے کہ انہوں نے کہا "دعا میں انتہائی عاجزی کا اظہار اس طرح ہے اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور ان کی پشت کو اپنے منہ کے قریب کیا (یعنی جس طرح کہ استغفار کے وقت ہاتھوں کو اٹھایا جانا منقول ہے) ابوداؤدؒ۔

تشریح: "ایک انگلی کے ذریعہ اشارہ کرو" میں انگلی سے مراد سبابہ ہے کہ جسے شہادت کی انگلی کہتے ہیں اور مقصود اس سے سبّ ہے یعنی نفس امارہ اور شیطان ملعون کو ملامت کرنا اور ان کی برائیوں سے پناہ مانگنا اس موقع پر "ایک" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ دونوں انگلیوں سے اشارہ کرنا مکروہ ہے چنانچہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دو انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا تو اس سے فرمایا کہ "ایک انگلی سے اشارہ کرو، ایک انگلی سے اشارہ کرو۔"

حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے دعا میں انتہائی عجز کے اظہار کا طریقہ عمل کے ذریعہ بتایا چنانچہ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اتنا زیادہ اٹھایا کہ بغلوں کی سفیدی ظاہر ہونے لگی اور ہاتھ سر کے برابر پہنچ گئے۔

ہر دعا کے وقت ہاتھوں کو بہت زیادہ اٹھانا بدعت ہے

(۳۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّ رَفْعَكُمْ اَيْدِيَكُمْ بِدْعَةٌ مَازَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى هٰذَا يَعْنِيْ اِلَى الصُّدُوْرِ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "تمہارا اپنے ہاتھوں کو بہت زیادہ" اٹھانا بدعت ہے آنحضرت ﷺ اکثر اس سے زیادہ یعنی سینہ سے زیادہ اوپر نہیں اٹھاتے تھے۔" (احمدؒ)

تشریح: حضرت ابن عمرؓ نے ہاتھوں کو زیادہ اٹھانے کو بدعت اس لئے کہا کہ وہ لوگ اپنے ہاتھوں کو اکثر اوقات بہت ہی زیادہ اٹھانے لگے تھے اور حالات و مواقع میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے حالانکہ انہیں چاہئے تھا کہ وہ ایک مقصد کے لئے تو ہاتھوں کو سینہ تک اٹھاتے اور مونڈھوں تک دوسرے مقصد کے لئے، اسی طرح اور مقصد کے لئے مونڈھوں سے اوپر اٹھاتے۔

اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں سمجھئے کہ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ اٹھانے کی مقدار کا فرق حالات و مواقع کے اختلاف پر مبنی تھا کہ آپ ﷺ اکثر تو اپنے ہاتھ سینے تک اٹھاتے تھے، بعض مواقع پر مونڈھوں تک اٹھاتے اور کسی خاص موقع پر مونڈھوں سے اوپر بھی اٹھاتے تھے لیکن حضرت ابن عمرؓ نے جو لوگوں کو یہ تنبیہ کی وہ مواقع اور حالات کے اختلاف کو مد نظر نہیں رکھتے تھے بلکہ ہر موقع پر اور ہر دعا کے وقت اپنے ہاتھوں کو بہت ہی زیادہ اوپر اٹھانے لگے تھے اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے ان کے اس طرز عمل سے بیزاری کا اظہار کیا اور اسے سُنّت کے خلاف قرار دیا۔

کسی کے لئے دعا کرتے وقت اپنی ذات کو مقدم رکھو

(۳۳) وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَکَرَ اَحَدًا فَدَعَا لَہٗ بَدَأَ بِنَفْسِہٖ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کسی کا ذکر کرتے اور پھر اس کے لئے دعا کرتے (یعنی اس کے لئے دعا کرنے کا ارادہ کرتے) تو پہلے اپنے لئے دعا کرنا شروع کرتے اس کے بعد اس شخص کے لئے دعا کرتے امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب صحیح ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں اُمت کے لئے تعلیم ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے لئے دعا کرے تو اپنے لئے دعا کرے پھر اس شخص کے لئے کرے مثلاً اس طرح دعا کرے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَلِفُلَانٍ — "اے اللہ میری اور فلاں شخص کی مغفرت فرما۔"

دعا کے نتیجے میں تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور حاصل ہوتی ہے

(۳۴) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَدْعُوْ بِدَعْوَۃٍ لَیْسَ فِیْھَا اِثْمٌ وَلَا قَطِیْعَۃُ رَحِمٍ اِلَّا اَعْطَاہُ اللّٰہُ بِھَا اِحْدٰی ثَلَاثٍ اِمَّا اَنْ یُّعَجِّلَ لَہٗ دَعْوَتَہٗ وَاِمَّا اَنْ یَّدَّخِرَھَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ وَاِمَّا اَنْ یَّصْرِفَ عَنْہُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَھَا قَالُوْا اِذًا نُکْثِرُ قَالَ اللّٰہُ اَکْثَرُ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو بھی مسلمان کوئی دعا مانگتا ہے ایسی دعا کہ اس میں نہ تو گناہ کی کسی چیز کی طلب ہو اور نہ ناتہ توڑنے کی تو اللہ تعالیٰ اسے اس دعا کے نتیجے میں تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور دیتا ہے یا تو یہ کہ جلدی ہی اس کا مطلوب عطا فرمادے یا یہ کہ اس کے لئے اس دعا کو ذخیرۂ آخرت بنادے "کہ دنیا میں اس کا مطلوب حاصل نہ ہونے کی صورت میں اس کے عوض آخرت میں اجر عطا کرتے) یا یہ کہ اسے اس کی دعا کے بقدر برائی سے بچائے" صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم تو اب بہت زیادہ دعائیں مانگیں گے کیونکہ ہمیں دعا کے بڑے بڑے فائدے معلوم ہوگئے آپ نے فرمایا "اللہ کا فضل بہت زیادہ ہے۔" (احمد)

تشریح: "اللہ تعالیٰ کا فضل بہت زیادہ ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہاری دعا کے نتیجہ میں تمہیں جو کچھ عطا فرماتا ہے اس کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ ہے جو وہ تمہیں مانگے بغیر محض اپنے بے پایاں فضل اور وسیع کرم سے دیتا ہے۔

وہ پانچ دعائیں جو رد نہیں ہوتیں

(۳۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ خَمْسُ دَعَوَاتٍ یُسْتَجَابُ لَھُنَّ دَعْوَۃُ الْمَظْلُوْمِ حَتّٰی یَنْتَصِرَ وَدَعْوَۃُ الْحَاجِّ حَتّٰی یَصْدُرَ وَدَعْوَۃُ الْمُجَاھِدِ حَتّٰی یَقْعُدَ وَدَعْوَۃُ الْمَرِیْضِ حَتّٰی یَبْرَأَ وَدَعْوَۃُ الْاَخِ لِاَخِیْہِ بِظَھْرِ الْغَیْبِ ثُمَّ قَالَ وَاَسْرَعُ ھٰذِہِ الدَّعَوَاتِ اِجَابَۃً دَعْوَۃُ الْاَخِ بِظَھْرِ الْغَیْبِ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِی الدَّعَوَاتِ الْکَبِیْرِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا پانچ دعائیں ہیں جنہیں شرف قبولیت سے نوازا جاتا ہے (۱) مظلوم کی دعا یہاں تک کہ وہ ظالم سے اپنے ہاتھ سے یا اپنی زبان کے ذریعہ بدلہ لے لے۔ (۲) حاجی کی دعا یہاں تک کہ وہ اپنے شہر اور اپنے اہل و عیال کے پاس واپس آجائے یا حج سے فارغ ہو جائے (۳) جہاد کرنے والے کی دعا یا طلب علم و عمل میں سعی و کوشش کرنے والے کی دعا) یہاں تک کہ وہ جہاد و سعی و کوشش سے فارغ ہو کر بیٹھ جائے) (۴) مریض کی دعا یہاں تک کہ وہ اچھا ہو جائے یا مر جائے (۵) ایک بھائی کی اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا۔" پھر اس کے بعد آپ نے فرمایا "ان دعاؤں میں سب سے جلدی قبول ہونے والی ایک بھائی کی

اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا ہے۔"

بَابُ ذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالتَّقَرُّبِ اِلَى اللّٰهِ

ذکر اللہ اور تقرب الی اللہ کا بیان

تقرب الی اللہ یعنی خدا کا قرب و نزدیکی حاصل کرنے سے "ذکر اللہ کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل کرنا" بھی مراد ہو سکتا ہے "اور نوافل کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔

ذکر اللہ کی قسمیں

ذکر اللہ (اللہ کا ذکر) دل سے بھی ہوتا ہے اور زبان سے بھی اور افضل یہ ہے کہ دل اور زبان دونوں سے اللہ کا ذکر ہو اور اگر ان میں سے کسی ایک سے ہو تو پھر دل کا ذکر افضل ہے، اب ذکر بالقلب (دل سے اللہ کے ذکر) کی بھی دو قسمیں ہیں ایک قسم تو یہ ہے "خدا کی عظمت میں، جبروت و ملکوت میں اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں جو زمین و آسمان میں ہیں، غور و فکر اور "استغراق!" اس قسم کے ذکر کو ذکر خفی کہتے ہیں۔

حدیث شریف میں منقول ہے کہ وہ ذکر خفی ستر درجہ افضل ہے جسے حفظہ (یعنی اعمال لکھنے والے فرشتے) بھی نہیں سنتے چنانچہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو حساب کتاب کے لئے جمع کرے گا تو حفظہ (اعمال لکھنے والے فرشتے) وہ تمام ریکارڈ لے کر حاضر ہوں گے جنہیں انہوں نے اپنی نوشت اور یادداشت میں محفوظ کر رکھا ہو گا وہ تمام ریکارڈ دیکھ کر اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ دیکھو میرے بندوں کے اعمال میں اور کیا چیز باقی رہ گئی ہے (جو تمہارے اس ریکارڈ میں نہیں ہے) وہ عرض کریں گے! پروردگار! بندوں کے اعمال کے سلسلہ میں جو کچھ بھی ہمیں معلوم ہوا اور جو کچھ بھی ہم نے یاد رکھا ہم نے اسے اس ریکارڈ میں جمع کر دیا ہے، اس ریکارڈ میں ہم نے ایسی کوئی چیز محفوظ کرنے سے نہیں چھوڑی جس کی ہمیں خبر ہوئی تب اللہ تعالیٰ بندہ کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ میرے پاس تیری ایسی نیکی محفوظ ہے جسے کوئی نہیں جانتا اور وہ ذکر خفی ہے میں تجھے اس نیکی کا اجر عطا کروں گا۔"

ذکر بالقلب کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جو احکام دیئے ہیں خواہ ان کا تعلق امر (کرنے) سے ہو یا نہی (نہ کرنے سے) ان کی ادائیگی کے وقت آنے پر اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے۔ ذکر بالقلب کی ان دونوں قسموں میں پہلی قسم افضل و اعلیٰ ہے بعض فقہاء کہتے ہیں کہ ذکر کا اطلاق صرف زبان کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنے پر ہوتا ہے اور قول مختار کے مطابق اس کا ادنی درجہ یہ ہے کہ "وہ اپنے تئیں سنائے۔ یعنی ذکر کرنے والے کی زبان کم سے کم اس درجہ میں جاری ہو کہ وہ خود سن لے ان فقہاء کے کہنے کے مطابق اس درجہ سے کم کا ذکر معتبر نہیں۔ نیز یہ فقہاء یہ کہتے ہیں کہ دل کے ذکر کی حیثیت از قسم علم و تصور قلب کے فعل کی تو ہے، لیکن اسے ذکر نہیں کہیں گے۔ ذکر اسی کو کہیں گے جس کا تعلق زبان کی ادائیگی سے ہو۔ اب نہیں کہا جاسکتا کہ اس بات سے ان فقہاء کا مقصود کیا ہے؟ اگر مطلب یہ ہے کہ لغوی طور پر "فعل قلب پر" ذکر کا اطلاق نہیں ہوتا تو یہ بات اس چیز کے خلاف ہے جو لغت کی کتابوں میں موجود ہے چنانچہ صحاح اور قاموس میں لکھا ہے کہ "ذکر نسیان کی ضد ہے" اور ظاہر ہے کہ یہ خود قلب کا فعل ہے کیونکہ جس طرح نسیان (بھول) کا تعلق قلب سے ہے اسی طرح اس کی ضد یعنی ذکر (یاد) کا تعلق بھی قلب ہی سے ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جو کچھ زبان سے ادا ہوتا ہے اسے بھی ذکر کہا جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ لفظ ذکر فعل قلب اور فعل لسان دونوں کے درمیان مشترک ہے جس طرح فعل قلب کو ذکر کہتے ہیں اسی طرح فعل لسان کو بھی ذکر کہا جاتا ہے لہٰذا جیسے ذکر باللسان معتبر ہے ایسے ہی ذکر بالقلب بھی معتبر ہے بلکہ ذکر بالقلب ہی افضل ہے۔ مشائخ طریقت رحمہم

اللہ بھی فرماتے کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں قلبی اور لسانی اور ذکر قلبی کا اثر لسانی کے اثر سے کہیں زیادہ قوی اور افضل ہے۔

جن فقہاء نے ذکر قلبی کا انکار کیا ہے ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ شریعت نے جن مواقع پر ذکر باللسان کی تعلیم دی ہے جیسے تسبیحات، قرأت نماز اور نماز کے بعد کے اذکار و اوراد وغیرہ تو وہاں قلبی ذکر کافی نہیں ہوتا بلکہ لسانی ذکر ہونا چاہئے ان فقہاء کی مراد یہ نہیں ہے کہ ذکر قلبی پر اخروی ثواب مرتب نہیں ہوتا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ذکر کرنے والوں کی فضیلت

(۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ وَاَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ دونوں راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب بھی کوئی جماعت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے بیٹھتی ہے تو ان کو وہ فرشتے گھیر لیتے ہیں (جو راستوں پر اہل ذکر کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں) ان کو رحمت اپنی آغوش میں لے لیتی ہے (وہ خاص رحمت جو ذَاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذَّاكِرَاتِ کے لئے مخصوص ہے) ان پر سکینہ کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان ذکر کرنے والوں کا تذکرہ اپنے پاس والوں (یعنی ملائکہ مقربین اور ارواح انبیاء) میں کرتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: "سکینہ" دل کے سکون و اطمینان اور خاطر جمعی کا نام ہے جس کے باعث دنیا کی لذتوں کی خواہش اور ماسوا اللہ کی لذت و طلب دل سے نکل جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں استغراق و استحضار اور اس کی طرف توجہ کی سعادت نصیب ہوتی ہے سکینہ کا نازل ہونا اس آیت سے بھی ثابت ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔ "آگاہ! اللہ کے ذکر کے ذریعہ قلوب کو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے۔"

(۲) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسِيْرُ فِیْ طَرِيْقِ مَكَّةَ فَمَرَّ عَلٰى جَبَلٍ يُقَالُ لَهٗ جُمْدَانُ فَقَالَ سِيْرُوْا هٰذَا جُمْدَانُ سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ قَالُوْا وَمَا الْمُفَرِّدُوْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الذَّاكِرُوْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذَّاكِرَاتُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ مکہ کے راستہ پر چلے جا رہے تھے کہ ایک پہاڑ کے پاس سے گزرے جس کا نام جمدان تھا آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا "چلے چلو یہ جمدان ہے، مفردون سبقت لے گئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مفردون کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "وہ مرد جو اللہ کو بہت یاد کریں۔ اور وہ عورتیں جو اللہ کو بہت یاد کریں۔" (مسلم)

تشریح: ما المفردون۔ (مفردون کون ہیں؟" درحقیقت صحابہؓ نے صفت کے بارہ میں سوال کیا کہ مفردون کی صفت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے اپنے مذکورہ بالا جواب کے ذریعہ مفردون کی صفت کی طرف اشارہ کیا کہ حقیقی تنہائی جو لائق اعتبار ہے وہ اللہ کی یاد کے لئے نفس کی تنہائی ہے"

منقول ہے کہ جب آنحضرت ﷺ مکہ سے آتے ہوئے اپنے رفقاء سمیت جمدان پہاڑ کے پاس پہنچے جو مدینہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ہے تو صحابہؓ کو اپنے گھر جلد سے جلد پہنچنے کا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ بعض صحابہؓ اپنے بقیہ ہم قافلہ لوگوں سے جدا ہو کر تیزی سے آگے بڑھ گئے تاکہ وہ دوسروں سے پہلے ہی اپنے وطن پہنچ جائیں جو صحابہؓ پیچھے رہ گئے تھے آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ گھر قریب آ پہنچا ہے جلد چلو کیونکہ مفردون (یعنی قافلہ سے الگ ہو جانے والے آگے پہنچ گئے ہیں اسی موقع پر صحابہؓ نے مفردوں کی صفت پوچھی۔ آپ ﷺ نے جو جواب دیا اس کا حاصل یہ تھا کہ ان مفردون (یعنی اس وقت ہم سے آگے نکل گئے ہیں) کے بارہ میں کیا پوچھتے ہو؟ ان کا مطلب تو ظاہر

ہی ہے کہ یہ لوگ گھر جلد پہنچنے کے لئے ہم سے سبقت لے گئے ان لوگوں کے بارہ میں پوچھو جو نیکیوں میں سبقت لے جاتے ہیں تو سنو کہ نیکیوں میں سبقت کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر کے لئے تنہاء اور علیحدہ کرتے ہیں یعنی وہ لوگوں سے منقطع ہو کر اور گوشہ نشینی اختیار کر کے اکثر ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں۔

"اللہ کو بہت یاد کرنے" سے مراد یہ ہے کہ بغیر کسی غفلت و کوتاہی کے ذکر اللہ پر ہمیشگی اختیار کرے اگر کوئی غفلت و کوتاہی ہو بھی جائے تو اسے فوراً ختم کر کے ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نماز کے بعد اور صبح و شام، سوتے بیٹھتے اور اسی طرح حدیث میں منقول دوسرے مواقع پر ذکر کرنے سے کثرت ذکر "اللہ کو بہت یاد کرنے) کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

ذکر کرنے والے اور ذکر نہ کرنے والے کی مثال

(٣) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ رَبَّہٗ وَالَّذِیْ لَا یَذْکُرُ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو موسیٰؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے پروردگار کو یاد کرتا ہے اور جو شخص اپنے پروردگار کو یاد نہیں کرتا ان دونوں کی مثال زندہ شخص اور مردہ شخص کی سی ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ذکر اللہ ذاکر کے قلب کی حیات ہے اور اس سے غفلت قلب کی موت ہے اور جس طرح کہ زندہ شخص اپنی زندگی سے بہرہ ور ہوتا ہے اسی طرح ذکر کرنے والا اپنے عمل سے بہرہ ور ہوتا ہے اور جس طرح مرنے کے بعد مردہ کو اپنی زندگی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اسی طرح ذکر اللہ سے غافل رہنے والا اپنے عمل سے بہرہ مند نہیں ہوتا کسی نے خوب کہا ہے ؂

زندگانی نتواں گفت حیاتے کہ مراست زندہ آنست کہ با دوست وصالے دارد

ذکر تقرب الٰہی کا باعث

(٤) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَہٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ فَاِنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ نَفْسِہٖ ذَکَرْتُہٗ فِیْ نَفْسِیْ وَاِنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ مَلَاءٍ ذَکَرْتُہٗ فِیْ مَلَاءٍ خَیْرٍ مِّنْھُمْ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارہ میں رکھتا ہے جب وہ دل سے یا زبان سے مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے پاس ہوتا ہوں پس اگر وہ اپنے ذات میں یعنی خفیہ طور پر اپنے دل میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنی ذات میں یاد کرتا ہوں یعنی نہ کہ اس کو صرف پوشیدہ طور پر ثواب دیتا ہوں بلکہ اس کو از خود ثواب دیتا ہوں ثواب دینے کا کام کسی اور کے سپرد نہیں کرتا اگر وہ مجھے جماعت میں (یعنی ظاہری طور پر) یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کا ذکر جماعت میں کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے بہتر ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ (میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں) کا مطلب یہ ہے کہ میرا بندہ میری نسبت جو گمان و خیال رکھتا ہے میں اس کے لئے ایسا ہی ہوں اور اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جس کی وہ مجھ سے توقع رکھتا ہے اگر وہ مجھ سے عفو و معافی کی امید رکھتا ہے تو اس کو معافی دیتا ہوں اور اگر وہ میرے عذاب کا گمان رکھتا ہے تو پھر عذاب دیتا ہوں۔

اس ارشاد کے ذریعہ گویا ترغیب دلائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کی امید اس کے عذاب کے خوف پر غالب ہونی چاہئے اور اس کے بارہ میں اچھا گمان رکھنا چاہئے کہ وہ مجھے اپنی بے پایاں بخشش اور لا محدود رحمت سے نوازے گا۔ ایک

روایت میں مذکور ہے کہ اللہ ایک شخص کو دوزخ میں لے جانے کا حکم کرے گا جب اسے کنارہ دوزخ پر کھڑا کیا جائے گا تو وہ عرض کرے گا کہ "اے میرے رب تیرے بارے میں میرا گمان اچھا تھا۔" اللہ تعالیٰ فرمائے گا "کہ اس کو واپس لے آؤ میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارہ میں رکھتا ہے۔" امید کا مطلب اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ عمل کیا جائے اور پھر بخشش کا امیدوار رہے بغیر عمل صرف امید ہی پر تکیہ کر لینا ٹھنڈے لوہے کو کوٹنا ہے یعنی ایسی امید کا کوئی فائدہ نہیں۔ "جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے پاس ہوتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو شخص میری یاد میں مشغول رہتا ہے تو میں اسے مزید نیکیوں اور بھلائیوں کی توفیق دیتا ہوں اس پر رحمت نازل کرتا ہوں اور اس کی مدد و حفاظت کرتا ہوں۔

خدا کی طرف بندہ کی تھوڑی سی توجہ بندہ کی طرف خدا کی زیادہ توجہ کا باعث

⑤ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَاَزِیْدُ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّیِّئَةِ فَجَزَاءُ سَیِّئَةٍ مِّثْلُهَا اَوْ اَغْفِرُ وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّیْ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّیْ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً وَمَنْ لَقِیَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطِیْئَةً لَا یُشْرِكُ بِیْ شَیْئًا لَقِیْتُهٗ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو اس جیسی دس نیکیوں کے برابر ثواب ملتا ہے اور اس سے زیادہ بھی دیتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اس کو اس سے صدق و اخلاص کی مطابق سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب دیتا ہوں) جو شخص کوئی برائی کرتا ہے تو اس کو اسی برائی کے برابر سزا ملتی ہے یا میں اسے بھی معاف کر دیتا ہوں) جو شخص اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعے ایک بالشت (یعنی بقدر قلیل) میری طرف آتا ہے تو میں ایک گز اس کی طرف آتا ہوں (یعنی میں اس کی توجہ و التفات سے کہیں زیادہ اس پر اپنی رحمت کے دروازے کھولتا ہوں جو شخص میری طرف ایک گز آتا ہے میں اس کی جانب دونوں ہاتھوں کے پھیلانے کے برابر بڑھتا ہوں۔ جو شخص میری طرف اپنی چال سے آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں اور جو شخص زمین کے برابر بھی گناہ لے کر مجھ سے ملے گا بشرطیکہ اس نے میرے ساتھ شریک نہ کیا ہو یعنی شرک میں مبتلا نہ ہو تو اگر میں چاہوں گا) اگر میں چاہوں گا تو اس کو زمین کے برابر ہی مغفرت عطا کروں گا۔" (مسلم)

تشریح: اللہ تعالیٰ کتنا رحیم و کریم ہے اس کی رحمت کتنی وسیع ہے اپنے بندوں پر وہ کتنا مہربان ہے اس کی شان عفو کس قدر بے پایاں ہے اور اس کا فضل کس قدر بے کراں ہے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اس حدیث سے ہو جاتا ہے۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اگر بندہ خدا کی طرف تھوڑی سی بھی توجہ اور رجوع کرتا ہے تو اس کی طرف بارگاہ الٰہی سے اس کی توجہ کہیں زیادہ توجہ، التفات اور رحمت اس کی طرف منعطف ہوتی ہے۔

تقرب الٰہی کا ثمرہ

⑥ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَكْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَكْرَهُ مَسَاءَتَهٗ وَلَا بُدَّ لَهٗ مِنْهُ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص میرے ولی کو ایذا پہنچاتا ہے تو میں اس کے ساتھ اپنی لڑائی کا اعلان کرتا ہوں اور میرا کوئی بندۂ مؤمن) میرا تقرب (اعمال میں سے) ایسی کسی چیز کے ذریعہ حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ہو جیسے ادائیگی فریضہ کے ذریعہ میرا تقرب حاصل ہے ہمیشہ نوافل کے ذریعہ (یعنی ان طاعات و عبادات کے ذریعہ جو فرائض کے علاوہ اور فرائض سے زائد ہیں میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا دوست بنالیتا ہوں۔ (کیونکہ وہ فرائض و نوافل دونوں کو اختیار کرتا ہے) اور جب میں اسے اپنا دوست بنالیتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں کہ وہ اسی کے ذریعہ سنتا ہے میں اس کی بینائی بن جاتا ہوں وہ اسی کے ذریعہ دیکھتا ہے میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ اسی کے ذریعہ پکڑتا ہے میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں کہ وہ اسی کے ذریعہ چلتا ہے اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور وہ برائیوں اور مکروہات سے میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں اور جس کام کو میں کرنے والا ہوں اس میں اس طرح تردد نہیں کرتا جس طرح کہ میں بندہ مؤمن کی جان قبض کرنے میں تردد کرتا ہوں کیونکہ وہ موت کو پسند نہیں کرتا حالانکہ اس کی ناپسندیدگی کو میں ناپسند کرتا ہوں اور موت سے کسی حال میں مفر نہیں ہے۔" (بخاری)

تشریح: فقد اذنتہ بالحرب کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے یعنی جو شخص میرے ولی کو ایذا پہنچاتا ہے اس کی اس انتہائی قابل نفرین حرکت کی وجہ سے میں اس کے ساتھ اپنی لڑائی کا اعلان کرتا ہوں یا مطلب یہ کہ میں اپنے ساتھ اس کی لڑائی کا اعلان کرتا ہوں پس وہ شخص میرے ولی کو ایذا پہنچا کر گویا مجھ سے لڑنے والا ہے ائمہ کہتے ہیں کہ ایسا کوئی گناہ نہیں ہے کہ جس کے مرتکب کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ اس سے اعلان جنگ کرتا ہے علاوہ اس گناہ یعنی خدا کے کسی محبوب بندہ اور ولی کو ایذا پہنچانے کے اور سود کھانے کے، سود کھانے والوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ پس اگر تم اس سے باز نہیں آتے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ دونوں گناہ نہایت ہی قابل نفرین اور بدترین ہیں اور ان دونوں میں دنیا اور آخرت دونوں کی مکمل تباہی کا خطرہ ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بندہ سے اللہ کی لڑائی اس کے خاتمہ بد پر دلالت کرتی ہے کیونکہ جس سے اللہ تعالیٰ لڑا وہ کبھی فلاح و نجات نہیں پاسکتا۔ "جو میں نے اس پر فرض کی ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی چیزیں میں نے اس پر واجب کی ہیں یعنی اوامر (یعنی جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کی فرمانبرداری! اور مناہی (یعنی جن چیزوں کے بچنے کا حکم دیا گیا ہے ان سے اجتناب ان چیزوں کو اختیار کر کے جو بندہ اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے وہ سب سے زیادہ محبوب ہے ان چیزوں کے برابر اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کو اختیار کر کے بندہ اس درجہ کا تقرب حاصل کر سکے "میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں الخ اس بارہ میں علامہ خطابیؒ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس بندہ پر ان افعال و اعمال کو آسان کر دیتا ہوں جن کا تعلق ان اعضاء سے ہے اور اس کو ان اعمال و افعال کے کرنے کی توفیق دیتا ہوں یہاں تک گویا وہ اعضاء ہی بن جاتا ہوں۔

بعض علماء نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ کے حواس اور اس کے اعضاء کو اپنی رضا و خوشنودی کا وسیلہ بنا دیتا ہے چنانچہ وہ بندہ اپنے کان سے صرف وہی بات سنتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے یا اسی طرح وہ اپنی آنکھ سے صرف انہیں چیزوں کو دیکھتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ بعض حضرات اس کا مطلب یہ لکھتے ہیں کہ اللہ رب العزت اس بندہ پر اپنی محبت غالب کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسی چیز کو دیکھتا ہے جس کو اللہ پسند کرتا ہے اور وہ اس چیز کو سنتا ہے جس کو اللہ پسند کرتا ہے اور اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ اس کا مددگار کارساز ہوتا ہے اور اس کے کان، اس کی آنکھ، اس کے ہاتھ اور اس کے پاؤں کو ان چیزوں سے بچاتا ہے جنہیں وہ پسند نہیں کرتا۔ "میں تردد کرتا ہوں" یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنی اس عنایت کے سبب جو اس بندہ کے شامل حال ہوتی ہے اس کی زندگی ختم کرنے میں تردد کرتا ہوں کیونکہ موت اس کے لئے کوئی پسندیدہ شے نہیں ہوتی لیکن موت سے چونکہ مفر نہیں اور یہ طے شدہ امر ہے کہ اس دنیا میں جو بھی جاندار آیا ہے اس کو موت کی آغوش میں ضرور ہی جانا ہے اس لئے اس کو موت دیتا ہوں پھر یہ کہ اس کی موت

بھی اس کے لئے بھلائی کا ہی سبب ہوتی ہے کیونکہ وہ موت کے بعد ہی عظیم الشان سعادتوں اور درجات عالیہ کو پہنچتا ہے مثلاً حضور باری تعالیٰ اور جنت وغیرہ کی لازوال نعمتیں موت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہیں۔ اس موقع پر یہ بات جان لیجئے کہ تردد کے معنی ہیں ایسی دو چیزوں کے درمیان تحیر اور پس وپیش کرنا جن کے بارہ میں یہ یقینی علم نہ ہو کہ ان دونوں میں سے کون سی چیز زیادہ بہتر ہے" ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات پر "تردد کے اس معنی کا اطلاق قطعاً ناممکن اور محال ہے لہٰذا حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے کسی فیصلہ کو پورا کرنے میں اس طرح تاخیر و توقف نہیں کرتا جس طرح کہ کوئی متردد شخص اپنے کسی کام اور معاملہ میں کرتا ہے اس بندہ مؤمن کی روح قبض کرنے کا معاملہ ایسا ہے کہ میں اس میں کچھ توقف کرتا ہوں تاکہ اس بندہ مؤمن پر موت آسان ہو اس کا دل اس کی طرف مائل ہو جائے اور وہ خود موت کے آنے کا مشتاق ہو جائے پھر اس کے بعد وہ زمرہ مقربین میں داخل ہو کر اعلی علیین میں اپنی جگہ حاصل کر لے۔

اہل ذکر کو فرشتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں

(۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً یَطُوْفُوْنَ فِی الطُّرُقِ یَلْتَمِسُوْنَ اَهْلَ الذِّكْرِ فَاِذَا وَجَدُوْا قَوْمًا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ تَنَادَوْ هَلُمُّوا اِلٰى حَاجَتِكُمْ قَالَ فَیَحُفُّوْنَهُمْ بِاَجْنِحَتِهِمْ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْیَا قَالَ فَیَسْأَلُهُمْ رَبُّهُمْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِهِمْ مَایَقُوْلُ عِبَادِی قَالَ یَقُوْلُوْنَ یُسَبِّحُوْنَكَ وَیُكَبِّرُوْنَكَ وَیَحْمَدُوْنَكَ وَیُمَجِّدُوْنَكَ قَالَ فَیَقُوْلُ هَلْ رَأَوْنِیْ قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ لَا وَاللّٰهِ مَارَأَوْكَ قَالَ فَیَقُوْلُ كَیْفَ لَوْرَأَوْنِی قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ لَوْرَأَوْكَ كَانُوْا اَشَدَّ لَكَ عِبَادَةً وَاَشَدَّ لَكَ تَمْجِیْدًا وَاَكْثَرَ لَكَ تَسْبِیْحًا قَالَ فَیَقُوْلُ فَمَا یَسْأَلُوْنَ قَالُوْا یَسْأَلُوْنَكَ الْجَنَّةَ قَالَ یَقُوْلُ وَهَلْ رَأَوْهَا قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ لَا وَاللّٰهِ یَارَبِّ مَارَأَوْهَا قَالَ یَقُوْلُ كَیْفَ لَوْ رَأَوْهَا قَالَ یَقُوْلُوْنَ لَوْ اَنَّهُمْ رَأَوْهَا كَانُوْا اَشَدَّ عَلَیْهَا حِرْصًا وَاَشَدَّ لَهَا طَلَبًا وَاَعْظَمَ فِیْهَا رَغْبَةً قَالَ فَمِمَّ یَتَعَوَّذُوْنَ قَالَ یَقُوْلُوْنَ مِنَ النَّارِ قَالَ یَقُوْلُ فَهَلْ رَأَوْهَا قَالَ یَقُوْلُوْنَ لَا وَاللّٰهِ یَارَبِّ مَارَأَوْهَا قَالَ یَقُوْلُ فَكَیْفَ لَوْرَأَوْهَا قَالَ یَقُوْلُوْنَ لَوْرَأَوْهَا كَانُوْا اَشَدَّ مِنْهَا فِرَارًا وَاَشَدَّ لَهَا مُخَافَةً قَالَ فَیَقُوْلُ فَاُشْهِدُكُمْ اَنِّی قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ قَالَ یَقُوْلُ مَلَكٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ فِیْهِمْ فُلَانٌ لَیْسَ مِنْهُمْ اِنَّمَا جَاءَ لِحَاجَةٍ قَالَ هُمُ الْجُلَسَاءُ لَا یَشْقٰى جَلِیْسُهُمْ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ رِوَایَةِ مُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً سَیَّارَةً فُضُلًا یَبْتَغُوْنَ مَجَالِسَ الذِّكْرِ فَاِذَا وَجَدُوْا مَجْلِسًا فِیْهِ ذِكْرٌ قَعَدُوْا مَعَهُمْ وَحَفَّ بَعْضُهُمْ بَعْضًا بِاَجْنِحَتِهِمْ حَتّٰى یَمْلَؤُا مَابَیْنَهُمْ وَبَیْنَ السَّمَاءِ الدُّنْیَا فَاِذَا تَفَرَّقُوْا عَرَجُوا وَصَعِدُوْا اِلَى السَّمَاءِ قَالَ فَیَسْأَلُهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ اَعْلَمُ مِنْ اَیْنَ جِئْتُمْ فَیَقُوْلُوْنَ جِئْنَا مِنْ عِنْدِ عِبَادِكَ فِی الْاَرْضِ یُسَبِّحُوْنَكَ وَیُكَبِّرُوْنَكَ وَیُهَلِّلُوْنَكَ وَیُمَجِّدُوْنَكَ وَیَسْأَلُوْنَكَ قَالَ وَمَاذَا یَسْأَلُوْنِیْ قَالُوا یَسْأَلُوْنَكَ جَنَّتَكَ قَالَ وَهَلْ رَأَوْا جَنَّتِیْ قَالُوا لَا اَیْ رَبِّ قَالَ وَكَیْفَ لَوْرَأَوْا جَنَّتِیْ قَالُوا وَیَسْتَجِیْرُوْنَكَ قَالَ وَمِمَّا یَسْتَجِیْرُوْنِیْ قَالُوا مِنْ نَارِكَ قَالَ وَهَلْ رَأَوْا نَارِیْ قَالُوا لَا قَالَ فَكَیْفَ لَوْرَأَوْا نَارِیْ قَالُوا یَسْتَغْفِرُوْنَكَ قَالَ فَیَقُوْلُ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ فَاَعْطَیْتُهُمْ مَاسَأَلُوْا وَاَجَرْتُهُمْ مِمَّا اسْتَجَارُوْا قَالَ یَقُوْلُوْنَ رَبِّ فِیْهِمْ فُلَانٌ عَبْدٌ خَطَّاءٌ اِنَّمَا مَرَّ فَجَلَسَ مَعَهُمْ قَالَ فَیَقُوْلُ وَلَهٗ غَفَرْتُ هُمُ الْقَوْمُ لَا یَشْقٰى بِهِمْ جَلِیْسُهُمْ۔

"اور ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کے کتنے ہی فرشتے (مسلمانوں کے راستے پر پھرتے ہیں اور ذکر کرنے والوں کو ڈھونڈتے ہیں تاکہ ان سے ملیں اور ان کا ذکر سنیں) چنانچہ جب وہ ان لوگوں کو پالیتے ہیں جو ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو پکار کر کہتے ہیں کہ اپنے مطلوب کی طرف (یعنی اہل ذکر سے ملاقات اور ان کا ذکر سننے کے لئے) جلدی آجاؤ! آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس کے بعد وہ فرشتے ان لوگوں کو اپنے پروں سے آسمان دنیا تک گھیر لیتے ہیں۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ان فرشتوں سے ان کا پروردگار ان لوگوں کے بارہ میں پوچھتا ہے کہ میرے بندے کیا کہتے ہیں حالانکہ پروردگار ان فرشتوں سے کہیں زیادہ ان

لوگوں کے بارہ میں جانتا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "فرشتے جواب دیتے ہیں کہ وہ تیری پاکی کی تسبیح کرتے ہیں تجھے یاد کرتے ہیں، تیری بڑائی بیان کرتے ہیں، تیری تعریف کرتے ہیں اور بزرگی و عظمت کے ساتھ تجھے یاد کرتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ ان فرشتوں سے پوچھتا ہے "کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "اس کے جواب میں فرشتے کہتے ہیں کہ "نہیں خدا کی قسم انہوں نے تجھے نہیں دیکھا ہے آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ ان فرشتوں سے کہتا ہے کہ "اچھا اگر وہ مجھے دیکھتے تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوتی "؟

آپ ﷺ نے فرمایا "فرشتے کہتے ہیں کہ اگر وہ تجھے دیکھتے تو پھر وہ تیری عبادت بہت ہی کرتے، بزرگی و عظمت کے ساتھ تجھے بہت ہی یاد کرتے، اور تیری تسبیح بہت ہی کرتے" آپ ﷺ نے فرمایا "پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ وہ بندے مجھ سے مانگتے کیا ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تجھ سے جنت مانگتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "فرشتے کہتے ہیں کہ "نہیں! اے پروردگار! خدا کی قسم انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ اچھا اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو جنت کے لئے ان کی حرص کہیں زیادہ ہوتی، اس کے لئے ان کی خواہش وطلب کہیں زیادہ ہوتی اور اس کی طرف ان کی رغبت کہیں زیادہ ہوتی۔ کیونکہ کسی چیز کے بارہ میں محض علم ہونا اس کے دیکھنے کے برابر نہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ "اچھا وہ پناہ کس چیز سے مانگتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "فرشتے جواب دیتے ہیں کہ وہ دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کیا انہوں نے دوزخ کو دیکھا ہے؟" فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں "ہمارے پروردگار! خدا کی قسم! انہوں نے دوزخ کو نہیں دیکھا" آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ اگر وہ دوزخ کو دیکھ لیتے تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوتی " آپ ﷺ نے فرمایا "فرشتے جواب دیتے ہیں "کہ اگر انہوں نے دوزخ کو دیکھ لیا ہوتا تو وہ اس سے بہت ہی بھاگتے (یعنی ان چیزوں سے بہت ہی دور رہتے جو دوزخ میں ڈالے جانے کا سبب بنتی ہیں اور ان کے دل کہیں زیادہ ڈرنے والے ہوتے" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے "کہ میں تمہیں اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا" آنحضرت ﷺ نے فرمایا" یہ (سن کر) ان فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے کہ "ذکر کرنے والوں میں وہ فلاں شخص ذکر کرنے والا نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے کسی کام کے لئے آیا تھا پھر وہ وہیں ذکر کرنے والوں کے پاس بیٹھ گیا اس لئے تو وہ اس مغفرت کی بشارت کا مستحق نہیں اللہ تعالیٰ اس سے فرماتا ہے کہ اہل ذکر ایسے بیٹھنے والے ہیں کہ ان کا ہمنشین بے نصیب نہیں ہوتا (بخاریؒ)

اور مسلمؒ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کے کتنے ہی فرشتے ایسے ہیں جو پھرنے والے اور زیادہ ہیں (یعنی اعمال لکھنے والوں وغیرہ کے علاوہ ہیں کہ ان کا مقصد صرف ذکر کے حلقوں میں حاضری ہے) چنانچہ وہ فرشتے ذکر کی مجلسیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، جب وہ کسی ایسی مجلس کو پالیتے ہیں جس میں اکثر ذکر ہی ہوتا ہے تو وہ اس میں بیٹھ جاتے ہیں اس وقت وہ فرشتے آپس میں ایک دوسرے کو اپنے پروں میں گھیر لیتے ہیں تاکہ ذکر والوں اور آسمان کے درمیان فرشتے ہی فرشتے بھر جائیں جب ذکر سے فراغت کے بعد) مجلس برخاست ہو جاتی ہے تو وہ فرشتے بھی اوپر چڑھتے ہیں اور ساتویں آسمان پر پہنچ جاتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ تم کہاں سے آئے ہو" حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے بارہ میں خوب جانتا ہے کہ وہ کہاں سے آئے ہیں) فرشتے کہتے ہیں ہم تیرے ایسے بندوں کے پاس سے آئے ہیں جو زمین پر ہیں تیری تسبیح کرتے ہیں تیرا کلمہ پڑھتے ہیں تجھے بزرگی و عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور تجھ سے مانگتے ہیں" اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ وہ مجھ سے کیا مانگتے ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تجھ سے تیری جنت مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا انہوں نے میری جنت دیکھی ہے" فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں پروردگار اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تیری پناہ بھی مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" وہ کس چیز سے میری پناہ مانگتے ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں "وہ تیری آگ سے پناہ مانگتے ہیں" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا انہوں نے میری آگ کو دیکھا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ نہیں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر وہ میری آگ کو دیکھ لیتے تو پھر ان

کی کیا کیفیت ہوتی؟ فرشتے کہتے ہیں وہ تجھ سے بخشش بھی طلب کرتے ہیں۔" آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فرشتے یہ سن کر عرض کرتے ہیں کہ پروردگار اس میں فلاں بندہ تو بہت ہی گناہ گار ہے تو وہ وہاں سے صرف اپنے کام سے گزر رہا تھا کہ ان کے پاس بیٹھ گیا آنحضرت ﷺ نے فرمایا ان کے جواب میں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اسے بخش دیا۔ کیونکہ وہ ذکر کرنے والے ایسے لوگ ہیں کہ جن کے سبب سے اور جن کی برکت کی وجہ سے ان کا ہمنشین بے نصیب نہیں ہوتا۔"

تشریح: ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے ایک ایک ذرہ پر حاوی ہے وہ ایک ایک فرد کے ایک ایک لمحہ کے حالات کی واقفیت رکھتا ہے اس لئے بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے ذکر کرنے والے بندوں کے بارہ میں جو کچھ پوچھتا ہے وہ علم حاصل کرنے کے لئے پوچھتا ہے بلکہ وہ جاننے کے باوجود محض الزاما فرشتوں سے سوال کرتا ہے تاکہ ان پر ابن آدم کی کمال عبدیت ظاہر ہو کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت یہ فرشتے ہی تو تھے جنہوں نے کہا تھا کہ پروردگار تو آدم اور ابن آدم کو کیوں پیدا کرتا ہے یہ تو دنیا میں سوائے فسق و فساد کے اور کچھ کریں گے ہی نہیں۔ تیری تسبیح اور تقدیس تو بس ہم ہی کر سکتے ہیں اور وہ ہم کرتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کو اس قسم کے سوال کر کے ان پر ابن آدم کی بزرگی کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح وہ ان فرشتوں کو بتانا چاہتا ہے کہ تم نے دیکھا جس مخلوق کے بارہ میں تم غلط گمان رکھتے تھے وہی مخلوق اب کس طرح میری عبادت، میری یاد اور میرے ذکر میں مشغول رہتی ہے اور خود تم ہی اس کی شہادت دیتے ہو۔

بخاریؒ کی روایت میں تو اس سوال (اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ وغیرہ) کے ساتھ ہی فرشتوں کے طرف سے اس کا جواب (اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو الخ۔ بھی منقول ہے لیکن مسلم کی روایت میں صرف سوال ہی منقول ہے جواب ذکر نہیں کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بخاری کی روایت میں تو یہ جملہ صرف سوال ہی کے لئے ہے لیکن مسلم کی روایت میں یہ سوالیہ جملہ تعجب کے لئے ہے دونوں روایتوں کے آخری جملہ کے ذریعہ امت کے لوگوں کو اہل ذکر کی ہمنشینی اختیار کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ خدا کی یاد اور اس کے ذکر میں مشغول رہنے والے خدا کے نیک و صالح بندوں کی ہمنشینی و صحبت اختیار کرنا فلاح و سعادت کی بات ہے کسی عارف نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صحبت (یعنی اس کی یاد اور ان کے ذکر میں مشغولیت اختیار کرو اگر یہ نہ کر سکو پھر ان مقدس بندوں کی صحبت و ہمنشینی اختیار کرو جو اللہ کی صحبت اختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی جو ذکر و شغل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوامی حضور رکھتے ہیں۔

ادائیگی حقوق کے وقت ذکر سے غفلت نقصان دہ نہیں ہے

⑧ وَعَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ الرَّبِيعِ الْأُسَيْدِيِّ قَالَ لَقِيَنِي أَبُوْبَكْرٍ فَقَالَ كَيْفَ أَنْتَ يَا حَنْظَلَةُ قُلْتُ نَافَقَ حَنْظَلَةُ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاتَقُوْلُ قُلْتُ نَكُوْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُذَكِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ كَأَنَّا رَأْيَ عَيْنٍ فَإِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَافَسْنَا الْأَزْوَاجَ وَالْأَوْلَادَ وَالضَّيْعَاتِ نَسِيْنَا كَثِيْرًا قَالَ أَبُوْبَكْرٍ فَوَ اللّٰهِ إِنَّا لَنَلْقَى مِثْلَ هٰذَا فَانْطَلَقْتُ أَنَا وَ أَبُوْبَكْرٍ حَتّٰى دَخَلْنَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ نَافَقَ حَنْظَلَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وما ذاكَ قلت یا رسولَ اللّٰه نَكُوْنُ عِنْدَكَ تُذَكِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ كَأَنَّا رَأْيَ عَيْنٍ فَإِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِكَ عَافَسْنَا الْأَزْوَاجَ وَالْأَوْلَادَ وَالضَّيْعَاتِ نَسِيْنَا كَثِيْرًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ تَدُوْمُوْنَ عَلٰى مَاتَكُوْنُوْنَ عِنْدِي وَفِي الذِّكْرِ لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلٰى فُرُشِكُمْ وَفِي طُرُقِكُمْ وَلٰكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حنظلہ ابن ربیع اسیدیؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہو

حنظلہ! تمہارا کیا حال ہے (یعنی آنحضرت ﷺ جو کچھ وعظ و نصیحت فرماتے ہیں اس پر تمہاری استقامت کیسی ہے؟ میں نے کہا کہ حنظلہ تو منافق ہو گیا (یعنی حال کے اعتبار سے ایمان کے اعتبار سے نہیں) حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ "سبحان اللہ حنظلہ! یہ تم کیا کہتے ہو! یعنی ابوبکرؓ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ کیا بات کہہ رہے ہو اس کا مطلب تو بیان کرو) میں نے کہا کہ (اس میں تعجب کی بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ) جب ہم رسول کریم ﷺ کے پاس ہوتے ہیں اور جس وقت آپ ﷺ ہمیں دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہیں اور یا جس وقت آپ ﷺ ہمیں جنت، کی نعمتوں کی بشارت سناتے ہیں تو اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم جنت اور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مگر جب ہم رسول کریم ﷺ کی صحبت سے جدا ہوتے ہیں اور اپنی بیویوں، اپنی اولادوں، اپنی زمینوں اور اپنے باغات میں مشغول ہوتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں (یعنی اپنے دنیاوی مشاغل میں پھنس کر ان باتوں کا بہت سا حصہ بھول جاتے ہیں جو آنحضرت ﷺ ہمارے سامنے بطور تذکیر و نصیحت فرماتے ہیں اور ہم پر وہ کیفیت باقی نہیں رہتی جو آپ کی صحبت میں ہوتی ہے) حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اب جب کہ تم نے اپنی یہ حالت بیان کی ہے تو سنو کہ خدا کی قسم ہم بھی اسی کو پہنچے ہوئے ہیں۔ یعنی ہمارا بھی یہی حال ہے کہ حاضر و غائب میں تفاوت ہے اس کے بعد میں اور حضرت ابوبکرؓ دونوں چلے یہاں تک کہ ہم رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے میں نے عرض کیا "یارسول اللہ" حنظلہ منافق ہو گیا! آنحضرت ﷺ نے (بھی بڑے تعجب سے پوچھا) کہ اس بات کا کیا مطلب ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت جب ہم آپ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ﷺ ہمیں بطور تذکیر و نصیحت جنت و دوزخ کے بارہ میں بتاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مگر جب ہم آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ جاتے ہیں اور اپنی بیویوں، اپنی اولاد، اپنی زمینوں اور باغات میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم نصیحت کی بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں یہ سن کر رسول کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم پر ہمیشہ وہی کیفیت طاری رہے جو میری صحبت اور حالت ذکر میں تم پر ہوتی ہے (یعنی تم ہر وقت صاف دل اور اللہ سے ڈرنے والے رہو تو یقیناً فرشتے تم سے تمہارے بچھونوں پر اور تمہاری راہوں میں مصافحہ کریں لیکن اے حنظلہ! یہ ایک ساعت ہے اور وہ ایک ساعت ہے اور آپ ﷺ نے (یعنی حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَّسَاعَةً تین مرتبہ فرمایا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "فرشتے تم سے مصافحہ کریں" کا مفہوم یہ ہے کہ ایسی صورت میں فرشتے علانیہ یعنی سب کے سامنے تم سے مصافحہ کرتے نظر آئیں اور تم ان کو مصافحہ کرتے دیکھو۔ علانیہ کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ویسے تو فرشتے اہل ذکر سے خفیہ طور پر مصافحہ کرتے ہی ہیں کہ جس کو دنیاوی نظریں نہیں دیکھ پاتیں۔

"بچھونوں پر اور راہوں میں" سے مراد ہے "حالت فراغت اور حالت مشغولیت" مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں چاہے تم کسی کام میں مشغول رہتے اور چاہے فارغ ہوتے یعنی ہر وقت اور ہمیشہ فرشتے تم سے مصافحہ کرتے رہتے۔

"یہ ایک ساعت ہے اور وہ ایک ساعت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب کہ تم پر حالت حضور طاری ہوتی ہے کہ تم اپنے پروردگار کے حقوق ادا کر سکو اور ذکر و شغل میں مصروف رہ سکو اور ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ جب کہ تم پر حالت غفلت کا غلبہ رہتا ہے تاکہ تم اپنے نفس اور اپنے متعلقین کے حقوق ادا کر سکو، لہٰذا اپنے اور اپنے متعلقین کے حقوق کی ادائیگی کے وقت ذکر و حضور سے غفلت نقصان دہ نہیں کہ اس صورت میں تم اپنے آپ کو منافق سمجھنے لگو۔ اس لئے اپنے دل سے یہ خوف نکال دو کہ تم خدانخواستہ منافق ہو گئے ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ذکر الٰہی کی فضیلت و اہمیت

⑨ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ اَعْمَالِكُمْ وَاَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيْكِكُمْ

وَارْفَعِهَا فِيْ دَرَجَاتِكُمْ وَخَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ اِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ وَخَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ اَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوْا اَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوْا اَعْنَاقَكُمْ قَالُوْا بَلٰى قَالَ ذِكْرُ اللّٰهِ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَاَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ اِلَّا اَنَّ مَالِكًا وَقَفَهُ عَلٰى اَبِي الدَّرْدَاءِ۔

"حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "کیا میں تمہیں ایک ایسے عمل سے آگاہ نہ کروں جو تمہارے اعمال میں بہت بہتر، تمہارے بادشاہ کے نزدیک بہت پاکیزہ تمہارے درجات بلند اور تمہارے روپیہ اور سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے اور اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے دشمنوں (یعنی کفار) سے ملو اور تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "ہاں اور ہمیں بتایئے کہ وہ کون سا عمل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "خدا کا ذکر" اس روایت کو مالکؒ، احمدؒ، ترمذی اور ابن ماجہ، نے نقل کیا ہے۔ لیکن امام مالکؒ نے اس روایت کو حضرت ابودرداءؓ سے بطریق موقوف نقل کیا ہے۔"

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ذکر سے مراد وہ ذکر ہے جو زبان اور دل دونوں سے ہو۔ نیز اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خدا کا ذکر، صدقہ وخیرات، جہاد اور دوسرے اعمال سے افضل ہے۔

بہتر عمل

(۱۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِيٌّ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ فَقَالَ طُوْبٰى لِمَنْ طَالَ عُمْرُهٗ وَحَسُنَ عَمَلُهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ قَالَ اَنْ تُفَارِقَ الدُّنْيَا وَلِسَانُكَ رَطْبٌ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا کہ "یارسول اللہ"! کون شخص بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "خوش بختی ہے اس کے لئے (یعنی وہ بہتر شخص ہے جس کی عمر دراز ہوئی اور اس کے اعمال نیک ہوئے" اس نے عرض کیا یارسول اللہ! کون سے عمل بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کہ جب تم دنیا سے جدا ہو تو تمہاری زبان خدا کے ذکر سے تر ہو۔" (ترمذیؒ، احمدؒ)

تشریح: جس طرح "زبان کی خشکی" زبان کے رکنے کے لئے کنایہ ہے اسی طرح "زبان کی تری" زبان کی روانی کے لئے کنایہ ہے یا پھر یہ کہ یہاں "زبان کی تری" اس بات سے کنایہ ہے کہ مرتے دم تک ذکر پر مداومت ہو بایں طور کہ ذکر خدا سے زبان خشک نہ ہونے پائی ہو کہ جان نکلے۔

حدیث میں مذکور ذکر سے ذکر جلی بھی مراد ہے اور ذکر خفی بھی "زبان" کے بارہ میں دونوں احتمال ہیں۔ قلبی بھی مراد ہو سکتی ہے اور قالبی زبان بھی، یعنی چاہے دل کی زبان سے ذکر کرے چاہے ظاہری زبان سے لیکن دونوں ہی سے ہو تو بہت ہی خوب ہے۔

ذکر کے حلقے جنّت کے باغات

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوْا قَالُوْا وَمَا رِيَاضُ الْجَنَّةِ قَالَ حِلَقُ الذِّكْرِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم جنّت کے باغات میں سے گزرو تو میوہ خوری کرو" صحابہؓ نے عرض کیا کہ جنّت کے باغات سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ذکر کے حلقے۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی ایسی مجلس کے پاس سے گزرو جہاں لوگ اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں تو تم بھی شریک مجلس بن کر

خدا کے ذکر اور اس کی یاد میں مشغول ہو جاؤ۔ یہاں ذکر کے حلقوں (مجالس ذکر) کو جنت کے باغات اس لئے کہا گیا ہے کہ ذکر کی وجہ سے انسان جنت کے باغات میں داخل ہونے کی سعادت سے نوازا جاتا ہے۔

نوویؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح ذکر کرنا مستحب ہے اسی طرح ذکر کے حلقے میں بیٹھنا بھی مستحب ہے، نیز ذکر دل سے بھی ہوتا ہے اور زبان سے بھی لیکن افضل یہ ہے کہ دونوں سے ہو جیسا کہ یہ بات تفصیل کے ساتھ پہلے بتائی جا چکی ہے اور اگر ذکر فقط زبان سے ہی ہو تب بھی خالی از ثواب نہیں۔

منقول ہے کہ ایک مرد نے اپنے شیخ سے کہا کہ میں زبان سے اللہ کو یاد کرتا ہوں مگر میرا دل غفلت میں پڑا رہتا ہے انہوں نے کہا کہ اللہ کو یاد کرو اور شکر کرو کہ اللہ نے تمہارے ایک عضو کو اپنی یاد میں مشغول کیا۔

ذکر اللہ سے خالی وقت حسرت و ندامت کا باعث

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَعَدَ مَقْعَدًا لَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ فِيْهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ تِرَةً وَمَنِ اضْطَجَعَ مَضْجَعًا لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ تِرَةً (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص" کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں اللہ کو یاد نہ کرے تو اس کا بیٹھنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے (یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قضا و قدر کے سبب سے اس کے لئے حسرت اور ٹوٹے کی بات ہوگی اور جو شخص اپنی خوابگاہ میں لیٹے اور اس میں اللہ کو یاد نہ کرے تو یہ اللہ کی طرف سے اس کے لئے حسرت اور ٹوٹے کی بات ہوگی۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث کا مطلب اور حاصل یہ ہے کہ ہمہ وقت اور ہر حال میں اٹھتے بیٹھتے، سوتے، جاگتے اور شب و روز اللہ رب العزت کے ذکر میں مشغول رہنا چاہئے، جو وقت بھی ذکر اللہ سے خالی ہوگا وہ قیامت کے دن حسرت و ندامت کا موجب بنے گا، کیا خوب کہا ہے۔ ؎

چو اول شب آہنگ خواب آورم — بہ تسبیح نامت شتاب آورم

اور ؎

وگرنیم شب سربر آرم زہ خواب! — ترا خوانم و زیزم از دیدہ آب

اور ؎

وگر با مرادست راہم بہ قست — ہمہ روز تا شب پنا ہم بہ تست

جس مجلس میں ذکر خدا نہ ہو

⑬ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ قَوْمٍ يَقُوْمُوْنَ مِنْ مَجْلِسٍ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ فِيْهِ اِلَّا قَامُوْا عَنْ مِثْلِ جِيْفَةِ حِمَارٍ وَكَانَ عَلَيْهِمْ حَسْرَةٌ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو لوگ کسی نشست کے بعد اٹھیں اور اس نشست میں خدا کا ذکر نہ ہو تو وہاں سے ان کا اٹھنا مردار گدھے کی مانند ہے اور ان پر حسرت و افسوس ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے اس نامبارک مجلس کے بارہ میں تہدیداً حسرت و افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی ہو۔ ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ جس مجلس میں اللہ کو یاد نہ کیا جائے۔ وہ مردار گدھے کی مانند ہے اور جو لوگ وہاں سے اٹھے وہ گویا مردار کھا کر اٹھے۔

⑭ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا لَمْ يَذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْهِ وَلَمْ يُصَلُّوْا عَلٰى

نَبِيِّهِمْ اِلَّا كَانَ عَلَيْهِمْ تِرَةً فَاِنْ شَاءَ عَذَّبَهُمْ وَاِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُمْ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں اور وہاں نہ تو اللہ کا ذکر کریں اور نہ اپنے نبی پر درود بھیجیں تو وہ مجلس ان کے لئے باعث افسوس ہی ہوگی اب چاہے تو اللہ تعالیٰ عذاب میں انہیں مبتلا کرے اور چاہے تو انہیں بخش دے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: عذاب میں مبتلا کرنا ان کے اگلے پچھلے گناہوں کے سبب سے ہوگا اور بخشش کا مدار محض اللہ تعالیٰ کے بیکراں فضل اور اس کی لامحدود رحمت پر ہوگا اس حدیث سے اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اہل مجلس اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ بلکہ یقینی طور پر ان کو بخشش و مغفرت سے نوازتا ہے۔

کلام نافع

⑮ وَعَنْ اُمِّ حَبِيْبَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ كَلَامِ ابْنِ اٰدَمَ عَلَيْهِ لَا لَهٗ اِلَّا اَمْرٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ نَهْيٌ عَنْ مُنْكَرٍ اَوْ ذِكْرُ اللّٰهِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت اُمّ حبیبہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ابن آدم کا ہر کلام اس کے لئے وبال ہے علاوہ اس کلام کے جو امر بالمعروف (نیکی کی تاکید و تعلیم کرنے) اور نہی عن المنکر (برائی سے بچنے کی تلقین) یا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے ہو۔" اس روایت کو ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا نیز ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسانی کلام اور بات چیت میں کوئی قسم مباح نہیں ہے لیکن علماء لکھتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی شرعی طور پر ناپسندیدہ اور غیر درست کلام اور گفتگو سے روکنے کے لئے تاکید اور مبالغہ پر محمول ہے اور ویسے بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ مباح کلام عقبیٰ و آخرت کے اعتبار سے نہ تو نافع ہوتا ہے نہ اس کا کوئی اثر مرتب ہوتا ہے۔ آخرت میں تو وہی کلام نافع اور سود مند ہوگا جو محض دینی تقاضا کے پیش نظر ہو مثلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ذکر اللہ یا پھر اس طرح کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی مفہوم کے اعتبار سے یوں ہے کہ "ابن آدم کا ہر کلام اس کے لئے باعث حسرت ہے کہ اس کے لئے اس میں کوئی منفعت نہیں علاوہ اس کلام کے جس کا تعلق امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ذکر اللہ، اور انہیں کی مانند دوسری باتوں سے ہو۔ اس تاویل سے نہ صرف یہ کہ تمام مذکورہ احادیث میں مطابقت پیدا ہو جائے گی بلکہ وہ اشکال اور اضطراب بھی باقی نہیں رہے گا جو مباح کلام کے سلسلہ میں پیدا ہو سکتا ہے۔

ذکر اللہ کے بغیر کلام کی کثرت دل کی سختی کا باعث

⑯ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ فَاِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ قَسْوَةٌ لِّلْقَلْبِ اِنَّ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْقَلْبُ الْقَاسِىْ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ذکر اللہ کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو کیونکہ ذکر اللہ کے بغیر کلام کی کثرت دل کی سختی کا باعث ہے اور یاد رکھو کہ آدمیوں میں اللہ سے دور سب سے وہ شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: کثرت کلام کو دل کی سختی کا باعث اس لئے بتایا گیا ہے کہ عام طور پر بہت زیادہ بولنے والا شخص اپنی ہی بات کہنا اور منوانا چاہتا ہے وہ صحیح اور مبنی برحق بات سنتا ہی نہیں اور نہ اپنی بات کے علاوہ کسی بات کو صحیح سمجھتا ہے چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی قریب کیوں نہ ہو اس کی سب سے بڑی خواہش لوگوں سے اختلاط و ارتباط ہوتی ہے خوف خدا اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا اور آخرت سے غفلت اس

کا شعار ہوتا ہے۔

بہترین سرمایہ

⑰ وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْضِ اَسْفَارِهٖ فَقَالَ بَعْضُ اَصْحَابِهٖ نَزَلَتْ فِي الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ لَوْ عَلِمْنَا اَيُّ الْمَالِ خَيْرٌ فَنَتَّخِذَهٗ فَقَالَ اَفْضَلُهٗ لِسَانٌ ذَاكِرٌ وَقَلْبٌ شَاكِرٌ وَزَوْجَةٌ مُؤْمِنَةٌ تُعِيْنُهٗ عَلٰى اِيْمَانِهٖ (رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ الآية جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں الخ نازل ہوئی تو اس وقت ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ کسی سفر میں تھے (یہ آیت سن کر) بعض صحابہؓ نے کہا کہ سونے اور چاندی کے بارہ میں تو یہ آیت نازل ہوگئی اور ہمیں ان چیزوں کا حکم اور ان کی مذمت معلوم ہوئی۔ کاش ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ سونے اور چاندی کے علاوہ) اور کون سا مال بہتر ہے تاکہ ہم اسے جمع کریں؟! آپ ﷺ نے فرمایا "خدا کا ذکر کرنے والی زبان، شکر ادا کرنے والا دل، اور مسلمان بیوی جو اپنے شوہر کے ایمان کی مددگار ہو" بہترین مال ہے۔" (احمد، ترمذی، ابن جاجہ)

تشریح: بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ نے ظاہری مال ہی کی قسم سے کسی چیز کی تعیین کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن حقیقت میں ان کی مراد یہی تھی کہ آپ ﷺ کوئی ایسی چیز بتادیجئے جو ظاہری مال کے علاوہ ہو مگر ایسا سرمایہ ہو جو ہماری پیش آنے والی حاجتوں میں نفع بخش ثابت ہو چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کی حقیقی مراد کے پیش نظر وہ چیزیں بتائیں جو مفید ہیں اور جن کے بہترین سرمایہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

"جو اپنے شوہر کے ایمان کی مددگار ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اپنے شوہر کے دینی امور اور دینی فرائض کی ادائیگی میں معاون مددگار ہو مثلاً نماز کا وقت آئے تو اسے نماز کی یاد دلائے۔ روزہ کا زمانہ آئے تو اسے روزہ رکھنے کے سلسلہ میں اس کی ضروریات پوری کرے اور ان کے علاوہ دیگر عبادتوں کے وقت اس کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرے۔ نیز شوہر کے لئے وہ ایسے حالات پیدا کرے کہ وہ نیک کاموں میں مشغول رہ سکے، اس کو بدکاری اور تمام حرام چیزوں سے روکے حرام کی کمائی اور ناجائز پیشہ سے اسے باز رکھے اسی طرح اگر وہ کسی برائی کی راہ پر لگے تو اسے اس راہ سے ہٹائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے ذاکرین پر فخر کرتا ہے

⑱ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ خَرَجَ مُعَاوِيَةُ عَلٰى حَلْقَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ مَا اَجْلَسَكُمْ قَالُوْا جَلَسْنَا نَذْكُرُ اللّٰهَ قَالَ اٰللّٰهِ مَا اَجْلَسَكُمْ اِلَّا ذٰلِكَ قَالُوْا اٰللّٰهِ مَا اَجْلَسَنَا غَيْرُهٗ قَالَ اَمَا اِنِّيْ لَمْ اَسْتَحْلِفْكُمْ تُهْمَةً لَّكُمْ وَمَا كَانَ اَحَدٌ بِمَنْزِلَتِيْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقَلَّ عَنْهُ حَدِيْثًا مِنِّيْ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ عَلٰى حَلْقَةٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ فَقَالَ مَا اَجْلَسَكُمْ هٰهُنَا قَالُوْا جَلَسْنَا نَذْكُرُ اللّٰهَ وَنَحْمَدُهٗ عَلٰى مَا هَدَانَا لِلْاِسْلَامِ وَمَنَّ بِهٖ عَلَيْنَا قَالَ اٰللّٰهِ مَا اَجْلَسَكُمْ اِلَّا ذٰلِكَ قَالُوْا اٰللّٰهِ مَا اَجْلَسَنَا اِلَّا ذٰلِكَ قَالَ اَمَا اِنِّيْ لَمْ اَسْتَحْلِفْكُمْ تُهْمَةً لَّكُمْ وَلٰكِنَّهٗ اَتَانِيْ جِبْرِيْلُ فَاَخْبَرَنِيْ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يُبَاهِيْ بِكُمُ الْمَلَائِكَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت امیر معاویہؓ ایک حلقہ کے پاس پہنچے جو ایک مسجد میں جما ہوا تھا انہوں نے حلقہ والوں سے پوچھا کہ تمہیں یہاں کس چیز نے بٹھایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ "ہم یہاں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں" حضرت امیر

معاویہؓ نے کہا کہ "بخدا (کیا) تمہیں خدا کے ذکر ہی نے یہاں بٹھایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں صرف خدا کے ذکر ہی نے یہاں بٹھایا ہے؟ حضرت معاویہؓ نے کہا "دیکھو! میں نے تم پر تہمت رکھنے کے لئے تمہیں قسم نہیں دی (یعنی تمہیں جھوٹا سمجھ کر تم سے قسم نہیں کھلائی بلکہ میں نے آنحضرت ﷺ کے اتباع کے پیش نظر قسم کھلوائی ہے کہ آپ ﷺ نے بھی اسی طرح کہا تھا (جیسا کہ آگے حدیث میں آتا ہے) اور پھر معاویہؓ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث کو کم نقل کرنے کے سلسلہ میں میرے برابر کوئی نہیں تھا۔ (یعنی میں احتیاطاً بہت کم احادیث روایت کیا کرتا تھا کہ مبادا کہیں کوئی کمی و زیادتی ہو جائے اور پھر اس کا وبال میری گردن پر ہو اس بات سے حضرت معاویہؓ کا مقصد یہ آگاہی تھی کہ روایت حدیث میں مجھ سے کوئی بھول نہیں ہوتی کیونکہ نسیان کا احتمال تو اسی شخص کے لئے ہوتا ہے جو بہت زیادہ روایت کرے اور ظاہر ہے کہ میں ایسا نہیں تھا۔ بہرکیف حضرت معاویہؓ نے کہا کہ اسی طرح ایک دن نبی کریم ﷺ اپنے صحابہؓ کے ایک حلقہ کے پاس پہنچے آپ نے ان سے فرمایا کہ "یہاں تمہیں کس چیز نے بٹھایا ہے؟ (یعنی یہاں کس مقصد کے لئے جمع ہو کر بیٹھے ہو) صحابہؓ نے عرض کیا! ہم یہاں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور ہم اس کی اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اسلام کی ہدایت بخشی اور اس کے ذریعہ ہم پر احسان کیا" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بخدا (کیا) تمہیں صرف اسی چیز نے یہاں بٹھایا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ خدا کی قسم اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اس چیز نے یہاں بٹھایا ہے" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو میں تم پر جھوٹ کی تہمت رکھنے کے لئے تم سے قسم نہیں کھلوائی بلکہ میرے پاس جبرئیل آئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ اللہ عزوجل اپنے فرشتوں کے سامنے تم پر فخر کرتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے بغرض تاکید و توثیق ارباب حلقہ سے بہ قسم پوچھا نہ یہ کہ خدانخواستہ آپ ﷺ ان کو اپنی بات میں سچا نہیں سمجھتے تھے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے نیک بندے آپس میں حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں اور اللہ کے ذکر اور اس کی یاد میں اجتماعی طور پر مشغول ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ میرے ان بندوں کو دیکھو میں نے ان کے اوپر ان کے نفس ان کی خواہشات اور شیاطین کو کس طرح سے مسلّط کیا ہے مگر یہ اس کے باوجود میری عبادت اور میرے ذکر میں مشغول ہیں لہٰذا ان کی اس شان عبودیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی تعریف تم سے زیادہ کی جائے اس لئے تمہیں تو میری عبادت میں کوئی مشقت اور تکلیف نہیں ہوتی لیکن ان کی عبادت تو تمہاری عبادت کی بہ نسبت ایسی ہے کہ اس میں محنت تکلیف اور سراسر مشقت ہی مشقت ہے۔

ذکر خدا کے اعتبار سے آسان اور ثواب کے اعتبار سے کہیں افضل

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ شَرَائِعَ الْاِسْلَامِ قَدْ كَثُرَتْ عَلَيَّ فَاَخْبِرْنِي بِشَيْءٍ اَتَشَبَّثُ بِهٖ قَالَ لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اسلام کے احکام (یعنی نوافل) مجھ پر بہت بھاری ہیں یعنی نوافل اتنے ہیں کہ میں اپنے ضعف و عجز کی بنا پر ان کی ادائیگی سے معذور ہوں) اس لئے آپ مجھے بھی ایسی چیزیں بتا دیجئے کہ جن پر میں بھروسہ کرلوں (یعنی آپ کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو زیادہ ثواب کا باعث ہو) جامع اور آسان ہو اور وہ کسی زمانہ کسی جگہ اور کسی حالت پر موقوف نہ ہوتا کہ میں ادائیگی فرائض کے بعد اس کو اپنا معمول بنالوں اور اس کی وجہ سے تمام نوافل سے مستغنی ہو جاؤں) آپ ﷺ نے فرمایا "تمہاری زبان (یعنی یا تو یہی ظاہری زبان یا دل کی زبان) اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہمیشہ تر" (یعنی جاری رہنی چاہئے" (ترمذی، ابن ماجہ) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

ذاکر کی فضیلت

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُئِلَ اَیُّ الْعِبَادِ اَفْضَلُ وَاَرْفَعُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ قَالَ الذَّاکِرُوْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَالذَّاکِرَاتُ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمِنَ الْغَازِیْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ لَوْ ضَرَبَ بِسَیْفِہٖ فِی الْکُفَّارِ وَالْمُشْرِکِیْنَ حَتّٰی یَنْکَسِرَ وَیَخْتَضِبَ دَمًا فَاِنَّ الذَّاکِرَ لِلّٰہِ اَفْضَلُ مِنْہُ دَرَجَۃً۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا بندہ بہتر ہے (یعنی بہت زیادہ ثواب پاتا ہے) اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند تر درجہ کا مالک ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے مرد اور عورتیں" عرض کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! کیا یہ جہاد کرنے والوں سے بھی زیادہ افضل ہے اور بلند مرتبہ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص کفار اور مشرکین پر اپنی تلوار مارے یہاں تک کہ وہ تلوار ٹوٹ جائے اور (وہ تلوار یا خود مجاہد) خون سے رنگین ہو جائے (یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ وہ شہید ہو جائے) تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا شخص باعتبار درجہ کے اس شخص سے بہتر ہے۔" (احمد، ترمذی) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جہاد میں زخمی ہونے والا تو الگ رہا اگر جہاد اس حد تک پہنچ جائے کہ مجاہد خون میں شرابور ہو جائے تب بھی اللہ کا ذکر کرنے والا ہی افضل ہوگا۔

ذکر اللہ شیطان سے دل کا محافظ

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الشَّیْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ فَاِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ (رواہ البخاری تعلیقا)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "شیطان انسان کے دل سے چپکا رہتا ہے جب وہ دل سے اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے" اس روایت کو بخاریؒ نے بطریق تعلیق (یعنی بغیر سند کے) نقل کیا ہے۔"

ذکر کی مثال اور اس کی فضیلت

(۲۲) وَعَنْ مَالِکٍ قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ ذَاکِرُ اللّٰہِ فِی الْغَافِلِیْنَ کَالْمُقَاتِلِ خَلْفَ الْفَارِّیْنَ وَذَاکِرُ اللّٰہِ فِی الْغَافِلِیْنَ کَغُصْنٍ اَخْضَرَ فِیْ شَجَرٍ یَابِسٍ وَفِیْ رِوَایَۃٍ مَثَلُ الشَّجَرَۃِ الْخَضْرَاءِ فِیْ وَسْطِ الشَّجَرِ وَذَاکِرُ اللّٰہِ فِی الْغَافِلِیْنَ مِثْلُ مِصْبَاحٍ فِیْ بَیْتٍ مُظْلِمٍ وَذَاکِرُ اللّٰہِ فِی الْغَافِلِیْنَ یُرِیْہِ اللّٰہُ مَقْعَدَہٗ مِنَ الْجَنَّۃِ وَھُوَ حَیٌّ وَذَاکِرُ اللّٰہِ فِی الْغَافِلِیْنَ یُغْفَرُ لَہٗ بِعَدَدِ کُلِّ فَصِیْحٍ وَاَعْجَمَ وَالْفَصِیْحُ بَنُوْ اٰدَمَ وَالْاَعْجَمُ الْبَھَائِمُ (رواہ رزین)

"اور حضرت امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں "غافلوں کے درمیان خدا کا ذکر کرنے والا بھاگنے والوں کے پیچھے لڑنے والے کی مانند ہے (یعنی اس شخص کی مانند ہے) جو میدان کارزار میں اپنے لشکر کے بھاگ کھڑے ہونے کے بعد تنہا ہی کافروں کے مقابلہ میں ڈٹا رہے (ایسے شخص کی بہت ہی زیادہ فضیلت منقول ہے اور غافلوں کے درمیان خدا کا ذکر کرنے والا خشک درخت میں سرسبز شاخ کی مانند ہے

ایک روایت میں یوں ہے کہ "درختوں کے درمیان سرسبز و شاداب درخت کی مانند ہے اور خدا کا ذکر کرنے والا اندھیرے گھر میں

چراغ کی مانند ہے اور غافلوں میں خدا کا ذکر کرنے والا ایسا شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کی زندگی ہی میں جنت میں اس کی جگہ دکھلاتا ہے (یعنی یا تو بذریعہ مکاشفہ دکھاتا ہے یا خواب میں اور یا اس کو ایسا یقین بخشتا ہے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے اور غافلوں میں خدا کو یاد کرنے والا ایسا شخص ہے جس کے گناہ ہر فصیح اور اعجم کے عدد کے بقدر بخشے جاتے ہیں، فصیح سے مراد انسان اور اعجم سے مراد جانور ہیں۔" (رزین)

ذکر اللہ سب سے زیادہ نجات دلانے والا عمل

(۲۳) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ مَا عَمِلَ الْعَبْدُ عَمَلاً اَنْجٰی لَهٗ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ ذِکْرِ اللّٰهِ (رواہ مالک و الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ فرماتے ہیں کہ "ایسا کوئی عمل نہیں ہے جسے بندہ کرے وہ ذکر اللہ سے زیادہ اللہ کے عذاب سے نجات دلائے۔" (مالکؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ذکر کے برابر ایسا کوئی عمل نہیں ہے جو قیامت میں اللہ کے عذاب سے بہت زیادہ نجات دلانے کا سبب بنے حاصل یہ کہ ذکر اللہ تمام اعمال سے افضل ہے۔

ذاکر کی سعادت

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی يَقُوْلُ اَنَا مَعَ عَبْدِیْ اِذَا ذَکَرَنِیْ وَتَحَرَّکَتْ بِیْ شَفَتَاهُ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر کے لئے اپنے دونوں ہونٹ ہلاتا ہے (یعنی دل اور زبان دونوں سے ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں (یعنی میں اس کا مددگار ہوتا ہوں اس کو توفیق دیتا ہوں اور اس پر اپنی رحمت و رعایت کرتا ہوں)۔" (بخاری)

ذکر الٰہی قلب کی صفائی کا باعث

(۲۵) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ کَانَ يَقُوْلُ لِکُلِّ شَیْءٍ صَقَالَةٌ وَصَقَالَةُ الْقُلُوْبِ ذِکْرُ اللّٰهِ وَمَا مِنْ شَیْءٍ اَنْجٰی مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ ذِکْرِ اللّٰهِ قَالُوْا وَلاَ الْجِهَادُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ وَلاَ اَنْ يَضْرِبَ بِسَيْفِهٖ حَتّٰی يَنْقَطِعَ - رَوَاهُ الْبَيْهَقِیُّ فِی الدَّعْوَاتِ الْکَبِيْرِ۔

"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہر چیز کے لئے صفائی ہے اور قلوب کی صفائی خدا کا ذکر ہے اور ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو ذکر الٰہی کے برابر خدا کے عذاب سے بہت نجات دلائے۔"

صحابہؓ نے عرض کیا کہ "کیا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا بھی ایسی چیز نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! اگرچہ وہ (مجاہد) اپنی تلوار اتنی مارے (یعنی اتنی شدت کے ساتھ مارے) کہ اس کی تلوار ٹوٹ جائے۔" (بیہقی)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر جہاد اس درجہ کو بھی پہنچ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے افضل ہے۔

كِتَابُ اَسْمَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰی

اللہ تعالیٰ کے ناموں کا بیان

یہ بات جان لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں یعنی سماع اور اذن شارع پر موقوف ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو نام شرع

سے منقول ہے وہی کہنا چاہئے اپنی طرف سے ازراہ عقل کوئی نام نہ لینا چاہئے، چاہے وہ نام معنی کے اعتبار سے شرع کے نام منقول کے مطابق ہی کیوں نہ ہو مثلاً اللہ تعالیٰ کو عالم کہنا چاہئے عاقل نہ کہا جائے جواد کہنا چاہئے سخی نہ کہا جائے اور شافی کہنا چاہئے طبیب نہ کہا جائے۔

بندہ کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اپنی ذات میں پیدا کرنے کی حتی المقدر کوشش کرے چنانچہ آگے صفحات میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کی وضاحت کے موقع پر یا اور دوسری عبادتوں کی تشریح میں باری تعالیٰ کی صفات کے حصول کی جو تلقین کی گئی ہے اس پر پوری طرح عمل کرنا چاہئے تاکہ ان صفات کے حصول کے بعد اپنی ذات انوار الٰہیہ کا پرتو اور اپنی زندگی اسلامی اخلاق و تعلیم کا پیکر بنے۔

اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا وَیَسِّرْ لَنَا حُصُوْلَھَا۔

ایک بزرگ کے بارہ میں منقول ہے کہ اس کے پاس جب کوئی شخص بیعت کے لئے آتا تو وہ پہلے اس کو حکم دیتے کہ وضو کر کے آؤ جب وہ وضو کر کے آتا تو وہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کے اسماء پوری عظمت و جلال کے ساتھ بآواز بلند پڑھتے پھر اس شخص میں جس اسم مبارک کی تاثیر دیکھتے وہی اسے تعلیم کرتے اس خیال سے کہ اسے کشود (حصول مقصد) جلد ہو گا چنانچہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اسماء باری تعالیٰ کو یاد کرنے کے لئے بشارت

(۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ اِسْمًا مِائَۃً اِلَّا وَاحِدًا مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَھُوَ وِتْرٌ یُحِبُّ الْوِتْرَ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں یعنی ایک کم سو جس شخص نے ان ناموں کو یاد کیا وہ ابتداء ہی میں بغیر عذاب کے) جنت میں داخل ہو گا۔" ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ "اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث میں جو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں تو اس سے حصر اور تحدید مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بس اتنے ہی نام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بہت نام ہیں چنانچہ آگے صفحات میں ننانوے اسماء مبارک کے بعد کچھ اور نام بھی ذکر کئے جائیں گے انشاء اللہ" بلکہ یہاں ننانوے کا عدد ذکر کرنے سے مراد اور مقصود یہ ہے کہ حدیث میں اسماء باری تعالیٰ کی جو خاصیت بیان کی گئی ہے کہ جو شخص انہیں یاد کرے وہ جنت میں داخل ہو گا) وہ انہیں ننانوے ناموں کے ساتھ مخصوص ہے۔

لفظ اَحْصَاھَا کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں بخاری وغیرہ نے اس کے معنی وہی لکھے ہیں جو ترجمہ سے ظاہر ہیں "یعنی ان ناموں کو یاد کیا" اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ چنانچہ بعض روایتوں میں احصاھا کی بجائے حفظھا ہی منقول ہے بعض علماء لکھتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں "ان کو پڑھا یا ایمان لایا۔ یا ان کے معانی جانے اور ان کے معانی پر عمل کیا۔"

ھُوَ وِتْرٌ یُحِبُّ الْوِتْرَ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ طاق اعمال و اذکار کو پسند کرتا ہے اور مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اعمال میں اس عمل کو پسند کرتا ہے جس کی بنیاد اخلاص پر ہو جو محض اللہ تعالیٰ ہی کے لئے اختیار کیا گیا ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام اور ان کی تفصیل و وضاحت

(۲) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰہِ تَعَالٰی تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ اِسْمًا مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ

الجنَّةَ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَهَّارُ الْوَهَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ الْحَكَمُ الْعَدْلُ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ الْحَلِیْمُ الْعَظِیْمُ الْغَفُوْرُ الشَّكُوْرُ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ الْحَفِیْظُ الْمُقِیْتُ الْحَسِیْبُ الْجَلِیْلُ الْكَرِیْمُ الرَّقِیْبُ الْمُجِیْبُ الْوَاسِعُ الْحَكِیْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِیْدُ الْبَاعِثُ الشَّهِیْدُ الْحَقُّ الْوَكِیْلُ الْقَوِیُّ الْمَتِیْنُ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ الْمُحْصِی الْمُبْدِئُ الْمُعِیْدُ الْمُحْیِی الْمُمِیْتُ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاهِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِی الْمُتَعَالِی الْبَرُّ التَّوَّابُ الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّءُوْفُ مَالِكُ الْمُلْكِ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِیُّ الْمُغْنِی الْمَانِعُ الضَّارُّ النَّافِعُ النُّوْرُ الْهَادِی الْبَدِیْعُ الْبَاقِی الْوَارِثُ الرَّشِیْدُ الصَّبُوْرُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالْبَیْهَقِیُّ فِی الدَّعْوَاتِ الْكَبِیْرِ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو شخص ان ناموں کو یاد کرے وہ جنت میں داخل ہوگا وہ اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اسم ذات اللہ کے علاوہ ننانوے نام یہ ہیں۔

① الرحمٰن ② الرحیم ③ الملک ④ القدوس ⑤ السلام ⑥ المؤمن ⑦ المھیمن ⑧ العزیز ⑨ الجبار ⑩ المتکبر ⑪ الخالق ⑫ الباری ⑬ المصور ⑭ الغفار ⑮ القھار ⑯ الوہاب ⑰ الرزاق ⑱ الفتاح ⑲ العلیم ⑳ القابض ㉑ الباسط ㉒ الخافض ㉓ الرافع ㉔ المعز ㉕ المذل ㉖ السمیع ㉗ البصیر ㉘ الحکم ㉙ العدل ㉚ اللطیف ㉛ الخبیر ㉜ الحلیم ㉝ العظیم ㉞ الغفور ㉟ الشکور ㊱ العلی ㊲ الکبیر ㊳ الحفیظ ㊴ المقیت ㊵ الحسیب ㊶ الجلیل ㊷ الکریم ㊸ الرقیب ㊹ المجیب ㊺ الواسع ㊻ الحکیم ㊼ الودود ㊽ المجید ㊾ الباعث ㊿ الشہید (۵۱) الحق (۵۲) الوکیل (۵۳) القوی (۵۴) المتین (۵۵) الولی (۵۶) الحمید (۵۷) المحصی (۵۸) المبدی (۵۹) المعید (۶۰) المحی (۶۱) الممیت (۶۲) الحی (۶۳) القیوم (۶۴) الواجد (۶۵) الماجد (۶۶) الواحد (۶۷) الاحد (۶۸) الصمد (۶۹) القادر (۷۰) المقتدر (۷۱) المقدم (۷۲) الموخر (۷۳) الاول (۷۴) الاخر (۷۵) الظاہر (۷۶) الباطن (۷۷) الوالی (۷۸) المتعالی (۷۹) البر (۸۰) التواب (۸۱) المنتقم (۸۲) العفو (۸۳) الروف (۸۴) مالک الملک (۸۵) ذوالجلال والاکرام (۸۶) المقسط (۸۷) الجامع (۸۸) الغنی (۸۹) المغنی (۹۰) المانع (۹۱) الضار (۹۲) النافع (۹۳) النور (۹۴) الہادی (۹۵) البدیع (۹۶) الباقی (۹۷) الوارث (۹۸) الرشید (۹۹) الصبور۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کیا۔ نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ جملہ مستانفہ ہے یعنی یہ ایک علیحدہ جملہ ہے اور ان ننانوے ناموں کا بیان ہے جو آگے ذکر کئے گئے ہیں۔

اس کلمہ کے کئی مراتب ہیں اول یہ کہ جب منافق اس کلمہ کو پڑھتا ہے اور اس کی تصدیق سے خالی ہوتا ہے یعنی وہ قلبی تصدیق اور اعتقاد کے بغیر محض اپنے کو مسلمان ظاہر کرنے کے لئے اس کلمہ کو زبان سے ادا کرتا ہے تو یہ کلمہ اس کی دنیا کے لئے تو نافع بن جاتا ہے بایں طور کہ اس کی وجہ سے اس کی جان، اس کا مال اور اس کے اہل و عیال مسلمانوں کے ہاتھوں) محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن آخرت کے اعتبار سے یہ کلمہ اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

دوم یہ کہ اس کلمہ کو زبان سے پڑھنے کی ساتھ اعتقاد قلبی بھی ہو مگر تقلید محض کے طور پر اس درجہ کے صحیح ہونے میں مختلف اقوال ہیں۔ صحیح قول یہ ہے کہ یہ درجہ صحیح ہے۔ سوم یہ کہ اس کلمہ کو پڑھنے کے ساتھ اعتقاد قلبی بھی ہو مگر ایسا اعتقاد قلبی جو اللہ کی قدرت کی نشانیوں کو دیکھ کر حاصل کیا گیا ہو۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ بھی درجہ معتبر ہے۔

چہارم یہ کہ زبان سے اس کلمہ کی ادائیگی کے ساتھ اعتقاد جازم بھی ہو۔ جو از راہ دلیل قطعی حاصل ہوا ہو متفقہ طور پر یہ درجہ مقبول ہے۔ پنجم یہ کہ اس کلمہ کو ادا کرنے والا اس طرح کا ہو کہ وہ دل کی آنکھوں سے اس کلمہ کے معنی جانتا ہو۔ یعنی اسے کامل طور پر عرفان حق

حاصل ہو اور یہی رتبہ عالی ہے یہ تفصیل تو اس صورت میں ہے جب کہ اس کلمہ کو زبان سے ادا کیا جائے دوسری شکل یہ ہے کہ اس کلمہ کو صرف دل میں کہے یعنی زبان سے ادائیگی نہ ہو اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کسی عذر مثلاً گونگے پن وغیرہ کی بنا پر اس کلمہ کو زبان سے ادا کرنے سے قاصر ہے تو یہ کلمہ دنیا و آخرت دونوں کے لئے نافع ہے یعنی وہ دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے نجات یافتہ ہوگا اور اگر کسی عذر کے بغیر بھی زبان سے ادا نہ کرے تو پھر آخرت میں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ نوویؒ نے اس بات پر اہل سُنّت کا اجماع نقل کیا ہے۔

"اللہ" باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اس کے معنی ہیں "وہ ذات جو عبادت کے لائق ہے" اکثر علماء کہتے ہیں کہ اسماء باری تعالیٰ میں یہ نام سب سے بڑا ہے نیز کہا گیا ہے کہ عوام کو چاہئے کہ وہ اس نام کو اپنی زبان پر جاری کریں اور خشیت و تعظیم کے طور پر اس نام کے ساتھ ذکر کریں خواص کو چاہئے کہ وہ اس نام کے معنی میں غور و فکر کریں اور یہ جانیں کہ اس نام کا اطلاق صرف اسی ذات پر ہو سکتا ہے جو صفات الوہیت کی جامع ہے اور خواص الخواص کو چاہئے کہ وہ اپنا دل اللہ میں مستغرق رکھیں اور اس ذات کے علاوہ اور کسی بھی طرف التفات نہ کریں اور صرف اسی سے ڈریں کیونکہ وہی حق اور ثابت ہے اس کے علاوہ ہر چیز فانی اور باطل ہے جیسا کہ بخاری میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ شاعروں کے کلام میں سب سے صحیح کلام شاعر لبید کا یہ مصرعہ ہے کہ ع

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَاخَلَا اللّٰہُ بَاطِلٌ

"یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔"

خاصیت: جو شخص اس اسم ذات (اللہ) کو ہزار بار پڑھے وہ صاحب یقین ہو اور جو شخص اس کو نماز کے بعد سو بار پڑھے اس کا باطن کشادہ ہو اور وہ صاحب کشف ہو۔

الرَّحْمٰنُ بخشنے والا الرَّحِیْمُ ان دونوں ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے (یعنی صفات باری تعالیٰ کو اپنانے کے سلسلہ میں ان اسماء کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کامل توجہ ہو، اسی ذات پر توکل و بھروسہ کیا جائے اپنا باطن اس کے ذکر میں مشغول رکھا جائے غیر اللہ سے بے پرواہی برتی جائے بندگان خدا پر رحم کیا جائے چنانچہ مظلوم کی حمایت و مدد کی جائے اور ظالم کو بطریق نیک ظلم سے باز رکھا جائے اللہ کی عبادت اور اس کے ذکر سے غفلت برتنے والوں کو خبردار کیا جائے گنہ گار کی طرف رحمت کی نظر کی جائے نہ کہ اسے نظر حقارت سے دیکھا جائے اپنی طاقت کے بقدر شرع امور کے استیصال میں کوشش صرف کی جائے اور اپنی وسعت و ہمت کے مطابق محتاجوں اور ضرورت مندوں کی حاجتوں کو پورا کرنے کی سعی کی جائے۔

خاصیت: جو شخص ہر نماز کے بعد سو بار الرحمٰن الرحیم کہے حق تعالیٰ اس کے دل سے غفلت، نسیان اور قساوت دور کرے گا اور تمام مخلوق اس پر مہربان و مشفق ہوگی۔

اَلْمَلِکُ حقیقی بادشاہ یعنی وہ زمین و آسمان اور تمام عالم کا حقیقی بادشاہ ہے دونوں جہاں اسی کے تصرف اور قبضہ میں ہیں وہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج۔

لہٰذا جب بندہ نے اس کی یہ حیثیت و صفت جان لی تو اس پر لازم ہے کہ اس کی بارگاہ کا بندہ و غلام اور اسی کے در کا گدا بنے اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعہ اسی کے آستانہ عزت و جاہ کی طلب کرے۔ نیز بندہ پر لازم ہے کہ اس کی بارگاہ قدرت و تصرف سے تعلق پیدا کرے اس کے علاوہ ہر ایک سے کلیۃً بے نیازی اختیار کرے۔ نہ کسی سے اپنی ضرورت و حاجت بیان کرے اور نہ کسی سے ڈرے نہ امید رکھے اپنے دل، اپنے نفس، اور اپنے قالب کی دنیا کا حاکم بنے اور اپنے اعضاء اور اپنے قویٰ کو قابو میں رکھ کر اس کی اطاعت و عبادت اور شریعت کی فرمانبرداری میں لگا دے تاکہ صحیح معنی میں اپنے وجود کی دنیا کا حاکم کہلائے۔

خاصیت: جو شخص اس اسم کو اسم القدوس کے ساتھ (یعنی ملک القدوس) پابندی کے ساتھ پڑھتا رہے تو اگر وہ صاحب ملک اور سلطنت ہوگا تو اس کے ملک اور سلطنت کو اللہ تعالیٰ قائم و دائم رکھے گا اور جو صاحب سلطنت نہ ہوگا تو اس کی برکت سے اس کا اپنا نفس مطیع و فرمانبردار رہے گا اور جو شخص اسے عزت و جاہ کے لئے پڑھے تو اس کا مقصود حاصل ہوگا اور اس بارہ میں یہ عمل مجرب ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحمٰنؒ نے اس کی خاصیت یہ لکھی ہے کہ جو شخص اس اسم "الملک" کو روزانہ نوے بار پڑھے تو نہ صرف یہ کہ روشن اور تو انگر ہوگا بلکہ حکام و سلاطین اس کے لئے مسخر ہو جائیں گے اور عزت و احترام اور جاہ کی زیادتی کے حصول کے لئے یہ مجرب ہے۔

اَلْقُدُّوْسُ "نہایت پاک" قشیریؒ نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نہایت پاک ہے تو اب اس کو چاہئے کہ اس بات کی آرزو کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہر حالت میں عیوب اور آفات سے دور اور گناہوں کی نجاست سے پاک رکھے۔

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو ہر روز زوال آفتاب کے وقت پڑھے اس کا دل صاف ہو اور جو شخص نماز جمعہ کے بعد اس اسم و اسم اَلسُّبُّوحُ کے ساتھ (یعنی القُدُّوسُ السبُّوحُ) روٹی کے ٹکڑے پر لکھ کر کھائے تو فرشتہ صفت ہو اور بھگدڑ کے وقت دشمنوں سے حفاظت کے وقت اس اسم کو جتنا پڑھا جاسکے پڑھا جائے اور مسافر اس کو برابر پڑھتا رہے اور کبھی ماندہ اور عاجز نہ ہو اور اگر اس کو تین سو انیس بار شیرنی پر پڑھ کر دشمن کو کھلادے تو وہ مہربان ہو۔

اَلسَّلَامُ "بے عیب و سلامت" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو ہر برے کام اور ہر برے اخلاق سے بے عیب بنائے! قشیریؒ نے کہا ہے کہ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے مولیٰ کی طرف رجوع کرے! بعض حضرات نے اس سے بندہ کا نصیب یہ بتایا ہے کہ "مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ و سلامت رہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ بہت زیادہ شفقت کا معاملہ کرے جب وہ کسی ایسے مسلمان کو دیکھے جو اس سے عمر میں بڑا ہو تو یہ کہے کہ " یہ مجھ سے بہتر ہے کیونکہ اس نے میری نسبت زیادہ عبادت اور طاعت کی ہے اور ایمان و معرفت میں مجھ پر سبقت رکھتا ہے" اور اگر کسی ایسے مسلمان کو دیکھے جو عمر میں اس سے چھوٹا ہو تو بھی یہی کہے "یہ مجھ سے بہتر ہے" کیونکہ اس نے میری بنسبت گناہ کم کئے ہیں" نیز اگر کسی مسلمان بھائی سے کوئی قصور ہو جائے اور وہ معذرت کرے تو اس کی معذرت قبول کر کے اس کا قصور معاف کر دیا جائے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص اس اسم مبارک کو کسی بیمار پر ایک سو گیارہ مرتبہ پڑھے تو انشاء اللہ حق تعالیٰ اسے صحت و شفا عطا فرمائے گا اور اگر کوئی شخص اس کو برابر پڑھتا رہے تو خوف سے نڈر ہوگا۔

اَلْمُؤْمِنُ "امن دینے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ مخلوق خدا کو نہ صرف اپنے شر اور اپنی برائی سے بلکہ دوسروں کی برائی اور شر سے بھی امن میں رکھے۔

خاصیت: جو شخص اس اسم کو بہت پڑھتا رہے یا اس کو لکھ کر اپنے پاس رکھے تو حق تعالیٰ اس کو شیطان کی شر سے نڈر رکھے گا اور کوئی شخص اس پر حاوی نہیں ہوگا نیز اس کا ظاہر اور اس کا باطن حق تعالیٰ کی امان میں رہے گا اور جو شخص اس کو بہت زیادہ پڑھتا رہے گا مخلوق خدا اس کی مطیع اور فرمانبردار ہوگی۔

اَلْمُهَيْمِنُ "ہر چیز کا اچھی طرح محافظ و نگہبان۔" اس اسم سے عارفؒ کا نصیب یہ ہے کہ بری عادتوں، برے عقیدوں اور بری چیزوں مثلاً حسد اور کینہ وغیرہما سے اپنے دل کی نگہبانی کرے اپنے احوال درست کرے اور اپنے قویٰ اور اپنے اعضا کو ان چیزوں میں مشغول ہونے سے محفوظ رکھے جو دل کو اللہ کی طرف سے غفلت میں ڈالنے والی ہوں۔

خاصیت: جو شخص غسل کے بعد اس اسم کو ایک سو پندرہ مرتبہ پڑھے وہ غیب اور باطن کی باتوں پر مطلع ہو اور جو شخص اس کو برابر پڑھتا رہے وہ تمام آفات سے پناہ پائے اور جنتیوں کی جماعت میں شامل ہو۔

اَلْعَزِيْزُ "غالب و بے مثل کہ کوئی اس پر غالب نہیں" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اپنے نفس، اپنی خواہشات اور شیطان پر غالب رہے علم و عمل اور عرفان بے مثل بنے اور مخلوق خدا کے آگے ہاتھ نہ پھیلا کر اپنی ذات کو عزت بخشے اور غیر اللہ کے آگے دست سوال دراز کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔

ابوالعباس مرسیؒ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! عزت تو میں نے مخلوق خدا سے بلند ہمتی اختیار کرنے (یعنی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے ہی میں دیکھی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ "اللہ کو عزیز و غالب و بے مثل) تو اسی نے جانا جس نے اس کے احکام اور اس کی شریعت کو عزیز یعنی (اپنے اوپر غالب) کیا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں بے مثل بنا اور جس نے ان چیزوں میں سہل پسندی اور بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا اس نے خدا کی عزّت نہیں پہچانی یعنی اسے عزیز نہیں مانا) اور ارشاد ربانی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

"اور اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے عزت ہے اور لیکن منافق اسے نہیں جانتے۔"

خاصیت: جو شخص اس اسم کو فجر کی نماز کے بعد اکتالیس بار پڑھے وہ دنیا اور آخرت میں کسی کا محتاج نہ ہو اور بعد خواری کے عزیز ہو اس کے علاوہ بھی اس اسم مبارک کی بڑی عجیب و غریب خاصیتیں مذکور ہیں۔

اَلْجَبَّارُ بگڑے کاموں کو درست کرنے والا" اور بعض علماء نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں" بندوں کو اس چیز کی طرف لانے والا جس کا ارادہ کرتا ہے" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ فضائل و کمال حاصل کر کے اپنے نفس کی خرابیوں کو درست کرے اور تقویٰ و پرہیز گاری اور طاعت پر مداومت اختیار کر کے اپنے نفس پر غالب ہو اور اس طرح درجہ کمال کو پہنچے۔

قشیریؒ کہتے ہیں کہ بعض کتابوں میں یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اے میرے بندے! (کسی چیز کا) تو بھی ارادہ کرتا ہے اور میں بھی ارادہ کرتا ہوں (یعنی اس چیز کے بارے میں تیری خواہش کچھ ہوتی ہے اور میری مشیت کچھ اور) ہوتا وہی ہے جو میں ارادہ کرتا ہوں لہٰذا تو اگر اس پر راضی ہو جائے جس کا میں ارادہ کرتا ہوں (یعنی اس چیز کے بارہ میں میری طرف سے جو فیصلہ صادر ہو جائے تو اپنی خواہش کے علی الرغم اس کو بلا چون و چرا مان لے اور اس پر راضی ہو جائے) تو تو جو ارادہ کرتا ہے میں اس پر تجھ سے کفایت کروں گا۔ (یعنی اس کا نعم البدل عطا کروں گا) اور تو اگر اس پر راضی نہ ہوا۔ جس کا میں ارادہ کرتا ہوں تو پھر میں اس میں تجھ سے کفایت نہیں کروں گا جس کا تو ارادہ کرتا ہے (یعنی تجھے نعم البدل عطا نہیں کروں گا۔" اور پھر ہو گا وہی جو میں ارادہ کرتا ہوں۔ اور تو محروم کا محروم رہ جائے گا)

خاصیت: جو شخص مسبحات عشر کے بعد اس اسم کو اکیس بار پڑھے وہ ظالموں کی شر سے امن میں رہے گا جو شخص اس اسم کو پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کرے گا وہ غیبت اور مخلوق کی بدگوئی سے نڈر اور امان میں رہے گا اور اہل دولت و سلطنت میں سے ہو گا اور اگر کوئی شخص اس اسم کو انگوٹھی پر نقش کرا کر پہنے تو لوگوں کے دل میں اس کی ہیبت اور شوکت بیٹھ جائے گی۔

اَلْمُتَكَبِّرُ "نہایت بزرگ" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اسے حق تعالیٰ کی یہ بزرگی معلوم ہوئی تو اب اسے چاہئے کہ وہ خواہشات نفسانی کی طرف میلان اور لذات شہوانی کی طرف رغبت سے تکبر یعنی پرہیز کرے کیونکہ ان چیزوں کی طرف رغبت کرے گا تو جانور کا شریک ہو گا۔ بلکہ ہر اس چیز سے تکبر کرنا چاہئے جو باطن کو حق سے باز رکھے اور حق تعالیٰ کی طرف پہنچنے کے علاوہ ہر چیز کو حقیر جاننا اور تواضع و تذلل کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے اور اپنی ذات سے تکبر کے تمام دعوؤں کو زائل کرنا چاہئے تاکہ نفس صاف ہو اور اس میں خدا کی محبّت جاگزیں ہو اور اس طرح نہ نفس کا اختیار باقی رہے اور نہ غیر اللہ کے ساتھ قرار۔

خاصیت: جو شخص اپنی بیوی سے مباشرت کے وقت دخول سے پہلے اس مبارک اسم کو دس مرتبہ پڑھے تو انشاء اللہ حق تعالیٰ اسے پرہیز گار

فرزند خلف عطا فرمائے گا اور جو شخص اپنے ہر کام کی ابتداء میں یہ اسم مبارک بہت پڑھے تو خدا نے چاہا وہ اپنی مراد کو پہنچے گا۔

اَلْخَالِقُ مشیت و حکمت کے موافق پیدا ہونے والی چیز کا اندازہ کرنے والا۔"

خاصیت: جو شخص اس اسم مبارک کو برابر پڑھتا رہتا ہے حق تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ پیدا فرماتا ہے تاکہ وہ اس کی طرف سے قیامت کے دن تک عبادت کرتا رہے، نیز حق تعالیٰ اس اسم مبارک کی برکت سے اس شخص کا دل اور منہ، روشن و نورانی کر دیتا ہے! حضرت شاہ عبدالرحمنؒ نے لکھا ہے کہ جو شخص رات میں یہ اسم بہت زیادہ پڑھے گا اس کا دل اور منہ روشن و منور ہو گا اور وہ تمام کاموں پر حاوی رہے گا۔

اَلْبَارِئُ "پیدا کرنے والا"

خاصیت: جو شخص اس اسم کو ہفتہ میں سو بار پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اس کو قبر میں نہیں چھوڑے گا بلکہ ریاض قدس میں لے جائے گا اور جو حکیم و معالج اس اسم کو مستقل طور پر پڑھتا رہے وہ جو بھی علاج کرے گا کامیاب رہے گا۔

اَلْمُصَوِّرُ صورت بنانے والا" مذکورہ بالا ان تینوں ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ جب کوئی چیز دیکھے اور جب بھی کسی چیز کا تصور کرے تو خدا کی قدرتوں اور عجائبات میں غور و فکر کرے جو اس چیز میں موجود ہیں۔

خاصیت: اگر کوئی عورت بانچھ ہو اور اولاد کی دولت سے محروم ہو تو اسے چاہئے کہ وہ سات دن روزے رکھے اور ہر روز افطار کے وقت اکیس بار المصور پڑھ کر پانی پر دم کرے اور اسے پی لے انشاء اللہ حق تعالیٰ اسے فرزند نیک عطا فرمائے گا۔ جو شخص کسی دشوار اور مشکل کام کے وقت اس اسم کو بہت پڑھے وہ کام آسان ہو جائے گا۔

اَلْغَفَّارُ بندوں کے گناہوں کو بخشنے والا اور ان کے عیوب کو ڈھانکنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلے کہ گناہوں کو خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں بخشتا نیز اسے چاہئے کہ وہ لوگوں کے عیوب کو چھپائے کسی سے کوئی قصور و خطا ہو جائے تو اس سے درگزر کرے اور اپنے اوپر ہمہ اوقات خصوصاً سحر کے وقت استغفار کو لازم کرے جو شخص جمعہ کے نماز کے بعد سو بار یہ کہتا ہے۔

یَا غَفَّارُ اغْفِرْلِی ذُنُوْبِی۔

"اے بخشنے والے! میرے گناہ بخش دے۔"

تو حق تعالیٰ اسے ان لوگوں میں سے قرار دیتا ہے جن کی بخشش ہو چکی ہوتی ہے۔

اَلْقَهَّارُ غالب کہ اس کی قدرت کے سامنے عاجز و مغلوب ہیں۔" اس اسم مبارک سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے بڑے دشمنوں پر غالب ہو کر انہیں اپنے سامنے عاجز اور اپنا مغلوب بنا دے اور وہ بڑے دشمن نفس اور شیطان ہیں۔

خاصیت: جو کوئی اس اسم کو بہت پڑھتا ہے حق تعالیٰ اس کے دل سے دنیا کی محبت دور کر دیتا ہے اور اس کا خاتمہ بخیر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے دل میں شوق و محبت پیدا کرتا ہے اور جو شخص اس اسم کو اپنی کسی بھی مہم کے لئے سو بار پڑھے تو اس کی مہم آسان ہو جائے گی اور جو کوئی اس کو پڑھنے میں ہمیشگی اختیار کرے گا اس کے دل سے دنیا کی محبت جاتی رہے گی اور اگر کوئی شخص سُنّت و فرض نمازوں کے درمیان اس اسم کو سو بار بہ نیت مقہوری پڑھے تو بڑے سے بڑا دشمن مقہور و مغلوب ہو۔

اَلْوَهَّابُ بغیر بدلہ کے بہت دینے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اپنا مال بغیر کسی غرض اور بلا کسی عوض کے لالچ کے خرچ کرے۔

خاصیت: جو کوئی فقر و فاقہ کی تکلیف و مصیبت جھیل رہا ہو تو اسے چاہئے کہ اس اسم پاک کو پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کرے حق تعالیٰ اسے

اس مصیبت سے اس طرح نجات دے گا کہ وہ حیران رہ جائے گا اور جو شخص اس کو لکھ کر اپنے پاس رکھے وہ اس کا ایسا ہی اثر پائے گا، اور جو شخص نماز چاشت کے بعد سجدہ کی کوئی آیت پڑھے۔ اور پھر سجدہ میں سر رکھ کر سات بار یہ اسم پاک پڑھے تو مخلوق سے بے نیاز و بے پرواہ ہو جائے گا اور اگر کسی کو اپنی کوئی حاجت پوری کرانی ہو تو وہ آدھی رات کو اپنے مکان یا مسجد کے صحن میں تین بار سجدہ کرے اور پھر ہاتھ اٹھا کر اسم کو سو بار پڑھے انشاء اللہ اس کی حاجت ضرور پوری ہوگی۔

مولانا شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ فراخی رزق کے لئے چاشت کے وقت چار رکعت نماز پڑھی جائے نماز سے فراغت کے بعد سجدہ میں جا کر ایک سو چار مرتبہ یا وھاب پڑھا جائے اور اگر اتنا وقت نہ ہو تو پچاس مرتبہ پڑھ لیا جائے انشاء اللہ رزق میں وسعت و فراخی ہوگی۔

اَلرَّزَّاقُ رزق پیدا کرنے والا اور مخلوقات کو رزق پہنچانے والا" رزق اس چیز کو کہتے ہیں جس سے فائدہ اٹھایا جائے پھر اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں ظاہری اور باطنی باطنی وہ ہے جس سے نفس کو اور دل کو فائدہ پہنچے جیسے علوم معارف وغیرہ اور ظاہری وہ ہے جس سے بدن کو فائدہ پہنچے مثلاً کھانے پینے کی چیزیں اور اسباب یعنی کپڑا وغیرہ۔

اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اس بات پر کامل یقین و اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی بھی ذات رزق دینے کے قابل نہیں ہے لہٰذا وہ رزق کی توقع صرف اللہ تعالیٰ سے ہی رکھے اور اپنے تمام امور اسی کی طرف سونپے نیز اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے لوگوں کو جسمانی اور روحانی رزق پہنچاتا رہے یعنی جو محتاج و ضرورت مند ہوں ان پر اپنا مال خرچ کرے۔ جو کہ کم علم اور گمراہ ہوں انہیں تعلیم دے اور ان کی ہدایت کرے اور ہر مسلمان کے لئے دعا خیر کرتا رہا کرے وغیرہ وغیرہ کسی عارف سے پوچھا گیا کہ آپ کے کھانے پینے کا انتظام کیسے ہوتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جب سے مجھے اپنے خالق کا عرفان حاصل ہوا میں نے کبھی بھی اپنے رزق کا فکر نہیں کیا اسی طرح ایک عارف سے پوچھا گیا کہ "قوت غذا کیا ہے؟ انہوں نے کہا حَیُّ الَّذِیْ لَایَمُوْتُ (وہ پاک ذات یعنی اللہ ایسا زندہ ہے جس کے لئے موت نہیں ہے) کا ذکر۔

خاصیت: جو شخص صبح صادق کے طلوع کے بعد اور نماز فجر سے پہلے اپنے گھر کے چاروں کونوں میں اس اسم پاک کو دس دس مرتبہ پڑھے اس طرح کہ داہنی طرف سے پڑھنا شروع کرے اور منہ قبلہ کی طرف سے نہ پھیرے تو اس گھر میں رنج اور مفلسی کا گزر نہیں ہوگا۔

اَلْفَتَّاحُ "حکم کرنے والا" اور بعضوں نے کہا ہے "رزق رحمت کے دروازے کھولنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان صلح و صفائی اور انصاف کے لئے فیصلہ کرنے کی سعی و کوشش کرتا رہے اور مظلوموں کی مدد کرے نیز لوگوں کی دنیاوی اور اخروی حاجتوں کو پورا کرنے کا ارادہ رکھے۔

قشیریؒ نے فرمایا "کہ جس شخص نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ رزق و رحمت کے دروازے کھولنے والا، اسباب میسر کرنے والا اور تمام چیزوں کو درست کرنے والا ہے تو اب وہ اللہ کے علاوہ کسی اور میں اپنا دل نہیں لگائے گا۔

خاصیت: جو شخص نماز فجر کے بعد اپنے سینہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر ستر بار اس اسم کو پڑھے تو اس کے دل کا میل جاتا رہے گا اور اسے قلب و باطن کی بہت زیادہ صفائی حاصل ہوگی۔

اَلْعَلِیْمُ "ظاہر و باطن کا جاننے والا" کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "جس شخص نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ میرا حال خوب جانتا ہے تو اب اس کے لئے ضروری ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے کسی مصیبت و بلا میں مبتلا کرے تو وہ اس پر صبر کرے اور جو کچھ عطا کرے اس کا شکر ادا کرے اور اس سے اپنی خطاؤں کی بخشش و معافی کا خواستگار ہو۔

بعض کتابوں میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ (بندوں سے) فرماتا ہے "اگر تم یہ نہیں جانتے کہ ہر حالت میں تم پر میری نظر رہتی ہے اور میں تمہیں دیکھتا ہوں تو پھر تمہارے ایمان میں کمی ہے اور اگر تم یہ جانتے ہو کہ میں تمہیں ہر وقت دیکھتا رہتا ہوں تو پھر کیوں تم مجھے دیکھنے

والوں میں سب سے حقیر سمجھتے ہو؟ یعنی (دوسروں سے تو تم ڈرتے ہو اور شرم کرتے ہو کہ کہیں وہ تمہیں برائی اور تمہارے کسی جرم کو دیکھ نہ لیں لیکن کسی بھی برائی اور جرم کے وقت مجھ سے نہ ڈرتے ہو اور شرم نہ کرتے ہو جب کہ تمہاری ایک ایک حرکت میری نظر رہتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) میرے مقابلہ پر تم دنیا والوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہو۔

خاصیت: جو شخص اس اسم کو بہت زیادہ پڑھتا ہے حق تعالیٰ اسے اپنی معرفت بہت زیادہ عطا کرتا ہے اور جو شخص نماز کے بعد یا عالم الغیب سو مرتبہ کہے حق تعالیٰ اسے صاحب کشف بنائے گا اور اگر کوئی چاہے کہ اسے کسی پوشیدہ چیز کا علم ہو تو اسے چاہئے کہ وہ عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں یہ سو مرتبہ کہہ کر سوئے۔ انشاء اللہ اس پر اس چیز کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔

اَلْقَابِضُ بندوں کی روزی یا دل تنگ کرنے والا اور اس کی روح قبض کرنے والا۔"

خاصیت: اگر کوئی شخص اس نام پاک کو چالیس دنوں تک روزانہ (روٹی وغیرہ) چار نوالوں پر لکھ کر کھایا کرے تو انشاء اللہ وہ بھوک اور قبر کے عذاب سے امن میں رہے گا۔

اَلْبَاسِطُ "بندوں کی روزی میں وسعت و فراخی پیدا کرنے والا یا ان کا دل کشادہ کرنے والا" ان دونوں ناموں (القابض اور الباسط) سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ تو کسی بلاء و مصیبت کے وقت نا امید ہو اور نہ اس کی بخشش و عطا کے وقت بے فکری اختیار کرے اور تنگی کو اس کے عدل کا نتیجہ جانے اور اس پر صبر کرے اور فراخی و وسعت کو اس کے فضل کا ثمرہ سمجھے اور اس پر شکر گزار ہو۔ قشیریؒ کہتے ہیں کہ یہ دونوں کیفیت یعنی دل کا تنگ اور کشادہ ہونا) عارفوں کے دل پر طاری ہوتی ہے کہ جب خوف خدا غالب ہوتا ہے تو ان کے دل تنگ ہوتے ہیں اور جب رحمت کی امید غالب ہوتی ہے تو ان کے دل کشادہ ہوتے ہیں! چنانچہ حضرت جنید بغدادی کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "خوف میرے دل کو تنگ کر دیتا ہے امید میرے دل کو کشادہ کر دیتی ہے حق مجھے جمع کرتا ہے (یعنی حق تعالیٰ کی یاد سے مجھے خاطر جمعی حاصل ہوتی ہے) اور مخلوق مجھے منتشر کرتی ہے (یعنی مخلوق کی صحبت سے میں پراگندہ خاطر اور متواحش ہوتا ہوں) اور بندہ کی شان کا تقاضہ یہ ہے کہ تنگی اور پریشانی کی حالت میں بے قراری سے پرہیز کرے اور وسعت و فراخی کے وقت بے جا خوشی اور بے ادبی سے اجتناب کرے کہ ان چیزوں سے بڑے بڑے لوگ ڈرتے رہے ہیں۔

خاصیت: جو شخص سحر کے وقت ہاتھ اٹھا کر اس اسم پاک کو دس بار پڑھے اور پھر اپنے ہاتھوں کو منہ پر پھیرے تو اسے کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں ہوگی کہ وہ کسی سے اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی درخواست کرے۔

اَلْخَافِضُ کافروں کو ذلیل و خوار کر کے یا ان کو اپنی درگاہ سے دور رکھ کر پشت کرنے والا۔"

خاصیت: جو شخص تین روزے رکھے اور چوتھے روز ایک نشست میں اس اسم پاک کو ستر ہزار بار پڑھے وہ دشمنوں پر فتح پائے گا۔

اَلرَّافِعُ مومنوں کی مدد کر کے یا ان کو اپنی درگاہ کا قرب بخش کر بلند کرنے والا۔" ان دونوں ناموں (الخافض اور الرافع) سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنی کسی بھی حالت پر اعتماد نہ کرے اور نہ اپنے علوم و اعمال میں سے کسی چیز پر بھروسہ کرے اور اس چیز کو پست و مغلوب کرے جس کو اللہ نے پست کرنے کا حکم دیا ہے مثلاً نفس و خواہش، اس چیز کو بلند کرے جس کو اللہ نے بلند کرنے کا حکم دیا ہے جیسے دل اور روح۔

منقول ہے کہ ایک شخص کو لوگوں نے ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا تو اس سے پوچھا کہ تم اس مرتبہ پر کیونکر پہنچے؟ اس نے کہا کہ میں نے اپنی ہوا) یعنی اپنی خواہشات کو پس پشت ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے فضا کی ہوا کو میرے لئے مسخر کر دیا۔

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو آدھی رات کے وقت یا دوپہر میں سو مرتبہ پڑھے حق تعالیٰ اسے مخلوق میں برگزیدہ اور تونگر اور بے نیاز بنائے گا۔

اَلْمُعِزُّ "عزت دینے والا" جو شخص اس اسم پاک کو دوشنبہ کی شب میں یا جمعہ کی شب میں ایک سو چالیس مرتبہ پڑھے گا مخلوق کی نظر میں اس کی ہیبت و شوکت پیدا ہوگی اور وہ حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کے خوف میں مبتلا نہیں ہوگا۔

اَلْمُذِلُّ "ذلت دینے والا" ان دونوں ناموں (المعز اور المذل) سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو عزیز رکھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کی وجہ سے عزیز رکھا ہے۔ اور ان لوگوں کو ذلیل و خوار سمجھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کفر و ضلالت کے سبب سے ذلیل و خوار قرار دیا ہے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص کسی ظالم و حاسد سے ڈرتا ہو اسے چاہئے کہ وہ اس اسم پاک کو پچھتر بار پڑھے اس کے بعد سجدہ کرے اور بارگاہ حق میں یوں عرض کرے "اے اللہ! فلاں ظالم و حاسد کی شر سے مجھے امان دے" حق تعالیٰ اسے امان دے گا"۔

اَلسَّمِیْعُ سننے والا اَلْبَصِیْرُ دیکھنے والا" ان ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ خلاف شرع چیزوں کے کہنے سننے اور دیکھنے سے پرہیز کرے اور اللہ کو اپنے اقوال و افعال پر حاضر و ناظر جانے:

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس نے غیر اللہ سے اس چیز کو چھپایا جس کو وہ اللہ سے نہیں چھپاتا اس نے گویا اللہ کی نظر کو حقیر جانا لہٰذا جس شخص نے یہ جانتے ہوئے کوئی گناہ کیا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے تو اس نے بڑی جرأت کی اور کیا ہی بڑی جرأت کی؟ اور جس نے اس گمان کے ساتھ کوئی گناہ کیا کہ اسے اللہ نہیں دیکھتا ہے تو پھر اس نے بڑا کفر کیا اور کیا ہی بڑا کفر کیا؟ اس لئے بطور تعلیق بالمحال کہا جاتا ہے کہ اگر تم اپنے خدا کا کوئی جرم کرو تو ایسی جگہ کرو جہاں وہ تمہیں نہ دیکھے مطلب یہ ہے کہ ایسی کون سی جگہ ہے کہ خدا کی نظر سے پوشیدہ ہو، اور جب ایسی کوئی جگہ بھی ممکن نہیں جہاں خدا گناہ کرتے نہ دیکھے تو پھر گناہ نہ کرو۔

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک "السمیع" کو پنجشنبہ کے دن نماز چاشت کے بعد پانچ سو بار ایک قول کے مطابق ہر روز نماز چاشت کے بعد ایک سو بار پڑھے اور پڑھنے کے درمیان کوئی کلام نہ کرے تو اس کے بعد جو دعا مانگے قبول ہوگی۔ اور اگر کوئی شخص فجر کی سنت و فرض نماز کے درمیان اسم پاک "البصیر" کو کامل اور صحیح اعتقاد کے ساتھ ایک سو ایک بار پڑھا کرے تو انشاء اللہ وہ حق تعالیٰ کی نظر عنایت کے ساتھ مختص ہوگا۔

اَلْحَکَمُ حکم کرنے والا کہ اس کے حکم کو کوئی رد نہیں کر سکتا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اس نے یہ جان لیا کہ حق تعالیٰ ایسا حاکم ہے کہ اس کے حکم اور اس کے فیصلہ کو کوئی ٹال نہیں سکتا تو اب اسے چاہئے کہ وہ اس کا ہر حکم مانے اور اس کی مشیت و قضا کا تابعدار ہو، لہٰذا جو بندہ اس کی مشیت اور اس کی قضا و قدر پر قصداً راضی نہ ہوگا تو حق تعالیٰ اس پر اپنی مشیت اور اپنا فیصلہ زبردستی جاری کرے گا اور جو شخص برضا و رغبت اور دل کے ساتھ بخوشی اسے مان لے گا۔

حق تعالیٰ اسے اپنی رحمت اور اپنے کرم سے نوازے گا وہ خوشی اور اطمینان کی زندگی گزارے گا اور وہ غیر اللہ کے سامنے اپنی فریاد لے کر جانے کا محتاج نہیں ہوگا۔

خاصیت: جو شخص اس اسم مبارک کو شب جمعہ میں اور ایک قول کے مطابق آدھی رات کے وقت اتنا پڑھے کہ بے ہوش ہو جائے تو حق تعالیٰ اس کے باطن کو معدن اسرار بنا دے گا۔

اَلْعَدْلُ "انصاف کرنے والا" یہ جاننے کے بعد کہ اللہ انصاف کرنے والا ہے بندہ کو چاہئے کہ اس کے احکام اور اس کے فیصلوں سے اپنے اندر گھبراہٹ اور تنگی پیدا نہ کرے بلکہ یہ یقین رکھے کہ اس نے میرے بارہ میں جو فیصلہ فرمایا ہے وہ عین انصاف ہے لہٰذا اس پر توکل اور اعتماد کے ذریعہ راحت و اطمینان پیدا کرنے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ اسے دے اس کو اس جگہ خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے جہاں خرچ کرنا از راہ شرع و عقل مناسب ہے اور اس کے عدل سے ڈرے اس کے فضل و کرم کا امیدوار رہے اور تمام امور میں افراط و تفریط سے پرہیز کرتے ہوئے درمیانی راہ کو اختیار کرے۔

خاصیت: یہ جو شخص اس اسم پاک کو شب جمعہ میں روٹی کے بیس لقموں پر لکھ کر کھائے حق تعالیٰ تمام مخلوق کو اس کے لئے مسخر کر دے گا۔

اَللَّطِیْفُ اپنے بندوں پر نرمی کرنے والا اور باریک بین کہ اس کے لئے دور و نزدیک یکساں ہیں۔" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ امور دین و دنیا میں غور و فکر کرے اور نرمی کے ساتھ لوگوں کو راہ حق کی طرف بلائے۔

خاصیت: جس شخص کو اسباب معیشت مہیا نہ ہوں اور فقر و فاقہ میں مبتلا رہتا ہو، یا غربت میں کوئی غمخوار نہ ہو یا بیمار ہو اور کوئی اس کی تیمارداری نہ کرتا ہو یا اس کے لڑکی ہو کہ اس کا رشتہ وغیرہ نہ آتا ہو تو اسے چاہئے کہ پہلے اچھی طرح وضو کرے اور دو رکعت نماز پڑھ کر اس اسم پاک کو اپنے مقصد کی نیت کے ساتھ سو بار پڑھے انشاء اللہ حق تعالیٰ اس کی مشکل آسان کرے گا اسی طرح لڑکیوں کا نصیب کھلنے کے لئے، امراض سے صحت یابی کے لئے اور مہمات کی تکمیل کے لئے اس اسم کو سو بار پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کرنی چاہئے اس اسم کے متعلق پیران اخوانیہ کا عمل یہ ہے کہ ہر (دینوی اور دینی مہم کے لئے کسی خالی جگہ میں اس اسم کی دعا کی شرائط کے ساتھ سولہ ہزار تین سو اکتالیس (۱۶۳۴۱) مرتبہ پڑھا جائے انشاء اللہ مراد حاصل ہوگی۔

اَلْخَبِیْرُ "دل کی باتوں اور تمام چیزوں کو خبر رکھنے والا۔" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اس نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ میرے بھیدوں پر مطلع ہے اور میرے دل کی باتیں تک جانتا ہے تو اب اس کے لئے لازم ہے کہ وہ بھی اس کو یاد رکھے اور اس کی یاد کے آگے اس کے ماسوا کو بھول جائے۔ ضلالت کے راستوں سے پرہیز کرے۔ اپنی ذات پر ریاکاری کے ترک اور تقویٰ کے اختیار کو لازم کرے۔ باطن کی اصلاح میں مشغول رہے اس سے غفلت نہ برتے اور دین و دنیا کی بہترین کھلی باتوں کی خبر رکھنے والا ہو۔

خاصیت: جو شخص نفس امارہ کے ہاتھوں گرفتار ہو وہ اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا رہے خدا نے چاہا تو اس سے نجات پائے گا۔

اَلْحَلِیْمُ بردبار کہ مؤمن کو عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ان کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ توبہ کر کے فلاح پائیں۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ بد طینت لوگوں کی ایذاء پر تحمل کرے، زیر دستوں کو سزا دینے پر تامل کرے اور غیض و غضب اور غصہ سے دور رہے اور حلم کے اس مرتبہ کمال کو پہنچنے کی کوشش کرے کہ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ برائی کرے تو وہ اس کے ساتھ نیکی کرے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو کاغذ پر لکھ کر دھوئے اور اس کا پانی کھیتی و درخت میں ڈالے نقصان سے محفوظ رہے گا، ان میں برکت ہوگی۔ اور ان سے پورا پورا ثمرہ حاصل ہوگا۔

اَلْعَظِیْمُ ذات پاک میں فہم و شعور کی حد رسائی سے بھی زیادہ بزرگ و برتر" یعنی اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے اس کی بزرگی و بڑائی اور عظمت اتنی زیادہ ہے کہ انسان کی عقل اور اس کی فہم و شعور اس کی عظمت و بڑائی کا ادراک بھی نہیں کر سکتا اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ عظمت الٰہی کے آگے کونین کو بھی حقیر جانے، دنیا کے لئے کسی کے آگے اپنا سر نہ جھکائے۔ اپنے نفس کو حقیر جانے اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو کرنے کا حکم کیا ہے ان کو اختیار کرے اور جن چیزوں سے بچنے کا حکم کیا ہے ان سے اجتناب کرے اور جو چیزیں خدا کو محبوب ہیں ان میں مشغول رہ کر اپنے نفس کو ذلیل کرے تاکہ خدا کی رضا و خوشنودی حاصل ہو۔

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو پڑھنے پر مداومت و ہمیشگی اختیار کرے وہ مخلوق خدا کی نظروں میں عزیز و مکرم ہوگا۔

اَلْغَفُوْرُ "بہت بخشنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ رات و دن کے اکثر اوقات میں خصوصاً سحر کے وقت استغفار کو اپنے اوپر لازم کرے اور اس شخص کو بخشش و معافی دے جو اسے تکلیف و ایذا پہنچائے۔

خاصیت: جس شخص کو کوئی بیماری ہو مثلاً بخار اور درد سر وغیرہ یا کوئی رنج و غم اس پر غالب ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس اسم پاک کو کاغذ پر لکھے اور اس کے نقش کو روٹی پر جذب کر کے اسے کھالے حق تعالیٰ اسے شفاء و نجات عطا فرمائے گا اور اگر کوئی شخص اس کو بہت پڑھتا رہے

اس کے دل کی ظلمت جاتی رہے گی۔

ایک حدیث میں منقول ہے کہ "جو شخص سجدہ کرے اور سجدہ میں یَارَبِّ اغْفِرْلِی اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے۔ تین مرتبہ کہے حق تعالیٰ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دے گا۔" جس شخص کو درد سر کا عارضہ لاحق ہو یا کسی اور بیماری اور غم میں مبتلا ہو تو اسے چاہئے کہ یاغفور کے مقطعات تین مرتبہ لکھ کر کھالے انشاء اللہ شفا پائے گا۔

اَلشَّکُوْرُ "قدر دان" اور تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ ثواب دینے والا" منقول ہے کہ کسی شخص کو (جو مر چکا تھا) خواب میں دیکھا گیا تو اس سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ حق تعالیٰ نے کیسا معاملہ کیا؟ اس شخص نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھ سے حساب کیا تو میری نیکیوں کا پلڑا اٹھ گیا۔ (اور گناہوں کا پلڑا غالب ہو گیا) کہ اچانک نیکیوں کے پلڑے میں ایک تھیلی آگر پڑی جس سے وہ پلڑا جھک گیا۔ جب میں نے پوچھا کہ "یہ کیا ہے" تو مجھے بتایا گیا کہ یہ ایک مٹھی بھر مٹی ہے جو تو نے اپنے ایک مسلمان بھائی کی قبر میں ڈالی تھی۔" اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کا فضل و کرم کتنے معمولی عمل پر بھی بندہ کو بے انتہا ثواب و رحمت سے نوازتا ہے اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے بایں طور کہ تمام نعمتوں کو اسی کی عطا جان کر اپنے ہر عضو کو اسی کام میں مشغول رکھے جس کے لئے حق تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے اور ان کا شکر ادا کرتا رہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے:

لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ مَنْ لَّا یَشْکُرُ النَّاسَ۔

"وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا۔"

خاصیت: جس شخص کی معیشت تنگ ہو یا اس کی آنکھ کی روشنی اور قلب کے نور میں کمی پیدا ہو گئی ہو تو وہ اس اسم پاک کو اکتالیس بار پانی پر پڑھ کر پیئے اور آنکھوں پر ملے انشاء اللہ تونگری حاصل ہوگی اور شفا پائے گا۔

اَلْعَلِیُّ "بلند مرتبہ" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ خدا کی ظاہری اور باطنی طاعات اور عبادات کے ذریعہ اپنے نفس کو ذلیل کرے اور اپنی تمام تر توانائی علم و عمل کے حصول میں صرف کرے یہاں تک وہ انتہائی کمالات اور مراتب عالی کو پہنچے۔ حدیث شریف میں منقول ہے کہ "اللہ تعالیٰ اعلیٰ امور کو پسند کرتا ہے (کیونکہ اس کی وجہ سے بندہ اعلیٰ مراتب اور بلند درجات کو پہنچتا ہے) اور ادنی امور کو ناپسند کرتا ہے اسی لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ مقولہ ہے کہ "علو ہمتی ایمان ہی سے پیدا ہوتی ہے۔"

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک پر مداومت کرے یا اس کو لکھ کر اپنے پاس رکھے تو اگر وہ کمتر اور بے قدر ہو تو بزرگ و بلند مرتبہ ہو جائے گا۔ فقر و افلاس میں مبتلا ہو تو تونگری حاصل ہوگی اگر سفر کی صعوبتوں میں مبتلا ہو تو وطن مالوف کو لوٹنا نصیب ہوگا۔

اَلْکَبِیْرُ "بڑا اور ایسا بڑا کہ اس کی بڑائی میں کوئی اس کا ہمسفر نہیں" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اس کی بڑائی کو ہمیشہ یاد رکھے یہاں تک کہ اس کے ماسوا کی بڑائی کو بالکل فراموش کردے علم و عمل کے حصول کے ذریعہ اپنے نفس کو کامل بنانے کی کوشش کرے تاکہ اس کے کمال اور اس کے فیض سے دوسرے مستفید ہوں، تواضع و انکساری اختیار کرنے میں مبالغہ کرے اور خدمت مولیٰ کو اپنے اوپر لازم قرار دے کر بے اعتنائی و بے ادبی سے احتراز کرے۔

خاصیت: اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھنے والا بزرگ مرتبہ اور عالی قدر ہوتا ہے اور اگر حکام و فرمانروا اس اسم پاک پر مداومت کریں تو لوگوں پر ان کا خوف و دبدبہ غالب ہو اور ان کے تمام امور بحسن خوبی انجام پائیں۔

اَلْحَفِیْظُ "عالم کو آفات و نقصانات سے محفوظ رکھنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے اعضاء کو گناہوں سے اور باطن کو ملاحظہ اغیار سے محفوظ رکھے اور اپنے تمام امور میں خدا کے فیصلوں اور اس کی مشیت پر اکتفا کرے اور اس کی قضا و قدر پر راضی ہو۔

ایک بزرگ کا یہ قول منقول ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے جس شخص کے اعضاء محفوظ رکھے اس کا دل محفوظ رکھا اور جس کا دل محفوظ رکھا

اس کے بھیدوں کو محفوظ کیا۔

منقول ہے کہ ایک دن اتفاق سے ایک بزرگ و صالح کی نظر کسی ممنوع چیز پر پڑ گئی فوراً وہ بارگاہ الٰہی میں عرض رساں ہوئے "الٰہ العالمین! مجھے اپنی بینائی کی بقاء کی صرف اسی لئے تمنا تھی تاکہ تیری عبادت میں کام آئے اب جب کہ تیرے حکم کی مخالفت کا سبب بن گئی ہے تو پروردگار اسے مجھ سے چھین لے۔" چنانچہ ان کی بینائی جاتی رہی اور وہ اندھے ہو گئے وہ رات میں نماز پڑھا کرتے تھا۔ بینائی جانے کے بعد رات میں انہیں پریشانی ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ طہارت اور وضو کے لئے پانی لینے سے بھی محتاج ہو گئے اب جب پانی ان کے ہاتھ نہ لگا اور نماز و عبادت میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو پھر خدا کے حضور عرض کیا "پروردگار" میں نے خود ہی کہا تھا کہ میری بینائی مجھ سے چھین لے لیکن اب رات میں تیری عبادت کے لئے مجھے اس کی ضرورت ہے اس کے بعد خدا نے ان کی بینائی واپس کر دی اور وہ ٹھیک ہو گئے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو لکھ کر اپنے دائیں بازو پر باندھ لے تو وہ ڈوبنے، جلنے، آسیب اور نظر بد وغیرہ سے محفوظ رہے گا۔

اَلْمُقِيْتُ بدن و روح کے لئے قوت (غذا) پیدا کرنے والا اور انہیں قوت دینے والا۔" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اس نے یہ جان لیا کہ وہی قوت پیدا کرنے والا ہے اور قوت دینے والا ہے تو اب اسے چاہئے کہ وہ اس کے ذکر (یعنی یاد الٰہی) کے سامنے اپنے قوت کا ذکر (یعنی اپنی غذا کا فکر) بھول جائے کیونکہ حقیقی قوت تو اسی کا ذکر اور اسی کی یاد ہے جیسا کہ حضرت سہل سے منقول ہے کہ ان سے جب قوت کے بارہ میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ حَيُّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ (ایسا زندہ جو نہیں مرتا) کا ذکر ہے" نیز بندہ کو چاہئے کہ وہ قوت اور قوت اپنے مولیٰ کے علاوہ اور کسی سے نہ مانگے ارشاد ربانی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔

"ایسی کوئی چیز نہیں ہے ہمارے پاس جس کے خزانے نہ ہوں اور ہم اسے اپنے اندازۂ مقرر کے مطابق ہی اتارتے ہیں۔"

نیز بندہ کو چاہئے کہ وہ اپنے ہر متعلق کو قوت دے جس کا وہ مستحق ہے تاکہ دوسروں کو نفع پہنچانا گمراہوں کی ہدایت کرنا اور بھوکوں کو کھانا کھلانا اس کا طرہ بن جائے۔

قشیریؒ فرماتے ہیں کہ "قوت مختلف نوع کے ہوتے ہیں ایک تو یہی ظاہری غذا اور خوراک کہ جس پر انسان کی زندگی کا مدار سمجھا جاتا ہے لیکن بعض بندے تو ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عبادات کی توفیق کو ان کے نفس کا قوت، مکاشفات کے صدور کو ان کے دل کا قوت اور مداومت مشاہدات کو ان کی روح کا قوت بنا دیتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی نیک بندہ کو اپنی طاعت و عبادات میں مشغول کرتا ہے اور اس طرح کہ وہ اپنی خواہشات نفس سے بالکل قطع نظر کر کے پورے حضور اور صدق و اخلاص کے ساتھ صرف اپنے مولیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کسی ایسے شخص کو مقرر فرما دیتا ہے جو اس کی خبر گیری اور خدمت کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اس کی ضروریات زندگی خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن جب کوئی بندہ اپنی خواہشات نفس کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کی تکمیل کو اسی کے بل بوتہ پر چھوڑ دیتا ہے اور اس کے اوپر سے اپنی عنایت و مدد کا سایہ اٹھا لیتا ہے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص کسی کو غربت زدہ دیکھے یا خود غربت میں مبتلا ہو، یا کوئی بچہ اپنی بدخوئی سے باز نہ آتا ہو یا بہت روتا ہو تو کسی خالی پیالہ وغیرہ پر سات بار اس اسم پاک کو پڑھ کر دم کرے اور پھر اس پیالہ میں پانی ڈال کر پی لے یا جس کو ضرورت ہو اسے پلا دے، اسی طرح اگر کسی روزہ دار کو ہلاکت کا خوف ہو تو وہ اس اسم پاک کو کسی پھول پر پڑھ کر سونگھے انشاء اللہ اسے قوت و تقویت حاصل ہو گی اور روزے رکھنے کے قابل ہو جائے گا۔

اَلْحَسِيْبُ "ہر حال میں کفایت کرنے والا یا قیامت کے دن حساب لینے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ محتاجوں کو کفایت کرنے والا" یعنی ان کی حاجتوں کو پورا کرنے والا ہو اور اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے۔

قشیریؒ نے اس موقع پر جو بات کہی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندوں کو اللہ کا کفایت کرنا یہ ہے کہ وہ اس کے ہر حال میں اور ہر کام میں مددگار ہوتا ہے اور اس کا ہر کام پورا ہوتا ہے لہٰذا جب بندہ نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ میرے لئے کافی اور میری ہر مراد اور میرے ہر کام کو پورا کرنے والا ہے تو اب اس کو چاہئے کہ وہ کسی بھی دنیاوی سہارے پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اگر اسے اپنے مقصد کے حصول میں کسی بھی دنیاوی سہارے سے بوقت ضرورت فائدہ نہ پہنچے جب کہ اسے اس سہارے پر اعتماد بھی رہا ہو تو اس سے بددل اور پریشان خاطر نہ ہو بلکہ یہ یقین رکھے کہ خدا نے میرے مقدر میں جو طے فرما دیا ہے بہرصورت وہی ہوگا اگر قسمت میں حصول مقصد لکھا جا چکا ہے تو وہ ضرور حاصل ہوگا چاہے وہ دنیاوی سہارا کتنا ہی مایوس کن کیوں نہ ہو اور اگر قسمت میں مقصد کا حصول نہیں لکھا ہے تو وہ حاصل نہیں ہوگا چاہے وہ دنیاوی سہارا کتنا ہی مایوس کن کیوں نہ ہو اور اگر قسمت میں مقصد کا حصول نہیں لکھا ہے تو وہ حاصل نہیں ہوگا چاہے وہ دنیاوی سہارا کتنا ہی زور کیوں نہ لگا لے اور پھر یہ کہ جو شخص خدا کی طرف سے پیش آنے والی چیز پر جو کہ اگرچہ اس کا مطلوب نہیں ہے اکتفا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو اس چیز پر راضی و مطمئن کر دے گا جو اس نے اس شخص کے لئے طے فرما دی ہوگی چنانچہ اس کا اثر یہ ہوگا کہ ایسا بندہ اپنے اسی وصف (یعنی راضی برضا ہو جانے کی) بناء پر اپنے مطلوب کے عدم حصول کو اس کے حصول کے مقابلہ میں فقر کو غنا کے مقابلہ میں برضا و رغبت اختیار و قبول کرے گا اور بسبب مشاہدہ و تصرف مولیٰ حصول مقصد کے اسباب و ذرائع مہیا نہ ہونے ہی پر مطمئن ہو جائے گا۔

خاصیت: جو شخص کسی چور یا حاسد یا ہمسایہ بد اور دشمن کے شر سے ڈرتا ہو یا چشم زخم سے پریشان ہو تو وہ ایک ہفتہ تک ہر صبح و شام ستر بار حَسْبِیَ اللّٰهُ الْحَسِیْبُ (کفایت کرنے والا اللہ میرے لئے کافی ہے) پڑھ لیا کرے اللہ تعالیٰ اسے ان چیزوں کے شر اور پریشانی سے محفوظ رکھے گا۔

اَلْجَلِیْلُ "بزرگ قدر" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ صفات کمال کے ذریعہ اپنے نفس کو آراستہ کر کے بزرگ مرتبہ بنے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو مشک و زعفران سے لکھ کر اپنے پاس رکھے یا کھائے تو تمام لوگ اس کی تعظیم و توقیر کرنے لگیں گے۔

اَلْکَرِیْمُ بڑا سخی اور بہت دینے والا کہ اس کا دینا نہ کبھی بند ہوتا ہے نہ اس کے خزانے خالی ہوتے ہیں" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ مخلوق خدا کو بغیر وعدہ کے مال و زر دیتا رہے اور ان کی ہر طرح کی مدد کرتا رہے نیز برے اخلاق اور برے فعل سے پرہیز کرے۔

خاصیت: جو شخص اپنے بستر پر پہنچ کر اس اسم پاک کو اتنا پڑھے کہ پڑھتے پڑھتے سو جائے تو اس کے لئے فرشتے دعا کریں اور کہیں اکرمک اللہ اللہ تجھے بزرگ مرتبہ کرے) اور تو مکرم و معزز ہو۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ اس اسم کو بہت زیادہ پڑھا کرتے تھے اسی وجہ سے انہیں "کرم اللہ وجہہ" کہا جانے لگا۔

اَلرَّقِیْبُ "ہر چیز کی نگہبانی کرنے والا" اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ "بندوں کے احوال و افعال جاننے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت اور ہر حال میں اللہ ہی پر نظر رکھے اس کے علاوہ کسی اور سے سوال نہ کرے کہ ماسوا اللہ کی طرف التفات ظاہر ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے جن کی نگہبانی اور دیکھ بھال پر مقرر فرمایا ہے ان کی نگہبانی اور دیکھ بھال میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہ کرے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم سب راعی یعنی نگہبان ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے بارہ میں محاسبہ کیا جائے گا یعنی جن کی نگہبانی اور خبر گیری پر تمہیں متعین کیا گیا ہے ان کی نگہبانی اور خبر گیری کا حال تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنا فرض کہاں تک ادا کیا؟

قشیریؒ کہتے ہیں کہ اس طائفہ یعنی اولیاء اللہ کی جماعت کے نزدیک مراقبہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ پر دل کے ساتھ..... اللہ کی یاد غالب ہو اور یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ میرے حال پر مطلع ہے لہٰذا وہ ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرے اور ہر دم اس کے عذاب سے ڈرے چنانچہ صاحب مراقبہ اللہ تعالیٰ کی حیا اور اس کی ہیبت کی وجہ سے خلاف شرع باتیں اس شخص سے زیادہ چھوڑتا ہے جو عذاب

خداوندی کے ڈر سے گناہ چھوڑتا ہے اور جو شخص اپنے دل کی رعایت کرتا ہے (یعنی ضمیر کے صحیح تقاضے پر ہی عمل کرتا ہے) تو اس کا کوئی لمحہ خدا کی یاد اور اس کی اطاعت سے خالی نہیں رہتا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک عمل کا حساب لے گا خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹا عمل ہو یا بڑے سے بڑا۔

چنانچہ ایک ولی کے بارہ میں منقول ہے کہ ان کے انتقال کے بعد انہیں کسی نے خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور مجھ پر اپنا احسان فرمایا لیکن پورا حساب لیا یہاں تک مجھ سے اس ایک عمل کا بھی مواخذہ کیا کہ ایک دن میں روزے سے تھا جب افطار کا وقت ہوا تو میں نے اپنے ایک دوست کی دکان سے گیہوں کا ایک دانہ اٹھا لیا اور پھر اسے توڑا، معاً مجھے خیال آیا کہ گیہوں کا یہ دانہ میری ملکیت میں نہیں ہے یہ خیال آتے ہی میں نے اس دانے کو اس جگہ ڈال دیا چنانچہ اب جب کہ میرا حساب لیا گیا تو اس گیہوں کے توڑنے کی بقدر نیکی میری نیکیوں سے لی گئی۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جس شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ اسے ایک دن خدا کی بارگاہ میں اتنی چھوٹی سے چھوٹی باتوں کا بھی حساب دینا ہے تو کیا وہ گوارا کرے گا کہ اپنی عمر عزیز باطل چیزوں میں ضائع کرے۔ اور اپنے وقت کوتاہیوں اور غفلتوں کی نذر کر دے؟ حدیث شریف میں منقول ہے کہ "تم اپنے اعمال کا خود محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تم سے تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے۔"

خاصیت: جو شخص اپنی بیوی، اپنی اولاد، اور اپنے مال پر اس اسم پاک کو سات مرتبہ پڑھ کر ان کے چاروں طرف دم کرے وہ تمام دشمنوں اور تمام آفات سے بے خوف ہو جائے گا۔

اَلْمُجِيْبُ "عاجزوں کی دعا قبول کرنے والا اور پکارنے والا" اس حدیث سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اوامر نواہی میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے اور حاجتمندوں کی حاجتوں کو پورا کرے۔

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو بہت پڑھے اور پھر دعا کرے تو اس کی دعا جلد قبول ہوگی اور اگر اسے لکھ کر اپنے پاس رکھے تو حق تعالیٰ کی امان میں رہے گا۔

اَلْوَاسِعُ "وسیع علم والا اور اپنی نعمتوں سے سب کو نوازنے والا۔" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اپنے علم میں اپنی سخاوت میں اور معارف و اخلاق میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کرے سب ہی سے چہرہ کی بشاشت اور کشادگی کے ساتھ پیش آئے اور دنیاوی مقاصد کے حصول میں فکر مند نہ رہا کرے۔

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو بہت پڑھے اور اس پر ہمیشگی اختیار کرے۔ حق تعالیٰ اسے قناعت اور برکت کی دولت سے نوازے گا۔

اَلْحَكِيْمُ "دانا اور استوار کار" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ کتاب اللہ میں مذکور صفات حمیدہ کو اپنائے اور کمال تعلق اس سے پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اپنے تمام امور میں استواری پیدا کرے نیز اسے چاہئے کہ وہ سفاہت یعنی بے وقوفی سے پرہیز کرے اور کوئی کام بغیر باعث حقانی اور بغیر داعیہ ربانی نہ کرے تاکہ اس کی ذات اسم "حکیم" کا پرتو ثابت ہو۔

حضرت ذوالنون مصری کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "جب میں نے سنا کہ مغرب کے علاقہ میں ایک شخص اپنے علم و حکمت کی بناء پر بہت مشہور و معروف ہیں تو میں ان کی زیارت کے لئے ان کے پاس پہنچا میں چالیس دن تک ان کے دروازے پر پڑا رہا اور میں یہ دیکھتا تھا کہ وہ نماز کے وقت مسجد میں آتے اور حیران و پریشان پھرنے لگتے اور میری طرف قطعاً کوئی توجہ و التفات نہ فرماتے اس صورت حال سے جب میں تنگ آگیا تو ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ "جناب! چالیس دن سے میں یہاں پڑا ہوں لیکن نہ تو آپ میری طرف التفات کرتے ہیں اور نہ مجھ سے کلام کرتے ہیں؟ آپ مجھے کوئی نصیحت کیجئے اور کچھ با حکمت باتیں بتائیے کہ اسے میں یاد رکھوں!" انہوں نے کہا کہ "تم اس پر عمل کرو گے یا نہیں؟ میں نے کہا "ہاں! اگر خدا نے توفیق دی تو ضرور عمل کروں گا" پھر انہوں نے حکمت و موعظت سے بھرپور یہ بات مجھ سے کہی کہ "دنیا کو دوست نہ رکھو، فقر کو غنیمت جانو، بلا کو نعمت سمجھو، منع یعنی نہ ملنے کو عطا جانو، غیر

اللہ کے ساتھ نہ انس اختیار کرو اور نہ ان کی صحبت میں اپنے کو مشغول رکھو، خواری کو عزت سمجھو، موت کو حقیقی حیات جانو، طاعت و عبادت کو اپنی عزت کا ذریعہ سمجھو اور توکل کو اپنی معاش قرار دو۔

از سینہ محوکن ہمہ نام و نشان غیر الا کسے کہ می دہداز وے نشان ترا

خاصیت: اگر کسی شخص کو اپنے کسی کام میں پریشانی ہو اور وہ پورا نہ ہو رہا ہو تو اسے چاہئے کہ اس اسم پاک پر مداومت اور ہمیشگی اختیار کرے انشاء اللہ تعالیٰ اس کا کام پورا ہو جائے گا۔

اَلْوَدُوْدُ: "فرمانبردار بندوں کو دوست رکھنے والا یا اولیاء اللہ کے قلوب میں محبوب" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ مخلوق خدا کے لئے وہی چیز پسند کرے گا جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور ان پر اپنی بساط بھر احسان کرتا ہے "آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے"

بندوں کو اللہ تعالیٰ کا دوست رکھنا یہ ہے کہ وہ بندوں پر اپنی رحمت نازل کرتا ہے۔ ان کی تعریف کرتا ہے ان کو خیر و بھلائی پہنچاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بندوں کا دوست رکھنا یہ ہے کہ وہ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور اپنے قلوب میں اس کی ہیبت و بڑائی رکھتے ہیں۔ حدیث میں منقول ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے دوستوں میں بڑا دوست وہ ہے جو غیر عطا کے لئے میری عبادت کرتا ہے یعنی وہ عطا و بخشش کی امید سے نہیں بلکہ صرف میری رضا اور خوشنودی کی خاطر ہی عبادت کرتا ہے۔

خاصیت: اگر میاں بیوی کے درمیان ناچاقی پیدا ہو جائے اور تعلقات انتہائی کشیدہ ہو جائیں تو اس اسم پاک کو کسی کھانے کی چیز پر ایک ہزار ایک مرتبہ پڑھ کر دونوں میں سے اس کو کھلا دیا جائے جس کی طرف سے ناچاقی پیدا ہوتی ہو انشاء اللہ ان دونوں کے درمیان اتفاق و الفت کی فضا بحال ہو جائے گی۔

اَلْمَجِيْدُ: "بزرگ و شریف ذات" اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم مبارک "العظیم" کے بارہ میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

خاصیت: جس شخص کو آبلہ پا، یا باد فرنگ (آتشک) یا برص اور یا جذام کا مرض لاحق ہو تو اسے چاہئے کہ وہ ایام بیض میں روزے رکھے اور افطار کے وقت اس اسم پاک کو بہت پڑھے اور پانی پر دم کر کے پی لے۔ خدا نے چاہا تو یقیناً شفا پائے گا اور جس شخص کو اپنے ہم عصروں اور ہم جنسوں میں عزت و احترام کی نظر سے نہ دیکھا جاتا ہو تو وہ ہر صبح اس اسم پاک کو ننانوے مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرے اسے عزت و احترام حاصل ہو گا۔

اَلْبَاعِثُ: "مردوں کی قبروں سے اٹھانے والا اور زندہ کرنے والا اور غافلوں کا دل خواب غفلت سے بیدار کرنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ جاہل نفسوں کو تعلیم دے کر اور نصیحت کر کے انہیں دنیا سے بے رغبتی کا احساس دلا کر اور آخرت کی نعمتوں کا راغب بنا کر جہالت و غفلت کے خواب سے انہیں بیدار کرے اور ان کے مردہ قلوب کو زندہ کرے۔ چنانچہ وہ اپنے نفس سے اس کی ابتدا کرے اس کے بعد دوسروں کی طرف متوجہ ہو۔

خاصیت: اگر کوئی یہ چاہے کہ اس کے قلب کو حقیقی زندگی ملے۔ سوتے وقت اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اس اسم پاک کو ایک سو ایک بار پڑھے۔ حق تعالیٰ اس کے دل کی مُردنی کو دور کرے گا اور اسے حیات بخش کر انوار کا مسکن بنائے گا۔

اَلشَّهِيْدُ: "حاضر اور ظاہر و باطن پر مطلع" قشیری کہتے ہیں کہ اہل معرفت، اللہ سے اس کی ذات کے علاوہ اور کسی مونس کی خواہش نہیں کرتے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ صرف اسی ذات پر خوش اور مطمئن رہتے ہیں کیونکہ صرف خدا ہی ان کے تمام احوال پر نظر رکھتا ہے اور وہی ان کے تمام امور و افعال کو جانتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ

"کیا تمہارا پروردگار تمہارے لئے اس بات میں کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر مطلع ہے۔"

اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اس بات کا دھیان رکھے کہ اس کا پروردگار اس کو کسی ایسی جگہ نہ دیکھے جو اس کے لئے پروردگار کی طرف سے ممنوع ہے یعنی برائی کی جگہ اور اس کو کسی بھی ایسی جگہ سے غیر موجود نہ دیکھے جہاں اس کو موجود رہنے کا اس نے حکم دیا ہے (یعنی بھلائی کی جگہ) اور اس یقین کی بناء پر کہ اللہ تعالیٰ میرے حال کو مجھ سے اچھی طرح جانتا ہے اور وہ میری حالت کو بخوبی دیکھتا ہے، غیر اللہ کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنے اور غیر اللہ کی طرف بنظر امید رغبت و میلان رکھنے سے باز رہے نیز بندہ پر اس اسم کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ صرف سچائی کا گواہ بنے اور سچائی ہی کی رعایت کرے۔

خاصیت: اگر کسی شخص کا لڑکا نافرمان ہو یا اس کی لڑکی غیر صالح ہو تو اسے چاہئے کہ وہ ہر روز صبح کے وقت اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھے اور اس کا منہ آسمان کی طرف اٹھوا کر "یاشہید" اکیس بار پڑھے حق تعالیٰ اسے فرمانبردار اور صالح بنائے گا۔

اَلْحَقُّ: "شہنشاہی کے ساتھ قائم اور خدائی کے لائق" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اس نے جان لیا کہ اسی کی ذات حق ہے تو اب وہ اس کے مقابلہ میں مخلوق کی یاد اور مخلوق کی طلب بھول جائے۔ نیز اس اسم کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام اقوال و افعال اور احوال میں حق بات اور حق چیز ہی کو اپنے اوپر لازم کرے۔

خاصیت: اگر کسی کی کوئی چیز گم ہو گئی تو ایک کاغذ کے چاروں کونوں پر اس اسم پاک کو لکھے اور کاغذ کے بیچ میں اس چیز کا نام لکھے اور پھر آدھی رات کے وقت اس کاغذ کو ہتھیلی پر رکھ کر اور آسمان کی طرف نظر کر کے حق تعالیٰ سے اس اسم پاک کی برکت اور اس کے وسیلہ کے ذریعہ اس چیز کے حصول کی دعا کرے۔ انشاء اللہ یا وہ چیز جوں کی توں مل جائے گی یا اس کا کچھ حصہ حاصل ہو جائے گا اور اگر کوئی قیدی آدھی رات کے وقت ننگے سر ہو کر اس اسم پاک کو ایک سو آٹھ مرتبہ پڑھے تو حق تعالیٰ اسے رہائی نصیب کرے گا۔

اَلْوَکِیْلُ: "کارساز" اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا (یعنی کارساز ہونے میں اللہ کفایت کرتا ہے) اور وَعَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوْا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اگر تم مؤمن ہو تو اپنا ہر کام اللہ ہی کی طرف سونپو وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (جو شخص اللہ ہی پر بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے اور اللہ اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے) اور وَتَوَکَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ (یعنی ایسے زندہ پر بھروسہ اور اعتماد کرو۔ جس کے لئے موت نہیں ہے) اور وَتَوَکَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ (یعنی اس ذات پر بھروسہ اور اعتماد کرو جو غالب اور مہربان ہے)۔

اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ضعیف اور لاچار لوگوں کا مددگار و معاون بنے اور ان کے کام کاج کرتا ہے ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اس طور پر سعی و کوشش کرے کہ گویا وہ ان کا وکیل ہے۔

خاصیت: اگر بجلی گرنے کا خوف ہو یا پانی اور آگ سے کسی نقصان کا خطرہ ہو تو اس اسم پاک کا ورد کیا جائے تو انشاء اللہ امان ملے گی اور اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو کسی خوف و خطر کی جگہ بہت پڑھے تو وہ بے خوف و بے خطر ہو گا۔

اَلْقَوِیُّ۔ اَلْمَتِیْنُ: "قوت والا" اور تمام امور میں استوار" ان سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ خواہشات نفسانی پر غالب اور قوی ہو، دین کے معاملہ میں سخت و چست رہے اور شرعی احکام کو نافذ کرنے اور پھیلانے میں کسی سستی اور کمزوری کو راہ نہ دے۔

خاصیت: اگر کسی کا دشمن قوی ہو اور وہ اس کے دفاع میں عاجز اور لاچار ہو تو وہ تھوڑا سا آٹا گوندھے اور اس کی ایک ہزار ایک سو گولیاں بنا لے۔ پھر ایک ایک گولی اٹھاتا جائے اور "یاقوی" پڑھتا جائے اور اس گولی کو بہ نیت دفاع دشمن مرغ کے آگے ڈالتا رہے۔ حق تعالیٰ اس کے دشمن کو مغلوب و مقہور کر دے گا اور اگر اس اسم پاک کو جمعہ کی شب میں بہت زیادہ پڑھا جائے تو نسیان کا مرض جاتا رہے گا اگر

کسی بچہ کا دودھ چھڑایا گیا ہو اور وہ بچہ اس کی وجہ سے صبر و قرار نہ پاتا ہو تو اس اسم پاک کو لکھ کر اس بچہ کو پلا دے اسے صبر و قرار آجائے گا، اسی طرح اگر کسی دودھ والی کے دودھ میں کمی ہو تو اس اسم پاک کو لکھ کر اس کو پلا دیا جائے اس کے دودھ میں فراوانی آجائے گی اور اگر کوئی شخص ملک و حکومت کے کسی منصب یا کام پانے کی خواہش رکھتا ہو تو وہ اس کو اتوار کے روز اول ساعت میں اپنے مقصد کی نیت سے اس اسم "المتین"، کو تین سو ساٹھ بار پڑھے۔ انشاء اللہ اس کو وہ منصب حاصل ہوگا۔

اَلْوَلِیُّ: "مددگار اور مؤمنوں کو دوست رکھنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ میل ملاپ اور دوستی رکھے، دین کی تائید و حمایت میں کوشش کرے اور مخلوق خدا کی حاجتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

قشیریؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی علامات میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ کو دوست رکھتا ہے اسے ہمیشہ خیر و برکت بھلائی کی توفیق دیتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بندہ اگر بتقاضائے بشریت کسی برائی کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ارتکاب سے اسے بچاتا ہے اور اگر وہ ناگہاں اس برائی میں مبتلا بھی ہو جاتا ہے تو اسے اس میں مبتلا نہیں رہنے دیتا بلکہ جلد ہی توبہ و انابت کے ساتھ اس برائی سے نکال لیتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے کہا گیا ہے:

اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا لَمْ يَضُرَّهٗ ذَنْبٌ

"اللہ تعالیٰ جب کسی کو دوست رکھتا ہے تو اس کو گناہ نقصان نہیں پہنچاتا۔"

اور اگر طاعت و عبادت میں کوتاہی و قصور کی طرف اس کا میلان ہوتا ہے۔ تو حق تعالیٰ اسے طاعت و عبادت میں مشغول ہونے ہی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور یہی بات بندہ کی سعادت کی علامت قرار پاتی ہے جب کہ اس کا عکس بندہ کی شقاوت و سیاہ بختی کی علامت ہے۔ نیز خدا تعالیٰ کی دوستی کی ایک اور علامت اور اس کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے اولیا کے قلوب میں ایسے بندہ کی محبت جاگزین کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اولیاء اللہ اس بندہ سے کمال تعلق اور کمال مہربانی سے پیش آتے ہیں۔

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا رہے وہ مخلوق خدا کی دل کی باتوں پر آگاہ ہو اور اگر کسی شخص کی بیوی یا لونڈی ایسی سیرت و عادت کی حامل ہو کہ اس کے لئے باعث کوفت اور باعث اذیت ہو تو اسے چاہئے کہ جب وہ اس بیوی یا لونڈی کے سامنے جانا چاہے تو اس اسم پاک کو بہت پڑھے حق تعالیٰ اسے صلاحیت و درستی کی راہ پر لگائے گا۔

اَلْحَمِیْدُ: "اپنی ذات و صفات کی تعریف کرنے والا یا تعریف کیا ہوا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ ہمیشہ حق کی تعریف کرنے والا رہے۔ صفات کمالیہ کے ساتھ اپنی ذات کو آراستہ کرے، یا اپنے اعمال حسنہ اور اخلاق حمیدہ کی بناء پر خدا اور خدا کی مخلوق دونوں کی نظروں میں ایسا ثابت ہو کہ اس کی تعریف کی جائے۔

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھے اس کے افعال پسندیدہ ہوں گے اور اگر کسی شخص پر فحش گوئی اور بدزبانی غالب ہو کہ اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے پر قادر نہ ہو تو اسے چاہئے کہ اس اسم پاک کو کسی پیالہ پر لکھے یا بعض حضرات کے قول کے مطابق اس اسم پاک کو اس پیالہ پر نوے بار پڑھے اور ہمیشہ اسی پیالہ میں پانی پیتا رہے انشاء اللہ فحش گوئی اور بدزبانی سے محفوظ رہے گا۔

اَلْمُحْصِیْ: "اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کے نزدیک تمام مخلوقات کی تعداد ظاہر ہے" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ خواہ حرکت کی حالت میں ہو یا سکون کی حالت میں یعنی کسی بھی لحظہ اور کسی بھی لمحہ غفلت میں مبتلا نہ ہو اور اس کا ایک ایک سانس یاد الٰہی کے ساتھ باہر آئے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ "اہل جنت اس لمحہ پر حسرت و افسوس کریں گے جو یاد الٰہی کے بغیر گزرا ہوگا"

نیز اس بات کی کوشش کرے کہ اپنے اعمال اور باطنی احوال پر مطلع رہے۔ اور اس اسم کا تقاضہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اسے جن نعمتوں

سے نوازا ہے ان کو شمار کرتا رہے تاکہ وہ ان کا شکر ادا کر کے خدا کے سامنے اپنے آپ کو عاجز و محتاج سمجھے اور اپنے گناہوں کو شمار کرے ان کی وجہ سے شرمندہ و شرمسار و معذرت خواہ ہو اور ان ایام اور لمحات کو یاد کر کے حسرت و افسوس کرے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت اور اس کی یاد سے خالی رہے ہوں۔

خاصیت: جو شخص شب جمعہ میں اس اسم پاک کو ایک ہزار ایک مرتبہ پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اسے عذاب قبر اور عذاب قیامت سے محفوظ رکھے گا۔

اَلْمُبْدِئُ "المعید": "پہلی مرتبہ پیدا کرنے والا اور دوبارہ پیدا کرنے والا" ان ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ہر معاملہ اور ہر چیز میں اللہ رب العزت کی طرف اول بار بھی اور دوبارہ بھی رجوع کرے، نیکیاں پیدا کرنے میں سعی و کوشش کرے اور جو نیک عمل کرنے سے رہ گیا ہو یا جس عمل میں کوئی کمی اور کوتاہی ہوگئی ہو اس کا اعادہ کرے یعنی ان کو دوبارہ کرے۔

خاصیت: جس کی بیوی کو حمل ہو اور اسقاط حمل کا خوف ہو یا ولادت میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہو تو خاوند کو چاہئے کہ وہ اس اسم پاک "المبدئ" کو نوے بار پڑھے اور شہادت کی انگلی اس کے پیٹ کے چاروں طرف پھیرے انشاء اللہ حمل ساقط ہونے کا خوف نہیں رہے گا اور ولادت سے باطمینان اور بلا کسی ضرر جلد فراغت حاصل ہوگی اور جو شخص اس اسم پاک پر مداومت کرے یعنی اس کو پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کرے تو اس کی زبان سے وہی بات نکلے گی جو صحیح اور باعث ثواب ہوگی۔

اگر کسی شخص کا کوئی عزیز وغیرہ غائب ہو گیا ہو اور اسکی آمد یا خیریت کی طلب کا خواہش مند ہو تو اس وقت جب کہ اس کے گھر والے سو گئے ہوں اس اسم پاک کو گھر کے چاروں کونوں میں ستر بار پڑھے اور اسکے بعد کہے یا معید فلاں شخص کو میرے پاس واپس بلا دے یا اس کی خیریت معلوم کرادے" سات دن بھی گزرنے نہ پائیں گے کہ یا تو غائب آجائے گا یا اس کی خیریت معلوم ہو جائے گی۔ اور اگر کسی شخص کی کوئی چیز گم ہوئی تو وہ اس اسم المعید" کو بہت زیادہ پڑھتا رہے انشاء اللہ اس کی وہ چیز مل جائے گی۔

اَلْمُحْیِ۔ اَلْمُمِیْتُ: "زندہ کرنے والا اور مارنے والا" یعنی اللہ تعالیٰ نور ایمان کے ذریعہ قلوب کو زندہ کرتا ہے اور جسم میں زندگی پیدا کرتا ہے۔ نیز وہی جسم کو موت دیتا ہے اور قلوب کو غفلت و نادانی کے ذریعہ مردہ کرتا ہے۔

ان دونوں ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ علم سے نفع پہنچا کر مخلوق خدا کو اور مغفرت الٰہی کی شمع جلا کر قلوب کو زندگی و تازگی کی دولت بخشے اور نفسانی خواہشات اور شیطانی خطرات و وساوس کو موت کے گھاٹ اتارے، نیز یہ حیات کی تمنا کرے اور نہ موت کی آرزو بلکہ قضاء و قدر الٰہی کا تابعدار بنے اور یہ دعا جو آنحضرت ﷺ سے منقول ہے پڑھتا رہے۔

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَ الْحَیٰوۃُ خَیْرًا لِّیْ وَ تَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِّیْ وَ اجْعَلِ الْحَیٰوۃَ زِیَادَۃً فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَّاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَۃً مِّنْ کُلِّ شَرٍّ۔

"اے اللہ مجھے زندگی دے کہ جب تک کہ زندگی میرے لئے بہتر ہو اور مجھے موت دے جب کہ موت میرے لئے بہتر ہو اور میری زندگی کو ہر خیر و بھلائی میں زیادتی کا سبب اور موت کو ہر برائی سے راحت کا باعث بنا دے۔"

خاصیت: جو شخص کسی درد، رنج و تکلیف اور کسی عضو کے ضائع ہو جانے کے خوف میں مبتلا ہو تو وہ اس اسم پاک "المحی" کو سات بار پڑھے حق تعالیٰ اسے خوف سے نجات دے گا نیز درد ہفت اندام کو دور کرنے کے لئے سات روز تک یہ اسم پڑھا کرے اور ہر روز پڑھ کر دم کیا جائے اور جو شخص اس اسم پاک کے پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کرے تو اس کے دل کو زندگی اور بدن کو قوت حاصل ہوگی جو شخص اپنے نفس پر قادر نہ ہو کہ اتباع شریعت کے معاملہ میں اس کا نفس اس پر غالب ہو یعنی اسے اتباع شریعت سے باز رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ سوتے وقت سینہ پر ہاتھ رکھ کر اسم پاک "الممیت" اتنا زیادہ پڑھا کرے کہ پڑھتے ہوئے سو جائے تو حق تعالیٰ اس کے نفس کو مطیع و فرمانبردار

بنادے گا۔

اَلْحَیُّ: "ازل سے ابد تک زندہ رہنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کے ذریعہ زندہ رہے اور اپنی جان اس کی راہ میں قربان کردے۔ یعنی راہ خدا میں شہید ہو کر ابدی حیات حاصل کرے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص بیمار ہو تو اس اسم پاک کو بہت پڑھتا رہے یا کوئی دوسرا شخص اس بیمار پر اور بعض حضرات کے قول کے مطابق آنکھ سامنے کر کے اسے بہت پڑھے تو حق تعالیٰ اسے صحت عطا فرمائے گا اور جو شخص ہر روز ستر بار اس اسم کو پڑھ لیا کرے تو اس کی عمر دراز ہوگی اور اس کی قوت روحانیہ میں اضافہ ہوگا۔

اَلْقَیُّوْمُ: "خود بھی قائم اور مخلوقات کا قائم رکھنے والا اور خبر گیری کرنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ماسوا اللہ سے بالکل بے پروا ہو جائے۔

قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جس نے یہ جانا کہ اللہ تعالیٰ قیوم ہے تو اس نے تدبیر و اشتغال کے رنج و فکر سے نجات پائی اور راحت و تفویض کے ساتھ اپنی زندگی گزاری لہٰذا اب نہ تو بخل کرے گا اور نہ دنیا کی کسی بھی بیش قیمت چیز کو کوئی اہمیت دے گا۔

خاصیت: جو شخص بوقت سحر اس اسم کو بہت زیادہ پڑھا کرے تو لوگوں کے قلوب میں اس کا تصرف ظاہر ہوگا یعنی تمام لوگ اسے محبوب و دوست رکھیں گے اور اگر کوئی شخص اس اسم کو بہت زیادہ پڑھے تو اس کے تمام امور بحسب دلخواہ پورے ہوں گے۔

اَلْوَاجِدُ: "غنی کہ کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ ضروری کمالات عالیہ حاصل کرنے میں سعی و کوشش کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے ماسوی اللہ سے مستغنی اور بے پرواہ ہو۔

خاصیت: اگر کوئی شخص کھانا کھاتے وقت ہر نوالے کے ساتھ یہ اسم پاک پڑھے تو وہ کھانا اس کے پیٹ میں نور ہوگا اور اگر کوئی خلوت میں اس اسم کو پڑھے تو تونگر ہوگا۔

اَلْمَاجِدُ: "بزرگ نصیب" اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اس سے پہلے نام کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو خلوت میں پڑھے اتنا کہ بے ہوش ہو جائے اس کے دل پر انوار الٰہی ظاہر ہوں گے اور اگر کوئی شخص اس کو بہت پڑھتا رہے تو مخلوق خدا کی نظروں میں بزرگ مرتبہ ہو۔

اَلْوَاحِدُ "اَلْاَحَدُ": "ذات وصفات میں یکتا و یگانہ" اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ عبادت و بندگی میں یکتا و یگانہ بنے جیسا کہ اس کا معبود خدائی میں یکتا و یگانہ ہے۔ اور ایسے فضائل سے اپنی ذات کو آراستہ کرے کہ اس کا کوئی ہم جنس اس کے مثال نہ ہو۔

خاصیت: اگر کسی کا دل خلوت سے ہراساں ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس اسم پاک کو ایک ہزار ایک مرتبہ پڑھے انشاء اللہ اس کے دل سے خوف جاتا رہے گا اور بارگاہ حق جل مجدہ کا مقرب ہوگا، اور اگر کسی کا فرزند پیدا ہونے کی تمنا ہو تو وہ اس کو لکھ کر اپنے پاس رکھے اللہ تعالیٰ اسے فرزند عطا کرے گا۔

اَلصَّمَدُ: بے پروا، کہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اپنی ہر حاجت میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرے، اپنے رزق سے بے فکر رہے، اس کی ذات پر توکل کرے۔ دنیا کی حرام چیزوں سے بچے دنیا کی زینت کی چیزوں کی طرف رغبت نہ کرے، دنیا کی حلال چیزوں کے حصول کی بھی ہوس نہ کرے، مخلوق سے اپنے آپ کو بے پروا رکھے اور مخلوق خدا کی حاجت روائی کی سعی و کوشش کرتا رہے۔

خاصیت: جو شخص بوقت سحر یا آدھی رات کو سجدہ کرے اور اس اسم پاک کو ایک سو پندرہ بار پڑھے اللہ تعالیٰ اسے صادق الحال بنائے گا اور کسی ظالم کے ہاتھ نہیں لگے گا۔ اور جو شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا رہے وہ بھوکا نہیں رہے گا۔ اور اگر حال وضو میں اسے پڑھے

گا تو مخلوق خدا سے بے پرواہو۔

اَلْقَادِرُ۔ اَلْمُقْتَدِرُ: "قدرت والا۔ اور قدرت ظاہر کرنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو خواہشات و لذات سے باز رکھنے پر قادر ہو۔

خاصیت: اگر کوئی شخص وضو میں وضو کے ہر عضو کو دھوتے وقت اسم پاک "القادر" پڑھ لیا کرے تو وہ کسی ظالم کے ہاتھوں گرفتار نہیں ہوگا اور کوئی دشمن اس پر فتحیاب نہ ہوگا اور اگر کوئی مشکل کام پیش آئے تو اکتالیس مرتبہ یہ اسم پڑھ لیا جائے خدا نے چاہا تو کام بحسن و خوبی انجام پذیر ہوگا۔

اگر کوئی شخص اسم پاک "المقتدر" کو پابندی کے ساتھ پڑھتا رہا تو غفلت ہوشیاری میں بدل جائے گی۔ اور جو شخص سو کر اٹھتے وقت یہ اسم پاک بیس بار پڑھ لیا کرے تو اس کے تمام کام حق تعالیٰ کی طرف راجع ہوں۔

اَلْمُقَدِّمُ۔ اَلْمُؤَخِّرُ: "دوستوں کو اپنی درگاہ عزت کا قرب بخش کر آگے بڑھانے والا اور دشمنوں کو اپنے لطف و کرم سے دور رکھ کر پیچھے ڈالنے والا" ان دونوں پاک ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ نیکیوں میں پیش قدمی اختیار کر کے اپنے آپ کو آگے کرے یعنی دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو افضل بنائے اور ان لوگوں کو آگے کرے جو اللہ رب العزت کی بارگاہ عزت کے مقربین میں سے ہیں یعنی ان کو عزیز رکھے اور نفس اور شیاطین کو اور ان لوگوں کو جو بارگاہ کبریائی کے ٹھکرائے ہوئے ہیں پس پشت ڈالے، نیز اپنے تمام امور و اعمال کو ضابطہ و قاعدہ کے مطابق انجام دے۔ مثلاً پہلے وہ کام اور عمل کرے جو سب سے زیادہ ضروری ہو اور جسے خدا نے سب سے مقدم کیا ہو اور سب سے بعد میں اس عمل کو اختیار کرے جو سب سے کم ضروری ہو۔

خاصیت: اگر کوئی شخص معرکہ جنگ میں اس اسم پاک "المقدم" پڑھے یا اسے لکھ کر اپنے پاس رکھے تو اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا اور جو شخص اس اسم پاک کو بہت پڑھتا ہے تو اس کا نفس طاعت الٰہی کے لئے فرمانبردار و مطیع ہو جائے گا۔

جو شخص یہ اسم پاک "المؤخر" سو مرتبہ پڑھے اس کے دل کو غیر اللہ کے ساتھ قرار نہیں ملے گا۔ اور جو شخص روزانہ اس اسم پاک کو سو بار پڑھ لیا کرے تو اس کے تمام کام انجام پذیر ہوں اور جو شخص اس کو اکتالیس مرتبہ پڑھے اس کا نفس مطیع و فرمانبردار ہو۔

اَلْاَوَّلُ۔ اَلْاٰخِرُ: "سب سے پہلے اور سب سے پیچھے" ان سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اللہ کی عبادات اور اس کے احکام بجالانے میں جلدی کرے اور اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی جان قربان کرے تاکہ حیات ابدی حاصل ہو۔

خاصیت: اگر کسی کو اولاد نرینہ نہ ہوتی ہو تو اس اسم پاک "الاول" چالیس دن تک ہر روز چالیس مرتبہ پڑھے اس کی مراد پوری ہوگی۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ فرزند، غنا یا اور کسی چیز کی حاجت و تمنا ہو تو وہ چالیس جمعوں کی راتوں میں ہر رات ایک ہزار مرتبہ یہ اسم پڑھے انشاء اللہ اس کی تمام حاجتیں پوری ہوں گی۔

جو شخص اپنی عمر کے آخری مرحلہ میں ہو اور اسکی پوری زندگی بدعملیوں اور گناہوں میں گزری ہو تو وہ اس اسم پاک "الاخر" کو اپنا ورد قرار دے لے حق تعالیٰ اس کا خاتمہ بخیر کرے گا۔

اَلظَّاهِرُ۔ اَلْبَاطِنُ: اپنی مصنوعات اور مخلوقات کے اعتبار سے کہ جو اس کے کمال صفات کی دلیل ہیں، آشکارا اور اپنی ذات کی حقیقت و کہنہ کے اعتبار سے وہم و خیال سے مخفی۔

خاصیت: جو شخص نماز اشراق کے بعد اسم پاک "الظاہر" پانچ سو مرتبہ پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اس کی آنکھیں روشن و منور کرے گا اگر طوفان باد و باران وغیرہ کا خوف ہو تو یہ اسم پاک بہت زیادہ پڑھا جائے امن و عافیت حاصل ہوگی، اگر اس اسم پاک کو گھر کی دیواروں پر لکھ دیا جائے تو وہ دیواریں محفوظ و سلامت رہیں گی۔

جو شخص ہر روز "یا باطن" تینتیس بار کہہ لیا کرے حق تعالیٰ اسے صاحب اسرار الٰہی بنائے گا۔ اور اگر کوئی شخص اس پر مداومت اختیار کرے تو اس پر جس کی بھی نظر پڑے گی اس کا دوست بن جائے گا۔

اَلْوَالِي: "کارساز و مالک" اس اسم پاک سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم پاک "الوکیل" کے ضمن میں نقل کیا جا چکا ہے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس کا یا اس کے علاوہ کسی اور کا گھر معمور و آباد ہو اور بارش و دیگر آفات سے محفوظ رہے تو اسے چاہئے کہ کوزہ آب نارسیدہ پر یہ اسم پاک لکھے اور اس کوزہ میں پانی ڈال کر اس کوزہ کو گھر کی دیوار پر مارے، گھر اور درودیوار محفوظ و سلامت رہیں گے۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اسم پاک "الولی" کو تین سو مرتبہ پڑھنے سے بھی یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور اگر کسی شخص کی تسخیر کی نیت سے یہ اسم پاک گیارہ مرتبہ پڑھا جائے تو وہ شخص اس کا مطیع و فرمانبردار ہو جائے گا۔

اَلْمُتَعَالِي: "بہت بلند مرتبہ" اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اس نام پاک "العلی" کے سلسلہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا ہے تو اس کو بھی جو دشواری پیش آئے گی حل ہو جائے گی اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ جو عورت ایام حمل میں یہ اسم پاک پڑھتی رہا کرے تو وہ حمل کی تمام تکلیفوں اور پریشانیوں سے نجات پائے گی۔

اَلْبَرُّ: "انتہائی احسان کرنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ، استاد بزرگان دین، عزیز و اقارب اور تمام لواحقین و متعلقین کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے۔

خاصیت: طوفان باد و باران اور کسی آفت وبلا کے وقت یہ اسم پاک پڑھنا چاہئے انشاء اللہ کوئی نقصان و گزند نہیں پہنچے گا۔ اگر اس اسم پاک کو سات مرتبہ پڑھ کر حق تعالیٰ کی امان میں دے دیا جائے تو وہ بچہ بالغ ہونے تک ہر آفت وبلا اور ہر تکلیف و مصیبت سے محفوظ رہے گا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شراب نوشی اور زنا میں مبتلا ہو تو وہ ہر روز سات مرتبہ یہ اسم پاک پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اس کے دل کو ان معصیتوں سے پھیر دے گا۔

اَلتَّوَّابُ: توبہ قبول کرنے والا" توبہ کے اصل معنی ہیں، رجوع کرنا یعنی پھرنا" جب اس لفظ کی نسبت بندہ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے کہ "گناہ سے پھرنا" یعنی اپنے گناہ پر نادم، و شرمندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا۔ اور جب حق تعالیٰ کی طرف نسبت ہوتی ہے تو اس لفظ کی مراد ہوتی ہے، رحمت و توفیق کے ساتھ پھرنا یعنی بندہ کی طرف نظر رحمت و توفیق متوجہ ہونا" اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر سمجھئے کہ جب کوئی بندہ گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو حق تعالیٰ اس کی توبہ کے اسباب میسر کرتا ہے اس کو توبہ کی توفیق دیتا ہے اور اس کو گناہوں کے عواقب سے ڈرا کر عذاب کا خوف دلا کر اور آخرت کی سزا کا احساس بخش کر اسے خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے اور اس کے قلب و شعور میں اپنے جرم کا احساس اور گناہ پر ندامت و شرمندگی کی توفیق عطا فرماتا ہے اس کے بعد وہ بندہ توبہ و ندامت کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور پھر حق تعالیٰ اپنے فضل اور اپنی رحمت کے ساتھ اس بندہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے یعنی اسے بخش دیتا ہے، لہٰذا حقیقت میں حق تعالیٰ کی توبہ یعنی اس کی توجہ بندہ کی توبہ یعنی اس کے رجوع پر مقدم ہوتی ہے اگر حق تعالیٰ کی توجہ نہ ہو تو بندہ کو رجوع کی نوبت نہیں آسکتی۔ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا اللہ تعالیٰ ان کی طرف متوجہ ہوا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں (یعنی توبہ کریں)۔ ع

توبہ کنم بشکنم توبہ دہی نشکنم

اس لئے بندہ کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ حق تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار رہے قبولیت توبہ کا یقین رکھے، ناامیدی کے دروازہ کو بند کر دے۔ بایں طور اس کی رحمت کے نزول سے ناامید نہ ہو دوسروں کی خطائیں معاف کرے معذرت خواہ کی معذرت قبول کرے چاہے کتنی بار

معذرت قبول کرنی پڑے۔ اور اگر کسی سے کوئی قصور و کوتاہی ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے درگزر کرے بلکہ انعام و اکرام کے ساتھ اس کی طرف توجہ ہو، جناب باری تعالیٰ سے توبہ طلب کرے، گناہوں پر شرمندہ و نادم ہو گوش عبرت کھلے رکھے اور توبہ میں تاخیر نہ کرے تاکہ اس حکم عَجِلُوا التَّوبَةَ قَبْلَ الْمَوتِ (مرنے سے پہلے توبہ میں جلدی کرو) کی بجاآوری ہو۔

اس موقع پر ایک عبرت انگیز اور سبق آموز حکایت سن لیجئے۔ کہتے ہیں کہ کسی سلطنت کا ایک وزیر تھا جس کا نام عیسی ابن عیسی تھا ایک دن وہ سواروں کی ایک جماعت کے ہمراہ چلا جا رہا تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے لوگ آپس میں پوچھتے تھے کہ یہ کون ہے یہ کون ہے، راستہ میں کہیں ایک بڑھیا بھی بیٹھی ہوئی تھی اس نے جو لوگوں کو پوچھتے سنا تو کہنے لگی کہ "لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ کون ہے، ہوتا کون! یہ ایک بندہ ہے جو نظر حق عنایت سے گرا ہوا ہے اور اس حالت میں مبتلا ہے (یعنی دنیاوی جاہ و جلال میں اس طرح مگن اور مطمئن ہے) عیسیٰ ابن عیسیٰ نے یہ بات سن لی۔ بس پھر کیا تھا فوراً اپنے مکان کو لوٹا وزارت پر لات ماری اور توبہ کی دولت سے مشرف ہوا اس طرح وہ تمام دنیاوی جاہ حشم کو پس پشت ڈال کر مکہ مکرمہ میں مقیم ہوا اور وہیں مجاور ہو گیا۔

خاصیت: اگر کوئی شخص نماز چاشت کے بعد اس اسم پاک کو تین سو ساٹھ مرتبہ پڑھے تو حق تعالیٰ اسے توبہ نصوح (یعنی ایسی پختہ توبہ کہ اس کے بعد گناہ سرزد نہ ہو) کی سعادت سے نوازے گا اور اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا رہے تو اس کے تمام امور انجام و صلاح پذیر ہوتے رہیں گے اور نفس کو طاعت و عبادت کے بغیر سکون و قرار نہیں ملے گا اور جو شخص نماز چاشت کے بعد یہ پڑھا کرے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دے جائیں گے۔

اَلْمُنْتَقِمُ: "کافروں اور سرکشوں سے عذاب کے ذریعہ بدلہ لینے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے بڑے دشمنوں سے کہ وہ نفس اور شیطان ہیں بدلہ لیتا رہے اور سب سے بڑا دشمن نفس امارہ ہے اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جب بھی کسی گناہ میں مبتلا ہو یا عبادت میں کوئی کوتاہی کرے تو اس سے انتقام لے بایں طور کہ اسے عقوبت و سختی میں مبتلا کرے۔ چنانچہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "راتوں میں اوراد وظائف میں مشغول رہا کرتا تھا کہ ایک رات میرے نفس نے تکاسل کیا اس کی سزا میں نے اس کو یہ دی کہ ایک برس تک اپنے نفس کو پانی سے محروم رکھا"

خاصیت: جو شخص اپنے دشمن کے ظلم و جور پر صبر اور اس کا دفاع نہ کر سکے وہ تین جمعوں تک اس اسم پاک کو پابندی سے پڑھتا رہے اس کا دشمن، دوست ہو جائے گا اور اس کے ظلم سے نجات مل جائے گی، نیز اگر کسی بھی مقصد کے حصول کے لئے اس مقصد کی نیت کے ساتھ اس اسم پاک کو آدھی رات کے وقت پڑھا جائے تو وہ مقصد حاصل ہو گا۔

ایک دوسری روایت میں حضرت ابوہریرہؓ کے علاوہ ایک اور صحابیؓ سے منقول ہے اس موقع پر باری تعالیٰ کا ایک اسم اَلْمُنْعِمُ بھی نقل کیا گیا ہے جو شخص اس اسم پاک "المنعم" پر مداومت کرے کبھی کسی کا محتاج نہ ہو گا۔

اَلْعَفُوُّ: "گناہوں اور تقصیرات سے درگزر کرنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو "الغفور" کے ضمن میں نقل کیا گیا حضرت شیخ عبدالحقؒ شرح اسماء حسنی میں لکھتے ہیں کہ "العفو" جس کے معنی ہیں سیئات کو محو کرنے والا اور گناہوں کو معاف کرنے والا، اگرچہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے "غفور" کے قریب ہے لیکن عفو، غفور سے زیادہ بلیغ کیونکہ غفران کے معنی ہیں ستر و کتمان اس لئے غفار کے معنی ہوں گے "گناہوں کو چھپانے والا جب کہ عفو مشعر بمحو و معدوم کر دینے کے ہے جس کا مطلب ہے گناہوں کو معاف کر کے ختم و معدوم کر دینے والا۔

لہٰذا بندہ کتنا ہی گنہ گار کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ کی شان عفو کے پیش نظر اس کی طرف سے معافی و بخشش کا پوری طرح امیدوار ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کسی بھی گنہ گار کے ساتھ تحقیر و تذلیل کا برتاؤ نہ کیا جائے کیونکہ یہ کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے حدود شرع اور احکام دین کی پابندی کی بنا پر بخشش دے اور اس کے گناہوں کو یکسر محو کر دے۔

رد مکن بدرا، چہ دانی درازل نام او درنامہ نیکاں بود
ورود وبر جائے نیکاں ایں گمان برتو روز جزا تاواں بود

اس اسم پاک کا بندہ پر تقاضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کی تقصیرات اور ان کی خطاؤں سے چشم پوشی کر کے انہیں معاف کردے تاکہ اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (غصہ کو نگل جانے والوں اور لوگوں کو معاف کرنے والوں) کے زمرہ میں داخل ہو۔

خاصیت: جو شخص زیادہ گنہگار ہو اسے چاہئے کہ وہ اس اسم پاک کو اپنا ورد قرار دے لے انشاء اللہ اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اَلرَّؤُفُ: "بہت مہربان اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم پاک "الرحیم" کے ضمن میں ذکر کیا گیا ہے۔

منقول ہے کہ ایک شخص کا ہمسایہ بہت برا تھا جب اس کا انتقال ہوا تو اس شخص نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی بعد میں اس کو کسی اور شخص نے خواب میں دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ اس شخص نے کہا کہ "مجھے تو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے لیکن وہ ذرہ ان صاحب سے (جنہوں نے نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی) یہ ضرور کہہ دینا کہ لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّي اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ (اگر میرے رب کی رحمتوں کے خزانے تمہاری ملکیت میں ہوتے تو تم انہیں خرچ ہو جانے کے خوف سے ضرور دبا کر بیٹھ جاتے) یہ گویا اس نے نماز جنازہ نہ پڑھنے والے پر طعن کیا کہ میرا رب تو بہت مہربان ہے اس نے مجھے بخش دیا ہے اگر کہیں تمہارا بس چل جاتا تو نہ معلوم تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔

خاصیت: اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ کسی مظلوم کو ظالم ہاتھوں سے بچالے تو وہ اس اسم اعظم کو دس بار پڑھے ظالم اس کی سفارش قبول کرے گا اور اپنے ظلم سے باز آجائے گا۔ اگر کوئی شخص اس اسم پاک پر مداومت کرے تو اس کا دل نرم رہے گا۔ وہ سب کو دوست رکھے گا اور سب اسے دوست رکھیں گے۔

مَالِكُ الْمُلْكِ: سارے جہان کا مالک" اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم پاک "الملک" کے ضمن میں بہت گزر چکا ہے۔

شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ "اے شخص! ایک دروازہ پر ٹھہر، یعنی صرف اللہ کے دروازہ پر آ، تاکہ تیرے لئے بہت سے دروازے کھولے جائیں اور صرف ایک بادشاہ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی گردن جھکا تاکہ تیرے سامنے بہت سی گردنیں جھکیں ارشاد ربانی ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ (ایسی کوئی چیز نہیں ہے ہمارے پاس جس کے خزانے نہ ہوں۔)

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک پر مداومت اختیار کرے تو انگر ہو اور اس کے دنیا و آخرت کے تمام امور اور تمام مقاصد نیک ثمرہ و انجام پذیر ہوں اس کے بعد ذکر کئے جانے والے اسم پاک "ذوالجلال والاکرام" کی بھی یہی خاصیت ہے۔

ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ: "بزرگی اور بخشش کا مالک" جس نے خدا کا اجلال جانا تو اس کی بارگاہ میں تذلل اختیار کرے اور جس نے اس کا اکرام دیکھا تو اس کا شکر گزار ہو پس نہ تو غیر اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے نہ خدا کے علاوہ کسی اور سے اپنی حاجت بیان کی جائے اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے نفس کے لئے بزرگی کے حصول کی کوشش کرے اور بندگان خدا سے اچھا سلوک کرے۔

اَلْمُقْسِطُ: "عدل کرنے والا، اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم پاک "العدل" کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے"

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو سو بار پڑھے وہ شیطان کے شر اور اس کے وسوسوں سے محفوظ رہے گا اور اگر سات سو بار پڑھے تو اس کا جو بھی مقصد ہو گا حاصل ہو گا۔

اَلْجَامِعُ: "قیامت میں لوگوں کو جمع کرنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ علم اور عمل اور کمالات نفسانیہ و جسمانیہ کا جامع بنے اور خدا کی ذات میں محویت استغراق اور غور و فکر، ذکر اللہ کے ذریعہ تسکین قلب و خاطر جمعی، ذات و صفت باری تعالیٰ کا عرفان

جیسی صفات حمیدہ کی سعادتیں اپنے اندر جمع کرے

در جمعیت کوش تاہمہ ذات شوی ترسم کہ پراگندہ شوی مات شوی

خاصیت: جس شخص کے عزیز و اقارب اور اہل خانہ منتشر اور تتر بتر ہوں وہ چاشت کے وقت غسل کرے اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اس اسم پاک کو دس مرتبہ اس طرح پڑھے کہ ہر مرتبہ ایک انگلی بند کرتا جائے اور پھر اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے انشاء اللہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ سب جمع و یکجا ہو جائیں گے۔

اَلْغَنِیُّ: "ہر چیز سے بے پروا"

خاصیت: جو شخص حرص و طمع کی بلا میں مبتلا ہو وہ اپنے جسم کے ہر عضو پر ہاتھ رکھ کر اسم پاک "الغنی" پڑھے اور ہاتھ کو اس عضو کے اوپر نیچے کی طرف لائے حق تعالیٰ اسے اس بلا سے نجات دے گا۔ اور جو شخص یہ اسم پاک ہر روز ستر بار پڑھے اس کے مال میں برکت ہوگی اور کبھی محتاج نہ ہوگا۔

اَلْمُغْنِی: "جس کو چاہے بے پروا کرنے والا" ان ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے مکمل استغناء اور بے پرواہی برتے اور خدا کے علاوہ کسی کو حاجت روا قرار نہ دے۔

خاصیت: جو شخص مسلسل دس جمعہ تک اس اسم پاک کو پڑھنے میں باقاعدگی اختیار کرے بایں طور کہ ہر جمعہ کے روز ایک ہزار بار پڑھے تو مخلوق سے بے پروا ہو جائے گا۔

اَلْمَانِعُ: "اپنے بندوں کو دین و دنیا کی ہلاکت و نقصان سے باز رکھنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اپنے نفس اور اپنی طبیعت کو خواہشات نفسانی سے باز رکھ کر اپنے آپ کو دینی و دنیاوی ہلاکت و نقصان سے محفوظ رکھے۔

خاصیت: اگر شوہر بیوی کے درمیان ناچاکی ہو تو بستر پر جاتے وقت اس اسم پاک کو بیس بار پڑھ لیا جائے تا کہ حق تعالیٰ غصہ و ناچاقی کی بدمزگی سے بچائے گا۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے شرح اسماء حسنٰی میں اسم پاک "المانع" سے پہلے اسم پاک "المعطی" بھی نقل کیا ہے اور انہوں نے ان دونوں ناموں کی ترجمانی کی وضاحت یوں کی ہے کہ وہ جس کو جو کچھ چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطٰی وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعَ (جان لو جس کو وہ دے اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو نہ دے اس کو کوئی دینے والا نہیں) لہٰذا جب بندہ نے جان لیا کہ حق تعالیٰ ہی (معطی) دینے والا اور مانع (نہ دینے والا) ہے تو اس کی عطا کا امیدوار اور اس کے منع سے خائف رہے! بندہ پر اس اسم کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ خدا کے نیک بندوں اور مستحقین کو اپنے عطا سے نوازے اور فاسقوں و ظالموں کو عطا کرنے سے باز رہے یا یہ کہ اپنے قلب و روح کو حضور و طاعت کے انوار عطا کرے اور اپنے نفس و طبیعت کو خواہشات و ہوس سے باز رکھے! حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں جو یہاں ذکر کی گئی ہے "المعطی" کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت کے پیش نظر "منع" کی وضاحت "رد و ہلاک" کی جاتی ہے"

اس کے بعد حضرت شیخؒ اسم پاک "المعطی" کی خاصیت یہ لکھتے ہیں کہ جو شخص "المعطی" کو اپنا ورد بنا لے اور یَا مُعْطِیَ السَّائِلِیْنَ بہت پڑھتا رہا کرے تو کسی سے سوال کا محتاج نہیں ہوگا۔

اَلضَّارُّ۔ اَلنَّافِعُ: "جس کو چاہے ضرر پہنچانے والا" اور "جس کو چاہے نفع پہنچانے والا" قشیریؒ کہتے ہیں کہ ان اسماء میں اس طرف اشارہ ہے کہ ضرر و نفع اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہے لہٰذا جو شخص اس کے حکم یعنی اس کی قضا و قدر کا تابعدار ہوا وہ راحت و سکون کی زندگی پائے گا اور جو شخص اس کا تابع دار نہ ہوا وہ آفت و مصیبت میں پڑیگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنِ اسْتَسْلَمَ لِقَضَآئِیْ وَصَبَرَ عَلٰی بَلَائِیْ وَ شَکَرَ عَلٰی نِعَمَآئِی کَانَ عَبْدِیْ حَقًّا وَمَنْ لَّمْ یَسْتَسْلِمْ لِقَضَآئِیْ وَلَمْ یَصْبِرْ عَلٰی بَلَائِیْ وَ لَمْ یَشْکُرْ عَلٰی نِعَمَآئِیْ فَلْیَطْلُبْ رَبًّا سِوَائِیْ۔

"جس شخص نے میری قضاو قدر کو تسلیم کیا میری بلا پر صبر کیا اور میری نعمتوں پر شکر کیا وہ میرا سچا بندہ ہے اور جس شخص نے میری قضاو قدر کو تسلیم نہ کیا، میری بلاء پر صبر نہ کیا اور میری نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا تو وہ میرے علاوہ کوئی اور رب ڈھونڈ لے۔"

حضرت شیخؒ نے شرح اسماء حسنیٰ میں ان دونوں اسماء اَلضَّارُّ اور اَلنَّافِعُ کی وضاحت کے سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ خیر و شر اور نفع و ضرر کا صرف اللہ تعالیٰ مالک ہے اور گرمی، سردی، خشکی، اور تری میں درد و تکلیف، رنج و پریشانی اور شفا کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ یہ قطعاً گمان نہ کیا جائے کہ دوا بذات خود فائدہ دیتی ہے، زہر بذات خود ہلاک کرتا ہے، کھانا بذات خود سیر کرتا ہے اور پانی بذات خود سیراب کرتا ہے بلکہ یہ تمام اسباب عادی ہیں بایں معنیٰ کہ یہ عادت قائم ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اسباب بنا دیا ہے کہ مذکورہ بالا چیزیں ان گے واسطہ سے پیدا کرتا ہے اگر وہ چاہے تو ان چیزوں کو ان واسطوں اور اسباب کے بغیر بھی پیدا کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو ان کے باوجود بھی ان چیزوں کو پیدا نہ ہونے دے۔ اسی طرح عالم علویات و سفلیات کی تمام چیزیں اور تمام اجزا محض واسطے اور اسباب کے درجہ میں ہیں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے زیر اثر ہیں اور ان تمام کی حیثیت بہ نسبت قدرت ازلیہ وہی ہے جو لکھنے والے کے ہاتھ میں قلم کی ہوتی ہے لہٰذا بندہ کو چاہئے کہ تمام نقصانات اور تمام فائدوں کو حق تعالیٰ کے فیصلے جانے، عالم اسباب کو اس قدرت کے زیر اثر سمجھے اور حکم و قضا الٰہی کا تابعدار ہو کر اپنے تمام امور اسی کے سپرد کرے تاکہ وہ ایک ایسی زندگی کا حامل بن جائے جو مخلوق سے محفوظ اور مطمئن ہو۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ نے دانتوں کے درد سے پریشان ہو کر بارگاہ حق میں فریاد کی تو وہاں سے حکم ہوا کہ فلاں گھاس دانتوں پر ملو تاکہ آرام ہو حضرت موسیٰ نے وہ گھاس دانتوں پر ملی تو آرام ہو گیا۔ ایک مدت کے بعد پھر ایک دانت میں درد ہوا تو انہوں نے وہی گھاس استعمال کی، اس مرتبہ درد کم تو کیا ہوتا اور بڑھ گیا بارگاہ حق میں عرض رساں ہوئے "الٰہ العالمین! یہ تو وہی گھاس ہے جس کو استعمال کرنے کا آپ نے حکم فرمایا تھا مگر اب اس کے استعمال سے درد اور بڑھ گیا ہے! بارگاہ حق سے عتاب کے ساتھ یہ ارشاد ہوا "اس مرتبہ تم نے ہماری طرف توجہ کی تھی تو ہم نے شفا دی اور اس مرتبہ تم نے گھاس کی طرف توجہ کی اس لئے ہم نے درد میں اضافہ کر دیا تاکہ تم یہ جان لو کہ شفا دینے والے تو ہم ہی ہیں نہ کہ گھاس۔

بندہ پر ان اسماء کا تقاضہ یہ ہے کہ امر الٰہی اور حکم شریعت کے ذریعہ دشمنان دین کو ضرر پہنچائے اور انہیں متنبہ کرے اور بندگان خدا کو نفع پہنچائے اور ان کی مدد کرتا رہے۔

خاصیت: اگر کسی شخص کو کوئی حال اور مقام میسر ہو تو وہ اسم پاک اَلضَّارُّ کو جمعہ کی راتوں میں سو بار پڑھا کرے حق تعالیٰ اسے اس مقام پر استقامت عطا فرمائے گا اور وہ مرتبہ اہل قرب کو پہنچے گا۔ اگر کوئی شخص کشتی یا پانی کے جہاز میں سفر کرے تو وہ روزانہ اسم پاک "النافع" کو اکتالیس بار پڑھے انشاء اللہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اپنے ہر کام کی ابتداء میں "النافع" اکتالیس بار پڑھ لیا کرے تو اس کے تمام کام حسب خواہش انجام پذیر ہوں گے۔

اَلنُّوْرُ: "آسمان کو ستاروں کے ساتھ، زمین کو انبیاء و علماء وغیرہ کے ذریعہ اور مسلمانوں کے قلوب کو نور معرفت و طاعت کے ذریعہ روشن کرنے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ایمان و عرفان کے نور سے اپنی ذات کو روشن و منور کرے۔

خاصیت: جو شخص جمعہ کی شب میں سورہ نور سات مرتبہ اور یہ اسم پاک ایک ہزار ایک مرتبہ پڑھے حق تعالیٰ اس کے دل میں نورانیت پیدا فرما دے گا اور جو شخص روزانہ صبح اس اسم پاک کو پڑھنے کا التزام رکھے تو اس کا دل منور ہو گا۔

اَلْهَادِیْ: "راہ دکھانے والا" اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ بندگان خدا کو خدا کی راہ دکھائے! اس بات کو حضرت شیخؒ نے

شرح اسماء حسنیٰ میں وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔ کہ "ہدایت" کا مطلب ہے "راہ دکھانا اور منزل و مقصود تک پہنچانا" لہٰذا اللہ تعالیٰ تمام راہ رووں کا رہنما ہے، اگر کوئی دنیا کی راہ پر ہوتا ہے تب بھی راہنما ہے اور اگر کوئی آخرت کی راہ پر چلتا ہے تو بھی راہبر اسی کی ذات ہوتی ہے ؎

گر نہ چراغ لطف تو راہ نماید از کرم قافلہائے شب رواں پے نبرد بمنزلے

حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی انواع ہدایت کی کوئی حد و شمار نہیں ہے۔ اَلَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (وہ ایسی ذات ہے جس نے ہر چیز کو وجود بخشا اور پھر اس کی راہ بتائی) چنانچہ یہ حق تعالیٰ ہی ہے جو بچہ کو پیٹ سے باہر آتے ہی ماں کی چھاتیوں سے دودھ پینے کی راہ بتاتا ہے، چوزہ کو انڈے سے نکلتے ہی دانہ چننے کی راہ پر لگاتا ہے اور شہد کی مکھی کو کیا عجیب و غریب گھر بنانے کی راہ دکھاتا ہے، حاصل یہ ہے کہ کائنات کا ایک ایک فرد اپنے ایک ایک لمحہ اور اپنے ایک ایک فعل میں اسی کی ہدایت و رہنمائی کا مرہون منت ہوتا ہے۔

لیکن سب سے افضل اور سب سے عظیم الشان ہدایت، وہ راستہ دکھانا ہے جو بارگاہ حق جل مجدہ تک اور دیدار باری تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ تک پہنچاتا ہے اور خواص کے باطن میں توفیق الٰہی اور اسرار تحقیق کا وہ نور پیدا کرنا ہے جو ہدایت معرفت اور طاعت کا سبب بنتا ہے۔

بندوں میں اس اسم پاک "الہادی" سے سب سے زیادہ بہرہ مند انبیاء اولیاء، اور علماء ہیں جو مخلوق خدا کو صراط مستقیم کی طرف راہ دکھانے والے ہیں۔ سید انبیاء اور ختم رسل دو عالم ﷺ کی ذات گرامی اس اسم پاک کا حقیقی پرتو ہے جو اس دنیا میں پوری انسانیت اور پوری کائنات کے سب سے بڑے اور سب سے بلند مرتبہ راہنما اور راہبر ہیں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ "تین چیزیں ایسی ہیں" جن کا عارفین کی صفات عالیہ میں شمار ہوتا ہے ① تنگدل اور غمزدوں کو کشادگی اور فرحت کی طرف لانا ② غافلین کو حق تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلانا ③ زبان توحید سے مسلمانوں کو حق کی راہ دکھانا، یعنی ان کے قلوب کی توجہ دنیا سے دین کی طرف اور معاش سے معاد کی طرف پھیرنا"

خاصیت: جو شخص ہاتھ اٹھا کر اور اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر اس اسم پاک "الہادی" کو بہت زیادہ پڑھا کرے اور پھر ہاتھوں کو آنکھوں اور منہ پر پھیر لیا کرے تو حق تعالیٰ اسے اہل معرفت کا مرتبہ بخشے گا۔

اَلْبَدِیْعُ: "عالم کو بغیر مثال کے پیدا کرنے والا"، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جو شخص قول و فعل میں اپنے نفس پر سُنّت کو امیر (حاکم) بناتا ہے وہ حکمت کی باتیں کرتا ہے یعنی اس کا ذہن اس کا فکر اس کی زبان حکمت و شریعت ہی کے ڈھانچے میں ڈھل جاتی ہے، اور جو شخص قول و فعل میں اپنے نفس پر خواہش کو امیر بناتا ہے وہ بدعت ہی کی باتیں کرتا ہے" اس کا ذہن، اس کا فکر اور اسکی زبان بدعت ہی کے چکر میں پڑھی رہتی ہے"۔

قشیریؒ فرماتے ہیں کہ "ہمارے مسلک کے تین اصول ہیں" ① اخلاق و افعال میں اور کھانے پینے میں کہ وہ حلال ہو نبی کریم ﷺ کی پیروی کرنا۔ ② ہمیشہ سچ بولنا۔ ③ تمام اعمال میں نیت کو خالص کرنا" نیز یہ بھی فرمایا کہ "جو شخص بدعتی کے بارہ میں مداہنت کرتا ہے یعنی اس سے نرمی برتتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعمال سے سُنّت کی حلاوت اٹھالیتا ہے اور جو شخص بدعتی کو دیکھ کر ہنستا ہے یعنی بدعتی کے ساتھ احترام کا معاملہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے ایمان کا نور سلب کر لیتا ہے۔

خاصیت: جس شخص پر کوئی غم پڑے یا کوئی دشوار کام پیش آئے تو وہ یَا بَدِیْعَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ستر ہزار بار اور ایک قول کے مطابق ایک ہزار بار پڑھے انشاء اللہ وہ غم دور ہو جائے گا اور اس کا کام پورا ہو گا اور اگر کوئی شخص باوضو ہو کر قبلہ کی طرف منہ کر کے یہ اتنا پڑھے کہ سو جائے تو وہ خواب میں جس چیز کے دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو گا دیکھ لے گا۔

اَلْبَاقِي: "ہمیشہ باقی رہنے والا"

خاصیت: جو شخص اس اسم پاک کو جمعہ کی شب میں سو بار پڑھ لیا کرے اس کے تمام اعمال قبول ہوں گے اور کوئی رنج و غم اسے نہ ستائے گا۔

اَلْوَارِثُ: "موجودات کے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہنے والا اور تمام مخلوقات کا مالک" جیسا کہ بتایا گیا وارث سے مراد ہے موجودات کے فنا ہو جانے کے بعد باقی تمام املاک اپنے مالکوں کے فنا ہو جانے کے بعد اس کی طرف رجوع کریں گی، لیکن یہ مطلب "وارث" کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے ہے ورنہ تو حقیقت میں کائنات کی ایک ایک چیز کا علی الاطلاق ازل سے ابد تک ملکیت میں بغیر کسی تبدل و تغیر کے وہی مالک ہے۔ تمام ملک و ملکوت بلا شرکت غیرے اسی کے لئے ہیں اور وہی سب کا حقیقی مالک ہے چنانچہ ارباب بصائر ہمیشہ یہ نداء لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (گوش ہوش سے سنتے ہیں)

لہٰذا بندہ کو چاہئے کہ وہ اپنے مال و میراث کے فکر میں نہ رہے بلکہ یہ جانے کہ یہ سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے جانا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا عارفوں کا شعار ہے ع

دل بریں منزل فانی چہ نہی رخت بہ بند

بندہ پر اس اسم پاک کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ان اعمال میں اپنی زندگی صرف کرے جو باقیات صالحات میں سے ہیں جیسے تعلیم و تعلّم اور صدقہ جاریہ وغیرہ، نیز دین کے علوم و معارف کو پوری سعی و کوشش کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حاصل کرے۔ تاکہ صحیح معنی میں انبیاء کا وارث قرار پائے۔

خاصیت: جو شخص طلوع آفتاب کے وقت اس اسم پاک کو سو بار پڑھا کرے اس کو کوئی رنج و غم نہیں پہنچے گا اور جو شخص اس اسم کو بہت زیادہ پڑھتا رہے اس کے تمام کام بحسن و خوبی انجام پذیر ہوں گے۔

اَلرَّشِيْدُ: "عالم کا رہنما" بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "اپنے بندہ کو اللہ کا راہ دکھانا یہ ہے اور وہ اس کے نفس کو اپنی طاعت و عبادت کی راہ دکھاتا ہے، اس کے قلب کو اپنی مغفرت کی راہ دکھاتا ہے اور اس کی روح کو اپنی محبت کی راہ دکھاتا ہے اور جس بندہ کا نفس سنوارنے کے لئے حق تعالیٰ اس کو راہ دکھاتا ہے اس کی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکے تمام امور میں توکل و تفویض الہام فرماتا ہے۔

منقول ہے کہ ایک دن حضرات ابراہیم بن ادہمؒ کو بھوک لگی تو انہوں نے ایک شخص کو ایک چیز دی جو ان کے پاس موجود تھی اور اس سے کہا کہ اس کو گروی رکھ کر کھانے کا انتظام کرو، جب وہ شخص وہ چیز لے کر وہاں سے نکلا تو اچانک اس کو ایک اور شخص ملا جو ایک خچر کے ساتھ چلا آرہا تھا اس خچر پر چالیس ہزار دینار لدے ہوئے تھے اس نے اس شخص سے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کے بارہ میں پوچھا اور کہا کہ یہ چالیس ہزار دینار ابراہیمؒ کی میراث ہیں جو ان تک ان کے والد کے مال سے پہنچی ہے میں ان کا غلام ہوں میراث کا یہ مال میں ان کی خدمت میں لایا ہوں۔ اس کے بعد وہ شخص حضرت ابراہیمؒ کے پاس پہنچا اور چالیس ہزار دینار ان کے حوالہ کئے۔ حضرت ابراہیمؒ نے کہا کہ اگر تم سچ کہتے ہو کہ تم میرے ہی غلام ہو اور یہ مال بھی میرا ہی ہے تو میں تمہیں خدا کی خوشنودی کے لئے آزاد کرتا ہوں اور یہ چالیس ہزار دینار بھی تمہیں بخشتا ہوں۔ بس اب تم میرے پاس سے چلے جاو! جب وہ شخص وہاں سے چلا گیا تو ابراہیمؒ نے کہا کہ "پروردگار" میں نے تو تیرے سامنے صرف روٹی کی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ تو نے مجھے اتنی مقدار میں دنیا دے دی پس قسم ہے تیری ذات کی اب اگر تو مجھے بھوک سے مار بھی ڈالے گا تو تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔

خاصیت: اگر کوئی شخص اپنے کسی کام کے بارہ میں کچھ طے نہ کر پا رہا ہو تو وہ عشا کی نماز اور اپنے سونے کے درمیان اس اسم پاک کو ایک ہزار مرتبہ پڑھے اس کام کے بارہ میں جو صحیح اور مفید بات ہوگی اس پر ظاہر ہو جائے گی اور جو شخص اس اسم پاک پر مداومت کرے۔ اس

کے تمام امور بغیر سعی و کوشش کے انجام پذیر ہوں گے۔

اَلصَّبُوْرُ: "بردبار کہ گنہ گاروں کو عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا" لغت میں "صبر کے معنی ہیں شکیبائی کرنا اور "صبور" وہ کہ گنہگاروں کو پکڑنے اور ان کو سزا دینے میں جلدی نہ کریں۔ "صبور" معنی و مفہوم کے اعتبار سے "حلیم" کے قریب ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے "صبور" اس بات پر مشعر ہے کہ اگرچہ فی الوقت بردباری کی لیکن آخرت میں پکڑے گا اور عذاب دے گا جب کہ "حلیم" بردباری کے مفہوم میں مطلق ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ "صبور" کے معنی بندہ کو اس کی مصیبت وبلاء میں صبر دینے والا لہٰذا مبارک امانت کے تحمل پر صبر دینے والا، شہوات وخواہش کی مخالفت پر صبر دینے والا اور اداء عبادت میں مشقت پر صبر دینے والا وہی حق سبحانہ و تعالیٰ ہے، اس لئے بندہ کو چاہئے کہ وہ ہر مصیبت و رنج و آفت وبلاء میں خدا سے صبر چاہے اور اس کی نافرمانی سے دور رہے۔ نیز اس اسم پاک کا بندہ پر یہ تقاضہ ہے کہ وہ کسی کام میں سبکی اور جلدی نہ کرے بلکہ وقار و طمانیت اور تمکین اختیار کرے اور ہر رنج میں اللہ تعالیٰ کی ہی پناہ طلب کرے۔ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ۞ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

مشائخ میں سے ایک شخص کا یہ مقولہ ہی کتنا عارفانہ ہے "جام صبر پیو اگر مارے جاؤ گے شہید اور اگر زندہ رہو گے تو سعید کہلاؤ گے۔

خاصیت: جس شخص کو رنج و مشقت، دردو تکلیف اور کوئی مصیبت پیش آئے تو یہ اسم تینتیس بار پڑھے اطمینان باطن پائے گا، دشمنوں کی زبان بندی وپسپائی، حکام کی خوشنودی اور لوگوں کے دلوں میں مقبولیت کے لئے آدھی رات کے وقت یا دوپہر میں اس اسم پاک کو باقاعدگی کے ساتھ پڑھنا بڑی خاصیت اور تاثیر رکھتا ہے۔

مشکوٰۃ میں ابوہریرہؓ کی روایت میں حق تعالیٰ کے جو ننانوں نام منقول ہیں ان کی وضاحت ختم ہوئی ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ قرآن کریم اور احادیث میں ان ناموں کے علاوہ بھی کچھ نام اور منقول ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ نام بھی آتے ہیں۔

الرب۔ الاکرم۔ الا علی۔ الحافظ۔ الخالق۔ السائر۔ الستار۔ الشاکر العادل۔ العلام الغالب۔ الناظر۔ الفالق۔ القدیر۔ القریب۔ القاھر۔ الکفیل۔ الکافی۔ المنیر۔ المحیط۔ الملک۔ المولی۔ النصیر۔ احکم الحاکمین۔ ارحم الراحمین۔ احسن الخالقین۔ ذو الفضل۔ ذو الطول۔ ذو القوۃ۔ ذو المعارج۔ ذو العرش۔ رفیع الدرجات۔ قابل التواب، الفعال لمایرید۔ مخرج الحی من المیت اور احادیث میں یہ نام بھی آئے ہیں۔ الحنان، المنان، المغیث نیز ان کے علاوہ دیگر آسمانی کتب مثلاً توریت وغیرہ سے اللہ تعالیٰ کے کچھ اور نام نقل کئے جاتے ہیں۔

اسم اعظم

(۳) وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلاً يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُ بِاَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اَنْتَ الاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ۔ فَقَالَ دَعَا اللّٰهَ بِاسْمِهِ الْاَعْظَمِ الَّذِيْ اِذَا سُئِلَ بِهِ اَعْطٰى وَاِذَا دُعِيَ بِهِ اَجَابَ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو یہ دعا مانگتے ہوئے سنا کہ "اے الٰہی میں تجھ سے اپنا مقصود و مطلوب اس وسیلہ کے ساتھ مانگتا ہوں کہ تو اللہ ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ایسا یکتا اور بے نیاز ہے کہ نہ تو اس نے کسی کو جنا اور نہ اسے کسی نے جنا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں (یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے اسم اعظم کے ساتھ دعا مانگی، ایسا اسم اعظم کہ جب اللہ تعالیٰ سے اس کے ذریعہ سوال کیا جاتا ہے تو وہ سوال پورا کرتا ہے اور جب اس کے ذریعہ دعا مانگی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتا ہے یعنی وہ دعا اکثر قبول ہوتی ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: زیادہ صحیح بات تو یہی ہے کہ "اسم اعظم" اللہ تعالیٰ کے اسماء میں پوشیدہ ہے تعین کے ساتھ اس کا کسی کو علم نہیں ہے جیسا کہ "لیلۃ القدر" لیکن جمہور علماء کہتے ہیں کہ اسم اعظم لفظ "اللہ" ہے اور قطب ربانی حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کے قول کے مطابق اس شرط کے ساتھ کہ زبان سے جب "اللہ" ادا ہو تو دل میں اللہ کے علاوہ اور کچھ نہ ہو یعنی اس اسم پاک کی تاثیر اسی وقت ہوگی جب کہ اللہ کو پکارتے وقت دل ماسوی اللہ سے بالکل خالی ہو۔

اس اسم اعظم کے سلسلہ میں علماء کے اور بھی اقوال ہیں چنانچہ باب کے آخر میں وہ اسماء نقل کئے جائیں گے جن کو علماء نے اپنی اپنی رائے و تحقیق کے مطابق اسم اعظم کہا ہے۔

علماء نے "سوال" اور "دعا" میں یہ فرق نقل کیا ہے کہ سوال" کے معنی ہیں طلب کرنا جیسے کہ کہا جائے۔ اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِی (اے اللہ مجھے فلاں چیز عطا کر) اور اس کے جواب میں اللہ کی عطا یعنی اس کا دینا اور دعا کے معنی ہیں پکارنا جیسے کہ کہا جائے "یا اللہ" اور اس کے جواب اللہ کی طرف سے اجابت یعنی قبول کرنا ہے جیسے اللہ تعالیٰ بندہ کی پکار پر فرمائے لَبَّیْكَ عَبْدِی (ہاں اے میرے بندے)

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کُنْتُ جَالِسًا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْمَسْجِدِ وَرَجُلٌ یُصَلِّی فَقَالَ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَا ذَالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ اَسْأَلُكَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَعَا اللّٰہَ بِاسْمِہِ الْاَعْظَمِ الَّذِیْ اِذَا دُعِیَ بِہٖ اَجَابَ وَاِذَا سُئِلَ بِہٖ اَعْطٰی۔

(رواہ الترمذی والبوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مسجد میں بیٹھا تھا اور ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے (نماز کے بعد) یہ دعا مانگی "یا الٰہی"! میں تجھ سے اپنا مطلب اس وسیلہ کے ساتھ مانگتا ہوں کہ تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو بہت مہربان بہت دینے والا اور آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے اے بزرگی و بخشش کے مالک! اے زندہ! و اے خبر گیری کرنے والے! میں تجھ سے ہی سوال کرتا ہوں"! (یہ سن کر) نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے اس کے بڑے نام کے ساتھ دعا مانگی ایسا بڑا نام کہ جب اللہ تعالیٰ سے اس کے ذریعہ دعا کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتا ہے اور جب اس کے ذریعہ سوال کیا جاتا ہے تو وہ سوال پورا کرتا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

⑤ وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ یَزِیْدَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِسْمُ اللّٰہِ الْاَعْظَمُ فِی ھَاتَیْنِ الْاٰیَتَیْنِ وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ وَفَاتِحَۃُ اٰلِ عِمْرَانَ الٓمّٓ اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔

(رواہ الترمذی والبوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ کا سب سے بڑا نام (اسم اعظم) ان دو آیتوں میں ہے وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (اور تمہارا معبود وہ ایک معبود ہے اس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں اور وہ بخشنے والا اور مہربان ہے) اور سورہ ال عمران کی یہ ابتدائی آیت الٓمّٓ اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الم اللہ کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے اور خبر گیری کرنے والا ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

دعا یونس کی برکت و تاثیر

⑥ وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَعْوَۃُ ذِی النُّوْنِ اِذَا دَعَا رَبَّہٗ وَھُوَ فِیْ بَطْنِ الْحُوْتِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ لَمْ یَدْعُ بِھَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا اسْتَجَابَ لَہٗ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت سعدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مچھلی والے یعنی حضرت یونسؑ کی وہ دعا جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے

پروردگار سے مانگی تھی یہ ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے بلاشک میں ظالموں میں سے تھا) جو مسلمان شخص اس دعا کے ذریعہ خدا سے کوئی چیز مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا سوال پورا کرتا ہے۔" (احمد، ترمذی)

تشریح : حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ مختصر طور پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شہر نینویٰ کے رہنے والوں کی طرف ان کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا انہوں نے ان کو ایمان کی دعوت دی جسے انہوں نے ٹھکرا دیا اور ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونسؑ کے پاس یہ وحی بھیجی کہ تم اپنی قوم کو آگاہ کر دو کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب نازل ہوگا، حضرت یونسؑ نے ان کو آگاہ کر دیا اور خود اس شہر سے نکل گئے وقت مقررہ پر ایک سیاہ ابر ظاہر ہوا اور قریب ہوتے ہوتے اس شہر پر آکر رک گیا اور اس میں سے ایک قسم کا دھواں نکلنے لگا۔ جب شہر والوں نے دیکھا کہ اب عذاب نازل ہوا چاہتا ہے تو سب اپنی بیویوں، اپنی اولاد، اپنے جانوروں کو لے کر جنگل کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور وہاں آدمیوں اور جانوروں کے بچوں کو ان ماؤں سے الگ کر کے گریہ وزاری کے ساتھ اپنی آوازیں بلند کیں اور اپنے کفر و گناہوں سے توبہ کر کے ایمان لائے اور یہ پکار اٹھے کہ لَا حَیُّ حِیْنَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ (یعنی اے زندہ اس وقت سے کہ کوئی زندہ نہ تھا۔ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ عذاب جو ان پر مسلط تھا ٹال دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت یونسؑ اس شہر کی طرف آئے تاکہ دیکھیں اس شہر اور شہر والوں کا کیا حال ہوا۔ انہوں نے دور سے دیکھا کہ شہر اسی طرح آباد ہے جس طرح کہ پہلے تھا اور شہر والے زندہ و سلامت ہیں۔ یہ دیکھ کر انہیں بڑی شرم محسوس ہوئی کہ میں نے تو ان سے کہا تھا کہ تین دن کے بعد تمہارے اوپر عذاب نازل ہوگا مگر عذاب کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ عذاب تو نازل ہوا تھا مگر ٹال دیا گیا۔ بہر کیف وہ یہ سوچ کر کہ ایسی صورت میں شہر جانا مناسب نہیں ہے وہاں سے واپس ہوئے اور دریا پر پہنچ کر تاکہ اس پار چلے جائیں کشتی تیار تھی وہ کشتی میں بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسا کشتی اپنی جگہ پر جم گئی ہو بہت ہی کوشش کی گئی مگر کشتی نے ہلنے کا نام بھی نہ لیا۔ ملاحوں نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کشتی میں کوئی ایسا غلام بیٹھا ہوا ہے جو اپنے مالک سے بھاگ کھڑا ہوا ہے اسی لئے یہ کشتی نہیں چل رہی اور یہ کہہ کر انہوں نے کشتی میں بیٹھے ہوئے تمام مسافروں میں قرعہ ڈالا اور قرعہ میں حضرت یونسؑ کے نام نکلا حضرت یونسؑ نے کہا کہ بیشک میں ہی بھاگا ہوا غلام ہوں۔ اس کے بعد خود ہی وہ دریا میں کود گئے اور ایک مچھلی نے اللہ کے حکم سے انہیں نگل لیا۔ اللہ نے مچھلی کو حکم دیا کہ انہیں اپنے پیٹ میں محفوظ رکھا جائے چنانچہ حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہے اور مچھلی انہیں لئے دریائے نیل دریائے فارس دریائے دجلہ میں پھرتی رہی اور حضرت یونس بارگاہ الٰہی میں یہ عرض کرتے رہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ اے اللہ تو معبود حاکم اور مطلق ہے، تیری ذات پاک ہے میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے بایں طور کہ میں تیری اجازت کے بغیر اپنی قوم سے نکل بھاگا، چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور مچھلی کو حکم دیا کہ انہیں نصیبین کے ساحل پر کہ جو شام کا ایک شہر ہے اپنے پیٹ سے نکال دے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اسم اعظم کی تحقیق

(۷) عَنْ بُرَیْدَةَ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَسْجِدَ عِشَاءً وَاِذَا رَجُلٌ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهٗ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَقُوْلُ هٰذَا مُرَاءٍ قَالَ بَلْ مُوْمِنٌ مُنِيْبٌ قَالَ وَاَبُوْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيُّ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهٗ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَسَمَّعُ لِقِرَاءَتِهٖ ثُمَّ جَلَسَ اَبُوْمُوْسَى يَدْعُوْ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُشْهِدُكَ اَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَحَدًا صَمَدًا لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ سَأَلَ اللّٰهَ بِاسْمِهِ الَّذِيْ اِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰى وَاِذَا دُعِيَ بِهٖ اَجَابَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُخْبِرُهٗ بِمَا سَمِعْتُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ فَاَخْبَرْتُهٗ

بِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِیْ اَنْتَ الْیَوْمَ لِیْ اَخٌ صَدِیْقٌ حَدَّثْتَنِیْ بِحَدِیْثِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (رواہ رزین)

"حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن، میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ عشاء کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوا تو وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص (نماز میں) قرآن کریم پڑھ رہا ہے اور اپنی آواز بلند کر رہا ہے میں نے کہا کہ یا رسول اللہ کیا آپ (ﷺ) اس شخص کو ریاکار نہیں کہیں گے؟ (یعنی کیا یہ شخص منافق نہیں ہے کہ دکھانے سنانے کے لئے اتنے زور زور سے قرآن کریم پڑھ رہا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں" بلکہ مؤمن جو (غفلت سے ذکر کی طرف) رجوع کر رہا ہے۔" بریدہؓ کہتے ہیں کہ "ابو موسیٰ (یعنی وہ شخص جن کے بارہ میں اوپر ذکر ہوا کہ وہ باواز بلند قرآن پڑھتے تھے حضرت ابو موسیٰؓ تھے۔) باواز بلند قرآن کریم پڑھتے رہے اور نبی کریم ﷺ ان کی قرأت سنتے رہے، پھر ابو موسیٰ (یا تو تشہد میں نماز کے بعد دعا کے لئے) بیٹھے اور بارگاہ الٰہی میں یوں عرض رساں ہوئے! اے الٰہی! میں تجھ کو گواہ (بنا کر تیرے حق میں یہ اعتقاد و اقرار کرتا ہوں کہ تو اللہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ایسا یکتا و بے نیاز ہے کہ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اسے کسی نے جنا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر) فرمایا "اس نے خدا سے اس کے نام کے ساتھ سوال کیا ایسا نام کہ جب اس کے ذریعہ سوال کیا جاتا ہے تو اللہ وہ سوال پورا کرتا ہے) اور جب اس کے ذریعہ دعا مانگی جاتی ہے تو دعا قبول کرتا ہے" حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میں نے آپ (ﷺ) سے جو یہ بات سنی ہے اسے ابو موسیٰ تک پہنچا دوں۔ آپ نے فرمایا کہ "ہاں" چنانچہ میں نے ابو موسیٰ تک آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی پہنچایا تو انہوں نے کہا کہ آج کے دن سے تم میرے سچے بھائی ہو کہ تم نے رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد مجھ تک پہنچایا ہے۔" (رزینؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اسم اعظم کے تعین کے بارہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ چنانچہ بعض حضرات نے تو "اللہ" کو اسم اعظم کہا ہے، کچھ علماء کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اسم اعظم ہے کچھ لوگوں نے لفظ "ھو" کو اسم اعظم کہا ہے بعض حضرات نے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کو بعض حضرات نے مَالِکُ الْمُلْکِ کو بعض حضرات نے کلمہ توحید کو اور بعض حضرات نے اَللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ کو اسم اعظم کہا ہے۔

حضرت امام زین العابدینؒ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے بارگاہ رب العزت میں عرض کی کہ مجھے اسم اعظم بتائے تو انہیں خواب میں دکھایا گیا کہ اسم اعظم۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اسم اعظم اسماء حسنیٰ میں مخفی ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اَللّٰھُمَّ اسم اعظم ہے۔

بعض سلف سے منقول ہے کہ جس شخص نے اَللّٰھُمَّ کہا اس نے گویا خدا سے اس کے تمام ناموں کے ذریعے (دعا مانگی اسی طرح کا قول حضرت حسن بصریؒ سے بھی منقول ہے)۔

بعض حضرات الٓمٓ کو اسم اعظم قرار دیتے ہیں اور بعض حضرات مثلاً امام جعفر صادق کہتے ہیں کہ جو شخص اسماء الٰہی میں سے کسی بھی اسم کے ساتھ اللہ کو اس طرح بطریق حضور و استغراق یاد کرے کہ اس وقت اس کے باطن میں اس اسم کے علاوہ اور کچھ نہ ہو تو وہی اسم اعظم ہے اور اس کے ذریعہ مانگی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے۔

حضرت ابو سلیمان درانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک شیخ کامل سے پوچھا کہ اسم اعظم کون سا ہے؟ تو انہوں نے پوچھا کیا تم اپنے دل کو جانتے ہو؟ میں نے کہا کہ "ہاں"! انہوں نے فرمایا کہ جب تم یہ دیکھو کہ تمہارا دل خدا کی طرف متوجہ اور نرم (یعنی ترساں و لرزاں ہو گیا ہے تو اس وقت خدا سے اپنی حاجت مانگو یہی اسم اعظم ہے۔

منقول ہے کہ حضرت ابو الربیعؒ سے کسی نے کہا کہ مجھے اسم اعظم کے بارہ میں بتایئے تو انہوں نے کہا کہ یہ لکھ لو اَطِعِ اللّٰہَ یُعْطِکَ یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرو وہ تمہاری ہر درخواست قبول کرے گا اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری ہی اسم اعظم

ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مہربان ہوتا ہے اور قبول کرتا ہے۔

نیز فرمایا کہ عارف کا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا کن کی طرح ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کن کہہ کر جو چاہتا ہے پیدا فرما دیتا ہے ایسے ہی بندہ کے لئے بسم اللہ ہے کہ وہ جس کام کی ابتداء میں بسم اللہ کہتا ہے اس کی برکت سے وہ کام پورا ہو جاتا ہے۔

بعض محققین فرماتے ہیں کہ دعا تمام اقوال کا جامع ہے یعنی بزرگان دین نے جن جن ناموں کو اسم اعظم کہا ہے وہ سب اس دعا میں آجاتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ یَا حَنَّانُ یَا مَنَّانُ یَا بَدِیْعَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ یَا خَیْرَ الْوَارِثِیْنَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ یَا سَمِیْعَ الدُّعَاءِ یَا اَللّٰهُ یَا اَللّٰهُ یَا عَالِمُ یَا سَمِیْعُ یَا عَلِیْمُ یَا حَلِیْمُ یَا مَالِكَ الْمُلْكِ یَا مَالِكُ یَا سَلَامُ یَا حَقُّ یَا قَدِیْمُ یَا قَائِمُ یَا غَنِیُّ یَا مُحِیْطُ یَا حَکِیْمُ یَا عَلِیُّ یَا قَاهِرُ یَا رَحْمٰنُ یَا رَحِیْمُ یَا سَرِیْعُ یَا کَرِیْمُ یَا مَخْفِیُ یَا مُعْطِیْ یَا مَانِعُ یَا مُحْیِیْ یَا مُقْسِطُ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا اَحْمَدُ یَا حَمْدُ یَا رَبِّ یَا رَبِّ یَا رَبِّ یَا رَبِّ یَا رَبِّ یَا وَهَّابُ یَا غَفَّارُ یَا قَرِیْبُ یَا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ اَنْتَ حَسْبِیْ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ مذکورہ بالا دعا میں جتنے اسماء ذکر کئے گئے ہیں یہ سب اسم اعظم ہیں۔

بَابُ ثَوَابِ التَّسْبِیْحِ وَالتَّحْمِیْدِ وَالتَّهْلِیْلِ وَالتَّکْبِیْرِ

تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر کے ثواب کا بیان

تسبیح سے مراد ہے سبحان اللہ کہنا تحمید سے مراد الحمد للہ کہنا اور تہلیل سے مراد ہے لا الہ الا اللہ کہنا اور تکبیر سے مراد اللہ اکبر کہنا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

سب سے بہتر کلام

① عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الْکَلَامِ اَرْبَعٌ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَحَبُّ الْکَلَامِ اِلَى اللّٰهِ اَرْبَعٌ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ لَا یَضُرُّكَ بِاَیِّهِنَّ بَدَأْتَ (رواہ مسلم)

"حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "انسان کے کلام میں سب سے بہتر کلام چار ہیں (اور وہ یہ ہیں) سُبْحَانَ اللّٰهِ (اللہ بہت پاک ہے) الحمد للہ (تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں) لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) اللہ اکبر (اللہ بہت بڑا ہے) ایک روایت میں ہے (کہ آپ ﷺ نے فرمایا) اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ کلام چار ہیں ① سبحان اللہ۔ ② الحمد للہ۔ ③ لا الہ الا اللہ۔ ④ اللہ اکبر۔ ان میں سے کسی بھی کلمہ سے شروع کرنا تمہارے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔" (مسلم)

تشریح: "سب سے بہتر کلام چار ہیں" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے بعد انسان کے کلام میں یہ چار کلمے سب سے افضل ہیں! یہ وضاحت اور ترجمہ میں انسان کی قید اس لئے ہے کہ چوتھا کلمہ یعنی "اللہ اکبر" قرآن کریم میں نہیں ہے اور یہ ایک ظاہر بات ہے کہ جو چیز قرآن میں نہیں ہے وہ اس چیز سے افضل نہیں ہے جو قرآن میں ہے لیکن اور ایک حدیث میں اس طرح ہے اَفْضَلُ الْکَلَامِ بَعْدَ الْقُرْاٰنِ وَهِیَ مِنَ الْقُرْاٰنِ یعنی (یہ کلمے) مجموعہ قرآن کے بعد افضل کلمے ہیں اور یہ کلمے بھی قرآن ہی کے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "کلام" سے انسانی کلام کے ساتھ کلام اللہ بھی مراد ہے یعنی یہ چار کلمے اللہ تعالیٰ کے تمام کلام میں افضل

ترین کلمے ہیں۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ ان میں سے اول الذکر تین کلمے تو بعینہٖ قرآن میں موجود ہیں۔ اور چوتھا کلمہ اگرچہ بعینہٖ قرآن میں نہیں ہے لیکن اس آیت وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا میں بالمعنی یقیناً موجود ہے۔

اس موقع پر یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ یہ چاروں کلمے اگرچہ افضل ہیں لیکن احادیث سے جو "ذکر" کسی حال یا کسی وقت سے متعلق ثابت ہے اس حالت یا اس وقت میں اس ذکر میں مشغول ہونا تسبیح وغیرہ سے افضل ہے۔

دوسری روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ان چاروں کلموں کو پڑھتے وقت مذکورہ ترتیب ضروری نہیں ہے چاہے کوئی پہلے سبحان اللہ کہے اور چاہے کوئی پہلے الحمد للہ یا لا الہ الا اللہ یا اللہ اکبر کہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تاہم طیبیؒ نے کہا ہے کہ ان چاروں کلمات کو مذکورہ ترتیب کے ساتھ پڑھنا عزیمت یعنی اولیٰ ہے اور بغیر ترتیب کے پڑھنا رخصت یعنی جائز ہے۔

تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر کی فضیلت

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ اَقُوْلَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میرا سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ کہنا بلاشبہ میرے نزدیک اس چیز سے جس پر آفتاب طلوع ہوتا ہے (یعنی دنیا اور دنیا کی چیزوں سے) زیادہ پسندیدہ ہے)۔" (مسلمؒ)

تسبیح و تحمید کی فضیلت و برکت

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ فِیْ یَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ حُطَّتْ خَطَایَا وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے کسی دن میں سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ پڑھا تو اس کے گناہ ختم کر دیئے جاتے ہیں اگرچہ وہ دریا کے جھاگ کی مانند (یعنی کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: طیبیؒ فرماتے ہیں کہ سو مرتبہ چاہے تو کئی مرتبہ کر کے پڑھا جائے دن کے ابتدائی یا آخری حصہ میں ایک ہی دفعہ میں پڑھ لیا جائے دونوں طرح درست ہے لیکن افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ دن کے ابتدائی حصہ میں ایک ہی دفعہ پڑھ لیا جائے۔ افضل ہے۔

(۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِیْنَ یُصْبِحُ وَحِیْنَ یُمْسِی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ مِائَةَ مَرَّةٍ لَمْ یَاْتِ اَحَدٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِاَفْضَلَ مِمَّا جَاءَ بِهٖ اِلَّا اَحَدٌ قَالَ مِثْلَ مَا قَالَ اَوْزَادَ عَلَیْهِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، جس نے صبح کے وقت اور شام کے وقت سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کہا تو قیامت کے دن کوئی شخص اس عمل سے بہتر کوئی عمل نہیں لائے گا علاوہ اس شخص کے جس نے اس کی مانند یا اس سے زیادہ کہا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس موقع پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے حدیث کی ظاہری عبارت سے یہ مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے پہلے شخص کی مانند کا یعنی اس نے پہلے شخص کی طرح صبح و شام کے وقت سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ کہا تو وہ قیامت کے دن اس عمل سے افضل لائے گا جو یہ پہلا شخص لائے گا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرے شخص نے اگر پہلے شخص کی طرح سبحان اللہ وبحمدہ صبح و شام سو سو مرتبہ کہا تو وہ قیامت کے دن پہلے ہی شخص کی طرح عمل لے کر حاضر ہوگا نہ کہ اس سے افضل عمل لائے گا۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حدیث کی عبارت حقیقت و معنی کے اعتبار سے یوں ہے کہ قیامت کے دن کوئی شخص اس عمل کے برابر

کوئی عمل نہیں لائے گا جو یہ شخص لائے گا اور نہ اس کے عمل سے افضل کوئی عمل لائے گا علاوہ اس شخص کے جس نے اس کی مانند (سبحان اللہ وبحمدہ صبح شام کے وقت سو سو مرتبہ سے زیادہ) کہا تو وہ اس پہلے شخص کے عمل سے افضل عمل لائے گا۔

یا پھر کہا جائے گا کہ مثل ما قال او زاد علیہ میں حرف اَوْ معنی کے اعتبار سے حرف وکی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِى الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا دو کلمے ہیں جو زبان میں کہنے سے تو ہلکے ہیں لیکن ترازو میں بھاری ہیں (یعنی ان کا ثواب میزان عمل میں بھاری ہوگا) اور بخشنے والے خدا کے نزدیک بہت پیارے ہیں اور وہ دو کلمے یہ ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ یعنی اللہ پاک ہے اور اپنی حمد کے ساتھ موصوف ہے پاک ہے جو اللہ بڑا ہے۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

⑥ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِىْ وَقَّاصٍ قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَيَعْجِزُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَكْسِبَ كُلَّ يَوْمٍ اَلْفَ حَسَنَةٍ فَسَأَلَهُ سَائِلٌ مِنْ جُلَسَائِهٖ كَيْفَ يَكْسِبُ اَحَدُنَا اَلْفَ حَسَنَةٍ قَالَ يُسَبِّحُ مِائَةَ تَسْبِيْحَةٍ فَيُكْتَبُ لَهٗ اَلْفُ حَسَنَةٍ اَوْ يُحَطُّ عَنْهُ اَلْفُ خَطِيْئَةٍ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِىْ كِتَابِهٖ فِىْ جَمِيْعِ الرِّوَايَاتِ عَنْ مُوْسَى الْجُهَنِىِّ اَوْ يُحَطُّ قَالَ اَبُوْبَكْرِ الْبَرْقَانِىُّ وَرَوَاهُ شُعْبَةُ وَاَبُوْ عَوَانَةَ وَيَحْيَى بْنُ سَعِيْدِ الْقَطَّانُ عَنْ مُوْسَى فَقَالُوْا وَيُحَطُّ بِغَيْرِ اَلْفٍ هٰكَذَا فِىْ كِتَابِ الْحُمَيْدِىِّ

"اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ ایک دن جب کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ نے فرمایا" کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ہر روز ایک ہزار نیکیاں حاصل کرے؟ مجلس میں موجود صحابہؓ میں سے ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ "ہم میں سے کوئی شخص، (روزانہ بسہولت) ایک ہزار نیکیاں کس طرح حاصل کر سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایک سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ پڑھ لے اس کے لئے ایک ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی (بایں حساب کہ ہر نیکی پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں) یا اس کے ایک ہزار (صغیرہ اگر اللہ چاہے گا تو کبیرہ) گناہ دور کئے جائے گے (مسلم) ابوبکر برقانیؒ کہتے ہیں کہ صحیح مسلم میں موسیٰ جہنی سے جو روایتیں منقول ہیں ان سب میں لفظ اَوْ یُحَطُّ ہی نقل کیا گیا ہے لیکن شعبہؒ، ابوعوانہؒ اور یحییٰ ابن سعید قطان نے موسیٰ جہنی سے ہی یہ روایت نقل کی ہے اس میں لفظ وَیُحَطُّ بغیر الف کے ذکر کیا ہے اور کتاب حمیدی یعنی جمع بین الصحیحین میں بھی اسی طرح منقول ہے۔"

تشریح: اَوْیُحَطُّ کے پیش نظر تو حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ دونوں میں سے کوئی ایک بات ہوتی ہے، یا تو ایک ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں یا ایک ہزار گناہ دور کئے جاتے ہیں جب کہ وَیُحَطُّ کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ایک ہزار نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں اور ایک ہزار گناہ بھی دور کئے جاتے ہیں۔ ترمذی، نسائی اور ابن حبان کی روایتیں بھی اسی مفہوم کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ان میں لفظ وَیُحَطُّ ہی ہے لہٰذا بظاہر تو دونوں روایتوں میں منافات معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ذہن میں یہ بات رہے کہ کبھی بھی "و" معنی کے اعتبار سے "او" کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے تو پھر کوئی منافات نظر نہیں آئے گی اور دونوں روایتوں کا ایک مفہوم نکلے گا، اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص نے یہ تسبیح پڑھی اس کے لئے ایک ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں اگر اس کے ذمہ گناہ نہ ہوں گے یا اس کے ایک ہزار گناہ دور کر دیئے جائیں گے اگر اس کے ذمے گناہ ہوں گے۔

بہتر کلام تسبیح و تحمید

⑦ وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَىُّ الْكَلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَا اصْطَفَى اللّٰهُ لِمَلٰٓئِكَتِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا کلام بہتر ہے؟" آپ نے فرمایا" وہ کلام جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے چن لیا ہے (اور وہ یہ ہے) سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ۔" (مسلم)

تشریح: "چن لیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر میں سے اس کلمہ کو اپنے فرشتوں کے لئے چن لیا ہے اور اس کلمہ کی انتہائی فضیلت کی وجہ سے انہیں حکم دیا کہ وہ اسے ہمیشہ پڑھتے رہا کریں۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ چاروں کلموں یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ کا اختصار ہے کیونکہ تشریح میں شرک کی نفی بھی ہوتی ہے۔ جو تہلیل کا حاصل ہے اور اس سے اللہ اکبر یعنی بہت بڑا ہونا بھی لازم آتا ہے۔

ذکر میں کیفیت کا اعتبار کمیت کا نہیں

⑧ وَعَنْ جُوَیْرِیَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ مِنْ عِنْدِھَا بُکْرَۃً حِیْنَ صَلَّی الصُّبْحَ وَھِیَ فِیْ مَسْجِدِھَا ثُمَّ رَجَعَ بَعْدَ اَنْ اَضْحٰی وَھِیَ جَالِسَۃٌ قَالَ مَازِلْتِ عَلَی الْحَالِ الَّتِیْ فَارَقْتُكِ عَلَیْھَا قَالَتْ نَعَمْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَقَدْ قُلْتُ بَعْدَكِ اَرْبَعَ کَلِمَاتٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتِ مُنْذُ الْیَوْمِ لَوَزَنَتْھُنَّ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ عَدَدَ خَلْقِہٖ وَرِضَا نَفْسِہٖ وَزِنَۃَ عَرْشِہٖ وَمِدَادَ کَلِمَاتِہٖ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جویریہؓ سے (جو آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں) منقول ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ صبح کے وقت نماز فجر کے لئے ان کے پاس سے نکلے اور وہ اپنے مصلیٰ پر بیٹھی ہوئی تھیں جب رسول کریم ﷺ چاشت کے وقت واپس تشریف لائے وہ اپنی جگہ یعنی مصلیٰ پر بدستور بیٹھی ہوئی تھیں آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر ان سے فرمایا کہ "جس حالت میں تمہیں چھوڑ کر گیا تھا کیا اسی طرح مسلسل بیٹھی ہوئی ہو؟ یعنی صبح کے وقت سے اب تک کہ چاشت کا وقت آگیا ہے مصلیٰ پر بیٹھی ہوئی اسی طرح ذکر الٰہی میں مشغول ہو) انہوں نے کہا "جی ہاں" نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میں نے تمہارے پاس سے جانے کے بعد چار کلمے تین مرتبہ کہے ہیں وہ چار کلمے ایسے ہیں کہ اگر ان کو اس چیز سے تولا جائے جس کے کہنے میں تم ابتداء دن سے اب تک مشغول رہی ہو (یعنی ذکر میں) تو یقیناً چار کلمے اس چیز پر بھاری رہیں گے (یعنی ان چار کلموں کا ثواب اس پورے وقت ذکر الٰہی میں تمہاری مشغولیت کے ثواب سے زیادہ ہوگا) اور وہ چار کلمے یہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ عَدَدَ خَلْقِہٖ وَرِضَاءَ نَفْسِہٖ وَزِنَۃَ عَرْشِہٖ وَمِدَادَ کَلِمَاتِہٖ "میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کی تعریف کرتا ہوں اس کی مخلوقات کی تعداد کی بقدر اور اس کی ذات کی مرضی کے موافق اور اس کے عرش کے وزن کے مطابق اور اس کے کلموں کی مقدار کے مانند ہے۔" (مسلم)

تشریح: "اور اس کلموں کی مانند" میں کلموں سے مراد یا تو ان کی کتابیں اور ان کے صحیفے ہیں یا اس کے اسماء ہیں اسی طرح کی صفات یا اس کے اوامر بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ذکر میں کیفیت کا اعتبار ہوتا ہے کمیت کا نہیں! یعنی وہ تسبیحات وغیرہ جن کے مضامین اعلیٰ اور بہت خوب ہوں اور جنہیں قلب کے حضور و اخلاص کے ساتھ پڑھا جائے اگرچہ کم ہوں مگر ان تسبیحات کے مضامین سے افضل ہیں جو ایسی نہ ہوں اور جنہیں پڑھتے وقت حضور قلب و اخلاص کی دولت میسر نہ ہو اگرچہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں اسی پر قیاس کرتے ہوئے سمجھا جا سکتا ہے کہ غور و فکر اور حضور و اخلاص کے ساتھ قرآن کی تلاوت و قرأت اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔ اس قرأت و تلاوت سے افضل ہے جو ان چیزوں سے خالی ہو۔ چاہے وہ بہت ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

شیطان سے پناہ میں رہنے کا طریقہ

⑨ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ لَہُ الْمُلْكُ

وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ فِي يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ كَانَتْ لَهُ عَدْلَ عَشْرِ رِقَابٍ وَكُتِبَتْ لَهُ مِائَةُ حَسَنَةٍ وَمُحِيَتْ عَنْهُ مِائَةُ سَيِّئَةٍ وَكَانَتْ لَهُ حِرْزًا مِنَ الشَّيْطَانِ يَوْمَهُ ذٰلِكَ حَتّٰى يُمْسِيَ وَلَمْ يَأْتِ اَحَدٌ بِاَفْضَلَ مِمَّا جَاءَ بِهٖ اِلَّا رَجُلٌ عَمِلَ اَكْثَرَ مِنْهُ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص یہ کلمات۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں" لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے" دن میں سو مرتبہ کہے اس کو سو غلاموں کے آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے، اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اس کے سو گناہ دور کئے جاتے ہیں اور اس کو اس دن شام تک شیطان سے پناہ حاصل رہتی ہے اور (قیامت کے دن) کوئی اس کے لائے ہوئے (اس عمل سے بہتر کوئی عمل لے کر نہیں آئے گا علاوہ اس شخص کے جس نے ان کلمات کو اس سے زیادہ پڑھا۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: ظاہری طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان کلمات کو شام کے وقت پڑھے تو اسے بھی اسی طرح صبح تک شیطان سے پناہ حاصل رہے گی لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اس بات کو راوی نے اختصار کے پیش نظر بیان کرنے سے چھوڑ دیا ہو یا یہ کہ خود نبی کریم ﷺ ہی نے اسے بیان نہ کیا ہو کیونکہ حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں جو کچھ فضیلت اور جو کچھ ثواب بیان کیا گیا ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ کوئی شخص ان کلمات کو سو مرتبہ پڑھے چنانچہ ان کلمات کو جتنا زیادہ پڑھے گا اسے اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب حاصل ہو گا پھر یہ کہ چاہے کوئی ان کلمات کو مختلف اوقات میں اور متفرق طور پر سو مرتبہ پڑھے اور چاہے تو ایک وقت میں اور اکٹھا سو مرتبہ پڑھے۔ ہر دو صورت میں اسے مذکورہ ثواب حاصل ہو گا لیکن افضل یہی ہے کہ ان کلمات کو ایک ہی دفعہ میں سو مرتبہ اور دن کے ابتدائی حصہ میں پڑھا جائے تاکہ پورا دن شیطان سے پناہ حاصل رہے۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ جنّت کا خزانہ ہے

(۱۵) وَعَنْ اَبِي مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَجْهَرُوْنَ بِالتَّكْبِيْرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّهَا النَّاسُ اِرْبَعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا اِنَّكُمْ تَدْعُوْنَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا وَهُوَ مَعَكُمْ وَالَّذِيْ تَدْعُوْنَهٗ اَقْرَبُ اِلٰى اَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهٖ فَقَالَ اَبُوْ مُوْسٰى وَاَنَا خَلْفَهٗ اَقُوْلُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فِيْ نَفْسِيْ فَقَالَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ قَيْسٍ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى كَنْزٍ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ فَقُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے کہ لوگوں نے (ایک موقع پر) پکار پکار کر تکبیر کہنی شروع کی آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا "لوگو! اپنی جانوں کے ساتھ نرمی اختیار کرو (یعنی اتنی بلند آواز سے تکبیر نہ کہو) کیونکہ تم (تکبیر کے ذریعہ) کسی بہرے یا غیر موجود کو نہیں پکارتے یا نہیں یاد کرتے ہو بلکہ اس کو پکارتے ہو جو سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے (یعنی وہ تمہارے حال پر مطلع ہے تم جہاں کہیں بھی ہو چاہے تم اسے باآواز بلند یاد کرو چاہے آہستہ آواز سے اس کے لئے دونوں برابر ہیں) اور جس کو کہ تم پکارتے ہو وہ تم میں سے ہر شخص کے، اس کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے" حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں (اس وقت) آپ ﷺ کے پیچھے (اونٹ پر یا پیادہ تھا اور اپنے دل میں یہ پڑھ رہا تھا (لاحول ولاقوۃ الا باللہ) کہ آپ ﷺ نے فرمایا" عبداللہ ابن قیس! (یہ حضرت ابوموسیٰؓ کا نام ہے" کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتلا دوں؟ میں نے عرض کیا" ہاں یا

رسول اللہ (ﷺ)! ضرور بتائیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "وہ خزانہ لاحول ولاقوۃ الاباللہ ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "پکار پکار کر تکبیر کہنی شروع" کا مطلب یہ ہے کہ کسی بلند جگہ پر چڑھتے ہوئے جو تکبیر کہنی سُنّت ہے اسی کو صحابہؓ نے چلا کر کہنا شروع کر دیا تھا یا پھر تکبیر سے "ذکر بھی مراد ہو سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس موقع پر صحابہؓ باآواز بلند ذکر اللہ کرنے لگے تھے۔

حدیث کے آخر میں لاحول ولاقوۃ الاباللہ کو "خزانہ" اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اسے پڑھنے والے کو بہت زیادہ ثواب ملتا ہے اور وہ اس کی برکتوں سے اسی طرح مالا مال ہوتا ہے جس طرح دنیاوی خزانہ سے بلکہ اس نعمت کے آگے دنیا کے بڑے بڑے خزانہ کو بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔

لاحول کے بارہ میں مشائخ لکھتے ہیں کہ یہ ذکر اعمال میں جتنی زیادہ مدد کرتا ہے اور اس سے جتنی زیادہ برکت حاصل ہوتی ہے اتنی مدد و برکت اور کسی ذکر سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کلمے کے معنی یہ ہیں "گناہ سے بچنے کی طاقت اور اللہ کی عبادت کرنے کی قوت اللہ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے"۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

تسبیح و تحمید کا ثمرہ

(۱۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِهٖ غُرِسَتْ لَهٗ نَخْلَةٌ فِی الْجَنَّةِ (رواہ الترمذی)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے " سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِهٖ کہا اس کے لئے جنت میں کھجور کا درخت لگا دیا جاتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: کھجور کے درخت کو اس لئے مخصوص کیا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ کھجور کے درخت سے بہت زیادہ منفعت حاصل ہوتی ہے بلکہ اس کا پھل بھی بہت اچھا اور عمدہ ہوتا ہے۔

ہر صبح ایک فرشتہ کی طرف سے تسبیح کی نداء

(۱۲) وَعَنِ الزُّبَیْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ صَبَاحٍ یُصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْهِ اِلَّا مُنَادٍ یُنَادِیْ سَبِّحُوْا الْمَلِكَ الْقُدُّوْسَ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایسی کوئی صبح نہیں ہوتی کہ جس میں ایک فرشتہ پکارنے والا پکار کر یہ نہ کہتا ہو" "کہ پاک بادشاہ کو اس کی پاکی کے ساتھ یاد کرو۔" (ترمذی)

تشریح: یعنی روزانہ صبح کے وقت ایک فرشتہ پکار پکار کر انسانوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ یہ کہیں سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ یا اس طرح کہیں سُبُّوْحٌ الْقُدُّوْسُ رَبُّ الْمَلٰئِكَةِ وَالرُّوْحِ یا اس کے معنی یہ ہیں کہ روزانہ صبح کے وقت ایک فرشتہ لوگوں کو آگاہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا یقین و اعتقاد رکھیں کہ ان کا رب تمام عیوب اور تمام نقائص سے پاک ہے۔

بہترین ذکر لا الہ الا اللہ

(۱۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ

(الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سب سے بہتر ذکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے اور سب سے بہتر دعا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہے"
(ترمذیؒ ، ابن ماجہؒ)

تشریح: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سب سے افضل اس لئے ہے کہ اسلام و ایمان کے سارے وجود کی بنیاد ہی اس پر ہے اس کے بغیر نہ ایمان صحیح ہوتا ہے اور نہ اس کے بغیر کوئی مسلمان بنتا ہے۔

بعض محققین فرماتے ہیں کہ تمام اذکار میں یہ کلمہ سب سے افضل اس وجہ سے ہے کہ ذاکر کے باطن کو برے اوصاف سے کہ جو انسان کے باطن کے "معبود" ہوتے ہیں۔ پاک اور صاف کرنے میں اس کلمہ کو بڑی عجیب و عظیم تاثیر حاصل ہے ارشاد ربانی ہے۔ اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰاهُ کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفسانی کو اپنا معبود قرار دیا ہے۔

لہٰذا جب ذکر لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے تو لا الٰہ کے ذریعے تو تمام معبودوں کی نفی ہوتی ہے اور "الا اللہ" کے ذریعہ صرف ایک معبود حقیقی یعنی "اللہ" کا اقرار ہوتا ہے اور پھر جب زبان سے یہ کلمہ ادا ہوتا ہے تو اس کی تاثیر ظاہری زبان سے دل کی گہرائیوں کی طرف رجوع کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبان سے تمام باطل معبودوں کی نفی اور ایک حقیقی معبود کا "اقرار" یقین و اعتقاد کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو اس کے قلب و باطن کو روشن و منور کر کے تمام برے و باطنی اوصاف کو صاف کر دیتا ہے اور آخر کار یہی تاثیر اس کے ظاہری اعضاء پر غالب آجاتی ہے کہ اس کے ظاہری اعضاء سے وہی اعمال و افعال صادر ہوتے ہیں جو اس اقرار و اعتقاد کا عین تقاضہ اور عین منشاء ہوتے ہیں۔

"الحمد للہ" کو دعا اس لئے فرمایا گیا ہے کہ کریم کی تعریف دعا و سوال کے زمرہ میں ہی آتی ہے اور اس کو افضل اس وجہ سے بتایا گیا ہے کہ منعم حقیقی یعنی خدا کی حمد شکر کے معنی میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شکر نعمت و برکت میں زیادتی کا موجب ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ۔ --- "اور اگر تم شکر کرو گے تو میں زیادہ نعمت دوں گا۔"

خدا کی تعریف، خدا کا شکر ہے

⑭ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ مَاشَكَرَ اللّٰهَ عَبْدٌ لَا يَحْمَدُهٗ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حمد (خدا کی تعریف) شکر کا سر ہے جس بندہ نے خدا کی حمد نہیں کی اس نے خدا کا (کامل) شکر ادا نہیں کیا"۔

تشریح: "حمد" یعنی خدا کی تعریف زبان سے ہوتی ہے اور شکر، زبان و دل اور اعضاء سے ہوتا ہے، لہٰذا خدا کی تعریف خدا کے شکر کی ایک شاخ ہے۔ حمد کو شکر کا سر اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ زبان کا فعل ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی تعریف زبان ہی سے خوب بیان ہوتی ہے اور پھر یہ کہ زبان چونکہ تمام اعضاء کی نائب ہے اس لئے حمد بھی گویا اجمالاً شکر ہے اور مفصل شکر کا جزو اعظم ہے اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ جس بندہ نے خدا کی حمد نہیں کی اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کیا اس بات میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے باطن کی صفائی و تزکیہ کے ساتھ ساتھ اپنے ظاہری احوال کی محافظت بھی کرے۔

خوشی و مصیبت دونوں صورتوں میں اللہ کی تعریف کرنے والوں کی فضیلت

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَّلُ مَنْ يُدْعٰى اِلَى الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الَّذِيْنَ

يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن جنت کی طرف جن لوگوں کو پہلے بلایا جائے گا ان میں وہ ہوں گے جو خوشی کے وقت بھی اور سختی کے وقت بھی اللہ کی تعریف کرتے ہیں (یعنی دونوں صورتوں میں راضی و برضاء مولیٰ رہتے ہیں) ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

لا الٰہ الا اللہ کی عظمت

(۱۶) وَعَنْ اَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا رَبِّ عَلِّمْنِي شَيْئًا اَذْكُرُكَ بِهٖ اَوْ اَدْعُوْكَ بِهٖ فَقَالَ يَا مُوْسٰى قُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَالَ يَا رَبِّ كُلُّ عِبَادِكَ يَقُوْلُ هٰذَا اِنَّمَا اُرِيْدُ شَيْئًا تَخُصُّنِي بِهٖ قَالَ يَا مُوْسٰى لَوْ اَنَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَعَامِرَهُنَّ غَيْرِيْ وَالْاَرَضِيْنَ السَّبْعَ وُضِعْنَ فِي كِفَّةٍ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فِي كِفَّةٍ لَمَالَتْ بِهِنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ پروردگار! مجھے کوئی ایسی چیز سکھلا دے جس کے ذریعہ میں تجھے یاد کروں اور تجھ سے دعا مانگوں! پروردگار نے فرمایا! موسیٰ لا الٰہ الا اللہ کہو! موسیٰؑ نے عرض کیا "میرے پروردگار" تیرے تمام بندے (یعنی موحدین) یہ کلمہ کہتے ہیں میں تو کوئی ایسی چیز چاہتا ہوں جسے تو میرے ہی لئے مخصوص کر دے۔ جس میں میرا اور کوئی شریک نہ ہو) اللہ تعالیٰ نے فرمایا "موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور میرے علاوہ ان کے سارے مکین (یعنی تمام فرشتے) اور ساتوں زمین ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور لا الٰہ الا اللہ یعنی اس کا ثواب دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً ان چیزوں کے پلڑے سے لا الٰہ الا اللہ کا پلڑا جھک جائے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو ایسا کوئی ذکر یا ایسی کوئی دعا طلب کی تھی کہ جو ان ہی کے لئے مخصوص ہو اور وہ اس کے ذریعہ دوسروں پر فائق ہوں لہٰذا سوال کے ساتھ جواب کی یہ کیا مطابقت ہوئی کہ ان سے فرمایا گیا کہ لا الٰہ الا اللہ کہو! اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کا سوال کچھ اور تھا اور بارگاہ الوہیت سے جواب کچھ اور دیا گیا۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کی تعلیم دے کر گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ تم نے ایک محال چیز کی طلب کی ہے۔ کیونکہ ایسی کوئی دعا اور ایسا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جو اس کلمے سے افضل ہو اور اسے سب پڑھتے ہیں۔ بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحسب عادت بشری کوئی مخصوص دعا اور ذکر کی طلب کی کیونکہ انسان کی یہ فطرت یہ ہے کہ اسے اسی وقت بہت زیادہ خوشی اور سرور حاصل ہوتا ہے جب کہ اسے کسی چیز کے ساتھ مختص کیا جائے جو اس کے علاوہ اور کسی کے پاس نہ ہو۔ مثلاً اگر کسی کے پاس کوئی ایسا جو ہریا ہیرا ہو تو جو اس کے علاوہ اور کسی کے پاس نہ ہو تو اسے اس قیمتی چیز کی موجودگی سے زیادہ اس احساس سے خوشی ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی چیز کا مالک ہے جو اس کے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں پائی جاتی۔ یہی حال اسماء، دعاؤں، نادر علوم اور ہنر کا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز جب کسی کے پاس ہوتی ہے اور وہ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوتی۔ تو اسے بے انتہا خوشی اور فرحت حاصل ہوتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت عام کے تحت اس کی قدرت کا نظام کچھ اس طرح ہے کہ جو چیز کائنات انسانی کے لئے سب سے گرانمایہ سب سے بیش بہا اور سب سے عزیز ہے وہی سب سے زیادہ پائی جاتی ہے، مثلاً زندگی، پانی اور نمک کی یہ چیزیں سب سے گرانمایہ اور عزیز تر ہیں۔ مگر یہی چیزیں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ بخلاف موتی، یاقوت اور زعفران وغیرہ کے کہ یہ ان چیزوں کے برابر گرانمایہ اور عزیز نہیں ہیں۔ مگر کم ہیں اسی طرح مصحف شریف یعنی قرآن کریم سب کتابوں سے افضل ہے مگر نہ صرف یہ کہ بہت پایا جاتا ہے بلکہ سستا بھی بہت ملتا ہے اس کے مقابلہ میں علم کیمیا وغیرہ کی کیا حقیقت ہے مگر اس کا وجود کتنا خال خال نظر آتا ہے یہ اور بات ہے کہ جاہل و بے وقوف لوگوں کی نظروں میں اس

کے حصول کی جتنی خواہش اور اس سے جتنی زیادہ خوشی ہوتی ہے اس کا عشر عشیر بھی قرآن وحدیث کے علم سے خوش نہیں ہوتے یا ایسے ہی کلمہ طیب اور کلمہ شہادت کے یہ تمام کلمات میں اشرف، تمام عبادتوں میں نفیس تر، تمام اذکار میں افضل اور تمام حسنات میں کامل ترین مگر اپنے وجود کے اعتبار سے اکثر اور حصول کے اعتبار سے آسان ترین ہیں پھر بھی عوام نے ان کو ترک کر رکھا ہے اور دور دراز کے ان اذکار اور ان دعاؤں کو اپنا معمول بنا رکھا ہے جن میں سے قرآن وحدیث میں اکثر کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

بہر کیف ان مثالوں کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اکثر چیزیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو بہت اعلیٰ ہوتی ہیں مگر بسبب کثرت کے لوگ ان کی قدر نہیں پہچانتے اور جو چیزیں اس درجہ کی عزیز نہیں ہوتیں لوگ انہیں کو ان کی کمیابی کی وجہ سے عزیز رکھتے ہیں۔

آخر میں یہ بات سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو الہام کیا کہ وہ اس بات کی درخواست کریں اور رب العزت انہیں یہ جواب دے تاکہ اس عظیم تر کلمہ کی عظمت و فضیلت عوام و خواص کی نظروں میں ظاہر ہو اور وہ اس کو ہر وقت اور ہر حالت میں اپنا ورد بنالیں اور اس پر مداومت کریں۔

⑰ وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ وَاَبِی هُرَیْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ صَدَّقَهٗ رَبُّهٗ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا وَاَنَا اَکْبَرُ وَاِذَا قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ یَقُوْلُ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا وَحْدِیْ لَا شَرِیْكَ لِیْ وَاِذَا قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَالِیَ الْمُلْكُ وَلِیَ الْحَمْدُ وَاِذَا قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِیْ وَکَانَ یَقُوْلُ مَنْ قَالَهَا فِیْ مَرَضِهٖ ثُمَّ مَاتَ لَمْ تَطْعَمْهُ النَّارُ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ و حضرت ابوہریرہؓ دونوں کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص یہ کہتا ہے (لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اللہ بہت بڑا ہے تو اس کا رب اس کو سچا کرتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اسے اس اقرار و اعتقاد پر قائم رکھتا ہے اور ان اقوال کو قبول فرماتا ہے) اور (اس کے کہنے کے موافق) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لا الٰہ الا انا وانا اکبر بیشک میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میں بہت بڑا ہوں جب وہ شخص یہ کہتا ہے (لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں) تو اللہ فرماتا ہے لا الٰہ الا اللہ لہ الملک ولہ الحمد) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے تعریف) تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) (لا الٰہ الا انالی الملک ولی الحمد) بیشک میرے سوا کوئی معبود نہیں میرے ہی لئے بادشاہت ہے اور میرے ہی لئے تعریف) اور جب وہ شخص یہ کہتا ہے (لا الٰہ الا اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گناہوں سے بچنا اور اطاعت کی قوت پانا اللہ ہی کی مدد سے ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (لا الٰہ الا انا ولاحول ولا قوۃ الا بی) بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، گناہوں سے بچنا اور اطاعت کی قوت پانا میری ہی مدد سے ہے) نیز نبی کریم ﷺ فرماتے تھے کہ جو شخص ان (مذکورہ بالا) کلمات کو اللہ تعالیٰ کے جوابوں کے علاوہ اپنی بیماری میں کہتا رہے اور پھر مر جائے تو اسے (دوزخ کی) آگ نہیں جلائے گی یعنی وہ دوزخ کے عذاب سے محفوظ رہے گا۔" (ترمذی و ابن ماجہ)

تسبیح و تحمید کی فضیلت

⑱ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّهٗ دَخَلَ مَعَ النَّبِیِّ عَلٰی اِمْرَأَةٍ وَبَیْنَ یَدَیْهَا نَوًی اَوْ حَصًی تُسَبِّحُ بِهٖ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُكِ بِمَا هُوَ اَیْسَرُ عَلَیْكِ مِنْ هٰذَا اَوْ اَفْضَلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا هُوَ خَلَقَ فِی السَّمَاءِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِی الْاَرْضِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا بَیْنَ ذٰلِكَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ مِثْلَ ذَالِكَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ مِثْلَ ذٰلِكَ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِثْلَ ذٰلِكَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مِثْلَ ذٰلِكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ایک خاتون کے ہاں گئے (اس وقت) اس خاتون

کے سامنے کھجور کی گٹھلیاں یا کنکریاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ ان پر تسبیح پڑھ رہی تھیں (یعنی ان کے ذریعہ تسبیح کو شمار کرتی تھیں) آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ "کیا میں تمہیں ایک ایسی تسبیح نہ بتا دوں جو (نہ صرف یہ کہ) اس تسبیح (یعنی ان بہت ساری گٹھلیوں یا کنکریوں پر تسبیح پڑھنے کے مقابلہ میں تمہارے لئے بہت آسان بھی ہے بلکہ وہ تسبیح بہت بہتر ہے اور وہ تسبیح یہ ہے (جسے تم پڑھ لیا کرو) سُبْحَانَ اللہِ عَدَدَ مَاھُوَ خَلَقَ فِی السَّمَاءِ وَ سُبْحَانَ اللہِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِی الْاَرْضِ وَ سُبْحَانَ اللہِ عَدَدَ مَا بَیْنَ ذٰلِکَ وَ سُبْحَانَ اللہِ عَدَدَ مَاھُوَ خَالِقٌ اللہ کے لئے پاکی ہے اس مخلوق کی تعداد کے بقدر جو آسمان میں ہے اور اللہ کے لئے پاکی ہے اس مخلوق کی تعداد کے بقدر جو زمین میں ہے اور اللہ کے لئے پاکی ہے اس مخلوق کی بقدر جو زمین و آسمان کے درمیان ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے پاکی ہے اس مخلوق کی تعداد کے بقدر جو اس کے بعد ازل سے ابد تک پیدا کی جانے والی ہے۔ اور اللہ اکبر بھی اسی طرح پڑھے اور الحمد للہ بھی اسی طرح پڑھے اور لا الہ الا اللہ بھی اسی طرح پڑھے اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ بھی پڑھے ترمذی، ابوداؤد، ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: بعض روایتوں میں آتا ہے وہ خاتون جن کے ہاں نبی کریم ﷺ اور حضرت سعد بن ابی وقاص تشریف لے گئے تھے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے یا تو ام المؤمنین حضرت جویریہؓ تھیں یا کوئی اور زوجہ مطہرہ "کھجور کی گٹھلیاں یا کنکریاں" یہ جملہ راوی؟ کے شک کو ظاہر کر رہا ہے راوی کو یقین کے ساتھ یاد نہیں آرہا کہ وہ خاتون جس چیز پر تسبیح پڑھ رہی تھیں کھجور کی گٹھلیاں تھیں یا کنکریاں اسی لئے انہوں نے دونوں کو ذکر کر دیا۔

مروجہ تسبیح کا جواز

وہ تسبیح جو آجکل رائج ہے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھی بلکہ بعض لوگ تو گٹھلیوں یا سنگریزوں پر پڑھتے تھے اور بعض ڈورے میں گرہیں دیتے جاتے تھے اور اس کے ذریعہ شمار کرتے تھے لیکن یہ حدیث جس طرح گٹھلیوں اور سنگریزوں پر پڑھنے کے جواز کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان خاتون کو اس سے منع نہیں کیا اسی طرح مروجہ تسبیح کے جائز ہونے کی بھی صحیح اصل و بنیاد اور دلیل ہے۔ کیونکہ شمار کے سلسلہ میں پروئے ہوئے دانوں میں اور بغیر پروئے ہوئے میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح بغیر پروئے ہوئے یعنی گٹھلیوں یا سنگریزوں سے پڑھی جانے والی چیز کا شمار مقصود ہوتا تھا اسی طرح پروئے ہوئے دانوں کی تسبیح کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے اس لئے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تسبیح کی وہ شکل جو آجکل رائج ہے، بدعت ہے تو اس پر اعتماد نہ کیا جائے، چنانچہ مشائخ نہ صرف یہ کہ اس کو جائز کہتے ہیں بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ شیطان کے لئے کوڑا ہے۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے بارہ میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ اس وقت جب کہ وہ تمام مدارج طے کر کے حالت منتہی کو پہنچ چکے تھے ان کے ہاتھوں میں تسبیح دیکھ کر کسی شخص نے اس کے بارہ میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ جس کے ذریعہ ہم اللہ تک پہنچے ہیں اس لئے میں اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں!؟ وَاللہُ اَکْبَرُ مِثْلَ ذٰلِکَ (اور اللہ اکبر بھی اسی طرح ہے) اس جملہ کے بارہ میں دو احتمال ہیں یا تو یہ راوی کے الفاظ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جس طرح تسبیح یعنی سُبْحَانَ اللہِ عَدَدَ مَا خَلَقَ الخ پوری طرح بیان کی اسی طرح آپ ﷺ نے تکبیر کو پوری طرح بیان کیا یعنی اس طرح بیان فرمایا۔ اَللہُ اَکْبَرُ عَدَدَ مَا خَلَقَ الخ مگر راوی نے یہ اختصار کے پیش نظر وَاللہُ اَکْبَرُ مِثْلَ ذٰلِکَ کہہ کر بتا دیا کہ آپ ﷺ نے بعد کے کلمات کی تعلیم بھی اسی طرح فرمائی۔ یا پھر یہ کہ راوی کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ خود نبی کریم ﷺ ہی نے اختصار کے پیش نظر عَدَدَ مَا خَلَقَ فِی السَّمَاءِ کہنے کی بجائے مِثْلَ ذَالِکَ پر اکتفا فرمایا اس طرح آپ ﷺ نے بتایا کہ جن الفاظ یعنی عَدَدَ مَا خَلَقَ الخ کے ساتھ تسبیح پڑھی جائے انہیں الفاظ کے ساتھ تکبیر بھی پڑھی جائے۔ اس طرح بعد کے جملوں یعنی وَالْحَمْدُ لِلہِ مِثْلَ ذَالِکَ وغیرہ میں بھی یہی دونوں احتمال ہیں۔

تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر کا ثواب

(۱۹) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَبَّحَ اللّٰهَ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعَشِيِّ كَانَ كَمَنْ حَجَّ مِائَةَ حَجَّةٍ وَمَنْ حَمِدَ اللّٰهَ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعَشِيِّ كَانَ كَمَنْ حَمَلَ عَلٰى مِائَةِ فَرَسٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَنْ هَلَّلَ اللّٰهَ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعَشِيِّ كَانَ كَمَنْ اَعْتَقَ مِائَةَ رَقَبَةٍ مِنْ وُلْدِ اِسْمَاعِيْلَ وَمَنْ كَبَّرَ اللّٰهَ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعَشِيِّ لَمْ يَأْتِ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ اَحَدٌ بِاَكْثَرَ مِمَّا اَتٰى بِهٖ اِلَّا مَنْ قَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ اَوْزَادَ عَلٰى مَا قَالَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد مکرم سے اور وہ اپنے جد محترم سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص سو مرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سو مرتبہ دن کے آخری حصہ میں سبحان اللہ کہے تو وہ (از روئے ثواب) اس شخص کی مانند ہے جس نے سو (نفل) حج کئے ہوں جو شخص سو مرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سو مرتبہ دن کے آخری حصہ میں الحمد للہ کہے تو اس شخص کی مانند ہے جس نے سو آدمیوں کو خدا کی راہ میں سو گھوڑوں پر سوار کرایا ہو جو شخص سو مرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سو مرتبہ دن کے آخری حصہ میں لا الٰہ الا اللہ کہے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے سو غلام آزاد کئے ہوں، اور جو شخص سو مرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سو مرتبہ دن کے آخری حصہ میں (اللہ اکبر) کہے تو اس دن (یعنی قیامت کے دن) کوئی شخص اس ثواب سے زائد ثواب لے کر نہیں آئے گا جو وہ لائے گا۔ علاوہ اس شخص کے جس نے اس کی مانند (یعنی اللہ اکبر) مذکورہ تعداد میں کہا ہو گا تو یہ شخص درجہ ثواب کے اعتبار سے اس کے برابر ہو گا) یا وہ شخص جس نے اس سے زائد کہا ہو گا (تو یہ اس سے بھی افضل ہو گا) امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: "اس شخص کی مانند ہے جس نے سو حج کئے ہوں" سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آسان و سہل ذکر بشرطیکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور کی کیفیت حاصل ہو ان عبادت شاقہ سے افضل ہے جس میں قلب حضور و اخلاص سے محروم اور غفلت میں گرفتار ہو لیکن یہ بھی امکان ہے کہ جس طرح کسی کمتر درجہ کے عمل کی فضیلت کو بطور مبالغہ بیان کرنے کے پیش نظر اس عمل کو اس سے برتر درجہ کے عمل کی مانند قرار دیا جاتا ہے اسی طرح سبحان اللہ کی عظمت و فضیلت کو بطور مبالغہ بیان کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے کہ جو شخص صبح شام سو سو مرتبہ تسبیح پڑھتا ہے وہ نفل حج کرنے والے کی مانند ہوتا ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ تسبیح سبحان اللہ پڑھنے کی چونکہ بہت زیادہ فضیلت ہے اس لئے اس کا ثواب بڑھا کر نفل حج کے اصل ثواب کے برابر کر دیا جاتا ہے۔

خدا کی راہ میں سو گھوڑوں پر سوار کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جہاد کے لئے سو گھوڑے دے ڈالے ہوں یا عاریۃً دیئے ہوں! اس بات سے گو ذکر اللہ میں مشغول رہنے کی ترغیب دلائی جا رہی ہے کہ کوئی شخص دنیا کی طرف التفات نہ کرے بلکہ وہ حضور مع اللہ کی سعادت عظمیٰ کے حصول میں اپنی پوری کوششیں اور توجہات صرف کرے کیونکہ خواہ عبادت بدنیہ ہوں یا مالیہ یا دونوں کا مجموعہ، سب کا مقصد اور حاصل ذکر اللہ ہے اور پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ مطلوب بہر صورت وسیلہ سے اولیٰ ہوتا ہے۔

"حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے سو غلام آزاد کئے ہوں" اس میں در حقیقت ان ذاکرین کے لئے تسلی اور ترغیب ہے جو محتاج اور کم استطاعت ہونے کی وجہ سے ان عبادت مالیہ سے عاجز ہوں جنہیں اہل ثروت اور مالدار ادا کرتے ہیں۔

"حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے مراد" اہل عرب ہیں" جو نبی کریم ﷺ کے قرابتی ہونے کی وجہ سے افضل و اعلیٰ ہیں حدیث کے آخری جزء سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ اکبر ان تمام تسبیحات میں جو حدیث میں ذکر کی گئی ہیں سب سے افضل ہے حالانکہ بہت سی صحیح احادیث

اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ان تسبیحات میں سب سے افضل لا الہ الا اللہ ہے۔ پھر الحمد للہ پھر اللہ اکبر، پھر سبحان اللہ! لہٰذا اس کی تاویل یہ کی جائے گی کہ حدیث کے آخری جز کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ اکبر ہر صبح و شام سو سو مرتبہ پڑھے گا قیامت کے دن لا الہ الا اللہ پڑھنے والے کے علاوہ کوئی شخص اس ثواب سے زیادہ ثواب لے نہیں آئے گا جو یہ شخص لائے گا۔

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ التَّسْبِيْحُ نِصْفُ الْمِيْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ يَمْلَؤُهُ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَيْسَ لَهَا حِجَابٌ دُوْنَ اللّٰهِ حَتّٰى تَخْلُصَ اِلَيْهِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ اِسْنَادُهُ بِالْقَوِيِّ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سبحان اللہ کہنا آدھی میزان اعمال کو (یعنی میزان اعمال کے اس پلڑے کو جو نیکیوں کو تولنے کے لئے مخصوص ہوگا) بھر دیتا ہے الحمد للہ کہنا پوری میزان عمل کو بھر دیتا ہے اور لا الہ الا اللہ کے لئے خدا تک (پہنچنے میں) کوئی پردہ حائل نہیں، یہ (سیدھا) خدا تک پہنچتا ہے" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔"

تشریح: "الحمد للہ کہنا پوری میزان عمل کو بھر دیتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ صرف الحمد للہ کا ثواب ہی پوری میزان کو بھر دیتا ہے اور یہ کہ الحمد للہ، سبحان اللہ سے افضل ہے! یا پھر مراد یہ ہے کہ الحمد للہ، سبحان اللہ کے برابر ہے کہ آدھی میزان کو تو سبحان اللہ کا ثواب بھر دیتا ہے اور آدھی میزان کو الحمد للہ کا ثواب بھر دیتا ہے اس طرح دونوں مل کر پوری میزان کو بھر دیتے ہیں۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ "لا الہ الا اللہ" بارگاہ کبریائی میں بہت جلد قبول ہوتا ہے اور اس کو پڑھنے والا بہت ثواب پاتا ہے اس طرح حدیث کا یہ آخری جزء وضاحت کے ساتھ اس بات کی دلیل ہے کہ سبحان اللہ اور الحمد للہ سے لا الہ الا اللہ افضل ہے۔

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا قَالَ عَبْدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا قَطُّ اِلَّا فُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ السَّمَاءِ حَتّٰى يُفْضِیَ اِلَى الْعَرْشِ مَا اجْتَنَبَ الْكَبَائِرَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی بندہ خلوص قلب کے ساتھ (یعنی بغیر ریا کے لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو اس کلمہ کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ عرش تک پہنچتا ہے یعنی جلد قبول ہوتا ہے بشرطیکہ وہ کلمہ کہنے والا کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "کبیرہ گناہوں سے بچنا" جلدی قبول ہونے کی شرط ہے اصل ثواب کی شرط نہیں یعنی یہ کلمہ بارگاہ حق جل مجدہ میں اس وقت جلدی قبول ہوتا ہے جب کہ یہ کلمہ کہنے والا کبیرہ گناہوں سے بچے اور اصل ثواب اسے بہر صورت ملتا ہے خواہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچے یا نہ بچے۔

تسبیحات جنّت کے درخت ہیں

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِيْتُ اِبْرَاهِيْمَ لَيْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اَقْرِأْ اُمَّتَكَ مِنِّی السَّلَامَ وَاَخْبِرْهُمْ اَنَّ الْجَنَّةَ طَيِّبَةُ التُّرْبَةِ عَذْبَةُ الْمَاءِ وَاَنَّهَا قِيْعَانٌ وَاَنَّ غِرَاسَهَا سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادًا۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس رات مجھے معراج کی سعادت نصیب ہوئی ہے اس رات میں (ساتوں آسمانوں) پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی (جو بیت المعمور سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے) انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ

"محمد!! اپنی امت کو میرا سلام کہئے گا اور انہیں بتا دیجئے گا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے اور وہ مٹی کی بجائے مشک وزعفران ہے) اس کا پانی شیریں ہے۔ اس کا میدان پٹ پڑ (یعنی ہموار اور درختوں سے خالی ہے) اور اس کے درخت ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت باعتبار اسناد کے غریب ہے۔"

تشریح: اس امت مرحومہ کی شان محبوبی اور شان عظمت کے صدقے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کے واسطہ سے اسے سلام کہلایا اور اس طرح اس امت سے اپنے تعلق کا اظہار کیا اس لئے اس اُمت کے ایک ایک فرد کے لئے یہی لائق ہے کہ اس حدیث کے ذریعہ جب بھی حضرت ابراہیمؑ کا سلام سنایا جائے یا پڑھا جائے تو یہ کہا جائے وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

وان غراسھا سبحان اللہ (اور اس کے درخت ہیں سبحان اللہ الخ) کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنی اُمت کو آگاہ کر دیجئے گا کہ یہ کلمات اور انہیں کی طرح دوسرے کلمات ذکر پڑھنے سے آدمی جنت میں داخل ہوتا ہے اور چونکہ جنت میں بہت سے درخت لگائے جاتے ہیں بایں طور کہ ہر کلمے کے پڑھنے سے ایک درخت لگتا ہے اس لئے ان کلمات کو جو شخص جتنا زیادہ پڑھے گا اس کی طرف سے جنت میں اتنے ہی زیادہ درخت لگائے جائیں گے۔

یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ ان کلمات کو پڑھنے والا جنت کی پر سکون اور پر راحت فضا اور وہاں کے سرور آمیز اطمینان وچین کا حقدار ہوگا اور وہاں یہ کلمات درخت کی شکل میں لازوال سکون آمیز حیات کے ضامن ہوں گے۔

اوراد واذکار کو انگلیوں پر پڑھنا افضل ہے

(۲۳) وَعَنْ يُسَيْرَةَ وَكَانَتْ مِنَ الْمُهَاجِرَاتِ قَالَتْ قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُنَّ بِالتَّسْبِيْحِ وَالتَّهْلِيْلِ وَالتَّقْدِيْسِ وَاعْقِدْنَ بِالْاَنَامِلِ فَاِنَّهُنَّ مَسْئُوْلَاتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ وَلَا تَغْفُلْنَ فَتُنْسَيْنَ الرَّحْمَةَ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت یسیرہؓ جو مہاجرات میں سے ہیں فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہم عورتوں سے فرمایا کہ (سُبْحَانَ اللّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ) یا سُبُّوْحٌ الْقُدُّوْسُ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ کو پڑھنا اپنے لئے ضروری قرار دو، اور ان (مذکورہ تسبیحات کو، اپنی انگلیوں پر شمار کرو کیونکہ ان انگلیوں سے پوچھا جائے گا اور ان کو گویائی دی جائے گی اور یاد رکھو، ذکر سے غافل مت ہونا یعنی ذکر کو ترک نہ کرنا، ورنہ رحمت سے تمہیں بھلایا جائے گا یعنی اگر ذکر کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤ گی تو اس کے بے شمار ثواب سے محروم ہوگی۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: یہ تو سب جانتے ہیں کہ قیامت کے دن جسم انسانی کا ایک ایک عضو اپنے مالک کے اعمال کا گواہ اور شاہد بنے گا ارشاد ربانی ہے۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

"یاد کرو اس دن کو جب کہ ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان چیزوں کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے ہیں۔"

ارشاد گرامی "ان (انگلیوں) سے پوچھا جائے گا" میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انگلیوں سے پوچھے گا کہ بتاؤ تم نے دنیا میں کیا کیا ہے اور پھر جواب دینے کے لئے ان انگلیوں کو گویائی عطا فرمائے گا۔ چنانچہ وہ انگلیاں اپنے مالک کے ان اچھے برے اعمال کی گواہی دیں گے۔ جو ان انگلیاں کے ذریعہ سرزد ہوئے تھے اس لئے آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ تسبیحات کو اپنی انگلیوں پر شمار کرو تاکہ وہ کل قیامت کے دن تمہارے اس نیک عمل کی گواہی دیں۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اوراد و اذکار اور تسبیحات کو انگلیوں پر شمار کرنا افضل ہے اگرچہ تسبیح پر پڑھنا بھی جائز ہے نیز اس میں

اس بات کی ترغیب بھی ہے کہ بندہ کی عقل و شعور کا تقاضہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اعضاء جسمانی کو انہیں کاموں میں مشغول رکھے جو اللہ تعالیٰ کی رضاو خوشنودی کا باعث ہوں اور اپنے ایک ایک عضو کو گناہ سے بچائے تاکہ قیامت کے دن کوئی بھی عضو گناہ کی گواہی دے کر عذاب خداوندی میں مبتلا نہ کرا دے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بہترین ورد اور بہترین دعا

(۲۴) عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِيٌّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عَلِّمْنِي كَلَامًا اَقُوْلُهُ قَالَ قُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ اللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ قَالَ فَهٰؤُلَاءِ لِرَبِّي فَمَالِيْ فَقَالَ قُلِ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَارْحَمْنِي وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِي وَعَافِنِي شَكَّ الرَّاوِيْ فِيْ عَافِنِي (رواہ مسلم)

"حضرت سعد ابن وقاصؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک دیہاتی نے رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت ﷺ! مجھے کوئی ایسا ذکر بتا دیجئے جسے میں کہتا رہوں (یعنی اس کو اپنا ورد بنا لوں) آپ ﷺ نے فرمایا یہ پڑھ لیا کرو۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ اللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اللہ بہت بڑا ہے اور اللہ ہی کے لئے بہت تعریف ہے اور پاکی ہے اللہ کے لئے جو پالنہار ہے تمام عالم کا گناہ سے بچنے کی طاقت اور عبادت کرنے کی قوت اللہ ہی کی مدد سے جو غالب حکمت والا ہے۔) اس دیہاتی نے عرض کیا یہ کلمات تو میرے پروردگار کے ذکر کے لئے ہیں میرے لئے وہ کون سے کلمات ہیں جن کے ذریعہ میں اپنے لئے دعا مانگوں آپ نے فرمایا اس طرح مانگو۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَارْحَمْنِي وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِي وَعَافِنِي شَكَّ الرَّاوِيْ فِيْ عَافِنِي اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے (تمام حرکات و سکنات میں طاعت ہی کی توفیق کے ذریعہ) مجھ پر رحم فرما (بہتر اعمال و احوال کی طرف) میری ہدایت کر مال حلال سے مجھے روزی دے اور مجھے عافیت بخش! راوی کو لفظ عافنی کے بارہ میں شک ہے (کہ آیا روایت میں یہ لفظ بھی ہے یا نہیں۔" (مسلم)

تشریح: بزاز کی روایت میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ العزیز الحکیم میں لفظ العزیز الحکیم کی بجائے العلی العظیم ہے اور عام طور پر لوگ العلی العظیم ہی پڑھتے بھی ہیں اگرچہ مسلم میں العزیز الحکیم منقول نہیں ہے۔

تسبیح وغیرہ سے گناہوں کا سقوط

(۲۵) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰى شَجَرَةٍ يَابِسَةِ الْوَرَقِ فَضَرَبَهَا بِعَصَاهُ فَتَنَاثَرَ الْوَرَقُ فَقَالَ اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ تُسَاقِطُ ذُنُوْبَ الْعَبْدِ كَمَا يَتَسَاقَطُ وَرَقُ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ خشک پتوں والے ایک درخت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اپنا عصاء مبارک اس کی ٹہنیوں پر مارا جس کی وجہ سے پتے جھڑنے لگے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اور وَاللّٰهُ اَكْبَرُ پڑھنا بندوں کے گناہوں کو اسی طرح جھاڑتا ہے۔ جس طرح اس درخت کے پتے جھڑ رہے ہیں، امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔"

لاحول ولاقوۃ کی فضیلت

(۲۶) وَعَنْ مَكْحُوْلٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْثِرْ مِنْ قَوْلِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ كَنْزِ الْجَنَّةِ قَالَ مَكْحُوْلٌ فَمَنْ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا مَنْجَأَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ كَشَفَ اللّٰهُ عَنْهُ سَبْعِيْنَ بَابًا مِنَ الضُّرِّ اَدْنَاهَا الْفَقْرُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَيْسَ اِسْنَادُهُ بِمُتَّصِلٍ وَمَكْحُوْلٌ لَمْ يَسْمَعْ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

"اور حضرت مکحولؒ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کثرت سے پڑھا کرو کیونکہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ حضرت مکحولؒ نے فرمایا کہ "جو شخص یہ کہے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا مَنْجَأَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ یعنی ضرر و نقصان کو (دفع کرنے کی) قوت اور نفع حاصل کرنے کی طاقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور اس کی قدرت کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات اسی (کی رضا اور رحمت کی توجہ) پر منحصر ہے" تو اللہ تعالیٰ اس سے ضرر و نقصان کی ستر قسمیں دور کر دیتا جس میں ادنیٰ قسم (فقر محتاجگی ہے) امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ سے حضرت مکحولؒ کی سماعت ثابت نہیں ہے۔"

تشریح: "ارشاد گرامی "جنت کا خزانہ" کا مطلب یہ ہے کہ لاحول ولاقوۃ الاباللہ جنت کا ایک ذخیرہ ہے جس سے کہ اس کو پڑھنے والا اس دن (یعنی قیامت کے دن) نفع و فائدہ حاصل کرے گا جس دن نہ دنیا کا کوئی خزانہ مال کا کام آئے گا اور نہ اولاد اور دوسرے عزیز و اقارب نفع پہنچائیں گے۔

فقر (محتاجگی) سے مراد دل کا فقر اور قلب کی تنگی ہے جس کے متعلق ایک حدیث یوں ہے فرمایا کہ:

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا۔

"فقر کفر کے قریب پہنچا دیتا ہے۔"

لہٰذا جو شخص ان کلمات کو پڑھتا ہے تو اس کی برکت سے دل کی محتاجگی دور ہوتی ہے کیونکہ جب وہ ان کلمات کو زبان سے ادا کرتا ہے اور پھر ان کلمات کے معنی و مفہوم کا تصور کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ یقین و اعتماد پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر امر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ہے ہر چیز اسی کے قبضہ قدرت کے زیر اثر ہے، کسی کو نفع و فائدہ آرام و راحت دنیا میں بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور کسی کو تکلیف و مصیبت اور ضرر و نقصان میں مبتلا کر دینا بھی اسی کی طرف سے ہے پس وہ شخص بلاء و مصیبت پر صبر کرتا ہے، نعمت و راحت پر شکر کرتا ہے اپنے تمام امور اللہ ہی کی طرف سونپ دیتا ہے اور اس طرح قضا و قدر الٰہی پر راضی ہو کر حق تعالیٰ کا محبوب بندہ اور دوست بن جاتا ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ اپنی ایک سیاحت کے دوران جن صاحب کی رفاقت و صحبت مجھے حاصل رہی انہوں نے مجھے نیکی و بھلائی کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ "خوب اچھی طرح جان لو اعمال نیک کے لئے اقوال و کلمات میں تو لاحول ولاقوۃ الاباللہ کے برابر کوئی قول و کلمہ اور افعال میں خدا کی طرف جھکنے اور اس کے فضل کی راہ کو اختیار کرنے کے برابر کوئی فعل ممد و معاون نہیں۔ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ جس شخص نے خدا کی راہ دکھائی ہوئی کو اختیار کیا تو بلاشبہ اسے مضبوط راہ کی ہدایت بخشی ہوگی۔

امام ترمذیؒ کے قول کے مطابق اگرچہ اس حدیث کی سند متصل نہیں ہے اور اس طرح یہ حدیث منقطع ہے لیکن اس حدیث کو حضرت موسیٰؓ کی یہ روایت صحیح ثابت کرتی ہے جو صحاح ستہ میں بطریق مرفوع منقول ہے کہ لاحول ولاقوۃ الاباللہ فانھا کنز من کنوز الجنۃ اسی طرح حدیث کی توثیق حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت مرفوع سے بھی ہوتی ہے جسے نسائیؒ اور بزارؒ نے نقل کیا ہے لاحول ولاقوۃ الا

باللہ اور اس میں لا منجا من اللہ الا الیہ کنز من کنوز الجنۃ بھی ہے لہٰذا حضرت مکحولؒ کی یہ حدیث اگرچہ اسناد کے اعتبار سے منقطع ہے مگر مفہوم و معنی کے اعتبار سے قابل اعتماد ہے۔

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ دَوَاءٌ مِنْ تِسْعَةٍ وَّتِسْعِیْنَ دَاءً اَیْسَرُهَا الْهَمُّ

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ننانوے (دنیاوی اور اخروی) بیماریوں کی دوا ہے جس میں سے ادنیٰ بیماری (دنیاوی و اخروی) غم ہے۔"

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰی كَلِمَةٍ مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ مِنْ كَنْزِ الْجَنَّةِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَسْلَمَ عَبْدِیْ وَاسْتَسْلَمَ۔ رَوَاهُمَا الْبَیْهَقِیُّ فِی الدَّعْوَاتِ الْكَبِیْرِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں ایک ایسا کلمہ نہ بتادوں جو عرش کے نیچے سے بہشت کے خزانے سے اترا ہے۔ اور وہ یہ ہے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ جب کوئی بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "میرا بندہ تابعدار اور بہت فرمانبردار ہوا" یہ دونوں حدیثیں بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہیں۔"

(۲۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ هِیَ صَلٰوةُ الْخَلَائِقِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَلِمَاتُ الشُّكْرِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ كَلِمَةُ الْاِخْلَاصِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ تَمْلَا مَا بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَسْلَمَ وَاسْتَسْلَمَ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا سُبْحَانَ اللّٰهِ مخلوقات کی عبادت ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ شکر کا کلمہ ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اخلاص کا کلمہ ہے (یعنی کلمہ توحید ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کے لئے آگ سے نجات کا سبب ہے) اور اللہ اکبر کا ثواب زمین و آسمان کے درمیان کو بھر دیتا ہے۔ اور جب کوئی بندہ حضور قلب کے ساتھ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بندہ فرمانبردار ہوا اور بہت فرمانبردار ہوا۔"

تشریح: "سبحان اللہ مخلوقات کی عبادت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ اور مخلوقات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی پاکی اس کی تعریف کے ساتھ بیان نہ کرتی ہو کے مطابق چونکہ تمام ہی مخلوقات اللہ رب العزت کی پاکی بیان کرتی ہے اس لئے یہ ان کی عبادت ہے۔

بَابُ الْاِسْتِغْفَارِ وَالتَّوْبَةِ

استغفار و توبہ کا بیان

"استغفار" کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے اپنی بخشش چاہنا اور چونکہ "استغفار" کے ضمن میں جس طرح "توبہ" بھی آجاتی ہے اسی طرح کبھی "توبہ" استغفار کے ضمن میں نہیں بھی آتی اس لئے باب کا عنوان قائم کرتے ہوئے بطور خاص والتوبۃ کا ذکر کیا گیا ہے یا پھر والتوبۃ کو الگ سے اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ استغفار تو زبان سے متعلق ہے کہ بندہ اپنی زبان کے ذریعہ خدا سے بخشش و مغفرت مانگتا ہے جب کہ "توبہ" کا تعلق دل سے ہے کیونکہ کسی گناہ پر ندامت و شرمندگی اور پھر خدا کی طرف رجوع اور آئندہ اس گناہ میں ملوث نہ ہونے کا عہد دل ہی سے ہوتا ہے۔

"توبہ" کے معنی ہیں رجوع کرنا گناہوں سے طاعت کی طرف، غفلت سے ذکر کی طرف اور غیبت" سے حضور کی طرف!" "اللہ تعالیٰ

کی طرف سے بندہ کی بخشش" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ کے گناہوں کو دنیا میں بھی ڈھانکے بایں طور کہ کسی کو اس کے گناہ کا علم نہ ہونے دے اور آخرت میں اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرے بایں طور کہ اس کو ان گناہوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہ کرے۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ سے پوچھا گیا کہ "توبہ" کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے فرمایا کہ گناہ کو فراموش کر دینا یعنی توبہ کرنے کے بعد گناہ کی لذت کا احساس بھی دل سے اس طرح ختم ہو جائے گویا وہ جانتا ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے!!۔

اور سہیل تستریؒ سے پوچھا گیا کہ "حضرت! توبہ کا کیا مفہوم ہے؟" تو انہوں نے فرمایا کہ تم گناہوں کو فراموش نہ کرو یعنی گناہ کو بھول مت جاؤ تاکہ عذاب الٰہی کے خوف سے آئندہ کسی گناہ کی جرأت نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے اس حکم تُوبُوا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع (توبہ) کرو۔

کے مطابق استغفار یعنی طلب بخشش و مغفرت اور توبہ کرنا ہر بندہ پر واجب ہے کیونکہ کوئی بندہ بحسب اپنے حال و مرتبہ کے گناہ کے یا بھول چوک سے خالی نہیں ہے لہٰذا ہر شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے تمام گزشتہ گناہوں سے توبہ کرے، طلب بخشش و مغفرت کرے آئندہ تمام گناہوں سے بچتا رہے اور صبح و شام توبہ و استغفار کو اپنا معمول بنالے تمام صغیرہ و کبیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا رہے خواہ وہ گناہ قصداً کئے ہوں یا خطاءً و سہواً سرزد ہوئے ہوں اور گناہوں کی نحوست کی وجہ سے طاعت کی توفیق سے محروم نہ رہے، نیز گناہوں پر اصرار کی ظلمت دل کو پوری طرح گھیر کر نعوذ باللہ کفر و دوزخ تک نہ پہنچا دے!۔

توبہ کے صحیح اور قبول ہونے کے لئے چار باتیں ضروری ہیں اور شرط کے درجہ میں ہیں: ایک تو یہ کہ محض خدا کے عذاب کے خوف سے اور اس کے حکم کی تعظیم کے پیش نظر ہی توبہ کی جائے، درمیان میں توبہ کی کوئی اور غرض نہ ہو مثلاً لوگوں کی تعریف و مدح کا حصول اور ضعف و فقر کی وجہ، توبہ کی غرض میں داخل نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ گزشتہ گناہوں پر واقعی شرمندگی و ندامت ہو۔ تیسرے یہ کہ آئندہ ہر ظاہری و باطنی گناہ سے اجتناب کرے۔ اور چوتھے یہ کہ پختہ عہد اور عزم بالجزم کرے کہ آئندہ ہرگز کوئی گناہ نہیں کروں گا۔

توبہ کی کیفیت و اثر اور آئندہ گناہ کرنے کے عزم کا صحیح ہونا یہ ہے کہ توبہ کرنے والا اپنے بلوغ کی ابتداء سے توبہ کرنے کے وقت تک پورے عرصہ کا جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ اس سے کیا کیا گناہ سرزد ہوئے ہیں تاکہ ان میں سے ہر ایک گناہ کا تدارک کرے چنانچہ اگر اس عرصہ میں وہ، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر فرائض ترک ہوئے ہوں تو ان کی قضاء کرے اور اپنے اوقات کو نفل یا فرض کفایہ عبادتوں میں مصروف رکھ کر ان فرائض کو قضا کرنے میں سستی نہ کرے۔

اسی طرح اس عرصہ میں اگر ممنوع حرام چیزوں کا ارتکاب کیا ہے مثلاً شراب پی ہے یا اور کوئی ممنوع و قبیح فعل کیا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کی درگاہ میں ان سے توبہ و استغفار کرے اور اس کے ساتھ ساتھ خدا کے نام پر غرباء و مساکین میں اپنا مال خرچ کرے اور صدقہ و خیرات کرتا رہے تاکہ اس کی توبہ باب قبولیت تک پہنچے اور حق تعالیٰ کی طرف سے اسے بخشش و مغفرت سے نوازا جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل پر یقین رکھے کہ انشاء اللہ توبہ قبول ہوگی اور مغفرت کی جائے گی، چنانچہ خود حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ هُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْ عَنِ السَّیِّاٰتِ وہ ایسا (رحیم و کریم ہے) کہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہے۔

یہ تو اس توبہ کی بات تھی جو ان گناہوں سے کی جائے جو محض اللہ تعالیٰ کے گناہ ہوں یعنی جن کا تعلق صرف "حق اللہ" سے ہو اور اگر اپنے اوپر وہ گناہ ہوں جن کا تعلق "حقوق العباد" یعنی بندوں کے حقوق کی تلفی یا ان کے نقصان سے ہو تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ سے بھی اپنی بخشش و مغفرت چاہے کیونکہ اس کی نافرمانی کی اور ان بندوں سے بھی ان کا تدارک کرے جن کی حق تلفی ہوئی ہے۔

چنانچہ اگر حق تلفی کا تعلق مال سے ہو تو یا صاحب حق کو وہ مال ادا کرے یا اس سے معاف کرائے اور اگر اس کا تعلق مال سے نہ ہو جیسے غیبت یا اور کوئی ذہنی و جسمانی تکلیف جو اسے پہنچی ہو تو اس سے معافی چاہے، اگر حق تلفی کا تعلق کسی ایسی کوتاہی یا قصور سے ہو کہ اگر

معاف کراتے وقت اس کا تذکرہ کسی فتنہ و فساد کا سبب بنتا ہو تو ایسی صورت میں اس قصور کا ذکر کئے بغیر اس شخص سے مطلقاً قصور کو معاف کرائے مثلاً اس سے یوں کہے کہ "مجھ سے جو بھی قصور ہو گیا ہو اسے معاف کر دیجئے" اور اگر اس طرح معاف کرانے میں بھی فتنہ و فساد کا خوف ہو تو پھر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرے۔ اس کی بارگاہ میں تضرع و زاری کرے، اچھے کام کرے اور صدقہ و خیرات کرتا رہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو اور اس شخص کو جس کا قصور ہوا ہے آخرت میں اپنے فضل و کرم کے تحت اپنے پاس سے اجر دے کر اسے راضی کرائے، اگر صاحب حق مر چکا ہو تو اس کے وارث اسکے قائم مقام ہیں اس لئے مردہ کا حق ان سے معاف کرائے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے نیز مردہ کی طرف سے بھی صدقہ خیرات کرے۔

ایک مؤمن مسلمان کی شان یہ ہونی چاہئے کہ اگر اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس سے توبہ کرنے میں بالکل سستی اور تاخیر نہ کرے نیز نفس کے مکر اور شیطان کے وسوسہ میں مبتلا ہو کر یہ نہ سوچے کہ میں توبہ پر قائم تو رہ سکوں گا نہیں اس لئے توبہ کیسے کروں، کیونکہ جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اس لئے اگر بتقاضائے بشریت توبہ کرنے کے بعد پھر گناہ سرزد ہو جائے تو پھر توبہ کرے چاہے دن میں کئی مرتبہ ایسا ہو بشرطیکہ توبہ کے وقت اس کے دل میں یہ خیال نہ ہو کہ میں پھر گناہ بھی کروں گا اور توبہ بھی کرلوں گا بلکہ توبہ کرتے وقت یہی احساس رہے کہ شاید پھر گناہ کرنے سے پہلے مر جاؤں اور یہ توبہ میری آخری توبہ ثابت ہو۔

جب کوئی شخص توبہ کرنا چاہے تو پہلے نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے اور دو رکعت نماز حضور قلب کے ساتھ پڑھے اور سجدہ میں گر کر بہت ہی زیادہ تضرع و زاری کے ساتھ اپنے نفس کو ملامت کرے اور اپنے گزشتہ گناہوں کو یاد کر کے عذاب الٰہی کے خوف سے اپنے قلب کو لرزاں و ترساں کرے اور شرمندگی و ندامت کے پورے احساس کے ساتھ توبہ و استغفار کرے اور پھر ہاتھ اٹھا کر بارگاہ الٰہی میں یوں عرض رسا ہو۔

"میرے پروردگار! تیرے در سے بھاگا ہوا یہ گنہ گار غلام اپنے گناہوں کی پوٹ لئے پھر تیرے در پر حاضر ہوا ہے انتہائی ندامت و شرمندگی کے ساتھ اپنی لغزشوں اور اپنے گناہوں کی معذرت لے کر آیا ہے تیری ذات رحیم و کریم ہے تو ستار و غفار ہے اپنے کرم کے صدقے میرے گناہ بخش دے! اپنے فضل سے میری معذرت قبول فرما کر رحمت کی نظر سے میری طرف دیکھ نہ صرف یہ کہ میرے پچھلے گناہ بخش دے بلکہ آئندہ ہر گناہ و لغزش سے مجھے محفوظ رکھ کہ خیر و بھلائی تیرے ہی دست قدرت میں ہے اور اپنے گناہ گار بندوں کو تو ہی بخشنے والا ہے" اس کے بعد درود پڑھے اور تمام ہی مسلمانوں کے لئے بخشش و مغفرت چاہے۔

یہ تو عوام کی توبہ ہے کہ جن کی زندگی اور گناہ کے درمیان کوئی بڑی حد فاصل نہیں ہوتی اور وہ گناہ و معصیت میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی یہ توبہ انہیں اس بشارت کا مستحق قرار دیتی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ لیکن خواص کہ جو خدا کے اطاعت گزار بندے ہوتے ہیں جن کی زندگی معصیت و گناہ سے دور رہتی ہے اور اتباع شریعت کی حامل ہوتی ہے، ان کی توبہ یہ ہے کہ وہ ان برے اخلاق سے کہ جن سے قلب کو پاک رکھنا واجب ہے توبہ کریں، اسی طرح "عاشقین خدا" کی توبہ یہ ہے کہ اگر بتقاضائے بشریت کسی وقت ان سے ذکر اللہ اور یاد الٰہی میں غفلت ہو جائے اور ماسوی اللہ میں مشغول ہو جائیں تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اپنی اس کوتاہی سے توبہ کریں۔

یہ بات جان لینی چاہئے کہ گناہ کبیرہ کا صدور ایمان سے خارج نہیں کرتا لیکن فاسق و عاصی کر دیتا ہے گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کے متعلق (باب الکبائر و علامات النفاق) مظاہر حق جدید جلد اول میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اس موقع پر گناہ کی ان دونوں اقسام کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک صغیرہ گناہوں کا تعلق ہے تو وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ایک عام زندگی کے لئے ان سے اجتناب بھی دشوار ہے چنانچہ مسلک مختار

کے مطابق صغیرہ گناہ سے "تقویٰ" میں خلل نہیں پڑتا بشرطیکہ گناہ صغیرہ پر اصرار و دوام نہ ہو کیونکہ صغیرہ گناہ پر اصرار و دوام گناہ کبیرہ کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا ہر مؤمن و مسلمان پر واجب ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں اور حتی المقدور صغیرہ گناہوں سے اجتناب بھی کرے اور جانے کہ اگرچہ گناہ ایمان سے خارج نہیں کر دیتے لیکن اس بات کا خوف ہے کہ گناہ کی زندگی رفتہ رفتہ انجام کار کفر اور دوزخ کی حد تک پہنچا دے۔

گناہوں سے بچنے کا علاج

گناہوں سے بچنے کا ایک آسان علاج یہ ہے کہ ہر چیز میں "حد ضرورت" پر قناعت کی جائے یعنی جو ضروری اور حد ضرورت یہ ہے کہ اتنی غذا جو بھوک ختم کرنے کے لئے ضروری ہو اتنا کپڑا جس سے ستر پوشی ہو سکے، اتنا مکان جو گرمی سردی سے بچا سکے اور اتنے برتن باسن جو ضروری ہوں اور ایک بیوی۔

لہٰذا یہ جان لینا چاہئے کہ حد ضرورت سے تجاوز کرنے اور مباح میں وسعت اختیار کرنے کی وجہ سے انسان ان چیزوں میں مبتلا ہوتا ہے جو مشتبہ اور مکروہ ہوتی ہیں۔ اور جب وہ مکروہات میں مبتلا رہتا ہے تو پھر رفتہ رفتہ حرام چیزوں کا ارتکاب بھی ہونے لگتا ہے اور یہ وہ نکتہ ہوتا ہے جہاں اسلام کی حد تو ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد سے کفر و آگ کا میدان شروع ہو جاتا ہے نعوذ باللہ منہ۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی توبہ و استغفار

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اللہ کی میں دن میں ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ اتنی کثرت سے استغفار و توبہ اس لئے نہیں کرتے تھے کہ معاذ اللہ آپ ﷺ گناہ میں مبتلا ہوتے تھے کیونکہ آپ ﷺ معصوم تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ مقام عبدیت کے سب سے اونچے مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے اپنے طور پر یہ سمجھتے تھے کہ شاید مجھ سے خدا کی بندگی و عبادت میں کوئی قصور ہو گیا ہو اور میں وہ بندگی نہ کر سکا ہوں جو رب ذوالجلال والاکرام کی شان کے لائق ہے، نیز اس سے مقصود اُمت کو استغفار و توبہ کی ترغیب دلانا تھا کہ آنحضرت ﷺ باوجودیکہ معصوم اور خیر المخلوقات تھے، جب آپ ﷺ نے دن میں ستر بار توبہ و استغفار کی تو گنہ گاروں کو بطریق اولیٰ استغفار و توبہ بہت کثرت سے کرنی چاہئے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ روئے زمین پر عذاب الٰہی سے امن کی دو ہی پناہ گاہیں تھیں ایک تو اٹھ گئی دوسری باقی ہے لہٰذا اس دوسری پناہ گاہ کو اختیار کرو، جو پناہ گاہ اٹھ گئی وہ تو نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی تھی اور جو باقی ہے وہ استغفار ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ وَمَا کَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ۔

"اور اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک عذاب میں مبتلا کرنے والا نہیں ہے جب تک کہ آپ ﷺ ان میں موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اس حالت میں عذاب میں مبتلا کرنے والا نہیں ہے جب تک وہ استغفار کرتے ہوں۔"

② وَعَنِ الْاَغَرِّ الْمُزَنِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِی الْیَوْمِ

مِائَةَ مَرَّةٍ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اغر مزنیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "یہ بات ہے کہ میرے دل پر پردہ ڈالا جاتا ہے اور میں دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں"۔ (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے معنی و مفہوم اور اس کی وضاحت کرنے کے سلسلہ میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں جن میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ چونکہ اس بات کو محبوب رکھتے تھے کہ آپ ﷺ کا قلب مبارک جناب باری تعالیٰ میں ہر وقت حاضر رہے کسی لمحہ بھی ادھر سے غافل نہ رہے لیکن جب آپ ﷺ مباح چیزوں مثلاً کھانے پینے اور اپنی ازواج کے ساتھ اختلاط یا اسی قسم کے ان امور میں مشغول ہوتے تھے جن کی وجہ سے فی الجملہ جناب باری تعالیٰ سے غفلت ہوتی تھی تو اس مشغولیت کو اپنے طور پر ایک پردہ اور گناہ سمجھ کر آپ ﷺ کا قلب مبارک لرزاں اور بے چین ہو جاتا تھا چنانچہ آپ ﷺ اس کی وجہ سے استغفار کرتے تھے اس حدیث کے سلسلہ میں سب سے اچھی بات وہی ہے جو بعض عارفین نے کہی ہے کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے اس کے اصل معنی کا علم اللہ اور اس کے رسول ہی کو ہے اُمت کا کام تو صرف یہ ہے کہ اس حدیث پر ایمان رکھے اور اس کے معنی سمجھنے کے درپے نہ ہو۔

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ فَاِنِّي اَتُوْبُ اِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اغر مزنیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "لوگو! اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، میں دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتا ہوں (لہٰذا تمہیں تو بطریق اولیٰ چاہئے کہ ہر ساعت میں ہزار بار توبہ کرو)۔" (مسلمؒ)

رجوع الی اللہ کا حکم

(۴) وَعَنْ اَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا يَرْوِي عَنِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَنَّهُ قَالَ يَا عِبَادِيْ اِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ فَاسْتَهْدُوْنِيْ اَهْدِكُمْ يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ جَائِعٌ اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُهُ فَاسْتَطْعِمُوْنِيْ اُطْعِمْكُمْ يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ كَسَوْتُهُ فَاسْتَكْسُوْنِيْ اَكْسُكُمْ يَا عِبَادِيْ اِنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَاَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا فَاسْتَغْفِرُوْنِيْ اَغْفِرْ لَكُمْ يَا عِبَادِيْ اِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّيْ فَتَضُرُّوْنِيْ وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِيْ فَتَنْفَعُوْنِيْ يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَتْقٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَازَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَاحِدٍ فَسَاَلُوْنِيْ فَاَعْطَيْتُ كُلَّ اِنْسَانٍ مَسْاَلَتَهُ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ اِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ يَا عِبَادِيْ اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا عَلَيْكُمْ ثُمَّ اُوَفِّيْكُمْ اِيَّاهَا فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ان حدیثوں کے سلسلہ میں کہ جو آپ ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے تھے فرمایا کہ (ایک حدیث قدسی یہ بھی ہے کہ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے (یعنی میں ظلم سے پاک ہوں) اور چونکہ ظلم میرے حق میں بھی ایسا ہے جیسے کہ تمہارے حق میں اس لئے میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار دیا ہے پس تم آپس میں (ایک دوسرے پر) ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں ہدایت بخشوں پس تم سب مجھ سے ہدایت چاہو، میں تمہیں ہدایت دوں گا، اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو (یعنی کھانے کے محتاج) ہو علاوہ اس شخص کے جس

کو میں کھلا دوں اور اسے رزق کی وسعت و فراخی بخشوں اور مستغنی بناؤں) پس تم سب مجھ سے کھانا مانگو میں تمہیں کھلاؤں گا اے میرے بندو! تم سب ننگے (یعنی ستر پوش کے لئے کپڑے کے محتاج ہو) علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے پہننے کے لئے دیا پس تم سب مجھ سے لباس مانگو میں تمہیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم اکثر دن رات خطائیں کرتے ہو اور میں تمہاری خطائیں بخشتا ہوں پس تم سب مجھ سے بخشش مانگو میں تمہیں بخشوں گا۔ اے میرے بندو! تم ہرگز میرے ضرر کو نہیں پہنچ سکو گے تاکہ مجھے نقصان پہنچا سکو اور ہرگز میرے نفع کو نہیں پہنچ سکو گے تاکہ مجھے فائدہ پہنچا سکو (یعنی گناہ کرنے سے بارگاہ صمدیت میں کوئی نقصان نہیں اور اطاعت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ دونوں کا نقصان و فائدہ صرف تمہیں ہی پہنچتا ہے چنانچہ آگے اس کی تفصیل فرمائی کہ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب مل کر بھی تم مین سے کسی ایک نہایت پرہیزگار دل کی مانند ہو جائیں تو اس سے میری مملکت میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی (یعنی اگر تم سب کے سب اتنے ہی پرہیزگار اور اتنے ہی نیک بن جاؤ جتنا کہ کوئی شخص پرہیزگار و نیک بن سکتا ہے مثلاً تم سب محمد ﷺ ہی کی طرح پرہیزگار بن جاؤ کہ روئے زمین پر کوئی بھی ایسا شخص باقی نہ رہے جس کی زندگی پر فسق و فجور اور گناہ و معصیت کا ہلکا سا اثر بھی ہو تو اس سے میری سلطنت و میری مملکت میں ادنی سی بھی زیادتی نہیں ہوگی) اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے، تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرضکہ سب کے سب) مل کر تم میں سے کسی ایک نہایت بدکار دل کی مانند ہو جائیں (یعنی تم سب مل کر شیطان کی مانند ہو جاؤ) تو اس سے میری مملکت کی کسی ادنی سی چیز کو بھی نہیں نقصان پہنچے گا، اے میرے بندو! اگر تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب مل کر کسی جگہ کھڑے ہوں اور مجھ سے پھر مانگیں اور میں ہر ایک کو اس کے مانگنے کے مطابق (ایک ہی وقت میں اور ایک ہی جگہ) دوں تو میرا یہ دینا اس چیز سے جو میرے پاس ہے اتنا ہی کم کرتی ہے جتنا کہ ایک سوئی سمندر میں گر کر (اس کے پانی کو کم کرتی ہے) اے میرے بندو! جان لو میں تمہارے اعمال یاد رکھتا ہوں اور انہیں تمہارے لئے لکھتا ہوں، میں تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا، پس جو شخص بھلائی پائے (یعنی اسے اللہ تعالیٰ کی نیک توفیق حاصل ہو اور عمل خیر کرے) تو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جو شخص بھلائی کے علاوہ پائے (یعنی اس سے کوئی گناہ سرزد ہو) تو وہ اپنے نفس کو ملامت کرے (کیونکہ اس سے گناہ کا سرزد ہونا نفس ہی کے تقاضہ سے ہوا۔" (مسلم)

تشریح: كُلُّكُمْ ضَالٌّ (تم سب گمراہ ہو) اس اعتبار سے فرمایا کہ دنیا کا کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس سے دنیا اور دین کا ہر کمال، ہر سعادت اور تمام ہی بھلائیاں ہوں، ہر شخص کے اندر کچھ نہ کچھ کمی اور کوتاہی ضرور ہوتی ہے اور اگر کوئی دینی اور اخروی اعتبار سے اپنے اندر کوئی کمی اور کوتاہی و گمراہی رکھتا ہے تو کسی کے اندر دنیاوی امور کے اعتبار سے کوئی نہ کوئی کمی اور کجی ہوتی ہے اس لئے فرمایا کہ تم سب گمراہ ہو۔ یعنی دنیوی اور دینی دونوں اعتبار سے درجۂ کمال سے ہٹے ہوئے ہوں۔

اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهٗ (علاوہ اس شخص کے جس کو میں ہدایت بخشوں) اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی مراد یہ ہے کہ اگر لوگوں کو ان کی اس حالت و کیفیت پر چھوڑ دیا جو ان کی طبیعت اور ان کے نفس کی بنیاد ہوتی ہے تو وہ خود رو درخت کی طرح جس طرح چاہیں بڑھیں اور جس سمت چاہیں چلیں، جس کا نتیجہ گمراہی اور بے راہ روی ہے اس لئے میں جس کو چاہتا ہوں اسے فکر و ذہن کی سلامت اور اعمال نیک کی ہدایت بخشتا ہوں جس کا نتیجہ گمراہی اور بے راہ روی ہے اس لئے میں جس کو چاہتا ہوں اسے فکر و ذہن کی سلامت اور اعمال نیک کی ہدایت بخشتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا نفس صحیح راستہ پر چلتا ہے اور اس کی طبیعت نیکی ہی کی سمت بڑھتی ہے اس بات کو نبی کریم ﷺ نے اس طور پر بیان فرمایا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فِيْ ظُلْمَةٍ ثُمَّ رَشَّ عَلَيْهِمْ مِنْ نُوْرِهٖ

"اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا اور پھر ان پر اپنے نور کا چھینٹا دیا۔"

اس موقع پر یہ خلجان پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ یہ بات اس حدیث:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ

"ہر بچہ فطرت (اسلام کی فطرت) پر پیدا کیا جاتا ہے۔"

کے منافی ہے کیونکہ "فطرت" سے مراد "توحید" ہے اور "ضلالت یا عظمت" سے مراد احکام ایمان کی تفصیل اور اسلام کے حدود و شرائط کا نہ جاننا ہے۔

وَاَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (میں تمہاری ساری خطائیں بخشتا ہوں) کا مطلب یہ ہے کہ تم دن رات لغزشوں اور گناہوں میں مبتلا رہتے ہو لیکن اگر اپنے ان گناہوں پر ندامت کے ساتھ توبہ و استغفار کرتے ہو تو میں تمہارے سب گناہ بخش دیتا ہوں یا پھر یہ مراد ہے کہ ایک تو صرف ایسا گناہ ہے جس سے توبہ کئے بغیر بخشش ممکن نہیں ہاں اس کے علاوہ اور سب گناہ اگر میں چاہتا ہوں تو بغیر توبہ و استغفار کے بھی اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت خاص کے پیش نظر بخش دیتا ہوں۔

"جتنا کہ سوئی کم کر دیتی ہے" کے بارہ میں علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ سوئی کا سمندر میں گر کر اس کے پانی کو کم کر دینا نہ محسوس چیز ہے اور نہ عقل و شعور کی رسائی میں آنے والی بات بلکہ وہ کالعدم ہے اس لئے اس کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے ورنہ تو اللہ کے خزانے میں کسی ادنی سے ادنی درجہ کی کمی کا بھی کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس بارہ میں یا پھر کہا جائے کہ یہ جملہ بالفرض والتقدیر کی قسم سے ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کمی فرض بھی کی جائے تو وہ اس قدر ہو سکتی ہے۔

توبہ اور رحمت الٰہی کی وسعت

⑤ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ فِيْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِنْسَانًا ثُمَّ خَرَجَ يَسْاَلُ فَاَتٰى رَاهِبًا فَسَاَلَهٗ فَقَالَ اَلَهٗ تَوْبَةٌ قَالَ لَا فَقَتَلَهٗ وَجَعَلَ يَسْاَلُ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ ائْتِ قَرْيَةَ كَذَا وَكَذَا فَاَدْرَكَهُ الْمَوْتُ فَنَاءَ بِصَدْرِهٖ نَحْوَهَا فَاخْتَصَمَتْ فِيْهِ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ وَمَلَائِكَةُ الْعَذَابِ فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلٰى هٰذِهٖ اَنْ تَقَرَّبِيْ وَاِلٰى هٰذِهٖ اَنْ تَبَاعَدِيْ فَقَالَ قِيْسُوْا مَا بَيْنَهُمَا فَوُجِدَ اِلٰى هٰذِهٖ اَقْرَبَ بِشِبْرٍ فَغُفِرَ لَهٗ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بنی اسرائیل (حضرت موسیٰؑ کی قوم میں) ایک شخص تھا جس نے ننانوے آدمیوں کو قتل کیا اور پھر (لوگوں سے یہ) پوچھنے نکلا (کہ اگر میں توبہ کرلوں تو وہ توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟) چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ ایک عابد و زاہد کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ کیا اس (اتنے بڑے گناہ سے یا اس اتنے بڑے گناہ کرنے والے ہی) کے لئے توبہ ہے؟ یعنی کیا اس کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟ اس عابد و زاہد نے کہا کہ نہیں! اس شخص نے (یہ سنتے ہی) اس عابد و زاہد کو بھی قتل کر دیا اور پھر (دوسرے لوگوں سے) پوچھتا پھرنے لگا، ایک شخص نے اس سے کہا کہ تم فلاں بستی میں جاؤ وہ ایسی اور ایسی ہے (یعنی اس نے اس بستی کا نام لیا اور اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت اچھی بستی ہے وہاں ایک عالم رہتا ہے جو تمہیں تمہاری توبہ کے قبول ہونے کا فتویٰ دے گا چنانچہ وہ شخص اس بستی کی طرف چل کھڑا ہوا ابھی آدھے ہی راستے پر پہنچ پایا تھا کہ اچانک اسے موت نے آدبوچا (چنانچہ اسے موت کی علامت محسوس ہوئیں) تو اس نے اپنا سینہ اس بستی کی طرف جھکا دیا اور پھر اس کی روح قبض کرنے کے وقت رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے (ملک الموت سے) جھگڑنے لگے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو (جس کی طرف وہ توبہ کرنے جا رہا تھا حکم دیا کہ وہ میت کے قریب آجائے اور اس بستی کو جہاں سے وہ قتل کر کے آرہا تھا حکم دیا کہ وہ میت سے دور ہو جائے پھر اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں سے فرمایا تم دونوں بستیوں کے درمیان پیمائش کرو اگر میت اس بستی کے قریب ہوگی جہاں وہ توبہ کے لئے جا رہا تھا تو اسے رحمت کے فرشتوں کے حوالہ کیا

جائے گا اور اگر اس بستی کے قریب ہو جہاں سے وہ قتل کر کے آرہا تھا تو عذاب کے فرشتوں کے حوالہ کیا جائے گا۔ چنانچہ جب فرشتوں نے پیمائش کی تو وہ توبہ کے لئے جس بستی کی طرف جارہا تھا اس سے یک بالشت قریب پایا گیا پس حق تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ جب ملک الموت نے اس شخص کی روح قبض کی تو رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے دونوں ملک الموت سے اس کی روح لینے کے لئے جھپٹنے لگے، رحمت کے فرشتے تو یہ کہتے تھے کہ چونکہ یہ شخص توبہ کے لئے اس بستی کی طرف متوجہ ہونے کی بنا پر تائب تھا اس لئے ہم اسے رحمتِ خداوندی کی طرف لے جائیں گے اور عذاب کے فرشتے یہ کہتے تھے کہ اس شخص نے چونکہ ایک سو آدمیوں کو ناحق قتل کیا ہے اور ابھی تک اس نے توبہ نہیں کی تھی اس لئے ہم اسے عذاب الٰہی کی طرف لے جائیں گے! چنانچہ حق تعالیٰ نے اس کا فیصلہ جس طرح فرمایا وہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ طالب توبہ کے لئے حق تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کسی قید اور حد کی پابند نہیں ہے اس کی بے پایاں رحمت خلوص قلب کے ساتھ اپنی طرف متوجہ ہونے والے بڑے سے بڑے سرکش اور گنہ گار کو بھی اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندہ قلب و نیت کے اخلاص کے ساتھ بارگاہ الوہیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دشمنوں کو بھی اس سے راضی کر دیتا ہے۔

یہ حدیث اس بات کی ترغیب دلا رہی ہے کہ توبہ و استغفار کے ذریعے اپنے دامن کو گناہوں کی آلائش سے پاک و صاف رکھا جائے اور حق تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی اور نا امیدی کو اپنے پاس بھٹکنے بھی نہ دیا جائے۔

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَوْلَمْ تُذْنِبُوْا لَذَهَبَ اللّٰهُ بِكُمْ وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ يُذْنِبُوْنَ فَيَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ فَيَغْفِرُ لَهُمْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے اگر تم لوگ گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اٹھالے اور (تمہاری جگہ) ایسے لوگ پیدا کر دے جو گناہ کریں اور خدا سے بخشش و مغفرت چاہیں اور پھر اللہ تعالیٰ انہیں بخشے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مقصد مغفرت اور رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کو بیان کرنا اور یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اسم پاک "غفور" کی شان کو ظاہر کرنے کے لئے اتنا بخشش کرنے والا ہے اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔

خدانخواستہ اس حدیث کے ذریعہ گناہ کی ترغیب مقصود ہی نہیں ہے کیونکہ گناہ سے بچنے کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور اپنے پیغمبر رسول مقبول ﷺ کو اس دنیا میں اسی لئے بھیجا ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کو گناہ و معصیت کی زندگی سے نکال کر طاعت و عبادت کی راہ پر لگائیں۔

(۷) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ يَدَهٗ بِاللَّيْلِ لِيَتُوْبَ مُسِیْءُ النَّهَارِ وَيَبْسُطُ يَدَهٗ بِالنَّهَارِ لِيَتُوْبَ مُسِیْءُ اللَّيْلِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ رات میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے۔ تاکہ دن میں گناہ کرنے والا توبہ کرے اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات میں گناہ کرنے والا توبہ کرے یہاں تک کہ سورج مغرب کی سمت سے نکلے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ہاتھ پھیلانا" دراصل کنایہ ہے طلب کرنے سے چنانچہ جب کوئی شخص کسی سے کچھ مانگتا ہے تو اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے "لہٰذا اللہ تعالیٰ رات میں ہاتھ پھیلاتا ہے" الخ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ گنہ گاروں کو توبہ کی طرف بلاتا ہے! بعض حضرات کہتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ کا ہاتھ پھیلانا اس کی رحمت و مغفرت سے کنایہ ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ "یہاں تک کہ سورج مغرب کی سمت سے نکلے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں سے طلب توبہ کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ قرب قیامت میں سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے کیونکہ جب آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا تو توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر کسی کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتا ہے

(۸) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اعْتَرَفَ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (متفق علیہ)

"اور اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب بندہ (اپنے گناہ کا ندامت و شرمندگی کے ساتھ) اعتراف کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَابَ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص مغرب کی سمت سے آفتاب طلوع ہونے سے پہلے پہلے توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ توبہ قبول ہونے کی حد ہے کہ مغرب کی سمت سے آفتاب نکلنے سے پہلے تک توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا لہٰذا اس وقت تک جو بھی توبہ کرے گا اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی لیکن اس کے بعد کی جانے والی توبہ قبول نہیں ہوگی، اسی طرح توبہ قبول ہونے کی ایک حد "شخصی" ہوتی ہے جس کا تعلق ہر فرد سے ہوتا ہے اور وہ حالت غرغرہ (نزع) سے پہلے پہلے کا وقت ہے یعنی جو شخص حالت غرغر سے توبہ کر لے گا اس کی توبہ قبول ہوگی۔ حالت غرغرہ میں کی جانے والی توبہ قبول نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ توبہ سے بہت خوش ہوتا ہے

(۱۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَلّٰهُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ حِيْنَ يَتُوْبُ اِلَيْهِ مِنْ اَحَدِكُمْ كَانَتْ رَاحِلَتُهٗ بِاَرْضٍ فَلَاةٍ فَانْفَلَتَتْ مِنْهُ وَ عَلَيْهَا طَعَامُهٗ وَشَرَابُهٗ فَاَيِسَ مِنْهَا فَاَتٰى شَجَرَةً فَاضْطَجَعَ فِيْ ظِلِّهَا قَدْ اَيِسَ مِنْ رَاحِلَتِهٖ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ اِذْهُوَ بِهَا قَائِمَةٌ عِنْدَهٗ فَاَخَذَ بِخِطَامِهَا ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَبْدِيْ وَاَنَا رَبُّكَ اَخْطَاَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص سے جو اس کے سامنے توبہ کرتا ہے اتنا زیادہ خوش ہوتا ہے کہ جتنا تم میں وہ شخص بھی خوش نہیں ہوتا جس کی سواری بیچ جنگل بیابان میں ہو اور پھر وہ جاتی رہی ہو (یعنی گم ہو گئی ہو) اور اس سواری پر اس کا کھانا بھی ہو اور پانی بھی ہو اور وہ (اس کو تلاش کرنے کے بعد) نا امید ہو جائے اور ایک درخت کے پاس آکر اپنی سواری سے نا امیدی کی حالت میں (انتہائی مغموم و پریشان) لیٹ جائے اور پھر اسی حالت میں اچانک وہ اپنی سواری کو اپنے پاس کھڑے ہوئے دیکھ لے۔ چنانچہ وہ اس سواری کی مہار پکڑ کر انتہائی خوشی میں (جذبات سے مغلوب ہو کر) یہ کہہ بیٹھے "اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں" مارے خوشی کے زیادتی کے اس کی زبان سے یہ غلط الفاظ نکل جائیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: یعنی اس شخص کو اصل میں کہنا تو یہ تھا کہ "اے اللہ! تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں" مگر انتہائی خوشی کی وجہ سے شدت جذبات سے مغلوب اور مدہوش ہو کر یہ کہنے کی بجائے یہ کہہ بیٹھا ہے کہ "اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں"۔

اس ارشاد کا مقصد اس بات کو بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے اور اس کی توبہ کو قبول فرما کر اپنی رحمت سے نواز دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس خوشی کو اس شخص کی خوشی کے ساتھ مشابہت دی جس کی سواری جنگل بیابان میں گم ہو جائے اور پھر اچانک اسے مل جائے۔

اللہ تعالیٰ بار بار توبہ قبول کرتا ہے

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عَبْدًا اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْهُ فَقَالَ رَبُّهٗ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَکَثَ مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَکَثَ مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا اٰخَرَ فَاغْفِرْهُ لِیْ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ فَلْیَفْعَلْ مَاشَاءَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اسی اُمت میں سے یا گزشتہ امتوں میں سے ایک بندے نے گناہ کیا اور پھر کہنے لگا "اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے" اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں سے) فرمایا "کیا میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو (جس کو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے) اس کے گناہ بخشتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے) اس کے گناہ پر مواخذہ کرتا ہے (تو جان لو) میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا۔ وہ بندہ اس مدت تک کہ اللہ نے چاہا (گناہ کرنے سے) باز رہا، اس کے بعد اس نے پھر گناہ کیا اور عرض کیا کہ "اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے" اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا "کیا یہ میرا بندہ یہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ کو بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے؟ میں نے اس بندہ کو بخش دیا۔" وہ بندہ اس مدت تک کہ اللہ نے چاہا گناہ سے باز رہا اور اس کے بعد پھر اس نے گناہ کیا اور عرض کیا کہ "اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے۔ اللہ تعالیٰ نے "فرشتوں سے فرمایا" کیا میرا بندہ یہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے؟ میں نے اس بندہ کو بخش دیا پس جب (تک وہ استغفار کرتا رہے) جو چاہے کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ "پس جو چاہے کرے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندہ جب تک گناہ کرتا رہے گا اور استغفار کرتا رہے گا اس کے گناہ بخشتا رہوں گا لہٰذا جملہ سے خدانخواستہ گناہ کی طرف رغبت دلانا مقصود نہیں ہے بلکہ استغفار کی فضیلت اور گناہوں کی بخشش میں استغفار کی تاثیر کو بیان کرنا مقصود ہے۔

کسی گناہ گار کو دوزخی نہ کہو

(۱۲) وَعَنْ جُنْدُبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ وَاللّٰهِ لَا یَغْفِرُ اللّٰهُ لِفُلَانٍ وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ ذَالَّذِیْ یَتَاَلّٰی عَلَیَّ اَنِّیْ لَا اَغْفِرُ لِفُلَانٍ فَاِنِّیْ قَدْ غَفَرْتُ لِفُلَانٍ وَاَحْبَطْتُ عَمَلَكَ اَوْ كَمَا قَالَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جندبؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے یہ بیان فرمایا "اس اُمت میں سے یا گزشتہ امتوں میں سے) ایک شخص نے کہا کہ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا" پھر آپ ﷺ نے بیان فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو میری قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا اور یہ جان لے کہ) میں نے اس شخص کو بخش دیا اور تیرے عمل کو ضائع کیا (یعنی تیری قسم کو جھوٹا کیا)۔" (مسلمؒ)

تشریح: کوئی شخص بہت زیادہ گناہ کرتا تھا اس کے بارہ میں ایک دوسرے شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اسے نہیں بخشے گا، اس نے یہ بات ازراہ تکبر اس کو بہت گناہ گار اور اپنے کو اس سے اچھا جان کر کہی۔ جیسا کہ بعض جاہل صوفیاء گناہ گاروں کے بارے میں اچھا گمان نہیں رکھتے حالانکہ ایسے لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع اور عام ہے اس کے گناہ گار بندوں کو بھی اس کے دامن میں پناہ ملتی ہے اور وہی ان کو بخشتا ہے۔

حاصل یہ کہ اس قسم کے کھانے والے نے اس کے نہ بخشے جانے کا جو یقین کیا تھا اس پر عتاب ہوا بایں طور کہ اس کی قسم کو جھوٹی کیا گیا اور اس شخص کو بخش دیا گیا۔ لہٰذا کسی بھی شخص کے بارہ میں قطعی طور پر یہ کہنا کہ وہ جنتی ہے! یا دوزخی ہے جائز نہیں ہے ہاں قرآن و حدیث نے وضاحت کے ساتھ جن لوگوں کو جنتی و دوزخی کہا ہے ان کو قطعی طور پر جنتی یا دوزخ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دعاء استغفار

(۱۳) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَیِّدُ الْاِسْتِغْفَارِ اَنْ تَقُوْلَ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَآ اِلٰہَ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰی عَھْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ قَالَ وَمَنْ قَالَھَا مِنَ النَّھَارِ مُوْقِنًا بِھَا فَمَاتَ مِنْ یَوْمِهٖ قَبْلَ اَنْ یُّمْسِیَ فَھُوَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّةِ وَمَنْ قَالَھَا مِنَ اللَّیْلِ وَھُوَ مُوْقِنٌ بِھَا فَمَاتَ قَبْلَ اَنْ یُّصْبِحَ فَھُوَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّةِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت شداد ابن اوسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "افضل استغفار یہ ہے کہ تم یوں دعا مانگو: اے اللہ! تو ہی میرا پروردگار ہے، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں! میں تیرے عہد پر ہوں (یعنی عہد میثاق پر قائم ہوں) اور تیرے وعدے پر ہوں (یعنی تو نے حشر وغیرہ کے بارے میں جو وعدہ کیا ہے اس پر یقین کامل رکھتا ہوں) میں اپنی طاقت کے بقدر اس برائی (یعنی گناہ سے) تیری پناہ چاہتا ہوں جس میں میں مبتلا ہوا۔ میں تیری نعمتوں کو جو تو نے مجھے عنایت فرمائیں اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں پس تو مجھے بخش دے۔ کیونکہ گناہوں کو تیرے علاوہ کوئی نہیں بخشتا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص ان کلمات کو دن میں ان کے معنی پر یقین رکھ کر پڑھے اور پھر اسی دن شام سے پہلے مرجائے تو وہ جنتیوں میں سے ہے اور جو شخص ان کلمات کو رات میں ان کے معنی پر یقین رکھ کر پڑھے اور اسی رات صبح ہونے سے پہلے مرجائے تو وہ جنتیوں میں سے ہے" (بخاریؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اللہ تعالیٰ کی بخشش کی کوئی انتہا نہیں

(۱۴) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِیْ وَرَجَوْتَنِیْ غَفَرْتُ لَكَ عَلٰی مَا كَانَ فِیْكَ وَلَآ اُبَالِیْ یَا ابْنَ اٰدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السَّمَآءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِیْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَآ اُبَالِیْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّكَ لَوْ لَقِیْتَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطَایَا ثُمَّ لَقِیْتَنِیْ لَا تُشْرِكُ بِیْ شَیْئًا لَاَ تَیْتُكَ بِقُرَابِھَا مَغْفِرَةً۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالدَّارِمِیُّ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! جب تک تو مجھ سے گناہوں کی معافی مانگتا رہے گا اور مجھ سے امید رکھے گا میں تجھے بخشوں گا تو نے جو بھی برا کام کیا ہوگا اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہوگی (یعنی تو چاہے کتنا ہی بڑا گنہ گار ہو تجھے بخشنا میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے) اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائیں اور تو مجھ سے بخشش چاہے تو میں تجھ کو بخش دوں گا۔ اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہوگی، اے ابن آدم! اگر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ تیرے ساتھ

گناہوں سے بھری ہوئی زمین ہو تو میں تیرے پاس بخشش و مغفرت سے بھری ہوئی زمین لے کر آؤں گا۔ بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو۔ (یعنی شرک میں مبتلا نہ ہوا ہو) ترمذیؒ اور احمدؒ و دارمیؒ نے اس روایت کو ابوذرؓ سے نقل کیا ہے نیز امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

مغفرت کا یقین رکھو

(۱۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ عَلِمَ اَنِّىْ ذُوْقُدْرَةٍ عَلٰى مَغْفِرَةِ الذُّنُوْبِ غَفَرْتُ لَهٗ وَلَا اُبَالِىْ مَالَمْ يُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص نے یہ جانا کہ میں گناہوں کو بخشنے پر قادر ہوں تو اسے بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ کو اس بات کا جاننا کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی مغفرت پر قادر ہے اس کی مغفرت و بخشش کا سبب ہے کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی بخشش پر قدرت رکھتا ہے وہ اس سے امید رکھتا ہے اور جو شخص کریم سے امید رکھتا ہے کریم اسے محروم نہیں رکھتا لہٰذا یہ حدیث قدسی اس حدیث قدسی: انا عند ظن عبدی بی میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارہ میں رکھتا ہے کے مانند ہے۔

منقول ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ بیمار ہوئے تو حضرت حماد ابن سلمہؒ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، حضرت سفیان ثوریؒ نے حضرت حمادؒ سے کہا کہ کیا آپ کو اس بات کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ جیسے کو بخش دے گا؟ حضرت حمادؒ نے جواب دیا کہ "اگر مجھے اس بات کا اختیار دے دیا جائے کہ حساب کتاب کے لئے چاہے تو میں اپنے باپ کے سامنے پیش ہو جاؤں چاہے اللہ تعالیٰ کے سامنے تو میں اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے پیش ہونے کو ترجیح دوں گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ باپ سے زیادہ مجھ پر رحم کرتا ہے۔" گویا حمادؒ کے اس جواب کا مقصد یہ تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی مغفرت و بخشش کی امید رکھئے اس کی رحمت پر بھروسہ کیجئے کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے۔

استغفار کی فضیلت اور اس کا اثر

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَخْرَجًا وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَرَزَقَهٗ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر تنگی سے نکلنے کی راہ نکال دیتا ہے۔ اور اسے ہر رنج و غم سے نجات دیتا ہے نیز اس کو ایسی جگہ سے (پاک و حلال) روزی بہم پہنچاتا ہے۔ جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہ)

تشریح: "استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار دے لینا کا" مطلب یہ ہے کہ جب بھی گناہ سرزد ہو جائے یا کوئی آفت و مصیبت اور رنج و غم ظاہر ہو تو استغفار کرے یا پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ استغفار پر مداومت و ہمیشگی اختیار کرے کیونکہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں انسان استغفار کا محتاج نہ ہو اس لئے سرکار دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

طُوْبٰى لِمَنْ وَجَدَ فِىْ صَحِيْفَتِهٖ اِسْتِغْفَارًا كَثِيْرًا

"خوش بختی ہے اس شخص کے لئے جس نے اپنے نامہ اعمال میں استغفار کی کثرت پائی۔"

حدیث میں مذکورہ بالا فضیلت کی بنیاد یہ ہے کہ جو شخص استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس کے قلب کا تعلق اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کا اعتماد مستحکم و قوی ہوتا ہے اور اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں اس کا شمار "اللہ سے ڈرنے والوں" اور اللہ کی ذات پر اعتماد کرنے والوں میں ہوتا ہے جن کے بارہ میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو مذکورہ بالا حدیث کی بنیاد بھی ہے کہ:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔

"جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے (ہر تنگی سے) نکلنے کی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی بہم پہنچاتا ہے جہاں اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ پر اعتماد کرتا ہے اللہ اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔"

استغفار کی فضیلت اور اس کا فائدہ مند ہونا اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا۔

"پس میں نے کہا کہ تم اپنے رب سے بخشش مانگو کیونکہ وہ بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر بکثرت بارش برسائے گا اور تمہیں مال اور اولاد دے گا اور تمہارے لئے باغ بنائے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا۔"

حضرت حسن بصریؒ کے بارہ میں منقول ہے کہ ایک شخص نے ان سے قحط سالی کی شکایت کی تو انہوں نے اس سے کہا کہ اللہ سے استغفار کرو، پھر ایک اور شخص نے محتاجگی کا شکوہ کیا، اور ایک اور نے اولاد نہ ہونے کی، اور ایک اور نے زمین کی پیداوار میں کمی کی شکایت کی انہوں نے سب ہی سے کہا کہ استغفار کرو! لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کے پاس کئی شخص آئے اور سب نے اپنی الگ الگ پریشانی ظاہر کی۔ مگر آپ نے سب ہی کو استغفار کرنے کا حکم دیا اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے اس کے جواب میں مذکورہ بالا آیت۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا الخ پڑھی اور اس طرح انہیں بتایا کہ میں نے جن جن باتوں کے لئے استغفار کا حکم دیا ہے اس آیت سے وہ سب ثابت ہیں۔

⑰ وَعَنْ اَبِىْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِى الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوبکر صدیقؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے (اپنے گناہ) پر استغفار کیا اس نے اپنے گناہ پر اصرار نہیں کیا اگرچہ وہ دن میں ستر بار گناہ کرے" (ترمذیؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: "گناہ پر اصرار" کا مطلب یہ ہے کہ گناہ پر دوام کرنا یعنی بار بار اس گناہ کو کرنا، یوں تو خود گناہ کرنا کوئی کم بری بات نہیں ہے چہ جائیکہ اس پر اصرار کرنا تو یہ تو بہت ہی برا ہے کیونکہ صغیرہ گناہ پر اصرار کبیرہ گناہ کے ارتکاب تک پہنچا دیتا ہے اور کبیرہ گناہ پر اصرار کفر کی حد تک لے جاتا ہے۔

لہٰذا اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی گناہ پر شرمندہ ہوتا ہے اور اس سے استغفار کرتا ہے خواہ وہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ تو وہ حد اصرار سے خارج ہوتا ہے چاہے اس سے اس گناہ کا ارتکاب کتنی ہی مرتبہ کیوں نہ ہو کیونکہ گناہ پر ارتکاب کرنے والا تو اسی کو کہیں گے جو بار بار گناہ کرے مگر نہ تو وہ اس گناہ سے شرمندہ و نادم ہو اور نہ استغفار کرے۔

توبہ کرنے والوں کی فضیلت

⑱ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ بَنِىْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ وَّخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت انس راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر انسان خطا کار ہے (یعنی ہر انسان گناہ کرتا ہے علاوہ انبیاء کرام کے کیونکہ وہ معصوم عن الخطاہیں) اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں۔" (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

گناہ کی زیادتی قلب کو زنگ آلود کر دیتی ہے

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِیْ قَلْبِهٖ فَاِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهٗ وَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰى تَعْلُوَ قَلْبَهٗ فَذَالِكُمُ الرَّانُ الَّذِیْ ذَكَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی مؤمن گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ ہو جاتا ہے پھر اگر وہ اس گناہ سے توبہ کر لیتا ہے اور استغفار کرتا ہے تو اس کا دل (اس نقطہ سیاہ سے) صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر زیادہ گناہ کرتا ہے تو وہ سیاہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے۔ پس یہ ران یعنی زنگ ہے جس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ یوں ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر یہ اس چیز (یعنی گناہ) کا زنگ ہے جو وہ کرتے تھے (یہاں تک کہ ان کے دلوں پر خیر و بھلائی بالکل باقی نہیں رہی) اس روایت کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ نے نقل کیا ہے نیز امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: "یہاں تک کہ وہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں گناہ میں زیادتی ہوتی جاتی ہے توں توں وہ سیاہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے قلب پر حاوی ہو جاتا ہے اور قلب کے نور کو ڈھانپ لیتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مؤمن دل کی بینائی سے محروم ہو جاتا ہے چنانچہ نہ تو نفع دینے والے علوم اور نفع دینے والے نیک اعمال ہی کی کوئی اہمیت اس کی نظروں میں باقی رہتی ہے اور نہ فائدہ مند عقل و حکمت کی باتوں کا اس پر کوئی اثر ہوتا ہے اس طرح وہ شفقت و رحمت کے حیات آفرین وصف سے خالی ہو جاتا ہے کہ نہ اپنے اوپر رحم کرتا ہے اور نہ دوسروں کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کرتا ہے اور آخر کار اس کے قلب میں ظلم و جہل اور شر و فتنہ کی تاریکی اپنا تسلط جما لیتی ہے جس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ گناہ پر اس کی جرأت بڑھ جاتی ہے اور معصیت آمیز زندگی ہی اس پر چھا جاتی ہے۔

قبولیت توبہ کا آخری وقت

(۲۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ (رواه الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ غرغرہ کی کیفیت شروع نہ ہو جائے۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: "غرغرہ" انسانی زندگی کا وہ آخری درجہ ہے جب جسم و روح کا تعلق اپنے انقطاع کے انتہائی نقطہ کے بالکل قریب ہوتا ہے جان پورے بدن سے کھنچ کر حلق میں آجاتی ہے۔ سانس اکھڑ کر صرف غرغر کی سی آواز میں تبدیل ہو جاتا ہے اور زندگی کی بالکل آخری امید بھی یاس و نا امیدی کے درجہ یقین پر پہنچ جاتی ہے۔

لہٰذا اس ارشاد گرامی میں "جب تک کہ غرغر کی کیفیت شروع نہ ہو جائے" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک موت کا یقین نہیں ہوتا اس وقت تک تو توبہ قبولیت سے نوازی جاتی ہے مگر جب موت کا بالکل یقین ہو جائے یعنی مذکورہ بالا کیفیت شروع ہو جائے تو اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی۔

اس حدیث کے ظاہری اور واضح مفہوم سے تو یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ مرنے کے وقت مطلقاً توبہ صحیح نہیں ہوتی خواہ کفر سے توبہ ہو یا گناہوں سے یعنی اس وقت نہ تو کافر کا ایمان لانا صحیح و درست ہوگا اور نہ مسلمان کی گناہوں سے توبہ صحیح ہوگی چنانچہ قرآن کریم کی آیت وَلَیسَتِ التَّوبَۃُ الخ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے لیکن بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ گناہوں سے توبہ تو صحیح ہوگی لیکن کفر سے توبہ صحیح نہیں ہوگی گویا ان حضرات کے نزدیک (یاس نا امید) کا ایمان غیر مقبول ہے اور یاس کی توبہ مقبول ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث مذکورہ بالا کے تحت جو حکم بیان کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق گناہوں سے توبہ کرنے سے ہے کہ حالت غرغرہ میں توبہ قبول نہیں ہوتی لیکن ایسی حالت میں اگر کسی سے اس کا کوئی حق معاف کرایا جائے اور وہ صاحب حق معاف کر دے یہ صحیح ہوگا۔

مغفرت خداوندی کی وسعت

(۲۱) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَالَ وَعِزَّتِكَ یَا رَبِّ لَا اَبْرَحُ اُغْوِیْ عِبَادَكَ مَا دَامَتْ اَرْوَاحُھُمْ فِیْ اَجْسَادِھِمْ فَقَالَ الرَّبُّ عَزَّوَجَلَّ وَعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ وَارْتِفَاعِ مَکَانِیْ لَا اَزَالُ اَغْفِرُ لَھُمْ مَا اسْتَغْفَرُوْنِیْ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ قسم ہے تیری عزت کی اے میرے پروردگار! میں تیرے بندوں کو ہمیشہ گمراہ کرتا رہوں گا جب تک کہ ان کی روحیں ان کے جسم میں ہیں! پروردگار عزوجل نے فرمایا "قسم ہے اپنی عزت اور بزرگی کی۔ اور اپنے مرتبے کی بلندی کی، میرے بندے جب تک مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے۔ میں بھی ہمیشہ ان کو بخشتا رہوں گا۔" (احمدؒ)

باب توبہ

(۲۲) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی جَعَلَ بِالْمَغْرِبِ بَابًا عَرْضُہٗ مَسِیْرَۃُ سَبْعِیْنَ عَامًا لِلتَّوْبَۃِ لَا یُغْلَقُ مَالَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ مِنْ قِبَلِہٖ وَذٰلِكَ قَوْلُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیَاتِ رَبِّكَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُھَا لَمْ تَکُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت صفوان ابن عسالؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے مغرب کی جانب ایک دروازہ بنایا ہے جو توبہ کے لئے ہے اور جس کا عرض ستر سال کی مسافت (کے بقدر) ہے اور یہ دروازہ اس وقت تک بند نہیں کیا جائے گا۔ جب تک کہ آفتاب مغرب کی سمت سے نکلے (یعنی مغرب کی سمت سے آفتاب کا نکلنا قبولیت توبہ کا مانع ہے) اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "کہ اس دن آویں گی بعض نشانیاں تیرے پروردگار کی، نہیں نفع دے گا کسی ایسی جان کو ایمان لانا جو پہلے سے ایمان نہیں لائی تھی" کا یہی مطلب ہے۔"

(ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "جو توبہ کے لئے ہے" کا مطلب یہ ہے کہ توبہ کرنے والوں کے لئے کھلا ہوا ہے یا یہ کہ وہ توبہ کے صحیح ہونے اور توبہ کے قبول ہونے کی علامت ہے! حاصل یہ کہ جب آفتاب مغرب کی جانب سے نہیں نکلتا لوگوں کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس کا جی چاہے اپنے شرک اور کفر سے توبہ کر کے اور جس کا جی چاہے اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اس دروازہ کے ذریعہ آخرت کی حیات ابدی راحتوں اور سعادتوں کا مستحق ہو جائے۔ جب مغرب کی سمت سے آفتاب نکلے گا تو توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا حدیث میں جس آیت کریمہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ پوری یوں ہے۔

يَوْمَ يَاْتِي بَعْضُ اٰيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْ اِيْمَانِهَا خَيْرًا۔

"اس دن کی آویں گی بعض نشانیاں تیرے پروردگار کی (یعنی قرب قیامت پروردگار بعض نشانیاں ظاہر کرے گا ان ہی میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ ایک دن آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا اس دن نہیں نفع دے گا کسی ایسی جان کو ایمان لانا جو پہلے سے (یعنی پروردگار کی نشانی ظاہر ہونے سے پہلے) ایمان لائی تھی اور اس جان کو کہ جس نے حالت ایمان میں بھلائی (یعنی توبہ) نہیں کی تھی (اس دن اس کی توبہ کوئی نفع نہیں دے گی۔"

اس آیت کا حاصل یہی ہے کہ جس دن آفتاب مغرب کی سمت سے طلوع ہوگا تو جو شخص اس سے پہلے ایمان نہیں لایا ہوگا یا ایمان پر تو ہوگا مگر توبہ نہیں کی ہوگی، اب نہ اس کا ایمان نفع دے گا اور نہ اس کی توبہ کوئی فائدہ پہنچائے گی۔

انقطاع قبولیت توبہ

(۲۳) وَعَنْ مُعٰوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ وَلَا تَنْقَطِعُ التَّوْبَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا (رواہ احمد وابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت معاویہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، ہجرت (یعنی گناہوں سے توبہ کی طرف رجوع) موقوف نہیں ہوگی تاوقتیکہ توبہ موقوف نہ ہو اور توبہ اس وقت تک موقوف نہیں ہوگی جب تک کہ آفتاب مغرب کی طرف سے نہ نکلے۔" (ابوداؤد، احمد، دارمی)

تشریح: جب تک توبہ موقوف نہیں ہوتی یعنی جب تک توبہ قبول ہوتی رہے گی ہر شخص گناہوں سے پاک ہو سکتا ہے اور جب توبہ موقوف ہو جائے گی تو کوئی شخص گناہوں سے پاک نہیں ہو سکے گا اور توبہ موقوف اسی وقت ہوگی جب کہ آفتاب مغرب کی سمت سے طلوع ہوگا۔

حاصل یہ کہ جب تک آفتاب مغرب کی سمت سے طلوع نہیں ہوتا اس وقت تک ہر شخص توبہ کر کے اپنے گناہوں سے پاک ہو سکتا ہے پھر اس کے بعد کسی کی توبہ کارگر ثابت نہیں ہوگی۔

کسی گناہ گار کو خدا کی رحمت سے مایوس نہ کرو

(۲۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَجُلَيْنِ كَانَا فِيْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ مُتَحَابَّيْنِ اَحَدُهُمَا مُجْتَهِدٌ فِي الْعِبَادَةِ وَالْاٰخَرُ يَقُوْلُ مُذْنِبٌ فَجَعَلَ يَقُوْلُ اَقْصِرْ عَمَّا اَنْتَ فِيْهِ فَيَقُوْلُ خَلِّنِيْ وَرَبِّيْ حَتّٰى وَجَدَهُ يَوْمًا عَلٰى ذَنْبٍ اِسْتَعْظَمَهُ فَقَالَ اَقْصِرْ فَقَالَ خَلِّنِيْ وَرَبِّيْ اَبُعِثْتَ عَلَيَّ رَقِيْبًا فَقَالَ وَاللّٰهِ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ اَبَدًا وَلَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ فَبَعَثَ اللّٰهُ اِلَيْهِمَا مَلَكًا فَقَبَضَ اَرْوَاحَهُمَا فَاجْتَمَعَا عِنْدَهُ فَقَالَ لِلْمُذْنِبِ اُدْخُلِ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِيْ وَقَالَ لِلْاٰخَرِ اَتَسْتَطِيْعُ اَنْ تَحْظُرَ عَلٰى عَبْدِيْ رَحْمَتِيْ فَقَالَ لَا يَا رَبِّ قَالَ اذْهَبُوْا بِهِ اِلَى النَّارِ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بنی اسرائیل میں دو شخص تھے جو آپس میں دوست تھے ان میں سے ایک تو عبادت میں بہت ریاضت کرتا تھا اور دوسرا گناہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں گناہگار ہوں (یعنی وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتا تھا) چنانچہ عبادت کرنے والے نے اس سے کہنا شروع کیا جس چیز میں تم مبتلا ہو (یعنی گناہ میں) اس سے باز آجاؤ گناہ گار اس کے جواب میں کہتا کہ "تم میرے پروردگار پر چھوڑ دو! کیونکہ وہ غفور الرحیم ہے وہ مجھے معاف کرے گا) یہاں تک کہ ایک دن اس عابد نے اس شخص کو ایک ایسے گناہ میں مبتلا دیکھا جسے وہ بہت بڑا گناہ سمجھتا تھا اس نے اس سے کہا کہ تم اس گناہ سے باز آجاؤ گنہ گار نے جواب دیا کہ تم مجھے میرے پروردگار پر چھوڑ دو، کیا تم میرے داروغہ بنا کر بھیجے گئے ہو؟ (عابد نے یہ سن کر) کہا کہ "خدا کی قسم! اللہ تمہیں کبھی نہیں بخشے گا اور نہ تمہیں جنت میں

داخل کرے گا اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان دونوں کے پاس فرشتہ بھیج کر ان کی روحیں قبض کرائیں اور پھر جب وہ دونوں (یعنی ان کی روحیں) حق تعالیٰ کے حضور (برزخ میں یا عرش کے نیچے) حاضر ہوئیں تو حق تعالیٰ نے گنہ گار سے تو فرمایا کہ تو میری رحمت کے سبب جنت میں داخل ہو جا اور دوسرے سے فرمایا کہ "کیا تو اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ میرے بندے کو میری رحمت سے محروم کردے؟ اس نے کہا کہ "نہیں" پروردگار پھر اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کو (جو دوزخ پر مامور ہیں) فرمایا کہ اس کو دوزخ کی طرف لے جاؤ۔" (احمدؒ)

تشریح: چونکہ عبادت کرنے والے نے اپنی عبادت اور اپنے نیک اعمال پر غرور و تکبر کا اعتماد کیا اور اس گنہ گار کو اپنے سے حقیر جان کر اس سے یہ کہا کہ حق تعالیٰ تمہیں نہیں بخشے گا اس لئے اسے مستحق عذاب قرار دیا گیا اسی لئے کسی بزرگ کا قول ہے کہ جو گناہ اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھنے کا باعث ہو وہ اس طاقت و عبادت سے بہتر ہے جو غرور و تکبر اور نخوت میں مبتلا کردے۔

گنہگار رحمت خداوندی سے مایوس نہ ہوں

(۲۵) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا وَلَا يُبَالِي۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ يَقُوْلُ بَدَلَ يَقْرَأُ۔

"اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول کریم ﷺ یہ آیت پڑھا کرتے تھے يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اے میرے وہ بندو جنہوں نے (گناہ کرنے کے سبب) اپنے نفس پر زیادتی کی ہے، رحمت خداوندی سے مایوس مت ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ سب گناہ بخشتا ہے۔ (نیز آپ ﷺ فرماتے کہ) اللہ تعالیٰ کو اس کی پرواہ نہیں کہ بندے کتنے ہی گناہ کرتے ہیں اور وہ سب کو بخش دیتا ہے) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور شرح السنۃ میں لفظ یقرأ کی بجائے لفظ یَقُوْلُ ہے۔"

تشریح: "اللہ تعالیٰ سب گناہ بخشتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کو تو توبہ کے ساتھ بخشتا ہے کہ اگر کوئی کافر اپنے کفر و شرک سے توبہ کر کے ایمان کی دولت قبول کرلے تو اسے حق تعالیٰ ابدی نجات و بخشش کا مستحق قرار دے دیتا ہے اور مؤمنین کو توبہ کے ساتھ بھی بخشتا ہے اور اپنے بے پایاں فضل و کرم کی بنا پر اگر چاہتا ہے تو بغیر توبہ کے بھی بخش دیتا ہے۔

(۲۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِلَّا اللَّمَمَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَاَيُّ عَبْدٍ لَكَ لَا اَلَمَّا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول اِلَّا اللَّمَمَ کی تفسیر کے ضمن میں روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے یہ شعر پڑھا ؎

اِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَاَيُّ عَبْدٍ لَكَ لَا اَلَمَّا

اگر بخشے تو اے الٰہی! تو بڑے سے گناہ بخش دے۔ اور تیرا کون سا بندہ ہے جس نے چھوٹے گناہ نہ کئے ہوں۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔"

تشریح: اِلَّا اللَّمَمَ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اور وہ پوری آیت یہ ہے:

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ۔

"اور (جن نیکوکاروں کا پیچھے ذکر ہوا) یہ وہ لوگ ہیں جو پرہیز کرتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے علاوہ چھوٹے گناہوں کے (کہ جن سے بچنا ممکن نہیں ہے) اور بے شک تیرا رب مغفرت کا وسیع کرنے والا ہے۔"

پس آیت میں چھوٹے گناہوں کا جو استثناء کیا گیا ہے اسی کی دلیل کے طور پر آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بالا شعر پڑھا کہ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی مؤمن صغیرہ گناہوں سے خالی نہیں ہوتا۔

شعر کا حاصل یہ ہے کہ پروردگار! تیری شان رحمت ایسی ہے اور تیرے فضل و کرم کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر تو چاہے تو کبیرہ گناہوں کو بھی بخش دے چھوٹے گناہوں کی تو حقیقت ہی کیا ہے اور پھر تیرا کون سا بندہ ایسا ہے جو چھوٹے گناہ نہیں کرتا اور تو اسے نہیں بخشا بلکہ تو ان چھوٹے گناہوں کو نیکیوں کے ذریعہ جھاڑتا رہتا ہے اور اس طرح ان بندوں کو چھوٹے گناہوں کے بوجھ سے بھی بچاتا ہے۔

یہ شعر جسے آنحضرت ﷺ نے پڑھا امیہ بن صلت کا ہے جو ایام جاہلیت کے مشہور شعراء میں سے ہے امیہ اس وقت بھی بہت زیادہ عبادت کرتا تھا اور قیامت پر اعتقاد کرتا تھا اگرچہ اس نے اسلام کا زمانہ پایا ہے مگر مسلمان ہونے کی سعادت سے محروم رہا۔ امیہ چونکہ حکمت آمیز اشعار کہا کرتا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نہ صرف یہ کہ اس کے اشعار سنتے ہی تھے بلکہ کبھی کبھی خود انہیں پڑھا کرتے تھے۔

بندہ کی عبادت اور معصیت سے خدا کی خدائی میں کوئی اثر نہیں پڑتا

(۲۷) وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی یَا عِبَادِیْ کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ ھَدَیْتُ فَاسْئَلُوْنِی الْھُدٰی اَھْدِکُمْ وَکُلُّکُمْ فُقَرَاءُ اِلَّا مَنْ اَغْنَیْتُ فَاسْاَلُوْنِیْ اَرْزُقْکُمْ وَکُلُّکُمْ مُذْنِبٌ اِلَّا مَنْ عَافَیْتُ فَمَنْ عَلِمَ مِنْکُمْ اَنِّیْ ذُوْقُدْرَۃٍ عَلَی الْمَغْفِرَۃِ فَاسْتَغْفَرَنِیْ غَفَرْتُ لَہٗ وَلَا اُبَالِیْ وَلَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَحَیَّکُمْ وَمَیِّتَکُمْ وَرَطْبَکُمْ وَیَابِسَکُمْ اِجْتَمَعُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ عَبْدٍ مِنْ عِبَادِیْ مَازَادَ ذٰلِکَ فِیْ مُلْکِیْ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ وَلَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَحَیَّکُمْ وَمَیِّتَکُمْ وَرَطْبَکُمْ وَیَابِسَکُمْ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَشْقٰی قَلْبِ عَبْدٍ مِنْ عِبَادِیْ مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِنْ مُلْکِیْ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ وَلَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَحَیَّکُمْ وَمَیِّتَکُمْ وَرَطْبَکُمْ وَیَابِسَکُمْ اجْتَمَعُوْا فِیْ صَعِیْدٍ وَاحِدٍ فَسَاَلَ کُلُّ اِنْسَانٍ مِنْکُمْ مَابَلَغَتْ اُمْنِیَّتُہٗ فَاَعْطَیْتُ کُلَّ سَائِلٍ مِنْکُمْ مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِنْ مُلْکِیْ اِلَّا کَمَا لَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ مَرَّ بِالْبَحْرِ فَغَمَسَ فِیْہِ اِبْرَۃً ثُمَّ رَفَعَھَا ذٰلِکَ بِاَنِّیْ جَوَادٌ مَاجِدٌ اَفْعَلُ مَا اُرِیْدُ عَطَائِیْ کَلَامٌ وَعَذَابِیْ کَلَامٌ اِنَّمَا اَمْرِیْ لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْتُ اَنْ اَقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! تم سب گم کردہ راہ ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے ہدایت بخشی پس تم سب مجھ سے ہدایت چاہو میں تمہیں ہدایت بخشوں گا) تم سب ظاہر و باطن میں محتاج ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے غنی بنادیا پس تم سب مجھ سے روزی مانگو میں تمہیں (پاک و حلال) روزی دوں گا تم سب گنہ گار ہو (یعنی سب ہی سے گناہ متصور ہے) علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے بچالیا ہو (یعنی انبیاء کرم) پس تم میں سے جس شخص نے جانا کہ میں بخشنے پر قادر ہوں اور پھر اس نے مجھ سے بخشش مانگی تو میں اس کو (یعنی اس کے سب گناہ) بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی اور اگر تمہارے پچھلے اگلے، تمہارے، زندے تمہارے مردے تمہارے تر اور تمہارے خشک (یعنی تمہارے جوان و بوڑھے) یا تمہارے عالم و جاہل اور یا تمہارے فرمانبردار و گنہ گار غرضکہ ساری مخلوقات) میرے بندوں میں سب سے زیادہ متقی دل بندہ (محمد ﷺ) کی طرح ہو جائیں تو اس سے (یعنی تمام مخلوقات کے عابد و متقی ہو جانے سے) میری خدائی میں ایک مچھر کے برابر بھی زیادتی نہیں ہوگی اور اگر تمہارے اگلے تمہارے پچھلے، تمہارے زندے، تمہارے مردے، تمہارے تر اور تمہارے خشک (غرضکہ ساری مخلوقات) میرے بندوں میں سے سب سے زیادہ (بدبخت بندہ شیطان لعین) کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری خدائی میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی کمی نہ ہوگی اور اگر تمہارے اگلے، تمہارے پچھلے، تمہارے زندے، تمہارے مردے تمہارے تر اور تمہارے خشک ایک جگہ جمع ہوں اور تم میں سے ہر شخص اپنی انتہائی

آرزو و خواہش کے مطابق مانگے (یعنی اس کے دل میں جو بھی آرزو اور خواہش ہو مجھ سے مانگے) اور پھر تم میں سے ہر شخص کو (اس کی خواہش کے مطابق دوں) تو اس سے میری خدائی میں کچھ بھی کمی نہیں ہوگی (ہاں اگر بفرض محال کمی ہو بھی تو) اسی قدر مثلاً تم میں کسی شخص کا دریا پر گزر ہو اور وہ اس میں سوئی ڈالکر پھر اسے نکالے (یعنی اگر بفرض محال کسی کمی کا تصور بھی کیا جائے تو وہ اسی قدر ہو گا جتنا کہ ایک سوئی پر پانی لگ جاتا ہے ورنہ حقیقت میں خدا کی خدائی میں کمی کے کسی بھی درجہ کا کیا سوال "وہ کتنا ہی دے اس کے ہاں ہرگز کمی نہیں ہوتی) اور اس کا سبب یہ ہے کہ میں بہت سخی ہوں۔ بہت دینے والا ہوں اور جو چاہتا ہوں کرتا ہوں (یعنی یہ تمام سخاوت اور کرم میرے ارادہ و اختیار کے ہی تحت ہے اس میں کسی بندے کے ارادے کو دخل نہیں ہے) میرا دینا صرف حکم کرنا ہے اور میرا عذاب صرف حکم دینا ہے (یعنی یہ سب چیزیں صرف میرے ایک حکم سے ہو جاتی ہیں میں ذرائع اور اسباب کا محتاج نہیں ہوں اور میں کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہوں تو اس کے لئے میرا صرف اتنا ہی حکم ہے کہ میں کہہ دیتا ہوں "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

شرک سے بچنے والے کو بخشش کی بشارت

(۲۸) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَرَأَ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ قَالَ قَالَ رَبُّكُمْ اَنَا اَهْلٌ اَنْ اُتَّقٰى فَمَنِ اتَّقَانِيْ فَاَنَا اَهْلٌ اَنْ اَغْفِرَ لَهٗ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت پڑھی هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (وہی صاحب تقویٰ ہے اور صاحب بخشش ہے) پھر آپ ﷺ نے اس کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے کہ میری شان کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ میرے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے پرہیز کریں لہٰذا جو شخص شرک سے بچتا ہے تو پھر میرے لائق یہی ہوتا ہے کہ میں اسے بخش دوں۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

مذکورہ بالا آیت کا مضمون اس آیت کے مضمون کی مانند ہے۔

تشریح: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اس (شرک) کے علاوہ (ہر گناہ) کو جس کے لئے چاہے معاف کر دیتا ہے۔

آنحضرت کا استغفار و توبہ

(۲۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اِنْ كُنَّا لَنَعُدُّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَجْلِسِ يَقُوْلُ رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ مِائَةَ مَرَّةٍ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم یہ شمار کرتے تھے کہ رسول کریم ﷺ ایک مجلس میں سو مرتبہ یہ کہا کرتے تھے: رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ میرے پروردگار! مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما بلاشبہ تو ہی بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔" (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

استغفار صدق دل سے کرو

(۳۰) وَعَنْ بِلَالِ بْنِ يَسَارِ بْنِ زَيْدٍ مَوْلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ عَنْ جَدِّيْ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قَالَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ غُفِرَ لَهٗ وَاِنْ كَانَ قَدْ فَرَّ مِنَ الزَّحْفِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاؤدَ لٰكِنَّهٗ عِنْدَ اَبِيْ دَاؤدَ هِلَالُ ابْنُ يَسَارٍ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ کے پوتے حضرت بلال بن یسارؒ کہتے ہیں کہ میرے (والد حضرت یسارؓ) نے مجھ سے یہ

حدیث بیان کی جسے انہوں نے میرے دادا (حضرت زیدؓ) سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے (یعنی حضرت زیدؓ) رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص یہ کہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ میں اللہ سے بخشش چاہتا ہوں وہ اللہ کہ نہیں معبود علاوہ اس کے جو زندہ ہے اور خبرگیری کرنے والا ہے۔ تو اس کی بخشش کی جاتی ہے اگرچہ وہ جہاد سے بھاگا ہوا ہو (جو ایک بہت بڑا گناہ ہے) اس روایت کو ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے لیکن ابوداؤدؒ کے نزدیک (بلال ابن یسار کی بجائے) ہلال بن یسار ہے، نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: کوئی بھی دعا ہو، کوئی بھی ذکر ہو اور کوئی بھی عمل ہو وورد ہو جب تک نیت و مقصد کا اخلاص اور دل کی تڑپ و لگن زبان کی ہمنوا نہ ہو، نہ اس دعا کا اثر ہوتا ہے نہ اس کا ذکر و عمل کا، اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ جب بھی استغفار پڑھا جائے تو صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ پڑھا جائے کیونکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ گناہ سے استغفار کرنے والا درانحالیکہ وہ اس گناہ پر قائم ہو اپنے پروردگار سے ٹھٹھول کرنے والا ہے۔ (نعوذ باللہ)۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اپنے مرحومین کے لئے استغفار کرو

(۳۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَیَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِی الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اَنّٰی لِیْ هٰذِهٖ فَیَقُوْلُ بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ (رواہ احمد)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ عزوجل جنت میں اپنے بندہ نیک بخت و صالح کا درجہ بلند کرتا ہے تو وہ پوچھتا ہے "میرے پروردگار! مجھے یہ درجہ کیسے حاصل ہوا؟" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تیرے لئے تیرے بیٹے کے استغفار کی وجہ سے" (احمدؒ)

مردوں کے لئے بہترین ہدیہ استغفار

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا الْمَیِّتُ فِی الْقَبْرِ اِلَّا كَالْغَرِیْقِ الْمُتَغَوِّثِ یَنْتَظِرُ دَعْوَةً تَلْحَقُهٗ مِنْ اَبٍ اَوْ اُمٍّ اَوْ اَخٍ اَوْ صَدِیْقٍ فَاِذَا لَحِقَتْهُ كَانَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَیُدْخِلُ عَلٰی اَهْلِ الْقُبُوْرِ مِنْ دُعَاءِ اَهْلِ الْاَرْضِ اَمْثَالَ الْجِبَالِ وَاِنَّ هَدِیَّةَ الْاَحْیَاءِ اِلَی الْاَمْوَاتِ الْاِسْتِغْفَارُ لَهُمْ۔ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قبر میں مردہ کی حالت ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص ڈوب رہا ہو اور کسی کو پکار رہا ہو (کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی سے باہر نکالے) چنانچہ وہ مردہ ہر وقت) اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ اس کے باپ کی طرف سے یا اس کی ماں کی طرف سے یا اس کے بھائی کی طرف سے یا اس کے دوست کی طرف سے اس کو دعا پہنچے پس جب اسے (کسی کی طرف سے دعا پہنچتی ہے تو یہ دعا کا پہنچنا اس کے لئے دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے محبوب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ قبر والوں کی طرف سے دعا کا ثواب پہاڑ کی مانند (یعنی بہت زیادہ ثواب اور رحمت و بخشش) پہنچاتا ہے اور زندوں کی طرف سے مردوں کے لئے بہترین ہدیہ استغفار ہے۔" (بیہقی)

استغفار کی فضیلت

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ طُوْبٰی لِمَنْ وَجَدَ فِیْ صَحِیْفَتِهٖ اِسْتِغْفَارًا كَثِیْرًا

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَى النَّسَائِيُّ فِيْ عَمَلِ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خوش بختی ہے اس شخص کے لئے جس نے اپنے نامہ اعمال میں بہت استغفار کی (یعنی مقبول استغفار پایا) ابن ماجہ اور نسائیؒ نے اس روایت کو اپنی کتاب عمل یوم ولیلۃ میں نقل فرمایا ہے۔"

تشریح: استغفار کی فضیلت کے سلسلہ میں یہ حدیث بھی بڑی ہی خوش کن ہے جسے بزارؒ نے حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ جب اعمال لکھنے والے دونوں فرشتے ہر دن بندے کا اعمال نامہ اوپر لے جاتے ہیں۔

استغفار کی فضیلت کے سلسلہ میں ایک یہ حدیث بھی ملاحظہ فرمائیے جسے بزارؒ نے حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع روایت کیا ہے کہ اعمال لکھنے والے دونوں فرشتے جب بندے کا اعمال نامہ لیکر اوپر جاتے ہیں تو حق تعالیٰ اس اعمال نامہ کے اول و آخر میں استغفار دیکھ کر فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندے کے وہ تمام گناہ بخش دیئے۔ جو اس نامہ اعمال کے دونوں کناروں کے درمیان ہیں۔ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص صبح و شام استغفار کرتا ہے اسے یہ فضیلت و سعادت حاصل ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی ایک دعا

(۳۴) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا أَسَاءُوْا اسْتَغْفَرُوْا رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ "اے اللہ" مجھے ان لوگوں میں سے بنا جو نیکی کریں تو خوش ہوں۔ اور برائی کریں تو استغفار کریں۔" (ابن ماجہ، بیہقی)

اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توبہ سے بہت خوش ہوتا ہے

(۳۵) وَعَنِ الْحَارِثِ بْنِ سُوَيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ حَدِيْثَيْنِ اَحَدُهُمَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ عَنْ نَفْسِهِ قَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَرٰى ذُنُوْبَهٗ كَاَنَّهٗ قَاعِدٌ تَحْتَ جَبَلٍ يَخَافُ اَنْ يَّقَعَ عَلَيْهِ وَاِنَّ الْفَاجِرَ يَرٰى ذُنُوْبَهٗ كَذُبَابٍ مَرَّ عَلٰى اَنْفِهٖ فَقَالَ بِهٖ هٰكَذَا اَيْ بِيَدِهٖ فَذَبَّهٗ عَنْهُ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَلّٰهُ اَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ الْمُؤْمِنِ مِنْ رَجُلٍ نَزَلَ فِيْ اَرْضٍ دَوِيَّةٍ مُهْلِكَةٍ مَعَهٗ رَاحِلَتُهٗ عَلَيْهَا طَعَامُهٗ وَشَرَابُهٗ فَوَضَعَ رَأْسَهٗ فَنَامَ نَوْمَةً فَاسْتَيْقَظَ وَقَدْ ذَهَبَتْ رَاحِلَتُهٗ فَطَلَبَهَا حَتّٰى اِذَا اشْتَدَّ عَلَيْهِ الْحَرُّ وَالْعَطَشُ وَمَاشَاءَ اللّٰهُ قَالَ اَرْجِعُ اِلٰى مَكَانِيَ الَّذِيْ كُنْتُ فِيْهِ فَاَنَامُ حَتّٰى اَمُوْتَ فَوَضَعَ رَأْسَهٗ عَلٰى سَاعِدِهٖ لِيَمُوْتَ فَاسْتَيْقَظَ فَاِذَا رَاحِلَتُهٗ عِنْدَهٗ عَلَيْهَا زَادُهٗ وَشَرَابُهٗ فَاللّٰهُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ هٰذَا بِرَاحِلَتِهٖ وَزَادِهٖ رَوَى مُسْلِمٌ الْمَرْفُوْعَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُ فَحَسْبُ وَرَوَى الْبُخَارِيُّ الْمَوْقُوْفَ عَلَى ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَيْضًا۔

"اور حضرت حارث ابن سویدؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے مجھ سے دو حدیثیں بیان کیں ایک تو انہوں نے رسول کریم ﷺ سے نقل کی اور دوسری اپنی طرف سے بیان کی چنانچہ انہوں نے فرمایا "مؤمن اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ ایک پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو اور خوفزدہ ہو کہ پہاڑ اس کے اوپر نہ گر پڑے اور فاجر اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے اس مکھی کو جو اس کی ناک پر اڑے اور وہ اس کی طرف اس طرح یعنی اپنے ہاتھ سے اشارہ کرے اور اسے اڑا دے (حاصل یہ کہ مؤمن گناہ سے بہت ڈرتا ہے اور اسے اس بات کا خوف رہتا ہے کہ کہیں میں اس گناہ کی پاداش میں پکڑا نہ جاؤں اس لئے اس کی نظر میں چھوٹے سے چھوٹے گناہ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن فاجر اپنے گناہوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اس کی نظر میں بڑے سے بڑے گناہ کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی) پھر حضرت

عبد اللہ نے (آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کی توبہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے (جو اپنے سفر کے دوران) کسی ایسے ہولناک میدان میں اترے جہاں سبزہ و درخت کا نام و نشان تک نہ ہو اور اس کے ساتھ جو سواری ہو اس پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو پھر (وہ استراحت کے لئے) وہیں زمین پر سر رکھ کر ایک نیند سو گیا ہو اور جب جاگنے کے بعد اسے معلوم ہو کہ سامان سے لدی ہوئی اس کی سواری گم ہو گئی ہے تو وہ اس کی تلاش میں مصروف ہو گیا ہو یہاں تک کہ گرمی کی تپش اور پیاس کی شدت اور گرمی اور پیاس کے علاوہ دوسری تکلیف اور پریشانی کی) ان چیزوں نے جو اللہ کو منظور تھیں اس پر غلبہ پالیا ہو تو اس نے یہ کہا ہو کہ میں اپنی جگہ لوٹ چلوں جہاں میں (سر رکھ کر سویا تھا) وہیں سو جاؤں تاکہ نیند کی حالت میں میرا خاتمہ ہو جائے چنانچہ وہ اپنے بازو پر سر رکھ کر موت کی انتظار میں سو رہا ہو کہ اس کی آنکھ کھل جائے اور اچانک وہ دیکھے کہ اس کی سواری اس کے سامنے موجود ہو جس پر اس کے کھانے پینے کا سامان موجود تھا پس اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندہ کی توبہ کی وجہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی سواری اور اپنے کھانے پینے کا سامان پا کر خوش ہوتا ہے۔ مسلمؒ نے ان دونوں روایتوں میں سے صرف اس روایت کو نقل کیا ہے جسے ابن مسعودؓ نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے (یعنی جس میں مؤمن بندہ کی توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بہت خوش ہونے کا بیان ہے) اور اس روایت کو نقل نہیں کیا ہے جسے ابن مسعودؓ نے اپنی طرف سے بیان کیا ہے اور جس میں گناہ کے بارے میں مؤمن اور فاجر کے فرق کو بیان کیا گیا ہے) اور بخاریؒ نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے جسے ابن مسعودؓ نے اپنی طرف سے بیان کیا ہے۔ حاصل یہ کہ حدیث مرفوع کو تو بخاریؒ و مسلمؒ دونوں نے نقل کیا ہے لیکن حدیث موقوف کو صرف بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: پہلی فصل میں بھی اس قسم کی حدیث گزر چکی ہے وہاں بھی بتایا گیا ہے کہ بندہ کی توبہ سے اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ خوش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ سے راضی ہوتا ہے اور اس کی توبہ قبول کرتا ہے گویا اس حدیث سے اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ۔

"اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔"

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بہت بڑے عالم باعمل حضرت استاد ابی اسحٰق اسفرائی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے اللہ سبحانہ تعالیٰ سے مسلسل تیس برس تک یہ دعا کی کہ مجھے توبہ نصوح کی سعادت سے بہرہ مند فرمائے لیکن میری دعا قبول نہیں ہوئی میں نے اپنے دل میں بہت تعجب کیا اور کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی پاک اور مستغنی ہے کہ میں نے تیس برس تک اپنی ایک خواہش کی تکمیل کی دعا کی لیکن وہ بارگاہ الوہیت میں قبولیت سے نوازی نہیں گئی، کہ جب ہی میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے۔ "تمہیں اس بات پر تعجب ہے کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم مانگ کیا رہے ہو؟ تمہاری دعا کا حقیقی منشاء تو یہی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوست اور محبوب نہ رکھے؟ تو کیا تم نے اللہ تعالیٰ کی یہ بشارت نہیں سنی کہ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ لہٰذا اس خواہش کی تکمیل نہ صرف یہ کہ بہت ہی آسان ہے بلکہ اس کی بشارت بھی دی جا چکی ہے۔

(۳۶) وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْمُفَتَّنَ التَّوَّابَ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس بندہ مؤمن کو بہت دوست رکھتا ہے جو گناہ میں مبتلا ہوتا ہے اور بہت زیادہ توبہ کرتا ہے۔"

تشریح: یہ منشاء نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اسے دوست رکھتا ہے، جی نہیں بلکہ گناہوں پر نادم و شرمندہ ہونے سے اور توبہ کرنے کی وجہ سے دوست رکھتا ہے۔

آیت لا تقنطوا من رحمة اللّٰہ کی فضیلت

(۳۷) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا اُحِبُّ اَنَّ لِيَ الدُّنْيَا بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا الْاٰيَةَ فَقَالَ رَجُلٌ فَمَنْ اَشْرَكَ فَسَكَتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اَلَا وَمَنْ اَشْرَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول کریم ﷺ فرماتے تھے "میں اس آیت یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا الْاٰیَة کے مقابلہ میں اپنے لئے تمام دنیا کا حصول بھی پسند نہیں کرتا" ایک شخص نے پوچھا کہ جس شخص نے شرک کیا (کیا وہ بھی اس آیت کی بشارت کا مستحق ہے؟) نبی کریم ﷺ نے (کچھ دیر) خاموشی اختیار فرمائی (تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آنے کے بعد یا پھر غور و فکر کر کے جواب دیں) پھر وحی آنے کے بعد یا خود اپنے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے) آپ ﷺ نے فرمایا "جان لو! جس شخص نے شرک کیا (اور اپنی زندگی ہی میں اس سے توبہ کر لی اور پھر اس کی توبہ قبول بھی ہوئی تو وہ بھی اس آیت کی بشارت کا مستحق ہے) یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمائی۔"

تشریح: آپ کے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ تھا کہ اگر اس آیت کریمہ کے مقابلہ میں مجھے دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں بھی دے دی جائیں اور میں دنیا کی ان تمام چیزوں کو خدا کی راہ میں صدقہ کر دوں اور جن چیزوں سے لذت حاصل کی جا سکتی ہے ان سے لذت حاصل کروں تو بھی میں اسے پسند نہیں کروں گا کیونکہ اس آیت کریمہ میں گناہوں سے مغفرت و بخشش کی سب سے عظیم سعادت کی بشارت دی گئی ہے جو اسی ایک دنیا نہیں بلکہ اس جیسی سینکڑوں دنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ گراں قدر ہے۔ پوری آیت کریمہ یہ ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔

"اے میرے وہ بندو جنہوں نے (گناہوں کے ذریعہ) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے نا امید و مایوس نہ ہو بلاشک اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخشتا ہے اور وہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے۔"

اسی مضمون کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان اشعار کے ذریعہ ادا کیا ہے ؎

اَيَا صَاحِبَ الذَّنْبِ لَا تَقْنَطَنْ فَاِنَّ الْاِلٰهَ رَءُوْفٌ رَؤُفٌ

"اے گنہ گار شخص نا امید اور مایوس مت ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مہربان ہے بڑا ہی مہربان۔"

وَلَا تَرْحَلَنَّ بِلَا عِدَّةٍ فَاِنَّ الطَّرِيْقَ مَخُوْفٌ مَخُوْفٌ

"بغیر زاد راہ کے کوچ نہ کر۔ کیونکہ راستہ بڑا دہشتناک ہے بڑا ہی دہشتناک۔"

اور پھر ایک شاعر نے اسی بات کو یوں کہا ہے ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مردرا در سنگ لاخ باد یہ پیبا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

شرک، خدا کی رحمت اور بندہ کے درمیان پردہ ہے

(۳۸) وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيَغْفِرُ لِعَبْدِهٖ مَالَمْ يَقَعِ الْحِجَابُ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْحِجَابُ قَالَ اَنْ تَمُوْتَ النَّفْسُ وَهِيَ مُشْرِكَةٌ۔ رَوَى الْاَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ اَحْمَدُ وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ

الْاَخِیْرَ فِیْ کِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے (گناہوں میں سے جنہیں چاہتا ہے ان) کو بخشتا ہے جب تک بندہ اور رحمت حق کے درمیان پردہ حائل نہ ہو، صحابہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! پردہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کہ آدمی شرک کرتا ہو (یعنی مشرک مرے) مذکورہ بالا تینوں روایتیں امام احمدؒ نے نقل کی ہیں۔ نیز یہ آخری روایت "کتاب البعث والنشور"۔ میں نقل کی ہے۔"

بارگاہ حق میں شرک کے علاوہ ہر گناہ قابل عفو ہے

(۳۹) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ لَقِیَ اللّٰہَ لَا یَعْدِلُ بِہٖ شَیْئًا فِی الدُّنْیَا ثُمَّ کَانَ عَلَیْہِ مِثْلُ جِبَالٍ ذُنُوْبٌ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ۔ رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ فِیْ کِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص خدا سے اس حال میں ملاقات کرے (یعنی اس حال میں مرے) کہ وہ دنیا میں خدا کی مانند کسی کو نہ مانتا ہو (یعنی شرک میں مبتلا نہ ہو) تو اگر مرنے کے بعد) اس کے اوپر پہاڑ کی مانند بھی گناہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (اگر چاہے گا تو) اس (کے ان سب گناہوں کو بخش دے گا)۔" (بیہقی)

توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے والے کی مانند ہے

(۴۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ۔ رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَالْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَقَالَ تَفَرَّدَ بِہِ النَّھْرَانِیُّ وَھُوَ مَجْھُوْلٌ وَفِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ رَوَاہُ عَنْہُ مَوْقُوْفًا قَالَ النَّدَمُ تُوْبَۃٌ وَالتَّائِبُ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "گناہوں سے (صحیح اور پختہ) توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ (بیہقیؒ) بیہقیؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کو صرف نہروانی نے نقل کیا ہے سو وہ مجہول ہیں، نیز بغویؒ نے شرح السنۃ میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی یہ روایت موقوف نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا (گناہوں پر شرمندگی اور) پشیمانی کا مطلب توبہ ہے اور توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔"

تشریح: یہ بات جان لینی چاہئے کہ جب کوئی گنہ گار شخص صدق دل کے ساتھ اپنے گناہ پر شرمندہ و نادم ہوتا ہے اور شرائط معتبرہ کے ساتھ توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کیونکہ خود حق تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ: وَھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ اور (اللہ) ایسا ہے جو اپنے بندہ کی توبہ قبول کرتا ہے۔

اور "استغفار" جو توبہ کے بغیر ہو اور جس کا تعلق خدا کے سامنے اپنے عجز و انکساری اور کسر نفسی کے اظہار سے ہو کبھی تو گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور کبھی نہیں مٹاتا لیکن اس پر ثواب بہر صورت ملتا ہے گویا اس کا انحصار مشیت ایزدی پر ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے استغفار کے ذریعہ گناہ کو دور کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے دور نہیں کرتا لیکن ثواب دونوں صورتوں میں دیتا ہے۔

بَابٌ

رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کا بیان

مشکوۃ کے اکثر نسخوں میں اس موقع پر صرف باب لکھا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس باب میں ان احادیث کو ذکر کیا گیا ہے جن

کا تعلق گزشتہ ابواب سے ہے اور بعض نسخوں میں یہاں یہ عنوان قائم کیا گیا ہے بَابٌ فِیْ سِعَةِ رَحْمَةِ یعنی رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کا بیان۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا قَضَى اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ كِتَابًا فَهُوَ عِنْدَهٗ فَوْقَ عَرْشِهٖ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ وَفِیْ رِوَایَةٍ غَلَبَتْ غَضَبِیْ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے (جب میثاق) کے دن مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا (یا یہ کہ جب مخلوقات کو پیدا کرنا شروع کیا) تو ایک کتاب لکھی (یعنی فرشتوں کو وہ کتاب لکھنے کا حکم دیا یا قلم کو لکھنے کا حکم فرمایا) وہ کتاب حق تعالیٰ کے پاس عرش کے اوپر ہے، اس کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ "بلاشبہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے" ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جس کتاب میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت عظمیٰ لکھی ہوئی ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے اس کتاب کی عظمت و بزرگ قدری کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب کی اس عظمت و بزرگ قدری کے پیش نظر حق تعالیٰ نے اس کو اپنے پاس عرش کے اوپر رکھا ہے۔

رحمت خداوندی کی سبقت اور اس کے غالب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی بخشش و کرم اور اس کی نعمتوں کی نشانیاں اور اس کے مظاہرے غالب ہیں کہ وہ تمام مخلوقات کو گھیرے ہوئے ہیں اور بے انتہا ہیں اس کے مقابلہ میں اس کے غضب کی نشانیاں اور اس کے مظاہر کم ہیں جیسا کہ خود حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔

"اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔"

نیز فرمایا:

عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ

"عذاب میں تو میں جسے چاہتا ہوں اسے ہی مبتلا کرتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے۔"

حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ اور اس کی نعمتوں کا سلسلہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ کائنات کا کوئی فرد اس سے باہر نہیں ہے اور اس دنیاوی زندگی کا ایک ایک لمحہ کسی نہ کسی شکل میں رحمت خداوندی ہی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں بندوں کی طرف سے خدائے رحیم و کریم کی نعمتوں اور رحمتوں کے شکر کی ادائیگی میں جتنی کوتاہی اور قصور ہوتا ہے اس کی بھی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ۔

"اور اگر اللہ تعالیٰ ان کے ظلم کے سبب ان سے مواخذہ کرنے لگے تو (اس کے نتیجہ میں) ایک بھی جاندار روئے زمین پر نہ چھوڑے۔"

چنانچہ یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت کا ہی ظہور ہے کہ بندوں کی تمام کوتاہیوں اور خطاؤں کے باوجود اس دنیا میں ان کو باقی رکھتا ہے ان کو

روزی دیتا ہے، ان پر اپنی نعمتوں کی بارش کرتا ہے اور اس دنیا میں ان کو عذاب و مواخذہ میں مبتلا نہیں کرتا یہ تو اس دنیا کا معاملہ ہے کہ یہاں حق تعالیٰ کی رحمت کا ظہور کس کس طرح اور کن کن صورتوں میں سامنے آتا ہے لیکن آخرت میں رحمت کا ظہور تو اس دنیا کے ظہور سے کہیں زیادہ ہوگا جیسا کہ اگلی حدیث سے معلوم ہوگا۔

رحمت خداوندی کی وسعت

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ رَحْمَةٍ اَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً بَیْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ فَبِهَا یَتَعَاطَفُوْنَ وَبِهَا یَتَرَاحَمُوْنَ وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلٰی وَلَدِهَا وَاَخَّرَ اللّٰهُ تِسْعًا وَتِسْعِیْنَ رَحْمَةً یَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ سَلْمَانَ نَحْوَهٗ وَفِیْ اٰخِرِهٖ قَالَ وَاِذَا کَانَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَکْمَلَهَا بِهٰذِهِ الرَّحْمَةِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کے پاس سو رحمتیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک رحمت تو جنات، انسان، چوپایوں اور زہریلے جانوروں میں اتاری ہے چنانچہ اسی ایک رحمت کے سبب وہ آپس میں میل ملاپ رکھتے ہیں اور اسی کے سبب وہ آپس میں رحم کرتے ہیں اور اسی کے سبب وحشی جانور اپنے بچوں سے الفت رکھتا ہے اور ننانوے رحمتیں اللہ تعالیٰ نے رکھ چھوڑی ہیں جن کے ذریعہ وہ قیامت کے دن اپنے (مؤمن) بندوں پر رحم کرے گا۔ (بخاری و مسلم) اور مسلمؒ نے ایک روایت حضرت سلمانؓ سے اسی کے مانند نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں آپ ﷺ نے فرمایا پس جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان ننانوے رحمتوں کو اس رحمت کے ساتھ (جو دنیا میں اتاری گئی ہے) "پورا فرمادے گا"۔"

تشریح: مسلمؒ کی اس دوسری روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قیامت کے دن وہ ایک رحمت بھی بندوں کے شامل حال رہے گی۔ جو دنیا میں اتاری گئی ہے اس طرح ایک رحمت تو یہ دنیا والی اور ننانوے رحمتیں وہ جو قیامت کے دن کے لئے حق تعالیٰ نے مخصوص کر رکھی ہیں یہ سب مل کر پوری سو ہو جائیں گی۔

بندہ کو بین الخوف والرجاء رہنا چاہئے

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْ یَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعُقُوْبَةِ مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهٖ اَحَدٌ وَلَوْ یَعْلَمُ الْکَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهٖ اَحَدٌ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کہ اگر مؤمن یہ جان لے کہ خدا کے ہاں کس قدر عذاب ہے تو پھر کوئی شخص اس کی جنت کی امید بھی نہ رکھے (یعنی عذاب کی فراوانی اسے جنت سے مایوس کر دے) اور اگر کافر یہ جان لے کہ اللہ کی رحمت کس قدر ہے تو پھر کوئی اس کی جنت سے ناامید نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث کا منشاء درحقیقت اللہ کی رحمت اور اس کے عذاب کی کثرت کو ظاہر کرنا ہے تاکہ مؤمن تو اس کی رحمت پہ اعتماد کر کے نہ بیٹھ جائے اور اس کے عذاب سے بالکل بے خوف و نڈر نہ ہو جائے اور کافر اس کی رحمت سے ناامیدی نہ اختیار کرلے اور توبہ کرنا نہ چھوڑے۔

اور حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ بین الخوف والرجاء (خوف اور امید کے درمیان) رہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت پر امید بھی رکھے اور اس کے عذاب سے بھی ڈرتا رہے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "اگر قیامت کے دن یہ اعلان کیا جائے گا کہ ایک شخص جنت میں داخل ہوگا تو میں امید رکھوں گا کہ وہ شخص میں ہوں اور اسی طرح اگر یہ اعلان کیا جائے

کہ ایک شخص دوزخ میں داخل کیا جائے گا تو میں گمان رکھوں گا کہ وہ شخص میں ہی ہوں"۔

جنّت و دوزخ ہر شخص کے بالکل قریب ہی ہے

(۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْجَنَّةُ اَقْرَبُ اِلٰى اَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهٖ وَالنَّارُ مِثْلُ ذٰلِكَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جنت تم میں سے ہر شخص کے جوتے کے تسمے کے برابر اس کے قریب ہے اور دوزخ بھی اسی طرح ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حاصل یہ کہ انسان اور جنت و دوزخ کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی زندگی کو اچھے کام اور نیک اعمال سے آراستہ کرے وہ جنّت کا امیدوار رہے نیز برے کاموں سے اجتناب کرے اور دوزخ سے ڈرتا رہے۔

اللہ تعالیٰ کی نکتہ نوازی

(۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَجُلٌ لَمْ يَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ لِاَهْلِهٖ وَفِیْ رِوَايَةٍ اَسْرَفَ رَجُلٌ عَلٰى نَفْسِهٖ فَلَمَّا حَضَرَهُ الْمَوْتُ اَوْصٰى بَنِيْهِ اِذَا مَاتَ فَحَرِّقُوْهُ ثُمَّ اذْرُوْا نِصْفَهٗ فِی الْبَرِّ وَنِصْفَهٗ فِی الْبَحْرِ فَوَاللّٰهِ لَئِنْ قَدَرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ لَيُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا لَا يُعَذِّبُهٗ اَحَدًا مِنَ الْعَالَمِيْنَ فَلَمَّا مَاتَ فَعَلُوْا مَا اَمَرَهُمْ فَاَمَرَ اللّٰهُ الْبَحْرَ فَجَمَعَ مَا فِيْهِ ثُمَّ قَالَ لَهٗ لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا قَالَ مِنْ خَشْيَتِكَ يَا رَبِّ وَاَنْتَ اَعْلَمُ فَغَفَرَ لَهٗ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایک شخص تھا جس نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی تھی اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس نے اپنے نفس پر زیادتی کی تھی یعنی بہت ہی زیادہ گناہ کئے تھے، جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب وہ (یعنی خود) مرجائے تو اس کو (یعنی مجھے) جلا کر آدھی راکھ تو جنگل میں اڑا دینا اور آدھی راکھ دریا میں بہا دینا کیونکہ قسم ہے خدا کی! اگر اللہ تعالیٰ نے اس سے مواخذہ کر لیا اور حساب میں سختی کی تو وہ اس کو ایسا عذاب دے گا کہ آج تک عالم کے لوگوں میں سے کسی کو نہ دیا ہوگا، چنانچہ جب وہ شخص مرگیا تو اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا (کہ اس کو جلا کر آدھی راکھ تو جنگل میں اڑادی اور آدھی کو دریا میں بہا دیا) اللہ تعالیٰ نے دریا کو، (اس کی راکھ جمع کرنے کا حکم دیا) اور اس نے وہ راکھ جو اس کے اندر تھی جمع کی اور جنگل کو حکم دیا اور اس نے بھی جو راکھ اس کے اندر تھی جمع کی) جب دریا اور جنگل نے اس کے اجزاء جمع کر لئے تو اس شخص کو ان جزاء سے استوار کر کے حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا، حق تعالیٰ نے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ پروردگار! تیرے خوف سے تو حقیقت و حال کو خوب جانتا ہے" "اللہ تعالیٰ نے یہ سن کر اسے بخش دیا"۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: وہ شخص یہ سمجھتا تھا کہ عذاب صرف اسی کو ہوتا ہے جو دفن کیا جاتا ہے چنانچہ اپنی بدعمل زندگی اور گناہوں کی زیادتی کو دیکھتے ہوئے اس نے انتہائی خوف و ڈر کی وجہ سے یہ وصیت کر دی کہ مجھے جلا کر میری راکھ کو بکھیر کر اڑا دینا، اللہ تعالیٰ بڑا ہی نکتہ نواز ہے۔ اس کو بس یہی بات پسند آگئی اس لئے اس نے بخش دیا۔

لَئِنْ قَدَرَ اللّٰهُ کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ترجمہ میں بیان کئے گئے ہیں یعنی "اگر اللہ تعالیٰ نے اس سے مواخذہ کر لیا اور حساب میں سختی کی" اس صورت میں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس شخص کی مراد اس کے لفظی معنی ہی تھے یعنی اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر قادر ہو گیا۔" تو پھر یہ اشکال پیدا ہوگا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک و شبہ کا اظہار کیا جو ظاہر ہے کہ بالکل کفر ہے"۔

اس اشکال کے علماء نے کئی جواب دیئے ہیں ان ہی میں سے ایک جواب یہ ہے کہ "زمانہ فترت" کی بات ہے اس وقت چونکہ کوئی نبی

نہیں تھا اور ایسے میں صرف توحید پر ایمان و اعتقاد ہی نجات کے لئے کافی تھا۔ اس لئے اس قسم کے شک و شبہ کے اظہار سے نہ کفر لازم آتا ہے نہ اس سے ابدی نجات پر کوئی اثر پڑتا تھا۔

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اس شخص نے یہ بات دہشت و خوف کے غلبہ کی بنا پر کہہ دی اور ایسی صورت میں انسان مجنون اور مغلوب العقل کے حکم میں ہوتا ہے اور وہ ماخوذ قرار نہیں دیا جاسکتا جیسا کہ گزشتہ باب ہی کی ایک حدیث میں اس شخص کے بارہ میں نقل کیا گیا ہے جسے اپنی گمشدہ سواری مل گئی اور خوشی و مسرت کے غلبہ اور زیادتی کی وجہ سے اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے تھے انت عبدی و انا ربک (تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں)۔

رحمت الٰہی کی وسعت

(۶) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْيٌ فَإِذَا امْرَأَةٌ مِنَ السَّبْيِ قَدْ تَحَلَّبَ ثَدْيُهَا تَسْعٰى إِذَا وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ أَخَذَتْهُ فَأَلْصَقَتْهُ بِبَطْنِهَا وَأَرْضَعَتْهُ فَقَالَ لَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتُرَوْنَ هٰذِهِ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّارِ فَقُلْنَا لَا وَهِيَ تَقْدِرُ عَلٰى أَنْ لَا تَطْرَحَهُ فَقَالَ لَلّٰهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هٰذِهِ بِوَلَدِهَا (متفق علیہ)

"اور حضرت عمر بن خطاب ؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے جن میں ایک عورت بھی تھی (اور دودھ کی کثرت کی وجہ سے) اس کی چھاتیاں بہہ رہی تھیں (کیونکہ اس کا بچہ نہیں تھا جو اس کا دودھ پیتا) وہ اپنا دودھ پلانے کی خاطر کسی بچہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتی تھی چنانچہ جب وہ قیدیوں میں سے کسی بچہ کو پالیتی تو (اپنے بچہ کی محبت میں) اسے لے کر اپنے پیٹ سے لگاتی اسے دودھ پلانے لگتی (یہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ "کیا تمہارے خیال میں یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں ڈالے گی؟ (یعنی جب یہ غیر کے بچے کے ساتھ اتنی محبت کرتی ہے تو کیا اس بات کا خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟ ہم نے کہا ہرگز نہیں ڈالے گی۔ بشرطیکہ وہ ڈالنے پر قدرت رکھتی ہو۔" آپ ﷺ نے فرمایا یہ عورت اپنے بچے پر جتنا رحم و پیار کرتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے (مؤمن) بندوں پر اس سے کہیں زیادہ رحم و پیار کرتا ہے"۔ (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

میانہ روی اختیار کرنے کا حکم

(۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يُنْجِيَ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ قَالُوْا وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ بِرَحْمَتِهِ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاغْدُوْا وَرُوْحُوْا وَشَيْءٌ مِنَ الدُّلْجَةِ وَالْقَصْدَ الْقَصْدَ تَبْلُغُوْا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کا عمل اسے (آگ سے) نجات نہیں دے گا (یعنی صرف عمل ہی نافع نہیں ہوگا بلکہ جب حق تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت بھی شامل حال ہوگی تب ہی عمل بھی فائدہ دے گا) صحابہ ؓ نے عرض کیا "کہ کیا آپ (ﷺ) کو بھی (آپ ﷺ کا عمل باوجود کامل ہونے کے نجات نہیں دلائے گا) آپ ﷺ نے فرمایا نہیں" مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے، لہٰذا تم لوگ اپنے اعمال کو تیر کی طرح راست و درست کرو، عمل میں میانہ روی اختیار کرو (یعنی کسی عمل کو کمی و زیادتی کے ساتھ نہ کرو) دن کے ابتدائی حصہ میں بھی عبادت کرو دن کے آخری حصہ میں عبادت کرو اور رات میں بھی کچھ عبادت کرو (یعنی نماز تہجد پڑھو) اور عبادت میں میانہ روی اختیار کرو، میانہ روی اختیار کرو، اپنی منزل کو پالو گے۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

رحمت الٰہی کے بغیر صرف عمل جنت، کی سعادت کا ضامن نہیں

(۸) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُدْخِلُ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا يُجِيْرُهُ مِنَ النَّارِ وَلَا

اَنَا اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کا عمل نہ اسے جنّت میں داخل کرے گا اور نہ اسے دوزخ سے بچائے گا اور نہ مجھے میرا عمل جنّت میں داخل کرے گا ہاں وہ جو اللہ کی رحمت کے ساتھ ہو۔" (مسلم)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ "ہاں جو اللہ کی رحمت کے ساتھ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ جنّت میں داخل ہونے اور دوزخ سے نجات کی سعادت کا باعث وہ عمل ہوگا جس کے ساتھ باری تعالیٰ کی رحمت بھی شامل ہو لہٰذا جنت میں داخل ہونا تو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور اس کی رحمت ہی کی بنا پر ہوگا البتہ جنّت میں جو درجات ملیں گے وہ اعمال کے مطابق ملیں گے یعنی جس کا عمل جس درجہ کا ہوگا اسے وہی درجہ ملے گا۔

جزاء اور سزا میں رحمت الٰہی کا ظہور

⑨ وَعَنْ اَبِي سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ اِسْلَامُهُ يُكَفِّرُ اللّٰهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلَفَهَا وَكَانَ بَعْدُ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا اِلَّا اَنْ يَتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی بندہ اسلام قبول کرتا ہے اور اس کا اسلام اچھا ہوتا ہے (یعنی نفاق سے پاک صاف ہوتا ہے) کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے وہ تمام گناہ دور کر دیتا ہے جو اس نے قبول اسلام سے پہلے کئے تھے اور اس کے بعد اسے بدلہ ملتا ہے جس کا حساب یہ ہے کہ) ایک نیکی کے بدلہ میں دس سے لے کر سات سو تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں (یعنی اسلام لانے کے بعد وہ بھی جو عمل کرتا ہے) بلکہ سات سو سے بھی زیادہ اور برائی کا بدلہ اسی کے مانند ملتا ہے یعنی جتنی برائی کرتا ہے وہ اتنی ہی لکھی جاتی ہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی درگزر کرتا ہے۔" (بخاری)

تشریح: یہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور ہے اور اس کے فضل و کرم کا اثر ہے کہ وہ ایک نیکی پر دس گنا سے سات سو گنا تک جزاء سے نوازا جاتا ہے بلکہ جس کو چاہتا ہے اس کی مشقت و ریاضت اور صدق و اخلاص کے موافق اس سے بھی زیادہ جزاء سے بہرہ مند فرماتا ہے۔ مگر بدی کی سزا اس بدی کے بقدر دیتا ہے چنانچہ جو جتنی برائی کرتا ہے اسے صرف اتنی ہی سزا ملتی ہے بلکہ جس کو چاہتا ہے اس کی اس برائی کو معاف کر دیتا ہے
اور اسے اتنی سزا سے بھی بچا لیتا ہے۔

⑩ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَاِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھی (یعنی فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ لوح محفوظ میں نیکیوں اور برائیوں کے بارہ میں یہ تفصیل لکھ دیں کہ) جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور وہ اس پر عمل نہ کر سکے (یعنی ارادہ کے باوجود وہ کسی عذر کی بنا پر اس نیکی کو کرنے پر قادر نہ ہو سکے) تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے ہاں اس ارادہ ہی) کو ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے اور جو شخص نیکی کا ارادہ کرے اور پھر اس نیکی کو کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے ہاں دس گنا سے سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکیاں لکھ لیتا ہے (یعنی اپنے بندوں میں سے جس کے لئے اللہ چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے بحسب اخلاص اور ادائیگی شرائط و آداب اس

سے بھی زیادہ ثواب لکھتا ہے) اور جو شخص کسی برائی کا ارادہ کرے اور پھر (خدا کے خوف کی وجہ سے) اس برائی میں بھی مبتلا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے ہاں ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے اور جس شخص نے کسی برائی کا ارادہ کیا تو پھر اس برائی میں مبتلا بھی ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک ہی برائی لکھتا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "نیکیوں" سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو کرنے سے ثواب ملتا ہے اور "برائیوں" سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو کرنے سے عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور وہ نیکی کسی وجہ سے نہ کر سکے تو اس کے لئے بھی ایک نیکی اس لئے لکھی جاتی ہے کہ کسی بھی عمل کا ثواب نیت پر موقوف ہے اور مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر اور افضل ہوتی ہے بلکہ یوں کہئے کہ اصل تو نیت ہی ہے عمل کا درجہ اس کے بعد ہے کیونکہ عمل کے بغیر صرف نیت پر تو ثواب دیا جاتا ہے مگر نیت کے بغیر صرف عمل پر ثواب نہیں دیا جاتا۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ بغیر عمل کے نیت پر جو ثواب ملتا ہے وہ مضاعف نہیں ہوتا۔

نیکی پر ثواب کے مضاعف ہونے کی مقدار کو سات سو تک بیان کیا جاتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ثواب میں کتنا اضافہ کرتا ہے اس کی آخری حد اور مقدار کسی کو معلوم نہیں ہے کیونکہ سات سو کے بعد مقدار کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی چیز کی طرف رغبت دلانے کے لئے اس کو معین کر کے ذکر کرنے کی بجائے مبہم ذکر کرنا زیادہ موثر ہوتا ہے اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا اُخْفِیَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

برائیوں سے تائب ہو کر نیکیاں کرنے والے کی مثال

(۱۱) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مَثَلَ الَّذِیْ یَعْمَلُ السَّیِّئَاتِ ثُمَّ یَعْمَلُ الْحَسَنَاتِ كَمَثَلِ رَجُلٍ كَانَتْ عَلَیْهِ دِرْعٌ ضَیِّقَةٌ قَدْ خَنَقَتْهُ ثُمَّ عَمِلَ حَسَنَةً فَانْفَكَّتْ حَلْقَةٌ ثُمَّ عَمِلَ اُخْرٰی فَانْفَكَّتْ اُخْرٰی حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَی الْاَرْضِ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص برائیاں کرتا ہو اور پھر نیکیاں کرنے لگے اس کی حالت اس شخص کی سی ہے جس کے جسم پر تنگ زرہ ہو اور اس زرہ کے حلقوں نے اس (کے جسم) کو بھینچ رکھا ہو۔ پھر وہ نیکی کرے اور اس کی زرہ کا ایک حلقہ کھل جائے پھر وہ دوسری نیکی کرے اور دوسرا حلقہ کھل جائے۔ یہاں تک کہ (اسی طرح) اس کے حلقے کھلتے رہیں اور وہ ڈھیلی ہو کر زمین پر گر پڑے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ برائی کرنے سے سینہ تنگ و تاریک ہو جاتا ہے اور برائی کرنے والا نہ صرف یہ کہ اپنے تمام امور میں ضمیر کی صحیح رہنمائی سے محروم ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی تمام فکری اور عملی راہوں پر یقین و اعتماد اور سکون و استقلال کے نور کی بجائے تحیر و گھبراہٹ اور اضطراب و عدم استقلال کے تاریک سایہ ہوتے ہیں بلکہ وہ لوگوں کی نظروں میں بے وقعت اور کمتر ہو جاتا ہے اور تمام ہی نیکی پسند انسان اسے غصہ اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اس کے برعکس نیکی کرنے سے سینہ کشادہ اور فراغ ہوتا ہے اور نیکی کرنے والا اپنے ہر کام میں آسانی و سہولت اور یقین و اعتماد کے سکون آمیز اثرات محسوس کرتا ہے نیز یہ کہ وہ لوگوں کی نظر میں محبوب و پسندیدہ اور باوقعت رہتا ہے۔

حدیث بالا میں اسی بات کو تنگ زرہ سے مشابہت دی گئی ہے کہ تنگ زرہ پہننے سے جسم تنگی اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کا

زرہ کا بدن پر سے کھلنا فراخی اور خوش دلی کا باعث ہوتا ہے۔

قیامت کے دن خدا سے ڈرنے والے کے لئے بشارت

(۱۲) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُصُّ عَلَی الْمِنْبَرِ وَهُوَ یَقُوْلُ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ الثَّانِیَةَ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ فَقُلْتُ الثَّانِیَةَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ الثَّالِثَةَ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ فَقُلْتُ الثَّالِثَةَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِی الدَّرْدَاءِ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو منبر پر وعظ و نصیحت فرماتے ہوئے سنا چنانچہ (ابودرداء کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ یعنی اور جو شخص (قیامت کے دن حساب کے لئے) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔" میں نے (یہ سن کر از راہ تعجب) پوچھا کہ "یا رسول اللہ اس (ڈرنے والے) نے زنا ہی کیا ہو اور چاہے اس نے چوری ہی کی ہو" (تب بھی اسے دو جنتیں ملیں گی؟) آنحضرت ﷺ نے پھر دوسری مرتبہ یہی فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ میں نے پھر دوسری مرتبہ پوچھا: یا رسول اللہ! چاہے اس نے زنا ہی کیا ہو اور چاہے اس نے چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے پھر تیسری مرتبہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ میں نے پھر تیسری مرتبہ پوچھا کہ "یا رسول اللہ! چاہے اس نے زنا ہی کیا ہو اور چاہے اس نے چوری ہی کی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اگرچہ ابودرداء کی ناک خاک آلودہ ہی کیوں نہ ہو۔" (احمدؒ)

تشریح: "اس کے لئے دو جنتیں ہیں" دو جنتوں کے بارہ میں بعض احادیث میں آیا ہے کہ ایک جنت تو ایسی ہے جس میں مکان، محل برتن اور زیورات وغیرہ سب کے سب سونے کے ہیں اور ایک جنت ایسی ہے جس میں اسی طرح سب سامان چاندی کا ہے حضرت ابودرداء نے چونکہ بشارت پر تعجب کیا اور انہیں یہ بات بعید سی معلوم ہوئی اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "اگرچہ ابودرداء کی ناک خاک آلودہ ہی کیوں نہ ہو" یعنی اگرچہ یہ بات ابودرداء کو کتنی ہی عجیب کیوں نہ معلوم ہو اور ابودرداءؓ اسے کتنا ہی بعید کیوں نہ سمجھیں مگر بات یوں ہی ہے جس طرح میں نے کہی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر رحم دل ماں سے زیادہ رحم کرتا ہے

(۱۳) وَعَنْ عَامِرِ الرَّامِ قَالَ بَیْنَا نَحْنُ عِنْدَهٗ یَعْنِی عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَقْبَلَ رَجُلٌ عَلَیْهِ كِسَاءٌ وَفِیْ یَدِهٖ شَیْءٌ قَدِ الْتَفَّ عَلَیْهِ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَرْتُ بِغَیْضَةِ شَجَرٍ فَسَمِعْتُ فِیْهَا اَصْوَاتَ فِرَاخِ طَائِرٍ فَاَخَذْتُهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ فِیْ كِسَائِیْ فَجَاءَتْ اُمُّهُنَّ فَاسْتَدَارَتْ عَلٰی رَاْسِیْ فَكَشَفْتُ لَهَا عَنْهُنَّ فَوَقَعَتْ عَلَیْهِنَّ فَلَفَفْتُهُنَّ بِكِسَائِیْ فَهُنَّ اُولَاءِ مَعِیْ قَالَ ضَعْهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ وَاَبَتْ اُمُّهُنَّ اِلَّا لُزُوْمَهُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتَعْجَبُوْنَ لِرُحْمِ اُمِّ الْاَفْرَاخِ فِرَاخَهَا فَوَالَّذِیْ بَعَثَنِیْ بِالْحَقِّ لَلّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ اُمِّ الْاَفْرَاخِ بِفِرَاخِهَا اِرْجِعْ بِهِنَّ حَتّٰی تَضَعَهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَخَذْتَهُنَّ وَاُمُّهُنَّ مَعَهُنَّ فَرَجَعَ بِهِنَّ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عامر رامیؓ (تیر انداز) کہتے ہیں کہ (ایک دن) جب کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اچانک ایک شخص آیا جس کے جسم پر ایک کملی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جس پر اس نے اپنی کملی لپیٹ رکھی تھی اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس سے گزر رہا تھا کہ میں نے اس جھنڈ میں سے پرندوں کے بچوں کی آوازیں سنیں، چنانچہ میں نے انہیں پکڑ لیا اور اپنی کملی میں رکھ لیا اتنے میں بچوں کی ماں آگئی اور میرے سر پر پھرنے لگی میں نے اس کے سامنے بچوں کے اوپر سے کملی کھول دی (تاکہ وہ

انہیں دیکھ لے) وہ اپنے بچوں کو دیکھتے ہی ان پر آگری اور میں نے ماں اور بچوں کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا اور اب وہ سب میرے پاس ہیں۔ "آپ ﷺ نے فرمایا" ان کو "یہاں رکھو"۔ میں نے ان کو وہاں رکھ دیا اور ان پر سے اپنی کملی ہٹادی۔ ماں سب چیزوں کو چھوڑ کر بچوں سے چمٹ گئی ہم سب اپنے بچوں کے ساتھ اس ماں کی اس محبت کو نظر تعجب سے دیکھ ہی رہے تھے) کہ آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم لوگ اس پر تعجب کر رہے ہو کہ ان بچوں کی ماں اپنے بچوں پر (کس قدر رحم دل واقع ہوئی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ رحم کرنے والا ہے۔" جتنا کہ ایک ماں اپنے بچوں پر رحم کرتی ہے اور جاؤ ان بچوں کو وہیں لے جا کر رکھ دو جہاں سے تم نے ان کو پکڑا تھا اور ان کی ماں کو ان کے ساتھ ہی چھوڑ دو، چنانچہ وہ ان سب کو لے گیا (اور جہاں سے پکڑا تھا وہیں چھوڑ آیا۔" (ابوداؤد)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۴) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ کُنَّا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ بَعْضِ غَزَوَاتِہٖ فَمَرَّ بِقَوْمٍ فَقَالَ مَنِ الْقَوْمُ قَالُوا نَحْنُ الْمُسْلِمُوْنَ وَامْرَأَۃٌ تَحْضِبُ بِقِدْرِھَا وَمَعَھَا ابْنٌ لَھَا فَاِذَا ارْتَفَعَ وَھَجٌ تَنَحَّتْ بِہٖ فَاَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ قَالَ نَعَمْ قَالَتْ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ اَلَیْسَ اللّٰہُ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ قَالَ بَلٰی قَالَتْ اَلَیْسَ اللّٰہُ اَرْحَمَ بِعِبَادِہٖ مِنَ الْاُمِّ بِوَلَدِھَا قَالَ بَلٰی قَالَتْ اِنَّ الْاُمَّ لَا تُلْقِیْ وَلَدَھَا فِی النَّارِ فَاَکَبَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَبْکِیْ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَہٗ اِلَیْھَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُعَذِّبُ مِنْ عِبَادِہٖ اِلَّا الْمَارِدَ وَالْمُتَمَرِّدَ وَالَّذِیْ یَتَمَرَّدُ عَلَی اللّٰہِ وَاَبٰی اَنْ یَّقُوْلَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ کسی غزوہ میں (چلے جا رہے) تھے کہ آپ ﷺ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے اور ان سے پوچھا "کہ تم لوگ کون ہو؟" انہوں نے عرض کیا "ہم مسلمان ہیں" ان میں ایک ایسی عورت بھی تھی جو اپنی ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہی تھی (یعنی کچھ پکا رہی تھی) اس کے پاس اس کا بچہ بھی تھا چنانچہ جب آگ کی لپٹ اٹھتی تو وہ بچے کو ایک طرف ہٹا دیتی (تاکہ آگ کی تپش سے اسے تکلیف نہ پہنچے) پھر وہ عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور آپ ﷺ سے عرض کرنے لگی کہ "آپ (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں؟ آپ نے فرمایا "ہاں اس عورت نے کہا" کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ رحم کرنے والا نہیں ہے جتنا کہ ایک ماں اپنے بچے پر رحم کرتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اس عورت نے کہا "ماں تو اپنے بچے کو آگ میں نہیں ڈالتی (تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دوزخ کی آگ میں کیوں ڈالتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر) روتے ہوئے اپنا سر نیچے کر لیا پھر (تھوڑی دیر کے بعد) اپنا سر مبارک اس عورت کی طرف اٹھایا اور فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر (ہمیشہ) عذاب نہیں کرتا ہاں صرف ان لوگوں کو عذاب دیتا ہے جو سرکش ہیں اور ایسے سرکش جو اللہ تعالیٰ سے سرکشی کرتے ہیں (یعنی اس کے احکام نہیں مانتے) اور لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کرتے ہیں۔" (ابن ماجہ)

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہنے والے بندہ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت

(۱۵) وَعَنْ ثَوْبَانَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ لَیَلْتَمِسُ مَرْضَاۃَ اللّٰہِ فَلَا یَزَالُ بِذٰلِکَ فَیَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ لِجِبْرِیْلَ اِنَّ فُلَانًا عَبْدِیْ یَلْتَمِسُ اَنْ یُّرْضِیَنِیْ اَلَا وَاِنَّ رَحْمَتِیْ عَلَیْہِ فَیَقُوْلُ جِبْرِیْلُ رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلٰی فُلَانٍ وَیَقُوْلُھَا حَمَلَۃُ الْعَرْشِ وَیَقُوْلُھَا مَنْ حَوْلَھُمْ حَتّٰی یَقُوْلَھَا اَھْلُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ ثُمَّ تَھْبِطُ لَہٗ اِلَی الْاَرْضِ (رواہ احمد)

"اور حضرت ثوبانؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو (نیک) بندہ (طاعات کی ادائیگی کے ذریعے) اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو تلاش کرتا ہے اور پھر ہمیشہ اس کی تلاش میں رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل سے فرماتا ہے کہ میرا فلاں بندہ میری رضا و

خوشنودی کی تلاش میں ہے لہٰذا آگاہ رہو اس پر میری رحمت (کاملہ) ہے" چنانچہ حضرت جبرئیل کہتے ہیں کہ فلاں شخص پر اللہ کی رحمت ہو، یہی بات عرش کو اٹھانے والے فرشتے بھی کہتے ہیں، پھر یہی بات وہ فرشتے کہتے جو ان سب کے گرد ہوتے ہیں یہاں تک کہ اس بات کو ساتوں آسمان کے فرشتے کہتے ہیں، چنانچہ پھر اس شخص کے لئے زمین پر رحمت نازل فرمائی جاتی ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: اس شخص کے لئے زمین پر رحمت نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ کو اپنا دوست اور پسندیدہ بناتا ہے اور روئے زمین پر اس کے لئے قبولیت عام کی فضا پیدا فرما دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا والے اس کو عزیز رکھتے ہیں اور ان کے قلوب میں اس کے لئے محبت و پیار اور عظمت و احترام کے پر خلوص جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

یہ حدیث مفہوم و معنی کے اعتبار سے اس ارشاد گرامی کے مماثل ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا" جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو جبرئیلؑ کو آگاہ فرماتا ہے کہ میں اپنے فلاں بندہ کو دوست رکھتا ہوں تم بھی اسے دوست رکھو چنانچہ جبریل اس بندہ کو دوست رکھتے ہیں اور پھر وہ آسمانوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندہ کو دوست رکھتا ہے لہٰذا تم سب بھی اس کو دوست رکھو پس آسمان والے اس کو دوست رکھتے ہیں پھر اس بندہ کے لئے روئے زمین پر قبولیت عام کی فضا پیدا کر دی جاتی ہے (جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے پسند کرتے ہیں) اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اپنا دشمن رکھتا ہے تو جبرئیلؑ کو آگاہ فرماتا ہے کہ فلاں شخص کو میں اپنا دشمن رکھتا ہوں تم بھی اسے دشمن رکھو چنانچہ جبرئیل بھی اس کو دشمن رکھتے ہیں اور پھر وہ آسمانوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو دشمن رکھتا ہے لہٰذا تم سب بھی اسے دشمن رکھو پس آسمان والے اس کو دشمن رکھتے ہیں پھر اس کے لئے روئے زمین پر عام دشمنی کی فضا پیدا کر دی جاتی ہے (جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے دشمن رکھتے ہیں۔

اس ارشاد گرامی کو سامنے رکھئے تو واضح ہو جائے گا کہ اولیاء اللہ کی عام شہرت و قبولیت اور عوام کے قلوب میں ان کے لئے بے پناہ محبت و عقیدت کا واحد سبب یہ ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ان کو دوست رکھتا ہے اور پھر روئے زمین پر ان کے لئے عام قبولیت و محبت کی فضا پیدا کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں تمام لوگ ان کو دوست و عزیز رکھتے ہیں۔ ہاں جو لوگ مکر و فریب کے راستوں سے اپنا مال و زر خرچ کر کے عوام کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں وہ اس زمرہ سے خارج ہیں کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

مؤمن بہر صورت جنتی ہے خواہ وہ نیکوکار ہو یا گنہ گار ہو

(۱۶) وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ قَالَ كُلُّهُمْ فِي الْجَنَّةِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي كِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"اور حضرت اسامہ بن زیدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ عزوجل کے اس ارشاد "پس ان میں سے بعض اپنے نفس کے حق میں ظالم ہیں۔ ان میں سے بعض میانہ رو ہیں اور ان میں سے بعض نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں" کی تفسیر کے ضمن میں فرمایا کہ یہ سب جنتی ہیں۔" (بیہقی)

تشریح: اس حدیث میں جس آیت کریمہ کی تفسیر کے ضمن میں مذکورہ بالا بشارت ارشاد فرمائی گئی ہے وہ پوری یہ ہے کہ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ (ترجمہ) پھر ہم نے کتاب و شریعت دی ان لوگوں کو کہ جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے (ایمان و اسلام کے ذریعہ) برگزیدہ کیا پس ان برگزیدہ لوگوں (یعنی مسلمانوں) میں سے بعض اپنے نفس کے حق میں ظالم ہیں (بایں طور کہ وہ ممنوع چیزوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو گناہوں میں مبتلا کرتے ہیں) اور ان میں سے بعض میانہ رو ہیں (بایں طور کہ وہ نیکیاں بھی کرتے ہیں) اور ان میں سے بعض نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں (بایں طور کہ وہ علم حاصل کرنے اور عمل کرنے میں بہت سعی اور جدوجہد کرتے ہیں اور اپنے علم و عمل کے ساتھ

دوسروں کو بھی اپنے علم، تذکیر و نصیحت کے ذریعے رشد و ہدایت کے راستے پر لگاتے ہیں)۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ "سبقت کرنے والے" سے وہ شخص مراد ہے جس کی نیکیاں، برائیوں پر غالب ہوں، یعنی نیکیاں زیادہ کرتا ہو اور برائیوں میں کم مبتلا ہوتا ہو! میانہ رو" وہ شخص ہے جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اور "ظالم" سے مراد وہ شخص ہے جس کی زندگی میں برائیاں نیکیوں پر غالب ہوں۔

پس حدیث بالا کا حاصل یہ ہے کہ ان تینوں اقسام کے لوگ برگزیدہ بندوں یعنی مؤمنین ہی میں سے ہیں اور یہ سب جنتی ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان کو جنت میں اپنے اپنے احوال و افعال کے اعتبار ہی سے درجات ملیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کتنی وسیع اور عام ہے کہ جس طرح اس کے نیکو کار بندے اس کی رحمتوں سے نوازے جائیں گے اسی طرح کے گنہ گار بندے بھی اسی کے سایہ رحمت میں ابدی سعادتوں سے ہمکنار ہوں گے۔

بَابُ مَايَقُوْلُ عِنْدَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَآءِ وَالْمَنَامِ

صبح، شام اور سوتے وقت پڑھی جانے والی دعاؤں کا بیان

"صبح" سے مراد ہے آفتاب طلوع ہونے تک دن کا بالکل ابتدائی حصہ "شام سے مراد ہے" آفتاب کے غروب ہونے کے وقت سے شفق غروب ہونے کے وقت تک دن کا بالکل آخری حصہ لہٰذا جو دعائیں صبح کے وقت پڑھنے کے لئے منقول ہیں ان کو چاہے نماز فجر سے پہلے پڑھا جائے چاہے نماز فجر کے بعد دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے اسی طرح شام کے وقت جن دعاؤں کا پڑھنا منقول ہے ان کو بھی چاہے تو مغرب کی نماز سے پہلے پڑھا جائے چاہے مغرب کی نماز کے بعد۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

صبح و شام کے وقت آپ ﷺ کی دعا

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمْسٰى قَالَ اَمْسَيْنَا وَاَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرِ مَا فِيْهَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَسُوْءِ الْكِبَرِ وَفِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَاِذَا اَصْبَحَ قَالَ ذٰلِكَ اَيْضًا اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ رَبِّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ وَعَذَابٍ فِي الْقَبْرِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جب شام ہوتی تو رسول کریم ﷺ کی لسان مقدس پر یہ الفاظ جاری ہوتے اَمْسَيْنَا وَاَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرِ مَافِيْهَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَافِيْهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَسُوْءِ الْكِبَرِ وَفِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ اور جب صبح ہوتی تو آپ ﷺ اسی طرح پڑھتے لیکن شروع میں اَمْسَيْنَا وَاَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ کی بجائے اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ یعنی ہم نے صبح کی اور ہر چیز نے صبح کی جو اللہ کی ملک میں ہے) پڑھتے۔ ایک دوسری روایت میں وَسُوْءِ الْكِبَرِ کے بعد یہ الفاظ ہیں رَبِّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ وَعَذَابٍ فِي الْقَبْرِ (یعنی اے میرے رب! میں اس عذاب سے جو دوزخ میں ہے اور اس عذاب سے جو قبر میں ہے تیری پناہ چاہتا ہوں۔" (مسلم)

تشریح: جب یہ دعا صبح کے وقت پڑھی جائے گی تو اس میں اللیلۃ کی بجائے الیوم پڑھا جائے گا یعنی یوں پڑھیں گے اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ مِنْ خَیْرِ ھٰذَا الْیَوْمِ نیز جہاں جہاں رات کی رعایت سے مونث کی ضمیریں استعمال ہوتی ہیں وہاں دن کی رعایت سے مذکر ضمیریں استعمال ہوں گی یعنی ھا کی جگہ ہٗ پڑھا جائے گا بقیہ عبارت جوں کی توں رہے گی۔

سونے اور جاگنے کے وقت کی دعا

(۲) وَعَنْ حُذَیْفَۃَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَخَذَ مَضْجَعَہٗ مِنَ اللَّیْلِ وَضَعَ یَدَہٗ تَحْتَ خَدِّہٖ ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی وَاِذَا اسْتَیْقَظَ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَمُسْلِمٌ عَنِ الْبَرَاءِ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب رات میں اپنے بستر پر تشریف لاتے اور سونے کے لئے لیٹتے تو اپنا ہاتھ (یعنی اپنی داہنی ہتھیلی) اپنے (دائیں) گال کے نیچے رکھتے اور یہ فرماتے اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی اے اللہ! تیرے ہی نام پر مرتا (یعنی سوتا) ہوں اور تیرے ہی نام پر زندہ ہوتا یعنی جاگتا ہوں اور جب آپ ﷺ نیند سے بیدار ہوتے تو یہ فرماتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ اس روایت کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے لیکن مسلم نے (حضرت حذیفہ) کی بجائے حضرت براءؓ سے روایت کیا ہے۔"

تشریح: "اسی کی طرف رجوع ہے" کا مطلب بعض علماء نے تو یہ لکھا ہے کہ "آخر کار موت کے بعد حساب اور جزاو سزا کے لئے اسی ذات باری تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے" لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ کہا جائے گا کہ یہاں نشور (رجوع) سے مراد ہے۔ "سونے کے بعد اٹھ کر طلب معاش اور اپنے کام کاج میں مصروف ہونے کے لئے" زندگی کی ہماہمی میں شریک ہو جانا۔ رخسار کے نیچے ہاتھ رکھ کر سونے سے چونکہ غفلت بہت زیادہ طاری نہیں ہوتی اس لئے آپ ﷺ اپنے دائیں رخسار مبارک کے نیچے اپنی دائیں ہتھیلی رکھ کر سوتے تھے۔ اسی طرح سوتے وقت اور جاگنے کے بعد ذکر و دعا کرنے کی حکمت و وجہ یہ ہے کہ اعمال کا خاتمہ بھی عبادت و طاعت پر ہو، افعال کی ابتداء بھی عبادت ہی سے ہے۔

سوتے وقت بستر کو جھاڑ لینا چاہئے

(۳) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَوٰی اَحَدُکُمْ اِلٰی فِرَاشِہٖ فَلْیَنْفُضْ فِرَاشَہٗ بِدَاخِلَۃِ اِزَارِہٖ فَاِنَّہٗ لَا یَدْرِیْ مَا خَلَفَہٗ عَلَیْہِ ثُمَّ یَقُوْلُ بِاسْمِکَ رَبِّیْ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَبِکَ اَرْفَعُہٗ اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْھَا وَاِنْ اَرْسَلْتَھَا فَاحْفَظْھَا بِمَا تَحْفَظُ بِہٖ عِبَادَکَ الصّٰلِحِیْنَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ ثُمَّ لِیَضْطَجِعْ عَلٰی شِقِّہِ الْاَیْمَنِ ثُمَّ لِیَقُلْ بِاسْمِکَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَلْیَنْفُضْہُ بِصَنِفَۃِ ثَوْبِہٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَاِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لَھَا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں کوئی (سونے کے لئے) اپنے بستر پر آئے تو اسے چاہئے کہ اپنے بستر کو اپنی لنگی کے اندر کے کونے سے جھاڑ لے۔ کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے بستر پر کیا چیز (مثلاً کیڑا مکوڑا یا گرد و غبار) گری پڑی ہو اس کے بعد وہ بستر پر لیٹے اور پھر کہے بِاسْمِکَ رَبِّیْ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَبِکَ اَرْفَعُہٗ اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْھَا وَاِنْ اَرْسَلْتَھَا فَاحْفَظْھَا بِمَا تَحْفَظُ بِہٖ عِبَادَکَ الصّٰلِحِیْنَ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی اپنے بستر پر آئے تو اسے چاہئے کہ وہ (پہلے) اپنا بستر جھاڑے پھر اپنی داہنی کروٹ پر لیٹے اور پھر بِاسْمِکَ (یعنی مذکورہ بالا دعا) آخر تک پڑھے" (مسلم و بخاری) ایک روایت میں یہ ہے کہ "اسے چاہئے کہ وہ اپنے بستر کو اپنے کپڑے کے کونے سے تین مرتبہ جھاڑے۔

نیز اس روایت میں وَاِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِی فَاغْفِرْلَھَا یعنی مذکورہ بالا دعا میں فَارْحَمْھَا کی بجائے فَاغْفِرْلَھَا ہے۔"

تشریح: "لنگی کے اندر کونے" سے مراد کپڑے کا وہ حصہ یا کونہ ہے جو اندرونی طرف اور بدن سے لگا ہوا ہوتا ہے خواہ وہ لنگی ہو یا کوئی اور لباس! "نیز لنگی کے کونے" سے جھاڑنے کے لئے اس لئے فرمایا کہ باہر کے کونے سے جھاڑنے سے اوپر کا کونہ یا حصہ میلا ہو جائے گا جس سے بدنمائی پیدا ہو جائے گی اور یہ کہ بستر کو اس طرح لنگی سے جھاڑنے سے بستر کا کوئی حصہ کھلنے بھی نہیں پائے گا! حاصل یہ کہ جب کوئی شخص بستر پر آئے تو پہلے وہ بستر کو کسی کپڑا وغیرہ سے جھاڑے تاکہ بستر پر اگر اذیت و نقصان پہنچانے والی کوئی بھی چیز گری پڑی ہو تو اس سے بستر صاف ہو جائے گا اگر بستر کو جھاڑنے کے لئے الگ سے کوئی کپڑا وغیرہ نہ ہو تو پھر اپنی لنگی یا کرتے وغیرہ کے کونے سے ہی اسے جھاڑ لیا جائے۔

جب انسان سوتا ہے تو وہ گویا مردے ہی کے حکم میں ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کی روح عارضی طور پر قبض کر لیتا ہے پھر اس کے بعد اس کی روح کو اس کے جسم میں بھیج دیتا ہے یعنی اسے نیند سے بیدار کر دیتا ہے یا اس کی روح کو چھوڑتا ہے یعنی مستقل طور پر قبض کر لیتا ہے اور اس شخص پر موت طاری کر دیتا ہے چنانچہ اسی چیز کے بارہ میں مذکورہ بالا دعا میں درخواست ہے کہ "پروردگار" اگر تو سونے کی حالت میں میری روح کو رکھ چھوڑے اور مجھ پر موت طاری فرمادے تو اس صورت میں مجھے بخش دیجئے اور اگر میری روح کو واپس بھیج دے اور مجھے زندہ رکھے تو پھر اسی طرح میری نگہبانی فرمائیے جس طرح تو اپنے نیک بندوں کی نگہبانی فرماتا ہے یعنی نیکی و بھلائی کی توفیق دیجئے" گناہوں سے بچائیے اور میرے ہر کام و فعل میں میرا معین و مددگار بنئے۔

"نیک بندوں" سے مراد وہ بندے ہیں۔ جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری اور عبادت و طاعت کے ذریعہ اللہ کا حق بھی ادا کرتے ہیں اور بندوں کے حقوق بھی جو ان کے ذمہ ہوتے ہیں پورا کرتے ہیں۔

دائیں کروٹ سونے میں حکمت یہ ہے کہ دل چونکہ بائیں پہلوں میں ہوتا ہے اس لئے دائیں کروٹ سونے کی صورت میں دل لٹکتا رہتا ہے جس کی وجہ سے نیند میں استراحت اور غفلت زیادہ نہیں ہوتی۔ اور نماز تہجد وغیرہ کے لئے جاگنا آسان ہوتا ہے جب کہ بائیں کروٹ سونے کی صورت میں دل اپنی جگہ ٹھہرا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے نیند میں غفلت اور استراحت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

(۴) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ نَامَ عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْمَنِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَيْكَ وَوَجَّهْتُ وَجْهِیْ اِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَيْكَ وَاَلْجَاْتُ ظَهْرِیْ اِلَيْكَ رَغْبَةً وَّرَهْبَةً اِلَيْكَ لَا مَلْجَاَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَهُنَّ ثُمَّ مَاتَ تَحْتَ لَيْلَتِهٖ مَاتَ عَلَى الْفِطْرَةِ وَفِیْ رِوَايَةٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِرَجُلٍ يَا فُلَانُ اِذَا اَوَيْتَ اِلٰى فِرَاشِكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوْءَكَ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰى شِقِّكَ الْاَيْمَنِ ثُمَّ قُلِ اللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَيْكَ اِلٰى قَوْلِهٖ اَرْسَلْتَ وَقَالَ فَاِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ مُتَّ عَلَى الْفِطْرَةِ وَاِنْ اَصْبَحْتَ اَصَبْتَ خَيْرًا (متفق علیہ)

"اور حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے بستر پر سوتے وقت دائیں کروٹ پر سوتے اور سونے سے پہلے یہ فرماتے اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَيْكَ وَوَجَّهْتُ وَجْهِیْ اِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَيْكَ وَاَلْجَاْتُ ظَهْرِیْ اِلَيْكَ رَغْبَةً وَّرَهْبَةً اِلَيْكَ لَا مَلْجَاَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے جس شخص نے ان کلمات کو (سونے سے پہلے کہا اور پھر اسی رات میں مرگیا تو وہ دین اسلام پر مرا۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ حضرت براء کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا۔ اے فلاں شخص جب تم اپنے بستر پر آؤ تو پہلے، تم نماز کے وضو جیسا وضو پورا کرو اور پھر اپنی داہنی کروٹ پر لیٹ کر اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ سے اَرْسَلْتَ تک (یعنی مذکورہ بالا) دعا پڑھو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اس رات میں

تمہاری موت واقع ہوگئی تو تم دین اسلام پر مروگے اور اگر تم نے صبح کرلی تو بھلائیوں کو (یعنی بہت زیادہ بھلائیوں کو یا یہ کہ دارین کی بھلائیوں کو پاؤ گے۔" (بخاری ومسلم)

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا فَكَمْ مِمَّنْ لَّا كَافِيَ لَهٗ وَلَا مُؤْوِيَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب اپنے بستر پر تشریف لاتے تو یہ کہتے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا فَكَمْ مِمَّنْ لَّا كَافِيَ لَهٗ وَلَا مُؤْوِيَ۔" (مسلم)

تشریح: دعا کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اس وسیع و عریض دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جو روز مرہ کی تکلیف و پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو تکالیف و پریشانیوں سے محفوظ نہیں رکھتا بلکہ وہ ان پر غالب رہتی ہیں چنانچہ نہ صرف یہ کہ وہ لوگ اپنی روز مرہ کی ضروریات زندگی ہی میں رحمت خداوندی کی التفات سے محروم رہتے ہیں بلکہ قضا و قدر خداوندی کے تحت ان کو سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ بھی میسر نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ کوچوں، بازاروں میں فٹ پاتھ اور سڑکوں پر اور جنگلات و ویرانوں میں اپنی سخت کوش زندگی کی گھڑیاں گزارتے ہیں نہ انہیں گرمی سے بچنے کی راحت نصیب ہوتی ہے اور نہ سردی کی ایذاء تکلیف سے نجات کی کوئی پناہ گاہ۔

⑥ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ فَاطِمَةَ اَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَشْكُوْ اِلَيْهِ مَا تَلْقٰى فِيْ يَدِهَا مِنَ الرُّحٰى وَبَلَغَهَا اَنَّهٗ جَاءَهٗ رَقِيْقٌ فَلَمْ تُصَادِفْهُ فَذَكَرَتْ ذٰلِكَ لِعَائِشَةَ فَلَمَّا جَاءَ اَخْبَرَتْهُ عَائِشَةُ قَالَ فَجَاءَنَا وَقَدْ اَخَذْنَا مَضَاجِعَنَا فَذَهَبْنَا نَقُوْمُ فَقَالَ عَلٰى مَكَانِكُمَا فَجَاءَ فَقَعَدَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهَا حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ قَدَمِهٖ عَلٰى بَطْنِيْ فَقَالَ اَلَا اَدُلُّكُمَا عَلٰى خَيْرٍ مِمَّا سَاَلْتُمَا اِذَا اَخَذْتُمَا مَضْجَعَكُمَا فَسَبِّحَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَاحْمَدَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَكَبِّرَا اَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمَا مِنْ خَادِمٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ (میری زوجہ محترمہ اور نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی) حضرت فاطمہؓ نبی کریم ﷺ کے ہاں اس غرض سے حاضر ہوئیں کہ چکی پیسنے کی وجہ سے ان کے ہاتھ جس زحمت و مشقت میں مبتلا تھے اس کی شکایت آنحضرت ﷺ سے کریں (اور کوئی خدمتگار مانگیں) کیونکہ حضرت فاطمہؓ کو معلوم ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس کچھ غلام آئے ہیں مگر (اس وقت) آپ ﷺ سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی، چنانچہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا (یعنی ان سے کہا کہ جب آنحضرت ﷺ تشریف لائیں تو کہہ دیجئے گا کہ فاطمہ اپنی مشقت و تکلیف کے پیش نظر ایک غلام مانگنے حاضر ہوئی تھیں) پھر جب آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ کا پیغام آپ ﷺ تک پہنچادیا، حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ ہمارے ہاں اس وقت تشریف لائے جب کہ ہم اپنے بستروں پر لیٹ چکے تھے (آپ ﷺ کو دیکھ کر ہم نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "اپنی جگہ پر لیٹے رہو" پھر آپ ﷺ ہمارے نزدیک) تشریف لائے اور میرے اور فاطمہؓ کے درمیان بیٹھ گئے یہاں تک کہ میں نے اپنے پیٹ پر آپ ﷺ کے مبارک قدموں کی ٹھنڈک محسوس کی پھر آپ ﷺ نے فرمایا (مجھے فاطمہ کا پیغام مل گیا ہے) کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتلادوں جو اس چیز (یعنی غلام) سے بہتر ہے جو تم نے مانگی تھی اور وہ یہ کہ جب تم اپنے بستر پر آؤ تو تینتیس بار سُبْحَانَ اللّٰهِ تینتیس بار اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور چونتیس بار اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہو تمہارے لئے خادم سے یہ چیز بہتر ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: چونکہ آنحضرت ﷺ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ دونوں ہی سے بے انتہا محبت فرماتے تھے اور آپ ﷺ کی بے حد شفقت کسی تکلف کو گوارہ نہیں کرتی تھی اسی لئے جب آپ ﷺ ان کے ہاں آئے تو کامل محبت و شفقت کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان

تشریف فرما ہوگئے کیونکہ پیار و محبّت اور شفقت و الفت کسی تکلّف کی پابند نہیں ہوتی اس لئے کہا گیا ہے کہ اِذَا جَآءَتِ الْاُلْفَةُ رُفِعَتِ الْكُلْفَةُ (ترجمہ) جب الفت آئی تو تکلّف اٹھا دی گئی۔

مذکورہ بالا کلمات کی ترتیب کے سلسلہ میں جزریؒ نے شرح مصابیح میں کہا ہے کہ تکبیر پہلے ہے چنانچہ ابن کثیرؒ فرمایا کرتے تھے کہ نمازوں کے بعد تو پہلے سبحان اللہ پڑھنا چاہئے اس کے بعد الحمد للہ اور پھر اللہ اکبر لیکن سوتے وقت پہلے اللہ اکبر ہی پڑھ لینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں علماء لکھتے ہیں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے۔ کہ اللہ اکبر کو کبھی تو پہلے پڑھا جائے اور کبھی بعد میں تاکہ اس بارہ میں منقول دونوں روایتوں ہی پر عمل ہو اور یہی اولی اور زیادہ بہتر ہے۔

ارشاد گرامی "تمہارے لئے یہ چیز خادم سے زیادہ بہتر ہے" کے ذریعہ حضرت فاطمہؓ کو دنیا کی مشقتوں اور تکالیف اور دنیاوی طور پر ناپسندیدہ چیزوں مثلاً مرض و فقر پر صبر کی ترغیب دلائی گئی ہے، نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ شکر کرنے والے مالدار کی بہ نسبت صبر کرنے والا مفلس زیادہ افضل ہے۔

(۷) وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَتْ فَاطِمَةُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسْاَلُهُ خَادِمًا فَقَالَ اَلَا اَدُلُّكِ عَلٰى مَا هُوَ خَيْرٌ مِنْ خَادِمٍ تُسَبِّحِيْنَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَتَحْمَدِيْنَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَتُكَبِّرِيْنَ اللّٰهَ اَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَعِنْدَ مَنَامِكِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہرہؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس مقصد سے حاضر ہوئیں کہ آپ ﷺ سے کوئی خادم مانگیں) لیکن آپ ﷺ سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ جب آنحضرت ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ (حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتا دوں جو خادم سے بہتر ہے۔ (اور وہ یہ ہے) ہر نماز کے بعد اور سوتے وقت سبحان اللہ تینتیس بار اور الحمد للہ تینتیس بار اور اللہ اکبر چونتیس بار پڑھ لیا کرو۔" (مسلمؒ)

تشریح: سونے کے وقت ان تسبیحات کا پڑھنا دن بھر کی مشقت و محنت و کوفت، اور ہر قسم کے رنج و غم کو دور کرتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

صبح و شام کے وقت کی دعا

(۸) عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَصْبَحَ قَالَ اللّٰهُمَّ بِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ اَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيٰى وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ وَاِذَا اَمْسٰى قَالَ اللّٰهُمَّ بِكَ اَمْسَيْنَا وَبِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ نَحْيٰى وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَيْكَ النُّشُوْرُ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب صبح ہوتی تو رسول کریم ﷺ کی زبان اقدس پر یہ دعائیہ کلمات جاری ہوتے اَللّٰهُمَّ بِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ اَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيٰى وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ اور جب شام ہوتی تو آپ ﷺ یہ دعا فرماتے اَللّٰهُمَّ بِكَ اَمْسَيْنَا وَبِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ نَحْيٰى وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَيْكَ النُّشُوْرُ۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

(۹) وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مُرْنِیْ بِشَیْءٍ اَقُوْلُهُ اِذَا اَصْبَحْتُ وَاِذَا اَمْسَيْتُ قَالَ قُلِ اللّٰهُمَّ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّ كُلِّ شَیْءٍ وَمَلِيْكَهُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِی وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهٖ قُلْهُ اِذَا اَصْبَحْتَ وَاِذَا اَمْسَيْتَ وَاِذَا اَخَذْتَ مَضْجَعَكَ (رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا! یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی دعا پڑھنے کا حکم دیجئے جسے

میں صبح کے وقت اور شام کے وقت (بطریق ورد) پڑھ لیا کروں آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ پڑھ لیا کرو اَللّٰھُمَّ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّ کُلِّ شَیْءٍ وَّمَلِیْکَہٗ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَمِنْ شَرِّ الشَّیْطَانِ وَشِرْکِہٖ (نیز آپ ﷺ نے فرمایا) تم اس دعا کو صبح کے وقت پڑھ لیا کرو، شام کے وقت پڑھ لیا کرو اور سونے کے وقت بھی۔" (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

⑩ وَعَنْ اَبَانِ بْنِ عُثْمَانَ قَالَ سَمِعْتُ اَبِیْ یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ یَقُوْلُ فِیْ صَبَاحِ کُلِّ یَوْمٍ وَّمَسَاءِ کُلِّ لَیْلَۃٍ بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَیَضُرُّہٗ شَیْءٌ فَکَانَ اَبَانٌ قَدْ اَصَابَہٗ طَرَفُ فَالِجٍ فَجَعَلَ الرَّجُلُ یَنْظُرُ اِلَیْہِ فَقَالَ لَہٗ اَبَانٌ مَا تَنْظُرُ اِلَیَّ اَمَا اِنَّ الْحَدِیْثَ کَمَا حَدَّثْتُکَ وَلٰکِنِّیْ لَمْ اَقُلْہُ یَوْمَئِذٍ لِیُمْضِیَ اللّٰہُ عَلَیَّ قَدَرَہٗ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَۃَ وَفِیْ رِوَایَتِہٖ لَمْ تُصِبْہُ فُجَاءَۃُ بَلَاءٍ حَتّٰی یُصْبِحَ وَمَنْ قَالَھَا حِیْنَ یُصْبِحُ لَمْ تُصِبْہُ فُجَاءَۃُ بَلَاءٍ حَتّٰی یُمْسِیَ۔

"اور حضرت ابان ابن عثمان کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد مکرم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جو بندہ روزانہ صبح و شام کے وقت یہ کہے بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اور یہ تین مرتبہ کہے تو اسے کوئی چیز ضرر نہیں پہنچائے گی (یعنی اگر کوئی شخص اس دعا کو صبح و شام تین تین بار پڑھ لے تو نہ اسے کوئی چیز ضرر و نقصان پہنچائے گی اور نہ وہ کسی آفت و مصیبت میں مبتلا ہوگا (اور اتفاق کی بات کہ اس وقت) حضرت ابان فالج کی ایک قسم میں مبتلا تھے چنانچہ اس شخص نے جو اس روایت کو سن رہا تھا حضرت ابان کی طرف (بڑی تعجب کی نظروں سے) دیکھنا شروع کیا (کہ یہ کہہ تو یہ رہے ہیں کہ جو شخص اس دعا کو پڑھے اسے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا حالانکہ یہ خود (فالج میں گرفتار ہیں) حضرت ابان نے اس سے کہا "تم میری طرف بنظر تعجب) کیا دیکھ رہے ہو؟ اچھی طرح جان لو، یہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح میں نے بیان کی ہے (یعنی بالکل صحیح ہے) البتہ جس دن میں اس مرض میں مبتلا ہوا اس دن میں نے یہ دعا نہیں پڑھی تھی تاکہ اللہ تعالیٰ نے میرے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا تھا وہ پورا ہو۔ (ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد) اور ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "جو شخص اس دعا کو شام کے وقت پڑھے وہ صبح تک کسی ناگہانی بلاء میں گرفتار نہیں ہوگا اور جو شخص اس کو صبح کے وقت پڑھے وہ شام تک کسی بلائے ناگہانی میں مبتلا نہیں ہوتا""۔

⑪ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ اِذَا اَمْسٰی اَمْسَیْنَا وَاَمْسَی الْمُلْکُ لِلّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ رَبِّ اَسْئَلُکَ خَیْرَ مَا فِیْ ھٰذِہِ اللَّیْلَۃِ وَخَیْرَ مَا بَعْدَھَا وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَا فِیْ ھٰذِہِ اللَّیْلَۃِ وَشَرِّ مَا بَعْدَھَا رَبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکَسَلِ وَمِنْ سُوْءِ الْکِبَرِ اَوِالْکُفْرِ، وَفِیْ رِوَایَۃٍ مِنْ سُوْءِ الْکِبَرِ وَالْکِبْرِ رَبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابٍ فِی النَّارِ وَعَذَابٍ فِی الْقَبْرِ وَاِذَا اَصْبَحَ قَالَ ذٰلِکَ اَیْضًا اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْکُ لِلّٰہِ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَمْ یَذْکُرْ مِنْ سُوْءِ الْکُفْرِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جب شام ہوتی تو نبی کریم ﷺ یہ دعائیہ کلمات فرماتے اَمْسَیْنَا وَاَمْسَی الْمُلْکُ لِلّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ رَبِّ اَسْئَلُکَ خَیْرَ مَا فِیْ ھٰذِہِ اللَّیْلَۃِ وَخَیْرَ مَا بَعْدَھَا وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَا فِیْ ھٰذِہِ اللَّیْلَۃِ وَشَرِّ مَا بَعْدَھَا رَبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکَسَلِ وَمِنْ سُوْءِ الْکِبَرِ اَوِالْکُفْرِ، اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ مِنْ سُوْءِ الْکِبَرِ وَالْکِبْرِ رَبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابٍ فِی النَّارِ وَعَذَابٍ فِی الْقَبْرِ اور جب صبح ہوتی تو آپ ﷺ یہی (مذکورہ بالا دعا) پڑھتے البتہ صبح کے وقت اَمْسَیْنَا وَاَمْسَی الْمُلْکُ لِلّٰہِ کی بجائے اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْکُ لِلّٰہِ پڑھتے اس روایت کو ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے لیکن ترمذی کی روایت میں من سوء الکفر کے الفاظ نہیں ہیں۔"

⑫ وَعَنْ بَعْضِ بَنَاتِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُعَلِّمُھَا فَیَقُوْلُ قُوْلِیْ حِیْنَ

تُصْبِحِيْنَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا فَاِنَّهٗ مَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُصْبِحُ حُفِظَ حَتّٰى يُمْسِيَ وَمَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُمْسِي حُفِظَ حَتّٰى يُصْبِحَ (رواہ ابوداؤد)

"اور نبی کریم ﷺ کی کسی صاحبزادی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں تعلیم دی کہ جب صبح ہو تو یہ دعا پڑھو سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا لہٰذا جس شخص نے صبح کے وقت یہ کلمات کہے (یعنی صبح کے وقت یہ دعا پڑھی) وہ شام تک بلاؤں (اور خطاؤں سے) محفوظ رہتا ہے اور جس شخص نے شام کے وقت یہ کلمات کہے وہ صبح تک محفوظ رہتا ہے۔" (ابوداؤد)

⑬ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ اِلٰى قَوْلِهٖ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ اَدْرَكَ مَافَاتَهٗ فِيْ يَوْمِهٖ ذٰلِكَ وَمَنْ قَالَهُنَّ حِيْنَ يُمْسِيْ اَدْرَكَ مَافَاتَهٗ فِيْ لَيْلَتِهٖ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص صبح کے وقت یہ آیت پڑھے فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (اور یہ آیت) وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ تک (پڑھے) تو اسے وہ چیز حاصل ہو جائے گی جس سے وہ اس دن محروم رہ گیا تھا اور جس نے یہ آیت شام کے وقت پڑھی تو اسے وہ چیز حاصل ہو جائے گی جس سے وہ اس رات میں محروم رہ گیا تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ کے بعد یہ آیت یوں ہے۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ اور اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے "پاکی کے ساتھ اللہ کو یاد کرو (یعنی نماز پڑھو) اس وقت جب کہ تم شام کرتے ہو (یعنی مغرب و عشاء کے وقت) اور اس وقت جب کہ تم صبح کرتے ہو (یعنی فجر کے وقت اور زمین و آسمانوں میں تمام تعریفیں اسی کے لئے ہیں اور پاکی کے ساتھ اللہ کو یاد کرو (یعنی نماز پڑھو) عصر کے وقت اور ظہر کے وقت اللہ تعالیٰ زندے کو مردے سے نکالتا ہے (یعنی بچے کو منی سے اور انڈے سے پیدا کرتا ہے) اور مردے کو زندہ نکالتا ہے (یعنی منی اور انڈے کو جاندار سے نکالتا ہے) اور زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے (یعنی زمین کو خشک ہو جانے کے بعد سرسبز کرتا ہے) اور اسی طرح تم بھی (قبر سے) نکالے جاؤ گے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی اس آیت کو صبح کے وقت پڑھتا ہے تو جو بھی نیک کام یا کوئی ورد وظیفہ وغیرہ اس دن میں فوت ہو جاتا ہے اسے اس کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے اسی طرح اس آیت کو شام کے وقت پڑھنے سے اس رات میں فوت ہو جانے والے کسی بھی نیک کام اور ورد و وظیفہ وغیرہ کا ثواب مل جاتا ہے۔ معالم التنزیل میں منقول ہے کہ حضرت نافع سے ابن ارزق نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا آپ قرآن کریم میں پانچوں نمازوں کا حکم (وقت کے تعین کے ساتھ) پاتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ "ہاں" اور پھر انہوں نے یہ مذکورہ بالا آیت پڑھ کر فرمایا کہ ان آیتوں نے پانچوں نمازوں کو اور ان کے اوقات کو جمع کر دیا ہے۔

⑭ وَعَنْ اَبِيْ عَيَّاشٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَالَ اِذَا اَصْبَحَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ كَانَ لَهٗ عِدْلُ رَقَبَةٍ مِنْ وُلْدِ اِسْمَاعِيْلَ وَكُتِبَ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَحُطَّ عَنْهُ عَشْرُ سَيِّئَاتٍ وَرُفِعَ لَهٗ عَشْرُ دَرَجَاتٍ وَكَانَ فِيْ حِرْزٍ مِنَ الشَّيْطَانِ حَتّٰى يُمْسِيَ وَاِنْ قَالَهَا اِذَا اَمْسٰى كَانَ لَهٗ مِثْلُ ذٰلِكَ حَتّٰى يُصْبِحَ قَالَ حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ فَرَاٰى رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا يَرَى النَّائِمُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَبَا عَيَّاشٍ يُحَدِّثُ عَنْكَ بِكَذَا وَكَذَا قَالَ صَدَقَ اَبُوْ عَيَّاشٍ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوعیاش کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص صبح کے وقت یہ کلمات کہتے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ تو اسے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ایک غلام آزاد کرنے کے ثواب کے بقدر ثواب ملتا ہے اس کے لئے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس کی دس برائیاں دور کی جاتی ہیں اس کے دس درجے بلند کئے جاتے ہیں اور وہ شام کے وقت تک شیطان (بہکانے کے شر) سے پناہ میں رہتا ہے اور جس شخص نے ان کلمات کو شام کے وقت پڑھا تو اس کو صبح تک یہی سعادت حاصل رہتی ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی حماد ابن سلمہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! " ابوعیاشؓ آپ ﷺ کی اس طرح کی حدیث (یعنی مذکورہ بالا حدیث) بیان کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ابوعیاشؓ نے سچ کہا۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

مغرب اور فجر کی نماز کے بعد کی دعا

(۱۵) وَعَنِ الْحَارِثِ بْنِ مُسْلِمِ التَّمِيْمِي عَنْ اَبِيْهِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ اَسَرَّ اِلَيْهِ فَقَالَ اِذَا انْصَرَفْتَ مِنْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ فَقُلْ قَبْلَ اَنْ تُكَلِّمَ اَحَدًا اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ سَبْعَ مَرَّاتٍ فَاِنَّكَ اِذَا قُلْتَ ذٰلِكَ ثُمَّ مُتَّ فِيْ لَيْلَتِكَ كُتِبَ لَكَ جَوَازٌ مِنْهَا وَاِذَا صَلَّيْتَ الصُّبْحَ فَقُلْ كَذٰلِكَ فَاِنَّكَ اِذَا مُتَّ فِيْ يَوْمِكَ كُتِبَ لَكَ جَوَازٌ مِنْهَا۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حارث ابن مسلم تمیمی اپنے والد مکرم سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان (مسلم تمیمیؓ) سے چپکے سے فرمایا کہ "جب تم مغرب کی نماز سے فارغ ہو جاؤ تو تم کسی سے کوئی کلام و گفتگو کرنے سے پہلے سات مرتبہ یہ کہو اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ (اے اللہ مجھے آگ سے پناہ میں رکھ) اور اگر تم اس کلمہ کو کہو اور پھر اس رات میں تمہارا انتقال ہو جائے تو تمہارے لئے آگ سے نجات لکھی جائے گی اور جب تم فجر کی نماز سے فارغ ہو جاؤ اور اسی طرح کہو (یعنی کسی سے کلام کرنے سے پہلے سات مرتبہ اس دعا کو پڑھو) اور پھر اس دن تمہارا انتقال ہو جائے تو تمہارے لئے آگ سے نجات لکھی جائے گی۔" (ابوداؤد)

صبح و شام کے وقت آنحضرت ﷺ کی دعا

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَعُ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ حِيْنَ يُمْسِيْ وَحِيْنَ يُصْبِحُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ الْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَاَهْلِيْ وَمَالِيْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ وَاٰمِنْ رَوْعَاتِيْ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِيْ وَعَنْ يَمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِيْ وَمِنْ فَوْقِيْ وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ يَعْنِي الْخَسْفَ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ صبح اور شام کے وقت یہ دعا پڑھنا نہ چھوڑتے اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ الْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَاَهْلِيْ وَمَالِيْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ وَاٰمِنْ رَوْعَاتِيْ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِيْ وَعَنْ يَمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِيْ وَمِنْ فَوْقِيْ وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ اے اللہ میں تجھ سے دنیا و آخرت کی عافیت مانگتا ہوں یا الٰہی میں تجھ سے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں اور اپنے دین و اپنی دنیا کے امور میں (عیوب اور برائیوں سے) اور اپنے اہل و عیال اور اپنے مال میں سلامتی مانگتا ہوں اے پروردگار میرے عیوب کی پردہ پوشی فرما اور مجھے خوف کی چیزوں سے امن میں رکھ (یعنی میری مصیبت اور بلائیں دور فرما) اور اے اللہ! تو مجھے آگے سے پیچھے سے دائیں سے بائیں سے اوپر سے محفوظ رکھ اور اے اللہ تیری عظمت و کبریائی کے ذریعہ اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ ہلاک کیا جاؤں اچانک نیچے کی جانب سے یعنی زمین میں دھنس جانے سے۔" (ابوداؤد)

صبح و شام کی دعا

(۱۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ اَللّٰهُمَّ اَصْبَحْنَا نُشْهِدُكَ وَنُشْهِدُ حَمَلَةَ عَرْشِكَ وَمَلٰئِكَتِكَ وَجَمِيْعَ خَلْقِكَ اَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ اِلَّا غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا اَصَابَهٗ فِيْ يَوْمِهٖ ذٰلِكَ مِنْ ذَنْبٍ وَاِنْ قَالَهَا حِيْنَ يُمْسِيْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا اَصَابَهٗ فِيْ تِلْكَ اللَّيْلَةِ مِنْ ذَنْبٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص صبح کے وقت یہ دعا پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے وہ تمام گناہ (علاوہ گناہ کبیرہ اور حقوق العباد کے) بخش دیتا ہے جو اس سے اس دن صادر ہوتے ہیں اور وہ دعا یہ ہے اَللّٰهُمَّ اَصْبَحْنَا نُشْهِدُكَ وَنُشْهِدُ حَمَلَةَ عَرْشِكَ وَمَلٰئِكَتِكَ وَجَمِيْعَ خَلْقِكَ اَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ (ترجمہ) اے اللہ ہم نے صبح کی اس حال میں کہ ہم تجھے، تیرے عرش کو اٹھانے والوں کو تیرے فرشتوں کو، اور تیری مخلوقات کو گواہ بناتے ہیں اس بات پر کہ تو اللہ ہے تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو یکتا ہے افعال و صفات میں) تیرا کوئی شریک نہیں اور بلاشبہ محمد ﷺ تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں اور جو شخص ان کلمات کو شام کے وقت کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام وہ گناہ بخش دیتا ہے جو اس سے اس رات میں صادر ہوتے ہیں۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: جملہ مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ میں لفظ من معنی کے اعتبار سے نافیہ کی جگہ استعمال ہوا ہے نیز یہ ممکن ہے کہ اِلَّا غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ میں لفظ اِلَّا زائد ہو چنانچہ جملہ وَاِنْ قَالَهَا الخ سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ لفظ اِلَّا زائد ہے۔

(۱۸) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يَقُوْلُ اِذَا اَمْسٰى وَاِذَا اَصْبَحَ ثَلَاثًا رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُرْضِيَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو مسلمان بندہ شام اور صبح کے وقت تین بار یہ کہے کہ رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا (ترجمہ) میں اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد کے نبی ہونے پر راضی ہوا) تو اللہ تعالیٰ پر از راہ کرم و فضل) یہ لازم ہوگا کہ وہ قیامت کے دن اس بندہ کو راضی کرے (یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اتنا ثواب دے گا کہ وہ راضی اور خوش ہو جائے گا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: بعض روایتوں میں لفظ نبیا ہے اور بعض میں رسولا، لہٰذا مستحب یہ ہے کہ دونوں ہی لفظ پڑھے جائیں یعنی یوں کہا جائے وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا وَّرَسُوْلًا۔

(۱۹) وَعَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَنَامَ وَضَعَ يَدَهٗ تَحْتَ رَأْسِهٖ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَجْمَعُ عِبَادَكَ اَوْ تَبْعَثُ عِبَادَكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَحْمَدُ عَنِ الْبَرَاءِ۔

"اور حذیفہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب سونے کا ارادہ فرماتے (یعنی سونے کے لئے لیٹتے) تو اپنا ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھتے اور یہ دعا پڑھتے اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَجْمَعُ عِبَادَكَ اَوْ تَبْعَثُ عِبَادَكَ (ترجمہ) اے اللہ مجھے اس دن کے عذاب سے بچائیے جب تو اپنے بندوں کو جمع کرے گا یا جب تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا (یعنی قیامت کے دن) یعنی راوی کو شک ہے کہ آپ ﷺ نے تجمع عبادک کہا یا اس کی بجائے تبعث عبادک کہا (ترمذیؒ) امام احمد نے اس روایت کو براءؓ سے نقل کیا۔"

تشریح: اس روایت میں تو یہ ہے کہ "آپ ﷺ دست مبارک سر کے نیچے رکھتے تھے" جب کہ ایک اور روایت میں منقول ہے کہ رخسارۂ مبارک کے نیچے رکھتے تھے لہٰذا ان دونوں روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کی جائے کہ آپ ﷺ اپنے ہاتھ کبھی تو سر کے نیچے

رکھتے ہوں گے اور کبھی رخسارہ مبارک کے نیچے جس راوی نے جو دیکھا اس کو روایت کر دیا یا یہ کہ ہاتھ کا کچھ حصہ تو سر کے نیچے ہوتا ہوگا اور کچھ حصہ رخسارہ کے نیچے لہٰذا جس راوی نے ہاتھ کا کچھ حصہ سر کے نیچے دیکھا اس نے یہ بیان کیا کہ آپ ﷺ اپنے ہاتھ سر کے نیچے رکھتے تھے اور جس راوی نے ہاتھ کا کچھ حصہ رخسارہ کے نیچے دیکھا اس نے رخسارہ کے نیچے رکھنے کو ذکر کیا۔

(۲۰) وَعَنْ حَفْصَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَرْقُدَ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى تَحْتَ خَدِّهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حفصہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب سونے کا ارادہ فرماتے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھتے اور تین مرتبہ کہتے اے اللہ! مجھے اس دن کے عذاب سے بچائیے جب تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا۔" (ابوداؤد)

(۲۱) وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ عِنْدَ مَضْجَعِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ وَكَلِمَاتِكَ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ تَكْشِفُ الْمَغْرَمَ وَالْمَأْثَمَ اَللّٰهُمَّ لَا يُهْزَمُ جُنْدُكَ وَلَا يُخْلَفُ وَعْدُكَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے سونے کے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ وَكَلِمَاتِكَ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ تَكْشِفُ الْمَغْرَمَ وَالْمَأْثَمَ اَللّٰهُمَّ لَا يُهْزَمُ جُنْدُكَ وَلَا يُخْلَفُ وَعْدُكَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ۔" (ابوداؤد)

(۲۲) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِيْنَ يَأْوِيْ اِلٰى فِرَاشِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ ذُنُوْبَهٗ وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ اَوْ عَدَدَ رَمْلِ عَالِجٍ اَوْ عَدَدَ وَرَقِ الشَّجَرِ اَوْ عَدَدَ اَيَّامِ الدُّنْيَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے بستر پر آکر (یعنی سونے کے وقت) تین مرتبہ یہ کلمات پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے چاہے وہ دریا کے جھاگ کے برابر یا عالج کے ریت (کے ذروں) کی تعداد کے برابر یا درخت کے پتوں کے برابر اور یا دنیا کے دنوں کی تعداد کے برابر ہی کیوں نہ ہوں اور وہ کلمات یہ ہیں اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ (یعنی میں اللہ سے بخشش چاہتا ہوں ایسا اللہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور جو زندہ مخلوق کی خبر گیری کرنے والا ہے اور میں اس کے سامنے توبہ کرتا ہوں۔ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "عالج" جو لام کے زیر کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور زبر کے ساتھ بھی، مغربی علاقہ میں ایک جنگل کا نام تھا۔ جہاں ریت بہت زیادہ ہوتی تھی اس حدیث میں ان تمام چیزوں کو بطور مثال بیان کرنے کی غرض یہ بتانا ہے کہ اگر گناہ بہت زیادہ ہوں گے تب بھی بخشے جائیں گے۔

سوتے وقت قرآن کی کوئی سورۃ پڑھنے کی برکت

(۲۳) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَأْخُذُ مَضْجَعَهٗ بِقِرَاءَةِ سُوْرَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ اِلَّا وَكَّلَ اللّٰهُ بِهٖ مَلَكًا فَلَا يَقْرَبُهٗ شَيْءٌ يُؤْذِيْهِ حَتّٰى يَهُبَّ مَتٰى هَبَّ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت شداد ابن اوسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو بھی مسلمان اپنی خوابگاہ میں آکر (یعنی سوتے وقت) قرآن کریم کی کوئی سورت پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایک فرشتہ متعین کر دیتا ہے اور اس فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ ضرر پہنچانے والی چیزوں سے اس بندہ کی حفاظت کی جائے) چنانچہ جب تک کہ وہ جاگ نہیں جاتا ضرر و نقصان پہنچانیوالی کوئی بھی چیز اس کے پاس بھٹکتی بھی نہیں چاہے

وہ جب بھی (یعنی دیر سے یا جلدی) جاگے۔" (ترمذی)

تشریح: حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع روایت ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) جب تم اپنے بستر پر اپنا پہلو رکھو یعنی سونے لگو اور اس وقت سورۂ فاتحہ اور سورۂ قل ھو اللہ پڑھ لو تو (جب تک سوتے رہو گے، موت کے علاوہ ہر چیز سے حفاظت میں رہو گے۔

ہر نماز کے بعد اور سوتے وقت تسبیح، تحمید، تکبیر پڑھنے کی فضیلت

(۲۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَلَّتَانِ لَا یُحْصِیْھِمَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ اَلَا وَھُمَا یَسِیْرٌ وَمَنْ یَعْمَلُ بِھِمَا قَلِیْلٌ یُسَبِّحُ اللّٰہَ فِیْ دُبُرِ کُلِّ صَلَاۃٍ عَشْرًا وَیَحْمَدُہٗ عَشْرًا وَیُکَبِّرُہٗ عَشْرًا قَالَ فَاَنَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعْقِدُھَا بِیَدِہٖ قَالَ فَتِلْکَ خَمْسُوْنَ وَمِائَۃٌ بِاللِّسَانِ وَاَلْفٌ وَخَمْسُ مِائَۃٍ فِی الْمِیْزَانِ وَاِذَا اَخَذَ مَضْجَعَہٗ یُسَبِّحُہٗ وَیُکَبِّرُہٗ وَیَحْمَدُہٗ مِائَۃً فَتِلْکَ مِائَۃٌ بِاللِّسَانِ وَاَلْفٌ فِی الْمِیْزَانِ فَاَیُّکُمْ یَعْمَلُ فِی الْیَوْمِ وَاللَّیْلَۃِ اَلْفَیْنِ وَخَمْسَ مِائَۃِ سَیِّئَۃٍ قَالُوْا وَکَیْفَ لَا نُحْصِیْھِمَا قَالَ یَاْتِیْ اَحَدَکُمُ الشَّیْطَانُ وَھُوَ فِیْ صَلَاتِہٖ فَیَقُوْلُ اُذْکُرْ کَذَا اُذْکُرْ کَذَا حَتّٰی یَنْفَتِلَ فَلَعَلَّہٗ اَنْ لَّا یَفْعَلَ وَیَاْتِیْہِ فِیْ مَضْجَعِہٖ فَلَا یَزَالُ یُنَوِّمُہٗ حَتّٰی یَنَامَ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ دَاؤدَ قَالَ خَصْلَتَانِ اَوْ خَلَّتَانِ لَا یُحَافِظُ عَلَیْھِمَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ وَکَذَا فِیْ رِوَایَتِہٖ بَعْدَ قَوْلِہٖ وَاَلْفٌ وَخَمْسُ مِائَۃٍ فِی الْمِیْزَانِ قَالَ یُکَبِّرُ اَرْبَعًا وَّثَلَاثِیْنَ اِذَا اَخَذَ مَضْجَعَہٗ وَیَحْمَدُ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ وَیُسَبِّحُ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ وَفِیْ اَکْثَرِ نُسَخِ الْمَصَابِیْحِ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ۔

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں جو بھی مرد مسلمان مداومت کے ساتھ اختیار کرتا ہے وہ جنّت میں داخل ہوتا ہے (یعنی وہ شخص جنّت میں نجات پانے والوں کے ساتھ ہوگا) اور جان لو وہ دونوں چیزیں آسان تو بہت ہیں (بایں طور کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں پر عمل کرنا جن لوگوں کے لئے آسان کردے ان کے لئے وہ کوئی مشکل نہیں ہیں) مگر ان پر عمل کرنے والے بہت کم ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ کی توفیق نہ ہونے کے سبب ان پر مداومت کے ساتھ عمل کرنے میں شاذ و نادر ہی ہیں) ان میں سے ایک چیز تو یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد اللہ کو پاکی کے ساتھ یاد کیا جائے یعنی سبحان اللہ پڑھا جائے دس مرتبہ خدا کی حمد کی جائے یعنی الحمد للہ کہا جائے اور دس مرتبہ اللہ اکبر کہا جائے۔ ابن عمرو کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا آپ ﷺ نے ان کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کیا اور فرمایا پس (پانچوں نمازوں کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے) یہ زبان سے کہنے میں تو ڈیڑھ سو ہیں لیکن (اعمال) کے ترازو میں ان کی تعداد ڈیڑھ ہزار ہوگی (بایں طور کہ ہر نیکی پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ اپنے بستر پر آکر (یعنی سونے کے وقت) سبحان اللہ، اللہ اکبر اور الحمد للہ سو مرتبہ کہے (یعنی سبحان اللہ تینتیس بار اور الحمد للہ تینتیس بار اور اللہ اکبر چونتیس بار کہا جائے ان کی مجموعی تعداد سو ہوتی ہے اور یہ زبان میں کہنے سے تو سو بار ہیں لیکن میزان اعمال میں ایک ہزار ہوں گی۔ پس تم میں سے وہ کون ہے جو دن رات میں ڈھائی ہزار برائیاں کرتا ہوگا؟ صحابہؓ نے عرض کیا (جب یہ بات ہے تو پھر) ہم ان چیزوں کی بھلا کیونکر محافظت نہ کریں گے آپ ﷺ نے فرمایا" جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھتا ہوا ہوتا ہے تو اس کے پاس شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز یاد کرو فلاں بات یاد کرو (یعنی اسے نماز کی حالت میں دنیا کی باتیں یا آخرت کی باتیں ایسی جن کا تعلق نماز سے ہوتا نہیں ہے یاد دلاتا رہتا ہے) یہاں تک کہ وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوتا ہے پس ہو سکتا ہے کہ وہ (ان کلمات پر محافظت نہ کرے) اور اسی طرح شیطان اس کی خوابگاہ میں آتا ہے اس کو سلاتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ سو جاتا ہے (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) اور ابوداؤد کی روایت میں بعض الفاظ میں اختلاف ہے چنانچہ ان کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا" دو خصلتیں ایسی ہیں یا دو (دو چیزیں ایسی ہیں) (راوی کو شک ہوا کہ آپ ﷺ نے لفظ خصلتین فرمایا تھا خلتین ویسے دونوں کے معنی ایک ہی ہیں) جنہیں جو بھی بندہ مسلمان اختیار کرتا ہے (یعنی اس روایت میں لا یحصیھما رجل مسلم کے بجائے لا یحافظ

علیھما عبد مسلم ہے) اسی طرح ابوداؤد کی روایت میں والف خمسمائۃ فی المیزان کے بعد یہ الفاظ ہیں کہ تکبیر کہے چونتیس بار جب کہ اپنے بستر پر آئے اور حمد کرے تینتیس بار اور تسبیح کرے تینتیس بار نیز مصابیح کے اکثر نسخوں میں یہ روایت عبداللہ ابن عمرؓ سے منقول ہے یعنی مؤلف مشکوٰۃ نے تو اس روایت کو عبداللہ ابن عمرو بن العاص سے نقل کیا ہے جب کہ مصابیح کے اکثر نسخوں میں اس حدیث کا راوی عبداللہ بن عمرؓ ہیں)۔"

تشریح: پس تم میں سے کون ہے؟ یہ جواب ہے شرط محذوف کا اور اس استفہام میں ایک طرح کا انکار ہے یعنی اس استفہامیہ جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جب ان دونوں چیزوں پر محافظت کی اور اس کے بدلہ میں دن رات میں ڈھائی ہزار نیکیاں حاصل ہوئیں تو ان میں سے ہر نیکی کے بدلہ برائیاں دور کی جاتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں)۔

لہٰذا تم میں سے ایسا کون ہے جو دن رات میں ان نیکیوں سے زیادہ برائیاں کرتا ہے اور جتنی بھی برائیاں کرتا ہو وہ ان نیکیوں کی وجہ سے معاف نہ ہو جاتی ہوں، اس لئے ایسی صورت میں تمہارے لئے یہ بات کیسے بہتر ہو سکتی ہے کہ تم ان دونوں چیزوں پر محافظت نہ کرو، حاصل یہ کہ ان دونوں چیزوں پر عمل کرنے سے نیکیاں برائیوں سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہیں اور پھر نہ صرف یہ کہ وہ برائیاں ان نیکیوں کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں بلکہ نیکیوں کی زیادتی کی وجہ سے درجات بھی بلند ہو جاتے ہیں، لہٰذا تمہیں چاہیے کہ تم پابندی کے ساتھ ان دونوں چیزوں پر عمل کرتے رہو پھر جب صحابہؓ نے ان دونوں چیزوں کا اتنا زیادہ ثواب اور ان کی اتنی فضیلت سنی تو کہنے لگے کہ جب یہ بات ہے تو پھر ہمارے لئے ایسی کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی کہ ہم ان دونوں چیزوں پر محافظت نہ کریں گویا انہوں نے ان چیزوں کے ترک کرنے سے بعید جانا مگر آپ ﷺ نے ان کے اس استبعاد (یعنی بعید جاننے کی) تردید فرمائی کہ شیطان جو انسان کی نیکی کا ازلی دشمن ہے۔ اپنی گھات میں رہتا ہے۔ وہ کب برداشت کرتا ہے کہ کوئی شخص اتنی عظیم سعادت کو حاصل کرلے اس لئے وہ نماز میں وسوسے پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ نماز کے بعد کے اوراد و افکار سے غافل کر دیتا ہے اسی طرح وہ سوتے وقت ذکر سے غافل کر کے سلا دیتا ہے۔

دن اور رات میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے شکر کی ادائیگی

(۲۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ غَنَّامٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ اَللّٰهُمَّ مَا اَصْبَحَ بِيْ مِنْ نِعْمَةٍ اَوْبِاَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ فَقَدْ اَدّٰى شُكْرَ يَوْمِهٖ وَمَنْ قَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ حِيْنَ يُمْسِيْ فَقَدْ اَدّٰى شُكْرَ لَيْلَتِهٖ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن غنامؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص صبح کے وقت یوں کہے اَللّٰهُمَّ مَا اَصْبَحَ بِيْ مِنْ نِعْمَةٍ اَوْبِاَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ تو اس نے اس دن کا شکر ادا کیا اور جس نے ایسے کلمات شام کے وقت کہے اس نے رات کا شکر ادا کیا (شام کے وقت جب یہ دعا پڑھی جائے تو صبح کی بجائے امسی کہا جائے)۔" (ابوداؤد)

تشریح: منقول ہے کہ ایک دن حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ "پروردگار" تیری بہت زیادہ نعمتیں مجھے حاصل ہیں میں ان کا شکر کس طرح ادا کروں! پروردگار! نے فرمایا داؤد! اگر تم نے یہ جانا کہ تمہیں نعمتیں جو حاصل ہیں وہ سب میری ہی طرف سے ہیں تو سمجھ لو کہ تم نے ان کا شکر ادا کیا۔

سوتے وقت کی دعا

(۲۶) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ اِذَا اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰى مُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ اِقْضِ عَنِّى الدَّيْنَ وَاَغْنِنِيْ مِنَ الْفَقْرِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ مَعَ اخْتِلَافٍ يَسِيْرٍ

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے بستر پر تشریف لاتے تو یہ دعا پڑھتے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰى مُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ اِقْضِ عَنِّى الدَّيْنَ وَاَغْنِنِيْ مِنَ الْفَقْرِ (حصن حصین میں ہے کہ یہ دعا سوتے وقت لیٹ کر پڑھی جائے) ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ! امام مسلم نے اس روایت کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔"

(۲۷) وَعَنْ اَبِيْ اَزْهَرَ الْاَنْمَارِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَخَذَ مَضْجَعَهٗ مِنَ اللَّيْلِ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَضَعْتُ جَنْبِيْ لِلّٰهِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ وَاَخْسِأْ شَيْطَانِيْ وَفُكَّ رِهَانِيْ وَاجْعَلْنِيْ فِى النَّدِيِّ الْاَعْلٰى (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابی ازہر انماریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب رات میں اپنے بستر پر آتے تو یہ فرماتے بِسْمِ اللّٰهِ وَضَعْتُ جَنْبِيْ لِلّٰهِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ وَاَخْسِأْ شَيْطَانِيْ وَفُكَّ رِهَانِيْ وَاجْعَلْنِيْ فِى النَّدِيِّ الْاَعْلٰى۔" (ابوداؤد)

تشریح: "رہن" (گروی) سے مراد نفس ہے مطلب یہ کہ میرے نفس کو بندوں کے حق سے آزاد بری الذمہ کر اور میری لغزشوں کو معاف فرما کر اپنے عذاب سے مجھے نجات بخش۔

(۲۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَخَذَ مَضْجَعَهٗ مِنَ اللَّيْلِ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَفَانِيْ وَآوَانِيْ وَاَطْعَمَنِيْ وَسَقَانِيْ وَالَّذِيْ مَنَّ عَلَيَّ فَاَفْضَلَ وَالَّذِيْ اَعْطَانِيْ فَاَجْزَلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ اَللّٰهُمَّ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَمَلِيْكَهٗ وَاِلٰهَ كُلِّ شَيْءٍ اَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب رات میں اپنے بستر پر آتے تو یہ پڑھتے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَفَانِيْ وَآوَانِيْ وَاَطْعَمَنِيْ وَسَقَانِيْ وَالَّذِيْ مَنَّ عَلَيَّ فَاَفْضَلَ وَالَّذِيْ اَعْطَانِيْ فَاَجْزَلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ اَللّٰهُمَّ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَمَلِيْكَهٗ وَاِلٰهَ كُلِّ شَيْءٍ اَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ۔" (ابوداؤد)

بے خوابی دور کرنے کی دعا

(۲۹) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ شَكَا خَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا اَنَامُ اللَّيْلَ مِنَ الْاَرَقِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَوَيْتَ اِلٰى فِرَاشِكَ فَقُلْ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَمَا اَظَلَّتْ وَرَبَّ الْاَرْضِيْنَ وَمَا اَقَلَّتْ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا اَضَلَّتْ كُنْ لِّيْ جَارًا مِّنْ شَرِّ خَلْقِكَ كُلِّهِمْ جَمِيْعًا اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيَّ اَحَدٌ مِّنْهُمْ اَوْ اَنْ يَّبْغِيَ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِالْقَوِيِّ وَالْحَكِيْمُ بْنُ ظُهَيْرٍ الرَّاوِيْ قَدْ تَرَكَ حَدِيْثَهٗ بَعْضُ اَهْلِ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت خالد بن ولیدؓ نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میں بے خوابی کے سبب رات میں سو نہیں پاتا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جب تم بستر پر آؤ تو یہ دعا پڑھو اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَمَا اَظَلَّتْ وَرَبَّ الْاَرْضِيْنَ وَمَا اَقَلَّتْ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا اَضَلَّتْ كُنْ لِّيْ جَارًا مِّنْ شَرِّ خَلْقِكَ كُلِّهِمْ جَمِيْعًا اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيَّ اَحَدٌ

مِنْهُمْ اَوْ اَنْ يَبْغِىَ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی اسناد قوی نہیں ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی حکیم ابن ظہیر کی روایت کو بعض محدثین نے ترک کر دیا ہے۔"

تشریح: حصن حصین میں ہے کہ اس روایت کو طبرانی نے اوسط میں اور ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے لیکن ان کی روایتوں میں لفظ جَمِيْعًا کی بجائے اَجْمَعِيْنَ ہے اور لفظ يَبْغِىَ کی بجائے يَطْغِىَ اور اسی طرح وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ سے آخر تک کے الفاظ ان کی روایت میں نہیں ہیں بلکہ عَزَّ جَارُكَ کے بعد وَتَبَارَ اسْمُكَ ہے اور اسی جملہ پر روایت ختم ہو گئی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

صبح و شام کی دعا

(۳۰) عَنْ اَبِىْ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَصْبَحَ اَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ فَتْحَهٗ وَنَصْرَهٗ وَنُوْرَهٗ وَبَرَكَتَهٗ وَهُدَاهُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِيْهِ وَمِنْ شَرِّ مَا بَعْدَهٗ ثُمَّ اِذَا اَمْسٰى فَلْيَقُلْ مِثْلَ ذٰلِكَ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابومالکؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب صبح ہو تو تم میں سے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ یہ دعا پڑھے اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ فَتْحَهٗ وَنَصْرَهٗ وَنُوْرَهٗ وَبَرَكَتَهٗ وَهُدَاهُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِيْهِ وَمِنْ شَرِّ مَا بَعْدَهٗ اور پھر جب شام ہو تو اسی طرح یہ دعا پڑھے۔" (ابوداؤد)

(۳۱) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِىْ بَكْرَةَ قَالَ قُلْتُ لِاَبِىْ يَا اَبَتِ اَسْمَعُكَ تَقُوْلُ كُلَّ غَدَاةٍ اَللّٰهُمَّ عَافِنِىْ فِىْ بَدَنِىْ اَللّٰهُمَّ عَافِنِىْ فِىْ سَمْعِىْ اَللّٰهُمَّ عَافِنِىْ فِىْ بَصَرِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ تُكَرِّرُهَا ثَلَاثًا حِيْنَ تُصْبِحُ وَثَلَاثًا حِيْنَ تُمْسِىْ فَقَالَ يَا بُنَىَّ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوْبِهِنَّ فَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اَسْتَنَّ بِسُنَّتِهٖ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن ابوبکرہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد صاحب سے کہا کہ اباجان میں سنتا ہوں آپ روزانہ یہ دعا پڑھتے ہیں اَللّٰهُمَّ عَافِنِىْ فِىْ بَدَنِىْ اَللّٰهُمَّ عَافِنِىْ فِىْ سَمْعِىْ اَللّٰهُمَّ عَافِنِىْ فِىْ بَصَرِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اور آپ ﷺ یہ دعا تین مرتبہ صبح کے وقت اور تین مرتبہ شام کے وقت پڑھتے ہیں انہوں نے کہا میرے بیٹے! میں نے رسول کریم ﷺ کو انہیں کلمات کے ذریعے دعا مانگتے سنا ہے لہٰذا میں اسے پسند کرتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کی سُنت کی پیروی کروں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ دعا اور اعمال خیر کا اصل مقصد آنحضرت ﷺ کے حکم کی بجا آوری اور آپ کی سنت کی پیروی ہونا چاہئے نہ کہ جزاء عمل اور قبولیت دعا۔

صبح کے وقت آنحضرت ﷺ کی دعا

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِىْ اَوْفٰى قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَصْبَحَ قَالَ اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْكِبْرِيَاءُ وَالْعَظَمَةُ لِلّٰهِ وَالْخَلْقُ وَالْاَمْرُ وَاللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَمَا سَكَنَ فِيْهِمَا لِلّٰهِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ هٰذَا النَّهَارِ صَلَاحًا وَاَوْسَطَهٗ نَجَاحًا وَاٰخِرَهٗ فَلَاحًا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ذَكَرَهُ النَّوَوِىُّ فِىْ كِتَابِ الْاَذْكَارِ بِرِوَايَةِ ابْنِ السُّنِّىْ

"اور حضرت عبداللہ ابن اوفیؓ کہتے ہیں کہ جب صبح ہوتی رسول کریم ﷺ یہ دعا پڑھتے۔ اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْكِبْرِيَاءُ وَالْعَظَمَةُ لِلّٰهِ وَالْخَلْقُ وَالْاَمْرُ وَاللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَمَا سَكَنَ فِيْهِمَا لِلّٰهِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ هٰذَا النَّهَارِ صَلَاحًا

وَ اَوْسَطَهٗ نَجَاحًا وَّ اٰخِرَهٗ فَلَاحًا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ صبح کی میں نے اور صبح کی ملک نے جو خدا کے لئے تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں اور بزرگی ذات وصفات کی خدا ہی کے لئے ہے اور حکم دن اور رات اور چیزیں دن رات میں آرام پاتی ہیں سب خدا ہی کے لئے ہیں اے اللہ اس دن کے ابتدائی حصہ کو نیکی کا بنا یعنی یہ کہ ہم اسے طاعات میں صرف کریں اور اس کا درمیانی حصہ حاجات کے پورا ہونے کا اور اس کے آخری حصہ کو نجات کا سبب بنا اے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔ اس حدیث کو نووی نے ابن سنی کی روایت کے ساتھ کتاب الاذکار میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے جس دعا کو یا ارحم الراحمین پر ختم کیا جائے وہ جلد قبول ہوتی ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس دعا کو انہیں الفاظ پر ختم کیا۔ حاکم نے مستدرک میں ابوامامہؓ سے بطریق مرفوع بیان کیا ہے کہ یا ارحم الراحمین کہنے والوں پر اللہ تعالیٰ فرشتہ متعین فرما دیتا ہے چنانچہ جو شخص اس جملہ کو تین بار کہتا ہے تو وہ فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ ارحم الراحمین تیری طرف متوجہ ہے جو مانگنا ہے مانگ لو۔

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبْزٰى قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا اَصْبَحَ اَصْبَحْنَا عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ وَكَلِمَةِ الْاِخْلَاصِ وَعَلٰى دِيْنِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى مِلَّةِ اَبِيْنَا اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (رواہ احمد والدارمی)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن ابزیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ صبح کے وقت یہ فرماتے اَصْبَحْنَا عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ وَكَلِمَةِ الْاِخْلَاصِ وَعَلٰى دِيْنِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى مِلَّةِ اَبِيْنَا اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ صبح کی ہم نے دین اسلام پر اور کلمۂ توحید پر کہ وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے اور اپنے نبی محمد ﷺ کے دین پر اور اپنے باپ ابراہیمؑ کے دین پر جو باطن سے بیزار ہو کر دین حق کی طرف متوجہ تھے اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں سے نہیں تھے۔" (احمد، دارمی)

تشریح: "اپنے نبی محمد ﷺ کے دین پر" ان الفاظ سے ظاہری طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ جس طرح دوسروں کی طرف مبعوث فرمائے گئے اسی طرح آپ ﷺ خود بھی اپنی ذات کی طرف مبعوث تھے یا پھر ان الفاظ کے بارہ میں یہ کہا جائے گا کہ آپ ﷺ نے اُمت کو سکھانے کے لئے فرمایا کہ دعا میں اس طرح کہا جائے۔

بَابُ الدَّعَوَاتِ فِي الْاَوْقَاتِ
مختلف اوقات کی دعاؤں کا بیان

جو اذکار یعنی دعائیں وغیرہ شارع سے کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت سے متعلق منقول ہیں ان کو اختیار کرنا اور ان اذکار کو ان کے منقول اوقات میں پورا کرنا ہر شخص کے لئے مسنون ہے اگر ان اذکار کو پابندی کے ساتھ اختیار کیا جائے تو کیا ہی کہنے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم ایک مرتبہ تو ضرور ہی ان کو پورا کیا جائے تاکہ آنحضرت ﷺ کی اتباع کی سعادت حاصل ہو جائے۔

اولاد کو شیطان سے کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَّاْتِيَ اَهْلَهٗ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا فَاِنَّهٗ اِنْ يُّقَدَّرْ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ فِيْ ذٰلِكَ لَمْ يَضُرَّهٗ شَيْطَانٌ اَبَدًا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی یا لونڈی کے پاس صحبت کے لئے آئے

تو دعا پڑھے اگر اس وقت (ان دونوں) مرد عورت کے جماع کے نتیجہ میں فرزند دیا جانا مقدر ہوا (یعنی بچہ پیدا ہوا) تو اس (بچہ) کو شیطان کبھی ضرر نہیں پہنچائے گا اور وہ دعا یہ ہے بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَ جَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا ہم مدد چاہتے ہیں اللہ کے نام کے ساتھ! اے اللہ تو ہمیں جو اولاد، نصیب کرے اسے شیطان سے اور شیطان کو اس سے دور رکھ۔"

تشریح: اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ اکثر لوگ یہ دعا پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی اولاد شیطان کے تصرف اور اس کے ضرر سے محفوظ نہیں رہتی؟ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ "شیطان کبھی ضرر نہیں پہنچائے گا" سے مراد یہ ہے کہ شیطان انہیں کفر کی کھائیوں میں نہیں پھینک سکتا، لہٰذا اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ صحبت کے وقت ذکر اللہ کی برکت سے اولاد خاتمہ بخیر کی سعادت ابدی سے نوازی جاتی ہے۔ یا پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان اس کی اولاد کو آسیب اور صرع (یعنی ہاتھ پاؤں ٹیڑھے) کر دینے یا اسی قسم کی دوسری بلاؤں میں مبتلا کر کے ضرر پہنچانے پر قادر نہیں رہتا۔

حضرت امام جوزیؒ کے قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اس شخص کی اولاد کے دین و اعتقاد پر اثر انداز نہیں ہوتا اور جس طرح کہ شیطان دوسروں کے صحیح اعتقادات اور دینی رجحانات میں نقصان پہنچاتا ہے ان کی بہ نسبت اس شخص کی اولاد کے حق میں اس کا ضرر و نقصان بے اثر رہتا ہے۔

بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ "ضرر پہنچانے" سے مراد یہ ہے کہ شیطان جو پیدائش کے وقت ہر بچہ کی کوکھ میں انگلی مارتا ہے جس کی وجہ سے بچہ روتا چلاتا پیدا ہوتا ہے اس دعا کی وجہ سے وہ زور سے انگلی نہیں مار پاتا۔

شدت فکر و غم کے وقت آپ ﷺ کی دعا

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ عِنْدَ الْكَرْبِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ شدت فکر و غم کے وقت یہ دعا پڑھتے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے جو بزرگ اور بردبار ہے نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے جو پروردگار ہے عرش عظیم کا نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے جو پروردگار ہے آسمانوں کا پروردگار ہے زمین کا اور پروردگار ہے عرش کریم کا۔"

غصہ فرو کرنے کی ترکیب

(۳) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ صُرَدٍ قَالَ اسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَهُ جُلُوْسٌ وَاَحَدُهُمَا يَسُبُّ صَاحِبَهُ مُغْضَبًا قَدِ احْمَرَّ وَجْهُهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي لَاَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ مِنَ الْغَضَبِ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ فَقَالُوْا لِلرَّجُلِ اَلَا تَسْمَعُ مَا يَقُوْلُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّي لَسْتُ بِمَجْنُوْنٍ (متفق علیہ)

"اور حضرت سلیمان بن صردؓ کہتے ہیں کہ ایک (دن) ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ کی مجلس میں دو آدمی آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے ان میں سے ایک آدمی تو دوسرے کو بہت ہی برا بھلا کہہ رہا تھا وہ غصہ میں بھرا ہوا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، نبی کریم ﷺ نے (اس کی یہ کیفیت دیکھ کر) فرمایا "کہ میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص اس کلمہ کو پڑھے تو اس کا غصہ جاتا رہے جو اس پر سوار ہے اور وہ کلمہ یہ ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ (میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے) صحابہؓ نے جب یہ دیکھا کہ

اس شخص نے کلمہ نہیں پڑھا) تو اس سے کہا کیا تم سن نہیں رہے ہو، آنحضرت ﷺ کیا فرما رہے ہیں؟ اس شخص نے کہا کہ "میں کوئی دیوانہ نہیں ہوں"۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غصہ فرو کرنے کا بڑا آسان طریقہ یہ ہے کہ اعوذ باللہ پڑھ لیا جائے اس سے غصہ فرو ہو جائے گا اس حدیث کی بنیاد یہ آیت ہے وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اور اگر تمہیں شیطان بہکا کر اپنے جال میں پھانسے تو اللہ سے پناہ مانگو بلا شبہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

جس شخص کو آنحضرت ﷺ نے یہ کلمہ تعلیم فرمایا وہ علم شریعت کے زیور سے آراستہ نہیں تھا اور دین کی سمجھ سے بالکل کورا تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ کلمہ پڑھنے کے لئے اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دیوانگی میں مبتلا ہو امیں دیوانگی میں مبتلا نہیں ہوں اس لئے یہ کلمہ کیوں پڑھوں اسی لئے جب صحابہؓ نے اس کو آنحضرت ﷺ کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا تو اس نے اس بد فہمی کی بنا پر اس کلمہ کو تو دیوانے پڑھتے ہیں یہی جواب دیا کہ میں دیوانہ نہیں ہوں جو اس کلمہ کو پڑھوں حالانکہ اس نے نہیں سمجھا کہ غصہ بھی شیطان کے بہکانے کا ہی اثر ہوتا ہے جو بسا اوقات دیوانگی کا ہی روپ دھار لیتا ہے اس لئے غصہ کے وقت بھی اس کلمہ کو پڑھنا نافع ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کی طرف اس شخص کی بے اعتنائی کے سلسلہ میں علامہ طیبیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص منافق رہا ہو یا پھر پرلے درجے کا بد خو، اجڈ اور گنوار۔

مرغ فرشتے کو دیکھ کر بانگ دیتا ہے اور گدھا شیطان کو دیکھ کر رینگتا ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعْتُمْ صِيَاحَ الدِّيَكَةِ فَاسْأَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنَّهَا رَأَتْ مَلَكًا وَاِذَا سَمِعْتُمْ نَهِيْقَ الْحِمَارِ فَتَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ فَاِنَّهٗ رَاٰى شَيْطَانًا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم مرغ کو بانگ دیتے سنو تو اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو کیونکہ وہ فرشتے کو دیکھتے ہیں اور جب گدھے کا رینگنا (چلانا) سنو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو۔ وہ شیطان کو دیکھتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ مرغ فرشتے کو دیکھ کر بانگ دیتا ہے اس سے اس وقت تم خدا سے دعا مانگو تاکہ وہ آمین کہے۔ اور تمہارے لئے بخشش چاہے اور جب گدھے کی آواز سنو تو۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھو کیونکہ وہ شیطان کو دیکھ کر رینگتا ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نیک ہستیوں کے آنے کے وقت اللہ کی رحمت اور برکت نازل ہوتی ہے اور لہٰذا اس وقت دعا مانگنی مستحب ہے نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کافروں پر چونکہ اللہ کا غضب اور عذاب نازل ہوتا ہے اس لئے کفار کے سامنے گزرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا مستحب ہے اس خوف سے کہ کہیں ان بدبختوں کی نحوست اور ان کی برائی کے جراثیم اپنے تک نہ پہنچ جائیں۔

سفر کے وقت کی دعا

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اسْتَوٰى عَلٰى بَعِيْرِهٖ خَارِجًا اِلَى السَّفَرِ كَبَّرَ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ فِیْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِلَنَا بُعْدَهٗ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِی الْاَهْلِ وَالْمَالِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَاٰبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِی الْمَالِ وَالْاَهْلِ وَاِذَا رَجَعَ

قَالَهُنَّ وَزَادَ فِيْهِنَّ اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب سفر کے لئے نکلتے اور اونٹ پر سوار ہوجاتے تو پہلے تین بار اللہ اکبر اور پھر یہ پڑھتے سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ فِيْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِلَنَا بُعْدَهٗ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَاٰبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْاَهْلِ پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارا تابعدار بنایا جب کہ ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں اے اللہ! ہم مانگتے ہیں تجھ سے اپنے اس سفر میں نیکی اور تقویٰ ایسا عمل ہے جس سے تو راضی ہوتا ہے (یعنی اسے قبول کرتا ہے) اے پروردگار! آسان کردے ہمارے لئے ہمارے اس سفر کو اور لپیٹ دے ہمارے لئے اس کی درازی کو (یعنی سفر کی طوالت کو جلد ختم کر دے) اے اللہ! سفر میں تو ہی ہمارا نگہبان ہے اور ہمارے گھر والوں کا تو ہی خبر گیراں ہے اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں سفر کی مشقت سے اور بری حالت دیکھنے سے یعنی اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ اپنے اہل و عیال اور اپنے اسباب و مال میں نقصان دیکھ کر غمگین ہوں اور اس سے بری حالت ہو) اور واپسی کی برائی سے اپنے گھر والوں اور اپنے مال میں (یعنی اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ سفر سے واپس آنے کے بعد اپنے گھر والوں اور اپنے مال میں کوئی نقصان دیکھوں اور اس کی وجہ سے میں رنج اٹھاؤں۔ جب آپ ﷺ سفر سے واپس ہوتے تو یہی دعا پڑھتے اور اس میں ان الفاظ کا اضافہ کرتے اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ ہم سفر سے پھرنے والے ہیں سلامتی کے ساتھ اپنے وطن کو توبہ کرنے والے ہیں اپنے رب کی عبادت کرنے والے ہیں اور تعریف کرنے والے ہیں۔" (مسلمؒ)

آنحضرت ﷺ سفر کے وقت کن چیزوں سے پناہ مانگتے تھے

(۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَرْجِسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَفَرَ يَتَعَوَّذُ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَاٰبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَالْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ وَدَعْوَةِ الْمَظْلُوْمِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن سرجسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب سفر کرتے تو پناہ مانگتے، سفر کی مشقت اور محنت سے واپسی سے بری حالت سے (اعمال صالح اور اہل و مال میں) زیادتی کے بعد نقصان سے، مظلوم کی بددعا سے اور واپس آکر) اہل و مال کو بری حالت میں دیکھنے سے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "مظلوم کی بددعا سے" پناہ مانگنے سے مراد یہ ہے کہ درحقیقت آپ ﷺ ظلم سے پناہ مانگتے تھے کہ خدایا مجھے اس بات سے محفوظ و مامون رکھ کہ دانستہ یا نادانستہ کسی پر ظلم نہ کراؤں تاکہ کوئی مظلوم میرے لئے بددعا نہ کرسکے۔

کسی نئی جگہ ٹھہرتے وقت کی دعا

(۷) وَعَنْ خَوْلَةَ بِنْتِ حَكِيْمٍ قَالَتْ، سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ نَزَلَ مَنْزِلًا فَقَالَ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ يَضُرَّهٗ شَيْءٌ حَتّٰى يَرْتَحِلَ مِنْ مَنْزِلِهٖ ذٰلِكَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت خولہ بنت حکیمؓ کہتی ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول کریم ﷺ فرماتے تھے جو شخص کسی نئی جگہ (خواہ سفر کی حالت میں یا حضر میں) آئے اور پھر یہ کلمات کہے تو اس کو کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی یہاں تک کہ وہ اس جگہ سے کوچ کرے۔ (اور وہ کلمات یہ ہیں) اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ پناہ مانگتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات (یعنی اس کے اسماء و صفات یا اس کی کتابوں) کے ذریعہ اس چیز کی برائی سے جو پیدا کی ہے۔" (مسلمؒ)

رات میں ضرر و نقصان سے بچانے والی دعا

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا لَقِيْتُ مِنْ عَقْرَبٍ لَدَغَتْنِی الْبَارِحَةَ قَالَ اَمَا لَوْ قُلْتَ حِيْنَ اَمْسَيْتَ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ تَضُرَّكَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا "یارسول اللہ! میں ایک بچھو کی وجہ سے اذیت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ جس نے گزشتہ رات میں مجھے ڈس لیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا" جان لو اگر تم شام کے وقت یہ کلمات کہہ لیتے تو (بچھو) تمہیں ضرر نہ پہنچاتا اور وہ کلمات یہ ہیں اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔" (مسلمؒ)

تشریح: ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ جو شخص (ان مذکورہ بالا) کلمات کو شام کے وقت تین مرتبہ پڑھ لے تو اسے اس رات میں (کسی بھی زہریلے جانور) کا زہر ضرر نہیں پہنچائے گا، نیز ایک روایت میں ان کلمات کو صبح کے وقت بھی پڑھنا منقول ہے یعنی اگر ان کلمات کو صبح کے وقت پڑھا جائے تو اس دن زہریلے جانوروں سے حفاظت حاصل رہتی ہے۔

حضرت مفضل ابن یسارؓ، جو صحابی ہیں سے منقول ہے کہ جو شخص ان کلمات کو پڑھتا ہے اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے متعین کئے جاتے ہیں جو اس شخص کے لئے بخشش کی دعا کرتے ہیں نیز وہ شخص اگر اسی حالت میں مر جاتا ہے تو شہید مرتا ہے۔

حالت سفر میں صبح کے وقت کی دعا

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا كَانَ فِیْ سَفَرٍ وَاَسْحَرَ يَقُوْلُ سَمِعَ سَامِعٌ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَحُسْنِ بَلَائِهٖ عَلَيْنَا رَبَّنَا صَاحِبْنَا وَاَفْضِلْ عَلَيْنَا عَائِذًا بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب سفر میں ہوتے تو بوقت سحر یہ کہتے! سنی سننے والے نے خدا کی تعریف کو جو میں نے کی اور اس کی نعمتوں کی خوبی کے اقرار کو جو میں نے کیا، اے ہمارے پروردگار ہماری نگہبانی اور (ہم) دوزخ کی آگ سے خدا کی پناہ مانگتے ہوئے۔" (مسلمؒ)

جہاد، حج اور عمرہ سے واپسی کے وقت آپ ﷺ کی دعا

⑩ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَفَلَ مِنْ غَزْوٍ اَوْ حَجٍّ اَوْ عُمْرَةٍ يُكَبِّرُ عَلٰى كُلِّ شَرَفٍ مِنَ الْاَرْضِ ثَلَاثَ تَكْبِيْرَاتٍ ثُمَّ يَقُوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب جہاد یا حج یا عمرہ سے واپسی میں سفر میں ہوتے تو ہر بلند جگہ (مثلاً ٹیلا وغیرہ) پر چڑھتے ہوئے پہلے) تین مرتبہ تکبیر (اللہ اکبر) کہتے اور پھر یہ کلمات فرماتے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کے لئے ملک ہے اور اسی کے لئے حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ہم (اپنے وطن کی طرف) واپس ہونے والے ہیں، توبہ کرنے والے ہیں (اللہ کی) عبادت کرنے والے ہیں (اللہ ہی کے آگے) سر جھکانے والے ہیں، اور اپنے پروردگار کی تعریف کرنے والے ہیں اللہ نے (دین کو پھیلانے کا) وعدہ پورا کیا، اپنے بندہ (محمد) کی مدد کی اور کفار کے گروہوں کو تنہا شکست دی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ سے غزوہ خندق کے موقع پر تائید و نصرت الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ علاوہ یہود قریظہ و

نضیر کے تقریباً دس یا بارہ ہزار کفار مدینہ پر چڑھ آئے تھے اور نبی کریم ﷺ سے جنگ کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر اللہ نے ہوا اور ملائکہ کی جماعت کو کفار کے لشکر پر مسلط کر دیا۔ جس کی وجہ سے جنگ کے بغیر ہی وہ ہلاک و خراب ہو گئے۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر مشرکین کے حق میں آپ ﷺ کی بد دعا

(۱۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَبِی اَوْفٰی قَالَ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ الْاَحْزَابِ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتَابِ سَرِیْعَ الْحِسَابِ اَللّٰھُمَّ اھْزِمِ الْاَحْزَابَ اَللّٰھُمَّ اھْزِمْھُمْ وَزَلْزِلْھُمْ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جنگ احزاب کے دن مشرکین کے لئے بد دعا فرمائی چنانچہ آپ ﷺ بارگارہ حق میں یوں عرض رساں ہوئے۔ اے اللہ نازل کرنے والے کتاب اور جلد لینے والے حساب کے، اے اللہ کفار کے گروہ کو شکست دے اے اللہ ان کو شکست دے اور ان کو ہلا کے رکھدے (یعنی ان کو مقابل میں جمنے نہ دے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

مہمان اور میزبان کے لئے کچھ مسنون باتیں

(۱۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ نَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اَبِیْ فَقَرَّبْنَا اِلَیْہِ طَعَامًا وَوَطْبَةً فَاَکَلَ مِنْھَا ثُمَّ اُتِیَ بِتَمْرٍ فَکَانَ یَاْکُلُہٗ وَیُلْقِی النَّوٰی بَیْنَ اِصْبَعَیْہِ وَیَجْمَعُ السَّبَّابَةَ وَالْوُسْطٰی وَفِیْ رِوَایَةٍ فَجَعَلَ یُلْقِی النَّوٰی عَلٰی ظَھْرِ اِصْبَعَیْہِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰی ثُمَّ اُتِیَ بِشَرَابٍ فَشَرِبَہٗ فَقَالَ اَبِیْ وَاَخَذَ بِلِجَامِ دَابَّتِہٖ اُدْعُ اللّٰہَ لَنَا فَقَالَ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَھُمْ فِیْمَا رَزَقْتَھُمْ وَاغْفِرْ لَھُمْ وَارْحَمْھُمْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ میرے والد کے پاس بطور مہمان تشریف لائے چنانچہ ہم نے کھانا اور (مالیدہ کی مانند ایک چیز) آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کی آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا پھر خشک کھجور پیش کی گئی آپ ﷺ کھجور کھاتے اور اس کی گٹھلی (بائیں ہاتھ کی) انگلیوں کے درمیان ڈالتے جاتے اور اس کے لئے آپ ﷺ اپنی شہادت کی اور بیچ کی انگلی یکجا کئے ہوئے تھے۔ ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ (بائیں ہاتھ کی) اپنی دونوں انگلیوں یعنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کی پشت پر گٹھلیاں ڈالتے جاتے تھے بہرکیف اس کے بعد پانی پیش کیا گیا جسے آپ ﷺ نے پیا پھر میرے والد نے جو آپ ﷺ کی سواری کی لگام پکڑے ہوئے تھے۔ عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دعا فرمائیے چنانچہ آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَھُمْ فِیْمَا رَزَقْتَھُمْ وَاغْفِرْ لَھُمْ وَارْحَمْھُمْ اے اللہ تعالیٰ انہیں جو کچھ روزی رزق دیا ہے اس میں برکت فرما ان کو بخش دے اور ان پر رحم فرما۔" (مسلمؒ)

تشریح: کھجوریں کھاتے ہوئے آپ ﷺ ان کی گٹھلیوں کو اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں پر جمع کرتے جاتے تھے۔ اب ایک روایت تو یہ بتاتی ہے کہ آپ ﷺ گٹھلیاں دونوں انگلیوں کے درمیان رکھتے جاتے تھے اور ایک روایت یہ بتا رہی ہے کہ دونوں انگلیوں کی پشت پر ڈالتے تھے۔ بظاہر اس بات میں اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ذہن میں یہ بات رہے کہ آپ ﷺ گٹھلیوں کو دونوں انگلیوں کے درمیان کبھی رکھتے جاتے ہوں گے اور کبھی دونوں انگلیوں کی پشت پر ڈالتے جاتے ہوں گے، تو ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نظر نہیں آئے گا، اور پھر پشت پر انگلیوں کی، گٹھلیوں کو ڈالنے کی وجہ یہ تھی تاکہ ہاتھ کے اندر کا رخ گٹھلیوں میں لگے ہوئے لعاب وغیرہ سے ملوث نہ ہو کیونکہ اندر کی صفائی اور ستھرائی باہر کی صفائی اور ستھرائی سے اولیٰ ہے۔

یہ حدیث ایسی کئی باتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو مہمان اور میزبان کے لئے مسنون کا درجہ رکھتی ہے۔ مثلاً اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اکابر اور مہمان کی سواری کی رکاب اور لگام کو ازراہ تواضع اور خاطرداری پکڑنا مسنون ہے۔ اسی طرح مہمان کو رخصت کرنے کے لئے مکان کے دروازے یا باہر کچھ دور تک اس کے ساتھ جانا سنت ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ میزبان کے

لئے تو یہ مسنون ہے کہ وہ مہمان سے طلب دعا کرے اور مہمان کے لئے یہ مسنون ہے کہ میزبان کے لئے دعا کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ہلال دیکھنے کے وقت کی دعا

(۱۳) عَنْ طَلْحَۃَ بْنِ عُبَیْدِ اللّٰہِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا رَأَی الْھِلَالَ قَالَ اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہلال (چاند دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے۔ اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ اے اللہ طلوع فرما اور دکھا ہم کو یہ چاند امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کے ساتھ (اے چاند) میرا پروردگار اور تیرا اللہ ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: "ہلال" کہتے ہیں قمری مہینے کی پہلی، دوسری اور تیسری رات کے چاند کو، اس کے بعد کی راتوں کا چاند "قمر" کہلاتا ہے لہٰذا حدیث بالا سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ جب ہلال دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے۔

اس دعا کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ اس مہینے میں ہم امن و ایمان کے ساتھ ہر آفت و مصیبت سے محفوظ و سلامت اور اسلام کے احکام پر ثابت قدم اور مستقیم رہیں اس کے بعد چاند کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے کہ میرا اور تیرا دونوں کا رب اللہ ہی ہے۔ جس طرح میں اس کی ایک مخلوق ہوں اسی طرح تو بھی اس کی ایک مخلوق ہے اس سے گویا ان لوگوں کے اعتقادات کی تردید مقصود ہوتی تھی جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں اور انہیں اپنا معبود اور رب مانتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔

مبتلاء مصیبت کو دیکھ کر پڑھنے کی دعا

(۱۴) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَامِنْ رَجُلٍ رَأَی مُبْتَلًا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا اِلَّا لَمْ یُصِبْہُ ذٰلِکَ الْبَلَاءُ کَائِنًا مَا کَانَ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ وَعَمْرُو بْنُ دِیْنَارٍ الرَّاوِیْ لَیْسَ بِالْقَوِیِّ۔

"اور حضرت عمر ابن خطاب اور حضرت ابوہریرہؓ دونوں کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مبتلاء مصیبت کو دیکھے اور دیکھ کر یہ دعا پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا (یعنی تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ کو اس چیز سے بچایا جس میں تجھے مبتلا کیا اور فضیلت بخشی اپنی بہت سی مخلوقات پر) تو وہ اس مصیبت میں مبتلا نہیں ہوگا وہ جو مصیبت ہو" (ترمذیؒ) اس روایت کو ابن ماجہؒ نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث غریب ہے اور (اس کے ایک راوی عمرو ابن دینار قوی نہیں ہیں)۔"

تشریح: اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص مبتلاء بلا اور مصیبت زدہ کو دیکھ کر یہ دعا پڑھتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا تو وہ اس بلا و مصیبت میں گرفتار نہیں ہوتا چاہے وہ بلاء و مصیبت بدنی ہو، جیسے برص، جزام، بینائی سے محرومی وغیرہ چاہے وہ بلاء دنیوی ہو، جیسے مال و جاہ کی محبت اور دنیا کی ہوس وغیرہ اور خواہ وہ بلاء دینی ہو، جیسے فسق ظلم اور شرک و کفر وغیرہ غرض کہ ہر طرح کے مبتلا کو دیکھ کر یہ دعا پڑھنی چاہیے لیکن علماء نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ اگر کوئی بیماری کی مصیبت میں مبتلا ہو تو اسے دیکھ کر یہ دعا آہستہ سے پڑھنی چاہئے تاکہ وہ بیمار آزردہ خاطر نہ ہو اور اگر کسی ایسے شخص کو دیکھے جو گناہ یا دنیا کی

محبت میں مبتلا ہو تو اسے اس صورت میں یہ دعا بلند آواز سے پڑھنی چاہئے تاکہ اسے اپنے احوال پر ندامت ہو اور وہ اس سے باز آجائے اور اگر یہ دعا بآواز بلند پڑھنے سے کسی فتنہ وفساد کا خوف ہو تو پھر اس صورت میں بھی یہ دعا آہستہ آواز میں پڑھی جائے۔

بازار میں پڑھنے کی دعا اور اس کی فضیلت

(۱۵) وَعَنْ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ دَخَلَ السُّوْقَ فَقَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَ يُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ اَلْفَ اَلْفِ حَسَنَةٍ وَمَحٰى عَنْهُ اَلْفَ اَلْفِ سَيِّئَةٍ وَرَفَعَ لَهٗ اَلْفَ اَلْفِ دَرَجَةٍ وَبَنٰى لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ مَنْ قَالَ فِيْ سُوْقٍ جَامِعٍ يُبَاعُ فِيْهِ بَدَلَ مَنْ دَخَلَ السُّوْقَ۔

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص بازار میں پہنچ کر یہ کلمات پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دس لاکھ نیکیاں لکھتا ہے اس سے دس لاکھ برائیاں دور کرتا ہے، اس کے لئے دس لاکھ درجے بلند کرتا ہے اور اس کے لئے جنت میں گھر بناتا ہے اور وہ کلمات یہ ہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَ يُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اس کے لئے تعریف ہے وہ زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے وہ (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے) زندہ ہے اس کے لئے موت نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے) ترمذی، ابن ماجہ) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے نیز شرح السنۃ میں من دخل السوق (جو شخص بازار میں پہنچ کر) کی بجائے یہ ہے من قال فی سوق جامع یباع فیه (جو بازار میں جہاں خرید وفروخت ہوتی ہو جہاں اکثر چیزیں بکتی ہوں یہ کلمات کہے۔"

تشریح: اتنا زیادہ ثواب ملنے کی وجہ یہ ہے کہ بازار غفلت کی جگہ ہے نیز بازار ایک ایسی جگہ ہے جہاں عام طور پر جھوٹ دغا، مکر وفریب اور چالبازیوں کی کثرت ہوتی ہے پھر یہ کہ بازاروں کو شیطانین کی سلطنت کہا جاتا ہے اس لئے اسی جگہ میں اللہ کو یاد کرنے سے بہت زیادہ ثواب ملتا ہے۔

دنیا کی نعمت پوری نعمت نہیں ہے

(۱۶) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يَدْعُوْ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ تَمَامَ النِّعْمَةِ فَقَالَ اَيُّ شَيْءٍ تَمَامُ النِّعْمَةِ قَالَ دَعْوَةٌ اَرْجُوْ بِهَا خَيْرًا فَقَالَ اِنَّ مِنْ تَمَامِ النِّعْمَةِ دُخُوْلَ الْجَنَّةِ وَالْفَوْزَ مِنَ النَّارِ وَسَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ فَقَالَ قَدِ اسْتُجِيْبَ لَكَ فَسَلْ وَسَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا وَهُوَ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ الصَّبْرَ فَقَالَ سَأَلْتَ اللّٰهَ الْبَلَاءَ فَسَلْهُ الْعَافِيَةَ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دعا مانگتے سنا جو اس طرح کہہ رہا تھا، اے اللہ! میں تجھ سے پوری نعمت مانگتا ہوں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا "پوری نعمت کیا چیز ہے؟ اس شخص نے کہا" یہ دعا ہے جس کے ذریعہ میں زیادہ مال کے حصول کی امید رکھتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نادان" جان لے جنت میں داخل ہونا اور دوزخ سے نجات پانا پوری نعمت ہے۔" نیز آپ ﷺ نے ایک شخص کو دعا مانگتے سنا جو بارگاہ حق میں (ان الفاظ کے ذریعہ) عرض رساں تھا يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (یعنی اے بزرگی اور بخشش کے مالک) آپ ﷺ نے فرمایا "تمہاری دعا قبول کی گئی لہٰذا جو مانگنا ہو" مانگ لو"۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے سنا ایک شخص یہ دعا مانگ رہا تھا "اے اللہ! میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں۔" آپ نے فرمایا "تم تو اللہ تعالیٰ سے بلاء مانگ رہے ہو۔ حالانکہ چاہئے کہ تم اس سے عافیت

مانگو"۔ (ترمذیؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا حاصل یہ ہے کہ وہ شخص دنیا کی نعمت کو "پوری نعمت" سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کے حصول کی دعا مانگ رہا تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسے متنبہ فرمایا کہ دنیا کی نعمت ایسی نعمت نہیں ہے جس کو اس طرح طلب کیا جائے کیونکہ یہ فنا ہو جانے والی ہے پوری نعمت اور حقیقی نعمت تو جنت میں داخل ہونا اور دوزخ سے نجات پانا ہے اس لئے اس نعمت کے حصول کی دعا مانگنی چاہئے۔

حدیث کے آخری جز کا حاصل یہ ہے کہ وہ شخص صبر مانگ رہا تھا ظاہر ہے صبر کی ضرورت مصیبت وبلاء کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اس لئے صبر مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ بالواسطہ بلاء مانگ رہا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا "صبر نہ مانگو کیونکہ اس طرح بلاء کا مانگنا مفہوم ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرو کہ وہ تمہیں تمام مصائب اور تمام بلاؤں سے محفوظ رکھے۔ ہاں اگر کسی مصیبت وبلاء میں مبتلا ہو تو پھر صبر کی طاقت مانگنا اور بلاء و مصیبت پر صبر کرنا چاہئے۔

كفارة المجلس

⑰ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا فَكَثُرَ فِيْهِ لَغْطُهٗ فَقَالَ قَبْلَ اَنْ يَّقُوْمَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ اِلَّا غُفِرَ لَهٗ مَا كَانَ فِیْ مَجْلِسِهٖ ذٰلِكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالْبَيْهَقِیُّ فِی الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی ایسی مجلس میں شریک ہو جہاں بے فائدہ باتیں ہو رہی ہوں اور وہاں سے اٹھنے سے پہلے یہ دعا پڑھے تو اس مجلس میں جو کچھ ہوا وہ اس کے لئے بخش دیا جاتا ہے۔ (دعا یہ ہے) اَللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ (یعنی تو پاک ہے اے الٰہی اور تیری تعریف کے ساتھ تیری پاکی بیان کرتے ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور میں تیرے سامنے توبہ کرتا ہوں)۔" (ترمذی، بیہقی)

تشریح: لفظ "لغط" سے یہاں مراد ایسا کلام ہے اور ایسی بات چیت ہے جس کی وجہ سے گناہ ہوتا ہو اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ "لغط" کے معنی ہیں بے فائدہ کلام، بہرکیف حدیث بالا میں جو دعا ذکر کی گئی ہے اسے "کفارۃ المجلس" کہتے ہیں۔ یعنی جس مجلس میں گناہ یا بے فائدہ باتیں ہوتی ہوں یا ہنسی ٹھٹھا ہوا ہو تو اس دعا کے پڑھنے سے اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو معاف کر دیتا ہے گویا یہ دعا مجلس کی غیر شرعی اور غیر پسندیدہ باتوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔

سوار ہونے کی دعا

⑱ وَعَنْ عَلِیٍّ اَنَّهٗ اُتِیَ بِدَابَّةٍ لِيَرْكَبَهَا فَلَمَّا وَضَعَ رِجْلَهٗ فِی الرِّكَابِ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ فَلَمَّا اسْتَوٰى عَلٰى ظَهْرِهَا قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ثَلَاثًا وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ثَلَاثًا سُبْحَانَكَ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ ثُمَّ ضَحِكَ فَقِيْلَ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ ضَحِكْتَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَنَعَ كَمَا صَنَعْتُ ثُمَّ ضَحِكَ فَقُلْتُ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ ضَحِكْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْجَبُ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ يَقُوْلُ اللّٰهُ يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ غَيْرِیْ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت علیؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ (ایک مرتبہ) ان کی خدمت میں (سواری کا) جانور لایا گیا تاکہ وہ اس پر سوار ہوں چنانچہ انہوں

نے اپنا پاؤں رکاب میں ڈالا (یعنی سوار ہونے کے لئے رکاب میں پاؤں ڈالنے کا ارادہ کیا) تو کہا بسم اللہ پھر جب اس کی پیٹھ پر چڑھے تو کہا الحمد للہ یعنی سواری کی نعمتوں اور اس کے علاوہ دوسری نعمتوں پر اللہ کا شکر ہے۔ اور پھر یہ کلمات پڑھے سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّالَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَالَمُنْقَلِبُوْنَ (یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارا تابعدار کیا جب کہ ہمیں اس کی طاقت حاصل نہیں تھی اور بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف ضرور لوٹ کر جانے والے ہیں) اس کے بعد انہوں نے تین مرتبہ الحمد للہ اور تین بار اللہ اکبر کہہ کر یہ پڑھا سُبْحَانَكَ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ (یعنی اے پروردگار تو پاک ہے، بیشک میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے پس تو مجھے بخش دے بلاشک گناہوں کو تیرے علاوہ کوئی بخشنے والا نہیں ہے) پھر حضرت علیؓ ہنسے ان سے پوچھا گیا کہ "امیرالمؤمنین! آپ کیوں ہنسے ہیں" حضرت علیؓ نے فرمایا "میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا آپ ﷺ نے اسی طرح کیا جس طرح میں نے کیا اور پھر آپ ﷺ ہنسے میں نے عرض کیا! یارسول اللہ! آپ (ﷺ) کس چیز کی وجہ سے ہنسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا پروردگار! اپنے بندہ سے راضی ہوتا ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار میرے لئے گناہوں کو بخش دے۔ چنانچہ جب بندہ پروردگار سے بخشش چاہتا ہے تو پروردگار فرماتا ہے کہ یہ بندہ جانتا ہے کہ گناہوں کو میرے سوا کوئی نہیں بخشتا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: نبی کریم ﷺ تو اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی وجہ سے ہنسے اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ہنسنا آنحضرت ﷺ کی اتباع اور پیروی کی بناء پر تھا۔

دعاء رخصت وو داع

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَدَّعَ رَجُلًا اَخَذَ بِيَدِهٖ فَلَا يَدَعُهَا حَتّٰى يَكُوْنَ الرَّجُلُ هُوَ يَدَعُ يَدَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَقُوْلُ اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَاٰخِرَ عَمَلِكَ وَفِیْ رِوَايَةٍ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِیْ رِوَايَتِهِمَا لَمْ يُذْكَرْ وَاٰخِرَ عَمَلِكَ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کسی شخص (مسافر) کو رخصت کرتے تو آپ ﷺ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ میں لیتے اور اس کے ہاتھ کو اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک کہ وہ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک کو نہ چھوڑ دیتا (یعنی آپ ﷺ بسبب حسن اخلاق و تواضع ایسا کرتے) اور پھر فرماتے اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَاٰخِرَ عَمَلِكَ (ترجمہ) میں نے تیرا دین، تیری امانت اور تیرا آخری عمل اللہ کے سپرد کیا (یعنی میں تیرے دین اور تیری امانت کی حفاظت کا طلبگار ہوں اور خدا کرے تیرا خاتمہ بخیر ہو) اور ایک روایت میں و اخر عملک کی بجائے و خواتیم عَمَلِكَ ہے یعنی تیرے آخری اعمال بھی اللہ کے سپرد کرتا ہوں (دونوں کا مطلب ایک ہی ہے) اس روایت کو ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے لیکن ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایتوں میں "و آخر عملک" کے الفاظ نہیں ہیں)۔"

تشریح: "امانت" سے مراد وہ اموال ہیں جن سے لوگوں کے ساتھ لین دین کیا جاتا ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ "امانت" سے مراد وہ اہل و اولاد ہیں جنہیں مسافر گھر میں چھوڑ کر راہ سفر اختیار کرتا ہے۔

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ الْخَطْمِیِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَسْتَوْدِعَ الْجَيْشَ قَالَ اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَاَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيْمَ اَعْمَالِكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ خطمیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب لشکر کو رخصت کرنے کا ارادہ فرماتے تو دعا فرماتے، میں نے تمہارا دین، تمہاری امانت اور تمہارا آخری عمل اللہ کو سونپا۔"

(۲۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّی اُرِیْدُ سَفَرًا فَزَوِّدْنِی فَقَالَ زَوَّدَکَ اللّٰہُ التَّقْوٰی قَالَ زِدْنِی قَالَ وَغَفَرَ ذَنْبَکَ قَالَ زِدْنِی بِاَبِی اَنْتَ وَاُمِّی قَالَ وَیَسَّرَ لَکَ الْخَیْرَ حَیْثُ مَا کُنْتَ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) میں سفر میں روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں مجھے توشہ عنایت فرمائیے (یعنی میرے لئے دعا فرمائیے تاکہ اس کی برکت سفر میں توشہ کی مانند میرے ساتھ ہو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تقویٰ کو تمہارا توشہ بنائے (یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں پرہیزگاری نصیب کرے کہ یہ راہ آخرت کا توشہ ہے اس نے عرض کیا کہ "آپ (ﷺ) پر میرے ماں باپ قربان، میرے لئے مزید کوئی دعا کیجئے" آپ ﷺ نے فرمایا اور تم جہاں کہیں بھی رہو اللہ تعالیٰ دین و دنیا کی بھلائی کو تمہارے لئے آسان کرے اور اس کی توفیق بخشے" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

(۲۲) وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّی اُرِیْدُ اَنْ اُسَافِرَ فَاَوْصِنِی قَالَ عَلَیْکَ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالتَّکْبِیْرِ عَلٰی کُلِّ شَرَفٍ فَلَمَّا وَلَّی الرَّجُلُ قَالَ اللّٰھُمَّ اَطْوِلَہُ الْبُعْدَ وَھَوِّنْ عَلَیْہِ السَّفَرَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں سفر میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "خدا سے ڈرنے کو اور (راہ سفر میں) ہر بلند جگہ اللہ اکبر کہنے کو اپنے اوپر لازم کرو" پھر جب وہ شخص (آپ ﷺ کے پاس سے واپس ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا "اے اللہ! اس کے لئے سفر کی درازی کو لپیٹ دے (یعنی اس کی دراز مسافت کو مختصر فرما کر سفر کی مشقتوں کو دور کر دے اور اس کے سفر کے تمام امور کو اس پر آسان کردے"۔" (ترمذی)

تشریح: علیک بتقوی اللّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ خوف و خشیت الٰہی اختیار کرو یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، شرک و گناہ اور شبہ کی چیزوں کو ترک کرو اور ایسی چیزوں کو بھی اختیار نہ کرو جو ضرورت و حاجت سے زائد ہوں۔ عبادت و ذکر اللہ میں غفلت اور ماسوی اللہ کے دھیان سے بچو، نیز اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا نہ جانو اور نہ غیر اللہ پر اعتماد کرو۔

سفر میں رات کے وقت آپ ﷺ کی دعا

(۲۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا سَفَرَ فَاَقْبَلَ اللَّیْلُ قَالَ یَا اَرْضُ رَبِّی وَرَبُّکِ اللّٰہُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّکِ وَشَرِّ مَا فِیْکِ وَشَرِّ مَا خُلِقَ فِیْکِ وَشَرِّ مَا یَدِبُّ عَلَیْکِ وَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ اَسَدٍ وَاَسْوَدَ وَمِنَ الْحَیَّۃِ وَالْعَقْرَبِ وَمِنْ شَرِّ سَاکِنِ الْبَلَدِ وَمِنْ وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب سفر کرتے اور رات آتی تو آپ ﷺ یہ فرماتے: (یعنی اے زمین میرا اور تیرا پروردگار اللہ ہے میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں تیری (ذات کی) برائی سے (مثلاً خسف وغیرہ سے) اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر ہے (جیسے پانی یا تجھ سے پیدا ہونے والی ایسی بوٹی وغیرہ جو کسی کو ہلاک کردے) اور اس چیز کی برائی سے جو تجھ میں پیدا کی گئی ہے (جیسے زہریلے جانور اور ہلاک کردینے والی چیزیں اور ان چیزوں کی برائی سے جو تجھ پر چلتی پھرتی ہیں (جیسے حشرات الارض اور حیوانات جو ضرر پہنچاتے ہیں) اور اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیر سے، کالے سانپ سے دوسرے قسم کے سانپوں سے اور بچھو سے اور آبادی میں رہنے والوں کی برائی سے (بعض حضرات کہتے ہیں ان سے مراد جنات ہیں جو ہر آبادی اور ہر زمین میں رہتے ہیں) اور جننے والے کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے کہ جنا گیا (یعنی ابلیس لعین اور اس کی اولاد کی شر سے یا ہر جننے والے اور اس کی اولاد کی شر سے پناہ مانگتا ہوں۔" (ابوداؤد)

جہاد کے وقت آپ ﷺ کی دعا

(۲۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا غَزَا قَالَ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ عَضُدِیْ وَنَصِیْرِیْ بِكَ اَحُوْلُ وَبِكَ اَصُوْلُ وَبِكَ اُقَاتِلُ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ جب جہاد کرتے تو یہ فرماتے اَللّٰھُمَّ اَنْتَ عَضُدِیْ وَنَصِیْرِیْ بِكَ اَحُوْلُ وَبِكَ اُقَاتِلُ۔ اے اللہ تو ہی میرا معتمد علیہ ہے۔ یعنی مجھے ہر معاملہ میں تجھی پر بھروسہ ہے اور تو ہی میرا پروردگار ہے کفار کے مکرو فریب کو دور کرنے کے لئے میں تیری قوت کے ساتھ حیلہ کرتا ہوں (یعنی ان کی طرف جنگ کے لئے متوجہ ہوں) اور تیری ہی قوت کے ساتھ دشمنان دین پر حملہ کرتا ہوں) اور تیری ہی مدد کے ساتھ دین کے ان دشمنوں سے لڑتا ہوں۔" (ترمذی، ابوداؤد)

دشمن کے خوف کے وقت کی دعا

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا خَافَ قَوْمًا قَالَ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ۔ (رواہ احمد والبوداؤد)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جب کسی قوم (دشمن) سے اندیشہ ہوتا تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ اے اللہ ہم تجھ کو دشمن کے مقابل کرتے ہیں یعنی تجھ سے اس بات کی درخواست کرتے ہیں کہ تو ان کی شر سے ہمیں محفوظ رکھ اور ان کے اور ہمارے درمیان حائل ہو اور ہم ان کے شر سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حصن حصین میں لکھا ہے کہ جو شخص دشمن یا کسی اور کے خوف میں مبتلا ہو تو سورۂ لایلاف قریش پڑھنا ہر شرو خوف سے امان کا باعث ہوگا اور یہ عمل مجرب ہے۔

گھر سے نکلتے وقت آپ ﷺ کی دعا

(۲۶) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَیْتِہٖ قَالَ بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ نَزِلَّ اَوْ نَضِلَّ اَوْ نَظْلِمَ اَوْ نُظْلَمَ اَوْ نَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیْنَا رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ دَاوٗدَ وَابْنِ مَاجَۃَ قَالَتْ اُمُّ سَلَمَۃَ مَا خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ بَیْتِیْ قَطُّ اِلَّا رَفَعَ طَرْفَہٗ اِلَی السَّمَاءِ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیَّ۔

"اور اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے گھر سے نکلتے تو یہ دعا پڑھتے بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ نَزِلَّ اَوْ نَضِلَّ اَوْ نَظْلِمَ اَوْ نُظْلَمَ اَوْ نَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیْنَا گھر سے نکلتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ، بھروسہ کیا میں نے اللہ پر اے اللہ! ہم تیری پناہ چاہتے ہیں اس سے کہ پھسلیں (یعنی بلا قصد گناہ میں مبتلا ہو جائیں) یا ہم گمراہ ہوں (یعنی قصداً گناہ کریں) یا ہم ظلم کریں یا ہم پر ظلم کیا جائے یا ہم پھر جہالت میں مبتلا ہوں یا ہمیں جہالت میں مبتلا کیا جائے۔ (احمد، ترمذی، نسائی) نیز امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ حضرت اُمّ سلمہؓ نے کہا رسول اللہ ﷺ جب بھی میرے گھر سے نکلتے آسمان کی طرف اپنی نگاہ اٹھا کر یوں فرماتے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اُضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْھَلَ اَوْ یُجْعَلَ عَلَیَّ (ترجمہ) اے اللہ! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میں گمراہ ہوں یا گمراہ کیا جاؤں (یعنی مجھے کوئی گمراہ کردے) یا میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے یا میں جہالت میں مبتلا ہوں یا مجھے جہالت میں مبتلا کیا جائے۔"

(۲۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا خَرَجَ الرَّجُلُ مِنْ بَیْتِہٖ فَقَالَ بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ یُقَالُ لَہٗ حِیْنَئِذٍ ھُدِیْتَ وَکُفِیْتَ وَوُقِیْتَ فَیَتَنَحّٰی لَہُ الشَّیْطَانُ وَیَقُوْلُ شَیْطَانٌ اٰخَرُ کَیْفَ لَکَ بِرَجُلٍ قَدْ ھُدِیَ وَکُفِیَ وَوُقِیَ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَی التِّرْمِذِیُّ اِلٰی قَوْلِہٖ لَہُ الشَّیْطَانُ۔

"اور حضرت حسنؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص اپنے گھر سے نکلتا ہے اور پھر یہ پڑھتا ہے بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ (یعنی نکلتا ہوں میں اللہ کے نام کے ساتھ بھروسہ کیا میں نے اللہ پر، گناہوں سے بچنے کی طاقت اور عبادت کرنے کی قوت اللہ ہی کی طرف سے ہے تو اس وقت اس سے کہا جاتا ہے (یعنی فرشتہ اسے بتاتا ہے) کہ اے اللہ کے بندے! تجھے راہ راست دکھائی گئی تجھے (جمع مہمات اور تمام امور میں) غیر سے مستغنی کر دیا گیا ہے اور تو (تمام برائیوں سے محفوظ رہا" چنانچہ یہ سن کر شیطان اس سے دور ہو جاتا ہے اور دوسرا شیطان (اس شیطان کی تسلی کے لئے اس سے کہتا ہے کہ تو اس شخص پر کیونکر قابو پا سکتا ہے جسے راہ راست دکھائی گئی جسے غیر سے مستغنی کر دیا گیا جو تمام برائیوں سے محفوظ رہا (ابوداؤد) امام ترمذیؒ نے اس روایت کو لفظ لہ الشیطن تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: "تجھے راہ راست دکھائی گئی"، یعنی چونکہ تو نے خدا کا نام لیا، اسی کی ذات پر توکل و اعتماد کیا اور لاحول پڑھ کر اپنے آپ کو عاجز جانا اس لئے تو نے راہ راست پائی کیونکہ (راہ راست" یہی ہے کہ بندہ خدا کو یاد کرے اور اسی پر اعتماد و توکل کر کے اپنے تمام امور اس کی طرف سونپ دے۔

کار خود راہ بخدا باگزار کت نمی بینم ازیں بہتر کار

امام نوویؒ کی کتاب الاذکار کے مطابق کتاب ابن سنی میں حضرت عمرؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص معاشی تنگی میں مبتلا ہو تو اس کو کون سی چیز اس بات سے روکتی ہے کہ وہ جب گھر سے نکلے تو یہ دعا پڑھ لیا کرے بِسْمِ اللّٰہِ عَلٰی نَفْسِیْ وَمَالِیْ وَدِیْنِیْ اَللّٰھُمَّ رَضِّنِیْ بِقَضَائِكَ وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا قَدَّرْتَ لِیْ حَتّٰی لَا اُحِبَّ تَعْجِیْلَ مَا اَخَّرْتَ وَلَا تَاخِیْرَ مَا عَجَّلْتَ (ترجمہ) میں گھر سے نکلا اللہ کے نام سے جو مالک ہے میری جان، میرے مال اور میرے دین کا اے اللہ! تو مجھے مطمئن کر دے اپنے فیصلہ پر اور تو مجھے برکت دے اس چیز میں جو تو نے میرا مقدر کر دیا ہے یہاں تک کہ میں نہ پسند کروں اس چیز میں عجلت کو جس کو تو نے مؤخر کیا اور نہ چاہوں تاخیر اس چیز میں جس میں تو نے عجلت کو پسند کیا۔

نیز ابن ماجہؒ میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص نماز کے لئے اپنے گھر سے نکلے اور پھر یہ دعا پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف بذات خود متوجہ ہوتا ہے اور ستر ہزار فرشتے اس کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں دعا یہ ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ بِحَقِّ مَمْشَایَ ھٰذَا فَاِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ اَشَرًا وَلَا بَطَرًا وَلَا رِیَآءً وَلَا سُمْعَۃً وَخَرَجْتُ اِتِّقَاءَ سَخَطِكَ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ فَاَسْئَلُكَ اَنْ تُعِیْذَنِیْ مِنَ النَّارِ وَاَنْ تَغْفِرَلِیْ ذُنُوْبِیْ فَاِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ (ترجمہ) اے اللہ! میں درخواست کرتا ہوں تجھ سے اپنے چلنے کے وسیلہ سے اس لئے میں نہیں نکلا تکبر کے ساتھ اور نہ اترا کر اور نہ ریاکاری کے لئے اور نہ نمود کے لئے بلکہ میں تیرے غضب سے ڈر کر اور تیری خوشنودی کی طلب میں اس لئے میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو مجھے دوزخ کی آگ سے اپنی پناہ میں رکھ اور میرے تمام گناہوں کو بخش دے کیونکہ تیرے علاوہ اور کوئی گناہوں کو نہیں بخش سکتا۔

گھر میں داخل ہونے کے وقت کی دعا

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا وَلَجَ الرَّجُلُ بَیْتَہٗ فَلْیَقُلِ اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ الْمَوْلِجِ وَخَیْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰہِ وَلَجْنَا وَعَلَی اللّٰہِ رَبِّنَا تَوَکَّلْنَا ثُمَّ لِیُسَلِّمْ عَلٰی اَھْلِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابومالک اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہو تو اسے چاہئے کہ وہ یہ دعا پڑھے اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ خَیْرَ الْمَوْلِجِ وَخَیْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰہِ وَلَجْنَا وَعَلَی اللّٰہِ رَبِّنَا تَوَکَّلْنَا (یعنی اے اللہ! میں تجھ سے گھر میں داخل ہونے اور گھر سے باہر نکلنے کی بھلائی مانگتا ہوں (یعنی گھر میں آنا اور گھر سے نکلنا خیر و برکت کے ساتھ ہو) اللہ کے نام سے ہم گھر میں داخل ہوئے اور ہم نے اللہ پر کہ وہ ہمارا رب ہے بھروسہ کیا) اس کے بعد اسے چاہئے کہ وہ اپنے گھر والوں کو سلام کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حصن حصین میں یہ دعا ابوداؤد ہی سے نقل کی گئی ہے اس میں بِسْمِ اللّٰہِ وَلَجْنَا کے بعد بِسْمِ اللّٰہِ خَرَجْنَا (اللہ کے نام سے ہم گھر سے نکلے) بھی ہے چنانچہ اصل ابوداؤد کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں بھی یہ جملہ موجود ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ یا تو خود مؤلف مشکوٰۃ علیہ الرحمۃ اس جملہ کو لکھنا بھول گئے ہوں یا پھر کاتب کی غلطی سے یہ جملہ نقل ہونے سے رہ گیا ہو، بہر کیف اس دعا کو پڑھتے وقت اس جملہ کو بھی پڑھنا چاہئے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اپنے گھر میں داخل ہونے اور یہ دعا پڑھنے کے بعد اپنے گھر والوں کو تو سلام کرنا ہی چاہئے جیسا کہ حدیث نے وضاحت کے ساتھ بتایا ہے لیکن اگر گھر میں کوئی موجود نہ ہو تب بھی بہ نیت ملائکہ سلام کر لینا چاہئے کیونکہ وہاں ملائکہ تو بہر صورت ہوتے ہی ہیں اور اس صورت میں اس طرح سلام کرنا چاہئے اَلسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔

دولہا اور دولہن کے لئے دعا

(۲۹) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا رَفَّأَ الْاِنْسَانَ اِذَا تَزَوَّجَ قَالَ بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ وَبَارَکَ عَلَیْکُمَا وَجَمَعَ بَیْنَکُمَا فِیْ خَیْرٍ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص نکاح کرتا اور نبی کریم ﷺ اسے دعا دیتے تو یہ فرماتے بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ وَبَارَکَ عَلَیْکُمَا وَجَمَعَ بَیْنَکُمَا فِیْ خَیْرٍ (یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں مبارک فرمائے اور تم دونوں (یعنی میاں بیوی) کو برکت دے یعنی تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے اور اولاد رزق کی وسعت اور فروانی سے نوازے) اور تم دونوں میں بھلائی جمع کرے (یعنی تمہیں طاعت و عبادت کی توفیق بخشے صحت و عافیت کے ساتھ تمہاری زندگی گزارے تم دونوں میں پیار و محبّت اور حسن سلوک ہمیشہ قائم رکھے تمہاری اولاد کو نیک و صالح بنائے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

نکاح کرنے والے کی دعا

(۳۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا تَزَوَّجَ اَحَدُکُمْ اِمْرَأَۃً اَوِ اشْتَرٰی خَادِمًا فَلْیَقُلْ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ خَیْرَھَا وَخَیْرَ مَا جَبَلْتَھَا عَلَیْہِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّھَا وَشَرِّ مَا جَبَلْتَھَا عَلَیْہِ وَاِذَا اشْتَرٰی بَعِیْرًا فَلْیَاْخُذْ بِذِرْوَۃِ سَنَامِہٖ وَلْیَقُلْ مِثْلَ ذٰلِکَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فِی الْمَرْأَۃِ وَالْخَادِمِ ثُمَّ لْیَاْخُذْ بِنَاصِیَتِھَا وَلْیَدْعُ بِالْبَرَکَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد (حضرت شعیبؒ) سے اور وہ اپنے دادا (یعنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ) سے اور عبداللہ بن عمروؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے یا کوئی غلام خریدے تو وہ یہ دعا پڑھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ خَیْرَھَا وَخَیْرَ مَا جَبَلْتَھَا عَلَیْہِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّھَا وَشَرِّ مَا جَبَلْتَھَا اے اللہ! میں تجھ سے اس (کی ذات) کی بھلائی مانگتا ہوں اور بھلائی اس چیز کی جس پر تو نے ان کو پیدا کیا (یعنی اچھے اخلاق) اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے جس پر تو نے اسے پیدا کیا (یعنی برے اخلاق و افعال) اور جب اونٹ خریدے تو اس کے کوہان کی بلندی کو پکڑ کر

اسی طرح کہے یعنی مذکورہ بالا دعا پڑھے۔" ایک اور روایت میں عورت اور غلام کے بارہ میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "پھر عورت یا غلام کی پیشانی کے بال پکڑ کر خیر و برکت کی دعا کرے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "خیر و برکت کی دعا" سے یہی مذکورہ بالا دعا ہے جیسا کہ حصن حصین سے مفہوم معلوم ہوتا ہے یعنی عورت یا غلام کی پیشانی کے بال پکڑ کر تب یہ دعا پڑھی جائے۔

علامہ جزریؒ فرماتے ہیں کہ صرف اونٹ پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ جو بھی جانور خریدا جائے یہ دعا پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اس جانور میں برکت و ترقی عطا فرمائے گا۔

غم دور کرنے کی دعا

(۳۱) وَعَنْ اَبِی بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَعَوَاتُ الْمَکْرُوْبِ اَللّٰھُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَکِلْنِی اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ وَاَصْلِحْ لِیْ شَأْنِیْ کُلَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "غمزدہ کی دعا جس کو پڑھنے سے غم جاتا رہتا ہے یہ ہے اَللّٰھُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَکِلْنِی اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ وَاَصْلِحْ لِیْ شَأْنِیْ کُلَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اے اللہ! میں تیری رحمت کا طلبگار ہوں پس مجھے ایک لحہ کے لئے بھی میرے نفس کے سپرد نہ کر (کیونکہ وہ میرا بڑا دشمن ہے اور عاجز ہے وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ حاجت روائی کر سکے) اور میرے سارے کاموں کو درست کر دے تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں)۔" (ابوداؤدؒ)

ادائیگی قرض کی دعا

(۳۲) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ ھُمُوْمٌ لَزِمَتْنِی وَدُیُوْنٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَفَلَا اُعَلِّمُكَ کَلَامًا اِذَا قُلْتَہٗ اَذْھَبَ اللّٰہُ ھَمَّكَ وَقَضٰی عَنْكَ دَیْنَكَ قَالَ قُلْتُ بَلٰی قَالَ قُلْ اِذَا اَصْبَحْتَ وَاِذَا اَمْسَیْتَ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَالْجُبْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ غَلَبَۃِ الدَّیْنِ وَقَھْرِ الرِّجَالِ قَالَ فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ فَاَذْھَبَ اللّٰہُ ھَمِّی وَقَضٰی عَنِّی دَیْنِی۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے فکر و غم نے گھیر رکھا ہے اور قرض نے جکڑ رکھا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں ایک ایسی دعا نہ بتا دوں جسے اگر تم پڑھ لیا کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارا فکر دور کر دے قرض کے بارے میں تمہیں نجات دے؟ حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (مجھ سے) کہا کہ میں نے عرض کیا کہ "ہاں ضرور بتائیے! آپ ﷺ نے فرمایا صبح شام دونوں وقت یہ دعا پڑھا کرو۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَالْجُبْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ غَلَبَۃِ الدَّیْنِ وَقَھْرِ الرِّجَالِ اس شخص کا بیان ہے کہ "میں نے ایسا ہی کیا، (یعنی یہ دعا پڑھنے لگا) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری فکر دور فرما دی اور میرے اوپر سے قرض کا بوجھ اتار دیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: عاجزی سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ ادائے طاعت و عبادت اور مصیبت و مشقت کے تحمل پر قادر نہ ہو سکوں اور ان سے عاجز رہوں۔

"بخل" سے مراد یہ ہے زکوٰۃ کفارات اور دوسرے واجبات مالیہ کی ادائیگی کا ترک کرنا، سائل و محتاج کو اپنے در سے نامراد واپس کر دینا مہمان کی ضیافت نہ کرنا، سلام نہ کرنا، اور سلام کا جواب نہ دینا، اگر کوئی علمی سوال کیا جائے یا کوئی دینی مسئلہ پوچھا جائے تو اس کو جانتے ہوئے اور اس کا علم رکھتے ہوئے بھی اس علمی سوال کا جواب نہ دینا اور وہ مسئلہ نہ بتانا۔ اور نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی سن کر درود نہ

پڑھنا۔

نامردی" سے مراد یہ ہے کہ جہاد کے وقت دشمنوں سے ڈر کر مقابلہ کی ہمت ہار بیٹھنا، اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے موقع پر جرأت اور حق گوئی کا مظاہرہ نہ کرنا اور رزق وغیرہ کے معاملہ میں دل سے اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد نہ کرنا۔

(۳۳) وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهُ جَاءَهُ مُكَاتَبٌ فَقَالَ اِنِّي عَجَزْتُ عَنْ كِتَابَتِي فَاَعِنِّي قَالَ اَلَا اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ عَلَّمَنِيْهِنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَ عَلَيْكَ مِثْلُ جَبَلٍ كَبِيْرٍ دَيْنًا اَدَّاهُ اللّٰهُ عَنْكَ قُلْ اَللّٰهُمَّ اكْفِنِي بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِي بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارہ میں منقول ہے کہ ان کے پاس ایک مکاتب آیا اور کہنے لگا کہ میں اپنا بدل کتابت ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں (یعنی مال کتابت ادا کرنے کا وقت آگیا ہے مگر میرے پاس مال نہیں ہے اس لئے آپ (مال و دعا سے) میری مدد کیجئے" حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "کیا تمہیں وہ دعا نہ بتا دوں جو نبی کریم ﷺ نے مجھے سکھائی تھی (کہ جس کی برکت سے) اگر تمہارے اوپر پہاڑ کی مانند بھی قرض ہو تو اللہ تعالیٰ تمہارے ذمہ سے ادا کر دے گا (تو سنو وہ دعا یہ ہے) تم اس کو پڑھ لیا کرو اَللّٰهُمَّ اكْفِنِي بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِي بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ (اے اللہ! مجھے حلال مال کے ذریعہ حرام مال سے بے نیاز کر دے (یعنی مجھے حلال رزق عطا فرما تاکہ اس کی وجہ سے حرام مال سے بے نیاز ہو جاؤں) اور اپنے فضل و کرم کے ذریعہ اپنے ماسوا سے مجھے مستغنی کر دے)۔" (ترمذیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: "مکاتب" اس غلام کو کہتے ہیں جس کا مالک اس سے لکھوا لے کہ جب وہ اتنا مال یا اتنے روپے ادا کر دے گا تو اس وقت وہ آزاد ہو جائے گا اسی طرح "بدل کتابت" اس مال کو کہتے ہیں جس کو ادا کرنے کی ذمہ داری اس مکاتب غلام نے قبول کر لی ہو لہٰذا جب وہ مقررہ مال ادا کر دے گا تو اسی وقت آزاد ہو جائے گا۔

وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ جَابِرٍ اِذَا سَمِعْتُمْ نُبَاحَ الْكِلَابِ فِي بَابِ تَغْطِيَةِ الْاَوَانِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى اور حضرت جابرؓ کی روایت اِذَا سَمِعْتُمْ نُبَاحَ الْكِلَابِ ہم انشاء اللہ باب تغطیۃ الاوانی میں ذکر کریں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

کسی مجلس سے اٹھتے ہوئے پڑھی جانے والی دعا

(۳۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا جَلَسَ مَجْلِسًا اَوْصَلّٰى تَكَلَّمَ بِكَلِمَاتٍ فَسَأَلْتُهُ عَنِ الْكَلِمَاتِ فَقَالَ اِنْ تُكُلِّمَ بِخَيْرٍ كَانَ طَابِعًا عَلَيْهِنَّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَاِنْ تُكُلِّمَ بِشَرٍّ كَانَ كَفَّارَةً لَهُ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ۔ (رواہ النسائی)

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کسی مجلس میں بیٹھتے یا نماز پڑھتے (تو اس مجلس سے اٹھتے ہوئے یا نماز سے فراغت کے بعد) چند کلمات پڑھا کرتے تھے (ایک مرتبہ) میں نے آپ ﷺ سے پوچھا (کہ ان کلمات کو پڑھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اگر ان کلمات سے پہلے مجلس میں نیک باتیں ہوئی ہوں گی تو یہ کلمات (ان نیک باتوں) پر قیامت تک کے لئے مہر ہو جائیں گے (یعنی ان کلمات کو پڑھنے سے وہ نیک باتیں قیامت تک محفوظ رہیں گی کہ ان کا ثواب ضائع نہیں ہوگا) اگر ان کلمات سے پہلے مجلس میں بری باتیں ہوں گی) تو یہ کلمات ان بری باتوں کی معافی اور بخشش کا ذریعہ بن جائیں گے اور وہ کلمات یہ ہیں سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ پاک ہے تو اے اللہ! اور تیری تعریف کے ساتھ تیری پاکی بیان کی جاتی ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور تیرے سامنے توبہ کرتا ہوں۔" (نسائیؒ)

ہلال دیکھ کر کہے جانے والے کلمات

(۳۵) وَعَنْ قَتَادَةَ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا رَأَى الْهِلَالَ قَالَ هِلَالُ خَيْرٍ وَّرُشْدٍ هِلَالُ خَيْرٍ وَّرُشْدٍ هِلَالُ خَيْرٍ وَّرُشْدٍ اٰمَنْتُ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ يَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ ذَهَبَ بِشَهْرِ كَذَا وَجَاءَ بِشَهْرِ كَذَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ ان تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ جب ماہ نو دیکھتے تو یہ کہتے هِلَالُ خَيْرٍ وَّرُشْدٍ هِلَالُ خَيْرٍ وَّرُشْدٍ هِلَالُ خَيْرٍ وَّرُشْدٍ یعنی چاند ہے بھلائی اور ہدایت کا، چاند ہے بھلائی اور ہدایت کا، چاند ہے بھلائی اور ہدایت کا (اسی کے ساتھ یہ کہتے) اٰمَنْتُ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ یعنی (اے چاند) میں اس ذات پاک پر ایمان رکھتا ہوں جس نے تجھے پیدا کیا یہ بھی تین بار فرماتے اور پھر اس کے بعد کہتے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ ذَهَبَ بِشَهْرِ كَذَا وَجَاءَ بِشَهْرِ كَذَا (تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے اس مہینہ کو ختم کیا اور اس مہینہ کی ابتدا کی۔ کذا کی جگہ گزشتہ اور آئندہ مہینہ کا نام لیتے)۔" (ابوداؤد)

تشریح: جیسا کہ دارمی میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے واضح ہے آپ ﷺ ماہ نو کو دیکھ کر پہلے اللّٰہ اکبر کہتے پھر اس کے بعد هِلَالُ خَيْرٍ وَّرُشْدٍ الخ کہتے۔

"چاند ہے بھلائی وہدایت کا" اس جملہ کے بارہ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دعائیہ جملہ ہے یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ "خدایا یہ چاند بھلائی اور ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہو" یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ بطور فال نیک جملہ خبریہ ہی ہے۔

فکر دور کرنے کی دعا

(۳۶) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَثُرَ هَمُّهُ فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ اِنِّىْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ وَفِىْ قَبْضَتِكَ نَاصِيَتِىْ بِيَدِكَ مَاضٍ فِىَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِىَّ قَضَاؤُكَ اَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهُ فِىْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهُ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوْ اَلْهَمْتَ عِبَادَكَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِىْ مَكْنُوْنِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِىْ وَجِلَاءَ هَمِّىْ وَغَمِّىْ مَا قَالَهَا عَبْدٌ قَطُّ اِلَّا اَذْهَبَ اللّٰهُ هَمَّهُ وَاَبْدَلَهُ بِهٖ فَرَحًا۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو بہت زیادہ فکروں نے گھیر رکھا ہو اسے چاہئے کہ وہ یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ وَفِىْ قَبْضَتِكَ نَاصِيَتِىْ بِيَدِكَ مَاضٍ فِىَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِىَّ قَضَاؤُكَ اَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهُ فِىْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهُ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوْ اَلْهَمْتَ عِبَادَكَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِىْ مَكْنُوْنِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِىْ وَجِلَاءَ هَمِّىْ وَغَمِّىْ اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے کا بیٹا ہوں، تیری لونڈی کا بیٹا ہوں تیرے قبضہ میں ہوں، (یعنی تیری ملک اور تیرے تصرف میں ہوں) میری پیشانی کے بال تیرے ہاتھ میں ہیں (تیری مدد کے بغیر مجھے حرکت وسکون کی قوت بھی حاصل نہیں) میرے حق میں تیرا حکم جاری ہے۔ (یعنی تیرے حکم کو توقف اور کوئی روکنے والا نہیں جو تو کہتا ہے اور چاہتا ہے وہی ہوتا ہے میرے بارہ میں تیرا فیصلہ عدل و انصاف ہے (یعنی میرے مقدر میں جو کچھ تو نے لکھ دیا ہے وہی عین انصاف ہے) میں تجھ سے تیرے ہر نام کے وسیلہ سے مانگتا ہوں جسے تو نے اپنی ذات کے لئے اختیار کیا ہے یا اس کو اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اس کو اپنی مخلوقات میں سے کسی کو سکھایا ہے (یعنی کتاب میں ذکر کئے بغیر انبیاء کو الہام کیا ہے) یا تو نے اسے اپنے ہاں پردہ غیب میں اختیار کیا ہے (یعنی وہ تیرے علاوہ کسی کو معلوم نہیں) یہ کہ تو نے قرآن کو میرے دل کی بہار، میری آنکھوں کا نور اور میرے فکر وغم کو دور کرنے والا بنا دے "اس دعا کو جو بھی بندہ پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر غم دور کر دیتا ہے اور اس کے بدلہ خوشی عطا فرماتا ہے"۔ (رزینؒ)

بلندی پر چڑھتے اور اترتے وقت تکبیر و تسبیح پڑھنا

(۳۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا اِذَا صَعِدْنَا كَبَّرْنَا وَ اِذَا نَزَلْنَا سَبَّحْنَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب ہم بلندی پر چڑھتے تو اللہ اکبر کہتے اور جب اترتے تو سبحان اللہ کہتے۔" (بخاریؒ)

غم دور کرنے کی دعا

(۳۸) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا كَرَبَهٗ اَمْرٌ يَقُوْلُ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ بِمَحْفُوْظٍ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو جب معاملہ غمگین کرتا تو آپ ﷺ یہ فرماتے۔ یَا حَيُّ یَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ یعنی اے زندہ! اے قائم رکھنے والے (مخلوق کو) میں تیری رحمت کے ذریعہ فریاد رسی چاہتا ہوں" اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔ اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔ محفوظ نہیں ہے۔"

تشریح: اس روایت کو حاکم اور ابن سنی نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔ نیز حاکم اور نسائی نے اسے حضرت علیؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ وَيُكَرِّرُ وَهُوَ سَاجِدٌ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ یعنی آپ ﷺ سجدہ میں یاحی یاقیوم بار بار کہتے۔

(۳۹) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قُلْنَا يَوْمَ الْخَنْدَقِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ مِنْ شَيْءٍ نَقُوْلُهٗ وَقَدْ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ قَالَ نَعَمْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَوْعَاتِنَا قَالَ فَضَرَبَ اللّٰهُ وُجُوْهَ اَعْدَائِهٖ بِالرِّيْحِ وَهَزَمَ اللّٰهُ بِالرِّيْحِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ خندق کے دن ہم نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! کیا کوئی ذکر و دعا ہے جسے ہم پڑھیں اور کامیاب ہوں" کیونکہ ہمارے دل گردن کو پہنچ گئے ہیں (یعنی انتہائی دشواریوں اور مشقتوں نے ہمیں گھیر لیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اور وہ یہ ہے اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَوْعَاتِنَا یعنی اے اللہ! ہمارے عیوب کی پردہ پوشی فرما اور ہمیں خوف سے امن میں رکھ! حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے منہ پر ہوا کے تھپیڑے مارے اور ہوا ہی کے ذریعہ انہیں شکست دی۔" (احمدؒ)

تشریح: "خندق" "کے دن" سے مراد غزوہ خندق ہے جسے غزوۂ احزاب بھی کہتے ہیں اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بایں طور اپنی مدد و نصرت سے نوازا کہ ہوا کے تیز و تند تھپیڑے (دشمنان دین پر مسلط کر دیئے جنہوں نے ان کی ہانڈیاں الٹ دیں، ان کے خیمے اکھاڑ ڈالے اور انہیں طرح طرح کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر کے تباہ و برباد کر دیا۔

بازار میں آنحضرت ﷺ کی دعا

(۴۰) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ السُّوْقَ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ السُّوْقِ وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُصِيْبَ فِيْهَا صَفْقَةً خَاسِرَةً۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بازار میں آتے تو یہ دعا پڑھتے۔ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ السُّوْقِ وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُصِيْبَ فِيْهَا صَفْقَةً خَاسِرَةً آیا میں اللہ کے نام کے ساتھ! اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں بھلائی اس بازار کی (یعنی حلال رزق میسر ہو اور اس میں نفع و برکت ہو) اور اس چیز کی بھلائی جو اس میں ہے (یعنی لوگ) اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے جو اس میں ہے (یعنی فاسد خرید و فروخت اور

نقصان اور فاسد لوگ) اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ اس بازار میں کسی نقصان وہ معاملہ سے دوچار ہوں۔" (بیہقی)

بَابُ الْاِسْتِعَاذَةِ

پناہ مانگنے کا بیان

اس باب میں ان دعاؤں پر مشتمل احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں اکثر غیر پسندیدہ، غیر شرعی اور نقصان دہ چیزوں اور شیطان کے مکرو فریب سے اللہ رب العزت کی پناہ مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ کلام اللہ پڑھنے سے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ پڑھنا افضل ہے یا اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ اکثر حضرات کہتے ہیں کہ اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ پڑھنا افضل ہے کیونکہ قرآن کریم سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ تاہم احادیث و آثار سے چونکہ اعوذ باللہ پڑھنا بھی ثابت ہے اس لئے اس کو پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بلاء، بدبختی، بری تقدیر، اور دشمن کی خوشی سے خدا کی پناہ مانگو

① عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰہِ مِنْ جَھْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بلاء کی مشقت سے بدبختی کے پہنچنے سے، بری تقدیر سے اور دشمنوں کے خوش ہونے سے۔ اللہ کی پناہ مانگو"۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "بلاء" اس حالت کو کہتے ہیں جس میں انسان امتحان و آزمائش کے سخت کوش مرحلہ سے دوچار اور فتنہ دین و دنیا کی گھٹائیوں اور دشواریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ "جہد" کے معنی ہیں "مشقت و غایت" لہٰذا جہد البلاء وبلاء کی مشقت) سے مراد دین و دنیا کی وہ مصیبتیں ہیں جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے اور وہ نہ صرف ان کو دور کرنے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ ان مصیبتوں کے آنے پر بھی صبر نہیں کر سکتا۔

"بری تقدیر" سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کے حق میں بری اور ناپسندیدہ ہو، اسی طرح دشمن کی خوشی سے پناہ مانگنے سے مراد یہ ہے کہ دین و دنیا کی کسی بھی ایسی مصیبت میں مبتلا نہ ہونے پائے جس سے دشمن خوش ہوتا ہو۔ بہرکیف اس حدیث میں جن چیزوں سے پناہ مانگنے کے لئے فرمایا جا رہا ہے اس میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس حدیث کے ذریعہ ایک ایسی جامع دعا کی طرف راہنمائی کی گئی ہے جو تمام دینی اور دنیوی مقاصد و مطالب پر حاوی ہے۔

آنحضرت ﷺ کن چیزوں سے پناہ مانگتے تھے

② وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضَلَعِ الدَّیْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضَلَعِ الدَّیْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ فکر سے، غم سے، عاجز ہونے سے، سستی سے، نامردی سے، بخل سے، قرض کے بوجھ سے اور لوگوں (یعنی ظالموں) کے غلبہ سے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَالْمَغْرَمِ وَالْمَأْثَمِ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ وَفِتْنَةِ النَّارِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْغِنٰى وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِمَاءِ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِي كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ بارہ گاہ رب العزت میں یوں عرض کیا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَالْمَغْرَمِ وَالْمَأْثَمِ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ وَفِتْنَةِ النَّارِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْغِنٰى وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِمَاءِ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِي كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں، طاعت میں سستی سے، بڑھاپے (کے سبب سے مغبوط الحواس اور اعضاء کے ناکارہ ہونے) سے تاوان یا قرض سے اور گناہ سے، اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں آگ کے عذاب سے اور عذاب کے فتنہ سے۔ قبر کے فتنہ اور قبر کے عذاب سے، دولت کے فتنہ سے اور برائی سے، فقر کے فتنہ کی برائی سے اور کانے دجال کے فتنہ سے اے اللہ! برف اور اولے کے پانی سے میرے گناہ دھودے (یعنی طرح طرح مغفرتوں کے ذریعہ مجھے گناہوں سے پاک کردے جس طرح برف اور اولے کا پانی میل کچیل کو صاف کرتا ہے اور میرے دل کو (برے اخلاق اور برے خیالات سے) پاک کردے جس طرح سفید کپڑا پانی سے صاف کیا جاتا ہے اور میرے گناہوں کے درمیان اسی طرح بعد پیدا کردے جس طرح تونے مشرق اور مغرب کے درمیان بعد پیدا کیا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "پناہ مانگتا ہوں آگ کے عذاب سے" کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میرا شمار ان لوگوں میں ہو جو دوزخی ہیں یا کفار۔

اس موقع پر یہ بات جان لینی چاہئے کہ "عذاب الٰہی" میں صرف کفار ہی مبتلا ہوں گے چنانچہ موحدین جو اپنی بدعملیوں کی سزا آخرت میں پائیں گے اسے "عذاب نہیں کہا جاتا بلکہ وہ" "تادیب" ہے یعنی اگر ان کو دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے گا اور ایسا عذاب کے لئے نہیں بلکہ "تادیب" یعنی ان کے گناہوں کو دھونے اور ختم کرنے کے لئے ہوگا۔

"آگ کے فتنہ" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو آگ اور قبر کے عذاب کا باعث بنتی ہیں یعنی گناہ و معصیت۔

"قبر کے فتنہ" سے مراد ہے منکر و نکیر کے سوالات کا جواب دیتے وقت حواس باختہ ہونا۔

"قبر کے عذاب" سے مراد ہے، فرشتوں کا، ان لوگوں کو لوہے کے گرزوں سے مارنا اور ان کا عذاب میں مبتلا ہونا۔ جو منکر نکیر کے سوالات کا جواب نہ دے سکیں گے "قبر" سے مراد ہے عالم برزخ چاہے وہ قبر ہو یا کچھ اور ہو دولت کے فتنہ سے مراد ہے تکبر و سرکشی کرنا مال و زر حرام ذرائع سے حاصل کرنا اور ان کو گناہ کی جگہ خرچ کرنا اور مال و جاہ پر بے جا فخر کرنا اسی طرح فخر کے فتنے سے مراد ہے۔ دولت مندوں پر حسد کرنا، ان کے مال و زر کی ہوس اور طمع رکھنا، اس چیز پر راضی نہ ہونا جو اللہ نے اس کی قسمت میں لکھ دی ہے یعنی فقر اور اسی قسم کی وہ تمام چیزیں جو صبر و توکل اور قناعت کے منافی ہیں۔

اب آخر میں یہ بات بطور خاص ذہن نشین کر لیجئے۔ کہ آنحضرت ﷺ کا ان تمام چیزوں سے پناہ مانگنا اس کے معنی میں نہیں تھا کہ نعوذ باللہ آپ ﷺ ان چیزوں میں مبتلا تھے، یا ان میں مبتلا ہونے کا خوف تھا۔ کیونکہ آپ ﷺ معصوم تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دائمی طور پر ان تمام چیزوں سے امن و حفاظت میں رکھا تھا بلکہ ان چیزوں سے پناہ مانگنا تعلیم اُمت کے طور پر تھا کہ اُمت کے لوگ ان چیزوں سے پناہ مانگیں اور ان سے بچیں۔

(۴) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ

وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْهَرَمِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوَاهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ کہتے ہیں "کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْهَرَمِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوَاهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتاہوں عاجزی (یعنی طاعت پر قادر نہ ہو کر) اچھے کاموں میں سستی سے، نامردی سے، بخل سے، بڑھاپے (کے سبب اعضاء کے ناکارہ اور حواس باختہ ہونے) سے اور قبر کے عذاب (یعنی قبر کی تنگی، وہاں کی وحشت گرزوں سے مارے جانے سے، بچھوؤں کے ڈنگ مارنے، سانپوں کے ڈسنے اور اسی قسم کی دوسری ہولناکیوں) سے اے اللہ! میرے نفس کو اس کی پرہیزگاری عطا کر اور اس کو پاک کر، کیونکہ اس کو پاک کرنے والوں میں تیری ہی ذات بہترین ہے تو ہی اس کا کارساز اور مالک ہے۔ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتاہوں اس علم سے جو نفع بخش نہ ہو۔ اس دل سے جو نہ ڈرے (یا اسے ذکر اللہ سے تسکین نہ ہو) اس نفس سے جو سیر نہ ہو (یعنی حریص ہو اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس پر قناعت نہ کرے اور اس دعا سے جو مرتبہ قبولیت کو نہ پہنچے۔" (مسلمؒ)

تشریح: غیر نفع بخش علم سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس علم سے پناہ مانگتاہوں جس پر عمل نہ کروں جو دوسروں کو نہ سکھاؤں اور جو اخلاق و افعال کو نہ سدھارے، یا پھر اس سے وہ علم مراد ہے جو دین کے لئے ضروری نہ ہو اس طرح وہ علم بھی مراد ہو سکتا ہے جس کو حاصل کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔

حضرت ابوطالب مکی فرماتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت ﷺ نے شرک، نفاق، اور برے افعال سے پناہ مانگی ہے اسی طرح آپ ﷺ نے علم کی (اس ایک قسم سے پناہ مانگی (جو اسلامی عقائد و اعمال کے نقطۂ نظر سے مضر ہے اور جو انسان کو تقویٰ اور خوف آخرت کی راہ پر لگانے کی بجائے دنیا کی حرص و محبت کے راستہ پر لے جائے) چنانچہ جس علم کے ساتھ تقویٰ اور خوف آخرت نہ ہو وہ دنیا کے دروازوں میں سے ایک دروازہ اور دنیاداری کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔

⑤ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی ہوتی تھی۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ اے اللہ میں تیری پناہ مانگتاہوں تیری نعمت کے جاتے رہنے سے (اور نعمت سے مراد ایمان و اسلام و نیکیاں اور عرفان ہے) تیری عافیت کی تبدیلی سے (مثلاً صحت کے بدلے بیماری اور غنا کے بدلے محتاجگی ہو جانے سے) تیرے ناگہانی عذاب سے اور تمام غصوں سے۔" (مسلمؒ)

⑥ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَالَمْ اَعْمَلْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَالَمْ اَعْمَلْ اے اللہ میں تیری پناہ مانگتاہوں اس کام کی برائی سے جو میں نے کیا اور اس کام کی برائی سے جو میں نے نہیں کیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ میں نے جو برے کام کئے ہیں ان سے بھی پناہ مانگتاہوں بایں معنی کہ ان کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤں اور وہ برے کام معاف فرما دیئے جائیں اور جو کام نہیں کئے ہیں ان سے بھی پناہ مانگتاہوں بایں معنی کہ آئندہ ایسا کوئی کام نہ کروں جو تیری

ناراضگی وخوشی کا باعث ہویا یہ کہ برے کاموں کے ترک کو اپنا کمال نہ سمجھوں بلکہ اسے صرف تیرا فضل جانوں۔

(۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِعِزَّتِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ مِنْ اَنْ تُضِلَّنِىْ اَنْتَ الْحَىُّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ يَمُوْتُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِعِزَّتِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ مِنْ اَنْ تُضِلَّنِىْ اَنْتَ الْحَىُّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ يَمُوْتُوْنَ اے اللہ! میں نے تیری اطاعت کی، میں تجھی پر ایمان لایا، میں نے تجھی پر توکل کیا، میں نے تیری ہی طرف رجوع کیا (یعنی گناہوں کو چھوڑ کر تیری ہی طاعت کی طرف متوجہ ہوا)، اور میں تیری مدد سے (کافروں سے) لڑتا ہوں۔ اے اللہ میں تیری عزت کے واسطے سے تیری پناہ مانگتا ہوں تیرے سوا کوئی معبود نہیں، اس سے کہ گمراہ کرے تو مجھ کو تو زندہ ہے ایسا کہ تو نہیں مرے گا اور تمام جن و انسان مریں گے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

(۸) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْاَرْبَعِ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دُعَاءٍ لَا يُسْمَعُ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَالنَّسَائِىُّ عَنْهُمَا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ یوں دعا مانگتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْاَرْبَعِ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دُعَاءٍ لَا يُسْمَعُ اے اللہ! میں چار چیزوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے اس دل سے جو عاجزی نہ کرے اس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اس دعا سے جو قبول نہ کی جائے۔ (احمد، ابوداؤد، وابن ماجہ) نیز اس روایت کو ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے اور نسائی نے (حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ) دونوں سے روایت کیا ہے۔"

(۹) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنْ خَمْسٍ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَسُوْءِ الْعُمُرِ وَفِتْنَةِ الصُّدُوْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ پانچ چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے (۱) نامردی سے۔ (۲) بخل سے۔ (۳) عمر کی برائی سے (یعنی عمر کی اتنی زیادتی سے کہ آخر میں قویٰ اور حواس میں فرق آجائے اور عبادت وطاعت کی قوت نہ رہے۔ (۴) سینہ کے فتنہ سے (یعنی اس چیز سے کہ سینہ کے اندر برے اخلاق اور برے عقائد جاگزین ہوں یا حق بات قبول نہ ہو اور بلاؤں کا متحمل نہ ہو) اور (۵) قبر کے عذاب سے۔" (ابوداؤد، نسائی)

(۱۰) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفَقْرِ وَالْقِلَّةِ وَالذِّلَّةِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا کرتے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفَقْرِ وَالْقِلَّةِ وَالذِّلَّةِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں، محتاجگی سے، قلت سے ذلت سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں کسی پر ظلم کروں یا کوئی مجھ پر ظلم کرے۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "محتاجگی" سے مراد دل کی محتاجگی ہے یعنی دل مال وزر جمع کرنے کا حریص ہو، یا اس سے مراد مال کی محتاجگی (افلاس) ہے کہ اس کی وجہ سے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے، لہٰذا حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے محتاجگی کے فتنہ سے پناہ مانگی خواہ وہ دل کی محتاجگی ہو یا مال کی۔

قلت سے مراد نیکیوں کی قلت (کمی) ہے مال وزر کی قلت مراد نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ تو خود مال وزر میں قلت و کمی رکھتے تھے۔ اور مال کی کثرت و زیادتی کو ناپسند فرماتے تھے، یا پھر قلت سے مال کی اتنی قلت مراد ہے کہ وہ قوت لایموت (بقدر بقاء زندگی غذا) کے لئے بھی کافی نہ ہو جس کی وجہ سے عبادات میں کوتاہی اور نقصان واقع ہو، بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں "صبر کی کمی) مراد ہے۔ "ذلت" سے مراد گناہوں کے نتیجہ میں ملنے والی ذلت ہے گنہ گار اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلیل ہوتا ہے یا پھر مالداروں کی مفلسی یا غربت کی بناء پر ذلیل ہونا مراد ہے۔

⑪ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ دعا کرتے اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اختلاف سے، نفاق سے، اور برے اخلاق سے)۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "خلاف" سے مراد ہے حق کی مخالفت، اور بعض حضرات نے کہا کہ آپس میں اختلاف وعداوت مراد ہے۔ "نفاق" سے نفاق کی تمام قسمیں مراد ہیں خواہ عقیدہ میں نفاق ہو یا عمل میں۔ مثلاً اول میں کفر و شرک کی تاریکی رکھنا اور زبان سے اسلام کا اظہار کرنا، کسی سے زبان سے تو کچھ کہنا اور دل میں کچھ رکھنا، بہت زیادہ جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت کرنا اور وعدہ کے خلاف کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

⑫ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِيْعُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِيْعُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے کہ وہ بدترین ہم خواب ہے اور تیری پناہ مانگتا ہوں خیانت سے کہ وہ باطن کی بدترین خصلت ہے۔" (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: بھوک سے اس لئے پناہ مانگی کہ اس کی وجہ سے انسان کے بدن، قوی اور حواس میں کمزوری ہو جاتی ہے اور اس کا اثر عبادت میں نقصان اور حضوری میں خلل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لہٰذا بدترین بھوک وہی ہے جو نقصان و خلل کا باعث بنے اور اکثر ہو جب کہ وہ بھوک جو ریاضت و مجاہدہ کے مقصد سے بطریق اعتدال اور اپنی حالت کے موافق ہو بدترین نہیں ہے۔ بلکہ وہ باطن کی صفائی دل کی نورانیت اور بیماریوں سے بدن کی صحت و سلامتی کا سبب ہے۔

"خیانت" سے مراد ہے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا ارتکاب کرنا اور لوگوں کے اموال اور ان کے رازوں میں بے ایمانی و خیانت کرنا، چنانچہ قرآن کریم کی یہ آیت اسی پر دلالت کرتی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ اے ایمان والو! (نافرمانی کے ذریعہ) اللہ اور رسول کے حق میں خیانت نہ کرو اور نہ اپنے اموال میں خیانت کرو۔

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُذَامِ وَالْجُنُوْنِ وَمِنْ سَيِّئِ الْاَسْقَامِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا مانگتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُذَامِ وَالْجُنُوْنِ وَمِنْ سَيِّئِ

الْاَسْقَامِ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کوڑھ سے، جذام سے دیوانگی سے، اور بری بیماریوں سے۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: سَيِّءِ الْاَسْقَامِ (بری بیماریوں) کا ذکر تعمیم بعد تخصیص کے طور پر ہے یعنی پہلے تو آپ ﷺ نے خاص طور پر چند بری بیماریوں کا نام لیتے ہوئے پناہ مانگی۔ پھر عام طور پر ہر بری بیماری مثلاً استسقاء اور دق وغیرہ سے پناہ مانگی۔ ان بیماریوں سے آپ ﷺ نے پناہ اس لئے مانگی کہ جس شخص کو ان میں سے کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے اکثر لوگ اس سے گھبراتے ہیں اور اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ نیز برص اور کوڑھ تو ایسے مرض ہیں جن کی وجہ سے مریض کا جسم بدہیئتی اور بدنمائی کا شکار ہو جاتا ہے اس طرح وہ جسم کے معاملہ میں اپنے ہی جیسے انسانوں کی صف سے باہر ہو جاتا ہے پھر یہ کہ مرض ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ جاتے ہیں جو کبھی اچھے نہیں ہوتے برخلاف اور امراض کے مثلاً بخار، سردرد، وغیرہ کا یہ حال نہیں ہوتا ان میں تکلیف بھی کم ہوتی ہے اور ثواب بھی بہت ملتا ہے۔

ابن مالکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو مرض ایسا ہو کہ لوگ مریض سے احتراز کرتے ہوں۔ نہ خود مریض دوسروں سے منقطع ہو سکتا ہو اور نہ دوسرے اس سے کوئی فائدہ حاصل کر سکتے ہوں اور مریض اس مرض کی وجہ سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے عاجز ہو جاتا ہو تو اس مرض سے پناہ مانگنی مستحب ہے۔

علماء کا خیال یہ ہے کہ کوڑھ اور جذام بالطبع متعدی نہیں ہیں یعنی یہ مرض کسی کو از خود نہیں لگتے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوڑھی کے بدن سے اپنا بدن لگانے کی وجہ سے جذامی کی پیپ لگ کر یہ بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱۴) وَعَنْ قُطْبَةَ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَهْوَاءِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت قطبہ بن مالکؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فرماتے اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَهْوَاءِ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں برے اخلاق سے برے اعمال سے اور بری خواہشات سے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "منکر" اسے کہتے ہیں جسے شریعت نے بھلائی میں شمار نہ کیا ہو یا شریعت نے جس کی برائی بیان کی ہو۔

"اخلاق" سے مراد "باطنی اعمال ہیں" لہٰذا منکر الاخلاق سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں دل کے برے اعمال سے مثلاً حسد و کینہ وغیرہ سے۔

"برے اعمال سے" مراد ظاہری برے افعال ہیں اور بری خواہشات سے مراد برے عقائد اور غلط افکار و نظریات ہیں۔

پناہ مانگنے کے سلسلے میں ایک جامع دعا کی تعلیم

(۱۵) وَعَنْ شُتَيْرِ بْنِ شَكَلِ بْنِ حُمَيْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ عَلِّمْنِيْ تَعْوِيْذًا اَتَعَوَّذُ بِهٖ قَالَ قُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِي وَشَرِّ بَصَرِيْ وَشَرِّ لِسَانِيْ وَشَرِّ قَلْبِي وَشَرِّ مَنِيِّ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی)

"اور حضرت شتیر بن شکل بن حمید اپنے والد (حضرت شکلؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسا تعویذ (یعنی ایسی دعا) بتا دیجئے جس کے ذریعہ سے میں پناہ مانگوں "آپ ﷺ نے فرمایا" یہ دعا پڑھو اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِي وَشَرِّ بَصَرِيْ وَشَرِّ لِسَانِيْ وَشَرِّ قَلْبِي وَشَرِّ مَنِيِّ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنی سماعت کی برائی سے۔ (کہ اپنے کان سے بری باتیں نہ سنوں) اپنی بینائی کی برائی سے (کہ اپنی آنکھوں سے بری چیزیں نہ دیکھوں) اپنی زبان کی برائی سے کہ اپنی زبان سے برے برے اور بے فائدہ کلمات نہ نکالوں، اپنے دل کی برائی سے کہ میرے دل میں برے عقیدے اور حسد اور کینہ وغیرہ کا گزر نہ ہو اور برے کام میں عزم مصمم نہ کروں) اور اپنی منی کی برائی سے کہ وہ حرام کاری میں صرف نہ ہو اور میں بنظر شہوت کسی کو نہ دیکھوں۔"

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

آنحضرت مہلک حادثات سے پناہ مانگتے تھے

(۱۶) وَعَنْ اَبِی الْیَسَرِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَدْعُوْ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْھَدْمِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ التَّرَدِّیْ وَمِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَالْھَرَمِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ یَتَخَبَّطَنِی الشَّیْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ فِی سَبِیْلِکَ مُدْبِرًا وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ لَدِیْغًا۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِیُّ وَزَادَ فِی رِوَایَۃٍ اُخْرٰی وَالْغَمِّ۔

"اور حضرت ابوالیسرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْھَدْمِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ التَّرَدِّیْ وَمِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَالْھَرَمِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ یَتَخَبَّطَنِی الشَّیْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ فِی سَبِیْلِکَ مُدْبِرًا وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ لَدِیْغًا اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں مکان گرنے سے (یعنی کوئی مکان یا دیوار مجھ پر نہ گر پڑے کہ جس کی وجہ سے میں ہلاک ہو جاؤں) اور تیری پناہ مانگتا ہوں کسی بلند جگہ سے گر پڑنے سے، ڈوبنے سے، جلنے سے، زیادہ بڑھاپے سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ موت کے وقت شیطان مجھے حواس باختہ کرے (یعنی وسوسے پیدا کر کے میرے دین کو تباہ کر دے) تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے تیری راہ میں پشت پھیر کر (یعنی جہاد میں کفار کے مقابلے سے بھاگ کر) مروں اور تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ لدیغ (یعنی سانپ بچھو اور دوسرے زہریلے جانوروں کے کاٹنے سے مروں)۔" (ابوداؤد، نسائی)

نسائیؒ نے ایک روایت میں و الغم بھی نقل کیا ہے۔ (یعنی تیری پناہ مانگتا ہوں غم سے)

تشریح: اگرچہ یہ اشکال پیدا ہو کہ حدیث میں مذکورہ بالا چیزیں بعض تو ایسی ہیں جن کے سبب سے موت واقع ہو جانے کی صورت میں شہادت کا درجہ ملتا ہے پھر آنحضرت نے ان سے پناہ کیوں مانگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں میں مبتلا ہونے کہ وجہ سے مصیبت و تکلیف اور پریشانیوں کا گویا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے نازک اور سخت موقع پر کوئی صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور شیطان کو موقع مل جائے اور وہ بہکا کر دینی و اخروی سعادتوں کو ملیا میٹ کر دے اس لئے آپ ﷺ نے ان سے بھی پناہ مانگی تاکہ اُمت کے لوگ ان چیزوں سے پناہ مانگیں۔

زیادہ بڑھاپے سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے کی برائی سے کہ حواس و قویٰ میں فرق آجائے بیہودہ و لایعنی کلام زبان سے نکلنے لگیں اور عبادت میں فتور آجائے ان سے پناہ مانگتا ہوں، منقول ہے کہ جو شخص کلام اللہ یاد کر لیتا ہے وہ ان آفات سے محفوظ رہتا ہے۔

طمع سے پناہ مانگنے کا حکم

(۱۷) وَعَنْ مُعَاذٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اسْتَعِیْذُوْا بِاللّٰہِ مِنْ طَمَعٍ یَھْدِیْ اِلٰی طَبَعٍ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالْبَیْھَقِیُّ فِی الدَّعْوَاتِ الْکَبِیْرِ۔

"اور حضرت معاذؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو طمع سے جو طبع تک پہنچا دے۔" (احمد، بیہقی)

تشریح: "طمع" کے معنی ہیں مخلوق خدا سے مال و زر کی امید رکھنا! اور طبع کے اصل معنی تو ہیں تلوار کو زنگ لگنا، لیکن یہاں اس لفظ سے مراد "عیب" ہے لہٰذا حدیث بالا کے مطابق "طمع" سے پناہ مانگنے کا مفہوم یہ ہے کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں طمع سے جو مجھے اس مقام پر پہنچا دے جہاں میری زندگی عیب دار ہو جائے اور وہ عیب ہے، اہل دنیا کے سامنے تواضع و انکساری اختیار کرنا، کم ظرف، پست خیال اور بد کردار دنیا داروں کے آگے اپنے آپ کو ذلیل کرنا، سمعہ و ریا (کسی بھی کام کے وقت دکھانے سنانے کے جذبہ) کو ظاہر کرنا، سرمایہ داروں کی بے جا تعریف و مدح اور ان کی چاپلوسی میں مبتلا ہونا اور اسی قسم کی وہ ذلیل حرکتیں جو طمع کی حالت میں صادر ہوتیں ہیں۔

حاصل یہ کہ طمع سے اجتناب ضروری ہے کیونکہ یہی وہ حقیر جذبہ ہے جو انسان کی عزت نفس، خودداری اور ضمیر کے شرف و وقار کے

لئے بہت بڑا عیب ہے جس کی وجہ سے انسان نہ صرف دنیاوی طور پر ذلیل و حقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے بلکہ دینی طور پر بھی اس کی روح کی بالیدگی اور پاکیزگی کے لئے ایک ناسور سے کم نہیں ہے جو آہستہ آہستہ دین کے تمام گوشوں میں مختلف طریقوں سے زہر کی آمیزش کرتا رہتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ طمع دین کے فساد کی جڑ ہے اور ورع (پرہیزگاری) دین کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔

حضرت شیخ علی متقیؒ فرماتے ہیں کہ "طمع" اسے کہتے ہیں کہ اس مال کی امید رکھی جائے جس کے حاصل ہونے میں شک ہو اگر اس کے حصول کا یقین ہو جیسے کسی پر کوئی حق ہو یا کسی کا وعدہ صادق ہوا اور یا کسی سے اتنی راسخ محبت ہو کہ وہ اس کی ہر خواہش کی تکمیل ضرور کرتا ہو تو اسی صورت میں اس سے توقع رکھنے کو طمع نہیں کہتے۔

چاند کے بے نور ہونے سے پناہ مانگو

(۱۸) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَظَرَ اِلَى الْقَمَرِ فَقَالَ يَا عَائِشَةُ اسْتَعِيْذِيْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ هٰذَا فَاِنَّ هٰذَا هُوَ الْغَاسِقُ اِذَا وَقَبَ۔ (رواہ الترمذیؒ)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ "عائشہ! اللہ کی پناہ مانگو! (اس چاند) کی برائی سے کیونکہ یہ غاسق (اندھیرا پھیلانے والا) ہے جب بے نور ہو جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "قرآن مجید کی سورت قل اعوذ برب الفلق میں جہاں اور کئی چیزوں سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے وہیں" ۔ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کا بھی ذکر ہے یعنی پناہ مانگو اندھیرا پھیلانے والے کی برائی سے جب وہ بے نور ہو جائے۔ چنانچہ آنحضرت کے ارشاد گرامی نے غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کی وضاحت فرمائی کہ اس سے مراد چاند ہے جب وہ گہن میں آجاتا ہے، لہٰذا اس سے پناہ مانگنے کا سبب یہ ہے کہ اس کا گرہن میں آنا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ یہ بلاؤں کے نازل ہونے کا اشارہ دیتا ہے، چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ جب چاند کو گرہن لگتا تو اس وقت آنحضرت ﷺ لرزاں و ترساں اٹھ کھڑے ہوتے۔

لیکن اتنی بات ذہن نشین رہے کہ "بلاؤں کے نازل ہونے سے" وہ بلائیں اور حادثات مراد نہیں ہیں جو منجم یا بد عقیدہ لوگ کسوف و خسوف (چاند سورج کے گرہن لگنے) کے سلسلہ میں بتاتے ہیں کیونکہ اہل اسلام کے نزدیک ان کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اس سے مراد عبرت کے مواقع ہیں۔ مثلاً جب چاند گرہن میں آتا ہے تو وہ ایک بڑے عبرت کا وقت ہوتا ہے جو ہر انسان کو احساس دلاتا ہے کہ جب چاند باوجود اپنی اس نورانیت کے اپنے نور کھو چکا ہے اور اس کے اپنے نور کی بقاء پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہے تو ایسا نہ ہو کہ میرے ایمان اور میرے عمل کا نور بھی جاتا رہے اسی اعتبار سے اس سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس حدیث سے تو معلوم ہوا کہ "غاسق اذا وقب" سے مراد گرہن میں آیا ہوا چاند ہے لیکن اکثر مفسرین نے مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد تاریک رات ہے واللہ اعلم۔

نفس کی برائی سے پناہ مانگو

(۱۹) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَبِيْ يَا حُصَيْنُ كَمْ تَعْبُدُ الْيَوْمَ اِلٰهًا قَالَ اَبِيْ سَبْعَةً سِتًّا فِي الْاَرْضِ وَوَاحِدًا فِي السَّمَاءِ قَالَ فَاَيُّهُمْ تَعُدُّ لِرَغْبَتِكَ وَرَهْبَتِكَ قَالَ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ قَالَ يَا حُصَيْنُ اَمَا اِنَّكَ لَوْ اَسْلَمْتَ عَلَّمْتُكَ كَلِمَتَيْنِ تَنْفَعَانِكَ قَالَ فَلَمَّا اَسْلَمَ حُصَيْنٌ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِّمْنِي الْكَلِمَتَيْنِ اللَّتَيْنِ وَعَدْتَنِي فَقَالَ قُلِ اللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَاَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرے باپ (حضرت حصینؓ) سے (جو اس وقت تک ایمان و اسلام کی دولت سے بہرہ مند نہیں تھے) فرمایا "حصین! آج کل تم کتنے معبودوں کی بندگی کرتے ہو" میرے باپ نے عرض کیا کہ سات معبودوں کی جن میں

سے چھ تو زمین پر ہیں (اور ان کے نام یہ ہیں) یغوث، یعوق، نسر، لات، منات اور عزیٰ اور ایک آسمان میں ہے (جو سب کا خالق ہے) آپ نے فرمایا "پھر ان میں سے کون سا معبود تمہاری امید اور تمہارے خوف کا مرجع ہے؟ یعنی ان میں سے کسی معبود سے تم ڈرتے ہو اور اس سے بھلائی کی امید رکھتے ہیں؟" انہوں نے عرض کیا کہ "جو آسمان میں ہے" آنحضرت نے فرمایا۔ "حصین! جان لو اگر تم مسلمان ہو جاتے تو میں تمہیں دو کلمے سکھاتا جو تمہیں (دنیا و آخرت) میں فائدہ پہنچاتے حضرت عمرانؓ کہتے ہیں کہ چنانچہ جب (میرے باپ) حضرت حصینؓ مسلمان ہو گئے تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اب وہ دو کلمے بتائیے جس کا آپ نے وعدہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا یہ پڑھو۔" اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ وَاَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِی اے اللہ میرے دل میں میری ہدایت ڈال اور میرے نفس کی برائی سے مجھے پناہ دے۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: "اور ایک آسمان میں ہے" یہ بات حضرت حصینؓ نے اپنے گمان کے مطابق کی تھی کیونکہ وہ ایمان و اسلام کی دولت سے اس وقت تک بہرہ ور نہیں تھے انہیں کیا معلوم تھا کہ اللہ کے لئے کوئی جگہ اور کوئی مکان مقرر نہیں ہے۔ وہ تو زمین اور آسمان کے ایک ایک ذرہ پر حاوی ہے اور محیط ہے اس کی ذات کسی مقام اور کسی جگہ کے ساتھ مختص نہیں ہے یا پھر یہ کہا جائے گا کہ ان کی اس بات کا مفہوم یہ تھا کہ وہ خدا جس کی آسمان میں فرشتے عبادت کرتے ہیں۔

نیند میں ڈرنے سے خدا کی پناہ مانگنے کا حکم

(۲۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَافَزِعَ اَحَدُکُمْ فِی النَّوْمِ فَلْیَقُلْ اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّاتِ مِنْ غَضَبِہٖ وَعِقَابِہٖ وَشَرِّ عِبَادِہٖ وَمِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَاَنْ یَحْضُرُوْنَ فَاِنَّھَا لَنْ تَضُرَّہٗ وَکَانَ عَبْدُاللّٰہِ بْنُ عَمْرٍو یُعَلِّمُھَا مَنْ بَلَغَ مِنْ وَلَدِہٖ وَمَنْ لَّمْ یَبْلُغْ مِنْھُمْ کَتَبَھَا فِیْ صَکٍّ ثُمَّ عَلَّقَھَا فِیْ عُنُقِہٖ۔

(رواہ ابوداؤد و الترمذی وھذا لفظہ)

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ (حضرت شعیبؒ) سے اور وہ اپنے دادا (یعنی حضرت عبداللہؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نیند میں ڈرے تو اسے چاہئے کہ یہ کلمات پڑھے" اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّاتِ مِنْ غَضَبِہٖ وَعِقَابِہٖ وَشَرِّ عِبَادِہٖ وَمِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَاَنْ یَحْضُرُوْنَ میں اللہ کے پورے کلمات کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں اس کے غضب سے اس کے عذاب سے اس کے بندوں کی برائی سے شیطان کے وسوسوں سے اور اس بات سے کہ شیطان میرے پاس آئیں، لہٰذا ان کلمات کو کہنے والے کو شیطان ہرگز کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ ان کلمات کو اپنی اولاد میں سے ہر اس شخص کو سکھاتے جو بالغ ہوتا اور ان کی اولاد میں جو نابالغ ہوتے ان کلمات کو کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر ان کے گلے میں ڈال دیتے۔" (اس روایت کو ابوداؤد و ترمذیؒ نے روایت کیا ہے لیکن الفاظ ترمذیؒ کے ہیں)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نیند میں ڈرنا شیطان کے تصرف اور اس کی شرارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نیز یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ گلے میں تعویذ ڈالنا اور لٹکانا جائز ہے، اس مسئلہ میں اگرچہ علماء کے اختلافی اقوال ہیں لیکن زیادہ صحیح اور مختار بات یہی ہے کہ حرزات وغیرہ تو گلے میں لٹکانا حرام اور مکروہ ہیں لیکن ایسے تعویذ لٹکانا جائز ہیں جن میں آیات قرآن یا اسمائے الٰہی لکھے ہوں۔

جنّت مانگنے اور آگ سے پناہ چاہنے والوں کے لئے جنّت و آگ کی سفارش

(۲۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ سَاَلَ اللّٰہَ الْجَنَّۃَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ الْجَنَّۃُ اَللّٰھُمَّ اَدْخِلْہُ الْجَنَّۃَ وَمَنِ اسْتَجَارَ مِنَ النَّارِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ النَّارُ اَللّٰھُمَّ اَجِرْہُ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ سے تین مرتبہ جنّت مانگتا ہے۔ (یعنی تین مرتبہ یہ دعا کرتا ہے

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُکَ الْجَنَّۃَ اے اللہ! میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں یا یوں کہے! اَللّٰھُمَّ اَدْخِلْنِی الْجَنَّۃَ اے اللہ مجھے جنت میں داخل کر اور یا کسی بھی زبان میں اس مفہوم و مضمون کو تین مرتبہ کہتا ہے) تو جنت کہتی ہے کہ اے اللہ! تو اس کو جنت میں داخل کر۔ اور جو شخص تین بار آگ سے پناہ مانگتا ہے۔ یعنی تین مرتبہ یوں کہتا ہے اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ! اے اللہ! مجھے آگ سے محفوظ رکھ۔ یا اسی مفہوم و مضمون کو کسی بھی زبان میں تین مرتبہ ادا کرتا ہے۔ تو آگ کہتی ہے کہ "اے اللہ! تو اس شخص کو آگ سے محفوظ رکھ۔ یا اسی مفہوم و مضمون کو کسی بھی زبان میں تین مرتبہ ادا کرتا ہے تو آگ کہتی ہے کہ اے اللہ! تو اس شخص کو آگ سے محفوظ رکھ۔" (ترمذیؒ ونسائیؒ)

تشریح: "تین مرتبہ" چاہے تو ایک ہی مجلس میں یہ دعا مانگی جائے اور چاہئے کئی مجلسوں میں، لیکن ضروری ہے کہ دعا کے وقت حضور، اخلاص، تضرع، عجز، اور انکساری و لجاجت زبان کے ہم نوا ہوں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سحر وغیرہ سے بچنے کی دعا

(۲۲) عَنِ الْقَعْقَاعِ اَنَّ کَعْبَ الْاَحْبَارِ قَالَ لَوْ لَا کَلِمَاتٌ اَقُوْلُھُنَّ لَجَعَلَتْنِیْ یَھُوْدُ حِمَارًا فَقِیْلَ لَہٗ مَاھُنَّ قَالَ اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ لَیْسَ شَیْءٌ اَعْظَمَ مِنْہُ وَبِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَا یُجَاوِزُھُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَبِاَسْمَاءِ اللّٰہِ الْحُسْنٰی مَاعَلِمْتُ مِنْھَا وَمَالَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ۔ (رواہ مالک)

"حضرت قعقاع کہتے ہیں کہ حضرت کعب احبار فرماتے تھے کہ اگر میں وہ کلمات نہ کہا کرتا تو یہود (مجھے گدھا بنا ڈالتے۔ ان سے پوچھا گیا وہ کلمات کیا ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ ہیں۔) اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ لَیْسَ شَیْءٌ اَعْظَمَ مِنْہُ وَبِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَا یُجَاوِزُھُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَبِاَسْمَاءِ اللّٰہِ الْحُسْنٰی مَاعَلِمْتُ مِنْھَا وَمَالَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی ذات کے ذریعہ جو بہت بڑا ہے وہ اللہ کہ کوئی چیز اس سے بڑی نہیں، اس کے کامل کلمات کے ذریعے کہ ان سے نہ کوئی نیک تجاوز کرتا ہے اور نہ کوئی بد، اللہ کے ناموں کے ذریعہ جو پاک و نیک ہیں اور ان میں سے جو کچھ میں جانتا ہوں اور جو کچھ میں نہیں جانتا اس چیز کی برائی سے جو اس نے پیدا کی اور پراگندہ و برابر کی (یعنی متناسب الاعضاء بنائیں)۔" (مالکؒ)

تشریح: کعب الاحبار قوم یہود کے ایک بڑے دانشمند فرد تھے وہ اگرچہ آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ میں تھے لیکن آپ ﷺ کے دیدار اور آپ ﷺ کی صحبت کے شرف سے محروم رہے۔ پھر بعد میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایمان و اسلام کی دولت سے مالامال ہوئے انہیں کعب کا بیان ہے کہ جب میں ایمان لایا اور مسلمان ہوا تو یہود میرے مخالف ہو گئے وہ میرے بارہ میں اس قدر بغض و کینہ رکھتے تھے کہ اگر ان کی حرکتیں کامیاب ہو جاتیں اور میں یہ دعا نہ پڑھتا تو وہ سحر کر کے مجھے گدھا بنا دیتے یعنی مجھے ذلیل و بے وقوف اور گدھے کی مانند مسلوب العقل کر دیتے۔

"اللہ کے کامل کلمات" سے مراد قرآن ہے چنانچہ ان سے تجاوز نہ کرنے کے معنی ہیں کہ اس کے ثواب و عذاب وغیرہ سے کوئی بھی خارج نہیں ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جس شخص کو اجر و ثواب دینے کا وعدہ کیا ہے یا جس شخص کو عذاب میں مبتلا کر دینے کا فیصلہ کیا ہے یا اور جن چیزوں کا بیان کیا ہے وہ سب بلاشبہ انجام پذیر ہوتا ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ یا پھر "اللہ کے کلمات" سے مراد صفات الٰہی اور علوم الٰہی ہیں کہ ان سے بھی کوئی چیز باہر نہیں یہ سب کو محیط یعنی گھیرے ہوئے ہیں۔

کفر سے پناہ مانگنی چاہئے

(۲۳) وَعَنْ مُسْلِمِ بْنِ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ کَانَ اَبِیْ یَقُوْلُ فِیْ دُبُرِ الصَّلٰوۃِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکُفْرِ وَالْفَقْرِ وَعَذَابِ

اَلْقَبْرِ فَكُنْتُ اَقُوْلُهُنَّ فَقَالَ اَیْ بُنَیَّ عَمَّنْ اَخَذْتَ هٰذَا قُلْتُ عَنْكَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُهُنَّ فِي دُبُرِ الصَّلٰوةِ۔ رَوَاهُ النَّسَائِىُّ وَالتِّرْمِذِیُّ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ فِیْ دُبُرِ الصَّلٰوةِ وَرَوٰى اَحْمَدُ لَفْظَ الْحَدِيْثِ وَعِنْدَهُ فِیْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ۔

"اور حضرت مسلم بن ابی بکرہ کہتے ہیں کہ میرے والد (ہر نماز یا فرض) نماز کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کفر سے فقر سے (یعنی قلبی فقر کے فتنہ سے کہ جو بے صبری اور کفران نعمت وغیرہ ہے) اور عذاب قبر سے چنانچہ میں بھی ان کلمات کو پڑھا کرتا تھا (ایک دن) میرے والد نے مجھ سے پوچھا کہ میرے بیٹے! تم نے یہ کلمات کس سے سیکھے؟ میں نے کہا آپ سے! انہوں نے فرمایا کہ رسول ﷺ نماز کے بعد یہ کلمات کہا کرتے تھے اس روایت کو نسائی اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ لیکن ترمذی نے فی دبر الصلوٰۃ (نماز کے بعد) کے الفاظ نقل نہیں کئے ہیں امام احمدؒ نے صرف حدیث کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ (یعنی ان کی روایت میں مسلم بن ابی بکرہ اور ان کے باپ کا ذکر نہیں ہے) نیز ان کی روایت میں فی دبر کل الصلوٰۃ (ہر نماز کے بعد) کے الفاظ ہیں یعنی ان کی روایت میں لفظ کل بھی ہے۔"

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْكُفْرِ وَالدَّيْنِ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَعْدِلُ الْكُفْرَ بِالدَّيْنِ قَالَ نَعَمْ وَفِیْ رِوَايَةٍ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ قَالَ رَجُلٌ وَيَعْدِلَانِ قَالَ نَعَمْ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ کلمات فرماتے سنا ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْكُفْرِ وَالدَّيْنِ (یعنی میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کفر اور قرض سے) ایک شخص نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! کیا آپ (ﷺ) نے کفر کو قرض کے برابر کر دیا"؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" اور ایک روایت میں یہ دعا منقول ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ یعنی اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کفر سے اور فقر سے (یہ سن کر، ایک شخص نے عرض کیا کہ "کیا کفر اور فقر دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں!۔" (نسائی)

تشریح: "کفر اور قرض" کو برابر اس لئے فرمایا کہ قرض کی وجہ سے انسان جھوٹ بولتا ہے، مکاری کرتا ہے، اور وعدہ کے خلاف کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بدترین خصلتیں کفار اور منافقین ہی میں ہوتی ہیں۔

"کفر" اور "فقر" کو برابر بایں معنی کیا گیا ہے کہ فقر کی وجہ سے انسان بے صبری کرتا ہے، اپنی قسمت کو کوستا ہے، تقدیر کا گلہ کرتا ہے اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکال بیٹھتا ہے جو کفر کا باعث ہوتے ہیں۔

بَابُ جَامِعِ الدُّعَاءِ

جامع دعاؤں کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی دعاء بخشش

(۱) عَنْ اَبِیْ مُوْسَى الْاَشْعَرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَانَ يَدْعُوْ بِهٰذَا الدُّعَآءِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِيْئَتِیْ وَجَهْلِیْ وَاِسْرَافِیْ فِیْ اَمْرِیْ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ جِدِّیْ وَهَزْلِیْ وَخَطَائِیْ وَعَمَدِیْ وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ وَجَھْلِیْ وَاِسْرَافِیْ فِیْ اَمْرِیْ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ جِدِّیْ وَھَزْلِیْ وَخَطَائِیْ وَعَمَدِیْ وَکُلُّ ذٰلِکَ عِنْدِیْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اے اللہ! معاف فرما میری خطا کو میری نادانی کو (یعنی جن چیزوں کو جاننا یا ان پر عمل کرنا واجب تھا اور میں نے ان کو نہیں جانا اسے معاف فرما) کاموں میں میری زیادتی کو اور اس گناہ سے جس کا علم مجھ سے زیادہ تجھ کو ہے۔ اے اللہ! معاف فرما میرے اس برے کام کو جسے میں نے قصد کیا ہے، اس کام کو جسے میں نے ہنسی دل لگی میں کیا ہو اور اس کام کو جسے میں نے دانستہ یا نادانستہ کیا ہوا اور یہ سب باتیں مجھ میں ہیں۔ اے اللہ! بخشش فرما میرے ان گناہوں کو جو میں نے پہلے کئے ہیں ان گناہوں کی جو (بالفرض والتقدیر) بعد میں ہوں گے، ان گناہوں کی جو پوشیدہ سرزد ہوئے ہوں ان گناہوں کی جو کھلم کھلا کئے ہوں اور ان گناہوں کی جن کا علم مجھ سے زیادہ تجھ کو ہے، تو ہی (جس کو چاہے اپنی توفیق کے ساتھ اپنی رحمت کی طرف آگے کرنے والا ہے اور تو ہی) جس کو چاہے اپنی رحمت سے پیچھے ڈالنے والا ہے۔ اور تو ہی ہر چیز پر قادر ہے۔"

(بخاری ومسلم)

تشریح: وَکُلُّ ذٰلِکَ عِنْدِیْ (اور یہ سب باتیں مجھ میں ہیں) یہ الفاظ آپ ﷺ نے بارگاہ رب العزت میں اپنے عجز و انکسار اور اپنے مقام عبدیت کے اظہار نیز از راہ تواضع کہے، ورنہ تو آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی تمام گناہوں سے پاک اور تمام خطاؤں سے مبرا تھی اور حقیقت میں تعلیم یہ ہے امت کے لئے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ سے بخشش و مغفرت مانگی جائے۔

اصلاح دنیا و آخرت کی دعا

(۴) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَدْعُوْ اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الَّذِیْ ھُوَ عِصْمَۃُ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ دُنْیَایَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَاشِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ اٰخِرَتِیَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَادِیْ وَاجْعَلِ الْحَیٰوۃَ زِیَادَۃً لِّیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَۃً لِّیْ مِنْ کُلِّ شَرٍّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا کرتے اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الَّذِیْ ھُوَ عِصْمَۃُ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ دُنْیَایَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَاشِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ اٰخِرَتِیَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَادِیْ وَاجْعَلِ الْحَیٰوۃَ زِیَادَۃً لِّیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَۃً لِّیْ مِنْ کُلِّ شَرٍّ اے اللہ! درست کر میرے دین کو جو میرے امور کا محافظ ہے (یعنی دین کی وجہ سے جان، مال، اور آبرو کی حفاظت ہوتی ہے اور آخرت کے عذاب سے نجات ملتی ہے) درست کر میری آخرت کو جہاں مجھے لوٹ کر جانا ہے) میری زندگی کو سبب بنا ہر نیکی میں زیادتی کا (یعنی طویل عمر عطا فرما تاکہ بہت سی نیکیاں کروں) اور میرے لئے موت کو ہر برائی سے راحت اور آرام کا سبب بنا۔" (رواہ مسلمؒ)

تشریح: دنیا کی درستی و اصلاح اس رزق سے ہوتی ہے جو حلال ذرائع سے اور غیر مشتبہ وسائل کے راستے حاصل ہوا ہو، اس رزق سے گزارا اچھی طرح ہوتا ہے، طاعت کی قوت حاصل ہوتی ہے قلب کو سکون و اطمینان کی دولت میسر آتی ہے اور عبادت میں خلل و تشویش کا گزر نہیں ہوتا۔

آخرت کی درستی و اصلاح کا انحصار ان امور (نیک عقائد، اچھے اعمال و کردار کی توفیق پر ہوتا ہے جو عذاب سے نجات کا سبب اور اس جہان کی سعادتوں تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

دعا کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ میری زندگی کا خاتمہ کلمہ شہادت، اچھے اعتقاد اور توبہ کرنے کے بعد ہو تاکہ میری موت دنیا کی مشقتوں اور مصائب سے نجات اور آخرت کی راحت کے حصول کا باعث ہو۔

دعاء ہدایت

③ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْأَلُكَ الْهُدٰى وَالتُّقٰى وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نبی ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ یہ دعا مانگتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْأَلُكَ الْهُدٰى وَالتُّقٰى وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰى "اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں، ہدایت، تقوی، اور حرام و مکروہ سے نفس کی حفاظت نیز (قلبی اور ظاہری) استغناء۔" (مسلمؒ)

④ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ لِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قُلْ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِىْ وَسَدِّدْنِىْ وَاذْكُرْ بِالْهُدٰى هِدَايَتَكَ الطَّرِيْقَ وَبِالسَّدَادِ سَدَادَ السَّهْمِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ یہ دعا مانگو۔ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِىْ وَسَدِّدْنِىْ اے اللہ! مجھے (سیدھی راہ دکھا کر) ہدایت یافتہ بنا اور میرے اعمال اور افعال کو راست درست فرما کر، مجھے سیدھا کر (نیز آپ ﷺ نے فرمایا) جب تم ہدایت کی طلب کرو تو راستہ کے سیدھا چلنے کا اور جب راستی کی طلب کرو تو تیر کی سی راستی کا تصور کرو۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب تم بارگاہ رب العزت میں طلب ہدایت کی درخواست کرو تو تمہارے ذہن میں یہ بات رہنی چاہئے کہ مجھے وہی راہنمائی اور ہدایت حاصل ہو، جو سیدھی راہ پر چلنے والے شخص کو حاصل ہوتی ہے اور جب تم راستی مانگو تو یہ خیال رکھو کہ مجھے ایسی ہی راستی اور استقامت حاصل ہو جس طرح تیر راست و سیدھا ہوتا ہے مقصد یہ ہے کہ آخری درجہ کی اور مکمل ہدایت اور آخری درجہ کی مکمل راستی طلب کرو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں مکمل ہدایت اور مکمل راستی ہی کی سعادت سے نوازے۔

نومسلم کی دعا

⑤ وَعَنْ اَبِىْ مَالِكٍ الْاَشْجَعِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ الرَّجُلُ اِذَا اَسْلَمَ عَلَّمَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةَ ثُمَّ اَمَرَهٗ اَنْ يَدْعُوَ بِهٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِىْ وَارْحَمْنِىْ وَاهْدِنِىْ وَعَافِنِىْ وَارْزُقْنِىْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابومالک اشجعیؒ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا تو نبی کریم ﷺ اسے نماز کی تعلیم دیتے پھر اس کو حکم دیتے کہ وہ ان کلمات کے ذریعہ دعا مانگے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِىْ وَارْحَمْنِىْ وَاهْدِنِىْ دَعَافِنِىْ وَارْزُقْنِىْ یعنی اے اللہ! میری مغفرت فرما میرے عیوب کو ڈھانک کر، مجھ پر رحم فرما، مجھے ہدایت یافتہ بنا اور مجھے (حلال) روزی عطا فرما۔" (مسلمؒ)

دنیا و آخرت کے تمام مقاصد کی جامع دعا

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَكْثَرُ دُعَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اے اللہ ہمیں دنیا میں نیکی و بھلائی (یعنی نعمتیں اور اچھی حالت) عطا کر اور آخرت میں (یعنی موت کے بعد) بھی نیکی و بھلائی

(یعنی اچھے مراتب) عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ کثرت سے یہ دعا اس لئے پڑھا کرتے تھے کہ یہ ایک جامع دعا ہے جس میں دین و دنیا کے تمام مقاصد آجاتے ہیں پھر یہ کہ یہ دعا قرآن کریم میں نازل کی گئی ہے۔

طالب صادق اگر حضور و مناجات کے وقت خلوت میں بیٹھ کر باطن کی صفائی کے ساتھ دنیا و آخرت کے حسنات کے ہر ہر گوشے کا تصور کر کے دعا پڑھے تو وہ دیکھے گا کہ کیا کچھ ذوق و جمعیت، سکون و اطمینان اور نورانیت و سعادت حاصل ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ایک جامع دعا

⑦ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُو يَقُوْلُ رَبِّ اَعِنِّيْ وَ لَاتُعِنْ عَلَيَّ وَ انْصُرْنِي وَلَا تَنْصُرْ عَلَيَّ وَامْكُرْلِيْ وَلَا تَمْكُرْ عَلَيَّ وَاهْدِنِي وَيَسِّرِ الْهُدٰى لِي وَانْصُرْنِي عَلٰى مَنْ بَغٰى عَلَيَّ رَبِّ اجْعَلْنِي لَكَ شَاكِرًا لَكَ ذَاكِرًا لَكَ رَاهِبًا لَكَ مِطْوَاعًا لَكَ مُخْبِتًا اِلَيْكَ اَوَّاهًا مُنِيْبًا رَبِّ تَقَبَّلْ تَوْبَتِي وَاغْسِلْ حَوْبَتِي وَاَجِبْ دَعْوَتِي وَثَبِّتْ حُجَّتِي وَسَدِّدْ لِسَانِي وَاهْدِ قَلْبِي وَاسْلُلْ سَخِيْمَةَ صَدْرِيْ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگتے تھے۔ رَبِّ اَعِنِّيْ وَلَاتُعِنْ عَلَيَّ وَانْصُرْنِي وَلَا تَنْصُرْ عَلَيَّ وَامْكُرْلِي وَلَا تَمْكُرْ عَلَيَّ وَاهْدِنِي وَيَسِّرِ الْهُدٰى لِي وَانْصُرْنِي عَلٰى مَنْ بَغٰى عَلَيَّ رَبِّ اجْعَلْنِي لَكَ شَاكِرًا لَكَ ذَاكِرًا لَكَ رَاهِبًا لَكَ مِطْوَاعًا لَكَ مُخْبِتًا اِلَيْكَ اَوَّاهًا مُنِيْبًا رَبِّ تَقَبَّلْ تَوْبَتِي وَاغْسِلْ حَوْبَتِي وَاَجِبْ دَعْوَتِي وَثَبِّتْ حُجَّتِي وَسَدِّدْ لِسَانِي وَاهْدِ قَلْبِي وَاسْلُلْ سَخِيْمَةَ صَدْرِيْ اے پروردگار میری مدد کرو (یعنی اپنے ذکر، شکر اور اپنی عبادت کے حسن کی مجھے توفیق دے) میرے خلاف کسی کی مدد نہ کر (یعنی جو طاقتیں مجھے تیری طاعت و عبادت سے باز رکھیں خواہ شیطان ہو، خواہ نفس اور خواہ کفار ان کو مجھ پر غالب نہ کر) مجھے فتح دے مجھ پر کسی کو فتحیاب نہ کر (یعنی مجھے کفار پر غالب کر کفار کو مجھ پر غلبہ نہ دے) اور میری مدد کرنے کے دشمنوں کے حق میں) میرے لئے مکر کر، میرے ضرر کے لئے مکر نہ کر مجھے سیدھی راہ دکھا سیدھی راہ پر چلنا میرے لئے آسان کر اور اس کے خلاف میری مدد کر جو مجھ پر زیادتی کرے اے میرے رب! مجھے ہر وقت، تیرا شکر گزار (ہر حال میں) تیرا ذکر کرنے والا تجھ سے ڈرنے والا، تیری بہت فرمانبرداری کرنے والا، بنا، اے اللہ! میری توبہ قبول کر، میرے گناہ دھودے، میری دعا قبول کر (دنیا و آخرت میں اپنے دشمنوں کے سامنے) میری دلیل و حجت کو ثابت کر، میری زبان کو سچی اور درست رکھ (یعنی اس سے سچ و حق بات کے علاوہ کچھ نہ نکلے) میرے دل کو ہدایت بخش اور میرے سینہ کی سیاہی دور کر دے۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: "مکر کے معنی ہیں" فریب لیکن جب اس لفظ کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے (دشمنان دین اسلام پر ایسی جگہ سے بلاؤں کا اترنا جہاں سے انہیں گمان بھی نہ ہو)۔

"سینہ کی سیاہی" سے مراد ہے کینہ، بغض، حسد اور اسی قسم کی دوسری خصلتیں۔"

ایمان کے بعد عافیت سے بہتر کوئی دولت نہیں

⑧ وَعَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ ثُمَّ بَكٰى فَقَالَ سَلُوا اللّٰهَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فَاِنَّ اَحَدًا لَمْ يُعْطَ بَعْدَ الْيَقِيْنِ خَيْرًا مِنَ الْعَافِيَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادًا۔

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے رونے لگے اور پھر فرمایا "اللہ تعالیٰ سے بخشش و عافیت مانگو کیونکہ کسی کو ایقان" (ایمان) کے بعد عافیت سے بہتر کوئی عمل نہیں اس روایت کو ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے، نیز امام ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث باعتبار سند کے حسن غریب ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ جانتے تھے کہ میری اُمت کے افراد خواہشات نفس، حوس و حرص اور غلبہ شہوت کے فتنوں میں مبتلا ہوں گے اس لئے آپ ﷺ اس کے تصور سے بھی رونے لگے کہ جس اُمت کے لوگوں کو ایمان و ایقان کی دولت اسلام کی ہدایت اور میری تربیت نے ضبط نفس ایثار و استغناء دیانت و امانت عزت و خودداری پاک دامنی و پرہیزگاری کے معیار پر نہ صرف پورا اتارا بلکہ انہیں ان اخلاق حمیدہ اور خصائل شریفہ کا بذات خود معیار بنادیا ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب اسی اُمت کے لوگ شیطان کے مکروفریب میں پھنس کر اور اپنے نفس کے تابع ہو کر حرص و ہوس کے مجسمے، بددیانتی و بدکرداری کے پیکر اور خواہشات نفسانیہ کے غلام بن جائیں گے چنانچہ آپ ﷺ نے منبر رشد و ہدایت سے یہ حکم فرمایا کہ لوگ اللہ تعالیٰ سے اپنی مغفرت و بخشش کی طلب کریں اور عافیت مانگیں تاکہ پروردگار انہیں ان آفات و بلاء سے محفوظ و مامون رکھے۔"

"عافیت" کے معنی ہیں سلامتی حاصل ہونی دین میں فتنہ سے اور جسم و بدن کو بری بیماریوں، شدید مصائب اور سخت رنج و تکلیف سے"

سب سے بہتر دعا طلب عافیت

⑨ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الدُّعَاءِ اَفْضَلُ قَالَ سَلْ رَبَّكَ الْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ثُمَّ اَتَاهُ فِي الْيَوْمِ الثَّانِي فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الدُّعَاءِ اَفْضَلُ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ اَتَاهُ فِي الْيَوْمِ الثَّالِثِ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ ذٰلِكَ قَالَ فَاِذَا اُعْطِيْتَ الْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَقَدْ اَفْلَحْتَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادًا۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! کون سی دعا سب سے بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا" اپنے رب سے عافیت (یعنی دین و بدن کی سلامتی اور دنیا آخرت میں معافات مانگو) معافات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں تمہیں لوگوں سے اور لوگوں کو تم سے عافیت و حفاظت میں رکھے۔ وہ شخص پھر دوسرے دن آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! کون سی دعا سب سے بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے اس سے وہی فرمایا جو (پہلے دن کہا تھا، پھر وہ شخص تیسرے دن آیا) اور اس نے وہی پوچھا آپ ﷺ نے اس کو وہی جواب دیا اور فرمایا کہ اگر تمہیں عافیت اور دنیا و آخرت میں معافات عطا کر دی جائے تو تم نجات پاگئے اور تم نے اپنے مقصد کو حاصل کرلیا اس روایت کو ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث باعتبار سند کے غریب ہے۔"

محبت الٰہی کی طلب کے لئے دعا

⑩ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ يَزِيْدَ الْخَطْمِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ فِي دُعَائِهِ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يَنْفَعُنِي حُبُّهُ عِنْدَكَ اَللّٰهُمَّ مَا رَزَقْتَنِي مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِي فِيْمَا تُحِبُّ اَللّٰهُمَّ مَا زَوَيْتَ عَنِّي مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًا لِي فِيْمَا تُحِبُّ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن یزید خطمیؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنی دعا میں یہ فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يَنْفَعُنِي حُبُّهُ عِنْدَكَ اَللّٰهُمَّ مَا رَزَقْتَنِي مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِي فِيْمَا تُحِبُّ اَللّٰهُمَّ مَا زَوَيْتَ عَنِّي مِمَّا

أُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًالِي فِيمَا تُحِبُّ اے اللہ! مجھے نصیب کر اپنی محبت اور اس شخص کی محبت جس کی محبت تیرے نزدیک مجھے نفع دے اے اللہ تو نے مجھے اس چیز میں سے جسے میں پسند کرتا ہوں جو کچھ بھی عطا کیا ہے اس کو میرے لئے اس چیز میں قوت کا سبب بنا جسے تو پسند کرتا ہے۔ (یعنی تو نے مال وزر، عافیت و اطمینان اور دوسری دنیاوی نعمتوں میں سے جو کچھ بھی عطا فرمایا ہے اور ان کو شکر گزاری اور اپنی طاعت کا سبب بنا کہ میں اسے تیری راہ میں اور تیری خوشنودی کے لئے خرچ کروں۔ اے اللہ! تو نے مجھے اس چیز میں سے جسے میں پسند کرتا ہوں جو کچھ نہیں دیا ہے اس کو میرے لئے اس میں فراغت کا سبب بنا جسے تو پسند کرتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: دعا کے آخری جز کا مطلب یہ ہے کہ تو نے مجھے مال وزر میں سے جو کچھ نہیں دیا ہے اس کو میرے لئے اپنی عبادت میں مشغولیت کا سبب بنا کہ مجھے قناعت و توکل کی دولت حاصل رہے اور وہ مال وزر جو مجھے حاصل نہیں ہوا ہے اس سے بے پرواہ ہو کر بغیر مانع کے تیری عبادت میں مشغول رہوں اور حاصل دعا کے آخری دونوں جملوں کا یہ ہے کہ اگر تو مجھے دنیا کی نعمتیں عطا کرے تو پھر ان کا شکر ادا کرنے کی توفیق بھی عطا فرما تاکہ میرا شمار شکر کرنے والے اغنیا کے زمرہ میں ہو اور اگر مجھے وہ نعمتیں حاصل نہ ہوں تو میرے دل کو فارغ رکھ بایں طور کہ میں ان سے بے پرواہ ہو جاؤں میرا دل ان میں نہ لگا رہے۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ تیری عبادت میں مشغول رہوں اور جزع وفزع، شکوہ وشکایت نہ کروں تاکہ میرا شمار صبر کرنے والے فقراء میں ہو۔

ایک عمدہ دعا

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَلَّمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْمُ مِنْ مَجْلِسٍ حَتَّى يَدْعُوْبِهٰؤُلَاءِ الدَّعْوَاتِ لِاَصْحَابِهِ اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهِ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهِ جَنَّتَكَ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهِ عَلَيْنَا مُصِيْبَاتِ الدُّنْيَا وَمَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِي دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ رسول ﷺ کسی مجلس سے اٹھتے ہوں اور ان کلمات کے ذریعے اپنے صحابہؓ کے لئے دعا نہ مانگتے ہوں۔ (کیونکہ مجلس اور دعا میں صحابہ بھی شامل ہوتا تھے۔ یا کہ ان کی تعلیم کے لئے یہ دعا مانگتے تھے.... اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهِ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهِ جَنَّتَكَ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهِ عَلَيْنَا مُصِيْبَاتِ الدُّنْيَا وَمَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِي دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا اے اللہ! تو ہم میں اپنا اتنا خوف پیدا کر دے کہ تو اس کی وجہ سے ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے (یعنی اس خوف کی وجہ سے ہم گناہوں سے بچیں) اور ہمیں اپنی اتنی طاعت نصیب کر کہ اس کی وجہ سے، ہمیں بہشت کے (عالی درجات) میں پہنچا دے ہمیں اتنا یقین عطا فرما کہ اس کی وجہ سے تو ہم پر دنیا کی مصیبتیں آسان کر دے، ہمیں ہمارے سماعتوں، ہماری بینائیوں اور ہماری قوتوں سے اس وقت تک بہرہ مند رکھ جب تک کہ تو ہمیں زندہ رکھے اور بہرمندی کو ہمارا وارث قرار دے یعنی ہمارے تمام اعضاء وحواس کو آخر تک برقرار وسلامت رکھ ہمارے کینہ و انتقال میں اس شخص کو مبتلا کر جس نے ہم پر ظلم کیا (یعنی ہمیں اتنی طاقت وقوت دے کہ ہم اپنے ظالموں سے بدلہ لے سکیں، یا ہماری طرف سے تو ان سے بدلہ لے) ہمیں فتح عطا فرما اس شخص سے جو ہم سے دشمنی رکھے خواہ وہ ہمارا دینی دشمن ہو یا دنیاوی دشمن ہماری مصیبتوں کو ہمارے دین میں موثر نہ کر (یعنی ہمیں ایسی مصیبتوں میں مبتلا نہ کر جو دین کے نقصان کا باعث ہوں) دنیا کو ہمارے لئے فکر کا مرکز اور ہمارے مبلغ علم کو ہمارا مطمع نظر بنا۔ اور ہم پر ان لوگوں کو مسلط نہ کر جو ہم پر رحم نہ کریں۔" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ

حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "ہمیں اتنا یقین عطا فرما" کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنی ذات و صفات پر اور سرکار دو عالم ﷺ کے ارشادات و تعلیم پر ہمیں اس درجہ کا یقین و اعتماد عطا فرما کہ دنیا کی سختیاں اور یہاں کے مصائب و آلام ہمارے لئے آسان ہوں۔ مثلاً جس شخص کو یہ یقین ہوگا کہ اللہ تعالیٰ رزاق ہے ہر جاندار کی ضروریات زندگی پورا کرتا ہے تو اسے ہرگز کوئی فکر نہیں ہوگی اور وہ اس کی ذات پر بھروسہ و اعتماد کرے گا اسی طرح جسے اس یقین کی دولت حاصل ہو جائے گی کہ آخرت کی سختیاں اور وہاں کے مصائب زیادہ سخت ہیں۔ دنیا کی سختیاں بالکل ناپائیدار اور ختم ہو جانے والی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو اس کے لئے دنیا کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی وہ بڑی سے بڑی دنیاوی مصیبت و سختی کا کوئی احساس نہیں کرے گا لہٰذا اے خدا! تو ہمیں یقین و اعتماد و توکل و بھروسہ کی اسی عظیم دولت سے بہرہ ور فرما۔

"دنیا کو ہمارے لئے فکروں کا مرکز نہ بنا" کا مطلب یہ ہے کہ ہم دنیا کی بہت زیادہ فکر و تدبیر میں نہ لگے رہیں۔ بلکہ آخرت کی فکر، وہیں کے اندیشہ کا زیادہ خیال رکھیں، دنیا کی صرف اتنی ہی فکر اور اپنے معاش کا صرف اتنا ہی خیال رکھیں جو ضروری ہے اور جس کے لئے نہ صرف ہمیں اجازت ہے بلکہ مستحب بھی ہے۔

علم و عمل کی دعا

(۱۲) وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مَا يَنْفَعُنِیْ وَزِدْنِیْ عِلْمًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ وَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ اَهْلِ النَّارِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مَا يَنْفَعُنِیْ وَزِدْنِیْ عِلْمًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ اَهْلِ النَّارِ اے اللہ! تو نے مجھے جو کچھ سکھلایا ہے اسے میرے لئے نفع بخش کر (یعنی مجھے ایسا علم دے جس کو حاصل کرنا اور جس چیز پر عمل کرنا دنیا و آخرت میں میرے لئے نفع کا باعث ہو اور میرے علم (یعنی دینی علم) میں زیادتی کر۔ ہر حالت میں اللہ ہی کے لئے تمام تعریفیں ہیں اور میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں دوزخیوں کی سی حالت سے (کہ دنیا میں فسق و فجور سے اور عقبیٰ میں عذاب سے بچوں۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث باعتبار سند کے غریب ہے۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

نعمت و عزت کی دعا

(۱۳) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْیُ سُمِعَ عِنْدَ وَجْهِهٖ دَوِیٌّ كَدَوِیِّ النَّحْلِ فَاُنْزِلَ عَلَيْهِ يَوْمًا فَمَكَثْنَا سَاعَةً فَسُرِّیَ عَنْهُ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَ اٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَارْضِنَا وَارْضَ عَنَّا ثُمَّ قَالَ اُنْزِلَ عَلَیَّ عَشْرُ اٰيَاتٍ مَنْ اَقَامَهُنَّ دَخَلَ الْجَنَّةَ ثُمَّ قَرَأَ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى خَتَمَ عَشْرَ اٰيَاتٍ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور امیر المؤمنین حضرت فاروقؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ کے مبارک منہ کے قریب شہد کی مکھی کی آواز کی مانند آواز سنی جاتی تھی چنانچہ ایک دن (ہمارے سامنے) آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی ہم تھوڑی دیر ٹھہرے رہے (یعنی ہم اس انتظار میں رہے کہ نزول وحی کی جو سختی آپ ﷺ پر طاری ہے وہ ختم ہو جائے) جب سختی کی وہ کیفیت آپ ﷺ سے دور ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنے منہ قبلہ کی طرف کیا اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر بارگاہ الٰہی میں یوں عرض رساں ہوئے۔ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَارْضِنَا وَارْضَ عَنَّا اے اللہ! ہماری دنیاوی اور اخروی نعمتوں یا مسلمانوں کی تعداد

میں زیادتی کر اور ان نعمتوں یا مسلمانوں میں کمی نہ کر ہمیں دنیا میں حاجت روائی کے ساتھ اور عقبی میں بلندی درجات کے ذریعہ معزز بنا (اور ہمیں ان چیزوں سے محروم رکھ کر ذلیل نہ کر ہمیں دنیا و آخرت کی بھلائیاں) عطا فرما اور ہمیں محروم نہ کر ا ہمیں اپنی رحمت و عنایت کے ذریعہ برگزیدہ بنا اور ہم پر غیروں کو اپنے لطف و کرم کے ذریعہ برگزیدہ نہ بنا یا کہ ہمارے دشمنوں کو ہم پر غالب نہ کر ہمیں اپنی قضاء و قدر پر صبر و شکر کی توفیق عطا فرما کر راضی رکھ اور تو ہی ہماری تھوڑی سی بھی عبادت و طاعت پر ہم سے راضی ہو پھر آپ ﷺ نے فرمایا ابھی مجھ پر دس آیتیں نازل ہوئی ہیں جو شخص ان پر عمل کرتا رہے وہ جنت میں نیکیوں کے ساتھ داخل ہوگا اس کے بعد آپ ﷺ نے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ دس آیتوں تک پڑھی۔" (احمد ترمذی)

تشریح: آنحضرت ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تھی اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کلام الٰہی کو آپ ﷺ تک پہنچاتے تھے تو صحابہؓ حضرت جبرئیل کی آواز کو سنتے تو تھے مگر اسے سمجھ نہیں پاتے تھے جیسا کہ شہد کی مکھی کی آواز سنی تو جاتی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی اسی لئے حضرت جبرئیل کی اس آواز کو حضرت عمر فاروقؓ نے شہد کی مکھی کی آواز سے مشابہت دی۔ وہ دس آیتیں اس وقت آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی تھیں اور جن پر عمل کرنے والے کے لئے مذکورہ بالا حدیث میں آپ ﷺ نے بشارت عطا فرمائی یہ ہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (ترجمہ) بیشک وہ ایمان والے رستگار ہوگئے (یعنی انہوں نے فلاح پائی) جو نماز میں (باطنی و ظاہری طور پر) عجز و نیاز کرتے ہیں اور جو بے ہودہ چیزوں سے خواہ وہ کہنے کی ہوں یا کرنے کی منہ موڑتے رہتے ہیں اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو حرام کاری سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا اپنی کنیزوں سے صحبت کرتے ہیں تو ان پر کوئی ملامت نہیں۔ ہاں جو اس کے علاوہ کے طالب ہوں (یعنی جو لوگ اپنی بیویوں سے اور کنیزوں کے علاوہ دوسرے افعال بد میں مبتلا ہوں۔ مثلاً اغلام بازی، جلق یا متعہ وغیرہ کریں) تو وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے (یعنی دائرہ حلال سے) تجاوز کرنے والے (اور حرام میں مبتلا ہونے والے) ہیں اور جو امانتوں اور عہد و پیمان کی محافظت کرتے ہیں اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں (یعنی شرائط و آداب کے ساتھ نمازیں پابندی سے ادا کرتے ہیں)، یہی وہ لوگ ہیں جو وارث ہیں کہ یہی فردوس کے مالک ہوں گے (جو جنت کا اعلیٰ درجہ ہے) وہ لوگ (یعنی یہ مؤمنین جن کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں) اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بینائی کے لئے دعا

(۱۴) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا ضَرِيْرًا لْبَصَرِ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ادْعُ اللّٰهَ اَنْ يُعَافِيَنِيْ فَقَالَ اِنْ شِئْتَ دَعَوْتُ وَاِنْ شِئْتَ صَبَرْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ قَالَ فَادْعُهُ قَالَ فَاَمَرَهُ اَنْ يَتَوَضَّاَ فَيُحْسِنَ الْوُضُوْءَ وَيَدْعُوَ بِهٰذَا الدُّعَاءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ اِنِّيْ تَوَجَّهْتُ بِكَ اِلٰى رَبِّيْ لِيَقْضِيَ لِيْ فِيْ حَاجَتِيْ هٰذِهٖ اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

"حضرت عثمان ابن حنیفؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص جسے کم نظر آتا تھا یا یہ کہ وہ بینائی سے محروم تھا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ بینائی کے نقصان سے عافیت بخشے آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہو تو تمہارے لئے دعا کروں اور اگر تم صبر و رضا چاہتے ہو تو صبر کرو صبر کرنا ہی تمہارے لئے بہتر ہے اس شخص نے کہا کہ آپ ﷺ میرے لئے دعا ہی کر دیجئے حضرت عثمانؓ

کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر اسے حکم دیا کہ وضو کرے اور اچھا یعنی سنن و آداب کے ساتھ وضو کرے اور ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اسے دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم بھی دیا اور یہ کہ پھر... ان کلمات کے ذریعہ دعا مانگنے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ وَ اَتَوَجَّهُ اِلَیْكَ بِنَبِیِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ اِنِّی تَوَجَّهْتُ بِكَ اِلٰی رَبِّی لِیَقْضِیَ لِیْ فِیْ حَاجَتِیْ ھٰذِهٖ اَللّٰھُمَّ فَشَفِّعْهُ فِیَّ میں تجھ سے اپنا مقصود مانگتا ہوں اور متوجہ ہوتا ہوں تیری طرف تیرے نبی کے وسیلہ سے جن کا نام محمد ﷺ جو نبی رحمت ہے اور میں متوجہ ہوتا ہوں اپنے پروردگار کی طرف اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے وسیلہ سے تاکہ وہ میری حاجت کے بارہ میں حکم کرے اور یہ کہ اے اللہ! میرے بارے میں اپنے نبی کی شفاعت قبول فرما امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔"

تشریح: صبر کرنے کو بہتر اس لئے فرمایا کہ بینائی سے محرومی پر صبر کا ثواب جنت ہے چنانچہ حدیث شریف میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے کسی بندے کو اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی کے نقصان میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ بندہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں اس کے عوض اسے جنت عطا کرتا ہوں۔

داؤد علیہ السلام کی دعا

⑮ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ دَاوٗدَ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ یُبَلِّغُنِیْ حُبَّكَ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَمَالِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ قَالَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَكَرَ دَاوٗدَ یُحَدِّثُ عَنْهُ یَقُوْلُ كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حضرت داؤد علیہ السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی تھی۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ یُبَلِّغُنِیْ حُبَّكَ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَمَالِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں تیری محبت اور اس شخص کی محبت جو تجھ سے محبت رکھے اور وہ عمل جو مجھے تیری محبت تک پہنچادے اے اللہ! تو اپنی محبت کو میرے لئے میری جان سے، میرے مال سے، میرے اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ عزیز بنادے۔ راوی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ جب حضرت داؤد علیہ السلام کی باتیں بیان فرماتے تھے تو فرماتے تھے کہ حضرت داؤدؑ اپنے زمانہ کے آدمیوں میں بڑے عابد تھے امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

ایک جامع دعا

⑯ وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ صَلّٰی بِنَا عَمَّارُ بْنُ یَاسِرٍ صَلَاةً فَاَوْجَزَ فِیْھَا فَقَالَ لَهٗ بَعْضُ الْقَوْمِ لَقَدْ خَفَّفْتَ وَاَوْجَزْتَ الصَّلَاةَ فَقَالَ اَمَا عَلَیَّ ذٰلِكَ لَقَدْ دَعَوْتُ فِیْھَا بِدَعَوَاتٍ سَمِعْتُھُنَّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا قَامَ تَبِعَهٗ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ ھُوَ اُبَیٌّ غَیْرَ اَنَّهٗ كَنّٰی عَنْ نَفْسِهٖ فَسَأَلَهٗ عَنِ الدُّعَاءِ ثُمَّ جَاءَ فَاَخْبَرَ بِهِ الْقَوْمَ اَللّٰھُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَیْبَ وَقُدْرَتِكَ عَلَی الْخَلْقِ اَحْیِنِیْ مَا عَلِمْتَ الْحَیٰوةَ خَیْرًا لِّیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَیْرًا لِّیْ اَللّٰھُمَّ وَاَسْأَلُكَ خَشْیَتَكَ فِی الْغَیْبِ وَالشَّھَادَةِ وَاَسْأَلُكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ فِی الرِّضَا وَالْغَضَبِ وَاَسْأَلُكَ الْقَصْدَ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنٰی وَاَسْأَلُكَ نَعِیْمًا لَّا یَنْفَدُ وَاَسْأَلُكَ قُرَّةَ عَیْنٍ لَّا تَنْقَطِعُ وَاَسْأَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ وَاَسْأَلُكَ بَرْدَ الْعَیْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَاَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ اِلٰی وَجْھِكَ وَالشَّوْقَ اِلٰی لِقَائِكَ فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَّلَا فِتْنَةٍ مُّضِلَّةٍ اَللّٰھُمَّ زَیِّنَّا بِزِیْنَةِ الْاِیْمَانِ وَاجْعَلْنَا ھُدَاةً مَّھْدِیِّیْنَ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت عطاء ابن سائب اپنے والد (حضرت سائب) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا حضرت عمار بن یاسرؓ نے ہمیں ایک نماز پڑھائی۔ نماز میں انہوں نے اختصار کیا (یعنی نہ تو انہوں نے طویل قرأت کی اور نہ تسبیحات وغیرہ بہت زیادہ پڑھیں، چنانچہ ان سے بعض لوگوں نے کہا آپ نے ہلکی نماز پڑھی اور نماز کو مختصر کر دیا حضرت عمارؓ نے فرمایا کہ میرے لئے یہ تخفیف مضر نہیں کیونکہ میں نے اس نماز کے قعدہ میں یا سجدہ میں وہ کئی دعائیں پڑھی ہیں جن کو میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا ہے پھر جب حضرت عمارؓ اٹھ کر چلے تو جماعت میں سے ایک شخص ان کے ساتھ ہو لیا اور حدیث کے راوی حضرت عطاء کہتے ہیں کہ وہ میرے باپ حضرت عطاء ہی تھے، سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنے آپ کو چھپایا یعنی انہوں نے اس طرح بیان نہیں کیا کہ حضرت عمارؓ کے ساتھ میں گیا بلکہ اپنے کو پوشیدہ رکھنے کے لئے یوں کہا کہ ایک شخص ان کے ساتھ ہو لیا۔ بہرکیف انہوں نے حضرت عمارؓ سے اس دعا کے بارہ میں دریافت کیا۔ حضرت عمارؓ نے انہیں وہ دعا بتا دی جو انہوں نے نماز کے دوران پڑھی تھی پھر وہ آئے اور جماعت کو وہ دعا بتا دی جو یہ ہے) اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبَ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ اَحْيِنِي مَاعَلِمْتَ الْحَيٰوةَ خَيْرًا لِي وَتَوَفَّنِي اِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِي اَللّٰهُمَّ وَاَسْئَلُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَاَسْأَلُكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ وَاَسْأَلُكَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنٰى وَاَسْأَلُكَ نَعِيْمًا لَا يَنْفَدُ وَاَسْأَلُكَ قُرَّةَ عَيْنٍ لَا تَنْقَطِعُ وَاَسْأَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ وَاَسْأَلُكَ بَرْدَ الْعَيْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَاَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظْرِ اِلٰى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ اِلٰى لِقَائِكَ فِي غَيْرِ ضَرَّاءٍ مُضِرَّةٍ وَلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ اَللّٰهُمَّ زَيِّنَّا بِزِيْنَةِ الْاِيْمَانِ وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مَهْدِيِّيْنَ (ترجمہ) اے اللہ! تو تجھ اپنے علم غیب کے اور تجھ قدرت کے اپنی مخلوق پر مجھ کو زندہ رکھ جب تک کہ تو زندگی کو میرے لئے بہتر جانے اور مجھے موت دے جب تو موت کو میرے لئے بہتر جانے (یعنی جب تک نیکیاں برائیوں پر غالب ہیں اس وقت تک زندگی بہتر ہے اور جب برائیاں نیکیوں پر غلبہ پالیں اور ظاہری و باطنی فتنے گھیرلیں تو اس وقت موت بہتر ہے اے اللہ! اور مانگتا ہوں میں تجھ سے تیرا خوف باطن و ظاہر میں اور مانگتا ہوں کلمہ حق (کہنے کی توفیق) خوشی میں بھی اور خفگی میں بھی اور مانگتا ہوں میں تجھ سے میانہ روی فقر و افلاس کی حالت میں بھی اور خوش حالی کے وقت میں بھی (یعنی نہ تو زیادہ فقر و افلاس اور رنج و تکلیف ہی میں مبتلا ہوں اور نہ اتنا تونگر و خوش حال ہو جاؤں کہ اسراف کرنے لگوں) اور مانگتا ہوں میں تجھ سے ایسی نعمت جو کبھی ختم نہ ہو۔ (یعنی غیب کی نعمتیں) اور مانگتا ہوں تجھ سے آنکھ کی ٹھنڈک جو کبھی ختم نہ ہو۔ اور مانگتا ہوں رضامندی (تیری) قضا (یعنی تقدیر) کے بعد اور مانگتا ہوں تجھ سے ٹھنڈک زندگی کی مرنے کے بعد (یعنی ہمیشہ کی راحت برزخ اور قیامت میں)۔ اور مانگتا ہوں لذت دیکھنے کی تیرے چہرہ کی طرف (آخرت میں) اور مانگتا ہوں تیری ملاقات کا شوق ایسی حالت میں جو ضرر نہ پہنچائے اور نہ گمراہی کے فتنہ میں مبتلا کرے اے اللہ! ہمیں ایمان کی زینت کے ساتھ مزین فرما یعنی ہمیں ایمان پر ثابت قدم رکھ اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرما اور ہمیں راہ راست دکھانے والے اور راہ راست پر چلنے والے بنا۔" (نسائیؒ)

تشریح: "اور مانگتا ہوں کلمہ حق" کا مطلب یہ ہے کہ میرے اندر اتنی استقامت اور بے خوفی پیدا فرما کہ میں ہمیشہ کلمہ حق یعنی حق بات ہی کہوں چاہے مجھ سے لوگ خوش ہوں یا ناراض ہوں۔ یا یہ کہ اپنی خوشی کی حالت میں بھی اور خفگی کی حالت میں بھی کلمہ حق ہی کہوں عوام کی طرح نہ ہو جاؤں کہ جب وہ خفگی کی حالت میں ہوتے ہیں تو برا کہتے ہیں اور جب خوش ہوتے ہیں تو خوش آمد کرتے ہیں۔

"آنکھ کی ٹھنڈک" سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے جذبہ طاعت و عبادت کامل اور حقیقی لذت و کیف پاتا ہے۔ یا اس سے مراد دعا مانگنے والے کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کا باقی رہنا ہے، اسی طرح آنکھ کی ٹھنڈک سے نماز پر پختگی اور اسکی پابندی بھی مراد ہو سکتی ہے اور اس کے مفہوم کو زیادہ وسعت دی جائے تو دونوں جہان کی بھلائیاں بھی مراد لی جا سکتی ہیں۔

فِي غَيْرِ ضَرَّاءٍ مُضِرَّةٍ ایسی حالت میں جو ضرر نہ پہنچائے، کا تعلق جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے شوق ملاقات سے ہے یعنی میں تیری ملاقات کا ایسا شوق چاہتا ہوں۔ جو میری راہ سلوک میں، راہ ادب پر میری استقامت میں اور احکام و اعمال کی بجا آوری اور ادائیگی میں

نقصان نہ پہنچائے کیونکہ جن لوگوں کو راہ سلوک و تصوف پر گامزن ہونے کا شرف حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی ملاقات کا شوق بسا اوقات ورفتگی و بے خودی کی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے جسے غلبہ حال کہا جاتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب قدم راہ ادب کی استقامت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، سلوک میں کوتاہی پیدا ہو جاتی ہے اور احکام و اعمال میں نقصان واقع ہو جاتا ہے چنانچہ اگلے جملہ وَلاَفِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ کا بھی یہی مطلب ہے کہ ایسا شوق چاہتا ہوں جو راہ استقامت سے ہٹانے والی اور احکام و اعمال میں بے راہ روی پیدا کرنے والی آزمائش میں مبتلا نہ کرے۔

یا پھر کہا جائے گا کہ اس جملہ کا تعلق دعا کے ابتدائی لفظ "احینی" سے ہے تا کہ اس کا مفہوم دعا میں مذکور تمام چیزوں پر حاوی ہو جائے یعنی مجھ کو اس مذکورہ نعمتوں کے ساتھ اسی طرح زندہ رکھ کہ ایسی بلاء و آزمائش میں گرفتار نہ ہو جاؤں جس میں صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اور میں گمراہی میں پڑ جاؤں۔

"راہ راست پر چلنے والے بنا" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم دوسروں کو اچھی راہ بتائیں اور دوسروں کو نیک زندگی اختیار کرنے کی تلقین کریں اسی طرح ہم خود بھی اس پر عمل کرتے ہوئے اچھی راہ اپنائیں۔ اور نیک زندگی اختیار کریں۔ ہماری حالت خودرا فضیحت و دیگرے نصیحت والی نہ ہو بلکہ ہمارا عمل ہمارے قول کے مطابق ہو۔

علم نافع و عمل مقبول اور حلال رزق کی دعا

(۱۷) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ فِي دُبُرِ الْفَجْرِ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَعَمَلاً مُتَقَبَّلاً وَرِزْقًا طَيِّبًا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ فجر کی نماز کے بعد یہ دعا مانگتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَعَمَلاً مُتَقَبَّلاً وَرِزْقًا طَيِّبًا یعنی اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں نفع دینے والا علم، قبول کیا جانے والا عمل اور حلال رزق۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

شکر گزار ہونے کی دعا

(۱۸) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ دُعَاءٌ حَفِظْتُهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا اَدَعُهُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي اُعَظِّمُ شُكْرَكَ وَاُكْثِرُ ذِكْرَكَ وَاَتَّبِعُ نُصْحَكَ وَاَحْفَظُ وَصِيَّتَكَ۔ (رواہ الترمذیؒ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے یہ دعا یاد کی ہے جسے میں ترک نہیں کرتا۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي اُعَظِّمُ شُكْرَكَ وَاُكْثِرُ ذِكْرَكَ وَاَتَّبِعُ نُصْحَكَ وَاَحْفَظُ وَصِيَّتَكَ یعنی اے اللہ! مجھے توفیق دے کہ میں تیرا بڑا شکر ادا کروں، تیرا بہت ذکر کروں، تیری نصیحت کو پورا کروں اور تیری وصیت یاد رکھوں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: نصیحت سے مراد بندوں کے حقوق ہیں اور "وصیت" سے مراد اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ خدایا! تو نے لوگوں کے حقوق ادا کرنے کا مجھے جو حکم دیا ہے اور اپنے حقوق کی ادائیگی کا جو فریضہ مجھ پر عائد کیا ہے اس پر محافظت کروں یعنی دونوں قسم کے حقوق ادا کرتا ہوں۔

صحت وغیرہ کی دعا

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْأَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْاَمَانَةَ وَحُسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضٰى بِالْقَدَرِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْأَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْاَمَانَةَ وَحُسْنَ

الْخُلُقِ وَالرِّضٰی بِالْقَدَرِ یعنی بری بیماریوں سے بدن کی سلامتی و تندرستی یا افعال و احوال و اعمال کی درستی و اصلاح اور حرام سے اجتناب اور امانت (یعنی لوگوں کے اموال میں یا شریعت کے تمام حقوق میں خیانت نہ کروں اور بہترین اخلاق اور تقدیر پر رضا۔"

خصائل بد سے بچنے کی دعا

(۲۰) وَعَنْ اُمِّ مَعْبَدٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِي مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِي مِنَ الرِّيَاءِ وَلِسَانِي مِنَ الْكِذْبِ وَعَيْنِي مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت اُم معبدؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ دعا مانگتے سنا ہے اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِي مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِي مِنَ الرِّيَاءِ وَلِسَانِي مِنَ الْكِذْبِ وَعَيْنِي مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ اے اللہ! پاک کر میرے دل کو نفاق سے، میرے عمل کو ریا سے، میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت (یعنی نظر حرام) سے بے شک تو جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کو اور اس چیز کو کہ دل میں پوشیدہ ہے یعنی خواہشات اور گناہ۔ یہ دونوں روایتیں بیہقیؒ نے دعوات کبیر میں نقل کی ہیں۔"

تشریح: خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ قرآن کریم کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس کے معنی ہیں "آنکھوں کی خیانت" حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس جملے کو بطور مثال یوں واضح کیا ہے کہ فرض کیجئے مردوں کی ایک جماعت کہیں بیٹھی ہوئی ہے اچانک ایک عورت ان کے سامنے سے گزرتی ہے اور وہ سب مرد ایک دوسرے کی شرم سے اس عورت کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہیں کرتے ہیں، چنانچہ جب وہ سب اپنی نظریں نیچی کر لیتے ہیں تو ان میں سے ایک شخص سب کی نگاہوں سے بچ کر اپنی نظر اٹھاتا ہے اور چوری سے اس عورت کو دیکھ لیتا ہے یہی آنکھوں کی خیانت ہے۔

دنیا و آخرت کی عافیت اور عذاب سے نجات کی دعا مانگو

(۲۱) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَادَ رَجُلًا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ قَدْ خَفَتَ فَصَارَ مِثْلَ الْفَرْخِ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ كُنْتَ تَدْعُو اللّٰهَ بِشَيْءٍ اَوْ تَسْاَلُهُ اِيَّاهُ قَالَ نَعَمْ كُنْتُ اَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ مَا كُنْتَ مُعَاقِبِيْ بِهِ فِي الْاٰخِرَةِ فَعَجِّلْهُ لِي فِي الدُّنْيَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ لَا تُطِيْقُهُ وَلَا تَسْتَطِيْعُهُ اَفَلَا قُلْتَ اَللّٰهُمَّ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ قَالَ فَدَعَا اللّٰهَ بِهٖ فَشَفَاهُ اللّٰهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک مسلمان کی عیادت کی جو پرندے کے ایک بچے کی مانند ضعیف ہو گیا تھا رسول کریم ﷺ نے (اس کی حالت دیکھ کر) فرمایا کہ "کیا تم اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کی دعا مانگا کرتے تھے؟ یا فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ سے کس چیز کی دعا مانگتے تھے؟ اس نے کہا کہ ہاں! میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ خدایا اگر تو آخرت میں مجھے عذاب میں مبتلا کرنے والا ہو تو (اس کے بدلے) دنیا ہی میں وہ عذاب دینے میں جلدی کر"۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا "تم نے بڑی عجیب دعا مانگی، نہ تم (دنیا ہی میں) اللہ تعالیٰ کے عذاب کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہو اور نہ آخرت ہی میں تم اللہ تعالیٰ کے عذاب کے متحمل ہو سکتے ہو۔ تم نے اس طرح کیوں نہ دعا مانگی۔ اَللّٰهُمَّ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ترجمہ: اے اللہ! ہمیں عطا فرما دنیا میں بھلائی (یعنی عافیت) اور آخرت میں بھلائی (یعنی عفو تقصیرات) اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔"

"راوی کا بیان ہے کہ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگنی شروع کی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے شفا عطا فرمائی۔" (مسلمؒ)

غیر متحمل چیزوں کی دعا نہ مانگو

(۲۲) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ اَنْ يُذِلَّ نَفْسَهُ قَالُوْا وَكَيْفَ يُذِلُّ نَفْسَهُ قَالَ يَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا يُطِيْقُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت حذیفہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل وخوار کرے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اپنے آپ کو ذلیل وخوار کس طرح کرتا ہے"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ایسی بلائیں اپنے سر لے لے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا"۔ ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: یہ بات مؤمن کی فراست کے منافی ہے کہ وہ ایسی چیز یا کسی ایسے کام کی ذمہ داری قبول کرے جو اس کی طاقت اور اس کی رسائی سے باہر ہو۔ ایسا کرنا اپنے آپ کو خوار کرنا اور اپنی سبکی کرانا ہے۔ مثلاً کوئی شخص حساب کتاب کے فن سے ناواقف ہو اور ایسے امور اپنے ذمہ لے لے جن کا تعلق حساب کتاب سے ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکے گا، جس کا نتیجہ اپنی خواری و سبکی کے علاوہ اور کیا نکلے گا۔ چنانچہ یہ ارشاد گرامی مسلمانوں کو اسی نکتہ کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ وہ صرف ایسے ہی امور اپنے ذمہ لیں جن کی انجام دہی کی وہ طاقت ولیاقت رکھتے ہوں۔ کسی غرض، کسی لالچ یا کسی جذبہ کی تسکین کی خاطر غیر متحمل چیزوں کی ذمہ داری قبول کرنا آل کار اپنی ذلت وخواری میں مبتلا ہونا ہے۔

بظاہر یہ حدیث اس باب سے متعلق معلوم نہیں ہوتی لیکن اگر اس حدیث کے مفہوم کو پچھلی حدیث کے مفہوم کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ اس باب سے اس حدیث کا گہرا تعلق ہے اور وہ یہ کہ آدمی جس چیز کا تحمل نہ ہو اس کی دعا بھی نہ مانگے۔

باطن کی ظاہر سے بہتری اور ظاہر کی شائستگی کی دعا

(۲۳) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ عَلَّمَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قُلِ اللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرَتِيْ خَيْرًا مِنْ عَلَانِيَتِيْ وَاجْعَلْ عَلَانِيَتِيْ صَالِحَةً اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ مِنْ صَالِحِ مَاتُؤْتِي النَّاسَ مِنَ الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ غَيْرِ الضَّالِّ وَلَا الْمُضِلِّ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ دعا مانگو۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرَتِيْ خَيْرًا مِنْ عَلَانِيَتِيْ وَاجْعَلْ عَلَانِيَتِيْ صَالِحَةً اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ مِنْ صَالِحِ مَاتُؤْتِي النَّاسَ مِنَ الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ غَيْرِ الضَّالِّ وَلَا الْمُضِلِّ یعنی اے اللہ! میرے باطن کو میرے ظاہر سے بہتر بنا اور میرے ظاہر کو شائستگی عطا فرما اے اللہ! میں تجھ سے بھلائی مانگتا ہوں اس چیز کی جو تو لوگوں کو دیتا ہے یعنی اہل، مال، اولاد کہ نہ گمراہ ہوں اور نہ گمراہ کریں۔" (ترمذیؒ)

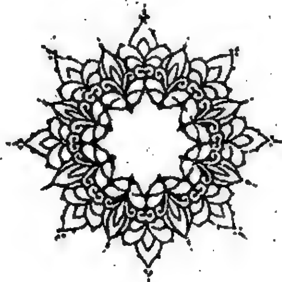

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب المناسک

افعال حج کا بیان

لغت کے اعتبار سے "حج" کے معنی ہیں کسی باعظمت چیز کی طرف جانے کا قصد کرنا اور "اصطلاح شریعت میں" کعبہ مکرمہ کا طواف اور مقام عرفات میں قیام انہیں خاص طریقوں سے جو شارع ؑ نے بتائے ہیں اور اسی خاص زمانے میں جو شریعت سے منقول ہے، حج کہلاتا ہے۔

حج دین کے ان پانچ بنیادی ستونوں میں سے ایک عظیم القدر ستون ہے جن پر اسلام کے عقائد و اعمال کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے حج کا ضروری ہونا (جس کو اصطلاح فقہ میں فرض کہا جاتا ہے، قرآن مجید سے اسی طرح صراحت کے ساتھ ثابت ہے جس طرح زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہے۔

حج کب فرض ہوا؟

فرضیت حج کی سعادت عظمٰی ہمارے آقا سرکار دو عالم ﷺ کی اُمت کے ساتھ مختص ہے گو کہنے کو تو حج کا رواج حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے ہے مگر اس وقت اس کی فرضیت کا حکم نہ تھا۔ چنانچہ صحیح مسلک یہی ہے کہ حج صرف اُمت محمدیہ پر فرض ہوا ہے۔

حج کب فرض ہوا؟ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، کچھ حضرات کہتے ہیں سن ۵ھ میں فرض ہوا اکثر علماء سن ۶ھ میں فرضیت کے قائل ہیں لیکن زیادہ صحیح قول ان علماء کا ہے جو یہ کہتے ہیں۔ کہ حج سن ۹ھ کے آخر میں فرض ہوا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا یعنی اللہ کی خوشنودی کے لئے لوگوں پر کعبہ کا حج (ضروری) ہے اور یہ اس شخص پر جو وہاں تک جا سکے۔

چونکہ یہ حکم سال کے آخر میں نازل ہوا تھا اس لئے آپ ﷺ تو افعال حج کی تعلیم میں مشغولیت اور آئندہ سال کے لئے سفر حج کے اسباب کی تیاری میں مصروفیت کی وجہ سے خود حج کے لئے تشریف نہیں لے جا سکے، بلکہ اس سال یعنی سن ۹ھ میں حضرت ابوبکرؓ کو حاجیوں کا امیر مقرر فرما کر مکہ بھیج دیا تاکہ وہ لوگوں کو حج کرا دیں اور پھر آپ ﷺ خود سال آئندہ یعنی سن ۱۰ھ میں اس حکم الٰہی کی تعمیل میں حج کے لئے تشریف لے گئے یہ عجیب اتفاق ہے کہ فرضیت کے بعد آپ ﷺ نے یہی پہلا حج کیا جو آخری حج بھی ثابت ہوا۔ چنانچہ یہی حج "حجۃ الوداع" کے نام سے مشہور ہے اسی حج کے بعد آپ ﷺ کے چہرہ عالمتاب اور وجود پر نور نے اس دنیا سے پردہ کیا۔

حج کے احکام

حج عمر میں ایک بار فرض ہے جب کہ وہ تمام شرائط پائے جائیں جن سے حج فرض ہوتا ہے ان شرائط کے پائے جانے کے باوجود جو شخص

حج نہ کرے وہ فاسق و گنہگار ہے اور جو شخص حج کی فرضیت کا انکار کرے وہ کافر ہے۔
صحیح یہ ہے کہ جب حج کے شرائط پائے جائیں توفی الفور حج کرنا فرض ہے۔ دوسرے سال تک اس میں تاخیر کرنا گناہ ہے۔ حج واجب ہے اس شخص پر جو میقات کے اندر بغیر احرام باندھے چلا جائے اور اس کے بعد حج کا احرام باندھے اسی طرح اس شخص پر حج فرض ہے جس نے حج کی نذر کی ہو۔
ناجائز مال سے حج کرنا حرام ہے اور مکروہ تحریمی ہے اس شخص کے لئے جو ان لوگوں کی اجازت کے بغیر حج کرے جن سے اجازت لینا ضروری ہے اس شخص کے لئے بھی حج مکروہ تحریمی ہے جو ان لوگوں کے نفقہ کا انتظام کئے بغیر حج کرے جن کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے۔

حج کے فرض ہونے کی شرطیں

حج ان شرائط کے پائے جانے کے بعد فرض ہوتا ہے۔ (۱) مسلمان ہونا، کافر پر حج فرض نہیں ہے (۲) آزاد ہونا، لونڈی غلام پر حج فرض نہیں ہے (۳) عاقل ہونا، مجنون، مست اور بیہوش پر حج فرض نہیں (۴) بالغ ہونا، نابالغ بچوں پر حج فرض نہیں (۵) صحت مند و تندرست ہونا، بیمار، اندھے، لنگڑے، اپاہج پر حج فرض نہیں (۶) قادر ہونا یعنی اس قدر مال کا مالک ہونا جو ضرورت اصلیہ اور قرض سے زائد ہو اور اس کے زاد راہ اور سواری کے کرایہ و خرچ کے لئے کافی ہو جائے نیز جن لوگوں کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے ان کے لئے بھی اس میں سے اس قدر چھوڑ جائے جو اس کی واپسی تک ان لوگوں کو کفایت کر سکے۔
(۷) راستے میں امن ہونا، اس بارے میں اکثر کا اعتبار ہے یعنی اگر اکثر لوگ امن و امان سے پہنچ جاتے ہوں تو حج فرض ہوگا، مثلاً اگر اکثر لوگ راستے میں ڈاکہ زنی وغیرہ سے لٹ جاتے ہوں یا کوئی ایسا دریا اور سمندر حائل ہو جس میں بکثرت جہاز ڈوب جاتے ہوں اور اکثر ہلاک ہو جاتے ہوں یا راستے میں اور کسی قسم کا خوف ہو تو ایسی حالت میں حج فرض نہیں ہوگا، ہاں اگر یہ حادثات کبھی کبھی اتفاقی طور پر ہو جاتے ہیں تو پھر حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوگی (۸) عورت کے لئے ہمراہی میں شوہر یا کسی اور محرم کا موجود ہونا جب کہ اس کے یہاں سے مکہ کی دوری بقدر مسافت سفر یعنی تین دن کی ہو۔ اگر شوہر یا محرم ہمراہی میں نہ ہوں۔ تو پھر عورت کے لئے سفر حج اختیار کرنا جائز نہیں ہے اور محرم کا عاقل بالغ ہونا اور مجوسی و فاسق نہ ہونا بھی شرط ہے۔ محرم کا نفقہ اس عورت پر ہوگا جو اپنے اپنے ساتھ حج میں لے جائے گی۔ نیز جس عورت پر حج فرض ہو وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی محرم کے ساتھ حج کے لئے جا سکتی ہے۔
اگر کوئی نابالغ لڑکا یا غلام احرام باندھنے کے بعد بالغ ہو جائے یا آزاد ہو جائے اور پھر وہ حج پورا کرے تو اس صورت میں فرض ادا نہیں ہوگا! ہاں اگر لڑکا فرض حج کے لئے از سر نو احرام باندھے گا تو صحیح ہو جائے گا۔ لیکن غلام کا احرام فرض حج کے لئے اس صورت میں بھی درست نہیں ہوگا۔

حج کے فرائض

حج میں پانچ چیزیں فرض ہیں۔ (۱) احرام، یہ حج کے لئے شرط بھی ہے اور رکن یعنی فرض بھی ہے۔ (۲) وقوف عرفات یعنی عرفات میں ٹھہرنا خواہ ایک ہی منٹ کے بقدر ہو اور خواہ دن میں ہو یا رات میں (۳) طواف الزیارۃ اس کو طواف الافاضہ اور طواف الرکن بھی کہتے ہیں۔ (۴) مذکورہ بالا فرائض میں ترتیب کا لحاظ یعنی احرام کو وقوف اور وقوف کو طواف زیارت پر مقدم کرنا (۵) ہر فرض کو اسی مکان مخصوص میں ادا کرنا یعنی وقوف کا خاص عرفات میں اور طواف کا خاص مسجد حرام (کعبہ مکرمہ) کے گرد ہونا اور ہر فرض کا اسی خاص وقت میں ادا کرنا جو شریعت سے اس کے لئے مقرر ہے یعنی وقوف کا نویں ذی الحجہ کی ظہر کے وقت سے دسویں تاریخ کی فجر سے پہلے تک ادا کرنا اور طواف کا اس کے بعد ادا کرنا۔

حج کے واجبات

حج میں یہ چیزیں واجب ہیں۔ ① وقوف مزدلفہ ② صفا اور مروہ کے درمیان سعی ③ رمی جمار ④ آفاقی یعنی غیر مکی کے لئے طواف قدوم ⑤ حلق یا تقصیر یعنی بال منڈوانا یا کتروانا ⑥ اور ہر وہ چیز جس کو ترک کر دینے پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہو جاتا ہو۔ ان فرائض وواجبات کے علاوہ اور بہت سی چیزیں جو حج کے سنن وآداب کے تحت آتی ہیں وہ آئندہ صفحات میں موقع بموقع بیان ہوں گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حج عمر بھر میں ایک مرتبہ فرض ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوْا فَقَالَ رَجُلٌ اَكُلَّ عَامٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَسَكَتَ حَتّٰى قَالَهَا ثَلَاثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُوْنِیْ مَا تَرَكْتُكُمْ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلٰى اَنْبِيَائِهِمْ فَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَیْءٍ فَدَعُوْهُ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ نے ہمارے سامنے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے لہٰذا تم حج کرو (یہ سن کر) ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم ہر سال حج کریں؟ آپ ﷺ خاموش رہے یہاں تک کہ اس شخص نے تین مرتبہ یہی بات کہی، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا ہوں تو یقیناً حج (ہر سال کے لئے) فرض ہو جاتا اور تم (ہر سال حج) کرنے پر قادر نہیں ہوسکتے تھے؟ پھر آپ ﷺ نے فرمایا جب تک میں تمہیں چھوڑوں تم مجھے چھوڑ دو (یعنی جو کچھ میں نہ کہا کروں مجھ سے مت پوچھا کرو) کیونکہ جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں (یعنی یہود ونصاریٰ) وہ اسی سبب سے ہلاک ہوئے کہ وہ اپنے انبیاء سے پوچھتے اور ان سے اختلاف کرتے تھے (جیسا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں منقول ہے لہٰذا جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو اس میں سے جو کچھ تم کرنے کی طاقت رکھتے ہو کرو اور جب میں تمہیں کسی بات سے منع کروں تو اس کو چھوڑ دو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ نے جب حج کی فرضیت کا فرمان نازل فرمایا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو اُمت کے اوپر نافذ کرنے کے لئے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ حج کریں چنانچہ جب آپ ﷺ لوگوں کے سامنے حج کی فرضیت بیان فرما رہے تھے اور انہیں حج کرنے کا حکم دے رہے تھے تو ایک صحابی جن کا نام اقرع بن حابسؓ تھا پوچھ بیٹھے کہ حج ہر سال کیا جائے گا؟ وہ یہ سمجھے کہ جس طرح دیگر عبادتیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ بار بار ادا کی جاتی ہیں اسی طرح یہ حج بھی مقرر ہی ہوگا اسی لئے انہوں نے یہ سوال کیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کو یہ بات ناگوار ہوئی اس لئے آپ ﷺ نے پہلے تو تنبیہا سکوت اختیار فرمایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ جب انہوں نے کئی بار پوچھا تو آخر کار آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ اگر میں اس سوال کے جواب میں "ہاں" کہہ دیتا تو یقیناً ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا کیونکہ میں یہ جواب اللہ تعالیٰ کے حکم کے بموجب دیتا بغیر اس کے حکم سے میری زبان سے کوئی تشریعی بات نہیں نکلتی، اور اگر ہر سال حج فرض ہو جاتا تو تم میں اتنی طاقت نہ ہوتی کہ ہر سال اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوتے۔ پھر آپ ﷺ نے متنبہ فرمایا کہ کسی بھی دینی حکم کو مجھ پر چھوڑ دو، جب میں کسی فعل کا حکم دوں تو مجھ سے یہ نہ پوچھو کہ یہ فعل کتنا ہے اور کیسا ہے جب تک میں خود یہ بیان نہ کروں کہ یہ فعل کتنا کیا جائے اور کس طرح کیا جائے۔ میں جس طرح کہوں تم اسی طرح کرو۔ اگر کسی فعل کے بارے میں بلاقید وتعین اعداد کے مطلق حکم کروں تو اس حکم کی اسی طرح بجا آوری کرو اور اگر یہ بیان کروں کہ اس فعل کو اتنی بار اور اس طرح کرو تو اسے اتنی ہی بار اور اسی طرح کرو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ میں دنیا میں اسی لئے آیا ہوں کہ تم تک اسلام کے احکام پوری وضاحت کے ساتھ پہنچا دوں اور شریعت کو بیان کر دوں جو بات جس طرح ہوتی ہے میں

اسے اسی طرح بیان کر دیتا ہوں۔ تمہارے سوال کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پھر آخر میں آپ ﷺ نے احکام کی بجا آوری کے سلسلے میں تائید و تاکید و مبالغہ کے طور پر فرمایا کہ فاتوا منہ ما استطعتم (اس میں سے جو کچھ تم کرنے کی طاقت رکھتے ہو کرو) یعنی خدا اور رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرنے کی تم جتنی بھی طاقت رکھتے ہو اس کے مطابق عمل کرو یا پھر یہ کہ اس جملے کے ذریعہ آپ ﷺ نے رفع حرج پر اشارہ فرمایا کہ مثلاً نماز کے بعض شرائط و ارکان کی ادائیگی سے تم اگر عاجز ہو تو جس قدر ہو سکے اسی قدر کرو، جو تم سے نہ ہو سکے اسے چھوڑ دو جیسے اگر تم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکو تو بیٹھ کر نماز پڑھو، اگر بیٹھ کر پڑھنے سے بھی عاجز ہو تو لیٹے ہی لیٹے پڑھو مگر پڑھو ضرور، اسی پر دوسرے احکام و اعمال کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟ قَالَ اِیْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ قِیْلَ ثُمَّ مَاذَا قَالَ الْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قِیْلَ ثُمَّ مَاذَا قَالَ حَجٌّ مَّبْرُوْرٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا کہ پھر کون سا عمل؟ فرمایا، خدا کی راہ میں جہاد کرنا، پوچھا گیا کہ پھر کون سا، فرمایا حج مقبول۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: افضل اعمال کے سلسلے میں سب سے بہتر عمل کون سا ہے۔ مختلف احادیث منقول ہیں کسی حدیث میں کسی عمل کو افضل فرمایا گیا ہے اور کسی میں کسی کو، ان سب میں مطابقت و موافقت یوں پیدا کی جاتی ہے کہ یہ اختلاف بیان سائلین کے اقوال، حیثیات اور مقامات کے فرق و تفاوت کی بناء پر ہے، اس حدیث کو تفصیل کے ساتھ کتاب الصلوٰۃ میں بھی ایک موقع پر بیان کیا جا چکا ہے۔

صرف اللہ کے لئے حج کرنے والے کی سعادت

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ یَرْفُثْ وَلَمْ یَفْسُقْ رَجَعَ کَیَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ کے لئے حج کرے اور (حج کے دوران) نہ ہم بستری اپنی عورت سے کرے اور نہ فسق میں مبتلا ہو تو وہ اس طرح (بے گناہ ہو کر) واپس آتا ہے جیسے (اس دن بے گناہ تھا) کہ جس دن اس کو اس کی ماں نے جنا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جو شخص اللہ کے لئے حج کرے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی اور صرف اس کے حکم کی بجا آوری کے لئے حج کرے، دکھانے، سنانے کا جذبہ یا غرض و مقصد پیش نظر نہ ہو۔ اس سلسلے میں اتنی بات ضرور جان لینی چاہئے کہ جو شخص حج اور تجارت یا مال وغیرہ لانے، دونوں کے قصد سے حج کے لئے جائے گا تو اسے ثواب کم ملے گا بہ نسبت اس شخص کے جو صرف حج کے لئے جائے گا کہ اسے ثواب زیادہ ملے گا۔

"رفث" کے معنی ہیں جماع کرنا، فحش گوئی میں مبتلا ہونا اور عورتوں کے ساتھ ایسی باتیں کرنا جو جماع کا داعیہ اور اس کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

"اور نہ فسق میں مبتلا ہو" کا مطلب یہ ہے کہ حج کے دوران گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے۔ یہ ذہن میں رہے کہ گناہوں سے توبہ نہ کرنا بھی کبیرہ گناہوں ہی میں شمار ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی سے واضح ہوتا ہے وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ترجمہ! اور جس نے توبہ نہیں کی تو یہی وہ ہیں جو (اپنے حق میں) ظالم ہیں۔

حاصل یہ کہ جو شخص خالصۃ للہ حج کرے اور اس حج کے دوران جماع اور فحش گوئی میں مبتلا نہ ہو اور نہ گناہ کی دوسری چیزوں کو اختیار کرے تو گناہوں سے ایسا ہی پاک وصاف ہو کر حج سے واپس آتا ہے جیسا کہ گناہوں سے پاک وصاف ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

حج کا ثمرہ جنّت ہے

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعُمْرَةُ اِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهٗ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک کفارہ ہے ان (صغیرہ) گناہوں کے لئے جو ان دونوں عمروں کے درمیان ہوں اور حج مقبول کا بدلہ جنّت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

رمضان میں عمرہ کا ثواب

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عُمْرَةً فِيْ رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا رمضان میں عمرہ کرنے کا ثواب حج کے ثواب کے برابر ہے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

نابالغ کو بھی حج کا ثواب ملتا ہے

⑥ وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِيَ رَكْبًا بِالرَّوْحَاءِ فَقَالَ مَنِ الْقَوْمُ قَالُوْا الْمُسْلِمُوْنَ فَقَالُوا مَنْ اَنْتَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَرَفَعَتْ اِلَيْهِ امْرَاَةٌ صَبِيًّا فَقَالَتْ اَلِهٰذَا حَجٌّ قَالَ نَعَمْ وَلَكِ اَجْرٌ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (سفر حج کے دوران) روحاء میں (جو مدینہ سے ۳۶ کوس کے فاصلے پر ایک جگہ کا نام تھا) ایک قافلے سے ملے، آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم کون قوم ہو؟ قافلے والوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں پھر قافلے والوں نے پوچھا کہ آپ (ﷺ) کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ (ﷺ) ہوں (یہ سن کر) ایک عورت نے ایک لڑکے کو (ہاتھ میں لے کر کجاوے سے) آنحضرت ﷺ کی طرف پکڑ کر بلند کیا (یعنی آپ ﷺ کو دکھلایا) پھر آپ ﷺ سے پوچھا کہ کیا اس کے لئے حج کا ثواب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اور تمہارے لئے بھی ثواب ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: عورت کے سوال کے جواب میں آپ ﷺ کے "ہاں" کا مطلب یہ تھا کہ لڑکا اگرچہ نابالغ ہے اور اس پر حج فرض نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ حج میں جائے گا تو اسے نفلی حج کا ثواب ملے گا اور چونکہ تم اس بچے کو افعال حج سکھلاؤ گی، اس کی خبر گیری کرو گی اور پھر یہ کہ تم ہی اس کے حج کا باعث بنو گی اس لئے تمہیں بھی ثواب ملے گا۔

مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی نابالغ حج کرے تو اس کے ذمہ سے فرض ساقط نہیں ہوگا اگر بالغ ہونے کے بعد فرضیت حج کے شرائط پائے جائیں گے تو اسے دوبارہ پھر کرنا ہوگا، اسی طرح اگر غلام حج کرے تو اس کے ذمہ سے بھی فرض ساقط نہیں ہوتا، آزاد ہونے کے بعد فرضیت حج کے شرائط پائے جانے کی صورت میں اس کے لئے دوبارہ حج کرنا ضروری ہوگا۔ ان کے برخلاف اگر کوئی مفلس حج کرے تو اس کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ مال دار ہونے کے بعد اس پر دوبارہ حج کرنا واجب نہیں ہوگا۔

دوسرے کی طرف سے حج کرنے کا مسئلہ

⑦ وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ امْرَاَةً مِنْ خَثْعَمٍ قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ فَرِيْضَةَ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ فِي الْحَجِّ اَدْرَكَتْ اَبِيْ شَيْخًا كَبِيْرًا

لَا يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ اَفَاَحُجُّ عَنْهُ قَالَ نَعَمْ وَذٰلِكَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ کے ایک فریضہ نے جو اس کے بندوں پر ہے میرے باپ کو بڑا بوڑھا پایا ہے یا جو سواری پر جم کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں! (اس کی طرف سے) حج کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اور اس عورت کے درمیان) یہ سوال جواب حجۃ الوداع میں ہوا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس عورت کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میرے باپ پر بوڑھاپے میں حج فرض ہوا ہے۔ بایں سبب کہ وہ بڑھاپے میں اس کو اتنا مال مل گیا ہے اور اس کے پاس اتنا مال ہے کہ جس کی وجہ سے اس پر حج فرض ہو جاتا ہے یا یہ کہ اب بڑھاپے میں اس کو اتنا مال مل گیا ہے کہ اس پر حج فرض ہو گیا ہے مگر وہ اتنا ضعیف اور کمزور ہے کہ ارکان وافعال حج کی ادائیگی تو الگ ہے وہ سواری پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تو کیا میں اس کی طرف سے نیابتہ حج کرلوں؟ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہاں! اس کی طرف سے تم حج کرلو۔

مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص پر اگر حج فرض ہو اور وہ بذات خود حج کرنے سے معذور ہو نیز یہ کہ اس کی وہ معذوری ایسی ہو جو موت تک زائل نہ ہونے والی ہو۔ جیسے بڑھاپے کا ضعف، نابینا ہونا، یا پیروں کا کٹا ہونا وغیرہ تو اس کی طرف سے کسی دوسرے شخص کا حج کرلینا جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ معذور اپنی طرف سے حج کرنے والے کو حج کے اخراجات بھی دے اور اسے اپنی طرف سے حج کرنے کا حکم بھی دے۔ نیز اس کی موت کے بعد بھی اس کی طرف سے کسی دوسرے شخص کا حج کرنا جائز ہے جب کہ وہ اس کی وصیت کر کے مرا ہو۔ لیکن بعض علماء کہتے ہیں کہ اولاد اگر اپنے والدین کی طرف سے فرض حج کرے تو اس صورت میں حکم اور وصیت شرط نہیں ہے یعنی والدین کی طرف سے حج کرنا۔ بغیر حکم اور بغیر وصیت کے بھی جائز ہے، یہ تو فرض حج کی بات تھی نفل حج کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی طرف سے کسی دوسرے سے نفل حج کرائے۔ تو معذوری شرط نہیں ہے۔ یعنی اگر بذات خود اسے حج کرنے کی قدرت وطاقت حاصل ہے تو اس کے باوجود وہ کسی دوسرے سے اپنا نفل حج کرا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا مسئلہ کو ذہن میں رکھ کر حدیث کی طرف آیئے۔ عورت اپنے باپ کی طرف سے حج کرنے کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے پوچھ رہی ہے۔ لیکن وہ چونکہ وضاحت نہیں کر رہی ہے اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے نہ تو اس کو اپنی طرف سے حج کرنے کا حکم دیا ہے اور نہ اسے اخراجات دیئے ہیں۔ گویا اس طرح حدیث کے ظاہری مفہوم اور مذکورہ بالا اس فقہی روایت میں کہ جس کی طرف سے حج کیا جائے اس کا حکم اور اس کی طرف سے اخراجات کی ادائیگی حج کے صحیح ہونے کی شرط ہے، تضاد نظر آتا ہے، لہٰذا اس تضاد کو اس تاویل کے ذریعے ختم کیا جائے گا کہ اس عورت کے باپ نے اس کو اپنی طرف سے حج کرنے کی اجازت بھی دی ہوگی اور اسے اخراجات بھی دیئے ہوں گے مگر اس نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

اس تاویل کی بنیاد حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی وہ تقریر ہے کہ انہوں نے حضرت ابورزینؓ کی روایت کی وضاحت کے ضمن میں بیان کی ہے یہ روایت اسی باب کی دوسری فصل میں آئے گی۔ بعض علماء کے قول کہ والدین کی طرف سے فرض حج کرنا بغیر حکم و وصیت کے بھی جائز ہے۔ کے پیش نظر اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس صورت میں تو یہ حدیث اس فقہی روایت کی دلیل بن جائے گی۔

⑧ وَعَنْهُ قَالَ اَتٰى رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اُخْتِيْ نَذَرَتْ اَنْ تَحُجَّ وَاِنَّهَا مَاتَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَ عَلَيْهَا دَيْنٌ اَكُنْتَ قَاضِيَهُ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاقْضِ دَيْنَ اللّٰهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِالْقَضَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میری بہن نے حج کرنے کی نذر مانی تھی مگر وہ مر گئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس کے ذمہ اگر کوئی مطالبہ (مثلاً قرض وغیرہ) ہوتا تو کیا تم اسے ادا کرتے؟ اس نے کہا ہاں!

آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر اللہ کا مطالبہ (یعنی حج نذر) ادا کرو کیونکہ اس کا ادا کرنا زیادہ ضروری ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کی بہن کے ورثہ میں کچھ مال ملا ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حق اللہ کو حق العباد پر قیاس فرماتے ہوئے اس کو بہن کا حج نذر کرنے کا حکم دیا۔

مسئلہ: وارث کے لئے جائز ہے کہ وہ مورث کی طرف سے اس کی اجازت و وصیت کے بغیر بھی حج کر سکتا ہے، یا اس کی طرف سے خود حج کر سکتا ہے۔ لیکن دوسروں کے لئے اجازت و وصیت شرط ہے کہ اس کے بغیر حج درست نہ ہوگا۔

عورت خاوند یا محرم کے بغیر حج کو نہیں جا سکتی

⑨ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ وَلَا تُسَافِرَنَّ امْرَأَةٌ اِلَّا وَمَعَهَا مَحْرَمٌ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُكْتُتِبْتُ فِي غَزْوَةِ كَذَا وَكَذَا وَخَرَجَتِ امْرَأَتِي حَاجَّةً قَالَ اذْهَبْ فَاحْجُجْ مَعَ امْرَأَتِكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کوئی شخص عورت کے ساتھ خلوت نہ کرے (یعنی اجنبی مرد و عورت کسی جگہ تنہا جمع نہ ہوں) اور کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔ یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! فلاں فلاں غزوہ میں میرا نام لکھا جا چکا ہے (یعنی فلاں جہاد جو درپیش ہے اور وہاں جو لشکر جانے والا ہے اس میں میرا نام بھی لکھا جا چکا ہے کہ میں بھی لشکر کے ہمراہ جاؤں) اور حالانکہ میری بیوی نے سفر حج کا ارادہ کر لیا ہے؟ تو کیا کروں؟ آیا جہاد (کو جاؤں اور بیوی کو اکیلا حج کے لئے جانے دوں یا بیوی کے ساتھ جاؤں اور جہاد میں نہ جاؤں) آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو (کیونکہ جہاد میں جانے والے تو بہت ہیں لیکن تمہاری بیوی کے ساتھ جانے والا تمہارے علاوہ اور کوئی محرم نہیں ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اجنبی عورت و مرد کے لئے حرام ہے کہ وہ تنہائی میں یکجا ہوں۔ اسی طرح عورت کو بقدر مسافت سفر (یعنی ۴۸ میل یا ۷۸ کلو میٹر) یا اس سے زائد مسافت میں خاوند یا محرم کے بغیر سفر کرنا حرام ہے حتیٰ کہ سفر حج میں بھی عورت کے لئے اس کے خاوند یا کسی محرم کا ساتھ ہونا وجوب حج کے لئے شرط ہے یعنی عورت پر حج اسی وقت فرض ہوتا ہے جب کہ اس کے ساتھ خاوند یا محرم ہو۔

محرم اصطلاح شریعت میں اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہو خواہ قرابت کے لحاظ سے ہو یا دودھ کے رشتے سے یا سسرال کے ناتے سے، نیز محرم کا عاقل و بالغ ہونا اور مجوسی و فاسق نہ ہونا بھی شرط ہے۔

عورتوں کا جہاد، حج ہے

⑩ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتِ اسْتَأْذَنْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْجِهَادِ فَقَالَ جِهَادُكُنَّ الْحَجُّ۔ (متفق علیہ)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے جہاد (میں جانے) کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا جہاد، حج ہے۔ (یعنی تم عورتوں پر جہاد واجب نہیں ہے اس کی بجائے حج بشرطیکہ نفل حج کرنے کی استطاعت ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

خاوند یا محرم کے بغیر عورت کے سفر کی حد

⑪ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُسَافِرُ امْرَأَةٌ مَسِيْرَةَ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ اِلَّا وَمَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی عورت ایک دن و ایک رات کی مسافت کے بقدر بھی سفر نہ کرے علاوہ یہ کہ اس کے ساتھ محرم ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس موقع پر حدیث اور فقہی روایت کا تضاد سامنے آسکتا ہے وہ یوں کہ ہدایہ میں جو فقہ حنفی کی مشہور ترین کتاب ہے لکھا ہے کہ عورتوں کو (بغیر خاوند یا محرم) کسی ایسی جگہ کا سفر مباح ہے جس کی مسافت حد سفر سے (کہ وہ تین منزل یعنی ۴۸ میل سے، کم ہو) لیکن یہاں حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی عورت بغیر خاوند یا محرم کسی ایسی جگہ کا سفر بھی نہیں کر سکتی جس کی مسافت ایک دن و ایک رات (یعنی ایک منزل یا ۱۶ میل) کے سفر کے بقدر ہو۔ نیز بخاریؒ و مسلمؒ میں بھی یہ ایک روایت منقول ہے کہ "کوئی عورت دو دن کی مسافت کے بقدر بھی سفر نہ کرے الا یہ کہ اس کے ساتھ اس کا خاوند یا محرم ہو۔"

لہٰذا فقہاء کا قول بظاہر ان روایات کے مخالف نظر آتا ہے لیکن اس تضاد و اختلاف کو دور کرنے کے لئے علماء یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں مطلق طور پر جو یہ منقول ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند یا محرم کے بغیر سفر نہ کرے تو چونکہ شرعی طور پر سفر کا اطلاق تین دن سے کم پر نہیں ہوتا اس لئے فقہاء نے اس حدیث کو تین دن (۴۸ میل کی مسافت کے بقدر سفر پر محمول کیا ہے اور یہ فقہی قاعدہ مرتب کر دیا کہ کوئی عورت اتنی دور کا سفر کہ جو تین دن کی مسافت کے بقدر ہو بغیر خاوند یا محرم کے نہ کرے اور جب تین دن کی مسافت کے بقدر تنہا سفر نہیں کر سکتی تو اس سے زائد مسافت کا سفر کرنا تو بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگا۔ اور جن حدیثوں میں دو دن یا ایک دن کی مسافت کے بقدر سفر سے بھی منع کیا گیا ہے تو اس کو فتنہ و فساد پر محمول کیا ہے کہ اگر سفر تین دن کی مسافت سے بھی کم یعنی دو دن یا ایک دن کی مسافت کے بقدر ہو اور کسی فتنہ و فساد مثلاً عورت کی عزت و آبرو پر حرف آنے کا گمان ہو تو اس صورت میں بھی عورت کو تنہا سفر نہیں کرنا چاہئے۔

یا پھر یہ کہا جائے گا کہ جہاں تین دن کی مسافت کے بقدر سفر کی ممانعت منقول ہے تو اس کی مراد یہ ہے کہ ہر منزل (یعنی ۱۶ میل) ایک دن کے اکثر حصے میں طے ہوتی ہو تو اس طرح تین دن میں تین منزلیں طے ہوں گی اور جہاں دو دن کے سفر کی ممانعت ہے۔ تو اس کی مراد یہ ہے کہ تمام دن چلے یعنی ایک دن میں ڈیڑھ منزل (۲۴) میل طے ہو اس طرح دو دن میں تین منزلیں طے ہوں گے اور جہاں ایک دن و رات کے سفر کی ممانعت ہے تو اس کی مراد یہ ہے کہ شب و روز چلے، یعنی ڈیڑھ منزل پورے دن میں طے ہو ڈیڑھ منزل پوری رات میں طے ہو اس طرح ایک دن و رات میں تین منزلیں طے ہوں گی۔

اس تاویل کی وجہ سے ان تمام روایات کا مقصد تین دن کی مسافت کے بقدر عورت کو تنہا سفر کرنے سے روکنا ثابت ہو جائے گا اور تمام روایات میں باہم کوئی تضاد بھی باقی نہیں رہے گا۔

اس سلسلے میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی یہ بات دل کو زیادہ لگتی ہے کہ ان تمام روایات (کہ جن سے عورت کو تنہا سفر کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے اور جن میں حد سفر کے بارے میں اختلاف نظر آرہا ہے) کا مقصد سفر کی کسی حد اور مدت کو متعین کرنا نہیں ہے بلکہ ان روایات کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ عورت بغیر خاوند یا محرم تنہا سفر مطلقاً نہ کرے مسافت چاہے طویل ہو اور چاہے کتنی ہی مختصر ہو۔ لہٰذا موجودہ دور میں جب کہ فتنہ فساد کا خوف عام ہے اور انسانی ذہن غلط طریقہ تعلیم و تربیت اور فاسد ماحول کی وجہ سے بے حیائی اور فحاشی کا مرکز بن گئے ہیں تو احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ عورت مطلقاً تنہا سفر نہ کرے سفر چاہے تھوڑی دور کا ہو چاہے زیادہ فاصلے کا۔ اس لئے کہ فتنہ و فساد کا خوف بہر صورت رہتا ہے۔

مواقیت حج

⑫ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ وَقَّتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ وَلِاَهْلِ الشَّامِ الْجُحْفَةَ وَلِاَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ وَلِاَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ فَهُنَّ لَهُنَّ وَلِمَنْ اَتٰى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ اَهْلِهِنَّ لِمَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَمَنْ كَانَ دُوْنَهُنَّ فَمُهَلُّهٗ مِنْ اَهْلِهٖ وَكَذَاكَ وَكَذَاكَ حَتّٰى اَهْلُ مَكَّةَ يُهِلُّوْنَ مِنْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (آفاقی یعنی غیر ملکی کے لئے احرام باندھنے کی جگہ (میقات) اس طرح متعین

فرمائیں) اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ شام والوں کے لئے جحفہ، نجد والوں کے لئے قرن منازل اور یمن والوں کے لئے یلملم۔ یہ سب مذکورہ علاقوں کے لوگوں کے لئے احرام باندھنے کی جگہ ہیں اور ان مقامات سے گزرنے والے ان لوگوں کے لئے (بھی یہی میقات ہیں) جو ان علاقوں کے علاوہ ہوں (مثلاً ہندوستانی کہ جب یمن کے راستے پر پہنچیں تو یلملم سے احرام باندھیں۔ اسی طرح دوسرے ملکوں کے لوگوں کے لئے بھی یہی ہے کہ ان کے راستے میں جو میقات آئے وہیں سے احرام باندھیں) اور یہ (احرام اور احرام باندھنے کی جگہیں) ان لوگوں کے لئے ہیں جو حج اور عمرہ کا ارادہ کریں۔ اور جو شخص ان مقامات کے اندر رہتا ہے اس کے احرام باندھنے کی جگہ اس کے گھر سے ہے اسی طرح اور اسی طرح یہاں تک کہ مکہ والے مکہ ہی سے احرام باندھیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: احرام کے معنی ہیں "حرام کر دینا" چونکہ حج کرنے والے پر کئی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اس اظہار کے واسطے کہ اس وقت سے یہ چیزیں حرام ہو گئی ہیں ایک لباس جو صرف ایک چادر اور ایک تہبند ہوتا ہے بہ نیت حج پہنا جاتا ہے۔ جس کو احرام کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ احرام کا عمل اس وقت سے شروع ہوتا ہے جس وقت احرام پہنے کے بعد حج کی نیت کی جائے اور لبیک کہی جائے یا کوئی ایسا فعل کیا جائے جو تلبیہ (لبیک کہنے) کے مثل ہو جیسے (یعنی قربانی کا جانور) روانہ کرنا، ورنہ صرف احرام کا لباس پہننے پھرنے سے کوئی شخص محرم نہیں ہو سکتا۔

مواقیت — میقات کی جمع ہے، میقات اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے مکہ مکرمہ میں جانے والے احرام باندھتے ہیں اور مکہ مکرمہ جانے والے کے لئے وہاں سے بغیر احرام آگے بڑھنا منع ہے۔

ذوالحلیفہ — ایک مقام کا نام ہے۔ جو مدینہ منورہ سے جنوب میں تقریباً ۶ میل (۱۰ کلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے اس کو ابیار علی بھی کہتے ہیں۔ یہ مقام مدینہ اور مدینہ کی طرف سے آنے والوں کے واسطے میقات ہے۔

جحفہ — ایک مقام کا نام ہے یہ مقام مکہ مکرمہ سے ۱۱۵ میل ۱۸۸ کلومیٹر کے فاصلے پر اور رابغ سے چند میل جنوب میں واقع ہے یہ قریش کی تجارتی شاہراہ کا ایک اسٹیشن رہ چکا ہے اب غیر آباد ہے، یہ مقام شام و مصر کی طرف سے آنے والوں کے واسطے میقات ہے۔

نجد — اصل میں تو "بلند زمین" کو کہتے ہیں۔ مگر اصطلاحی طور پر جزیرۃ العرب کے ایک علاقے کا نام ہے جو "مملکت سعودی عرب" کا ایک حصہ ہے۔ اس علاقے کو نجد غالباً اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سطح سمندر سے یہ علاقہ اچھا خاصا بلند ہے اس وقت جزیرۃ العرب کا سارا وسطی علاقہ جسے "نجد" کہا جاتا ہے۔ شمال میں بادیۃ الشام کے جنوبی سرے سے شروع ہو کر جنوب میں وادی الاداسریا الربع الخال تک اور عرضاً احساء سے حجاز تک پھیلا ہوا ہے، حکومت سعودی عرب کا دارالسلطنت "ریاض" نجد ہی کے علاقے میں ہے۔

قرن المنازل — یہ ایک پہاڑی ہے جو مکہ سے تقریباً تیس میل (۴۸ کلومیٹر) جنوب میں تہامہ کی ایک پہاڑی ہے یہ پہاڑی یمن سے مکہ آنے والے راستے پر واقع ہے اس پہاڑی سے متصل سعدیہ نامی ایک بستی ہے یہ یمن کی طرف سے آنے والوں کی میقات ہے۔ ہندوستان سے جانے والے اس پہاڑی کے سامنے سے گزرتے ہیں اس لئے ہندوستان والوں کے لئے بھی یہی میقات ہے۔

ان مواقیت کے علاوہ ایک میقات "ذات عرق" ہے۔ یہ مکہ مکرمہ سے تقریباً ساٹھ میل (۹۷ کلومیٹر) کے فاصلے پر شمال مشرقی جانب عراق جانے والے راستے پر واقع ہے۔ اور عراق کی طرف سے آنے والوں کے واسطے میقات ہے۔

حدیث کے الفاظ لِمَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ (اور یہ احرام کی جگہیں ان لوگوں کے لئے ہیں جو حج و عمرہ کا ارادہ کریں)۔ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص (یعنی غیر مکی) حج و عمرہ کے ارادے کے بغیر میقات سے گزرے تو اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ مکہ میں داخل ہونے کے لئے احرام باندھے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے، لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق مکہ میں بغیر احرام کے داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ خواہ حج و عمرہ کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ یعنی اگر کوئی غیر مکی شخص مکہ مکرمہ میں داخل ہونا چاہے خواہ وہ حج کے لئے جاتا ہو یا کسی اور غرض سے تو اس پر واجب ہے کہ وہ میقات سے احرام باندھ کر جائے احرام کے بغیر وہ مکہ میں داخل

نہیں ہو سکتا۔ حنفی مسلک کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ:

لا یجاوز حد المیقات الا محرما۔

"کوئی شخص (مکہ میں داخل ہونے کے لئے) میقات کے آگے بغیر احرام کے نہ بڑھے۔"

یہ حدیث اس بارے میں مطلق ہے اس میں حج و عمرہ کے ارادے کی قید نہیں ہے، پھر یہ کہ احرام اس مقدس و محترم مکان یعنی کعبہ مکرمہ کی تعظیم واحترام کی غرض سے باندھا جاتا ہے۔ حج و عمرہ کیا جائے یا نہ کیا جائے لہٰذا اس حکم کا تعلق جس طرح حج و عمرہ کرنے والے سے ہے اسی طرح یہ حکم تاجر و سیاح وغیرہ پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ ہاں جو لوگ میقات کے اندر ہیں ان کو اپنی حاجت کے لئے بغیر احرام مکہ میں داخل ہونا جائز ہے کیونکہ ان کو بار ہا مکہ مکرمہ میں آنا جانا پڑتا ہے۔ اس واسطے ان کے لئے ہر بار احرام کا واجب ہونا دقت و تکلیف سے خالی نہیں ہو گا، لہٰذا اس معاملے میں وہ اہل مکہ کے حکم میں داخل ہیں کہ جس طرح ان کے لئے جائز ہے کہ اگر وہ کسی کام سے مکہ مکرمہ سے باہر نکلیں اور پھر مکہ میں داخل ہوں تو بغیر احرام چلے آئیں اسی طرح میقات کے اندر والوں کو بھی احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہونا جائز ہے۔

فمن کان دونھن (اور جو شخص ان مقامات کے اندر رہتا ہے الخ) کا مطلب یہ ہے کہ لوگ میقات کے اندر مگر حدود حرم سے باہر رہتے ہوں تو ان کے لئے احرام باندھنے کی جگہ ان کے گھر سے تا حد حرم ہے ان کو احرام باندھنے کے لئے میقات پر جانا ضروری نہیں ہے، اگرچہ وہ میقات کے قریب ہی کیوں نہ ہوں۔

جو لوگ خاص میقات میں ہی رہتے ہوں ان کے بارے میں اس حدیث میں کوئی حکم نہیں ہوتا۔ لیکن جمہور علماء کہتے ہیں کہ ان کا حکم بھی وہی ہے جو میقات کے اندر رہنے والوں کا ہے۔

وَكَذَاكَ وَكَذَاكَ (اور اسی طرح اور اسی طرح) اس کا تعلق پہلے ہی جملے سے ہے کہ حل (حدود حرم سے باہر سے مواقیت تک جو زمین ہے اس میں جو جہاں رہتا ہے وہیں سے احرام باندھے یعنی میقات اور حد حرم کے درمیان جو لوگ رہنے والے ہیں وہ اپنے اپنے گھر ہی سے احرام باندھیں گے چاہے وہ میقات کے بالکل قریب ہوں اور چاہے میقات سے کتنے ہی دور اور حد حرم کے کتنے ہی قریب ہوں۔

حتی اهل مكة يهلون منها کا مطلب یہ ہے کہ اہل مکہ یعنی اہل حرم مکہ سے احرام باندھیں جو لوگ خاص مکہ شہر میں رہتے ہیں وہ تو خاص مکہ ہی سے احرام باندھیں گے اور جو لوگ خاص مکہ شہر میں نہیں بلکہ شہر سے باہر مگر حدود حرم میں رہتے ہیں وہ حرم مکہ سے احرام باندھیں گے۔

حدیث کے آخری الفاظ سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ کے لئے احرام باندھنے کی جگہ مکہ ہے خواہ احرام حج کے لئے ہو خواہ عمرہ کے لئے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ عمرہ کرنے والا حل کی طرف جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر پھر حرم میں داخل ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ عمرہ کا احرام باندھنے کے لئے تنعیم جائیں جو حل میں ہے لہٰذا یہی کہا جائے گا کہ اس حدیث کا تعلق صرف حج کے ساتھ ہے یعنی یہ حکم اہل مکہ کے لئے ہے کہ وہ جب حج کرنے کا ارادہ کریں تو احرام مکہ ہی سے باندھیں اور اگر عمرہ کرنے کا ارادہ ہو تو پھر حل میں آکر احرام باندھیں جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

(۱۳) وَعَنْ جَابِرٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مُهَلُّ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مِنْ ذِى الْحُلَيْفَةِ وَالطَّرِيْقُ الْاٰخَرُ الْجُحْفَةُ وَمُهَلُّ اَهْلِ الْعِرَاقِ مِنْ ذَاتِ عِرْقٍ وَمُهَلُّ اَهْلِ نَجْدٍ قَرْنٌ وَمُهَلُّ اَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مدینہ والوں کے لئے احرام کی جگہ ذوالحلیفہ ہے اور دوسرا راستہ جحفہ ہے، عراق والوں کے لئے احرام کی جگہ ذات عرق ہے، نجد والوں کے لئے احرام کی جگہ قرن ہے اور یمن والوں کے لئے احرام کی جگہ یلملم

ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اور دوسرا راستہ جحفہ ہے" کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ والوں کے لئے احرام باندھنے کی دوسری جگہ جحفہ ہے اگر وہ مکہ کے لئے مدینہ سے وہ راہ اختیار کریں جس میں جحفہ ملتا ہے تو وہ پھر جحفہ ہی سے احرام باندھیں، ذو الحلیفہ جانے کی ضرورت نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ پہلے مدینہ سے مکہ آنے کے لئے دو راستے تھے ایک راستے میں تو ذو الحلیفہ ملتا تھا اور دوسرے راستے میں جحفہ اسی لئے یہ حکم دیا گیا کہ اگر وہ راہ اختیار کی جائے جس میں ذو الحلیفہ ملتا ہے تو احرام ذو الحلیفہ سے باندھا جائے اور اگر وہ راہ اختیار کی جائے جس میں جحفہ ملتا ہے تو پھر جحفہ سے احرام باندھا جائے، لیکن اب ایک ہی راستہ ہو گیا ہے جس میں پہلے تو ذو الحلیفہ آتا ہے اور پھر جحفہ، اسی طرح اہل مدینہ کے لئے دو میقات ہو گئی ہیں، اس صورت میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب اہل مدینہ احرام کہاں سے باندھیں؟ تو علماء لکھتے ہیں کہ اس جگہ سے باندھنا اولیٰ ہے جو مکہ سے زیادہ فاصلے پر واقع ہے یعنی ذو الحلیفہ اور اگر کوئی شخص جحفہ سے احرام باندھے تو یہ بھی جائز ہے۔

آنحضرت ﷺ کے حج و عمرہ کی تعداد

⑭ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اعْتَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعَ عُمَرٍ كُلُّهُنَّ فِي ذِي الْقَعْدَةِ اِلَّا الَّتِي كَانَتْ مَعَ حَجَّتِهٖ عُمْرَةٌ مِنَ الْحُدَيْبِيَةِ فِي ذِي الْقَعْدَةِ وَعُمْرَةٌ مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ فِي ذِي الْقَعْدَةِ وَعُمْرَةٌ مِنَ الْجِعِرَّانَةِ حَيْثُ قَسَمَ غَنَائِمَ حُنَيْنٍ فِي ذِي الْقَعْدَةِ وَعُمْرَةٌ مَعَ حَجَّتِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے چار عمرے کئے ہیں اور وہ سب ذی قعدہ کے مہینے میں کئے گئے تھے علاوہ اس ایک عمرہ کے جو حج کے ساتھ کیا گیا تھا اور ذی الحجہ کے مہینے میں ہوا تھا (اور ان چار عمروں کی تفصیل یہ ہے کہ) ایک عمرہ حدیبیہ سے ذی قعدہ کے مہینے میں، دوسرا عمرہ اس کے اگلے سال وہ بھی ذی قعدہ میں ہوا، تیسرا عمرہ جعرانہ سے جہاں غزوہ حنین کا مال غنیمت تقسیم کیا گیا یہ عمرہ بھی ذی قعدہ میں ہوا اور چوتھا عمرہ حج کے ساتھ جو ذی الحجہ میں ہوا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیبیہ ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے مغربی جانب تقریباً پندرہ سولہ میل (۲۶ کلو میٹر) کے فاصلے پر جدہ جاتے ہوئے ملتی ہے یہ مکہ سے شمال مغربی جانب ہے یہیں جَبَلُ الشُّمَيْسِي نامی ایک پہاڑ ہے جس کی وجہ سے اب اس مقام کو شمیسہ بھی کہتے ہیں۔ حدود حرم یہاں سے بھی گزرتے ہیں اس لئے اس جگہ کا اکثر حصہ حرم میں ہے اور کچھ حصہ حل میں (یعنی حرم سے باہر) ہے۔

عمرہ حدیبیہ کا (اجمالی بیان یہ ہے کہ سن ۶ ھ میں ذی قعدہ کی پہلی تاریخ کو دو شنبہ کے دن نبی کریم ﷺ عمرہ کے قصد سے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے چودہ سو یا اس سے کچھ زائد رفقاء آپ ﷺ کے ساتھ تھے جب آپ ﷺ حدیبیہ پہنچے تو قریش مکہ جمع ہو کر آپ ﷺ کے پاس آئے اور زیارت بیت اللہ سے آپ ﷺ کو روکا، کافی رد و قدح کے بعد کہ جس کی تفصیل تاریخ و سیر کی کتابوں میں ملتی ہے، آنحضرت ﷺ اور قریش مکہ کے درمیان ایک معاہدہ عمل میں آیا جو معاہدہ حدیبیہ اور صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے اس معاہدے کی رو سے یہ طے پایا کہ آنحضرت ﷺ مع رفقاء اس سال تو مدینہ واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آکر عمرہ کریں۔ چنانچہ آپ ﷺ قریش سے صلح کر کے عمرہ کئے بغیر مدینہ منورہ واپس ہو گئے لہٰذا حقیقت میں تو آپ ﷺ نے عمرہ ادا نہیں کیا مگر عمرہ کا ثواب مل جانے کی وجہ سے یہ آپ ﷺ کا پہلا عمرہ شمار کیا گیا۔ اسی موقع پر احصار کا حکم مشروع ہوا۔ چنانچہ آئندہ سال اسی عمرہ کی قضاء کے لئے آپ ﷺ مکہ تشریف لائے تین روز مکہ میں قیام فرمایا عمرہ ادا کیا اور چوتھے روز وہاں سے واپس ہوئے۔ یہ دوسرا عمرہ ہوا اسی عمرہ کو "عمرۃ القضاء" کہتے ہیں یہ نام احادیث میں بھی منقول ہے۔ حنفیہ اس سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محرم احصار کی وجہ سے احرام سے باہر آجائے تو اس کی قضا اس پر واجب ہو گی حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک قضا واجب نہیں ہوتی۔

آپ ﷺ کا تیسرا عمرہ وہ ہے جو آپ ﷺ نے جعرانہ سے مکہ مکرمہ جا کر ادا کیا۔ جہاں آپ ﷺ نے غزوہ حنین کا مال تقسیم کیا تھا،

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جعرانہ، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جب فتح مکہ کے بعد سن ۸ھ میں غزوہ حنین کا واقعہ پیش آیا تو اس وقت بے شمار مال غنیمت ہاتھ لگا، اسی موقع پر آپ ﷺ جعرانہ میں پندرہ سولہ روز قیام پذیر رہے اور وہ مال غنیمت صحابہؓ میں تقسیم فرمایا، انہیں دنوں میں ایک روز رات میں بعد نماز عشاء آپ ﷺ مکہ تشریف لے گئے اور عمرہ کیا اور اسی رات میں واپس آئے اور جعرانہ میں نماز فجر پڑھی۔

چوتھا عمرہ وہ ہے جو آپ ﷺ نے حج فرض ہونے کے بعد سن ۱۰ھ میں حج کے ساتھ کیا، لہٰذا یہ عمرہ تو ذی الحجہ میں ہوا اور بقیہ عمرے ذی قعدہ میں کئے اس طرح آپ ﷺ نے جو چار عمرے کئے تھے وہ یہ تھے، البتہ زمانہ اسلام میں حج آپ ﷺ نے ایک مرتبہ کیا ہے۔ جب کہ وہ فرض ہوا ہے۔ ایام جاہلیت میں قریش حج کرتے تھے۔ آپ ﷺ بھی اس وقت حج کرتے تھے لیکن ان کی تعداد علماء کو صحیح طور پر معلوم نہیں ہے۔

حج و عمرہ کا فرق

حج اور عمرہ کی کیفیت اور ان کے متعلقات کا تفصیلی بیان تو آگے آئے گا، اس موقع پر صرف اتنی بات جان لینی چاہئے کہ حج و عمرہ میں فرق کیا ہے؟ حج میں وقوف عرفات، طواف بیت اللہ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی ہوتی ہے جب کہ عمرہ میں صرف طواف بیت اللہ اور سعی بین الصفا والمروہ ہوتی ہے، احرام دونوں کے لئے شرط ہے جس طرح حج احرام کے بغیر صحیح نہیں اسی طرح عمرہ بھی احرام کے بغیر صحیح نہیں ہوتا، حج فرض بھی ہوتا ہے، سُنّت بھی اور نفل بھی جب کہ عمرہ فرض نہیں ہوتا۔ صرف سُنّت اور نفل ہوتا ہے، ہاں اگر کوئی عمرہ کی نذر مانے تو پھر عمرہ کرنا واجب ہوجاتا ہے۔

حج سے پہلے آپ ﷺ نے دو عمرے کئے یا تین؟

⑮ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ اعْتَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ذِي الْقَعْدَةِ قَبْلَ اَنْ يَحُجَّ مَرَّتَيْنِ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ذی قعدہ کے مہینے میں حج سے پہلے دو مرتبہ عمرہ کیا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس سے پہلی حدیث سے تو یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے حج سے پہلے تین عمرے کئے تھے۔ جب کہ یہ حدیث حج سے پہلے آپ ﷺ کے عمرے کی تعداد دو بتا رہی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کی تضاد کو یوں دور کیجئے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر اگرچہ بظاہر آپ ﷺ نے عمرہ نہیں کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آپ (ﷺ) احرام سے باہر آجائیے آپ (ﷺ) کو عمرے کا ثواب حاصل ہوگیا، گویا آپ ﷺ نے عمرہ کے افعال ادا نہیں کئے ہیں لہٰذا جس روایت میں حج سے پہلے عمرے کی تعداد تین بتائی گئی ہے اس میں اس عمرہ سے مراد عمرہ کا ثواب ہے اس اعتبار سے تین عمرے شمار کئے گئے ہیں اور جس روایت میں حج سے پہلے عمرہ کی تعداد دو بتائی گئی ہے اس کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ آپ ﷺ کو ثواب تین عمرے کے ملے ہیں۔ لیکن ظاہری طور پر عمرے آپ ﷺ نے دو ہی کئے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِي

حج صرف ایک مرتبہ فرض ہے

⑯ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَقَامَ الْاَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ فَقَالَ اَفِي كُلِّ عَامٍ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَوْ قُلْتُهَا نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَوْ وَجَبَتْ لَمْ تَعْمَلُوْا بِهَا وَلَمْ تَسْتَطِيْعُوْا وَالْحَجُّ

مَرَّةً فَمَنْ زَادَ فَتَطَوُّعٌ۔ (رواہ احمد والنسائی والدارمی)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جب فرمایا کہ لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے تو اقرع بن حابسؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا ہر سال (حج کرنا فرض ہوا ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ میں اس حج (کے ہر سال فرض ہونے کے سوال) کے بارے میں ہاں کہہ دیتا تو یقیناً (ہر سال حج کرنا) واجب (یعنی فرض) ہو جاتا اور اگر ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا تو نہ تم (اس حکم پر) عمل کرپاتے اور نہ تم اس کی استطاعت ہی رکھتے، حج (پوری زندگی میں بشرط قدرت) ایک ہی مرتبہ فرض ہے ہاں جو شخص ایک بار سے زیادہ کرے وہ نفل ہوگا (جس پر اسے بہت زیادہ ثواب ملے گا)۔" (احمدؒ ونسائیؒ ودارمیؒ)

باوجود قدرت کے حج نہ کرنے والے کے لئے وعید

⑰ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا وَذٰلِكَ اَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَفِي اِسْنَادِهٖ مَقَالٌ وَهِلَالُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ مَجْهُوْلٌ وَالْحَارِثُ يُضَعَّفُ فِي الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص زاد راہ اور سواری کا مالک ہو جو اسے بیت اللہ تک پہنچادے (یعنی جو شخص حج کرنے کی استطاعت وقدرت رکھتا ہو) اور (پھر بھی) وہ حج نہ کرے تو اس کے یہودی یا نصرانی ہو کر مرجانے (اور بے حج مرجانے) میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ (یعنی حج کے لئے زاد راہ وسواری کا شرط ہونا اور اس عظیم عبادت کو ترک کردینے پر مذکورہ بالا وعید) اس لئے ہے کہ اللہ بزرگ وبرتر فرماتا ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے لوگوں پر کعبہ کا حج کرنا ضروری ہے۔ جو وہاں تک جاسکتا ہو۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند محل کلام ہے ہلال ابن عبداللہ مجہول ہیں اور حارث روایت حدیث میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اتنا روپیہ ہو کہ وہ سفر حج میں جانے اور آنے کے اخراجات کے لئے کافی بھی ہو جائے اور اپنے اہل وعیال کو بھی اس قدر دے جائے جو اس کی واپسی تک ان کی ضروریات زندگی کو پورا کرسکے نیز اس کے پاس ایسی سواری ہو جو بیت اللہ تک پہنچاسکے، چاہے وہ اپنی ہو یا کرایہ ہو اور وہ اتنی استطاعت وقدرت کے باوجود بھی حج نہ کرے اور مرجائے تو وہ یہودی ونصرانی ہو کر مرتا ہے۔

اب اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس نے استطاعت وقدرت کے باوجود حج اس لئے نہیں کیا کہ وہ اس کی فرضیت ہی کا منکر ہو تو پھر یہودی اور نصرانی کی اس مشابہت کا تعلق کفر سے ہوگا۔ یعنی جس طرح یہودی ونصرانی کفر کی حالت میں مرتے ہیں، اسی طرح وہ بھی کفر کی حالت میں مرے گا اور اگر فرضیت کا منکر ہوئے بغیر حج نہ کرے تو اس مشابہت کا تعلق گناہ سے ہوگا کہ یہودی ونصرانی جتنے سخت گناہ کی حالت میں مرتے ہیں وہ بھی اتنے ہی شدید گناہ کا بار لئے موت کی نذر ہوگا۔ اگر بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ وعید ازراہ تغلیظ وتشدید یعنی ترک حج کے گناہ کی شدت وہیبت ناکی کے اظہار کے لئے فرمائی ہے۔ لیکن بہر نوع ترک حج ایک ایسا گناہ ہے اور اتنا شدید جرم ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اتنی شدید اور سخت وعید بیان فرمانی پڑی کہ حج نہ کرنے والا یہودی یا نصرانی ہو کر مرتا ہے عیاذاباللہ منہ۔

اِلَيْهِ سَبِيْلًا کے بعد آیت کا بقیہ حصہ یہ ہے وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ (ترجمہ) اور کوئی کفر کرے اور (طاعات وعبادت نہ کرکے) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفران کرے تو اللہ تعالیٰ عالم کے لوگوں سے بے نیاز ہے۔ یعنی لوگ طاعت وعبادت کریں یا نہ کریں اس سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نقصان نہیں ہے، نفع نقصان تو انہیں لوگوں کو ہے کہ اگر طاعت وعبادت کریں گے تو فلاح ونجات پائیں گے اور

اگر نہ کریں گے تو خسران و عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ پوری آیت پڑھی ہوگی کیونکہ استدلال تو پوری ہی آیت سے ہوتا ہے لیکن راوی نے الیہ سبیلا ہی تک اس آیت کو نقل کیا۔

(۱۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا صَيْرُوْرَةَ فِي الْاِسْلَامِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "صرورت اسلام میں داخل نہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: صرورت کا مفہوم ہے "وہ شخص جس نے کبھی حج نہ کیا ہو۔" لہٰذا اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے حج واجب ہونے کے باوجود حج نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "اس حدیث کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ جو شخص حج کرنے کی استطاعت رکھے اور پھر بھی حج نہ کرے تو وہ مسلمان نہیں ہے"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ارشاد یا تو از راہ تغلیظ و تشدید ہے یا پھر اس کی مراد یہ ہے کہ ایسا شخص کامل مسلمان نہیں ہوتا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "صرورت" کے معنی ہیں "نکاح اور حج کو ترک کرنا" اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نکاح و حج کو ترک کرنا اسلام کا طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ رہبانیت میں داخل ہے اس لئے مسلمان کو نکاح و حج ترک نہ کرنا چاہئے۔

حج علی الفور واجب ہے یا علی التراخی

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَرَادَ الْحَجَّ فَلْيُعَجِّلْ۔ (رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص حج کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ جلدی کرے۔"

(ابوداؤدؒ دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص حج کرنے پر قادر ہو اور حج کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ جلدی کرے اور اس فرض کو ادا کرنے کے لئے ملے ہوئے موقع کو غنیمت جانے کیونکہ تاخیر کرنے کی صورت میں نہ معلوم کتنی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں اور مآل کار اس نعمت عظمیٰ سے محرومی رہے۔

اس بارے میں کہ حج علی الفور واجب ہے یا التراخی؟ حنفیہ کے ہاں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ جب حج واجب ہو یعنی شرائط حج پائے جائیں اور حج کا وقت آجائے نیز قافلہ مل جائے (بشرطیکہ قافلے کی ضرورت ہو جیسا کہ پہلے زمانے میں بغیر قافلہ کے سفر کرنا تقریباً ناممکن ہوتا تھا) تو اسی سال حج کرے دوسرے سال تک تاخیر نہ کرے، اگر کوئی شخص بلا عذر کئی سال تاخیر کرتا رہے گا تو وہ فاسق کہلائے گا اور شرعی نقطہ نظر سے اس کی گواہی قبول نہ ہوگی۔ یعنی وہ شریعت کی نظر میں ناقابل اعتبار قرار پائے گا یہاں تک کہ اس عرصے میں اگر اسباب حج (کہ جن کی وجہ سے اس پر حج واجب ہوا تھا) جاتا رہے گا تو اس کے ذمہ سے فرض ساقط نہیں ہوگا بلکہ باقی رہے گا (جس کی وجہ سے وہ حج نہ کرسکنے کی صورت میں گنہگار ہوگا) حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے ہاں واجب علی التراخی ہے یعنی آخر عمر تک حج میں تاخیر جائز ہے جیسا کہ نماز میں آخر وقت تک تاخیر جائز ہے، حضرت امام محمدؒ کا بھی یہی قول ہے لیکن اس سلسلے میں دونوں یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تاخیر اسی وقت جائز ہوگی جب کہ حج کے فوت ہو جانے کا گمان نہ ہو، اگر یہ گمان ہو کہ تاخیر کرنے میں حج فوت ہو جائے گا (یعنی کبھی حج نہیں کر سکے گا) تو پھر تاخیر نہ کرے، اس صورت میں اگر کوئی شخص حج فرض ہونے کے باوجود بغیر حج کے مرے گا تو تمام ہی علماء کے نزدیک گنہگار میرے گا چنانچہ حج نہ کرنے کا اس سے مواخذہ ہوگا۔

حنفی علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے شرائط حج پائے جانے کے بعد حج میں تاخیر کی اور اس عرصے میں اس کا مال و زر تلف ہو گیا تو وہ قرض لے کر حج کرے اگرچہ اس قرض کی ادائیگی پر وہ قادر نہ ہو اور اس بات کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قرض کی عدم ادائیگی پر

مواخذہ نہیں کرے گا بشرطیکہ اس کی نیت یہ ہو کہ میرے پاس جب بھی مال آجائے گا میں یہ قرض ضرور ادا کروں گا۔

حج و عمرہ ساتھ کرنے کا حکم

(۲۰) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَابِعُوْا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَاِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوْبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُوْرَةِ ثَوَابٌ اِلَّا الْجَنَّةُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ عَنْ عُمَرَ اِلٰى قَوْلِهٖ خَبَثَ الْحَدِيْدِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حج اور عمرہ ایک ساتھ کرو اور اس لئے کہ یہ دونوں (یعنی ان میں سے ہر ایک) فقر اور گناہوں کو ایسا دور کرتے ہیں جیسے بھٹی لوہے سونے اور چاندی کے میل کو دور کرتی ہے اور حج مقبول کا ثواب جنت کے سوا کچھ نہیں" (ترمذیؒ، نسائیؒ، امام احمد اور ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت عمرؓ سے لفظ خبث الحدید تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: "حج اور عمرہ ساتھ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ قران کرو، یہ حج کی سب سے افضل قسم ہے جس میں حج و عمرہ دونوں ساتھ ہوتے ہیں اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔ یا پھر اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے عمرہ کیا ہے تو پھر حج بھی کرو اور حج کر لیا ہے تو پھر عمرہ بھی کرو۔

"فقر" سے مراد ظاہری فقر بھی ہو سکتا ہے اور باطنی بھی یعنی حج و عمرہ کرنے سے اللہ تعالیٰ مال و دولت کی نعمت سے نوازتا ہے یا یہ کہ دل غنی ہو جاتا ہے۔

حج کے شرائط

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يُوْجِبُ الْحَجَّ قَالَ الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! کون سی چیز حج کو واجب کرتی ہے؟ آپ نے فرمایا "زاد راہ اور سواری"۔ (ترمذیؒ، وابن ماجہؒ)

تشریح: سوال کون سی چیز حج کو واجب کرتی ہے؟ کا مطلب یہ ہے کہ حج واجب ہونے کی شرط کیا ہے؟ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک چیز تو زاد راہ بتایا جس کی مراد یہ ہے کہ اتنا مال و زر جو سفر حج میں جانے اور آنے کے اخراجات اور تا واپسی اہل و عیال کی ضروریات کے لئے کافی ہو اور دوسری چیز سواری بتائی جس پر سوار ہو کر بیت اللہ تک پہنچا جا سکے اگرچہ حج کے واجب ہونے کی شرطیں اور بھی ہیں مگر یہاں بطور خاص ان ہی دونوں چیزوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اصل میں یہی دو شرائط ایسے ہے جو حج کے لئے بنیادی اور ضروری اسباب کا درجہ رکھتے ہیں۔

یہ حدیث حضرت امام مالکؒ کے مسلک کی تردید کرتی ہے ان کے ہاں اس شخص پر بھی حج واجب ہوتا ہے جو پیادہ چلنے پر قادر ہو اور تجارت یا محنت مزدوری کے ذریعہ سفر حج کے اخراجات کے بقدر روپے پیسے حاصل کر سکتا ہو۔

حاجی کی صفت و کیفیت

(۲۲) وَعَنْهُ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا الْحَاجُّ قَالَ الشَّعِثُ التَّفِلُ فَقَامَ اٰخَرُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الْحَجِّ اَفْضَلُ قَالَ الْعَجُّ وَالثَّجُّ فَقَامَ اٰخَرُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا السَّبِيْلُ قَالَ زَادٌ وَرَاحِلَةٌ۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ فِيْ سُنَنِهٖ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرِ الْفَصْلَ الْاَخِيْرَ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا کہ "حاجی کی صفت وکیفیت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "غبار آلود سر، پراگندہ بال اور پسینہ ومیل کی وجہ سے بو آتی ہو (یعنی زیب وزینت سے مکمل اجتناب جیسا کہ کسی عاشق صادق اور محب مخلص کی علامت ہوتی ہے) پھر ایک دوسرا شخص کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! حج میں (ارکان کے بعد) کون سی چیزیں بہت زیادہ ثواب کی حامل ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "لبیک کے ساتھ آواز بلند کرنا اور قربانی یا ہدی کا جانور کا خون بہانا۔ اس کے بعد ایک اور شخص کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ سبیل" کیا ہے؟ یعنی قرآن کریم میں حج کے سلسلہ میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً تو اس آیت میں سبیل سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا "زادراہ اور سواری" (شرح السنۃ) نیز اس روایت کو ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ لیکن انہوں نے حدیث کا آخری حصہ یعنی فقام اخر (اس کے بعد ایک اور شخص کھڑا ہوا) سے آخر تک ذکر نہیں کیا ہے۔"

باپ کی طرف سے حج کرنے کی اجازت

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ رَزِیْنِ الْعُقَیْلِیِّ اَنَّہٗ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ اَبِیْ شَیْخٌ کَبِیْرٌ لَا یَسْتَطِیْعُ الْحَجَّ وَلَا الْعُمْرَۃَ وَلَا الظَّعْنَ قَالَ حُجَّ عَنْ اَبِیْکَ وَاعْتَمِرْ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابورزین عقیلیؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرا باپ بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے وہ نہ تو حج کی طاقت رکھتا ہے اور نہ عمرے کی اور نہ ہی سوار ہونے کی (یعنی بسبب ضعف وکبر سنی نہ تو حج وعمرہ کے افعال و ارکان کی ادائیگی پر قادر ہے اور نہ سوار ہو کر حج وعمرہ کے لئے جا سکتا ہے) آپ نے فرمایا اس کی طرف سے تم حج وعمرہ کرو۔ (ترمذیؒ، وابوداؤدؒ ونسائیؒ) نیز امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: اس باب کی پہلی فصل میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت (حدیث سات) کی تشریح کے ضمن میں اس روایت کا تذکرہ آ چکا ہے۔

دوسرے کی طرف سے حج کرنے سے پہلے کیا اپنا حج کئے ہونا ضروری ہے؟

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلاً یَقُوْلُ لَبَّیْکَ عَنْ شُبْرُمَۃَ قَالَ مَنْ شُبْرُمَۃُ قَالَ اَخٌ لِّیْ اَوْ قَرِیْبٌ لِّیْ قَالَ اَحَجَجْتَ عَنْ نَفْسِکَ قَالَ لَا قَالَ حُجَّ عَنْ نَفْسِکَ ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَۃَ۔

(رواہ الشافعی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (حج کے دوران) ایک شخص کو سنا کہ وہ شبرمہ کی طرف سے لبیک کہہ رہا ہے، آپ نے پوچھا کہ "شبرمہ" کون ہے؟ اس شخص نے عرض کیا کہ میرا بھائی ہے یا کہا کہ میرا قریبی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم اپنی طرف سے حج کر چکے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں! آپ نے فرمایا "تو پہلے تم اپنی طرف سے حج کرو پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرنا۔"

(شافعیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص پہلے اپنا فرض حج نہ کر[illegible] تو اس کو دوسرے کی طرف سے حج کرنا درست نہیں ہے، چنانچہ یہ حدیث ان حضرات کی دلیل ہے، حضرت امام اعظمؒ اور حضرت امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ دوسرے کی طرف سے حج کرنا درست ہے چاہے خود اپنا فریضہ حج ادا نہ کر پایا ہو۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک بھی اولیٰ یہی ہے کہ پہلے اپنا حج کرے اس کے بعد دوسرے کی طرف سے حج کرے چنانچہ ان کے مسلک کے مطابق اس حدیث میں پہلے اپنا حج کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ

استحباب کے طور پر ہے وجوب کے طور پر نہیں ہے۔ ویسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا یہ کہ منسوخ ہے اس لئے انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا ہے۔

مشرق والوں کی میقات

(۲۵) عَنْهُ قَالَ وَقَّتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَهْلِ الْمَشْرِقِ الْعَقِيْقَ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مشرق والوں کے لئے احرام (باندھنے) کی جگہ (یعنی میقات) عقیق کو متعین فرمایا ہے۔" (ترمذیؒ والبوداؤدؒ)

تشریح: "عقیق" ایک جگہ کا نام ہے جو ذات عرق کے محاذات میں واقع ہے یہ جگہ مشرق والوں کے لئے میقات ہے "مشرق والوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو حرم سے باہر مکہ کی مشرقی جانب کے علاقوں میں رہنے والے ہیں یہی لوگ عراقی بھی کہلاتے ہیں جن کا تذکرہ اگلی حدیث میں ہے، اس طرح مشرق والوں کے لئے احرام باندھنے کی دو جگہیں ہوئیں ایک تو عقیق اور ذات عرق۔ لہٰذا اس سمت سے آنے والے لوگ ان دونوں میں سے جس جگہ سے بھی گزریں وہیں سے احرام باندھیں۔

(۲۶) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَّتَ لِاَهْلِ الْعِرَاقِ ذَاتَ عِرْقٍ۔ (رواہ البوداؤد والنسائی)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے عراق والوں کے لئے احرام باندھنے کی جگہ ذات عرق متعین فرمائی۔" (البوداؤدؒ، نسائیؒ)

میقات سے پہلے احرام باندھنا افضل ہے

(۲۷) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَهَلَّ بِحَجَّةٍ اَوْ عُمْرَةٍ مِنَ الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى اِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ اَوْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ۔ (رواہ البوداود وابن ماجۃ)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کے لئے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) سے مسجد حرام (یعنی مکہ مکرمہ) تک احرام باندھے (یعنی بیت المقدس سے حج یا عمرہ کے لئے روانہ ہونے والا بیت المقدس ہی سے احرام باندھ کر چلے) تو اس کے وہ تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے جو اس نے پہلے کئے ہونگے اور جو بعد میں کرے گا یا فرمایا کہ اس شخص کے لئے (ابتداء ہی) جنت واجب ہو جائے گی (یعنی وہ شروع ہی میں جنت میں داخل ہوگا)۔" (البوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: من اهل بحجة او عمرة میں حرف او تنویع کے لئے ہے اور اَوْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ میں او راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے۔

جب کوئی شخص بیت المقدس سے مکہ کے لئے چلتا ہے تو وہ راستہ میں مدینہ منورہ سے گزرتا ہے، اس طرح وہ شخص اپنے راستہ میں تینوں افضل ترین مقامات سے مشرف ہوتا ہے بایں طور کہ اس راستہ کے سفر کی ابتداء بیت المقدس سے ہوتی ہے درمیان میں مدینہ منورہ آتا ہے اور آخر میں مکہ مکرمہ پہنچتا ہے، لہٰذا اس شخص کی خوش بختی کا اندازہ لگایئے جو اپنے سفر حج کی ابتداء بیت المقدس سے کرے کہ اول تو خود سفر مقدس و باعظمت پھر سفر کی ابتداء بیت المقدس سے درمیان میں مدینہ منورہ اور سفر کی انتہاء حرم محترم پر اس سبب سے مذکورہ بالا شخص یہ عظیم ثواب پاتا ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ احرام باندھنے کی جگہ حرم محترم سے جتنی دور ہوگی ثواب بھی اتنا زیادہ ہوگا اس بارہ میں فقہی تفصیل یہ ہے کہ حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک مواقیت سے احرام کی تقدیم یعنی احرام باندھنے کی جگہوں سے پہلے ہی احرام باندھ لینا یا اپنے گھر ہی سے احرام باندھ کر چلنا افضل ہے حضرت امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے لیکن یہ اس

صورت میں ہے جب کہ ممنوعات احرام سے بچ سکے، ورنہ اگر یہ جانے کہ اس صورت میں ممنوعات احرام سے اجتناب ممکن نہیں ہوگا تو پھر میقات ہی سے احرام باندھنا افضل ہوگا۔

اسی طرح حج کے مہینوں میں (یعنی شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ کے ابتدائی دس دن) سے پہلے احرام باندھنے کے بارہ میں حنفیہ کے ہاں جواز کا قول بھی ہے اور مکروہ بھی کہا گیا ہے، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ بھی کراہت ہی کے قائل ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کا ایک قول اگرچہ یہ بھی ہے کہ حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھنے والوں کا احرام درست نہیں ہوگا لیکن ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھے گا تو اس کا وہ احرام حج کی بجائے عمرہ کا ہو جائے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حج میں لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے اجتناب کرو

(۲۸) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ اَهْلُ الْيَمَنِ يَحُجُّوْنَ فَلَا يَتَزَوَّدُوْنَ وَيَقُوْلُوْنَ نَحْنُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ فَاِذَا قَدِمُوْا مَكَّةَ سَأَلُوا النَّاسَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یمن والے جب حج کرنے آئے تو زاد راہ ساتھ نہیں لائے تھے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ توکل ہم تو کرنے والے ہیں اور پھر جب وہ مکہ میں آتے تو لوگوں سے مانگتے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس سے منع کرنے کے لئے) یہ آیت نازل فرمائی وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (اور جب حج کو جانے لگو) تو زاد راہ ضرور (ساتھ) لے لیا کرو کیونکہ سب سے بڑی بات (اور خوبی) زاد راہ میں (گداگری) سے بچنا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: ان لوگوں نے توکل کو "زاد راہ" کا درجہ دے دیا تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ حج کے ضروری اخراجات کی فراہمی سے قطع نظر توکل بہترین چیز ہے لیکن حقیقت میں نہ تو وہ توکل تھا اور نہ یہ کوئی اچھی بات تھی کہ حج کے لئے مکہ مکرمہ پہنچ کر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائے جائیں جو انسانی شرف و عظمت کے خلاف ہے اس لئے فرمایا گیا ہے کہ سب سے بڑی بات اور خوبی یہ ہے کہ زاد راہ اپنے ساتھ رکھو اور گداگری سے بچو۔

اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ حج کے ضروری اخراجات ساتھ رکھے بغیر اس شخص کے لئے جانا درست نہیں ہے جس کے نفس میں توکل کو قوت نہ ہو اور اسی کو غالب گمان ہو کہ میں شکایت و بے صبری اور گداگری میں مبتلا ہو کر خود بھی پوری طمانیت اور سکون کے ساتھ افعال حج ادا نہ کر سکوں گا اور دوسروں کو بھی پریشانی میں مبتلا کروں گا۔

آیت اور حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ اتنا وسائل اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے چنانچہ کاملین کے نزدیک یہ افضل ہے کہ ہاں اگر کوئی بغیر اسباب کے صرف توکل ہی کو اختیار کرے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ اپنے عزم و ارادہ پر مستحکم و مضبوط رہ کر صبر کر سکے اور ایسا کوئی بھی کام نہ کرے جو حقیقی توکل کے منافی ہو۔

عورتوں کا جہاد حج و عمرہ ہے

(۲۹) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ قَالَ نَعَمْ عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لَا قِتَالَ فِيْهِ الْحَجُّ وَ الْعُمْرَةُ۔

(رواہ ابن ماجۃ)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا عورتوں پر جہاد ہے؟" آپ نے فرمایا ہاں "عورتوں پر ایسا جہاد ہے جس میں لڑائی نہیں ہے اور وہ حج و عمرہ ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اسلام نے عورتوں کے لئے جہاد واجب قرار نہیں دیا ہے لیکن چونکہ یہ ایک ایسی عظیم سعادت ہے جس سے عورتیں محروم رہیں اس لئے ان کے حق میں حج و عمرہ کو جہاد کا درجہ دے کر جہاد کے ثواب کی سعادت سے انہیں نوازا گیا، چنانچہ حج و عمرہ میں اگرچہ جنگ و جدل اور قتل و قتال نہیں ہے لیکن اس میں بھی مشقت سفر، گھر والوں سے مفارقت اور وطن کی جدائی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح جہاد میں۔ اس لئے عورتوں کے حق میں حج و عمرہ بمنزلہ جہاد ہے۔

بغیر عذر فرض حج نہ کرنے والوں کے لئے وعید

(۳۰) وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ لَمْ یَمْنَعْہُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاھِرَةٌ اَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ اَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ فَمَاتَ وَلَمْ یَحُجَّ فَلْیَمُتْ اِنْ شَاءَ یَھُوْدِیًّا وَاِنْ شَاءَ نَصْرَانِیًّا۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو ظاہری حاجت نے (کہ وہ زاد راہ اور سواری کا نہ ہونا ہے) یا ظالم بادشاہ نے یا خطرناک مرض نے حج سے نہ روک رکھا ہو اور وہ حج کئے بغیر مرجائے تو اسے اختیار ہے کہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر۔" (دارمیؒ)

تشریح: اگر کسی شخص کو سفر حج کے راستہ میں کسی ظالم بادشاہ و حکمران کی طرف سے جان و مال کے اتلاف کا خوف ہو تو اس پر حج فرض نہیں رہتا باوجودیکہ اس میں حج کے دوسرے شرائط مثلاً اخراجات کے بقدر مال و زر اور سواری وغیرہ پائے جاتے ہوں اسی طرح وہ بیماریاں جن کی وجہ سے سفر کرنا ممکن نہ ہو حج کی فرضیت کو ساقط کر دیتی ہیں۔ چنانچہ اندھے و فالج زدہ وغیرہ پر باوجود مالی استطاعت و قدرت کے حج فرض نہیں ہوتا۔

اس تفصیل کی روشنی میں حدیث بالا کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کے پاس زاد راہ ہو اور سواری کا انتظام ہو، راستہ میں کسی ظالم بادشاہ کا خوف نہ ہو، کوئی بیماری مانع سفر نہ ہو گویا کہ حج کے تمام شرائط موجود ہوں اور اس پر حج فرض ہو اور پھر وہ حج نہ کرے تو اب چاہئے وہ یہودی ہو کر مرے۔ اور چاہے عیسائی ہو کر اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں اس وعید کے سلسلہ میں گزشتہ صفحات میں ایک موقع پر تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

حج و عمرہ کرنے والے اللہ کے مہمان ہوتے ہیں

(۳۱) وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ الْحَاجُّ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللّٰہِ اِنْ دَعَوْہُ اَجَابَھُمْ وَاِنِ اسْتَغْفَرُوْہُ غَفَرَ لَھُمْ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اگر وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرتا ہے اور اگر وہ اس سے مغفرت مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرماتا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: کعبہ مکرمہ کو "بیت اللہ" فرمایا گیا ہے یعنی وہ اللہ جل شانہ کا گھر ہے جو شخص اس کے گھر کی زیارت کے لئے جاتا ہے وہ اس کا مہمان ہوتا ہے جس طرح میزبان اپنے مہمان کی ہر جائز خواہش کا احترام کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے مہمانوں کی لاج رکھتا ہے جو وہ مانگتے ہیں قبول فرماتا ہے وہ اگر اپنی مغفرت و بخشش چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت و بخشش کی دولت سے نوازتا ہے۔

(۳۲) وَعَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ وَفْدُ اللّٰہِ ثَلَاثَةٌ اَلْغَازِیْ وَالْحَاجُّ وَالْمُعْتَمِرُ۔ (رواہ النسائی والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تین قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ ① جہاد کرنے والے۔ ② حج کرنے والے۔ ③ عمرہ کرنے والے۔" (نسائی۔ بیہقی)

حج کر کے واپس آنے والے سے سلام و مصافحہ کرو

(۳۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا لَقِیْتَ الْحَاجَّ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ وَصَافِحْہُ وَمُرْہُ اَنْ یَسْتَغْفِرَ لَکَ قَبْلَ اَنْ یَدْخُلَ بَیْتَہٗ فَاِنَّہٗ مَغْفُوْرٌ لَّہٗ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم حاجی سے ملاقات کرو تو اس کو سلام کرو اس سے مصافحہ کرو اور اس سے اپنے لئے بخشش (کی دعا کرنے) کو کہو اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو اور یہ اس لئے کہ اس کی بخشش کی جا چکی ہے۔"

(احمدؒ)

تشریح: جیسا کہ ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے حاجی مستجاب الدعوات ہو جاتے ہیں جس وقت کہ وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہیں اور گھر واپس آنے کے چالیس روز بعد تک ایسے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ زمانہ میں دستور تھا اور اب بھی ہے کہ جب حجاج اپنے گھر واپس آتے تھے تو لوگ ان کے استقبال کے واسطے جایا کرتے تھے اور ان کی غرض یہ ہوتی تھی کہ چونکہ اس شخص کی مغفرت ہو چکی ہے اور یہ گناہوں سے پاک ہو کر آیا ہے اس سے مل کر مصافحہ کریں پیشتر اس کے کہ وہ دنیا میں ملوث ہو جائے تاکہ ہم کو بھی ان سے کچھ فیض پہنچے۔ اگرچہ آجکل یہ غرض کم اور نام و نمود کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔

چنانچہ اس حدیث میں بھی حاجی سے سلام و مصافحہ کرنے کے لئے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ اس وقت تک دنیا میں ملوث اور اپنے اہل و عیال میں مشغول نہیں ہوتا بلکہ اس وقت تک وہ راہ خدا ہی میں ہوتا ہے اور گناہوں سے پاک و صاف ہوتا ہے اور اس صورت میں حاجی چونکہ مستجاب الدعوات ہوتا ہے اس لئے فرمایا کہ اس سے اپنے لئے مغفرت و بخشش کی دعا کراؤ تاکہ اللہ تعالیٰ اسے قبول کرے اور تمہیں مغفرت و بخشش سے نوازے۔

علماء لکھتے ہیں کہ عمرہ کرنے والا، جہاد کرنے والا اور دینی طالب علم بھی حاجی کے حکم میں یعنی جب یہ لوگ لوٹ کر اپنے گھر آئیں تو ان سے بھی گھر میں داخل ہونے سے پہلے سلام و مصافحہ کیا جائے اور دعاء بخشش و مغفرت کی درخواست کی جائے کیونکہ یہ لوگ بھی مغفور ہوتے ہیں۔

حج و عمرہ کی راہ میں مر جانے والے کو پورا ثواب ملتا ہے

(۳۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ خَرَجَ حَاجًّا اَوْ مُعْتَمِرًا اَوْ غَازِیًا ثُمَّ مَاتَ فِیْ طَرِیْقِہٖ کَتَبَ اللّٰہُ لَہٗ اَجْرَ الْغَازِیْ وَالْحَاجِّ وَالْمُعْتَمِرِ رَوَاہُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص حج یا عمرہ اور یا جہاد کے ارادہ سے (گھر سے) نکلا اور پھر اس کے راستہ میں مر گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جہاد کرنے والے اور حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے ہی کا ثواب لکھتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: انہیں لوگوں کے حکم میں دینی طالب علم بھی ہے یعنی اگر کوئی شخص دین کا علم حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر سے نکلا اور پھر وہ راستہ میں مر گیا تو اس کے لئے بھی عالموں کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ

حج کے بارہ میں چند بنیادی باتیں اجمالی طور پر اس باب میں بیان ہوئی ہیں۔ مابعد کے ابواب میں حج کے تفصیلی احکام و مسائل آئیں گے چونکہ مکہ مکرمہ اس عظیم عبادت و سعادت کا بنیادی مقام و محور ہے اور مدینہ منورہ ایک ایک مسلمان کے دل کی دھڑکنوں کا مرکز اور

دیار محبوب ہے اور جس کی زیارت بھی سفر حج کی ایک بنیادی خواہش ہے اس لئے اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مقدس و بابرکت مقامات کا ایک مختصر سا تاریخی اور جغرافیائی خاکہ پیش کر دیا جائے اگرچہ آگے ان مقامات کے فضائل و مسائل پر مشتمل الگ ابواب میں آئیں گے۔

مکہ مکرمہ: جہاں بیت اللہ شریف واقع ہے مملکت سعودی عرب کے علاقہ "حجاز" کا ایک شہر ہے جو "وادی ابراہیم" میں آباد ہے سطح سمندر سے اس کی بلندی تقریباً ساڑھے تین سو فٹ بتائی جاتی ہے اس کا عرض البلد اکیس درجہ شمالی اور طول البلد ساڑھے انتالیس درجہ مشرقی ہے، آبادی چار لاکھ یا اس سے متجاوز ہے اس کا محل وقوع ساحل سمندر سے تقریباً اڑتالیس میل (۸۷ کلومیٹر) کے فاصلہ پر ہے۔

مکہ کے علاوہ بکہ، ام القری اور "بلد الامین" بھی اسی شہر کے نام ہیں مشہور اور متعارف نام مکہ ہی ہے یہ جس جگہ واقع ہے وہ ناقابل کاشت، تنگ اور گہری وادی ہے جو کسی زمانہ میں بالکل جنگل اور بے آب و گیاہ ریگستان ہونے کے سبب لوگوں کی آبادی کا مرکز نہیں بنتی تھی اس وادی میں شہر مکہ مکرمہ مشرق سے مغرب تک پانچ میل سے زائد حصہ میں پھیلا ہوا ہے اس کا عرض دو میل سے زائد ہے اس کی زمین سیلاب کی گزرگاہ ہونے کے باعث "بطحا" بھی کہی جاتی ہے مکہ کی وادی دو پہاڑی سلسلوں سے گھری ہوئی ہے جو مغرب سے شروع ہو کر مشرق تک چلے گئے ہیں ان میں ایک سلسلہ شمالی ہے اور ایک جنوبی ان دونوں سلسلوں کو "اخشبان" کہتے ہیں ان پہاڑوں کو توریت میں "جبال فاران" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

تقریباً چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اہلیہ حضرت ہاجرہ اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو اس جنگل اور بے آب و گیاہ وادی میں لا کر آباد کیا اور اسی وقت "کعبہ" کی دوبارہ تعمیر کی نیز انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اس جنگل کو آباد کر دے۔ جب ہی سے یہ بے آب و گیاہ میدان قرب و جوار بلکہ ساری دنیا کا مرکز بنا، اللہ کے اطاعت گزار بندے اسی کا رخ بنا کر پانچ وقت اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

حضرت اسماعیلؑ کی نسلیں یہاں مقیم ہوئیں اور کچھ نسلیں قرب و جوار میں بھی پھیلیں آخر میں قریش یہاں کے متولی اور باشندے ہوئے اور پھر یہیں قریش میں دنیا کے سب سے عظیم رہنما اور خدا کے سب سے آخری پیغمبر و رسول سرکار دو عالم ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اور آپ ﷺ نے مبعوث ہونے کے بعد اسی مقدس شہر سے خدا کے آخری دین "اسلام" کا پیغام دنیا کو سنایا اور یہیں سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی تمام تر جدوجہد کا آغاز ہوا۔

مکہ کی آبادی پہلے صرف خیموں میں رہتی تھی ہجرت سے صرف دو صدی پہلے آنحضرت ﷺ ایک جدہ قصی ابن کلاب جب شام سے آئے تو ان کے مشورہ سے مکانات کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا، پھر اسلام کے آنے کے بعد اس شہر کو برابر ترقی ہوتی رہی، اب یہ اپنے قرب و جوار میں دور دور تک سب سے بڑا اور پورے عالم اسلام کا سب سے اہم اور مرکزی شہر ہے۔ شہر میں پانی کا ایک ہی چشمہ ہے جسے "زمزم" کہتے ہیں اس کے علاوہ یہاں پانی کا اور کوئی کنواں نہیں ہے پانی کی کمی کی وجہ سے یہاں کی زمین میں کچھ کاشت نہیں ہو سکتی تھی، اب پانی کی افراط کی وجہ سے کچھ گھاس اور پودے لگائے گئے ہیں پہلے شہر میں پانی کی بہت قلت ہونے کی وجہ سے طائف کے قریب یہاں ایک نہر لائی گئی ہے جس کا نام نہر زبیدہ ہے۔ یہ نہر امین الرشید کی والدہ زبیدہ نے بنوائی تھی بعد میں اس کو ترقی دی جاتی رہی اس کے لئے پانی پہنچانے کے دوسرے ذرائع بھی اختیار کئے گئے اب موجودہ حکومت میں پانی کی سپلائی کا بہت معقول انتظام اور عمدہ ہونے کی وجہ سے یہ قلت بالکل جاتی رہی ہے۔

پہاڑوں کے درمیان گھرے ہونے کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں گرمی زیادہ اور سردی کم ہوتی ہے شہر کا موسم گرمیوں میں بڑا سخت ہوتا ہے۔ اور بارش صرف جاڑوں میں ہوتی ہے جس کی سالانہ مقدار چار پانچ انچ سے زیادہ نہیں ہوتی لہٰذا گرمی کا موسم مارچ میں شروع ہو کر آخر اکتوبر تک رہتا ہے موسم سرما میں سردی کم ہوتی ہے۔

مدینہ منورہ: مکہ مکرمہ سے بجانب شمال تقریباً دو سو ستر میل (چار سو بتیس کلو میٹر) کے فاصلہ پر واقع اس کے مغربی جانب سوا سو میل (سو کلو میٹر) کے فاصلہ پر سمندر اور اس علاقہ کا مشہور بندر گاہ ینبوع ہے۔ مدینہ منورہ مکہ مکرمہ اور شام کے درمیان راستہ کے تقریباً وسط پر واقع ہے اس کا طول البلد ساڑھے انتالیس درجہ مشرقی اور عرض البلد چوبیس درجہ شمالی ہے۔

جب خدا کے نام لیواؤں پر مکہ کی زمین تنگ ہوئی اور کفار مکہ کی خطرناک انتقامی کاروائیوں، ایذار سانیوں اور سازشوں کی وجہ سے تبلیغ اسلام میں رکاوٹ اور مسلمانوں کی جان و آبرو کے لالے پڑ گئے تو خدا کے حکم سے آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا اور خود بھی مکہ چھوڑ کر مدینہ آ گئے اس طرح اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز مدینہ منورہ منتقل ہو گیا اور پھر اسی سرزمین سے اسلام کی روشنی عرب کی حدود سے نکل کر پوری دنیا میں پہنچی۔

آپ کی تشریف آوری سے قبل اس شہر کا نام "یثرب" تھا یہاں قدیم زمانہ میں عمارز اور دوسری قومیں رہ چکی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام بدل دیا اور پھر اسے "مدینۃ الرسول) یعنی رسول اللہ ﷺ کا شہر کہا جانے لگا۔ اس کے علاوہ۔ طابہ۔ طیبہ، طائبہ، ارض اللہ۔ دار الہجرۃ۔ بیت رسول اللہ۔ حرم رسول اللہ۔ محبوبہ۔ حسنہ وغیرہ بھی نام احادیث وغیرہ میں آتے ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور اور متعارف نام "مدینہ" ہے۔

مدینہ منورہ مکہ مکرمہ کے برعکس سرسبز و شاداب اور ایک زراعتی شہر ہے۔ مغربی جانب کے علاوہ اس کے دوسرے اطراف میں باغات بکثرت ملتے ہیں جن میں کھجور، انگور انار سیب اور دوسرے پھل کافی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی زمینوں میں کھیتی باڑی کی جاتی ہے مدینہ کی آب و ہوا مکہ کی آب و ہوا کے مقابلہ میں معتدل ہے ایک تو وجہ یہ ہے کہ وہ مکہ مکرمہ کی طرح پہاڑیوں سے گھرا ہوا نہیں ہے دوسرے یہ کہ اس کو مختلف سمتوں سے باغات نے گھیر رکھا ہے تیسرے یہ کہ شہر سطح سمندر سے ساڑھے بارہ ہزار فٹ بلند ہے یہاں جاڑا گرمی دونوں سخت ہوتے ہیں۔ یہ شہر ایک صحت پرور شہر سمجھا جاتا ہے منقول ہے کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو اس وقت یہاں کی آب و ہوا نہایت ناقص اور خراب تھی اکثر وبائی بیماریاں ہوتی رہتی تھیں چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت بلالؓ یہاں آتے ہی سخت بیمار ہو گئے آنحضرت ﷺ نے اس شہر کی آب و ہوا کی اصلاح اور درستی کیلئے دعا مانگی اور آپکی دعا قبول ہوئی۔

مدینہ کی مشرقی جانب حرۃ الواقم اور مغربی جانب "حرۃ الوبرہ" نامی پہاڑ ہیں۔ شمالی جانب "جبل احد" ہے جس کے پاس احد کا معرکہ پیش آیا تھا اور وہاں متعدد صحابہؓ اور حضرت حمزہؓ کی قبریں ہیں یہ پہاڑ شہر سے تقریباً اڑھائی میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور جنوبی جانب جبال عیر نامی دو پہاڑ ہیں اور قبا اور عوالی نامی دو بستیاں ہیں حرۃ الواقم اور حرۃ الوبرہ کے درمیان شمال میں لیکن ذرہ علیحدہ "جبل سلع" ہے یہی وہ جگہ ہے یہاں چار ھجری میں آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودی تھی۔ اور مدینہ منورہ پر حملہ آور کفار کا راستہ بند کر دیا تھا یہ واقعہ غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق کہلاتا ہے یہ خندق حرۃ الواقم سے حرۃ الوبرہ تک ہلالی شکل میں کھودی گئی تھی اور جبل سلع کے پیچھے سے گزری تھی۔ مسلمانوں کا لشکر جبل سلع کے دامن میں مقیم ہوا تھا۔ شہر تقریباً وسط میں قدرے مستطیل شکل کی رسول اللہ ﷺ کی پر شکوہ مسجد ہے اس مسجد کے مشرقی پہلو اور جنوبی سرے پر روضۂ اطہر ہے جس میں سرکار دو عالم ﷺ آرام فرما ہیں اور آپ کے دو معزز رفیق ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ بھی یہیں مدفون ہیں۔

بَابُ الْاِحْرَامِ وَالتَّلْبِيَةِ

احرام باندھنے اور لبیک کہنے کا بیان

احرام کے معنی ہیں "حرام کر دینا" چونکہ حج کرنے والے پر کئی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں لہٰذا اس اظہار کے واسطے کہ اس وقت یہ

چیزیں حرام ہوگئی ہیں ایک لباس جو صرف ایک چادر اور تہبند ہوتا ہے۔ بہ نیت حج یا عمرہ باندھا جاتا ہے جس کو احرام کہتے ہیں۔
"تلبیہ" یعنی لبیک کہنے سے مراد یہ عبارت پڑھنا ہے لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

احرام میں خوشبو لگانے کا مسئلہ

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اُطَيِّبُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاِحْرَامِهٖ قَبْلَ اَنْ يُّحْرِمَ وَلِحِلِّهٖ قَبْلَ اَنْ يَّطُوْفَ بِالْبَيْتِ بِطِيْبٍ فِيْهِ مِسْكٌ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى وَبِيْصِ الطِّيْبِ فِيْ مَفَارِقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔
(متفق علیہ)

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کو آپ ﷺ کے احرام کے لئے احرام باندھنے سے پہلے اور آپ ﷺ کے احرام سے نکلنے کے لئے طواف کعبہ سے پہلے خوشبو لگاتی اور ایسی خوشبو لگاتی تھی جس میں مشک ہوتا تھا گویا میں اب بھی آپ ﷺ کی مانگ میں خوشبو کی چمک دیکھ رہی ہوں اس حال میں کہ آپ ﷺ احرام باندھے ہوئے ہیں یعنی وہ چمک گویا میری آنکھوں تلے پھرتی ہے۔"
(بخاری و مسلم)

تشریح: حضرت عائشہؓ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ جب احرام کا ارادہ کرتے تو احرام باندھنے سے پہلے میں آپ ﷺ کو خوشبو لگاتی اور وہ خوشبو ایسی ہوتی جس میں مشک بھی ہوتا تھا۔ لہٰذا اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر خوشبو احرام سے پہلے لگائی جائے اور اس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ خوشبو کا احرام کے بعد استعمال کرنا ممنوعات احرام سے ہے نہ کہ احرام سے پہلے۔ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ احرام کے بعد خوشبو استعمال کرنا ممنوع ہے احرام سے پہلے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے ہاں احرام سے پہلے بھی ایسی خوشبو لگانا مکروہ ہے جس کا اثر احرام باندھنے کے بعد بھی باقی رہے۔

ولحلہ قبل ان یطوف بالبیت (اور آپ ﷺ کے احرام سے نکلنے کے لئے الخ) کا مفہوم سمجھنے سے پہلے یہ تفصیل جان لینی چاہئے کہ بقرعید کے روز (یعنی دسویں ذی الحجہ کو) حاجی مزدلفہ سے منیٰ میں آتے ہیں اور وہاں رمی جمرۂ عقبہ (جمرۂ عقبہ پر کنکر مارنے) کے بعد احرام سے نکل آتے ہیں یعنی وہ تمام باتیں جو حالت احرام میں منع تھیں اب جائز ہو جاتی ہیں البتہ رفث (یعنی جماع کرنا یا عورت کے سامنے جماع کا ذکر اور شہوت انگیز باتیں کرنا) جائز نہیں ہوتا یہاں تک کہ جب مکہ واپس آتے ہیں اور طواف افاضہ کر لیتے ہیں تو رفث بھی جائز ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حضرت عائشہؓ کے اس جملہ کی مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب احرام سے نکل آتے یعنی مزدلفہ سے منیٰ آکر رمی جمرہ عقبہ سے فارغ ہو جاتے لیکن ابھی تک مکہ آکر طواف افاضہ نہ کر چکے ہوتے تو میں اس وقت بھی آپ ﷺ کو خوشبو لگاتی تھی۔

تلبید و تلبیہ

② وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُهِلُّ مُلَبِّدًا يَقُوْلُ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَا يَزِيْدُ عَلٰى هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو (تلبیہ) اس طرح باآواز بلند کہتے سنا اور اس وقت آپ تلبید کئے ہوئے تھے لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ یعنی حاضر ہوں میں تیری خدمت

میں اے اللہ! حاضر ہوں تیری خدمت میں، میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، حاضر ہوں میں تیری خدمت میں بے شک تمام تعریف اور ساری نعمت تیرے ہی لئے ہے اور بادشاہت بھی تیری ہی ہے تیرا کوئی شریک نہیں۔" آپ ﷺ ان کلمات سے زیادہ نہیں کہتے تھے"۔" (بخاری ؒ ومسلم ؒ)

تشریح: تلبید کرنا یہ کہ محرم (احرام باندھنے والا) اپنے سر کے بالوں میں گوند یا خطمی یا مہندی یا اور کوئی چیز لگالیتا ہے تاکہ بال آپس میں یکجا رہیں اور چپک جائیں ان میں گرد و غبار نہ بیٹھے اور جوؤں سے محفوظ رہیں۔

تلبیہ یعنی لبیک کہنے میں علماء کا اختلافی اقوال ہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک احرام کے صحیح ہونے کے لئے تلبیہ شرط ہے، حضرت امام مالک ؒ کہتے ہیں کہ تلبیہ واجب نہیں ہے لیکن تلبیہ ترک کرنے کی وجہ سے دم (جانور ذبح کرنا) لازم آتا ہے اور حضرت امام شافعی ؒ کے ہاں تلبیہ سُنّت ہے اس کو ترک کرنے کی صورت میں دم لازم نہیں ہوتا۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ تلبیہ میں اکثر اتنے ہی الفاظ کہتے تھے کیونکہ اور روایتوں میں تلبیہ کے الفاظ کے علاوہ دوسرے الفاظ بھی منقول ہیں چنانچہ اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ تلبیہ کے جو الفاظ یہاں حدیث میں نقل کئے گئے ہیں، ان میں کمی کرنا تو مکروہ ہے زیادتی مکروہ نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔

حدیث سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوگیا کہ تلبیہ باآواز بلند ہونا چاہئے چنانچہ تمام علماء کے نزدیک بلند آواز سے لبیک کہنا مستحب ہے۔

تلبیہ کب کیا جائے

(۳) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَدْخَلَ رِجْلَهُ فِي الْغَرْزِ وَاسْتَوَتْ بِهِ نَاقَتُهُ قَائِمَةً اَهَلَّ مِنْ عِنْدِ مَسْجِدِ ذِي الْحُلَيْفَةِ۔ (متفق علیه)

"اور حضرت ابن عمر ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جب اپنے پاؤں رکاب میں ڈالے اور اونٹنی آپ ﷺ کو لے کر کھڑی ہوئی تو آپ ﷺ نے ذوالحلیفہ کی مسجد کے قریب تلبیہ کیا (یعنی باآواز بلند لبیک کہی)۔" (بخاری ؒ ومسلم ؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر رخت سفر باندھا اور ظہر کی نماز مدینہ میں پڑھ کر روانہ ہوئے۔ عصر کی نماز ذوالحلیفہ پہنچ کر پڑھی جو اہل مدینہ کے لئے میقات ہے رات وہیں گزاری اور پھر صبح کو آپ ﷺ نے احرام باندھا۔

اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اور اونٹ کے کھڑے ہو جانے کے بعد لبیک کہی جب کہ ایک دوسری روایت میں یہ منقول ہے کہ احرام کے لئے بہ نیت نفل دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد لبیک کہی نیز ایک روایت یہ بتاتی ہے کہ آپ ﷺ نے بیداء پہنچ کر جو ایک بلند جگہ کا نام ہے لبیک کہی اس طرح لبیک کہنے کے وقت سلسلہ میں تین طرح کی روایتیں منقول ہیں، چنانچہ حضرت امام شافعی ؒ نے تو پہلی روایت پر کہ جو یہاں نقل کی گئی ہے عمل کرتے ہوئے کہا کہ اونٹ پر (یا جو بھی سواری ہو اس پر بیٹھ کر لبیک کہی جائے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ ؒ، حضرت امام مالک ؒ اور حضرت امام احمد ؒ نے دوسری روایت کو اختیار کیا ہے۔ لہٰذا ان تینوں ائمہ کے ہاں مستحب یہ ہے کہ دو رکعت نماز نفل پڑھنے کے بعد احرام کی نیت کی جائے اور پھر وہیں مصلے پر بیٹھے ہی ہوئے لبیک کہے تو یہ جائز ہے لیکن نماز کے بعد ہی لبیک کہنا افضل ہے۔

اب ان تینوں روایتوں کے تضاد کو اس تطبیق کے ساتھ دور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز پڑھ کر مصلے پر بیٹھے ہوئے لبیک کہی پھر جب اونٹنی پر بیٹھے تو اس وقت بھی لبیک کہی اور اس کے بعد جب مقام بیداء پر پہنچے تو وہاں بھی لبیک کہی چنانچہ علماء نے اسی لئے لکھا ہے کہ حالت وقت اور جگہ کے تغیرات کے وقت لبیک کی تکرار مستحب ہے۔

بہر کیف آپ ﷺ نے اس طرح تین مرتبہ لبیک کہی اور جس راوی نے جہاں لبیک کہتے سنا وہ یہ سمجھا کہ آپ ﷺ نے یہیں سے

لبیک کہنی شروع کی ہے اس لئے ہر ایک راوی نے اپنے سننے کے مطابق ذکر کر دیا۔ اس تطبیق و توجیہ کی بنیاد حضرت ابن عباسؓ کی وہ روایت ہے جسے شیخ عبدالحقؒ نے اشعۃ اللمعات میں شرح کتاب خرقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

تلبیہ کا ذکر اور حج کی قسمیں

④ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَصْرُخُ بِالْحَجِّ صُرَاخًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ (سفر حج میں) اس طرح روانہ ہوئے کہ ہم حج کے لئے چلاتے تھے (یعنی حج کے لئے بآواز بلند لبیک کہتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: صرف حج ہی کا ذکر اس لئے کیا کہ حج ہی اصل اور مقصود اعظم ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ بات راوی نے اپنے بارہ میں کہی ہے زیادہ سے زیادہ اس کا تعلق ان لوگوں سے بھی ہو سکتا ہے جو راوی کی طرح صرف حج کے لئے تلبیہ کرتے تھے۔ یا زیادہ سے زیادہ وضاحت سے یوں کہئے کہ یہ حدیث صرف ان لوگوں کا حال بیان کر رہی ہے جنہوں نے افراد کا احرام باندھا تھا۔ جہاں تک آنحضرت ﷺ کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کے بارہ میں یہ حدیث ساکت ہے کہ اس کی وضاحت دوسری روایت سے ہوگی اس لئے یہ روایت روایات آئندہ کے منافی نہیں ہے۔

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنْتُ رَدِيْفَ اَبِیْ طَلْحَةَ وَاِنَّهُمْ لَيَصْرُخُوْنَ بِهِمَا جَمِيْعًا اَلْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں سواری پر حضرت ابو طلحہؓ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور (اکثر) صحابہ دونوں چیزوں یعنی حج و عمرہ کے لئے چلاتے تھے (یعنی بآواز بلند کہتے۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قران افضل ہے چنانچہ حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔ اس حدیث کو مستدل قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہؓ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے وہ آنحضرت ﷺ کے خلاف عمل کرنا کب گوارا کر سکتے تھے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے قران کیا ہوگا اس لئے اکثر صحابہؓ نے بھی آپ ﷺ کی اتباع ہی میں قران کیا۔ قران کے معنی اگلی حدیث میں بیان کئے جائیں گے۔

⑥ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ فَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِحَجٍّ وَعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِالْحَجِّ وَاَهَلَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْحَجِّ فَاَمَّا مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ وَاَمَّا مَنْ اَهَلَّ بِالْحَجِّ اَوْ جَمَعَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَلَمْ يَحِلُّوْا حَتّٰى كَانَ يَوْمُ النَّحْرِ۔ (متفق علیہ)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم حجۃ الوداع کے سال رسول کریم ﷺ کے ہمراہ (حج کے لئے) روانہ ہوئے چنانچہ ہم میں سے بعض تو وہ تھے جنہوں نے صرف عمرہ کے لئے حرام باندھا اور رسول کریم ﷺ نے بھی صرف حج کا احرام باندھا تھا لہٰذا جس نے صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا وہ تو حلال ہو گیا (یعنی احرام سے باہر ہو گیا) اور جنہوں نے صرف حج کا یا حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا تھا وہ حلال نہیں ہوئے یہاں تک کہ قربانی کا دن آیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حج کرنے والوں کی تین قسمیں ہیں۔ ① مفرد۔ ② قارن۔ ③ متمتع۔ مفرد اسے کہتے ہیں جو صرف حج کا احرام باندھے چنانچہ صرف حج کا احرام باندھنے اور صرف حج پر اکتفا کرنے کو "افراد" کہتے ہیں۔ قارن اسے کہتے ہیں جو حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھ کر پہلے عمرہ کرے اور پھر حج کرے چنانچہ حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ کر پہلے عمرہ اور پھر حج کرنے کو "قران" کہتے ہیں۔ متمتع اسے کہتے ہیں جو حج کے مہینوں میں میقات سے عمرہ کا احرام باندھے اور عمرہ کے افعال ادا کرے پھر اگر ہدی (قربانی کا جانور) ساتھ لایا ہو تو احرام باندھے رہے اور اگر ہدی ساتھ نہیں لایا ہے تو احرام سے نکل آئے اور مکہ میں مقیم رہے، جب حج کے دن آئیں تو حج کا احرام

حرم سے باندھے اور حج کرے چنانچہ حج کے مہینوں میں پہلے عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کرنا اور عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد وطن جانے سے پہلے بغیر احرام کھولے (اگر قربانی کا جانور ساتھ لایا ہے) یا احرام کھول کر پھر حج کے دنوں میں حرم سے حج کا احرام باندھ کر حج کرنے کو "تمتع" کہتے ہیں۔ یہاں اجمالی طور پر صرف تعریفات بیان کردی گئی ہیں۔ تفصیلی احکام انشاء اللہ آگے آئیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع میں کس قسم کے لئے احرام باندھا تھا، آیا آپ ﷺ مفرد تھے یا قارن اور یا متمتع؟ علماء لکھتے ہیں کہ اس بارہ میں مختلف احادیث منقول ہیں، بعض حدیثوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مفرد تھے چنانچہ یہاں جو حدیث نقل کی گئی ہے یہ بھی انہیں میں سے ہے، اکثر احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ قارن تھے۔ اور بعض احادیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ متمتع تھے۔

لہٰذا ان تمام احادیث میں تطبیق یوں کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ کے رفقاء میں سے بعض تو احرام باندھتے وقت آنحضرت ﷺ سے صرف لَبَّيْكَ بِحَجَّةٍ ہی سنا اور لفظ وَعُمْرَةٍ نہ سنا لہٰذا انہوں نے یہ کہا کہ آپ ﷺ مفرد تھے۔ بعض نے لَبَّيْكَ بِحَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ سنا لہٰذا انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ قارن تھے، اور بعض نے لَبَّيْكَ بِعُمْرَةٍ سنا لہٰذا انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ متمتع تھے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی تو لبیک بحجۃ کہا ہو کبھی لبیک بعمرۃ اور کبھی لبیک بحجۃ وعمرۃ کہا ہو، لہٰذا جس نے جو کچھ سنا وہی روایت کیا نیز یہ کہ قران و تمتع کے افعال آپس میں چونکہ مشابہ ہیں اس لئے بعض صحابہؓ نے جانا کہ آنحضرت ﷺ نے جو قران کیا ہے انہوں نے اسی کو نقل کیا ہے اور بعض صحابہؓ نے جانا کہ آپ ﷺ نے تمتع کیا ہے اس لئے انہوں نے اسی کو نقل کیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس روایت میں "تمتع" منقول ہے وہاں اس کے لغوی معنی مراد ہوں کیونکہ تمتع کے معنی ہیں نفع اٹھانا اور ظاہر ہے کہ یہ مفہوم قران سے بھی حاصل ہوتا ہے بایں طور کہ قارن عمرہ سے متمتع ہوتا ہے جو وہ حج کے ساتھ کرتا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ الخ (لہٰذا جس نے صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا وہ تو حلال ہو گیا الخ) کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے حج کے پہلے صرف عمرہ کے لئے احرام باندھا تھا وہ طواف و سعی کرنے اور حلق یعنی سر منڈانے کے بعد عمرہ کے احرام سے باہر ہو گئے اور پھر انہوں نے حج کا احرام باندھا اور جن لوگوں نے صرف حج کا یا حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا تھا وہ احرام سے باہر نہیں ہوئے یہاں تک کہ نحر (قربانی) کا دن گزر گیا، نحر کے دن وہ بھی رمی جمرۃ العقبہ (جمرہ عقبہ پر کنکری مارنے اور حلق کے بعد احرام سے باہر آ گئے جس کے بعد تمام ممنوعات احرام ان کے لئے جائز ہو گئے علاوہ عورت کے ساتھ مباشرت کے کہ یہ طواف رکن (کہ جس کو طواف افاضہ بھی کہتے ہیں) کے بعد جائز ہوئی۔

آنحضرت ﷺ کا حج

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ تَمَتَّعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ بَدَأَ فَاَهَلَّ بِالْعُمْرَةِ ثُمَّ اَهَلَّ بِالْحَجِّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں عمرہ کو حج سے ملا کر تمتع کیا (یعنی فائدہ اٹھایا) بایں طور کہ آپ ﷺ نے عمرہ کے احرام سے ابتدا کی اور پھر حج کا احرام باندھا (اس طرح آپ ﷺ نے حج و عمرہ کو ملا دیا اور قارن ہو گئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

احرام کے کپڑے

⑧ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّهٗ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَجَرَّدَ لِاِهْلَالِهٖ وَاغْتَسَلَ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"حضرت زید بن ثابتؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ رسول کریم ﷺ اپنے احرام کے لئے ننگے ہوئے اور غسل کیا۔"
(ترمذیؒ و دارمیؒ)

تشریح: "ننگے ہونے" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سلے ہوئے کپڑے اپنے بدن سے اتار دیئے اور تہبند باندھ کر چادر اوڑھ لی جو احرام کے کپڑے ہیں چنانچہ احرام کی حالت میں سلا ہوا کپڑا مثلاً کرتا، پائجامہ، ٹوپی عبا، قبا اور موزہ وغیرہ پہننا منع ہے۔
جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوا احرام کے لئے غسل کرنا مسنون و افضل ہے، اگر غسل نہ ہو سکے تو پھر وضو پر اکتفا بھی جائز ہے حیض و نفاس والی عورت اور نابالغ بچوں کے لئے بھی غسل مسنون ہے۔

تلبید کا ذکر

⑨ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَبَّدَ رَأْسَهُ بِالْغِسْلِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے سر کے بالوں کو ان چیزوں کے ذریعہ جمایا جن سے سر دھویا جاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آپ نے احرام کے وقت اپنے سر کے بالوں کو گوندیا خطمی وغیرہ سے جما لیا تھا تاکہ وہ گرد و غبار سے محفوظ رہیں، اسی کو تلبید کہتے ہیں۔ اس کے بارہ میں پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

تلبیہ میں آواز بلند کرنے کا حکم

⑩ وَعَنْ خَلَّادِ بْنِ السَّائِبِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَانِيْ جِبْرِيْلُ فَاَمَرَنِيْ اَنْ اٰمُرَ اَصْحَابِيْ اَنْ يَّرْفَعُوْا اَصْوَاتَهُمْ بِالْاِهْلَالِ اَوِ التَّلْبِيَةِ۔ (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت خلاد بن سائب اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ میرے پاس جبریلؑ آئے اور مجھے یہ امر کیا کہ میں اپنے صحابہؓ کو اس بات کا حکم دوں کہ وہ اہلال یا تلبیہ میں اپنی آوازیں بلند کریں۔"
(مالکؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: بِالْاِهْلَالِ اَوِ التَّلْبِيَةِ میں حرف او راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو بِالْاِهْلَالِ فرمایا یا بِالتَّلْبِيَةِ کہا معنی دونوں کے ایک ہی ہیں یعنی لبیک کہنا۔
باآواز بلند لبیک کہنا مردوں کے لئے مستحب ہے لیکن آواز کو اتنا بلند نہ کرنا چاہئے جس سے تکلیف پہنچے، عورتیں اتنی آہستہ آواز سے لبیک کہیں کہ وہ خود ہی سن سکیں دوسروں تک ان کی آواز نہ پہنچے۔

لبیک کہنے والے کی فضیلت و عظمت

⑪ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُلَبِّيْ اِلَّا لَبّٰى مَنْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَشِمَالِهٖ مِنْ حَجَرٍ اَوْ شَجَرٍ اَوْ مَدَرٍ حَتّٰى تَنْقَطِعَ الْاَرْضُ مِنْ هٰهُنَا وَهٰهُنَا۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، جب کوئی بھی مسلمان لبیک کہتا ہے تو اس کے دائیں اور بائیں کی ہر چیز خواہ وہ پتھر ہو یا درخت اور یا ڈھیلے سب لبیک کہتے ہیں یہاں تک کہ اس طرف سے (یعنی اس کی دائیں طرف کی ساری (زمین) اور اس طرف سے (یعنی اس کی بائیں طرف کی ساری زمین اس میں شامل ہوتی ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یہ حدیث گویا لبیک اور لبیک کہنے والے کی عظمت و فضیلت کو ظاہر کر رہی ہے کہ جب کوئی بھی مسلمان لبیک کہتا ہے تو زمین کی تمام چیزیں لبیک کہنے والے کی ہمنوائی کرتی ہیں بایں طور کہ وہ بھی لبیک کہتی ہیں۔

احرام کے لئے دو رکعت نماز پڑھنا مسنون ہے

⑫ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْكَعُ بِذِي الْحُلَيْفَةِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ إِذَا اسْتَوَتْ بِهِ النَّاقَةُ قَائِمَةً عِنْدَ مَسْجِدِ ذِي الْحُلَيْفَةِ أَهَلَّ بِهٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ وَيَقُوْلُ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ لَبَّيْكَ وَالرَّغْبَاءُ إِلَيْكَ وَالْعَمَلُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَفْظُهُ لِمُسْلِمٍ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (احرام باندھتے وقت) ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھتے اور پھر جب ذوالحلیفہ کی مسجد کے قریب اونٹنی آپ ﷺ کو لے کر کھڑی ہوتی تو آپ ﷺ ان کلمات کو (یعنی لبیک کے مشہور کلمات کو جو پہلے گزر چکے ہیں، با آواز بلند کہتے اور (پھر) یہ کلمات (مزید) کہتے لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ لَبَّيْكَ وَالرَّغْبَاءُ إِلَيْكَ وَالْعَمَلُ حاضر ہوں تیری خدمت میں اے اللہ! تیری خدمت میں حاضر ہوں، حاضر ہوں تیری خدمت میں اور نیک بختی حاصل کرتا ہوں تیری خدمت میں اور بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے حاضر ہوں تیری حدمت میں اور رغبت و توجہ تیری طرف ہے او عمل تیرے ہی لئے ہے۔ اس روایت کو بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کیا ہے لیکن الفاظ مسلمؒ کے ہیں۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ ذوالحلیفہ پہنچتے تو وہاں پہلے آپ ﷺ دو رکعت نماز بہ نیت نفل پڑھتے جو احرام کے لئے مسنون ہے، اور ان دونوں رکعتوں میں قل یا ایہا الکافرون اور قل ہو اللہ احد کی قرأت کرتے پھر نیت کرتے اس کے بعد لبیک کہتے اور پھر جب آپ مسجد ذوالحلیفہ کے پاس اونٹنی پر سوار ہوتے اور اونٹنی آپ ﷺ کو لے کر کھڑی ہوتی تو اس وقت بھی پہلے تو آپ ﷺ انہیں کلمات کے ذریعہ تلبیہ کرتے جو مشہور ہیں اور پھر لبیک کے مزید وہ کلمات کہتے جو حدیث میں نقل کئے گئے ہیں۔

تلبیہ کے بعد درود و دعا

⑬ وَعَنْ عُمَارَةَ بْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ كَانَ إِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَتِهِ سَأَلَ اللّٰهَ رِضْوَانَهُ وَالْجَنَّةَ وَاسْتَعْفَاهُ بِرَحْمَتِهِ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت عمارہ ابن خزیمہ ابن ثابت اپنے والد مکرم (حضرت خزیمہ) سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ جب تلبیہ (یعنی لبیک کہنے) سے فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی خوشنودی اور جنت مانگتے اور اس کی رحمت کے ذریعہ دوزخ کی آگ سے معافی کے خواستگار ہوتے۔" (شافعیؒ)

تشریح: حنفی علماء فرماتے ہیں کہ یہ مستحب ہے کہ جو شخص تلبیہ سے فارغ ہو تو وہ نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے اور درود پڑھتے وقت اپنی آواز تلبیہ کی آواز کی بہ نسبت پست و دھیمی رکھے نیز اللہ تعالیٰ سے اس کی خوشنودی اور جنت مانگے، دوزخ کی آگ سے اس کی پناہ چاہے اور اپنی جس دینی و دنیاوی فلاح و بھلائی کے لئے چاہے دعا مانگے۔

یہ مسئلہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ تلبیہ کرنے والے کو سلام کرنا مکروہ ہے ہاں اگر کوئی تلبیہ کرنے کی حالت میں سلام کر ہی لے تو اس کے سلام کا جواب دینا جائز ہے نیز حنفی علماء کے نزدیک ایک مرتبہ تلبیہ کرنا تو فرض ہے اور ایک مرتبہ سے زیادہ سُنّت ہے ایسی سُنّت کہ جس کو ترک کرنے والا "برا" سمجھا جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان عام

⑭ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا اَرَادَ الْحَجَّ اَذَّنَ فِی النَّاسِ فَاجْتَمَعُوْا فَلَمَّا اَتَی الْبَیْدَاءَ اَحْرَمَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جب حج کا ارادہ کیا تو لوگوں کو خبردار کیا (یعنی اعلان کرایا) چنانچہ لوگ جمع ہو گئے اور پھر جب بیداء کے میدان میں پہنچے تو احرام باندھا۔" (بخاریؒ)

تشریح: جب حج فرض ہوا اور آپ ﷺ نے دس ہجری میں اس فریضہ کی ادائیگی کا ارادہ فرمایا تو یہ اعلان عام کرا دیا کہ رسول اللہ (ﷺ) حج کا ارادہ رکھتے ہیں جن لوگوں پر حج فرض ہے وہ سفر حج کے لئے تیار ہو جائیں چنانچہ وقت مقررہ پر مدینہ میں مسلمانوں کی کثیر تعداد جمع ہوئی اور آپ تمام رفقاء کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہو گئے پھر جب آپ ﷺ بیداء کے میدان میں جو ذوالحلیفہ کے قریب ہے پہنچے تو احرام باندھا۔ اب اس موقع پر اتنی بات سمجھ لیجئے کہ یہاں احرام باندھنے سے مراد یہ ہے کہ بیداء میں آپ ﷺ نے دوبارہ لبیک کہہ کر اپنے محرم ہونے کا اظہار کیا، کیونکہ پہلے بتایا جا چکا ہے اور یہی ثابت بھی ہے کہ آپ ﷺ نے ابتداءً ذوالحلیفہ ہی میں احرام کے لئے دو رکعت نماز پڑھ کر احرام باندھ لیا تھا۔

مشرکوں کا تلبیہ

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ الْمُشْرِکُوْنَ یَقُوْلُوْنَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ فَیَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَیْلَکُمْ قَدْ قَدْ اِلَّا شَرِیْکًا هُوَ لَکَ تَمْلِکُہٗ وَمَا مَلَکَ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا وَھُمْ یَطُوْفُوْنَ بِالْبَیْتِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مشرک لوگ جب تلبیہ کہتے اور یہ کلمات ادا کرتے لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ (حاضر ہیں تیری خدمت میں، تیرا کوئی شریک نہیں) تو رسول اللہ ﷺ فرماتے "افسوس ہے تم پر! بس بس (یعنی بس اتنا ہی کہو اس سے زیادہ مت کہو، مگر مشرک کب ماننے والے تھے وہ پھر اس کے بعد یہ کہتے) اِلَّا شَرِیْکًا هُوَ لَکَ تَمْلِکُہٗ وَمَا مَلَکَ یعنی (تیرا کوئی شریک نہیں) ہاں وہ (بت) تیرا شریک ہے جو تیری ملک میں ہے، تو اس کا مالک ہے وہ شریک تیرا مالک نہیں ہے۔ مشرک لوگ (تلبیہ کے) یہ کلمات خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مشرک بھی حج و عمرہ اور طواف وغیرہ کیا کرتے تھے نیز وہ خانہ کعبہ کی تعظیم بھی ہمیشہ کیا کرتے تھے اور اس کا احترام ملحوظ رکھتے مگر جب لبیک کہتے تو اپنے شریک کی وجہ سے اس طرح کہتے لبیک لاشریک لک الا شریکا ھو لک تملکہ و ماملک یعنی وہ حق تعالیٰ سے شرک کی نفی تو کرتے مگر بتوں کا استثناء کرتے اور یہ کہتے کہ وہ بت خدا کے شریک ہیں لیکن اس کے مملوک ہیں اور خدا ان بتوں کا مالک ہے، چنانچہ وہ جب تلبیہ کہنا شروع کرتے اور یہ کہتے لبیک لاشریک لک تو آنحضرت ﷺ فرماتے کہ یہاں تک تو ٹھیک ہے بس تم اتنا ہی کہو کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، اس سے آگے نہ کہو مگر مشرکین کی عقلوں پر تو پردے پڑے ہوئے تھے وہ ہدایت کو کیسے مان لیتے اس لئے وہ آگے کے الفاظ کہنے سے باز نہیں آتے تھے، حالانکہ ان کے یہ کلمات اِلَّا شَرِیْکًا هُوَ لَکَ الخ درحقیقت ان کی انتہائی حماقت اور بیوقوفی ہی کو ظاہر کرتے تھے کہ بتوں کو خدا کی ملکیت بھی بتاتے تھے اور پھر انہیں شریک بھی کہتے تھے حالانکہ اگر انہیں عقل سلیم کی ذرا بھی راہنمائی حاصل ہوتی تو وہ خود یہ سمجھ سکتے تھے کہ بھلا مملوک اپنے مالک کا شریک کیوں کر ہو سکتا ہے؟

بَابُ قِصَّةِ حَجَّةِ الْوَدَاعِ

حجۃ الوداع کے واقعہ کا بیان

"وَدَاع" واؤ کے زبر کے ساتھ کے معنی ہیں "رخصت کرنا" اور حجۃ الوداع اس حج کو کہتے ہیں جو آنحضرت ﷺ نے حج کی فرضیت نازل ہونے کے بعد ۱۰ھ میں کیا! اس حج کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ آنحضرت ﷺ نے اس حج میں احکام شریعت کی تعلیم دی، ان کو رخصت کیا، اس دنیا سے اپنے رخصت ہونے کی انھیں خبردی، اور منصب رسالت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی و انجام دہی اور دینی و تشریعی احکام کو دنیا کے سامنے پہنچادینے اور نافذ کردینے پر ان کو اپنا گواہ بنایا۔

اس باب میں سب سے پہلے حضرت جابرؓ کی جو طویل وبسیط حدیث نقل کی جارہی ہے یہ احادیث میں سب سے جامع حدیث ہے اس حدیث سے ڈیڑھ سو فقہی مسئلے مستنبط ہوتے ہیں اور اگر کوئی زیادہ غور تامل کرے تو اس سے بھی زیادہ مسئلے سامنے آسکتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حجۃ الوداع کی تفصیل حضرت جابرؓ کی زبانی

① عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَثَ بِالْمَدِيْنَةِ تِسْعَ سِنِيْنَ لَمْ يَحُجَّ ثُمَّ اَذَّنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ فِي الْعَاشِرَةِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاجٌّ فَقَدِمَ الْمَدِيْنَةَ بَشَرٌ كَثِيْرٌ فَخَرَجْنَا مَعَهُ حَتّٰى اِذَا اَتَيْنَا ذَالْحُلَيْفَةِ فَوَلَدَتْ اَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ مُحَمَّدَ بْنَ اَبِي بَكْرٍ فَاَرْسَلَتْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ اَصْنَعُ قَالَ اغْتَسِلِيْ وَاسْتَثْفِرِيْ بِثَوْبٍ وَاَحْرِمِيْ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ رَكِبَ الْقَصْوَاءَ حَتّٰى اِذَا اسْتَوَتْ بِهٖ نَاقَتُهٗ عَلَى الْبَيْدَاءِ اَهَلَّ بِالتَّوْحِيْدِ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ قَالَ جَابِرٌ لَسْنَا نَنْوِي اِلَّا الْحَجَّ لَسْنَا نَعْرِفُ الْعُمْرَةَ حَتّٰى اِذَا اَتَيْنَا الْبَيْتَ مَعَهُ اسْتَلَمَ الرُّكْنَ فَطَافَ سَبْعًا فَرَمَلَ ثَلَاثًا وَمَشٰى اَرْبَعًا ثُمَّ تَقَدَّمَ اِلٰى مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ فَقَرَاَ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ فَجَعَلَ الْمَقَامَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْبَيْتِ، وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَرَاَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَقُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ ثُمَّ رَجَعَ اِلَى الرُّكْنِ فَاسْتَلَمَهٗ ثُمَّ خَرَجَ مِنَ الْبَابِ اِلَى الصَّفَا فَلَمَّا دَنَا مِنَ الصَّفَا قَرَاَ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ اَبْدَاُ بِمَا بَدَاَ اللّٰهُ بِهٖ فَبَدَاَ بِالصَّفَا فَرَقِيَ عَلَيْهِ حَتّٰى رَاَى الْبَيْتَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَوَحَّدَ اللّٰهَ وَكَبَّرَهٗ وَقَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ ثُمَّ دَعَا بَيْنَ ذٰلِكَ قَالَ مِثْلَ هٰذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ نَزَلَ وَمَشٰى اِلَى الْمَرْوَةِ حَتَّى انْصَبَّتْ قَدَمَاهُ فِيْ بَطْنِ الْوَادِيْ ثُمَّ سَعٰى حَتّٰى اِذَا صَعِدَتَا مَشٰى حَتّٰى اَتَى الْمَرْوَةَ فَفَعَلَ عَلَى الْمَرْوَةِ كَمَا فَعَلَ عَلَى الصَّفَا حَتّٰى اِذَا كَانَ اٰخِرُ طَوَافٍ عَلَى الْمَرْوَةِ نَادٰى وَهُوَ عَلَى الْمَرْوَةِ وَالنَّاسُ تَحْتَهٗ فَقَالَ لَوْ اَنِّي اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِيْ مَا اسْتَدْبَرْتُ لَمْ اَسُقِ الْهَدْيَ وَجَعَلْتُهَا عُمْرَةً فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ لَيْسَ مَعَهٗ هَدْيٌ فَلْيَحِلَّ وَلْيَجْعَلْهَا عُمْرَةً فَقَامَ سُرَاقَةُ بْنُ مَالِكِ بْنِ جُعْشُمٍ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلِعَامِنَا هٰذَا اَمْ لِاَبَدٍ فَشَبَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصَابِعَهٗ وَاحِدَةً فِي الْاُخْرٰى وَقَالَ دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِي الْحَجِّ مَرَّتَيْنِ لَا بَلْ لِاَبَدِ اَبَدٍ وَقَدِمَ عَلِيٌّ مِنَ الْيَمَنِ بِبُدْنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ مَاذَا قُلْتَ حِيْنَ فَرَضْتَ الْحَجَّ قَالَ قُلْتُ اللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُهِلُّ بِمَا اَهَلَّ بِهٖ رَسُوْلُكَ قَالَ فَاِنَّ مَعِيَ الْهَدْيَ فَلَا تَحِلَّ قَالَ فَكَانَ جَمَاعَةُ الْهَدْيِ الَّذِيْ قَدِمَ بِهٖ عَلِيٌّ مِنَ الْيَمَنِ وَالَّذِيْ اَتٰى بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِائَةً۔

قَالَ فَحَلَّ النَّاسُ كُلُّهُمْ وَ قَصَّرُوْا اِلاَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ كَانَ مَعَهُ هَدْيٌ فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوْا اِلٰى مِنًى فَاَهَلُّوْا بِالْحَجِّ وَرَكِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى بِهَا الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ ثُمَّ مَكَثَ قَلِيْلاً حَتّٰى طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَاَمَرَ بِقُبَّةٍ مِنْ شَعَرٍ تُضْرَبُ لَهُ بِنَمِرَةَ فَسَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلاَ تَشُكُّ قُرَيْشٌ اِلاَّ اَنَّهُ وَاقِفٌ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ كَمَا كَانَتْ قُرَيْشٌ تَصْنَعُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَاَجَازَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَتٰى عَرَفَةَ فَوَجَدَ الْقُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ فَنَزَلَ بِهَا حَتّٰى اِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ اَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ فَاَتٰى بَطْنَ الْوَادِيْ فَخَطَبَ النَّاسَ وَقَالَ اِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَاَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا اَلاَ كُلُّ شَيْءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوْعٌ وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَةٌ وَاِنَّ اَوَّلَ دَمٍ اَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ رَبِيْعَةَ بْنِ الْحَارِثِ وَكَانَ مُسْتَرْضِعًا فِيْ بَنِيْ سَعْدٍ فَقَتَلَهُ هُذَيْلٌ وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ مِنْ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَاِنَّهُ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَاِنَّكُمْ اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَنْ لاَ يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَهُ فَاِنْ فَعَلْنَ ذٰلِكَ فَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَالَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ كِتَابَ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تُسْئَلُوْنَ عَنِّيْ فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ فَقَالَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَابَةِ يَرْفَعُهَا اِلَى السَّمَاءِ وَيَنْكُتُهَا اِلَى النَّاسِ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ اَذَّنَ بِلاَلٌ ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئًا ثُمَّ رَكِبَ حَتّٰى اَتَى الْمَوْقِفَ فَجَعَلَ بَطْنَ نَاقَتِهِ الْقَصْوَاءِ اِلَى الصَّخَرَاتِ وَجَعَلَ حَبْلَ الْمُشَاةِ بَيْنَ يَدَيْهِ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفًا حَتّٰى غَرَبَتِ الشَّمْسُ وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيْلاً حَتّٰى غَابَ الْقُرْصُ وَاَرْدَفَ اُسَامَةَ وَدَفَعَ حَتّٰى اَتَى الْمُزْدَلِفَةَ فَصَلّٰى بِهَا الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ بِاَذَانٍ وَاحِدٍ وَاِقَامَتَيْنِ وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا شَيْئًا ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتّٰى طَلَعَ الْفَجْرُ فَصَلَّى الْفَجْرَ حِيْنَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ بِاَذَانٍ وَاِقَامَةٍ ثُمَّ رَكِبَ الْقَصْوَاءَ حَتّٰى اَتَى الْمَشْعَرَ الْحَرَامَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَدَعَاهُ وَكَبَّرَهُ وَهَلَّلَهُ وَوَحَّدَهُ فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفًا حَتّٰى اَسْفَرَ جِدًّا فَدَفَعَ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَاَرْدَفَ الْفَضْلَ بْنَ عَبَّاسٍ حَتّٰى اَتٰى بَطْنَ مُحَسِّرٍ فَحَرَّكَ قَلِيْلاً ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيْقَ الْوُسْطٰى الَّتِيْ تَخْرُجُ عَلَى الْجَمْرَةِ الْكُبْرٰى حَتّٰى اَتَى الْجَمْرَةَ الَّتِيْ عِنْدَ الشَّجَرَةِ فَرَمَاهَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ مِنْهَا مِثْلَ حَصَى الْخَذْفِ رَمٰى مِنْ بَطْنِ الْوَادِيْ ثُمَّ انْصَرَفَ اِلَى الْمَنْحَرِ فَنَحَرَ ثَلاَثًا وَسِتِّيْنَ بَدَنَةً بِيَدِهِ ثُمَّ اَعْطٰى عَلِيًّا فَنَحَرَ مَا غَبَرَ وَاَشْرَكَهُ فِيْ هَدْيِهِ ثُمَّ اَمَرَ مِنْ كُلِّ بَدَنَةٍ بِبَضْعَةٍ فَجُعِلَتْ فِيْ قِدْرٍ فَطُبِخَتْ فَاَكَلاَ مِنْ لَحْمِهَا وَشَرِبَا مِنْ مَرَقِهَا ثُمَّ رَكِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَفَاضَ اِلَى الْبَيْتِ فَصَلّٰى بِمَكَّةَ الظُّهْرَ فَاَتٰى عَلٰى بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ يَسْقُوْنَ عَلٰى زَمْزَمَ فَقَالَ انْزِعُوْا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَلَوْلاَ اَنْ يَّغْلِبَكُمُ النَّاسُ عَلٰى سِقَايَتِكُمْ لَنَزَعْتُ مَعَكُمْ فَنَاوَلُوْهُ دَلْوًا فَشَرِبَ مِنْهُ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں نو برس اس طرح گزارے کہ حج نہیں کیا البتہ آپ ﷺ نے عمرے کئے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے پھر جب حج کی فرضیت نازل ہوئی تو دسویں سال آپ ﷺ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ رسول اللہ ﷺ حج کا ارادہ رکھتے ہیں جو لوگ حج کے لئے جانا چاہتے ہیں وہ رفاقت کے لئے تیار ہو جائیں اس اعلان کو سن کر مخلوق خدا کی ایک بہت بڑی تعداد مدینہ میں جمع ہوگئی چنانچہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ ماہ ذی قعدہ کے ختم ہونے سے پانچ دن پہلے ظہر و عصر کے درمیان مدینہ سے روانہ ہوگئے جب ہم لوگ ذوالحلیفہ پہنچے تو وہاں اسماء بنت عمیسؓ کے بطن سے محمد بن ابوبکر پیدا ہوئے۔ اسماءؓ نے کسی کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور دریافت کرایا کہ اب میں کیا کروں؟ آیا احرام باندھوں یا نہ باندھوں اور اگر باندھوں تو کس طرح

باندھوں؟ آپ ﷺ نے کہلا بھیجا کہ غسل کر کے کپڑے کا لنگوٹ باندھو اور پھر احرام باندھ لو بہرکیف رسول کریم ﷺ نے مسجد ذوالحلیفہ میں نماز پڑھی اور قصواء پر کہ جو آنحضرت کی اونٹنی کا نام تھا سوار ہوئے یہاں تک کہ جب آپ ﷺ کی اونٹنی آپ ﷺ کو لے کر بیداء کے میدان میں کھڑی ہوئی تو آپ ﷺ نے باواز بلند تلبیہ کے یہ کلمات کہے:

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ حاضر ہوں تیری خدمت میں اے اللہ! تیری خدمت میں حاضر ہوں، حاضر ہوں تیری خدمت میں تیرا کوئی شریک نہیں حاضر ہوں تیری خدمت میں بیشک تعریف اور نعمت تیرے لئے ہے اور بادشاہت بھی تیرے ہی لئے ہے تیرا کوئی شریک نہیں ہے حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم اس سے پہلے حج ہی کی نیت کیا کرتے تھے اور ہم حج کے مہینوں میں عمرہ سے واقف بھی نہیں تھے بہرکیف جب ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ بیت اللہ پہنچے تو حجر اسود پر ہاتھ رکھا اور اس کو بوسہ دیا اور تین بار رمل یعنی تیز رفتار سے اور اکڑ کر خانہ کعبہ کا طواف کیا اور چار مرتبہ اپنی رفتار سے یعنی آہستہ آہستہ چل کر طواف کیا اور طواف کے بعد مقام ابراہیم کی طرف بڑھے اور یہ آیت پڑھی۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى مقام ابراہیم کے اطراف کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ یعنی وہاں نماز پڑھو پھر آنحضرت ﷺ نے مقام ابراہیم اور بیت اللہ کو اپنے درمیان کر کے دو رکعت نماز پڑھی اور ایک روایت کے مطابق ان دو رکعتوں میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اور قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کی قرات کی پھر حجر اسود کی طرف لوٹے اور اس کو بوسہ دیا اس سے فارغ ہو کر مسجد کے دروازہ یعنی باب الصفا سے نکلے اور صفا پہاڑ کی طرف چلے چنانچہ جب صفا کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ کے دین کی نشانیوں میں سے ہیں اور فرمایا میں بھی اسی چیز کے ساتھ ابتداء کرتا ہوں۔ "یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پہلے صفا کا ذکر کیا ہے پھر مروہ کا اسی طرح میں بھی پہلے صفا پر چڑھتا ہوں پھر مروہ پر چڑھوں گا، چنانچہ آپ ﷺ نے سعی کی ابتداء صفا سے کی اور اس پر چڑھے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے جب صفا سے بیت اللہ کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی بڑائی بیان کی یعنی لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہا، اور یہ کلمات فرمائے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے تعریف ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا و تنہا ہے اس نے اسلام کا بول بالا کرنے کا اپنا وعدہ پورا کیا اس نے اپنے بندوں کی مدد کی اور کفار کے لشکر کو تنہا شکست دی یعنی غزوہ خندق۔ پھر اس کے درمیان دعا کی اور تین مرتبہ اسی طرح کہا (یعنی پہلے یہ کلمات کہے اور پھر دعا کی اور اسی طرح تین مرتبہ کہا)، اس کے بعد صفا سے اترے اور مروہ پہاڑ کی طرف چلے یہاں تک کہ جب آپ ﷺ کے قدم مبارک میدان کے نشیب میں پہنچے (یعنی میدان کی بلندی سے نشیبی حصہ میں آئے) تو دوڑے یعنی سعی کی اور جب آپ ﷺ کے دونوں قدم چڑھنے لگے (یعنی نشیب سے مروہ کی بلندی پر چڑھنے لگے) تو (دوڑنا موقوف کر کے) آہستہ آہستہ چلنے لگے اور پھر جب مروہ پر پہنچ گئے تو وہی کیا جو صفا پر کیا تھا یہاں تک کہ جب آپ ﷺ نے مروہ پر سعی کا اختتام کیا تو لوگوں کو آواز دی درآنحالیکہ آپ ﷺ مروہ کے اوپر تھے۔ اور لوگ اس کے نیچے اور فرمایا اگر اپنے بارہ میں مجھے پہلے سے وہ بات معلوم ہوتی جو بعد کو معلوم ہوئی ہے تو ہدی قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا اور اپنے حج کو عمرہ کر دیتا لہٰذا تم میں سے جو شخص ہدی اپنے ساتھ نہ لایا ہو وہ حلال ہو جائے یعنی حج کا احرام کھول دے اور حج کو عمرہ بنا لے یہ سن کر حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمارے واسطے یہ حکم اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے؟ آنحضرت ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر فرمایا عمرہ حج میں داخل ہو گیا ہے آپ ﷺ نے یہ بات دو مرتبہ کہی اور پھر فرمایا نہیں یہ حکم خاص طور پر اسی سال کے لئے نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ جائز ہے اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو یمن کے حاکم مقرر ہو گئے تھے جب آنحضرت ﷺ کے لئے قربانی کے واسطے یمن سے اونٹ لے کر آئے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ جب تم نے اپنے اوپر حج لازم کیا تھا تو اس وقت یعنی احرام

باندھنے کے وقت کیا کہا تھا؟ تو نے کس چیز کے لئے احرام باندھا تھا اور کیا نیت کی تھی؟ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں نے اس طرح کہا تھا کہ۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اُھِلُّ بِمَا اَھَلَّ بِہٖ رَسُوْلُكَ یعنی اے اللہ! میں اس چیز کا احرام باندھتا ہوں جس چیز کا احرام تیرے رسول ﷺ نے باندھا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میرے ساتھ تو قربانی کا جانور ہے اور میں عمرے کا احرام باندھے ہوئے ہوں، اس لئے جب تک عمرہ اور حج دونوں سے فارغ نہ ہو جاؤ اس وقت تک احرام سے نہیں نکل سکتا اور چونکہ تم نے وہی نیت کی ہے جو میں نے کی ہے، تو تم بھی احرام نہ کھولو حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ وہ اونٹ جو آنحضرت ﷺ کے لئے قربانی کے واسطے حضرت علیؓ یمن سے لے کر آئے تھے اور وہ اونٹ جو آنحضرت ﷺ خود اپنے ہمراہ لائے تھے، سب کی مجموعی تعداد سو تھی! حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق، سب لوگوں نے کہ جن کے ساتھ قربانی کا جانور نہیں تھا عمرہ کر کے، احرام کھول دیا، اپنے سروں کے بال کٹوا دیئے، مگر آنحضرت ﷺ اور وہ لوگ جن کے ساتھ قربانی کے جانور تھے احرام کی حالت میں رہے پھر جب ترویہ کا دن آیا یعنی ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ آئی تو سب لوگ منی کی طرف روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے چنانچہ ان صحابہؓ نے کہ جو عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد احرام سے نکل آئے تھے حج کا احرام باندھا اور آنحضرت ﷺ بھی آفتاب طلوع ہونے کے بعد سوار ہوئے اور منی پہنچ گئے منی کی مسجد خیف میں ظہر و عصر، مغرب و عشاء اور فجر کی نمازیں پڑھی گئیں اور نویں تاریخ کی فجر کی نماز پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر قیام کیا یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا اور آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ آپ ﷺ کے لئے وادی نمرہ عرفات میں خیمہ نصب کیا جائے جو بالوں کا بنا ہوا تھا پھر رسول کریم ﷺ منی سے عرفات کو روانہ ہوئے، قریش کو گمان تھا کہ آنحضرت مشعر حرام مزدلفہ میں قیام کریں گے جیسا کہ قریش زمانہ جاہلیت میں حج کے موقعہ پر کیا کرتے تھے مگر رسول کریم ﷺ مزدلفہ سے آگے بڑھ گئے یہاں تک کہ جو میدان عرفات میں آئے، اور وادی نمرہ میں اپنے خیمہ کھڑا پایا چنانچہ آپ ﷺ اس میں آگرے اور قیام کیا یہاں تک کہ جب دوپہر ڈھل گیا تو قصواء کو جو آپ ﷺ کی اونٹنی کا نام تھا، لانے کا حکم دیا جب قصواء آگئی تو اس پر پالان کس دیا گیا اور آپ ﷺ اس پر سوار ہو کر وادی نمرہ میں تشریف لائے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔ "لوگو!" تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے اس دن عرفہ میں تمہارے اس مہینہ ذی الحجہ میں اور تمہارے اس شہر (مکہ) میں حرام ہیں یعنی جس طرح تم عرفہ کے دن ذی الحجہ کے مہینہ میں اور مکہ مکرمہ میں قتل وغارتگری اور لوٹ مار کو حرام سمجھتے ہو اسی طرح ہمیشہ کے لئے اور ہر جگہ ایک مسلمان کی جان و مال دوسرے مسلمان پر حرام ہے لہٰذا تم میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ کسی کا خون نہ کرے کسی کا مال چوری و دغابازی سے نہ کھا جائے اور کسی کو کسی جانی اور مالی تکلیف و مصیبت میں مبتلا نہ کرے، یاد رکھو! زمانہ جاہلیت کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے ہے اور پامال و بے قدر یعنی موقوف باطل ہے لہٰذا اسلام سے پہلے جس نے جو کچھ کیا میں نے وہ سب معاف کیا اور زمانۂ جاہلیت کے تمام رسم و رواج کو موقوف و ختم کر دیا زمانہ جاہلیت کے خون معاف کر دیئے گئے ہیں لہٰذا زمانہ جاہلیت میں اگر کسی نے کسی کا خون کر دیا تھا تو اب نہ اس کا قصاص ہے نہ دیت اور نہ کفارہ بلکہ اس کی معافی کا اعلان ہے اور سب سے پہلا خون جسے میں اپنے خونوں سے معاف کرتا ہوں ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون ہے۔ جو ایک شیر خوار بچہ تھا۔ اور قبیلہ بنی سعد میں دودھ پیتا تھا۔ اور ہذیل نے اس کو مار ڈالا تھا۔ زمانہ جاہلیت کا سود معاف کر دیا گیا ہے اور سب سے پہلا سود جسے میں اپنے سودوں سے معاف کرتا ہوں عباسؓ ابن عبدالمطلب کا سود ہے لہٰذا وہ زمانہ جاہلیت کا سود ہے لہٰذا وہ زمانہ جاہلیت کا سود بالکل معاف کر دیا گیا ہے۔ (لوگو!) عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، تم نے ان کو خدا کی امان کے ساتھ لیا ہے یعنی ان کے حقوق کی ادائیگی اور ان کو عزت و احترام کے ساتھ رکھنے کا جو عہد خدا نے تم سے لیا ہے یا اس کا عہد جو تم نے خدا سے کیا ہے اسی کے مطابق عورتیں تمہارے پاس آئی ہیں، اور ان کی شرم گاہوں کو خدا کے حکم سے (یعنی فانکحوا کے مطابق رشتہ زن و شو قائم کر کے) اپنے لئے حلال بنایا ہے اور عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کا آنا تم کو ناگوار گذرے یعنی وہ تمہارے گھروں میں کسی کو بھی تمہاری اجازت کو بغیر نہ آنے دیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت، پس اگر وہ اس معاملہ میں نافرمانی کریں کہ تمہاری اجازت کے بغیر کسی کو گھر آنے

دیں اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد بھی وہ اس سے باز نہ آئیں تو تم اسکو مارو مگر اس طرح نہ مارو جس سے سختی وشدت ظاہر ہو اور انھیں کوئی گزند پہنچ جائے اور تم پر ان کا حق یہ ہے کہ تم ان کو اپنی استطاعت و حیثیت کے مطابق کھانے پینے کا سامان اور مکان اور کپڑا دو۔ لوگو! میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑتا ہوں جس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رہو گے تو میرے بعد (یا اس کو مضبوطی سے تھامے رہنے اور اس پر عمل کرنے کے بعد) تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے اور وہ چیز کتاب اللہ ہے اور اے لوگو! میرے بارہ میں تم سے پوچھا جائے گا کہ میں نے منصب رسالت کے فرائض پوری طرح انجام دیئے یا نہیں؟ اور میں نے دین کے احکام تم تک پہنچادیئے یا نہیں؟ تو تم کیا جواب دو گے؟ اس موقع پر صحابہؓ نے (بیک زبان کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ) کے سامنے اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپ ﷺ نے دین کو ہم تک پہنچادیا اپنے فرض کو ادا کر دیا اور ہماری خیر خواہی کی اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا باں طور کہ اسے آسمان کی طرف اٹھایا اور پھر لوگوں کی طرف جھکا کر تین مرتبہ یہ کہا کہ اے اللہ! اپنے بندوں کے اس اقرار اور اعتراف پر تو گواہ رہ اے اللہ! تو گواہ رہ۔

اس کے بعد حضرت بلالؓ نے اذان دی اور اقامت کہی اور ظہر کی نماز پڑھی گئی پھر دوبارہ اقامت کہی گئی اور عصر کی نماز ہوئی، اور ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی چیز یعنی سُنّت و نفل نہیں پڑھی گئی پھر آنحضرت ﷺ سوار ہوئے اور میدان عرفات میں ٹھہرنے کی جگہ پہنچے وہاں اپنی اونٹنی قصواء کا پیٹ پتھروں کی طرف کیا اور جبل مشاۃ یہ ایک جگہ کا نام ہے اپنے آگے رکھا پھر قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا، زردی بھی تھوڑی سی جاتی رہی اور آفتاب کی ٹکیہ غائب ہو گئی، آپ ﷺ نے حضرت اسامہؓ کو اپنے پیچھے بٹھایا اور تیز تیز چل کر مزدلفہ آگئے یہاں ایک اذان اور دو تکبیروں کے ساتھ مغرب و عشاء کی نمازیں پڑھیں اور ان دونوں نمازوں کے درمیان اور کچھ نہیں پڑھا پھر آپ ﷺ لیٹ گئے یہاں تک کہ جب فجر طلوع ہو گئی تو آپ ﷺ نے صبح کی روشنی پھیل جانے پر اذان واقامت کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی پھر آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر مشعر حرام میں آئے اور وہاں قبلہ رو ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی "تکبیر کہی"۔ لا الٰہ الا اللہ پڑھا اور خدا کی وحدانیت کی یعنی لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ آخر تک پڑھا وہیں کھڑے تکبیر و تہلیل وغیرہ میں مصروف رہے یہاں تک کہ صبح خوب روشن ہو گئی تو سورج نکلنے سے پہلے وہاں سے چلے اور حضرت فضل بن عباسؓ کو اپنے پیچھے سوار کیا جب وادی محسر میں پہنچے تو اپنی سواری کو تیز چلانے کے لئے تھوڑی سی حرکت دی اور اس درمیانی راہ پر ہو لئے جو جمرہ کبریٰ کے اوپر نکلتی ہے تاآنکہ آپ اس جمرہ کے پاس پہنچے جو درخت کے قریب ہے اور اس پر سات کنکریاں ماریں اس طرح کہ ان میں سے ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے اور وہ کنکریاں باقلہ کے دانہ کے برابر تھیں اور آپ ﷺ نے وہ کنکریاں نالے یعنی وادی کے درمیان سے ماریں اس کے بعد قربانی کرنے کی جگہ جو منیٰ میں ہے واپس آئے اور یہاں آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ ذبح کئے اور باقی اونٹ حضرت علیؓ کے سپرد کئے چنانچہ باقی سینتیس اونٹ حضرت علیؓ نے ذبح کئے، آنحضرت ﷺ نے اپنی قربانی کے جانوروں میں حضرت علیؓ کو بھی شریک کر لیا تھا پھر آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ ہر اونٹ میں سے گوشت کا ایک ٹکڑا لے لیا جائے چنانچہ وہ سب گوشت لے کر ایک ہانڈی میں ڈال دیا گیا اور اسے پکایا گیا جب گوشت پک گیا تو آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ نے قربانی کے اس گوشت میں سے کھایا اور اس کا شوربہ پیا۔ آنحضرت ﷺ سوار ہوئے اور خانہ کعبہ کی طرف روانہ ہو گئے، وہاں پہنچ کر طواف کیا اور مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی پھر عبد المطلب کی اولاد یعنی اپنے چچا حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کے پاس تشریف لائے جو زمزم کا پانی پلا رہے تھے آپ ﷺ نے ان سے فرمایا عبد المطلب کی اولاد زمزم کا پانی کھینچو اور پلاؤ کہ یہ بہت ثواب کا کام ہے اگر مجھے اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ لوگ تمہارے پانی پلانے پر غلبہ پالیں گے تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی کھینچتا ابھی اس بات کا خوف ہے کہ لوگ مجھے پانی کھینچتا دیکھ کر میری اتباع میں خود بھی پانی کھینچنے لگیں گے اور یہاں بہت زیادہ جمع ہو جائیں گے جس کی وجہ سے زمزم کا پانی کھینچنے اور پلانے کی یہ سعادت تمہارے ہاتھ سے چلی جائے گی اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا تو میں خود بھی تم لوگوں کے ساتھ پانی کھینچتا اور لوگوں کو پلاتا، چنانچہ عبد المطلب کی اولاد نے آپ ﷺ کو پانی کا ایک ڈول دیا جس میں سے آپ ﷺ نے پانی پیا۔" (مسلم)

تشریح: حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ کتنے آدمی تھے؟ اس بارہ میں مختلف اقوال ہیں چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس حج میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نوے ہزار آدمی تھے، بعض حضرات نے ایک لاکھ تیس ہزار اور بعضوں نے اس سے بھی زائد تعداد بیان کی ہے۔

حضرت اسماء بنت عمیس پہلے حضرت جعفر ابن ابوطالب کے نکاح میں تھیں ان کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کے نکاح میں آئیں۔ حضرت ابوبکر کے انتقال کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان سے نکاح کیا۔ چنانچہ جب آنحضرت ﷺ حجۃ الوداع کے لئے روانہ ہوئے ہیں تو اس وقت یہ حضرت ابوبکر صدیق کے نکاح میں تھیں اور ان سے محمد ابن ابوبکر پیدا ہوئے۔

آنحضرت ﷺ کی طرف سے حضرت اسماء کو غسل کرنے کی ہدایت اس بات کی دلیل ہے کہ نفاس والی عورت کو احرام کے لئے غسل کرنا مسنون ہے اور یہ غسل نظافت یعنی ستھرائی کے لئے ہوتا ہے طہارت یعنی پاکی کے لئے نہیں، اسی لئے نفاس والی عورت کو تیمم کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے اور یہی حکم حائضہ کا بھی ہے نیز ان کو آپ ﷺ کے اس حکم کہ "اور پھر احرام باندھ لو یعنی احرام کی نیت کرو اور لبیک کہو" سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نفاس والی عورت کا احرام صحیح ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

"رسول کریم ﷺ نے مسجد ذوالحلیفہ میں نماز پڑھی" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے احرام کی سنت دو رکعت نماز پڑھی، اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر میقات میں مسجد ہو تو مسجد ہی میں یہ دو رکعتیں پڑھنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص مسجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ پڑھ لے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، نیز اوقات مکروہہ میں یہ نماز نہ پڑھی جائے، علماء یہ بھی لکھتے ہیں کہ تحیۃ المسجد کی طرح فرض نماز بھی اس نماز کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔

لسنا نعرف العمرۃ (اور ہم عمرہ سے واقف نہیں تھے) یہ جملہ دراصل پہلے جملہ لسنا ننوی الا الحج (ہم حج ہی کی نیت کیا کرتے تھے) کی تاکید کے طور پر استعمال کیا گیا ان جملوں کی وضاحت یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں یہ معمول تھا کہ لوگ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو بڑا گناہ سمجھتے تھے، چنانچہ اس وقت آنحضرت ﷺ نے اس کا رد کیا اور حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کا حکم فرمایا اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

جب ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ بیت اللہ پہنچے یعنی پہلے ہم ذی طوی میں اترے اور رات کو وہیں قیام کیا اور پھر ۴ ذی الحجہ کو نہا دھو کر ثنیہ علیا کی طرف سے یعنی جانب بلند سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور پھر باب السلام کی جانب سے مسجد حرام میں آئے اور وہاں آکر تحیۃ المسجد کی نماز نہیں پڑھی کیونکہ بیت اللہ کا طواف ہی وہاں کا تحیہ ہے۔

"تین بار رمل کیا اور چار مرتبہ اپنی رفتار سے طواف کیا" اس بارہ میں یہ تفصیل جان لینی چاہئے کہ خانہ کعبہ کے گرد مطاف پر سات چکر کرنے کو طواف کہتے ہیں۔ کل طواف کے سات چکر ہوتے ہیں اور ہر چکر حجر اسود سے شروع ہو کر حجر اسود ہی پر ختم ہوتا ہے ہر چکر کو اصطلاح شریعت میں "شوط" کہا جاتا ہے۔

طواف کے سات چکروں میں سے پہلے تین چکر میں تو رمل کرنا چاہئے اور پہلوانوں کی طرح کندھے ہلا ہلا کر، اکڑ کر اور کچھ تیزی کے ساتھ قریب قریب قدم رکھ کر چلنا "رمل" کہلاتا ہے، طواف کے باقی چار چکروں میں آہستہ آہستہ یعنی اپنی معمولی چال کے ساتھ چلنا چاہئے۔

"رمل" یعنی اکڑ کر تیز تیز چلنے کی وجہ یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ عمرۃ القضاء کے لئے مکہ تشریف لائے تو مشرکین نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ تپ یثرب یعنی مدینہ کے بخار نے ان کو بہت ضعیف و سست کر دیا ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس طرح چل کر اپنی قوت و چستی کا اظہار کرو۔ وہ وقت تو گذر گیا مگر اس علت اور وجہ کے دور ہو جانے کے بعد بھی یہ حکم باقی رہا چنانچہ یہ طریقہ اب تک جاری ہے۔

اس حدیث میں "اضطباع" کا ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن طواف کے وقت اضطباع بھی مسنون ہے چنانچہ دوسری احادیث میں اس کا

ذکر موجود ہے۔
چادر کو اس طرح اوڑھنا کہ ان کا ایک سرا داہنے کاندھے سے اتار کر اور داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کاندھے پر ڈال لیا جائے "اضطباع" کہلاتا ہے۔ چادر کو اس طرح اوڑھنے کا حکم بھی اظہار قوت کے لئے دیا گیا تھا اور یہ حکم بھی بعد میں باقی رہا۔
"مقام ابراہیم" کے معنی ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے رہنے کی جگہ ویسے یہ ایک پتھر کا نام ہے جس پر کھڑے ہو کہ حضرت ابراہیم کعبہ کی تعمیر کرتے تھے، اس پتھر پر حضرت ابراہیم کے پاؤں کے نشان بن گئے تھے جو آج تک قائم ہیں۔
بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ مقام ابراہیم ایک پتھر ہے کہ جب حضرت ابراہیم اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو دیکھنے مکہ آتے تھے تو اونٹ سے اسی پتھر پر اترتے تھے اور جب جانے لگتے تو اسی پتھر پر کھڑے ہو کر سوار ہوتے اس پتھر پر ان کے دونوں مبارک قدموں کا نشان بن گیا ہے! بہر کیف یہ پتھر اب خانہ کعبہ کے آگے ایک حجرے میں رکھا ہوا ہے، آنحضرت ﷺ نے طواف سے فارغ ہو کر اسی مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی یہ دو رکعت نماز اگرچہ اسی جگہ کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے لیکن جائز حرم میں ہر جگہ پڑھنا ہے چاہے مسجد حرام میں پڑھی جائے اور چاہے مسجد حرام سے باہر نیز ہر طواف کے بعد یہ نماز حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے ہاں سُنّت ہے۔
ان دو رکعتوں میں قل ہو اللہ احد اور قل یا ایہا الکافرون کی قرأت کی اس عبارت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قل ہو اللہ احد پہلی رکعت میں پڑھی اور قل یا ایہا الکافرون دوسری رکعت میں جب کہ اس طرح سورہ مقدم پر سورہ متاخر کی تقدیم یعنی بعد کی سورت کو پہلے اور پہلے کی سورت کو بعد میں پڑھنے کی صورت لازم آتی ہے، اس لئے علماء نے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ حدیث میں اس بارہ میں جو عبارت نقل کی گئی ہے اس میں حرف واؤ صرف اظہار جمع کے لئے یعنی آپ کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں رکعتوں میں یہ دونوں سورتیں پڑھیں، اب یہ کہ ان میں سے کون سی پہلی رکعت میں پڑھی اور کون سی سورت دوسری رکعت میں؟ اس کی وضاحت نہ اس سے مقصود ہے اور نہ یہاں اس کی وضاحت موجود ہی ہے اس توجیہ کے پیش نظر کوئی اشکال پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر طیبیؒ نے اس عبارت میں ان دونوں سورتوں کے ذکر کی مذکورہ ترتیب کے بارہ میں یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ قل ہو اللہ احد، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اثبات و اظہار کے لئے ہے اور قل یا ایہا الکافرون شرک سے بیزاری کے واسطے ہے، اس لئے توحید کی عظمت شان اور اس کی سب سے زیادہ اہمیت کی بناء پر اس سورت کو پہلے ذکر کیا جس سے توحید کا اثبات ہوتا ہے۔
ان تمام باتوں کے علاوہ بعض روایتوں میں اس عبارت کو اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ اس میں پہلے قل یا ایہا الکفرون ذکر ہے اور بعد میں قل ہو اللہ احد کا اس صورت میں بات بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے۔
آپ ﷺ نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی سات بار کی، بایں طور کہ صفا سے مروہ تک ایک بار، مروہ سے صفا تک دوسری بار، اسی طرح آپ ﷺ نے سات پھیرے کئے اس طرح سعی کی ابتداء تو صفا سے ہوئی اور ختم مروہ پر ہوئی جیسا کہ حدیث کے الفاظ یہاں تک کہ جب آپ ﷺ نے مروہ پر سعی کا اختتام کیا سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔
سعی یعنی صفا مروہ کے درمیان پھیرے کرنا واجب ہے اس کی اصل یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جن دنوں چھوٹے تھے تو ان کی والدہ حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش کو گئیں جب نشیب میں پہنچیں تو حضرت اسمٰعیل ان کی نظر سے پوشیدہ ہو گئے وہ صفا اور مروہ پر چڑھ کر ان کو دیکھنے کے لئے ان دونوں کے درمیان پھیرے کرتی تھیں، چنانچہ یہ سعی انھیں کی سُنّت ہے جسے آنحضرت نے پورا کیا اب صفا و مروہ کے درمیان چونکہ مٹی بھر گئی ہے اس لئے وہ نشیب باقی نہیں رہا ہے البتہ وہاں نشان بنا دیئے گئے ہیں اور حضرت ہاجرہ کی سنت کو پورا کرنے کے لئے وہاں دوڑتے ہیں۔

لَوْ اَنِّی اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ الخ اگر اپنے بارہ میں مجھے پہلے سے وہ بات معلوم ہوتی الخ اس سلسلہ میں اگرچہ بڑی طویل بحث ہے تاہم خلاصہ کے طور پر سمجھ لیجئے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ پہنچے اور عمرہ سے فارغ ہوگئے تو صحابہؓ کو حکم دیا کہ جو شخص قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہیں لایا ہے وہ عمرہ کے بعد احرام سے باہر آجائے اور حج کو عمرہ کے ساتھ فسخ کر دے یعنی حج کے احرام کو عمرہ کا احرام قرار دے لے جب حج کے دن آجائیں تو دوبارہ احرام باندھے اور حج کرے، اور جو شخص قربانی کا جانور اپنے ساتھ لایا ہے وہ عمرہ کے بعد احرام نہ کھولے بلکہ حج تک حالت احرام ہی میں رہے اور حج کے بعد احرام کھول دے۔ چونکہ رسول کریم ﷺ قربانی کا جانور اپنے ساتھ لائے تھے اس لئے آپ ﷺ نے احرام نہیں کھولا بلکہ عمرہ کے بعد بھی حالت احرام ہی میں رہے۔ یہ حکم صحابہؓ کو بڑا گراں گزرا، ایک تو اس لئے ہم تو احرام کھول دیں اور سرکار دوعالم ﷺ حالت احرام میں رہیں اس طرح آپ ﷺ کی متابعت کا ترک ہوگا جو صحابہؓ کو کسی حال میں بھی گوارا نہیں تھا، دوسرے انہوں نے یہ سوچا کہ اب عرفہ میں صرف پانچ رہ گئے ہیں اس لئے یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ احرام کھول دیا جائے اور پھر ہم اس عرصہ میں اپنی عورتوں کے پاس جاتے رہیں اور جب عرفہ کا دن آئے تو فوراً احرام باندھ کر عرفات روانہ ہو جائیں اور حج کریں۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ درمیانی پانچ دن بھی احرام ہی کی حالت میں گزر جائیں اس طرح رسول کریم ﷺ کی متابعت بھی ہوگی اور ان ایام میں طبعی خواہشات اور دنیاوی امور میں مشغولیت سے اجتناب بھی رہے گا۔ پھر یہ کہ ایام جاہلیت میں چونکہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو برا سمجھا جاتا تھا، اور ان کے ذہن میں بھی ابھی تک یہی بات تھی اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت مستقل طور پر عمرہ کی صورت پیدا ہو جائے انہیں سب وجوہ کی بناء پر وہ چاہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ ہمیں احرام کھولنے کا حکم نہ دیں، اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے برہمی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یہ تو دین کی بات ہے میں کیا کروں، اللہ تعالیٰ نے جس طرح حکم دیا ہے اسی طرح کرنا پڑے گا، چاہے طبیعت پر بار ہی کیوں نہ ہو "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میری متابعت کے ترک کی بناء پر تم لوگوں کو احرام کھولنا گراں گزرے گا تو میں بھی قربانی کا جانور ساتھ نہ لاتا اور احرام کھول کر اس وقت حج کو عمرہ کے ساتھ فسخ کر دیتا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ حکم الٰہی یہ ہوگا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ عمرہ کے ساتھ اس فسخ حج کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا یہ اس سال میں صرف صحابہؓ ہی کے لئے تھا یا ہمیشہ کے لئے دوسروں کو بھی ایسا جائز ہے؟ چنانچہ امام احمدؒ اور اہل ظاہر کی ایک جماعت نے تو یہ کہا ہے کہ یہ فسخ حج صرف صحابہؓ ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ یہ حکم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی ہے، لہٰذا اس شخص کے لئے کہ جو حج کا احرام باندھے، اور ہدی اس کے ساتھ نہ ہو یہ جائز ہے کہ وہ حج کا احرام عمرہ کے ساتھ فسخ کر دے اور افعال عمرہ کی ادائیگی کے بعد حلال ہو جائے یعنی احرام کھول دے، جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ، اور علماء سلف و خلف کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ یہ حکم صرف اسی سال میں صحابہؓ کے لئے تھا کہ زمانہ جاہلیت میں حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو جو حرام سمجھا جاتا تھا اس کی تردید ہو جائے۔

نیز اسی حدیث کے پیش نظر حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ بھی ہے کہ جو شخص عمرہ کا احرام باندھے اور ہدی اپنے ساتھ نہ لایا تو افعال عمرہ کی ادائیگی کے بعد احرام سے باہر آجائے اور اگر ہدی ساتھ لایا ہو تو احرام سے باہر نہ ہوتا آنکہ "نحر" (قربانی) کے دن اس کی ہدی ذبح ہو جائے، لیکن حضرت امام شافعیؒ، اور حضرت امام مالکؒ یہ کہتے ہیں کہ محض افعال عمرہ کی ادائیگی کے بعد احرام سے باہر آجانا جائز ہے خواہ ہدی ساتھ لایا ہو یا ساتھ نہ ہو۔

"مشعر حرام" مزدلفہ میں ایک پہاڑی کا نام ہے۔ ایام جاہلیت میں قریش کا یہ طریقہ تھا کہ وہ حج کے لئے بجائے عرفات میں ٹھہرنے کے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ یہ "موقف حمس" یعنی قریش اور حرم والوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ قریش کے علاوہ تمام اہل عرب عرفات ہی میں وقوف کرتے تھے، آنحضرت ﷺ چونکہ قریش سے تھے اس لئے اہل قریش نے یہ گمان کیا کہ آنحضرت ﷺ بھی عرفات کی بجائے مزدلفہ ہی میں وقوف کریں گے لیکن آنحضرت ﷺ نے وہاں وقوف نہیں کیا بلکہ سیدھے عرفات

پہنچے اور وادئ نمرہ میں خطبہ ارشاد فرمایا، آپ ﷺ نے دو خطبے پڑھے، پہلے خطبہ میں تو حج کے احکام بیان کئے اور عرفات میں کثرت ذکر و دعا پر ترغیب دلائی، دوسرا خطبہ پہلے خطبہ کی بہ نسبت چھوٹا تھا اس میں صرف دعا تھی۔

ربیعہ ابن حارث کے بیٹے کے خون کا قصہ یہ ہے کہ حارث آنحضرت ﷺ کے چچا اور عبدالمطلب کے بیٹے تھے ان کا لڑکا تھا ربیعہ، اور ربیعہ، کا ایک شیر خوار بچہ تھا جس کا نام تھا ایاس عرب کے عام قاعدہ کے مطابق ایاس کو دودھ پلانے کے لئے قبیلہ بنی سعد میں دے دیا گیا تھا جن دنوں قبیلہ بنی سعد اور قبیلہ ہذیل کے درمیان معرکہ آرائی ہو رہی تھی ایاس قبیلہ بنی سعد ہی میں تھا، اسی لڑائی کے دوران قبیلہ ہذیل کے کسی شخص نے ایاس کو پتھر مارا جس سے وہ شیر خوار بچہ مرگیا ایاس چونکہ آنحضرت ﷺ کے چچا کا پوتا تھا اس لئے اس کے قتل کا انتقام لینے کا حق آنحضرت ﷺ کو حاصل تھا مگر آنحضرت ﷺ نے اس کا خون معاف کر دیا۔

اس طرح حضرت عباس ابن عبدالمطلبؓ جو آنحضرت ﷺ کے عم محترم تھے، ایام جاہلیت میں سود کا لین دین کرتے تھے اسی وقت کا ان کا بہت زیادہ سود لوگوں کے ذمہ باقی تھا اسے بھی آنحضرت ﷺ نے معاف فرما دیا۔

"پھر (دوبارہ) اقامت کہی گئی اور عصر کی نماز ہوئی"۔ یعنی ظہر ہی کے وقت پہلے تو ظہر کی نماز پڑھی گئی، پھر عصر کی نماز ہوئی، گویا ظہر و عصر کی نماز کو جمع کر کے پڑھا گیا۔ اس کو جمع تقدیم کہتے ہیں عرفات میں وقوف کے لئے یہ دونوں نمازیں ملا کر ظہر کے وقت پڑھی جاتی ہیں اس طرح کہ ظہر کے چار فرض کے بعد موذن دوسری اقامت کہتا ہے اور پھر عصر کی نماز ہوتی ہے نیز ان دونوں نمازوں کے درمیان سنن و نوافل وغیرہ نہیں پڑھی جاتیں تاکہ دونوں نمازوں کے درمیان وقفہ ہو جانے کی وجہ سے جمع باطل نہ ہو جائے کیونکہ ان نمازوں کو پے در پے پڑھنا واجب ہے۔

اور تیز تیز چل کر مزدلفہ آ گئے۔ مزدلفہ منی اور عرفات کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے، دسویں تاریخ کی رات پھر مزدلفہ میں ٹھہرنا حنفیہ کے نزدیک سنت ہے اور حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے ہاں واجب ہے۔

حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مزدلفہ پہنچ کر مغرب و عشاء کی نمازیں ایک اذان اور دو تکبیر کے ساتھ پڑھیں جس طرح کہ آپ ﷺ نے عرفات میں ظہر و عصر کی نماز ایک اذان اور دو تکبیر کے ساتھ پڑھی تھی چنانچہ حضرت امام شافعیؒ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں مزدلفہ میں یہ دونوں نمازیں ایک اذان اور ایک ہی تکبیر کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں کیونکہ اس موقع پر عشاء کی نماز چونکہ اپنے وقت میں پڑھی جاتی ہے اس لئے زیادتی اعلام کے لئے علیحدہ سے تکبیر کی ضرورت نہیں برخلاف عرفات میں عصر کی نماز کے کہ وہاں عصر کی نماز چونکہ اپنے وقت میں نہیں ہوتی بلکہ ظہر کے وقت ہوتی ہے اس لئے وہاں زیادتی اعلام کے لئے علیحدہ تکبیر کی ضرورت ہے، صحیح مسلم میں حضرت ابن عمرؓ سے یہی روایت منقول ہے اور ترمذیؒ نے بھی اس کی تحسین و تصحیح کی ہے۔

"مشعر حرام" جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے عرفات میں ایک پہاڑ کا نام ہے، دسویں تاریخ کی صبح وہاں وقوف حنفیہ کے نزدیک واجب ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک رکن حج ہے۔

"وادی محسر" مزدلفہ اور منی کے درمیان ایک گھاٹی کا نام ہے کہا جاتا ہے کہ اصحاب فیل یہیں عذاب خداوندی میں مبتلا ہو کر ہلاک و برباد ہوئے تھے، رسول ﷺ جب مشعر حرام مزدلفہ سے روانہ ہوئے اور اس وادی میں پہنچے تو اپنی سواری کو تیز کر دیا اور اس وادی کی مسافت کو تیزی سے گزر کر پورا کیا، کیونکہ آپ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جس جگہ کسی قوم پر عذاب نازل ہوا ہوتا تو آپ ﷺ ازراہ عبرت اس جگہ سے تیزی سے گذر جاتے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حج کے موقعہ پر نصاریٰ یا مشرکین عرب وادی محسر میں ٹھہرا کرتے تھے اس لئے آپ ﷺ نے ان کی مخالفت کے پیش نظر اس وادی میں اپنی سواری کو تیز تیز چلا کر وہاں سے جلد گذر گئے۔ بہر حال آنحضرت ﷺ کی پیروی کے پیش نظر ہر شخص کے لئے مستحب ہے کہ اس وادی میں تیزی سے گزرے۔

اور اس درمیانی راہ پر ہوئے جو جمرہ کبریٰ کے اوپر نکلتی ہے کا مطلب یہ ہے کہ جس راستہ سے جاتے ہوئے آپ ﷺ تشریف لے گئے تھے وہ راستہ اور تھا اور یہ راستہ دوسرا تھا جو جمرہ کبریٰ یعنی جمرہ عقبہ پر جا کر نکلتا ہے۔ پہلا راستہ جس سے آپ ﷺ عرفات و مزدلفہ تشریف لے گئے تھے اس کو طریق ضب کہتے تھے اور یہ راستہ جس سے آپ ﷺ رمی جمرہ کے لئے منیٰ واپس آ رہے تھے۔ طریق مازمین کہلاتا تھا ضب اور مازمین دو پہاڑوں کے نام ہیں۔

تاآنکہ آپ ﷺ اس جمرہ کے پاس پہنچے جو درخت کے قریب ہے یہاں جمرہ سے جمرہ عقبہ مراد ہے جس کا پہلے ذکر ہوا، جمرہ منار کو کہتے ہیں منیٰ میں کئی ایسے منار ہیں جن پر سنگریزے مارے جاتے ہیں اس کا تفصیلی بیان انشاء اللہ آگے آئے گا۔

آنحضرت نے اپنی قربانی کے جانوروں میں حضرت علیؓ کو بھی شریک کر لیا تھا۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو کچھ اونٹ دے دیئے تاکہ وہ اپنی طرف سے ذبح کر لے اب یا تو آپ ﷺ نے انہیں وہ اونٹ اپنے باقی اونٹوں میں سے دیئے یا پھر دوسرے اونٹوں میں سے دیئے گئے ہوں گے آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ نے اپنی قربانی کا گوشت کھایا اور اس کا شوربہ پیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اپنی قربانی میں سے گوشت کھانا مستحب ہے۔

اور خانہ کعبہ کی طرف روانہ ہوگئے وہاں پہنچ کر طواف کیا اس طواف کو طواف افاضہ بھی کہتے ہیں اور طواف رکن بھی یہ طواف حج کا ایک رکن ہے، اس پر حج کا اختتام ہو جاتا ہے۔ ویسے تو یہ طواف قربانی کے دن ہی کرنا افضل ہے لیکن بعد میں کرنا بھی جائز ہے۔

اور مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی یہ بات حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت کے خلاف ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھی ان دونوں روایتوں میں مطابقت یوں پیدا کی جائے کہ آنحضرت ﷺ نے ظہر کی نماز تو مکہ ہی میں پڑھی البتہ آپ ﷺ نے منیٰ میں نفل نماز پڑھی تھی جسے حضرت ابن عمرؓ نے ظہر کی نماز گمان کیا یا یوں کہا جائے کہ جب دونوں روایتیں متعارض ہوئیں تو دونوں ساقط ہوگئیں اب ترجیح اس بات کو دی جائے گی کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی کیونکہ مکہ میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ واللہ اعلم

احرام کے طریقے اور حج کی اقسام

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ فَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِحَجٍّ فَلَمَّا قَدِمْنَا مَكَّةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ وَلَمْ يُهْدِ فَلْيَحْلِلْ وَمَنْ اَحْرَمَ بِعُمْرَةٍ وَاَهْدٰى فَلْيُهِلَّ بِالْحَجِّ مَعَ الْعُمْرَةِ ثُمَّ لَا يَحِلَّ حَتّٰى يَحِلَّ مِنْهُمَا وَفِي رِوَايَةٍ فَلَا يَحِلُّ حَتّٰى يَحِلَّ بِنَحْرِ هَدْيِهٖ وَمَنْ اَهَلَّ بِحَجٍّ فَلْيُتِمَّ حَجَّهٗ قَالَتْ فَحِضْتُ وَلَمْ اَطُفْ بِالْبَيْتِ وَلَا بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ فَلَمْ اَزَلْ حَائِضًا حَتّٰى كَانَ يَوْمُ عَرَفَةَ وَلَمْ اُهْلِلْ اِلَّا بِعُمْرَةٍ فَاَمَرَنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَنْقُضَ رَأْسِي وَاَمْتَشِطَ وَاُهِلَّ بِالْحَجِّ وَاَتْرُكَ الْعُمْرَةَ فَفَعَلْتُ حَتّٰى قَضَيْتُ حَجِّيْ بَعَثَ مَعِي عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ اَبِي بَكْرٍ وَاَمَرَنِي اَنْ اَعْتَمِرَ مَكَانَ عُمْرَتِي مِنَ التَّنْعِيْمِ قَالَتْ فَطَافَ الَّذِيْنَ كَانُوْا اَهَلُّوْا بِالْعُمْرَةِ بِالْبَيْتِ وَبَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ ثُمَّ حَلُّوْا ثُمَّ طَافُوْا طَوَافًا بَعْدَ اَنْ رَجَعُوْا مِنْ مِنًى وَاَمَّا الَّذِيْنَ جَمَعُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَاِنَّمَا طَافُوْا طَوَافًا وَاحِدًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حجۃ الوداع کے موقع پر روانہ ہوئے تو ہم میں سے بعض تو وہ تھے جنہوں نے صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا اور بعض وہ تھے جنہوں نے صرف حج کا (یا حج و عمرہ دونوں کا) احرام باندھا چنانچہ جب ہم مکہ پہنچے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے صرف عمرہ کا احرام باندھا ہے اور اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہیں لایا ہے وہ افعال عمرہ کے بعد اپنے سر کے بال منڈوا کر یا کتروا کر، احرام کھول دے اور جس نے عمرہ کا احرام باندھا ہے اور قربانی کا جانور اپنے ساتھ لایا ہے تو وہ عمرہ کے ساتھ حج کا احرام باندھ لے یعنی حج کو عمرہ کے ساتھ شامل کر کے قارن ہو جائے اور جب تک وہ حج و عمرہ دونوں سے فارغ نہ ہو جائے

احرام نہ کھولے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب تک کہ وہ (بقر عید کے دن) اپنی قربانی کے جانور کے ذبح کرنے سے فارغ نہ ہوئے احرام نہ کھولے اور جس نے حج کا احرام باندھا ہے خواہ وہ قربانی کا جانور اپنے ساتھ لایا ہو یا نہ لایا ہو اور اس نے حج کے ساتھ عمرہ کا بھی احرام باندھا ہو یا نہ باندھا ہو وہ اپنا حج پورا کرے مگر جن لوگوں کو عمرہ کے ساتھ حج فسخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ گذشتہ روایت میں گذرا وہ اپنے حج پورا نہ کریں حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ چونکہ میں حائضہ تھی اس لئے مکہ پہنچ کر نہ تو میں نے (عمرہ کے لئے) طواف کیا اور نہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کی، میں حیض ہی کی حالت میں تھی کہ عرفہ کا دن آگیا اور میں نے چونکہ عمرہ کا احرام باندھا تھا اس لئے رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میں اپنا سر کھول ڈالوں اور بالوں میں کنگھی کرلوں یعنی احرام کھول دوں تاکہ جو چیزیں احرام کی حالت میں ممنوع ہیں وہ مباح ہو جائیں اور پھر حج کا احرام باندھ لوں، نیز یہ کہ عمرہ چھوڑ دوں یعنی حج سے فارغ ہو کر عمرہ کے احرام کی قضا کروں چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، اور جب میں حج ادا کر چکی تو آپ ﷺ نے میرے ساتھ عبدالرحمن ابن ابوبکرؓ کو تنعیم بھیجا اور مجھے حکم دیا کہ مقام تنعیم سے (احرام باندھ کر) اپنے (قضا شدہ) عمرہ کے بدلے عمرہ کروں! حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جن لوگوں نے حج و عمرہ دونوں کو جمع کیا تھا یعنی شروع ہی سے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا تھا انہوں نے (عمرہ کے لئے) خانہ کعبہ کا طواف کیا اور پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ اس کے بعد انہوں نے احرام کھول ڈالا لوگوں نے منیٰ سے (مکہ) واپس آکر دوبارہ اپنے حج کا طواف کیا جسے طواف افاضہ کہتے ہیں اور جن لوگوں نے حج و عمرہ دونوں کو جمع کیا تھا (یعنی شروع میں سے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا تھا۔ یا بعد میں ایک کو دوسرے کے ساتھ شامل کیا، انھوں نے صرف ایک ہی یعنی نحر کے دن طواف کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: تنعیم ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر شمال مغربی جانب واقع ہے۔ یہ جگہ حدود حرم سے باہر ہے حجاج عمرہ کا احرام باندھنے کے لئے یہیں آجاتے ہیں۔

عمرہ کے احرام کے لئے ضروری اور شرط ہے کہ حل سے یعنی حدود حرام سے باہر باندھا جائے عمرہ کرنے والا خواہ مکی ہو یا غیر مکی جب کہ حج کا احرام غیر مکی تو حل سے باندھے اور مکی حدود حرم ہی میں کہیں سے باندھے۔

"انھوں نے صرف ایک ہی طواف کیا" سے اگرچہ یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ قارن کو ایک طواف عمرہ اور حج دونوں کے لئے کافی ہے، جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک ہے لیکن حنفیہ کے ہاں قارن کو دو طواف کرنے ضروری ہیں ایک طواف تو عمرہ کے لئے جو مکہ میں داخل ہونے کے بعد کیا جائے اور دوسرا طواف حج کے لئے وقوف عرفات کے بعد کیا جائے کیونکہ حدیث سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ قارن تھے، چنانچہ آپ ﷺ جب مکہ میں داخل ہوئے تو ایک طواف اس وقت کیا اور دوسری مرتبہ طواف الزیارۃ وقوف عرفات کے بعد کیا نیز دار قطنیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل بھی یہی ہے کہ قارن دو طواف کرے اور صفا و مروہ کے درمیان دو مرتبہ سعی کرے! حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے بھی یہی بات منقول ہے کہ قارن دو طواف اور دو مرتبہ سعی کرے۔

(۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ تَمَتَّعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَسَاقَ مَعَهُ الْهَدْيَ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ وَبَدَأَ فَاَهَلَّ بِالْعُمْرَةِ ثُمَّ اَهَلَّ بِالْحَجِّ فَتَمَتَّعَ النَّاسُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَكَانَ مِنَ النَّاسِ مَنْ اَهْدَى وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ يُهْدِ فَلَمَّا قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَّةَ قَالَ لِلنَّاسِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ اَهْدَى فَاِنَّهُ لَا يَحِلُّ مِنْ شَيْءٍ حَرُمَ مِنْهُ حَتَّى يَقْضِيَ حَجَّهٗ وَمَنْ لَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ اَهْدَى فَلْيَطُفْ بِالْبَيْتِ وَبِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَلْيُقَصِّرْ وَلْيَحْلِلْ ثُمَّ لِيُهِلَّ بِالْحَجِّ وَلْيُهْدِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ هَدْيًا فَلْيَصُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعَ اِلَى اَهْلِهٖ فَطَافَ حِيْنَ قَدِمَ مَكَّةَ وَاسْتَلَمَ الرُّكْنَ اَوَّلَ شَيْءٍ ثُمَّ خَبَّ ثَلَاثَةَ اَطْوَافٍ وَمَشَى اَرْبَعًا فَرَكَعَ حِيْنَ قَضَى طَوَافَهٗ بِالْبَيْتِ عِنْدَ الْمَقَامِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَانْصَرَفَ فَاَتَى الصَّفَا فَطَافَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ سَبْعَةَ اَطْوَافٍ

ثُمَّ لَمْ يَحِلَّ مِنْ شَيْءٍ حَرُمَ مِنْهُ حَتّٰى قَضٰى حَجَّهُ وَنَحَرَ هَدْيَهُ يَوْمَ النَّحْرِ وَاَفَاضَ فَطَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ حَلَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ حَرُمَ مِنْهُ وَفَعَلَ مِثْلَ مَا فَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَاقَ الْهَدْيَ مِنَ النَّاسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر تمتع کیا (یعنی فائدہ اٹھایا بایں طور پر کہ پہلے عمرے کا احرام باندھا پھر حج کا) اور ذوالحلیفہ سے (کہ جہاں آپ ﷺ نے احرام باندھا تھا) قربانی کا جانور ساتھ لے لیا تھا، چنانچہ پہلے تو آپ ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا تھا، پھر حج کا احرام باندھا، اور لوگوں نے بھی نبی کریم ﷺ کے ہمراہ عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر تمتع کیا، بعض لوگ (کہ جنہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا) وہ تھے جو قربانی کے جانور اپنے ساتھ لائے تھے اور بعض وہ تھے جو قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، جب آنحضرت ﷺ مکہ پہنچے تو (عمرہ کرنے والے) لوگوں سے فرمایا کہ "تم میں سے جو شخص قربانی کا جانور ساتھ لایا ہو وہ اس چیز کو حلال نہ کرے جس سے وہ باز رہا ہے (یعنی احرام نہ کھولے) یہاں تک کہ وہ اپنا حج ادا کرے اور جو شخص قربانی کا جانور ساتھ نہ لایا ہو تو وہ (عمرہ کے لئے) خانہ کعبہ کا طواف کرے، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے، بال کتروائے اور پھر وہ (عمرہ کا) احرام کھول دے (یعنی جو چیزیں حالت احرام میں ممنوع تھیں انہیں مباح کرلے) اس کے بعد حج کے لئے (دوبارہ) احرام باندھے اور (رمی جمار کے بعد سر منڈانے سے پہلے نحر کے دن) قربانی کرے (کیونکہ ادائیگی حج و عمرہ کی توفیق اور حق تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کے طور پر متمتع پر قربانی واجب ہے) اور جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو تو وہ تین روزے رکھے حج کے دنوں میں (یعنی حج کے مہینوں میں احرام کے بعد اور قربانی کے دن سے پہلے) رکھے اس بارہ میں افضل یہ ہے کہ ذی الحجہ کی ساتویں، آٹھویں اور نویں تاریخ کو تین روزے رکھے اور سات روزے اس وقت رکھے جب اپنے اہل و عیال کے پاس پہنچ جائے (یعنی افعال حج سے فراغت کے بعد رکھے چاہے مکہ ہی میں یہ سارے روزے رکھ لے چاہے گھر پہنچ کر) بہرکیف آنحضرت ﷺ نے مکہ پہنچ کر (عمرہ کے لئے) خانہ کعبہ کا طواف کیا اور (طواف کے جو افعال ہیں ان میں) سب چیزوں سے پہلے (مگر لبیک کہنے کے بعد) حجر اسود کو بوسہ دیا، اور طواف میں تین مرتبہ تو جلدی جلدی (یعنی اکڑ کر اور تیز رفتار سے) چلے اور چار مرتبہ معمولی رفتار سے چلے، پھر خانہ کعبہ کے گرد طواف پورے کرنے کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی اور سلام پھیرا (یعنی صلوٰۃ الطواف پڑھی، حنفیہ کے نزدیک یہ نماز واجب ہے) اس کے بعد (خانہ کعبہ) سے چل کر صفاء پر آئے اور صفا و مروہ کے درمیان سات پھیرے کئے (یعنی سعی کی) اس کے بعد کسی ایسی چیز کے ساتھ حلال نہیں ہوئے جس سے اجتناب کیا جاتا ہے (یعنی احرام سے باہر نہ آئے) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اپنا حج پورا کیا، اور نحر کے دن (دسویں ذی الحجہ کو) اپنی قربانی کا جانور ذبح کرلیا (تو اب سر منڈانے کے بعد وہ تمام چیزیں جو حالت احرام میں ممنوع تھیں مباح ہوگئیں علاوہ بیوی سے ہمبستری) اور پھر (منٰی سے) چلے اور (مکہ پہنچ کر) خانہ کعبہ کا طواف یعنی افاضہ) کیا اور اس کے بعد وہ چیز حلال ہوگئی جو ممنوع تھی (یعنی اب طواف سے فراغت کے بعد بیوی سے ہمبستری بھی حلال ہوگئی) پھر جن لوگوں کے ساتھ قربانی کے جانور تھے انہوں نے بھی وہی کیا جو رسول کریم ﷺ نے کیا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حج تمتع کیا تھا جب کہ زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ آپ ﷺ قارن تھے لہٰذا اب حدیثوں کے بارہ میں یہی کہا جائے گا کہ یہاں "تمتع" سے مراد اس کے لغوی معنی ہیں یعنی "نفع اٹھانا" اور یہ مفہوم قرآن میں بھی موجود ہے بایں طور کہ قارن حج کے ساتھ عمرہ ملا کر منتفع ہوتا ہے۔

حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا جائز ہے

(۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهٖ عُمْرَةٌ اسْتَمْتَعْنَا بِهَا فَمَنْ لَمْ يَكُنْ عِنْدَهُ الْهَدْيُ فَلْيَحِلَّ الْحِلَّ كُلَّهُ فَاِنَّ الْعُمْرَةَ قَدْ دَخَلَتْ فِي الْحَجِّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "یہ عمرہ ہے جس سے ہم نے فائدہ اٹھایا ہے، جس کے پاس قربانی کا جانور نہ

ہو وہ ہر طرح سے حلال ہو جائے (یعنی عمرہ کے بعد پورا احرام کھول دے) کیونکہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا قیامت تک کے لئے جائز ہو گیا ہے"۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں بھی "تمتع" سے مراد اس کے لغوی معنی ہیں یعنی "فائدہ اٹھانا" اس کی بقیہ وضاحت پہلے ذکر ہو چکی ہے۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِي۔

"اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

تبدیل احرام کے حکم پر صحابہؓ کا تردد و تامل

⑤ وَعَنْ عَطَاءٍ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ فِي نَاسٍ مَعِي قَالَ اَهْلَلْنَا اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَجِّ خَالِصًا وَحْدَهُ قَالَ عَطَاءٌ قَالَ جَابِرٌ فَقَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صُبْحَ رَابِعَةٍ مَضَتْ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ فَاَمَرَنَا اَنْ نَحِلَّ قَالَ عَطَاءٌ قَالَ حِلُّوا وَاَصِيْبُوا النِّسَاءَ قَالَ عَطَاءٌ وَلَمْ يَعْزِمْ عَلَيْهِمْ وَلٰكِنْ اَحَلَّهُنَّ لَهُمْ فَقُلْنَا لَمَّا لَمْ يَكُنْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ عَرَفَةَ اِلَّا خَمْسٌ اَمَرَنَا اَنْ نُفْضِيَ اِلٰى نِسَائِنَا فَنَاْتِي عَرَفَةَ تَقْطُرُ مَذَاكِيْرُنَا الْمَنِيَّ قَالَ يَقُوْلُ جَابِرٌ بِيَدِهٖ كَاَنِّي اَنْظُرُ اِلٰى قَوْلِهٖ يُحَرِّكُهَا قَالَ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْنَا فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُمْ اِنِّي اَتْقَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَصْدَقُكُمْ وَاَبَرُّكُمْ وَلَوْ لَا هَدْيِي لَحَلَلْتُ كَمَا تَحِلُّوْنَ وَلَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ لَمْ اَسُقِ الْهَدْيَ فَحِلُّوْا فَحَلَلْنَا وَسَمِعْنَا وَاَطَعْنَا قَالَ عَطَاءٌ قَالَ جَابِرٌ فَقَدِمَ عَلِيٌّ مِنْ سِعَايَتِهٖ فَقَالَ بِمَ اَهْلَلْتَ قَالَ بِمَا اَهَلَّ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَهْدِ وَامْكُثْ حَرَامًا قَالَ وَاَهْدٰى لَهٗ عَلِيٌّ هَدْيًا فَقَالَ سُرَاقَةُ بْنُ مَالِكِ بْنِ جُعْشُمٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلِعَامِنَا هٰذَا اَمْ لِاَبَدٍ قَالَ لِاَبَدٍ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عطاءؒ کہتے ہیں کہ میں نے کتنے ہی آدمیوں کے ساتھ کہ جو میرے ساتھ شریک مجلس تھے حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ (حجۃ الوداع کے موقع پر) ہم (صحابہؓ) نے (بغیر عمرہ کی شمولیت کے) خالص حج کا احرام باندھا۔ عطاء کہتے ہیں کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا۔ پھر جب رسول کریم ﷺ ذی الحجہ کی چوتھی تاریخ کی صبح کو (مکہ) میں پہنچے تو ہمیں حکم دیا کہ ہم احرام کھول دیں۔ حضرت عطاء کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ احرام کھول دو۔ اور عورتوں کے پاس جاؤ (یعنی ان سے مقاربت بھی کرو) نیز عطاءؒ کہتے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ نے عورتوں کی مقاربت کو واجب نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ نے صرف عورتوں کو ان کے لئے حلال کر دیا تھا (یعنی احرام کھول دینے کا حکم تو وجوب کے طور پر تھا البتہ صحبت و مجامعت کا حکم صرف اباحت و جواز کی صورت میں تھا) حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم (آنحضرت ﷺ کا یہ حکم سن کر تعجب کے ساتھ) کہنے لگے کہ "جب کہ ہمارے اور عرفہ کے دن کے درمیان صرف پانچ راتیں باقی رہ گئی ہیں) آنحضرت ﷺ نے ہمیں یہ حکم دے دیا کہ ہم اپنی عورتوں سے مجامعت کریں (یہ تو بڑی عجیب بات ہوگی کہ) ہم میدان عرفات میں اس طرح جائیں کہ ہمارے عضو مخصوص سے منی ٹپکتی ہو! (یعنی رات کو ہم جماع کریں اور صبح کو عرفات میں پہنچ جائیں، اس بات کو ایام جاہلیت میں بہت برا سمجھا جاتا تھا" کہ عورتوں سے مجامعت اور حج میں اتنا قرب ہو جائے کہ بلکہ اس چیز کو حج میں نقصان کا باعث جانتے تھے) عطاء کہتے ہیں کہ حضرت جابرؓ نے (یہ بات کہتے ہوئے) اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور ان کا ہاتھ کا اشارہ اور اپنے ہاتھ کو ہلانا گویا اب بھی میری نظروں میں پھر رہا ہے" حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (کو جب ہمارے اس تردد و تامل کا علم ہوا تو آپ ﷺ) ہمارے درمیان (خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا "تم جانتے ہو کہ میں تمہاری بہ نسبت خدا سے زیادہ ڈرتا ہوں" تم سے زیادہ سچا اور تم میں سب سے

زیادہ نیکوکار ہوں۔ اگر میرے ساتھ قربانی کا جانور ہوتا تو میں بھی تمہاری طرح احرام کھول دیتا جس طرح تم احرام کھولو گے، اور اگر مجھے میری یہ بات پہلے سے معلوم ہوتی جو بعد کو معلوم ہوئی ہے تو میں قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا (یعنی اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ احرام کھولنا تم پر شاق گزرے گا تو میں قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا اور میں بھی احرام کھول دیتا) تم (بلا تامل) احرام کھول دو۔ چنانچہ ہم نے احرام کھول دیا اور آپ ﷺ کے ارشاد کو سنا اور اطاعت کی۔ عطاءؒ کا بیان ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ اپنے کام پر آئے (یعنی وہ یمن قاضی ہو کر گئے تھے جب وہاں سے آئے) تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے کس چیز کا احرام باندھا ہے؟ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ "جس چیز کا احرام نبی کریم (ﷺ) نے باندھا ہے" پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ (نحر کے دن) قربانی کا جانور ذبح کرو (کہ یہ قارن پر واجب ہے) اور حالت احرام کو برقرار رکھو (یعنی میری طرح اب تم بھی احرام باندھے رکھو) چنانچہ حضرت علیؓ آنحضرت ﷺ کے لئے (یا خود اپنے لئے) قربانی کا جانور لے کر آئے! سراقہ ابن مالک ابن جعشمؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! یہ (یعنی حج کے مہینوں میں عمرہ کا جواز) صرف اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے؟" آپ ﷺ نے فرمایا ہمیشہ کے لئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ہم نے خالص حج کا احرام باندھا" حضرت جابرؓ نے یہ بات اپنے خیال و گمان کے مطابق کہی ورنہ تو جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہ معلوم ہی ہو چکا ہے کہ بعض صحابہؓ نے صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا اور بعض نے صرف حج کا اور بعض نے عمرہ اور حج دونوں کا احرام باندھا تھا۔

"حضرت جابرؓ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت جابرؓ نے اپنے ہاتھ کو حرکت دے کر عضو مخصوص سے قطرات ٹپکنے کی طرف اشارہ کیا۔ یا یہ کہ انہوں نے عضو مخصوص کی حرکت کو ہاتھ کی حرکت سے تشبیہ دی۔ بہرکیف یہ اہل عرب کی عادت تھی کہ وہ بات کرتے ہوئے اعضاء کے اشاروں سے وضاحت کرتے تھے تاکہ مفہوم اچھی طرح واضح اور ذہن نشین ہو جائے۔

صحابہؓ کے تردد پر آنحضرت ﷺ کی برہمی

⑥ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَرْبَعٍ مَضَيْنَ مِنْ ذِی الْحِجَّةِ اَوْ خَمْسٍ فَدَخَلَ عَلَیَّ وَهُوَ غَضْبَانُ فَقُلْتُ مَنْ اَغْضَبَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ قَالَ اَوَمَا شَعَرْتِ اَنِّیْ اَمَرْتُ النَّاسَ بِاَمْرٍ فَاِذَا هُمْ يَتَرَدَّدُوْنَ وَلَوْ اَنِّی اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا سُقْتُ الْهَدْیَ مَعِیْ حَتّٰی اَشْتَرِيَهُ ثُمَّ اَحِلَّ كَمَا حَلُّوْا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ میں) رسول کریم ﷺ ذی الحجہ کی چوتھی یا پانچویں تاریخ کو میرے پاس غصہ کی حالت میں تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کس نے آپ (ﷺ) کو غصہ دلایا؟ اللہ اسے دوزخ میں ڈالے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے (بعض لوگوں کو (عمرہ کے ساتھ حج کو فسخ کر دینے کا) ایک حکم دیا اور وہ اس حکم سے تردد میں ہیں، اگرچہ مجھے یہ بات پہلے سے معلوم ہوتی جو بعد کو معلوم ہوئی تو میں اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہ لاتا اور اسی طرح احرام کھول دیتا جس طرح ان لوگوں نے احرام کھولا ہے اور پھر میں (یہاں مکہ میں یا راستہ میں) قربانی کا جانور خرید لیتا۔" (مسلمؒ)

بَابُ دُخُوْلِ مَكَّةَ وَالطَّوَافِ

مکہ میں داخل ہونے اور طواف کرنے کا بیان

"مَكُّ" کے لغوی معنی ہیں "ہلاک کرنا، برباد کرنا، اس شہر مقدس کو مکہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ گناہوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اور اس شخص کو (آخرت میں یا دنیا ہی میں) ہلاک کرا دیتا ہے جو اس شہر میں ظلم و کجروی اختیار کرتا ہے۔

اس باب میں اس چیز کو ذکر کیا جائے گا کہ مکہ آنے والا اس مقدس شہر میں کس طرف سے داخل ہو، کس طرف سے نکلے، کس وقت آئے اور یہ کہ داخلہ کے وقت کیا آداب و قواعد ملحوظ ہونے چاہئیں، نیز طواف اور اس کے متعلقات مثلاً حجر اسود کو بوسہ دینے وغیرہ کی کیفیات اور ان کے مسائل کا بیان ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مکہ کا مدخل اور مخرج

① عَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ ابْنَ عُمَرَ کَانَ لَا یَقْدِمُ مَکَّۃَ اِلَّا بَاتَ بِذِی طُوًی حَتّٰی یُصْبِحَ وَیَغْتَسِلَ وَیُصَلِّیَ فَیَدْخُلَ مَکَّۃَ نَهَارًا وَاِذَا نَفَرَ مِنْهَا مَرَّ بِذِی طُوًی وَبَاتَ بِهَا حَتّٰی یُصْبِحَ وَیَذْکُرُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَفْعَلُ ذٰلِکَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت نافع" کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ جب بھی مکہ آتے، تو ذی طوی میں رات گزارتے اور جب صبح ہوتی تو غسل کرتے اور نماز پڑھتے پھر دن کو مکہ میں داخل ہوتے اور جب مکہ سے واپس ہوتے تو اس وقت بھی ذی طوی سے گزرتے اور صبح تک وہیں رات بسر کرتے، نیز حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بھی اسی طرح کرتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ذی طوی" ایک جگہ کا نام ہے جو حدود حرم میں مقام تنعیم کی طرف واقع ہے نبی کریم ﷺ جب مکہ تشریف لائے تو استراحت کے لئے رات ذی طوی میں گزارتے پھر صبح غسل فرماتے اور نماز پڑھ کر اس شہر مقدس میں داخل ہوتے۔ نماز سے بظاہر نماز نفل مراد ہے جو وہاں جانے کے لئے پڑھتے تھے، پھر جب آپ ﷺ مکہ سے واپس ہوتے تو اس وقت بھی ذی طوی میں قیام فرماتے تاکہ رفقاء وہاں جمع ہو جائیں اور سب لوگوں کا سامان وغیرہ اکٹھا ہو جائے۔

حضرت ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مکہ میں دن کے وقت داخل ہونا مستحب ہے تاکہ شہر میں داخل ہوتے ہی بیت اللہ شریف نظر آئے اور دعا کی جائے۔

② وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا جَاءَ اِلٰی مَکَّۃَ دَخَلَهَا مِنْ اَعْلَاهَا وَخَرَجَ مِنْ اَسْفَلِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ (حجۃ الوداع کے موقع پر) جب مکہ تشریف لائے تو شہر میں اس کے بلند حصہ کی طرف سے داخل ہوئے اور (واپسی کے وقت) نشیبی حصے کی طرف سے نکلے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

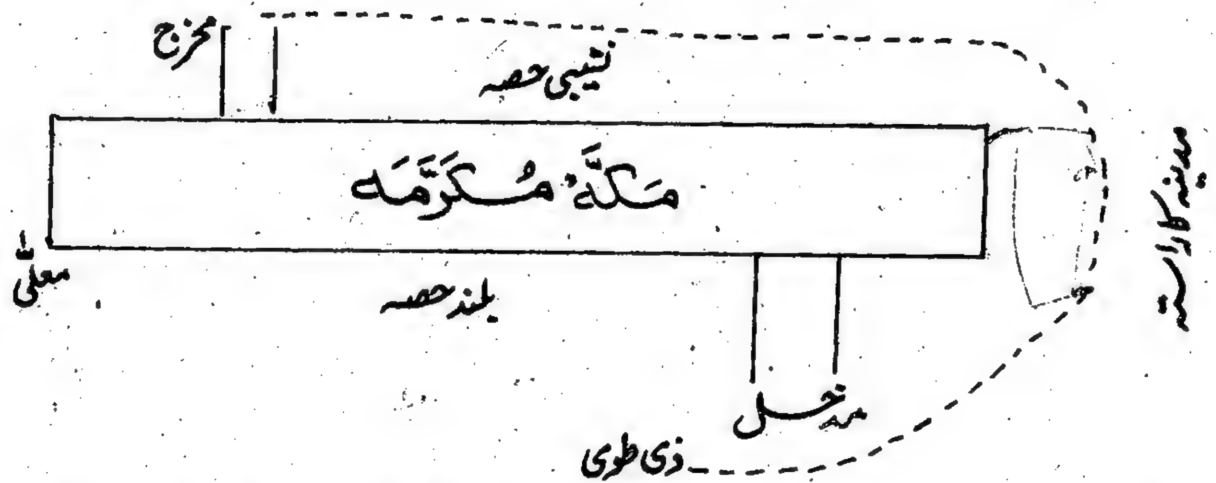

تشریح: مکہ کے جس طرف ذی طوی ہے وہی شہر کا بلند حصہ ہے، جنت المعلی یعنی مکہ کا مشہور قبرستان بھی اسی جانب ہے۔ شہر کی دوسری جانب نشیبی حصہ ہے۔

پہلی حدیث اور اس حدیث میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ مکہ کے نشیبی حصہ سے نکل کر جب مدینہ کا راستہ اختیار کرتے تو ذی طوی پہنچتے اور وہاں رات گزار کر صبح مدینہ کے لئے روانہ ہو جاتے۔

طواف کے لئے پاکی واجب ہے

③ وَعَنْ عُرْوَةَ ابْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَدْ حَجَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَتْنِي عَائِشَةُ اَنَّ اَوَّلَ شَيْءٍ بَدَأَ بِهٖ حِيْنَ قَدِمَ مَكَّةَ اَنَّهٗ تَوَضَّأَ ثُمَّ طَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ عُمْرَةٌ ثُمَّ حَجَّ اَبُوْبَكْرٍ فَكَانَ اَوَّلَ شَيْءٍ بَدَأَ بِهِ الطَّوَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ عُمْرَةٌ ثُمَّ عُمَرُ ثُمَّ عُثْمَانُ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عروہ ابن زبیر کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حج کیا اور حضرت عائشہؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے مکہ میں پہنچ کر جو سب سے پہلے کام کیا وہ یہ تھا کہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور پھر بیت اللہ کا طواف کیا (یعنی عمرہ کا طواف کیا کیونکہ آپ ﷺ قارن یا متمتع تھے) اور عمرہ نہیں ہوا، پھر (آپ ﷺ کے بعد) حضرت ابوبکرؓ نے حج کیا تو آپ نے بھی بیت اللہ کے طواف سے افعال حج کی ابتداء کی اور عمرہ نہیں ہوا، پھر حضرت عمرؓ نے اور حضرت عثمانؓ نے بھی اسی طرح کیا۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: "آپ ﷺ نے وضو کیا" کا مطلب یہ ہے کہ مکہ پہنچ کر طواف بیت اللہ سے پہلے آپ ﷺ نے دوبارہ وضو کیا، کیونکہ یہ بات پہلے ہی معلوم ہو چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ذی طوی میں غسل کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ غسل میں وضو بھی شامل ہوتا تھا۔ طواف کے صحیح ہونے کے لئے طہارت یعنی پاکی جمہور علماء کے نزدیک تو شرط ہے لیکن حنفیہ کے ہاں شرط نہیں ہے البتہ واجب ہے۔

گزشتہ احادیث میں یہ بات گزر چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ نے مکہ پہنچ کر عمرہ کیا، اس کے بعد جو لوگ قربانی کا جانور ساتھ لائے تھے وہ تو احرام باندھے رہے اور جو لوگ قربانی کا جانور ساتھ نہ لائے تھے انہوں نے احرام کھول دیا۔ لہٰذا "اور عمرہ نہ ہوا" کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حج کو فسخ یعنی موقوف کر کے عمرہ نہیں کیا اور احرام نہیں کھولا بلکہ آپ ﷺ عمرہ کے بعد احرام ہی کی حالت میں رہے کیونکہ قارن تھے اور پھر آخر میں قربانی کے دن آپ ﷺ نے احرام کھولا۔ لہٰذا راوی نے یہ بات اس لئے کہی تاکہ ان لوگوں کی تردید ہو جائے جو یہ گمان کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے حج کو فسخ کر کے عمرہ کیا۔

یا پھر اس جملہ کی مراد یہ ہے کہ ان سب نے حج کے بعد الگ سے اور عمرہ نہیں کیا بلکہ اسی عمرہ پر اکتفاء کیا جو حج کے ساتھ شامل تھا۔

طواف میں رمل کا ذکر

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا طَافَ فِي الْحَجِّ اَوِ الْعُمْرَةِ اَوَّلَ مَا يَقْدَمُ سَعٰى ثَلَاثَةَ اَطْوَافٍ وَمَشٰى اَرْبَعَةً ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ يَطُوْفُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب حج یا عمرہ کا طواف کرتے تو پہلے تین شوط میں تیز تیز (اور اکڑ کر) چلتے (یعنی رمل کرتے) اور باقی چار شوط میں اپنی معمولی رفتار سے چلتے پھر (طواف کی) دو رکعت نماز پڑھتے اور اس کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: خانہ کعبہ کے گرد ایک پھیرے کو "شوط" کہتے ہیں اور سات شوط کا ایک طواف ہوتا ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ طواف کے وقت تین پھیروں میں تو اس طرح تیز چلتے کہ قدم پاس پاس رکھتے اور جلد جلد اٹھاتے اور دوڑتے اور اچھلتے نہ تھے اور باقی چار پھیرے اپنی معمولی رفتار سے چل کر کرتے۔

صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب ہے

(۵) وَعَنْهُ قَالَ رَمَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْحَجَرِ اِلَى الْحَجَرِ ثَلَاثًا وَمَشَى اَرْبَعًا وَكَانَ يَسْعٰى بِبَطْنِ الْمَسِيْلِ اِذَا طَافَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے طواف کے وقت حجر اسود سے حجر اسود تک تین پھیروں میں تو رمل کیا اور چار پھیروں میں اپنی معمولی رفتار سے چلے اور جب صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے تو بطن مسیل میں دوڑتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: سعی کرنا یعنی صفا و مروہ کے درمیان سات پھیرے کرنا حنفیہ کے نزدیک واجب ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے ہاں رکن ہے۔

"بطن مسیل" صفا و مروہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے شناخت کے لئے اس کے دونوں سروں پر نشان بنے ہوئے ہیں، جنہیں "میلین اخضرین" کہتے ہیں۔ سعی کے وقت اس جگہ تیز رفتاری سے چلنا تمام علماء کے نزدیک سُنّت ہے۔

حجر اسود کا بوسہ

(۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا قَدِمَ مَكَّةَ اَتَى الْحَجَرَ فَاسْتَلَمَهٗ ثُمَّ مَشٰى عَلٰى يَمِيْنِهٖ فَرَمَلَ ثَلَاثًا وَمَشٰى اَرْبَعًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (جب حج یا عمرہ کے لئے) مکہ تشریف لائے تو حجر اسود کے پاس آئے اور اس کو بوسہ دیا پھر (طواف کے لئے) داہنے ہاتھ کی طرف چلے، چنانچہ تین مرتبہ تو بازو ہلا کر اور جلدی جلدی چلے (جس طرح پہلوان چلتے ہیں) اور چار مرتبہ اپنی معمولی رفتار سے چلے۔" (مسلمؒ)

(۷) وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَرَبِيٍّ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ ابْنَ عُمَرَ عَنِ اسْتِلَامِ الْحَجَرِ فَقَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَلِمُهٗ وَيُقَبِّلُهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت زبیر ابن عربیؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عمرؓ سے حجر اسود کو بوسہ دینے کے سلسلہ میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اسے ہاتھ لگاتے اور چومتے تھے۔" (بخاریؒ)

استلام رکن یمانی

(۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَمْ اَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَلِمُ مِنَ الْبَيْتِ اِلَّا الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو خانہ کعبہ کے صرف دو رکن کا استلام کرتے دیکھا ہے جو یمن کی سمت ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کعبہ مقدسہ کے چار رکن یعنی چار کونے ہیں، ایک رکن تو وہ ہے جس میں حجر اسود نصب ہے، دوسرا اس کے سامنے ہے اور حقیقت میں "یمانی" اسی رکن کا نام ہے، مگر اس طرف کے دونوں ہی رکن کو تغلیباً رکن یمانی ہی کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو رکن اور ہیں جن میں سے ایک تو "رکن عراقی" ہے اور دوسرا "رکن شامی" مگر ان دونوں کو "رکن شامی" ہی کہتے ہیں۔

جن رکن میں حجر اسود ہے اس کو دوہری فضیلت حاصل ہے، ایک فضیلت تو اسے اس لئے حاصل ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے، اور دوسری فضیلت یوں حاصل ہے کہ اس میں حجر اسود ہے، جب کہ رکن یمانی کو صرف یہی ایک فضیلت حاصل ہے

کہ اسے حضرت ابراہیمؑ نے بنایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ان دونوں رکن کو رکن شامی و عراقی پر فضیلت و برتری حاصل ہے۔ اسی لئے "اسلام" انہیں دونوں رکن کے ساتھ مختص ہے۔

"استلام" کے معنی ہیں "لمس کرنا یعنی چھونا" یہ چھونا خواہ ہاتھ وغیرہ کے ذریعہ ہو یا بوسہ کے ساتھ اور یا دونوں کے ساتھ لہٰذا جب یہ لفظ رکن اسود کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس سے حجر اسود کو چومنا مقصود ہوتا ہے اور جب رکن یمانی کی نسبت استعمال ہوتا ہے تو اس سے رکن یمانی کو صرف چھونا مراد ہوتا ہے۔

چونکہ رکن اسود، رکن یمانی سے افضل ہے اس لئے اس کو بوسہ دیتے ہیں یا ہاتھ وغیرہ لگا کر یا کسی چیز سے اس کی طرف اشارہ کر کے چومتے ہیں، اور رکن یمانی کو صرف چوما جاتا ہے اس کو بوسہ نہیں دیا جاتا، بقیہ دونوں رکن یعنی شامی اور عراقی کو نہ بوسہ دیتے ہیں اور نہ ہاتھ لگاتے ہیں، چنانچہ مسئلہ یہی ہے کہ حجر اسود اور رکن یمانی کے علاوہ کسی اور پتھر وغیرہ کو نہ چومنا چاہئے اور نہ ہاتھ لگانا چاہئے۔

اونٹ پر سوار ہو کر طواف کرنے کا مسئلہ

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ طَافَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ عَلٰى بَعِيْرٍ يَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا اور محجن کے ذریعہ حجر اسود کو بوسہ دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حنفیہ کے ہاں چونکہ پیادہ پا طواف کرنا واجب ہے اس لئے اس حدیث کے بارہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی عذر اور مجبوری کی بناء پر اس طرح طواف کیا ہوگا۔ لہٰذا یہ طواف آنحضرت ﷺ کے ساتھ مختص ہے کسی اور کو سواری پر بیٹھ کر طواف کرنا جائز نہیں ہے۔

علامہ طیبی شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ پیادہ پا طواف کرنا افضل ہے لیکن آنحضرت ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر اس لئے طواف کیا تاکہ سب لوگ آپ ﷺ کو دیکھتے رہیں۔

یہاں ایک اشکال بھی واقع ہوتا ہے وہ یہ کہ احادیث سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر طواف کرتے ہوئے پہلے تین پھیروں میں رمل کیا تھا، جب کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں رمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا پیادہ پا طواف کرنا اور اس کے تین پھیروں میں رمل کرنا طواف قدوم کے موقع پر تھا، اور اونٹ پر سوار ہو کر طواف کرنے کا تعلق طواف افاضہ سے ہے جو فرض ہے اور قربانی کے دن (دسویں ذی الحجہ کو) ہوا تھا اور جسے طواف الرکن بھی کہتے ہیں۔ اور اس موقع پر اونٹ سوار ہو کر طواف کرنے کی وجہ یہی تھی کہ لوگ آپ ﷺ کو دیکھتے رہیں۔ تاکہ طواف کے افعال و مسائل سیکھ لیں۔

"محجن" اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کا سرا خمدار ہوتا ہے، اس کے ذریعہ حجر اسود کو بوسہ دینے کی صورت یہ تھی کہ آپ ﷺ اس لکڑی سے حجر اسود کی طرف اشارہ کر کے اس کو چومتے تھے۔

طریق استلام حجر اسود

⑩ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَافَ بِالْبَيْتِ عَلٰى بَعِيْرٍ كُلَّمَا اَتٰى عَلَى الرُّكْنِ اَشَارَ اِلَيْهِ بِشَيْءٍ فِي يَدِهٖ وَكَبَّرَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خانہ کعبہ کا طواف اونٹ پر سوار ہو کر کیا، جب آپ ﷺ حجر اسود کے سامنے آئے تو ایک چیز سے (یعنی لکڑی سے) کہ جو آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھی اس کی طرف اشارہ کرتے اور اللہ اکبر کہتے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حجر اسود کو بوسہ دینے کا طریقہ تو یہ ہے کہ دونوں ہاتھ حجر اسود پر رکھ کر دونوں ہونٹوں کو حجر اسود پر لگایا جائے، لیکن آنحضرت ﷺ ہجوم کی زیادتی اور لوگوں کے ازدحام کی وجہ سے حجر اسود کی طرف اشارہ کرتے اور اسے چومتے ہوں گے، چنانچہ حنفیہ کا یہی مسلک ہے کہ حجر اسود کی طرف اشارہ کر کے اس کو نہ چوما جائے۔ ہاں اگر کسی وجہ سے حجر اسود پر ہاتھ رکھنا اور اس کو چومنا ممکن نہ ہو تو پھر اشارہ کے ذریعہ ہی یہ سعادت حاصل کی جاسکتی ہے۔

(۱۱) وَعَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَطُوْفُ بِالْبَیْتِ وَیَسْتَلِمُ الرُّکْنَ بِمِحْجَنٍ مَعَہٗ وَیُقَبِّلُ الْمِحْجَنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوالطفیل کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ (سوار ہو کر) خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے اور ایک خمدار سرے والی لکڑی سے کہ جو آپ ﷺ کے ساتھ تھی حجر اسود کی طرف اشارہ کرتے اور اس لکڑی کو چومتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے بارہ میں بعض روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کو چوما، بعض روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کو ہاتھ لگا کر بوسہ دیا اور بعض روایتوں سے حجر اسود کی طرف اشارہ کر کے بوسہ دینا ثابت ہے۔ لہٰذا ان تمام روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کی جائے کہ کسی طواف میں تو آپ ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا ہوگا کسی طواف میں ہاتھ لگا کر چوما ہوگا اور کسی طواف میں کثرت ہجوم و اژدحام کی وجہ سے حجر اسود کی طرف اشارہ کے ذریعہ استلام کر لیا ہوگا، یا پھر یہ کہ ایک طواف میں ہر شوط (چکر) کے بعد حجر اسود کا استلام وغیرہ ہے چنانچہ آپ ﷺ کسی شوط میں تو بوسہ دیتے ہوں گے، کسی شوط میں ہاتھ لگا کر چومتے ہوں گے اور کسی شوط میں اژدحام کی وجہ سے اشارہ کے ذریعہ استلام کر لیتے ہوں گے۔

حائضہ طواف وسعی نہ کرے

(۱۲) وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَذْکُرُ اِلَّا الْحَجَّ فَلَمَّا کُنَّا بِسَرِفَ طَمِثْتُ فَدَخَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَبْکِیْ فَقَالَ لَعَلَّکِ نُفِسْتِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَاِنَّ ذٰلِکِ شَیْءٌ کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلٰی بَنَاتِ اٰدَمَ فَافْعَلِیْ مَا یَفْعَلُ الْحَاجُّ غَیْرَ اَنْ لَّا تَطُوْفِیْ بِالْبَیْتِ حَتّٰی تَطْہُرِیْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ (حج کے لئے) روانہ ہوئے تو ہم (لبیک کہتے وقت) صرف حج کا ذکر کرتے تھے بعض حضرات نے یہ معنی لکھے ہیں کہ ہم صرف حج کا قصد کرتے تھے یعنی مقصود اصلی حج تھا عمرہ نہیں تھا، لہٰذا عمرہ کا ذکر نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ عمرہ نیت میں بھی نہیں تھا) پھر جب ہم مقام سرف میں پہنچے تو میرے ایام شروع ہو گئے، چنانچہ نبی کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں (اس خیال سے) رو رہی تھی کہ (حیض کی وجہ سے میں حج نہ کر پاؤں گی) آنحضرت ﷺ نے (میری کیفیت دیکھ کر) فرمایا کہ "شاید تمہارے ایام شروع ہو گئے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ "ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا یہ تو ایک ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے لئے مقرر فرما دیا ہے (اس کی وجہ سے رونے اور مضطرب ہونے کی کیا ضرورت ہے) تم بھی وہی افعال کرو جو حاجی کرتے ہیں۔ ہاں جب تک پاک نہ ہو جاؤ (یعنی ایام ختم نہ ہو جائیں اور اس کے بعد نہا نہ لو) اس وقت تک بیت اللہ کا طواف نہ کرنا (اور نہ سعی کرنا کیونکہ سعی طواف کے بعد ہی صحیح ہوتی ہے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "سرف" ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے تقریباً چھ میل اور مقام تنعیم سے جانب شمال تین یا چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اس

جگہ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کی قبر ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت میمونہؓ کا نکاح بھی اسی جگہ ہوا، شب زفاف بھی یہیں گزری اور انتقال بھی یہیں ہوا۔

اس حدیث کے پیش نظر ایک خلجان پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت عائشہؓ کے یہ الفاظ لانذکر الا الحج (ہم صرف حج کا ذکر کرتے تھے) خود حضرت عائشہؓ ہی کی اس روایت کے بالکل متضاد ہیں جو گزشتہ باب میں (دو) گزر چکی ہے جس میں حضرت عائشہؓ نے اپنے بارہ میں یہ بتایا تھا کہ وَلَمْ اُهْلِلْ اِلَّا بِعُمْرَةٍ (یعنی میں نے صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا) لہٰذا اس ظاہری تضاد کو دفع کرنے کے لئے یہ تاویل کی جائے گی کہ یہاں حضرت عائشہؓ کے الفاظ لانذکر الا الحج کی مراد یہ ہے کہ اس سفر سے ہمارے اصل مقصد حج تھا اور چونکہ حج کی تین قسمیں ہیں یعنی افراد، تمتع اور قران، اس لئے ہم میں سے بعض تو مفرد تھے اور بعض متمتع اور بعض قارن۔ میں نے تمتع کا قصد کیا تھا، چنانچہ میں نے میقات سے عمرہ کا احرام باندھا مگر مکہ پہنچنے سے پہلے ہی میرے ایام شروع ہو گئے جس کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ عرفہ کا دن اور وقوف عرفات کا وقت آ گیا اور اس طرح عمرہ کا وقت گزر کر ایام حج شروع ہو گئے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں عمرہ کا احرام تو کھول دوں اور حج کا احرام باندھ لوں اور پھر طواف اور سعی کے علاوہ دیگر افعال حج کروں۔

مشرکین کو طواف کعبہ کی ممانعت

⑬ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ بَعَثَنِیْ اَبُوْبَکْرٍ فِی الْحَجَّةِ الَّتِیْ اَمَّرَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَیْهَا قَبْلَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ یَوْمَ النَّحْرِ فِیْ رَهْطٍ اَمَرَهُ اَنْ یُّؤَذِّنَ فِی النَّاسِ اَلَا لَا یَحُجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَّلَا یَطُوْفَنَّ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع سے پہلے جس حج میں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو لوگوں کا امیر حج بنا کر بھیجا تھا اس حج میں نحر (قربانی) کے دن حضرت ابوبکرؓ نے مجھے بھی اس جماعت کے ساتھ بھیجا جس کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ "خبردار! اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی شخص ننگا ہو کر بیت اللہ کا طواف کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ حج ۹ھ کے آخر میں فرض ہوا ہے آنحضرت ﷺ تو اس سال دیگر دینی امور میں مشغولیت کی وجہ سے خود حج کو تشریف نہ لے جا سکے بلکہ حضرت ابوبکرؓ کو قافلہ حجاج کا امیر بنا کر حج کے لئے روانہ کیا۔ یہ واقعہ حجۃ الوداع سے ایک سال پہلے کا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جب وہاں پہنچے تو ایک جماعت کو کہ جس میں حضرت ابوہریرہؓ بھی شامل تھے لوگوں کے پاس بھیجا اور اسے یہ حکم دیا کہ لوگوں میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ اس سال کے بعد آئندہ کوئی مشرک یعنی کافر بیت اللہ کا حج کرنے کے لئے نہ آئے کیونکہ حج کی سعادت عظمیٰ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص کی گئی ہے اور انہوں نے یہ اعلان اس آیت کریمہ کے پیش نظر کرایا کہ:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔

"تمام مشرک نجس (ناپاک) ہیں لہٰذا کوئی بھی مشرک اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آئے۔"

نیز حضرت ابوبکرؓ نے اس جماعت کو یہ اعلان کرنے کا بھی حکم دیا کہ "کوئی بھی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہ کرے" یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ایام جاہلیت میں لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ ہم خدا کی یہ عظیم الشان عبادت ان کپڑوں میں کس طرح کر سکتے ہیں جن میں دن رات گناہ کیا کرتے تھے چنانچہ اسلام نے اس لغویت کو بند کیا اور حکم دیا کہ آئندہ کوئی بھی اس غیر اخلاقی و انسانی اور سراسر جہالت آمیز حرکت کی جرأت نہ کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

خانۂ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ

⑭ عَنِ الْمُهَاجِرِ الْمَكِّيِّ قَالَ سُئِلَ جَابِرٌ عَنِ الرَّجُلِ يَرَى الْبَيْتَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فَقَالَ قَدْ حَجَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ نَكُنْ نَفْعَلُهُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"حضرت مہاجر مکی (تابعیؒ) کہتے ہیں کہ حضرت جابرؓ سے اس شخص کے بارہ میں پوچھا گیا جو خانۂ کعبہ کو دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے (کہ آیا یہ مشروع ہے یا نہیں؟) تو حضرت جابرؓ نے کہا کہ جب ہم نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حج کیا تو ایسا نہ کرتے تھے (یعنی خانہ کعبہ کو دیکھ کر دعا مانگنے کے لئے اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے)۔" (ترمذی و ابوداؤد)

تشریح: زائر بیت اللہ، مکہ پہنچ کر جب مسجد حرام میں داخل ہوتا ہے، وہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی دعا مانگتا ہے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اس لئے مسئلہ یہ ہے کہ کعبۂ مقدس کے جمال دلربا پر نظر پڑتے ہی جو کچھ دل چاہے اپنے پروردگار سے مانگ لیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس وقت دعا مانگتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ بھی اٹھائے جائیں یا نہیں؟ چنانچہ یہ حدیث اس کا انکار کر رہی ہے اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ ۔ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ خانہ کعبہ کو دیکھ کر دعا مانگنے والا اپنے ہاتھ نہ اٹھائے، جب کہ حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھائے جائیں اور دعا مانگی جائے۔ (طیبیؒ)۔

ملا علی قاریؒ نے مرقات میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا مسلک اس کے برخلاف لکھا ہے، یعنی ان کی نقل کے مطابق ان دونوں ائمہ کے ہاں ہاتھ اٹھانا مشروع ہے لیکن انہیں ملا علی قاریؒ نے اپنی ایک اور کتاب "مناسک" میں اس کو مکروہ لکھا ہے اگرچہ بعض علماء سے اس کا جواز بھی نقل کیا ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور و معتمد کتاب "ہدایہ" اور در مختار سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس موقع پر ہاتھ نہ اٹھانا چاہئے۔

سعی کے دوران صفا سے کعبہ کو دیکھنا اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

⑮ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ مَكَّةَ فَاَقْبَلَ اِلَى الْحَجَرِ فَاسْتَلَمَهُ ثُمَّ طَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ اَتَى الصَّفَا فَعَلَاهُ حَتّٰى يَنْظُرَ اِلَى الْبَيْتِ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَجَعَلَ يَذْكُرُ اللّٰهَ مَا شَاءَ وَيَدْعُوْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب (حج و عمرہ کے لئے) تشریف لائے اور مکہ میں داخل ہوئے تو حجر اسود کے پاس گئے اور اس کو بوسہ دیا، پھر خانۂ کعبہ کا طواف کیا اس کے بعد (نماز طواف پڑھ کر صفا کی طرف آئے اور اس پر چڑھے یہاں تک کہ جب خانۂ کعبہ کی طرف نظر اٹھائی تو (دعا کے لئے) اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور جس قدر چاہا اللہ کا ذکر (یعنی تکبیر و تہلیل) کرتے رہے اور دعا مانگتے رہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: سعی کے وقت جب صفا پر چڑھا جائے تو وہاں بیت اللہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونا چاہئے اور پھر تکبیر و تہلیل کرنے اور درود پڑھنے کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنی چاہئے۔

کبھی یہ طریقہ رہا ہوگا اور شاید اب بھی ہو کہ بعض لوگ اس موقع پر تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھاتے ہیں جیسا کہ نماز میں تکبیر کے ساتھ رفع یدین کیا جاتا ہے، خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے یہ ایک غیر مشروع و غیر مسنون طریقہ ہے۔

نماز و طواف میں مماثلت

⑯ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلٰوةِ اِلَّا اَنَّكُمْ تَتَكَلَّمُوْنَ فِيْهِ

فَمَنْ تَكَلَّمَ فِيْهِ فَلَا يَتَكَلَّمَنَّ اِلَّا بِخَيْرٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَذَكَرَ التِّرْمِذِيُّ جَمَاعَةً وَقَفُوْهُ عَلٰى ابْنِ عَبَّاسٍ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنا نماز کی مانند ہے اگرچہ تم اس میں کلام کرتے ہو، لہٰذا جو شخص طواف میں کلام کرے تو وہ (لغو ولایعنی اور غیر پسندیدہ کلام نہ ہو بلکہ) نیک کلام ہی کرے۔ (ترمذیؒ، نسائیؒ، دارمیؒ) اور امام ترمذیؒ نے ذکر کیا ہے کہ کچھ لوگ اس روایت کو حضرت ابن عباسؓ پر موقوف کرتے ہیں (یعنی یہ حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے)۔"

تشریح: نماز و طواف میں مماثلت کا تعلق ثواب سے ہے کہ جیسے نماز کا ثواب بہت زیادہ ہے ویسے ہی خانۂ کعبہ کا طواف بھی کثیر ثواب حاصل ہے۔ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ جس طرح نماز میں بات چیت اور کلام مفید ہے۔ اس طرح طواف میں کلام مفسد نہیں ہے۔ لہٰذا حدیث کی مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ کلام اور جو چیزیں کہ کلام کے حکم میں آتی ہیں جیسے کھانا پینا اور افعال کثیرہ وغیرہ طواف کے لئے مفسد نہیں ہیں۔

حدیث کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ نماز اور طواف دونوں یکساں ہیں کیونکہ ایک فرق تو خود حدیث نے بتا دیا ہے اس کے علاوہ بھی بعض چیزیں ایسی ہیں جو دونوں کے ظاہری فرق کو واضح کرتی ہیں، مثلاً آنحضرت ﷺ کے عمل سے یہ بات ثابت ہے کہ جس طرح نماز میں استقبال قبلہ اور وقت شرط ہے اسی طرح طواف میں قبلہ رو ہونا اور کسی خاص وقت کا متعین ہونا شرط نہیں ہے۔

اسی طرح نماز کی اور شرطیں جیسے طہارت حقیقیہ اور حکمیہ اور ستر کا چھپا ہونا، اگرچہ امام شافعیؒ کے نزدیک طواف کے لئے اسی درجہ میں ہیں جس درجہ میں نماز کے لئے ہیں یعنی جس طرح یہ چیزیں نماز کی شرائط میں سے ہیں کہ ان کے بغیر نماز اداء ہی نہیں ہوتی اسی طرح طواف کے لئے بھی شرط ہیں لیکن حنفیہ کے ہاں یہ چیزیں طواف کے لئے صرف واجب کے درجہ میں ہیں شرط نہیں۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ "طواف کرنا نماز کی مانند ہے" سے یہ لازم نہیں آتا کہ طواف بعینہٖ نماز کے درجہ کا عمل ہو جائے، بلکہ طواف کو نماز کی مانند کہنا خود اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ نماز طواف سے افضل ہے۔

حجر اسود کی حقیقت و ماہیت

⑰ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزَلَ الْحَجَرُ الْاَسْوَدُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهُوَ اَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ فَسَوَّدَتْهُ خَطَايَا بَنِىْ اٰدَمَ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حجر اسود بہشت سے اترا ہے یہ پتھر (پہلے) دودھ سے بھی زیادہ سفید تھا مگر ابن آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا ہے۔ (احمدؒ، ترمذیؒ) نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: وہ مقدس پتھر جسے آج حجر اسود (کالا پتھر) کہا جاتا ہے جب جنت سے اتر کر ظلم و جہل سے معمور اس دنیا میں آیا اور دنیا کے گنہ گار باسیوں نے اس کو چھونا اور اس کو ہاتھ لگانا شروع کیا تو ان کے گناہوں کی تاثیر نے اس کا رنگ بدل دیا اور وہ پتھر جو دودھ سے زیادہ سفید تھا انسانوں کے گناہوں سے سیاہ ہو گیا۔

اب غور کیجئے جب پتھر پر انسان کے گناہوں کا یہ اثر ہو سکتا ہے تو خود انسان کے قلوب پر ان گناہوں کا کیا اثر ہوتا ہوگا۔ معاذ اللہ۔

قیامت کے دن حجر اسود کی گواہی

⑱ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى الْحَجَرِ وَاللّٰهِ لَيَبْعَثَنَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَهٗ عَيْنَانِ يُبْصِرُ بِهِمَا وَلِسَانٌ يَنْطِقُ بِهٖ يَشْهَدُ عَلٰى مَنِ اسْتَلَمَهٗ بِحَقٍّ۔ (رواه الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حجر اسود کے بارہ میں فرمایا کہ "خدا کی قسم! قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے اٹھالے گا، پھر اس کو دو آنکھیں دی جائیں گی جن کے ذریعہ وہ دیکھے گا اور اس کو زبان دی جائے گی جس کے ذریعہ وہ بولے گا، چنانچہ وہ اس شخص کے حق میں گواہی دے گا جس نے حق کے ساتھ اس کو بوسہ دیا ہوگا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "جس نے حق کے ساتھ اس کو بوسہ دیا ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے ایمان، صدق اور یقین کے ساتھ اور محض طلب ثواب کی خاطر حجر اسود کو بوسہ دیا ہوگا قیامت میں وہ اس شخص کے بارہ میں گواہی دے گا کہ اس شخص نے مجھے بوسہ دیا تھا۔

یہ حدیث بھی اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے، اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ قیامت کے دن حجر اسود کو بالکل اسی طرح آنکھیں اور زبان عطا ہوں گی جس طرح ہم انسانوں کو عطا کی گئی ہیں کیونکہ اللہ رب العزت جمادات میں بینائی اور گویائی پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ اگر خون و گوشت کے ایک لوتھڑے کو دیکھنے اور بولنے کی قوت دے سکتا ہے تو اسی طرح ایک پتھر کو بھی دیکھنے اور بولنے پر قادر کر سکتا ہے۔

حجر اسود اور مقام ابراہیم جنّت کے یاقوت ہیں

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الرُّكْنَ وَالْمَقَامَ يَاقُوْتَتَانِ مِنْ يَّاقُوْتِ الْجَنَّةِ طَمَسَ اللّٰهُ نُوْرَهُمَا وَلَوْ لَمْ يَطْمِسْ نُوْرَهُمَا لَاَضَاءَ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا سرکار دو عالم ﷺ فرماتے تھے۔ حجر اسود اور مقام ابراہیم جنّت کے یاقوتوں میں سے دو یاقوت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا نور اٹھالیا ہے (تاکہ ایمان بالغیب رہے) اگر ان کا نور باقی رہتا تو اس میں شک نہیں کہ مشرق و مغرب کے درمیان ساری چیزوں کو روشن کر دیتا۔" (ترمذیؒ)

استلام حجر اسود اور طواف کی فضیلت

(۲۰) وَعَنْ عُبَيْدِ بْنِ عُمَيْرٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُزَاحِمُ عَلَى الرُّكْنَيْنِ زِحَامًا مَا رَاَيْتُ اَحَدًا مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُزَاحِمُ عَلَيْهِ قَالَ اِنْ اَفْعَلْ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ مَسْحَهُمَا كَفَّارَةٌ لِّلْخَطَايَا وَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ مَنْ طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ اُسْبُوْعًا فَاَحْصَاهُ كَانَ كَعِتْقِ رَقَبَةٍ وَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ لَا يَضَعُ قَدَمًا وَلَا يَرْفَعُ اُخْرٰى اِلَّا حَطَّ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً وَكَتَبَ لَهٗ بِهَا حَسَنَةً۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبید ابن عمیرؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ دونوں رکن یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کو ہاتھ لگانے میں لوگوں پر جس طرح سبقت حاصل کرتے تھے اس طرح میں نے رسول کریم ﷺ کے کسی بھی صحابیؓ کو (ان دونوں رکن میں سے) کسی پر سبقت کرتے ہوئے نہیں دیکھا، نیز حضرت ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش کروں تو مجھے مت روکو، کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ان دونوں رکن کو ہاتھ لگانا گناہوں کے لئے کفارہ ہے" اور میں نے آپ ﷺ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص خانہ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کرے اور اس کی محافظت کرے (یعنی طواف کے واجبات و سنن اور آداب بجا لائے) تو اس کا ثواب غلام آزاد کرنے کے ثواب کے برابر ہے" نیز میں نے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے۔ (طواف کرتے وقت) جب بھی کوئی قدم رکھتا ہے اور پھر اسے اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ قدم رکھنے کے عوض تو اس کا گناہ ختم کرتا ہے اور قدم اٹھانے کے عوض اس کے لئے نیکی لکھتا ہے (یعنی طواف کرنے والے کا جب قدم رکھا جاتا ہے تو اس سے گناہ دور کر دیا جاتا ہے اور جب قدم اٹھتا ہے تو اس کی نیکیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، اس طرح پورے طواف میں اس کے گناہ ختم ہوتے رہتے ہیں اور نیکیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے)۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "سبقت حاصل کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ حجر اسود اور رکن یمانی کے استلام کے لئے لوگوں کے ہجوم کو چیر پھاڑ کر آگے

بڑھنے اور ان دونوں رکن کو ہاتھ لگاتے، لیکن ان کی یہ سبقت اس طرح ہوتی تھی کہ لوگوں کو کوئی ایذا نہیں پہنچتی تھی، چنانچہ اگر کوئی شخص استلام کے لئے لوگوں کو دھکیلتا، گراتا ان دونوں رکن تک پہنچے اور لوگ اس کی وجہ سے ایذاء محسوس کریں تو وہ گنہ گار ہوگا، لہٰذا ہجوم کی صورت میں ہاتھ کے ذریعہ دور سے اشارہ کر لینے ہی پر اکتفا کر لینا چاہئے۔

"سات مرتبہ طواف کرے" میں تین احتمال ہیں ایک تو یہ کہ سات شوط کرے یعنی خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے اور یہ معلوم ہی ہے کہ سات شوط (چکر) کا ایک طواف ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ سات طواف کرے اور تیسرے یہ کہ سات روز تک طواف کرے۔

حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان آپ ﷺ کی دعا

(۲۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن سائب کہتے ہیں کہ میں نے سنا، رسول کریم ﷺ دونوں رکن یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان یہ (دعا) پڑھتے تھے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (ابوداؤد) اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

سعی کا حکم

(۲۲) وَعَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ اَخْبَرَتْنِي بِنْتُ اَبِي تُجْرَاةَ قَالَتْ دَخَلْتُ مَعَ نِسْوَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ دَارَ اٰلِ اَبِي حُسَيْنٍ نَنْظُرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَسْعٰى بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ فَرَاَيْتُهُ يَسْعٰى وَاِنَّ مِئْزَرَهُ لَيَدُوْرُ مِنْ شِدَّةِ السَّعْيِ وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ اسْعَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ۔ رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوٰى اَحْمَدُ مَعَ اخْتِلَافٍ۔

"اور حضرت صفیہ بنت شیبہ کہتی ہیں کہ ابو تجراۃ کی بیٹی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں قریش کی عورتوں کے ساتھ آل ابوحسن کے گھر گئی تاکہ ہم رسول اللہ ﷺ کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے دیکھیں (اور اس طرح ہم آپ ﷺ کے جمال باکمال سے مشرف اور آپ ﷺ کے عمل و برکت سے مستفید ہوں) چنانچہ میں نے آپ ﷺ کو صفا و مروہ کے درمیان اس طرح سعی کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ ﷺ کا تہ بند سعی (دوڑنے) میں تیزی کی وجہ سے (آپ ﷺ کے پیروں کے گرد) گھوم رہا تھا، نیز میں نے سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے کہ "سب لوگ سعی کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے سعی کو لکھ دیا ہے" (شرح السنۃ) اس روایت کو احمد نے بھی کمی بیشی کے ساتھ نقل کیا ہے۔"

تشریح: پہلے بتایا جا چکا ہے کہ صفا و مروہ پہاڑیوں کے درمیان سات مرتبہ چکر لگانے کو سعی کہتے ہیں جو حج کا ایک اہم رکن ہے صفا اور مروہ کی پہاڑیاں اب باقی نہیں رہی ہیں دونوں کٹ کٹا کر ختم ہو گئی ہیں صرف ان کی جگہیں متعین ہیں جہاں چند سیڑھیاں بنا دی گئی ہیں، دونوں میں آپس کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کا ہے۔ یہ بھی پہلے بتایا جا چکا ہے یہ "سعی" درحقیقت حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی اس بھاگ دوڑ اور اضطراب کی یادگار ہے جس میں وہ اپنے شیر خوار بچے حضرت اسمٰعیلؑ کی پیاس بجھانے کے لئے پانی کی تلاش میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان مبتلا ہوئی تھیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمزم شریف پیدا فرمایا تھا، اسلام سے قبل عربوں نے ان دونوں پہاڑیوں پر ایک ایک بت رکھ دیا تھا صفا کے بت کا نام "اساف" تھا اور مروہ کے بت کا نام "نائلہ" تھا۔ صفا کی پہاڑی جبل ابوقبیس کے دامن میں تھی وہیں سے سعی شروع کی جاتی ہے، صفا اور مروہ کے درمیان وہ راستہ جس پر سعی کی جاتی ہے اور جسے مسعیٰ کہتے ہیں بیت اللہ کے مشرقی جانب ہے، یہ پہلے مسجد حرام سے باہر تھا، اب اس کے ساتھ ہی شامل کر دیا گیا ہے۔

حدیث کے الفاظ فان اللّٰہ کتب علیکم السعی کے معنی حضرت شافعیؒ تو یہ مراد لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کو فرض کیا ہے، چنانچہ ان کے نزدیک صفا و مروہ کے درمیان سعی فرض ہے اگر کوئی شخص سعی نہیں کرے گا تو اس کا حج باطل ہو جائے گا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے ہاں چونکہ سعی فرض نہیں ہے بلکہ واجب ہے اس لئے وہ اس جملہ کے یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کو واجب کیا ہے"، حنفی مسلک کے مطابق اگر کوئی شخص سعی ترک کرے تو اس پر دم یعنی دنبہ وغیرہ ذبح کرنا واجب ہو جاتا ہے حج باطل نہیں ہوتا۔

پیادہ پا سعی کرنا واجب ہے

(۲۳) وَعَنْ قُدَامَةَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمَّارٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْعٰى بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ عَلٰى بَعِيْرٍ لَا ضَرْبَ وَلَا طَرْدَ وَلَا اِلَيْكَ اِلَيْكَ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"اور حضرت قدامہؓ ابن عبداللہ ابن عمار کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو صفا و مروہ کے درمیان اونٹ پر (سوار ہو کر) سعی کرتے دیکھا ہے (اور اس وقت) نہ مارنا تھا نہ ہانکنا تھا اور نہ ہٹو بچو کی آوازیں تھیں۔" (شرح السنۃ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر سعی کی جب کہ اوپر کی حدیث اور بعض دوسری احادیث سے یہ ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے پیادہ پا سعی کی ہے۔ لہٰذا احادیث کے اس تضاد کو یوں ختم کیا جائے کہ کسی سعی میں تو آپ ﷺ پیادہ پا تھے اور کسی وقت آپ ﷺ نے تعلیم اُمت کی خاطر یا کسی عذر کی وجہ سے اونٹ پر سوار ہو کر سعی کی چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق بشرط قدرت پیادہ پا سعی کرنا واجب ہے اگر کوئی شخص بلا عذر سواری وغیرہ پر سعی کرے گا تو اس پر دم (جانور ذبح کرنا) واجب ہو گا۔

حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ اونٹ پر سوار ہو کر سعی کر رہے تھے تو اس وقت اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے اور اظہار شان کی خاطر نہ تو کسی کو مارتے دھکیلتے تھے اور نہ ہاتھ وغیرہ سے کسی کو ہٹاتے تھے اور نہ ہی ہٹو بچو کی ہانک لگاتے تھے جیسا کہ امراء و سلاطین اور حکام نیز ظالم و مغرور لوگوں کی عادت ہے، گویا اس جملہ کے ذریعہ ایسے لوگوں کو غیرت دلانا اور ان پر طعن مقصود ہے جو اس قسم کی حرکت کرتے ہیں۔

طواف میں اضطباع

(۲۴) وَعَنْ يَعْلَى ابْنِ اُمَيَّةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَافَ بِالْبَيْتِ مُضْطَبِعًا بِبُرْدٍ اَخْضَرَ۔

(رواہ الترمذی والبوداؤد ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت یعلی ابن امیہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس حالت میں طواف کیا کہ آپ ﷺ سبز (دھاریوں والی) چادر کے ذریعہ اضطباع کئے ہوئے تھے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: پہلے بتایا جا چکا ہے کہ چادر کو اس طرح اوڑھنا کہ اسے دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کاندھے پر ڈال لیا جائے "اضطباع" کہلاتا ہے۔ طواف کے وقت اس طرح چادر اوڑھنے کی وجہ بھی پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

طواف میں اضطباع سُنّت ہے

(۲۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابَهُ اعْتَمَرُوْا مِنَ الْجِعْرَّانَةِ فَرَمَلُوْا بِالْبَيْتِ ثَلَاثًا وَجَعَلُوْا اَرْدِيَتَهُمْ تَحْتَ اٰبَاطِهِمْ ثُمَّ قَذَفُوْهَا عَلٰى عَوَاتِقِهِمُ الْيُسْرٰى۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے جعرانہ سے (کہ جو مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے) عمرہ کیا، چنانچہ سب نے خانۂ کعبہ کے طواف کے (پہلے) تین پھیروں میں رمل کیا نیز انہوں نے (طواف میں) اپنی چادروں کو (دائیں) بغل کے نیچے سے نکال کر اپنے بائیں کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اضطباع پورے طواف میں سُنّت ہے جب کہ رمل یعنی تیز اور اکڑ کر چلنا طواف کے پہلے دو تین پھیروں میں ہوتا ہے اتنی بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ "اضطباع" صرف طواف کے وقت ہی مستحب ہے، طواف کے علاوہ اوقات میں مستحب نہیں ہے، نیز بعض لوگ جو ابتداء احرام ہی سے اضطباع اختیار کر لیتے ہیں اس کی بھی کوئی اصل نہیں بلکہ نماز کی حالت میں یہ مکروہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

استلام حجر اسود و رکن یمانی کی اہمیت

(۲۶) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَا تَرَكْنَا اسْتِلَامَ هٰذَيْنِ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيِّ وَالْحَجَرِ فِي شِدَّةٍ وَلَا رَخَاءٍ مُنْذُ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَلِمُهُمَا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لَهُمَا قَالَ نَافِعٌ رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يَسْتَلِمُ الْحَجَرَ بِيَدِهٖ ثُمَّ قَبَّلَ يَدَهٗ وَقَالَ مَا تَرَكْتُهٗ مُنْذُ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهٗ۔

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب سے میں نے رسول کریم ﷺ کو دونوں رکن استلام کرتے دیکھا ہے ہم نے ان دونوں رکن یعنی رکن یمانی اور حجر اسود کا استلام نہ کبھی بھیڑ میں چھوڑا ہے اور نہ چھیڑ میں (یعنی کسی حال میں بھی ہم نے اس سعادت کو ترک نہیں کیا ہے) (بخاریؒ و مسلمؒ) نیز بخاریؒ و مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت نافعؒ نے کہا "میں نے حضرت ابن عمرؓ کو دیکھا کہ وہ حجر اسود کو ہاتھ سے چھوتے اور پھر اس ہاتھ کو چومتے اور فرماتے کہ جب سے میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ کرتے ہوئے دیکھا ہے میں نے کبھی اس کو ترک نہیں کیا۔"

بسبب عذر سوار ہو کر طواف کرنا جائز ہے

(۲۷) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ شَكَوْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنِّيْ اَشْتَكِيْ فَقَالَ طُوْفِيْ مِنْ وَرَاءِ النَّاسِ وَاَنْتِ رَاكِبَةٌ فَطُفْتُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ اِلٰى جَنْبِ الْبَيْتِ يَقْرَأُ بِالطُّوْرِ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے (حج کے دنوں میں) رسول کریم ﷺ سے شکایت کی (کہ میں بیمار ہوں جس کی وجہ سے پیادہ پا طواف نہیں کر سکتی) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم لوگوں سے ایک طرف ہو کر سواری پر طواف کر لو۔ چنانچہ میں نے اسی طرح طواف کیا، اور (میں نے اس دوران دیکھا کہ) رسول کریم ﷺ بیت اللہ کے پہلو میں (یعنی خانہ کعبہ کی دیوار سے متصل) نماز پڑھ رہے تھے اور نماز میں والطور و کتاب مسطور کی قرأت فرما رہے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سورۂ طور آپ ﷺ نے ایک رکعت میں پڑھی ہوگی اور دوسری رکعت میں کوئی اور سورہ پڑھی ہوگی جیسا کہ آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی۔ یا یہ کہ سورۂ طور کو دونوں ہی رکعتوں میں پڑھا ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی عذر کی بناء پر بیت اللہ کا طواف سوار ہو کر کرنا جائز ہے بلا عذر جائز نہیں ہے کیونکہ پیادہ پا طواف کرنا واجب ہے۔

بوسہ دیتے ہوئے حجر اسود سے حضرت عمرؓ کا خطاب

(۲۸) وَعَنْ عَابِسِ بْنِ رَبِيعَةَ قَالَ رَأَيْتُ عُمَرَ يُقَبِّلُ الْحَجَرَ وَيَقُوْلُ اِنِّي لَاَعْلَمُ اَنَّكَ حَجَرٌ مَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ وَلَوْ لَا اَنِّي رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عابس ابن ربیعہ" (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا حضرت عمر فاروقؓ حجر اسود کو بوسہ دیتے تھے اور (اس کے سامنے) یہ فرماتے تھے کہ اس میں کوئی شک نہیں، میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، اگر میں رسول کریم ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں کبھی بھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد اس اعتقادی و عملی گمراہی کو روکنے کے لئے تھا کہ کہیں بعض نومسلم اس پتھر کو پوجنے ہی نہ لگیں، چنانچہ اس ارشاد سے آپ کی مراد یہی تھی کہ یہ پتھر بذات خود نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے، اگر اس کی ذات سے کوئی نفع پہنچتا ہے تو صرف اسی حد تک کہ رسول کریم ﷺ کے حکم کی تعمیل میں اس کو چومنے سے ثواب ملتا ہے۔

رکن یمانی پر دعا اور وہاں متعین فرشتوں کی آمین

(۲۹) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وُكِّلَ بِهِ سَبْعُوْنَ مَلَكًا يَعْنِي الرُّكْنَ الْيَمَانِيَّ فَمَنْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ قَالُوْا اٰمِيْنَ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "وہاں یعنی رکن یمانی پر ستر فرشتے متعین ہیں، چنانچہ جو شخص (وہاں) یہ دعا پڑھتا ہے، فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔ دعا یہ ہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (ابن ماجہ) اے اللہ! میں تجھ سے گناہوں کی معافی اور دنیا و آخرت میں عافیت مانگتا ہوں، اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔"

تشریح: رکن یمانی کی جب یہ فضیلت ہے تو حجر اسود کی فضیلت تو اس سے بھی زائد ہوگی لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ فضیلت و امتیاز صرف رکن یمانی ہی کے ساتھ مختص ہو اور حجر اسود کے لئے اس سے زائد دوسری فضیلتیں ہوں۔ اس حدیث میں اور حدیث نمبر اکیس میں کہ جس میں یہ ذکر ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان ربنا اتنا الخ پڑھتے تھے، کوئی منافات و تضاد نہیں ہے بایں طور کہ جب آپ ﷺ طواف کے دوران رکن یمانی کی طرف پہنچتے اور چلتے ہوئے یہ دعا شروع کرتے تو ظاہر ہے کہ اس دعا کا پڑھنا رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان ہی ہوتا ہوگا کیونکہ طواف کرتے ہوئے دعا کے لئے ٹھہرنا تو درست نہیں ہے۔ چنانچہ جو لوگ طواف کے دوران ٹھہر کر دعا پڑھتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔

طواف کی حالت میں تسبیح و تہلیل وغیرہ کی فضیلت

(۳۰) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ طَافَ بِالْبَيْتِ سَبْعًا وَّلَا يَتَكَلَّمُ اِلَّا بِسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مُحِيَتْ عَنْهُ عَشْرُ سَيِّئَاتٍ وَكُتِبَ لَهُ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَرُفِعَ لَهُ عَشْرُ دَرَجَاتٍ وَمَنْ طَافَ فَتَكَلَّمَ وَهُوَ فِي تِلْكَ الْحَالِ خَاضَ فِي الرَّحْمَةِ بِرِجْلَيْهِ كَخَائِضِ الْمَاءِ بِرِجْلَيْهِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص خانۂ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کرے اور (طواف کے دوران) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کے علاوہ اور کوئی کلام نہ کرے تو اس کے دس گناہ

محو کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور اس کے درجے بلند کر دیئے جاتے ہیں، اور جو شخص طواف کرے اور اس (طواف کرنے کی) حالت میں کلام کرے تو وہ اپنے دونوں پاؤں کے ساتھ دریائے رحمت میں اسی طرح داخل ہوتا ہے جس طرح کوئی اپنے پاؤں کے ساتھ پانی میں داخل ہوتا ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص طواف کی حالت میں تسبیح و تکبیر اور تہلیل وغیرہ میں مشغول رہتا ہے اس کے گناہ دور ہوتے رہتے ہیں اس کی نیکیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے درجات میں بلندی عطا فرمائی جاتی ہے۔

دوسرا جزو "اور جو شخص طواف کرے اور اسی حالت میں کلام کرے" درحقیقت پہلے ہی جزو کی تکرار ہے اور "اس حالت میں کلام کرے" میں کلام سے مراد تسبیح و تکبیر وغیرہ کے مذکورہ بالا کلمات پڑھنا ہیں، دوبارہ اس بات کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے، تاکہ طواف کی حالت میں ان کلمات کا مزید ثواب بیان کیا جائے کہ ایک ثواب تو وہ ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے اور ایک ثواب یہ ہے۔ لیکن علماء یہ بھی لکھتے ہیں کہ حدیث کے اس دوسرے جزء میں "کلام" سے مراد تسبیح و تکبیر وغیرہ کے مذکورہ بالا کلمات کے علاوہ دوسرے قسم کے اذکار اور اولیاء کرام و مشائخ عظام کے منقولات و ارشادات وغیرہ ہیں۔

بَابُ الْوُقُوْفِ بِعَرَفَةَ

وقوف عرفات کا بیان

"عرفہ" ایک مخصوص جگہ کا نام ہے اور یہ زمان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے بایں طور کہ نویں ذی الحجہ کو عرفہ کا دن کہتے ہیں۔ لیکن "عرفات" جمع کے لفظ کے ساتھ صرف اس مخصوص جگہ ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ جمع اطراف و جوانب کے اعتبار سے ہے۔

"عرفات" مکہ مکرمہ سے تقریباً ساڑھے پندرہ میل (پچیس کلومیٹر) کے فاصلہ پر واقع ہے یہ ایک وسیع وادی یا میدان ہے جو اپنے تین طرف سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، درمیان میں اس کے شمالی جانب جبل الرحمۃ ہے۔

عرفات کی وجہ تسمیہ کے متعلق بہت اقوال ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ جب جنت سے اتر کر اس دنیا میں آئے تو وہ دونوں سب سے پہلے اسی جگہ ملے۔ اس تعارف کی مناسبت سے اس کا نام عرفہ پڑ گیا ہے اور یہ جگہ عرفات کہلائی۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب اس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو افعال حج کی تعلیم دے رہے تھے تو وہ اس دوران ان سے پوچھتے کہ عرفت (یعنی جو تعلیم میں نے دی ہے) تم نے اسے جان لیا؟ حضرت ابراہیمؑ جواب میں کہتے عرفت (ہاں میں نے جان لیا) اور آخر کار دونوں کے سوال و جواب میں اس کلمہ کا استعمال اس جگہ کی وجہ تسمیہ بن گیا۔ ان کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔

وقوف عرفات یعنی نویں ذی الحجہ کو ہر حاجی کا میدان عرفات میں پہنچنا اس کی ادائیگی حج کے سلسلہ میں ایک سب سے بڑا رکن ہے جس کے بغیر حج نہیں ہوتا، چنانچہ حج کے دو رکنوں یعنی طواف الافاضہ اور وقوف عرفات میں وقوف عرفات چونکہ حج کا سب سے بڑا رکن ہے اس لئے اگر یہ ترک ہو گیا تو حج ہی نہیں ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عرفہ کے دن تکبیر و تلبیہ کا مسئلہ

(۱) عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِيْ بَكْرٍ الثَّقَفِيِّ اَنَّهُ سَاَلَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ وَهُمَا غَادِيَانِ مِنْ مِنًى اِلَى عَرَفَةَ كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ فِيْ هٰذَا الْيَوْمِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كَانَ يُهِلُّ مِنَّا الْمُهِلُّ فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ وَيُكَبِّرُ الْمُكَبِّرُ مِنَّا فَلَا يُنْكَرُ

عَلَیْهِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت محمد بن ابوبکر ثقفی (تابعیؒ) کے بارہ میں منقول ہے انہوں نے حضرت انسؓ سے پوچھا جب کہ وہ دونوں صبح کے وقت منیٰ سے عرفات جا رہے تھے، کہ آپ لوگ رسول کریم ﷺ کے ساتھ اس (عرفہ کے) دن کیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ "ہم میں سے لبیک کہنے والا لبیک کہا کرتا تھا اور اس کو اس سے منع نہیں کیا جاتا تھا اور تکبیر کہنے والا تکبیر کہا کرتا تھا اور اس کو اس سے منع نہیں کیا جاتا تھا۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن حاجیوں کو تکبیر کہنی جائز تو ہے جیسا کہ اور اذکار جائز ہیں لیکن سُنّت نہیں ہے بلکہ اس دن ان کے لئے سُنّت تلبیہ میں مصروف رہنا ہے جب تک کہ وہ جمرۂ عقبہ کی رمی سے فارغ نہ ہو جائیں۔

یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ عرفہ کی صبح سے ایام تشریق کے آخر یعنی ذی الحجہ کی تیرھویں تاریخ کی عصر تک ہر فرض نماز پڑھنے والے کے لئے خواہ حج میں ہو یا حج کے علاوہ ہو تکبیر کہنی واجب ہے۔

منیٰ میں قربانی اور عرفات و مزدلفہ میں وقوف کی جگہ

(۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَحَرْتُ هٰهُنَا وَمِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ فَانْحَرُوْا فِىْ رِحَالِكُمْ وَوَقَفْتُ هٰهُنَا وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ وَوَقَفْتُ هٰهُنَا وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میں نے تو اس جگہ قربانی کی ہے ویسے منیٰ میں ہر جگہ قربان گاہ ہے لہٰذا تم اپنے ڈیروں میں قربانی کرو اور میں نے تو اس جگہ وقوف کیا ہے ویسے عرفات میں ہر جگہ موقف ہے اور میں نے تو اس جگہ وقوف کیا ہے ویسے مزدلفہ کی ہر جگہ موقف ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اس جگہ" سے آنحضرت ﷺ نے منیٰ کی اس خاص جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں آپ ﷺ نے قربانی کی، چنانچہ یہ جگہ "منحر النبی" (نبی کریم ﷺ کے قربانی کرنے کی جگہ) کہی جاتی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے اس جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے تو یہاں قربانی کی ہے ویسے منیٰ میں کسی بھی جگہ قربانی کی جا سکتی ہے کیونکہ وہاں ہر جگہ قربانی کرنا سُنّت ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے عرفات میں اپنے وقوف کی جگہ اشارہ کر کے فرمایا کہ میں تو عرفات میں اس جگہ ٹھہرا ہوں ویسے عرفات کی جگہ سوائے وادی عرفہ کے وقوف کیا جا سکتا ہے۔

مزدلفہ کو "جمع" بھی کہتے ہیں چنانچہ آپ ﷺ نے یہاں کے بارہ میں اپنے وقوف کے جگہ کی طرف کہ جو مشعر حرام کے قریب ہے اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے تو یہاں وقوف کیا ہے ویسے مزدلفہ میں کسی بھی جگہ علاوہ وادی محسر کے وقوف کیا جا سکتا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ منیٰ میں کسی بھی جگہ قربانی کی جا سکتی ہے، عرفات اور مزدلفہ میں کسی بھی جگہ علاوہ وادی عرفہ اور وادی محسر کے وقوف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس جگہ قربانی کی ہے، جس جگہ وقوف کیا ہے، اسی جگہ قربانی کرنا یا وقوف کرنا بہر حال افضل ہے۔

عرفہ کے دن کی فضیلت

(۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ يَوْمٍ اَكْثَرَ مِنْ اَنْ يُعْتِقَ اللّٰهُ فِيْهِ عَبْدًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ وَاِنَّهُ لَيَدْنُوْ ثُمَّ يُبَاهِىْ بِهِمُ الْمَلَائِكَةَ فَيَقُوْلُ مَا اَرَادَ هٰؤُلَاءِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ایسا کوئی دن نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ بندہ کو عرفہ کے دن سے زیادہ آگ سے

آزاد کرتا ہو (یعنی اس عرفہ کے دن عرفات میں اللہ تعالیٰ سب دنوں سے زیادہ بندوں کو آگ سے نجات اور رستگاری کا پروانہ عطا فرماتا ہے) اور بلاشبہ (اس دن) اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت و مغفرت کے ساتھ) بندوں کے قریب ہوتا ہے پھر فرشتوں کے سامنے حج کرنے والوں پر فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ (یہ جو کچھ بھی چاہتے ہیں) میں انہیں وہ دوں گا۔" (مسلم)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

امام کے موقف سے بُعد میں کوئی مضائقہ نہیں

④ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ صَفْوَانَ عَنْ خَالٍ لَهُ يَزِيْدُ ابْنُ شَيْبَانَ قَالَ كُنَّا فِيْ مَوْقِفٍ لَنَا بِعَرَفَةَ يُبَاعِدُهُ عَمْرٌو مِنْ مَوْقِفِ الْاِمَامِ جِدًّا فَاَتَانَا ابْنُ مِرْبَعٍ الْاَنْصَارِيُّ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْكُمْ يَقُوْلُ لَكُمْ قِفُوْا عَلٰى مَشَاعِرِكُمْ فَاِنَّكُمْ عَلٰى اِرْثٍ مِنْ اِرْثِ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"حضرت عمرو بن عبداللہ بن صفوان (تابعی) اپنے ماموں سے کہ جن کا نام یزید ابن شیبان تھا، نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "ہم میدان عرفات میں اس جگہ پر ٹھہرے ہوئے تھے جو ہمارے لئے متعین تھی" اور عمرو اس جگہ کو امام کے موقف (ٹھہرنے کی جگہ) سے بہت دور بیان کرتے تھے، چنانچہ ابن مربع الانصاری ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں رسول کریم ﷺ کا ایلچی بن کر تمہارے پاس آیا ہوں اور آنحضرت ﷺ کا تمہارے لئے یہ پیغام ہے کہ تم لوگ اپنے مشاعر (یعنی اپنی عبادت کی جگہ) ٹھہرے رہو کیونکہ تم اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی میراث (کی پیروی) پر قائم ہو۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: عرب میں زمانہ اسلام سے پہلے یہ دستور تھا کہ میدان عرفات میں ہر قبیلہ اور ہر قوم کے لئے الگ الگ ایک جگہ موقف کے لئے متعین ہوتی تھی، ہر شخص اسی جگہ وقوف کرتا جو اس کی قوم کے لئے متعین ہوتی، چنانچہ حضرت یزید بن شیبان کے قبیلہ کا موقف جس جگہ تھا وہ جگہ اس مقام سے بہت دور تھی جہاں آنحضرت ﷺ نے وقوف فرمایا تھا، لہٰذا حدیث "امام کے موقف" سے مراد آنحضرت ﷺ کا موقف ہے۔

بہر کیف میدان عرفات میں آنحضرت ﷺ سے اس دوری اور بعد کی بنا پر یزید بن شیبان نے چاہا کہ آنحضرت ﷺ سے یہ عرض کریں کہ آپ ﷺ ہمیں بھی اپنے قریب ہی وقوف کرنے کی اجازت عطا فرمائیں۔ آنحضرت ﷺ نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ اس بات کی درخواست کرنے والے ہیں تو آپ ﷺ نے ایک صحابیؓ کے ذریعہ کہ جن کا نام ابن مربع تھا یہ پیغام بھیجا کہ تم لوگ اپنے قدیمی موقف ہی پر وقوف کرو، چنانچہ حدیث میں "مشاعر" سے مراد ان کا قدیمی موقف ہے اور تم لوگ اپنے اس موقف سے جو تمہارے باپ دادا سے تمہارے لئے متعین چلا آرہا ہے منتقل ہونے کی خواہش نہ کرو، کیونکہ اول تو پورا میدان عرفات موقف ہے۔ دوسرے یہ کہ میدان عرفات میں امام کے موقف کی دوری یا نزدیکی سے کوئی فرق نہیں پڑتا پھر یہ کہ اگر ہر شخص یہی خواہش کرنے لگے کہ میں اپنے امام اور اپنے امیر کے قریب ہی وقوف کروں تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے یہ بات ان کی تسلی کے لئے کہلائی تاکہ آپس میں نزاع و اختلاف کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔

حدود حرم میں ہر جگہ قربانی کی جا سکتی ہے

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُلُّ عَرَفَةَ مَوْقِفٌ وَكُلُّ مِنًى مَنْحَرٌ وَكُلُّ الْمُزْدَلِفَةِ مَوْقِفٌ وَكُلُّ فِجَاجِ مَكَّةَ طَرِيْقٌ وَمَنْحَرٌ۔ (رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا پورا میدان عرفات ٹھہرنے کی جگہ ہے، سارا منیٰ قربان گاہ ہے، سارا مزدلفہ

ٹھہرنے کی جگہ ہے اور مکہ کا ہر راستہ (اور اس کی ہر گلی) راستہ اور قربانی کی جگہ ہے۔" (ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: حدیث کے آخری کلمات کا مطلب یہ ہے کہ جس راستہ سے بھی مکہ میں جائیں درست ہے اور مکہ میں جس جگہ چاہیں قربانی کا جانور ذبح کریں جائز ہے کیونکہ قربانی کا جانور حرم میں ذبح کرنا چاہئے اور مکہ حرم میں واقع ہے، یہ اور بات ہے کہ قربانی کا جانور منی ہی میں ذبح کرنے کا دستور بن گیا ہے کیونکہ قربانی کے دن کہ وہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ ہے حاجی منی میں ہوتے ہیں اس لئے اپنی قربانی بھی وہیں کرتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات بیان جواز کی خاطر ارشاد فرمائی ورنہ تو وہی جگہ افضل ہے جہاں آپ ﷺ نے وقوف فرمایا جہاں آپ ﷺ نے قربانی کا جانور ذبح کیا اور وہی راستہ افضل ہے جس سے آپ ﷺ مکہ آئے۔

آپ ﷺ نے خطبہ کس طرح ارشاد فرمایا؟

(٦) وَعَنْ خَالِدِ بْنِ هَوْذَةَ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ النَّاسَ يَوْمَ عَرَفَةَ عَلٰى بَعِيْرٍ قَائِمًا فِي الرِّكَابَيْنِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت خالد بن ہوذہؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا نبی کریم ﷺ عرفہ کے دن (میدان عرفات میں) اونٹ کے اوپر دونوں رکابوں پر کھڑے ہوئے لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بلندی پر ہونے کے لئے آپ ﷺ رکابوں پر کھڑے ہوئے اور پھر آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا تاکہ دور و نزدیک کے سبھی لوگ آپ ﷺ کا خطبہ سن سکیں۔

یوم عرفہ کی دعا

(٧) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُ الدُّعَاءِ دُعَاءُ يَوْمِ عَرَفَةَ وَخَيْرُ مَا قُلْتُ اَنَا وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ قَبْلِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوٰى مَالِكٌ عَنْ طَلْحَةَ ابْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ اِلٰى قَوْلِهٖ لَا شَرِيْكَ لَهٗ۔

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (حضرت شعیبؒ) سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمروؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ سب سے بہتر دعا عرفہ کے دن کی ہے (خواہ وہ میدان عرفات میں مانگی جائے یا کسی بھی جگہ) اور ان کلمات میں کہ جو میں نے یا مجھ سے پہلے کے نبیوں نے (بطور دعا) پڑھے ہیں سب سے بہتر یہ کلمات ہیں: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو یکتا و تنہا ہے؟ اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، نیز مالکؒ نے اس روایت کو طلحہ بن عبیداللہ سے الفاظ لَا شَرِيْكَ لَهٗ تک نقل کیا ہے۔"

یوم عرفہ شیطان کی سب سے زیادہ ذلت و خواری کا دن ہے

(٨) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ كَرِيْزٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا رَاَى الشَّيْطَانُ يَوْمًا هُوَ فِيْهِ اَصْغَرُ وَلَا اَدْحَرُ وَلَا اَحْقَرُ وَلَا اَغْيَظُ مِنْهُ فِيْ يَوْمِ عَرَفَةَ وَمَا ذَاكَ اِلَّا لِمَا يَرٰى مِنْ تَنَزُّلِ الرَّحْمَةِ وَتَجَاوُزِ اللّٰهِ عَنِ الذُّنُوْبِ الْعِظَامِ اِلَّا مَا رَاٰى يَوْمَ بَدْرٍ فَقِيْلَ مَا رُئِيَ يَوْمَ بَدْرٍ؟ قَالَ فَاِنَّهٗ قَدْ رَاٰى جِبْرِيْلَ يَزَعُ الْمَلَائِكَةَ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلًا وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ۔

"اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ بن کریز کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، ایسا کوئی دن نہیں ہے جس میں شیطان کو اتنا زیادہ ذلیل ورانده اور اتنا زیادہ حقیر پر غیظ دیکھا گیا ہو جتنا کہ وہ عرفہ کے دن ہوتا ہے (یعنی یوں تو شیطان ہمیشہ ہی آدمیوں کو نیکیاں کرتا ہوا دیکھ کر پر غیظ و حقیر ہوتا ہے مگر عرفہ کے دن سب دنوں سے زیادہ پر غیظ بھی ہوتا ہے اور ذلیل وخوار بھی) اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ (اس دن ہر خاص وعام پر) اللہ کی نازل ہوتی ہوئی رحمت اور اس کی طرف سے بڑے بڑے گناہوں کی معافی دیکھتا ہے۔ ہاں بدر کے دن بھی شیطان کو ایسا ہی دیکھا گیا تھا (یعنی غزوۂ بدر کے دن جب مسلمانوں کو عزت اور اسلام کو شوکت حاصل ہوئی تو اس دن بھی شیطان عرفہ ہی کے دن کی طرح یا اس سے بھی زیادہ ذلیل وخوار اور پر غیظ تھا) چنانچہ (بدر کے دن) شیطان نے دیکھا تھا کہ حضرت جبرئیل (مشرکین سے لڑنے کے لئے) فرشتوں کی صفوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ اس روایت کو امام مالکؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے، نیز شرح السنۃ میں یہ روایت مصابیح کے الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔"

یوم عرفہ کی فضیلت

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ عَرَفَةَ اِنَّ اللّٰهَ يَنْزِلُ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيُبَاهِيْ بِهِمُ الْمَلَائِكَةَ فَيَقُوْلُ انْظُرُوْا اِلٰى عِبَادِىْ اَتَوْنِىْ شُعْثًا غُبْرًا ضَاجِّيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ اُشْهِدُكُمْ اَنِّىْ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ فَيَقُوْلُ الْمَلَائِكَةُ يَا رَبِّ فَلَانٌ كَانَ يُرْهَقُ وَفُلَانٌ وَفُلَانَةٌ قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا مِنْ يَوْمٍ اَكْثَرَ عَتِيْقًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے (یعنی رحمت اور احسان وکرم کے ساتھ قریب ہوتا ہے) اور پھر فرشتوں کے سامنے حاجیوں پر فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ذرا میرے بندوں کی طرف تو دیکھو، یہ میرے پاس پراگندہ بال، گرد آلود اور لبیک وذکر کے ساتھ) آوازیں بلند کرتے ہوئے دور، دور سے آئے ہیں، میں تمہیں اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا، (یہ سن کر) فرشتے کہتے ہیں کہ "پروردگار! (ان میں) فلاں شخص وہ بھی ہے جس کی طرف گناہ کی نسبت کی جاتی ہے اور فلاں شخص اور فلاں عورت بھی ہے جو گنہ گار ہیں! آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے انہیں بھی بخش دیا" پھر رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ایسا کوئی دن نہیں ہے جس میں یوم عرفہ کی برابر لوگوں کو آگ سے نجات ورستگاری کا پروانہ عطا کیا جاتا ہو۔" (شرح السنۃ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عرفات میں وقوف کا حکم

⑩ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ قُرَيْشٌ وَمَنْ دَانَ دِيْنَهَا يَقِفُوْنَ بِالْمُزْدَلِفَةِ وَكَانَ يُسَمُّوْنَ الْحُمْسَ فَكَانَ سَائِرُ الْعَرَبِ يَقِفُوْنَ بِعَرَفَةَ فَلَمَّا جَاءَ الْاِسْلَامُ اَمَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى نَبِيَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّاْتِىَ عَرَفَاتٍ فَيَقِفُ بِهَا ثُمَّ يُفِيْضُ مِنْهَا فَذٰلِكَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ (متفق علیہ)

"اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ قریش اور وہ لوگ جو قریش کے طریقہ کے پابند تھے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے اور قریش کو حمس یعنی بہادر وشجاع کہا جاتا تھا۔ (قریش کے علاوہ) اور تمام اہل عرب میدان عرفات میں وقوف کرتے تھے، لیکن جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ میدان عرفات میں آئیں، وہاں وقوف کریں اور پھر وہاں سے واپس ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوتے ہیں وہیں سے تم بھی واپس ہو، کے یہی معنی ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "مزدلفہ" حدود حرم میں واقع ہے، جب کہ عرفات حرم سے باہر ہے۔ چنانچہ قریش اور ان کے حواری دوسرے لوگوں پر اپنی برتری اور فوقیت جتانے کے لئے مزدلفہ میں وقوف کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم "اہل اللہ" ہیں اور اللہ کے حرم کے باشندہ ہیں اس لئے ہم حرم سے باہر وقوف نہیں کر سکتے، قریش کے علاوہ اور تمام اہل عرب قاعدہ کے مطابق میدان عرفات ہی میں قیام کرتے تھے۔ چنانچہ جب اسلام کی روشنی نے طبقاتی اونچ نیچ کی تاریکیوں کو ختم کر دیا اور قبیلہ وذات کے دنیاوی فرق و امتیاز کو مٹاڈالا تو یہ حکم دیا گیا کہ جس طرح تمام لوگ میدان عرفات میں وقوف کرتے ہیں اسی طرح قریش بھی میدان عرفات ہی میں وقوف کریں اور اس طرح اپنے درمیان امتیاز و فوقیت کی کوئی دیوار کھڑی نہ کریں۔

مزدلفہ میں آنحضرت ﷺ کی دعا کی قبولیت اور ابلیس کا واویلا

(۱۱) وَعَنْ عَبَّاسِ بْنِ مِرْدَاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَا لِاُمَّتِهٖ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ بِالْمَغْفِرَةِ فَاُجِيْبَ اَنِّيْ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ مَاخَلَا الْمَظَالِمَ فَاِنِّيْ اٰخُذُ لِلْمَظْلُوْمِ مِنْهُ قَالَ اَيْ رَبِّ اِنْ شِئْتَ اَعْطَيْتَ الْمَظْلُوْمَ مِنَ الْجَنَّةِ وَغَفَرْتَ لِلظَّالِمِ فَلَمْ يُجَبْ عَشِيَّتَهٗ فَلَمَّا اَصْبَحَ بِالْمُزْدَلِفَةِ اَعَادَ الدُّعَاءَ فَاُجِيْبَ اِلٰى مَاسَأَلَ قَالَ فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ قَالَ تَبَسَّمَ فَقَالَ لَهٗ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ اِنَّ هٰذِهٖ لَسَاعَةٌ مَا كُنْتَ تَضْحَكُ فِيْهَا فَمَا الَّذِيْ اَضْحَكَكَ اَضْحَكَ اللّٰهُ سِنَّكَ قَالَ اِنَّ عَدُوَّ اللّٰهِ اِبْلِيْسَ لَمَّا عَلِمَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدِ اسْتَجَابَ دُعَائِيْ وَغَفَرَ لِاُمَّتِيْ اَخَذَ التُّرَابَ فَجَعَلَ يَحْثُوْهُ عَلٰى رَاسِهٖ وَيَدْعُوْ بِالْوَيْلِ وَالثُّبُوْرِ فَاَضْحَكَنِيْ مَارَاَيْتُ مِنْ جَزْعِهٖ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ كِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ نَحْوَهٗ۔

"اور حضرت عباس بن مرداسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے عرفہ کی شام کو اپنی اُمت کے لئے بخشش کی دعا مانگی، جو قبول کی گئی اور (حق تعالیٰ نے فرمایا کہ) میں نے آپ (ﷺ) کی اُمت کو بخش دیا۔ علاوہ بندوں کے حقوق کے کہ میں ظالم سے مظلوم کا حق لوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے عرض کیا کہ "میرے پروردگار! اگر تو چاہے تو مظلوم کو (اس حق کے بدلہ میں کہ جو ظالم نے کیا ہے) جنت کی نعمتیں عطا فرمادے اور ظالم کو بھی بخش دے۔" مگر عرفہ کی شام کو یہ دعا قبول نہیں کی گئی، جب مزدلفہ میں صبح ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے پھر وہی دعا کی، اور آپ ﷺ نے جو چیز مانگی وہ عطا فرمادی گئی۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہنسے یا راوی نے یہ کہا کہ آپ ﷺ مسکرائے، (یہ دیکھ کر) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ "میرا باپ اور میری ماں آپ (ﷺ) پر قربان، یہ ایسا وقت ہے جس میں آپ ﷺ ہنستے نہیں تھے (یعنی یہ وقت ہنسنے کا تو نہیں ہے) پھر کس چیز نے آپ ﷺ کو ہنسایا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ ﷺ کے دانتوں کو ہنستا رکھے (یعنی اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "دشمن خدا ابلیس کو جب یہ معلوم ہوا کہ اللہ بزرگ و برتر نے میری دعا قبول کر لی ہے اور میری اُمت کو بخش دیا تو اس نے مٹی لی اور اسے اپنے سر پر ڈالنے لگا اور واویلا کرنے اور چیخنے چلانے لگا چنانچہ اس کی بدحواسی اور اضطراب نے مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔" (ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح: چونکہ اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُمت کو مغفرت عام سے نوازا گیا ہے کہ حقوق اللہ بھی بخش دیئے اور حقوق العباد بھی اس لئے بہتر یہ ہے کہ حدیث کے مفہوم میں یہ قید لگادی جائے کہ اس مغفرت عام کا تعلق ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس سال حج کے موقعہ پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، یا یہ بات اس شخص کے حق میں ہے جس کا حج مقبول ہو بایں طور کہ اس کے حج میں فسق و فجور کی کوئی بات نہ ہوئی ہو۔

یا پھر یہ کہ مفہوم اس ظالم پر محمول ہے جس کو توبہ کی توفیق ہوئی اور اس نے صدق نیت اور اخلاص کے ساتھ توبہ کی مگر حق کی واپسی سے عاجز و معذور رہا۔ پھر یہ کہ رحمت خداوندی جسے چاہے اپنے دامن میں چھپا سکتی ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا

دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے ہاں مشرک کے علاوہ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت اور مغفرت عام کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت ہر مسلمان کو حاصل ہوگی خواہ وہ صالح ہو یا گنہ گار، اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے جنت میں صالح اور نیکو کار لوگوں کے تو درجات بلند کرے گا اور اکثر گنہ گاروں کو بخش کر جنت میں داخل کرے گا۔ اب رہ گئے وہ لوگ جو دوزخ میں ہوں گے تو ان کے حق میں آنحضرت ﷺ کی شفاعت کا اثر یہ ہوگا کہ ان کے عذاب میں تخفیف اور مدت عذاب میں کمی کر دی جائے گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش بھی انشاء اللہ ہر مسلمان کو حاصل ہوگی خواہ وہ صالح ہو یا گنہ گار۔ بایں طور کہ جنت میں صالح و نیکو کاروں کے درجات اس جزاء و انعام سے زیادہ بلند ہوں گے جس کا وہ اپنے نیک اعمال کی وجہ سے مستحق ہوگا۔ اور فاجر و گنہ گار کے حق میں اس کی مغفرت یہ ہوگی کہ یا تو انہیں اپنے فضل و کرم سے بغیر عذاب ہی کے جنت میں داخل کر دے گا یا پھر ان کے عذاب کی شدت میں کمی کر دے گا جو مغفرت ہی کی ایک نوع ہے۔

بَابُ الدَّفْعِ مِنْ عَرَفَةَ وَالْمُزْدَلِفَةِ

عرفات اور مزدلفہ سے واپسی کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عرفات سے آنحضرت ﷺ کی واپسی

① عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سُئِلَ اُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسِيْرُ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ حِيْنَ دَفَعَ قَالَ كَانَ يَسِيْرُ الْعَنَقَ فَاِذَا وَجَدَ فَجْوَةً نَصَّ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ہشام بن عروہؒ اپنے والد حضرت عروہؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "حضرت اسامہ بن زیدؓ سے پوچھا گیا کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر عرفات سے واپسی میں آنحضرت ﷺ کی رفتار کیا تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ کی رفتار تیز تھی اور جہاں کہیں کشادہ راستہ ملتا (اپنی سواری) دوڑاتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ دَفَعَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ عَرَفَةَ فَسَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَاءَهٗ زَجْرًا شَدِيْدًا وَضَرْبًا لِلْاِبِلِ فَاَشَارَ بِسَوْطِهٖ اِلَيْهِمْ وَقَالَ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ عَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ فَاِنَّ الْبِرَّ لَيْسَ بِالْاِيْضَاعِ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ عرفہ کے دن (عرفات سے منیٰ کی طرف) واپسی میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے چنانچہ (ان کا بیان ہے کہ راستہ میں) آنحضرت ﷺ نے اپنے پیچھے (بلند آوازوں کے ساتھ جانوروں کو ہانکنے اور اونٹوں کو مارنے کا) شور و شغب سنا تو آپ ﷺ نے اپنے کوڑے سے لوگوں کی طرف اشارہ کیا (تاکہ لوگ متوجہ ہو جائیں اور آپ ﷺ کی بات سنیں) اور فرمایا "لوگو! آرام و اطمینان کے ساتھ چلنا تمہارے لئے ضروری ہے کیونکہ دوڑانا کوئی نیکی نہیں ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "دوڑانا کوئی نیکی نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ نیکی صرف اپنی سواری کو دوڑانے ہی میں نہیں ہے بلکہ نیکی کا اصل تعلق افعال حج کی ادائیگی اور ممنوعات سے اجتناب و پرہیز سے ہے، حاصل یہ ہے کہ نیکیوں کی طرف جلدی و مسابقت، اگرچہ پسندیدہ اور اچھی چیز ہے

لیکن ایسی جلدی و مسابقت پسندیدہ نہیں ہے جو مکروہات تک پہنچادے اور جس پر گناہ کا ترتب ہو۔ اس مفہوم کی روشنی میں اس حدیث میں اور پہلی حدیث میں منافات اور کوئی تضاد نہیں ہوگا۔

رمی جمرۂ عقبہ تک برابر تلبیہ میں مصروف رہنا سُنّت ہے

(۳) وَعَنْهُ اَنَّ اُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ كَانَ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ عَرَفَةَ اِلَى الْمُزْدَلِفَةِ ثُمَّ اَرْدَفَ الْفَضْلَ مِنَ الْمُزْدَلِفَةِ اِلٰى مِنًى فَكِلَاهُمَا قَالَ لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُلَبِّيْ حَتّٰى رَمٰى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ عرفات سے مزدلفہ تک تو اسامہ ابن زیدؓ نبی کریم ﷺ کے پیچھے بیٹھے رہے پھر آپ ﷺ نے مزدلفہ سے منیٰ تک فضلؓ کو اپنے پیچھے بٹھالیا تھا، اور ان دونوں کا بیان ہے کہ رسول کریم ﷺ برابر لبیک کہتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے جمرۂ عقبہ پر کنکری ماری (یعنی قربانی کے دن جب جمرۂ عقبہ پر پہلی ہی کنکری ماری تو تلبیہ موقوف کردیا)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

مزدلفہ میں جمع بین الصلاتین

(۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ جَمَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ بِجَمْعٍ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا بِاِقَامَةٍ وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا وَلَا عَلٰى اِثْرِ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کیا (یعنی عشاء کے وقت دونوں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا) اور ان میں سے ہر ایک کے لئے تکبیر کہی گئی (یعنی مغرب کے لئے علیحدہ تکبیر ہوئی اور عشاء کے لئے علیحدہ) اور آپ ﷺ نے نہ تو ان دونوں کے درمیان نفل نماز پڑھی اور نہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے بعد۔" (بخاریؒ)

تشریح: ان نمازوں کے بعد نفل پڑھنے کی جو نفی کی گئی ہے تو اس سے ان دونوں کے بعد سنتیں اور وتر پڑھنے کی نفی لازم نہیں آتی۔

باب قصة حجة الوداع میں حضرت جابرؓ کی جو طویل حدیث گزری ہے اس کے ان الفاظ لم یسبح بینهما شیئا کی وضاحت میں ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ جب مزدلفہ میں آپ ﷺ مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھ چکے تو مغرب و عشاء کی سنتیں اور نماز وتر بھی پڑھی۔ چنانچہ ایک روایت میں بھی یہ منقول ہے۔ نیز شیخ عابد سندھیؒ نے بھی در مختار کے حاشیہ میں اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال نقل کرنے کے بعد یہی لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ آپ ﷺ نے عشاء کی نماز کے بعد سنتیں اور وتر پڑھی۔

(۵) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى صَلَاةً اِلَّا لِمِيْقَاتِهَا اِلَّا صَلَاتَيْنِ صَلَاةَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِجَمْعٍ وَصَلَّى الْفَجْرَ يَوْمَئِذٍ قَبْلَ مِيْقَاتِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ رسول کریم ﷺ نے کوئی نماز اپنے وقت کے علاوہ کسی اور وقت میں پڑھی ہو سوائے دو نمازوں کے کہ وہ مغرب و عشاء کی ہیں جو مزدلفہ میں پڑھی گئی تھیں (یعنی مزدلفہ میں مغرب کی نماز عشاء کے وقت پڑھی) اور اس دن (یعنی مزدلفہ میں قربانی کے دن) فجر کی نماز آپ ﷺ نے وقت سے پہلے پڑھی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہاں صرف مغرب و عشاء کی نمازوں کو ذکر کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب کی نماز عشاء کے وقت پڑھی، حالانکہ آپ ﷺ نے عرفات میں ظہر و عصر کی نماز بھی ایک ساتھ اسی طرح پڑھی تھی کہ عصر کی نماز مقدم کر کے ظہر کے وقت ہی پڑھ لی گئی تھی، لہٰذا یہاں ان دونوں نمازوں کو اس سبب سے ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ دن کا وقت تھا، سب ہی جانتے تھے کہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز کو مقدم کر کے ظہر کے وقت پڑھا ہے اس لئے اس کو بطور خاص ذکر کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

"فجر کی نماز وقت سے پہلے پڑھی" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس دن فجر نماز وقت معمول یعنی اجالا پھیلنے سے پہلے تاریکی ہی میں

پڑھ لی تھی، یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے فجر کے وقت سے پہلے پڑھی تھی کیونکہ تمام ہی علماء کے نزدیک فجر کی نماز، فجر سے پہلے پڑھنی جائز نہیں ہے۔

مزدلفہ سے عورتوں اور بچوں کو پہلے ہی منیٰ روانہ کر دینا جائز ہے

(۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَنَا مِمَّنْ قَدَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ الْمُزْدَلِفَةِ فِيْ ضَعَفَةِ اَهْلِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اہل و عیال کے کمزور و ضعیف لوگوں کے جس زمرے کو مزدلفہ کی رات میں پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا اسی میں میں بھی شامل تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کمزور و ضعیف لوگوں" سے مراد عورتیں اور بچے ہیں جن کو آنحضرت ﷺ نے دسویں ذی الحجہ کو پہلے ہی سے منی روانہ کر دیا تھا ان میں حضرت ابن عباسؓ بھی شامل تھے اور خود آنحضرت ﷺ آفتاب طلوع ہونے سے پہلے اور صبح روشن ہو جانے کے بعد منی کے لئے سوار ہوئے جیسا کہ سُنّت ہے، آپ ﷺ نے اپنے ہی عیال کو پہلے اس لئے بھیج دیا تھا تاکہ ہجوم کی وجہ سے انہیں تکلیف نہ ہو اور ایسا کرنا جائز ہے۔

رمی جمار کا وقت: ایک اور روایت میں جو آگے آرہی ہے یہ بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ان لوگوں کو پہلے سے روانہ کر دیا اور ان سے فرمایا کہ رمی جمرۂ عقبہ آفتاب طلوع ہونے کے بعد ہی کرنا، چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہی ہے کہ رمی جمرۂ عقبہ کا وقت دسویں ذی الحجہ کو سورج نکلنے کے بعد شروع ہوتا ہے لیکن بعض روایت میں یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ان لوگوں سے بس اتنا ہی فرمایا تھا کہ جاؤ اور رمی جمرۂ عقبہ کرو، اس روایت میں طلوع آفتاب کی قید نہیں ہے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ نے اسی روایت پر عمل کیا ہے کہ ان کے ہاں رمی جمرۂ عقبہ کا وقت نصف شب کے بعد ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔

رمی جمار کے واسطے کنکریاں مزدلفہ یا راستہ سے لے لی جائیں

(۷) وَعَنِ الْفَضْلِ بْنِ عَبَّاسٍ وَكَانَ رَدِيْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ فِيْ عَشِيَّةِ عَرَفَةَ وَغَدَاةِ جَمْعٍ لِلنَّاسِ حِيْنَ دَفَعُوْا عَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ وَهُوَ كَافٌّ نَاقَتَهٗ حَتّٰى دَخَلَ مُحَسِّرًا وَهُوَ مِنْ مِنًى قَالَ عَلَيْكُمْ بِحَصَى الْخَذْفِ الَّذِيْ يُرْمٰى بِهِ الْجَمْرَةُ وَقَالَ لَمْ يَزَلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُلَبِّيْ حَتّٰى رَمَى الْجَمْرَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ راوی ہیں کہ حضرت فضل ابن عباسؓ نے جو (مزدلفہ سے منیٰ آتے ہوئے) نبی کریم ﷺ کی سواری پر پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، بیان کیا کہ "جب عرفہ کی شام کو (عرفات سے مزدلفہ آتے ہوئے) اور مزدلفہ کی صبح کو (مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے) لوگوں نے سواریوں کو تیزی سے ہانکنا اور مارنا شروع کیا تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "اطمینان و آہستگی کے ساتھ چلنا تمہارے لئے ضروری ہے" اور اس وقت خود آنحضرت ﷺ اپنی اونٹنی کو روکے ہوئے بڑھا رہے تھے، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ وادی محسر میں جو منیٰ (کے قریب مزدلفہ کے آخری حصہ) میں ہے پہنچے تو فرمایا کہ "تمہیں (اس میدان سے) خذف کی مانند کنکریاں اٹھا لینی چاہئیں جو جمرہ (یعنی مناروں) پر ماری جائیں گی۔ اور فضل بن عباسؓ کہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ رمی جمرہ تک برابر لبیک کہتے رہے تھے (یعنی جمرۂ عقبہ پر پہلی کنکری ماری تو لبیک کہنا موقوف کر دیا)۔" (مسلمؒ)

تشریح: عرفہ کے دن شام کو آنحضرت ﷺ جب میدان عرفات سے مزدلفہ کو چلے تو اس وقت حضرت فضل بن عباسؓ آپ ﷺ کے ساتھ سواری پر نہیں تھے۔ البتہ جب اگلے روز دسویں ذی الحجہ کی صبح کو مزدلفہ سے منی روانہ ہوئے تو اس وقت حضرت فضلؓ آپ ﷺ کی سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔

"خذف" اصل میں تو چھوٹی کنکری یا کھجور کی گٹھلی دونوں شہادت کی انگلیوں میں رکھ کر پھینکنے کو کہتے ہیں۔ اور یہاں "خذف کی مانند کنکریوں" سے مراد یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں جو چنے کی برابر ہوتی ہیں یہاں سے اٹھا لو جو رمی جمار کے کام آئیں گی۔

اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ رمی جمار کے واسطے کنکریاں مزدلفہ سے روانگی کے وقت وہیں سے یا راستہ میں سے اور یا جہاں سے جی چاہے لے لی جائیں ہاں جمرہ کے پاس سے وہ کنکریاں نہ لی جائیں جو جمرہ پر ماری جا چکی ہیں کیونکہ یہ مکروہ ہے ویسے اگر کوئی شخص جمرہ کے پاس ہی سے پہلے پھینکی گئی کنکریاں اٹھا کر مارے تو یہ جائز تو ہو جائے گا مگر خلاف اولیٰ ہوگا۔ چنانچہ شمنیؒ نے شرح نقایہ میں لکھا ہے کہ ان کنکریوں سے رمی کافی ہو جائے گی مگر ایسا کرنا برا ہے۔

اس بارہ میں بھی اختلافی اقوال ہیں کہ کنکریاں کتنی اٹھائی جائیں؟ آیا صرف اسی دن رمی جمرۂ عقبہ کے لئے سات کنکریاں اٹھائی جائیں یا ستر کنکریاں اٹھائی جائیں جن میں سات تو اسی دن رمی جمرۂ عقبہ کے کام آئیں گی اور تریسٹھ بعد کے تینوں دنوں میں تینوں جمرات پر پھینکی جائیں گی۔

آپ ﷺ کی طرف سے اپنے وصال کی اطلاع

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَفَاضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ جَمْعٍ وَعَلَيْهِ السَّكِيْنَةُ وَاَمَرَهُمْ بِالسَّكِيْنَةِ وَاَوْضَعَ فِي وَادِي مُحَسِّرٍ وَاَمَرَهُمْ اَنْ يَّرْمُوْا بِمِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ وَقَالَ لَعَلِّي لَا اُرَاكُمْ بَعْدَ عَامِيْ هٰذَا ..... لَمْ اَجِدْ هٰذَا الْحَدِيْثَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ اِلَّا فِي جَامِعِ التِّرْمِذِيِّ مَعَ تَقْدِيْمٍ وَتَاخِيْرٍ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (منیٰ کے لئے) مزدلفہ سے چلے تو آپ ﷺ کی رفتار میں سکون و وقار تھا، اور آپ ﷺ نے دوسرے لوگوں کو بھی سکون و اطمینان کے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ ہاں میدان محسر میں آپ ﷺ نے اونٹنی کو تیز رفتاری کے ساتھ گزارا اور آپ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ خذف کی کنکریوں جیسی (یعنی چنے کی برابر) سات کنکریوں سے رمی کریں، نیز آپ ﷺ نے (صحابہؓ سے) یہ بھی فرمایا کہ "شاید اس سال کے بعد میں تمہیں نہیں دیکھوں گا" (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ) میں نے یہ حدیث بخاریؒ و مسلمؒ میں تو پائی نہیں۔ ہاں ترمذیؒ میں یہ حدیث کچھ تقدیم و تاخیر کے ساتھ مذکور ہے۔"

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ سال میری دنیاوی زندگی کا آخری سال ہے، آئندہ سال میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا، اس لئے تم لوگ مجھ سے دین کے احکام اور حج کے مسائل سیکھ لو۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس حج کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے کہ اسی حج کے موقعہ پر آپ ﷺ نے دین کے احکام پورے طور پر لوگوں تک پہنچا دیئے اور اپنے صحابہ کو رخصت و وداع کیا، پھر اگلے سال یعنی بارہ ہجری کے ماہ ربیع الاول میں آپ ﷺ کا وصال ہوا۔

صاحب مشکوٰۃ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مصابیح نے اس حدیث کو پہلی فصل میں نقل کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث صحیحین یعنی بخاری و مسلم کی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ترمذی کی روایت ہے۔ اس لئے صاحب مصابیح کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اس روایت کو پہلی فصل کی بجائے دوسرے فصل میں نقل کرتے۔ اگرچہ اس صورت میں تقدیم و تاخیر کا اعتراض پھر بھی باقی رہتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

عرفات سے واپسی اور مزدلفہ سے روانگی کا وقت

⑨ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ قَيْسِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اَهْلَ الْجَاهِلِيَّةِ كَانُوْا يَدْفَعُوْنَ مِنْ عَرَفَةَ حِيْنَ تَكُوْنُ الشَّمْسُ كَاَنَّهَا عَمَائِمُ الرِّجَالِ فِي وُجُوْهِهِمْ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ وَمِنَ الْمُزْدَلِفَةِ بَعْدَ اَنْ تَطْلُعَ

الشَّمْسُ حِيْنَ تَكُوْنُ كَاَنَّهَا عَمَائِمُ الرِّجَالِ فِيْ وُجُوْهِهِمْ وَاِنَّا لَا نَدْفَعُ مِنْ عَرَفَةَ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ وَنَدْفَعُ مِنَ الْمُزْدَلِفَةِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ هَدْيُنَا مُخَالِفٌ لِهَدْيِ عَبَدَةِ الْاَوْثَانِ وَالشِّرْكِ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ خَطَبَنَا وَسَاقَهُ وَنَحْوَهُ.

"حضرت محمد بن قیس بن مخرمہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایام جاہلیت میں (یعنی اسلام سے پہلے) لوگ عرفات سے اس وقت واپس ہوتے جب آفتاب غروب ہونے سے پہلے مردوں کے چہروں پر پگڑیوں کی طرح نظر آتا (یعنی عرفات سے غروب آفتاب سے پہلے چلتے) اور مزدلفہ سے طلوع آفتاب کے بعد اس وقت روانہ ہوتے جب آفتاب مردوں کے چہروں پر پگڑیوں کی طرح نظر آتا، مگر ہم عرفات سے اس وقت تک نہیں چلیں گے جب تک کہ آفتاب غروب نہ ہو جائے اور مزدلفہ سے ہم سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہوں گے کیونکہ ہمارا طریقہ بت پرستوں اور مشرکین سے مختلف ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں لوگ عرفات سے ایسے وقت چلتے تھے جب آفتاب آدھا تو غروب ہو چکا ہوتا اور اس کا آدھا حصہ باہر ہوتا آفتاب کی اسی صورت کو پگڑی سے مشابہت دی گئی ہے کہ آفتاب کا آدھا گروہ پگڑی کی شکل کا ہوتا ہے، اسی طرح مزدلفہ سے ایسے وقت روانہ ہوتے جب آفتاب کا آدھا حصہ طلوع ہو چکا ہوتا اور آدھا حصہ اندر رہتا۔

صاحب مشکوٰۃ کو اس کی تحقیق نہیں ہو سکی تھی کہ یہ روایت کس نے نقل کی ہے، چنانچہ مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں لفظ رواہ کے بعد جگہ چھوٹی ہوئی ہے البتہ ایک دوسرے صحیح نسخہ کے حاشیہ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ رواہ البیهقی فی شعب الایمان وقال خطبنا وساقه نحوه۔

رات میں رمی جائز نہیں ہے

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدَّمَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ الْمُزْدَلِفَةِ اُغَيْلِمَةَ بَنِيْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ عَلٰى حُمُرَاتٍ فَجَعَلَ يَلْطَحُ اَفْخَاذَنَا وَيَقُوْلُ اُبَيْنِيَّ لَا تَرْمُوا الْجَمْرَةَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ. (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں مزدلفہ کی رات (یعنی شب عید الاضحی) میں (منیٰ کے لئے) روانہ کیا اور عبدالمطلب کے خاندان کے ہم کئی بچے تھے (جنہیں آپ ﷺ نے رات میں روانہ کیا تھا) اور گدھے ہماری سواری تھے۔ رسول کریم ﷺ (ہماری روانگی کے وقت ازراہ محبت و الفت) ہماری رانوں پر ہاتھ مارتے اور فرماتے تھے "میرے چھوٹے بچو! جب تک سورج نہ نکلے تم منارے (یعنی جمرۂ عقبہ) پر کنکریاں نہ پھینکنا"۔" (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رات میں رمی جائز نہیں ہے چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے ہاں آدھی رات کے بعد سے رمی جائز ہے، نیز طلوع فجر کے بعد اور آفتاب نکلنے سے پہلے رمی اگرچہ تمام علماء کے نزدیک جائز ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کراہت کے ساتھ جواز کے قائل ہیں، حنفی مسلک کے مطابق طلوع آفتاب کے بعد رمی مستحب ہے۔

امام شافعیؒ کی مستدل حدیث اور اس کی تاویل

(۱۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَرْسَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاُمِّ سَلَمَةَ لَيْلَةَ النَّحْرِ فَرَمَتِ الْجَمْرَةَ قَبْلَ الْفَجْرِ ثُمَّ مَضَتْ فَاَفَاضَتْ وَكَانَ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ يَكُوْنُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهَا. (رواہ ابوداؤد)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کو بقرعید کی رات میں (مزدلفہ سے منیٰ) بھیج دیا

تھا۔ چنانچہ انہوں نے (وہاں پہنچ کر) فجر سے پہلے جمرۂ عقبہ پر کنکریاں ماریں اور پھر وہاں سے (مکہ) آئیں اور طواف افاضہ (جو فرض ہے) کیا اور یہ وہ دن تھا جس میں آنحضرت ﷺ ان کے پاس تھے یعنی یہ اُم سلمہؓ کی باری کا دن تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ میں دراصل اس طرف اشارہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت اُمّ سلمہؓ کو اس رات میں منیٰ کیوں بھیجا، انہوں نے رات میں رمی کیوں کی اور دن ہی میں طواف افاضہ سے فارغ کیوں ہو گئیں جب کہ دیگر ازواج مطہرات نے اگلی رات میں طواف افاضہ کیا؟

حضرت امام شافعیؒ فجر سے پہلے رمی جمرہ کے جواز کے لئے اس حدیث کو دلیل قرار دیتے ہیں اگرچہ افضل فجر کے بعد ہے حضرت امام شافعیؒ کے علاوہ دیگر علماء اس حدیث کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ یہ سہولت و رعایت ہے جو صرف حضرت اُمّ سلمہؓ کو دی گئی تھی دوسروں کے لئے حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت کے پیش نظر فجر سے پہلے رمی جائز نہیں ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں "فجر" سے مراد "نماز فجر" ہو کہ حضرت اُمّ سلمہؓ نے نماز فجر سے پہلے اور طلوع فجر کے بعد رمی کی۔

عمرہ میں تلبیہ کب موقوف کیا جائے

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ يُلَبِّي الْمُقِيْمُ اَوِ الْمُعْتَمِرُ حَتّٰى تَسْتَلِمَ الْحَجَرَ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ وَرَوِيَ مَوْقُوْفًا عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مقیم اور عمرہ کرنے والا حجر اسود کو بوسہ دینے تک لبیک کہتا رہے۔ ابوداؤدؒ نے اس روایت کو (بطریق مرفوع) نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ پر موقوف ہے۔"

تشریح: "مقیم" سے مراد مکہ کا رہنے والا ہے جو عمرہ کرے اور "عمرہ کرنے والا" سے غیر مکی مراد ہے جو عمرہ کے لئے مکہ آیا ہو، لہٰذا جملہ یلبی المقیم او المعتمر میں حرف "او" تنویع کے لئے ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح حج میں رمی جمرۂ عقبہ پر تلبیہ کو موقوف کرتے ہیں اسی طرح عمرہ میں حجر اسود کو چومتے ہی تلبیہ موقوف کر دیا جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ نے عرفات و مزدلفہ کا پورا درمیانی راستہ سواری پر طے کیا

(۱۳) عَنْ يَعْقُوْبَ بْنِ عَاصِمِ بْنِ عُرْوَةَ اَنَّهُ سَمِعَ الشَّرِيْدَ يَقُوْلُ اَفَضْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا مَسَّتْ قَدَمَاهُ الْاَرْضَ حَتّٰى اَتٰى جَمْعًا۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت یعقوب بن عاصم بن عروہؒ (تابعی) سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت شریدؓ (صحابی) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں (عرفات سے) واپسی میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ تھا چنانچہ رسول کریم ﷺ کے قدم مبارک زمین پر نہیں گئے یہاں تک کہ مزدلفہ پہنچے۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: اس روایت کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عرفات سے مزدلفہ تک کا پورا راستہ سواری پر طے کیا پیدل نہیں چلے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے پورے راستہ میں زمین پر قدم ہی نہیں رکھے کیونکہ صحیح بخاری میں منقول ہے کہ عرفات سے واپسی کے موقع پر راستہ میں آپ ﷺ (سواری سے اتر کر) پہاڑ کے ایک درہ کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں پیشاب کیا اور پھر

وضو کیا یہ دیکھ کر حضرت اسامہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا نماز کا وقت آگیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نماز تو آگے آرہی ہے (یعنی نماز تو مزدلفہ پہنچ کر پڑھیں گے)۔

عرفات میں جمع بین الصلوٰتین

⑭ وَعَنِ ابْنِ شَهَابٍ قَالَ اَخْبَرَنِي سَالِمٌ اَنَّ الْحَجَّاجَ بْنَ يُوْسُفَ عَامَ نَزَلَ بِابْنِ الزُّبَيْرِ سَأَلَ عَبْدَاللّٰهِ كَيْفَ نَصْنَعُ فِي الْمَوْقِفِ يَوْمَ عَرَفَةَ فَقَالَ سَالِمٌ اِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ السُّنَّةَ فَهَجِّرْ بِالصَّلَاةِ يَوْمَ عَرَفَةَ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ صَدَقَ اِنَّهُمْ كَانُوْا يَجْمَعُوْنَ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ فِي السُّنَّةِ فَقُلْتُ لِسَالِمٍ اَفَعَلَ ذٰلِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ سَالِمٌ وَهَلْ يَتَّبِعُوْنَ ذٰلِكَ اِلَّا سُنَّتَهُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے صاحبزادے حضرت سالمؒ نے مجھ سے بتایا کہ حجاج ابن یوسف نے جس سال حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو قتل کیا اسی سال اس نے (مکہ آنے کے بعد) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے پوچھا کہ ہم عرفہ کے دن وقوف کے دوران کیا کریں۔ (یعنی عرفات میں اس دن ظہر، عصر کی نماز وقوف سے پہلے پڑھ لیں یا وقوف کے دوران اور یا وقوف کے بعد؟) اس کا جواب سالمؒ نے دیا کہ "اگر تو سُنّت پر عمل کرنا چاہتا ہے تو عرفہ کے دن (ظہر و عصر کی نماز) سویرے پڑھ" (یہ جواب سن کر) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ "سالم ٹھیک کہتے ہیں، کیونکہ صحابہؓ طریقہ سُنّت کو اختیار کرنے کے لئے ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سالمؒ سے پوچھا کیا آنحضرت ﷺ نے اسی طرح کیا تھا؟ حضرت سالمؒ نے فرمایا "ہم اس معاملہ میں (یعنی اس طرح نماز پڑھنے میں) صرف آنحضرت ﷺ ہی کے طریقہ کی پیروی کرتے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: جو شخص اسلامی تاریخ سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے وہ حجاج بن یوسف کے نام سے بخوبی واقف ہوگا۔ یہ نام ظلم و بربریت کی داستانوں میں اپنی ایک بڑی ہی وحشت ناک داستان کا حامل ہے۔ حجاج بن یوسف جس کے نام کا جز ہی "ظالم" بن چکا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں کو باندھ کر قتل کرایا تھا۔ عبدالملک ابن مروان کی طرف سے اسی ظالم نے مکہ میں حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ پر چڑھائی کی تھی اور ان جلیل القدر صحابیؓ کو اس نے سولی پر چڑھا دیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد اسی سال عبدالملک ابن مروان نے اس کو حاجیوں کا امیر مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ تمام افعال حج میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا افعال و اقوال کی پیروی کرنا، ان سے حج کے مسائل پوچھتے رہنا اور کسی معاملہ میں ان کی مخالفت نہ کرنا، چنانچہ حجاج نے اس وقت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مذکورہ بالا مسئلہ بھی پوچھا۔

بَابُ رَمْيِ الْجِمَارِ
مناروں پر کنکریاں پھینکنے کا بیان

"جمار" دراصل سنگریزوں اور کنکریوں کو کہتے ہیں اور "جمار حج" ان سنگریزوں اور کنکریوں کا نام ہے جو مناروں پر مارے جاتے ہیں اور جن مناروں پر کنکریاں ماری جاتی ہیں انہیں جمار کی مناسبت سے "جمرات" کہتے ہیں۔

جمرات یعنی وہ منارے جن پر کنکریاں پھینکی جاتی ہیں تین ہیں۔ ① جمرۂ اولی۔ ② جمرۂ وسطی۔ ③ جمرۂ عقبہ۔ یہ تینوں جمرات منیٰ میں واقع ہیں اور بقرعید کے روز یعنی دسویں ذی الحجہ کو صرف جمرۂ عقبہ پر کنکریاں پھینکی جاتی ہیں، پھر گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں کو تینوں جمرات پر کنکریاں مارنا واجب ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

رمی جمرۂ عقبہ سواری پر بھی جائز ہے

(۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْمِي عَلٰى رَاحِلَتِهٖ يَوْمَ النَّحْرِ وَيَقُوْلُ لِتَاخُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ فَاِنِّيْ لَا اَدْرِيْ لَعَلِّيْ لَا اَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِيْ هٰذِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا، نحر (قربانی) کے دن نبی کریم ﷺ اپنی سواری پر سوار کنکریاں مار رہے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھ سے افعال حج سیکھ لو، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ شاید میں اپنے اس حج کے بعد پھر حج نہ کر سکوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص منیٰ میں پیادہ پا پہنچے تو وہ پیادہ ہی جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارے اور پھر گیارھویں اور بارھویں تاریخ کو تو تینوں جمرات پر پیادہ رہ کر ہی رمی کرے اور تیرھویں تاریخ کو سوار ہو کر کنکریاں مارے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں لکھا ہے کہ جس رمی کے بعد دوسری رمی ہے جیسے جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ وسطیٰ کی رمی تو اس رمی کو پیادہ کرنا ہی افضل ہے کیوں کہ اس رمی کے بعد وقوف کرنا، درود و دعا، وغیرہ میں مشغول ہونا ہوتا ہے اور ایسی صورت میں پیادہ پائی کی حالت عاجزی و تضرع کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔

جہاں تک آنحضرت ﷺ کے عمل کا تعلق ہے تو احادیث صحیحہ میں جو کچھ منقول ہے اس کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نحر کے دن جمرۂ عقبہ کی رمی تو سواری پر کی ہے اور بقیہ دونوں کی رمی پیادہ کی ہے۔

کنکریوں کی تعداد اور اس کو پھینکنے کا طریقہ

(۲) وَعَنْهُ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَمَى الْجَمْرَةَ بِمِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو خذف کی کنکریوں کی طرح (یعنی چھوٹی چھوٹی) کنکریوں سے رمی جمار کرتے دیکھا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مناروں پر کنکریاں پھینکنے کا طریقہ کئی طرح سے منقول ہے لیکن زیادہ صحیح اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ کنکری کو شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے سروں سے پکڑ کر یعنی چٹکی میں رکھ کر پھینکا جائے، چنانچہ اب معمول بھی اسی طرح ہے۔

رمی جمار کا وقت

(۳) وَعَنْهُ قَالَ رَمٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى وَاَمَّا بَعْدَ ذٰلِكَ فَاِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قربانی کے دن کو چاشت کے وقت (یعنی زوال سے پہلے) منارے پر کنکریاں پھینکیں اور بعد کے دنوں میں دوپہر ڈھلنے کے بعد کنکریاں پھینکیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ضحوہ دن کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو طلوع آفتاب کے بعد سے زوال آفتاب سے پہلے تک ہوتا ہے، بعد کے دنوں سے مراد ایام تشریق یعنی گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں تاریخیں ہیں۔ ان دنوں میں آپ ﷺ نے زوال آفتاب کے بعد رمی کی۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ دوسرے دن یعنی گیارہویں تاریخ کو رمی جمار کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہوتا ہے اسی طرح تیسرے دن یعنی بارہویں تاریخ کو بھی رمی کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد اگر کوئی شخص مکہ

جانا چاہے تو وہ تیرہویں تاریخ کو طلوع فجر سے پہلے جاسکتا ہے اور اگر طلوع فجر کے بعد مکہ جانا چاہے گا تو پھر اس پر اس دن کی رمی جمار واجب ہو جائے گی اب اس کے لئے رمی جمار کئے بغیر مکہ جانا درست نہیں ہو گا ہاں اس دن یعنی تیرہویں تاریخ کو زوال آفتاب سے پہلے بھی رمی جمار جائز ہو جائے گی۔

اس موقع پر ایک یہ مسئلہ بھی جان لیجئے کہ اگر کوئی شخص کنکریاں مناروں پر پھینکے نہیں بلکہ ان پر ڈال دے تو یہ کافی ہو جائے گا مگر یہ چیز غیر پسندیدہ ہوگی بخلاف مناروں پر کنکریاں رکھ دینے کے کہ یہ اس طرح کافی بھی نہیں ہو گا۔

رمی جمار کے وقت تکبیر

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّهٗ انْتَهٰى اِلَى الْجَمْرَةِ الْكُبْرٰى فَجَعَلَ الْبَيْتَ عَنْ يَسَارِهٖ وَمِنًى عَنْ يَمِيْنِهٖ وَرَمٰى بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا رَمَى الَّذِىْ اُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ (رمی کے لئے) جمرۂ کبریٰ (یعنی جمرۂ عقبہ) پر پہنچے تو (اس طرح کھڑے ہوئے کہ) انہوں نے خانۂ کعبہ کو اپنی بائیں طرف کیا اور منیٰ کو دائیں طرف اور پھر انہوں نے سات کنکریاں (اس طرح) پھینکیں کہ ہر کنکری پھینکتے ہوئے تکبیر کہتے تھے، پھر انہوں نے فرمایا کہ اسی طرح اس ذات گرامی (یعنی رسول کریم ﷺ) نے کنکریاں پھینکی ہیں جس پر سورۂ بقرہ نازل ہوئی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابن مسعودؓ جمرۂ عقبہ پر اس طرح کھڑے ہوئے کہ خانۂ کعبہ تو ان کی بائیں سمت تھا اور منی دائیں سمت لیکن دوسرے جمرات پر اس طرح کھڑا ہونا مستحب ہے کہ منہ قبلہ کی طرف ہو۔

رمی جمرہ میں سات کنکریاں پھینکی جاتی ہیں اور ہر کنکری پھینکتے ہوئے تکبیر کہی جاتی ہے چنانچہ بیہقیؒ کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ ہر کنکری کے ساتھ اس طرح تکبیر کہتے تھے۔ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَّذَنْبًا مَّغْفُوْرًا وَّعَمَلًا مَّشْكُوْرًا۔

یوں تو پورا قرآن ہی آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا ہے لیکن اس موقع پر خاص طور پر سورۂ بقرہ کا ذکر اس مناسبت سے کیا گیا ہے کہ اس سورت میں حج کے احکام و افعال مذکور ہیں۔

جمرات پر سات کنکریاں پھینکنا واجب ہے

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِسْتِجْمَارُ تَوٌّ وَرَمْىُ الْجِمَارِ تَوٌّ وَالسَّعْىُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ تَوٌّ وَالطَّوَافُ تَوٌّ وَاِذَا اسْتَجْمَرَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَجْمِرْ بِتَوٍّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا استنجاء طاق ہے (یعنی استنجے کے لئے تین ڈھیلے لینے چاہئیں) کنکریاں پھینکنی طاق ہے (یعنی سات کنکریاں پھینکنی چاہئیں) صفا اور مروہ کے درمیان سعی طاق ہے (یعنی ان دونوں کے درمیان سات مرتبہ پھرنا چاہئے) خانہ کعبہ کے گرد طواف طاق ہے (یعنی سات چکر کا ایک طواف ہوتا ہے) اور جب تم میں سے کوئی شخص اگر کی دھونی لینا چاہے تو اسے چاہئے کہ طاق (یعنی تین یا پانچ یا سات مرتبہ) لے۔" (مسلمؒ)

تشریح: جمرات (مناروں) پر سات سات کنکریاں پھینکنا واجب ہے، اسی طرح صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی واجب ہے اور جمہور علماء کے نزدیک ایک طواف کے لئے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر فرض ہیں جب کہ حنفیہ کے ہاں چار چکر تو فرض ہیں اور باقی واجب ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

سواری پر رمی جمار

⑥ وَعَنْ قُدَامَةَ ابْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمَّارٍ قَالَ رَأَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَرْمِی الْجَمْرَةَ یَوْمَ النَّحْرِ عَلٰی نَاقَةٍ صَہْبَاءَ لَیْسَ ضَرْبٌ وَلَا طَرْدٌ وَلَیْسَ قِیْلٌ اِلَیْکَ اِلَیْکَ۔ (رواہ الشافعی والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت قدامہ بن عبداللہ بن عمارؓ کہتے ہیں کہ میں نے قربانی کے دن رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اپنی اونٹنی صہباء پر سوار (جمرۂ عقبہ پر) کنکریاں پھینک رہے تھے نہ تو وہاں مارنا تھا نہ ہانکنا اور نہ ہٹو بچو کی آوازیں تھیں۔" (شافعیؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "صہباء" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کی رنگت کی سفیدی، سرخی آمیز، ہو بایں طور کہ اس کے بالوں کی نوکیں اوپر سے سرخ ہوں اور نیچے کی طرف سفیدی ہو۔

حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح امراء و سلاطین اور سربراہ مملکت کی سواری کے آگے آگے نقیب و چوب دار راستہ کا انتظام و اہتمام کرتے ہوئے چلتے ہیں سرور کائنات اور آقائے نامدار ﷺ کی سواری کے آگے اس طرح کا کوئی انتظام و اہتمام نہیں ہوتا تھا۔

سعی اور رمی جمار ذکر اللہ کا ذریعہ

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اِنَّمَا جُعِلَ رَمْیُ الْجِمَارِ وَالسَّعْیُ بَیْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ لِاِقَامَةِ ذِکْرِ اللّٰہِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مناروں پر کنکریاں مارنا اور صفا اور مروہ کے درمیان پھرنا ذکر اللہ کے قیام کے لئے ہے" (ترمذیؒ، دارمیؒ) امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: ظاہری طور پر یہ فعل ایسے ہیں کہ ان کا عبادت ہونا معلوم نہیں ہوتا اس لئے فرمایا کہ یہ دونوں فعل اللہ تعالیٰ کے ذکر کو قائم کرنے کے لئے مقرر ہوئے ہیں، چنانچہ یہ معلوم ہی ہے کہ ہر کنکری مارتے وقت تکبیر سُنت ہے اور سعی کے دوران وہ بھی دعائیں پڑھنا سُنت ہے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

منیٰ میں کسی کے لئے کوئی جگہ متعیّن نہیں ہے

⑧ وَعَنْھَا قَالَتْ قُلْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَلَا نَبْنِیْ لَکَ بِنَاءً یُظِلُّکَ بِمِنًی قَالَ لَا مِنًی مُنَاخُ مَنْ سَبَقَ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! کیا ہم آپ (ﷺ) کے لئے منیٰ میں کوئی ایسی عمارت نہ بنوا دیں جو آپ ﷺ کے لئے سایہ کی جگہ رہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! منیٰ اس شخص کے اونٹ بٹھانے کی جگہ ہے جو پہلے پہنچے۔"

(ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ منیٰ میں پہنچنے میں خصوصیت سبقت کے ساتھ ہے مکان بنانے یا کوئی جگہ متعیّن کر لینے کے ساتھ نہیں ہے۔ یعنی منیٰ ایسی جگہ ہے جہاں کسی کے لئے کوئی خصوصیت نہیں ہے اور نہ وہاں کسی کے لئے کوئی خاص جگہ متعیّن ہے بلکہ وہاں جو شخص جس جگہ پہلے پہنچ جائے وہی اس جگہ کا مستحق ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جمرات پر وقوف

⑨ عَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يَقِفُ عِنْدَ الْجَمْرَتَيْنِ الْاُوْلَيَيْنِ وُقُوْفًا طَوِيْلاً يُكَبِّرُ اللّٰهَ وَيُسَبِّحُهُ وَيَحْمَدُهُ وَيَدْعُو اللّٰهَ وَلَا يَقِفُ عِنْدَ جَمْرَةِ الْعَقَبَةِ۔ (رواہ مالک)

"حضرت نافع" کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ پہلے دونوں مناروں کے نزدیک بہت دیر تک ٹھہرتے اور (وہاں) اللہ کی تکبیر، اللہ کی تسبیح اور اللہ کی تحمید میں مشغول رہتے، نیز (ہاتھ اٹھا کر) اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے اور جمرۂ عقبہ کے پاس نہیں ٹھہرتے تھے۔" (مالکؒ)

تشریح: "پہلے دونوں مناروں" سے مراد جمرۂ اولی اور جمرۂ وسطی ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ جب ان دونوں جمروں پر رمی کر چکتے تو وہاں ٹھہر کر دعا وغیرہ میں مشغول رہتے، چنانچہ ان جمرات پر وقوف کرنا اور وقوف کے دوران دعا وزاری اور تسبیحات وغیرہ میں مشغول رہنا مسنون ہے۔ مدت وقوف کے بارہ میں علماء نے لکھا ہے کہ ان جمرات پر اتنی دیر تک ٹھہرنا چاہئے جتنی دیر میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔ ویسے بعض اہل اللہ کے بارہ میں تو یہ منقول ہے کہ وہ ان جمرات پر اتنی دیر تک کھڑے رہے ہیں کہ ان کے پاؤں ورم کر گئے تھے۔

"اور جمرۂ عقبہ کے پاس نہیں ٹھہرتے تھے" کا مطلب یہ ہے کہ جمرۂ عقبہ کی رمی کے بعد دعا کے لئے اس جمرہ پر نہ تو قربانی کے دن ٹھہرتے تھے اور نہ دوسرے ہی دنوں میں وقوف کرتے تھے تاہم اس سے دعا کا بالکل ترک کرنا لازم نہیں آتا۔ باب النحر میں وہ روایت آئے گی جس میں حضرت ابن عمرؓ نے یہ وضاحت کی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

بَابُ الْهَدْيِ

ہدی کا بیان

"ہدی" ہا کے زبر اور دال کے سکون کے ساتھ، ان چوپایوں کو کہتے ہیں جو حرم میں طلب ثواب کی خاطر ذبح کئے جاتے ہیں، وہ بکری، دنبہ، بھیڑ ہوں خواہ گائے، بھینس بیل اور خواہ اونٹ ہوں، اور عمر وغیرہ کی جو شرائط قربانی کے جانوروں میں ہوتی ہیں وہی ہدی میں بھی ہوتی ہیں۔ بکری اور اس کی مانند دوسرے جانور جیسے دنبہ اور بھیڑ کی قربانی یوں تو ہر موقع پر جائز ہے لیکن اگر کوئی شخص حالت جنابت یا حیض میں طواف الزیارۃ کرے یا کوئی شخص وقوف عرفات کے بعد سر منڈانے سے پہلے ہی جماع کرے تو اس صورت میں بطور کفارہ وجزاء قربانی کے لئے بکری کا ذبح کرنا کافی نہیں ہوگا بلکہ بدنہ یعنی اونٹ یا گائے کی قربانی کرنی ہوگی۔

ہدی کی دو قسمیں ہیں: ① واجب، ② تطوع یعنی نفل، پھر ہدی واجب کی کئی قسمیں ہیں۔ ہدی قران، ہدی تمتع، ہدی جنایات، ہدی نذر اور ہدی احصار۔

"ہدی" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بندہ بارگاہ حق جل مجدہٗ میں اس جانور کی قربانی کا ہدیہ بھیجتا ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرتا ہے۔ اس مناسبت سے اس جانور کو ہدی کہتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اشعار اور تقلید کا مسئلہ

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ بِذِى الْحُلَيْفَةِ ثُمَّ دَعَا بِنَاقَتِهٖ فَاَشْعَرَهَا فِي صَفْحَةِ سَنَامِهَا الْاَيْمَنِ وَسَلَتَ الدَّمَ عَنْهَا وَقَلَّدَهَا نَعْلَيْنِ ثُمَّ رَكِبَ رَاحِلَتَهٗ فَلَمَّا اسْتَوَتْ بِهٖ عَلَى الْبَيْدَاءِ اَهَلَّ

بِالْحَجِّ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (سفرحج میں) ذوالحلیفہ پہنچ کر ظہر کی نماز پڑھی اور پھر اپنی اونٹنی کو (جو قربانی کے لئے تھی) طلب فرمایا اور اس کی کوہان کے داہنے پہلو کو زخمی کیا اور اس کے خون کو پونچھ کر اس کے گلے میں دو جوتیوں کا ہار ڈال دیا اور اس کے بعد اپنی (سواری کی) اونٹنی پر (کہ جس کا نام قصواء تھا) سوار ہوئے اور جب مقام بیداء میں اونٹنی آپ ﷺ کو لے کھڑی ہوئی تو آپ ﷺ نے لبیک کہی۔" (مسلم)

تشریح: پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اشعار اور تقلید کسے کہتے ہیں؟ حج میں ہدی کا جو جانور ساتھ لے جایا جاتا ہے اس کے پہلو کو زخم آلود کردیتے ہیں جسے اشعار کہا جاتا ہے نیز اس جانور کے گلے میں جوتے یا ہڈی وغیرہ کا ہار ڈال دیتے ہیں جسے تقلید کہا جاتا ہے اور ان دونوں کا مقصد اس امر کی علامت کردینا ہوتا ہے کہ یہ ہدی کا جانور ہے۔

آنحضرت ﷺ جب حج کے لئے چلے اور ذوالحلیفہ کو جو اہل مدینہ کا میقات ہے پہنچے تو نماز پڑھنے کے بعد اس اونٹنی کو طلب فرمایا جسے آپ ﷺ بطور ہدی اپنے ساتھ لے چلے تھے، پہلے آپ ﷺ نے اس کی کوہان کے داہنے پہلو میں نیزہ مارا جب اس سے خون بہنے لگا تو اسے پونچھ دیا اور پھر اس کے گلے میں دو جوتیوں کا ہار ڈال دیا اس طرح آپ ﷺ نے یہ علامت مقرر فرمادی کہ یہ ہدی کا جانور ہے تاکہ لوگ جب اس نشانی و علامت کے ذریعہ یہ جانیں کہ یہ ہدی ہے تو اس سے کوئی تعرض نہ کریں اور قذاق وغیرہ اسے غائب نہ کردیں اور اگر یہ جانور راستہ بھٹک جائے تو لوگ اسے اس کی جگہ پہنچا دیں۔ ایام جاہلیت میں لوگوں کا یہ شیوہ تھا کہ جس جانور پر ایسی کوئی علامت نہ دیکھتے اسے ہڑپ کر جاتے تھے اور جس جانور پر یہ علامت ہوتی تھی اسے چھوڑ دیتے تھے، چنانچہ شارع اسلام نے بھی اس طریقہ کو مذکورہ بالا مقصد کے تحت جائز رکھا۔

اب اس فقہی مسئلہ کی طرف آئیے جمہور ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ اشعار یعنی جانور کو اس طرح زخمی کرنا سنت ہے لیکن جثم یعنی بکری، دنبہ اور بھیڑ میں اشعار کو ترک کردینا چاہئے کیونکہ یہ جانور بہت کمزور ہوتے ہیں ان جانوروں کے لئے صرف تقلید یعنی گلے میں ہار ڈال دینا کافی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تقلید تو مستحب ہے لیکن اشعار مطلقاً مکروہ ہے خواہ بکری و چھترہ ہو یا اونٹ وغیرہ علماء حضرت امام اعظمؒ کی اس بات کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ حضرت امام اعظمؒ مطلق طور پر اشعار کی کراہت کے قائل نہیں تھے بلکہ انہوں نے صرف اپنے زمانے کے لئے اشعار کو مکروہ قرار دیا تھا کیونکہ اس وقت لوگ اس مقصد کے لئے ہدی کو بہت زیادہ زخمی کردیتے تھے جس سے زخم کے سرایت کر جانے کا خوف ہوتا تھا۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ظہر کی نماز ذوالحلیفہ کی مسجد میں پڑھی جب کہ باب صلوٰۃ السفر کی پہلی حدیث میں جو بخاری و مسلم نے روایت کی ہے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز تو مدینہ ہی میں پڑھ لی تھی اور عصر کی نماز ذوالحلیفہ میں پڑھی لہٰذا ان دونوں روایتوں کے تضاد کو یوں دور کیا جائے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز تو مدینہ ہی میں پڑھی تھی مگر حضرت ابن عباسؓ نے چونکہ مدینہ میں ظہر کی نماز آپ ﷺ کے ہمراہ نہیں پڑھی ہوگی اس لئے جب انہوں نے آنحضرت کو ذوالحلیفہ میں نماز پڑھتے دیکھا تو یہ گمان کیا کہ آپ ﷺ یہاں ظہر کی نماز پڑھ رہے ہیں اسی لئے انہوں نے یہاں یہ بیان کیا کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز ذوالحلیفہ میں پڑھی۔

اَھَلَّ بِالْحَجِّ (آپ ﷺ نے حج کے لئے لبیک کہی) سے یہ نہ سمجھئے کہ آپ ﷺ نے واقعۃً صرف حج ہی کے لئے لبیک کہی بلکہ یہ مفہوم مراد لیجئے کہ آپ ﷺ نے حج اور عمرہ دونوں کے لئے لبیک کہی کیونکہ صحیحین میں حضرت انسؓ سے منقول اس روایت نے اس بات کو بالکل واضح کردیا ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو حج اور عمرہ کے لئے لبیک کہتے سنا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر راوی نے یا تو عمرہ کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اصل چونکہ حج ہی ہے اس لئے صرف اسی کے ذکر پر اکتفاء کیا یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے جب دونوں کے لئے

لبیک کہی تو راوی نے صرف حج کو سنا عمرہ کا ذکر نہیں سنا۔

② وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَهْدَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّةً اِلَى الْبَيْتِ غَنَمًا فَقَلَّدَهَا۔ (متفق علیہ)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ بکریوں کو بطور ہدی خانہ کعبہ کو بھیجا اور ان کے گلے میں ہار ڈالا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: علامہ طیبی کہتے ہیں کہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ بکریوں میں اشعار یعنی ان کو زخمی کرنا مشروع نہیں ہے البتہ ان میں تقلید یعنی ان کے گلے میں ہار ڈالنا سنّت ہے لیکن اس بارہ میں حضرت امام مالکؒ کا اختلافی قول ہے۔

دوسرے کی طرف سے قربانی

③ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ ذَبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَائِشَةَ بَقَرَةً يَوْمَ النَّحْرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قربانی کے دن حضرت عائشہ کی طرف سے ایک گائے ذبح فرمائی۔" (مسلم)

④ وَعَنْهُ قَالَ نَحَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نِسَائِهِ بَقَرَةً فِيْ حَجَّتِهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ ہی کی یہ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔" (مسلمؒ)

تشریح: علماء لکھتے ہیں کہ دونوں حدیثیں اس بات پر محمول ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج کی اجازت سے قربانی کی ہوگی کیونکہ دوسرے کی طرف سے قربانی اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔

ائمہ کے یہاں مشہور مسئلہ تو یہی ہے کہ ایک گائے میں سات آدمیوں تک کی طرف سے قربانی جائز ہوتی ہے لیکن حضرت امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ ایک گائے یا ایک بکری وغیرہ کی قربانی تمام گھر والوں کی طرف سے کافی ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ حدیث حضرت امام مالکؒ کے اس قول کی دلیل ہو سکتی ہے بشرطیکہ آپ ﷺ نے سات سے زائد کی طرف سے ایک قربانی کی ہو جب کہ دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ آپ ﷺ نے ایک گائے کی قربانی صرف سات ہی کی طرف سے کی ہوگی۔

خود حج کو نہ جانے اور ہدی بھیجنے کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ فَتَلْتُ قَلَائِدَ بُدْنَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدَيَّ ثُمَّ قَلَّدَهَا وَاَشْعَرَهَا وَاَهْدَاهَا فَمَا حَرُمَ عَلَيْهِ شَيْءٌ كَانَ اُحِلَّ لَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے اونٹوں کے لئے اپنے ہاتھوں سے پٹے بنائے اور پھر انہیں اونٹوں کے گلے میں ڈالا اور ان (کے کوہان) کو زخمی کیا اور پھر ان کو بطور ہدی خانہ کعبہ روانہ کر دیا (یعنی جب ۹ھ میں حج فرض ہوا اور حضرت ابوبکرؓ کو حاجیوں کا امیر مقرر کر کے مکہ مکرمہ بھیجا گیا تو ان کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی طرف سے بطور ہدی اونٹ بھیجے گئے) اور اس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ پر ایسی کوئی چیز حرام نہیں ہوئی جو ان کے لئے حلال تھی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ان جانوروں کو بطور ہدی بھیجنے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ پر احرام کے احکام جاری نہیں ہوئے کہ احرام کی حالت میں جو چیزیں حرام ہو جاتی ہیں وہ آپ ﷺ پر حرام ہو گئی ہوں، یہ بات حضرت عائشہؓ نے اس لئے کہی کہ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کے بارہ میں سنا تھا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جو شخص خود حج کو نہ جائے اور اپنی طرف سے ہدی مکہ بھیجے تو اس پر وہ تمام چیزیں کہ جو محرم پر حرام ہوتی ہیں اس وقت تک کے لئے حرام ہو جاتی ہیں جب تک کہ اس کی ہدی حرم میں نہ پہنچ جائے اور ذبح

نہ ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے حضرت عباسؓ کے اس قول کی تردید کی۔

(٦) وَعَنْهَا قَالَتْ فَتَلْتُ قَلَائِدَهَا مِنْ عِهْنٍ كَانَ عِنْدِيْ ثُمَّ بَعَثَ بِهَا مَعَ اَبِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے اس صوف کے جو میرے پاس تھا پٹے بنائے اور پھر (یہ پٹے اونٹوں کے گلے میں ڈال کر) ان کو بطور ہدی اپنے والد ماجد (حضرت ابوبکر صدیقؓ) کے ہمراہ (خانہ کعبہ) روانہ کیا۔" (بخاری ومسلم)

ہدی پر سوار ہونے کا مسئلہ

(٧) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى رَجُلًا يَسُوْقُ بُدْنَةً فَقَالَ ارْكَبْهَا فَقَالَ اِنَّهَا بُدْنَةٌ قَالَ ارْكَبْهَا فَقَالَ اِنَّهَا بُدْنَةٌ قَالَ ارْكَبْهَا وَيْلَكَ فِي الثَّانِيَةِ اَوِ الثَّالِثَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اونٹ ہانکتا ہوا جارہا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس اونٹ پر سوار ہو جاو" اس نے کہا کہ یہ تو ہدی ہے (میں اس پر کیسے سوار ہو جاؤں؟ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ہدی پر سوار ہونا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے) آنحضرت ﷺ نے پھر فرمایا کہ "اس پر سوار ہو جاو" اس نے پھر کہا کہ "یہ ہدی ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "اس پر سوار ہو جاو، افسوس ہے تم پر (کہ میں تمہیں سوار ہونے کے لئے کہتا ہوں اور تم اپنی طرف سے عذر بیان کرتے ہو) آپ ﷺ نے یہ بات دوسری یا تیسری مرتبہ میں فرمائی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

(٨) وَعَنْ اَبِي الزُّبَيْرِ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ سُئِلَ عَنْ رُكُوْبِ الْهَدْيِ فَقَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ارْكَبْهَا بِالْمَعْرُوْفِ اِذَا اُلْجِئْتَ اِلَيْهَا حَتّٰى تَجِدَ ظَهْرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوزبیر (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے سنا حضرت جابر بن عبداللہؓ سے ہدی پر سوار ہونے کے بارہ میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تک کہ تمہیں کوئی اور سواری نہ ملے اور تم سوار ہونے پر مجبور ہو تو اس ہدی پر (اس) احتیاط کے ساتھ سوار ہو (کہ اسے کوئی ضرر و تکلیف نہ پہنچے)۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا ہدی پر سوار ہونا جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر سوار ہونے کی صورت میں ہدی کو کوئی ضرر نہ پہنچے تو اس پر سوار ہونا جائز ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک یہ مسئلہ ہے کہ اگر ضرورت و مجبوری ہو تو ہدی پر سوار ہوا جاسکتا ہے ورنہ نہیں، لہٰذا جن روایتوں میں ہدی پر سوار ہونے کا مطلق طور پر جواز ملتا ہے وہ روایتیں ضرورت و مجبوری پر محمول ہیں۔

راستہ میں قریب المرگ ہو جانے والی ہدی کا مسئلہ

(٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةَ عَشَرَ بُدْنَةً مَعَ رَجُلٍ وَاَمَّرَهُ فِيْهَا فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ اَصْنَعُ بِمَا اُبْدِعَ عَلَيَّ مِنْهَا قَالَ انْحَرْهَا ثُمَّ اصْبَغْ نَعْلَيْهَا فِيْ دَمِهَا ثُمَّ اجْعَلْهَا عَلٰى صَفْحَتِهَا وَلَا تَاْكُلْ مِنْهَا اَنْتَ وَلَا اَحَدٌ مِنْ اَهْلِ رُفْقَتِكَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص (جس کا نام ناجیہ اسلمیؓ تھا) کے ہمراہ سولہ اونٹ مکہ روانہ کئے اور اس شخص کو ان اونٹوں کا محافظ بنایا (کہ نہ صرف ان اونٹوں کو حفاظت کے ساتھ لے جائے بلکہ مکہ پہنچ کر انہیں ذبح بھی کر دے) اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ان میں سے جو (تھک جانے کی وجہ سے) نہ چل سکے (یا کمزوری وغیرہ کی بناء پر قریب المرگ ہو جائے) تو اس کو کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "تم اسے ذبح کر دینا اور پھر وہ دونوں جوتیاں (جو بطریق ہار اس کے گلے میں پڑی ہوں) اس کے خون

میں رنگ کر ان کے نشان اس کے کوہان کے کنارہ پر لگا دینا اور اس کا گوشت نہ تم کھانا اور نہ اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو کھانے دینا۔" (مسلمؒ)

تشریح: جوتیوںؑ کو خون میں رنگ کر اونٹ کے کوہان پر نشان لگا دینے کے لئے آپ ﷺ نے اس لئے فرمایا تاکہ راستہ چلنے والے یہ جان لیں کہ یہ ہدی ہے اس طرح اس کا گوشت جو فقراء و مساکین ہوں وہ تو کھالیں اور اغنیاء اس سے اجتناب کریں کیونکہ اس کا گوشت کھانا اغنیاء پر حرام ہے

آخر میں آپ ﷺ نے اس کی ہدایت فرمادی کہ اس اونٹ کو ذبح کر کے وہیں چھوڑ دینا، اس کا گوشت نہ تم خود کھانا اور نہ اپنے رفقاء سفر کو کھانے دینا خواہ فقراء و مساکین ہوں یا اغنیاء۔ ان کو ہر حال میں ان کا گوشت کھانے سے منع اس لئے کیا کہ کہیں یہ لوگ اپنی ماندگی کا کوئی بہانہ کر کے اپنے کھانے کے لئے کوئی اونٹ ذبح نہ کر ڈالیں۔

اب یہ بات محل اشکال بن سکتی ہے کہ ایسی صورت میں کہ گوشت کھانے سے خود محافظ کو بھی منع کیا جا رہا ہے اور اس کے رفقاء قافلہ کو بھی، تو پھر اس گوشت کا مصرف کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس طرح وہ گوشت یوں ہی ضائع ہوگا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ گوشت ضائع نہیں ہوگا بلکہ جہاں وہ اونٹ ذبح ہوگا وہاں آس پاس کے رہنے والے اسے اپنے استعمال میں لے آئیں گے، یا قافلے تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں ان کے بعد جو قافلہ وہاں سے گزرے گا وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا۔

بہر کیف راستے میں جو ہدی قریب المرگ ہو جائے اور اس کو ذبح کر دیا جائے تو اس کا حکم یہ ہے جو حدیث میں ذکر کیا گیا کہ اس کا گوشت اغنیاء اور اہل قافلہ کے لئے کھانا درست نہیں ہے لیکن اس بارہ میں فقہی تفصیل ہے جس کو ملتقی الابحر اور در مختار میں یوں نقل کیا گیا ہے کہ۔ ① اگر ہدی واجب ہو اور وہ راستہ میں قریب المرگ ہو جائے یا ایسی عیب دار ہو کہ اس کی قربانی جائز نہ ہوتی ہو تو اس کے بجائے دوسری ہدی روانہ کرے، اس پہلی ہدی کو چاہے تو ذبح کر کے خود کھالے یا دوسروں کو کھلا دے یا اور جو چاہے کرے۔ ② اگر ہدی نفل ہو اور مرنے کے قریب ہو تو اس کو ذبح کرلے اور جوتیاں (جو بطور ہار اس کے گلے میں پڑی ہوں) اس کے خون میں رنگ کر اس کی گردن پر نشان کر دے اور اس کے گوشت میں سے نہ مالک کھائے اور نہ اغنیاء کھائیں۔ ③ جو ہدی منزل مقصود پر پہنچ کر ذبح ہو اس کے بارہ میں اسی فصل کی آخری حدیث کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ نفل تمتع اور قران کی ہدی اور قربانی کے گوشت میں سے مالک کو کھانا مستحب ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے قسم کی ہدی کے گوشت میں سے مالک کو کھانا درست نہیں ہے۔

آخر میں ایک بات اور جان لیجئے کہ مذکورہ بالا حدیث کی شرح میں بعض شارحین سے کچھ چوک ہوگئی ہے کیوں کہ انہوں نے لکھا ہے کہ حدیث میں گوشت نہ کھانے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس ہدی سے متعلق ہے جسے اپنے اوپر واجب کیا گیا ہو جیسے نذر کی ہدی اور اگر ہدی نفل ہو تو اس کا گوشت کھانا جائز ہے، لہٰذا ان شارحین سے راستہ کی اس ہدی کو منزل مقصود پر پہنچ کر ذبح ہونے والی ہدی پر قیاس کر کے یہ بات لکھ دی ہے حالانکہ یہ بات حدیث کے منشاء و حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔

ہدی اور قربانی کے حصے

⑩ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَحَرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَامَ الْحُدَیْبِیَۃِ الْبَدَنَۃَ عَنْ سَبْعَۃٍ وَالْبَقَرَۃَ عَنْ سَبْعَۃٍ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے حدیبیہ کے سال رسول کریم ﷺ کے ہمراہ سات آدمیوں کی طرف سے اونٹ ذبح کیا اور سات آدمیوں کی طرف سے گائے ذبح کی۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ہم نے شرکت میں جانور ذبح کئے اس طرح کہ اونٹ اور گائے میں سات سات آدمی شریک تھے۔ چنانچہ یہ

حدیث حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور اکثر علماء کے اس مسلک کی دلیل ہے کہ اونٹ اور گائے میں سات آدمیوں کا شریک ہونا جائز ہے جب کہ ان ساتوں کو قربت یعنی ثواب مقصود ہو، قربت خواہ ایک طرح کی ہو۔ جیسے کہ اگر ایک شخص ہدی کی نیت رکھتا ہے تو دوسرے بھی ہدی ہی کی نیت رکھیں یا قربت مختلف ہو جیسے کہ بعض تو ہدی کے ارادہ و نیت سے شریک ہوں اور بعض قربانی کی نیت سے، اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی ایک اونٹ یا گائے میں سات آدمیوں کی شرکت جائز ہے جب کہ بعض تو مثلاً ہدی یا قربانی کی نیت سے شریک ہوں اور بعض محض گوشت کے لئے! حضرت امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ واجب قربانی یا ہدی میں کسی بھی جانور میں مطلق طور پر شرکت درست نہیں ہے۔ بکری و بھیڑ میں شرکت متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

اونٹ کے نحر کا طریقہ

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ اَتٰى عَلٰى رَجُلٍ قَدْ اَنَاخَ بَدَنَتَهٗ يَنْحَرُهَا قَالَ اِبْعَثْهَا قِيَامًا مُقَيَّدَةً سُنَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جو اپنے اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا تھا، انہوں نے اس سے فرمایا کہ "اس اونٹ کو کھڑا کر دو اور اس کا (بایاں) پاؤں باندھو (اور اس طرح اونٹ کو نحر کر کے) رسول کریم ﷺ کے طریقہ کو اختیار کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اونٹ کے سینہ میں برچھی مارنے کو "نحر" کہتے ہیں اور گائے وغیرہ کا گلا چھری سے کاٹنا "ذبح" کہلاتا ہے لہٰذا اونٹ کو تو نحر کرنا افضل ہے اور گائے، بیل، بھینس، بھیڑ اور بکری کو ذبح کرنا افضل ہے۔

نحر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اونٹ کو کھڑا کر کے اس کی بائیں ٹانگ رسی سے باندھ دی جائے اور پھر اس کے سینہ میں برچھی ماری جائے تاکہ خون جاری ہو اور وہ گر پڑے۔

امام ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اونٹ کو کھڑا کر کے نحر کرنا افضل ہے اور اگر کھڑا نہ کیا جا سکے تو پھر بٹھا کر نحر کرنا لٹا کر نحر کرنے سے افضل ہے۔ جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان کو بائیں پہلو پر لٹا کر ذبح کرنا چاہئے۔

قرآن کریم سے بھی یہی ثابت ہے کہ اونٹ کو نحر کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ اللہ تعالیٰ کے واسطے نماز پڑھو اور نحر کرو۔ اس آیت کی تفسیر میں اونٹ کو نحر کرنا لکھا گیا ہے۔ ذبح کرنے کے بارے میں یہ آیت کریمہ ہے:

اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً۔

"یہ کہ گائے کو ذبح کرو۔"

ہدی کے بارہ میں کچھ ہدایات

(۱۲) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقُوْمَ عَلٰى بُدْنِهٖ وَاَنْ اَتَصَدَّقَ بِلَحْمِهَا وَجُلُوْدِهَا وَاَجِلَّتِهَا وَاَنْ لَّا اُعْطِيَ الْجَزَّارَ مِنْهَا قَالَ نَحْنُ نُعْطِيْهِ مِنْ عِنْدِنَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے ہدایت فرمائی کہ میں آپ ﷺ کے اونٹوں کی خبر گیری کروں، ان کے گوشت کو خیرات کر دوں اور ان کی کھالیں اور جھولیں بھی صدقہ کر دوں، اور یہ کہ قصائی کو ان میں سے کوئی چیز (بطور مزدوری) نہ دوں، نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "(مزدوری) ہم اپنے پاس سے دیں گے"۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اونٹوں" سے مراد وہ اونٹ ہیں جو آنحضرت ﷺ حجۃ الوداع میں بطور ہدی مکہ مکرمہ لے گئے تھے اور جن کی تعداد سو تھی، اس

کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ہدی کے جانور کی کھال، جھول اور مہار وغیرہ بھی خیرات کر دینی چاہئے، ان چیزوں کو قصائی کو مزدوری میں نہ دینا چاہئے ہاں اگر قصائی کو احساناً دیا جائے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔

چاہے تو کھال ہی کسی کو صدقہ و خیرات کر دی جائے اور اگر اس کو فروخت کر کے جو قیمت ملے وہ صدقہ کر دی جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

ہدی کا دودھ نہ نکالنا چاہئے بلکہ اس کے تھنوں پر ٹھنڈا پانی چھڑک دیا جائے تاکہ اس کا دودھ اترنا موقوف ہو جائے اور اگر دودھ نہ نکالنے سے جانور کو تکلیف ہو تو پھر دودھ نکال لیا جائے اور اسے خیرات کر دیا جائے۔

کس ہدی کا گوشت مالک کو کھانا جائز ہے

⑬ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا لَا نَأْكُلُ مِنْ لُحُوْمِ بُدْنِنَا فَوْقَ ثَلَاثٍ فَرَخَّصَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كُلُوْا وَتَزَوَّدُوْا فَاَكَلْنَا وَتَزَوَّدْنَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (پہلے) ہم اپنی قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہیں کھاتے تھے، پھر رسول کریم ﷺ نے ہمیں اجازت دی اور فرمایا کہ کھاؤ اور اسے توشہ بناؤ، (یعنی تین دن کے بعد بھی) چنانچہ ہم نے کھایا اور توشہ بنایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ابتداء اسلام میں لوگوں کو گوشت کی زیادہ ضرورت تھی اور ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی جو خود قربانی نہیں کر سکتے تھے اس لئے آپ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ قربانی کا گوشت تین دن کے بعد جمع کر کے نہ رکھو بلکہ دوسرے لوگوں کو کھانے کے لئے صدقہ کر دیا کرو، پھر بعد میں جب گوشت کی زیادہ ضرورت نہ رہی اور سب ہی لوگوں کو قربانی کی استطاعت حاصل ہو گئی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی کہ قربانی کا گوشت تین دن کے بعد بھی جمع کر کے رکھا جا سکتا ہے۔

شمنیؒ فرماتے ہیں کہ مالک کو نفل تمتع اور قران کی ہدی اور قربانی کا گوشت کھانا جائز ہے، ان کے علاوہ دوسرے قسم کی ہدی کا گوشت درست نہیں کیونکہ وہ کفارہ اور جنایت کی ہوگی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

دشمنان خدا کو رنج پہنچانا مستحب ہے

⑭ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَهْدٰى عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ فِيْ هَدَايَا رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ جَمَلًا كَانَ لِاَبِيْ جَهْلٍ فِيْ رَأْسِهٖ بُرَةٌ مِنْ فِضَّةٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ مِنْ ذَهَبٍ يَغِيْظُ بِذٰلِكَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حدیبیہ کے سال اپنے ہدی کے جانوروں میں ابوجہل کا اونٹ بھی لے گئے تھے جس کی ناک میں چاندی کی نتھنی تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ نتھنی سونے کی تھی اور اس سے مقصد مشرکین کو غیظ دلانا تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ چھ ہجری میں عمرے کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے مگر مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے رفقاء کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا اور مکہ نہیں جانے دیا، یہ بہت مشہور واقعہ ہے، اسی سفر میں آنحضرت ﷺ جو اونٹ بطور ہدی ذبح کرنے کے لئے لے گئے تھے ان میں ایک اونٹ ابوجہل کا بھی تھا جو غزوۂ بدر میں بطور غنیمت ہاتھ لگا تھا۔ اس اونٹ کو آپ ﷺ اپنے ہمراہ اس لئے لے گئے تھے تاکہ مشرکین مکہ اس اونٹ کو دیکھ کر کڑھیں اور جلیں کہ یہ اونٹ مسلمانوں کے ہاتھ پڑا اور ذبح کیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ دشمنان خدا کو رنج پہنچانا اور انہیں جلانا مستحب ہے۔

قریب المرگ ہدی کا حکم

⑮ وَعَنْ نَاجِيَةَ الْخُزَاعِيِّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ اَصْنَعُ بِمَا عَطِبَ مِنَ الْبُدْنِ قَالَ انْحَرْهَا ثُمَّ اغْمِسْ نَعْلَهَا فِيْ دَمِهَا ثُمَّ خَلِّ بَيْنَ النَّاسِ وَبَيْنَهَا فَيَاْكُلُوْنَهَا۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ عَنْ نَاجِيَةَ الْاَسْلَمِيِّ۔

"اور حضرت ناجیہ خزاعیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہدی کے جانوروں میں سے جو جانور (کسی بھی وجہ سے) قریب المرگ ہو تو میں اس کا کیا کروں؟" آپ ﷺ نے فرمایا اس جانور کو ذبح کر ڈالو پھر اس کی جوتی کو (اس کے گلے میں بطور ہار پڑی ہو) اس کے خون میں رنگ دو (اور اس کے ذریعہ اس کی گردن پر نشان لگا دو) اس کے بعد اس جانور کو لوگوں کے درمیان چھوڑ دو (یعنی اس کا گوشت کھانے سے فقراء کو منع نہ کرو) تاکہ وہ اسے کھائیں۔ (مالکؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) ابوداؤدؒ اور دارمیؒ نے اس روایت کو حضرت ناجیہ اسلمیؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "تاکہ وہ اسے کھائیں" کا مطلب یہ ہے کہ رفقاء قافلہ کے علاوہ خواہ وہ اغنیاء ہوں یا فقراء، دوسرے فقراء اس جانور کے گوشت کو اپنے استعمال میں لائیں۔ اس بارہ میں پوری تفصیل پہلی فصل میں گزر چکی ہے۔

مذکورہ بالا حدیث کو مالکؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے حضرت ناجیہ خزاعیؓ سے نقل کیا ہے اور ابوداؤدؒ اور دارمیؒ نے حضرت ناجیہ اسلمیؓ سے۔ اس طرح بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کے دو راوی ہیں ایک ناجیہ خزاعیؓ اور دوسرے ناجیہ اسلمیؓ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ صحابہؓ میں ناجیہؓ نام کے صرف ایک ہی صحابی ہیں لہٰذا محدثین اس بارہ میں لکھتے ہیں یہاں اختلاف صرف نسب کا ہے ذات ایک ہی ہے یعنی ناجیہ خزاعی اور ناجیہ اسلمی ایک ہی صحابیؓ کا نام ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بعض نے تو انہیں ناجیہؓ خزاعی کے نام سے ذکر کیا ہے اور بعض نے ناجیہ اسلمی کہا ہے کیونکہ خزاعی اور اسلمی یہ دونوں ان کے قبیلہ کے نام ہیں۔

قربانی کے دن کی فضیلت

⑯ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ قُرْطٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَعْظَمَ الْاَيَّامِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمُ النَّحْرِ ثُمَّ يَوْمُ الْقَرِّ قَالَ ثَوْرٌ وَهُوَ الْيَوْمُ الثَّانِي قَالَ وَقُرِّبَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَدَنَاتٌ خَمْسٌ اَوْسِتٌّ فَطَفِقْنَ يَزْدَلِفْنَ اِلَيْهِ بِاَيَّتِهِنَّ يَبْدَأُ قَالَ فَلَمَّا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا قَالَ فَتَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ خَفِيَّةٍ لَمْ اَفْهَمْهَا فَقُلْتُ مَا قَالَ قَالَ مَنْ شَاءَ اقْتَطَعَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن قرطؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام دنوں میں بہت بڑا دن (از روئے فضیلت) قربانی کا دن (یعنی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ) ہے اور پھر قر کا دن۔ حدیث کے راوی حضرت ثورؓ کہتے ہیں کہ یہ (قر کا دن) دوسرا دن (یعنی ذی الحجہ کی گیارھویں تاریخ ہے) حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ (جب قربانی کے دن) آنحضرت ﷺ کے قریب وہ اونٹ لائے گئے جو پانچ یا چھ کی تعداد میں تھے تو اونٹوں نے (ایک دوسرے پر سبقت کر کے) آپ ﷺ کے نزدیک آنا شروع کیا تاکہ جسے چاہیں پہلے اسی کو ذبح کریں۔ راوی کہتے ہیں کہ جب یہ جانور پہلو پر گر گئے (یعنی وہ ذبح کر دیئے گئے) تو آنحضرت ﷺ نے آہستہ سے کچھ فرمایا جسے میں نہ سمجھ سکا، چنانچہ میں نے (اس شخص سے جو میرے پاس تھا) پوچھا کہ آپ ﷺ نے کیا فرمایا ہے؟ اس نے کہا کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ "جو شخص چاہے (ہدی کے) ان جانوروں میں سے (گوشت) کاٹ کر لے جائے"۔ (رواہ ابوداؤدؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "دنوں میں بہت بڑا دن قربانی کا دن ہے" سے مراد یہ ہے کہ قربانی کا دن ان دنوں میں سے ایک دن ہے جو افضل اور بزرگ ترین دن ہیں۔ یہ مراد اس لئے لی گئی ہے کہ دوسری احادیث میں (ذی الحجہ کے) عشرہ کو تمام دنوں کے مقابلہ میں

افضل کہا گیا ہے لہٰذا اس اعتبار سے کہ عشرہ ذی الحجہ افضل ہے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ (جو قربانی کا دن ہے) بھی افضل ہے کیونکہ یہ دن بھی عشرۂ ذی الحجہ میں شامل ہے۔

اب رہی یہ بات کہ جس طرح احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام دنوں میں افضل ترین عشرہ ذی الحجہ ہے اسی طرح یہ بات بھی احادیث ہی سے ثابت ہے کہ رمضان کا آخری عشرہ افضل ترین ہے۔ تو اس تضاد کو یوں رفع کیا جائے کہ ان احادیث کو کہ جن سے عشرہ ذی الحجہ کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے اشہر حرم کے ساتھ مقید کیا جائے یعنی یہ کہا جائے کہ اشہر حرم کے دنوں میں افضل ترین عشرہ ذی الحجہ ہے لہٰذا حاصل یہ نکلے گا کہ عشرہ ذی الحجہ حرام مہینوں میں افضل ہے اور عشرہ رمضان مطلق طور پر تمام دنوں میں افضل ہے۔

مذکورہ بالا تضاد کو دور کرنے کے لئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ افضلیت باعتبار حیثیت کے مختلف ہے یعنی چونکہ رمضان میں روزے رکھے جاتے ہیں، اس ماہ مقدس میں عبادت کا ثواب بہت زیادہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے آخر عشرہ میں اعتکاف ہوتا ہے اس اعتبار سے تو رمضان کا آخر عشرہ افضل ہے اور چونکہ ذی الحجہ میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں اور قربانی کی جاتی ہے اس اعتبار سے یہ افضل ہے۔

"قر کا دن" سے بقر عید کے بعد کا دن یعنی ذی الحجہ کی گیارہویں تاریخ مراد ہے، اس دن کو قر کا دن اس لئے کہتے ہیں کہ ادائے مناسک کی محنت و مشقت برداشت کرنے کے بعد منیٰ میں اسی دن حاجیوں کو سکون و قرار ملتا ہے۔

اس موقع پر بھی یہ خلجان پیدا ہوسکتا ہے کہ حدیث صحیح میں تو عرفہ کے دن کو افضل کہا گیا ہے؟ تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ قر کا دن ان دنوں میں سے ایک دن ہے جو افضل ہیں۔

"اونٹوں نے آپ ﷺ کے نزدیک آنا شروع کیا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب ان اونٹوں کو ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا اور وہ اونٹ آپ ﷺ کے پاس لائے گئے تو ہر اونٹ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک کی برکت حاصل کرنے کے لئے اس بات کا منتظر تھا کہ پہلے مجھے ذبح کریں، اس مقصد کے لئے اونٹ ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، یہ دراصل آپ ﷺ کا معجزہ تھا کہ جانوروں میں بھی حصول برکت و سعادت کا وہ جذبہ لطیف پیدا ہو گیا جو انسانوں ہی کا خاصہ ہوسکتا ہے۔ وَذُكِرَ حَدِيثُ ابْنِ عَبَّاسٍ وَجَابِرٍ فِي بَابِ الْأُضْحِيَةِ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ کی حدیثیں باب الاضحیہ میں ذکر کی جا چکی ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قربانی کا گوشت

(۱۷) عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ضَحّٰى مِنْكُمْ فَلَا يُصْبِحَنَّ بَعْدَ ثَالِثَةٍ وَفِي بَيْتِهِ مِنْهُ شَيْءٌ فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَفْعَلُ كَمَا فَعَلْنَا الْعَامَ الْمَاضِيَ قَالَ كُلُوْا وَاَطْعِمُوْا وَادَّخِرُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ الْعَامَ كَانَ بِالنَّاسِ جُهْدٌ فَاَرَدْتُ اَنْ تُعِيْنُوْا فِيْهِمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت سلمہ ابن اکوعؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص قربانی کرے تو تیسرے دن کے بعد اس حال میں صبح نہ ہو کہ اس کے گھر میں قربانی کا گوشت موجود ہو۔" یعنی قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھے پھر جب دوسرا سال آیا تو بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ) کیا ہم اس سال بھی ایسا ہی کریں جیسا کہ پچھلے سال کیا تھا؟ (یعنی گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی قربانی کا گوشت تین دن کے بعد نہ رہنے دیں) آپ ﷺ نے فرمایا "کھاؤ" کھلاؤ اور جمع کر کے رکھو، دراصل پچھلے سال لوگ محنت و مشقت اور محتاجگی میں مبتلا تھے اس لئے میں نے (جمع کرنے سے منع کر کے) یہ چاہا تھا کہ تم لوگ ان ضرورت مندوں کی مدد کرو (اور اب چونکہ ایسی ضرورت و حاجت نہیں رہی ہے اس لئے اگر تم قربانی کا گوشت جمع رکھنا چاہتے ہو تو تمہیں اس کی اجازت ہے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ایک سال مدینہ اور آس پاس کے علاقوں میں شدید قحط پڑا تھا، اس موقع پر باہر کے رہنے والے بڑی کثرت کے ساتھ مدینہ آگئے

تھے جن سے سارا مدینہ بھر گیا تھا، اسی سال آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ لوگوں کے پاس جتنا گوشت ہو تقسیم کر دیں، جمع کر کے نہ رکھیں۔ پھر آئندہ سال جب تقسیم کی حاجت وضرورت نہ رہی تو آپ ﷺ نے جمع رکھنے کی اجازت دے دی۔

(۱۸) وَعَنْ نُبَيْشَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا كُنَّا نَهَيْنَاكُمْ عَنْ لُحُوْمِهَا اَنْ تَاْكُلُوْهَا فَوْقَ ثَلَاثٍ لِكَيْ تَسَعَكُمْ جَاءَ اللّٰهُ بِالسَّعَةِ فَكُلُوْا وَادَّخِرُوْا وَأْتَجِرُوْا اَلَا وَاِنَّ هٰذِهِ الْاَيَّامَ اَيَّامُ اَكْلٍ وَشُرْبٍ وَذِكْرِ اللّٰهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت نبیشہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہم تمہیں قربانی یا ہدی کے گوشت کے بارہ میں اس بات سے منع کرتے تھے کہ تم اسے تین دن سے زیادہ کھاؤ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وسعت ہو (یعنی تاکہ اس طرح تمہارے فقراء بھی اس گوشت سے فائدہ اٹھائیں) اب اللہ تعالیٰ نے وسعت بخش دی ہے اس لئے تم (جب تک جی چاہے) کھاؤ اور جمع رکھو نیز (اس گوشت کے صدقہ وخیرات کے ذریعہ) ثواب حاصل کرو اور یاد رکھو! یہ (چار) دن (جو منیٰ میں گزارے جاتے ہیں) کھانے پینے کے دن ہیں (کہ ان ایام میں روزہ رکھنا حرام ہے) اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کے دن ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ارشاد کے مطابق یہ ایام ذکر اللہ میں بہت زیادہ مشغول رہنے کے ہیں۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔

"یعنی جب تم اپنے حج کے افعال کی ادائیگی سے فارغ ہو چکو تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو یعنی بہت زیادہ یاد کرنا۔"

بَابُ الْحَلْقِ

سر منڈانے کا بیان

دسویں ذی الحجہ کو جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارنے کے بعد منیٰ ہی میں ہدی ذبح کی جاتی ہے اس کے بعد سر منڈوا کر یا بال کتروا کر احرام کھول دیا جاتا ہے اس طرح رفث (عورت سے جماع وغیرہ) کے علاوہ ہر وہ چیز جو احرام کی حالت میں ممنوع تھی، جائز ہو جاتی ہے، چنانچہ اس باب میں سر منڈوانے اور بال کتروانے دونوں چیزوں کا ذکر ہے، اگرچہ مؤلف مشکوٰۃ نے عنوان میں صرف سر منڈوانے کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے کیونکہ احرام سے نکلنے کے لئے بال کتروانے کی بہ نسبت سر منڈانا افضل ہے، اس بارہ میں تفصیل انشاء اللہ حسب موقع بیان ہوگی۔

یہ بات جان لیجئے کہ آنحضرت ﷺ کے بارہ میں یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے حج وعمرہ کے علاوہ اور کبھی سر منڈایا ہو۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

سر منڈانا افضل ہے

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَلَقَ رَأْسَهٗ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ وَاُنَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ وَقَصَّرَ بَعْضُهُمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اپنا سر منڈایا اور صحابہؓ میں سے کچھ نے تو اپنے سر منڈائے اور کچھ نے اپنے بال کتروائے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: جن صحابہؓ نے اپنے سر منڈائے انہوں نے تو آنحضرت ﷺ کی اتباع کے جذبے اور حصول افضلیت کو پیش نظر رکھا اور جن صحابہؓ نے بال کتروانے پر اکتفاء کیا (انہوں نے گویا جواز پر عمل کیا کہ بال کتروانا بھی جائز ہے۔ صحیحین وغیرہما میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عمرۃ القضاء میں سر منڈانے کی بجائے بال کتروائے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ سے یہ دونوں چیزیں ثابت ہیں لیکن افضل سر منڈانا ہی ہے۔

آنحضرت ﷺ کا بال کتروانا

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ لِیْ مُعَاوِیَةُ اِنِّی قَصَّرْتُ مِنْ رَأْسِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ الْمَرْوَةِ بِمِشْقَصٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے سر کے بال مروہ کے قریب تیر کی پیکان سے کترے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مِشْقَص" کے معنی ہیں "تیر کی پیکان" لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ "مِشْقَص" بڑی قینچی کو کہتے ہیں اور یہ معنی زیادہ مناسب اور زیادہ صحیح بھی ہیں۔

احادیث سے چونکہ یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے حج میں سر کے بال کتروائے نہیں بلکہ منڈوائے تھے اس لئے حضرت معاویہؓ کے اس بیان کا تعلق حج سے نہیں بلکہ عمرے سے ہے، چنانچہ حضرت معاویہؓ کے الفاظ عِنْدَ الْمَرْوَةِ (مروہ کے قریب) بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ حضرت معاویہؓ اگر آپ ﷺ کے بال حج میں کترتے تو "مروہ کے قریب" نہ کہتے بلکہ یہ کہتے کہ میں نے آپ ﷺ کے سر کے بال منیٰ میں کترے۔

سر منڈانے والوں کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعاءِ رحمت

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِی حَجَّةِ الْوَدَاعِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِیْنَ قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِیْنَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِیْنَ قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِیْنَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَالْمُقَصِّرِیْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں فرمایا "اے اللہ! سر منڈانے والوں پر رحم فرما!" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! بال کتروانے والوں کے لئے دعاء رحمت کیجئے" آپ ﷺ نے فرمایا "اے اللہ! سر منڈانے والوں پر رحم فرما" صحابہؓ نے (جب پھر) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! بال کتروانے والوں کے لئے بھی دعا رحمت کیجئے"۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا (اے اللہ!) اور بال کتروانے والوں پر بھی (رحم فرما)۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: اس بات سے سر منڈانے کی افضلیت ثابت ہوئی کہ آپ ﷺ نے سر منڈانے والوں کے لئے تو کئی بار دعاء رحمت کی اور بال کتروانے والوں کے لئے کئی بار کے بعد ایک ہی مرتبہ دعاء رحمت کی۔

(۴) وَعَنْ یَحْیَی بْنِ الْحُصَیْنِ عَنْ جَدَّتِهٖ اَنَّهَا سَمِعَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی حَجَّةِ الْوَدَاعِ دَعَا لِلْمُحَلِّقِیْنَ ثَلَاثًا وَلِلْمُقَصِّرِیْنَ مَرَّةً وَاحِدَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت یحییٰ ابن حصینؒ (تابعی) اپنی دادی محترمہ سے (کہ جن کی کنیت اُمّ الحصین ہے) نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے حجۃ الوداع میں نبی کریم ﷺ کو سر منڈانے والوں کے لئے تین مرتبہ اور بال کتروانے والوں کے لئے (آخر میں) ایک مرتبہ دعا کرتے سنا۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے پہلے بخاری و مسلم کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے سر منڈانے والوں کے

لئے تو دو مرتبہ دعا کی اور تیسری مرتبہ میں بال کتروانے والوں کو بھی شامل فرمایا، نیز بخاری و مسلم ہی کی ایک اور روایت میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چوتھی مرتبہ میں بال کتروانے والوں کو شامل فرمایا، جب کہ مسلم کی یہ روایت بتا رہی ہے کہ آپ ﷺ نے سر منڈانے والوں کے لئے تو تین مرتبہ دعا کی اور بال کتروانے والوں کے لئے ایک مرتبہ، اب چاہے تو ان کو تیسری ہی مرتبہ میں شامل کیا ہو، چاہے چوتھی مرتبہ ان کے لئے علیحدہ سے دعا کی۔

بہر کیف ان تمام روایتوں میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے علماء لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ دعا کئی مجلسوں میں کی ہوگی، چنانچہ کسی مجلس میں آپ ﷺ نے سر منڈانے والوں کے لئے دو مرتبہ اور تیسری مرتبہ میں بال کتروانے والوں کے لئے دعا کی اور کسی مجلس میں تین مرتبہ سر منڈانے والوں کے لئے اور چوتھی مرتبہ بال کتروانے والوں کے لئے دعا کی ہوگی، یا پھر یہ کہ جس راوی نے جو سنا اور اس پر جو حقیقت ظاہر ہوئی اس نے اسی کو ذکر کیا۔

سر منڈانے میں دائیں طرف سے ابتداء کرنا سُنّت ہے

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتٰى مِنًى فَاَتَى الْجَمْرَةَ فَرَمَاهَا ثُمَّ اَتٰى مَنْزِلَهٗ بِمِنًى وَنَحَرَ نُسُكَهٗ ثُمَّ دَعَا بِالْحَلَّاقِ وَنَاوَلَ الْحَالِقَ شِقَّهُ الْاَيْمَنَ فَحَلَقَهٗ ثُمَّ دَعَا اَبَا طَلْحَةَ الْاَنْصَارِيَّ فَاَعْطَاهُ اِيَّاهُ ثُمَّ نَاوَلَ الشِّقَّ الْاَيْسَرَ فَقَالَ احْلِقْ فَحَلَقَهٗ فَاَعْطَاهُ اَبَا طَلْحَةَ فَقَالَ اقْسِمْهُ بَيْنَ النَّاسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ منیٰ میں آنے کے بعد جمرۂ عقبہ کے پاس تشریف لائے اور وہاں کنکریاں ماریں پھر منیٰ میں اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے اور اپنی ہدی کے جانوروں کو ذبح کیا، اس کے بعد سر مونڈنے والے کو (جس کا نام معمر ابن عبداللہ تھا) بلایا اور اپنے سر کا دایاں حصّہ اس کے سامنے کیا، چنانچہ اس نے آپ ﷺ کے سر (کے اس داہنے حصہ) کو مونڈا، پھر آپ ﷺ نے حضرت طلحہ انصاریؓ کو بلایا اور ان کو اپنے وہ مونڈے ہوئے بال دیئے، اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے سر کا بایاں حصّہ مونڈنے والے کی طرف کر کے فرمایا کہ اب اسے مونڈو، چنانچہ اس نے مونڈ دیا، یہ بال بھی آپ ﷺ نے حضرت ابو طلحہ انصاری کو دے دیئے اور فرمایا کہ یہ بال لوگوں میں تقسیم کر دو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سر منڈانے میں دائیں طرف سے ابتداء کرنا سُنّت ہے، نیز اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دائیں طرف میں منڈوانے والے کا اعتبار ہے کہ وہ اپنے سر کو دائیں طرف سے منڈانا شروع کرے، جب کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مونڈنے والے کی دائیں طرف کا اعتبار ہے یعنی مونڈنے والا اپنی دائیں طرف سے سر مونڈنا شروع کرے۔

قربانی کے دن خوشبو کا استعمال

⑥ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اُطَيِّبُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ يُّحْرِمَ وَيَوْمَ النَّحْرِ قَبْلَ اَنْ يَّطُوْفَ بِالْبَيْتِ بِطِيْبٍ فِيْهِ مِسْكٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کو احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگاتی تھی (احرام خواہ حج کا ہوتا خواہ عمرہ کا اور خواہ دونوں کا) اور میں نحر (قربانی) کے دن بھی خانہ کعبہ کے طواف سے پہلے (سر منڈانے اور کپڑے پہننے کے بعد) آپ ﷺ کے خوشبو لگاتی تھی، اور خوشبو بھی وہ جس میں مشک ہوتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علماء لکھتے ہیں کہ جن مواقع پر حضرت عائشہؓ نے خوشبو لگانے کا ذکر کیا ہے یعنی احرام باندھنے سے پہلے اور نحر کے دن طواف خانہ کعبہ سے قبل، اگر ان اوقات میں خوشبو لگائی جائے تو مشک اور گلاب کی خوشبو لگانا سب سے بہتر اور اولیٰ ہے کیونکہ ان دونوں میں

صرف خوشبو ہوتی ہے رنگ نہیں ہوتا۔

نحر(قربانی کے دن) یعنی دسویں ذی الحجہ کو سر منڈانے کے بعد حاجی احرام سے باہر ہو جاتے ہیں یعنی وہ چیزیں جو احرام کی وجہ سے ان پر حرام تھیں اس دن سب حلال ہو جاتی ہیں علاوہ رفث کے اور جب طواف زیارت سے فراغت ہو جاتی ہے تو رفث بھی حلال ہو جاتا ہے۔

نحر کے دن آنحضرت ﷺ نے ظہر کی نماز کہاں پڑھی

(۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفَاضَ يَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ رَجَعَ فَصَلَّى الظُّهْرَ بِمِنًى۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نحر کے دن (رمی اور قربانی سے فارغ ہو کر) مکہ تشریف لائے اور چاشت کے وقت طواف فرض کیا پھر (اسی روز) وہاں سے واپس ہوئے اور ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھی۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے دسویں ذی الحجہ کو ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھی جب کہ باب حجۃ الوداع میں حضرت جابرؓ کی روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس دن ظہر کی نماز مکہ میں ادا فرمائی؟ چنانچہ دونوں روایتوں کے اس ظاہری تضاد کو حضرت جابرؓ کی روایت کی تشریح میں رفع کیا جا چکا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ظہر کی نماز تو مکہ ہی میں ادا کی تھی البتہ آپ ﷺ نے منیٰ میں نفل نماز پڑھی جس کو حضرت ابن عمرؓ نے ظہر کی نماز گمان کیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

عورت کو سر منڈانے کی ممانعت

(۸) وَعَنْ عَلِيٍّ وَعَائِشَةَ قَالَا نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تَحْلِقَ الْمَرْاَةُ رَأْسَهَا۔ (رواه الترمذی)

"حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے عورت کو اپنا سر منڈوانے سے منع فرمایا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عورت جب احرام سے باہر آئے تو اپنا سر نہ منڈائے چنانچہ فقہی مسئلہ بھی یہی ہے۔ ویسے اس حدیث سے عورتوں کو مطلقاً سر منڈانے کی ممانعت بھی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ جس طرح مرد کو داڑھی منڈانا حرام ہے اسی طرح عورت کو اپنا سر منڈانا حرام ہے۔ ہاں کسی ضرورت و مجبوری کی بناء پر عورت اپنا سر منڈوا سکتی ہے۔

عورت کو صرف بال کتروانے چاہئیں

(۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ الْحَلْقُ اِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيْرُ۔ (رواه ابوداؤد والترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سر منڈانا عورتوں کے لئے ضروری نہیں ہے بلکہ انہیں صرف اپنے بال کتروانے چاہئیں۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں جب احرام سے باہر آئیں تو سر منڈانا ان پر واجب نہیں ہے بلکہ ان کے لئے حرام ہے ہاں بال کتروانا ان پر واجب ہے، بخلاف مردوں کے کہ ان پر دونوں چیزوں میں سے کوئی ایک واجب ہے کہ چاہے تو سر منڈائیں چاہے صرف بال کتروالیں البتہ سر منڈانا افضل ہے۔

سر منڈانے یا بال کتروانے کی مقدار: حنفیہ کے ہاں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ سر منڈانے کے سلسلہ میں صرف چوتھائی سر کا منڈانا واجب ہے اور پورے سر کا منڈانا افضل ہے، ہاں بال کتروانے کے سلسلہ میں واجب صرف چوتھائی سر کے بال کو ایک انگلی پور کے برابر کتروانا ہے اور پورے سر کے بال کتروانے مستحب ہیں، لیکن علامہ ابن ہمامؒ نے اس قول کو اختیار کیا ہے جو حضرت امام مالکؒ کا مسلک ہے کہ پورے سر کو منڈوانا یا پورے سر کے بال کتروانا ہی واجب ہے اور انہوں نے فرمایا ہے کہ یہی صواب ہے۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّالِثِ

اور اس باب میں تیسری فصل نہیں ہے۔

بَابٌ

گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

افعال حج میں تقدیم و تاخیر

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِمِنًى لِلنَّاسِ يَسْأَلُوْنَهٗ فَجَاءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ فَحَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ فَقَالَ اِذْبَحْ وَلَا حَرَجَ فَجَاءَ اٰخَرُ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ فَنَحَرْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ فَقَالَ ارْمِ وَلَا حَرَجَ فَمَا سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا اُخِّرَ اِلَّا قَالَ افْعَلْ وَلَا حَرَجَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ اَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ حَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ ارْمِ وَلَا حَرَجَ وَاَتَاهُ اٰخَرُ فَقَالَ اَفَضْتُ اِلَى الْبَيْتِ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ ارْمِ وَلَا حَرَجَ۔

"حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر جب منیٰ میں ٹھہرے تاکہ لوگ آپ ﷺ سے مسائل دریافت کریں تو ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ ناواقفیت کی وجہ سے میں نے ذبح کرنے سے پہلے اپنا سر منڈوا لیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اب ذبح کرلو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر ایک اور شخص نے آکر عرض کیا کہ میں نے ناواقفیت کی بناء پر کنکریاں مارنے سے پہلے جانور ذبح کرلیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اب کنکریاں مارلو، اسمیں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ سے جس فعل کی بھی تقدیم یا تاخیر کے بارہ میں سوال کیا گیا آپ ﷺ نے یہی فرمایا کہ "اب کرلو" اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) مسلمؒ کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ "ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ "میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے سر منڈا لیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اب کنکریاں مارلو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے" ایک اور شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں نے خانۂ کعبہ کا فرض طواف کنکریاں مارنے سے پہلے کرلیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اب کنکریاں مارلو، اس میں کوئی حرج نہیں"۔

تشریح: اس روایت میں ان افعال حج کی تقدیم و تاخیر کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے اور سائلین کے جواب دیئے گئے ہیں جو قربانی کے دن یعنی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو کئے جاتے ہیں، چنانچہ اس دن چار چیزیں ہوتی ہیں جن کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے منیٰ میں پہنچ کر جمرۂ عقبہ پر جو ایک مینار ہے سات کنکریاں ماری جائیں، پھر جانور کہ جن کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے ذبح کئے جائیں اس کے بعد سر منڈایا جائے یا بال

لٹروائے جائیں اور پھر مکہ جاکر خانہ کعبہ کا طواف کیا جائے، اس ترتیب کے ساتھ ان افعال کی ادائیگی اکثر علماء کے نزدیک مذکورہ بالا حدیث کی روشنی میں سُنّت ہے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ بھی انہیں میں شامل ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک اگر ان افعال کی ادائیگی میں تقدیم وتاخیر ہو جائے تو بطور جزاء (اس کے بدلہ میں) دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب نہیں ہوتا۔ علماء کی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ مذکورہ بالا ترتیب واجب ہے۔ حضرت امام اعظمؒ اور حضرت امام مالکؒ بھی اس جماعت کے ساتھ ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ ارشاد گرامی "اس میں کوئی حرج نہیں ہے" کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ تقدیم وتاخیر چونکہ ناواقفیت یا نسیان کی وجہ سے ہوئی ہے اس لئے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے لیکن جزاء کے طور پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا۔ لہٰذا ان حضرات کے مسلک کے مطابق ان چاروں چیزوں میں سے کوئی چیز اگر مقدم یا مؤخر ہوگئی تو بطور جزاء ایک بکری یا اس کے مانند کوئی جانور ذبح کرنا ضروری ہوگا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے ایسی ہی ایک حدیث روایت کی ہے جب کہ خود انہوں نے مذکورہ افعال کی تقدیم وتاخیر کے سلسلہ میں دم واجب کیا ہے، اگر وہ حدیث کے وہ معنی نہ سمجھتے جو حضرت امام اعظمؒ اور ان کے ہمنوا علماء نے سمجھے ہیں تو وہ خود دم واجب کیوں کرتے؟

(۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْئَلُ يَوْمَ النَّحْرِ بِمِنًى فَيَقُوْلُ لَا حَرَجَ فَسَأَلَهُ رَجُلٌ فَقَالَ رَمَيْتُ بَعْدَمَا اَمْسَيْتُ فَقَالَ لَا حَرَجَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قربانی کے دن منیٰ میں لوگ نبی کریم ﷺ سے (تقدیم وتاخیر کے سلسلہ میں) مسائل دریافت کررہے تھے اور آپ ﷺ جواب میں یہی فرماتے تھے کہ "کوئی حرج نہیں ہے" چنانچہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ میں نے شام ہونے کے بعد کنکریاں ماری ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کوئی حرج نہیں ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: دوسرے آئمہ کا مسلک تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قربانی کے دن کنکریاں مارنے میں اتنی تاخیر کرے کہ آفتاب غروب ہو جائے تو اس پر دم واجب ہوگا، چنانچہ ان کے نزدیک حدیث میں "شام کے بعد" سے مراد "بعد عصر" ہے۔

حنفیہ کے ہاں اس بارہ میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ دسویں ذی الحجہ کو طلوع فجر کے بعد (اور طلوع آفتاب سے پہلے) کا وقت کنکریاں مارنے کے لئے وقت جواز ہے مگر اساءۃ کے ساتھ، یعنی اگر کوئی شخص طلوع فجر کے بعد ہی کنکریاں مارے تو یہ جائز ہو جائے گا مگر یہ اچھا نہیں ہوگا۔ طلوع آفتاب کے بعد سے زوال آفتاب تک کا وقت، وقت مسنون ہے۔ زوال آفتاب کے بعد سے غروب آفتاب تک کا وقت، وقت جواز ہے مگر بغیر اساءۃ کے یعنی اگر کوئی شخص زوال آفتاب کے بعد سے غروب آفتاب تک کے کسی حصہ میں کنکریاں مارے تو یہ جائز بھی ہوگا اور اس کے بارہ میں یہ بھی نہیں کہیں گے کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ البتہ "وقت مسنون" کی سعادت اسے حاصل نہیں ہوگی۔ اور غروب آفتاب کے بعد یعنی رات کا وقت، وقت جواز ہے مگر کراہت کے ساتھ۔

مگر اتنی بات ذہن میں رہے کہ کراہت اس صورت میں ہے جب کہ کوئی شخص بلا عذر اتنی تاخیر کرے کہ آفتاب بھی غروب ہو جائے اور پھر وہ رات میں کنکریاں مارے، چنانچہ اگر چرواہے یا ان کے مانند وہ لوگ جو کسی عذر کی بناء پر رات ہی میں کنکریاں مار سکتے ہوں تو ان کے حق میں کراہت نہیں ہے، البتہ اس حدیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ "کوئی حرج نہیں ہے" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سائل کوئی چرواہا ہوگا جس نے "شام کے بعد" یعنی رات میں کنکریاں ماریں اس لئے آپ ﷺ نے اس کے بارہ میں فرمایا کہ تم چونکہ دن میں کنکریاں مارنے سے معذور تھے اس لئے رات میں کنکریاں مارنے کی وجہ سے تم پر کوئی گناہ نہیں۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بلا عذر رمی (کنکریاں مارنے) میں اتنی تاخیر کرے کہ صبح ہو جائے تو وہ رمی کرے گا مگر اس پر بطور جزاء دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہو جائے گا، یہ حضرت امام اعظمؒ کا قول ہے صاحبینؒ کا اس سے اختلاف ہے۔

یوم نحر کے بعد کے دو دنوں یعنی ذی الحجہ کی گیارھویں اور بارھویں تاریخ میں کنکریاں مارنے کا وقت مسنون زوال آفتاب کے بعد سے

غروب آفتاب تک ہے اور غروب آفتاب کے بعد سے فجر طلوع ہونے تک مکروہ ہے، لہٰذا فجر طلوع ہوتے ہی حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک وقت ادا ختم ہو جاتا ہے جب کہ صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک وقت ادا طلوع فجر کے بعد بھی باقی رہتا ہے، گویا رمی کا وقت طلوع فجر کے بعد بالاتفاق باقی رہتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت کی رمی حضرت امام اعظمؒ کے ہاں وقت قضا میں ہوگی اور صاحبینؒ کے ہاں وقت ادا ہی میں! اور چوتھے دن یعنی ذی الحجہ کی تیرھویں تاریخ کو آفتاب غروب ہوتے ہی متفقہ طور پر سب کے نزدیک رمی کا وقت ادا بھی فوت ہو جاتا ہے اور وقت قضا بھی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۳) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي اَفَضْتُ قَبْلَ اَنْ اَحْلِقَ قَالَ اِحْلِقْ اَوْ قَصِّرْ وَلَا حَرَجَ وَجَاءَ اٰخَرُ فَقَالَ ذَبَحْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ اَرْمِ وَلَا حَرَجَ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! میں نے طواف افاضہ یعنی فرض طواف سر منڈانے سے پہلے کر لیا؟" آپ ﷺ نے فرمایا اب سر منڈا لو یا بال کتروا لو۔ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک اور شخص نے آکر عرض کیا کہ "میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے جانور ذبح کر لیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا اب کنکریاں مار لو، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔" (ترمذیؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۴) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاجًّا فَكَانَ النَّاسُ يَأْتُوْنَهٗ فَمِنْ قَائِلٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَعَيْتُ قَبْلَ اَنْ اَطُوْفَ اَوْ اَخَّرْتُ شَيْئًا اَوْ قَدَّمْتُ شَيْئًا فَكَانَ يَقُوْلُ لَا حَرَجَ اِلَّا عَلٰى رَجُلٍ اقْتَرَضَ عِرْضَ مُسْلِمٍ وَهُوَ ظَالِمٌ فَذٰلِكَ الَّذِيْ حَرِجَ وَهَلَكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت اسامہ بن شریکؓ کہتے ہیں کہ مجھے رسول کریم ﷺ کے ہمراہ ادائیگی حج کی سعادت حاصل ہوئی ہے، چنانچہ حج کے دوران) جو لوگ (مسائل پوچھنے کے لئے) آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے تھے، ان میں کوئی یہ کہتا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! میں نے طواف کعبہ سے پہلے سعی کر لی ہے یا (افعال منیٰ میں سے) یہ کام میں نے پہلے کر لیا یا یہ کام میں نے بعد میں کیا؟ آپ ﷺ اس سے فرماتے کہ "اس میں کوئی گناہ نہیں ہے، بلکہ گناہ اس شخص پر ہے جو ظالم ہونے کی وجہ سے کسی مسلمان کی آبروریزی کرے پس یہ وہ شخص ہے جو گنہ گار ہے اور ہلاک ہوا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اگر احرام باندھنے اور طواف قدوم یا طواف نفل سے پہلے سعی کر لی جائے تو صحیح نہیں ہوگی یعنی طواف افاضہ سے پہلے سعی کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ سعی، احرام اور طواف کے بعد ہو خواہ نفل ہی طواف ہو۔

اس لئے "میں نے طواف کعبہ سے پہلے سعی کر لی ہے" کہ بارہ میں یہ کہا جائے گا کہ سائل اگر آفاقی (یعنی غیر مکی) تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے حج کے احرام اور طواف قدوم کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے سعی کر لی ہے۔ اور اگر سائل مکی تھا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "میں نے حج کے احرام اور طواف نفل کے بعد طواف افاضہ سے پہلے سعی کر لی ہے۔"

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر افعال منیٰ میں نادانستگی کی وجہ سے کوئی تقدیم و تاخیر ہو جائے تو کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، بلکہ دراصل گناہ گار تو وہ شخص ہے جو از راہ ظلم و ایذا رسانی ناحق کسی کی آبروریزی کرے مثلاً کسی کی اہانت کرے یا کسی کی غیبت کرے۔ گویا وہ شخص اس حکم میں داخل نہیں رہا جو دین کی خاطر کسی کی آبروریزی کرے چنانچہ ایسا شخص گنہگار نہیں ہوتا۔

بَابُ خُطْبَةِ يَوْمِ النَّحْرِ وَرَمْيِ اَيَّامِ التَّشْرِيْقِ وَالتَّوْدِيْع

قربانی کے دن کے خطبہ ایام تشریق میں رمی اور طواف رخصت کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قربانی کے دن خطبہ

① عَنْ اَبِي بَكْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ قَالَ اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ السَّنَةُ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ثَلَاثٌ مُتَوَالِيَاتٌ ذُو الْقَعْدَةِ وَذُو الْحِجَّةِ وَالْمُحَرَّمُ وَرَجَبُ مُضَرَ الَّذِي بَيْنَ جُمَادىٰ وَشَعْبَانَ وَ قَالَ اَيُّ شَهْرٍ هٰذَا قُلْنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ فَسَكَتَ حَتّٰى ظَنَنَّا اَنَّهُ سَيُسَمِّيْهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ فَقَالَ اَلَيْسَ ذَا الْحِجَّةِ قُلْنَا بَلٰى قَالَ اَيُّ بَلَدٍ هٰذَا قُلْنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ فَسَكَتَ حَتّٰى ظَنَنَّا اَنَّهُ سَيُسَمِّيْهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ قَالَ اَلَيْسَ الْبَلْدَةَ قُلْنَا بَلٰى قَالَ فَاَيُّ يَوْمٍ هٰذَا قُلْنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ فَسَكَتَ حَتّٰى ظَنَنَّا اَنَّهُ سَيُسَمِّيْهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ قَالَ اَلَيْسَ يَوْمَ النَّحْرِ قُلْنَا بَلٰى قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا وَسَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ فَيَسْاَلُكُمْ عَنْ اَعْمَالِكُمْ اَلَا فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ ضُلَّالًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ۔
(متفق علیہ)

"حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے قربانی کے دن ہمارے سامنے خطبہ ارشاد کرتے ہوئے فرمایا" (لوگو!) زمانہ (یعنی سال) کی گردش پوری ہوگئی ہے اپنی اس وضع کے موافق جس پر کہ وہ اس روز تھا جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا (یعنی سال اپنی وضع کے مطابق بارہ مہینے کا پورا ہو گیا ہے) سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے جس میں سے چار مہینے باحرمت ہیں تین تو مسلسل ہیں یعنی ذی قعدہ، ذی الحجہ محرم اور (چوتھا) مضر کا رجب جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان ہے۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کون سا مہینہ ہے؟" ہم نے عرض کیا "اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) زیادہ جانتا ہے۔" آپ ﷺ نے سکوت فرمایا یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ ﷺ اس مہینہ کا کوئی اور نام رکھیں گے، مگر آپ ﷺ نے فرمایا "کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے؟" ہم نے کہا "بیشک ذی الحجہ ہے۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کون سا شہر ہے؟" ہم نے کہا "اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے۔" آپ ﷺ پھر خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ ﷺ اس شہر کا کوئی اور نام رکھیں گے مگر آپ ﷺ نے فرمایا "کیا یہ بلدہ (مکہ کا ایک نام ہے) نہیں ہے؟" ہم نے عرض کیا کہ "بیشک! بلدہ ہی ہے۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کون سا دن ہے؟ ہم نہ کہا کہ "اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے۔" آپ ﷺ نے پھر سکوت فرمایا یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ ﷺ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے مگر آپ ﷺ نے فرمایا "کیا یہ یوم نحر (قربانی کا دن) نہیں ہے؟" ہم نے عرض کیا کہ "بیشک یہ یوم نحر ہی ہے۔" اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "(یاد رکھو!) تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تم پر (ہمیشہ کے لئے) اسی طرح حرام ہیں جس طرح کہ تمہارے اس دن میں، تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس مہینہ میں! اور (اے لوگو!) تم عنقریب اپنے پروردگار سے ملوگے وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارہ میں سوال کرے گا! خبردار! میری وفات کے بعد تم ضلالت کی طرف نہ لوٹ جانا کہ تم ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو! آگاہ! کیا میں نے (احکام خداوندی پہنچانے کا) اپنا فرض ادا کر دیا؟ ہم نے عرض کیا "بیشک! آپ ﷺ نے اپنا فرض پورا کر دیا۔" آپ ﷺ نے فرمایا "پروردگار! تو (ان لوگوں کے اس اقرار پر) گواہ رہ (تاکہ یہ قیامت کے دن اپنے اس اقرار کا انکار نہ کریں) پھر (آپ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ) جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ان تک پہنچا دیں جو یہاں

موجود نہیں ہیں، کیونکہ بعض وہ لوگ جنھیں کوئی بات پہنچائی جائے اس بات کو سننے والے سے زیادہ یاد رکھتے ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: شافعیہ کے نزدیک ایام نحر کے پہلے دن یعنی دسویں ذی الحجہ کو خطبہ پڑھنا مستحب ہے، جب کہ حنفیہ کے ہاں نحر کے دوسرے دن یعنی گیارھویں ذی الحجہ کو مستحب ہے، چنانچہ حنفی مسلک کے مطابق ایک خطبہ تو ذی الحجہ کی ساتویں کو، ایک خطبہ نویں کو اور ایک خطبہ گیارھویں کو پڑھا جاتا ہے اور ان خطبات میں حج کے احکام بیان کئے جاتے ہیں جن احادیث صحیحہ میں دوسرے دن (یعنی گیارھویں) کو آنحضرت ﷺ کے خطبہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ حنفی مسلک کی مؤید ہیں لہٰذا اس حدیث کے بارہ میں کہا جائے گا کہ آپ ﷺ نے بطور تذکیر و نصیحت یہ خطبہ دیا ہوگا اور اصل خطبہ آپ ﷺ نے دوسرے ہی دن ارشاد فرمایا تھا۔

ارشاد گرامی کے ابتدائی جملوں کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء پیدائش میں اللہ تعالیٰ نے سال کے جو بارہ مہینے مقرر فرمائے تھے اس کے مطابق بارہ مہینے کا یہ سال پورا ہوگیا، چنانچہ قرآن کریم میں سال کے بارہ مہینوں کے سلسلہ میں یوں فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ الاية۔

"یقیناً شمار مہینوں کا کتاب الٰہی میں اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین پیدا کئے تھے۔"

آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں اہل عرب نے سال کے مہینوں میں تغیر کر دیا تھا جس کی صورت یہ تھی کہ وہ ایک سال کو بارہ مہینے کا رکھتے تو ایک سال کو تیرہ مہینوں کا، اس طرح وہ حج کی ادائیگی کو ہر دو برس بعد ایک مہینہ مؤخر کر دیتے تھے، مثلاً ایک سال وہ کسی مہینہ میں حج کرتے پھر دوسرے سال کو تیرہ مہینے کا قرار دے کر اس مہینہ میں حج کرتے جو پہلے سال کے ماہ حج کے بعد آتا۔ اس صورت میں نہ صرف یہ کہ حج کا مہینہ بدلتا رہتا تھا بلکہ جو مہینے اشہر حرام ہوتے ان کو تو وہ اشہر حلال قرار دے لیتے اور جو مہینے اشہر حلال ہوتے ان کو اشہر حرام بنا لیتے تھے، مثلاً جن مہینوں میں جنگ و جدل حرام نہ ہوتا، اس میں تو وہ جنگ و جدل سے اجتناب کرتے اور ان مہینوں کی خوب تعظیم کرتے اور جن مہینوں میں جنگ و جدال حرام ہوتا اس میں پوری طرح جنگ و جدال کرتے، گویا جو مہینہ واقعۃً محرم کا مہینہ ہوتا اسے وہ احمق اپنے حساب کی رو سے محرم کا مہینہ نہ سمجھتے نتیجہ اس میں خوب لڑتے مرتے، اسی طرح صفر یا کسی دوسرے مہینے کو اپنے حساب سے حرام ٹھہرا لیتے اور اس میں لڑنے مرنے سے باز رہتے، چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کے اس احمقانہ طرز عمل کے بارہ میں یہ حکم فرمایا:

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ۔

"اور ان کی طرف سے مہینوں میں یہ تبدیلی ان کے کفر میں زیادتی ہے۔"

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے حساب کو باطل قرار دیا اور سال کے ہر مہینے کو اس کی اصل پر برقرار رکھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جس سال حجۃ الوداع کیا ہے اس سال ذی الحجہ کا مہینہ اپنی اصل پر تھا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ (سال کی گردش اپنی وضع کے موافق پوری ہوگئی) ارشاد فرما کر لوگوں کو آگاہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یہ مہینہ ماہ ذی الحجہ ہے اور حج کا یہی مہینہ ہے، لہٰذا اس مہینہ کو یاد رکھو، اسی مہینہ میں حج کیا کرو اور آئندہ ایک مہینہ کو دوسرے مہینہ سے تبدیل نہ کرو۔

مشہور مفسر بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں اہل عرب کا یہ دستور ہوگیا تھا کہ جب ماہ حرام آتا اور ان کو اس مہینہ میں لڑنا منظور ہوتا تو وہ اس ماہ حرام کو حلال قرار دے لیتے اور اس کے بعد کسی اور حلال مہینہ کو ماہ حرام بنا لیتے اس طرح مہینوں کی جو اصل خصوصیت تھی اسے تو انہوں نے ترک کر دیا تھا صرف عدد کا اعتبار کر رکھا تھا۔

حدیث کے الفاظ اَلسَّنَةُ اِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا جملہ مستانفہ ہے یعنی علیحدہ ایک جملہ ہے جو ماقبل جملہ کا بیان اور اس کی وضاحت ہے۔

مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (جس میں سے چار مہینے باحرمت ہیں) جیسا کہ حدیث نے ان چار مہینوں کی وضاحت کی ہے۔ وہ ذی قعدہ، ذی

الحجہ، محرم اور رجب کے مہینے ہیں ان مہینوں میں قتل وقتال اور جنگ وجدل ممنوع ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ۔

"پس ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔"

لیکن علماء کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ ان مہینوں میں قتل وقتال اور جنگ وجدل کی حرمت منسوخ ہے، ان کے نزدیک مذکورہ بالا آیت میں "ظلم" سے مراد "ارتکاب معاصی" ہے، اس طرح آیت بالا کا مطلب یہ ہوگا کہ "ان مہینوں میں گناہ کرکے اپنے نقصان مت کرو کیونکہ جس طرح حرم میں اور حالت احرام میں گناہ کرنا بہت ہی برا ہے اسی طرح ان مہینوں میں ارتکاب معاصی" بھی بہت ہی بری بات ہے، ان علماء کے اس قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شوال اور ذی قعدہ کے مہینوں میں طائف کا محاصرہ اور قبیلہ ہوازن کے ساتھ غزوہ کیا تھا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ان مہینوں میں حرمت قتل کا حکم اب بھی باقی ہے۔

"مضر" عرب کے ایک قبیلہ کا نام تھا، یہ قبیلہ، ماہ رجب کی بہت زیادہ تعظیم کرتا تھا، اسی وجہ سے رجب کی نسبت اس قبیلہ کی طرف کرتے ہوئے آپ ﷺ نے رَجَبَ مُضَرَ (مضر کا رجب) فرمایا۔

آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے مہینہ، دن اور شہر کا نام اس لئے پوچھا تا کہ لوگوں کے ذہن وقلوب میں اس مہینہ دن اور شہر کی حرمت پوری طرح جاگزین ہو اور اس طرح وہ اس بات کی اہمیت کو سمجھ سکیں اور اس پر عمل کرنے کا پورا عزم ویقین پیدا کریں جسے بعد میں بیان کرنا مقصود تھا۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے سوال پر لوگوں کا جواب میں یہ کہنا کہ "اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے" نہ صرف ازراہ ادب تھا بلکہ اس سے یہ جاننا بھی مقصود تھا کہ اس سوال سے آنحضرت ﷺ کی غرض کیا ہے۔

بعض احادیث میں اس جملہ فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ ضُلَّالًا (میری وفات کے بعد تم ضلالت کی طرف نہ لوٹ جانا) میں لفظ ضُلَّالًا کی بجائے لفظ کفارا ذکر کیا گیا ہے اس صورت میں اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ "میری وفات کے بعد تو اعمال میں کافروں کے مشابہ نہ ہو جانا کہ ان کافروں کی طرح تم بھی ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔"

گیارھویں اور بارھویں کو رمی کا وقت

(۲) وَعَنْ وَبَرَةَ قَالَ سَأَلْتُ ابْنَ عُمَرَ مَتٰى اَرْمِى الْجِمَارَ قَالَ اِذَا رَمٰى اِمَامُكَ فَارْمِهِ فَاَعَدْتُ عَلَيْهِ الْمَسْأَلَةَ فَقَالَ كُنَّا نَتَحَيَّنُ فَاِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ رَمَيْنَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت وبرہؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ میں (گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کو) رمی جمار کس وقت کروں؟" تو انہوں نے فرمایا کہ "جس وقت تمہارا امام رمی کرے، اسی وقت تم بھی رمی کرو (یعنی رمی میں اس شخص کی پیروی کرو جو رمی کے وقت کے بارہ میں تم سے زیادہ جانتا ہو) میں نے ان کے سامنے پھر یہ مسئلہ رکھا (یعنی میں نے ان سے رمی کے وقت کی مزید وضاحت چاہی) انہوں نے فرمایا "ہم رمی کے وقت کا انتظار کرتے تا آنکہ جب دوپہر ڈھلتی تو ہم کنکریاں مارتے۔" (بخاریؒ)

رمی جمرات کی ترتیب

(۳) وَعَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ كَانَ يَرْمِىْ جَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ عَلٰى اِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ ثُمَّ يَتَقَدَّمُ حَتّٰى يُسْهِلَ فَيَقُوْمُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ طَوِيْلًا وَيَدْعُوْ وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ ثُمَّ يَرْمِى الْوُسْطٰى بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ كُلَّمَا رَمٰى بِحَصَاةٍ ثُمَّ يَاْخُذُ بِذَاتِ الشِّمَالِ فَيُسْهِلُ وَيَقُوْمُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ ثُمَّ يَدْعُوْ وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ وَيَقُوْمُ طَوِيْلًا ثُمَّ يَرْمِىْ جَمْرَةَ ذَاتِ الْعَقَبَةِ مِنْ بَطْنِ الْوَادِىْ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ عِنْدَ كُلِّ حَصَاةٍ وَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا ثُمَّ يَنْصَرِفُ فَيَقُوْلُ هٰكَذَا رَاَيْتُ النَّبِىَّ صَلَّى

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سالمؒ، حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "وہ (یعنی ابن عمرؓ) نزدیک کے جمرہ (یعنی جمرہ اولیٰ) پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے بعد اللہ اکبر کہتے پھر آگے بڑھتے یہاں تک کہ جب نرم زمین پر پہنچتے تو دیر تک (یعنی بقدر تلاوت سورۂ بقرہ) قبلہ رو کھڑے رہتے اور دعا مانگتے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے، پھر جمرۂ وسطیٰ پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہتے، پھر بائیں جانب کو بڑھتے اور نرم زمین پر پہنچ کر قبلہ رو کھڑے ہو جاتے اور دعا مانگتے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے اور دیر تک کھڑے رہتے، یہاں تک کہ جمرۂ عقبہ پر بطن وادی سے سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے اور اس جمرہ کے قریب نہیں ٹھہرتے، پھر وہ وہاں سے واپس ہوتے اور کہتے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق رمی اگرچہ حنفیہ کے ہاں سُنّت ہے لیکن احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اس ترتیب کو ترک نہ کیا جائے کیونکہ یہ ترتیب حضرت امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک واجب ہے! موالات یعنی تمام جمرات پر پے در پے رمی بھی سُنّت ہے جب کہ یہ حضرت امام مالکؒ کے مسلک میں واجب ہے۔

مِنْ بطْنِ الْوَادِیْ (بطن وادی سے) یہ بات معلوم ہوئی کہ رمی جمرہ عقبہ، بطن وادی سے (یعنی نشیبی حصہ میں کھڑے ہو کر) کی جائے چنانچہ نشیب میں کھڑے ہو کر رمی کرنا مسنون ہے۔ لیکن ہدایہ میں لکھا ہے کہ اگر اوپر کی جانب سے جمرۂ عقبہ پر کنکریاں پھینکی جائیں تو اس طرح بھی رمی ہو جائے گی مگر یہ خلاف سُنّت ہے۔

جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ وسطیٰ کے پاس ٹھہرنا اور حمد و صلوٰۃ اور وہاں دعا میں مشغول ہونا تو ثابت ہے لیکن تیسرے جمرہ یعنی جمرۂ عقبیٰ کے پاس ٹھہرنا اور دعا مانگنا ثابت نہیں ہے اور اس کی کوئی وجہ و علت منقول نہیں ہے اگرچہ بعض علماء نے اس بارہ میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔

منیٰ میں رات کو ٹھہرنا واجب ہے یا سُنّت؟

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اسْتَأْذَنَ الْعَبَّاسُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّبِيْتَ بِمَكَّةَ لَيَالِيَ مِنًى مِنْ اَجْلِ سِقَايَتِهٖ فَاَذِنَ لَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عباسؓ ابن عبد المطلب نے رسول کریم ﷺ سے اس بات کی درخواست کی کہ جن راتوں میں منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے ان میں انہیں سبیل زمزم کی خدمت کے لئے مکہ رہنے کی اجازت دے دی جائے چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: طواف افاضہ کے بعد آب زمزم پینا مستحب ہے چنانچہ اس زمانہ میں زمزم کے کنوئیں کے قریب ہی کئی حوض زمزم کے پانی سے بھرے رہتے تھے تاکہ اگر کوئی شخص اژدحام وغیرہ کی وجہ سے کنوئیں سے پانی نہ پی سکے تو وہ ان حوضوں میں سے پی لے، سبیل زمزم کی نگرانی کی سعادت آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ ابن عبد المطلب کو حاصل تھی، اس طرح زمزم کا پانی پلانے کی اس عظیم السعادت خدمت کو وہ اپنے کئی مددگاروں کے ذریعہ انجام دیتے تھے! چنانچہ جن راتوں میں حاجی منیٰ میں قیام کرتے ہیں انہیں راتوں میں حضرت عباسؓ نے نبی کریم ﷺ سے اجازت مانگی کہ اگر حکم ہو تو میں ان راتوں میں مکہ میں رہوں تاکہ سبیل زمزم کی جو مقدس خدمت میرے سپرد ہے اسے انجام دے سکوں آنحضرت ﷺ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔

اب مسئلہ کی طرف آیئے، جو راتیں منیٰ میں گذاری جاتی ہیں ان میں منیٰ میں قیام اکثر علماء کے نزدیک واجب ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے ہاں ان راتوں میں منا میں رہنا سُنّت ہے، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا ایک قول بھی یہی ہے

اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رہے کہ رات کے قیام کے سلسلہ میں رات کے اکثر حصہ یعنی آدھی رات سے زیادہ کے قیام کا اعتبار

ہے اور یہی حکم ان راتوں کا بھی ہے جن میں عبادت وغیرہ کے لئے شب بیداری مستحب ہے مثلاً لیلۃ القدر وغیرہ کہ ان راتوں کے اکثر حصہ کی شب بیداری کا اعتبار ہے۔

بہر کیف جن علماء کے نزدیک منیٰ میں رات کا قیام سُنّت ہے جیسے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے کہ اگر منیٰ میں رات میں قیام واجب ہوتا تو آنحضرت ﷺ حضرت عباسؓ کو ان راتوں میں مکہ میں رہنے کی اجازت کیسے دیتے۔

بعض حنفی علماء کہتے ہیں حضرت عباسؓ کی طرح جس شخص کے سپرد زمزم کا پانی پلانے کی خدمت ہو یا جس کو کوئی شدید عذر لاحق ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ جو راتیں منیٰ میں گذاری جاتی ہیں وہ ان میں منیٰ کا قیام ترک کر دے، گویا اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ بلا عذر سنت کو ترک کرنا جائز نہیں ہے اور یہ کہ کسی عذر کی بناء پر سُنّت کو ترک کرنے میں اساءۃ بھی نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ سبیل زمزم پر

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَ اِلَى السِّقَايَةِ فَاسْتَسْقٰى فَقَالَ الْعَبَّاسُ يَا فَضْلُ اذْهَبْ اِلٰى اُمِّكَ فَأْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَرَابٍ مِنْ عِنْدِهَا فَقَالَ اسْقِنِىْ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهُمْ يَجْعَلُوْنَ اَيْدِيَهُمْ فِيْهِ قَالَ اسْقِنِىْ فَشَرِبَ مِنْهُ ثُمَّ اَتٰى زَمْزَمَ وَهُمْ يَسْقُوْنَ وَيَعْمَلُوْنَ فِيْهَا فَقَالَ اعْمَلُوْا فَاِنَّكُمْ عَلٰى عَمَلٍ صَالِحٍ ثُمَّ قَالَ لَوْلَا اَنْ تُغْلَبُوْا لَنَزَلْتُ حَتّٰى اَضَعَ الْحَبْلَ عَلٰى هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلٰى عَاتِقِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سبیل پر تشریف لائے اور زمزم کا پانی مانگا، حضرت عباسؓ نے اپنے صاحبزادے سے کہا کہ "فضل! اپنی والدہ کے پاس جاؤ اور رسول کریم ﷺ کے لئے ان سے (زمزم کا وہ) پانی مانگ لاؤ (جو انکے پاس رکھا ہوا ہے اور ابھی استعمال نہیں ہوا ہے) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "تم تو مجھے (اسی سبیل سے) پانی پلا دو۔" حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! لوگ اس میں اپنے ہاتھ ڈالتے ہیں!؟ آپ ﷺ نے فرمایا "کوئی مضائقہ نہیں ہے) مجھے (اسی میں سے) پلا دو۔" چنانچہ آپ ﷺ نے اس پانی میں سے پیا اور پھر زمزم کے کنویں کے پاس تشریف لائے جہاں لوگ (یعنی عبد المطلب کے خاندان والے) لوگوں کو پانی پلا رہے تھے اور اس خدمت میں پوری طرح مصروف تھے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا "اپنا کام کئے جاؤ، کیونکہ تم ایک نیک کام میں لگے ہوئے ہو۔" پھر فرمایا "اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ تم پر غلبہ پالیں گے تو میں (اپنی اونٹنی پر سے) اترتا (جس پر آپ ﷺ سوار تھے تاکہ آپ ﷺ سب کے سامنے رہیں اور لوگ آپ ﷺ سے حج کے عملی احکام سیکھیں) اور آپ ﷺ نے اپنے مونڈھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ رسی اس پر رکھتا (یعنی اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ لوگ مجھے پانی کھینچتا دیکھ کر میری سُنّت کی اتباع میں پانی کھینچنے لگیں گے اور اس سعادت کے حصول کے لئے اتنا اژدحام کریں گے کہ وہ تم پر غالب آجائیں گے اور تمہیں پانی نہ کھینچنے دیں گے جس کی وجہ سے یہ مقدس خدمت تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے گی تو میں بھی اپنی اونٹنی سے اتر کر اس کنویں سے پانی کھینچتا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "لوگ اس میں اپنے ہاتھ ڈالتے ہیں" اس بات سے حضرت عباسؓ کا مطلب یہ تھا کہ یہاں پانی پینے والوں کا اژدحام رہتا ہے اس میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جن کے ہاتھ صاف ستھرے نہیں ہوتے اور وہ پانی پینے کے لئے اس حوض میں اپنے ہاتھ ڈالتے رہتے ہیں اس لئے میں نے آپ ﷺ کے لئے اس پانی میں سے منگایا ہے جو بالکل الگ رکھا ہوا ہے لیکن آنحضرت ﷺ نے اسے منظور نہیں کیا اور فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے تم تو مجھے اسی حوض میں سے پانی پلا دو چنانچہ آپ ﷺ نے اسی حوض سے پانی پیا گویا یہ بات اس روایت کی مانند ہے جس میں منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ کا بچا ہوا پانی ازراہ تبرک پینا پسند فرماتے تھے! نیز حضرت انسؓ نے بطریق مرفوع (یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی) نقل کیا ہے کہ "یہ چیز تواضع میں داخل ہے کہ انسان اپنے (کسی) بھائی کا جھوٹا پیئے۔" لیکن لوگوں میں جو یہ حدیث مشہور ہے کہ سور المؤمنین شفاء (مؤمنین کا جھوٹا شفاء ہے) تو اس کے

بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ یہ حدیث غیر معروف ہے۔اس کے صحیح ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔
مذکورہ بالا روایت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ زمزم کے کنوئیں سے پانی کھینچنے اور پینے کے لئے اونٹنی سے اترے نہیں، جب کہ ایک اور روایت میں جو حضرت عطاءؒ سے منقول ہے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب طواف افاضہ کر چکے تو آپ ﷺ نے زمزم کے کنویں سے ڈول (میں پانی کھینچا اور اس کھینچنے میں آپ ﷺ کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں تھا پھر آپ ﷺ نے اس میں سے پیا اور ڈول میں جو پانی بچ گیا اسے کنویں میں ڈال دیا۔
ان دونوں روایتوں میں مطابقت یہ ہے کہ پہلے تو آنحضرت ﷺ بھیڑ کی وجہ سے اونٹنی سے نہ اترے ہوں گے پھر دوبارہ تشریف لائے تو چھیڑ دیکھ کر پانی کھینچا اور پیا چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت کا تعلق پہلی مرتبہ سے ہے اور حضرت عطاء کی روایت کا تعلق دوسری مرتبہ سے ہے۔

آنحضرت ﷺ کا طواف وداع

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَآءَ ثُمَّ رَقَدَ رَقْدَةً بِالْمُحَصَّبِ ثُمَّ رَكِبَ اِلَى الْبَيْتِ فَطَافَهُ بِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ذی الحجہ کی تیرھویں تاریخ کو منیٰ سے روانہ ہو کر) محصب میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور وہیں کچھ دیر تک سو رہے پھر خانہ کعبہ کے لئے سوار ہوئے اور (وہاں پہنچ کر) طواف (طواف وداع) کیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "محصب" اصل میں تو اس زمین کو کہتے ہیں جہاں بہت زیادہ کنکریاں ہوں، لیکن یہ ایک خاص جگہ کا نام بھی ہے جو مکہ و مدینہ کے درمیان منا کے قریب واقع ہے اور چونکہ اس جگہ کو محصب کے علاوہ ابطح، بطحاء اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں، اسی لئے راوی نے یہاں تو یہ کہا کہ آپ نے محصب میں نماز پڑھی اور دوسری روایت میں یہ کہا گیا کہ ابطح میں نماز پڑھی۔

آنحضرت ﷺ نے ترویہ اور نفر کے دن ظہر و عصر کی نماز کہاں پڑھی؟

⑦ وَعَنْ عَبْدِالْعَزِيْزِ بْنِ رُفَيْعٍ قَالَ سَأَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قُلْتُ اَخْبِرْنِي بِشَيْءٍ عَقَلْتَهٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيْنَ صَلَّى الظُّهْرَ يَوْمَ التَّرْوِيَةِ قَالَ بِمِنًى قَالَ فَاَيْنَ صَلَّى الْعَصْرَ يَوْمَ النَّفْرِ قَالَ بِالْاَبْطَحِ ثُمَّ قَالَ افْعَلْ كَمَا يَفْعَلُ اُمَرَاؤُكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبدالعزیز ابن رفیع (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے عرض کیا کہ آپ رسول کریم ﷺ کے متعلق اس بارہ میں جو کچھ جانتے ہیں مجھے بتائیے کہ آپ ﷺ نے ترویہ کے دن (یعنی ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ کو) ظہر کی نماز کہاں پڑھی؟ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ "منیٰ میں" عبدالعزیز (کہتے ہیں کہ میں نے) پھر حضرت انسؓ سے یہ پوچھا کہ "آپ ﷺ نے نفر کے دن (یعنی ذی الحجہ کی تیرھویں تاریخ کو) عصر کی نماز کہاں پڑھی؟" تو حضرت انس نے فرمایا کہ "ابطح میں" پھر حضرت انسؓ نے فرمایا کہ "تم اسی طرح کرو جس طرح تمہارے سردار کرتے ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تو اسی طرح کیا تھا لیکن تم اس بارہ میں اپنے سردار اور اپنے امیر کی پیروی و اتباع کرو کہ جس طرح وہ کریں اسی طرح تم کرو تاکہ ان کی مخالفت کرنے کی وجہ سے کوئی فتنہ انگیزی نہ ہو اور ویسے یہ کوئی ضروری بات بھی نہیں ہے کہ ترویہ کے دن آنحضرت ﷺ نے جہاں ظہر کی نماز اور نفر کے دن جہاں عصر کی نماز پڑھی ہے وہیں تم بھی پڑھو۔
پہلی روایت سے تو یہ معلوم ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے نفر کے دن یعنی ذی الحجہ کی تیرھویں تاریخ کو ظہر کی نماز محصب میں پڑھی

تھی جب کہ یہ حدیث اس سلسلہ میں خاموش ہے چنانچہ ان دونوں روایتوں میں بایں معنی کوئی تضاد نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ظہر کی نماز محصب ہی میں پڑھی تھی جیسا کہ حضرت انسؓ کی پہلی روایت سے معلوم ہوا مگر اس موقع پر چونکہ حضرت عبد العزیزؒ نے اس دن کی ظہر کی نماز کے بارہ میں دریافت نہیں کیا اس لئے اس دوسری روایت میں حضرت انسؓ نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

ابطح میں قیام سُنّت ہے یا نہیں؟

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَ نُزُوْلُ الْاَبْطَحِ لَيْسَ بِسُنَّةٍ اِنَّمَا نَزَلَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَنَّهُ كَانَ اَسْمَحَ لِخُرُوْجِهِ اِذَا خَرَجَ۔ (متفق علیہ)

"اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ابطح میں اترنا (یعنی ٹھہرنا) سُنّت نہیں ہے، اور نبی کریم ﷺ تو وہاں صرف اس لئے اترے تھے کہ (مکہ سے) چلنے میں آسانی ہو جب کہ آپ ﷺ وہاں سے واپس ہوئے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عائشہ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب تیرھویں ذی الحجہ کو منیٰ سے لوٹے تو ابطح یعنی محصب میں صرف اس غرض سے ٹھہر گئے تھے تاکہ وہاں اپنا سامان وغیرہ چھوڑ کر مکہ جائیں اور وہاں طواف الوداع کریں اور جب مکّہ سے مدینہ واپس ہوں تو اس وقت سامان وغیرہ ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے آسانی ہو۔

اس بارہ میں جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو اس میں اختلاف ہے، بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ تحصب یعنی محصب میں ٹھہرنا سُنّت ہے اور افعال حج کا ایک تتمہ ہے۔ یہ حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے، ان کے نزدیک قیام محصب کے مسنون ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (منیٰ میں) فرمایا تھا کہ کل ہم انشاء اللہ خیف بنی کنانہ یعنی محصب میں ٹھہریں گے، اور اس کا سبب یہ تھا کہ خیف بنی کنانہ ہی وہ جگہ ہے جہاں مشرکین مکّہ نے آنحضرت ﷺ کی مکی زندگی میں باہم یہ عہد و پیمان کیا تھا اور یہ قسم کھائی تھی کہ ہم بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب (یعنی ان دونوں خاندانوں کے لوگوں سے میل جول، نکاح بیاہ، خرید و فروخت اور ان میں اٹھنا بیٹھنا اس وقت تک چھوڑے رہیں گے جب تک یہ لوگ محمد (ﷺ) کو ہمارے سپرد نہ کردیں گے گویا اس مقام پر انہوں نے ان خاندانوں سے مکمّل مقاطعہ اور بائیکاٹ کا اعلان کر کے شعائر کفر کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی قوت کو غالب فرمایا اور کفر و شرک کا پھیلاؤ دُور ہوا تو آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ سے مکّہ کو واپس ہوتے ہوئے یہ چاہا کہ اس جگہ یعنی خیف بنی کنانہ (محصب) میں ٹھہر کر شعائر اسلام کو ظاہر کریں جہاں کچھ ہی سال پیشتر کفار نے شعائر کفر کو ظاہر کیا تھا اور اس طرح وہاں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کیا جو اس نے اسلام کو غلبہ اور عظمت دے کر عطا فرمائی تھیں۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ، یوم النفر کی رات میں ابطح میں ٹھہرنا منجملہ سُنّت ہے، نیز یہ کہ حضرت عمر فاروقؓ لوگوں کو اس رات میں ابطح میں ٹھہرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

فقہ حنفی کی مشہور ترین کتاب ہدایہ میں لکھا ہے کہ "زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ابطح میں اس مقصد سے قیام فرماتے تھے کہ مشرکین کو اللہ تعالیٰ کی قدرت دکھائیں کہ کل جس جگہ انہوں نے مکمّل مقاطعہ کا عہد و پیمان کر کے اپنی برتری کا اظہار کیا تھا آج وہی جگہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کے زیر تسلط ہے، چنانچہ اس جگہ رات میں قیام سُنّت ہے۔

اس کے برخلاف، بعض حضرات کہتے ہیں کہ محصب میں قیام سُنّت نہیں ہے کیونکہ وہاں آنحضرت ﷺ کا قیام محض اتفاقی طور پر ہو گیا تھا جس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافع جو آنحضرت ﷺ کے سامان سفر کے نگران تھے اپنی رائے سے اور اتفاقی طور پر وہاں رک گئے اور آپ ﷺ کا خیمہ نصب کر دیا، اس بارہ میں آنحضرت ﷺ کا کوئی حکم نہیں تھا۔ قیام محصب کو سُنّت نہ کہنے والوں میں حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرت عائشہؓ بھی ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا۔

بہر کیف اس بارہ میں بہتر بات یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کا محصب میں ٹھہرنا منقول ہے چاہے وہ ٹھہرنا اتفاقی طور پر ہی کیوں نہ رہا ہو تو اچھا یہی ہے کہ وہاں قیام کر لیا جائے جیسا کہ دیگر صحابہ اور خلفاء راشدین بھی اس پر عمل کرتے تھے اور اگر کوئی شخص وہاں نہ ٹھہرے تو اس میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔

طواف وداع کے بعد آنحضرت ﷺ کی مکہ سے روانگی

(۹) وَعَنْهَا قَالَتْ اَحْرَمْتُ مِنَ التَّنْعِيْمِ بِعُمْرَةٍ فَدَخَلْتُ فَقَضَيْتُ عُمْرَتِي وَانْتَظَرَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْاَبْطَحِ حَتّٰى فَرَغْتُ فَاَمَرَ النَّاسَ بِالرَّحِيْلِ فَخَرَجَ فَمَرَّ بِالْبَيْتِ فَطَافَ بِهٖ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ ثُمَّ خَرَجَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ هٰذَا الْحَدِيْثُ مَا وَجَدْتُهٗ بِرِوَايَةِ الشَّيْخَيْنِ بَلْ بِرِوَايَةِ اَبِيْ دَاؤُدَ مَعَ اخْتِلَافٍ يَسِيْرٍ فِيْ اٰخِرِهٖ۔

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عمرہ کے لئے تنعیم سے احرام باندھا اور مکہ میں داخل ہوئی اور پھر میں نے اپنا (وہ) عمرہ ادا کیا (جو ایام شروع ہو جانے کی وجہ سے رہ گیا تھا اور جس کی قضا مجھے کرنی تھی، اس کی تفصیل باب قصہ حجۃ الوداع میں گزر چکی ہے اور رسول کریم ﷺ ابطح میں میرے انتظار میں رہے، یہاں تک کہ جب میں (افعال عمرہ سے) فارغ ہو گئی تو آپ ﷺ نے لوگوں کو روانگی کا حکم دیا، چنانچہ آپ ﷺ (ابطح سے) روانہ ہو کر خانۂ کعبہ تشریف لائے اور نماز فجر سے پہلے اس کا طواف (یعنی طواف وداع) کیا پھر (نماز فجر سے پہلے ہی یا نماز فجر پڑھنے کے بعد) مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ مؤلف مشکوۃؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث بخاری و مسلم (میں سے کسی) کی روایت کے ساتھ نہیں ملی، بلکہ اس حدیث کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے وہ بھی آخر میں کس قدر مختلف ہے۔"

تشریح: مؤلف مشکوۃ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ میرے علم کے مطابق اس روایت کو نہ تو بخاری نے نقل کیا ہے اور نہ مسلم نے، بلکہ اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے مزید کہ ابوداؤد کی روایت اور صاحب مصابیح کی نقل کردہ اس روایت کے آخری جزء میں کچھ اختلاف بھی ہے، گویا اس جملہ کے ذریعہ مؤلف مشکوۃ نے صاحب مصابیح پر ایک اعتراض تو یہ کیا ہے کہ انہوں نے اس روایت کو فصل اول میں نقل کیا ہے جب کہ فصل اول میں صرف بخاریؒ و مسلمؒ ہی کی روایت نقل کی جاتی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ نقل حدیث میں راوی یعنی ابوداؤد کی مخالفت کی بایں طور کہ حدیث کا آخری جزو بعینہ وہ نقل نہیں کیا جو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

طواف وداع واجب ہے

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّاسُ يَنْصَرِفُوْنَ فِيْ كُلِّ وَجْهٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْفِرَنَّ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ اٰخِرُ عَهْدِهٖ بِالْبَيْتِ اِلَّا اَنَّهٗ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ لوگ (افعال حج کی ادائیگی کے بعد) طواف وداع کئے بغیر ہر طرف (یعنی اپنے اپنے وطن کو) روانہ ہو رہے تھے (یعنی لوگ اس بات کی پابندی نہیں کر رہے تھے کہ افعال حج کے بعد مکہ آ کر طواف وداع کرتے) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تم میں سے کوئی بھی (یعنی آفاقی) روانہ نہ ہو جب تک کہ (سفر حج کا) آخری مرحلہ بیت اللہ کو قرار نہ دے لے (یعنی کوئی بھی آفاقی طواف وداع کئے بغیر اپنے وطن کو واپس نہ ہو، ہاں یہ طواف حیض (ونفاس) والی عورت کے لئے موقوف ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: افعال حج سے فراغت کے بعد اور مکہ سے اپنے وطن کو روانہ ہونے سے پہلے جو طواف کیا جاتا ہے اسے "طواف وداع" کہتے ہیں اور اس کا ایک نام طواف صدر بھی ہے، یہ طواف آفاقی پر واجب ہے اگرچہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے کہ اس طواف کے بعد جتنے دن چاہیں مکہ میں مقیم رہا جائے لیکن افضل یہی ہے کہ مکہ سے روانگی کے وقت ہی یہ طواف کیا جائے چنانچہ امام اعظمؒ ابوحنیفہ فرماتے تھے کہ، اگر کوئی شخص (دن کے کسی حصہ میں) طواف وداع کرے اور پھر عشاء تک مکہ میں مقیم رہے تو میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ بات یہی

ہے کہ وہ (مکہ سے روانگی کے وقت) دوسرا طواف کرلے۔

یہ طواف نہ تو اہل مکہ پر واجب ہے نہ اس شخص پر جو میقات کے اندر رہتا ہو اور نہ اس شخص پر واجب ہے جو مکہ میں آکر رہ گیا ہو اور پھر وہ وہاں سے چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہو، اسی طرح یہ طواف نہ تو اس شخص پر واجب ہے جس کا حج فوت ہو گیا ہو اور نہ عمرہ کرنے والے پر واجب ہے نیز اس طواف میں نہ رمل (یعنی اکڑ کر چلنا) ہوتا ہے اور نہ اس کے بعد سعی کی جاتی ہے۔

عذر کی بناء پر طواف وداع واجب نہیں رہتا

(۱۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ حَاضَتْ صَفِيَّةُ لَيْلَةَ النَّفْرِ فَقَالَتْ مَا اُرَانِي اِلَّا حَابِسَتَكُمْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقْرٰى حَلْقٰى اَطَافَتْ يَوْمَ النَّحْرِ قِيْلَ نَعَمْ قَالَ فَانْفِرِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ یوم نفر کی رات میں حضرت صفیہ کے ایام شروع ہو گئے تو وہ کہنے لگیں کہ میرا خیال ہے میں آپ لوگوں کو (مدینہ کی روانگی سے) روکوں گی (کیونکہ میرے ایام شروع ہو گئے ہیں اور میں نے طواف وداع کیا ہی نہیں) آنحضرت ﷺ نے (جب یہ سنا تو) فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اسے ہلاک و زخمی کرے کیا اس نے نحر کے دن طواف (طواف زیارۃ) کیا ہے؟" عرض کیا گیا کہ ہاں!" آپ ﷺ نے فرمایا "پھر رکنے کی ضرورت نہیں ہے) چلو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یوم نفر کی رات سے مراد وہی رات ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے محصب میں قیام فرمایا تھا، یعنی تیرھویں ذی الحجہ کی رات، مگر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ حج کے بیان میں رات کی نسبت روز گزشتہ کی طرف کی جاتی ہے نہ کہ روزہ آئندہ کی طرف، لہٰذا یوم نفر (تیرھویں ذی الحجہ) کی رات سے وہ رات مراد ہوتی ہے جو تیرھویں کے دن کے بعد آتی ہے۔

بہر کیف حضرت صفیہ نے تو یہ گمان کیا کہ جس طرح طواف زیارۃ عذر کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا اسی طرح عذر کے سبب طواف وداع کا ترک بھی جائز نہیں اس لئے انہوں نے کہا کہ اب میں جب تک پاک نہ ہو جاؤں اور طواف نہ کرلوں اس وقت تک سب کو ٹھہرنا پڑے گا اور آنحضرت ﷺ یہ سمجھے کہ انہوں نے طواف زیارۃ نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے اب ٹھہرنا پڑے گا اس لئے آپ ﷺ نے یہ جملہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسے ہلاک و زخمی کرے، مگر جب آپ کو تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ صفیہؓ نے یہ بات طواف زیارۃ کے لئے نہیں کہی بلکہ طواف وداع کے لئے کہی ہے تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ طواف وداع کے بغیر ہی مدینہ روانہ ہو جاؤ کیونکہ عذر کی بناء پر طواف کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر طواف زیارۃ ابھی نہ ہوا ہوتا تو پھر اس کی وجہ سے رکنا پڑتا۔

"اللہ تعالیٰ اسے ہلاک و زخمی کرے" یہ جملہ اگرچہ بددعائیہ ہے مگر یہ بددعا کے ارادہ سے استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اہل عرب کی عادت ہے کہ وہ ایسے جملے ازراہ پیار استعمال کرتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

قربانی کے دن آپ ﷺ کی تذکیر و نصیحت

(۱۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ الْاَحْوَصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ اَيُّ يَوْمٍ هٰذَا قَالُوْا يَوْمُ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا اَلَا لَا يَجْنِيْ جَانٍ عَلٰى نَفْسِهٖ اَلَا لَا يَجْنِيْ جَانٍ عَلٰى وَلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ عَلٰى وَالِدِهٖ اَلَا وَاِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ اَيِسَ اَنْ يُّعْبَدَ فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا اَبَدًا وَلٰكِنْ سَتَكُوْنُ لَهٗ طَاعَةٌ فِيْمَا تَحْتَقِرُوْنَ مِنْ اَعْمَالِكُمْ فَسَيَرْضٰى بِهٖ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهٗ۔

"حضرت عمرو بن احوصؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں قربانی کے دن (یعنی دسویں ذی الحجہ کو صحابہؓ کو

مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا (جانتے بھی ہو) کہ یہ کون سا دن ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "(ہاں) حج اکبر کا دن ہے" پھر آپ نے فرمایا "(یاد رکھو) تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں، تمہارے درمیان اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے اس دن اور تمہارے اس شہر میں! خبردار! ظلم کرنے والا صرف اپنی جان پر ظلم کرتا ہے (یعنی جو شخص کسی پر ظلم کرتا ہے اس کا وبال اسی پر ہوتا ہے کہ وہی ماخوذ ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ ظلم کوئی کرے اور پکڑا کوئی جائے) یاد رکھو! کوئی ظالم اپنے بیٹے پر ظلم نہیں کرتا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ پر ظلم کرتا ہے، جان لو! شیطان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس بات سے نا امید ہو گیا ہے کہ تمہارے اس شہر (مکہ) میں اس کی پرستش کی جائے۔ ہاں تمہارے ان اعمال میں شیطان کی فرمانبرداری ہو گی جنہیں تم حقیر سمجھو گے، چنانچہ وہ ان (گناہوں) سے خوش ہو گا جن کو تم حقیر سمجھو گے۔"

تشریح: "حج اکبر" مطلق حج کو کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْۤءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج کے دن عام لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول، مشرکوں (کو امن دینے) سے دست بردار ہوتے ہیں۔

اور حج کو صفت اکبر کے ساتھ موصوف اس لئے کیا جاتا ہے کہ عمرہ حج اصغر کہلاتا ہے اس مناسبت سے حج کو حج اکبر سے موسوم کیا گیا۔ مشہور مفسر بیضاویؒ کہتے ہیں کہ یوم بقر عید یعنی ذی الحجہ کا دسویں دن "یوم حج اکبر" کہلاتا ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ اسی دن حج مکمل ہوتا ہے بلکہ حج کے تمام بڑے بڑے افعال اسی دن میں ادا کئے جاتے ہیں چنانچہ ایک روایت میں اس کی صراحت بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع میں قربانی (بقر عید) کے دن جمرات کے قریب کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ یہ حج اکبر کا دن ہے۔

پچھلے صفحات میں اسی مضمون کی جو حدیث (ایک) گزری ہے اس میں تو یہ ذکر تھا کہ آنحضرت ﷺ نے جب صحابہؓ سے پوچھا کہ یہ کون سا دن ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے جب کہ یہاں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے جواب دیا کہ یہ حج اکبر کا دن ہے، بظاہر ان دونوں میں تضاد نظر آتا ہے حالانکہ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے تو وہ جواب دیا ہو اور بعض نے یہ، لہٰذا جس راوی نے جو جواب سنا وہ ذکر کر دیا۔

فَاِنَّ دِمَآءَ كُمْ الخ (اور تمہارے خون الخ) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم لوگ اس مبارک دن اور اس مقدس شہر میں ایک دوسرے کا خون بہانے، ایک دوسرے کا مال ہڑپ کرنے اور ایک دوسرے کی بے آبروئی کو حرام اور برا سمجھتے ہو اسی طرح یہ چیزیں ہر جگہ اور ہر وقت حرام و بری ہیں۔

"کوئی ظالم اپنے بیٹے پر ظلم نہیں کرتا الخ" زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جملہ، نفی کو ظاہر کر رہا ہے یعنی اگر کسی کا بیٹا کسی پر ظلم کرتا ہے یا کسی کا باپ کسی پر ظلم کرتا ہے تو وہ ایک دوسرے کے ظلم کی وجہ سے ماخوذ نہیں ہوتے، یہ نہیں ہوتا کہ کسی پر ظلم تو کرے بیٹا اور اس کی وجہ سے پکڑا جائے باپ، یا کسی پر ظلم کرے باپ اور اس کی وجہ سے پکڑا جائے بیٹا، بلکہ جو ظلم کرتا ہے وہی پکڑا جاتا ہے، چنانچہ یہ ارشاد گرامی اس آیت کی مانند ہے کہ: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور یہ بات صرف باپ بیٹے ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ عمومی طور پر کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے ظلم و جرم کی وجہ سے ماخوذ نہیں ہوتا۔

چنانچہ یہاں باپ بیٹے کو بطور خاص محض اس مقصد سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ دونوں سب سے زیادہ قریبی اقرباء ہیں جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے فعل کی وجہ سے ماخوذ نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اس طرح یہ جملہ ماقبل کی عبارت لایجنی جان الخ ظلم کرنے والا صرف اپنی جان پر ظلم کرتا ہے کی تاکید کے طور پر ہو گا۔

بعض شارحین نے اس جملہ لایجنی الاعلی نفسہ میں لفظ الا نقل نہیں کیا ہے اور لکھا ہے یہ جملہ نفی بمعنی نہی ہے یعنی اس جملہ کے ذریعہ منع کیا جا رہا ہے کہ کوئی ظالم اپنے نفس پر ظلم نہ کرے جس سے مراد یہ ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے کیونکہ جو شخص کسی پر ظلم کرتا

ہے وہ در حقیقت اپنی جان پر ظلم کرتا ہے بایں طور کہ وہ کسی پر ظلم کر کے اپنے کو سزا اور عذاب کا مستحق بنالیتا ہے۔

وان الشیطن قد ایس الخ کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس بات سے نا امید ہو گیا ہے کہ اس شہر (مکہ) میں غیر اللہ کی عبادات کے ذریعہ اس کی فرمانبرداری ہو۔ لہٰذا یہاں اب کبھی بھی کوئی شخص شیطان کے فریب میں آکر غیر اللہ کی عبادت و پرستش کھلم کھلا نہیں کرے گا۔ اس سے گویا اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ مقدس شہر ہمیشہ کے لئے کفر و شرک کی غلاظت سے پاک کر دیا گیا ہے، اور اب کبھی بھی اس پاک سرزمین پر کسی غیر مسلم کو قدم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کوئی غیر مسلم چوری چھپے اس شہر میں آجائے اور وہ خفیہ طور پر غیر اللہ کی عبادت کرنے لگے۔

"ہاں تمہارے ان اعمال میں شیطان کی فرمانبرداری ہوگی" میں اعمال سے مراد گناہ کے اعمال ہیں جیسے ناحق قتل کرنا، کسی کا مال لوٹنا یا اسی قسم کے دوسرے اعمال بد اور صغیرہ گناہوں کو اہمیت نہ دینا۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ان اعمال بد میں مبتلا ہونے والا جب ان کو حقیر سمجھتا ہے اور جس کے نتیجہ میں وہ ان اعمال سے اجتناب نہیں کرتا تو گویا وہ شیطان کی اطاعت کرتا ہے کیونکہ شیطان ان باتوں سے خوش ہوتا ہے اور پھر وہی اعمال بڑے فتنہ و فساد کا باعث بن جاتے ہیں۔

(۱۳) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ عَمْرٍو الْمُزَنِيِّ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ النَّاسَ بِمِنًى حِيْنَ ارْتَفَعَ الضُّحٰى عَلٰى بَغْلَةٍ شَهْبَاءَ وَعَلِيٌّ يُعَبِّرُ عَنْهُ وَالنَّاسُ بَيْنَ قَائِمٍ وَقَاعِدٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت رافع ابن عمروؓ مزنی کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا رسول کریم ﷺ منیٰ میں قربانی کے دن چاشت کے وقت لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے آپ ﷺ ایسے خچر پر سوار تھے جس کے بال اوپر کی جانب سے سرخ اور اندر کی جانب سفید تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ ﷺ کی طرف سے بیان کر رہے تھے (یعنی آنحضرت ﷺ جو کچھ فرماتے حضرت علیؓ اسے دہراتے تھے تاکہ دور کے لوگ بھی آپ ﷺ کی بات سن لیں) اور لوگوں میں سے کچھ تو کھڑے تھے اور کچھ بیٹھے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

طواف زیارۃ کا وقت

(۱۴) وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخَّرَ طَوَافَ الزِّيَارَةِ يَوْمَ النَّحْرِ اِلَى اللَّيْلِ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہؓ و حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے طواف زیارۃ میں قربانی کے دن رات تک تاخیر کی۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں کے لئے یا یہ کہ سب ہی کے لئے طواف زیارت میں قربانی کے دن رات تک تاخیر کو جائز قرار دیا۔ حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے طواف زیارت میں رات تک تاخیر کی، کیونکہ آپ ﷺ کے بارہ میں تو یہ صراحت کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ نے قربانی کے وقت طواف زیارۃ کیا اور اس کے بعد مکہ میں یا منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ طواف زیارۃ کا وقت امام شافعیؒ کے نزدیک بقرعید کی آدھی رات کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے جب کہ دیگر ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ اس کا وقت بقرعید کے دن طلوع فجر کے بعد شروع ہوتا ہے اور آخری وقت کا کوئی تعین نہیں ہے جب بھی کیا جائے گا جائز ہو جائے گا لیکن امام ابوحنیفہؒ کے ہاں طواف زیارت کی ادائیگی ایام نحر میں واجب ہے لہٰذا اگر کوئی شخص اتنی تاخیر کرے کہ ایام نحر پورے گزر جائیں اور پھر وہ بعد میں طواف زیارۃ کرے تو اس پر دم یعنی بطور جزاء جانور ذبح کرنا واجب ہوگا۔

طواف زیارۃ میں رمل نہیں ہے

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمْ یَرْمَلْ فِی السَّبْعِ الَّذِی اَفَاضَ فِیْہِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے طواف زیارت میں رمل نہیں کیا۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بھی بتایا جاچکا ہے کہ "شانہ ہلاتے ہوئے چھاتی نکال کر کچھ تیزی کے ساتھ چلنا" رمل کہلاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے طواف زیارۃ میں جوکہ فرض ہے رمل نہیں کیا کیونکہ طواف قدوم میں آپ ﷺ یہ کر چکے تھے۔

اس بارہ میں مسئلہ بھی یہی ہے کہ جو شخص طواف قدوم میں رمل وسعی کر چکا ہو وہ طواف زیارۃ میں نہ تو رمل کرے اور نہ طواف کے بعد سعی کرے اور جو شخص طواف قدوم میں یہ دونوں چیزیں نہ کر چکا ہو تو پھر وہ طواف زیارت میں رمل بھی کرے اور اس کے بعد سعی بھی کرے۔

محرم کے لئے ممنوع چیزیں کب جائز ہوتی ہیں

⑯ وَعَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَمٰی اَحَدُکُمْ جَمْرَۃَ الْعَقَبَۃِ فَقَدْ حَلَّ لَہٗ کُلُّ شَیْءٍ اِلَّا النِّسَاءَ۔ رَوَاہُ فِی شَرْحِ السُّنَّۃِ وَقَالَ اِسْنَادُہٗ ضَعِیْفٌ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَحْمَدَ وَالنَّسَائِیِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِذَا رَمَی الْجَمْرَۃَ فَقَدْ حَلَّ لَہٗ کُلُّ شَیْءٍ اِلَّا النِّسَاءَ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی رمی جمرہ عقبہ سے فارغ ہو جاتا ہے (اور سر منڈوالیتا ہے یا بال کتروالیتا ہے) تو اس کے لئے عورت کے علاوہ ہر چیز حلال ہو جاتی ہے (یعنی بیوی کے ساتھ جماع ان چیزوں کے بعد بھی حلال نہیں ہوتا، بلکہ یہ طواف زیارت سے فراغت کے بعد ہی حلال ہوتا ہے) اس روایت کو (صاحب مصابیح نے) شرح السنۃ میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی اسناد ضعیف ہے۔ اور احمدؒ ونسائیؒ نے اس روایت کو حضرت ابن عباسؓ سے یوں نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے رمی جمرۂ عقبہ کرلی تو (سر منڈوانے یا بال کتروانے کے بعد) اس کے لئے عورت کے علاوہ ہر چیز حلال ہو جاتی ہے۔"

آنحضرت ﷺ کی رمی جمرات

⑰ وَعَنْہَا قَالَتْ اَفَاضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ اٰخِرِ یَوْمِہٖ حِیْنَ صَلَّی الظُّہْرَ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰی مِنًی فَمَکَثَ بِہَا لَیَالِیَ اَیَّامِ التَّشْرِیْقِ یَرْمِی الْجَمْرَۃَ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ کُلَّ جَمْرَۃٍ بِسَبْعِ حَصَیَاتٍ یُکَبِّرُ مَعَ کُلِّ حَصَاۃٍ وَیَقِفُ عِنْدَ الْاُوْلٰی وَالثَّانِیَۃِ فَیُطِیْلُ الْقِیَامَ وَیَتَضَرَّعُ وَیَرْمِی الثَّالِثَۃَ فَلَا یَقِفُ عِنْدَہَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قربانی کے دن آخری حصہ میں اس وقت فرض طواف کیا جب کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی اس کے بعد منیٰ میں واپس آگئے اور منیٰ میں ایام تشریق (یعنی گیارھویں، بارھویں، اور تیرھویں تاریخوں) کی راتیں بسر کیں، ان ایام میں آپ ﷺ جمروں پر اس وقت کنکریاں مارتے جب دوپہر ڈھل جاتی ہر جمرہ پر سات سات کنکریاں مارتے، ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہتے اور پہلے دوسرے جمرہ (یعنی جمرۂ اولیٰ وجمرۂ وسطیٰ) پر دعا واذکار کے لئے) دیر تک ٹھہرتے اور اس وقت مختلف دعاؤں اور عرض حاجات کے لئے تضرع اختیار کرتے اور پھر (جب) تیسرے جمرہ (یعنی جمرہ عقبہ) پر کنکریاں مارتے تو اس کے پاس نہ ٹھہرتے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی صریح دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دسویں ذی الحجہ کو ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی منیٰ میں نہیں پڑھی تھی۔

فلا یقف عندھا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ﷺ جمرۂ عقبہ کے پاس یا اس کے بعد ذکر ودعا نہیں کرتے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ جس طرح دعا و اذکار کے لئے جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ وسطیٰ کے پاس دیر تک کھڑے رہتے تھے اس طرح دعا واذکار کے لئے جمرۂ

عقبہ کے پاس کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ وہاں چلتے چلتے ہی دعا وغیرہ کر لیا کرتے تھے۔

ایام تشریق کی رمی جمرات میں تقدیم و تأخیر کا مسئلہ

(۱۸) وَعَنْ اَبِی الْبَدَّاحِ بْنِ عَاصِمِ بْنِ عَدِیٍّ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ رَخَّصَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِرِعَاءِ الْاِبِلِ الْبَیْتُوْتَةِ اَنْ یَرْمُوْا یَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ یَجْمَعُوْا رَمْیَ یَوْمَیْنِ بَعْدَ یَوْمِ النَّحْرِ فَیَرْمُوْهُ فِیْ اَحَدِهِمَا۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابوالبداح بن عاصم بن عدی (تابعی) اپنے والد مکرم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ "رسول کریم ﷺ نے اونٹ چرانے والوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ منیٰ میں شب باشی نہ کریں اور یہ کہ نحر کے دن (یعنی دسویں ذی الحجہ کو جمرۂ عقبہ پر) کنکریاں ماریں اور پھر دونوں دن کی رمی جمرات کو یوم نحر کے بعد ایک ساتھ کریں اس طرح دونوں دن کی رمی جمرات ان میں سے کسی ایک دن کریں۔ (مالکؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ) اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ حدیث کی مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چرواہوں کو یہ اجازت عطا فرمادی تھی کہ وہ ایام تشریق کی راتوں میں منیٰ میں نہ رہیں کیونکہ وہ اپنے جانوروں کی دیکھ بھال اور ان کے چرانے وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں، نیز انہیں اس بات کی بھی اجازت دے دی کہ وہ صرف بقر عید کے دن جمرۂ عقبہ پر کنکریاں ماریں اس کے بعد دوسرے دن یعنی گیارھویں کو رمی جمرات نہ کریں بلکہ تیسرے دن یعنی بارھویں کو دونوں دن کی ایک ساتھ رمی کریں اس طرح گیارھویں کی رمی تو بطور قضا ہوگی اور بارھویں کی ادا ہی ہوگی۔

اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ ائمہ کے نزدیک عید کے دوسرے دن کی رمی کی تقدیم جائز نہیں ہے یعنی اگر کوئی عید کے دوسرے دن (یعنی گیارھویں کو) اس دن کی رمی کے ساتھ تیسرے دن (یعنی بارھویں کی) رمی بھی کرے تو یہ درست نہیں ہوگا ہاں تاخیر درست ہے کہ دوسرے دن کی رمی بھی تیسرے دن کی رمی کے ساتھ کی جاسکتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

بَابُ مَا یَجْتَنِبُهُ الْمُحْرِمُ

جن چیزوں سے محرم کو بچنا چاہئے ان کا بیان

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے احرام باندھ لینے کے بعد کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو محرم پر حرام ہو جاتی ہیں اور ان چیزوں سے اجتناب محرم کے لئے ضروری ہوتا ہے، پھر ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے ارتکاب سے دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس باب میں ان چیزوں کا ذکر ہوگا جن سے محرم کو بچنا چاہئے اور ضمناً وہ چیزیں بھی ذکر ہوں گی جو محرم کے لئے مباح ہیں۔

اس موقع پر اتنی بات جان لیجئے کہ جن ممنوع چیزوں کے ارتکاب سے صدقہ واجب ہوتا ہے ان میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کی وجہ سے بطور صدقہ نصف صاع (یعنی ایک کلو ۶۳۳ گرام) گیہوں یا ایک صاع (یعنی تین کلو ۲۶۶ گرام) جو دینا بھی واجب ہوتا ہے اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں صدقہ کی مقدار اس سے بھی کم ہے اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں کوئی بھی غیر متعین چیز تھوڑی سی صدقہ کر دینا واجب ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

وہ چیزیں جو محرم کو پہننا ممنوع ہیں

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا یَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّیَابِ فَقَالَ لَا

"تَلْبَسُوا الْقُمُصَ وَلَا الْعَمَائِمَ وَلَا السَّرَاوِيْلَاتِ وَلَا الْبَرَانِسَ وَلَا الْخِفَافَ اِلَّا اَحَدٌ لَا يَجِدُ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسْ خُفَّيْنِ وَلْيَقْطَعْهُمَا اَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ وَلَا تَلْبَسُوْا مِنَ الثِّيَابِ شَيْئًا مَسَّهٗ زَعْفَرَانٌ وَلَا وَرْسٌ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ الْبُخَارِيُّ فِي رِوَايَةٍ وَلَا تَنْتَقِبُ الْمَرْأَةُ الْمُحْرِمَةُ وَلَا تَلْبَسُ الْقُفَّازَيْنِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ محرم کپڑوں میں سے کیا چیزیں پہن سکتا ہے (اور کیا چیزیں نہیں پہن سکتا؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "نہ تو قمیص وکرتہ پہنو، نہ عمامہ باندھو، نہ پاجامہ پہنو، نہ برنس اوڑھو اور نہ موزے پہنو، ہاں جس شخص کے پاس جوتے نہ ہوں وہ موزے پہن سکتا ہے مگر اس طرح کہ موزہ دونوں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے، نیز کوئی ایسا کپڑا نہ پہنو جس پر زعفران یا ورس لگی ہو۔ (بخاریؒ ومسلمؒ) بخاری نے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "محرم عورت نقاب نہ ڈالے اور نہ دستانے پہنے"۔

تشریح: قمیص وکرتہ اور پاجامہ پہننے سے مراد ان کو اس طرح پہننا ہے جس طرح کہ عام طور پر یہ چیزیں پہنی جاتی ہیں جیسے قمیص وکرتہ کو گلے میں ڈال کر پہنتے ہیں یا پاجامہ ٹانگوں میں ڈال کر پہنا جاتا ہے، چنانچہ احرام کی حالت میں ان چیزوں کو اس طرح پہننا ممنوع ہے۔ ہاں اگر کوئی محرم ان چیزوں کو مروج طریقہ پر پہننے کی بجائے بدن پر چادر کی طرح ڈالے تو یہ ممنوع نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے قمیص وکرتہ پہنا ہے یا پاجامہ پہنا ہے۔

"برنس" اس لمبی ٹوپی کو کہتے ہیں جو عرب میں اوڑھی جاتی تھی اور برنس وہ لباس بھی ہوتا ہے جس کا کچھ حصہ ٹوپی کی جگہ کام دیتا ہے جیسے برساتی وغیرہ۔ چنانچہ "نہ برنس اوڑھو" سے مراد یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز نہ اوڑھو جو سر کو ڈھانپ لے خواہ وہ ٹوپی ہو یا برساتی اور خواہ کوئی اور چیز۔ ہاں جو چیز ایسی ہو جس پر عرف عام میں پہننے یا اوڑھنے کا اطلاق نہ ہوتا ہو مثلاً سر پر کونڈا یا گھڑا وغیرہ رکھ لینا یا سر پر گٹھر اٹھا لینا تو اس صورت میں کوئی مضائقہ نہیں۔

"وہ موزہ دونوں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے" میں یہاں ٹخنے سے مراد حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ ہڈی ہے جو پیر کی پشت پر بیچ میں ہوتی ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے ہاں وہی متعارف ٹخنہ مراد ہے جس کو وضو میں دھونا فرض ہے۔

اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ جس شخص کے پاس جوتے نہ ہوں اور وہ موزے پہن لے تو آیا اس پر فدیہ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ تو یہ کہتے ہیں کہ اس پر کچھ واجب نہیں ہوتا لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پر فدیہ واجب ہوتا ہے۔ جس طرح یہ مسئلہ ہے کہ اگر احرام کی حالت میں کسی کو سر منڈانے کی احتیاج وضرورت لاحق ہو جائے تو وہ سر منڈالے اور فدیہ ادا کرے۔

"ورس" ایک قسم کی گھاس کا نام ہے جو زرد رنگت کی اور زعفران کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس گھاس سے رنگائی کا کام لیا جاتا ہے۔ زعفران اور اس کے رنگ آلود کپڑوں کو پہننے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔

"محرم عورت نقاب نہ ڈالے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے منہ کو برقع اور نقاب سے نہ ڈھانکے ہاں اگر وہ پردہ کی خاطر کسی ایسی چیز سے اپنے منہ کو چھپائے جو منہ سے الگ رہے تو جائز ہے، اسی طرح حنفیہ کے ہاں مرد کو بھی عورت کی طرف احرام کی حالت میں منہ ڈھانکنا حرام ہے، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک بھی ایک روایت کے مطابق یہی ہے جب کہ امام شافعیؒ کا مسلک اس کے برخلاف ہے۔

ہودج میں بیٹھنا ممنوع ہے بشرطیکہ سر ہودج میں لگتا ہو، اگر سر ہودج میں نہ لگتا ہو تو پھر اس میں بیٹھنا ممنوع نہیں ہے، اسی طرح اگر کعبہ کا پردہ یا خیمہ سر میں لگتا ہو تو ان کے نیچے کھڑا ہونا ممنوع ہے اور اگر سر میں نہ لگتا ہو تو ممنوع نہیں ہے۔

④ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ وَهُوَ يَقُوْلُ اِذَا لَمْ يَجِدِ الْمُحْرِمُ نَعْلَيْنِ

لَبِسَ خُفَّيْنِ وَاِذَا لَمْ يَجِدْ اِزَارًا لَبِسَ سَرَاوِيْلَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے، نیز آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اگر محرم کو جوتے میسر نہ ہوں تو وہ موزے پہن سکتا ہے اور جس محرم کے پاس تہ بند نہ ہو تو وہ پائجامہ پہن سکتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: موزوں کے استعمال کے بارہ میں تو گزشتہ حدیث میں بتایا جا چکا ہے کہ جوتے میسر نہ ہوں تو محرم پائجامہ پہن سکتا ہے۔ اس صورت میں امام شافعیؒ کے نزدیک اس پر کوئی فدیہ واجب نہیں ہوگا۔ لیکن حضرت امام اعظمؒ کا مسلک اس بارہ میں یہ ہے کہ اگر تہ بند نہ ہو تو پائجامہ کو پھاڑ کر اسے تہ بند کی صورت میں باندھ لیا جائے اور اگر کوئی شخص اسے پھاڑ کر استعمال نہ کرے بلکہ پائجامہ ہی پہن لے تو اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا۔

(۳) وَعَنْ يَعْلَى ابْنِ اُمَيَّةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجِعِرَّانَةِ اِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ اَعْرَابِيٌّ عَلَيْهِ جُبَّةٌ وَهُوَ مُتَضَمِّخٌ بِالْخَلُوْقِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي اَحْرَمْتُ بِالْعُمْرَةِ وَهٰذِهِ عَلَيَّ فَقَالَ اَمَّا الطِّيْبُ الَّذِي بِكَ فَاغْسِلْهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَاَمَّا الْجُبَّةُ فَانْزِعْهَا ثُمَّ اصْنَعْ فِي عُمْرَتِكَ كَمَا تَصْنَعُ فِي حَجِّكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت یعلی ابن امیہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ جعرانہ میں (کہ جو مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ایک مقام ہے اور جہاں سے آپ ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا تھا) نبی کریم ﷺ کے پاس تھے کہ اچانک ایک شخص جو دیہاتی تھا آیا) اس نے کرتہ پہنا ہوا تھا، نیز وہ شخص خلوق میں رنگا بسا تھا (خلوق ایک خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے تیار ہوتی تھی) اس شخص نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میں نے عمرہ کا احرام اس حالت میں باندھا تھا کہ یہ کرتہ میرے جسم پر تھا؟" آپ ﷺ نے فرمایا "تمہارے اوپر جو خوشبو لگی ہوئی ہے اسے تو تین مرتبہ دھوڈالو اور کرتہ کو اتار دو اور پھر اپنے عمرہ (کے احرام) میں وہی کرو جو تم اپنے حج کے احرام میں کرتے ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: زعفران کا استعمال چونکہ مردوں کے لئے حرام ہے اور خلوق زعفران ہی سے تیار ہوتی تھی اس لئے آپ ﷺ نے اس شخص کو یہ حکم دیا کہ وہ اسے دھوڈالے نیز تین مرتبہ دھونے کا حکم صرف اس لئے دیا تاکہ وہ خوب اچھی طرح چھوٹ جائے ورنہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ خلوق کو بالکل صاف کر دو خواہ وہ کسی طرح اور کتنی ہی مرتبہ میں صاف ہو۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں حج کے احرام کی حالت میں ممنوع ہیں وہی عمرہ کے احرام کی حالت میں بھی ممنوع ہیں اس لئے تم عمرہ کے احرام کی حالت میں ان تمام چیزوں سے پرہیز کرو جن سے حج کے احرام کی حالت میں پرہیز کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: احرام کی حالت میں بغیر خوشبو کا سرمہ لگانا جائز ہے بشرطیکہ اس سے زیب و زینت مقصود نہ ہو۔ اگر کوئی شخص زیب و زینت کے بغیر خوشبو کا بھی سرمہ لگائے تو مکروہ ہوگا۔

اس موقع پر ایک خاص بات یہ جان لینی چاہئے کہ جو چیزیں احرام کی حالت میں حرام ہو جاتی ہیں ان کا ارتکاب اگر قصداً ہوگا تو متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک اس کی وجہ سے مرتکب پر فدیہ لازم ہوگا۔ ہاں بھول چوک سے ارتکاب کرنے والے پر فدیہ واجب نہیں ہوگا جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ، ثوریؒ، احمدؒ، اور اسحٰقؒ کا قول ہے البتہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی فدیہ واجب ہوگا۔

حالت احرام میں نکاح کرنے کرانے کا مسئلہ

(۴) وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ وَلَا يُنْكَحُ وَلَا يَخْطُبُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ محرم نکاح کرے، اسی طرح (ولایۃً یا وکالۃً) نکاح

کرانا اور منگنی کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ اور اکثر علماء کے نزدیک خود اپنا نکاح کرنے یا کسی کا نکاح کرانے کی ممانعت مکروہ تحریمی کے طور پر ہے اور منگنی کرنے کی ممانعت مکروہ تنزیہی کے طور پر ہے۔ چنانچہ ان حضرات کے نزدیک حالت احرام میں نہ تو خود اپنا نکاح کرنا درست ہے اور نہ کسی کا نکاح کرانا جائز ہے۔ لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں تینوں کی ممانعت صرف مکروہ تنزیہی کے طور پر ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہؓ سے اپنا نکاح کیا تھا۔

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزَوَّجَ مَيْمُوْنَةَ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے اس حالت میں نکاح کیا کہ آپ (عمرۃ القضا کا) احرام باندھے ہوئے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

⑥ وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ الْاَصَمِّ ابْنِ اُخْتِ مَيْمُوْنَةَ عَنْ مَيْمُوْنَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزَوَّجَهَا وَهُوَ حَلَالٌ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ قَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ مُحْيِ السُّنَّةِ وَالْاَكْثَرُوْنَ عَلٰى اَنَّهٗ تَزَوَّجَهَا حَلَالًا وَظَهَرَ اَمْرُ تَزْوِيْجِهَا وَهُوَ مُحْرِمٌ ثُمَّ بَنٰى بِهَا وَهُوَ حَلَالٌ بِسَرِفَ فِيْ طَرِيْقِ مَكَّةَ۔

"اور حضرت یزید (ابن اصم (تابعی) جو اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے ہیں (اپنی خالہ) حضرت میمونہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ان (حضرت میمونہؓ) سے جب نکاح کیا تو آپ ﷺ احرام کی حالت میں نہیں تھے۔ (مسلمؒ) حضرت امام محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر علماء (یعنی حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے علاوہ) اس بات کے قائل ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تو اس وقت آپ ﷺ حالت احرام میں نہیں تھے۔ ہاں حضرت میمونہؓ کے ساتھ آپ ﷺ کے نکاح کا اظہار عام اس وقت ہوا جب آپ ﷺ احرام کی حالت میں تھے، پھر آپ ﷺ نے حضرت میمونہؓ کے ساتھ شب زفاف مقام سرف ہی میں جو مکہ کے راستہ میں واقع ہے اس وقت گزاری جب کہ آپ ﷺ احرام کھول چکے تھے۔"

تشریح: مظاہر حق جدید کی زیر نظر جلد میں ایک موقع پر یہ بتایا جا چکا ہے کہ "سرف" ایک مقام کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے تقریباً چھ میل اور مقام تنعیم سے جانب شمال تین یا چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے اسی موقع پر ایک تاریخی اتفاق بھی ذکر کیا گیا تھا کہ آنحضرت ﷺ حضرت میمونہؓ کا نکاح بھی سرف میں ہوا (جب کہ آپ ﷺ عمرۃ القضاء کے لئے مکہ تشریف لا رہے تھے اور اس وقت حالت احرام میں تھے) اور ان کی شب زفاف بھی یہیں گزری (جب کہ آپ ﷺ عمرہ سے فارغ ہو کر مدینہ واپس ہو رہے تھے) اور پھر بعد میں ان کا انتقال بھی یہیں ہوا۔

بہر کیف یہ حدیث جسے حضرت میمونہؓ کے بھانجے حضرت یزیدؒ نے روایت کیا ہے، حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کے بالکل برخلاف ہے جو اس سے پہلے نقل کی گئی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت تو اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے حالت احرام میں نکاح کیا تھا جب کہ حضرت یزیدؒ کی یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت میمونہؓ سے آپ ﷺ کا نکاح اس وقت ہوا تھا جب کہ آپ ﷺ حالت احرام میں نہیں تھے۔ اس طرح ان دونوں روایتوں میں تعارض ہو گیا ہے، چنانچہ حنفیہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں اول تو اس وجہ سے کہ حضرت ابن عباسؓ کو اپنے علم و فضل، قوت حافظہ، فقہی بصیرت اور اپنی شان مرتبت کے اعتبار سے حضرت یزیدؒ پر کہیں زیادہ برتری حاصل ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کو بخاریؒ و مسلمؒ دونوں نے نقل کیا ہے جب کہ حضرت یزیدؒ کی روایت کو صرف مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت عثمانؓ کی روایت (چار) میں احرام کی حالت میں نکاح کرنے کرانے کی ممانعت منقول ہے؟ تو اس کے

بارہ میں حنفی علماء لکھتے ہیں کہ اس ممانعت سے یہ مراد ہی نہیں ہے کہ نکاح کرنا کرانا قطعاً ناجائز یا حرام ہے، بلکہ اس کا مقصد تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ محرم چونکہ ایک عبادت میں مشغول رہتا ہے اس لئے اس کی شان اور اس کے حال کے مناسب یہ نہیں ہے کہ وہ نکاح کرے یا کسی کا نکاح کرائے۔ چنانچہ اس حدیث کی تشریح میں یہی وضاحت کی گئی تھی کہ یہاں اس ممانعت کا مطلب مکروہ تنزیہی ہے۔

حضرت امام محی السنۃؒ کے یہ الفاظ وظهر امر تزويجها وهو محرم (حضرت میمونہؓ کے ساتھ آپ ﷺ کے نکاح کا اظہار عام اس وقت ہوا جب کہ آپ ﷺ احرام کی حالت میں تھے) دراصل شوافع کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کہ "آپ ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے اس حالت میں نکاح کیا کہ آپ ﷺ احرام باندھے ہوئے تھے۔" کی تاویل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نکاح تو اس وقت ہی کیا تھا جب کہ آپ ﷺ حالت احرام میں نہیں تھے ہاں اس نکاح کا علم لوگوں کو اس وقت ہوا جب آپ ﷺ نے احرام باندھ لیا تھا۔ گویا امام محی السنۃؒ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کو بھی اس نکاح کا علم اس وقت ہوا جب کہ آپ ﷺ حالت احرام میں تھے اس لئے وہ یہی سمجھے کہ نکاح آپ ﷺ نے حالت احرام ہی میں کیا ہے حالانکہ شوافع کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی یہ تاویل "تکلف" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

سر دھونے کی اجازت

(۷) وَعَنْ اَبِي اَيُّوْبَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَغْسِلُ رَأْسَهُ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوایوبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ احرام کی حالت میں اپنا سر مبارک دھوتے تھے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: بغیر کسی اختلاف کے محرم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنا سر دھوئے مگر اس طرح کہ سر کا کوئی بال ٹوٹنے نہ پائے، ہاں اگر کوئی خطمی سے سر دھوئے گا تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا کیونکہ نہ صرف یہ کہ حظمی خوشبو کی قسم سے ہے بلکہ اس کے لگانے سے جوئیں مرجاتی ہیں۔ البتہ (بغیر خوشبو کے) صابون یا بیری کے پتوں اور یا اسی قسم کی دوسری چیزوں سے سر دھونے کی صورت میں متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک اس پر کچھ واجب نہیں ہوتا۔

سینگی کھنچوانا جائز ہے

(۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ احْتَجَمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے احرام کی حالت میں بھری ہوئی سینگی کھنچوائی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اکثر علماء کے نزدیک احرام کی حالت میں سینگی کھنچوانا جائز ہے بشرطیکہ کوئی بال نہ ٹوٹے۔

سرمہ لگانے کا مسئلہ

(۹) وَعَنْ عُثْمَانَ حَدَّثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الرَّجُلِ اِذَا اشْتَكٰى عَيْنَيْهِ وَهُوَ مُحْرِمٌ ضَمَّدَهُمَا بِالصَّبِرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عثمانؓ نے ایک شخص کے بارہ میں رسول کریم ﷺ کی یہ حدیث بیان کی کہ اگر حالت احرام میں اس کی آنکھیں دکھیں یا وہ ضعف بصارت میں مبتلا ہو تو وہ اپنی آنکھوں پر ایلوے کا لیپ کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: تاج المصادر میں "تضمید" کے معنی "لیپ کرنا" ہی لکھتے ہیں۔ لیکن کچھ علماء نے اس کے معنی "آنکھوں کے اندر لگانا" لکھے ہیں۔ یعنی جس طرح سرمہ لگایا جاتا ہے اسی طرح وہ آنکھوں میں ایلوا لگائے۔

اور علامہ طیبیؒ نے یہ لکھا ہے کہ تضمید "زخم پر پٹی باندھنے کو کہتے ہیں" اسی طرح زخم پر دوا لگانے کو بھی تضمید کہتے ہیں۔
یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ محرم کو بغیر خوشبو کا سرمہ لگانا جائز ہے اور اس کی وجہ سے بطور جزاء کوئی چیز واجب نہیں ہوتی بشرطیکہ اس سے زیب وزینت مقصود نہ ہو کیونکہ زیب وزینت کے لئے سرمہ لگانا مکروہ ہے۔ اس موقع پر خوشبو دار سرمہ کے بارہ میں یہ تفصیل جان لیجئے کہ اگر سرمہ میں کم خوشبو ہو تو اس کو لگانے سے صرف صدقہ واجب ہوگا اور اگر خوشبو زیادہ ہوگی تو ایسے سرمہ کو لگانے سے دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا۔ ایسے ہی یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی محرم اپنے سر اور منہ کے علاوہ کسی اور عضو پر پٹی باندھے تو اس پر اگرچہ بطور جزاء کچھ واجب نہیں ہوتا لیکن یہ مکروہ ہے۔ اور اگر کوئی محرم اپنے سر یا منہ کے چوتھائی حصہ یا اس سے زیادہ کو کسی کپڑے وغیرہ سے ڈھانکے گا تو اس پر دم لازم ہوگا اور چوتھائی حصہ سے کم کو ڈھانکے گا تو صرف صدقہ واجب ہوگا۔

حالت احرام میں سر پر سایہ کرنے کا مسئلہ

(۱۵) وَعَنْ اُمِّ الْحُصَيْنِ قَالَتْ رَأَيْتُ اُسَامَةَ وَبِلَالًا وَاَحَدُهُمَا اٰخِذٌ بِخِطَامِ نَاقَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ رَافِعٌ ثَوْبَهٗ يَسْتُرُهٗ مِنَ الْحَرِّ حَتّٰى رَمٰى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اُمّ حصینؓ کہتی ہیں کہ میں نے حضرت اسامہؓ اور حضرت بلالؓ کو دیکھا کہ ان میں سے ایک (یعنی حضرت اسامہؓ) اپنا کپڑا اٹھائے (آپ ﷺ کے اوپر) سورج کی گرمی کی تپش سے سایہ کئے ہوئے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے جمرۂ عقبہ پر کنکریاں ماریں۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت اسامہؓ نے آپ ﷺ کے سر مبارک پر کپڑے سے اس طرح سایہ کر رکھا تھا کہ وہ کپڑا اونچا ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے سر مبارک سے لگتا نہیں تھا۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ "وہ سایہ کے لئے آنحضرت ﷺ کے مبارک سر پر چھتری کی مانند ایک چیز اٹھائے ہوئے تھے۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محرم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے سر پر کسی چیز سے سایہ کرلے بشرطیکہ سایہ کرنے والی چیز اس کے سر کو نہ لگے، چنانچہ اکثر علماء کا یہی قول ہے لیکن حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ نے اسے مکروہ کہا ہے۔

سر منڈوانے کی جزا

(۱۱) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّبِهٖ وَهُوَ بِالْحُدَيْبِيَةِ قَبْلَ اَنْ يَّدْخُلَ مَكَّةَ وَهُوَ مُحْرِمٌ وَهُوَ يُوْقِدُ تَحْتَ قِدْرٍ وَالْقَمْلُ تَتَهَافَتُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَقَالَ اَتُؤْذِيْكَ هَوَامُّكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاحْلِقْ رَأْسَكَ وَاَطْعِمْ فَرَقًا بَيْنَ سِتَّةِ مَسَاكِيْنَ وَالْفَرَقُ ثَلَاثَةُ اٰصُعٍ اَوْصُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اَوِ انْسُكْ نَسِيْكَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت کعبؓ ابن عجرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس سے گزرے جب کہ وہ مکّہ میں داخل ہونے سے پہلے حدیبیہ میں تھے اور وہ (کعبؓ) احرام کی حالت میں تھے (یعنی یہ اس موقع کا ذکر ہے جب آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ہمراہ عمرہ کے لئے مکّہ روانہ ہوئے تھے لیکن مشرکین نے حدیبیہ میں سب کو روک دیا تھا چنانچہ سب کے ساتھ کعبؓ بھی مکّہ میں داخل ہونے کے متوقع تھے مگر پھر بعد میں ایک معاہدہ کے تحت کہ جس کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں، سب لوگ عمرہ کئے بغیر واپس ہوگئے تھے، بہرکیف جب آنحضرت ﷺ کعبؓ کے پاس سے گزرے تو) وہ ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہے تھے اور جوئیں (سر سے جھڑ کر) ان کے منہ پر گر رہی تھیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا کہ "کیا یہ جوئیں تمہیں تکلیف پہنچا رہی ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ "جی ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر تم اپنا سر منڈوا لو اور (بطور جزاء) ایک فرق کھانا چھ مسکینوں کو کھلا دو اور فرق تین صاع کا ہوتا ہے یا تین دن روزے رکھ لو اور یا ایک جانور ذبح کرنے کے قابل

ہو، ذبح کرو"۔ (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: حضرت کعب ابن عجرہؓ ایک جلیل القدر انصاری صحابی ہیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر یہ بھی موجود تھے، ان کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور بڑا سبق آموز بھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس ایک بت تھا جس کو یہ پوجا کرتے تھے، عبادہ ابن صامتؓ ان کے دوست تھے، ایک دن عبادہؓ کعبؓ کے پاس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ کعب بت کی پوجا کرنے کے بعد گھر سے نکل گئے ہیں، عبادہ گھر میں داخل ہوئے اور اس بت کو توڑ ڈالا، جب کعب گھر میں آئے تو دیکھا کہ بت ٹوٹا پڑا ہے، انہیں معلوم ہوا کہ یہ حرکت عبادہ کی ہے، بڑے غضب ناک ہوئے اور چاہا کہ عبادہ کو برا بھلا کہیں مگر پھر سوچ میں پڑ گئے، دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر اس بت کو کچھ بھی قدرت حاصل ہوتی تو اپنے آپ کو بچالیتا، بس یہ خیال گزرنا تھا کہ شرک و کفر کا اندھیرا چھٹ گیا اور ایمان و صداقت کے نور نے قلب و دماغ کے ایک ایک گوشہ کو منور کر دیا اور اس طرح وہ مشرف باسلام ہو گئے، سچ ہے اللہ تعالیٰ جسے ہدایت یافتہ بناتا ہے اسی طرح ہدایت کی توفیق بخش دیتا ہے۔

بہر کیف۔ اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی محرم کسی عذر مثلاً جوئیں، زخم اور درد سر وغیرہ کی وجہ سے اپنا سر منڈوائے تو اسے اختیار ہے کہ بطور جزاء چاہے تو چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے بایں طور کہ ہر مسکین کو آدھا آدھا صاع گیہوں دے دے، چاہے تین روزے رکھ لے اور چاہے جانور ذبح کرے۔ چنانچہ یہ حدیث اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے کہ۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْبِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْصَدَقَةٍ اَوْنُسُكٍ (ترجمہ) اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ اپنا سر منڈا دے) تو وہ بطور فدیہ یا تو روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

احرام میں عورتوں کے لئے ممنوع چیزیں

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَى النِّسَاءَ فِيْ اِحْرَامِهِنَّ عَنِ الْقُفَّازَيْنِ وَالنِّقَابِ وَمَامَسَّ الْوَرْسُ وَالزَّعْفَرَانُ مِنَ الثِّيَابِ وَالْتَلْبَس بَعْدَ ذٰلِكَ مَا اَحَبَّتْ مِنْ اَلْوَانِ الثِّيَابِ مُعَصْفَرٍ اَوْخَزٍّ اَوْ حُلِيٍّ اَوْ سَرَاوِيْلَ اَوْ قَمِيْصٍ اَوْ خُفٍّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے سنا رسول کریم ﷺ اس سے منع فرماتے تھے کہ عورتیں اپنے احرام کی حالت میں دستانے پہنیں اور (اس طرح) نقاب ڈالیں (کہ وہ نقاب ان کے منہ پر لگتی ہو) اور ایسے کپڑے پہنیں جس میں زعفران اور ورس لگی ہو، ہاں اس کے بعد (یعنی احرام سے نکلنے کے بعد) وہ کپڑوں کی انواع سے جو چاہیں پہنیں خواہ وہ کسم کا رنگا ہوا ہو۔ ریشم ہو، یا زیور ہو اور خواہ پائجامہ ہو، قمیص ہو یا موزہ ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بَعْدَ ذٰلِكَ (اس کے بعد) کا مطلب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تو "احرام سے نکلنے کے بعد" ہی لکھا ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے یہ معنی لکھے ہیں کہ "ان مذکورہ چیزوں کے بعد" یعنی حدیث میں جن چیزوں کے استعمال سے منع کیا گیا ہے ان کے علاوہ اور جس قسم کا بھی کپڑا چاہے پہنے۔

نیز ملا علیؒ قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ (بَعْدَ ذٰلِكَ کے یہ معنی مراد لینے کی صورت میں) حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ احرام کی حالت میں زعفران کا رنگا ہوا کپڑا پہننا تو ممنوع ہے لیکن کسم کا رنگا ہوا کپڑا پہننا منع نہیں ہے جب کہ حنفیہ کے مسلک میں حالت احرام میں جس طرح زعفرانی کپڑا پہننا ممنوع ہے اسی طرح کسم کا رنگا کپڑا پہننا بھی ممنوع ہے، چنانچہ خزانۃ الاکمل اور ولوالجی اور فقہ کی دوسری

کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ اگر کسی محرم نے زعفران یا کسم میں رنگا ہوا کپڑا ایک دن پہنا تو اس پر بطور جزاء دم واجب ہوتا ہے اور اگر ایک دن سے کم پہنا تو صدقہ لازم ہوگا لہٰذا اول تو یہی بہتر ہے کہ بعد ذالک کے وہی معنی مراد لئے جائیں جو شیخ عبدالحق نے لکھے ہیں، یا پھر یہ تاویل کی جائے کہ حدیث میں کسم کا وہ رنگا ہوا کپڑا مراد ہے جو دھل چکا ہو اور جس میں خوشبو باقی نہ رہ گئی ہو۔

طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث کے آخر میں کپڑوں کے ساتھ زیور کا ذکر مجازاً کیا گیا ہے۔

احرام میں پردہ کا طریقہ

(۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ الرُّكْبَانُ يَمُرُّوْنَ بِنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُحْرِمَاتٌ فَاِذَا جَاوَزُوْا بِنَا سَدَلَتْ اِحْدَانَا جِلْبَابَهَا مِنْ رَأْسِهَا عَلٰى وَجْهِهَا فَاِذَا جَاوَزُوْنَا كَشَفْنَاهُ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَلِابْنِ مَاجَةَ مَعْنَاهُ۔

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ہم (سفر کے دوران) حالت احرام میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے (اور احرام کی وجہ سے ہمارے منہ کھلے ہوئے تھے) اور ہمارے قریب سے قافلے گزرتے رہے، چنانچہ جب کوئی قافلہ ہمارے سامنے سے گزرتا تو ہم میں سے ہر عورت (پردہ کی غرض سے) اپنی چادر اپنے سر پر تان کر اپنے منہ پر (اس طرح) ڈال لیتی تھی (کہ وہ چادر اس کے منہ کو نہ لگتی) اور جب قافلہ ہمارے سامنے سے گزر جاتا تو ہم اپنا منہ کھول دیتے تھے۔ (ابوداؤد) ابن ماجہ نے بھی اسی مضمون کی ایک روایت نقل کی ہے۔

حالت احرام میں خوشبودار تیل استعمال کرنا ممنوع ہے

(۱۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَدَّهِنُ بِالزَّيْتِ وَهُوَ مُحْرِمٌ غَيْرَ الْمُقَتَّتِ يَعْنِي غَيْرَ الْمُطَيَّبِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ احرام کی حالت میں بغیر خوشبو کا زیتون کا تیل استعمال کرتے تھے۔" (ترمذی)

تشریح: مُقَتَّتْ اس تیل کو کہتے ہیں جس میں خوشبو کے پھول ڈال کر اسے پکالیا جائے تاکہ وہ تیل خوشبودار ہو جائے یا اس تیل میں کوئی خوشبودار تیل وغیرہ ملا دیا جائے۔

احرام کی حالت میں خوشبودار تیل استعمال کرنا مکروہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی محرم کسی ایک عضو کے پورے حصہ پر یا کئی یا سب اعضاء پر روغن بنفشہ، روغن گلاب، روغن موتیا یا اسی قسم کا کوئی بھی خوشبودار تیل لگائے گا تو حنفیہ کے ہاں بالاتفاق اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا اور اگر زیتون یا تل کا ایسا تیل کہ جس میں خوشبو نہ ملی ہوئی ہو زیادہ مقدار میں لگائے گا تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اس صورت میں بھی دم واجب ہوگا جب کہ صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسف اور حضرت امام محمد کہتے ہیں کہ صدقہ واجب ہوگا۔ لیکن یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ یہ دونوں تیل خوشبو سے بالکل خالی اور کسی خوشبودار پھول کے پکائے ہوئے نہ ہوں، کیونکہ اگر زیتون کے یا تل کے تیل میں خوشبو ملی ہوگی یا اس میں خوشبودار پھول ڈال کر پکایا گیا ہو تو پھر سب ہی کے نزدیک اس کو استعمال کرنے کی وجہ سے دم واجب ہوگا۔ اسی طرح یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ یہ تیل زیادہ مقدار میں لگائے جائیں اور اگر کم لگایا جائے گا تو متفقہ طور پر سب کے نزدیک اس کے استعمال کرنے سے صرف صدقہ واجب ہوگا۔

اور پھر ایک بات یہ بھی جان لیجئے کہ ان تیلوں کے استعمال کی وجہ سے دم یا صدقہ اسی وقت واجب ہوگا جب کہ ان کو محض خوشبو کی خاطر استعمال کیا جائے اور اگر انہیں دوا کے طور پر استعمال کیا جائے گا تو پھر علی الاتفاق کچھ بھی واجب نہیں ہوگا۔ جب کہ مشک یا دوسری خوشبوؤں کے استعمال کا مسئلہ اس سے مختلف ہے کہ ان کے استعمال سے بہر صورت دم واجب ہوتا ہے خواہ بطور خوشبو استعمال ہوں خواہ بطور دوا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سلے ہوئے کپڑوں کو بدن پر ڈال لینے کا مسئلہ

(۱۵) وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ وَجَدَ الْقُرَّ فَقَالَ اَلْقِ عَلَيَّ ثَوْبًا يَا نَافِعُ فَاَلْقَيْتُ عَلَيْهِ بُرْنُسًا فَقَالَ تُلْقِي عَلَيَّ هٰذَا وَقَدْ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّلْبَسَهُ الْمُحْرِمُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت نافع" (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کو (حالت احرام میں ایک موقع پر) سردی لگنے لگی تو انہوں نے فرمایا کہ "نافع! مجھ پر کوئی کپڑا ڈال دو" چنانچہ میں نے ان کے بدن پر برساتی ڈال دی تو انہوں نے فرمایا کہ تم میرے بدن پر یہ (برساتی) ڈال رہے ہو؟ حالانکہ رسول کریم ﷺ نے محرم کو اس کے پہننے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ سلے ہوئے کپڑے کو اس طرح استعمال کرنا محرم کے لئے ممنوع ہے جس طرح اسے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، بصورت دیگر ممنوع نہیں ہے مثلاً برساتی عام طور پر پہنی جاتی ہے۔ اگر کوئی محرم اسے پہنے نہیں بلکہ ایسے ہی جسم پر ڈال لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ اس بارہ میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے برساتی کو اپنے جسم پر ڈال لینے سے بھی منع یا تو اس لئے فرمایا کہ وہ اپنے خیال کی بناء پر سلے ہوئے کپڑے کو مطلقاً کسی بھی استعمال کرنے سے اجتناب کرتے ہوں گے یا پھر یہ کہ نافعؒ نے ان کا سر بھی ڈھانک دیا ہوگا۔ اس وجہ سے انہوں منع فرمایا۔

آنحضرت ﷺ کا پچھنے لگوانا

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَالِكٍ ابْنِ بُحَيْنَةَ قَالَ احْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ بِلَحْيِ جَمَلٍ مِنْ طَرِيْقِ مَكَّةَ فِيْ وَسَطِ رَاْسِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مالکؓ جو بحینہ کے بیٹے ہیں، کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مکہ کے راستے میں لحی جمل کے مقام پر بحالت احرام اپنے سر کے بیچوں بیچ سینگی کھنچوائی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مالک، حضرت عبداللہ کے باپ کا نام ہے اور بحینہ ان کی ماں کا نام ہے گویا ابن بحینہ، حضرت عبداللہ کی دوسری صفت ہے اسی لئے "عبداللہ بن مالک ابن بحینہ" میں مالک کو تنوین کے ساتھ پڑھتے ہیں اور "ابن بحینہ" میں الف لکھا جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے جب سر کے بیچوں بیچ پچھنے لگوائے تو سر مبارک کے بال کچھ نہ کچھ ضرور ٹوٹے ہوں گے لہٰذا یہ حدیث ضرورت پر محمول ہے کہ آپ ﷺ نے کسی عذر و ضرورت کی بناء پر سر میں پچھنے لگوائے تھے، چنانچہ اگر محرم کسی ایسی جگہ پچھنے لگوائے جہاں بال نہ ہوں تو اس پر فدیہ واجب نہیں ہوتا۔

مسئلہ: اگر کوئی محرم سر کے بال چوتھائی حصہ سے کم منڈوائے یا پچھنے وغیرہ کی وجہ سے اس کے سر کے چوتھائی حصہ سے کم بال ٹوٹ جائیں تو اس پر صدقہ واجب ہوگا یعنی وہ بطور جزاء یا تو کسی بھوکے کے پیٹ بھر کھانا کھلا دے یا اسے نصف صاع گیہوں دے دے۔ اگر کوئی محرم بلا عذر چوتھائی سر سے زیادہ منڈوا دے یا بلا عذر پچھنے لگوالے اور اس کی وجہ سے چوتھائی سر سے زیادہ بال ٹوٹ جائیں تو اس پر دم واجب ہوگا یعنی وہ بطور جزاء ایک بکری یا اس کی مانند کوئی جانور ذبح کرے اور اگر کوئی کسی عذر کی بناء پر چوتھائی سر سے زیادہ منڈوائے یا کسی عذر کی وجہ سے پچھنے لگوائے اور اس کی وجہ سے چوتھائی سر سے زائد بال ٹوٹ جائیں تو اسے تین چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا اختیار ہوگا کہ چاہے تو وہ ایک بکری ذبح کرے، چاہے نصف صاع فی مسکین کے حساب سے چھ مسکینوں کو تین صاع گیہوں دے اور چاہے تین روزے رکھے خواہ تین روزے مسلسل رکھ لے یا متفرق طور پر۔

اگر کوئی محرم پچھنے لگوانے کی وجہ سے محاجم یعنی پچھنوں کی جگہ سے بال منڈوائے تو اس صورت میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو اس پر دم واجب ہوگا اور صاحبین کے نزدیک صدقہ۔

"پچھنوں کی جگہ" سے گردن کے دونوں کنارے اور گدی مراد ہے؛ اس لئے اگر کوئی پوری گردن منڈوائے گا تو پھر متفقہ طور پر سب کے نزدیک اس پر دم واجب ہوگا اور اگر پوری سے کم منڈوائے گا تو صدقہ واجب ہوتا ہے! خود بخود بال ٹوٹنے سے کچھ بھی واجب نہیں ہوتا۔

⑰ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ احْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ عَلٰى ظَهْرِ الْقَدَمِ مِنْ وَجَعٍ كَانَ بِهٖ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے احرام کی حالت میں اپنے پیر کی پشت پر پچھنے لگوائے کیونکہ آپ کے درد تھا۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: پیر کی پشت پر چونکہ بال نہیں ہوتے اور وہاں پچھنے لگوانے سے بال ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے اس حدیث میں کوئی اشکال نہیں ہے اور پھر یہ کہ آپ ﷺ نے ایک عذر یعنی درد کی وجہ سے یہ پچھنے لگوائے تھے۔

حضرت میمونہؓ سے آپ ﷺ کا نکاح

⑱ وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ تَزَوَّجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَيْمُوْنَةَ وَهُوَ حَلَالٌ وَبَنٰى بِهَا وَهُوَ حَلَالٌ وَكُنْتُ اَنَا الرَّسُوْلَ بَيْنَهُمَا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جب حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تو آپ ﷺ حالت احرام میں نہیں تھے، اور جب ان کے ساتھ شب زفاف گزاری تب بھی حالت احرام میں نہیں تھے۔ نیز ان دونوں کے درمیان نکاح کا پیغام لے جانے والا میں تھا۔ (احمدؒ، ترمذیؒ) امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔"

تشریح: یہ حدیث بھی حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کے برخلاف ہے جس میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے نکاح اس وقت کیا تھا جب کہ آپ ﷺ حالت احرام میں تھے، اس بارہ میں حدیث نمبر چھ کی تشریح میں بحث کی گئی تھی، اس موقع پر بھی یہ جان لیجئے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے جب کہ اس روایت کو ان دونوں میں سے کسی نے بھی نقل نہیں کیا ہے، اس بنیاد پر یہ روایت چونکہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مرتبہ کو نہیں پہنچتی اس لئے ترجیح حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت کو حاصل ہوگی۔

بَابُ الْمُحْرِمِ يَجْتَنِبُ الصَّيْدَ

محرم کے لئے شکار کی ممانعت کا بیان

متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک شکار یا شکار میں کسی کی اعانت محرم کے لئے حرام ہے، چنانچہ کسی شکار کے جانور کو قتل کرنے یا اس کے قتل میں اعانت کرنے سے محرم پر جزاء لازم آتی ہے۔

شکار کی جزاء یا کفارہ: شکار کی وجہ سے محرم پر جو جزاء یا کفارہ لازم ہوتا ہے اس سے مراد وہ قیمت ہے جو دو عادل و تجربہ کار شخص اس شکار کی تجویز کریں اور یہ قیمت یا تو اس مقام کے اعتبار سے ہو جہاں وہ شکار مارا گیا ہے یا اگر اس مقام پر کوئی قیمت نہ ہو تو اس مقام کے اعتبار

سے ہو جو شکار کے مقام سے قریب تر ہو کیونکہ ایک چیز کی قیمت مختلف مقامات کے اعتبار سے بدل جاتی ہے، اسی طرح یہ قیمت اس زمانہ کے اعتبار سے ہو جس میں وہ شکار مارا گیا ہے کیونکہ ایک چیز کی قیمت مختلف اوقات و زمانہ میں بدل جاتی ہے، پھر اس بارہ میں محرم کو اختیار ہو گا کہ چاہے تو وہ اس مجوزہ قیمت سے قربانی کا کوئی جانور خرید کر (اگر اس قیمت میں کوئی جانور مل سکتا ہو) حرم میں ذبح کر دے اور چاہے اس قیمت سے غلہ خرید کر ہر فقیر کو، اگر گیہوں ہو تو نصف نصف صاع اور اگر جو یا کھجور ہو تو ایک ایک صاع تقسیم کر دے کسی فقیر کو اس تعداد سے کم نہ دے اور چاہے ہر فقیر کی تعداد صدقہ (یعنی نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو) کے عوض ایک ایک روزہ رکھ لے اور اس صورت میں اگر ایک فقیر کے مقدار صدقہ کا کوئی حصہ باقی بچے تو اس کو خیرات کر دے یا اس کے بدلہ بھی ایک روزہ رکھ لے۔ اس صورت میں یہ بات ملحوظ رہے کہ شکار کی جزا بہر صورت واجب ہو گی خواہ کوئی محرم قصداً شکار مارے یا سہواً اس کا مرتکب ہو جائے۔

اگر کوئی محرم کسی شکار کو زخمی کر دے اور وہ اس زخم سے مرے نہیں، یا شکار کے بال اکھاڑ ڈالے یا اس کا کوئی عضو توڑ دے تو اس شکار کی حالت صحت کی قیمت میں اس کی وجہ سے جس قدر کمی آگئی ہو وہ اس محرم کو دینا چاہئے۔

اگر کوئی محرم کسی شکار کے ہاتھ پیر کاٹ دے یا اس کے پر نوچ اکھاڑ دے کہ جس کی وجہ سے وہ اپنی حفاظت سے معذور ہو جائے تو اس شکار کی پوری قیمت دینا پڑے گی اور اس کا دودھ دوہے تو اس دودھ کی قیمت اس پر واجب ہو گی، اسی طرح اگر اس کا انڈا توڑ دے تو اس کی قیمت دینی پڑے گی۔

محرم شکار کھائے یا نہ کھائے؟ اس بارہ میں تفصیل ہے اس بات میں تو بالاتفاق تمام علماء کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی محرم خود شکار کرے یا کوئی دوسرا محرم شکار کرے تو وہ شکار کھانا محرم کے لئے حرام ہے ہاں اگر صورت یہ ہو کہ کوئی غیر محرم اپنے لئے شکار کرے یا محرم کے لئے اس کی اجازت سے یا اس کی اجازت کے بغیر شکار کرے تو اس کے کھانے کے بارہ میں علماء کے مختلف اقوال و مسلک ہیں چنانچہ بعض صحابہ و تابعین کہ جس میں حضرت علیؓ بھی ہیں کا قول تو یہ ہے کہ محرم کے لئے مطلق شکار کھانا حرام ہے، ان کی دلیل حضرت صعب ابن جثامہؓ کی روایت ہے جو اس باب کی پہلی حدیث ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر محرم خود شکار کرے یا کوئی دوسرا شخص اس کے لئے یا اس کی اجازت سے یا اس کی اجازت کے بغیر شکار کرے تو اس کے لئے اس شکار کو کھانا حرام ہے۔ ہاں اگر کوئی غیر محرم اپنے لئے شکار کرے اور اس میں سے کچھ بطور ہدیہ محرم کو بھیجے تو اس کا کھانا اس کے لئے حلال ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین علماء کا مسلک یہ ہے کہ محرم کے لئے شکار کا گوشت کھانا حلال ہے خواہ وہ شکار اس کے لئے ہی کیوں نہ کیا گیا ہو بشرطیکہ وہ شکار نہ تو اس نے خود کیا ہو، نہ اس شکار کرنے کا کسی کو حکم دیا ہو، نہ اس شکار کی راہ کسی کو دکھائی ہو، نہ اس شکار کی طرف کسی کو متوجہ کیا ہو اور نہ اس شکار میں خود اس نے یا کسی اور محرم نے اعانت کی ہو۔ حنفیہ کی دلیل حضرت ابوقتادہؓ کی روایت ہے۔

شکار سے کون جانور مراد ہیں؟ محرم کے لئے جس شکار کی ممانعت ہے اس سے مراد جنگلی شکار کو قتل کرنا ہے۔ جنگلی ان جانوروں کو کہتے ہیں جن کا توالد و تناسل خشکی یا جنگل میں ہوتا ہو گو ان کی بود و باش پانی میں ہو جیسے مرغابی وغیرہ۔ اسی طرح شکار اس جانور کو کہتے ہیں جو اصل خلقت میں وحشی ہو خواہ وہ کسی وجہ سے مانوس ہو گیا ہو جیسے ہرن کہ وہ پالنے والے سے مانوس ہو جاتا ہے مگر چونکہ وہ دراصل وحشی ہے اس لئے شکار کہلائے گا خواہ وہ جنگل میں رہتا ہو یا پلا ہوا ہو بہر صورت اس کا شکار کرنے سے جزا واجب ہو گی۔ جو جانور دراصل وحشی نہ ہو اس کا قتل کرنا حالت احرام میں بھی جائز ہے چنانچہ بکری، دنبہ، بھیڑ گائے اونٹ اور گھر کی پلی ہوئی بط کو ذبح کرنا محرم کے لئے جائز ہے۔ کبوتر کو فقہاء نے وحشی الاصل قرار دیا ہے اس لئے اس کے شکار پر جزا واجب ہوتی ہے۔ دریائی جانوروں کا شکار آیت کریمہ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ کے پیش نظر محرم اور غیر محرم دونوںؓ کے لئے حلال ہے خواہ وہ جانور کھائے جانے والے ہوں یا کھائے جانے والے نہ ہوں۔

جو جنگلی جانور کھائے جاتے ہیں ان کا شکار تو متفقہ طور پر حرام ہے، ہاں جو جانور کھائے نہیں جاتے ان کو صاحب بدائع نے دو قسمیں کی ہیں ایک قسم تو ان جانوروں کی ہے جو طبعًا ایذا پہنچاتے ہیں اور اکثر و بیشتر ایذا پہنچانے میں خود ابتداء کرتے ہیں، جیسے شیر، چیتا اور بھیڑیا چنانچہ ان جانوروں کو قتل کرنا محرم کے لئے جائز ہے اور ان کو قتل کرنے سے محرم پر جزاء واجب نہیں ہوتی، دوسری قسم ان جانوروں کی ہے جو ایذا پہنچانے میں ابتداء نہیں کرتے جیسے چرغ (شکرہ کی ایک قسم وغیرہ) ایسے جانوروں کے بارہ میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر یہ جانور محرم پر پہلے حملہ کریں تو وہ ان کو مار سکتا ہے اور اس کی وجہ سے اس پر جزاء واجب نہیں ہوگی اور اگر وہ حملہ نہ کریں تو پھر محرم کے لئے یہ مباح نہیں ہے کہ وہ ان کو مارنے میں ابتداء کرے اگر ابتداء کرے گا تو اس پر جزاء واجب ہوگی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حالت احرام میں آنحضرت ﷺ کا شکار سے اجتناب

(۱) عَنِ الصَّعْبِ بْنِ جُثَّامَةَ اَنَّهٗ اَهْدٰى لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِمَارًا وَحْشِيًّا وَهُوَ بِالْاَبْوَاءِ اَوْبِوَدَّانِ فَرَدَّ عَلَيْهِ فَلَمَّا رَاٰى مَافِيْ وَجْهِهٖ قَالَ اِنَّا لَمْ نَرُدَّهٗ عَلَيْكَ اِلَّا اَنَّا حُرُمٌ۔ (متفق علیہ)

"حضرت صعب ؓ ابن جثامہ کے بارہ میں مروی ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حمار وحشی (گورخر) بطور ہدیہ بھیجا جب کہ آپ ﷺ مقام ابواء یا ودان میں (کہ جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہیں) تشریف فرما تھے، آپ ﷺ نے اسے واپس کر دیا اور جب آپ ﷺ نے اس کی وجہ سے ان کے چہرہ پر غم (و افسوس) کے آثار محسوس کئے تو فرمایا کہ "ہم نے تمہارا ہدیہ اس لئے واپس کر دیا ہے کہ ہم احرام باندھے ہوئے ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بظاہر یہ حدیث ان حضرات کی دلیل ہے جو مطلق شکار کا گوشت کھانے کو محرم کے لئے حرام قرار دیتے ہیں اور چونکہ حنفیہ کا مسلک (جو باب کی ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے) حضرت عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت طلحہ ابن عبید اللہؓ اور حضرت عائشہؓ کے قول کے مطابق ہے اس لئے حنفیہ کے نزدیک اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ زندہ گورخر بطور شکار آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا اور چونکہ شکار قبول کرنا محرم کے لئے درست نہیں ہے اس لئے آپ ﷺ نے اسے واپس کر دیا۔ لیکن پھر ایک اشکال اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ایک روایت میں وضاحت کے ساتھ یہ منقول ہے کہ گورخر کا گوشت بھیجا گیا تھا، ایک روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گورخر کی ران بھیجی گئی تھی، اسی طرح ایک روایت یہ بتاتی ہے کہ اس کا ایک ٹکڑا بھیجا گیا تھا۔

لہٰذا ان روایتوں کے پیش نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندہ گورخر نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ یہاں حدیث میں بھی گورخر سے اس کا گوشت ہی مراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ کی خدمت میں زندہ گورخر ہی بھیجا گیا ہوگا جسے آپ ﷺ نے قبول نہیں کیا، پھر بعد میں دوسرے گورخر کی ران بھیجی گئی اسی کو کسی نے تو گوشت سے تعبیر کیا اور کسی نے اسے اس کا ٹکڑا کہا۔

اس بارہ میں حنفیہ کی بڑی دلیل یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ کی خدمت میں گورخر پیش کیا گیا جب کہ آپ ﷺ مقام عرج میں تشریف فرما تھے اور احرام باندھے ہوئے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ اسے رفقاء میں تقسیم کر دو۔ مذکورہ بالا حدیث کے بارہ میں شافعیہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے اس گورخر کو اس گمان کی بناء پر واپس کر دیا کہ بطور خاص میرے لئے شکار کیا گیا ہے۔

حنفیہ کی مستدل حدیث

(۲) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّهٗ خَرَجَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَخَلَّفَ مَعَ بَعْضِ اَصْحَابِهٖ وَهُمْ مُحْرِمُوْنَ وَهُوَ غَيْرُ مُحْرِمٍ فَرَاَوْا حِمَارًا وَحْشِيًّا قَبْلَ اَنْ يَّرَاهُ فَلَمَّا رَاَوْهُ تَرَكُوْهُ حَتّٰى رَاٰهُ اَبُوْ قَتَادَةَ فَرَكِبَ فَرَسًا لَهٗ فَسَاَلَهُمْ اَنْ يُّنَاوِلُوْهُ

سَوْطَهُ فَاَبَوْا فَتَنَاوَلَهُ فَحَمَلَ عَلَيْهِ فَعَقَرَهُ ثُمَّ اَكَلَ فَاَكَلُوْا فَنَدِمُوْا فَلَمَّا اَدْرَكُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلُوْهُ قَالَ هَلْ مَعَكُمْ مِنْهُ شَيْءٌ قَالُوْا مَعَنَا رِجْلُهُ فَاَخَذَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَكَلَهَا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لَهُمَا فَلَمَّا اَتَوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَمِنْكُمْ اَحَدٌ اَمَرَهُ اَنْ يَحْمِلَ عَلَيْهَا اَوْ اَشَارَ اِلَيْهَا قَالُوْا لَا قَالَ فَكُلُوْا مَا بَقِيَ مِنْ لَحْمِهَا۔

"اور حضرت ابوقتادہؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ وہ (واقع حدیبیہ کے موقع پر مکّہ کے لئے) رسول کریم ﷺ کے ہمراہ روانہ ہوئے تو وہ اپنے چند ساتھیوں سمیت پیچھے رہ گئے جو (عمرہ کے لئے) احرام باندھے ہوئے تھے لیکن خود ابوقتادہؓ حالت احرام میں نہیں تھے؟ چنانچہ (راستہ میں ایک جگہ) ان کے ساتھیوں نے گورخر دیکھا مگر ابوقتادہؓ کی نظر اس پر نہیں پڑی، ان کے ساتھیوں نے اس گورخر کو دیکھ کر صرف نظر کر لیا، آخر کار ابوقتادہؓ نے بھی اس گورخر کو دیکھ لیا اور (اس کو شکار کرنے کی غرض سے) گھوڑے پر سوار ہوئے اور اپنے ساتھیوں سے اپنا چابک مانگا مگر انہوں نے (اس وجہ سے کہ اس شکار میں ہماری اعانت کسی درجہ میں بھی شامل نہ ہو) چابک دینے سے انکار کر دیا ابوقتادہؓ نے (گھوڑے سے اتر کر) خود چابک اٹھایا اور گورخر پر حملہ آور ہوئے یہاں تک کہ اسے مار لیا، پھر اس (کے گوشت کو تیار کر کے) خود انہوں نے بھی کھایا اور ان کے ساتھیوں نے بھی کھایا، مگر ان کے ساتھی (اس کا گوشت کھا کر) پشیمان ہوئے (کیونکہ انہوں نے گمان کیا کہ محرم کے لئے مطلق شکار کا گوشت کھانا درست نہیں ہے) چنانچہ جب وہ لوگ آنحضرت ﷺ سے ملے تو آپ ﷺ سے (اس کا حکم) پوچھا (کہ آیا اس گورخر کا گوشت کھانا ہمارے لئے درست تھا یا نہیں؟) آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ "تمہارے پاس اس میں سے کچھ باقی ہے یا نہیں؟" انہوں نے کہا کہ "ہمارے پاس اس کا پاؤں باقی رہ گیا ہے" آپ ﷺ نے وہ پاؤں لے لیا اور (اس کو تیار کرا کر) کھایا (اس طرح آپ ﷺ نے ظاہر فرمایا کہ اس کا گوشت کھانا تمہارے لئے درست تھا) (بخاریؒ و مسلمؒ) بخاری و مسلم ہی کی ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لوگ رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے (اور انہوں نے آپ ﷺ سے اس کے بارہ میں مسئلہ دریافت کیا) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کیا تم میں سے کسی نے ابوقتادہؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ گورخر پر حملہ آور ہوں یا تم میں سے کسی نے گورخر کی طرف اشارہ کر کے اس کے شکار پر متوجہ) کیا تھا"؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر اس کے گوشت میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے کھالو"

تشریح: اس حدیث کے بارہ میں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں تو بتایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس گورخر میں سے بچا ہوا پاؤں تیار کرا کر کھایا جب کہ ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے کھایا نہیں؟ لہٰذا اس اشکال کو دور کرنے کے لئے علماء ان دونوں روایتوں میں یہ مطابقت پیدا کرتے ہیں کہ آپ ﷺ خود چونکہ حالت احرام میں تھے اس لئے ابتداء میں آپ ﷺ نے یہ گمان کیا ہوگا کہ اس گورخر کے شکار میں کسی محرم کے حکم یا اس کی اعانت کو دخل رہا ہوگا اس لئے آپ ﷺ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا ہوگا مگر جب صحیح صورت حال سامنے آگئی اور آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ اس کے شکار میں کسی محرم کے حکم یا اس کی اعانت کا کوئی دخل نہیں تھا تو آپ ﷺ نے اسے کھایا۔

محرم کے لئے جس طرح یہ ممنوع ہے کہ وہ شکار کے لئے کسی کو حکم دے اسی طرح دلالت اور اشارت بھی ممنوع ہے دلالت اور اشارت میں فرق یہ ہے کہ دلالت کا تعلق زبان سے ہوتا ہے مثلاً محرم کو کسی ہاتھ کے اشارہ سے شکار کی طرف متوجہ کرے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ دلالت کا تعلق اس شکار سے ہوتا ہے جو نظر کے سامنے نہ ہو اور اشارت کا تعلق اس شکار سے ہوتا ہے جو نظر کے سامنے ہو۔

اس موقع پر یہ بات جان لیجئے کہ محرم کے لئے تو دلالت حدود حرم میں بھی حرام ہے اور حدود حرم سے باہر بھی لیکن غیر محرم کے لئے حدود حرم میں تو حرام ہے اور حدود حرم سے باہر حرام نہیں ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ محرم کو شکار کا گوشت کھانا حلال ہے بشرطیکہ وہ شکار نہ تو خود اس نے کیا ہو اور نہ اس شکار

میں اس کی دلالت اشارت اور اعانت کا قطعاً دخل ہو، چنانچہ یہ حدیث حنفیہ کے اس مسلک کی دلیل ہے اور ان حضرات کے مسلک کی تردید کرتی ہے جو محرم کو مطلق شکار کا گوشت کھانے سے منع کرتے ہیں۔

وہ جانور جن کو حالت احرام اور حرم میں مارنا جائز ہے

③ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَمْسٌ لَا جُنَاحَ عَلٰى مَنْ قَتَلَهُنَّ فِي الْحَرَمِ وَالْإِحْرَامِ الْفَارَةُ وَالْغُرَابُ وَالْحِدَاةُ وَالْعَقْرَبُ وَالْكَلْبُ الْعَقُوْرُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، پانچ جانور ہیں جن کو حرم میں اور حالت احرام میں مارنا گناہ نہیں ہے۔ ① چوہا۔ ② کوا۔ ③ چیل۔ ④ بچھو۔ ⑤ کٹ کھنا کتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: الغراب (کوا) سے مراد الغراب الابقع (ابلق کوا) یعنی وہ سیاہ سفید کوا ہے جو اکثر مردار اور نجاسات کھاتا ہے۔ چنانچہ اگلی روایت میں اس کی وضاحت بھی ہے، اس لئے وہ کوا مارنا جائز نہیں ہے جو کھیت کھلیان کھاتا ہے اور جس کے پورے جسم کا رنگ تو سیاہ اور چونچ و پاؤں کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔

کٹ کھنے کتے کے حکم میں وہ تمام درندے جانور شامل ہیں جو حملہ آور ہوتے ہیں، ایسے تمام جانوروں کو حرم میں اور احرام کی حالت میں مارنا جائز ہے۔

④ وَعَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَمْسٌ فَوَاسِقُ يُقْتَلْنَ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ الْحَيَّةُ وَالْغُرَابُ الْاَبْقَعُ وَالْفَارَةُ وَالْكَلْبُ الْعَقُوْرُ وَالْحُدَيَّا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ایذا پہنچانے والے پانچ جانور ہیں جن کو حدود حرم سے باہر بھی اور حدود حرم میں بھی مارا جاسکتا ہے (مارنے والا خواہ احرام کی حالت میں ہو خواہ احرام سے باہر ہو۔ سانپ، ابلق کوا، چوہا، کٹ کھنا کتا، چیل۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس کتے کو مارنا حرام ہے جس سے فائدہ حاصل ہوتا ہو، اسی طرح اس کتے کو بھی مارنا حرام ہے جس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو تو اس سے کوئی ضرر و نقصان بھی نہ پہنچتا ہو۔

مذکورہ بالا دونوں حدیث میں جن جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے مارنے کی اجازت صرف انہیں پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہی حکم ان تمام جانوروں کا بھی ہے جن سے ایذاء پہنچتی ہو جیسے چیونٹی، پسو، چچڑی، اور کھٹل وغیرہ۔ ہاں اگر جوئیں ماری جائیں گے تو پھر حسب استطاعت و توفیق صدقہ دینا واجب ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

امام مالکؒ و امام شافعیؒ کی مستدل حدیث اور اس کا مطلب

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَحْمُ الصَّيْدِ لَكُمْ فِي الْاِحْرَامِ حَلَالٌ مَالَمْ تَصِيْدُوْهُ اَوْ يُصَادُ لَكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارے لئے احرام کی حالت میں شکار کا گوشت حلال ہے بشرطیکہ وہ شکار نہ تو تم نے خود کیا ہو اور نہ تمہارے لئے کیا گیا ہو۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ اگر حالت احرام میں تم خود شکار کرو گے یا کوئی دوسرا تمہارے لئے شکار کرے گا، اگرچہ وہ شکاری حالت احرام میں نہ ہو تو اس شکار کا گوشت کھانا تمہارے لئے درست نہیں ہوگا۔ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ اس حدیث کو اپنے اس مسلک کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ محرم کے لئے اس شکار کا گوشت کھانا حرام ہے جسے کسی غیر محرم نے اس کے لئے شکار کیا ہو۔

لیکن حنفیہ اس حدیث کے یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ اگر حالت احرام میں زندہ شکار تمہارے لئے بطور تحفہ بھیجا جائے تو اس کا گوشت کھانا تمہارے لئے حرام ہوگا۔ ہاں اگر اس شکار کا گوشت تحفہ کے طور پر تمہارے پاس بھیجا جائے اس کا کھانا حرام نہیں ہوگا۔ گویا اس صورت میں حدیث کا حاصل یہ ہوگا کہ اگر تمہارے حکم کی بناء پر کوئی شکار کیا جائے گا تو اس کا کھانا تمہارے لئے درست نہیں ہوگا لہٰذا اس شکار کا گوشت محرم کے لئے حرام نہیں ہے جسے کوئی غیر محرم اس کے لئے ذبح کرے بشرطیکہ اس شکار میں محرم کے حکم یا اس کی اعانت اور اشارت و دلالت کا کوئی دخل نہ ہو۔

ٹڈی کے شکار کا مسئلہ

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْجَرَادُ مِنْ صَيْدِ الْبَحْرِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ٹڈی دریا کے شکار کی مانند ہے"۔ (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: حنفی علماء کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ٹڈی کو دریا کے شکار کی مانند صرف اس اعتبار سے فرمایا ہے، کہ ٹڈی دریائی شکار یعنی مچھلی کے مشابہ ہے کہ جس طرح مچھلی بغیر ذبح کئے ہوئے کھائی جاتی ہے اسی طرح ٹڈی کو بھی بغیر ذبح کئے کھانا درست ہے، چنانچہ محرم کے لئے ٹڈی مارنا جائز نہیں ہے اگر کوئی محرم ٹڈی مارے گا تو اس پر صدقہ (جتنا بھی وہ دے سکے گا) لازم ہوگا۔ نیز ہدایہ میں بھی یہ لکھا ہے کہ ٹڈی جنگل کے شکار کے حکم میں ہے اور ابن ہمامؒ کے قول کے مطابق اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے لئے ٹڈی کا شکار یعنی ٹڈی پکڑنا جائز ہے کیونکہ یہ دریائی شکار کی مانند ہے اور اس آیت کریمہ: وَاُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ مَادُمْتُمْ حُرُمًا اور احرام کی حالت میں تمہارے لئے دریائی شکار حلال رکھا گیا ہے کے پیش نظر محرم کے لئے دریا کا شکار جائز ہے۔

حملہ آور درندے کو مار ڈالنے کا حکم

(۷) وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقْتُلُ الْمُحْرِمُ السَّبُعَ الْعَادِيَ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "محرم حملہ کرنے والے درندے کو مار ڈالے۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "حملہ کرنے والے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ جان لینے یا زخمی کرنے کے لئے چڑھ دوڑے جیسے شیر، بھیڑیا اور چیتا وغیرہ کہ یہ درندے انسان کو دیکھتے ہی اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

چرغ کے شکار کا مسئلہ

(۸) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ عَمَّارٍ قَالَ سَاَلْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ الضَّبُعِ اَصَيْدٌ هِيَ فَقَالَ نَعَمْ فَقُلْتُ اَيُؤْكَلُ فَقَالَ نَعَمْ فَقُلْتُ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَالشَّافِعِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت عبد الرحمٰن ابن ابو عمار (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر ابن عبد اللہؓ سے چرغ کے بارہ میں پوچھا کہ کیا وہ شکار ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں! میں نے پھر پوچھا کہ کیا اس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں؟ میں نے کہا کہ کیا آپ نے یہ رسول کریم ﷺ سے سنا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں (ترمذیؒ، نسائیؒ، شافعیؒ)۔ نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: سائل کا مطلب یہ تھا کہ چرغ شکار ہے کہ محرم کے لئے اس کا کھانا حرام ہو یا یہ کہ شکار نہیں ہے۔ بہرکیف اس موقع پر محرم سے قطع نظر چرغ کے بارہ میں بنیادی اختلاف تو یہ ہے کہ چرغ کا گوشت ویسے بھی حلال ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ تو اس حدیث کے پیش نظر یہ فرماتے ہیں کہ چرغ حلال جانور ہے اس کا گوشت کھانا درست ہے جب کہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلال جانور نہیں ہے اس لئے اس کا گوشت کسی کو بھی کھانا درست نہیں ہے، ان کی دلیل حضرت خزیمہ ابن جزیؓ کی روایت ہے جو آگے آرہی ہے۔

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الضَّبُعِ قَالَ هُوَ صَيْدٌ وَيَجْعَلُ فِيْهِ كَبْشًا اِذَا اَصَابَهُ الْمُحْرِمُ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے چرغ کے بارہ میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ شکار ہے اگر کوئی محرم اس کا مرتکب ہوجائے تو اس کے بدلہ میں دنبہ یا مینڈھا دے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے احرام کی حالت میں چرغ کا شکار کیا اسے خریدا تو اس کی جزاء کے طور پر ایک دنبہ یا ایک مینڈھا واجب ہوگا۔

چرغ حلال نہیں ہے

⑩ وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ جَزِيٍّ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الضَّبُعِ قَالَ اَوَيَأْكُلُ الضَّبُعَ اَحَدٌ وَسَأَلْتُهُ عَنْ اَكْلِ الذِّئْبِ قَالَ اَوَيَأْكُلُ الذِّئْبَ اَحَدٌ فِيْهِ خَيْرٌ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ لَيْسَ اِسْنَادُهُ بِالْقَوِيِّ۔

"اور حضرت خزیمہ ابن جزیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے چرغ کا گوشت کھانے کے بارہ میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کہیں کوئی اس کا گوشت بھی کھاتا ہے؟ (یعنی اس کا گوشت نہ کھانا چاہئے) پھر میں نے بھیڑیئے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا "کیا کوئی ایسا شخص جس میں بھلائی (یعنی ایمان یا تقویٰ) ہو بھیڑئے کا گوشت بھی کھاتا ہے؟" اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔"

تشریح: جیسا کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ روایت اگرچہ باعتبار سند کے ضعیف ہے لیکن بذات خود یہ حدیث بالکل صحیح ہے جس کی دلیل ابن ماجہ کی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ وَمَنْ يَأْكُلُ الضَّبُعَ نیز اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہر ذی ناب (کونچلی والا) درندہ کھانے سے منع کیا ہے (ذی ناب درندہ اس درندہ کو کہتے ہیں جو دانت سے شکار کرتا ہے) اور چرغ ذی ناب درندہ ہے، بہرکیف چونکہ چرغ کے مباح اور حرام ہونے کی دلیلوں میں تعارض ہے اس لئے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے کہ اس کا گوشت نہ کھانا چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

محرم کو شکار کا گوشت کھانا جائز ہے

⑪ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عُثْمَانَ التَّيْمِيِّ قَالَ كُنَّا مَعَ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ وَنَحْنُ حُرُمٌ فَاُهْدِيَ لَهٗ طَيْرٌ وَطَلْحَةُ رَاقِدٌ

فَمِنَّا مَنْ اَکَلَ وَمِنَّا مَنْ تَوَرَّعَ فَلَمَّا اسْتَیْقَظَ طَلْحَۃُ وَافَقَ مَنْ اَکَلَہٗ قَالَ فَاَکَلْنَاہُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔
(رواہ مسلم)

"حضرت عبدالرحمٰن ابن عثمان تیمیؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) ہم حضرت طلحہ ابن عبید اللہؓ کے ساتھ تھے اور ہم سب احرام کی حالت میں تھے کہ ان کے پاس بطور ہدیہ ایک پرندہ کا (پکا ہوا گوشت) آیا حضرت طلحہؓ اس وقت سو رہے تھے چنانچہ ہم میں سے بعض نے وہ گوشت کھالیا (کیونکہ وہ جانتے تھے کہ محرم کو شکار کا گوشت کھانا جائز ہے بشرطیکہ اس شکار میں اس کے حکم وغیرہ کو کوئی دخل نہ ہو) اور بعض نے اس سے پرہیز کیا (کیونکہ ان کا گمان تھا کہ محرم کو یہ گوشت کھانا درست نہیں ہے) پھر حضرت طلحہؓ جب بیدار ہوئے تو انہوں نے ان لوگوں کی موافقت کی جنہوں نے وہ گوشت کھایا تھا، نیز انہوں نے فرمایا کہ ہم نے رسول کریم ﷺ کے ہمراہ اسی طرح (یعنی حالت احرام میں شکار کا گوشت) کھایا تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: گوشت کھانے والوں سے حضرت طلحہؓ کی موافقت کا تعلق قول سے بھی ہو سکتا ہے اور فعل سے بھی، یعنی یا تو حضرت طلحہؓ نے ان سے زبانی یہ کہا ہوگا کہ تم نے گوشت کھالیا، اچھا کیا، اس میں کوئی حرج نہیں یہ قولی موافقت ہے، یا پھر یہ کہ خود انہوں نے بھی باقی بچا ہوا گوشت کھایا ہوگا یہ فعلی موافقت ہے۔ بہر کیف یہ حدیث حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اس مسلک کی تائید کرتی ہے کہ اگر محرم خود شکار نہ کرے اور نہ اس شکار میں اس کے حکم وغیرہ کا دخل ہو تو وہ اس کا گوشت کھا سکتا ہے۔

"ایک پرندہ" سے مراد یا تو جنس ہے کہ کئی پرندوں کا گوشت آیا تھا، یا پھر وہ ایک ہی پرندہ تھا جو اتنا بڑا تھا کہ اس کا گوشت تمام لوگوں کے لئے کافی ہو گیا۔

بَابُ الْاِحْصَارِ وَفَوْتِ الْحَجِّ

احصار اور حج کے فوت ہو جانے کا بیان

احصار کے معنی: احصار کے معنی لغت کے اعتبار سے تو "روک لیا جانا" ہیں اور اصطلاح فقہ میں "احرام باندھ لینے کے بعد حج یا عمرہ سے روکا جانا" احصار کہلاتا ہے۔

جس شخص پر ایسا واقعہ پیش آجائے یعنی جس شخص نے احرام باندھا اور پھر جس کام کے واسطے (یعنی حج یا عمرہ کے لئے) احرام باندھا تھا اس کے ادا کرنے سے وہ روکا گیا تو اس کو "محصر" کہتے ہیں۔

احصار کی صورتیں: حنفی مسلک کے مطابق احصار کی کئی صورتیں ہیں جو اس چیز کی ادائیگی سے کہ جس کا احرام باندھا ہے (یعنی حج یا عمرہ) حقیقۃً یا شرعاً مانع ہو جاتی ہیں، ان صورتوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

① کسی دشمن کا خوف ہو دشمن سے مراد عام ہے خواہ کوئی آدمی ہو یا درندہ جانور۔ مثلاً یہ معلوم ہو کہ راستہ میں کوئی دشمن بیٹھا ہے جو حجاج کو ستاتا ہے یا لوٹتا ہے یا مارتا ہے آگے نہیں جانے دیتا، یا ایسے ہی کسی جگہ شیر وغیرہ کی موجودگی کا علم ہو۔

② بیماری! احرام باندھنے کے بعد ایسا بیمار ہو جائے کہ اس کی وجہ سے آگے نہ جا سکتا ہو یا آگے جا تو سکتا ہے مگر مرض بڑھ جانے کا خوف ہو۔

③ عورت کا محرم نہ رہے! احرام باندھنے کے بعد عورت کا محرم یا اس کا خاوند مر جائے، یا کہیں چلا جائے یا آگے جانے سے انکار کر دے۔

④ خرچ کم ہو جائے! مثلاً احرام باندھنے کے بعد مال و اسباب چوری ہو جائے، یا پہلے ہی سے خرچ کم لے کر چلا ہو اور اب آگے کی

ضروریات کے لئے روپیہ پیسہ نہ رہے۔

⑤ عورت کے لئے عدت! احرام باندھنے کے بعد عورت کا شوہر مرجائے یا طلاق دے دے جس کی وجہ سے وہ پابند عدت ہو جائے تو یہ احصار ہو جائے گا۔ ہاں اگر وہ عورت اس وقت مقیم ہے اور اس کے جاء قیام سے مکہ بقدر مسافت سفر نہیں ہے تو احصار نہیں سمجھا جائے گا۔

⑥ راستہ بھول جائے اور کوئی راہ بتانے والا نہ مل سکے۔

⑦ عورت کو اس کا شوہر منع کر دے! بشرطیکہ اس نے حج کا احرام اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر باندھا ہو، حج فرض کے روکنے کا اور حج نفل میں اجازت دینے کے بعد روکنے کا اختیار شوہر کو نہیں ہے۔

⑧ لونڈی یا غلام کو اس کا مالک منع کر دے۔

احصار کی یہ تمام صورتیں حنفیہ کے مسلک کے مطابق ہیں، بقیہ تینوں ائمہ کے ہاں احصار کی صرف ایک ہی صورت یعنی دشمن کا خوف ہے۔ چنانچہ ان حضرات کے نزدیک دیگر صورتوں میں احصار درست نہیں ہوتا بلکہ احرام کی حالت برقرار رہتی ہے۔

احصار کا حکم: جس محرم کو احصار کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت پیش آجائے تو اسے چاہئے کہ وہ اگر مفرد ہو تو ایک ہدی کا جانور (مثلاً ایک بکری) اور اگر قارن ہو تو دو ہدی کے جانور (مثلاً دو بکری) کسی شخص کے ذریعہ حرم میں بھیج دے تاکہ وہ اس کی طرف سے وہاں ذبح ہو۔ یا قیمت بھیج دے کہ وہاں ہدی کا جانور خرید کر ذبح کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ذبح کا دن اور وقت بھی متعین کر دے یعنی جس شخص کے ذریعہ جانور حرم بھیج رہا ہو اس کو یہ تاکید کرے کہ یہ جانور وہاں فلاں دن اور فلاں وقت ذبح کیا جائے پھر وہ اس متعین دن اور وقت کے بعد احرام کھول دے، سر منڈانے یا بال کتروانے کی ضرورت نہیں! اور پھر آئندہ سال اس کی قضا کرے بایں طور کہ اگر اس نے احصار کی وجہ سے حج کا احرام اتارا ہے تو اس کے بدلہ ایک حج اور ایک عمرہ کرے اور اگر قران کا احرام اتارا ہے تو اس کے بدلہ ایک حج اور دو عمرے کرے جب کہ عمرہ کا احرام اتارنے کی صورت میں صرف ایک عمرہ کیا جائے گا۔

اگر ہدی کا جانور بھیجنے کے بعد احصار جاتا رہے اور یہ ممکن ہو کہ اگر محصر روانہ ہو جائے تو قربانی کے ذبح ہونے سے پہلے پہنچ جائے گا اور حج بھی مل جائے گا تو اس پر واجب ہوگا کہ وہ فوراً روانہ ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس پر فوراً جانا واجب نہیں ہوگا۔ تاہم اگر وہ حج کو روانہ ہو جائے اور وہاں اس وقت پہنچے جب کہ ہدی کا جانور بھی ذبح ہو چکا ہو اور حج کا وقت بھی گذر چکا ہو تو اس صورت میں وہ عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے۔

حج فوت ہو جانے کا مطلب اور اس کا حکم: حج فوت ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص حج کے لئے گیا، اس نے احرام بھی باندھ لیا تھا مگر کوئی ایسی بات پیش آگئی کہ وہ عرفہ کے دن زوال آفتاب کے بعد سے بقرعید کی صبح تک کے عرصہ میں ایک منٹ کے لئے بھی وقوف عرفات نہ کر سکا، (یاد رہے کہ وقوف عرفات کا وقت عرفہ کے دن زوال آفتاب کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اور بقرعید کی فجر طلوع ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے اس عرصہ میں وقوف عرفات فرض ہے۔ خواہ ایک ہی منٹ کے لئے کیوں نہ ہو تو اس صورت میں حج فوت ہو جائے گا اور جس شخص کا حج فوت ہو جاتا ہے اسے فائت الحج کہتے ہیں۔

جس شخص کا حج فوت ہو جائے اس کو چاہئے کہ عمرہ کر کے یعنی خانہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے بعد احرام کھول دے، اگر مفرد ہو تو ایک عمرہ کرے اور اگر قارن ہو تو دو عمرے کرے اور اس کے بعد سر منڈوا دے یا بال اتروا دے اور پھر سال آئندہ میں اس حج کی قضا کرے۔

حج فوت ہو جانے کے سلسلہ کا ایک پیچیدہ مسئلہ: جس شخص کا حج فوت ہو رہا ہو اس کے بارہ میں ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وہاں بقرعید کی رات کے بالکل آخری حصہ میں اس حال میں پہنچے کہ اس نے ابھی تک عشاء کی نماز نہ پڑھی ہو اور اسے اس

بات کا خوف ہو کہ اگر عرفات جاتا ہوں تو عشاء کی نماز جاتی رہے اور اگر عشاء کی نماز میں مشغول ہوتا ہوں تو وقوف عرفات ہاتھ نہیں لگے گا، اس صورت میں وہ کیا کرے؟ اس کے متعلق بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ اسے عشاء کی نماز میں مشغول ہو جانا چاہئے اگرچہ وقوف عرفات فوت ہو جائے، جب کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ عشاء کی نماز چھوڑ دے اور عرفات چلا جائے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی کتاب درمختار میں بھی یہی لکھا ہے کہ اگر عشاء کا وقت بھی تنگ ہو اور وقوفِ عرفات بھی نکلا جا رہا ہو تو اس صورت میں نماز چھوڑ کر عرفات چلے جانا چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کے احصار کا بیان

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدْ اُحْصِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَلَقَ رَأْسَهٗ وَ جَامَعَ نِسَاءَهٗ وَ نَحَرَ هَدْيَهٗ حَتّٰى اعْتَمَرَ عَامًا قَابِلًا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (واقعہ حدیبیہ کے سال) رسول کریم ﷺ کو (عمرہ سے) روکا گیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنا سر منڈوایا اور (احرام کھولنے کے بعد) اپنی ازواج مطہرات سے ہم بستر ہوئے اور اپنی ہدی کا جانور ذبح کیا، پھر اگلے سال آپ ﷺ نے اپنا عمرہ ادا کیا۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: "روکا گیا" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ عمرہ کا احرام باندھ کر مکّہ کو روانہ ہوئے مگر حدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو مع رفقاء کے مکّہ میں داخل ہونے سے روک دیا جس کی وجہ سے آپ ﷺ عمرہ نہ کر سکے چنانچہ آپ ﷺ نے وہاں احرام کھول دیا۔

وَجَامَعَ نِسَائَهٗ میں حرف "واؤ" مطلقاً اظہار جمع کے لئے استعمال کیا گیا ہے، یعنی سر منڈانا وغیرہ یہاں ترتیب کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ اصل ترتیب کے مطابق آپ ﷺ نے نحر کے بعد احرام کھولا اور اس کے بعد اپنی ازواج سے ہمبستر ہوئے چنانچہ بخاریؒ و مسلمؒ کی ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء نے حدیبیہ میں احرام کھولا جب کہ ان کو مشرکین مکّہ نے (مکہ جانے سے) روکا، چنانچہ آنحضرت ﷺ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے نحر کیا یعنی ہدی کا جانور ذبح کیا، پھر سر منڈایا اور پھر اپنے رفقاء سے فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ اور نحر کرو اور پھر سر منڈاؤ۔" ہدایہ نے اس کے بعد یہ نقل کیا ہے کہ "پھر (سر منڈانے کے بعد) انہوں نے احرام کھول دیا۔"

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ ہدایہ کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ محصر ہدی کا جانور ذبح ہونے سے پہلے احرام نہیں کھولتا اسی لئے یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی محصر نے ہدی کا جانور حرم روانہ کیا اور اس جانور کو لے جانے والے سے یہ تاکید کی کہ اس جانور کو فلاں دن اور فلاں وقت ذبح کر دینا اور پھر اس نے اس متعین دن میں یہ سمجھ کر کہ اب جانور ذبح ہو گیا ہوگا اپنے کو احرام سے باہر سمجھ لیا اور کوئی ایسا فعل کیا جو حالت احرام میں ممنوع ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ہدی کا وہ جانور اس متعین دن ذبح نہیں ہوا تھا یا ذبح تو اسی دن ہوا تھا مگر حرم میں ذبح ہونے کی بجائے حرم سے باہر ذبح ہو گیا تھا تو اس صورت میں اس نے خلاف احرام جس قدر فعل کئے ہوں گے ہر فعل کے عوض جزاء دینی پڑے گی۔

احصار کی ہدی کہاں ذبح کی جائے؟: احصار کی ہدی کے علاوہ باقی ہدایا کے بارہ میں تو حنفیہ اور شوافع کا اتفاق ہے کہ وہ حرم کے علاوہ اور کہیں ذبح نہ کی جائیں مگر حج یا عمرہ کے احصار کی ہدی کہاں ذبح کی جائے؟ اس بارہ میں دونوں کے اختلافی اقوال ہیں۔ حضرت امام

شافعیؒ فرماتے ہیں کہ احصار کی ہدی اسی جگہ ذبح کی جائے جہاں احصار کی صورت پیش آئی ہو جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ احصار کی ہدی حرم میں بھیجی جائے اور وہاں ذبح ہو، حرم کے علاوہ اور کہیں ذبح نہ کی جائے، کیونکہ خاص دنوں میں اور خاص موقع پر ہدی کا ذبح ہونا عبادت ہے۔ اور جب یہ بات ہے کہ ایک خاص وقت اور خاص جگہ ہدی کا ذبح کرنا عبادت شمار کیا جاتا ہے تو اگر اس کے خلاف کیا گیا یعنی اس ہدی کو ذبح کرنے کی جو خاص جگہ (یعنی حرم) ہے اگر وہاں یہ ہدی ذبح نہ کی گئی تو عبادت کہاں رہی اور جب عبادت نہ رہی تو اس کی وجہ سے حلال ہونا (یعنی احرام کھولنا) کس طرح درست ہوگا۔"

حضرت امام شافعیؒ کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے اپنی ہدی حدیبیہ میں ذبح کی جو حل میں یعنی حرم سے باہر ہے۔ اس کا جواب حنفیہ کی جانب سے یہ دیا جاتا ہے کہ اس موقع پر ہدی کے جانوروں کا حرم میں پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا اس مجبوری کی بناء پر آپ ﷺ نے اور صحابہؓ نے اپنی ہدی وہیں ذبح کر دی۔ نیز بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ تو حل میں ہے اور کچھ حصہ حرم میں ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ نے ہدی کے جانور حدیبیہ کے اس حصہ میں ذبح کئے ہوں جو حرم میں شامل ہے۔

محصر پر قضا واجب ہے: جیسا کہ حدیث بالا سے معلوم ہوا آنحضرت ﷺ جب احصار کی وجہ سے عمرہ ادا نہ کر سکے تو آپ ﷺ نے آئندہ سال یعنی ۷ھ میں اس عمرہ کو پورا کیا چنانچہ اس عمرہ کو عمرۃ القضاء کہا گیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر کوئی محصر ہو جائے یعنی اسے حج یا عمرہ سے روک دیا جائے تو وہ اس کی قضاء کرے اسی لئے حنفیہ کے مسلک میں اس کی قضا واجب ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے ہاں محصر پر اس کی قضا واجب نہیں ہوتی آنحضرت ﷺ نے ۷ھ میں جو عمرہ کیا، اس کا نام "عمرۃ القضا" ہونا حنفیہ کے مسلک کی تائید کرتا ہے۔

محصر کے لئے حلق یا تقصیر کا مسئلہ

(۲) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَالَ كُفَّارُ قُرَيْشٍ دُوْنَ الْبَيْتِ فَنَحَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَدَايَاهُ وَحَلَقَ وَقَصَّرَ اَصْحَابُهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے ہمراہ (عمرے کے لئے) گئے تو کفار قریش نے (ہمیں) خانہ کعبہ (پہنچنے) سے پہلے (حدیبیہ میں) روک دیا چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی ہدی کے جانور (وہیں) ذبح کئے اور سر منڈوایا، نیز آپ ﷺ کے رفقاء (میں سے کچھ) نے بال کتروائے (اور کچھ نے سر منڈوائے۔" (بخاری)

تشریح: فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ میں لکھا ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ تو یہ کہتے ہیں کہ محصر کے لئے سر منڈوانا یا بال کتروانا ضروری نہیں ہے کیونکہ حلق (سر منڈوانا) تقصیر (بال کتروانا) اسی صورت میں عبادت شمار کیا جاتا ہے جب کہ افعال حج کی ترتیب میں ہو لہٰذا جب حج کے افعال ادا ہی نہ ہوں تو ان کو عبادت شمار نہیں کر سکتے جہاں تک آنحضرت ﷺ کا تعلق ہے تو آپ ﷺ نے اور صحابہؓ نے حلق یا تقصیر اس مقصد سے کیا تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بس اب واپسی کا پختہ ارادہ ہو گیا ہے اور عمرہ کی ادائیگی کی صورت نہیں رہی ہے حضرت امام یوسفؒ کے نزدیک محصر کو اگرچہ سر منڈوانا یا کتروانا چاہئے لیکن اگر وہ سر نہ منڈوائے یا بال نہ کتروائے تو اس صورت میں بھی احرام سے باہر ہو جائے گا اور بطور جزاء اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔

(۳) وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحَرَ قَبْلَ اَنْ يَّحْلِقَ وَ اَمَرَ اَصْحَابَهٗ بِذٰلِكَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت مسور ابن مخرمہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنا سر منڈوانے سے پہلے ہدی کا جانور ذبح کیا، نیز آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ

کو بھی اس بات کا حکم دیا (کہ وہ سر منڈوانے سے پہلے اپنی ہدی کے جانور ذبح کریں۔" (بخاریؒ)

احصار اور حج فوت ہو جانے کا مسئلہ

④ وعن ابنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ اَلَیْسَ حَسْبُکُمْ سُنَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنْ حُبِسَ اَحَدُکُمْ عَنِ الْحَجِّ طَافَ بِالْبَیْتِ وَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ ثُمَّ حَلَّ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ حَتّٰی یَحُجَّ عَامًا قَابِلًا فَیُهْدِیَ اَوْیَصُوْمَ اِنْ لَمْ یَجِدْ هَدْیًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "کیا تمہارے لئے رسول کریم ﷺ کی یہ سنت، یعنی آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی) کافی نہیں ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص حج سے روکا جائے (یعنی اس کو کوئی ایسا عذر پیش آجائے جو حج کے رکن اعظم یعنی وقوف عرفات سے مانع ہو اور طواف وسعی سے مانع نہ ہو) تو وہ بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کر کے ہر چیز سے حلال ہو جائے یعنی اس کے بعد اس کے لئے ہر وہ چیز حلال ہو جائے گی جو احرام کی حالت میں ممنوع تھی) تا آنکہ وہ اگلے سال حج کرے اور ہدی ذبح کرے اور اگر وہ ہدی ذبح نہ کر سکتا ہو تو روزہ رکھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں احصار کا حکم بیان کیا گیا ہے! کچھ لوگوں نے اس بارہ میں خلاف سُنّت طرز عمل اختیار کیا ہو گا، اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے انہیں متنبہ فرمایا اور کہا کہ اس بارہ میں آنحضرت ﷺ کی سُنّت یہ ہے کہ اگر کسی کو حج میں حصر و حبس کی صورت پیش آجائے تو وہ عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے اور سال آئندہ اس حج کی قضا کرے۔

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ "فائت الحج" اور "محصر" کے حکم میں تھوڑا سا فرق ہے "فائت الحج" کے لئے تو یہ حکم ہے کہ اگر وہ مفرد ہو (یعنی اس نے صرف حج کا احرام باندھا ہو) تو طواف وسعی کر کے احرام کھول دے اس پر صرف سال آئندہ اس حج کی قضا واجب ہے، عمرہ اور ہدی اس کے لئے واجب نہیں ہے۔

محصر کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر وہ مفرد ہو اور اسے حرم پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں احصار کی کوئی صورت پیش آجائے تو وہ پہلے ہدی کا جانور حرم بھیجے جب وہ جانور حرم میں پہنچ کر ذبح ہو جائے تو وہ احرام کھول دے اور آئندہ سال اس حج کی قضا کرے اور اس کے ساتھ ہی ایک عمرہ بھی کرے

لیکن حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس پر سال آئندہ صرف حج کرنا ہی واجب ہو گا عمرہ کرنا ضروری نہیں ہو گا، کیونکہ وہ صرف حج سے محصر ہوا ہے اور چونکہ ہدی کا جانور بھیج کر اس نے احرام کھولا تھا تو بس اس کے بدلہ اس کے ذمہ صرف حج ہی ہے عمرہ نہیں ہے۔

اور اگر محصر قارن ہو (یعنی اس نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا ہو) تو وہ بھی ہدی کا جانور حرم میں بھیجے اور وہاں اس جانور کے ذبح ہو جانے کے بعد احرام کھول دے، لیکن سال آئندہ اس پر اس حج کی قضا اور اس کے ساتھ دو عمرے واجب ہوں گے، اس پر ایک حج اور دو عمرے واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایک حج اور عمرہ تو اصلی حج و عمرہ کے بدلہ ادا کرنا ہو گا، اور دوسرا عمرہ اس واسطے کہ اس سے حج اور عمرہ فوت ہوا اس لئے اس کی جزاء کے طور پر ایک عمرہ ادا کرنا ہو گا۔

اور اگر احصار کی صورت حرم پہنچنے سے پہلے راستہ میں پیش نہ آئے بلکہ حرم پہنچ کر پیش آئے کہ وہ کسی عذر کی وجہ سے وقوف عرفات سے تو عاجز رہے مگر طواف اور سعی کر سکتا ہو تو وہ طواف وسعی کرنے کے بعد یعنی عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے اور پھر آئندہ سال اس حج کی قضا کرے اور ہدی کا جانور ذبح کرے اور اگر ہدی کا جانور ذبح نہ کر سکتا ہو تو روزہ رکھے، مذکورہ حدیث میں یہی صورت بیان فرمائی گئی ہے۔

"فائت الحج" اگر قارن ہو تو پہلے وہ عمرہ کے لئے طواف وسعی کرے پھر حج فوت ہو جانے کے بدلہ میں طواف وسعی کرے اس کے بعد سر منڈوائے یا بال کتروائے اور احرام کھول دے اس کے ذمہ سے قران کی قربانی ساقط ہو جائے گی۔ اور اگر وہ متمتع ہو گا تو اس کا تمتع

باطل ہو جائے گا اور اس کے ذمہ سے تمتع کی قربانی بھی ساقط ہو جائے گی اگر وہ اس کی قربانی کا جانور اپنے ساتھ لایا ہو تو اس کو جو چاہے کرے۔

جس طرح مفرد کا حج فوت ہو جانے کی صورت میں اس پر آئندہ سال صرف حج کی قضا ہی واجب ہوتی ہے اسی طرح قران اور تمتع کی صورت میں بھی اس پر آئندہ سال صرف حج کی قضا واجب ہوگی۔

عمرہ فوت نہیں ہوا کرتا: اس موقع پر یہ بات بھی جان لیجیئے کہ عمرہ فوت نہیں ہوا کرتا کیونکہ وہ تو سال میں کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے علاوہ یوم عرفہ، یوم عید الاضحی اور ایام تشریق کے، جب کہ حج کی ادائیگی تو اسی خاص زمانہ اور خاص وقت میں ہو سکتی ہے جو شریعت نے متعین کی ہے۔

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى ضُبَاعَةَ بِنْتِ الزُّبَيْرِ فَقَالَ لَهَا لَعَلَّكِ اَرَدْتِ الْحَجَّ وَاللّٰهِ مَا اَجِدُنِیْ اِلَّا وَجِعَةً فَقَالَ لَهَا حُجِّیْ وَاشْتَرِطِیْ وَقُوْلِیْ اَللّٰهُمَّ مَحِلِّیْ حَیْثُ حَبَسْتَنِیْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (جب حج کے لئے روانہ ہونے والے تھے تو اپنی چچازاد بہن) ضباعہؓ بنت زبیر کے ہاں تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا کہ شاید تم (ہمارے ساتھ) حج کا ارادہ رکھتی ہو؟ (اور ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ تم ہمارے ساتھ حج کے لئے چلو) ضباعہؓ نے عرض کیا کہ (جی ہاں، میرا ارادہ تو ہے) لیکن خدا کی قسم! میں اپنے کو بیمار پاتی ہوں (یعنی مرض کی بناء پر میں بڑا ضعف محسوس کر رہی ہوں اگر میں چلتی ہوں تو نہیں جانتی کہ حج پورا بھی کر سکوں گی یا نہیں؟) آنحضرت ﷺ (نے یہ سن کر) فرمایا کہ "تم حج (کا ارادہ) کر لو، اور (جب احرام باندھو تو یہ) شرط کر لو یعنی یہ کہو کہ: اَللّٰهُمَّ مَحِلِّیْ حَیْثُ حَبَسْتَنِیْ "اے اللہ! میرے احرام سے نکلنے کی جگہ وہ ہے جہاں میں (بیماری کے سبب) روک دی جاؤں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "میرے احرام سے نکلنے کی جگہ وہ ہے جہاں میں روک دی جاؤں" کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ مجھ پر مرض غالب ہو جائے اور وہاں سے میں خانہ کعبہ کی طرف آگے نہ چل سکوں اسی جگہ میں احرام کھول دوں گی۔

جن ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ احصار کی صرف ایک ہی صورت یعنی دشمن کا خوف ہے اور بیماری سے احصار نہیں ہوتا، ان کی دلیل یہی حدیث ہے کہ اگر مرض کی وجہ سے احرام کھول دینا مباح ہوتا تو آنحضرت ﷺ حضرت ضباعہؓ کو مذکورہ بالا شرط کرنے کا حکم نہ دیتے کیونکہ جب مرض کی وجہ سے احصار ہو ہی جاتا تو پھر شرط کا کیا فائدہ حاصل ہوتا۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک چونکہ یہ ہے کہ احصار مرض کی وجہ سے بھی ہو جاتا ہے اس لئے وہ حضرت حجاج ابن عمرؓ و انصاری کی حدیث کو اپنی دلیل قرار دیتے ہیں جو آگے آرہی ہے، نیز ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ شرط کے منکر تھے، جو لوگ شرط کے قائل تھے ان سے حضرت ابن عمرؓ یہی فرماتے تھے کہ کیا تمہارے لئے آنحضرت ﷺ کی سُنّت کافی نہیں ہے؟ یعنی جب اس بارہ میں آنحضرت ﷺ کا واضح حکم موجود ہے تو پھر شرط کو اختیار کرنے کا کیا معنی۔ اب رہی یہ بات کہ جب مرض کی وجہ سے احرام کھول دینا مباح تھا تو پھر حضرت ضباعہؓ کو شرط کا حکم دینا کس مقصد سے تھا اور اس کا کیا فائدہ تھا؟ حنفیہ کہتے ہیں کہ ضباعہؓ کے حق میں شرط کا فائدہ یہ تھا کہ وہ احرام کی پابندیوں سے جلد آزاد ہو جائیں، اس لئے کہ وہ اگر یہ شرط نہ کرتیں تو انہیں احرام سے نکلنے میں دیر لگتی بایں طور کہ جب ان کی ہدی کا جانور حرم پہنچ کر ذبح ہو جاتا تب ہی وہ احرام کھول سکتی تھیں، چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ محرم کے لئے احرام کھولنا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک کہ اس کی ہدی حرم میں ذبح نہ ہو جائے۔ ہاں اگر وہ احرام باندھتے وقت یہ شرط کر لے کہ جس جگہ بھی مجھے احصار کی صورت پیش آجائے گی میں وہیں احرام کھول دوں گا تو وہ محض احصار کی صورت پیش آجانے پر، ہدی کا جانور ذبح ہوئے بغیر احرام سے باہر ہو سکتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

محصر کی ہدی کا جانور، حرم ہی میں ذبح ہونا چاہئے

(۶) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَ اَصْحَابَہٗ اَنْ یُبَدِّلُوا الْھَدْیَ الَّذِیْ نَحَرُوْا عَامَ الْحُدَیْبِیَۃِ فِیْ عُمْرَۃِ الْقَضَاءِ۔ رَوَاہُ۔

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو یہ حکم دیا کہ عمرۃ القضاء کے موقع پر اپنی ہدی کے ان جانوروں کے عوض جانور ذبح کریں جو انہوں نے واقعہ حدیبیہ کے سال ذبح کئے تھے۔"

تشریح: اس حکم گرامی کا مطلب یہ تھا کہ صحابہؓ نے واقعہ حدیبیہ کے موقعہ پر عمرہ سے احصار کی صورت پیش آجانے کی وجہ سے ہدی کے جو جانور ذبح کئے تھے سال آئندہ عمرۃ القضا کے موقع پر ان جانوروں کے بدلے دوسرے جانور حرم پہنچ کر ذبح کریں تاکہ ہدی کا حرم میں ذبح ہونا واقع ہو جائے کیونکہ احصار کی ہدی کا جانور حرم ہی میں ذبح کیا جاتا ہے جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔ لیکن مذکورہ بالا حکم کا یہ مطلب اس صورت میں ہے جب کہ یہ بات ثابت ہو کہ واقعہ حدیبیہ کے موقع پر ہدی کے جانور حرم سے باہر ذبح کئے گئے تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ہدی کے وہ جانور حرم ہی میں ذبح ہوئے تھے کیونکہ حدیبیہ کا اکثر حصہ حدود حرم میں واقع ہے (جیسا کہ باب کی پہلی حدیث کی تشریح کے ضمن میں ایک قول نقل کیا گیا تھا) تو پھر واقعہ حدیبیہ کے موقع پر ذبح کئے گئے جانوروں کے عوض دوسرے جانور ذبح کرنے کے اس حکم کا تعلق صرف احتیاط اور حصول فضیلت سے ہوگا اور کہا جائے گا کہ یہ حکم محض استحباب کے طور پر ہے۔

مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف مشکوٰۃ کو اس حدیث کے اصل مآخذ کی تحقیق نہیں ہو سکی تھی، لیکن ایک دوسرے نسخہ میں رواہ کے بعد ابوداؤد لاحق کیا گیا ہے یعنی اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے، نیز ایک اور نسخہ میں رواہ ابوداؤد کے بعد ان الفاظ کا بھی اضافہ ہے وفیہ قصۃ وفی سندہ محمد بن اسحٰق۔

بیماری سے احصار واقع ہو جاتا ہے

(۷) وَعَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ عَمْرٍو الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کُسِرَ اَوْ عَرِجَ فَقَدْ حَلَّ وَعَلَیْہِ الْحَجُّ مِنْ قَابِلٍ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَالدَّارِمِیُّ وَزَادَ اَبُوْدَاؤدَ فِیْ رِوَایَۃٍ اُخْرٰی اَوْ مَرِضَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ وَفِی الْمَصَابِیْحِ ضَعِیْفٌ۔

"اور حضرت حجاج ابن عمرو انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کا پاؤں ٹوٹ جائے یا وہ لنگڑا ہو جائے تو وہ حلال ہو گیا (یعنی اس کے لئے جائز ہے کہ وہ احرام کھول دے اور اپنے گھر واپس جائے) لیکن آئندہ سال اس پر حج واجب ہوگا (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) ابوداؤدؒ کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "یا وہ بیمار ہو جائے۔" نیز امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے جب کہ بغویؒ نے مصابیح میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔"

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو احرام باندھ لینے کے بعد دشمن کے خوف کے علاوہ بھی اور کوئی مانع پیش آجائے اس کے لئے جائز ہے کہ وہ احرام کھول دے، چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دشمن کے خوف کے علاوہ احصار کی اور صورتیں بھی ہیں مثلاً بیماری وغیرہ جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔

وفی المصابیح ضَعِیْفٌ کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کو بغوی نے جس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ سند ضعیف ہے لہٰذا بغوی کی سند ضعیف ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ترمذی وغیرہ کی سند بھی ضعیف ہو، اور اگر اس بارہ میں تعارض تسلیم بھی کر لیا جائے تو ترمذیؒ

کے قول ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ (یہ حدیث حسن ہے) کو بغوی کے اس کہنے پر کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو ترجیح حاصل ہوگی، پھر یہ کہ ایک نسخہ میں ترمذی کے قول میں لفظ "حسن" کے بعد لفظ "صحیح" بھی ہے، نیز تورپشتی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو ضعیف کہنا بالکل غلط ہے۔

حج کا رکن اعظم قیام عرفات ہے

⑧ وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ يَعْمُرَ الدِّيْلِيِّ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْحَجُّ عَرَفَةُ مَنْ اَدْرَكَ عَرَفَةَ لَيْلَةَ جَمْعٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الْفَجْرِ فَقَدْ اَدْرَكَ الْحَجَّ اَيَّامُ مِنًى ثَلَاثَةٌ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن یعمر دیلی کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "حج" عرفہ ہے، (یعنی حج کا سب سے بڑا رکن ذی الحجہ کی نویں تاریخ میں قیام عرفات ہے) جس نے مزدلفہ کی رات (یعنی ذی الحجہ کی دسویں رات) میں طلوع فجر سے پہلے وقوف عرفات پالیا اس نے حج کو پالیا۔ ا منیٰ (میں ٹھہرنے) کے تین دن ہیں (یعنی ذی الحجہ کی گیارہویں، بارہویں تیرھویں تاریخ جنہیں ایام تشریق کہتے ہیں، ان دنوں میں منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے اور رمی جمار کی جاتی ہے) پس جو شخص جلدی کرے اور دو ہی دن کے بعد چلا آئے اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو شخص تاخیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ نیز امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "اس نے حج کو پالیا" کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حج فوت نہیں ہوا اور وہ حج میں کسی خرابی اور فساد سے مامون رہا، بشرطیکہ اس نے احرام کا وقت پورا ہونے سے پہلے بیوی سے ہم بستری یا کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہ کیا ہو جو احرام کی حالت میں ممنوع ہے، اور یہ بات تو پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ جس شخص کا حج فوت ہو جائے یعنی وہ ذی الحجہ کی دسویں رات کی طلوع فجر تک ایک منٹ کے لئے بھی وقوف عرفات نہ کر سکے تو اس پر یہ واجب ہوگا کہ وہ عمرہ کے افعال یعنی طواف و سعی کے بعد احرام کھول دے، آئندہ سال کے حج تک مسلسل احرام باندھے رہنا اس کے لئے حرام ہے۔

"جو شخص جلدی کرے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بارھویں تاریخ کو ظہر کے بعد تینوں مناروں پر کنکریاں مار کر مکہ چلا آئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور تیرھویں رات میں قیام منیٰ اور تیرھویں تاریخ کو کنکریاں مارنا اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح "جو شخص تاخیر کرے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بارھویں تاریخ کو رمی جمرات کے بعد منیٰ ہی میں ٹھہرا رہے تا آنکہ تیرھویں رات کو بھی رمی جمرات کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، گویا جواز کے اعتبار سے تو دونوں صورتیں برابر ہیں، البتہ کثرت عبادت کے پیش نظر تاخیر افضل ہے۔

منقول ہے کہ اہل جاہلیت میں دو فریق تھے، ایک فریق تو تعجیل کو گناہ کہتا تھا اور دوسرا فریق تاخیر کو، چنانچہ یہ حکم نازل ہوا کہ تعجیل اور تاخیر دونوں برابر ہیں ان میں سے کسی میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

بَابُ حَرَمِ مَكَّةَ حَرَسَهَا اللّٰهُ تَعَالٰى

حرم مکہ (اللہ تعالیٰ اس کی حرمت کو آفات سے محفوظ رکھے) کی حرمت کا بیان

"حرم" زمین کے اس قطعہ کو کہتے ہیں جو کعبہ اور مکہ کے گرداگرد ہے۔ ! اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی عظمت کے سبب اس زمین کو بھی معظم و مکرم کیا ہے۔ اس زمین کو حرم اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس خطہ زمین کی بزرگی کی وجہ سے اس کی حدود میں ایسی بہت سی چیزیں

حرام قرار دی ہیں جو اور جگہ حرام نہیں ہیں۔ مثلاً حدود حرم میں شکار کرنا، درخت کاٹنا اور جانوروں کو ستانا وغیرہ درست نہیں۔ ! بعض علماء کہتے ہیں کہ زمین کا یہ حصہ "حرم" اس طرح مقرر ہوا کہ جب حضرت آدمؑ زمین پر اتارے گئے تو شیاطین سے ڈرتے تھے کہ مجھے ہلاک نہ کر ڈالیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت و نگہبانی کے لئے فرشتوں کو بھیجا ان فرشتوں نے مکّہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا لہٰذا مکّہ کے گرد اگرد جہاں جہاں فرشتوں نے کھڑے ہو کر حد بندی کی وہ حرم کی حد مقرر ہوئی اور اس طرح کعبہ مکرمہ اور ان فرشتوں کے کھڑے ہونے کی جگہ کے درمیان جو زمین آ گئی، وہ حرم ہوئی۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے جب کعبہ بناتے وقت حجر اسود رکھا تو اس کی وجہ سے ہر چہار طرف کی زمین روشن ہو گئی چنانچہ اس کی روشنی اس زمین کے چاروں طرف جہاں جہاں تک پہنچی وہیں حرم کی حد مقرر ہوئی زمین حرم کے حدود یہ ہیں، مدینہ منورہ کی طرف تین میل (مقام تنعیم تک) یمن، طائف، جعرانہ اور جدہ کی طرف سات سات میل بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جدہ کی طرف دس میل اور جعرانہ کی طرف نو میل۔ ! چاروں طرف جہاں جہاں حرم کی زمین ختم ہوتی ہے۔ وہاں حدود کی علامت کے طور پر برجیاں بنی ہوئی ہیں مگر جدہ اور جعرانہ کی طرف برجیاں نہیں ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حرم مکّہ کی فضیلت

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ لَا ھِجْرَۃَ وَلٰکِنْ جِھَادٌ وَنِیَّۃٌ وَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا وَقَالَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ اِنَّ ھٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَہُ اللّٰہُ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فَھُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَۃِ اللّٰہِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ وَاِنَّہٗ لَمْ یَحِلَّ الْقِتَالُ فِیْہِ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ وَلَمْ یَحِلَّ لِیْ اِلَّا سَاعَۃً مِّنْ نَّھَارٍ فَھُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَۃِ اللّٰہِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ لَا یُعْضَدُ شَوْکُہٗ وَلَا یُنَفَّرُ صَیْدُہٗ وَلَا یَلْتَقِطُ لُقْطَتَہٗ اِلَّا مَنْ عَرَّفَھَا وَلَا یُخْتَلٰی خَلَاھَا فَقَالَ الْعَبَّاسُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِلَّا الْاِذْخِرَ فَاِنَّہٗ لِقَیْنِھِمْ وَلِبُیُوْتِھِمْ فَقَالَ اِلَّا الْاِذْخِرَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ لَا یُعْضَدُ شَجَرُھَا وَلَا یَلْتَقِطُ سَاقِطَتَھَا اِلَّا مُنْشِدٌ۔

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ اب (مکہ سے مدینہ کو) ہجرت (فرض) نہیں ہے البتہ جہاد اور عمل میں نیت کا اخلاص (ضروری) ہے لہٰذا جب تمہیں جہاد کے لئے بلایا جائے (یعنی تمہارا امیر تمہیں جہاد کا حکم دے) تو جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو۔" نیز آپ ﷺ نے فتح مکہ ہی کے دن یہ بھی فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے اس شہر (یعنی تمام زمین حرم) کو حرام کیا ہے (بایں طور کہ تمام لوگوں پر اس مقدس خطہ زمین کی ہتک و بے حرمتی حرام ہے اور اس کی تعظیم واجب ہے) اسی دن سے جب کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا (یعنی اس خطہ زمین کی حرمت شروع ہی سے ہے لہٰذا یہ خطہ زمین اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی حرمت کے سبب قیامت تک کے لئے حرام کیا گیا بلاشبہ اس خطہ زمین میں نہ تو مجھ سے پہلے کسی کے لئے قتل و قتال حلال کیا گیا تھا اور نہ میرے لئے حلال ہوا ہے علاوہ (فتح مکہ کے) دن کی ایک ساعت کے، پس (اس دن کے بعد) یہ خطہ زمین اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی حرمت کے سبب قیامت (کے دن پہلا صور پھونکے جانے) تک (ہر شخص کے لئے) حرام کر دیا گیا ہے لہٰذا نہ تو (اس زمین کا) کوئی خار دار درخت ہی کاٹا جائے (اگرچہ وہ ایذا دے) نہ اس کا شکار بھگایا جائے (یعنی کوئی شکار کی غرض سے یا محض بھڑکانے ستانے کے لئے یہاں کے کسی جانور کے ساتھ تعارض نہ کرے) اور نہ یہاں کا لقطہ اٹھایا جائے ہاں وہ شخص (اس کو اٹھا سکتا ہے) جو اس کا اعلان کرے اور نہ اس زمین کی گھاس کاٹی جائے۔" حضرت عباسؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ) مگر اذخر (ایک قسم کی گھاس) تو ایسی چیز ہے جو لوہاروں اور سناروں (کے لئے لوہا اور سونا گلانے) کے کام میں آتی ہے اور گھروں (کی چھتیں بنانے) میں اس کی ضرورت پڑتی ہے (اس کو کاٹنے کی اجازت دے دیجئے) آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں

اذخر کاٹی جاسکتی ہے۔" (بخاری ومسلم) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "نہ یہاں کا درخت کاٹا جائے اور نہ یہاں کی گری پڑی کوئی چیز اٹھائی جائے البتہ اس (کے مالک) کو تلاش کرنے والا اٹھا سکتا ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو اس وقت ہجرت ہر اس شخص پر فرض تھی جو اس کی استطاعت رکھتا تھا" پھر جب مکہ فتح ہو گیا تو اس ہجرت کا سلسلہ منقطع ہو گیا جو فرض تھی کیونکہ اس کے بعد مکہ دار الحرب نہیں رہا تھا لہٰذا ارشاد گرامی "اب ہجرت نہیں ہے الخ" کا مطلب یہی ہے کہ اگر اب کوئی ہجرت کرے تو اسے وہ درجہ حاصل نہیں ہوگا جو مہاجرین کو حاصل ہو چکا ہے البتہ جہاد اور اعمال میں حسن نیت کا اجر اب بھی باقی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا، اسی طرح وہ ہجرت بھی باقی ہے جو اپنے دین اور اسلام کے احکام و شعائر کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے اور اس کا اجر بھی ملتا ہے۔

"نہ کوئی خاردار درخت کاٹا جائے" اس سے معلوم ہوا کہ بغیر خاردار درخت کو کاٹنا تو بدرجۂ اولیٰ جائز نہیں ہوگا ہدایہ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص زمین حرم کی ایسی گھاس یا ایسا درخت کاٹے جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو اور خودرو ہو تو اس پر اس گھاس یا درخت کی قیمت بطور جزاء واجب ہوگی، البتہ خشک گھاس کاٹنے کی صورت میں قیمت واجب نہیں ہوتی لیکن اس کا کاٹنا بھی درست نہیں ہے۔! زمین حرم کی گھاس کو چرانا بھی جائز نہیں ہے، البتہ اذخر کو کاٹنا بھی جائز ہے اور چرانا بھی، اسی طرح کماۃ یعنی کھنبی (ایک قسم کا خودرو ساگ) بھی مستثنیٰ ہے کیونکہ یہ نباتات میں سے نہیں ہے۔! حضرت امام شافعیؒ کے مسلک میں زمین حرم کی گھاس میں جانوروں کو چرانا بھی جائز ہے

"لقطہ" اس چیز کو کہتے ہیں جو کہیں گری پڑی پائی جائے اور اس کا مالک معلوم نہ ہو۔ زمین حرم کے علاوہ عام طور پر لقطہ کا حکم تو یہ ہے کہ اس کو اٹھانے والا عام لوگوں میں یہ اعلان کراتا رہے کہ میں نے کسی کی کوئی چیز پائی ہے جس شخص کی ہو وہ حاصل کرلے۔ اگر اس اعلان کے بعد بھی اس چیز کا مالک نہ ملے تو وہ شخص اگر خود نادار و مستحق ہو تو اسے اپنے استعمال میں لے آئے اور اگر نادار نہ ہو تو پھر کسی نادار کو بطور صدقہ دے دے پھر اگر بعد میں اس کا مالک مل جائے تو اس کو اس کی قیمت ادا کرے لیکن زمین حرم کے لقطہ میں، جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا، یہ بات نہیں ہے بلکہ صرف اعلان ہے جب تک کہ اس کا مالک نہ مل جائے، یعنی جب تک اس کے مالک کا پتہ نہ لگے اس وقت تک اس کا اعلان کیا جاتا رہے اور مالک کا انتظار کیا جائے، اس کو آخر تک نہ تو اپنے استعمال میں لا سکتا ہے نہ کسی کو بطور صدقہ دیا جاسکتا ہے اور نہ اپنی ملکیت بنایا جاسکتا ہے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے، لیکن اکثر علماء کے نزدیک حرم اور غیر حرم کے لقطہ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے، ان کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں مطلق طور پر لقطہ کا حکم بیان کیا گیا ہے جو انشاء اللہ لقطہ کے باب میں آئیں گی۔

حدیث کے الفاظ الا من عرفھا کا مطلب ان علماء کے نزدیک یہ ہے کہ زمین حرم کے لقطہ کو اٹھانے والا پورے ایک برس تک مکہ میں اس کا اعلان کرتا کراتا رہے جیسا کہ اور جگہ کرتے ہیں، اعلان کو صرف ایام حج کے ساتھ مخصوص نہ کرے، گویا حدیث کے اس جملہ کا حاصل یہ ہوا کہ زمین حرم کے لقطہ کے بارے میں کسی کو یہ غلط فہمی و گمان نہ ہونا چاہئے کہ وہاں اس کا اعلان صرف ایام حج ہی کے دوران کرنا کرانا کافی ہے۔

مکہ میں بلا ضرورت ہتھیار اٹھانا درست نہیں

(۴) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَحِلُّ لِاَحَدِكُمْ اَنْ يَحْمِلَ بِمَكَّةَ السِّلَاحَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تم میں سے کسی کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ مکہ میں

ہتھیار اٹھائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اکثر علماء کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مکّہ میں بلاضرورت ہتھیار اٹھانا درست نہیں ہے، لیکن حضرت امام حسنؒ فرماتے ہیں کہ مکّہ میں نہ صرف بلاضرورت بلکہ بضرورت بھی ہتھیار اٹھانا درست نہیں ہے۔

حرم مکّہ میں قصاص اور حد جاری کرنے کا مسئلہ

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَعَلٰى رَأْسِهِ الْمِغْفَرُ فَلَمَّا نَزَعَهٗ جَاءَ رَجُلٌ وَقَالَ اِنَّ ابْنَ خَطَلٍ مُتَعَلِّقٌ بِاَسْتَارِ الْكَعْبَةِ فَقَالَ اقْتُلْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فتح مکّہ کے دن مکّہ معظمہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے سر مبارک پر خود تھا، جب آپ ﷺ نے اس خود کو اتارا تو ایک شخص (یعنی فضل ابن عبیدؓ) نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ "ابن خطل کعبہ کے پردہ کو پکڑے ہوئے ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس کو مار ڈالو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا، خود پہن کر مکّہ میں داخل ہونا حضرت امام شافعیؒ کے اس مسلک کی دلیل ہے کہ جو شخص نسک یعنی حج یا عمرہ کا ارادہ نہ رکھتا ہو وہ احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ لیکن حنفیہ کا مسلک چونکہ یہ ہے کہ جو شخص (بشرطیکہ وہ آفاقی ہو) مکّہ میں داخل ہونا چاہے خواہ وہ حج یا عمرہ کا ارادہ رکھتا ہو یا کسی اور غرض سے مکّہ جا رہا ہو تو وہ میقات سے احرام باندھے بغیر مکہ میں داخل نہ ہو۔ اس لئے شمنیؒ کہتے ہیں کہ حنفیہ کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ کوئی شخص احرام باندھے بغیر میقات سے آگے نہ بڑھے۔" نیز یہ کہ احرام تو محض اس مقدس جگہ یعنی خانۂ کعبہ کی تعظیم کے لئے باندھا جاتا ہے اس لئے چاہے کوئی حج یا عمرہ کے لئے مکّہ جائے چاہے کسی اور غرض سے، اس کے لئے ضروری ہے کہ خانۂ کعبہ کی تعظیم کے پیش نظر احرام کے بغیر مکّہ میں داخل نہ ہو۔

اب رہی یہ بات کہ پھر آنحضرت ﷺ احرام کے بغیر مکّہ میں کیسے داخل ہوئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ فتح مکّہ کے دن اس خاص ساعت میں بغیر احرام مکّہ میں داخل ہونا آپ ﷺ کے لئے حلال ہو گیا تھا، چنانچہ اس کی تائید باب کی پہلی حدیث کے ان الفاظ وَلَمْ يَحِلَّ لِي اِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ (اور نہ میرے لئے حلال ہوا ہے علاوہ دن کی ایک ساعت کے) سے ہوتی ہے۔

ابن خطل کے بارہ میں علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ مسلمان تھا مگر پھر مرتد ہو گیا تھا اور اس نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا تھا۔ جو اس کا خدمت گار تھا، نیز اس نے ایک پیشہ ور گانے والی لڑکی پال رکھی تھی جو آنحضرت ﷺ، آپ کے صحابہ کرامؓ اور اسلام کے احکام و شعائر کی ہجو کرتی تھی اسی لئے آپ ﷺ نے اس کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔

اس بات سے حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ یہ استدلال کرتے ہیں کہ حرم مکّہ میں قصاص اور حدود (سزائیں) جاری کرنا جائز ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے، امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ابن خطل کے قتل کا حکم اس لئے دیا کہ وہ مرتد ہو گیا تھا، تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ ﷺ نے اس کو قصاص کے طور پر قتل کرایا تو پھر یہ کہا جائے گا کہ اس کا قتل اس خاص ساعت میں ہوا ہو گا جس میں آنحضرت ﷺ کے لئے زمین حرم مباح کر دی گئی تھی۔

بغیر احرام مکّہ میں داخلہ

(۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ بِغَيْرِ اِحْرَامٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ فتح مکّہ کے دن بغیر احرام کے (مکہ میں) داخل ہوئے اور اس وقت آپ ﷺ (کے سر مبارک) پر سیاہ عمامہ تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سر پر خود پہن کر اس کے اوپر سیاہ عمامہ باندھ رکھا ہوگا، بغیر احرام مکہ میں داخل ہونے کے بارہ میں حدیث نمبر۳ کی تشریح میں بحث کی جاچکی ہے۔! یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سیاہ رنگ کی پگڑی استعمال کرنا مستحب ہے جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے۔

کعبہ کی تخریب کے بارہ میں ایک پیشگوئی

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْزُوْ جَيْشٌ الْكَعْبَةَ فَإِذَا كَانُوا ابِبَيْدَاءَ مِنَ الْأَرْضِ يُخْسَفُ بِأَوَّلِهِمْ وَاٰخِرِهِمْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يُخْسَفُ بِأَوَّلِهِمْ وَاٰخِرِهِمْ وَفِيْهِمْ اَسْوَاقُهُمْ وَمَنْ لَيْسَ مِنْهُمْ قَالَ يُخْسَفُ بِأَوَّلِهِمْ وَاٰخِرِهِمْ ثُمَّ يُبْعَثُوْنَ عَلٰى نِيَّاتِهِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک لشکر خانۂ کعبہ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کرے گا (تاکہ وہ خانۂ کعبہ کو نقصان پہنچائے) چنانچہ جب وہ لشکر زمین کے ایک میدانی حصہ میں پہنچے گا تو وہ اول سے آخر تک (یعنی پورا لشکر) زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔" میں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! وہ لشکر اول سے آخر تک (یعنی سب کو) کس طرح دھنسا دیا جائے گا جب کہ ان میں کاروباری لوگ بھی ہوں گے اور ان میں وہ شخص بھی ہوگا جو ان میں سے نہیں ہے (لشکر میں ایسے لوگ بھی شامل ہوں گے جو نہ سب لشکر والوں کی طرح کافر ہوں گے اور نہ کعبہ کو نقصان پہنچانے میں ان کے ہمنوا و شریک ہوں گے بلکہ ان کو زبردستی لشکر میں شامل کر لیا ہوگا تو کیا ایسے لوگ بھی زمین میں دھنسا دیئے جائیں گے؟) آپ ﷺ نے فرمایا" (ہاں) اول سے آخر تک سب ہی دھنسائے جائیں گے البتہ انہیں ان کی نیتوں کے مطابق اٹھایا جائے گا۔!" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ گویا آنحضرت ﷺ نے اس زمانہ کے بارہ میں پیشگوئی فرمائی ہے جب دنیا اپنی عمر کے آخری دور میں ہوگی، چنانچہ اس آخری زمانہ میں حضرت امام مہدی کے ظہور کے بعد مصر کے حکمران سفیانی کا ایک لشکر خانۂ کعبہ کو نقصان پہنچانے کے ناپاک ارادہ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوگا مگر وہ اپنے اس ناپاک ارادہ میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ایسے لوگ لشکر کے ناپاک ارادوں کے ہمنوا نہ ہوں گے اور خانۂ کعبہ کو نقصان پہنچانا یا اس کی توہین کرنا ان کا مقصد نہیں ہوگا مگر چونکہ وہ لشکر میں شامل ہو کر نہ صرف یہ کہ ان کی بھیڑ میں اضافہ کریں گے بلکہ ایک طرح سے ان کے ناپاک ارادوں میں اعانت کا سبب بھی بنیں گے اس لئے پورے لشکر کے ساتھ ان کو بھی زمین میں دھنسا دیا جائے گا، ہاں پھر قیامت میں سب کو ان کی نیتوں کے مطابق اٹھایا جائے گا کہ جو شخص کسی مجبوری اور زبردستی کے تحت لشکر میں شامل ہوا ہوگا اور اس کی نیت صاف اور اس کا قلب ایمان و اسلام کی روشنی سے منور ہوگا وہ جنت میں داخل کیا جائے گا اور جو لوگ واقعی ناپاک ارادوں کے ساتھ اور بہ نیت کفر لشکر میں شامل ہوں گے انہیں دوزخ کی آگ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔

مخرب کعبہ کے بارہ میں پیشگوئی

⑥ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُخَرِّبُ الْكَعْبَةَ ذُو السُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خانۂ کعبہ کو نقصان پہنچانے والا حبشیوں میں سے وہ شخص ہوگا جس کی پنڈلیاں چھوٹی اور پتلی ہوں گی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ مقدر ہو چکا ہے کہ خانۂ کعبہ کی تخریب ایک حبشی کے ہاتھوں ہوگی! چنانچہ یہ عبرت پکڑنے کی بات ہے کہ خانۂ کعبہ باوجود اپنی

قدر و عظمت کے ایک حقیر آدمی کے ہاتھوں تباہ و خراب ہوگا اور جب خانہ کعبہ تباہ خراب ہوگا تو قیامت آجائے گی جس کے نتیجہ میں یہ پوری دنیا تباہ و خراب ہو جائے گی کیونکہ اس عالم کی آبادی وغیرہ خانہ کعبہ کے وجود کے ساتھ متعلق ہے۔

⑦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَأَنِّي بِهٖ أَسْوَدَ أَفْحَجَ يَقْلَعُهَا حَجَرًا حَجَرًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "گویا میں خانہ کعبہ کی تخریب کرنے والے کو دیکھ رہا ہوں، وہ ایک سیاہ رنگ کا اور پھڈا شخص ہوگا جو خانہ کعبہ کا ایک ایک پتھر اکھاڑ ڈالے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: اَفْحَجَ (پھڈا) اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پنجے آپس میں ملے ہوئے ہوں اور ایڑیاں اور پنڈلیاں دور دور ہوں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِي

حرم میں احتکار، کجروی ہے

⑧ عَنْ يَعْلَى ابْنِ أُمَيَّةَ قَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ احْتِكَارُ الطَّعَامِ فِي الْحَرَمِ إِلْحَادٌ فِيْهِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"حضرت یعلی ابن امیہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حرم میں غلہ کا احتکار (یعنی گراں بیچنے کے لئے غلہ کی ذخیرہ اندوزی) کجروی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "احتکار" کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص گراں بازاری کے دور میں غلہ اس نیت سے خرید کر رکھے کہ جب گرانی اور زیادہ بڑھے گی تو اسے فروخت کرے گا۔! یہ نہ صرف یہ کہ ایک سماجی اور معاشرتی ظلم ہے بلکہ شرعی طور پر گناہ بھی ہے اسلامی نقطہ نظر سے یہ قابل نفریں فعل ویسے تو ہر جگہ اور ہر شہر میں حرام ہے لیکن حرم میں اس کا ارتکاب اشد حرام ہے جس پر "کجروی" (یعنی حق چھوڑ کر باطل کی طرف مائل ہونا) کا اطلاق فرمایا گیا ہے اور حرم میں کجروی کے بارہ میں حق تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَنْ يُرِدْ فِيْهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ۔

"اور جو شخص حرم میں ظلم کے ساتھ کجروی کا ارادہ کرے گا ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھا دیں گے۔"

مسئلہ گراں فروشی کی نیت سے انسان اور جانوروں کی غذائی چیزوں کو روکے رکھنا اس شہر میں مکروہ ہے جس کے رہنے والوں کو اس سے تکلیف پہنچتی ہو۔

مکہ مکرمہ کی فضیلت

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَكَّةَ مَا أَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَأَحَبَّكِ إِلَيَّ وَلَوْلَا أَنَّ قَوْمِي أَخْرَجُوْنِي مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ إِسْنَادًا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (فتح مکہ کے بعد وہاں سے واپس ہوتے وقت) مکہ کی نسبت فرمایا کہ تو کتنا اچھا شہر ہے!؟ اور تو مجھے بہت ہی پیارا ہے! اگر میری قوم (قریش) کے لوگ مجھے یہاں سے نہ نکال چکے ہوتے تو میں اس شہر کے علاوہ کہیں نہ رہتا۔" امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث اسناد کے اعتبار سے حسن، صحیح، غریب ہے۔

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ سے افضل ہے چنانچہ اکثر علماء کا یہی قول ہے لیکن امام مالکؒ کے نزدیک

مدینہ کی فضیلت مکّہ سے زیادہ ہے۔

(۱۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَدِیِّ بْنِ حَمْرَاءَ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاقِفًا عَلَی الْحَزْوَرَۃِ فَقَالَ وَاللّٰہِ اِنَّکِ لَخَیْرُ اَرْضِ اللّٰہِ وَاَحَبُّ اَرْضِ اللّٰہِ اِلَی اللّٰہِ وَلَوْلَا اَنِّیْ اُخْرِجْتُ مِنْکِ مَاخَرَجْتُ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عدی ابن حمراءؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا رسول کریم ﷺ حزورہ پر کھڑے ہوئے (مکہ کی نسبت) فرمارہے تھے کہ "خدا کی قسم! تو خدا کی زمین کا سب سے بہتر قطعہ ہے، اور تو خدا کے نزدیک خدا کی زمین کا سب سے محبوب حصہ ہے۔! اگر مجھے تجھ نہ نکالا جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "حزورہ" مکّہ میں ایک جگہ کا نام ہے، آپ ﷺ نے اسی جگہ کھڑے ہو کر مکّہ کو مخاطب کرتے ہوئے مذکورہ بالا جملے ارشاد فرمائے۔

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ مؤمن کی شان کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اس شہر مقدس میں اپنے قیام کو ایک عظیم سعادت تصور کرتے ہوئے مکّہ کی اقامت کو اس وقت تک ترک نہ کرے جب تک وہ اس پر حقیقۃً یا حکماً (یعنی دینی و دنیاوی ضرورت کے تحت) مجبور نہ ہو اسی لئے کہا گیا ہے کہ "مکہ میں داخل ہونا سعادت اور وہاں سے نکلنا شقاوت ہے۔"

در مختار میں لکھا ہے کہ "مکہ اور مدینہ کی مجاورت (یعنی ان دونوں شہروں میں مستقل طور پر رہنا) اس شخص کے لئے مکروہ نہیں ہے جس کو اپنے نفس پر قابو حاصل ہو۔" گویا جس شخص کو یہ یقین ہو کہ مجھ سے گناہ سرزد نہیں ہوں گے تو وہ ان شہروں میں اقامت حاصل کرے مگر جس شخص کو یہ یقین حاصل نہ ہو وہ اقامت اختیار نہ کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۱) عَنْ اَبِیْ شُرَیْحِ نِ الْعَدَوِیِّ اَنَّہٗ قَالَ لِعَمْرِو بْنِ سَعِیْدٍ وَھُوَیَبْعَثُ الْبُعُوْثَ اِلٰی مَکَّۃَ ائْذَنْ لِیْ اَیُّھَا الْاَمِیْرُ اُحَدِّثْکَ قَوْلًا قَامَ بِہٖ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْغَدَمِنْ یَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعَتْہُ اُذُنَایَ وَوَعَاہُ قَلْبِیْ وَاَبْصَرَتْہُ عَیْنَایَ حِیْنَ تَکَلَّمَ بِہٖ حَمِدَاللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ مَکَّۃَ حَرَّمَھَا اللّٰہُ وَلَمْ یُحَرِّمْھَا النَّاسُ فَلَا یَحِلُّ لِامْرِیٍٔ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یَّسْفِكَ بِھَا دَمًا وَلَا یَعْضُدُ بِھَا شَجَرَۃً فَاِنْ اَحَدٌ تَرَخَّصَ بِقِتَالِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْھَا فَقُوْلُوْا لَہٗ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذِنَ لِرَسُوْلِہٖ وَلَمْ یَأْذَنْ لَکُمْ وَاِنَّمَا اَذِنَ لِیْ فِیْھَا سَاعَۃً مِنْ نَھَارٍ وَقَدْ عَادَتْ حُرْمَتُھَا الْیَوْمَ کَحُرْمَتِھَا بِالْاَمْسِ وَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ فَقِیْلَ لِاَبِیْ شُرَیْحٍ مَا قَالَ لَکَ عَمْرٌو قَالَ قَالَ اَنَا اَعْلَمُ بِذٰلِكَ مِنْکَ یَا اَبَاشُرَیْحٍ اِنَّ الْحَرَمَ لَا یُعِیْذُ عَاصِیًا وَلَا فَارًّا بِدَمٍ وَلَا فَارًّا بِخَرْبَۃٍ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِی الْبُخَارِیِّ الْخَرْبَۃُ الْجِنَایَۃُ۔

"حضرت ابوشریح عدویؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے عمرو بن سعید سے اس وقت، جب کہ وہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے مقابلے پر) مکّہ کی طرف لشکر بھیج رہے تھے، یہ کہا کہ میرے سردار مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے سامنے وہ بات بیان کروں جس کو رسول کریم ﷺ نے فتح مکّہ کے اگلے دن ایک خطبہ کے دوران ارشاد فرمایا تھا، اس بات کو میرے کانوں نے سنا، میرے دل نے یاد رکھا اور میری آنکھوں نے آنحضرت کو وہ بات فرماتے دیکھا ہے! چنانچہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا کہ "مکہ کو اللہ تعالیٰ نے عظمت بخشی ہے، اس کو لوگوں نے بزرگی نہیں دی ہے، لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس شہر میں خونریزی کرے (یعنی کوئی مسلمان اس شہر میں کسی کو قتل نہ کرے اگرچہ وہ لائق قتل ہی کیوں نہ ہو اور جو شخص لائق قتل نہ ہو اس کو قتل کرنا ہر جگہ حرام ہے خواہ حرم مکّہ کے اندر ہو خواہ اس کے باہر) اور یہ حلال ہے کہ اس کی زمین کا درخت کاٹے؛ اور اگر کوئی شخص اس شہر میں قتل وقتال کے لئے رسول اللہ ﷺ کے عمل سے (جیسا کہ حدیث نمبر ۳ میں ابن خطل کے قتل کا واقعہ گذرا) جواز

پیدا کرے تو اس سے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس کی اجازت دے دی تھی اور تم کو اجازت نہیں ہے، چنانچہ مجھے بھی ایک دن کی صرف ایک ساعت کے لئے اس شہر میں قتل کرنے کی اجازت دی گئی تھی اور اب آج کے دن (جب کہ یہ خطبہ دیا جارہا ہے) اس شہر کی عظمت و حرمت بحالہ ہے جو کل گذشتہ (اس مباح ساعت کے علاوہ) تھی۔ اجو لوگ یہاں موجود ہیں ان کو چاہئے کہ میری اس بات کو ان لوگوں تک پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں ابو شریح ؓ سے پوچھا گیا۔ کہ عمرو بن سعید نے (یہ حدیث سن کر) آپ سے کیا کہا۔ انہوں نے فرمایا کہ عمروابن سعید نے مجھ سے کہا کہ "ابو شریح! میں (اس حدیث کو) تم سے زیادہ جانتا ہوں لیکن سرزمین حرم نافرمان کو پناہ نہیں دیتی اور نہ اس شخص کو پناہ دیتی ہے جو خون کر کے بھاگا ہو یا کوئی تقصیر کر کے فرار ہوا ہو۔" (بخاری و مسلم)

بخاری کی روایت میں الخربة کے معنی "قصور" ہیں۔

تشریح: عمرو بن سعید، خلیفہ عبدالملک ابن مروان کی جانب سے مدینہ کے حاکم تھے، انہوں نے جب حضرت عبداللہ ابن زبیر ؓ کو قتل کرنے کے لئے مدینہ سے مکّہ کو لشکر روانہ کیا تو حضرت ابو شریح صحابی ؓ نے ان کے اس فیصلہ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی مذکورہ بالا حدیث بیان کی جس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ حرم مکّہ میں تو لائق قتل شخص کو بھی قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے چہ جائیکہ آپ ایک جلیل القدر صحابی کا خون بہانے کے لئے وہاں لشکر بھیج رہے ہیں۔ اس کے جواب میں عمرو ابن سعید نے کہا کہ زمین حرم اس شخص کو پناہ نہیں دیتی جو خلیفہ سے بغاوت کر کے نافرمانی کا مرتکب ہوا ہو، گویا عمرو ابن سعید کے گمان میں عبدالملک ابن مروان، خلیفہ برحق تھا اور حضرت عبداللہ ابن زبیر ؓ اس کے باغی، حالانکہ عبدالملک ابن مروان خلیفہ برحق نہیں تھا کہ اس کی خلافت کا انکار کرنے والے کو شرعی نقطہ نظر سے باغی قرار دیا جاتا، اسی طرح عمروابن سعید نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی شخص کسی کا خون کر کے حرم میں چلا جائے تو حرم اس کو بھی پناہ نہیں دیتا ایسے ہی اگر کوئی شخص تقصیر کر کے یعنی دین میں فساد کا بیج بو کر یا کوئی دینی جرم کر کے یا کوئی اور قصور کر کے مثلاً کسی کا مال تلف کر کے یا کسی کا حق غصب کر کے بھاگ جائے اور حرم میں پناہ لے لے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے درگذر کر لیا جائے! گویا عمروابن سعید کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ عبداللہ ابن زبیر ؓ ایک گنہ گار و نافرمان شخص ہیں کیونکہ انہوں نے خلیفہ کی اطاعت سے انحراف کیا ہے، اگر وہ زمین حرم سے باہر آجائیں گے تو وہاں ان کو سزا دی جائے گی اور اگر حرم ہی میں رہیں گے تو ان کو حرم ہی میں سزا دوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنی زمین حرم ہی میں ان کو شہید کر دیا گیا۔

⑫ وَعَنْ عَيَّاشِ بْنِ اَبِي رَبِيعَةَ الْمَخْزُوْمِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ هٰذِهِ الْاُمَّةُ بِخَيْرٍ مَا عَظَّمُوْا هٰذِهِ الْحُرْمَةَ حَقَّ تَعْظِيْمِهَا فَاِذَا ضَيَّعُوْا ذٰلِكَ هَلَكُوْا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عیاش ابن ابی ربیعہ مخزومی ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ اُمت اس وقت تک بھلائی کے ساتھ رہے گی جب تک کہ اس حرمت (یعنی مکّہ اور حرم مکّہ کی حرمت) کی تعظیم کرتی رہے گی جیسا کہ اس کی تعظیم کا حق ہے اور جب لوگ اس تعظیم کو ترک کر دیں گے تو ہلاک کر دیئے جائیں گے۔" (ابن ماجہ)

بَابُ حَرَمِ الْمَدِيْنَةِ حَرَّسَهَا اللّٰهُ تَعَالٰى

حرم مدینہ (اللہ اس کو آفات سے محفوظ رکھے) کا بیان

مدینہ اور اس کی گرد اگرد زمین کی حرمت کے بارہ میں بھی احادیث منقول ہیں، لیکن اس سلسلہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، چنانچہ حنفی علماء کے نزدیک مدینہ اور اس کی گرد اگرد زمین کی حرمت کا مطلب یہ ہے کہ اس شہر مقدس اور اس کی چاروں طرف کی زمین کی تعظیم و تکریم کی جائے، نہ یہ کہ اس کا بھی وہی حکم ہے جو مکّہ اور اس کی گرد اگرد زمین کا ہے، لہٰذا حنفی مسلک کے مطابق مدینہ اور اس کی

اطراف کی زمین میں درخت وغیرہ کاٹنا اور شکار کرنا حرام نہیں ہے، لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چونکہ حرم مکہ اور حرم مدینہ کا ایک ہی حکم ہے اس لئے ان کے مسلک میں مدینہ اور اس کے اطراف کی زمین میں وہ تمام چیزیں حرام ہیں جو مکہ اور اس کے اطراف کی زمین میں حرام ہیں تاہم ان ائمہ کے ہاں بھی حرم مدینہ میں ان چیزوں کے ارتکاب سے جزاء واجب نہیں ہوتی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حرم مدینہ کی حدود

① عَنْ عَلِيٍّ قَالَ مَا كَتَبْنَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلاَّ الْقُرْاٰنَ وَمَافِيْ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَدِيْنَةُ حَرَامٌ مَابَيْنَ عَيْرٍ اِلٰى ثَوْرٍ فَمَنْ اَحْدَثَ فِيْهَا حَدَثًا اَوْ اٰوٰى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ لاَ يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلاَ عَدْلٌ۔ ذِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ وَاحِدَةٌ يَسْعٰى بِهَا اَدْنَاهُمْ فَمَنْ اَخْفَرَ مُسْلِمًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ لاَ يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلاَ عَدْلٌ وَمَنْ وَالٰى قَوْمًا بِغَيْرِ اِذْنِ مَوَالِيْهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ لاَ يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلاَ عَدْلٌ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُمَا مَنِ ادَّعٰى اِلٰى غَيْرِ اَبِيْهِ اَوْتَوَلّٰى غَيْرَ مَوَالِيْهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ لاَ يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلاَ عَدْلٌ۔

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کی طرف سے علاوہ قرآن اور ان باتوں کے جو اس صحیفہ میں ہیں، اور کچھ نہیں لکھا ہے۔! حضرت علیؓ نے فرمایا کہ (میں نے) اس صحیفہ میں رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی (بھی لکھا) ہے کہ "مدینہ" عیر اور ثور کے درمیان، حرام ہے، لہٰذا جو شخص مدینہ میں بدعت پیدا کرے (یعنی ایسی بات کہے یا رائج کرے جو قرآن و حدیث کے خلاف ہو) یا کسی بدعتی کو پناہ دے تو اس پر خدا کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے، اس شخص کے نہ تو (کامل طور پر) فرض (اعمال) قبول کئے جاتے ہیں نہ نفل! مسلمانوں کے عہد ایک ہے جس کے لئے ان میں کا ادنی شخص بھی کوشش کر سکتا ہے لہٰذا جو شخص کسی مسلمان کے عہد کو توڑے اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے، نہ تو اس کے فرض قبول کئے جاتے ہیں اور نہ نفل! جو شخص اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کسی قوم سے موالات (دوستی) قائم کرے اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب آدمیوں کی لعنت ہے، نہ تو اس کے فرض قبول کئے جاتے ہیں اور نہ نفل!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

بخاری اور مسلم ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "جو شخص اپنے باپ کی بجائے کسی دوسرے کی طرف اپنی نسبت کا دعویٰ کرے (یعنی یوں کہے کہ میں زید کا بیٹا ہوں جب کہ حقیقت میں وہ بکر کا بیٹا ہو) یا اپنے مالک کی بجائے کسی دوسرے کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے (مثلاً یوں کہے کہ میں زید کا غلام یا خدمت گار ہوں جب کہ حقیقت میں وہ بکر کا غلام یا خدمت گار ہو) تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے نہ تو اس کے فرض قبول کئے جاتے ہیں اور نہ نفل۔"

تشریح: کچھ لوگوں نے آپس میں کہا ہو گا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور کتاب بطور خاص عنایت کی ہے جس کا علم اور کسی کو نہیں ہے، جب یہ بات حضرت علیؓ نے سنی تو اس کی تردید کی اور فرمایا کہ میں نے تو آنحضرت ﷺ کی طرف سے صرف قرآن کریم لکھا ہے یا پھر چند احکام پر مشتمل وہ احادیث لکھی ہیں جو اس صحیفہ میں ہیں، ان کے علاوہ نہ تو میں نے کوئی اور کتاب لکھی ہے اور نہ آنحضرت ﷺ نے قرآن کریم کے علاوہ مجھے اور کوئی کتاب دی ہے۔ چنانچہ "اس صحیفہ" سے مراد وہ لکھا ہوا ورق تھا جس میں آنحضرت ﷺ نے دیات کے احکام اور چند دوسرے احکام تحریر کرائے تھے اور جو حضرت علیؓ کی تلوار کی نیام میں رہتا تھا۔

اس صحیفہ یا ورق میں دیات کے احکام کے علاوہ اور جو احکام لکھے ہوئے تھے ان میں مدینہ کے بارہ میں بھی یہ حکم تھا، جو حضرت علیؓ

نے مذکورہ بالا حدیث میں بیان کیا۔! لہٰذا مدینہ عیر اور ثور کے درمیان حرام ہے" کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے گرد اگرد زمین کا وہ حصہ جو عیر اور ثور کے درمیان ہے بزرگ قدر اور باعظمت ہے! اس میں ایسی چیزوں کا ارتکاب ممنوع ہے، جو اس مقدس شہر اور اس کی باعظمت زمین کی توہین و حقارت کا سبب ہوں، لیکن حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک "حرام" سے مراد "حرم" ہے یعنی مدینہ، حرم مکہ کی مانند ہے کہ جو چیزیں مثلاً شکار وغیرہ حرم مکہ میں حرام ہیں وہ مدینہ میں بھی حرام ہیں، اس طرح ان کے ہاں حرم مدینہ کی حدود عیر اور ثور نامی پہاڑ ہیں جو مدینہ مطہرہ کے دونوں طرف واقع ہیں۔

لَا یُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ" میں لفظ صرف کے معنی "فرض بھی مراد لئے جاسکتے ہیں اور "نفل" بھی، نیز "توبہ" اور "شفاعت" بھی اس لفظ کے معنی ہوسکتے ہیں، اس طرح لفظ "عدل" کے معنی "نفل" بھی مراد لئے جاسکتے ہیں اور "فرض" بھی، نیز "فدیہ" اور بعض حضرات کے قول کے مطابق "شفاعت" یا "توبہ" بھی اس لفظ کے معنی ہوسکتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے اس صحیفہ میں سے آنحضرت ﷺ کا لکھوایا ہوا دوسرا حکم یہ بیان کیا کہ مسلمانوں کا امان ایک شئے واحد کی مانند ہے کہ اس کا تعلق ملت کے ہر فرد سے ہوسکتا ہے خواہ وہ برتر ہو یا کمتر، مثلاً جس طرح کسی اعلیٰ حیثیت کے مسلمان کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ کسی کو عہد امان سے اسی طرح کسی ادنیٰ ترین مسلمان کو بھی عہد امان دینے کا اختیار حاصل ہے اور اس کے عہد امان کا لحاظ کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، گویا اس حکم کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمانوں میں سے اگر کوئی بھی شخص خواہ وہ کتنا ہی حقیر و کمتر ہو (جیسے غلام وغیرہ) کسی غیر مسلم کو امان دے اور اس سے اس کی جان و مال کی حفاظت کا عہد کرے، اس کو اپنی پناہ میں لے لے تو اس کے عہد کو توڑنا کسی دوسرے مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے عہد امان کو پامال کرے گا بایں طور کہ اس کے زیر امان غیر مسلم کی جان و مال کو نقصان پہنچائے تو وہ خدا کی، فرشتوں کی اور تمام مسلمانوں کی لعنت کے مستحق ہوگا۔

حضرت علیؓ نے اس صحیفہ کا ایک حکم یہ بھی بیان کیا کہ جو شخص اپنے ساتھیوں اور دوستوں کی اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں سے سلسلہ موالات یعنی رابطہ دوستی قائم کرے وہ بھی لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔! اس ضمن میں کچھ تفصیل ہے اس کو جان لینا چاہئے، "ولاء" کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم تو "ولاء موالات" ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً اہل عرب کا یہ معمول تھا کہ کچھ لوگ آپس میں دوستی کا رشتہ قائم کر کے یہ عہد کرتے اور قسم کھاتے تھے کہ ہم دوسرے کے بھلے برے میں شریک رہیں گے، زندگی کے ہر مرحلہ پر ہر ایک دوسرے کا مدد و معاون رہے گا، آپس میں ایک دوسرے کے دوست سے دوستی رکھیں گے اور دشمن کو دشمن سمجھیں گے۔! اسی کو "ولاء موالات" کہتے ہیں۔ ایام جاہلیت میں تو آپس کے عہد و پیمان کا تعلق صحیح و غلط، حق و ناحق، ہر معاملہ سے ہوتا تھا، ایک شخص چاہے حق پر ہو چاہے ناحق پر، اس کے دوسرے ساتھی اس کی مدد ہر حال میں کرتے تھے۔ لیکن جب اسلام کی روشنی نے عہد جاہلیت کی ظلمت کو ختم کیا تو مسلمانوں نے اس میں اتنی ترمیم کی کہ ان کا ایک دوسرں کے ساتھ تعاون و اشتراک صرف صحیح اور حق معاملہ تک محدود رہتا لیکن اس کے باوجود یہ معمول جاری رہا یہاں تک کہ اکثر اہل عجم، عرب میں آکر صحابہؓ سے اس کا سلسلہ قائم کرتے تھے۔

دوسری قسم "ولاء عتاقت" ہے اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے کسی غلام کو آزاد کرتا ہے تو اس غلام پر یہ حق ولاء ثابت ہوجاتا ہے کہ اس کے عصبہ (بیٹا پوتا وغیرہ) نہ ہونے کی صورت میں وہ آزاد کرنے والا اس کا وارث بن جاتا ہے لہٰذا ذوی الفروض (باپ دادا وغیرہ) سے جو کچھ بچتا ہے وہ اس کا مالک ہوتا ہے۔"

اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر اب سمجھئے کہ حدیث میں مذکورہ "موالات" سے ولاء کی پہلی قسم بھی مراد ہوسکتی ہے، اس صورت میں اس حکم کے معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص کے موالی یعنی مذکورہ بالا عہد و پیمان کے مطابق دوست اور رفقاء ہوں تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے ان دوستوں کی اجازت کے بغیر کسی اور جماعت کو اپنا موالی (دوست) نہ بنائے کیونکہ اس کی وجہ سے ایک طرح کی عہد شکنی بھی ہوتی ہے اور مسلمانوں کو قلبی اذیت اور روحانی تکلیف میں مبتلا کرنا بھی ہوتا ہے جو کسی مسلمان کے لئے قطعاً مناسب نہیں ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے

کہ "موالات" سے ولاء کی دوسری قسم مراد ہو، اس کے پیش نظر معنی یہ ہوں گے کہ جو شخص اپنی آزادی کی نسبت آزاد کرنے والے کی بجائے کسی دوسرے کی طرف کرے تو وہ مستحق لعنت ہوتا ہے جیسا کہ اپنے باپ کی بجائے کسی غیر کی طرف اپنی نسبت کرنے والا شخص مستحق لعنت ہوتا ہے اس صورت میں "بغیر اذن موالیہ" کی قید اکثر کے اعتبار سے ہوگی کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر آزادی یافتہ غلام اپنے مالک سے اس بات کی اجازت چاہتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کی نسبت اس کی بجائے کسی دوسرے کی طرف کرے تو وہ اس کی اجازت نہیں دیتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر مالک اجازت دے دے تو پھر غیر مالک کی طرف نسبت کرنا درست ہو جائے گا کیونکہ پھر یہ جھوٹ کی صورت بن جائے گی جو ویسے بھی جائز نہیں ہے۔

شیعوں کے قول کی تردید: شیعہ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے ایک وصیت نامہ مرتب کرایا تھا، جس میں جہاں اور بہت سی خاص باتیں تھیں وہیں حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ اول مقرر کرنے کی ہدایت بھی تھی۔ اس وصیت نامہ کا علم اہل بیت میں سے چند مخصوص افراد (مثلاً حضرت علیؓ و حضرت فاطمہؓ وغیرہ) کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا، ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات کا یہ قول اختراع سے زیادہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ مذکورہ بالا حدیث اس قول کی تردید میں مضبوط دلیل ہے، چنانچہ حضرت علیؓ خود وضاحت کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے قرآن کریم اور صحیفہ مذکورہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں لکھی ہے۔

آخر میں ایک بات یہ بھی جان لیجئے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ علم کی باتوں کو لکھنا اور مرتب کرنا مستحب ہے، جو ایک عظیم الشان خدمت بھی ہے اور اجر و ثواب کا باعث بھی۔

مدینہ میں رہنا دنیا و عقبیٰ کی بھلائی ہے

(۲) وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي اُحَرِّمُ مَابَيْنَ لَابَتَيِ الْمَدِيْنَةِ اَنْ يُقْطَعَ عِضَاهُهَا اَوْ يُقْتَلَ صَيْدُهَا وَقَالَ الْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ لَا يَدَعُهَا اَحَدٌ رَغْبَةً عَنْهَا اِلَّا اَبْدَلَ اللّٰهُ فِيْهَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنْهُ وَلَا يَثْبُتُ اَحَدٌ عَلٰى لَاْوَائِهَا وَجَهْدِهَا اِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيْعًا اَوْ شَهِيْدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے کناروں کے درمیان کو حرام (باعظمت) قرار دیتا ہوں، لہٰذا نہ تو اس زمین کے (جو، ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ہے) خاردار درخت کاٹے جائیں اور نہ اس میں شکار مارا جائے (حنفیہ کے نزدیک یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے) مدینہ ان (لوگوں) کے لئے (جو مدینہ میں رہتے ہیں) بہتر ہے (یعنی مدینہ کا قیام دنیا و عقبیٰ کی بھلائی کا ضامن ہے) بشرطیکہ وہ (اس کی بھلائی و بہتری کو) جانیں تو اس شہر کی اقامت کو ترک نہ کریں اور دنیا کے آرام و راحت کے لئے اس کو چھوڑ کر اور کہیں نہ جائیں جو بھی شخص بے رغبتی کے ساتھ (یعنی بلا ضرورت) اس شہر کو چھوڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ کسی دوسرے ایسے شخص کو مقیم کر دے گا جو اس سے بہتر ہوگا (یعنی بے رغبتی کے ساتھ مدینہ کو چھوڑنا مدینہ کے لئے نقصان دہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے مفید ہی ہوگا کہ اس شخص کی جگہ کوئی اس سے بہتر شخص آکر مقیم ہوگا کہ ضرورت و مجبوری کے تحت مدینہ کو چھوڑنا اس حکم میں داخل نہیں) اور جو بھی شخص مدینہ میں سختیوں اور بھوک پر ثابت قدم رہے گا (یعنی وہاں کی ہر تنگی و پریشانی پر صبر کرے گا) تو میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا یا یہ فرمایا کہ میں اس (کی اطاعت) کا گواہ بنوں گا۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں جہاں مدینہ کے رہنے والوں کے لئے خاتمہ بخیر کی سعادت عظمیٰ کی بشارت ہے وہیں یہ تنبیہ بھی ہے کہ مؤمن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حرمین شریفین (یعنی مکہ مکرم و مدینہ منورہ) کی سکونت پر اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت پر شکر بھی کرتا ہے اور وہاں کی ہر سختی و مصیبت پر صابر بھی رہے، نیز یہ کہ وہ ان مقدس شہروں کی بھلائی سے صرف نظر کر کے دوسری جگہوں کی ظاہری نعمت اور راحت و آرام پر نظر نہ رکھے کیونکہ اصل نعمت اور اصل راحت تو آخرت کی نعمت اور وہاں کی راحت ہے جیسا کہ یہ حدیث ہے:

اَللّٰھُمَّ لَاعَیْشَ اِلَّاعَیْشُ الْاٰخِرَۃِ۔

"اے اللہ! آخرت کی راحت و آرام کے علاوہ اور کوئی راحت و آرام نہیں ہے۔"

مدینہ میں تکلیف و مصیبت کے وقت صبر کرنیوالے کا اجر

(۳) وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَصْبِرُ عَلٰی لَاْوَاءِ الْمَدِیْنَۃِ وَشِدَّتِھَا اَحَدٌ مِنْ اُمَّتِی اِلَّا کُنْتُ لَہٗ شَفِیْعًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میری اُمت میں کا جو بھی شخص مدینہ میں سختی و بھوک پر اور وہاں کی کسی بھی تکلیف و مشقت پر صبر کرے گا میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا۔" (مسلمؒ)

مدینہ کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعا

(۴) وَعَنْہُ قَالَ کَانَ النَّاسُ اِذَا رَأَوْا اَوَّلَ الثَّمَرَۃِ جَاءُوْا بِہٖ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِذَا اَخَذَہٗ قَالَ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِی ثَمَرِنَا وَ بَارِکْ لَنَا فِی مَدِیْنَتِنَا وَ بَارِکْ لَنَا فِی صَاعِنَا وَ بَارِکْ لَنَا فِی مُدِّنَا اَللّٰھُمَّ اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ عَبْدُکَ وَخَلِیْلُکَ وَنَبِیُّکَ وَاِنِّی عَبْدُکَ وَنَبِیُّکَ وَاِنَّہٗ دَعَاکَ لِمَکَّۃَ وَاَنَا اَدْعُوْکَ لِلْمَدِیْنَۃِ بِمِثْلِ مَا دَعَاکَ لِمَکَّۃَ وَمِثْلِہٖ مَعَہٗ ثُمَّ قَالَ یَدْعُوْ اَصْغَرَ وَلِیْدٍ لَہٗ فَیُعْطِیْہِ ذٰلِکَ الثَّمَرَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کا معمول تھا کہ جب وہ کوئی نیا پھل دیکھتے تو اس کو رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لاتے اور جب آپ ﷺ اس پھل کو لیتے تو فرماتے "اے اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما، ہمارے شہر میں برکت عطا فرما، ہمارے صاع میں برکت عطا فرما (صاع ایک پیمانہ کا نام تھا) ہمارے مد میں برکت عطا فرما (مد بھی ایک پیمانہ کا نام تھا) اور اے اللہ! ابراہیمؑ تیرے بندہ تھے، تیرے خاص دوست تھے اور تیرے نبی تھے، اور میں بھی تیرا بندہ ہوں اور تیرا نبی ہوں، ابراہیمؑ نے تجھ سے مکہ کے لئے دعا مانگی تھی (جو اس آیت فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ الخ میں مذکور ہے) اور میں بھی تجھ سے مدینہ کے لئے دعا مانگتا ہوں اسی طرح کی دعا جو ابراہیمؑ نے مکہ کے لئے مانگی تھی بلکہ اس کی مانند اور بھی دعا (یعنی ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی تھی میں نہ صرف اسی طرح کی دعا بلکہ اس سے بھی دو چند دعا مانگتا ہوں) پھر ابوہریرہؓ نے کہا کہ "اس کے بعد آنحضرت ﷺ اپنے خاندان کے سب سے چھوٹے بچے کو بلاتے اور اس کو وہ پھل عنایت فرماتے (تاکہ وہ بچہ خوش ہو جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "برکت" کے معنی ہیں "زیادہ ہونا" لہٰذا پھل میں برکت کی دعا مانگنے کا مطلب تو ظاہر ہی ہے، البتہ شہر میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ شہر میں وسعت ہو، اس میں لوگ کثرت سے آباد ہوں اور اس کی تہذیبی و تمدنی حیثیت مثالی درجہ اختیار کرے چنانچہ آپ ﷺ کی دعا اس طرح قبول ہوئی کہ شہر کا رقبہ بڑھا، اس کی آبادی بڑھی، مسجد نبوی ﷺ کی بھی توسیع ہوئی، اور دور دور سے آکر مسلمان کثیر تعداد میں یہاں آباد ہوئے اور اس کے علاوہ یہ شہر اپنی تہذیبی و تمدنی حیثیت سے بھی مثالی درجہ پر پہنچا۔! صاع اور مد میں برکت سے مراد یہ ہے کہ رزق میں فراخی ہو۔

حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں اور آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے حبیب۔! اس کے باوجود کہ خلیل سے حبیب کا مرتبہ بڑا ہے آپ ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس صفت کو ذکر کیا مگر بسبب تواضع و انکسار اپنی صفت کو ذکر نہیں کیا اپنے کو صرف اللہ کا بندہ اور اس کا نبی کہنے پر اکتفاء فرمایا۔

مدینہ کی حرمت کا ذکر

(۵) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ حَرَّمَ مَکَّۃَ فَجَعَلَھَا حَرَامًا وَاِنِّی حَرَّمْتُ الْمَدِیْنَۃَ

حَرَامًامَابَیْنَ مَازَمَیْهَا اَنْ لَا یُهْرَاقَ فِیْهَادَمٌ وَلَا یُحْمَلَ فِیْهَاسِلَاحٌ لِقِتَالٍ وَلَا تُخْبَطَ فِیْهَا شَجَرَۃٌ اِلَّا لِعَلَفٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعیدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "حضرت ابراہیمؑ نے مکّہ کو بزرگی دی اور اس کو حرم قرار دیا (یعنی انہوں نے مکّہ کی بزرگی اور حرمت کو ظاہر کیا) اور میں نے مدینہ کو بزرگی دی ہے اور مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان کی بزرگی (کا تقاضا) یہ ہے کہ نہ تو اس میں خونریزی کی جائے نہ وہاں جنگ کے لئے ہتھیار اٹھایا جائے، اور نہ اس (کے درخت) کے پتے جھڑے جائیں البتہ جانوروں کے کھانے کے لئے جھاڑے جاسکتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: علامہ تورپشتیؒ کہتے ہیں کہ "حدیث کے الفاظ وانی حرمت المدینۃ میں تحریم سے مراد تعظیم ہے (جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے) اس سے وہ احکام مراد نہیں جو حرم سے متعلق ہیں (یعنی شکار وغیرہ کا حرام ہونا) چنانچہ اس بات کی دلیل خود آنحضرت ﷺ کا یہ رشاد ہے کہ "اور نہ اس کے (درخت کے) پتے جھاڑے جائیں البتہ جانوروں کے کھانے کے لئے جھاڑے جاسکتے ہیں۔" (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حرم مکّہ کا جو حکم ہے وہ حرم مدینہ کا نہیں ہے) کیونکہ مکّہ کے جو درخت ہیں ان کے پتے جھاڑنے کسی حالت میں بھی درست نہیں ہیں، جہاں تک شکار کا تعلّق ہے تو اگرچہ بعض صحابہؓ نے مدینہ میں شکار مارنے کو حرام کہا ہے لیکن اکثر صحابہؓ نے مدینہ کے پرندوں کے شکار کا انکار (یعنی اس سے منع) نہیں کیا ہے نیز اس بارہ میں آنحضرت ﷺ کی کوئی ممانعت کسی ایسے طریق سے ہم تک نہیں پہنچی ہے جس پر اعتماد کیا جاسکے۔" یہ علامہ تورپشتیؒ کا اقتباس ہے اس بارہ میں ملا علی قاریؒ نے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، اہل علم ان کی شرح سے مراجعت کرسکتے ہیں۔

سعد بن وقاصؓ کا ایک واقعہ

(۶) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ اَنَّ سَعْدًا رَکِبَ اِلٰی قَصْرِہٖ بِالْعَقِیْقِ فَوَجَدَ عَبْدًا یَقْطَعُ شَجَرًا اَوْیَخْبِطُهٗ فَسَلَبَهٗ فَلَمَّا رَجَعَ سَعْدٌ جَاءَہٗ اَهْلُ الْعَبْدِ فَکَلَّمُوْہُ اَنْ یَرُدَّ عَلٰی غُلَامِهِمْ اَوْعَلَیْهِمْ مَا اَخَذَ مِنْ غُلَامِهِمْ فَقَالَ مَعَاذَاللّٰهِ اَنْ اَرُدَّ شَیْئًا نَفَّلَنِیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَبٰی اَنْ یَّرُدَّ عَلَیْهِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عامرؒ ابن سعد (کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت سعد ابن وقاصؓ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ایک جلیل القدر صحابی ہیں) اپنی حویلی کی طرف جو (مدینہ کے قریب) مقام عقیق میں تھی، سوار ہو کر چلے تو (راستہ میں) انہوں نے ایک غلام کو دیکھا جو ایک درخت کاٹ رہا تھا یا اس درخت کے پتے جھاڑ رہا تھا، حضرت سعدؓ نے (بطور سزا و تنبیہ) اس غلام کے کپڑے چھین لئے، پھر جب وہ (مدینہ) واپس آئے تو غلام کے مالک ان کی خدمت میں آئے اور یہ گفتگو کی کہ انہوں نے جو چیز ان کے غلام سے لی ہے (یعنی اس کے کپڑے اسے وہ غلام کو واپس کردیں یا ان (مالکوں) کو دے دیں۔" حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ "خدا کی پناہ میں اس چیز کو کیسے واپس کرسکتا ہوں جو مجھے رسول اللہ ﷺ نے دلوائی ہے۔" چنانچہ سعدؓ نے کپڑے واپس کرنے سے بالکل انکار کردیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: ان یرد علی غلامهم اَوْعَلَیْهِمْ میں حرف "أَو" راوی کے شک کو ظاہر کررہا ہے کہ ان کے مالکوں نے یا تو یہ کہا تھا کہ غلام کے کپڑے غلام کو واپس کردیں، یا اس کے بجائے یہ کہا تھا کہ جو کپڑے ہمارے غلام سے لئے ہیں وہ ہمیں دے دیں۔ حدیث کے اس جملہ "جو مجھے رسول اللہ ﷺ نے دلوائی ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس بات کی اجازت دی تھی کہ جو شخص کسی کو مدینہ میں شکار مارتے یا درخت کاٹتے دیکھے تو وہ اس کے کپڑے ضبط کرلے، لہٰذا کہا جائے گا کہ یا تو یہ حدیث منسوخ ہے یا پھر یہ کہ آپ ﷺ کی طرف سے یہ اجازت زجر و تنبیہ کے طور پر دی گئی تھی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ مدینہ میں شکار مارنے یا درخت کاٹنے کی وجہ سے بدلہ (کفارہ) واجب نہیں ہوتا بلکہ مدینہ میں یہ چیزیں بغیر بدلہ کے حرام ہیں، جب کہ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ جس طرح مکّہ میں ان

چیزوں کے ارتکاب سے بدلہ واجب ہوتا ہے اسی طرح مدینہ میں بھی ان کی وجہ سے بدلہ واجب ہوتا ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مدینہ میں یہ چیزیں حرام نہیں ہیں البتہ مکروہ ہیں۔

مدینہ کی آب وہوا کی اصلاح کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعا

(۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وُعِكَ اَبُوْبَكْرٍ وَبِلَالٌ فَجِئْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرْتُهُ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ اِلَيْنَا الْمَدِيْنَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ اَوْ اَشَدَّ وَصَحِّحْهَا وَبَارِكْ لَنَا فِيْ صَاعِهَا وَ مُدِّهَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا فَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (اور صحابہ) جب (مکہ سے ہجرت کرکے) مدینہ آئے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ بخار میں مبتلا ہوگئے، چنانچہ میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ ﷺ کو (ان کی بیماری کی) خبردی، آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی "اے اللہ! تو مدینہ کو ہمارا محبوب بنادے جس طرح تو نے مکّہ کو ہمارا محبوب بنایا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ، اور مدینہ کی آب وہوا درست فرمادے اور مدینہ کے صاع ومد میں ہمارے لئے برکت عطافرما، نیز مدینہ کے بخار کو (یعنی بخار کی کثرت ووباء کو) یہاں سے نکال کر جحفہ میں منتقل کردے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: منقول ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ شدت بخار میں مبتلا ہوئے اور حضرت عائشہؓ نے ان کی مزاج پرسی کی تو اس وقت وہ مکہ اور وہاں کی آب وہوا، وہاں کے مکانات اور پہاڑوں کی صحت افزاء فضاؤں وغیرہ کا باآواز بلند ذکر کرنے لگے، چنانچہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ سے یہ حال ذکر کیا تو آپ ﷺ نے مذکورہ بالا دعا فرمائی۔

"جحفہ" ایک مقام کا نام ہے جو مکّہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے، اس مقام پر یہودی آباد تھے، یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے کفار کے لئے مہلک امراض اور ان کے شہروں کی خرابی کی بددعا کرنا جائز ہے، چنانچہ اس حدیث کے علاوہ ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ مدینہ میں آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے بیماری اور وباؤں کی کثرت تھی آپ ﷺ نے ان وباؤں کو (اللہ تعالیٰ سے دعا کے ذریعہ) کفار کے علاقوں میں بھیج دیا۔

آپ ﷺ کا ایک خواب اور اس کی تعبیر

(۸) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فِيْ رُؤْيَا النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَدِيْنَةِ رَأَيْتُ امْرَأَةً سَوْدَاءَ ثَائِرَةَ الرَّأْسِ خَرَجَتْ مِنَ الْمَدِيْنَةِ حَتّٰى نَزَلَتْ مَهْيَعَةَ فَتَأَوَّلْتُهَا اَنَّ وَبَاءَ الْمَدِيْنَةِ نُقِلَ اِلٰى مَهْيَعَةَ وَهِيَ الْجُحْفَةُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ مدینہ سے متعلق نبی کریم ﷺ کے خواب کے سلسلہ میں یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) "میں نے ایک کالی عورت کو دیکھا جس کے بال پراگندہ تھے وہ مدینہ سے نکلی اور مہیعہ چلی گئی۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے اس خواب کی تعبیر یہ لی کہ مدینہ کی وباء مہیعہ یعنی جحفہ کی طرف منتقل کردی گئی ہے۔" (بخاریؒ)

مدینہ کے کچھ لوگوں کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی ایک پیش گوئی

(۹) وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ اَبِيْ زُهَيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يُفْتَحُ الْيَمَنُ فَيَأْتِيْ قَوْمٌ يَبُسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِيْهِمْ وَمَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ وَيُفْتَحُ الشَّامُ فَيَأْتِيْ قَوْمٌ يَبُسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِيْهِمْ وَمَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ وَيُفْتَحُ الْعِرَاقُ فَيَأْتِيْ قَوْمٌ يَبُسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِيْهِمْ وَمَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سفیان ابن ابوزہیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا، رسول کریم ﷺ فرماتے تھے "جب یمن فتح ہو جائے گا تو ایک ایسا گروہ آئے گا جو آہستہ رو ہو گا (یعنی مدینہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو محنت و مشقت سے دور رہ کر دنیا کی راحت و آرام کے طالب ہوں گے) چنانچہ وہ لوگ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینہ سے چلے جائیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لئے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ (مدینہ کے بہتر ہونے کو) جانیں (تو مدینہ کو نہ چھوڑیں) جب شام فتح ہو گا تو ایک گروہ آئے گا جو آہستہ رو ہو گا چنانچہ وہ لوگ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینہ سے چلے جائیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لئے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ جانیں، اسی طرح جب عراق کو فتح کیا جائے گا تو ایک گروہ آئے گا جو آہستہ رو ہو گا چنانچہ وہ لوگ اپنے اہل و عیال کو لے کر مدینہ سے چلے جائیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لئے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ جانیں (تو مدینہ کو نہ چھوڑیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ آپ ﷺ نے مدینہ کے کچھ لوگوں کے بارے میں پیش گوئی فرمائی ہے کہ جب مذکورہ بالا ممالک مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو جائیں گے تو وہ لوگ مدینہ کی سخت کوش زندگی سے اکتا کر طلب معاش اور دنیا کے فانی فائدوں اور آسائشوں کی خاطر اس مقدس و بابرکت شہر کو چھوڑ کر ان ممالک میں جابسیں گے، حالانکہ ہر اعتبار سے مدینہ ہی ان کے لئے سب سے بہتر جگہ ہوگی، اگر وہ اس حقیقت کو جان لیں اور دنیا و آخرت کی سعادت و بھلائی ان کے پیش نظر رہے تو مدینہ کو نہ چھوڑیں۔

مدینہ برے آدمیوں کو نکال دیتا ہے

⑮ وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ بِقَرْیَةٍ تَاْكُلُ الْقُرٰی یَقُوْلُوْنَ یَثْرِبُ وَهِیَ الْمَدِیْنَةُ تَنْفِی النَّاسَ كَمَا یَنْفِی الْكِیْرُ خَبَثَ الْحَدِیْدِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مجھے ایک ایسی بستی کی طرف ہجرت کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں پر غالب رہتی ہے اور اس بستی کو لوگ یثرب کہتے ہیں اور (وہ مدینہ ہے جو برے آدمیوں کو اس طرح نکال دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکال دیتی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جو تمام بستیوں پر غالب رہتی ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مدینہ میں رہتے ہیں وہ دوسرے لوگوں پر غالب رہتے ہیں اور دوسرے شہروں کو فتح کرتے ہیں، چنانچہ تاریخی طور پر اس عظیم الشان شہر کی یہ خصوصیت ثابت ہے کہ مدینہ میں آکر بسنے والے دوسروں پر غالب اور بیشتر شہروں کے فاتح رہے ہیں، پہلے قوم عمالقہ آکر شہر میں آباد ہوئی اس نے غلبہ حاصل کیا اور کتنے ہی شہروں اور علاقوں کو فتح کیا، پھر یہود آئے تو وہ عمالقہ پر غالب ہوئے پھر انصار پہنچے تو انہوں نے یہودیوں پر اپنا اقتدار قائم کیا، یہاں تک کہ جب سرکار دوعالم ﷺ اور مہاجرین کرامؓ نے اس شہر کو اپنا مسکن بنایا تو ان کو جس طرح غلبہ حاصل ہوا اور جس طرح انہوں نے مشرق سے لے کر مغرب تک پورے عالم کو اپنے زیر اثر کیا وہ سامنے کی بات ہے۔

اس شہر کا نام پہلے یثرب اور اثرب تھا، جب رسول کریم ﷺ ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اس شہر کی مدنیت اور کثرت آبادی کے پیش نظر اس کا نام "مدینہ رکھا، نیز آپ ﷺ نے حکم دیا کہ آئندہ اس شہر کو یثرب نہ کہا جائے، کیونکہ اول تو یہ زمانہ اسلام سے قبل کا نام تھا جس سے عہد جاہلیت کی بو آتی تھی، دوسرے یہ کہ معنوی طور پر بھی یہ نام بالکل نامناسب تھا اس لئے کہ یثرب کے معنی ہیں "ہلاک و فساد" نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یثرب ایک بت یا ایک بہت بڑے ظالم شخص کا نام تھا۔

بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ یثرب کہے تو اسے چاہئے کہ وہ دس مرتبہ مدینہ کہے تاکہ اس (مقدس شہر کا ممنوع نام لینے کا تدارک اور اس کی تلافی ہو جائے، نیز ایک روایت یہ بھی ہے کہ "جو شخص یثرب کہے وہ استغفار کرے۔"

"برے آدمیوں) سے مرد اہل کفرو شرک ہیں، جو اسلام کا غلبہ ہو جانے کے بعد اس شہر سے نکال دیئے گئے تھے، چنانچہ کفار و مشرکین پر اس شہر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدینہ کا نام

(۱۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ سَمَّى الْمَدِيْنَةَ طَابَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا، رسول کریم ﷺ یہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام طابہ رکھا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام طابہ رکھا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے لسان مقدس کے ذریعہ مدینہ کا نام طابہ ظاہر فرمایا ہے، اور ایک روایت میں "طیبہ" ہے جس کے معنی ہیں "پاک و خوش" یعنی یہ شہر مقدس کفرو شرک کی نجاستوں سے پاک ہے، اس کی آب و ہوا طبائع سلیم کو موافق ہے اور یہاں کے رہنے والے خوش و خرم ہیں۔

مدینہ کی خصوصیت

(۱۲) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ اَعْرَابِيًّا بَايَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَصَابَ الْاَعْرَابِيَّ وَعْكٌ بِالْمَدِيْنَةِ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اَقِلْنِيْ بَيْعَتِيْ فَاَبٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ اَقِلْنِيْ بَيْعَتِيْ فَاَبٰى ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ اَقِلْنِيْ بَيْعَتِيْ فَاَبٰى فَخَرَجَ الْاَعْرَابِيُّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْمَدِيْنَةُ كَالْكِيْرِ تَنْفِيْ خَبَثَهَا وَتَنْصَعُ طَيِّبَهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابر ابن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے رسول کریم ﷺ (کی خدمت میں رہنے کی آپ ﷺ سے) بیعت کی، (کچھ ہی دنوں کے بعد) جب وہ مدینہ کے (شدید) بخار میں مبتلا ہوا (اور اس صورت میں اسے مدینہ میں رہنا گوارا نہ ہوا اور وہاں سے چلے جانے کا ارادہ کیا) تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ "اے محمد (ﷺ) میری بیعت فسخ کر دیجئے۔" مگر آپ ﷺ نے انکار کر دیا، وہ پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میری بیعت فسخ کر دیجئے! آپ ﷺ نے (اس مرتبہ بھی) انکار کر دیا، اس کے بعد وہ پھر آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میری بیعت فسخ کر دیجئے، آپ ﷺ نے پھر انکار کر دیا، چنانچہ وہ (آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر ہی) مدینہ سے بھاگ گیا، (جب آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مدینہ بھٹی کی مانند ہے جو اپنے میل کو دور کر دیتا ہے اور اپنے اچھے آدمی کو نکھار دیتا ہے (یعنی برے آدمی کو نکال باہر کرتا ہے اور پاک باطن و مخلص آدمی کو پلید ذہن اور بد طینت آدمی سے الگ کر دیتا ہے" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اس کی بیعت کو فسخ کرنے سے اس لئے انکار فرمایا کہ جس طرح اسلام کی بیعت کو فسخ کر دینا جائز نہیں تھا اسی طرح آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کی بیعت کو بھی فسخ کر دینے کی اجازت نہیں تھی۔

علماء لکھتے ہیں کہ مدینہ کی اس خاصیت یعنی برے آدمیوں کو نکال دینے اور اچھے آدمیوں کو خالص کر دینے کا تعلق یا تو آنحضرت ﷺ ہی کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا یا پھر آخر زمانہ میں قیامت کے قریب اس مقدس شہر کی یہ خاصیت ظاہر ہوگی کہ جب دجال نمودار ہوگا تو مدینہ کو تین مرتبہ ہلایا اور جھنجھوڑا جائے گا چنانچہ اس وقت مدینہ میں جتنے بھی برے لوگ ہوں گے (خواہ وہ کافر ہوں یا منافق) اس شہر سے نکل پڑیں گے اور دجال کے پاس پہنچ جائیں گے، نیز یہ احتمال بھی ہے کہ اس خاصیت کا تعلق ہر زمانہ کے ساتھ ہو۔

(۱۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَنْفِيَ الْمَدِيْنَةُ شِرَارَهَا كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ مدینہ اپنے شریر (یعنی برے) لوگوں کو اس طرح نہ نکال پھینکے گا جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکال پھینکتی ہے۔" (مسلمؒ)

مدینہ میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہوگا

⑭ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَنْقَابِ الْمَدِيْنَةِ مَلاَئِكَةٌ لاَ يَدْ خُلُهَا الطَّاعُوْنُ وَلاَ الدَّجَّالُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مدینہ کے راستوں یا اس کے دروازوں پر بطور نگہبان فرشتے متعین ہیں، نہ تو مدینہ میں طاعون کی بیماری داخل ہوگی نہ دجال داخل ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "طاعون" وبا کے علاوہ ایک خاص بیماری کو بھی کہتے ہیں چنانچہ یہاں حدیث میں اسی خاص بیماری کے بارہ میں فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت سے یہ بیماری مدینہ میں داخل نہیں ہوگی، گویا یہ آنحضرت ﷺ کا ایک صریح معجزہ ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب میں طاعون کا ترجمہ "وباء" ہی کیا ہے اور فرمایا ہے کہ مدینہ میں وباء کا داخل نہ ہونا یا تو دجال کے ظاہر ہونے کے وقت ہوگا یا یہ کہ اس کا تعلق ہر زمانہ سے ہے۔

⑮ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنْ بَلَدٍ اِلاَّ سَيَطَأُهُ الدَّجَّالُ اِلاَّ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةَ لَيْسَ نَقَبٌ مِنْ اَنْقَابِهَا اِلاَّ عَلَيْهِ الْمَلاَئِكَةُ صَافِّيْنَ يَحْرُسُوْنَهَا فَيَنْزِلُ السَّبِخَةَ فَتَرْجُفُ الْمَدِيْنَةُ بِاَهْلِهَا ثَلاَثَ رَجَفَاتٍ فَيَخْرُجُ اِلَيْهِ كُلُّ كَافِرٍ وَمُنَافِقٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مکہ اور مدینہ کے علاوہ ایسا کوئی شہر نہیں ہے جسے دجال نہ روندے گا اور مدینہ، یا مکہ اور مدینہ میں سے ہر ایک کے راستوں میں ایسا کوئی راستہ نہیں ہے جس پر صف باندھے ہوئے فرشتے نہ کھڑے ہوں جو اس شہر کی نگہبانی کرتے ہیں، چنانچہ (جب) دجال (مدینہ سے باہر) زمین شور میں نمودار ہوگا تو مدینہ اپنے باشندوں کے ساتھ (زلزلہ کی صورت میں) تین مرتبہ ہلے گا جس کے نتیجہ میں ہی کافر و منافق مدینہ سے نکل پڑے گا اور دجال کے پاس چلا جائے گا۔" (بخاری و مسلمؒ)

اہل مدینہ سے مکر و فریب کرنے والے کی سزا

⑯ وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لاَ يَكِيْدُ اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ اَحَدٌ اِلاَّ انْمَاعَ كَمَا يَنْمَاعُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص بھی مدینہ والوں سے مکر و فریب کرے گا، وہ اس طرح گھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: تاریخ اسلام کی بدنام ترین شخصیت یزید کا یہی حال ہوا کہ وہ واقعہ حرہ کے بعد دق اور سل کی بیماری میں گھل گھل کر مر گیا۔

مدینہ سے آنحضرت ﷺ کی محبت

⑰ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَنَظَرَ اِلٰى جُدُرَاتِ الْمَدِيْنَةِ اَوْضَعَ رَاحِلَتَهٗ وَاِنْ كَانَ عَلٰى دَابَّةٍ حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کسی سفر سے واپس ہوتے تو مدینہ منورہ کی دیواریں (یعنی اس کی عمارتیں) دیکھ کر اپنے

اونٹ کو دوڑانے لگتے اور اگر گھوڑے یا خچر پر سوار ہوتے تو اس کو تیز کر دیتے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ آپ ﷺ کو مدینہ سے محبت تھی۔" (بخاریؒ)

احد پہاڑ کی فضیلت

(۱۸) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ طَلَعَ لَهٗ اُحُدٌ فَقَالَ هٰذَا جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهٗ اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ حَرَّمَ مَکَّةَ وَاِنِّیْ اُحَرِّمُ مَابَیْنَ لَابَتَیْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی نظر مبارک جب احد پہاڑ پر پڑی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یہ پہاڑ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں (پھر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ) اے اللہ! حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کو حرام کیا (یعنی اس کے حرم ہونے کو ظاہر کیا) اور میں اس قطعہ زمین کو حرام کرتا ہوں (یعنی قابل تعظیم قرار دیتا ہوں) جو سنگسان مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان ہے۔"

(بخاری و مسلمؒ)

تشریح: "یہ پہاڑ ہم سے محبت رکھتا ہے۔" یہ جملہ بلاشک وشبہ اپنے ظاہری معنی ہی پر محمول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جمادات (یعنی پتھروں وغیرہ) میں بھی ان کے حسب حال علم و فہم اور محبت وعداوت، خاص طور سے انبیاء واولیاء اور بالاخص حضرت سید الانبیاء ﷺ کی محبت پیدا کی ہے، نیز یہ کہ پروردگار عالم جس کو دوست رکھتا ہے اس کو تمام چیزیں دوست رکھتی ہیں کیونکہ ہر چیز پروردگار کی مخلوق اور اس کی تابعدار ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی مفارقت کی وجہ سے کھجور کے تنے کے رونے کا واقعہ اس دعوی کی صریح دلیل ہے۔

وانی احرم مابین لابتیھا کا مطلب جیسا کہ ترجمہ میں بھی ظاہر کیا گیا، یہ ہے کہ میں اس قطعہ زمین کو جس میں مدینہ بھی ہے بزرگ قدر اور قابل تعظیم قرار دیتا ہوں، اس جملہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ مکہ کی طرح مدینہ اور اس کے اطراف کی زمین بھی بایں معنی حرم ہے کہ اس کا درخت کاٹنا اور اس میں شکار وغیرہ حرام ہے۔

(۱۹) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُحُدٌ جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت سہل بن سعدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "احد پہاڑ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔"

(بخاریؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حرم مدینہ کا مسئلہ

(۲۰) عَنْ سُلَیْمَانَ بْنِ اَبِیْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ رَاَیْتُ سَعْدَ بْنَ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَخَذَ رَجُلًا یَصِیْدُ فِیْ حَرَمِ الْمَدِیْنَةِ الَّذِیْ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَسَلَبَهٗ ثِیَابَهٗ فَجَاءَ مَوَالِیْهِ فَکَلَّمُوْهُ فِیْهِ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَرَّمَ هٰذَا الْحَرَمَ وَقَالَ مَنْ اَخَذَ اَحَدًا یَصِیْدُ فِیْهِ فَلْیَسْلُبْهُ فَلَا اَرُدُّ عَلَیْکُمْ طُعْمَةً اَطْعَمَنِیْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَلٰکِنْ اِنْ شِئْتُمْ دَفَعْتُ اِلَیْکُمْ ثَمَنَهٗ۔ (رواه ابوداؤد)

"حضرت سلیمان بن ابو عبداللہ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک شخص کو پکڑا جو اس حرم مدینہ (یعنی مدینہ کے اطراف) میں شکار مار رہا تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے حرام (یعنی قابل تعظیم) قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت سعدؓ نے اس شخص کے کپڑے (زجر و تنبیہ کے طور پر) چھین لئے، پھر اس شخص کے مالک آئے اور حضرت سعدؓ سے اس کے بارہ میں گفتگو کی، حضرت سعدؓ نے ان سے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے اس حرم کو حرام قرار دیا ہے، نیز آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ایسے آدمی کو پکڑے جو اس میں

شکار مار رہا ہو تو وہ اس کا سامان چھین لے" لہٰذا جو چیز رسول اللہ ﷺ نے مجھے دلوائی ہے (یعنی جو چیز میں نے آپ ﷺ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے حاصل کی ہے) وہ تو میں (کسی حال میں بھی) واپس نہیں کروں گا، ہاں اگر تم چاہو تو میں اس کی قیمت (ازراہ مروت و احسان) تمہیں دے دوں۔" (ابوداؤد)

(۲۱) وَعَنْ صَالِحٍ مَوْلًى لِسَعْدٍ اَنَّ سَعْدًا وَجَدَ عَبِيْدًا مِنْ عَبِيْدِ الْمَدِيْنَةِ يَقْطَعُوْنَ مِنْ شَجَرَةِ الْمَدِيْنَةِ فَاَخَذَمَتَاعَهُمْ وَقَالَ يَعْنِي لِمَوَالِيْهِمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى اَنْ يُّقْطَعَ مِنْ شَجَرِ الْمَدِيْنَةِ شَيْءٌ وَقَالَ مَنْ قَطَعَ مِنْهُ شَيْئًا فَلِمَنْ اَخَذَهُ سَلَبُهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت سعدؓ کے آزاد کردہ غلام صالح کہتے ہیں کہ حضرت سعدؓ نے مدینہ کے غلاموں میں سے کچھ غلاموں کو مدینہ کا درخت کاٹتے ہوئے پایا تو انہوں نے ان کے اسباب ضبط کر لئے اور پھر ان کے مالکوں سے فرمایا کہ میں نے خود سنا ہے، رسول کریم ﷺ نے مدینہ کے درخت کا کوئی بھی حصہ کاٹنے سے منع فرمایا ہے، نیز آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مدینہ کے درخت کا کچھ بھی حصہ کاٹے تو اس کا اسباب اس شخص کے لئے ہے جو اس کو پکڑے۔" (ابوداؤد)

تشریح: عن صالح مولی لسعد (حضرت سعدؓ کے آزاد کردہ غلام صالح کہتے ہیں) کے بجائے صحیح یوں ہے عن صالح عن مولی لسعد (صالح حضرت سعدؓ کے آزادہ غلام سے روایت کرتے ہیں) گویا "مولی لسعد" سے پہلے لفظ "عن" یا تو کاتب کی غلطی سے نہیں لکھا گیا، یا پھر اس بارہ میں خود مصنف کو سہو ہوا ہے کیونکہ صالح حضرت سعدؓ کے آزاد کردہ غلام نہیں بلکہ توامہ کے آزاد کردہ غلام ہیں اور صالح نے یہ روایت حضرت سعدؓ کے آزاد کردہ غلام سے نقل کی ہے۔

وج میں شکار وغیرہ کی ممانعت؟

(۲۲) وَعَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ صَيْدَ وَجٍّ وَعِضَاهَهُ حِرْمٌ مُحَرَّمٌ لِلّٰهِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَقَالَ مُحْيِ السُّنَّةِ وَجٌّ ذَكَرُوْا اَنَّهَامِنْ نَاحِيَةِ الطَّائِفِ وَقَالَ الْخَطَّابِيُّ اَنَّهُ بَدَلَ اَنَّهَا۔

"اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وج کا شکار اور اس کے خاردار درخت حرام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لئے (یعنی اللہ تعالیٰ کے بموجب) حرام کئے گئے (یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں یعنی غازیوں کی وجہ سے حرام کئے گئے ہیں۔" (ابوداؤد)

امام محی السنہ فرماتے ہیں کہ "وج" کے بارہ میں علماء نے لکھا ہے کہ یہ یعنی وج طائف کے کنارے ایک مقام ہے، نیز خطابیؒ نے انہامن ناحیۃ الطائف میں انہا کی بجائے انہ لکھا ہے۔

تشریح: علماء لکھتے ہیں کہ مقام وج میں شکار وغیرہ کی حرمت حمی کے طور پر تھی (حمی اس چراگاہ کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کے جانور کو چرانے کی ممانعت ہو) چنانچہ مقام وج میں چونکہ غازیوں کے گھوڑوں کے لئے گھاس وغیرہ روکی جاتی تھی اس لئے اس مقام میں شکار کے لئے جانا یا اس کے درخت وغیرہ کاٹنا ممنوع تھا، حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مقام وج کی مذکورہ بالا حرمت، حرم کے طور پر تھی، اور اگر یہ حرمت حرم ہی کے طور پر تھی تو پھر کہا جائے گا کہ اس حرمت کا تعلق ایک مخصوص زمانہ کے ساتھ تھا جو بعد میں منسوخ ہو گئی تھی۔

امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ مقام وج میں نہ تو شکار کیا جائے نہ وہاں کے درخت وغیرہ کاٹے جائیں تاہم انہوں نے اس میں ضمان (یعنی بطور جزاء و کفارہ کسی چیز کا واجب ہونا) ذکر نہیں کیا ہے۔

مدینہ میں مرنے کی سعادت

(۲۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَّمُوْتَ بِالْمَدِيْنَةِ فَلْيَمُتْ بِهَا فَاِنِّي

اَشْفَعُ لِمَنْ یَمُوْتُ بِھَا۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ اِسْنَادًا۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص مدینہ میں مرسکتا ہو اسے مدینہ ہی میں مرنا چاہئے کیونکہ جو شخص مدینہ میں مرے گا میں اس کی شفاعت کروں گا۔" (احمد، ترمذی)

امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے حسن صحیح غریب ہے۔

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس بات پر قادر ہو کہ مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رہ سکے، تو اسے چاہئے کہ وہ مدینہ ہی میں رہے تا آنکہ اس کی موت اسی مقدس شہر میں واقع ہو اور میں اس کی شفاعت کروں بایں طور کہ اگر وہ گنہ گار ہوگا تو میں اسے بخشواؤں گا اور اگر نیکوکار ہوگا تو اس کے درجات بلند کراؤں گا۔

واضح رہے کہ یہاں شفاعت سے مراد وہ خاص شفاعت ہے جو صرف مدینہ میں رہنے والوں ہی کو حاصل ہوگی اور کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوگی، البتہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت عام ہر مسلمان کے لئے ہوگی۔ لہٰذا افضل یہ ہے کہ جس کی عمر زیادہ ہو جائے یا کشف وغیرہ کے ذریعہ اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی موت کا وقت قریب آگیا ہے تو وہ مدینہ منورہ میں جا رہے تاکہ وہاں مرنے کی وجہ سے وہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت خاص کی اس سعادت عظیم کا حق دار ہو جائے، حضرت عمرؓ کی دعا کیا خوب ہے:

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ بِبَلَدِ رَسُوْلِكَ۔

"اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت نصیب کر اور اپنے رسول ﷺ کے شہر میں مجھے موت دے۔"

دعا ہے کہ رب کریم ہم جیسے بے زر و بے پر کو بھی یہ دولت نصیب کرے۔ آمین

قرب قیامت میں مدینہ سب سے آخر میں ویران ہوگا

(۲۴) وعن اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اٰخِرُ قَرْیَۃٍ مِّنْ قُرَی الْاِسْلَامِ خَرَابًا نِ الْمَدِیْنَۃُ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ "ویران و اجاڑ ہونے والے اسلامی شہروں میں سب سے آخری نمبر مدینہ کا ہوگا امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب قیامت قریب ہوگی تو تمام آبادیاں اور شہر ویران و اجاڑ ہو جائیں گے اور ان میں مدینہ سب سے آخر میں ویران و اجاڑ ہوگا۔ گویا مدینہ کو یہ برکت آنحضرت ﷺ کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے لئے مدینہ کا تعین

(۲۵) وعن جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اَوْحٰی اِلَیَّ اَیَّ ھٰؤُلَاءِ الثَّلَاثَۃِ نَزَلْتَ فَھِیَ دَارُ ھِجْرَتِكَ الْمَدِیْنَۃِ اَوِ الْبَحْرَیْنِ اَوْ قِنَّسْرِیْنَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جریر بن عبداللہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے مطلع فرمایا کہ آپ ﷺ ان تین شہروں (۱) مدینہ (۲) بحرین (۳) قنسرین۔ میں سے جس شہر (رہنے کے لئے) اتریں گے وہی آپ ﷺ کے لئے دار الہجرت (ہجرت کا مکان) ہوگا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "بحرین" موجودہ جغرافیائی نقشہ کے مطابق ان متعدد جزیروں کے مجموعہ کا نام ہے جو خلیج عربی کے جنوب مغربی گوشے میں

واقع ہیں، ان جزیروں میں سب سے بڑا جزیرہ، جزیرہ منامہ ہے جس کا دوسرا نام بحرین بھی ہے اسی جزیرہ کے نام پر پورے ملک کو بحرین کہتے ہیں۔! لیکن حدیث شریف اور تاریخ کی کتابوں میں "بحرین" کا لفظ اس علاقہ کے متعلق آیا ہے جو جزیرہ العرب کے مشرقی ساحل پر خلیج بصرہ سے قطر اور عمان تک پھیلا ہوا ہے اور موجودہ بحرین کے مغرب میں واقع ہے۔ اس علاقہ کو اب "احساء" کہا جاتا ہے، لہٰذا یہاں حدیث میں بھی "بحرین" سے مراد وہی علاقہ ہے جس کا نام اب "احساء" ہے۔

"قنسرین" ملک شام کے ایک شہر کا نام ہے۔! بہرکیف آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا تھا کہ ان تین شہروں میں جس شہر کے بارہ میں آپ کی خواہش ہو مکہ سے ہجرت کر کے وہاں چلے جائیے اور اسی شہر کو اپنا مسکن قرار دیجئے۔! لیکن تاریخ مدینہ میں یہ لکھا ہے کہ اگرچہ شروع میں آنحضرت ﷺ کو ان تین شہروں میں سے کسی بھی ایک شہر میں رہنے کا اختیار دیا گیا تھا مگر آخر میں مدینہ ہی کو متعین کر دیا گیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

دجال سے مدینہ کی حفاظت

(۲۶) عَنْ اَبِی بَكْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْمَدِيْنَةَ رُعْبُ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ لَهَا يَوْمَئِذٍ سَبْعَةُ اَبْوَابٍ عَلٰى كُلِّ بَابٍ مَلَكَانِ۔ (رواه البخاری)

"حضرت ابوبکرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں، کہ آپ نے فرمایا "مدینہ میں کانے دجال کا خوف (بھی) داخل نہیں ہوگا، اس دن (جب کہ کانا دجال نمودار ہوگا) مدینہ کے سات دروازے (یعنی سات راستے) ہوں گے اور ہر دروازہ یعنی ہر راستہ پر (دائیں بائیں) دو فرشتے (مدینہ کی حفاظت پر مامور) ہوں گے۔" (بخاریؒ)

مدینہ میں برکت کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعا

(۲۷) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِيْنَةِ ضِعْفَیْ مَا جَعَلْتَ بِمَكَّةَ مِنَ الْبَرَكَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (بطور دعا) فرمایا "اے اللہ! مدینہ کو اس برکت سے دوگنی برکت عطا فرما جو تو نے مکہ کو عطا کی ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: دعا کا مطلب یہ ہے کہ "اے اللہ! مکہ کی شان و شوکت کی نسبت مدینہ کو دوگنی شان و شوکت عطا فرما، یہ دعا مدینہ پر مکہ کی فضیلت کے منافی بایں اعتبار نہیں ہے کہ مکہ میں حسنات کی زیادتی اس کے افضل ہونے کی سب سے بڑی وجہ ترجیح ہے۔

حرمین میں سکونت پذیر ہونے کی سعادت

(۲۸) وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ اٰلِ الْخَطَّابِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ زَارَنِیْ مُتَعَمِّدًا كَانَ فِیْ جِوَارِیْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَكَنَ الْمَدِيْنَةَ وَصَبَرَ عَلٰى بَلَائِهَا كُنْتُ لَهٗ شَهِيْدًا وَشَفِيْعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ مَاتَ فِیْ اَحَدِ الْحَرَمَيْنِ بَعَثَهُ اللّٰهُ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

"اور خطاب کے خاندان کا ایک شخص ناقل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص بالقصد میری زیارت کرے گا وہ قیامت کے دن میرا ہمسایہ اور میری پناہ میں ہوگا، جس شخص نے مدینہ میں سکونت اختیار کر کے اس کی سختیوں پر صبر کیا قیامت کے دن میں اس (کی اطاعت) کا

گواہ بنوں گا اور اس (کے گناہوں کی بخشش کے لئے) شفاعت کروں گا، اور جو شخص حرمین (یعنی مکّہ اور مدینہ) میں سے کسی ایک میں مرے گا قیامت کے دن اسے اللہ تعالیٰ امن والوں میں اٹھائے گا (یعنی قیامت کے دن عذاب کے خوف سے مامون رہے گا۔"

تشریح: "جو شخص بالقصد میری زیارت کرے گا" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تجارت، دکھانے سنانے، یا اسی طرح کی اور کسی دنیاوی غرض کے لئے نہیں بلکہ حصول ثواب کے پیش نظر صرف میری زیارت کے لئے آئے گا اسے مذکورہ سعادت حاصل ہوگی۔

روضۂ اطہر کی زیارت کی فضیلت

(۲۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعًا مَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِیْ بَعْدَ مَوْتِیْ کَانَ کَمَنْ زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ۔ رَوَاھُمَا الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ بطریق مرفوع (یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی) نقل کرتے ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) "جس شخص نے حج کیا اور پھر میرے وصال کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص کی مانند ہوگا جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی (یہ دونوں روایتیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں۔"

تشریح: روضۂ اطہر کی زیارت کرنے والا آپ ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کی زیارت کرنے والے کی مانند اس لئے ہوتا ہے کہ آپ ﷺ حیات ہیں! یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ روضۂ اطہر کی زیارت حج کے افعال سے فراغت کے بعد کی جائے۔

ایک اور روایت میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص میری قبر کی زیارت کرتا ہے اس کے لئے میری شفاعت واجب ولازم ہوتی ہے۔" نیز ایک روایت میں یہ ہے کہ "جس شخص نے حج بیت اللہ کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ پر ظلم کیا۔" اسی طرح ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ "جس شخص نے مکّہ (یعنی حج) کا قصد کیا اور پھر میری زیارت اور میری مسجد میں شرف حاضری کے حصول کا قصد کیا تو اس کے لئے (یعنی اس کے نامۂ اعمال میں) دو مقبول حج لکھے جاتے ہیں۔

مدینہ سے آپ ﷺ کا کمال تعلق

(۳۰) وَعَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ جَالِسًا وَقَبْرٌ یُحْفَرُ بِالْمَدِیْنَۃِ فَاطَّلَعَ رَجُلٌ فِی الْقَبْرِ فَقَالَ بِئْسَ مَضْجَعُ الْمُؤْمِنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِئْسَمَا قُلْتَ قَالَ الرَّجُلُ اِنِّیْ لَمْ اُرِدْ ھٰذَا اِنَّمَا اَرَدْتُ الْقَتْلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا مِثْلَ الْقَتْلِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَا عَلَی الْاَرْضِ بُقْعَۃٌ اَحَبُّ اِلَیَّ اَنْ یَکُوْنَ قَبْرِیْ بِھَا مِنْھَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ رَوَاہُ مَالِکٌ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت یحییٰ بن سعیدؓ کہتے ہیں کہ (مجھ تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ ایک دن) مدینہ میں ایک قبر کھودی جا رہی تھی اور رسول کریم ﷺ بھی وہاں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے قبر میں جھانکا اور کہنے لگا کہ (یہ) قبر مؤمن کے لئے بری خوابگاہ ہے، رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ بری تو وہ چیز ہے جو تم نے کہی ہے اس شخص نے عرض کیا کہ "میرا منشاء یہ نہیں تھا، بلکہ اس بات سے میرا مطلب اللہ کی راہ میں شہید ہونے (کی فضیلت) کو ظاہر کرنا تھا۔" آپ ﷺ نے فرمایا "(ہاں یہ بات تو صحیح ہے کہ) اللہ کی راہ میں شہید ہونے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے لیکن (یہ بات بھی ہے کہ) روئے زمین کا کوئی بھی ٹکڑا ایسا نہیں ہے جس میں میری قبر بنے اور وہ مجھے مدینہ سے زیادہ محبوب ہو۔" آپ ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی۔" (اس روایت کو امام مالکؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: "بری تو وہ چیز ہے جو تم نے کہی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری یہ بات بری اور غلط ہے کہ قبر مؤمن کے لئے بری خوابگاہ ہے کیونکہ تم نے مؤمن کی قبر کو برا کہا ہے حالانکہ مؤمن کی قبر جنّت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ چنانچہ اس شخص نے اپنی بات کی وضاحت کی کہ میرا منشاء قبر کو

مطلقاً مؤمن کی بری خوابگاہ کہنا نہیں تھا بلکہ میرا مطلب تو یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونا گھر میں مرنے سے بہتر ہے، آنحضرت ﷺ نے اس کے اس نکتہ کو پسند فرمایا اور تصدیق کی کہ واقعی اللہ کی راہ میں شہید ہونے کے برابر کوئی چیز نہیں ہے، پھر آپ ﷺ نے اپنی قبر کے لئے مدینہ کی زمین کو پسند فرما کر اس شخص کی فضیلت کو ظاہر کیا جو مدینہ میں مرے اور مدینہ ہی میں دفن کیا جائے خواہ وہ شہید ہو یا غیر شہید۔

وادی عقیق میں نماز کی فضیلت

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ بِوَادِي الْعَقِيْقِ يَقُوْلُ اَتَانِي اللَّيْلَةَ اٰتٍ مِنْ رَبِّي فَقَالَ صَلِّ فِي هٰذَا الْوَادِي الْمُبَارَكِ وَقُلْ عُمْرَةٌ فِي حَجَّةٍ وَفِي رِوَايَةٍ وَقُلْ عُمْرَةٌ وَحَجَّةٌ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ حضرت عمر ابن خطابؓ نے کہا کہ میں نے وادی عقیق میں (جو مدینہ کا ایک جنگل ہے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آج کی رات میرے پروردگار کی طرف سے ایک آنے والا (یعنی فرشتہ) میرے پاس آیا اور کہا کہ اس مبارک وادی میں نماز پڑھئے اور وہ عمرہ کہئے جو حج کے ساتھ ہوتا ہے۔" اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "اور عمرہ و حج کہئے" (یعنی اس وادی میں نماز پڑھنا حج و عمرہ کے برابر ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ عربی قواعد کے مطابق لفظ "قول" فعل کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا حدیث کے آخری جملہ قل عمرة فی حجة کے معنی ہیں "اور اس نماز کو وہ عمرہ شمار کیجئے جو حج کے ساتھ ہوتا ہے" گویا اس جملہ کے ذریعہ وادی عقیق میں ادا کی جانے والی نماز کی فضیلت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ وادی عقیق میں جو نماز پڑھی جاتی ہے اس کا ثواب اس عمرہ کے برابر ہے جو حج کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح دوسری روایت کے الفاظ و قل عمرة و حجة کا مطلب یہ ہے کہ وادی عقیق میں پڑھی جانے والی نماز عمرہ و حج کے برابر ہے۔

مدینہ منورہ کے کچھ اور فضائل: علماء نے لکھا ہے کہ حکیم مطلق اللہ جل شانہٗ نے اس شہر پاک کی خاک پاک اور وہاں کے میوہ جات میں تاثیر شفا ودیعت فرمائی ہے۔! اکثر احادیث میں منقول ہے کہ "مدینہ کے غبار میں ہر قسم کے مرض کی شفا ہے" بعض دوسرے طرق سے منقول احادیث میں ہے کہ "مدینہ کے غبار میں جذام اور برص کی شفا ہے۔" آنحضرت ﷺ نے اپنے بعض صحابہؓ کو حکم فرمایا تھا کہ وہ بخار کا علاج اس کی خاک پاک سے کریں۔ چنانچہ نہ صرف مدینہ ہی میں اس حکم پر عمل ہوتا رہا ہے بلکہ اس خاک پاک کو بطور دوا لے جانے کے سلسلہ میں بھی کتنے ہی آثار منقول ہیں اور بعض علماء نے تو اس معالجہ کا تجربہ بھی کیا ہے، حضرت شیخ مجد الدین فیروز آبادیؒ کا بیان ہے کہ میں نے خود اس کا تجربہ کیا ہے کہ میرا ایک خدمت گار مسلسل ایک سال سے بخار کے مرض میں مبتلا تھا میں نے مدینہ کی وہ تھوڑی سی خاک پاک پانی میں گھول کر اس خدمت گار کو پلا دی اور وہ اسی دن صحت یاب ہو گیا۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ کی خاک پاک سے معالجہ تجربہ مجھے بھی ہوا ہے وہ اس طرح کہ جن دنوں میں مدینہ منورہ میں مقیم تھا میرے پاؤں میں ایک سخت مرض پیدا ہو گیا جس کے بارہ میں تمام اطباء کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ اس کا آخری درجہ موت ہے اور اب صحت دشوار ہے۔ میں نے اسی خاک پاک سے اپنا علاج کیا، تھوڑے ہی دنوں میں بہت آسانی سے صحت حاصل ہو گئی۔! اسی قسم کی خاصیتیں وہاں کی کھجور کے بارہ میں بھی منقول ہیں چنانچہ صحیح احادیث میں وارد ہے کہ اگر کوئی شخص سات عجوہ کھجوریں (عجوہ مدینہ کی کھجور کی ایک قسم ہے) نہار منہ کھا لیا کرے تو کوئی زہر اور کوئی سحر اس پر اثر نہیں کرے گا۔

فضائل مدینہ کے سلسلہ میں یہ بات بھی بطور خاص قابل لحاظ ہے کہ اس مقدس شہر کی عظمت و بزرگی ہی کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو اس شہر کے رہنے والوں کی تعظیم و تکریم کی یہ وصیت کی تھی کہ میری اُمت کے لوگوں کو چاہئے کہ وہ میرے ہمسایوں یعنی اہل مدینہ کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں، ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں، ان سے اگر کوئی لغزش ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہ کریں اور اس وقت تک ان کی خطاؤں سے درگذر کریں جب تک کہ وہ کبائر سے اجتناب کریں (یعنی اگر وہ کبائر کے مرتکب ہوں تو پھر رعایت اور درگذر کا کوئی سوال نہیں ہے بلکہ اللہ

اور بندوں کے حقوق کے سلسلے میں شریعت کا جو حکم ہوا سے جاری کرے) یاد رکھو، جو شخص ان کے احترام و حرمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے گا میں قیامت کے دن اس کا گواہ اور شفاعت کرنے والا ہوں گا اور جو شخص اہل مدینہ کے احترام و حرمت کو ملحوظ نہیں رکھے گا اسے طینۃ الخبال کا سیال پلایا جائے گا۔" (واضح رہے کہ "طينة الخبال" دوزخ کے ایک حوض کا نام ہے جس میں دوزخیوں کی پیپ اور لہو جمع ہوتا ہے)۔

ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ "ایک دن آنحضرت ﷺ نے دست دعا بلند کئے اور یوں گویا ہوئے "خداوندا! جو شخص میرے اور میرے شہر والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے اس کو جلد ہی ہلاک کر دے۔" نیز آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جس شخص نے اہل مدینہ کو ڈرایا اس نے گویا مجھے ڈرایا۔" نسائی کی روایت میں یہ ہے کہ "جس شخص نے اہل مدینہ کو اپنے ظلم کے خوف میں مبتلا کیا اسے (اللہ تعالیٰ خوف میں مبتلا کرے گا اور اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہوگی" اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "ایسے شخص کا کوئی بھی عمل بارگاہ خداوندی میں مقبول نہیں ہوگا خواہ فرض ہو یا نفل۔"

حج کے کچھ مسائل اور ادائیگی حج کا طریقہ: اگرچہ احادیث کی تشریح میں حج کے اکثر مسائل بیان کئے جا چکے ہیں مگر اب "کتاب الحج" کے اختتام پر مناسب ہے کہ کچھ اور مسائل یکجا طور پر ذکر کر دیئے جائیں اور حج کی ادائیگی کا طریقہ بھی بیان کر دیا جائے۔

حج میں چار چیزیں فرض ہیں۔ ① احرام۔ ② عرفہ کے دن وقوف عرفات۔ ③ طواف الزیارت۔ ④ ان فرائض میں ترتیب کا لحاظ یعنی احرام کو وقوف عرفات پر اور وقوف عرفات کو طواف الزیارت پر مقدم کرنا۔

واجبات حج یہ ہیں، وقوف مزدلفہ، صفا و مروہ کے درمیان سعی، رمی جمار، آفاقی کے لئے طواف قدوم، حلق یا تقصیر، احرام میقات سے باندھنا، غروب آفتاب تک وقوف عرفات، طواف حجر اسود سے شروع کرنا (بعض علماء نے اسے سنت کہا ہے) طواف کی ابتداء دائیں طرف سے کرنا، طواف پیادہ پا کرنا بشرطیکہ کوئی عذر لاحق نہ ہو، طواف باطہارت کرنا، طواف میں ستر ڈھانکنا، سعی کی ابتداء صفا سے کرنا، سعی پا پیادہ کرنا بشرطیکہ کوئی عذر نہ ہو، قارن اور متمتع کو بکری یا اس کی مانند جانور ذبح کرنا، ہر سات شوط یعنی ایک طواف کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا، رمی حلق اور قربانی میں ترتیب کا لحاظ رکھنا بایں طور کہ پہلے رمی کی جائے پھر قربانی پھر حلق اور پھر طواف زیارت کی جائے، طواف الزیارۃ ایام نحر میں کرنا، طواف اس طرح کرنا کہ حطیم طواف کے اندر آ جائے، سعی، طواف کے بعد کرنا حلق حرم اور ایام نحر میں کرنا، وقوف عرفہ کے بعد ممنوعات احرام مثلاً جماع وغیرہ سے اجتناب، نیز وہ چیزیں بھی واجبات حج میں شامل ہیں، جن کو ترک کرنے سے دم لازم آتا ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ اور سب حج کے مستحبات اور آداب میں سے ہیں۔

غنی کا حج فقیر کے حج سے افضل ہے، والدین کی فرمانبرداری سے حج فرض تو اولی ہے لیکن حج نفل اولی نہیں ہے۔ بلکہ والدین کی فرمانبرداری ہی حج نفل سے افضل ہے۔ سرائے بنانا حج نفل سے افضل ہے۔ البتہ صدقہ کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں کہ بعض تو صدقہ کو افضل کہتے ہیں۔ اور بعض حج نفل کو افضل کہا ہے، تاہم بزازیہ میں ہے کہ حج نفل کی فضیلت ہی کو ترجیح دی گئی ہے، کیونکہ حج میں مال بھی خرچ ہوتا ہے اور جسمانی مشقت بھی ہوتی ہے جب کہ صدقہ میں صرف مال خرچ ہوتا ہے جس حج میں وقوف عرفات جمعہ کے دن ہو وہ حج ستر حجوں پر فضیلت رکھتا ہے اور اس حج میں ہر شخص کی بلا واسطہ مغفرت ہوتی ہے، اس بارہ میں اختلافی اقوال ہیں کہ آیا حج کی وجہ سے کبیرہ گناہ ساقط ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ ساقط ہو جاتے ہیں جس طرح کہ جب کوئی حربی کافر اسلام قبول کرتا ہیں تو اس کے سب گناہ ساقط ہو جاتے ہیں، لیکن بعض حضرات کا یہ قول ہے کہ حج کی وجہ سے حقوق اللہ تو معاف ہو جاتے ہیں لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوتے جس طرح کہ جب کوئی ذمی کافر، اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کے ذمہ سے حقوق اللہ تو ساقط ہو جاتے ہیں لیکن حقوق العباد ساقط نہیں ہوتے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ تمام علماء اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ کبیرہ گناہ صرف توبہ ہی سے ساقط ہوتے ہیں، (محض حج کی وجہ سے بھی ساقط نہیں ہوتے) نیز کوئی بھی عالم حج کی وجہ سے دین (قرض) کے ساقط ہونے کا بھی قائل نہیں ہے۔ خواہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ ہی سے ہو جیسے نماز و زکوٰۃ، ہاں ادائیگی قرض یا ادائیگی نماز وغیرہ میں تاخیر کا گناہ ضرور ساقط ہو جاتا ہے لہٰذا جو علماء کبیرہ گناہ کے ساقط ہو جانے کے قائل ہیں ان کی مراد بھی یہی ہے:

خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہونا مستحب ہے بشرطیکہ خود اس کو یا کسی اور کو اس سے تکلیف نہ پہنچے، خانۂ کعبہ کا غلاف اور پردہ بنی شیبہ سے خریدنا جائز نہیں ہے ہاں امام سے یا اس کے نائب سے لینا جائز ہے، خانۂ کعبہ کے غلاف و پردہ کو لباس میں استعمال کرنا جائز ہے اگرچہ جنبی (ناپاک) یا حائضہ ہی کیوں نہ ہو، اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر کے حرم میں پناہ لے لے تو اس کو بطور قصاص قتل کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ حرم میں رہے، ہاں اگر قاتل نے حرم ہی میں قتل کا ارتکاب کیا ہو تو اس کو بھی حرم میں مار ڈالنا جائز ہے لیکن خانۂ کعبہ کے اندر قاتل کو اس صورت میں بھی قتل کرنا جائز نہیں ہے جب کہ اس نے خانۂ کعبہ کے اندر ہی قتل کا ارتکاب کیا ہو۔

آب زمزم سے استنجا کرنا تو مکروہ ہے لیکن نہانا مکروہ نہیں ہے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ سے افضل ہے لیکن مدینہ منورہ کی زمین کا وہ قطعہ پاک جس پر سرکار دوعالم ﷺ آرام فرما ہیں مطلقاً افضل ہے حتیٰ کہ کعبہ اور عرش و کرسی سے بھی افضل ہے۔ آنحضرت ﷺ کے روضہ اطہر کی زیارت کرنا مستحب ہے بلکہ بعض علماء تو یہ کہتے ہیں کہ اس شخص کے لئے واجب ہے جسے فراغت میسر ہو! حج فرض کی ادائیگی کی صورت میں حج روضۂ اطہر کی زیارت سے پہلے کرنا چاہئے ہاں نفل کی صورت میں اختیار ہے کہ چاہے تو پہلے کیا جائے چاہے پہلے زیارت کی جائے بشرطیکہ مدینہ راستہ میں نہ پڑتا ہو۔ اگر مکہ کا راستہ مدینہ سے ہو کر گذرتا ہو تو پھر پہلے روضۂ اطہر کی زیارت کرنا ضروری ہے، روضۂ اطہر کی زیارت کے ساتھ مسجد نبوی ﷺ کی زیارت کی نیت بھی کرنی چاہئے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مسجد نبوی میں ادا کی جانے والی ایک نماز مسجد حرام کے علاوہ دوسری مساجد میں ادا کی جانے والی ہزار نمازوں سے بہتر ہے (مسجد حرام کا استثناء اس لئے ہے کہ اس میں ادا کی جانے والی ایک نماز کا ثواب دس لاکھ نمازوں کے ثواب کے برابر ہوتا ہے)

حج کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ جس خوش نصیب کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے حج کی سعادت عظمیٰ کی توفیق بخشے اور وہ حج کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ پہلے وہ اپنی نیت کو درست کرے کہ اس کے پیش نظر محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ادائیگی فرض ہو، کوئی دنیاوی غرض یا نام و نمود کا کوئی ہلکا سا تصور بھی نہ ہو ورنہ سب محنت اکارت جائے گی، پھر اپنے ماں باپ سے اجازت لے کر، اعزہ و احباب سے رخصت ہو کر، سب سے معافی تلافی کر کے اپنے وطن سے کم از کم ایسے وقت روانہ ہو کہ مکہ مکرمہ میں ساتویں ذی الحجہ سے پہلے پہنچ جائے اور ساتویں تاریخ کا خطبہ سن سکے، جب میقات پر پہنچے (ہندوستانیوں کی میقات یلملم ہے) تو احرام باندھے، اگر مفرد ہو تو صرف حج کا، قارن ہو تو حج و عمرہ دونوں کا اور متمتع ہو تو صرف عمرہ کا احرام باندھے، مستحب یہ ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے ہاتھ پاؤں کے ناخن کٹوائے، زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرے، حجامت بنوائے، اگر سر منڈانے کی عادت ہو تو سر منڈائے ورنہ بال درست کرائے اور ان میں کنگھی کرے، اگر بیوی ہمراہ ہو تو صحبت کرے، پھر وضو کرے یا نہائے لیکن نہانا افضل ہے اس کے بعد احرام کا لباس پہنے یعنی ایک لنگی باندھے اور ایک چادر اس طرح اوڑھے کہ سر کھلا رہے، یہ دونوں کپڑے نئے ہوں تو افضل ہے ورنہ صاف دھلے ہوئے ہونے چاہئیں، اگر کسی کے پاس دو کپڑے میسر نہ ہوں تو ایک ایسا کپڑا لپیٹ لینا بھی جائز ہے جس سے ستر پوشی ہو جائے پھر خوشبو لگائے، اس کے بعد نیت کرے، اگر قران کا ارادہ ہو تو اس طرح کہے اَللّٰهُمَّ اِنِّي اُرِيْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَيَسِّرْهُمَا لِي وَتَقَبَّلْهُمَا مِنِّي اگر تمتع کا ارادہ ہو تو یوں کہے اَللّٰهُمَّ اِنِّي اُرِيْدُ الْعُمْرَةَ فَيَسِّرْهَا لِي وَتَقَبَّلْهَا مِنِّي اور اگر افراد کا ارادہ رکھتا ہو تو اس طرح کہے اَللّٰهُمَّ اِنِّي اُرِيْدُ الْحَجَّ فَيَسِّرْهُ لِي وَتَقَبَّلْهُ مِنِّي اگر نیت کے مذکورہ بالا الفاظ زبان سے ادا نہ کئے جائیں بلکہ دل ہی میں نیت کر لی جائے تو بھی جائز ہے، نیت کے بعد لبیک کہے حج یا عمرہ کی نیت کے ساتھ لبیک کہتے ہی محرم ہو جائے گا، لبیک کے الفاظ یہ ہیں لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ ان الفاظ میں کمی نہ کی جائے ہاں زیادتی جائز ہے چنانچہ یہ الفاظ بھی منقول ہیں جن کے اضافہ میں کوئی حرج نہیں ہے لبیک وسعدیک والخیر بیدیک لبیک والرغباء الیک والعمل لبیک لبیک اله الخلق لبیک۔ بعد ازاں اکثر اوقات آواز بلند لبیک کہتا رہے خصوصاً نماز کے بعد خواہ فرض ہو خواہ نفل نماز، صبح کے وقت، باہم ملاقات کے، بلندی پر چڑھتے یا نشیب میں اترتے وقت، غرضیکہ یہ سفر حج چونکہ نماز کے حکم میں ہے کہ جس طرح نماز میں ہر حالت کی تبدیلی پر تکبیر کہی جاتی ہے اس طرح اس سفر میں ہر حالت کی تبدیلی کے وقت لبیک کہنی چاہئے۔! احرام باندھ لینے کے بعد ان تمام چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے جو حالت احرام میں ممنوع ہیں مثلاً سلے ہوئے کپڑے جیسے کرتہ، انگرکھا، پاجامہ، فرغل، جبہ، قبا، بارانی موزہ، دستانہ اور ٹوپی وغیرہ نہ پہنے جائیں، جو کپڑے

رنگ دار خوشبو جیسے زعفران وغیرہ میں رنگے ہوئے وہ بھی استعمال نہ کئے جائیں ہاں دھلنے کے بعد کہ جس سے خوشبو نہ آتی ہو استعمال کرنا جائز ہے، سر اور منہ کسی چیز سے نہ ڈھانکا جائے، جوئیں نہ ماری جائیں، بیوی سے نہ تو صحبت کی جائے اور نہ ان چیزوں کا ارتکاب کیا جائے جو جماع کا باعث بنتی ہیں مثل بوسہ لینا، شہوت کے ساتھ عورت کو ہاتھ لگانا یا اس کے سامنے فحش باتیں یا جماع کا ذکر کرنا وغیرہ وغیرہ! فسق وفجور سے پرہیز کیا جائے کسی کے ساتھ جنگ وجدل سے گریز کیا جائے، صحرائی وحشی جانوروں کا شکار نہ کیا جائے حتی کہ کوئی محرم نہ تو شکار کی طرف اشارہ کرے اور نہ شکار میں کسی کی اعانت کرے، ہاں دریائی جانوروں مثلاً مچھلی کا شکار درست ہے۔! خوشبو کا استعمال نہ کیا جائے، ناخن نہ کٹوائے جائیں، سر داڑھی بلکہ تمام بدن کے بال نہ کتروائے جائیں نہ منڈوائے جائیں اور نہ اکھاڑے جائیں، سر وداڑھی کے بالوں کو خطمی سے نہ دھویا جائے البتہ محرم نہا سکتا ہے، حمام میں داخل ہو سکتا ہے، گھر اور کجاوہ کے سایہ میں بیٹھ سکتا ہے، ہمیانی (یعنی روپیہ رکھنے والی تھیلی) کمر میں باندھ سکتا ہے اور اپنے دشمن سے دفاعی لڑائی لڑ سکتا ہے۔! احرام کی حالت میں جن جانوروں کو مارنا جائز ہے اور جن کے مارنے کی وجہ سے بطور جزاء نہ دم لازم ہوتا ہے نہ صدقہ وہ یہ ہیں۔ کوا، چیل، سانپ، بچھو، چوہا، چیچڑی، کچھوا، بھیڑیا، گیدڑ، پتنگا، مکھی، چیونٹی، گرگٹ، بھڑ، مچھر، حملہ آور درندہ اور موذی جانور۔

جب مکہ مکرمہ قریب آجائے تو غسل کرے کہ یہ مستحب ہے پھر دن میں کسی وقت باب المعلی سے مکہ میں داخل ہو، اور اپنی قیامگاہ پر سامان وغیرہ رکھ کر سب سے پہلے مسجد حرام کی زیارت کرے، مستحب یہ ہے کہ مسجد حرام میں لبیک کہتا ہوا اور باب السلام سے داخل ہو اور اس وقت نہایت خشوع وخضوع کی حالت اپنے اوپر طاری کرے اور اس مقدس مقام کی عظمت وجلالت کے تصور دل میں رکھے اور کعبہ کے جمال دلربا پر نظر پڑتے ہی جو کچھ دل چاہے اپنے پروردگار سے طلب کرے پھر تکبیر وتہلیل کرتا ہوا حمد وصلوۃ پڑھتا ہوا حجر اسود کے سامنے آئے اور اس کو بوسہ دے اور بوسہ کے وقت اپنے دونوں ہاتھ کو اس طرح اٹھائے جس طرح تکبیر تحریمہ کے وقت اٹھاتے ہیں، اگر اژدحام کی وجہ سے بوسہ نہ دے سکے تو حجر اسود کو ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چوم لے اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کسی لکڑی سے حجر اسود کو چھو کر چومے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو پھر دونوں ہتھیلیوں سے حجر اسود کی طرف اشارہ کر کے ہتھیلیوں کو چوم لے، حجر اسود کے استلام کے بعد حجر اسود کے پاس ہی سے اپنی داہنی جانب سے طواف قدوم شروع کرے، طواف میں سات شوط (چکر) کرے، اور ہر شوط کو حجر اسود ہی پر ختم کرے اور ہر شوط ختم کرنے کے بعد مذکورہ بالا طریقے سے حجر اسود کا استلام اور تکبیر وتحلیل کرے طواف میں حطیم کو بھی شامل کرے، طواف میں اضطباع کرے اور پہلے تین شوطوں میں رمل کرے نیز ہر شوط میں رکن یمانی کا بھی استلام کرے مگر اس کے استلام میں اس کو چومنا نہیں چاہئے طواف ختم کرنے کے بعد دو رکعت نماز طواف مقام ابراہیم کے قریب پڑھے، یہ نماز حنفیہ کے نزدیک واجب ہے، اگر اژدحام وغیرہ کی وجہ سے اس نماز کو مقام ابراہیم کے قریب پڑھنا ممکن نہ ہو تو پھر مسجد حرام میں جہاں بھی چاہے پڑھ لے، اس نماز کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قل یا ایہا الکفرون اور دوسری رکعت میں قل ہو اللہ کی قرأت کرے، اور دعائیں جو چاہے اللہ سے مانگے، اس کے بعد چاہ زمزم پر آئے اور زمزم کا پانی پیٹ بھر کر پئے پھر مقام ملتزم میں آئے اور حجر اسود کا استلام کرے اور حمد وصلوۃ پڑھے اور تکبیر وتہلیل کرے اور اس کے بعد صفا ومروہ کے درمیان سعی کرے (مفرد کے لئے تو بہتر یہی ہے کہ وہ طواف زیارت کے بعد سعی کرے لیکن اگر طواف قدوم ہی کے بعد کرے کوئی حرج نہیں ہے) سعی کا طریقہ یہ ہے کہ مسجد حرام سے باہر نکل کر صفا کی طرف آئے اور جو صفا پر چڑھے تو بیت اللہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو اور تکبیر وتہلیل کرے، درود پڑھے اور ہاتھ اٹھا کر اپنے مقصد کے لئے دعا مانگے پھر صفا سے مروہ کی طرف اپنی چال کے ساتھ چلے مگر جب وادی بطن پہنچے، تو میلین اخضرین کے درمیان تیز تیز چلے اور پھر جب مروہ پر چڑھے تو وہی کچھ یعنی تکبیر وتہلیل وغیرہ کرے جو صفا پر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح صفا ومروہ کے درمیان سات شوط کرے، ہر شوط کی ابتداء صفا سے ہو اور انتہا مروہ پر اور ہر شوط میں میلین اخضرین کے درمیان تیز تیز چلے، یہ بات ذہن میں رہے کہ سعی سے پہلے طواف کرنا ضروری ہے اگر کسی نے طواف سے پہلے سعی کر لی تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ طواف کے بعد پھر دوبارہ سعی کرے۔ یہ بھی معلوم رہنا چاہئے کہ اس سعی، وقوف عرفات، وقوف مزدلفہ اور رمی جمار کے لئے طہارت (پاکی) شرط نہیں ہے لیکن اولی ضرور ہے جب کہ طواف کے لئے طہارت شرط ہے۔! نیز طواف، وسعی کے وقت بات چیت کرنا مکروہ ہے۔! جب سعی سے فارغ ہو جائے تو مسجد حرام میں جا کر دو رکعت نماز پڑھے جو بہتر ہے واجب نہیں ہے بعد ازیں مکہ میں ٹھہرا رہے اور اس کے دوران نفل طواف جس قدر ہو سکے کرتا رہے، مگر نفل طواف کے درمیان رمل اور اس کے بعد سعی نہ کرے، پھر ساتویں

الحجہ کو مسجد حرام میں خطبہ سنے، اس خطبہ میں جو ظہر کی نماز کے بعد ہوتا ہے امام حج کے احکام و مسائل بیان کرتا ہے، پھر اگر احرام کھول چکا ہو تو آٹھ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھ کر طلوع آفتاب کے بعد منٰی روانہ ہو جائے، اگر ظہر کی نماز پڑھ کر منٰی میں پہنچے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، رات منی میں گذارے اور عرفہ کے روز یعنی نویں تاریخ کو فجر کی نماز اول وقت اندھیرے میں پڑھ کر طلوع آفتاب کے بعد عرفات جائے، اگر کوئی آٹھویں تاریخ کو منٰی میں نہ جائے بلکہ نویں کو عرفات پہنچ جائے تو بھی جائز ہے مگر یہ خلاف سُنّت ہے۔ عرفات میں بطن عرنہ کے علاوہ جس جگہ چاہے اترے لیکن جبل عرفات کے نزدیک اترنا افضل ہے پھر اسی دن زوال آفتاب کے بعد غسل کرے (جو سُنّت ہے) اور عرفات میں وقوف کرے (جو فرض ہے اور جس کے بغیر حج ہی نہیں ہوتا) امام جو خطبہ دے اسے سنے اور امام کے ساتھ بشرط احرام ظہر و عصر کی نماز ایک وقت میں پڑھے اور جبل رحمت کے پاس کھڑا ہو کر نہایت خشوع و خضوع اور تذلل و اخلاص کے ساتھ تکبیر و تہلیل کرے، تسبیح پڑھے، اللہ کی ثنا کرے آنحضرت ﷺ پر درود بھیجے اور اپنے تمام اعزہ و احباب کے لئے استغفار کرے اور تمام مقاصد دینی و دنیوی کے لئے دعا مانگے، پھر غروب آفتاب کے بعد امام کے ہمراہ مزدلفہ کی طرف روانہ ہو جائے اور راستہ میں استغفار، لبیک، حمد و صلوٰۃ اور اذکار میں مشغول رہے مزدلفہ پہنچ کر امام کے ہمراہ مغرب و عشاء کی نماز ایک ساتھ پڑھے اور رات میں وہیں رہے کیونکہ رات میں وہاں رہنا واجب ہے، نیز اس پوری رات میں نماز، تلاوت قرآن اور ذکر و دعا میں مشغول رہنا مستحب ہے، جب صبح ہو جائے تو (یعنی دسویں ذی الحجہ کو) فجر کی نماز اول وقت اندھیرے میں پڑھے اور وہاں وقوف کرے، مزدلفہ میں سوائے بطن محسر کے جہاں چاہے وقوف کر سکتا ہے، اس وقوف کی حالت میں نہایت الحاح وزاری کے ساتھ اپنے دینی و دنیاوی مقصد کے لئے خداوند عالم سے دعا مانگے، آفتاب نکلنے سے کچھ پہلے وقوف ختم کر لیا جائے، پھر جب روشنی خوب پھیل جائے تو آفتاب سے پہلے منٰی واپس پہنچ کر جمرۃ العقبہ پر سات کنکریاں مارے اور پہلی کنکری مارتے ہی تلبیہ موقوف کر دے، اس کے بعد قربانی کرے پھر سر منڈوائے یا بال کتروائے، اس کے بعد وہ تمام چیزیں جو حالت احرام میں ممنوع تھیں، سوائے رفث کے جائز ہو جائیں گی، پھر عید کی نماز منٰی ہی میں پڑھ کر اسی دن مکہ آجائے اور طواف زیارت کرے، اس طواف کے بعد سعی نہ کرے ہاں اگر پہلے سعی نہ کر چکا ہو تو وہ پھر اس طواف کے بعد سعی کرے، اس کے بعد رفث بھی جائز ہو جائے گا طواف زیارت سے فارغ ہو کر پھر منٰی واپس آجائے اور رات میں وہاں قیام کرے۔ گیارہویں تاریخ کو تینوں جمرات کی رمی کرے بایں طور کہ پہلے تو اس جمرۃ پر سات کنکریاں مارے جو مسجد خیف کے قریب ہے اور جس کو جمرۃ اولیٰ کہتے ہیں اس کے بعد اس جمرہ پر جو اس کے قریب ہے اور جس کو جمرۃ وسطیٰ کہتے ہیں سات کنکریاں مارے اور پھر سوار ہو کر یا پیادہ پا ہی جمرہ عقبہ پر سات کنکریاں مارے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتا رہے، اسی طرح بارھویں تاریخ کو تینوں جمرات پر کنکریاں مارے اور تیرھویں تاریخ کو اگر منٰی میں قیام رہے گا تو اس دن پھر تینوں جمرات کی رمی اس پر واجب ہوگی اور اگر بارھویں تاریخ ہی کو منٰی سے رخصت ہو گیا تو پھر اس پر تیرھویں تاریخ کو واجب نہیں ہوگی۔!
گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں تاریخوں میں رمی کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہے لیکن تیرھویں تاریخ کو اگر طلوع فجر کے بعد اور زوال آفتاب سے پہلے بھی رمی کرے تو جائز ہے مگر مسنون زوال آفتاب کے بعد ہی ہے جب کہ گیارھویں اور بارھویں تاریخوں میں زوال آفتاب سے پہلے رمی جائز نہیں ہے! آخری دن رمی سے فارغ ہو کر مکہ روانہ ہو جائے اور راستہ میں تھوڑی دیر کے لئے محصب میں اترے، پھر جب مکہ مکرمہ سے وطن کے لئے روانہ ہونے لگے طواف وداع کرے اس طواف میں بھی رمل اور اس کے بعد سعی نہ کرے طواف کے بعد دو رکعت پڑھ کر زمزم کا مبارک پانی گھونٹ گھونٹ کر کے پیے اور ہر مرتبہ کعبہ مکرمہ کی طرف دیکھ کر حسرت سے آہ سرد بھرے نیز اس مبارک پانی کو منہ، سر اور بدن پر ملے پھر خانہ کعبہ کی طرف آئے اگر ممکن ہو بیت اللہ کے اندر داخل ہو اگر اندر نہ جاسکے تو اس کی مقدس چوکھٹ کو بوسہ دے اور اپنا سینہ اور منہ ملتزم پر رکھ دے اور کعبہ مکرمہ کے پردوں کو پکڑ پکڑ کر دعا کرے اور روئے اور اس وقت بھی تکبیر و تہلیل، حمد و ثنا اور دعا و استغفار میں مشغول رہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے مقاصد کی تکمیل طلب کرے۔ اس کے بعد پچھلے پیروں یعنی کعبہ مکرمہ کی طرف پشت نہ کر کے مسجد حرام سے باہر نکل آئے۔ حج کے تمام افعال ختم ہو گئے۔

عمرہ کے احکام: عمرہ واجب نہیں ہے بلکہ عمر بھر میں ایک مرتبہ سُنّت مؤکدہ ہے عمرہ کے لئے کسی خاص زمانہ کی شرط نہیں ہے، جیسا کہ حج کے لئے ہے بلکہ جس وقت چاہے کر سکتا ہے اسی طرح ایک سال میں کئی مرتبہ بھی عمرہ کیا جاسکتا ہے، البتہ غیر قارن کو ایام حج میں عمرہ کرنا مکروہ ہے

ایام حج کا اطلاق یوم عرفہ یوم نحر اور ایام تشریق پر ہوتا ہے۔! عمرہ کا رکن طواف ہے اور اس میں دو چیزیں واجب ہیں ایک تو صفا و مروہ کے درمیان سعی اور دوسرے سر منڈوانے یا بال کتروانا۔ جو شرائط اور سنن و آداب حج کے ہیں وہی عمرہ کے بھی ہیں۔

جنایات کے احکام: حج کے بیان میں "جنایت" اس حرام فعل کو کہتے ہیں جس کی حرمت احرام یا حرم کے سبب سے ہو اور جس کے مرتکب پر کوئی چیز مثلاً قربانی یا صدقہ بطور جزاء (یعنی بطور کفارہ) واجب ہوتی ہو، چنانچہ اس کی کچھ تفصیل اس طرح ہے کہ اگر محرم اپنے کسی ایک پورے عضو پر خوشبو لگائے یا کوئی خوشبو دار چیز کھا کر منہ کو خوشبو دار کرے بشرطیکہ وہ خوشبو خالص ہو اور اس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہو یا رقیق مہندی کا استعمال کرے خواہ سر میں لگائے یا داڑھی یا ہاتھ پر وغیرہ میں یا روغن زیتون لگائے یا پورے ایک دن سلے ہوئے کپڑے رواج وعادت کے موافق استعمال کرے یا پورا دن اپنا سر ڈھانکے رکھے یا سر، داڑھی چوتھائی یا اس سے زیادہ منڈوائے یا پوری ایک بغل کے بال یا زیر ناف بال یا گردن کے بالوں کو دور کرے یا دونوں ہاتھوں یا دونوں پیروں یا ایک ہاتھ اور ایک پیر کے ناخن ترشوائے یا طواف قدوم یا طواف صدر حالت جنات میں کرے یا طواف زیارت (یعنی طواف فرض) بے وضو کرے یا عرفات سے امام سے پہلے واپس آجائے یا سعی چھوڑے یا وقوف مزدلفہ چھوڑدے یا تمام دنوں کی رمی یا ایک دن کی یا پہلے دن کی رمی نہ کرے، یا حلق و تقصیر حرم سے باہر کرائے یا احرام کی حالت میں بیوی کا بوسہ لے یا اس کو شہوت کے ساتھ چھوئے یا حلق و تقصیر یا طواف زیارت ایام نحر گذر جانے کے بعد کرے، یا افعال حج کی واجب ترتیب کو بدل دے مثلاً قربانی سے پہلے سر منڈوالے تو ان تمام صورتوں میں اس پر بطور جزاء ایک قربانی واجب ہوگی! اور اگر محرم تلبید کرے یعنی اپنے سر کے بال گوند وغیرہ لگا کر جمالے یا قارن ہونے کی صورت میں قربانی سے پہلے حلق یا تقصیر کرائے تو اس پر دو قربانی واجب ہوں گی۔! اور اگر محرم ایک عضو سے کم میں خوشبو استعمال کرے یا ایک دن سے کم اپنا سر ڈھانکے یا سلا ہوا کپڑا پہنے یا سر داڑھی چوتھائی حصہ سے کم منڈوائے یا پانچ ناخون سے کم ترشوائے یا پانچ ناخون مختلف مجلسوں میں ترشوائے یا طواف قدوم یا طواف صدر یا یوم نحر کے بعد تینوں جمرات میں سے کسی ایک جمرہ کی رمی ترک کردے تو ان سب صورتوں میں اس پر صدقہ واجب ہوگا جس کی مقدار نصف صاع گیہوں ہے۔! اگر محرم کسی عذر یا بیماری کی وجہ سے خوشبو استعمال کرے یا سر منڈوائے یا سلا ہوا کپڑا پہنے تو ان صورتوں میں اسے اختیار ہوگا کہ چاہے تو ایک بکری ذبح کرے چاہے چھ مسکینوں کو ایک ایک مقدار صدقہ فطر دے دے اور چاہے تین روزے مسلسل یا غیر مسلسل رکھ لے۔! خوشبو یا خوشبو دار پھول یا خوشبو دار میوہ سونگھنے سے محرم پر کچھ واجب نہیں ہوتا تاہم یہ مکروہ ہے۔ اگر کوئی محرم جوں مارے تو بطور صدقہ تھوڑی سی کھانے کی چیز مثلاً ایک مٹھی آٹا دے دے بشرطیکہ اس نے وہ جوں اپنے بدن سے یا سر سے یا کپڑے سے نکال کر ماری ہو، اور اگر زمین سے پکڑ کر مارے تو کچھ بھی واجب نہیں ہوتا اور اگر اس نے اپنے کپڑے دھوپ میں اس نیت سے ڈال دیئے کہ اس میں موجود جوئیں مرجائیں اور پھر بہت ساری جوئیں مرجائیں تو اس پر نصف صاع گیہوں کا صدقہ واجب ہوگا۔ ہاں اگر کپڑے کو خشک کرنے کی نیت سے دھوپ میں ڈالے اور جوئیں مارنا اس کا مقصد نہ ہو اور پھر اس صورت میں جوئیں مرجائیں تو اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔ اگر محرم شکار مارے یا کسی کو شکار کی راہ بتائے یا شکار کی طرف کسی کو متوجہ کرے تو اس پر بطور جزا اس شکار کی وہ قیمت واجب ہوگی جو دو عادل شخص تجویز کریں اور وہ قیمت اس مقام کے اعتبار سے ہو جہاں شکار مارا گیا ہو یا اس کے قریب تر مقام کے اعتبار سے ہو، اس بارہ میں محرم کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو وہ اس قیمت سے قربانی کا کوئی جانور خرید کر ذبح ہونے کیلئے حرم بھیج دے چاہے اس قیمت سے گیہوں وغیرہ خرید کر ہر فقیر کو صدقہ فطر کی ایک ایک مقدار تقسیم کردے اور چاہے ہر فقیر کی مقدار صدقہ کے عوض ایک ایک روزہ رکھ لے۔

آخر میں یہ بات بھی بتادینی ضروری ہے کہ ان تمام جنایات کے ارتکاب میں قصد اور اضطرار علم اور لاعلمی، رغبت اور جبر سب برابر ہے یعنی محرم ممنوعات احرام میں سے جو بھی فعل کرے گا اس پر جزاء بہر صورت واجب ہوگی خواہ اس سے اس فعل کا ارتکاب قصداً ہوا ہو یا بلا قصد اس کے علم کے باوجود ہوا ہو یا اس کی لاعلمی کی وجہ سے اور اس نے وہ فعل اپنی رغبت سے کیا ہو یا کسی دوسرے کی زبردستی کی وجہ سے۔

روضۂ اطہر کی زیارت کے احکام و آداب: جو کوئی حج کرنے جائے اس کو چاہئے کہ اگر حج فرض ہو تو پہلے اپنے حج سے فارغ ہو جائے پھر روضہ اطہر کی زیارت کے لئے مدینہ جائے اور اگر حج نفل ہو تو اختیار ہے کہ چاہے تو پہلے زیارت کرے اور اس کے بعد حج کرے چاہے پہلے حج کر لے بعد میں زیارت کرے بشرطیکہ حج کے لئے مکہ جانے والا راستہ مدینہ کی طرف سے نہ ہو۔! جب زیارت کے لئے چلے تو یہ نیت کرے کہ میں

آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک اور آپ ﷺ کی مسجد انور کی زیارت کے لئے سفر کرتا ہوں۔! راستہ میں جتنی مسجدیں ملیں سب میں نماز پڑھے، راستہ میں درود پڑھتا رہے، جب مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو اس شہر مقدس کی عظمت کو دل میں جاگزیں کرے، جب مدینہ منورہ بالکل سامنے آجائے تو بہ خیال ادب اور بہ مقتضائے شوق اپنی سواری سے اتر پڑے اور اگر ممکن ہو تو وہاں سے مسجد شریف تک پاپیادہ جائے۔ حدود شہر میں داخل ہونے سے پہلے اگر ممکن ہو تو غسل کرلے ورنہ وضو کرکے عمدہ اور خاص طور پر سفید کپڑے پہن لے اور خوشبو لگائے، شہر کے اندر پہنچ کر سب سے پہلے مسجد نبوی ﷺ میں جائے، مسجد نبوی میں داخلہ سے پہلے غسل کرلے تو بہتر ہے ورنہ وضو کرے اور خوشبو لگائے، مسجد نبوی پہنچ کر تحیۃ المسجد اور نماز شکر پڑھے، اس کے بعد اس تصور و یقین کے ساتھ بصد ادب و احترام قبر اقدس کی زیارت کی طرف متوجہ ہو کہ میں اس با عظمت درگاہ میں حاضر ہو رہا ہوں جس کے سامنے تمام دنیا کے پر جلال بادشاہوں کی بھی کوئی وقعت نہیں، پھر مرقد اطہر کے پاس آکر نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ نماز کی طرح داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر اس طرح کھڑا ہو کہ حضرت سید بشر ﷺ کی طرف منہ ہو اور قبلہ کی طرف پیٹھ اور اس بات کا یقین کرے کہ آنحضرت ﷺ میری حاضری سے واقف ہیں، میرے سلام کا جواب دیتے ہیں اور میری دعا پر آمین کہتے ہیں اور پھر انتہائی شوق و ذوق کے ساتھ معتدل آواز میں سلام و صلوٰۃ پیش کرے اور عرض و معروض کرے، جب اپنی عرض و نیاز سے فارغ ہو جائے تو اپنے اعزاء واحباب میں سے جس نے عرض سلام کی درخواست کی ہو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس کی طرف سے اس طرح سلام عرض کردے کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! فلاں ابن فلاں نے آپ کو سلام عرض کیا ہے آپ ﷺ اس کے لئے پروردگار سے شفاعت کریں۔" اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق؄ اور پھر حضرت عمر؄ فاروق کے سر مبارک کے سامنے کھڑا ہو اور ان کی خدمت میں سلام عرض کرے، اس کے بعد پھر آنحضرت ﷺ کے سر مبارک کے سامنے پہلے کی طرح دست بستہ کھڑا ہو اور بہت ذوق و شوق کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کرے اور جو جو خواہش رکھتا ہو، آپ ﷺ کے طفیل میں حق تعالیٰ سے مانگے، وہاں سے ہٹ کر حضرت ابولبابہ؄ کے ستون کے پاس جس قدر ممکن ہو نوافل پڑھے اور توبہ و استغفار کرے اس کے بعد آثار نبویہ ﷺ کی زیارت کرے جو معلمین بتادیتے ہیں، اور جنت البقیع جائے وہاں صحابہ کرام اور اہل بیت کے مزارات مقدسہ کی زیارت کرے پھر شہدائے احد خصوصاً سید الشہداء حضرت امیر حمزہ؄ کی قبر کی زیارت کرے اور ان تمام مشاہد و مزارات پر فاتحہ پڑھے اور شنبہ کے دن یا جس دن ممکن ہو مسجد قبا کی زیارت کرے اور دو رکعت نماز بہ نیت تحیۃ المسجد پڑھے۔

مدینہ منورہ اور روضۂ اطہر کی زیارت کے آداب یہ ہیں کہ جتنے دنوں مدینہ منورہ میں قیام ہو سکے اس کو غنیمت سمجھے حتی الامکان اپنا اکثر وقت مسجد شریف نبوی ﷺ میں صرف کرے وہاں اعتکاف کرے اور ہر قسم کی عبادت یعنی نماز، روزہ، تلاوت، درود اور صدقہ و خیرات سے اپنے اوقات کو آباد رکھے، جب تک مسجد میں رہے حجرۂ شریف کی طرف نہایت شوق کی نگاہوں سے نظر کرتا رہے اور اگر مسجد سے باہر ہو تو بنظر احترام و تعظیم اور انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ قبہ شریف کو دیکھتا رہے کیونکہ روضہ حبیب کبریا پر نظر ڈالنا استحباباً حکم نظر کرنے کعبہ شریف کا ہے نیز شہر سے باہر قبہ شریف پر نظر کرنے سے اہل شوق کو جو نورانیت اور سرور و ذوق حاصل ہوتا ہے اس کا ادراک اسی حالت پر موقوف ہے جس کو الفاظ کے ذریعہ ظاہر نہیں کیا جاسکتا ع ذوق ایں می نشناسی بخدا تانہ چشی۔

مسجد نبوی میں جس قدر بھی شب بیداری کی سعادت حاصل ہو سکے خواہ ایک ہی شب کے لئے ہو اسے ہاتھ سے نہ جانے دے کیونکہ یہ شب قدر و منزلت کے اعتبار سے شب قدر سے کم نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اس لئے اس ایک رات کو اپنی تمام عمر کا ماحصل اور خلاصہ سمجھ کر عبادت میں کاٹ دے بہتر یہی ہے کہ اس رات میں اور کوئی عبادت نہ کرے بلکہ صرف درود شریف پڑھتا رہے، اور اگر نیند آنے لگے تو حبیب ﷺ کبریا کی حضوری اور آپ ﷺ کے جمال باکمال کا سرور آمیز تصور کرکے نیند کو دفع کرے جب آنحضرت ﷺ کے جمال کمال کا تصور اس کے دل و دماغ کو کیف حضوری کا سرور بخشے گا تو کہاں نیند رہے گی اور کہاں غفلت قرار چیست صبوری کدام و خواب کجا۔! مسجد نبوی ﷺ میں جب تک رہے اپنے دل، اپنی زبان اور تمام اعضاء کو برے کلمات و خیالات اور ہر خلاف اولیٰ فعل سے محفوظ رکھے اور محبوب دو عالم ﷺ کی حضوری کے تصور کے سوا اور کسی طرف متوجہ نہ ہو اگر کوئی اس کی مشغولیت میں مخل ہو تو اس سے کنارہ کشی اختیار کرے ہاں کسی سے نہایت ضروری گفتگو کرنی ہو تو مختصر کلام کرکے اسی جناب مقدس ﷺ کی طرف متوجہ ہو جائے، مسجد شریف کے آداب کا بطور خاص خیال رکھے تھوک

وغیرہ وہاں نہ گرنے پائے مسجد میں آنے سے قبل روضہ اطہر اور منبر کے درمیان اپنا مصلے پہلے سے نہ بچھوائے رکھے بلکہ اگر اس مقدس مقام پر ادیگی نماز کی فضیلت کے حصول کا شوق ہو تو سب سے پہلے مسجد میں پہنچنے کی کوشش کرے اور وہاں بیٹھ جائے اس مقدس مسجد میں جو نزول قرآن و جبریل کی جگہ ہے قرآن پاک ختم کرنے میں کوتاہی نہ کرے کم از کم ایک قرآن مجید کا ختم اس مسجد پاک میں ضرور کرے اگر ممکن ہو تو ایسی کتابیں پڑھے یا سنے جس میں آنحضرت ﷺ کے مبارک حالات و خصائل اور فضائل ہوں تاکہ آپ ﷺ کی ملاقات اور عبادت کا شوق فزوں ہو۔ اقبر شریف کے سامنے سے جتنی مرتبہ بھی گذرنا ہو وہاں تمام آداب زیارت کو ملحوظ رکھ کر کھڑا ہو جائے اور آپ ﷺ کی خدمت میں سلام وصلوٰۃ پیش کرے، مدینہ منورہ اور مسجد نبوی ﷺ کے رہنے والوں اور خدمت گاروں کی محبت و تعظیم کو ہمہ وقت ملحوظ رکھے چاہے ان میں کوئی بات خلاف شریعت و سُنّت ہی کیوں نہ دیکھے کیونکہ آنحضرت ﷺ کی ہمسائیگی کا شرف ہی ان کی سب سے بڑی فضیلت ہے جو کسی گناہ و بدعت کی وجہ سے ختم نہیں ہوتا اور انہیں حسن خاتمہ و مغفرت کی سعادت سے محروم نہیں ہونے دیتا۔

دیار مقدس سے وطن کو واپسی: جب مدینہ منورہ میں قیام کی مدت ختم ہو جائے اور اس مقام مقدس سے جدا ہو کر وطن کو روانہ ہونے کا ارادہ ہو جائے تو مصلے نبوی یا اس کے قریب نماز پڑھ کر اور دعا مانگ کر مسجد نبوی ﷺ سے رخصت ہو بعد ازاں آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی زیارت کرے اور اللہ تعالیٰ سے نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے اعزاء و احباب کے لئے کونین کی سعادتوں کے حصول کی دعا مانگے نیز دیار مقدس میں اپنی تمام عبادات کی قبولیت اور اپنے اہل اعیال کے پاس امن و سلامتی کے ساتھ پہنچنے کی درخواست کرے اور یہ دعا پڑھے اللھم انا نسألک فی سفرنا ھذا البر و التقوی و من العمل ماتحب و ترضی اللھم لا تجعل ھذا آخر العھد بنبیک و مسجدہ و حرمہ و یسرلی العود الیہ و العکوف لدیہ و ارزقنی العفو و العافیۃ فی الدنیا و الاخرۃ و رددنا الی اھلنا سالمین غانمین امنین یہ بات ذہن میں رہے کہ مقبولیت دعا اور حصول مقصد کی علامت یہ ہے کہ اس وقت بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور دل دیار محبوب کی جدائی کی حسرت و یاس سے معمور ہو بلکہ درحقیقت تمام اوقات دعا میں گریہ و زاری حصول رزق کا باعث اوّر امیدواری رحمت کی علامت ہے ایں دلم باغست و چشم ابروش ابر گرید باغ خندد شاد و خوش!۔

اس وقت اگر خدانخواستہ کسی شخص پر حالت گریہ و زاری طاری نہ ہو تو وہ بہ تکلّف اپنے اوپر یہ حالت طاری کرے اور ان باتوں کا تصور کرے جو ذوق اور گریہ و رقت کی حالت پیدا کریں کیونکہ اس وقت حالت گریہ ہی بہر صورت قبولیت کی علامت ہے، اور پھر وہاں کی جدائی سے بہ چشم تن اور بہ حسرت و یاس رخصت ہو اور رخصت ہوتے وقت پچھلے پیروں نہ لوٹے کیونکہ یہ صرف خانۂ کعبہ کے ساتھ مخصوص ہے اور وقت وداع جس قدر ہو سکے صدقہ و خیرات کرے اور ان تمام آداب کو ملحوظ رکھے جو سفر سے واپسی کے وقت کے سلسلہ میں منقول ہیں اور پھر جب اپنے شہر کے قریب پہنچ جائے تو یہ دعا پڑھے اللھم انی اسألک خیرھا و خیر اھلھا و خیر مافیھا و اعوذ بک من شرھا و شر اھلھا و شر مافیھا اللھم اجعل لنا بھا قرار او رزقا حسنا اور جب شہر میں پہنچ جائے تو یہ دعا پڑھے لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک و لہ الحمد و ھو علی کل شیئ قدیر اٰئبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ صدق وعدہ و نصر عبدہ و ھزم الاحزاب وحدہ و اعز جندہ فلا شیئ بعدہ اور چاہئے کہ اپنے شہر و مکان پہنچنے سے پہلے اپنے اعزہ کو خبر کر دے کہ میں فلاں دن فلاں وقت پہنچ رہا ہوں بغیر اطلاع کے ایک دم نہ پہنچ جائے نیز اپنے شہر میں پہنچنے کا بہترین وقت چاشت ہے یا شام۔ رات کے وقت نہ پہنچے پھر جب اپنے مکان پہنچ جائے۔ تو مکان کے اندر جانے سے پہلے اگر وقت مکروہہ نہ ہو تو مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھے دعا مانگے اور بخیر و عافیت وطن واپس پہنچ جانے پر باری تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور یہ کہے الحمد للّٰہ الذی بنعمتہ و جلالہ تتم الصالحات

الحمد للّٰہ کہ آج مورخہ ۸ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۶۷ء بروز دوشنبہ بوقت سوا گیارہ بجے شب مظاہر حق جلد دوم کی بطرز جدید ترتیب و تسوید اللہ رب العزۃ کی مدد سے اور توفیق سے مکمل ہوئی۔ حق تعالیٰ مجھ سیہ کار انسان کی اس خدمت کو قبول و مقبول فرمائے آمین۔

صلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و علی اٰلہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

عبداللہ جاوید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب البیوع

خرید و فروخت کا بیان

اسلامی نقطۂ نظر سے کائنات انسانی کی عملی زندگی کے دو محور ہیں۔ اوّل "حقوق اللہ" کہ جسے عبادات کہتے ہیں اور دوم "حقوق العباد" کہ جسے معاملات کہا جاتا ہے، یہی دو اصطلاحیں ہیں جو انسانی نظام حیات کے تمام اصول و قواعد اور قوانین کی بنیاد ہیں۔

ان دونوں میں چونکہ حقوق اللہ کی عمومیت حاصل ہے کہ اس کا تعلق کائنات انسانی کے ہر فرد سے ہے اس لئے مصنف کتاب نے پہلے ان کو بیان کیا۔ اب اس کے بعد حقوق العباد یعنی معاملات کا بیان شروع کیا ہے جس کا سب سے اہم جزو "بیع" ہے۔

بیع کے معنی: "بیع" کے معنی ہیں "بیچنا یعنی فروخت کرنا" لیکن کبھی اس کے معنی "خریدنا" بھی مراد ہوتے ہیں، اس لئے بیع کا ترجمہ اصطلاحی طور پر "خرید و فروخت" کیا جاتا ہے۔

فخر الاسلام کا بیان ہے کہ اصطلاح شریعت میں "آپس کی رضامندی سے مال کے ساتھ مال بدلنا" بیع کہلاتا ہے۔

بیع کی شرعیت: بیع یعنی خرید و فروخت کا شرعی ہونا، قرآن کریم کی اس آیت واحل اللّٰہ البیع وحرم الربوا (اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے) اور رسول کریم ﷺ کی احادیث (جو آگے آئیں گی) سے ثابت ہے۔

بیع کی قسمیں: بیع یعنی خرید و فروخت میں بنیادی طور پر تین چیزیں ہوتی ہیں۔ اوّل تو عقد بیع یعنی نفس معاملہ کہ ایک شخص کوئی چیز فروخت کرتا ہے اور دوسرا اسے خریدتا ہے، دوم مبیع یعنی وہ چیز جس کو فروخت کیا جاتا ہے اور سوم ثمن یعنی قیمت۔ ان تینوں کے اعتبار سے فقہی طور پر بیع کی کچھ قسمیں ہیں، چنانچہ نفس معاملہ اور اس کے حکم، کہ بیع صحیح ہوئی یا نہیں، کے اعتبار سے بیع کی چار قسمیں ہیں۔ ① نافذ ② موقوف ③ فاسد ④ باطل۔ بیع نافذ اس بیع کو کہتے ہیں کہ طرفین میں مال ہو (یعنی بیچنے والے کے پاس مبیع ہو اور خریدار کے پاس ثمن ہو) اور عاقدین یعنی بیچنے والا اور خریدار دونوں عاقل ہوں، نیز وہ دونوں بیع یا تو اصالۃً کریں یا وکالۃً اور دلالۃً جس بیع میں یہ تینوں چیزیں پائی جائیں گی وہ بیع بالکل صحیح اور نافذ ہوگی۔ بیع موقوف اس بیع کو کہتے ہیں جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کی چیز کو اس کی اجازت یا ولایت کے بغیر فروخت کرے۔ اس بیع کا حکم یہ ہے کہ جب تک کہ اصل مالک کی اجازت و رضامندی حاصل نہ ہو جائے یہ بیع صحیح نہیں ہوتی۔ اجازت کے بعد صحیح ہو جاتی ہے۔ بیع فاسد وہ بیع ہے جو باصلہ یعنی معاملہ کے اعتبار سے تو درست ہو مگر بوصفہ یعنی کسی خاص وجہ کی بناء پر درست نہ ہو۔ بیع باطل اس بیع کو کہتے ہیں جو نہ تو باصلہ درست ہو اور نہ بوصفہ۔ بیع فاسد اور بیع باطل کی تفصیل اور ان کی مثالیں انشاء اللہ "باب المنہی عنہا من البیوع" میں ذکر کی جائیں گی۔

مبیع یعنی فروخت کی جانے والی چیز کے اعتبار سے بھی مبیع کی چار قسمیں ہیں۔ ① مقائضہ ② صرف ③ سلم ④ بیع مطلق۔ بیع مقائضہ

یہ ہے کہ مبیع بھی مال اور ثمن بھی مال ہو مثلاً ایک شخص کپڑا دے اور دوسرا شخص اس کے بدلے میں اس کو غلہ دے۔ گویا بیع کی یہ وہ صورت ہے جسے عرف عام میں "تبادلہ مال" کہا جاتا ہے۔ بیع صرف یہ ہے کہ نقد کا تبادلہ نقد سے کیا جائے مثلاً ایک شخص ایک روپیہ کا نوٹ دے اور دوسرا شخص اس کے بدلے میں ایک روپیہ کے پیسے دے یا ایک شخص اشرفی دے اور دوسرا شخص اس کے بدلے میں اسے روپے دے گویا روپیہ بھنانا یا روپیہ کی ریزگاری لینا دینا بیع صرف کی ایک قسم ہے۔ بیع سلم یہ ہے کہ بیچنے والا خریدار سے کسی چیز کی قیمت پیشگی لے لے اور یہ طے ہو جائے کہ خریدار یہ چیز اتنی مدت مثلاً ایک دو مہینے کے بعد لے لے گا۔ بیع مطلق یہ ہے کہ کسی چیز کی بیع نقد کے عوض کی جائے مثلاً بیچنے والا ایک من گیہوں دے اور خریدار اس کی قیمت کے طور پر تیس روپے ادا کرے۔

ثمن یعنی قیمت کے اعتبار سے بیع کی چار قسمیں یہ ہیں۔ ① مرابحہ ② تولیت ③ وضیعت ④ مساومت۔ مرابحہ کی یہ صورت ہے کہ بیچنے والا مبیع کو اپنے خریدار سے نفع لے کر فروخت کرے۔ تولیت کی یہ صورت ہے کہ بیچنے والا مبیع کو بلا نفع کے اس قیمت پر فروخت کرے جس قیمت میں اس نے خود خریدی ہو۔ وضیعت کی صورت یہ ہے کہ بیچنے والا مبیع کو اس قیمت سے بھی کم میں فروخت کرے جتنی قیمت میں اس نے خود خریدی ہو اور مساومت کی صورت یہ ہے کہ بیچنے والا اور خریدار آپس کی رضامندی سے کسی چیز کی خرید و فروخت چاہے جس قیمت پر کریں اور اس میں بیچنے والے کی قیمت خرید کا کوئی لحاظ نہ ہو۔

بَابُ الْكَسْبِ وَطَلَبِ الْحَلَالِ

کسب اور طلب حلال کا بیان

"کسب اور طلب حلال" کا مطلب ہے "اپنی معاشی ضروریات مثلاً روٹی، کپڑے وغیرہ کے حصول کے لئے کمانا اور پاک روزی و حلال پیشہ کو بہر صورت اختیار کرنا" چنانچہ اس باب میں کسب معاش کی فضیلت ذکر کی گئی ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ کون سا کسب اور کون سا پیشہ اچھا ہے اور کون سا برا ہے؟

فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ سب سے بہتر کسب و پیشہ جہاد ہے، اس کے بعد تجارت، پھر زراعت اور پھر دستکاری (یعنی کتابت وغیرہ)۔

کسب یعنی کمانا فرض بھی ہے اور مستحب بھی، اسی طرح مباح بھی ہے اور حرام بھی۔ چنانچہ اتنا کمانا فرض ہے جو کمانے والے اور اس کے اہل و عیال کی معاشی ضروریات کے لئے اور اگر اس کے ذمہ قرض ہو تو اس کی ادائیگی کے لئے کافی ہو جائے۔ اس سے زیادہ کمانا مستحب ہے بشرطیکہ اس نیت کے ساتھ زیادہ کمائے کہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات سے جو کچھ بچے گا وہ فقراء و مساکین اور اپنے دوسرے مستحق اقرباء پر خرچ کروں گا۔ اسی طرح ضروریات زندگی سے زیادہ کمانا اس صورت میں مباح ہے جب کہ نیت اپنی شان و شوکت اور اپنے وقار و تمکنت کی حفاظت ہو، البتہ محض مال و دولت جمع کر کے فخر و تکبر کے اظہار کے لئے زیادہ حرام ہے۔ اگرچہ حلال ذرائع ہی سے کیوں نہ کمایا جائے۔

کمانے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی کمائی کو اپنی ذات پر اور اپنے اہل و عیال پر اس طرح خرچ کرے کہ نہ تو اسراف میں مبتلا ہو اور نہ بخل و تنگی کرے۔

جو شخص کمانے اور اپنی روزی خود فراہم کرنے پر قادر ہو اس پر لازم ہے کہ وہ کمائے اور جس طرح بھی ہو سکے حلال ذرائع سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی آبرومندانہ زندگی کے تحفظ کے لئے معاشی ضروریات خود فراہم کر کے دوسروں پر بار نہ بنے، ہاں جو شخص کسی بھی مجبوری اور عذر کی وجہ سے کسب و کمائی پر قادر نہ ہو تو پھر اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ دوسروں سے سوال کر کے اپنی زندگی

حفاظت کرے اگر اس صورت میں کوئی شخص محض اس وجہ سے کہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا اس کی غیرت کو گوارا نہیں، اس نے کسی سے سوال نہیں کیا یہاں تک کہ بھوک وافلاس نے اس کی زندگی کے چراغ کو گل کر دیا تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنی موت کا خود ذمہ دار ہوگا بلکہ ایک گنہگار کی موت مرے گا۔ نیز جو شخص خود کما کر اپنا پیٹ بھرنے سے عاجز ہو تو اس کا حال جاننے والے پر یہ فرض ہے کہ وہ اس معذور شخص کی خبر گیری کرے بایں طور کہ اس کا پیٹ بھرے یا وہ خود اس انسانی فریضہ کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو کسی ایسے شخص سے اس کی مدد کی سفارش کرے جو اس کی مدد کرنے پر قادر ہو۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اس آیت کریمہ:

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ۔

"اے مؤمنو! تم صرف وہی پاک وحلال رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے۔"

کی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ سب سے بہتر کسب جہاد ہے بشرطیکہ جہاد کے ارادے کے وقت مال غنیمت کے حصول کا خیال دل میں قطعا نہ ہو بلکہ نیت میں اخلاص ہو، اس کے بعد تجارت کا درجہ ہے خاص طور پر وہ تجارت جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں یا ایک شہر سے دوسرے شہر میں مسلمانوں کی ضروریات خاص کی چیزوں کو لانے لے جانے کا ذریعہ ہو، اس قسم کی تجارت کرنے والا شخص اگر حصول منفعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی خدمت اور ان کی حاجت روائی کی نیت بھی رکھے تو اس کی تجارت، عبادت کی بھی ایک صورت بن جائے گی۔ تجارت کے بعد زراعت کا درجہ ہے، زراعت کا پیشہ بھی دنیاوی منفعت کے علاوہ اجر وثواب کا ایک بڑا ذریعہ بن جاتا ہے جب کہ اس میں مخلوق خدا یعنی انسانوں اور جانوروں کی غذائی ضروریات کی فراہمی کی نیت خیر اور اللہ تعالیٰ کی رحمت یعنی بارش وہوا وغیرہ پر توکل واعتماد ہو، ان تینوں پیشوں کے علاوہ اور پیشے آپس میں کوئی فضیلت نہیں رکھتے، البتہ کتابت کا پیشہ بہتر درجہ ضرور رکھتا ہے کیونکہ اس پیشے میں نہ صرف یہ کہ علم کی خدمت ہوتی ہے بلکہ دینی علوم، شرعی احکام انبیاء اور بزرگوں کے احوال بھی یاد ہو جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا پیشوں کے بعد ان پیشوں کا درجہ آتا ہے جو بقاء عالم اور معاشرت وتمدن کی اصل ضروریات کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں مثلاً معماری، بیلداری، خشت سازی، چونا بنانا، گھی اور تیل نکالنا، روئی بیچنا، سوت کاتنا، کپڑے سینا اور آٹا پیسنا وغیرہ۔ یہ تمام کسب اور پیشے ان پیشوں سے بہتر ہیں جو محض تکلف وتزئین اور اظہار امارت ودولت کے کام آتے ہیں، جیسے زردوزی ونقاشی، مٹھائی بنانا، عطر بنانا بیچنا اور رنگریزی وغیرہ۔ تاہم یہ پیشے بھی اگر حسب موقع ہوں بایں طور کہ ان کی وجہ سے خلاف شرع امور کا ارتکاب نہ ہوتا ہو تو ان میں بھی کچھ کراہیت نہیں ہے۔ بخلاف ان پیشوں کے جن میں آلودگی، نجاست، مخلوق خدا بدخواہی، گناہوں کے ارتکاب میں اعانت، دین فروشی، کذب وجہل سازی اور فریب ودغا کا دخل رہتا ہو جیسے شاخ کشی، جاروب کشی، دباغی، احتکار غلہ، حمالی، مردہ شوئی، کفن فروشی، کٹنائی، ناچنا گانا، نقالی، جرہ بازی (پہلے زمانے میں ایک مستقل پیشہ تھا کہ کچھ چہل باز شارع عام پر ایک شخص کو کھڑا کر دیتے جو راہ چلتے آدمی کی کوکھ میں اس طرح ٹھوکا مار دیتا کہ اسے یہ پتہ نہ چلتا کہ یہ کس کی حرکت ہے چنانچہ جب وہ اس پر حیران وپریشان ہوتا تو سب چہل باز اس پر قہقہے لگاتے اس کو جرہ بازی کہتے تھے) نقالی، دلالی اور وکالت (جس میں جھوٹ فریب سے کام لیا جاتا ہو) امامت، اذان اور خدمت مسجد کی اجرت اور قرآن کی تلاوت وتعلیم کا معاوضہ لینا وغیرہ یہ سب پیشے مکروہ ہیں۔ (شاہ عبدالعزیزؒ)

مغنی الطالب میں لکھا ہے کہ کسب اور کسب کرنے والے کی فضیلت احادیث میں بہت منقول ہے، اسی طرح جو شخص کسب پر قادر ہونے کے باوجود از راہ کسل وسستی کسب نہ کرے بلکہ اپنی گذر اوقات کے لئے دوسروں سے مانگتا پھرے اس کے حق میں بڑی وعید بیان کی گئی ہے۔ لیکن جو شخص خدا کی رزاقی پر اعتماد وبھروسہ کرتے ہوئے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے اور نہ ہی اپنی دینی مصروفیات اور عبادت واذکار میں خلل پڑنے کی وجہ سے کسب وغیرہ کرے تو اس وعید میں داخل نہیں بشرطیکہ اپنی امداد کے لئے دوسرے لوگوں کی طرف نہ تو اس کا دل متوجہ ہو اور نہ وہ کسی سے اپنی امداد وفروخت کی توقع رکھتا ہو کیونکہ اسے سوال دلی کہتے ہیں جو سوال زبانی سے کہیں بدتر چیز ہے۔

جو شخص اتنا مال و زر رکھتا ہو جو اس کی معاشی ضروریات کے لئے کافی ہو یا اوقات وغیرہ سے اسے بقدر ضروریات روپیہ پیسہ مل جاتا ہو (مطلب یہ کہ گھر بیٹھے اسے کسی بھی جائز وسیلے سے بقدر ضروریات آمدنی ہو جاتی ہو) تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ عبادت وغیرہ میں مشغول رہے، اپنے اوقاف کو کسی کسب وغیرہ میں صرف نہ کرے، اسی طرح دینی علوم کی تعلیم دینے والے مفتی، قاضی اور اسی زمرہ کے دوسرے لوگوں کے لئے بھی یہی حکم ہے اگر یہ لوگ بقدر کفایت ضروریات آمدنی رکھتے ہوں تو ان کو اپنے امور ہی میں مصروف رہنا چاہئے کسب وغیرہ میں مصروف نہ ہوں۔

جو شخص کسی کسب مثلاً تجارت وغیرہ کا پیشہ اختیار کرے تو اس پر فرض ہے کہ وہ صرف حلال اور جائز مال کمائے، حرام سے کلیۃً اجتناب کرے اور اپنے پیشے و ہنر میں احکام شرعی کی رعایت، بہر صورت ملحوظ رکھے، نیز اپنے پیشہ میں تمام تر محنت وجدوجہد کے باوجود اللہ کی ذات پر توکل و اعتماد رکھے کہ رزاق مطلق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور کسب، محض ایک ظاہری وسیلہ کے درجہ کی چیز ہے، اپنے پیشے و کسب کو رزاق ہرگز نہ سمجھے کیونکہ یہ شرک خفی ہے۔ حرام کسب کے ذریعے حاصل ہونے والے مال و زر سے مکمل پرہیز کرے کیونکہ اس کے بارے میں سرکار دو عالم ﷺ کی یہ وعید منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص حرام مال سے صدقہ و خیرات کرتا ہے تو اس کا صدقہ قبول نہیں ہوتا" اور مال حرام اپنے پیچھے یعنی مالک کی موت کے بعد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں رہتا کہ وہ (اپنے مالک کے لئے ایسا برا) زاد راہ بن جاتا ہے جو اسے (یعنی مالک کو) دوزخ کی آگ میں پہنچا دیتا ہے۔

بعض لوگ حرام مال کی بڑی تعداد سے تو پرہیز کرتے ہیں لیکن قلیل مقدار میں احتیاط نہیں کرتے، حالانکہ حرام مال کی قلیل ترین مقدار سے بھی اسی طرح اجتناب کرنا چاہئے جس طرح بڑی سے بڑی مقدار سے اجتناب ضروری ہے اس بارے میں یہ احساس ہونا چاہئے کہ حرام مال کی وہ قلیل ترین مقدار بقیہ تمام حلال مال میں مل کر سارے مال کو مشتبہ بنا دے گی اور مشتبہ مال و مشتبہ پیشے کے بارے میں بھی یہ مسئلہ ہے کہ اس سے اجتناب ہی اولیٰ ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کو بطور ہدیہ وغیرہ کوئی ایسی چیز یا ایسا مال دے جس کی حرمت و حلت کے بارے میں شبہ ہو تو چاہئے کہ اس چیز یا اس مال کو اچھے انداز میں اور نرمی کے ساتھ دینے والے کو واپس کر دے ہاں اگر واپس کرنے سے دینے والا آزردہ خاطر ہو تو پھر واپس نہ کرنا چاہئے۔ یہی حکم اس مشتبہ مال کی تحقیق کرنے کا بھی ہے کہ اگر وہ مشتبہ مال دینے والا آزردہ خاطر نہ ہو تو تب اس مال کی تحقیق کی جائے اور اگر وہ تحقیق کرنے سے آزردہ خاطر ہو تو پھر تحقیق بھی نہ کی جائے کیونکہ کسی مسلمان کو آزردہ خاطر کرنا حرام ہے جب کہ مشتبہ مال کی تحقیق کرنا ورع (تقویٰ) ہے اور اس بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ ورع کے لئے حرام کا ارتکاب نہ کرنا چاہئے ہاں جس مال کے بارے میں بالکل تحقیق ہو کہ یہ حرام محض ہے تو پھر اس کو واپس کر دینا بہر صورت ضروری ہے اگرچہ دینے والا آزردہ خاطر ہی کیوں نہ ہو البتہ اگر اس مال کو واپس کرنے میں کسی فتنہ انگیزی کا خوف ہو تو پھر اسے بھی واپس نہ کرے بلکہ اسے لے کر کسی مضطر کو دے دے اور اگر خود مضطر ہو تو اسے اپنے استعمال میں لے آئے۔

جس بازار میں حرام مال کی تجارت ہوتی ہو اس بازار سے بھی اجتناب کرنا چاہئے کہ اس میں خرید و فروخت نہ کرے۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں مال حرام ہے، مشتبہ ہے اس کی تحقیق و تفتیش ضروری نہیں ہے کیونکہ حرمت و شبہ کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں ہر جگہ اور ہر چیز کی تحقیق و تجسس محض وسوسہ ہے۔

غیر مشروع کسب کی اجرت بھی حرام ہے مثلاً مردوں کے لئے ریشمی کپڑے سینا یا مردوں کے لئے سونے کے زیور بنانا اسی طرح غیر مشروع خرید و فروخت سے حاصل ہونے والا نفع و مال بھی حرام ہے جیسے محتکرہ غلہ بیچنا۔ تمام تجارتوں میں سب سے بہتر تجارت بزازی ہے اسی طرح تمام پیشوں میں سب سے بہتر پیشہ مشک بنانا و سینا ہے۔ خرید و فروخت میں کھوٹے سکوں کو پھیلانا قطعاً ناجائز ہے اگر کھوٹے ہاتھ لگیں تو انہیں کنویں وغیرہ میں ڈال کر ضائع کر دینا چاہئے۔

اسی طرح ہر تاجر اور دوکاندار کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاملات میں مکر وفریب سے کام نہ لے، بات بات پر قسم نہ کھائے کسی چیز میں اگر کوئی عیب ہو تو اسے خریدار سے پوشیدہ نہ رکھے، اپنی اشیاء کی تعریف و توصیف حقیقت سے زیادہ نہ کرے، کوئی چیز کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت نہ کرے جو اسے حرام کام میں استعمال کرے مثلاً انگور کسی شراب ساز کو نہ بیچے، یا ہتھیار وغیرہ کسی ڈاکو و قزاق وغیرہ کے ہاتھ فروخت نہ کرے، دستکار و صنعت گر اپنی بنائی ہوئی چیز میں کھوٹ ملاوٹ اور غلط چیزوں کی آمیزش نہ کرے کیونکہ ایسی چیز سے حاصل ہونے والی اجرت و قیمت حرام ہوتی ہے، ناپ تول میں کمی نہ کرے، غبن و دھوکہ دہی میں اپنا دامن ملوث نہ کرے، ہمہ وقت یہ تصور رکھے کہ ناجائز طریقوں اور حرام ذرائع سے حاصل ہونے والا ایک پیسہ بھی جنت میں داخل ہونے سے روک دے گا، تھوڑے منافع پر اکتفا کرے کہ یہ مستحب ہے اور جس تجارت و حرفت میں مشغول ہو اور اس سے اس کی ضروریات پوری ہو جاتی ہوں تو اسی پر قناعت کرے، اس کی موجودگی میں دوسری تجارتوں اور دوسرے کاروبار کے ذریعے زیادہ کمانے کی حرص نہ رکھے بلکہ اپنے بقیہ اوقات کو آخرت کی بھلائیوں کو حاصل کرنے میں صرف کرے کیونکہ صرف اس دنیا کی فانی زندگی کی راحت و تعیش کے حصول میں ہمہ وقت لگے رہنا اور آخرت کی ابدی زندگی کی سعادتوں سے بے پرواہ ہو جانا عقل و دانش سے بعید تر بات ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اپنے ہاتھ کی محنت کی روزی سب سے بہتر ہے

① عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِي كَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ اَنْ يَاكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَاِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت مقدامؓ بن معدی کرب کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کبھی کسی نے اپنے ہاتھ کی محنت کی روزی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمائی ہوئی روزی کھاتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے ایک جلیل القدر نبی تھے اور ساتھ ہی خدا نے انہیں دنیا کی سلطنت و حکومت بھی عطا کی تھی۔ ان کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی حکومت میں لوگوں سے اپنے بارے میں تجسس کرتے رہتے تھے، چنانچہ جو شخص ان کو نہیں پہچانتا تھا اس سے وہ دریافت کرتے کہ بتاؤ داؤد کیسا ہے؟ لوگوں میں اس کی سیرت و عادت کس درجے کی ہے، اور اس کے بارے میں تمہارا تاثر کیا ہے؟ ایک دن ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو آدمی کی صورت میں ان کے پاس بھیجا انہوں نے اس سے بھی اس قسم کے سوال کئے۔ اس نے کہا کہ داؤد علیہ السلام ہیں تو اچھے آدمی، مگر اتنی بات ضرور ہے کہ وہ بیت المال سے روزی کھاتے ہیں۔ بس یہ سننا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے دل و دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی، فوراً اپنے پروردگار سے دعا کی کہ "رب العالمین! مجھے بیت المال سے مستغنی بنا دے اور مجھے کوئی ایسا ہنر عطا کر دے کہ جس سے میں اپنی روزی کما سکوں" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں زرہ بنانے کا ہنر عطا فرمایا، منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو ایسی خاصیت عنایت کی کہ لوہا ان کے ہاتھوں میں پہنچتے ہی موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا جس سے وہ زرہ بناتے اور جو چار چار ہزار درہم میں فروخت ہوتی بلکہ بعض علماء نے تو یہ لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام ہر روز ایک زرہ بناتے اور اس کو چھ ہزار درہم میں فروخت کرتے، پھر اس چھ ہزار کو اس طرح صرف کرتے کہ دو ہزار تو اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتے اور چار ہزار درہم بنی اسرائیل کے فقراء و مساکین میں بطور صدقہ و خیرات تقسیم کر دیتے۔

بہر کیف آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بالا ارشاد گرامی کے ذریعے جہاں یہ ارشاد فرمایا کہ کسب یعنی اپنی روزی خود پیدا کرنا انبیاء کی سنت ہے جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے عمل سے معلوم ہوا اس لئے تم بھی ان کے طریقے کو اختیار کرو، وہیں گویا آپ نے اپنی روزی خود اپنی صنعت و حرفت کے ذریعے پیدا کرنے پر لوگوں کو ترغیب دلائی ہے کیونکہ اس میں بڑے بڑے فائدے ہیں مثلاً جو شخص اپنی صنعت

وحرفت سے کماتا ہے نہ صرف یہ کہ خود اسے منافع حاصل ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کی صنعت وحرفت سے فائدہ پہنچتا ہے پھر یہ کہ ایسا شخص اپنے پیشے میں مصروف رہنے کی وجہ سے بری باتوں اور لہو ولعب سے محفوظ رہتا ہے، نیز چونکہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی وجہ سے کسر نفسی بھی پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے نفس کی سرکشی سے بچتا ہے اور پھر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایسا شخص کسی کا محتاج نہیں رہتا، کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا، کسی کے آگے جھکتا نہیں اور اسے ایک آبرومندانہ زندگی حاصل رہتی ہے۔

صرف حلال مال کھانے کی فضیلت اور حرام مال سے نہ بچنے کا اثر

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ فَقَالَ يَآ اَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا وَقَالَ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَاءِ يَارَبِّ يَارَبِّ وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ (تمام کمی اور عیوب سے) پاک ہے، اس پاک ذات کی بارگاہ میں صرف وہی (صدقات واعمال) مقبول ہوتے ہیں جو (شرعی عیوب اور نیت کے فساد سے پاک ہوں یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے جس چیز (یعنی حلال مال کھانے اور اچھے اعمال) کا حکم اپنے رسولوں کو دیا ہے اسی چیز کا حکم تمام مومنوں کو بھی دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا (یعنی اے رسولو! حلال روزی کھاؤ اور اچھے اعمال کرو) نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یا ایھا الذین امنوا کلوا من طیبات مارزقنکم (یعنی اے مؤمنو! تم صرف وہی پاک وحلال رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے) پھر آپ ﷺ نے (بطور مثال) ایک شخص کا حال ذکر کیا کہ وہ طول طویل سفر اختیار کرتا ہے پراگندہ بال اور غبار آلودہ ہے وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے، اے میرے رب! اے میرے رب (یعنی وہ اپنے مقاصد کے لئے دعاء مانگتا ہے) حالانکہ کھانا اس کا حرام، لباس اس کا حرام (شروع سے اب تک) پرورش اس کی حرام ہی (غذاؤں سے) ہوئی پھر کیونکر اس کی دعا قبول کی جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں پہلے تو حلال مال کمانے کی فضیلت اور اس کا حکم بیان کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کہ خود پاک ہے اور حلال رزق کو اس کی جناب پاک میں اس وجہ سے ایک نسبت حاصل ہے کہ حلال رزق بھی حرمت کی نجاستوں سے پاک ہوتا ہے تو تقاضاء عبودیت یہی ہے کہ بندہ حلال ہی رزق کھائے تاکہ اس پاک وحلال رزق کی وجہ سے اس بندہ کو بارگاہ خداوندی میں تقرب کی دولت حاصل ہو۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ بتایا ہے کہ حرام مال سے اجتناب نہ کرنے کا اثر دعا کا قبول نہ ہونا ہے، چنانچہ اس بات کو آپ ﷺ نے اس مثال کے ذریعے ظاہر فرمایا ہے کہ ایک شخص حج یا اور عبادات کے لئے طول طویل سفر اختیار کرتا ہے وہ ان مقامات مقدسہ تک پہنچنے میں پوری مشقت وجدوجہد کرتا ہے جہاں مانگی جانے والی دعا باب قبولیت تک پہنچتی ہے یہاں تک کہ وہ ان مقامات تک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ اس حال میں دست سوال اٹھاتا ہے کہ سفر کی مشقت وطوالت کی وجہ سے اس کے بال پراگندہ ہیں، پورا جسم گرد وغبار سے آلودہ ہے اور تضرع والحاح کی پوری کیفیت اس پر طاری ہے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کی دعاء بظاہر قبول ہونی چاہئے کیونکہ اول تو ایک عبادت گذار بندہ ہے پھر وہ مسافر بھی ہے اور مسافر کے بارے میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کی دعاء باب قبولیت تک پہنچ کر رہتی ہے دوسرے یہ کہ اس جگہ دعا مانگ رہا ہے جہاں مانگی جانے والی ہر دعا کی لاج رکھی جاتی ہے، غرضیکہ قبولیت دعا کے تمام آثار موجود ہیں مگر اس شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی، کیوں؟ اس لئے کہ جاننے والا جانتا ہے کہ وہ حرام مال سے پرہیز نہیں

کرتا، گویا اس کی ساری محنت و مشقت اور اس کی ساری عبادت و حالت اس کی دعا کو صرف اس لئے مؤثر نہیں بنا سکی کہ وہ حرام مال کھاتا ہے، حرام لباس پہنتا ہے اور کمائی کے حرام ذرائع سے اجتناب نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا کی قبولیت حلال رزق پر موقوف ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ دعا کے دو بازو ہیں (جن کے سہارے وہ دعا باب قبولیت تک پہنچتی ہے) ایک تو اکل حلال دوسرا صدق مقال یعنی حلال کھانا اور سچ بولنا۔

آنے والے زمانہ کے بارے میں ایک پیش گوئی

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْتِىْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِى الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْهُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو جو مال ملے گا اس کے بارے میں وہ اس کی پرواہ نہیں کرے گا کہ یہ حلال ہے یا حرام۔" (بخاریؒ)

تشریح: قیامت کے قریبی زمانہ میں جہاں عام گمراہی کی وجہ سے افکار و اعمال کی اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی وہیں ایک بڑی خرابی یہ بھی پیدا ہوگی کہ لوگ حلال و حرام مال کے درمیان تمیز کرنا چھوڑ دیں گے جس کو جو بھی مال ملے گا اور جس ذریعہ سے بھی ملے گا اسے یہ دیکھے بغیر کہ یہ حلال ہے یا حرام ہضم کر جائے گا۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ پیش گوئی آج کے زمانہ پر پوری طرح منطبق ہے۔ آج ایسے کتنے لوگ ہیں جو حلال و حرام مال کے درمیان تمیز کرتے ہیں؟ ہر شخص مال و زر بٹورنے کی ہوس میں مبتلا ہے مال حلال ہے یا حرام ہے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوئی۔ بس ہاتھ لگنا چاہئے کسی نے سچ کہا ہے ؎

ہر چہ آمد بدہان شاں خورند　　　　وآنچہ آمد بزبان شان گفتند

یہ اس دور کی عام وبا ہے جس سے کوئی طبقہ اور کوئی جماعت محفوظ نہیں ہے۔

مشتبہ چیزوں سے بھی اجتناب کرنا چاہئے

④ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِى الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِى الْحَرَامِ كَالرَّاعِىْ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَّرْتَعَ فِيْهِ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِى الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِىَ الْقَلْبُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت نعمانؓ ابن بشیر راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حلال ظاہر ہے، حرام ظاہر ہے، اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، لہٰذا جس شخص نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو پاک و محفوظ کر لیا۔ (یعنی مشتبہ چیزوں سے بچنے والے کے نہ تو دین میں کسی خرابی کا خوف رہیگا، اور نہ کوئی اس پر طعن تشنیع کریگا) اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہوا وہ حرام میں مبتلا ہو گیا، اور اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو ممنوعہ چراگاہ کی مینڈ پر چراتا ہے اور ہر وقت اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کے جانور اس ممنوعہ چراگاہ میں گھس کر چرنے لگیں۔ جان لو! ہر بادشاہ کی ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے، اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چراگاہ حرام چیزیں ہیں۔ اور اس بات کو بھی ملحوظ رکھو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست حالت میں رہتا ہے یعنی جب وہ ایمان و عرفان اور یقین کے نور سے منور رہتا ہے تو (اعمال خیر اور حسن اخلاق و احوال کی وجہ سے پورا جسم درست حالت میں رہتا ہے اور جب اس ٹکڑے میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے یاد رکھو! گوشت کا وہ ٹکڑا دل ہے۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: "حلال ظاہر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کچھ چیزیں تو وہ ہیں، جن کا حلال ہونا سب کو معلوم ہے۔ نیک کلام، اچھی باتیں وہ مباح چیزیں ہیں جن کو کرنا یا جن کی طرف دیکھنا درست ہے، شادی بیاہ کرنا اور چلنا پھرنا وغیرہ وغیرہ! اسی طرح حرام ظاہر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا حرام ہونا نص کے ذریعہ بالکل واضح طور پر معلوم ہو گیا ہے۔ جیسے شراب، خنزیر، مردار جانور، جاری خون، زنا، سود، جھوٹ، غیبت، چغل خوری، امرد اور اجنبی عورت کی طرف بہ نظر بد دیکھنا وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی حرمت یا حلت کے بارہ میں دلائل کے تعارض کی بناء پر کوئی واضح حکم معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ حرام ہیں یا حلال ایسی کتنی ہی چیزیں ہیں جن کے حلال ہونے کی دلیلیں بھی ہیں اور حرام ہونے کی بھی، اس صورت میں کوئی واضح فیصلہ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں کی حقیقت بہت سے لوگ نہیں جان پاتے البتہ وہ علماء جو مرتبہ اجتہاد پر فائز ہوتے ہیں یا جن کا علم بہت وسیع و گہرا ہوتا ہے ایسی چیزوں کے بارہ میں دونوں طرف کی دلیلوں میں سے کسی ایک طرف کی دلیل کو اپنی قوت اجتہاد اور بصیرت فکر و نظر کے ذریعہ راجح قرار دیکر کوئی واضح فیصلہ کر لیتے ہیں۔ بہرکیف مشتبہ چیز کے بارہ میں علماء کے تین قول ہیں۔

❶ ایسی چیز کو نہ حلال سمجھا جائے نہ حرام اور نہ مباح یہی قول سب سے زیادہ صحیح ہے اور اسی پر عمل کرنا چاہئے جس کا مطلب یہ ہے ایسی چیز سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔

❷ ایسی چیز کو حرام سمجھا جائے۔

❸ ایسی چیز کو مباح سمجھا جائے۔

اب ان تینوں اقوال کو ذہن میں رکھ کو مشتبہ کو بطور مثال اس طرح سمجھئے کہ مثلاً ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا۔ ایک دوسری عورت نے آکر کہا کہ میں نے ان دونوں کو اپنا دودھ پلایا ہے، اس صورت میں وہ منکوحہ عورت اس شخص کے حق میں مشتبہ ہو گئی کیونکہ ایک طرف تو عورت کا بیان ہے کہ میں نے چونکہ ان دونوں کو دودھ پلایا ہے اس لئے یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہوئے اور ظاہر ہے کہ رضاعی بھائی بہن کے درمیان نکاح درست نہیں ہوتا لہٰذا اس دلیل کا تو یہ تقاضا ہے کہ اس نکاح کو قطعاً ناجائز کہا جائے مگر دوسری طرف نکاح کے جائز رہنے کی یہ دلیل ہے کہ صرف یہ ایک عورت کی بات ہے جس پر کوئی شرعی گواہی نہیں ہے اس پر کیسے یقین کر لیا جائے کہ یہ عورت صحیح ہی کہہ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض بدنیتی کی وجہ سے یہ بات کہہ کر ان دونوں کے درمیان افتراق کرانا چاہتی ہے، اس صورت میں کہا جائے گا نکاح جائز اور درست ہے دلائل کے اس تعارض کی وجہ سے لامحالہ یہی حکم ہو گا کہ یہ ایک مشتبہ مسئلہ ہو گیا ہے اس لئے اس شخص کے حق میں بہتر یہی ہو گا کہ وہ اس عورت کو اپنے نکاح میں نہ رکھے کیونکہ مشتبہ چیز سے اجتناب ہی اولیٰ ہے مشتبہ چیز کی دوسری مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کے پاس کچھ روپے ہیں جن میں سے کچھ تو جائز آمدنی کے ہیں اور کچھ ناجائز آمدنی کے اس صورت میں وہ سب روپے اس شخص کے حق میں مشتبہ ہیں لہٰذا اس کو ان روپیوں سے اجتناب و پرہیز کرنا چاہئے۔

ارشاد گرامی میں حرام چیزوں کو ممنوعہ چراگاہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح کوئی حاکم کسی خاص چراگاہ کو دوسروں کے لئے ممنوع قرار دے دیتا ہے جس کے نتیجہ میں لوگوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو اس ممنوعہ چراگاہ سے دور رکھیں۔

اسی طرح جو چیزیں شریعت نے حرام قرار دی ہیں وہ لوگوں کے لئے ممنوع ہیں کہ ان کے ارتکاب سے اجتناب و پرہیز واجب و ضروری ہے اور مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہونے کو ممنوعہ چراگاہ کی مینڈ (منڈیر) پر عام جانور چرانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح چرواہے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو ممنوعہ چراگاہ سے دور رکھ کر چرائے تاکہ اس کے جانور اس ممنوعہ چراگاہ میں نہ گھس جائیں اور اگر وہ اپنے جانوروں کو ممنوعہ چراگاہ کی مینڈ پر چرائے گا۔ تو پھر اس بات کا ہر وقت احتمال رہیگا کہ اس کے جانور ممنوعہ چراگاہ میں گھس جائیں جس کے نتیجہ میں اسے مجرم قرار دے دیا جائیگا اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ مشتبہ چیزوں سے دور رہے تاکہ محرمات (حرام چیزوں) میں مبتلا نہ ہو جائے اس کے بعد آپ نے مذکورہ بالا تشبیہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جان لو کہ ہر بادشاہ کا ایک

ایسا ممنوعہ علاقہ ہوتا ہے جس میں جانور چرانا جرم سمجھا جاتا ہے (یہ گویا زمانہ جاہلیت کے بادشاہوں اور حکام کے بارہ میں خبر دی ہے یا یہ کہ مسلمانوں میں سے ان بادشاہوں اور حکام کے بارہ میں خبر دی ہے جو غیر عادل ہیں کیونکہ کسی علاقہ کی گھاس کو جانوروں کے چرنے سے روک کو ممنوعہ چراگاہ قرار دینا درست نہیں ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ممنوعہ علاقہ حرام چیزیں ہیں کہ جن میں مبتلا ہونا لوگوں کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا ہے لہٰذا جو کوئی اس ممنوعہ علاقہ میں داخل ہوگا یعنی حرام چیزوں کا ارتکاب کریگا اسے مستوجب عذاب قرار دیا جائے گا اور پھر ان حرام چیزوں میں بھی بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کے مرتکب کی بخشش ہی نہیں ہوگی جیسے شرک اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہیں کہ چاہے ان کے مرتکب کو بخشے چاہے نہ بخشے البتہ سچے دل کے ساتھ توبہ استغفار سے ہر چیز بخشی جائیگی۔

حضرت شیخ علی متقیؒ نے اس موقع پر یہ ترتیب ضروری، مباح، مکروہ، حرام، کفر، قائم کر کے لکھا ہے کہ جب بندہ اپنی معاشی تمدنی اور سماجی زندگی کے تمام گوشوں میں اس قدر ضرورت پر اکتفا کر لیتا ہے جس سے اس کا وجود اور اس کی عزت باقی رہے تو وہ اپنے دین میں ہر خطرہ سے سلامت رہتا ہے مگر جب حد ضرورت سے گذرنے کی کوشش کرتا ہے تو حد مکروہات میں داخل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ حرص و ہوس حد مکروہات سے نکال کر محرمات کی مد میں داخل کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا اگلا قدم کفر میں پہنچ جاتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

حدیث کے آخر میں انسانی جسم میں گوشت کے اس ٹکڑے کی اہمیت بیان کی گئی ہے جسے دل کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ جب وہ ٹکڑا بگڑ جاتا ہے یعنی انکار، شک اور کفر کی وجہ سے اس پر ظلمت طاری ہو جاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں ارتکاب گناہ و معصیت کی وجہ سے پورا جسم بگڑ جاتا ہے، لہٰذا ہر عاقل و بالغ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل کی طرف متوجہ رہے اور اس کو خواہشات نفسانی میں منہمک ہونے سے روکے تاکہ وہ آگے بڑھ کر مشتبہ چیزوں کی حد میں داخل نہ ہو جائے کیونکہ جب دل خواہشات نفسانی کی طرف چل پڑتا ہے تو پھر خدا کی پناہ، وہ تمام حدوں کو پھلانگتا ہوا ظلمت کی آخری حدوں تک پہنچ جاتا ہے۔

آخر میں یہ سمجھ لیجئے کہ یہ حدیث اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ بدن کی بھلائی و بہتری حلال غذا پر موقوف ہے کیونکہ حلال غذا سے دل کو صفائی حاصل ہوتی ہے اور دل کی صفائی ہی سے تمام بدن اچھی حالت میں رہتا ہے بایں طور کہ اس کے ایک ایک عضو سے اچھے اعمال ہی صادر ہوتے ہیں اور تمام اعضاء کا برائی کی طرف میلان ختم ہو جاتا ہے۔

اور اب ایک بات یہ جان لیجئے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث علم و مسائل کے بڑے وسیع خزانے کی حامل ہے نیز جن حدیثوں پر اسلامی شرائع و احکام کا مدار ہے وہ تین ہیں ایک تو اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ دوسری مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ اور تیسری یہی ہے اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ الخ۔

زانیہ کی اجرت مال حرام ہے

⑤ وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَمَنُ الْکَلْبِ خَبِیْثٌ وَ مَهْرُ الْبَغِیِّ خَبِیْثٌ وَکَسْبُ الْحَجَّامِ خَبِیْثٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت رافعؓ ابن خدیج کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کتے کی قیمت ناپاک مال ہے، زنا کار عورت کی اجرت، حرام مال ہے۔ سینگی کھینچنے والے کی کمائی ناپسندیدہ مال ہے"۔ (مسلم)

تشریح: پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ لفظ "خبیث" کے لغوی معنی "ناپاک اور برا" کے ہیں لیکن فقہی طور پر اس کے کوئی معنی نہیں ہیں ائمہ مجتہدین اور فقہاء حسب موقع و محل اس کے معنی کبھی حرام، کبھی ناپاک اور کبھی مکروہ وغیرہ مراد لیتے ہیں۔

چنانچہ حضرت امام شافعیؒ نے "ثمن الکلب خبیث" میں "خبیث" کے معنی حرام مراد لیتے ہوئے کہا ہے کہ حدیث سے چونکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتے کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والا مال حرام ہے اس لئے کتے کی خرید و فروخت بھی ناجائز ہے۔ کتا خواہ معلّم (یعنی سدھایا ہوا) ہو خواہ غیر معلّم (یعنی سدھایا ہوا نہ) ہو۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ حضرت امام محمدؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا قول یہ ہے کہ ان کتوں، چیتوں اور درندوں کی خرید و فروخت جائز ہے، جن سے فائدے حاصل ہوتے ہیں خواہ وہ معلّم ہوں یا غیر معلّم۔ ان حضرات نے "ثمن الکلب خبیث" کے بارہ میں یہ کہا ہے کہ لفظ "خبیث" محض حرمت ہی پر دلالت نہیں کرتا جس کی واضح مثال اس حدیث کے الفاظ "و کسب الحجام خبیث" ہیں۔ اگر لفظ "خبیث" سے حرام ہی مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ سینگی کھینچنے والے کو جو اجرت حاصل ہوتی ہے وہ بھی حرام ہے حالانکہ متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک وہ حرام نہیں ہے لہٰذا "ثمن الکلب خبیث" میں لفظ خبیث کے معنی "ناپاک" مراد لیتے ہوئے اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ کتے کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والا مال ناپاک یعنی مکروہ ہے، حرام نہیں ہے۔

"کسب الحجام خبیث" میں لفظ خبیث کے معنی "ناپسندیدہ" مراد لئے گئے ہیں کیونکہ خود آنحضرت ﷺ کے بارہ میں ثابت ہے کہ آپ نے سینگی کھنچوانے کی اجرت ادا کی ہے اگر یہ اجرت حرام ہوتی تو آپ خود کیوں دیتے؟ لہٰذا اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ سینگی کھینچنے والے کو اپنی اجرت کے طور پر جو مال ملتا ہے وہ ناپسندیدہ یعنی مکروہ تنزیہی ہے۔

کتے کی قیمت کا مسئلہ

⑥ وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ ثَمَنِ الْکَلْبِ وَ مَھْرِ الْبَغِیِّ وَ حُلْوَانِ الْکَاھِنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابومسعودؓ انصاری کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے کتے کی قیمت، بدکار عورت کی اجرت اور کاہن کے حلوان یعنی اس کی اجرت (کے طور پر حاصل ہونے والے مال کو استعمال کرنے) سے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کتے کی خرید و فروخت اور اس کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والے مال کے سلسلہ میں تفصیلی بحث اس سے پہلی حدیث کی تشریح میں کی جا چکی ہے چنانچہ اس حدیث میں کتے کی قیمت کے ممنوع ہونے کا جو حکم بیان کیا گیا اس کے بارہ میں حنفی علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت تھا جب کہ آنحضرت ﷺ نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ نیز آپ نے کتوں سے فائدہ حاصل کرنے کی بھی ممانعت کر دی تھی مگر پھر بعد میں آپ نے یہ اجازت دے دی تھی کہ کتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ یہ بھی منقول ہے کہ ایک شخص نے ایک شکاری کتے کو مار ڈالا تھا تو آپ نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ کتے کے مالک کو چالیس درہم ادا کرے۔ اسی طرح ایک شخص نے ایک ریوڑ کے نگہبان کتے کو مار ڈالا تو آپ نے اسے حکم دیا کہ وہ مالک کو اس کتے کے بدلہ میں ایک دنبہ دے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ نہ تو کتے کی خرید و فروخت جائز ہے اور نہ کسی کتے کو مار ڈالنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کتے کی قیمت اس کے مالک کو ادا کرے کتا خواہ معلّم ہو یا غیر معلّم ہو، اسی طرح خواہ اس کتے کا پالنا جائز ہو یا ناجائز ہو لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس کتے کی خرید و فروخت جائز قرار دی ہے جس سے فائدہ اٹھانا مقصود ہو مثلاً گھر بار کی نگرانی یا ریوڑ گلوں کی نگہبانی وغیرہ نیز حضرت امام اعظمؒ نے ایسے کتے کو مار ڈالنے والے کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس کتے کی قیمت اس کے مالک کو ادا کرے۔

بدکار عورت کے اس مال کا حکم جو اس نے اپنی بدکاری کی اجرت کے طور پر حاصل کیا ہو، گذشتہ حدیث کی تشریح میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

"کاہن" اس شخص کو کہتے ہیں جو آنے والے زمانہ کی خبریں بتایا کرتا ہے، اسی طرح "حلوان" کے لغوی معنی اگرچہ "شیرنی اور مٹھائی" لیکن اصطلاحی طور پر عربی میں "حلوان" اس اجرت کو کہتے ہیں جو کاہن آیندہ کی خبریں معلوم کرنے والے سے وصول کرتا ہے، خواہ وہ مٹھائی اور کھانے وغیرہ کی صورت میں ہو یا کپڑے، زیور اور نقدی وغیرہ کی شکل ہیں، کاہن کی اجرت کو حلوان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح شیرنی اور مٹھائی کھانے سے طبیعت کو فرحت محسوس ہوتی ہے اسی طرح کاہن کو اپنی یہ اجرت لے کر بہت ہی فرحت محسوس ہوتی ہے کیونکہ بغیر کسی محنت و مشقت کے وہ اچھا خاصا مال بٹور لیتا ہے۔

یہ بات تو معلوم ہی ہوگی کہ جس طرح کاہن کے پاس جانا اور ان سے آئیندہ کی خبریں معلوم کرنا حرام ہے اسی طرح پوشیدہ باتوں کو معلوم کرنے کے لئے نجومی اور پامسٹ وغیرہ کے پاس جانا اور ان کی بتائی ہوئی باتوں پر یقین کرنا حرام ہے اس بارہ میں کسی عالم کا کوئی اختلاف نہیں ہے اس کی تفصیلی بحث انشاء اللہ "باب السحر و الکھانہ" میں آئے گی۔"

خون بیچنا حرام ہے

(۷) وَعَنْ اَبِیْ جُحَیْفَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ ثَمَنِ الدَّمِ وَ ثَمَنِ الْکَلْبِ وَکَسْبِ الْبَغِیِّ وَ لَعَنَ اٰکِلَ الرِّبَا وَ مُؤْکِلَهٗ وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ وَالْمُصَوِّرَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوجحیفہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے خون کی قیمت، کتے کی قیمت اور بدکار عورت کی اجرت (کے طور پر حاصل ہونے والے مال کے استعمال سے منع فرمایا ہے نیز آپ نے سود لینے والے اور سود دینے والے گودنے والے! اور گودوانے والے اور مصور پر لعنت فرمائی ہے)۔" (بخاری)

تشریح: خون کی قیمت سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے خون کی خرید و فرخت سے منع فرمایا ہے کیونکہ خون نجس ہوتا ہے اور اس کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ جس چیز کی خرید و فروخت ناجائز ہوتی ہے اس کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والا مال بھی ناجائز ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے "ثمن الدم" (خون کی قیمت) کو سینگی کھینچنے والے کی اجرت پر محمول کیا ہے اس صورت میں ممانعت کا تعلق مکروہ تنزیہی سے ہوگا۔ کتے کی قیمت اور بدکار عورت کی اجرت کے بارہ میں گزشتہ احادیث بیان کی جا چکی ہیں۔

"گودنے" کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جسم کے کسی حصہ پر یا پورے جسم پر سوئی سے گود کر سرمہ یا تیل بھر دیتے ہیں جس سے سرمئی یا نیلے داغ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے گودنے والے پر بھی اور گودوانے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ کیونکہ یہ فاسقوں اور غیر مسلموں کا کام ہے، نیز اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ جسم کی اصل خلقت میں تغیر و بدنمائی ہوتی ہے۔ اگر کسی مسلمان کے جسم پر گودنے کے داغ ہوں تو اس کے بارہ میں تعلیق القرار میں لکھا ہے کہ اسے کسی بھی تدبیر سے مٹا دیا جائے اور اگر زخم و خراش پیدا کئے بغیر کسی بھی تدبیر سے اس کو مٹانا ممکن نہ ہو تو پھر چھوڑ دیا جائے ان کو مٹانے کے لئے زخم و خراش کی تکلیف برداشت کرنے کی ضرورت نہیں ہے تاہم بہر صورت اس قبیح فعل پر ندامت کے ساتھ توبہ کی جائے، توبہ کے بعد گناہ گار نہیں رہے گا۔

آپ نے مصور پر بھی لعنت فرمائی ہے، لیکن مصور سے مراد یہ ہے کہ وہ جانور کا فوٹو کھینچے یا جاندار کی تصویر بنائے یا تصویر گاڑھے، غیر جاندار چیزوں مثلاً مکانات، درخت اور پہاڑ وغیرہ کی تصویریں کھینچنا، بنانا اور گاڑھنا درست ہے۔

خطابیؒ نے لکھا ہے کہ تصویر کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تو یہ ہے کہ جس چیز پر تصویر بنائی جاتی ہے وہ چیز تصویر کی ایک ضمنی شے ہوتی ہے اور تصویر مقصود بالذات ہوتی ہے مثلاً جب فوٹو کھینچا جاتا ہے یا کاغذ پر تصویر بنائی جاتی ہے تو اس فوٹو یا تصویر کے کاغذ کی حیثیت محض ضمنی ہوتی ہے اصل مقصد کا تعلق تصویر سے ہوتا ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ جس چیز پر تصویر بنی ہوئی ہوتی ہے وہ چیز مقصود بالذات ہوتی ہے اور تصویر اس چیز کا ایک ضمنی وصف ہوتا ہے مثلاً برتن، دیواروں، چھتوں، قالینوں اور پردوں وغیرہ پر بنی ہوئی تصویریں۔ لہٰذا دوسری

قسم کی خرید و فروخت جائز ہے جب کہ بنانا دونوں ہی کا ناجائز ہے۔

حرام چیزوں کی خرید و فروخت بھی حرام ہے

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ عَامَ الْفَتْحِ وَهُوَ بِمَكَّةَ اِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَ الْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَ صْنَامِ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ شُحُوْمَ الْمَيْتَةِ فَاِنَّهُ تُطْلٰى بِهَا السُّفُنُ وَيُدْهَنُ بِهَا الْجُلُوْدُ وَيَسْتَصْبِحُ بِهَا النَّاسُ فَقَالَ لَا هُوَ حَرَامٌ ثُمَّ قَالَ عِنْدَ ذٰلِكَ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَّا حَرَّمَ شُحُوْمَهَا اَجْمَلُوْهُ ثُمَّ بَاعُوْهُ فَاَكَلُوْا ثَمَنَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال مکہ میں رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے جب آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہمیں مردار کی چربی کا حکم بھی بتایئے جو کشتیوں پر ملی جاتی ہے نیز اس سے چمڑوں کو چکنا کیا جاتا ہے اور لوگ (گھروں میں) اس سے چراغ جلاتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ مردار کی چربی بھی حرام ہے اس لئے اس سے یہ فائدے اٹھانے جائز نہیں۔ پھر آپ نے اسی وقت یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت فرمائے جب اللہ تعالیٰ نے مردار کی چربی کو حرام قرار دیا تو یہود (نے یہ حیلہ اختیار کیا کہ وہ) چربی کو پگھلاتے اور بیچ ڈالتے اور پھر اس کی قیمت کھا جاتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عطاء نے لکھا ہے کہ شراب وغیرہ کے مذکورہ بالا حکم میں باجا بھی داخل ہے کہ اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں ہے نیز اگر کوئی شخص کسی باجے کو تلف کر دے تو اس پر ضمان یعنی مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا واجب نہیں ہوتا۔

حضرت امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ مردار کی چربی کی خرید و فروخت تو جائز نہیں ہے لیکن اس چربی سے فائدہ اٹھانا یعنی اس کو کھانے اور آدمی کے جسم پر ملنے کے علاوہ اور کام میں استعمال کرنا جائز ہے خواہ کشتی پر ملے، خواہ چراغ میں جلائے اور خواہ کسی اور کام میں لائے اسی طرح ان کے مسلک کے مطابق جو گھی یا زیت یا اور کوئی تیل نجاست پڑ جانے کی وجہ سے نجس ہو گیا ہو تو اس کو چراغ میں جلانے یا اس کا صابون بنانا جائز ہے جب کہ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جس طرح مردار کی خرید و فروخت ناجائز ہے اسی طرح اس سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا یعنی اس کی کسی بھی چیز کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے کیونکہ مردار کی حرمت بطریق عموم ثابت ہے البتہ دباغت کیا ہوا چمڑا اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کا جواز خصوصی طور پر ثابت ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین علماء نے نجس زیت کو بیچنے کی اجازت دی ہے البتہ ان کے نزدیک نجس تیل کو چراغ میں جلانا بالخصوص مسجد میں جلانا مکروہ ہے۔

حدیث کے آخر میں یہودیوں کی ایک خاص عیاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کے لئے مردار کی چربی کو حرام قرار دیا تو انہوں نے یہ حیلہ اختیار کیا کہ وہ چربی کو پگھلا کر اس کو بیچ دیتے تھے اور پھر اس کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والے مال کو اپنے استعمال میں لے آتے اور یہ کہتے تھے کہ اللہ نے تو چربی کھانے سے منع کیا ہے اور ہم چربی نہیں کھاتے بلکہ اس کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والا مال کھاتے ہیں گویا وہ جاہل چربی کو پگھلا کر یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے چربی کی حقیقت کو بدل دیا ہے کہ پگھلنے کے بعد وہ چربی نہیں رہ گئی ہے اس لئے اس صورت میں حکم الٰہی کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی اس عیارانہ چال کی وجہ سے ان کو اللہ کی لعنت کا مستحق قرار دیا اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایسا حیلہ اختیار کرنا کہ جس کے سبب سے حرام کا ارتکاب ہوتا ہو بالکل غلط ہے، نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کسی چیز کی قیمت حکم کے اعتبار سے اسی چیز کے تابع ہے کہ اگر وہ چیز حرام ہو گی تو اس کی قیمت بھی حرام ہو گی اور جو چیز حلال ہو گی اس کی قیمت بھی حلال ہو گی۔

یہودیوں کی ایک عیاری

(۹) وَعَنْ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ حُرِّمَتْ عَلَيْهِمُ الشُّحُوْمُ فَجَمَلُوْهَا فَبَاعُوْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہودیوں کو ہلاک کرے ان پر (مردار کی) چربیاں حرام کی گئیں تو انہوں نے اس کو پگھلایا (تاکہ چربی کا نام باقی نہ رہے) اور پھر اس کی خرید وفروخت شروع کر دی (اس کی وضاحت حدیث بالا میں کی جاچکی ہے)۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

بلی کی خرید وفروخت کا مسئلہ

(۱۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَالسِّنَّوْرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کتے اور بلی کی قیمت (کو استعمال میں لانے) سے منع فرمایا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ بلی کی قیمت کو استعمال میں لانے کی یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔ چنانچہ تقریباً تمام علماء نے بلی کی خرید وفروخت، ہبہ کرنے اور عاریۃً دینے کو جائز کہا ہے۔ البتہ حضرت ابوہریرہؓ اور تابعینؒ میں سے کچھ حضرات اس حدیث کے ظاہری معنی کے پیش نظر اس کے جواز کے قائل نہیں تھے۔

پچھنے لگانے کا پیشہ حلال ہے

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ حَجَمَ اَبُوْطَيْبَةَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَ لَهٗ بِصَاعٍ مِنْ تَمْرٍ وَ اَمَرَ اَهْلَهٗ اَنْ يُخَفِّفُوْا عَنْهُ مِنْ خَرَاجِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ابوطیبہ نے رسول کریم ﷺ کے پچھنے لگائے تو آپ نے اس کے مالکوں کو حکم دیا کہ وہ ابوطیبہ کی کمائی میں سے کم لیا کریں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اہل عرب کی عادت تھی کہ وہ اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو مختلف پیشوں میں لگادیتے تھے اور ان سے یہ طے کر دیتے تھے اجرت کے طور پر حاصل ہونے والے مال میں سے اتنا حصّہ ہمارا ہوگا اور باقی کے تم حقدار ہوگے، چنانچہ ابوطیبہ نے جو بنی بیاضہ کے غلام تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت گزاری کی تو آپ ان سے بہت خوش ہوئے اور ان کے مالکوں سے کہا کہ تم لوگ ابوطیبہ کی کمائی میں جو کچھ روزانہ لیا کرتے ہو اس میں کمی کردو۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ پچھنے لگانے کا پیشہ ایک حلال پیشہ ہے اور اس کی اجرت دینا جائز ہے نیز اس حدیث سے چند اور مسائل ثابت ہوتے ہیں اول یہ کہ علاج کرنا اور علاج کرانے کی اجرت دینا مباح ہے، دوم یہ کہ مالک کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے غلام کو کمائی پر لگادے اور اس کے کمائے ہوئے مال میں سے اپنا کوئی حصّہ مقرر کرے، سوم یہ کہ صاحب حق اور صاحب مطالبہ سے سفارش کرنا جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

اولاد کی کمائی کھانا جائز ہے

(۱۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ وَاِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ

رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ دَاوٗدَ وَالدَّارِمِیِّ اِنَّ اَطْیَبَ مَا اَکَلَ الرَّجُلُ مِنْ کَسْبِہٖ وَاِنَّ وَلَدَہٗ مِنْ کَسْبِہٖ۔

"حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کچھ تم کھاتے ہو اس میں سب سے بہتر وہ چیز ہے جو تمہیں کمائی سے حاصل ہوئی ہے اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

ابوداؤدؒ اور دارمی کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "انسان جو کچھ کھاتا ہے اس میں سب سے بہتر وہ چیز ہے جو اسے اس کی کمائی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی ہے")

تشریح: اولاد کو کمائی اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ ماں باپ کے آپس کے نکاح کے نتیجہ ہی میں پیدا ہوتی ہے گویا اس ارشاد کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ماں باپ اگر خود کمانے کے قابل نہ ہوں تو ان کے لئے اپنی اولاد کی کمائی کھانا جائز ہے ہاں اگر ماں باپ اپنے دست و بازو کی محنت سے اپنے رزق کی راہیں خود بنا سکتے ہوں تو پھر ان کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ اپنی اولاد پر بار بنیں، البتہ اولاد کی خوشنودی و مرضی اگر یہی ہو کہ ماں باپ اس کی کمائی کھائیں تو پھر بہر صورت اولاد کی کمائی کھانا جائز ہوگا چنانچہ حنفی علماء کا یہی قول ہے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اگر والدین محتاج ہوں تو ان کی ضرورت زندگی کی کفالت لڑکے پر واجب ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ کے مسلک میں اس وجوب کی شرط یہ ہے کہ وہ کمانے سے معذور بھی ہوں، جب کہ دوسرے علماء کے ہاں یہ شرط نہیں ہے۔

مال حرام کا حکم

⑬ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَایَکْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَیَتَصَدَّقُ مِنْہُ فَیُقْبَلُ مِنْہُ وَلَایُنْفِقُ مِنْہُ فَیُبَارَکُ لَہٗ فِیْہِ وَلَایَتْرُکُہٗ خَلْفَ ظَھْرِہٖ اِلَّاکَانَ زَادَہٗ اِلَی النَّارِ اِنَّ اللّٰہَ لَایَمْحُو السَّیِّیَٔ بِالسَّیِّیِٔ وَلٰکِنْ یَمْحُو السَّیِّیَٔ بِالْحَسَنِ اِنَّ الْخَبِیْثَ لَایَمْحُوا الْخَبِیْثَ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَکَذَافِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ۔

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رسول ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ حرام مال کما کر اس میں سے صدقہ وخیرات کرتا ہو اور اس کا وہ صدقہ قبول کر لیا جاتا ہو (یعنی اگر کوئی شخص حرام ذرائع سے کمایا ہوا مال صدقہ وخیرات کرے تو اس کا صدقہ قطعاً قبول نہیں ہوتا اور نہ اسے کوئی ثواب ملتا ہے) اور نہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص اس حرام کو (اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال پر) خرچ کرتا ہو اور اس میں اسے برکت حاصل ہوتی ہو (یعنی حرام مال میں سے جو بھی خرچ کیا جاتا ہے اس میں بالکل برکت نہیں ہوتی) اور جو شخص اپنے (مرنے کے بعد) حرام مال چھوڑ جاتا ہے اس کی حیثیت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں رہتی کہ وہ مال اس شخص کے لئے ایک ایسا توشہ بن جاتا ہے جو اسے دوزخ کی آگ تک پہنچا دیتا ہے اور (یہ بات یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعہ دور نہیں کرتا بلکہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ دور کرتا ہے، اسی طرح ناپاک مال ناپاک کو دور نہیں کرتا (یعنی حرام مال برائی کو دور نہیں کرتا بلکہ حلال مال برائی کو دور کرتا ہے)۔" (احمدؒ، شرح السنۃ)

تشریح: خدا کی پناہ: مال وزر کی ہوس انسان کو کتنا اندھا بنا دیتی ہے کہ وہ اس چند روزہ دنیا کی جائز وناجائز آسائشوں کی خاطر عاقبت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی کو تباہ وبرباد کر لیتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ جس مال وزر کی خاطر وہ اپنی زندگی کو عزت وآبرو کی بڑی سے بڑی نیلام گاہ میں لا کھڑا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں کبھی جھوٹ بولتا ہے، کبھی مکر وفریب سے کام لیتا ہے، کبھی دوسروں کا حق غصب کرتا ہے کبھی غریبوں کا خون چوستا ہے یہاں تک کہ اپنے دین وایمان کا سودا کرتا ہے۔ اپنے ضمیر کو گروی رکھتا ہے، اپنی عزت کو داؤ پر لگاتا ہے اور انسانی شرف وعظمت کی ساری حدوں کو پار کر جاتا ہے آخر کار ان تمام ذرائع اور حرام طریقوں سے کمایا ہوا ہی مال وزر اپنے کمانے والے کے لئے بعد

مرگ ایک ایسا توشہ اور ذریعہ بن جاتا ہے جو اسے جہنم کی آگ تک پہنچا دیتا ہے کیونکہ اوّل تو حرام ذرائع سے کمانے اور پھر اس کمائی سے فائدہ اٹھانے کا گناہ اس پر ہوتا ہے اس کے علاوہ مرنے کے بعد وہ جو کچھ حرام مال وزر چھوڑ جاتا ہے وہ یکے بعد دیگرے اس کے وارثوں کی ملکیت میں جاتا ہے جس سے فائدہ اٹھانے کی وجہ سے وہ سب گناہ و معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور انجام کار اس حرام مال کے ذریعہ قیامت تک صادر ہونے والے گناہوں کی سیاہی اس کے نامہ اعمال کو داغدار کرتی رہتی ہے۔

ان اللہ لا یمحو السئ یہ جملہ مستانفہ یعنی ایک علیحدہ جملہ ہے جو بمنزلہ تعلیل عدم قبول یعنی مال حرام کے صدقہ کے قبول نہ ہونے کی علت کو بیان کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حرام مال میں سے صدقہ دینا ثواب کا ذریعہ تو کیا ہوتا یہ خود ایک برائی اور گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ برے اعمال کو برائیوں کے ذریعہ دور نہیں کرتا یعنی اگر کوئی یہ چاہے کہ اپنے حرام مال میں سے کچھ خدا کے نام پر صدقہ دے کر اپنے گناہوں میں تخفیف کا سامان کرے تو یہ ناممکن ہے کیونکہ حرام مال میں سے صدقہ دینا خود گناہ ہے بلکہ بعض علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی حرام مال میں سے صدقہ و خیرات کرے اور پھر اس پر ثواب کی امید رکھے تو وہ کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے نیز اگر کسی فقیر و محتاج کو یہ معلوم ہو جائے کہ اسے صدقہ دینے والا بطور صدقہ جو مال دے رہا ہے وہ حرام ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے اور اس کے باوجود وہ صدقہ دینے والے کے لئے دعا کرے تو وہ بھی کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

"وَلٰكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ" کا تعلق ماقبل کے جملہ سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں میں تخفیف یا گناہوں کی بخشش تو نیک اعمال اور اچھے کاموں کے ذریعہ ہوتی ہے مثلاً حلال میں سے صدقہ کرنا ایک نیک عمل ہے۔ جو شخص اپنے حلال مال میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرے گا۔ اسے اس کا ثواب بھی ملے گا اور اس کے گناہ بھی دور کئے جائیں گے۔ گویا اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں۔

اور یہ سب جملے اصل حدیث کی آخری عبارت "ان الخبیث" کی تمہید و مقدمہ کے طور پر ہیں۔

حرام مال کھانے پر وعید

(۱۴) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَ كُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ اَوْلٰى بِهٖ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالدَّارِمِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ گوشت جس نے حرام مال سے پرورش پائی ہے جنت میں داخل نہیں ہوگا" اور جو گوشت یعنی جو جسم حرام مال سے نشو و نما پائے وہ دوزخ کی آگ ہی کے لائق ہے۔" (احمدؒ، دارمیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: حرام مال سے نشو و نما پانے والے جسم کے دوزخ میں داخل ہونے سے مراد یا تو یہ ہے کہ ایسا شخص شروع میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ اس نے جتنا حرام مال کھایا ہوگا اس کے بقدر جب سزا بھگت لے گا تو اس کو جنت میں داخل کیا جائے گا یا یہ کہ ایسا شخص جنت کے اعلیٰ درجات میں داخل نہیں ہو سکے گا یا یہ مراد ہے کہ وہ لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جو حرام مال کو حرام مال سمجھ کر نہیں بلکہ حلال مال یقین کر کے کھاتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ اس ارشاد گرامی کا اصل مقصد حرام مال کھانے کی برائی بیان کرنا ہے اور اس سے مراد زجر و توبیخ، تہدید اور سخت وعید ہے۔

جو شخص حرام مال کھانے کمانے کے بعد اپنے اس قبیح فعل پر ندامت و شرمندگی کے ساتھ سچے دل سے توبہ کرے، یا اللہ تعالیٰ اس کو بغیر توبہ کے محض اپنے فضل و کرم سے بخش دے اور اس نے جن لوگوں کا مال حرام طریقوں سے کمایا ہوگا ان کو راضی کر دے اور یا اسے کسی کی شفاعت حاصل ہو جائے تو وہ شخص اس وعید سے مستثنیٰ ہوگا۔

شبہات میں پڑنے سے بچو

⑮ وَعَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰى مَالَا يُرِيْبُكَ فَاِنَّ الصِّدْقَ طُمَانِيْنَةٌ وَاِنَّ الْكِذْبَ رِيْبَةٌ۔ رواه اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ الْفَصْلَ الْاَوَّلَ۔

"اور حضرت حسنؓ ابن علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کو (خود سنا ہے اور اسے) یاد رکھا ہے کہ "جو چیز تم کو شک میں ڈالے اس کو چھوڑ دو اور اس چیز کی طرف میلان رکھو جو تم کو شک میں نہ ڈالے کیونکہ حق دل کے اطمینان کا باعث ہے اور باطل شک وتردد کا موجب (احمدؒ، ترمذی، نسائی اور دارمیؒ نے حدیث کا صرف پہلا حصہ (یعنی دع مایریبک الی مالا یریبک) نقل کیا ہے۔"

تشریح: ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ شبہات میں پڑنے سے بچو اور جو چیزیں شبہات میں مبتلا کرنے والی ہوں۔ ان سے اجتناب کرو بعض علماء کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ از قسم اقوال و اعمال جس چیز کی حلت وحرمت کے بارہ میں تمہارا ضمیر شک میں مبتلا ہو جائے تو اس چیز کو چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کر لو جس کے بارہ میں تمہارا ضمیر کسی شک میں مبتلا نہ ہو کیونکہ انسان کا ضمیر چونکہ غلط راہنمائی نہیں کرتا اس لئے کسی چیز کے بارہ میں ضمیر کا شک میں مبتلا ہونا اس چیز کے غلط اور باطل ہونے کی علامت ہے اور کسی چیز کے بارہ میں ضمیر کا مطمئن ہو جانا اس چیز کے صحیح اور حق ہونے کی علامت ہے گویا کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے اور اس کے حلال یا حرام ہونے کی پہچان کے لئے یہ ایک قاعدہ اور کسوٹی ہے تاہم یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ یہ بات ہر شخص کو حلال نہیں ہوتی بلکہ یہ وصف خاص ان صالح انسانوں کو نصیب ہوتا ہے، جن کے ذہن وفکر اور جن کے دل ودماغ تقویٰ وایمان داری اور راستبازی وحق پسندی کے جوہر سے معمور ہوتے ہیں۔

اچھائی اور برائی کی پہچان

⑯ وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا وَابِصَةُ جِئْتَ تَسْاَلُ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَجَمَعَ اَصَابِعَهُ فَضَرَبَ بِهَا صَدْرَهُ وَ قَالَ اسْتَفْتِ نَفْسَكَ اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ ثَلَاثًا اَلْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَاَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَاحَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ۔ (رواہ احمد و الدارمی)

"اور حضرت وابصہؓ ابن معبد کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا "وابصہ! تم یہی پوچھنے آئے ہوناں! کہ نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں" ان کا بیان ہے کہ (یہ سن کر آپ نے اپنی انگلیوں کو اکٹھا کیا اور میرے سینے پر مار کر فرمایا کہ) اپنے آپ سے دریافت کرو۔ اپنے دل سے دریافت کرو آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین مرتبہ فرمائے اور پھر فرمایا کہ "نیکی وہ ہے جس سے انسان خود مطمئن ہو جائے اور جس سے اس کے دل کو سکون حاصل ہو جائے، اور گناہ وہ ہے جس سے انسان کا وجود خلش محسوس کرے اور جس سے اس کے دل وسینہ میں شک وتردد پیدا ہو جائے اگرچہ لوگ اسے صحیح کہیں"۔" (احمدؒ، دارمی)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں نیکی وبدی اور اچھائی وبرائی کو پہچاننے کی ایک ایسی واضح علامت بتائی گئی ہے جسے ہر صالح انسان اپنے ہر قول وفعل کی کسوٹی بنا سکتا ہے، جس قول اور جس عمل پر اپنا جی مطمئن ہو جائے اور دل سکون محسوس کرے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ قول یا عمل، نیک اور اچھا ہے اور جس قول یا عمل پر طبیعت میں خلش وچبھن اور دل میں شک وتردد کی کسک پیدا ہو جائے، سمجھ لینا چاہئے کہ وہ قول یا فعل غلط اور برا ہے۔ چنانچہ حدیث کا حاصل یہی ہے کہ ہر قول وفعل کے بارہ میں خود اپنے ضمیر کی راہنمائی حاصل کرو۔ جس چیز سے خاطر جمعی حاصل ہو اور دل میں یہ خلجان نہ ہو کہ یہ بری ہے سمجھو کہ وہی نیکی ہے اور جس چیز سے خاطر جمعی حاصل نہ ہو اور دل میں تردد وخلجان پیدا ہو جائے سمجھو کہ وہی گناہ ہے اگرچہ لوگ اس چیز کے بارہ میں یہی کیوں نہ کہیں کہ یہ صحیح اور اچھی ہے اور کوئی مفتی اس کے صحیح ہونے کا

فتویٰ ہی کیوں نہ دے دے لہٰذا ان کے کہنے پر عمل نہ کرو۔ مثلاً اگر کسی شخص کے بارہ میں تمہیں یہ معلوم ہو کہ اس کے پاس حلال مال بھی ہے اور حرام مال بھی، اور وہ شخص تمہیں اپنے مال میں سے کچھ دینا چاہتا ہے تو اگر تمہارا دل اس پر مطمئن ہو کہ وہ تمہیں جو مال دے رہا ہے وہ وہی مال ہے جو اس نے صرف حلال ذرائع سے کمایا ہے تو تم لے لو اور اگر تمہارا دل مطمئن نہ ہو اور تمہیں یہ خوف ہو کہ کہیں یہ وہ مال نہ ہو جو اس نے حرام ذرائع سے کمایا ہے تو تم اس سے ہرگز کچھ نہ لو اگرچہ وہ خود یہ کہے کہ میں تمہیں اپنے حلال میں سے دے رہا ہوں اور کوئی مفتی یہ فتوے بھی دے رہا ہو کہ تمہارے لئے یہ مال لینا جائز ہے کیونکہ فتویٰ اور چیز ہے اور تقویٰ اور چیز ہے، تقویٰ پر عمل کرنا فتویٰ پر عمل کرنے سے کہیں بہتر ہے۔

گزشتہ حدیث کی تشریح میں بھی یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ضمیر کی صحیح راہنمائی کا جوہر ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا اور اب اس موقع پر بھی جان لیجئے کہ حدیث میں اپنے دل سے دریافت کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق ان صالح لوگوں سے ہے جن کے دل خواہشات نفسانی کی کدورت سے صاف اور تقویٰ وخدا ترسی کے جوہر سے معمور ہوتے ہیں کیونکہ ان کے طبائع اور ان کے قلوب صرف خیر و بھلائی کی طرف مائل اور برائی سے بیزار رہتے ہیں جبکہ برے لوگ نفسانی خواہشات میں گرفتار رہتے ہیں اور نیکی و بھلائی سے بے اعتنائی اختیار کئے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں انہیں ضمیر کی صحیح راہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی نیز یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ اپنے دل سے دریافت کرنے کا یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ کسی چیز کے بارہ میں کوئی واضح شرعی فیصلہ سامنے نہ ہو، چنانچہ جب کسی چیز کے حکم کے بارہ میں قرآن کی آیتوں میں تعارض نظر آئے تو واجب ہے کہ حدیث کی طرف رجوع کیا جائے حدیث جس آیت کے مطابق فیصلہ کرے اسی آیت پر عمل کیا جائے۔ اگر حدیثوں میں بھی تعارض ہو تو پھر علماء کے اقوال کی طرف رجوع کرنا واجب ہے اور اگر علماء کے اقوال میں بھی تعارض ہو تو پھر اس کے بعد اپنے دل کی راہنمائی حاصل کرے اور ان اقوال میں سے اس قول کے مطابق عمل کرے جس کو اپنا دل صحیح وراجح تسلیم کرے اور اس پر مطمئن ہو جائے۔

آخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جب حضرت وابصہؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے اپنی حاضری کا مقصد خود بیان نہیں کیا تھا بلکہ یہ اعجاز نبوت تھا کہ آنحضرت ﷺ نے از خود ازراہ مکاشفہ ان کے دل کی بات بیان فرما دی نیز آنحضرت ﷺ نے اپنی انگلیاں اٹھا کر ان کے سینہ پر اس لئے ماریں تاکہ آپ کے مبارک ہاتھوں کی برکت کی وجہ سے ان کو آپ کے کلام کی پوری سمجھ حاصل ہو جائے، دوسرے ان کے دل کی طرف اشارہ کرنا بھی مقصود تھا کہ دل یہاں ہے اس سے دریافت کرو۔

کامل پرہیزگاری کا درجہ

(۱۷) وَعَنْ عَطِيَّةَ السَّعْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ يَكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَاْسَ بِهٖ حَذَرًا لِمَا بِهٖ بَاْسٌ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عطیہ سعدیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بندہ اس وقت تک (کامل) پرہیزگاروں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن میں کوئی قباحت نہیں ہے تاکہ اس طرح وہ ان چیزوں سے بچ سکے جن میں قباحت ہے۔"

(ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: شرعی نقطہ نظر سے متقی یعنی پرہیزگار وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو ان چیزوں سے دور رکھے جنہیں اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے عذاب کا سبب ہو۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ تقویٰ یعنی پرہیزگاری کے تین درجے ہیں اوّل شرک سے اجتناب۔ چنانچہ جو بندہ شرک سے بچتا ہے وہ دائمی عذاب سے نجات پاتا ہے، اس آیت کریمہ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى (اور اللہ نے ان (مومنوں) کو پرہیزگاری کی بات (یعنی توحید) پر قائم کیا) میں یہی درجہ مراد ہے۔ دوم ہر گناہ یہاں تک کہ صغیرہ گناہوں سے بھی اجتناب۔ چنانچہ بعض علماء کے

نزدیک تقویٰ کی جو مشہور شرعی اصطلاح ہے اس کا اطلاق اسی درجہ پر ہوتا ہے اور اس آیت کریمہ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا (اور اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیز گار ہو جاتے) میں بھی یہی درجہ مراد ہے۔ سوم ہر چیز میں پوری احتیاط ملحوظ رکھنا یہاں تک کہ بعض مباح چیزوں کو بھی احتیاط اور مصلحت کے پیش نظر ترک کر دینا، اپنا دل غیر اللہ میں نہ لگانا، اور غیر اللہ سے اپنا دھیان ہٹا کر صرف اسی کی طرف متوجہ رکھنا۔ چنانچہ اس آیت کریمہ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ (اے مؤمنو) اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے میں تقویٰ کے یہی معنی مراد ہیں اور مذکورہ بالا حدیث میں بھی تقویٰ یعنی پرہیز گاری کا یہی کامل درجہ مراد ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک پورا متقی و پرہیز گار نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس خوف کی وجہ سے مباح چیزیں بھی نہیں چھوڑ دیتا کہ مبادا یہ مباح چیز کسی حرام یا مکروہ یا مشتبہ چیز تک پہنچنے کا ذریعہ بن جائے مثلاً اگر وہ شادی شدہ نہ ہو تو شہوت کا غلبہ بھی زیادہ ہوتا ہے اسی طرح خوشبو وغیرہ نہ لگائے اور نہ کوئی ایسی مباح چیز استعمال کرے جس سے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہو۔ بہرکیف حرام، مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے اجتناب کے بعد احتیاط کے پیش نظر بعض مباح چیزوں سے بھی بچنا تقویٰ و پرہیز گاری کا کامل ترین درجہ ہے، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ حرام میں مبتلا ہو جانے کے خوف سے دس حلال حصوں میں سے نو حصے چھوڑ دیتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ کے بارے میں منقول ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ حرام میں مبتلا ہو جانے کے خوف سے از قسم مباح ستر حصے ترک کر دیتے تھے۔

متعلقین شراب پر لعنت

⑱ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْخَمْرِ عَشَرَةً عَاصِرَهَا وَ مُعْتَصِرَهَا وَ شَارِبَهَا وَ حَامِلَهَا وَ الْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهِ وَ سَاقِيَهَا وَ بَائِعَهَا وَ اٰكِلَ ثَمَنِهَا وَ الْمُشْتَرِيْ لَهَا وَ الْمُشْتَرٰى لَهٗ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے شراب کے معاملہ میں ان دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے ① شراب کشید کرنے والا ② شراب کشید کرانے والا ③ شراب پینے والا ④ شراب، اٹھانے والا یعنی وہ شخص جو کسی کو شراب اٹھا کر دے ⑤ شراب اٹھوانے والا یعنی وہ شخص جو کسی کو شراب اٹھا لانے کا حکم دے ⑥ شراب پلانے والا ⑦ شراب بیچنے والا ⑧ شراب کی قیمت کھانے والا ⑨ خریدوانے والا یعنی وہ شخص جو کسی دوسرے کے پینے کے لئے یا اس کی تجارت کے لئے بطریق وکالت یا بطریق ولایت شراب خریدے ⑩ خریدوانے والا یعنی وہ شخص جو کسی دوسرے سے اپنے پینے یا اپنی تجارت کے لئے شراب خرید منگوائے۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: "کشید کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جو شراب بنانے کے لئے انگور کا شیرہ کشید کرے خواہ اپنے لئے کشید کرے خواہ دوسرے کے لئے اسی طرح کشید کرانے والا خواہ اپنے لئے کشید کرائے خواہ دوسرے کے لئے بہر صورت وہ لعنت کا مستحق ہے۔ "بیچنے والے" سے مراد وہ شخص بھی ہے، جو خود اپنی تجارت کے طور پر شراب بیچتا ہو اور وہ شخص بھی مراد ہے جو کسی دوسرے کی طرف سے بطور دلال یا بطور وکیل بیچتا ہو۔ نیز جو شخص شراب کشید کرنے والے کے ہاتھ انگور بیچتا ہے اور اس انگور کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والا مال کھاتا ہے وہ بھی اس لعنت کا مستحق ہے۔

⑲ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اللّٰهُ الْخَمْرَ وَ شَارِبَهَا وَ سَاقِيَهَا وَ بَائِعَهَا وَ مُبْتَاعَهَا وَ عَاصِرَهَا وَ مُعْتَصِرَهَا وَ حَامِلَهَا وَ الْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب پر، شراب پینے والے پر شراب بیچنے والے پر، شراب خریدنے والے پر شراب کشید کرنے والے پر، شراب کشید کرانے والے پر، شراب اٹھانے والے پر، شراب اٹھوانے والے پر"۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: شراب پر اللہ تعالیٰ نے لعنت اس لئے فرمائی ہے کہ شراب ام الخبائث یعنی تمام برائیوں کی جڑ ہے تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں "شراب" سے مراد وہ شخص ہو جو شراب کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والا مال کھاتا ہے۔

پچھنے لگانے والے کی کمائی کا حکم

(۲۰) وَعَنْ مُحَيِّصَةَ اَنَّهُ اسْتَاذَنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اُجْرَةِ الْحَجَّامِ فَنَهَاهُ فَلَمْ يَزَلْ يَسْتَاذِنُهُ حَتّٰى قَالَ اَعْلِفْهُ نَاضِحَكَ وَاَطْعِمْهُ رَقِيْقَكَ۔ (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت محیصہؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے رسول ﷺ سے پچھنے لگانے والے کی کمائی کھانے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے انہیں منع کر دیا چنانچہ جب وہ آپ ﷺ سے بار بار اجازت مانگتے رہے تو آپ نے انہیں یہ حکم دیا کہ اس کمائی کا مال اپنے اونٹ کو کھلادو، یا اپنے بردہ (غلام، لونڈی) کو کھلاؤ۔" (مالک، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: اکثر صحابہؓ کی ملکیت میں غلاموں کی ایک بڑی تعداد رہتی تھی۔ جن میں سے کچھ غلاموں کو وہ پچھنے لگانے کے کام پر مامور کر دیتے تھے، اور پھر ان کی اجرت کے طور پر حاصل ہونے والے مال کو اپنے استعمال میں لاتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی حضرت محیصہؓ نے آنحضرت ﷺ سے یہ جاننا چاہا کہ پچھنے لگانے والے کی کمائی آیا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ اجازت مانگی کہ میرا غلام پچھنے لگانے کی جو اجرت حاصل کرتا ہے چونکہ اس میں سے کچھ حصہ میری ملکیت میں آتا ہے اس لئے میں اپنے اس حصہ کو اپنے استعمال میں لاؤں یا نہیں؟ آنحضرت ﷺ نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی، چونکہ صحابہؓ اپنے بعض غلاموں سے پچھنے لگانے کی حاصل ہونے والی اجرت میں سے اپنا حصہ لیکر اسے اپنی ضروریات میں صرف کرتے تھے اور اسے وہ پسند بھی کرتے تھے اس لئے آنحضرت ﷺ کے اس کی اجازت نہ دینے سے محیصہ کو اس بارہ میں دشواری محسوس ہوئی اور اس امید کی بناء پر کہ آپ اجازت دے دیں وہ بار بار اجازت طلب کرتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے انہیں اتنی اجازت دے دی کہ وہ اس اجرت کو اپنے اونٹوں کے گھاس اور چارے میں اور اپنے غلاموں، لونڈیوں پر صرف کرلیں، اور اس طرح آپ ﷺ نے ایک طرف تو اشارہ فرمایا کہ پچھنے لگانے سے جو اجرت حاصل ہوتی ہے وہ اگرچہ جائز مال ہے مگر چونکہ وہ خون نکالنے کی کمائی ہے اس لئے اس کو شرفاء کے لئے استعمال کرنا مکروہ اور انکی شان کے خلاف ہے اور لونڈی، غلام چونکہ آزاد لوگوں کے برخلاف ایسا شرف نہیں رکھتے جو اس پیشہ کی دنائت کے منافی ہو اس لئے پچھنے لگانے کی کمائی کھانا ان کی شان سے فروتر نہیں ہے۔ دوسری طرف آپ ﷺ نے اس کے ذریعہ گویا اولوالعزمی اور عالی ہمتی کی ترغیب بھی دی ہے کہ شرفاء کو باوقار پیشہ اور اپنے دست و بازو کی محنت کی ہی کمائی کھانی چاہئے۔

بہرکیف آنحضرت ﷺ نے حضرت محیصہؓ کو جو اجازت نہیں دی وہ محض نہی تنزیہی کے طور پر ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پچھنے لگانے کی اجرت، مال حرام ہے کیونکہ اگر یہ مال حرام ہوتا تو آپ ﷺ ان کو اسے اپنے جانور اور اپنے غلام لونڈی پر خرچ کی اجازت نہیں دیتے اس لئے کہ آقا کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے جانوروں یا اپنے غلام لونڈی کو حرام مال کھلائے لہٰذا حدیث کا حاصل یہ ہے کہ پچھنے لگانے والے کی کمائی کھانا مکروہ تنزیہی ہے۔

مغنیہ کی کمائی کھانے کی ممانعت

(۲۱) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَكَسْبِ الزَّمَّارَةِ۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے "کتے کی قیمت اور گانے والیوں کی کمائی کھانے سے منع فرمایا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: بعض علماء کا قول یہ ہے کہ "زمارۃ" سے مراد (مغنیہ یعنی گانے والی عورت کی بجائے) وہ خوب صورت عورت ہے جو بد کاری کراتی ہے۔ اسی طرح بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ لفظ "زمارۃ" مشتق ہے "زمر" سے جس کے معنی ہیں "چشم و ابرو کے ذریعہ اشارہ کرنا" اور بد کار عورتیں چونکہ مردوں کو اپنے چشم و ابرو کے اشاروں سے فریفتہ کر کے انہیں اپنے چنگل میں پھنساتی ہیں اس لئے ارشاد گرامی میں "بدکار عورت" کو "زمارۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

گانے والی لونڈیوں کی خرید و فروخت کا حکم

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتَبِیْعُوا الْقَیْنَاتِ وَلَا تَشْتَرُوْ ھُنَّ وَلَا تُعَلِّمُوْ ھُنَّ وَثَمَنُھُنَّ حَرَامٌ وَفِیْ مِثْلِ ھٰذَا اُنْزِلَتْ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ وَعَلِیُّ بْنُ یَزِیْدَ الرَّاوِیُّ یُضَعَّفُ فِی الْحَدِیْثِ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ جَابِرٍ نَھٰی عَنْ اَکْلِ الْھِرِّ فِیْ بَابِ مَایَحِلُّ اَکْلُہٗ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "گانے والی لونڈیوں کو نہ بیچو، نہ ان کو خریدو اور نہ لونڈیوں کو گانا سکھاؤ اور ان (گانے والی لونڈیوں) کی حاصل ہونے والی قیمت مال حرام ہے" اور اسی سلسلہ میں (یعنی گانے والیوں کو خریدنے کی مذمت میں) یہ آیت نازل کی گئی ہے۔ "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ" یعنی اور انسانوں میں بعض ایسے (نادان و غلط کار) لوگ بھی ہیں جو کھیل کی بات خریدتے ہیں (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی علی ابن یزید روایت حدیث کے سلسلہ میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔"

تشریح: بعض علماء نے حدیث کے ظاہری الفاظ وَثَمَنُھُنَّ حرام (یعنی ان کی حاصل ہونے والی قیمت مال حرام ہے) کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ گانے والی لونڈیوں کو بیچنا جائز نہیں ہے جبکہ بقیہ تمام علماء یہ کہتے ہیں کہ ان کو بیچنا جائز ہے۔ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے جس کی بناء پر اس کو کسی مسلک کی دلیل قرار دینا مناسب نہیں ہے لیکن اس کے باوجود (ثَمَنُھُنَّ حرام) کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ اس حدیث کا مطلب صرف ان کے گانے کی اجرت کی حرمت کو بیان کرنا ہے یعنی ان کے گانے سے حاصل ہونے والی اجرت مال حرام ہے۔ جیسا کہ کسی شراب فروش یا شراب بنانے والے کے ہاتھ جو انگور فروخت کئے جاتے ہیں کہ اس کی حاصل ہونے والی قیمت مال حرام کے حکم میں ہوتی ہے نہ کہ فی نفسہ انگور کی قیمت حرام ہوتی ہے اسی طرح گانے والی لونڈیوں کی وہ اجرت جو ان کے گانے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اس لئے مال حرام ہے کہ وہ ایک حرام ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ اس لئے حرام ہے کہ ان لونڈیوں کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

آیت کریمہ میں "کھیل کی بات" سے مراد ہیں وہ گانے، گیت اور حرام آوازیں جو ذکر اللہ سے باز رکھیں اور گناہ و معصیت کا سبب بنیں۔ چنانچہ کہانیاں، جھوٹی باتیں، خرافات بکنا، ٹھٹھے کی باتیں، موسیقی سیکھنا اور اسی قسم کی اور تمام فضول و لغو چیزیں بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ اس آیت کے نازل ہونے کا پس منظر یہ ہے کہ ایک شخص نصر ابن حارث تھا جو گانے والی لونڈیاں اس مقصد سے خریدتا تھا کہ ان کے ذریعہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے گمراہ کرے، چنانچہ اس کی مذمت میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ نضر ابن حارث نے عجمیوں کی لکھی ہوئی چند کتابیں خریدی تھیں جن کی جھوٹی سچی کہانیاں پڑھ کر قریش کو سنایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ محمد ﷺ تو تمہارے سامنے قوم عاد و ثمود کے قصص بیان کرتے ہیں اور میں تمہارے سامنے رستم و اسفندیار اور بادشاہوں کی کہانیاں سناتا ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت بالا کے ذریعہ اس کی مذمت بیان فرمائی۔

وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ جَابِرٍ نَھٰی عَنْ اَکْلِ الْھِرِّ فِیْ بَابِ مَایَحِلُّ اَکْلُہٗ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

اور حضرت جابرؓ کی روایت نَھٰی عَنْ اَکْلِ الْھِرِّ الخ انشاء اللہ ہم باب مایحل اکلہ میں ذکر کریں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حلال روزی کمانا ایک فرض ہے

(۲۳) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَلَبُ کَسْبِ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"حضرت عبداللہؓ ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حلال روزی کمانا فرض کے بعد ایک فرض ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی معاشی ضروریات کی کفالت کے لئے اپنے دست وبازو کی محنت سے کمانا فرض ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو فرائض مقرر کئے ہیں جیسے نماز، روزہ وغیرہ پہلے ان کا درجہ ہے کہ ان فرائض کی تکمیل کے بعد حلال روزی کمانا فرض ہے۔

اس بارے میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ کمانا اس شخص پر فرض ہے جو اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال (کہ جن کی کفالت اس کے ذمہ ضروری ہے) کی ضروریات زندگی کی کفالت کے لئے کمائی کا محتاج ہو۔

حدیث میں مذکور "کسب حلال" یعنی حلال کمائی سے مراد وہ روزی ہے جس کا حرام نہ ہونا یقینی ہو، گویا یہاں حلال روزی کا اطلاق اس مال پر بھی ہوسکتا ہے جو مشتبہ ہو، کیونکہ احادیث میں مشتبہ سے پرہیز کرنے کا حکم محض احتیاط کے طور پر ہے۔ فرض ہونے کے طور پر نہیں ہے۔ نیز ایک بات یہ بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ اس حدیث میں حلال روزی کمانے کو جو فرض کہا گیا ہے اس کا مخاطب ہر شخص بذاتہ نہیں ہے کیونکہ ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کی ضروریات زندگی کی کفالت دوسروں پر واجب ہوتی ہے جس کی وجہ سے خود انہیں کمانا ضروری نہیں ہوتا۔

کتابت قرآن کی اجرت جائز ہے

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّہٗ سُئِلَ عَنْ اُجْرَۃِ کِتَابَۃِ الْمُصْحَفِ فَقَالَ لَابَاسَ اِنَّمَا ھُمْ مُصَوِّرُوْنَ وَاِنَّھُمْ اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ مِنْ عَمَلِ اَیْدِیْھِمْ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے کتابت قرآن کی اجرت کا حکم دریافت کیا گیا (کہ کتابت قرآن کی اجرت کھانا جائز ہے یا نہیں؟) تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ کاتب لوگ تو صرف نقش کھینچنے والے ہیں جو اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتے ہیں۔" (رزین)

تشریح: سائل نے گویا کتابت قرآن کی اجرت لینے اور اس کے کھانے کو ایک بعید سی بات جانی اس لئے اس نے حضرت ابن عباسؓ سے اس کا حکم دریافت کیا، چنانچہ ابن عباسؓ نے اسے جواب دیا کہ کاتب تو کاغذ پر الفاظ کا نقش بناتے ہیں۔ یعنی ان کا کام صرف کتابت کرنا اور لکھنا ہے جس کی وہ اجرت حاصل کرتے ہیں خواہ وہ قرآن کی کتابت کریں یا کسی اور کتاب کی اور یہی ان کا ہنر وپیشہ ہوتا ہے جو ان کی حلال روزی کا ذریعہ ہے۔

کون سا کسب افضل ہے؟

(۲۵) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ قَالَ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْکَسْبِ اَطْیَبُ قَالَ عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِہٖ وَکُلُّ بَیْعٍ مَبْرُوْرٍ۔

(رواہ احمد)

"اور حضرت رافع بن خدیج راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ کونسا کسب پاکیزہ (یعنی افضل ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کا اپنے ہاتھ سے کمانا اور ہروہ تجارت جو مقبول (یعنی شرعی اصول و قواعد کے مطابق) ہو۔" (احمدؒ)

تشریح: آپ ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ سب سے بہتر تو وہ کسب و پیشہ ہے جس میں انسان کو اپنے ہاتھوں سے محنت کرنی پڑتی ہو جیسے زراعت اور کتابت وغیرہ اور اگر کوئی شخص ہاتھوں کی محنت والا کسب اختیار نہ کر سکے تو پھر ایسی تجارت کے ذریعے اپنی حلال روزی پیدا کرے جس میں دیانت و امانت کی روح بہر صورت کارفرما ہے کیونکہ ایسی تجارت بھی ایک پاک و حلال کسب ہے۔

دودھ کی قیمت کا حکم

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ اَبِیْ مَرْیَمَ قَالَ کَانَتْ لِمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیْ کَرِبَ جَارِیَةٌ تَبِیْعُ اللَّبَنَ وَیَقْبِضُ الْمِقْدَامُ ثَمَنَهٗ فَقِیْلَ لَهٗ سُبْحَانَ اللّٰهِ اَتَبِیْعُ اللَّبَنَ وَتَقْبِضُ الثَّمَنَ فَقَالَ نَعَمْ وَمَا بَاْسٌ بِذٰلِكَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَیَاْتِیَنَّ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَنْفَعُ فِیْهِ اِلَّا الدِّیْنَارُ وَالدِّرْهَمُ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوبکرؒ ابن مریم (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت مقدامؓ ابن معدی کرب (صحابی) کی ایک باندی (ان کے گھر کے جانوروں کا) دودھ بیچا کرتی تھی اور مقدامؓ اس سے دودھ کی حاصل ہونے والی قیمت لے لیا کرتے تھے چنانچہ ایک روز مقدامؓ سے کسی نے کہا کہ سبحان اللہ! (کتنی عجیب بات ہے کہ) باندی دودھ بیچتی ہے اور تم اس کی قیمت لے لیتے ہو؟ مقدامؓ نے کہا کہ ٹھیک تو ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں درہم و دینار کے علاوہ کوئی چیز فائدہ نہیں دے گی۔" (احمدؒ)

تشریح: گویا لوگوں نے حضرت مقدامؓ کو طعنہ دیا کہ آپ کی باندی آپ کے جانوروں کا دودھ بیچتی ہے اور آپ اس دودھ کی قیمت لے کر کھاتے ہیں حالانکہ دودھ کے بارے میں تو بہتر یہی ہے کہ اسے فقراء و مساکین میں صدقہ و خیرات کے طور پر تقسیم کر دیا جائے یا اسے اپنے دوستوں اور متعلقین پر صرف کیا جائے، دودھ کو بیچنا اور ان کی قیمت وصول کرنا آپ جیسوں کی شان کے لائق نہیں ہے، اس کا جواب حضرت مقدامؓ نے یہ دیا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جس میں کوئی شرعی نقصان ہو۔ دودھ بیچنا اور اس کی قیمت وصول کرنا نہ ہی حرام ہے اور نہ مکروہ ہے، اور پھر میرا یہ فعل کسی لالچ کی بناء پر یا مال و زر کی ہوس میں نہیں ہے بلکہ دراصل میں اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے اس کا محتاج ہوں، اس کے بعد حضرت مقدامؓ نے آنے والے زمانے میں مال و زر کی طرف لوگوں کے شدید میلان کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی یہ پیش گوئی بیان کی کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جس میں لوگوں کی تمام تر توجہ اور کوششوں کا مرکز صرف مال و زر بن جائے گا۔ چونکہ لوگ اپنی ضروریات کا دائرہ وسیع کریں گے اور اسباب معیشت کی قلت و گرانی ہمہ قسم کی پریشانیوں اور نقصانات میں مبتلا کر دے گی۔ اس لئے نہ علم و ہنر کی طرف توجہ ہوگی اور نہ اہل علم و کمال کی قدر و منزلت، بلکہ صرف مال و زر کی طرف توجہ ہوگی اور مالداروں کی قدر و منزلت۔

منقول ہے کہ صحابہؓ آپس میں فرمایا کرتے تھے کہ تجارت و محنت کے ذریعے اتنا مال و زر ضرور کما لیا کرو جس سے آبرومندانہ زندگی کا تحفظ ہو سکے، اور یاد رکھو کہ ایک ایسا بھی دور آنے والا ہے کہ جب تم میں سے کوئی محتاج و تنگدست ہوگا تو سب سے پہلے اپنے دین و ایمان ہی کو کھا جائے گا۔

مقررہ ذریعہ معاش کو بلاسبب ترک نہ کرو

(۲۷) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ کُنْتُ اُجَهِّزُ اِلَی الشَّامِ وَاِلٰی مِصْرَ فَجَهَّزْتُ اِلَی الْعِرَاقِ فَاَتَیْتُ اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ عَائِشَةَ فَقُلْتُ لَهَا یَا

اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ كُنْتُ أُجَهِّزُ اِلَى الشَّامِ فَجَهَّزْتُ اِلَى الْعِرَاقِ فَقَالَتْ لَا تَفْعَلْ مَالَكَ وَلِمَتْجَرِكَ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا سَبَّبَ اللّٰهُ لِاَحَدِكُمْ رِزْقًا مِنْ وَجْهٍ فَلَا يَدَعْهُ حَتّٰى يَتَغَيَّرَ لَهٗ اَوْ يَتَنَكَّرَ لَهٗ۔

(رواہ احمد وابن ماجۃ)

"اور حضرت نافع کہتے ہیں کہ میں (اپنی تجارت کا) مال واسباب تیار کر کے (اپنے ملازموں اور وکیلوں کی سپردگی میں) شام اور مصر بھیجا کرتا تھا، پھر بعد میں (ایک مرتبہ) میں نے اپنا تجارتی سامان عراق کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا اور اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ اُمّ المومنین میں (پہلے تو) اپنا تجارتی سامان شام بھیجا کرتا تھا مگر اب میرا ارادہ ہے کہ اپنا تجارتی سامان لے کر عراق کی طرف جاؤں۔ (یہ سن کر) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، تمہیں اور تمہاری تجارت کو کیا ہوا ہے؟ کہ تم شام کے سلسلہ تجارت کو منقطع کرتے ہو میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے رزق کا کوئی سبب کسی صورت میں پیدا کردے تو اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے حتیٰ کہ اس میں کوئی تبدیلی پیدا ہو جائے یا نقصان پہنچنے لگے۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے رزق کا جو بھی جائز ذریعہ ہو مثلاً وہ سامان تجارت کہیں باہر بھیجتا ہو جس کے نفع سے اسے رزق حاصل ہوتا ہو تو وہ اس کو بلا سبب چھوڑے نہیں، ہاں اگر کوئی ایسا امر پیش آجائے جس کی بناء پر اس ذریعے کو ختم کرنا ہی ضروری ہو مثلاً نفع ہونا بند ہو جائے یا اصل مال میں نقصان واقع ہونے لگے تو ایسی صورت میں اسے چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص از قسم مباح کسی اچھی چیز کو حاصل کرلے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کو اللہ کی ایک نعمت سمجھ کر اس پر قائم وبرقرار رہے اور بغیر کسی قوی عذر کے اسے چھوڑ کر اس کے غیر کی طرف مائل نہ ہو۔

حضرت ابوبکرؓ کا وصف احتیاط وتقویٰ

(۲۸) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ لِاَبِیْ بَكْرٍ غُلَامٌ يُخْرِجُ لَهُ الْخَرَاجَ فَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ يَاكُلُ مِنْ خَرَاجِهٖ فَجَاءَ يَوْمًا بِشَیْءٍ فَاَكَلَ مِنْهُ اَبُوْبَكْرٍ فَقَالَ لَهُ الْغُلَامُ تَدْرِیْ مَا هٰذَا فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَمَا هُوَ قَالَ كُنْتُ تَكَهَّنْتُ لِاِنْسَانٍ فِی الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا اُحْسِنُ الْكِهَانَةَ اِلَّا اَنِّیْ خَدَعْتُهٗ فَلَقِيَنِیْ فَاَعْطَانِیْ بِذٰلِكَ فَهٰذَا الَّذِیْ اَكَلْتَ مِنْهُ قَالَتْ فَاَدْخَلَ اَبُوْبَكْرٍ يَدَهٗ فَقَاءَ كُلَّ شَیْءٍ فِیْ بَطْنِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک غلام تھا جو اپنی کمائی میں سے ایک مقررہ حصہ حضرت ابوبکرؓ کو دیا کرتا تھا، (جیسا کہ اہل عرب کا معمول تھا کہ وہ اپنے غلاموں کو کمائی پر لگا دیتے تھے اور ان کو حاصل ہونے والی اجرت میں سے کوئی حصہ اپنے لئے مقرر کر لیتے تھے) چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اس غلام کی لائی ہوئی چیز کو کھا لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ غلام کوئی چیز لایا جس میں سے حضرت ابوبکرؓ نے بھی کھایا، ان کے کھانے کے بعد غلام نے کہا کہ آپ جانتے بھی ہیں یہ کیسی چیز ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ مجھے کیا معلوم، تم ہی بتاؤ یہ کیسی چیز ہے؟ غلام نے کہا کہ میں ایام جاہلیت میں (یعنی اپنی حالت کفر میں) ایک شخص کو غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا حالانکہ میں کہانت کا فن (یعنی پوشیدہ باتیں بتانے کا فن) اچھی طرح نہیں جانتا تھا بلکہ میں اس کو (غلط سلط باتیں بنا کر) فریب دیا کرتا تھا (اتفاقاً آج) اس شخص سے میری ملاقات ہوگئی تو اس نے مجھے یہ چیز دی، یہ وہی چیز ہے جو آپ نے کھائی ہے حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (یہ سنتے ہی) حضرت ابوبکرؓ نے اپنے منہ (یعنی حلق) میں ہاتھ ڈال کر قے کردی اور جو کچھ پیٹ میں تھا (از راہ احتیاط) سب باہر نکال دیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ حدیث حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دینی احتیاط اور ان کے کمال تقویٰ کی واضح مثال ہے کہ انہیں جیسے ہی معلوم ہوا کہ ان کے پیٹ میں ایک چیز ایسی چلی گئی ہے جو ایک حرام سلسلے میں حاصل ہوئی تھی، انہوں نے فوراً قے کر کے اسے باہر نکال دیا، بلکہ وہ چیز چونکہ کہانت

اور اس کے ساتھ ہی فریب کی آمیزش کی وجہ سے بڑی شدید حرمت کی حامل تھی اس لئے انہوں نے قے کر کے صرف اسی چیز کو نکال دینے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ہر اس چیز کو نکالنا ضروری سمجھا جو پیٹ کے اندر اس کے علاوہ تھی کیونکہ انہیں خوف تھا کہ اس چیز کے کسی بھی جزء نے پیٹ میں دوسری چیزوں کو بھی ملوث کر دیا ہوگا۔

حضرت ابوبکرؓ کے اس فعل سے حضرت امام شافعیؒ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی حرام چیز کھالی ہو اور وہ اس نے اس کی حرمت کے علم کے باوجود کھائی ہو یا لاعلمی میں کھائی ہو اور بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ حرام چیز تھی تو اس پر لازم ہے کہ فوراً قے کر کے اس چیز کو پیٹ سے نکال دے۔

حضرت امام غزالیؒ نے منہاج العابدین میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا یہ فعل، ورع یعنی تقویٰ وپرہیزگاری کی قسم سے ہے، نیز انہوں نے لکھا ہے کہ ورع کا حکم یہ ہے کہ تم کسی سے کوئی چیز اس وقت تک نہ لو جب تک کہ اس کے بارے میں پوری تحقیق نہ کر لو، پھر تحقیق کے بعد یہ یقین بھی حاصل کر لو کہ اس چیز میں کسی بھی درجے کا کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ اگر اس چیز کے بارے میں پوری تحقیق اور یہ یقین حاصل نہ ہو سکے تو اس چیز کو نہ لو اور اگر لے لی ہو تو اسے واپس کر دو۔

حرام مال کھانے پر وعید

(۲۹) عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَایَدْخُلُ الْجَنَّۃَ جَسَدٌ غُذِیَ بِالْحَرَامِ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس بدن نے حرام مال سے پرورش پائی ہوگی وہ (شروع ہی میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ اور جزا بھگتے بغیر) جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" (بیہقیؒ)

حضرت عمرؓ کے تقویٰ اور احتیاط کی ایک مثال

(۳۰) وَعَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّہٗ قَالَ شَرِبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَبَنًا وَّاَعْجَبَہٗ وَقَالَ لِلَّذِیْ سَقَاہُ مِنْ اَیْنَ لَکَ ھٰذَا اللَّبَنُ فَاَخْبَرَہٗ اَنَّہٗ وَرَدَ عَلٰی مَاءٍ قَدْ سَمَّاہُ فَاِذَا نَعَمٌ مِنْ نَعَمِ الصَّدَقَۃِ وَھُمْ یَسْقُوْنَ فَحَلَبُوْا لِیْ مِنْ اَلْبَانِھَا فَجَعَلْتُہٗ فِیْ سِقَائِیْ وَھُوَ ھٰذَا فَاَدْخَلَ عُمَرُ یَدَہٗ فَاسْتَقَاءَہٗ۔ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت زید ابن سلم (جو حضرت عمر فاروقؓ کے آزاد کردہ غلام تھے) کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت عمر ابن خطاب نے دودھ پیا جو ان کو عجیب معلوم ہوا، انہوں نے اس شخص سے کہ جس نے دودھ لا کر پلایا تھا، پوچھا کہ یہ دودھ تمہیں کہاں سے ملا؟ تو اس نے ان کو بتایا کہ وہ (یعنی میں) پانی کے ایک چشمے یا کنویں پر گیا تھا، اس نے چشمے یا کنویں کا نام بھی بتایا، وہاں میں نے دیکھا کہ زکوٰۃ کے کچھ جانور (یعنی اونٹ وبکری وغیرہ پانی پینے کے لئے آئے ہوئے) ہیں اور ان جانوروں کے نگران ان کا دودھ نکال کر لوگوں کو پلا رہے ہیں، چنانچہ انہوں نے میرے لئے بھی دودھ دوہا۔ جسے میں نے لے کر اپنی مشک میں ڈال لیا یہ وہی دودھ تھا (یہ سن کر) حضرت عمرؓ نے (اپنے حلق میں) ہاتھ ڈال کر قے کر دی (اور اس دودھ کو پیٹ سے باہر نکال دیا کیونکہ وہ زکوٰۃ کا مال تھا جو ان کے لئے جائز نہیں تھا) ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت سید جمال الدینؒ محدث نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں اس موقع پر مذکور نہیں ہے چنانچہ ہم نے مشکوٰۃ کے جس نسخے میں اپنے استاد سے حدیثیں سماعت کی ہیں اس میں بھی یہاں یہ حدیث نہیں ہے البتہ اس کے حاشیے میں لکھی ہوئی ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ یہ حدیث اس باب سے محذوف رکھی جائے (ویسے بھی یہ حدیث چونکہ مشکوٰۃ کی کتاب الزکوٰۃ میں چند الفاظ کی

کمی بیشی کے ساتھ نقل کی جاچکی ہے اس لئے یہاں دوبارہ نقل کرنا مشکوۃ کی ترتیب کے مطابق موزوں نہیں ہے)۔
لہٰذا جن نسخوں میں اس موقع پر یہ حدیث نقل نہیں کی گئی ہے ان میں پہلی حدیث یعنی حضرت ابوبکرؓ کی روایت کے بعد یہ عبارت "رواھما البیھقی" لکھا ہوا ہے۔

حرام مال کا قلیل ترین جز بھی عبادت کے نتیجے پر اثر انداز ہو جاتا ہے

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَنِ اشْتَرٰی ثَوْبًا بِعَشْرَةِ دَرَاهِمَ وَفِیْهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ تَعَالٰی لَهٗ صَلٰوةً مَادَامَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَدْخَلَ اِصْبَعَيْهِ فِیْ اُذُنَيْهِ وَقَالَ صُمَّتَا اِنْ لَمْ يَكُنِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُهٗ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ اِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مثلاً ایک کپڑا دس درہم میں خریدے اور ان میں ایک درہم بھی حرام مال کا ہو تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس شخص کی نماز نہیں قبول کرے گا جب تک کہ آدمی کے جسم پر وہ کپڑا ہوگا۔ اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ نے اپنی (شہادت کی) دونوں انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالیں اور کہا کہ یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں اگر میں نے یہ رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے نہ سنا ہو۔ (احمدؒ، بیہقیؒ) اور بیہقیؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد ضعیف ہے۔"

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اگر حرام مال کا قلیل ترین جزء بھی جسم پر موجود ہو تو اس سے عبادت کا نتیجہ اثر پذیر ہو جاتا ہے، چنانچہ اس بات کو بطور مثال بیان کیا گیا کہ اگر کوئی شخص ایک کپڑا دس درہم میں خریدے اور ان دس درہم میں ایک درہم ہو جو اسے کسی بھی حرام ذریعے سے حاصل ہوا تو وہ کپڑا جب تک کہ اس کے جسم پر رہے گا اس کی نماز قبول نہیں ہوگی اگرچہ اس شخص کے ذمہ سے فرضیت ساقط ہو جائے گی، مگر اس کی نماز اس لائق نہیں ہوگی کہ اسے ثواب سے نوازا جائے جس طرح کہ اگر کوئی شخص کسی غصب کردہ زمین پر نماز پڑھتا ہے تو اگرچہ اس کے ذمہ سے فرضیت ساقط ہو جاتی ہے مگر اسے نماز کا پورا ثواب نہیں ملتا۔
روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جو بات میں نے کہی ہے وہ کوئی میری اپنی بات نہیں ہے بلکہ آنحضرت ﷺ کا وہ ارشاد گرامی ہے جسے خود میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے، اگر میں نے یہ حدیث اپنے کانوں سے نہ سنی ہو اور میں یہ غلط کہہ رہا ہوں تو خدا کرے میرے دونوں کان بہرے ہو جائیں۔

بَابُ الْمُسَاهَلَةِ فِی الْمُعَامَلَةِ

معاملات میں نرمی کرنے کا بیان

باہمی لین دین اور خرید و فروخت کے معاملات میں نرمی اور مسامحت اختیار کرنا معاشرتی تعلقات کے استحکام اور آپس کے تعاون و ہمدردی کے نقطہ نظر سے انتہائی ضروری ہے، چنانچہ اس باب میں اسی موضوع سے متعلق احادیث نقل کی جائیں گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

معاملات میں نرمی کرنے والے کے لئے آنحضرت ﷺ کی دعاء رحمت

(۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَاِذَا اشْتَرٰی وَاِذَا اقْتَضٰی۔
(رواہ البخاری)

"حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو بیچنے میں خریدنے میں اور تقاضہ کرنے میں نرمی کرتا ہے۔" (بخاریؒ)

تم دوسروں کے معاملہ میں نرمی کرو اللہ تعالیٰ تمہارے معاملہ میں نرمی کرے گا

② وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَجُلاً كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اَتَاهُ الْمَلَكُ لِيَقْبِضَ رُوْحَهٗ فَقِيْلَ لَهٗ هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ قَالَ مَا اَعْلَمُ قِيْلَ لَهٗ اُنْظُرْ قَالَ مَا اَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ اَنِّيْ كُنْتُ اُبَايِعُ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا وَاُجَازِيْهِمْ فَاُنْظِرُ الْمُوْسِرَ وَاَتَجَاوَزُ عَنِ الْمُعْسِرِ فَاَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ نَحْوَهٗ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ وَاَبِيْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيِّ فَقَالَ اللّٰهُ اَنَا اَحَقُّ بِذَا مِنْكَ تَجَاوَزُوْا عَنْ عَبْدِيْ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تم سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں (یعنی گذشتہ امتوں میں) سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ جب اس کے پاس موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تو نے کوئی نیک کام کیا ہے؟ اس نے کہا مجھے یاد نہیں ہے (کہ میں نے کوئی نیک کام کیا ہو) اس سے پھر کہا گیا کہ اچھی طرح سوچ لے اس نے کہا کہ مجھے قطعاً یاد نہیں آرہا ہے ہاں (اتنا ضرور جانتا ہوں کہ) میں دنیا میں جب لوگوں سے (خرید و فروخت کے) معاملات کیا کرتا تھا تو تقاضہ کے وقت (یعنی مطالبات کی وصولی میں) ان پر احسان کیا کرتا تھا بایں طور کہ مستطیع لوگوں کو تو مہلت دے دیتا تھا اور جو نادار ہوتے ان کو معاف کر دیتا تھا (یعنی اپنے مطالبات کا کوئی حصہ یا پورا مطالبہ ان کے لئے معاف کر دیتا تھا) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس کے اسی عمل سے خوش ہو کر) اس کو جنت میں داخل کر دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک اور روایت میں جو عقبہؓ ابن عامر اور ابو مسعود انصاریؓ نے اسی کے مثل (یعنی کچھ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ) نقل کی ہے، یہ الفاظ ہیں کہ (جب اس شخص نے اپنا یہ عمل بیان کیا) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اس کا (یعنی معاف کرنے کا) حق تجھ سے زیادہ رکھتا ہوں، (اور پھر فرشتوں سے کہا کہ) میرے اس بندہ سے درگذر کرو۔

تشریح: "اتاہ الملک" سے مراد یا تو یہ ہے کہ خود حضرت عزرائیل علیہ السلام ہی اس کی روح قبض کرنے آئے تھے یا پھر یہ کہ ان فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ آیا ہوگا جو حضرت عزرائیل علیہ السلام کے مددگار و ماتحت ہیں، لیکن اغلب یہ ہے کہ خود حضرت عزرائیل علیہ السلام ہی آئے ہوں گے کیونکہ قبض روح کے سلسلے میں زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ ارواح قبض کرنے کا کام حضرت عزرائیل علیہ السلام ہی انجام دیتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ۔

"کہہ دیجئے کہ تمہیں وہ ملک الموت (عزرائیل علیہ السلام) مارتا ہے جو تم پر (اس کام کے لئے) متعین ہے۔"

چنانچہ حضرت عزرائیل علیہ السلام جب روح قبض کر لیتے ہیں تو جو اچھی یعنی پاکباز روح ہوتی ہے اسے رحمت کے فرشتے لے لیتے ہیں اور جو بری روح ہوتی ہے وہ عذاب کے فرشتوں کی نگرانی (CUSTODY) میں چلی جاتی ہے لیکن اتنی بات ملحوظ رہے کہ ملک الموت (خواہ وہ عزرائیل ہوں یا کوئی اور فرشتہ) روح قبض کرنے کا صرف ایک ظاہری ذریعہ بنتا ہے ورنہ حقیقت میں تو روح قبض کرنے والا اور موت طاری کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسا کہ خود اسی کا ارشاد ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا۔

"ہر نفس کو اس کی موت کے وقت اللہ تعالیٰ ہی مارتا ہے۔"

فَقِیْلَ لَہٗ (تو اس سے پوچھا گیا)! اس کے بارے میں بھی دونوں احتمال ہیں، یا تو اس سے یہ سوال اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا یا فرشتوں نے یہ بات پوچھی، نیز وقت سوال کے سلسلے میں زیادہ واضح بات تو یہ ہے کہ اس شخص سے یہ سوال روح قبض کرنے سے پہلے کیا گیا تھا جیسا کہ حدیث کے ابتدائی الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سوال روح قبض ہونے کے بعد قبر میں کیا گیا ہوگا جیسا کہ شیخ مظہرؒ کا قول ہے اور علامہ طیبیؒ نے ایک یہ احتمال بھی بیان کیا ہے کہ دراصل یہ سوال قیامت میں کیا جائے گا۔

بہر کیف، اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مطالبات کی وصولی میں مستطیع کو مہلت دینا اور نادار شخص کو معاف کر دینا بڑے ثواب کی چیز ہے۔

خرید و فروخت میں زیادہ قسم نہ کھاؤ

(۳) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِیَّاکُمْ وَکَثْرَۃَ الْحَلْفِ فِی الْبَیْعِ فَاِنَّہٗ یُنَفِّقُ ثُمَّ یَمْحَقُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو قتادہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اپنی تجارتی زندگی میں زیادہ قسمیں کھانے سے پرہیز کرو، کیونکہ تجارتی معاملات میں زیادہ قسمیں کھانا (پہلے تو) کاروبار کو رواج دیتا ہے مگر پھر برکت کو کھو دیتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تجارتی معاملات میں زیادہ قسمیں کھانے کی وجہ سے وقتی طور پر کاروبار میں وسعت ہوتی ہے بایں طور کہ لوگ قسم پر اعتبار کر کے زیادہ خریداری کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن انجام کار زیادہ قسمیں کاروبار میں خیر و برکت کو ختم کر دیتی ہیں کیونکہ جس شخص کو زیادہ قسمیں کھانے کی عادت ہوگی اس سے جھوٹی قسموں کا بھی صدور ہونے لگے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک تو باطنی طور پر اس کی تجارت سے خیر و برکت کی روح نکل جائے گی دوسرے اس کا اعتبار آہستہ آہستہ اٹھنے لگے گا اور لوگ اس سے لین دین کرنے میں تامل کرنے لگیں گے۔

(۴) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْحَلِفُ مَنْفَقَۃٌ لِلسِّلْعَۃِ مُمْحَقَۃٌ لِلْبَرَکَۃِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول کریم ﷺ یہ فرماتے تھے کہ "قسم (شروع میں تو) مال و اسباب میں منفعت کا سبب بنتی ہے لیکن (انجام کار) برکت کے خاتمے کا سبب بن جاتی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قسم سے مراد قسم کی کثرت و زیادتی بھی ہو سکتی ہے اور جھوٹی قسم بھی مراد لی جا سکتی ہے، حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زیادہ قسمیں کھاتا ہے اگرچہ وہ قسمیں سچی ہوتی ہوں یا جھوٹی قسم کھاتا ہے تو اس کی وجہ سے شروع میں اور وقتی طور پر اس کے مال و اسباب میں وسعت و زیادتی ہو جاتی ہے کہ لوگ اس کی قسم پر اعتبار کر کے اس سے لین دین کثرت سے کرتے ہیں لیکن آخر کار یہی چیز اس کے مال و اسباب میں برکت ختم ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے بایں طور کہ یا تو اس کا مال و اسباب تلف ہو جاتا ہے یا وہ ایسی جگہ خرچ ہو جاتا ہے جس کا کوئی فائدہ نہ تو اسے دنیا میں حاصل ہوتا ہے اور نہ اخروی طور پر اسے کچھ اجر و ثواب ملتا ہے۔

جھوٹی قسمیں کھا کر تجارت بڑھانے والے کے لئے وعید

(۵) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثَۃٌ لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ قَالَ اَبُوْذَرٍّ خَابُوْا وَخَسِرُوْا مَنْ ھُمْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَہٗ بِالْحَلِفِ الْکَاذِبِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا تین شخص ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو ان سے

(مہربانی و عنایت کا) کلام کرے گا نہ (بنظر رحمت و عنایت) ان کی طرف دیکھے گا۔ اور نہ ان کو (گناہوں سے) پاک کرے گا اور ان تینوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ابوذرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! خیرو بھلائی سے محروم اور اس ٹوٹے میں رہنے والے وہ کون شخص ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایک تو پائنچے لٹکانے والا، دوسرا کسی کو کوئی چیز دے کر احسان جتانے والا اور تیسرا جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی تجارت بڑھانے والا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "پائنچے لٹکانے والے" سے مراد وہ شخص ہے جو ازراہ تکبر ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہنتا ہے، چنانچہ اس میں وہ شخص بھی داخل ہے جو ٹخنوں سے نیچا کرتہ پہنے۔

"احسان جتانے" کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کر کے مثلاً کسی کو کوئی چیز دے کر یا کسی کے ساتھ ہمدردی کا کوئی معاملہ کر کے اسے زبان پر لایا جائے، چنانچہ جو شخص کسی کے ساتھ ہمدردی و اعانت کا کوئی معاملہ کر کے پھر اس پر احسان جتاتا ہے تو وہ ثواب سے محروم رہتا ہے۔

"جھوٹی قسمیں کھا کر تجارت بڑھانے والے" سے مراد وہ تاجر ہے جو زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے یا اپنا مال تجارت بڑھانے کے لئے جھوٹی قسمیں کھائے مثلاً اس نے کوئی چیز نوے روپے میں خریدی ہو مگر اپنے خریدار سے اس کی زیادہ قیمت وصول کرنے کے لئے یا اس کی مالیت بڑھانے کے لئے جھوٹی قسم کھا کر کہے کہ خدا کی قسم میں نے یہ چیز سو روپے میں خریدی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

امانت دار کاروباری شخص کی فضیلت

(۶) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَالدَّارِ قُطْنِیُّ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ (قول و فعل میں) نہایت سچائی اور نہایت دیانتداری کے ساتھ کاروبار کرنے والا شخص نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ (ترمذیؒ، دارمیؒ، دارقطنیؒ) اور ابن ماجہؒ نے یہ روایت حضرت ابن عمرؓ سے نقل کی ہے، نیز ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "کاروباری" سے مراد وہ شخص ہے جو تجارتی کاروبار اور اجارہ داری کرتا ہو اور یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ سب سے بہتر کاروبار کپڑے کی تجارت ہے اس کے بعد عطاری ہے۔

ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ جو کاروباری شخص سچائی، دیانت داری اور امانت کے اوصاف سے متصف ہوگا۔ گویا اس کی زندگی تمام صفات کمالیہ سے مزین ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ یا تو میدان حشر میں نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا، کہ جس طرح وہاں کی ہولناکیوں کے وقت یہ تینوں طبقے رحمت الٰہی کے سایہ میں ہوں گے اسی طرح وہ شخص بھی رحمت خداوندی کی خاص پناہ میں ہوگا یا یہ کہ اسے جنت میں ان کی رفاقت کا شرف حاصل ہوگا، چنانچہ اسے انبیاء کی رفاقت تو ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی وجہ سے حاصل ہوگی۔ صدیقوں کا ساتھ ان کی صفت خاص یعنی صدق کی موافقت کی وجہ سے ہوگا۔ اور شہیدوں کی رفاقت کی سعادت اسے اس لئے نصیب ہوگی کہ شہداء اس شخص کے وصف صدق و امانت کی شہادت دیں گے۔

تجارت کے ساتھ صدقہ و خیرات کا حکم

(۷) وَعَنْ قَیْسِ بْنِ اَبِیْ غَرَزَۃَ قَالَ کُنَّا نُسَمّٰی فِیْ عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ السَّمَاسِرَۃَ فَمَرَّبِنَا رَسُوْلُ

اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمَّانَا بِاسْمٍ هُوَ اَحْسَنُ مِنْهُ فَقَالَ يَامَعْشَرَ التُّجَّارِ اِنَّ الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْحَلْفُ فَشُوْبُوْهُ بِالصَّدَقَةِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور قیس بن غرزہ (جو سوداگری کرتے تھے) کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم لوگوں کو (یعنی سوداگروں کو) "سماسرہ" کہا جاتا تھا، چنانچہ (ایک دن کا ذکر ہے کہ) نبی کریم ﷺ کا گذر ہماری طرف ہوا تو آپ ﷺ نے ہمارے طبقے کو ایک ایسا نام عطا کیا جو ہمارے پہلے نام سے کہیں بہتر ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اے طبقہ تجار! تجارت میں اکثر بے فائدہ باتیں اور (بہت زیادہ) قسم (یا کبھی کبھی جھوٹی قسم) کھانے کی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں اس لئے تم تجارت کو صدقہ وخیرات کے ساتھ ملائے رکھو۔" (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: "سماسرہ" دراصل لفظ "سمسار" کے جمع کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں "دلال، یا کسی چیز کا مالک ومنتظم"، چنانچہ پہلے زمانے میں تجارتی کاروبار کرنے والے کو "سمسار" ہی کہتے تھے، پھر آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو اس سے بہتر نام یعنی تجار جو لفظ تاجر کے جمع کا صیغہ ہے، عطا کیا۔ اس نام کے بہتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خرید وفروخت کے کاروبار کو مدحیہ طور پر لفظ "تجارت" کے ساتھ ذکر کیا ہے جیسے ایک آیت کی عبارت کا یہ ٹکڑا ہے هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے) یا ایک اور آیت میں ہے تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ (سوداگری آپس کی رضامندی سے) یا ایک آیت کے یہ الفاظ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (تجارت کرو، ہلاکت میں نہ پڑو)۔

"فَشُوْبُوْهُ بِالصَّدَقَةِ" (تجارت کو صدقہ وخیرات کے ساتھ ملائے رکھو) کا مطلب یہ ہے کہ تجارتی زندگی میں عام طور پر بے فائدہ باتیں اور جھوٹی سچی قسموں کا صدور ہوتا رہتا ہے اور یہ دونوں ہی چیزیں پروردگار کے غضب وغصہ کا باعث ہیں، اس لئے تم ان دونوں چیزوں کے کفارہ کے طور پر اپنا کچھ مال صدقہ وخیرات کرتے رہا کرو، کیونکہ صدقہ وخیرات اللہ تعالیٰ کے غضب وغصہ کو دور کرتا ہے۔

تاجروں کے لئے وعید

⑧ وَعَنْ عُبَيْدِ بْنِ رِفَاعَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ التُّجَّارُ يُحْشَرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰى وَبَرَّ وَصَدَقَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنِ الْبَرَاءِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت عبیدؒ ابن رفاعہ (تابعی) اپنے والد محترم (حضرت رفاعہؓ ابن رافع انصاری صحابی) سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ قیامت کے دن تاجر لوگوں کا حشر، فاجروں (یعنی دروغ گو اور نافرمان لوگوں) کے ساتھ ہوگا، ہاں (وہ تاجر اس سے مستثنیٰ ہوں گے) جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی (یعنی خیانت اور فریب دہی وغیرہ میں مبتلا نہ ہوئے) اور نیکی کی (یعنی اپنے تجارتی معاملات میں لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا یا یہ کہ عبادت خداوندی کرتے رہے) اور سچ پر قائم رہے۔ (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں اس روایت کو حضرت براءؓ سے نقل کیا ہے، نیز امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

بَابُ الْخِيَارِ

خیار کا بیان

"خیار" لفظ "اختیار" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں "دو چیزوں میں سے کسی ایک اچھی چیز کا انتخاب کرنا"۔ چنانچہ کسی تجارتی معاملے کو فسخ کر دینے یا اس کو باقی رکھنے کا وہ اختیار جو خریدار اور تاجر کو حاصل ہوتا ہے، اصطلاح فقہ میں "خیار کہلاتا ہے" تجارتی معاملات میں اس اختیار کی کئی قسمیں ہیں جن کے تفصیلی احکام اور فقہی اختلاف فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، تاہم اس موقع پر ان قسموں کے نام اور

تعریفات ذکر کر دینا ضروری ہے۔

خیار شرط! جو تجارتی معاملے طے ہو جانے کے بعد، تاجر یا خریدار یا دونوں کو اس معاملے کے ختم کر دینے یا باقی رکھنے کا حق دیا جانا "خیار شرط" کہلاتا ہے، مثلاً تاجر نے ایک چیز فروخت کی جسے خریدار نے خریدلی مگر اس خرید و فروخت کے بعد تاجر نے یا خریدار نے یہ کہا کہ باوجود بیع ہو جانے کے مجھ کو ایک روز، یا دو روز یا تین روز تک یہ اختیار حاصل ہو گا کہ خواہ اس بیع کو باقی رکھا جائے خواہ ختم کر دیا جائے۔ خرید و فروخت میں یہ صورت جائز ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مدت اختیار میں بیع کو فسخ کیا جائے تو وہ فسخ ہو جائے گی۔ اور اگر اس مدت کے ختم ہونے تک بیع کو برقرار رکھا یا سکوت کیا تو بعد ختم مدت، بیع پختہ ہو جائے گی، یہ بات ذہن میں رہے کہ "خیار شرط" کی مدت حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ تین دن تک ہے۔

خیار عیب: بیع ہو جانے کے بعد خریدی ہوئی چیز میں کوئی عیب معلوم ہونے کے بعد اس چیز کو رکھ لینے یا واپس کر دینے کا جو اختیار خریدار کو حاصل ہوتا ہے، اسے "خیار عیب" کہتے ہیں، مثلاً تاجر نے ایک چیز بیچی جسے خریدار نے خریدلی اب اس بیع کے بعد اگر خریدار کو پتہ چلے کہ میں نے جو چیز خریدی ہے اس میں یہ فلاں عیب ہے تو اسے اختیار ہو گا کہ چاہے تو وہ اس چیز کو رکھ لے اور چاہے بیچنے والے کو واپس کر کے اپنی دی ہوئی قیمت لوٹالے البتہ اگر بیچنے والے نے اس چیز کو بیچنے کے وقت خریدار سے یہ کہہ دیا تھا کہ اس چیز میں جو کچھ عیب ہو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں خواہ تم اس وقت اسے خرید و یا نہ خرید و اور اس کے باوجود بھی خریدار رضامند ہو گیا تھا تو خواہ کچھ ہی عیب اس میں نکلے خریدار کو واپسی کا اختیار حاصل نہیں ہو گا۔

خیار رؤیت: بے دیکھی ہوئی چیز کو خریدنے کے بعد اس چیز کو رکھ لینے یا واپس کر دینے کا جو اختیار خریدار کو حاصل ہوتا ہے اسے "خیار رؤیت" کہتے ہیں، مثلاً کسی خریدار نے بغیر دیکھے کوئی چیز خریدی تو یہ بیع جائز ہو جائے گی لیکن خریدار کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ اس چیز کو جس وقت دیکھے چاہے تو اسے رکھ لے اور چاہے بیچنے والے کو واپس کر دے۔

خیار تعیین: چند چیزوں میں بعض کو رکھ لینے اور بعض کو واپس کر دینے کا جو اختیار خریدار کو حاصل ہوتا ہے اسے "خیار تعیین" کہتے ہیں۔ مثلاً خریدار کسی تاجر سے کپڑے کے چند تھان لایا ان میں سے ایک کو لے لینے کی بات طے کر لی، اب اسے اختیار ہو گا کہ وہ ان میں سے جس تھان کو پسند کرے اسے لے لے اور بقیہ کو واپس کر دے۔

ان اقسام کے علاوہ اس باب میں خیار کی ایک اور قسم ذکر ہو گی جسے "خیار مجلس" کہتے ہیں، اس کی صورت یہ ہے کہ کسی ایک مجلس میں تاجر و خریدار کے درمیان خرید و فروخت کا کوئی معاملہ طے ہو جانے کے بعد اس مجلس کے ختم ہونے تک تاجر اور خریدار دونوں کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس معاملہ کو ختم کر سکتا ہے، مجلس ختم ہونے کے بعد یہ اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں رہتا۔ لیکن خیار کی اس قسم میں اختلاف ہے۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور بعض دوسرے علماء اس خیار کے قائل ہیں جبکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور دوسرے علماء اس کے قائل نہیں ہیں، یہ حضرات کہتے ہیں کہ جب بیع کا ایجاب و قبول ہو گیا یعنی معاملہ تکمیل پا گیا تو اب کسی کو بھی اس معاملے کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہے گا اور یہ کہ معاملہ کے وقت خیار کی شرط طے پا گئی ہو جسے "خیار شرط" کہتے ہیں اور جس کی مدت زیادہ سے زیادہ تین دن تک ہے۔ تین دن کے بعد خیار شرط کی صورت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خیار مجلس کا مسئلہ

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُتَبَایِعَانِ کُلُّ وَاحِدٍ مِنْھُمَا بِالْخِیَارِ عَلٰی صَاحِبِہٖ مَالَمْ

يَتَفَرَّقَا اِلَّا بَيْعَ الْخِيَارِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ اِذَا تَبَايَعَ الْمُتَبَايِعَانِ فَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِيَارِ مِنْ بَيْعِهٖ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا اَوْ يَكُوْنَ بَيْعُهُمَا عَنْ خِيَارٍ فَاِذَا كَانَ بَيْعُهُمَا عَنْ خِيَارٍ فَقَدْ وَجَبَ وَفِي رِوَايَةٍ لِلتِّرْمِذِيِّ اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا اَوْ يَخْتَارَا وَفِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ اَوْ يَقُوْلُ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهٖ اخْتَرْ بَدَلَ اَوْ يَخْتَارَا۔

"حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بیچنے والا خریدنے والا دونوں میں سے ہر ایک اپنے دوسرے صاحب معاملہ پر (اس بات کا) اختیار رکھتا ہے کہ چاہے تو وہ خرید و فروخت کے معاملے کو باقی رکھے اور چاہے تو ختم کر دے۔ جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں (یعنی جس مجلس میں وہ معاملہ طے پایا ہو گا جب وہ ختم ہو جائے گی بایں طور کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے تو ان میں سے کسی کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں رہے گا)۔ ہاں بیع خیار اس سے مستثنیٰ ہے (یعنی بیع میں خریدار نے اس اختیار کی شرط طے کر لی ہو گی کہ اگر میں چاہوں تو اس خریدی ہوئی چیز کو رکھوں گا اور اگر نہ چاہوں گا تو واپس کردوں گا، اس بیع میں ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد بھی اختیار باقی رہتا ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "جب بیچنے والا اور خریدنے والا خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کریں تو ان میں سے ہر ایک کو (معاملے کو باقی رکھنے یا فسخ کر دینے کا) اختیار حاصل ہو گا جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں یا یہ کہ ان کی خرید و فروخت کا معاملہ بشرط خیار ہو، چنانچہ اگر وہ خیار شرط کے ساتھ کوئی تجارتی معاملہ کریں گے تو اس صورت میں (جدائی کے بعد بھی) اختیار کا حق حاصل رہے گا۔

ترمذیؒ کی روایت میں یوں ہے کہ بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں جب تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں انہیں اختیار حاصل ہے الا یہ کہ وہ (اپنے تجارتی معاملے میں) خیار کی شرط طے کریں (یعنی اگر وہ اپنا تجارتی معاملہ مذکورہ بالا خیار شرط کے ساتھ طے کریں گے تو انہیں جدائی کے بعد بھی اختیار حاصل رہے گا)۔ لیکن بخاریؒ و مسلمؒ کی ایک روایت میں (ترمذیؒ کی اس روایت کے آخری الفاظ) او یختار (الا یہ کہ وہ خیار کی شرط طے کریں) کی بجائے یہ الفاظ ہیں کہ الا یہ کہ ان دونوں میں سے ایک اپنے دوسرے صاحب معاملہ سے یہ کہہ دے کہ اختیار کی شرط طے کرلو (اور وہ دوسرا کہہ دے کہ مجھے یہ منظور ہے)

تشریح: اس حدیث سے بظاہر "خیار مجلس" کا جواز ثابت ہوتا ہے، لیکن جو حضرات "خیار مجلس" کے قائل نہیں ہیں (جیسے امام ابوحنیفہؒ) وہ یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں "ایک دوسرے سے جدا ہونے" کا مطلب مجلس کا ختم ہو جانا نہیں ہے، بلکہ "جدا ہونے" سے مراد دونوں کی اس تجارتی معاملے کی گفتگو کا پایۂ تکمیل کو پہنچ کر منقطع ہو جانا ہے، یعنی جب تک کہ وہ دونوں اس معاملے سے متعلق گفتگو کر رہے ہوں اور ایجاب و قبول پورا نہیں ہوا ہو اس وقت تک ان میں سے ہر ایک کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ چاہے تو زیر گفتگو معاملہ کو فسخ کر دے چاہے اسے باقی رکھے لیکن جب ایجاب و قبول پورا ہو جائے گا یعنی بیچنے والا یہ کہہ دے کہ میں نے یہ چیز تمہیں فروخت کر دی اور خریدنے والا یہ کہہ دے کہ میں نے یہ چیز خرید لی تو اب اس کے بعد ان میں سے کسی کو بھی اس معاملے کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہے گا۔ ان حضرات نے "جدا ہونے" کے یہ معنی مراد لینے کے سلسلے میں اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ۔

"اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں گے تو اللہ اپنے فضل سے ان میں سے ہر ایک کو بے پروا کر دے گا۔"

چنانچہ اس آیت میں "جدا ہونے" کا مطلب مجلس سے جدا ہونا نہیں ہے بلکہ "خاوند و بیوی کے درمیان طلاق کے ذریعے جدائی مراد ہے۔

④ وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا فَاِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا

بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا وَاِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حکیمؓ ابن حزام کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں کو (اپنے تجارتی معاملہ کو باقی رکھنے یا فسخ کردینے کا) اختیار حاصل رہتا ہے۔ (لیکن یہ اختیار اس وقت تک حاصل رہتا ہے) جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں اور (یاد رکھو) جب بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں (فروخت کی جانے والی چیز اور اس کی تعریف میں) سچ بولتے ہیں اور (اس چیز و قیمت میں جو عیب و نقصان ہوتا ہے اس کو) ظاہر کردیتے ہیں (تاکہ کسی دھوکہ اور فریب کا دخل نہ رہے) تو ان کے تجارتی معاملے میں برکت عطا کی جاتی ہے اور جب وہ عیب چھپاتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں تو ان کی خرید و فروخت میں برکت ختم کردی جاتی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

خرید و فروخت میں فریب نہ کرو

③ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ اُخْدَعُ فِي الْبُيُوْعِ فَقَالَ اِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ فَكَانَ الرَّجُلُ يَقُوْلُهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ "میں خرید و فروخت کے معاملے میں فریب کھا جاتا ہوں" آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "تم (جب) خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کرو تو اس وقت یہ کہہ دیا کرو کہ (دین میں) فریب (کے لئے کوئی گنجائش) نہیں ہے" چنانچہ وہ شخص اسی طرح کہہ دیا کرتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ارشاد گرامی فقل لا خلابة (تم یہ کہہ دیا کرو کہ فریب نہیں ہے) کے بیان مطلب میں علماء کے مختلف اقوال ہیں کسی نے اس کا مطلب کچھ بیان کیا ہے اور کسی نے کچھ۔ ان اقوال کی تفصیل دیگر شروح میں مذکور ہے یہاں اختصار کے پیش نظر صرف وہ مطلب بیان کیا جاتا ہے جو تورپشتیؒ کے قول پر مبنی ہے اور جسے علامہ طیبیؒ نے بھی پسند کیا ہے۔ چنانچہ تورپشتیؒ کے قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو یہ حکم دیا تھا کہ جب تم کسی شخص سے خرید و فروخت کا معاملہ کرو تو پہلے اس کو آگاہ کردیا کرو کہ دیکھو بھائی، مجھے خرید و فروخت کے معاملات سے زیادہ واقفیت نہیں ہے، تم کوئی ایسی چیز اختیار نہ کرنا جس سے میں دھوکہ کھا جاؤں اور مجھے کوئی نقصان پہنچ جائے اور چونکہ ہمارے دین میں اس بات کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ کسی بھی شخص کو دھوکہ و فریب میں مبتلا کیا جائے اس لئے مہربانی کرکے تم میرے ساتھ کوئی دھوکہ فریب نہ کرنا۔

چنانچہ یہ اس پُر خیر دور کی بات ہے جبکہ عام طور پر لوگ دیانتداری، امانت اور پرہیزگاری کے حامل تھے۔ مخلوق خدا کی ہمدردی و بھلائی کا جذبہ فراواں تھا۔ ہر مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لئے وہی بات پسند کرتا تھا جو اپنی ذات کے لئے پسندیدہ ہوتی، خصوصاً اگر کوئی کسی کو آگاہ کردیتا کہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرنا جس سے مجھے نقصان و تکلیف پہنچے تو وہ اس کا بطور خاص خیال و کوشش رکھتا کہ میں کبھی نادانستگی میں بھی اس کو نقصان پہنچنے کا ذریعہ نہ بن جاؤں، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اسے اس بات کی تعلیم فرمائی کہ اگر وہ اپنے بارے میں اس طرح آگاہ کردیا کرے گا تو لوگ اس کی خیر خواہی بہرصورت ملحوظ رکھیں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

تجارتی معاملات میں فریقین کی رضامندی و طمانیت ضروری ہے

④ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ صَفْقَةَ خِيَارٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُ اَنْ يُفَارِقَ صَاحِبَهُ خَشْيَةَ اَنْ يَسْتَقِيْلَهُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"حضرت عمرو ابن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بیچنے والا اور خریدنے والا

دونوں (اسی وقت تک بیع کو باقی رکھنے یا اس کو فسخ کر دینے کا) اختیار رکھتے ہیں جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں الا یہ کہ ان کی بیع بشرط خیار ہو (تو اس میں جدائی کے بعد بھی اختیار باقی رہتا ہے) اور ان دونوں میں سے کسی کے لئے (از روئے تقویٰ) یہ جائز نہیں ہے کہ وہ معاملہ کرتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو اس خوف سے کہ مبادا دوسرا فریق معاملے کو فسخ کرنے کا اختیار مانگ لے (یعنی جب تک کسی معاملے میں دونوں فریق پوری طرح مطمئن نہ ہو جائیں ایجاب وقبول میں ان میں سے کوئی محض اس لئے جلد بازی نہ کرے کہ مبادا فریق ثانی معاملے کو فسخ کر دے یا معاملہ طے کرتے ہی ان میں سے کوئی محض اس وجہ سے نہ بھاگ کھڑا ہو کہ کہیں دوسرا فریق بیع کو فسخ کرنے کے اختیار کی شرط نہ چاہنے لگے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَایَتَفَرَّقَنَّ اثْنَانِ اِلَّا عَنْ تَرَاضٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا "بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں آپس کی رضامندی کے بغیر جدا نہ ہوں۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دونوں صاحب معاملہ کوئی تجارتی معاملہ طے کرنے کے بعد اس وقت تک ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں جب تک کہ قیمت کی ادائیگی اور خرید کردہ چیز کی حوالگی، دونوں میں برضا ورغبت طے نہ پا جائے یا عمل میں نہ آجائے کیونکہ اس کے بغیر ایک دوسرے کو نقصان وتکلیف پہنچنے کا احتمال رہے گا، جو شریعت میں ممنوع ہے یا پھر اس سے مراد یہ ہے کہ جب معاملہ طے ہو جائے اور دونوں صاحب معاملہ میں سے کوئی ایک وہاں سے اٹھ کھڑے ہونے کا ارادہ کرے تو وہ دوسرے فریق سے پہلے یہ پوچھ لے کہ اب تمہیں کوئی اشکال واعتراض تو نہیں ہے؟ اور کیا اس معاملے پر تم راضی ہو گئے ہو؟ اس کے بعد اگر وہ دوسرا فریق معاملے کو فسخ کرنا چاہے تو وہ بھی معاملے کو فسخ کر دے اور اگر وہ معاملے کی برقراری پر رضامند ہو تو پھر تکمیل کے بعد اس سے الگ ہو۔ اس صورت میں یہ حدیث معنی کے اعتبار سے پہلی حدیث کے موافق ہوگی۔ نیز یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے کیونکہ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ایک دوسرے کی اجازت کے بغیر جدا ہونا حلال ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عقد بیع کے بعد فسخ کا اختیار

⑥ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیَّرَ اَعْرَابِیًّا بَعْدَ الْبَیْعِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک اعرابی کو خرید وفروخت کا معاملہ ہو جانے کے بعد دوسرے فریق کی رضامندی سے اس معاملے کو فسخ کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

بَابُ الرِّبٰوا

سود کا بیان

"سود" ایک معاشرتی لعنت وعفریت ہے جس کی اقتصادی تباہ کاریوں نے ہمیشہ ہی غربت کے لہو سے سرمایہ داری کی آبیاری کی ہے اور غریب کے سسکتے وجود سے سرمایہ دار کی ہوس کو غذا بخشی ہے، چنانچہ اس لعنت میں مبتلا ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں تنبیہ کی ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (البقرہ: ۲:۲۷۹)

"پھر اگر تم اس (سود خوری چھوڑنے کے حکم) پر عمل نہ کرو تو پس اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔"

اسلام نے تجارت اور قرض دونوں میں سود کو حرام قرار دیا ہے اور اس کا ارتکاب گناہ کبیرہ بتایا ہے۔ جو مسلمان سود کے حرام ہونے کا قائل نہ ہو اسلامی قانون کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے۔

یہ لعنت بہت پرانی ہے، اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں بھی اس کا طریقہ رائج تھا۔ چنانچہ قریش مکہ اور یہود مدینہ میں اس کا عام رواج تھا اور ان میں صرف شخصی ضرورتوں مثلاً قرض وغیرہ ہی کے لئے نہیں بلکہ تجارتی مقاصد کے لئے بھی سود کا لین دین جاری تھا۔ اسی طرح سود کی تباہ کاریاں بھی ہمیشہ ہی تسلیم شدہ رہی ہیں اور اس کو اختیار کرنے والے بھی کبھی اس کے مضر اثرات کے منکر نہیں رہے ہیں، البتہ ایک نئی بات یہ ضرور ہوئی ہے کہ جب سے یورپ کے دلال دنیا کی مسند اقتدار و تجارت پر چھائے ہیں انہوں نے مہاجنوں اور یہودیوں کے اس خاص کاروبار کو نئی نئی شکلیں اور نئے نئے نام دے کر اس کا دائرہ اتنا عام اور وسیع کر دیا ہے کہ وہی سود جو پہلے انسان کی معاشرتی زندگی کا ایک گھن سمجھا جاتا تھا آج معاشیات، اقتصادیات اور تجارت کے لئے ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے اور سطحی ذہن و فکر رکھنے والوں کو یقین ہو گیا ہے کہ آج کوئی تجارت یا صنعت یا اور کوئی معاشی نظام سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتا، اگرچہ آج بھی اہل یورپ ہی میں سے وہ لوگ جو تقلید محض اور عصبیت سے بلند ہو کر وسیع نظر سے معاملات کا جائزہ لیتے ہیں اور جو معاشیات (ECONOMICS) کا وسیع علم ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کے عملی پہلوؤں پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں خود ان کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ سود، معاشیات اور اقتصادی زندگی کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ایک ایسا کیڑا ہے جو ریڑھ کی ہڈی میں لگ گیا ہے اور جب تک اس کیڑے کو نہ نکالا جائے گا دنیا کی معیشت میں جو اضطراب و ہیجان ہے وہ ختم نہیں ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ آج دنیا میں سود کا لین دین جتنا وسیع ہو گیا ہے اور دنیا کے اس کونہ سے لے کر اس کونہ تک تمام ہی تجارتوں میں اس کا جال جس طرح پھیلا دیا گیا ہے، افراد و اشخاص کی کیا حیثیت، اگر کوئی پورا طبقہ و جماعت بلکہ کوئی پورا ملک بھی اس سے نکلنا چاہے تو اس کو اس کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا کہ یا تو اپنی تجارت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے یا نقصان برداشت کرتا رہے یہی وجہ ہے کہ اب تو عام مسلمان تاجر الگ رہے وہ دیندار و پرہیزگار مسلمان تاجر جن کی اعتقادی و عملی زندگی بڑی پاکیزہ اور مثالی ہے اب انہوں نے بھی یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ سود جو حرام ترین چیز اور بدترین سرمایہ ہے اس سے کس طرح نجات حاصل کریں جس کا نتیجہ یہ ہے ان دیندار اور پابند شریعت مسلمانوں اور ایک خالص دیندار مہاجن میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

لہٰذا سود کی ہمہ گیری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان اس عام مجبوری کا سہارا لے کر اتنی بڑی لعنت سے بالکل بے پرواہ ہو کر بیٹھ جائیں اور ان کے دل میں ذرہ برابر کھٹک بھی پیدا نہ ہو کہ وہ کتنی بڑی حرام چیز میں مبتلا ہیں، آج سود کے بارے میں جو تاویلیں کی جاتی ہیں یا اس کو جو نئی شکلیں دی جاتی ہیں یاد رکھئے وہ سب اسی درجے میں حرام ہیں جس درجے میں خود سود کی حرمت ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے تجارتی معاملات کو اس انداز میں استوار کریں جس سے حتی الامکان اس لعنت سے نجات مل سکے، اگر موجودہ معاشی نظام میں اس حد تک تبدیلی ان کے بس میں نہیں ہے کہ جس میں سود کا دخل نہ ہو تو کم سے کم اپنی زندگی اور نجی معاملات ہی کو درست کریں تاکہ سود کی لعنت سے اگر بالکل نجات نہ ملے تو کم از کم اس میں کمی ہی ہو جائے اور مسلمان ہونے کا یہ ادنی تقاضہ تو پورا ہو کہ وہ حتی الامکان حرام سے بچنے کی فکر میں رہے۔

بہرکیف اس باب میں اسی موضوع سے متعلق احادیث ذکر ہوں گی جن کے ضمن میں حسب موقع سود کے احکام و مسائل بیان کئے جائیں گے لیکن یہ ضروری ہے کہ پہلے اس موضوع سے متعلق چند بنیادی باتیں بتا دی جائیں۔

ربا کی تعریف: لغت کے اعتبار سے ربا کے معنی "زیادتی، بڑھوتری بلندی" کے آتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں ایسی زیادتی کو ربا کہتے ہیں جو کسی مالی معاوضہ کے بغیر حاصل ہو۔

ربا اور سود میں فرق: قرآن کریم میں جس چیز کو لفظ "ربا" کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے اس کا ترجمہ اردو میں عام طور پر "سود" کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے عموماً لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ربا اور مروجہ سود، دونوں عربی اور اردو میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یعنی جس چیز کو عربی میں ربا کہتے ہیں اسی کو اردو میں سود کہا جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ "ربا" ایک عام اور وسیع مفہوم کا حامل ہے، جبکہ مروجہ سود ربا کی ایک قسم یا اس کی ایک شاخ ہے۔ کیونکہ مروجہ سود کے معنی ہیں "روپیہ کی ایک متعین مقدار، ایک متعین میعاد کے لئے قرض دے کر متعین شرح کے ساتھ نفع یا زیادتی لینا"۔ بلاشبہ یہ بھی ربا کی تعریف میں داخل ہے مگر صرف اسی ایک صورت یعنی قرض وادھار پر نفع وزیادتی لینے کا نام ربا نہیں ہے بلکہ ربا کا مفہوم اس سے بھی وسیع ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے وحی الٰہی کی روشنی میں ربا کے مفہوم کو وسعت دے کر لین دین اور خرید و فروخت کے معاملات کی بعض ایسی صورتیں بھی بیان فرمائی ہیں جن میں چیزوں کے باہم لین دین یا ان کی باہمی خرید و فروخت میں کمی بیشی کرنا بھی ربا ہے اور ان میں ادھار لین دین کرنا بھی ربا ہے اگرچہ اس ادھار میں اصل مقدار پر کوئی زیادتی نہ ہو بلکہ برابر سرابر لیا دیا جائے۔

ربا کی قسمیں اور ان کے احکام: ربا کے مذکورہ بالا وسیع مفہوم کے مطابق فقہانے ربا کی جو قسمیں مرتب کی ہیں ان میں سے عام طور پر یہ پانچ قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ ① رباء قرض ② رباء رہن ③ رباء شراکت ④ رباء نسیہ ⑤ رباء فضل۔

رباء قرض: کا مطلب ہے "قرض خواہ کا قرض دار سے بحسب شرط، متعینہ میعاد کے بعد اپنے اصل مال پر کچھ زائد مقدار لینا"۔ اس کی مثال مروجہ سود کی صورت ہے یعنی ایک شخص کسی کو اپنے روپیہ کی ایک متعین مقدار ایک متعین میعاد کے لئے اس شرط پر قرض دیتا ہے کہ اتنا روپیہ اس کا ماہوار سود کے حساب سے دینا ہوگا اور اصل روپیہ بدستور باقی رہے گا۔ ربا کی یہ صورت کلیۃً حرام ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

رباء رہن: کا مطلب ہے "بلا کسی مالی معاوضہ کے وہ نفع جو مرتہن کو راہن سے یا شے مرہونہ سے حاصل ہو"۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص (یعنی راہن) اپنی کوئی ملکیت مثلاً زیور یا مکان کسی دوسرے شخص (یعنی مرتہن) کے پاس بطور ضمانت رکھ کر اس سے کچھ روپیہ قرض لے اور وہ مرتہن اس رہن کی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھائے مثلاً اس مکان میں رہے یا اسے کرایہ پر چلائے اور یا یہ کہ اس رہن رکھی ہوئی چیز سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ راہن سے نفع حاصل کرے بایں طور کہ قرض دی ہوئی رقم پر سود حاصل کرے۔ رہن کی یہ دونوں ہی صورتیں حرام ہیں۔

رباء شراکت: کا مطلب ہے "کسی مشترک کاروبار میں ایک شریک اپنے دوسرے شریک کا نفع متعین کردے" اور جملہ نقصانوں اور فائدوں کا خود مستحق بن جائے۔ یہ بھی حرام ہے۔

رباء نسیہ: کا مطلب ہے "دو چیزوں کے باہم لین دین یا دو چیزوں کے باہم خرید و فروخت" میں ادھار کرنا خواہ اس ادھار میں اصل مال پر زیادتی لی جائے۔ مثلاً ایک شخص کسی دوسرے کو ایک من گیہوں دے اور دوسرا شخص اس کے بدلہ میں اسے ایک ہی من گیہوں دے مگر ایک دو دن یا ایک دو ماہ بعد دے۔ یہ اس صورت کی مثال ہے کہ دو چیزوں میں باہم تبادلہ ہوا مگر یہ تبادلہ دست بدست نہیں ہوا بلکہ ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار معاملہ ہوا نیز اس ادھار میں اصل مال پر کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ کمی بیشی کے ساتھ ادھار لین دین کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی دوسرے کو ایک من گیہوں دے گا۔ رباء نسیہ کی یہی وہ صورت ہے جو زمانہ جاہلیت میں بھی رائج تھی اور اب بھی مروجہ سود کی شکل میں موجود ہے اور ایک اعتبار سے یہ "رباء قرض" کی قسم میں بھی داخل ہے۔

ربائے فضل: کا مطلب ہے دو چیزوں میں باہم کمی بیشی کے ساتھ دست بدست لین دین ہو۔ مثلاً ایک شخص کسی کو ایک من گیہوں دے اور اس سے اسی وقت اپنے ایک من گیہوں کے بدلہ میں سوا من گیہوں لے۔ رباء کی یہ دونوں قسمیں یعنی نسیہ اور فضل چونکہ باہم لین دین کی دو بنیادی صورتیں ہیں نیز لاعلمی کی بناء پر عام طور پر لوگ ان میں سود کے پیدا ہونے والے حکم سے نابلد ہیں اس لئے مناسب ہے کہ ان کے احکام بیان کرنے سے پہلے چند باتیں بطور تمہید و قاعدہ بیان کر دی جائیں تاکہ ان احکام کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

❶ لین دین اور تجارت کا معاملہ جن چیزوں سے متعلق ہوتا ہے وہ تین قسم کی ہیں ① یا تو ان کا لین دین وزن سے ہوتا ہے ② یا کسی برتن سے ناپی جاتی ہے ③ یا نہ تو وزن کی جاتی ہیں اور نہ کسی برتن سے ناپی جاتی ہیں۔ پہلی اور دوسری قسم کی مثال غلہ ہے کہ کہیں تو غلہ کو تول کر بیچنے کا دستور ہے اور کہیں برتن میں بھر کر ناپنے کا۔ لین دین اور خرید و فروخت میں جو چیزیں تولی جاتی ہیں ان کو "موزون" کہتے ہیں اور جو چیزیں ناپی جاتی ہیں ان کو "مکیل" کہتے ہیں۔ کسی چیز کے موزون یا مکیل ہونے کی صفت کو اصطلاح فقہ میں "قدر" کہتے ہیں اس مختصر سے لفظ "قدر" کو ذہن میں رکھئے۔

❷ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے، مثلاً گیہوں کا گیہوں ہونا، چاندی کا چاندی ہونا اور کپڑے کا کپڑا ہونا، اسی حقیقت کو "جنس" کہتے ہیں۔ اور اس لفظ "جنس" کو بھی یاد رکھنا چاہئے۔

❸ جن چیزوں کا باہم لین دین ہوتا ہے وہ کبھی تو "قدر" میں متحد اور مشترک ہوتی ہیں اور "جنس" میں مختلف ہوتی ہیں مثلاً گیہوں اور چنا، یہ دونوں چیزیں قدر میں مشترک یعنی یکساں ہیں کیونکہ دونوں موزون ہیں یا مکیل ہیں۔ مگر جنس میں مختلف یعنی یکساں نہیں ہیں کیونکہ ایک کی حقیقت گیہوں ہے اور دوسرے کی حقیقت چنا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جن دو چیزوں میں باہم لین دین ہوتا ہے ان کی جنس تو متحد و یکساں ہوتی ہے مگر قدر میں یکسانیت نہیں ہوتی مثلاً ململ کا ململ سے تبادلہ کہ دونوں کی جنس تو ایک ہے مگر چونکہ دونوں موزوں اور مکیل نہیں (کیونکہ ململ کی خرید و فروخت نہ تو تول کر ہوتی ہے اور نہ کسی برتن سے ناپ کر) اس لئے جب یہ دونوں قدر ہی نہیں تو قدر میں ایک کیسے ہوں گی، یا بکری کا بکری سے تبادلہ کہ دونوں کی جنس تو ایک ہے مگر چونکہ موزوں اور مکیل نہیں اس لئے نہ قدر ہے اور نہ اتحاد قدر اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جن دو چیزوں میں باہم لین دین ہوتا ہے ان کی جنس بھی ایک ہوتی ہے اور قدر میں بھی یکسانیت ہوتی ہے جیسے گیہوں کا گیہوں سے تبادلہ کہ ان دونوں کی جنس بھی ایک ہے اور قدر بھی ایک ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جن دو چیزوں میں باہم لین دین ہوتا ہے ان میں نہ تو جنس کی یکسانیت ہوتی ہے اور نہ قدر کی جیسے روپیہ اور کپڑا یا روپیہ اور غلہ (گویا آج کل لین دین اور تجارت کی جو عام شکل ہے) کہ نہ تو ان کی جنس ایک ہے اور نہ قدر ایک ہے۔ لہٰذا باہم لین دین اور تجارت کی جانے والی چیزیں چار قسم کی ہوئیں۔ ① متحد القدر والجنس (یعنی دونوں کی جنس بھی ایک اور قدر بھی ایک) ② متحد القدر غیر متحد الجنس (یعنی دونوں کی قدر تو ایک مگر جنس الگ الگ) ③ متحد الجنس غیر متحد القدر (یعنی دونوں کی جنس تو ایک مگر قدر الگ الگ) ④ غیر متحد الجنس والقدر (یعنی دونوں کی نہ تو جنس ایک اور نہ قدر ایک)۔

اس تمہید کو جان لینے کے بعد چیزوں کے باہم لین دین اور تجارت کے سلسلے میں وہ قاعدہ کلیہ سمجھ لیجئے جو اگر ذہن میں رہے تو نہ صرف اس باب کے احکام و مسائل سمجھنے میں آسانی ہوگی بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی ربا اور سود جیسے گناہ سے بچنا آسان ہوگا۔ وہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو دو چیزیں متحد القدر والجنس ہوں ان کے باہم تبادلہ و تجارت میں شرعی طور پر دو چیزیں ضروری ہیں ایک تو یہ کہ وہ دونوں چیزیں وزن یا پیمانے میں برابر ہوں دوسرے یہ کہ دونوں دست بدست ہوں مثلاً اگر ہم دو شخص آپس میں گیہوں کو گیہوں سے بدلنا چاہیں تو اس میں کمی بیشی درست نہیں ہے یعنی یہ درست نہیں کہ ہم میں سے ایک تو سیر بھر گیہوں دے اور دوسرا سوا سیر دے بلکہ دونوں ہی کو سیر سیر بھر یا سوا سوا سیر ہی دینا ضروری ہے اور نہ یہ درست ہے کہ ایک تو سر دست لے لے اور دوسرا کل یا پرسوں یا تھوڑی دیر کے بعد، بلکہ ایک ہی مجلس

میں اور ایک ہی وقت میں دونوں کو اپنا اپنا حق لینا واجب ہے اور جو چیزیں متحد القدر غیر متحد الجنس ہوں یا متحد الجنس غیر متحد القدر ہوں ان دونوں کا حکم ایک ہے وہ یہ کہ ان کے باہم لین دین میں کمی بیشی تو جائز ہے مگر ادھار جائز نہیں مثلاً گیہوں کو چنے سے بدلنا چاہیں کہ ان دونوں کی جنس تو الگ الگ ہے مگر قدر ایک ہے اس لئے ان دونوں کے تبادلہ میں کمی بیشی تو جائز ہوگی کہ ایک شخص ایک سیر گیہوں دے اور دوسرا اس کے بدلے میں سوا سیر چنا دے مگر ان کے تبادلہ میں ادھار جائز نہیں ہوگا۔ یا اسی طرح ایک بکری کو دوسری بکری سے بدلنا چاہیں کہ ان دونوں کی جنس تو ایک ہے مگر قدر ایک نہیں کیونکہ قدر تو موزون یا مکیل ہونے کو کہتے ہیں اور بکری نہ مکیل ہے اور نہ موزون، لہٰذا ان میں بھی کمی بیشی جائز ہے کہ ایک شخص تو ایک بکری دے اور دوسرا اس کے بدلے میں دو بکریاں دے مگر ان کے تبادلے میں بھی ادھار جائز نہیں ہوگا۔ اور جو چیزیں نہ متحد الجنس ہوں اور نہ متحد القدر ہوں ان میں کمی بیشی بھی جائز ہے اور نقد و ادھار کا فرق بھی جائز ہے مثلاً روپیہ اور غلہ کی باہم تجارت (جیسا کہ آج کل رائج ہے کہ اشیاء کا لین دین روپیہ کے ذریعہ ہوتا ہے) کہ ان دونوں کی نہ تو جنس ایک ہے اور نہ ان کی قدر ایک ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص روپیہ دے کر غلہ خریدنا چاہے تو اس صورت میں کمی بیشی بھی جائز ہے کہ چاہے تو ایک روپیہ کے بدلے میں ایک سیر غلہ لیا دیا جائے اور چاہے ایک روپیہ کے بدلے میں دو سیر غلہ لیا دیا جائے اس طرح اس صورت میں ادھار لین دین بھی جائز ہے کہ چاہے تو دست بدست لین دین ہو چاہے ادھار کی صورت میں اب اس قاعدہ کلیہ کا حاصل چار قاعدے ہوئے۔

❶ اشیاء متحد القدر و متحد الجنس کے لین دین میں برابری اور دست بدست ہونا واجب ہے۔
❷ اشیاء متحد القدر و غیر متحد الجنس کے لین دین میں نہ برابری واجب ہے اور نہ دست بدست ہونا واجب ہے۔
❸ اشیاء متحد الجنس غیر متحد القدر کے لین دین میں دست بدست ہونا ضروری ہے مگر برابری ضروری نہیں۔
❹ اشیاء متحد القدر غیر متحد الجنس کے لین دین میں دست بدست ہونا ضروری ہے مگر برابری ضروری نہیں۔

ان تمام بنیادی اور تمہیدی باتوں کو ذہن میں رکھ کر اب ربا کی ان دونوں اقسام یعنی نسیہ اور فضل کے احکام کی جانب آیئے جن کا تذکرہ شروع میں کیا گیا تھا چنانچہ اگر لین دین ایسی دو چیزوں کے درمیان ہو جن میں اتحاد جنس بھی پایا جائے اور اتحاد قدر بھی یعنی وہ دونوں متحد الجنس بھی ہوں اور متحد القدر بھی (جیسے گیہوں) تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس لین دین میں ربا نسیہ بھی حرام ہے اور ربا فضل بھی۔ اور یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ "جنس" سے مراد ہے اس چیز کی حقیقت اور قدر سے مراد ہے اس چیز کا مکیل یا موزون ہونا، کیونکہ لین دین اور تجارت کے معاملات میں شرعی معیار ہی کیل ہے یا وزن۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ شارع نے جس چیز کو مکیل (یعنی پیمانہ سے ناپی جانے والی) کہا ہے وہ موزون (یعنی تولی جانے والی) نہیں ہوگی اگرچہ عرف عام اور رواج کے اعتبار سے وہ موزوں ہی ہوں، اسی طرح جس چیز کو موزون کہا ہے وہ مکیل نہیں ہوگی اگرچہ عرف عام اور رواج کے اعتبار سے وہ مکیل ہو، مثلاً گیہوں کو شارع نے ان چیزوں میں شمار کیا ہے جن کا لین دین پیمانہ سے ناپ کر ہوتا ہے اگرچہ آج کل عام طور پر گیہوں کا لین دین وزن کے ذریعے ہوتا ہے (گو بعض علاقوں میں اب بھی اس کا لین دین ناپ کر ہی ہوتا ہے) اس لئے گیہوں کا گیہوں کے ساتھ لین دین کرنا وزن کے ذریعے جائز نہیں ہوگا، اسی طرح چاندی اور سونے کو شارع نے چونکہ موزون کہا ہے اس لئے چاندی کا چاندی کے ساتھ، یا سونے کا سونے کے ساتھ لین دین کیل کے ذریعے جائز نہیں ہوگا، اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ کسی معاملے میں شارع کا واضح حکم، عرف عام اور رواج سے کہیں قوی اور برتر ہوتا ہے۔ ہاں جن چیزوں کو شارع نے نہ مکیل کہا ہے اور نہ موزون، ان کے لین دین میں عرف عام اور رواج ہی کا اعتبار ہوگا۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ حنفیہ میں سے حضرت امام ابویوسفؒ نے مطلق طور پر عرف عام اور رواج ہی کا اعتبار کیا ہے ان کے نزدیک ان چیزوں کا لین دین وزن کے ذریعے جائز ہے جن کو شریعت نے مکیل کہا ہے۔ بشرطیکہ عرف عام اور رواج، ان کے ذریعے ہی اس کے لین دین کا ہو۔ چنانچہ کمالؒ نے حضرت امام ابویوسفؒ ہی کے قول کو ترجیح دی ہے اور اسی بناء پر انہوں نے

نقود مسکوکہ (یعنی سونے اور چاندی کے سکہ مثلاً اشرفی وغیرہ کا گنتی کے ذریعے بطور قرض لین دین یا آٹے کی وزن کے ذریعے خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے، نیز مستند ترین کتاب کافی میں بھی یہی ہے کہ حنفیہ کے ہاں اس بارے میں حضرت امام ابو یوسف ؒ ہی کے قول پر فتویٰ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ شارع نے گیہوں (یا دوسرے غلوں) کو مکیل کہا ہے لیکن ان کا لین دین وزن کے ذریعے بلاشبہ جائز ہے کیونکہ آج کل عام طور پر ان کا لین دین وزن ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔

بہر کیف اتحاد جنس اور اتحاد قدر والی چیزوں کے لین دین کے بارے میں تو معلوم ہو گیا کہ ان میں رباء نسیہ بھی حرام ہے اور رباء فضل بھی۔ اسی طرح اگر لین دین ایسی دو چیزوں کے درمیان ہو جن میں جنس و قدر میں سے کسی ایک کا اتحاد پایا جائے مثلاً وہ متحد الجنس تو ہوں مگر متحد القدر نہ ہوں۔ تو ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ایسی چیزوں کے لین دین میں رباء نسیہ تو حرام ہے مگر رباء فضل حرام نہیں ہے۔ لہٰذا اگر گیہوں کا گیہوں کے ساتھ، یا چنے کا چنے کے ساتھ، یا چونے کا چونے کے ساتھ یا سونے کا سونے کے ساتھ، یا لوہے کا لوہے کے ساتھ لین دین کیا جائے تو اس صورت میں فضل (یعنی کمی بیشی کے ساتھ دست بدست لینا دینا) بھی حرام ہو گا اور نسیہ (یعنی ادھار لینا دینا) بھی حرام ہے۔ اور نسیہ (یعنی ادھار لینا دینا) بھی حرام ہو گا کیونکہ یہاں اتحاد قدر بھی پایا جاتا ہے اور اتحاد جنس بھی اور اگر گیہوں کا چنے کے ساتھ یا سونے کا چاندی کے ساتھ اور لوہے کا تانبے کے ساتھ لین دین کیا جائے تو اس صورت میں فضل (یعنی کمی بیشی کے ساتھ دست بدست لینا دینا) تو حلال ہو گا لیکن نسیہ (یعنی ادھار لینا دینا) حرام ہو گا کیونکہ یہاں صرف اتحاد قدر موجود ہے بایں طور کہ گیہوں اور چنے کا لین دین بھی کیل یا وزن کے ساتھ ہوتا ہے، لوہے اور تانبے کا لین دین بھی وزن کے ساتھ ہوتا ہے اور چاندی کا لین دین بھی وزن کے ساتھ ہوتا ہے لیکن یہاں اتحاد جنس موجود نہیں ہے اور اگر کسی کپڑے کے ایک ٹکڑے کا اس کپڑے کے دوسرے ٹکڑے کے ساتھ یا گھوڑے کا گھوڑے کے ساتھ لین دین کیا جائے تو اس صورت میں بھی فضل حلال ہو گا اور نسیہ حرام ہو گا۔ کیونکہ یہاں اتحاد جنس موجود ہے مگر اتحاد قدر نہیں ہے بایں طور کہ نہ تو کپڑا ہی مکیل یا موزون ہے اور نہ گھوڑا ہی مکیل یا موزون ہے۔ جبکہ معیار شرعی، مکیل یا موزون ہوتا ہے اور گز وغیرہ معیار شرعی نہیں ہے۔

اور اگر لین دین ایسی دو چیزوں کے درمیان ہو جن میں نہ تو اتحاد قدر ہو اور نہ اتحاد جنس تو ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ایسی چیزوں کے لین دین میں فضل بھی حلال ہو گا اور نسیہ بھی، مثلاً اگر گیہوں کا چاندی یا لوہے کے ساتھ لین دین کیا جائے تو اس صورت میں فضل اور نسیہ دونوں جائز ہیں اس لئے کہ یہاں نہ اتحاد جنس ہے اور نہ اتحاد قدر بایں طور کہ گیہوں تو مکیل ہے اور چاندی یا لوہا موزون ہے، اسی طرح لوہے کا سونے کے ساتھ، یا سونے کا لوہے کے ساتھ لین دین کرنے کی صورت میں بھی فضل و نسیہ دونوں جائز ہیں کیونکہ یہاں بھی نہ اتحاد جنس ہے اور نہ اتحاد قدر بایں طور کہ سونا تولنے کے باٹ ترازو کی قسم الگ ہوتی ہے اور لوہا جن باٹ ترازو سے تولا جاتا ہے ان کی علیحدہ قسم ہوتی ہے۔ گیہوں کا چونے کے ساتھ لین دین کرنے کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ ان میں بھی یہی صورت ہے کہ گیہوں کے لین دین کا پیمانہ الگ قسم کا ہوتا ہے اور چونے کے لین دین کا پیمانہ الگ قسم کا ہوتا ہے (لیکن یہ ان علاقوں کی صورت ہے جہاں گیہوں اور چونے کا لین دین وزن کے ساتھ نہیں بلکہ پیمانے کے ذریعے ہوتا ہے)۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

سود لینے دینے والے پر لعنت

(۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدَيْهِ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ۔

(رواہ مسلم)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے سود لینے والے پر، سود دینے والے پر، سودی لین دین کا کاغذ لکھنے والے پر اور اس کے

گواہوں پر، سب ہی پر لعنیت فرمائی ہے، نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سب (اصل گناہ میں) برابر ہیں (اگرچہ مقدار کے اعتبار سے مختلف ہوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: سودی لین دین کا کاغذ لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت اس لئے فرمائی کہ ایک غیر مشروع اور حرام کام میں یہ معاون ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات صراحت کے ساتھ معلوم ہوئی کہ سود و بیاج کا تمسک لکھنا اور اس کا گواہ بننا حرام ہے۔

ہم جنس اشیاء کے باہمی تبادلہ و تجارت میں ربا کی صورت

④ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلاً بِمِثْلٍ سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ فَاِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ اِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبادہؓ ابن صامت کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سونا، سونے کے بدلے اور چاندی، چاندی کے بدلے اور گیہوں، گیہوں کے بدلے اور جو، جو کے بدلے اور نمک، نمک کے بدلے اگر لیا دیا جائے تو ان کا لین دین (مقدار) میں مثل بمثل یعنی برابر سرابر و دست بدست ہونا چاہئے، اگر یہ قسمیں مختلف ہوں (مثلاً گیہوں کا تبادلہ جو کے ساتھ یا جو کا تبادلہ کھجور کے ساتھ ہو) تو پھر اجازت ہے کہ جس طرح چاہو خرید و فروخت کرو (یعنی برابر سرابر ہونا ضروری نہیں ہے) البتہ لین دین کا دست بدست ہونا (اس صورت میں بھی) ضروری ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہی وہ حدیث ہے جس نے ربا کے مفہوم کو وسعت دے کر خرید و فروخت اور لین دین کے بعض معاملات کو ربا اور سود قرار دیا ہے چنانچہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہاں جن چھ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اگر ان کا باہمی تبادلہ یا ان کی باہمی خرید و فروخت کی جائے تو یہ ضروری ہے کہ لین دین برابر سرابر بھی ہو اور دست بدست بھی ہو، برابر سرابر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اپنا گیہوں بطور تبادلہ بیع دے تو اس سے اتنا ہی گیہوں لے جتنا خود دے۔ دست بدست کا مطلب یہ ہے کہ جس مجلس میں معاملہ طے ہو اس مجلس میں دونوں فریق اپنا اپنا حق ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے ہی اپنے قبضے میں لے لیں یہ نہ ہونا چاہئے کہ ایک فریق تو نقد دے اور دوسرا یہ وعدہ کرے کہ میں بعد میں دے دوں گا۔ اگر اس حکم کے برخلاف ہو گا کہ یا لین دین برابر سرابر نہ ہو یا دست بدست نہ ہو تو اس صورت میں وہ معاملہ ربا یعنی سود کے حکم میں داخل ہو جائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث میں جن چھ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے آیا ربا کا حکم انہی چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا یہ چیزیں بطور مثال کے بیان فرمائی گئی ہیں۔ اور دوسری کچھ اشیاء بھی اس حکم میں داخل ہیں اور اگر دوسری اجناس بھی داخل ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے؟

چنانچہ ائمہ مجتہدین کا یہ فیصلہ ہے کہ حدیث میں جن چھ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہیں اور انہوں نے اپنے اجتہاد سے کچھ اور چیزوں مثلاً لوہے، چونے اور دیگر اجناس کو ان چھ چیزوں پر قیاس کیا ہے اور اس سلسلے میں ایک ضابطہ بنانے کے لئے ہر ایک نے اپنے اپنے اجتہاد سے ان چھ چیزوں میں ربا کی علت الگ الگ متعین کی ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک ان چھ چیزوں میں سے سونے اور چاندی میں ربا کی علت تو ثمنیت (یعنی کسی چیز کی قیمت ہونے کی صلاحیت) ہے اور باقی چار چیزوں میں ربا کی علت، قوت مدخر (یعنی محفوظ رہنے والی غذا) ہونا ہے۔ اس اعتبار سے ان چھ چیزوں کے علاوہ بھی جن چیزوں میں ثمنیت پائی جائے گی یا جو چیزیں "قوت مدخر" ہوں گی ان سب میں ربا حرام ہو گا۔ لہٰذا حضرت امام مالکؒ کے مسلک میں ترکاریاں، پھل اور کھانے کی ایسی اشیاء جو (کافی عرصے تک) محفوظ نہ رہ سکتی ہوں وہ چیزیں ہیں جن کے باہمی تبادلہ اور خرید و فروخت میں ربا یعنی کمی بیشی کے ساتھ لینا دینا جائز ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک بھی سونے اور چاندی میں تو ربا کی علت ثمنیت ہے، لیکن باقی چار چیزوں میں ربا کی علت محض قوت (یعنی صرف غذائیت) ہے۔ لہٰذا ان کے مسلک میں ترکاریوں، پھلوں اور ادویات کی چیزوں میں ربا کا حکم جاری ہوگا کہ ان چیزوں کے باہمی تبادلہ میں برابر سرابر لینا دینا تو جائز ہوگا مگر کمی بیشی کے ساتھ لین دین کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اسی طرح حضرت امام شافعیؒ کے ہاں لوہا، تانبا، پیتل، دھلت، چونا اور اسی قسم کی دوسری اشیاء وہ چیزیں ہیں جن کے باہم تبادلہ میں ربا کا حکم جاری نہیں ہوگا مثلاً ایک پیانہ چونے کے بدلے میں دو پیانے چونے کا لینا دینا درست ہے۔ اسی طرح ایک سیر لوہے یا ایک سیر تانبے کے بدلے میں دو سیر لوہا یا دو سیر تانبا لینا دینا جائز ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں اصولی طور پر ربا کی علت "قدر مع الجنس" ہے اس اعتبار سے حنفی مسلک میں سونے اور چاندی میں ربا کی علت چونکہ "وزن" ہے اس لئے ہر اس چیز کے باہمی لین دین میں ربا کا حکم جاری ہوگا جو موزون (یعنی وزن کے ذریعے لی دی جانے والی) ہو جیسے لوہا، تانبا وغیرہ۔ اور باقی چار چیزوں میں ربا کی علت چونکہ "مکیل" ہے اس لئے ہر اس چیز کے باہمی لین دین میں ربا کا حکم جاری ہوگا جو کیلی (یعنی پیمانے کے ذریعے لی دی جانے والی) ہو جیسے چونا وغیرہ۔ اور یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ شریعت نے جس چیز کے مکیل یا موزون ہونے کا حکم صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اس میں تبدیلی روا نہیں ہے مثلاً سونے اور چاندی کو شریعت نے ان چیزوں میں شمار کیا ہے جو وزن کے ذریعے لی دی جاتی ہیں اس لئے یہ دونوں "موزون" کے حکم میں ہیں اگرچہ عام رواج اس کے برخلاف ہو، اسی طرح گیہوں، جو، کھجور اور نمک کو شریعت نے ان چیزوں میں شمار کیا ہے جو کیل یعنی پیمانے کے ذریعے لی دی جاتی ہیں اس لئے یہ چیزیں "مکیل" کے حکم میں ہیں اگرچہ عام رواج اس کے برخلاف ہو۔ لہٰذا سونے یا چاندی کے باہم لین دین کے جائز ہونے میں وزن اور کیل ہی کا اعتبار ہوگا کہ اگر سونے کو سونے کے بدلے یا چاندی کو چاندی کے بدلے لیا دیا جائے تو وزن کا برابر سرابر ہونا ضروری ہے وزن میں کمی بیشی قطعاً جائز نہیں ہوگی۔ اسی طرح باقی چار چیزوں کے باہم لین دین کے جائز ہونے میں کیل کا اعتبار ہوگا کیونکہ اگرچہ عام رواج کے مطابق ان چیزوں کا لین دین وزن کے ذریعے ہوتا ہے لیکن شرعی طور پر یہ چیزیں مکیل ہی کے حکم میں ہوں گی۔ اس لئے اگر کوئی شخص کسی کو ایک من گیہوں کے بدلے میں ایک ہی من گیہوں دے تو یہ لین دین جائز نہ ہوگا تاوقتیکہ دونوں طرف کے گیہوں پیمانے کے اعتبار سے برابر سرابر نہ ہوں (لیکن یہ بات بھی پہلے صاف کی جا چکی ہے کہ حنفیہ میں حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک مطلقاً ہر چیز کے مکیل یا موزون ہونے میں عام رواج کا اعتبار ہے اور حنفیہ کے ہاں اس پر عمل ہے) جو، کھجور اور نمک کا بھی یہی حکم ہے۔ ہاں جس چیز کا موزون یا مکیل ہونا شریعت نے صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے اس کے بارے میں عام رواج ہی کا اعتبار ہوگا کہ اگر وہ چیز عام رواج کے مطابق وزن کے ذریعے لی دی جاتی ہوگی تو وہ شرعی طور پر بھی موزون ہی کے حکم میں ہوگی کہ اس کے باہم لین دین میں وزن کا برابر سرابر ہونا ضروری ہوگا۔ اس لئے لوہا اور تانبا چونکہ عام رواج کے مطابق وزن کے ذریعے لیا دیا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے باہم لین دین میں وزن کا برابر سرابر ہونا ضروری ہے اگر وزن میں کمی بیشی ہوگی تو یہ ربا کے حکم میں داخل ہوگا۔

③ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الذَّھَبُ بِالذَّھَبِ وَالْفِضَّۃُ بِالْفِضَّۃِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِیْرُ بِالشَّعِیْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلاً بِمِثْلٍ یَدًا بِیَدٍ فَمَنْ زَادَ اَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ اَرْبٰی۔ اَلْاٰخِذُ وَالْمُعْطِیْ فِیْہِ سَوَاءٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سونا، سونے کے بدلے اور چاندی، چاندی کے بدلے، اور گیہوں، گیہوں کے بدلے اور جو، جو کے بدلے اور کھجور، کھجور کے بدلے اور نمک، نمک کے بدلے میں اگر دیا جائے تو ان کا لین دین برابر سرابر دست بدست ہونا چاہئے۔ لہٰذا جس نے (ایسا نہیں کیا بلکہ) زیادہ دیا یا زیادہ طلب کیا اور لیا تو گویا اس نے سود لیا اور سود دیا اور لینے دینے والا دونوں اس میں برابر ہیں۔" (مسلم)

سونے یا چاندی کے باہم لین دین کا حکم

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَبِیْعُوا الذَّھَبَ بِالذَّھَبِ اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوْا بَعْضَھَا عَلٰی بَعْضٍ وَلَا تَبِیْعُوا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوْا بَعْضَھَا عَلٰی بَعْضٍ وَلَا تَبِیْعُوْا مِنْھَا غَائِبًا بِنَاجِزٍ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَا تَبِیْعُوا الذَّھَبَ بِالذَّھَبِ وَلَا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ اِلَّا وَزْنًا بِوَزْنٍ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سونے کو سونے کے بدلے میں فروخت نہ کرو الایہ کہ دونوں وزن میں برابر سرابر ہوں لہٰذا دونوں میں کمی بیشی نہ کرو، اسی طرح چاندی کو چاندی کے بدلے میں فروخت نہ کرو الایہ کہ دونوں برابر سرابر ہوں، لہٰذا دونوں میں کمی بیشی نہ کرو نیز ان (سونے اور چاندی) میں سے کسی کا باہم لین دین اس طرح نہ کرو کہ ایک تو نقد دے اور دوسرا ادھار۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص سونے کے زیور کا سونے کے ساتھ، یا چاندی کے زیور کا چاندی کے ساتھ تبادلہ کرے تو اس صورت میں بھی دونوں کا وزن میں برابر سرابر ہونا ضروری ہے۔ زیور کی بنوائی لینی جائز نہیں ہے کیونکہ پھر اس طرح کمی بیشی لازم آئے گی جو سود کے حکم میں ہو جائے گی۔

ہم جنس چیزوں کا تبادلہ برابر سرابر کرو

⑤ وَعَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ کُنْتُ اَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الطَّعَامُ بِالطَّعَامِ مِثْلًا بِمِثْلٍ۔

(رواہ مسلم)

"اور حضرت معمرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کرتا تھا کہ غذا کے بدلے میں (یعنی غلہ کو ہم جنس غلہ کے بدلے میں) اگر لیا دیا جائے تو یہ لین دین برابر سرابر ہونا چاہئے۔" (مسلمؒ)

متحد القدر چیزوں کے باہمی تبادلہ میں ادھار ناجائز ہے

⑥ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلذَّھَبُ بِالذَّھَبِ رِبًا اِلَّا ھَاءَ وَھَاءَ وَالْوَرِقُ بِالْوَرِقِ رِبًا اِلَّا ھَاءَ وَھَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا اِلَّا ھَاءَ وَھَاءَ وَالشَّعِیْرُ بِالشَّعِیْرِ رِبًا اِلَّا ھَاءَ وَھَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رِبًا اِلَّا ھَاءَ وَھَاءَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سونے کا سونے کے ساتھ (برابر سرابر بھی) تبادلہ سود ہے الایہ کہ لین دین دست بدست ہو (یعنی اگر دونوں طرف سے برابر سرابر اور دست بدست لین دین ہو تو پھر سود نہیں ہے)۔ اسی طرح چاندی کا چاندی کے ساتھ تبادلہ سود ہے الایہ کہ لین دین دست بدست ہو، گیہوں کا گیہوں کے ساتھ تبادلہ سود ہے، الایہ کہ لین دین دست بدست ہو، جو کا جو کے ساتھ تبادلہ سود ہے، الایہ کہ لین دین دست بدست ہو، کھجور کا کھجور کے ساتھ تبادلہ سود ہے، الایہ کہ لین دین دست بدست ہو۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ہم جنس چیزوں میں ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تبادلے کے معاملے میں تین صورتیں ہوتی ہیں۔ ① یا تو دونوں طرف موزون ہوں یا مکیل ہوں ② دونوں طرف اشیاء نقد ہوں یا دونوں طرف ادھار ہوں ③ ایک طرف نقد ہو اور دوسری طرف کچھ دنوں کے لئے یا زیادہ دنوں کے لئے ادھار ہو، ان تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت کے مطابق تو لین دین جائز ہوگا بشرطیکہ دونوں طرف مقدار برابر سرابر ہو کہ اگر وہ دونوں چیزیں موزون ہیں تو وزن میں برابر ہوں اور اگر مکیل ہوں تو پیمانہ میں برابر ہوں اور یہ کہ دونوں طرف کی اشیاء نقد ہوں اور بعد کی دونوں صورتوں کے مطابق یعنی دونوں طرف ادھار یا ایک طرف ادھار ہونے کی صورت میں لین دین

کا معاملہ جائز نہیں ہوگا۔ اگرچہ مقدار کے اعتبار سے دونوں ہم جنس چیزیں برابر سرابر ہوں۔

اچھی اور خراب ہم جنس چیزوں کے تبادلہ میں بھی کمی بیشی کے ساتھ لین دین جائز نہیں

(۷) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلٰى خَيْبَرَ فَجَاءَهُ بِتَمْرٍ جَنِيْبٍ فَقَالَ اَكُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هٰكَذَا قَالَ لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هٰذَا بِالصَّاعَيْنِ وَالصَّاعَيْنِ بِالثَّلَاثِ فَقَالَ لَا تَفْعَلْ بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيْبًا وَقَالَ فِی الْمِيْزَانِ مِثْلُ ذَالِكَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

"حضرت ابوسعیدؓ اور ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنا کر بھیجا چنانچہ جب وہ شخص وہاں سے واپس آیا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بہت عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے وہ کھجوریں دیکھ کر اس سے پوچھا کہ کیا خیبر کی سب کھجوریں ایسی ہی اچھی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا کہ نہیں! خدا کی قسم سب کھجوریں ایسی نہیں ہوتیں، بلکہ ہم ایسا کرتے ہیں کہ دو صاع (خراب) کھجوروں کے بدلے میں ایک صاع اچھی کھجوریں اور تین صاع (خراب) کھجوروں کے بدلے دو صاع اچھی کھجوریں لے لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا" ایسا نہ کرو، بلکہ پہلے تمام کھجوروں کو ملا کر درہموں کے عوض فروخت کرو اور پھر ان درہموں کے عوض اچھی کھجوریں خریدو۔" اور پھر فرمایا جو چیزیں ترازو (یعنی وزن) کے ذریعے لی دی جاتی ہیں، ان کا بھی یہی حکم ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کھجور اور ان چیزوں کے بارے میں کہ جو کیل یعنی پیمانے کے ذریعے لی دی جاتی ہیں یہ حکم بیان کیا گیا ہے اسی طرح ان چیزوں کے بارے میں بھی کہ جو وزن کے ذریعے لی دی جاتی ہیں جیسے سونا اور چاندی وغیرہ۔ یہی حکم ہے کہ اگر ان میں سے ایسی دو ہم جنس چیزوں کا باہمی تبادلہ کیا جائے جن میں سے ایک اچھی ہو اور دوسری خراب، تو اس صورت میں بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اچھی چیز کم وزن میں دی جائے اور اس کے بدلے میں خراب چیز زیادہ وزن میں لی جائے، بلکہ اس صورت میں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ پہلے تو خراب چیز کو درہم یا روپیہ کے عوض فروخت کر دیا جائے اور پھر اس درہم یا روپیہ سے اچھی چیز خرید لی جائے۔

(۸) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ جَاءَ بِلَالٌ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَمْرٍ بَرْنِیٍّ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَيْنَ هٰذَا قَالَ عِنْدَنَا تَمْرٌ رَدِیٌّ فَبِعْتُ مِنْهُ صَاعَيْنِ بِصَاعٍ فَقَالَ اَوَّهْ عَيْنُ الرِّبَا لَا تَفْعَلْ وَلٰكِنْ اِذَا اَرَدْتَّ اَنْ تَشْتَرِیَ فَبِعِ التَّمْرَ بِبَيْعٍ اٰخَرَ ثُمَّ اشْتَرِ بِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت بلالؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اچھی قسم کی کھجور لے کر آئے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ "یہ کہاں سے لائے ہو؟" انہوں نے عرض کیا کہ میرے پاس کچھ خراب کھجوریں تھیں، اس میں سے میں نے دو صاع کھجوریں دے کر اس کے بدلے میں ایک صاع یہ (اچھی) کھجوریں لے لی ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا" اوہ! یہ تو بالکل سود ہے، ایسا نہ کرو، البتہ جب تم (اچھی کھجوریں) بدلنا چاہو تو (یہ طریقہ اختیار کرو کہ پہلے) اپنی (خراب) کھجوریں (درہم یا روپے کے عوض) فروخت کر دو پھر ان درہموں یا روپیوں کے ذریعے اچھی کھجوریں خرید لو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

ایک غلام کے بدلے میں دو غلام

(۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَ عَبْدٌ فَبَايَعَ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْهِجْرَةِ وَلَمْ يَشْعُرْ اَنَّهٗ عَبْدٌ فَجَاءَ سَيِّدُهٗ يُرِيْدُهٗ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعْنِيْهِ فَاشْتَرَاهُ بِعَبْدَيْنِ اَسْوَدَيْنِ وَلَمْ يُبَايِعْ اَحَدًا بَعْدَهٗ حَتّٰى يَسْأَلَهٗ اَعَبْدٌ هُوَ اَوْ حُرٌّ۔ (رواہ مسلم)

اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک غلام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ ﷺ سے ہجرت پر بیعت کی (یعنی اس نے آپ ﷺ سے عہد کیا کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر باش رہوں گا)۔ اور آنحضرت ﷺ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ غلام ہے (کچھ دنوں کے بعد) جب اس کا مالک اس کو تلاش کرتا ہوا آیا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "اس غلام کو میرے ہاتھ بیچ دو" چنانچہ آپ ﷺ نے اس غلام کو دو سیاہ رنگ کے غلاموں کے بدلے میں خرید لیا اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے کسی شخص سے بیعت نہ لی جب تک کہ یہ معلوم نہ کر لیا کہ وہ غلام ہے یا آزاد۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک غلام کو دو غلاموں کے بدلے میں لینا دینا جائز ہے، نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جو چیزیں "مال ربا" میں داخل نہیں ان کا لین دین اس طرح کرنا کہ ایک طرف کم ہو اور دوسری طرف زیادہ ہو جائز ہے، چنانچہ شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ علماء نے اسی بنیاد پر یہ مسئلہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک جانور کو دو جانوروں کے بدلے میں دست بدست لینا دینا جائز ہے خواہ دونوں طرف سے ایک ہی جنس کے جانور ہوں یا دو جنس کے۔ البتہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا جانور کا جانور کے بدلے میں ادھار لین دین جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ صحابہؓ میں سے ایک جماعت اس کے عدم جواز کی قائل تھی نیز حضرت عطاء ابن ابی رباح بھی اسی کے قائل تھے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ نے جانور کا جانور کے بدلے میں ادھار لین دین کرنے سے منع فرمایا ہے۔ لیکن بعض صحابہؓ اس کے جواز کے قائل تھے اور حضرت امام شافعیؒ کے مسلک میں بھی یہ جائز ہے۔

ہم جنس چیزوں کا تفاوت کے ساتھ لین دین جائز نہیں

⑩ وَعَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الصُّبْرَةِ مِنَ التَّمْرِ لَا يُعْلَمُ مَكِيْلَتُهَا بِالْكَيْلِ الْمُسَمّٰى مِنَ التَّمْرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے کسی ایسے ڈھیر کو کہ جس کی مقدار معلوم نہ ہو، ایک معین پیمانے کی کھجوروں کے بدلے میں لینے دینے سے منع فرمایا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آپ ﷺ نے لین دین کی اس صورت سے منع فرمایا ہے کہ ایک طرف تو کھجوروں کی غیر معین مقدار کا ڈھیر ہو اور دوسری طرف کھجوروں کی ایک معین مقدار مثلاً دس یا بیس پیمانے (یا دس یا بیس من) ہو کیونکہ ایسی صورت میں اس ڈھیر کی کھجوروں کی مقدار غیر معلوم ہوتی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ ڈھیر دوسری طرف کی معین مقدار سے کم رہ جائے یا اس سے زیادہ ہو جائے اس کی وجہ سے ان دونوں ہی صورتوں میں سود کی شکل ہو جائے گی۔ تاہم یہ ملحوظ رہے کہ لین دین کی یہ صورت باہم تبادلہ کی جانے والی ایسی دو چیزوں کے درمیان ممنوع ہے جو ایک ہی جنس سے ہوں جیسا کہ اوپر کھجور کی مثال دی گئی ہے، ہاں مختلف الجنس چیزوں کے لین دین میں یہ صورت ممنوع نہیں ہے۔ کیونکہ مختلف الجنس چیزوں کا باہمی لین دین کمی بیشی کے ساتھ بھی جائز ہے۔

سونے کی خرید و فروخت کا مسئلہ

⑪ وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ اَبِىْ عُبَيْدٍ قَالَ اشْتَرَيْتُ يَوْمَ خَيْبَرَ قِلَادَةً بِاثْنَىْ عَشَرَ دِيْنَارًا فِيْهَا ذَهَبٌ وَخَرَزٌ فَفَصَّلْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيْهَا اَكْثَرَ مِنِ اثْنَىْ عَشَرَ دِيْنَارًا فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا تُبَاعُ حَتّٰى تُفَصَّلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت فضالہ ابن عبید کہتے ہیں کہ میں نے خیبر کے سال ایک ہار بارہ دینار میں خریدا جو سونے کا تھا اور اس میں نگینے جڑے ہوئے تھے، پھر جب میں نے انہیں الگ الگ کیا (یعنی نگینوں کو سونے سے نکال ڈالا) تو وہ سونا بارہ دینار سے زائد قیمت کا نکلا، میں نے اس کا ذکر

رسول کریم ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (ایسا ہار) اس وقت تک فروخت نہ کیا جائے تاوقتیکہ سونا اور نگینہ الگ الگ نہ کر لئے جائیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اگر مال ربا میں سے دو ایسی ہم جنس چیزوں کا ایک دوسرے کے عوض لین دین کیا جائے کہ ان میں سے ایک طرف کی چیز میں کوئی اور غیر جنس کی چیز بھی شامل ہو تو یہ جائز نہیں ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص مثلاً سونے کا جڑاؤ زیور، سونے کے عوض میں خرید و فروخت کرے، خواہ وہ اشرفیوں کی صورت میں ہو یا کسی اور شکل میں تو لازم ہے کہ پہلے اس زیور میں سے نگینے وغیرہ الگ کر دیئے جائیں اور پھر اس زیور کا خالص سونا دوسری طرف کے سونے کے برابر سرابر وزن کے ساتھ لیا دیا جائے۔ یہی حکم چاندی کے بارے میں بھی ہے کہ اگر چاندی کا کوئی ایسا زیور وغیرہ کہ جس میں کوئی اور غیر جنس چیز مخلوط ہو، چاندی ہی کے بدلے میں خواہ وہ روپے کی صورت میں ہو یا کسی اور شکل میں خرید و فروخت کیا جائے تو ضروری ہے کہ اس زیور وغیرہ کی چاندی کو الگ کر کے دوسری طرف کی چاندی کے برابر سرابر وزن کے ساتھ خریدا جائے یا فروخت کیا جائے اور یہ حکم اس لئے ہے تاکہ ہم جنس چیزوں کا کمی بیشی کے ساتھ باہمی لین دین ہونے کی وجہ سے سود کی صورت پیدا نہ ہو جائے، ہاں اگر سونے کا جڑاؤ زیور وغیرہ چاندی کے بدلے میں خرید و فروخت کیا جائے خواہ وہ چاندی روپے کی صورت میں ہو یا کسی اور شکل میں، یا اس کا برعکس ہو کہ چاندی کا جڑاؤ زیور، سونے کے بدلے میں خرید و فروخت کیا جائے خواہ وہ سونا اشرفی وغیرہ کی صورت میں ہو یا کسی اور شکل میں، تو اس صورت میں اس جڑاؤ زیور سے نگینے وغیرہ اکھاڑ کر الگ کر دینا ضروری نہیں ہے کیونکہ مختلف الجنس چیزوں کا باہمی لین دین کمی بیشی کے ساتھ بھی جائز ہے، اس میں کمی زیادتی سے سود کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

سود کے بارے میں آپ ﷺ کی ایک پیش گوئی

⑫ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیَاْتِیَنَّ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی اَحَدٌ اِلَّا اٰکِلَ الرِّبَا فَاِنْ لَمْ یَاْکُلْهُ اَصَابَهٗ مِنْ بُخَارِهٖ وَیُرْوٰی مِنْ غُبَارِهٖ۔ (رواه احمد وابوداؤد والنسائی وابن ماجة)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب سود کھانے والوں کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں رہے گا اور اگر کوئی شخص ایسا باقی بھی رہے گا۔ تو وہ سود کے بخار میں مبتلا ہو گا۔ نیز (بعض کتابوں میں لفظ من بخارہ کی بجائے) من غبارہ (یعنی وہ سود کے غبار میں مبتلا ہو گا) نقل کیا گیا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "بخار" یا "غبار" سے مراد سود کا اثر ہے، مطلب یہ ہے کہ سود کے عام ابتلاء کے زمانے میں اگر کوئی شخص براہ راست سود کے لین دین سے بچ بھی جائے گا تو وہ کسی نہ کسی صورت میں سود کے زیر اثر ضرور ہو گا۔ مثلاً وہ کسی سود خور کا ملازم و وکیل ہو گا، یا تمسک لکھنے والا ہو گا۔ یا کسی سودی معاملے کا گواہ ہو گا یا سودی کاروبار کے درمیان رابطہ پیدا کرنے والا ہو گا، یا اس کے اپنے دوسرے ذاتی و تجارتی معاملات سود خواروں کے ساتھ استوار ہوں گے اس طرح ایسا شخص بھی بالواسطہ طور پر سود کے مال سے اپنے مال کو ملوث کرے گا یا یہ کہ جب سود کا دائرہ وسیع ہو کر تجارت و معیشت کے ہر گوشہ پر حاوی ہو گا (جیسا کہ آج کل ہے) تو پھر سود کا مال ہر شخص تک کسی نہ کسی حیثیت میں ضرور پہنچے گا۔ مثال کے طور پر اپنے ہی زمانے کو لے لیجئے، آپ ایک متقی شخص کو دیکھتے ہیں جو اتنا دیندار اور اتنا پرہیز گار ہے کہ اس کی اعتقادی و عملی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جہاں ذرا سا بھی جھول نظر آئے اور واقعۃً اس شخص کی پاکبازی و پرہیز گاری ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر جب وہی شخص اپنے بچوں کے لئے ایک آنے کی مونگ پھلی خرید کر لاتا ہے تو کیا وہ شخص بھی اس کا تصور کرتا ہے کہ میں جو یہ ایک کمتر سی چیز اپنے بچوں کو کھلا رہا ہوں یا خود کھا رہا ہوں نہ معلوم یہ کتنے سودی ذرائع اور کتنے سودی لین دین کے مراحل سے گذر کر

میرے ہاتھوں تک پہنچی ہے؟ حدیث کا یہی مفہوم ہے کہ آنے والے زمانہ میں سود کی لعنت اتنی ہمہ گیر اور وسیع ہوگی کہ ہر شخص شعوری و غیر شعوری طور پر اس میں مبتلا ہوگا کوئی بلاواسطہ سود کھائے گا کوئی بالواسطہ اس کا مرتکب ہوگا اور کوئی بالکل ہی غیر شعوری طور پر اس کے زیر اثر ہوگا۔

مختلف الجنس چیزوں کے دست بدست باہمی لین دین میں کمی بیشی جائز ہے

⑬ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَبِيْعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ وَلَا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ وَلَا الْبُرَّ بِالْبُرِّ وَلَا الشَّعِيْرَ بِالشَّعِيْرِ وَلَا التَّمْرَ بِالتَّمْرِ وَلَا الْمِلْحَ بِالْمِلْحِ اِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ عَيْنًا بِعَيْنٍ يَدًا بِيَدٍ وَلٰكِنْ بِيْعُوا الذَّهَبَ بِالْوَرِقِ وَالْوَرِقَ بِالذَّهَبِ وَالْبُرَّ بِالشَّعِيْرِ وَالشَّعِيْرَ بِالْبُرِّ وَالتَّمْرَ بِالْمِلْحِ وَالْمِلْحَ بِالتَّمْرِ يَدًا بِيَدٍ كَيْفَ شِئْتُمْ۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت عبادہؓ ابن صامت کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "نہ تو سونا، سونے کے بدلے میں بیچو، نہ چاندی، چاندی کے بدلے میں، نہ گیہوں، گیہوں کے بدلے میں، نہ جو، جو کے بدلے میں، نہ کھجور، کھجور کے بدلے میں اور نہ نمک، نمک کے بدلے میں، ہاں برابر سرابر، نقد بہ نقد یعنی دست بدست لین دین جائز ہے چنانچہ سونا، چاندی کے بدلے میں اور چاندی، سونے کے بدلے میں گیہوں، جو کے بدلے میں، اور جو گیہوں کے بدلے میں، اور کھجور، نمک کے بدلے میں اور نمک، کھجور کے بدلے میں دست بدست جس طرح چاہو خرید و فروخت کرو۔" (نسائی)

تشریح: حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایسی دو چیزوں کا آپس میں لین دین کرو جو ہم جنس ہوں (جیسے گیہوں، گیہوں کے بدلے میں تو اس صورت میں برابر سرابر اور دست بدست ہونا ضروری ہے اور اگر ایسی دو چیزوں کا آپس میں لین دین کیا جائے جو ہم جنس نہ ہوں بلکہ الگ الگ جنس کی ہوں (جیسے گیہوں، جو کے بدلے میں) تو اس صورت میں صرف دست بدست ہونا ضروری ہے برابر سرابر ہونا ضروری نہیں ہے۔

خشک اور تازہ پھلوں کے باہمی لین دین کا مسئلہ

⑭ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ شِرَاءِ التَّمْرِ بِالرُّطَبِ فَقَالَ اَيَنْقُصُ الرُّطَبُ اِذَا يَبِسَ فَقَالَ نَعَمْ فَنَهَاهُ عَنْ ذٰلِكَ۔ (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول کریم ﷺ سے جب تازی کھجور کے بدلے میں (خشک) کھجور خریدنے کا مسئلہ پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کیا تازہ کھجور خشک ہونے کے بعد کم ہو جاتی ہے۔ عرض کیا گیا کہ "جی ہاں! چنانچہ آپ ﷺ نے اس طرح لین دین سے منع فرمایا۔" (مالکؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: آپ ﷺ نے خشک اور تازہ کھجوروں کے باہم لین دین سے اس لئے منع فرمایا کہ اس صورت میں برابر سرابر ہونے کی شرط فوت ہو جائے گی جس کی وجہ سے وہ سودی معاملہ ہو جائے گا، چنانچہ حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمدؒ اور دیگر اکثر علماء کے علاوہ حنفیہ میں سے حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ نے بھی اس حدیث پر عمل کیا ہے، جبکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ہم جنس خشک اور تازہ پھلوں کے باہمی لین دین کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ دونوں طرف کے پھل مقدار یا وزن میں برابر سرابر ہوں، انہوں نے اس حدیث کو نسیہ کی صورت پر محمول کیا ہے یعنی امام اعظمؒ کے نزدیک حدیث میں مذکورہ ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے جبکہ ایک فریق تو نقد دے اور دوسرا فریق بعد میں دینے کا وعدہ کرے چنانچہ مذکورہ بالا حدیث سے امام اعظمؒ نے جو مراد اختیار کی ہے اس کی تائید

ایک اور روایت سے ہوتی ہے جو یہ ہے کہ "آنحضرت ﷺ نے تازہ کھجور کے بدلے میں خشک کھجور کا لین دین ادھار کی صورت میں ممنوع قرار دیا ہے، نیز اس مسئلہ میں جو حکم خشک و تازہ کھجوروں کا ہے وہی حکم دیگر پھلوں مثلاً انگور وغیرہ کا بھی ہے، نیز خشک و تازہ گوشت کا معاملہ بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

گوشت اور جانور کے باہمی تبادلہ کا مسئلہ

⑮ وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ مُرْسَلاً اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ بَيْعِ اللَّحْمِ بِالْحَيْوَانِ قَالَ سَعِيْدٌ كَانَ مِنْ مَيْسِرِ اَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ۔ (رواه فی شرح السنۃ)

"اور حضرت سعیدؒ ابن مسیب بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جانور کے بدلے میں گوشت کا لین دین کرنے سے منع فرمایا ہے۔ نیز حضرت سعدؓ کا بیان ہے کہ جانور کے بدلے میں گوشت کا لین دین زمانہ جاہلیت کے جوئے کی قسم سے تھا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "زمانہ جاہلیت کے جوئے کی قسم" سے مراد یہ ہے کہ جس طرح جوئے کی صورت میں غلط ذرائع سے لوگوں کا مال کھایا جاتا ہے اسی طرح اس میں بھی ایسی ہی صورت پیدا ہو جاتی ہے اگرچہ طریقہ کے اعتبار سے دونوں صورتیں مختلف ہیں کیونکہ اس میں جوا کھیلا جاتا ہے اور اس میں لین دین کا ایک معاملہ کیا جاتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جانور کے عوض گوشت کے لین دین کا معاملہ حرام ہے۔ خواہ گوشت اس جانور کی جنس کا ہو یا کسی دوسری جنس کے جانور کا ہو نیز چاہے وہ جانور کھایا جاتا ہو چاہے نہ کھایا جاتا ہو جبکہ حضرت امام اعظمؒ ابوحنیفہ کے ہاں یہ معاملہ جائز ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ اس معاملے میں ایک موزون چیز (یعنی گوشت کہ اس کا لین دین وزن کے ذریعے ہوتا ہے) کا تبادلہ ایک غیر موزون چیز (یعنی جانور کا اس کا لین دین وزن کے ذریعے نہیں ہوتا) کے ساتھ کیا جاتا ہے جس میں دونوں طرف کی چیزوں کا برابر سرابر ہونا ضروری نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ لین دین اور خرید و فروخت کی یہ صورت جائز ہے ہاں اس صورت میں چونکہ لین دین کا دست بدست ہونا ضروری ہے اس لئے حدیث میں مذکورہ بالا ممانعت کا تعلق دراصل گوشت اور جانور کے باہم لین دین کی اس صورت سے ہے جبکہ لین دین دست بدست نہ ہو بلکہ ایک طرف تو نقد ہو اور دوسری طرف وعدہ یعنی ادھار ہو۔

دو جانوروں کا باہمی تبادلہ ادھار کی صورت میں ناجائز ہے

⑯ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الْحَيْوَانِ بِالْحَيْوَانِ نَسِيْئَةً۔

(رواه الترمذی والبوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت سمرہؓ ابن جندب کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جانور کا جانور کے بدلے میں ادھار لین دین کرنے سے منع فرمایا ہے۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

غیر مثلی چیز کے قرض لینے کا مسئلہ

⑰ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَهٗ اَنْ يُّجَهِّزَ جَيْشًا فَنَفِدَتِ الْاِبِلُ فَاَمَرَهٗ اَنْ يَّاْخُذَ عَلٰى قَلَائِصِ الصَّدَقَةِ فَكَانَ يَاْخُذُ الْبَعِيْرَ بِالْبَعِيْرَيْنِ اِلٰى اِبِلِ الصَّدَقَةِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص کے بارے میں مروی ہے کہ (ایک غزوہ کے موقع پر) نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ لشکر کا سامان درست کرلو (یعنی لشکر میں شامل ہونے کے لئے سواری اور ہتھیار وغیرہ تیار رکھو) چنانچہ جب اونٹوں کی کمی ہوئی (یعنی جتنے اونٹ تھے وہ اکثر لوگوں میں تقسیم ہو گئے اور کچھ لوگ کہ جن میں حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص بھی شامل تھے اونٹ حاصل نہ کر سکے) تو

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ کو حکم دیا کہ "وہ زکوٰۃ کے اونٹ کے بدلے میں اونٹ (قرض) لے لیں" چنانچہ حضرت عبداللہ زکوٰۃ کے اونٹ آنے تک (کے وعدے پر) دو اونٹ کے عوض ایک اونٹ لے لیا کرتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حدیث کا مطلب سمجھنے سے پہلے قرض کے سلسلے میں یہ ایک بنیادی بات جان لیجئے کہ صرف اسی چیز کا قرض لینا درست ہے جو اپنی مثل رکھتی ہو بایں معنی کہ اسی طرح کی چیز قرض خواہ کو واپس کی جا سکتی ہو جیسے اناج، انڈا، گوشت اور روپیہ وغیرہ، ایسی چیز کو "مثلی" کہا جاتا ہے اور جو چیز ایسی ہو کہ اسی طرح کی چیز قرض خواہ کو واپس کرنا مشکل ہو تو اس کا قرض درست نہیں ہے جیسے پھل اور جانور وغیرہ، ایسی چیز کو "غیر مثلی" کہتے ہیں۔

اب حدیث کی طرف آیئے، حضرت عبداللہؓ کو آنحضرت ﷺ کے اس حکم کہ "وہ زکوٰۃ کے اونٹ کے بدلے میں اونٹ لے لیں" کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی شخص سے اس شرط پر بطور قرض اونٹ لے لیں کہ جب زکوٰۃ میں حاصل ہونے والے اونٹ آجائیں گے تو وہ اس کا قرض ادا کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک چونکہ "غیر مثلی چیز کا قرض لینا جائز نہیں ہے اور اونٹ بھی "غیر مثلی" ہے اس لئے اس حدیث کے بارے میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کو یہ حکم اس وقت دیا تھا جبکہ غیر مثلی چیز کا قرض لینا بھی جائز تھا مگر بعد میں غیر مثلی چیز کے قرض لینے کا جواز چونکہ ختم کر دیا گیا تھا اس لئے یہ حدیث گویا منسوخ ہے۔

لیکن شیخ عبدالحقؒ نے اس حدیث کے حکم کو بیع پر محمول کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جانور کا جانور کے بدلے میں ادھار لین دین جائز ہے جبکہ ہمارے (یعنی حنفی) علماء نے حضرت سمرہؓ کی حدیث (جو اس سے پہلے گذری ہے) کے مطابق اس کو ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ تورپشتیؒ نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہؓ ابن عمرو کی یہ روایت ضعیف ہے جبکہ حضرت سمرہؓ کی روایت اس سے کہیں زیادہ قوی ہے اس لئے حنفیہ نے حضرت سمرہؓ کی حدیث پر عمل کیا ہے، یا پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حکم اس وقت دیا تھا جبکہ دو ہم جنس چیزوں کا باہمی ادھار لین دین ربا کی قسم میں داخل نہیں تھا، لیکن جب لین دین کی یہ صورت "ربا" قرار پائی تو اس حدیث کا یہ حکم بھی منسوخ قرار پا گیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ادھار لین دین میں سود کا مسئلہ

(۱۸) عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الرِّبَا فِي النَّسِيْئَةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ لَا رِبَا فِيْمَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت اسامہؓ ابن زید کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ادھار لین دین میں سود ہو جاتا ہے" ایک اور روایت میں یوں ہے کہ "اس لین دین میں سود نہیں ہوتا جو دست بدست ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ادھار لین دین میں سود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سود کی صورت ایسے معاملے میں پیدا ہوتی ہے جس میں دو ہم قدر چیزوں کا باہمی تبادلہ ادھار کی شکل میں ہو کہ ایک فریق تو نقد دے اور دوسرا بعد میں دینے کا وعدہ کرے اگرچہ دونوں چیزوں کی جنسیں مختلف ہوں اور برابر سرابر ہوں مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو جو دے کر اس سے گیہوں لے تو اس لین دین میں کمی بھی جائز ہے بشرطیکہ دست بدست لین دین ہو۔ اگر کسی ایک طرف سے بھی ادھار ہو گا تو پھر یہ معاملہ جائز نہ ہو گا اور سود کی صورت ہو جائے گی اسی طرح "اس لین دین میں سود نہیں ہوتا جو دست بدست ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایسی دو چیزوں کا باہمی تبادلہ کیا جائے جو ایک جنس کی ہوں اور برابر سرابر ہوں، نیز دونوں فریق اپنی اپنی چیز اسی مجلس میں اپنے اپنے قبضے میں کر لیں تو یہ جائز ہو گا اور سود کی صورت نہیں ہو گی اور اگر دونوں چیزیں ایک جنس کی ہوں

تو پھر کمی بیشی کے ساتھ لین دین میں بھی یہ معاملہ جائز ہوگا۔ اور سود کی صورت نہیں ہوگی بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔

سود کھانے پر وعید

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ حَنْظَلَةَ غَسِيْلِ الْمَلَائِكَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِرْهَمُ رِبًا يَاكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَيَعْلَمُ اَشَدُّمِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِيْنَ زِنْيَةً رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالدَّارَ قُطْنِيُّ وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَزَادَ وَقَالَ مَنْ نَبَتَ لَحْمُهُ مِنَ السُّحْتِ فَالنَّارُ اَوْلٰى بِهٖ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن حنظلہ غسیل ملائکہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سود کا ایک درہم، یہ جاننے کے باوجود کھانا کہ یہ سود ہے، چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے" (احمدؒ، دار قطنیؒ) اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے، نیز بیہقیؒ نے اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ کے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جس شخص کا گوشت حرام مال سے پیدا ہوا ہو (یعنی جس شخص کی جسمانی نشو و نما حرام مال مثلاً سود و رشوت وغیرہ سے ہوئی ہو) وہ شخص دوزخ ہی کے لائق ہے۔"

تشریح: جس طرح مذکورہ بالا وعید اس شخص کے بارے میں فرمائی گئی ہے جو سود کا مال یہ جاننے کے باوجود کھائے کہ یہ مال سودی ذریعے سے حاصل شدہ ہے اسی طرح اس وعید کا تعلق اس شخص سے بھی ہے جس نے لاعلمی میں سود کا مال کھایا بشرطیکہ اس لاعلمی میں خود اس کی اپنی کوتاہی یا لاپرواہی کا دخل ہو۔

علماء کہتے ہیں کہ سود کھانے کے گناہ کو زنا کے گناہ سے بھی زیادہ سخت اور بڑا گناہ اس لئے کہا گیا ہے کہ سود کھانے والے کے حق میں اللہ تعالیٰ نے جتنی سخت اور غضب ناک تنبیہ فرمائی ہے اتنی سخت اور غضب ناک تنبیہ، زنا کیا کسی بھی گناہ کے بارے میں نہیں فرمائی ہے چنانچہ سود کھانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں متنبہ کیا ہے۔

فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (البقرہ ۲:۲۷۹)

"اعلان جنگ سن لو، اللہ اور اس کے رسول کا۔"

یہ بات ہر ذی شعور شخص جانتا ہے کہ کسی کے خلاف "اعلان جنگ" کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کا رسول جس شخص کے خلاف اعلان جنگ کرے یا جو شخص اللہ اور اسکے رسول سے برسر جنگ ہو، اس کی محرومی، شقاوت، بدبختی اور دنیا و آخرت کی مکمل تباہی و بربادی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

علماء یہ بھی لکھتے ہیں کہ سود کھانے والے کے حق میں اتنی سخت وعید اور اتنی شدید و غضب ناک تنبیہ کا سبب یہ ہے کہ سود کے بارے میں عملی طور پر ہی گمراہی کا صدور نہیں ہوتا بلکہ سود کی پہچان مشکل ہونے کی وجہ سے عموماً اعتقادی گمراہی میں بھی لوگ مبتلا ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگ سود کو حرام بھی نہیں سمجھتے بلکہ ان کے ذہن و فکر اور قلب و دماغ پر گمراہی و کجروی کی اتنی ظلمت چھائی ہوئی ہے کہ وہ سود کو حلال سمجھتے ہیں اور یہ معلوم ہی ہے کہ سود کی حرمت کا اعتقاد رکھتے ہوئے اس کا مرتکب ہونا عملی گمراہی یعنی گناہ کبیرہ ہے جس پر معافی بھی ممکن ہے مگر سود کی حرمت کا اعتقاد نہ رکھنا بلکہ اس کو حلال سمجھنا اعتقادی گمراہی و کجروی ہے جس کا آخری نتیجہ کفر ہے، اور اس کی معافی و بخشش ناممکن ہے۔ جبکہ زنا ایک فعل ہے جس کی حرمت و برائی سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا، جو شخص اس فعل میں مبتلا ہوتا ہے وہ بھی اس کی برائی کا بہر صورت اعتقاد رکھتا ہے یہاں تک کہ اسلام ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب و فرقے میں "زنا" ایک برائی ہی تصور کی جاتی ہے کوئی بھی اسے جائز اور حلال نہیں سمجھتا۔

اب رہی یہ بات کہ چھتیس کا عدد بطور خاص کیوں ذکر کیا گیا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ اس کا مقصد محض سود کی حرمت کی اہمیت جتانا ہے، یا

اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔

⑳ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا اَیْسَرُهَا اَنْ یَّنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سود کے گناہ کے ستر درجے ہیں، اور ان میں جو سب سے ادنی درجہ ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنی ماں سے صحبت کرے۔"

㉑ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرِّبَا وَاِنْ كَثُرَ فَاِنَّ عَاقِبَتَهٗ تَصِیْرُ اِلٰی قُلٍّ رَوَاهُمَا ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَرَوٰی اَحْمَدُ الْاٰخِیْرَ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سود (سے حاصل شدہ مال) خواہ کتنا ہی زیادہ ہو مگر آخر کار اس میں کمی (یعنی بے برکتی) آجاتی ہے" ان دونوں روایتوں کو ابن ماجہؒ نے اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے نیز دوسری روایت کو امام احمدؒ نے بھی نقل کیا ہے۔"

تشریح: سودی ذرائع سے حاصل ہونے والا مال بظاہر تو بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے مگر چونکہ سودی مال میں خیر و برکت کا کوئی جز نہیں ہوتا اس لئے انجام کار وہ مال اس طرح تباہ و برباد اور ختم ہو جاتا ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا، یہ محض ایک وعیدی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو روزانہ نظروں کے سامنے آتی رہتی ہے، چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے بھی ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ۔ (البقرہ ۲:۲۷۶)

"اللہ تعالیٰ سود کو مٹادیتا ہے اور صدقات کو بڑھادیتا ہے۔"

اس آیت کا مطلب یہی ہے کہ انسان جو مال سود کے ذریعے حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے نیست و نابود کر دیتا ہے۔ مگر انسان اپنی جائز محنت و حلال ذریعہ سے جو مال کما کر اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ بڑھادیتا ہے۔ گویا اس آیت میں سود اور صدقہ کو ایک ساتھ ذکر کر کے جہاں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ان دونوں کی حقیقت میں تضاد ہے وہیں ان دونوں کے متضاد نتائج کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، چنانچہ ان دونوں کی حقیقت میں تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں بغیر کسی معاوضے اور بغیر کسی لالچ کے انسان اپنا مال محض خدا کی خوشنودی کے لئے دوسروں کو دیتا ہے جبکہ سود میں بغیر کسی معاوضہ کے انسان محض مال و زر کی ہوس اور دولت کی فراوانی کے جذبے کے تحت دوسرے سے مال حاصل کرتا ہے، اس طرح دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض بالکل جدا جدا ہوتی ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کے لئے اپنے مال کو ختم کرنے یا کم کرنے کا فیصلہ کر کے ایک زبردست ایثار کرتا ہے اور سود لینے والا محض دنیاوی حرص و طمع کی بناء پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے غصہ و ناراضگی سے بالکل بے پرواہ ہو کر اپنے موجودہ مال میں ناجائز زیادتی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہ تو سود اور صدقہ کی حقیقت کا تضاد تھا۔ دونوں کے نتائج کا تضاد یہ ہے کہ جو مال اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر ناجائز طریقے یعنی سود سے حاصل کیا جاتا ہے اسے اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے یا اس میں سے برکت اٹھالیتا ہے اس کے برخلاف جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضامندی و خوشنودی کی خاطر اپنا مال دوسروں کو دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے مال کو بڑھادیتا ہے بایں طور کہ اس کے موجودہ مال میں خیر و برکت عطا فرماتا ہے۔

اس آیت کے ضمن میں دونوں کے نتائج میں تضاد کا مطلب مفسرین نے اس انداز میں بیان کیا ہے کہ "سود کو مٹانے اور صدقہ کو بڑھانے کا تعلق آخرت سے ہے، یعنی سود خوار کو اس کا مال آخرت میں کچھ بھی نفع نہیں پہنچائے گا بلکہ عذاب ہی کا موجب بنے گا۔ جبکہ صدقہ کرنے والے کا مال آخرت میں اس کے لئے ابدی سعادتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا"۔ پھر سود کا مٹایا جانا اور صدقہ کا بڑھایا جا

آخرت سے تو تعلق رکھتا ہی ہے۔ مگر اس کے کچھ آثار دنیا ہی میں مشاہدہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سود، جس مال میں شامل ہو جاتا ہے بعض اوقات وہ مال اس طرح تباہ و برباد ہو جاتا ہے کہ اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا، جیسا کہ سود اور سٹہ کے بازاروں میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصانات کے احتمال ضرور ہیں اور اسی وجہ سے بعض مرتبہ بے سود کی تجارت کرنے والوں کو بھی کسی تجارت میں نقصان ہو جاتا ہے، لیکن ایسا تاجر جو کل کروڑ پتی تھا اور آج ایک ایک پیسہ کی بھیک کا محتاج ہے۔ یہ صرف سود اور سٹہ کے بازاروں ہی میں نظر آتا ہے۔

بہر کیف، جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے سودی مال کا وقتی طور پر بڑھنا اور آخر میں تباہ و برباد ہو جانا، محض ایک شرعی وعید کے درجے کی بات نہیں ہے بلکہ اہل تجربہ کے بیانات بھی اس پر شاہد ہیں کہ سود کا مال فوری اور وقتی طور پر کتنا ہی بڑھ جائے لیکن وہ عموماً ایسا دیرپا نہیں ہوتا کہ اس کا فائدہ نسلوں تک پہنچے، اکثر ایسی کوئی نہ کوئی صورت پیش آجاتی ہے جو سودی مال کو ختم یا کم کر دیتی ہے۔

سود خوروں کی ظاہری خوشحالی سے دھوکہ نہ کھائیے: آج کل سود کا کاروبار عام ہے، چپہ چپہ پر سود خوروں کا لین دین جاری ہے۔ ان کے یہاں ظاہری طور پر مال و دولت کی ریل پیل نظر آتی ہے، اسباب عیش و عشرت کی فراوانی ہر طرف رقصاں دیکھی جاتی ہے۔ اسی لئے عام سطح میں لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ آج کل تو سود خواروں کو بڑی سے بڑی راحت حاصل ہے۔ وہ کوٹھیوں، بنگلوں اور عالیشان عمارتوں کے مالک ہیں، نوکر چاکر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں، اس لئے یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ سود خواروں کو دنیا میں بھی راحت حاصل نہیں ہوتی اور ان کا مال و زر ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ حالانکہ غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح نظر آئے گی کہ سامان راحت اور راحت میں بڑا فرق ہے۔ سامان راحت تو آپ کارخانوں اور فیکٹریوں اور بازاروں سے حاصل کر سکتے ہیں وہ سونے چاندی اور سکوں کے عوض مل سکتا ہے لیکن جس چیز کا نام راحت ہے وہ نہ کسی فیکٹری میں بنتی ہے اور نہ کسی بازار سے دستیاب ہوتی ہے بلکہ وہ ایک ایسے روحانی اطمینان اور قلب و دماغ کے ایک ایسے سکون کا نام ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی صورت میں براہ راست انسان کو عطا ہوتا ہے جو بعض اوقات بالکل بے سرو سامان انسان اور جانوروں تک کو میسر آجاتا ہے۔ اور بعض اوقات ہزاروں اسباب عیش و عشرت اور سامان راحت رکھنے کے باوجود حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک نیند کو لے لیجئے، یہ نیند کیا ہے؟ ایک راحت و سکون کا نام ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے آپ یہ تو کر سکتے ہیں کہ ایک اعلیٰ قسم کی خواب گاہ بنوالیں جس میں ہوا، روشنی کا پورا انتظام ہو، عمدہ قسم کے اور آرام دہ پلنگ ہوں، دلفریب و دلکش گدیلے بستر اور ملائم تکیے ہوں لیکن آپ خود بتائیے کیا ان سامانوں کے مہیا ہو جانے پر نیند کا آجانا لازمی ہے؟ اگر آپ کو خود اس کا تجربہ نہیں ہے تو وہ ہزاروں آدمی اس کا جواب نفی میں دیں گے جنہیں کسی عارضے کی وجہ سے نیند نہیں آتی ان کے لئے یہ سامان دھرے رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ خواب آور دوائیاں بھی جواب دے دیتی ہیں، چنانچہ نیند کے سامان تو بازار سے آگئے لیکن نیند کسی بازار سے کسی بھی قیمت پر نہیں لائی جاسکتی۔ اسی طرح دوسری لذتوں اور راحتوں کا حال ہے۔ ان کے اسباب تو روپیہ پیسہ کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں مگر ان راحتوں اور لذتوں کا حاصل ہونا ان اسباب کے باوجود بھی ضروری نہیں ہے، یہ بات سمجھ لینے کے بعد سود خواروں کے حالات کا جائزہ لیجئے، تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر راحت اور اطمینان کا نام نہ پائیں گے۔ وہ اپنی حرص و ہوس میں اپنی تجوریوں کو بھرنے اور اپنے ایک کروڑ کو ڈیڑھ کروڑ دو کروڑ بنانے میں ایسے مست نظر آتے ہیں کہ نہ ان کو اپنے کھانے پینے کا ہوش رہتا ہے نہ اپنی بیوی بچوں کا خیال، ایمانداری سے بتائیے کیا اطمینان و راحت اسی طرح حاصل ہوتا ہے، صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک مال و دولت کو بڑھانے کی ادھیڑ بن میں اپنے آپ کو فنا کر دینے کا نام راحت ہے؟ کتنے بے وقوف ہیں وہ لوگ جنہوں نے اسباب راحت کا نام راحت رکھ لیا ہے اور جو حقیقی راحت ہے اس سے کوسوں دور ہیں۔

سود خوروں کو حقیقی عزت حاصل نہیں ہوتی: ایک دنیادار انسان مال و دولت کے انبار اسی لئے جمع کرتا ہے کہ اسے دنیا کا اطمینان و سکون اور راحت حاصل ہو اور وہ سماج و معاشرہ میں عزت و وقار کی زندگی بسر کر سکے لیکن سود خوروں کی راحت کا حال تو معلوم ہوا کہ ان

کے ہاں ظاہری طور پر مال و دولت کی فراوانی، اور عیش و عشرت اور راحت و آرام کے تمام تر اسباب کی موجودگی کے باوجود ان بد نصیبوں کو حقیقی راحت و اطمینان کی دولت نصیب نہیں ہوتی۔ اور سکون قلب و دماغ جیسی اعلیٰ نعمت میں مسلسل مبتلا رہنے کی وجہ سے طبعی طور پر بھی بے رحم اور سنگ دل بن جاتا ہے اور اس کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ مصیبت زدہ اور افلاس کے مارے، لوگوں کی مصیبت و مفلسی سے اور کم مایہ انسانوں کی کم مائیگی سے فائدہ اٹھائے اور ان کا خون چوس کر اپنے بدن کو سیم و زر سے پالے، اس مقصد کے لئے وہ بھوک سے بلکتے معصوم بچوں کے ہاتھ سے سوکھی روٹی کا ٹکڑا چھیننے اور افلاس زدہ کی ستائی ہوئی باحیا عورت کے جسم پر لپٹے ہوئے کپڑے کا آخری چیتھڑا اتار لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا، اس شقاوت اور سنگ دلی کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں سود خوار کی عزت و وقار کے لئے کوئی گوشہ ہو۔ آپ اپنی آبادی کے کسی بھی بڑے سے بڑے سود خوار پر نظر ڈالئے۔ اس کی تجوریاں سونے چاندی اور روپیوں کے کتنے ہی بڑے ذخیروں سے بھری پڑی ہوں۔ اس کے گھر میں مال و دولت کے کتنے ہی خزانے محفوظ ہوں۔ لیکن کیا لوگوں کی نظروں میں اس کی ادنیٰ بھی وقعت ہوتی ہے بے کس و مجبور لوگ بھلے ہی اپنی ضرورت و احتیاج کی بناء پر اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں مگر ان کے دلوں میں بھی اس کے لئے عزت و احترام کا کوئی ادنیٰ سا جذبہ نہیں ہوتا۔ معاشرہ میں اس کی حیثیت اس درندے کے برابر نہیں ہوتی جو اپنے پنجوں سے انسانوں کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے نوچ کر انہیں ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل کر دیتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے ہر طبقہ میں اس انسانی شرف و احترام سے بھی محروم رہتا ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے عزت و وقار کا پیکر بنا کر پیش کرتا ہے۔

آج کی بین الاقوامی بے چینی اور اقتصادی بدحالی سود خوروں ہی کی مسلط کی ہوئی ہے: بات جب چل نکلی ہے تو پھر سود خواری کے ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈال لیجئے، بڑی مصیبت یہ ہے کہ سائنسی ارتقاء اور مادی عروج نے انسان کو "جی لینے کا سلیقہ" کیا بخشا کہ سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ تک بدل گئے، آج کا انسانی ذہن علم و دانش کی فراوانی اور فہم و فراست کی پختگی کے دعوے کے باوجود غور و فکر کے ایک مخصوص نہج سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے، آج کی دنیا نے انسان کے گرد خالص مادی سانچے میں ڈھلے ذہن جدید کے مصنوعی نظریات کا جو حصار کھینچ دیا ہے اس نے سوجھ بوجھ کی تمام صلاحیتوں کو سیم و زر کے ایک خالص ماحول میں مقید کر دیا ہے اور احساسات فکر و نظر کو حقیقی اچھائی اور برائی کی قوت امتیاز سے محروم کر کے صرف دنیا کے وقتی اور ظاہری فائدوں اور تن آسانیوں کا اسیر بنا دیا ہے۔ اسی لئے آج ہمیشہ کی تسلیم شدہ صداقتیں قابل انکار ہوگئی ہیں اور ہزاروں سال پرانے اٹل اور حقیقی نظریات قابل شکست و ریخت سمجھے جانے لگے ہیں۔

اسلام کی یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ سود حرام ہے ہر فرد کے لئے ہر طبقہ کے لئے ہر زمانہ کے لئے اور ہر حالت میں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اگرچہ بظاہر پڑھے لکھے ہیں لیکن عہد حاضر کے مصنوعی افکار و نظریات نے انہیں دین و شریعت کے حقیقی راستے سے دور کر رکھا ہے اور ان کے ذہن و فکر پر موجودہ دور کی مخصوص چھاپ نے انہیں "جہالت" کی وادیوں میں بھٹکا رکھا ہے ان کے نزدیک نہ صرف حرمت سود جیسی مسلمہ حقیقت آج کے زمانہ میں ایک ناقابل عمل چیز ہے بلکہ مادی خوشحالی اور تجارتی کامیابیوں کی راہ میں ایک رکاوٹ بھی ہے ان کے نقطہ نظر سے آج کا معاشی نظام جو سود کی جکڑ بندیوں میں محصور ہے صرف ایک فرد ایک قوم ملک ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اقتصادی استحکام اور بنی نوع انسان کی معاشی خوشحالی کا ضامن ہے وہ بڑے بڑے سرمایہ دار ملک جنہوں نے سود کی شکل میں غریب قوموں اور ترقی پذیر ملکوں کی اقتصادیات و معاشیات کی روح کھینچ کر ان کو دنیا کا دریوزہ گر بنا دیا ہے ان دیوانوں کی نظر میں بنی نوع انسان کی معاشی فلاح و بہبود اور ان کے اقتصادی اطمینان کے واحد سہارے ہیں یہ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ سرمایہ دار طاقتوں نے غریب ملکوں اور اقتصادی بدحالی کی شکار قوموں کے لئے اپنے خزانوں کے جو منہ کھول رکھے ہیں وہ در حقیقت عالمی بھائی چارگی اور بین الاقوامی اقتصادی خوشحالی کے تئیں ان کے حقیقی جذبات ایثار و ہمدردی کا مظہر ہیں۔ حالانکہ اگر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ یہ سب کچھ اسی ہوس و عیاری کا ترقی یافتہ راستہ ہے جس پر چل کر پہلے تو ایک

انسان نے دوسرے انسان کا خون چوسا ہے اور اب اسی راستہ پر گامزن ایک قوم اور ایک ملک دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں کا خون چوس رہے ہیں بس فرق اتنا ہی ہے کہ پہلے ایک طبقہ سود کی اقتصادی تباہ کاری کا شکار ہوا کرتا تھا اور وہ اسے محسوس بھی کرتا تھا لیکن آج پورے پورے ملک اور پوری پوری قومیں سود کی اقتصادی تباہ کاری کا غیر محسوس طور پر شکار ہو کر اپنے باوقار وجود کو سود خواروں کے پاس رہن رکھ چکی ہیں۔ جن دانشوروں کی نظر دنیا کے ان اقتصادی منصوبوں پر ہے جن کے تحت سرمایہ دار ممالک پسماندہ قوموں اور ترقی پذیر ملکوں کو ہر سال اربوں ڈالر کے امدادی قرض دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ممالک کس طرح سود کی شکل میں ان غریب ملکوں کی اقتصادی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر اپنے ملک کے خزانے بھر رہے ہیں۔ اس حقیقت سے کون باخبر اور باہوش انسان انکار کر سکتا ہے کہ ان سود خور ملکوں کی سود خوری نے دنیا کے ان تمام غریب ملکوں کے اقتصادی نظام میں جو شومی قسمت سے اپنے وسائل اور اپنے دست و بازو کی قوت محنت پر بھروسہ نہ کر کے سرمایہ دار ملکوں کے جال فریب میں پھنس گئے ہیں، غربت و افلاس اور مالی بدحالی کا ایسا زہر گھول دیا ہے کہ ان کا تمام تر معاشی ڈھانچہ اپنی جگہ چھوڑ چکا ہے اور اقتصادی موت کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اس صورت حال نے دنیا کے امن و سکون کو بھی متزلزل کر کے رکھ دیا ہے آج آپ کو کتنے ہی ایسے ملک نظر آئیں گے جو ان کی سیاسی اور ملکی پالیسیوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں کہ ان کی اقتصادی زندگی کا تمام دارومدار انہیں سود خوروں کے امدادی اور سودی قرضوں پر ہے ان مسائل کا حل چونکہ ان کی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کے خلاف ہے اس لئے وہ ان کو دنیا پر اس طرح معلق کئے ہوئے ہیں کہ آج ان کی وجہ سے قوموں کی قومیں اور ملک کے ملک اپنی داخلی بے چینیوں بے اطمینانیوں اور مایوسیوں کا شکار ہو کر موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آج پوری دنیا پر سیاسی بے اطمینانی اور اقتصادی بے چینی کا جو مہیب بادل چھایا ہوا ہے وہ دراصل سود خوروں کا مسلط کیا ہوا ہے جس سے کوندنے والی برق کسی بھی لمحہ بنی نوع انسان کے پورے وجود کو بھسم کر سکتی ہے۔

سود کے بارے میں ایک شبہ اور اس کا جواب: بعض پڑھے لکھے لوگ اس شبہ میں بھی مبتلا ہیں کہ قرآن کریم نے جس ربا کو حرام قرار دیا ہے وہ ایک خاص قسم کا ربا تھا جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا کہ کوئی غریب مصیبت زدہ شخص اپنی مصیبت دور کرنے کے لئے کسی سے قرض لے لیتا تھا اور قرض خواہ اس پر ایک متعین نفع (سود) لیا کرتا تھا یہ بے شک ایک سنگدلی کی بات تھی کہ کوئی شخص کسی کی مصیبت میں اس کی مدد کرنے کی بجائے الٹا اس کی مصیبت سے فائدہ اٹھائے قرآن نے سود کی اس صورت کو حرام قرار دیا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس حرمت کا اطلاق آج کے زمانہ میں بھی سود کی اس صورت پر ہو سکتا ہے جو مہاجنوں اور دوسرے سود خوروں کے ہاں شخصی اور انفرادی طور پر رائج ہے۔ کہ کوئی ضرورت مند و غریب اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے (خواہ کوئی چیز رہن و گروی رکھ کر یا اور کسی اعتماد پر) ان سے قرض لیتا ہے اور اس پر حسب شرط و تعیین سود ادا کرتا ہے لیکن آج کل تجارتوں، بینکوں، کمپنیوں اور اجتماعی اداروں کے ذریعہ جو سودی کاروبار ہوتا ہے اس کی صورت بالکل مختلف ہے جس کی وجہ سے اب سود دینے والے مصیبت زدہ لوگ نہیں رہے بلکہ متمول اور سرمایہ دار تجار ہیں جو غریبوں سے سود لینے کی بجائے خود ان کو دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں غریبوں کا ہی فائدہ ہے کہ بہت سے قلیل سرمایہ والے لوگ مذکورہ بالا ذرائع سے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ لہٰذا موجودہ دور کے تجارتی سود پر حرمت کا اطلاق نہیں ہونا چاہئے۔

اس کے جواب کے سلسلہ میں پہلے تو ایک بنیادی بات یہ جان لینی چاہئے کہ شریعت کے کسی بھی حکم کا تعلق اصول اور کلیہ سے ہوتا ہے جزئیات اور اقسام کے اختلاف سے اس حکم کے نفاذ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ شریعت نے جس چیز کو اصولی طور پر حرام قرار دیا ہے وہ چیز اپنے تمام اجزاء اور اپنی تمام اقسام کے ساتھ حرام ہوگی۔ یہ حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں اس چیز کے کسی جز یا کسی قسم کو محض اپنے خیال سے مستثنیٰ کر دے یا اس حکم کے اطلاق کو بلا کسی شرعی دلیل کے مقید و محدود کر سکے اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ اس حرمت کا تعلق اس شراب سے ہے جو پہلے زمانہ میں خراب قسم کے برتنوں میں سڑا کر بنائی جاتی تھی۔ اب تو چونکہ صفائی ستھرائی کا بڑا

اہتمام ہے مشینوں کے ذریعہ سب کام ہوتا ہے اعلیٰ درجہ کی شرابیں بنتی ہیں لہٰذا موجودہ دور کی شراب پر حرمت کا اطلاق نہیں ہونا چاہئے تو ظاہر ہے کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اسلامی شریعت کا ذرا سا بھی علم نہ رکھتا ہو یا اسلامی شریعت کے مزاج سے قطعاً ناواقف ہو۔ اس کے علاوہ اس پر بھی غور کیجئے کہ اس طرح احکام قرآن کو اپنے خیالات کے تابع کرنے کا دروازہ کھل جائے تو پھر کس چیز کی حرمت باقی رہ جائے گی قمار جوا چوری ڈاکہ زنا فواحش ان میں سے کون سی برائی ایسی ہے جس کی موجودہ صورت پہلے زمانہ کی صورت سے مختلف نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ان سبھی برائیوں کو جائز کہنا پڑے گا۔ لہٰذا جب محض چولہ بدلنے سے کسی شخص کی حقیقت نہیں بدلا کرتی تو کوئی بھی برائی خواہ وہ کتنی صورت اختیار کرے اس کا حکم بھی کسی حال میں نہیں بدلے گا۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد اب ربا کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا۔ قرآن کریم میں ربا کی مخالفت کا ذکر ایک جگہ نہیں، مختلف سورتوں کی کئی آیتوں میں آیا ہے اور چالیس سے زائد احادیث میں مختلف عنوان سے اس کی حرمت بیان کی گئی ہے ان میں سے کسی ایک جگہ کسی ایک لفظ میں بھی یہ اشارہ نہیں ہے کہ حرمت کا یہ حکم کسی خاص صورت یا کسی خاص مصلحت کے پیش نظر ہے۔ حرمت ربا کی کسی بھی آیت یا کسی بھی حدیث سے یہ اشارہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ یہ حرمت صرف اس ربا کی ہے جو شخصی اغراض کے لئے لیا دیا جاتا تھا تجارتی سود اس سے مستثنیٰ ہے بلکہ اگر اس مسئلہ پر تاریخی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرے سے یہ خیال ہی غلط ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں سود کی صرف یہی صورت رائج تھی کہ کوئی مصیبت زدہ شخص یا غریب آدمی اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے سود پر قرض کا معاملہ کرتا تھا، اور تجارتی معاملات کے لئے سود پر روپیہ لینے دینے کا رواج نہیں تھا بلکہ آیات ربا کا شان نزول دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمت ربا کا جب نزول ہوا ہے تو اس وقت شخصی اغراض کے لئے سودی لین دین کے علاوہ تجارتی معاملات کے لئے بھی سود کا لین دین رائج تھا کیونکہ عرب اور بالخصوص قریش تجارت پیشہ لوگ تھے جو تجارتی اغراض ہی کے لئے سود کا لین دین کرتے تھے چنانچہ حضرت عباسؓ اور حضرت خالدؓ ابن ولید کے بارہ میں امام بغویؒ نے لکھا ہے کہ یہ دونوں شرکت میں کاروبار کرتے تھے اور ان کا لین دین طائف کے بنو ثقیف کے ساتھ تھا حضرت عباسؓ کی ایک بڑی رقم سود کے طور پر بنو ثقیف کے ذمہ واجب الادا تھی انہوں نے بنو ثقیف سے اپنی سابقہ رقم کا مطالبہ کیا تو آنحضرت ﷺ نے قرآن کے اس حکم کے تحت کہ ربا حرام قرار دے دیا گیا ہے، اپنے چچا حضرت عباسؓ کو سود کی اپنی اتنی بڑی رقم چھوڑ دینے کا حکم دے دیا جس کا اعلان آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں بھی یوں فرمایا کہ۔

وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ وَأَوَّلُ رِبًا أَضَعُ مِنْ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ۔

"زمانہ جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا ہے اور سب سے پہلا سود جسے میں اپنے سودوں میں سے چھوڑتا ہوں عباسؓ ابن عبد المطلب کا سود ہے"

اس کے علاوہ اور بہت سے ایسے واقعات منقول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ کا دوسرے قبیلہ کے ساتھ اور ایک خاندان کے ساتھ سودی لین دین تھا پھر اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ جن قبائل یا خاندان کے باہمی سودی لین دین کا ذکر منقول ہے وہ کسی فوری ضرورت یا مصیبت کے تحت قرض لینے کی حیثیت سے نہیں تھا بلکہ اس انداز سے تھا کہ ان کے درمیان یہ لین دین کاروباری اور تجارتی حیثیت سے مسلسل جاری تھا جیسے ایک تاجر دوسرے تاجر سے یا ایک کمپنی دوسری کمپنی سے معاملہ کیا کرتی ہے، بلکہ سودی کاروبار کرنے والے لوگ "ربا" کو بھی ایک قسم کی تجارت ہی سمجھا کرتے تھے جس کی تردید قرآن کو کرنی پڑی اور خرید و فروخت کے معاملات کو سود ہی کی ایک قسم سمجھنے والوں کے لئے سخت تہدید و وعید نازل ہوئی۔

اب رہی یہ بات کہ بینکوں کے سودی کاروبار سے غریب عوام کا نفع ہے کہ انہیں اپنی رقموں پر کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ تو یاد رکھئے کہ یہی وہ حسین فریب ہے جس کی بنیاد پر یورپین اقوام نے سود جیسی بدی اور ہمیشہ کی مسلم لعنت کو کاروبار کا ایک خوب صورت جامہ پہنایا اور عوام نے اس فریب میں مبتلا ہو کر سود کے چند ٹکوں کے لالچ میں اپنی پونجی کو بینکوں کے حوالہ کر دیا اس طرح پوری قوم کا سرمایہ سمٹ کر بینکوں میں آگیا، اور ادھر اس سرمایہ کو بڑے بڑے تاجروں اور بیوپاریوں نے بینکوں سے بطور قرض لیکر اپنے کاروبار کو وسعت دی

اور اس سے جو عظیم الشان نفع حاصل ہوا اس میں سے چند ٹکے بینکوں کو دے کر باقی سب اپنی تجوریوں میں بھر لیا بینک والوں نے ان ٹکوں میں سے کچھ حصہ پوری قوم کے ان لوگوں کو بانٹ دیا جنہوں نے اپنی پونجی بینک کے حوالہ کی تھی اس طرح سرمایہ دار نے تو اپنے دس ہزار روپیہ سے ایک لاکھ روپیہ کما لیا اور بے چارے غریبوں کے حصہ میں کیا آیا؟ صرف چند ٹکے اب بتائیے کہ ان بینکوں سے بھی اصل فائدہ کسے حاصل ہوا سرمایہ دار کو یا غریب کو؟ فریب خوردہ غریب تو اس متوقع فائدہ سے بھی محروم رہا جو وہ اپنی پونجی کو بینک کے حوالے کر دینے کی بجائے کسی چھوٹی موٹی تجارت میں لگا دینے سے حاصل کرتا اسے تو اتنی بھی سہولت نہ ملی کہ وہ بینک سے کوئی بڑی رقم قرض لے کر کاروبار کر سکتا کیونکہ بینک تو کسی غریب کو پیسہ دینے سے رہا، وہ تو بڑے بڑے سرمایہ داروں اور ساکھ والوں کو قرض دیتا ہے لیکن اس کے برخلاف سرمایہ دار نے بینک سے کیا فائدہ حاصل کیا؟ اس نے بینک سے بڑی بڑی رقمیں قرض کے نام پر لیں ان رقموں سے تجارت وصنعت کی بڑی بڑی منڈیوں پر اپنا اجارہ، جمایا اور ہر قسم کے کاروبار پر قابض ہو گیا۔ کسی کم سرمایہ والے کو مقابلہ و مسابقت (competition) کے ذریعہ تجارت کے کسی میدان میں جمنے نہیں دیا۔ اور انجام کار تجارت کا کاروبار جو پوری قوم کے لئے فائدہ مند اور ترقی کا ذریعہ تھا چند مخصوص لوگوں میں محدود ہو کر رہ گیا۔ اور پھر آخر میں جا کر اس سودی کاروبار کی تان غریبوں ہی پر اس طرح ٹوٹی کہ جب تجارت کے اڈوں پر مخصوص سرمایہ دار ناگ بن کر بیٹھ گئے تو اشیاء کے نرخ بھی ان کے رحم و کرم پر رہ گئے۔ جس کا نتیجہ وہ ہے جو آج ہر جگہ سامنے آ رہا ہے کہ سامان معیشت میں روز بروز گرانی بڑھتی ہی جا رہی ہے اور اشیاء کی قیمتیں اس طرح چڑھ رہی ہیں کہ حکومتوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود قابو میں نہیں آ رہی ہیں۔ اور انجام کار فریب خوردہ عوام کو سود کے نام پر جو چند ٹکے ملے تھے ان کے نتیجہ میں سامان معیشت دوگنی تگنی قیمتوں تک پہنچا تو ان غریبوں کی جیب سے سود کے وہ چند ٹکے کچھ اور سود لے کر نکل گئے اور پھر لوٹ پھر کر انہیں سرمایہ داروں کی جیب میں پہنچ گئے لہٰذا بینکوں اور تجارتی اداروں کے سودی کاروبار کے اس فریب کا پردہ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سودی کاروبار کا عام نتیجہ کسی بھی طرح غریبوں کے حق میں مفید نہیں ہوتا بلکہ یہ درحقیقت پوری قوم کی غربت و افلاس اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں بے پناہ اضافہ کا ذریعہ ہے اور یہی وہ معاشی بے اعتدالی اور اقتصادی تباہ کاری ہے۔ جو پوری قوم اور پورے ملک کی تباہی کا سبب بنتی ہے اس لئے اسلام نے سود کے ہر طریقہ اور ہر ذریعہ پر قدغن لگائی ہے خواہ وہ انفرادی و شخصی اغراض کے لئے قرض لینے کی صورت میں ہو یا اجتماعی تجارت اور بینکوں کے کاروبار کی شکل میں کیونکہ دونوں ہی صورتوں میں غریب کا خون سود خواروں کی غذا بنتا ہے۔

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَيْتُ لَيْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ عَلٰی قَوْمٍ بُطُوْنُهُمْ كَالْبُيُوْتِ فِيْهَا الْحَيَّاتُ تُرٰی مِنْ خَارِجِ بُطُوْنِهِمْ فَقُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرِيْلُ قَالَ هٰؤُلَاءِ اَكَلَةُ الرِّبَا۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا معراج کی رات میرا گذر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کے پیٹ گھروں مکانوں کی مانند (بڑے بڑے) تھے اور ان کے پیٹوں میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو پیٹوں کے باہر سے بھی نظر آ رہے تھے، میں نے انہیں دیکھ کر بڑی حیرت کے ساتھ جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ جبرئیل (علیہ السلام)! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ سود خور ہیں۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ)

سود خور پر آپ ﷺ کی لعنت

(۲۳) وَعَنْ عَلِیٍّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اٰكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَمَانِعَ الصَّدَقَةِ وَكَانَ يَنْهٰی

عَنِ النَّوْحِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے سنا رسول کریم ﷺ سود لینے والے سود دینے والے سود کا تمسک لکھنے والے، سود کا حساب کتاب لکھنے والے، اور صدقہ سے منع کرنے والے پر لعنت فرماتے تھے، نیز آپ ﷺ نوحہ کرنے سے منع فرماتے تھے۔" (نسائیؒ)

تشریح: صدقہ سے منع کرنے والے سے مراد یا تو وہ شخص ہے جو کسی دوسرے کو صدقہ و خیرات کرنے سے منع کرے اور روکے چنانچہ آپ ﷺ نے ایسے شخص پر لعنت فرمائی ہے یا پھر اس سے وہ شخص مراد ہے جو واجب صدقہ یعنی زکوٰۃ وغیرہ ادا نہ کرتا ہو۔

کسی مردہ شخص کے اوصاف بیان کرکے اور چلا چلا کر رونا "نوحہ" کہلاتا ہے چونکہ یہ ایک انتہائی نازیبا اور خلاف وقار و دانش فعل ہے اس لئے شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔

ربا کی تشریح کے متعلق حضرت عمرؓ کا ارشاد

(۲۴) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اِنَّ اٰخِرَ مَانَزَلَتْ اٰيَةُ الرِّبٰوا وَاَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا فَدَعُوا الرِّبٰوا وَالرِّيْبَةَ۔ (رواہ ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جو چیز نازل ہوئی ہے یعنی قرآن کریم اس کا معاملات سے متعلق جو حصہ سب سے آخر میں نازل ہوا ہے وہ ربا کی آیت ہے چنانچہ رسول کریم ﷺ اس دنیا سے اس حالت میں تشریف لے گئے کہ آپ ﷺ نے اس کی تفصیل بیان نہیں فرمائی لہٰذا سود کو بھی چھوڑ دو اور جس چیز میں سود کا شک و شبہ ہو اسے بھی چھوڑ دو۔" (ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: یہ بات ابتداء میں بتائی جا چکی ہے کہ سود کی مروجہ شکل یعنی قرض و ادھار پر متعین نفع لینا اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں بھی رائج تھی اور لوگوں میں اس طرح کے سود کا بہت زیادہ رواج تھا چنانچہ قرآن کریم نے جب ربا کی حرمت بیان کی اور آیت ربا نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے حرمت کے اس حکم کو نہ صرف اس وقت کے رائج و متعارف سود پر نافذ کیا بلکہ ربا کے مفہوم کو وسعت دیکر اشیاء کے باہمی لین دین اور خرید و فروخت کی بعض صورتوں کو بھی ربا کے حکم میں داخل فرمایا جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں ذکر کی جا چکی ہے لیکن صورت یہ ہوئی کہ آیت ربا نازل ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ اس دنیا میں بہت کم عرصہ تشریف فرما رہے اس تھوڑی مدت میں دیگر دینی و ضروری مصروفیات میں اتنا انہماک رہا کہ آپ ﷺ نے لین دین کی ان صورتوں کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپ واصل بحق ہوگئے چنانچہ حضرت فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد میں تفصیل سے مراد انہیں صورتوں کی تشریح و تفصیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جن چھ چیزوں (سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور، نمک) کے باہمی لین دین کی بعض صورتوں کو ربا کے حکم میں داخل فرمایا تھا۔ آیا یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا یہ چیزیں بطور مثال کے بیان فرمائیں اور بقیہ چیزوں کو قیاس و اجتہاد پر موقوف رکھا؟ یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے ائمہ مجتہدین امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ امام مالکؒ امام احمدؒ ابن حنبل نے اپنے اپنے اجتہاد سے ان چیزوں کا ایک ضابطہ بنایا اور دوسری چیزوں کو بھی اس ضابطہ کے ماتحت اس حکم میں داخل قرار دیا، اس کی تفصیل بھی گذشتہ صفحات میں ذکر کی جا چکی ہے۔

حاصل یہ کہ نزول قرآن سے سود کا ایک مخصوص معاملہ یعنی قرض دے کر اس پر نفع لینا عربی زبان میں لفظ "ربا" کے ساتھ متعارف چلا آرہا تھا اور پورے عرب میں اس کا رواج تھا چنانچہ اہل عرب صرف اسی خاص معاملہ کو "ربا" کہتے اور سمجھتے تھے اسی "ربا" کو قرآن کریم نے حرام فرمایا۔ لہٰذا "ربا" کی اس صورت میں نہ کوئی ابہام تھا نہ اجمال اور اسی لئے جب قرآن کریم نے "ربا" کی حرمت کا ذکر کیا تو نہ کسی کو اس کے سمجھنے میں دقت ہوئی اور نہ کسی کو اس پر عمل کرنے میں ایک منٹ کا بھی تامل و تردد ہوا۔ البتہ جب رسول ﷺ نے

باشارات وحی الٰہی "ربا" کے مفہوم میں اور چند معاملات کا اضافہ فرمایا تو چونکہ وہ معاملات اہل عرب کے متعارف مفہوم سے الگ اور ان کے مروجہ سود سے ایک زائد چیز تھی اور پھر اتفاق کی بات کہ آنحضرت ﷺ ربا کے اس وسیع مفہوم کی تفصیلات پوری تشریح کے ساتھ بیان فرمانے سے پہلے اس دنیا سے تشریف لے گئے، اسی لئے اس کی تشریحات میں حضرت فاروق اعظمؓ کو کچھ اشکالات پیش آئے بالآخر انہوں نے اپنے اجتہاد سے احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہوئے فرمایا کہ ربا کی جو صورتیں بالکل واضح اور متعین ہیں جیسے مروجہ سود یا اشیاء کے باہمی لین دین کی وہ صورتیں جو آنحضرت ﷺ نے بیان فرمادی ہیں ان کو بھی ترک کردو اور ان سے مکمل اجتناب کرو اور جس چیز میں سود کا شبہ اور شائبہ بھی محسوس ہو جائے ازراہ ورع و احتیاط اسے بھی چھوڑ دو اور اس سے پرہیز کرو۔

ایک شبہ اور غلط فہمی: سود کے بارے میں بعض لوگوں نے حضرت فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد کو آڑ بنالیا جو سود کی اس خاص قسم کے بارہ میں تھا جس کا مروجہ سود کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں یعنی چھ چیزوں کا باہمی بیع و شراء اور لین دین ان لوگوں نے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ "ربا" کی حقیقت ہی مبہم رہ گئی تھی۔ اس کے متعلق علماء اور فقہاء نے جو کچھ لکھا ہے وہ صرف ان کا اپنے اجتہاد تھا۔ لیکن جیسا کہ ابھی اوپر بتایا گیا حضرت فاروق اعظمؓ کو ربا کی صرف اس قسم کے بارہ میں تردد پیش آیا جو قرآن کے الفاظ سے ثابت نہیں تھا بلکہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اس کی حرمت کو بیان فرمایا تھا اور وہ چھ چیزوں کی آپس میں خرید و فروخت کا معاملہ تھا جو سود آج کل رائج ہے اور جو ایام جاہلیت میں بھی عام تھا۔ اس سے حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کو دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے، جب کہ زمانہ جاہلیت ہی سے اس کے معاملات رائج اور جاری تھے۔ پھر اس ارشاد کہ ان چھ چیزوں کے سود کے بارہ میں حضرت عمرؓ کو جو اشکال پیش آیا وہ بھی اس بات میں نہیں تھا کہ انہیں ان چھ چیزوں کے لین دین میں سود کو حرام سمجھنے میں تردد تھا بلکہ اشکال صرف یہ تھا کہ یہ حکم شاید ان چھ چیزوں (یعنی سونا، چاندی اور گیہوں وغیرہ) تک ہی محدود نہ ہو۔ بلکہ اس کے حکم کا دائرہ ان چھ چیزوں کے علاوہ دیگر اشیاء تک بھی وسیع ہو۔ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ لوگ یہ خیال کر کے کہ آنحضرت ﷺ نے صرف چھ چیزوں کے بارے میں یہ حکم فرمایا ہے دیگر اشیاء کے لین دین میں وہی صورتیں اختیار کر کے سود میں مبتلا ہو جائیں جنہیں آپ ﷺ نے چھ چیزوں کے لئے واضح طور پر ربا کہا ہے اس تردد کے پیش نظر آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ سود کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کو بھی قطعاً چھوڑ دو جن میں سود کا شائبہ تک نہ پایا جائے لہٰذا یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اشکال کا نتیجہ تو یہ ظاہر فرمایا کہ منصوص چیزوں میں بھی ایسے معاملات سے پرہیز کیا جائے جن میں سود کا شبہ بھی پایا جائے اور ان لوگوں نے حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کا تعلق اس سود کی اس مخصوص قسم سے منقطع کر کے عام سود و ربا کے معاملات سے جوڑ دیا اور پھر اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ مزید ستم یہ کیا کہ محض اپنی نافہمی کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے ارشاد کی روشنی میں سرے سے سود کی حرمت ہی کو ایک مشتبہ مسئلہ قرار دے دیا۔

قرض خواہ، قرض دار کا کوئی تحفہ بھی قبول نہ کرے

(۲۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَقْرَضَ اَحَدُكُمْ قَرْضًا فَاَهْدٰى اِلَيْهِ اَوْحَمَلَهٗ عَلَى الدَّابَّةِ فَلَا يَرْكَبْهُ وَلَا يَقْبَلْهَا اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ جَرٰى بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ قَبْلَ ذَالِكَ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو قرض دے اور پھر قرض لینے والا اس قرض دینے والے کے پاس کوئی تحفہ بھیجے یا سواری کے لئے کوئی جانور دے تو وہ قرض دینے والا نہ اس جانور پر سوار ہو اور نہ اس کا تحفہ قبول کرے ہاں اگر قرض دینے والے اور قرض لینے والے دونوں کے درمیان پہلے سے تحفہ یا سواری کے جانور کا لینا دینا جاری ہو تو پھر اس کو قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" (ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ اپنے قرض دار سے تحفہ و ہدیہ کے طور پر کوئی بھی چیز قبول نہ کرے۔ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس

صورت میں سود کا اشتباہ ہوسکتا ہے کیونکہ قرض خواہ کو قرض کے ذریعہ جو بھی منفعت حاصل ہوتی ہے وہ سود کے حکم میں ہے۔ہاں اگر قرض کے لین دین سے پہلے ہی سے دونوں کے تعلقات کی نوعیت یہ ہو کہ ان کا آپس میں تحفہ تحائف لینے دینے کے رسوم جاری ہوں تو پھر اس صورت میں قرض لینے کے بعد بھی قرض دار کوئی چیز قرض خواہ کے پاس بھیجے تو قرض خواہ اسے قبول کر سکتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں قرضدار اگر کوئی چیز بطور تحفہ وہدیہ قرض خواہ کو دے گا تو اس کا وہ دینا قرض کے دباؤ کی وجہ سے نہیں ہو گا بلکہ اپنے سابقہ تعلقات اور پہلے سے جاری رسوم کی بنیاد پر ہو گا۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو کچھ قرض دے رکھا تھا چنانچہ ایک دن جب وہ اپنے قرض دار کے ہاں تقاضہ کے لئے گئے تو اس وقت بڑی سخت دھوپ اور گرمی کی شدید تپش تھی انہوں نے چاہا کہ جب تک قرض دار گھر میں سے نکل کر آئے میں اس کے مکان کی دیوار کے سایہ میں کھڑا ہو جاؤں مگر معاً انہوں نے سوچا کہ اگرچہ شرعی طور پر اس کی ممانعت نہیں ہے مگر تقویٰ اور احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ میں اس کی دیوار کے سایہ سے بھی فائدہ حاصل نہ کروں چنانچہ وہ قرض دار بہت دیر کے بعد گھر میں سے نکلا اور حضرت امام صاحبؒ اس وقت تک دھوپ ہی میں کھڑے رہے یہ گویا ان کی احتیاط کا درجہ کمال تھا کہ انہوں نے اپنے قرض دار کی دیوار کے سایہ سے بھی اجتناب کیا۔

مالابد منہ میں لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو قرض قرض خواہ کو نفع پہنچانے کا سبب بنے وہ "ربا" ہے لہذا قرض خواہ اپنے قرض دار کی دعوت بھی قبول نہ کرے ہاں اگر قرض سے پہلے سے دونوں کے درمیان ایک دوسرے کی دعوت میں آنے جانے کا معمول چلا آرہا ہو تو پھر اس صورت میں دعوت قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، نیز یہ بھی لکھا ہے قرض خواہ کے لئے اپنے قرضدار کی دیوار کے سایہ میں بیٹھنا بھی مکروہ ہے۔

(۲۶) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَقْرَضَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فَلَا يَاخُذْ هَدِيَّةً۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِيْ تَارِيْخِهٖ هٰكَذَا فِي الْمُنْتَقٰى۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی کو قرض دے تو وہ اپنے قرضدار سے بطور تحفہ بھی کوئی چیز قبول نہ کرے امام بخاریؒ نے اس روایت کو اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے نیز المُنْتَقٰی میں بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے۔"

(۲۷) وَعَنْ اَبِيْ بُرْدَةَ ابْنِ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ قَدِمْتُ الْمَدِيْنَةَ فَلَقِيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ سَلَامٍ فَقَالَ اِنَّكَ بِاَرْضٍ فِيْهَا الرِّبَا فَاشٍ فَاِذَا كَانَ لَكَ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَاَهْدٰى اِلَيْكَ حِمْلَ تِبْنٍ اَوْ حِمْلَ شَعِيْرٍ اَوْ حَبْلَ قَتٍّ فَلَا تَاخُذْهُ فَاِنَّهٗ رِبًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوبردہؒ ابن ابی موسیٰ (تابعی) کہتے ہیں کہ جب میں مدینہ میں آیا اور حضرت عبداللہؓ ابن سلام (صحابی) سے ملا تو انہوں نے فرمایا کہ تم ایک ایسی سرزمین پر ہو جہاں سود کا بہت رواج ہے لہذا اگر کسی پر تمہارا حق ہو یعنی کوئی تمہارا قرضدار ہو اور وہ تمہیں بھوسے کا ایک گٹھر یا جو کی ایک گٹھری، یا گھاس کا ایک گٹھا بھی تحفہ کے طور پر دے تو تم اسے قبول نہ کرنا کیونکہ وہ سود کا حکم رکھتا ہے۔" (بخاری)

تشریح: علماء لکھتے ہیں کہ كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبٰوا (یعنی ہر قرض جس میں نفع لیا جائے سود ہے) کے اصول کے تحت ہر وہ قرض جس میں کوئی نفع مشروط ہو "ربا" ہے اسی طرح قرض دینے والے کو قرض لینے والے سے قرض کے دباؤ یا قرض کی رعایت سے جو بھی نفع حاصل ہو گا وہ سود ہو گا۔

مسئلہ: اگر قرض خواہ اپنے قرض دار سے قرض کی ادائیگی سے پہلے کوئی نفع حاصل کرے تو دیکھا جائے گا کہ وہ نفع موعود و مشروط ہے یا نہیں؟ اگر وہ نفع موعود و مشروط ہو گا تو اس صورت میں اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں یعنی وہ نفع سود کے حکم میں ہو گا اور اگر وہ نفع موعود و مشروط نہیں ہو گا تو پھر اس کے بارہ میں بھی علماء کے اختلافی اقوال ہیں حضرت امام محمدؒ تو جواز کے قائل ہیں مگر ایک جماعت

ممانعت کی طرف مائل ہے مگر بات یہی ہے کہ اگر وہ نفع قرض کے دباؤ قرض کی رعایت کی وجہ سے ہو گا یا مہلت و تسامح کی بناء پر حاصل ہو گا تو بہر حال ناجائز ہے ہاں اگر مروت و احسان یا سابقہ تعلقات و مراسم کے تحت ہو گا تو پھر اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

قرض میں لزوم مدت سے منع فرمایا گیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ تعیین مدت سے کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی اس لئے مسئلہ یہ ہے کہ اگر قرض ایک متعین مدت کی شرط کے ساتھ لیا دیا جائے گا تو وہ مدت بحیثیت شرط تو لازم ہوگی مگر بحیثیت قرض لازم نہیں ہوگی۔ اگر قرض خواہ اس مدت سے پہلے اپنا قرض طلب کرے تو اسے یہ حق ہے اور قرضدار کو چاہئے کہ وہ حتی الامکان ادا کرنے کی کوشش کرے۔

اگر کوئی شخص کسی کو قرض دیتے وقت یہ شرط عائد کر دے کہ میرا یہ قرض فلاں شہر میں ادا کرنا تو یہ شرط بطریق لزوم ناجائز ہوگی۔

بعض لوگ سودی بنکوں میں اپنا روپیہ بطور امانت جمع کر دیتے ہیں اور اس کا نفع و سود نہیں لیتے چونکہ جو روپیہ بنک میں جمع کیا جاتا ہے وہ یقینی طور پر بعینہ محفوظ نہیں رہتا بلکہ کاروبار میں لگا رہتا ہے اس لئے وہ امانت نہیں رہتا بلکہ قرض ہو جاتا ہے گو اس شخص نے سود نہیں لیا مگر اس نے ایک طرح سے قرض کے ذریعہ سود لینے والوں کی اعانت کی اور سود لینے دینے والوں کی اعانت بھی گناہ ہے اس لئے اپنے روپیہ کو بینک میں داخل کرنا بھی درست نہیں ہے۔

بَابُ الْمَنْهِيِّ عَنْهَا مِنَ الْبُيُوْعِ
جن بیعوں سے منع کیا گیا ہے ان کا بیان

شریعت اسلامی نے خرید و فروخت کے بعض معاملات اور لین دین کی کچھ صورتوں سے منع کیا ہے اسی طرح کچھ چیزیں اور اشیاء ایسی ہیں جن کی خرید و فروخت شرعی نقطہ نظر سے ممنوع ہے پھر بعض معاملات اور بعض چیزوں کی ممانعت و نہی بطریق حرمت (یعنی ان معاملات اور ان چیزوں کے حرام ہونے کی وجہ سے) ہے جیسے بیع باطل اور بیع فاسد کی ممانعت اور بعض ممانعت کا تعلق محض کراہت سے ہے جیسے جمعہ کی اذان کے وقت خرید و فروخت کا معاملہ کرنے کی ممانعت۔

چنانچہ خرید و فروخت کے جن معاملات یا جن چیزوں کی خرید و فروخت کی ممانعت اس وجہ سے ہے کہ وہ معاملات یا وہ چیزیں شریعت کی نظر میں حرام ہیں ان کی حنفی مسلک کے مطابق دو قسمیں ہیں ① بیع فاسد ② بیع باطل۔

بیع فاسد! خرید و فروخت اور لین دین کے اس معاملہ کو کہتے ہیں جو اصول بیع کے پائے جانے کی وجہ سے تو یہ صحیح ہو جاتا ہے مگر بیع کے صحیح ہونے کی جو شرائط ہیں ان میں سے بعض شرطوں کے فوت ہو جانے کی وجہ سے وہ معاملہ جائز نہیں رہتا اس لئے ایسے معاملہ کو ختم کر دینا ہی ضروری ہوتا ہے اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں مشروع بنفسہ اور ممنوع بوصفہ کہا جاتا ہے یعنی ایسی بیع باعتبار اصول مشروع و صحیح ہے اور باعتبار مشروط و اوصاف ممنوع ہے۔

بیع باطل! خرید و فروخت اور لین دین کے اس معاملہ کو کہتے ہیں جو شرعی نقطہ نظر سے کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ معاملہ نہ تو اصول بیع کے اعتبار سے صحیح ہوتا ہے اور نہ باعتبار شروط و اوصاف جائز ہوتا ہے۔

مناسب ہے کہ اس ضمن میں کچھ مسائل ذکر کر دیئے جائیں جن سے نہ صرف مذکورہ بالا اقسام کی تعریفات سمجھنے میں آسانی ہوگی بلکہ باب کے موضوع کے اعتبار سے ان کا جاننا بھی ضروری ہے۔

اگر مبیع (یعنی بیچی اور خریدی جانے والی چیز) شرعی اعتبار سے "مال" نہ ہو جیسے خون، مردار، آزاد شخص، اُم الولد، مکاتب، پیشاب اور بالکل نکمی چیز تو ایسی کسی بھی چیز کی بیع "باطل" ہے اسی طرح مبیع مال تو ہو مگر متقوم نہ ہو جیسے شراب اور سور (خنزیر) تو اس کی بیع اس صورت میں تو باطل ہوگی جبکہ اسے روپے کے عوض فروخت کیا جائے اور اگر اس کی بیع اسباب کے عوض کی جائیگی تو اس صورت میں

اسباب کی بیع تو فاسد ہوگی اور اس مال غیر متقوم کی بیع باطل ہوگی۔

"بیع باطل" اور "بیع فاسد" میں فرق یہ ہے کہ بیع باطل میں تو بیع (بیچی جانے والی چیز) شرعی نقطہ نظر سے مشتری یعنی خریدار کی ملکیت میں سرے سے آتی ہی نہیں جبکہ بیع فاسد میں بیع قبل قبضہ تو کوئی حکم نہیں رکھتی مگر بعد قبضہ بطور حرام مشتری کی ملکیت میں آجاتی ہے اور نقود سے اس کی قیمت کی ادائیگی اس کے ذمہ ضروری ہوتی ہے لیکن قبضہ کے بعد بھی اس بیع کو فسخ کردینا واجب ہوتا ہے بشرطیکہ مبیع بعینہٖ خریدار کے پاس موجود ہو۔

جانور کے تھن میں دودھ کی بیع باطل ہے کیونکہ وہ مشکوک الوجود ہوتا ہے ہوسکتا ہے کہ جانور کے تھن کی ظاہری حالت دیکھ کر اس میں دودھ کی موجودگی کا یقین کرایا جائے اور اس دودھ کی بیع کردی جائے مگر بعد میں پتہ چلے کہ تھن میں سرے سے دودھ تھا ہی نہیں بلکہ ہوا وغیرہ کی وجہ سے تھن پھولا ہوا تھا ایسی صورت میں یہ فریب اور دھوکہ دہی کا معاملہ ہو جائے گا۔

ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے بھی بیچنا جائز نہیں ہے بشرطیکہ وہ جانور ایسا نہ ہو، جو لوٹ پھر کر آجاتا ہو جیسے کبوتر تو اس کو ہوا میں اڑتے ہوئے بھی بیچنا درست ہے اسی طرح اس مچھلی کی بیع بھی ناجائز ہے جو ابھی پکڑی نہ گئی ہو بلکہ پانی مثلاً دریا وغیرہ ہی میں ہو یا پکڑی جاچکی ہو مگر پھر اسے کسی ایسے حوض وغیرہ میں ڈال دیا گیا ہو جس میں سے اسے بغیر جال وغیرہ کے پکڑنا ممکن نہ ہو ایسے ہی لونڈی یا جانور کا حمل، وہ موتی جو سیپ میں ہو اور جانور کے ذبح ہونے اور کٹنے سے پہلے اس کے گوشت کی بیع کرنا جائز نہیں ہے سور (خنزیر) کے بالوں کی بیع کرنا بھی جائز نہیں ہے البتہ ان بالوں سے فائدہ اٹھانا مثلاً گون یعنی غلہ وغیرہ بھر کر جانور کی پیٹھ پر لادے جانے والے تھیلے اور بورے کو سینے کے مصرف میں لانا جائز ہے۔ لیکن آدمی کے بالوں کی بیع بھی ناجائز ہے اور ان سے فائدہ اٹھانا بھی ناجائز ہے۔

جو بیع آپس کے نزاع کا باعث بنتی ہو وہ فاسد ہے جیسے بکری وغیرہ کی پیٹھ پر اس کی پشم کی بیع، یا چھت میں لگی ہوئی کڑی کی بیع، یا ایک بڑے کپڑے میں سے ایک گز کپڑے کی بیع، یا ایسی بیع کرنا جس میں ادائیگی قیمت کی مدت کو مجہول رکھا جائے مثلاً یوں کہے کہ جس روز بارش برسے گی یا جس روز تیز ہوا چلے اس روز اس کی قیمت ادا کروں گا۔ لیکن اگر ان تمام صورتوں میں خریدار نے بیع کو فسخ نہ کیا اور بیچنے والے نے خریدار کو دینے کے لئے چھت میں سے کڑی کو جدا کردیا یا بڑے کپڑے میں سے گز بھر کپڑا جدا کردیا خریدار نے ادائیگی قیمت کی مدت مجہول کو موقوف کردیا تو بیع صحیح ہو جائے گی۔

شرط فاسد کے ساتھ کی جانے والی بیع فاسد ہوتی ہے اور شرط فاسد اسے کہتے ہیں جو اقتضائے عقد کے خلاف ہو اور اس میں یا بیچنے والے کا فائدہ ہو جیسے بیچنے والا یہ شرط عائد کرے کہ میں نے یہ مکان بیچا مگر ایک ماہ تک میں اسی مکان میں رہوں گا یا خریدار کا فائدہ ہو جیسے خریدار یہ شرط عائد کرے کہ میں نے یہ کپڑا خرید لیا لیکن یہ کپڑا مجھے سی کردے مبیع (بیچی جانے والی چیز) کا فائدہ ہو جب کہ انسان یعنی غلام و لونڈی ہو اور وہ نفع کا مستحق ہو جیسے بیچنے والا خریدار سے کہے کہ اس غلام کو آزاد کردینا یا اس غلام کا نکاح کردینا، اس قسم کی شرطیں فاسد ہیں ان کی وجہ سے بیع بھی فاسد ہو جاتی ہے۔

خریدار کی ملکیت کی شرط کرنا چونکہ اقتضائے عقد کے خلاف نہیں ہے اس لئے فاسد نہیں اسی طرح اگر کوئی تاجر مثلاً کوئی کپڑا بیچتے ہوئے خریدار پر یہ شرط عائد کرے کہ اس کپڑے کو فروخت نہ کرنا تو یہ شرط اگرچہ اقتضائے عقد کے خلاف ہے لیکن چونکہ اس شرط میں کسی کی بھی منفعت نہیں ہے اس لئے یہ شرط فاسد نہیں ہوگی، نیز گھوڑا بیچنے والا اگر خریدار پر یہ شرط عائد کرے کہ اس گھوڑے کو فربہ کرنا اگرچہ اس شرط میں مبیع کی منفعت ہے لیکن مبیع چونکہ انسان نہیں کہ وہ نفع کا مستحق ہو اس لئے یہ شرط بھی فاسد نہیں یہ شرط لغو ساقط ہوگی اور بیع صحیح ہو جائے گی۔

بیع فاسد و باطل کی مزید تفصیل فقہ کی کتابوں میں درج ہے ان کو جاننا چاہئے تاکہ خرید و فروخت کے ان معاملات سے جو شریعت کی نظر

میں ناقابل اعتبار ہیں اور جن کا آج کل بہت رواج ہے اجتناب کیا جاسکے۔ اس موقع پر چند دیگر مسائل کی وضاحت بھی ضروری ہے مثلاً:
بیچنے والے کی طرف سے بیع کے ناپ تول میں کمی یا خریدار کی طرف سے قیمت میں کٹوتی حرام ہے جس طرح بیچنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیع کو پورا پورا ناپ تول کر دے اسی طرح خریدار کے لئے بھی ضروری ہے کہ جو قیمت طے ہو چکی ہے اس میں ادائیگی کے وقت کمی نہ کرے جو لوگ اس کے خلاف کرتے ہیں ان کے بارہ میں قرآن کریم نے یوں تنبیہ فرمائی ہے۔
وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی الخ۔
مبیع کی قیمت دیون معجلہ اور مزدوروں کی ادائیگی میں بلاعذر تاخیر کرنا حرام ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "غنی (صاحب استطاعت) کی طرف سے (ادائیگی مطالبہ میں) تاخیر ظلم ہے لہٰذا مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دیدو"۔
منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ جب کسی کا دین (مطالبہ) ادا کرتے تو مقدار واجب سے زیادہ ادا فرماتے مقدار واجب اگر آدھا وسق ہوتی تو اس کی بجائے ایک وسق دیتے اور اگر ایک وسق واجب ہوتا تو اس کی بجائے دو وسق عطا کرتے اور یہ فرماتے کہ یہ تو تمہارا حق ہے اور اس قدر مزید میری طرف سے (عطاء) ہے، لیکن یہ ذہن میں رہے کہ اس طرح مقدار واجب سے زیادہ دینا سود کے حکم میں داخل نہیں ہے کیونکہ سود تو اس وقت ہوتا ہے جب اس زیادتی کو پہلے سے مشروط کر دیا گیا ہو، بغیر شرط زیادہ دینا جائز بلکہ مستحب ہے۔
معاملات میں عہد شکنی مکر و فریب اور جھوٹ کی آمیزش کسب حلال کو بھی حرام کو دیتی ہے لہٰذا ان سے اجتناب ضروری ہے۔
آنحضرت ﷺ کے بارہ میں منقول ہے کہ ایک دن آپ ﷺ نے بازار میں ایک دوکان پر رکھے ہوئے گیہوں کے ایک ڈھیر کو دیکھا اور جب آپ ﷺ نے اس ڈھیر میں اپنا دست مبارک ڈالا تو اندر سے گیہوں تر معلوم ہوئے، آپ ﷺ نے دکاندار سے پوچھا! یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ان گیہوں تک بارش کا پانی پہنچ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ اندر کی جانب سے گیلے ہو گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو پھر تم نے ان گیلے گیہوں کو ڈھیر کے اوپر کیوں نہیں رکھا (تاکہ کوئی لاعلم شخص ان کی وجہ سے دھوکہ میں مبتلا نہ ہو جائے) یاد رکھو جو شخص مسلمانوں کو فریب دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔
بیع مرابحت (قیمت خرید پر نفع لے کر بیچنے کی صورت) اور بیع تولیت (قیمت خرید پر بلا نفع بیچنے کی صورت) میں خریدار کے سامنے پہلی قیمت، (یعنی جس قیمت پر خود بیچنے والے نے خریدا ہو) کو بلا کم و بیش ظاہر کر دینا واجب ہے۔ اگر بیچنے والے نے بیع پر قیمت کے علاوہ کچھ اور مثلاً مزدوری، ڈھلائی اور چنگی وغیرہ کا خرچ برداشت کیا ہو تو اس کو بھی قیمت کے ساتھ ملالے اور خریدار سے یوں کہے کہ اس چیز پر میرے اتنے روپے خرچ ہوئے ہیں یہ نہ کہے کہ میں نے یہ چیز اتنے روپے میں خریدی ہے تاکہ جھوٹا نہ بنے۔
اگر کسی شخص نے ایک کپڑا مثلاً دس روپے میں بیچا اور ہنوز خریدار نے بیچنے والے کو وہ دس روپے ادا نہیں کئے تھے کہ بیچنے والے نے پھر وہی کپڑا خریدار سے پانچ روپے میں خرید لیا یا اس کپڑے کو ایک اور کپڑے کے ساتھ دس درہم میں خریدا تو یہ بیع صحیح نہیں ہوگی۔
کیونکہ یہ سود کے حکم میں آجائے گی۔ بیع پر قبضے سے پہلے تصرف جبکہ مبیع منقول ہو حرام ہے، چنانچہ منقول چیز کو قبضہ کرنے سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے۔
کسی شخص نے ایک کیلی چیز (جو پیمانہ میں ناپ کر لی دی جاتی ہو) بشرطیکہ کیل خریدی اور بیچنے والے سے وہ چیز پیمانہ میں نپوا کر لے لی، اور پھر اسی چیز کو اس نے کسی دوسرے کے ہاتھ بشرط کیل بیچی تو اب اس دوسرے خریدار کے لئے ضروری ہے کہ جب تک وہ خود بھی اس پہلے خریدار سے اس چیز کو پیمانہ میں نپوا نہ لے، نہ تو اس چیز کو اپنے تصرف میں لائے اور نہ کسی اور کے ہاتھ بیچے کیونکہ پہلا ناپ کافی نہیں ہے۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کو پھر ناپ لیا جائے کہ مبادا وہ چیز پیمانہ میں کچھ زائد نکلے اور وہ بائع کا مال نہ ہو۔
اگر ایک مسلمان کسی چیز کی خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کرتے ہوئے ایک نرخ متعین کرتا ہے یا ایک مسلمان نے کسی عورت سے نکاح کا پیغام دیا ہے تو تاوقتیکہ اس کا معاملہ طے یا موقوف نہ ہو جائے کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس چیز کا معاملہ کرے یا اپنا

پیغام بھیجے۔ بوقت اذان جمعہ خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس کی وجہ سے سعی واجب (یعنی نماز جمعہ کی ضروری تیاریوں) میں خلل آتا ہے اگر متعدد مسجدوں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہو تو جس مسجد میں نماز پڑھنے کا ارادہ ہو اس کی اذان سے بیع ترک کرے۔

اگر دو بڑے چھوٹے غلام آپس میں محرمیت کی قرابت رکھتے ہوں تو ان کی علیحدہ علیحدہ بیع کرنا مکروہ و ممنوع ہے اسی طرح اگر ایک ان میں سے چھوٹا ہو اور دوسرا بڑا تب بھی مکروہ و ممنوع ہے بلکہ بعض علماء کے نزدیک تو یہ بیع ہی جائز نہیں ہوگی۔

مردار کی چربی بیچنا جائز نہیں ہے نجس کا تیل بیچنا حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں تو جائز ہے لیکن دوسرے ائمہ کے ہاں جائز نہیں ہے، انسان کی غلاظت کی بیع جب کہ اس میں کچھ ملا نہ ہو حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک مکروہ ہے اور اگر راکھ وغیرہ ملی ہوئی ہو تو جائز ہے حضرت امام اعظمؒ کے ہاں گوبر کا بیچنا بھی جائز نہیں اس سے فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں ہے۔

بادشاہ و حاکم کے لئے یہ مکروہ ہے کہ وہ اشیاء کے نرخ متعین کردیں۔ ہاں اگر تاجر غلہ و دیگر اشیاء کی گرانی میں حد سے تجاوز کرنے لگیں اور عوام پریشانی میں مبتلا ہو جائیں تو پھر حاکم کے لئے جائز ہے کہ وہ تجربہ کار اور ماہرین کے مشورہ سے نرخ متعین کردے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

وہ بیوع جن سے منع کیا گیا ہے

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُزَابَنَةِ اَنْ يَّبِيْعَ ثَمَرَ حَائِطِهٖ اِنْ كَانَ نَخْلًا بِتَمْرٍ كَيْلًا وَاِنْ كَانَ كَرْمًا اَنْ يَّبِيْعَهٗ بِزَبِيْبٍ كَيْلًا اَوْكَانَ۔ وَعِنْدَ مُسْلِمٍ وَاِنْ كَانَ زَرْعًا اَنْ يَّبِيْعَهٗ بِكَيْلِ طَعَامٍ نَهٰى عَنْ ذٰلِكَ كُلِّهٖ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُمَا نَهٰى عَنِ الْمُزَابَنَةِ قَالَ وَالْمُزَابَنَةُ اَنْ يُّبَاعَ مَافِيْ رُؤُوْسِ النَّخْلِ بِتَمْرٍ بِكَيْلٍ مُسَمًّى اِنْ زَادَ فَلِيْ وَاِنْ نَقَصَ فَعَلَيَّ۔ (بخاری و مسلم)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مزابنہ سے منع فرمایا ہے اور مزابنہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باغ کا میوہ (تازہ پھل) اگر وہ کھجور ہو تو خشک کھجوروں کے بدلے پیمانہ کے ذریعہ (مثلاً دس پیمانے کے بقدر) بیچے یعنی ایک شخص کے باغ میں تازہ کھجوریں لگی ہوئی ہوں اور ایک دوسرے شخص کے پاس خشک کھجوریں رکھی ہوئی ہوں تو باغ والا شخص اس دوسرے شخص سے دس پیمانے بھر کر خشک کھجوریں لے لے اور اس کے عوض اپنے درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوریں اسی پیمانے کے مطابق اندازہ کر کے بیچ دے اور اگر میوہ انگور ہو تو اس کو خشک انگور کے بدلے پیمانہ کے ذریعہ بیچے (حاصل یہ کہ بیع مزابنہ کا مطلب ہے درخت پر لگے ہوئے تازہ میوہ کو خواہ وہ کھجور ہو یا کوئی اور پھل، رکھے ہوئے خشک میوہ کے عوض بیچنا) اور مسلم میں یہ بھی ہے کہ اگر کھیتی ہو تو اس میں بیع مزابنہ کی شکل یہ ہے کہ اس کو غلہ کے عوض پیمانہ کے ذریعہ بیچے (یعنی کھیت میں کھڑی ہے اور ایک دوسرے شخص کے پاس گیہوں رکھا ہوا ہے تو پہلا شخص اپنے کھیت میں کھڑے ہوئے گیہوں کا اندازہ کر کے اس کو دوسرے شخص کے ہاتھ بیچ دے اور اس کے عوض اس شخص سے وہ رکھا ہوا گیہوں اپنے اندازے کے مطابق پیمانہ بھر کے لے لے) آنحضرت ﷺ نے بیع کی ان تمام قسموں سے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور بخاری و مسلم ہی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ہے نیز فرمایا کہ بیع مزابنہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوروں کو کسی شخص کو ہاتھ اس کے پاس رکھی ہوئی خشک کھجوروں کے عوض پیمانہ معین کر کے بیچے اور خریدار سے کہہ دے کہ اگر درخت کی کھجوریں (معین پیمانہ سے) زائد ہوں گی تو میری ہیں (یعنی میں اسے لے لوں گا) اور اگر کم نکلیں تو اس کا میں ذمہ دار ہوں (کہ اس کمی کو میں پورا کردوں گا)

تشریح: "مزابنہ" لفظ "زبن" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "دفع کرنا" دور کرنا بیع مزابنہ سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس بیع کی بنیاد قیاس اور اندازے پر ہوتی ہے اس میں فریقین کے لئے زیادتی اور نقصان دونوں کا احتمال رہتا ہے اس کی وجہ سے دونوں (یعنی بیچنے

والے اور خریدار) کے درمیان نزاع وفساد بھی پیدا ہوسکتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے (دفیعہ اور دوری کی نوبت بھی آسکتی ہے۔

یہاں دو روایتیں نقل کی گئی ہیں ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی روایت میں مزابنہ کی تعریف لفظ ثمر کے ذکر سے کی گئی ہے جو عمومیت لئے ہوئے ہے۔ دوسری روایت میں مزابنہ کی تعریف لفظ تمر کے ذکر سے کی گئی ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیع مزابنہ کا تعلق صرف کھجور سے ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسری روایت میں بھی عمومیت ہی مراد ہے خاص طور پر کھجور کا ذکر محض تمثیل ہے۔

(۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُخَابَرَةِ وَالْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُحَاقَلَةُ اَنْ يَبِيْعَ الرَّجُلُ الزَّرْعَ بِمِائَةِ فَرَقٍ حِنْطَةٍ وَالْمُزَابَنَةُ اَنْ يَبِيْعَ التَّمْرَ فِيْ رُؤُوْسِ النَّخْلِ بِمِائَةِ فَرَقٍ وَالْمُخَابَرَةُ كِرَاءُ الْاَرْضِ بِالثُّلُثِ وَالرُّبُعِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ مخابرۃ، محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے اور محاقلہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی کھیتی کو سو فرق گیہوں کے بدلے میں بیچ دے اور مزابنہ یہ ہے کہ کوئی شخص درختوں پر لگی ہوئی کھجوروں کو سو فرق رکھی ہوئی کھجوروں کے بدلے میں بیچ دے اور مخابرۃ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کو ایک معین حصہ جیسے تہائی یا چوتھائی پر کاشت کے لئے دے دے۔" (مسلم)

تشریح: "فرق" راء کے زبر کے ساتھ ایک پیمانہ کا نام تھا جس میں سولہ رطل یعنی تقریباً سات سیر غلہ آتا تھا اور "فرق" راء کے جزم کے ساتھ اس پیمانے کو کہتے تھے جس میں ایک سو بیس رطل غلہ آتا تھا، حدیث میں سو ۱۰۰ فرق کا ذکر محض تمثیل کے طور پر ہے۔ مقصود تو صرف یہ بتانا ہے کہ کٹنے سے پہلے کھیت میں کھڑے ہوئے گیہوں کو رکھے ہوئے گیہوں کے عوض بیچنا، محاقلہ، کہلاتا ہے۔

یہی مفہوم گذشتہ حدیث میں "مزابنہ" کے ضمن میں بھی ذکر کیا جا چکا ہے لیکن "مزابنہ" وسیع و عام کا حامل ہے کہ اس کا اطلاق میووں اور پھلوں پر بھی آتا ہے اور کھیتی اور غلوں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جبکہ "محاقلہ" کا استعمال صرف کھیتی اور غلوں ہی کے لئے کیا جاتا ہے اگرچہ بعض مواقع پر "مزابنہ" بھی صرف میووں اور پھلوں ہی کے بارہ میں استعمال ہوتا ہے۔

"مخابرۃ" کا مطلب ہے کہ "اپنی زمین کو بٹائی پر کاشت کے لئے کسی دوسرے کو دیدینا" مثلاً کوئی شخص اپنی زمین کسی دوسرے کو اس شرط کے ساتھ دے دے کہ اس زمین کو جوتنا بونا اور جو کچھ اس میں پیدا ہو اس میں سے تہائی یا چوتھائی مجھے دیدینا۔

حدیث بالا میں اس کی بھی ممانعت فرمائی گئی ہے کیونکہ اوّل تو یہ اجرت کی ایک شکل ہوتی ہے اور اس میں اجرت مجہول رہتی ہے۔ دوسرے حاصل ہونے والی چیز معدوم ہوتی ہے اور جو چیز معدوم ہوتی ہے اس کا کوئی معاملہ مقرر نہیں ہوتا۔ "مخابرت" کو "مزارعت" بھی کہتے ہیں لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ "مخابرت" کی صورت میں تو تخم و بیج کاشت کرنے والے کا ہوتا ہے اور "مزارعت" میں زمین کے مالک کا، مزارعت (اور مخابرت بھی) حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں حکم ہے لیکن صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک درست ہے، حنفی مسلک میں فتویٰ صاحبین ہی کے قول پر ہے کیونکہ یہ کثیر الوقوع اور بہت زیادہ احتیاج کی چیز ہے اس کو جائز نہ رکھنے کی صورت میں لوگوں کو بہت زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

(۳) وَعَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُخَابَرَةِ وَالْمُعَاوَمَةِ وَعَنِ الثُّنْيَا وَرَخَّصَ فِي الْعَرَايَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے محاقلت، مزابنت، مخابرت، معاومت اور ثنیا سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ نے عرایا کی اجازت دی ہے۔" (مسلم)

تشریح: محاقلت، مزابنت اور مخابرت کے معنی تو بیان کئے جا چکے ہیں "معاومت" کے معنی یہ ہیں کہ درختوں کے پھلوں کو نمودار ہونے سے پہلے ایک سال، دو سال، تین سال یا زیادہ مدت کے لئے فروخت کر دیا جائے اور "ثنیا" کا مطلب یہ ہے کہ درختوں پر موجود (پھلوں

کو بیچا جائے لیکن ان میں سے ایک غیر معین مقدار مستثنیٰ کرلی جائے یعنی اسے نہ بیچا جائے)۔

"عرایا" جمع ہے "عریت" کی اور "عریت" کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جسے اس کا مالک کسی محتاج وفقیر کو پھل کھانے کے لئے عاریتاً دیدے۔ "عرایا کی اجازت دی ہے" کی وضاحت یہ ہے کہ بعض لوگ اپنے باغ میں سے ایک درخت یا دو درخت کسی محتاج کو پھل کھانے کے لئے دیدیا کرتے تھے پھر جیسا کہ معمول تھا وہ (باغ کا مالک) اپنے اہل وعیال کے ساتھ جب باغ میں آتا اور ان سب لوگوں کی موجودگی میں وہ محتاج آجاتا تو اپنے باغ میں ایک شخص کے آجانے کی وجہ سے ان کو کچھ کبیدگی ہوتی اس لئے اس محتاج کو وہ اس درخت کی بجائے اپنے پاس سے کچھ پھل دے کر رخصت کردیتے اور اس درخت کا پھل خود رکھ لیتے چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو روا رکھا لیکن یہ پانچ وسق سے کم میں تو جائز ہے اس سے زیادہ میں درست نہیں جیسا کہ آگے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آجائے گا۔

④ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِیْ حَثْمَةَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ التَّمْرِ بِالتَّمْرِ اِلاَّ اَنَّهٗ رَخَّصَ فِی الْعَرِيَّةِ اَنْ تُبَاعَ بِخَرْصِهَا تَمْرًا يَاْكُلُهَا اَهْلُهَا رُطَبًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل ابن ابی حثمہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو خشک کھجوروں کے بدلے بیچنے سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ نے عریہ (کسی محتاج کو دیئے گئے درخت) کے متعلق یہ اجازت دی کہ اس درخت پر لگے ہوئے پھل کو اس کے خشک ہونے (کے بعد کی مقدار) کا اندازہ کر کے بیچا جائے (یعنی یہ اندازہ کرلیا جائے کہ اس درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوریں خشک ہونے کے بعد کتنی رہیں گی اور پھر اتنی ہی مقدار میں خشک کھجوریں اس محتاج کو دے کر اس درخت پر لگی ہوئی کھجوریں لے لی جائیں) اس طرح اس کے مالک اس درخت کا تازہ پھل کھائیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

بیع عرایا کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْخَصَ فِیْ بَيْعِ الْعَرَايَا بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمْرِ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ اَوْفِیْ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ شَكَّ دَاوُدُ بْنُ الْحُصَيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے عاریتاً (محتاجوں کو عاریتاً دیئے گئے درختوں کے پھلوں) کو خشک کھجوروں کے ساتھ اندازہ کر کے بیچنے کی اجازت دے دی ہے۔ یعنی اگر عرایا پر لگی ہوئی کھجوروں کو خشک کھجوروں سے بدلنا ہو تو پہلے یہ اندازہ کرلیا جائے کہ یہ تازہ کھجوریں خشک ہونے کے بعد کتنی رہیں گی پھر اتنی ہی مقدار میں خشک کھجوریں لیکر وہ تازہ کھجوریں دیدی جائیں مگر اس اجازت کا تعلق اس صورت سے ہے) جبکہ وہ پانچ وسق سے کم ہوں۔ یہ حدیث کے ایک راوی داؤد ابن حصینؒ کا شک ہے (کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں پانچ وسق سے کم کا تذکرہ تھا یا پانچ وسق کا تذکرہ تھا)۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "پانچ وسق سے کم" کی قید اس لئے ہے کہ اس اجازت کا تعلق احتیاج اور ضرورت سے ہے اور احتیاج وضرورت پانچ وسق سے کم ہی ہوتی ہے، چنانچہ عرایا کے پھلوں کی مذکورہ بالا بیع وتبادلہ پانچ وسق سے کم میں سب ہی علماء کے نزدیک جائز ہے پانچ وسق سے زیادہ میں جائز نہیں ہے البتہ پورے پانچ وسق کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں زیادہ صحیح قول عدم جواز ہی کا ہے۔ کیونکہ بیان مقدار میں راوی نے شک کا اظہار کیا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں احتیاط کا تقاضہ یہی ہونا چاہئے کہ پانچ وسق سے کم مقدار پر عمل کیا جائے جو بہر حال متعین ہے۔ اس بات میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ اس اجازت کا تعلق صرف محتاجوں ہی سے ہے یا اغنیاء بھی اس اجازت کے دائرہ میں آتے ہیں، چنانچہ زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ یہ اجازت دونوں کے لئے ہے۔

"وسق" ایک پیمانہ کا نام ہے ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع کے پیمانہ میں تقریباً ساڑھے تین سیر غلہ آتا ہے (انگریزی سیر کے اعتبار سے پانچ وسق تقریباً چھبیس من کا ہوتا ہے۔)

بیع ثمر خام کی ممانعت

(۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ الثِّمَارِ حَتّٰی یَبْدُوَ صَلَاحُھَا، نَھَی الْبَائِعَ وَالْمُشْتَرِیَ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ۔ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِمُسْلِمٍ نَھٰی عَنْ بَیْعِ النَّخْلِ حَتّٰی تَزْھُوَ وَعَنِ السُّنْبُلِ حَتّٰی یَبْیَضَّ وَیَاْمَنَ الْعَاھَۃَ۔ (بخاری ومسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے پھلوں کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ ان کی پختگی ظاہر نہ ہو جائے یہ ممانعت بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں کے لئے ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "آپ ﷺ نے کھجور کے پھل اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سرخ و زرد نہ ہو جائیں، نیز آپ ﷺ نے کھیتی کے خوشوں کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ پختہ نہ ہو جائیں اور کسی آفت سے محفوظ نہ ہوں۔"

تشریح: بیچنے والے کے لئے ممانعت اس لئے ہے تاکہ وہ خریدار کا مال بغیر کسی چیز کے عوض کے حاصل نہ کرے اور خریدار کے لئے ممانعت اس لئے ہے تاکہ وہ اپنے مال کے نقصان و تباہی میں مبتلا نہ ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ غیر پختہ و غیر تیار پھل خرید لے اور اس کی قیمت ادا کر دے مگر پھل تیار و پختہ ہونے سے پہلے ہی کسی آفت مثلاً آندھی اور بارش وغیرہ کی وجہ سے ضائع ہو جائیں۔

(۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ الثِّمَارِ حَتّٰی تُزْھِیَ قِیْلَ وَمَا تُزْھِیْ قَالَ حَتّٰی تَحْمَرَّ وَقَالَ اَرَاَیْتَ اِذَا مَنَعَ اللّٰہُ الثَّمَرَۃَ بِمَ یَاْخُذُ اَحَدُکُمْ مَالَ اَخِیْہِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے پھلوں کو درختوں پر اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ خوش رنگ نہ ہو جائیں۔ عرض کیا گیا کہ خوش رنگ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تک وہ سرخ نہ ہو جائیں یعنی پک نہ جائیں" اور پھر فرمایا تم ہی بتاؤ جب اللہ تعالیٰ پھلوں کو (پکنے سے) روک دے تو تم میں سے کوئی کیونکر اپنے بھائی کا مال لے گا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ پختہ و تیار ہونے سے پہلے پھلوں کی بیع میں اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ شاید کوئی آفت مثلاً آندھی وغیرہ آجائے اور پھل درختوں سے جھڑ کر ضائع ہو جائیں۔ اس صورت میں بیچنے والا خریدار سے پھلوں کی قیمت کے طور پر جو کچھ لے گا وہ اسے بلا عوض اور مفت مل جائے گا لہٰذا یہ ضروری ہے کہ پھلوں کے پختہ و تیار ہونے تک صبر و انتظار کیا جائے۔ جب وہ پک کر تیار ہو جائیں تو اس وقت خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا جائے۔

پھلدار درختوں کو کئی سالوں کے لئے پیشگی بیچ ڈالنے کی ممانعت

(۸) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ السِّنِیْنَ وَاَمَرَ بِوَضْعِ الْجَوَائِحِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے چند سالوں کا پھل بیچنے سے منع فرمایا ہے (یعنی ایک سال یا دو سال یا تین سال اور یا اس سے زائد سالوں کے لئے درختوں کا پھل پیشگی نہیں بیچنا چاہئے) نیز آپ ﷺ نے آفت زدہ کے ساتھ رعایت کرنے کا حکم دیا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جز کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص نے درخت پر لگے ہوئے پھل پختہ و تیار ہونے کے بعد خرید لئے مگر سوء اتفاق سے قبل اس کے کہ خریدار پھلوں کو اپنے تصرف میں لاتا کسی بھی وجہ سے وہ پھل جھڑ گئے اور ضائع ہو گئے اس صورت میں بیچنے والے کو چاہئے کہ اگر اس نے ابھی تک قیمت وصول نہیں کی ہے تو اس میں کچھ کمی کر دے اور اگر قیمت وصول کر لی ہے تو اس میں سے کچھ خریدار کو واپس کر دے اگرچہ بیع ہو چکی ہے اور قاعدہ کے اعتبار سے وہ اس کے لئے مجبور نہیں ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کا اس بارہ

میں مذکورہ بالا حکم صرف استحباب کے لئے ہے اور اس کا مقصد آفت زدہ خریدار کے ساتھ ممکنہ رعایت کے لئے بیچنے والے کو ایک اخلاقی توجہ دلانا ہے، ورنہ تو جہاں تک فقہی مسئلہ کا تعلق ہے یہ بات بالکل صاف ہے کہ خریدار کے قبضہ و ملکیت میں آجانے کے بعد مبیع (خریدی ہوئی چیز) کے ہر نفع و نقصان کا ذمہ دار خریدار ہی ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قبضہ میں آجانے کے بعد اگر مبیع کسی آفت کی وجہ سے ہلاک و ضائع ہو جاتی ہے تو وہ خریدار ہی کا نقصان ہوتا ہے بیچنے والے پر اس کا کوئی بدلہ وغیرہ واجب نہیں ہوتا۔

ضائع ہو جانے والی مبیع کا ذمّہ دار کون ہے؟

(۹) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ بِعْتَ مِنْ اَخِيْكَ ثَمَرًا فَاَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ فَلَا يَحِلُّ لَكَ اَنْ تَأْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا بِمَ تَأْخُذُ مَالَ اَخِيْكَ بِغَيْرِ حَقٍّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" اگر تم نے اپنے مسلمان بھائی کے ہاتھ پھل بیچا اور کوئی ایسی آفت آئی کہ وہ پھل ضائع ہو گیا تو تمہارے لئے اس سے کچھ لینا حلال نہیں ہے (تم خود سوچو کہ ایسی صورت میں) ایک بھائی کا مال ناحق کیسے لوگے۔" (مسلمؒ)

تشریح: فَلَا يَحِلُّ لَكَ "اس سے کچھ بھی لینا حلال نہیں ہے" یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ مبیع بالکلیہ اور مطلقاً ضائع ہو جائے اور اگر کوئی ایسی آفت آئے کہ جس سے مبیع کا کچھ حصہ نقصان ہو تو اس صورت میں قیمت میں کچھ کمی کر دینی چاہئے۔ جیسا کہ گذشتہ حدیث کی تشریح میں بتایا گیا، اس حدیث کے بارے میں بھی وہی تشریح سامنے رہنی چاہئے جو گذشتہ حدیث کے سلسلے میں گذری ہے۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت ابن مالکؒ نے بھی یہ وضاحت کی ہے کہ اگر مبیع خریدار کی سپردگی میں جانے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا نقصان بیچنے والے کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس صورت میں حدیث کی کوئی تاویل کرنے ہی کی ضرورت نہیں ہوگی اور اگر مبیع خریدار کی سپردگی و قبضے میں جانے کے بعد ضائع ہو تو پھر کہا جائے گا کہ حدیث گرامی کے الفاظ "اس سے کچھ بھی لینا حلال نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ازروئے تقویٰ و ورع اور ازراہ اخلاق و احسان خریدار سے کچھ بھی لینا حلال (مناسب) نہیں ہے۔

اشیاء منقولہ میں قبل قبضہ دوسری بیع جائز نہیں ہے

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانُوْا يَبْتَاعُوْنَ الطَّعَامَ فِيْ اَعْلَى السُّوْقِ فَيَبِيْعُوْنَهُ فِيْ مَكَانِهِ فَنَهَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِهِ فِيْ مَكَانِهِ حَتّٰى يَنْقُلُوْهُ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَلَمْ اَجِدْهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ بازار کے اس حصے میں جو جانب بلندی واقع تھا لوگ غلہ خریدتے اور پھر اس کی اسی جگہ قبضہ میں لینے سے پہلے بیچ ڈالتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس بات سے منع فرمایا کہ جب تک غلہ کو (خریدنے کے بعد) وہاں سے منتقل نہ کیا جائے اس کو اسی جگہ فروخت نہ کیا جائے۔" "اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا اور مجھے یہ روایت بخاری و مسلمؒ میں نہیں ملی ہے)

تشریح: "وہاں سے منتقل نہ کیا جائے" کا مطلب یہ ہے کہ "جب تک اسے اپنے قبضہ میں نہ لے لیا جائے" اور اشیاء منقولہ کا قبضہ میں لینا یہ ہے کہ اس کو خریدنے کے بعد اس کی جگہ سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ رکھ دیا جائے چاہے وہ دوسری جگہ کتنی ہی قریب کیوں نہ ہو۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اگر اس چیز کو پیمانے یا وزن کے ذریعے لیا ہے تو پیمانے میں نپوا کر یا وزن کرانے کے بعد ہی اسے اٹھائے اور اگر بلا پیمانہ و وزن لیا ہے تو پھر اس کے بغیر ہی اٹھا کر رکھ دے۔ حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اشیاء منقولہ میں سے کوئی چیز خریدے اور پھر اسے کسی دوسرے کو فروخت کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے اس چیز کو اپنے قبضے میں لے۔ اس کے بعد اسے فروخت کرے کیونکہ بیع اشیاء منقولہ میں قبل قبضہ دوسری بیع جائز نہیں ہے۔

صاحب مشکوٰۃ نے "مجھے یہ روایت بخاری و مسلم میں نہیں ملی ہے" کے ذریعے دراصل صاحب مصابیح پر اعتراض کیا ہے کہ اس روایت کو پہلی فصل میں ذکر کیا گیا ہے جب کہ یہ روایت نہ تو بخاری میں ہے اور نہ مسلم میں بلکہ ابوداؤد میں ہے اس لئے یہ روایت قاعدہ کے اعتبار سے دوسری فصل میں نقل کی جانی چاہئے تھی۔

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهُ وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ حَتّٰى يَكْتَالَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص غلہ خریدے تو اس کو اس وقت تک فروخت نہ کرے جب تک کہ اسے پوری طرح نہ لے لے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب تک اس کو ناپ نہ لے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جب تک کہ اسے پوری طرح نہ لے لے" کا مطلب یہ ہے کہ "جب تک کہ اسے اپنے قبضہ میں نہ لے لے"۔ اس کی وضاحت گذشتہ حدیث کے ضمن میں کی جا چکی ہے۔ اس موقع پر اس بارے میں یہ فقہی اختلاف بھی جان لیجئے کہ حضرت امام شافعیؒ اور حنفیہ میں سے حضرت امام محمدؒ کے نزدیک کسی چیز کو خرید کر پھر اسے کسی دوسرے کے ہاتھ قبضہ سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے وہ چیز خواہ اشیاء منقولہ میں سے ہو جیسے غلہ وغیرہ یا عقار یعنی زمین ہو۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک قبل قبضہ صرف غلے کا بیچنا تو جائز نہیں ہے اور سب چیزوں کا بیچنا جائز ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ کے ہاں قبل قبضہ عقار یعنی زمین کا بیچنا تو جائز ہے لیکن اشیاء منقولہ میں سے کسی بھی چیز کا بیچنا جائز نہیں ہے۔ حضرت امام احمدؒ کا مسلک بھی بظاہر یہی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ "جب تک کہ اس کو ناپ نہ لے" سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر بیچنے والا خریدار کے سامنے غلہ کو ناپ کر یا وزن کر کے دے تو یہ کافی نہیں ہے بلکہ خریدار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کو اپنے قبضے میں لے لینے کے بعد پھر دوبارہ خود بھی ناپے یا وزن کرے، لیکن اس بارے میں زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ خریدار کے سامنے بیچنے والے کا ناپنا یا وزن کرنا کافی ہے کیونکہ خریدار کے سامنے بیچنے والے کا ناپنا یا وزن کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ خود خریدار ناپے یا وزن کرے۔

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَمَّا الَّذِيْ نَهٰى عَنْهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهُوَ الطَّعَامُ اَنْ يُّبَاعَ حَتّٰى يُقْبَضَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَلَا اَحْسِبُ كُلَّ شَيْءٍ اِلَّا مِثْلَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جس چیز کو منع کیا ہے وہ غلہ ہے کہ اس کو قبضے میں لانے سے پہلے فروخت کرنا ممنوع ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے تھے کہ میرا گمان ہے کہ اس بارے میں ہر چیز غلہ کی مانند ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابن عباسؓ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح غلہ کو قبل قبضہ بیچنا جائز نہیں ہے اسی طرح کسی بھی چیز کو اس وقت تک بیچنا جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ قبضہ میں نہ آجائے۔ یہ گویا حضرت ابن عباسؓ کا اپنا گمان و خیال ہے کہ انہوں نے اس مسئلے میں غلے پر غیر غلے کو قیاس کیا ہے۔

(۱۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَلَقَّوُا الرُّكْبَانَ لِبَيْعٍ وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ وَلَا تُصَرُّوا الْاِبِلَ وَالْغَنَمَ فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ اَنْ يَحْلُبَهَا اِنْ رَضِيَهَا اَمْسَكَهَا وَاِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ مَنِ اشْتَرٰى شَاةً مُصَرَّاةً فَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَاِنْ رَدَّهَا رَدَّ مَعَهَا صَاعًا مِنْ طَعَامٍ لَا سَمْرَاءَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم آگے جا کر غلہ وغیرہ لانے والے قافلے سے خرید و فروخت کے لئے نہ ملو

اور تم میں سے کوئی شخص کسی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نجش نہ کرو اور شہر کا آدمی کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے اور اونٹ و بکری کے تھنوں میں دودھ جمع نہ کرو، اور اگر کوئی شخص ایسا جانور خریدے جس کے تھنوں میں دودھ جمع کیا گیا ہو تو دودھ دوہنے کے بعد اسے اس جانور کو رکھ لینے یا پھیر لینے کا اختیار ہوگا کہ اگر اس کی مرضی ہو تو اس جانور کو رکھ لے اور اگر مرضی ہو تو اس کو پھیر دے اور اس کے ساتھ ہی صاع (ساڑھے تین سیر) کھجوریں دے دے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

مسلمؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ جو شخص ایسی بکری خریدے جس کے تھنوں میں دودھ جمع کیا گیا ہو تو اس بکری کو رکھ لینے یا پھیر دینے کا تین دن تک اختیار رہتا ہے چنانچہ اگر وہ (ان تین دنوں میں) اس بکری کو واپس کرے تو اس کے ساتھ ایک صاع کھجوریں دے دے مگر گیہوں نہ دے۔"

تشریح: پہلی ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً تمہیں معلوم ہو کہ بیوپاریوں کا کوئی گروہ غلہ وغیرہ لے کر شہر آرہا ہے تو قبل اس کے کہ وہ بیوپاری شہر میں پہنچیں اور وہاں بازار کا بھاؤ وغیرہ معلوم کریں تم راستے میں جا کر ان سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ نہ کرلو! یہ حکم آپ نے اس لئے دیا ہے تاکہ ان بیوپاریوں اور تاجروں کو فریب دینے یا ان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع پیدا نہ ہو جائے۔

"تم میں سے کوئی شخص کسی کی بیع پر بیع نہ کرے" یعنی دو شخصوں میں خرید و فروخت کا کوئی معاملہ ہو رہا ہو تو تم اس میں دخل نہ دو بایں طور کہ نہ تو چیز کے دام بڑھا کر یا کسی اور ذریعے سے اس کو خریدنے کا اظہار کہ اس میں خریدار کا نقصان ہوگا اور نہ اپنا مال دکھا کر کم قیمت پر اسے بیچو کہ اس میں بیچنے والے کو نقصان ہوگا، یا مثلاً اگر کوئی شخص کسی سے کوئی چیز بشرط خیار خریدے تو تم اس خریدار کے پاس جا کر یوں کہو کہ تم اس معاملے کو فسخ کر کے اسے واپس کردو میں ایسی ہی چیز تمہیں اس سے سستے داموں دے دوں گا۔ اس طرح اپنے فائدے کے لئے کسی کا معاملہ بگاڑنا برا ہے اگر مقصد خود خریدنا یا خود بیچنا نہ ہو بلکہ محض معاملہ بگاڑنا ہی منظور ہو تو یہ بہت ہی برا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس مخالفت کا تعلق اس چیز سے ہے کہ جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو، اور اگر کسی چیز میں کوئی شرعی قباحت ہو جیسے کوئی شخص کسی کو غبن یا چوری کا مال بیچتا ہو تو اس صورت میں معاملہ کو فسخ کرا دینا جائز ہے۔

"نجش" کے معنی ہیں "رغبت دلانا اور فریب دینا" اس کی صورت یہ ہے کہ دو شخصوں کے درمیان معاملہ ہو رہا ہو تو تیسرا شخص آکر اس چیز کی تعریف کرنے لگے جس کا معاملہ ہو رہا ہے یا اس چیز کی قیمت زیادہ لگا دے اور اس سے اس کا مقصد خریداری نہ ہو بلکہ منظور یہ ہو کہ خریدار میری دیکھا دیکھی اس چیز کی خریداری کی طرف زیادہ راغب ہو جائے یا اس چیز کی قیمت اور زیادہ لگا دے، آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ اصل خریدار کو فریب میں مبتلا کرنے کی ایک بدترین صورت ہے۔

"شہری آدمی کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے" مثلاً کوئی دیہاتی اپنا مال جیسے غلہ وغیرہ بازار کے بھاؤ فروخت کرنے کے لئے شہر لائے اور کوئی شہری اس سے آکر یہ کہے کہ تم اپنا یہ مال میرے پاس چھوڑ جاؤ میں اس کو بڑی آسانی کے ساتھ گراں نرخ پر بیچ دوں گا! اس سے آپ ﷺ نے اس لئے منع فرمایا ہے کہ اس میں مخلوق خدا کو نفع سے باز رکھنا ہے، چنانچہ یہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک حرام ہے اور حنفی مسلک کے مطابق مکروہ ہے۔

"اونٹ و بکری کے تھنوں میں دودھ جمع نہ کرو" مثلاً ایک شخص کے پاس دودھ والا کوئی جانور جیسے بکری و بھینس وغیرہ ہے۔ وہ اس کو بیچنا چاہتا ہے اس جانور کی زیادہ قیمت وصول کرنے کے لئے وہ یہ کرتا ہے کہ بیچنے سے دو تین دن یا دو تین وقت پہلے اس جانور کا دودھ دوہتا نہیں بلکہ اس کے تھن میں چھوڑے رکھتا ہے تاکہ تھن میں زیادہ دودھ جمع ہو جائے اور خریدار یہ سمجھ کر کہ یہ جانور بہت زیادہ دودھ دینے والا ہے اس کی زیادہ قیمت دے دے! اس سے آپ ﷺ نے اس لئے منع فرمایا کہ یہ فریب دہی کا معاملہ ہے۔ اس ضمن میں آپ ﷺ نے جو مسئلہ بیان فرمایا اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر اور کوئی شخص ایسا جانور خرید لائے جس کا کئی دن یا کئی وقت کا دودھ اس کے تھن میں جمع رکھا گیا اور پھر اس کا دودھ دوہنے کے بعد معلوم ہو کہ یہ جانور کم دودھ دیتا ہے تو اسے اختیار حاصل ہوگا کہ چاہے تو اس

جانور کو واپس کر دے اور چاہے رکھ لے، مگر جب جانور کو واپس کرے تو اس کے ساتھ ایک صاع کھجوریں اس دودھ کے عوض میں دے جو اس نے دوہا ہے۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دودھ کے عوض میں ایک صاع کھجوروں کا تعین کیوں کیا گیا ہے جب کہ اس دودھ ہی کو واپس کر دینے یا اس دودھ کی قیمت دے دینے کا حکم بھی دیا جا سکتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خریدار نے اس جانور کا جو دودھ دوہا ہے اس میں کچھ حصّہ تو وہ ہوگا جو خریدار کی ملکیت میں آنے کے بعد جانور کے تھن میں پیدا ہوا ہے اور کچھ حصّہ وہ ہے جو جانور کی خریداری کے وقت اس کے تھن میں تھا اور جانور کے ساتھ اس دودھ کی بھی بیع ہوئی تھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں دودھ کے ان دونوں حصوں کا تعین وامتیاز ناممکن ہونے کی وجہ سے نہ تو دودھ واپس کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی قیمت ہی متعین کر کے دی جا سکتی ہے لہٰذا شارع نے اس کا حل یہ نکالا کہ طرفین میں فتنہ وفساد کے دفعیہ کے لئے ایسے دودھ کا عوض ایک صاع کھجوریں متعین کر دیں اور اس سلسلے میں دودھ کی کمی بیشی کو بنیاد نہیں بنایا، چنانچہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ شارع نے خون ناحق کی دیت یعنی قتل کا مالی معاوضہ ایک سو اونٹ مقرر کیا ہے۔ حالانکہ مراتب وحیثیت کے اعتبار سے ہر جان اور ہر خون یکساں نہیں ہوتا، لیکن اس بارے میں شریعت نے اس تفاوت کو بنیاد نہیں بنایا۔

اس حدیث پر امام شافعیؒ نے عمل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس طرح کے جانور کی بیع میں خیار (یعنی بیع کو فسخ کر دینے یا باقی رکھنے کا اختیار) حاصل ہوتا ہے، لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ اس میں خیار نہیں ہے۔ ان کے نزدیک حدیث میں مذکورہ بالا حکم متروک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم ربا کے حرام ہونے سے پہلے تھا جب کہ معاملات میں اس قسم کی چیزیں جائز تھیں اب یہ منسوخ ہو گیا ہے۔

حدیث کے آخری جملے "ایک صاع غلہ دے دے مگر گیہوں نہ دے" کے بارے میں علامہ ابن حجر شافعی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ جانور واپس کرتے ہوئے اس کے دودھ کے عوض میں کھجوروں کے علاوہ اور کچھ دینا جائز نہیں ہے، اگرچہ بیچنے والا کوئی بھی چیز لینے پر راضی ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کی غذا کا زیادہ تر تعلق کھجور اور دودھ ہی سے تھا اس لئے دودھ کی بجائے کھجور دینا مقرر کیا گیا۔ لیکن بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اگر بیچنے والا راضی ہو تو کھجور کے علاوہ اور کوئی چیز بھی دی جا سکتی ہے۔

(۱۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلَقَّوُا الْجَلَبَ فَمَنْ تَلَقَّاهُ فَاشْتَرٰى مِنْهُ فَاِذَا اَتٰى سَيِّدُهُ السُّوْقَ فَهُوَ بِالْخِيَارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم آگے جا کر غلہ وغیرہ لانے والے قافلے سے نہ ملو، اگر کوئی شخص جا کر ملا اور کچھ سامان خرید لیا اور پھر سامان کا مالک بازار میں آیا تو اس کو اختیار ہوگا (کہ چاہے بیع کو قائم رکھے چاہے فسخ کر دے)۔" (مسلم)

تشریح: لفظ جلب اور لفظ رکبان جو گذشتہ حدیث میں منقول تھا دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور ان کی وضاحت گذشتہ حدیث کی تشریح میں کی جا چکی ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ اس ممانعت کا تعلق اس صورت میں ہے جب کہ آنے والے بیوپاریوں سے راستے ہی میں خریداری کرنے کی وجہ سے اہل شہر کو نقصان وضرر پہنچے اور خریدار شہر وبازار کے نرخ کو پوشیدہ رکھ کر بیوپاریوں کو فریب دے، اور اگر اہل شہر کو نقصان وضرر نہ پہنچے، نیز نہ تو خریدار بیوپاریوں سے شہر کا نرخ چھپائے اور نہ ان کو فریب میں مبتلا کرے تو اس صورت میں یہ ممانعت نہیں ہوگی۔

حدیث میں جس "اختیار" کو ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں شافعیہ تو یہ کہتے ہیں کہ جب مالک (یعنی باہر سے مال لانے والا بیوپاری) شہر میں آئے اور اسے یہ معلوم ہو کہ خریدار نے اس شہر کی بہ نسبت سستا لیا ہے تو اس صورت میں اسے اختیار ہوگا کہ چاہے تو بیع کو فسخ کرے اپنا مال واپس لے لے اور چاہے بیع کو باقی رکھے۔ اور اگر اسے یہ معلوم ہو کہ خریدار نے شہر کے بھاؤ سے گراں لیا ہے یا شہر کے بھاؤ کے مطابق لیا ہے تو پھر اس صورت میں بیوپاری کو اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

اس مسئلے میں فقہ حنفی کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوپاری کو یہ اختیار اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ اسے شہر میں آنے کے بعد معلوم ہو کہ خریدار نے اس سے کھلا ہوا فریب کیا ہے، اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلَقَّوُا السِّلَعَ حَتّٰى يُهْبَطَ بِهَا اِلَى السُّوْقِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سامان (لانے والوں سے) ان کے شہر پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں جا کر نہ ملو اور اس وقت تک ان سے کوئی معاملہ نہ کرو جب تک کہ ان کا سامان بازار میں آکر نہ اتر جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

کسی کے معاملہ میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ

⑯ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبِيْعُ الرَّجُلُ عَلٰى بَيْعِ اَخِيْهِ وَلَا يَخْطُبُ عَلٰى اَخِيْهِ اِلَّا اَنْ يَّاذَنَ لَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نہ کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کے نکاح کے پیغام پر اپنے نکاح کا پیغام بھیجے الایہ کہ اس کو اس کی اجازت دے دی جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے" کی وضاحت حضرت ابوہریرہؓ کی روایت نمبر (۱۳) کے ضمن میں کی جا چکی ہے۔

حدیث کے دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص نے کسی عورت کے پاس اس سے اپنے نکاح کا پیغام بھیجا ہے۔ تو اب کسی دوسرے مرد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ بھی اس عورت کے پاس اپنا پیغام بھیج دے، مگر یہ ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ طرفین مہر کی ایک معین مقدار پر راضی ہو گئے ہوں، تمام معاملات طے ہو چکے ہوں اور صرف نکاح ہونا باقی رہ گیا ہو۔

حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے معاملات خرید و فروخت یا پیغام نکاح میں مداخلت نہ کرنے کا حکم اسی وقت تک کے لئے ہے جب تک کہ فریقین معاملے کو ترک نہ کر دیں مثلاً اگر صاحب معاملہ یہ کہہ دے کہ میں یہ چیز نہیں خرید رہا ہوں نیز تم خرید لو، یا اس عورت سے میں نکاح نہیں کروں گا تم اپنا پیغام بھیج دو تو اس صورت میں اس چیز کو خریدنا یا نکاح کا پیغام بھیجنا جائز ہوگا۔

⑰ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَسُمِ الرَّجُلُ عَلٰى سَوْمِ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے (یعنی کسی سے خرید و فروخت کا معاملہ ہو رہا ہو تو اس میں مداخلت نہ کرے اور چیز کے زیادہ دام نہ لگائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ بیچنے والا اور خریدار دونوں کسی ایک قیمت پر راضی ہو گئے ہوں، لہٰذا اب کسی اور کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو لینے کا ارادہ کرے اور زیادہ دام لگا کر ان کا معاملہ خراب کرے، ایسا کرنا مکروہ ہے اگرچہ بیع صحیح ہو جائے گی۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں "مسلمان" کے حکم میں ذمی (غیر مسلم جو اسلامی سلطنت میں رہے اور جزیہ ادا کرے) معاہد (جس سے کسی مسلمان کا معاہدہ ہو) اور مستامن (جو کسی مسلمان کے زیر پناہ ہو) بھی داخل ہیں۔

شہری آدمی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے

⑱ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ دَعُوا النَّاسَ يَرْزُقُ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ مِنْ بَعْضٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "شہری آدمی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو کہ

اللہ تعالیٰ کسی کے ذریعہ کسی کو رزق پہنچاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ دیہاتیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ باہر سے غلہ لاکر شہر میں سستے داموں فروخت کریں اور اس طرح وہ اہل شہر کے رزق میں وسعت و فراخی کا باعث بنیں۔ بقیہ حدیث کی وضاحت حضرت ابوہریرہؓ کی روایت (نمبر ۱۳) کی تشریح میں کی جاچکی ہے۔

بیع بلا صورت و منابذت کی ممانعت

⑲ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ لِبْسَتَیْنِ وَعَنْ بَیْعَتَیْنِ نَھٰی عَنِ الْمُلَامَسَةِ وَالْمُنَابَذَةِ فِی الْبَیْعِ وَالْمُلَامَسَةُ لَمْسُ الرَّجُلِ ثَوْبَ الْاٰخَرِ بِیَدِہٖ بِاللَّیْلِ اَوْ بِالنَّھَارِ وَلَا یَقْلِبُہٗ اِلَّا بِذٰلِكَ وَالْمُنَابَذَةُ اَنْ یَّنْبِذَ الرَّجُلُ اِلَی الرَّجُلِ بِثَوْبِہٖ وَیَنْبِذَ الْاٰخَرُ ثَوْبَہٗ وَیَکُوْنُ ذٰلِكَ بَیْعُھُمَا عَنْ غَیْرِ نَظَرٍ وَلَا تَرَاضٍ وَاللِّبْسَتَیْنِ اشْتِمَالُ الصَّمَّاءِ وَالصَّمَّاءُ اَنْ یَجْعَلَ ثَوْبَہٗ عَلٰی اَحَدِ عَاتِقَیْہِ فَیَبْدُوْ اَحَدُ شِقَّیْہِ لَیْسَ عَلَیْہِ ثَوْبٌ وَاللِّبْسَةُ الْاُخْرٰی اِحْتِبَاءُهٗ بِثَوْبِہٖ وَھُوَ جَالِسٌ لَیْسَ عَلٰی فَرْجِہٖ مِنْہُ شَیْءٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے دو طرح کے پہناوے سے اور دو طرح کی بیع سے منع کیا ہے وہ ملامست اور منابذت ہیں۔ ملامست یہ ہے کہ ایک شخص (یعنی خریدار) دوسرے شخص (یعنی تاجر) کے کپڑے کو (جسے وہ لینا چاہتا ہے) دن میں یا رات میں صرف ہاتھ سے چھولے اسے کھول، الٹ کر دیکھے نہیں اور اس کا یہ چھونا بیع کے لئے ہو۔ اور منابذت یہ ہے کہ معاملہ کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے کپڑے کو دوسرے کی طرف پھینک دے اور اس طرح بغیر دیکھے بھالے اور بغیر اظہار رضامندی کے بیع ہوجائے۔ اور جن دو طرح کے پہناوے سے منع فرمایا ہے ان میں سے ایک کپڑے کو صَمّاء کے طور پر پہننا ہے اور صَمّاء کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ایک مونڈھے پر اس طرح کپڑا ڈال لے کہ اس کی دوسری سمت کہ جس پر کپڑا نہ ہو ظاہر و برہنہ رہے اور دوسرا پہناوا (جس سے منع کیا گیا ہے) یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے گرد اس طرح کپڑا لپیٹ لے کہ جب وہ بیٹھے تو اس کی شرم گاہ اس کپڑے سے بالکل عاری ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ملامست" کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص کوئی چیز مثلاً کپڑا خریدنے جاتا تو کپڑے کو ہاتھ لگادیتا، کپڑے کو ہاتھ لگاتے ہی بیع ہوجاتی تھی نہ تو آپس میں قولی ایجاب و قبول ہوتا تھا کہ دوکاندار تو یہ کہتا کہ میں نے تمہارے ہاتھ یہ چیز بیچ دی اور خریدار یہ کہتا کہ میں نے تم سے یہ چیز خرید لی اور نہ فعلی لین دین (جسے اصطلاح فقہ میں تعاطی کہتے ہیں) ہوتا تھا کہ دوکاندار برضاء و رغبت خاموشی کے ساتھ وہ چیز دیتا اور خریدار اس کی قیمت ادا کردیتا بلکہ خریدار کا اس چیز کو ہاتھ سے چھو دینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔

علامہ طیبیؒ نے حدیث کے الفاظ لا یقلبہ الا بذالک (اسے کھول الٹ کر دیکھے نہیں الخ) کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "کپڑے کو علاوہ چھونے کے نہ الٹے نہ کھولے" یعنی چاہئے تو یہ کہ کپڑے کو کھولا جائے اور اچھی طرح دیکھا بھالا جائے مگر بیع ملامست کرنے والا نہ کھولتا تھا نہ اسے دیکھتا بھالتا تھا، البتہ صرف اسے چھولیتا تھا، ظاہر ہے کہ کسی چیز کو محض چھولینا اس کو الٹ کھول کر دیکھنے بھالنے کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔

بہرکیف "ملامست" ایام جاہلیت میں خرید و فروخت کا ایک خاص طریقہ تھا کہ جہاں ایک نے دوسرے کے کپڑے کو ہاتھ لگایا، بس بیع ہوگئی نہ وہ اس کو دیکھتے بھالتے تھے اور نہ شرط خیار کرتے تھے کہ اس کو دیکھنے کے بعد اگر چاہیں گے تو رکھ لیں گے نہیں تو واپس کردیں گے۔ چونکہ یہ ایک بالکل غلط طریقہ تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

منابذت کی صورت یہ ہوتی تھی کہ دونوں صاحب معاملہ نے جہاں آپس میں ایک دوسرے کی طرف کپڑا ڈالا بس بیع ہوگئی۔ مبیع کو دیکھنے بھالنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہ بھی ایام جاہلیت میں رائج بیع کا ایک طریقہ تھا لہٰذا اس کی ممانعت بھی فرمائی گئی۔

صَمَّاء کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ترجمے میں ظاہر کئے گئے لیکن اس کا زیادہ واضح اور مشہور مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص ایک کپڑا لے کر اسے سر سے پاؤں تک اپنے بدن پر اس طرح لپیٹ لے کہ دونوں ہاتھ بھی اس کے اندر لپٹے رہیں اور جسم کہیں سے کھلا نہ رہے، ظاہر ہے کہ اس طرح آدمی بالکل مفلوج و ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

دوسرا پہناوا جس سے آپ ﷺ نے منع فرمایا یہ ہے کہ کوئی شخص کولہوں پر بیٹھ جائے اور دونوں زانوں کو کھڑا کرے اور پھر اپنے زانوں اور کمر کے گرد کوئی کپڑا اس طرح لپیٹ لے کہ ستر کھلا رہے۔ آپ ﷺ نے اس سے اس لئے منع فرمایا کہ اس میں ستر کی پردہ پوشی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اگر کوئی شخص مذکورہ بالا صورت میں اس طرح کپڑا لپیٹے کہ اس کا ستر چھپا رہے تو پھر یہ ممانعت نہیں رہے گی۔

بطور نکتہ ایک بات ذہن میں رہے کہ زانوں کے گرد ہاتھوں کا حلقہ بنا کر بیٹھنا مسنون ہے۔

بیع حصاۃ اور بیع غرر کی ممانعت

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بیع حصاۃ اور بیع غرر سے منع فرمایا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "بیع حصاۃ" کی صورت یہ ہے کہ خریدار دوکاندار سے کہے کہ جب میں تیری اس چیز (یعنی مبیع) پر کنکری ماردوں تو سمجھ لینا کہ بیع واجب ہوگئی، یا دوکاندار خریدار سے کہے کہ میں نے اپنی چیزوں میں سے وہ چیز تمہیں بیچی جس پر تمہاری پھینکی ہوئی کنکری آکر گرے، یا میں نے یہ زمین وہاں تک تمہارے ہاتھ فروخت کی جہاں تک تمہاری پھینکی ہوئی کنکری جاکر گرے! بیع کا یہ طریقہ ایام جاہلیت میں رائج تھا آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

"بیع غرر" اس بیع کو کہتے ہیں جس میں مبیع (یعنی بیچی جانے والی چیز، مجہول یا بیچنے والے کے قبضہ وقدرت سے باہر ہو جیسے اس مچھلی کو بیچنا جو دریا میں ہو، یا ہوا میں اڑتے ہوئے جانور اور مفرور غلام کو بیچنا۔

بیع حبل الحبلہ کی ممانعت

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ حَبَلِ الْحَبَلَةِ وَكَانَ بَيْعًا يَتَبَايَعُهُ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ كَانَ الرَّجُلُ يَبْتَاعُ الْجَزُوْرَ اِلٰى اَنْ تُنْتَجَ النَّاقَةُ ثُمَّ تُنْتَجُ الَّتِیْ فِیْ بَطْنِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بیع حبل الحبلہ (یعنی جانور کا حمل) بیچنے سے منع فرمایا ہے (حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ بیع حبل الحبلہ ایام جاہلیت میں رائج ایک بیع تھی جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کوئی شخص اس وقت تک کے وعدے پر اونٹنی خریدتا تھا جب تک کہ اس کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو اور پھر اس بچے کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو (یعنی وہ اس وعدے پر اونٹنی خریدتا تھا کہ جب اس اونٹنی کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے کے پیٹ سے بچے پیدا ہوگا تب اس کی قیمت ادا کروں گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جانور کے حمل کے حمل کی بیع کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً ایک اونٹنی کے پیٹ میں بچہ ہے۔ اب اس کا مالک اس طرح خریدار سے معاملہ کرے کہ اس اونٹنی کے پیٹ سے جو اونٹنی پیدا ہوگی اور وہ اونٹنی جو بچہ دے گی اس کی بیع کرتا ہوں! اس سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ ایک معدوم چیز یعنی اس بچہ کی بیع ہے جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے ظاہر ہے کہ جب کسی جانور کے حمل ہی کو بیچنا جائز نہیں ہے تو اس بچہ کی بیع کیسے جائز ہو سکتی ہے جو اس حمل کے حمل سے پیدا ہوگا۔

بعض حضرات کے نزدیک "بیع حبل الحبلہ" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی حاملہ اونٹنی کو اس وعدے پر بیچے کہ اس کی قیمت اس وقت ادا ہوگی جب وہ بچہ جنے گی۔ حضرت ابن عمرؓ نے یہی مطلب مراد لیا ہے جیسا کہ روایت کے آخر میں و کان مبیعا الخ سے انہوں

نے خود اس کی وضاحت کی ہے۔

نر کو مادہ پر چھوڑنے کی اجرت لینے کی ممانعت

(۲۲) وَعَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے نر کو مادہ پر چھوڑنے کی اجرت وصول کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: نر جانور خواہ اونٹ ہو خواہ گھوڑا اور خواہ کوئی اور جانور اس کو مادہ پر چھوڑنے کے لئے کسی کو دینا اور اس کی اجرت وصول کرنا منع ہے کیونکہ اس میں ایک ایسے کام کی اجرت وصول کرنا لازم آتا ہے جس کا وقوع پذیر ہونا متیقن نہیں ہوتا۔ بایں طور کہ نر جانور کبھی تو جست کر جاتا ہے اور کبھی جست نہیں کرتا اسی طرح مادہ کبھی تو بار آور ہوتی ہے اور کبھی نہیں، اسی لئے اکثر صحابہؓ اور فقہاء نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ہاں نر جانور کو مادہ پر جست کرنے کے لئے عاریۃً دینا مستحب ہے۔ البتہ عاریۃً دینے کے بعد اگر مادہ کا مالک اپنی طرف سے اسے کچھ بطریق انعام دے تو اس کو قبول کر لینا درست ہے۔

پانی بیچنے کی ممانعت

(۲۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ ضِرَابِ الْجَمَلِ وَعَنْ بَيْعِ الْمَاءِ وَالْاَرْضِ لِتُحْرَثَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اونٹ کو جفتی کے لئے کرایہ پر دینے اور پانی و زمین کو کاشت کے لئے بیچنے سے منع فرمایا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "زمین و پانی کو کاشت کے لئے بیچنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین اور وہ پانی جو اس زمین سے متعلق ہو کسی شخص کو اس شرط کے ساتھ دے کہ یہ زمین پانی تو میرا ہے اور تخم اور محنت تمہاری ہے زمین کو جوتو بوؤ اس میں سے جو کچھ پیدا ہو گا اس کا اتنا حصہ مثلاً تہائی یا چوتھائی میں لے لوں گا اس کو "مخابرت" کہتے ہیں۔ مخابرت کے بارے میں تفصیلی حکم حضرت جابرؓ کی گذشتہ روایت (نمبر۲) کی تشریح میں بیان کی جا چکا ہے۔

ضرورت سے زائد پانی کو بیچنے کی ممانعت

(۲۴) وَعَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ فَضْلِ الْمَاءِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنی ضرورت سے زائد پانی کو بیچنے سے منع فرمایا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یعنی اگر کسی شخص کی ملکیت میں اتنا پانی ہو جو اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد بچ جائے اور دوسرے لوگ اس کے حاجت مند ہوں تو اس بچے ہوئے پانی کو روکنا اور ضرورت مند لوگوں کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ وہ پانی انہیں مفت ہی دے دینا چاہئے لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ ان لوگوں کی ضرورت کا تعلق اس پانی کو خود پینے یا جانوروں کو پلانے سے ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے کھیتوں یا درختوں کو سیراب کرنے کے لئے وہ پانی چاہے تو پھر مالک کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پانی کو بغیر معاوضے کے نہ دے۔

(۲۵) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُبَاعُ فَضْلُ الْمَاءِ لِيُبَاعَ بِهِ الْكَلَاءُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اپنی ضرورت سے زائد پانی کو نہ بیچو کہ اس کی وجہ سے گھاس کا بکنا لازم آئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: پانی کے بیچنے سے گھاس کا بکنا اس طرح لازم آتا ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی دوسرے شخص کے پانی کے گرد اپنے جانوروں کو

چرائے اور ظاہر ہے کہ وہ جانور چرنے کے بعد پانی ضرور پئیں گے لیکن چونکہ پانی کا مالک کسی دوسرے کے جانوروں کو بلا قیمت پانی پینے نہیں دیتا اس لئے لامحالہ وہ شخص اس بات کے لئے مجبور ہوگا کہ پانی خریدے اور اپنے جانوروں کو پلائے اس طرح پانی کا بیچنا در اصل گھاس کا بیچنا ہوگا اور یہ معلوم ہی ہے کہ گھاس بیچنی جائز نہیں ہے۔

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ ممانعت آیا تحریمی ہے یا تنزیہی؟ بعض تو تحریمی کے قائل ہیں اور بعض تنزیہی کے، لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ یہ ممانعت تنزیہی ہے۔

فریب دہی سے بچو

(۲۶) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی صُبْرَةِ طَعَامٍ فَاَدْخَلَ یَدَہٗ فِیْھَا فَنَالَتْ اَصَابِعُہٗ بَلَلًا فَقَالَ مَا ھٰذَا یَا صَاحِبَ الطَّعَامِ قَالَ اَصَابَتْہُ السَّمَاءُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَفَلَا جَعَلْتَہٗ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰی یَرَاہُ النَّاسُ۔ مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ ایک ڈھیر کے پاس سے گذرے اور اپنا ہاتھ اس ڈھیر میں داخل کیا تو آپ ﷺ کی انگلیوں کو کچھ تری محسوس ہوئی، آپ ﷺ نے فرمایا اے غلے کے مالک! یہ تری کیسی ہے یعنی ڈھیر کے اندر یہ تری کہاں سے پہنچی اور تم نے غلہ کو تر کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اس تک بارش کا پانی پہنچ گیا تھا (جس کی وجہ سے غلہ کا کچھ حصہ تر ہوگیا ہے میں نے قصداً تر نہیں کیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر تم نے غلہ کو اوپر کی جانب کیوں نہیں رکھا تاکہ لوگ اس کو دیکھ لیتے (اور کسی فریب میں مبتلا نہ ہوتے) یاد رکھو! جو شخص فریب دے وہ مجھ سے نہیں ہے (یعنی میرے طریقہ پر نہیں ہے)۔" (مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بیع ثنیا کی ممانعت

(۲۷) عَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنِ الثُّنْیَا اِلَّا اَنْ یُّعْلَمَ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بیع ثنیا یعنی استثناء کرنے سے منع فرمایا ہے الا یہ کہ مقدار متعین کردی جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: کوئی شخص اپنی کوئی چیز کسی کو بیچتے وقت یہ کہے کہ میں نے یہ چیز تمہارے ہاتھ بیچی مگر اس میں سے کچھ حصہ میں نے نہیں بیچا۔ پس مبیع میں سے کچھ حصہ کا استثناء کرنا ثنیا کہلاتا ہے، شارع نے اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں مقدار معین نہیں ہوتی۔ ہاں اگر مبیع کی کوئی مقدار معین کر کے مستثنیٰ کی جائے مثلاً بیچنے والا اس طرح کہے کہ میں نے تمہیں یہ چیز فروخت کی مگر اس کی اتنی مقدار جیسے چوتھائی یا تہائی اور یا اتنے سیر اتنے من میں نے اپنے لئے مستثنیٰ کرلیا ہے جو فروخت نہیں کررہا ہوں تو یہ جائز ہے۔

پھل اور کھیتی پکنے کے بعد ہی فروخت کی جائے

(۲۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ الْعِنَبِ حَتّٰی یَسْوَدَّ وَعَنْ بَیْعِ الْحَبِّ حَتّٰی یَشْتَدَّ ھٰکَذَا رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَ اَبُوْدَاوٗدَ

عَنْ اَنَسٍ وَالزِّیَادَةُ الَّتِیْ فِی الْمَصَابِیْحِ وَھِیَ قَوْلُہٗ نَھٰی عَنْ بَیْعِ التَّمْرِ حَتّٰی تَزْھُوَ اِنَّمَا ثَبَتَتْ فِیْ رِوَایَتِھِمَا عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَھٰی عَنْ بَیْعِ النَّخْلِ حَتّٰی تَزْھُوَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ

حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے انگور کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سیاہ نہ ہو جائے (یعنی پک نہ جائے) اسی طرح آپ ﷺ نے غلہ کو بھی اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سخت نہ ہو جائے (یعنی قابل انتفاع نہ ہو جائے) اس روایت کو ترمذیؒ اور ابوداؤد نے حضرت انسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور صاحب مصابیح نے اس روایت میں یہ الفاظ "آپ ﷺ نے کھجور کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ خوش رنگ نہ ہو جائے۔" جو مزید نقل کئے ہیں وہ ترمذیؒ وابوداؤد میں (حضرت انسؓ سے منقول نہیں ہیں بلکہ) حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہیں اور وہ بھی اس طرح ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ "آنحضرت ﷺ نے کھجور کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ خوش رنگ نہ ہو جائے" امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: روایت کے آخر میں مشکوۃ کے مؤلف نے مصابیح کے مؤلف حضرت امام بغویؒ پر دو اعتراض وارد کئے ہیں اول تو یہ کہ روایت میں مذکورہ بالا مزید الفاظ کا ناقل انہوں نے حضرت انسؓ کو بتایا ہے جب کہ یہ الفاظ حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہیں۔ دوم یہ کہ انہوں نے ان مزید الفاظ میں بیع التمر نقل کیا ہے جب کہ اصل روایت میں بیع النخل ہے۔

ادھار کو ادھار کے ساتھ بیچنے کی ممانعت

(۲۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ بَيْعِ الْكَالِیءِ بِالْكَالِیءِ۔ (رواہ الدار قطنی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ادھار کو ادھار کے ساتھ بیچنے سے منع فرمایا ہے۔" (دار قطنیؒ)

تشریح: لفظ "كالیء" ہمزہ کے ساتھ بھی لکھا پڑھا جاتا ہے اور بغیر ہمزہ یعنی "كالی" بھی استعمال ہوتا ہے دونوں "کلاء" سے مشتق ہیں جس کے معنی ہیں "تاخیر یا ادھار"۔

"ادھار کو ادھار کے ساتھ بیچنے" کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی سے کوئی چیز ایک متعین مدت کے وعدے پر خریدے اور یہ طے ہو جائے کہ خریدار اس چیز کی قیمت جب اگلے ماہ کی فلاں تاریخ کو ادا کرے گا تو بیچنے والا وہ چیز اسے دے دے گا مگر جب وہ متعین تاریخ آجائے اور اس وقت بھی خریدار قیمت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو بیچنے والے سے یہ کہے کہ اب اس چیز کو ایک اور مدت کے لئے کچھ زیادہ قیمت پر فروخت کر دو مثلاً اس نے وہ چیز دس روپے میں خریدی تھی اب یہ کہے کہ اسی چیز کو گیارہ روپے میں بیچ دو میں اگلے ماہ کی فلاں تاریخ کو گیارہ روپے ادا کر دوں گا۔ بیچنے والا کہے کہ میں نے بیچ دی، اس طرح یہ معاملہ آپس کے قبضہ کے بغیر طے ہو جائے کہ نہ تو بیچنے والا مبیع دے اور نہ خریدار اس کی قیمت ادا کرے بلکہ مبیع بیچنے والے کے پاس رہے اور قیمت خریدار کے پاس اور خرید و فروخت کا معاملہ طے ہو جائے۔ اس طرح کی بیع کرنے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا کیونکہ یہ ایک ایسی بیع ہے جس میں قبضہ حاصل نہیں ہوتا۔

بعض حضرات نے اس کی ایک دوسری صورت یہ بیان کی ہے کہ مثلاً عمرو کے پاس زید کا ایک کپڑا ہے اور عمرو ہی کے ذمہ بکر کے دس روپے ہیں اب زید بکر سے یہ کہے کہ عمرو کے پاس میرا جو کپڑا ہے اسے میں تمہارے ہاتھ ان دس روپوں کے عوض کہ جو تمہارے عمرو کے ذمہ ہیں بیچتا ہوں میں عمرو سے دس روپے لے لوں گا تم اس سے کپڑا لے لینا اور بکر کہے کہ مجھے یہ منظور ہے۔ یہ بیع بھی ناجائز ہے کیونکہ اس میں بھی قبضہ حاصل نہیں ہوتا۔

بیعانہ یا سائی کا مسئلہ

(۳۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْعُرْبَانِ۔

(رواہ مالک وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا ہے۔"

(مالکؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "بیع عربان" کی وضاحت یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی سے کوئی چیز خریدے اور بیچنے والے کو کچھ رقم پیشگی دے دے اور یہ طے کر دے کہ اگر یہ معاملہ مکمل ہو گیا تو یہ رقم قیمت میں مجرا ہو جائے گی اور اگر معاملہ نہ ہوا بایں طور کہ میں پوری قیمت ادا کر کے اس چیز کو اپنے قبضے میں نہ لے سکا تو پھر یہ رقم تمہارے ہی پاس رہے گی میں اسے واپس نہ لوں گا۔ اسے ہماری زبان میں بیعانہ یا سائی کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ شرعی طور پر یہ بیع باطل ہے لیکن حضرت ابن عمرؓ اور امام احمدؒ اس کے جواز کے قائل ہیں، حنفیہ کے ہاں یہ اس صورت میں جائز ہے جب کہ یہ طے ہو کہ اگر معاملہ مکمل ہو جائے تو وہ رقم بیچنے والے کا حق ہو بایں طور کہ وہ قیمت میں مجرا ہو جائے اور اگر معاملہ مکمل نہ ہوا تو پھر وہ خریدار ہی کا حق رہے کہ وہ رقم اسے واپس مل جائے۔

بیع مضطر کی ممانعت

(۳۱) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْمُضْطَرِّ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ وَعَنْ بَيْعِ الثَّمَرَةِ قَبْلَ اَنْ تُدْرِكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بیع مضطر سے، بیع غرر سے اور پختہ ہونے سے پہلے پھلوں کی "بیع" سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "بیع مضطر" میں "بیع" سے مراد خریدنا ہے یعنی آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کسی سے زبردستی کچھ خریدا جائے، کسی سے زبردستی خریدنا بیع فاسد کے حکم میں ہے جو منعقد و نافذ نہیں ہوتی۔

یا پھر "مضطر" سے مراد "محتاج" ہے جو کسی مصیبت کی وجہ سے اپنا سامان بیچنے پر مجبور ہو مثلاً زید کسی کا قرض دار ہے اور قرض کی ادائیگی کے لئے اسے روپے چاہئیں یا اس پر کوئی مصیبت آپڑی ہے جس کی وجہ سے اسے روپیوں کی شدید ضرورت ہے اور وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے اپنے مال و اسباب میں سے کوئی چیز سستے داموں فروخت کر رہا ہو تو کسی کے لئے مناسب نہیں ہے۔ کہ وہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے اور اس کا سامان سستے داموں خریدے بلکہ مروت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس مجبور و مضطر کی مجبوری کا خیال کیا جائے۔ اس کا مال سستے داموں نہ خریدا جائے اور ایسے موقع پر اس کی اس طرح مدد کی جائے کہ یا تو اسے کچھ رقم بطور قرض دے دی جائے یا اس کا مال اصل قیمت کے عوض خریدا جائے۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ اس صورت میں بیع فاسد نہیں ہوگی بلکہ صحیح ہوگی لیکن کراہت کے ساتھ صحیح ہوگی، بیع غرر کی وضاحت اسی باب کے گذشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے۔ اسی طرح پختہ ہونے سے قبل پھلوں کی بیع کا مسئلہ بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

نر کو مادہ پر چھوڑنے کی اجرت لینا ممنوع ہے

(۳۲) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً مِنْ كِلَابٍ سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ فَنَهَاهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نُطْرِقُ الْفَحْلَ فَنُكْرَمُ فَرَخَّصَ لَهُ فِي الْكَرَامَةِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ قبیلہ کلاب میں سے ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے مادہ پر چھوڑنے کے لئے نر کو اجرت پر دینے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے اس کو منع فرمایا (کہ اجرت نہ لو) پھر اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم نر کو عاریۃً دیتے ہیں اور ہمیں اس سلسلے میں بطور انعام کچھ دیا جاتا ہے (یعنی ہم کوئی اجرت مقرر کر کے اپنا نر جانور نہیں دیتے بلکہ عاریۃً دیتے ہیں مگر جانور لے

جانے والالالا طلب ہمیں بطور انعام کچھ دیتا ہے تو کیا ہم پھر بھی نہ لیں) آنحضرت ﷺ نے اسے انعام لے لینے کی اجازت عطا فرمائی۔"
(ترمذی)

جو چیز اپنے پاس نہ ہو اس کی بیع نہ کرو

(۳۳) وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ نَهَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَبِيْعَ مَالَيْسَ عِنْدِيْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ - وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ وَلِاَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ يَاْتِيْنِي الرَّجُلُ فَيُرِيْدُ مِنِّي الْبَيْعَ وَلَيْسَ عِنْدِيْ فَاَبْتَاعُ لَهُ مِنَ السُّوْقِ قَالَ لَاتَبِعْ مَالَيْسَ عِنْدَكَ۔

"اور حضرت حکیم ابن حزامؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے اس سے منع کیا کہ میں اس چیز کو نہ بیچوں جو میرے پاس نہیں۔"
(ترمذی)

"ترمذی، ابوداؤدؒ اور نسائیؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت حکیمؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ایک شخص میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے ایک ایسی چیز خریدنے کا ارادہ کرتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی تو میں اس چیز کو بازار سے خرید لاتا ہوں (یعنی میں اس چیز کا معاملہ اس سے کر لیتا ہوں پھر وہ چیز بازار سے خرید لاتا ہوں اور اس شخص کے حوالے کر دیتا ہوں) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "تم کسی ایسی چیز کو نہ بیچو جو تمہارے پاس نہیں ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو چیز خرید و فروخت کا معاملہ کرتے وقت اپنی ملکیت میں نہ ہو اسے نہیں بیچنا چاہئے، اب اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اول تو یہ کہ وہ چیز نہ تو اپنی ملکیت میں ہو اور نہ اپنے پاس موجود ہی ہو) اس صورت میں تو اس چیز کی بیع صحیح ہی نہیں ہوگی دوم یہ کہ وہ اپنی ملکیت میں نہیں ہے ایک دوسرا شخص اس کا مالک ہے لیکن ہے اپنے ہی پاس، اس صورت میں بھی مالک کی اجازت کے بغیر اس کی بیع نہیں کرنی چاہئے۔ اور اگر مالک کی اجازت لینے سے پہلے ہی اس کی بیع کر دی جائے گی تو حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کے مسلک کے مطابق وہ بیع مالک کی منظوری پر موقوف رہے گی، اگر منظوری دے دے گا تو صحیح ہو جائے گی، نہیں تو کالعدم ہو جائے گی، لیکن حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وہ بیع سرے سے صحیح ہی نہیں ہوگی مالک خواہ منظوری دے یا نہ دے۔

پہلی صورت کے حکم میں اس چیز کی بیع داخل ہے جس پر قبضہ حاصل نہ ہوا ہو یا وہ چیز گم ہو گئی ہو، یا مفرور ہو جیسے غلام وغیرہ اور یا اس کو خریدار کے حوالے کرنے پر قادر نہ ہو، جیسے ہوا میں اڑتا ہوا جانور اور وہ مچھلی جو ابھی پانی (یعنی دریا وغیرہ سے نہ نکالی گئی ہو) لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ ممانعت "بیع السلم" کے علاوہ صورت میں ہے کیونکہ بیع السلم متعینہ و معروف شرائط کے ساتھ بالاتفاق تمام علماء کے نزدیک جائز ہے، بیع السلم اور اس کی شرائط کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ باب السلم میں کیا جائے گا۔

ایک بیع میں دو بیع نہ کرو

(۳۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ۔ (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (مالکؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "ایک بیع میں دو بیع" کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ کوئی شخص کسی سے یوں کہے کہ مثلاً میں اپنی بھینس ایک ہزار روپیہ کے عوض تمہارے ہاتھ بیچتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنا گھوڑا پانچ سو روپے کے عوض میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ اس طرح کی بیع درست نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں اپنا گھوڑا تمہارے ہاتھ پانچ سو روپے نقد میں اور سات سو روپے ادھار

میں بیچتا ہوں۔ یہ بھی ناجائز ہے بشرطیکہ کوئی ایک امر طے نہ ہو اور خریدار کو اختیار حاصل رہے کہ چاہے تو اسی وقت پانچ سو روپے دے کر گھوڑا لے لے اور چاہے بعد میں سات سو روپے دے۔ اور اگر ایک امر طے ہو جائے اور معاملہ مجمل نہ رہے یعنی یہ اسی وقت طے ہو جائے کہ نقد لیا یا ادھار لیا تو پھر یہ معاملہ درست ہو گا۔

(۳۵) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ صَفْقَةٍ وَّاحِدَةٍ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد (شعیبؒ) سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ ابن عمرؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک معاملے میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: یہ حدیث اور اوپر کی حدیث ہم معنی ہیں جو تشریح اوپر کی حدیث میں کی گئی ہے وہی اس حدیث کی بھی ہے۔

بیع کو قرض کے ساتھ نہ ملاؤ

(۳۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ وَلَا شَرْطَانِ فِيْ بَيْعٍ وَلَا رِبْحُ مَالَمْ يُضْمَنْ وَلَا بَيْعُ مَالَيْسَ عِنْدَكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ ناقل ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قرض اور بیع (ایک دوسرے سے متعلق کر کے) حلال نہیں، بیع میں دو شرطیں کرنی درست نہیں، اس چیز سے نفع اٹھانا درست نہیں جو ابھی اپنے ضمان (قبضہ) میں نہیں آئی، اور اس چیز کو بیچنا جائز نہیں جو تمہارے پاس (یعنی تمہاری ملکیت میں) نہیں ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے)

تشریح: "قرض اور بیع حلال نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ قرض اور بیع کے دو الگ الگ معاملوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک نہ کرنا چاہئے مثلاً کوئی شخص کسی کے ہاتھ اس شرط کے ساتھ کوئی چیز بیچے کہ تم مجھے اتنے روپے قرض دینا۔ یہ جائز نہیں ہے یا یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ مثلاً کوئی شخص کسی کو کچھ روپے بطور قرض دے اور اسی کے ساتھ اپنی کوئی چیز اس قرض دار کے ہاتھ اصل قیمت سے زائد پر بیچے۔ یہ حرام ہے، کیونکہ اس صورت میں ظاہر ہے کہ خریدار اس چیز کی زائد قیمت محض اس لئے ادا کرے گا کہ اس نے بیچنے والے سے قرض لیا ہے اور یہ بالکل صاف مسئلہ ہے کہ جو بھی قرض کوئی نفع حاصل کرے وہ حرام ہے، چونکہ یہ سود خواروں کا نکالا ہوا ایک حیلہ ہے اس لئے اس سے اجتناب ضروری ہے۔

"بیع میں دو شرطیں کرنی درست نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ ایک بیع میں دو بیع نہ کرے جس کی وضاحت اوپر کی حدیث میں کی جا چکی ہے۔ لیکن بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیچنے والا اپنی کوئی چیز دو شرطوں کے ساتھ نہ بیچے مثلاً وہ خریدار سے یوں کہے کہ میں نے یہ کپڑا تمہارے ہاتھ دس روپے میں بیچا بایں شرط کہ میں اس کپڑے کو دھلوا بھی دوں گا۔ یہ ناجائز ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ حدیث میں دو شرطوں کی قید محض اتفاقی ہے ویسے بیع میں ایک شرط بھی جائز نہیں ہے۔

"اس چیز سے نفع اٹھانا جو ابھی اپنے ضمان میں نہیں آئی" کا مفہوم یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص نے کسی سے کوئی چیز خریدی مگر وہ چیز ابھی خریدار کے قبضے میں نہیں آئی ہے اس عرصے میں بیچنے والے نے اس چیز کا کرایہ وصول کیا، اب اگر خریدار چاہے کہ یہ چیز چونکہ میں نے خریدی ہے، اس لئے میری خریداری کے بعد اس چیز کو جو کرایہ بیچنے والے کی ذمہ داری میں ہے فرض کیجئے اگر وہ چیز ضائع ہو جاتی ہے تو اس کا نقصان بیچنے والے ہی کو برداشت کرنا ہو گا۔ خریدار کا کچھ بھی نہ جائے گا۔ اسی طرح اگر اس چیز سے کوئی نفع حاصل ہوا ہے تو وہ بھی بیچنے والے ہی کا حق ہے خریدار کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔

ادائیگی قیمت میں سکہ کی تبدیلی جائز ہے

(۳۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنْتُ اَبِيْعُ الْاِبِلَ بِالنَّقِيْعِ بِالدَّنَانِيْرِ فَاٰخُذُ مَكَانَهَا الدَّرَاهِمَ وَاَبِيْعُ بِالدَّرَاهِمِ فَاٰخُذُ مَكَانَهَا الدَّنَانِيْرَ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ لَا بَاْسَ اَنْ تَاْخُذَهَا بِسِعْرِ يَوْمِهَا مَالَمْ تَفْتَرِقَا وَبَيْنَكُمَا شَيْءٌ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نقیع میں (جو مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے) اونٹوں کو دیناروں کے عوض بیچا کرتا تھا اور دیناروں کے بدلے درہم لے لیا کرتا تھا اسی طرح جب اونٹوں کو درہم کے عوض بیچا تو درہم کے بدلے دینار لے لیا کرتا تھا۔ پھر (جب) میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے (کہ تم دینار کے بدلے درہم اور درہم کے بدلے دینار لے لو) جب کہ نرخ اس دن کے مطابق ہو اور تم دونوں ایک دوسرے سے اس حال میں جدا ہو کہ تمہارے درمیان کوئی چیز نہ ہو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "درہم اور دینار" دو سکوں کے نام ہیں۔ درہم چاندی کا ہوتا ہے اور دینار سونے کا۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی سے کوئی چیز روپے کے عوض خریدے اور روپے کے بدلے اشرفیاں دے دے یا کوئی چیز اشرفیوں کے عوض خریدے اور اشرفیوں کے بدلے روپے دے دے تو جائز ہے۔

"اس دن کے نرخ" کی قید استحبابی ہے یعنی مستحب و مناسب یہ ہے کہ اس دن کے نرخ کا لحاظ رکھا جائے ورنہ تو جہاں تک فقہی مسئلہ کا تعلق ہے یہ جائز ہے کہ جس نرخ سے چاہے لے۔

"تمہارے درمیان کوئی چیز نہ ہو" میں "کوئی چیز سے مراد" مبیع یا قیمت اور یا دونوں پر قبضہ نہ ہونا ہے مطلب یہ ہے کہ درہم و دینار کو آپس میں بدلنا بایں شرط جائز ہے جس مجلس میں خرید و فروخت کا معاملہ ہو اسی مجلس میں فریقین اپنی اپنی چیز پر قابض ہو جائیں تاکہ اس کے برخلاف ہونے کی صورت میں نقد کی بیع ادھار کے ساتھ لازم نہ آئے جو ربوٰ کی ایک شکل ہونے کی وجہ سے حرام ہے، چنانچہ حضرت شیخ علی متقیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ جب مکہ معظمہ میں اپنے خادم کو بازار بھیجتے تو اسی حدیث کے پیش نظر اسے بطور خاص یہ نصیحت کرتے کہ خبردار! باہمی قبضہ کرنے میں معاملہ دست بدست کرنا، درمیان میں فرق واقع نہ ہو۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ درہم (سکہ خلقی ہونے کی وجہ سے) چونکہ غیر متعین ہے اس لئے اگر کوئی شخص دو کاندار کو ایک درہم دکھا کر کہے کہ اس کے عوض فلاں چیز میرے ہاتھ بیچ دو اور پھر جب دو کاندار وہ چیز اسے بیچ دے تو اس درہم کی بجائے دوسرا درہم دے دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ دونوں درہم مالیت میں یکساں ہوں۔

آپ ﷺ سے متعلق ایک بیعانہ کا ذکر

(۳۸) وَعَنِ الْعَدَّاءِ بْنِ خَالِدِ بْنِ هَوْذَةَ اَخْرَجَ كِتَابًا هٰذَا مَا اشْتَرَى الْعَدَّاءُ بْنُ خَالِدِ بْنِ هَوْذَةَ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْتَرٰى مِنْهُ عَبْدًا اَوْ اَمَةً لَا دَاءَ وَلَا غَائِلَةَ وَلَا خِبْثَةَ بَيْعُ الْمُسْلِمِ الْمُسْلِمَ۔ رواه الترمذي وقال هٰذا حديثٌ غريبٌ۔

"اور حضرت عداء ابن خالد ابن ہوذہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک تحریر نکال کر دکھائی جس میں یہ لکھا تھا کہ "یہ بیع نامہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور عداء بن خالد بن ہوذہ کی خریداری سے متعلق ہے۔ عداء نے محمد ﷺ سے ایک غلام یا لونڈی خریدی، جس میں کوئی بیماری نہیں ہے کوئی بدی نہیں ہے اور کوئی برائی نہیں ہے، عداء نے اس کو اس طرح خریدا ہے جس طرح ایک مسلمان ایک مسلمان سے خریدتا ہے۔" (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریح: "ایک غلام یا لونڈی خریدی" میں لفظ "یا" راوی کے شک کو ظاہر کر رہا ہے، یعنی حدیث کے کسی راوی کو شک ہوا ہے کہ اس بیع نامہ میں غلام لکھا ہوا تھا یا لونڈی؟

"جس میں کوئی بیماری نہیں ہے" میں بیماری سے مراد جنون، جذام اور کوڑھ جیسے موذی امراض ہیں۔ اسی طرح "کوئی بدی نہیں ہے" میں بدی سے مراد وہ عیب ہے جو خریدار کے مال کے نقصان وہلاکت کا باعث بنے جیسے غلام کا چور ہونا یا بھگوڑا ہونا۔

"اور کوئی برائی نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کی خلقت وجبلت میں ایسی کوئی برائی نہیں ہے جس سے بڑے اور غلط اخلاق وافعال پیدا ہوں جیسے اس کا ولد الزنا ہونا یا فاسق یا جھوٹا اور یا جواری ہونا۔

آخری جملے "ایک مسلمان ایک مسلمان سے خریدتا ہے" سے رعایت وخیر خواہی اور حقوق اسلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کا یہ تقاضہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ہاتھ ہر معاملہ وعقد میں رعایت وخیر خواہی، مروت وہمدردی اور ان حقوق کا جو ایک مسلمان کے تئیں دوسرے مسلمان پر عائد ہوتے ہیں پورا پورا لحاظ رکھے، بہر کیف مذکورہ بالا تحریر کا حاصل یہ ہوا کہ یہ غلام اچھا ہے اس میں کوئی عیب نہیں ہے، اور خرید وفروخت کے اس معاملہ میں فریقین نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی دغا اور فریب نہیں کیا ہے۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو غریب کہا ہے کیونکہ یہ حدیث عباد ابن لیث کی سند کے علاوہ کسی سند سے ثابت نہیں ہے، نیز محدثین کے نزدیک عباد، روایت حدیث میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے بعد کوئی بیع نہیں کی ہے اور اگر آپ ﷺ نے کوئی بیع کی ہے تو وہ شاذ ونادر کے درجے کی چیز ہے ہاں ہجرت سے پہلے آپ ﷺ بیع وشراء دونوں کرتے تھے۔

بخاری میں یہ حدیث یوں ہے۔ هٰذَا مَا اشْتَرٰى مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ عَدَّاءِ بْنِ خَالِدٍ (یعنی یہ بیع نامہ ہے جو عداء ابن خالد سے محمد رسول ﷺ کی خریداری سے متعلق ہے) گویا بخاری کی روایت سے یہ معلوم ہوا کہ خریدار تو آنحضرت ﷺ تھے اور بیچنے والے عداء ابن خالدؓ جب کہ یہاں جو روایت نقل کی گئی ہے وہ اس کے برعکس ہے کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عداء ابن خالدؓ خریدار تھے اور آنحضرت ﷺ بیچنے والے۔

بطریق نیلام بیع جائز ہے

(۳۹) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَاعَ حِلْسًا وَقَدَحًا فَقَالَ مَنْ يَّشْتَرِيْ هٰذَا الْحِلْسَ وَالْقَدَحَ فَقَالَ رَجُلٌ اٰخُذُهُمَا بِدِرْهَمٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّزِيْدُ عَلٰى دِرْهَمٍ فَاَعْطَاهُ رَجُلٌ دِرْهَمَيْنِ فَبَاعَهُمَا مِنْهُ۔

(رواه الترمذی وابوداؤد وابن ماجة)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ بیچنے لگے تو فرمایا کہ اس ٹاٹ اور پیالہ کا خریدار کون ہے؟ (جو خریدنا چاہتا ہو وہ اس کی قیمت لگائے) ایک شخص نے عرض کیا کہ "میں ان دونوں چیزوں کو ایک درہم کے عوض لے سکتا ہوں"۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ "ایک درہم سے زیادہ قیمت دینے والا کوئی ہے؟ چنانچہ ایک دوسرے شخص نے آپ ﷺ کو دو درہم پیش کئے اور آپ ﷺ نے وہ دونوں چیزیں اس شخص کے ہاتھ دو درہم کے عوض فروخت کر دیں۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس بیع کا اصل واقعہ یوں ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ کے سامنے دست سوال دراز کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ ﷺ اسے کچھ عنایت فرما دیں تاکہ وہ اپنا پیٹ بھر سکے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ سامان بھی ہے؟ اس نے عرض کیا کہ "جی نہیں میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے ہاں ٹاٹ کا ایک ٹکڑا اور ایک پیالہ ضرور پڑا ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

پھر ان دونوں چیزوں کو بیچ دو اور اس کی قیمت کے طور پر جو کچھ وصول ہو اس سے اپنا پیٹ بھرو اس کے بعد جب تمہارے پاس کچھ بھی نہ رہ جائے تب صدقہ وخیرات مانگو، چنانچہ وہ شخص دونوں چیزیں لے آیا اور آپ ﷺ نے مذکورہ بالا طریقے پر (گویا بصورت نیلام) ان چیزوں کو فروخت فرمایا۔ بیع کی صورت کو عربی میں "بیع من یزید" اور "حراج" کہتے ہیں شرعی طور پر یہ بیع درست ہے۔

اب رہی یہ بات کہ شارع نے چونکہ اس سے منع کیا ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی چیز کے دام نہ لگائے جس کے دام کسی دوسرے شخص کی جانب سے لگ رہے ہوں، تو بیع کی یہ صورت کیسے جائز ہوگی؟ تو اس بارے میں سمجھ لینا چاہئے کہ دام پر دام لگانے کی ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ بیچنے والا اور خریدار دونوں ہی کسی ایک دام پر راضی ہو گئے ہوں اور معاملہ طے پا گیا ہو، ایسی صورت میں اب کسی دوسرے شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس بیع میں مداخلت کرے اور اپنی طرف سے بھی دام لگانے لگے، لیکن یہاں بیع کی جو صورت ذکر کی گئی اس کی نوعیت بالکل دوسری ہے، اس بیع میں تو بیچنے والے کا ارادہ ہی یہ ہوتا ہے کہ جو سب سے زیادہ دام لگائے گا اسی کو چیز دی جائے گی چنانچہ نیلام میں یہی ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر دام لگاتے رہتے ہیں، جس شخص کی آخری بولی ہوتی ہے اسی کے ہاتھ چیز بیچ دی جاتی ہے۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ معاملات یعنی بیچنے والے کا چیز دینا اور خریدار کا قیمت دے دینا کافی ہے اگرچہ وہ دونوں منہ سے کچھ نہ کہیں یعنی زبانی ایجاب وقبول نہ ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عیب دار چیز دھوکہ سے بیچنے والے کے لئے وعید

(۴۰) عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُنَبِّهْهُ لَمْ يَزَلْ فِیْ مَقْتِ اللّٰهِ اَوْلَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهٗ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت واثلہ ابن اسقعؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول کریم ﷺ فرماتے تھے کہ جو شخص کسی عیب دار چیز کو اس طرح بیچے کہ "اس کے عیب سے خریدار کو مطلع نہ کرے تو وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں رہتا ہے۔ یا یہ فرمایا کہ اس پر فرشتے ہمیشہ لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔" (ابن ماجہؒ)

باب

گذشتہ باب کے متعلقات کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

پھلدار درخت کی بیع کا مسئلہ

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ ابْتَاعَ نَخْلًا بَعْدَ اَنْ تُؤَبَّرَ فَثَمَرَتُهَا لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ يَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ وَمَنِ ابْتَاعَ عَبْدًا وَلَهٗ مَالٌ فَمَالُهٗ لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ يَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَ رَوَى الْبُخَارِیُّ الْمَعْنَى الْاَوَّلَ وَحْدَهٗ۔

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر کسی شخص نے تابیر کئے ہوئے کھجور کا درخت خریدا تو اس کا پھل بیچنے والے کا ہے الا یہ کہ خریدنے والا پھل مشروط کر دے، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی ایسا غلام خریدا جس کے پاس مال ہو تو اس کا وہ مال بیچنے والے

کا ہے۔ (مسلم) بخاری نے اس حدیث کا صرف پہلا جزو یعنی من ابتاع نخلا نقل کیا ہے۔"

تشریح: "تابیر" کی صورت یہ ہے کہ کھجور کے نر درخت کا پھول، کھجور کے مادہ درخت میں رکھدیتے ہیں، عربوں کا اعتقاد تھا کہ اس وجہ سے زیادہ پھل پیدا کرتا ہے۔

حدیث بالا میں ایسے ہی درخت کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص تابیر کیا ہوا درخت خریدے اور خریداری کے وقت اس درخت پر پھل لگے ہوئے ہوں تو وہ بیچنے والے کے ہوتے ہیں ہاں اگر خریدار خریداری کے وقت یہ طے کرے کہ میں اس درخت کو اس کے پھل سمیت خریدتا ہوں تو پھر وہ پھل خریدار کے ہوں گے۔ حنفیہ کے نزدیک بغیر تابیر کئے ہوئے درخت کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ بغیر تابیر کئے ہوئے درخت کا پھل بیع میں شامل نہیں ہے بلکہ یہ میرے ہوں گے تو پھر اس صورت میں وہ بیچنے والے کے ہوتے ہیں۔

غلام چونکہ کسی مال کا مالک نہیں ہوتا اس لئے حدیث میں اس کی طرف مال کی ملکیت کی نسبت ظاہر کے اعتبار سے ہے کہ اگر بیع کے وقت اس کے ہاتھ میں کوئی مال ہو تو وہ مال بیچنے والے کا ہے۔ ہاں اگر خریدار اس مشروط طریقہ پر اسے خریدے کہ غلام کی خریداری میں یہ مال بھی شامل ہے جو اس کے ہاتھ میں ہے تو اس صورت میں وہ مال خریدار کا ہوگا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غلام کی بیع کے وقت وہ کپڑے جو اس کے جسم پر ہوں بیع میں داخل نہیں ہوتے الا یہ کہ خریدار ان کپڑوں سے بیع کو مشروط کر دے، حنفیہ کے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ کپڑے بیع میں داخل ہوتے ہیں، بعض علماء کا یہ قول ہے کہ صرف اسی قدر بیع میں داخل ہوتے ہیں جو ستر پوشی کے لئے کافی ہوں۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ حدیث کے ظاہر مفہوم کے مطابق اس کا کوئی بھی سامان اور سامان (یعنی کپڑے وغیرہ) کا کوئی بھی حصہ بیع میں داخل نہیں ہوتا۔

مشروط بیع کا مسئلہ

(۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ كَانَ يَسِيْرُ عَلٰى جَمَلٍ لَهٗ قَدْ اَعْيٰى فَمَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهٖ فَضَرَبَهٗ فَسَارَ سَيْرًا لَيْسَ يَسِيْرُ مِثْلَهٗ ثُمَّ قَالَ بِعْنِيْهِ بِوُقِيَّةٍ قَالَ فَبِعْتُهٗ فَاسْتَثْنَيْتُ حُمْلَانَهٗ اِلٰى اَهْلِيْ فَلَمَّا قَدِمْتُ الْمَدِيْنَةَ اَتَيْتُهٗ بِالْجَمَلِ وَ نَقَدَنِيْ ثَمَنَهٗ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَاَعْطَانِيْ ثَمَنَهٗ وَرَدَّهٗ عَلَيَّ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ اَنَّهٗ قَالَ لِبِلَالٍ اِقْضِهٖ وَزِدْهُ فَاَعْطَاهُ وَزَادَهٗ قِيْرَاطًا۔

"اور حضرت جابرؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ وہ (ایک سفر کے دوران جب کہ وہ مدینہ آرہے تھے) اپنے اونٹ پر سوار چل رہے تھے اور وہ (اتنا) تھک گیا تھا (کہ چلنے سے معذور ہو رہا تھا) چنانچہ رسول کریم ﷺ جب جابرؓ کے قریب سے گذرے تو آپ ﷺ نے ان کے اونٹ کو لکڑی سے یا اس چابک سے جو آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھا) مارا پھر تو وہ (آپ ﷺ کے دست مبارک کی برکت سے) اتنی تیز رفتاری سے چلا کہ پہلے کبھی اتنی تیز رفتاری سے نہ چلا تھا، پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت جابرؓ سے فرمایا کہ تم اس اونٹ کو میرے ہاتھ ایک وقیہ کے عوض بیچ دو! حضرت جابرؓ نے کہا کہ میں نے یہ اونٹ آپ ﷺ کے ہاتھ بیچ دیا لیکن میں اپنے گھر تک اس پر سواری کو مستثنیٰ کرتا ہوں یعنی میں اس شرط کے ساتھ اس کو فروخت کرتا ہوں۔ کہ اپنے گھر تک اسی اونٹ پر سوار ہو کر جاؤں گا۔ چنانچہ (حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) جب میں مدینہ آیا تو وہ اونٹ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے مجھے اس کی قیمت عطا فرمادی۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے قیمت عطا فرمائی اور اونٹ واپس کر دیا یعنی اس کی قیمت بھی دی اور اونٹ بھی عطا فرمادیا (بخاری و مسلم)۔ بخاریؒ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب حضرت جابرؓ نے آپ ﷺ کو اونٹ دیا تو" آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ جابرؓ کو اونٹ کی قیمت دے دو کچھ زیادہ بھی دے دو، چنانچہ حضرت بلالؓ نے انہیں اونٹ کی قیمت بھی دی، در

ایک قیراط (جو درہم کا چھٹا حصہ ہوتا تھا) زیادہ بھی دیا۔"

تشریح: وقیہ کہ جسے اوقیہ بھی کہا جاتا ہے چالیس ۴۰ درہم یعنی ساڑھے دس تولہ (۱۲۲ء۴۷ گرام) چاندی کے بقدر ہوتا ہے۔ فاستثنیث حملانہ الی اھلی سے حضرت جابرؓ کا مطلب یہ تھا کہ میں اس اونٹ کو آپ ﷺ کے ہاتھ اس شرط کے ساتھ بیچتا ہوں کہ مدینہ تک اسی اونٹ پر سوار چلوں گا یا اپنا سامان لاد کر لے چلوں گا۔

لہٰذا اس کے ظاہر مفہوم سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی جانور کو اس شرط کے ساتھ بیچے کہ یہ جانور فلاں مدت تک میرے زیر سواری رہے گا تو جائز ہے، چنانچہ حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے، حضرت امام مالکؒ کے ہاں اتنی قید ہے۔ کہ اگر مسافت نزدیک ہو تو اس شرط کے ساتھ بیع کرنا جائز ہے چنانچہ یہاں یہی صورت پیش آئی کہ حضرت جابرؓ کو صرف مدینہ تک جانا تھا اس لئے اس کم مسافت کی وجہ سے انہوں نے سواری کی شرط رکھی اور ان کی یہ شرط منظور کی گئی۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے ہاں ایسی کسی بھی شرط کے ساتھ بیع جائز نہیں ہے جس میں بیچنے والے کا یا خریدنے والے کا نفع ہو خواہ مسافت قریب ہو یا بعید: ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے مشروط بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اس حدیث کا جواب ان کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ یا تو یہ ایک وقتی رعایت تھی کہ حضرت جابرؓ کو اس مشروط بیع کی بطور خاص اجازت دے دی گئی تھی کسی دوسرے کے لئے یہ جائز نہیں ہے، یا پھر یہ کہ حضرت جابرؓ نے مدینہ تک اپنی سواری کو بیع کرنے کے بعد مشروط کیا ہوگا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے اونٹ کی بیع کر دی اور آنحضرت ﷺ نے اسے خرید لیا تو اس کے بعد حضرت جابرؓ نے آپ ﷺ سے یہ رعایت چاہی کہ مجھے مدینہ تک اس پر سوار چلنے یا اپنا سامان لادنے کی اجازت دیدی جائے جسے آنحضرت ﷺ نے منظور کر لیا۔

حق ولاء آزاد کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے

(۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتْ بَرِيْرَةُ فَقَالَتْ اِنِّيْ كَاتَبْتُ عَلٰى تِسْعِ اَوَاقٍ فِيْ كُلِّ عَامٍ وَقِيَّةٌ فَاَعِيْنِيْنِيْ فَقَالَتْ عَائِشَةُ اِنْ اَحَبَّ اَهْلُكِ اَنْ اَعُدَّهَا لَهُمْ عُدَّةً وَاحِدَةً وَاُعْتِقَكِ فَعَلْتُ وَيَكُوْنُ وَلَاءُكِ لِيْ فَذَهَبَتْ اِلٰى اَهْلِهَا فَاَبَوْا اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ الْوَلَاءُ لَهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذِيْهَا وَاَعْتِقِيْهَا ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي النَّاسِ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَمَا بَالُ رِجَالٍ يَشْتَرِطُوْنَ شُرُوْطًا لَيْسَتْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ وَاِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ فَقَضَاءُ اللّٰهِ اَحَقُّ وَشَرْطُ اللّٰهِ اَوْثَقُ وَاِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) بریرہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں نے نو اوقیہ پر اس شرط کے ساتھ مکاتبت کی ہے کہ ہر سال ایک اوقیہ ادا کیا کروں گی، لہٰذا آپ میری مدد کیجئے! حضرت عائشہؓ (کہتی ہیں کہ یہ سن کر میں) نے کہا کہ "اگر تمہارے مالکوں کو یہ پسند ہو کہ میں سب کے سب اوقیئے ایک ہی مرتبہ میں انہیں دیدوں اور پھر تجھے آزاد کر دوں تو ایسا کر سکتی ہوں لیکن اس صورت میں حق ولاء مجھے حاصل ہوگا۔ بریرہ (یہ سنکر) اپنے مالکوں کے پاس گئی (اور ان کے سامنے یہ صورت رکھی) مگر انہوں نے اسے نامنظور کر دیا اور کہا کہ ہم صرف اس شرط کے ساتھ (تجھے) بیچ سکتے ہیں کہ حق ولاء ہمیں حاصل ہو، آنحضرت ﷺ (کو جب اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ) نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ تم اسے لیکر آزاد کر دو اس کا حق ولاء تمہیں ہی حاصل ہوگا" پھر آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی شرطیں کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں (یعنی مشروع نہیں ہیں) جو شرط کتاب

اللہ میں نہیں ہے وہ باطل ہے اگرچہ وہ سو شرطیں ہوں (یعنی جو شرط ناجائز و نامشروع ہے اسے چاہے کوئی سو ۱۰۰ بار ہی کیوں نہ عائد کرے وہ باطل ہی رہے گی اور اس کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی) اور خدا ہی کا حکم سب سے زیادہ اس لائق ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور اللہ تعالیٰ ہی کی شرط سب سے زیادہ مضبوط ہے (یعنی بیع و شراء کے معاملات میں خدا نے جو احکام دیئے ہیں بہرصورت ان ہی کی تعمیل ضروری ہے اور خدا نے جو شرائط مقرر کی ہیں صرف انہی کا لحاظ ضروری ہے اپنی طرف سے عائد کردہ کوئی شرط بھی قابل عمل نہیں ہوگی، جان لو، حق ولاء اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو آزاد کرے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مکاتبت" غلام اور اس کے مالک کے درمیان ایک خاص نوعیت کے معاہدہ کا اصطلاحی نام ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ غلام کا مالک اسے اس شرط پر آزاد کرتا ہے کہ روپیہ کی اتنی مقدار اتنی مدت میں دینی ہوگی غلام اسے قبول و منظور کر لیتا ہے چنانچہ غلام اگر روپیہ کی وہ مقدار اس متعینہ مدت میں ادا کر لیتا ہے تو اپنے مالک کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے اور اگر وہ مقدار ادا نہیں کر پاتا تو پھر جوں کا توں اس کی غلامی میں رہتا ہے! اس معاملہ کو مکاتبت یا کتابت اور اس غلام کو مکاتب کہتے ہیں۔

"ولاء آزاد کرنے کے اس حق کو کہتے ہیں جو غلام کے مالک کو حاصل ہوتا ہے" یعنی اگر کوئی شخص اپنے کسی غلام کو آزاد کر دے اور وہ آزادی ہی کی حالت میں مرجائے اور اپنے پیچھے کچھ مال و اسباب چھوڑ جائے تو اس کے عصبہ کے نہ ہونے کی صورت میں اس کے تمام مال و اسباب کا حق دار وہی آزاد کرنے والا شخص ہوتا ہے! یہی حق ولاء کہلاتا ہے۔

بریرہ، حضرت عائشہؓ کی لونڈی کا نام ہے، یہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آنے سے پہلے ایک یہودی کی ملکیت میں تھیں جب انہوں نے اپنے مالکوں سے کتابت کی، تو وہ حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ان سے کہا کہ میں نے اپنے مالکوں سے نو اوقیہ پر اس شرط کے ساتھ کتابت کی ہے کہ ہر سال ایک اوقیہ (جو چالیس درہم کا ہوتا ہے) دیا کروں گی، اب میں آپ کے پاس اس لئے آئی ہوں کہ آپ میری مدد کریں اور مجھے اتنا دے دیں جو میں بدل کتابت کے طور پر اپنے مالکوں کو دیدوں، حضرت عائشہؓ نے کہا کہ اگر تمہارے مالکوں کو پسند ہو تو میں یہ کر سکتی ہوں کہ انہیں یہ نو اوقیہ یک مشت (تمہاری قیمت کے طور پر) انہیں دے دوں اور تمہیں خرید کر آزاد کردوں (اگر مکاتب بدل کتابت ادا کرنے سے عاجز ہو تو اسے بیچنا خریدنا جائز ہے) ظاہر ہے کہ اس صورت میں تمہاری طرف سے حق ولاء مجھے ہی حاصل ہوگا۔ لیکن جب یہ بات بریرہ کے مالکوں کو پہنچی تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ بریرہ کو حضرت عائشہؓ کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کرنا چاہتے تھے کہ بریرہ کا حق ولاء ان کو حاصل ہو، چونکہ ان کی یہ شرط کہ بریرہ کو خرید کو آزاد تو کریں عائشہؓ اور حق ولاء پہنچے ان کو بالکل نادانی کی بات تھی اور شرعی طور پر مطلقاً ناجائز، اس لئے جب حضرت عائشہ نے اس کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ ناراض ہوئے اور حدیث میں مذکورہ کلمات ارشاد فرمائے۔

حق ولاء کو بیچنا یا اس کو ہبہ کرنا ناجائز ہے

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَعَنْ هِبَتِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ولاء کو بیچنے یا اس کو ہبہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یعنی مثلاً ایک شخص نے اپنے غلام کو آزاد کیا جس کی وجہ سے حق ولاء اس کے لئے ثابت ہو گیا، اب اگر وہ یہ چاہے کہ اس حق ولاء کو کسی کے ہاتھ بیچ دے یا کسی کو ہبہ کر دے تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ ولاء کوئی مال نہیں ہے کہ اس کو بیچا یا ہبہ کیا جا سکے، اس بارہ میں تمام علماء کا متفقہ طور پر یہی مسلک ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جو نقصان کا ذمہ دار ہے وہی نفع کا بھی حق دار ہے

⑤ عَنْ مَخْلَدِ بْنِ خُفَافٍ قَالَ اِبْتَعْتُ غُلَامًا فَاسْتَغْلَلْتُهٗ ثُمَّ ظَهَرْتُ مِنْهُ عَلٰی عَيْبٍ فَخَاصَمْتُ فِيْهِ اِلٰی عُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِ فَقَضٰی لِیْ بِرَدِّهٖ وَقَضٰی عَلَیَّ بِرَدِّ غَلَّتِهٖ فَاَتَيْتُ عُرْوَةَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اَرُوْحُ اِلَيْهِ الْعَشِيَّةَ فَاُخْبِرُهٗ اَنَّ عَائِشَةَ اَخْبَرَتْنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰی فِیْ مِثْلِ هٰذَا اَنَّ الْخَرَاجَ بِالضَّمَانِ فَرَاحَ اِلَيْهِ عُرْوَةُ فَقَضٰی لِیْ اَنْ اٰخُذَ الْخَرَاجَ مِنَ الَّذِیْ قَضٰی بِهٖ عَلَیَّ لَهٗ رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"حضرت مخلد ابن خفاف کہتے ہیں کہ میں نے ایک غلام خریدا جس کی کمائی میں وصول کرتا رہا پھر مجھے اس کے ایک ایسے عیب کا علم ہوا جو اس میں خریداری سے پہلے تھا اور بیچنے والے نے مجھے اس سے مطلع نہیں کیا تھا چنانچہ اس غلام کے معاملہ کو میں نے حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ (خلیفہ وقت) کی خدمت میں پیش کیا انہوں نے مجھے یہ فیصلہ سنایا کہ غلام کو واپس کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس کی کمائی بھی واپس کر دی جائے۔ پھر میں حضرت عروہ ابن زبیرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا (جو ایک جلیل القدر تابعی اور فقہاء میں سے تھے) اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فیصلہ سے انہیں آگاہ کیا حضرت عروہؒ نے فرمایا کہ میں شام کے وقت حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں جاؤں گا اور ان کو بتاؤں گا کہ حضرت عائشہ نے مجھ سے یہ نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اسی قسم کے ایک معاملہ میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ "منفعت" ضمان (یعنی تاوان) کے ساتھ ہے چنانچہ حضرت عروہؒ، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کے پاس تشریف لے گئے (اور ان کو آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے مطلع کیا، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے (یہ ارشاد گرامی سننے کے بعد) پھر مجھے یہ حکم دیا کہ میں غلام کی کمائی اس شخص سے لے لوں جسے دینے کے لئے مجھے پہلے حکم دیا گیا تھا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "منفعت" ضمان (یعنی تاوان) کے ساتھ ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اگر وہ غلام، خریدنے والے کے پاس مرجاتا یا اس میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ اس خریدار کا نقصان ہوتا بیچنے والے کا کچھ نہ جاتا اسی طرح غلام سے کوئی منفعت حاصل ہوگی تو اس کا حقدار خریدار ہی ہوگا بیچنے والے کا اس پر کوئی حق نہیں ہوگا"۔

بائع و مشتری کے نزاع کی صورت میں کس کا قول معتبر ہوگا

⑥ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ فَالْقَوْلُ قَوْلُ الْبَائِعِ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ۔ وَفِیْ رِوَايَةِ ابْنِ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیِّ قَالَ الْبَيِّعَانِ اِذَا اخْتَلَفَا وَالْمَبِيْعُ قَائِمٌ بِعَيْنِهٖ وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ فَالْقَوْلُ مَا قَالَ الْبَائِعُ اَوْ يَتَرَادَّانِ الْبَيْعَ۔ (ترمذیؒ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب خریدار اور بیچنے والے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس صورت میں بیچنے والے کا قول معتبر ہوگا اور خریدار کو بیع فسخ کر دینے یا باقی رکھنے کا اختیار حاصل ہوگا" (ترمذیؒ) ابن ماجہؒ اور دارمیؒ کی روایت میں یوں ہے کہ "آنحضرت ﷺ نے فرمایا، جب خریدار بیچنے والے کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے اور مبیع (بیچی خریدی جانے والی چیز) جوں کی توں باقی ہو اور ان دونوں کے درمیان کوئی گواہ نہ ہو تو اس صورت میں بیچنے والے کا قول معتبر ہوگا یا پھر وہ دونوں بیع کو فسخ کر دیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: خریدار بیچنے والے کے درمیان بسا اوقات اختلاف و نزاع کی صورت پیدا ہو جاتی ہے کبھی تو یہ اختلاف و نزاع قیمت کے تعین کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے کہ خریدار کہتا ہے میں۔ نے تم سے اس چیز کا معاملہ دس روپے میں طے کیا ہے اور بیچنے والا کہتا ہے کہ نہیں میں

نے یہ چیز بارہ روپے میں فروخت کی ہے، شرط خیار یا تعین مدت میں اختلاف ہو جاتا ہے اور کبھی ان کے علاوہ دیگر شروط میں نزاع کی صورت پیدا ہو جاتی ہے ایسے ہی مواقع کے لئے حدیث نے واضح ہدایات کی ہے کہ ان صورتوں میں بیچنے والے کا قول معتبر ہوگا بشرطیکہ اس کا قول قسم کے ساتھ ہو یعنی اس سے کہا جائے گا کہ تم قسم کھاؤ کہ تم نے یہ چیز اس قیمت پر نہیں بیچی ہے جو خریدار بتا رہا ہے۔ پھر خریدار کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو بیچنے والے کی اس بات پر راضی ہو جائے جو اس نے قسم کھا کر کہی ہے اور بیع کو برقرار رکھے اور چاہے وہ بھی قسم کھائے اور کہے کہ میں نے یہ چیز اس قیمت پر نہیں خریدی ہے جو بیچنے والا بتا رہا ہے اور جب دونوں اپنی اپنی بات پر قسم کھائیں گے تو ان کا معاملہ اسی صورت میں باقی رہے گا جب کہ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی بات کو تسلیم کر لے گا، اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے دوسرے فریق کی بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوگا تو پھر آخری درجہ پر قاضی و حاکم کو اختیار ہوگا کہ وہ اس بیع و معاملہ کو فسخ کرا دے خواہ بیع (فروخت شدہ چیز) بعینہ باقی ہو یا بعینہ باقی نہ ہو جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک ہے لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ یہ کہتے ہیں کہ اگر مبیع باقی نہ ہو تو پھر دونوں فریق قسم نہ کھائیں بلکہ اس صورت میں خریدار کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہوگا۔

حدیث کے الفاظ اَلْمَبِيْعُ قَائِمٌ ان دونوں کے قول کی تائید کرتے ہیں چنانچہ دوسری روایت (جسے ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے کے الفاظ فالقول ما قال البائع (تو اس صورت میں بیچنے والے کا قول معتبر ہوگا) کا مطلب بھی حنفی مسلک کے مطابق یہ ہی ہے کہ اگر مبیع بعینہ باقی ہو تو بیچنے والے نے قسم کھلائی جائے اگر وہ قسم کھالے تو خریدار کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو بیچنے والے کی بات کو تسلیم کر دے اور چاہے خود بھی قسم کھائے یا پھر دونوں فریق بیع کو فسخ کر دیں اور اگر اختلاف و نزاع کے وقت مبیع بعینہ باقی نہ ہو تو پھر اس صورت میں قسم کے ساتھ خریدار ہی کا قول معتبر ہوگا بیچنے والے سے قسم نہ کھلائی جائے۔

یہ مسئلہ یہاں اجمالی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ہدایہ میں اسے بہت وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اہل علم ہدایہ میں یہ تفصیل دیکھ سکتے ہیں۔

اقالہ بیع کا مسئلہ

(۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَقَالَ مُسْلِمًا اَقَالَهُ اللّٰهُ عَثْرَتَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ عَنْ شُرَيْحِ الشَّامِیِّ مُرْسَلاً۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص مسلمان کی بیع کو واپس کریگا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گناہ بخش دے گا" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) اور شرح السنۃ میں یہ روایت ان الفاظ میں ذکر کی گئی ہے جو مصابیح میں شریح شامی سے بطریق ارسال منقول ہیں۔"

تشریح: "اقالہ کا مطلب ہے" بیع کو واپس کر دینا یعنی فسخ کر دینا۔ شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ بیع اور سلم میں قبل قبضہ بھی اور بعد قبضہ بھی اقالہ جائز ہے۔

اس روایت کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے متصل نقل کیا ہے اسی طرح حاکم نے بھی اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ سے متصل ہی نقل کیا ہے لیکن مصابیح میں یہ روایت بطریق ارسال ان الفاظ میں منقول ہے مَنْ اَقَالَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ صَفْقَةً كَرِهَهَا اَقَالَ اللّٰهُ عَثْرَتَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (جو شخص مسلمان کی کسی ناپسندیدہ بیع کو واپس کر دیگا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گناہ بخش دیگا) چنانچہ مؤلف مشکوۃ نے روایت کے آخری الفاظ کے ذریعہ گویا مصابیح کے مصنف علامہ بغویؒ پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب مصابیح میں اولی کو ترک کیا ہے بایں طور کہ ابوداؤد و ابن ماجہ کی نقل کردہ یہ متصل روایت تو نقل نہیں کی بلکہ حدیث مرسل نقل کی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ایک سبق آموز واقعہ

⑧ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اشْتَرٰی رَجُلٌ مِمَّنْ كَانَ قَبْلَكُمْ عَقَارًا مِنْ رَجُلٍ فَوَجَدَ الَّذِی اشْتَرَی الْعَقَارَ فِیْ عَقَارِهٖ جَرَّةً فِیْهَا ذَهَبٌ فَقَالَ لَهُ الَّذِی اشْتَرَی الْعَقَارَ خُذْ ذَهَبَكَ عَنِّیْ اِنَّمَا اشْتَرَیْتُ الْعَقَارَ وَلَمْ اَبْتَعْ مِنْكَ الذَّهَبَ فَقَالَ بَائِعُ الْاَرْضِ اِنَّمَا بِعْتُكَ الْاَرْضَ وَمَا فِیْهَا فَتَحَاكَمَا اِلٰی رَجُلٍ فَقَالَ الَّذِیْ تَحَاكَمَا اِلَیْهِ اَلَكُمَا وَلَدٌ فَقَالَ اَحَدُهُمَا لِیْ غُلَامٌ وَقَالَ الْآخَرُ لِیْ جَارِیَةٌ فَقَالَ اَنْكِحُوا الْغُلَامَ الْجَارِیَةَ وَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِمَا مِنْهُ وَتَصَدَّقُوْا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ تم سے پہلے (زمانہ کے) لوگوں میں سے ایک شخص نے ایک دوسرے شخص سے زمین کا ایک قطعہ خریدا اور اس کو اپنے تصرف میں لایا اتفاق کی بات کہ جس شخص نے زمین خریدی تھی اس نے اپنی اس خرید کردہ زمین میں ایک ایسا گھڑا پایا جس میں سونا بھرا ہوا تھا، اس نے زمین بیچنے والے سے کہا کہ تم اپنا یہ سونا لے لو کیونکہ میں نے تو صرف زمین خریدی تھی یہ سونا میں نے نہیں خریدا تھا بیچنے والے نے کہا کہ میں نے تمہارے ہاتھ صرف زمین ہی نہیں بیچی تھی بلکہ ہر وہ چیز بیچ دی تھی جو اس زمین میں ہے "اس لئے یہ سونا بھی تمہارا ہے اسے تم ہی رکھو مگر خریدار اس پر تیار نہیں ہوا) یہاں تک کہ دونوں اپنا معاملہ ایک شخص حَکَم وثالث کے پاس لے گئے اس حَکَم نے (واقعہ کی تفصیل سن کر) ان دونوں سے پوچھا کہ تم دونوں کے ہاں اولاد کیا ہے؟ ان میں سے ایک نے تو کہا کہ میرے ہاں لڑکا ہے اور دوسرے نے کہا کہ میرے ہاں لڑکی ہے۔ حَکَم نے یہ (سن کر) کہا کہ اس لڑکے کا نکاح لڑکی سے کر دو اور اس سونے کو اس دونوں پر خرچ کرو اور پھر جو کچھ بچے اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کر دو۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا ہے جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے کہ ان دونوں نے جس شخص کو اپنا حَکَم وثالث بنایا تھا وہ حضرت داؤد علیہ السلام تھے، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام نے صدور فیصلہ میں کمال ذہانت وذکاوت کا ثبوت دیا اور ایسا معتدل و معقول فیصلہ دیا کہ جو نبوت ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بیچنے والے اور خریدنے والے کے درمیان صلح صفائی کرانے کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ نیز علماء لکھتے ہیں کہ..... مخالف اشخاص میں صلح کرانا قاضی وحاکم کے لئے اسی طرح مستحب ہے جس طرح غیر قاضی کے لئے مستحب ہے۔

بَابُ السَّلَمِ وَالرَّهْنِ

بیع سلم اور رہن کا بیان

"سلم" ایک بیع کا نام ہے جس میں مبیع موجل اور ثمن معجل ہوتا ہے، یعنی خریدی جانے والی چیز بعد میں لی جاتی ہے اور اس کی قیمت پہلے ہی دی جاتی ہے۔

اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ زید نے بکر سے مثلاً ایک سو ۱۰۰ روپے کے عوض دو من گیہوں کی خریداری کا معاملہ کیا، بایں طور کہ زید نے بکر کو ایک سو ۱۰۰ روپے دیدئے اور اس سے طے کر دیا کہ میں اتنی مدت کے بعد اس کے عوض فلاں قسم کے دو من گیہوں تم سے لے لوں گا، اس بیع ومعاملہ کو عربی میں "سلم" کہتے ہیں، بعض مواقع پر "سلف" بھی کہا جاتا ہے، اپنی زبان میں اسے "بدھنی" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس بیع کے مشتری یعنی خریدار کو عربی میں "رب سلم" ثمن یعنی قیمت کو "راس المال" بائع یعنی بیچنے والے کو "مسلم الیہ"

اور مبیع یعنی خریدی جانے والی چیز کو "مسلم فیہ" کہتے ہیں۔

یہ بیع شرعی طور پر جائز و درست ہے بشرطیکہ اس کی تمام شرائط پائی جائیں اور تمام شرائط کی تعداد سولہ ۱۶ ہے اس طرح کہ چھ شرطوں کا تعلق تو اس المال یعنی قیمت سے ہے اور دس شرطوں کا تعلق مسلم فیہ یعنی مبیع سے ہے۔

راس المال سے متعلق چھ شرطیں یہ ہیں:

❶ جنس کو بیان کرنا یعنی یہ واضح کر دینا کہ یہ درہم ہیں یا دینار ہیں یا اشرفیاں ہیں۔ اور یا روپے ہیں۔

❷ نوع کو بیان کرنا یعنی یہ واضح کر دینا کہ یہ روپے چاندی کے ہیں یا گلٹ کے ہیں یا نوٹ ہیں۔

❸ صفت کو بیان کرنا یعنی یہ واضح کر دینا کہ روپے کھرے ہیں یا کھوٹے ہیں۔

❹ مقدار کو بیان کرنا یعنی یہ واضح کر دینا کہ یہ روپے سو ۱۰۰ ہیں یا دو سو ۲۰۰ ہیں۔

❺ روپے نقد دینا وعدہ پر نہ رکھنا۔

❻ اور جس مجلس میں معاملہ طے ہوا اس مجلس میں بیچنے والے کا راس المال پر قبضہ کر لینا۔

مسلم فیہ سے متعلق دس شرطیں یہ ہیں:

❶ جنس کو بیان کرنا مثلاً یہ واضح کر دینا کہ مسلم فیہ گیہوں ہے یا جو ہے اور یا چنا ہے۔

❷ نوع کو بیان کرنا یعنی یہ واضح کر دینا کہ گیہوں فلاں قسم یا فلاں جگہ کے ہیں۔

❸ صفت کو بیان کرنا یعنی یہ واضح کر دینا کہ مثلاً گیہوں اچھے ہیں یا خراب ہیں۔

❹ مسلم فیہ کی مقدار کو واضح کرنا کہ مثلاً ایک من ہیں یا دو من ہیں۔

❺ مسلم فیہ کا وزنی یا کیلی یا ذرعی یا عددی ہونا تا کہ اس کا تعین و اندازہ کیا جاسکے۔

❻ مدت کو بیان کرنا یعنی یہ واضح کر دینا کہ یہ چیز اتنی مدت کے بعد مثلاً ایک مہینہ یا دو مہینہ میں یا چار مہینے میں لیں گے لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ کم سے کم مدت ایک مہینہ ہونی چاہئے۔

❼ مسلم فیہ کا موقوف و معدوم نہ ہونا یعنی یہ ضروری ہے کہ مسلم فیہ عقد کے وقت سے ادائیگی کے وقت تک بازار میں برابر مل سکے تا کہ معدوم کی بیع لازم نہ آئے۔

❽ بیع سلم کا معاملہ بغیر شرط خیار کے طے ہونا، یعنی اس بیع میں خیار بیع کو برقرار رکھنے یا فسخ کر دینے کے اختیار کی شرط نہیں ہونی چاہئے۔

❾ اگر مسلم فیہ ایسی وزن دار چیز ہے جس کی باربرداری دینا پڑے تو اس کے دینے کی جگہ کو متعین کرنا یعنی یہ واضح کر دینا کہ میں یہ چیز فلاں جگہ یا فلاں مقام پر دوں گا۔

❿ مسلم فیہ کا ایسی چیز ہونا جو جنس، نوع اور صفت بیان کرنے سے متعین و معلوم ہو جاتی ہو، جو چیز ایسی ہو کہ جنس، نوع اور صفت بیان کرنے سے معلوم و متعین نہ ہوتی ہو جیسے حیوان یا بعض قسم کے کپڑے تو اس میں بیع سلم جائز نہیں۔

بیع سلم کی شرائط صحت

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يُسْلِفُوْنَ فِى الثِّمَارِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ وَالثَّلٰثَ فَقَالَ مَنْ اَسْلَفَ فِىْ شَيْءٍ فَلْيُسْلِفْ فِىْ كَيْلٍ مَعْلُوْمٍ وَوَزْنٍ مَعْلُوْمٍ اِلٰى اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (جب مکہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ پھلوں میں ایک سال دو سال، تین سال کی بیع سلم کیا کرتے تھے (یعنی پیشگی قیمت دیکر کہہ دیا کرتے تھے کہ ایک سال یا دو سال یا تین سال کے بعد پھل پہنچا دینا)

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا "کہ جو شخص کسی چیز کی بیع سلم کرے اسے چاہئے کہ معین پیمانہ معین وزن اور معین مدت کے ساتھ سلم کرے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس چیز کی بیع سلم کی جارہی ہو اگر وہ پیمانہ سے ناپ کرلی دی جاتی ہے تو اس کا پیمانہ متعین کرنا ضروری ہے کہ یہ چیز دس پیمانے ہوگی یا پندرہ پیمانے اور اگر وہ چیز وزن کے ذریعہ لی دی جاتی ہے تو اس کا وزن متعین کرنا ضروری ہے کہ یہ چیز دس سیر ہوگی یا پندرہ سیر، اسی طرح سلم میں خریدی جانے والی چیز کی ادائیگی کی مدت کا تعین بھی ضروری ہے کہ یہ چیز مثلاً ایک ماہ بعد دی جائے گی یا ایک سال بعد۔

اس حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بیع سلم میں مدت کا تعین بیع کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا مسلک ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تعین مدت ضروری اور شرط نہیں ہے۔

ادھار خریدنا اور گروی رکھنا جائز ہے

(۴) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ اِشْتَرٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامًا مِنْ يَهُوْدِيٍّ اِلٰى اَجَلٍ وَرَهَنَهٗ دِرْعًا لَهٗ مِنْ حَدِيْدٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ غلہ ایک متعین مدت کے ادھار پر خریدا اور اپنے لوہے کی زرہ اس کے پاس گروی رکھی۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث سے چند مسائل معلوم ہوئے اول یہ کہ کوئی چیز ادھار قیمت پر خریدنا اور اس ادھار قیمت کے بدلے اپنی کوئی چیز رہن رکھنا جائز ہے۔ دوم یہ کہ سفر کے علاوہ حضر (یعنی اپنے شہر و مسکن) میں بھی رہن رکھنا جائز ہے اگرچہ قرآن کریم نے جس آیت میں رہن رکھنے کی اجازت دی ہے اس میں سفر کی قید ہے اور وہ آیت یہ ہے وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ۔ (البقرہ ۲: ۲۸۳) (یعنی اگر تم کہیں سفر میں ہو اور وہاں دستاویز لکھنے کے لئے) کوئی کاتب نہ پاؤ تو (اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (صاحب حق کے) قبضہ میں دے دی جائیں۔

چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ اس آیت میں سفر کی قید محض اتفاقی ہے، رہن رکھنا جس طرح سفر میں جائز ہے اسی طرح حضر میں بھی جائز ہے اور سوم یہ کہ (اہل ذمہ) اسلامی سلطنت میں جزیہ دے کر رہنے والے، اہل کتاب جیسے یہود و نصاری کے ساتھ معاملات کرنے جائز ہیں چنانچہ تمام علماء کا بالاتفاق یہ مسلک ہے کہ اہل ذمہ اور کفار سے خرید و فروخت کا معاملہ کرنا جائز ہے بشرطیکہ ان کے پاس جو مال ہے اس کا حرام نہ ہونا ثابت و معلوم ہو، لیکن اہل حرب کے ساتھ مسلمانوں کا ہتھیار یا سامان جنگ بیچنا جائز نہیں ہے اسی طرح مطلقاً کسی بھی کافر کے ہاتھ ایسی کوئی چیز بیچنی جائز نہیں ہے جو اس کے دین و مذہب کی تقویت کا باعث ہو، نیز کفار کے ہاتھ مسلمانوں کا مصحف شریف (قرآن کریم) اور غلام بیچنا بھی جائز نہیں ہے۔

علامہ نوویؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ دنیا کا مال و اسباب نہیں رکھتے تھے اور یہ تنگ دستی و قلت مال آپ کی شان استغناء توکل علی اللہ اور مال و زر سے آپ کی کلیۃً بے رغبتی کی ایک واضح مثال ہے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اہل ذمہ کے پاس مسلمانوں کا سامان جنگ گروی رکھنا جائز ہے نیز آپ ﷺ کے اس عمل یعنی گروی رکھنے کا یہ معاملہ آپ ﷺ نے ایک یہودی سے کیا صحابہؓ سے نہیں کیا۔ کے بارہ میں بعض علماء تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شاید بیان جواز کی خاطر تھا یعنی اپنے اس عمل کے ذریعہ آپ ﷺ نے یہ واضح کیا کہ اہل ذمہ کے ساتھ بھی اپنے معاملے کرنا جائز ہے، اور بعض علماء

یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہودی کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا کہ اس وقت اپنی حاجت و ضرورت سے زائد غلہ یہودیوں کے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں تھا۔

③ وَعَنْهَا قَالَتْ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدِرْعُهٗ مَرْهُوْنَةٌ عِنْدَ يَهُوْدِيٍّ بِثَلَاثِيْنَ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا اس حال میں وصال ہوا ہے کہ آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس ۳۰ صاع جو کے بدلے گروی رکھی ہوئی تھی۔" (بخاریؒ)

انتفاع رہن کا مسئلہ

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظَّهْرُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا وَعَلَى الَّذِيْ يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ النَّفَقَةُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر سواری کی جائے تو اس پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کے بدلے میں اس پر سواری کی جاسکتی ہے اور اگر دودھ والا جانور گروی ہو تو اس پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کے بدلے اس کا دودھ پیا جائے اور جو شخص سواری کرے اور دودھ پئے وہی اس کے مصارف کا ذمہ دار ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کی وضاحت کے ضمن میں ملا علی قاری نے جو مسئلہ لکھا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا کوئی جانور کسی کے پاس رہن رکھے تو اس جانور کے مصارف مثلاً دانہ و چارہ وغیرہ کا بار چونکہ راہن پر ہوتا ہے۔ اسے باربرداری کے کام میں لائے چنانچہ حضرت امام اعظمؒ ابوحنیفہ اور حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

لیکن حضرت شیخ عبدالحقؒ نے حدیث کے آخری جملہ وعلی الذی یرکب ویشرب النفقۃ (اور جو شخص سواری کرے اور دودھ پئے وہی مصارف کا ذمہ دار ہے) کے تحت یہ لکھا ہے کہ جو شخص گروی رکھے ہوئے جانور پر سوار ہوگا یا اس کا دودھ پئے گا وہی اس کے مصارف کا بھی ذمہ دار ہوگا خواہ وہ راہن ہو یا مرتہن، گویا مطلب یہ ہوا کہ اگر مرتہن اپنے پاس گروی رکھے ہوئے جانور کا گھاس دانہ کرتا ہے اور اس کے مصارف برداشت کرتا ہے تو وہ اس جانور کو اپنے مصرف میں لاسکتا ہے اور اس کا دودھ پی سکتا ہے اور اگر راہن اس جانور کا (کہ جسے اس نے مرتہن کے پاس گروی رکھا ہے) گھاس دانہ کرتا ہے اور اس کے مصارف برداشت کرتا ہے تو پھر اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس جانور کو اپنے استعمال میں لائے اور اس کا دودھ پئے۔

حضرت شیخؒ کی اس وضاحت کی روشنی میں حدیث کا یہ مطلب ہوگا کہ مرتہن کو گروی رکھے ہوئے جانور سے نفع اٹھانا اور اس کے مصارف برداشت کرنا جائز ہے حالانکہ اکثر علماء اس کے برخلاف ہیں۔ چنانچہ ہدایہ میں لکھا ہے کہ مرتہن کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے پاس گروی رکھی ہوئی چیز سے نفع حاصل کرے اور یہ کہ گروی رکھی ہوئی چیز کا نفقہ (جیسے جانور کا گھاس دانہ) راہن کے ذمہ ہے، مرتہن کے لئے رہن سے نفع حاصل کرنا اس لئے ناجائز ہے کہ یہ بالکل کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ جو قرض نفع لائے وہ حرام ہے اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث آگے آنے والی حدیث کے ذریعہ منسوخ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

شے مرہون، راہن کی ملکیت سے باہر نہیں ہوتی

⑤ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَغْلَقُ الرَّهْنُ الرَّهْنَ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِيْ رَهَنَهٗ لَهٗ

غُنْمُهٗ وَعَلَيْهِ غُرْمُهٗ۔ رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ مُرْسَلًا وَرُوِيَ مِثْلُهٗ اَوْمِثْلُ مَعْنَاهُ لَا يُخَالِفُهٗ عَنْهُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ مُتَّصِلًا۔

"حضرت سعید ابن مسیب (تابعی) کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کسی چیز کو گروی رکھنا مالک کو کہ جس نے وہ چیز گروی رکھی ہے (ملکیت سے) نہیں روکتا (یعنی کسی چیز کو گروی رکھ دینے سے راہن کی ملکیت ختم نہیں ہوتی) اس لئے اس گروی رکھی ہوئی چیز کے ہر نفع و بڑھوتری کا حقدار راہن ہے اور وہی اس کے نقصان کا ذمہ دار ہے۔ اس روایت کو امام شافعیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔ اور اس قسم کی ایک اور حدیث (یعنی ہم معنی بھی اور ہم لفظ بھی) حضرت سعید ابن مسیبؒ سے روایت کی گئی ہے جسے سعید ابن مسیبؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے بطریق اتصال نقل کیا ہے یا وہ روایت ہم معنی ہے اور اس کے الفاظ مختلف ہیں مگر الفاظ کا یہ اختلاف ایسا نہیں ہے جو اس کے ہم معنی ہونے کے منافی ہو۔"

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی چیز کسی کے پاس رہن رکھ دے تو اس کا یہ رہن رکھنا اس چیز کی ملکیت کو ختم نہیں کرتا بلکہ وہ چیز جوں کی توں راہن کی ملکیت میں رہتی ہے اس لئے حدیث نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس رہن رکھی ہوئی چیز سے اگر کوئی نفع حاصل ہوتا ہے یا اس میں کوئی بڑھوتری ہوتی ہے تو وہ راہن ہی کا حق ہے بایں طور کہ اگر اس چیز کا کرایہ آتا ہے تو راہن وہ کرایہ وصول کر سکتا ہے اگر وہ کوئی جانور ہے تو اس پر سوار ہو سکتا ہے یا اسے اپنی بار برداری میں استعمال کر سکتا ہے ایسے ہی اگر اس جانور کے بچے پیدا ہوں تو وہ بچے بھی راہن ہی کا حق ہوتے ہیں، پھر جس طرح راہن رہن رکھی ہوئی چیز کے منافع کا حقدار ہوتا ہے اسی طرح اس کے نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے بایں طور کہ اگر وہ چیز مرتہن کے ہاں ہلاک و ضائع ہو جاتی ہے تو اس کا نقصان راہن ہی برداشت کرتا ہے اس کی وجہ سے مرتہن کے حق (یعنی جو قرض وغیرہ اس نے راہن کو دیا ہے) میں سے کچھ بھی ساقط نہیں ہوتا بلکہ راہن کو پورا پورا قرض واپس کرنا ہوتا ہے۔

لفظ رُوِیَ مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں صیغہ معروف کے ساتھ یعنی رَوٰی منقول ہے اس صورت میں اس کے فاعل امام شافعیؒ ہوں گے اور لفظ مثلہ اور مثل منصوب ہی رہیں گے۔

حقوق شرعیہ میں پیمانہ اور وزن کا اعتبار

(۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمِكْيَالُ مِكْيَالُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَالْمِيْزَانُ مِيْزَانُ اَهْلِ مَكَّةَ۔
(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (پیمانہ اہل مدینہ کا معتبر ہے اور وزن اہل مکہ کا معتبر ہے)۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ حقوق شرعیہ مثلاً زکوٰۃ وغیرہ میں لین دین کے لئے پیمانہ میں اہل مدینہ کے پیمانہ کا اعتبار ہے اور وزن میں اہل مکہ کے وزن کا اعتبار ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مکہ اور مدینہ کے پیمانوں اور اوزان میں کچھ فرق و اختلاف تھا۔ مدینہ کے پیمانہ اور وزن کی مقدار کچھ اور تھی اور مکہ کے پیمانہ اور وزن کی کچھ اور اس کی وجہ سے حقوق شرعیہ یعنی زکوٰۃ و صدقہ فطر وغیرہ میں لینا دینا خلجان کا باعث بنتا ہوگا۔ اس لئے آپ ﷺ نے مذکورہ بالا ہدایت جاری فرمائی، گویا اس کا حاصل یہ تھا کہ مثلاً درہموں میں زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب کہ وہ مکہ کے وزن کے مطابق دو سو ہوں گے اور صدقہ فطر و دیگر صدقات واجبہ میں اہل مدینہ کا صاع معتبر ہوگا۔

مدینہ کے وزن کے مقابلہ میں مکہ کے وزن کو اور مکہ کے پیمانہ کے مقابلہ میں مدینہ کے پیمانہ کو ترجیح دینے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں وہاں غلہ کا لین دین پیمانہ ہی کے ذریعہ ہوا کرتا تھا اور اہل مدینہ چونکہ زراعت پیشہ تھے اس لئے انہیں پیمانوں کے بارہ میں زیادہ واقفیت رہا کرتی تھی اور اوزان کا استعمال چونکہ تجارت میں زیادہ ہوتا ہے اور اہل مکہ تجارت پیشہ تھے اس لئے وہ اوزان کی واقفیت زیادہ

رکھتے تھے۔

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے وعید

⑦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِ الْکَیْلِ وَالْمِیْزَانِ اِنَّکُمْ قَدْ وُلِّیْتُمْ اَمْرَیْنِ ھَلَکَتْ فِیْھِمَا الْاُمَمُ السَّابِقَۃُ قَبْلَکُمْ۔ (الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ناپ تول کرنے والوں سے فرمایا کہ تمہارے ذمہ ایسے دو کام ہیں (یعنی ناپنا اور تولنا) جن کے سبب تم سے پہلی امتیں ہلاک کی جاچکی ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: امت محمدیہ سے قبل کچھ ایسی قومیں گذری ہیں جن کے افراد اس بدترین خصلت میں مبتلا تھے کہ جب وہ کوئی چیز لوگوں سے لیتے تھے تو اسے پورا پورا ناپتے تولتے تھے مگر جب کسی کو کوئی چیز دیتے تھے تو اس کی ناپ تول میں کمی کر دیتے تھے۔ ان کی اس عام برائی کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا اور وہ تہس نہس کر دیئے گئے ایسی قوموں میں سرفہرست حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا نام آتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی اُمت کے افراد کو متنبہ کیا کہ تم ناپنے تولنے میں کمی کرنے سے پوری طرح اجتناب کرو تاکہ اس لعنت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کہیں تم بھی خدا کے قہر و غضب کا شکار نہ ہو جاؤ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بیع سلم کی مبیع کو قبل قبضہ فروخت کرنے کی ممانعت

⑧ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَسْلَفَ فِیْ شَیْءٍ فَلَا یَصْرِفْہُ اِلٰی غَیْرِہٖ قَبْلَ اَنْ یَقْبِضَہٗ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی چیز کے لئے بیع سلم کا معاملہ کرے تو اس چیز کو قبضہ میں کرنے سے پہلے کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ کرے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ کرے" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ چیز اپنے قبضہ میں نہ آجائے اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے اور نہ ہبہ کرے، یا یہ مطلب ہے کہ اس چیز کو کسی دوسری چیز سے نہ بدلے یعنی جس چیز کی بیع سلم ہوئی ہے معاملہ کے مطابق اسی کو لے، قبل قبضہ اس کے بدلے میں کوئی دوسری چیز نہ لے۔

بَابُ الْاِحْتِکَارِ

احتکار کا بیان

احتکار کے معنی: لغوی طور پر "احتکار" کے معنی ہیں گراں فروشی کی نیت سے غلہ کی ذخیرہ اندوزی۔ اور شریعت کی اصطلاح میں احتکار کا مفہوم ہے ہر ایسی چیز کو مہنگا بیچنے کے لئے روک رکھنا جو انسان یا حیوان کی غذائی ضرورت میں کام آتی ہو۔ مثلاً گراں بازاری کے زمانہ میں جب کہ مخلوق خدا کو غلہ وغیرہ کی زیادہ ضرورت ہو کوئی شخص غلہ خرید کر اس نیت سے اپنے پاس روک رکھے کہ جب اور زیادہ گرانی ہوگی تو اسے بیچوں گا یہ احتکار کہلاتا ہے۔

احتکار کا حکم: شرعی نقطہ نظر سے احتکار حرام ہے اس قابل نفریں فعل میں مبتلا ہونے والا شخص شریعت کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنی زمین سے پیدا شدہ غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرے یا ارزانی کے زمانہ میں غلہ خرید کر رکھ چھوڑے اور پھر اسے گرانی کے وقت بیچے تو یہ حرام نہیں ہے اسی طرح ان اشیاء کو روک رکھنا جو غذائی ضروریات میں استعمال نہ ہوتی ہوں حرام نہیں ہے۔

ہدایہ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ انسانوں اور جانوروں کی غذائی چیزوں کا احتکار مکروہ ہے بشرطیکہ یہ احتکار ایسے شہر میں ہو جہاں اس کی وجہ سے شہر والوں کو تکلیف و نقصان پہنچے، یعنی اگر کوئی چھوٹا شہر ہو تو وہاں احتکار کی وجہ سے چونکہ غلہ کی قلت پیدا ہو جائے گی جس کی بناء پر غلہ کی گرانی بڑھ جائے گی اور لوگوں کو نقصان پہنچے گا اس لئے ایسے شہر میں احتکار ممنوع ہوگا، ہاں اگر بڑا شہر ہو اور وہاں کسی کے احتکار کی وجہ سے اہل شہر کو نقصان نہ پہنچ سکتا ہو تو پھر ایسے شہر میں احتکار ممنوع نہیں ہوگا۔ اسی طرح ہدایہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین کے غلہ کا احتکار کرے یا کسی اور شہر سے غلہ خرید کر لائے اور اس کو احتکار کرے تو ایسے شخص کو شرعی طور پر احتکار کرنے والا نہیں کہیں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

احتکار کرنے والا گنہگار ہے

① عَنْ مَعْمَرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت معمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص احتکار کرے وہ گنہگار ہے۔" (مسلم)

وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ عُمَرَ كَانَتْ اَمْوَالُ بَنِى النَّضِيْرِ فِىْ بَابِ الْفَيْئِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى اور حضرت عمرؓ کی روایت "کانت اموال بنی النضیر" کو ہم انشاء اللہ باب الفئ میں نقل کریں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

احتکار کرنے والے کے لئے وعید

② عَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْجَالِبُ مَرْزُوْقٌ وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ۔

"حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تاجر کو رزق دیا جاتا ہے اور احتکار کرنے والا ملعون ہے۔" (ابن ماجہ، داری)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص کہیں باہر سے شہر میں غلہ وغیرہ لاتا ہے کہ اسے موجودہ اور رائج نرخ پر فروخت کرے اور گراں فروشی کی نیت سے اس کی ذخیرہ اندوزی نہ کرے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق دیا جاتا ہے یعنی اسے بغیر گناہ کے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور اسکے رزق میں برکت عطا کی جاتی ہے اس کے خلاف مخلوق خدا کی پریشانیوں اور غذائی قلت سے فائدہ اٹھا کر غلہ وغیرہ کی ناجائز ذخیرہ اندوزی کرنے والا گنہ گار ہوتا ہے اور خیر و بھلائی سے دور رہتا ہے جب تک کہ وہ اس لعنت میں مبتلا رہتا ہے اس کو برکت حاصل نہیں ہوتی۔

حاکم اپنی طرف سے نرخ مقرر نہ کرے

③ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ غَلَا السِّعْرُ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَعِّرْ لَنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَاِنِّىْ لَاَرْجُوْ اَنْ اَلْقٰى رَبِّىْ وَلَيْسَ اَحَدٌ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِىْ بِمَظْلِمَةٍ بِدَمٍ وَلَا مَالٍ۔ (رواہ الترمذی، وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں غلہ کا نرخ مہنگا ہوگیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمارے لئے نرخ مقرر فرمادیجئے یعنی تاجروں کو حکم دیدیجئے کہ وہ اس نرخ سے غلہ فروخت کیا کریں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا" اللہ ہی تنگی پیدا کرنے والا ہے اللہ ہی فراخی دینے والا ہے اور اللہ ہی رزق دینے والا ہے میں اس بات کا امیدوار اور خواہشمند ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ مجھ پر تم میں سے کسی کے خون اور مال کا کوئی مطالبہ نہ ہو۔"

(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا ہے کا مطلب یہ ہے کہ گرانی اور ارزانی اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ میں ہے۔ نرخ جس کا ظاہری سبب بنتا ہے، چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو کبھی تو نرخوں میں کمی اور ارزانی کے ذریعہ لوگوں کے رزق میں وسعت و فراخی پیدا کردیتا ہے اسی کو بعض لوگ "نرخ آسمانی" سے تعبیر کرتے ہیں لہٰذا جب گراں بازاری کا دور ہو اور نرخوں میں اضافے ہوجائیں تو اللہ کی طرف رجوع کیا جائے اور اسی سے مدد مانگی جائے، اپنے عقائد و اعمال میں دوستی اور اصلاح کرکے خدا کی رضاء و خوشنودی کا سامان کیا جائے تاکہ وہ اپنے بندوں سے خوش ہو اور ان پر ارزانی وسعت رزق کی رحمت نازل فرمائے،

حدیث کے آخری جز میں اس بات کا امیدوار اور خواہشمند ہوں سے دراصل اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ سرکار وحکومت کی طرف سے نرخ مقرر کیا جانا ممنوع ہے کیونکہ اس طرح لوگوں کے معاملات میں بیجا دخل اندازی ہوتی ہے۔ اور ان کے مال میں ان کی اجازت و مرضی کے بغیر تصرف کرنا لازم آتا ہے جو ظلم کی ایک صورت ہے، پھر نرخ مقرر کرنے کا ایک برا نتیجہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے بسا اوقات لوگ کاروبار بند کردیتے ہیں اور تجارتی زندگی میں اضمحلال پیدا ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے قحط وقت تک کی نوبت آجاتی ہے، انجام کار جو چیز مخلوق خدا کی بھلائی کے لئے اختیار کی جاتی ہے وہی ان کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

لہٰذا آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ نرخ مقرر کرکے لوگوں کو تکلیف و پریشانی میں مبتلا نہ کیا جائے اور تاجروں پر کوئی نرخ لازم نہ کیا جائے بلکہ اس کی بجائے تاجروں کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ مخلوق خدا کے ساتھ ہمدردی و انصاف اور خیر خواہی کا معاملہ کریں اور ان کے ضمیر و احساس کو اس طرح بیدار کیا جائے کہ دراز جو نرخوں میں کمی کرکے لوگوں کی پریشانی و مصیبت دور کریں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

غلہ کی ناجائز ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کے لئے موعظت و عبرت

④ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ احْتَكَرَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ طَعَامَهُمْ ضَرَبَهُ اللّٰهُ بِالْجُذَامِ وَالْاِفْلَاسِ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَرَزِيْنٌ فِيْ كِتَابِهٖ۔

(ابن ماجہ، بیہقی، رزین)

"حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سنا رسول کریم ﷺ یہ فرماتے تھے کہ جو شخص غلہ روک کر گراں نرخ پر مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جذام و افلاس میں مبتلا کردیتا ہے۔" (ابن ماجہ، بیہقی، رزین)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص مخلوق خدا اور خاص طور پر مسلمانوں کو تکلیف و نقصان میں ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جسمانی و مالی بلاؤں میں مبتلا کرتا ہے اور جو شخص انہیں نفع و فائدہ پہنچاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے جسم و مال میں خیر و برکت عطا فرماتا ہے۔

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا يُرِيْدُ بِهِ الْغَلَاءَ فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللّٰهِ وَبَرِئَ اللّٰهُ مِنْهُ۔ (رواہ رزینؒ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے چالیس دن تک گرانی کے خیال سے غلہ کو روک رکھا گویا وہ خدا سے بیزار ہوا اور خدا اس سے بیزار ہوا" (رزینؒ)

تشریح: "وہ خدا سے بیزار ہوا" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کا وہ عہد توڑ ڈالا جو اس نے احکام شریعت کی بجا آوری اور مخلوق خدا کے ساتھ ہمدردی و شفقت کے سلسلہ میں باندھا ہے۔

اسی طرح اور خدا اس سے بیزار ہوا کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے اس بدترین عمل کے ذریعہ مخلوق خدا کی پریشانی و تکلیف کا سامان کیا تو خدا نے اس پر سے اپنی حفاظت اٹھالی اور اس کو اپنی نظر کرم و عنایت سے دور کر دیا۔

⑥ وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بِئْسَ الْعَبْدُ الْمُحْتَكِرُ اِنْ اَرْخَصَ اللّٰهُ الْاَسْعَارَ حَزِنَ وَاِنْ اَغْلَاهَا فَرِحَ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَرَزِيْنٌ فِيْ كِتَابِهٖ۔

"اور حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "غلہ وغیرہ کی ناجائز ذخیرہ اندوزی کرنے والا بندہ برا ہے، اگر اللہ تعالیٰ نرخوں میں ارزانی کرتا ہے تو وہ سنجیدہ ہوتا ہے اور اگر نرخوں کو گراں کرتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔" (بیہقی، رزین)

⑦ وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ تَصَدَّقَ بِهٖ لَمْ يَكُنْ لَهٗ كَفَّارَةً۔ (رواہ رزینؒ)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے گراں فروشی کی نیت سے غلہ کو چالیس روز تک روکے رکھا اور پھر اسے خدا کی راہ میں خیرت کر دیا تو وہ اس کے لئے کفارہ نہیں ہوگا۔" (رزینؒ)

تشریح: یہ گویا اس شخص کے لئے وعید و سزا ہے جو چالیس دن تک گراں فروشی کی نیت سے غلہ کو روکے رکھے کہ نہ تو اسے بازار میں لاکر بیچے اور نہ اس کے ذریعہ مخلوق خدا کی غذائی ضروریات کو پورا کرے، اور جو شخص اس سے کم مدت کے لئے احتکار کرے اس کے لئے بھی سزا ہے مگر اس سے کم درجہ کی۔

بَابُ الْاِفْلَاسِ وَالْاِنْظَارِ

افلاس اور مہلت دینے کا بیان

انسانی زندگی میں کسی ایک حالت کو قرار و دوام نہیں ہے آج کچھ ہے کل کچھ، یہ روزانہ کے مشاہدہ کی بات ہے، انسان کی اقتصادی و مالی زندگی ہی کو دیکھ لیجئے جس طرح ایک مفلس اور قلاش شخص راتوں رات رحمت خداوندی کے نتیجہ میں مال و زر کے خزانوں کا مالک بن جاتا ہے اسی طرح بڑے بڑے کاروباری دیکھتے ہی دیکھتے دیوالیہ ہو جاتے ہیں جو لوگ ہر وقت لاکھوں میں کھیلتے رہتے ہیں۔ مال و زر ہی جن کا اوڑھنا، بچھونا ہوتا ہے چشم زدن میں وہ پائی پائی کے محتاج نظر آتے ہیں۔ یہی کائنات کا نظام ہے اور یہی تقدیر کا کھیل ہے۔ حالات کو کسی ایک راستے پر برقرار رکھنا نہ کبھی کسی کے بس میں رہا ہے اور نہ کبھی کسی کے بس میں رہے گا۔ یہ سارے کھیل قدرت خداوندی کے پابند رہے ہیں اور ہمیشہ اسی طرح پابند رہیں گے۔ لیکن بدلے ہوئے حالات کو متوازن بنانا اور متوازن بنانے میں مدد دینا انسان کے بس میں ہے جسے وہ اختیار کر کے ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹ بھی سکتا ہے اور بدلے ہوئے حالات کو سنوارنے میں مدد بھی دے سکتا ہے چنانچہ یہاں جو باب قائم کیا گیا ہے اس کے تحت نقل کی جانے والی احادیث کا یہی حاصل ہے کہ اگر کوئی شخص حالات کی تبدیلی کا شکار ہو جائے بایں طور کہ افلاس و تنگدستی اسے اپنی لپیٹ میں لے لے تو دوسرے انسانوں کا نہ صرف یہ فریضہ ہے کہ اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کریں بلکہ اگر اس شخص پر کسی کا کوئی حق و مطالبہ ہو اور وہ مفلس ہو جانے کی وجہ سے اس کی ادائیگی سے وقتی طور پر عاجز ہو تو

صاحب حق اسے اتنی مہلت دیدے کہ جب بھی اس کے حالات سدھریں وہ اس کا حق ادا کردے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مفلس ہو جانے والے کے بارے میں ایک مسئلہ

① عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ اَفْلَسَ فَاَدْرَكَ رَجُلٌ مَالَهُ بِعَيْنِهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص مفلس ہو جائے اور وہ شخص (کہ جس نے اس کے ہاتھ اپنے مال بیچا تھا اس کے پاس) اپنا مال بعینہ پائے تو وہ کسی دوسرے کے مقابلے میں اس مال کا زیادہ حق دار ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس ارشاد گرامی کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ زید نے بکر سے کوئی مال خریدا، مگر اس کی قیمت ابھی ادا نہیں کر پایا تھا کہ مفلس ہو گیا اور حاکم وقاضی نے بھی اس کے مفلس و دیوالیہ ہو جانے کا فیصلہ کر دیا، اب بکر (یعنی بیچنے والے) نے دیکھا کہ زید کے پاس اس کا بیچا ہوا مال جوں کا توں موجود ہے یعنی نہ تو وہ ظاہری طور پر ضائع وہلاک ہوا ہے اور نہ تصرفات شرعیہ مثلاً ہبہ و وقف کے ذریعہ معنوی طور پر ختم ہوا ہے تو اس صورت میں بکر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی کی ہوئی بیع کو فسخ کر دے اور زید سے اپنا مال واپس لے لے کیونکہ دوسرے قرض خواہوں کی بہ نسبت وہ مقدم ہے لہٰذا بجائے اس کے کہ وہ مال دوسرے قرض خواہ زید سے لیں بکر اس کے لینے کا زیادہ حقدار ہے۔

اور اگر زید نے مال کی خریداری کے وقت قیمت کا کچھ حصہ ادا کر دیا ہو اور بقیہ حصہ ادا کرنے سے پہلے مفلس و دیوالیہ ہو گیا ہو تو اس صورت میں بکر اس مال کی اتنی ہی مقدار لے جو قیمت کے بقیہ حصہ کے بقدر ہو۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے ان حضرات کی طرف سے اس حدیث کا یہی مطلب بیان کیا جاتا ہے۔

لیکن حنفیہ کے نزدیک چونکہ اس صورت میں بیچنے والے کو نہ تو بیع فسخ کر دینے کا اختیار ہے اور نہ وہ مال واپس لے لینے کا حق اسے پہنچتا ہے اس لئے حنفیہ اس حدیث کو عقد بالخیار پر محمول کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک اس حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ بیع اس شرط کے ساتھ ہوئی ہو کہ بیچنے والے کو فلاں مدت تک اس بیع کو فسخ کر دینے کا اختیار حاصل ہوگا، چنانچہ بیع کے بعد اگر خریدار مفلس و دیوالیہ ہو جائے اور مدت خیار کے اندر بائع کو معلوم ہو گیا کہ خریدار مفلس و دیوالیہ ہو گیا ہے تو اب اس کے لئے زیادہ بہتر یہی ہے کہ بیع کو فسخ کر دے اور اپنا مال واپس لے لے۔

مفلس ہو جانے والے کی امداد کرنے کا حکم

② وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ اُصِيْبَ رَجُلٌ فِیْ عَهْدِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ ثِمَارٍ ابْتَاعَهَا فَكَثُرَ دَيْنُهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقُوْا عَلَيْهِ فَتَصَدَّقَ النَّاسُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَبْلُغْ ذٰلِكَ وَفَاءَ دَيْنِهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِغُرَمَائِهِ خُذُوْا مَا وَجَدْتُمْ وَلَيْسَ لَكُمْ اِلَّا ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص پھلوں کے سخت نقصان میں مبتلا ہو گیا جو اس نے خریدے تھے اور اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ قرضدار ہو گیا" اس کی حالت دیکھ کر) رسول کریم ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ صدقہ کے ذریعہ اس کی مدد کرو (تاکہ یہ قرض کے بوجھ سے ہلکا ہو) لوگوں نے صدقہ کے ذریعہ اس کی مدد کی، مگر لوگوں کی مدد بھی اس کے قرض کی پوری ادائیگی کے لئے کافی نہ ہو سکی اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ تمہیں اس سے جو کچھ بھی حاصل ہو بس وہ لے لو، اس سے اس کے علاوہ اور کچھ تمہیں نہیں ملیگا۔" (مسلم)

تشریح: اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے ایک پھل دار درخت خریدا، درخت پر لگے ہوئے پھل ابھی اس کے تصرف میں نہیں آئے تھے سوء اتفاق سے ان پر آفت نازل ہوئی اور وہ سب جھڑ گئے ادھر اس نے اس کی قیمت بھی ادا نہیں کی تھی، چنانچہ جب بیچنے والے نے قیمت کا مطالبہ کیا تو اس نے لوگوں سے قرض لے کر وہ قیمت ادا کی، اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ قرض دار ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ نے جب اس کی پریشان حالی دیکھی تو لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا کہ وہ صدقہ و خیرات کے ذریعہ ہی اس کی مدد کر دیں تاکہ وہ قرض کے بار سے ہلکا ہو جائے۔ لوگوں نے اس کی مدد کی مگر ان کی مدد بھی اس کے قرض کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں ہو سکی، لوگوں کی مدد سے جتنا قرض وہ ادا کر سکتا تھا اتنا ادا کر دیا بقیہ قرض کی ادائیگی سے جب وہ بالکل ہی عاجز ہو گیا تو آنحضرت ﷺ نے قرض خواہوں سے وہ الفاظ ارشاد فرمائے جو حدیث کے آخر میں نقل کئے گئے ہیں۔

چنانچہ قرض خواہوں سے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ جب اس شخص کا افلاس بالکل ظاہر ہو گیا ہے اور اس کی خستہ حالی عیاں ہو چکی ہے تو اب تمہارے لئے یہ قطعاً مناسب نہیں ہے کہ تم اسے پریشان کرو، اسے ڈراؤ دھمکاؤ یا اسے قید و بند کی مصیبت میں مبتلا کرو، بلکہ اس صورت میں تم لوگوں پر واجب ہے کہ اسے مہلت دے دو، جب دیکھو کہ اس کے پاس ادائیگی قرض کا کچھ سامان فراہم ہو گیا ہے اس وقت اپنا مطالبہ کرنا اور اس سے اپنا قرض واپس لے لینا، آپ ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب قطعاً نہیں تھا کہ قرضدار کے ذمہ سے قرض خواہوں کا حق ہی سرے سے ساقط ہو گیا ہے بلکہ جیسا کہ ابھی بتایا گیا اس سے آپ ﷺ کا مقصد صرف یہ تھا کہ قرض دار کو مہلت مل جائے۔

وصولیٔ قرض میں درگذر کرنے کا اجر

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ رَجُلٌ يُدَايِنُ النَّاسَ فَكَانَ يَقُوْلُ لِفَتَاهُ اِذَا اَتَيْتَ مُعْسِرًا تَجَاوَزْ عَنْهُ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يَتَجَاوَزَ عَنَّا قَالَ فَلَقِيَ اللّٰهَ فَتَجَاوَزَ عَنْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایک شخص تھا جو لوگوں سے قرض لین دین کا معاملہ کرتا تھا (یعنی لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا) اور اس نے اپنے کارندے سے یہ کہہ رکھا تھا کہ جب کسی تنگدست کے پاس (قرض وصول کرنے جاؤ) تو اس سے درگذر کرو شاید اللہ تعالیٰ ہم سے درگذر فرمائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جب اس نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی (یعنی اس کا انتقال ہوا) تو اللہ تعالیٰ نے اس سے درگذر کیا (اور اس کے گناہوں پر مواخذہ نہیں کیا)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۴) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّنْجِيَهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلْيُنَفِّسْ عَنْ مُّعْسِرٍ اَوْ يَضَعْ عَنْهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن کی سختیوں سے محفوظ رکھے تو اسے چاہئے کہ وہ مفلس و تنگدست سے اپنا قرض وصول کرنے میں تاخیر کرے یا اس کو معاف کر دے (یعنی اپنا پورا قرض یا جس قدر ممکن ہو معاف کر دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یوں تو فرض اعمال، نفل اعمال سے ستر درجے زیادہ فضیلت کے حامل ہیں لیکن بعض مسائل و معاملات میں نفل اعمال فرض اعمال سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں، انہیں میں سے ایک تو تنگدست و مفلس کو اپنا حق (مثلاً قرض وغیرہ) معاف کر دینا ہے کہ یہ اگرچہ مستحب ہے لیکن مفلس و تنگدست کو قرض وغیرہ ادا کرنے میں مہلت دینے سے افضل ہے جو واجب ہے دوسرے سلام کرنے میں پہل کرنا سنت ہے لیکن یہ افضل ہے سلام کا جواب دینے سے جو فرض ہے، تیسرے وقت سے پہلے وضو کرنا مستحب ہے لیکن یہ افضل ہے وقت شروع ہو جانے کے بعد وضو کرنے سے جو فرض ہے۔

⑤ وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَنْجَاهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ فرماتے تھے "جو شخص (اپنا مطالبہ وصول کرنے میں) مفلس کو مہلت دے یا اس کو (اپنا پورا مطالبہ یا اس کا کچھ حصہ) معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن کی سختیوں سے نجات دے گا۔" (مسلمؒ)

⑥ وَعَنْ اَبِى الْيَسَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِىْ ظِلِّهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوالیسرؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا، رسول کریم ﷺ فرماتے تھے "جو شخص تنگدست کو مہلت دے یا اس کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا (یعنی قیامت کے دن اسے گرمی کی تپش اور اس دن کی سختیوں سے محفوظ رکھے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: امام احمدؒ، ابن ماجہؒ اور حاکمؒ نے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ جو شخص مفلس و تنگدست کو مہلت دے تو ادائیگی کا دن آنے تک اس کو ہر دن کے بدلے اس کے قرض کے برابر صدقہ کا ثواب ملتا ہے اور پھر جب ادائیگی کا دن آئے اور وہ پھر اسے مہلت دے دے اور اس کی ادائیگی کا دن آنے تک ہر دن کے بدلے اس کے قرض کے برابر صدقہ کا ثواب ملتا ہے اور پھر جب ادائیگی کا دن آئے اور وہ پھر اس مہلت دے دے تو اس کو ہر دن کے بدلے اس کے قرض کی دگنی مقدار کے برابر صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

اس روایت کو تمثیلی طور پر یوں سمجھئے کہ مثلاً ایک شخص نے کسی کو دو مہینے کے وعدے پر ایک سو روپے قرض دیئے اور دو مہینے کے بعد اس کی مفلسی و تنگدستی کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک مہینے کی مہلت دے دی تو اسے پورے مہینے اس طرح ثواب ملتا رہے گا کہ گویا وہ ہر دن ایک سو روپیہ صدقہ و خیرات کرتا ہے، اسی طرح ایک مہینے کی مدت گذر جانے کے بعد دوبارہ مہلت دینے میں ایسا ہی ثواب ملتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب تیسری مرتبہ مہلت دے گا تو اسے ہر دن ایسا ثواب ملے گا جیسے کہ وہ ہر دن دو سو روپے صدقہ و خیرات کرتا ہے۔

خوبی کے ساتھ قرض ادا کرنے والا بہترین شخص ہے

⑦ وَعَنْ اَبِىْ رَافِعٍ قَالَ اسْتَسْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكْرًا فَجَاءَتْهُ اِبِلٌ مِّنَ الصَّدَقَةِ قَالَ اَبُوْ رَافِعٍ فَاَمَرَنِىْ اَنْ اَقْضِىَ الرَّجُلَ بَكْرَهُ فَقُلْتُ لَا اَجِدُ اِلَّا جَمَلًا خِيَارًا رَبَاعِيًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطِهِ اِيَّاهُ فَاِنَّ خَيْرَ النَّاسِ اَحْسَنُهُمْ قَضَاءً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے ایک جوان اونٹ قرض لیا اور پھر جب آپ ﷺ کے پاس زکوۃ کے اونٹ آئے تو ابورافعؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس شخص کو کہ جس سے آپ ﷺ نے اونٹ قرض لیا تھا ایسا ہی ایک اونٹ دے دوں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے ایسا ہی اونٹ کوئی نظر نہیں آرہا ہے البتہ ایک اونٹ ہے جو اس کے اونٹ سے اچھا ہے اور ساتویں برس میں لگا ہے (لہٰذا میں اس کے اونٹ سے اچھا اونٹ کیسے دے دوں) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اسے اچھا ہی اونٹ دے دو کیونکہ لوگوں میں بہترین شخص وہی ہے جو ادائیگی قرض میں سب سے اچھا ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جانور کا قرض لینا جائز ہے جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ اور اکثر علماء کا مسلک ہے۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ سے واضح ہوا کہ جو چیز قرض لی ہے اس کی واپسی میں اس کی بہ نسبت اچھی چیز دینا مستحب بھی ہے اور عالی ہمتی بھی بشرطیکہ قرض لیتے وقت اس کی شرط نہ کی گئی ہو۔

قرض خواہ تقاضہ کر سکتا ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً تَقَاضٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَغْلَظَ لَهٗ فَهَمَّ اَصْحَابُهٗ فَقَالَ دَعُوْهُ فَاِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالاً فَاشْتَرُوْا لَهٗ بَعِیْرًا فَاَعْطُوْهُ اِیَّاهُ قَالُوْا لَانَجِدُ اِلَّا اَفْضَلَ مِنْ سِنِّهٖ قَالَ اشْتَرُوْهُ فَاَعْطُوْهُ اِیَّاهُ فَاِنَّ خَیْرَکُمْ اَحْسَنُکُمْ قَضَاءً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے "اس اونٹ کا تقاضہ کیا (جو آپ ﷺ نے اس سے بطور قرض لیا تھا) اور تقاضہ بھی بڑی سخت کلامی کے ساتھ کیا، آپ ﷺ کے صحابہؓ نے جب ان کو "اس سخت کلامی اور آداب نبوت کے خلاف اس کی حرکت پر) سزادینی چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اسے کچھ نہ کہو، کیونکہ جس کا حق ہے اسے کہنے کا اختیار ہے البتہ ایسا کرو کہ ایک اونٹ خرید کر اسے دے دو (تاکہ اس کا مطالبہ ادا ہو جائے اور اسے پھر کچھ کہنے کا حق نہ رہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اس نے آپ (ﷺ) کو بطور قرض جو اونٹ دیا تھا) اس کی عمر کا کوئی اونٹ نہیں مل رہا ہے بلکہ اس سے زیادہ عمر کا مل رہا ہے (یعنی اس کا اونٹ چھوٹا اور کمتر تھا اور ہمیں جو اونٹ مل رہا ہے وہ اس کے اونٹ سے بڑا اور اچھا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا (جو اونٹ تمہیں مل رہا ہے) اسی کو خرید لو (اگرچہ وہ اس کے اونٹ کی بہ نسبت بڑا اور اچھا ہے) اور اسے دے دو، یاد رکھو، تم میں بہتر وہ شخص ہے جو قرض ادا کرنے میں اچھا ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آپ ﷺ سے اپنے قرض کا تقاضہ کرنے والا اور پھر تقاضہ میں سخت کلامی کرنے والا کوئی کافر رہا ہو گا خواہ وہ یہودی ہو یا کوئی اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ شاید کوئی اجڈ گنوار دیہاتی ہو گا جو مجلس نبوت اور مقام نبوت کے آداب سے مطلقاً بے بہرہ تھا، جسے یہ سلیقہ بھی نہیں تھا کہ کس سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس سرکار دو عالم ﷺ نے اس کی باتوں کو جس عالی ظرفی اور خوش اخلاقی کے ساتھ برداشت کیا وہ صرف نبوت ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔

"جس کا حق ہے اسے کہنے کا اختیار ہے" کے بارے میں ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ یہاں "حق" سے مراد قرض ہے، یعنی اگر کسی شخص کا کسی پر قرض ہو اور وہ قرض دار ادائیگی قرض میں تاخیر کرے تو قرض خواہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس سے سختی کے ساتھ تقاضہ کرے، اس پر اظہار ناراضگی کرے اور اگر وہ پھر بھی قرض ادا نہ کرے تو حاکم وعدالت کی طرف رجوع کرے۔

ادائیگی قرض پر قادر ہونے کے باوجود قرض ادا نہ کرنا ظلم ہے

⑨ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَطْلُ الْغَنِیِّ ظُلْمٌ فَاِذَا اُتْبِعَ اَحَدُکُمْ عَلٰی مَلِیْءٍ فَلْیَتْبَعْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "صاحب استطاعت کا (ادائیگی قرض میں) تاخیر کرنا ظلم ہے۔ اور جب تم میں سے کسی کو صاحب استطاعت کے حوالہ کیا جائے تو اسے اس حوالہ کو قبول کر لینا چاہئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کوئی چیز خریدے اور اس کی قیمت ادا کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود قیمت ادا نہ کرے یا کسی کا قرض دار ہو اور ادائیگی قرض پر قادر ہونے کے باوجود (قرض ادا کرنے میں تاخیر کرے تو یہ ظلم ہے)۔ بلکہ بعض علماء نے تو یہ لکھا ہے کہ یہ فسق ہے اور اس کی وجہ سے ایسے شخص کی گواہی رد ہوتی ہے، اگرچہ یہ نادہندگی ایک ہی مرتبہ کیوں نہ ظاہر ہوئی ہو، لیکن بعض دوسرے علماء کا قول یہ ہے کہ اس شخص کی گواہی قابل رد ہے جو صاحب استطاعت ہونے کے باوجود بار بار نادہندگی میں مبتلا ہو اور ادائیگی میں تاخیر کرنا اس کی عادت بن چکی ہو۔

حدیث کے دوسرے جزء "اور جب تم سے کسی کو صاحب استطاعت کے حوالہ کیا جائے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص کا کسی پر قرض ہو اور وہ قرض دار ادائیگی قرض پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے کسی مالدار شخص سے یہ کہے کہ تم میرا قرض ادا کر دینا تو قرض خواہ کو چاہئے

کہ وہ قرضدار کی اس بات کو فوراً قبول کرلے تاکہ اس کا مال ضائع نہ ہو، یہ حکم استحباب کے طور پر ہے، لیکن بعض علماء کا قول ہے کہ یہ حکم بطریق وجوب ہے جب کہ کچھ علماء اس حکم کو بطریق اباحت کہتے ہیں۔

قرض خواہ وقرض دار کا تنازعہ ختم کرانا جائز ہے

⑩ وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهُ تَقَاضٰى ابْنَ اَبِیْ حَدْرَدٍ دَيْنًا لَهُ عَلَيْهِ فِیْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِی الْمَسْجِدِ فَارْتَفَعَتْ اَصْوَاتُهُمَا حَتّٰى سَمِعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِیْ بَيْتِهٖ فَخَرَجَ اِلَيْهِمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى كَشَفَ سِجْفَ حُجْرَتِهٖ وَنَادٰى كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ يَا كَعْبُ قَالَ لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَشَارَ بِيَدِهٖ اَنْ ضَعِ الشَّطْرَ مِنْ دَيْنِكَ قَالَ كَعْبٌ قَدْفَعَلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ قُمْ فَاقْضِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت کعب ابن مالکؓ کے بارے میں منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں (ایک دن) انہوں نے مسجد نبوی ﷺ میں ابن ابی حدرد سے اپنے قرض کی واپسی کا تقاضہ کیا یہاں تک کہ جب دونوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور رسول کریم ﷺ نے جو اس وقت اپنے حجرہ مبارک میں تشریف فرما تھے۔ان دونوں کی آوازیں سنیں تو حجرہ سے باہر آنے کا ارادہ فرمایا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے حجرہ کا پردہ ہٹایا اور کعب ابن مالکؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "کعب! کعب ابن مالکؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! حاضر ہوں" آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کے ذریعے ان کی طرف اشارہ کیا کہ اپنے قرض کا نصف حصہ معاف کردو۔ کعبؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! میں نے معاف کیا" اس کے بعد آپ ﷺ نے ابن ابی حدرد سے فرمایا کہ "اب اٹھ جاؤ اور باقی قرض ادا کردو۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں کسی سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنا جائز ہے، نیز حقدار سے سفارش کرنا جھگڑنے والوں میں صلح صفائی کرانا اور کسی کی سفارش قبول کرنا بشرطیکہ اس سفارش کا تعلق کسی معصیت وبرائی سے نہ ہو، جائز ہے۔

ادائیگی قرض میں تاخیر کرنے والوں کے لئے ایک عبرتناک واقعہ

⑪ وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ اُتِیَ بِجَنَازَةٍ فَقَالُوْا صَلِّ عَلَيْهَا فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قَالُوْا لَا فَصَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ اُتِیَ بِجَنَازَةٍ اُخْرٰى فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قِيْلَ نَعَمْ قَالَ فَهَلْ تَرَكَ شَيْئًا قَالُوْا ثَلَاثَةَ دَنَانِيْرَ فَصَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ اُتِیَ بِالثَّالِثَةِ فَقَالَ عَلَيْهِ دَيْنٌ قَالُوْا ثَلَاثَةُ دَنَانِيْرَ قَالَ هَلْ تَرَكَ شَيْئًا قَالُوْا لَا قَالَ صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ قَالَ اَبُوْقَتَادَةَ صَلِّ عَلَيْهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَلَیَّ دَيْنُهٗ فَصَلّٰى عَلَيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سلمہ بن اکوعؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول کریم ﷺ کی مجلس میں حاضر تھے کہ ایک جنازہ لایا گیا، صحابہؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ جنازہ کی نماز پڑھ لیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر قرض تو نہیں ہے؟ صحابہؓ نے کہا کہ نہیں! چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس پر قرض تو نہیں ہے" عرض کیا گیا کہ "ہاں" ہے! آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کچھ چھوڑ کر بھی مرا ہے یا نہیں؟" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "تین دینار اس نے چھوڑے ہیں" (یہ سن کر) آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی! پھر ایک تیسرا جنازہ لایا گیا، آپ ﷺ نے پوچھا کہ "اس پر قرض تو نہیں ہے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "ہاں تین دینار اس پر قرض ہیں"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کچھ چھوڑ کر بھی مرا ہے یا نہیں" عرض کیا گیا کہ "کچھ نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو" ابوقتادہؓ نے (جب یہ سنا تو) کہا کہ "یارسول اللہ! آپ (ﷺ) اس کی نماز جنازہ پڑھ لیجئے اس کا قرض میں ادا کردوں گا" تب آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: ہوسکتا ہے کہ تینوں جنازے ایک ہی دن اور ایک ہی مجلس میں لائے گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ الگ الگ دن اور الگ الگ

مجلس میں یہ جنازے لائے گئے ہوں۔

دوسرے شخص پر جو قرض تھا اس کی مقدار انہیں تین دینار کے برابر رہی ہوگی جو وہ چھوڑ کر مرا تھا اس لئے جب آپ ﷺ کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس شخص پر جتنا قرض ہے اس کی ادائیگی کے بقدر اثاثہ چھوڑ کر مرا ہے تو آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھ لی۔

تیسرا چونکہ اپنے قرض کی ادائیگی کے بقدر مال چھوڑ کر نہیں مرا تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا، اس انکار کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس سے لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور وہ قرض سے پرہیز کریں اور اگر بدرجہ مجبوری قرض لیں تو اس کی ادائیگی میں تاخیر و تقصیر سے باز رہیں۔ یا پھر آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھنا اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ میں اس کے لئے دعا کروں اور دعا قبول نہ ہو کیونکہ اس پر لوگوں کا حق تھا جس سے بری الذمہ ہوئے بغیر وہ مر گیا تھا۔

اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ میت کی طرف سے ضامن ہونا جائز ہے خواہ میت نے ادائیگی قرض کے لئے مال چھوڑا ہو یا نہ چھوڑا ہو۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔ بخلاف حضرت امام ابوحنیفہؒ کے کہ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔

بعض حنفی علماء لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمدؒ اور حنفیہؒ میں سے حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ نے اس حدیث سے اس بات کا استدلال کیا ہے کہ اس میت کی طرف سے کفالت جائز ہے جس نے کچھ بھی مال نہ چھوڑا ہو اور اس پر قرض ہو۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر میت کی طرف سے کفالت جائز نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ اس تیسرے جنازہ کی نماز نہ پڑھتے۔

لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مفلس میت کی طرف سے کفالت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مفلس میت کی طرف سے کفالت دراصل دین ساقط کی کفالت ہے اور یہ بالکل صاف مسئلہ ہے کہ دین ساقط کی کفالت باطل ہے۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت ابوقتادہؓ نے میت کی طرف سے اس کے قرض کی کفالت کی اور آنحضرت ﷺ نے ابوقتادہؓ کی کفالت کو تسلیم کر کے اس کی نماز جنازہ پڑھ لی، تو اس کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ ابوقتادہؓ نے اس شخص کی زندگی ہی میں اس کی طرف سے کفالت کر لی ہوگی، اس موقع پر تو انہوں نے صرف آپ ﷺ کے سامنے اس بات کا اقرار و اظہار کیا کہ میں اس کی کفالت پہلے ہی کر چکا ہوں اب میں اس کے قرض کا ذمہ دار ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کے اس اقرار و اظہار پر نماز جنازہ پڑھی۔

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابوقتادہؓ نے اس وقت میت کی طرف سے کفالت کی نہیں تھی بلکہ از راہ احسان و تبرع یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں گا۔

قرض کو ادا کرنے کی نیت رکھنے والے کی اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ یُرِیْدُ اَدَاءَ ھَا اَدَّی اللّٰہُ عَنْہُ وَمَنْ اَخَذَ یُرِیْدُ اِتْلَافَھَا اَتْلَفَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص لوگوں کا مال لے اور اس کے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو (یعنی کسی ضرورت و احتیاج ہی کی بناء پر قرض لے اور قرض کی ادائیگی کا ارادہ بھی رکھتا ہو اور اس کو ادا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہو) تو اللہ تعالیٰ اس سے وہ مال ادا کرا دیتا ہے (یعنی قرض کو ادا کرنے کی نیت رکھنے والے کی اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے بایں طور کہ یا تو دنیا میں قرض ادا کرنے کی استطاعت دے دیتا ہے یا آخرت میں حقدار کو راضی کر دیتا ہے) اور جو شخص لوگوں کا مال لے اور ضائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہو (یعنی

احتیاج وضرورت کے بغیر کسی سے قرض لے اور پھر اس قرض کی ادائیگی کی نیت بھی نہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے مال کو ضائع کر دیتا ہے (یعنی جو شخص کسی سے قرض لے اور اس قرض کو نہ ادا کرے اور نہ ادا کرنے کی نیت رکھے تو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ ادائیگی قرض پر اس کی مدد نہیں کرتا اور اس کے رزق میں وسعت وفراخی عطا نہیں کرتا بلکہ اس کا مال تلف وضائع بھی کر دیتا ہے کیونکہ وہ ایک مسلمان کا مال ضائع کرنے کی نیت رکھتا ہے)۔" (بخاری)

اللہ تعالیٰ حقوق العباد معاف نہیں کرتا

⑬ وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ صَابِرًا مُحْتَسِبًا مُقْبِلًا غَیْرَ مُدْبِرٍ یُکَفِّرُ اللّٰهُ عَنِّیْ خَطَایَایَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ فَلَمَّا اَدْبَرَ نَادَاهُ فَقَالَ نَعَمْ اِلَّا الدَّیْنَ کَذٰلِكَ قَالَ جِبْرِیْلُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بتائیے اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں اس حال میں کہ میں صبر کرنے والا اور ثواب کا خواہش مند ہوں (یعنی میں دکھانے سنانے کی غرض سے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی کی خاطر اور ثواب کی طلب میں جہاد کروں) اور اس طرح جہاد کروں کہ میدان جنگ میں دشمن کو پیٹھ نہ دکھاؤں بلکہ ان کے سامنے سینہ سپر رہوں (یہاں تک کہ میں لڑتے لڑتے مارا جاؤں) تو کیا اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف کر دے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ "ہاں! پھر جب وہ شخص (اپنے سوال کا جواب پا کر) واپس ہوا تو آپ ﷺ نے اسے آواز دی اور فرمایا کہ "ہاں! اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ یقیناً معاف کر دے گا مگر قرض کو معاف نہیں کرے گا، مجھ سے جبریل نے یہی کہا ہے۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کا معاملہ بڑا سخت اور کٹھن ہے، اللہ تعالیٰ اپنے حقوق یعنی عبادات وطاعات میں کوتاہی اور گناہ ومعصیت کو معاف کر دیتا ہے مگر بندوں کے حقوق یعنی قرض وغیرہ کو معاف نہیں کرتا۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ تک اللہ تعالیٰ کا صرف وہی پیغام نہیں پہنچاتے تھے جو قرآن کریم کی شکل میں ہمارے سامنے ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی دیگر ہدایات واحکام پہنچاتے رہتے تھے۔

⑭ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یُغْفَرُ لِلشَّهِیْدِ کُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّیْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "شہید کے تمام (صغیرہ اور کبیرہ) گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ مگر دین (یعنی حقوق) کی معافی نہیں ہوتی۔" (مسلم)

تشریح: "دین" سے مراد حقوق العباد ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص پر بندہ کا کوئی حق ہو یعنی خواہ اس کے ذمہ کسی کا مال ہو، یا اس نے کسی کا ناحق خون کیا ہو، یا کسی کی آبروریزی کی ہو، یا کسی کو برا کہا ہو، یا کسی کی غیبت کی ہو تو اگر وہ شخص شہید بھی ہو جائے تب بھی یہ چیزیں معاف نہیں کی جائیں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے حقوق کسی حال میں معاف نہیں کرتا۔

لیکن ابن مالکؒ کہتے ہیں کہ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس حدیث کا تعلق "شہداء بر" یعنی بری جنگ میں شہید ہونے والوں سے ہے، بحری جنگ میں شہید ہونے والے اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ابن ماجہؒ نے ابوامامہؓ کی یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ بحری جنگ میں شہید ہونے والوں کے تمام گناہ حتی کہ دین (یعنی حقوق العباد) بھی بخشے جاتے ہیں۔

قرض دار کی نماز جنازہ پڑھنے سے آنحضرت ﷺ کا اجتناب

⑮ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُؤْتٰی بِالرَّجُلِ الْمُتَوَفّٰی عَلَیْهِ الدَّیْنُ فَیَسْأَلُ هَلْ تَرَكَ لِدَیْنِهٖ قَضَاءً فَاِنْ

حُدِّثَ اَنَّهٗ تَرَكَ وَفَاءً صَلّٰى وَاِلَّا قَالَ لِلْمُسْلِمِيْنَ صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْفُتُوْحَ قَامَ قَالَ اَنَا اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَتَرَكَ دَيْنًا فَعَلَيَّ قَضَاؤُهٗ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَهُوَ لِوَرَثَتِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کے سامنے کسی ایسے شخص کا جنازہ لایا جاتا جس پر قرض ہوتا تو آپ ﷺ پہلے پوچھتے کہ کیا یہ شخص اپنا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ مال چھوڑ کر مرا ہے؟ اگر یہ بتایا جاتا کہ یہ شخص اتنا مال چھوڑ کر مرا ہے جس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہے تو آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھ لیتے، اور اگر (یہ معلوم ہوتا کہ) کچھ بھی چھوڑ کر نہیں مرا ہے تو پھر (آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ خود نہ پڑھتے بلکہ) مسلمانوں سے فرماتے کہ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات کے دروازے کھول دیئے (اور مشرکین وکفار سے جنگ کے بعد غنیمت کی صورت میں مال وزر میں وسعت وکشادگی نصیب ہوئی) تو آپ ﷺ (ایک دن) خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور (مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ) میں (دین ودنیا کے تمام امور میں) مسلمانوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں لہٰذا جو مسلمان اس حالت میں مرے کہ اس پر قرض ہو (اور اس نے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کا قرض ادا ہو سکے) تو اس کے قرض کو ادا کرنے کا میں ذمہ دار ہوں اور جو مسلمان مال چھوڑ کر مرے (تو اس مال سے اس کا قرض ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے) وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "میں (دین ودنیا کے تمام امور میں) مسلمانوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں" سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ومحبوب رکھیں، آپ ﷺ کے حکم اور آپ ﷺ کی خواہش کو اپنے نفس کے حکم اور اپنے نفس کی خواہش پر مقدم رکھیں، آپ ﷺ کے حق کو اپنی جانوں کے حق سے مقدم جانیں اور ان کے قلوب اپنی جانوں کی شفقت ومحبت سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی شفقت ومحبت سے لبریز ہوں، اسی طرح آنحضرت ﷺ کی شان رحمت بھی یہی ہے کہ ایک مسلمان اپنی ذات پر جتنا شفیق ومہربان ہو سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ اس کے حق میں اس سے کہیں زیادہ شفیق ومہربان ہیں، ایک مسلمان کی جان، اس کی عزت وآبرو اور اس کا دین آنحضرت ﷺ کو جتنا زیادہ عزیز ومحبوب ہے اتنا خود اس کو نہیں ہے، چنانچہ مسلمانوں پر یہ آپ ﷺ کی بے پناہ شفقت ہی کا پرتو ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات جنگ میں حاصل ہونے والی غنیمت کے ذریعے آپ ﷺ پر مال وزر کے دروازے کھول دیئے تو آپ ﷺ کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہوا کہ اس مال وزر کو صرف اپنی ہی ذات تک محدود رکھیں بلکہ آپ ﷺ نے خود تو سختی وتنگدستی کی سابقہ حالت پر ہی قناعت کی اور سارا مال وزر مسلمانوں ہی کے لئے وقف رکھا۔ اسی لئے آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ اب جب کہ خدا نے مال وزر کے خزانے میرے تصرف میں دے دیئے ہیں تو میں اس بات کا زیادہ حقدار ہوں کہ مسلمانوں کی مال عزت وآبرو کا تحفظ کروں لہٰذا مسلمانوں کے قرض کی ادائیگی کا میں خود ذمہ دار ہوں کہ اگر کوئی مسلمان اس حال میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے کہ اس پر قرض ہے اور وہ قرض کی ادائیگی کے بقدر مال نہیں چھوڑ گیا ہے تو اس کا قرض میں ادا کروں گا۔

بعض حضرات تو یہ فرماتے تھے کہ آنحضرت ﷺ مردوں کے قرض کی ادائیگی بیت المال سے فرمایا کرتے تھے اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے لیکن بعض علماء کا قول یہ ہے کہ آپ ﷺ ان کا قرض اپنے مال میں سے ادا کرتے تھے۔

اسی طرح بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ مردوں کی طرف سے قرض کی ادائیگی آنحضرت ﷺ پر واجب تھی اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ ان کا قرض ادا کرنا آپ ﷺ پر واجب نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ تبرعاً یعنی ازراہ احسان وشفقت ان کے قرض کی ادائیگی کرتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

دیوالیہ کا حکم

(۱۶) عَنْ اَبِيْ خَلْدَةَ الزُّرَقِيِّ قَالَ جِئْنَا اَبَاهُرَيْرَةَ فِيْ صَاحِبٍ لَنَا قَدْ اَفْلَسَ فَقَالَ هٰذَا الَّذِيْ قَضٰى فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ مَاتَ اَوْ اَفْلَسَ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ اَحَقُّ بِمَتَاعِهٖ اِذَا وَجَدَهٗ بِعَيْنِهٖ۔ رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ۔

"حضرت ابی خلدہ زرقی کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابوہریرہؓ کے پاس اپنے ایک ساتھی کا معاملہ لے کر آئے جو مفلس ہو گیا تھا (مگر اس کے پاس لوگوں کا وہ سامان موجود تھا جس کی قیمت اس نے ادا نہیں کی تھی) ہم نے حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا کہ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ اس شخص کا معاملہ بالکل اس شخص جیسا ہے جس کے بارے میں رسول کریم ﷺ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ جو شخص مرجائے یا مفلس ہو جائے (اور اس کے ذمے لوگوں کے مطالبات ہوں) تو جس شخص کا مال اس کے پاس ہے وہی شخص اس مال کا زیادہ حقدار ہے بشرطیکہ وہ مال جوں کا توں موجود ہو۔" اس کی وضاحت کے لئے اسی باب کی پہلی فصل میں حدیث نمبر ۱ دیکھئے۔"

(شافعیؒ، ابن ماجہؒ)

قرض دار کی روح قرض کی ادائیگی تک معلق رہتی ہے

⑰ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهٖ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ۔

(رواہ الشافعی واحمد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مؤمن کی روح اپنے قرض کی وجہ سے اس وقت تک معلق رہتی ہے جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ ہو جائے (یعنی جب کوئی شخص قرضدار مرتا ہے تو اس کی روح اس وقت تک بندگان صالح کی جماعت میں داخل نہیں ہوتی جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ ہو جائے۔" (شافعیؒ، احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ جو قرض اپنی ادائیگی کے وقت تک مؤمن کی روح کو جنت اور بندگان صالح کی جماعت میں داخل ہونے سے روکتا ہے وہ قرض وہ ہے جو بلا ضرورت واقعی مال وزر کی صورت میں کسی سے لیا گیا ہو اور وہ مال وزر واہیات اور فضول کاموں میں خرچ کیا گیا ہو اور اسے اسراف کے طور پر لٹایا گیا ہو۔ ہاں جس شخص نے اپنی واقعی ضرورت کے لئے مثلاً حقوق واجبہ کی تکمیل یا کسی کے مالی مطالبہ کی ادائیگی کے بقدر ضرورت روپیہ یا مال قرض لیا ہو اور پھر قرضدار اس کو ادا کرنے سے پہلے مرگیا ہو تو ایسا قرض اس کو جنت اور بندگان صالح کی جماعت میں داخل ہونے سے انشاء اللہ نہیں روکے گا، مگر ایسے قرض کے بارے میں سلطان وقت یعنی حاکم (یا قرض دار کے متعلقین میں سے مستطیع لوگوں) کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ اس کا قرض ادا کر دیں اور اگر کوئی بھی اس کا قرض ادا نہیں کرے گا تو پھر امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں قرض خواہوں کو راضی کر دے گا تاکہ وہ اس قرض دار سے آخرت میں کوئی مطالبہ نہ کریں۔

⑱ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَاحِبُ الدَّيْنِ مَأْسُوْرٌ بِدَيْنِهٖ يَشْكُوْ اِلٰى رَبِّهِ الْوَحْدَةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرُوِيَ اَنَّ مُعَاذًا كَانَ يَدَّانُ فَاَتٰى غُرَمَاؤُهٗ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَاعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالَهٗ كُلَّهٗ فِيْ دَيْنِهٖ حَتّٰى قَامَ مُعَاذٌ بِغَيْرِ شَيْءٍ مُرْسَلٌ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ وَلَمْ اَجِدْهُ فِي الْاُصُوْلِ اِلَّا فِي الْمُنْتَقٰى، وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ شَابًّا سَخِيًّا وَكَانَ لَا يُمْسِكُ شَيْئًا فَلَمْ يَزَلْ يَدَّانُ حَتّٰى اَغْرَقَ مَالَهٗ كُلَّهٗ فِي الدَّيْنِ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَلَّمَهٗ لِيُكَلِّمَ غُرَمَاءَهٗ فَلَوْ تَرَكُوْا لِاَحَدٍ لَتَرَكُوْا لِمُعَاذٍ لِاَجْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَاعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُمْ مَالَهٗ حَتّٰى قَامَ مُعَاذٌ بِغَيْرِ شَيْءٍ۔ رَوَاهُ سَعِيْدٌ فِيْ سُنَنِهٖ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قرض دار اپنے قرض کی وجہ سے محبوس کر دیا جائے گا (یعنی جنت میں داخل ہونے اور بندگان صالح کی صحبت میں پہنچنے سے روک دیا جائے گا) چنانچہ وہ قیامت کے دن اپنے پروردگار سے اپنی تنہائی کی شکایت کرے گا۔" (شرح السنۃ)

"منقول ہے کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ قرض لیا کرتے تھے (ایک مرتبہ) ان کے قرض خواہ (اپنے قرض کی وصولی کے سلسلے میں) آنحضرت ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے معاذؓ کا سارا مال واسباب ان کے قرض کی ادائیگی کے لئے بیچ ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاذؓ مفلس ہوگئے۔ یہ حدیث مرسل ہے اور یہ الفاظ مصابیح کے نقل کردہ ہیں۔ (مشکوٰۃ کے مؤلف کہتے ہیں کہ) مجھے یہ روایت اصول یعنی صحاح ستہ وغیرہ میں نہیں ملی ہے، البتہ یہ روایت منتقی میں ملی ہے اور وہ بھی اس طرح ہے کہ "حضرت عبدالرحمٰن ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ ابن جبلؓ ایک سخی جوان تھے اور (اپنی سخاوت کی وجہ سے) کوئی مال واسباب اپنے پاس نہیں رکھتے تھے (کیونکہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ سب دوسروں کو دے دیا کرتے تھے) اسی وجہ سے وہ ہمیشہ قرض لیتے رہتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے اپنا مال واسباب قرض کی نذر کردیا۔ پھر وہ (ایک دن) آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے (اور اس بات کی خواہش کی) کہ آپ ﷺ ان کے قرض خواہوں سے سفارش کردیں (کہ وہ سارا قرض یا قرض کا کچھ حصہ معاف کردیں) چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے قرض خواہوں سے اس سلسلے میں گفتگو کی مگر انہوں نے کچھ بھی معاف نہیں کیا، اور اگر وہ کسی کا قرض معاف کرسکتے تو آنحضرت ﷺ کی وجہ سے معاذؓ کا قرض ضرور معاف کردیتے (لہٰذا جب انہوں نے معاف کرنے سے صاف انکار کردیا تو) آنحضرت ﷺ نے ان قرض خواہوں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے معاذؓ کا سارا مال واسباب بیچ دیا یہاں تک کہ "اس کی وجہ سے) معاذؓ مفلس ہوگئے! سعیدؒ نے اس روایت کو اپنی سنن میں بطریق ارسال نقل کیا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "اپنے پروردگار سے اپنی تنہائی کی شکایت کرے گا" کا مطلب یہ ہے کہ جب اس شخص کو نہ تو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی اور نہ نیک بخت لوگوں کی صحبت میں اسے جانے دیا جائے گا اور اس طرح جب وہ یہ دیکھے گا کہ تمام ہی نیک بخت لوگ تو جنت میں جارہے ہیں اور میں ایسا بدبخت ہوں کہ ان کی رفاقت وصحبت کی سعادت سے بھی محروم ہوں، نیز اسے کوئی ایسا سفارشی بھی نظر نہیں آئے گا جو اسے اس قید تنہائی سے نجات دلائے تو وہ اپنی تنہائی اور اس قید کی وحشت سے مضطرب ہو کر بارگاہ خداوندی میں شکوہ کرے گا۔ چنانچہ جب تک وہ قرض کی وجہ سے چھٹکارا نہ پا جائے گا۔ بایں طور کہ یا تو وہ اس قرض کے عوض میں اپنی نیکیاں قرض خواہوں کو دے دے، یا قرض خواہوں کے گناہوں کو ان کے قرض کے عوض اپنے اوپر لادلے، یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کے قرض خواہوں کو راضی کردے اور وہ اپنا حق معاف کردیں، اس وقت تک وہ اسی تنہائی میں رہے گا، گویا یہ تنہائی بھی اس کے لئے ایک عذاب کے درجے کی چیز ہوگی جس سے وہ سخت رنج واذیت محسوس کرے گا۔

ایک روایت میں یوں منقول ہے کہ قرض دار اپنے قرض کی وجہ سے اپنی قبر میں قید کیا جائے گا اور پھر وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی قید تنہائی کا شکوہ کرے گا۔

"اصول" ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں حدیثیں سند کے ساتھ نقل کی گئی ہیں۔ "منتقی" ابن تیمیؒ کی ایک کتاب کا نام ہے۔ لہٰذا مشکوٰۃ کے مؤلف روایت کے الفاظ لم اجد الخ کے ذریعے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مصابیح کے مصنف نے یہ روایت وروی ان معاذا کان الخ جن الفاظ میں نقل کی ہے ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت مجھے اصول کی کتابوں میں نہیں ملی ہے بلکہ یہ روایت منتقی میں منقول ہے اور وہ بھی ان الفاظ میں وعن عبدالرحمٰن الخ۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ منتقی کے ہیں اور ان کو یہاں مؤلف مشکوٰۃ نے اس لئے نقل کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ حدیث اگرچہ اصول کی ان کتابوں میں نہیں ہے جنہیں مؤلفؒ نے دیکھا ہے لیکن منتقی میں موجود ہے لہٰذا یہ روایت اگر اصول کی کتابوں میں نہ ہوتی تو صاحب منتقی اس کو اپنی کتاب میں نقل نہ کرتے۔

بلاعذر قرض ادا نہ کرنے والا مستطیع شخص قابل ملامت ہے

(۱۹) وَعَنِ الشَّرِيْدِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهٗ وَعُقُوْبَتَهٗ قَالَ ابْنُ الْمُبَارَكِ

يُحِلُّ عِرْضَهٗ يُغَلَّظُ لَهٗ وَ عُقُوْبَتَهٗ يُحْبَسُ لَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت شرید کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مستطیع شخص کا (ادائیگی قرض میں) تاخیر کرنا، اس کی بے آبروئی اور اسے سزادینے کو حلال کرنا ہے" ابن مبارک فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی بے آبروئی کا حلال ہونا یہ ہے کہ اسے ملامت کی جائے اور اسے سزادینا یہ ہے کہ اس کو قید کرادیا جائے۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص صاحب استطاعت اور مالدار ہونے کے باوجود بلاعذر اپنے قرض خواہ کا قرض ادا نہ کرے تو اس کی آبروریزی بھی مباح ہے اور اس کو سزادینا بھی درست ہے کیونکہ اس کی طرف سے بلاعذر ادائیگی قرض میں ٹال مٹول اور تاخیر ایک طرح کا ظلم ہے۔ آبروریزی کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے سرزنش کی جائے اور اسے برا بھلا کہا جائے۔ اور اس کو سزادینے کا مطلب یہ ہے کہ حاکم وعدالت سے چارہ جوئی کر کے اسے قید خانہ میں ڈلوادیا جائے۔

قرض دار مرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنے سے آنحضرت ﷺ کا انکار

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِجَنَازَۃٍ لِیُصَلِّیَ عَلَیْھَا فَقَالَ ھَلْ عَلٰی صَاحِبِکُمْ دَیْنٌ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ھَلْ تَرَکَ لَہٗ مِنْ وَفَاءٍ قَالُوْا لَا قَالَ صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِکُمْ قَالَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیَّ دَیْنُہٗ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰی عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ مَعْنَاہُ وَقَالَ فَکَّ اللّٰہُ رِھَانَکَ مِنَ النَّارِ کَمَا فَکَکْتَ رِھَانَ اَخِیْکَ الْمُسْلِمِ لَیْسَ مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ یَقْضِیْ عَنْ اَخِیْہِ دَیْنَہٗ اِلَّا فَکَّ اللّٰہُ رِھَانَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک جنازہ لایا گیا تاکہ آپ ﷺ اس کی نماز پڑھیں، آپ ﷺ نے (جنازہ لانے والوں سے) دریافت فرمایا کہ "کیا تمہارے اس ساتھی پر قرض بھی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ "ہاں!" آپ ﷺ نے پھر پوچھا کہ "کیا یہ شخص اپنے قرض کی ادائیگی کے بقدر (مال) چھوڑ گیا ہے؟ جواب دیا گیا کہ "نہیں!" آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر تم لوگ اس کی نماز جنازہ پڑھ لو (میں نہیں پڑھوں گا) حضرت علی نے (یہ سن کر) کہا کہ "یارسول اللہ! اس کے قرض کی ادائیگی میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ آگے بڑھے اور اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ ایک اور روایت میں جو اسی مضمون کی منقول ہے (مگر اس کے الفاظ اس سے مختلف ہیں) یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ نے (حضرت علی سے) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری جان کو دوزخ کی آگ سے اسی طرح نجات دے جس طرح تم نے اپنے ایک مسلمان بھائی کی جان کو (قرض کے بوجھ سے) نجات دی، (یاد رکھو) جو بھی مسلمان بندہ اپنے مسلمان بھائی کا قرض ادا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی جان کو نجات دے گا" (شرح السنۃ)

قرض کے بوجھ سے ہلکا ہو کر مرنے والے کے لئے بشارت

(۲۱) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ وَھُوَ بَرِیْءٌ مِنَ الْکِبْرِ وَالْغُلُوْلِ وَالدَّیْنِ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اس حالت میں مرے کہ وہ تکبر، خیانت اور قرض سے پاک ہو تو وہ (مقبول بندوں کے ساتھ) جنت میں داخل ہو گا۔" (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

بالکل مفلسی کی حالت میں قرض دار مرنا ایک بڑا گناہ ہے

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ یَلْقَاہُ بِھَا عَبْدٌ بَعْدَ الْکَبَائِرِ الَّتِیْ نَھَی اللّٰہُ عَنْھَا اَنْ یَمُوْتَ رَجُلٌ وَعَلَیْہِ دَیْنٌ لَا یَدَعُ لَہٗ قَضَاءً۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "کبیرہ گناہ کہ جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے اللہ کے نزدیک ان کے بعد عظیم ترین گناہ کہ جس کا مرتکب ہو کر بندہ خدا سے ملے یہ ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں مرے کہ اس پر قرض کا بوجھ ہو اور اس نے اپنے پیچھے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کا قرض ادا ہو جائے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: بالکل مفلسی کی حالت میں قرض کا بوجھ لے کر مرنے کے گناہ کو "گناہ کبیرہ" کے بعد کا درجہ اس لئے دیا گیا ہے کہ "گناہ کبیرہ" تو بذات خود ممنوع ہے لیکن قرض لینا بذات خود ممنوع نہیں ہے کہ وہ گناہ کبیرہ ہو بلکہ بعض احادیث میں تو (اپنی واقعی ضروریات کی تکمیل کے لئے) قرض لینے کو مستحب کہا گیا ہے، چنانچہ بعض مواقع پر قرض کی جو ممانعت منقول ہے وہ اس عارض کی بناء پر ہے کہ بسا اوقات قرض لینے میں لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں یعنی قرض لینے والا جب قرض کی ادائیگی نہیں کرتا تو قرض خواہ کا مال بلاوجہ ضائع ہو جاتا ہے اس صورت میں قرض لینا گناہ بن جاتا ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں منقول "گناہ کبیرہ" کی اگر یہ وضاحت کر دی جائے کہ ایسے گناہ کبیرہ جو مشہور ہیں۔ جیسے شرک اور زنا وغیرہما تو مطلب یہ ہوگا کہ بالکل مفلسی کی حالت میں قرض دار مرنے کے گناہ کا درجہ مشہور کبیرہ گناہ جیسے شرک وغیرہ کے بعد ہے، اس صورت میں یہ بھی (مشہور کبیرہ گناہوں کے علاوہ) دوسرے کبیرہ گناہوں کے زمرہ میں آجائے گا۔

حرام چیزوں میں صلح ناجائز ہے

(۲۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ الْمُزَنِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا صُلْحًا حَرَّمَ حَلَالًا اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا وَالْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ اِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَاَبُوْدَاوُدَ وَانْتَهَتْ رِوَايَتُهٗ عِنْدَ قَوْلِهٖ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ۔

"اور حضرت عمرو ابن عوف مزنیؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے ہاں وہ صلح جائز نہیں ہے جو حلال چیز کو حرام یا حرام چیز کو حلال کر دے اور مسلمان اپنی شرطوں پر ہیں (یعنی مسلمان صلح و جنگ یا ان کے علاوہ دوسرے معاملات میں آپس میں جو شرطیں یعنی عہد و پیمان کرتے ہیں ان کی پاسداری و پابندی ضروری ہے) ہاں اس شرط کی پابندی جائز نہیں ہے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، ابوداؤدؒ) ابوداؤد نے اس روایت کو لفظ علی شروطھم تک نقل کیا ہے

تشریح: ناجائز صلح کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص اس بات پر صلح کرے کہ میں بیوی کی سوکن سے جماع نہیں کروں گا یہ صلح درست نہیں ہے کیونکہ اس میں ایک ایسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینا لازم آتا ہے جو بالکل جائز اور حلال ہے اسی طرح وہ صلح بھی جائز نہیں ہے جو حرام چیز کو حلال کر دے مثلاً کوئی اس بات پر صلح کرے کہ میں شراب پیوں گا یا سور کھاؤں گا اس میں ایک چیز کو اپنے لئے حلال سمجھ لینا ہے جو قطعاً حرام ہے۔

جس طرح کی پاسداری و پابندی جائز نہیں ہے اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ شرط و عہد کر لے کہ میں اپنی لونڈی سے جماع نہیں کروں گا، اس میں ایک ایسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی شرط ہے جو حلال ہے، یا مثلاً کوئی اس بات کی شرط کرے کہ میں اپنی بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے شادی کر لوں گا، اس شرط و عہد کی پاسداری بھی درست نہیں کیونکہ اس میں ایک ایسی چیز کو اپنے لئے حلال قرار دے لینا لازم آتا ہے جو قطعاً حرام ہے۔

بظاہر یہ حدیث اس باب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی لیکن چونکہ مؤلف کتاب نے اس حدیث کو یہاں نقل کیا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ خرید و فروخت کے معاملات میں مفلس و دیوالیہ ہو جانے کے وقت اکثر صلح و شرائط کی نوبت آتی ہے اس لئے اس مناسبت سے اس

حدیث کو یہاں نقل کیا گیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ کا پائجامہ خریدنا

(۲۴) عَنْ سُوَيْدِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ جَلَبْتُ اَنَا وَمُخْرَفَةُ الْعَبْدِيُّ بَزًّا مِنْ هَجَرٍ فَاَتَيْنَا بِهٖ مَكَّةَ فَجَاءَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِيْ فَسَاوَمَنَا بِسَرَاوِيْلَ فَبِعْنَاهُ وَثَمَّ رَجُلٌ يَزِنُ بِالْاَجْرِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زِنْ وَاَرْجِحْ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"حضرت سوید ابن قیسؓ کہتے ہیں کہ میں اور مخرفہ عبدی نے مقام ہجر سے (جو مدینہ کے قریب واقع ہے) بیچنے کے لئے کپڑا لیا اور اسے لے کر مکہ میں آئے، رسول اللہ ﷺ (کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم بیچنے کے لئے کپڑا لے کر مکہ آئے ہیں تو آپ ﷺ) بہ نفس نفیس چل کر (بغیر سواری کے) ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے ایک پائجامہ خریدا، چنانچہ جب ہم نے وہ پائجامہ آپ ﷺ کو بیچا تو آپ ﷺ نے اس شخص سے کہ جو اس جگہ اجرت پر لوگوں کے اسباب تولا کرتا تھا فرمایا کہ تم (میرے چاندی کے یہ ٹکڑے) تول دو (تاکہ میں یہ ٹکڑے اس پائجامہ کی قیمت کے طور پر دے دوں) اور (جتنے ٹکڑوں کی بات طے ہوئی ہے اس سے) کچھ زیادہ ہی تول دینا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: ابو یعلیٰ نے اپنی سند میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے وہ پائجامہ چار درہم کے عوض خرید فرمایا تھا۔ احادیث سے صرف آپ ﷺ کا پائجامہ خریدنا ثابت ہوتا ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ نے وہ پائجامہ پہنا بھی تھا۔

اس حدیث میں جہاں آنحضرت ﷺ کی تواضع وانکساری کا بیان ہے کہ آپ ﷺ پائجامہ خریدنے کے لئے خود بہ نفس نفیس چل کر تشریف لائے وہیں اس حدیث سے آپ ﷺ کے کمال اخلاق وکرم فرمائی کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے پائجامہ بیچنے والے کو طے شدہ قیمت سے زائد مال عنایت فرمایا۔

یہ حدیث بھی بظاہر اس باب کے موضوع سے متعلق نہیں ہے الا یہ کہ یہ کہا جائے کہ بعض وقت بیچنے والے کے افلاس اور اس کی خستہ حالت کی وجہ سے اس کو ازراہ احسان وبھلائی متعینہ قیمت سے کچھ زائد بھی دے دیا جاتا ہے اس مناسبت سے یہ حدیث یہاں نقل کی گئی ہے۔

قرض کی واپسی میں غیر مشروط زیادتی جائز ہے

(۲۵) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ لِيْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَيْنٌ فَقَضَانِيْ وَزَادَنِيْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ پر میرا کچھ قرض تھا، چنانچہ جب آپ ﷺ نے وہ قرض واپس کیا تو مجھے کچھ زیادہ دیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی کا کوئی مطالبہ (مثلاً قرض وغیرہ) ادا کرے اور اپنی طرف سے کچھ زیادہ بھی دے دے بشرطیکہ وہ زیادتی سرے سے مشروط نہ ہو تو یہ درست ہے۔ اس زیادتی کو سود نہیں کہیں گے۔ کیونکہ سود تو اس زیادتی کو کہتے ہیں جو قرض خواہ قرض دیتے وقت مشروط کر دے مثلاً ایک سو روپیہ ایک متعین مدت کے وعدے سے بطور قرض کسی کو دے اور یہ شرط عائد کر دے کہ اس قرض کی واپسی کے وقت دس روپیہ مزید لوں گا یہ قطعاً حرام ہے۔

ادائیگی قرض کا جلد انتظام کرو

(۲۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ رَبِیْعَةَ قَالَ اسْتَقْرَضَ مِنِّی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعِیْنَ اَلْفًا فَجَاءَهُ مَالٌ فَدَفَعَهُ اِلَیَّ وَقَالَ بَارَكَ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ اِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْاَدَاءُ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت عبداللہ ابن ابی ربیعہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے ایک موقع پر چالیس ہزار (درہم) قرض لئے تھے، پھر جب آپ ﷺ کے پاس ایک بڑی مقدار میں مال آیا تو آپ ﷺ نے مجھے (وہ سب مال یا اس مال میں سے میرے قرض کے بقدر) دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اہل وعیال اور تمہارے اموال میں برکت عطا فرمائے قرض کا بدلہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ (جب قرض مل جائے تو) شکر وثنا کی جائے اور (جلد سے جلد) اس کی ادائیگی کا انتظام کیا جائے۔" (نسائی)

مہلت دینے والے کو ثواب ملتا ہے

(۲۷) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهٗ عَلٰی رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ یَوْمٍ صَدَقَةٌ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص کا کسی پر کوئی حق (یعنی قرضہ وغیرہ) ہو اور وہ اس (کو وصول کرنے) میں تاخیر کرے (یعنی قرض دار کو مہلت دے) تو اسے (دی ہوئی مہلت کے) ہر دن کے بدلے صدقہ کا ثواب ملے گا۔" (احمد)

دین میراث پر مقدم ہے

(۲۸) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ الْاَطْوَلِ قَالَ مَاتَ اَخِیْ وَتَرَكَ ثَلَاثَمِائَةِ دِیْنَارٍ وَتَرَكَ وَلَدًا صِغَارًا فَاَرَدْتُ اَنْ اُنْفِقَ عَلَیْهِمْ فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخَاكَ مَحْبُوْسٌ بِدَیْنِهٖ فَاقْضِ عَنْهُ قَالَ فَذَهَبْتُ فَقَضَیْتُ عَنْهُ ثُمَّ جِئْتُ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ قَضَیْتُ عَنْهُ وَلَمْ تَبْقَ اِلَّا امْرَاَةٌ تَدَّعِیْ دِیْنَارَیْنِ وَلَیْسَتْ لَهَا بَیِّنَةٌ قَالَ اَعْطِهَا فَاِنَّهَا صَادِقَةٌ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت سعد ابن اطول کہتے ہیں کہ جب میرا بھائی مرا تو اس نے تین سو دینار اور چھوٹے چھوٹے لڑکے چھوڑے تھے، چنانچہ میں نے چاہا کہ ان تین سو دیناروں کو اس کے چھوٹے بچوں پر خرچ کردوں (اور اس کا قرض ادا نہ کروں) لیکن رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارا بھائی اپنے قرض کی وجہ سے (عالم برزخ میں) محبوس کردیا گیا ہے (جس کے سبب وہ وہاں کی نعمتوں اور صلحاء کی صحبت سے محروم ہے) لہٰذا تم اس کا قرض ادا کردو۔ حضرت سعد کہتے ہیں کہ (یہ سنتے ہی) میں گھر آیا اور اپنے بھائی کا قرض ادا کیا۔ پھر میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنے بھائی کا قرض ادا کردیا ہے، اب کسی کا کوئی مطالبہ باقی نہیں ہے ہاں ایک عورت باقی رہ گئی ہے جو دو دینار کا دعویٰ کررہی ہے لیکن اس کا کوئی گواہ نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا "اس کو بھی دو دینار دے دو وہ سچی ہے۔" (احمد)

تشریح: یا تو آپ ﷺ کو سعد کے بھائی کے قرض کا حال بغیر وحی کے کسی اور ذریعے سے معلوم ہوا ہوگا اس لئے آپ ﷺ نے سعد کو اس کا قرض ادا کرنے کا حکم دیا کیونکہ حاکم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی معلومات پر اعتماد کرتے ہوئے حکم جاری کردے یا پھر آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے اس کے قرض کا حال معلوم ہوا ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین، میراث پر مقدم ہے، یعنی مرنے والے کے مال وزر میں سے پہلے لوگوں کے وہ مطالبات ادا کئے جائیں جو اپنے ذمہ چھوڑ گیا ہو اس کے بعد جو کچھ بچے وہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے

بار بار کی شہادت بھی قرض کا کفارہ نہیں ہو سکتی

(۲۹) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جَحْشٍ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا بِفِنَاءِ الْمَسْجِدِ حَيْثُ يُوْضَعُ الْجَنَائِزُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ بَيْنَ ظَهْرَيْنَا فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَصَرَهُ قِبَلَ السَّمَاءِ فَنَظَرَ ثُمَّ طَأطَأَ بَصَرَهُ وَوَضَعَ يَدَهُ عَلٰى جَبْهَتِهِ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاذَا نَزَلَ مِنَ التَّشْدِيْدِ قَالَ فَسَكَتْنَا يَوْمَنَا وَلَيْلَتَنَا فَلَمْ نَرَ اِلَّا خَيْرًا حَتّٰى اَصْبَحْنَا قَالَ مُحَمَّدٌ فَسَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا التَّشْدِيْدُ الَّذِيْ نَزَلَ قَالَ فِي الدَّيْنِ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ اَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يُقْضٰى دَيْنُهُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ نَحْوُهُ۔

"اور حضرت محمد بن عبداللہ ابن جحش ؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ مسجد نبوی ﷺ کے قریب اس صحن میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں جنازے لاکر رکھے جاتے تھے، ہمارے درمیان رسول کریم ﷺ بھی تشریف فرما تھے، اچانک آپ ﷺ نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور ادھر دیکھا پھر اپنی نظر جھکالی اور اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ کر (انتہائی تعجب کے عالم میں) فرمایا کہ "سبحان اللہ! سبحان اللہ! کس قدر سختی نازل ہوئی ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ "ہم خاموش رہے (یعنی ہم نے آپ ﷺ سے کوئی سوال نہیں کیا) یہاں تک کہ وہ پورا دن گذرا، پوری رات گذری اور ہمیں اچھائی کے علاوہ کوئی سخت بات نظر نہیں آئی (یعنی صحابہ ؓ آپ ﷺ کے اس ارشاد سے یہ سمجھے کہ شاید اسی وقت کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے یا کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے مگر وہ پورا دن گذر گیا، پوری رات گذر گئی نہ کوئی عذاب نازل ہوا اور نہ کوئی مصیبت پیش آئی) تا آنکہ صبح ہوگئی۔ حدیث کے راوی محمد ابن عبداللہ ؓ کہتے ہیں کہ: "اس کے بعد میں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ وہ کیا سختی ہے جو نازل ہوئی ہے" (اور جس کا اظہار آپ ﷺ نے اتنے تعجب کے ساتھ کل فرمایا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا (دین (یعنی قرض وغیرہ) کے بارے میں وہ سختی نازل ہوئی ہے، قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر کوئی شخص اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کرتے ہوئے) مارا جائے اور پھر زندہ ہو، پھر اللہ کی راہ میں مارا جائے اور پھر زندہ ہو، پھر اللہ کی راہ میں مارا جائے اور پھر زندہ ہو اور اس پر قرض ہو تو وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے (یعنی اگر کوئی قرض دار بار بار بھی اللہ کی راہ میں مارا جائے تو یہ بار بار کی شہادت بھی اس کے قرض کا کفارہ نہیں ہو سکتی) اس روایت کو امام احمد ؒ نے نقل کیا ہے۔ نیز شرح السنۃ میں بھی اسی طرح کی حدیث منقول ہے۔" (جس کا مضمون تو یہی ہے مگر الفاظ دوسرے ہیں)

تشریح: اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ ؓ جنازہ کی نماز مسجد میں نہیں پڑھتے تھے بلکہ مسجد سے باہر دوسری جگہ پڑھتے تھے۔

بَابُ الشِّرْكَةِ وَالْوَكَالَةِ

شرکت اور وکالت کا بیان

لغت میں "شرکت" کے معنی ہیں "ملانا" لیکن اصطلاح شریعت میں "شرکت کہتے ہیں "دو آدمیوں کے درمیان ایک ایسا (مثلاً تجارتی) عقد و معاملہ ہونا جس میں وہ اصل اور نفع دونوں میں شریک ہوں

"شرکت" کی دو قسمیں ہیں، "شرکت ملک" اور "شرکت عقد" شرکت ملک اسے کہتے ہیں کہ دو آدمی یا کئی آدمی بذریعہ خرید یا ہبہ یا میراث کسی ایک چیز کے مالک ہوں، یا دو شخص مشترک طور پر کسی مباح چیز کو حاصل کریں، مثلاً دو آدمی مل کر شکار کریں اور وہ شکار دونوں کی مشترک ملکیت ہو۔ یا دو آدمیوں کا ایک ہی جنس کا الگ الگ مال ایک دوسرے میں اس طرح مل جائے کہ ان دونوں کے مال کا امتیاز نہ

ہوسکے۔ مثلاً زید کا دودھ بکر کے دودھ میں مل جائے یا وہ دونوں اپنے اپنے مال کو قصداً ایک دوسرے کے مال میں ملادیں۔ یہ سب شریک ملک کی صورتیں ہیں۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ ہر شریک اپنے دوسرے شریک کے حصے میں اجنبی آدمی کی طرح ہے، اور ہر شریک اپنا حصہ اپنے دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر اس شریک کو یا کسی (دوسرے شخص (یعنی غیر شریک کو) فروخت کرسکتا ہے البتہ آخری دونوں صورتوں میں (یعنی ایک دوسرے کے مال کے آپس میں مل جانے یا اپنے مال کو ایک دوسرے کے مال میں قصداً ملادینے کی صورت میں) کوئی بھی شریک اپنا حصہ کسی دوسرے شخص (یعنی غیر شریک) کو اپنے دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر نہیں بیچ سکتا۔

"شرکت عقد" کا مطلب ہے "شرکاء کا ایجاب وقبول کے ذریعے اپنے اپنے حقوق واموال کو متحد کردینا" اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک دوسرے سے یہ کہے کہ میں نے اپنے فلاں حقوق اور فلاں معاملات یعنی تجارت وغیرہ میں تمہیں شریک کیا اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا۔ اس طرح "شرکت عقد" کا رکن (یعنی اس کی بنیاد) تو ایجاب وقبول ہے اور اس کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ معاہدہ شرکت میں ایسی کوئی دفعہ مطلقاً شامل نہ ہو جو شرکت کے بنیادی اصولوں کو فوت کردے جیسے شرکاء میں سے کسی ایک کا فائدے میں سے کچھ حصے کو اپنے لئے متعین ومخصوص کرلینا مثلاً کسی تجارت میں دو آدمی شریک ہوں اور ان میں سے کوئی ایک شریک یہ شرط عائد کردے کہ اس تجارت سے حاصل ہونے والے فائدے میں سے پانچ سو روپے ماہوار لیا کروں گا۔ یہ شرط مشترک ومتحد معاملات کے بالکل منافی ہے۔ جو شرکت کے بنیادی اصول ومقاصد ہی کو فوت کردیتی ہے، اس لئے معاہدہ شرکت میں ایسی کسی دفعہ کا شامل نہ ہونا شرکت کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے۔

پھر شرکت عقد کی چار قسمیں ہیں۔ ① شرکت مفاوضہ ② شرکت عنان ③ شرکت صنائع والتقبل ④ اور شرکت وجوہ۔

"شرکت مفاوضہ" تو یہ ہے کہ دو شخص یہ شرط کریں یعنی آپس میں ٹھہرالیں کہ مال میں تصرف میں مفاوضہ میں دونوں شریک رہیں گے لیکن اس شرکت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ دونوں دین ومذہب میں بھی یکساں اور برابر ہوں۔ یہ شرکت ایک دوسرے کی وکالت اور کفالت کو لازم کردیتی ہے، یعنی شرکت مفاوضہ میں شرکاء ایک دوسرے کے وکیل اور کفیل ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ شرکت مسلمان اور ذمی کے درمیان جائز نہیں ہوتی کیونکہ دین ومذہب کے اعتبار سے دونوں مساوی اور یکساں نہیں ہیں، اسی طرح غلام اور آزاد کے درمیان اور بالغ ونابالغ کے درمیان بھی یہ شرکت جائز نہیں کیونکہ یہ تصرف میں مساوی ویکساں نہیں ہیں۔

اس شرکت کے معاہدہ وشرائط میں لفظ "مفاوضت" یا اس کے تمام مقتضیات کو بیان وواضح کردینا ضروری ہے۔ اس شرکت میں عقد ومعاہدہ کے وقت شرکاء کا اپنا اپنا مال دینا یا اپنے اپنے مال کو ملانا شرط نہیں ہے۔ اس شرکت میں شرکاء چونکہ ایک دوسرے کے کفیل ووکیل ہوتے ہیں اس لئے اگر اس میں سے کوئی بھی اپنے بال بچوں کے کھانے اور کپڑے کے علاوہ جو کچھ خریدے گا وہ تمام شرکاء کی ملکیت ہوگا۔

حضرت امام محمدؒ کے نزدیک شرکت مفاوضت اور عنان صرف ایسے سرمایہ اور مال میں صحیح ہوسکتی ہے جو روپے، اشرفی اور رائج الوقت سکوں کی شکل میں ہو۔ ہاں سونے اور چاندی کے ڈلوں اور ٹکڑوں میں بھی جائز ہے بشرطیکہ ان کے ذریعے لین دین ہوتا ہو اور اگر شرکاء میں سے کوئی ایک وارث یا کسی اور ذریعے سے کسی ایسے مال کا مالک ہوا جس میں مفاوضت درست ہوسکتی ہے جیسے روپے اور اشرفی وغیرہ تو شرکت مفاوضت باطل ہوکر شرکت عنان ہوجائے گی اور اگر شرکاء میں سے کوئی ایک کسی ایسے مال کا وارث ہوگیا جس میں شرکت مفاوضت نہیں ہوسکتی جیسے اسباب، مکان اور زمین وغیرہ تو شرکت مفاوضت باقی رہے گی۔

"شرکت عنان" یہ ہے کہ دو آدمی ایک خاص طور کے معاملہ مثلاً تجارت میں شریک ہوں اور وہ دونوں مذکورہ بالا چیزوں یعنی تصرف اور دین ومذہب وغیرہ میں یکساں وبرابر ہوں یا یکساں وبرابر نہ ہوں۔ یہ شرکت ایک دوسرے کی وکالت کو تو لازم کرتی ہے مگر کفالت کو لازم نہیں کرتی۔ ہاں شرکاء ایک دوسرے کے وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ کفیل وامین بھی ہوتے ہیں مگر اسی کام میں جس میں وہ شریک

ہوں۔

"شرکت صنائع والتقبل" یہ ہے کہ دو پیشہ ور مثلاً دو درزی یا دو رنگریز اس شرط پر شرکت میں کام کریں کہ دونوں شریک کام لیں گے اور دونوں اس کام کو مل جل کر کریں گے اور پھر جو اجرت حاصل ہوگی اسے دونوں تقسیم کریں گے۔ اگر ان کے معاہدہ شرکت میں یہ شرط ہو کہ کام تو دونوں آدھوں آدھ کریں گے مگر نفع میں سے ایک تو دو تہائی لے گا اور دوسرا ایک تہائی تو یہ شرط جائز ہے۔ دونوں شرکاء میں سے جو بھی کسی کا کام لے گا اس کو کرنا دونوں کے لئے ضروری ہوگا یہ نہیں کہ جس شریک نے کام لیا ہو وہی اسے کرے بھی، اسی طرح ان کے یہاں کام کرانے والا دونوں شرکاء میں سے کسی سے بھی اپنا کام طلب کر سکتا ہے ایسے ہی دونوں شرکاء میں سے ہر ایک کو مساوی طور پر یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کسی بھی کام کی اجرت حاصل کرلے اور ان میں سے کسی ایک کو اجرت دینے والا بری الذمہ ہو جائے گا۔ کام کے منافع اور کمائی میں دونوں شریک حصہ دار ہوں گے خواہ کام دونوں کریں یا صرف ایک کرے۔

"شرکت وجوہ" یہ ہے کہ ایسے دو آدمی جن کے پاس اپنا کوئی سرمایہ اور مال نہ ہو اس شرط پر مشترک کاروبار کریں کہ دونوں اپنی اپنی حیثیت اور اپنے اپنے اعتبار پر قرض سامان لاکر فروخت کریں گے اور اس کا نفع آپس میں تقسیم کریں گے۔ اگر ان دونوں کی شرکت میں مفاوضت کی شرط ہوگی تو وہ صحیح ہو جائے گی اور اگر وہ شرکت کو بلا شرط مفاوضت یعنی مطلق رکھیں گے تو ان کی یہ شرکت بطور عنان ہوگی، یہ شرکت تجارت کے لئے خریدے گئے مال میں وکالت کو لازم کرتی ہے، یعنی وہ اپنے یہاں فروخت کرنے کے لئے جو مال خرید کرائیں گے اس میں وہ ایک دوسرے کے وکیل ہوں گے، لہذا اگر دونوں میں یہ شرط طے پائی ہو کہ تجارت کے لئے جو مال خریدا جائے گا وہ دونوں کا آدھوں آدھ رہے گا تو اس کے نفع میں بھی دونوں آدھوں آدھ کے حقدار ہوں گے اور اگر یہ شرط طے پائے کہ جو مال خرید کر لایا جائے گا اس میں سے ایک کا تو ایک تہائی ہوگا اور دوسرے کا دو تہائی یا ایک کا دو تہائی ہوگا اور دوسرے کا ایک تہائی تو اس کا نفع بھی اسی اعتبار سے تقسیم ہوگا نفع میں کمی بیشی کی شرط باطل ہوگی یعنی یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ مال کو تو آدھوں آدھ رکھیں اور نفع میں کمی بیشی کریں بایں طور کہ ایک تو نفع میں دو حصے لے اور دوسرا ایک حصہ لے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نفع کا استحقاق ضمان یعنی ذمہ داری کی وجہ سے ہوتا ہے اور ضمان اس خریدی ہوئی چیز کی ملک کے تابع ہے مثلاً اگر ان میں سے کوئی مال کے نصف حصہ کا مالک بنا ہے تو اسے نصف قیمت ادا کرنی ہوگی اور جو دو حصوں کا مالک بنا ہے اسے دو حصوں کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ اس لئے نفع بھی ملکیت کے مطابق ہی قرار پائے گا جو جتنے حصہ کا مالک بنے گا اسے اتنا ہی نفع ملے گا۔ اور اس چیز میں شرکت جائز نہیں ہے جس میں وکالت صحیح نہ ہوتی ہو جیسے لکڑی کاٹنا، گھاس کھودنا، شکار کرنا اور پانی لانا۔ دونوں میں سے جو شخص پانی لائے گا وہی اس کا مالک ہوگا، اگر دوسرا اس میں اس کی مدد کرے گا تو وہ رائج اجرتوں کے مطابق اپنی اجرت پانے کا مستحق ہوگا۔

"وکالت" کے معنی ہیں اپنے حقوق و مال کے تصرف (یعنی لینے دینے) میں کسی دوسرے کو اپنا قائم مقام بنانا"۔ وکالت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ موکل (یعنی کسی دوسرے کو اپنا وکیل بنانے والا) تصرف (یعنی لین دین) کا مالک ہو اور جس شخص کو وکیل بنایا جا رہا ہو وہ اس معاملہ کو جانتا ہو جس میں وہ وکیل بنایا گیا ہے۔

اور جو معاملہ آدمی کو خود کرنا جائز ہے اس میں دوسرے کو وکیل کرنا بھی جائز ہے اور جو معاملہ آدمی کو خود کرنا جائز نہیں ہے اس میں وکیل کرنا بھی جائز نہیں ہے مثلاً کوئی شخص شراب یا سور وغیرہ حرام چیزوں کی خرید و فروخت کے لئے کسی کو وکیل کر دے تو یہ درست نہیں ہوگا۔ تمام حقوق کو ادا کرنے اور ان کے حاصل کرنے میں وکیل کرنا جائز ہے اسی طرح حقوق پر قبضہ کرنے کے لئے بھی وکیل کرنا جائز ہے مگر حدود اور قصاص میں جائز نہیں ہے کیونکہ ان کی انجام دہی پر باوجود موکل کے اس جگہ موجود نہ ہونے کے وکالت درست نہیں ہوتی۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ حقوق کی جواب دہی کے لئے وکیل کرنا فریق ثانی کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے ہاں اگر

کل بیمار ہو یا تین منزل کی مسافت یا اس سے زائد کی دوری پر ہو تو جائز ہے لیکن صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسف اور حضرت امام محمد کہتے ہیں کہ فریق ثانی کی رضامندی کے بغیر بھی حقوق کی جواب دہی کے لئے وکیل کرنا جائز ہے۔

شرکت اور وکالت کے بارے میں یہ چند اصول و مسائل فقہ کی کتابوں سے تلخیص کر کے لکھ دیئے ہیں مزید تفصیل کے لئے اہل علم فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عقود میں شرکت جائز ہے

① عَنْ زُهْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ اَنَّهُ كَانَ يَخْرُجُ بِهٖ جَدُّهُ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ هِشَامٍ اِلَى السُّوْقِ فَيَشْتَرِى الطَّعَامَ فَيَلْقَاهُ ابْنُ عُمَرَ وَ ابْنُ الزُّبَيْرِ فَيَقُوْلَانِ لَهُ اَشْرِكْنَا فَاِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ دَعَا لَكَ بِالْبَرَكَةِ فَيُشْرِكُهُمْ فَرُبَّمَا اَصَابَ الرَّاحِلَةَ كَمَا هِيَ فَيَبْعَثُ بِهَا اِلَى الْمَنْزِلِ وَكَانَ عَبْدُاللّٰهِ ابْنُ هِشَامٍ ذَهَبَتْ بِهٖ اُمُّهُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَسَحَ رَاْسَهُ وَدَعَا لَهُ بِالْبَرَكَةِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت زہرہ ابن معبد (تابعی) کے بارہ میں منقول ہے کہ ان کو ان کے دادا حضرت عبداللہ ابن ہشام بازار لے جایا کرتے تھے جہاں وہ غلہ خریدا کرتے تھے چنانچہ (جب وہ غلہ خرید لیتے تو) وہاں انکو حضرت ابن عمر اور حضرت ابن زبیر ملتے اور وہ دونوں ان سے کہتے کہ ہم کو اپنا شریک بنالو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے تمہارے لئے برکت کی دعا کی ہے (حضرت زہرہ کہتے ہیں کہ میرے دادا انکو شریک کر لیا کرتے تھے اور) آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت سے انکو بلا کسی نقصان و خسارہ کے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ کا فائدہ ہوتا تھا جسے وہ اپنے گھر بھیجدیا کرتے تھے۔ اور انکے حق میں آنحضرت ﷺ کے دعا کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن ہشام کی والدہ انہیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئیں تو آپ ﷺ نے ان کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور ان کے لئے برکت کی دعا کی۔" (بخاری)

انصار کے مال میں مہاجرین کی شرکت

② وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَتِ الْاَنْصَارُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اقْسِمْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ اِخْوَانِنَا النَّخِيْلَ قَالَ لَا تَكْفُوْنَنَا الْمُؤْنَةَ وَنُشْرِكُكُمْ فِى الثَّمَرَةِ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ (جب مکہ سے مہاجرین مدینہ آئے تو) انصار (یعنی مدینہ کے لوگوں) نے نبی ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے کھجوروں کے درختوں کو ہمارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں درختوں کو تقسیم نہیں کرونگا تم ہی لوگ ہماری (یعنی مہاجرین کی) طرف سے بھی محنت کر لیا کرو ہم پیداوار میں تمہارے شریک رہیں گے۔ انصار نے کہا کہ ہم آپ ﷺ کی اس بات کو بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔" (بخاری)

تشریح: جب مکہ کے مسلمانوں پر ان کے وطن کی زمین تنگ کر دی گئی اور خدا اور خدا کے رسول کے حکم پر وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آگئے تو چونکہ انہوں نے اپنا سارا سامان و اسباب اور مال و متاع مکہ ہی میں چھوڑ دیا تھا اس لئے یہاں مدینہ میں ان کی معاشی زندگی کا تکفل مدینہ کے مسلمانوں نے کہ جنہیں "انصار" کہا جاتا ہے اپنے ذمہ لیا اس کی شکل یہ کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے انصار مدینہ اور مہاجرین مکہ کے درمیان "بھائی چارہ" کرایا چنانچہ انصار مدینہ نے اپنے تمام مال و اسباب میں مہاجرین کو برابر شریک بنالیا۔ اسی موقع پر انصار نے آپ سے درخواست کی کہ ہمارے کھجوروں کے درختوں کو بھی ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم فرما دیجئے گہ ہم اپنے اپنے حصہ کے درختوں میں محنت مشقت کریں اور ان سے پھل پیدا کریں، آپ نے ان سے فرمایا کہ میں درختوں کی تقسیم

نہیں کروں گا، بلکہ تمہیں لوگ ان درختوں کی دیکھ بھال کرو اور ان میں پانی وغیرہ دینے کی محنت و مشقت خود گوارہ کرلو کیونکہ تمہارے ان بیچارے مہاجرین بھائیوں سے یہ محنت و مشقت برداشت نہیں ہوگی۔ پھر جب پھل تیار ہو جائے گا تو میں تمہارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کردوں گا۔ آپ کے اس فیصلہ کو انصار نے برضاء ورغبت اور بسروچشم قبول کرلیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرنا، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور ان کی طرف سے محنت و مشقت کرنا مستحب ہے تیز یہ حدیث بھی شرکت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

معاملات میں وکیل بنانا جائز ہے

③ وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ اَبِی الْجَعْدِ الْبَارِقِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَاهُ دِیْنَارًا لِیَشْتَرِیَ لَهٗ شَاةً فَاشْتَرٰی لَهٗ شَاتَیْنِ فَبَاعَ اِحْدَاهُمَا بِدِیْنَارٍ وَاَتَاهُ بِشَاةٍ وَّدِیْنَارٍ فَدَعَالَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ بَیْعِهٖ بِالْبَرْکَةِ فَکَانَ لَوِاشْتَرَی تُرَابًا لَرَبِحَ فِیْهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عروہ ابن الجعد بارقیؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ نے انہیں ایک دینار دیا تاکہ وہ آپ ﷺ کے لئے ایک بکری خرید لائیں، چنانچہ انہوں نے ایک دینار میں دو بکریاں خرید لیں اور پھر ان میں سے ایک بکری کو ایک دینار کے عوض (کسی کے ہاتھ) بیچ دیا، اس طرح انہوں نے آنحضرت ﷺ کو ایک بکری دی اور ایک دینار بھی دیا۔ رسول کریم ﷺ نے ان کی اس ذہانت سے خوش ہو کر ان کے خرید و فروخت کے معاملات میں برکت کی دعا فرمائی، جس کا اثر یہ ہوا کہ اگر وہ مٹی خرید لیتے تو اسمیں بھی انہیں فائدہ ہوتا۔"

(بخاریؒ)

تشریح: ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تجارتی معاملات میں وکالت جائز ہے اسی طرح ان تمام چیزوں میں بھی کسی کو اپنا وکیل بنانا درست ہے جن میں نیابت اور قائم مقامی چلتی ہو۔

اگر کوئی شخص کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر بیچے تو بیع منعقد ہو جاتی ہے لیکن اس کا صحیح ہونا مال کے مالک کی اجازت پر موقوف رہتا ہے اگر مال کا مالک اجازت دے دے گا تو بیع صحیح ہو جائے گی۔ یہ حنفیہ کا مسلک ہے، لیکن حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مالک کی اجازت کے بغیر اس کا مال بیچنا سرے سے جائز ہی نہیں ہے اگرچہ بعد میں مالک کی اجازت بھی حاصل کیوں نہ ہو جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

امانت دار شرکاء کا اللہ تعالیٰ محافظ رہتا ہے

④ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَفَعَهٗ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یَقُوْلُ اَنَا ثَالِثُ الشَّرِیْکَیْنِ مَالَمْ یَخُنْ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهٗ فَاِذَا خَانَهٗ خَرَجْتُ مِنْ بَیْنِهِمَا۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَزَادَ رَزِیْنٌ وَجَاءَ الشَّیْطَانُ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میں دو شریکوں کے درمیان ایک تیسرا (نگہبان) ہوں جب تک کہ ان میں سے کوئی اپنے دوسرے شریک کے ساتھ خیانت نہیں کرتا" اور جب وہ خیانت و بددیانتی پر اتر آتے ہیں تو میں ان کے درمیان سے ہٹ جاتا ہوں (ابوداؤدؒ) اور رزینؒ نے اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "اور پھر ان کے درمیان شیطان آجاتا ہے۔"

تشریح: "میں دو شریکوں کے درمیان ایک تیسرا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ شرکاء جب تک دیانت، امانت اور ایمانداری کے ساتھ باہم شریک رہتے ہیں میری محافظت و برکت کا سایہ ان پر رہتا ہے بایں طور کہ میں انہیں ہر نقصان و تباہی سے محفوظ رکھتا ہوں، ان کے مال پر

کوئی آفت نازل نہیں کرتا، ان کے رزق میں وسعت بخشتا ہوں، ان کے معاملات میں خیرو بھلائی برقرار رکھتا ہوں، ان کے مال پر کوئی آفت نازل نہیں کرتا، ان کے رزق میں وسعت بخشتا ہوں، ان کے معاملات میں خیرو بھلائی برقرار رکھتا ہوں اور ہر موقع پر ان کی مدد نصرت کرتا ہوں۔

ان کے درمیان سے ہٹ آتا ہوں کا مطلب یہ ہے کہ جب شرکاء میں بددیانتی کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ خیانت کرنے لگتے ہیں تو میری محافظت و برکت کا سایہ ان پر سے ہٹ جاتا ہے اور اس کے بجائے شیطان اپنا تسلط جمالیتا ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ شرکاء مکمل نقصان و تباہی کے کنارے پہنچ جاتے ہیں اور ان کے مال و رزق سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معاملات بطور خاص تجارت وغیرہ میں شرکت مستحب ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے کاروبار اور مال و سرمایہ میں اللہ تعالیٰ کی وہ برکت نازل ہوتی ہے جو تنہا کاروبار کرنے والے کو حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ جب کسی کاروبار میں دو آدمی شریک ہوتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اپنے دوسرے شریک کے مال کی حفاظت و نگرانی میں کوشاں رہتا ہے، اور یہ معلوم ہی ہے کہ کوئی بندہ جب تک اپنے مسلمان بھائی کی مدد اور خیر خواہی میں لگا رہتا ہے اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال رہتی ہے۔

خائن سے انتقام کا جذبہ تمہیں خیانت پر نہ اکسادے

⑤ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَدِّ الْاَمَانَةَ اِلٰى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ۔

(رواه الترمذی، وابوداؤد، والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے تمہیں امین بنایا ہے اس کی امانت اس تک پہنچاؤ جو شخص تمہارے ساتھ خیانت کرے تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: قاضیؒ کہتے ہیں کہ حدیث کی آخری ہدایت سے مراد یہ ہے کہ خائن نے تمہارے ساتھ جو معاملہ کیا ہے وہی معاملہ تم اس کے ساتھ نہ کرو یعنی اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہے تو تم بھی اس کے ساتھ خیانت نہ کرو کیونکہ اگر تم بھی خیانت کرو گے تو پھر جس طرح وہ خائن ہے اسی طرح تم بھی خائن قرار دیئے جاؤ گے۔ ہاں اس سے وہ شخص مستثنیٰ ہے جو ظالم (کسی کا مال لیکر مکر جانے والے) سے اپنے حق کے بقدر اس کا مال لے لے، کیونکہ وہ تو اپنا حق اس سے لیتا ہو جو کوئی عدوان یعنی ظلم و زیادتی نہیں ہے جب کہ خیانت ایک صریح عدوان (ظلم) ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کا کوئی حق مثلاً مال کسی کے ذمہ واجب ہو اور اس کا مال اس صاحب حق کی دسترس میں ہو تو وہ اپنے مال کے بقدر اس کے مال میں سے لے لے بشرطیکہ جو مال کی دسترس میں ہے وہ اس مال کی جنس سے ہو جو مال والے کے ذمہ ہے مثلاً زید کے دس ۱۰ روپے بکر کے ذمہ واجب ہیں اور..... بکر کے کچھ روپے زید کی دسترس میں ہیں تو اب زید کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان روپوں میں سے اپنے دس ۱۰ روپے لے لے۔

آنحضرت ﷺ کا وکیل

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَرَدْتُ الْخُرُوْجَ اِلٰى خَيْبَرَ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ اِنِّيْ اَرَدْتُ الْخُرُوْجَ اِلٰى خَيْبَرَ فَقَالَ اِذَا اَتَيْتَ وَكِيْلِيْ فَخُذْ مِنْهُ خَمْسَةَ عَشَرَ وَسْقًا فَاِنِ ابْتَغٰى مِنْكَ اٰيَةً فَضَعْ يَدَكَ عَلٰى تَرْقُوَتِهٖ۔

(رواه ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے خیبر جانے کا ارادہ کیا تو (رخصت ہونے کے ارادہ سے) نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر

ہوا میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا اور عرض کیا کہ میں نے خیبر جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم خیبر میں میرے وکیل کے پاس جاؤ تو اس سے پندرہ وسق (کھجوریں) لے لینا اگر وہ تم سے کوئی نشانی مانگے تو اپنا ہاتھ اس کے حلق پر رکھ دینا۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے جس شخص کو خیبر میں اپنا وکیل مقرر کر رکھا تھا اسے یہ ہدایت دے رکھی ہوگی کہ اگر کوئی شخص میری طرف سے کچھ مانگنے آئے اور تم اس سے میرا فرستادہ ہونے کی کوئی نشانی و علامت طلب کرو اور وہ اپنا ہاتھ تمہارے حلق پر رکھ دے تو سمجھ لینا کہ اس شخص کو میں نے بھیجا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت جابرؓ کو یہی نشانی سکھا کر بھیجا تاکہ وکیل اس نشانی کے ذریعہ ان کو پندرہ ۱۵ وسق کھجوریں دیدے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

شرکت مضاربت میں خیر و بھلائی ہے

⑦ عَنْ صُهَيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ فِيْهِنَّ الْبَرَكَةُ الْبَيْعُ اِلٰى اَجَلٍ وَالْمُقَارَضَةُ وَاِخْلَاطُ الْبُرِّ بِالشَّعِيْرِ لِلْبَيْتِ لَا لِلْبَيْعِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت صہیبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تین چیزیں ایسی ہیں جن میں برکت (یعنی بہت زیادہ خیر و بھلائی) حاصل ہوتی ہے"۔ ① وعدہ پر بیچنا یعنی خریدار کو ادائیگی قیمت میں مہلت دینا ② مضاربت ③ (گیہوں میں جو ملانا گھر کے خرچ کے لئے بیچنے کے لئے نہیں۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مضاربت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا مال تجارت کے لئے دے اور وہ اپنی محنت سے کاروبار کرے پھر اس کاروبار سے جو نفع حاصل ہو وہ دونوں آپس میں تقسیم کر لیں۔

گھر کے خرچ کے لئے گیہوں میں جو ملانا ایک فائدہ مند چیز ہے کیونکہ اس طرح گھر کی غذائی ضرورت کی تکمیل کفایت کے ساتھ ہو جاتی ہے، البتہ بیچے جانے والے گیہوں میں جو ملا دینا مطلقاً ممنوع ہے کیونکہ یہ گناہ و فریب ہے۔

ایک واقعہ

⑧ وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مَعَهٗ بِدِيْنَارٍ لِيَشْتَرِيَ لَهٗ بِهٖ اُضْحِيَةً فَاشْتَرٰى كَبْشًا بِدِيْنَارٍ وَبَاعَهٗ بِدِيْنَارَيْنِ فَرَجَعَ فَاشْتَرٰى اُضْحِيَةً بِدِيْنَارٍ فَجَاءَ بِهَا وَبِالدِّيْنَارِ الَّذِي اسْتَفْضَلَ مِنَ الْاُخْرٰى فَتَصَدَّقَ رَسُوْلُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالدِّيْنَارِ فَدَعَا لَهٗ اَنْ يُّبَارَكَ لَهٗ فِيْ تِجَارَتِهٖ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت حکیم ابن حزامؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ نے انہیں ایک دینار دیکر بھیجا تاکہ وہ اس دینار سے آپ ﷺ کے لئے قربانی کا جانور خرید لیں، چنانچہ انہوں نے اس دینار کے عوض ایک مینڈھا یا دنبہ خریدا اور پھر اسے دو دینار میں بیچ دیا، اس سے فارغ ہو کر انہوں نے قربانی کا جانور ایک دینار میں خریدا اور اس جانور کے ساتھ وہ دینار بھی لا کر آنحضرت ﷺ کو دیدیا جو پہلے خریدے گئے جانور کی وصول شدہ قیمت میں سے بچ گیا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس دینار کو تو صدقہ کر دیا اور حضرت حکیم ابن حزامؓ کے حق میں یہ دعا فرمائی کہ خدا ان کی تجارت میں برکت عطا فرمائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

شرکت و وکالت کے کچھ مسائل: شرکت و وکالت کے بارہ میں کچھ اصولی باتیں باب کی ابتداء میں اور پھر کچھ مسائل احادیث کی تشریحات میں بیان ہو چکے ہیں، چونکہ باب ختم ہو رہا ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس موضوع سے متعلق کچھ اور ضروری مسائل یکجا طور پر

ذکر کر دیئے جائیں۔

شراکتی جماعت: کسی تجارتی کاروبار یا معاملہ میں جو لوگ شریک و حصہ دار ہوتے ہیں ان کی دو شکلیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ اس کاروبار یا معاملہ کا ہر شریک مالک و متصرف یا صرف متصرف ہوتا ہے اس طرح اس کاروبار یا معاملہ میں جملہ شرکاء کے باہمی مشورے پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ اسی شکل کی وہ چار قسمیں، شرکت مفاوضہ، شرکت عنان، شرکت صنائع والتقبل اور شرکت وجوہ ہیں جن کا بیان باب کی ابتداء میں ہو چکا ہے۔

شرکاء کی دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ چند افراد کی ایک جماعت کسی تجارتی معاملہ میں شریک و حصہ دار ہو اور وہ تمام افراد کسی قانونی نظام اور مقررہ قواعد و ضوابط کے پابند و ماتحت ہوں اور ان میں سے ہر ایک شریک اپنے آپ کو مالکانہ حیثیت سے علیحدہ تصور کرے۔ اس شکل کو موجودہ دور کے مشترک تجارتی اداروں اور کمپنیوں پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اس بارہ میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ:

① ایسے کسی بھی مشترک تجارتی ادارے یا کمپنی کا نظم و نسق چلانے، قانون پر عملدرآمد کرنے اور اجرائے کار کے لئے شرکاء ہی میں سے یا ان کے علاوہ لوگوں میں سے ایک شخص یا کئی آدمیوں کو جملہ شرکاء کے مشورہ سے منتخب کیا جائے۔

② کوئی بھی شریک بانصرام اور تصرف کا حق نہیں رکھتا البتہ حق ملک ہر شریک کو حاصل ہوتا ہے۔

③ جملہ شرکاء کی جماعت بہیئت مجموعی مالک و متصرف ہوگی اور یہ ہیئت مجموعی خواہ باتفاق کل حاصل ہو یا بکثرت آراء۔

④ کوئی بھی شریک اپنے مشترک تجارتی ادارہ کا اجیر و ملازم بن سکتا ہے۔

⑤ کوئی بھی شریک علیحدگی اختیار نہیں کر سکتا البتہ اپنا حصہ بذریعہ ہبہ یا بذریعہ بیع منتقل کر سکتا ہے۔

⑥ جب تعداد شرکاء محدود و مکمل ہو جائے اور کوئی شریک اپنا حصہ بیچے تو دوسرے شرکاء مقدم سمجھے جائیں گے۔

⑦ اگر کوئی حصہ میراث یا بیع وغیرہ کے ذریعہ تقسیم ہو جائے تو کارکنان کمپنی اس بات پر مجبور ہوں گے کہ اس حصہ کے جملہ ورثاء یا حقداروں سے لین دین کرنے میں جو کچھ زحمت ہو اسے برداشت کریں اس حصہ کے جملہ ورثاء یا شرکاء خواہ مل کر داد و ستد (لین دین) کریں یا کسی ایک کو وکیل بنادیں، ایسے حصہ کے جملہ شرکاء کا مجموعہ ایک ذات کے برابر سمجھا جائے گا۔

⑧ شرکاء کمپنی کاروبار چلانے کے لئے جو قانون مرتب و نافذ کریں گے ان کی پابندی تمام شرکاء پر ضروری ہوگی البتہ خلاف شرع قانون بنانا معصیت و گناہ اور اس کی پابندی ناجائز ہے۔

⑨ ایسے جملہ قانون جو کسی نظم و نسق کی حالت کے لئے وضع کئے جائیں صرف مباحات سے متعلق رہیں گے، منصوصات شرعیہ میں اثر انداز نہیں ہوں گے۔

⑩ یہ شرط کہ شرکاء ذاتی طور پر کسی دین اور نقصان کے ذمہ دار نہیں صرف اس صورت میں معتبر ہے جب کہ اس کا اعلان کیا جا چکا ہو۔

فسخ شراکت: جو تجارتی کاروبار یا کوئی معاملہ دو فریق کے زیر شرکت ہو اس کو فسخ کر دینے یعنی شرکت کو ختم کر دینے کی دو صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ شرکت کو ختم کر دینے پر دونوں فریق راضی ہیں۔

دوم یہ کہ ایک فریق علیحدگی چاہے جیسے وہ مر گیا یا مجنوں ہو گیا یا کسی مطالبے میں مال دینا پڑا جس سے سرمایہ قائم نہیں رہ سکتا یا علیحدگی کی کوئی اور وجہ ہو۔ ان تمام صورتوں میں شرکت ختم ہو کر تقسیم عمل میں آجائے گی اگرچہ میت کے ورثاء اور مجنوں کے اولیاء شراکت کو باقی رکھنا چاہیں۔

فسخ شراکت میں فقہی ہدایت یہ ہے کہ:

① پہلے تمام مطالبات ادا کئے جائیں۔

۲ ان معاہدوں کی تکمیل کا انتظام بھی ہو جائے جو شراکت کے ذمہ تھے۔
۳ وہ تمام حقوق جو "اصل و ہم" میں معتبر سمجھے گئے ہیں مثل اموال قیمتی کے تقسیم ہوں گے۔
۴ جو مطالبات دوسروں پر واجب ہیں اور جن کا وصول ہونا باقی ہے وہ بوقت وصول بقدر حصہ ملا کریں گے اور ہر شریک دوسرے کا وکیل سمجھا جائے گا تاکہ تقاضہ اور وصول کرتا رہے۔
۵ فسخ شراکت کی دوسری صورت میں ان دو چیزوں کا لحاظ ضروری ہے اول یہ کہ شراکت سے علیحدگی اختیار کرنے والا فریق یا اس کے قائم مقام ذمہ داریوں کے بارے میں سبکدوش نہیں ہو سکیں گے۔ دوم یہ کہ جملہ حقوق معتبرہ مثل دوکان و نام وغیرہ میں فریق خارج کو کوئی حق نہیں دیا جائے گا۔
۶ شراکتی جماعتوں یعنی مشترک تجارتی اداروں اور کمپنیوں پر اس ادارہ یا کمپنی کے مقررہ قانون کے حکم یا حاکم کے حکم کے بغیر ایسے انفساخ کا اثر نہیں پڑ سکتا کیونکہ کسی شریک کی موت و جنون کا افلاس وغیرہ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

فسخ شرکت کی صورت میں تقسیم کی ترتیب: جب شراکت ختم ہو جائے اور فریقین کے درمیان سرمایہ و اموال کی تقسیم ہونے لگے تو ان امور کی ترتیب اور ان کا لحاظ ضروری ہے۔
۱ جو مطالبات شراکت کے ذمہ ہوں ان کی ادائیگی یا جو معاہدات کئے گئے ہوں ان کی تکمیل کا انتظام پیش نظر رہے۔
۲ جملہ حقوق معتبرہ اور اموال قیمتی کی قیمت متعین کر دی جائے اور در صورت اختلاف و نزاع قرعہ سے فیصلہ کرنا شرعاً جائز ہے۔
۳ فریق خارج کو کوئی حق آئندہ نہ دلایا جائے گو ذمہ داری کے بارے سے وہ سبک دوش نہیں ہے۔
۴ شراکت کے جو مطالبات دوسروں کے ذمہ ہوں ان میں حسب دستور وکالت رہے گی، وصول ہونے پر بقدر حصہ تقسیم کرنا چاہئے۔

وکالت کے احکام:
۱ وکالت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ وکیل اور موکل، مجنوں، نابالغ، غلام اور مجور نہ ہوں۔
۲ کسی ایسی شے میں وکیل بنانا جائز نہیں جو کسی کی مملوک نہ ہو جیسے جنگل کی گھاس یا لکڑیاں جمع کرنا، دریا سے پانی لانا، غوطہ لگا کر موتی نکالنا، یا صدقہ لینے کے لئے وکیل بنانا۔
۳ جائز ہے کہ وکیل چاہے تو مفت خدمات انجام دے، چاہے اپنی اجرت وصول کر لے اور چاہے نفع میں شریک ہو۔
۴ ہر ایسے تصرف میں جس کی نسبت اپنی اور موکل دونوں کی طرف کر سکتا ہے، وکیل مثل اصل کے مدعی اور مدعا علیہ بن سکتا ہے جیسے خرید و فروخت، اور ہر ایسے امر میں جس کی نسبت اپنی طرف نہیں کر سکتا وکیل کو حقوق عقد سے کوئی واسطہ نہیں جیسے نکاح، طلاق۔
۵ وکیل کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی ذات کے لئے مالکانہ تصرف کرے کیونکہ وہ صرف امین ہے۔
۶ موکل اپنے وکیل کو تصرف سے پہلے معزول کر سکتا ہے، تصرف کے بعد اسے وکیل کے انجام دیئے ہوئے کام کو قبول و تسلیم کر لینے کے علاوہ اور کوئی حق حاصل نہیں۔
۷ وکیل کو حق ہے کہ وہ موکل کے لئے جو مال لایا ہے اس کے دام وصول کئے بغیر اس کے حوالے نہ کرے مگر دے کر واپس نہیں کر سکتا۔
۸ جب تک وکیل دام وصول کرنے کے لئے مال نہ روکے امین ہے اور روکنے کے بعد ضامن ہو جائے گا۔
۹ وکیل کو جائز نہیں کہ جس چیز کے لئے وکیل بنایا گیا ہے اس کا معاملہ اپنی ذات کے لئے کرے۔

مسئلہ: ۱ زید نے اپنے نوکر سے کسی دوکان سے کوئی چیز منگوائی اور نوکر وہ چیز دوکاندار سے ادھار لے آیا تو وہ دوکاندار زید سے قیمت کا

تقاضہ نہیں کر سکتا بلکہ اسی نوکر سے تقاضہ کرے اور وہ نوکر زید سے تقاضا کرے۔ بشرطیکہ زید نے قیمت اسے نہ دی ہو۔ اسی طرح اگر زید نے اپنی کوئی چیز اپنے نوکر سے بکوائی تو زید کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ خریدار سے تقاضہ کرے یا اس سے قیمت وصول کرے، کیونکہ خریدار نے جس شخص سے وہ چیز حاصل کی ہے اسی کو قیمت ادا کرے گا، ہاں اگر خریدار زید کو از خود قیمت دیدے تو یہ جائز ہے مطلب یہ ہے کہ اگر خریدار زید کو قیمت نہ دے تو زید زبردستی نہیں کر سکتا۔

❷ زید نے اپنے نوکر سے ایک من گیہوں منگوایا تھا مگر وہ ڈیڑھ من اٹھالایا تو زید کو پورا ڈیڑھ من لینا واجب نہیں ہے بلکہ اگر وہ نہ لے تو آدھ من نوکر کو لینا پڑے گا۔

❸ زید نے کسی سے کہ فلاں بکری جو فلاں کے یہاں ہے تم جاکر اس کو پندرہ روپے میں لے آؤ تو اب وہ شخص وہی بکری خود اپنے لئے نہیں خرید سکتا، مطلب یہ ہے کہ جو چیز خاص کر کے وکیل کو بتادی جائے اس وقت وکیل کو خود اپنے لئے اس کو خریدنا جائز نہیں ہے، البتہ موکل نے جو دام بتائے ہیں اس سے زیادہ میں اگر وکیل اپنے لئے خریدے تو جائز ہے اور اگر موکل نے کچھ دام نہ بتائے ہوں صرف خریدنے کے لئے کہا ہو تو پھر کسی صورت میں بھی وہ چیز وکیل اپنے لئے نہیں خرید سکتا۔

❹ زید کے وکیل نے زید کے لئے ایک بکری خریدی پھر ابھی وکیل زید کو دینے نہ پایا تھا کہ بکری مرگئی یا چوری ہوگئی تو اس بکری کے دام زید ہی کو دینا پڑیں گے، اگر زید وکیل سے یہ کہے کہ تم نے وہ بکری میرے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے خریدی تھی تو زید کی اس بات کا اعتبار نہیں ہوگا بشرطیکہ زید نے اس بکری کے دام وکیل کو پہلے ہی دے دیئے ہوں، ہاں اگر اس نے دام پہلے نہیں دیئے تھے تو اس صورت میں اگر زید قسم کھاکر وکیل سے یہ کہے کہ تم نے وہ بکری اپنے لئے خریدی تھی تب اس کی بات کا اعتبار ہوگا اور اس بکری کا نقصان وکیل کو برداشت کرنا ہوگا، اور اگر زید قسم نہ کھاسکے تو پھر وکیل ہی کی بات کا اعتبار کرنا ہوگا۔

❺ زید کا نوکر اگر کوئی چیز گراں خرید لائے تو اگر تھوڑا ہی فرق ہو تب تو وہ چیز زید کو لینی پڑے گی اور اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی اور اگر بہت زیادہ گراں خرید لاتا ہے کہ وہ چیز اتنی قیمت میں کوئی نہیں خرید سکتا تو اسکا لینا واجب نہیں ہے۔ اگر زید وہ چیز نہ لے تو خود نوکر اس چیز کا ذمہ دار ہوگا۔

❻ زید نے اپنی کوئی چیز بکر کو دی کہ وہ اسے فروخت کردے تو بکر کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس چیز کو خود لے لیوے اور اس کے دام زید کو دیدے، اسی طرح اگر زید نے بکر سے کہا کہ فلاں کی چیز مجھے خرید لاؤ تو بکر کو یہ اجازت نہیں ہوگی۔ کہ وہ اپنی چیز زید کو لا کر دیدے اور اس سے اس کی قیمت وصول کرلے، اگر بکر اپنی چیز دینا یا خود لینا چاہے تو زید سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ چیز میں لیتا ہوں مجھ کو دے دو یا یوں کہہ دے کہ یہ میری چیز لے لو اور اتنی قیمت مجھے دیدو بغیر بتلائے ہوئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

❼ زید نے اپنے نوکر سے بکری کا گوشت منگوایا اور وہ بھینس کا لے آیا تو زید کو اختیار ہوگا کہ چاہے لے چاہے نہ لے اسی طرح زید نے نوکر سے آلو منگوائے اور بھنڈی لے آیا تو اس کا لینا ضروری نہیں اگر زید لینے سے انکار کردے تو نوکر کو خود لینا پڑے گا۔

❽ زید نے دو آدمیوں کو بھیجا کہ بازار جاکر فلاں چیز لے آؤ تو اس چیز کی خریداری کے وقت ان دونوں آدمیوں کو موجود رہنا ضروری ہے۔ صرف ایک آدمی کو خریدنا جائز نہیں ہے اگر ایک ہی آدمی خریداری کرے تو بیع موقوف رہے گی۔ اگر زید صرف ایک آدمی کی خریداری کو منظور کرلے گا تو صحیح ہوجائے گا۔

❾ زید نے کسی شخص سے کہا کہ بازار سے فلاں چیز خرید لاؤ مگر اس شخص نے وہ چیز خود نہیں خریدی بلکہ کسی دوسرے سے خریدنے کے لئے کہہ دیا تو اب اس چیز کو لینا زید پر واجب نہیں رہے گا۔ چاہے وہ لے لے چاہے لینے سے انکار کردے دونوں اختیار ہیں البتہ اگر وہ شخص خود خریدے تو پھر زید کو لینا پڑے گا۔

وکیل کی برطرفی: وکیل کو قبل تصرف برطرف کردینے کا ہر وقت اختیار ہے مثلاً زید نے کسی سے کہا تھا کہ مجھے ایک بکری کی ضرورت ہے

کہیں مل جائے تو لے لینا پھر منع کر دیا کہ میں نے تم سے جو بکری خریدنے کے لئے کہا تھا اب نہ خریدنا، اس کے باوجود وہ شخص بکری خرید لے تو زید کے لئے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ وہ بکری لے لے کیونکہ منع کرنے کے بعد اس شخص کو زید کے لئے بکری خریدنے کا اختیار نہیں رہا تھا۔ ہاں اگر اس نے بکری خرید لی اور پھر اس کے بعد زید نے منع کیا تو اس صورت میں زید پر واجب ہوگا کہ وہ بکری لے لے اور اس کی قیمت ادا کرے۔

اور اگر یہ صورت ہو کہ زید نے خود اس کو منع نہیں کیا بلکہ خط لکھ کر بھیجا یا آدمی بھیج کر اطلاع دی کہ اب میرے لئے بکری نہ خریدنا تب بھی وہ شخص وکالت سے برطرف ہو گیا، اور اگر زید نے برطرفی کی اطلاع نہیں دی بلکہ کسی اور آدمی نے اس سے کہہ دیا کہ زید نے تمہیں وکالت سے برطرف کر دیا ہے اب اس کے لئے نہ خریدنا، تو اس صورت میں اگر اطلاع دینے والے دو آدمی ہوں یا ایک ہی آدمی نے اطلاع دی مگر وہ معتبر اور پابند شرع ہے تو اس اطلاع پر بھی برطرفی عمل میں آجائے گی اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ شخص وکالت سے برطرف نہیں ہوگا اگر اس نے بکری خرید لی تو زید کو لینی پڑے گی۔

بَابُ الْغَصَبِ وَالْعَارِيَةِ

غصب اور عاریت کا بیان

"غصب" کے معنی چھیننے کے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں "غصب" کہتے ہیں چوری کے بغیر از راہ ظلم وجور کسی کا مال زبردستی چھین لینا۔ ایسے شخص کو کہ جو کسی کی کوئی چیز زبردستی چھین لے یا ہڑپ کر لے "غاصب کہتے ہیں" اور مغصوب اس چھینی ہوئی یا ہڑپ کی ہوئی چیز کو کہتے ہیں خواہ وہ کچھ ہو۔

"عاریت" کے معنی ہیں مانگی ہوئی۔ چیز اصطلاحی طور پر بغیر کسی عوض کے کسی دوسرے شخص کو اپنی کسی چیز کے نفع وفائدہ کا مالک بنا دینا عاریت کہلاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

غصب کرنے والی کی سزا

(۱) عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهُ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت سعید ابن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص (کسی کی) بالشت بھر زمین بھی از راہ ظلم لے گا قیامت کے دن ساتوں زمینوں میں سے اتنی ہی زمین اس کے گلے میں بطور طوق ڈالی جائے گی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: کسی کی کوئی بھی چیز خواہ وہ زیادہ ہو یا کتنی کم ہو، اور راہ زور زبردستی چھین لینا یا ہڑپ کر لینا نہ صرف سماجی طور پر ایک ظلم اور اخلاقی طور پر ایک بھیانک برائی ہے بلکہ شرعی طور پر بھی انتہائی سخت جرم اور گناہ ہے۔ اسلام نے انسانی حقوق کے تحفظ کا جو اعلیٰ تصور پیش کیا ہے اور اسلامی شریعت نے حقوق العباد پر ڈاکہ ڈالنے والوں کو جن سخت سزاؤں اور عقوبتوں کا مستوجب گردانا ہے، یہ حدیث گرامی اس کا ایک نمونہ ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص کسی دوسرے کی زمین کا ایک بالشت بھر حصہ بھی زبردستی ہتھیائے گا اسے اس کے ظلم وجور کی یہ سزا دی جائے گی کہ قیامت کے دن زمین کا صرف وہی حصہ نہیں جو وہ غصب کرے گا بلکہ ساتوں زمینوں میں سے اتنی ہی زمین لے کر اس کے گلے میں بطور طوق ڈال دی جائے گی، العیاذ باللہ۔

شرح السنۃ میں "طوق ڈالنے کا مفہوم یہ بیان کیا" گیا ہے جو شخص کسی کی زمین کا بالشت بھر حصہ بھی غصب کرے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے زمین میں دھنسائے گا چنانچہ زمین کا وہ قطعہ جو اس نے غصب کیا ہو گا اس کے گلے کو طوق کی مانند جکڑ لے گا۔

کسی جانور کا دودھ مالک کی اجازت کے بغیر نہ دوہو

(۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحْلِبَنَّ اَحَدٌ مَاشِيَةَ امْرِئٍ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يُّؤْتٰى مَشْرُبَتُهٗ فَتُكْسَرَ خِزَانَتُهٗ فَيُنْتَقَلَ طَعَامُهٗ وَاِنَّمَا يَخْزُنُ لَهُمْ ضُرُوْعُ مَوَاشِيْهِمْ اَطْعِمَاتِهِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے جانور کا دودھ اس کی اجازت (یعنی اس کے حکم ورضا) کے بغیر نہ دوہے! کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ کوئی شخص اس کے خزانہ (یعنی اس کے غلہ کو گودام میں) آئے اور اس کا خزانہ (گودام) کھول دے یہاں تک کہ اس کا غلہ اٹھا لیا جائے؟ اسی طرح (جان لو کہ) دوسروں کے جانوروں کے تھن ان کی غذائی ضرورت (یعنی دودھ) کی حفاظت کرتے ہیں۔" (مسلم)

تشریح: جانوروں کے تھن کو غلہ وغیرہ کے گودام سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح تم اپنے غلوں کو گوداموں میں بھر کر محفوظ رکھتے ہو اسی طرح دوسرے لوگوں کے جانور اپنے تھنوں میں اپنے مالک کی غذائی ضرورت یعنی دودھ کو محفوظ رکھتے ہیں لہٰذا جس طرح تم اس بات کو کبھی بھی پسند و گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی دوسرا شخص تمہارے گوداموں اور تمہارے خزانوں کو غیر محفوظ بنا کر وہاں سے غلہ یا دوسری محفوظ اشیاء نکال لے اسی طرح تمہارا یہ فعل بھی جانوروں کے مالکوں کو کیسے گوارہ ہو سکتا ہے کہ تم ان جانوروں کے تھنوں سے دودھ نکال لو۔

حاصل یہ کہ تم دوسروں کے مال پر بری نگاہ نہ ڈالو اور دوسروں کے حقوق کو غصب نہ کرو تاکہ کوئی دوسرا تمہارے مال کو غصب نہ کرے۔ اور جس طرح تم اپنا مال غصب کیا جانا گوارہ نہیں کر سکتے اسی طرح کسی دوسرے کا مال خود غصب کرنا بھی گوارہ نہ کرو۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اکثر علماء نے اس ارشاد گرامی پر عمل کرتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ کسی کے جانور کا دودھ مالک کی اجازت کے بغیر دوہنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص بھوک سے بے حال ہو رہا ہو تو اس کے لئے اتنی اجازت ہے کہ وہ بقدر ضرورت کسی کے جانور کا دودھ پی لے مگر پھر اس کی قیمت ادا کرے۔ اگر اس کے پاس موجود ہو تو اسی وقت یہ قیمت دے دے ورنہ بعد میں جب بھی قادر ہو قیمت کی ادائیگی کر دے۔

ایک واقعہ

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ بَعْضِ نِسَائِهٖ فَاَرْسَلَتْ اِحْدٰى اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِصَحْفَةٍ فِيْهَا طَعَامٌ فَضَرَبَتِ الَّتِيْ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَيْتِهَا يَدَ الْخَادِمِ فَسَقَطَتِ الصَّحْفَةُ فَانْفَلَقَتْ فَجَمَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِلَقَ الصَّحْفَةِ ثُمَّ جَعَلَ يَجْمَعُ فِيْهَا الطَّعَامَ الَّذِيْ كَانَ فِي الصَّحْفَةِ وَيَقُوْلُ غَارَتْ اُمُّكُمْ ثُمَّ حَبَسَ الْخَادِمَ حَتّٰى اُتِيَ بِصَحْفَةٍ مِنْ عِنْدِ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا فَدَفَعَ الصَّحْفَةَ الصَّحِيْحَةَ اِلَى الَّتِيْ كُسِرَتْ صَحْفَتُهَا وَاَمْسَكَ الْمَكْسُوْرَةَ فِيْ بَيْتِ الَّتِيْ كَسَرَتْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ اپنی کسی زوجہ مطہرہ (یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ) کے ہاں قیام فرماتے تھے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے (یعنی حضرت زینبؓ یا حضرت صفیہؓ اور یا حضرت ام سلمہؓ نے) ایک رکابی بھیجی جس میں کھانے کی کوئی چیز تھی (اسے دیکھتے ہی) ان زوجہ مطہرہ نے کہ جن کے ہاں آپ ﷺ قیام فرماتے تھے (یعنی حضرت عائشہؓ نے) خادم کے ہاتھ پر (اسطرح) مارا کہ وہ رکابی گر پڑی اور ٹوٹ گئی۔ نبی کریم ﷺ نے رکابی کے وہ (ٹوٹے ہوئے) ٹکڑے اکٹھا کئے اور پھر ان ٹکڑوں میں کھانے کی وہ چیز جمع کی جو

رکابی میں تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تمہاری ماں کو غیرت آگئی تھی" بہرکیف آپ ﷺ نے (کچھ دیر) خادم کو روکے رکھا یہاں تک کہ جن زوجہ مطہرہ کے گھر آپ ﷺ قیام فرماتھے (یعنی حضرت عائشہؓ انکے ہاں سے دوسری رکابی مہیا کی گئی اور پھر آپ ﷺ نے) (اسی خادم کے ذریعہ) ان زوجہ مطہرہ کے ہاں کہ جن کی رکابی ٹوٹ گئی تھی وہ صحیح وسالم رکابی بھیجدی اور وہ ٹوٹی ہوئی رکابی ان زوجہ مطہرہ کے گھر رکھ لی جنہوں نے اس رکابی کو توڑا تھا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "خادم" غلام کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی۔ چنانچہ یہاں "خادم" سے مراد لونڈی ہی ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کے ہاں لونڈی ہی وہ رکابی اور اس میں کھانے کی کوئی چیز لے کر آئی تھی۔

جب وہ رکابی گر کر ٹوٹ گئی اور اس میں سے کھانے کی وہ چیز بھی زمین پر گر گئی جو اس رکابی میں تھی تو آنحضرت ﷺ نے نہ صرف رکابی کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا بلکہ کھانے کی اس چیز کو بھی نہایت احتیاط کے ساتھ جمع کیا، اس فعل سے آپ ﷺ کے کمال تحمل، انتہائی تواضع اور ازواج مطہرات کے ساتھ آپ ﷺ کی خوش مزاجی اور عفوودرگذر کے عالی جذبات ہی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے۔

"تمہاری ماں کو غیرت آگئی" یہ دراصل اس واقعہ کو سننے پڑھنے والوں سے آپ ﷺ کا خطاب عام ہے، اس ارشاد کے ذریعہ گویا آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کی طرف سے عذر بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے جو یہ اضطراری فعل صادر ہوا وہ درحقیقت اس غیرت کی بناء پر تھا جو ہر عورت کی جبلت وسرشت میں داخل ہے کہ کوئی بھی عورت خواہ وہ کتنے ہی اونچے مقام پر کیوں فائز ہو اپنی سوکن کے تئیں مخصوص رقیبانہ اور رشک آمیز جذبات واحساسات سے عاری نہیں ہوسکتی اور نہ کسی بھی عورت کے بس کی یہ بات ہے کہ وہ اپنی طبیعت اور اپنے نفس کو اس طبعی اور جبلی جذبہ سے محفوظ رکھ لے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تاکہ لوگ حضرت عائشہؓ کے اس فعل کو برائی پر محمول نہ کریں بلکہ یہ جان لیں کہ ان سے یہ فعل بتقاضائے بشریت سرزد ہوگیا تھا جس میں ان کے مقصد وارادے یا کسی برائی کا قطعًا دخل نہیں تھا۔

قاضیؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو اس باب میں نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ رکابی توڑ دینا ایک طرح کا غصب تھا کیونکہ اس سے ایک دوسرے کا مال تلف ہوا اگرچہ اس کا سبب خواہ کچھ ہی رہا ہو۔

یا پھر یہ کہ کھانے کی جو چیز بھیجی گئی تھی وہ تو تحفہ کے طور پر تھی لیکن جس رکابی میں وہ چیز بھیجی گئی تھی وہ بطریق عاریت کے تھی اس لئے اس مناسبت سے یہ حدیث اس باب میں ذکر کی گئی۔

کسی مسلمان کا مال لوٹنا حرام ہے

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ يَزِيْدَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ نَهٰى عَنِ النُّهْبَةِ وَالْمُثْلَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبداللہ ابن یزیدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے لوٹنے اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: کسی مسلمان کا مال لوٹنا حرام ہے لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ غیر مسلم کا مال لوٹنا حرام نہیں ہے بلکہ مقصد تو صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو کسی بھی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ مسلمان بھائیوں کے مال کو ناحق طور پر اور زور زبردستی سے لوٹ ماریں کیونکہ اس کا تعلق صرف حقوق العباد کی پامالی ہی سے نہیں ہے بلکہ معاشرہ اور سوسائٹی کے امن وسکون کی مکمل تباہی سے بھی ہے، لہٰذا امن وسلامتی کے سرچشمہ "اسلام کا تابعدار ہونے کے ناطے ایک مسلمان پر یہ ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاشرہ، اپنی قوم اور اپنے ملک کے نظام امن وامان کو درہم برہم ہونے اور لاقانونیت پھیلنے سے بچائے جس کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ دوسرے کے مال، دوسرے کی جائیداد اور دوسرے کے حقوق کی پامالی اور لوٹ مار کو اسی طرح ناقابل برداشت سمجھا

جائے جس طرح اپنے مال، اپنی جائیداد اور اپنے حقوق پر کسی کی دست درازی قطعاً برداشت نہیں ہو سکتی۔

"مثلہ"، جسم کے کسی عضو مثلاً ناک اور کان وغیرہ کاٹ ڈالنے کو کہتے ہیں، اسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس طرح خدا کی تخلیق میں بگاڑ اور بدنمائی پیدا کرنا لازم آتا ہے۔

حاجیوں کا سامان چرانے والے کا عبرتناک حشر

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ مَاتَ اِبْرَاهِيْمُ ابْنُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ سِتَّ رَكَعَاتٍ بِاَرْبَعِ سَجَدَاتٍ فَانْصَرَفَ وَقَدْ اٰضَتِ الشَّمْسُ وَقَالَ مَا مِنْ شَيْءٍ تُوْعَدُوْنَهُ اِلَّا قَدْ رَأَيْتُهُ فِيْ صَلَاتِيْ هٰذِهٖ لَقَدْ جِيْءَ بِالنَّارِ وَذٰلِكَ حِيْنَ رَاَيْتُمُوْنِيْ تَأَخَّرْتُ مَخَافَةَ اَنْ يُصِيْبَنِيْ مِنْ لَفْحِهَا وَحَتّٰى رَاَيْتُ فِيْهَا صَاحِبَ الْمِحْجَنِ يَجُرُّ قُصْبَهٗ فِي النَّارِ وَكَانَ يَسْرِقُ الْحَاجَّ بِمِحْجَنِهٖ فَاِنْ فُطِنَ لَهٗ قَالَ اِنَّمَا تَعَلَّقَ بِمِحْجَنِيْ وَاِنْ غُفِلَ عَنْهُ ذَهَبَ بِهٖ وَحَتّٰى رَاَيْتُ فِيْهَا صَاحِبَةَ الْهِرَّةِ الَّتِيْ رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَاْكُلُ مِنْ خِشَاشِ الْاَرْضِ حَتّٰى مَاتَتْ جُوْعًا ثُمَّ جِيْئَ بِالْجَنَّةِ وَذٰلِكَ حِيْنَ رَاَيْتُمُوْنِيْ تَقَدَّمْتُ حَتّٰى قُمْتُ فِيْ مَقَامِيْ وَلَقَدْ مَدَدْتُ يَدِيْ وَاَنَا اُرِيْدُ اَنْ اَتَنَاوَلَ مِنْ ثَمَرَتِهَا لِتَنْظُرُوْا اِلَيْهِ ثُمَّ بَدَا لِيْ اَنْ لَّا اَفْعَلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات کے دن سورج گرہن ہوا، چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو (سورج گرہن کی) نماز چھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ پڑھائی (یعنی دو رکعتیں پڑھیں اور ہر رکعت میں تین تین رکوع اور دو دو سجدے کئے) اور جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سورج پہلے کی طرح روشن ہو چکا تھا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز کا یعنی جنت اور دوزخ کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ میں نے آج اپنی اس نماز میں دیکھ لی ہے، چنانچہ دوزخ کو میرے سامنے پیش کیا گیا اور یہی وہ وقت تھا جب (نماز کے دوران) تم نے مجھے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا تھا اور میں اس خوف سے پیچھے ہٹ گیا تھا کہ کہیں اس کی گرمی مجھ تک نہ پہنچ جائے، میں نے "اس وقت) دوزخ میں خمدار لکڑی والے (یعنی عمرو ابن لحی) کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اس میں اپنی انتڑیوں کو کھینچ رہا تھا، یہ شخص اپنی خمدار لکڑی کے ذریعہ حاجیوں کا سامان چرایا کرتا تھا (جس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ وہ چلتے چلتے کسی کی کوئی چیز اپنی خمدار لکڑی میں الجھا لیتا تھا) اگر کوئی اس کی یہ حرکت دیکھ لیتا تو وہ یہ کہہ دیتا کہ یہ چیز اپنے آپ میری لکڑی میں الجھ آئی ہے اور اگر کوئی نہ دیکھ پاتا تو وہ اس چیز کو غائب کر دیتا تھا۔ نیز میں نے اس وقت دوزخ میں اس بلی والی عورت کو بھی دیکھا جس نے ایک بلی باندھ رکھی تھی جسے نہ وہ کچھ کھلاتی تھی اور نہ اسے چھوڑتی تھی کہ وہ حشرات الارض یعنی چوہے وغیرہ کھا لے یہاں تک کہ وہ بلی مارے بھوک کے مر گئی۔ پھر میرے سامنے جنت کو پیش کیا گیا اور یہی وہ وقت تھا جب تم نے مجھے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تھا مگر پھر میں اپنی جگہ ٹھہر گیا اور میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ میں اس کے پھل توڑلوں جسے تم بھی دیکھ لو لیکن میں نے سوچا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے (تاکہ تمہارے ایمان بالغیب میں رخنہ نہ پڑے)۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں اول یہ کہ جنت اور دوزخ عالم وجود میں آچکی ہیں اور موجود ہیں چنانچہ اہل سُنّت کا یہی مسلک ہے، دوم یہ کہ عذاب اور ہلاکت کی جگہ سے ہٹ جانا سُنّت ہے، سوم یہ کہ بعض لوگ اس وقت بھی دوزخ کے عذاب میں گرفتار ہیں اور چہارم یہ کہ تھوڑا سا عمل نماز کو باطل نہیں کرتا جیسا کہ آنحضرت ﷺ نماز کے دوران جنت اور دوزخ کو دیکھ کر آگے بڑھے اور پیچھے ہٹے۔

جانور کا عاریۃً مانگ لینا جائز ہے

⑥ وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسًا يَقُوْلُ كَانَ فَزَعٌ بِالْمَدِيْنَةِ فَاسْتَعَارَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَسًا مِنْ اَبِيْ

طَلْحَةَ يُقَالُ لَهُ الْمَنْدُوْبُ فَرَكِبَ فَلَمَّا رَجَعَ قَالَ مَا رَأَيْنَا مِنْ شَيْءٍ وَإِنْ وَجَدْنَاهُ لَبَحْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ ایک (ایک دن اس خیال سے کہ کفار کا لشکر مدینہ کے قریب آگیا ہے) مدینہ میں گھبراہٹ اور خوف کی ایک فضا پیدا ہوگئی ہے۔ (یہ دیکھ کر) نبی کریم ﷺ نے حضرت طلحہؓ کا گھوڑا کہ جسے مندوب یعنی سست کہا جاتا تھا، عاریۃً مانگا اور اس پر سوار ہو کر (تحقیق حال کے لئے مدینہ سے باہر) نکلے پھر جب آپ ﷺ واپس آئے تو فرمایا کہ میں نے خوف و گھبراہٹ کی کوئی چیز نہیں دیکھی ہے، نیز میں نے اس گھوڑے کو کشادہ قدم یعنی تیز رفتار پایا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابوطلحہؓ کا گھوڑا پہلے بہت ڈھیلا اور سست رفتار تھا اسی واسطے اس کا نام ہی "مندوب" یعنی سست رکھدیا گیا تھا مگر جب آنحضرت ﷺ اس پر سوار ہوئے تو آپ ﷺ کی برکت سے وہی گھوڑا بڑا چاق و چوبند اور تیز رفتار ہوگیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی جانور کو عاریۃً مانگنا اور اسے اپنے استعمال میں لانا جائز ہے نیز کسی جانور کو کسی نام سے موسوم کر دینا بھی جائز ہے اسی طرح سامان جنگ کا نام رکھنا بھی جائز ہے۔

یہ حدیث جہاں آنحضرت ﷺ کی شجاعت و بہادری اور کمال جانبازی کو ظاہر کرتی ہے کہ جب دشمن کی فوج کے مدینہ کے قریب آجانے کے خوف سے پورے مدینہ میں اضطراب و گھبراہٹ کی ایک عام فضا پیدا ہوگئی تھی تو آپ ﷺ بالکل بے خوف ہو کر تحقیق حال کے لئے تن تنہا مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے، وہیں یہ حدیث اس بات کی بھی غماز ہے کہ دشمنوں کی ٹوہ لینی اور ان کے حالات پر مطلع ہونے کے لئے سعی کرنا ضروری ہے۔ نیز حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی خوف و اضطراب کے موقع پر خوف کے خاتمہ کی خوشخبری لوگوں کو دینا مستحب ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بنجر زمین کا آباد کرنے والا اس زمین کا مالک ہے

⑦ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ مَنْ أَحْيَى أَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ وَلَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ عُرْوَةَ مُرْسَلًا وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"حضرت سعید بن زیدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص مردہ زمین کو زندہ کرے یعنی بنجر و ویران زمین کو آباد کرے وہ اسی کی ہے اور ظالم کی رگ کا کوئی استحقاق نہیں ہے" اس روایت کو احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ نے (بطریق اتصال) نقل کیا ہے جب کہ مالکؒ نے اس روایت کو عروہ سے بطریق ارسال کیا ہے، نیز امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جزء کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی زمین ویران و بنجر پڑی ہوئی ہو اور کوئی شخص اپنی محنت و مشقت سے اس زمین کو قابل کاشت بنائے یا اس کو آباد کرے تو وہ زمین اسی شخص کی ملکیت ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ پہلے سے کسی مسلمان کی ملکیت میں نہ ہو اور نہ شہر و گاؤں کی کسی ضرورت و مصلحت سے متعلق ہو جیسے وہ جانوروں کے بیٹھنے کی جگہ ہو، کھلیان کے کام آتی ہو، یا دھوبی کپڑے دھو کر وہاں پھیلاتے ہوں اور یا اس سے کسی بھی عوامی فائدہ کا تعلق ہو، حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک بنجر و ویران زمین کو قابل کاشت یا قابل آبادی کر کے اپنی ملکیت بنانے کی ایک شرط، امام (یعنی حکومت وقت) کی اجازت بھی ہے اگر اسے سرکار کی طرف سے اجازت مل جائے تب وہ اس کا مالک ہو سکتا ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ حضرت امام احمدؒ اور حنفیہ میں سے حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے ہاں یہ اجازت شرط نہیں ہے، ان سب کی دلیلیں فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

"اور ظالم کی رگ کا کوئی استحقاق نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی آباد کی ہوئی زمین میں کاشت کرے یا

اس میں کوئی درخت لگالے تو وہ اس کی وجہ سے اس زمین کا مالک نہیں بن جائے گا۔

کسی دوسرے کا مال بغیر اجازت حلال نہیں ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ حُرَّةَ الرَّقَاشِیِّ عَنْ عَمِّہٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا لَا تَظْلِمُوْا اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِنْہُ رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَالدَّارَقُطْنِیُّ فِی الْمُجْتَبٰی۔

"اور حضرت ابوحرہ رقاشیؒ (تابعی) اپنے چچا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا خبردار کسی پر ظلم نہ کرنا! جان لو! کسی بھی دوسرے شخص کا مال (لینا یا استعمال کرنا) اس کی مرضی و خوشی کے بغیر حلال نہیں۔ اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں اور دار قطنیؒ نے مجتبیٰ میں نقل کیا ہے۔"

کسی کا مال لوٹنے والا اسلامی برادری کا فرد بننے کے قابل نہیں

⑨ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ لَا جَلَبَ وَلَا جَنَبَ وَلَا شِغَارَ فِی الْاِسْلَامِ وَمَنِ انْتَہَبَ نُھْبَۃً فَلَیْسَ مِنَّا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا نہ "جلب" (جائز) ہے اور نہ جنب اور نہ شغار اسلام میں (جائز) ہے اور یاد رکھو جو شخص (کسی کو) لوٹتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے (یعنی وہ ہماری) جماعت میں سے نہیں ہے یا ہمارے طریقہ پر نہیں ہے حاصل یہ کہ ایسا شخص اس قابل نہیں کہ اسے اسلامی برادری کا ایک فرد سمجھا جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جلب اور جنب یہ دو اصطلاحی الفاظ ہیں۔ ان کا تعلق "سباق" سے بھی ہے اور "صدقہ" سے بھی سباق و مسابقت یعنی گھوڑ دوڑ کے مقابلہ کو کہتے ہیں مثلاً دو آدمی اس شرط کے ساتھ آپس میں گھوڑے دوڑائیں کہ دیکھیں کون آگے نکل جاتا ہے، لہٰذا سباق میں جلب یہ ہے کہ گھوڑا دوڑانے والا ایک آدمی اپنے گھوڑے کے پیچھے رکھے جس کا کام یہ ہو کہ وہ گھوڑے کو مارے، آوازیں لگائے اور اس کو دوڑائے۔ اور جنب یہ ہے کہ گھوڑا اپنے ساتھ رکھے تاکہ سواری کا گھوڑا اگر تھک جائے تو اس دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے نکل جائے۔

"صدقہ" میں جلب کی صورت یہ ہے کہ صدقات و زکوۃ وصول کرنے والا جب صدقہ و زکوۃ وصول کرنے لوگوں کے پاس جائے تو آبادی سے باہر یا ان لوگوں سے دور کہیں بھی دوسری جگہ ٹھہر جائے اور کسی دوسرے آدمی کو ان لوگوں کے پاس یہ کہلا کر بھیجے کہ جن جن لوگوں پر زکوۃ واجب ہے وہ اپنی زکوۃ کا مال لے کر یہاں آجائیں۔

اسی طرح "جنب" یہ ہے کہ جس شخص پر زکوۃ واجب ہو وہ اپنا مال لے کر اپنے مکان سے کہیں دور چلا جائے اور زکوۃ وصول کرنے والے سے کہے کہ وہ اس کے پاس وہیں پہنچ کر زکوۃ وصول کرے، اس کا بیان کتاب زکوۃ میں گذر چکا ہے چنانچہ یہاں بھی جلب و جنب سے منع فرمایا گیا ہے خواہ ان کا تعلق سباق سے ہو یا صدقہ سے۔

"شغار" یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بہن یا بیٹی کا نکاح کسی سے اس شرط کے ساتھ کرے کہ وہ اپنی بہن یا بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کر دے اور مہر کچھ نہ مقرر ہو بلکہ یہ شرط ہی مہر کے قائم مقام ہو۔ حدیث میں اس قسم کے عقد کو اسلام کے طریقہ کے خلاف فرمایا گیا ہے چنانچہ اکثر علماء کے نزدیک ایسا عقد فاسد ہے لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ اور سفیانؒ کے نزدیک یہ عقد نہ کرنا چاہئے۔

کسی کی کوئی چیز ہنسی مذاق میں لیکر ہڑپ نہ کر جاؤ

⑩ وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ یَزِیْدَ عَنْ اَبِیْہِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَاْخُذُ اَحَدُکُمْ عَصَا اَخِیْہِ لَاعِبًا جَادًّا

فَمَنْ اَخَذَ عَصَا اَخِيْهِ فَلْيَرُدَّهَا اِلَيْهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَرِوَايَتُهُ اِلٰى قَوْلِهٖ جَادًا۔

"اور حضرت سائب ابن یزیدؓ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اپنے کسی بھائی کا عصار (لاٹھی) ہنسی مذاق میں اس مقصد سے نہ لے کہ وہ اس کو رکھ لے گا جو شخص اپنے کسی بھائی سے عصا لے تو اسے واپس کر دینا چاہئے۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)، لیکن ابوداؤد کی روایت لفظ جادا تک ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی سے اس کی لاٹھی یا چھڑی بظاہر تو ہنسی مذاق میں لے مگر مقصد یہ ہو کہ اسے ہڑپ کر لونگا جیسا کہ آج کل اس کا بہت رواج ہے کہ ایک دوسرے کی چیز ہنسی مذاق میں چھپا دی جاتی ہے اگر مالک کو اس کا علم ہو جاتا ہے تو وہ چیز اسے واپس دیدی جاتی ہے اگر اسے علم نہیں ہو پاتا تو پھر ہمیشہ کے لئے غائب کر دی جاتی ہے اس سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

حدیث میں بطور خاص عصا کا ذکر بطریق مبالغہ ہے جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب اتنی حقیر اور کم تر چیز کا لینا منع ہے تو اس سے زیادہ حیثیت کی چیز کا لینا بطریق اولی ممنوع ہو گا۔

اپنا چوری کا مال جس کے پاس دیکھو اس سے لے لو

(۱۱) وَعَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ وَجَدَ عَيْنَ مَالِهٖ عِنْدَ رَجُلٍ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ وَيَتَّبِعُ الْبَيِّعَ مَنْ بَاعَهُ۔ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت سمرۃؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنا مال بعینہ کسی کے پاس دیکھے تو وہ "اس کو لے لینے کا) حقدار ہے اور اس کو خریدنے والا اس شخص کا پیچھا کرے جس نے اسے بیچا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: حدیث کے مفہوم کا حاصل یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص نے کسی کا کوئی مال غصب کیا، یا کسی کی کوئی چیز چوری کی یا کسی شخص کی کوئی گمشدہ چیز اس کے ہاتھ لگ گئی اور اس نے وہ چیز کسی دوسرے شخص کو بیچ دی تو اب اگر مالک اپنی وہ چیز خریدنے والے کے پاس دیکھے تو اسے اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی چیز اس سے لے لے اور خریدنے والے نے وہ چیز جس سے خریدی ہے اس کا پیچھا کر کے اس سے اپنی قیمت واپس لے لے۔

جس سے کوئی چیز لو اس کو واپس کردو

(۱۲) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عَلَى الْيَدِ مَا اَخَذَتْ حَتّٰى تُؤَدِّيَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت سمرۃؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی سے لی گئی چیز (لینے والے کے) ہاتھ کے اوپر ہے جب تک کہ وہ واپس نہ کر دی جائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے کسی سے کوئی چیز لی ہے وہ اس کے ذمہ واجب الادا ہے جب تک کہ وہ چیز اس کے مالک کو واپس نہ کر دی جائے۔ حاصل یہ کہ اگر کسی شخص نے کسی کی کوئی چیز چھین رکھی ہے یا کسی کی کوئی چیز چرا رکھی ہے یا کسی کی کوئی چیز مستعار لے رکھی ہے اور یا کسی کی کوئی چیز اپنے پاس بطور امانت رکھ چھوڑی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس چیز کو مالک کے حوالے کر دے، للہذا چھینا ہوا مال اس کے مالک کو واپس کر دینا واجب ہے اگرچہ مالک اس کا مطالبہ نہ کرے، اسی طرح عاریۃً لی ہوئی چیز وہ مدت پوری ہو جانے کے بعد مالک کو واپس کر دینا ضروری ہے اگر کوئی مدت مقرر کی گئی ہو ہاں جو چیز بطور امانت اپنے پاس رکھی ہوئی ہو اس کو اسی وقت واپس کرنا لازم ہو گا جب کہ مالک مطالبہ کرے مالک کے مطالبہ سے پہلے واپس کرنا واجب نہیں ہے۔

کسی کے باغ وغیرہ کو جانور کے نقصان پہنچانے کا مسئلہ

⑬ وَعَنْ حَرَامِ بْنِ سَعْدِ بْنِ مُحَيِّصَةَ اَنَّ نَاقَةً لِلْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ دَخَلَتْ حَائِطًا فَاَفْسَدَتْ فَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ عَلٰى اَهْلِ الْحَوَائِطِ حِفْظَهَا بِالنَّهَارِ وَاَنَّ مَا اَفْسَدَتِ الْمَوَاشِيْ بِاللَّيْلِ ضَامِنٌ عَلٰى اَهْلِهَا۔

(رواہ مالک وابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت حرام ابن سعد ابن محیصہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت براء ابن عازبؓ کی اونٹنی ایک باغ میں گھس گئی اور باغ کو خراب کر ڈالا جب یہ معاملہ رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ دن کہ دن میں باغات کی حفاظت باغ والوں کے ذمہ ہے اور جو جانور رات میں باغات کو خراب کریں تو اس کا ضمان یعنی تاوان جانوروں کے مالکوں پر ہے۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی جانور دن میں کسی کے باغ کو خراب کردے تو اس کا تاوان جانور کے مالک پر نہیں آتا کیونکہ دن میں باغ کی حفاظت کرنا باغ والے کی ذمہ داری ہے لہٰذا یہ اس کی اپنی کوتاہی ہے کہ اس نے اپنے باغ کی نگہبانی کیوں نہیں کی اور کسی جانور کو باغ میں کیوں گھسنے دیا۔ اور اگر کوئی جانور رات میں کسی کے باغ کو نقصان پہنچائے تو اس کا تاوان اس جانور کے مالک پر واجب ہوگا کیونکہ یہ جانور کے مالک کا قصور ہے کہ جب رات میں اپنے جانوروں کی نگہبانی اس کے ذمہ ہے تو اس نے اپنے جانور کو آزاد چھوڑ کر ایک دوسرے شخص کے نقصان کا باعث کیوں بنا۔

یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے جب کہ جانور کا مالک جانور کے ساتھ نہ ہو۔ اگر مالک جانور کے ساتھ ہوگا خواہ وہ جانور پر سوار ہو یا اسے کھینچ کر لے جا رہا ہو تو پھر دن میں بھی جانور کے پہنچائے ہوئے نقصان کا تاوان جانور کے مالک پر ہوگا چاہے وہ جانور اپنے ہاتھ پاؤں سے نقصان پہنچائے چاہے منہ سے۔

یہ تو حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا مسلک ہے، اس بارہ میں حنفی مسلک یہ ہے کہ اگر جانور کا مالک جانور کے ساتھ نہ ہو تو پھر اس پر نقصان کا تاوان واجب نہیں ہوتا خواہ وہ جانور دن میں نقصان پہنچائے خواہ رات میں۔

⑭ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الرِّجْلُ جُبَارٌ وَقَالَ النَّارُ جُبَارٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا پاؤں کا روندا ہوا معاف ہے اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ کا جلایا ہوا معاف ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یعنی اگر کوئی جانور کسی کی چیز کو پاؤں سے روند کچل کر تلف وضائع کردے تو اس کی وجہ سے اس جانور کے مالک پر تاوان واجب نہیں ہوگا بشرطیکہ وہ مالک جانور کے ساتھ نہ ہو۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی برے مقصد مثلاً ایذار سانی وغیرہ کے بغیر محض اپنی ضرورت یا کسی اور وجہ سے آگ جلائی اور اس کی کوئی چنگاری ہوا میں اڑ کر کسی دوسرے کے سامان پر جا پڑی جس سے وہ سامان جل گیا تو اس صورت میں آگ جلانے والے پر نقصان کا تاوان نہیں واجب ہوگا۔ بشرطیکہ اس نے جس وقت آگ جلائی ہو اس وقت ہوا ٹھہری ہوئی ہو اور آگ جلنے کے بعد چلی ہو، اور اگر اس نے ایسے وقت آگ جلائی جب کہ ہوا چل رہی تھی اور اس کی وجہ سے آگ سے نقصان پہنچ جانے کا احتمال تھا تو پھر اس پر تاوان واجب ہوگا۔

حالت اضطرار میں دوسرے کے جانور کا دودھ پینے کی اجازت

⑮ وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَتٰى اَحَدُكُمْ عَلٰى مَاشِيَةٍ فَاِنْ كَانَ فِيْهَا صَاحِبُهَا فَلْيَسْتَاْذِنْهُ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْهَا فَلْيُصَوِّتْ ثَلَاثًا فَاِنْ اَجَابَهُ اَحَدٌ فَلْيَسْتَاْذِنْهُ وَاِنْ لَمْ يُجِبْهُ اَحَدٌ فَلْيَحْتَلِبْ

وَلْيَشْرَبْ وَلَا يَحْمِلْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حسن حضرت سمرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص دودھ کے جانوروں کے پاس آئے تو اگر وہاں ان جانوروں کا مالک موجود ہو تو اس سے دودھ پینے کی اجازت مانگے اور اگر وہاں مالک موجود نہ ہو تو اس شخص کو چاہئے کہ وہ تین مرتبہ آواز دے اس کی آواز سن کر اگر کوئی جواب دے تو اس سے پوچھ لے اور اگر کوئی جواب نہ دے تو وہ بقدر ضرورت دودھ دوہ کر پی لے مگر دودھ اپنے ساتھ بالکل نہ لے جائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث میں مذکورہ ہدایت کا تعلق اس شخص سے ہے جو حالت اضطرار کو پہنچ چکا ہو یعنی بھوک کے مارے مرا جا رہا ہو، ایسے شخص کے لئے یہ اجازت ہے کہ اگر وہ دودھ کے جانور کے پاس ہو اور وہاں ان کا مالک موجود نہ ہو جس سے وہ اجازت لے کر دودھ پی سکے تو وہ مذکورہ ہدایت کے مطابق ان جانوروں کا بقدر ضرورت دودھ دوہ کر پی لے۔

دوسرے کے باغ کا پھل مالک کی اجازت کے بغیر کھانے کا مسئلہ

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ دَخَلَ حَائِطًا فَلْيَأْكُلْ وَلَا يَتَّخِذْ خُبْنَةً۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی دوسرے شخص کے باغ میں جائے تو اسے چاہئے کہ وہ وہاں کے پھل کھالے، جیب اور جھولے میں بھر کر نہ لے جائے۔ (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)، امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: اس حدیث کا مقصد اس بات کی عام اجازت دینا نہیں ہے کہ جو بھی چاہے کسی غیر شخص کے باغ میں جا کر پھل توڑے اور کھالے کیونکہ کسی دوسرے کی کوئی بھی چیز اس کی اجازت و مرضی کے بغیر لینا اور کھانا مطلقاً درست نہیں ہے بلکہ یہ حدیث بھی پہلی حدیث کی طرح یا تو حالت اضطرار پر محمول ہے یا اس کا تعلق ایسے مقامات سے ہے جہاں کسی کے باغ میں پہنچ کر باغ والے کی اجازت کے بغیر پھل کھالینا ممنوع نہیں ہوتا۔

مستعار لی ہوئی چیز امانت کے حکم میں ہے

(۱۷) وَعَنْ أُمَيَّةَ بْنِ صَفْوَانَ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَعَارَ مِنْهُ أَدْرَاعَهُ يَوْمَ حُنَيْنٍ فَقَالَ أَغَصْبًا يَا مُحَمَّدُ قَالَ بَلْ عَارِيَةً مَضْمُوْنَةً۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت امیہ ابن صفوان اپنے والد (صفوان) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حنین کی جنگ کے دن ان (صفوان) سے کئی زرہیں عاریۃً لیں انہوں نے پوچھا کہ اے محمد (ﷺ) کیا آپ (ﷺ) یہ زرہیں غصب کے طریقہ پر لے رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ عاریۃً لے رہا ہوں جو واپس کر دی جائیں گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: غزوہ حنین کے موقع پر جب کہ آپ ﷺ نے کچھ زرہیں صفوان سے مستعار لیں تو چونکہ صفوان اسلام کی دولت سے بہرہ ور نہیں تھے اسی لئے انہوں نے آپ ﷺ کو زرہیں دیتے ہوئے جو سوال کیا وہ بظاہر حد ادب سے گذرا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں صفوان اسلام کی دولت سے مشرف ہو گئے تھے رضی اللہ عنہ۔

حضرت شریح، حضرت نخعی، حضرت سفیان ثوری اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ جو چیز مستعار لی جاتی ہے وہ مستعار لینے والے کے پاس بطور امانت ہوتی ہے کہ اگر وہ تلف وضائع ہو جائے تو اس کا بدلہ دینا واجب نہیں ہوتا، ہاں اگر مستعار

لینے والا اس چیز کو قصداً ضائع کردے تو پھر اس پر اس چیز کا بدل واجب ہوتا ہے لیکن حضرت ابن عباسؓ حضرت ابوہریرہؓ حضرت امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر وہ چیز ضائع و تلف ہوجائے تو مستعار لینے والے پر اس کا بدل یعنی اس چیز کی قیمت ادا کرنا واجب ہوتا ہے اسی لئے ان حضرات کے نزدیک لفظ مضمونۃ (جو واپس کردی جائیں گی) کے یہ معنی ہیں (تلف ہوجانے کی صورت میں) ان کا بدل ادا کیا جائے گا۔

مستعار چیز کو واپس کردینا واجب ہے

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْعَارِیَۃُ مُؤَدَّاۃٌ وَالْمِنْحَۃُ مَرْدُوْدَۃٌ وَالدَّیْنُ مَقْضِیٌّ وَالزَّعِیْمُ غَارِمٌ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا رسول کریم ﷺ فرماتے تھے کہ مستعار چیز واپس کی جائے (یعنی کسی کی کوئی چیز مستعار لینے والے پر واجب ہے کہ وہ اس چیز کو اس کے مالک کے پاس واپس پہنچادے) منحہ کا واپس کرنا ضروری ہے، قرض کو ادا کیا جائے (یعنی قرض کو ادا کرنا واجب ہے) اور ضامن ضمانت پوری کرنے پر مجبور ہے (یعنی اگر کوئی شخص کسی کے قرض وغیرہ کا ضامن ہو تو اس کی ادائیگی اس پر لازم ہے)۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "منحہ" اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کو اپنا جانور دودھ پینے کے لئے دے دے، یا کسی کو اپنی زمین یا اپنا باغ پھل وغیرہ کھانے کے لئے دے دے، لہٰذا منحہ میں چونکہ صرف منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے نہ کہ اصل اس چیز کا اس لئے اس چیز (مثلاً جانور سے) فائدہ اٹھانے کے بعد اسے مالک کو واپس کردینا واجب ہے۔

درخت سے گرے ہوئے پھل اٹھانے کا مسئلہ

(۱۹) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْغِفَارِیِّ قَالَ کُنْتُ غُلَامًا اَرْمِیْ نَخْلَ الْاَنْصَارِ فَاُتِیَ بِیَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا غُلَامُ لِمَ تَرْمِی النَّخْلَ قُلْتُ اٰکُلُ قَالَ فَلَا تَرْمِ وَکُلْ مِمَّا سَقَطَ فِیْ اَسْفَلِھَا ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَہٗ فَقَالَ اللّٰھُمَّ اَشْبِعْ بَطْنَہٗ۔ (رواہ الترمذی و البوداود و ابن ماجۃ)

"اور حضرت رافع ابن عمرو غفاریؓ کہتے ہیں کہ جب میں بچہ تھا تو انصار کے کھجوروں کے درختوں پر پتھر پھینکا کرتا تھا (ایک دن) انصار مجھے پکڑ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئے، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا "لڑکے! تو کھجوروں پر پتھر کیوں پھینکتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ کھجوریں کھاتا ہوں (یعنی کھجوریں کھانے کے لئے ان کے درختوں پر پتھر مارتا ہوں کسی اور مقصد سے پتھر نہیں پھینکتا) آپ ﷺ نے فرمایا "پتھر نہ پھینکا کرو ہاں جو کھجوریں درخت کے نیچے گری پڑی ہوں ان کو کھا لیا کرو"۔ پھر آپ ﷺ نے میرے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور فرمایا کہ "اے اللہ! تو اس کا پیٹ بھر۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے رافعؓ کو درخت کے نیچے گری پڑی کھجوریں کھا لینے کی اجازت اس لئے عطا فرمائی کہ عام طور پر درختوں پر سے گرے ہوئے پھلوں کو کھانے سے کوئی منع نہیں کرتا، خاص طور پر بچے چونکہ کچے پکے اور گرے پڑے پھلوں کی طرف بہت راغب ہوتے ہیں اس لئے ان کو اس سے کوئی بھی منع نہیں کرتا کہ وہ درخت کے نیچے گرے پڑے پھل اٹھا کر کھالیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر رافعؓ حالت اضطرار میں ہوتے یعنی بھوک کی وجہ سے مجبور ہوتے تو آنحضرت ﷺ انہیں گرے پڑے پھلوں ہی کے کھانے کی اجازت دینے پر اکتفاء نہ فرماتے بلکہ درخت پر سے کھجوریں توڑ کر کھا لینے کی بھی اجازت دے دیتے۔

وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ فِیْ بَابِ اللُّقْطَۃِ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ کی حدیث کو ہم انشاء اللہ باب لقطہ میں ذکر کریں گے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

زمین غصب کرنے کی سزا

(۲۰) عَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شَیْئًا بِغَیْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلٰی سَبْعِ اَرْضِیْنَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت سالمؒ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بیان کیا کہ "جو شخص زمین کا کوئی حصہ بھی ناحق لے گا۔ (یعنی کسی کی زمین کا کوئی بھی قطعہ ازراہ ظلم وزبردستی لے گا) تو قیامت کے دن اسے زمین کے ساتویں طبقہ تک دھنسایا جائے گا۔" (بخاریؒ)

(۲۱) وَعَنْ یَعْلَی بْنِ مُرَّةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ اَخَذَ اَرْضًا بِغَیْرِ حَقِّهَا کُلِّفَ اَنْ یَحْمِلَ تُرَابَهَا الْمَحْشَرَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت یعلی ابن مرۃؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا رسول کریم ﷺ یہ فرماتے تھے کہ "جو شخص زمین کا کوئی بھی حصہ ناحق (یعنی ازراہ ظلم) لے گا، اسے حشر کے دن اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس زمین کی (ساری) مٹی اپنے سر پر اٹھائے۔" (احمدؒ)

تشریح: ازراہ ظلم کسی کی زمین غصب کرنے والے کی مختلف سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے، پہلی فصل میں تو یہ فرمایا گیا تھا کہ قیامت کے دن ایسے شخص کے گلے میں زمین کا وہ قطعہ طوق بنا کر ڈالا جائے گا جو اس نے کسی سے زبردستی ہتھیایا ہوگا، اوپر کی حدیث میں یہ بیان کیا گیا کہ کسی کی زمین پر ناحق قبضہ کرنے والا قیامت کے دن زمین کے ساتویں طبقہ تک دھنسایا جائے گا۔ یہاں اس حدیث میں یہ سزا ذکر کی گئی ہے کہ کسی کی زمین پر ناجائز طریقہ سے قبضہ کرنے والا حشر کے دن اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ اس زمین کی ساری مٹی اپنے سر پر اٹھائے۔ آنے والی حدیث اس بارے میں سزا کی ایک اور قسم کو بیان کر رہی ہے۔

گویا عذاب وسزا کی مختلف صورتیں اور قسمیں ہیں، چنانچہ کسی کو اس طرح عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور کسی کو اس طرح سزا دی جائے گی۔

(۲۲) وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَیُّمَا رَجُلٍ ظَلَمَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ کَلَّفَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اَنْ یَحْفِرَهٗ حَتّٰی یَبْلُغَ اٰخِرَ سَبْعِ اَرْضِیْنَ ثُمَّ یُطَوَّقَهٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ حَتّٰی یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت یعلی ابن مرۃؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص (کسی کی) بالشت بھر بھی زمین ازراہ ظلم لے گا اسے "اس کی قبر میں) اللہ تعالیٰ اس بات پر مجبور کرے گا کہ وہ اس زمین کو ساتویں طبقہ زمین تک کھودتا رہے پھر وہ زمین اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈالی جائے گی۔ اور وہ قیامت تک اسی حال میں رہے گا حتی کہ (قیامت کے دن) لوگوں کا حساب کتاب ہو جائے۔" (احمدؒ)

بَابُ الشُّفْعَةِ

ملانے کا بیان

"شفعہ" مشتق ہے "شفع" سے، جس کے لغوی معنی ہیں "ملانا اور جفت کرنا" شفعہ اصطلاح فقہ میں اس ہمسائیگی یا شرکت کو کہتے ہیں

جس کی وجہ سے کسی ہمسایہ یا کسی شریک کو اس کے دوسرے ہمسایہ یا دوسرے شریک کے فروخت ہونے والی زمین یا فروخت ہونے والے مکان کو خریدنے کا ایک مخصوص حق حاصل ہوتا ہے اور یہ حق صرف زمین یا مکان کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے جس شخص کو یہ حق حاصل ہوتا ہے اسے "شفیع" کہتے ہیں۔ اس حق کا نام "شفعہ" اس لئے ہے کہ یہ خاص حق فروخت ہونے والی زمین یا مکان کو شفیع کی زمین یا مکان سے ملاتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک حق شفعہ صرف شریک کو حاصل ہوتا ہے ہمسایہ کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا۔ جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ حق شفعہ جس طرح شریک کے لئے ثابت ہے اسی طرح ہمسایہ کے لئے بھی ثابت ہے۔

ایک صحیح روایت کے مطابق حضرت امام احمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں، ہمسایہ کے حق شفعہ کے ثبوت میں احادیث منقول ہیں جو بالکل صحیح درجے کی ہیں ان کی موجودگی میں ہمسایہ کو حق شفعہ دینے سے انکار ایک بے دلیل بات ہے۔

حنفی مسلک کے مطابق شفیع کے تین درجے ہیں اول "خلیط فی النفس المبیع" یعنی فروخت ہونے والے مکان کی ملکیت میں کئی آدمی شریک ہوں خواہ وہ مکان ان سب شرکاء کو وراثت میں پہنچا ہو یا ان سب نے مشترک طور پر اسے خریدا ہو اور یا کسی نے ان سب کو مشترک طور پر ہبہ کیا ہو۔

دوم "خلیط فی حق المبیع" یعنی اس فروخت ہونے والے مکان یا زمین کی ملکیت میں شریک نہ ہو بلکہ اس زمین یا مکان کے حقوق میں شریک ہو جیسے حق مرور (یعنی آمد و رفت کا حق) حق مسیل (یعنی پانی کے نکاس کا حق) اور حق شرب (یعنی کھیت وغیرہ کو سیراب کرنے کے لئے پانی لے جانے کی نالی وغیرہ کا حق)۔

سوم "جار" یعنی ہمسایہ جس کا مکان فروخت ہونے والے مکان سے متصل ہو اور ان دونوں مکانوں کی دیواریں ملی ہوئی ہوں، نیز دونوں کے دروازوں کا راستہ ایک ہو۔

ان تینوں کے علاوہ اور کوئی شفیع نہیں ہو سکتا لہٰذا سب سے پہلے تو حق شفعہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو اس فروخت ہونے والے مکان یا زمین کی ملکیت میں شریک ہو۔ اس کی موجودگی میں حق شفعہ نہ تو حقوق میں شریک کو حاصل ہوگا اور نہ ہمسایہ کو، اگر یہ شریک حق شفعہ سے دست کشی اختیار کرے تو پھر حق شفعہ اس شخص کو پہنچے گا جو حقوق میں شریک ہو اور یہ بھی دست کشی اختیار کر لے تب حق شفعہ ہمسایہ کو حاصل ہوگا اور اگر یہ ہمسایہ بھی اپنے اس حق سے دست کش ہو جائے تو اس کے بعد کسی کو بھی حق شفعہ حاصل نہیں ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حق شفعہ صرف شریک کو حاصل ہوتا ہے یا ہمسایہ کو بھی

① عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالشُّفْعَةِ فِيْ كُلِّ مَالَمْ يُقْسَمْ فَاِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ وَصُرِفَتِ الطُّرُقُ فَلَا شُفْعَةَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہر اس (غیر منقول) چیز میں حق شفعہ ثابت ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا ہے جو (شراکت میں ہو) اور شرکاء کے درمیان تقسیم نہ کی گئی ہو، لہٰذا جب حدود مقرر ہو جائیں (یعنی مشترک ملکیت کی زمین یا مکان، باہم تقسیم ہو جائے) اور (ہر ایک حصہ کے) راستے الگ الگ کر دیئے جائیں تو پھر شفعہ باقی نہیں رہتا (یعنی اس صورت میں چونکہ شرکت باقی نہیں رہتی اس لئے کسی کو بھی حق شفعہ حاصل نہیں ہوتا۔" (بخاریؒ)

تشریح: جب کسی زمین یا کسی مکان کے مشترک طور پر کئی مالک ہوں تو اس کے شرکاء کو ہر ایک کے حصہ میں حق شفعہ اسی وقت تک

حاصل رہتا ہے جب تک کہ اس زمین یا اس مکان کی باہم تقسیم نہ ہو۔ اگر وہ زمین یا مکان شرکاء آپس میں تقسیم کرلیں، اور سب کے حصے الگ ہو جائیں اور سب حصوں کے راستے بھی جدا جدا ہو جائیں تو اس صورت میں کسی کو بھی حق شفعہ حاصل نہیں رہتا۔ اس طرح یہ حدیث اس بات کی دلیل ہوگی کہ حق شفعہ صرف شریک کو حاصل ہوتا ہے، ہمسایہ کو حاصل نہیں ہوتا چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں ہمسایہ کو بھی حق شفعہ حاصل ہوتا ہے ان کی دلیل دوسری احادیث ہیں، ان کے نزدیک اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ اس زمین یا مکان کی تقسیم کے بعد شرکت کا شفعہ باقی نہیں رہتا، لہٰذا حدیث کا یہ مفہوم مراد لینے کی صورت میں ہمسائیگی کے شفعہ کی نفی لازم نہیں آتی۔

حق شفعہ صرف زمین اور مکان کے ساتھ مخصوص ہے

② وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالشُّفْعَةِ فِىْ كُلِّ شِرْكَةٍ لَمْ تُقْسَمْ رَبْعَةٍ اَوْحَائِطٍ لَايَحِلُّ لَهٗ اَنْ يَّبِيْعَ حَتّٰى يُؤْذِنَ شَرِيْكَهٗ فَاِنْ شَاءَ اَخَذَ وَاِنْ شَاءَ تَرَكَ فَاِذَا بَاعَ وَلَمْ يُؤْذِنْهُ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ ہر ایسی مشترک زمین میں شفعہ ثابت ہے۔ جو تقسیم نہ کی گئی ہو خواہ وہ گھر ہو یا باغ ہو۔ نیز ایسی مشترک زمین کے کسی بھی شریک کو اپنا حصہ بیچنا حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ اپنے دوسرے شریک کو مطلع نہ کردے (اطلاع کے بعد) وہ دوسرا شریک چاہے تو وہ حصہ خود خرید لے اور چاہے چھوڑ دے (یعنی کسی دوسرے کو بیچنے کی اجازت دے دے) اور اگر کسی شریک نے اپنے دوسرے شریک کو اطلاع دیئے بغیر اپنا حصہ بیچ دیا تو وہ دوسرا شریک اس (بات) کا حقدار ہے (کہ وہ اس فروخت شدہ حصہ کو خرید لے)۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حق شفعہ صرف غیر منقولہ جائیداد (یعنی زمین، مکان اور باغ کے ساتھ مخصوص ہے اشیاء منقولہ جیسے اسباب اور جانور وغیرہ میں شفعہ کا حق نہیں ہوتا، چنانچہ تمام علماء کا متفقہ طور پر یہی مسلک ہے پھر حق شفعہ صرف مسلمان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مسلمان اور ذمی کے درمیان بھی شفعہ کا حق جاری ہوتا ہے (ذمی اس غیر مسلم کو کہتے ہیں جو جزیہ یعنی اپنے جان ومال اور اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کا ایک مخصوص ٹیکس ادا کر کے اسلامی سلطنت کا اطاعت گزار شہری ہو)۔

مشترک زمین یا مکان کے کسی حصہ کے فروختگی کے وقت دوسرے شریک کو اطلاع دینا ضروری ہے

ارشاد گرامی کے الفاظ لَایَحِلُّ لَهٗ الخ (کسی بھی شریک کو اپنا حصہ بیچنا حلال نہیں ہے الخ) سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگر کسی مشترک زمین یا مکان کا کوئی حصہ دار اپنا حصہ بیچنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ فروختگی کے ارادے کے وقت ہی اپنے دوسرے حصہ دار کو اس کی اطلاع دے دے تاکہ اگر وہ خریدنا چاہے تو اس حصہ کو خرید لے ورنہ عدم اطلاع کی صورت میں اس دوسرے حصہ دار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بذریعہ شفعہ اس حصہ کو حاصل کرے۔

ہمسایہ کو حق شفعہ حاصل ہونے کی دلیل

③ وَعَنْ اَبِىْ رَافِعٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْجَارُ اَحَقُّ بِسَقَبِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہمسایہ اپنے قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ حقدار ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ہمسایہ شفعہ کا زیادہ حق دار ہے اور یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شفعہ کا حق صرف اسی ہمسایہ کو ہوتا ہے کہ جو نزدیک

اور متصل ہو۔

یہ حدیث بڑی وضاحت کے ساتھ حنفیہ کے اس مسلک کی دلیل ہے کہ حق شفعہ صرف شریک ہی کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ ہمسایہ کو بھی حاصل ہوتا ہے۔

ہمسائیگی کا حق

④ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَمْنَعُ جَارٌ جَارَہٗ اَنْ یَّغْرِزَ خَشَبَۃً فِیْ جِدَارِہٖ۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی ہمسایہ اپنے دوسرے ہمسایہ کو اپنی دیوار میں لکڑی گاڑنے سے منع نہ کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: منع نہ کرنے کا یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ لکڑی گاڑنے کی وجہ سے کوئی نقصان و ضرر نہ پہنچتا ہو۔ حضرت امام احمدؒ اور محدثین کے نزدیک مذکورہ بالا حکم وجوب کے طور پر ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم استحباب کے طور پر ہے۔

راستے کے سلسلے میں ایک ہدایت

⑤ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِی الطَّرِیْقِ جُعِلَ عَرْضُہٗ سَبْعَۃَ اَذْرُعٍ۔
(رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب راستہ کی بابت تم میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کی چوڑائی سات ہاتھ متعین کر دو۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی افتادہ زمین پر راستہ بنا ہوا ہو اور وہاں کچھ لوگ عمارت بنانا چاہیں تو بہتر یہی ہے کہ آپس کے اتفاق و اتحاد (سے مناسب راستہ کے لائق زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر اس کے ارد گرد عمارت بنالی جائے لیکن اگر راستہ کے لئے زمین کی کسی مقدار پر اتفاق نہ ہو اور آپس میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس صورت میں واضح ہدایت یہ ہے کہ راستہ کے لئے چوڑائی میں سات ہاتھ زمین متعین کر دی جائے اور اس سات کے اندر کوئی کچھ نہ بنائے۔

مذکورہ بالا حدیث کی مراد تو یہ ہے لیکن اس بارے میں ایک یہ مسئلہ بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اگر کوئی چلتا ہوا راستہ سات ہاتھ سے زائد چوڑا ہو تو اس صورت میں کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے وہ اس پورے زائد حصے یا اس میں سے کچھ پر قابض ہو جائے اور یہ کہے کہ راستہ کی سات ہاتھ چوڑائی کافی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

غیر منقولہ جائداد کو بلا ضرورت بیچنا مناسب نہیں ہے

⑥ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ حُرَیْثٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ بَاعَ مِنْکُمْ دَارًا اَوْعَقَارًا قَمِنٌ اَنْ لَا یُبَارَکَ لَہٗ اِلَّا اَنْ یَجْعَلَہٗ فِیْ مِثْلِہٖ۔ (رواہ ابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت سعید ابن حریثؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تم میں سے جو شخص اپنا مکان یا زمین

فروخت کرے تو مناسب یہ ہے کہ اس (کی قیمت) میں برکت نہ ہو الایہ کہ وہ اس (قیمت) کو اس ہی جیسی جائیداد کی خریداری میں صرف کرے۔" (ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ غیر منقولہ جائیداد (مثلاً مکانات اور زمین کو بلاضرورت بیچنا اور اس سے حاصل ہونے والی قیمت سے منقولہ اشیاء خریدنا غیر مستحب اور غیر مناسب ہے کیونکہ غیر منقولہ جائیداد میں منافع بھی بہت ہیں اور اس کے اتلاف و نقصان کے خطرات بھی کم ہوتے ہیں، جیسے اسے کوئی چور چرا نہیں سکتا اور کوئی لٹیرا لوٹ کر لے نہیں جاسکتا، بخلاف اشیاء منقولہ کے کہ ان کی چوری کا ہر وقت خوف رہتا ہے۔ لہٰذا عقل و دانش کا تقاضہ یہی ہونا چاہئے کہ بلاضرورت غیر منقولہ جائیداد کو فروخت نہ کیا جائے، اگر فروخت ہی کیا جائے تو اس کی قیمت کو دوسرے مکانات و زمین کی خریداری میں صرف کیا جائے۔

ہمسایہ کو حق شفعہ حاصل ہوتا ہے

⑦ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْجَارُ اَحَقُّ بِشُفْعَتِهٖ يُنْتَظَرُ لَهَا وَاِنْ كَانَ غَائِبًا اِذَا كَانَ طَرِيْقُهُمَا وَاحِدًا۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہمسایہ اپنے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کے شفعہ کی وجہ سے اس کا انتظار کیا جائے (اور ہمسایہ شفعہ کا اس صورت میں حق دار ہے) جب کہ دونوں کا راستہ ایک ہو۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

شفعہ کا تعلّق ہر غیر منقول جائیداد سے ہے

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الشَّرِيْكُ شَفِيْعٌ وَالشُّفْعَةُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ قَالَ وَقَدْ رُوِيَ عَنِ ابْنِ اَبِيْ مُلَيْكَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرْسَلًا وَهُوَ اَصَحُّ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا (وہ شخص جو (فروخت کی جانے والی جائیداد میں) شریک ہو، شفعہ کا حق رکھتا ہے اور شفعہ کا تعلق ہر (اس) چیز سے ہے (جو غیر منقولہ جائیداد ہو جیسے زمین اور باغ وغیرہ) اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت ابن ابی ملیکہؒ نے بھی نبی کریم ﷺ سے بطریق ارسال نقل کی ہے اور وہی زیادہ صحیح ہے۔"

بیری کا درخت کاٹنے پر وعید

⑨ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ حُبَيْشٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَطَعَ سِدْرَةً صَوَّبَ اللّٰهُ رَاْسَهٗ فِى النَّارِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَقَالَ هٰذَا الْحَدِيْثُ مُخْتَصَرٌ يَعْنِيْ مَنْ قَطَعَ سِدْرَةً فِيْ فَلَاةٍ يَسْتَظِلُّ بِهَا ابْنُ السَّبِيْلِ وَالْبَهَائِمُ غَشْمًا وَظُلْمًا بِغَيْرِ حَقٍّ يَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا صَوَّبَ اللّٰهُ رَاْسَهٗ فِى النَّارِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن حبیشؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص بیری کا درخت کاٹے گا اللہ تعالیٰ اسے الٹے سر دوزخ میں ڈالے گا امام ابوداؤدؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث مختصر ہے جس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص جنگل میں بیری کے کسی ایسے درخت کو کہ جس کے سایہ میں مسافر اور جانور پناہ حاصل کرتے ہیں، از راہ ظلم و زیادتی اور بغیر حق کے کاٹے گا تو اللہ تعالیٰ اسے الٹے سر دوزخ میں ڈالے گا۔"

تشریح: جملہ غشمًا و ظلمًا بغیر حق میں لفظ "ظلم" اور "بغیر حق" لفظ "غشمًا" کی تاکید کے طور پر استعمال کیا گیا ہے یا پھر یہ کہ

لفظ "ظلم"، "تو غشمًا کی تاکید کے طور پر ہے لیکن "بغیر حق" سے مراد شفعہ ہے۔

ابوداؤدؒ کی کتاب "مرقات الصعود" میں لکھا ہے کہ طبرانی نے اپنی کتاب "اوسط" میں یہ وضاحت کی ہے کہ جو شخص حدود حرم میں بیری کا درخت کاٹے گا اس کے لئے یہ وعید ہے، بعضوں نے کہا ہے کہ یہاں مدینہ کی بیری کا درخت مراد ہے، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جنگل کی وہ بیری کا درخت مراد ہے جس کے سائے میں مسافر اور جانور راحت پاتے ہیں، اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس وعید کا تعلق اس شخص سے ہے جو کسی دوسرے شخص کا بیری کا درخت از راہ ظلم وزیادتی کاٹ ڈالے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ہر غیر منقول جائیداد میں شفعہ ہے خواہ وہ تقسیم ہو سکتی ہے یا ناقابل تقسیم ہو

⑮ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ اِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ فِی الْاَرْضِ فَلَا شُفْعَةَ فِيْهَا وَلَا شُفْعَةَ فِیْ بِئْرٍ وَلَا فَحْلِ النَّخْلِ۔

(رواہ مالک)

"حضرت عثمان ابن عفانؓ فرماتے ہیں کہ جب زمین میں حدیں قائم ہو جائیں (یعنی مشترک زمین شرکاء میں باہم تقسیم ہو جائے اور ہر ایک کے حصے الگ الگ ہو جائیں) تو (شرکت کا) شفعہ باقی نہیں رہتا اور نہ کنویں میں شفعہ کا حق حاصل ہوتا ہے اور نہ نر کھجور کے درخت میں۔"

(مالکؒ)

تشریح: کنواں ایک ایسی چیز ہے جو تقسیم کا احتمال نہیں رکھتا اور چونکہ شفعہ کا حق اسی زمین میں حاصل ہوتا ہے جو تقسیم کا احتمال رکھتی ہو اس لئے کنویں میں شفعہ نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک شفعہ ہر زمین میں ثابت ہے خواہ وہ تقسیم کا احتمال رکھے جیسے مکانات اور باغات وغیرہ یا تقسیم کا احتمال نہ رکھے جیسے کنواں، حمام اور چکی وغیرہ حنفیہ کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ واضح ارشاد گرامی ہے کہ اَلشُّفْعَةُ فِیْ كُلِّ شَيْءٍ یعنی شفعہ ہر (غیر منقول) چیز میں ہے۔

"اور نہ نر کھجور کے درخت میں" یعنی مثلاً چند لوگوں کو کھجور کے کچھ درخت مشترک طور پر وراثت میں حاصل ہوئے۔ جنہیں انہوں نے آپس میں تقسیم کر لیا لیکن ان میں ایک نر درخت بھی تھا۔ جس کے پھول لے کر سب ہی لوگ اپنے اپنے کھجور کے درختوں پر ڈالتے تھے، اب ان ہی میں کا ایک شخص اپنے حصہ کے کھجور کے درختوں کے ساتھ اس نر درخت کے اپنے حقوق بھی فروخت کرے تو شرکاء کو اس فروخت میں شفعہ کا حق حاصل نہیں ہوگا کیونکہ نہ تو وہ کوئی زمین ہے اور نہ اس کو تقسیم کر لینا ممکن ہے۔

بَابُ الْمُسَاقَاةِ وَالْمُزَارَعَةِ

مساقات اور مزارعت کا بیان

"مساقات" کی صورت یہ ہے کہ مثلاً زید اپنا باغ یا اپنے کچھ درخت بکر کو اس شرط کے ساتھ دے کہ تم ان درختوں کو سیراب کرنا، ان کی دیکھ بھال کرنا، پھر ان پر جو پھل آئیں گے ان کو آدھوں آدھ یا تہائی یا چوتھائی وغیرہ (جو بھی مقدار مقرر ہو) آپس میں تقسیم کر لیں گے۔

"مزارعت" کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً زید اپنی زمین بکر کو اس شرط کے ساتھ دے کہ تم اس کو جوتنا بونا، اس کی جو پیداوار ہوگی اسے آدھوں آدھ یا تہائی اور یا چوتھائی (جو بھی مقدار مقرر ہو) آپس میں تقسیم کر لیں گے۔

گویا "مساقات" اور "مزارعت" دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے یعنی "بٹائی پر دینا" فرق صرف اتنا ہے کہ مساقات کا تعلق تو درختوں سے ہوتا ہے اور مزارعت کا تعلق زمین سے ہے، ان دونوں کا فقہی حکم بھی ایک ہی ہے، مساقات اور مزارعت یعنی اپنے درختوں یا زمین

کو بٹائی پر دینا حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک فاسد ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ اور حنفیہ میں سے حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ نیز دوسرے علماء کے نزدیک یہ جائز ہے۔

حضرت امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ یہ ایک ایسا اجارہ ہے جس میں اجر مجہول اور معدوم ہوتا ہے پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ سے مخابرت (مزارعت) کی نہی ثابت ہے، لیکن فتویٰ چونکہ حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے قول پر ہے اس لئے حنفیہ کے ہاں بھی مساقات اور مزارعت جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خیبر کی زمین کا بندوبست

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَفَعَ اِلٰى يَهُوْدِ خَيْبَرَ نَخْلَ خَيْبَرَ وَاَرْضَهَا اِلٰى اَنْ يَعْتَمِلُوْهَا مِنْ اَمْوَالِهِمْ وَلِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَطْرُ ثَمَرِهَا۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِىْ رِوَايَةِ الْبُخَارِىِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطٰى خَيْبَرَ الْيَهُوْدَ اَنْ يَعْمَلُوْهَا وَيَزْرَعُوْهَا وَلَهُمْ شَطْرُ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا۔

"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کی کھجوروں کے درخت اور وہاں کی زمین اس شرط پر خیبر کے یہودیوں کے حوالہ کردی کہ وہ اس میں اپنی جان اور اپنا مال لگائیں اور اس کا آدھا پھل رسول کریم ﷺ کے لئے ہوگا۔" (مسلم)

"اور بخاریؒ کی روایت میں یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کو (یعنی وہاں کی زمین اور درخت کو) اس شرط پر خیبر کے یہودیوں کے حوالہ کردیا تھا کہ وہ اس میں محنت کریں اور کاشت کاری کریں اور پھر اس کی پیداوار کا آدھا حصہ یہودیوں کا حق ہوگا اور آدھا حصہ آنحضرت ﷺ لے لیں گے۔"

تشریح: خیبر ایک بستی کا نام ہے جو مدینہ سے تقریباً (۶۰) میل شمال میں ایک حرے کے درمیان واقع ہے۔ پہلے یہ ایک مشہور مقام رہ چکا ہے جہاں یہودیوں کی بود و باش تھی، لیکن اب یہ بستی چند گاؤں کا مجموعہ ہے، چونکہ اس کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے اس لئے یہاں لوگ اقامت اختیار کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اس کے علاقہ میں کھجور وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔

بہرحال یہ حدیث علاوہ امام اعظم ابوحنیفہ کے تمام علماء کے اس مسلک کی دلیل ہے کہ مساقات و مزارعت جائز ہے حضرت امام اعظمؒ یہ فرماتے ہیں کہ خیبر کی زمین اور درختوں کو وہاں کے یہودیوں کو دینا مساقات و مزارعت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ کیونکہ خیبر کی زمین اور وہاں کے درخت آنحضرت ﷺ کی ملکیت میں نہیں تھے کہ آپ ﷺ بطور مساقات و مزارعت وہاں کے یہودیوں کو دیتے بلکہ وہ زمین بھی یہودیوں ہی کی ملکیت تھی اور وہاں کے درختوں کے مالک بھی یہودی ہی تھے۔ آپ ﷺ نے ان کی املاک کو انہیں کے حوالے کیا اور اس کی پیداوار کا نصف بطور خراج اپنے لئے مقرر فرمایا، چنانچہ خراج کی دو قسمیں ہیں۔ ① خراج موظف ② خراج مقاسمت۔

خراج موظف کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اسلامی مملکت کی طرف سے جن لوگوں پر خراج عائد کیا جاتا ہے ان سے سربراہ مملکت ہر سال کچھ مال لینا مقرر کرلیتا ہے جیسا کہ اہل نجران سے ہر سال بارہ سو حلے یعنی جوڑے لئے جاتے تھے۔

خراج مقاسمت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جن لوگوں پر خراج عائد کیا جاتا ہے ان کی زمین کی پیداوار ان لوگوں اور اسلامی حکومت کی درمیان کسی مقررہ مقدار میں تقسیم ہوتی ہے جیسا کہ اہل خیبر کے ساتھ ہوا کہ ان کی زمین اور درختوں کی نصف پیداوار آنحضرت ﷺ لے لیتے تھے۔

مخابرت کی ممانعت

② وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نُخَابِرُ وَلَا نَرٰى بِذٰلِكَ بَأْسًا حَتّٰى زَعَمَ رَافِعُ بْنُ خُدَيْجٍ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْهَا فَتَرَكْنَاهَا مِنْ اَجَلِ ذٰلِكَ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ مخابرت کیا کرتے تھے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے یہاں تک کہ جب حضرت رافع ابن خدیجؓ نے یہ بتایا کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے تو ہم نے اس وجہ سے اسے ترک کر دیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "مخابرت" اس مزارعت کو کہتے ہیں جس کا ذکر اوپر کی حدیث میں ہوا، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک چونکہ مزارعت ممنوع ہے اس لئے یہ حدیث ان کی دلیل ہے۔

اجرت یا لگان پر زمین دینے کا ذکر

(۳) وَعَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ قَيْسٍ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عَمَّايَ اَنَّهُمْ كَانُوْا يُكْرُوْنَ الْاَرْضَ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا يَنْبُتُ عَلَى الْاَرْبِعَاءِ اَوْ شَيْئٍ يَسْتَثْنِيْهِ صَاحِبُ الْاَرْضِ فَنَهَانَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذٰلِكَ فَقُلْتُ لِرَافِعٍ فَكَيْفَ هِيَ بِالدَّرَاهِمِ وَالدَّنَانِيْرِ فَقَالَ لَيْسَ بِهَا بَاْسٌ وَكَانَ الَّذِيْ نُهِيَ عَنْ ذٰلِكَ مَالَوْ نَظَرَ فِيْهِ ذَوُوا الْفَهْمِ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ لَمْ يُجِيْزُوْهُ لِمَا فِيْهِ مِنَ الْمُخَاطَرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حنظلہ ابن قیسؒ (تابعی) حضرت رافع بن خدیجؓ (صحابی) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی رافعؓ نے) فرمایا کہ مجھے میرے دو چچاؤں نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ نالیوں پر ہونے والی پیداوار کے عوض اپنی زمین اجرت پر دیا کرتے تھے (یعنی صحابہؓ اپنی زمین کو کسی دوسرے شخص کو اس شرط کے ساتھ اجرت پر دے دیا کرتے تھے کہ وہ شخص اپنی محنت اور اپنا تخم لگا کر اس میں کاشت کرے اور اس زمین کی پانی کی نالیوں کے کناروں پر جو کچھ پیدا ہوگا وہ اس زمین کی اجرت میں مالک کا حق ہوگا اور اس کے علاوہ باقی زمین کی پیداوار کاشت کرنے والے کا حق ہوگا) یا اپنی زمین کو اس قطعہ (کی پیداوار) کے عوض اجرت پر دیتے تھے جسے مالک اپنے لئے علیحدہ کر لیتا تھا (یعنی زمین کو اجرت پر دینے کی دوسری صورت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی زمین جب کسی کو کاشت کے لئے دیتے تو اس کا کوئی قطعہ اپنے لئے متعین کر دیتے تھے اور یہ طے ہو جاتا تھا کہ کاشت کرنے والا اپنی محنت اور اپنا تخم لگا کر پوری زمین پر کاشت کرے پھر اس متعین قطعہ کی جو کچھ پیداوار ہوگی وہ تو مالک لے لے گا اور باقی زمین کی پیداوار کاشت کرنے والا لے گا) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرمایا (کیونکہ اس میں نقصان اور فریب میں مبتلا ہونے کا خوف رہتا تھا) حدیث کے راوی حضرت حنظلہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت رافعؓ سے پوچھا کہ درہم و دینار کے عوض مزارعت کا کیا حکم ہے (یعنی اپنی زمین کسی کو کاشت کرنے کے لئے دے دی جائے اور اس کے عوض بطور لگان روپے لئے جائیں تو کیا حکم ہے؟) حضرت رافعؓ نے فرمایا کہ "اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور جس چیز سے رسول کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ (یعنی مزارعت کی مذکورہ دونوں صورتیں) وہ ایسی چیز ہے کہ اگر حرام و حلال کی سمجھ رکھنے والا شخص اس میں غور کرے تو نقصان پہنچنے کے خوف سے اسے پسند نہ کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اپنی زمین کو کاشت کے لئے دینے کی جو دو صورتیں ذکر کی گئی ہیں اور جن سے رسول کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے وہ ان علماء کے نزدیک بھی محل نہی ہیں جو مزارعت کے جواز کے قائل ہیں۔

مزارعت کے سلسلے میں چونکہ مختلف احادیث منقول ہیں اس لئے جو علماء مزارعت کو جائز کہتے ہیں وہ بھی اپنے مسلک کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں اور وہ علماء بھی حدیث ہی سے استدلال کرتے ہیں جن کے نزدیک مزارعت جائز نہیں ہے، گویا دونوں طرف کے علماء کے لئے تاویل کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ اکثر علماء مزارعت کو جائز کہتے ہیں، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں۔ لیکن حنفیہ کے دو جلیل القدر ائمہ حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ چونکہ جواز ہی کے قائل ہیں پھر یہ کہ دفع ضرورت کی مصلحت بھی

پیش نظر ہے اس لئے حنفی مسلک میں بھی فتویٰ اسی بات پر ہے کہ مزارعت جائز ہے۔

مزارعت کی ایک ممنوع صورت

④ وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ كُنَّا اَكْثَرَ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ حَقْلًا وَكَانَ اَحَدُنَا يُكْرِىْ اَرْضَهُ فَيَقُوْلُ هٰذِهِ الْقِطْعَةُ لِىْ وَهٰذِهِ لَكَ فَرُبَّمَا اَخْرَجَتْ ذِهِ وَلَمْ تُخْرِجْ ذِهِ فَنَهَاهُمُ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت رافع ابن خدیج کہتے ہیں کہ ہم اکثر مدینہ والے کاشتکاری کیا کرتے تھے اور ہم میں سے بعض لوگ اپنی زمین کو بٹائی پر کاشت کرنے کے لئے (کسی دوسرے کو) دے دیا کرتے تھے اور اس سے یہ کہہ دیتے تھے (کہ تم اس پوری زمین پر کاشت کرو، اس کے عوض میں) اس زمین کا یہ قطعہ میرے لئے ہے (یعنی اس قطعہ کی پیداوار میں لے لوں گا) اور یہ قطعہ تمہارے لئے ہے (یعنی اس دوسرے قطعہ کی پیداوار تم لے لینا) اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک قطعہ میں پیداوار ہو جاتی تھی لیکن دوسرے قطعہ میں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا تھا، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے (مزارعت کی اس صورت سے) منع فرمادیا۔ (کیونکہ اس کی وجہ سے ایک شخص کو تو زمین کی پوری پیداوار مل جاتی تھی اور دوسرے شخص کا حق بالکل ضائع ہو جاتا تھا۔" (بخاری و مسلم)

کسی کو اپنی زمین کاشت کرنے کے لئے بطور رعایت دینا بہتر ہے

⑤ وَعَنْ عَمْرٍو قَالَ قُلْتُ لِطَاؤُسٍ لَوْتَرَكْتَ الْمُخَابَرَةَ فَاِنَّهُمْ يَزْعُمُوْنَ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْهُ قَالَ اَىْ عَمْرُو اِنِّىْ اُعْطِيْهِمْ وَاُعِيْنُكُمْ وَاِنَّ اَعْلَمَهُمْ اَخْبَرَنِىْ يَعْنِى ابْنَ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَنْهَ عَنْهُ وَلٰكِنْ قَالَ اَنْ يَمْنَحَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ اَنْ يَاْخُذَ عَلَيْهِ خَرْجًا مَعْلُوْمًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرو ابن دینار (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت طاؤس (تابعی) سے کہا کہ اگر آپ مزارعت کو ترک کر دیتے تو بہتر تھا کیونکہ علماء کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ "طاؤس" نے کہا کہ عمرو! میں (اپنی زمین کاشت کرنے کے لئے) لوگوں کو دیتا ہوں اور ان کی مدد کرتا ہوں اور سب سے بڑے عالم یعنی حضرت ابن عباس نے مجھے بتایا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ اپنے کسی بھائی کو اپنی زمین کاشت کرنے کے لئے دے دینا اس سے بہتر ہے کہ اس پر اس زمین کا کوئی لگان وغیرہ متعین کر کے لے لیا جائے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مزارعت میں تو یہ ہوتا ہے کہ کچھ دیا جاتا ہے اور کچھ لیا جاتا ہے، یعنی اپنی زمین دی جاتی ہے اور اس کے عوض اس کی پیداوار میں سے کچھ حصہ متعین کر کے لیا جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس اگر کسی کے ساتھ احسان کیا جائے بایں طور کہ اسے اپنی زمین بغیر کچھ لئے بطور رعایت دی جائے تو وہ اس سے فائدہ اٹھائے تو یہ بہتر ہے۔

اپنی زمین کو بے کار نہ چھوڑو

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهُ اَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا اَوْ لِيَمْنَحْهَا اَخَاهُ فَاِنْ اَبٰى فَلْيُمْسِكْ اَرْضَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کے پاس زمین ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس میں خود کاشت کرے یا (خود کاشت نہ کر سکے تو) اپنے کسی بھائی کو عاریۃً دے دے اور اگر یہ دونوں ہی باتیں پسند نہ ہوں تو پھر چاہئے کہ اپنی زمین اپنے پاس رکھے۔"
(بخاری و مسلم)

تشریح: شیخ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی کے پیش نظر انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے مال سے نفع حاصل کرے، لہٰذا جس شخص کے پاس زمین ہو اسے چاہئے کہ وہ اس میں خود کھیتی باڑی کرے تاکہ اس سے پیداوار ہو اور اس کی وجہ سے اسے نفع ہو، اور اگر کسی وجہ سے وہ خود کاشت نہ کر سکتا ہو تو پھر وہ اس زمین کو اپنے کسی مستحق مسلمان بھائی کو عاریۃً دے دے تاکہ وہ اس میں محنت مشقت کر کے اپنا پیٹ بھرے، اس صورت میں انسانی اخلاق و ہمدردی کا ایک تقاضہ بھی پورا ہو گا اور اسے ثواب بھی ملے گا لیکن اگر وہ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت پسند نہ کرے تو پھر اپنی زمین کو اپنے پاس رہنے دے، یہ آخری حکم گویا ان دونوں صورتوں کو ترک کرنے اور مزارعت کو اختیار کرنے پر ازراہ تنبیہ دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص نہ تو اپنی زمین سے مالی فائدہ حاصل کرے کہ اس پر خود کاشت کرے اور نہ کسی مسلمان بھائی کو عاریۃً دے کر اس سے روحانی نفع حاصل کرے تو پھر بہتر یہی ہے کہ وہ اس زمین کو یوں ہی چھوڑ دے کسی کو بطور مزارعت نہ دے، نیز اس میں ایسے لوگوں کے لئے بھی تنبیہ ہے جو اپنے مال سے نہ تو خود ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ دوسرے کو نفع پہنچاتے ہیں۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "تو پھر چاہئے کہ اپنی زمین اپنے پاس رکھے، کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص اس کی زمین عاریتہ قبول کرنے سے انکار کر دے تو اپنی زمین اپنے پاس رہنے دے، اس صورت میں یہ حکم اباحت کے طور پر ہو گا۔

زراعت میں مشغولیت کی وجہ سے جہاد ترک کرنے پر وعید

(۷) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ وَرَاٰی سِکَّةً وَشَیْئًا مِنْ اٰلَةِ الْحَرْثِ فَقَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَدْخُلُ هٰذَا بَیْتَ قَوْمٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الذُّلَّ۔ (رواہ البخاری)

"منقول ہے کہ حضرت ابوامامہؓ نے (ایک جگہ) ہل اور کھیتی باڑی کا کچھ دیگر سامان دیکھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ سامان جس گھر میں داخل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس گھر میں ذلت داخل کر دیتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کے نزدیک زراعت کا پیشہ ناپسندیدہ یا معیوب تھا یا اس سے آپ ﷺ کا مقصد کھیتی باڑی کرنے والوں کی مذمت کرنا تھا بلکہ درحقیقت اس ارشاد گرامی کا منشاء جہاد کی ترغیب دینا ہے اور یہ آگاہ کرنا ہے کہ زراعت میں مشغول ہو کر جہاد کو ترک نہ کر دیا جائے، اگر کوئی شخص اپنی معاشی ضروریات کی جائز و حلال تکمیل کے لئے زراعت کے پیشے کو اختیار کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی غیر پسندیدہ بات نہیں ہے اور نہ ایسا شخص اس وعید میں داخل ہے۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس وعید کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو دشمنان دین کے قریب یا ان کے ملک کی سرحدوں سے متصل اقامت پذیر ہوں کہ اگر ایسے لوگ اپنی تمام تر توجہ زراعت کی طرف مبذول کر کے جہاد کی ضرورت و اہمیت کو فراموش کر دیں گے تو دشمن ان پر غالب آ جائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اپنے دشمن کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو جائیں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

کسی کی زمین میں بلا اجازت کاشت نہ کرو

(۸) عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ زَرَعَ فِیْ اَرْضِ قَوْمٍ بِغَیْرِ اِذْنِهِمْ فَلَیْسَ لَهٗ مِنَ الزَّرْعِ شَیْئٌ وَلَهٗ نَفَقَتُهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت رافع ابن خدیجؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص کسی کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر (یعنی مالک کی رضا اور حکم کے بغیر) کاشت کرے تو اس کے لئے اس زمین کی پیداوار میں سے علاوہ اس کے کہ جو اس نے خرچ کیا ہے اور

کچھ نہیں ہوگا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی کی زمین میں مالک کی اجازت و مرضی کے بغیر اگر کوئی شخص کاشت کرے تو اس زمین کی ساری پیداوار زمین کے مالک ہی کو ملے گی ہاں کاشت کرنے والے نے اپنا جو تخم اس کاشت میں لگایا ہوگا وہ اسے مل جائے گا اس کے علاوہ اور کچھ اسے نہیں ملے گا۔ چنانچہ حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے۔

لیکن دوسرے علماء یہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں زمین کی پیداوار کاشت کرنے والے ہی کو ملے گی البتہ اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ زمین کا نقصان اس کے مالک کو ادا کرے۔ حنفیہ کے بعض علماء نے بھی اسی قول کو ذکر کیا ہے اور ابن مالکؒ نے یہ کہا ہے کہ ایسے شخص پر زمین پر قبضہ کے دن سے اس کی کاشت کے دن سے زمین خالی ہونے کے دن تک اس زمین کا معاوضہ واجب ہوگا اور اس کی جو کچھ پیداوار ہوگی وہ اس شخص کی ہوگی۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مزارعت کا ثبوت

(۹) عَنْ قَیْسِ بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ قَالَ مَا بِالْمَدِیْنَةِ اَھْلُ بَیْتِ ھِجْرَةٍ اِلَّا یَزْرَعُوْنَ عَلَی الثُّلُثِ وَالرُّبُعِ وَزَارَعَ عَلِیٌّ وَسَعْدُ بْنُ مَالِكٍ وَعَبْدُاللّٰہِ بْنُ مَسْعُوْدٍ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِالْعَزِیْزِ وَالْقَاسِمُ وَعُرْوَةُ وَاٰلُ اَبِیْ بَکْرٍ وَاٰلُ عَلِیٍّ وَابْنُ سِیْرِیْنَ وَقَالَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ الْاَسْوَدِ کُنْتُ اُشَارِكُ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ یَزِیْدَ فِی الزَّرْعِ وَعَامَلَ عُمَرُ النَّاسَ عَلٰی اِنْ جَاءَ عُمَرُ بِالْبَذْرِ مِنْ عِنْدِہٖ فَلَہُ الشَّطْرُ وَاِنْ جَاءُوْا بِالْبَذْرِ فَلَھُمْ کَذَا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت قیسؓ ابن اسلم، حضرت ابوجعفرؒ یعنی امام محمد باقر سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا مدینہ میں مہاجرین کا کوئی ایسا گھر نہ تھا جو تہائی اور چوتھائی (کی بٹائی پر) کھیتی نہ کرتا ہو۔ اور حضرت علیؓ حضرت سعد ابن مالکؒ یعنی سعد ابن ابی وقاص، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ حضرت عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ، حضرت ابوبکرؓ کی اولاد، حضرت عمرؓ کی اولاد، حضرت علیؓ کی اولاد اور ابن سیرین یہ سب کھیتی کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن اسودؒ، تابعی کا بیان ہے کہ میں حضرت عبدالرحمٰن ابن یزید کی شرکت میں مزارعت کیا کرتا تھا، نیز حضرت عمرؓ نے لوگوں سے اس شرط پر (مزارعت کا) معاملہ کیا تھا کہ اگر عمرؓ تخم اپنے پاس سے دیں گے تو (پیداوار کا) نصف حصہ ان کا ہوگا اور اگر وہ لوگ بیج دیں گے تو پیداوار میں اس کے مطابق ان کا حصہ ہوگا (یعنی نصف، یا تہائی یا چوتھائی جو بھی مقرر ہوتا ہو)۔" (بخاریؒ)

تشریح: میرک شاہؒ نے کہا ہے کہ خود بخاری کی عبارت اور اس کی شرحوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوجعفرؒ کی عبارت لفظ والربع پر ختم ہوگئی ہے اس کے آگے وزارع سے آخر تک ساری عبارت خود بخاری کی ہے، اور یہ سب آثار (یعنی صحابی یا تابعی کے اقوال) ہیں جن کو بخاریؒ نے چونکہ بغیر اسناد کے نقل کیا ہے اس لئے معلق ہیں، چنانچہ مؤلف مشکوۃ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ روایت کے آخر میں رواہ بخاری تعلیقا (اس روایت کو بخاری نے بطریق تعلیق نقل کیا ہے) لکھتے۔

بَابُ الْاِجَارَةِ

اجارہ کا بیان

"اجارہ" کے معنی ہیں "کسی چیز کو کرایہ پر دینا" اور اصطلاح شریعت میں اجارہ کا مفہوم ہے "اپنی کسی چیز کی منفعت کا کسی کو مالک بنا دینا"۔

فقہی طور پر قیاس تو یہ کہتا ہے کہ اجارہ میں چونکہ منفعت معدوم ہوتی ہے اس لئے اجارہ جائز ہونا چاہئے لیکن شریعت نے لوگوں کی احتیاج و ضرورت کے پیش نظر اس کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ اجارہ احادیث و آثار سے ثابت ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اجارہ کا جواز

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ زَعَمَ ثَابِتُ بْنُ الضَّحَّاكِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْمُزَارَعَةِ وَاَمَرَ بِالْمُؤَاجَرَةِ وَقَالَ لَا بَاْسَ بِهَا۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عبداللہ ابن مغفل کہتے ہیں کہ حضرت ثابت ابن ضحاک ؓ نے یہ بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا ہے اور اجارہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "مزارعت سے منع فرمایا ہے" میں مزارعت سے مراد مزارعت کی وہ صورتیں ہیں جس کا عدم جواز معلوم و متعین ہے اور جن کا تذکرہ گذشتہ باب کی حدیث نمبر (۳) میں (جو حضرت حنظلہ ابن قیس ؓ سے منقول ہے) کیا گیا ہے۔

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَمَ فَاَعْطَى الْحَجَّامَ اَجْرَهٗ وَاسْتَعَطَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عباس راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) بھری ہوئی سینگی کھچوائی اور سینگی کھینچنے والے کو اجرت عطا فرمائی، نیز آپ ﷺ نے اپنی ناک میں دوا ڈالی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شاخ کشی (سینگی کھینچنے) کا پیشہ اور اجارہ مباح ہے اور علاج کرنا جائز ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ نے اجرت پر بکریاں چرائی ہیں

③ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا اِلَّا رَعَى الْغَنَمَ فَقَالَ اَصْحَابُهٗ وَاَنْتَ فَقَالَ نَعَمْ كُنْتُ اَرْعٰى عَلٰى قَرَارِيْطَ لِاَهْلِ مَكَّةَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی نبی مبعوث نہیں کیا ہے جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں" یہ سن کر آپ ﷺ کے صحابہ ؓ نے پوچھا کہ "کیا آپ ﷺ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟" فرمایا "ہاں میں چند قیراط کی اجرت پر اہل مکہ کی بکریاں چراتا تھا۔" (بخاریؒ)

تشریح: منصب نبوت کے فریضہ کی ادائیگی جن اوصاف و خصوصیات کی حامل ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ نبی کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے معاشرہ اور سماج سے جو قریبی ربط و تعلق رکھنا پڑتا تھا اس کے لئے چونکہ یہ ضروری تھا کہ دعوت و تبلیغ اور اصلاح اور رہنمائی کے کسی بھی موڑ پر پورے معاشرے کے افراد اور نبی کے درمیان اجنبیت اور غیریت کی دیوار حائل نہ رہے اس لئے قدرت کی طرف سے ابتداء میں نبی کو ایک ایسے تربیتی اور آزمائشی دور سے گذارا جاتا تھا جس کے بعض مرحلے بظاہر تو بہت نچلی سطح کے معلوم ہوتے تھے لیکن نتائج و اثرات کے اعتبار سے وہی مرحلے بہت ہی دور رس اور کار آمد ثابت ہوتے تھے، ایسا ہی ایک مرحلہ بکریوں کا چرانا بھی ہے جو اگرچہ بہت معمولی درجہ کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی بکریوں کا چرانا محبت و شفقت، محنت و مشقت، باہمی ربط و تعلق اور عام خیر خواہی و نگہداشت کا ایک بہترین سبق ہے جو کسی رہبر و مصلح کی حیات کا ایک بنیادی وصف ہے، چنانچہ ہر نبی اسی لئے بکریاں چراتا تھا تاکہ اس تجربہ سے گذرنے کے بعد اُمت کی نگہبانی و شفقت اور معاشرے سے ربط و تعلق کا حقیقی جذبہ

پوری زندگی میں سرایت کئے رہے اور قوم کی طرف سے پیش آنے والی ہر سختی و مشقت پر صبر و تحمل کی قوت حاصل رہے۔ نیز اس ذریعے سے وہ حقیقی خلوت و تنہائی بھی حاصل ہو جاتی تھی جو نبی کی ابتدائی زندگی کا ایک مطلوب ہوتی تھی۔

مذکورہ بالا نکتہ زیادہ واضح ہو جاتا ہے اگر یہ تجزیہ پیش نظر ہو کہ ایک رہبر اور ایک بادشاہ اپنی قوم یا اپنی رعایا کے ساتھ وہی نسبت و تعلق رکھتا ہے جو ایک چرواہا اپنی بکریوں کے ساتھ رکھتا ہے۔

مزدور کو اس کی مزدوری نہ دینے والے کے لئے وعید

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى ثَلَاثَةٌ اَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اَعْطٰى بِیْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اسْتَاْجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهٖ اَجْرَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑوں گا، ایک تو وہ شخص ہے جس نے میرے نام اور میری سوگند کے ذریعے کوئی عہد کیا اور پھر اس کو توڑ ڈالا، دوسرا شخص وہ ہے جس نے ایک آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کا مول کھایا اور تیسرا شخص وہ ہے جس نے کسی مزدور کو مزدوری پر لگایا اور اس سے کام لیا (یعنی جس کام کے لئے لگایا تھا وہ پورا کام اس سے کرایا) لیکن اس کو اس کی مزدوری نہیں دی۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں ایسے تین اشخاص کی نشان دہی کی گئی ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا خاص طور سے نشانہ ہوں گے، ان میں سے پہلا شخص تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام پر یعنی اس کی قسم کھا کر کوئی عہد و معاہدہ کرتا ہے اور پھر اس کو توڑ ڈالتا ہے یوں تو عہد و معاہدہ کی پاسداری بہر صورت ایک ضروری چیز ہے کیونکہ انسان کی شرافت و انسانیت کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ جو عہد و معاہدہ کرے اسے پورا کرے، کسی معاہدہ کو بلا عذر ختم کر دینا انسانی شرف کے خلاف بھی ہے اور انسانیت کی توہین بھی، لیکن اگر کوئی عہد و معاہدہ کے نام پر کیا جاتا ہے تو پھر اس کی تکمیل کہیں زیادہ ضروری ہو جاتی ہے، اس لئے جو شخص اللہ کے نام پر کئے ہوئے عہد و معاہدہ کو توڑتا ہے وہ بجا طور پر غضب خداوندی کا مستحق ہے۔

دوسرا شخص وہ ہے جو کسی آزاد انسان کو بیچ ڈالے، شرف انسانی کی توہین اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک انسان اپنے ہی جیسے ایک دوسرے آزاد انسان کو ایک بازاری مال بنا دے اور اس کی خرید و فروخت کرے چنانچہ ایسے شخص کو بھی قیامت کے دن عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

اس بارے میں یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں "اس کا مول کھانے" کی قید محض زیادتی تنبیہ کے لئے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی آزاد انسان کو فروخت کرنا ہی ایک بڑے گناہ کی بات ہے خواہ اس کا مول کھائے یا نہ کھائے۔ اگر اس کا مول نہیں کھائے گا تب بھی گنہگار ہو گا اور اس وعید میں داخل ہو گا۔

تیسرا شخص وہ ہے جو کسی مزدور کو اپنے کسی کام کی تکمیل کے لئے مزدوری پر لگائے اور اپنا وہ کام پورا کرانے کے بعد اس کی مزدوری نہ دے، یہ ایک انتہائی قابل نفریں فعل ہے۔ کسی شخص کی محنت اس کی زندگی کا ایک قیمتی اثاثہ ہوتا ہے جسے حاصل کر کے اس کی اجرت نہ دینا شیوۂ انسانیت کے خلاف ہے۔ یہ کتنے ظلم کی بات ہے کہ کوئی غریب اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر کے کسی کے یہاں محنت کرے مگر اس کی محنت کی اجرت اسے نہ دی جائے، چنانچہ ایسے شخص کے بارے میں بھی کہ جو مزدور کی مزدوری نہ دے اللہ تعالیٰ نے یہ آگاہی دی ہے کہ ایسا شخص قیامت کے دن اپنے اس انسانی ظلم کی ضرور سزا پائے گا۔

جھاڑ پھونک کرنے والا اپنے عمل کی اجرت لے سکتا ہے

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ نَفَرًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرُّوْا بِمَاءٍ فِيْهِمْ لَدِيْغٌ اَوْ سَلِيْمٌ فَعَرَضَ لَهُمْ

رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْمَاءِ فَقَالَ هَلْ فِيْكُمْ مِنْ رَاقٍ اِنَّ فِي الْمَاءِ رَجُلًا لَدِيْغًا اَوْسَلِيْمًا فَانْطَلَقَ رَجُلٌ مِنْهُمْ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ عَلٰى شَاءٍ فَبَرَأَ فَجَاءَ بِالشَّاءِ اِلٰى اَصْحَابِهٖ فَكَرِهُوْا ذٰلِكَ وَقَالُوْا اَخَذْتَ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ اَجْرًا حَتّٰى قَدِمُوْا الْمَدِيْنَةَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخَذَ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ اَجْرًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَصَبْتُمْ اقْسِمُوْا وَاضْرِبُوْا لِيْ مَعَكُمْ سَهْمًا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ کی ایک جماعت ایک ایسے گاؤں سے گذری جس میں کسی شخص کو بچھو یا سانپ نے ڈس رکھا تھا، چنانچہ اس بستی کا ایک شخص ان صحابہؓ کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں میں کوئی شخص جھاڑ پھونک کرنے والا بھی ہے؟ کیونکہ ہماری بستی میں ایک شخص کو بچھو یا سانپ نے ڈس لیا ہے؟ (اگر ایسا کوئی شخص ہے تو وہ میرے ساتھ چل کر اس شخص پر دم کردے)۔ چنانچہ ان میں سے ایک صحابیؓ تشریف لے گئے اور انہوں نے بکریوں کے عوض سورۂ فاتحہ پڑھی۔ یعنی انہوں نے کہا کہ میں اس شخص پر اس شرط کے ساتھ جھاڑ پھونک کروں گا کہ میں اس کے عوض اتنی بکریاں لوں گا، اسے بستی والوں نے منظور کر لیا لہٰذا ان صحابیؓ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر اس شخص پر دم کیا کیونکہ منقول ہے کہ فاتحۃ الکتاب شفاء من السم یعنی سورۂ فاتحہ زہر کے لئے شفاء ہے۔ لہٰذا وہ شخص اچھا ہو گیا، پھر جب وہ صحابیؓ بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آئے تو ان ساتھیوں نے اس کو ناپسند کیا اور کہا کہ (بڑے تعجب کی بات ہے کہ) تم نے کتاب اللہ (پڑھنے) پر مزدوری لی ہے یہاں تک کہ وہ سب صحابہؓ مدینہ پہنچے اور (آنحضرت ﷺ سے) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! فلاں صحابی نے کتاب اللہ (پڑھنے) پر مزدوری لی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جن چیزوں کی اجرت لیتے ہو ان میں سب سے بہتر کتاب اللہ ہے۔" (بخاریؒ)

"ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "تم نے اچھا کیا، ان بکریوں کو (آپس میں) تقسیم کر لو اور اپنے ساتھ میرا حصہ بھی لگاؤ۔"

تشریح: لفظ سَلِيْمٌ اور لفظ لَدِيْغٌ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی سانپ کا ڈسا ہوا۔ چنانچہ روایت کے الفاظ لَدِيْغٌ اَوْسَلِيْمٌ میں اَوْ سَلِيْمٌ راوی کے لفظی شک کو ظاہر کرتا ہے یعنی راوی نے یہ دونوں لفظ نقل کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ مجھے یہ صحیح یاد نہیں ہے کہ اس موقع پر لفظ "لدیغ" کہا گیا تھا یا لفظ "سلیم" اور علامہ طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ اکثر و بیشتر لفظ لدیغ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جسے بچھو کاٹ لے اور "سلیم" کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جسے سانپ ڈس لے، اس صورت میں کہا جائے گا کہ اس موقع پر راوی کو معنی کے اعتبار سے شک ہوا ہے کہ یا تو وہ شخص بچھو کا کاٹا ہوا تھا یا سانپ کا ڈسا ہوا تھا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ جن صحابیؓ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تھا وہ حضرت ابو سعید خدریؓ تھے اور صحابہؓ کی وہ جماعت تیس نفوس پر مشتمل تھی، اسی اعتبار سے سورۂ فاتحہ پڑھنے والے صحابیؓ نے تیس بکریاں لی تھیں۔

آنحضرت ﷺ نے ان بکریوں میں اپنا حصہ لگانے کے لئے اس واسطے فرمایا تاکہ وہ صحابہؓ خوش بھی ہوں اور یہ بھی جان لیں کہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے کے عوض حاصل ہونے والی بکریاں بلاشک و شبہ حلال ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی آیتوں اور ذکر اللہ کے ذریعے جھاڑ پھونک کرنا اور اس کی اجرت لینا جائز ہے، چنانچہ عامل روحانیات یعنی قرآن کریم کی آیتوں اور دیگر منقول دعاء و عملیات کے ذریعے علاج کرنے والے اپنے عمل یعنی تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک کی جو اجرت لیتے ہیں اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ تلاوت قرآن کی اجرت لینا جائز ہے۔ کیونکہ ان دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ کہ تلاوت قرآن ایک عبادت ہے۔ اور عبادت کی قیمت لینا قطعًا جائز نہیں ہے اور کسی مریض و دکھی شخص پر قرآن پڑھ کر دم کرنا اور اس کی برکت سے شفا حاصل ہو جانا عبادت نہیں ہے لہٰذا اس کی اجرت لینا جائز ہے۔

اس سے گویا یہ بھی ثابت ہوا کہ مصحف (یعنی قرآن کریم کو کتابی صورت میں) بیچنا، اس کو خریدنا، اجرت پر اس کی کتابت کرنا اور دین

کی دوسری کتابوں کو مزدوری پر لکھنا جائز ہے۔ اسی طرح متأخرین (یعنی بعد کے علماء) نے قرآن کریم کی تعلیم کو بھی اس پر قیاس کرتے ہوئے کہا ہے کہ تعلیم قرآن کی اجرت لینا جائز ہے جب کہ متقدمین (یعنی پہلے زمانے کے علماء) جیسے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ وغیرہ نے تعلیم قرآن کی اجرت لینے کو حرام کہا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جس طرح غیر شرعی جھاڑ پھونک ناجائز ہے اسی طرح اس کی اجرت بھی حرام ہے

(۶) عَنْ خَارِجَةَ بْنِ الصَّلْتِ عَنْ عَمِّهٖ قَالَ اَقْبَلْنَا مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَيْنَا عَلٰى حَيٍّ مِنَ الْعَرَبِ فَقَالُوْا اِنَّا اُنْبِئْنَا اَنَّكُمْ قَدْجِئْتُمْ مِنْ عِنْدِ هٰذَا الرَّجُلِ بِخَيْرٍ فَهَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ دَوَاءٍ اَوْرُقْيَةٍ فَاِنَّ عِنْدَنَا مَعْتُوْهًا فِى الْقُيُوْدِ فَقُلْنَا نَعَمْ قَالَ فَجَاءُوْا بِمَعْتُوْهٍ فِى الْقُيُوْدِ فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ غُدْوَةً وَعَشِيَّةً اَجْمَعُ بُزَاقِىْ ثُمَّ اَتْفُلُ قَالَ فَكَاَنَّمَا اُنْشِطَ مِنْ عِقَالٍ فَاَعْطَوْنِىْ جُعْلًا فَقُلْتُ لَا حَتّٰى اَسْاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كُلْ فَلَعَمْرِىْ لَمَنْ اَكَلَ بِرُقْيَةٍ بَاطِلٍ لَقَدْ اَكَلْتَ بِرُقْيَةٍ حَقٍّ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"حضرت خارجہ ابن صلتؓ اپنے چچا سے نقل کرتے ہیں کہ (انہوں نے کہا کہ) جب ہم لوگ رسول کریم ﷺ سے رخصت ہو کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں ہمارا گذر عرب کے ایک قبیلے پر ہوا جس (کے کچھ لوگوں) نے ہم سے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے تم اس شخص (یعنی رسول کریم ﷺ کے پاس سے بھلائی (یعنی قرآن کریم اور ذکر اللہ) لے کر آئے ہو، تو کیا تمہارے پاس کوئی (دوا یا جھاڑ پھونک بھی ہے کیونکہ ہمارے ہاں ایک شخص پاگل ہو گیا ہے جو بیڑیوں میں جکڑا پڑا ہے؟ ہم نے کہا کہ ہاں (ہمارے پاس ایسا عمل ہے جس سے ہم اس کا علاج کر سکتے ہیں) چنانچہ وہ اس پاگل کو بیڑیوں میں جکڑے ہوئے، پاس لائے، اور میں نے اس پر تین دن تک صبح و شام سورۂ فاتحہ اس طرح پڑھی کہ (پڑھتے وقت) اپنا تھوک جمع کرتا رہتا اور پھر (پڑھنے کے بعد) اس پر تھوک دیتا۔ راوی کہتے ہیں کہ میرے چچا نے فرمایا کہ اس کے بعد (وہ اتنی جلدی اچھا ہو گیا) گویا اسے بندھی ہوئی رسی سے کھول دیا گیا ہو پھر انہوں نے مجھے اس کی اجرت (کے طور پر کوئی چیز) دی تو میں نے کہا کہ یہ چیز اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک کہ میں اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے نہ پوچھ لوں، چنانچہ (میں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو کچھ تمہیں ملا ہے اسے کھالو کیونکہ قسم ہے! اپنی زندگی کی، جو شخص باطل منتر کی اجرت کھاتا ہے وہ برا کرتا ہے تم نے تو حق اور سچے منتر کی اجرت کھائی ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "باطل منتر" ایسی جھاڑ پھونک کو کہتے ہیں جس میں ستاروں، اور ارواح خبیثہ، جنات اور اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کا ذکر ہو اور ان میں سے مدد مانگی جاتی ہو چنانچہ ایسے عملیات جو غیر اللہ کے ذکر یا غیر اللہ سے مدد مانگنے کی وجہ سے غیر شرعی ہوں جس طرح ان کو اختیار کرنا ناجائز ہے اسی طرح ان کی اجرت کھانا بھی حرام ہے۔

"حق منتر" ایسی جھاڑ پھونک اور عملیات کو کہتے ہیں جن میں ذکر اللہ اور قرآن کریم کی آیتیں ہوں خواہ ان کا تعلق پڑھ کر دم کرنے سے ہو یا تعویذ وغیرہ لکھ کر دینے سے ہو۔

حدیث کے الفاظ فلعمری (یعنی قسم ہے اپنی زندگی کی) سے یہ اشکال واقع ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری چیزوں کی قسم کھانا منع ہے پھر آپ ﷺ نے اپنی زندگی کی قسم کس طرح کھائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ "فلعمری" سے قسم مراد نہیں ہے بلکہ دراصل یہ اہل عرب کے کلام کا ایک خاص لفظ ہے جو اکثر و بیشتر دوران گفتگو ان کی زبان پر جاری ہوتا ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت نہیں ہوئی تھی۔

اور علامہ طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اس قسم کی قسمیں کھانے کی اجازت حاصل ہو لہٰذا اس کا تعلق ان چیزوں

سے ہو گا جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ مختص ہیں کہ وہ آپ ﷺ کے لئے تو جائز تھیں دوسروں کے لئے جائز نہیں ہیں۔

مزدور کو اس کی مزدوری دینے میں تاخیر نہ کرو

⑦ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطُوا الْاَجِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يَجِفَّ عَرَقُهٗ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو (یعنی جب مزدور اپنا کام پورا کر چکے تو اس کی مزدوری فوراً ادا کر دو اس میں تاخیر نہ کرو)۔" (ابن ماجہؒ)

⑧ وَعَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَاِنْ جَاءَ عَلٰى فَرَسٍ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَفِي الْمَصَابِيْحِ مُرْسَلٌ۔

"اور حضرت حسین ابن علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے سائل کے بارے میں فرمایا کہ "وہ (بہر صورت دیئے جانے کا) مستحق ہے اگرچہ گھوڑے پر آئے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ) اور مصابیح میں کہا گیا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مقصد یہ تعلیم دینا ہے کہ سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرنا چاہئے اگرچہ وہ گھوڑے پر چڑھ کر بھی مانگنے آئے تو اس کا سوال پورا کیا جائے۔ چنانچہ قاضی نے کہا ہے کہ سائل کو خالی نہ پھیرو اگرچہ ایسی حالت میں تمہارے پاس مانگنے آئے جو اس کے مستغنی ہونے پر دلالت کرے، کیونکہ تمہیں یہ سوچنا چاہئے کہ اگر اسے سوال کرنے کی حاجت نہ ہوتی تو وہ اپنا دست سوال دراز کر کے تمہارے آگے اپنے آپ کو ذلیل و خوار کیوں کرتا۔

یہ حدیث بظاہر اس باب سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ سائل کو جو کچھ دیا جاتا ہے وہ گویا اس کے سوال کی اجرت ہے لہٰذا اس مناسبت سے اس حدیث کو باب الاجارہ میں نقل کیا گیا ہے۔

اس حدیث کی اسناد میں علماء نے نقل کیا ہے، چنانچہ حضرت امام احمدؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے اور کہا ہے کہ یہ بازار میں گشت کرتی ہے۔ امام ابوداؤدؒ نے البتہ اس بارے میں سکوت اختیار کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث قابل استدلال ہے۔ مصابیح میں اس حدیث کو مرسل کہا گیا ہے لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ یہ مسند ہے چنانچہ مصابیح کے بعض نسخوں میں لفظ "مرسل" مذکور بھی نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مزدوری کے سلسلے میں حضرت موسیٰ کا ذکر

⑨ عَنْ عُتْبَةَ بْنِ الْمُنْذِرِ قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَأَ طٰسٓمٓ حَتّٰى بَلَغَ قِصَّةَ مُوْسٰى قَالَ اِنَّ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ اٰجَرَ نَفْسَهٗ ثَمَانَ سِنِيْنَ اَوْ عَشْرًا عَلٰى عِفَّةِ فَرْجِهٖ وَطَعَامِ بَطْنِهٖ۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ)

"حضرت عتبہ ابن منذرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ ﷺ نے طٰسٓمٓ پڑھی اور جب آپ ﷺ حضرت موسیٰؑ کے قصہ پر پہنچے تو فرمایا کہ موسیٰ نے اپنی شرم گاہ کو بچانے کے لئے اور پیٹ بھرنے کے لئے اپنے آپ کو آٹھ سال یا دس سال تک مزدوری میں دے رکھا تھا۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: طٰسٓمٓ یعنی سورۂ قصص میں حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے وہاں حضرت شعیب علیہ السلام سے ان کی ملاقات ہوئی، پھر ان کی صاحبزادی سے حضرت موسیٰؑ کا نکاح ہوا اور حضرت موسیٰؑ نے اس کے عوض میں

اپنے آپ کو حضرت شعیب علیہ السلام کی مزدوری میں دیا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ اس سورۃ کی تلاوت کے وقت جب حضرت موسیٰ کے اس تذکرہ پر پہنچے تو آپ ﷺ نے مذکورہ بالا کلام ارشاد فرمایا۔

"شرم گاہ بچانے" سے مراد نکاح ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے اس معاہدہ پر نکاح کیا کہ میں آٹھ یا دس سال تک تمہاری بکریاں چراؤں گا گویا اتنی مدت تک بکریاں چرانے کو انہوں نے اپنی بیوی کا مہر قرار دیا۔ چنانچہ ان کی شریعت میں یہ جائز تھا کہ آزاد شخص کی خدمت کو اس کی بیوی کا مہر قرار دیا جاسکتا تھا، لیکن حضرت موسیٰ کے اس معاملے میں یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کا مہر تو کچھ اور مقرر کیا ہوگا اور بکریاں چرانے کی یہ خدمت بطریق احسان قبول کی ہوگی۔

خاوند کی خدمت بیوی کا مہر ہوسکتا ہے یا نہیں؟

اس بارے میں علماء کا فقہی اختلاف ہے۔ چنانچہ حنفی علماء تو یہ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ کسی عورت کا نکاح اس چیز کے عوض کیا جائے کہ اس کا آزاد خاوند مثلاً ایک سال تک اس کی خدمت کرے گا۔ ہاں یہ جائز ہے کہ عورت کا نکاح اس چیز کے عوض میں کیا جائے کہ اس کے خاوند کا غلام مثلاً ایک سال تک اس کی خدمت کرے گا۔ شافعی علماء کے نزدیک بعض کاموں کی مزدوری وخدمت کے عوض نکاح کرنا درست ہے۔ جب کہ متاجرلہ (وہ کام جو اجیر ومزدور انجام دے) اور مخدوم فیہ (وہ خدمت جو انجام دی جائے) معلوم ومتعین چیز ہو۔

دین کی تعلیم دینے کی اجرت لینے کا مسئلہ

⑮ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ رَجُلٌ اَهْدٰى اِلَيَّ قَوْسًا مِمَّنْ كُنْتُ اُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْقُرْاٰنَ وَلَيْسَتْ بِمَالٍ فَاَرْمِيْ عَلَيْهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ اِنْ كُنْتَ تُحِبُّ اَنْ تُطَوَّقَ طَوْقًا مِنْ نَارٍ فَاقْبَلْهَا۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت عبادہ ابن صامت کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! ایک شخص نے مجھے بطور تحفہ ایک کمان بھیجی ہے اور وہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جنہیں میں کتاب وقرآن کی تعلیم دیا کرتا تھا، اور (میں سمجھتا ہوں کہ اس کمان کو قبول کر لینے میں اس لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ) کمان کوئی مال نہیں ہے۔ چنانچہ اس کمان کے ذریعے راہ خدا (یعنی جہاد) میں تیر اندازی کروں گا"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تمہیں یہ پسند ہو کہ تمہارے گلے کو آگ کا طوق پہنایا جائے تو اسے قبول کرلو۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: "کمان کوئی مال نہیں ہے" سے حضرت عبادہ کی یہ مراد تھی کہ کمان ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے مال یا اجرت شمار کیا جائے بلکہ یہ تو لڑائی کا ایک سامان ہے جسے میں خدا کی راہ میں استعمال کروں گا بایں طور کہ جہاد میں اس کے ذریعے تیز اندازی کروں گا۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں متنبہ فرمایا کہ یہ کمان اگرچہ تمہیں کلام اللہ کی تعلیم کی اجرت کے طور پر نہیں ملی ہے اور نہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے اجرت شمار کیا جاسکے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمہارے اس اخلاص کو ختم کردے گی۔ جو تمہاری خدمت تعلیم کا محور تھا جس سے سرشار ہو کر تم نے ان لوگوں کو قرآن ودین کی تعلیم دی تھی، لہٰذا تمہارے لئے مناسب یہی ہے کہ تم اسے قبول نہ کرو۔ جو علماء قرآن ودین کی تعلیم دینے کی اجرت لینے کو حرام کہتے ہیں وہ اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے استدلال کرتے ہیں۔

بَابُ اِحْيَاءِ الْمَوَاتِ وَالشِّرْبِ

غیر آباد زمین کو آباد کرنے اور پانی پلانے کے حق کا بیان

نہایہ میں لکھا ہے کہ "موات" اس زمین کو کہتے ہیں جس میں نہ کوئی کھیتی ہو نہ مکان ہو اور نہ اس کا کوئی مالک ہو اور ہدایہ میں لکھا ہے

کہ "موات" اس زمین کو کہتے ہیں جو پانی کے منقطع ہونے یا اکثر زیر آب رہنے کی وجہ سے ناقابل انتفاع ہو یا اس میں ایسی کوئی چیز ہو جو زراعت سے مانع ہو، لہٰذا ایسی زمین جو عادی یعنی قدیم ہو کہ اس کا کوئی مالک نہ ہو یا اسلامی سلطنت کی مملوک ہو اور اس کے مالک کا پتہ نامعلوم ہو اور وہ زمین بستی سے اس قدر دوری پر ہو کہ اگر کوئی شخص بستی کے کنارے پر کھڑا ہو کر آواز بلند کرے تو اس کی آواز اس زمین تک نہ پہنچے تو وہ زمین "موات" ہے۔

"احیاء موات" سے مراد ہے اس زمین کو آباد کرنا ہے اور اس زمین کو آباد کرنے کی صورت یہ ہے کہ یا تو اس زمین میں مکان بنایا جائے یا اس میں درخت لگایا جائے یا اس میں زراعت کی جائے، یا اسے سیراب کیا جائے اور یا اس میں ہل چلا دیا جائے۔

اس قسم کی زمین یعنی موات کا شرعی حکم یہ ہے کہ جو شخص اس زمین کو آباد کرتا ہے وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے لیکن اس بارے میں علماء کا تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ اس زمین کو آباد کرنے کے لئے امام (یعنی حکومت وقت) سے اجازت لینا شرط ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ اور صاحبین (یعنی حنفیہ کے حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ) کے نزدیک اجازت شرط نہیں ہے۔

شرب کے لغوی معنی ہیں "پینے کا پانی" پانی کا حصہ، گھاٹ اور پینے کا وقت، اصطلاح شریعت میں اس لفظ کا مفہوم ہے "پانی سے فائدہ اٹھانے کا وہ حق جو پینے، برتنے، اپنی کھیتی اور باغ کو سیراب کرنے اور جانوروں کو پلانے کے لئے ہر انسان کو حاصل ہوتا ہے"۔ چنانچہ پانی جب تک اپنے معدن (یعنی دریا اور تالاب وغیرہ) میں ہے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا، اس سے بلا تخصیص ہر انسان کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے جس سے منع کرنا اور روکنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔

لیکن اس سلسلے میں دریا، نہروں، نالوں کے پانی اور اس پانی میں کہ جو برتنوں میں بھر لیا گیا ہو، فرق ہے۔ جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اس موقع پر تو صرف اس قدر جان لیجئے کہ حنفی مسلک کے مطابق دریا کے پانی پر تمام انسانوں کا یکساں حق ہے چاہے کوئی اس کا پانی پینے پلانے کے استعمال میں لائے، چاہے کوئی اس سے اپنی زمین سیراب کرے اور چاہے کوئی نہروں اور نالیوں کے ذریعے اس کا پانی اپنے کھیت و باغات میں لے جائے کسی کو بھی اور کسی صورت میں بھی دریا کے پانی کے استعمال سے نہیں روکا جا سکتا اور نہ کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی کو روکے یا منع کرے، چنانچہ دریا کے پانی سے فائدہ اٹھانا، چاند، سورج اور ہوا سے فائدہ اٹھانے کی طرح ہے کہ خدا نے ان نعمتوں کو بلا تخصیص کائنات کے ہر فرد کے لئے عام کیا ہے ان کا نفع و فائدہ کسی خاص شخص یا کسی خاص طبقے کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان سے فائدہ اٹھانے میں سب یکساں شریک ہیں، اسی طرح کنویں اور نہروں کے پانی پر بھی سب کا حق ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ کسی کنویں یا کسی نہر کے پانی سے موات کا احیاء کرے یعنی افتادہ زمین میں زراعت کرے تو اس صورت میں ان لوگوں کو کہ جن کے علاقے میں وہ کنواں اور نہر ہے منع کر دینے کا حق حاصل ہے خواہ اس شخص کے افتادہ زمین میں پانی لے جانے سے اس کنویں اور نہر کے پانی میں کمی اور نقصان واقع ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو کیونکہ ان کے علاقے میں اس کنویں یا اس نہر کے ہونے کی وجہ سے ان کے پانی پر انہیں بہر حال ایک خاص حق حاصل ہے۔ اور جو پانی کسی برتن یا ٹنکی وغیرہ میں بھر لیا جاتا ہے وہ اس برتن و ٹنکی والے کی ملکیت ہو جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پانی پر ہر شخص کا حق ہوتا ہے کہ جو چاہے مارلے لیکن جب اسے کوئی شکاری پکڑ لیتا ہے تو اس کے قبضہ میں آتے ہی وہ اس شکاری کی ملکیت ہو جاتا ہے اور اس پر بقیہ سب کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔

اور کوئی کنواں یا نہر اور چشمہ کسی ایسی زمین میں ہو جو کسی خاص شخص کی ملکیت ہو تو اس شخص کو یہ حق حاصل ہو گا کہ اگر وہ چاہے تو اپنی حدود ملکیت میں پانی کے طلب گار کسی غیر شخص کے داخلے پر پابندی عائد کر دے، بشرطیکہ وہ پانی کا طلبگار شخص وہاں کسی ایسے قریبی مقام سے پانی حاصل کر سکتا ہو جو کسی غیر کی ملکیت میں نہ ہو اور اگر وہاں کسی اور قریبی جگہ سے پانی کا حصول اس کے لئے ممکن نہ ہو تو پھر اسی مالک سے کہا جائے گا کہ یا تو وہ خود اس نہر یا کنویں سے پانی لا کر دے دے یا اسے اجازت دے دے کہ وہ وہاں آکر پانی لے سکے لیکن اس شرط

کے ساتھ کہ وہ کنویں یا نہر کے کنارے کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

اگر موات زمین میں کوئی کنواں کھدوایا گیا ہو تو اس زمین کو آباد کرنے والے کو یہ حق نہیں پہنچے گا کہ وہ اس کنویں سے پانی لینے سے لوگوں کو منع کرے کیونکہ آباد کرنے کی وجہ سے جس طرح وہ زمین اس ملکیت میں آگئی ہے اس طرح اس کنویں کا پانی اس کی ملکیت میں نہیں آیا ہے اگر وہ کسی ایسے شخص کو منع کرے گا جو اس کنویں سے خود پانی پینا چاہتا یا اپنے جانور کو پلانا چاہتا ہے اور پانی نہ ملنے کی صورت میں خود اس کی یا اس کے جانور کی ہلاکت کا خدشہ ہے تو اسے اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ زبردستی اس کنویں سے پانی حاصل کرے چاہے اس مقصد کے لئے اس کو لڑنا ہی کیوں نہ پڑے اور اس لڑائی میں ہتھیار استعمال کرنے کی نوبت کیوں نہ آجائے۔

کنواں بے شک کسی کی ذاتی ملکیت ہو سکتا ہے مگر اس کنویں کا پانی کنویں والے کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر شخص کے لئے مباح ہوتا ہے، بخلاف اس پانی کے جو کسی نے اپنے برتن باسن میں بھر لیا ہو کہ وہ ذاتی ملکیت ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص پیاس کی شدت سے بے حال ہوا جارہا ہو اور اس شخص سے وہ پانی مانگے جو اس نے اپنے برتن باسن میں بھر رکھا ہو اور وہ پانی دینے سے انکار کردے تو اس پیاسے کو یہ حق ہوگا کہ وہ لڑ جھگڑ کر اس سے پانی حاصل کرلے بشرطیکہ پانی نہ ملنے کی صورت میں جان چلی جانے کا خدشہ ہو اور وہ لڑائی میں کسی ہتھیار وغیرہ کا استعمال نہ کرے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اگر کوئی شخص بھوک کی وجہ سے مرا جارہا ہو اور کسی کھانے والے سے کھانا مانگے اور وہ کھانا نہ دے تو اسے حق ہوتا ہے کہ اپنی جان بچانے کے لئے اس سے لڑ جھگڑ کر کھانا حاصل کرے مگر اس کو لڑائی میں ہتھیار وغیرہ استعمال کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی۔

بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے کنویں سے پانی نہ لینے دے تو اس بارے میں زبردستی پانی حاصل کرنے کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ کنویں والے سے بغیر ہتھیار استعمال کئے لڑے جھگڑے اور اس کی اجازت بھی اس لئے ہے کہ کسی کو پانی جیسی خدا کی عام نعمت سے روکنا گناہ کا ارتکاب کرنا ہے اور یہ لڑ جھگڑ کر پانی حاصل کرنا اس کے حق میں تعزیر (سزا) کے قائم مقام ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

افتادہ و بنجر زمین کو آباد کرنے والا اس زمین کا مالک ہو جاتا ہے

① عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ عَمَرَ اَرْضًا لَيْسَتْ لِاَحَدٍ فَهُوَ اَحَقُّ قَالَ عُرْوَةُ قَضٰى بِهٖ عُمَرُ فِيْ خِلَافَتِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی ایسی (افتادہ و بنجر) زمین کو آباد کرے جس کا کوئی مالک نہ ہو تو وہ آباد کرنے والا شخص ہی اس زمین کا سب سے زیادہ حق دار ہے؟" حضرت عروہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے دور میں اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت عروہؓ کے یہ الفاظ کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث منسوخ نہیں ہے۔

کسی چراگاہ کو اپنے لئے مخصوص کر لینے کی ممانعت

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ الصَّعْبَ بْنَ جَثَّامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَاحِمٰى اِلَّا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت صعب ابن جثامہ نے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کسی

چراگاہ کو مخصوص کر لینے کا حق اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے۔" (بخاری)

تشریح: حمی (حاء کے زیر کے ساتھ) اس زمین (چراگاہ) کو کہتے ہیں جس میں جانوروں کے لئے گھاس روکی جاتی ہے اور اس میں کسی دوسرے کے جانوروں کو چرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات مناسب نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اجازت کے بغیر کسی چراگاہ کو صرف اپنے جانوروں کے لئے مخصوص کر لیا جائے اور اس میں دوسرے کے جانوروں کے چرنے پر پابندی عائد کر دی جائے۔

اس حکم کی ضرورت یوں پیش آئی کہ زمانہ جاہلیت میں یہ معمول تھا کہ جس زمین میں گھاس اور پانی ہوتا اسے عرب کے سردار اپنے جانوروں کے لئے اپنی مخصوص چراگاہ بنا لیتے تھے جس میں ان کے علاوہ دوسروں کے جانوروں کو چرنے کی قطعًا اجازت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا تاہم آپ ﷺ نے جہاد میں کام آنے والے گھوڑوں اور اونٹوں نیز زکوٰۃ میں آئے ہوئے جانوروں کے لئے ایسی مخصوص چراگاہیں قائم کرنے کی اجازت عطا فرما دی تھی۔ لیکن اب آنحضرت ﷺ کے بعد کسی بھی حاکم و سردار کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی چراگاہ کو اپنے لئے یا کسی اور کے لئے مخصوص کر دے۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ کسی فرد کے لئے نہیں بلکہ اکثر مسلمانوں کے لئے کسی چراگاہ کو مخصوص کرنا بھی ناجائز ہے یا یہ جائز ہے؟ چنانچہ بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے جہاد کے گھوڑوں اور اونٹوں نیز زکوٰۃ میں آئے ہوئے جانوروں کے لئے چراگاہ کو مخصوص کرنے کی اجازت دے دی تھی لیکن بعض دوسرے حضرات اس کو بھی ناجائز کہتے ہیں بشرطیکہ اکثر مسلمانوں کے لئے کسی چراگاہ کو مخصوص کر دینا اہل شہر کی تکلیف و پریشانی کا باعث ہو۔

کھیتوں میں پانی لے جانے کے سلسلے میں ایک تنازعہ اور آنحضرت ﷺ کا فیصلہ

(۳) وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ خَاصَمَ الزُّبَيْرُ رَجُلاً مِنَ الْاَنْصَارِ فِیْ شِرَاجٍ مِنَ الْحَرَّةِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْقِ يَا زُبَيْرُ ثُمَّ اَرْسِلِ الْمَاءَ اِلٰى جَارِكَ فَقَالَ الْاَنْصَارِیُّ اَنْ كَانَ ابْنَ عَمَّتِكَ فَتَلَوَّنَ وَجْهُهٗ ثُمَّ قَالَ اِسْقِ يَا زُبَيْرُ ثُمَّ احْبِسِ الْمَاءَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَى الْجَدَرِ ثُمَّ اَرْسِلِ الْمَاءَ اِلٰى جَارِكَ فَاسْتَوْعَى النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلزُّبَيْرِ حَقَّهٗ فِیْ صَرِيْحِ الْحُكْمِ حِيْنَ اَحْفَظَهُ الْاَنْصَارِیُّ وَكَانَ اَشَارَ عَلَيْهِمَا بِاَمْرٍ لَهُمَا فِيْهِ سَعَةٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عروہؒ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) پہاڑی زمین سے (کھیتوں میں) پانی لے جانے والی نالیوں کے سلسلے میں (میرے والد) حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری کے درمیان ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا (جب وہ معاملہ بارگاہ رسالت میں پہنچا تو) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "زبیر! (پہلے تم اپنے کھیتوں میں پانی لے جاؤ پھر اپنے ہمسایہ (یعنی اس انصاری) کے کھیتوں میں پانی چھوڑ دو"۔ (یہ فیصلہ سن کر) اس انصاری نے کہا کہ آپ (ﷺ) نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ زبیرؓ آپ (ﷺ) کی پھوپھی کے بیٹے ہیں (یہ سنتے ہی) آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ (غصہ کی وجہ سے) متغیر ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا "زبیر! (اپنے کھیت میں) پانی لے جاؤ اور پھر پانی کو روکے رکھو (یعنی پانی کو اس انصاری کے کھیت میں نہ جانے دو) تاکہ (تمہارا پورا کھیت اچھی طرح سیراب ہو جائے) اور پانی کھیت کی منڈیر تک پہنچ جائے اس کے بعد نالی کا رخ اپنے ہمسایہ (یعنی اس انصاری) کے کھیت کی طرف کر دو۔ گویا آپ ﷺ نے اس صریح حکم کے ذریعے حضرت زبیرؓ کو ان کا پورا حق دلوایا اس لئے کہ اس انصاری نے آپ ﷺ کو غضب آمیز کر دیا تھا حالانکہ آنحضرت ﷺ نے ابتداء میں ان دونوں کے بارے میں جو فیصلہ صادر فرمایا تھا اس میں دونوں ہی کے لئے آسانی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عروہ ابن زبیر بن العوام جلیل القدر اور بڑے اونچے درجے کے تابعین میں سے ہیں، اس وقت مدینہ میں جو سات فقیہ تھے جن کا علم و فضل سب پر حاوی تھا ان میں سے ایک حضرت عروہؒ بھی ہیں، ان کی والدہ محترمہ مشہور صحابیہ حضرت اسماءؓ ہیں جو

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی ہیں اور ان کے والد حضرت زبیرؓ مشہور صحابی اور آنحضرت ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب کے صاحبزادے تھے۔ حضرت زبیرؓ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ قدیم الاسلام ہیں یعنی آنحضرت ﷺ کی دعوت کے بالکل ابتدائی دور ہی میں مشرف باسلام ہوگئے تھے جب کہ ان کی عمر صرف سولہ سال کی تھی، ایک طرف تو یہ ان کی سعادت تھی کہ انہوں نے اتنی چھوٹی سی عمر ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا دوسری طرف ان کے ظالم چچا کی شقاوت تھی کہ اس نے ان کو؟ سلام لانے کے "جرم" میں طرح طرح کی سزا اور اذیتوں میں مبتلا کیا یہاں تک کہ وہ بدبخت ان کو راہ مستقیم سے ہٹانے کے لئے دھویں میں ڈال دیا کرتا تھا، مگر یہ نوخیز جان ساری اذیتیں برداشت کرتی، تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرتی مگر اسلام کی راہ میں جو قدم اٹھ چکا تھا وہ پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے ہی بڑھتا رہا۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تمام غزوات (جنگوں) میں شرکت کی اور اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لئے شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے رسول کریم ﷺ نے جن دس خوش نصیب صحابہؓ کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی۔ اور جنہیں "عشرہ مبشرہ" کہا جاتا ہے ان میں سے ایک حضرت زبیرؓ بھی ہیں۔

انہی حضرت زبیرؓ کا واقعہ ہے کہ یہ اور ایک انصاری ایک ہی نالی کے ذریعے اپنے اپنے کھیتوں میں پانی لے جاتے تھے۔ سو اتفاق کہ ایک مرتبہ اسی نالی سے پانی لے جانے کے بارے میں ان دونوں میں یہ تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ انصاری تو کہتا تھا کہ پہلے میں اپنے کھیت میں پانی لے جاؤں گا اور حضرت زبیرؓ یہ کہتے تھے کہ پہلے میں اپنے کھیت کو سیراب کروں گا، جب یہ بات زیادہ الجھ گئی اور وہ آپس میں کوئی تصفیہ نہ کر سکے تو اپنا معاملہ لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ آپ ﷺ کا فیصلہ حاصل کریں۔

موقع کی نوعیت یہ تھی کہ حضرت زبیرؓ کی زمین بلندی پر بھی تھی اور نالی کے قریب بھی تھی جب کہ اس انصاری کی زمین نیچے تھی اور نالی سے دور تھی، قاعدہ کے مطابق پانی پہلے حضرت زبیرؓ ہی کے کھیت میں جانا چاہئے تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس صورت حال کے پیش نظر یہ منصفانہ فیصلہ صادر فرمایا کہ پہلے زبیرؓ اپنے کھیت میں پانی لے جائیں بعد میں ان کا ہمسایہ یعنی وہ انصاری اپنے کھیت میں پانی لے جائے۔ حق و صداقت کا صحیح شعور کھو دینے والے انسان کی جبلت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ کسی معاملہ میں حق پر نہیں ہوتا اور اس کی وجہ سے فیصلہ اس کی خواہش کے برخلاف ہوتا ہے تو وہ بجائے اس کے کہ قبول کر کے انصاف کی برتری کو تسلیم کر لے، کرتا یہ ہے کہ فیصلہ کرنے والے پر فیصلہ میں جانب داری کا الزام عائد کر دیتا ہے، چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہوا وہ انصاری چونکہ حق پر نہیں تھا اس لئے جب بارگاہ رسالت سے اس کی خواہش کے برخلاف فیصلہ صادر ہوا تو اس فیصلے کو برضا و تسلیم قبول کرنے کی بجائے اس نے یہ کہا کہ زبیرؓ چونکہ آپ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں اس لئے یہ فیصلہ کیا ہے، اسی طرح گویا اس نے آپ ﷺ پر جانب داری کا الزام عائد کیا ظاہر ہے کہ کسی منصف و عادل کے لئے ذہنی اذیت و کوفت کا اس سے بڑا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا کہ اس کے کسی منصفانہ فیصلے پر جانبداری اور عصبیت کا الزام عائد کر دیا جائے۔

اسی لئے جب اس انصاری نے یہ بات کہی تو آنحضرت ﷺ کی جبیں پر بل پڑ گئے اور غصے کے شدید ترین جذبات نے آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ کے اس فیصلے نے (جس میں تھوڑی بہت رعایت اس انصاری کی بھی تھی) اس صریح حکم کی صورت اختیار کر لی کہ "زبیر! اب تم اپنا حق پورا پورا لو، اور وہ یہ کہ نہ صرف پہلے تم اپنے کھیت میں پانی لے جاؤ بلکہ کھیت کو پوری طرح سیراب کرو، اس میں اچھی طرح پانی دو، جب تمہارا کھیت منڈیروں تک بھر جائے تب نالی کا رخ اس انصاری کے کھیت کی طرف کرو"۔

چنانچہ روایت کے آخری جملوں کا مطلب یہی ہے کہ ابتداء میں آنحضرت ﷺ نے جو فیصلہ صادر فرمایا تھا اس میں حضرت زبیرؓ کو یہ اشارہ بھی تھا کہ اپنا کچھ حق ازراہ احسان اپنے ہمسایہ کے لئے چھوڑ دو، تاکہ تمہارا کام بھی ہو جائے جو انصاف کا تقاضہ ہے اور اس انصاری کے ساتھ بھی کچھ رعایت ہو جائے جو اگرچہ تم پر واجب نہیں ہے مگر آپس کے معاملات میں بہتری و بھلائی پیدا کرنے کے نقطہ نظر

مناسب ہے۔ مگر جب اس انصاری نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا تو پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو اپنا حق پورا پورا حاصل کرنے کا حکم دیا۔

اب رہی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ کی شان میں اس انصاری کی اس گستاخی کا کیا سبب تھا؟ تو بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ انصاری دراصل منافق تھا اور منافقوں کا یہ رویہ تھا کہ وہ آپ ﷺ کی گستاخی اور آپ ﷺ کو ذہنی اذیت و کوفت میں مبتلا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ منافق تھا تو اسے "انصاری" کیوں کہا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو انصاری اس مناسبت سے کہا گیا کہ وہ انصار کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، چنانچہ انصار کے قبیلوں میں بعض منافق بھی تھے مثلاً عبداللہ ابن ابی وغیرہ۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، یہاں پہنچ کر ایک یہ نیا سوال سر ابھارتا ہے کہ جب وہ منافق تھا اور اس نے شان رسالت میں اتنی بڑی گستاخی کی تھی تو اسے سزا کیوں نہیں دی گئی، اسے تو فوراً قتل کر دینا چاہئے تھا؟ اس سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اسے بسزاء قتل نہ کرنے کا سبب یا تو اس کی تالیف یعنی از راہ الفت و رعایت اس کو راہ حق لگانا تھا، یا یہ کہ آپ ﷺ کے اس صبر و تحمل نے اس کو قتل کرنا گوارا نہ کیا جو ہمیشہ ہی منافقوں کی ایذاء رسانیوں پر ظاہر ہوتا تھا، پھر اگر اسے قتل کر دیا جاتا تو مخالفین اسلام طعن کرتے کہ محمد ﷺ تو اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں کیونکہ منافق بہر حال ظاہر طور پر اپنے کو مسلمان کہتے تھے اور آپ ﷺ کا ساتھی ہونے کا اظہار کرتے تھے۔

بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ وہ انصاری مؤمن ہی تھا مگر غصہ اور جھنجھلاہٹ نے اس کے دل و دماغ کو اس طرح ماؤف کر دیا تھا کہ وہ اضطراراً آپ ﷺ کی شان میں یہ گستاخی کر بیٹھا۔ واللہ اعلم

جو پانی تمہاری ضرورت سے زائد ہو اسے جانوروں کو پلانے سے نہ روکو

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَمْنَعُوْا فَضْلَ الْمَاءِ لِتَمْنَعُوْا بِهٖ فَضْلَ الْكَلَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جو پانی تمہاری ضرورت سے زائد ہو اسے (جانوروں کو پلانے سے) منع نہ کرو تاکہ اس کی وجہ سے ضرورت سے زائد گھاس سے منع کرنا لازم نہ آئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عام طور پر جانوروں کو گھاس وہاں چرائی جاتی ہے جہاں پانی ہوتا ہے، اس لئے اگر جانوروں کو پانی پلانے سے روکو گے تو کوئی وہاں اپنے جانور کاہے کو چرائے گا؟ اس طرح پانی پلانے سے روکنے کا مطلب یہ ہو گا کہ تم بالواسطہ طور پر گھاس چرانے سے روک رہے ہو، اور گھاس چونکہ جانوروں کی عام غذا ہونے کی وجہ سے جانوروں کے لئے بہت زیادہ ضرورت کی چیز ہے اس لئے اس سے منع کرنا درست نہیں ہے، لہٰذا آپ ﷺ نے منع فرمایا کہ جانوروں کو پانی پلانے سے کسی کو نہ روکو تاکہ اس کی وجہ سے گھاس چرانے سے باز رکھنا لازم نہ آئے۔ "ضرورت سے زائد" کی قید اس لئے ہے کہ اگر پانی اور گھاس اپنی اور اپنے جانوروں کی ضرورت کے بقدر ہی ہو تو اس صورت میں اپنی ضرورت کو مقدم رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ہاں اگر ضرورت سے زائد ہو تو پھر دوسرے کو منع کرنا انتہائی نامناسب بات ہے۔

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ رَجُلٌ حَلَفَ عَلٰى سِلْعَةٍ لَقَدْ اُعْطِیَ بِهَا اَكْثَرَ مِمَّا اُعْطِیَ وَهُوَ كَاذِبٌ وَرَجُلٌ حَلَفَ عَلٰى یَمِیْنٍ كَاذِبَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ لِیَقْتَطِعَ بِهَا مَالَ رَجُلٍ مُسْلِمٍ وَرَجُلٌ مَنَعَ فَضْلَ مَاءٍ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ الْیَوْمَ اَمْنَعُكَ فَضْلِیْ كَمَا مَنَعْتَ فَضْلَ مَاءٍ لَمْ تَعْمَلْ یَدَاكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (رحم و کرم کی) بات

نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف (بنظر عنایت) دیکھے گا، ایک تو وہ (تاجر) شخص ہے جو قسم کھا کر (خریدار سے) کہتا ہے کہ اس چیز کے جو دام تم نے دیئے ہیں اس سے زیادہ دام اسے مل رہے تھے (یعنی جب وہ کسی کو اپنی کوئی چیز بیچتا ہے اور خریدار اس کی قیمت دیتا ہے تو وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ مجھے اس چیز کی اس سے زیادہ قیمت مل رہی تھی) حالانکہ وہ شخص (اپنی قسم میں) جھوٹا ہے (کیونکہ درحقیقت اس سے زیادہ قیمت اسے نہیں مل رہی تھی) دوسرا شخص وہ ہے جو عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائے اور اس (جھوٹی قسم کھانے) کا مقصد کسی مسلمان شخص (یا ذمی) کا کوئی مال لینا ہو، اور تیسرا شخص وہ ہے جو فاضل پانی (پینے پلانے) سے لوگوں کو منع کرتا ہو ایسے شخص سے (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جس طرح تو نے (دنیا میں) اپنے فاضل پانی سے لوگوں کو باز رکھا تھا باجودیہ کہ وہ پانی تو نے اپنے ہاتھ سے نہیں نکالا تھا اسی طرح میں بھی آج تجھے اپنے فضل سے باز رکھوں گا۔" (بخاری)

تشریح: "عصر کے بعد" کی تخصیص یا تو اس لئے ہے کہ مغلظہ قسمیں اسی وقت کھائی جاتی ہیں، یا یہ تخصیص اس لئے ہے کہ عصر کے بعد کا وقت چونکہ بہت ہی بافضیلت اور بابرکت ہے اس لئے اس وقت جھوٹی قسم کھانا بہت ہی زیادہ گناہ کی بات ہے۔

"باوجود یہ کہ وہ پانی تو نے اپنے ہاتھ سے نہیں نکالا تھا" یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص پر طعن کرے گا کہ اگر وہ پانی تیری قدرت کا رہین منت ہوتا اور تو اسے پیدا کرتا تو ایک طرح سے تیرا یہ عمل موزوں بھی ہوتا مگر اس صورت میں جب کہ وہ پانی محض میری قدرت سے پیدا ہوا تھا اور اسے میں نے ایک عام نعمت کے طور پر تمام مخلوق کے لئے مباح کر دیا تھا تو پھر تیری یہ مجال کیسے ہوئی کہ تو نے مخلوق خدا کو میری اس نعمت سے باز رکھا۔

اگرچہ کنواں اور نہر وغیرہ انسان کی مشقت و محنت سے وجود میں آتے ہیں مگر اس کی اصل چیز یعنی پانی صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پیدا ہوتا ہے، اگر کوئی شخص کنواں بنوائے، نہر کھدوائے یا ہینڈ پمپ وغیرہ لگوائے اور اس میں پانی نہ آئے تو اس کنویں یا نہر وغیرہ کی کیا حقیقت رہ جائے گی، اس لئے محض کنواں بنوا دینا یا ہینڈ پمپ وغیرہ لگوا دینا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ اس شخص کو دوسروں پر پانی استعمال کرنے کی پابندی عائد کر دینے کا حق مل گیا ہے۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ فِيْ بَابِ الْمَنْهِيِّ عَنْهَا مِنَ الْبُيُوْعِ۔

"اور حضرت جابرؓ کی روایت باب المنهی عنها من البیوع میں ذکر کی جا چکی ہے۔"

یعنی حضرت جابرؓ کی یہ روایت نهی رسول الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عن بيع فضل الماء (رسول کریم ﷺ نے اپنی ضروریات سے زائد پانی کو بیچنے سے منع فرمایا ہے) صاحب مصابیح نے یہاں نقل کی تھی لیکن صاحب مشکوٰۃ نے اسے "باب المنهی عنها من البیوع" میں نقل کیا ہے جو پیچھے گذر چکا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

افتادہ زمین کی دیوار کے ذریعے حد بندی کر دینے سے ملکیت ثابت ہو جاتی ہے یا نہیں؟

(۶) عَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَحَاطَ حَائِطًا عَلَى الْاَرْضِ فَهُوَ لَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت حسن بصریؒ، حضرت سمرہؓ سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص (افتادہ) زمین پر دیوار گھیر دے تو وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص موات (یعنی افتادہ و غیر آباد) زمین پر دیوار گھیر دے گا وہ زمین اسی کی ملکیت ہو جائے گی۔ گویا یہ حدیث اپنے ظاہری مفہوم کے مطابق اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ موات زمین کی ملکیت کے ثبوت کے لئے اس پر دیوار کھینچ دینا کافی ہے جیسا

کہ مشہور ترین روایت کے مطابق حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے جب کہ بقیہ تینوں آئمہ کے نزدیک ایسی زمین کی ملکیت کے ثبوت کے لئے احیاء یعنی اس کو آباد کرنا شرط ہے۔ جس کی وضاحت باب کے شروع میں کی جاچکی ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ دیوار کھینچنا، احیاء یعنی آباد کرنے کے مفہوم میں داخل ہی نہیں ہے لہٰذا تینوں آئمہ کے مسلک کے مطابق اس حدیث کی تاویل یہ ہوگی کہ اس سے "سکونت کے لئے دیوار کھینچنا" مراد ہے۔

آنحضرت ﷺ کی طرف سے صحابہؓ کو افتادہ زمین کا جاگیری عطیہ

⑦ وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ لِلزُّبَیْرِ نَخِیْلاً۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت زبیرؓ کے لئے کھجوروں کے درخت جاگیر کر دیئے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس بارے میں ایک احتمال یہ ہے کہ کھجور کے جو درخت حضرت زبیرؓ کو بطور جاگیر عطا کئے گئے تھے وہ دراصل خمس میں سے تھے جو ان کا حق تھا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ درخت اس موات (افتادہ و غیر آباد) زمین میں تھے جسے حضرت زبیرؓ نے آباد کیا ہوگا۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ لِلزُّبَیْرِ حُضْرَ فَرَسِہٖ فَاَجْرٰی فَرَسَہٗ حَتّٰی قَامَ ثُمَّ رَمٰی بِسَوْطِہٖ فَقَالَ اَعْطُوْہُ مِنْ حَیْثُ بَلَغَ السَّوْطُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو ان کے گھوڑے کی دوڑ کے بقدر زمین بطور جاگیر (یعنی ایک دوڑ میں گھوڑا جہاں تک پہنچ کر ٹھہر جائے وہاں تک کی زمین عطا کر دی چنانچہ (اس مقصد کے لئے) حضرت زبیرؓ نے اپنا گھوڑا دوڑایا اور وہ گھوڑا (ایک جگہ پہنچ کر) ٹھہر گیا پھر حضرت زبیرؓ نے اپنا کوڑا پھینکا اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ زبیر کا کوڑا جہاں جاکر گرا وہاں تک کی زمین زبیرؓ کو دے دی جائے۔" (ابوداؤدؒ)

⑨ وَعَنْ عَلْقَمَۃَ بْنِ وَائِلٍ عَنْ اَبِیْہِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَہٗ اَرْضًا بِحَضْرَمَوْتَ قَالَ فَاَرْسَلَ مَعِیَ مُعَاوِیَۃَ قَالَ اَعْطِھَا اِیَّاہُ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت علقمہ ابن وائل اپنے والد (حضرت وائل ابن حجرؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان (وائل ابن حجرؓ) کو حضر موت میں کچھ زمین بطور جاگیر عطا فرمائی، چنانچہ حضرت وائل کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاویہؓ کو میرے ہمراہ بھیجا تاکہ وہ اس زمین کی پیمائش کر دیں، اور معاویہؓ نے فرمایا کہ وہ زمین (ناپ کر) وائل کو دے دو۔" (ترمذیؒ والدارمیؒ)

تشریح: موجودہ جغرافیائی نقشے کے مطابق جبل السراۃ کا ایک سلسلہ یمن سے گذر کر جزیرۃ العرب کے جنوب مغربی گوشے سے مشرق کی طرف مڑ گیا ہے پھر جنوبی ساحل کے قریب قریب دور تک چلا گیا ہے، جبل السراۃ کا یہی سلسلہ جن علاقوں پر مشتمل ہے انہیں "حضر موت" کہا جاتا ہے۔ یوں تو حضر موت کا پورا علاقہ عموماً بنجر اور غیر شاداب پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ جو نہ زیادہ بلند ہیں اور بارش کم ہونے کی وجہ سے ناقابل زراعت ہیں، لیکن ان سلسلوں میں کچھ وادیاں ہیں جو نسبۃً شاداب ہیں، ان میں سے ایک وادی کا نام وادی حضر موت ہے۔

حضرت وائل ابن حجرؓ اسی علاقے کے قدیم شاہی خاندان کے ایک فرد تھے ان کے والد وہاں کے بادشاہ تھے۔ یہ جب پیغمبر اسلام کی دعوت سن کر اپنے ملک کے ایک وفد کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہونے کے لئے حضر موت سے روانہ ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں ان کی آمد سے پیشتر صحابہؓ کو مطلع کر دیا تھا، اور وھو بقیۃ ابناء الملوک (اور وہ شاہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں) کے ذریعے ان کا تعارف کرایا تھا، پھر جب وہ مدینہ پہنچے اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی حیثیت کے مطابق

ان کا استقبال کیا، انہیں اپنے قریب بٹھایا اور ان کے لئے اپنی مبارک چادر بچھادی، اور پھر آپ ﷺ نے ان کو حضر موت کے علاقہ کا حاکم مقرر فرمایا اور وہاں کی کچھ زمین انہیں بطور جاگیر عطا فرمائی۔

⑮ وَعَنْ اَبْيَضَ بْنِ حَمَّالِ الْمَأْرِبِيِّ اَنَّهٗ وَفَدَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَقْطَعَهُ الْمِلْحَ الَّذِیْ بِمَارِبَ فَاَقْطَعَهٗ اِيَّاهُ فَلَمَّا وَلّٰى قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّمَا اَقْطَعْتَ لَهُ الْمَاءَ الْعِدَّ قَالَ فَرَجَعَهٗ مِنْهُ قَالَ وَسَأَلَهٗ مَاذَا يُحْمٰى مِنَ الْاَرَاكِ مَالَمْ تَنَلْهُ اَخْفَافُ الْاِبِلِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابیض ابن حمال ماربیؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ درخواست پیش کی کہ مارب میں نمک کی جو کان ہے وہ ان کے لئے جاگیر کردی جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں نمک کی وہ کان بطور جاگیر عطا فرمادی، جب ابیض واپس ہوئے تو ایک شخص (یعنی اقرع ابن حابس تمیمیؓ) نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! آپ (ﷺ) نے تو ابیضؓ کو تیار پانی (یعنی کان میں بالکل تیار نمک) دے دیا ہے؟" راوی کہتے ہیں کہ (جب آپ ﷺ کو حضرت اقرعؓ سے یہ معلوم ہوا کہ ابیضؓ کو ایک ایسی کان دے دی گئی ہے جس میں نمک بالکل تیار ہے تو) آپ ﷺ نے وہ کان ابیضؓ سے واپس لے لی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی حضرت اقرعؓ) نے آپ ﷺ سے یہ بھی دریافت کیا کہ پیلو کے درختوں کی کون سی زمین گھیری جائے؟ یعنی کون سی افتادہ و غیر آباد زمین کو آباد کر کے اپنی ملکیت بنایا جائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ زمین جہاں اونٹوں کے پاؤں نہ پہنچیں۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "مارب" یمن کے ایک شہر کا نام ہے جو صنعاء سے ۶۰ میل مشرق میں تقریباً چار ہزار فٹ بلند سطح زمین پر واقع ہے یمن میں پہلی صدی عیسوی تک سبا نامی نسل کے اقتدار کے زمانے میں "مارب" یمن کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے نہ صرف ایک بڑا شہر تھا بلکہ ایک عظیم تجارتی مرکز بھی تھا، حضرت ابیضؓ اسی شہر کے رہنے والے تھے اسی لئے انہیں ماربی کہا جاتا ہے۔

الماء العد یعنی تیار پانی کا مطلب ہے بالکل تیار ہمیشہ رہنے والا کہ اس کا مادہ منقطع نہ ہو۔ اس سے کان میں نمک کی بالکل تیار حالت کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے شروع میں تو سمجھا تھا کہ ابیضؓ نے نمک کی جس کان کی فرمائش کی ہے وہ بالکل ابتدائی حالت میں ہے جس سے محنت و مشقت اور سخت جدوجہد کے بعد نمک نکلے گا، مگر جب حضرت اقرع کی توجہ دلانے سے آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ وہ کان ابتدائی حالت میں نہیں ہے بلکہ اس میں نمک تیار ہو چکا ہے۔ جو بغیر کسی محنت و مشقت کے تیار پانی اور گھاس کی طرح حاصل کیا جاسکتا ہے تو آپ ﷺ نے وہ کان واپس لے لی، کیونکہ اس صورت میں اس کان اور اس میں تیار شدہ نمک پر سب لوگوں کا حق تھا اسے کسی فرد واحد کی ملکیت بنا دینا مناسب نہیں تھا، اس لئے آپ ﷺ نے تمام لوگوں کے حقوق کی رعایت کے پیش نظر اس کان کو واپس لے لینا ہی بہتر سمجھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام (یعنی حکومت وقت) کی طرف سے کوئی کان کسی شخص کو بطور جاگیر عطا ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ کان زیر زمین پوشیدہ ہو اور اس سے محنت و مشقت اور جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہ ہو سکتا ہو۔ ہاں جو کانیں برآمد ہو چکی ہوں اور ان سے نکلنے والا مال کسی محنت و مشقت اور جدوجہد کے بغیر حاصل ہو سکتا ہو تو انہیں کسی فرد واحد کی جاگیر بنا دینا جائز نہیں ہے بلکہ گھاس اور پانی کی طرح ان کی منفعت میں بھی تمام لوگ شریک ہوں گے اور ان پر سب کا استحقاق ہوگا۔ اس حدیث سے یہ نکتہ بھی معلوم ہوا کہ اگر حاکم کسی معاملے میں کوئی حکم و فیصلہ صادر کرے اور پھر اس پر یہ ظاہر ہو کہ یہ حکم و فیصلہ حقیقت کے منافی ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس فیصلے و حکم کو منسوخ کردے اور اس سے رجوع کرلے۔

"وہ زمین جہاں اونٹوں کے پاؤں نہ پہنچیں" سے مراد وہ زمین ہے جو چراگاہ اور عمارات سے الگ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس موات (افتادہ) زمین کا احیاء (یعنی اسے آباد کرنا) جائز نہیں ہے جو عمارات کے قریب ہو کیونکہ وہ جانوروں کو چرانے اور اہل بستی کی دیگر ضرورت کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

خدا کی تین عام نعمتیں

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُوْنَ شُرَكَاءُ فِيْ ثَلَاثٍ فِي الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تین چیزیں یعنی پانی، گھاس اور آگ ایسی ہیں جن میں تمام مسلمان شریک ہیں۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث میں خدا کی ان تین عام نعمتوں کا ذکر ہے جو کائنات کے ہر فرد کے لئے ہے، ان میں کسی کی ذاتی ملکیت و خصوصیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

"پانی" سے مراد دریا، تالاب اور کنویں وغیرہ کا پانی ہے، وہ پانی مراد نہیں ہے جو کسی شخص کے برتن یا سن میں بھرا ہوا ہو، چنانچہ اس کی وضاحت باب کی ابتداء میں کی جا چکی ہے، اسی طرح "گھاس" سے وہ گھاس مراد ہے جو جنگل میں اگی ہوئی ہو۔

"آگ" سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس آگ ہو تو اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے کو آگ لینے سے منع کرے، یا چراغ جلانے سے روکے اور یا اس کی روشنی میں بیٹھنے سے منع کر دے وغیرہ ذالک۔ ہاں اگر کوئی شخص اس آگ میں سے وہ لکڑی لینا چاہے جو اس میں جل رہی ہو تو اس صورت میں اس کو روکنا جائز ہے کیونکہ اس کی وجہ سے آگ میں کمی آجائے گی اور بجھ جائے گی اور بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے "سنگ چقماق" (یعنی وہ پتھر جس کے مارنے سے آگ نکلتی ہے) مراد ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اس پتھر کے لینے سے نہ روکا جائے بشرطیکہ وہ پتھر موات (یعنی افتادہ) زمین میں ہو۔

کسی مباح چیز کو جو شخص پہلے حاصل کرے گا وہ اسی کی ہو جائے گی

(۱۲) وَعَنْ اَسْمَرَبْنِ مُضَرِّسٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَايَعْتُهٗ فَقَالَ مَنْ سَبَقَ اِلٰى مَاءٍ لَمْ يَسْبِقْهُ اِلَيْهِ مُسْلِمٌ فَهُوَ لَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت اسمر بن مضرسؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے بیعت ہوا (یعنی اسلام قبول کیا) چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص کسی ایسے پانی کی طرف سبقت کرے (یعنی اس پانی کو حاصل کرے) جسے کسی مسلمان نے حاصل نہ کیا ہو تو وہ اسی کا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص مباح پانی یعنی دریا یا تالاب وغیرہ میں سے کوئی مقدار لے لیتا ہے تو پانی کی وہ لی ہوئی مقدار اس شخص کی ملکیت ہو جاتی ہے اور جو پانی اس جگہ یعنی دریا و تالاب وغیرہ میں باقی رہ جاتا ہے وہ اس کی ملکیت میں نہیں آتا، بلکہ وہ جوں کا توں مباح رہتا ہے، اسی طرح دوسری مباح چیزیں مثلاً گھاس اور لکڑی وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔

جس قوم میں کمزور انسانوں کے حقوق محفوظ نہ ہوں وہ برائیوں سے پاک نہیں ہوتی

(۱۳) وَعَنْ طَاؤسٍ مُرْسَلًا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَحْيَا مَوَاتًا مِنَ الْاَرْضِ فَهُوَ لَهٗ عَادِيُّ الْاَرْضِ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ هِيَ لَكُمْ مِنِّيْ۔ رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَرُوِيَ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ لِعَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ الدُّوْرَ بِالْمَدِيْنَةِ وَهِيَ بَيْنَ ظَهْرَانِيْ عِمَارَةِ الْاَنْصَارِ مِنَ الْمَنَازِلِ وَالنَّخْلِ فَقَالَ بَنُوْ عَبْدِبْنِ زُهْرَةَ نَكِّبْ عَنَّا ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلِمَ ابْتَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِذًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُقَدِّسُ اُمَّةً لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيْفِ فِيْهِمْ حَقُّهٗ۔

"اور حضرت طاؤس بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "افتادہ و بنجر زمین کو جو شخص آباد کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہو جائے گی۔ اور قدیم زمین اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے اور پھر وہ میری طرف سے تمہارے لئے ہے (شافعیؒ) اور شرح السنۃ میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو مدینہ میں جو مکانات دیئے وہ انصار کی آبادی (یعنی ان کے مکان اور ان کے کھجور کے درختوں) کے درمیان واقع تھے، چنانچہ عبد ابن زہرہ کے بیٹوں نے کہا کہ آپ اُمّ عبد کے بیٹے (یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ) کو ہم سے دور رکھئے (اس کے جواب میں) رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے کیوں بھیجا ہے (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ اس قوم کو پاکیزگی عطا نہیں کرتا جس میں کمزور کے حق کو تحفظ حاصل نہ ہو۔"

تشریح: عادی الارض (قدیم زمین) سے مراد وہ افتادہ و بنجر زمین ہے جس کے مالک کا کوئی علم نہ ہو، اس میں زمین کی لفظی نسبت "عاد" یعنی حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کی طرف محض ایسی زمین کی قدامت کے اظہار میں مبالغہ کے لئے ہے کیونکہ حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کی مدت قدامت بہت زیادہ ہے۔

"اور اس کے رسول کے لئے ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ایسی تمام افتادہ و بنجر زمینیں جن کا کوئی مالک نہیں ہے، میرے تسلط میں ہیں، اپنی مرضی و مصلحت کے مطابق ان میں تصرف کرتا ہوں کہ جسے چاہتا ہوں عطا کرتا ہوں اور اس کو آباد کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔

قاضی کہتے ہیں کہ ثم ھی لکم منی (اور پھر وہ میری طرف سے تمہارے لئے ہے) سے معلوم ہوا کہ اس جملے "اور قدیم زمین اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہیں" میں "اللہ" کی عظمت شان کے پیش نظر آپ ﷺ کے ذکر کی تمہید کے طور پر ہے ورنہ بظاہر "اللہ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اللہ کا حکم و فیصلہ گویا اللہ کا حکم و فیصلہ ہے۔

عبد ابن زہرہ کے بیٹوں نے اپنے مکانات اور کھجوروں کے درختوں کے درمیان حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو مکان دیئے جانے کی جو مخالفت کی اس کا ایک جذباتی پس منظر تھا اور وہ یہ کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے والد یعنی مسعود زمانہ جاہلیت میں عبد ابن زہرہ کے بیٹوں کے حریف (مقابل) تھے، نیز حضرت عبداللہؓ کی والدہ یعنی اُمّ عبد ان کے خدمت گاروں میں سے تھیں، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو ایسی جگہ مکانات دیئے جو عبد ابن زہرہ کے بیٹوں کے مکانات اور ان کے کھجوروں کے باغات کے درمیان واقع تھی تو یہ ان کو گوارا نہیں ہوا کہ عبداللہ ابن مسعودؓ کا مکان ان کے مکانات کے درمیان واقع ہو، گویا اس طرح انہوں نے اپنے ان جذبات حقارت کا اظہار کیا جو وہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے تئیں رکھتے تھے۔

لہٰذا آنحضرت ﷺ نے ان کے غلط جذبات پر برہمی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اگر حقوق العباد اس قسم کے احساسات سے متعلق ہوتے اور کمزور انسانوں کے تئیں یہ جذبات و حقارت جائز ہوتے تو میں اللہ کا رسول بن کر اس دنیا میں کیوں آتا؟ اگر میں کمزور و ناتوانوں اور مسکینوں کی تقویت کا باعث اور ان کا مددگار نہ بنوں تو میری بعثت کا ایک بڑا مقصد کیسے پورا ہوگا، اور میری بعثت میں اللہ کی کیا حکمت رہ جائے گی؟ تمہیں نہ بھولنا چاہئے کہ میرے بنیادی مقاصد میں یہ بات داخل ہے کہ میں انسانوں کے درمیان اونچ نیچ اور معاشرتی فرق و امتیاز کی خود ساختہ دیواروں کو ڈھادوں، جو لوگ اپنے آپ کو طاقتور و بڑا سمجھتے ہوں انہیں راہ اعتدال پر لاؤں اور جو کمزور و ناتواں ہوں انہیں اپنی مدد و نصرت سے طاقت بخشوں پھر آپ نے قوموں کے کیرکٹر و کردار کے ایک بڑے نازک گوشے کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو قوم اپنے کمزور افراد کے حقوق کا تحفظ نہیں کرتی اور جس قوم میں کمزور انسانوں کی کوئی اہمیت و وقعت نہیں ہوتی وہ قوم نہ صرف یہ کہ کائنات انسانی کا ایک بدترین حصہ ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو گناہوں اور برائیوں سے پاکیزگی عطا نہیں کرتا، جس قوم کے طاقتور لوگ کمزور لوگوں کے حقوق کو پامال کرتے ہیں، ان کی سماجی و معاشرتی زندگی پر، بدعنوانیوں اور گناہ و معصیت کی دبیز تہیں جم جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم نہ تو معاشرہ میں کوئی باوقار اور صالح کردار انجام دیتی ہے اور نہ خدا کی طرف سے ان پر رحمت و برکت نازل ہوتی ہے، لہٰذا آپ ﷺ نے عبد ابن زہرہ کے بیٹوں کو آگاہ فرمایا کہ یہ مت سمجھو کہ عبداللہ ابن مسعودؓ چونکہ دنیاوی طور پر تم سے کمتر ہیں اور وہ

ایک کمزور انسان ہیں۔ اس لئے تم ان کا یہ جائز حق کہ وہ جس موزوں جگہ پر چاہیں اپنی سکونت اختیار کریں، غصب کر لوگے، میں ان کا مددگار و معین ہوں اور مجھ پر یہ لازم ہے کہ میں ان کی حمایت کروں۔

نہر وغیرہ سے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنے کا ضابطہ

(۱۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى فِي السَّيْلِ الْمَهْزُوْرِ اَنْ يُمْسَكَ حَتّٰى يَبْلُغَ كَعْبَيْنِ ثُمَّ يُرْسِلَ الْاَعْلٰى عَلَى الْاَسْفَلِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور وہ اپنے دادا (یعنی حضرت عبداللہ ابن عمروؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مہزور کے پانی کے بارے میں یہ حکم دیا کہ (جب اس کا پانی کھیت وغیرہ میں) ٹخنوں تک بھر جائے تو اسے بند کر دیا جائے اور پھر اوپر والا نیچے والے کے لئے (اس کا پانی) چھوڑ دے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "مہزور" مدینہ کی ایک وادی کا نام ہے جو بنی قریظہ کے علاقے میں واقع تھی، بنی قریظہ کے کھیتوں اور باغوں میں اسی وادی سے پانی آتا تھا، اسی کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ اس وادی سے پانی لانے والی نالی کے قریب جس شخص کی زمین ہو اس کا حق مقدم ہے کہ پہلے وہ اپنی زمین میں پانی لے جائے جب اس کی زمین میں ٹخنوں تک پانی پہنچ جائے یعنی پوری طرح سیراب ہو جائے تب وہ اس پانی کو چھوڑ دے تاکہ اس کے بعد وہ اس زمین میں جائے جو اس کی زمین سے نیچے ہے۔

چنانچہ ہر اس نہر کے بارے میں یہی ضابطہ ہے جو کسی شخص کی ذاتی محنت و مشقت کے بغیر از خود جاری ہو کہ جس شخص کی زمین اس نہر کے قریب اور بلندی پر ہو پہلے وہ اپنی زمین میں پانی لا کر روکے رکھے یہاں تک کہ اس کی زمین میں ٹخنوں تک پانی بھر جائے پھر وہ پانی کا رخ اپنی زمین سے موڑ دے تاکہ وہ اس زمین میں چلا جائے جو اس کی زمین سے متصل اور اس سے نیچے ہو۔

اپنی جائیداد کے ذریعے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ

(۱۵) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّهٗ كَانَتْ لَهٗ عَضُدٌ مِّنْ نَخْلٍ فِيْ حَائِطِ رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ وَمَعَ الرَّجُلِ اَهْلُهٗ فَكَانَ سَمُرَةُ يَدْخُلُ عَلَيْهِ فَيَتَاَذّٰى بِهٖ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهٗ فَطَلَبَ اِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَبِيْعَهٗ فَاَبٰى فَطَلَبَ اَنْ يُّنَاقِلَهٗ فَاَبٰى قَالَ فَهَبْهُ لَهٗ وَلَكَ كَذَا اَمْرًا رَغَّبَهٗ فِيْهِ فَاَبٰى فَقَالَ اَنْتَ مُضَارٌّ فَقَالَ لِلْاَنْصَارِيِّ اذْهَبْ فَاقْطَعْ نَخْلَهٗ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا فِيْ بَابِ الْغَصْبِ بِرِوَايَةِ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ۔

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے کھجوروں کے چند درخت ایک انصاری (جن کا نام بعض علماء نے مالکؓ ابن قیس لکھا ہے) کے باغ میں تھے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اسی باغ میں رہتے تھے، چنانچہ جب سمرہؓ (اپنے ان درختوں کی وجہ سے) باغ میں آتے تو ان انصاری کو اس سے تکلیف ہوتی (ایک دن) وہ انصاری نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا، آپ ﷺ نے سمرہؓ کو اپنی مجلس میں طلب کیا تاکہ (ان سے یہ فرمائیں کہ) وہ (اپنے کھجور کے ان درختوں کو) انصاری کے ہاتھ فروخت کر دیں (تاکہ ان درختوں کی وجہ سے انصاری کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس سے نجات پا جائیں) لیکن سمرہؓ نے (اپنے درختوں کو فروخت کرنے سے) انکار کر دیا، پھر آپ ﷺ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سمرہؓ اپنے ان درختوں کو انصاری کے (ان) درختوں سے بدل لیں (جو کسی دوسری جگہ واقع تھے) مگر سمرہؓ اس پر بھی تیار نہیں ہوئے، تب آپ ﷺ نے سمرہؓ سے یہ فرمایا کہ اچھا اپنے درخت انصاری کو بطور ہدیہ دے دو تمہیں اس کا اجر (بہشت کی نعمتوں کی صورت میں) مل جائے گا۔ گویا آپ ﷺ نے (بطور سفارش) اور رغبت دلانے کے لئے یہ حکم دیا (یا امرا رغبہ کا ترجمہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سمرہؓ سے ترغیب کی ایک بات فرمائی یعنی اپنے درخت کو

بطور ہدیہ دے دینے کا ثواب ذکر فرمایا) لیکن سمرہؓ نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ آخر میں آپ ﷺ نے سمرہؓ سے فرمایا کہ "اس کا یہ مطلب ہے کہ تم (واقعی) اس انصاری کو ضرور تکلیف پہنچانا چاہتے ہو" اور جو شخص کسی کو ضرور تکلیف پہنچائے اس کا دفعیہ چونکہ ضروری ہے اس لئے آپ ﷺ نے انصاری سے فرمایا کہ "تم جاؤ! اور سمرہؓ کے درختوں کو کاٹ پھینکو" (ابوداؤد)

تشریح : آنحضرت ﷺ نے حضرت سمرہؓ کو اپنے درختوں کو انصاری کے ہاتھ فروخت کر دینے یا تبادلہ کر لینے اور ہبہ کرنے کا جو حکم دیا اور انہوں نے وہ حکم نہیں مانا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ نے وہ حکم بطریق وجوب نہیں دیا تھا کہ اس کا ماننا ضروری ہوتا، بلکہ بطور سفارش تھا یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے جو آخری صورت حضرت سمرہؓ کے سامنے رکھی اس میں ثواب کی ترغیب دلائی تھی۔

اگر آنحضرت ﷺ کے اس حکم کا تعلق وجوب سے ہوتا (کہ جس کو ماننا حضرت سمرہؓ کے لئے ضروری ہوتا) تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت سمرہؓ اتنی صفائی کے ساتھ انکار کر دیتے بلکہ وہ ایک فرمانبردار و مطیع صحابی ہونے کے ناطے فوراً مان لیتے۔

اب رہی یہ بات کہ اگر آپ ﷺ نے یہ حکم بطریق وجوب نہیں دیا تھا بلکہ اس کا تعلق سفارش سے تھا تو پھر آپ ﷺ نے انصاری کو حضرت سمرہؓ کے درخت کاٹ ڈالنے کا حکم کیوں دیا؟

اس کا جواب بالکل صاف ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ نے سفارش کے ذریعے اخلاقی طور پر حضرت سمرہؓ کو اس بات پر تیار کرنا چاہا کہ وہ اپنے درختوں سے دست کش ہو جائیں مگر جب سمرہؓ نے دست کشی سے انکار کر دیا تو آپ ﷺ پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ سمرہؓ نے انصاری کے باغ میں عاریۃً درخت لگائے تھے مگر اب نہ وہ ان درختوں کو بیچتے ہیں نہ تبادلہ کرتے ہیں اور نہ ہبہ کرتے ہیں تو گویا وہ واقعۃً انصاری کو ضرر و تکلیف پہنچانا چاہتے ہیں، اس صورت میں یہ ضروری تھا کہ انصاری کو اس ضرر و تکلیف سے نجات دلائی جائے اس لئے اس کی آخری صورت یہی رہ گئی تھی کہ آپ ﷺ ان درختوں کو کاٹ ڈالنے کا حکم دے دیں۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا فِيْ بَابِ الْغَصَبِ بِرِوَايَةِ سَعِيْدِبْنِ زَيْدٍ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ اَبِيْ صِرْمَةَ مَنْ ضَارَّ اَضَرَّ اللّٰهُ بِهٖ فِيْ بَابِ مَايُنْهٰى مِنَ التَّهَاجُرِ۔

اور حضرت جابرؓ کی حدیث مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا الخ بروایت حضرت سعید ابن زیدؓ باب الغصب میں نقل کی جا چکی ہے اور حضرت ابی صرمہ کی حدیث مَنْ ضَارَّ ضَرَّ اللّٰهُ بِهٖ الخ باب ماينهى من التهاجر میں نقل کی جائے گی۔ (یہ دونوں حدیثیں صاحب مصابیح نے یہاں نقل کر رکھی تھیں۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

پانی، نمک اور آگ دینے سے انکار نہ کرو

(۱۶) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الشَّيْئُ الَّذِيْ لَا يَحِلُّ مَنْعُهٗ قَالَ الْمَاءُ وَالْمِلْحُ وَالنَّارُ قَالَتْ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا الْمَاءُ قَدْعَرَفْنَاهُ فَمَا بَالُ الْمِلْحِ وَالنَّارِ قَالَ يَاحُمَيْرَاءُ مَنْ اَعْطٰى نَارًا فَكَاَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِيْعِ مَا اَنْضَجَتْ تِلْكَ النَّارُ وَمَنْ اَعْطٰى مِلْحًا فَكَاَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِيْعِ مَاطَيَّبَتْ تِلْكَ الْمِلْحُ وَمَنْ سَقٰى مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَاءٍ حَيْثُ يُوْجَدُ الْمَاءُ فَكَاَنَّمَا اَعْتَقَ رَقَبَةً وَمَنْ سَقٰى مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَاءٍ حَيْثُ لَا يُوْجَدُ الْمَاءُ فَكَاَنَّمَا اَحْيَاهَا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کونسی چیز ہے جس کو دینے سے انکار کرنا درست نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "پانی، نمک اور آگ" حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! پانی کا معاملہ تو مجھے معلوم ہے (کہ یہ خدا کی ایک ایسی عام نعمت ہے جو کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے اور چونکہ کیا انسان

اور کیا حیوان ساری ہی مخلوق کی ضرورتیں اس سے وابستہ ہیں اس لئے اس سے منع کرنا بہت زیادہ تکلیف وضرر کا باعث بن سکتا ہے) لیکن نمک اور آگ کی بات سمجھ میں نہیں آتی (کہ یہ دونوں چیزیں پانی کے مثل نہیں ہیں اور بظاہر بالکل حقیر و کمتر چیزیں ہیں جن کا دیا جانا اور نہ دیا جانا کیا حیثیت رکھ سکتا ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "حمیراء! (یہ مت سمجھو کہ ان دونوں چیزوں کے دینے یا نہ دینے کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ) جس شخص نے کسی کو آگ دی تو گویا اس نے وہ تمام چیزیں بطور صدقہ دیں جو اس آگ پر پکائی گئیں۔ اسی طرح جس نے کسی کو نمک دیا گویا اس نے وہ تمام چیزیں بطور صدقہ دیں جنہیں اس نمک نے ذائقہ دار بنایا اور پانی کی اہمیت تو تم جانتی ہو۔ لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ جس شخص نے کسی کو اس جگہ کہ جہاں پانی ملتا ہو ایک بار پانی پلایا تو گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا اور جس شخص نے کسی کو اس جگہ کہ جہاں پانی دستیاب نہ ہوتا ہو ایک بار پانی پلایا تو گویا اس نے اس کو (یعنی ایک مسلمان کو) زندہ کر دیا۔" (ابن ماجہ)

تشریح: حضرت عائشہؓ نے چونکہ پانی اہمیت اور اس کی کیفیت حال کو جاننے کا دعویٰ کیا تھا اس لئے آپ ﷺ نے ان کے دعویٰ کو روکنے کے لئے آخر میں پانی دینے اور پلانے کا ثواب اور اس کی فضیلت کو ذکر کرتے ہوئے گویا یہ ظاہر فرمایا کہ تمہیں صرف یہ تو معلوم تھا کہ پانی ایک عام ضرورت کی چیز ہونے کی وجہ سے ایک بڑی اہم نعمت ہے لیکن اس کے بارے میں یہ تفصیل کہ پانی دینے والے کا کیا درجہ ہوتا ہے اور اسے کتنا زیادہ ثواب ملتا ہے تم نہیں جانتی تھیں۔

بَابُ الْعَطَايَا

عطایا کا بیان

"عطایا" لفظ عطیہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں "بخشش" یعنی اپنی کسی چیز کی ملکیت اور اس کے حق تصرف کو کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دینا یا کسی کو اپنی کوئی چیز بلا کسی عوض دے دینا۔ چنانچہ اس باب میں عطایا و بخشش کی تمام قسموں مثلاً وقف، ہبہ، عمریٰ اور رقبی کا ذکر کیا جائے گا۔

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ "عطایا" سے مراد "امراء و سلاطین اور سربراہان مملکت کی بخششیں اور ان کے انعام ہیں"۔

امام غزالیؒ نے منہاج العابدین میں لکھا ہے کہ امراء و سلاطین کی بخششوں اور سرکاری انعامات کو قبول کرنے کے سلسلے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، چنانچہ بعض علماء تو یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ بخشش و انعام کسی ایسے مال کی صورت میں ہو جس کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو تو اسے قبول کر لینا درست ہے، لیکن بعض حضرات کا یہ قول ہے کہ جب تک اس مال کے حلال ہو جانے کا یقین نہ ہو تو اسے قبول نہ کرنا ہی اولیٰ اور زیادہ بہتر ہے کیونکہ موجودہ زمانے میں سلاطین کے پاس اور سرکاری خزانوں میں اکثر و بیشتر غیر شرعی ذرائع سے حاصل ہونے والا مال وزر ہوتا ہے۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ غنی اور فقیر (یعنی مستطیع و مفلس) دونوں کے لئے امراء و سلاطین کے صلے (تحفے وہدایا) حلال ہیں جب کہ ان کا مال حرام ہونا تحقیقی طور پر ثابت نہ ہو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس کا تحفہ قبول فرمایا تھا، اور ایک یہودی سے قرض لیا تھا باوجودیہ کہ یہودیوں کے بارے میں قرآن نے اکالون للسحت (حرام مال کھانے والے) فرمایا ہے۔

اور بعضوں نے یہ کہا ہے کہ جس مال کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو وہ فقیر (مفلس) کے لئے تو حلال ہے لیکن غنی (مستطیع) کے لئے حلال نہیں ہے۔

آخر میں خلاصہ کے طور پر یہ مسئلہ جان لیجئے کہ جو شخص مفلس و نادار ہو اس کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ سلاطین کا مال قبول کرے کیونکہ اگر وہ مال سلطان کی ذاتی ملکیت میں سے ہے تو اس کو لے لینا بلا شبہ درست ہے، اور اگر وہ مال فئی (مال غنیمت) خراج

یا عشر میں سے ہے تو پھر مفلس اس کا حقدار ہی ہے۔ اسی طرح ایسے مال میں (جو فئی اور خراج عشر میں حاصل ہوا ہو) اہل علم کا بھی حق ہے کہ اسے وہ مال لے لینا چاہئے چنانچہ منقول ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا کہ جو شخص برضا و رغبت اسلام میں داخل ہوا اور اس نے قرآن یاد کیا تو وہ بیت المال سے ہر سال دو سو درہم لینے کا حق دار ہے، اگر وہ اپنے اس حق کو دنیا میں نہیں لے گا تو وہ (یعنی اس کا اجر) اسے عقبی میں مل جائے گا۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ مفلس اور عالم دین کو بیت المال سے اپنا حق لے لینا چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضرت عمرؓ کی طرف سے اپنی خیبر کی زمین کا وقف نامہ

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ اَصَابَ اَرْضًا بِخَیْبَرَ فَاَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّی اَصَبْتُ اَرْضًا بِخَیْبَرَ لَمْ اُصِبْ مَالاً قَطُّ اَنْفَسَ عِنْدِیْ مِنْهُ فَمَا تَاْمُرُنِیْ بِهٖ قَالَ اِنْ شِئْتَ حَبَسْتَ اَصْلَهَا وَتَصَدَّقْتَ بِهَا فَتَصَدَّقَ بِهَا عُمَرُ اَنَّهٗ لَا یُبَاعُ اَصْلُهَا وَلَا یُوْهَبُ وَلَا یُوْرَثُ وَتَصَدَّقَ بِهَا فِی الْفُقَرَاءِ وَفِی الْقُرْبٰی وَفِی الرِّقَابِ وَفِی سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَالضَّیْفِ لَا جُنَاحَ عَلٰی مَنْ وَلِیَهَا اَنْ یَّاْکُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوْفِ اَوْیُطْعِمَ غَیْرَ مُتَمَوِّلٍ قَالَ ابْنُ سِیْرِیْنَ غَیْرَ مُتَاَثِّلٍ مَالاً۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ خیبر کی کچھ زمین کہ جس میں کھجوریں پیدا ہوتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کو (مال غنیمت کے حصے کے طور پر) ملی تو وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "یارسول اللہ! میں نے خیبر میں (اپنے حصے کی) ایسی زمین پائی ہے کہ اس سے زیادہ بہتر و عمدہ مال مجھے کبھی نہیں ملا ہے (اور اب میں چاہتا ہوں کہ اس زمین کو اللہ تعالیٰ کی رضاء و خوشنودی میں دے دوں اس لئے) آپ ﷺ مجھے حکم فرمائیے (کہ میں اس بارے میں کیا کروں) آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تم یہی چاہتے ہو تو اصل زمین کو وقف کردو اور اس سے جو کچھ پیدا ہو اسے بطور صدقہ تقسیم کردو۔" چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس زمین کو اس شرط کے ساتھ خدا کی راہ میں دے دیا (یعنی اسے وقف کردیا) کہ اصل زمین کو نہ تو فروخت کیا جائے، نہ ہبہ کیا جائے اور نہ اسے کسی کی میراث قرار دی جائے اور اس کی پیداوار کو بطور صدقہ اس طرح صرف کیا جائے کہ اس سے فقیروں، قرابتداروں کو نفع پہنچایا جائے، غلاموں کی مدد کی جائے (یعنی جس طرح مکاتب کو زکوٰۃ دے دی جاتی ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنے مالک کو بدل کتابت دے کر آزاد ہو جائے اسی طرح اس زمین کی پیداوار سے بھی مکاتب کی اعانت کی جائے) اللہ کی راہ میں یعنی غازیوں اور حاجیوں پر خرچ کیا جائے، مسافروں کی ضرورتیں پوری کی جائیں (باوجودیکہ وہ اپنے وطن میں مال و زر کے مالک ہوں) اور مہمانوں کی مہمانداری کی جائے، اور اس زمین کا متولی بھی بقدر حاجت اس میں سے کھائے یا اپنے اہل و عیال کو (کہ جو مستطیع نہ ہونے کی وجہ سے اس کے زیر کفالت ہوں) کھلائے تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے بشرطیکہ وہ متولی (اس وقف کی آمدنی سے) مالدار نہ بنے (یعنی جو شخص اس زمین کی دیکھ بھال کرنے اور اس کی پیداوار کو مذکورہ بالا لوگوں پر خرچ کرنے کی ذمہ داری پر بطور متولی معمور کیا جائے اگر وہ بھی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے اس زمین کی پیداوار اور آمدنی میں سے کچھ لے لیا کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ہاں اسے اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اس زمین کے ذریعے مالدار و متمول بن جائے چنانچہ ابن سیرینؒ نے (غیر متمول کا مطلب) یہی بیان کیا ہے کہ وہ متولی اس زمین کو اپنے لئے مال و زر جمع کرنے کا ذریعہ نہ بنائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث وقف کے صحیح ہونے کی دلیل ہے چنانچہ تمام مسلمانوں کا بالاتفاق یہ مسلک ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی جائیداد مثلاً زمین و مکان وغیرہ کسی نیک مقصد اور اچھے کام کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضاء و خوشنودی کی راہ میں وقف کر دیتا ہے تو یہ جائز ہے اور وہ

وقف کرنے والا بیشمار اجر و ثواب سے نوازا جاتا ہے، نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وقف جائیداد نہ فروخت کی جاسکتی ہے نہ ہبہ ہوسکتی ہے اور نہ کسی کی میراث بن سکتی ہے۔ یہ حدیث وقف کی فضیلت کو بھی ظاہر کرتی ہے کیونکہ وقف ایک صدقہ جاریہ ہے جس کا ثواب وقف کرنے والے کو برابر ملتا رہتا ہے۔

"خیبر" ایک بستی کا نام ہے جو مدینہ سے تقریباً ۱۰۶ میل شمال میں ایک حرے کے درمیان واقع ہے اس علاقے میں کھجور وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں اس بستی پر مسلمانوں نے "عنوۃ" یعنی بزور طاقت فتح اور غلبہ حاصل کیا تھا، اسی موقع پر غانمین (یعنی مال غنیمت لینے والے) اس کی زمین و باغات کے مالک قرار پائے اور انہوں نے اسے آپس میں تقسیم کیا جس کا ایک حصہ حضرت عمر فاروق ؓ کو بھی ملا، اپنے اسی حصے کی زمین کو انہوں نے اللہ کی راہ میں وقف کر دیا۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وقف کرنے والے کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے اس وقف سے بقدر ضرورت نفع حاصل کرے بایں طور کہ اس آمدنی کا کچھ حصہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی پر خرچ کرے یا اس سے فائدہ اٹھائے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کے مذکورہ وقف نامہ کی شرائط کی گویا توثیق فرما کر وقف کی آمدنی میں سے بقدر ضرورت حصہ اس شخص کے لئے مباح قرار دیا جو اس کا متولی ہو اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ وقف کرنے والا اپنے وقف کا متولی ہوتا ہے۔

نیز اس بات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (ایک موقع پر) یہ فرمایا کہ ایسا کوئی شخص ہے جو بیر رومہ (مدینہ کا ایک کنواں جو ایک یہودی کی ملکیت تھا) خریدے؟ (جو شخص اس کنویں کو خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دے گا تو) اس کنویں میں اس شخص کا ڈول مسلمانوں کے ڈول کی طرح ہوگا (یعنی جس طرح عام مسلمان اس کنویں سے پانی حاصل کریں گے اسی طرح وہ شخص بھی اس سے پانی حاصل کرتا رہے گا) چنانچہ حضرت عثمان ؓ نے اس کنویں کو خرید لیا اور عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔

عمریٰ جائز ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْعُمْرٰی جَائِزَةٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "عمریٰ جائز ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آپس کا لین دین معاشرۂ انسانی کے باہمی ربط و تعلق کے استحکام کا ذریعہ ہے، آپس کے تعلقات، ایک دوسرے سے محبت اور باہمی ارتباط کی خوشگواری و پائیداری آپس کے ہدایا و تحائف پر بھی منحصر ہوتی ہے کیونکہ اس ذریعہ فطرت انسانی ایک خاص قسم کی محبت و مسرت اور جذبہ ممنونیت سے سرشار ہوتی ہے۔ یہ آپس کا لین دین کئی طریقوں سے ہوتا ہے، ہدیہ و تحفہ اور ہبہ کے ساتھ ساتھ ایک صورت "عمریٰ" بھی ہے جو بظاہر ہبہ کی ایک شاخ ہے، چنانچہ حدیث بالا اسی کے جواز کو ظاہر کر رہی ہے۔

عمریٰ کیا ہے؟

ابتداء باب کے حاشیہ میں "عمریٰ" کے معنی بیان کئے جاچکے ہیں، چنانچہ اس موقع پر بھی جان لیجئے کہ عمریٰ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی سے یہ کہے کہ میں نے اپنا یہ مکان تمہیں تمہاری زندگی تک کے لئے دیا۔ یہ جائز ہے، اس صورت میں جب تک وہ شخص (جس کو مکان دیا گیا ہے) زندہ ہے، اس سے وہ مکان واپس نہیں لیا جاسکتا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد وہ مکان واپس لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ عمریٰ کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔

اول یہ کہ کوئی شخص مثلاً اپنا مکان کسی کو دے اور یہ کہے کہ میں نے اپنا یہ مکان تمہیں دے دیا، جب تک تم زندہ رہو گے یہ تمہاری

ملکیت میں رہے گا، تمہارے مرنے کے بعد تمہارے وارثوں اور اولاد کا ہو جائے گا۔ اس صورت کے بارے میں تمام علماء کا بالاتفاق یہ مسلک ہے کہ یہ ہبہ ہے، اس صورت میں مکان مالک کی ملکیت سے نکل جاتا ہے اور جس شخص کو دیا گیا ہے اس کی ملکیت میں آجاتا ہے، اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء اس مکان کے مالک ہو جاتے ہیں، اگر ورثاء نہ ہوں تو بیت المال میں داخل ہو جاتا ہے۔

عمریٰ کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ دینے والا بلا کسی قید و شرط کے یعنی مطلقاً یہ کہے کہ یہ مکان تمہاری زندگی تک تمہارا ہے۔ اس صورت کے بارے میں علماء کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ اس کا بھی حکم وہی ہے جو پہلی صورت کا حکم ہے۔ چنانچہ حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کا قول بھی یہی ہے۔ لیکن بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں وہ مکان اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کا حق نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک (یعنی جس نے اس شخص کو دیا تھا) کی ملکیت میں واپس آجاتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ دینے والا یوں کہے کہ یہ مکان تمہاری زندگی تک تمہارا ہے، تمہارے مرنے کے بعد میری اور میرے وارثوں کی ملکیت میں آجائے گا"۔ اس صورت کے بارے میں بھی زیادہ صحیح یہی بات ہے کہ اس کا حکم بھی وہی ہے جو پہلی صورت ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ شرط کہ "تمہارے مرنے کے بعد میری اور میرے وارثوں کی ملکیت میں آجائے گا" فاسد ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ کسی فاسد شرط کی وجہ سے ہبہ فاسد نہیں ہوتا۔

حضرت امام شافعیؒ کا بھی زیادہ صحیح قول یہی ہے، لیکن حضرت امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ عمریٰ کی یہ صورت ایک فاسد شرط کی وجہ سے فاسد ہے۔

عمریٰ کے بارے میں حضرت امام مالکؒ کا یہ قول ہے کہ اس کی تمام صورتوں میں بنیادی مقصد دی جانے والی چیز کی منفعت کا مالک کرنا ہوتا ہے۔

عمریٰ معمرلہ، کے ورثاء کی ملکیت بن جاتا ہے

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْعُمْرٰى مِيْرَاثٌ لِاَهْلِهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "عمریٰ اپنے مالک (یعنی معمرلہ) کے ورثاء کی میراث ہو جاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "معمرلہ" اس شخص کو کہتے ہیں جسے بطور عمریٰ کوئی چیز دی جاتی ہے، چنانچہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو مثلاً کوئی مکان بطور عمریٰ دیا جاتا ہے۔ وہ مکان اس کی زندگی تک تو اس کی ملکیت رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء کی ملکیت بن جاتا ہے، گویا یہ حدیث اپنے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے جمہور علماء کے مسلک کی دلیل ہے۔

(۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ اُعْمِرَ عُمْرٰى لَهٗ وَلِعَقِبِهٖ فَاِنَّهَا لِلَّذِيْ اُعْطِيَهَا لَا تَرْجِعُ اِلَى الَّذِيْ اَعْطَاهَا لِاَنَّهٗ اَعْطٰى عَطَاءً وَقَعَتْ فِيْهِ الْمَوَارِيْثُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر کسی شخص اور اس کے ورثاء کو کوئی چیز بطور عمریٰ دی جاتی ہے تو وہ عمریٰ اسی شخص کا ہو جاتا ہے جسے وہ دیا گیا ہے (یعنی وہ چیز اس کی ملکیت ہو جاتی ہے) عمریٰ دینے والے کی ملکیت میں واپس نہیں آتا کیونکہ دینے والے نے اس طرح دیا ہے کہ اس میں میراث جاری ہو جاتی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز کسی شخص کو بطور عمریٰ دی جاتی ہے وہ اس شخص کی ہو جاتی ہے، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کی ملکیت میں چلی جاتی ہے دینے والے کی ملکیت میں واپس نہیں آتی۔ حضرت ابوہریرہؓ کی جو روایت (۲) اوپر گذری ہے اس کی تشریح کے ضمن میں عمریٰ کی تین صورتیں بیان کی گئی تھیں۔ اس حدیث میں انہیں سے پہلی صورت کا بیان ہے۔ اس بارے میں جو

فقہی اختلاف ہے اس کی تفصیل وہاں ذکر کی جاچکی ہے۔

مسلک جمہور کے خلاف حضرت جابرؓ کی روایت اور اس کی تاویل

⑤ وَعَنْهُ قَالَ اِنَّمَا الْعُمْرٰى الَّتِىْ اَجَازَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَقُوْلَ هِىَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ فَاَمَّا اِذَا قَالَ هِىَ لَكَ مَاعِشْتَ فَاِنَّهَا تَرْجِعُ اِلٰى صَاحِبِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے عمریٰ کی جس صورت کو جائز قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ مالک (یعنی دینے والا) یوں کہے کہ "یہ چیز (تمہاری زندگی تک) تمہاری ہے اور (تمہارے مرنے کے بعد) تمہارے ورثاء کی ہے! اور اگر صرف یوں کہے کہ "یہ عمریٰ تمہاری زندگی تک تمہارے لئے ہے" تو اس صورت میں (اس شخص کے مرنے کے بعد) وہ عمریٰ مالک (یعنی دینے والے) کی ملکیت میں واپس آجائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث بظاہر جمہور علماء کے مسلک کے خلاف ہے اور جمہور علماء کا مسلک حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کی تشریح میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ لہٰذا جمہور علماء اس حدیث کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مرفوع نہیں ہے یعنی یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں ہے بلکہ خود حضرت جابرؓ کا اپنا قول ہے جو ان کی اپنی رائے اور اپنے اجتہاد پر مبنی ہے۔ اس صورت میں اس قول کا جمہور علماء کے مسلک پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

عمریٰ اور رقبیٰ سے آنحضرت ﷺ کی ممانعت اور اس کی وضاحت

⑥ عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُرْقِبُوْا وَلَا تُعْمِرُوْا فَمَنْ اُرْقِبَ شَيْئًا اَوْ اُعْمِرَ فَهِىَ لِوَرَثَتِهٖ۔

(رواہ ابوداؤد)

"حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "رقبیٰ کرو اور نہ عمریٰ کرو، کیونکہ جو چیز (یعنی مثلاً مکان یا زمین) بطور رقبیٰ یا بطور عمریٰ دی جاتی ہے وہ اس کے ورثاء کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: عمریٰ کی طرح "رقبیٰ" بھی ہبہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس کی وضاحت بھی ابتداء باب کے حاشیہ میں کی جاچکی ہے۔ چنانچہ رقبیٰ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے یہ کہے کہ میں اپنا مکان تمہیں اس شرط کے ساتھ دیتا ہوں کہ اگر میں تم سے پہلے مرگیا تو یہ مکان تمہاری ملکیت میں رہے گا اور اگر تم مجھ سے پہلے مرگئے تو پھر یہ میری ملکیت میں آجائے گا۔ رقبیٰ مشتق ہے "ارقاب" سے جو مراقبہ کے معنی میں ہے گویا رقبیٰ میں ہر ایک دوسرے کی موت کا منتظر رہتا ہے۔

اس حدیث میں عمریٰ اور رقبیٰ سے منع کیا گیا ہے، اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ تم جو چیز بطور عمریٰ یا رقبیٰ کسی کو دیتے ہو وہ اس شخص کی ملکیت میں چلی جاتی ہے اور تمہاری ملکیت چونکہ کلیۃً ختم ہوجاتی ہے اس لئے اس شخص کے مرنے کے بعد وہ چیز اس کے ورثاء کی ملکیت میں منتقل ہوجاتی ہے، لہٰذا تم اپنے مال کو بطور عمریٰ یا رقبیٰ اپنی ملکیت سے نکال کر اپنا نقصان نہ کرو۔

اب رہی یہ بات کہ جب پہلے ہمیں یہ معلوم ہوچکا ہے کہ عمریٰ اور رقبیٰ جائز ہیں تو پھر اس ممانعت کا محمول کیا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو یہ ممانعت اس وقت فرمائی گئی ہوگی جب یہ دونوں جائز نہیں تھے، اس صورت میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ یا پھر اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ عمریٰ اور رقبیٰ اگرچہ مصلحت کے خلاف ہیں لیکن جب یہ وقوع پذیر ہوجاتے ہیں (یعنی کسی کو کوئی چیز بطور عمریٰ یا رقبیٰ دے دی جاتی ہے) تو شرعی طور پر یہ صحیح ہوجاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز نہ صرف اس کی ملکیت میں آجاتی ہے کہ جس کو دی گئی ہے بلکہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء کی ملکیت میں پہنچ جاتی ہے۔ اس صورت میں اس

حدیث کو منسوخ قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔
عمریٰ کے بارے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ حنفیہ کے ہاں جائز ہے لیکن رقبیٰ کے بارے میں ملا علی قاریؒ یہ لکھتے ہیں کہ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک تو جائز نہیں ہے لیکن حضرت امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق جائز ہے۔
حنفی علماء میں سے بعض شارحین حدیث نے اس حدیث کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ نہی (ممانعت) ارشادی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنا مال کسی مدت متعینہ تک کے لئے ہبہ نہ کرو، کہ جب وہ مدت پوری ہو جائے تو اپنا مال واپس لے لو، کیونکہ جب تم اپنی کوئی چیز کسی کو دے دو تو وہ تمہاری ملکیت سے نکل گئی اب وہ تمہاری ملکیت میں نہیں آئے گی خواہ تم وہ چیز ہبہ کی صراحت کر کے دو یا عمریٰ و رقبیٰ کے طور پر دو۔

عمریٰ اور رقبیٰ جائز ہے

⑦ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْعُمْرٰى جَائِزَةٌ لِاَهْلِهَا وَالرُّقْبٰى جَائِزَةٌ لِاَهْلِهَا (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد)
"اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "عمریٰ، عمریٰ والوں کے لئے جائز ہے (یعنی جس شخص کو کوئی چیز بطور عمریٰ دی گئی وہ اس کے لئے جائز ہے، اور رقبیٰ، رقبیٰ والوں کے لئے جائز ہے (یعنی جو چیز بطور رقبیٰ کسی کو دی گئی وہ اس کے لئے جائز ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جواز عمریٰ کی بظاہر مخالف ایک اور حدیث

⑧ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمْسِكُوْا اَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ لَا تُفْسِدُوْهَا فَاِنَّهٗ مَنْ اَعْمَرَ عُمْرٰى فَهِيَ لِلَّذِيْ اُعْمِرَ حَيًّا وَمَيِّتًا وَلِعَقِبِهٖ۔ (رواہ مسلم)
"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم اپنے مال اپنے پاس رکھو ان میں نقصان پیدا نہ کرو، کیونکہ جو شخص کسی کو اپنی کوئی چیز عمریٰ کے طور پر دیتا ہے تو وہ چیز (یعنی مکان یا زمین) کہ جو بطور عمریٰ دی گئی ہے زندگی و موت دونوں حالت میں اس شخص کی ملکیت رہتی ہے جسے وہ چیز بطور عمریٰ دی گئی ہے (بایں طور کہ جب تک وہ زندہ رہتا ہے تو خود اس چیز کا مالک رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد) پھر اس کی اولاد مالک ہو جاتی ہے۔" (مسلمؒ)
تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم کے پیش نظر عمریٰ کے جواز میں اشکال پیدا ہو سکتا ہے لیکن دوسری فصل کی حدیث نمبر ۶ کی وضاحت اگر پیش نظر رہے تو یہ اشکال ختم ہو جائے گا کیونکہ اس حدیث کی تاویل بھی وہی ہے جو اس حدیث کی بیان کی گئی ہے۔

بَاب

گذشتہ باب کے متعلقات کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خوشبودار پھول کا تحفہ واپس نہ کرو

① عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عُرِضَ عَلَيْهِ رَيْحَانٌ فَلَا يَرُدُّهٗ فَاِنَّهٗ خَفِيْفُ

الْمَحْمَلِ طَيِّبُ الرِّيحِ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو خوشبودار پھول (تحفہ کے طور پر) دیا جائے تو وہ اسے واپس نہ کرے کیونکہ (اول تو) وہ سبکسار (یعنی بہت ہلکا احسان) ہے اور (دوسرے یہ کہ) وہ ایک اچھی خوشبو ہے۔" (مسلم)

تشریح: یہی حکم کہ اسے واپس نہ کیا جائے ہر اس تحفہ کا ہے جو بظاہر کم تر ہونے کی وجہ سے زیادہ احسان نہ رکھتا ہو مگر نفع و خوشگواری کے اعتبار سے بہت مفید اور نافع ہو، تاکہ جس شخص نے وہ تحفہ دیا ہے اس کی دل شکنی نہ ہو۔

(۲) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَرُدُّ الطِّيبَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ خوشبو (کے تحفے) کو واپس نہیں کیا کرتے تھے۔" (بخاریؒ)

کسی کو کوئی چیز دے کر پھر واپس لے لینا ایک بری مثال ہے

(۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَائِدُ فِي هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِي قَيْئِهٖ لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اپنے ہبہ کو واپس لینے والا (یعنی کسی کو کوئی چیز بطور ہدیہ و تحفہ دے کر پھر اسے واپس لے لینے والا) اس کتے کی طرح ہے جو اپنی قے چاٹتا ہے اور ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم کسی بری مثال سے تشبیہ دیئے جائیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ملت اور ہماری قوم جس عزو شرف کی حامل ہے اور اسے انسانیت کے جن اعلیٰ اصول اور شرافت و تہذیب کے جس بلند معیار سے نوازا گیا ہے اس کے پیش نظر ہماری ملت و قوم کے کسی بھی فرد کے لئے یہ بات قطعًا مناسب نہیں ہے کہ وہ کوئی بھی ایسا کام کرے جو اس کے ملی شرف اور اس کی قومی عظمت کے منافی ہو اور اس کی وجہ سے اس پر کوئی بری مثال چسپاں کی جائے۔

اس سے گویا آپ ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ کسی کو کوئی چیز بطور ہدیہ و تحفہ دے کر واپس لینا چونکہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کتا اپنی قے چاٹ لیتا ہے اس لئے کسی مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنی کوئی چیز ہدیہ کرے اور پھر اسے واپس لے لے اور اس طرح اس پر یہ بری مثال چسپاں کی جانے لگے۔

یہ تو حدیث کی وضاحت اور اس سے پیدا ہونے والا ایک اخلاقی اور نفسیاتی پہلو تھا۔ لیکن اس کا فقہی اور شرعی پہلو یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق کسی کو کوئی چیز بطور ہبہ یا بطور صدقہ دینا اور پھر لینے والے کے قبضے میں اس چیز کے چلے جانے کے بعد اس کو واپس لے لینا جائز تو ہے مگر مکروہ ہے البتہ بعض صورتوں میں جائز نہیں ہے۔ جس کی تفصیل دوسری فصل کی پہلی حدیث کے ضمن میں ذکر کی جائے گی اور اس بارے میں ایک حدیث بھی منقول ہے۔

یہاں مذکورہ حدیث کے بارے میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ یہ کراہت پر محمول ہے اور اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لے لینا بے مروتی اور غیر پسندیدہ بات ہے لیکن بقیہ تینوں آئمہ یعنی حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک چونکہ یہ حدیث حرمت پر محمول ہے اس لئے ان تینوں کا مسلک یہ ہے کہ ہدیہ اور صدقہ دے کر واپس لے لینا جائز نہیں ہے، البتہ حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو کوئی چیز ہبہ کرے تو وہ اس سے واپس لے سکتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت امام احمدؒ کا قول بھی یہی ہے اور آگے آنے والی بعض احادیث بھی ان پر دلالت کرتی ہیں لیکن ان احادیث کے جو معنی حنفیہ نے مراد لئے ہیں وہ بھی آگے مذکور ہوں گے۔

کوئی چیز دینے میں اولاد کے درمیان فرق و امتیاز نہ کرو

④ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ اَنَّ اَبَاهُ اَتٰى بِهٖ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ نَحَلْتُ ابْنِيْ هٰذَا غُلَامًا فَقَالَ اَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَ مِثْلَهٗ قَالَ لَا قَالَ فَارْجِعْهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَالَ اَيَسُرُّكَ اَنْ يَكُوْنُوْا اِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً قَالَ بَلٰى قَالَ فَلَا اِذًا وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَالَ اَعْطَانِيْ اَبِيْ عَطِيَّةً فَقَالَتْ عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ لَا اَرْضٰى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ اَعْطَيْتُ ابْنِيْ مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِيَّةً فَاَمَرَتْنِيْ اَنْ اُشْهِدَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَعْطَيْتَ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ هٰذَا؟ قَالَ لَا قَالَ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ قَالَ فَرَجَعَ فَرَدَّ عَطِيَّتَهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَالَ لَا اُشْهِدُ عَلٰى جَوْرٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ (ایک دن) ان کے والد (حضرت بشیر) انہیں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ میں نے اپنے اس بیٹے (نعمانؓ) کو ایک غلام عطا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم نے اپنے سب بیٹوں کو اسی طرح ایک ایک غلام دیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر (نعمان سے بھی) اس غلام کو واپس لے لو"۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے (نعمانؓ کے والد سے) فرمایا کہ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمہارے سب بیٹے تمہاری نظر میں نیکی کے اعتبار سے یکساں ہوں (یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو ، کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمہارے سب بیٹے تمہاری نظر میں نیکی کے اعتبار سے یکساں ہوں یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے سب بیٹے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں اور سب ہی تمہاری فرمانبرداری اور تمہاری تعظیم کریں؟ انہوں نے کہا کہ "ہاں!" آپ ﷺ نے عرض کیا کہ "اس صورت میں (جب کہ تم نے اپنے تمام بیٹوں سے اپنے تئیں یکساں اچھے سلوک کے خواہشمند ہو تو) صرف اپنے ایک بیٹے (نعمانؓ) کو غلام نہ دو۔ ایک اور روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ "حضرت نعمانؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میرے والد نے مجھے ایک چیز دی تو عمرہ بنت رواحہ (میری والدہ) نے (میرے والد حضرت بشیرؓ سے) کہا کہ میں اس پر اس وقت تک رضامند نہیں ہوں جب تک کہ تم اس (ہبہ) پر رسول کریم ﷺ کو گواہ نہ بنالو، چنانچہ حضرت بشیرؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میں نے اپنے بیٹے (نعمانؓ) کو جو عمرہ بنت رواحہ کے بطن سے ہے ایک چیز دی ہے اور عمرہ بنت رواحہ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اس ہبہ پر آپ ﷺ کو گواہ بنالوں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ "جس طرح تم نے اپنے اس بیٹے کو ایک غلام دیا ہے کیا اسی طرح اپنے سب بیٹوں کو بھی ایک ایک غلام دیا ہے؟" انہوں نے کہا کہ "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو!" حضرت نعمانؓ کہتے ہیں کہ میرے والد (آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سن کر) واپس آئے اور مجھے جو چیز دی تھی وہ واپس لے لی۔"

"ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ "آپ ﷺ نے (حضرت بشیرؓ کی یہ بات سن کر) فرمایا کہ "میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا"۔ (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کے درمیان فرق وامتیاز کرنا انتہائی نامناسب بات ہے، چنانچہ ارشاد گرامی کی روشنی میں یہ مستحب ہے کہ کوئی چیز اپنے کسی ایک بیٹے، بیٹی کو نہ دی جائے بلکہ وہ چیز برابری کے طور پر سب بیٹے بیٹیوں کو دی جائے۔

حضرت بشیرؓ کو آنحضرت ﷺ کا یہ حکم کہ "اس غلام کو واپس لے لو" اولویت پر محمول ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس غلام کو واپس لے لینا ہی اولیٰ اور زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد میں بعضوں کو کچھ دے تو اس کا ہبہ صحیح ہوگا مگر کراہت کے ساتھ۔

اس کے برعکس حضرت امام احمدؒ، ثوریؒ اور اسحٰقؒ وغیرہ کے نزدیک یہ حرام ہے، آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی لَا اُشْهِدُ عَلٰى جَوْرٍ

(میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا) ان حضرات کی دلیل ہے جب کہ اول الذکر یعنی حضرت امام ابوحنیفہ آپ ﷺ کے ان الفاظ مبارک سے استدلال کرتے ہیں جو ایک روایت میں منقول ہیں کہ فَاشْهِدْ عَلٰى هٰذَا غَيْرِي یعنی آپ ﷺ نے بشیرؓ سے کہا کہ تم اس بارے میں میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بنالو۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اگر یہ ہبہ (یعنی حضرت بشیرؓ کا اپنے ایک بیٹے کو غلام دینا) حرام یا باطل ہوتا تو آپ ﷺ یہ نہ فرماتے کہ کسی اور کو گواہ بنالو۔ کیونکہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بشیرؓ کا یہ ہبہ بہرحال صحیح اور جائز تھا لیکن چونکہ غیر پسندیدہ اور مکروہ تھا اس لئے آپ ﷺ نے خود گواہ بننا مناسب نہیں سمجھا اور یہ فرمادیا کہ کسی اور کو گواہ بنالو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ہبہ واپس لے لینا مناسب نہیں ہے

⑤ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْجِعُ اَحَدٌ فِيْ هِبَتِهِ اِلَّا الْوَالِدُ مِنْ وَلَدِهٖ۔

(رواه النسائی وابن ماجة)

"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص اپنا ہبہ واپس نہ لے (یعنی ہبہ واپس لے لینا مناسب نہیں ہے) ہاں باپ بیٹے سے (ہبہ واپس لے سکتا ہے۔" (نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یہ حدیث امام شافعیؒ کی دلیل ہے کیونکہ ان کے ہاں ہبہ واپس لے لینا جائز نہیں ہے لیکن باپ اپنے بیٹے سے اپنا ہبہ واپس لے سکتا ہے۔

حضرت امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ "باپ اپنے بیٹے سے اپنا ہبہ واپس لے سکتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی باپ ضرورت وحاجت کے وقت اپنی اولاد کے مال و زر میں سے کچھ لے کر اپنے اوپر صرف کرسکتا ہے اسی طرح جو چیز اس نے اپنے بیٹے کو بطور ہبہ دی ہے بوقت ضرورت اس کو لے کر اپنے مصرف میں لاسکتا ہے۔

سات صورتوں میں ہبہ واپس لے لینا جائز نہیں ہے

یہ بات پہلے بتائی جاچکی ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں ہبہ واپس لے لینا جائز ہے لیکن مکروہ ہے، چنانچہ جن احادیث سے ہبہ واپس لے لینے کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے وہ ان کو کراہت پر محمول کرتے ہیں، ہاں ہبہ کی سات صورتیں ایسی ہیں جن میں امام اعظمؒ کے نزدیک بھی اپنا ہبہ واپس لے لینا جائز نہیں ہے۔

چنانچہ فقہ کی بعض کتابوں میں سات حرفوں کے اس مجموعے دمع خزقہ سے ان ساتوں صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بایں طور کہ اس مجموعہ کا ہر حرف ایک صورت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی تفصیلی وضاحت یہ ہے کہ حرف دال سے مراد "زیادتی متصلہ" ہے۔ یعنی جس ہبہ میں کسی چیز کا اضافہ ہوگیا ہو یا اس میں کوئی چیز ملالی گئی ہو تو اس ہبہ کی واپسی درست نہیں۔

مثال کے طور پر اس صورت کو یوں سمجھئے کہ زید نے بکر کو زمین کا ایک ایسا قطعہ ہبہ کیا جس میں نہ کوئی عمارت تھی اور نہ درخت وغیرہ تھے اب بکر نے اس زمین میں کوئی عمارت بنالی یا اس میں کوئی درخت وغیرہ لگالئے تو اس صورت میں ہبہ کرنے والے یعنی زید کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ اپنا ہبہ یعنی اس زمین کو واپس لے لے۔

حرف میم "واہب یا موہوب لہ کی موت" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فرض کیجئے حسن نے نعیم کو اپنی کوئی چیز ہبہ کردی اور پھر حسن مرگیا، تو اب حسن کے ورثاء کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ موہوب لہ یعنی نعیم سے اس چیز کی واپسی کا مطالبہ کریں جو حسن

نے اس کو ہبہ کی تھی یا اگر نعیم مرجائے تو واہب یعنی حسن کو یہ حق نہیں پہنچے گا کہ وہ نعیم کے ورثاء سے اس چیز کے بارے میں کسی قسم کا کوئی مطالبہ کرے جو اس نے نعیم کو ہبہ کردی تھی۔

حرف ع سے اشارہ ہے "ہبہ بالعوض" کی طرف یعنی اگر کوئی شخص کسی کو اپنی کوئی چیز کسی چیز کے عوض میں ہبہ کرے تو واہب کو اپنے اس ہبہ کو واپس لے لینے کا حق نہیں پہنچتا۔

حرف خ سے اشارہ ہے "خروج کی طرف یعنی اگر موہوب، موہوب لہ کی ملکیت سے نکل گئی بایں طور کہ اس نے وہ چیز یا تو کسی کے ہاتھ فروخت کردی یا کسی کو دے ڈالی تو اس صورت میں واہب، موہوب لہ سے اس چیز کا تقاضہ کر کے نہیں لے سکتا۔

حرف ز سے "زوجین" کی طرف اشارہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی کو یا بیوی اپنے خاوند کو کوئی چیز ہبہ کردے تو وہ ایک دوسرے سے اس چیز کو واپس نہیں لے سکتے۔

حرف ق سے قرابت (رشتہ داری) کی طرف اشارہ ہے اور قرابت بھی وہ جس میں محرمیت ہو۔ یعنی اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو یا کوئی بیٹا اپنے باپ کو، یا ماں کو، یا دادا کو، یا نانا کو، یا بھائی کو، یا بہن کو اور یا کسی بھی ایسے عزیز کو کہ جس سے محرمیت کی قرابت ہو، اپنی کوئی چیز ہبہ کردے تو اس ہبہ کو واپس لے لینا اس کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

اور حرف ہ سے موہوب کے ہلاک وضائع ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اگر موہوب (وہ چیز جو ہبہ کی گئی تھی) موہوب لہ کے پاس سے ہلاک یا ضائع ہوگئی تو واہب کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ موہوب لہ سے اس کی واپسی کا مطالبہ کرے۔

کسی کو کوئی چیز دے کر پھر واپس لے لینا مروت کے خلاف ہے

(۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ اَنْ يُعْطِيَ عَطِيَّةً ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْهَا اِلَّا الْوَالِدِ فِيْمَا يُعْطِيْ وَلَدَهُ وَمَثَلُ الَّذِيْ يُعْطِي الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْهَا كَمَثَلِ الْكَلْبِ اَكَلَ حَتّٰى اِذَا شَبِعَ قَاءَ ثُمَّ عَادَ فِيْ قَيْئِهٖ۔ (رواه ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ وصححہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "کسی شخص کے لئے یہ حلال نہیں ہے (یعنی از راہ مروت یہ بات مناسب نہیں ہے) کہ وہ کسی کو اپنی کوئی چیز دے اور پھر اس کو واپس لے لے، البتہ باپ اپنی اس چیز کو واپس لے سکتا ہے جو وہ اپنے بیٹے کو دے! اور جو شخص کسی کو کچھ دے کر پھر واپس لے لیتا ہے اس کی مثال اس کتے کی سی ہے جس نے (پیٹ بھر کر) کھایا اور جب اس کا پیٹ بھر گیا تو قے کرڈالی اور پھر اس قے کو چاٹنے لگا۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائی، ابن ماجہؒ) امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

تحفہ کا بدلہ تحفہ

(۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ اَعْرَابِيًّا اَهْدٰى لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكْرَةً فَعَوَّضَهٗ مِنْهَا سِتَّ بَكَرَاتٍ فَتَسَخَّطَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ فُلَانًا اَهْدٰى اِلَيَّ نَاقَةً فَعَوَّضْتُهٗ مِنْهَا سِتَّ بَكَرَاتٍ فَظَلَّ سَاخِطًا لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ لَا اَقْبَلَ هَدِيَّةً اِلَّا مِنْ قُرَشِيٍّ اَوْ اَنْصَارِيٍّ اَوْ ثَقَفِيٍّ اَوْ دَوْسِيٍّ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی رسول کریم ﷺ کے لئے بطور ہدیہ ایک جوان اونٹنی لے کر آیا، چنانچہ آپ ﷺ نے بھی اس دیہاتی کو اس ایک اونٹنی کے بدلے میں چھ جوان اونٹنیاں عطا فرمائیں لیکن وہ دیہاتی پھر بھی خوش نہ ہوا۔ جب آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے پہلے خدا کی حمد وثنا بیان کی (جیسا کہ آپ ﷺ کا معمول تھا آپ ﷺ جب خطبہ دیتے یا کوئی بات شروع کرتے تو پہلے خدا کی حمد وثنا بیان فرماتے) بعد ازاں آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں شخص بطور ہدیہ میرے لئے ایک اونٹنی لایا تھا، میں نے بھی اس کے

بدلے میں اس کو چھ اونٹنیاں دیں مگر وہ پھر بھی ناخوش رہا، چنانچہ میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ اب میں قریشی، ثقفی اور دوسی کے علاوہ اور کسی کا کوئی ہدیہ قبول نہ کروں۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اگر آپ کسی کو اپنی کوئی چیز بطور ہدیہ و تحفہ دیں تو اس کے عوض وبدلہ کی توقع رکھنا آپ کے خلوص کے منافی ہوگا لیکن اگر آپ کو کوئی شخص اپنی کوئی چیز بطور تحفہ وہدیہ دے تو کسی بھی صورت میں آپ کی طرف سے اس کے بدلے کی ادائیگی آپ کی عالی ہمتی، بلند حوصلگی اور آپ کے احساس مروت و محبت کے عین مطابق ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کو جب کوئی صحابی اپنی کوئی چیز بطور ہدیہ دیتے تھے تو اس کا بدلہ ملنے کی ہلکی سی خواہش بھی ان کے ذہن میں نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ان کا ہدیہ سراپا خلوص اور ہمہ تن نیازمندی کا ایک اظہار محبت ہوتا تھا جو اپنے دامن میں کسی مادی خواہش کا ادنی سا شائبہ بھی نہیں آنے دیتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب بھی کوئی شخص آپ ﷺ کی خدمت میں کوئی چیز بطور ہدیہ پیش کرتا تو آپ ﷺ کسی نہ کسی صورت میں اس کو اس کا بدلہ اس سے کہیں زیادہ کر کے عطا فرماتے تھے۔ اور آپ ﷺ کا یہ معمول صرف آپ ﷺ کے جذبہ سخاوت وفیاضی اور آپ ﷺ کی عالی ہمتی نیز باہمی ربط و تعلق کے ایک عظیم جذبہ کا مظہر ہوتا تھا۔

چنانچہ جب ایک دیہاتی آپ ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ ایک اونٹنی لے کر آیا تو آپ ﷺ نے حسب معمول اس کے ہدیہ سے کئی گنا زیادہ بدلہ یعنی چھ جوان اونٹنیاں اسے دیں، مگر اس پر بھی وہ خوش نہیں ہوا یہ بات یقیناً بڑی عجیب تھی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بظاہر وہ اپنے ہدیہ میں گویا مخلص نہیں تھا، اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں اونٹنی اس لئے لے کر آیا تھا کہ آپ ﷺ اسے بدلہ دیں اور بدلہ بھی ایسا جو اس کی خواہش کے مطابق ہو چنانچہ جب آپ ﷺ نے اسے چھ اونٹنیاں دیں تو وہ اس پر خوش نہیں ہوا اور اس طرح اس نے دنیاوی مال میں اپنے جذبہ حرص کا اظہار کیا، چنانچہ اس کی یہ بات آنحضرت ﷺ کو اتنی ناگوار ہوئی کہ آپ ﷺ کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ میں نے قریشی، انصاری، ثقفی اور دوسی کے علاوہ اور کسی کا ہدیہ قبول نہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

قریشی ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کا تعلق قبیلہ قریش سے ہے اور "انصاری" سے مراد انصار مدینہ ہیں۔ ثقفی اور دوسی دو قبیلوں کے نام ہیں۔ آپ ﷺ نے ان قبیلوں کو بطور خاص اس لئے ذکر کیا اور ان کا استثناء کیا کہ یہ قبیلے عالی ہمتی، بلند حوصلگی اور سخاوت وفیاضی میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ أُعْطِيَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْيَجْزِبِهِ وَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُثْنِ فَإِنَّ مَنْ أَثْنٰى فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ وَمَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو کوئی چیز (بطور ہدیہ) دی جائے اور وہ اس کا بدلہ دینے پر قادر ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس کا بدلہ دے اور جو شخص بدلہ دینے پر قادر نہ ہو تو وہ ہدیہ دینے والے کی تعریف و توصیف کرے (اور اس کے دیئے ہوئے ہدیہ کا اظہار کرے) کیونکہ جس شخص نے اپنے محسن کی تعریف کی اس نے گویا اس کا شکر ادا کیا (یعنی فی الجملہ اس کا بدلہ اتارا) اور جس شخص نے کسی کا احسان چھپایا (یعنی نہ تو اس نے کچھ دے کر اور نہ تعریف کر کے اس کا بدلہ اتارا) تو اس نے کفران نعمت کیا اور (یاد رکھو) جو شخص اپنے آپ کو کسی ایسی چیز سے آراستہ کرے جو اسے نہیں دی گئی ہے تو اس کی مثال جھوٹ موٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی سی ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: محسن کی تعریف کرنے کو اس کا شکر ادا کرنے کا قائم مقام اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ تعریف دراصل شکر ہی کی ایک شاخ ہے۔ کیونکہ شکر کا مفہوم ہے "دل میں محبت رکھنا، زبان سے تعریف کرنا اور ہاتھ پاؤں سے خدمت کرنا۔"

حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے اندر کسی ایسے دینی یا دنیاوی کمال وصفت کا اظہار کرے جو درحقیقت اس میں نہیں ہے تو وہ جھوٹ موٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی مانند ہے۔ جھوٹ موٹ کے دو کپڑے پہننے والے سے مراد وہ شخص ہے جو علماء

اور صلحاء کا لباس پہن کر اپنے آپ کو عالم وصالح ظاہر کرے حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے نہ وہ عالم ہو اور نہ صالح ہو۔
اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو کوئی ایسا پیراہن پہنے جس کی آستینوں کے نیچے مزید دو آستینیں لگائے تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ اس نے دو پیراہن پہن رکھے ہیں۔
اور بعضوں نے یہ کہا ہے کہ عرب میں ایک شخص تھا جو انتہائی نفیس قسم کے دو کپڑے پہنتا تھا تاکہ لوگ اسے عزت دار اور باحیثیت سمجھیں اور جب وہ کوئی جھوٹی گواہی دے تو اس کی اس ظاہری پوشاک کو دیکھ کر اسے جھوٹا نہ سمجھیں۔ آپ ﷺ نے اسی شخص کے ساتھ اس شخص کو تشبیہ دی جو اپنے آپ کو کسی ایسے کمال کا حامل ظاہر کرے جو اس کے اندر نام ونشان کو بھی موجود نہ ہو۔

محسن کے لئے دعاء اجر و خیر

⑨ وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صُنِعَ اِلَيْهِ مَعْرُوْفٌ فَقَالَ لِفَاعِلِه جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا فَقَدْ اَبْلَغَ فِى الثَّنَاءِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت اسامہ ابن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کے ساتھ کوئی احسان کیا جائے اور وہ احسان کرنے والے کے حق میں یہ دعا کرے جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا (یعنی اللہ تعالیٰ تجھے اس کا بہتر بدلہ دے) تو اس نے اپنے محسن کی کامل تعریف کی۔"
(ترمذیؒ)

تشریح: "کامل تعریف کی" یعنی اس نے اپنے محسن کے حق میں یہ دعائیہ الفاظ کہہ کر گویا اس کے تئیں ادائیگی شکر کا حق ادا کر دیا کیونکہ اس نے اپنے محسن کا بدلہ اتارنے اور اس کی تعریف کرنے میں اپنے قصور و کوتاہی کا اعتراف اور اپنے عاجز ہونے کا اقرار کر کے اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دیا کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا اور آخرت میں پورا پورا اجر عطا فرمائے اور ظاہر ہے کہ اللہ کے اجر سے بہتر اجر کون دے سکتا ہے۔

راہ استقامت کا سنگ میل

جلیل القدر بزرگ اور شیخ باکمال حضرت عبدالوہاب متقیؒ فرمایا کرتے تھے کہ صوفی کو چاہئے کہ وہ مخلوق خدا کے دینے یا نہ دینے دونوں ہی صورتوں میں دائرہ استقامت سے نہ نکلے اور نہ راہ حق سے قدم کو بھٹکنے دے۔ اگر کوئی فاسق و نااہل شخص اسے کچھ (بطور ہدیہ) دے تو وہ اس کی اتنی تعریف نہ کرے کہ اسے صالح اور ولی کی صف میں کھڑا کر دے بلکہ اس کے حق میں یہ دعائیہ الفاظ کہے کہ "اللہ تعالیٰ اسے جزاء خیر عطا کرے"۔ اور اگر اسے کسی صالح و متقی شخص سے کوئی رنج و تکلیف پہنچے تو محض اس کی وجہ سے اس کے صلاح و تقویٰ کی نفی نہ کرے اور اسے برا بھلا نہ کہے بلکہ اس کے حق میں یہ دعائیہ الفاظ کہے کہ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَلَنَا (یعنی اللہ تعالیٰ اسے اور ہمیں مغفرت و بخشش سے نوازے) اہل استقامت کا یہی طریقہ ہے اور یہی ان کی راہ عمل ہے۔

انسان کا شکر ادا نہ کرنے والا اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا

⑩ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص لوگوں کا شاکر نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔"
(احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کی ادائیگی کی تکمیل اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی تابعداری کی جائے بایں طور کہ اس نے ان

انسانوں کا جو کہ اس تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے پہنچنے کا ظاہری واسطہ اور وسیلہ بنے ہیں، شکر ادا کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی پیروی کی جائے لہٰذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی تابعداری نہیں کی اور اس کے حکم کی پیروی نہیں کی بایں معنی کہ اس نے ان لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا جن کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اسے دی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا۔

یا پھر اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنے محسن کا شکر ادا نہیں کرتا اور اپنے ساتھ کئے گئے احسان اور اچھے سلوک کا اقرار نہیں کرتا وہ کفران نعمت کی اپنی اس عادت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

شکرانِ نعمت کی اہمیت

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ اَتَاهُ الْمُهَاجِرُوْنَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا رَأَيْنَا قَوْمًا اَبْذَلَ مِنْ كَثِيْرٍ وَلَا اَحْسَنَ مُوَاسَاةً مِنْ قَلِيْلٍ مِنْ قَوْمٍ نَزَلْنَا بَيْنَ اَظْهُرِهِمْ لَقَدْ كَفَوْنَا الْمُؤْنَةَ وَاَشْرَكُوْنَا فِي الْمَهْنَا حَتّٰى لَقَدْ خِفْنَا اَنْ يَذْهَبُوْا بِالْاَجْرِ كُلِّهٖ فَقَالَ لَا مَا دَعَوْتُمُ اللّٰهَ لَهُمْ وَاَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهٗ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ (مکہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ تشریف لے آئے تو (ایک دن) مہاجرین کی ایک جماعت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہم نے ایسی کوئی قوم نہیں دیکھی جو زیادہ مالداری میں بہت زیادہ خرچ کرنے اور کم مالداری میں بہت اچھی خدمت اور مدد کرنے کے وصف میں اس قوم سے بہتر ہو جس میں ہم آکر اترے ہیں، انہوں نے (یعنی انصار نے) ہمیں محنت سے سبکدوش کر دیا، اور تمام تر منفعت میں ہمیں شریک کر لیا ہے، اور اب (انکے اس جذبہ سخاوت و ایثار کو دیکھتے ہوئے) ہمیں تو یہ اندیشہ ہے کہ تمام تر ثواب کہیں انہی کے حصہ میں نہ آجائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں (تمام تر ثواب انہی کے حصہ میں نہیں آئے گا) جب تک کہ تم ان کے لئے اللہ سے دعا کرتے رہو گے اور ان کی تعریف (یعنی شکرانہ نعت ادا) کرتے رہو گے۔" امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔"

تشریح: جب نبی کریم ﷺ نے مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں اقامت اختیار فرمائی اور آپ ﷺ کے ساتھ ہی مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مدینہ میں اقامت گزیں ہوئی تو مدینہ کے رہنے والوں یعنی انصار نے ان کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اور ایثار و سخاوت نیز اخوت و محبت کی جو عظیم روایت قائم کی، بلا مبالغہ تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، انصار مدینہ نے مہاجرین مکہ کے لئے اپنے دیدۂ و دل ہی فرش راہ نہیں کئے بلکہ اپنے خون پسینہ کی گاڑھی کمائی بھی ان کے لئے وقف کر دی۔ انہوں نے اپنی زمین اپنے باغات اور اپنے مکانات آدھوں آدھ ان میں تقسیم کر دیئے، ان کی خدمت گذاری اور خاطر تواضع میں شرافت انسانی کی ساری بلندیوں کو پیچھے چھوڑ دیا، چنانچہ ان کے اسی طرز عمل اور ان کے بے پایاں احسانات نے مہاجرین کو اتنا متأثر کیا کہ وہ باقاعدہ بارگاہ رسالت میں اپنا یہ اندیشہ لے کر حاضر ہوئے کہ یا رسول اللہ! یہ انصار کہیں سارا ثواب ہی نہ لے بیٹھیں، کیونکہ ہم نے تو آج تک ان سے زیادہ ایثار پسند مخیر و سخی اور احسان کرنے والی کوئی قوم نہیں دیکھی ہے، انہوں نے مال و زر کی کمی بیشی سے بے نیاز ہو کر ہماری خاطر داری کی ہے، جس کے پاس زیادہ مال تھا اس نے ہم پر اتنا ہی زیادہ خرچ کیا جس کے پاس کم مال تھا اس نے اسی کے مطابق ہماری اعانت کی، گویا جس کی جتنی استطاعت تھی اس نے اسی حیثیت سے ہماری مہمانداری و غم خواری کی، یہاں تک کہ انہوں نے حصول معاش میں ہمیں محنت و مشقت سے بھی باز رکھا بایں طور کہ کھیتی باڑی کی محنت، باغات اور درختوں کی دیکھ بھال کی صعوبت اور مکانات بنانے کی مشقت انہوں نے خود اپنے ذمہ لی مگر منفعت و پیداوار میں ہمیں برابر کا شریک رکھا ہے کہ وہ اپنی زمین اور اپنے باغات میں اپنی محنت سے جو کچھ کرتے ہیں آدھا ہمیں تقسیم کر دیتے ہیں، چنانچہ اب تو ڈرنے لگے ہیں کہ یہ ہمارا سارا ثواب خود ہی حاصل نہ کریں اور یہ اندیشہ ہے کہ ہماری ہجرت اور ہماری عبادتوں کا اجر اللہ تعالیٰ کہیں ان کے اعانات کی بے پناہ زیادتی کی وجہ سے ان کے نامۂ اعمال میں لکھ دے۔

لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں بتایا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بہت وسیع ہے، اس کے ہاں اجر کی کمی نہیں ہے، تمہیں تمہاری عبادت کا ثواب ملے گا اور انصار کو ان کی مددگاری اور ان کے ایثار و سخاوت کا اجر دیا جائے گا، تاوقتیکہ تم ان کے لئے بھلائی کی دعا کرتے رہو، کیونکہ ان کے حق میں تمہاری یہی دعا ان کے احسان کا بدلہ ہو جائے گی اور تمہاری عبادتوں کا ثواب تمہیں ہی ملتا رہے گا۔

آپس میں بطور تحفہ لین دین عداوتوں کو دور کرتا ہے

⑫ وَعَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَهَادَوْا فَاِنَّ الْهَدِيَّةَ تُذْهِبُ الضَّغَائِنَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "آپس میں تحفہ کا لین دین کیا کرو، کیونکہ تحفہ کا لینا دینا کینوں کو دور کرتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپس میں تحفہ کے لین دین سے باہمی بغض و عداوت کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے بجائے آپس کی الفت و محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف مشکوٰۃ کو اس حدیث کے مآخذ کا علم نہیں ہو سکا تھا چنانچہ بعد میں کسی نے الترمذی بڑھا دیا۔

کمتر چیز کے تحفہ کا لینا دینا حقیر نہ سمجھو

⑬ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَهَادَوْا فَاِنَّ الْهَدِيَّةَ تُذْهِبُ وَحَرَ الصَّدْرِ وَلَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْشِقَّ فِرْسِنِ شَاةٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "آپس میں تحفہ دیا لیا کرو کیونکہ تحفہ سینے کی کدورت کو دور کرتا ہے اور (یاد رکھو) کوئی ہمسایہ اپنے دوسرے ہمسایہ کے واسطے (کسی کمتر چیز کے) تحفہ کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ وہ بکری کے کھر کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنے ہمسایہ کو کسی کمتر اور تھوڑی سی چیز کے بطور تحفہ بھیجنے کو اس ہمسایہ کے حق میں حقیر نہ سمجھے بلکہ جو بھیجنا چاہے اسے بھیجدے خواہ وہ کتنی ہی کمتر اور تھوڑی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح جس ہمسایہ کو تحفہ بھیجا گیا ہو۔ اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنے ہمسایہ کے کسی تحفہ کو حقیر سمجھے بلکہ اس کے پاس جو بھی تحفہ آئے اسے رغبت و بشاشت کے ساتھ قبول کرلے اگرچہ وہ کتنی ہی تھوڑی اور کیسی ہی خراب چیز کیوں نہ ہو۔

⑭ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ لَا تُرَدُّ الْوَسَائِدُ وَالدُّهْنُ وَاللَّبَنُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ قِيْلَ اَرَادَ بِالدُّهْنِ الطِّيْبَ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تین چیزیں ایسی ہیں جنہیں قبول کرنے سے انکار نہ کرنا چاہئے ① تکیہ ② تیل ③ دودھ۔" امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ "تیل" سے آنحضرت ﷺ کی مراد خوشبو تھی۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مہمان کو تواضع کے طور پر تکیہ دے یا تیل دے اور یا پینے کے لئے دودھ دے تو اس مہمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دے، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ "دھن" یعنی تیل سے مراد خوشبو

ہے جیسا کہ ترجمہ میں ذکر کیا گیا۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ "دہن" سے مراد تیل ہی ہے کیونکہ اس زمانہ میں بھی اہل عرب اپنے سروں میں عمومیت کے ساتھ تیل لگایا کرتے تھے۔

خوشبودار پھول کا تحفہ واپس نہ کرو

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ عُثْمَانَ النَّهْدِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُعْطِیَ اَحَدُکُمُ الرَّیْحَانَ فَلَا یَرُدَّهٗ فَاِنَّهٗ خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت ابو عثمان نہدیؒ (تابعی) کی روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کو خوشبودار پھول (بطور تحفہ و ہدیہ) دیا جائے تو وہ اسے قبول کرنے سے انکار نہ کرے کیونکہ وہ پھول جنت سے آیا ہے" اس روایت کو امام ترمذیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: "وہ پھول جنت سے آیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ خوشبودار پھول کی ایک فضیلت و خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جڑ جنت سے آئی ہے، اس طرح اس میں سے جو خوشبو آتی ہے وہ گویا جنت کی خوشبو ہے، پھر یہ کہ پھول کا تحفہ بہت سبکسار یعنی بہت کم احسان رکھتا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں اس کی وضاحت بیان کی جا چکی ہے۔ لہٰذا جب کسی کو خوشبودار پھول دیا جائے تو اسے قبول کرنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اولاد میں سے کسی ایک کے ساتھ ترجیحی سلوک مناسب نہیں ہے

(۱۶) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَتِ امْرَأَةُ بَشِیْرٍ اَنْحِلِ ابْنِیْ غُلَامَكَ وَاَشْهِدْلِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَتٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ ابْنَةَ فُلَانٍ سَاَلَتْنِیْ اَنْ اَنْحَلَ ابْنَهَا غُلَامِیْ وَقَالَتْ اَشْهِدْلِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلَهٗ اِخْوَةٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَفَکُلَّهُمْ اَعْطَیْتَهُمْ مِثْلَ مَا اَعْطَیْتَهٗ قَالَ لَا قَالَ فَلَیْسَ یَصْلُحُ هٰذَا وَاِنِّیْ لَا اَشْهَدُ اِلَّا عَلٰی حَقٍّ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک صحابی) حضرت بشیرؓ کی بیوی نے ان سے کہا کہ تم "میرے بیٹے (نعمان) کو اپنا غلام ہبہ کر دو اور اس پر میرے اطمینان کے لئے رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنالو، چنانچہ بشیرؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ فلاں کی بیٹی (یعنی عمرہ بنت رواحہ) نے (جو میری بیوی ہے) مجھ سے یہ خواہش کی ہے کہ میں اس کے بیٹے (نعمان) کو اپنا غلام ہبہ کر دوں، نیز اس نے یہ بھی کہا ہے کہ (اس بارہ میں) میرے اطمینان کے لئے رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنالوں! آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "کیا اس بیٹے کے اور بھائی بھی ہیں؟" انہوں نے کہا کہ "ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم نے ان سب کو اسی طرح (ایک ایک غلام) دیا ہے جس طرح اس بیٹے (نعمان) کو دیا ہے" انہوں نے کہا کہ "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ مناسب نہیں ہے اور میں صرف حق بات پر گواہ بنتا ہوں۔"
(مسلم)

تشریح: "حق" سے مراد یا تو یہ ہے کہ میں صرف اسی معاملہ میں گواہ بنتا ہوں جو بلاشک و شبہ اور بلا کراہت خالص طور پر حق اور صحیح ہو، یا پھر یہ کہ آپ ﷺ نے عمومی طور پر یہ فرمایا کہ میں حق پر گواہ بنتا ہوں باطل پر گواہ نہیں بنتا۔ بہرکیف اس سلسلہ میں تفصیلی بحث پہلی فصل کی حدیث نمبر ۴ کے ضمن میں گذر چکی ہے۔

آنحضرت ﷺ نئے پھل کا ہدیہ کس طرح قبول کرتے تھے

(۱۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِیَ بِبَاكُوْرَةِ الْفَاكِهَةِ وَضَعَهَا عَلٰى عَيْنَيْهِ وَعَلٰى شَفَتَيْهِ وَقَالَ اللّٰهُمَّ كَمَا اَرَيْتَنَا اَوَّلَهٗ فَاَرِنَا اٰخِرَهٗ ثُمَّ يُعْطِيْهَا مَنْ يَكُوْنُ عِنْدَهٗ مِنَ الصِّبْيَانِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِیُّ فِی الدَّعَوَاتِ الْكَبِيْرِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسول کریم ﷺ کو جب کوئی نیا پھل پیش کیا جاتا تو (پہلے) اس پھل کو (قبول فرما کر) اپنی آنکھوں اور ہونٹوں پر رکھتے پھر یہ فرماتے "اے اللہ! جس طرح تو نے ہمیں اس پھل کی ابتداء دکھائی اسی طرح اس کی انتہا بھی دکھا۔" اس کے بعد آپ ﷺ وہ پھل کسی اس بچے کو دے دیتے جو آپ ﷺ کے پاس ہوتا۔" (بیہقی)

تشریح: تازہ پھل کو اپنی آنکھوں پر رکھنے سے آپ ﷺ کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ایک تازہ نعمت کی تعظیم ہوتا تھا۔ "انتہا" کا تعلق اگر دنیا سے ہے تو پھر یہ دعا درازی عمر کے لئے ہوگی اور اگر اس کا تعلق عقبی سے ہے تو اس سے اس طرف اشارہ ہوگا کہ آخرت کے آگے دنیا کی کیا حقیقت ہے، بڑی نعمت تو آخرت کی نعمت ہے، اس طرح اس دعا کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ! جس طرح تو نے ہمیں اس دنیا کی نعمت عطا کی ہے اسی طرح آخرت کی نعمت بھی کہ حقیقی نعمت وہی ہے، عطا فرما۔

بَابُ اللُّقْطَةِ

لقطہ کا بیان

لقطہ کے معنی اور اس کا مفہوم

"لقطہ" لام کے پیش اور قاف کے زیر کے ساتھ یعنی "لقِطہ" بھی منقول ہے اور قاف کے جزم کے ساتھ یعنی "لقْطہ" بھی لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ محدثین کے ہاں قاف کے زبر کے ساتھ یعنی "لقَطہ" مشہور ہے۔

"لقطہ" اس چیز کو کہتے ہیں جو کہیں (مثلاً راستہ وغیرہ میں) گری پڑی پائی جائے اور اس کے مالک کا کوئی علم نہ ہو۔ اس بارہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کہیں کوئی گری پڑی چیز پائی جائے تو اسے (یعنی لقطہ کو) اٹھا لینا مستحب ہے بشرطیکہ اپنے نفس پر یہ اعتماد ہو کہ اس چیز کی تشہیر کرا کر اسے اس کے مالک کے حوالہ کر دیا جائے گا، اگر اپنے نفس پر یہ اعتماد نہ ہو تو پھر اسے وہیں چھوڑ دینا ہی بہتر ہے، لیکن اگر یہ خوف ہو کہ اس چیز کو یوں ہی پڑا رہنے دیا گیا تو یہ ضائع ہو جائے گی تو اس صورت میں اسے اٹھا لینا واجب ہوگا۔ اگر دیکھنے والا اسے نہ اٹھائے گا اور وہ چیز ضائع ہو جائے گی تو وہ گنہ گار ہوگا! یہ لقطہ کا اصولی حکم ہے، اب اس کے چند تفصیلی مسائل ملاحظہ کیجئے۔

لقطہ، اس شخص کے پاس بطور امانت رہتا ہے جس نے اسے اٹھایا ہے بشرطیکہ وہ اس پر کسی کو گواہ کر لے کہ میں اس چیز کو حفاظت سے رکھنے یا اس کے مالک کے پاس پہنچا دینے کے لئے اٹھاتا ہوں، اس صورت میں وہ لقطہ اٹھانے والے کے پاس سے ضائع ہو جائے تو اس پر تاوان واجب نہیں ہوگا۔ اور اگر اٹھانے والے نے کسی کو اس پر گواہ بنایا اور وہ لقطہ اس کے پاس سے تلف ہو گیا تو اس پر تاوان واجب ہوگا بشرطیکہ لقطہ کا مالک یہ انکار کر دے کہ اس نے وہ چیز مجھے دینے کے لئے نہیں اٹھائی تھی۔

لقطہ جہاں سے اٹھایا جائے اس جگہ بھی اور ان مقامات پر بھی کہ جہاں لوگوں کا اجتماع رہتا ہے اس کی تشہیر کی جائے (یعنی اٹھانے والا کہتا پھرے) کہ یہ چیز کس کی ہے؟ اور یہ تشہیر اس وقت تک کی جانی چاہئے جب تک کہ اٹھانے والے کو یقین نہ ہو جائے کہ اب اتنے دنوں کے بعد اس کا مالک مطالبہ نہیں کرے گا، لیکن صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک مدت تشہیر

ایک سال ہے یعنی ان کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ لقطہ کی ایک سال تک تشہیر کی جانی چاہئے اور جو چیز زیادہ دن تک نہ ٹھہر سکتی ہو اس کی تشہیر صرف اسی وقت تک کی جائے کہ اس کے خراب ہو جانے کا خوف نہ ہو۔

مدت تشہیر کے دوران اگر اس کا مالک آجائے تو اسے وہ چیز دے دی جائے ورنہ مدت تشہیر گزر جانے کے بعد اس چیز کو خیرات کر دیا جائے اب اگر خیرات کرنے کے بعد مالک آئے تو چاہے وہ اس خیرات کو برقرار رکھے اور اس کے ثواب کا حق دار ہو جائے اور چاہے اس اٹھانے والے سے تاوان لے یا اس شخص سے اپنی چیز واپس لے لے جس کو وہ بطور خیرات دی گئی ہے اور اگر وہ چیز اس کے پاس موجود نہ ہو تو اس سے تاوان لے لے جیسا کہ بطور لقطہ ملے ہوئے جانور کا حکم ہے۔

جانوروں میں بھی لقطہ ہونا جائز ہے یعنی اگر کسی کا کوئی گم شدہ جانور کسی شخص کو مل جائے تو اسے پکڑ لینا اور اس کی تشہیر کر کے اس کے مالک تک پہنچا دینا جائز ہے۔ اس بارہ میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر مدت تشہیر کے دوران اس جانور کے کھلانے پلانے پر کچھ خرچ ہوا ہے تو وہ احسان شمار ہوگا یعنی اس کا مطالبہ مالک سے نہیں کیا جائے گا بشرطیکہ وہ خرچ حاکم کی اجازت کے بغیر کیا گیا ہو۔ اور اگر جانور پکڑنے والے نے اس شرط کے ساتھ کہ اس جانور پر جو کچھ خرچ ہوگا جانور کے مالک سے لے لوں گا۔ حاکم کی اجازت سے اس جانور پر کچھ خرچ کیا تو اس کی ادائیگی مالک پر بطور قرض واجب ہوگی کہ جب وہ مالک اپنا جانور حاصل کرے تو اس کے جانور کو پکڑنے والے نے اس پر کچھ خرچ کیا ہے وہ سب ادا کر دے۔ اس صورت میں لقطہ رکھنے والے کو یہ حق حاصل ہوگا کہ جب تک مالک اسے سارے اخراجات ادا نہ کر دے وہ لقطہ کو اپنے پاس روکے رکھے۔

اس سلسلہ میں حاکم و قاضی کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ بطور لقطہ ملنے والی چیز اگر ایسی ہے جس سے منفعت حاصل ہو سکتی ہو جیسے بھاگا ہوا غلام تو اس سے محنت و مزدوری کرائی جائے اور وہ جو کچھ کمائے اسی سے اس کے اخراجات پورے کئے جائیں اور اگر لقطہ کسی ایسی چیز کی صورت میں ہو جس سے کوئی منفعت حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کو رکھنے میں کچھ خرچ کرنا پڑتا ہو جیسے جانور تو قاضی اس کے اخراجات پورے کرنے کی اجازت دے دے اور یہ طے کر دے کہ اس پر جو خرچ ہوگا۔ وہ مالک سے وصول کر لیا جائے گا۔ بشرطیکہ اس میں مالک کے لئے بہتری ہو، اور اگر قاضی یہ دیکھے کہ اس صورت میں مالک کو بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا تو پھر اس چیز کو فروخت کرا دے اور اس کی قیمت کو رکھ چھوڑے تاکہ جب مالک آجائے تو اسے دے دی جائے۔

اگر کسی شخص کے پاس کوئی لقطہ ہو اور وہ اس کی علامات بتا کر اپنی ملکیت کا دعوی کرے تو وہ لقطہ اسے دے دینا جائز ہے اس صورت میں گواہوں کا ہونا ضروری نہیں ہوگا۔ ہاں اگر وہ علامات نہ بتا سکے تو پھر گواہوں کے بغیر وہ لقطہ اسے نہیں دینا چاہئے۔ اگر لقطہ پانے والا کوئی مفلس ہے تو مدت تشہیر ختم ہو جانے کے بعد وہ خود اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور اگر وہ خود مالدار ہے تو پھر اسے خیرات کر دے۔ اس بارہ میں اسے یہ اجازت ہوگی کہ اگر وہ چاہے تو اپنے اصول یعنی ماں باپ اور اپنے فروغ یعنی بیٹا بیٹی اور بیوی کو بطور خیرات وہ لقطہ دے دے بشرطیکہ یہ لوگ مفلس و ضرورت مند ہوں۔

بھاگے ہوئے غلام کو پکڑ لینا اس شخص کے لئے مستحب ہے جو اس کو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہو، اسی طرح اس غلام کو بھی اپنے پاس رکھ لینا مستحب ہے جو راستہ بھول جانے کی وجہ سے بھٹک رہا ہو۔

اگر کسی کا کوئی غلام بھاگ جائے اور تین دن کی مسافت یا اس سے زیادہ دور سے کوئی شخص اسے پکڑ کر اس کے مالک کے پاس پہنچا دے تو وہ لانے والا اس بات کا مستحق ہوگا کہ غلام کے مالک سے اپنی مزدوری کے طور پر چالیس درہم وصول کرے گا اگرچہ وہ غلام چالیس درہم سے کم ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ لانے والے نے اس بات پر کسی کو گواہ بنا لیا ہو کہ میں اس غلام کو اس لئے پکڑتا ہوں تاکہ اسے اس کے مالک کے پاس پہنچا دوں۔ اور اگر کوئی شخص بھاگے ہوئے غلام کو اس کے مالک کے پاس تین دن کی مسافت سے کم دوری سے لایا ہو تو اسی حساب سے اجرت دی جائے گی۔ مثلاً ڈیڑھ دن کی مسافت کی دوری سے لایا ہے تو اسے بیس درہم دیئے جائیں گے، اور

اگر وہ غلام اس شخص سے بھی چھوٹ کر بھاگ گیا جو اسے پکڑ کر لایا تھا تو اس پر کوئی تاوان واجب نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ اس نے کسی کو گواہ بنا لیا ہو اور اگر گواہ نہ بنایا ہوگا تو اس صورت میں نہ صرف یہ کہ اسے کوئی اجرت نہیں ملے گی۔ بلکہ اس پر تاوان بھی واجب ہوگا۔

بے وارث بچے کو اٹھانے کا مسئلہ

لقیط (یعنی بے وارث بچہ) اگر کہیں پڑا ہوا ملے تو اسے اٹھا لینا مستحب ہے اور اگر اس کے ہلاک ہو جانے کا خوف ہو تو پھر اسے اٹھانا واجب ہوگا۔ ایسا بچہ جب تک مملوک (غلام) ہونا ثابت نہ ہو حر یعنی آزاد ہے، لقیط کا نفقہ اور اس کا خون بہا بیت المال کے ذمہ ہوگا، اسی طرح اس کی میراث بھی بیت المال کی تحویل میں رہے گی۔ جس شخص نے لقیط کو اٹھایا ہے اس سے کسی اور کو لینے کا اختیار نہیں ہوگا۔ اگر کسی شخص نے یہ دعوی کیا کہ یہ میرا بچہ ہے تو قسم کے ساتھ اس کا قول معتبر ہوگا اور اس بچہ کا نسب اس سے ثابت ہو جائے گا۔ اور اگر دو آدمی ایک ساتھ اس کا دعویٰ کریں تو اس کو لینے کا زیادہ حقدار وہ شخص ہوگا جو اس بچہ کے بدن میں کوئی علامت بتائے اور دیکھنے پر وہ علامت موجود پائی جائے مثلاً وہ یہ بتائے کہ اس کی پیٹھ پر مسہ ہے اور پھر جب دیکھا جائے تو اس کی پیٹھ پر مسہ موجود ہو۔ اگر کوئی غلام یہ دعوی کرے کہ یہ لقیط میرا لڑکا ہے تو اس کا دعوی صحیح تسلیم کیا جائے گا، لیکن وہ بچہ مسلمان رہے گا۔ بشرطیکہ وہ مسلمانوں کی آبادی یا مسلمانوں کے محلہ میں ملا ہو۔ اور اگر وہ ذمیوں کی بستی میں یا ان کے محلہ یا ان کے گرجا و مندر میں ملا ہوگا تو اس صورت میں وہ ذمی رہے گا۔ اگر لقیط کے ساتھ بندھا ہوا کچھ مال یا اس کے جسم پر کوئی زیور وغیرہ ملے تو اسے قاضی کے حکم کے بعد لقیط ہی پر خرچ کیا جائے اگرچہ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ قاضی کے حکم و اجازت کے بغیر بھی اس کے مال کو اس پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ صحیح قول کے مطابق اٹھانے والے کے لئے یہ تو جائز ہے کہ وہ اس لقیط کو کوئی پیشہ سیکھنے کے لئے کسی پیشہ ور کے سپرد کردے مگر اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کا نکاح کردے یا اس کے مال میں تصرف کرے اور یا اس سے محنت و مزدوری کرائے۔

لقطہ کے کچھ متفرق مسائل

مسئلہ: فرض کیجئے ایک شخص نے کسی جگہ اپنے جوتے اتار کر رکھے، ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے بھی اپنے جوتے اتار کر وہیں رکھ دیئے۔ اب پہلا شخص جب وہاں سے چلا تو اپنے جوتے پہننے کی بجائے اس دوسرے شخص کے جوتے پہن لئے اور چلا گیا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں وہ دوسرا شخص کیا کرے: کیا اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ پہلے شخص کے جوتے لے لے؟ اس بارہ میں مختار مسئلہ یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے بشرطیکہ اس پہلے شخص کے جوتے کی مانند ہوں یا اس کے جوتے سے بہتر ہوں، ہاں اگر وہ جوتے اس کے جوتے سے خراب ہوں، تو پھر ان کو استعمال کرنا بلاشبہ جائز ہوگا۔

مسئلہ: جو شخص کسی دوسرے کی گری پڑی چیز پاتا ہے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ چیز اتنی کمتر ہوتی ہے جس کے بارہ میں پانے والا یہ جانتا ہے کہ اس کا مالک اس کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ جیسے ادھر ادھر پڑی ہوئی گٹھلیاں وغیرہ یا متفرق جگہوں پر پڑے ہوئے انار کے چھلکے وغیرہ، ایسی چیز کے بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ اٹھانے والا اس کو اپنے استعمال میں لا سکتا ہے باوجودیکہ وہ اس کی ملکیت میں نہیں آتی اور اس کے مالک کو لینے کا حق پہنچتا ہے لیکن شیخ الاسلامؒ کا قول یہ ہے کہ ایسی چیز لینے والے کی ملکیت میں آجاتی ہے۔ گری پڑی ملنے والی چیز کی دوسری قسم ایسا مال ہے جس کے بارہ میں پانے والا جانتا ہے کہ اس کا مالک اس کا مطالبہ کرے گا۔ جیسے سونا چاندی وغیرہ اور دیگر تمام اشیاء ایسی چیز کے بارہ میں یہ حکم ہے اگر اس قسم کی کوئی چیز گری پڑی نظر آئے تو اسے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا جائے اور اس کی تشہیر کرائی جائے یہاں تک کہ وہ چیز اس کے مالک کے پاس پہنچا دی جائے۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص ایک روٹی یا ایک روٹی کے بقدر کھانے کی کوئی چیز اور یا اس سے کم پائے تو اسے فراخی کی حالت میں بھی کھا لینا جائز

ہے۔

مسئلہ: اگر کسی چکی میں گیہوں پسوایا جائے اور اس کے آٹے میں وہ آٹا مل جائے جو عام طور پر چکی میں باقی رہ جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی جھاڑو میں سے کوئی تنکا دانتوں میں خلال کرنے کے لئے لیا جائے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

مسئلہ: سرائے میں مسافروں کے جو جانور لید وغیرہ کرتے ہیں وہ ان جانوروں کے مالک کے چلے جانے کے بعد اس شخص کی ملکیت ہو جاتے ہیں جو انہیں پہلے اٹھائے، سرائے کے مالک یا منتظم کی ملکیت میں نہیں آتے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کوئی شخص گری پڑی چیز پائے تو وہ کیا ہے؟

① عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ عَنِ اللُّقَطَةِ فَقَالَ اعْرِفْ عِفَاصَهَا وَوِكَاءَهَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً فَاِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَاِلَّا فَشَأْنُكَ بِهَا قَالَ فَضَالَّةُ الْغَنَمِ قَالَ هِيَ لَكَ اَوْ لِاَخِيْكَ اَوْ لِلذِّئْبِ قَالَ فَضَالَّةُ الْاِبِلِ قَالَ مَالَكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاءُهَا وَحِذَاءُهَا تَرِدُ الْمَاءَ وَتَاكُلُ الشَّجَرَ حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ فَقَالَ عَرِّفْهَا سَنَةً ثُمَّ اعْرِفْ وِكَاءَهَا وَعِفَاصَهَا ثُمَّ اسْتَنْفِقْ بِهَا فَاِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَاَدِّهَا اِلَيْهِ۔

"حضرت زید ابن خالدؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ ﷺ سے لقطہ کے بارے میں پوچھا (کہ اگر کوئی گری پڑی چیز پائی جائے تو کیا کیا جائے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "پہلے تو اس کا ظرف پہچان لو (یعنی اگر وہ چیز کسی کپڑے یا چمڑے کے تھیلے وغیرہ میں ہے تو اسے شناخت میں رکھو) اور اس کا سربند بھی پہچانے رہو پھر ایک سال تک اس کی تشہیر کرو (ایک سال کی مدت میں) اگر اس کا مالک آجائے تو وہ چیز اس کے حوالہ کر دو اور اگر وہ نہ آئے تو پھر اسے اپنے استعمال میں لے آؤ۔ پھر اس شخص نے گمشدہ بکری کے بارہ میں پوچھا (کہ اگر کسی کی گم شدہ بکری کوئی شخص پکڑ لائے تو اس کا کیا کرے) آپ ﷺ نے فرمایا "وہ تمہاری ہے یا تمہارے بھائی کی ہے اور یا بھیڑیئے کی ہے" اس کے بعد اس شخص نے پوچھا کہ "گمشدہ اونٹ کے بارے میں کیا حکم ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "تمہیں اس سے کیا مطلب ہے (یعنی اسے نہ پکڑو کیونکہ وہ ضائع ہو جانے والی چیز نہیں ہے اس لئے اس کو پکڑ کر لانے کی ضرورت نہیں) اس کی مشک اور اس کے موزے اس کے ساتھ ہیں کہ وہ جب تک اپنے مالک کے پاس نہ پہنچے پانی تک جا سکتا ہے اور درخت کے پتے کھا سکتا ہے"۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ "(جب اس شخص نے لقطہ کے بارہ میں پوچھا تو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک سال تک اس کی تشہیر کرو اور اس کا سربند اور ظرف (تھیلا وغیرہ پہچانے رکھو (اس مدت تشہیر میں اگر اس کا مالک نہ آئے تو) پھر اسے اپنے استعمال میں لے آؤ اور اگر اس کے بعد اس کا مالک آجائے تو اس کی وہ چیز (بشرطیکہ تمہارے پاس جوں کی توں موجود ہو) دے دو (ورنہ اس کی قیمت ادا کر دو۔"

تشریح: ابن مالکؒ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس چیز کا ظرف اور سربند پہچان لینے کا حکم اس لئے دیا تاکہ جو شخص اس چیز کی ملکیت کا دعویٰ کرے اس پہچان کی وجہ سے اس کا سچا یا جھوٹا ہونا معلوم ہو جائے۔ لیکن اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ اگر کوئی شخص لقطہ اٹھانے والے کے پاس آئے اور اپنا ظرف اور اس کا سربند پہچان کر اس لقطہ کے مالک ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ لقطہ اسے دے دینا واجب ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تو یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں وہ لقطہ اسے کسی گواہی کے بغیر ہی دے دینا واجب ہے کیونکہ ظرف اور اس کے سربند کی پہچان رکھنے کا یہی مقصد ہے لیکن امام شافعیؒ اور حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص لقطہ کا ظرف اور اس کا سربند پہچان لے اور اس لقطہ کا وزن یا عدد بتا دے، نیز لقطہ اٹھانے والے کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ یہ شخص سچا

ہے تب وہ لقطہ اس شخص کو دے دینا جائز تو ہے لیکن وہ شخص گواہوں کے بغیر لقطہ اٹھانے والے کو دینے پر مجبور نہیں کر سکتا، اس صورت میں کہا جائے گا کہ "ظرف اور سربند کی پہچان رکھنے" کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے وہ لقطہ اٹھانے والے کے مال میں اس طرح خلط ملط نہیں ہو جائے گا کہ جب لقطہ کا مالک آئے تو وہ اپنے مال و اسباب اور اس لقطہ کے درمیان امتیاز نہ کر سکے۔

ثُمَّ عَرِّفْهَا (پھر اس کی تشہیر کرو) کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ وہ لقطہ پایا گیا ہے نہ صرف وہاں بلکہ بازاروں میں، مسجدوں میں اور ان تمام مقامات پر کہ جہاں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہو، اس لقطہ کی بابت لوگوں میں یہ اعلان کرو اور کراؤ کہ جس شخص کی کوئی چیز گم ہوگئی ہو وہ فلاں کے پاس پہنچ کر اس چیز کی تفصیل وعلامات بیان کر کے لے جائے۔ مدت تشہیر کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ اور حنفیہ میں سے حضرت امام محمدؒ تو حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے لئے ایک سال کی مدت متعین ہے یعنی لقطہ کی ایک سال تک تشہیر کرانی چاہئے، لیکن صحیح تر روایت کے مطابق حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابو یوسفؒ کا قول یہ ہے کہ مدت متعین کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ حدیث میں "ایک سال" کا ذکر باعتبار غالب کے بر سبیل اتفاق ہے۔ لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث میں ایک سال کی مدت اگر اتفاقی طور پر ذکر کی گئی ہے۔ اور متعین طور پر مذکور نہیں ہے۔ تو پھر تشہیر کی کیا مدت متعین کی جائے؟ اس کی وضاحت ہدایہ نے امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت کے مطابق یوں کی ہے کہ اگر لقطہ دس درہم سے کم قیمت کا ہو تو اس کی تشہیر چند دن تک کرنا کافی ہے، اگر دس درہم کی مالیت کا ہو تو ایک مہینہ تک تشہیر کی جائے اور وہ سو درہم کی مالیت کا ہو پھر ایک سال تک کی تشہیر کی جائے۔

بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ مالیت کی مذکورہ بالا مقدار کی جو مختلف مدتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے لازم کوئی بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ لقطہ اٹھانے والے کی رائے پر موقوف ہے کہ وہ لقطہ کی اس وقت کی تشہیر کرے جب تک کہ اسے یہ غالب گمان نہ ہو جائے کہ اب کوئی نہیں آئے گا اور اس مدت کے بعد اس لقطہ کو طلب نہیں کرے گا۔ ان علما کی دلیل مسلم کی وہ روایت ہے جس میں لفظ سَنَةً (ایک سال) کی قید کے بغیر صرف عَرِّفْهَا (اس کی تشہیر کی جائے) منقول ہے۔

لقطہ اگر کسی چیز کی صورت میں ہو جو زیادہ دنوں تک نہ ٹھہر سکتی ہو۔ اور موسمی حالات کے تغیر و تبدل سے متاثر ہوتی ہو جیسے کھانے کی کوئی چیز یا پھل وغیرہ تو اس کے بارہ میں یہ حکم ہے کہ اس کی تشہیر اسی وقت تک کی جائے جب تک کہ وہ خراب نہ ہو۔ اور اگر لقطہ کوئی بہت ہی حقیر و کمتر چیز ہو جیسے گٹھلی اور انار کا چھلکا وغیرہ تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی تشہیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اسے بغیر تشہیر و اعلان استعمال کر لینے کی اجازت ہے مگر اس کے مالک کو یہ حق حاصل ہوگا۔ کہ اگر وہ چاہے تو اپنی اس چیز کا مطالبہ کرے۔

فان جاء صاحبها والافشانک بها کا مطلب یہ ہے کہ لقطہ کی تشہیر کے بعد اگر اس کا مالک آجائے تو اسے وہ لقطہ دے دیا جائے اگر اس مالک کے ساتھ گواہ بھی ہوں جو اس کے دعوی کی ملکیت کی گواہی دیں تو لقطہ اٹھانے والے پر یہ واجب ہوگا کہ وہ اسے لقطہ دے دے اور اگر گواہ نہ ہوں گے تو پھر دے دینا واجب نہیں جائز ہوگا جیسا کہ اوپر اسی کی وضاحت کی گئی۔ اور اگر مدت تشہیر گزر جانے کے بعد اس لقطہ کا مالک نہ آئے تو پھر لقطہ اٹھانے والا اس لقطہ کو اپنے استعمال میں لے آئے۔ اس سے گویا یہ معلوم ہوا کہ لقطہ اٹھانے والا اصل مالک کے نہ آنے کی صورت میں اس لقطہ کا خود ممالک بن جاتا ہے خواہ وہ مالدار ہو یا مفلس ہو، چنانچہ اکثر صحابہؓ اور حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے لیکن بعض صحابہؓ کا قول یہ ہے کہ اگر لقطہ اٹھانے والا خود مالدار ہو تو وہ اس لقطہ کا مالک نہیں بنتا بلکہ اسے چاہئے کہ وہ اس لقطہ کو فقراء و مساکین کو بطور صدقہ دے دے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سفیان ثوریؒ ابن المبارکؒ اور حنفیہ کا یہی قول ہے نیز اس بارہ میں یہ بھی حکم ہے کہ اگر صدقہ کر دینے کے بعد مالک آئے تو اسے یہ اختیار ہوگا کہ چاہے تو وہ اس صدقہ کو برقرار رکھے اور اس کے ثواب کا حصہ دار بن جائے اور چاہے لقطہ اٹھانے والے یا اس مفلس سے کہ جس کو وہ لقطہ بطور صدقہ دے دیا گیا تھا تاوان لے لے بشرطیکہ وہ چیز ہلاک و ضائع ہوگئی ہو۔ لیکن ان دونوں میں سے جو بھی تاوان دے گا وہ دوسرے سے کوئی مطالبہ نہیں کر سکتا یعنی اگر

لقطہ اٹھانے والے نے تاوان دیا تو اسے مفلس سے کوئی مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہوگا اور اگر مفلس سے تاوان لیا تو وہ لقطہ اٹھانے والے سے کوئی مطالبہ نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر وہ لقطہ ہلاک وضائع نہ ہوا ہو بلکہ جوں کا توں موجود ہو تو وہی لے لے، گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مالک کو تاوان لینے کا حق اسی صورت میں پہنچے گا۔ جب کہ وہ لقطہ ہلاک وضائع ہو گیا ہو۔ اور اگر وہ ہلاک وضائع نہ ہوا ہو تو پھر وہی لینا ہوگا۔ شرح وقایہ کے بعض حاشیوں میں نہایہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ تشہیر کے بعد لقطہ کو صدقہ کر دینا جائز ہے لیکن اسے رکھ چھوڑنا عزیمت ہے۔ ھی لک (وہ تمہاری ہے) کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بکری بطور لقطہ تم نے پکڑی اور پھر تم نے اس کی تشہیر کی جس کے نتیجہ میں اس کا مالک آگیا تو وہ تم سے لے لے گا، لیکن اگر تشہیر کے بعد مالک نہ آیا تو پھر وہ بکری تمہاری ہو جائے گی تم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو اسی طرح اولاخیک۔ الاخ (یا تمہارے بھائی کی ہے الخ) کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے وہ بکری پکڑی لی اور اس کا مالک آگیا تو وہ اسے لے لے گا۔ اور اگر تم نے نہ پکڑی اور مالک کے ہاتھ لگ گئی تب بھی وہ لے لے گا، یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے وہ بکری نہ پکڑی تو تمہارے بجائے کوئی اور تمہارا مسلمان بھائی اسے پکڑ لے گا اور اگر ان میں سے کوئی بھی صورت نہ ہوئی تو پھر بھیڑیا اس بکری کو پکڑ لے گا، گویا اس ارشاد کا مقصد اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ اگر کوئی بکری بطور لقطہ ملے تو اسے پکڑ لینا اور مالک کے نہ آنے کی صورت میں اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے تاکہ وہ بکری یوں ہی ضائع نہ ہو اور بھیڑیا وغیرہ اسے نہ کھالے۔ یہی حکم ہر اس جانور کے بارہ میں ہے جو اپنے نگہبان (یعنی چرانے والے) کی عدم موجودگی میں بھیڑیئے کی گرفت میں جانے سے محفوظ نہ رہ سکتا ہو۔

"اونٹ کی مشک" سے مراد اس کا پیٹ ہے یعنی اونٹ کا پیٹ مشک کی طرح ہوتا ہے جس میں اتنی رطوبت رہتی ہے جو اس کو بہت دنوں تک بغیر پانی کے رکھ سکتی ہے چنانچہ اونٹ کئی روز تک پیاس کو برداشت کر لیتا ہے جب کہ دوسرے جانوروں میں یہ چیز نہیں ہوتی۔ اس بارہ میں مشہور ہے کہ اونٹ پندرہ روز تک اپنی پیاس برداشت کر لیتا ہے۔

"اونٹ کے موزے" سے مراد اس کے مضبوط وقوی تلوے ہیں کہ وہ راہ چلنے اور پانی گھاس تک پہنچنے اور درندوں سے اپنے آپ کو بچانے کی خوب طاقت رکھتا ہے۔ گویا اس ارشاد گرامی میں مشک اور موزے کے ذریعہ اونٹ کو اس مسافر سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنے ساتھ سامان سفر رکھتا ہے جس کی موجودگی میں اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس معاملہ میں ہر وہ جانور اونٹ کے حکم میں ہے جو اپنے نگہبان (یعنی چرانے والے) کی عدم موجودگی میں (بھیڑیئے وغیرہ کے چنگل میں پھنس کر) ضائع وہلاک نہیں ہوتا جیسے گھوڑا، گائے اور گدھا وغیرہ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ نے اس حدیث سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ جنگل میں اونٹ اور گائے وغیرہ بطور لقطہ نہیں پکڑے جاسکتے کیونکہ وہاں ان کے ضائع ہو جانے کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا البتہ دیہات اور شہروں میں اگر یہ جانور ملیں تو انہیں بطور لقطہ پکڑنا جائز ہے۔ حنفیہ کے ہاں تمام جانوروں کا التقاط اور تعریف (یعنی انہیں بطور لقطہ پکڑنا اور اس کی تشہیر کرنا) لوگوں کے مال کی حفاظت کے پیش نظر ہر جگہ مستحب ہے خواہ جنگل ہو یا آبادی۔ حضرت زید کی اس روایت کے بارہ میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں مذکورہ حکم کہ اونٹ کو پکڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس زمانہ میں تھا جب کہ امانتدار اور خیر و بھلائی کے حامل لوگوں ہی کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے اگر کبھی کا جانور کوئی نہ پکڑتا تھا تو کسی خائن کا ہاتھ ان تک نہیں پہنچتا تھا لیکن اب اس زمانہ میں یہ بات مفقود ہے اور امانت ودیانت کے حامل لوگ بہت ہی کم ہیں اس لئے مخلوق خدا کے مال کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے کہ جو جانور جہاں مل جائے اسے بطور لقطہ پکڑ لایا جائے اور اس کے مالک تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

لقطہ کو بغیر تشہیر اپنے پاس رکھنا خیانت ہے

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰوٰى ضَالَّةً فَهُوَ ضَالٌّ مَالَمْ يُعَرِّفْهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص (کسی کی) کوئی گم شدہ چیز اٹھا کر رکھ لے تو وہ گمراہ ہے جب تک کہ وہ اس کی

تشہیر نہ کرے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی کی کوئی گم شدہ چیز بطور لقطہ اپنے پاس رکھے تو اسے چاہئے کہ وہ اس چیز کی تشہیر و اعلان کرتا رہے بغیر تشہیر اپنے پاس نہ رکھ چھوڑے کیونکہ یہ خیانت اور گمراہی ہے۔

حنفیہ کے ہاں زمین حل اور زمین حرم کا لقطہ برابر ہے

③ وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عُثْمَانَ التَّيْمِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ لُقْطَةِ الْحَاجِّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبدالرحمن ابن عثمان تیمی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حاجیوں کی گری پڑی چیز اٹھانے سے منع کیا ہے۔" (مسلم)

تشریح: گویا حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حرم مکہ کی حدود میں پائے جانے والے لقطہ کا تشہیر و اعلان کے بعد بھی مالک ہونا جائز نہیں ہے بلکہ اٹھانے والے کے لئے واجب ہے کہ وہ اسے اپنے پاس اس وقت تک جوں کا توں رہنے دے جب تک کہ اس کا مالک لینے نہ آئے خواہ کتنی ہی مدت گزر جائے چنانچہ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے لیکن حنفیہ کے مسلک میں زمین حل اور زمین حرم کا لقطہ برابر ہے چنانچہ اس کا بیان "باب حرم مکہ" میں گزر چکا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ویران و غیر آباد زمین کے لقطہ اور برآمد ہونے والے دفینہ کا حکم

④ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنِ الثَّمَرِ الْمُعَلَّقِ فَقَالَ مَنْ اَصَابَ مِنْهُ مِنْ ذِيْ حَاجَةٍ غَيْرَ مُتَّخِذٍ خُبْنَةً فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ فَعَلَيْهِ غَرَامَةُ مِثْلَيْهِ وَالْعُقُوْبَةُ وَمَنْ سَرَقَ مِنْهُ شَيْئًا بَعْدَ اَنْ يُّؤْوِيَهُ الْجَرِيْنُ فَبَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ فَعَلَيْهِ الْقَطْعُ وَذَكَرَ فِيْ ضَالَّةِ الْاِبِلِ وَالْغَنَمِ كَمَا ذَكَرَ غَيْرُهٗ قَالَ وَسُئِلَ عَنِ اللُّقَطَةِ فَقَالَ مَا كَانَ مِنْهَا فِي الطَّرِيْقِ الْمِيْتَاءِ وَالْقَرْيَةِ الْجَامِعَةِ فَعَرِّفْهَا سَنَةً فَاِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا فَادْفَعْهَا اِلَيْهِ وَاِنْ لَّمْ يَاْتِ فَهُوَ لَكَ وَمَا كَانَ فِي الْخَرَابِ الْعَادِيِّ فَفِيْهِ وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ۔ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَرَوٰى اَبُوْدَاؤُدَ عَنْهُ مِنْ قَوْلِهٖ وَسُئِلَ عَنِ اللُّقَطَةِ اِلٰى اٰخِرِهٖ۔

"حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد (حضرت شعیبؒ) سے اور شعیب اپنے دادا (یعنی حضرت عبداللہ ابن عمروؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے (درختوں پر) لٹکے ہوئے پھلوں کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی ضرورت مند کچھ پھل (توڑ کر) کھالے مگر اپنی جھولی میں بھر کر نہ لے جائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں اور جو شخص کھائے بھی اور جھولی بھر کر لے بھی جائے تو اس پر دوگنا تاوان ہے اور سزا ہے اور جو شخص ان پھلوں میں سے کچھ چرائے جو کھلیان میں رکھے جا چکے ہوں اور وہ چرائی ہوئی مقدار ایک سپر (ڈھال) کی قیمت کے بقدر ہو تو اس کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ راوی نے گمشدہ اونٹ اور بکری کے بارہ میں اس سوال و جواب کا ذکر کیا جو دوسرے راویوں نے بیان کیا ہے (اور جو پہلے گزر چکا ہے) اس کے بعد راوی کہتے ہیں کہ پھر آنحضرت ﷺ سے لقطہ کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو لقطہ کسی ایسے راستہ پر پایا جائے جس پر آمد و رفت رہتی ہو اور گاؤں و آبادی کے قریب ہو تو اس کے بارہ میں ایک سال تک تشہیر و اعلان کرو اور پھر جب مالک آجائے تو وہ لقطہ اس کے سپرد کر دو اور اگر مالک نہ آئے تو وہ لقطہ تمہارا ہے (کہ تم اسے اپنے کام میں لا سکتے ہو) اور وہ لقطہ جو ویرانہ قدیم میں پایا جائے اس کا اور زمین سے برآمد ہونے والے دفینے کا یہ حکم ہے کہ اس کا پانچواں حصہ خدا کی راہ میں دے دیا جائے (نسائی) اور ابوداؤد نے اس روایت کو عمرو ابن شعیبؒ سے وسئل عن اللقطہ تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: ضرورت مند سے مراد یا تو مطلقاً فقیر و مفلس ہے کہ اگرچہ وہ حالت اضطرار میں نہ ہو اور یا اس سے مضطر یعنی وہ شخص مراد ہے جو بھوک کی وجہ سے مرا جارہا ہو۔ گویا اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت مند درخت سے بقدر ضرورت پھل توڑ کر کھا لے مگر اپنی جھولی میں بھر کر نہ لے جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ ابن مالک کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص گنہ گار تو نہیں ہوتا۔ لیکن اس پر تاوان یعنی اتنے پھل کی قیمت دینا واجب ہوتا ہے، یا پھر یہ کہ اس حکم کا تعلق اسلام کے ابتدائی زمانہ سے تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ "اور اس پر دوگنا تاوان ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص پھل توڑ کر کھائے بھی اور اپنی جھولی میں بھر کر لے بھی جائے تو اس سے اس پھل کی دوگنی قیمت وصول کی جائے گی لیکن ابن مالک فرماتے ہیں کہ حکم بطریق تنبیہ ہے ورنہ مسئلہ یہ ہے کہ اس پھل کی دوگنی قیمت دینا واجب نہیں ہوتا بلکہ صرف اصل قیمت لی جاسکتی ہے۔ اگرچہ حضرت امام احمد کا مسلک بھی یہی ہے۔ اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ حکم اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ "اور سزا ہے" میں "سزا" سے مراد "تقدیر" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ ہاں بطور تعزیر کوئی سزا دی جاسکتی ہے اور یہ اس لئے ہے کہ اس زمانہ میں باغات محفوظ اور گھرے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ جو کھلیان میں رکھے ہوئے اناج و پھل اگر اتنی مقدار میں چرائے جو ایک سیر کی قیمت کے بقدر ہو تو شرعی قانون کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس وقت ایک سیر کی قیمت تین یا چار درہم ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت امام شافعی کے نزدیک چوری کے مال کی وہ مقدار کہ جس پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتی ہے چار درہم یا اس سے زیادہ مالیت کی ہے۔ لیکن حنفیہ کے مسلک میں ابتدائی دس درہم ہے۔ چنانچہ شمنی نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں سیر کی قیمت دس درہم ہوتی تھی۔

اور جو لقطہ کسی ایسے راستہ پر پایا جائے جو آبادی کے قریب ہونے کی وجہ سے گزر گاہ عام و خاص ہو تو اس کی تشہیر و اعلان واجب ہے کیونکہ اس بات کا غالب گمان ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مسلمان کا ہو۔ اور جو لقطہ کسی ویرانہ قدیم یعنی کسی ایسے ویران گاؤں یا قدیم و غیر آباد زمین پر پایا جائے جہاں مسلمانوں کی عمارات نہ ہوں اور نہ وہ کسی مسلمان کی ملکیت میں ہوں تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں سے پانچواں حصہ نکال کر اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات کر دیا جائے۔ اور بقیہ اپنے استعمال میں لے آیا جائے خواہ وہ لقطہ سونے چاندی کی صورت میں ہو یا ان کے علاوہ کسی اور سامان و زیورات کی شکل میں ہو، اسی طرح کسی ویرانہ قدیم سے اگر کوئی دفینہ وغیرہ برآمد ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

لقطہ استعمال میں آجانے کے بعد اس کا مالک طلب کرے تو اس کا بدل دینا چاہئے

⑤ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ وَجَدَ دِیْنَارًا فَاَتٰی بِهٖ فَاطِمَةَ فَسَاَلَ عَنْهُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا رِزْقُ اللّٰهِ فَاَکَلَ مِنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَکَلَ عَلِیٌّ وَفَاطِمَةُ فَلَمَّا کَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ اَتَتِ امْرَاَةٌ تَنْشُدُ الدِّیْنَارَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا عَلِیُّ اَدِّ الدِّیْنَارَ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے (کسی راستہ میں بطور لقطہ) ایک دینار پایا حضرت علی اسے حضرت فاطمہ کے پاس لائے اور پھر جب حضرت علی نے اس کے بارہ میں رسول کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یہ اللہ کا دیا ہوا رزق ہے" پھر اس دینار (سے خریدی ہوئی چیز) کو آنحضرت ﷺ نے بھی کھایا اور حضرت علی و حضرت فاطمہ نے بھی کھایا اس کے بعد جب ایک عورت اپنا دینار ڈھونڈھتی ہوئی آئی تو آپ ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا کہ "علی! اس عورت کو دینار دے دو۔"

(ابوداؤد)

تشریح: روایت کے مفہوم سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت علی نے تشہیر و اعلان کے بغیر اس دینار کو صرف کیا بلکہ احتمال یہی ہے

کہ پہلے انہوں نے اس کی تشہیر کی پھر بعد میں اسے خرچ کیا۔ آنحضرت ﷺ نے جو اس عورت کے محض کہنے پر اس کو دینار دلوایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو اس عورت نے اس دینار کی علامت بیان کی ہوگی یا آنحضرت ﷺ کو کسی اور ذریعہ سے علم ہو گیا ہوگا کہ وہ دینار اسی عورت کا تھا۔

لقطہ بری نیت سے نہ اٹھاؤ

⑥ وَعَنِ الْجَارُوْدِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَالَّةُ الْمُسْلِمِ حَرَقُ النَّارِ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت جارودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مسلمان کی گم شدہ چیز (دوزخ کی) آگ کا ایک شعلہ ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی لقطہ کو اس بدنیتی کے ساتھ اٹھائے کہ میں اس کا مالک ہو جاؤں گا۔ نیز وہ ان احکام کو پورا نہ کرے۔ جو لقطہ کے سلسلہ میں از قسم تشہیر وغیرہ شریعت نے نافذ کئے ہیں تو وہ لقطہ اس شخص کو دوزخ کی آگ کے حوالہ کر دے گا۔

جب لقطہ اٹھاؤ تو کسی کو گواہ بنالو

⑦ وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وَجَدَ لُقَطَةً فَلْيُشْهِدْ ذَا عَدْلٍ اَوْ ذَوَیْ عَدْلٍ وَلَا يَكْتُمْ وَلَا يُغَيِّبْ فَاِنْ وَجَدَ صَاحِبَهَا فَلْيَرُدَّهَا عَلَيْهِ وَاِلَّا فَهُوَ مَالُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔ (رواہ احمد وابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت عیاض ابن حمارؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز پائے تو چاہئے کہ وہ کسی عادل شخص کو۔ یا فرمایا کہ۔ دو عادل شخصوں کو گواہ بنالے اور (اس کی تشہیر و اعلان نہ کر کے) اس لقطہ کو چھپائے نہیں اور نہ اسے (کسی دوسری جگہ بھیج کر) غائب کر دے۔ پھر اگر مالک آجائے تو وہ لقطہ اس کے حوالہ کر دے اور اگر مالک ہاتھ نہ لگے تو پھر وہ اللہ کا دیا ہوا مال ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے (غیب سے) مال دیتا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: جب کوئی شخص لقطہ اٹھائے تو وہ اس وقت کسی کو اس بات پر گواہ بنالے کہ مجھے یہ چیز بطور لقطہ ملی ہے تا کہ کوئی دوسرا شخص (مثلاً مالک) نہ تو اس پر چوری وغیرہ کی تہمت لگا سکے اور نہ کمی بیشی کا دعوی کر سکے گواہ بنالینے میں ایک مصلحت و فائدہ یہ بھی ہے کہ اس صورت میں اس کا نفس، حرص و طمع میں مبتلا نہیں ہوگا کیونکہ بغیر گواہ کے یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ نفس بدنیتی میں مبتلا ہو جائے اور یہ سوچ کر کہ جب کوئی گواہ نہیں ہے تو یہ چیز مالک کو دینے کی بجائے خود کیوں نہ رکھ لوں جب کہ گواہ بنالینے سے نہ صرف یہ کہ طمع نہیں ہوتی بلکہ وہ لقطہ مالک کے حوالہ کرنا یوں بھی ضروری ہو جاتا ہے پھر اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اٹھانے والے کی ناگہانی موت کے بعد اس کے ورثاء اس لقطہ کو اپنی میراث اور ترکہ میں داخل نہیں کر سکتے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ گواہ بنالینے کا یہ حکم بطریق استحباب ہے جب کہ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم بطریق وجوب ہے۔ اس حدیث میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ "وہ اللہ کا دیا ہوا مال ہے" جب کہ اوپر کی حدیث میں اسے "اللہ کا دیا ہوا رزق ہے" کہا گیا ہے لہٰذا ان دونوں سے مراد "حلال" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مالک کے نہ آنے کی صورت میں وہ لقطہ ایک ایسا حلال مال ہے جس سے وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جسے خدا نے غیب سے دیا ہے۔ ہاں اگر بعد میں مالک آجائے تو پھر اس کا بدل دینا ہوگا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔

لقطہ کی وہ مقدار جس میں تشہیر و اعلان کی ضرورت نہیں

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ رَخَّصَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِی الْعَصَا وَالسَّوْطِ وَالْحَبْلِ وَاَشْبَاهِهِ يَلْتَقِطُهُ الرَّجُلُ يَنْتَفِعُ بِهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں، لاٹھی کوڑے رسی اور اسی کی مانند ان چیزوں کے بارہ میں (کہ جو عام طور پر کم تر سمجھی جاتی ہیں) یہ اجازت دی تھی کہ جو شخص چاہے اٹھالے اور اسے اپنے کام میں لے آئے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یعنی اگر لقطہ ان میں سے کسی چیز کا ہو تو اسے اٹھانے والا جب کہ وہ خود مالدار نہ ہو بغیر تشہیر و اعلان اس کو اپنے استعمال میں لے آئے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر لقطہ کسی کمتر مال کی صورت میں ہو تو اس کی تشہیر نہ کی جائے لیکن اس قول پر تنقید کی گئی ہے۔ رہا یہ سوال کہ "کمتر مال" کی حد کیا ہے تو بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ لقطہ دس درہم سے کم مالیت کا ہو وہ کمتر مال ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ جو لقطہ ایک دینار یا ایک دینار سے کم مالیت کا ہو وہ "کمتر مال" ہے جیسا کہ حضرت علیؓ کے بارہ میں منقول حدیث سے معلوم ہوا۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْ كَرِبَ اَلَا لَا يَحِلُّ فِيْ بَابِ الْاِعْتِصَامِ

اور حضرت مقدام ابن معدی کرب کی روایت اَلَا لَا يَحِلُّ الخ باب الاعتصام بالکتاب و السنۃ میں نقل کی جاچکی ہے۔

بَابُ الْفَرَائِضِ
فرائض کا بیان

"فرائض" جمع ہے "فریضہ" کی جو "فرض" سے مشتق ہے۔ فرائض میراث کے ان حصوں کو کہتے ہیں جو قرآن یا حدیث میں متعین و مقرر ہیں۔ گویا اس باب میں یہ بیان کیا جائے گا کہ جو شخص مرجائے اس کے کون کون عزیز و اقارب اس کے وارث ہوں گے اور اس کا چھوڑا ہوا مال و اسباب ان ورثاء میں کس طرح تقسیم ہوگا۔ یہ باب چونکہ ایک بڑے اہم موضوع سے متعلق ہے اس لئے مناسب ہے کہ ابتدائی طور پر چند اصولی باتیں اور کچھ ضروری مسائل یکجائی انداز میں نقل کر دیئے جائیں۔

ورثاء کی ترتیب

علماء لکھتے ہیں کہ میت کے ترکہ (یعنی اس کے چھوڑے ہوئے مال و اسباب) کے ساتھ چار حق متعلق ہوتے ہیں جس کی ترتیب یہ ہے کہ ① پہلے تو میت کی تجہیز و تکفین کی جائے یعنی اسے غسل دیا جائے، پھر کفن دیا جائے، اس کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھوا کر قبرستان لے جایا جائے اور پھر قبر میں دفن کیا جائے، ان چیزوں میں جو کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہو وہ اس کے ترکہ میں سے اس طرح خرچ کیا جائے کہ نہ تو تنگی کی جائے اور نہ اسراف کیا جائے۔

② اس کے بعد اگر میت کے ذمہ کوئی قرض و مطالبہ ہو تو اس کی ادائیگی کی جائے۔ پھر قرض و مطالبہ کی ادائیگی کے بعد۔

③ جو مال و اسباب بچے اس میں سے تہائی حصہ میں وصیت جاری کی جائے بشرطیکہ اس نے وصیت کی ہو ان تین مرحلوں کے بعد۔

④ اس کا بقیہ تمام مال و اسباب اس کے وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے جس کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے ذوی الفروض کو ان کے مقررہ حصے دیئے جائیں اور ان کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ میت کے عصبات نسبی کو دے دیا جائے کیونکہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ عصبات نسبی کا حق ہوتا ہے اور اگر میت کے وارثوں میں ذوی الفروض موجود نہیں ہوتے تو پھر اس کا تمام ترکہ عصبات نسبی کو ملتا ہے اور اگر اس کے وارثوں میں عصبات نسبی نہیں ہوتے تو ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ آزاد کرنے والے کو ملتا ہے بشرطیکہ میت غلام رہا ہو اور اس کو آزاد کیا گیا ہو اور اگر آزاد کرنے والا موجود نہ ہو تو پھر اس آزاد کرنے والے کے مرد عصبات کو دیا جاتا

ہے اور اگر یہ بھی نہ ہوں تو بھی وہ بچا ہوا ترکہ ذوی الفروض کی طرف لوٹ جائے گا علاوہ زوجین کے کیونکہ اس دوبارہ تقسیم میں ذوی الفروض میں سے زوجین کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اور اگر میت کے ورثاء میں نہ تو ذوی الفروض میں سے کوئی ہو اور نہ عصبات نسبی وسببی ہوں تو اس کا ترکہ ذوی الارحام کو دیا جائے اور اگر ذوی الارحام بھی نہ ہوں تو مولی موالات کو دیا جائے اور اگر کوئی مولا موالات بھی نہ ہو تو پھر وہ تمام ترکہ اس غیر شخص کو ملے گا جس کے نسب کا میت نے اقرار کیا ہو مثلاً اس نے زید کے بارہ میں کہا ہو کہ یہ میرے باپ کا بیٹا ہے حالانکہ زید کا یہ نسب (یعنی اس میت کے باپ کا بیٹا ہونا) اس اقرار کے علاوہ اور کسی صورت میں ثابت نہ ہو لیکن پھر بھی وہ میت کے ترکہ کا حقدار قرار پائے گا۔ اور اگر ایسا بھی کوئی شخص نہ ہو تو پھر وہ ترکہ اس شخص کو دیا جائے گا۔ جس کے لئے میت نے اپنے تمام مال کی وصیت کی ہو، اور اگر ایسا بھی کوئی شخص نہ ہو جس کے لئے میت نے اپنے تمام مال و اسباب کی وصیت کی ہو تو پھر اس کا سارا مال و اسباب بیت المال میں رکھا جائے گا۔ اور اگر بیت المال بھی نہ ہو تو پھر آخر میں بیت المال کے مصرف میں صرف کیا جائے یعنی مدارس و مساجد یا فقراء و مساکین وغیرہ کو دے دیا جائے۔

ذوی الفروض کی تفصیل

ذوی الفروض بارہ ہیں۔ ① باپ۔ ② دادا خواہ اوپر کے درجہ کے ہوں جیسے پڑدادا اور سکڑ دادا وغیرہ۔ ③ اخیافی بھائی (اخیافی ان بھائیوں کو کہتے ہیں جن کے باپ الگ الگ ہوں اور ماں ایک ہو)۔ ④ بیوی۔ ⑤ خاوند۔ ⑥ ماں۔ ⑦ جدہ (یعنی دادی یا نانی (خواہ اوپر کے درجہ کی ہوں جیسے پڑدادی یا پڑنانی اور سکڑ دادی یا پڑنانی اور سکڑ نانی۔ ⑧ بیٹی۔ ⑨ پوتی۔ ⑩ حقیقی بہن۔ ⑪ سوتیلی بہن۔ اور ⑫ اخیافی بہن۔

ذوی الفروض کے حصے

میت کے ترکہ میں باپ کا چھٹا حصہ ہوتا ہے جب کہ میت کا بیٹا یا پوتا اور یا پڑپوتا بھی موجود ہو، اور اگر یہ نہ ہوں بلکہ بیٹی یا پوتی اور یا پڑپوتی موجود ہو تو باپ کو چھٹا حصہ بھی ملے گا اور وہ عصبہ بھی ہو گا اور اگر نہ تو بیٹا یا پوتا اور پڑپوتا ہو اور نہ بیٹی یا پوتی اور یا پڑپوتی ہو تو باپ صرف عصبہ ہو گا۔ حاصل یہ ہے کہ پہلی صورت میں تو باپ صرف صاحب فرض ہوتا ہے اور دوسری صورت میں صاحب فرض بھی ہوتا ہے اور عصبہ بھی اور تیسری صورت میں صرف عصبہ ہوتا ہے۔ اگر میت کا باپ موجود نہ ہو تو مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں اس کا دادا باپ کی مانند ہو گا، اور اگر میت کے باپ اور دادا دونوں زندہ ہوں تو پھر دادا محروم ہو گا یعنی اسے میت کے ترکہ میں سے کچھ نہیں ملے گا۔

اخیافی بھائی اور اخیافی بہن کو میراث کا چھٹا حصہ ملے گا بشرطیکہ وہ ایک ہو، اور اگر وہ دو یا دو سے زائد ہوں تو ان کے لئے تہائی حصہ ہے جو مرد و عورت پر برابر تقسیم ہو گا، اور اگر میت کا باپ یا دادا زندہ ہو یا اس کا بیٹا یا بیٹے کی اولاد موجود ہو تو پھر اخیافی بھائی بہن محروم ہوں گے۔

اگر بیوی مر جائے اور اس کا بیٹا بیٹی نہ ہو اور بیٹے کی اولاد بھی نہ ہو تو اس کے ترکہ میں سے شوہر کو نصف حصہ ملے گا اور اگر بیٹا بیٹی یا بیٹے کی اولاد موجود ہو تو شوہر کو چوتھا حصہ ملے گا۔

اگر خاوند مر جائے اور نہ تو اس کے بیٹے بیٹی ہوں اور نہ بیٹے کی اولاد ہو تو اس کے ترکہ میں سے بیوی کو چوتھائی حصہ ملے گا اور اگر میت کے بیٹا بیٹی یا بیٹے کی اولاد موجود ہو تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا، یہ بات ملحوظ رہے کہ اگر میت کی ایک ہی بیوی ہو تو اس کو بھی وہی حصہ ملے گا جو ذکر کیا گیا ہو اور اگر ایک سے زائد یعنی دو یا تین اور چار بیویاں ہوں تب بھی یہی حصہ ملے گا فرق صرف اتنا ہے کہ اگر ایک بیوی ہو گی تو مذکورہ بالا حصہ کی وہ تنہا حق دار ہو گی اور ایک سے زائد بیویاں ہوں گی تو وہ اس حصہ کو باہم برابر تقسیم کر لیں گی۔

میت کے ترکہ میں سے ماں کو چھٹا حصہ ملے گا بشرطیکہ میت کے بیٹا بیٹی یا پوتا یا اس کی اولاد یا ایک بہن یا دو بھائی اور دو بہن یا دو سے

زائد بھائی اور بہن (خواہ حقیقی بھائی بہن ہوں یا سوتیلے اور اخیافی ہوں) موجود ہوں، اگر ان میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو گا تو ماں کو کل ترکہ میں سے تہائی حصہ ملے گا۔ اور اگر ماں کے ساتھ باپ اور خاوند یا بیوی بھی ہو تو اس صورت میں باپ اور خاوند یا بیوی کا حصہ دے کر جو باقی بچے گا اس میں سے ماں کو تہائی حصہ ملے گا اور اگر مذکورہ بالا صورت میں بیوی یا خاوند کے ساتھ باپ کے بجائے دادا موجود ہو تو پھر ماں کو تمام ترکہ کا تہائی حصہ ملے گا کیونکہ اس صورت میں دادا، باپ کا قائم مقام نہیں ہوتا۔

دادی اور نانی کا چھٹا حصہ ہوتا ہے خواہ وہ ایک ہوں یا کئی ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر صرف ایک دادی یا صرف ایک نانی ہوگی تو وہ میت کے ترکہ کے چھٹے حصہ کی تنہا حق دار ہوگی اور اگر ایک سے زائد ہوں گی مثلاً ایک دادی اور ایک نانی ہو یا دو دادی یا دو نانی ہوں تو وہ سب اس چھٹے حصہ کو باہم برابر تقسیم کرلیں گی بشرطیکہ وہ سب درجہ میں برابر ہوں اور اگر درجہ میں برابر نہ ہوں بلکہ درجہ میں متفاوت ہوں (جیسے ایک دادی ہو اور ایک پڑدادی ہو یا ایک نانی ہو اور ایک پڑنانی ہو) تو دور کے درجہ والی (یعنی پڑنانی) قریب کے درجہ والی (یعنی نانی) کے سامنے محروم ہوگی، اسی طرح ماں کی موجودگی میں تمام ہی جدات (یعنی دادی و نانی وغیرہ) محروم ہوتی ہیں، نیز دادا کی موجودگی میں باپ کی دادیاں محروم ہوتی ہیں لیکن دادا کی بیوی یعنی باپ کی ماں محروم نہیں ہوتی۔

میت کی بیٹی میراث سے کبھی محروم نہیں ہوتی اگر اس کا بھائی یعنی میت کا بیٹا موجود ہوتا ہے تو وہ عصبہ بن جاتی ہے ورنہ ذوی الفروض رہتی ہے، چنانچہ بیٹی کے میراث پانے کی دو تین صورتیں ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ اگر صرف ایک بیٹی ہو اور اس کے ساتھ اس کا کوئی حقیقی یا سوتیلا بھائی نہ ہو تو میت کے ترکہ میں سے اس کو نصف حصہ ملتا ہے (اور اگر کوئی دوسرا وارث بھی نہ ہو تو باقی نصف حصہ بھی اسی کو مل جاتا ہے) دوم یہ کہ اگر دو بیٹیاں ہوں یا دو سے زائد ہوں اور ان کے ساتھ ان کا کوئی حقیقی یا سوتیلا بھائی نہ ہو تو ان بیٹیوں کو ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا جسے وہ سب آپس میں برابر تقسیم کرلیں گی۔ سوم یہ کہ اگر بیٹیوں کے ساتھ میت کا بیٹا موجود ہو تو اس صورت میں بیٹی کا کوئی حصہ مقرر نہیں بلکہ وہ عصبہ بن جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میت کے ترکہ میں سے جس قدر بیٹے کو ملے گا اس کا آدھا ہر ایک بیٹی کو ملے گا خواہ ایک بیٹی ہو یا دو چار بیٹیاں ہوں، چنانچہ اگر کسی میت کے متعدد بیٹے اور متعدد بیٹیاں ہوں تو ان میں ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ ہر بیٹے کو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔

اگر میت کے بیٹی بیٹا یا پوتا موجود نہ ہو صرف ایک پوتی ہو تو اس کو ترکہ میں سے نصف ملے گا اور اگر دو یا دو سے زیادہ پوتیاں ہوں تو ان کو کل ترکہ میں سے دو تہائی دیا جائے گا۔ جسے وہ سب آپس میں برابر تقسیم کرلیں گی؛ اگر میت کے بیٹا، پوتا یا پڑپوتا موجود نہ ہو بلکہ صرف ایک بیٹی ہو تو پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا خواہ ایک پوتی ہو یا متعدد پوتیاں ہوں، اور اگر میت کے دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں موجود ہوں گی تو اس صورت میں پوتی بالکل محروم رہے گی ہاں اگر پوتی کے ساتھ میت کا پوتا بھی موجود ہو (خواہ وہ نیچے ہی کے درجہ کا کیوں نہ ہو یعنی پوتا اور خواہ یہ پوتا اس پڑپوتی کا حقیقی بھائی ہو یا سوتیلا بھائی ہو اور یا چچازاد بھائی ہو) تو پھر چاہے میت کی ایک ہی بیٹی ہو یا متعدد بیٹیاں ہوں وہ پوتی عصبہ ہو جائے گی۔ جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ذوی الفروض کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچے گا یہ پوتی اور پوتا آپس میں بطور عصوبت تقسیم کریں گے یعنی پوتے کو دو حصے اور پوتی کو ایک حصہ ملے گا، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اگر میت کا بیٹا موجود ہو گا تو پھر یہ پوتی ہر حال میں بالکل محروم رہے گی۔ نیز اگر نہ تو میت کی اولاد موجود ہو اور نہ میت کے بیٹے کی اولاد موجود ہو تو مذکورہ بالا تمام صورتوں میں میت کی پوتی اس کی پوتی کے قائم مقام ہوگی اور اگر بیٹی موجود ہے تو بیٹی کی اولاد محروم رہے گی اور اگر پوتی موجود ہے تو پوتی کی اولاد محروم قرار پائے گی۔

اگر میت کی اولاد موجود ہو یا اس کے بیٹے کی اولاد موجود ہو (خواہ وہ نیچے ہی کے درجہ کی کیوں نہ ہو) تو اخیافی بہن بھائی محروم قرار پاتے ہیں، اسی طرح اگر میت کا باپ یا دادا موجود ہو تو اخیافی بہن بھائی محروم ہوتے ہیں۔

اگر میت کے کوئی بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی اور یا پڑپوتا پڑپوتی موجود نہ ہو بلکہ صرف ایک حقیقی بہن ہو تو وہ ہر حال میں بیٹی کے قائم مقام ہوگی یعنی

اگر ایک بہن ہوگی تو اسے میت کے کل ترکہ میں سے نصف ملے گا اور اگر دو یا دو سے زائد بہنیں ہوں گی تو انہیں کل ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا جسے وہ آپس میں برابر، تقسیم کرلیں گی، مذکورہ بالا صورت میں سوتیلی بہن کا بھی یہی حکم ہے بشرطیکہ حقیقی بہن موجود نہ ہو۔

اگر میت کی بیٹی یا پوتی یا پڑپوتی اور سکڑپوتی موجود ہو (خواہ ایک ہو یا زیادہ ہوں) تو اس صورت میں حقیقی بہن (اور اگر حقیقی بہن نہ ہو تو سوتیلی بہن) عصبہ ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میت کے ترکہ میں سے ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ اس بہن کو مل جائے گا۔

اگر میت کے حقیقی بھائی (ایک یا زیادہ) موجود ہو تو حقیقی بہن اسکے ساتھ مل کر عصبہ بن جائے گی اور اگر بھائی حقیقی نہ ہو بلکہ سوتیلا ہو تو حقیقی بہن اس سوتیلے بھائی کی موجودگی میں ذوی الفروض میں شامل ہو جائے گی۔

اگر میت کے ایک حقیقی بھائی ہو اور اس کے ساتھ ہی سوتیلے بھائی بہن بھی ہوں تو اس حقیقی بھائی کی موجودگی میں وہ سوتیلے بھائی بہن محروم ہوں گے۔

اگر میت کی ایک حقیقی بہن موجود ہو تو اس کی موجودگی میں سوتیلی بہن کو چھٹا حصہ ملے گا خواہ وہ ایک ہو یا ایک سے زائد ہوں اور اگر حقیقی بہنیں ایک سے زائد ہوں تو پھر سوتیلی بہن ساقط ہو جائے گی اسے کچھ نہیں ملے گا ہاں اگر سوتیلی بہن کے ساتھ سوتیلا بھائی ہو تو پھر یہ سوتیلی بہن محروم نہیں ہوگی بلکہ خواہ ایک حقیقی بہن ہو ایک سے زائد ہوں اور خواہ ایک بھی نہ ہو ہر صورت میں سوتیلی بہن سوتیلے بھائی کے ساتھ عصبہ ہو جائے گی جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد میت کے ترکہ میں سے جو کچھ بھی بچے گا وہ سب ان سوتیلے بہن بھائی کے درمیان بطور عصوبت تقسیم ہو جائے گا۔ اور اگر میت کی حقیقی بہن، میت کی بیٹی یا پوتی یا پڑپوتی اور یا سکڑپوتی کے ساتھ عصبہ ہو جائے گی تو اس صورت میں سوتیلا بھائی اور سوتیلی بہن بالکل محروم رہیں گے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اگر میت کے بیٹا یا پوتا یا پڑپوتا اور یا سکڑپوتا موجود ہوگا تو میت کا حقیقی بھائی، حقیقی بہن اور سوتیلے بھائی بہن محروم رہیں گے اسی طرح میت کے باپ یا دادا کی موجودگی میں بھی میت کے حقیقی اور سوتیلے بہن بھائی محروم رہیں گے۔

عصبات کی تفصیل

میت کے ترکہ میں سے ذوی الفروض کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ عصبات میں تقسیم ہوگا، گویا ذوی الفروض پہلے درجہ کے وارث ہیں اور عصبات دوسرے درجہ کے وارث ہیں۔ چنانچہ عصبات کے بھی چار درجے ہیں۔ اول بیٹا، پوتا، پڑپوتا، سکڑپوتا (یا اس کے نیچے کے درجہ کے) دوم باپ، دادا، پڑدادا، (یا اس کے اوپر کے درجہ کے) سوم۔ حقیقی اور سوتیلے بھائی اور ان کے لڑکے (اگرچہ نیچے کے درجہ کے ہوں) چہارم میت کے چچا میت کے باپ کے چچا، میت کے دادا کے چچا اور ان چچاؤں کے بیٹے، پوتے پڑوتے اور سکڑوتے۔

اب ان چاروں درجوں کی ترتیب یہ ہوگی، ان چاروں درجوں میں مقدم بیٹے ہیں پھر پوتے پھر پڑپوتے پھر سکڑوتے، پھر باپ پھر دادا پھر پڑدادا پھر سکڑدادا، پھر بھائی پھر بہن پھر بھتیجے (اگرچہ نیچے کے درجے کے ہوں) پھر چچا پھر چچا کی اولاد۔ لہٰذا جب ان چاروں درجوں میں سے پہلے درجہ کا کوئی عصبہ موجود ہوگا تو باقی تینوں درجوں کے عصبات بالکل محروم قرار پائیں گے۔ اسی طرح اگر پہلے درجہ کا کوئی عصبہ یعنی بیٹا یا پوتا یا پڑوتا اور یا سکڑوتا موجود نہ ہوگا اور دوسرے درجہ میں کا کوئی عصبہ موجود ہوگا تو باقی دو درجوں کے عصبات بالکل محروم ہو جائیں گے اور اگر نہ تو پہلے درجہ کے عصبات میں سے کوئی موجود ہو اور نہ دوسرے درجہ کے عصبات میں سے بلکہ تیسرے درجہ کے عصبات میں سے کوئی موجود ہو تو پھر چوتھے درجہ کے عصبات بالکل محروم رہیں گے۔ ایسے ہی ان چاروں درجوں میں سے ہر درجہ میں قریب کا عصبہ بعید کے عصبہ پر مقدم ہوگا یعنی قریب کے عصبہ کی موجودگی میں بعید کے عصبہ کو کچھ نہیں ملے گا۔ مثلاً میت کے بیٹا بھی موجود ہو اور پوتا بھی موجود ہو اور یہ دونوں ہی درجہ اول کے عصبہ ہیں مگر اس صورت میں قریب کا عصبہ یعنی بیٹا مقدم ہوگا کہ اسے میت کا ترکہ ملے گا اور بعید کا عصبہ یعنی پوتا محروم ہو جائے گا، اسی طرح حقیقی عصبہ سوتیلے عصبہ پر مقدم ہوگا اور میت کے چچاؤں کے پوتے

میت کے باپ کے چچاؤں پر مقدم ہوں گے۔ اور میت کے باپ کے چچاؤں کے پوتے میت کے دادا کے چچاؤں پر مقدم ہوں گے۔

ذوی الارحام کی تفصیل

جیسا کہ پہلے بتایا گیا تھا کہ میت کے وارثوں میں سب سے پہلا درجہ ذوی الفروض کا ہے اور دوسرا درجہ عصبات کا ہے، اب یہ سمجھئے کہ اگر کسی میت کے وارثوں میں نہ تو ذوی الفروض ہوں اور نہ عصبات ہوں تو پھر اس کا ترکہ ذوی الارحام کو ملے گا، گویا ذوی الارحام کے وارثوں کا تیسرا درجہ ہے، چنانچہ جس طرح عصبات کے چار درجے ہیں اسی طرح ذوی الارحام کے بھی چار درجے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

اول۔ میت کی بیٹی، پوتی اور پڑپوتی (خواہ اس سے نیچے کے درجہ) کی اولاد یعنی میت کے نواسہ، نواسی، میت کے بیٹے کا نواسہ، نواسی، میت کے نواسے کا بیٹا، بیٹی کی نواسی کا بیٹا بیٹی اور میت کے پوتے کے نواسہ نواسی وغیرہ۔

دوم۔ دادا فاسد، دادی فاسدہ اور نانی فاسدہ (خواہ یہ سب اوپر کے درجہ کے ہوں) اس موقع پر یہ سمجھ لیجئے کہ دادا فاسد اس دادا کو کہتے ہیں جس کے اور میت کے درمیان عورت کا واسطہ ہو جیسے میت کا نانا اور میت کی دادی یا نانی کا باپ۔ اور دادی فاسدہ اور نانی فاسدہ اس دادی یا نانی کو کہتے ہیں جس کے اور میت کے درمیان دادا فاسد کا واسطہ ہو جیسے نانا کی ماں اور دادی یا نانی کے باپ کی ماں۔ یہ سب ذوی الارحام ہیں جب کہ دادا صحیح اور دادی و نانی صحیحہ ذوی الفروض ہیں چنانچہ دادا صحیح اس دادا کو کہتے ہیں جس کے اور میت کے درمیان عورت کا واسطہ نہ ہو جیسے دادا اور پڑدادا (یا اس سے اوپر کے درجہ کے) اور دادی و نانی صحیحہ اس دادی یا نانی کو کہتے ہیں جس کے اور میت کے درمیان دادا فاسد کا واسطہ نہ ہو جیسے دادی یا پڑدادی اور نانی یا پڑنانی (یا اس سے اوپر کے درجہ کی)۔

سوم۔ حقیقی بہنوں کی اولاد، سوتیلی بہنوں کی اولاد اخیافی بہنوں کی اولاد، اخیافی بھائی کی اولاد حقیقی بھائی کی بیٹیاں اور سوتیلے بھائی کی بیٹیاں۔

چہارم۔ پھوپیاں خواہ حقیقی ہوں یا سوتیلی اور اخیافی ہوں۔ اخیافی چچا، ماموں اور خالائیں۔

ذوی الارحام کے یہ چار درجے ہیں اور عصبات کی طرح ان کی ترتیب بھی یہ ہے کہ اگر ان چاروں درجوں میں سے اول درجہ کے ذوی الارحام وارث موجود ہوں گے یا ان کی اولاد (خواہ وہ کتنے ہی نیچے کے درجہ کی ہو) موجود ہوگی تو باقی تینوں درجوں کے ذوی الارحام محروم ہوں گے، اسی طرح درجۂ دوم کے ذوی الارحام ورثاء کی موجودگی میں سوم اور چہارم درجہ کے اور تیسرے درجہ کے ذوی الارحام کی موجودگی میں چوتھے درجہ کے ذوی الارحام محروم ہوں گے، نیز عصبات کی طرح ذوی الارحام میں بھی اس کے ہر درجہ میں قریب کا ذی رحم بعید کے ذی رحم پر مقدم ہوگا۔

میراث پانے سے محروم کر دینے والی چیزیں

اللہ تعالیٰ نے میت کا مال و اسباب اس کے موجودہ ورثاء کو متعینہ حصوں اور مقررہ ضابطوں کے تحت دینے کا جو حکم دیا ہے اس میں دراصل میت اور اس کے ورثاء کے درمیان ایک خاص علاقہ، تعلق اور رشتہ داری کو ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اگر کوئی ایسی بات پیش آجائے جس سے نہ صرف یہ کہ میت اور اس کے وارث کے درمیان کسی خاص علاقہ و تعلق کا اظہار نہ ہوتا ہو بلکہ وہ ایک قسم کی جدائی علیحدگی اور نفرت ثابت کرنے کا ذریعہ بن جائے تو وہ وارث میراث میت کا حق دار نہیں ہوگا اور اسے کوئی میراث نہیں ملے گی۔ لہٰذا ایسی چار چیزیں ہیں جو کسی شخص کو میراث پانے سے محروم کر دیتی ہیں، ان چار چیزوں کی تفصیل یہ ہے۔

① غلامی۔ نہ تو کسی غلام کا وارث کوئی آزاد شخص ہوتا ہے اور نہ خود غلام کسی آزاد شخص کا وارث بن سکتا ہے کیونکہ غلام شرعی طور پر کسی چیز کا مالک ہونے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا اور نہ کوئی چیز اس کی ملکیت ہوتی ہے۔

② قتل۔ اگر کوئی بالغ وارث اپنے مورث کو قتل کر دے تو وہ وارث، میراث پانے سے بالکل محروم رہے گا، لیکن یہاں قتل سے مراد وہ قتل ہے جس کی وجہ سے قاتل پر قصاص یا کفارہ واجب ہوتا ہے، چنانچہ قتل کی پانچ قسمیں ہیں (جن کی تفصیل انشاء اللہ اپنے موقع پر آئے گی) ان میں سے چار قسمیں ایسی ہیں کہ کسی میں قصاص واجب ہوتا ہے اور کسی میں کفارہ اور دیت۔ لہٰذا ان چاروں صورتوں میں حنفی مسلک کے مطابق قاتل میراث سے محروم ہو جاتا ہے جب کہ وہ اپنے مورث کو ناحق قتل کرے، ہاں اگر وارث اپنے مورث کو ظلماً قتل نہ کرے بلکہ دفاع کرتے ہوئے مورث پر وار کرے اور مورث مارا جائے۔ مثلاً مورث ناحق اس وارث پر حملہ کرے اور پھر وہ وارث اپنے کو بچانے کے لئے مورث پر وار کرے اور اس کے وار کے نتیجہ میں مورث مارا جائے، یا مورث پر شرعاً کسی وجہ سے بطور سزا قتل واجب ہو (مثلاً قصاص کے طور پر) یا اس پر کوئی حد جاری کی جانی ضروری ہو اور بادشاہ یا قاضی کے حکم سے وارث نے اس مورث کو قتل کیا یا اس پر حد جاری کی اور وہ مرگیا تو اس صورت میں بھی وارث میراث سے محروم نہیں ہوگا۔

قتل کی پانچ قسموں میں ایک قسم "قتل بالتسبب" ہے۔ قتل کی اس قسم پر نہ قصاص لازم آتا ہے اور نہ کفارہ بلکہ صرف دیت واجب ہوتی ہے چنانچہ اس قسم کے قتل میں بھی قاتل میراث سے محروم نہیں ہوتا۔ قتل بالتسبب کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی زمین میں مالک کی اجازت کے بغیر پتھر رکھ دے یا کنواں کھود دے اور پتھر سے ٹھوکر کھا کر یا کنویں میں گر کر کوئی شخص مرجائے تو اس شخص پر دیت واجب ہوتی ہے۔

اسی طرح حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی نابالغ یا مجنوں اپنے مورث کو قتل کر دے تو وہ میراث سے محروم نہیں ہوتا کیونکہ نابالغ اور مجنون کے اکثر افعال پر شرعی طور پر کوئی سزا واجب نہیں ہوتی۔

③ اختلاف مذہب۔ دو مذہبوں کا اختلاف میراث سے محروم کر دیتا ہے، یعنی اگر وارث مسلمان ہے اور مورث غیر مسلم ہے (خواہ وہ ہندو ہو یا عیسائی اور یہودی وغیرہ ہو) تو اس کی میراث مسلمان کو نہیں ملے گی، اسی طرح اگر وارث غیر مسلم ہے اور مورث مسلمان ہے تو اس کی میراث غیر مسلم کو نہیں ملے گی۔

④ اختلاف دارین۔ یعنی ممالک ووطن کا اختلاف۔ میت اور وارث کے ملک ووطن کا مختلف ہونا میراث سے محروم کر دیتا ہے مثلاً ایک شخص دار الاسلام میں رہتا ہے اور ایک شخص دار الحرب میں تو دونوں ایک دوسرے کی میراث سے محروم رہیں گے۔ لیکن یہ حکم غیر مسلم کے لئے ہے۔ مسلمان مورث ووارث اگر اختلاف دارین بھی رکھتے ہوں گے تب بھی ایک دوسرے کی میراث کے حقدار ہوں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

میت کا ترکہ اس کے ورثاء کا حق ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنَا اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ مَاتَ وَعَلَیْهِ دَیْنٌ وَلَمْ یَتْرُكْ وَفَاءً فَعَلَیَّ قَضَاؤُهُ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ وَفِیْ رِوَایَةٍ مَنْ تَرَكَ دَیْنًا اَوْضِیَاعًا فَلْیَاتِنِیْ فَاَنَا مَوْلَاهُ وَفِیْ رِوَایَةٍ مَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ وَمَنْ تَرَكَ كَلًّا فَاِلَیْنَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میں مسلمانوں کے حق میں خود ان سے بھی زیادہ عزیز ہوں (یعنی دین ودنیا کے ہر معاملہ میں ایک مسلمان اپنے اوپر خود جتنا شفیق ومہربان ہو سکتا ہے میں اس پر اس سے بھی زیادہ شفیق ومہربان ہوں اسی لئے ان کے قرضوں کو ادا کرنے میں زیادہ حق دار ہوں) لہٰذا جو شخص (یعنی مسلمان) مرجائے اور اس پر قرض ہو اور اس نے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور جو شخص (اتنا) مال چھوڑ جائے (جو اس کے قرض کی ادائیگی اور اس کی کی ہوئی وصیت کی شرعی تکمیل کے بعد بھی بچ جائے) تو وہ اس کے وارثوں کا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "جو شخص قرض دار یا

عیال دار مرجائے (اور اس نے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کے قرض کی ادائیگی ہو سکے یا اس کے عیال کی پرورش ہو سکے) تو (اس کا وکیل یا وصی) میرے پاس آئے میں اس کا انتظام کروں گا (یعنی میں اس کا قرض ادا کروں گا اور اس کے عیال کی نگہداشت و غم خواری کروں گا)۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص مال چھوڑ کر مرے تو وہ مال اس کے وارثوں کا ہے اور جو بھاری چیز (یعنی قرض اور عیال) چھوڑ کر مرے تو اس کا انتظام کرنا میرے ذمہ ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: شروع میں آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ اگر کوئی شخص مرتا جس کے ذمہ قرض ہوتا اور اس کے ترکہ میں اتنا مال نہ ہوتا جو اس قرض کی ادائیگی کے لئے کافی ہوتا تو آپ ﷺ اس کے جنازہ کی نماز پڑھنے سے احتراز فرماتے لیکن جب حق تعالیٰ نے وسعت عطا فرمائی اور آپ ﷺ کو کشائش مال کی نعمت میسر ہوئی تو آپ ﷺ نے یہ معمول بنالیا کہ جو شخص قرضدار مرجاتا آپ ﷺ اس کا قرض ادا کرتے اور اس کے جنازہ کی نماز پڑھتے۔ یہ بات حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت سے مفہوم ہوتی ہے جو باب الافلاس و الانظار کی پہلی فصل میں گزر چکی ہے۔ اور یہ گویا آنحضرت ﷺ کے اس بے پناہ جذبۂ شفقت و مہربانی اور کمال رحمت ہمدردی کا مظہر ہے جو آپ ﷺ تمام مسلمانوں کے تئیں رکھتے تھے۔

میت کا ترکہ پہلے ذوی الفروض کو دو

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ میراث کے حصے (جو قرآن کریم میں متعین کئے گئے ہیں) حصہ داروں کو دو پھر جو کچھ بچے وہ میت کے اس مرد وارث (عصبہ) کا حق ہے جو میت کا سب سے قریبی عزیز ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ میت کا ترکہ سب سے پہلے ان لوگوں کو دو جن کے حصے قرآن کریم میں مقرر ہیں کہ جنہیں ذوی الفروض کہا جاتا ہے، ان کو معینہ حصے دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ عصبات کو دو، اور پھر عصبات میں مقدم وہ عصبہ ہے جو میت کا سب سے قریبی عزیز ہو، چنانچہ قریب کے عصبہ کی موجودگی میں بعید کا عصبہ میت کے ترکہ کا وارث نہیں ہوتا، ابتداء باب میں ذوی الفروض اور عصبات کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ رجل ذکر میں لفظ "ذکر" تاکید کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ خنثیٰ سے احتراز ہو جائے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ یہ ارشاد گرامی اس بات کی دلیل ہے کہ بعض وارث بعض دوسرے وارثوں کے حق میں حاجب (یعنی میراث سے روکنے والے) ہوتے ہیں، چنانچہ حجب یعنی میراث سے روکنا دو طرح سے ہوتا ہے۔ اول "حجب نقصان" دوم "حجب حرمان" اس موقعہ پر اجمالی طور پر ان دونوں کی یہ تعریف جان لیجئے کہ بعض وارث ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے دوسرے وارثوں کا حصہ کم ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب میت کے اولاد نہ ہو تو میت کی ماں کو ترکہ میں سے ایک تہائی ملتا ہے۔ اور اگر میت کی اولاد موجود ہو تو میت کی ماں کو صرف چھٹا حصہ ملتا ہے اس کو حجب نقصان کہتے ہیں، اسی طرح بعض وارث ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے بعض عزیزوں کو میراث میں سے کچھ بھی نہیں ملتا مثلاً میت کے بیٹے کے موجودگی میں بھائی میراث سے بالکل محروم رہ جاتا ہے۔ اس کو حجب حرمان کہتے ہیں۔

اختلاف مذہب میراث سے محروم کر دیتا ہے

(۳) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" نہ تو مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے کہ کافر، مسلمان کا وارث نہیں ہوتا یعنی اگر مورث مسلمان ہو اور وارث کافر ہو تو مسلمان مورث کے مرنے کے بعد اس کا کافر وارث میراث سے محروم رہے گا۔ لیکن اس بارہ میں اختلاف ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے یا نہیں، چنانچہ اکثر علماء تو یہ کہتے ہیں کہ جس طرح کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، اسی طرح مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا، مگر صحابہ اور تابعین میں سے بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے چنانچہ حضرت امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

اسی طرح اس بات پر بھی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ کافر کی طرح مرتد بھی مسلمان کا وارث نہیں ہوتا لیکن اس بارہ میں اختلاف ہے کہ مسلمان، مرتد کا وارث ہوتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ حضرت ربیعہؒ اور حضرت ابن ابی لیلیؒ وغیرہ تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بھی مرتد کا وارث نہیں ہوتا، حضرت امام ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ مرتد نے اپنے ارتداد کی زندگی میں جو کچھ کمایا ہے وہ بیت المال میں جائے گا اور حالت اسلام میں جو کچھ کمایا ہے وہ اس کے مسلمان ورثاء کو ملے گا۔

آزاد کرنے والا غلام کا وارث ہوتا ہے

④ وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا" قوم کا مولی اسی قوم میں سے ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: ارشاد گرامی میں "مولی" سے مراد "آزاد کرنے والا" ہے گویا اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ آزاد شدہ غلام کا وارث وہ شخص ہوتا ہے جس نے اسے آزاد کیا ہے، اس کے برخلاف آزاد شدہ غلام اپنے آزاد کرنے والے کا وارث نہیں ہوگا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "مولی" سے مراد "آزاد شدہ غلام" ہے یعنی جس قبیلہ و فرد سے کسی غلام کو آزاد کیا گیا ہو تو اس آزاد شدہ غلام کا وہی حکم ہوگا جو اس کو آزاد کرنے والے قبیلے یا فرد کا ہوگا۔ مثلاً بنی ہاشم (سید) نے کسی غلام کو آزاد کیا تو اب وہ آزاد شدہ غلام زکوٰۃ کے باب میں بنی ہاشم ہی کا سا حکم رکھے گا کہ جس طرح بنی ہاشم پر زکوٰۃ کا مال حرام ہے اسی طرح اس آزاد شدہ غلام پر بھی زکوٰۃ کا مال حرام ہوگا۔

بھانجا، ماموں کے ترکہ کا وارث ہوتا ہے

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْنُ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" کسی قوم کا بھانجہ اسی قوم میں سے ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ بھانجا اپنے ماموں کا وارث ہوتا ہے اور یہ ذوی الارحام میں سے ہے، چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک ذوی الارحام میت کے وارث ہوتے ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ذوی الارحام کو میت کے ترکہ میں سے میراث اسی صورت میں ملتی ہے جب کہ میت کے ذوی الفروض اور عصبات موجود نہ ہوں، ان دونوں کی موجودگی میں ذوی الارحام کو کچھ نہیں ملتا۔ اس کی تفصیل ابتداء باب میں گزر چکی ہے۔

بہر کیف حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ذوی الارحام کے وارث ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ عَائِشَةَ اِنَّمَا الْوَلَاءُ فِيْ بَابٍ قَبْلَ بَابِ السَّلَمِ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ الْبَرَاءِ الْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْاُمِّ فِيْ بَابِ بُلُوْغِ الصَّغِيْرِ وَحَضَانَتِهٖ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت عائشہؓ کی روایت اِنَّمَا الْوَلَاءُ الخ باب السلم سے پہلے باب میں نقل کی جاچکی ہے اور حضرت براءؓ کی روایت الخالة بمنزلة الام الخ انشاء اللہ باب بلوغ الصغیر وحضانتہ میں ذکر کی جائے گی۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

مسلم، غیر مسلما کا اور غیر مسلم، مسلم کا وارث نہیں ہوتا

⑥ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَوَارَثُ اَهْلُ الْمِلَّتَيْنِ شَتّٰى رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ جَابِرٍ۔

"حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا دو مختلف مذہب کے لوگوں کے درمیان وراثت قائم نہیں ہوتی۔ (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) امام ترمذیؒ نے اس روایت کو حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نہ تو مسلمان، غیر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے، اور نہ غیر مسلمان، مسلمان کا وارث بن سکتا ہے۔

اپنے مورث کا قاتل میراث سے محروم ہوجاتا ہے

⑦ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قتل کرنے والا وارث نہیں ہوسکتا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے مورث کو ناحق قتل کردے وہ اس کی میراث پانے سے محروم ہوجاتا ہے چنانچہ اس بارہ میں تفصیل ابتداء باب میں گزرچکی ہے۔

جدہ کا چھٹا حصّہ ہے

⑧ وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَعَلَ لِلْجَدَّةِ السُّدُسَ اِذَا لَمْ تَكُنْ دُوْنَهَا اُمٌّ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جدہ کا چھٹا حصّہ مقرر کیا ہے جب کہ ماں اسے محجوب نہ کردے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر میت کی ماں زندہ ہوگی تو اس کی وجہ سے میت کی جدہ محروم ہوجائے گی۔ ہاں اگر میت کی ماں زندہ نہ ہوگی تو اس کے ترکہ میں سے جدہ کو چھٹا حصّہ ملے گا۔ یہاں جدہ کے عام معنی یعنی دادی اور نانی دونوں مراد ہیں۔

زندہ پیدا ہونے والا بچہ وارث ہے

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَهَلَّ الصَّبِيُّ صُلِّيَ عَلَيْهِ وَوَرِثَ۔

(رواه ابن ماجة والدارمی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اگر بچہ نے کوئی آواز نکالی ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور اسے وارث قرار دیا جائے۔" (ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "آواز نکالنے سے مراد" علامت زندگی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بچہ پیدائش کے وقت ماں کے پیٹ سے آدھے سے زیادہ نکلا اور اس میں زندگی کی کوئی علامت پائی گئی بایں طور کہ اس کے منہ سے آواز نکلی، یا سانس لیا، یا چھینکا اور یا اس کا کوئی عضو ہلا اور پھر وہ مرگیا تو اس بچہ کی بھی نماز جنازہ پڑھی جائے اور اس کو وارث قرار دے کر اس کا ورثہ بھی تقسیم کیا جائے۔

اب حدیث کی اس وضاحت کی روشنی میں یہ مسئلہ جان لیجئے کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کا وارث ماں کے پیٹ میں ہو تو اس کی میراث رکھ چھوڑی جائے پھر اگر وہ زندہ پیدا ہوا تو وہ وارث قرار پائے گا اور اس کی میراث اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گی اور اگر وہ زندہ پیدا نہ ہوا تو پھر وارث نہیں ہوگا اور وہ میراث دوسرے وارثوں کو مل جائے گی۔

ابتداء اسلام کا ایک حکم

(۱۰) وَعَنْ كَثِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَحَلِيْفُ الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَابْنُ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت کثیر ابن عبداللہ اپنے والد (حضرت عبداللہ تابعیؒ) اور وہ کثیرؒ کے دادا (یعنی اپنے والد حضرت عمرو ابن عوف مزنیؓ صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "کسی قوم کا مولی اسی قوم میں سے ہے، کسی قوم کا حلیف اسی قوم میں سے ہے اور کسی قوم کا بھانجا اسی قوم میں سے ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: پہلی فصل میں حضرت انسؓ کی جو روایت (۴) گزری ہے اس کی تشریح میں "مولی کی وضاحت کی جا چکی ہے" "کسی قوم کا حلیف اسی قوم میں سے ہے کی وضاحت یہ ہے کہ پہلے اہل عرب میں یہ دستور تھا کہ دو شخص آپس میں قسم و حلف کے ذریعہ یہ باہمی عہد و اقرار کر لیتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے رنج و راحت اور موت و حیات میں شریک رہیں گے ایک کا خون دوسرے کا خون ہوگا، ایک کی صلح دوسرے کی صلح ہوگی، اور ایک کی جنگ دوسرے کی جنگ ہوگی، ہم میں سے کسی پر کوئی تاوان لازم ہوگا تو دوسرا ادا کرے گا، اسی طرح ایک دوسرے کی میراث کے بارہ میں بھی ایک دوسرا یہ اقرار کرتا تھا کہ میں تمہارا وارث ہوں گا اور تم میرے وارث ہوگے، چنانچہ میراث کے سلسلہ میں اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی اس پر عمل ہوتا رہا، مگر جب قرآن کریم میں وراثت کا ایک واضح ضابطہ نازل کیا گیا اور ورثاء اور ان کے حصے متعین و مقرر کر دیئے گئے تو یہ پرانا دستور بھی ختم ہو گیا۔ اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی منسوخ ہو گیا۔ "اور کسی قوم کا بھانجا اسی قوم میں سے ہے" اس کی وضاحت بھی حضرت انسؓ ہی کی روایت (۵) کی تشریح کے تحت کی جا چکی ہے۔

ماموں اپنے بھانجے کا ذی رحم وارث ہوتا ہے

(۱۱) وَعَنِ الْمِقْدَامِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلٰى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهٖ فَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا اَوْضَيْعَةً فَاِلَيْنَا وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ وَاَنَا مَوْلٰى مَنْ لَا مَوْلٰى لَهٗ اَرِثُ مَالَهٗ وَاَفُكُّ عَانَهٗ وَالْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهٗ يَرِثُ مَالَهٗ وَيَفُكُّ عَانَهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَاَنَا وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهٗ اَعْقِلُ عَنْهُ وَاَرِثُهٗ وَالْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهٗ يَعْقِلُ عَنْهُ وَيَرِثُهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مقدامؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں ہر مؤمن کے حق میں خود اس سے زیادہ عزیز و خیر خواہ ہوں لہٰذا جو شخص اپنے ذمہ عیال یا قرض چھوڑ کر مرے تو اس کے قرض کی ادائیگی اور اس کے عیال کی پرورش میرے ذمہ ہے اور جو شخص مال چھوڑ کر مرے تو وہ اس کے وارثوں کا ہے۔ اور میں اس شخص کا کارساز (یعنی منتظم) ہوں جس کا کوئی کارساز نہیں چنانچہ میں اس کے مال کا وارث ہوتا ہوں اور اس کے قیدی کو نجات دلاتا ہوں (یعنی اس کی زندگی میں اس پر جو خون بہا لازم ہوا تھا اور وہ خون بہا ادا کرنے سے پہلے مر گیا تو اس کی وجہ سے چونکہ اس کا نفس عالم برزخ میں ایک قیدی کی طرح سختیوں میں مبتلا ہے اس لئے میں اس کا خون بہا اپنے پاس سے ادا کر کے اسے نجات دلاتا ہوں) اور ماموں اس شخص کا وارث ہوتا ہے جس کا کوئی وارث نہیں، وہ میت کی میراث پاتا ہے اور اس کے قیدی کو نجات دلاتا ہے (یعنی جس شخص کے ذوی الفروض اور عصبی وارث نہیں ہوتے اس کا ماموں کہ جو اس کے ذوی الارحام میں سے ہے اس کا وارث ہوتا

ہے چنانچہ وہ میت کا ترکہ پاتا ہے اور اس پر جو خوں بہا وغیرہ لازم تھا اس کو ادا کر کے اس کی روح کو عالم برزخ کے عذاب سے نجات دلاتا ہے) ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "میں اس شخص کا وارث ہوتا ہوں جس کا کوئی وارث نہیں چنانچہ میں اس کی طرف سے اس کا خون بہا ادا کرتا ہوں اور اس کا وارث ہو جاتا ہوں (یعنی اس کا ترکہ اپنی نگرانی میں لے کر بیت المال میں داخل کر دیتا ہوں) اور جس شخص کا (ذوی الفروض و عصبات میں سے) کوئی وارث نہیں ہوتا تو (ذوی الارحام میں سے) اس کا ماموں اس کا وارث ہوتا ہے جو اس کی طرف سے خون بہا ادا کرتا ہے اور اس کی میراث پاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

عورت کن تین آدمیوں کی میراث پاتی ہے؟

(۱۲) وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحُوْزُ الْمَرْأَةُ ثَلَاثَ مَوَارِيْثَ عَتِيْقَهَا وَلَقِيْطَهَا وَوَلَدَهَا الَّذِىْ لَاعَنَتْ عَنْهُ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت واثلہ ابن اسقعؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا عورت تین آدمیوں کی میراث لیتی ہے، ایک تو اپنے آزاد کئے ہوئے غلام کی، دوسرے اپنے لقیط کی اور تیسرے اپنے بچے کی جس کی وجہ سے لعان ہوا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "اپنے آزاد کئے ہوئے غلام کی" سے مراد یہ ہے کہ مثلاً ایک عورت نے کسی غلام کو آزاد کیا اور وہ آزاد شدہ غلام اس حالت میں مرا کہ اس کا کوئی نسبی عصبہ نہیں تھا تو جس طرح ایک مرد اس صورت میں اپنے آزاد شدہ غلام کا وارث ہوتا اسی طرح یہ عورت بھی اپنے اس آزاد شدہ غلام کی میراث پائے گی۔

"دوسرے اپنے لقیط کی" سے مراد یہ ہے کہ مثلاً کسی عورت نے کہیں راستہ میں پڑا ہوا کوئی بچہ پایا اور اسے پالا پوسا، تو اب یہ عورت اس کی وارث ہوگی کہ اس لقیط کے مرنے کے بعد اس کی میراث پائے گی، چنانچہ حضرت اسحٰق ابن راہوؒ کا یہی مسلک ہے۔ لیکن دوسرے علماء کا یہ مسلک ہے کہ ملتقط (یعنی لقیط کو اٹھانے والا) حق ولاء نہیں رکھتا جس کا مطلب یہ ہے کہ جو عورت کسی بچہ کو اٹھالے اور اسے پالے پوسے تو وہ اس کی وارث نہیں ہوتی، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد گرامی لا ولاء لها الا ولاء العتاقة کے ذریعہ لقیط کے حق ولاء کو آزاد کرنے والے کے ساتھ مختص کیا ہے چنانچہ ان علماء کے نزدیک یہ حکم کہ "عورت اپنے لقیط کی وارث ہوتی ہے" منسوخ ہے۔

البتہ قاضیؒ نے اس حکم کا جو مطلب بیان کیا ہے اس کے پیش نظر اس کو منسوخ کہنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ قاضیؒ کہتے ہیں کہ اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ لقیط کا چھوڑا ہوا مال و اسباب بیت المال کا حق ہے، ہاں جس عورت نے لقیط کو اٹھایا اور اسے پالا پوسا وہ دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں اس بات کی زیادہ مستحق اور اولیٰ ہے کہ بیت المال کی طرف سے وہ مال جو اس لقیط نے چھوڑا ہے۔ اس عورت پر صرف کیا جائے۔

"لعان" اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے یا جو بچہ پیدا ہوا ہے، اس کے بارہ میں یہ کہے کہ یہ میرا نہیں ہے اور وہ اس کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے پر لعنت ملامت کریں، اس کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ باب اللعان میں آئے گا، لہٰذا جس بچہ کے پیدا ہونے میں لعان ہوا ہے۔ اس بچہ کا نسب باپ سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ وہ بچہ اور باپ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں کیونکہ وراثت کا تعلق نسب سے ہوتا ہے جو اس صورت میں منتفی ہوتا ہے البتہ اس بچہ کا نسب چونکہ ماں سے ثابت ہوتا ہے اس لئے وہ بچہ اور ماں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔ ولد الزنا کا بھی یہی حکم ہے۔

ولد الزنا کا حکم

(۱۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ عَاهَرَ بِحُرَّةٍ اَوْ اَمَةٍ

فَالْوَلَدُ وَلَدُ زِنًا لَا یَرِثُ وَلَا یُوْرَثُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؓ اپنے والد حضرت شعیبؒ اور حضرت شعیبؒ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" جو شخص کسی آزاد عورت یا لونڈی سے زنا کرے تو (اس کے نتیجہ میں) جو بچہ پیدا ہو گا وہ ولد الزنا (حرامی بچہ) کہلائے گا، وہ بچہ نہ کسی کا وارث ہو گا اور نہ اس کی میراث کسی کو ملے گی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ زنا کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا بچہ نہ تو زنا کرنے والے کا وارث ہوتا ہے اور نہ اس کے اقرباء کی کوئی میراث اسے ملتی ہے کیونکہ وراثت نسب کی وجہ سے ہوتی ہے جب کہ ولد الزنا اور زنا کرنے والے کے درمیان نسب کا کوئی وجود نہیں ہوتا، اسی طرح زنا کرنے والا بھی اپنے ولد الزنا کا وارث نہیں ہوتا اور نہ اس کے اقرباء اس کی میراث پاتے ہیں اس کے برعکس ولد الزنا کی ماں اس کی وارث ہوتی ہے اور ولد الزنا اپنی ماں کی میراث پاتا ہے۔

آزاد شدہ غلام کی میراث

⑭ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ مَوْلًى لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاتَ وَتَرَكَ شَيْئًا وَلَمْ يَدَعْ حَمِيْمًا وَلَا وَلَدًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطُوْا مِيْرَاثَهُ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ قَرْيَتِهِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا ایک آزاد کیا ہوا غلام مرگیا اور اس نے کچھ مال چھوڑا لیکن نہ تو اس نے کوئی ناطے دار چھوڑا اور نہ فرزند جو (اس کے ترکہ کا وارث ہوتا) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کا چھوڑا ہوا مال اس کی بستی کے کسی آدمی کو دے دو۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: چونکہ اس آزاد شدہ غلام نے کوئی وراث نہیں چھوڑا تھا اس لئے اس کے ترکہ کا حقدار بیت المال تھا اور بیت المال کا مصرف چونکہ فقراء و مساکین وغیرہ ہوتے ہیں اس لئے آنحضرت ﷺ نے اسے مال کو اس کی بستی کے کسی محتاج و مستحق کو دے دینا مناسب سمجھا۔

انبیاء کسی کے وارث نہیں ہوتے

یہ بات پہلے ہو چکی ہے کہ آزاد شدہ غلام کے اگر عصبات نسبی نہیں ہوتے تو اس کا حق ولاء اس کو آزاد کرنے والے کو پہنچتا ہے یعنی اس کے مرنے کے بعد اس کو آزاد کرنے والا اس کی میراث کا مالک بنتا ہے۔ اس قاعدہ کے مطابق جب آنحضرت ﷺ کا آزاد کردہ غلام مرگیا اور اس کا کوئی نسبی وارث نہیں تھا۔ تو اس کی میراث آنحضرت ﷺ کو ملنی چاہئے تھی۔ لیکن انبیاء چونکہ کسی کے وارث نہیں ہوتے اور نہ کوئی شخص انبیاء کا وارث ہوتا ہے اس لئے اس آزاد شدہ غلام کی میراث آپ ﷺ نے خود نہیں لی۔ بیت المال کے مصرف میں دے دی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء کسی کے وارث کیوں نہیں ہوتے اور ان کی میراث کسی کو کیوں نہیں ملتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا کی بے ثباتی، دنیا کے مال و اسباب سے بے تعلقی اور دنیا کی خواہشات سے اجتناب کی صرف تعلیم ہی نہیں دیتے تھے بلکہ اپنی تعلیم پر خود عمل بھی کرتے تھے اور دنیا داری کی کوئی چیز ان کے لئے اہمیت نہیں رکھتی تھی چنانچہ ان کی حقیقت شناس نظر پر چونکہ غفلت کا پردہ نہیں تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے حقیقی مالک و متصرف ہونے کا مشاہدہ اور کامل یقین ان کو حاصل ہوتا تھا، دنیا کے مال و اسباب کے مستعار ہونے اور دنیا میں انسان کی مسافرانہ حالت کا نقشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا اس لئے انہیں نہ تو دنیا کے مال و اسباب اور یہاں کے سازو سامان سے کوئی دلچسپی ہوتی تھی اور نہ انہیں یہ خواہش ہوتی تھی کہ ہمارے فلاں عزیز و رشتہ دار کا متروکہ ہمیں مل جائے

اور نہ ہی اس دنیا سے رخصت ہونے کے وقت انہیں اپنے مال و اسباب کے چھوٹنے کا کوئی افسوس ہوتا تھا کیونکہ اول تو انبیاء کے پاس دنیا کا مال و اسباب ہوتا ہی کیا تھا اور جو کچھ تھوڑا بہت ہوتا بھی تھا تو اس سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی لہٰذا انبیاء کی اس شان کے پیش نظر قانون الٰہی نے یہ فیصلہ نافذ کیا انبیاء اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد جو تھوڑا بہت سامان و اسباب چھوڑ جاتے وہ بھی کسی کی وراثت نہیں ہوگا اور نہ انبیاء اپنی زندگی میں اپنے اقرباء کی میراث سے کوئی حصہ لیں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تمام انبیاء کی شان ان الفاظ میں ظاہر فرمائی:

إِنَّا مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ۔

"یعنی ہم نبیوں کے مال و اسباب میں میراث جاری نہیں ہوتی، ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہے۔"

جس کا کوئی بھی وارث نہ ہو اس کا ترکہ بیت المال کے مصرف میں دے دیا جائے

⑮ وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ مَاتَ رَجُلٌ مِنْ خُزَاعَةَ فَأُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِيْرَاثِهِ فَقَالَ الْتَمِسُوْا لَهُ وَارِثًا أَوْ ذَارَحِمٍ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُ وَارِثًا وَلَا ذَا رَحِمٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْطُوْهُ الْكُبْرَ مِنْ خُزَاعَةَ رَوَاهُ أَبُوْدَاؤُدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ قَالَ أُنْظُرُوْا أَكْبَرَ رَجُلٍ مِنْ خُزَاعَةَ۔

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص مرگیا تو اس کی میراث نبی کریم ﷺ کے پاس لائی گئی آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا کوئی وارث تلاش کرو۔ (یعنی پہلے تو ذوی الفروض اور عصبات میں سے کوئی وارث ڈھونڈو اگر ان میں سے کوئی وارث نہ ملے تو) چاہیے کوئی ذی رحم ہی وارث ہو، چنانچہ (تلاش کے بعد) نہ تو (ذوی الفروض اور عصبات میں سے) کوئی وارث پایا گیا اور نہ ذی رحم اس لئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اس کی میراث قبیلہ خزاعہ کے کسی بڑے بوڑھے کو دے دو (ابوداؤدؒ) اور ابوداؤد ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قبیلہ خزاعہ کے کسی بڑے بوڑھے شخص کو دیکھو (اور اس کو یہ میراث دے دو)۔"

تشریح: اس حدیث کی وضاحت بھی وہی ہے جو اوپر کی حدیث میں کی گئی ہے کہ اس شخص کا چونکہ کوئی بھی وارث نہیں تھا اس لئے اس کے ترکہ کو بیت المال میں داخل کیا جاتا لہٰذا آپ ﷺ نے یہ مناسب سمجھا کہ اس کا ترکہ اس کے قبیلہ کے کسی بڑے بوڑھے کو دے دیا جائے کیونکہ ایسا شخص بیت المال کا مصرف بھی ہے اور اس کے قبیلہ کا ایک فرد ہونے اور اپنے بڑھاپے کی وجہ سے اس کا سب سے زیادہ مستحق بھی ہے۔

میت کے قرض کی ادائیگی اس کی وصیت کی تعمیل پر مقدم ہے

⑯ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ إِنَّكُمْ تَقْرَؤُوْنَ هٰذِهِ الْآيَةَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بِالدَّيْنِ قَبْلَ الْوَصِيَّةِ وَإِنَّ أَعْيَانَ بَنِي الْأُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِي الْعَلَّاتِ الرَّجُلُ يَرِثُ أَخَاهُ لِأَبِيْهِ وَأُمِّهِ دُوْنَ أَخِيْهِ لِأَبِيْهِ۔ رواہ الترمذی وابن ماجه وفی روایة الدارمی: قال "الاخوة من الأم يتوارثون دون بنی العلات ..... إلی آخره"۔

"اور حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ (ایک دن) انہوں نے (لوگوں سے) کہا کہ تم اس آیت کو پڑھتے ہو مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ جب کہ نبی کریم ﷺ نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور آپ ﷺ نے یہ حکم بھی صادر فرمایا ہے کہ حقیقی بھائی وارث ہوتے ہیں نہ کہ سوتیلے بھائی (یعنی حقیقی بھائیوں کی موجودگی میں سوتیلے بھائیوں کو کچھ نہیں ملتا) اور یہ کہ آدمی اپنے حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے۔ نہ کہ سوتیلے بھائی کا (یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید کے طور پر استعمال کیا گیا ہے) (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور دارمی

کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ " وہ بھائی جو ماں میں بھی شریک ہوں (یعنی باپ اور ماں دونوں میں شریک ہوں کہ جنہیں حقیقی بھائی کہتے ہیں) وارث ہوتے ہیں نہ کہ وہ بھائی جو صرف باپ میں شریک ہوں (یعنی سوتیلے بھائی) آگے حدیث کے وہی الفاظ ہیں جو اوپر نقل ہوئے۔"

تشریح: حدیث میں مذکورہ آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ اگر میت نے کوئی وصیت کی ہے تو اس کو پوری کرنے کے بعد اور اگر اس کے ذمہ کوئی قرض ہو تو اس کو ادا کرنے کے بعد اس کے ورثاء کو اس کی میراث تقسیم کی جائے گی۔ گویا آیت کریمہ میں بظاہر وصیت کی تعمیل کو قرض کی ادائیگی پر مقدم کیا گیا ہے جب کہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ وصیت کی تعمیل سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیتے تھے۔ چنانچہ اسی بارہ میں حضرت علیؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم یہ آیت پڑھتے ہو کیا اس کی مراد بھی سمجھتے ہو یا نہیں؟ گویا اس طرح حضرت علیؓ نے لوگوں کو آگاہ کیا کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ قرآن کریم کی اس آیت اور آنحضرت ﷺ کے فعل میں کوئی تضاد نظر آتا ہے۔ یا یہ کہ آیت کریمہ میں چونکہ وصیت کو مقدم کیا گیا ہے اس لئے وصیت کی تعمیل قرض کی ادائیگی پر مقدم ہے بلکہ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ آیت میں الفاظ کے اعتبار سے قرض کی ادائیگی کو اگرچہ بعد میں ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت اور حکم کے اعتبار سے یہی ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے حکم کے ذریعہ اس کو واضح کر دیا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ پھر آیت کریمہ میں وصیت کا ذکر پہلے کیوں ہے؟ تو اس کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ میت کی وصیت کی تعمیل چونکہ گراں گزر سکتی ہے اور اس میں کوتاہی ہو سکتی ہے اس لئے وصیت کے ذکر کو مقدم کر کے یہ آگاہی دی گئی ہے کہ میت کی تعمیل کو آسان اور غیر ضروری نہ سمجھا جائے بلکہ اسے ایک اہم اور ضروری چیز سمجھ کر پورا کیا جائے۔

آیت میراث کا شان نزول

(۱۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَتِ امْرَأَةُ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ بِابْنَتَيْهَا مِنْ سَعْدِ ابْنِ الرَّبِيعِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَاتَانِ ابْنَتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ قُتِلَ اَبُوْهُمَا مَعَكَ يَوْمَ اُحُدٍ شَهِيْدًا وَاِنَّ عَمَّهُمَا اَخَذَ مَالَهُمَا وَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالًا وَلَا تُنْكَحَانِ اِلَّا وَلَهُمَا مَالٌ قَالَ يَقْضِي اللّٰهُ فِيْ ذٰلِكَ فَنَزَلَتْ اٰيَةُ الْمِيْرَاثِ فَبَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى عَمِّهِمَا فَقَالَ اَعْطِ لِابْنَتَيْ سَعْدٍ الثُّلُثَيْنِ وَاَعْطِ اُمَّهُمَا الثُّمُنَ وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت سعد ابن ربیعؓ کی زوجہ اپنی دونوں بیٹیوں کو جو حضرت سعد ابن ربیعؓ سے تھیں، لے کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ یہ دونوں بیٹیاں سعد ابن ربیع کی ہیں، ان کا باپ جو غزوہ احد کے دن آپ کے ہمراہ تھا، میدان جنگ میں شہید ہو گیا اور ان کا مال ان کے چچا نے لے لیا ہے (یعنی ان کے باپ کا جو ترکہ ان لڑکیوں کو پہنچتا وہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق سعد کے بھائی نے لے لیا ہے) اور ان کے لئے کچھ بھی مال نہیں چھوڑا ہے، اب تاوقتیکہ ان کے پاس مال نہ ہو ان سے کوئی نکاح کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "(کچھ دنوں کے لئے صبر کرو) ان لڑکیوں کے معاملہ کا اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا (یعنی ان کے بارہ میں جب کوئی وحی نازل ہو گی تو فیصلہ ہو گا) چنانچہ (کچھ دنوں کے بعد) آیت میراث یعنی یوصیکم اللہ فی اولادکم الخ نازل ہوئی تو آپ نے کسی کو ان لڑکیوں کے چچا کے پاس بھیجا (اور بلا کر) کہا کہ سعدؓ کی بیٹیوں کو (سعدؓ کے ترکہ میں سے) دو تہائی اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دے دو اور جو کچھ باقی بچے وہ تمہارا ہے۔ (احمدؒ، ترمذی، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے اور اسلام کا اجالا پھیلنے سے پہلے زمانہ جاہلیت میں یہ طریقہ رائج تھا کہ میت کا ترکہ صرف

وہی مرد لیتے تھے جو پورے مرد، جوان اور میدان جنگ میں جانے کے قابل ہوں، عورتوں بچوں، ضعیفوں کو میراث نہیں ملتی تھی، مفلس و بے کس بیوہ، معصوم و یتیم بچے اور قابل رحم لڑکیاں روتی چلاتی رہ جاتیں مگر ان کی پرواہ کئے بغیر جوان اور قوی و مال دار چچا اور بھائی آتے اور میت کا سب مال لے جاتے، ظلم و ستم کا یہ طریقہ رائج تھا کہ آنحضرت ﷺ بیواؤں یتیموں، مسکینوں، لڑکیوں اور لاچاروں کے ماوا و ملجا اور ان کے ہمدرد و غم گسار بن کر اس دنیا میں تشریف لائے اور اسلام کا نور ہر ظلم، ہر ستم ہر برائی اور ہر ناانصافی کے اندھیرے کو مٹاتا رہا، یہاں تک کہ میراث کے معاملہ میں عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو ختم کرنے کا وقت بھی آ پہنچا چنانچہ عورتوں کے حق میں اس صریح ظلم کے خاتمہ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک صحابی حضرت اوس ابن ثابت انصاری ؓ کا انتقال ہوا۔ انہوں نے پسماندگان میں ایک زوجہ اُم کمحہ اور تین لڑکیاں چھوڑیں (بعض روایات میں یہ ہے کہ دو بیٹیاں اور ایک چھوٹا لڑکا تھا) حضرت اوس ؓ نے اپنے مال و اسباب کا جن دو ادمیوں کو کار پرداز اور وصی بنایا تھا۔ انہوں نے زمانہ جاہلیت کے رائج طریقہ کے مطابق اوس ؓ کا کل مال ان کے چچازاد بھائی (یا بعض روایات کے مطابق ان کے دو حقیقی بھائیوں) خالد اور عرفطہ کو دے دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوس ؓ کی بیکس بیوہ اور ان کی معصوم بچیاں روتی رہ گئیں مگر انہیں کچھ نہ ملا ظاہر ہے کہ ایسے بے کس و لاچار اور غریب مسلمانوں کا ہمدرد و مددگار اور چارہ گر رحمت دو عالم ﷺ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا وہ پریشان حال اور گھبرائی ہوئی دربار رسالت میں دوڑی آئیں اور عرض کیا کہ شوہر کے کار پردازوں نے نہ مجھ کو کچھ دیا نہ میری بیٹیوں کو جو کچھ تھا خالد اور عرفطہ کو دے کر یکسو ہو گئے، اب ہمارا کیا ہو گا؟ یہ حال زار سن کر آپ ﷺ کو بہت افسوس ہوا۔ مگر فوری طور پر آپ ﷺ کچھ نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ خود مختار حاکم اور خدا کی خدائی میں شریک تو تھے نہیں اس لئے اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کیسے فرما سکتے تھے۔ تاہم آپ ﷺ نے اوس ؓ کی زوجہ کو تسلی دے کر فرمایا کہ اب تو اپنے گھر لوٹ جاؤ اور اس معاملہ میں جب تک خدا کی طرف سے کوئی فیصلہ صادر ہو، انتظار اور صبر کرو، چنانچہ آپ ﷺ احکم الحاکمین کے حکم و فیصلہ کے انتظار میں تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی:

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا۔ (النساء ۴:۷)

"مردوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر ہو، حصہ قطعی۔"

اس آیت کے نازل ہونے سے یہ معلوم ہو گیا کہ میراث کے معاملہ میں عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ آج تک جو ناانصافی ہو رہی تھی وہ اب ختم ہو گئی ہے اور ترکہ و میراث میں صرف مردوں ہی کا حق نہیں ہے بلکہ عورتوں کا بھی حق ہے، لیکن بہر حال آیت مجمل تھی کہ اس میں صرف عورتوں کا حق ثابت کیا گیا تھا۔ ابھی یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ ترکہ میں مردوں کا کیا حصہ ہے اور عورتوں کو کتنا حصہ ملے گا۔ اسی لئے اس حکم الٰہی کے نزول کے بعد آپ ﷺ نے اوس ؓ کے کار پردازوں کے پاس کہلا بھیجا کہ اللہ تعالیٰ نے میراث میں عورتوں کا بھی حق مقرر فرما دیا ہے لیکن ابھی تک مقدار اور حصہ مقرر نہیں فرمایا ہے اس لئے تم اوس ؓ کے مال کو حفاظت سے رکھنا اس میں سے ایک حبہ بھی خرچ نہ کرنا عنقریب ہی کوئی ایسا حکم نازل ہونے والا ہے جس میں حصوں کا تعین کیا جائے گا چنانچہ اس قصہ کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ واقعہ پیش آیا جو مذکورہ حدیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ قبیلہ خزرج کے ایک جلیل القدر انصاری صحابی حضرت سعد ابن ربیع ۳ھ میں احد کی مشہور لڑائی میں بارہ زخم کھا کر شہید ہو گئے ان کی شہادت کے بعد ان کے بھائی نے زمانہ جاہلیت کے رائج دستور کے مطابق حضرت سعد ؓ کے کل مال پر قبضہ کر لیا اور زوجہ اور دونوں بیٹیاں محروم رہ گئیں، اس طرح حضرت سعد ؓ کی زوجہ دربار رسالت میں حاضر ہوئیں اور اس ناانصافی کے خلاف مرافعہ پیش کیا، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ کچھ دن صبر کرو، اللہ تعالیٰ عنقریب آخری اور قطعی فیصلہ صادر فرمانے والا ہے، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد یہ آیت میراث نازل ہوئی۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ اَلخ۔ (آخری رکوع تک، النساء ۴: ۱۱)

"یعنی اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارہ میں کہ لڑکے کا حصّہ دو لڑکیوں کے حصّہ کے برابر ہے الخ۔"

اس آخری فیصلہ کے بعد جب تمام ورثاء کے حصوں کا تعیّن ہو گیا تو آپ ﷺ نے سعد ابن ربیع ؓ کے بھائی کے پاس کہلا بھیجا کہ حکم الٰہی کے پیش نظر اپنے بھائی کے ترکہ میں سے دو تہائی لڑکیوں کو دے دو اور آٹھواں حصّہ ان کی ماں کو، اس کے بعد جو کچھ باقی بچے وہ تم لے لو۔ یعنی سعد ؓ نے جو کچھ چھوڑا ہے پہلے اس کے چوبیس حصے کر لو پھر ان چوبیس حصوں میں سے آٹھ آٹھ حصے دونوں لڑکیوں کو دو، تین حصے ان کی ماں کو دو اور باقی پانچ حصے تم لے لو اس طرح اس تقسیم کو یوں ظاہر کریں گے۔

میت سعد		مسئلہ ۲۴	
بنت	بنت	زوجہ	اخ
۸	۸	۳	۵

بیٹی، پوتی اور بہن کے حصے

(۱۸) وَعَنْ هُزَيْلِ بْنِ شُرَحْبِيْلٍ قَالَ سُئِلَ اَبُوْمُوْسٰى عَنْ اِبْنَةٍ وَبِنْتِ ابْنٍ وَاُخْتٍ فَقَالَ لِلْبِنْتِ النِّصْفُ وَلِلْاُخْتِ النِّصْفُ وَأْتِ ابْنَ مَسْعُوْدٍ فَسَيُتَابِعُنِيْ فَسُئِلَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَاُخْبِرَ بِقَوْلِ اَبِيْ مُوْسٰى فَقَالَ لَقَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ اَقْضِيْ فِيْهَا بِمَا قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْبِنْتِ النِّصْفُ وَلِابْنَةِ الْاِبْنِ السُّدُسُ تَكْمِلَةَ الثُّلُثَيْنِ وَمَا بَقِيَ فَلِلْاُخْتِ فَاَتَيْنَا اَبَا مُوْسٰى فَاَخْبَرْنَاهُ بِقَوْلِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ لَا تَسْاَلُوْنِيْ مَادَامَ هٰذَا الْحِبْرُ فِيْكُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ہزیل ابن شرحبیل ؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ ؓ (صحابی) سے یہ سوال کیا گیا کہ (مثلاً زید مر گیا اور اس کے وارثوں میں) ایک بیٹی ایک پوتی اور ایک بہن ہے (تو زید کی میراث کو کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟) حضرت ابوموسیٰ نے جواب دیا کہ (زید کا ترکہ) آدھا بیٹی کو اور آدھا بہن کو ملے گا (پوتی محروم رہے گی) پھر حضرت ابوموسیٰ نے سوال کرنے والے سے کہا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود ؓ کے پاس جاؤ (اور ان سے بھی یہی مسئلہ پوچھو) وہ بھی میرے اس جواب سے اتفاق کریں گے (یعنی اس مسئلہ کا جو جواب میں نے دیا ہے یہی جواب وہ بھی دیں گے) چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعود ؓ سے بھی یہ مسئلہ پوچھا گیا اور اس کا جو جواب حضرت ابوموسیٰ نے دیا تھا وہ بھی انہیں بتایا گیا، حضرت عبداللہ ابن مسعود ؓ نے (مسئلہ اور حضرت ابوموسیٰ کا جواب سن کر) کہا کہ ایسی صورت میں (یعنی ابوموسیٰ ؓ نے جو فتویٰ دیا ہے وہی فتویٰ اگر میں بھی دوں تو) میں گمراہ سمجھا جاؤں گا اور اپنے کو راہ ہدایت پر نہ پاؤں گا، لہٰذا اس مسئلہ میں، میں وہی فیصلہ دوں گا جو رسول کریم ﷺ کے حکم کے مطابق ہے اور وہ یہ ہے کہ بیٹی کو آدھا ملے گا اور دو تہائی پورا کرنے کے لئے پوتی کو چھٹا حصّہ ملے گا (یعنی میت کے ترکہ میں سے دو یا دو سے زائد بیٹیوں کو تہائی ملتا ہے اب چونکہ بیٹی ایک ہے اور اس کو آدھا حصّہ ملا ہے تو پوتی کو چھٹا حصّہ دے کر دو تہائی پورا کر دیا جائے گا) اور جو کچھ باقی بچے (یعنی ایک تہائی) وہ بہن کا ہے (یعنی اس حدیث "بیٹوں کی موجودگی میں بہن کو عصبہ قرار دو" کے مطابق بہن عصبہ ہو کر باقی ماندہ ترکہ لے لے گی چنانچہ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے) راوی کہتے ہیں کہ (حضرت عبداللہ ابن مسعود ؓ کا یہ جواب سن کر) ہم حضرت ابوموسیٰ ؓ کے پاس آئے اور انہیں حضرت ابن مسعود ؓ کے جواب سے آگاہ کیا حضرت ابوموسیٰ ؓ نے فرمایا کہ (مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے کیونکہ ابن مسعود نے جو فتویٰ دیا ہے وہی صحیح اور حق ہے لہٰذا) جب تک تمہارے درمیان یہ عالم (یعنی ابن مسعود ؓ) موجود ہیں مجھ سے کوئی مسئلہ نہ پوچھا کرو۔" (بخاری)

تشریح: حضرت عبداللہ ابن مسعود ؓ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ میت کے کل ترکہ کے چھ حصے کر کے اس طرح تقسیم کرو یعنی لڑکی کو تین حصے، پوتی کو ایک حصّہ اور بہن کو دو حصے دو۔

دادا کا حصہ

⑲ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ ابْنِي مَاتَ فَمَالِيْ مِنْ مِيْرَاثِهِ قَالَ لَكَ السُّدُسُ فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ قَالَ لَكَ سُدُسٌ اٰخَرُ فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ قَالَ اِنَّ السُّدُسَ الْاٰخَرَ طُعْمَةٌ لَكَ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت عمران ابن حصین کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ میرا پوتا مرگیا ہے اس کے ترکہ میں سے مجھے کتنا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، "چھٹا حصہ" جب وہ (یہ جواب سن کر) واپس ہوا تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا کہ "تمہیں چھٹا حصہ اور ملے گا) پھر جب وہ واپس ہوا تو آپ ﷺ نے بلایا اور کہا کہ "یہ آخر کا چھٹا حصہ تمہارا رزق ہے"۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد) اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: "یہ آخر کا چھٹا حصہ تمہارا رزق ہے" کا مطلب یہ ہے کہ پہلا چھٹا حصہ تو تمہارے ذی فرض ہونے کی وجہ سے تمہیں ملا اور یہ دوسرا چھٹا تمہارے عصبہ ہونے کی حیثیت سے تمہیں ملا ہے، اس طرح اس شخص کو گویا کل ترکہ میں سے تہائی ملا مگر آپ ﷺ نے یکبارگی اسے تہائی نہیں دیا تاکہ وہ یہ گمان نہ کرلے کہ پوتے کے ترکہ میں سے دادا کا حصہ ذی فرض ہونے کی حیثیت سے تہائی ہی ہوتا ہے۔ یہ تو حدیث کی وضاحت تھی اب مسئلہ کی نوعیت سمجھئے جو یہ تھی کہ ایک شخص کا انتقال ہوا جس کے وارثوں میں دو بیٹیاں تھیں۔ اور ایک یہ سائل یعنی دادا تھا، چنانچہ میت کے ترکہ میں سے اس کی دونوں بیٹیوں کو دو تہائی ملا باقی ایک تہائی میں سے آدھا یعنی کل ترکہ کا چھٹا حصہ تو دادا کو ذی فرض ہونے کی حیثیت سے ملا اور جو آدھا یعنی کل ترکہ کا چھٹا حصہ بچا وہ بھی دادا ہی کو عصبہ ہونے کی وجہ سے مل گیا گویا ترکہ کی تقسیم یوں ہوئی۔

مسئلہ ۶

میت ـــــــــ زید

بنت بنت جد بالفروض والعصبیت

جدہ کا حصہ

⑳ وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ ذُؤَيْبٍ قَالَ جَاءَتِ الْجَدَّةُ اِلَى اَبِيْ بَكْرٍ تَسْأَلُهُ مِيْرَاثَهَا فَقَالَ لَهَا مَالَكِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ شَيْءٌ وَمَالَكِ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ فَارْجِعِيْ حَتّٰى اَسْأَلَ النَّاسَ فَسَأَلَ فَقَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ حَضَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَاهَا السُّدُسَ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ هَلْ مَعَكَ غَيْرُكَ فَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ مِثْلَ مَاقَالَ الْمُغِيْرَةُ فَاَنْفَذَهُ لَهَا اَبُوْبَكْرٍ ثُمَّ جَاءَتِ الْجَدَّةُ الْاُخْرٰى اِلٰى عُمَرَ تَسْأَلُهُ مِيْرَاثَهَا فَقَالَ هُوَ ذٰلِكَ السُّدُسُ فَاِنِ اجْتَمَعْتُمَا فَهُوَ بَيْنَكُمَا وَاَيَّتُكُمَا خَلَتْ بِهِ فَهُوَ لَهَا۔ (رواہ مالک واحمد والترمذی وابوداؤد والدارمی وابن ماجۃ)

"اور حضرت قبیصہ ابن ذویب کہتے ہیں کہ (ایک متوفی شخص کی) جدہ حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ان سے اپنی میراث دلوائے جانے کا مطالبہ کیا، حضرت ابوبکر نے اس سے فرمایا کہ کتاب اللہ میں تمہارے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں ہے اور نہ سنت رسول اللہ ﷺ میں تمہارے لئے کوئی حصہ مقرر کیا گیا ہے (یعنی مجھے جو حدیثیں یاد ہیں ان میں سے کسی حدیث میں جدہ کا کوئی ذکر نہیں ہے) اس لئے اب تم واپس جاؤ میں پھر لوگوں سے (یعنی علماء صحابہ سے) پوچھوں گا (شاید ان میں سے کسی کو جدہ کے حصہ کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا کوئی ارشاد معلوم ہو) چنانچہ حضرت ابوبکر نے لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ ابن شعبہ نے کہا کہ میں (ایک دن)

رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا (تو میں نے دیکھا) کہ آپ ﷺ نے جدہ کو چھٹا حصہ دلوایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت مغیرہ سے کہا کہ تمہارے علاوہ کوئی اور شخص بھی تمہارے ساتھ تھا؟ (یعنی حضرت ابوبکرؓ نے بطور احتیاط ان سے پوچھا کہ تمہارے علاوہ کسی اور شخص نے بھی رسول کریم ﷺ سے یہ حکم سنا یا دیکھا ہے؟) چنانچہ (ایک اور صحابی) حضرت محمد ابن مسلمہؓ نے (حضرت مغیرہ کے قول کی تائید کی یعنی انہوں نے) وہی کہا جو حضرت مغیرہؓ نے کہا تھا حضرت ابوبکرؓ کو (جب اطمینان ہو گیا کہ میت کے ترکہ میں سے جدہ کا بھی حصہ ہے تو انہوں) نے اس جدہ کو (میت کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ دیئے جانے کا فیصلہ کر دیا۔ پھر دوسری جدہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے ان سے اپنی میراث دلوائے جانے کا مطالبہ کیا حضرت عمرؓ نے کہا وہی چھٹا حصہ تمہارے لئے بھی ہے، اگر تم دو ہو تو وہ چھٹا حصہ تم دونوں کے درمیان مشترک ہے۔ اور اگر تم میں سے کوئی ایک ہے تو وہ چھٹا حصہ اس ایک کے لئے ہوگا۔"

(مالکؒ، احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "جدہ" دادی کو بھی کہتے ہیں اور نانی کو بھی کہتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں جو عورت آئی تھی وہ تو میت کی نانی تھی اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں جو عورت آئی تھی وہ اس میت کی دادی تھی، جیسا کہ ایک اور روایت میں یہ وضاحت موجود ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میت کے ترکہ میں جدہ کا چھٹا حصہ ہوتا ہے خواہ ایک ہو یا کئی ہوں، اگر ایک جدہ ہو گی تو وہ اس چھٹے حصہ کی تنہا مالک ہو گی اور اگر کئی ہوں گی تو اس چھٹے حصہ کو سب آپس میں برابر، برابر تقسیم کر لیں گی، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے وہ چھٹا حصہ تنہا ایک جدہ یعنی نانی کو دیئے جانے کا حکم دیا کیونکہ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ میت کی دوسری جدہ یعنی دادی بھی موجود ہے لیکن حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ میت کی دوسری جدہ بھی ہے تو انہوں نے یہ حکم دیا کہ اس چھٹے حصہ میں دونوں جدہ شریک ہوں۔

باپ کی موجودگی میں دادی کو چھٹا حصہ دلوائے جانے کا ایک خاص واقعہ

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ فِی الْجَدَّةِ مَعَ ابْنِهَا اَنَّهَا اَوَّلُ جَدَّةٍ اَطْعَمَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سُدُسًا مَعَ ابْنِهَا وَابْنُهَا حَیٌّ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَالتِّرْمِذِیُّ ضَعَّفَهُ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس جدہ کے بارے میں جس کا بیٹا موجود ہو یہ کہا کہ (میراث دلوائی جانے والی) وہ پہلی جدہ تھی جسے رسول کریم ﷺ نے اس کے بیٹے کی موجودگی میں اسے چھٹا حصہ دلوایا تھا اور اس کا بیٹا زندہ تھا۔ (ترمذیؒ، دارمیؒ) اور امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔"

تشریح: صورت مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص دادی اور باپ چھوڑ کر مرا تو آنحضرت ﷺ نے اس کے ترکہ میں سے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا باوجودیکہ اس کا بیٹا یعنی میت کا باپ موجود تھا۔ حالانکہ علماء کا مسلک یہ ہے کہ اگر میت کا باپ موجود ہو تو اس کے ترکہ میں سے دادی کو کچھ نہیں ملتا، گویا دادی اپنے بیٹے یعنی میت کے باپ کی موجودگی میں پوتے کے ترکہ سے محروم رہتی ہے، مذکورہ بالا حدیث پر علماء نے اس لئے عمل نہیں کیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے جس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا، دلیل کے طور پر صحیح حدیث ہی اختیار کی جا سکتی ہے۔ یا پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک خاص صورت تھی جس میں آپ نے جدہ کو اس کے بیٹے یعنی میت کے باپ کی موجودگی میں تبرعًا یعنی ازراہ احسان حصہ دلوایا تھا، بطریق میراث نہیں دلوایا تھا۔

خون بہا کا مال مقتول ورثاء کو ملتا ہے

(۲۲) وَعَنِ الضَّحَّاكِ بْنِ سُفْیَانَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَتَبَ اِلَیْهِ اَنْ وَرِّثْ امْرَاَةَ اَشْیَمَ الضِّبَابِیِّ مِنْ دِیَةِ زَوْجِهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ضحاک ابن سفیان سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے انہیں لکھا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو اس کے خاوند کے خون بہا میں سے میراث دی جائے امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اشیم ضبابی، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں قتل کر دیئے گئے تھے لیکن یہ قتل قصداً نہیں ہوا تھا بلکہ خطاءً ہوا تھا، چنانچہ جس شخص کی خطاء اور غلطی سے وہ قتل ہو گئے تھے، اس پر خوں بہا واجب ہوا۔ اور جب اس نے خون بہا ادا کیا تو آپ ﷺ نے ضحاک کو لکھا کہ مقتول یعنی اشیم ضبابی کے خوں بہا کے طور پر جو مال حاصل ہوا ہے اس میں سے اس کی بیوی کو میراث دے دی جائے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دیت پہلے تو مقتول کے لئے واجب ہوتی ہے پھر اس دیت میں حاصل ہونے والا مال مقتول کی دوسری املاک کی طرح اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، چنانچہ اکثر علماء کا یہی قول ہے۔

منقول ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے کہ عورت اپنے خاوند کی دیت میں حاصل ہونے والے مال کی وارث نہیں ہوتی، چنانچہ حضرت ضحاکؓ نے ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی اور یہ ثابت کیا کہ خاوند کی دیت میں حاصل ہونے والے مال میں سے اس کی بیوی کو میراث ملتی ہے۔

موالی آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے

(۲۳) وَعَنْ تَمِيمٍ الدَّارِيِّ قَالَ سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا السُّنَّةُ فِي الرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ الشِّرْكِ يُسْلِمُ عَلٰى يَدَيْ رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ هُوَ أَوْلَى النَّاسِ بِمَحْيَاهُ وَمَمَاتِهِ۔ (رواه الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت تمیم داری کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ اس مشرک کے بارہ میں کیا حکم ہے جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام لایا ہو (یعنی وہ مسلمان اس نومسلم کا مولی ہوتا ہے یا نہیں؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ مسلمان (جس کے ہاتھ پر وہ مشرک اسلام لایا ہے) اس کی زندگی میں اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے اور مرنے کے بعد بھی سب سے زیادہ حقدار وہی ہے (یعنی وہ مسلمان اس نومسلم کا مولیٰ ہے)۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: حضرت تمیم داریؓ ایک جلیل القدر اور مشہور صحابی ہیں، یہ پہلے عیسائی تھے، پھر اللہ نے انہیں ہدایت بخشی اور ۹ھ میں مشرف باسلام ہوئے اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی زندگی خوف خدا اور عبادت گزاری سے اس قدر معمور ہوئی کہ شب بیداری جیسے عظیم وصف میں امتیازی حیثیت کے مالک ہوئے رات میں ایک رکعت میں پورا قرآن کریم ختم کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایک ہی آیت پڑھتے پڑھتے صبح کر دیتے، اتفاق سے ایک رات تہجد کی نماز نہ پڑھ سکے تو اپنے نفس کو اس کی اس طرح سزا دی کہ پورے ایک برس تک مسلسل سوئے نہیں۔ حضرت تمیم داریؓ کو ایک تاریخی امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مسجد میں چراغ روشن کیا ہے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہے تو وہ مسلمان اس نومسلم کا مولی ہو جاتا ہے چنانچہ ابتداء اسلام میں یہی حکم تھا کہ موالی آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ "وہ سب سے زیادہ حقدار ہے" کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کرنے والے پر یہ حق سب سے زیادہ ہے کہ وہ اس نومسلم کی زندگی میں تو اس کی اعانت و خیر خواہی کرے اور اس کے مرنے کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھے۔

آزاد شدہ غلام اپنے آزاد کرنے والے کا وارث ہوتا ہے یا نہیں؟

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَجُلًا مَاتَ وَلَمْ يَدَعْ وَارِثًا إِلَّا غُلَامًا كَانَ أَعْتَقَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ لَهُ

اَحَدٌ؟ قَالُوْا لَا اِلَّاغُلَامٌ لَهٗ كَانَ اَعْتَقَهٗ فَجَعَلَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِيْرَاثَهٗ لَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ ایک ایسا شخص مرگیا جس نے اپنے ایک غلام کے علاوہ کہ جسے وہ آزاد کر چکا تھا اور کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا اس کا کوئی وارث ہے یا نہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ کوئی وارث نہیں ہے، البتہ ایک غلام ہے جسے اس نے آزاد کر دیا تھا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس میت کی میراث اس کے آزاد کردہ غلام کو دلوادی۔"

(ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: چونکہ آزاد شدہ غلام اپنے آزاد کرنے والا کا وارث نہیں ہوتا اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس آزاد شدہ غلام کو اس کے آزاد کرنے والے کی میراث از راہ تبرع (احسان کے طور پر) دلوائی تھی۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث (۱۴) میں گزرا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک لاوارث میت کی میراث کے بارہ میں فرمایا کہ اس کی میراث اس کی بستی کے کسی شخص کو دے دو، چنانچہ اس موقع پر جو وضاحت کی گئی تھی وہی وضاحت یہاں بھی ہے۔

حضرت شریحؒ اور حضرت طاؤسؒ نے اس حدیث کے ظاہری مفہوم کے پیش نظر کہا ہے کہ جس طرح آزاد کرنے والا اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث ہوتا ہے اسی طرح آزاد شدہ غلام بھی اپنے آزاد کرنے والے کا وارث ہو سکتا ہے۔

ولاء کی وراثت کا مسئلہ

⑳ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَرِثُ الْوَلَاءَ مَنْ يَرِثُ الْمَالَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ اِسْنَادُهٗ لَيْسَ بِالْقَوِیِّ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص مال کا وارث ہوتا ہے وہ ولاء کا بھی وارث ہوتا ہے" امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے۔"

تشریح: آزاد شدہ غلام کے مال کو "ولاء" کہتے ہیں۔ لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص مثلاً زید کا باپ مرگیا پھر اس کے بعد اس کے باپ کا آزاد کردہ غلام یا اس کے باپ کا آزاد کردہ غلام مرا تو اب یہ شخص یعنی زید اس کے مال کا وارث ہوگا کیونکہ جس طرح یہ اپنے باپ کی دیگر املاک کا وارث ہوتا ہے اسی طرح اپنے باپ کے ولاء کا بھی وارث ہے۔ لیکن یہ حکم صرف عصبہ کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جو عصبہ وارث (مثلاً بیٹا) بنفسہ ہونے کی حیثیت سے میت کے مال کا وارث ہوتا ہے وہی عصبہ ولاء کا وارث ہوگا لہٰذا آزاد کرنے والے کی بیٹی اپنے باپ کے ولاء کی وارث نہیں ہوگی کیونکہ اگرچہ وہ اپنے باپ کے مال کی وارث ہوتی ہے مگر عصبہ نہیں ہوتی بلکہ عصبہ بنفسہ تو صرف مرد ہوتے ہیں عورتیں عصبہ بنفسہ نہیں ہوتیں، ہاں عورت ایسے آزاد شدہ غلام کے مال کی تو وارث ہوتی ہے جسے اس نے خود آزاد کیا ہو یا اس کو اسکے آزاد کردہ غلام نے آزاد کیا ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اسلام لانے سے پہلے جو میراث تقسیم ہو چکی ہے اسلام لانے کے بعد اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوگی

㉖ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا كَانَ مِنْ مِيْرَاثٍ قُسِمَ فِی الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ عَلٰى قِسْمَةِ الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا كَانَ مِنْ مِيْرَاثٍ اَدْرَكَهُ الْاِسْلَامُ فَهُوَ عَلٰى قِسْمَةِ الْاِسْلَامِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو میراث زمانہ جاہلیت میں تقسیم ہو چکی ہے وہ زمانہ جاہلیت ہی کی تقسیم

کے مطابق رہے گی اور جس میراث نے اسلام کا زمانہ نہ پایا وہ اسلام ہی کے مطابق تقسیم ہوگی۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو میراث زمانہ جاہلیت میں تقسیم ہو چکی ہے اب اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوگی جس کو جتنا مل چکا ہے وہ اتنے ہی کا مالک رہے گا، اگر اس زمانہ میں کسی کے پاس زیادہ چلا گیا ہے تو اب اس کی واپسی ضروری نہیں ہے اور اگر کسی کو کم حصہ ملا ہے تو اسے باقی کے مطابق کا حق پہنچتا، ہاں اسلام لانے کے بعد جو بھی میراث تقسیم ہوگی، اسلامی احکام و قواعد کے مطابق ہی تقسیم ہوگی۔

پھوپھیوں کے وارث نہ ہونے کے بارہ میں حضرت عمرؓ کا تعجب

(۲۷) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ حَزْمٍ اَنَّهٗ سَمِعَ اَبَاهُ کَثِیْرًا یَقُوْلُ کَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ یَقُوْلُ عَجَبًا لِلْعَمَّةِ تُوْرِثُ وَلَا تَرِثُ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت محمد بن ابی بکر ؒابن حزمؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے سنا جو اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے تھے کہ پھوپھی کے بارہ میں تعجب ہے کہ اس کا بھتیجا تو اس کا وارث ہو جاتا ہے مگر وہ اپنے بھتیجے کی وارث نہیں ہوتی۔" (مالکؒ)

تشریح: حضرت عمرؓ کا یہ تعجب محض عقل و قیاس کی بنیاد پر ہے ورنہ اگر بجا آوری حکم کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے یا یہ بات پیش نظر ہو کہ اس کی حکمت و مصلحت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تو تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔

حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی پھوپھی مر جائے تو وہ اپنی پھوپھی کا وارث ہو سکتا ہے اس کے برعکس اگر وہ شخص مر جائے تو اس کی پھوپھی اس کی وارث نہیں ہو سکتی، چنانچہ حدیث کا یہ مفہوم اور حضرت عمرؓ کا یہ تعجب ان علماء کے مسلک کے مطابق ہے جن کے نزدیک ذوی الارحام میت کے وارث نہیں ہوتے جب کہ پھوپھی ذوی الارحام میں سے ہونے کی وجہ سے ان علماء کے نزدیک اپنے بھتیجے کی وارث ہو سکتی ہے جو ذوی الارحام کو علم فرائض میں مذکورہ تفصیل کے مطابق میت کا وارث قرار دیتے ہیں۔

فرائض کا علم سیکھنے کا حکم

(۲۸) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَزَادَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَالطَّلَاقَ وَالْحَجَّ قَالَا فَاِنَّهٗ مِنْ دِیْنِکُمْ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "فرائض کے احکام و مسائل سیکھو" نیز حضرت ابن مسعودؓ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے "طلاق اور حج کے احکام و مسائل (بھی) سیکھو" انہوں نے کہا کہ (اس کا سیکھنا اس لئے ضروری ہے کہ) یہ علم تمہاری دینی ضروریات میں سے ہے۔" (دارمیؒ)

بَابُ الْوَصَایَا

وصیتوں کا بیان

"وصایا" وصیت کی جمع ہے "خطایا" خطیہ کی جمع ہے: "وصیت" اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے وارثوں سے یہ کہہ جائے کہ میرے مرنے کے بعد یہ فلاں فلاں کام کرنا مثلاً میری طرف سے مسجد بنوا دینا، کنواں بنوا دینا، یا مدرسہ اور خانقاہ وغیرہ میں اتنا روپیہ دے دینا، یا فلاں شخص کو اتنا روپیہ یا مال دے دینا، یا فقراء و مساکین کو طعام و غلہ یا کپڑے تقسیم کر دینا وغیرہ وغیرہ اور یا جو فرائض و واجبات مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ اس کی غفلت کی وجہ سے قضا ہو گئے تھے ان کے بارے میں اپنے ورثاء سے کہے کہ یہ ادا کر دینا یا ان کا کفارہ دے دینا، اسی طرح بعض مواقع پر "وصیت" نصیحت کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

علماء ظواہر (یعنی وہ علماء جو بہر صورت قرآن و حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہیں) کے نزدیک وصیت کرنا واجب ہے، جب کہ

دوسرے تمام علماء کے ہاں پہلے تو وصیت واجب تھی یعنی اپنے اختیار سے والدین اور رشتہ داروں کے لئے اپنے مال و اسباب میں سے حصے مقرر کر جانا ہر مال دار پر واجب تھا لیکن جب آیت میراث نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے خود تمام حصے متعین و مقرر فرما دیئے تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اسی لئے وارث کے لئے وصیت کرنا درست نہیں ہے، البتہ آیت میراث کے بعد بھی تہائی مال میں وصیت کرنے کا اختیار باقی رکھا گیا تاکہ اگر کوئی شخص اپنے آخری وقت میں فی سبیل اللہ مال خرچ کر کے اپنی عمر بھی کی تقصیرات مثلاً بخل وغیرہ کا کفارہ اور مکافات کرنا چاہے تو یہ سعادت حاصل کر لے یا اگر اپنے کسی دوست یا دور کے رشتہ دار یا خادم وغیرہ کو کچھ دینا چاہے تو اس تہائی میں سے دے کر اپنا دل خوش کر لے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص پر کوئی قرض وغیرہ ہو یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی ادائیگی و واپسی کی وصیت کر جائے اور اس بارہ میں ایک وصیت نامہ لکھ کر اس پر گواہیاں کرا لے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

وصیت نامہ لکھ رکھنے کا حکم

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا حَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ لَہٗ شَیْءٌ یُوْصٰی فِیْہِ یَبِیْتُ لَیْلَتَیْنِ اِلَّا وَوَصِیَّتُہٗ مَکْتُوْبَۃٌ عِنْدَہٗ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس مسلمان مرد کے (مال یا آپسی تعلقات کے) معاملے میں کوئی بات وصیت کے قابل ہو تو اسے چاہئے کہ وہ دو راتیں بھی وصیت لکھ رکھے بغیر نہ گزارے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے ذمہ کسی کا کوئی حق ہو یا لوگوں کا کوئی معاملہ اس کے سپرد ہو تو اسے چاہئے کہ وہ دو راتیں گزرنے سے پہلے وصیت نامہ لکھ کر رکھ لے۔ "دو راتوں" سے مراد "عرصہ قلیل" ہے یعنی کم سے کم عرصہ بھی ایسا نہ گزرنا چاہئے جس میں وصیت نامہ لکھا ہوا نہ رکھا ہو، کیونکہ انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، نہ معلوم کس لمحہ زندگی کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور وصیت نامہ کی عدم موجودگی میں ورثاء کے لاعلم ہونے کی وجہ سے حق تلفی کا وبال اس دنیا سے اس کے ساتھ جائے۔

علماء ظواہر اسی حدیث کے پیش نظر وصیت کے واجب ہونے کے قائل ہیں حالانکہ یہ حدیث عمومی طور پر وصیت کے واجب ہونے پر دلالت نہیں کرتی البتہ اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ جس شخص پر کسی کا قرض ہو یا اس کے پاس کسی کی امانت ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس قرض یا امانت کے بارہ میں وصیت کر جائے۔

علماء لکھتے ہیں کہ جس معاملہ میں (یعنی قرض اور امانت وغیرہ کے سلسلہ میں) وصیت کرنا لازم ہو اس کا وصیت نامہ جلد سے جلد مرتب کر لینا مستحب ہے۔ نیز یہ ضروری ہے کہ وصیت نامہ لکھ کر اس وصیت نامہ پر دو اشخاص کی گواہیاں ثبت کرا دی جائیں۔

اپنے ترکہ کے تہائی حصہ میں وصیت کی جا سکتی ہے

② وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ مَرِضْتُ عَامَ الْفَتْحِ مَرَضًا اَشْفَیْتُ عَلَی الْمَوْتِ فَاَتَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعُوْدُنِیْ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ لِیْ مَالًا کَثِیْرًا وَلَیْسَ یَرِثُنِیْ اِلَّا ابْنَتِیْ اَفَاُوْصِیْ بِمَالِیْ کُلِّہٖ قَالَ لَا قُلْتُ فَثُلُثَیْ مَالِیْ قَالَ لَا قُلْتُ فَالشَّطْرُ قَالَ لَا قُلْتُ فَالثُّلُثُ قَالَ الثُّلُثُ وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ اِنَّکَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَکَ اَغْنِیَاءَ خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَھُمْ عَالَۃً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ وَاِنَّکَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَۃً تَبْتَغِیْ بِھَا وَجْہَ اللّٰہِ اِلَّا اُجِرْتَ بِھَا حَتَّی اللُّقْمَۃَ تَرْفَعُھَا اِلٰی فِیْٓ امْرَاَتِکَ۔ (متفق علیہ)

"اور سعد ابن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں فتح مکہ کے سال اتنا سخت بیمار ہوا کہ موت کے کنارہ پر پہنچ گیا، چنانچہ جب رسول کریم ﷺ میری عیادت کے لئے میرے پاس تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے پاس بہت مال ہے، مگر ایک بیٹی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہے تو کیا میں اپنے سارے مال کے بارہ میں وصیت کر جاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا! "نہیں" پھر میں نے عرض کیا کہ "کیا دو تہائی مال کے بارہ میں وصیت کر دوں؟ آپؐ فرمایا نہیں۔ میں نے پوچھا نصف کے لئے؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے پوچھا ایک تہائی کے لئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں تہائی مال کے بارہ میں وصیت کر سکتے ہو اگرچہ یہ بھی بہت ہے۔ اور یاد رکھو، اگر تم اپنے وارثوں کو مال دار و خوش حال چھوڑ جاؤ گے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو مفلس چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں، جان لو، تم اپنے مال کا جو بھی حصہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے جذبہ سے خرچ کرو گے تو تمہیں اس کے خرچ کا ثواب ملے گا، یہاں تک کہ تمہیں اس لقمہ کا بھی ثواب ملے گا جو تم اپنی بیوی کے منہ تک لے جاؤ گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "میرا کوئی وارث نہیں ہے" سے حضرت سعدؓ کی مراد یہ تھی کہ ذوی الفروض سے میرا کوئی وارث نہیں ہے، یا یہ کہ ایسے وارثوں میں سے کہ جن کے بارہ میں مجھے یہ خوف نہ ہو کہ وہ میرا مال ضائع کر دیں گے، علاوہ ایک بیٹی کے اور کوئی وارث نہیں ہے۔ حضرت سعدؓ کے اس جملہ کی یہ تاویل اس لئے کی گئی ہے کہ حضرت سعدؓ کے کئی عصبی وارث تھے۔

یہ حدیث جہاں اس بات کی دلیل ہے کہ مال جمع کرنا مباح ہے وہیں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وارثوں کے حق میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس میت کے وارث موجود ہوں تو اس کی وصیت اس کے تہائی مال سے زائد میں جاری نہیں ہوتی البتہ اگر وہ ورثا اپنی اجازت و خوشی سے چاہیں تو ایک تہائی سے زائد میں بھی بلکہ سارے ہی مال میں وصیت جاری ہو سکتی ہے بشرطیکہ سب وارث عاقل و بالغ اور موجود ہوں۔ اور جس میت کا کوئی وارث نہ ہو تو اس صورت میں بھی اکثر علماء کا یہی مسلک ہے کہ اس کی وصیت بھی ایک تہائی سے زائد میں جاری نہیں ہو سکتی۔ البتہ حضرت امام اعظم اور ان کے متبعین علماء اس صورت میں ایک تہائی سے زائد میں بھی وصیت جاری کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ نیز حضرت امام احمدؒ اور حضرت اسحٰقؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

اس حدیث میں اس بات کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، ان کے حق میں ہمیشہ خیر خواہی کا جذبہ رکھا جائے اور وارثوں کے تئیں شفقت و محبت ہی کے طریقے کو اختیار کیا جائے! علاوہ ازیں اس حدیث سے اور بھی کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ اپنا مال غیروں کو دینے سے افضل یہ ہے کہ اس کو اپنے قرابتداروں پر خرچ کیا جائے، دوم یہ کہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے سے ثواب ملتا ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی رضا خوشنودی کی طلب پیش نظر ہو، اور سوم یہ کہ اگر کسی مباح کام میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضاء خوشنودی کی نیت کر لی جائے تو وہ مباح کام بھی طاعت و عبادت بن جاتا ہے چنانچہ بیوی اگرچہ جسمانی و دنیوی لذت و راحت کا ذریعہ ہے اور خوشی و مسرت کے وقت اس کے منہ میں نوالہ دینا محض ایک خوش طبعی ہے جس کا طاعت و عبادت اور امور آخرت سے کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا مگر اس کے باجود آنحضرت ﷺ نے یہ بتایا کہ اگر بیوی کے منہ میں نوالہ دینے میں اللہ تعالیٰ کی رضاء و خوشنودی کی طلب کی نیت ہو تو اس میں ثواب ملتا ہے لہٰذا اس کے علاوہ دوسری حالتوں میں تو بطریق اولی ثواب ملے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

(۳) عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ عَادَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا مَرِیْضٌ فَقَالَ اَوْصَیْتَ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ بِکَمْ قُلْتُ بِمَالِیْ کُلِّہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ فَمَا تَرَکْتَ لِوَلَدِکَ قُلْتُ ھُمْ اَغْنِیَاءُ بِخَیْرٍ فَقَالَ اَوْصِ بِالْعُشْرِ فَمَازِلْتُ اُنَاقِصُہٗ حَتّٰی قَالَ اَوْصِیْ بِالثُّلُثِ وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت سعد ابن ابی وقاص ؓ کہتے ہیں کہ جب میں بیمار تھا تو رسول کریم ﷺ مجھے پوچھنے آئے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کیا تم نے وصیت کرنے کا ارادہ کیا ہے"؟ میں نے کہا کہ "ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا "کتنے مال کی وصیت کا تم نے ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ "میں نے تو اللہ کی راہ میں اپنے سارے مال کی وصیت کرنے کا ارادہ کر لیا ہے" آپ نے فرمایا: اولاد کے لئے کیا چھوڑا؟ میں نے عرض کیا وہ خود مال دار خوشحال ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "(اگر وصیت کرنا ہی چاہتے ہو تو) اپنے مال کے دسویں حصہ کے بارہ میں وصیت کر دو" حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ جب میں آپ ﷺ کی بتائی ہوئی اس مقدار کو بار بار کم کہتا رہا تو (میرے اصرار پر) آپؐ نے فرمایا کہ "اچھا تہائی مال کے بارہ میں وصیت کر دو اگرچہ یہ تہائی بھی بہت ہے۔" (ترمذیؒ)

وارث کے حق میں وصیت درست نہیں

④ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِیْ خُطْبَتِهٖ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَعْطٰى كُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ رواہ ابوداؤد وابن ماجة وزاد الترمذی "الولد للفراش وللعاهر حجر وحسابهم علی اللّٰه" ويروی عن ابن عباسؓ عن النَّبِیِّ ﷺ قال لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ الْوَرَثَةُ منقطع هذا لفظ المصابيح وفی رواية الدار القطنی قال لا تجوز وصية لوارث الا ان يشاء الورثة۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبہ میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دیدیا ہے۔ لہٰذا وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

اور امام ترمذیؒ نے یہ مزید نقل کیا ہے کہ بچہ صاحب فراش کے لئے ہے، اور زنا کرنے والے کے لئے پتھر ہے، نیز ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے" اور حضرت ابن عباسؓ نے نبی کریم ﷺ سے یہ نقل کیا ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) "وارث کے لئے وصیت نہیں ہے مگر جب کہ وارث چاہیں" یہ حدیث منقطع ہے اور یہ مصابیح کے الفاظ ہیں۔

اور دار قطنی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) "وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہوتی مگر جب کہ وارث چاہیں۔

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دیدیا ہے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ورثا کے لئے حصے متعین و مقرر فرما دیئے ہیں خواہ وہ کسی وارث کے حق میں یہ وصیت کر بھی جائے کہ اسے دوسرے وارثوں سے اتنا زیادہ حصہ دیا جائے تو شرعی طور پر اس کا کچھ اعتبار نہیں، ہاں اگر تمام ورثاء عاقل و بالغ ہوں اور وہ برضاء و رغبت کسی وارث کو میت کی وصیت کے مطابق اس کے حصے سے زیادہ دے دیں تو کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، آیت میراث نازل ہونے سے پہلے اپنے اقرباء کے حق میں وصیت کر جانا واجب تھا مگر جب آیت میراث نازل ہوئی اور تمام ورثا کے حصے متعین و مقرر ہو گئے تو وصیت کا واجب ہونا منسوخ ہو گیا۔

"فراش" ویسے تو عورت کو کہتے ہیں لیکن یہاں الولد للفراش میں فراش سے مراد "صاحب فراش" (یعنی عورت کا مالک) ہے۔ حدیث گرامی کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے زنا کرے اور اس کے نتیجہ میں بچہ پیدا ہو تو اس بچہ کا نسب زنا کرنے والے سے قائم نہیں ہوتا بلکہ وہ صاحب فراش کی طرف منسوب ہوتا ہے خواہ وہ صاحب فراش زنا کرانے والی عورت کا خاوند ہو یا (لونڈی ہونے کی صورت میں) اس کا آقا ہو اور یا وہ شخص جس نے شبہ میں مبتلا ہو کر اس عورت سے صحبت کر لی تھی۔

اور زنا کرنے والے کے لئے پتھر ہے" یہ جملہ زنا کرنے والے کی محرومی کی طرف اشارہ کرتا ہے جیسا کہ ہماری عام بول چال میں کسی ایسے شخص کے بارہ میں کہ جسے کچھ نہیں ملتا، کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس خاک پتھر ملے گا، لہٰذا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ زنا کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچہ کا نسب چونکہ زنا کرنے والے سے قائم نہیں ہوتا اس لئے ولد الزنا کی میراث میں سے اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ یا پھر یہ کہ یہاں "پتھر" سے مراد سنگسار کرنا ہے کہ اس زنا کرنے والے کو (اگر وہ شادی شدہ تھا) سنگسار کیا جائے گا۔

"ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس بدکاری میں مبتلا ہونے والوں کا حساب وکتاب اللہ پر ہے کہ وہ ہر ایک کو ان کے کرتوت کے مطابق بدلہ دے گا۔ ویسے یہ جملہ ایک دوسرے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے تو یہاں ہم زنا کرنے والوں کو سزا دیتے ہیں بایں طور کہ ان پر حد جاری کرتے ہیں۔ اب رہا وہاں یعنی آخرت کا معاملہ تو یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشاء پر موقوف ہے چاہے تو مواخدہ کرے اور چاہے تو اپنے بے پایاں رحم وکرم کے صدقہ میں انہیں بخش دے۔

مذکورہ بالا عبارت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص زنا کرے یا کسی اور گناہ میں مبتلا ہو اور اس پر کوئی حد قائم نہ ہو یعنی دنیا میں اسے کوئی سزا نہ دی جائے تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہ چاہے تو اسے بخش دے اور چاہے اسے عذاب میں مبتلا کرے۔

کسی دوسرے کے حق میں وصیت کرکے اپنے ورثا کا نقصان نہ پہنچاو

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ وَالْمَرْاَۃُ بِطَاعَةِ اللّٰهِ سِتِّیْنَ سَنَةً ثُمَّ یَحْضُرُ هُمَا الْمَوْتُ فَیُضَارَّانِ فِی الْوَصِیَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ ثُمَّ قَرَاَ اَبُوْهُرَیْرَةَ مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصٰی بِهَا اَوْدَیْنٍ غَیْرَ مُضَارٍّ اِلٰی قَوْلِهٖ تَعَالٰی وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مرد اور عورت ساٹھ برس تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں مگر جب ان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وصیت کے ذریعہ (وارثوں کو) نقصان پہنچاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے دوزخ ضروری ہو جاتی ہے" اس کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے یہ آیت کریمہ پڑھی۔ "وَصِیَّةٍ یُّوْصٰی بِهَآ اَوْدَیْنٍ غَیْرَ مُضَارٍّ۔ "یعنی (ورثاء اپنے حصے کی) وصیت پوری کرنے کے بعد جس کی وصیت کی جائے یا دین کے بعد بشرطیکہ (وصیت کرنے والا) کسی کو ضرر نہ پہنچائے۔"
حضرت ابوہریرہؓ نے یہ آیت ارشاد ربانی وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (اور یہ بڑی کامیابی ہے) تک تلاوت کی ہے۔

(ترمذی، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یہ حدیث حقوق العباد کی اہمیت ظاہر کرتی ہے کہ جو لوگ اپنی ساری زندگی عبادت الٰہی میں گذار دیتے ہیں مگر حقوق العباد کو نقصان پہنچانے سے اجتناب نہیں کرتے وہ اپنی تمام عبادتوں کے باوجود خدا کی ناراضگی کا مورد بن جاتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ خواہ وہ مرد ہوں یا عورت ساٹھ سال تک عبادت کرتے ہیں مگر اپنی زندگی کے آخری لمحات میں یہ وبال اپنے سر لے لیتے ہیں کہ وہ اپنے مال میں تہائی سے زیادہ کی وصیت کسی غیر شخص کے حق میں کر جاتے ہیں یا اپنا سارا مال کسی ایک وارث کو ہبہ کر دیتے ہیں تاکہ دوسرے وارثوں کو کچھ نہ ملے اور اس طرح وہ اپنے وارثوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ اتنے طویل عرصہ کی اپنی عبادتوں کے باوجود اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب کا سزاوار بنا لیتے ہیں۔ کیونکہ اپنے وارثوں کو نقصان پہنچانا حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی کی وجہ سے غیر مناسب و ناجائز ہی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے روگردانی اور اس کی مقررہ ہدایات سے تجاوز بھی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرت ﷺ کا ارشاد بیان کرنے کے بعد بطور تائید مذکورہ بالا آیت کریمہ پڑھی۔ کیونکہ اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مورث کو چاہئے کہ وہ اپنے مال کے تہائی حصہ سے زائد کے بارہ میں وصیت کرکے اپنے وارثوں کو نقصان نہ پہنچائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جائز وصیت کر جانے والے کے لئے بشارت

⑥ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ عَلٰی وَصِیَّةٍ مَاتَ عَلٰی سَبِیْلٍ وَسُنَّةٍ وَمَاتَ عَلٰی تُقًی وَشَهَادَةٍ وَمَاتَ مَغْفُوْرًا لَّهٗ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص وصیت کر کے مرا (یعنی جس شخص نے اپنی موت کے وقت اپنے مال کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں مثلاً فقراء کو دینے کی وصیت کی) تو وہ راہ مستقیم اور پسندیدہ طریقہ پر اور تقویٰ و شہادت پر مرا (یعنی متقیوں اور شہیدوں میں داخل ہوا) اور اس حال میں مرا کہ اس کی مغفرت کی گئی۔" (ابن ماجہ)

کافروں کو اعمال نیک کا ثواب نہیں پہنچتا

⑦ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ الْعَاصَ بْنَ وَائِلٍ اَوْصٰى اَنْ يُّعْتَقَ عَنْهُ مِائَةُ رَقَبَةٍ فَاَعْتَقَ ابْنُهٗ هِشَامٌ خَمْسِيْنَ رَقَبَةً فَاَرَادَ ابْنُهٗ عَمْرٌو اَنْ يُّعْتِقَ عَنْهُ الْخَمْسِيْنَ الْبَاقِيَةَ فَقَالَ حَتّٰى اَسْاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَبِيْ اَوْصٰى اَنْ يُّعْتَقَ عَنْهُ مِائَةُ رَقَبَةٍ وَاِنَّ هِشَامًا اَعْتَقَ عَنْهُ خَمْسِيْنَ وَبَقِيَتْ عَلَيْهِ خَمْسُوْنَ رَقَبَةً اَفَاُعْتِقُ عَنْهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ لَوْ كَانَ مُسْلِمًا فَاَعْتَقْتُمْ عَنْهُ اَوْ تَصَدَّقْتُمْ عَنْهُ اَوْ حَجَجْتُمْ عَنْهُ بَلَغَهٗ ذٰلِكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور شعیب اپنے دادا (حضرت عبداللہؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ عاص ابن وائل نے یہ وصیت کی تھی کہ میری طرف سے سو غلام آزاد کئے جائیں چنانچہ پچاس غلام تو ان کے بیٹے ہشامؓ نے آزاد کر دیئے پھر جب ان کے (دوسرے) بیٹے عمروؓ نے یہ ارادہ کیا کہ باقی پچاس غلام اس وقت تک آزاد نہیں کرونگا جب تک کہ رسول کریم ﷺ سے نہ پوچھ لوں۔ (کہ آیا اپنے دل میں سوچا) کہ میں یہ پچاس غلام اس وقت تک آزاد کرنا جائز اور مفید بھی ہے یا نہیں؟) چنانچہ عمروؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میرے باپ (عاص) نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کی طرف سے سو غلام آزاد کئے جائیں۔ لہٰذا ہشامؓ نے پچاس غلام تو آزاد کر دیئے ہیں ان پر (یعنی ہشامؓ ہی کے ذمہ یا میرے ذمہ) پچاس غلام باقی رہ گئے ہیں۔ تو کیا میں اپنے باپ کی طرف سے (وہ باقی پچاس غلام، آزاد کر دوں؟" رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ (تمہارے باپ عاص) اگر مسلمان ہوتے اور تم ان کی طرف سے غلام آزاد کرتے یا ان کی طرف سے صدقہ دیتے یا ان کی طرف سے حج کرتے تو ان کو اس کا ثواب پہنچتا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: عاص ابن وائل نے اسلام کا زمانہ پایا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ اسلام کی دولت سے بہرہ ور نہیں ہوسکے اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے ان کے دو بیٹے تھے ایک حضرت ہشامؓ ابن عاص اور دوسرے حضرت عمروؓ ابن عاص ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے راستہ پر گامزن کیا، چنانچہ یہ دونوں مشرف باسلام ہوئے اور رسول کریم ﷺ کے صحابی ہونے کا اعزاز پایا رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

آنحضرت ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ تمہارے والد عاص اگر مسلمان ہوتے اور اسلام ہی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوتے تو ان کی طرف سے جو بھی عبادت دین کی جاتی اس کا ثواب انہیں پہنچتا لیکن چونکہ وہ مسلمان نہیں ہوئے اور کفر ہی کی حالت میں اس دنیا سے چلے گئے تو اب تم ان کی طرف سے کوئی بھی عبادت کرو یا کوئی بھی نیک کام کرو اس کا ثواب انہیں نہیں پہنچے گا۔ لہٰذا حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ وغیرہ کافر کے لئے فائدہ مند نہیں ہے اور نہ اس کی وجہ سے اسے عذاب سے نجات ملتی ہے جب کہ یہ مسلمان کے لئے مفید ہے۔

وارثوں کا حق مارنے والے کے لئے وعید

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَطَعَ مِيْرَاثَ وَارِثِهٖ قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے وارث کی میراث کاٹے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی جنت

کی میراث کاٹ لے گا(ابن ماجۃ) اور بیہقیؒ نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو جنت کا وارث بنانے کا وعدہ بایں طور کیا ہے کہ:

يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ۔

"یعنی وہ (مؤمن) بہشت کے وارث ہوں گے۔"

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی کے پیش نظر فرمایا کہ جو شخص ناجائز طور پر اپنے وارث کو میراث سے محروم کردیگا، اللہ قیامت کے دن اس کو جنت کی وراثت سے محروم رکھے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص ابتداء ہی میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

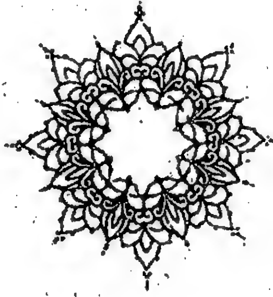

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب النکاح

نکاح کا بیان

"نکاح" کے لغوی معنی جمع کرنا۔ لیکن اس لفظ کا اطلاق "مجامعت کرنے" اور "عقد" کے معنی پر بھی ہوتا ہے کیونکہ مجامعت اور عقد دونوں ہی میں "جمع ہونا اور ملنا" پایا جاتا ہے لہٰذا اصول فقہ میں نکاح کے یہی معنی یعنی جمع ہونا بمعنی "مجامعت کرنا" مراد لینا چاہئے بشرطیکہ ایسا کوئی قرینہ نہ ہو جو اس معنی کے خلاف دلالت کرتا ہو۔

علماء فقہ کی اصطلاح میں "نکاح" اس خاص عقد و معاہدہ کو کہتے ہیں جو مرد و عورت کے درمیان ہوتا ہے اور جس سے دونوں کے درمیان زوجیت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

نکاح کی اہمیت

نکاح یعنی شادی صرف دو افراد کا ایک سماجی بندھن، ایک شخصی ضرورت، ایک طبعی خواہش اور صرف ایک "ذاتی معاملہ" ہی نہیں ہے بلکہ یہ معاشرہ انسانی کے وجود و بقاء کا ایک بنیادی ستون بھی ہے اور شرعی نقطہ نظر سے ایک خاص اہمیت و فضیلت کا حامل بھی ہے۔ نکاح کی اہمیت اور اس کی بنیادی ضرورت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی ایسی شریعت نہیں گزری ہے جو نکاح سے خالی رہی ہو اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ ایسی کوئی عبادت نہیں ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک مشروع ہو اور جنت میں بھی باقی رہے سواء نکاح اور ایمان کے چنانچہ ہر شریعت میں مرد و عورت کا اجتماع ایک خاص معاہدہ کے تحت مشروع رہا ہے اور بغیر اس معاہدہ کے مرد و عورت کا باہمی اجتماع کسی بھی شریعت و مذہب نے جائز قرار نہیں دیا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس معاہدہ کی صورتیں مختلف رہی ہیں اور اس کے شرائط و احکام میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں اسلام نے جو شرائط مقرر کی ہیں، جو احکام نافذ کئے ہیں اور جو قواعد و ضوابط وضع کئے ہیں اس باب سے ان کی ابتداء ہو رہی ہے۔

نکاح کے فوائد و آفات

نکاح کا جہاں سب سے بڑا عمومی فائدہ نسل انسانی کا بقاء اور باہم توالد و تناسل کا جاری رہنا ہے وہیں اس میں کچھ مخصوص فائدے اور بھی ہیں جن کو پانچ نمبروں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

❶ نکاح کر لینے سے ہیجان کم ہو جاتا ہے یہ جنسی ہیجان انسان کی اخلاقی زندگی کا ایک ہلاکت خیز مرحلہ ہوتا ہے جو اپنے سکون کی خاطر مذہب و اخلاق ہی کی نہیں شرافت و انسانیت کی بھی ساری پابندیاں توڑ ڈالنے سے گریز نہیں کرتا، مگر جب اس کو جائز ذرائع سے سکون مل جاتا ہے تو پھر یہ پابند اعتدال ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جائز ذریعہ صرف نکاح ہی ہو سکتا ہے۔

❷ نکاح کرنے سے اپنا گھر بستا ہے، خانہ داری کا آرام ملتا ہے گھریلو زندگی میں سکون و اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے اور گھریلو زندگی کے اس اطمینان و سکون کے ذریعہ حیات انسانی کو فکر و عمل کے ہر موڑ پر سہارا ملتا ہے۔

❸ نکاح کے ذریعہ سے کنبہ بڑھتا ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو مضبوط و زبردست محسوس کرتا ہے اور معاشرہ میں اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے اپنا رعب داب قائم رکھتا ہے۔

❹ نکاح کرنے سے نفس مجاہدہ کا عادی ہوتا ہے کیونکہ گھربار اور اہل و عیال کی خبرگیری و نگہداشت اور ان کی پرورش و پرداخت کے سلسلہ میں جدوجہد کرنا پڑتی ہے اس مسلسل جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بے عملی اور لاپرواہی کی زندگی سے دور رہتا ہے جو اس کے لئے دنیاوی طور پر بھی نفع بخش ہے اور اس کی وجہ سے وہ دینی زندگی یعنی عبادات و طاعات میں بھی چاق و چوبند رہتا ہے۔

❺ نکاح ہی کے ذریعہ صالح و نیک بخت اولاد پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کی زندگی کا سب سے گراں مایہ سرمایہ اس کی صالح اور نیک اولاد ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ نہ صرف دنیا میں سکون و اطمینان اور عزت و نیک نامی کی دولت حاصل کرتا ہے بلکہ اخروی طور پر بھی فلاح و سعادت کا حصہ دار بنتا ہے۔

یہ تو نکاح کے فائدے تھے لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو نکاح کی وجہ سے بعض لوگوں کے لئے نقصان و تکلیف کا باعث بن جاتی ہیں اور جنہیں نکاح کی آفات کہا جاتا ہے چنانچہ ان کو بھی چھ نمبروں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

❶ طلب حلال سے عاجز ہونا یعنی نکاح کرنے کی وجہ سے چونکہ گھربار کی ضروریات لاحق ہوجاتی ہیں اور طرح طرح کے فکر دامنگیر رہتے ہیں اس لئے عام طور پر طلب حلال میں وہ ذوق باقی نہیں رہتا جو ایک مجرد و تنہا زندگی میں رہتا ہے۔

❷ حرام امور میں زیادتی ہونا۔ یعنی جب بیوی کے آجانے اور بال بچوں کے ہوجانے کی وجہ سے ضروریات زندگی بڑھ جاتی ہیں تو بسا اوقات اپنی زندگی کا وجود معیار برقرار رکھنے کے لئے حرام امور کے ارتکاب تک سے گریز نہیں کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ذہن و عمل سے حلال و حرام کی تمیز بھی اٹھ جاتی ہے اور بلا جھجک حرام چیزوں کو اختیار کرلیا جاتا ہے۔

❸ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہونا۔ اسلام نے عورتوں کو جو بلند و بالا حقوق عطا کئے ہیں ان میں بیوی کے ساتھ اچھے سلوک اور حسن معاشرت کا ایک خاص درجہ ہے لیکن ایسے بہت کم لوگ ہیں جو بیوی کے حقوق کا لحاظ کرتے ہوں، بلکہ بدقسمتی سے چونکہ بیوی کو "زیردست" سمجھ لیا جاتا ہے اس لئے عورتوں کے حقوق کی پامالی اور ان کے ساتھ برے سلوک و برتاؤ بھی ایک "ذاتی معاملہ" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا حالانکہ یہ چیز ایک انسانی اور معاشرتی بداخلاقی ہی نہیں ہے بلکہ شرعی طور پر بھی بڑے گناہ کی حامل ہے اور اس سے دین و دنیا دونوں کا نقصان ہوتا ہے۔

❹ عورتوں کی بدمزاجی پر صبر نہ کرنا عام طور پر شوہر چونکہ اپنے آپ کو بیوی سے برتر سمجھتا ہے اس لئے اگر بیوی کی طرف سے ذرا سی بھی بدمزاجی ہوئی تو ناقابل برداشت ہوجاتی ہے اور صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے فوراً چھوٹ جاتا ہے۔

❺ عورت کی ذات سے تکلیف اٹھانا بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی بدمزاجی و بداخلاقی کی وجہ سے اپنے شوہروں کے لئے تکلیف و پریشانی کا ایک مستقل سبب بن جاتی ہیں اس کی وجہ سے گھریلو ماحول غیر خوشگوار اور زندگی غیر مطمئن و اضطراب انگیز بن جاتی ہے۔

❻ بیوی بچوں کی وجہ سے حقوق اللہ کی ادائیگی سے باز رہنا یعنی ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں جو اپنی گھریلو زندگی کے استحکام اور بیوی بچوں کے ساتھ حسن معاشرت کے ساتھ ساتھ اپنی دینی زندگی کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوں جب کہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بیوی بچوں اور گھر بار کے ہنگاموں اور مصروفیتوں میں پڑ کر دینی زندگی مضمحل و بے عمل ہوجاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو عبادات و طاعات کا خیال رہتا ہے نہ حقوق اللہ کی ادائیگی پورے طور پر ہوپاتی ہے۔

نکاح کے ان فوائد و آفات کو سامنے رکھ کر اب یہ سمجھئے کہ اگر یہ دونوں مقابل ہوں۔ یعنی فوائد و آفات برابر، برابر ہوں۔ تو جس چیز

سے دین کی باتوں میں زیادتی ہوتی ہو اسے ترجیح دی جائے مثلاً ایک طرف تو نکاح کا یہ فائدہ ہو کہ اس کی وجہ سے جنسی ہیجان کم ہوتا ہے اور دوسری طرف نکاح کرنے سے یہ دینی نقصان سامنے ہو کہ عورت کی بد مزاجی پر صبر نہیں ہو سکے گا تو اس صورت میں نکاح کرنے ہی کو ترجیح دی جائے کیونکہ اگر نکاح نہیں کریگا تو زنا میں مبتلا ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ یہ چیز عورت کی بد مزاجی پر صبر نہ کرنے سے کہیں زیادہ دینی نقصان کا باعث ہے۔

نکاح کے احکام

❶ حنفی مسلک کے مطابق نکاح کرنا اس صورت میں فرض ہو جاتا ہے جب کہ جنسی ہیجان اس درجہ غالب ہو کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں زنا میں مبتلا ہو جانے کا یقین ہو اور بیوی کے مہر پر اور اس کے نفقہ پر قدرت حاصل نہ ہو اور یہ خوف نہ ہو کہ بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی بجائے اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کا برتاؤ ہو گا۔

❷ نکاح کرنا اس صورت میں واجب ہو جاتا ہے جب کہ جنسی ہیجان کا غلبہ ہو مگر اس درجہ کا غلبہ نہ ہو کہ زنا میں مبتلا ہو جانے کا یقین ہو، نیز مہر و نفقہ کی ادائیگی کی قدرت رکھتا ہو اور بیوی پر ظلم کرنے کا خوف نہ ہو۔ اگر کسی شخص پر جنسی ہیجان کا غلبہ تو ہو مگر وہ مہر اور بیوی کے اخراجات کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو ایسی صورت میں اگر وہ نکاح نہ کرے تو اس پر گناہ نہیں ہو گا، جب کہ مہر اور نفقہ پر قادر شخص جنسی ہیجان کی صورت میں نکاح نہ کرنے سے گناہ گار ہوتا ہے۔

❸ اعتدال کی حالت میں نکاح کرنا سُنت مؤکدہ ہے "اعتدال کی حالت" سے مراد یہ ہے کہ جنسی ہیجان کا غلبہ تو نہ ہو لیکن بیوی کے ساتھ مباشرت و مجامعت کی قدرت رکھتا ہو اور مہر و نفقہ کی ادائیگی پر بھی قادر ہو۔ لہٰذا اس صورت میں نکاح نہ کرنے والا گنہ گار ہوتا ہے جب کہ زنا سے بچنے اور افزائش نسل کی نیت کے ساتھ نکاح کرنے والا اجر و ثواب سے نوازا جاتا ہے۔

❹ نکاح کرنا اس صورت میں مکروہ ہے جب کہ بیوی پر ظلم کرنے کا خوف ہو، یعنی اگر کسی شخص کو اس بات کا خوف ہو کہ میرا مزاج چونکہ بہت برا اور سخت ہے اس لئے میں بیوی پر ظلم و زیادتی کروں گا تو ایسی صورت میں نکاح کرنا مکروہ ہے۔

❺ نکاح کرنا اس صورت میں حرام ہے جب کہ بیوی پر ظلم کرنے کا یقین ہو۔ یعنی اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ میں اپنے مزاج کی تختی و تندی کی وجہ سے بیوی کے ساتھ اچھا سلوک قطعاً نہیں کر سکتا بلکہ اس پر میری طرف سے ظلم ہونا بالکل یقینی چیز ہے تو ایسی صورت میں نکاح کرنا اس کے لئے حرام ہو گا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شریعت نے نکاح کے بارہ میں مختلف حالات کی رعایت رکھی ہے بعض صورتوں میں تو نکاح کرنا فرض ہو جاتا ہے بعض میں واجب اور بعض میں سُنت مؤکدہ ہوتا ہے جب کہ بعض صورتوں میں نکاح کرنا مکروہ بھی ہوتا ہے اور بعض میں تو حرام ہو جاتا ہے لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اسی صورت کے مطابق عمل کرے جو اس کی حالت کے مطابق ہو۔

نکاح کے مستحبات

جب کوئی شخص نکاح کرنا چاہے خواہ مرد ہو یا عورت تو چاہئے کہ نکاح کا پیغام دینے سے پہلے ایک دوسرے کے حالات کی اور عادات و اطوار کی خوب اچھی طرح جستجو کر لی جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی ایسی چیز معلوم ہو جو طبیعت و مزاج کے خلاف ہونے کی وجہ سے زوجین کے درمیان ناچاقی و کشیدگی کا باعث بن جائے۔

یہ مستحب ہے کہ عمر، عزت، حسب اور مال میں بیوی، خاوند سے کم ہو اور اخلاق و عادات، خوش سلیقی و آداب، حسن و جمال اور تقویٰ میں خاوند سے زیادہ ہو مرد کے لئے یہ بھی مسنون ہے کہ وہ جس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اس کو نکاح سے پہلے دیکھ لے بشرطیکہ یہ یقین ہو کہ میں اگر اس کو پیغام دوں گا تو منظور ہو جائے گا۔

مستحب ہے کہ نکاح کا اعلان کیا جائے اور نکاح کی مجلس اعلانیہ طور پر منعقد کی جائے جس میں دونوں طرف سے اعزہ و احباب نیز بعض علماء و صلحا بھی شریک۔ اسی طرح یہ بھی مستحب ہے کہ نکاح پڑھانے والا نیک بخت و صالح ہو اور گواہ عادل و پرہیزگار ہوں۔

ایجاب و قبول اور ان کے صحیح ہونے کی شرائط

نکاح، ایجاب و قبول کے ذریعہ منعقد ہوتا ہے اور یہ ایجاب و قبول دونوں ماضی کے لفظ کے ساتھ ہونے چاہئیں (یعنی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جس سے یہ بات سمجھی جائے کہ نکاح ہو چکا ہے) جیسے عورت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو تمہاری زوجیت میں دیا، یا عورت کا ولی، مرد سے یہ کہے کہ میں نے فلاں عورت کا جس کا نام یہ ہے، تمہارے ساتھ نکاح کیا اور اس کے جواب میں مرد یہ کہے کہ میں نے منظور کیا یا ایجاب و قبول میں سے کوئی ایک ماضی کے لفظ کے ساتھ ہو جیسے عورت یہ کہے کہ مجھ سے نکاح کر لو یا عورت کا ولی، مرد سے یہ کہے کہ فلاں عورت سے جس کا نام یہ ہے نکاح کر لو اور اس کے جواب میں مرد یہ کہے کہ میں نے نکاح کر لیا۔ یا اس کا برعکس ہو، جیسے مرد یہ کہے کہ میں نے تمہارے ساتھ اپنا نکاح کر لیا اور اس کے جواب میں عورت یہ کہے کہ میں منظور کرتی ہوں۔ اور اگر مرد، عورت سے یوں کہے کہ "کیا تم نے اپنے آپ کو میری زوجیت میں دیا؟ یا کہے کہ "کیا تم نے مجھے قبول کیا" اور اس کے جواب میں عورت (ہاں میں نے دیا یا ہاں میں نے قبول کیا کہنے کی بجائے) صرف یہ کہے کہ ہاں دیا۔ یا ہاں قبول کیا (یعنی لفظ "میں" نہ کہے) تو اس صورت میں بھی نکاح ہو جاتا ہے۔ البتہ گواہوں کے سامنے صرف یہ کہنے سے کہ "ہم بیوی خاوند ہیں" نکاح نہیں ہوتا۔

جس طرح ایجاب و قبول میں ماضی کا لفظ استعمال کرنا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ایجاب و قبول میں خاص کر نکاح اور تزویج کا لفظ استعمال کیا جائے مثلاً یوں کہا جائے کہ میں نے تمہارے ساتھ نکاح کیا یا تمہارے ساتھ تزویج کیا۔ یا نکاح و تزویج کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا جائے جو نکاح کا مطلب صراحۃً ادا کرتا ہو جیسے مرد یوں کہے کہ میں نے تمہیں اپنی بیوی بنالیا یا یوں کہے کہ میں تمہارا شوہر ہو گیا۔ یا یوں کہے کہ تم میری ہو گئیں۔ اور نکاح و تزویج یا اس کا ہم معنی لفظ صراحۃً استعمال نہ کیا جائے بلکہ کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جس سے کنایۃً نکاح کا مفہوم سمجھا جاتا ہو تو یہ بھی جائز ہے بشرطیکہ وہ لفظ ایسا ہو جس کے ذریعہ سے کسی ذات کامل کی ملکیت فی الحال حاصل کی جاتی ہو جیسے ہبہ کا لفظ، یا صدقہ کا لفظ، یا تملیک کا لفظ، یا بیع و شراء کا لفظ جیسے بیوی یوں کہے کہ میں نے اپنی زوجیت تمہیں ہبہ کر دی، یا میں نے اپنی ذات تمہیں بطور صدقہ دے دی۔ یا میں نے تمہیں اپنی ذات کا مالک بنادیا، یا یوں کہے کہ میں نے تمہیں اس قدر روپیہ کے عوض خرید لیا اور ان سب کے جواب میں مرد یہ کہے کہ میں نے قبول کیا" لیکن اس کے صحیح ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ متکلم نے اس لفظ سے نکاح مراد لیا ہو اور کوئی قرینہ اس پر دلالت کرتا ہو اور اگر کوئی قرینہ نہ ہو تو قبول کرنے والے نے متکلم کی مراد کی تصدیق کر دی ہو، نیز گواہوں نے بھی سمجھ لیا ہو کہ اس لفظ سے مراد نکاح ہے خواہ انہوں نے کسی قرینہ سے سمجھا ہو یا بتادینے سے سمجھا ہو۔

ایجاب و قبول کے وقت عاقدین (دولہا دولہن) میں سے ہر ایک کے لئے دوسرے کا کلام سننا ضروری ہے خواہ وہ بالاصالۃ (یعنی خود سنیں خواہ بالوکالۃ سنیں (یعنی ان کا وکیل سنے) اور خواہ بالولایۃ سنیں (یعنی ان کا ولی سنے)

ایجاب و قبول کے وقت دو گواہوں کی موجودگی، نکاح صحیح ہونے کی شرط ہے۔ اور یہ گواہ خواہ دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، گواہوں کا آزاد ہونا ضروری ہے، لونڈی یا غلام گواہوں کی گواہی معتبر نہیں ہوگی، اسی طرح گواہوں کا عاقل اور مسلمان ہونا بھی ضروری ہے۔ مسلمانوں کی گواہی ہر حال میں کافی ہوگی خواہ وہ پرہیزگار ہوں یا فاسق ہوں اور خواہ ان پر حد قذف لگائی جا چکی ہو۔ گواہوں کا بیٹا ہونا یا زوجین کا رشتہ دار نہ ہونا شرط نہیں ہے، چنانچہ اندھوں کی گواہی اور زوجین کے رشتہ داروں کی گواہی معتبر ہوگی خواہ وہ زوجین کے یا ان میں سے کسی ایک کے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ گواہوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں ایجاب و قبول کے الفاظ کو ایک ساتھ سنیں اور سنکر یہ سمجھ لیں کہ نکاح ہو رہا ہے گو ان الفاظ کے معنی نہ سمجھیں (مثلاً ایجاب و قبول کسی ایسی زبان میں ہو جسے وہ نہ جانتے ہوں) اگر دونوں گواہ

ایجاب و قبول کے الفاظ ایک ساتھ نہ سنیں بلکہ الگ الگ سنیں تو نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص سے کہا کہ میری فلاں نابالغ لڑکی کا نکاح فلاں شخص کے ساتھ کردو اور اس شخص نے اس لڑکی کا نکاح اس باپ اور ایک دوسرے مرد کی موجودگی میں کیا تو یہ جائز ہوگا لیکن اگر باپ موجود نہ ہو تو پھر دونوں مردوں یا ایک مرد اور عورتوں کی موجودگی کے بغیر نکاح درست نہیں ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جوانوں کو نکاح کرنے کا حکم

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهُ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اے جوانوں کے گروہ! تم میں سے جو شخص مجامعت کے لوازمات (یعنی بیوی بچوں کا نفقہ اور مہر ادا کرنے) کی استطاعت رکھتا ہو، اسے چاہئے کہ وہ نکاح کرلے، کیونکہ نکاح کرنا نظر کو بہت چھپاتا ہے اور شرم گاہ کو بہت محفوظ رکھتا ہے (یعنی نکاح کرلینے سے اجنبی عورت کی طرف نظر مائل نہیں ہوتی اور انسان حرام کاری سے بچتا ہے) اور جو شخص جماع کے لوازمات کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اسے چاہئے کہ وہ روزے رکھے کیونکہ روزہ رکھنا اس کے لئے خصی کرنے کا فائدہ دیگا (یعنی جس طرح خصی ہو جانے سے جنسی ہیجان ختم ہو جاتا ہے اسی طرح روزہ رکھنے سے بھی جنسی ہیجان ختم ہو جاتا ہے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس خطاب عام کے ذریعہ نبی کریم ﷺ نے جوانوں کو نکاح کی ترغیب دلاتے ہوئے نکاح کے دو بڑے فائدے ظاہر فرمائے ہیں ایک تو یہ کہ انسان نکاح کرنے سے اجنبی عورتوں کی طرف نظر بازی سے بچتا ہے دوسرے یہ کہ حرام کاری سے محفوظ رہتا ہے۔

جوانی کی حد

انسان، بالغ ہونے کے بعد جوان کہلاتا ہے۔ لیکن جوانی کی یہ حد کہاں تک ہے؟ اس میں اختلاف ہے چنانچہ امام شافعیؒ کے نزدیک جوانی کی حد تیس برس کی عمر تک ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ ایک انسان چالیس برس کی عمر تک جوان کہلانے کا مستحق رہتا ہے۔

تبتل کی ممانعت

② وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ رَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ التَّبَتُّلَ وَلَوْ اَذِنَ لَهٗ لَاخْتَصَيْنَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ "رسول کریم ﷺ نے حضرت عثمان ابن مظعونؓ کو تبتل (یعنی نکاح ترک کرنے) سے منع کر دیا تھا، اگر آنحضرت ﷺ ان کو تبتل کی اجازت دیدیتے تو ہم بھی خصی ہو جاتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "تبتل" کے معنی ہیں "عورتوں سے انقطاع اور ترک نکاح" نصاری (حضرت عیسی علیہ السلام کے متبعین) کے ہاں تبتل ایک اچھا اور پسندیدہ فعل ہے کیونکہ ان کے نزدیک دینداری کی آخری حد یہ ہے کہ انسان عورتوں سے اجتناب کرے اور نکاح وغیرہ سے پرہیز کرے۔ لیکن جس طرح عیسائیت یا بعض دوسرے مذاہب میں نکاح کو ترک کر دینا اور لذائذ زندگی سے کنارہ کش ہو جانا عبادت اور نیکی و تقویٰ کی آخری حد سمجھا جاتا ہے اس طرح کی کوئی بات اسلام میں نہیں ہے بلکہ شریعت اسلامیہ نے نکاح کو انسانی زندگی کے لئے ایک ضرورت قرار دیکر اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ لذائذ زندگی سے مکمل کنارہ کشی اور خود ساختہ تکالیف برداشت کرنا عبادت

نہیں ہے بلکہ "رہبانیت" ہے جسے اس دین فطرت میں کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ ہاں امام شافعی اتنا ضرور کہتے ہیں کہ بغیر نکاح زندگی گزارنا افضل ہے لیکن امام شافعیؒ کا یہ قول بھی نکاح کے بارے میں شریعت اسلامیہ کے بنیادی منشاء کے منافی نہیں ہے کیونکہ اول تو اس کا تعلق صرف افضلیت سے ہے اور دوسرے یہ کہ یہ افضلیت بھی نفس نکاح (یعنی کرنے یا نہ کرنے) کے بارہ میں نہیں ہے بلکہ صرف "تخلي للعبادة" (یعنی عبادت کے لئے مجرد رہنا) کے نکتہ نظر سے ہے گویا امام شافعیؒ کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ عبادات میں مشغول رہنا نکاح کی مشغولیت سے افضل ہے۔ چنانچہ ملا علی قاریؒ نے مرقات میں امام شافعیؒ کی دلیلیں نقل کرنے کے بعد امام اعظم ابوحنیفہؒ کی بہت سی دلیلیں نقل کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ تجرد (بغیر نکاح رہنے) کے مقابلہ میں تاہل (نکاح کرنا) ہی افضل ہے۔

بہر کیف حضرت عثمان ابن مظعونؓ نے جب آنحضرت ﷺ سے تبتل کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے انہیں اس کی اجازت دینے سے انکار کردیا کیونکہ اسلام مسلمانوں کے ہاں نکاح کے ذریعہ افزائش نسل کو پسند کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ خدا کے حقیقی نام لیوا موجود رہیں اور وہ ہمیشہ کفر و باطل کے خلاف جہاد کرتے رہیں۔ اسی سلسلہ میں حدیث کے راوی حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے یہ کہا کہ اگر آنحضرت حضرت عثمانؓ کو تبتل کی اجازت دیدیتے تو ہم سب اپنے آپ کو خصی کرڈالتے تاکہ ہمیں عورتوں کی ضرورت پڑتی اور نہ ہمیں عورتوں سے متعلق کسی برائی میں مبتلا ہوجانے کا خوف رہتا۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس موقع کے مناسب تو یہ تھا کہ حضرت سعدؓ یہ کہتے کہ اگر آنحضرت ﷺ حضرت عثمانؓ کو تبتل کی اجازت دیدیتے تو ہم بھی تبتل کرتے۔ مگر حضرت سعدؓ نے یہ کہنے کی بجائے یہ کہا کہ ہم سب اپنے آپ کو خصی کرڈالتے لہٰذا حضرت سعدؓ نے یہ بات دراصل بطور مبالغہ کہی یعنی اپنی اس بات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر آنحضرت ﷺ حضرت عثمانؓ کو اجازت دیدیتے تو ہم بھی تبتل میں اتنا مبالغہ اور اتنی سخت کوشش کرتے کہ آخر کار خصی کی مانند ہوجاتے۔ گویا اس جملہ سے حضرت سعدؓ کی مراد حقیقۃً خصی ہوجانا نہیں تھا۔ کیونکہ یہ فعل (یعنی اپنے آپ کو خصی کرڈالنا) جائز نہیں ہے۔

اور علامہ نوویؒ کہتے ہیں کہ حضرت سعدؓ نے یہ بات اس وجہ سے کہی کہ ان کا گمان یہ تھا کہ خصی ہوجانا جائز ہے حالانکہ انکا یہ گمان حقیقت و واقعہ کے خلاف تھا کیونکہ خصی ہوجانا انسان کے لئے حرام ہے خواہ چھوٹی عمر کا ہو یا بڑی عمر کا! اس موقع پر جانوروں کے بارہ میں جان لینا چاہئے کہ ہر اس جانور کو خصی کرنا حرام ہے جو غیر ماکول (یعنی کھایا نہ جاتا) ہو اور جو جانور کھایا جاتا ہے اس کو خصی کرنا چھوٹی عمر میں تو جائز ہے لیکن بڑی عمر میں حرام ہے۔ جانوروں کو خصی کرنے کے بارہ میں مذکورہ بالا تفصیل علامہ نووی شافعیؒ نے لکھی ہے جب کہ فقہ حنفی کی کتابوں اور مختار اور ہدایہ میں "بڑی عمر اور چھوٹی عمر" کی تفصیل کے بغیر صرف یہ لکھا ہے کہ جانوروں کو خصی کرنا جائز ہے۔

دیندار عورت سے نکاح کرنا بہتر ہے

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُنْكَحُ الْمَرْاَةُ لِاَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کسی عورت سے نکاح کرنے کے بارہ میں چار چیزوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اول اس کا مالدار ہونا، دوم اس کا حسب نسب والی ہونا، سوم اس کا حسین و جمیل ہونا اور چہارم اس کا دین دار ہونا۔ لہٰذا دیندار عورت کو اپنا مطلوب قرار دو، اور خاک آلودہ ہوں تیرے دونوں ہاتھ۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "حسب و نسب والی" سے مراد وہ عورت ہے جو نہ صرف اپنی ذات میں شرف و بلندی اور وجاہت رکھتی ہو۔ بلکہ وہ جس خاندان و قبیلہ کی فرد ہو وہ خاندان و قبیلہ بھی عزت و وجاہت اور شرف و بلندی کا حامل ہو چنانچہ انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسی عورت سے بیاہ کرے جو باحیثیت و باعزت خاندان و قبیلہ کی فرد ہو تاکہ اس عورت کی وجہ سے اپنی اولاد کے نسب میں شرف و بلندی کا

امتیاز حاصل ہو۔

بہر کیف حدیث کا حاصل یہ ہے کہ عام طور پر لوگ عورت سے نکاح کرنے کے سلسلہ میں مذکورہ چار چیزوں کو بطور خاص ملحوظ رکھتے ہیں کہ کوئی شخص تو مالدار عوت سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ بعض لوگ اچھے حسب و نسب کی عورت کو بیوی بنانا پسند کرتے ہیں، بہت سے لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ایک حسین و جمیل عورت ان کی رفیقہ حیات بنے اور کچھ نیک بندے دین دار عورت کو ترجیح دیتے ہیں لہٰذا دین و مذہب سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ دین دار عورت ہی کو اپنے نکاح کے لئے پسند کرے کیونکہ اس میں دنیا کی بھی بھلائی بھی ہے اور آخرت کی بھی سعادت ہے۔

"اور خاک آلودہ ہوں تیرے دونوں ہاتھ" ویسے تو یہ جملہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے ذلت و خواری اور ہلاکت کی بددعا کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، لیکن یہاں اس جملہ سے یہ بددعا مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد دین دار عورت کو اپنا مطلوب قرار دینے کی ترغیب دلانا ہے۔

نیک بخت عورت دنیا کی بہترین متاع ہے

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "پوری دنیا ایک متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک بخت عورت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: متاع کے معنی ہیں "وہ چیز جس سے تھوڑا سا فائدہ اٹھایا جائے پھر فنا ہو جائے"۔ لہٰذا پوری دنیا کو ایک متاع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پوری دنیا ایک ایسی چیز ہے جس کا فائدہ قلیل المدت ہے اور جس کا نفع جلد ہی فنا ہو جانے والا ہے! اس طرح "دنیا کی بہترین متاع نیک بخت عورت ہے" کا مطلب یہ ہوگا کہ اس دنیا میں جن چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان میں کی بہترین چیز نیک بخت عورت ہے کیونکہ نیک بخت عورت آخرت کے کاموں میں بہت مددگار و مفید ثابت ہوتی ہے۔

قریش کی نیک بخت عورتوں کی فضیلت

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ نِسَاءٍ رَكِبْنَ الْاِبِلَ صَالِحُ نِسَاءِ قُرَيْشٍ اَحْنَاهُ عَلٰى وَلَدٍ فِیْ صِغَرِهٖ وَاَرْعَاهُ عَلٰى زَوْجٍ فِیْ ذَاتِ يَدِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اونٹوں پر سوار ہونے والی عورتوں میں بہترین عورتیں قریش کی ہیں جو چھوٹے بچوں پر بہت شفیق ہوتی ہیں اور اپنے شوہر کے اس مال کی جو ان کے قبضہ میں ہوتا ہے، بہت زیادہ حفاظت کرتی ہیں۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اونٹوں پر سوار ہونے والی عورتوں" سے مراد عرب کی عورتیں کیونکہ عرب کی عورتیں عام طور پر اونٹ کی سواری کی عادی ہوتی تھیں لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ عرب کی عورتوں میں بہترین عورتیں قریش کی نیک بخت عورتیں ہیں۔

عورتوں کا فتنہ زیادہ نقصان دہ ہے

⑥ وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا تَرَكْتُ بَعْدِیْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ ابن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں نے اپنے بعد ایسا کوئی فتنہ نہیں چھوڑا ہے جو مردوں کے حق میں عورتوں کے فتنہ سے زیادہ ضرر رساں ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مردوں کے حق میں عورتوں کے فتنے کو سب سے زیادہ ضرر رساں اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ اول تو مردوں کی طبائع عام طور پر عورتوں کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ مرد عام طور پر عورتوں کی خواہشات کے زیادہ پابند ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حرام امور میں گرفتار ہوتے ہیں اور عورتوں ہی کی وجہ سے آپس کے لڑائی جھگڑے نفرت وعداوت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ یہ عورتیں ہی ہیں جن کی بے جا ناز برداریاں مردوں کو دنیاداری کی طرف راغب کرتی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ دنیاداری سے زیادہ اور کون سی چیز ضرر رساں ہو سکتی ہے، کیونکہ سرکار دو عالم ﷺ نے اس کے بارہ میں فرمایا ہے کہ۔

حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ۔

"دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔"

ارشاد گرامی "اپنے بعد" سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عورتوں کے فتنے آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں کم تھے اور ان کا زیادہ ظہور آپ ﷺ کے بعد ہوا کیونکہ اس وقت حق کا غلبہ تھا اور نیکی کی طاقت تمام برائیوں کو دبائے ہوئے تھی جب کہ آنحضرت ﷺ کے بعد آہستہ آہستہ باطل کی قوت بڑھتی گئی اور برائیوں کا غلبہ ہوتا گیا۔

عورت کے فتنہ سے بچو

⑦ وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَاِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيْهَا فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ فَاِنَّ اَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ كَانَتْ فِى النِّسَاءِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "دنیا شیریں اور سبز (جاذب نظر) ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا کا خلیفہ بنایا ہے اس لئے وہ (ہر وقت) دیکھتا ہے کہ تم اس دنیا میں کس طرح عمل کرتے ہو، لہٰذا دنیا سے بچو اور عورتوں (کے فتنہ) سے بچو کیونکہ بنی اسرائیل کی تباہی کا باعث سب سے پہلا فتنہ عورتوں ہی کی صورت میں تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "دنیا شیریں اور سبز ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شیرینی، طبیعت کے لئے ایک مرغوب چیز ہوتی ہے اور جس طرح سبز چیز آنکھوں کو بہت بھاتی ہے اسی طرح دنیا بھی دل کو بہت پیاری لگتی ہے اور آنکھوں کو بھی بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا کا خلیفہ بنایا ہے" الخ کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، وہی اس کا حقیقی مالک و حاکم ہے تمہیں اس نے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر گویا اس دنیا کے تصرفات میں تمہیں اپنا وکیل بنایا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ تمہیں ہر وقت دیکھتا ہے کہ تم اس زمین پر اس کے بار خلافت کو کس طرح اٹھا رہے ہو اور اپنی عملی زندگی کے ذریعہ تصرفات دنیا میں حق وکالت کس طرح ادا کر رہے ہو؟ یا اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ تم سے پہلے اس دنیا سے جا چکے ہیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان کا خلیفہ (وارث) بنایا ہے، لہٰذا ان کے پاس جو کچھ تھا وہ سب تمہیں دیدیا ہے اور اب وہ تمہیں دیکھتا ہے کہ تم اپنے اسلاف کے احوال و کوائف سے کس طرح عبرت پکڑتے ہو اور ان کے اموال و میراث میں کس طرح تصرف و انتظام کرتے ہو:

"دنیا سے بچو" الخ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا مکر و فریب کا بچھا ہوا ایک جال ہے اس جال سے حتی الامکان بچتے رہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس جال میں پھنس کر دنیا کے ظاہری مال و جاہ پر اپنی دینداری گنوا بیٹھو کیونکہ دنیا کو ثبات نہیں ہے، یہ ایک فنا ہو جانے والی چیز ہے، پھر اس فناء کے بعد کل جب تم ہمیشہ کی زندگی کے لئے اٹھائے جاؤ گے اس کی حلال چیزوں کا حساب دینا ہو گا اور اس کی حرام چیزوں پر عذاب میں

مبتلا کئے جاؤ گے۔ اسی طرح عورتوں کے مکروفریب سے بھی بچتے رہو، کیونکہ ایک مشت خاک کا یہ دل فریب مجسمہ جہاں نیک عورت کی صورت میں خدا کی ایک نعمت ہے وہیں بری عورت کے روپ میں فتنہ عالم بھی ہے ایسا نہ ہو کہ بری عورتوں کی مکاریاں یا اپنی بیویوں کی بے جاناز برداریاں تمہیں ممنوع وحرام چیزوں کی طرف مائل کردیں اور ان کی وجہ سے تم تباہی وہلاکت کی کھائیوں میں دھکیل دیئے جاؤ۔

بنی اسرائیل پر تباہی کے دروازے کھولنے والا پہلا فتنہ عورت

تباہیوں کے دروازے کھلنے کا پہلا سبب اور ذریعہ بنا۔ چنانچہ اس کی تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص جس کا نام بلعم بن باعور تھا، بہت مستجاب الدعوات تھا، اسے اسم اعظم یاد تھا جس کے ذریعہ وہ اپنی ہر دعا مقبول کرالیتا تھا، چنانچہ جب حضرت موسی علیہ السلام "جباروں" سے لڑنے کے لئے علاقہ شام میں واقع بنی کنعان کے ایک حصہ میں خیمہ زن ہوئے تو بلعم کی قوم کے لوگ بلعم کے پاس آئے اور کہا کہ موسی علیہ السلام اپنے پیروکاروں کا ایک عظیم لشکر لے کر ہمیں قتل کرنے اور اس علاقہ سے نکالنے کے لئے آئے ہیں تم ان کے لئے کوئی ایسی بد دعا کرو کہ وہ یہاں سے واپس بھاگ جائیں۔ بلعم نے جواب دیا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم وہ نہیں جانتے بھلا میں خدا کے پیغمبر علیہ السلام اور اس کے ماننے والوں کے حق میں بد دعا کیسے کر سکتا ہوں؟ اگر میں ان کے لئے بد دعا کرتا ہوں تو میری دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو جائیں گی! جب اس قوم کے لوگوں نے بہت منت سماجت کی اور وہ بد دعا کرنے پر اصرار کرتے رہے تو بلعم نے کہا کہ اچھا میں استخارہ کروں گا اور دیکھوں گا کہ کیا حکم ہوتا ہے پھر اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ بلعم کا یہ معمول تھا کہ وہ بغیر استخارہ کوئی بھی کام نہیں کرتا تھا، چنانچہ اس نے جب استخارہ کیا تو خواب میں اسے ہدایت کی گئی کہ پیغمبر اور مؤمنوں کے حق میں ہرگز بد دعا مت کرنا! بلعم نے اس خواب سے اپنی قوم کو مطلع کیا اور بد دعا نہ کرنے کے لئے اپنے ارادہ کا پھر اظہار کیا، قوم کے لوگوں نے غور و فکر کے بعد ایک طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ وہ لوگ اپنے ساتھ بیش قیمت تحفے لے کر بلعم کے پاس آئے اور پھر اس کے سامنے بہت ہی زیادہ منت سماجت کی، روئے گڑگڑائے اور اسے اتنا مجبور کیا کہ آخر کار وہ ان کے جال میں پھنس ہی گیا، چنانچہ وہ بد دعا کرنے کی غرض سے اپنے گدھے پر سوار ہو کر جستان پہاڑ کی طرف چلا جس کے قریب حضرت موسی علیہ السلام کا لشکر مقیم تھا، راستہ میں کئی مرتبہ گدھا گرا جسے وہ مار مار کر اٹھاتا رہا، یہاں تک کہ جب یہ سلسلہ دراز ہوا اور بلعم بھی اپنے گدھے کو مار مار کر اٹھاتا ہوا پریشان ہو گیا تو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے گدھے کو گویائی عطا کی چنانچہ گدھا بولا کہ "نادان بلعم! تجھ پر افسوس ہے، کیا تو یہ نہیں دیکھتا کہ تو کہاں جارہا ہے، تو مجھے آگے چلانے کی کوشش کر رہا ہے اور ملائکہ میرے آگے آکر مجھے پیچھے دھکیل رہے ہیں"! بلعم نے جب چشم حیرت سے گدھے کو بولتے دیکھا تو بجائے اس کے کہ اس تنبیہ پر اپنے ارادہ سے باز آجاتا گدھے کو وہیں چھوڑا..... پیادہ پا پہاڑ پر چڑھ گیا اور وہاں بد دعا کرنے لگا، مگر یہاں بھی قدرت خداوندی نے اپنا یہ کرشمہ دکھایا کہ بلعم اپنی بد دعا میں جب بھی حضرت موسیٰ اور ان کے لشکر کا نام لینا چاہتا، اس کی زبان سے بنی اسرائیل کے بجائے بلعم کی قوم کا نام نکلتا، یہ سن کر اس کی قوم کے لوگوں نے کہا کہ "بلعم! یہ کیا حرکت ہے؟ بنی اسرائیل کی بجائے ہمارے حق میں بد دعا کر رہے ہو۔ بلعم نے کہا کہ اب میں کیا کروں، یہ حق تعالیٰ میرے قصد و ارادہ کے بغیر میری زبان سے تمہارا نام نکلوا رہا ہے۔ لیکن بلعم پھر بھی اپنی بد دعا سے باز نہ آیا اور اپنی سی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ عذاب الٰہی کی وجہ سے بلعم کی زبان اس کے منہ سے نکل کر سینہ پر آپڑی، پھر تو گویا بلعم کی عقل بالکل ہی ماری گئی اور دیوانہ وار کہنے لگا کہ لو اب تو میری دنیا اور آخرت دونوں ہی برباد ہو گئی اس لئے اب ہمیں بنی اسرائیل کی تباہی کے لئے کوئی دوسرا جال تیار کرنا پڑے گا۔ پھر اس نے مشورہ دیا کہ تم لوگ اپنی اپنی عورتوں کو اچھی طرح آراستہ پیراستہ کر کے اور ان کے ہاتھوں میں کچھ چیزیں دے کر ان چیزوں کو فروخت کرنے کے بہانہ سے عورتوں کو بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو اور ان سے کہہ دو کہ اگر بنی اسرائیل میں سے کوئی شخص تمہیں اپنے پاس بلائے تو انکار نہ کرنا یاد رکھو اگر بنی اسرائیل میں سے ایک شخص بھی کسی عورت کے ساتھ حرام کاری میں مبتلا ہو گیا تو تمہاری ساری کوششیں کامیاب ہو جائیں گی۔ چنانچہ بلعم کی قوم نے اس مشورہ پر عمل کیا اور اپنی عورتوں کو بنا سنوار کر بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دیا۔ وہ عورتیں جب لشکر میں پہنچیں اور

ان میں سے ایک عورت جس کا نام کسی بنت صور تھا، بنی اسرائیل کے ایک سردار زمزم بن شلوم نامی کے سامنے سے گذری تو وہ اس عورت کے حسن و جمال کا اسیر ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت موسی علیہ السلام کے پاس لے گیا اور ان سے کہنے لگا کہ کیا آپ اس عورت کو میرے لئے حرام قرار دیتے ہیں؟ حضرت موسی علیہ السلام نے جواب دیا کہ ہاں! اس عورت کے پاس ہرگز مت جانا، تو زمزم نے کہا کہ میں اس بارہ میں آپ کا حکم نہیں مانوں گا چنانچہ وہ اس عورت کو اپنے خیمہ میں لے گیا اور وہاں اس کے ساتھ منہ کالا کیا بس پھر کیا تھا حکم الٰہی نے قہر کی شکل اختیار کر لی اور اس سرد لر کی شامت عمل سے ایک ایسی وبا پورے لشکر پر نازل ہوئی کہ آن کی آن میں ستر ہزار آدمی ہلاک و تباہ ہو گئے ادھر جب فحاص کو کہ جو حضرت ہارون علیہ السلام کا پوتا اور ایک قوی ہیکل آدمی تھا اور حضرت موسی علیہ السلام کا نگہبان تھا، یہ معلوم ہوا کہ ہمارے ایک سردار کی شامت عمل نے قہر خداوندی کو دعوت دے دی ہے تو فوراً اپنا ہتھیار لے کر زمزم کے خیمہ میں داخل ہوا اور پلک جھپکتے ہی زمزم اور اس عورت کا کام تمام کر ڈالا اور پھر بولا کہ "اللہ تعالیٰ نے اسی شخص کی وجہ سے ہم سب کو ہلاک و تباہ کر دیا ہے" چنانچہ ان دونوں کے قتل ہوتے ہی وہ وباء جو عذاب خداوندی کی صورت میں نازل ہوئی تھی ختم ہو گئی۔

وہ تین چیزیں جن میں نحوست ہوتی ہے

(۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشُّؤْمُ فِي الْمَرْأَةِ وَالدَّارِ وَالْفَرَسِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ الشُّؤْمُ فِي ثَلَاثَةٍ فِي الْمَرْأَةِ وَالْمَسْكَنِ وَالدَّابَّةِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عورت، گھر اور گھوڑے میں نحوست ہوتی ہے۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "نحوست تین چیزوں میں ہوتی ہے عورتوں میں، مکان میں اور جانور میں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "شوم ضد ہے" "یمن" کی جس کے معنی ہیں "بے برکتی" اور اسی کو "نحوست" بھی کہتے ہیں۔ لہٰذا حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ان تین چیزوں میں نحوست ہوتی ہے تو تفصیل کے ساتھ سمجھ لیجئے کہ "نحوست" سے کیا مراد ہے؟

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "گھر کی نحوست" سے گھر کی تنگی اور بری ہمسائیگی مراد ہے، یعنی جو گھر تنگ و تاریک ہو اور اس کا پڑوس برا ہو تو وہ گھر تکلیف و پریشانی کا باعث ہو جاتا ہے، "عورت کی نحوست" سے مہر کی زیادتی، اس کی بد مزاجی و زبان درازی اور بانجھ پن مراد ہے یعنی جس عورت کا مہر زیادہ مقرر کیا گیا ہو، وہ بد مزاجی و تند خو، زبان دراز ہو اور یہ کہ بانجھ ہو تو ایسی عورت راحت و سکون کی بجائے اذیت و کوفت کا ذریعہ بن جاتی ہے اسی طرح گھوڑے کی نحوست "سے" اس کا شوخ ہونا، مٹھا قدم ہونا، اور اس پر سوار ہو کر جہاد نہ کیا جانا، مراد ہے یعنی جو گھوڑا ایسا ہو کہ اپنی شوخی کی وجہ سے پریشان کرتا ہو، سست رفتار ہو اور مٹھ ہو اور اس پر سوار ہو کر جہاد کرنے کی کبھی نوبت نہ آئی ہو تو وہ گھوڑا اپنے مالک کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

کچھ علماء یہ کہتے ہیں کہ ان تین چیزوں میں نحوست کے اظہار کرنے کا مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ اگر بالفرض کسی چیز میں نحوست کا ہونا اپنی کوئی حقیقت رکھتا تو ان تین چیزوں میں نحوست ہوتی۔ گویا اس تشریح سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی چیز میں نحوست کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا چنانچہ یہ کہنا کہ فلاں چیز منحوس ہے یا فلاں چیز میں نحوست ہے صرف ایک واہمہ کے درجہ کی چیز ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اگر واقعۃ نحوست کسی چیز میں ہوا کرتی تو ان تین چیزوں میں ضرور ہوتی کیونکہ یہ تین چیزیں نحوست کے قابل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے کہ "اگر کوئی چیز تقدیر کے دائرہ سے باہر ہوتی تو وہ نظر بد تھی" یعنی کائنات کی ہر جنبش و حرکت اور یہاں کا ذرہ ذرہ پابند تقدیر ہے، اس عالم میں صرف وہی ظہور میں آتا ہے جو پہلے سے مقدر ہو چکا ہو کوئی چیز تقدیر سے باہر نہیں ہے اور اگر بفرض محال کوئی چیز مقدرات کے دائرہ سے باہر ہوتی تو وہ نظر بد ہے (کہ جسے عام طور پر نظر لگنا کہتے ہیں) لہٰذا جس طرح اس ارشاد کا مقصد یہ ظاہر کرنا نہیں ہے کہ نظر بد تقدیر کے دائرہ سے باہر ہے اسی طرح مذکورہ بالا تینوں چیزوں کے ساتھ

نحوست کا ذکر کرنے کا یہ مقصد نہیں ہے۔ کہ ان تین چیزوں میں نحوست ہوتی ہے۔

اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی کے ذریعہ دار صل اُمت کے لوگوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کسی کے پاس ایسا مکان ہو جس میں رہنا وہ ناپسند کرتا ہو، یا کسی کی ایسی بیوی ہو جس کے ساتھ صحبت و مباشرت اسے ناگوار ہو، یا کسی کے پاس ایسا، گھوڑا ہو جو اسے اچھا معلوم نہ ہوتا ہو تو ان صورتوں میں یہ چیزیں چھوڑ دینی چاہئیں یعنی مکان والا اس مکان سے منتقل ہو جائے بیوی والا اس کو طلاق دیدے اور گھوڑے والا اس گھوڑے کو بیچ ڈالے۔

حدیث کی ان توضیحات کی روشنی میں یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ ارشاد گرامی طیرۃ منھی عنھا (بدشگونی لینے کی ممانعت) کے منافی نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عام طور پر لوگ جو یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ مکان منحوس ہے یا فلاں عورت یا فلاں گھوڑا سبز قدم ہے، تو یہ بات یہاں مراد نہیں ہے۔

اپنے نکاح کے لئے کنواری عورت کو ترجیح دو

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةٍ فَلَمَّا قَفَلْنَا كُنَّا قَرِيْبًا مِنَ الْمَدِيْنَةِ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِعُرْسٍ قَالَ تَزَوَّجْتَ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ اَبِكْرًا اَمْ ثَيِّبٌ قُلْتُ بَلْ ثَيِّبٌ قَالَ فَهَلَّا بِكْرًا تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ فَلَمَّا قَدِمْنَا ذَهَبْنَا لِنَدْخُلَ فَقَالَ اَمْهِلُوْا حَتّٰى نَدْخُلَ لَيْلًا اَيْ عِشَاءً لِكَيْ تَمْتَشِطَ الشَّعِثَةُ وَتَسْتَحِدَّ الْمُغِيْبَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک جہاد میں ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے چنانچہ جب ہم (جہاد سے) واپس ہوئے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میری نئی شادی ہوئی تھی (کہ میں جہاد میں چلا گیا اب اگر حکم ہو تو میں آگے چلا جاؤں تاکہ اپنے گھر جلد سے جلد پہنچ سکوں) آپ ﷺ نے فرمایا "تم نے نکاح کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں!" آپ ﷺ نے پوچھا "بیوی کنواری تھی یا بیوہ تھی؟ میں نے عرض کیا کہ "بیوہ تھی، آپ ﷺ نے فرمایا "تو تم نے کنواری سے کیوں نکاح نہیں کیا تاکہ تم اس کے ساتھ کھیلتے اور وہ تمہارے ساتھ کھیلتی" پھر جب ہم مدینہ پہنچ گئے اور ہم سب نے اپنے اپنے گھروں میں جانے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ابھی ٹھہر جاؤ، ہم رات میں (یعنی شام کے وقت) گھروں میں داخل ہوں گے تاکہ جس عورت کے بال پراگندہ ہوں وہ کنگھی چوٹی کرلے اور وہ عورت جس کا خاوند موجود نہیں تھا (بلکہ ہمارے ساتھ جہاد میں گیا ہوا تھا) اپنے زائد بال صاف کرلے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: تم اس کے ساتھ کھیلتے الخ" سے آپ کی بے تکلفی اور کمال الفت و رغبت مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ کنواری عورت سے نکاح کرنے میں آپس کی زندگی زیادہ الفت و رغبت کے ساتھ گذرتی ہے اور بے تکلفی اور چاہت زیادہ ہوتی ہے، اس کے برخلاف بیوہ عورت جب کسی دوسرے کی زوجیت میں آتی ہے چونکہ اس کا دل پہلے خاوند کی یاد کی کسک محسوس کرتا ہے دوسرے یہ کہ اگر رہن سہن اور میل ملاپ میں اس دوسرے خاوند کو اپنے پہلے خاوند کی طرح نہیں پاتی تو اس کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے، ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی زیادہ بے تکلف اور خوش مزاج ثابت نہیں ہوتی جتنی ایک کنواری عورت ہوتی ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھروں میں جانے میں جلدی نہ کرو بلکہ کچھ دیر توقف کرو، تاکہ تمہاری بیویاں رات سے پہلے اپنا بناؤ سنگھار کر کے تمہاری مجامعت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرلیں اور جب تم رات میں ان کے پاس پہنچو تو تمہیں کسی قسم کا کوئی تکدر اور کوئی بے لطفی نہ ہو۔ اس موقع پر یہ خلجان پیدا ہو سکتا ہے کہ دوسری حدیثوں میں تو اپنے گھر واپس آنے والے مسافر کو رات کے وقت گھر میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے جب کہ یہاں رات کے وقت گھروں میں داخل ہونے کو فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ گھر لوٹنے والے مسافر کو رات کے وقت گھر میں داخل ہونے کی جو ممانعت ہے اس کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ بغیر اطلاع کے یکایک گھر میں چلا جائے اور اگر گھر والوں کو پہلے سے اطلاع ہو جیسا کہ اس موقع پر ہوا تو اس صورت میں رات کے وقت اپنے گھر میں

داخل ہونا ممنوع نہیں ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

وہ تین شخص جن کی اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرتا ہے

⑩ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثَۃٌ حَقٌّ عَلَی اللّٰہِ عَوْنُھُمْ اَلْمُکَاتَبُ الَّذِیْ یُرِیْدُ الْاَدَاءَ وَالنَّاکِحُ الَّذِیْ یُرِیْدُ الْعَفَافَ وَالْمُجَاھِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایسے تین شخص ہیں جن کی مدد اللہ پر (اس کے وعدہ کے مطابق) واجب ہے ایک تو وہ مکاتب جو اپنا بدل کتابت ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، دوسرا وہ نکاح کرنے والا شخص جو حرام کاری سے بچنے کی نیت رکھتا ہو، اور تیسرا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والا۔"

تشریح: مکاتب اس غلام کو کہتے تھے جس کا آقا اس سے یہ کہہ دیتا تھا کہ اگر تم مجھے اتنا روپیہ کما کر دیدو گے تو تم آزاد ہو جاؤ گے۔ اسی طرح روپیہ کی وہ مقدار جو اس غلام کا آقا آزادی کے لئے ضروری قرار دیتا تھا "بدل کتابت" کہلاتی تھی۔

عورت کے ولی کے لئے ایک ضروری ہدایت

⑪ وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا خَطَبَ اِلَیْکُمْ مَّنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَہٗ وَخُلُقَہٗ فَزَوِّجُوْہُ اِنْ لَا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِیْضٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تمہارے پاس کوئی شخص نکاح کا پیغام بھیجے اور تم اس شخص کی دینداری اور اس کے اخلاق سے مطمئن وخوش ہو تو (اس کا پیغام منظور کر کے) اس سے نکاح کر دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین پر فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو جائیگا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہ ارشاد گرامی دراصل عورتوں کے سرپرست اور ولیوں سے ایک خطاب اور ان کے لئے ایک ضروری ہدایت ہے کہ اگر کوئی دیندار اور اچھے اخلاق و اطوار کا حامل شخص تمہاری بیٹی یا تمہاری بہن وغیرہ سے نکاح کا پیغام بھیجے تو منظور کر لو اور اس سے نکاح کر دو، اگر ایسا نہ کرو گے بلکہ ایسے شخص کے پیغام کو نظر انداز کر کے کسی مالدار یا ثروت دار شخص کے پیغام کی انتظار میں رہو گے جیسا کہ اکثر دینداروں کی عادت ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثر عورتیں بغیر خاوند کے بیٹھی رہ جائیں گی اور اکثر مرد بغیر بیوی کے پڑے رہیں گے اس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ بدکاری اور برائیوں کا عام چلن ہو جائے گا بلکہ ان عورتوں کے سرپرست اور ولی بڑی بری قسم کی عار و غیرت میں مبتلا ہوں گے پھر جو لوگ ان کو عار و غیرت دلائیں گے وہ ان سے لڑنے جھگڑنے لگیں گے آخر کار اس برائی و فحاشی اور لڑائی جھگڑے سے ایک ہمہ گیر فتنہ و فساد کی شکل پیدا ہو جائے گی۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ایک طرح سے یہ حدیث حضرت امام مالکؒ کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ کفائت (زوجین میں سے ایک دوسرے کا کفو ہونے) کا لحاظ صرف دین کے وصف میں کیا جائے گویا ان کے نزدیک ایک دوسرے کا کفو صرف دین میں ہو سکتا ہے جب کہ علماء کی اکثریت کا مسلک یہ ہے کہ ان چار اوصاف میں ایک دوسرے کا کفو (شریک) ہونے کا لحاظ کیا جائے ① دین، حریت، نسب، پیشہ۔ چنانچہ کسی مسلمان عورت کا نکاح کافر سے نہ کیا جائے۔ نہ کسی غیر معلوم النسب سے کیا جائے۔ اور کسی سوداگر یا اچھے پیشے والے کی بیٹی کا نکاح کسی حرام یا مکروہ پیشہ والے سے نہ کیا جائے۔ لیکن اس بارہ میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اگر کسی عورت کا ولی اور خود وہ عورت کسی غیر کفو والے سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا۔

محبت کرنے والی عورت سے نکاح کرو

⑫ وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت معقل ابن یسارؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم ایسی عورت سے نکاح کرو جو اپنے خاوند سے محبت کرنے والی ہو اور زیادہ بچے جننے والی ہو، کیونکہ دوسری امتوں کے مقابلہ میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔" (ابوداؤد ونسائی)

تشریح: منکوحہ عورت میں مذکورہ بالا دو صفتوں کو ساتھ ساتھ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اگر کسی عورت کے ہاں بچے تو بہت پیدا ہوتے ہوں مگر وہ اپنے خاوند سے محبت کم کرتی ہو تو اس صورت میں خاوند کو اس کی طرف رغبت کم ہوگی اور اگر کوئی عورت خاوند سے محبت تو بہت کرے مگر اس کے یہاں بچے زیادہ نہ ہوں تو اس صورت میں مطلوب حاصل نہیں ہوگا۔ اور مطلوب اُمت محمدیہ ﷺ کی کثرت ہے جو ظاہر ہے کہ زیادہ بچے ہونے کی صورت میں ممکن ہے۔ اگر مسلمان عورتوں کے ہاں زیادہ بچے ہوں گے تو امت میں کثرت ہوگی جو پیغمبر اسلام کے نزدیک پسندیدہ اور مطلوب ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نکاح سے پہلے یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ کون سی عورت اپنی آئندہ زندگی میں ان اوصاف کی حامل ثابت ہو سکتی ہے؟ تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ کسی خاندان و کنبہ کا عام مشاہدہ اس کی کسی عورت کے لئے ان صفتوں کا معیار بن سکتا ہے چنانچہ ان اکثر لڑکیوں میں یہ صفتیں موجود ہو سکتی ہیں جن کے خاندان و قرابت داروں میں ان صفتوں کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، عام طور پر چونکہ اقرباء کے طبعی اوصاف ایک دوسرے میں سرایت کئے ہوتے ہیں اور عادت و مزاج میں کسی خاندان و کنبہ کا ہر فرد ایک دوسرے کے ساتھ یکسانیت رکھتا ہے اس لئے کسی خاندان کی لڑکی کے بارہ میں اس کے خاندان کے عام مشاہدہ کے پیش نظر ان اوصاف کا اندازہ لگالینا کوئی مشکل نہیں ہے۔

بہرکیف، اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ شوہر سے بہت زیادہ محبت کرنے والی اور بچے پیدا کرنے والی عورت سے نکاح کرنا مستحب ہے، نیز یہ کہ زیادہ بچے ہونا بہتر اور پسندیدہ ہے کیونکہ اس سے آنحضرت ﷺ کا مقصد (یعنی اُمت کی زیادتی و کثرت کا فخر) حاصل ہوتا ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں "نکاح کرنے" سے مراد یہ تعلیم دینا ہے کہ تمہاری جن بیویوں میں یہ اوصاف موجود ہوں ان کے ساتھ زوجیت کے تعلق کو ہمیشہ قائم رکھو اور اس بات کی کوشش کرو کہ آپس میں کبھی کوئی تفرقہ اور جدائی نہ ہو۔

کنواری سے نکاح کرنا زیادہ بہتر ہے

⑬ وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَالِمِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ عُوَيْمِ بْنِ سَاعِدَةَ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِالْاَبْكَارِ فَاِنَّهُنَّ اَعْذَبُ اَفْوَاهًا وَّاَنْتَقُ اَرْحَامًا وَّاَرْضٰى بِالْيَسِيْرِ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت عبدالرحمٰنؒ ابن سالمؒ ابن عتبہؒ ابن عویمؓ ابن ساعدہ انصاری اپنے والد حضرت سالم سے اور وہ عبدالرحمٰن کے دادا (یعنی حضرت عتبہؒ تابعی) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تمہیں کنواری عورتوں سے نکاح کرنا چاہئے کیونکہ وہ شریں دہن ہوتی ہیں (یعنی کنواری عورتیں شیریں زبان و خوش کلام ہوتی ہیں کہ وہ بدزبانی فحش گوئی میں مبتلا نہیں ہوتیں) اور زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہوتی ہیں نیز وہ تھوڑے پر بھی راضی رہتی ہیں (یعنی تھوڑا مال و اسباب پانے پر بھی راضی رہتی ہیں) اس روایت کو ابن ماجہؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس ارشاد گرامی کے ذریعہ کنواری عورتوں کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بیوہ عورتوں میں نہیں پائی جاتیں مثلاً

کنواری عورت زیادہ بچے پیدا کرنے کے قابل ہوتی ہے کیونکہ اس کے رحم میں حرارت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا رحم، مرد کا مادہ تولید بہت جلد قبول کر لیتا ہے لیکن یہ چیز محض ظاہری اسباب کے درجہ کی ہے جو حکم الٰہی کے بغیر کوئی اہمیت نہیں رکھتی، کنواری عورتوں کی ایک نفسیاتی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ تھوڑے سے مال و اسباب پر بھی راضی و خوش رہتی ہیں ان کا شوہر انہیں جو کچھ دیدیتا ہے اسی کو برضا و رغبت قبول کر لیتی ہیں اور اس پر قانع رہتی ہیں کیونکہ وہ بیوہ عورت کی طرح پہلے سے کسی خاوند کا کچھ دیکھے ہوئے تو ہوتی نہیں کہ انہیں کمی بیشی کا احساس ہو اور وہ اپنے شوہر سے زیادہ مال و اسباب کا مطالبہ کریں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

نکاح کی ایک خصوصیت

⑭ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمْ تَرَ لِلْمُتَحَابَّیْنِ مِثْلَ النِّکَاحِ۔

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(اے شخص!) تو نے نکاح کی مانند ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی ہوگی جو دو محبت کرنے والوں کے درمیان محبت کو زیادہ کرے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نکاح کے ذریعہ جس طرح خاوند اور بیوی کے درمیان بغیر کسی قرابت کے بے پناہ محبت و الفت پیدا ہو جاتی ہے اس طرح کا کوئی تعلق ایسا نہیں ہے جو دو شخصوں کے درمیان، جو ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہوں، اس درجہ کی محبت و الفت پیدا کردے۔

آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی فضیلت

⑮ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَلْقَی اللّٰہَ طَاھِرًا مُطَھَّرًا فَلْیَتَزَوَّجِ الْحَرَائِرَ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اس بات کا خواہشمند ہو کہ وہ (زنا کی نجاست سے) پاکی کی حالت میں اور پاکیزہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے تو اسے چاہئے کہ آزاد عورتوں سے نکاح کرے۔"

تشریح: اس کی وجہ عام طور پر آزاد عورتیں، لونڈیوں کی بہ نسبت زیادہ پاک و پاکیزہ ہوتی ہیں اس لئے ان کی پاکیزگی مخالطت و مباشرت کے ذریعہ ان کی شوہروں میں سرایت کرتی ہے پھر یہ کہ آزاد عورتیں اپنی اولاد کو جو ادب و سلیقہ اور تہذیب سکھا سکتی ہیں وہ لونڈیوں کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ جب وہ خود بھی کمتر و پست حیثیت ہوتی ہیں تو اپنی اولاد کو ادب و تہذیب اور اخلاق سے کیسے مزین کر سکتی ہیں۔

نیک بخت بیوی کی خصوصیت

⑯ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ یَقُوْلُ مَا اسْتَفَادَ الْمُؤْمِنُ بَعْدَ تَقْوَی اللّٰہِ خَیْرًا لَّہٗ مِنْ زَوْجَۃٍ صَالِحَۃٍ اِنْ اَمَرَھَا اَطَاعَتْہُ وَاِنْ نَظَرَ اِلَیْھَا سَرَّتْہُ وَاِنْ اَقْسَمَ عَلَیْھَا اَبَرَّتْہُ وَاِنْ غَابَ عَنْھَا نَصَحَتْہُ فِیْ نَفْسِھَا وَمَالِہٖ رَوَی ابْنُ مَاجَۃَ الْاَحَادِیْثَ الثَّلَاثَۃَ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمن اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے بعد جو سب سے بہتر چیز اپنے لئے منتخب کرتا ہے وہ نیک بخت و خوب صورت بیوی، ایسی بیوی کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر (شوہر) اس کو کوئی حکم دیتا ہے تو وہ اس کی تعمیل کرتی ہے، جب وہ اس کی طرف دیکھتا ہے تو وہ (اپنے حسن اور پاکیزگی اور اپنی خوش سلیقگی و پاک سیرتی سے) اس کا دل خوش کرتی ہے، جب وہ اس کو قسم دیتا ہے تو

اس قسم کو پورا کرتی ہے اور جب اس کا خاوند موجود نہیں ہوتا تو وہ اپنے نفس کے بارہ میں (یہ) خیر خواہی کرتی ہے (کہ اس کو ضائع و خراب ہونے سے بچاتی ہے اور اس میں کوئی خیانت نہیں کرتی) مذکورہ بالا تینوں حدیثیں ابن ماجہؒ نے نقل کی ہیں۔"

تشریح: اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کو اور ممنوعات سے بچنے کو "تقویٰ" کہتے ہیں لہٰذا ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا نیک و صالح بندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری اور ممنوعات سے اجتناب کے بعد اپنی دینی و دنیاوی بھلائی کے لئے جو سب سے بہتر چیز پسند کرتا ہے وہ نیک بخت و خوب صورت بیوی ہے۔

"وہ اس کی تعمیل کرتی ہے" کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو گناہ و معصیت کا باعث نہیں ہوتیں یعنی وہ اپنے شوہر کی انہیں باتوں اور انہی احکام کی تعمیل کرتی ہے جو شریعت کے خلاف اور خدا کی ناراضگی کا باعث نہیں ہوتے، یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ مخلوق (یعنی کسی شخص) کا کوئی بھی ایسا حکم تعمیل نہ کرنا چاہئے جو خالق (یعنی اللہ تعالیٰ) کی نافرمانی سے متعلق ہو۔

"وہ اس کی قسم کو پورا کرتی ہے، کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی خواہش و مرضی پر اپنے شوہر کی خواہش و مرضی کو مقدم رکھتی ہے مثلاً جب اس کا شوہر اس کو کسی ایسے کام کے کرنے کی قسم دیتا ہے جو اس کی خواہش کے خلاف ہوتا ہے تو وہ اپنی خواہش کو چھوڑ کر وہ اپنے شوہر کی قسم و مرضی کے مطابق وہی کام کرتی ہے یا جب اس کا شوہر اس کو کسی ایسے کام کے نہ کرنیکی قسم دیتا ہے جو اس کی خواہش کے مطابق ہے تو وہ اپنی خواہش کی پرواہ کئے بغیر اپنے شوہر کی قسم و مرضی کی مطابق اس کام کو ترک کر دیتی ہے۔

نکاح، آدھا دین ہے

⑰ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الدِّيْنِ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ فِي النِّصْفِ الْبَاقِيْ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس بندہ نے نکاح کیا اس نے اپنا آدھا دین پورا کر لیا اب اسے چاہئے کہ باقی آدھے کے بارے میں خدا سے ڈرے۔"

تشریح: انسان کے جسم میں دو چیزیں ایسی ہیں جو عام طور پر دین میں فساد و نقصان کا سبب بنتی ہی یعنی شرمگاہ اور پیٹ، لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص نے نکاح کر کے شرمگاہ کے فتنہ و فساد سے نجات پائی تو اب اسے چاہئے کہ پیٹ کے فتنے و فساد کو دور کرنے کے بارہ میں خدا سے ڈرتا رہے یعنی حلال کمائی اور حلال رزق ہی کے ذریعہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھرے تاکہ دین کی بھلائی پوری حاصل ہو۔

کون سا نکاح بابرکت ہے؟

⑱ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَعْظَمَ النِّكَاحِ بَرَكَةً اَيْسَرُهُ مُؤْنَةً۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بلاشبہ بہت زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جو محنت کے لحاظ سے آسان ہو" یہ دونوں روایتیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں۔"

تشریح: "محنت کے لحاظ سے آسان نکاح" سے مراد وہ نکاح ہے جس میں بیوی کا مہر کم ہو اور عورت زیادہ مال و اسباب اور حیثیت سے زیادہ ضروریات زندگی (یعنی روٹی کپڑا) طلب کر کے مرد کو پریشان نہ کرے بلکہ شوہر کی طرف سے جو کچھ اور جیسا کچھ مل جائے برضا و رغبت اسی پر قانع رہے۔

بَابُ النَّظْرِ اِلَى الْمَخْطُوْبَةِ وَبَيَانُ الْعَوْرَاتِ

منسوبہ کو دیکھنے اور جن اعضاء کو چھپانا واجب ہے ان کا بیان

"مخطوبہ" سے مراد وہ عورت ہے جس سے نکاح کا پیغام دیا گیا ہو "عورت" سے مراد جسم کے وہ اعضاء ہیں جن کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔

منسوبہ کو دیکھنے کا مسئلہ

حضرت امام اعظمؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمدؒ، اور اکثر علماء کے نزدیک اپنی منسوبہ کو نکاح سے پہلے دیکھ لینا جائز ہے خواہ منسوبہ اس بات کی اجازت دے یا نہ دے۔ حضرت امام مالکؒ کے ہاں اپنی منسوبہ کو نکاح سے پہلے دیکھنا اسی صورت میں جائز ہے جب کہ اس کی اجازت حاصل ہو، اس کی اجازت کے بغیر دیکھنا جائز نہیں ہے، لیکن ایک روایت کے مطابق حضرت امام مالکؒ کے ہاں منسوبہ کو دیکھنا مطلقاً ممنوع ہے۔

اس بارہ میں فقہی مسئلہ یہ بھی ہے کہ بہتر اور مناسب یہی ہے کہ مرد اپنی منسوبہ کو دیکھنے کی بجائے کسی تجربہ کار اور معتمد عورت کو بھیج دے تاکہ وہ اس کی منسوبہ کو دیکھ کر مطلوبہ معلومات فراہم کردے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اپنی منسوبہ کو دیکھ لینا مستحب ہے

① عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ تَزَوَّجْتُ امْرَاَةً مِنَ الْاَنْصَارِ قَالَ فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَاِنَّ فِيْ اَعْيُنِ الْاَنْصَارِ شَيْئًا۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ایک انصاری عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں (اس بارہ میں آپ ﷺ کی کیا ہدایت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس عورت کو دیکھ لو (تو اچھا ہے) کیونکہ (بعض) انصاریوں کی آنکھوں میں کچھ خرابی ہے۔" (مسلم)

تشریح: آپ ﷺ کی اس ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ بعض انصاریوں کی آنکھ میں کچھ خرابی ہے جس سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے اس لئے مناسب ہے کہ تم اپنی منسوبہ کو دیکھ کر یہ اطمینان کرلو کہ اس کی آنکھوں میں تو کوئی نقص نہیں ہے۔ علامہ نوویؒ نے فی اعین الانصار شیئا کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ "(بعض) انصاریوں کی آنکھیں کیری یا کرنجی ہوتی ہیں" بہرکیف اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ خیر خواہی کے نکتہ نظر سے کسی چیز کا عیب و نقصان بیان کردینا جائز ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نکاح کا پیغام بھیجنے سے پہلے اپنی منسوبہ کو دیکھ کر مرد سے اس کے حالات بتادے نیز اس بارہ میں مسئلہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ اپنی منسوبہ کا صرف منہ اور اس کی ہتھیلیاں ہی دیکھنا مباح ہے اگرچہ جنسی ہیجان سے مامون نہ ہو کیونکہ اس کے لئے یہ دونوں اعضاء "ستر" کے حکم میں نہیں ہیں۔

کسی عورت کے جسم کا حال اپنے شوہر سے بیان نہ کرو

② وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُبَاشِرُ الْمَرْاَةُ الْمَرْاَةَ فَتَنْعَتُهَا لِزَوْجِهَا كَاَنَّهُ يَنْظُرُ

اِلَيهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی عورت اپنا برہنہ جسم کسی دوسری عورت کے برہنہ جسم سے نہ لگائے اور نہ اس عورت کے جسم کا حال اپنے خاوند کے سامنے بیان کرے (کیونکہ اپنے خاوند کے سامنے کسی اجنبی عورت کے جسم کا حال بیان کرنا ایسا ہی ہے) جیسا کہ اس کا خاوند اس عورت کے جسم کو خود دیکھ رہا ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کسی عورت کا اپنے جسم کو برہنہ کر کے کسی دوسری عورت کے برہنہ جسم سے مس کرنا اور پھر اس عورت کے جسم کی خصوصیات یعنی گداز پن وغیرہ اپنے شوہر کے سامنے بیان کرنا انتہائی معیوب بات ہے چنانچہ آپ ﷺ نے اس سے عورتوں کو منع کیا ہے، کیونکہ یہ نہ صرف بے شرمی کی بات اور غیر اخلاقی حرکت ہے بلکہ اس سے یہ بھی خطرہ ہے کہ اس کا خاوند کسی اجنبی عورت کے جسم کی پرکشش خصوصیات سنکر نفسانی ہیجان اور گندے خیالات میں مبتلا ہو جائے جو فتنہ و برائی کی جڑ ہے۔

عورتوں اور مردوں کے لئے چند ہدایات

(۳) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَنْظُرُ الرَّجُلُ اِلٰی عَوْرَةِ الرَّجُلِ وَلَا الْمَرْاَةُ اِلٰی عَوْرَةِ الْمَرْاَةِ وَلَا یُفْضِی الرَّجُلُ اِلَی الرَّجُلِ فِیْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ وَلَا تُفْضِی الْمَرْاَةُ اِلَی الْمَرْاَةِ فِیْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی مرد کسی دوسرے مرد کے ستر کی طرف نہ دیکھے کوئی عورت کسی دوسری عورت کے ستر کی طرف نہ دیکھے، دو برہنہ مرد ایک کپڑے میں جمع نہ ہوں اور نہ دو برہنہ عورتیں ایک کپڑے میں جمع ہوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: شریعت نے مرد و عورت کے جسم کے جن حصوں اور اعضاء کو باہم دیکھنے اور چھونے کی ممانعت کی ہے ان کو "ستر" کہا جاتا ہے اور جسم کے ان حصوں کو عام نظروں سے چھپانا ڈھانکنا ضروری ہے، اس بارہ میں جو فقہی تفصیل ہے وہ اس طرح ہے:

مرد کا ستر اس کے جسم کا وہ حصہ ہے جو زیر ناف سے گھٹنوں کے نیچے تک ہوتا ہے اس کے جسم کے اس حصہ کو بلا ضرورت دیکھنا نہ تو کسی مرد کے لئے جائز ہے اور نہ کسی عورت کے لئے ہاں اس مرد کی بیوی یا لونڈی دیکھ سکتی ہے، مرد کے جسم کے اس حصہ کے علاوہ بقیہ حصوں کو دیکھنا مرد کے لئے بھی جائز ہے اور عورت کے لئے بھی بشرطیکہ عورت جنسی ہیجان سے مامون ہو اگر عورت جنسی ہیجان سے مامون نہ ہو تو پھر وہ غیر مرد کے جسم کے کسی بھی حصہ کو مطلقاً نہ دیکھے۔ اسی طرح عورت کا ستر عورت کے حق میں اس کے جسم کا زیر ناف سے زانوں تک کا حصہ ہے، لہٰذا عورت کے جسم کے اس حصہ کو بلا ضرورت دیکھنا عورت کے لئے بھی جائز نہیں ہے جب کہ عورت کا ستر، اجنبی مرد کے حق میں اس کا پورا جسم ہے، یعنی مرد کے لئے کسی اجنبی عورت کے جسم کے کسی بھی حصہ پر نظر ڈالنا جائز نہیں ہے، ہاں ایک روایت کے مطابق عورت کا چہرہ، اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر اس کے "ستر" میں داخل نہیں ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کا ان اعضاء کا دیکھنا غیر مرد کے لئے جائز ہے بشرطیکہ وہ مرد جنسی ہیجان سے مامون ہو، اگر جنسی ہیجان سے مامون نہ ہو تو پھر اس کے لئے ان اعضاء کا دیکھنا بھی جائز نہیں ہوگا۔ البتہ کسی خاص ضرورت کے وقت دیکھنا جائز ہوگا۔ خواہ جنسی ہیجان سے مامون ہو یا مثلاً گواہ کسی معاملہ میں گواہی کے وقت یا حاکم کسی معاملہ کے فیصلہ کے وقت ہر حالت میں ان اعضاء کو دیکھ سکتا ہے اسی طرح عورت کے ان اعضاء یعنی چہرہ اور ہاتھ پیر کو چھونا غیر مرد کے لئے جائز نہیں ہے اگرچہ وہ جنسی ہیجان سے مامون ہی کیوں نہ ہو بشرطیکہ عورت جوان ہو ہاں اگر عورت اتنی عمر رسیدہ ہو کہ نفسانی خواہش اس کی طرف مائل ہی نہ ہوتی ہو یا مرد اتنا بڈھا ہو کہ خود بھی اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو اور اس عورت کے نفس کی طرف سے بھی مطمئن ہو تو اس صورت میں ان اعضاء کو چھونا جائز ہوگا۔

مرد کو اپنی بیوی کے جسم کا ہر حصہ دیکھنا جائز ہے اسی طرح اپنی اس لونڈی کا پورا جسم دیکھنا جائز ہے جس سے مجامعت حلال ہو۔

عورت کا ستر اس کے محرم کے حق میں اس کی پیٹھ، پیٹ اور زیر ناف سے گھٹنوں کے نیچے تک کا حصہ ہے۔ لہٰذا کسی عورت کے جسم کے ان حصوں اور اعضاء کو دیکھنا اور چھونا اس کے محرم کے لئے جائز نہیں ہے اگرچہ وہ جنسی ہیجان سے مامون ہی کیوں نہ ہو! چونکہ عورت کا سر، پنڈلی، بازو اور سینا اس کے محرم کے حق میں ستر نہیں ہے اس لئے ان اعضاء کو محرم دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ جنسی ہیجان سے مامون ہو۔

مرد کے حق میں غیر کی لونڈی کا ستر اس کی محرمہ کے ستر کی مانند ہے یعنی پیٹھ، پیٹ اور زیر ناف سے گھٹنوں کے نیچے تک کا حصہ لہٰذا غیر کی لونڈی کے جسم کے ان حصوں اور اعضاء کو جو اس کے ستر کے حکم میں ہے دیکھنے اور چھونے کے بارہ میں وہی تفصیل ہے جو اپنی محرمہ کے جسم کے مستور حصوں کو دیکھنے اور چھونے کی ہے۔

خوبصورت مرد کو نفسانی خواہش کے ساتھ دیکھنا یا اس کو ہاتھ لگانا حرام ہے۔ کسی عورت کو اس سے نکاح کے ارادہ کے وقت، یا کسی لونڈی کو اس کی خریداری کے وقت نفسانی خواہش کے خوف کے باوجود دیکھنا یا ہاتھ لگانا جائز ہے۔

غلام اپنی مالکہ یعنی مالک کی بیوی کے حق میں اجنبی مرد کی طرح ہے یعنی جس طرح اس کے لئے اجنبی مرد سے پردہ کرنا ضروری ہے اسی طرح غلام سے بھی پردہ کرنا چاہئے، ایسے ہی ہیجڑا اور خواجہ سرا بھی مرد کی مانند ہے۔ علماء فقہ لکھتے ہیں کہ اجنبی عورت پر نظر ڈالنا حرام ہے خواہ یہ نظر ڈالنا نفسانی خواہش کے تحت ہو یا اس کے بغیر ہو۔

"دو برہنہ مرد ایک کپڑے میں جمع نہ ہوں" کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ دو ننگے مردوں کا ایک کپڑے میں یکجا ہونا یا دو ننگی عورتوں کا ایک کپڑے میں اکٹھا ہونا اگرچہ بحسب عادت کسی برائی کا محل نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود یہ حرام اور مکروہ ہے کیونکہ یہ چیز بہر حال شرم و حیا کے منافی ہے۔

اجنبی عورت کے ساتھ خلوت گزینی کی ممانعت

④ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا لَا يَبِيْتَنَّ رَجُلٌ عِنْدَ امْرَأَةٍ ثَيِّبٍ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ نَاكِحًا اَوْ ذَا مَحْرَمٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خبردار! کوئی مرد کسی ثیب عورت کے ساتھ شب نہ گذارے اِلّا یہ کہ وہ مرد منکوح یعنی خاوند ہو یا محرم ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہاں "رات گذارنے سے مراد" تنہائی میں ملنا" ہے! لہٰذا اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مرد کسی اجنبی ثیب عورت کے ساتھ کسی جگہ تنہائی میں اکٹھا نہ ہو خواہ رات ہو یا دن ہو۔

ثیب اس عورت کو کہتے ہیں جس سے جماع ہو چکا ہو۔ یا جو خاوند کر چکی ہو۔ لیکن یہاں ثیب سے مراد جوان عورت ہے خواہ وہ کنواری ہو یا غیر کنواری ہو۔

"محرم" سے مراد ہے جس سے نکاح کرنا ابدی طور پر ناجائز ہو جیسے بیٹا، بھائی اور داماد وغیر اگرچہ یہ محرمیت دودھ کے رشتہ ہی کی وجہ سے کیوں نہ ہو۔

⑤ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكُمْ وَالدُّخُوْلَ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ الْحَمْوَ قَالَ الْحَمْوُ الْمَوْتُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ (اجنبی) عورتوں کے نزدیک جانے سے اجتناب کرو (جب کہ وہ تنہائی میں ہوں یا ننگی کھلی بیٹھی ہوں) ایک شخص نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! حمو کے بارہ میں آپ (ﷺ) کا کیا حکم ہے؟

(کیا ان کے لئے بھی یہ ممانعت ہے) آپ ﷺ نے فرمایا "حمو" تو موت ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حمو شوہر کے قرابت داروں کو کہتے ہیں جیسے بھائی (یعنی عورت کا دیور) وغیرہ ہاں شوہر کا باپ اور شوہر کا بیٹا حمو میں داخل نہیں ہے۔

"حمو تو موت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح موت انسان کی ظاہری اور دنیوی زندگی کو ہلاک کر دیتی ہے اس طرح حمو کا تنہائی میں غیر محرم عورت کے پاس جانا اس کی دینی اور اخلاقی زندگی کو ہلاکت و تباہی کے راستہ پر ڈال دیتا ہے، کیونکہ عام طور پر لوگ غیر محرم عورتوں کے ساتھ حمو کے خلط ملط کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس لئے ان کے عورتوں کے پاس ہر وقت آتے جاتے رہنے اور ان کے ساتھ بے محابا نشست و برخواست رکھنے کی وجہ سے ان کا کسی برائی میں مبتلا ہو جانا زیادہ مشکل نہیں رہتا اس کی وجہ سے فتنے سر ابھارتے ہیں اور نفس برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

یہ جملہ الحمو الموت (یعنی حمو تو موت ہے) لفظ "موت" کا ذکر دراصل اس محاورہ کی بنیاد پر ہے جو اہل عرب کے ہیں عام طور پر کسی خطرناک چیز سے خوف دلانے کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ اہل عرب کہہ دیا کرتے ہیں کہ شیر مرگ ہے یا بادشاہ آگ ہے۔ چنانچہ ان جملوں کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ شیر کے قریب جانا، موت کی آغوش میں چلا جانا ہے یا بادشاہ کی قربت آگ کی مانند ہے لہٰذا ان سے بچنا چاہئے۔

معالج عورت کا جسم دیکھ سکتا ہے

(۶) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ اُمَّ سَلَمَةَ اسْتَاذَنَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْحِجَامَةِ فَاَمَرَ اَبَا طَيْبَةَ اَنْ يَحْجِمَهَا قَالَ حَسِبْتُ اَنَّهُ كَانَ اَخَاهَا مِنَ الرَّضَاعَةِ اَوْ غُلَامًا لَمْ يَحْتَلِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ نے رسول کریم ﷺ سے سینگی کھچوانے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے حضرت ابوطیبہؓ کو سینگی کھینچنے کا حکم دیا۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ حضرت ابوطیبہؓ (کو سینگی کھینچنے کا حکم دینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ) حضرت اُمّ سلمہؓ کے دودھ شریک بھائی تھے یا ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت جابرؓ کا اپنے گمان کا اظہار کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت اُمّ سلمہؓ کو سینگی کھچوانے کی ضروری حاجت نہیں تھی، کیونکہ ضرورت کے وقت اجنبی مرد کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ کسی عورت کے سینگی کھینچے اور فصد کھولے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی بھی معالج، علاج معالجہ کے وقت عورت کے پورے جسم کو دیکھ سکتا ہے۔

کسی اجنبی عورت پر اچانک نظر پڑ جانے کا مسئلہ

(۷) وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نَظَرِ الْفُجَاءَةِ فَاَمَرَنِيْ اَنْ اَصْرِفَ بَصَرِيْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جریر ابن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے کسی اجنبی عورت پر ناگہاں نظر پڑ جانے کے بارہ میں پوچھا تو آپ ﷺ نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں اپنی نظر (فوراً) پھیر لوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کی طرف دیکھتا نہ رہے بلکہ فوراً اپنی نظر پھیر لے اور پھر دوبارہ اس کی طرف نہ دیکھے، کیونکہ پہلی نظر جو بلا قصد و ارادہ پڑی ہو وہ معاف ہے مگر فی الفور نظر پھیر لینا چونکہ واجب ہے اس لئے پہلی نظر کے بعد اس عورت کی طرف دیکھتے رہنا گناہ کی بات ہے چنانچہ قرآن کریم کی اس آیت میں بھی یہی حکم ہے۔

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ (النور ۲۴: ۳۰)

"مؤمنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں پست کریں۔"

ہاں کسی ضرورت کے وقت مثلاً نکاح وغیرہ کے لئے پہلی نظر کے بعد بھی دیکھنا جائز ہے۔ اگر کسی عورت کے جسم کے کسی حصے پر زخم وغیرہ ہو، یا فصد کھلوانی ہو، اور یا جسم کا کوئی حصہ کسی مرض کی وجہ سے معالج کو دکھانا ہو تو وہ اپنے جسم کے صرف اسی حصہ کو دکھائے جہاں زخم ہو، یا جس جگہ فصد کھلوانی ہو اور یا جس حصہ کو دکھانا ضروری ہو اور جسم کے باقی حصہ کو کپڑے سے چھپائے رکھے۔

کسی اجنبی عورت کو دیکھ کر برا خیال پیدا ہو تو بیوی کے پاس چلے جانا چاہئے

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَرْاَةَ تُقْبِلُ فِيْ صُوْرَةِ شَيْطَانٍ وَتُدْبِرُ فِيْ صُوْرَةِ شَيْطَانٍ اِذَا اَحَدُكُمْ اَعْجَبَتْهُ الْمَرْاَةُ فَوَقَعَتْ فِيْ قَلْبِهٖ فَلْيَعْمِدْ اِلَى امْرَاَتِهٖ فَلْيُوَاقِعْهَا فَاِنَّ ذٰلِكَ يَرُدُّ مَا فِيْ نَفْسِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عورت شیطان کی صورت میں آتی ہے اور شیطان کی صورت میں جاتی ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کسی کو کوئی اجنبی عورت اچھی لگے اور وہ اس کے دل میں گھر کرنے لگے تو اسے چاہئے کہ وہ فوراً اپنی بیوی کے پاس چلا جائے اور اس سے مباشرت کرلے کیونکہ یہ مباشرت اس چیز کو ختم کردے گی جو اس کے دل میں پیدا ہوگئی ہے (یعنی جنسی خواہش)۔" (مسلمؒ)

تشریح: "عورت شیطان کی صورت میں آتی ہے الخ یہ دراصل گندے خیالات، برے وسوسوں اور گمراہی میں مبتلا کرنے کے سلسلہ میں عورت کو شیطان کے ساتھ مشابہت دینے کا ایک اسلوب ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شیطان انسانوں کے دل و دماغ میں برے خیالات ڈال کر گمراہ کرتا ہے اسی طرح عورت کا جمال مرد کی نظر کو اپنا اسیر بنا کر اس کے دل کو بری خواہشات اور گندے خیالات کی گمراہی میں مبتلا کردیتا ہے، لہٰذا اجنبی عورت کو دیکھنا فتنہ و شر کا باعث بن جاتا ہے اس سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ عورت کو تو یہ چاہئے کہ وہ بلاضرورت گھر سے باہر نہ نکلے اور کسی ضرورت کے تحت باہر نکلے تو بناؤ سنگار کرکے نہ نکلے اور مرد کو یہ چاہئے کہ وہ اجنبی عورت کی طرف نہ دیکھے اور نہ اس کے کپڑوں کی طرف نظر کرے۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ مرد اپنی بیوی کو مباشرت کے لئے دن میں اپنے پاس بلالے اگرچہ بیوی کسی ایسے کام میں مشغول ہو جس کو اس وقت چھوڑ دینا ممکن ہو، کیونکہ بسا اوقات مرد پر جنسی ہیجان کا غلبہ ہوتا ہے کہ مباشرت میں تاخیر اس کے دل و دماغ یا جسم کی کسی تکلیف و مرض کا باعث بن جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

اپنی منسوبہ کو نکاح سے پہلے دیکھ لینا مستحب ہے

⑨ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَطَبَ اَحَدُكُمُ الْمَرْاَةَ فَاِنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَنْظُرَ اِلٰى مَا يَدْعُوْهُ اِلٰى نِكَاحِهَا فَلْيَفْعَلْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ نکاح کا پیغام بھیجے تو اگر وہ اس عورت کے ان اعضاء) کو دیکھنے پر قادر ہو جو اس کو نکاح کی رغبت دلاتے ہیں (یعنی ہاتھ اور چہرہ) تو ایک نظر دیکھ لے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بھی بتایا جاچکا کہ اپنی منسوبہ کو نکاح کا پیغام بھیجنے سے پہلے ایک نظر دیکھ لینا مستحب ہے کیونکہ اگر وہ عورت پسند آگئی اور

طبیعت کو بھا گئی تو اس نکاح کے بعد وہ اس عورت کی وجہ سے بدکاری سے بچا رہے گا جو نکاح کا اصل مقصود ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ایک موقع پر جو یہ فرمایا گیا ہے کہ کسی عورت سے اس کے حسن و جمال کی وجہ سے نکاح نہ کیا جائے تو اس حکم کا یہ مقصد نہیں ہے کہ حسن و جمال کو ملحوظ ہی نہ رکھا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی حسین و جمیل عورت سے نکاح کرنے میں کوئی دینی نقصان و فساد ہو تو اس دینی نقصان و کوتاہی سے بالکل صرف نظر کر کے اس سے محض اس بناء پر نکاح نہ کیا جائے کہ وہ حسن و جمال کی حامل ہے۔

(۱۰) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ خَطَبْتُ امْرَأَةً فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ نَظَرْتَ اِلَيْهَا قُلْتُ لَا قَالَ فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَاِنَّهٗ اَحْرٰى اَنْ يُّؤْدَمَ بَيْنَكُمَا۔ (رواہ احمد و الترمذی والنسائی و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے منگنی کا ارادہ کیا تو رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "کیا تم نے اس عورت کو دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم اس عورت کو ایک نظر دیکھ لو کیونکہ دیکھ لینا بہت مناسب و بہتر ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: یعنی اگر تم اپنی منسوبہ کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد اس سے نکاح کرو گے تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت الفت بہت زیادہ ہوگی کیونکہ جب منسوبہ کو دیکھ لینے کے بعد نکاح ہوتا ہے تو عام طور پر کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا اور نہ اپنے اس انتخاب پر کوئی شرمندگی و پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔

کسی اجنبی عورت پر نظر پڑ جائے تو فوراً اپنی بیوی سے تسکین حاصل کر لو

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ رَاٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ امْرَأَةً فَاَعْجَبَتْهُ فَاَتٰى سَوْدَةَ وَهِيَ تَصْنَعُ طِيْبًا وَعِنْدَهَا نِسَاءٌ فَاَخْلَيْنَهٗ فَقَضٰى حَاجَتَهٗ ثُمَّ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ رَاٰى امْرَأَةً تُعْجِبُهٗ فَلْيَقُمْ اِلٰى اَهْلِهٖ فَاِنَّ مَعَهَا مِثْلَ الَّذِيْ مَعَهَا۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی نظر ایک عورت پر پڑی تو وہ آپ ﷺ کو اچھی لگی، چنانچہ آپ ﷺ (فورا) اُم المؤمنین حضرت سودہؓ کے پاس تشریف لائے وہ اس وقت خوشبو تیار کر رہی تھیں اور چند عورتیں ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، ان عورتوں نے خلوت کر دی (یعنی حضرت سودہؓ کے پاس سے اٹھ کر باہر آگئیں) پھر آپ ﷺ نے اپنی ضرورت پوری کی (یعنی حضرت سودہؓ سے مجامعت فرمائی) اور فرمایا کہ "جس مرد کی کسی ایسی عورت پر نظر پڑ جائے جو اسے اچھی لگے تو اسے چاہئے کہ وہ (فوراً) اپنی بیوی کے پاس چلا جائے (اور اس کے ذریعہ جنسی تسکین حاصل کر لے تاکہ اس کی جنسی خواہش پوری ہو جائے اور برے خیالات میں مبتلا نہ ہو) کیونکہ اس کی بیوی کے پاس بھی وہی چیز ہے جو اس عورت کے پاس ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: اس عورت پر آنحضرت ﷺ کی نظر پڑ جانا ایک اتفاقی امر تھا جس پر کوئی اختیار نہیں تھا اور پھر اس عورت کا آپ ﷺ کی نظر میں اچھا لگنا انسانی طبیعت و جبلت کا تقاضا تھا جو ایک فطری امر ہے۔

عورت بیگانی نظروں سے چھپنے کی چیز ہے

(۱۲) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ فَاِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "عورت پردہ میں رہنے کی چیز ہے، چنانچہ جب کوئی عورت (اپنے پردہ سے باہر) نکلتی ہے تو شیطان اس کو مردوں کی نظر میں اچھا کر کے دکھاتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: المرأة عورة کا لفظی ترجمہ ہے "عورت، ستر ہے" یعنی جس طرح ستر (شرمگاہ) کو عام نظروں سے چھپاتی ہے اسی طرح عورت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کو بیگانے مرد کی نظروں سے چھپ کر پردہ میں رہنا چاہئے اور جس طرح سب کے سامنے ستر کو کھولنا ایک برا فعل سمجھا جاتا ہے اسی طرح عورت کا بھی لوگوں کے سامنے آنا برا ہے۔

کسی عورت پر اتفاقی نظر پڑ جانے کے بعد دوسری نظر ڈالنا جائز نہیں ہے

⑬ وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ يَا عَلِيُّ لَاتُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَكَ الْاُوْلٰى وَلَيْسَتْ لَكَ الْاٰخِرَةُ۔ (رواہ احمد و الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت بریدہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ "علی! نظر پڑ جانے کے بعد پھر نظر نہ ڈالو (یعنی اگر کسی عورت پر ناگہاں نظر پڑ جائے تو پھر اس کے بعد دوبارہ اس کی طرف نہ دیکھو) کیونکہ تمہارے لئے پہلی نظر تو جائز ہے (جب کہ اس میں قصد وارادہ کو قطعاً دخل نہ ہو) مگر دوسری نظر جائز نہیں ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

اپنی لونڈی کا نکاح کر دینے کے بعد اسے اپنے لئے حرام سمجھو

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا زَوَّجَ اَحَدُكُمْ عَبْدَهٗ اَمَتَهٗ فَلَا يَنْظُرَنَّ اِلٰى عَوْرَتِهَا وَفِيْ رِوَايَةٍ فَلَا يَنْظُرَنَّ اِلٰى مَادُوْنَ السُّرَّةِ وَفَوْقَ الرُّكْبَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام کا نکاح اپنی لونڈی سے کر دے تو پھر اس لونڈی کی (شرمگاہ) کو نہ دیکھے (کیونکہ نکاح کے بعد وہ اپنے آقا کے لئے حرام ہو جاتی ہے، اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "تو وہ (اس لونڈی کے جسم کے) اس حصہ کو نہ دیکھے جو ناف کے نیچے سے زانو کے اوپر تک ہے۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: جب اپنے غلام کے ساتھ نکاح کر دینے کی صورت میں یہ حکم ہے تو پھر کسی دوسرے کے غلام کے ساتھ اپنی لونڈی کا نکاح کر دینے کی صورت میں یہ حکم بطریق اولی ہوگا کہ اس لونڈی کو اپنے لئے بالکل حرام سمجھا جائے۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جب اس لونڈی کو بیاہ دیا جائے تو پھر اس کے جسم کی اس حد کو دیکھنا حرام ہوگا جو ناف اور زانو کے درمیان ہوتا ہے۔

اس بارہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے۔ کہ بیاہ ہو جانے کے بعد لونڈی اپنے آقا کے حق میں کسی غیر کی لونڈی کی مانند ہو جاتی ہے اور غیر کی لونڈی کے جسم کے مستور حصہ کی تفصیل اور اس کا حکم پیچھے حضرت ابوسعدؓ کی روایت کی تشریح میں گذر چکا ہے، لیکن حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ بیاہ ہو جانے کے بعد لونڈی کا ستر (یعنی اس کے جسم کا مستور حصہ) مرد کے ستر کی مانند ہے، دونوں کے دلائل فقہ کی بڑی کتابوں میں مذکور ہیں۔

ران، جسم کا مستور حصہ ہے

⑮ وَعَنْ جَرْهَدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْفَخِذَ عَوْرَةٌ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت جرہدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "کیا تم نہیں جانتے کہ ران ستر ہے (یعنی ران جسم کا وہ حصہ ہے جسے چھپا ہوا ہونا چاہئے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: کتاب "اسد الغابہ" میں یہ لکھا ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ مسجد میں حضرت جرہدؓ کے پاس سے گذرے تو دیکھا کہ ان کی

ران کھلی ہوئی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی ران ڈھانک لو کیونکہ ران ستر ہے۔ لہٰذا یہ ارشاد گرامی ان علماء کے مسلک کے خلاف دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ران ستر نہیں ہے، چنانچہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ ان کے نزدیک ران ستر میں داخل نہیں ہے۔

⑯ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ يَا عَلِيُّ لَا تُبْرِزْ فَخِذَكَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰى فَخِذِ حَيٍّ وَّلَا مَيِّتٍ۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "علیؓ اپنی ران کو (لوگوں کے سامنے) مت کھولو اور نہ زندہ شخص کی ران دیکھو اور نہ مردے کی ران دیکھو۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ستر کے حکم میں زندہ اور مردہ دونوں برابر ہیں، یعنی جس طرح زندہ شخص کے جسم کے ان حصوں کو دیکھنا ممنوع ہے جن کا چھپایا جانا شرعی طور پر ضروری ہے اسی طرح مردہ کے جسم کے ان حصوں کو دیکھنا بھی ممنوع ہے۔

⑰ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جَحْشٍ قَالَ مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مَعْمَرٍ وَفَخِذَاهُ مَكْشُوْفَتَانِ فَقَالَ يَا مَعْمَرُ غَطِّ فَخِذَيْكَ فَاِنَّ الْفَخِذَيْنِ عَوْرَةٌ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت محمد ابن جحشؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ حضرت معمرؓ کے پاس سے اس حال میں گذرے کہ ان کی دونوں رانیں کھلی ہوئی تھیں چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "معمر! اپنی رانوں کو چھپالو کیونکہ ران ستر ہے۔" (شرح السنۃ)

بغیر ضرورت تنہائی میں بھی ستر کھولنا اچھا نہیں ہے

⑱ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكُمْ وَالتَّعَرِّيَ فَاِنَّ مَعَكُمْ مَنْ لَا يُفَارِقُكُمْ اِلَّا عِنْدَ الْغَائِطِ وَحِيْنَ يُفْضِي الرَّجُلُ اِلٰى اَهْلِهٖ فَاسْتَحْيُوْهُمْ وَاَكْرِمُوْهُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم برہنہ ہونے سے اجتناب کرو (اگرچہ تنہائی کیوں نہ ہو) کیونکہ پاخانہ اور اپنی بیوی سے مجامعت کے اوقات کے علاوہ تمہارے ساتھ ہروقت وہ (فرشتے) ہوتے ہیں (جو تمہارے اعمال لکھنے پر مامور ہیں) لہٰذا تم ان (فرشتوں) سے حیا کرو اور ان کی تعظیم کرو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تم ہروقت اپنے ستر کو چھپائے رکھو، اچھے کام کرتے رہو اور بری باتوں اور فحش اعمال سے اجتناب کرتے رہو تاکہ ان فرشتوں کی شان میں حیا سوزی نہ ہو اور ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی فرق نہ آئے ابن ملک کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی ضرورت مثلاً مجامعت یا رفع حاجت وغیرہ کے علاوہ ستر کو کھولنا جائز نہیں ہے کیونکہ بڑی بے شرمی اور بے غیرتی کی بات ہے۔

عورت، مرد کو دیکھ سکتی ہے یا نہیں؟

⑲ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّهَا كَانَتْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَيْمُوْنَةُ اِذْ اَقْبَلَ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ فَدَخَلَ عَلَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احْتَجِبَا مِنْهُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَيْسَ هُوَ اَعْمٰى لَا يُبْصِرُنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفَعَمْيَاوَانِ اَنْتُمَا اَلَسْتُمَا تُبْصِرَانِهٖ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت اُمّ المؤمنین اُمّ سلمہؓ راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) وہ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ رسول کریم ﷺ کے پاس موجود تھیں کہ اچانک ابن اُمّ مکتومؓ (جو ایک نابینا صحابی تھے) آگئے، آنحضرت ﷺ نے (ابن ام مکتومؓ کو دیکھ کر) ان دونوں ازواج مطہرات سے فرمایا کہ "ان سے چھپ جاؤ" اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ (آپ ﷺ کا یہ حکم سن کر) میں نے عرض کیا کہ "کیا وہ نابینا نہیں ہیں وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے،

آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم ان کو نہیں دیکھ رہی ہو؟ (یعنی اگر وہ اندھے ہیں تو تم تو اندھی نہیں ہو۔" (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مرد کا اجنبی یعنی غیر محرم عورت کو دیکھنا حرام ہے اس کی طرح عورت کا اجنبی مرد کو دیکھنا بھی حرام ہے لیکن علماء یہ لکھتے ہیں کہ یہ تو یہ ارشاد گرامی ورع، اور تقویٰ پر محمول ہے یا یہ کہ اس سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ عورت، مرد کو بطور اختلاط نہ دیکھے یعنی ایسا ہونا چاہئے کہ دو اجنبی مرد و عورت ایک جگہ باہم ہوں اور دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کریں اور عورت، مرد کو شوق و دل چسپی کے ساتھ غور سے دیکھے، چنانچہ اس بارہ میں صحیح مسئلہ یہی ہے کہ عورت، مرد کو دیکھ سکتی ہے۔ لیکن ناف سے زانوں تک کے حصہ پر نظر ڈالنا جائز نہیں ہے اس مسئلہ کی دلیل حضرت عائشہؓ کا یہ قول ہے کہ "جب حبشی نیزہ بازی کر رہے تھے تو میں ان کو دیکھ رہی تھی" حضرت عائشہؓ کی حبشیوں کو دیکھنا ۹ ھ کی بات ہے جب کہ حضرت عائشہؓ کی عمر ۱۶ سال کی تھی اور پردہ کا حکم نافذ ہو چکا تھا، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا مرد کو دیکھنا جائز ہے۔ علاوہ اس کے جسم کے اس مذکورہ حصہ کے جو ستر میں داخل ہے، لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ اجازت اس صورت میں ہے جب کہ جنسی خواہش سے مامون ہو، اگر جنسی خواہش سے مامون نہ ہو تو پھر مرد کو بالکل نہ دیکھے۔

خلوت میں بھی اپنا ستر چھپائے رکھو

(۲۰) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احْفَظْ عَوْرَتَكَ اِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ اَوْمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَرَأَيْتَ اِذَا كَانَ الرَّجُلُ خَالِيًا قَالَ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ يُّسْتَحْيٰى مِنْهُ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت بہز ابن حکیمؒ اپنے والد مکرم (حضرت حکیمؓ سے اور وہ بہزؒ کے دادا (حضرت معاویہؓ ابن حیدہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "تم اپنا ستر چھپائے رکھو علاوہ اپنی بیوی یا اپنی لونڈی کے (کہ ان کے سامنے اپنا ستر چھپانا ضروری نہیں ہے) حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بتائیے کہ آدمی جب خلوت (تنہائی) میں ہو تو کیا وہاں بھی اپنا ستر چھپائے رکھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ لائق تر ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: آپ ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ خلوت میں اگرچہ کوئی موجود نہیں ہوتا لیکن اس وقت بھی اپنا ستر کھولنا مناسب نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ تو بہر صورت دیکھتا ہے جو انسانوں سے زیادہ اس بات کا لائق ہے کہ اس سے شرم و حیاء کی جائے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ خلوت میں بھی ستر کو چھپائے رکھنا واجب ہے ہاں کسی ضرورت کی بناء پر کھولنا جائز ہے۔

حدیث میں ستر کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں بیوی اور لونڈی کا جو استثناء کیا گیا ہے کہ اپنی بیوی یا اپنی لونڈی کے سامنے اپنا ستر چھپانا ضروری نہیں ہے تو اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ ملک اور نکاح، جانبین (یعنی مرد و عورت) کے لئے ایک دوسرے کے ستر کی طرف دیکھنے کو مباح کر دیتے ہیں۔

اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ رہو

(۲۱) وَعَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ اِلَّا كَانَ ثَالِثُهُمَا الشَّيْطَانُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب بھی کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں یک جا ہوتا ہے تو وہاں ان میں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جب دو اجنبی مرد و عورت کہیں خلوت میں جمع ہوتے ہیں تو وہاں شیطان فوراً پہنچ جاتا ہے جو ان دونوں کے جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان پر جنسی ہیجان کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ بدکاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں لہٰذا حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تم کسی اجنبی عورت کے ساتھ خلوت میں یکجا ہونے کا کوئی موقع ہی نہ آنے دو کہ شیطان تمہارے درمیان آجائے اور تمہیں برائی کے راستہ پر لگا دے۔

(۲۲) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَلِجُوْا عَلَى الْمُغِيْبَاتِ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنْ اَحَدِكُمْ مَجْرَى الدَّمِ قُلْنَا وَمِنْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَمِنِّيْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ان عورتوں کے پاس (تنہائی میں) نہ جاؤ جن کے خاوند موجود نہ ہوں کیونکہ تمہارے جسموں میں خون دوڑنے کی جگہ شیطان دوڑتا رہتا ہے (یعنی شیطان کا بہکاوا اور اس کا تصرف انسان کے تمام رگ و پوست میں سرایت کرتا ہے) ہم نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! کیا شیطان آپ ﷺ کے جسم میں بھی دوڑتا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! میرے جسم میں بھی دوڑتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے شیطان کے مقابلہ پر میری اعانت فرمائی ہے چنانچہ میں اس سے محفوظ رہتا ہوں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یوں تو کسی غیر محرم عورت کے پاس تنہائی میں جانا اس کے ساتھ اختلاط رکھنا ممنوع ہے لیکن اس حدیث میں ان عورتوں کا کہ جن کے خاوند گھر پر موجود نہ ہوں (مثلاً باہر سفر میں گئے ہوں) خاص طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ عام طور پر شادی کے بعد چونکہ عورتوں کے جنسی جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اور ان پر نفسانی خواہش کا غلبہ رہتا ہے اس لئے ان کے خاوند کی غیر موجودگی میں ان کے پاس تنہائی میں غیر محرم مرد کا جانا برائی میں مبتلا ہو جانے کے بہت زیادہ احتمال رکھتا ہے۔

لفظ مَجْرَى الدَّمِ کا ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے "خون دوڑنے کی جگہ یعنی رگ" کیا ہے جیسا کہ یہاں نقل کیا گیا ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ (تمہارے اندر شیطان اس طرح دوڑتا ہے) جس طرح تمہاری رگوں میں خون دوڑتا ہے جو تمہیں نظر نہیں آتا" یعنی جس طرح تمہاری رگوں میں خون دوڑتا رہتا ہے اور تم اسے دیکھ نہیں پاتے ایسے ہی تم پر شیطان اس طرح مسلط اور چھپا ہوا ہے کہ باوجودیکہ وہ تم پر اپنا تصرف کرتا رہتا ہے لیکن تم اسے دیکھ نہیں پاتے! مآل کار اور نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

لفظ اسلم مضارع متکلم کے صیغہ کے ساتھ منقول ہے اور بعض روایتوں میں صیغہ ماضی کے ساتھ بھی نقل ہوا ہے اور یہ دونوں صحیح ہیں چنانچہ مضارع متکلم کا ترجمہ تو وہی ہے جو یہاں نقل کیا گیا اور اگر اسے صیغہ ماضی کے ساتھ پڑھا جائے تو پھر اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ (اللہ تعالیٰ نے شیطان کے مقابلہ پر میری اعانت فرمائی ہے) چونکہ وہ شیطان (میرے حق میں) مسلمان (یعنی مطیع و مغلوب) ہو گیا ہے۔

غلام، اپنی مالکہ کے حق میں اجنبی مرد کی طرح ہے

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتٰى فَاطِمَةَ بِعَبْدٍ قَدْ وَهَبَهُ لَهَا وَعَلٰى فَاطِمَةَ ثَوْبٌ اِذَا قَنَّعَتْ بِهِ رَاْسَهَا لَمْ يَبْلُغْ رِجْلَيْهَا وَاِذَا غَطَّتْ بِهِ رِجْلَيْهَا لَمْ يَبْلُغْ رَاْسَهَا فَلَمَّا رَاٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا تَلْقٰى قَالَ اِنَّهُ لَيْسَ عَلَيْكِ بَاْسٌ اِنَّمَا هُوَ اَبُوْكِ وَغُلَامُكِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لائے اس وقت حضرت فاطمہؓ کی خدمت میں وہ غلام بھی موجود تھا جو ان کو آنحضرت ﷺ نے عطا کیا تھا اور حضرت فاطمہؓ کے جسم پر ایک ایسا (چھوٹا) کپڑا تھا کہ جب وہ اس سے اپنے سر کو چھپاتیں تو پاؤں کھلے رہ جاتے تھے اور جب اس سے اپنے پاؤں کو چھپاتیں تو انکا سر کھلا رہ جاتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت

فاطمہؓ کو اس پریشانی میں دیکھا (کہ وہ شرم وحیاء کی وجہ سے اپنے پورے جسم کو چھپانے کی غیر معمولی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں) تو فرمایا کہ "(فاطمہ! اتنا کیوں پریشان ہوتی ہو) اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ (جس سے تم اتنا شرما رہی ہو) وہ کوئی غیر نہیں ہے بلکہ تمہارا باپ ہے یا تمہارا غلام ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث سے حضرت امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ عورت کا غلام اس کا محرم ہے یعنی پردہ وغیرہ کے بارہ میں جو محرم کا حکم ہے وہی اس کے غلام کا ہے، جب کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک غلام اپنی مالکہ کے حق میں اجنبی مرد کی طرح ہوتا ہے لہٰذا غلام کے لئے اپنی مالکہ کے جسم کے صرف انہی حصوں کی طرف نظر اٹھانا جائز ہے جن حصوں کی طرف ایک اجنبی مرد نظر اٹھا سکتا ہے یعنی چہرہ اور ہاتھ پاؤں۔ حنفیہ کی طرف سے اس حدیث کے بارہ میں حضرت امام شافعیؒ کا یہ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ جو بات کہتے ہیں وہ اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ غلام جو حضرت فاطمہؓ کے پاس تھا اس وقت نابالغ ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عورتوں میں مخنث کے آنے کی ممانعت

(۲۴) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عِنْدَهَا وَفِی الْبَیْتِ مُخَنَّثٌ فَقَالَ لِعَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ اَبِیْ اُمَیَّةَ اَخِیْ اُمِّ سَلَمَةَ یَا عَبْدَ اللّٰهِ اِنْ فَتَحَ اللّٰهُ لَكُمْ غَدًا الطَّائِفَ فَاِنِّیْ اَدُلُّكَ عَلَی ابْنَةِ غَیْلَانَ فَاِنَّهَا تُقْبِلُ بِاَرْبَعٍ وَتُدْبِرُ بِثَمَانٍ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلَنَّ هٰؤُلَاءِ عَلَیْكُمْ۔ (متفق علیہ)

"ام المؤمنین حضرت اُم سلمہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف فرما تھے اور گھر میں ایک مخنث (بھی موجود) تھا وہ مخنث حضرت عبداللہ ابن امیہ سے کہ جو حضرت اُم سلمہؓ کے بھائی تھے کہنے لگا کہ "عبداللہ اگر اللہ تعالیٰ نے کل آپ لوگوں کو طائف پر فتح بخشی تو میں آپ کو غیلان کی بیٹی دکھلاؤں گا جو چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ جاتی ہے" رسول کریم ﷺ نے (جب اس مخنث کی یہ بات سنی تو) فرمایا کہ "یہ مخنث تمہارے پاس نہ آیا کریں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: لفظ "مخنث" نون کے زیر کے ساتھ یعنی "مخنِث" بھی لکھا پڑھا جاتا ہے اور نون کے زبر کے ساتھ "مخنَث" بھی استعمال ہوتا ہے لیکن زیادہ صحیح زیر کے ساتھ یعنی "مخنِث" ہی ہے جب کہ مشہور زبر کے ساتھ یعنی عام طور "مخنَث" لکھا پڑھا جاتا ہے۔ مخنث اس شخص کو کہتے ہیں جو عادات و اطوار، بول چال اور حرکات و سکنات میں عورتوں کے مشابہ ہو جس کو ہمارے ہاں زنانہ اور زنخا کہتے ہیں۔ یہ مشابہت کبھی تو خلقی طور پر ہوتی ہے اور کبھی مصنوعی طور پر اختیار کی جاتی ہے خلقی طور پر جو مشابہت ہوتی ہے اس میں کوئی گناہ نہیں کیونکہ یہ ایک قدرتی چیز ہوتی ہے جس میں انسانی اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ ہاں جو مشابہت مصنوعی ہوتی ہے کہ بعض مرد، عورتوں کی مشابہت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے رہن سہن، عادات واطوار اور بول چال میں اپنے آپ کو بالکل عورت ظاہر کرتے ہیں یہ بہت برائی اور گناہ کی بات ہے ایسے لوگ لعنت کے مستحق ہیں کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ان عورتوں پر اللہ کی لعنت ہو جو مردوں کے مشابہت اختیار کرتی ہیں اور ان مردوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

یہاں حدیث میں جس مخنث کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام ہیت تھا بعض نے اس کا نام ماطع لکھا ہے، اس کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ یہ پہلے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کے گھروں میں آیا جایا کرتا تھا کیونکہ ازواج مطہرات کا یہ گمان تھا کہ یہ خلقی طور پر اوصاف مردانگی سے عاری اور جذبات نفسانی سے خالی ہے، اسے عورتوں کی طرف نہ کوئی رغبت وحاجت ہے اور نہ جنسیات سے اسے کوئی دلچسپی ہے بلکہ یہ "غیر اولی الاربہ" میں سے ہے جن کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے اور کہا ہے کہ ان سے پردہ کرنا عورتوں کے لئے واجب نہیں

ہے۔ مگر جب آنحضرت ﷺ نے اس کی یہ بات سنی جو جنسی معاملات میں اس کی دلچسپی کی مظہر تھی تو آپ ﷺ کو اندازہ ہوگیا کہ مخنث غیر اولی الاربہ میں سے نہیں ہیں بلکہ اولی الاربہ میں سے ہیں اور جنسیات کی طرف خواہش و رغبت رکھتے ہیں لہٰذا آپ ﷺ نے فوراً منع کردیا کہ اب مخنث گھروں میں داخل نہ ہوا کریں۔ اور عورتوں کے پاس آیا جایا نہ کریں۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ مخنث کے لئے گھروں میں داخل ہونے اور عورتوں کے پاس آنے جانے کی ممانعت ہے بلکہ خصی اور مجبوب کا بھی یہی حکم ہے اور پردہ وغیرہ کے سلسلہ میں تینوں ان مردوں کی مانند ہیں جن سے پردہ کرنا عورتوں پر واجب ہے۔

"جو چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ جاتی ہے" اس بات سے اس مخنث کا مقصد غیلان کی بیٹی تھی کہ جس کا نام بادیہ تھا کہ فربہی و تنومندی کو بیان کرنا تھا کیونکہ عام طور پر جس شخص کا جسم فربہ ہوتا ہے اس کے پیٹ پر چار شکن پڑے ہوتے ہیں جو سامنے سے چار ہی نظر آتے ہیں مگر پیچھے سے دیکھنے پر وہ آٹھ نظر آتے ہیں بایں طور کہ ان چاروں شکنوں کے سرے دونوں پہلوں کی طرف نمایاں ہوتے ہیں، لہٰذا مخنث نے جو یہ بات کہی تو اس کی مراد یہی تھی کہ غیلان کی بیٹی جب آتی ہے تو اس کے پیٹ پر چار شکن نظر آتے ہیں اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتی ہے تو پیچھے آٹھ شکن معلوم ہوتے ہیں جو دراصل پیٹ کے ان چاروں شکنوں کے وہ دونوں طرف کے سرے ہوتے ہیں جو دونوں پہلوں کی طرف نمایاں ہوتے ہیں حاصل یہ ہے کہ عرب کے لوگ چونکہ فربہ جسم والی عورتوں کی طرف زیادہ میلان رکھتے تھے اس لئے اس مخنث نے غیلان کی بیٹی کی فربہی کو ظاہر کرنے کے لئے یہ طرز تعبیر اختیار کیا۔

برہنگی کی ممانعت

(۲۵) وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ حَمَلْتُ حَجَرًا ثَقِيلًا فَبَيْنَا اَنَا اَمْشِيْ سَقَطَ عَنِّيْ ثَوْبِيْ فَلَمْ اَسْتَطِعْ اَخْذَهُ فَرَاٰنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِيْ خُذْ عَلَيْكَ ثَوْبَكَ وَلَا تَمْشُوْا عُرَاةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مسور ابن مخرمہ ؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن اپنی کسی ضرورت کے تحت) میں نے ایک بڑا بھاری پتھر اٹھایا اور اسے لے کر چلا تو (راستہ میں) میرا کپڑا (یعنی تہبند) میرے بدن سے گر پڑا (جس کیوجہ سے میرا ستر کھل گیا) مگر میں (بوجھ کی وجہ سے فوری طور پر) اپنے کپڑے کو اٹھا نہیں سکا اور اسی دوران رسول کریم ﷺ نے مجھے (برہنگی کی حالت میں) دیکھ لیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ (فورا) اپنا کپڑا اٹھاؤ (اور ستر پوشی کرو) اور پھر آپ ﷺ نے یہ عام حکم دیا کہ) ننگے نہ چلا کرو۔" (مسلم)

شرم و حیا کا انتہائی درجہ

(۲۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا نَظَرْتُ اَوْ مَا رَاَيْتُ فَرْجَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطُّ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ستر کی طرف کبھی نظر نہیں اٹھائی۔ یا یہ فرمایا کہ میں نے آپ ﷺ کا ستر کبھی نہیں دیکھا۔" (ابن ماجہ)

تشریح: حرف "او" دراصل راوی کے اس شک کو ظاہر کرتا ہے کہ روایت میں مانظرت (میں نے کبھی نظر نہیں اٹھائی) کے الفاظ ہیں یا مارأیت (میں نے کبھی نہیں دیکھا) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں بہرحال ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں ان کے مفہوم و مطلب میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ایک روایت میں حضرت عائشہ ؓ کے یہ الفاظ ہیں کہ نہ تو آنحضرت ﷺ نے میرا ستر کبھی دیکھا اور نہ کبھی میں نے آنحضرت ﷺ کا ستر دیکھا۔ ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ اگرچہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا ستر دیکھ سکتے ہیں لیکن آداب زندگی اور شرم و حیا کا انتہائی درجہ یہی ہے کہ شوہر اور بیوی بھی آپس میں ایک دوسرے کا ستر نہ دیکھیں۔

حسین عورت کی طرف اچانک نظر اٹھ جانے کے بعد پھر فوراً اپنی نظر پھیر لینے کا اجر

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَنْظُرُ اِلٰی مَحَاسِنِ امْرَاَةٍ اَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ یَغُضُّ بَصَرَهٗ اِلَّا اَحْدَثَ اللّٰهُ لَهٗ عِبَادَةً یَجِدُ حَلَاوَتَهَا۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس مسلمان کی نظر پہلی مرتبہ (بلا قصد وارادہ) کسی عورت کے حسن وجمال کی طرف اٹھ جائے اور پھر وہ (فوراً) اپنی نظر پھیر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک عبادت پیدا کر دیگا جس سے وہ شخص لذت حاصل کریگا۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے چونکہ اپنے رب کی فرمانبرداری میں ایک حسن وجمال کی طرف اٹھی ہوئی نظر کو فوراً پھیر لیا اور اس طرح اس نے گویا اپنے جمالیاتی ذوق کو تسکین پہنچانے کی بجائے اپنے پروردگار کے حکم کے سامنے اپنے نفس کی خواہش کو پامال کر دیا اس لئے حق تعالیٰ اس کے اس فعل (نظر پھیر لینے) کو ایک ایسی عبادت میں تبدیل کر دے گا جس کی وجہ سے وہ اپنے قلب ودماغ میں حکم خداوندی کی تعمیل کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے مخصوص سکون قلب کی لذت محسوس کرے گا اور یہ لذت دراصل اس تلخی کا بدلہ ہوگی جو اس نے اپنے نفس کی خواہش پر صبر وضبط کر کے برداشت کی تھی۔

ممنوع النظر چیز کی طرف قصداً دیکھنے والے کے لئے وعید

(۲۸) وَعَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ اِلَیْهِ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت حسن بصریؒ نے بطریق ارسال روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے (صحابہؓ سے) یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اس شخص پر کہ جس نے (بلا عذر وبغیر اضطرار) دیکھا اور اس پر کہ جس کو دیکھا گیا اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جو اس چیز کی طرف قصداً اور ارادۃً دیکھے جس کو دیکھنا جائز نہیں ہے وہ چیز خواہ کوئی اجنبی عورت ہو یا کسی کا ستر ہو یا اور کوئی ممنوع النظر چیز ہو۔ اسی طرح اس کو بھی مستحق لعنت قرار دیا گیا ہے جس کو دیکھا جائے۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس نے بغیر عذر اور اضطرار کے قصداً اپنے آپ کو دکھایا ہو مثلاً کوئی عورت اپنے آپ کو قصداً کسی اجنبی مرد کو دکھائے تو اس صورت میں وہ بھی اس لعنت میں داخل ہوگی ہاں اگر کسی عورت کو کسی اجنبی مرد نے اس طرح دیکھا کہ اس میں اس عورت کے قصد وارادہ کو قطعاً دخل نہ ہو تو وہ بھی اس لعنت کا مورد نہیں بنے گی۔

بَابُ الْوَلِیِّ فِی النِّکَاحِ وَاسْتِیْذَانِ الْمَرْاَةِ

نکاح کے ولی اور عورت سے نکاح کی اجازت لینے کا بیان

"ولی" لغوی طور پر "کارساز منتظم" کو کہتے ہیں یعنی وہ شخص جو کسی کام کا منتظم ہو۔ لیکن یہاں "ولی" سے مراد وہ شخص ہے جو کسی عورت کے نکاح کا متولی وذمہ دار ہوتا ہے بایں طور کہ اس عورت کے نکاح کا اختیار اسے حاصل ہوتا ہے۔

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے یہ معلوم ہوگا کہ نکاح کے بارے میں ولی کی اجازت کا حاصل ہونا اور عورت کی رضا معلوم کرنا ضروری ہے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ولایت (یعنی کسی کے ولی ہونے کا حق) کن کن لوگوں کو حاصل ہے؟ چنانچہ جاننا چاہئے کہ نکاح کے

سلسلہ میں ولایت کے اختیار اس کے ان رشتہ دار کو حاصل ہوتے ہیں جو عصبہ بنفسہ ہوں اگر کئی عصبات بنفسہ ہوں تو انمیں مقدم وہ ہو گا جو وراثت میں مقدم ہو گویا اس بارہ میں عصبات کی وہ ترتیب رہے گی جو وراثت میں ہوتی ہے۔ اگر عصبات بنفسہ میں کوئی نہ ہو تو ماں کو ولایت حاصل ہوگی پھر دادی کو (قنیہ میں اس کے برعکس ترتیب مذکور ہے) پھر بیٹی کو پھر، پوتی کو پھر، نواسی کو پھر، پوتے کی بیٹی کو، اور اگر انمیں سے کوئی بھی نہ ہو تو پھر نانا کو ولایت حاصل ہوگی، پھر حقیقی بہن کو، پھر سوتیلی بہن کو، پھر ماں کی اولاد کو (خواہ مرد یا عورت ہوں) پھر اسی ترتیب کے مطابق ان کی اولاد کو، اور اگر ان میں سے کوئی بھی نہ ہو تو پھر ذوی الارحام کو حاصل ہوگی، ذوی الارحام میں سب سے پہلے پھوپھیاں ولی ہوں گی، ان کے بعد ماموں، ان کے بعد خالائیں، ان کے بعد چچا کی بیٹیاں اور ان کے بعد اسی ترتیب کے مطابق ان کی اولاد اور اگر ان میں سے کوئی بھی نہ ہو تو حق ولایت مولی الموالات کو حاصل ہو گا (مولی الموالات کے معنی باب الفرائض میں بیان ہو چکے ہیں) اگر مولی الموالات بھی نہ ہو تو پھر بادشاہ وقت ولی ہوگا۔ بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔ اس کے بعد بادشاہ وقت کا کوئی نائب مثلاً قاضی بھی ولی ہو سکتا ہے بشرطیکہ بادشاہ کی طرف سے اس کو یہ اختیار دیا گیا ہو اس کے بعد قاضی کے نائبوں کو حق ولایت حاصل ہو گا بشرطیکہ اپنا نائب بنانے کی اجازت واختیار قاضی کو حاصل ہو۔ اگر قاضی کو یہ اجازت حاصل نہیں ہوگی تو پھر اس کا کوئی بھی نائب ولی نہیں ہو سکے گا۔

ولایت کا حق حاصل ہونے کے لئے آزاد ہونا۔ عاقل ہونا بالغ ہونا اور مسلمان ہونا شرط ہے، لہٰذا کوئی غلام کسی کا ولی نہیں ہو سکتا۔ کوئی نابالغ کسی کا ولی نہیں ہو سکتا، کوئی دیوانہ اور پاگل کسی کا ولی نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی کافر کسی مسلمان کا ولی ہو سکتا ہے، اسی طرح کوئی مسلمان بھی کسی کافر کا ولی نہیں ہو سکتا الا یہ کہ کوئی عام سبب پایا جائے جیسے کوئی مسلمان کسی کافرہ لونڈی کا آقا ہو، یا مسلمان بادشاہ یا بادشاہ کا نائب ہو تو اس صورت میں مسلمان، کافر کا ولی ہو سکتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نکاح سے پہلے عورت کی اجازت حاصل کر لینی چاہئے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُنْكَحُ الْاَیِّمُ حَتّٰی تُسْتَاْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰی تُسْتَاْذَنَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَیْفَ اِذْنُهَا قَالَ اَنْ تَسْكُتَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایم (یعنی بیوہ بالغہ) کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس کا حکم حاصل نہ کر لیا جائے، اسی طرح کنواری عورت (یعنی کنواری بالغہ) کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے" (یہ سنکر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ اس (کنواری عورت) کی اجازت کیسے حاصل ہوگی (کیونکہ کنواری عورت تو بہت شرم و حیا کرتی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا "اس طرح کہ وہ چپکی رہے یعنی کوئی کنواری عورت اپنے نکاح کی اجازت مانگے جانے پر اگر بسبب شرم و حیا زبان سے ہاں نہ کرے بلکہ خاموش رہے تو اس کی یہ خاموشی بھی اس کی اجازت سمجھی جائے گی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: ایم اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو خواہ وہ باکرہ ہو (پہلے کبھی اس کی شادی نہ ہوئی ہو) خواہ ثیب ہو کہ پہلے اس کی شادی ہو چکی ہو اور پھر یا تو اس کا خاوند مر گیا ہو یا اس نے طلاق دیدی ہو) لیکن یہاں ایم سے مراد ثیب بالغہ ہے یعنی وہ عورت جو بالغہ ہو اور اس کا پہلا شوہر یا تو مر گیا ہو یا اس نے طلاق دیدی ہو۔

عورت سے اس کے نکاح کی اجازت حاصل کرنے کے سلسلہ میں حدیث نے باکرہ (کنواری) اور ثیب (بیوہ) کا ذکر اس فرق کے ساتھ کیا ہے کہ ثیب کے بارہ میں تو یہ فرمایا گیا کہ "جب تک اس کا حکم حاصل نہ کر لیا جائے" اور باکرہ کے بارہ میں یہ الفاظ ہیں کہ "جب تک کہ اس کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے" لہٰذا "حکم" اور "اجازت" کا یہ فرق اس لئے ظاہر کیا گیا ہے کہ ثیب یعنی بیوہ عورت اپنے نکاح کے سلسلہ میں زیادہ شرم و حیا نہیں کرتی بلکہ وہ خود کھلے الفاظ میں اپنے نکاح کا حکم کرتی ہے یا کم سے کم صریح اشارات کے ذریعہ اپنی

خواہش کا از خود اظہار کر دیتی ہے اور اس بارہ میں اسے کوئی خاص جھجک نہیں ہوتی اس کے برخلاف باکرہ یعنی کنواری عورت چونکہ بہت زیادہ شرم وحیا کرتی ہے اس لئے وہ نہ تو کھلے الفاظ میں اپنے نکاح کا حکم کرتی ہے اور نہ صریح اشارات کے ذریعہ ہی اپنی خواہش کا اظہار کرتی ہے ہاں جب اس کے نکاح کی اجازت اس سے لی جائے تو وہ اپنی رضامندی و اجازت دیتی ہے بلکہ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ طلب اجازت کے وقت وہ زبان سے اجازت دینا بھی شرم کے خلاف سمجھتی ہے اور اپنی خاموشی و سکوت کے ذریعہ ہی اپنی رضامندی کا اظہار کر دیتی ہے۔

اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے حکم یا اجازت کے بغیر نکاح جائز نہیں ہوتا، لیکن فقہاء کے یہاں اس بارہ میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ تمام عورتوں کی چار قسمیں ہیں اول ثیب بالغہ یعنی وہ بیوہ عورت جو بالغ ہو، ایسی عورت کے بارہ متفقہ طور پر تمام علماء کا قول یہ ہے کہ اس کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کرنا جائز نہیں ہے بشرطیکہ وہ عاقلہ ہو یعنی دیوانی نہ ہو، اگر عاقلہ نہ ہوگی تو ولی اجازت سے اس کا نکاح ہو جائے گا۔

دوم باکرہ صغیرہ یعنی وہ کنواری لڑکی جو نابالغ ہو، اس کے بارہ میں بھی تمام علماء کا متفقہ طور پر یہ قول ہے کہ اس کے نکاح کے لئے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا ولی اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کر سکتا ہے۔

سوم ثیب صغیرہ یعنی وہ بیوہ جو بالغ نہ ہو، اس کے بارہ میں حنفی علماء کا تو یہ قول ہے کہ اس کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر ہو سکتا ہے لیکن شافعی علماء کہتے ہیں کہ اس کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔

چہارم باکرہ بالغہ یعنی وہ کنواری جو بالغہ ہو، اس کے بارہ میں حنفی علماء تو یہ کہتے ہیں کہ اس کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں لیکن شافعی علماء کے نزدیک جائز ہے۔

گویا تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ حنفی علماء کے نزدیک ولایت کا مدار صغر پر ہے یعنی ان کے نزدیک ولی کو عورت کی اجازت کے بغیر نکاح کر دینے کا حق اسی صورت میں حاصل ہوگا جب کہ وہ کمسن یعنی نابالغ ہو خواہ وہ باکرہ (کنواری) ہو یا ثیب (بیوہ) ہو۔ جب کہ شافعی علماء کے نزدیک ولایت کا مدار بکارت پر ہے یعنی ان کے نزدیک ولی کو عورت کی اجازت کے بغیر نکاح کر دینے کا حق اس صورت میں حاصل ہوگا جب کہ وہ باکرہ ہو۔ خواہ بالغ ہو یا نابالغ ہو۔ لہٰذا یہ حدیث حنفیہ کے نزدیک بالغہ پر محمول ہے خواہ وہ ثیب ہو یا باکرہ ہو۔ اور آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی وَلاَ تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَأذَنَ (کنواری عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے) شوافع کے قول کے خلاف ایک واضح دلیل ہے۔

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاَيِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا وَالْبِكْرُ تُسْتَاْذَنُ فِیْ نَفْسِهَا وَاِذْنُهَا صُمَاتُهَا وَفِیْ رِوَايَةٍ قَالَ الثَّيِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا وَالْبِكْرُ تُسْتَاْمَرُ وَاِذْنُهَا سُكُوْتُهَا۔ وَفِیْ رِوَايَةٍ قَالَ الثَّيِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا وَالْبِكْرُ يَسْتَاْذِنُهَا اَبُوْهَا فِیْ نَفْسِهَا وَاِذْنُهَا صُمَاتُهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ایم یعنی وہ عورت جو بیوہ بالغہ اور عاقلہ ہو اپنے (نکاح) کے معاملہ میں اپنے ولی سے زیادہ خود اختیار رکھتی ہے اور کنواری لڑکی (جو بالغ ہو) بھی اس کی حق دار ہے کہ اس کے نکاح کی اس سے اجازت حاصل کی جائے اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے۔ (یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان سے اجازت دے بلکہ اس کی شرم وحیا کے پیش نظر اس کا خاموش رہنا ہی اس کی اجازت کے لئے کافی ہے)

ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ثیب (یعنی بیوہ عورت) اپنے بارہ میں اپنے ولی سے زیادہ خود اختیار رکھتی ہے اور کنواری لڑکی سے بھی (اس کے نکاح کی) اجازت حاصل کی جائے اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے۔

اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ثیب اپنے بارہ میں اپنے ولی سے زیادہ خود اختیار رکھتی ہے اور کنواری لڑکی سے

بھی اس کا باپ اس کے نکاح کے بارہ میں اجازت حاصل کرے اور اس کی اجازت اس کا چپ رہنا ہے۔" (مسلم)

تشریح: "اپنے ولی سے زیادہ خود اختیار رکھتی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ بیوہ عورت اپنے نکاح کی اجازت دینے یا نہ دینے کے معاملہ میں بالکل خود مختار ہے اور یہ کہ جب تک وہ خود اپنی زبان سے اجازت نہ دیدے اس کا نکاح نہیں ہوگا بخلاف کنواری عورت کے کہ اس کے لئے زبان سے اجازت دینا ضروری نہیں ہے بلکہ وہ خاموشی کے ذریعہ بھی اپنی اجازت کا اظہار کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں باقی تفصیل و تشریح وہی ہے جو اس سے پہلے ذکر کی گئی ہے۔

یہاں جو کئی روایتیں نقل کی گئی ہیں ان میں صرف تھوڑا سا اختلاف ہے مفہوم، و معنی کے اعتبار سے تمام روایتیں تقریباً یکساں ہیں۔

بیوہ اپنی مرضی کے خلاف ہو جانے والے نکاح کو رد کر سکتی ہے

③ وَعَنْ خَنْسَاءَ بِنْتِ خِذَامٍ اَنَّ اَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ ثَيِّبٌ فَكَرِهَتْ ذٰلِكَ فَاَتَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَدَّ نِكَاحَهَا رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ مَاجَةَ نِكَاحَ اَبِيْهَا۔

"اور حضرت خنساء بنت خذامؓ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کا نکاح (ان کی اجازت حاصل کئے بغیر) کر دیا جب کہ وہ بیوہ (اور بالغہ) تھیں چنانچہ انہوں نے اس عقد کو ناپسند کیا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں (اپنا معاملہ لیکر) حاضر ہوئیں، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کا نکاح (یعنی ان کے والد کے نکاح کرنے کو) رد کر دیا" (بخاریؒ) اور ابن ماجہؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کا نکاح جو ان کے والد نے کیا تھا، رد کر دیا۔"

آنحضرت ﷺ سے نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر

④ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزَوَّجَهَا وَهِيَ بِنْتُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَزُفَّتْ اِلَيْهِ وَهِيَ بِنْتُ تِسْعِ سِنِيْنَ وَلُعَبُهَا مَعَهَا وَمَاتَ عَنْهَا وَهِيَ بِنْتُ ثَمَانِيَ عَشْرَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے اس وقت نکاح کیا جب کہ ان کی عمر سات سال کی تھی اور جب وہ آنحضرت ﷺ کے گھر بھیجی گئیں تو ان کی عمر نو سال کی تھی اور ان کے (کھیلنے کے لئے) کھلونے ان کے ساتھ تھے اور جب آنحضرت ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور حضرت عائشہؓ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوئے تو اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث حضرت عائشہؓ کی ابتدائی زندگی کے تین اہم موڑ اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان کی رفاقت کی مدت کو ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ کی زوجیت میں آئیں، نو سال کی عمر میں رخصت ہو کر آستانہ نبوت میں لائی گئیں اور نو سال کی رفاقت کے بعد جب کہ ان کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی، آنحضرت ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

نو سال کی عمر بچپن کی عمر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ جب آنحضرت ﷺ کے ہاں تشریف لائیں تو ان کے ساتھ وہ کھلونے بھی آئے جن سے وہ اپنے گھر کھیلا کرتی تھیں اور یہ کھلونے بھی کیا تھے وہ گڑیاں تھیں جو عام طور پر بچیوں کا سب سے محبوب کھلونا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب ان گڑیوں کو دیکھا تو ان پر اظہار پسندیدگی نہیں کیا لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوا کہ گڑیوں کا بنانا جائز ہے اور بچیوں کو گڑیوں سے کھیلنا مباح ہے، اس کا سبب علماء نے یہ لکھا ہے کہ گڑیوں سے کھیلنا دراصل بچیوں کے لئے ایک سبق بھی ہے جس سے وہ اولاد کی پرورش سینا پرونا اور گھر کی اصلاح و انتظام کی تربیت حاصل کرتی ہیں تاہم اس بارہ میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کا ہے اور اس وقت تک تصویر کی حرمت نازل نہیں ہوئی ہوگی۔ جب کہ علماء نے یہ کہا ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے ساتھ گڑیاں لیکر آئی تھیں ان میں صورتیں بنی ہوئی نہیں تھیں جو تصویروں میں ہوتی ہیں اور حرام ہیں بلکہ کپڑوں اور

چیتھڑوں کو لپیٹ کر بغیر صورتوں کے یوں ہی بنائی گئی تھیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

کمسن لڑکی کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا

⑤ عَنْ اَبِی مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت ابوموسیٰ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ولی (کی اجازت) کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: حنفیہ کے نزدیک اس حدیث کا تعلق نابالغہ اور غیر عاقلہ سے ہے یعنی کمسن لڑکی اور دیوانی کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا جب کہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ، نے حدیث کے ظاہری الفاظ پر عمل کیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ نکاح اسی وقت صحیح ہوتا ہے جب کہ ولی عقد کرے اور عورتوں کی عبارت کے ساتھ نکاح منعقد نہیں ہوتا عورت خواہ اصیلہ ہو خواہ وکیلہ ہو۔

علامہ سیوطیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو (نابالغہ اور غیر عاقلہ پر محمول نہ ماننے بلکہ رکھنے کی صورت میں) جمہور علماء نے نفی صحت پر اور امام ابوحنیفہؒ، نے نفی کمال پر محمول کیا ہے۔

⑥ وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَیُّمَا امْرَأَۃٍ نَکَحَتْ نَفْسَھَا بِغَیْرِ اِذْنِ وَلِیِّھَا فَنِکَاحُھَا بَاطِلٌ فَنِکَاحُھَا بَاطِلٌ فَنِکَاحُھَا بَاطِلٌ فَاِنْ دَخَلَ بِھَا فَلَھَا الْمَھْرُ بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِھَا فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَہٗ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس عورت نے اپنا نکاح اپنے ولی کی اجازت کے بغیر کیا تو اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، پھر اگر شوہر نے اس کے ساتھ مجامعت کی تو وہ مہر کی حق دار ہوگی کیونکہ شوہر نے اس کی شرم گاہ سے فائدہ اٹھایا ہے، اور اگر کسی عورت کے ولی باہم اختلاف کریں تو جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی بادشاہ ہے۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "اس کا نکاح باطل ہے۔" یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین بار ارشاد فرما کر گویا ولی کی اجازت کے بغیر ہونے والے نکاح پر متنبہ کیا اور اس بات کی تاکید فرمائی کہ نکاح کے معاملہ میں ولی کی اجازت و مرضی کو بنیادی درجہ حاصل ہونا چاہئے، اس طرح یہ حدیث اور اسی مضمون کی دوسری حدیثیں ارشاد گرامی اَلْاَیِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِھَا مِنْ وَلِیِّھَا (ایم کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس کا حکم حاصل نہ کرلیا جائے) کے معارض و برعکس ہیں۔ اس لئے حنفیہ کی طرف سے اس حدیث کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر کفو سے نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے یا یہ کہ جو کمسن لڑکی، یا لونڈی اور یا مکاتبہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہوگا۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ یہ حدیث اور اسے سے پہلے کی حدیث، یہ دونوں فنی طور پر اس درجہ کی نہیں ہیں کہ انہیں کسی مسلک کے خلاف بطور دلیل اختیار کیا جاسکے کیونکہ ان دونوں حدیثوں کے صحیح ہونے میں محدثین نے کلام کیا ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی عورت کے ولی آپس میں اختلاف و نزاع کرتے ہیں اور کسی فیصلہ پر متفق نہیں ہو پاتے تو وہ سب کالعدم ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں ولایت کا حق بادشاہ وقت کو حاصل ہوتا ہے ورنہ تو یہ معلوم ہی ہے کہ ولی کی موجودگی میں بادشاہ کو ولایت کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

بغیر گواہوں کے نکاح صحیح نہیں ہوتا

⑦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَغَايَا اللَّاتِيْ يُنْكِحْنَ اَنْفُسَهُنَّ بِغَيْرِ بَيِّنَةٍ وَالْاَصَحُّ اَنَّهٗ مَوْقُوْفٌ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "وہ عورتیں زنا میں مبتلا ہوتی ہیں جو بغیر گواہوں کے اپنا نکاح کر لیتی ہیں" اس روایت کے بارہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حضرت ابن عباسؓ پر موقوف ہے یعنی یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں ہے بلکہ خود حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: نکاح کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے منعقد ہو۔ چنانچہ اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بغیر گواہوں کے نکاح صحیح نہیں ہوتا ہے۔ تمام ائمہ کا بھی یہی مسلک ہے اور صحابہؓ و تابعین سے بھی یہ ہی منقول ہے۔

نکاح کی طلب اجازت کے وقت عورت کی خاموشی ہی اس کی رضا ہے

⑧ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْيَتِيْمَةُ تُسْتَاْمَرُ فِيْ نَفْسِهَا فَاِنْ صَمَتَتْ فَهُوَ اِذْنُهَا وَاِنْ اَبَتْ فَلَا جَوَازَ عَلَيْهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بالغہ کنواری عورت سے اس کے نکاح کے بارہ میں اجازت حاصل کی جائے اور اگر وہ (طلب اجازت کے وقت) خاموش رہے تو اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے اور اگر وہ انکار کر دے تو اس پر جبر نہ کیا جائے (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ) دارمیؒ نے اس روایت کو حضرت ابوموسیٰؒ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: شادی بیاہ کا معاملہ انسانی زندگی کا بڑا اہم موڑ ہوتا ہے، اس موڑ پر زوجین کی مرضی و خواہش کے علی الرغم والدین اور ولی و سرپرست کا کوئی بھی فیصلہ اور اس میں ادنی درجہ کی کوتاہی اور غیر دانشمندی زوجین کی پوری زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔ اس لئے شریعت نے ہر بالغ مسلمان کو خواہ مرد ہو یا عورت یہ حق دیا ہے کہ وہ اس مرحلہ پر اپنی مرضی و خواہش اور اپنی پسند و ناپسند کا پورا پورا اظہار کرے۔ خاص طور پر عورتوں کے بارہ میں ان کے ماں باپ اور ولی و سرپرست پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں اپنی ذاتی پسند و ناپسند ہی کو مدار قرار نہ دیں بلکہ عورت کو خود بھی سوچنے سمجھنے کا موقع دیں اور اس کی اجازت و مرضی ہی کو اصل فیصلہ سمجھیں۔ پھر اس کی اجازت کے بارہ میں یہ آسانی بھی دی گئی ہے کہ اگر کوئی عورت شرم و حیا کی وجہ سے اپنی اجازت و مرضی کا زبان سے اظہار نہیں کر سکتی تو اس کی خاموشی ہی کو اس کی اجازت سمجھا جائے۔

لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ عورت کی خاموشی کو اس کی اجازت کا قائم مقام ہونا صرف اس کے ولی کے حق میں ہے یعنی عورت اگر اپنے ولی کی طلب اجازت کے موقع پر خاموش رہے تو اس کی خاموشی اس کی اجازت سمجھی جائے گی اور اگر ولی کے علاوہ کوئی اور اجازت طلب کرے تو اس صورت میں عورت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ زبان سے اجازت دے۔

غلام کا نکاح اس کے آقا کی اجازت کے بغیر صحیح نہیں ہوتا

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَيُّمَا عَبْدٍ تَزَوَّجَ بِغَيْرِ اِذْنِ سَيِّدِهٖ فَهُوَ عَاهِرٌ۔

(رواہ الترمذی والبوداؤد والدارمی)

"اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو غلام اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کرے وہ زانی ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مملوک کا نکاح مالک کی اجازت کے بغیر صحیح نہیں ہوتا، لہٰذا اگر کوئی مملوک اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گا اور اس نکاح کے بعد منکوحہ سے مجامعت کریگا تو یہ فعل حرام ہوگا اور وہ زنا کار کہلائے گا، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے کہ غلام کا نکاح اس کے آقا کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہوتا اور نکاح کے بعد اگر آقا اجازت دیدے تب بھی وہ عقد صحیح نہیں ہوتا جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ آقا کی اجازت کے بغیر نکاح تو ہوجاتا ہے مگر اس کا نافذ ہونا یعنی صحیح ہونا آقا کی اجازت پر موقوف رہتا ہے کہ جب آقا اجازت دیدے گا تو صحیح ہوجائے گا جیسا کہ فضولی کے نکاح کا حکم ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بالغہ اپنے نکاح کے معاملہ میں خود مختار ہے

(۱۰) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ جَارِيَةً بِكْرًا اَتَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَتْ اَنَّ اَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ فَخَيَّرَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک کنواری عورت (جو بالغ تھی) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے یہ بیان کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح کر دیا ہے جسے وہ ناپسند کرتی ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اسے اختیار دیدیا (کہ چاہے تو وہ نکاح کو باقی رکھے اور چاہے تو فسخ کر دے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ولی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ نکاح کے معاملہ میں عورت پر جبر کرے اگرچہ وہ باکرہ ہی کیوں نہ ہو اور ولی خواہ باپ دادا ہو یا اور کوئی عزیز چنانچہ حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔

اس مسئلہ میں حضرت امام شافعیؒ مخالف ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جو عورت کنواری نہ ہو گو وہ بالغ ہو تو ولی کو اس کا نکاح کرنے کے معاملہ میں اس پر جبر کرنے کا حق نہیں ہے لیکن عورت کنواری ہو اس (کی اجازت) کے بجز نکاح کر دینے کا اختیار ولی کو حاصل ہے۔ اگرچہ وہ عورت بالغہ ہی کیوں نہ ہو۔

بالغہ عورت کا نکاح ولی کو کرنا مستحب ہے

(۱۱) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُزَوِّجِ الْمَرْاَةُ الْمَرْاَةَ وَلَا تُزَوِّجُ الْمَرْاَةُ نَفْسَهَا فَاِنَّ الزَّانِيَةَ هِيَ الَّتِيْ تُزَوِّجُ نَفْسَهَا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ عورت خود اپنا نکاح کرے کیونکہ وہ عورت زنا میں مبتلا رہتی ہے جو اپنا نکاح خود کرتی ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے" حنفیہ کے نزدیک اس ممانعت کا تعلق یا تو اس عورت سے ہے جس کو ولایت حاصل نہ ہو یا پھر یہ نہی تنزیہی پر محمول ہے کیونکہ اگرچہ بالغہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنا نکاح اپنے ولی کی اجازت کے بغیر خود کرلے یا کسی کو بھی اپنا وکیل بناوے۔ لیکن اس کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ اپنے نکاح کا معاملہ اپنے ولی ہی کو سپرد کردے چنانچہ اگر کسی عورت کا ولی موجود ہو تو اس عورت کا نکاح اسی کو کرنا مستحب ہے اور یہ بات پہلے بتائی جاچکی ہے اگر کسی کا کوئی بھی ولی موجود نہ ہو تو پھر اس کا ولی قاضی ہوتا ہے۔

"لہٰذا حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ بہتر اور مناسب بات یہ ہے کہ جس عورت کا ولی موجود ہو تو کوئی دوسری عورت اس کا نکاح نہ کرے

بلکہ وہ ولی خود کرے اور اگر ولی موجود نہ ہو تو پھر قاضی کو حق ولایت حاصل ہو گا جو اس عورت کا نکاح کرے گا۔

"نہ عورت خود اپنا نکاح کرے" حنفیہ کے نزدیک اس ممانعت کی مراد یہ ہے کہ کوئی عورت بغیر گواہوں کے اور غیر کفو سے اپنا نکاح نہ کرے۔ جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مراد یہ ہے کہ کوئی عورت اپنے ولی کے بغیر نکاح نہ کرے۔ اس طرح حدیث کے آخری جملہ کا مطلب حنفیہ کی مراد کی روشنی میں تو یہ ہو گا کہ جو عورت اس شوہر سے مجامعت کرے گی جس سے اس نے بغیر گواہوں کے اور اس کے غیر کفو ہونے کے باوجود نکاح کیا ہے تو اس کی مجامعت زنا کے حکم میں ہو گی۔ اور حضرت امام شافعیؒ کی مراد کی روشنی میں یہ مطلب ہو گا کہ جو عورت اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح کرے گی تو وہ جب بھی اپنے اس شوہر سے مجامعت کرے گی گویا زنا کا ارتکاب کریگی۔ کیونکہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جس طرح کسی عورت کو کسی دوسری عورت کا عقد کرنے کی ولایت حاصل نہیں ہوتی اسی طرح کوئی عورت خود اپنا عقد نکاح کرنے کا بھی اختیار نہیں رکھتی۔ چنانچہ شوافع کے ہاں عورتوں کی عبادت کے ساتھ نکاح صحیح نہیں ہوتا۔

اولاد کے تئیں باپ کے فرائض

(۱۲) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ وَابْنِ عَبَّاسٍ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وُلِدَ لَهٗ وَلَدٌ فَلْیُحْسِنِ اسْمَهٗ وَاَدَبَهٗ فَاِذَا بَلَغَ فَلْیُزَوِّجْهُ فَاِنْ بَلَغَ وَلَمْ یُزَوِّجْهُ فَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُهٗ عَلٰی اَبِیْهِ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہو تو چاہئے کہ وہ اس کا اچھا نام رکھے اور اسے نیک ادب سکھائے (یعنی اسے شریعت کے احکام و آداب اور زندگی کے بہترین طریقے سکھائے تاکہ وہ دنیا و آخرت میں کامیاب و سربلند ہو) اور پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے۔ اگر لڑکا بالغ ہو (اور غیر مستطیع ہو) اور اس کا باپ اس (اس کا نکاح کرنے پر قادر ہونے کے باوجود) اس کا نکاح نہ کرے اور پھر وہ لڑکا برائی میں مبتلا ہو جائے (یعنی جنسی بے راہروی کا شکار ہو جائے) تو اس کا گناہ باپ پر ہو گا۔"

تشریح: صالح معاشرہ کی حقیقی بنیاد وہ نوخیز ذہن ہیں جو اپنے والدین اور سرپرست کی آغوش پرورش میں اعمال و کردار کی بنیادی تربیت حاصل کرتے ہیں، اگر اس بنیادی تربیت کا فقدان ہوتا ہے تو کائنات انسانی کا ہر طبقہ بھیانک قسم کی برائیوں سے متاثر ہوتا ہے کیونکہ آگے چل کر یہی نوخیز معاشرہ کا فعال جز بنتے ہیں اور ان کا ایک ایک فعل و عمل اپنے اثرات پیدا کرتا ہے۔

آج کے دور میں فحاشی و بے حیائی اور جنسی بے راہ روی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ جو بھی نئی نسل سامنے آتی ہے وہ اعمال و کردار اور ذہن و عقیدہ کی اس بنیادی تربیت سے یکسر محروم رہتی ہے جو والدین اور سرپرستوں کے زیر سایہ ملنی چاہئے۔ اسی لئے یہ حدیث اس اہم نکتہ کی طرف متنبہ کر رہی ہے اور والدین کو ان کے اس فریضہ سے آگاہ کر رہی ہے کہ جب ان کے لڑکا پیدا ہو تو پہلے وہ اس کا اچھا نام رکھیں کیونکہ اچھا نام پوری زندگی پر اچھے اثرات مرتب کرتا ہے، پھر جب وہ ہوش سنبھالے تو اس کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دیں بایں طور کہ اسے دین کی تعلیم دلوائیں، اسلامی احکام و آداب سے روشناس کرائیں اور اسے زندگی کے اعلیٰ اصول اور اچھے طریقوں کے سانچے میں ڈھالیں تاکہ سب سے پہلے تو اس کا قلب و دماغ نیکی و برائی کے امتیاز کو جان لے اور پھر اس کا کردار اس پختگی کے حامل ہو جائے جو زندگی کے ہر راستہ پر اسے نیکی و بھلائی ہی کی طرف لے جائے۔

جب تعلیم و تربیت کا یہ مرحلہ گذر جائے اور وہ لڑکا بالغ ہو جائے تو اس کے بعد والدین کا بڑا فریضہ یہ ہے کہ اس کی شادی کی طرف فوراً متوجہ ہوں تاکہ وہ مرد زندگی کی وجہ سے جنسی جذبات کی مغلوبیت کا شکار ہو کر برائیوں کے راستہ پر نہ لگ جائے چنانچہ اس فریضہ کی اہمیت کو بتانے اور اس بات کی تاکید کے لئے بطور زجر و تہدید یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے بالغ لڑکے کی شادی نہیں کی اور وہ

لڑکا جنسی بے راہ روی کا شکار ہو کر بدکاری میں مبتلا ہو گیا تو اس کا گناہ اور وبال باپ پر ہو گا۔ اس بارے میں غلام اور لونڈی کا بھی وہی حکم ہے جو لڑکے کا ہے۔

لڑکی کے بالغ ہوتے ہی اس کا نکاح کر دو

⑬ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَاَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي التَّوْرَاةِ مَكْتُوْبٌ مَنْ بَلَغَتْ اِبْنَتُهُ اثْنَتَيْ عَشَرَةَ سَنَةً وَلَمْ يُزَوِّجْهَا فَاَصَابَتْ اِثْمًا فَاِثْمُ ذٰلِكَ عَلَيْهِ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت انس ابن مالک جناب رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جس شخص کی لڑکی کی عمر بارہ سال کی ہو جائے اور وہ (کفو پانے کے باوجود) اس کا نکاح نہ کرے اور پھر وہ لڑکی برائی (یعنی بدکاری وغیرہ) میں مبتلا ہو جائے تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہے" ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

بَابُ اِعْلَانِ النِّكَاحِ وَالْخُطْبَةِ وَالشَّرْطِ

نکاح کا اعلان اور نکاح کے خطبہ و شرط کا بیان

"اعلان نکاح" نکاح کا اعلان کرنا مستحب ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ "نکاح کا اعلان کرو اگرچہ دف بجا کر ہی کیوں نہ اعلان کرنا پڑے" دف بجانے کے سلسلہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، چنانچہ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ دف بجانا تو حرام ہے۔ یا مطلقاً مکروہ ہے اور بعض علماء نے اس کو مطلقاً مباح کہا ہے، زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ بعض مواقع پر جیسے "عید کے دن، کسی معزز مسافر و مہمان کے آنے کے وقت اور نکاح کے موقعہ پر دف بجانا مباح ہے، ان کے علاوہ اور کسی بھی وقت اور کسی بھی موقعہ پر دف بجانا حرام ہے۔

"خطبہ" علماء نے اسے خ کے پیش کے ساتھ (یعنی خطبہ) بھی صحیح کہا ہے اور خ کے زیر کے ساتھ (یعنی خطبہ) کو بھی صحیح قرار دیا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ "خطبہ" سے مراد نکاح کا پیغام بھیجنا اور "خطبہ" اس خطبے کو کہتے ہیں جو نکاح میں پڑھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں عنوان میں خطبہ سے مراد نکاح کا پیغام بھیجنا ——— (کہ جسے منگنی کہتے ہیں) بھی ہو سکتا ہے لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ یہاں "خطبہ" سے وہی مراد ہے جو نکاح کے وقت پڑھا جاتا ہے۔

حنفیہ کے نزدیک عقد نکاح کے وقت خطبہ پڑھنا مسنون ہے، شوافع کے نزدیک بھی مسنون ہے لیکن ان کے ہاں عقد نکاح ہی نہیں بلکہ ہر عقد مثلاً بیع و شراء وغیرہ کے وقت بھی خطبہ پڑھنا مسنون ہے۔

شادی بیاہ کی رسوم و بدعات

"شرط" سے مراد وہ شرطیں ہیں جو نکاح میں ذکر کی جائیں خواہ وہ فاسد ہوں یا صحیح ہوں۔

یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ نکاح جیسا پاکیزہ معاملہ بھی غیر مسلموں کی ناپاک رسموں اور ملکی رواجوں سے محفوظ نہیں رہا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کی غیر شرعی رسمیں جس کثرت اور شدت کے ساتھ مسلمانوں کے شادی بیاہ کے معاملات میں داخل ہو گئی ہیں اس نے نکاح کے اسلامی اور مسنون طریقے کو بالکل ہی اوجھل کر دیا ہے اور اب تو جس قدر رسمیں رائج ہیں یا پہلے رائج تھیں ان سب کا احاطہ کرنا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ تاہم اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ رسموں اور بدعتوں کا ذکر کر دیا جائے تاکہ ان سے بچنے کی کوشش کی جا سکے۔

حرام باجوں اور مزامیر کا استعمال کرنا، ناچ گانے اور قوالی کا انتظام کرنا، سہرا باندھنا، کٹھ پتلیوں کے کھیل جیسی لغویات کرانا، گھر بار کی غیر معمولی اور اسراف کی حد تک زیبائش و آرائش کرنا جیسے دیواروں کو کپڑے سے ڈھانکنا، گھوڑے پر سواری کرنا، بارات لیکر بلا ضرورت

شہر میں پھرنا، دولھا کا شہر و آبادی کے مزارات پر جانا اور وہاں کچھ نقد چڑھا کر پھر برات میں شامل ہو جانا، بارات کے ساتھ ڈھول باجا ہونا یا گانے والوں کا اور گانے والیوں کو بارات میں شامل کرنا، آتش بازی کے ذریعہ اپنا مال ضائع کرنا، اور بارات میں مردوں کے سامنے عورتوں کا جلوہ آرائی کرنا، یہ سب چیزیں بہت سی برائی کی ہیں اور حرام ہیں۔

اسی طرح یہ چیزیں بھی حرام ہیں: مثلاً نکاح کی مجلس میں مستور چیزوں کو ظاہر کرنا، دولھا کو ریشمی مسند پر بٹھانا، دولھا کی پگڑی کو ڈوری سے ناپنا اور پھر اس ڈوری کو ٹوٹکا کرنے والے یا ساحر کو دیدینا تاکہ وہ اس کے ذریعہ دولھا دولہن کے درمیان محبت کے لئے کوئی ٹوٹکا کردے، سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا، باراتیوں اور دولھا کے قرابت داروں کی حد سے زیادہ تعریف وتوصیف کرنا اور ان کی بے جا خوشامد وچاپلوسی میں ایسی باتیں کرنا جو بالکل جھوٹی ہوں۔

ایسے ہی یہ چیزیں بھی حرام ہیں: دولھا کا حریر یا زعفرانی رنگ کا یا کسبنا اور یا ریشمی کپڑا پہننا (مردوں کے لئے ایسے کپڑے شادی کے علاوہ بھی پہننے حرام ہیں) دولھا کے سر سے پگڑی اتار کر دولہن کے سر پر رکھ دینا، دولھا کا دولہن کے گرد سات بار چکر لگانا، اجنبی عورتوں کا دولھا کے پاس آنا اور اسے ہاتھ لگانا یا اس کے ناک کان پکڑنا اور اس کے ساتھ بے حیائی کی باتیں کرنا، دولھا کا انگوٹھا دودھ کے ذریعہ عورت سے دھلوانا، عورتوں کا دولھا کو شکر کھلانا اور رزنہ پلانا، مصری کی ڈلی دولہن کے بدن پر رکھ کر دولھا سے کہنا کہ اسے اپنے منہ سے اٹھالو اور خلوت میں جب دولھا دولہن جمع ہوں تو عورتوں کا انہیں گھیرے رہنا۔ یہ سب چیزیں بدعت اور حرام ہیں جن کا شریعت وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان سے اجتناب کرنا انتہائی ضروری ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نکاح کے وقت دف بجانا جائز ہے

(۱) عَنِ الرُّبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ قَالَتْ جَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ حِيْنَ بُنِيَ عَلَيَّ فَجَلَسَ عَلٰى فِرَاشِيْ كَمَجْلِسِكَ مِنِّيْ فَجَعَلَتْ جُوَيْرِيَاتٌ لَنَا يَضْرِبْنَ بِالدُّفِّ وَيَنْدُبْنَ مَنْ قُتِلَ مِنْ اٰبَائِيْ يَوْمَ بَدْرٍ اِذْ قَالَتْ اِحْدَاهُنَّ وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ فَقَالَ دَعِيْ هٰذِهٖ وَقُوْلِيْ بِالَّذِيْ كُنْتِ تَقُوْلِيْنَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراءؓ کہتی ہیں کہ جب میں (نکاح کے بعد) اپنے شوہر کے گھر رخصت ہو کر آئی تو نبی کریم ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے اور میرے بستر پر اس طرح بیٹھ گئے جس طرح تم میرے بستر پر بیٹھ گئے ہو (ربیعؓ نے یہ بات حضرت خالد ابن ذکوانؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہی جنہوں نے یہ روایت نقل کی ہے) اور ہمارے خاندان کی بچیوں نے (جو اس وقت ہمارے گھر میں موجود تھیں) دف بجانا شروع کیا اور ہمارے آباء میں سے جو لوگ بدر کے دن شہید ہوگئے تھے ان کی خوبیوں اور شجاعت پر مشتمل اشعار پڑھنے لگیں، اسی دوران ان میں سے ایک بچی نے یہ کہا کہ "اور ہمارے درمیان وہ نبی ﷺ ہیں جو کل ہونے والی بات کو جانتے ہیں" آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "اس بات کو چھوڑ دو (یعنی اس قسم کی باتیں نہ کہو) بلکہ وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "عفراء" حضرت معوذؓ کی والدہ کا نام ہے، حضرت معوذؓ ایک عظیم المرتبت صحابی ہیں جنہوں نے غزوہ بدر کے موقع پر حق کا پرچم سربلند کرتے ہوئے میدان کارزار میں جام شہادت نوش کیا اور تاریخ اسلام کی یہی وہ عظیم ہستی ہے جس نے اپنے بھائی معاذؓ کی معیت میں اس غزوہ بدر میں ابوجہل لعین کو قتل کیا۔

"بچیوں" سے انصار کی وہ چھوٹی بچیاں مراد ہیں جو ابھی بچپن کے دور سے گذر رہی تھیں اور حد بلوغ کو نہیں پہنچی تھیں۔

اکمل الدینؒ نے کہا کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ وقت نکاح اور زفاف کے اعلان کے لئے دف بجانا جائز ہے پھر بعض علماء

نے اس جواز میں ختنہ، عیدین، مسافر کی آمد اور تقریب مسرت میں احباب و اعزہ کے اجتماع کو بھی شامل کر دیا ہے یعنی نکاح کی طرح ان مواقع پر بھی دف بجانا جائز ہے۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ "دف" سے مراد وہ دف ہے جس میں جھانج نہ ہو، کیونکہ جھانج دار دف بجانا متفقہ طور پر مکروہ ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کی وضاحت یہ ہے کہ اس وقت جب کہ وہ بچیاں اپنے آباء و اجداد کے بہادرانہ کارناموں اور حق کی راہ میں ان کے قربان ہو جانے کی پر شجاعت داستانوں کے گیت گانے لگیں تو اسی دوران ایک بچی نے جو ابھی عقائد کے نازک گوشوں سے ناواقف تھی، گویا آپ ﷺ کی توصیف میں یہ کہا کہ ہمارے درمیان وہ نبی موجود ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ آنے والی کل میں کیا وقوع پذیر ہوگا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے یہ سنتے ہی اسے روک دیا کیونکہ اس نے علم غیب کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف کی تھی جو ظاہر ہے آپ ﷺ کو کیسے گوارا ہو سکتی تھی اس لئے کہ عقائد کا یہ کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ غیب کی باتوں کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ہاں یہ اور بات ہے کہ غیب کی جن باتوں کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اپنے رسولوں پر منکشف کر دیتا ہے۔

یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جن اشعار میں شریعت کے خلاف اور عقائد کے منافی کوئی بات نہ ہو اور فحش کذب شامل نہ ہو انہیں پڑھنا اور سننا جائز ہے۔

② وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ زُفَّتِ امْرَأَةٌ اِلٰى رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا كَانَ مَعَكُمْ لَهْوٌ فَاِنَّ الْاَنْصَارَ يُعْجِبُهُمُ اللَّهْوُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک عورت نکاح کے بعد رخصت کرا کر انصار کے ایک شخص کے ہاں لائی گئی تو رسول کریم ﷺ نے (اس شخص سے) فرمایا کہ "کیا تمہارے ساتھ کھیل (یعنی دف اور گانا) نہیں ہے (یعنی شریعت نے شادی بیاہ میں جس دف کے بجانے کی اجازت دی ہے اور جس قسم کے گیت جائز قرار دیئے ہیں تمہاری شادی ان چیزوں سے خالی کیوں ہے؟ کیونکہ انصار تو ان چیزوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔" (بخاریؒ)

شوال کے مہینے میں نکاح کرنا مستحب ہے

③ وَعَنْهَا قَالَتْ تَزَوَّجَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ شَوَّالٍ وَبَنٰى بِيْ فِيْ شَوَّالٍ فَاَيُّ نِسَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اَحْظٰى عِنْدَهُ مِنِّيْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے شوال کے مہینے میں نکاح کیا اور پھر (تین سال کے بعد) شوال ہی کے مہینے میں مجھے رخصت کرا کر اپنے گھر لائے۔ اب (تم ہی بتاؤ) رسول کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں کون سی زوجہ مطہرہ مجھ سے زیادہ خوش نصیب تھی۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض جاہل لوگ شوال کے ماہ میں شادی بیاہ کرنے کو جو منحوس سمجھتے ہیں وہ بالکل غلط ہے بلکہ اس مہینہ میں شادی بیاہ کرنا یا دولہن کو رخصت کرا کر اپنے گھر لانا مستحب ہے۔ چنانچہ عرب میں بھی زمانہ جاہلیت کے لوگ یہی عقیدہ رکھتے تھے اور شوال میں نکاح کرنے اور دولہن کو گھر میں لانے کو برا سمجھتے تھے، اسی غلط عقیدہ کی تردید میں حضرت عائشہؓ نے یہ بات فرمائی کہ اگر شوال کے مہینہ میں شادی بیاہ کرنا اپنے اندر کوئی نحوست رکھتا ہے۔ تو پھر آخر میں شادی میرے حق میں منحوس کیوں نہیں رہی جب کہ شوال ہی کے مہینہ میں میرا نکاح ہوا اور شوال ہی کے مہینہ میں رخصت کرا کر میں آپ ﷺ کے گھر آئی اور اس بات کو دنیا جانتی ہے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں جو خوش نصیبی اور آپ ﷺ کی محبت مجھے نصیب ہوئی وہ کسی بھی زوجہ کو حاصل نہیں ہوئی۔

مہر ادا کرنے کی تاکید

④ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشُّرُوْطِ اَنْ تُوْفُوْا بِهٖ مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوْجَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جن شرطوں کا پورا کیا جانا تمہارے لئے ضروری ہے ان میں سب سے اہم شرط وہ ہے جس کے ذریعہ تم نے شرمگاہوں کو حلال کیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "سب سے اہم شرط" سے مراد بیوی کا مہر ہے یا پھر بیوی کے وہ تمام حقوق مراد ہیں جو شوہر کے ذمہ ہوتے ہیں لہٰذا حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تم اپنی بیوی کے مہر ادا کرو۔ ان کے کھانے پینے کا خرچ ان کو دو، انہیں رہنے کے لئے مکان دو اور ان کی دیگر ضروریات زندگی اپنی استطاعت کے مطابق پوری کرو اور صرف یہ نہیں بلکہ ان کے ساتھ اپنی زندگی اس حسن سلوک میل جول اور پر محبت انداز سے گزارو جو ایک باوقار اور شریف انسان کی شان کے عین مطابق ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ان چیزوں کو "شرط" کیوں کہا گیا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے۔ تو اس کے ذہن میں تصور کے ہر گوشہ میں یہی عزم ہوتا ہے کہ وہ جس عورت کو اپنی بیوی بنا کر اپنے گھر لا رہا ہے اس کے تمام حقوق کی ادائیگی پورے طور پر کریگا اور پھر وہ ان حقوق کی ادائیگی کا التزام بھی کرتا ہے لہٰذا اس کا یہ عزم اور پھر یہ التزام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ گویا اس نے حقوق کی ادائیگی کی شرط کی ہے۔

کسی دوسرے کی منسوبہ کو اپنے نکاح کا پیغام نہ دو

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَخْطُبُ الرَّجُلُ عَلٰى خِطْبَةِ اَخِيْهِ حَتّٰى يَنْكِحَ اَوْ يَتْرُكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" کوئی مرد اپنے نکاح کا پیغام اپنے کسی مسلمان بھائی کے پیغام پر نہ بھیجے تا آنکہ وہ اس سے نکاح کرلے یا اس کو ترک کردے۔" (بخاریؒ و مسلم)

تشریح: کسی شخص کی منسوبہ سے نکاح کا پیغام بھیجنے کی یہ ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ ان دونوں کی شادی کا معاملہ تقریباً طے ہو چکا ہو، یعنی لڑکی اور لڑکا دونوں راضی ہو گئے ہوں اور مہر متعین ہو چکا ہو، لہٰذا اس صورت میں اب کسی دوسرے شخص کے لئے جائز نہیں ہو گا کہ وہ اپنے نکاح کا پیغام بھیجے، اگر کوئی دوسرا شخص اس ممانعت کے باوجود کسی کی منسوبہ کے پاس نکاح کا پیغام بھیج دے اور اس پہلے شخص کی اجازت کے بغیر نکاح بھی کرلے تو یہ نکاح تو صحیح ہو جائے گا لیکن یہ دوسرا شخص (جس نے پہلے شخص کی منسوبہ سے نکاح کیا ہے) گناہ گار ہو گا۔

عورت اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے کسی دوسری عورت کو طلاق نہ دلوائے

⑥ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْأَلِ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ اُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَلِتَنْكِحَ فَاِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا۔ (متفق علیہ)

اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" عورت (کسی شخص سے) اپنی کسی (دینی) بہن کے بارہ میں یہ نہ کہے کہ اس کو طلاق دے دو اور اس عورت کو طلاق دلوانے کا مقصد یہ ہو کہ وہ اس کے پیالہ کو خالی کردے (یعنی اس کو طلاق دلوا کر اس کے

سارے حقوق خود سمیٹ لے) اور اس کے خاوند سے خود نکاح کر لے، کیونکہ اس کے لئے وہی ہے جو اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: فرض کیا جائے کہ زید شادی شدہ ہے اور خالدہ اس کی بیوی کا نام ہے۔ اب زید کسی دوسری عورت مثلاً زہرہ سے بھی شادی کرنا چاہتا ہے لیکن زہرہ کہتی ہے کہ میں تم سے شادی تو کرلوں گی مگر تم اپنی پہلی بیوی خالدہ کو طلاق دیدو! یا یہ صورت ہے کہ مثلاً زید نے دو شادیاں کر رکھی ہیں ایک بیوی کا نام خالدہ ہے اور دوسری کا نام زہرہ ہے، اب زہرہ اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ اپنی دوسری بیوی خالدہ کو طلاق دے دو۔ اسی بات سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کوئی عورت کسی دوسری عورت کو طلاق دلوانے کے لئے نہ کہے کیونکہ اپنی اپنی تقدیر اپنے ساتھ ہے کسی دوسرے کا برا چاہنے سے کیا فائدہ۔

حدیث کی وضاحت کے سلسلہ میں اگر پہلی صورت کا اعتبار کیا جائے تو لتنکح کا ترجمہ وہی ہو گا جو اوپر نقل کیا گیا جب کہ دوسری صورت مراد لیجائے تو پھر اس جملہ کا ترجمہ یہ ہو گا کہ "اور (اس عورت کا طلاق دلوانے سے یہ مقصد ہو کہ) اس کی سوکن کسی اور مرد سے نکاح کر لے۔

شغار کی ممانعت

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الشِّغَارِ وَالشِّغَارُ اَنْ تُزَوِّجَ الرَّجُلُ ابْنَتَهٗ عَلٰى اَنْ يُزَوِّجَهُ الْاٰخَرُ بِنْتَهٗ وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا صَدَاقٌ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ لَا شِغَارَ فِي الْاِسْلَامِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے شغار سے منع کیا ہے، اور شغار یہ ہے کہ کوئی شخص (کسی دوسرے آدمی سے) اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کر دے کہ اس دوسرے شخص کو اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کرنا ہو گا اور دونوں میں مہر کچھ نہ ہو۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اسلام میں شغار (جائز) نہیں ہے۔"

تشریح: "شغار" دو آدمیوں کے درمیان ایک دوسرے کی بیٹی سے نکاح کرنے کی ایک خاص صورت کا نام ہے جیسے کہ زید بکر سے اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کرے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح زید سے کر دیگا۔ اور ان دونوں کے نکاح میں مہر کچھ بھی متعین نہ ہو بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے کی بیٹی کا تبادلہ ہی گویا مہر ہو۔ اس طرح کا نکاح زمانہ جاہلیت میں لوگ کر لیا کرتے تھے مگر اسلام نے اس سے منع کیا ہے۔

اس بارہ میں فقہی اختلاف یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے ہاں تو اس طرح کا نکاح سرے سے صحیح ہی نہیں ہوتا جب کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح سے نکاح کرے تو وہ نکاح صحیح ہو جائے گا اور مہر مثل دینا لازم ہو گا لیکن حکم یہ ہے کہ اس طرح کے نکاح سے اجتناب کرنا چاہئے۔

متعہ کی ممانعت

⑧ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ وَ عَنْ اَكْلِ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاِنْسِيَّةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کے دن عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے سے منع فرمایا ہے نیز آپ ﷺ نے گھروں میں رہنے والے گدھوں کا گوشت کھانے سے بھی منع فرمایا ہے (گھروں میں رہنے والے گدھوں سے مراد وہ گدھے ہیں جو لوگوں کے پاس رہتے ہیں اور بار برداری وغیرہ کے کام آتے ہیں، جنگلی گدھا کہ جس کو گور خر کہتے ہیں حلال ہے اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کسی متعینہ مدت کے لئے ایک متعینہ رقم کے عوض نکاح کرنے کو "متعہ" کہتے ہیں جیسے کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ یہ کہہ کر نکاح کرے کہ فلاں مدت مثلاً دو سال تک اتنے روپے (مثلا ایک ہزار روپے) کے عوض تم سے فائدہ اٹھاؤں گا! نکاح کا یہ خاص طریقہ یعنی متعہ، اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تو جائز تھا مگر بعد میں حرام قرار دیدیا گیا۔

علماء لکھتے ہیں کہ متعہ کے سلسلے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ متعہ دو مرتبہ تو حلال قرار دیا گیا اور دو مرتبہ حرام ہوا، چنانچہ پہلی مرتبہ تو جنگ خیبر سے پہلے کسی جہاد میں جب صحابہ تجرد کی وجہ سے سخت پریشان ہوئے یہاں تک کہ بعض لوگوں نے رسول کریم ﷺ سے خصی کرانے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے انہیں متعہ کرنے کی اجازت دیدی۔ پھر جنگ خیبر کے دن جو ۷ ھ کا واقعہ ہے، آپ ﷺ نے ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے دیا، چنانچہ جواز متعہ کا فسخ ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

اسی سلسلہ میں حضرت ابن عمرؓ نے اپنی روایت میں یہ ذکر کیا ہے کہ جس طرح حالت اضطرار میں بھوکے کو مردار کھانے کی اجازت ہے، اسی طرح اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اس شخص کے لئے جو بسبب تجرد، جنسی ہیجان کی وجہ سے حالت اضطرار کو پہنچ گیا ہو، یہ اجازت تھی کہ وہ متعہ کرلے مگر (جب بعد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ حرام قرار دیدیا گیا تو) پھر صحابہؓ نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ متعہ کے طور پر جو بھی نکاح ہوا سے باطل قرار دیا جائے۔

اس لئے ہر دور میں تمام اہل اسلام کا اس بات پر اجماع و اتفاق رہا ہے کہ متعہ حرام ہے، کیا صحابہ کیا فقہاء اور کیا محدثین سبھی کے نزدیک اس کا حرام ہونا ایک متفقہ مسئلہ ہے صحابہ میں صرف ابن عباسؓ پہلے اضطرار کی حالت میں متعہ کو مباح سمجھتے تھے مگر جب حضرت علی مرتضیؓ نے ان کو سخت تہدید کی اور متعہ کی قطعی و ابدی حرمت سے ان کو واقف کیا تو حضرت ابن عباسؓ نے اپنے قول سے رجوع کیا اور وہ بھی اس کی حرمت کے قائل ہوگئے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کا اپنے اباحت کے قول سے رجوع کرنا حدیث وفقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

"ہدایہ" فقہ حنفی کی ایک مشہور ترین اور اونچے درجہ کی قابل اعتماد کتاب ہے، اس کے مصنف اپنے علم و فضل اور فقہی بصیرت و نکتہ رسی کے اعتبار سے فقہا کی جماعت میں سب سے بلند مرتبہ حیثیت کے حامل ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ متعہ کے سلسلہ میں انہوں نے حضرت امام مالکؒ کی طرف قول جواز کی جو نسبت کی ہے وہ ان کی سخت علمی چوک ہے نہ معلوم انہوں نے یہ بات کہاں سے لکھ دی کہ امام مالکؒ متعہ کے جائز ہونے کے قائل تھے، امام مالک بھی متعہ کو اسی طرح حرام کہتے ہیں جس طرح تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے۔ چنانچہ نہ صرف ابن ہمامؒ نے ہدایہ میں مذکورہ امام مالکؒ کی طرف قول جواز کی نسبت کو غلط کہا ہے بلکہ ہدایہ کے بعد فقہ کی جتنی بڑی کتابیں تالیف ہوئیں تقریباً سب ہی میں ہدایہ کی اس غلطی کو بیان کرنا لازم سمجھا گیا ہے۔

متعہ کے بارے میں شیعوں کا مسلک

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ متعہ حرام ہے، لیکن نہ معلوم شیعہ کیوں اب بھی اسے جائز کہتے ہیں۔ بڑی عجیب بات یہ ہے کہ شیعوں کی کتابوں میں تو انہی کی صحیح احادیث میں ائمہ سے متعہ کی حرمت منقول ہے، مگر شیعوں کا عمل یہ ہے کہ وہ نہ صرف متعہ کے حلال ہونے پر اصرار کرتے ہیں بلکہ اس کے فضائل بھی بیان کرتے ہیں، اور پھر مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ شیعہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ متعہ کو دراصل حضرت عمرؓ نے حرام کیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، حضرت عمرؓ کو حرام کرنے کا کیا اختیار تھا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ انہوں نے جس طرح دوسرے اسلامی احکام کی تبلیغ میں بڑی شدت کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے متعہ کی حرمت کے اعلان میں بھی بڑی شد و مد کے ساتھ کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کا آخری اعلان یہ تھا کہ اگر میں نے سنا کہ کسی نے متعہ کیا ہے تو میں اس کو زنا کی سزا دوں گا۔ ان کے اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس وقت کہ متعہ کی حرمت سے ناواقف تھے وہ بھی واقف ہوگئے، لہٰذا حضرت عمرؓ نے تو صرف اتنا کیا کہ رسول کریم ﷺ کے ایک حکم کی تبلیغ کر دی اب اگر شیعہ یہ

کہیں کہ متعہ کو حضرت عمرؓ نے حرام کیا ہے تو اس کی ایک مضحکہ خیز الزام سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

(۹) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ رَخَّصَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ اَوْطَاسٍ فِي الْمُتْعَةِ ثَلاَثًا ثُمَّ نَهٰى عَنْهَا۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت سلمہ ابن اکوعؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جنگ اوطاس کے تین یوم کے لئے متعہ کی اجازت دی تھی پھر اس سے (ہمیشہ کے لئے) منع کر دیا۔" (مسلم)

تشریح: "اوطاس" ایک وادی کا نام ہے جو مکہ مکرمہ کے قریب طائف جانے والے راستے میں واقع ہے اور جس کے گرد و پیش قبیلہ ہوازن کی شاخیں آباد تھیں اس کو "وادی حنین" بھی کہتے ہیں۔ جب رمضان المبارک ۸ھ میں مکہ فتح ہو گیا اور اسلام کی طاقت نے گویا پورے عرب کے باطل عناصر کو حق کے سامنے سرنگوں کر دیا تو اوطاس میں بسنے والے ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں کو بڑی غیرت آئی اور انہوں نے پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ایک مرتبہ اسلام کے مقابلہ کی ٹھانی چنانچہ شوال ۸ھ میں ان قبیلوں کے لوگوں کے ساتھ اوطاس میں آنحضرت ﷺ کی قیادت میں وہ جنگ ہوئی جسے "غزوہ حنین" کہا جاتا ہے اور غزوہ اوطاس اور غزوہ ہوازن کے نام سے بھی اس کو یاد کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حق کو سربلند کیا اور اسلامی لشکر کو فتح عطا فرمائی، اس غزوہ میں غنیمت کے طور پر مسلمانوں کو بہت زیادہ مال و اسباب ہاتھ لگا، چوبیس ہزار اونٹ چالیس ہزار بکریاں اور تقریباً چالیس ہزار روپیہ کی مالیت کی چاندی پر مسلمانوں نے قبضہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے یہ سارا مال غنیمت وہیں اوطاس میں مسلمانوں کے درمیان تقسیم فرمایا۔

بہر حال متعہ کی تحلیل و تحریم دوسری مرتبہ اسی جنگ اوطاس کے موقع پر ہوئی ہے، اور یہ جنگ چونکہ فتح مکہ کے فوراً بعد ہوئی ہے اس لئے اس موقع پر متعہ کی ہونے والی تحلیل و تحریم کی نسبت کو فتح مکہ کے دن کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ گویا اس سے پہلے کی حدیث کی تشریح میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ متعہ کی تحلیل و تحریم دوسری مرتبہ فتح مکہ کے دن ہوئی ہے تو وہاں "فتح مکہ کے دن" سے مراد فتح مکہ کے سال ہے، لہٰذا اب بات یوں ہوگی کہ دوسری مرتبہ متعہ کی تحلیل و تحریم فتح مکہ کے سال یعنی ۸ھ میں جنگ اوطاس کے موقع پر ہوئی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

نکاح کا خطبہ

(۱۰) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ عَلَّمَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ التَّشَهُّدَ فِي الصَّلاَةِ وَالتَّشَهُّدَ فِي الْحَاجَةِ قَالَ التَّشَهُّدُ فِي الصَّلٰوةِ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلاَمُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ اَلسَّلاَمُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لاَّ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَالتَّشَهُّدُ فِي الْحَاجَةِ اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَيَقْرَأُ ثَلاَثَ اٰيَاتٍ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلاَ تَمُوْتُنَّ اِلاَّ وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْدًا يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَفِيْ جَامِعِ التِّرْمِذِيِّ فَسَّرَ الْاٰيَاتِ الثَّلاَثَ سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ وَزَادَ ابْنُ مَاجَةَ بَعْدَ قَوْلِهٖ اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَبَعْدَ قَوْلِهٖ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا وَالدَّارِمِيُّ بَعْدَ قَوْلِهٖ عَظِيْمًا ثُمَّ يَتَكَلَّمُ بِحَاجَتِهٖ وَرَوٰى فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ فِيْ خُطْبَةِ الْحَاجَةِ مِنَ النِّكَاحِ وَغَيْرِهٖ۔

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں نماز میں پڑھا جانے والا تشہد بھی سکھایا ہے اور کسی حاجت و ضرورت کے وقت جو تشہد پڑھا جائے اس کی تعلیم بھی دی ہے۔ چنانچہ نماز کا تشہد تو یوں ہے:

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰاتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَكَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

"زبان کی عبادتیں، بدنی عبادتیں اور مالی عبادتیں سب اللہ کے لئے ہیں۔ اے نبی (ﷺ)! آپ پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت و برکت ہو، اور ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر بھی سلامتی ہو، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔"

اور کسی حاجت و ضرورت کے وقت پڑھا جانے والا تشہد یہ ہے:

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

"تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ہم اس سے مدد چاہتے ہیں اور اسی سے بخشش کے طلب گار ہیں اور ہم اپنے نفس کی ہر برائی سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، جس کو اللہ ہدایت (کی توفیق) دیدے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں (یعنی نہ شیطان بہکا سکتا ہے نہ نفس گمراہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی اور گمراہی میں مبتلا کر سکتا ہے) اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔"

پھر اس تشہد کے بعد آپ ﷺ قرآن کریم کی تین آیتیں پڑھتے، ایک آیت یہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔

"اے ایمان والو! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔"

دوسری آیت یہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا۔

"اے ایمان والو! خدا سے ڈرو جس کے نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو اور (قطع مودت) ارحام سے (بچو) بیشک خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

تیسری آیت یہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا۔

"اے ایمان والو خدا سے ڈرا کرو، اور بات سیدھی کہا کرو، وہ تمہارے سب اعمال درست کر دے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک بڑی مراد پائے گا۔"

اور جامع ترمذی میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "ان تینوں آیتوں کو سفیان ثوریؒ نے بیان کیا ہے۔

ابن ماجہؒ نے ان الحمدللہ کے بعد نحمدہ اور من شرور انفسنا کے بعد و من سیئات اعمالنا کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے اور دارمیؒ نے اپنی روایت میں "عظیما" کے بعد یہ اضافہ کیا ہے کہ (یہ تشہد اور آیتیں پڑھنے کے بعد) اپنی حاجت (یعنی عقد کے الفاظ)

بیان کرے۔

اور شرح السنہ میں ابن مسعودؓ کی اس روایت کو نقل کیا ہے اس میں خطبہ حاجت کی وضاحت نکاح وغیرہ سے کی گئی ہے (یعنی شرح السنہ نے لفظ "حاجت" کی توضیح میں من النکاح وغیرہ کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے)۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "تشہد" کے معنی "ایمان کی گواہی کا اظہار کرنا" اور زین العرب نے کہا ہے کہ یہاں "تشہد" سے مراد وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف اور دونوں کلمہ شہادت کا ذکر ہو۔

"حاجت وضرورت" سے مراد نکاح وغیرہ ہے اور حاجت وضرورت کے وقت پڑھے جانے والے تشہد سے مراد وہ خطبہ ہے جو نکاح وغیرہ کے وقت پڑھا جاتا ہے۔ یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک صرف نکاح ہی میں نہیں بلکہ تمام عقود کے وقت خطبہ پڑھنا مسنون ہے۔

روایت میں جو دوسری آیت نقل کی گئی ہے۔ اس میں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ بھی ہیں اور یہ آیت مشکوٰۃ کے تمام نسخوں میں اسی طرح نقل ہوئی ہے حالانکہ قرآن کریم میں یہ آیت یوں نہیں ہے بلکہ دراصل سورہ نساء کی پہلی آیت کا ٹکڑا ہے جو یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے بغیر اس طرح ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا لہٰذا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کا جو مصحف حضرت ابن مسعودؓ کے پاس تھا اس میں یہ آیت اسی طرح ہو۔

حصن حصین سے مفہوم ہوتا ہے کہ ابوداؤد نے مذکورہ خطبہ میں لفظ "ورسولہ" کے بعد یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں اَرْسَلَهٗ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا بَیْنَ یَدَیِ السَّاعَةِ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ یَّعْصِهِمَا فَلَا یَضُرُّ اِلَّا نَفْسَهٗ وَلَا یَضُرُّ اللّٰهَ شَیْئًا۔

جو شخص عقد کرانے بیٹھے وہ پہلے یہ خطبہ پڑھے اور پھر اس کے بعد ایجاب و قبول کرائے اور ایجاب و قبول میں ان باتوں کا لحاظ رکھے جو ضروری ہیں اور جن کا ذکر کتاب النکاح کی ابتدا میں ہو چکا ہے۔

خطبہ کے بغیر نکاح بے برکت رہتا ہے

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کُلُّ خُطْبَةٍ لَیْسَ فِیْهَا تَشَهُّدٌ فَهِیَ کَالْیَدِ الْجَذْمَاءِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کے رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس خطبہ میں تشہد (یعنی خدا کی حمد و ثنا) نہ ہو وہ کٹے ہوئے ہاتھ کی طرح ہے" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح کٹا ہوا ہاتھ بے فائدہ ہوتا ہے کہ ہاتھ والا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اسی طرح خطبہ کے بغیر نکاح بھی بے فائدہ ہے کہ وہ خیر و برکت سے خالی رہتا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے اپنی شرح میں لفظ "خطبہ" کو خ کے زیر کے ساتھ لکھا ہے اور اس کے معنی "تزویج یعنی نکاح کرنا" بیان کئے ہیں جب کہ حضرت مولانا شاہ اسحٰق دہلویؒ نے کہا ہے کہ ہم نے اپنے اساتذہ سے اس لفظ کو خ کے پیش کے ساتھ یعنی خُطبہ سنا ہے اور حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ کے کلام سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے۔

(۱۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَا یُبْدَاُ فِیْهِ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ فَهُوَ اَقْطَعُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس اہم اور عظیم الشان کام کو خدا کی حمد و ثنا کے بغیر شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

نکاح کا اعلان کرنا مستحب ہے

⑬ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم نکاح کا اعلان کیا کرو، نکاح مسجد کے اندر کیا کرو اور نکاح کے وقت دف بجایا کرو" ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "اعلان" سے مراد اگر گواہوں کی موجودگی ہو کہ نکاح گواہوں کے سامنے کیا جائے تو یہ حکم بطریق وجوب ہوگا۔ اور اگر "اعلان" سے مراد "تشہیر" ہو کہ نکاح کی مجلس اعلانیہ طور پر منعقد کرو تو پھر یہ حکم بطریق استحباب ہوگا۔

مسجد میں نکاح کرنا مستحب ہے، اسی طرح جمعہ کے دن نکاح کرنا مستحب ہے کیونکہ مسجد میں اور جمعہ کے دن نکاح کرنے سے برکت حاصل ہوتی ہے۔

⑭ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ حَاطِبِ الْجُمَحِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَصْلُ مَا بَيْنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ الصَّوْتُ وَالدُّفُّ فِي النِّكَاحِ۔ (رواه احمد والترمذی و النسائی وابن ماجة)

"اور حضرت محمد ابن حاطب جمحیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حلال اور حرام کے درمیان فرق، نکاح میں آواز اور دف بجانا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "آواز" سے مراد تو گانا ہے یا لوگوں کے درمیان نکاح کا ذکر و اعلان کرنا ہے۔ حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بغیر آواز اور دف کے نکاح ہوتا ہی نہیں کیونکہ نکاح دو گواہوں کے سامنے بھی ہو جاتا ہے بلکہ اس حدیث کا مقصد لوگوں کو اس بات کی ترغیب دلانا ہے کہ نکاح کی مجلس علانیہ طور پر منعقد کی جائے اور لوگوں میں اس کی تشہیر کی جائے اب رہی یہ بات کہ تشہیر کی حد کیا ہے؟ تو وہ یہ ہے کہ اگر ایک مکان میں نکاح ہو تو دوسرے مکان میں یا پڑوس میں اس کا علم ہو جائے اور یہ چیز دف بجانے یا آواز کے ذریعہ (یعنی گوئی نظم و گیت پڑھنے گانے سے) حاصل ہو جاتی ہے، تشہیر کا مطلب قطعاً نہیں ہے کہ محلوں اور شہروں میں شہنائی، نوبت اور باجوں کے شور و شغب کے ذریعہ نکاح کا اعلان کیا جائے۔

شادی گانے کی اجازت

⑮ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَتْ عِنْدِيْ جَارِيَةٌ مِنَ الْاَنْصَارِ زَوَّجْتُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَائِشَةُ اَلَا تُغَنِّيْنَ فَاِنَّ هٰذَا الْحَيَّ مِنَ الْاَنْصَارِ يُحِبُّوْنَ الْغِنَاءَ رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ فِيْ صَحِيْحِهٖ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میرے پاس ایک انصاری لڑکی تھی جب میں نے اس کا نکاح (کسی سے) کیا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "عائشہؓ! کیا تم گانے کے لئے کسی سے نہیں کہہ رہی ہو؟ کیونکہ یہ انصار کی قوم گانے کو بہت پسند کرتی ہے" (اس روایت کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے)۔"

تشریح: یہ لڑکی جو حضرت عائشہؓ کے پاس رہا کرتی تھی اور جس کا نکاح انہوں نے کیا تھا تو ان کے قرابت داروں میں سے کسی کی تھی جیسا کہ آگے آنے والی حدیث وضاحت کر رہی ہے یا پھر کوئی یتیمہ رہی ہوگی جسے انہوں نے اپنے یہاں رکھ کر پالا پوسا تھا۔

مشکوۃ کے اصل نسخہ میں لفظ رواہ کے بعد کوئی عبارت نہیں لکھی ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف مشکوۃ کو اس روایت کے اصل مآخذ کا علم نہیں ہو سکا تھا، پھر بعد میں دوسرے علماء نے حاشیہ پر یہ عبارت "ابن حبان فی صحیحہ (یعنی اس روایت کو ابن حبان نے اپنی

صحیح میں نقل کیا ہے) لکھدی ہے۔

⑯ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَنْکَحَتْ عَائِشَةُ ذَاتَ قَرَابَةٍ لَهَا مِنَ الْاَنْصَارِ فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَهَدَيْتُمُ الْفَتَاةَ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ اَرْسَلْتُمْ مَعَهَا مَنْ تُغَنِّي قَالَتْ لَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْاَنْصَارَ قَوْمٌ فِيْهِمْ غَزَلٌ فَلَوْ بَعَثْتُمْ مَعَهَا مَنْ يَقُوْلُ اَتَيْنَاكُمْ اَتَيْنَاكُمْ فَحَيَّانَا وَحَيَّاكُمْ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے ایک لڑکی کا نکاح کیا جو انصاری تھی اور ان کے قرابتداروں میں سے تھی چنانچہ جب (نکاح کے بعد) رسول کریم ﷺ (گھر میں) تشریف لائے تو پوچھا کہ کیا تم نے اس لڑکی کو کہ جس کا نکاح کیا گیا ہے۔ اس کے خاوند کے گھر بھیجدیا ہے؟" گھر والوں نے کہا کہ "ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم نے اس کے ساتھ کسی گانے والے کو بھی بھیجا ہے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "انصار ایک ایسی قوم ہے جس میں گانے کا شوق ہے، کاش! تم اس کے ساتھ کسی ایسے شخص کو بھیج دیتیں جو یہ گاتا ہوا جاتا اَتَيْنَاكُمْ اَتَيْنَاكُمْ فَحَيَّانَا وَحَيَّاكُمْ (یعنی ہم تمہارے پاس آئے ہم تمہارے پاس آئے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور تمہیں بھی سلامتی کے ساتھ رکھے)۔" (ابن ماجہ)

تشریح: شادی بیاہ کے موقعہ پر طربیہ اشعار کے ذریعہ خوشی و مسرت کا اظہار ایک قدیم روایت ہے، چنانچہ انصار میں بھی یہ روایت جاری تھی اور وہ اسے بہت پسند کرتے تھے، اسی وجہ سے جب حضرت عائشہؓ نے اس انصاری لڑکی کا نکاح کیا اور اس کے ساتھ کسی گانے والے کو نہیں بھیجا تو آنحضرت ﷺ نے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ اگر اس لڑکی کے ساتھ کوئی گانے والا بھی جاتا تو اس موقعہ پر اس کے طربیہ اشعار لڑکی کے سسرال والوں کے جذبات مسرت و خوشی میں یقیناً اضافہ کرتے، پھر آپ ﷺ نے اس طربیہ گیت کا ایک مصرعہ بھی پڑھ کر سنایا جو عرب میں شادی بیاہ کے موقع پر گایا جاتا تھا، چنانچہ وہ پورا شعر یوں ہے ۔

اَتَيْنَاكُمْ اَتَيْنَاكُمْ فَحَيَّانَا وَحَيَّاكُمْ وَلَوْلَا الْحِنْطَةُ السَّمْرَاءُ لَمْ تَسْمُنْ عَذَارَاكُمْ

ہم تمہارے پاس آئے خداوند تعالیٰ تمہیں بھی اور ہمیں بھی سلامتی کے ساتھ رکھے۔ اگر سرخ گیہوں نہ ہوتے تو تمہاری کنواریاں گدازبدن والی نہ ہوتیں۔

بعض لوگوں نے کہا ہے دوسرا مصرعہ "ولو الحنطه الخ" کی بجائے یہ ہے:

وَلَوْلَا الْعَجْوَةُ السَّوْدَاءُ مَا كُنَّا بِوَادِيْكُمْ

اگر سیاہ کھجوریں نہ ہوتیں تو ہم تمہارے مکانوں میں نہ رہتے (بلکہ بھوک کے مارے کہیں نکل جاتے)

دو نکاحوں میں پہلا نکاح درست ہے

⑰ وَعَنْ سَمُرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَيُّمَا امْرَاَةٍ زَوَّجَهَا وَلِيَّانِ فَهِيَ لِلْاَوَّلِ مِنْهُمَا وَمَنْ بَاعَ بَيْعًا مِنْ رُجُلَيْنِ فَهُوَ لِلْاَوَّلِ مِنْهُمَا۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس عورت کے دو ولی اس کا نکاح کر دیں تو وہ عورت ان دونوں میں سے اس کے لئے ہے جس کا ساتھ نکاح پہلے ہوا ہے، اور جو شخص (کسی ایک چیز کو) دو آدمیوں کے ہاتھ بیچے تو وہ چیز ان دونوں میں سے اس کے لئے ہے جسے پہلے بیچی گئی ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: کسی عورت کے دو ولی ہوں اور دونوں ولی اس عورت کا نکاح الگ الگ وقتوں میں دو مردوں سے کر دیں بایں طور کہ پہلے ایک ولی نے کسی شخص سے نکاح کر دیا پھر دوسرے ولی نے کسی دوسرے شخص سے نکاح کر دیا تو دوسرے ولی کا کیا ہوا نکاح باطل ہوگا اور وہ

عورت اسی شخص کی بیوی ہوگی جس سے پہلے نکاح ہوا ہے لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ دونوں ولی ایک ہی درجہ کے ہوں یعنی دونوں یکساں قرابت رکھتے ہوں، اگر دونوں ولی ایک درجے کے نہ ہوں تو پھر وہ ولی مقدم ہوگا۔ جو اقرب ہو یعنی قریبی قرابت رکھتا ہو لہٰذا اس صورت میں وہ عورت اس شخص کی بیوی ہوگی جس سے اس کے قریبی قرابت والے ولی نے نکاح کیا ہے چاہے اس نے پہلے نکاح کیا ہو اور چاہے بعد میں کیا ہو۔ اور اگر عورت کے یکساں درجہ والے دو ولی اس کا نکاح ایک وقت میں دو الگ الگ مردوں سے کر دیں مثلاً ایک ولی نے زید سے نکاح کیا اور ٹھیک اسی وقت دوسرے ولی نے بکر سے اس کا نکاح کیا تو اس صورت میں متفقہ طور پر تمام علماء کا مسلک یہ ہے کہ دونوں ہی نکاح باطل ہو گئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

متعہ ابتداء اسلام میں جائز تھا

(۱۸) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنَّا نَغْزُوْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مَعَنَا نِسَاءٌ فَقُلْنَا اَلَا نَخْتَصِيْ فَنَهَانَا عَنْ ذٰلِكَ ثُمَّ رَخَّصَ لَنَا اَنْ نَسْتَمْتِعَ فَكَانَ اَحَدُنَا يَنْكِحُ الْمَرْاَةَ بِالثَّوْبِ اِلٰى اَجَلٍ ثُمَّ قَرَاَ عَبْدُاللّٰهِ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ۔

"حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک غزوہ کے موقع پر) ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ شریک جہاد تھے اور اس وقت ہمارے ساتھ ہماری عورتیں (یعنی بیویاں اور لونڈیاں) نہیں تھیں چنانچہ (جب عورتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم جنسی ہیجان سے پریشان ہوئے تو) ہم نے کہا کہ کیا ہم خصی نہ ہو جائیں (تاکہ جنسی ہیجان اور شیطان کے وسوسوں سے ہمیں نجات مل جائے) لیکن رسول کریم ﷺ نے ہم کو اس سے تو منع فرما دیا البتہ ہمیں متعہ کرنے کی اجازت دیدی چنانچہ ہم میں سے بعض لوگ کپڑے کے معاوضہ پر ایک معینہ مدت کے لئے عورت سے نکاح (یعنی متعہ) کر لیتے تھے۔ اس کے بعد ابن مسعودؓ نے یہ آیت پڑھی: يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ (اے ایمان والو! جن پاک چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے ان کو حرام نہ سمجھو)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث متعہ کی اجازت پر دلالت کرتی ہے، چنانچہ ابتداء اسلام میں متعہ کی اجازت تھی مگر بعد میں یہ اجازت منسوخ ہو گئی اور اب متعہ کرنا حرام ہے جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے بھی معلوم ہوگا اور پہلے بھی وہ احادیث گذر چکی ہیں جن سے متعہ کی اجازت کا منسوخ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کا مذکورہ بالا آیت پڑھنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ بھی حضرت ابن عباسؓ کی طرح متعہ کی مباح ہونے کے قائل تھے، لیکن حضرت ابن عباسؓ کے بارہ میں تو یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا اور وہ بھی متعہ کے حرام ہونے کے قائل ہو گئے تھے جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے معلوم ہوگا، اب رہی حضرت ابن مسعودؓ کی بات تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے بھی اس کے بعد اس سے رجوع کر لیا ہو اور وہ بھی متعہ کے حرام ہونے کے قائل ہو گئے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں جواز متعہ کے منسوخ ہونے کا صریح حکم معلوم ہی نہ ہوا ہو اور اس وجہ سے وہ آخر تک جواز متعہ کے قائل رہے ہوں۔

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّمَا كَانَتِ الْمُتْعَةُ فِيْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ كَانَ الرَّجُلُ يَقْدَمُ الْبَلْدَةَ لَيْسَ لَهٗ بِهَا مَعْرِفَةٌ فَيَتَزَوَّجُ الْمَرْاَةَ بِقَدْرِ مَا يُرٰى اَنَّهٗ يُقِيْمُ فَتَحْفَظُ لَهٗ مَتَاعَهٗ وَتُصْلِحُ لَهٗ شَيْئَهٗ حَتّٰى اِذَا نَزَلَتِ الْاٰيَةُ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَكُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا فَهُوَ حَرَامٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ متعہ (کا جواز) صرف ابتداء اسلام میں تھا (اور اس وقت متعہ کی ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ) جب کوئی

مرد کسی شہر میں جاتا اور وہاں (لوگوں سے) اس کی کوئی شناسائی نہ ہوتی (کہ جن کے ہاں وہ اپنے قیام وطعام کا بندوبست کرتا) تو وہاں کسی عورت سے اتنی مدت کے لئے نکاح کر لیتا جتنی مدت اس کو ٹھہرنا ہوتا، چنانچہ وہ عورت اس کے سامان کی دیکھ بھال کرتی، اور اس کا کھانا پکاتی، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ان دونوں (یعنی بیوی اور لونڈی) کی شرمگاہ کے علاوہ ہر شرم گاہ حرام ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: آیت کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ اپنی شرم گاہوں کو اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے محفوظ رکھتے ہیں ان پر کوئی ملامت نہیں ہے لیکن جو لوگ اپنی بیویوں اور لونڈیوں پر قناعت نہیں کرتے یا جو لوگ نکاح کے ذریعہ اپنی شرعی طور پر اپنی جنسی خواہش کی تسکین کا سامان نہیں کرتے بلکہ غیر عورتوں کی طرف مائل ہوتے ہیں وہ دراصل حلال سے گذر کر حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہیں جن کے لئے سخت ملامت ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد سے حضرت ابن عباسؓ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ پرہیزگار بندوں کی تعریف بیان کی ہے کہ وہ عورتوں سے اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں البتہ اپنی بیویوں اور اپنی لونڈیوں سے اجتناب نہیں کرتے بلکہ ان کے ذریعہ اپنے جنسی جذبات کو تسکین پہنچاتے ہیں اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ متعہ کی صورت میں جو اس عورت پر تسلط حاصل ہوتا ہے وہ نہ تو بیوی ہوتی ہے اور نہ مملوکہ (لونڈی) ہوتی ہے کیونکہ اگر وہ بیوی ہوتی تو اس کے اور اس کے مرد کے درمیان میراث کا سلسلہ ضرور ہوتا اور یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ متعہ کی عورت کے ساتھ میراث کا کوئی سلسلہ قائم نہیں ہوتا چونکہ وہ عورت محض چند روز (یعنی ایک متعین مدت) کے لئے اجرت پر اپنے نفس کو اس مرد کے حوالہ کرتی ہے۔ اس لئے وہ مملوکہ بھی نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص متعہ کے طور پر کسی عورت سے جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ تو وہ ان لوگوں کے زمرہ میں نہیں ہے جن کی توصیف مذکورہ آیت بیان کر رہی ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ جو شخص کسی عورت سے متعہ کرتا ہے تو وہ عورت اس کی بیوی نہیں بنتی اور جب وہ بیوی نہیں بنتی تو پھر لامحالہ یہ واجب ہوگا کہ وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہو۔

شیعوں کے بارہ میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان کے نزدیک متعہ جائز ہے، چنانچہ بڑی مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ وہ حضرت ابن عباسؓ کے قول پر تو عمل کرتے ہوئے متعہ کو جائز کہتے ہیں۔ باوجودیکہ جواز متعہ کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کا اپنے قول سے رجوع کرنا ثابت ہو چکا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مسلک وعقیدہ کو ترک کرتے ہیں اور ان کے خلاف عمل کرتے ہیں جب کہ صحیح مسلم میں یہ روایت موجود ہے کہ جب حضرت علیؓ نے یہ سنا کہ حضرت ابن عباسؓ متعہ کو جائز کہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ ابن عباسؓ! ایسا نہ کہو کیونکہ میں نے خود سنا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کے دن متعہ اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا۔

شادی بیاہ کے موقع پر گانے کی اجازت

(۲۰) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی قَرَظَةَ بْنِ کَعْبٍ وَاَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ فِیْ عُرْسٍ وَاِذَا جَوَارٍ یُغَنِّیْنَ فَقُلْتُ اَیْ صَاحِبَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَھْلَ بَدْرٍ یُفْعَلُ ھٰذَا عِنْدَکُمْ فَقَالَا اجْلِسْ اِنْ شِئْتَ فَاسْمَعْ مَعَنَا وَاِنْ شِئْتَ فَاذْھَبْ فَاِنَّہٗ قَدْ رُخِّصَ لَنَا فِی اللَّھْوِ عِنْدَ الْعُرْسِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت عامر بن سعدؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ جب ایک شادی میں شرکت کے لئے پہنچا جہاں (دو صحابی) حضرت قرظہ ابن کعبؓ اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ بھی موجود تھے، تو دیکھا کہ چند بچیاں گا رہی ہیں میں نے کہا کہ "اے رسول کریم (ﷺ) کے صحابیوں اور جنگ بدر میں شریک رہنے والو! کیا تمہارے سامنے بھی یہ (گانا) ہو رہا ہے؟ (یہ سنکر) ان دونوں صحابیوں نے کہا کہ "بیٹھ جاؤ! اگر تمہارا جی چاہے تو تم بھی ہمارے ساتھ سنو اور چاہے چلے جاؤ، کیونکہ شادی بیاہ کے موقع پر ہمیں گیت (گانے سننے) کی اجازت دی گئی ہے۔" (نسائیؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی گانے کی حرمت وکراہت ہی مشہور تھی، عیدین اور نکاح وغیرہ کی تخصیص بعض لوگوں کو تو معلوم تھی اور بعض لوگوں کو معلوم نہیں تھی، چنانچہ حضرت عامر ابن سعدؓ انہیں لوگوں میں سے تھے جنہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ عیدین اور شادی بیاہ وغیرہ میں گانا جائز ہے۔

بَابُ الْمُحَرَّمَاتِ

جو عورتیں مرد پر حرام ہیں ان کا بیان

نکاح کے صحیح ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ عورت محرمات میں سے نہ ہو، لہٰذا اس باب میں یہی بتایا جائے گا کہ کون کون عورتیں محرمات میں سے ہیں کہ جن سے نکاح کرنا حرام ہے! ان عورتوں کی تفصیل فقہ حنفی کی مشہور و معتمد کتاب فتاویٰ عالمگیری میں بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کی گئی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کی اس تفصیل کو یہاں ذکر کر دیا جائے۔

محرمات کی تفصیل

جو عورتیں محرمات میں سے ہیں ان کی نو قسمیں ہیں یا یوں کہئے کہ نکاح کے حرام ہونے کے نو سبب ہیں جن کی نمبروار تفصیل یوں ہے۔

پہلا سبب — نسبی رشتہ: جو عورتیں نسبی رشتہ کے سبب حرام ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ۔ بھتیجی اور بھانجی۔ لہٰذا ان رشتوں سے نکاح کرنا جماع کرنا اور ایسے کام کرنا جو جماع کے محرک اور سبب بن جاتے ہیں۔ جیسے بوسہ لینا وغیرہ یہ سب کام ہمیشہ کے لئے حرام ہیں۔

"ماں" سے اپنی ماں بھی مراد ہے اور دادی اور نانی (خواہ اوپر کے درجہ کی ہوں جیسے پردادی اور پرنانی وغیرہ) بھی مراد ہیں! بیٹی کے حکم میں اپنی حقیقی بیٹی، اپنے بیٹے کی بیٹی (پوتی) اپنی بیٹی کی بیٹی (یعنی نواسی) اور اس طرح نیچے تک سب شامل ہیں۔ اسی طرح "بہن" خواہ حقیقی ہو خواہ سوتیلی صرف باپ شریک) ہو اور خواہ اخیافی (صرف ماں شریک ہو) سب حرام ہیں۔

"بھتیجی اور بھانجی" سے بھی تین طرح کی بھتیجیاں اور بھانجیاں یعنی حقیقی بھائی بہن کی اولاد، سوتیلے بھائی بہن کی اولاد اور اخیافی بھائی بہن کی اولاد مراد ہیں (اگرچہ نیچے درجہ کی ہوں) کہ یہ سب محرمات میں سے ہیں۔

پھوپھی بھی تینوں طرح کی مراد ہیں یعنی حقیقی پھوپھی، سوتیلی (باپ شریک) پھوپھی اور اخیافی (صرف ماں شریک) پھوپھی، اسی طرح پھوپھی کے حکم میں باپ کی پھوپھی اور دادا کی پھوپھی اور دادی کی پھوپھی بھی شامل ہیں کہ یہ سب پھوپھیاں بھی محرمات میں سے ہیں: ہاں پھوپھی کی پھوپھی حرام ہے یا نہیں اس میں تفصیل ہے۔ اگر مثلاً زید کی پھوپھی اس کے باپ کی حقیقی بہن ہو یا سوتیلی (یعنی صرف باپ شریک) بہن ہو تو اس پھوپھی کی پھوپھی زید کے لئے حرام ہوگی اور اگر زید کی پھوپھی اس کے باپ کی اخیافی (یعنی صرف ماں شریک) بہن ہو تو ایسی پھوپھی زید کے لئے حرام نہیں ہوگی۔

خالہ بھی کئی طرح کی مراد ہیں تفصیل ہے، اگر مثلاً سوتیلی خالہ، اخیافی خالہ، اپنے باپ کی خالہ اور اپنی ماں کی خالہ یہ سب خالائیں حرام ہیں لیکن خالہ کی خالہ کے بارہ میں تفصیل ہے، اگر مثلاً زید کی خالہ اس کی ماں کی حقیقی بہن ہو یا اخیافی (یعنی صرف ماں شریک) بہن ہو تو اس خالہ کی خالہ زید کے لئے حرام ہوگی یعنی اس سے زید کا نکاح نہیں ہو سکتا اور اگر زید کی خالہ اس کی ماں کی سوتیلی (یعنی صرف باپ شریک) بہن ہو تو ایسی خالہ حرام نہیں ہوگی۔ اس سے زید کا نکاح جائز ہوگا۔

دوسرا سبب — سسرالی رشتہ: وہ عورتیں جو بسبب صہریت یعنی سسرالی رشتہ کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہیں ان کی چار قسمیں ہیں۔ ایک

ساس یعنی بیوی کی ماں، دویا ساس، یعنی بیوی کی دادی، ننیا ساس یعنی بیوی کی نانی اور اس سے اوپر کے درجہ کی مثلاً بیوی کے باپ اور ماں کی دادی وغیرہ بیوی کی بیٹی اور اور بیوی کے بیٹوں کی اولاد اور اس سے نیچے کے درجہ کی مثلاً بیوی کی نواسی کی اولاد وغیرہ یہ سب حرام ہیں بشرطیکہ بیوی سے جماع کر لیا ہو، خواہ وہ (بیوی کی) بیٹی اس مرد کی پرورش میں ہو یا نہ ہو! اور حنفی علماء نے بیوی کی بیٹیوں کی حرمت کے سلسلہ میں خلوت صحیحہ کو جماع کا قائم مقام قرار نہیں دیا یعنی بیوی کی بیٹیوں کی حرمت ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ مرد نکاح کے بعد بیوی سے جماع بھی کر لے اگر صرف خلوت صحیحہ ہوئی ہو۔! (یعنی جماع کرنے کا پورا موقع مل گیا ہو) مگر دونوں نے جماع نہ کیا ہو تو اس صورت میں اس بیوی کی بیٹی (جو دوسرے شوہر کے نطفہ سے ہو) کی حرمت ثابت نہیں ہوگی بہو یعنی بیٹے کی بیوی، پوت بہو یعنی پوتے کی بیوی اور نواسی بہو یعنی نواسے کی بیوی اور اس سے نیچے کے درجہ کی (یعنی پڑپوتے کی بیوی وغیرہ) اور ان عورتوں کے ساتھ ان کے شوہروں یعنی بیٹے اور پوتے وغیرہ نے جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو دونوں صورتوں میں حرام ہیں۔ ہاں لے پالک یعنی منہ بولے بیٹے کی بیوی حرام نہیں ہوتی یعنی مثلاً زید بکر کا منہ بولا بیٹا ہے تو زید کی بیوی بکر کے حق میں محرمات میں سے نہیں ہوگی اگر زید اپنی بیوی کو طلاق دیدے یا وہ مر جائے تو بکر اس کی مطلقہ یا وہ بیوہ سے اپنا نکاح کر سکتا ہے باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں اور دادا اور نانا کی بیویاں یعنی سوتیلی دادی اور سوتیلی نانی اور اس سے اوپر کے درجہ کے یہ سب بھی ہمیشہ کے لئے حرام ہیں نہ ان سے نکاح ہو سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے طریقہ سے جماع ہو سکتا ہے۔

سسرالی رشتہ سے حرمت اس صورت میں ثابت ہوتی ہے جب کہ نکاح صحیح ہو، فاسد نکاح سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، چنانچہ اگر کسی شخص نے کسی عورت سے زنا کیا تو زنا کرنے والے کے لئے اس عورت کی ماں، دادی، نانی اور اس عورت کی بیٹی پوتی نواسی سب حرام ہو جائیں گی اسی طرح اس عورت کے لئے زنا کرنے والے کے باپ، دادا، نانا اور اس عورت کے لڑکے، پوتے نواسے سب حرام ہو جائیں گے۔

اگر کسی شخص نے ایک عورت سے جماع کیا جس کی وجہ سے اس عورت کے پیشاب اور پاخانہ کا مقام ایک ہو گیا تو اس عورت کی ماں جماع کرنے والے کے لئے حرام نہیں ہوگی کیونکہ اس صورت میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے عورت کے پیشاب کے مقام ہی میں جماع کیا ہے، ہاں اگر جماع کے بعد وہ عورت حاملہ ہو جائے اور یہ معلوم بھی ہو جائے کہ یہ حمل اسی شخص کے نطفہ سے قرار پایا ہے تو اس صورت میں اس کی ماں اس کے لئے حرام ہو جائے گی۔ اور جس طرح یہ حرمت جماع کرنے سے ثابت ہوتی ہے اسی طرح (شہوت کے ساتھ) عورت کو چھونے، بوسہ لینے اور شہوت کے ساتھ عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھنے سے ثابت ہو جاتی ہے۔ اور یہ مذکورہ چیزیں یعنی چھونا وغیرہ خواہ نکاح کی صورت میں پیش آئیں یا خواہ ملکیت کی صورت اور خواہ فجور کی صورت میں حنفیہ کے نزدیک یہ تینوں یکساں ہیں۔ نیز حنفی علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس بارہ میں شبہ اور غیر شبہ برابر ہیں اور اس سلسلہ میں شہوت کے ساتھ مباشرت (مرد و عورت کا شہوت کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹنا) بھی بوسہ کے حکم میں ہے اسی طرح معانقہ کا بھی یہی حکم ہے، ایسے ہی اگر شہوت کے ساتھ دانتوں سے اس کو کاٹا تو بھی یہی حکم ہے یعنی ان تمام صورتوں میں حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

اگر کسی نے شہوت کے ساتھ مرد کے عضو مخصوص کی طرف دیکھا یا شہوت کے ساتھ اس کو ہاتھ لگایا یا بوسہ لیا تو اس صورت میں اس کے ساتھ حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی اور بقیہ دوسرے تمام اعضاء کی طرف دیکھنے سے اور ان کو ہاتھ لگانے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی ہاں اگر یہ دیکھنا یا ہاتھ لگانا شہوت کے ساتھ ہو تو پھر بغیر کسی اختلاف کے حرمت ثابت ہو جائے گی۔ حرمت کے سلسلہ میں عورت کی شرمگاہ کے ظاہری حصہ کو دیکھنے کا اعتبار نہیں ہے بلکہ اندر کے حصہ کو دیکھنے سے حرمت ثابت ہوا کرتی ہے چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر مرد کسی کھڑی ہوئی عورت کی شرم گاہ کو دیکھ لے تو اس صورت میں حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ عورت جب کھڑی ہوئی ہو تو اس کی شرم گاہ کے اندرونی حصہ پر نظر نہیں پڑتی بلکہ شرمگاہ کے اندرونی حصہ پر اس وقت نظر پڑے گی جب

وہ پشت سے تکیہ لگائے ہوئے بیٹھی ہو۔ اگر کسی مرد نے عورت کی شرم گاہ کے اندرونی حصہ کو اس طرح دیکھا کہ درمیان میں باریک پردہ یا شیشہ حائل تھا لیکن اندرونی حصہ نظر آرہا تھا تو بھی حرمت ثابت ہو جائے گی۔ ہاں اگر کوئی شخص آئینہ دیکھ رہا تھا اور اس میں کسی عورت کی شرمگاہ نظر آگئی اور پھر مرد نے اس کو شہوت کے ساتھ دیکھا تو اس مرد پر نہ اس عورت کی ماں حرام ہوگی اور نہ بیٹی حرام ہوگی کیونکہ اس نے شرمگاہ کو نہیں دیکھا بلکہ اس کا عکس دیکھا ہے۔ اگر کوئی عورت پانی کے حوض کے کنارے پر یا پل پر بیٹھی ہو اور کسی مرد نے اس کا عکس پانی میں دیکھا اور پھر اس کے بعد وہ شہوت کے ساتھ پانی ہی میں اس کی شرمگاہ کا عکس دیکھتا رہا تو اس صورت میں بھی حرمت ثابت نہیں ہوگی ہاں اگر عورت پانی میں ہو اور مرد کی نگاہ اس کی شرمگاہ پر پڑ جائے اور پھر اسے شہوت کے ساتھ دیکھے تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔

کسی عورت کو شہوت کے ساتھ چھونے سے حرمت ثابت ہونے کے سلسلہ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ قصداً چھوئے تب ہی حرمت ثابت ہوگی بلکہ چاہے قصداً چھوئے یا چاہے بھول کر چھوئے، چاہے کسی کے زبردستی کرنے سے (یا خود غلطی سے) چھوئے اور چاہے نیند کی حالت میں چھوئے ہر صورت میں حرمت ثابت ہو جائے گی۔ چنانچہ اگر کسی مرد نے جماع کرنے کے لئے اپنی بیوی کو نیند سے اٹھانا چاہا مگر غلطی سے اس کا ہاتھ لڑکی پر پڑ گیا اور پھر یہ سمجھ کر کہ یہی میری بیوی ہے شہوت کے ساتھ اس کے چٹکی لی اور وہ لڑکی بھی جوان تھی قابل شہوت تھی تو اس صورت میں اس مرد کے لئے اس لڑکی کی ماں یعنی اس کی بیوی ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی۔

اگر کسی مرد نے شہوت کے ساتھ عورت کے ان بالوں کو ہاتھ لگایا جو سر سے ملے ہوئے ہیں تو حرمت ثابت ہو جائے گی اور اگر لٹکے ہوئے بالوں کو ہاتھ لگایا تو حرمت ثابت نہیں ہوگی مگر ناطفی ؒ نے اس تفصیل کے بغیر مطلقاً بالوں کے چھونے کو حرمت کا باعث لکھا ہے اسی طرح اگر مرد نے عورت کے ناخن کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔

یہ جو بتایا گیا ہے کہ عورت کو شہوت کے ساتھ چھونا اور ہاتھ لگانا حرمت کو ثابت کر دیتا ہے تو اس بارہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ عورت کو چھونے اور ہاتھ لگانے سے اسی صورت میں حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے جب کہ دونوں کے درمیان کپڑا حائل نہ ہو اور اگر کپڑا حائل ہو تو وہ اس قدر باریک ہو کہ چھونے والے کا ہاتھ بدن کی حرارت محسوس نہیں ہوتی تو حرمت ثابت نہیں ہوگی خواہ اس کی وجہ سے مرد کے عضو مخصوص میں استادگی ہی کیوں نہ ہو جائے، اسی طرح اگر کسی مرد نے عورت کے موزہ کے نیچے کا حصہ چھوا تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔ ہاں اگر موزے پر چمڑا چڑھا ہوا ہو جس کی وجہ سے عورت کے پاؤں کی ایڑھی چھونے والے کو محسوس نہ ہو تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

اگر کسی مرد نے عورت کا بوسہ لیا ایسی حالت میں کہ دونوں کے درمیان کپڑا حائل ہو تو حرمت ثابت ہو جائے گی بشرطیکہ بوسہ لینے والے کو عورت کے دانتوں کی یا ہونٹوں کی ٹھنڈک محسوس ہو۔

حرمت ثابت ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ چھونے کے بعد دیر تک چھوتا ہی رہے چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے شہوت کے ساتھ اپنی بیوی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ ہاتھ بیوی کی بجائے اپنی لڑکی کی ناک پر پڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی شہوت زیادہ ہوگئی تو اس لڑکی کی ماں یعنی بیوی اس مرد کے لئے حرام ہو جائے گی اگرچہ اس نے اپنا ہاتھ فوراً ہی ہٹا لیا ہو۔

حرمت ثابت ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ جس عورت کو ہاتھ لگایا جائے یا بوسہ لیا جائے اور وہ قابل شہوت ہو اور فتویٰ اس پر ہے کہ کم سے کم نو سال کی لڑکی قابل شہوت ہوتی ہے اس سے کم نہیں، چنانچہ اگر کسی مرد نے کسی ایسی نابالغہ لڑکی سے جماع کیا جو قابل شہوت نہیں تو حرمت ثابت نہیں ہوگی اس کے برخلاف اگر عورت اتنی بوڑھی ہو جائے کہ قابل شہورت نہ رہے تو وہ حرمت ثابت ہونے کا باعث بن جاتی ہے کیونکہ وہ حرمت کے حکم میں داخل ہو چکی تھی اور بڑھاپے کی وجہ سے اس حکم سے باہر نہیں ہو سکتی جب کہ نابالغہ ابھی حرمت کے حکم میں داخل ہی نہیں ہوئی۔

جس طرح حرمت ثابت ہونے کے لئے عورت کا قابل شہوت ہونا شرط ہے اسی طرح مرد کا بھی قابل شہوت ہونا شرط ہے، لہٰذا اگر چار سال کے بچہ نے مثلاً اپنے باپ کی بیوی (یعنی اپنی سوتیلی ماں) سے جماع کر لیا تو اس کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر جماع کرنے والا ایسا بچہ ہو جس کے ہم عمر بچے عام طور پر جماع کر سکتے ہوں تو اس کا وہی حکم ہوگا جو بالغ کا ہوتا ہے اور اس بارہ میں علماء نے لکھا ہے کہ ایسے بچہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ جماع کرنے پر قادر ہو، عورت کی طرف اس کا میلان ظاہر ہوتا ہو، اور عورتیں اس سے شرم کرتی ہوں۔

مذکورہ بالا چیزوں یعنی چھونے اور دیکھنے کے بارہ میں شہوت (یعنی ہیجان) کا ہونا شرط ہے یعنی عورت کو ہاتھ لگانے، بوسہ لینے اور شرم گاہ کے اندرونی حصہ کی طرف دیکھتے وقت اگر شہوت ہو تب حرمت ثابت ہوگی لہٰذا اگر یہ دونوں چیزیں بغیر شہوت کے پائی جائیں اور پھر بعد میں شہوت پیدا ہو تو حرمت ثابت نہیں ہوگی اور شہوت کا معیار مرد کے لئے یہ ہے کہ اس کے عضو مخصوص میں استادگی ہو جائے اور اگر استادگی پہلے سے تھی تو اس میں زیادتی ہو جائے۔ اس مسئلہ میں یہی قول صحیح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، لہٰذا اگر کسی مرد کے عضو مخصوص میں استادگی تھی ایسی حالت میں اس نے اپنی بیوی کو اپنے پاس بلایا اور پھر اسی دوران کسی طرح اس کا عضو مخصوص اس کی لڑکی کی دونوں رانوں کے درمیان داخل ہو گیا۔ تو اس صورت میں اگر اس کے عضو مخصوص کی استادگی میں زیادتی نہ پیدا ہو گئی ہو تو اس لڑکی کی ماں یعنی اس کی بیوی اس کے لئے حرام نہیں ہوگی۔ اور شہوت کا معیار اس مرد کے لئے ہے جو جوان اور جماع کرنے پر قادر ہو اور اگر مرد بوڑھا ہو تو اس کے حق میں شہوت کا معیار یہ ہے کہ خواہش کے وقت اس کے قلب میں حرکت پیدا ہو جائے اگر پہلے سے حرکت نہیں تھی اور اگر قلب میں پہلے سے حرکت موجود تھی تو اس خواہش میں زیادتی ہو جائے اور عورت کے لئے اور اس مرد کے لئے جس کا عضو مخصوص کٹا ہوا ہو شہوت کا معیار یہ ہے کہ قلب میں خواہش پیدا ہو اور ہاتھ لگانے وغیرہ سے جنسی لذت حاصل ہو۔ اگر خواہش وغیرہ پہلے سے موجود نہ تھی۔ اور اگر یہ پہلے سے موجود تھی تو اس میں زیادتی ہو جائے، اور یہ بات ملحوظ رہے کہ مرد و عورت میں سے کسی ایک میں شہوت کا ہونا حرمت ثابت ہونے کے لئے کافی ہے۔

ہاتھ لگانے یا بوسہ لینے وغیرہ سے جو حرمت ثابت ہوتی ہے اس میں یہ شرط اور ضروری ہے کہ انزال نہ ہو، اگر ہاتھ لگانے یا شرم گاہ کی طرف دیکھنے کے وقت انزال ہو گیا تو حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی۔ کیونکہ اب انزال ہونے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ چھونا وغیرہ جماع لینے کا سبب نہیں بنا۔ اگر کسی مرد نے عورت کی مقعد کی طرف دیکھا تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی اسی طرح اگر کسی مرد نے عورت کے پیچھے کی طرف بدفعلی کی تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ ایسے ہی اگر مرد کے ساتھ جماع کے افعال کئے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

اگر کسی مرد نے اپنی بیوی کے ساتھ حرمت مصاہرت کا اقرار کیا تو اس کا اعتبار کیا جائے گا اور ان دونوں یعنی میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کرا دی جائے گی اسی طرح اگر مرد نکاح سے قبل زمانہ کی طرف حرمت کی نسبت کرے یعنی اپنی بیوی سے یوں کہے کہ میں نے تم سے نکاح کرنے سے پہلے تمہاری ماں سے جماع کیا تھا تو اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا اور دونوں میں جدائی کرا دی جائے گی لیکن اس عورت کا پورا مہر (جو نکاح کے وقت متعین ہوا تھا) واجب ہوگا عقد واجب نہیں ہوگا اور اس اقرار کے لئے مداومت شرط نہیں ہے یعنی صرف ایک مرتبہ اقرار کر لینا کافی ہے بار بار اقرار کرنا ضروری نہیں ہے اسی لئے اگر کوئی شخص اپنے اقرار سے رجوع کر لے یعنی ایک مرتبہ اقرار کرنے کے بعد پھر انکار کر دے تو قاضی اس نکاح کو صحیح تسلیم نہیں کرے گا ہاں اگر اس نے واقعۃً غلط اقرار کیا تھا تو عند اللہ وہ عورت اس کی بیوی رہے گی اگرچہ ظاہراً قاضی جدائی کر دے گا۔

اگر کسی شخص نے ایک عورت کے بارہ میں یہ کہا کہ میری رضاعی ماں ہے (یعنی اس عورت نے مجھے دودھ پلایا ہے) اور پھر کچھ عرصہ بعد جب اس عورت سے نکاح کرنا چاہے اور یہ کہے کہ میں نے پہلے یہ غلط کہا تھا کہ یہ میری رضاعی ماں ہے تو اس صورت میں اس کے

لئے اس عورت سے نکاح کرنا استحسانا جائز ہوگا۔

اگر کسی شخص نے عورت کا بوسہ لیا اور پھر کہنے لگا کہ یہ شہوت کے ساتھ نہیں تھا، یا عورت کو چھوا اور یا اس کی شرم گاہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ شہوت کے ساتھ نہیں تھا تو بوسہ لینے کی صورت میں تو فوراً حرمت کا حکم لگا دیا جائے گا جب تک کہ یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس نے واقعی شہوت کے ساتھ بوسہ نہیں لیا تھا، اور دوسری دونوں صورتوں میں حرمت کا حکم فوراً لگا دیا جائے گا بلکہ جب یہ یقین ہو جائے کہ یہ چیز شہوت کے ساتھ سرزد ہوئی ہے تو حرمت کا حکم لگایا جائے گا۔ اور یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ بوسہ عام طور پر شہوت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور بوسہ کی بنیاد ہی شہوت پر ہوتی ہے بخلاف چھونے اور دیکھنے کے کہ یہ دونوں فعل بغیر شہوت کے بھی سرزد ہوتے ہیں مگر یہ حکم اس صورت میں ہے کہ جب کہ شرمگاہ کے علاوہ کسی اور عضو کو چھوا ہو اور اگر کسی شخص نے عورت کی شرم گاہ کو چھوا اور پھر کہا کہ یہ شہوت کے ساتھ نہیں تھا تو ایسی صورت میں اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اگر کسی شخص نے عورت کی چھاتی پکڑ لی اور کہا کہ شہوت کے ساتھ نہیں پکڑی تھی تو اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اسی طرح اگر عورت کے ساتھ جانور پر سوار ہوا تو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ ہاں اگر عورت کی پشت پر سوار ہو کر دریا کو پار کیا اور کہا کہ اس وقت شہوت نہیں تھی۔ تو اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔

ایک شخص نے لوگوں کے سامنے اقرار کیا کہ میں نے فلاں عورت کو شہوت کے ساتھ چھوا ہے یا اس کا بوسہ لیا ہے اور ان لوگوں نے اس کے اس اقرار کی گواہی دی تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی اور حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی اسی طرح اگر گواہ یہ کہیں کہ فلاں شخص نے فلاں عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا تھا، یا بوسہ لیا تھا تو ان کی گواہی مانی جائے گی کیونکہ شہوت ایک ایسی چیز ہے جو فی الجملہ معلوم ہو جاتی ہے چنانچہ جن لوگوں کے عضو میں حرکت ہوتی ہے اس کو دیکھ کر اور جن کے عضو میں حرکت نہیں ہوتی ان کے بارہ میں دوسری علامتوں سے شہوت کا معلوم ہو جانا ممکن ہوتا ہے۔

قاضی علی سعدیؒ فرماتے ہیں کہ اگر نشہ میں مدہوش کسی شخص نے اپنی لڑکی کو پکڑ کر اپنے بدن سے لپٹایا اور اس کا بوسہ لیا اور پھر جب اس سے جماع کرنے کا ارادہ کیا تو لڑکی نے کہا کہ میں تمہاری لڑکی ہوں، یہ سنکر اس شخص نے لڑکی کو چھوڑ دیا تو اس صورت میں بھی لڑکی کی ماں یعنی اس شخص کی بیوی اس کے لئے حرام ہو جائے گی۔

اگر کسی شخص سے پوچھا گیا کہ تم نے اپنی ساس کے ساتھ کیا کیا ہے؟ اس نے جواب میں کہا کہ میں نے جماع کیا ہے تو اس صورت میں بھی حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی اگرچہ سوال کرنے والے نے مذاق میں سوال کیا ہو اور اس شخص نے بھی ازراہ مذاق ہی جواب دیا ہو، پھر اس کے بعد وہ شخص لاکھ کہے کہ میں نے یہ بات غلط کہی تھی اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

اگر کسی شخص نے کسی ایسی لونڈی کے بارہ میں جو اس کی ملکیت میں ہو، یہ کہا کہ میں نے اس لونڈی سے جماع کیا ہے تو وہ لونڈی اس کے لڑکے کے لئے حلال نہیں ہوگی اور اگر اس نے کسی ایسی لونڈی کے بارہ میں جو اس کی ملکیت میں نہیں ہے بلکہ کسی اور کی ہے یہ کہا کہ میں نے اس سے جماع کیا ہے تو اس صورت میں اس کے لڑکے کے لئے یہ جائز ہوگا کہ اپنے باپ کی اس بات کا اعتبار نہ کرے اور اس لونڈی کو اپنی ملکیت میں لے کر اس سے جماع کر لے، اور اگر کسی شخص کو اپنے باپ کی میراث میں کوئی لونڈی ملی تو وہ اس سے جماع کر سکتا ہے جب تک کہ یقین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ باپ نے اس لونڈی کے ساتھ جماع کیا ہے۔

اگر کسی شخص نے کسی عورت سے اس شرط پر شادی کی کہ وہ باکرہ ہے لیکن شادی کے بعد جب اس سے جماع کرنے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ باکرہ نہیں ہے، پھر اس نے عورت سے پوچھا کہ تمہارا پردہ بکارت کس طرح زائل ہوا ہے (یعنی تمہارے ساتھ کسی مرد نے جماع کیا ہے؟) عورت نے جواب دیا کہ تمہارے باپ نے۔ اس صورت میں اگر وہ شخص (خاوند) اس کی بات کا اعتبار کرے تو نکاح ختم ہو جائے گا۔ اور عورت مہر کی حقدار نہیں ہوگی اور اگر وہ شخص اس کی بات کا اعتبار نہ کرے اور کہے کہ تم جھوٹ بولتی ہو تو نکاح باقی

رہے گا۔

اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کے لڑکے کے بارہ میں کہا کہ اس نے مجھے شہوت کے ساتھ چھوا ہے لہٰذا میں اپنے شوہر کی بیوی نہیں رہی تو عورت کی اس بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ شوہر کے لڑکے کا قول معتبر ہوگا۔

کسی شخص نے اپنے باپ کی بیوی کا شہوت کے ساتھ زبردستی بوسہ لیا، یا کسی باپ نے اپنے لڑکے کی بیوی کا شہوت کے ساتھ زبردستی بوسہ لیا اور شوہر نے کہا کہ یہ عمل شہوت کے ساتھ نہیں تھا تو شوہر کی بات کا اعتبار کیا جائے گا اور یہ اسی کی بیوی رہے گی، لیکن اگر شوہر نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ بوسہ لینا واقعی شہوت ہی کے ساتھ تھا تو پھر دونوں (میاں بیوی) میں جدائی ہو جائے گی، لیکن اگر شوہر نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ بوسہ لینا واقعی شہوت ہی کے ساتھ تھا تو پھر دونوں (میاں بیوی) میں جدائی ہو جائے گی اور شوہر پر مہر واجب ہوگا مگر شوہر وہ رقم جو اس نے مہر میں ادا کی ہے اس شخص سے وصول کر لے گا جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے بشرطیکہ اس نے فتنہ پھیلانے کے لئے یہ حرکت کی ہو اور اگر یہ حرکت فتنہ پھیلانے کے مقصد سے نہیں تھی تو پھر کچھ بھی وصول کرنے کا حق نہیں ہوگا۔

اور اگر اس مسئلہ میں بوسہ لینے کی بجائے (باپ نے لڑکے کی بیوی سے یا لڑکے نے باپ کی بیوی سے) جماع کر لیا تو اس صورت میں شوہر مہر میں دی ہوئی رقم کسی طرح بھی وصول نہیں کر سکتا کیونکہ جماع کرنے والے پر حد واجب ہوگی اور ضابطہ یہ ہے کہ شرعی حد کے ساتھ کوئی مالی جرمانہ واجب نہیں ہوا کرتا۔

کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کی باندی کے ساتھ نکاح کیا اور پھر اس کے قبل کہ اس کا خاوند جماع کرتا باندی نے شوہر کے لڑکے کا شہوت کے ساتھ بوسہ لیا، خاوند نے دعوی کیا کہ میری بیوی نے میرے لڑکے کا بوسہ شہوت کے ساتھ لیا ہے مگر باندی کے آقا نے کہا کہ یہ غلط ہے، اس صورت میں نکاح ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ شوہر نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ میری بیوی نے شہوت کے ساتھ بوسہ لیا ہے، لیکن شوہر پر پورا مہر واجب نہیں ہوگا بلکہ نصف مہر واجب ہوگا کیونکہ اس باندی کے مالک نے اس کی بات کو جھٹلایا ہے اس بارہ میں لونڈی کا قول معتبر نہیں ہوگا کہ میں نے شہوت کے ساتھ بوسہ لیا تھا لہٰذا پورا مہر دو۔

اگر کسی عورت نے لڑائی جھگڑے میں اپنے دادا کا عضو مخصوص پکڑ لیا اور کہا کہ میں نے شہوت کے ساتھ نہیں پکڑا تھا تو اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔

حرمت مصاہرت یا حرمت رضاعت کی وجہ سے نکاح بالکل باطل نہیں ہو جاتا بلکہ فاسد ہو جاتا ہے (جس کی وجہ سے جماع کرنا حرام ہو جاتا ہے لہٰذا شوہر کو چاہئے کہ طلاق دیدے اگر وہ طلاق نہ دے تو پھر قاضی دونوں کے درمیان جدائی کرا دے) چنانچہ جدائی سے پہلے اگر شوہر نے جماع کر لیا تو اس پر حد واجب نہیں ہوگی خواہ اس نے جماع شبہ میں مبتلا ہو کر کیا ہو یا بغیر شبہ کے کیا ہو۔ اگر کسی شخص نے ایک عورت سے حرام کاری کی یا ایسا کوئی بھی فعل کیا جس سے حرمت مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے جیسے چھونا وغیرہ اور پھر توبہ کر لی تو یہ شخص اس عورت کی لڑکی کا محرم ہی رہے گا اس لئے کہ اس کی لڑکی سے نکاح کرنا اس کے حق میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محرمت، زنا سے ثابت ہوتی ہے اور ایسے ہی ان تمام چیزوں سے بھی ثابت ہو جاتی ہے جن سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے جیسے چھونا وغیرہ۔

اگر مثلاً زید نے خالدہ سے نکاح کیا اور زید کے لڑکے نے (جو خالدہ کے پیٹ سے نہیں ہے) خالدہ کی بیٹی سے (جو خالدہ کے پہلے شوہر سے ہے) نکاح کر لیا یا خالدہ کی ماں سے نکاح کر لیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر کسی شخص نے عضو مخصوص پر کپڑا لپیٹ کر اپنی بیوی سے جماع کیا تو دیکھا جائے گا کہ وہ کپڑا باریک تھا اور مرد کے عضو مخصوص کو حرارت محسوس ہونے سے نہیں روکتا تھا تو وہ عورت جماع کے بعد پہلے شوہر کے لئے (جس نے اسے طلاق مغلظہ دے دی تھی) حلال ہو جائے گی اور اگر کپڑا ایسا تھا جس کی وجہ سے اس کے عضو مخصوص کو حرارت محسوس نہیں ہو رہی تھی تو وہ عورت اپنے شوہر کے لئے

حلال نہیں ہوگی۔

تیسرا سبب — دودھ کا رشتہ: یعنی وہ عورتیں جو رضاعت (دودھ پلانے) کی وجہ سے حرام ہیں، چنانچہ تمام وہ رشتے جو نسبی اور سسرالی ہونے کی وجہ سے حرام ہیں رضاعت کی وجہ سے بھی حرام رہیں گے اگر کسی عورت نے کسی بچہ کو اس کی شیر خوارگی کی عمر میں دودھ پلایا ہے تو ان دونوں میں ماں اور اولاد کا تعلق پیدا ہو جائے گا لہٰذا دودھ پلانے والی عورت کا شوہر دودھ پینے والے بچہ کا رضاعی باپ ہوگا جس کی وجہ سے رضاعی ماں اور باپ کے تمام وہ رشتے دار اس بچہ کے لئے حرام ہوں گے۔ جو حقیقی ماں اور باپ کی رشتہ داری کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں۔

شیر خوارگی کی عمر میں مطلقاً دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے خواہ زیادہ دودھ پیا ہو خواہ کم پیا ہو اور کم کی آخری حد یہ ہے کہ دودھ کا پیٹ میں مطلقاً پہنچ جانا یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے۔ شیر خوارگی کی عمر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق تو تیس مہینہ تک ہے اور صاحبینؒ یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے قول کے مطابق دو برس تک ہے۔

اگر کسی بچہ نے شیر خوارگی کی عمر میں دودھ پینا بند کر دیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد اس نے شیر خوارگی ہی کی عمر میں دودھ پیا تو یہ رضاعت کے حکم میں داخل ہوگا کیونکہ دودھ پلانا شیر خوارگی ہی کی مدت میں واقع ہوا ہے۔ شیر خوارگی کی مدت رضاعت گذر جانے کے بعد دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دودھ پلانے کی اجرت کے استحقاق کے سلسلہ میں شیر خوارگی کی مدت دو برس ہی تسلیم کی گئی ہے چنانچہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اس مطلقہ نے اس کے بچہ کو دو برس کی عمر کے بعد دودھ پلانے کی اجرت کا مطالبہ بچہ کے باپ (یعنی اپنے سابق شوہر) سے کیا تو اس کا مطالبہ تسلیم نہیں ہوگا اور بچہ کے باپ کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنی مطلقہ کو دو برس کے بعد کے عرصہ کے دودھ پلانے کی اجرت دے ہاں اس کی مطلقہ نے دو برس کے عرصہ میں جو دودھ پلایا ہے اس کی اجرت دینے پر اسے مجبور کیا جائے گا۔

حرمت رضاعت جس طرح رضاعی ماں (یعنی دودھ پلانے والی) کی رشتہ داروں میں ثابت ہوتی ہے اسی طرح رضاعی باپ کے رشتہ داروں میں بھی ثابت ہوتی ہے اور "رضاعی باپ" سے مراد دودھ پلانے والی کا وہ خاوند ہے جس کے جماع کی وجہ سے دودھ اترتا ہے۔

"رضیع" (یعنی دودھ پینے والے) پر اس کے رضاعی ماں باپ اور ان رضاعی ماں باپ کے اصول (یعنی ان کے باپ دادا وغیرہ) اور ان کے فروع (یعنی ان کی اولاد) خواہ وہ نسبی ہوں یا رضاعی، سب حرام ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے دودھ پینے سے پہلے اس کی رضاعی ماں کے ہاں جو اولاد ہو چکی ہوگی، یا اس کے دودھ پینے کے بعد جو اولاد ہوگی اور وہ اولاد خواہ اس کے رضاعی باپ سے ہو خواہ اس کی رضاعی ماں کے کسی دوسرے شوہر سے ہو، یا اس کی رضاعی ماں نے کسی دوسرے شخص کے بچہ کو دودھ پلایا یا اس کے رضاعی باپ کی کسی دوسری بیوی کے ہاں کوئی بچہ ہوا تو یہ سب رضیع کے رضاعی بہن اور بھائی بہن کی اولاد، اس کے بھتیجے، بھتیجی اور بھانجے، بھانجی ہوں گے، اسی طرح رضاعی باپ کا بھائی اس کا چچا ہوگا، رضاعی باپ کی بہن اس کی پھوپھی ہوگی، رضاعی ماں کا بھائی اس کا ماموں ہوگا رضاعی ماں کی بہن اس کی خالہ ہوگی اور رضاعی ماں کا دادا اور اس کی دادی ونانی رضیع کا دادا اور اس کی دادی ونانی ہوگی۔

جس طرح رضاعت میں نسبی رشتوں کی حرمت ثابت ہوتی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اسی طرح رضاعت میں حرمت مصاہرت یعنی سسرالی رشتہ کی حرمت بھی ثابت ہوتی ہے چنانچہ رضاعی باپ کی بیوی، اور رضیع (دودھ پینے والے) پر حرام ہے اور رضیع کی بیوی اس کے رضاعی باپ پر حرام ہے، اسی پر دوسرے رشتوں کو بھی قیاس کیا جاتا ہے لیکن دو صورتیں مستثنیٰ ہیں۔ اول تو یہ کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اپنے نسبی بیٹے کی بہن سے نکاح کر لے تو یہ اس کے لئے جائز نہیں ہے لیکن رضاعت یعنی دودھ کے رشتہ میں یہ جائز ہے کیونکہ کسی شخص کے نسبی بیٹے کی بہن اگر اس کے نطفہ سے ہے تو وہ اس کی حقیقی بیٹی ہوگی اور اگر اس کے نطفہ سے نہیں ہے تو پھر یہ (یعنی اس کی

سوتیلی بیٹی) ہوگی جب کہ دودھ کے رشتہ میں یہ دونوں باتیں مفقود ہوتی ہیں چنانچہ اگر نسبی رشتہ میں بھی ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی بات نہیں پائی جائے گی تو نکاح درست ہوگا مثلاً کسی ایسی لونڈی کے بچہ پیدا ہوا جو دو آدمیوں کی مشترک مملوکہ ہے اور وہ دونوں شریک اس بچہ پر اپنا اپنا دعوی کرتے ہیں یہاں تک کہ اس بچہ کا نسب ان دونوں سے ثابت ہو گیا، ادھر ان دونوں کے ہاں اپنی اپنی عورت سے ایک ایک بیٹی ہے تو اب ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ دوسرے شریک کی بیٹی سے اپنا نکاح کر لے کیونکہ اس صورت میں دونوں باتوں میں سے ایک بات بھی نہیں پائی گئی باوجودیکہ ان میں سے جس نے بھی دوسرے کی بیٹی سے نکاح کیا ہے اس نے گویا اپنے نسبی بیٹے کی بہن سے نکاح کیا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے نسبی بھائی کی ماں سے نکاح کرے اور دودھ کے رشتہ میں یہ جائز ہے کیونکہ نسبی رشتہ میں یا تو یہ صورت ہوگی کہ وہ دونوں اخیافی (یعنی سرالی صرف ماں شریک) بھائی ہوں گے۔ اسی طرح دونوں کی ماں ایک ہی ہوگی یا یہ صورت ہوگی کہ وہ دونوں سوتیلے (صرف باپ شریک) بھائی ہوں گے اسی طرح بھائی کی ماں اپنے باپ کی بیوی ہوگی جب کہ دودھ کے رشتہ میں یہ دونوں باتیں مفقود ہوتی ہیں۔

دودھ شریک بھائی کی بہن سے (یعنی جس نے اس کی ماں کا دودھ پیا ہے اس کی بہن سے) نکاح کرنا جائز ہے جس طرح کہ نسبی رشتہ میں جائز ہے مثلاً زید کا ایک سوتیلا بھائی ہے جس کا نام بکر ہے اور بکر کی ایک اخیافی بہن ہے (یعنی دونوں کی ماں تو ایک ہے مگر باپ الگ الگ ہیں) تو بکر کی اس اخیافی بہن سے نکاح کرنا زید کے لئے جائز ہوگا جو بکر کا سوتیلا بھائی ہے۔

دودھ شریک بھائی کی ماں (یعنی جس نے اس کی ماں کا دودھ پیا ہے اس کی ماں) محرمات میں سے نہیں ہے، اسی طرح رضاعی چچا، رضاعی ماموں، رضاعی پھوپھی اور رضاعی خالہ کی ماں بھی محرمات میں سے نہیں۔ اپنی رضاعی پوتی کی ماں سے نکاح کرنا جائز ہے اسی طرح اپنے رضاعی بیٹے کی دادی اور نانی سے بھی نکاح کرنا جائز ہے۔ رضاعی بیٹے کی پھوپھی، اس کی بہن کی ماں، اس کی بھانجی اور اس کی پھوپھی کی بیٹی سے بھی نکاح کرنا جائز ہے، اسی طرح عورت کو اپنی رضاعی بہن کے باپ، اپنے رضاعی بیٹے کے بھائی، اپنے رضاعی پوتے کے باپ اور اپنے رضاعی بیٹے کے دادا اور ماموں سے نکاح کرنا جائز ہے جب کہ نسبی رشتہ میں یہ سب محرمات میں سے ہیں جن سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا۔

کسی شخص نے اپنی بیوی کو جس کے دودھ اترا ہوا تھا طلاق دیدی پھر اس مطلقہ نے عدت کے دن گزار کر ایک دوسرے شخص سے نکاح کر لیا اور اس دوسرے خاوند نے اس سے جماع کیا تو اس بارہ میں علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب اس دوسرے خاوند کے نطفہ سے اس کے بچہ پیدا ہوگا، تو اس عورت کے دودھ کا سبب بھی دوسرا خاوند قرار پائے گا، اس کے دودھ سے پہلے خاوند کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا ہاں اگر دوسرے خاوند سے حاملہ نہیں ہوگی تو اس دودھ کا سبب پہلا ہی خاوند سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر یہ صورت ہو کہ دوسرے شوہر سے حاملہ تو ہوئی مگر ابھی بچہ پیدا نہیں ہوا ہے تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جب تک اس دوسرے شوہر کا بچہ پیدا نہ ہو جائے وہ دودھ پہلے شوہر ہی کا کہلائے گا۔

ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا لیکن اس سے کبھی بھی کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا پھر (بغیر کسی ولادت کے) اس کے دودھ اتر آیا اور وہ دودھ اس نے کسی دوسرے کے بچہ کو پلایا تو وہ دودھ اسی عورت کا کہلائے گا اس کے خاوند کا اس دودھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اس صورت میں اس دودھ پینے والے بچہ اور اس شخص کی اس اولاد کے درمیان جو دوسری بیوی سے ہو، حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔

ایک شخص نے کسی عورت سے زنا کیا جس کے نتیجہ میں اس کے ہاں ولادت ہوئی اور پھر اس عورت نے کسی دوسری لڑکی کو دودھ پلایا تو اس زنا کرنے والے، اس کے باپ دادا، اور اس کی اولاد کو اس دودھ پینے والی لڑکی سے نکاح کرنا جائز نہیں، ہاں زنا کرنے والے کا چچا اور اس کا ماموں نکاح کر سکتا ہے جس طرح کہ زنا کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی لڑکی سے زنا کرنیوالے کا چچا اور ماموں نکاح کر سکتا

ہے۔ کسی شخص نے شبہ میں مبتلا ہو کر (یعنی کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر) ایک عورت سے جماع کر لیا جس سے وہ حاملہ ہو گئی اور پھر اس نے کسی بچہ کو دودھ پلایا تو یہ بچہ اس جماع کرنے والے کا رضاعی بیٹا ہو گا اس پر یہ قیاس کیا جانا چاہئے کہ جن صورتوں میں بچہ کا نسب جماع کرنے والے سے ثابت ہوتا ہے انہی صورتوں میں رشتہ رضاعت بھی اس سے ثابت ہو گا اور جن صورتوں میں بچہ کا نسب جماع کرنے والے سے ثابت نہیں ہوتا اس صورت میں رشتہ رضاعت دودھ پلانے والی عورت سے ثابت ہو گا۔

کسی شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اس سے عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ عورت نے اپنے بچہ کو دودھ پلایا اور بعد میں دودھ خشک ہو گیا، کچھ عرصہ کے بعد دودھ پھر اتر آیا اور اس نے کسی دوسرے لڑکے کو وہ دودھ پلایا تو اس لڑکے کے لئے اس شخص کی اس اولاد سے نکاح کرنا جائز ہو گا جو اس دودھ پلانے والی عورت کے علاوہ کسی دوسری بیوی کے بطن سے ہو،

کسی کنواری لڑکی کے دودھ اتر آیا اور اس نے وہ دودھ کسی بچی کو پلایا تو یہ اس بچی کی رضاعی ماں ہو گی اور رضاعت کے تمام احکام دونوں کے حق میں ثابت ہوں گے لہٰذا اگر کسی شخص نے اس کنواری لڑکی سے نکاح کیا اور جماع سے پہلے اسے طلاق دیدی تو اس شخص کے لئے اس دودھ پینے والی لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہو گا (کیونکہ اس صورت میں بیوی کی بیٹی کا بھی یہی حکم ہے) اور اگر جماع کے بعد طلاق دی تو اس لڑکی سے نکاح کرنا نا جائز ہو گا۔

اگر کسی ایسی لڑکی کے دودھ اتر آیا جس کی عمر نو برس سے کم تھی اور پھر اس نے وہ دودھ ایک لڑکے کو پلایا تو اس سے دونوں کے درمیان حرمت رضاعت ثابت نہیں ہو گی کیونکہ حرمت رضاعت اسی صورت میں ثابت ہوتی ہے جب کہ دودھ نو برس یا نو برس سے زائد کی عمر میں اترے۔ اسی طرح اگر کسی کنواری لڑکی کی چھاتیوں میں زرد رنگ کا پانی اتر آیا تو اس کے پلانے سے بھی حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

کسی عورت نے ایک بچہ کے منہ میں اپنی چھاتی داخل کر دی لیکن بچہ کا اس کی چھاتی سے دودھ چوسنا معلوم نہیں ہوا تو اس صورت میں شک کی وجہ سے حرمت رضاعت کا حکم نافذ نہیں کیا جائے گا البتہ احتیاط کا تقاضا یہی ہو گا کہ حرمت ثابت کی جائے۔

کسی عورت کی چھاتی سے زرد رنگ کی بہنے والی پتلی چیز بچہ کے منہ میں پہنچ گئی تو حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی اور یہی کہا جائے گا کہ یہ دودھ ہی ہے جس کا رنگ متغیر ہو گیا ہے۔

اگر کسی مرد کی چھاتیوں میں دودھ اتر آیا اور اس نے کسی بچہ کو پلا دیا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہو گی اور حرمت ثابت ہونے کے لئے زندہ اور مردہ عورت کے دودھ کا یکساں حکم ہے۔ اور اگر دو بچوں نے کسی ایک چارپائے جانور کا دودھ پیا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہو گی۔

رضاعت کا حکم دار الاسلام اور دار الحرب دونوں جگہ یکساں ہے، لہٰذا اگر کسی (کافر) عورت نے دار الحرب میں (کسی کافر) بچہ کو دودھ پلایا اور پھر وہ (دودھ پلانے والی، اس کے قرابتدار اور دودھ پینے والا بچہ) مسلمان ہو گئے یا وہ (دار الحرب میں اسلام ہی کی حالت میں تھے اور پھر) دار الحرب سے دار الاسلام میں آ گئے تو پھر رضاعت کے تمام احکام نافذ ہوں گے۔

جس طرح عورت کی چھاتی سے دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے اسی طرح بچہ کے منہ میں دودھ ڈال دینے یا ناک میں نچوڑ دینے سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے البتہ کان میں ٹپکانے، عضو مخصوص کے سوراخ میں ڈالنے، حقنہ کے ذریعہ استعمال کرنے اور مقعد میں اور دماغ اور پیٹ کے زخم میں ڈالنے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی اگرچہ دودھ ان زخموں کے ذریعہ دماغ اور پیٹ میں پہنچ جائے۔ لیکن حضرت امام محمدؒ کے نزدیک حقنہ کے ذریعہ استعمال کرنے سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

اگر غذا کی کسی چیز میں دودھ مل گیا اور اسے آگ پر پکا کر کھانا بنا لیا گیا جس کی وجہ سے دودھ کی حقیقت بدل گئی تو اس کو کھانے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی خواہ دودھ غالب ہو یا مغلوب ہو، اور اگر دودھ ملی ہوئی چیز آگ پر پکائی نہیں گئی تو اس صورت میں بھی اس کو کھانے سے

حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ بشرطیکہ اس چیز میں دودھ غالب نہ ہو اور اگر وہ دودھ غالب ہوگا تو بھی حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک حرمت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ جب بہنے والی چیز جمی ہوئی چیز میں مخلوط ہوگئی تو بہنے والی چیز اس جمی ہوئی چیز کے تابع ہوگئی اور مشروبات کی قسم سے خارج ہوگئی یعنی پینے کے قابل نہیں رہی اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ جس چیز میں دودھ مخلوط ہوگیا اگر وہ غالب نہ ہو اور اب بھی وہ دودھ بہنے کے قابل ہو تو اس کے پینے سے حرمت ثابت ہو جائے گی۔

اگر عورت کا دودھ (کسی جانور مثلا) بکری کے دودھ میں مخلوط ہوگیا اور عورت کا دودھ غالب ہے تو اس کو پینے سے حرمت ثابت ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر عورت نے اپنے دودھ میں روٹی بھگوئی اور روٹی نے دودھ کو جذب کر لیا یا اپنے دودھ میں ستو گھولا اور پھر وہ روٹی یا ستو کسی بچہ کو کھلا دیا تو اگر اس میں دودھ کا ذائقہ موجود ہو تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔ لیکن ذائقہ کی موجودگی کی شرط اسی صورت میں ہے جب کہ اس کو لقمہ لقمہ کر کے کھلایا جائے اور اگر گھونٹ گھونٹ کر کے پلایا گیا تو پھر (اگر ذائقہ موجود نہ ہو) تب بھی حرمت ثابت ہو جائے گی۔

اگر عورت کا دودھ، پانی یا دوا جانور کے دودھ میں مخلوط ہوگیا تو اس میں غالب کا اعتبار ہوگا یعنی اگر وہ دودھ غالب ہوگا تو اس کو پینے سے حرمت ثابت ہو جائے گی اور اگر پانی وغیرہ غالب ہوگا تو حرمت ثابت نہیں ہوگی) اس طرح اگر عورت کا دودھ کسی بھی پتلی (سیال) چیز یا کسی بھی جمی ہوئی چیز میں مخلوط ہو جائے تو غالب کا اعتبار ہوگا۔ اور "غالب" سے مراد یہ ہے کہ اس کا رنگ "بو" اور ذائقہ تینوں چیزیں یا ان میں سے کوئی ایک چیز محسوس و معلوم ہو۔ اور اگر دونوں چیزیں (یعنی دودھ اور وہ چیز جس میں دودھ مخلوط ہوگیا ہے) برابر ہوں تو حرمت کا ثابت ہونا ضروری ہو جائے گا کیونکہ دودھ مغلوب نہیں ہے۔

اگر دو عورتوں کا دودھ باہم مل گیا ہے تو حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک اس عورت سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی جس کا دودھ زیادہ اور غالب ہو لیکن حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں دونوں عورتوں سے حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی، حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول بھی اسی کے مطابق ہے اور یہی قول زیادہ صحیح اور اقرب الی الاحتیاط ہے اور اگر دونوں عورتوں کا دودھ برابر ہو تو متفقہ طور پر (یعنی ان تینوں ائمہ کے نزدیک) مسئلہ یہی ہے کہ دونوں عورتوں کے ساتھ حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

اگر کسی عورت نے اپنے دودھ کا چھاچھ یا دہی یا پنیر اور یا ماوا وغیرہ بنا لیا اور اسے کسی بچہ کو کھلا دیا تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ اس پر رضاعت (یعنی دودھ پینے) کا اطلاق نہیں ہوتا۔

بستی و گاؤں کی کسی عورت نے ایک بچی کو دودھ پلایا مگر بعد میں یہ کسی کو بھی یاد و معلوم نہیں رہا کہ وہ دودھ پلانے والی عورت کون تھی اور پھر اس بستی کے کسی شخص نے اس لڑکی سے نکاح کر لیا تو یہ نکاح جائز ہو جائے گا۔

عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ بلا ضرورت کسی بچہ کو اپنا دودھ نہ پلائیں اور اگر کسی بچہ کو اپنا دودھ پلائیں تو یاد رکھیں یا لکھ لیا کریں (عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بلا ضرورت دوسروں کے بچوں کے منہ میں اپنی چھاتی دیدیتی ہیں اور انہیں دودھ پلادیتی ہیں اور پھر بعد میں انہیں یاد بھی نہیں رہتا کہ کس بچہ کو میں نے اپنا دودھ پلایا ہے اس کی وجہ سے حرمت رضاعت کے احکام کی صریحا خلاف ورزی ہوتی ہے لہٰذا اس بارہ میں احتیاط ضروری ہے)

دودھ خواہ پہلے پلایا ہو خواہ بعد میں پلایا گیا ہو حرمت رضاعت بہر صورت ثابت ہو جائے گی پہلے اور بعد میں کوئی فرق نہیں ہوگا لہٰذا اگر کسی شخص نے ایک شیر خوار بچی سے نکاح کر لیا اور پھر بعد میں اس شخص (یعنی خاوند) کی نسبی یا رضاعی ماں نے یا بہن نے یا لڑکی نے آکر اس کو اپنا دودھ پلا دیا تو یہ بچی اس شخص کے لئے حرام ہو جائے گی اور اس پر نصف مہر واجب ہوگا لیکن اس نصف مہر کے طور پر جو رقم وہ ادا کرے گا۔ اسے وہ مرضعہ (یعنی دودھ پلانے والی) سے وصول کریگا بشرطیکہ اس دودھ پلانے والی نے محض شرارت (یعنی نکاح ختم کرنے

کے لئے اپنا دودھ پلادیا ہو اور اگر اس نے شرارت کی نیت سے دودھ نہ پلایا ہو (بلکہ وہ بچی بھوک سے بلک رہی تھی اور اس عورت نے ہمدردی کے جذبہ سے اسے دودھ پلادیا) تو پھر خاوند اس سے اپنی رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

کسی شخص نے دو شیر خوار بچیوں سے نکاح کیا اس کے بعد ایک اجنبی عورت نے آکر ان دونوں بچیوں کو ایک ساتھ یا یکے بعد دیگرے دودھ پلادیا تو وہ دونوں بچیاں شوہر کے لئے حرام ہو جائیں گی اور پھر اس کے بعد وہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے جسے وہ پسند کرے نکاح کر سکتا ہے۔ اور اگر (اس کے نکاح میں دو کی بجائے) تین بچیاں ہوں۔ اور اس عورت نے ان تینوں کو ایکساتھ دودھ پلایا تو وہ تینوں حرام ہو جائیں گی اس کے بعد وہ ان تینوں میں سے جس سے چاہے نکاح کر سکتا ہے۔ اور اگر تینوں کو یکے بعد دیگرے پلایا تو پہلی دو تو حرام ہو جائیں گی اور تیسری اس کی بیوی رہے گی۔ اور اگر پہلے تو دو بچیوں کو ایک ساتھ پلایا اور اس کے بعد تیسری کو پلایا تو بھی یہی حکم ہو گا۔ اور اگر پہلے ایک لڑکی کو پلایا اور بعد میں دو کو ایک ساتھ پلایا تو تینوں حرام ہو جائیں گیا اور ان میں سے ہر ایک بچی کا نصف مہر اس پر واجب ہو گا جسے وہ دودھ پلانے والی سے وصول کرے گا۔ بشرطیکہ اس نے شرارت کی نیت سے دودھ پلایا ہو اور اگر (اس کے نکاح میں) چار بچیاں ہوں اور اس عورت نے ان چاروں بچیوں کو ایک ساتھ یا یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے دودھ پلایا ہو تو چاروں حرام ہو جائیں گی اور اگر پہلے ایک کو اور پھر تین کو ایک ساتھ پلایا ہو تو بھی یہی حکم ہو گا۔ اور اگر پہلے تین کو ایکساتھ اور بعد میں چوتھی کو پلایا تو چوتھی حرام نہیں ہو گی۔

اگر کسی شخص نے ایک بڑی عورت سے اور ایک شیر خوار بچی سے نکاح کیا اور پھر بڑی نے چھوٹی کو اپنا دودھ پلادیا تو شوہر کے لئے دونوں حرام ہو جائیں گی اب اگر اس شخص نے بڑی سے جماع نہیں کیا تھا تو اس کو کچھ مہر نہیں ملے گا۔ اور چھوٹی کو اس کا آدھا مہر دینا واجب ہو گا جسے وہ بڑی سے وصول کر لے گا۔ بشرطیکہ اس نے شرارت کی نیت سے اسے دودھ پلایا ہو اور اگر اس نے دودھ شرارت کی نیت سے نہیں پلایا تو اس سے کچھ وصول نہیں کیا جائے گا اگرچہ اس بڑی کو یہ معلوم ہو کہ یہ چھوٹی بچی میرے شوہر کی بیوی ہے۔

رضاعت (دودھ پلانے) کا ثبوت دو باتوں میں سے کسی ایک بات سے ہو جاتا ہے ایک تو اقرار (یعنی کوئی عورت خود اقرار کرے کہ میں نے فلاں کو دودھ پلایا ہے اور دوسرے گواہی (یعنی گواہ یہ گواہی دیں کہ فلاں عورت نے فلاں بچے کو دودھ پلایا ہے) اور رضاعت کے سلسلہ میں گواہی یا تو دو مردوں کی معتبر ہوتی ہے یا ایک مرد اور دو عورتوں کی بشرطیکہ وہ عادل ہوں۔

(حرمت رضاعت کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان) جو تفریق (جدائی) ہوتی ہے وہ قاضی کے حکم کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے اور جب دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں (کسی میاں بیوی کے درمیان) رضاعت کے رشتہ کی گواہی دیں اور اس کی بنیاد پر قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کرادے تو عورت کو کچھ نہیں ملے گا بشرطیکہ اس کے ساتھ جماع نہ ہوا ہو اور اگر جماع ہو چکا ہو گا تو مہر مثل اور مہر متعین میں سے جس کی مقدار کم ہو گی وہ مہر خاوند پر واجب ہو گا اور نفقہ و سکنہ (یعنی کھانے پینے کا خرچ اور رہنے کے لئے مکان) واجب نہیں ہو گا۔

اگر دو عادل مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں نے نکاح ہو جانے کے بعد شادی شدہ عورت کے سامنے گواہی دی (اور کہا کہ شوہر کے ساتھ تمہارا رشتہ رضاعت ثابت ہوتا ہے) تو اس عورت کے لئے شوہر کے ساتھ رہنا جائز نہیں کیونکہ یہ شہادت صحیح ہے بایں طور کہ جس طرح یہ شہادت اگر قاضی کے سامنے دی جاتی تو رضاعت ثابت ہو جاتی (اور وہ دونوں کے درمیان تفریق کرادیتا) اسی طرح جب یہ شہادت عورت کے سامنے آئے گی تو اس کا حکم بھی وہی ہو گا اور اگر رضاعت کی یہ خبر صرف ایک شخص دے اور اس عورت کے دل میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے تو شوہر سے پرہیز کرنا بہتر ہے لیکن واجب نہیں ہے۔

ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس کے بعد ایک دوسری عورت نے آکر ان دونوں میاں بیوی سے کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے تو اس مسئلہ کی چار صورتیں ہوں گی۔

(۱) اگر دونوں میاں بیوی نے اس عورت کا اعتبار کر لیا تو نکاح فاسد ہو جائے گا اور عورت کو کچھ مہر نہیں ملے گا بشرطیکہ اس کے ساتھ

جماع نہ ہوا ہو۔

❷ اگر دونوں میاں بیوی نے اس عورت کا اعتبار نہ کیا تو نکاح بحالہ باقی رہے گا لیکن اگر وہ عورت (جس نے رشتہ رضاعت کی خبر دی ہے) عادل ہے تو پھر احتیاط کا تقاضہ یہی ہوگا کہ خاوند اپنی بیوی کو چھوڑ دے، اب اگر اس نے چھوڑ دیا تو بہتر یہ ہے کہ خاوند نصف مہر دیدے اور عورت کے لئے بہتر یہ ہے کہ کچھ نہ لے بشرطیکہ چھوڑنا جماع سے پہلے ہو، اور اگر چھوڑنے سے پہلے جماع ہو چکا ہو تو مرد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اس کا پورا مہر بھی دیدے اور (عدت کے ایام پورے ہونے تک) نفقہ و سکنہ بھی دے اور عورت کے لئے بہتر یہ ہے کہ مہر مثل و مہر متعین میں سے جس کی مقدار کم ہو وہ لے لے اور نفقہ و سکنہ نہ لے، اور اگر خاوند نے بیوی کو نہیں چھوڑا (یعنی اس نے طلاق نہیں دی) تو بیوی کو خاوند کے پاس رہنا جائز ہے، اسی طرح اگر دو عورتوں نے، یا ایک مرد اور ایک عورت نے یا دو غیر عادل مردوں نے یا غیر عادل ایک مرد اور دو عورتوں نے رضاعت کی گواہی دی تو اس کا بھی یہی حکم ہوگا یعنی خاوند کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔

❸ اگر خاوند نے اس عورت کا اعتبار کیا اور بیوی نے اعتبار نہیں کیا تو نکاح فاسد ہو جائے گا اور مہر دینا واجب ہوگا۔

❹ اگر بیوی نے اس عورت کا اعتبار کیا مگر خاوند نے اس کا اعتبار نہیں کیا تو نکاح بحالہ باقی رہیگا لیکن بیوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاوند سے قسم کھلوائے (کہ وہ واقعۃ اس عورت کی بات کو صحیح نہیں سمجھتا) اور اگر خاوند قسم کھانے سے انکار کر دے تو دونوں کے درمیان جدائی کرادی جائے گی۔

ایک مرد نے کسی عورت سے نکاح کیا اور پھر کہنے لگا کہ یہ میری رضاعی بہن ہے یا اس کی طرف اسی قسم کے کسی اور رضاعی رشتہ کی نسبت کی، اس کے بعد اس نے کہا کہ مجھے وہم ہو گیا تھا میں نے جو کچھ کہا تھا غلط تھا تو استحساناً ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کرائے جائے گی بشرطیکہ وہ اپنی اس دوسری بات پر قائم رہے (کہ میں نے جو کچھ کہا تھا غلط ہے) اور اگر وہ اپنی پہلی بات پر قائم رہے اور یہ کہے کہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح ہے تو اس صورت میں دونوں کے درمیان تفریق کرادی جائے گی پھر اس کے بعد وہ اپنی پہلی بات سے انکار کرے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور اگر عورت نے اپنے خاوند کی اس بات کی تصدیق کر دی تو اس کو کچھ مہر نہیں ملے گا (بشرطیکہ اس کے ساتھ جماع نہ ہوا ہو) اور اگر عورت نے اپنے خاوند کی اس بات کی تکذیب کی تو مرد پر اس عورت کا نصف مہر واجب ہوگا (بشرطیکہ اس کے ساتھ جماع نہ ہوا ہو) اور اگر اس عورت کے ساتھ جماع ہو چکا ہو اور وہ اپنے خاوند کی اس بات کی تصدیق نہ کرے تو مرد پر اس کا پورا مہر اور نفقہ و سکنہ واجب ہوگا۔

اور اگر مرد نے کسی عورت کے بارہ میں اس سے نکاح کرنے سے پہلے یہ کہا کہ یہ میری رضاعی بہن ہے یا رضاعی ماں ہے اور پھر بعد میں کہنے لگا مجھے وہم ہو گیا تھا یا مجھ سے چوک ہو گئی تھی (یعنی میں نے پہلے جو کچھ کہا تھا غلط ہے) تو اس شخص کو اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ اور اگر اپنی سابقہ بات پر قائم رہا یعنی بعد میں اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ پہلے کہا تھا وہ صحیح ہے تو اس صورت میں اس عورت سے اس کو نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا اور اگر وہ اس کے باوجود نکاح کر لے تو ان دونوں کے درمیان جدائی کرادی جائے گی اور اگر وہ اپنے سابقہ اقرار ہی سے مکر جائے (یعنی یہ کہنے لگے کہ میں نے یہ اقرار نہیں کیا تھا کہ یہ میری رضاعی ماں یا بہن ہے) لیکن دو شخص اس بات کی گواہی دیں کہ اس نے اقرار کیا تھا تو پھر اس صورت میں ان کے درمیان جدائی کرادی جائے گی۔

اگر کسی عورت نے کسی مرد کے بارہ میں اقرار کیا کہ یہ میرا رضاعی باپ رضاعی بھائی یا رضاعی بھتیجا ہے لیکن مرد نے اس کا انکار کیا اور اس کے بعد پھر عورت نے بھی اپنے قول کی تردید کی اور کہا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی تو اس عورت سے نکاح جائز ہو جائے گا اور اسی طرح اگر مرد نے اس عورت سے نکاح کر لیا قبل اس کے کہ وہ عورت اپنے قول کی تردید کرتی تو نکاح صحیح ہوگا۔

اگر کسی مرد نے کسی عورت سے (جو اس کے نکاح میں ہو) اپنے نسبی رشتہ کا اقرار کیا یعنی یوں کہا کہ یہ عورت میری حقیقی ماں ہے یا حقیقی

بہن ہے یا حقیقی بیٹی ہے اور اس عورت کا نسب کسی کو معلوم نہیں ہے نیز وہ مرد یہ صلاحیت رکھتا ہے (یعنی اس کے بارہ میں یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ عورت اس کی ماں یا بیٹی ہو تو) اس مرد سے دوبارہ پوچھا جائے گا اب اگر وہ یہ کہے کہ مجھے وہم ہو گیا تھا، یا میں چوک گیا تھا، یا میں نے غلط کہا تھا تو استحساناً ان کا نکاح باقی رہے گا اور اگر (دوبارہ پوچھے جانے پر) اس نے یہ کہا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہی صحیح ہے تو پھر دونوں میں تفریق کرا دی جائے گی۔ اور اگر مرد یہ صلاحیت نہیں رکھتا (یعنی ان دونوں کی عمر میں اس قدر تفاوت ہے کہ وہ اس بات کا امکان نہیں رکھتا) کہ وہ عورت جس عمر کی ہے اس عمر کی کوئی عورت اس کی حقیقی ماں یا اس کی حقیقی بہن ہو سکے تو نسب ثابت نہیں ہوگا اور ان دونوں کے درمیان جدائی نہیں کرائی جائے گی اور اگر مرد نے اپنی بیوی کے بارہ میں کہا کہ یہ میری حقیقی لڑکی ہے اور پھر بعد میں اپنی اس بات کی تردید بھی نہیں کی بلکہ اس پر اصرار کرتا رہا حالانکہ لوگوں کو اس لڑکی کا نسب معلوم ہے (یعنی دنیا جانتی ہے کہ یہ لڑکی اس کی نہیں ہے بلکہ دوسرے کی ہے) تو ان دونوں کے درمیان جدائی نہیں کرائی جائے گی اور اسی طرح اگر اس نے یہ کہا کہ یہ میری حقیقی ماں ہے حالانکہ لوگوں کو اس کا نسب معلوم ہے (یعنی سب جانتے ہیں کہ یہ اس کی ماں نہیں ہے) تو اس صورت میں بھی دونوں کے درمیان تفریق نہیں کرائی جائے گی۔

چوتھا سبب — جمع کرنا: یعنی وہ عورتیں جو دوسری عورتوں کے ساتھ جمع ہو کر محرمات میں سے ہو جاتی ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔
① اجنبی عورتوں کو جمع کرنا۔ ② ذوات الارحام کو جمع کرنا۔

پہلی قسم یعنی اجنبی عورتوں کو جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ (شریعت نے جس قدر نکاحوں کی اجازت دی ہے ان سے زیادہ نکاح کرنا چنانچہ شریعت نے آزاد مرد کو ایک وقت میں چار نکاح تک کی اجازت اور غلام کو ایک وقت میں دو نکاح تک کی اجازت دی ہے لہٰذا کسی آزاد شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتوں کو جمع کرے (یعنی چار سے زیادہ عورتوں کو اپنی بیوی بنائے) اور غلام کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایک وقت میں دو سے زیادہ عورتوں کو جمع کرے آزاد شخص کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ایک وقت میں جتنی چاہے (بغیر نکاح) باندیاں رکھے باندیاں رکھنے کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہے لیکن غلام کو (بغیر نکاح) باندی رکھنا جائز نہیں ہے اگرچہ اس کا آقا اجازت دے دے! آزاد شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اور وہ چار عورتیں خواہ آزاد ہوں خواہ باندیاں ہوں خواہ باندی اور آزاد دونوں ملی جلی ہوں۔

اگر کسی شخص نے پانچ عورتوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کیا تو پہلی چار کا نکاح جائز اور پانچویں کا باطل ہوگا اور اگر پانچوں سے ایک ہی عقد میں نکاح کیا تو پانچوں کا نکاح باطل ہوگا اسی طرح اگر کسی غلام نے تین عورتوں سے نکاح کیا تو یہی تفصیل ہوگی (کہ ان تینوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کرنے کی صورت میں تو پہلی دونوں کا نکاح صحیح ہو جائے گا اور تیسری کا باطل ہوگا اور اگر تینوں سے ایک ہی عقد میں نکاح کیا تو تینوں کا نکاح باطل ہوگا۔

اگر کسی حربی کافر نے پانچ کافرہ عورتوں سے نکاح کیا اور پھر وہ سب (یعنی پانچوں بیویاں اور شوہر) مسلمان ہو گئے تو اگر یہ پانچوں نکاح یکے بعد دیگرے ہوئے تھے تو پہلی چار بیویاں جائز رہیں گی اور پانچویں بیوی سے جدائی کرا دی جائے گی اور اگر پانچوں نکاح ایک ہی عقد میں ہوئے تھے تو پانچوں کا نکاح باطل ہو جائے گا اور ان پانچوں سے شوہر کی جدائی کرا دی جائے گی۔

اگر کسی شخص نے پہلے تو ایک عورت سے نکاح کیا اور پھر چار عورتوں سے ایک ساتھ نکاح کیا تو صرف پہلی کا نکاح درست ہوگا بعد کی ان چاروں کا نکاح درست نہیں ہوگا۔

اگر کسی عورت نے ایک عقد میں دو مردوں سے نکاح کیا اور ان میں سے ایک شخص کے نکاح میں پہلے سے چار عورتیں تھیں تو اس کا نکاح (اس) دوسرے شخص کے ساتھ صحیح ہوگا (جس کے نکاح میں پہلے سے چار بیویاں نہیں تھیں اور اگر ان دونوں کے نکاح میں پہلے سے چار چار بیویاں تھیں یا ان میں سے کسی ایک کے بھی نکاح میں چار عورتیں نہیں تھیں تو یہ نکاح کسی کے ساتھ بھی صحیح نہیں ہوگا)۔

جمع کرنے کی دوسری قسم یعنی ذوات الارحام کو جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ (ایسی دو عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھا جائے جو آپس میں ذی رحم اور نسبی رشتہ دار ہوں چنانچہ) دو بہنوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا حرام ہے اسی طرح دو بہنوں کو باندی بنا کر ان سے جماع کرنا بھی حرام ہے (یعنی اگر دو بہنیں بطور باندی کسی کی ملکیت میں ہوں تو دونوں سے جماع نہ کیا جائے اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) خواہ وہ دونوں نسبی (حقیقی) بہنیں ہوں یا رضاعی بہنیں ہوں۔

اس بارہ میں اصول اور ضابطہ یہ ہے کہ ایسی دو عورتیں جو ایک دوسرے کی رشتہ دار ہوں اور ایسا رشتہ ہو کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو مرد فرض کر لیا جائے تو آپس میں ان دونوں کا نکاح درست نہ ہو خواہ وہ رشتہ نسبی (حقیقی) ہو یا رضاعی ہو تو ایسی دو عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہوتا لہٰذا (جس طرح دو حقیقی یا رضاعی بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے اسی طرح) لڑکی اور اس کی حقیقی یا رضاعی پھوپھی کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ ایسے ہی کسی لڑکی اور اس کی حقیقی یا رضاعی خالہ یا اسی قسم کی کسی اور رشتہ دار کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے۔ ہاں کسی عورت اور اس کے (پہلے) خاوند کی لڑکی کو (جو اس عورت کے بطن سے نہیں ہے) بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز ہے کیونکہ اگر اس عورت کو مرد فرض کر لیا جائے تو اس کے شوہر کی اس لڑکی سے اس کو نکاح کرنا جائز ہوگا بخلاف اس کے عکس کے (کہ اگر اس لڑکی کو مرد فرض کر لیا جائے تو اس کے لئے اس عورت یعنی باپ کی بیوی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا) اسی طرح کسی عورت اور اس کی باندی کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز ہے بشرطیکہ پہلے اس باندی سے نکاح کیا ہو۔

اگر کسی شخص نے دو بہنوں سے ایک ہی عقد میں نکاح کیا تو (نکاح باطل ہوگا اور) ان دونوں کو ان کے شوہر سے جدا کرا دیا جائے گا اور پھر یہ جدائی اگر دخول (یعنی جماع) سے پہلے ہوگی تو ان دونوں کو مہر کے طور پر کچھ نہیں دلوایا جائے گا اور اگر جدائی دخول کے بعد ہوگی تو مہر مثل اور مہر متعین میں سے جس کی مقدار کم ہوگی وہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو دیا جائے گا۔ اگر کسی شخص نے دو بہنوں سے مختلف عقد میں یعنی یکے بعد دیگرے نکاح کیا تو جو نکاح بعد میں ہوگا وہ فاسد ہو جائے گا اور شوہر کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس سے علیحدگی اختیار کرے۔ اگر وہ خود سے علیحدگی اختیار نہ کرے اور قاضی کو اس کا علم ہو جائے تو قاضی علیحدگی کرا دے۔ اور پھر یہ علیحدگی اگر دخول (جماع) سے پہلے واقع ہوگئی تو علیحدگی کے احکام (یعنی مہر و عدت وغیرہ) میں سے کوئی حکم نافذ نہیں ہوگا اور اگر دخول کے بعد علیحدگی واقع ہوگئی تو مہر مثل اور مہر متعین میں سے جس کی مقدار کم ہوگی وہ مہر مل جائے گا اور اس پر عدت واجب ہوگی اور اگر بچہ پیدا ہوا تو اس کا نسب ثابت ہوگا اور اس شخص کو اپنی بیوی (یعنی پہلی منکوحہ) سے اس وقت تک علیحدہ رہنا ہوگا جب تک کہ اس کی بہن کی عدت پوری نہ ہو جائے اور اگر کسی شخص نے دو بہنوں سے دو عقد میں یعنی یکے بعد دیگرے نکاح کر لیا مگر یہ معلوم نہیں کہ کس بہن سے پہلے اور کس بہن سے بعد میں نکاح کیا تھا تو ایسی صورت میں شوہر کو حکم دیا جائے گا کہ وہ بیان کرے، اگر وہ بیان کر دے (کہ فلاں بہن سے پہلے اور فلاں بہن سے بعد میں نکاح ہوا تھا) تو اس کے بیان کے مطابق عمل کیا جائے (یعنی پہلی کا نکاح باقی اور دوسری کا نکاح باطل قرار دیا جائے) اور اگر شوہر بھی بیان نہ کر سکے تو پھر قاضی ان دونوں ہی سے شوہر کی علیحدگی کرا دے، علیحدگی کے بعد ان دونوں کو نصف مہر ملے گا بشرطیکہ دونوں کا مہر برابر ہو اور عقد کے وقت متعین ہوا ہو اور یہ علیحدگی بھی جماع سے پہلے واقع ہوئی ہو۔ اور اگر دونوں کا مہر برابر نہ ہو تو ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے مہر کا چوتھائی حصہ ملے گا۔ اور اگر عقد کے وقت مہر متعین نہ ہوا تو آدھے مہر کی بجائے ایک جوڑا کپڑا دونوں کو دیا جائے گا۔ اور اگر یہ علیحدگی جماع کے بعد ہوئی ہو تو ہر ایک کو اس کا مہر پورا ملے گا۔

اور ابو جعفر ہندوانیؒ فرماتے ہیں کہ مسئلہ مذکورہ کا یہ حکم اس وقت ہوگا جب کہ ان دونوں میں سے ہر ایک یہ دعوی کرے کہ پہلے مجھ سے نکاح ہوا ہے اور گواہ کسی ایک کے بھی پاس نہ ہوں تو دونوں کو نصف مہر دلایا جائے گا لیکن اگر دونوں یہ کہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم میں سے کس کا نکاح پہلے ہوا ہے تو ان کے بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا جب تک کہ دونوں کسی ایک بات پر متفق ہو کر صلح نہ کر لیں اور دونوں کے صلح کی صورت یہ ہوگی کہ وہ دونوں قاضی کے پاس جا کر یہ کہیں کہ ہم دونوں کا مہر ہمارے خاوند پر واجب ہے اور

ہمارے اس مطالبہ میں کوئی تیسرا دعوی دار شریک نہیں ہے (یعنی ہمارے خاوند پر مہر کی جو رقم واجب ہے اس میں ہم دونوں کے علاوہ اور کسی تیسری عورت کا کوئی حق نہیں ہے) لہٰذا ہم دونوں اس بات پر صلح و اتفاق کرتی ہیں کہ نصف مہر لے لیں، اس کے بعد قاضی فیصلہ کر دے گا، اور اگر ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنا نکاح پہلے ہونے پر گواہ پیش کئے تو مرد پر نصف مہر واجب ہوگا جو دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا، اس حکم میں تمام علماء کا اتفاق ہے! نیز دو بہنوں کے سلسلہ میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ ایسی تمام عورتوں میں بھی جاری ہوں گے جن کا جمع کرنا (یعنی جن کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا) حرام ہے اور اگر یہ شخص (یعنی جس نے دو بہنوں سے ایک عقد میں نکاح کر لیا تھا اور یہ نکاح باطل ہونے کی وجہ سے ان دونوں بہنوں اور اس کے درمیان علیحدگی کرا دی تھی) ان دونوں بہنوں کے علیحدہ ہو جانے کے بعد پھر ان دونوں میں سے کسی ایک سے نکاح کرنا چاہے تو نکاح کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ علیحدگی جماع سے پہلے ہوئی ہو اور اگر یہ علیحدگی جماع کے بعد ہوئی تھی تو اس صورت میں دونوں بہنوں کی عدت گزر جانے سے پہلے نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا اور اگر ایک عدت میں ہے اور دوسری کی عدت پوری ہو گئی ہے تو اس بہن سے نکاح کرنا جائز ہوگا جو عدت میں ہے دوسری سے اس وقت تک نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا جب تک اس بہن کی عدت پوری نہ ہو جائے جو عدت میں ہے اور اگر علیحدگی سے پہلے ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ جماع ہو گیا تھا تو اس بہن سے نکاح کرنا جائز ہوگا جس سے جماع ہو چکا تھا اور (اگر اس بہن سے نکاح کرنا چاہے جس سے جماع نہیں ہوا تھا تو) اس سے اس وقت تک نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا جب تک اس بہن کی عدت پوری نہ ہو جائے جس سے جماع ہوا تھا، ہاں اگر اس بہن کی عدت پوری ہو جائے جس سے جماع ہوا تھا تو پھر ان دونوں میں سے جس سے چاہے نکاح کر سکتا ہے۔

جس طرح بیک وقت دو بہنوں کو اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے اسی طرح بیک وقت دو باندی بہنوں سے جنسی لطف حاصل کرنا (یعنی مساس و جماع وغیرہ کرنا) بھی جائز نہیں ہے (یعنی اگر کسی شخص کی ملکیت میں بیک وقت دو بہنیں بطور باندی ہوں تو وہ ان دونوں سے جنسی تلذذ حاصل نہ کرے بلکہ ان میں سے کسی ایک ہی سے مساس و جماع وغیرہ کرے) کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے جنسی لطف لینے کے بعد دوسری بہن حرام ہو جائے گی اس دوسری بہن سے اسی وقت جنسی لطف حاصل کر سکتا ہے جب کہ پہلی بہن کو اپنے اوپر حرام کر لے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے ایک باندی خریدی اور اس سے جماع کر لیا پھر اس کے بعد اس کی بہن کو خرید لیا تو صرف پہلی ہی سے جماع کر سکتا ہے دوسری سے جماع اس وقت تک حرام ہوگا جب تک کہ پہلی کو اپنے لئے حرام نہ کر لے اور حرام کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یا تو کسی سے اس کا نکاح کر دے، یا اپنی ملکیت سے نکال دے، یا آزاد کر دے یا کسی کو ہبہ کر دے یا فروخت کر دے، یا صدقہ کر دے، اور یا مکاتب بنا دے۔

اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ بعض حصہ کو آزاد کرنا، کل حصہ کو آزاد کرنے کے مرادف ہے۔ (مثلاً کسی نے اپنی باندی سے کہا کہ میں نے تیرا آدھا حصہ یا تیرا چوتھائی حصہ آزاد کیا تو یہ کل کو آزاد کرنے کے مرادف ہوگا اور اس سے جماع کرنا جائز ہوگا) اسی طرح اس کے بعض حصہ کو اپنی ملکیت سے نکالنا کل کو اپنی ملکیت سے نکالنے کے مرادف ہوگا۔ اگر صرف یہ کہہ دیا جائے کہ پہلی مجھ پر حرام ہے تو اس کو کہہ دینے کی وجہ سے دوسری سے جماع کرنا جائز نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ایک کے حیض و نفاس اور احرام و روزہ کی وجہ سے دوسری حلال نہیں ہو جاتی (یعنی جس طرح اگر ایک بہن حیض وغیرہ کی حالت میں حرام ہو جاتی ہے تو محض اس کی وجہ سے اس کی دوسری بہن حلال نہیں ہو جاتی، اسی طرح فقط اتنا کہہ دینا کہ پہلی میرے لئے حرام ہے۔ دوسری کو حلال کر دینے کے لئے کافی نہیں ہے)۔

اگر کسی شخص نے ان دونوں بہنوں سے جماع کر لیا جو بطور باندی اس کی ملکیت میں تھیں تو اس کے بعد ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ جماع نہیں کر سکتا تاوقتیکہ مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق دوسری کو اپنے لئے حرام نہ کر لے۔

اگر کسی شخص نے (ان دونوں باندی بہنوں میں سے کہ جو بیک وقت اس کی ملکیت میں تھیں) کسی ایک کو فروخت کر دیا لیکن وہ کسی عیب کی وجہ سے لوٹ کر آگئی یا اس کو ہبہ کر دیا تھا لیکن اپنے ہبہ کو ختم کر کے اسے واپس لے لیا، یا اس کا نکاح کر دیا تھا مگر اس کے شوہر نے اس

کو طلاق دے دی اور اس کی عدت بھی پوری ہو گئی تو ان صورتوں میں وہ شخص ان میں سے کسی ایک سے بھی جماع نہ کرے تاوقتیکہ دوسری بہن کو اپنے لئے حرام نہ کر لے۔

کسی شخص نے ایک باندی سے نکاح کر لیا اور اس کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے اس کی بہن کو خرید لیا تو اس کے لئے خریدی ہوئی باندی سے جنسی لطف حاصل کرنا جائز نہیں ہو گا کیونکہ فراش (یعنی زوجیت کا استحقاق) نفس نکاح سے ثابت ہو جاتا ہے اس لئے اگر وہ خریدی ہوئی باندی سے جماع کرے گا تو یہی کہا جائے گا کہ اس نے فراش (یعنی زوجیت کے استحقاق) میں دو بہنوں کو جمع کیا اور یہ حرام ہے۔

اگر ایک شخص نے اپنی باندی سے جماع کر لیا اور اس کے بعد اس کی بہن سے نکاح کیا تو یہ نکاح صحیح ہو گا اور جب نکاح صحیح ہو گیا تو اب وہ باندی سے جماع نہ کرے گا اگرچہ ابھی تک منکوحہ سے جماع نہ کیا ہو اور اس منکوحہ سے اس وقت تک جماع نہ کرے جب تک کہ اپنی باندی (یعنی منکوحہ کی بہن) کو مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے اپنے لئے حرام نہ کر لے اور اگر اس نے اپنی باندی کی بہن سے ایسی صورت میں نکاح کیا کہ اس باندی سے جماع نہیں ہوا ہے تو پھر منکوحہ سے جماع کر سکتا ہے۔

اگر کسی شخص نے اپنی باندی سے جماع کے بعد اس کی بہن سے نکاح کیا مگر وہ نکاح کسی وجہ سے فاسد ہو گیا تو محض نکاح سے وہ باندی حرام نہ ہو گی ہاں اگر نکاح کے بعد وہ منکوحہ سے جماع کر لے تو باندی سے جماع کرنا حرام ہو جائے گا۔

اگر دو بہنوں نے کسی شخص سے یہ کہا کہ ہم نے اتنے مہر کے عوض تمہارے ساتھ اپنا نکاح کیا اور یہ الفاظ دونوں کی زبان سے ایک ساتھ ادا ہوئے اور اس شخص نے ان میں سے ایک کا نکاح قبول کر لیا تو یہ نکاح جائز ہو جائے گا اور اگر پہلے خود اس شخص نے ان دونوں بہنوں سے یہ کہا کہ میں نے تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ہزار روپیہ کے عوض اپنا نکاح کیا اور ان میں سے ایک نے قبول کر لیا اور دوسری نے انکار کر دیا تو دونوں کا نکاح باطل ہو گا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے اپنا نکاح کرانے کے لئے ایک آدمی کو اپنا وکیل بنایا اور پھر کسی دوسرے آدمی کو بھی اسی کام کے لئے اپنا وکیل بنا دیا، اس کے بعد ان دونوں میں سے ہر ایک وکیل نے ایک ایک عورت سے اس شخص کا نکاح ان عورتوں کی اجازت کئے بغیر کر دیا اور پھر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دونوں عورتیں رضاعی بہنیں ہیں، نیز ان دونوں وکیلوں کی زبان سے نکاح کے الفاظ ایک ساتھ ادا ہوئے تھے تو اس صورت میں دونوں عورتوں کے نکاح باطل ہوں گے، اسی طرح اگر یہ دونوں نکاح ان عورتوں کی اجازت سے ہوں یا ایک کی اجازت سے اور ایک کی بغیر اجازت تو بھی یہی حکم ہو گا۔

ایک شخص مثلاً زید نے دو بہنوں سے نکاح کیا حالانکہ ان میں سے ایک بہن کسی دوسرے شخص کے نکاح میں تھی یا کسی دوسرے شوہر کے طلاق دینے کی وجہ سے ابھی عدت کے دن گزار رہی تھی تو اس صورت میں زید کا نکاح صرف دوسری بہن کے ساتھ صحیح ہو گا۔

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق رجعی، یا ایک طلاق بائن یا تین طلاق دی یا نکاح فاسد ہو جانے کی وجہ سے نکاح فسخ ہو گیا، یا شبہ ہو کر کسی عورت سے جماع کر لیا، غرضیکہ ان میں سے کسی بھی صورت کے پیدا ہونے کی وجہ سے وہ عورت کہ عدت کے دن گزار رہی ہو تو اس کے زمانہ عدت میں اس کی بہن سے وہ شخص نکاح نہیں کر سکتا اور جس طرح اس کے زمانہ عدت میں اس کی بہن سے نکاح کرنا جائز نہیں اسی طرح اس کی کسی بھی ایسی رشتہ والی عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں جو اس کے لئے ذوات الارحام میں سے ہو اور دونوں کا بیک وقت کسی ایک کے نکاح میں رہنا حرام ہو (مثلاً اس کے زمانہ عدت میں اس کی بھتیجی سے نکاح کرنا جائز نہیں) اور اسی طرح اس کے زمانہ عدت میں اس کے علاوہ مزید چار عورتوں سے نکاح کرنا بھی حلال نہیں۔

اگر کسی شخص نے اپنی باندی کو جو اُمّ ولد (یعنی اس کے بچہ کی ماں) تھی آزاد کر دیا تو جب تک اس کی عدت پوری نہ ہو جائے اس کی بہن سے شادی کرنا جائز نہیں ہو گا۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کے زمانہ عدت میں اس کے ماسوا چار عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہو گا

جب کہ صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک اس کے زمانہ عدت میں اس کی بہن سے بھی نکاح کر سکتا ہے۔

اگر کسی شوہر نے کہا کہ میری مطلقہ بیوی نے بتایا کہ اس کی عدت کے دن پورے ہو گئے ہیں (لہٰذا میں اس کی بہن سے نکاح کر سکتا ہوں) تو اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ طلاق دیئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے، اگر طلاق دیئے ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا ہے جس میں عدت پوری ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں تو شوہر کا قول معتبر نہ ہوگا اس طرح اس کی مطلقہ بیوی کا یہ کہنا کہ "میری عدت پوری ہو گئی ہے" قابل اعتبار نہ ہوگا ہاں اگر وہ کوئی ایسی صورت بیان کرے جس میں عدت پوری ہونے کا احتمال ہو جیسے وہ یہ بیان کرے کہ طلاق کے دوسرے دن میرا حمل جس کے اعضاء پورے تھے ساقط ہو گیا ہے تو اس صورت میں اس کا قول معتبر ہوگا۔ اور طلاق کو اتنا عرصہ گزر چکا ہو کہ اس میں عدت پوری ہونے کا امکان ہو تو اگر عورت اپنے شوہر کے قول کی تصدیق کر دے یا اس مجلس میں موجود نہ ہو تو شوہر کا قول معتبر ہوگا اور اس کے لئے بیک وقت چار دوسری عورتوں سے یا سابقہ بیوی کی بہن سے نکاح کرنا جائز ہوگا بلکہ حنفی علماء تو یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں اگر بیوی شوہر کو جھٹلا دے تو بھی شوہر کا قول معتبر ہوگا۔

کسی شخص کی بیوی مرتد ہو کر دار الحرب چلی جائے تو شوہر کے لئے اس کی عدت پوری ہونے سے پہلے اس کی بہن سے نکاح کرنا جائز ہے جیسا کہ اس کے مرجانے کی صورت میں اس کی بہن سے نکاح کرنا جائز ہے پھر اگر وہ مرتدہ عورت مسلمان ہو کر دار الحرب سے لوٹے اور اس کا شوہر اس کی بہن سے نکاح کر چکا ہو تو اس کی بہن کا نکاح فاسد نہیں ہوگا اور اگر وہ بہن کے ساتھ نکاح ہونے سے پہلے لوٹے تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو اس صورت میں بھی وہ شخص اس کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے لیکن صاحبینؒ یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص اس صورت میں اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔

ایسی دو عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے جو ایک دوسرے کی پھوپھی یا ایک دوسرے کی خالہ ہوں اور اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً زید نے عمرو کی ماں سے اور عمرو نے زید کی ماں سے نکاح کیا اور ان دونوں کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوئیں تو ان میں ہر ایک لڑکی دوسری لڑکی کی پھوپھی ہوگی یا یہ کہ مثلاً زید نے عمر کی لڑکی سے اور عمر نے زید کی لڑکی سے نکاح کیا اور ان کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوئیں تو ان میں سے ہر ایک لڑکی کی خالہ ہوگی اور ان دونوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہوگا۔

اگر کسی شخص نے ایسی دو عورتوں سے نکاح کر لیا جن میں سے ایک تو اس شخص کے لئے حرام تھی خواہ اس کی محرم ہونے کی وجہ سے یا شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اور یا بت پرست ہونے کی وجہ سے اور دوسری عورت ایسی تھی جس سے اس شخص کو نکاح کرنا جائز تھا تو ایسی صورت میں اس کا اس عورت کے ساتھ نکاح صحیح ہوگا جو اس کے لئے حلال تھی اور اس عورت کے ساتھ نکاح باطل ہوگا جو اس کے لئے حرام تھی اور مقرر کردہ کل مہر اسی عورت کو ملے گا جس کے ساتھ نکاح صحیح ہوا ہے۔ یہ حکم امام اعظم ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق ہے اور اگر اس شخص نے نکاح کے بعد اس عورت سے جماع کر لیا جس کے ساتھ نکاح کرنا اس کے لئے حلال نہیں تھا تو اس کو مہر مثل ملے گا خواہ وہ کسی مقدار میں ہو اور مقرر کردہ کل مہر اس عورت کو ملے گا جس کے ساتھ نکاح کرنا حلال تھا۔

پانچواں سبب — مملوکہ ہونا: یعنی وہ باندیاں جن کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے جب کہ پہلے سے آزاد عورت نکاح میں ہو۔ اسی طرح آزاد عورت اور باندی سے ایک ساتھ نکاح کرنا بھی حرام ہے۔ مدبر (یعنی وہ لونڈی جس سے اس کا آقا کہہ دے کہ میرے مرنے کے بعد تو آزاد ہو جائے گی) اور ام ولد (یعنی وہ باندی جس کے پیٹ سے اس کے آقا کا بچہ پیدا ہو) اس کا بھی یہی حکم ہے۔

اگر کسی شخص نے ایک عقد میں ایک آزاد عورت اور ایک باندی سے نکاح کیا تو آزاد عورت کا نکاح صحیح ہوگا اور باندی کا نکاح باطل ہو جائے گا بشرطیکہ وہ آزاد عورت ایسی ہو جس سے نکاح کرنا اس کے لئے جائز تھا اگر وہ آزاد عورت ایسی ہو جس کے ساتھ نکاح کرنا اس کے لئے جائز نہیں تھا جیسے وہ اس کی پھوپھی یا خالہ تھی تو پھر باندی کا نکاح باطل نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی شخص نے پہلے باندی سے نکاح کیا

اور پھر آزاد عورت سے نکاح کیا تو دونوں کا نکاح صحیح ہوگا۔

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو جو ایک آزاد عورت ہے طلاق بائن یا تین طلاق دیدیں اور وہ ابھی تک اپنی عدت کے دن گزار رہی تھی کہ اس شخص نے ایک باندی سے نکاح کر لیا تو اس صورت میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا قول تو یہ ہے کہ باندی کا نکاح جائز نہیں ہوگا اور امام ابویوسفؒ و امام محمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ جائز ہو جائے گا اور اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی طلاق رجعی کی عدت کے دوران کسی باندی سے نکاح کرلے تو اس کے بارہ میں متفقہ طور پر یہ مسئلہ ہے کہ اس کا نکاح جائز نہیں ہوگا۔

اگر کسی شخص نے ایک باندی اور ایک ایسی آزاد عورت کے ساتھ نکاح کیا جو نکاح فاسد یا جماع بشبہ کی عدت کے دن گزار رہی تھی تو باندی کا نکاح صحیح ہو جائے گا۔

اگر کسی شخص نے اپنی منکوحہ باندی کی طلاق رجعی کی عدت کے دوران کسی آزاد عورت سے نکاح کیا اور پھر اپنی اس منکوحہ باندی سے رجوع کر لیا (یعنی اپنی دی ہوئی طلاق واپس لے کر پھر اسے بیوی بنالیا) تو یہ جائز ہوگا۔

کسی غلام نے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر ایک آزاد عورت سے نکاح کیا اور اس سے جماع بھی کر لیا اور پھر آقا کی اجازت کے بغیر کسی باندی سے بھی نکاح کر لیا اور اس کے بعد اس کے آقا نے اس کو دونوں سے نکاح کی اجازت دے دی تو اس صورت میں آزاد عورت کا نکاح صحیح اور باندی کا نکاح باطل ہوگا۔

اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کی باندی سے اس کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیا لیکن اس کے ساتھ جماع نہیں کیا اور پھر کسی آزاد عورت سے بھی نکاح کر لیا اور اس کے بعد باندی کے مالک نے نکاح کی اجازت دے دی تو اس صورت میں بھی باندی کا نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی شخص نے ایک باندی سے اس کے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اور پھر اس باندی کی لڑکی سے جو آزاد تھی، نکاح کر لیا اور اس کے بعد باندی کے مالک نے باندی کے نکاح کی اجازت دی تو لڑکی کا نکاح صحیح ہوگا۔ باندی کا نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

ایک شخص مثلاً زید کے ایک بالغہ لڑکی اور ایک بالغہ باندی ہے، زید نے کسی شخص سے کہا کہ میں نے دونوں کا نکاح اتنے مہر کے عوض تمہارے ساتھ کر دیا، اس شخص نے باندی کا نکاح قبول کر لیا تو یہ نکاح باطل ہوگا اور اگر اس کے بعد اس شخص نے آزاد لڑکی کا نکاح قبول کر لیا تو یہ نکاح جائز ہو جائے گا۔

اور اگر کوئی شخص آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود کسی باندی سے نکاح کر لے اور وہ باندی خواہ مسلمان ہو یا اہل کتاب (یعنی یہودی اور عیسائی) تو نکاح صحیح ہو جائے گا لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت وقدرت رکھنے کے باوجود باندی سے نکاح کرنا مکروہ ہے۔

اگر کسی شخص نے ایک ہی عقد میں چار باندیوں اور پانچ آزاد عورتوں کے ساتھ نکاح کیا تو صرف باندیوں کا نکاح صحیح ہوگا۔

چھٹا سبب — **تعلق حق غیر**: یعنی ان عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے جن کے ساتھ کسی دوسرے مرد کا حق متعلق ہو۔ چنانچہ جو عورت کسی کے نکاح میں ہو، یا کسی کی عدت میں ہو اور عدت خواہ طلاق کی ہو، یا موت کی، یا نکاح فاسد کی کہ جس میں جماع ہو گیا تھا اور یا شبہ نکاح کی، تو ایسی عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں۔

اگر کسی شخص نے انجانے میں دوسرے کی منکوحہ عورت سے نکاح کر لیا اور اس کے ساتھ جماع بھی کر لیا تو اب جب کہ ان میں جدائی ہوگی تو عورت پر عدت واجب ہوگی اور اگر وہ شخص جانتا تھا کہ یہ دوسرے کی بیوی ہے تو جدائی کے بعد اس عورت پر عدت واجب نہیں ہوگی اور اس کے خاوند کے لئے اس سے جماع کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اور اگر اس کا خاوند اسے طلاق دے دے تو صاحب عدت کے لئے زمانہ عدت میں اس سے نکاح کرنا جائز ہوگا بشرطیکہ عدت کے علاوہ اور کوئی مانع موجود نہ ہو۔

جس عورت کو زنا کا حمل ہو اس سے نکاح کرنا جائز ہے لیکن جب تک ولادت نہ ہو جائے خاوند کو اس سے جماع کرنا ناجائز ہے اور

اسباب جماع (یعنی بوسہ اور مساس وغیرہ) بھی ناجائز ہیں۔ اور اگر اس حاملہ زنا سے وہ شخص نکاح کرے جس نے اس کے ساتھ زنا کیا تھا تو اس کا نکاح بھی صحیح ہو گا اور وہ وضع حمل سے قبل جماع بھی کر سکتا ہے اور وہ عورت نفقہ کی مستحق ہو گی۔

ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا، کچھ عرصہ بعد عورت کا حمل ساقط ہو گیا جس کے اعضاء ظاہر ہو چکے تھے۔ اب اگر یہ اسقاط حمل، نکاح سے چار ماہ یا اس سے زائد عرصہ بعد ہوا ہے تو نکاح جائز ہو گا اور اگر چار مہینہ سے کم عرصہ میں یہ اسقاط ہوا ہے۔ تو نکاح جائز نہیں ہو گا اس لئے کہ حمل کے اعضاء چار مہینہ سے کم میں ظاہر نہیں ہوتے (حاصل یہ کہ اگر اسقاط نکاح سے چار ماہ یا اس سے زائد عرصہ کے بعد ہوا ہے اور حمل کے اعضاء ظاہر ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہو گا کہ وہ حمل اسی شخص کا ہے جس نے نکاح کیا ہے اور اگر چار ماہ سے کم عرصہ میں اسقاط ہوا ہے اور حمل کے اعضاء ظاہر ہیں تو پھر یہ احتمال ہو گا کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں تھی اور اس کا یہ حمل ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں نکاح صحیح نہیں ہوتا) اور ایسی حاملہ عورت جس کے بارہ میں یہ معلوم ہو کہ اس کا حمل فلاں شخص کے جائز نطفہ سے ہے تو متفقہ طور پر یہ مسئلہ ہے کہ اس سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور امام ابویوسفؒ نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی ایسی عورت ہو جو حربی کافر سے حاملہ ہوئی ہو اور وہ ہجرت کر کے یا باندی بنا کر دارالاسلام میں لائی گئی ہو تو اس سے نکاح کرنا جائز ہے لیکن جب تک اس کے ہاں ولادت نہ ہو جائے اس سے جماع کرنا جائز نہیں ہو گا۔ امام طحاویؒ نے اسی قول پر اعتماد کیا ہے، لیکن حضرت امام محمدؒ نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ایک یہ قول نقل کیا ہے کہ اس صورت میں نکاح جائز نہیں ہوتا، اسی پر امام کرخیؒ نے اعتماد کیا ہے اور یہی قول زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے۔

اگر کسی شخص نے اپنی اُمّ ولد باندی کا نکاح کسی کے ساتھ کر دیا در آنحالیکہ وہ اپنے آقا سے حاملہ تھی تو یہ نکاح باطل ہو گا۔ ہاں اگر وہ حاملہ نہ ہو تو پھر نکاح صحیح ہو گا۔

ایک شخص نے اپنی باندی سے جماع کیا اور اس کے بعد کسی سے اس کا نکاح کر دیا تو نکاح جائز ہو گا لیکن آقا کے لئے یہ مستحب ہو گا کہ وہ اپنے نطفہ کی حفاظت کی خاطر اس باندی سے استبراء کرائے (یعنی ایک حیض آنے کے بعد اس کو خاوند سے جماع کرانے دے) اور جب یہ نکاح جائز ہو گیا تو خاوند کے لئے (استبراء کا انتظار کئے بغیر) اس سے جماع کرنا بھی جائز ہو گا۔ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ کا قول ہے اور حضرت امام محمدؒ کا یہ قول ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ اس کا خاوند اس کے استبراء کے بغیر اس سے جماع کر لے۔ فقیہ ابولیثؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حضرت امام محمدؒ کا قول مبنی بر احتیاط ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں! لیکن اس مسئلہ میں ائمہ کا یہ اختلاف قول اس صورت میں ہے جب کہ آقا نے باندی کا نکاح استبراء کرائے بغیر کر دیا ہو، اور اگر نکاح سے پہلے استبراء ہو چکا تھا (یعنی آقا سے مجامعت کے بعد باندی کو ایک حیض آ گیا تھا) تو اس صورت میں سب کا متفقہ قول یہی ہے کہ خاوند کو استبراء کے بغیر اس سے جماع کرنا جائز ہو گا۔

کسی شخص نے ایک عورت کو زنا کراتے دیکھا اور پھر بعد میں خود اس سے نکاح کر لیا تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک اس کو استبراء سے پہلے بھی اس سے جماع کرنا جائز ہو گا لیکن حضرت امام محمدؒ کا اس صورت میں بھی یہی قول ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ اس کا خاوند اس سے استبراء کے بغیر جماع کر لے۔ اگر کوئی شخص اپنے لڑکے کی باندی سے نکاح کر لے تو حنفیہ کے نزدیک یہ نکاح جائز ہو جائے گا۔

اگر کسی عورت کو قید کر کے دارالحرب سے دارالاسلام لایا گیا اور اس کا شوہر ساتھ نہیں ہے تو اس پر عدت واجب نہ ہو گی اور اس سے کوئی بھی شخص نکاح کر سکتا ہے، اسی طرح اگر کوئی عورت مسلمان ہو کر دارالحرب سے ہجرت کر کے دارالاسلام آ جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق اس پر بھی عدت واجب نہیں ہو گی اور اس سے کوئی بھی شخص نکاح کر سکتا ہے لیکن صاحبین یعنی امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اس پر عدت واجب ہو گی۔ (جب تک اس کی عدت پوری نہ ہو جائے) اس سے نکاح کرنا جائز نہیں ہو گا لیکن اس بارہ

میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس سے جماع کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہوگا جب تک کہ ایک حیض آجانے کی وجہ سے استبراء نہ ہو جائے۔

ساتواں سبب — اختلاف مذہب: یعنی وہ عورتیں جن کے مشرک ہونے کی وجہ سے ان سے نکاح کرنا حرام ہے، چنانچہ آتش پرست اور بت پرست عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں خواہ وہ آزاد ہوں یا باندی۔ اور بت پرستوں کے حکم میں وہ عورتیں بھی داخل ہیں جو سورج اور ستاروں کی پرستش کرتی ہیں، یا اپنی پسندیدہ تصویروں کی پوجا کرتی ہیں، یا یونانی حکماء کے نظریہ کے مطابق خدا کے بے کار (معطل) ہونے کا عقیدہ رکھتی ہیں، یا زندقہ (یعنی دہریت) میں مبتلا ہیں یا فرقہ باطنیہ اور فرقہ اباحیہ سے تعلق رکھتی ہیں (فرقہ باطنیہ سے وہ فرقہ مراد ہے جو قرآن کے باطنی معنی کا عقیدہ رکھتا ہے اور فرقہ اباحیہ سے وہ فرقہ مراد ہے جس کے ہاں دنیا کا ہر کام خواہ وہ اچھا ہو یا برا کرنا جائز ہے) اسی طرح ہر اس مذہب کو ماننے والی عورت بھی اسی حکم میں داخل ہے جس کو اختیار کرنا کفر کا باعث ہو، اسی طرح اپنی اس باندی سے جو آتش پرست مشرکہ ہو، جماع کرنا بھی ناجائز ہے۔

مسلمان کو کتابیہ (یعنی یہودی یا عیسائی) عورت سے جو دارالحرب میں رہتی ہو اور ذمیہ کافرہ (یعنی مسلمانوں کے ملک میں خراج دے کر رہنے والی) عورت سے شادی کرنا جائز ہے خواہ وہ آزاد ہو یا باندی ہو لیکن اولیٰ یہی ہے کہ ان سے بھی شادی نہ کی جائے اور نہ ان کا ذبح کیا ہوا جانور بغیر ضرورت کے کھایا جائے۔ اگر کسی مسلمان نے کسی یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کر لی تو اس کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے عبادت خانہ (یعنی گرجا گھر وغیرہ) نہ جانے دے اور نہ اسے اپنے گھر میں شراب بنانے دے لیکن مسلمان شوہر کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ اپنی عیسائی یا یہودی بیوی کو حیض و نفاس کے منقطع ہونے اور جنابت لاحق ہونے پر غسل کے لئے مجبور کرے۔

اگر کسی مسلمان نے دارالحرب میں کتابیہ حربیہ سے نکاح کر لیا تو اس کا نکاح جائز ہو جائے گا لیکن مکروہ ہوگا اور پھر اس نکاح کے بعد دونوں میاں بیوی دارالاسلام آجائیں تو دارالحرب میں کیا ہوا نکاح باقی رہے گا۔ ہاں اگر یہ صورت ہو کہ شوہر دارالاسلام آجائے، بیوی کو وہیں چھوڑ آئے تو تباین دارین (ملک بدل جانے) کی وجہ سے دونوں میں جدائی ہو جائے گی۔

جو لوگ کسی آسمانی مذہب کے پیروکار ہوں اور ان کے فرقہ کے لئے آسمانی کتاب بھی ہو جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت شیث علیہ السلام کے صحیفے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور وغیرہ، تو وہ لوگ اہل کتاب میں شمار ہوں گے اور ان کی عورتوں سے مسلمانوں کی شادی بھی جائز ہوگی اور ان کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا بھی حلال ہوگا۔ اگر کسی شخص کے والدین میں سے ایک تو کتابی یعنی یہودی یا عیسائی ہو اور دوسرا آتش پرست ہو تو وہ شخص اہل کتاب میں شمار کیا جائے گا۔

ایک مسلمان نے کسی کتابیہ عورت سے شادی کی اور پھر وہ عورت (اپنا مذہب تبدیل کر کے) آتش پرست ہو گئی تو وہ اپنے مسلمان شوہر کے لئے حرام ہو جائے گی اور دونوں کی شادی کالعدم قرار پائے گی۔ اور اگر یہودی عورت سے شادی کی اور پھر وہ عیسائی ہو گئی، یا عیسائی عورت سے شادی کی اور شادی کے بعد وہ یہودی ہو گئی تو اس صورت میں نکاح باقی رہے گا۔ اس بارہ میں یہ اصول و ضابطہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ تبدیل مذہب کے وقت یہ دیکھا جائے گا کہ خاوند بیوی میں سے جس نے بھی اپنا مذہب چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب قبول کیا ہے وہ کوئی ایسا مذہب تو نہیں ہے کہ اگر وہ دونوں از سر نو شادی کریں تو اس مذہب کی وجہ سے ان کی شادی جائز نہ ہو سکے (مثلاً آتش پرستی ایسا مذہب ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی آتش پرست عورت سے شادی کرنا چاہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا) چنانچہ اگر وہ مذہب ایسا ہوگا جس کے پیروکار اور مسلمان کے درمیان شادی بیاہ سرے سے جائز ہی نہیں ہوتا تو خاوند و بیوی میں سے جو بھی اپنا مذہب چھوڑ کر اس مذہب کو قبول کرے گا شادی کالعدم ہو جائے گی۔ اب رہی یہ بات کہ اگر مسلمان خاوند اور یہودی یا عیسائی بیوی میں سے کوئی بھی مجوسیت (یعنی آتش پرستی) اختیار کر لے اور اس کی وجہ سے ان دونوں کی شادی فاسد ہو جائے تو اس کے بعد کیا حکم ہوگا؟ تو اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر شادی کے فاسد ہونے کا سبب عورت بنی ہے یعنی بیوی نے مجوسیت اختیار کر لی ہے تو دونوں کے درمیان جدائی

ہو جائے گی اور اسے نہ مہر ملے گا اور نہ متعہ، بشرطیکہ اس نے جماع سے پہلے اپنا مذہب تبدیل کیا ہو، اور اگر اس نے اس وقت مجوسیت کو اختیار کیا جب کہ اس کا شوہر اس سے جماع کر چکا تھا تو پھر اس کو پورا مہر دیا جائے گا۔ اور اگر شادی کے فاسد ہونے کا سبب مرد بنا ہے یعنی خاوند نے اپنا مذہب چھوڑ کر مجوسیت کو اختیار کر لیا ہے اور خاوند و بیوی میں جدائی ہو گئی ہے تو اسے عورت کو مقررہ مہر کا آدھا دینا ہو گا بشرطیکہ یہ صورت حال جماع سے پہلے ہی واقع ہو چکی ہو اور اگر مہر مقرر نہیں تھا تو متعہ (ایک جوڑا کپڑا) دینا ہو گا اور اگر جماع کے بعد ایسا ہوا تو پھر اس عورت کو پورا مہر دینا واجب ہو گا۔

جو مسلمان مرتد ہو گیا ہو اس کا نکاح نہ تو کسی مرتدہ سے جائز ہوتا ہے نہ کسی کافرہ سے اور نہ کسی مسلمان عورت سے، اسی طرح جو مسلمان عورت، مرتدہ ہو جائے اس کا نکاح بھی کسی کے ساتھ جائز نہیں ہوتا۔

کسی مسلمان عورت کی شادی نہ تو مشرک سے جائز ہوتی ہے اور نہ کتابی یعنی یہودی یا عیسائی سے۔ بت پرست و آتش پرست عورت کی شادی ہر مشرک و کافر سے صحیح ہو جاتی ہے مگر مرتد کے ساتھ صحیح نہیں ہوتی۔ ذمی کافروں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے اگرچہ ان کے مذاہب مختلف ہوں۔

مسلمان کے لئے اپنی مسلمان بیوی کی موجودگی میں کتابیہ (یعنی یہودی یا عیسائی عورت) سے اور اپنی کتابیہ بیوی کی موجودگی میں مسلمان عورت سے عقد ثانی جائز ہے اور نوبت (یعنی شب گزاری کے لئے باری) مقرر کرنے کے سلسلہ میں دونوں کے حقوق برابر ہوں گے۔

آٹھواں سبب — مالک ہونا: یعنی وہ عورتیں جو مالک ہونے کی وجہ سے اپنے مملوک (غلام) کے لئے حرام ہیں چنانچہ کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے غلام سے نکاح کرے، اسی طرح اس کو اس غلام کے ساتھ بھی نکاح کرنا جائز نہیں ہے جو اس کے اور کسی دوسرے شخص کے درمیان مشترک ہو۔ اگر نکاح کے بعد خاوند و بیوی میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے کل یا جزو کا مالک ہو جائے تو نکاح باطل ہو جائے گا۔

اگر کسی مرد نے اپنی لونڈی سے نکاح کر لیا، یا اس لونڈی سے نکاح کیا جس کا وہ جزوی مالک ہے تو یہ نکاح صحیح نہیں ہو گا۔ لیکن اس بارہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ ہمارے زمانہ میں لونڈی غلاموں کی خرید و فروخت کا بالکل رواج نہیں رہا اور نہ آج کے دور میں وہ شرائط و قیود پائی جاتی ہیں جن کی موجودگی میں لونڈی سے جماع جائز ہوتا ہے اسی لئے بعض علماء لکھتے ہیں کہ اگر کہیں لونڈی رکھنے کا کوئی رواج ہو تو (اس سے جماع نہ کرنا چاہئے بلکہ) اس لونڈی سے نکاح کر لینا چاہئے۔ تاکہ اگر واقعۃً لونڈی نہ ہو بلکہ آزاد عورت ہو تو نکاح کی وجہ سے اس سے جماع کرنا جائز ہو جائے۔

اگر کسی آزاد مرد نے اپنی بیوی کو (جو کسی کی باندی ہو) شرط خیار کے ساتھ خرید لیا تو اس صورت میں اس کا نکاح باطل نہیں ہو گا۔ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

نواں سبب — طلاق: یعنی وہ عورتیں جو طلاق سے حرام ہو جاتی ہیں چنانچہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو جو آزاد عورت ہو تین طلاق دے دیں تو اس کے بعد اس سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا ہاں اگر وہ عورت (اپنی عدت پوری کر کے) دوسرے کسی مرد سے نکاح کر لے اور دونوں میں مجامعت ہو جائے اور پھر وہ مرد اس کو طلاق دے دے تو عدت گزرنے کے بعد پہلے شوہر کے لئے اس سے نکاح کرنا جائز ہو جاتا ہے اور اگر کسی شخص نے کسی باندی سے نکاح کیا اور پھر اسے دو طلاقیں دے دیں تو اس کے بعد اس سے بھی نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا اور جس طرح اس سے نکاح کرنا جائز نہیں اسی طرح اس کو باندی بنا کر اس سے جماع کرنا بھی درست نہیں۔

ایک شخص نے کسی کی باندی سے نکاح کیا اور پھر دو طلاقیں دے دیں اس کے بعد اس کو خرید کر آزاد کر دیا اب اگر وہ اس سے نکاح کرنا چاہے تو وہ اس صورت میں جائز ہو گا کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ مرد اس کے ساتھ جماع کرے اور پھر اس کو

طلاق دے دے اور جب عدت کے دن پورے ہو جائیں تو وہ شخص (یعنی پہلا شوہر) اس سے نکاح کرلے۔

متعلقہ ضروری مسائل

یہاں تک محرمات کا ذکر پورا ہو گیا، اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس باب سے متعلق چند ضروری مسائل نقل کر دیئے جائیں۔

نکاح متعہ باطل ہے، اور جب کسی عورت سے اس طرح کا نکاح (یعنی متعہ) جائز ہی نہیں ہو گا تو نہ اس سے جماع کرنا حلال ہو گا، نہ پر طلاق واقع ہو گی اور نہ اس پر ایلاء اور ظہار کے احکام نافذ ہوں گے، اسی طرح ان کے درمیان وراثت کا کوئی سلسلہ بھی قائم نہیں

نکاح متعہ کی صورت یہ ہے کہ کوئی مرد کسی ایسی عورت سے جو موانع (یعنی کسی دوسرے کی زوجیت یا عدت وغیرہ) سے خالی ہو، یہ کہے کہ میں مال کی اتنی مقدار مثلاً ایک ہزار روپیہ کے عوض اتنی مدت مثلاً دس روز کے لئے تمتع یعنی فائدہ اٹھاؤں گا۔ یا یوں کہے کہ "تم اتنے روپیہ کے عوض دس روز یا چند روز تک اپنے نفس سے مجھے متمتع یعنی بہرہ مند کرو" اور جس طرح نکاح متعہ ناجائز ہے اسی طرح نکاح موقت بھی ناجائز ہے اور نکاح موقت میں مدت قلیل ہو یا کثیر، متعین ہو یا غیر متعین، بہر صورت نکاح ناجائز ہو گا، ہاں اگر دونوں کسی ایسی مدت کا تعین کریں جو اتنی طویل ہو کہ اتنی مدت تک دونوں کا زندہ رہنا ناممکن ہو مثلاً یہ کہیں کہ ہم نے ایک ہزار سال کے لئے نکاح کیا، تو اس صورت میں نکاح موقت کا حکم جاری نہیں ہو گا بلکہ نکاح صحیح ہو جائے گا اور وقت کی شرط باطل ہو جائے گی۔ جیسا کہ نکاح کا وقت وقوع قیامت یا خروج دجال یا نزول عیسی تک کی مدت بیان کرنے کی صورت میں نکاح صحیح ہو جاتا ہے اور وقت کی شرط باطل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر نکاح کا وقت متعین نہیں کیا لیکن دل میں مدت متعین تھی یعنی نکاح کرنے والے کا یہ خیال تھا کہ اس کو ایک سال تک اپنے پاس رکھوں گا، پھر چھوڑ دوں گا تو اس صورت میں بھی نکاح صحیح ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی شخص نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ ایک ماہ بعد طلاق دے دوں گا، تو نکاح صحیح ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے نکاح کے وقت عورت سے یہ شرط کی کہ میں دن میں تمہارے ساتھ رہا کروں گا رات میں نہیں تو یہ نکاح بھی صحیح ہو جائے گا۔

اگر مرد و عورت دونوں احرام باندھے ہوئے ہوں تو ان کے لئے احرام کی حالت میں نکاح کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر کوئی ولی احرام باندھے ہوئے ہو تو احرام کی حالت میں اس عورت کا نکاح کر سکتا ہے جس کا وہ ولی ہے۔

ایک عورت نے (قاضی کی عدالت میں) کسی مرد مثلاً زید کے بارہ میں دعوی کیا کہ اس نے میرے ساتھ نکاح کیا ہے اور ثبوت کے طور پر اس نے دو گواہ بھی پیش کر دیئے، قاضی نے فیصلہ کر دیا کہ زید اس عورت کا شوہر ہے حالانکہ واقعۃً زید نے اس عورت سے نکاح نہیں کیا تھا تو اس عورت کے لئے جائز ہو گا کہ وہ زید کے ساتھ رہنے لگے اور زید کے لئے یہ جائز ہو گا کہ اگر وہ عورت اس سے جماع کی خواہش ظاہر کرے تو جماع کرے۔

یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا قول ہے اور حضرت امام ابویوسف کا پہلا قول بھی یہی ہے لیکن ان کا دوسرا قول اس کے خلاف ہے اور حضرت امام محمد کے قول کے مطابق ہے، امام محمد کا قول یہ ہے کہ اس صورت میں مرد کے لئے اس عورت سے جماع کرنا جائز نہیں ہو گا۔ مسئلہ مذکورہ میں قاضی کا فیصلہ عقد نکاح کے حکم میں ہو گا (یعنی یہ سمجھا جائے گا کہ گویا قاضی نے اس وقت نکاح کر دیا اس لئے عورت کو مرد کے ساتھ رہنے اور امام اعظم کے قول کے مطابق اس کی خواہش پر زید کو اس سے جماع کرنے کی بھی اجازت ہے) لیکن شرط یہ ہے کہ اس وقت عورت میں نکاح کی صلاحیت ہو (یعنی ایسا کوئی مانع موجود نہ ہو جو اس کو زید کی بیوی بننے سے روک دے) چنانچہ اگر یہ صورت ہو کہ قاضی کے فیصلہ کے وقت وہ عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں ہو یا پہلے شوہر کے طلاق دے دینے کی وجہ سے عدت کے دن گزار رہی ہو، یا اس مرد یعنی زید نے اس کو تین طلاق دے رکھی ہو تو پھر قاضی کا فیصلہ نافذ نہیں ہو گا اور یہ عورت زید کی بیوی نہیں بنے گی، اسی طرح اکثر علماء کے نزدیک قاضی کے فیصلہ کے نفاذ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس فیصلہ کے وقت گواہ بھی موجود ہوں۔ اور اگر

خود زید کسی عورت کے بارہ میں دعوی کرے کہ میں نے اس عورت سے نکاح کیا تھا اور اپنے دعوی کے ثبوت میں گواہ پیش کرے تو اس کا بھی وہی حکم ہوگا جو اوپر ذکر کیا گیا اسی طرح اگر کوئی عورت قاضی کی عدالت میں یہ دعوی کرے کہ میرے شوہر زید نے مجھے طلاق دے دی تھی اور اس نے جھوٹے گواہ بھی پیش کئے تو قاضی طلاق کا فیصلہ صادر کر دے گا باوجودیکہ وہ عورت جانتی ہے کہ میں نے جھوٹ بولا ہے لہٰذا قاضی کا یہ فیصلہ طلاق کے حکم میں ہوگا اور اس عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی اس کے بعد وہ عورت عدت کے دن گزار کر کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے اور گواہ کے لئے بھی اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہوگا نیز وہ عورت نہ تو پہلے شوہر زید کے لئے حلال ہوگی یعنی اس سے نکاح نہیں کر سکتی اور نہ اس کے لئے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنا جائز ہوگا، نیز وہ عورت اپنے پہلے خاوند یعنی زید کے لئے حرام ہو جائے گی لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں وہ عورت نہ تو پہلے شوہر زید کے لئے حلال ہوگی یعنی اس سے نکاح نہیں کر سکتی اور نہ اس کے لئے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنا جائز ہوگا، حضرت امام محمدؒ کا یہ قول ہے کہ جب تک دوسرا مرد (جس سے اس نے نکاح کر لیا ہو) اس سے جماع نہ کرے پہلے شوہر کے لئے حلال رہے گی، اگر دوسرا مرد اس سے جماع کر لے گا، تو پھر جب تک اس کی عدت پوری نہ ہو جائے عدت واجب ہونے کی وجہ سے پہلے شوہر کے لئے حرام رہے گی، گویا امام محمدؒ کے نزدیک دوسرے کے ساتھ اس کا نکاح سرے سے جائز ہی نہیں ہوتا۔

ایک شخص مثلاً زید نے کسی عورت مثلاً خالدہ کے بارہ میں دعوی کیا کہ اس نے میرے ساتھ نکاح کیا تھا لیکن خالدہ نے اس سے انکار کیا اس کے بعد زید نے خالدہ سے صلح کرنی چاہی اور اس سے کہا کہ اگر تم اقرار کر لو تو میں تمہیں ایک سو روپے دوں گا۔ خالدہ نے اقرار کر لیا تو اب زید پر یہ مال یعنی خالدہ کو ایک سو روپیہ دینا واجب ہوگا اور خالدہ کا یہ اقرار عقد نکاح سمجھا جائے گا چنانچہ خالدہ نے یہ اقرار اگر گواہوں کے سامنے کیا ہوگا تو نکاح صحیح ہو جائے گا اور خالدہ کے لئے زید کے ساتھ رہنا عند اللہ بھی صحیح سمجھا جائے گا (یعنی اس صورت میں وہ دونوں نہ صرف دنیاوی اور قانونی طور پر میاں بیوی سمجھے جائیں گے بلکہ اس کی وجہ سے ان پر کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا) ہاں اگر خالدہ کے اقرار کے وقت گواہ موجود نہ ہوں گے تو نہ نکاح منعقد ہوگا اور نہ خالدہ کے لئے زید کے ساتھ رہنا جائز ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی کو ایک وقت اپنے نکاح میں نہ رکھا جائے

① عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْاَةِ وَعَمَّتِهَا وَلَا بَيْنَ الْمَرْاَةِ وَخَالَتِهَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کسی عورت کو اس کی پھوپھی کے ساتھ اپنے نکاح میں نہ رکھا جائے اور نہ کسی عورت کو اس کی خالہ کے ساتھ اپنے نکاح میں رکھا جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "پھوپھی اور خالہ" سے عمومیت مراد ہے یعنی خواہ حقیقی پھوپھی اور خالہ ہوں جیسے اس عورت کے باپ اور ماں کی بہن یا مجازی ہوں جیسے اس عورت کے دادا اور پڑدادا (یا اس سے اوپر کے درجہ) کی بہن اور نانی و پڑنانی (یا اس سے اوپر کے درجہ) کی بہن۔ حدیث میں پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کی تخصیص محض اتفاقی ہے کہ کسی شخص نے ان دونوں ہی کے بارہ میں پوچھا ہوگا اس لئے آپ ﷺ نے صرف انہی دو کا تذکرہ فرمایا ورنہ ان دونوں کے علاوہ اور بھی کچھ عورتیں ایسی ہیں جن کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا حرام ہے گزشتہ صفحات میں اس کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہوگا۔

حرمت رضاعت کا ذکر

② وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "دودھ پینے کی وجہ سے وہ رشتے حرام ہوتے ہیں جو پیدائش کی وجہ سے حرام ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: یعنی جو رشتے، نسب کی وجہ سے ایک دوسرے کے لئے حرام ہیں وہی رشتے دودھ پینے کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کے لئے حرام ہو جاتے ہیں مثلاً جس طرح نسبی یعنی حقیقی بہن اپنے بھائی کے لئے حرام ہے اسی طرح رضاعی بہن بھی حرام ہے۔ ہاں کچھ مسائل ایسے ہیں جو اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں، چنانچہ بعض صورتوں میں نسبی رشتہ اور رضاعی رشتہ کے درمیان فرق ہو جاتا ہے جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگرچہ رضاعت سے نکاح حرام ہو جاتا ہے اور نظر و خلوت اور مسافرت حلال ہو جاتی ہے (یعنی مثلاً رضاعی ماں بیٹے کے درمیان نکاح تو حرام ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کی طرف نگاہ ڈالنا، اور ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں اٹھنا بیٹھنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تنہا سفر کرنا جائز ہو جاتا ہے لیکن رضاعی رشتہ پر نسبی رشتہ کے تمام احکام نافذ نہیں ہوتے چنانچہ رضاعی رشتہ میں نہ تو ایک دوسرے کا وارث ہوتا ہے، نہ ایک دوسرے پر نان نفقہ واجب ہوتا ہے، نہ ایک دوسرے کی ملکیت میں آجانے سے آزادی مل جاتی ہے اور اگر دودھ پلانے والی اپنا دودھ پینے والے کو قتل کر دے تو اس کے ذمہ سے اس کا قصاص بھی ساقط نہیں ہوتا چنانچہ ان تمام صورتوں میں وہ دونوں رضاعی رشتہ دار بالکل اجنبیوں کی طرح ہوتے ہیں۔

(۳) وَعَنْهَا قَالَتْ جَاءَ عَمِّي مِنَ الرَّضَاعَةِ فَاسْتَأْذَنَ عَلَيَّ فَاَبَيْتُ اَنْ اٰذَنَ لَهٗ حَتّٰى اَسْاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلْتُهٗ فَقَالَ اِنَّهٗ عَمُّكِ فَأْذَنِيْ لَهٗ قَالَتْ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّمَا اَرْضَعَتْنِي الْمَرْاَةُ وَلَمْ يُرْضِعْنِي الرَّجُلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ عَمُّكِ فَلْيَلِجْ عَلَيْكِ وَذٰلِكَ بَعْدَ مَا ضُرِبَ عَلَيْنَا الْحِجَابُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) میرے رضاعی چچا میرے گھر آئے اور انہوں نے میرے پاس آنے کی اجازت مانگی، میں نے ان کو اجازت دینے سے انکار کر دیا تاکہ میں رسول کریم ﷺ سے پوچھ لوں (کہ ان کا میرے پاس آنا درست ہے یا نہیں؟) چنانچہ جب رسول کریم ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ ﷺ سے اس کے بارہ میں پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ تمہارے چچا ہیں، ان کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے دو" حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (یہ سن کر) میں نے عرض کیا کہ "مجھ کو تو عورت نے دودھ پلایا تھا کسی مرد نے تو دودھ نہیں پلایا تھا" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمہارے چچا ہیں اس لئے وہ تمہارے پاس آسکتے ہیں" (حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ) میرے رضاعی چچا کی یہ آمد اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ ہمارے لئے (اجنبی مردوں سے) پردہ کرنا واجب ہو چکا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ کے جن رضاعی چچا کا ذکر کیا گیا ہے ان کا نام افلح تھا اور حضرت عائشہؓ نے جس عورت کا دودھ پیا تھا اس کے خاوند ابوالقیس تھے وہ اور افلح بھائی تھے اس رشتہ سے وہ حضرت عائشہؓ کے رضاعی چچا ہوئے۔

"مجھ کو تو عورت نے دودھ پلایا ہے الخ" سے حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا کہ میں نے چونکہ عورت کا دودھ پیا ہے اس لئے میرا رضاعت کا تعلق تو عورت سے قائم ہوا ہے نہ کہ مرد سے، گویا حضرت عائشہؓ یہ سمجھتی تھیں کہ کسی عورت کا دودھ پلانا اس کے خاوند کے قرابت داروں سے رضاعت کا تعلق قائم نہیں کرتا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے اس گمان کی تصحیح کی کہ کسی عورت کا دودھ پلانا جس طرح اس عورت سے اور اس کے قرابت داروں سے رضاعت کا رشتہ قائم کر دیتا ہے اسی طرح اس کے خاوند اور خاوند کے قرابت داروں سے بھی رضاعی تعلق پیدا کر دیتا ہے اور جس طرح رضاعی ماں کی بہن رضاعی خالہ اور اس کی بیٹی رضاعی بہن ہوتی ہے

اسی طرح اس کے خاوند کا بھائی بھی رضاعی چچا ہوتا ہے اور رضاعی چچا چونکہ حقیقی چچا کی مانند ہے اس لئے افلح تمہارے پاس شوق سے آئیں ان سے کوئی شرم و پردہ نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح دودھ پلانے والی کے قرابت داروں کے ساتھ حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے اس طرح اس کے خاوند کے قرابت داروں سے بھی حرمت رضاعت کا تعلق ہو جاتا ہے۔

رضاعی بھتیجی سے نکاح کرنا حرام ہے

④ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ لَكَ فِيْ بِنْتِ عَمِّكَ حَمْزَةَ فَاِنَّهَا اَجْمَلُ فَتَاةٍ فِيْ قُرَيْشٍ فَقَالَ لَهٗ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ حَمْزَةَ اَخِيْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَاَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا حَرَّمَ مِنَ النَّسَبِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) کے چچا (حمزہؓ) کی لڑکی آپ ﷺ کو (اپنے نکاح کے لئے) کیوں پسند نہیں ہے؟ وہ تو قریش کی جوان عورتوں میں ایک حسین ترین لڑکی ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حمزہؓ میرے دودھ شریک بھائی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام قرار دیئے ہیں وہی رشتے رضاعت کی وجہ سے حرام قرار دیئے ہیں۔" (مسلم)

تشریح: یوں تو حضرت حمزہؓ ابولہب کی طرح آنحضرت ﷺ کے حقیقی چچا تھے لیکن وہ آپ ﷺ کے دودھ شریک بھائی بھی تھے، جس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ ابولہب کے ہاں ایک لونڈی تھی جس کا نام ثوبیہ تھا۔ ثوبیہ نے پہلے حضرت حمزہؓ کو دودھ پلایا تھا اور پھر چار سال کے بعد آنحضرت ﷺ کو بھی دودھ پلایا یہ وہی ثوبیہ ہے جس نے جب ابولہب کو آنحضرت ﷺ کے پیدا ہونے کی خوش خبری سنائی تو ابولہب نے بھتیجے کی پیدائش کی خوشی میں اس کو آزاد کر دیا، بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش پر ابولہب نے اپنی اس خوشی و مسرت کا جو اظہار کیا تھا اس کی وجہ سے پیر (سوموار) کے دن حق تعالیٰ کی طرف سے ابولہب کے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ پیر ہی کے دن پیدا ہوئے تھے۔

آنحضرت ﷺ کو چار عورتوں نے دودھ پلایا تھا، آپ ﷺ کی والدہ محترمہ نے، حضرت حلیمہؓ نے، ثوبیہ نے اور اُمّ ایمن نے جو آپ کے والد محترم حضرت عبداللہ کی لونڈی تھیں۔

رضاعت کی مقدار

⑤ وَعَنْ اُمِّ الْفَضْلِ قَالَتْ اِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُحَرِّمُ الرَّضْعَةُ اَوِ الرَّضْعَتَانِ وَفِيْ رِوَايَةِ عَائِشَةَ قَالَ لَا تُحَرِّمُ الْمَصَّةُ وَالْمَصَّتَانِ وَفِيْ اُخْرٰى لِاُمِّ الْفَضْلِ قَالَ لَا تُحَرِّمُ الْاِمْلَاجَةُ وَالْاِمْلَاجَتَانِ هٰذِهٖ رِوَايَاتٌ لِمُسْلِمٍ۔

"اور حضرت اُمّ فضل کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ایک بار یا دو بار دودھ پینا حرام نہیں کرتا (یعنی ایک بار یا دو بار چوسنے سے نکاح کے لئے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی) اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ایک بار یا دو بار چوسنا (نکاح کو) حرام نہیں کرتا" اور اُمّ فضل کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ایک بار یا دو بار (منہ میں) چھاتی داخل کر لینا (نکاح کو) حرام نہیں کرتا" (یہ سب روایتیں مسلمؒ نے نقل کی ہیں)۔"

تشریح: بظاہر ان روایتوں سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ایک بار یا دو بار دودھ چوسنے سے نکاح حرام نہیں ہوتا ہاں تین بار یا اس سے زائد مرتبہ دودھ چوسنے سے حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، چنانچہ بعض علماء نے اسی پر عمل کرنے کا فتویٰ دیا ہے، لیکن حنفیہ اور اکثر علماء کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ مطلق دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے خواہ وہ مقدار کے اعتبار سے کم ہو یا زیادہ ہو بشرطیکہ

دودھ بچہ کے حلق سے نیچے اتر کر پیٹ میں پہنچ جائے اور وہ دودھ بھی مدت رضاعت (شیر خوارگی کی مدت) میں پیا گیا ہو۔ اور مدت رضاعت اکثر علماء بشمول صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک دو سال کی عمر تک ہے جب کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ مدت رضاعت ڈھائی سال کی عمر تک ہے لیکن حنفی مسلک میں صاحبینؒ ہی کے قول پر فتویٰ ہے۔

جو علماء یہ کہتے ہیں کہ مطلق دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے ان کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ۔ (النساء ۴: ۲۳)

"اور تم پر تمہاری رضائی مائیں حرام ہیں۔"

اس روایت میں مطلق دودھ پینے کی حرمت رضاعت کا ذکر ہے کم وزیادہ کی کوئی قید نہیں لہٰذا خبر واحد کو چونکہ یہ درجہ حاصل نہیں ہوگا کہ وہ قرآن کریم کے کسی مطلق حکم کو مقید کرے اس لئے مذکورہ روایت اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ حرمت رضاعت اسی صورت میں ثابت ہوتی ہے جب کہ بچہ نے تین بار یا تین بار سے زائد دودھ چوسا ہو، نیز ان حضرات کی ایک دلیل حضرت عائشہؓ کی وہ روایت (۲) بھی ہے جس میں مطلق دودھ پینے سے حرمت ثابت ہو جانے کو ان الفاظ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔

یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا یَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ۔

"دودھ پینے سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو پیدائش کی وجہ سے حرام ہیں۔"

حرمت رضاعت کے سلسلہ میں حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بچہ پانچ بار سے کم دودھ پئے تو حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی، ان کی دلیل آگے آنے والی حدیث ہے۔

⑥ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ فِیْمَا اُنْزِلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُوْمَاتٍ یُحَرِّمْنَ ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُوْمَاتٍ فَتُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهِیَ فِیْمَا یُقْرَأُ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ قرآن کریم میں یہ حکم نازل ہوا تھا کہ "دس بار دودھ پینا، جب کہ اس کے پینے کا کامل یقین ہو (نکاح کو) حرام کرتا ہے" پھر یہ حکم پانچ بار پینے کے ساتھ کہ جس کے پینے کا کامل یقین ہو، منسوخ ہو گیا (یعنی جب بعد میں یہ حکم نازل ہوا کہ پانچ بار دودھ پینا کہ اس کے پینے کا کامل یقین ہو، حرمت رضاعت ثابت کرتا ہے تو پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس کے بعد رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور یہ آیت قرآن کریم میں تلاوت کی جاتی رہی۔" (مسلمؒ)

تشریح: پہلے یہی حکم تھا کہ اگر کوئی بچہ کسی عورت کا دس بار دودھ پی لے تو ان دونوں کے درمیان حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، بعد میں نہ صرف یہ کہ یہ حکم ہی منسوخ ہو گیا بلکہ اس آیت کی تلاوت بھی منسوخ ہو گئی جس میں یہ حکم تھا اور یہ آیت نازل ہوئی کہ پانچ بار دودھ پینا نکاح کو حرام کرتا ہے اور پھر اس آیت کی تلاوت بھی تمام صحابہؓ کے نزدیک تو منسوخ ہو گئی لیکن حضرت عائشہؓ کی قرأت میں اس کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی یہاں تک کہ اب حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا حکم تو باقی ہے کہ حرمت رضاعت پانچ بار دودھ پینے ہی سے ثابت ہوتی ہے اور اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی ہے لیکن حضرت امام اعظمؒ اور دیگر علماء کے نزدیک اس آیت کی تلاوت بھی منسوخ ہو گئی اور اس کا حکم بھی اس مطلق آیت وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ کے ذریعہ منسوخ ہو گیا۔

مدت رضاعت کے بعد دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا رَجُلٌ فَكَاَنَّهٗ كَرِهَ ذٰلِكَ فَقَالَتْ اِنَّهٗ اَخِیْ فَقَالَ انْظُرْنَ مَنْ اِخْوَانُكُنَّ فَاِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ ان کے ہاں تشریف لائے تو اس وقت ان کے پاس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا (اسے دیکھ کر) آنحضرت ﷺ کو گویا ناگواری ہوئی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے (آپ ﷺ کی اس ناگواری کو محسوس کر کے) عرض کیا کہ "یہ میرے دودھ شریک بھائی ہیں" آپ نے فرمایا کہ دیکھا (یعنی یہ غور کرو اور سوچو) کہ تمہارا بھائی کون ہو سکتا ہے، کیونکہ شرعی طور پر رضاعت کا اعتبار بھوک کے وقت ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ دودھ پینے کے احکام اسی صورت میں جاری ہوتے ہیں جب کہ دودھ بطور غذا پیا گیا ہو اور اس سے بھوک دور کی گئی ہو۔ چنانچہ یہ بات خورد سالی یعنی ایام شیر خوارگی ہی میں ہوتی ہے۔ اور شیر خوارگی کی مدت اکثر علماء کے نزدیک دو سال اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق ڈھائی سال کی عمر تک رہتی ہے اس مدت میں بچہ کی غذائی ضرورت و خواہش کا دارو مدار عورت کے دودھ پر ہوتا ہے، جب تک وہ دودھ نہیں پیتا اس کی بھوک ختم نہیں ہوتی، لہٰذا حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ بڑی عمر میں یعنی مدت رضاعت ختم ہو جانے کے بعد کسی عورت کا دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی اور وہ شخص جو اس وقت حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور جسے حضرت عائشہؓ نے اپنا دودھ شریک بھائی کہا تھا اس نے دراصل بڑی عمر میں دودھ پیا تھا اور چونکہ بڑی عمر میں دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی اس لئے آنحضرت ﷺ کو ان کا حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھنا ناگوار ہوا۔

ثبوت رضاعت کے سلسلہ میں ایک عورت کی گواہی معتبر ہے یا نہیں؟

⑧ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ اَنَّهٗ تَزَوَّجَ ابْنَةً لِاَبِیْ اِهَابِ بْنِ عَزِیْزٍ فَاَتَتِ امْرَاَةٌ فَقَالَتْ قَدْ اَرْضَعْتُ عُقْبَةَ وَالَّتِیْ تَزَوَّجَ بِهَا فَقَالَ لَهَا عُقْبَةُ مَا اَعْلَمُ اَنَّكِ قَدْ اَرْضَعْتِنِیْ وَلَا اَخْبَرْتِنِیْ فَاَرْسَلَ اِلٰی اٰلِ اَبِیْ اِهَابٍ فَسَاَلَهُمْ فَقَالُوْا مَا عَلِمْنَا اَرْضَعَتْ صَاحِبَتَنَا فَرَكِبَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِیْنَةِ فَسَاَلَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَیْفَ وَقَدْ قِیْلَ فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَیْرَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عقبہ ابن حارثؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے ابواہاب ابن عزیز کی بیٹی سے نکاح کیا تو ایک عورت نے آکر کہا کہ میں نے عقبہ کو اور ابواہاب کی بیٹی کو جس سے عقبہؓ نے شادی کی ہے دودھ پلایا ہے (لہٰذا عقبہ اور ابواہاب کی بیٹی چونکہ دودھ شریک بھائی بہن ہوئے اس لئے ان کا نکاح باطل ہوا) عقبہ نے اس عورت سے کہا کہ مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ تم نے مجھے دودھ پلایا ہے اور نہ تم نے مجھے (اس سے پہلے) اس بارہ میں بتایا، پھر عقبہؓ نے ایک آدمی کو ابواہاب کے خاندان والوں کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ کیا اس عورت نے تمہاری بیٹی کو دودھ پلایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں معلوم نہیں کہ اس عورت نے ہماری لڑکی کو دودھ پلایا ہو۔ اس کے بعد عقبہؓ سوار ہو کر مدینہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس گئے اور آپ ﷺ سے اپنے نکاح کے بارہ میں پوچھا کہ (یہ صورت پیدا ہو گئی ہے آیا میرا نکاح باطل ہو گیا ہے یا باقی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم اس لڑکی کو کس طرح اپنے نکاح میں رکھ سکتے ہو جب کہ یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ تمہاری دودھ شریک بہن ہے" چنانچہ عقبہؓ نے اس لڑکی کو علیحدہ کر دیا اور اس لڑکی نے ایک دوسرے شخص سے نکاح کر لیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت امام احمدؒ نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ ثبوت رضاعت کے سلسلہ میں ایک عورت کی گواہی قبول ہوتی ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور اکثر علماء کے نزدیک چونکہ دودھ پلانے کا ثبوت دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت جو عادل ہوں، کی گواہی سے ہوتا ہے اس لئے یہ حضرات اس حدیث کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا تعلق محض تقویٰ اور احتیاط سے ہے کہ آپ ﷺ نے احتیاطاً یہ مناسب نہیں سمجھا کہ عقبہؓ اس لڑکی کو اپنے نکاح میں رکھیں۔

دارالحرب سے قید کر کے لائی جانے والی عورت کا حکم

⑨ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَوْمَ حُنَیْنٍ بَعَثَ جَیْشًا اِلٰی اَوْطَاسٍ فَلَقُوْا عَدُوًّا

فَقَاتَلُوْهُمْ فَظَهَرُوْا عَلَيْهِمْ وَاَصَابُوْا لَهُمْ سَبَايَا فَكَاَنَّ نَاسًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَرَّجُوْا مِنْ غِشْيَانِهِنَّ مِنْ اَجْلِ اَزْوَاجِهِنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ ذٰلِكَ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اي فَهُنَّ لَهُمْ حَلَالٌ اِذَا انْقَضَتْ عِدَّتُهُنَّ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے غزوہ حنین کے دن ایک لشکر کو اوطاس کی جانب روانہ کیا (جو طائف کے قریب واقع ہے) چنانچہ وہ لشکر دشمنوں سے نبردآزما ہوا اور جنگ کے بعد ان پر فتح یاب ہوا اور بہت سارے قیدی ان کے ہاتھ لگے (جن میں عورتیں بھی تھیں اور وہ عورتیں بطور لونڈی مجاہدین کی ملکیت میں آئیں) لیکن رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے بعض حضرات نے گویا ان لونڈیوں سے بایں وجہ جماع کرنے سے پرہیز کیا کہ وہ خاوند والی تھیں اور ان کے خاوند مشرک تھے چنانچہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اور حرام کی گئی ہیں تم پر وہ عورتیں جو خاوند والی ہیں مگر وہ عورتیں تم پر حرام نہیں ہیں جو تمہاری ملکیت میں آ گئی ہوں۔ یعنی (وہ عورتیں جنہیں تم جنگ کے بعد دارالحرب سے بطور باندی پکڑ لائے ہو اور ان کے شوہر دارالحرب میں رہ گئے ہیں) وہ عورتیں عدت گزر جانے کے بعد تمہارے لئے حلال ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: مسئلہ یہ ہے کہ جو عورت کسی مرد کے نکاح میں ہو کسی دوسرے مرد کو نہ تو اس سے نکاح کرنا درست ہے اور نہ اسے اپنے تصرف میں لانا جائز ہے ہاں کافروں کی وہ بیویاں جنہیں جنگ وجدل کے بعد دارالحرب سے پکڑ کر لایا جائے اور ان کے خاوند دارالحرب میں رہ گئے ہوں تو ان عورتوں کو ان کی عدت گزر جانے کے بعد اپنے تصرف میں لانا جائز ہے اور یہاں عدت سے مراد "استبراء" ہے یعنی اگر وہ عورت حاملہ ہو تو جب اس کے ہاں ولادت ہو جائے اور اگر اسے حیض آتا ہو تو جب اسے ایک حیض آ جائے اور اگر اسے حیض نہ آتا ہو تو پھر جب ایک مہینہ گزر جائے تب اس سے جماع کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں طیبیؒ نے یہ کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کریمہ کے پیش نظر یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ جب کوئی خاوند والی لونڈی فروخت کی جاتی ہے تو اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور جو شخص اسے خریدتا ہے اس کے لئے استبراء کے بعد اس سے جماع کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ گویا ابن عباسؓ نے اس آیت کے حکم کو عمومیت پر محمول کیا ہے جب کہ اور تمام علماء کا یہ متفقہ مسلک ہے کہ اس کا نکاح نہیں ٹوٹتا ان کے نزدیک یہ آیت ہر خاوند والی لونڈی کے بارہ میں نازل نہیں ہوئی ہے بلکہ یہ صرف ان لونڈیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو دارالحرب سے پکڑ کر لائی گئی ہوں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

وہ عورتیں جنہیں بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا ممنوع ہے

(۱۰) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى اَنْ تُنْكَحَ الْمَرْاَةُ عَلٰى عَمَّتِهَا اَوِ الْعَمَّةُ عَلٰى بِنْتِ اَخِيْهَا وَالْمَرْاَةُ عَلٰى خَالَتِهَا اَوِ الْخَالَةُ عَلٰى بِنْتِ اُخْتِهَا لَا تُنْكَحُ الصُّغْرٰى عَلَى الْكُبْرٰى وَلَا الْكُبْرٰى عَلَى الصُّغْرٰى رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَرِوَايَتُهُ اِلٰى قَوْلِهٖ بِنْتِ اُخْتِهَا۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کسی عورت سے اس کی پھوپھی کی موجودگی میں یا کسی عورت سے اس کی بھتیجی کی موجودگی میں نکاح کیا جائے اور اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ کسی عورت سے اس کی خالہ کی موجودگی میں یا کسی عورت سے اس کی بھانجی کی موجودگی میں نکاح کیا جائے نیز (آپ ﷺ نے فرمایا کہ) بڑے رشتہ والی کی موجودگی میں چھوٹے رشتہ والی سے اور چھوٹی رشتہ والی کی موجودگی میں بڑی رشتہ والی سے نکاح کیا جائے۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ، نسائیؒ) اور نسائیؒ نے اس روایت کو بنت اختہا

تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: حدیث کا دوسرا جز یعنی لا تنکح الصغری علی الکبریٰ الخ دراصل حدیث کے پہلے جزء یعنی ان تنکح المراۃ علی عمتہا الخ کے حکم کی تاکید کے طور پر ہے چنانچہ بڑے رشتہ والی سے پھوپھی اور خالہ مراد ہیں اور چھوٹے رشتہ والی سے بھتیجی اور بھانجی مراد ہیں۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اگر پہلے سے خالہ اپنے نکاح میں ہو تو اس کی موجودگی میں اس کی بھانجی سے یا پہلے سے بھانجی نکاح میں ہو تو اس کی موجودگی میں اس کی خالہ سے یا اسی طرح پہلے سے پھوپھی نکاح میں ہو تو اس کی موجودگی میں اس کی بھتیجی سے یا پہلے سے بھتیجی نکاح میں ہو تو اس کی موجودگی میں اس کی پھوپھی سے نکاح کرنا ناجائز ہے ہاں ان میں سے کسی ایک کو طلاق دینے اور اس کے عدت کے دن گزر جانے کے بعد دوسری سے نکاح کیا جاسکتا ہے یا ان میں سے کسی ایک کے مرجانے کے بعد دوسری سے نکاح کرنا درست ہے۔

باپ کی بیوی سے نکاح کرنا حرام ہے

(۱۱) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ مَرَّبِيْ خَالِي اَبُوْبُرْدَةَ بْنُ نِيَارٍ وَمَعَهُ لِوَاءٌ فَقُلْتُ اَيْنَ تَذْهَبُ فَقَالَ بَعَثَنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةَ اَبِيْهِ اٰتِيْهِ بِرَأْسِهٖ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ وَلِلنَّسَائِيِّ وَابْنِ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيِّ فَاَمَرَنِيْ اَنْ اَضْرِبَ عُنُقَهُ وَاٰخُذَ مَالَهُ وَفِيْ هٰذِهِ الرِّوَايَةِ قَالَ عَمِّيْ بَدَلَ خَالِيْ۔

"اور حضرت براء ابن عازب ؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میرے ماموں حضرت ابوبردۃ ابن نیار میرے پاس سے اس حال میں گزرے کہ ان کے ہاتھ میں ایک نشان تھا، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کہاں جارہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ایک شخص نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرلیا ہے رسول کریم ﷺ نے مجھے اس شخص کے پاس بھیجا ہے تاکہ میں اس کا سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں لے آؤں۔ (ترمذی، ابوداؤد) اور ابوداؤد کی ایک اور روایت میں نیز نسائی، ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں یوں ہے کہ (ابوبردہ ؓ نے کہا کہ) آنحضرت ﷺ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کی گردن ماردوں اور اس کا مال و اسباب لے آؤں۔ اور اس روایت میں "میرے ماموں" کی جگہ "میرے چچا" کے الفاظ ہیں۔ (لہذا یہ بات مختلف فیہ ہوگئی کہ حضرت بردہ ابن نیار ؓ حضرت براء ابن عازب ؓ کے ماموں تھے یا چچا تھے؟)۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے ابوبردہ ؓ کو اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرنے والے کی گردن مارنے کے لئے بھیجا تو ان کے ہاتھ میں بطور نشان ایک جھنڈا دے دیا تھا تاکہ لوگ اس علامتی جھنڈے کو دیکھ کر جان لیں کہ یہ شخص مذکورہ بالا خدمت کی انجام دہی کے لئے دربار رسالت کا فرستادہ ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ابوبردہ ؓ کو جس شخص کی گردن مارنے کا حکم دیا تھا اس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرکے شریعت اسلام کے ایک ظاہری حکم کی محض خلاف ورزی ہی نہیں کی تھی بلکہ اس کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ باپ کی بیوی کے ساتھ نکاح کرنا حلال ہے جیسا کہ اہل جاہلیت یعنی کفار ایسا عقیدہ رکھتے تھے لہذا اسلامی شریعت کا یہ فیصلہ ہے کہ جو شخص کسی حرام چیز کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھے وہ کافر ہوجاتا ہے اور ایسے شخص کو قتل کرڈالنا اور اس کا مال و اسباب ضبط کرلینا جائز ہے۔

مدت رضاعت گزرنے کے بعد دودھ پینا حرمت کو ثابت نہیں کرتا

(۱۲) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُحَرِّمُ مِنَ الرَّضَاعِ اِلَّا مَا فَتَقَ الْاَمْعَاءَ فِي الثَّدْيِ وَكَانَ قَبْلَ الْفِطَامِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ام سلمہ ؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ دودھ پینا حرمت رضاعت کو ثابت کرتا ہے جو چھاتی سے پینے کی وجہ سے

انتڑیوں کو کھول دیتا ہے اور وہ دودھ دودھ چھڑانے کے وقت سے پہلے پیا گیا ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "انتڑیوں کو کھول دیتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ دودھ بچہ کے پیٹ کو اس طرح سیر کردے جس طرح کسی بھوکے پیٹ کو غذا سیر کر دیتی ہے اور وہ دودھ بچہ کی انتڑیوں میں غذا کی جگہ حاصل کرلے، چنانچہ یہ بات شیر خوارگی کی مدت میں ہوتی ہے اور شیر خوارگی کی مدت دو سال یا ڈھائی سال کی عمر تک رہتی ہے۔ اس ارشاد کی مراد یہ ہے کہ بڑی عمر میں یعنی دو سال یا ڈھائی سال کی عمر کے بعد دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی بلکہ چھوٹی عمر یعنی دو سال یا ڈھائی سال کی عمر تک کے عرصہ میں دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے۔

"چھاتی سے پینے کی وجہ سے" ان الفاظ کا مقصد محض دودھ پلانے کی صورت اور واقعہ کا بیان کرنا ہے کہ عورت بچہ کو اپنی چھاتی سے دودھ پلاتی ہے ورنہ تو حرمت رضاعت کے ثابت ہونے کے لئے چھاتی سے دودھ پینا شرط نہیں ہے یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ حرمت رضاعت اسی صورت میں ثابت ہوگی جب کہ بچہ نے عورت کی چھاتی ہی سے دودھ پیا ہو بلکہ خواہ عورت اپنی چھاتی سے دودھ پلائے خواہ کسی چیز جیسے چمچہ وغیرہ میں دودھ نکال کر پھر بچہ کو پلائے اور خواہ کسی اور ذریعہ سے اپنا دودھ اس کے پیٹ میں پہنچائے بہرصورت حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

"وہ دودھ، دودھ چھڑانے کے وقت سے پہلے پیا ہو" یہ جملہ دراصل ماقبل کی عبارت کی تاکید کے طور پر ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ شریعت میں بچہ کا دودھ چھڑانے کا جو وقت مقرر ہے یعنی دو سال یا ڈھائی سال کی عمر اس سے پہلے جو دودھ پیا گیا ہے حرمت رضاعت کے سلسلے میں اسی کا اعتبار ہوگا۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ مدت رضاعت کے سلسلے میں وقت معین سے پہلے دودھ چھڑانے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا چنانچہ اگر کسی بچہ کا دودھ وقت متعین سے پہلے یعنی دو سال یا ڈھائی سال کی عمر سے پہلے چھڑا دیا گیا اور اس کے بعد اس مدت متعین یعنی دو سال یا ڈھائی سال کی عمر کے اندر کسی عورت نے اس کو اپنا دودھ پلا دیا تو حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی اس بارہ میں ضمنی طور یہ مسئلہ جان لینا ضروری ہے کہ کسی بچہ کو وقت متعین یعنی دو سال یا ڈھائی سال کی عمر کے بعد دودھ پلانا جائز نہیں ہے کیونکہ دودھ، انسان کا ایک جزو ہے اور انسان کے جزو سے بغیر ضرورت فائدہ اٹھانا حرام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مدت رضاعت کے بعد ضرورت ختم ہو جاتی ہے اسی بناء پر انسان کے دودھ کو بطور دوا استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

بطور نکتہ ایک یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ اطباء نے ثابت کیا ہے کہ بیٹی کا دودھ آنکھ کو فائدہ کرتا ہے، علماء نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے چنانچہ بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ (اگرچہ طبی طور پر یہ بات صحیح ہو لیکن شرعی طور پر) یہ جائز نہیں ہے جب کہ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے بشرطیکہ یہ گمان غالب ہو کہ اپنی بیٹی کا دودھ آنکھ میں ڈالنے سے آنکھ کا مرض جاتا رہے گا۔

دودھ پلانے والی کا حق کس طرح ادا ہو سکتا ہے؟

⑬ وَعَنْ حَجَّاجِ بْنِ حَجَّاجِ الْاَسْلَمِيِّ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يُذْهِبُ عَنِّيْ مَذِمَّةَ الرَّضَاعِ فَقَالَ غُرَّةٌ عَبْدٌ اَوْ اَمَةٌ۔ (رواه الترمذی والبوداؤد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت حجاج ابن حجاج اسلمیؓ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی حضرت حجاج اسلمیؓ نے) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! وہ کون سی چیز ہے جس سے میں دودھ کے حق میں سبکدوش ہو سکتا ہوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "مملوک یعنی بردہ خواہ غلام ہو یا لونڈی۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: پوچھنے والے کا مطلب یہ تھا کہ وہ کون سی چیز ہے جو میں اگر دودھ پلانے والی کو دے دوں تو اس کی وجہ سے دودھ پلانے والی

کے اس حق سے میں سبکدوش ہو جاؤں جو اس کا دودھ پینے کی وجہ سے مجھ پر ہے! آنحضرت ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر تم اس عورت کو کہ جس نے تمہیں دودھ پلایا ہے کوئی غلام یا لونڈی دے دو تو اس کے دودھ پلانے کا حق ادا ہو جائے گا۔ گویا حاصل یہ ہوا کہ دودھ پلانے والی چونکہ ایک بڑی خدمت انجام دیتی ہے اس لئے اس کو بھی کوئی خادم دے دینا چاہئے تاکہ وہ خادم اس کی خدمت کرے اور اس طرح "خدمت" کا بدلہ "خدمت" ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ کی طرف سے دایہ حلیمہؓ کی تعظیم و تکریم

⑭ وَعَنْ اَبِي الطُّفَيْلِ الْغَنَوِيِّ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ اَقْبَلَتِ امْرَاَةٌ فَبَسَطَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رِدَاءَهُ حَتّٰى قَعَدَتْ عَلَيْهِ فَلَمَّا ذَهَبَتْ قِيْلَ هٰذِهٖ اَرْضَعَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابوطفیل غنویؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نبی کریم ﷺ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ایک خاتون (یعنی دایہ حلیمہؓ) آئیں آنحضرت ﷺ نے (ان کی تعظیم و تکریم اور ان کی خوشی کے لئے) اپنی مبارک چادر بچھادی اور وہ اس پر بیٹھ گئیں پھر جب وہ (کہیں) چلی گئیں تو (ان لوگوں کو جو آپ ﷺ کی اس تعظیم و تکریم کی وجہ سے اور آپ ﷺ کی مبارک چادر پر ان خاتون کے بیٹھ جانے سے حیران و متعجب تھے) بتایا گیا کہ یہ وہ خاتون ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کو دودھ پلایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

چار سے زیادہ نکاح کی ممانعت

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ غَيْلَانَ بْنَ سَلَمَةَ الثَّقَفِيَّ اَسْلَمَ وَلَهٗ عَشْرُ نِسْوَةٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَاَسْلَمْنَ مَعَهٗ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمْسِكْ اَرْبَعًا وَفَارِقْ سَائِرَهُنَّ۔ (رواه احمد والترمذی وابن ماجة)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب غیلان ابن سلمہؓ ثقفی مسلمان ہوئے تو ان کے دس بیویاں تھیں جن سے انہوں نے ایام جاہلیت میں شادیاں کی تھیں چنانچہ ان کے ساتھ ان کی وہ دس بیویاں بھی مسلمان ہو گئیں پھر رسول کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ ان میں سے چار عورتوں کو (اپنے نکاح میں) رکھو اور باقی کو علیحدہ کر دو۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کفر کی حالت میں جو شادی کی جاتی ہے وہ معتبر ہوتی ہے، چنانچہ اگر کافر میاں بیوی اسلام لے آئیں تو انہیں تجدید نکاح کا حکم نہیں دیا جائے گا بشرطیکہ ان کے نکاح میں ایسے رشتوں والی عورتیں نہ ہوں جنہیں بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا شریعت اسلامی نے ممنوع قرار دیا ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چار سے زیادہ عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے۔

⑯ وَعَنْ نَوْفَلِ بْنِ مُعَاوِيَةَ قَالَ اَسْلَمْتُ وَتَحْتِيْ خَمْسُ نِسْوَةٍ فَسَاَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ فَارِقْ وَاحِدَةً وَاَمْسِكْ اَرْبَعًا فَعَمَدْتُ اِلٰى اَقْدَمِهِنَّ صُحْبَةً عِنْدِيْ عَاقِرٍ مُنْذُ سِتِّيْنَ سَنَةً فَفَارَقْتُهَا۔ (رواه فی شرح السنة)

"اور حضرت نوفل ابن معاویہؓ کہتے ہیں کہ جب میں مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں چنانچہ میں نے (اس بارہ میں) رسول کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ایک کو علیحدہ کر دو اور چار کو باقی رکھو" (آپ ﷺ کا یہ حکم سن کر) میں نے اپنی سب سے پہلی بیوی کو علیحدہ کر دیا جو بانجھ تھی اور ساٹھ سال سے میرے ساتھ تھی۔" (شرح السنة)

دو بہنوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنے کی ممانعت

⑰ وَعَنِ الضَّحَّاكِ بْنِ فَيْرُوْزَ الدَّيْلَمِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اَسْلَمْتُ وَتَحْتِيْ اُخْتَانِ قَالَ اخْتَرْ اَيَّتَهُمَا شِئْتَ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد وابن ماجة)

"اور حضرت ضحاک ابن فیروز دیلمی اپنے والد (حضرت فیروز ؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میرے نکاح میں دو بہنیں ہیں (اس بارہ میں کیا حکم ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "ان دونوں میں جس ایک کو چاہو رکھ لو۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: مظہرؒ کہتے ہیں کہ حضرت امام شافعیؒ حضرت امام مالکؒ کا مسلک تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس حال میں اسلام قبول کرے کہ اس کے نکاح میں دو بہنیں ہوں اور وہ دونوں بھی اس کے ساتھ اسلام قبول کر لیں تو اس کے لئے جائز ہو گا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے نکاح میں برقرار رکھے خواہ وہ پہلی منکوحہ ہو یا دوسری منکوحہ ہو لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر اس شخص نے ان دو بہنوں سے ایک ساتھ عقد کیا تھا تو اس صورت میں اس کے لئے ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے نکاح میں برقرار رکھنا جائز نہیں ہو گا ہاں اگر اس نے ان دونوں سے آگے پیچھے عقد کیا تھا تو ان میں سے ایک اس کو اپنے نکاح میں رکھنا جائز ہو گا، جس سے اس نے پہلا نکاح کیا تھا، جس سے بعد میں نکاح کیا تھا اس کو کسی صورت میں بھی اپنے نکاح میں برقرار رکھنا جائز نہیں ہو گا۔

کافر میاں بیوی میں سے کوئی ایک اسلام قبول کر لے تو ان دونوں کا نکاح باقی رہتا ہے یا نہیں؟

⑱ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَسْلَمَتْ امْرَأَةٌ فَتَزَوَّجَتْ فَجَاءَ زَوْجُهَا اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي قَدْ اَسْلَمْتُ وَعَلِمَتْ بِاِسْلَامِي فَانْتَزَعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ زَوْجِهَا الْاٰخِرِ وَرَدَّهَا اِلَى زَوْجِهَا الْاَوَّلِ وَفِي رِوَايَةٍ اَنَّهُ قَالَ اِنَّهَا اَسْلَمَتْ مَعِي فَرَدَّهَا عَلَيْهِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَرُوِيَ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ اَنَّ جَمَاعَةً مِنَ النِّسَاءِ رَدَّهُنَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنِّكَاحِ الْاَوَّلِ عَلَى اَزْوَاجِهِنَّ عِنْدَ اجْتِمَاعِ الْاِسْلَامَيْنِ بَعْدَ اخْتِلَافِ الدِّيْنِ وَالدَّارِ مِنْهُنَّ بِنْتُ الْوَلِيْدِ بْنِ مُغِيْرَةَ كَانَتْ تَحْتَ صَفْوَانَ ابْنِ اُمَيَّةَ فَاَسْلَمَتْ يَوْمَ الْفَتْحِ وَهَرَبَ زَوْجُهَا مِنَ الْاِسْلَامِ فَبَعَثَ اِلَيْهِ ابْنَ عَمِّهٖ وَهْبَ بْنَ عُمَيْرٍ بِرِدَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَانًا لِصَفْوَانَ فَلَمَّا قَدِمَ جَعَلَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسْيِيْرًا اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ حَتّٰى اَسْلَمَ فَاسْتَقَرَّتْ عِنْدَهٗ وَاَسْلَمَتْ اُمُّ حَكِيْمٍ بِنْتُ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ امْرَأَةُ عِكْرِمَةَ بْنِ اَبِي جَهْلٍ يَوْمَ الْفَتْحِ بِمَكَّةَ وَهَرَبَ زَوْجُهَا مِنَ الْاِسْلَامِ حَتّٰى قَدِمَ الْيَمَنَ فَارْتَحَلَتْ اُمُّ حَكِيْمٍ حَتّٰى قَدِمَتْ عَلَيْهِ الْيَمَنَ فَدَعَتْهُ اِلَى الْاِسْلَامِ فَاَسْلَمَ فَثَبَتَا عَلَى نِكَاحِهِمَا رَوَاهُ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ ایک عورت نے اسلام قبول کیا اور پھر اس نے (ایک شخص سے) نکاح کر لیا، اس کے بعد اس کا پہلا شوہر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں اسلام قبول کر چکا ہوں اور میری اس بیوی کو میرے اسلام قبول کر لینے کا علم تھا (لیکن اس کے باوجود اس نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو دوسرے خاوند سے علیحدہ کر کے پہلے خاوند کے حوالے کر دیا۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ "اس پہلے خاوند نے یہ کہا کہ وہ عورت (یعنی میری بیوی جس نے اب دوسرے شخص سے نکاح کر لیا ہے) میرے ساتھ ہی مسلمان ہوئی تھی آپ ﷺ نے یہ (سن کر) اس عورت کو اسی (پہلے شوہر) کے حوالہ کر دیا" (ابوداؤد) اور شرح السنۃ میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان جیسی بہت سی عورتوں کو ان کے پہلے نکاح کے مطابق ان کے شوہروں کے حوالہ کر دیا تھا جن کے شوہر دین اور ملک کے فرق کے بعد ان کے ساتھ اسلام کی صف میں شامل ہو گئے تھے (یعنی غیر مسلم میاں بیوی میں سے کسی ایک کے اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے اور ایک کے دار الاسلام میں اور دوسرے کے دار الحرب میں رہنے کی وجہ سے گویا دونوں کے درمیان مذہبی اور ملکی بعد و اختلاف واقع ہو جاتا تھا مگر جب وہ دوسرا بھی اسلام قبول کر لیتا تو آنحضرت ﷺ ان کے سابقہ نکاح کو باقی رکھتے ہوئے بیوی کو شوہر کے حوالہ کر دیتے تھے گویا قبولیت اسلام کے بعد تجدید نکاح کی ضرورت نہیں ہوتی تھی) چنانچہ ان عورتوں میں ایک عورت ولید ابن مغیرہ کی بیٹی بھی تھی جو صفوان ابن امیہ کی بیوی تھی، یہ

عورت (اپنے شوہر سے پہلے) فتح مکہ کے دن مسلمان ہوگئی اور اس کے شوہر نے اسلام سے گریز کیا، آنحضرت ﷺ نے اس کے شوہر (صفوان ابن امیہ) کے پاس اس کے چچا کے بیٹے وہب ابن عمیرؓ کو اپنی مبارک چادر دے کر بھیجا اور اس کو امان عطا کیا (یعنی آپ ﷺ نے وہبؓ کو بطور علامت اپنی چادر دے کر بھیجا کہ وہ صفوان کو یہ چادر دکھا کر مطلع کریں کہ قتل و تشدد سے تمہیں امان دی گئی ہے تم بلا خوف آسکتے ہو) پھر جب صفوان آگئےؓ تو ان کی سیر کے لئے چار مہینے مقرر کئے گئے (یعنی انہیں اجازت دی گئی کہ وہ پورے امن و امان کے ساتھ چار مہینے تک مسلمانوں کے درمیان گھومیں پھریں تاکہ وہ مسلمانوں کی عادات و اطوار کا اچھی طرح مشاہدہ کرلیں چنانچہ وہ چند دنوں تک مسلمانوں کے درمیان گھومتے پھرتے رہے) یہاں تک کہ صفوان بھی (اپنی بیوی کے مسلمان ہونے کے دو مہینے بعد) مسلمان ہوگئے اور ولید کی بیٹی جو ان کے نکاح میں تھی ان کی بیوی برقرار رہی۔ اسی طرح ان عورتوں میں ایک عورت اُمّ حکیم تھیں جو حارث ابن ہشامؓ کی بیٹی اور ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ کی بیوی تھیں، انہوں نے بھی فتح مکہ کے دن مکہ میں اسلام قبول کیا اور ان کے خاوند (عکرمہ) نے اسلام سے گریز کیا اور یمن چلے گئے چنانچہ (کچھ دنوں کے بعد) اُمّ حکیمؓ بھی (آنحضرت ﷺ کے حکم سے اپنے خاوند کو راہ راست پر لانے کے لئے) یمن پہنچیں اور انہوں نے اپنے خاوند عکرمہؓ کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی تاآنکہ وہ مسلمان ہوگئے اور ان دونوں کا نکاح باقی رہا۔ اس روایت کو امام مالکؒ نے ابن شہاب سے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: اگر غیر مسلم میاں بیوی میں سے کوئی ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا مسلمان نہ ہو تو ان دونوں کا نکاح باقی رہے گا یا نہیں؟ اس بارہ میں مظہرؒ کہتے ہیں کہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں اگر وہ دوسرا (کہ جس نے پہلے کے ساتھ اسلام قبول نہیں کیا تھا خواہ وہ بیوی ہو یا خاوند ہو) عدت کے ایام گزرنے سے پہلے اسلام قبول کرلے تو ان کا نکاح باقی رہے گا خواہ ان دونوں کا سابقہ مذہب یکساں رہا ہو مثلاً دونوں عیسائی یا یہودی اور یا بت پرست رہے ہوں، خواہ دونوں کا سابقہ مذہب یکساں نہ رہا ہو مثلاً ایک کا مذہب بت پرستی رہا ہو اور دوسرا عیسائی یا یہودی رہا ہو، اسی طرح خواہ وہ دونوں ہی دارالاسلام میں رہنے والے ہوں یا دارالحرب میں اور خواہ ان میں ایک تو دارالاسلام میں رہتا ہو اور دوسرا دارالحرب میں۔

اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ان دونوں کے درمیان تفریق ان تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ ہی سے ہو سکتی ہے، اول یہ کہ عدت کے دن پورے ہو جائیں۔ دوم یہ کہ ان دونوں میں سے جس نے اسلام قبول کرلیا ہے وہ اسلام قبول نہ کرنے والے کو اسلام کی دعوت دے اور وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کردے۔ سوم یہ کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک دارالاسلام سے منتقل ہو کر دارالحرب چلا جائے یا دارالحرب چھوڑ کر دارالاسلام آجائے۔ نیز امام اعظمؒ کے نزدیک ان دونوں میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کرنا خواہ مجامعت سے پہلے واقع ہوا ہو یا بعد میں دونوں صورتوں کا یکساں حکم ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

کون کون رشتہ والی عورتیں محرمات میں داخل ہیں

(۱۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حُرِّمَ مِنَ النَّسَبِ سَبْعٌ وَمِنَ الصِّهْرِ سَبْعٌ ثُمَّ قَرَأَ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ الْآيَةَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ازروئے نسب سات رشتوں کی عورتیں حرام کی گئی ہیں اور ازروئے مصاہرت بھی سات رشتوں کی عورتیں حرام کی گئی ہیں پھر حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ (النساء ۴: ۲۳) آخر تک پڑھی۔" (بخاری)

تشریح: ازروئے نسب جو سات رشتہ والی عورتیں حرام قرار دی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) ماں۔ (۲) بیٹی۔ (۳) بہن۔ (۴) پھوپھی۔ (۵) خالہ۔ (۶) بھتیجی۔ (۷) بھانجی۔

"مصاہرت" اس رشتہ اور قرابت کو کہتے ہیں جو نکاح کے ذریعہ قائم ہو اور جسے "سسرالی رشتہ" بھی کہا جاتا ہے، چنانچہ مصاہرت یعنی سسرالی رشتہ کی وجہ سے جو سات عورتیں حرام قرار دی گئی ہیں ان میں سے چار تو ہمیشہ کے لئے حرام ہوتی ہیں کہ ان سے کسی بھی حال میں اور کسی بھی وقت نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا اور وہ یہ ہیں۔ ① بیوی کی ماں یعنی ساس۔ ② بیٹے اور پوتے کی بیویاں یعنی بہو اور پوت بہو، اگرچہ وہ کتنے ہی نیچے درجہ کی ہوں جیسے پڑپوتے اور سکڑ پوتے وغیرہ کی بیویاں۔ ③ باپ اور دادا کی بیویاں اگرچہ اوپر کے درجہ کی ہوں جیسے پڑدادا اور سکڑ دادا وغیرہ کی بیویاں۔ ④ اپنی اس بیوی کی بیٹی جس سے جماع کر چکا ہو۔ سسرالی رشتہ کی وہ تین عورتیں جو ہمیشہ کے لئے حرام نہیں ہیں وہ یہ ہیں۔ ① بیوی کی بہن۔ ② بیوی کی پھوپھی۔ ③ بیوی کی خالہ۔

حضرت ابن عباسؓ نے اپنی بات کی دلیل کے طور پر قرآن کریم کی آیت پڑھی، چنانچہ اس آیت میں نسبی رشتہ والی ان ساتوں عورتوں کا ذکر ہے جو حرام قرار دی گئی ہیں اور سسرالی رشتہ کی وجہ سے جو عورتیں حرام ہیں ان میں سے اکثر کا ذکر اس آیت میں ہے۔ پوری آیت یوں ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنَاتُ الْاَخِ وَبَنَاتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (النساء ۴: ۲۳)

"حرام کی گئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہاری بھتیجیاں اور تمہاری بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جو ان کے پہلے شوہر سے ہیں اور تمہاری پرورش میں ہیں اور جو تمہاری ان بیویوں سے ہیں جن سے تم نے جماع کیا ہے اور اگر تم نے ان بیویوں سے جماع نہیں کیا ہے تو تمہارے لئے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم ان کی بیٹیوں سے نکاح کرو، اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی حرام ہیں) جو تمہاری نسل سے ہوں اور یہ بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ اپنے نکاح میں رکھو لیکن جو پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے) بے شک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے رحمت والے ہیں۔"

اپنی بیوی کی بیٹی سے نکاح کی ممانعت

⑳ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ نَكَحَ امْرَاَةً فَدَخَلَ بِهَا فَلَا يَحِلُّ لَهٗ نِكَاحُ ابْنَتِهَا وَاِنْ لَّمْ يَدْخُلْ بِهَا فَلْيَنْكِحِ ابْنَتَهَا وَاَيُّمَا رَجُلٍ نَكَحَ امْرَاَةً فَلَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يَّنْكِحَ اُمَّهَا دَخَلَ بِهَا اَوْلَمْ يَدْخُلْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَا يَصِحُّ مِنْ قِبَلِ اِسْنَادِهٖ وَاِنَّمَا رَوَاهُ ابْنُ لَهِيْعَةَ وَالْمُثَنَّى بْنُ الصَّبَّاحِ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ وَهُمَا يُضَعَّفَانِ فِي الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص عورت سے نکاح کرے اور پھر اس سے جماع کرے تو اس کے لئے اس بیوی کی بیٹی سے (جو اس کے پہلے شوہر سے ہے) نکاح کرنا جائز نہیں ہے (بشرطیکہ اس بیوی کو طلاق دے چکا ہو یا وہ مر گئی ہو، کیونکہ اس بیوی کو اور اس کی بیٹی کو ایک ساتھ اپنے نکاح میں رکھنا اس صورت میں بھی جائز نہیں ہے) اور جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کر لیا تو اب اس کے لئے اپنی اس منکوحہ کی ماں یعنی اپنی ساس سے نکاح کرنا جائز نہیں ہو گا خواہ اپنی اس منکوحہ سے جماع کیا ہو یا جماع نہ کیا ہو۔ اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث اپنی سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کو ابن لہیعہ اور مثنی ابن صباح نے عمرو ابن شعیبؒ سے نقل کیا ہے اور وہ دونوں

حدیث روایت کرنے کے سلسلہ میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں (گویا یہ حدیث اپنے راویوں سے اعتبار سے تو صحیح نہیں ہے لیکن اپنے مفہوم ومعنی کے اعتبار سے صحیح ہے کیونکہ اس حدیث میں جو مفہوم بیان کیا گیا ہے وہ قرآن کی آیت کے مطابق ہے)۔"

تشریح: حدیث میں اپنی بیوی کی بیٹی سے نکاح کے عدم جواز کا جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ قرآن کریم کی اس آیت سے ثابت ہے:

وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ۔

(النساء ۴: ۲۳)

"اور حرام ہیں تم پر تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جوان کے لئے پہلے شوہر سے ہیں اور تمہاری پرورش میں ہیں اور جو تمہاری ان بیویوں سے ہیں جن سے تم جماع کر چکے ہو اور اگر تم نے ان بیویوں سے جماع نہیں کیا ہے تو اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم ان کی بیٹیوں سے نکاح کرو۔"

اور بیوی کی ماں یعنی اپنی ساس سے نکاح کے عدم جواز کا جو مطلق حکم بیان کیا گیا ہے وہ قرآن کریم کی اس مطلق آیت سے ثابت ہے۔

وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِکُمْ۔

"اور حرام ہیں تم پر تمہاری بیویوں کی مائیں۔"

بَابُ الْمُبَاشَرَةِ

مباشرت کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مباشرت کے سلسلہ میں یہود کے ایک غلط خیال کی تردید

① عَنْ جَابِرٍ قَالَ کَانَتِ الْیَهُوْدُ تَقُوْلُ اِذَا اَتَی الرَّجُلُ امْرَاَتَهٗ مِنْ دُبُرِهَا فِیْ قُبُلِهَا کَانَ الْوَلَدُ اَحْوَلَ فَنَزَلَتْ نِسَاءُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ یہودی یہ کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی عورت کے پیچھے کی طرف سے اس کے اگلے حصہ (یعنی شرم گاہ) میں جماع کرتا ہے تو اس کے بھینگا بچہ پیدا ہوتا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: نِسَآءُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ تمہاری عورتیں (یعنی تمہاری بیویاں اور لونڈیاں) تمہاری کھیتی ہیں لہٰذا تمہیں اختیار ہے کہ ان کے پاس جس طرح چاہو آؤ۔ (اس روایت کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: یہودی یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص عورت سے اس طرح جماع کرے کہ اس کے پیچھے کھڑا ہو کر یا بیٹھ کر اس کے اگلے حصہ یعنی شرم گاہ میں اپنا عضو داخل کرے تو اس کی وجہ سے بھینگا بچہ پیدا ہوگا، چنانچہ ان کے اس غلط خیال اور وہم کی تردید کے لئے یہ آیت نازل ہوئی کہ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں کہ جس طرح تمہارے کھیتوں میں تمہارے لئے فصل پیدا ہوتی ہے اسی طرح تمہاری بیویوں کے ذریعہ تمہاری اولاد پیدا ہوتی ہے اس لئے تم اپنی کھیتی میں آنے میں خود مختار ہو کہ جس طرح چاہو آؤ خواہ لیٹ کر خواہ بیٹھ کر خواہ کھڑے ہو کر خواہ پیچھے ہو کر اور خواہ آگے ہو کر جس طرح بھی تمہارا جی چاہے ان سے جماع کرو کسی صورت میں کوئی نقصان نہیں ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جماع بہر صورت عورت کے اگلے حصہ یعنی شرم گاہ ہی میں کیا جائے کیونکہ جس اعتبار سے عورت کو کھیتی کہا گیا ہے اس کا اطلاق عورت کی شرم گاہ ہی پر ہو سکتا ہے مقعد پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا، بایں وجہ کہ مقعد اولاد پیدا ہونے کی جگہ نہیں ہے بلکہ پاخانہ کی جگہ۔

ہے اس لئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ پیچھے کے حصہ میں بد فعلی یعنی اغلام کرنا صرف اسلام ہی نہیں بلکہ ہر دین میں حرام ہے۔

عزل کا مسئلہ

(۲) وَعَنْهُ قَالَ كُنَّا نَعْزِلُ وَالْقُرْاٰنُ يَنْزِلُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ مُسْلِمٌ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَنْهَنَا۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ (رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں) عزل کرتے تھے اور قرآن نازل ہوتا رہتا تھا (یعنی نزول کا سلسلہ جاری تھا مگر اس بارہ میں کوئی ممانعت نازل نہیں ہوئی)۔ (بخاری و مسلم) مسلمؒ نے اپنی روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "ہمارے اس فعل کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو تھی مگر آپ ﷺ نے ہمیں اس سے منع نہیں فرمایا۔"

تشریح: "عزل" کا مطلب یہ ہے کہ عورت سے اس طرح جماع کیا جائے کہ مرد جب منزل ہونے لگے تو وہ اپنا عضو مخصوص عورت کی شرم گاہ سے باہر نکال کر مادہ کا باہر ہی اخراج کر دے۔ اس طریقہ سے مادہ منویہ چونکہ اندر نہیں پہنچتا اس لئے عورت حاملہ ہونے سے بچ جاتی ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اکثر علماء اس بات کے قائل ہیں کہ عزل جائز ہے اور بعض حضرات جن میں کچھ صحابہؓ بھی شامل ہیں اس کو ناجائز کہتے ہیں لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ عزل کرنا جائز ہے چنانچہ در مختار میں بھی یہی لکھا ہے کہ (اگر کوئی شخص کسی کی خاص مصلحت یا عذر کی بنا پر عزل کرنا چاہے تو اس کی اجازت ہے لیکن یہ ملحوظ رہے کہ) اپنی لونڈی سے عزل کرنا تو اس کی اجازت کے بغیر بھی جائز ہے جب کہ اپنی آزاد منکوحہ سے اس کی اجازت کے بعد ہی جائز ہوگا اسی طرح اگر کسی دوسرے کی لونڈی اپنے نکاح میں ہو تو اس کے مالک کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اس سے عزل کرنا جائز ہوگا حضرت امام شافعیؒ کے بارہ میں سید نے یہ لکھا ہے کہ ان کے نزدیک بھی اپنی آزاد منکوحہ سے اس کی اجازت کے بعد ہی عزل کرنا جائز ہے لیکن لونڈی خواہ اپنی مملوکہ ہو یا منکوحہ ہو اس کی اجازت کے بغیر بھی عزل کرنا جائز ہے۔ اور امام نوویؒ نے (جو شافعی المسلک ہیں) یہ لکھا ہے کہ ہمارے یعنی شوافع کے نزدیک عزل کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ انقطاع نسل کا سبب ہے۔

(۳) وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ رَجُلاً اَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ لِيْ جَارِيَةً هِيَ خَادِمَتُنَا وَاَنَا اَطُوْفُ عَلَيْهَا وَاَكْرَهُ اَنْ تَحْمِلَ فَقَالَ اِعْزِلْ عَنْهَا اِنْ شِئْتَ فَاِنَّهُ سَيَاْتِيْهَا مَا قُدِّرَ لَهَا فَلَبِثَ الرَّجُلُ ثُمَّ اَتَاهُ فَقَالَ اِنَّ الْجَارِيَةَ قَدْ حَبِلَتْ فَقَالَ قَدْ اَخْبَرْتُكَ اَنَّهُ سَيَاْتِيْهَا مَا قُدِّرَ لَهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے پاس لونڈی ہے جو ہماری خدمت کرتی ہے اور میں اس سے جماع بھی کرتا ہوں لیکن میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ وہ حاملہ ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تم چاہو تو عزل کر لیا کرو لیکن اس (لونڈی) کے ذریعہ جو چیز پیدا ہونی مقدر ہو چکی ہے وہ ضرور پیدا ہوگی" اس کے بعد کچھ عرصہ تک وہ شخص نہیں آیا اور پھر جب آیا تو کہنے لگا کہ میری لونڈی حاملہ ہو گئی ہے، آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "میں نے تو تمہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ اس کے ذریعہ جو چیز پیدا ہونی مقدر ہو چکی ہے وہ ضرور پیدا ہوگی"۔ (مسلم)

تشریح: علامہ نوویؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عزل کرنے کے باوجود اگر حمل ٹھہر جائے تو اس کا نسب ثابت ہوگا اور علامہ ابن ہمامؒ نے اس بارہ میں لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے عورت کی اجازت کے بعد یا اس کی اجازت کے بغیر عزل کیا اور اس کے باوجود اس عورت کے حمل ٹھہر گیا۔ تو آیا اس شخص کے لئے اس حمل سے انکار کرنا (یعنی یہ کہنا کہ یہ حمل میرا نہیں ہے) جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں تفصیل ہے، چنانچہ علماء کا قول ہے کہ اگر اس شخص نے عزل کرنے کے بعد پھر دخول نہیں کیا تھا یا دخول کیا تھا مگر اس سے پہلے پیشاب نہیں کیا تھا تو پھر اس کے لئے اس حمل سے انکار کرنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں اس بات کا قوی احتمال

ہوسکتا ہے کہ اس کے ذکر میں منی کا کوئی قطرہ باقی رہ گیا ہو اور وہ اب دخول کی صورت میں عورت کے رحم میں چلا گیا ہو۔ اسی طرح حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہ مسلک ہے کہ اگر کسی شخص نے (مثلاً جماع سے فارغ ہونے کے بعد) پیشاب کرنے سے پہلے غسل جنابت کیا اور اس کے بعد جب اس نے پیشاب کیا تو منی کا کوئی قطرہ نکل آیا تو اس صورت میں اس پر واجب ہوگا کہ وہ اب پھر غسل کرے۔

④ وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ غَزْوَۃِ بَنِی الْمُصْطَلَقِ فَاَصَبْنَا سَبْیًا مِنْ سَبْیِ الْعَرَبِ فَاشْتَھَیْنَا النِّسَاءَ وَاشْتَدَّتْ عَلَیْنَا الْعُزْبَۃُ وَاَحْبَبْنَا الْعَزْلَ فَاَرَدْنَا اَنْ نَعْزِلَ وَقُلْنَا نَعْزِلُ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَ اَظْھُرِنَا قَبْلَ اَنْ نَسْاَلَہٗ فَسَاَلْنَاہُ عَنْ ذٰلِکَ فَقَالَ مَا عَلَیْکُمْ اَنْ لَّا تَفْعَلُوْا مَا مِنْ نَسَمَۃٍ کَائِنَۃٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ اِلَّا وَھِیَ کَائِنَۃٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؒ کہتے ہیں کہ جب ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ بنی المصطلق کی جنگ میں گئے تو عرب قوم میں سے کچھ لونڈی غلام ہمارے ہاتھ آئے، ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی اور مجرد رہنا ہمارے لئے سخت مشکل ہو گیا اور (ان لونڈیوں سے جو ہمارے ہاتھ لگی تھیں) ہم نے عزل کرنا چاہا) تاکہ ان کے حمل نہ ٹھہر جائے) آخر ہم نے عزل کا ارادہ کر لیا مگر پھر ہم نے سوچا کہ جب رسول کریم ﷺ ہمارے درمیان ہیں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ ہم نے آپ سے اس کے بارہ میں دریافت تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اگر تم عزل نہ کرو تو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے اس لئے کہ قیامت تک جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو پیدا ہو کر رہے گی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: امام نوویؒ کہتے ہیں کہ سبیا من العرب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اہل عرب پر بھی رق جاری ہوتا ہے جب کہ وہ مشرک ہوں۔ (یعنی جس طرح غیر عرب مشرک و کافر جنگ میں پکڑ لئے جانے کے بعد غلام و لونڈی بنائے جاسکتے ہیں اسی طرح اگر وہ مشرک و کافر جن کا تعلق عرب و نسل سے ہو کسی جنگ میں بطور قیدی ہاتھ لگیں تو وہ بھی مسلمانوں کے حق میں لونڈی غلام ہو جاتے ہیں کیونکہ یہاں جن لونڈی غلاموں کا ہاتھ لگنا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق بنی المصطلق سے تھا جو قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ تھی اور قبیلہ خزاعہ والے اہل عرب میں سے تھے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا قول قدیم بھی یہی ہے۔

ماعلیکم ان لا تفعلو میں حروف "ان" الف کے زبر کے ساتھ یعنی۔ اَن بھی صحیح ہے اور الف کے زیر کے ساتھ یعنی اِن بھی صحیح ہے، اس جملہ کے معنی نوویؒ نے یہ بیان کئے ہیں کہ اگر تم عزل نہ کرو تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے کیونکہ جب یہ بات طے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس نفس کو پیدا کرنا مقدر کر دیا ہے تو وہ ضرور پیدا ہو کر رہے گا اس لئے تم عزل کرو یا عزل نہ کرو پیدا ہونے والی جان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا اگر اسے دنیا میں آنا ہے تو تم لاکھ عزل کرلو ضبط ولادت کے لاکھ طریق آزمالو وہ اس دنیا میں آکر رہے گی اور اگر اس کا پیدا ہونا مقدر نہیں ہے۔ تو پھر اگر عزل نہ کرو تو تمہارا کوئی نقصان نہیں حاصل یہ کہ تمہارا عزل کرنا کوئی فائدہ مند چیز نہیں ہے۔ اس اعتبار سے یہ حدیث عزل کے عدم جواز کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان لا تفعلوا میں حرف لا زائد ہے اس صورت میں اس جملہ کے یہ معنی ہوں گے کہ "عزل کرنے میں کوئی قباحت نہیں" اس اعتبار سے یہ حدیث عزل کے جائز ہونے کی دلیل ہوگی۔

⑤ وَعَنْہُ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْعَزْلِ فَقَالَ مَا مِنْ کُلِّ الْمَاءِ یَکُوْنُ الْوَلَدُ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ خَلْقَ شَیْءٍ لَمْ یَمْنَعْہُ شَیْءٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعدی خدریؒ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے عزل کرنے کے بارہ میں پوچھا گیا (کہ عزل کرنا جائز ہے یا نہیں؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا "منی کے ہر پانی سے بچہ نہیں بنتا، اور جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو پیدا ہونے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔" (مسلم)

تشریح: بظاہر اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ سوال اور جواب میں کوئی مطابقت نہیں ہے حالانکہ اگر حدیث کے حقیقی مفہوم پر نظر ہو تو یہ اشکال پیدا ہونے کا کوئی محل ہی نہیں رہ جاتا کیونکہ سوال کا مقصد یہ تھا کہ عزل کرنے کی اجازت مل جائے تاکہ عورت کے ہاں ولادت ہونے کا کوئی خوف نہ رہے، سوال کے اسی حقیقی مفہوم کے پیش نظر آپ ﷺ نے جواب دیا کہ تم لوگ تو یہ سمجھتے ہو کہ مرد کی منی کا عورت کے رحم میں گرنا عورت کے ہاں ولادت ہونے کا سبب ہے اور عزل کر لینا ولادت نہ ہونے کا سبب ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ منی کے ہر پانی سے بچہ نہیں بنتا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مرد کی منی عورت کے رحم تک پہنچ جاتی ہے مگر اس سے بچہ نہیں بنتا، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے لوگ عزل کرتے ہیں مگر اس کے باوجود عورت حاملہ ہو جاتی ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا حاملہ ہونا مرد کے مادۂ تولید کے اندر گرنے پر موقوف نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ پر موقوف ہے، اسی طرح عورت کا حاملہ نہ ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ ہی پر موقوف ہے عزل پر موقوف نہیں ہے۔ ہاں یہ ثابت ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل کا ایک نظام مقرر کر دیا ہے کہ مرد کے نطفہ سے بچہ کی تولید ہوتی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ عزل کرنے کی صورت میں بھی نطفہ کا کوئی حصہ بلا اختیار عورت کے رحم میں چلا جائے اور اس سے بچہ بن جائے بلکہ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اگر کسی بچہ کا پیدا ہونا ہی تقدیر الٰہی میں ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت حاصل ہے کہ وہ اس بچہ کو بغیر نطفہ کے بھی پیدا کر دے۔

بظاہر یہ احادیث عزل کے جائز نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے لیکن ان کا حقیقی مفہوم ومنشاء اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ عزل کرنا پسندیدہ نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے، اس مسئلہ میں حنفیہ اور دوسرے علماء کا جو فقہی مسلک ہے اس کا بیان حضرت جابرؓ کی روایت کی تشریح میں گزر چکا ہے۔

(۶) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّ رَجُلًا جَاءَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ اَعْزِلُ عَنِ امْرَاَتِیْ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِمَ تَفْعَلُ ذٰلِکَ فَقَالَ الرَّجُلُ اُشْفِقُ عَلٰی وَلَدِھَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْکَانَ ذٰلِکَ ضَارًّا ضَرَّ فَارِسَ وَالرُّوْمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ میں اپنی عورت سے عزل کرتا ہوں" آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "تم ایسا کیوں کرتے ہو؟" اس شخص نے کہا کہ "میں اس کے شیر خوار بچہ کی وجہ سے ڈرتا ہوں کہ "کہیں مدت رضاعت میں وہ حاملہ نہ ہو جائے اور اس حالت میں بچہ کو دودھ پلانا نقصان پہنچائے گا) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اگر یہ نقصان پہنچاتا تو روم وفارس والوں کو ضرور نقصان پہنچاتا۔" (مسلم)

تشریح: لوگوں کا خیال یہ تھا کہ مدت رضاعت میں جماع اور پھر حمل ٹھہرنے سے چونکہ عورت کے دودھ میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے اس دودھ کو پینے سے شیر خوار بچہ کو نقصان پہنچتا ہے اس کے علاوہ ایسی حالت میں عورت کا دودھ بھی کم ہو جاتا ہے اس کا حاصل یہ تھا کہ اسی خوف کی بناء پر اس شخص نے آنحضرت ﷺ سے عزل کی اجازت چاہی، اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے جو فرمایا اس کا حاصل یہ تھا کہ اگر مدت رضاعت میں جماع کرنا اور حمل ٹھہر جانا شیر خوار بچہ کو نقصان دہ ہوتا تو یہ روم وفارس والوں کو ضرور نقصان پہنچاتا کیونکہ وہ اس کے عادی ہیں اور جب ان کی یہ عادت ان کے لئے نقصان دہ نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ مدت رضاعت میں حمل ٹھہر جانا نقصان دہ نہیں ہے لہٰذا عزل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور حمل ٹھہر جانے کے خوف کی وجہ سے عزل نہ کرو۔ گویا آپ کا یہ ارشاد عزل کی کراہت وناپسندیدگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(۷) وَعَنْ جُدَامَۃَ بِنْتِ وَھْبٍ قَالَتْ حَضَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اُنَاسٍ وَھُوَ یَقُوْلُ لَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ اَنْھٰی عَنِ الْغِیْلَۃِ فَنَظَرْتُ فِی الرُّوْمِ وَفَارِسَ فَاِذَاھُمْ یُغِیْلُوْنَ اَوْلَادَھُمْ فَلَا یَضُرُّ اَوْلَادَھُمْ ذٰلِکَ شَیْئًا ثُمَّ سَاَلُوْہُ عَنِ الْعَزْلِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذٰلِکَ الْوَاْدُ الْخَفِیُّ وَھِیَ وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جدامہ بنت وہبؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس وقت لوگوں کی ایک جماعت وہاں موجود تھی اور آپ ﷺ (ان کو مخاطب کر کے) فرمارہے تھے کہ "میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ لوگوں کو "غیلہ" سے منع کردوں لیکن پھر میں نے دیکھا کہ روم وفارس کے لوگ اپنی اولاد کی موجودگی میں "غیلہ" کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی اولاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا (تو میں نے اس ارادہ کو ترک کردیا) پھر لوگوں نے آپ ﷺ سے عزل کرنے کے بارہ میں پوچھا کہ (اس کا کیا حکم ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یہ (عزل کرنا) تو پوشیدہ طور پر زندہ گاڑ دینا ہے اور یہ ایک بری عادت ہے جو اس آیت کریمہ وَاِذَا الْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ الآیۃ (اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے پاداش میں قتل کی گئی تھی) کے حکم میں داخل ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "غیلہ" کے معنی ہیں "حمل کی حالت میں بچہ کو دودھ پلانا" اور نہایہ میں لکھا ہے کہ "غیلہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایام رضاعت میں اپنی بیوی سے جماع کرے چنانچہ اہل عرب غیلہ (یعنی ایام رضاعت میں اپنی بیوی سے جماع کرنے) سے احتراز کرتے تھے اور اس کی وجہ ان کا یہ گمان تھا کہ اس صورت میں شیرخوار بچہ کو نقصان پہنچتا ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے بھی یہ ارادہ فرمایا کہ لوگوں کو ایام رضاعت میں اپنی بیوی کے پاس جانے سے منع کردیں لیکن جب آپ نے دیکھا کہ روم وفارس کے لوگ ایسا کرتے ہیں اور ان کی اولاد کو کوئی نقصان نہیں ہوتا تو آپ ﷺ نے ممانعت کا ارادہ ترک فرمادیا۔

واد کے معنی ہیں "زندہ درگور کرنا، جیتا گاڑ دینا۔" زمانہ جاہلیت میں اہل عرب تنگدستی کے خوف اور عار کی وجہ سے اپنی بچیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے، مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان والدین سے سخت باز پرس کی جائے گی جو اپنے ہاتھوں اپنی بچیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے عزل کو بھی "وأد خفی" یعنی پوشیدہ زندہ گاڑ دینے سے تعبیر فرمایا۔ اس طرح یہ حدیث منسوخ ہے یا آپ نے یہ بات محض تہدید وتنبیہ کے طور پر فرمائی ہے یا پھر یہ کہ اس ارشاد کے ذریعہ گویا اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ عزل نہ کرنا ہی اولیٰ اور زیادہ بہتر ہے۔

ان حضرات کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ کے صحابہ کی ایک مجلس منعقد تھی۔ حاضرین میں حضرت علیؓ حضرت زبیرؓ اور حضرت سعد جیسے جلیل القدر صحابہ کے علاوہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ بھی موجود تھے، عزل کے سلسلہ میں مباحثہ ہورہا تھا. صحابہؓ کی رائے تھی کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن ایک صحابیؓ نے یہ کہا کہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ (عزل کرنا) موءودۃ (چھوٹی موءودۃ) ہے (یعنی جس طرح اپنی اولاد کو زندہ گاڑ دینا موءودۃ کبری ہے اسی طرح عزل کرنا موءودۃ صغریٰ) ہے حضرت علیؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "اس سلسلہ میں حاصل کلام یہ ہے کہ جب تک بچہ میں جان نہ پڑے موءودۃ کے مفہوم کا اطلاق نہیں ہوگا یعنی اگر جان پڑ جانے کے بعد اسقاط حمل کرایا جائے یا زندہ پیدا ہونے کے بعد اسے جیتا جاگتا گاڑ دیا جائے تو اس کو موءودۃ کہا جائے گا۔" حضرت علیؓ کا یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ علی! اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے تم نے سچ کہا ہے۔" چنانچہ فقہی مسئلہ یہ ہے کہ جب تک بچہ میں جان نہ پڑے اسقاط حمل جائز ہے اور قرار حمل کے بعد ایک سو بیس دن میں حمل کے اندر جان پڑتی ہے گویا قرار حمل کے بعد ایک سو بیس دن کے اندر اندر تو اسقاط حمل جائز ہے اس کے بعد جائز نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی عزل کے حرام ہونے پر دلالت نہیں کرتا البتہ اس کے مکروہ ہونے پر ضرور دلالت کرتا ہے بایں معنی کہ عزل کرنا، واد حقیقی (یعنی واقعۃً زندہ درگور کردینے) کے حکم میں داخل نہیں ہے کیونکہ "وأد حقیقی" کا مطلب ہوتا ہے ایک جان کو ہلاک کردینا جب کہ عزل میں یہ صورت نہیں ہوتی البتہ عزل کرنا وأد حقیقی کے مشابہ یقیناً ہے اسی واسطے اس کو "پوشیدہ زندہ گاڑ دینا" فرمایا گیا ہے جو اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ عزل کے ذریعہ چونکہ اپنے مادہ تولید (نطفہ) کو ضائع کیا جاتا ہے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ مادۂ تولید اللہ تعالیٰ نے بچہ پیدا ہونے کے لئے مہیا کیا ہے اسلئے یہ فعل (یعنی عزل کرنا) اپنے بچہ کو ہلاک کرنے یا اس کو زندہ درگور کردینے کے مشابہ ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کے بارہ میں یہ صحیح روایت منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ عزل موؤدۃ صغری ہے۔ نیز حضرت ابوامامہؓ کے بارہ میں یہ منقول ہے کہ جب ان سے عزل کا حکم پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے کسی مسلمان کو عزل کرتے نہیں دیکھا سنا (اس سے معلوم ہوا کہ عزل کرنا پسندیدہ نہیں ہے)

اسی طرح حضرت ابن عمرؓ سے یہ منقول ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے بعض لوگوں کو عزل کرنے پر مارا ہے اور حضرت عثمان غنیؓ کے بارہ میں یہ منقول ہے کہ وہ عزل کرنے سے منع کرتے تھے۔ ان تمام روایات سے عزل کی ممانعت ثابت ہوتی ہے لیکن علماء لکھتے ہیں کہ یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔

اپنی بیوی کی پوشیدہ باتوں کو افشاء کرنے والے کے بارہ میں وعید

(۸) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَعْظَمَ الْاَمَانَۃِ عِنْدَ اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَفِی رِوَایَۃٍ اِنَّ مِنْ اَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰہِ مَنْزِلَۃً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ الرَّجُلُ یُفْضِی اِلَی امْرَأَتِہٖ وَتُفْضِی اِلَیْہِ ثُمَّ یَنْشُرُ سِرَّھَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑی امانت۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعتبار مرتبہ کے سب سے برا شخص وہ ہوگا جو اپنی بیوی سے ہم بستر ہو اور اس کی بیوی اس کی ہم آغوش ہو اور پھر وہ اس کی پوشیدہ باتیں ظاہر کرتا پھرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علامہ طیبیؒ اِنَّ اَعْظَمَ الْاَمَانَۃِ کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت بڑی امانت کہ جس میں خیانت کرنے والے سے قیامت کے دن سخت باز پرس ہوگی شوہر و بیوی کے درمیان جنسی معاملات اور نجی امور سے متعلق باتیں ہیں یعنی خاوند بیوی کے درمیان جنسی افعال اور راز و نیاز کی باتیں ایک بہت بڑی امانت ہے جس کی حفاظت ہر شوہر کی ذمہ داری ہے، جو شوہر اس امانت کی حفاظت نہیں کرے گا بایں طور کہ وہ اپنی بیوی سے ہمبستری کے بعد اس کے راز افشاء کرے گا اس سے قیامت کے دن باز پرس کی جائے گی اور اشرفؒ کے قول کے مطابق اس ارشاد کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑی امانت میں خیانت اس شخص کے خیانت ہوگی جو اپنی بیوی سے ہمبستری کرے اور پھر اس کے راز کو افشاء کردے اور افشاء کرنے" سے مراد یہ ہے کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان راز و نیاز کی جو باتیں ہوئی ہوں اور جنسیات سے متعلق جو افعال ہوئے ہوں ان کو لوگوں سے کہتا پھرے جیسا کہ بے حیا لوگوں کی عادت ہے، یا اپنی بیوی کے کسی عیب کو بیان کرتا پھرے اور یا یہ کہ اپنی بیویوں کی ان خوبیوں اور اوصاف کو ذکر کرتا پھرے جن کو چھپانا شرعًا اخلاقًا اور عرفًا واجب ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ خاوند و بیوی میں سے ہر ایک اپنے دوسرے کے افعال و اقوال کا امین ہے لہٰذا ان میں سے جو بھی اپنے دوسرے کے ان افعال و اقوال کو ظاہر کرے گا جن کو ظاہر کرنا وہ دوسرا ناپسند کرتا ہو تو وہ خیانت کرنے والا کہلائے گا۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ خاوند و بیوی میں سے ہر ایک اپنے دوسرے کے افعال و اقوال کا امین ہے لہٰذا ان میں سے جو بھی اپنے دوسرے کے ان افعال و اقوال کو ظاہر کرے گا جب کو ظاہر کرنا وہ دوسرا ناپسند کرتا ہو تو وہ خیانت کرنے والا کہلائے گا۔

بہر کیف حدیث کا حاصل یہ ہے کہ خاوند و بیوی کے درمیان جنسی معاملات اور ذاتی امور سے متعلق جو باتیں ہوتی ہیں یا جو افعال ہوتے ہیں ان کو غیروں کے سامنے بیان کرنا یا ایک دوسرے کے عیوب وغیرہ کو ظاہر کرنا اخلاقی نکتہ نظر ہی سے معیوب نہیں ہے بلکہ شرعی طور پر آخرت میں مواخذۂ خداوندی کا موجب ہے۔

اس سلسلہ میں ایک سبق آموز واقعہ بیان کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے ایک مرتبہ ایک صاحب علم و دانش نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں اپنی بیوی کے عیوب کیونکر ذکر کروں (یعنی اگر میں طلاق کی وجہ بیان کروں تو گویا میں اس کے عیوب کو جو طلاق کی وجہ ہیں، تمہارے سامنے بیان کردوں اور یہ مجھے گوارہ نہیں ہے کہ جب تک وہ میری بیوی ہے اس کے عیوب دوسروں کے سامنے آئیں) پھر جب اس نے طلاق دے دی تو پھر کچھ اور لوگوں نے پوچھا کہ تم نے اپنی بیوی کو طلاق کیوں دی؟ اس نے کہا کہ میں ایک اجنبی عورت کے عیوب کیسے ظاہر کردوں؟ (یعنی اگر میں طلاق کی وجہ بیان کروں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ایک اجنبی عورت کے عیوب تمہارے سامنے بیان کردوں اور اسے میں مطلقاً مناسب نہیں سمجھتا)

بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ خاوند و بیوی کے لئے ایک دوسرے کی باتوں کو ظاہر کرنے کی یہ ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ اس کا کوئی فائدہ اور مقصد نہ ہو، ہاں اگر اس کا کوئی فائدہ یا اس کی کوئی معقول وجہ ہو تو پھر یہ ممانعت نہیں ہوگی مثلاً اگر عورت کا دعوی ہو کہ اس کا خاوند اس کی جنسی خواہش کی تسکین کا اہل نہیں ہے، یا بیوی یہ شکایت کرے کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ سے بیزاری اور لا پرواہی کا برتاؤ کرتا ہے تو اس صورت میں بیوی کے لئے ان چیزوں کا ذکر کرنا غیر پسندیدہ نہیں ہوگا جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔

"اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی بری بات کو اعلانیہ بیان کیا جائے ہاں اگر کسی پر ظلم کیا گیا ہے (تو وہ اسے علانیہ بھی بیان کر سکتا ہے)۔"

ایام حیض میں اپنی بیوی کے پاس نہ جاؤ اور نہ بیوی کے ساتھ بدفعلی کرو

(۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اُوْحِیَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نِسَاۗءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ الْاٰیَةَ اَقْبِلْ وَاَدْبِرْ وَاتَّقِ الدُّبُرَ وَالْحِیْضَةَ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ پر یہ آیت نازل کی گئی نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ الآیۃ (یعنی تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں پس آؤ تم اپنی کھیتیوں میں الخ) لہٰذا تم جس طرح چاہو ان سے مجامعت کرو) خواہ آگے سے اگلی جانب میں آؤ یا پیچھے سے اگلی جانب آؤ لیکن مقعد میں دخول کرنے سے اجتناب کرو اور حیض کی حالت میں جماع نہ کرو۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: لفظ "اقبل" (خواہ آگے سے اگلی جانب میں آؤ) اور ادبر (یا پیچھے سے اگلی جانب میں آؤ) یہ دونوں لفظ آیت کریمہ کے الفاظ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ الآیۃ کی تفسیر و بیان ہیں، یعنی ان دونوں الفاظ کے ذریعہ یہ وضاحت تنبیہ کی گئی ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خواہ آگے کی طرف سے آؤ یا پیچھے کی طرف سے آؤ مگر دخول بہر صورت اگلے حصہ یعنی شرمگاہ ہی میں کرو چنانچہ بدفعلی کرنا یعنی مقعد میں دخول کرنا قطعی حرام ہے اسی طرح حیض کی حالت میں اگلے حصہ میں بھی دخول کرنا حرام ہے۔

(۱۰) وَعَنْ خُزَیْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیِیْ مِنَ الْحَقِّ لَا تَاْتُوا النِّسَاۗءَ فِیْ اَدْبَارِهِنَّ۔ (رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجۃ و الدارمی)

"اور حضرت خزیمہ ابن ثابتؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے حیا نہیں کرتا تم عورتوں کی مقعد میں بدفعلی نہ کرو۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "حیا" اس "تغیر" کو کہتے ہیں جو عیب لگنے اور برا کہے جانے کے خوف سے انسان میں واقع ہوتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی تغیر کا واقع ہونا محال ہے اس لئے یہاں "حیا" سے حقیقی حیا مراد نہیں ہے بلکہ مجازی حیا یعنی "ترک کرنا" مراد ہے جو "حیا" کا مقصد

ہے، اس طرح اِنَّ اللّٰہَ لَایَسْتَحْیِیْ الخ کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ حق بات کہنے اور اس کے اظہار کو ترک نہیں کرتا۔ لہٰذا حدیث میں اس بات کو مابعد کے مضمون (عورت کے ساتھ بد فعلی کی ممانعت) کی تمہید و مقدمہ کے طور پر ذکر کرنا گویا اس فعل بد کی انتہائی برائی اور اس کے حرام ہونے پر متنبہ کرنا ہے کہ یہ بات اتنی ناپسندیدہ اور مکروہ ہے کہ اس کو زبان پر لانا اور اس کا ذکر کرنا بھی شرم و حیا کے منافی ہے اگرچہ اس کا ذکر کرنا اس سے روکنے ہی کی وجہ سے کیوں نہ ہو لیکن چونکہ یہ ایک شرعی مسئلہ ہے اور شرعی مسئلہ کو بیان کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے اس لئے سن لو کہ عورتوں کے ساتھ "ان کی مقعد میں" بد فعلی کرنا حرام ہے اس لئے اجتناب کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب عورتوں کے ساتھ بد فعلی کرنا حرام ہے تو مردوں کے ساتھ یہ فعل بد طریقہ اولیٰ حرام ہو گا۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر مناسب تو یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ "میں حق بات بیان کرنے سے حیا نہیں کرتا۔" لیکن آپ ﷺ نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اور اس سے آپ ﷺ کا مقصد اس حکم کی اہمیت کو ظاہر کرنا اور اس فعل بد کی برائی کو بطور مبالغہ بیان کرنا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے ساتھ بد فعلی کرنا حرام ہے لہٰذا جو لوگ اس کو جائز کہتے ہیں وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہیں۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ یہ فعل بد کرے تو وہ زانی کے حکم میں ہو گا، اور اگر اپنی بیوی یا اپنی لونڈی کے ساتھ کرے تو وہ حرام کا مرتکب ہوا لیکن اس کی پاداش میں اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا اور نہ اس پر حد جاری کی جائے گی البتہ اسے کوئی سزا ضرور دی جائے گی۔ اور نوویؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ساتھ (اغلام) کرے تو وہ اجنبی کے ساتھ بد فعلی کرنے والے کے حکم میں ہو گا، نیز حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس فعل بد پر فاعل اور مفعول (یعنی یہ فعل بد کرنے والا اور کرانے والا) دونوں مستوجب تعزیر ہوتے ہیں کہ ان دونوں کو ان کے حال کے مناسب کوئی سزا دی جائے گی ہاں اگر مفعول (یعنی جس کے ساتھ یہ بد فعلی کی گئی ہے) چھوٹا ہو یا دیوانہ ہو یا اس کے ساتھ زبردستی یہ فعل بد کیا گیا ہو تو اسے سزا نہیں دی جائے گی۔

اپنی بیوی کے ساتھ بد فعلی کرنے والا ملعون ہے

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَلْعُوْنٌ مَنْ اَتَی امْرَاَتَہٗ فِیْ دُبُرِھَا۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ شخص ملعون ہے جو اپنی عورت کے ساتھ بد فعلی کرے۔" (ابوداؤدؒ، احمدؒ)

(۱۲) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الَّذِیْ یَاْتِی امْرَاَتَہٗ فِیْ دُبُرِھَا لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ اِلَیْہِ۔

(رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنی عورت کے ساتھ بد فعلی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف (رحمت و شفقت کی نظر سے) نہیں دیکھتا۔" (ترمذیؒ)

(۱۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ اِلٰی رَجُلٍ اَتٰی رَجُلًا اَوِ امْرَاَۃً فِی الدُّبُرِ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف (رحمت و شفقت کی نظر سے) نہیں دیکھتا جو مرد یا عورت کے ساتھ بد فعلی کرتا ہے۔" (ترمذیؒ)

غیلہ کی ممانعت

(۱۴) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ یَزِیْدَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ سِرًّا فَاِنَّ الْغَیْلَ یُدْرِکُ الْفَارِسَ فَیُدَعْثِرُہٗ عَنْ فَرَسِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم اپنی اولاد کو مخفی طور پر قتل نہ کرو کیونکہ غیل، سوار پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے گھوڑے سے گرا دیتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "اپنی اولاد کو مخفی طور پر قتل نہ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ غیلہ کے ذریعہ اولاد کو ہلاکت میں نہ ڈالو، اور یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حمل کی حالت میں دودھ پلانے یا مدت رضاعت میں جماع کرنے کو غیلہ کہتے ہیں لہٰذا حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ غیلہ کی وجہ سے بچہ کے مزاج میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے قوی ضعیف ہو جاتے ہیں اور اس خرابی و ضعف کا اثر اس کے بالغ ہونے کے بعد تک رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بچہ بڑا ہونے کے بعد جب میدان کارزار میں جاتا ہے تو دشمن کے مقابلہ میں سست اور کمزور پڑ جاتا ہے اور گھوڑے سے گر پڑتا ہے اور یہ چیز اس کے حق میں ایسی ہے جیسا کہ اسے مقابلہ سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا ہو لہٰذا علیہ نہ کرو تاکہ غیلہ کی وجہ سے اپنے بچے کے قتل ہو جانے کا باعث نہ بنو۔

اس موقع پر یہ خلجان پیدا ہو سکتا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہو کہ بچہ پر غیلہ کا اثر پڑتا ہے جب کہ اس سے پہلے گزرنے والی بعض احادیث سے یہ معلوم ہوا تھا کہ غیلہ، بچہ پر اثر انداز نہیں ہوتا؟ اس کا جواب طیبی نے یہ دیا ہے کہ گزشتہ احادیث میں بچہ پر غیلہ کے اثر انداز ہونے کی نفی زمانہ جاہلیت کے اس اعتقاد کی تردید کے لئے تھے کہ لوگ غیلہ ہی کو حقیقی مؤثر سمجھتے تھے۔ اور اس حدیث کے ذریعہ غیلہ کے اثر انداز ہونے کا جو اثبات کیا گیا ہے وہ اس بات کے پیش نظر ہے کہ غیلہ فی الجملہ سبب بنتا ہے اور مؤثر حقیقی حق تعالیٰ کی مرضی اور اس کا حکم ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس حدیث میں غیلہ کی جو ممانعت بیان کی گئی ہے وہ نہی تنزیہی کے طور پر ہے اور آپ ﷺ کا گزشتہ ارشاد لَقَدْ هَمَمْتُ الخ (حدیث نمبر ۷) تحریم پر محمول ہے، اسی طرح دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد باقی نہیں رہے گا، اس کے علاوہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے) ان دونوں کی بنیاد آپ ﷺ کا اجتہاد تھا، یعنی جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ عرب کے لوگ جب غیلہ کرتے ہیں تو ان کے بچے ضعیف و کمزور ہو جاتے ہیں تو آپ ﷺ نے غلیہ سے منع کیا مگر جب بعد میں آپ ﷺ نے روم و فارس کے لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہاں غیلہ کی وجہ سے بچہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو آپ ﷺ نے غیلہ کی ممانعت کو ختم کر دیا چنانچہ حضرت جدامہؓ کی روایت نمبر ۷ سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عزل کا مشروط جواز

⑮ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُعْزَلَ عَنِ الْحُرَّةِ اِلَّا بِاِذْنِهَا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عمر ابن خطابؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حرۃ (آزاد عورت) کے ساتھ اس کی اجازت کے بغیر عزل کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: آزاد عورت سے جماع کے وقت اگر عزل کیا جائے تو اس سے اجازت لینی ضروری ہے اس کی اجازت حاصل کئے بغیر عزل نہ کیا جائے کیونکہ عزل کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ بچہ نہیں ہوتا بلکہ عورت کی جنسی لذت میں کمی بھی ہو جاتی ہے اور ان دونوں چیزوں سے آزاد عورت کا حق متعلق ہے کہ اگر عورت بچہ کی پیدائش چاہتی ہے تو مرد کو یہ اختیار نہیں کہ وہ عورت کی اس خواہش کو پورا نہ ہونے دے اسی طرح عورت اگر عزل کی وجہ سے اپنی جنسی لذت میں کمی محسوس کرتی ہے تو یہ اس کے ساتھ بے انصافی ہے اس لئے ضروری ہے کہ عزل کے لئے عورت کی اجازت حاصل کر لی جائے اگر وہ اجازت دے تو عزل کیا جائے اور اگر اجازت نہ دے تو عزل نہ کیا جائے۔ گویا یہ حدیث آزاد عورت کی اجازت کی شرط کے ساتھ اور لونڈی کی اجازت کے بغیر بھی عزل کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے۔

بَابٌ

گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

لونڈی آزاد ہونے کے بعد اپنا نکاح فسخ کر سکتی ہے

① عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهَا فِيْ بَرِيْرَةَ خُذِيْهَا فَاعْتِقِيْهَا وَكَانَ زَوْجُهَا عَبْدًا فَخَيَّرَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاخْتَارَتْ نَفْسَهَا وَلَوْ كَانَ حُرًّا لَمْ يُخَيِّرْهَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت عروہؓ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ان (یعنی حضرت عائشہؓ) سے بریرہؓ کے بارہ میں فرمایا کہ اسے خرید لو اور پھر اس کو آزاد کر دو اور بریرہؓ کا خاوند چونکہ غلام تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے اسے اختیار دے دیا تھا اور بریرہؓ نے (اس اختیار کے مطابق) اپنے آپ کو (اپنے خاوند سے) علیحدہ کر لیا تھا۔ اور اگر اس کا خاوند آزاد ہوتا تو آپ ﷺ اسے یہ اختیار نہ دیتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بریرہؓ کا مذکورہ بالا واقعہ تفصیلی طور پر کتاب البیوع میں گزر چکا ہے، یہ بطور لونڈی ایک یہودی کی ملکیت میں تھیں، پھر حضرت عائشہؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تھا چنانچہ بریرہؓ کی خریداری کے وقت آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ پہلے اسے اس کے مالکوں سے خرید لو اور پھر اس کو آزاد کر دو، آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق حضرت عائشہؓ نے اسے خریدا اور پھر آزاد کر دیا، بریرہؓ کا خاوند چونکہ ایک غلام تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے بریرہؓ کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ آزاد ہونے کے بعد اگر چاہو تو تم اپنے خاوند کے نکاح میں حسب سابق رہو اور اگر اس کے نکاح میں رہنا نہ چاہو تو اس سے علیحدہ ہو جاؤ، اس اختیار کے پیش نظر بریرہؓ نے علیحدگی کو اختیار کیا اور اپنے خاوند سے قطع تعلق کر لیا۔ حدیث کا آخری جملہ ولو کان حرا الخ اور اگر اس کا خاوند آزاد ہوتا الخ بظاہر حضرت عروہ کا اپنا قول معلوم ہوتا ہے اور آئمہ ثلثہ یعنی حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ لونڈی کو آزاد ہونے کے بعد اپنے نکاح کو باقی یا فسخ کرنے کا اختیار اسی صورت میں ہوتا ہے جب کہ اس کا خاوند غلام ہوتا کہ وہ آزاد ہو جانے کے بعد ایک غلام کے نکاح میں رہنے کو عار محسوس نہ کرے، اگر اس کا خاوند غلام نہ ہو تو پھر اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہوگا، لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اسے بہر صورت یہ اختیار حاصل ہوتا ہے خواہ اس کا شوہر غلام ہو یا آزاد ہو۔ دونوں طرف کے علماء کی دلیلیں فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور اگر میاں بیوی دونوں ایک ساتھ آزاد ہوں تو تمام علماء کا متفقہ طور پر یہ مسلک ہے کہ اس صورت میں بیوی کو یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا اسی طرح اگر شوہر آزاد ہو جائے تو اسے اپنا نکاح باقی رکھنے یا فسخ کر دینے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ خواہ اس کی بیوی آزاد عورت ہو یا لونڈی ہو۔

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ زَوْجُ بَرِيْرَةَ عَبْدًا اَسْوَدَ يُقَالُ لَهٗ مُغِيْثٌ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ يَطُوْفُ خَلْفَهَا فِيْ سِكَكِ الْمَدِيْنَةِ يَبْكِيْ وَدُمُوْعُهٗ تَسِيْلُ عَلٰى لِحْيَتِهٖ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْعَبَّاسِ يَا عَبَّاسُ اَلَا تَعْجَبُ مِنْ حُبِّ مُغِيْثٍ بَرِيْرَةَ وَمِنْ بُغْضِ بَرِيْرَةَ مُغِيْثًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ رَاجَعْتِيْهِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تَاْمُرُنِيْ قَالَ اِنَّمَا اَشْفَعُ قَالَتْ لَا حَاجَةَ لِيْ فِيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ بریرہؓ کا شوہر ایک سیاہ فام تھا جس کو مغیثؓ کہا جاتا تھا، میری آنکھوں کے سامنے اب بھی وہ منظر ہے

جب وہ بریرہؓ کے پیچھے پیچھے مدینہ کی گلیوں میں روتا پھرتا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر اس کی داڑھی پر گرتے تھے چنانچہ (ایک دن) آنحضرت ﷺ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ "عباس! کیا تمہیں اس پر حیرت نہیں ہے کہ مغیثؓ، بریرہؓ کو کتنا چاہتا ہے اور بریرہؓ مغیث سے کس قدر نفرت کرتی ہے؟" پھر آپ ﷺ نے بریرہؓ سے بھی فرمایا کہ "بریرہؓ! کاش تم مغیث سے رجوع کرتیں (یعنی مغیث سے دوبارہ نکاح کر لیتیں) بریرہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا آپ مجھے (بطور وجوب) اس کا حکم دے رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بریرہ!! میں تو سفارش کر رہا ہوں (یعنی بطور وجوب نہیں بلکہ بطریق استحباب تمہیں حکم دے رہا ہوں) بریرہؓ نے کہا کہ مجھے اس سے رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے (یعنی مجھے اس کے پاس رہنا منظور نہیں ہے)۔" (بخاریؒ)

تشریح: چونکہ بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغیثؓ یعنی بریرہؓ کا شوہر آزاد تھا اس لئے اگر اس حدیث کے ابتدائی جملہ کی یہ وضاحت کی جائے کہ مغیث بدصورتی میں ایک سیاہ فام غلام کی مانند تھا۔ یا یہ کہ مغیث پہلے تو غلام تھا (جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے) لیکن پھر آزاد کیا گیا اور وہ آزاد ہو گیا۔" تو اس صورت میں روایتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں رہے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سردار حاکم کو اپنی رعایا سے کسی کے حق میں جائز کام کی سفارش کرنا ایک اچھی بات ہے، اسی طرح حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اپنے سردار حاکم کی سفارش کو قبول کرنا واجب نہیں ہے اور نہ اس سفارش کو نہ ماننے کی وجہ سے اس سے سردار حاکم کو کوئی مواخذہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ نیز حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی سے اس کی بدصورتی و بدخلقی کی وجہ سے تعلق نہ رکھنا جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

مملوک خاوند و بیوی کو آزاد کرنا ہو تو پہلے خاوند کو آزاد کیا جائے

(۳) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا اَرَادَتْ اَنْ تُعْتِقَ مَمْلُوْكَيْنِ لَهَا زَوْجٌ فَسَأَلَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَهَا اَنْ تَبْدَأَ بِالرَّجُلِ قَبْلَ الْمَرْأَةِ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے دو مملوکوں کو آزاد کرنے کا ارادہ کیا جو آپس میں خاوند بیوی تھے تو نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا، آپ نے انہیں عورت سے پہلے مرد کو آزاد کرنے کا حکم دیا (تاکہ عورت کو نکاح کے فسخ کرنے کا اختیار باقی نہ رہے)۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اگر حضرت عائشہؓ پہلے عورت کو آزاد کرتیں تو وہ آزاد ہونے کے بعد ایک غلام کے نکاح میں رہتی اس صورت میں اسے یہ اختیار حاصل ہو جاتا کہ اگر وہ چاہتی تو اپنا نکاح باقی رکھتی اور اگر اسے شوہر کے ساتھ رہنا گوارہ نہ ہوتا تو نکاح فسخ کر دیتی (جیسا کہ آئمہ ثلاثہ کا مسلک ہے اور جس کی تفصیل ابھی پیچھے گزری ہے) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو پہلے مرد کو آزاد کرنے کا حکم دیا تاکہ یہ اختیار نہ رہے اور مرد کی دل شکنی نہ ہو۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے مرد کو آزاد کرنے کا حکم اس لئے دیا کہ مرد، عورت کی بہ نسبت زیادہ کامل اور افضل ہوتا ہے لہٰذا اس کو مقدم رکھنا چاہئے، یا پھر یہ کہ آپ ﷺ اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ مرد تو لونڈی بیوی کو گوارا کر لیتا ہے لیکن عورت اگر کسی غلام کے نکاح میں ہوتی ہے تو پھر اکثر اس سے بیزار رہتی ہے اور ہمہ وقت ذہنی اذیت و کوفت میں مبتلا رہتی ہے اس لئے آپ ﷺ نے پہلے مرد کو آزاد کرنے کا حکم دیا تاکہ اس کی بیوی اپنے شوہر کی طرف سے کسی بیزاری میں مبتلا نہ ہو۔

اگر لونڈی اپنی مرضی سے اپنا نکاح کرے تو آزاد ہونے کے بعد فسخ نکاح کا اختیار اسے حاصل نہیں ہوتا

(۴) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ بَرِيْرَةَ عَتَقَتْ وَهِيَ عِنْدَ مُغِيْثٍ فَخَيَّرَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ لَهَا اِنْ قَرِبَكِ

فَلَا خِيَارَ لَكِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ بریرہؓ اس حال میں آزاد ہوئی تھی کہ وہ مغیث کے نکاح میں تھی چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اسے (اپنا نکاح باقی رکھنے یا فسخ کر دینے کا) اختیار دے دیا لیکن یہ بھی فرمایا کہ اگر تیرا شوہر تجھ سے جماع کرے گا تو تجھے یہ اختیار حاصل رہے گا (کیونکہ اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ تو اس کی زوجیت پر راضی ہے)۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ہدایہ میں لکھا ہے کہ اگر کسی لونڈی نے اپنے مالک کی رضامندی سے اپنا نکاح کیا یا اس کے مالک نے اس کا نکاح اس کی رضا مندی سے یا اس کی رضامندی کے بغیر کر دیا اور پھر وہ لونڈی آزاد ہوگئی تو اس کو اپنا نکاح باقی رکھنے یا فسخ کر دینے کا اختیار حاصل ہوتا ہے خواہ اس کا خاوند ہو یا غلام ہو اور اگر لونڈی اپنے مالک کی رضامندی و اجازت کے بغیر اپنا نکاح خود کرے اور پھر اس کا مالک اس کو آزاد کر دے تو آزاد ہوتے ہی اس کا نکاح منعقد یعنی صحیح ہو جاتا ہے لیکن اسے مذکورہ اختیار حاصل نہیں رہتا۔ ائمہ ثلاثہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر لونڈی کسی آزاد کے نکاح میں ہو تو آزاد ہونے کے بعد اس لونڈی کو اپنے نکاح کے باقی یا فسخ کر دینے کا اختیار نہیں ہوتا۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ائمہ ثلاثہ کے درمیان اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ بریرہؓ کے خاوند کے بارہ میں متعارض روایتیں منقول ہیں بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت بریرہؓ کو اس حال میں اختیار دیا تھا کہ اس کا شوہر غلام تھا لیکن بخاری و مسلم ہی میں یہ بھی منقول ہے کہ جب بریرہؓ کو آزاد کیا گیا تو اس کا شوہر ایک آزاد مرد تھا۔

اسی طرح کی روایت سنن اربعہ یعنی ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے بھی نقل کی ہے، نیز ترمذیؒ نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے، لہٰذا ائمہ ثلاثہ نے تو پہلی روایت کو ترجیح دی اور حضرت امام ابوحنیفہؒ نے دوسری روایت کو راجح قرار دیا۔ ملا علی قاریؒ نے ابن ہمامؒ کے اس قول کو مرقات میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، یہاں طوالت کے خوف سے اس کا خلاصہ نقل کر دیا گیا ہے۔

بَابُ الصَّدَاقِ

مہر کا بیان

"مہر" حقوق زوجیت حاصل ہونے کے اس معاوضہ کو کہتے ہیں جو عورت کو اس کے شوہر کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ مہر کے نہ دینے کی نیت نہ ہونا نکاح کے صحیح ہونے کی ایک شرط ہے یعنی اگر کوئی شخص نکاح کے وقت یہ نیت کرلے کہ مہر دیا ہی نہ جائے گا۔ تو اس کا نکاح صحیح نہ ہوگا۔ نکاح کے وقت مہر کا ذکر کرنا نکاح صحیح ہونے کے لئے شرط نہیں ہے، اگر مہر کا ذکر نہ کیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا اور شوہر پر مہر مثل واجب ہوگا۔

مہر کی مقدار: نہ تو شریعت نے مہر کے لئے کسی خاص مقدار کو متعین کر کے اسے واجب قرار دیا ہے اور نہ اس کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر کی گئی ہے بلکہ اسے شوہر کی حیثیت و استطاعت پر موقوف رکھا ہے کہ جو شخص جس قدر مہر دینے کی استطاعت رکھتا ہو اسی قدر مقرر کرے البتہ مہر کی کم سے کم ایک حد ضرور مقرر کی گئی ہے تاکہ کوئی شخص اس سے کم مہر نہ باندھے، چنانچہ حنفیہ کے مسلک میں مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم (۳۰ء۶۲ گرام چاندی) ہے اگر کسی شخص نے اتنا مہر باندھا جو دس درہم یعنی ۳۰ء۶۲ گرام چاندی کی قیمت سے کم ہو تو مہر صحیح نہیں ہوگا۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک کم سے کم مہر کی آخری حد چوتھائی دینار ہے اور حضرا امام شافعیؒ و حضرت امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ جو بھی چیز ثمن یعنی قیمت ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو اس کا مہر باندھنا جائز ہے۔

ازواج مطہراتؓ اور صاحبزادیوںؓ کا مہر؟: ام المؤمنین حضرت ام حبیبہؓ کے علاوہ تمام ازواج مطہراتؓ اور حضرت فاطمہؓ کے علاوہ

تمام صاحبزادیوں کا مہر پانچ سو درہم چاندی کی مقدار۔ ۱۵۷۵ ماشہ یعنی ایک کلو ۵۳۰ گرام ہوتی ہے آجکل کے نرخ کے مطابق ایک کلو ۵۳۰ گرام چاندی کی قیمت تقریباً ۹۱۸ روپے ہوتی ہے۔ اُمّ المؤمنین اُمّ حبیبہؓ کا مہر چار ہزار درہم یا چار سو دینار تھا، چار ہزار درہم بارہ ہزار چھ سو ماشہ یعنی بارہ کلو ۲۴۷ گرام چاندی کے بقدر ہوتے ہیں اور چاندی کے موجودہ نرخ کے مطابق اس کی قیمت سات ہزار تین سو اڑتالیس روپیہ (۷۳۴۸/) ہوتی ہے۔

حضرت فاطمہ زہراءؓ کا مہر چار سو مثقال نقرہ تھا، چار سو مثقال، اٹھارہ سو ماشہ یعنی ایک کلو ۷۵۰ گرام چاندی کے بقدر ہوتے ہیں اور چاندی کے موجودہ نرخ کے مطابق اس کی قیمت ایک ہزار پچاس روپیہ (۱۰۵۰/) ہوتی ہے۔

(اس قدر چاندی کے ساتھ روپے کی یہ مطابقت آج کل کے دور میں درست نہیں کیونکہ پاکستان میں روپے کی قیمت بہت زیادہ گر چکی ہے۔ ہاں ہر زمانے میں چاندی کی قیمت معلوم کر کے روپے کی تعیین کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ از اصغر۔ م۔)

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مہر کی کم سے کم مقدار کیا ہونی چاہئے؟

① وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَتْهُ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ وَهَبْتُ نَفْسِيْ لَكَ فَقَامَتْ طَوِيْلًا فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ زَوِّجْنِيْهَا اِنْ لَّمْ تَكُنْ لَكَ فِيْهَا حَاجَةٌ فَقَالَ هَلْ عِنْدَكَ مِنْ شَيْءٍ تُصْدِقُهَا قَالَ مَا عِنْدِيْ اِلَّا اِزَارِيْ هٰذَا قَالَ فَالْتَمِسْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيْدٍ فَالْتَمَسَ فَلَمْ يَجِدْ شَيْئًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ مَعَكَ مِنَ الْقُرْاٰنِ شَيْءٌ قَالَ نَعَمْ سُوْرَةُ كَذَا وَسُوْرَةُ كَذَا فَقَالَ قَدْ زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ انْطَلِقْ فَقَدْ زَوَّجْتُكَهَا فَعَلِّمْهَا مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک عورت، رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ "یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اپنے آپ کو آپ (ﷺ) کے لئے ہبہ کر دیا" (یہ کہہ کر) وہ عورت دیر تک کھڑی رہی یہاں تک کہ (آنحضرت ﷺ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ابھی آپ ﷺ خاموش ہی تھے کہ) ایک صحابیؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! اگر آپ (ﷺ) اس عورت کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوں تو اس سے میرا نکاح کر دیجئے۔" آپ ﷺ نے پوچھا "کیا تمہارے پاس کوئی ایسی چیز بھی ہے جسے تم اس عورت کو مہر میں دے سکو؟" انہوں نے عرض کیا کہ "اس تہ بند کے علاوہ (جسے میں باندھے ہوئے ہوں) میرے پاس کوئی اور چیز نہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ (کوئی چیز) ڈھونڈ لاؤ، اگرچہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی ہو۔" جب صحابیؓ نے بہت تلاش کیا اور انہیں کوئی چیز نہیں ملی تو پھر آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ "کیا تمہیں قرآن میں سے کچھ یاد ہے؟" انہوں نے عرض کیا کہ "ہاں! فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا "قرآن میں سے جو کچھ تمہیں یاد ہے اس کے سبب میں نے تمہارا نکاح اس عورت سے کر دیا۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جاؤ میں نے تمہارا نکاح اس عورت سے کر دیا۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، جاؤ میں نے تمہارا نکاح اس عورت سے کر دیا، تم اس کو قرآن کی تعلیم دیا کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ میں یہ حکم تھا کہ اگر کوئی عورت اپنے آپ کو آنحضرت ﷺ کے لئے ہبہ کر دیتی تھی اور آپ ﷺ اس کے ہبہ کو قبول کر لیتے تھے تو وہ عورت آنحضرت ﷺ کے لئے حلال ہو جاتی تھی اور آپ ﷺ پر اس کا کچھ مہر واجب نہیں ہوتا تھا۔ یہ اور کسی کے لئے نہ آپ ﷺ کے وقت میں جائز تھا اور نہ اب جائز ہے بلکہ یہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ یعنی صرف آپ ﷺ ہی کے لئے جائز تھا، چنانچہ قرآن کریم کی یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے۔

وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (النساء ۳۳ : ۵۰)

"اور اگر کوئی مؤمن عورت اپنے تئیں پیغمبر (ﷺ) کو ہبہ کردے (یعنی مہر لینے کے بغیر نکاح میں آنا چاہے) اور پیغمبر ﷺ بھی اس سے نکاح کرنا چاہیں (تو وہ عورت حلال ہے لیکن اے محمد (ﷺ) یہ اجازت صرف آپ ہی کو ہے سب مسلمانوں کو نہیں۔"

اس بارہ میں فقہی تفصیل یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر مہر کے، لفظ ہبہ کے ذریعہ نکاح کا جواز صرف آنحضرت ﷺ کے لئے تھا یہ کسی اور کے لئے جائز نہیں ہے جب کہ حنفی مسلک یہ ہے کہ لفظ ہبہ کے ذریعہ نکاح کرنا تو سب کے لئے جائز ہے مگر اس صورت میں مہر کا واجب نہ ہونا صرف آنحضرت ﷺ کے لئے تھا، لہٰذا اگر کوئی عورت اپنے آپ کو کسی شخص کے لئے ہبہ کرے اور وہ شخص اس ہبہ کو قبول کرلے تو اس ہبہ کے ذریعہ دونوں کے درمیان نکاح صحیح ہوجائے گا اور اس شخص پر مہر مثل واجب ہوگا۔ اگرچہ وہ عورت مہر کا کوئی ذکر نہ کرے یا مہر کی نفی ہی کیوں نہ کردے لہٰذا حنفی مسلک کے مطابق مذکورہ بالا آیت کے الفاظ خالصۃ لک الخ کے معنی ہیں کہ اپنے آپ کو ہبہ کردینے والی عورت کا مہر واجب ہوئے بغیر حلال ہونا صرف آپ ﷺ کے لئے ہے۔

وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيْدٍ (اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہو) سے معلوم ہوا کہ از قسم مال کسی بھی چیز کا مہر باندھنا جائز ہے خواہ وہ چیز کتنی ہی کم تر کیوں نہ ہو بشرطیکہ مرد و عورت دونوں اس پر راضی ہوں چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے اس بارہ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کا جو مسلک ہے وہ ابتدائے باب میں ذکر کیا جاچکا ہے حنفیہ کی دلیل حضرت جابرؓ کی یہ روایت ہے جس کو دار قطنیؒ نے نقل کیا ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تنکحوا النساء الا الاکفاء ولا یزوجھن الا الاولیاء ولا مھر دون عشرۃ دراھم۔

"رسول کریم ﷺ نے فرمایا عورتوں کا نکاح ان کے کفو ہی سے کیا جائے اور عورتوں کا نکاح ان کے ولی کریں اور دس درہم سے کم مہر کا اعتبار نہیں ہے۔"

نیز حنفی مسلک کی تائید دار قطنی اور بیہقی ہی میں منقول حضرت علیؓ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ:

لا صداق اقل من عشرۃ دراھم۔

"حضرت علیؓ نے فرمایا کہ (دس درہم سے کم کا مہر معتبر نہیں۔"

حضرت سہیلؓ کی اس روایت کو حنفیہ نے مہر معجل پر محمول کیا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ ازواج مطہراتؓ کے مقررہ مہر میں سے کچھ حصہ علی الفور عین جماع کرنے سے پہلے دے دیتے تھے اسی لئے آپ ﷺ نے ان صحابیؓ کو بھی یہ حکم فرمایا کہ اگر تمہیں کوئی بھی چیز خواہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو مل جائے تو لے آؤ تاکہ نکاح کے بعد اس عورت کو مہر کے طور پر کچھ نہ کچھ دے سکو۔ اسی بناء پر بعض علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ نکاح کے بعد اپنی بیوی سے اس وقت تک جماع نہ کیا جائے جب تک اس کے مہر میں سے کچھ نہ کچھ اسے دے دیا جائے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن عمرؓ حضرت زہریؒ اور حضرت قتادہؒ کا یہی مسلک تھا ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے نکاح کیا تو آنحضرت ﷺ نے انہیں حضرت فاطمہؓ کے پاس اس وقت تک جانے سے ممانعت کردی جب تک کہ وہ حضرت فاطمہؓ کو ان کے مہر میں سے کچھ نہ دے دیں حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم فاطمہ کو اپنی زرہ دے دو۔" حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو اپنی زرہ دے دی اور اس کے بعد ان کے پاس گئے۔ اور یہ معلوم ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا مہر چار سو مثقال چاندی کا تھا اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو اس مقررہ مہر سے ایک زرہ کی بقدر دینے کا حکم دیا تھا لہٰذا ان حضرات کے نزدیک مقررہ مہر میں

سے علی الفور (یعنی جماع سے قبل) کچھ دے دینا واجب ہے جب کہ حنفیہ کے ہاں یہ مستحب ہے واجب نہیں ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے تعلیم قرآن کو مہر قرار دیا، چنانچہ بعض آئمہ نے اسے جائز رکھا ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں (یعنی تعلیم قرآن کو مہر قرار دے کے نکاح کر لینے کی صورت میں) نکاح تو صحیح ہو جاتا ہے مگر خاوند پر مہر مثل واجب ہوتا ہے اور جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے تو ارشاد گرامی بما معک الخ میں حرف با بدل کے لئے نہیں ہے بلکہ سببیت کے اظہار کے لئے ہے یعنی اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ قرآن میں سے جو کچھ تمہیں یاد ہے اس کے سبب میں نے تمہارا نکاح اس عورت سے کر دیا گویا تمہیں قرآن کا یاد ہونا اس عورت کے ساتھ ہوا تھا تو قبولیت اسلام ان کے نکاح کا سبب تھا اسے مہر قرار نہیں دیا گیا تھا۔

"تم اس کو قرآن کی تعلیم دیا کرو" یہ حکم بطور وجوب نہیں تھا بلکہ بطریق استحباب تھا لہٰذا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تعلیم قرآن کو مہر قرار دیا تھا۔

ازواج مطہرات کے مہر کی مقدار

(۲) وَعَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ كَمْ كَانَ صَدَاقُ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ كَانَ صَدَاقُهُ لِاَزْوَاجِهٖ ثِنْتَیْ عَشْرَةَ اُوْقِيَّةً وَنَشٌّ قَالَتْ اَتَدْرِیْ مَاالنَّشُّ قُلْتُ لَا قَالَتْ نِصْفُ اُوْقِيَّةٍ فَتِلْكَ خَمْسُمِائَةِ دِرْهَمٍ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَنَشٌّ بِالرَّفْعِ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَفِیْ جَمِيْعِ الْاُصُوْلِ۔

"اور حضرت ابوسلمہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے (اپنی ازواج مطہراتؓ کا) کتنا مہر مقرر کیا تھا؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج کے لئے بارہ اوقیہ اور ایک نش کا مہر مقرر فرمایا تھا۔" پھر حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ "جانتے ہو نش کسے کہتے ہیں؟" میں نے عرض کیا کہ "نہیں" انہوں نے فرمایا کہ "ایک نش آدھے اوقیہ کے برابر ہوتا ہے اس طرح بارہ اوقیہ ایک نش کی مجموعی مقدار پانچ سو درہم کے برابر ہوئی (کیونکہ ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے) اس روایت کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور شرح السنۃ اور اصول کی تمام کتابوں میں لفظ نش نون کے پیش کے ساتھ یعنی نُش منقول ہے "اصول حدیث کی ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں تمام احادیث سند کے ساتھ لکھی گئی ہوں)۔"

تشریح: پانچ سو درہم کے موجودہ وزن اور موجودہ حیثیت کی تفصیل ابتداء باب میں بیان کی جا چکی ہے اس حدیث سے شوافع یہ استدلال کرتے ہیں کہ پانچ سو درہم کا مہر باندھنا مستحب ہے۔

یہاں ایک خلجان پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ کی تمام ازواج مطہراتؓ کی مقدار پانچ سو درہم بتائی ہے حالانکہ حضرت ام حبیبہؓ کا مہر چار ہزار درہم یا چار سو دینار تھا اور حضرت ام حبیبہؓ بھی آنحضرت ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے تمام ازواج مطہراتؓ کے مہر کی مقدار بتائی ہے جن کا مہر خود آنحضرت ﷺ نے مقرر فرمایا تھا، جب کہ حضرت ام حبیبہؓ کا مہر حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے باندھا تھا۔

بھاری مہر کی ممانعت

(۳) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ اَلَا لَا تُغَالُوْا صَدُقَةَ النِّسَاءِ فَاِنَّهَا لَوْ كَانَتْ مَكْرُمَةً فِی الدُّنْيَا وَتَقْوٰى عِنْدَ اللّٰهِ لَكَانَ اَوْلَاكُمْ بِهَا نَبِیُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا عَلِمْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَكَحَ شَيْئًا مِنْ نِسَائِهٖ وَلَا اَنْكَحَ شَيْئًا مِنْ بَنَاتِهٖ عَلٰى اَكْثَرَ مِنِ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اُوْقِيَّةً۔ (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ و الدارمی)

"حضرت عمر ابن خطابؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ خبردار! عورتوں کا بھاری مہر نہ باندھو! اگر بھاری مہر باندھنا دنیا میں بزرگی و عظمت کا سبب اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقویٰ کا موجب ہوتا تو یقیناً نبی کریم ﷺ اس کے زیادہ مستحق تھے (آپ ﷺ بھاری سے بھاری مہر باندھتے) مگر میں نہیں جانتا کہ رسول کریم ﷺ نے بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر پر اپنی ازواج مطہرات سے نکاح کیا ہو یا اس سے زیادہ مہر پر اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کرایا ہو۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "تقویٰ" سے مراد زیادہ تقویٰ ہے اور آیت کریمہ:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یعنی اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑے مرتبہ والا وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ کے بموجب اللہ تعالیٰ کے نزدیک امتیاز عطا کرنے والی بزرگی و فضیلت کا مستحق بناتا ہے حاصل یہ کہ بھاری مہر باندھنے سے نہ صرف یہ کہ دنیا میں کوئی عظمت و بزرگی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ سے آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک امتیازی بزرگی و فضیلت کا درجہ حاصل نہیں ہوگا اور جب اس کی وجہ سے نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے اور نہ دین کا کوئی نفع تو پھر اس لاحاصل چیز کو کیوں اختیار کیا جائے! ازواج مطہرات کے مہر کے سلسلہ میں تین روایتیں ہیں جو بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں، ایک تو حضرت عائشہؓ کی روایت ہے دوسری روایت یہ ہے جس میں بارہ اوقیہ یعنی چار سو اسی درہم کی مقدار ذکر کی گئی ہے اور ایک روایت آگے آئے گی جس میں حضرت اُمّ حبیبہؓ کے مہر کی مقدار چار ہزار درہم ذکر ہوگی ان تینوں روایتوں میں سے حضرت اُمّ حبیبہؓ کے مہر والی روایت کو مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ان کا مہر آنحضرت ﷺ نے مقرر نہیں کیا تھا بلکہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے باندھا تھا اور نجاشی بادشاہ نے بھی اتنا زیادہ مہر محض آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کے پیش نظر باندھا تھا۔

اب رہی حضرت عائشہؓ اور حضرت عمرؓ کی روایتیں تو دونوں کے درمیان بھی در حقیقت کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ نے مہر کی اصل مقدار کی وضاحت کرتے ہوئے اوقیہ کے ساتھ کسر یعنی آدھے اوقیہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور حضرت عمرؓ نے صرف اوقیہ کا ذکر کیا کسر کو چھوڑ دیا اس کے علاوہ یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عمرؓ نے بارہ اوقیہ سے زیادہ کی نفی اپنے علم کے مطابق کی ہے "یعنی حضرت عمرؓ کو صرف بارہ اوقیہ ہی کا علم ہوگا اور حضرت عائشہؓ نے جو ایک نش (آدھا اوقیہ) زیادہ ذکر کیا ہے وہ حضرت عمرؓ کے علم میں نہیں آیا ہوگا۔

یہ بات ملحوظ ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہاں صرف اولی اور افضل کو بیان کیا ہے یعنی ان کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ بہتر اور افضل و اولی یہ ہے کہ مہر کم ہی باندھا جائے جس کی مسنون مقدار بارہ اوقیہ ہے ورنہ تو جہاں تک جواز کا تعلق ہے یہ بتایا ہی جا چکا ہے کہ اس سے زیادہ مہر باندھنا بھی جائز ہے۔

مہر میں کچھ حصہ علی الفور دے دینا بہتر ہے

④ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَعْطٰی فِیْ صَدَاقِ امْرَأَتِہٖ مِلْءَ کَفَّیْہِ سَوِیْقًا اَوْ تَمْرًا فَقَدِ اسْتَحَلَّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اپنی بیوی کے مہر میں سے (کچھ حصہ بطور مہر معجل دے دیا مثلاً) دونوں ہاتھ بھر کر ستو یا کھجوریں دے دیں تو اس نے اس عورت کو اپنے لئے حلال کر لیا۔" (ابوداؤدؒ)

⑤ وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِیْعَۃَ اَنَّ امْرَاَۃً مِنْ بَنِیْ فَزَارَۃَ تَزَوَّجَتْ عَلٰی نَعْلَیْنِ فَقَالَ لَھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرَضِیْتِ مِنْ نَّفْسِكِ وَمَالِكِ بِنَعْلَیْنِ قَالَتْ نَعَمْ فَاَجَازَہٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عامر ابن ربیعہؓ کہتے ہیں کہ (قبیلہ) بنی فزارہ کی ایک عورت نے ایک جوڑی جوتی پر ایک شخص سے نکاح کیا تو رسول کریم ﷺ نے اس سے فرمایا "کیا تم اپنی مالداری کے باوجود اپنے آپ کو ایک جوڑا جوتی کے بدلے حوالے کر دینے پر راضی ہو گئیں۔" یعنی

اس کے باوجود کہ تم خود مالدار اور باحیثیت خاتون ہو کیا صرف ایک جوڑا جوتی کے بدلے اپنے آپ کو حوالے کر دینے پر راضی ہو؟") اس عورت نے کہا کہ ہاں (میں راضی ہوں) آپ ﷺ نے (یہ جواب سن کر) اس کو جائز رکھا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: رفع تعارض کے پیش نظر اس حدیث کو بھی "مہر معجل" پر محمول کیا جائے گا! لیکن اس کی یہ توضیح زیادہ مناسب ہے کہ جب اس عورت نے ایک جوڑا جوتی کے عوض نکاح کیا تو اس کا نکاح صحیح ہو گیا اور اسے اپنے مہر مثل کے مطالبہ کا حق حاصل ہو گیا جب وہ ایک جوڑا جوتی پر راضی ہو گئی تو گویا وہ اپنے مہر مثل میں سے ایک جوڑا جوتی سے زیادہ کے حق سے دست بردار ہو گئی لہٰذا رسول کریم ﷺ نے اس کو جائز رکھا اور چونکہ اس صورت میں اس کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لئے یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ وغیرہ کے مسلک کی دلیل نہیں ہو سکتی اور ویسے بھی یہ حدیث ضعیف ہے۔

مہر مثل واجب ہونے کی ایک صورت

⑥ وَعَنْ عَلْقَمَةَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّهُ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً وَلَمْ يَفْرِضْ لَهَا شَيْئًا وَلَمْ يَدْخُلْ بِهَا حَتّٰى مَاتَ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ لَهَا مِثْلُ صِدَاقِ نِسَائِهَا لَا وَكْسَ وَلَا شَطَطَ وَعَلَيْهَا الْعِدَّةُ وَلَهَا الْمِيْرَاثُ فَقَامَ مَعْقِلُ بْنُ سِنَانٍ الْاَشْجَعِيُّ فَقَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بِرْوَعَ بِنْتِ وَاشِقٍ امْرَأَةٍ مِنَّا بِمِثْلِ مَا قَضَيْتَ فَفَرِحَ بِهَا ابْنُ مَسْعُوْدٍ۔

(رواه الترمذی و ابوداؤد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت علقمہؒ حضرت ابن مسعودؓ کے بارہ میں نقل کرتے ہیں کہ ان سے ایک ایسے شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اس کا کچھ مہر مقرر نہیں کیا اور پھر اس نے ابھی دخول نہیں کیا تھا یعنی نہ تو اپنی بیوی کے ساتھ جماع کیا تھا اور نہ خلوت صحیحہ ہوئی تھی۔ کہ اس کا انتقال ہو گیا، حضرت ابن مسعودؓ نے ایک مہینہ تک اس مسئلہ پر غور و فکر کیا اور پھر (اپنے اجتہاد کی بنیاد پر فرمایا کہ "اس عورت کو وہ مہر ملے گا، جو اس کے خاندان کی عورتوں کا ہے (یعنی اس شخص کی بیوہ کو مہر دیا جائے گا) نہ اس میں کوئی کمی ہو گی نہ زیادتی اور اس عورت پر (شوہر کی وفات کی) عدت بھی واجب ہو گی اور اس کو میراث بھی ملے گی۔ (یہ سن کر) حضرت معقلؓ ابن سنان اشجعی کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ "نبی کریم ﷺ نے ہمارے خاندان کی ایک عورت بروع بنت واشق کے بارہ میں یہی حکم دیا تھا جو اس وقت آپ نے بیان کیا ہے۔" حضرت ابن مسعودؓ (یہ بات سن کر) بہت خوش ہوئے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: حضرت ابن مسعودؓ کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل، ذہانت و ذکاوت اور دینی فہم و فراست کی دولت بڑی فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی تھی کسی بھی الجھے ہوئے مسئلے کو اپنی بے پناہ قوت اجتہاد کے ذریعہ اس طرح حل فرما دیتے تھے کہ وہ قرآن و حدیث کے بالکل مطابق ہوتا تھا، چنانچہ اس موقع پر بھی جب یہ مسئلہ آپ سے پوچھا گیا تو وہ اس پر ایک ماہ تک قرآن و سُنّت کی روشنی میں غور و فکر کرتے رہے پھر جب انہوں نے اپنی قوت اجتہاد سے اس کا شرعی فیصلہ سنایا تو ایک صحابی حضرت معقلؓ نے علی الاعلان یہ شہادت دی کہ حضرت ابن مسعودؓ کا یہ فیصلہ آنحضرت ﷺ کے حکم کے عین مطابق ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے بھی اسی قسم کے ایک معاملہ میں ایسا ہی فیصلہ صادر فرمایا تھا چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے اپنی اس بات پر بہت زیادہ خوشی کا اظہار فرمایا کہ حق تعالیٰ نے میری رہبری فرمائی اور میرا یہ فیصلہ آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق ہوا۔

مذکورہ بالا مسئلہ میں حضرت علیؓ اور صحابہ کی ایک جماعت کا یہ مسلک تھا کہ اس صورت میں عورت عدم دخول کی وجہ سے مہر کی حقدار نہیں ہوتی، ہاں اس پر عدت واجب ہوتی ہے اور اسے شوہر کی میراث بھی ملتی ہے اس بارہ میں حضرت امام شافعیؒ کے دو قول ہیں ایک تو حضرت علیؓ کے موافق ہے اور دوسرا قول حضرت ابن مسعودؓ کے مطابق ہے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک وہی ہے جو حضرت ابن مسعود نے بیان کیا ہے۔

مہر مثل کسے کہتے ہیں: "مہر مثل" عورت کے اس مہر کو کہتے ہیں جو اس کے باپ کے خاندان کی ان عورتوں کا ہو جو ان باتوں میں اس کے مثل ہوں عمر، جمال، مال، زمانہ، عقل، دینداری، بکارت وثیوبت، علم وادب اور اخلاق وعادات۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اُمّ حبیبہؓ سے آنحضرت ﷺ کے نکاح کی تفصیل اور ان کے مہر کی مقدار

(۷) عَنْ اُمِّ حَبِيْبَةَ اَنَّهَا كَانَتْ تَحْتَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جَحْشٍ فَمَاتَ بِاَرْضِ الْحَبْشَةِ فَزَوَّجَهَا النَّجَاشِيُّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَمْهَرَهَا عَنْهُ اَرْبَعَةَ الْاٰفٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَرْبَعَةَ الْاٰفِ دِرْهَمٍ وَبَعَثَ بِهَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَ شُرَحْبِيْلِ ابْنِ حَسَنَةَ۔ (رواه ابوداؤد والنسائی)

"اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ (پہلے) عبداللہ ابن جحش کے نکاح میں تھیں پھر جب ملک حبشہ میں عبداللہ کا انتقال ہو گیا تو حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے ان کا نکاح نبی کریم ﷺ کے ساتھ کر دیا اور نجاشی نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے اُمّ حبیبہؓ کا مہر چار ہزار مقرر کیا! ایک اور روایت میں چار ہزار درہم کے الفاظ ہیں (یعنی یہاں جو روایت نقل کی گئی ہے اس میں "درہم" کا لفظ نہیں ہے بلکہ صرف چار ہزار کا ذکر ہے جب کہ ایک دوسری روایت میں چار ہزار کے ساتھ درہم کا لفظ بھی ہے اور یہی مراد ہے) اور نجاشی نے (نکاح کے بعد) اُمّ حبیبہؓ کو شرحبیل ابن حسنہ کے ہمراہ آنحضرت ﷺ کے پاس بھیج دیا۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: حضرت اُمّ حبیبہؓ کے پہلے شوہر کا نام مشکوۃ کے تمام نسخوں میں عبداللہ ابن جحش ہی لکھا ہوا ہے حالانکہ یہ غلط نام ہے صحیح نام عبید اللہ ابن جحش (تصغیر کے صیغہ کے ساتھ) ہے چنانچہ سنن ابوداؤد اور اصول وغیرہ میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔

حضرت اُمّ حبیبہؓ کا اصل نام رملہ تھا، یہ حضرت ابوسفیانؓ کی صاحبزادی اور حضرت معاویہؓ کی بہن تھیں، پہلے ان کی شادی عبید اللہ ابن جحش کے ساتھ ہوئی تھی، عبید اللہ نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اُمّ حبیبہؓ کے ساتھ مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے پھر وہاں پہنچ کر مرتد ہو گئے یعنی اسلام ترک کر کے عیسائی ہو گئے اور وہیں مر گئے اُمّ حبیبہؓ اسلام پر ثابت قدم رہیں پھر آنحضرت ﷺ نے عمرو ابن امیہ ضمریؓ کو حبشہ کے بادشاہ اصحمہ جن کا لقب نجاشی تھا، کے پاس یہ حکم دے کر بھیجا کہ وہ اُمّ حبیبہؓ کو آپ ﷺ کے نکاح کا پیغام دیں چنانچہ نجاشی نے آنحضرت ﷺ کا یہ حکم آپ کی اپنی ایک لونڈی ابرہہ کے ذریعہ حضرت اُمّ حبیبہؓ کی خدمت میں بھیجا ابرہہ نے ان سے کہا کہ مجھے بادشاہ نے آپ ﷺ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ مجھے رسول کریم ﷺ کا یہ حکم ملا ہے کہ آپ سے رسول کریم ﷺ کا نکاح کر دوں حضرت اُمّ حبیبہؓ نے یہ پیغام بطیب خاطر قبول کیا اور فوراً ایک آدمی کو حضرت خالد ابن سعیدؓ کے پاس بھیج کر ان کو اپنا وکیل مقرر کیا جو ان کے والد کے چچازاد بھائی تھے اور ساتھ ہی ابرہہ کو یہ خوشخبری سنانے کے عوض دو کپڑے اور چاندی کی ایک انگوٹھی عطا کی، پھر جب شام ہوئی تو نجاشی نے حضرت جعفر ابن ابوطالبؓ کو اور ان تمام مسلمانوں کو جو اس وقت حبشہ میں موجود تھے جمع ہونے کا حکم دیا جب سب لوگ جمع ہو گئے تو نجاشی نے یہ خطبہ پڑھا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ السَّلَامِ الْمُؤْمِنِ الْمُهَيْمِنِ الْعَزِيْزِ الْجَبَّارِ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

پھر یہ الفاظ کہے "بعد ازاں میں نے اس چیز کو قبول کیا جو رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے اور میں نے چار سو دینار مہر مقرر کیا۔" اس کے بعد انہوں نے وہ چار سو دینار لوگوں کے سامنے پیش کر دیئے اس کے بعد حضرت خالد ابن سعیدؓ نے یہ خطبہ پڑھا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ السَّلَامِ الْمُؤْمِنِ الْمُهَيْمِنِ الْعَزِيْزِ الْجَبَّارِ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ

رَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

پھر یہ الفاظ کہے "بعد ازاں میں نے اس چیز کو قبول کیا جو رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے اور میں نے ابوسفیان ؓ کی بیٹی اُمّ حبیبہ ؓ سے آنحضرت ﷺ کا نکاح کر دیا اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کو یہ نکاح مبارک کرے۔" اس ایجاب و قبول کے بعد مہر کے وہ چار سو دینار حضرت خالد ابن سعید ؓ کو دے دیئے گئے جنہیں انہوں نے رکھ لیا پھر جب لوگوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو نجاشی نے کہا کہ ابھی آپ لوگ بیٹھے رہیں کیونکہ نکاح کے وقت کھانا کھلانا انبیاء کی سُنّت ہے چنانچہ انہوں نے کھانا منگوایا اور سب لوگ کھانا کھا کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ یہ سن ۷ ھ کا واقعہ ہے اس وقت حضرت اُمّ حبیبہ ؓ کے والد ابوسفیان مشرک تھے اور آنحضرت ﷺ کے سخت دشمن تھے پھر بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

قبولیت اسلام مہر کا قائم مقام

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ تَزَوَّجَ اَبُوْطَلْحَةَ اُمَّ سُلَيْمٍ فَكَانَ صَدَاقُ مَابَيْنَهُمَا الْاِسْلَامُ اَسْلَمَتْ اُمُّ سُلَيْمٍ قَبْلَ اَبِيْ طَلْحَةَ فَخَطَبَهَا فَقَالَتْ اِنِّيْ قَدْ اَسْلَمْتُ فَاِنْ اَسْلَمْتَ نَكَحْتُكَ فَاَسْلَمَ فَكَانَ صَدَاقُ مَابَيْنَهُمَا۔ (رواہ نسائی)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ ابوطلحہ ؓ نے جب اُمّ سلیم ؓ سے نکاح کیا تو قبولیت اسلام آپس میں مہر قرار پایا۔ اُمّ سلیم نے ابوطلحہ ؓ سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور پھر جب ابوطلحہ ؓ نے اُمّ سلیم ؓ کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا تو اُمّ سلیم ؓ نے کہا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو میں تم سے نکاح کر لوں گی۔ (اور تم سے مہر نہیں لوں گی) چنانچہ ابوطلحہ ؓ نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام قبول کر لینا ہی آپس میں مہر قرار پایا۔" (نسائی ؒ)

تشریح: حضرت اُمّ سلیم ؓ ملحان کی بیٹی اور حضرت انس ؓ بن مالک کی ماں ہیں پہلے ان کی شادی مالک ابن نضر کے ساتھ ہوئی تھی جس سے حضرت انس ؓ پیدا ہوئے مالک کو قبولیت اسلام کی توفیق نصیب نہیں ہو سکی اور وہ حالت شرک میں مارا گیا پھر اُمّ سلیم نے اسلام قبول کر لیا اور ابوطلحہ نے جو اس وقت تک مشرک تھے ان کو اپنے نکاح کا پیغام دیا اُمّ سلیم سے ان کا نکاح ہو گیا۔

لہٰذا حدیث کے الفاظ "اور اسلام قبول کر لینا ہی مہر قرار پایا" کی وضاحت حنفیہ کے مسلک کے مطابق یہ ہے کہ اُمّ سلیم ؓ کے ساتھ ابوطلحہ ؓ کا نکاح تو مہر کے ساتھ ہی ہوا لیکن اُمّ سلیم ؓ نے اپنے وعدہ کے مطابق ابوطلحہ ؓ کے اسلام لانے کی وجہ سے اپنا مہر بخش دیا گویا ابوطلحہ ؓ کا اسلام قبول کرنا ان کے آپس کے نکاح کا سبب ہوا نہ یہ کہ قبولیت اسلام ان کا مہر تھا ہاں دوسرے آئمہ اس حدیث کو ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ ابوطلحہ کا اسلام قبول کرنا ہی ان کا مہر تھا۔

بَابُ الْوَلِيْمَةِ

ولیمہ کا بیان

"ولیمہ" اس کھانے کو کہتے ہیں جو نکاح میں کھلایا جاتا ہے اور چونکہ ولیمہ مشتق ہے التیام سے جس کے معنی اجتماع کے ہیں اس لئے اس کھانے کو "ولیمہ" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اجتماع زوجین کی تقریب میں کھلایا جاتا ہے۔

ولیمہ کی شرعی حیثیت اور اس کا وقت: اکثر علماء کے قول کے مطابق "ولیمہ" مسنون ہے جب کہ بعض علماء اسے مستحب کہتے ہیں اور بعض حضرات کے نزدیک یہ واجب ہے اسی طرح "ولیمہ" کے وقت کے بارہ میں بھی اختلافی اقوال ہیں بعض علماء تو یہ فرماتے ہیں کہ ولیمہ کا اصل وقت دخول (یعنی شب زفاف) کے بعد ہے بعض حضرات کا یہ قول ہے کہ ولیمہ عقد نکاح کے وقت کھلانا چاہئے۔ اور بعض علماء یہ

کہتے ہیں کہ عقد نکاح کے وقت بھی کھلانا چاہئے اور دخول کے بعد بھی۔

دو دن سے زیادہ وقت تک ولیمہ کھلانے کے بارہ میں بھی علماء کے مختلف قول ہیں ایک طبقہ تو اسے مکروہ کہتا ہے یعنی علماء کے اس طبقہ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ دو دن تک کھلایا جاسکتا ہے اس سے زیادہ وقت تک کھلانا مکروہ ہے حضرت امام مالکؒ کے ہاں ایک ہفتہ تک کھلانا مستحب ہے لیکن اس سلسلہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کا انحصار خاوند کی حیثیت و استطاعت پر ہے اگر وہ صرف ایک ہی وقت پر اکتفا کرے اور اگر کئی دن اور کئی وقت تک کھلانے کی استطاعت رکھتا ہے تو کئی دن اور کئی وقت تک کھلا سکتا ہے۔

ضیافت کی قسمیں: مجمع البحار میں لکھا ہے کہ ضیافت یعنی دعوت کی آٹھ قسمیں ہیں۔ ① ولیمہ ② خرس ③ اعذار ④ وکیرہ ⑤ نقیعہ ⑥ وضیمہ ⑦ عقیقہ ⑧ مادبہ۔ چنانچہ ولیمہ اس دعوت کو کہتے ہیں جو شادی بیاہ کے موقعہ پر کی جائے خرس اس دعوت کو کہتے ہیں کہ جو بچہ کی پیدائش کی خوشی میں کی جائے اعزار اس دعوت کو کہتے ہیں جو ختنہ کی تقریب میں کی جائے، وکیرہ اس دعوت کو کہتے ہیں جو مکان بننے کی خوشی میں کی جائے، نقیعہ اس دعوت کو کہتے ہیں جو مسافر کے آنے کی تقریب میں کی جائے عقیقہ اس دعوت کو کہتے ہیں جو بچہ کا نام رکھنے کی تقریب میں کی جائے اور مادبہ ہر اس دعوت کو کہتے ہیں جو بلا کسی خاص تقریب کے کی جائے ضافت کی یہ تمام قسمیں مستحب ہیں البتہ ولیمہ کے بارہ میں بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ دعوت واجب ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ولیمہ کرنے کا حکم

① وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى عَلٰى عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَثَرَ صُفْرَةٍ فَقَالَ مَاهٰذَا قَالَ اِنِّيْ تَزَوَّجْتُ امْرَاَةً عَلٰى وَزْنِ نَوَاةٍ مِنْ ذَهَبٍ قَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے عبدالرحمن ابن عوفؓ (کے بدن یا کپڑے) پر زعفران کا) زرد نشان دیکھا تو پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عبدالرحمن نے کہا کہ میں نے ایک نواۃ سونے کے عوض ایک عورت سے نکاح کیا ہے۔" آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ تمہیں مبارک کرے، تم ولیمہ کرو (یعنی کھانا پکوا کر کھلاؤ) اگرچہ وہ ایک بکری کا ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عبدالرحمنؓ کے کپڑوں پر یا ان کے بدن پر زعفران کا نشان دیکھ کر آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ "یہ کیا ہے؟" کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس زعفران کے لگنے کا سبب دریافت فرمایا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ چونکہ مردوں کو خلوق استعمال کرنے سے منع کرتے تھے (خلوق ایک خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے بنتی ہے) اس لئے آپ ﷺ نے ان الفاظ کے ذریعہ ان کو تنبیہ فرمائی کہ جب مردوں کے لئے یہ ممنوع ہے تو تم نے کیوں لگائی؟ چنانچہ عبدالرحمنؓ نے جواب دیا کہ میں نے قصدًا نہیں لگائی ہے بلکہ دلہن سے اختلاط کی وجہ سے بغیر میرے قصد اور بغیر علم کے لگ گئی ہے۔

قاضیؒ کہتے ہیں کہ جس طرح "نش" بیس درہم اور اوقیہ چالیس درہم کے برابر وزن کو کہتے ہیں اسی طرح "نواۃ" پانچ درہم کے برابر وزن کا نام ہے۔ لہٰذا ایک نواۃ سونے کے عوض کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس عورت کا مہر پانچ درہم کے برابر یعنی پونے سولہ ماشہ سونا مقرر کیا ہے۔ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ "نواۃ" سے نواۃ تمر یعنی کھجور کی گٹھلی مراد ہے اور بظاہر یہی مراد زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس صورت میں حضرت عبدالرحمنؓ کے کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے کھجور کی گٹھلی کے بقدر سونے کا مہر باندھا ہے۔

"تم ولیمہ کرنا اگرچہ وہ ایک بکری کا ہو" اس طرح کی عبارت تقلیل "کم سے کم مقدار بیان کرنے" کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے اور یہاں تکثیر مراد ہے یعنی آنحضرت ﷺ کا مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ اگرچہ زیادہ خرچ ہو تب بھی ولیمہ کرو۔ اور "تکثیر" مراد لینے کی وجہ یہ

ہے کہ اس زمانہ میں بکری کو ایک قلیل ترین مقدار کے اظہار کے لئے ذکر کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی مالی اور اقتصادی حالت بہت کمزور تھی لوگ ستو اور اسی قسم کی دوسری کم تر چیزوں کے ذریعہ ولیمہ کی سُنت پوری کیا کرتے تھے۔ پھر یہ کہ خود حضرت عبدالرحمن ابن عوف کی مالی حیثیت اس وقت اتنی زیادہ نہیں تھی کہ آنحضرت ﷺ ان کے سامنے بکری جیسی چیز کو کم سے کم مقدار کی صورت میں بیان کرتے۔

آنحضرت ﷺ نے سب سے بڑا ولیمہ حضرت زینبؓ کے نکاح میں کیا تھا

(۲) وَعَنْهُ قَالَ مَا اَوْلَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اَحَدٍ مِنْ نِّسَائِہٖ مَا اَوْلَمَ عَلٰی زَیْنَبَ اَوْلَمَ بِشَاۃٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنی کسی بھی زوجہ مطہرہ کا اتنا بڑا ولیمہ نہیں کیا جتنا بڑا ولیمہ حضرت زینبؓ کے نکاح میں کیا تھا، آپ ﷺ نے ان کے نکاح میں ایک بکری کا ولیمہ کیا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس سے پہلے حدیث کی تشریح میں جو یہ بتایا گیا تھا کہ بکری کا ذکر بیان تکثیر کے لئے ہے تو اس حدیث سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ایسا ولیمہ جس میں ایک بکری استعمال کی گئی ہو ایک بڑے اور کثیر خرچ ولیمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۳) وَعَنْهُ قَالَ اَوْلَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ بَنٰی بِزَیْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ فَاَشْبَعَ النَّاسَ خُبْزًا وَّ لَحْمًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ شب زفاف گزارنے کے بعد ولیمہ کیا اور (اس ولیمہ میں) لوگوں کا پیٹ گوشت اور روٹی سے بھر دیا۔" (بخاریؒ)

عورت کی آزادی کو اس کا مہر قرار دیا جا سکتا ہے

(۴) وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْتَقَ صَفِیَّۃَ وَتَزَوَّجَھَا وَجَعَلَ عِتْقَھَا صَدَاقَھَا وَ اَوْلَمَ عَلَیْھَا بِحَیْسٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت صفیہؓ کو (پہلے) آزاد کیا اور (پھر) ان سے نکاح کر لیا، آپ ﷺ نے ان کی آزادی ہی کو ان کا مہر قرار دیا اور ان کے نکاح میں حیس کا ولیمہ کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت صفیہؓ حُیَیّ ابن اخطب کی بیٹی تھیں جو خیبر میں آباد قبیلہ بنو قریظہ و بنو نضیر کے سردار تھے جب خیبر کے یہودیوں سے مسلمانوں کی جنگ ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح عطا کی تو صفیہؓ بھی ہاتھ لگیں اور بطور لونڈی آنحضرت ﷺ کی ملکیت میں آئیں مگر آپ ﷺ نے ان کو آزادی کے خلعت سے نوازا اور پھر اپنی زوجیت میں لے کر انہیں دین و دنیا کی سب سے بڑی سعادت سے سرفراز کیا۔

اس مسئلہ میں اہل علم کے اختلافی اقوال ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی لونڈی کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرے اور اس کی آزادی ہی کو اس کا مہر قرار دے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ صحابہؓ کی ایک جماعت اور بعض علماء اس حدیث کے ظاہری مفہوم کے پیش نظر اس کے جواز کے قائل ہیں جب کہ صحابہؓ اور علماء کی ایک جماعت نے اسے جائز نہیں کہا ہے اور حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے ان کی طرف سے اس حدیث کی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے حضرت صفیہؓ کی آزادی کو ان کا مہر قرار دیا جانا ایک استثنائی صورت ہے جو صرف آنحضرت ﷺ کی ذات کے ساتھ مختص ہے لہٰذا یہ آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے تھا اور کسی کو جائز نہیں ہے۔

شرح ہدایہ میں لکھا ہے اگر کوئی شخص اپنی لونڈی کو آزاد کرے اور اس کی آزادی کو مہر قرار دے بایں طور کہ اس سے یہ کہے کہ میں نے تجھ کو اس شرط پر آزاد کیا کہ تو مجھ سے آزادی کے عوض نکاح کرلے اور پھر اس لونڈی نے اسے قبول کرلیا تو یہ آزاد کرنا صحیح ہو جائے گا یعنی وہ آزاد ہو جائے گی البتہ نکاح کے معاملہ میں وہ خود مختار ہوگی یہاں تک کہ اگر اس نے اس شخص سے نکاح کرلیا تو اس کے لئے اس کا مہر مثل واجب ہوگا۔

"حیس" ایک کھانے کا نام ہے جو حلوے کی قسم کا ہوتا ہے اور کھجور گھی اور اقط سے بنتا ہے۔ "اقط" کہ جس کا دوسرا نام قروط" ہے پنیر کی طرح ہوتا ہے اور دہی سے بنایا جاتا ہے۔

حضرت صفیہؓ کے ولیمہ کا ذکر

⑤ وَعَنْهُ قَالَ اَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ خَيْبَرَ وَالْمَدِيْنَةِ ثَلَاثَ لَيَالٍ يُبْنٰى عَلَيْهِ بِصَفِيَّةَ فَدَعَوْتُ الْمُسْلِمِيْنَ اِلٰى وَلِيْمَتِهٖ وَمَا كَانَ فِيْهَا مِنْ خُبْزٍ وَلَا لَحْمٍ وَمَا كَانَ فِيْهَا اِلَّا اَنْ اَمَرَ بِالْاَنْطَاعِ فَبُسِطَتْ فَاُلْقِيَ عَلَيْهَا التَّمْرُ وَالْاَقِطُ وَالسَّمْنُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خیبر اور مدینہ کے درمیان تین رات قیام فرمایا اور صفیہؓ کے ساتھ "ان کے نکاح کے بعد) شب زفاف گزاری اور میں نے مسلمانوں کو آپ ﷺ کی دعوت ولیمہ میں بلایا ولیمہ میں نہ تو گوشت تھا اور نہ روٹی تھی بلکہ آپ ﷺ نے دستر خوان بچھانے کا حکم دیا اور جب دستر خوان بچھا دیا گیا تو اس پر کھجوریں اقط اور گھی رکھ دیا گیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: اوپر کی حدیث میں حضرت صفیہؓ کے ولیمہ میں جس "حیس" کا ذکر کیا گیا ہے اسی کی تفصیل اس حدیث میں بیان کی گئی ہے کہ حیس کے اجزاء کھجور اقط اور گھی تھے۔

حضرت اُمّ سلمہؓ کا ولیمہ

⑥ وَعَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَ اَوْلَمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى بَعْضِ نِسَائِهٖ بِمُدَّيْنِ مِنْ شَعِيْرٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت صفیہؓ بنت شیبہ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زوجہ مطہرہ (غالباً اُمّ سلمہؓ) کا ولیمہ دو سیر جو کے ساتھ کیا۔" (بخاریؒ)

ولیمہ کی دعوت قبول کرنا چاہئے

⑦ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ اِلَى الْوَلِيْمَةِ فَلْيَاْتِهَا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ فَلْيُجِبْ عُرْسًا كَانَ اَوْنَحْوَهٗ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کو شادی کے کھانے پر بلایا جائے تو اسے جانا چاہئے اور مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے کہ "دعوت قبول کرنی چاہئے خواہ وہ ولیمہ کی دعوت ہو یا اسی قسم کی کوئی اور دعوت۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "یا اسی قسم کی کوئی اور دعوت" سے ختنہ و عقیقہ وغیرہ کی دعوت مراد ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان روایتوں میں "ولیمہ" سے مراد صرف وہی کھانا ہے جو شادی بیاہ کے موقع پر کھلایا جاتا ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ شادی بیاہ کے کھانے کی دعوت قبول کرنا واجب ہے اگر کوئی شخص بلا کسی عذر کے دعوت قبول نہ کرے تو وہ گنہ گار ہوتا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

مَنْ تَرَكَ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔

"جس شخص نے دعوت قبول نہ کی اس نے خدا اور رسول (ﷺ) کی نافرمانی کی۔"

اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ "قبول کرنے" سے مراد دعوت میں جانا یعنی اگر کسی شخص کو شادی میں بلایا جائے تو اس کے لئے اس دعوت میں جانا بعض علماء کے نزدیک واجب ہے اور بعض علماء کے نزدیک مستحب ہے اب رہی یہ بات کہ کھانے میں شریک ہونے کی تو اس کے بارہ میں متفقہ طور پر مسئلہ یہ ہے کہ اگر روزے سے نہ ہو تو کھانے میں شریک ہونا مستحب ہے شادی کے کھانے کی دعوت کے علاوہ دوسری دعوتوں کا قبول کرنا مستحب ہے۔

طیبیؒ اور ابن ملکؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ دعوت قبول کرنے کا وجوب یا استحباب بعض صورتوں میں ساقط ہو جاتا ہے یہ شبہ ہونا کہ دعوت میں جو کھانا کھلایا جائے گا وہ حلال مال کا نہیں ہو گا یا اس دعوت میں مالداروں کی تخصیص ہو یا اس دعوت میں کوئی ایسا شخص شریک ہو جس سے یا تو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو یا وہ اس قابل نہ ہو کہ اس کے ساتھ کہیں بیٹھا جائے ان صورتوں میں اگر کوئی شخص دعوت قبول نہ کرے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اسی طرح اگر کسی شخص کو دعوت میں محض اس لئے بلایا جائے کہ اس کی خوشنودی مزاج حاصل ہو جائے اور اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے یا اس کی ذات وجاہ سے کوئی دنیاوی غرض پوری ہو جائے تو ایسی دعوت کو قبول نہ کرنا ہی اولیٰ ہے یا ایسے ہی اگر کچھ لوگ کسی شخص کو اس مقصد کے لئے دعوت میں بلائیں کہ وہ ان لوگوں کے باطل ارادوں یا غیر شرعی کاموں میں مدد کرے یا کسی دعوت میں ممنوع چیزیں جیسے شراب وغیرہ موجود ہو یا وہاں ناچ گانے یا غیر شرعی تفریحات کی چیزیں ہوں یا جس جگہ دعوت ہو وہاں حریر وغیرہ کا فرش بچھا ہو تو ایسی دعوت میں شریک نہ ہونا چاہئے۔ یہ بات مد نظر رہنی چاہئے کہ آجکل کی مجالس مذکورہ بالا چیزوں سے خالی نہیں تیں اگر سب چیزیں نہیں ہوتیں تو ان میں بعض چیزیں اکثر مجلسوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے صوفیاء کا قول ہے کہ عزلت (گوشہ نشینی) حلال ہوگئی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ آجکل گوشہ نشینی واجب ہوگی ہے۔ لہٰذا جو شخص احتیاط کے پیش نظر گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہے اور کسی بھی مجلس یا دعوت میں شریک ہونا مناسب نہ سمجھتا ہو تو اس کے لئے گوشہ نشینی ہی بہتر ہے۔

(۸) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ إِلٰى طَعَامٍ فَلْيُجِبْ فَإِنْ شَاءَ طَعِمَ وَإِنْ شَاءَ تَرَكَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کو (شادی بیاہ اسی قسم کی کسی اور تقریب کے) کھلانے پر بلایا جائے تو اسے چاہئے کہ وہ دعوت قبول کرلے (یعنی دعوت میں چلا جائے) پھر (وہاں جا کر اس کی مرضی پر موقوف ہو گا کہ) چاہے تو کھائے چاہے تو نہ کھاؤ۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے بھی یہ معلوم ہوا کہ دعوت قبول کرنے کا مطلب داعی کے یہاں جانا ہے اور یہ واجب یا سُنت ہے ہاں دعوت کے کھانے میں شریک ہونا سُنت ہے بشرطیکہ روزہ سے نہ ہو۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ ارشاد گرامی میں دعوت کو قبول کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بطریق وجوب ہے لیکن اس کا تعلق اس شخص سے ہے جس کو کوئی عذر لاحق نہ ہو، اگر کوئی شخص معذور ہو مثلاً دعوت کی جگہ اتنی دور ہے کہ وہاں جانا تکلیف و مشقت برداشت کرنے کا مرادف ہے تو اس صورت میں اس دعوت کو قبول نہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ولیمہ میں صرف مالداروں کو بلانا انتہائی برا ہے

(۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُدْعٰى لَهَا الْاَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ وَمَنْ تَرَكَ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "برا کھانا اس ولیمہ کا کھانا ہے جس میں مالداروں کو بلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے اور جس شخص نے دعوت کو (کوئی عذر نہ ہونے کے باوجود) قبول نہ کیا تو اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔" (بخاریؒ)

تشریح: "شر الطعام" یعنی برے کھانے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اور بہت سے برے کھانے ہیں اس میں سے ایک یہ بھی ہے یہ اس لئے کہا گیا ہے۔ کہ بعض کھانے اس سے بھی برے ہوتے ہیں چنانچہ جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ شَرُّ النَّاسِ مَنْ اَکَلَ وَحْدَہٗ (یعنی برا شخص وہ ہے جس نے تنہا کھانا کھایا) وہاں بھی یہ مراد ہے کہ جہاں اور بہت سے برے شخص ہیں ان میں سے ایک برا شخص وہ بھی ہے جو تنہا کھانا کھاتا ہے۔

اس حدیث کا مقصد مطلقاً ولیمہ کے کھانے کی برائی بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ نہ صرف دعوت ولیمہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ اس دعوت کو قبول کرنے کی تاکید بھی فرمائی گئی ہے اور جو شخص دعوت ولیمہ کو قبول نہیں کرتا وہ گنہگار ہوتا ہے لہٰذا حدیث کی مراد یہ ہے کہ جو ولیمہ ایسا ہو کہ اس میں صرف مالداروں کو بلایا جائے اور غربا کو نہ پوچھا جائے تو وہ ایک برا ولیمہ ہے۔ چنانچہ اس وقت کچھ لوگوں کی یہ عادت تھی، کہ وہ اپنے ولیمہ میں صرف مالداروں کو بلاتے ہیں اور انہیں اچھا اچھا کھانا کھلاتے اور بیچارے غریبوں کی بات بھی نہ پوچھتے تھے لہٰذا آپ ﷺ نے گویا اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اس بری عادت سے منع فرمایا۔

دعوت قبول نہ کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اس طرح ہوتی ہے کہ اللہ کے رسول نے دعوت قبول کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا جس نے دعوت قبول نہ کر کے اللہ کے رسول کے حکم کی نافرمانی کی اس نے گویا اللہ ہی کے حکم کی نافرمانی کی۔ جو حضرات دعوت کے قبول کرنے کو واجب کہتے ہیں انہوں نے اس حدیث کو اپنے قول کی دلیل قرار دیا ہے جب کہ جمہور علماء نے اس حدیث کو تاکیداً استحباب پر محمول کیا ہے۔

غیر مدعو کو کھانا کھلانا، میزبان کی اجازت پر موقوف ہے

⑮ وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ کَانَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ یُکْنٰی اَبَا شُعَیْبٍ کَانَ لَہٗ غُلَامٌ لَحَّامٌ فَقَالَ اِصْنَعْ لِیْ طَعَامًا یَکْفِیْ خَمْسَۃً لَعَلِّیْ اَدْعُو النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَامِسَ خَمْسَۃٍ فَصَنَعَ لَہٗ طُعَیْمًا ثُمَّ اَتَاہُ فَدَعَاہُ فَتَبِعَھُمْ رَجُلٌ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا اَبَا شُعَیْبٍ اِنَّ رَجُلًا تَبِعَنَا فَاِنْ شِئْتَ اَذِنْتَ لَہٗ وَاِنْ شِئْتَ تَرَکْتَہٗ قَالَ لَا بَلْ اَذِنْتُ لَہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو مسعودؓ انصاری کہتے ہیں کہ ایک انصاری صحابیؓ کے ہاں جن کی کنیت ابوشعیبؓ تھی ایک غلام تھا جو گوشت بیچا کرتا تھا (ایک دن) ان انصاری صحابہؓ (یعنی ابوشعیب) نے اپنے اس غلام سے کہا کہ میری ہدایت کے مطابق اتنا کھانا تیار کرو جو پانچ آدمیوں کے لئے کافی ہو کیونکہ میں رسول کریم ﷺ کی دعوت کروں گا اور آپ ﷺ پانچ آدمیوں میں سے ایک ہوں گے (یعنی ایک آنحضرت ﷺ ہونگے اور چار آدمی آپ ﷺ کے ساتھ ہوں گے) چنانچہ اس غلام نے ان کی ہدایت کے مطابق آنحضرت ﷺ کے لئے تھوڑا سا کھانا تیار کر لیا پھر وہ (ابوشعیبؓ) آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو (اور آپ ﷺ کے چار صحابہؓ کو) اس کھانے پر مدعو کیا۔ (جب آنحضرت ﷺ ان کے گھر تشریف لے چلے تو) ایک شخص آپ ﷺ کے ساتھ ہو لیا آپ ﷺ نے (ان کے گھر پہنچ کر) فرمایا کہ "ابوشعیب! ایک اور شخص ہمارے ساتھ ہو لیا ہے اگر تم چاہو تو اس کو بھی (کھانے پر) آنے کی اجازت دے دو ورنہ اس کو (دروازہ ہی پر) چھوڑ دو (اور دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت نہ دو) ابوشعیبؓ نے کہا کہ "نہیں (اس کو دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت نہ دینا میں مناسب نہیں سمجھتا) بلکہ میں اس کو بھی اجازت دیتا ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کسی بھی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کی دعوت میں بن بلائے پہنچ جائے اور اسی طرح کسی مہمان کے لئے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بن بلائے شخص کو اپنے ساتھ دعوت میں لے جائے ہاں اگر میزبان نے اس بات کی صریح اجازت دی ہو یا کوئی ایسی دعوت ہو جہاں اذن عام ہو یا مہمان یہ جانتا ہو کہ اگر میں کسی بن بلائے مہمان شخص کو اپنے ساتھ دعوت میں لے گیا تو میزبان کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگا۔ تو ان صورتوں میں مدعو کسی غیر مدعو کو اپنے ساتھ دعوت میں لے جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس حدیث سے اور بھی کئی باتیں معلوم ہوئی۔ اول یہ کہ صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں ہے دوم یہ کہ اگر کوئی شخص چند مخصوص آدمیوں کی دعوت کرے اور ان کے ساتھ کوئی بن بلایا شخص بھی ہو لے تو ان مہمانوں کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ صاحب خانہ یعنی میزبان سے اس شخص کے لئے کھانے میں شریک ہونے کی اجازت لے لیں، سوم یہ کہ بن بلائے مہمان کے بارہ میں میزبان کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ اس کو دستر خوان پر بیٹھنے سے نہ روکے الا یہ کہ اس کی وجہ سے مہمانوں کو کوئی نقصان یا تکلیف پہنچنے کا خوف ہو، اور اگر اس کو کھانے میں شریک کئے بغیر واپس کرے تو نرمی کے ساتھ واپس کرے لیکن بہتر یہی ہے کہ اس کو کھانے میں سے کچھ دے دے بشرطیکہ وہ اس کا مستحق ہو۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کسی غیر مدعو کو دعوت کے کھانے میں شریک ہونا جائز نہیں ہے اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ جب ایک شخص نے کسی کی دعوت کی اور اس کے سامنے کھانا رکھ کر اس کو اس کھانے کا مالک بنا دیا تو اب وہ شخص (یعنی مہمان) مختار ہے کہ چاہے تو اس کھانے کو خود کھائے چاہے کسی اور کو کھلائے اور چاہے اٹھا کر اپنے گھر لے جائے ہاں اگر یہ صورت ہو کہ میزبان دستر خوان بچھا کر اس پر کھانا چن دے جو اس بات کی علامت ہو کہ اس نے مہمان کو اس کھانے کا مالک نہیں بنایا ہے بلکہ اسے اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ یہیں بیٹھ کر کھائے اور جو کچھ بچ جائے اسے میزبان اٹھا کر لے جائے تو اب مہمان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ دستر خوان پر بیٹھ کر حسب قاعدہ اور حسب رواج کھانا کھائے نہ تو اس کھانے میں سے کچھ اٹھا کر اپنے گھر لے جائے اور نہ اس میں سے کسی اور کو کھلائے۔

بعض اہل علم نے اس چیز کو بہت اچھا جانا ہے کہ جب ایک دستر خوان پر کچھ لوگ کھانا کھانے بیٹھیں تو دستر خوان پر موجود کھانے کی چیزیں آپس میں ایک دوسرے کے سامنے کرتے رہیں ہاں اگر وہ لوگ دو دستر خوانوں پر بیٹھے ہوں تو ایک دستر خوان کے لوگوں کو دوسرے دستر خوان کے لوگوں کے سامنے اپنے دستر خوان کے کھانے پیش کرنا جائز نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

حضرت صفیہؓ کا ولیمہ

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْلَمَ عَلٰى صَفِيَّةَ بِسَوِيْقٍ وَّتَمْرٍ۔ (رواہ احمد و الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کا ولیمہ ستو اور کھجور کے ساتھ کیا تھا۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حضرت صفیہؓ کے ولیمہ کے سلسلہ میں جو حدیث پہلے گزری ہے اس میں ان کے ولیمہ کا کھانا حیس ذکر کیا گیا تھا جب کہ یہاں ستو اور کھجور کا ذکر ہے۔ ان دونوں روایتوں میں اس طرح مطابقت ہوگی کہ حضرت صفیہؓ کے ولیمہ میں دونوں چیزیں تھیں حیس بھی تھا اور ستو اور کھجوریں بھی تھیں راویوں میں سے جس نے جو دیکھا اسی کو بیان کر دیا۔

دنیاوی زیب و زینت کی چیزوں سے آنحضرت ﷺ کا اجتناب

(۱۲) وَعَنْ سَفِيْنَةَ اَنَّ رَجُلًا ضَافَ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ فَصَنَعَ لَهٗ طَعَامًا فَقَالَتْ فَاطِمَةُ لَوْ دَعَوْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَكَلَ مَعَنَا فَدَعَوْهُ فَجَاءَ فَوَضَعَ يَدَيْهِ عَلٰى عِضَادَتَيِ الْبَابِ فَرَأَى الْقِرَامَ قَدْ ضُرِبَ فِيْ نَاحِيَةِ الْبَيْتِ فَرَجَعَ قَالَتْ فَاطِمَةُ فَتَبِعْتُهُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ مَا رَدَّكَ قَالَ اِنَّهُ لَيْسَ لِيْ اَوْلِنَبِيِّ اَنْ يَّدْخُلَ بَيْتًا مُزَوَّقًا۔ (رواہ احمد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت سفینہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے ہاں ایک مہمان آیا تو حضرت علیؓ نے اس کے لئے کھانا تیار کرایا! حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ اگر ہم رسول کریم ﷺ کو بھی مدعو کرلیں اور آپ ﷺ ہمارے ساتھ کھانا کھالیں تو بڑا اچھا ہو، چنانچہ آپ ﷺ کو بلایا گیا جب آپ ﷺ تشریف لائے اور (مکان میں داخل ہونے کے لئے جیسے ہی) دروازے کے دونوں بازوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے آپ ﷺ کی نظر اس پردہ پر گئی جو گھر کے ایک کونے پر پڑا ہوا تھا آپ ﷺ (اس پردہ کو دیکھتے ہیں) واپس ہوگئے حضرت فاطمہؓ کہتی ہیں کہ میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے گئی اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ) آپ واپس کیوں ہوگئے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "مجھ کو یا کسی بھی نبی کو زینت والے گھر میں داخل ہونا مناسب نہیں ہے۔" (احمدؒ، ابن ماجہ)

تشریح: قرام باریک اور منقش پردہ کو کہتے ہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کے گھر کے گوشہ میں جو پردہ پڑا ہوا تھا وہ منقش نہیں تھا لیکن اس پردہ سے دیوار کو اس طرح ڈھکا گیا تھا، جیسے دلہا دلہن کے چھپر کٹ کو پردوں سے سجاتے اور ڈھکتے ہیں اور یہ چونکہ دنیاداروں اور اپنی وجاہت و مالداری کا بے جا اظہار کرنے والوں کا طریقہ ہے اس لئے آپ ﷺ اس پردہ کو دیکھتے ہی واپس ہوگئے اور اسی طرح آپ ﷺ نے گویا یہ تنبیہ فرمائی کہ دیواروں کو اس طرح پردوں سے سجانا اور ڈھکنا مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ دنیا کی بیجا زیب و زینت ہے جو آخرت کے لئے نقصان دہ بھی ہوسکتی ہے۔

کسی دعوت میں بغیر بلائے پہنچ جانے والے کی مذمت

(۱۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ دُعِيَ فَلَمْ يُجِبْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَمَنْ دَخَلَ عَلٰى غَيْرِ دَعْوَةٍ دَخَلَ سَارِقًا وَخَرَجَ مُغِيْرًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو کھانے پر بلایا جائے اور وہ دعوت قبول نہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے والا ہوگا اور جو شخص بغیر بلائے کسی کے ہاں کھانے کی مجلس میں چلا جائے تو وہ چوروں کی طرح آیا اور مال لوٹ کر نکل گیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: کسی دعوت میں بغیر بلائے پہنچ جانے والے کو چور کے ساتھ اس وجہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح کوئی چور چھپ کر کسی کے گھر میں داخل ہوتا ہے اسی طرح "بن بلایا مہمان" بھی صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر اس کے کھانے کی مجلس میں گویا چور کی طرح چپکے سے آتا ہے لہٰذا جس طرح چور کسی کے گھر میں گھسنے کی وجہ سے گنہ گار ہوتا ہے اسی طرح "بن بلایا مہمان" بھی اپنے اس غیر اخلاقی اور قبیح فعل کی وجہ سے گنہ گار ہوتا ہے گویا آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اپنی امت کے لوگوں کو اخلاق زندگی کے دو بنیادی سبق دیئے ہیں جو ایک انسان کی معاشرتی برائی اور انسانی وقار کے ضامن ہیں اول تو یہ کسی کی دعوت کو بلا عذر کے قبول نہ کرنا نفس کے تکبر و رعونت اور عدم الفت پر دلالت کرتا ہے دوم یہ کہ بغیر دعوت کے کسی کے ہاں پہنچ جانا نفس کے حرص و لالچ اور اپنی عزت اپنے ہاتھوں خراب کرنے پر دلالت کرتا ہے۔

اگر دو آدمی بیک وقت دعوت کریں تو ان میں سے کس کی دعوت قبول کی جائے

(۱۴) وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اجْتَمَعَ الدَّاعِيَانِ فَاَجِبْ اَقْرَبَهُمَا بَابًا وَاِنْ سَبَقَ اَحَدُهُمَا فَاَجِبِ الَّذِيْ سَبَقَ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے ایک شخص سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر بیک وقت دو شخص دعوت کریں تو ان میں سے اس شخص کی دعوت قبول کرو جس کا دروازہ زیادہ قریب ہو اور اگر ان میں سے ایک نے پہلے مدعو کیا (اور دوسرے نے اس کے بعد دعوت دی) تو (اس صورت میں) اس شخص کی دعوت قبول کی جائے جس نے پہلے مدعو کیا۔" (احمدؒ، ابوداؤد)

تشریح: بظاہر یہ حکم (اس صورت سے متعلق ہے جب کہ ایک ہی وقت ہونے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے دونوں کی دعوت میں شریک ہونا ممکن نہ ہو، ہاں اگر دونوں کی دعوت میں شریک ہونا ممکن ہو تو پھر یہی حکم ہوگا کہ دونوں کی دعوت میں شرکت کی جائے نیز یہ حکم دو ہمسایوں کی دعوت کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ایک ہی وقت میں پڑوس کے دو آدمی دعوت کریں تو اس پڑوسی کی دعوت کو ترجیح حاصل ہوگی جس کا دروازہ زیادہ قریب ہو اور اگر ہمسایوں کے علاوہ شہر آبادی کے دوسرے دو آدمی بیک وقت مدعو کریں تو اس صورت میں دوسری وجوہ مثلاً معرفت، اصلاح اور حقوق کے پیش نظر ترجیح دی جائے گی۔ یعنی ان دونوں میں سے اس شخص کی دعوت کو ترجیح حاصل ہوگی جو دوسرے سے زیادہ قریبی جان پہچان کا ہو یا وہ دوسرے سے زیادہ نیک بخت وصالح ہو۔ اور یا حقوق کے اعتبار سے وہ دوسرے سے زیادہ قریب ہو۔

اس حدیث سے ایک نکتہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی استاد کے پاس اس کے دو شاگرد بیک وقت سبق پڑھنے آئیں یا کسی عالم کے پاس ایک ہی وقت میں دو آدمی مسئلہ پوچھنے آئیں تو پہلے اس کو سبق پڑھایا جائے یا مسئلہ بتایا جائے جو پہلے آیا ہے۔

نام و نمود کے لئے زیادہ دنوں تک ولیمہ کھلانے والے کے بارے میں وعید

⑮ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامُ اَوَّلِ يَوْمٍ حَقٌّ وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّانِيْ سُنَّةٌ وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّالِثِ سُمْعَةٌ وَمَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "پہلے دن (شادی کا) کھانا کھلانا حق ہے، دوسرے دن کا کھانا سنت ہے اور تیسرے دن کا کھانا (اپنے آپ کو) سنانا ہے اور جو اپنے آپ کو سنانے کا خواہشمند ہوگا اللہ تعالیٰ اسے سنائے گا۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ شادی بیاہ میں پہلے دن لوگوں کو کھانے پر بلانا اور لوگوں کا اس دعوت کو قبول کرنا سنت موکدہ ہے (اور جن علماء نے ولیمہ کی دعوت کو واجب کہا ہے۔ ان کے نزدیک "حق" سے مراد "واجب" ہے اور دوسرے دن کو مدعو کرنا مسنون و مستحب ہو دو دن کے بعد جب تیسرے دن بھی کوئی مدعو کرے تو سمجھنا چاہئے کہ اب اس کی دعوت میں نام و نمود کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے یعنی اس نے تیسرے دن لوگوں کو کھانے پر اس لئے بلایا ہے تاکہ شہرت ہو جائے اور لوگ اس کی تعریف کریں اس کے بارہ میں یہ تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ جو شخص اپنے نام و نمود کے تحت تیسرے دن بھی لوگوں کو کھانے پر بلائے گا اور خواہش مند ہوگا کہ اس کی سخاوت کی تعریف کریں تاکہ وہ اظہار فخر کر سکے، تو ایسے شخص کو جان لینا چاہئے کہ میدان حشر میں اللہ تعالیٰ اس کے بارہ میں یہ اعلان کرائے گا کہ دیکھو یہ شخص جھوٹا اور مفتری ہے جس نے محض دکھانے سنانے کے لئے لوگوں کو کھانا کھلایا تھا چنانچہ وہ شخص تمام مخلوق خدا کے سامنے سخت رسوا اور ذلیل ہوگا۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ جس بندہ کو اللہ تعالیٰ کوئی نعمت عطا کرے (مثلاً اس کا نکاح ہو جائے) تو اس پر لازم ہے کہ وہ شکر ادا کرے (اور شکر یہ ہے کہ دعوت ولیمہ میں لوگوں کو بلا کر کھانا کھلائے اور یہ (یعنی شکر ادا کرنا مثلاً دعوت کرنا پہلے دن تو ضروری ہے اور) دوسرے دن مستحب ہے تاکہ پہلے دن اگر کوتاہی ہوگئی ہو تو دوسرے دن ان کی تلافی ہو جائے اس لئے کہ سنت واجب کو مکمل کر دیتی ہے اور تیسرے دن (دعوت کرنا) بس دکھانے سنانے کے لئے ہے (یعنی تیسرے دن دعوت کرنے کا نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ نام و نمود کی وجہ سے آخرت کا نقصان ہی ہوتا ہے) اسی طرح جن لوگوں کی دعوت کی جائے ان کے بارہ میں یہ مسئلہ ہے کہ پہلے دن کی دعوت قبول کرنا ان کے لئے واجب ہے، دوسرے دن کی دعوت قبول کرنا مستحب ہے اور تیسرے دن کی دعوت قبول کرنا مکروہ بلکہ حرام ہے۔

اس حدیث سے مالکیہ کے اس مسلک کی صریح تردید ہوتی ہے کہ سات دن تک ولیمہ کی دعوت کرتے رہنا مستحب ہے۔

اظہار فخر میں مقابلہ کرنے والے دونوں آدمیوں کی دعوت کھانا ممنوع ہے

(۱۶) وَعَنْ عِكْرَمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِيَيْنِ اَنْ يُؤْكَلَ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ مُحْيِ السُّنَّةِ وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ عَنْ عِكْرَمَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرْسَلاً۔

"اور حضرت عکرمہؒ حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں آدمیوں کا کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے جو آپس میں فخر کا مقابلہ کریں۔" (ابوداؤد) اور محی السنۃ نے کہا ہے کہ صحیح الفاظ یہ ہیں "حضرت عکرمہؓ نبی کریم ﷺ سے بطریق ارسال نقل کرتے ہیں" (یعنی روایت کی سند میں عن ابن عباسؓ کے الفاظ مذکور نہیں ہیں بلکہ یہ یہاں زیادہ نقل کئے گئے ہیں)۔"

تشریح: متبارِیین ان دو شخصوں کو کہتے ہیں جو زیادہ کھانا پکانے کا آپس میں مقابلہ کریں اور ان میں سے ہر ایک کی یہی کوشش ہو کہ وہ دوسرے کی ضد میں زیادہ سے زیادہ کھانا پکوائے اور زیادہ لوگوں کی دعوت کرے تاکہ وہ برتر اور دوسرا کمتر رہے گویا اس مقابلہ سے دونوں ہی کا مقصد اظہار فخر اور محض نام و نمود ہو۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں حکم دیا گیا ہے کہ ان کی دعوت نہ قبول کی جائے اور نہ ان کے کھانے میں شرکت کی جائے۔

آجکل تو اس سلسلہ میں احتیاط نہیں برتی جاتی لیکن پہلے زمانہ کے بزرگوں کا یہ حال تھا کہ اگر انہیں کسی شخص کی دعوت کے بارہ میں یہ شبہ بھی ہو جاتا تھا کہ اس دعوت کا مقصد محض اظہار فخر اور نام و نمود ہے تو وہ اس دعوت میں شرکت کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُتَبَارِيَانِ لَا يُجَابَانِ وَلَا يُؤْكَلُ طَعَامُهُمَا قَالَ الْاِمَامُ اَحْمَدُ يَعْنِي الْمُتَعَارِضَيْنِ بِالضِّيَافَةِ فَخْرًا وَّرِيَاءً۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ان دو شخصوں کی دعوت قبول نہ کی جائے اور نہ ان کا کھانا کھایا جائے جو اظہار فخر کے لئے کھانا پکانے کھلانے کا آپس میں مقابلہ کریں۔" امام احمدؒ نے لفظ متباریان کی وضاحت میں کہا ہے کہ متباریان سے آنحضرت ﷺ کی مراد وہ شخص ہیں جو از راہ فخر و ریا اور بطریق مقابلہ یعنی ایک دوسرے کی ضد میں دعوت کریں۔"

فاسق کی دعوت قبول نہ کرو

(۱۸) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اِجَابَةِ طَعَامِ الْفَاسِقِيْنَ۔

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فاسق لوگوں کی دعوت قبول کرنے سے منع فرمایا ہے۔"

تشریح: "فاسق" سے مراد مطلق فاسق ہے خواہ وہ کسی طرح کے فسق میں مبتلا ہو، فاسق کی دعوت قبول کرنے کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ اکثر فاسق اپنے مزاج و کردار کے اعتبار سے ظالم بھی ہوتا ہے اور یہ مسئلہ ہے کہ ظالم جو لوگوں کا مال از راہ ظلم لیتا ہے اس کے کھانے میں شریک ہونا حرام ہے اس کے علاوہ فاسق کی دعوت قبول کرنا گویا اس فاسق کو خوش کرنا اور اس کی عزت کرنا ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔

کسی متقی کے ہاں کھانا کھانے جاؤ تو اس کے کھانے کے جائز و ناجائز ہونے کی تحقیق نہ کرو

(۱۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمْ عَلٰى اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ فَلْيَاْكُلْ مِنْ طَعَامِهٖ وَلَا يَسْاَلْ وَيَشْرَبْ مِنْ شَرَابِهٖ وَلَا يَسْاَلْ رَوَى الْاَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ هٰذَا اِنْ صَحَّ فَلِاَنَّ

الظَّاھِرَ اَنَّ الْمُسْلِمَ لَا یُطْعِمُهٗ وَلَا یَسْقِیْهِ اِلَّا مَا ھُوَ حَلَالٌ عِنْدَهٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جب تم میں سے کوئی شخص کسی مسلمان بھائی کے ہاں جائے تو اس کا کھانا کھالے اور پانی پی لے اور یہ نہ پوچھے کہ وہ کھانا اور پانی کیسا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔" ان تینوں حدیثوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ (آخری) حدیث اگر صحیح ہے تو اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو وہی چیز کھلاتا پلاتا ہے جو اس کے نزدیک حلال ہوتی ہے۔"

تشریح: "مسلمان" سے کامل یعنی متقی و پرہیزگار مسلمان مراد ہے چنانچہ اس کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے ہاں کھانا کھانے جائے تو اس کے کھانے کے جائز و ناجائز ہونے کی تحقیق نہ کرے بلکہ جو کچھ اس کے سامنے آئے بلاشک و شبہ اسے کھاپی لے کیونکہ اول تو اس کے متقی و پرہیزگار ہونے کی وجہ سے اس کے بارہ میں یہی نیک گمان رکھا جائے کہ وہ ناجائز و حرام چیز نہیں کھلائے گا دوسرے یہ کہ اگر اس کے کھانے کے جائز و ناجائز کی تحقیق کی جائے گی تو اسے تکلیف پہنچے گی جو مناسب نہیں ہے۔ ہاں اگر یہ یقین ہو کہ جو چیز کھلائی پلائی جارہی ہے اس کا کوئی جز حرام ذریعہ سے آیا ہوا ہے یا اس کھانے کا اکثر حصہ حرام ہے تو پھر اس کو نہ کھائے پیئے۔

بَابُ الْقَسْمِ

باری مقرر کرنے کا بیان

اگر کسی شخص کے ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان کے ساتھ شب باشی کے لئے نوبت (باری) مقرر کرنا واجب ہے یعنی ان بیویوں کے پاس باری باری سے جانا چاہئے۔ اس سلسلہ میں چند باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

① جب باری مقرر ہو جائے تو ایک بیوی کی باری میں دوسری بیوی کے ہاں شب باشی جائز نہیں ہے مثلاً جس رات میں پہلی بیوی کے ہاں جانا ہو اس رات میں دوسری بیوی کے ہاں نہ جائے۔

② ایک رات میں بیک وقت دو بیویوں کے ساتھ شب باشی جائز نہیں ہے اگر وہ دونوں بیویاں اس کی اجازت دے دیں اور وہ خود بھی اس کے لئے تیار ہوں تو جائز ہے آنحضرت ﷺ کے بارہ میں جو یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ایک رات میں ایک سے زائد بیویوں سے جماع کیا ہے تو یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کے باری مقرر کرنا واجب نہیں تھا یا یہ کہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کو ان بیویوں کی اجازت حاصل تھی اس کے علاوہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ باری مقرر کرنا آنحضرت ﷺ پر واجب نہیں تھا۔ بلکہ آپ ﷺ نے محض اپنے کرم اور اپنی عنایت سے اپنی ہر زوجہ مطہرہ کے ہاں رہنے کی باری مقرر کر دی تھی۔

③ سفر کی حالت میں بیویوں کو باری کا حق حاصل نہیں ہوتا اور نہ کسی بیوی کی باری کا لحاظ رکھنا ضروری ہے بلکہ اس کا انحصار خاوند کی مرضی پر ہے کہ وہ جس بیوی کو چاہے اپنے ساتھ سفر میں لے جائے اگرچہ بہتر اولیٰ یہی ہے کہ خاوند اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈال لے اور جس کا نام قرعہ میں نکلے اس کو سفر میں ساتھ رکھے۔

④ مقیم کے حق میں اصلی باری کا تعلق رات سے ہے! دن رات کا تابع ہے ہاں جو شخص رات میں اپنے کام کاج میں مشغول رہتا ہو مثلاً چوکیداری وغیرہ کرتا ہو اور اس کی وجہ سے وہ رات اپنے گھر میں بسر نہ کر سکتا ہو تو اس کے حق میں اصل باری کا تعلق دن سے ہوگا۔

در مختار میں یہ لکھا ہے کہ جس شخص کے ایک سے زائد بیویاں ہوں تو اس پر ان بیویوں کے پاس رات میں رہنے اور ان کے کھلانے پلانے میں برابری کرنا واجب ہے ان کے ساتھ جماع کرنے یا جماع نہ کرنے اور پیار و محبت میں برابری کرنا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔

کسی عورت کا جماع سے متعلق اس کے شوہر پر حق ہوتا ہے وہ ایک بار جماع کرنے سے ساقط ہو جاتا ہے جماع کرنے کے بارہ میں

شوہر خود مختار ہے کہ جب چاہے کرے لیکن کبھی کبھی جماع کر لینا اس پر دیانۃً واجب ہے اور مدت ایلاء کے بقدر (یعنی چار چار مہینہ تک) جماع نہ کرنا خاوند کے لئے مناسب نہیں ہے ہاں اگر بیوی کی مرضی سے اتنے دنوں جماع نہ کرے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں ہے، ہر بیوی کے ہاں ایک ایک رات اور ایک ایک دن رہنا چاہئے۔ لیکن برابری کرنا رات ہی میں ضروری ہے چنانچہ اگر کوئی شخص ایک بیوی کے ہاں مغرب کے فوراً بعد چلا گیا اور دوسری بیوی کے ہاں عشاء کے بعد گیا تو اس کا یہ فعل برابری کے منافی ہوگا اور اس کے بارہ میں کہا جائے گا۔ اس نے باری کے حکم کو ترک کیا کسی بیوی سے اس کی باری کے علاوہ (یعنی کسی دوسری بیوی کی باری میں) جماع نہ کرے اسی طرح کسی بیوی کے پاس اس کی باری کے علاوہ کسی رات میں نہ جائے ہاں اگر وہ بیوی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے لئے جا سکتا ہے بلکہ اگر اس کا مرض شدید ہو تو اس کی باری کے علاوہ بھی اس کے پاس اس وقت تک رہنا جائز ہے جب تک کہ وہ شفایاب ہو یا اس کا انتقال ہو جائے لیکن یہ اس صورت میں جائز ہے جب کہ اس کے پاس کوئی اور تیمار دار اور غم خوار نہ ہو اور اگر خاوند اپنے گھر میں بیماری کی حالت میں ہو تو وہ اپنی ہر بیوی کو اس کی باری میں بلاتا رہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی تعداد

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُبِضَ عَنْ تِسْعِ نِسْوَۃٍ وَکَانَ یَقْسِمُ مِنْھُنَّ لِثَمَانٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت رسول کریم ﷺ نے وفات پائی اس وقت آپ ﷺ کے نکاح میں نو بیویاں تھیں جن میں سے آٹھ بیویوں کی باری مقرر تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یوں تو آنحضرت ﷺ کی گیارہ بیویاں تھیں یہاں صرف ان بیویوں کی تعداد کا ذکر کیا گیا ہے جو آپ ﷺ کی وفات کے وقت آپ ﷺ کے نکاح میں تھیں اور جن کے اسماء یہ ہیں۔

(۱) حضرت عائشہؓ۔ (۲) حضرت حفصہؓ (۳) حضرت اُمّ حبیبہؓ (۴) حضرت سودہؓ (۵) حضرت اُمّ سلمہؓ (۶) حضرت صفیہؓ (۷) حضرت میمونہؓ (۸) حضرت زینب بنت جحشؓ (۹) حضرت جویریہؓ۔

ان نو بیویوں میں سے آٹھ کی باری مقرر تھی اور نویں حضرت سودہؓ کے لئے کوئی باری نہ تھی کیونکہ انہوں نے اپنی مرضی سے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے دی تھی چنانچہ آپ ﷺ ان کی باری میں حضرت عائشہؓ کے پاس رہتے تھے جیسا کہ اگلی حدیث سے معلوم ہوگا۔

کوئی اپنی باری اپنی کسی سوکن کو دے سکتی ہے

(۲) وَعَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ سَوْدَۃَ لَمَّا کَبُرَتْ قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَدْ جَعَلْتُ یَوْمِیْ مِنْكَ لِعَائِشَۃَ فَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقْسِمُ لِعَائِشَۃَ یَوْمَیْنِ یَوْمَھَا وَیَوْمَ سَوْدَۃَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ حضرت سودہؓ کی عمر جب زیادہ ہو گئی تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں نے اپنی باری کا دن جو آپ ﷺ نے میرے لئے مقرر کیا تھا عائشہؓ کو دے دیا۔ چنانچہ اس کے بعد آپ حضرت عائشہؓ کے ہاں دو دن رہنے لگے ایک دن تو ان کی باری میں اور ایک دن حضرت سودہؓ کی باری میں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت سودہؓ کے والد کا نام زمعہ اور والدہ کا نام سموس تھا پہلے ان کی شادی حضرت سکرانؓ کے ساتھ ہوئی تھی یہ دونوں آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ابتدائی ایام میں اسلام لے آئے تھے اور ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے جب ان کے خاوند حضرت سکرانؓ کا انتقال ہو گیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد مکہ میں ان سے نکاح کیا حضرت عائشہؓ سے آپ ﷺ کا نکاح ان

کے نکاح کے بعد ہوا۔ حضرت عمرؓ یا حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ان کا انتقال ہوا اور مدینہ منورہ میں مدفون ہوئیںؓ۔
فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کی کوئی بیوی اپنی باری اپنی کسی سوکن کو دے تو جائز ہے بشرطیکہ اس میں شوہر کی طرف سے کسی لالچ یا جبر کا دخل نہ ہو نیز اپنی باری اپنی کسی سوکن کو دینے والی عورت کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ جب چاہے اپنی پیش کش کو واپس لے لے۔

③ وَعَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَسْأَلُ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ اَيْنَ اَنَا غَدًا اَيْنَ اَنَا غَدًا يُرِيْدُ يَوْمَ عَائِشَةَ فَاَذِنَ لَهُ اَزْوَاجُهُ يَكُوْنُ حَيْثُ شَاءَ فَكَانَ فِيْ بَيْتِ عَائِشَةَ حَتّٰى مَاتَ عِنْدَهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنی اس بیماری میں کہ جس میں آپ ﷺ نے وفات پائی (روزانہ) یہ پوچھا کرتے تھے کہ کل میں کہاں رہوں گا کہ کل میں کس بیوی کے گھر رہوں گا اور اس دریافت کرنے سے آپ کا منشاء یہ معلوم کرنا ہوتا تھا کہ عائشہؓ کی باری کس دن ہے (کیونکہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہؓ سے بہت زیادہ محبت تھی اس لئے آپ ﷺ ان کی باری کے شدت سے منتظر رہتے تھے) چنانچہ ازواج مطہرات نے (آپ ﷺ کے اس قلبی اضطراب کو محسوس کیا تو سب نے) یہ اجازت دے دی کہ آپ ﷺ جس کے ہاں چاہیں رہیں پھر آپ ﷺ حضرت عائشہؓ ہی کے ہاں مقیم رہے یہاں تک کہ انہیں کے پاس آپ ﷺ کی وفات ہوئی۔" (بخاریؒ)

تشریح: یرید یوم عائشة ماقبل جملہ کی وضاحت ہے یعنی آپ ﷺ کا روزانہ پوچھنا ازواج مطہرات سے طلب اجازت کے لئے تھا کہ تمام ازواج مطہرات آپ ﷺ کو حضرت عائشہؓ ہی کے ہاں رہنے کی اجازت دے دیں چنانچہ یہ جملہ فاذن له ازواجه ازواج مطہرات نے آپ ﷺ کو اجازت دے دی اسی بات پر دلالت کرتا ہے۔

سفر میں ساتھ لے جانے کے لئے کسی بیوی کا انتخاب قرعہ کے ذریعہ کیا جائے

④ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ سَفَرًا اَقْرَعَ بَيْنَ نِسَائِهِ فَاَيَّتُهُنَّ خَرَجَ سَهْمُهَا خَرَجَ بِهَا مَعَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے، ان میں سے جس کا نام قرعہ میں نکلتا اسی کو آپ ﷺ اپنے ساتھ سفر میں لے جاتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

⑤ وَعَنْ اَبِيْ قِلَابَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ مِنَ السُّنَّةِ اِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْبِكْرَ عَلَى الثَّيِّبِ اَقَامَ عِنْدَهَا سَبْعًا وَقَسَمَ، وَاِذَا تَزَوَّجَ الثَّيِّبَ اَقَامَ عِنْدَهَا ثَلَاثًا ثُمَّ قَسَمَ قَالَ اَبُوْقِلَابَةَ وَلَوْشِئْتُ لَقُلْتُ اِنَّ اَنَسًا رَفَعَهُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقلابہ (تابعیؒ) حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔ یہ مسنون ہے کہ جب کوئی شخص ثیبہ کی موجودگی میں کسی باکرہ سے نکاح کرے تو سات رات تک اس کے پاس رہے اور پھر اس میں اور پرانی بیویوں کے درمیان) باری مقرر کر دے اور کسی ثیب (یعنی کسی بیوہ یا مطلقہ عورت سے نکاح کرے تو اس کے پاس تین رات رہے اور پھر باری مقرر کر دے۔ حضرت ابوقلابہؒ کہتے ہیں کہ اگر میں چاہتا تو یہ کہتا کہ حضرت انسؓ نے یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے نقل کی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ نے اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کسی شخص کے نکاح میں کئی عورتیں ہوں یا ایک عورت ہو اور پھر وہ ایک عورت سے نکاح کرے تو اگر وہ عورت باکرہ (کنواری) ہو تو اس کے پاس سات رات تک رہے اور اگر وہ ثیبہ (یعنی بیوہ یا مطلقہ ہو) تو اس کے پاس تین رات تک رہے اور پھر نئی اور پرانی بیویوں کے درمیان باری مقرر کر دے کہ ہر ایک کے پاس برابر برابر ایک ایک رات جایا کرے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس سلسلہ میں باکرہ اور ثیبہ یائی اور پرانی کے درمیان کوئی فرق

نہیں ہے۔ باری کے اعتبار سے سب برابر ہیں انہوں نے ان دونوں حدیثوں پر عمل کیا ہے۔ جو اس باب کی دوسری فصل میں آئیں گی اور جن میں اس قسم کا فرق و امتیاز بیان نہیں کیا گیا ہے، امام اعظمؒ کے نزدیک اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی ایک یا ایک سے زائد بیویوں کی موجودگی میں کسی باکرہ سے نکاح کرے تو اس کے پاس سات رات تک رہے اور پھر پہلی بیویوں میں سے بھی ہر ایک کے پاس سات سات رات تک رہے اور اگر ثیبہ کے ساتھ نکاح کرے تو اس کے پاس تین رات تک رہے اور پھر پہلی بیویوں سے بھی ہر ایک کے پاس تین تین رات تک رہے۔

روایت کے آخر میں ابوقلابہؓ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں چاہتا تو اس حدیث کو مرفوع کہتا یعنی یہ کہتا کہ اس حدیث کو حضرت انسؓ نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے کیونکہ صحابہؓ کا یہ کہنا کہ "یہ مسنون ہے مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔

⑥ وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حِیْنَ تَزَوَّجَ اُمَّ سَلَمَةَ وَاَصْبَحَتْ عِنْدَهٗ قَالَ لَهَا لَیْسَ بِكِ عَلٰی اَهْلِكِ هُوَانٌ اِنْ شِئْتِ سَبَّعْتُ عِنْدَكِ وَسَبَّعْتُ عِنْدَهُنَّ وَاِنْ شِئْتِ ثَلَّثْتُ عِنْدَكِ وَدُرْتُ قَالَتْ ثَلِّثْ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَنَّهٗ قَالَ لَهَا لِلْبِکْرِ سَبْعٌ وَّلِلثَّیِّبِ ثَلَاثٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جب حضرت اُمّ سلمہؓ سے نکاح کیا تو دوسرے دن صبح کو ان سے فرمایا کہ تمہارے خاندان والوں کے لئے تمہاری طرف سے اس میں کوئی ذلت نہیں کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے پاس سات رات رہوں اور پھر دوسری تمام بیویوں کے پاس بھی سات سات رات تک رہوں اور اگر تم چاہو تو تمہارے پاس تین رات تک رہوں اور پھر اس کے بعد دورہ کروں (یعنی تمام بیویوں کے پاس بھی تین تین رات تک رہوں) حضرت اُمّ سلمہؓ نے (یہ سن کر) کہا کہ "آپ (ﷺ) میرے پاس تین راتیں رہیے۔" ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت اُمّ سلمہؓ سے فرمایا کہ "کنواری کے پاس سات رات تک رہنا چاہئے اور ثیبہ کے پاس تین رات تک۔" (مسلم)

تشریح: "اس میں کوئی ذلت نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے پاس جو تین رات رہوں گا تو اس کی وجہ سے تمہارے خاندان و قبیلہ پر کسی حقارت یا ذلت کا داغ نہیں لگے گا کیونکہ تمہارے ساتھ میرا تین رات تک رہنا تمہاری صحبت و اختلاط سے بے رغبتی کے سبب سے نہیں ہے۔ بلکہ شرعی حکم کی بناء پر ہے۔ ان الفاظ کے ذریعہ گو آپ ﷺ نے اس عذر کی تمہید بیان فرمائی ہے جس کی وجہ سے شادی کی ابتداء کے ایام میں حضرت اُم سلمہؓ کے ہاں شب باشی کے لئے صرف تین راتوں پر اکتفا کرنا پڑا اور وہ عذر یہ شرعی حکم ہے کہ اگر اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں کسی اور عورت سے نکاح کیا جائے۔ تو اس نئی بیوی کے ساتھ مسلسل سات دن تک شب باشی اس صورت میں جائز ہوگی جب کہ وہ باکرہ (کنواری) ہو لیکن اس کے بعد پہلی بیویوں میں سے بھی ہر ایک کے ہاں سات سات دن تک شب باشی ہونی چاہئے۔ تاکہ باری کے اعتبار سے کسی کے ساتھ بے انصافی اور حق تلفی نہ ہو اور اگر وہ نئی بیوی ثیبہ (کسی کی بیوہ یا مطلقہ) ہو تو پھر اس کے ساتھ تین دن تک شب باشی کی جائے لیکن اس کے بعد پہلی بیویوں میں سے بھی ہر ایک کے ساتھ تین تین دن تک شب باشی کی جائے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت اُمّ سلمہؓ کے سامنے اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے یہاں بھی سات راتوں تک رہ سکتا ہوں۔ لیکن یہ حق کنواری عورت کے لئے ہے اور تم ثیبہ ہو اور پھر یہ کہ بعد میں مجھے دوسری تمام بیویوں کے پاس بھی سات سات راتوں تک رہنا ہوگا اس لئے بہتر یہ ہے کہ ثیبہ کے حق میں جو حکم ہے اسی کے مطابق میں تمہارے پاس تین دن تک شب باشی کروں اور پھر بعد میں ہر ایک بیوی کے ہاں تین تین دن تک شب باشی کر کے تمہارے سب کے درمیان باری مقرر کر دوں لہٰذا حضرت اُمّ سلمہؓ نے منشاء شریعت اور مزاج نبوت کے مطابق اسی بات کو قبول کیا کہ آپ ﷺ کے ہاں تین رات تک رہیں۔

کوئی شخص اپنی تمام بیویوں سے یکساں محبت کرنے پر مجبور نہیں ہے۔

⑦ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقْسِمُ بَیْنَ نِسَائِهٖ فَیَعْدِلُ وَیَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنی بیویوں کے درمیان باری مقرر فرماتے اور عدل سے کام لیتے (یعنی ان کے پاس رات رہنے کے سلسلہ میں برابری کا خیال رکھتے) اور پھر اس احتیاط و عدل کے باوجود) یہ دعا مانگا کرتے کہ "اے اللہ! جس چیز کا میں مالک ہوں اس میں باری مقرر کردی ہے لہٰذا جس کا تو مالک ہے میں مالک نہیں ہوں اس پر مجھے ملامت نہ کیجئے۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: دعا کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیویوں کے پاس جانے کی باری مقرر کرنے اور ان کے نان نفقہ کا میں مالک ہوں لہٰذا ان چیزوں میں عدل و برابری کرنا میری ذمہ داری ہے جسے میں پورا کرتا ہوں اور کسی بھی بیوی کے ساتھ ناانصافی یا اس کی حق تلفی نہیں کرتا ہاں پیار و محبت کا معاملہ دل سے متعلق ہے جس پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے، میں اس میں برابری نہیں کر سکتا اس لئے اگر مجھے کسی بیوی سے زیادہ محبت اور کسی سے کم محبت ہو تو چونکہ میرے قصد و ارادہ کو دخل نہیں ہوگا لہٰذا اس پر مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے ایک سے زائد بیویاں ہوں تو اس پر یہ لازم ہوگا کہ وہ ان بیویوں کے پاس جائے، ان کے ہاں شب گزارے اور ان کے نان و نفقہ میں پورا پورا عدل کرے اور ان چیزوں میں ان کے درمیان اس طرح برابری کرے کہ کسی بھی بیوی کو فرق و امتیاز کی شکایت نہ ہو ہاں پیار و محبت مباشرت و جماع اور جنسی لطف حاصل کرنے کے بارہ میں عدل و برابری لازم نہیں ہوگی کیونکہ یہ چیزیں دل و طبیعت سے متعلق ہیں جس پر کسی انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔

اپنی بیویوں کے درمیان عدل و برابری نہ کرنے والے کے بارہ میں وعید

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَانَتْ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ فَلَمْ یَعْدِلْ بَیْنَهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَشِقُّهٗ سَاقِطٌ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص کے نکاح میں (ایک سے زائد مثلاً) دو بیویاں ہوں اور وہ ان دونوں کے درمیان عدل و برابری نہ کرتا ہو تو وہ قیامت کے دن (میدان حشر میں) اس طرح آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ ساقط ہوگا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، الدارمیؒ)

تشریح: جس شخص کے ہاں ایک سے زائد بیویاں ہوں خواہ دو ہوں اور خواہ تین یا چار ہوں اور وہ ان دونوں کے درمیان عدل و برابری نہ کرتا ہو تو اس کی اس بے انصافی پر مذکورہ بالا سزا کی دھمکی دی گئی ہے لہٰذا باری میں برابری کرنا بایں اعتبار سے واجب ہے کہ رات جتنا حصہ ایک بیوی کے ہاں گزارتا ہو اتنا ہی حصہ دوسری بیوی کے ہاں بھی گزارنا چاہئے مثلاً اگر ایک بیوی کے ہاں مغرب کے بعد چلا جاتا ہے تو دوسری بیوی کے ہاں بھی مغرب کے بعد ہی چلا جائے اگر اس کے پاس عشاء کے بعد جائے گا تو یہ عدل و انصاف کے خلاف ہوگا یہاں صحبت کے معاملہ میں برابری کرنا واجب نہیں ہے۔

اس بارہ میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے۔ اس حکم میں باکرہ، ثیبہ، نئی، پرانی مسلمان اور کتابیہ سب برابر ہیں اور سب کے حقوق یکساں ہیں البتہ آزاد عورت کی بہ نسبت لونڈی، مکاتبہ، مدبرہ اور اُمّ ولد کی لئے آدھی باری ہے یعنی اگر کسی شخص کے نکاح میں ایک آزاد عورت ہو اور کسی کی لونڈی وغیرہ سے بھی اس نے نکاح کر رکھا ہو تو لونڈی وغیرہ کے پاس ایک رات رہے اور آزاد عورت کے پاس دو راتیں رہے!

حرم (باندی) کے لئے باری مقرر کرنا واجب نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ کی نو ازواج مطہرات میں سے آٹھ کے لئے باری مقرر تھی

(۹) عَنْ عَطَاءٍ قَالَ حَضَرْنَا مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ جَنَازَةَ مَيْمُوْنَةَ بِسَرِفٍ فَقَالَ هٰذِهٖ زَوْجَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا رَفَعْتُمْ نَعْشَهَا فَلَا تُزَعْزِعُوْهَا وَلَا تُزَلْزِلُوْهَا وَارْفُقُوْا بِهَا فَإِنَّهٗ كَانَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِسْعُ نِسْوَةٍ كَانَ يَقْسِمُ مِنْهُنَّ لِثَمَانٍ وَلَا يَقْسِمُ لِوَاحِدَةٍ قَالَ عَطَاءٌ الَّتِيْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْسِمُ لَهَا بَلَغَنَا أَنَّهَا صَفِيَّةُ وَكَانَتْ اٰخِرَهُنَّ مَوْتًا مَاتَتْ بِالْمَدِيْنَةِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَقَالَ رَزِيْنٌ قَالَ غَيْرُ عَطَاءٍ هِيَ سَوْدَةُ وَهُوَ أَصَحُّ وَهَبَتْ يَوْمَهَا لِعَائِشَةَ حِيْنَ أَرَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَاقَهَا فَقَالَتْ لَهٗ أَمْسِكْنِيْ قَدْ وَهَبْتُ يَوْمِيْ لِعَائِشَةَ لَعَلِّيْ أَنْ أَكُوْنَ مِنْ نِسَائِكَ فِي الْجَنَّةِ۔

"حضرت عطاء ابن رباحؒ تابعی کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابن عباسؓ کے ہمراہ مقام سرف میں اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کے جنازہ میں شریک ہوئے تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ (دیکھو) یہ رسول کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں جب تم ان کا جنازہ اٹھاؤ تو اس کو زیادہ حرکت و جنبش نہ دینا بلکہ (تعظیم و تکریم کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر) نہایت آہستگی سے اٹھانا اس لئے کہ یہ ان ازواج مطہرات میں سے ہیں جن کے لئے آنحضرت ﷺ نے باری مقرر کر رکھی تھی چنانچہ) آنحضرت ﷺ کی نو بیویاں تھیں آپ ﷺ نے ان میں سے آٹھ کے لئے باری مقرر کر رکھی تھی اور ایک کے لئے کوئی باری نہیں تھی۔" حضرت عطاءؒ کہتے ہیں کہ وہ زوجہ حضرت صفیہؓ تھیں اور رسول کریم ﷺ کی بیویوں میں حضرت صفیہؓ کا سب سے آخر میں مدینہ میں انتقال ہوا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ) اور رزینؒ کا بیان ہے کہ عطاءؒ کے علاوہ دوسرے آئمہ حدیث سے منقول ہے کہ وہ زوجہ مطہرہ جن کے لئے باری مقرر نہیں تھی (حضرت صفیہؓ نہیں تھیں بلکہ) حضرت سودہؓ تھیں اور یہی قول زیادہ صحیح ہے اور حضرت سودہؓ (کے لئے باری مقرر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں) نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہؓ کو دے دیا تھا (جس کی تفصیل یہ ہے کہ) جب رسول کریم ﷺ نے حضرت سودہؓ کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ میں اپنی باری کا دن عائشہؓ کو دے رہی ہوں آپ (ﷺ) مجھے اپنے نکاح میں رہنے دیجئے تاکہ جنت میں آپ (ﷺ) کی بیویوں میں شامل رہنے کا شرف مجھے بھی حاصل رہے۔"

تشریح: حضرت میمونہؓ جو آنحضرت ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ ہیں حضرت ابن عباسؓ کی خالہ تھیں ان کے والد کا نام حارث تھا ماں کا نام ہندہ تھا خود ان کا نام برہ تھا مگر آنحضرت ﷺ نے میمونہ رکھا یہ پہلے مسعود ابن عمرو کے نکاح میں تھیں پھر ابورہم کے ساتھ شادی ہوئی ان کا رسول کریم ﷺ کے ساتھ ذی قعدہ سن ۶ ہجری میں بمقام سرف جو مکہ معظمہ سے آٹھ میل کا فاصلہ ہے وہاں ان کا نکاح ہوا یہیں شب زفاف گزری اور اتفاق کی بات کہ اسی مقام سرف میں وفات پائی اور یہیں مدفون ہوئیں۔

جن زوجہ مطہرہ کے لئے باری مقرر نہیں تھی وہ حضرت صفیہؓ تھیں یا حضرت سودہ؟ اس بارہ میں بظاہر دو متضاد روائتیں ہیں لیکن تحقیقی بات یہی ہے کہ وہ حضرت سودہؓ تھیں بلکہ خطابی نے تو عطاءؒ کے اس قول کو کہ "وہ حضرت صفیہؓ تھیں کے بارے میں یہ کہا ہے کہ کسی راوی کی چوک ہے یعنی حضرت عطاءؒ نے تو یہاں "حضرت سودہؓ" ہی کہا تھا مگر کسی راوی کی چوک سے "حضرت صفیہؓ" نقل ہو گیا۔

وکانت اخرھن موتا ماتت بالمدینۃ اور آنحضرت ﷺ کی بیویوں میں حضرت صفیہؓ کا سب سے آخر میں مدینہ میں انتقال ہوا ہے، توضیح سے پہلے یہ جان لیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کس زوجہ مطہرہ کا انتقال کب ہوا ہے صاحب مواہب نے لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ کا انتقال سن ۵۰ ہجری کے ماہ رمضان میں ہوا ہے اور بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ ان کا انتقال حضرت معاویہؓ

کے زمانہ سن ۵۲ یا ۵۵ ہجری میں ہوا ہے اور بقیع میں مدفون ہوئیں ہیں۔ حضرت میمونہؓ کا انتقال ۵۱ ہجری میں ہوا اور بعض علماء کے قول کے مطابق ۶۶ یا سن ۶۳ ہجری میں ہوا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے مدینہ میں ۵۷ہجری میں وفات پائی جب کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ ان کی وفات سن ۵۸ میں ہوئی ہے حضرت سودہؓ نے سن ۵۴ ہجری میں حضرت حفصہؓ نے سن ۵۰ یا بعض علماء کے قول کے مطابق ۴۱ ہجری میں حضرت سلمہؓ نے سن ۵۹ ہجری میں حضرت اُمّ حبیبہؓ نے سن ۴۴ ہجری یا بعض علماء کے قول کے مطابق ۴۳ ہجری حضرت زینب بنت جحش نے سن ۲۰ ہجری میں یا بعض علماء کے قول کے مطابق سن ۲۱ ہجری میں اور حضرت جویریہؓ نے سن ۵۰ ہجری میں انتقال کیا ہے حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں ہو گیا تھا اور حضرت زینب بنت خزیمہؓ بھی آنحضرت ﷺ کے سامنے ہی وفات پا گئی تھیں۔

اب اس تفصیل کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کہنا کہ "حضرت صفیہؓ کا سب سے آخر میں انتقال ہوا ہے، صحیح نہیں ہے اور اگر لفظ کانت کی ضمیر کا مرجع حضرت میمونہؓ کو قرار دیا جائے تو بھی بات صحیح نہیں ہوتی کیونکہ اگر بعض علماء کے قول کے مطابق حضرت میمونہؓ کا سن وفات سن ۶۶ ہجری یا ۶۳ زیادہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ازواج مطہرات میں ان کا سب سے آخر میں انتقال ہونا تو ثابت ہو جائے گا مگر یہ بات خود آگے عبارت کے اگلے جملے مَاتَتْ بِالْمَدِيْنَه کے مطابق نہیں ہوگی کیونکہ اس بارہ میں حدیث نے وضاحت کر دی ہے کہ ان کا انتقال مقام سرف میں ہوا ہے۔ لہٰذا اس عبارت کا صحیح مفہوم متعین کرنا بڑا مشکل ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس عبارت میں کیا مفہوم پوشیدہ ہے اور اس کا صحیح مطلب کیا ہے؟

بَابُ عِشْرَةِ النِّسَاءِ وَمَا لِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنَ الْحُقُوْقِ

عورتوں کے ساتھ صحبت و اختلاط اور ہر ایک عورت کے حقوق کا بیان

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جو عورتوں کے ساتھ صحبت و اختلاط اور حسن معاشرت اور ہر ایک عورت کے حق کے بارے میں منقول ہیں۔ عنوان میں "ہر ایک عورت کے حقوق" کہنے کی بجائے "عورتوں کے حقوق" کہنا بظاہر زیادہ مناسب تھا لیکن اس میں نکتہ یہ ہے کہ یہاں عورتوں کی جنس مراد نہیں ہے بلکہ عورتوں کی اقسام مراد ہے یعنی جن عورتوں سے نکاح کیا جاتا ہے وہ کئی قسم کی ہوتی ہیں کوئی تو باکرہ ہوتی ہے اور کوئی ثیبہ ہوتی ہے اور کوئی خوش خلق ہوتی ہے کوئی بد خلق ہوتی ہے اسی طرح کوئی عورت مالدار ہوتی ہے اور کوئی مفلس ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ لہٰذا یہاں چونکہ عورتوں کی یہ اقسام مراد تھیں اس لئے عنوان میں "ہر ایک عورت کے حقوق" کہا گیا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عورت کی کجی کو سخت روی سے دور نہیں کیا جاسکتا

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَیْرًا فَاِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَیْءٍ فِی الضِّلَعِ اَعْلَاهُ فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِیْمُهٗ كَسَرْتَهٗ وَاِنْ تَرَكْتَهٗ لَمْ یَزَلْ اَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عورتوں کے حق میں بھلائی کی وصیت قبول کرو، اس لئے کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں جو ٹیڑھی ہے اور سب سے زیادہ ٹیڑھاپن اس پسلی میں ہے جو اوپر کی ہے لہٰذا اگر تم پسلی کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اس کو توڑ دو گے اور اگر پسلی کو اپنے حال پر چھوڑ دو تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے گی اس لئے عورتوں کے حق میں بھلائی کی وصیت قبول کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی نے عورتوں کی خلقت و طبیعت کے بارہ میں دو بنیادی نکتے بیان کئے ہیں اول تو یہ کہ عورتوں کی اصل و بنیاد حضرت حوا ہیں جو حضرت آدم کی اوپر کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں جو بہت زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے لہٰذا عورتوں کی اصل خلقت ہی میں ٹیڑھا پن ہے جسے کوئی درست نہیں کر سکتا دوم یہ کہ جس طرح پسلی کا حال ہے کہ اگر کوئی اسے سیدھا کرنا چاہے تو سیدھی نہیں ہوگی۔ بلکہ ٹوٹ جائے گی اور اگر اس کو اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی ٹھیک اسی طرح عورتوں کا حال ہے کہ ان کی اصل خلقت ہی میں چونکہ اعمال و اخلاق کی کجی ہے اس لئے اگر مرد چاہیں کہ ان کی کجی کو درست کر دیں تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہوں گے بلکہ اس کو توڑ ڈالیں گے (توڑنے سے مراد طلاق دینا ہے جیسا کہ اگلی حدیث سے معلوم ہوگا)۔ لہٰذا عورتوں سے فائدہ اٹھانا اور ان کا کار آمد رہنا اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ان کو ان کے خلقی ٹیڑھے پن پر چھوڑے رکھا جائے پس حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ عورتوں کی اصلاح و درستگی کا معاملہ بہت پیچیدہ اور نازک ہے ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر سخت روی اور غیظ و غضب کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے اور اس بنیادی نکتہ کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ان کے ٹیڑھے پن کو درست کرنے کے لئے اگر سختی سے کام لیا جائے گا۔ اس کا انجام ان کی توڑ پھوڑ یعنی طلاق کی صورت میں ظاہر ہوگا جو ان عورتوں ہی کے لئے تباہی کا باعث نہیں ہوگا بلکہ خود اپنی زندگی کے لئے بھی نقصان دہ اور اضطراب انگیز ہوگا۔ اس لئے اپنی عورتوں کے ساتھ نرم معاملہ رکھو اور ان کے ٹیڑھے پن پر صبر کرو اور یہ طریقہ چھوڑ دو کہ وہ سب باتوں میں تمہاری مرضی اور تمہاری خواہش کے مطابق عمل کریں گی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کا ٹیڑھا پن اگر روز مرہ کی گھریلو زندگی اور معاشرتی امور سے گزر کر گناہ و معصیت کی حدود میں پہنچ جائے تب بھی اس پر صبر کیا جائے بلکہ ان کے ٹیڑھے پن پر صبر کرنا اور اس سے چشم پوشی کرنا اس وقت تک مناسب ہوگا۔ جب تک کوئی گناہ لازم نہ آئے۔ اگر گناہ لازم آئے تو پھر تغافل اور چشم پوشی بالکل مناسب نہیں ہوگی۔

② وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ لَنْ تَسْتَقِیْمَ لَكَ عَلٰی طَرِیْقَةٍ فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَبِهَا عِوَجٌ وَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِیْمُهَا كَسَرْتَهَا وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عورت کی اصل اور بنیاد یعنی اس کی ماں حوا) چونکہ (حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ (اس لئے تمہارے لئے کسی ایک راہ پر ہرگز سیدھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر تم اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اس کے ٹیڑھے پن ہی کی حالت میں اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو (اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ) تم اسے توڑ ڈالو گے اور اس کا توڑنا اس کو طلاق دینا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ہرگز سیدھی نہیں ہوگی" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ چاہو کہ کوئی عورت کسی ایک حالت پر ہمیشہ قائم رہے تو یہ ناممکن ہے کیونکہ اس کی خلقت ہی میں چونکہ کجی ہے اسی لئے اس کی حالت بدلتی سدلتی رہے گی کبھی شکر گزاری کی راہ چھوڑ کر ناشکری کا راستہ اختیار کرے گی کبھی طاعت و فرمانبرداری کے راستہ پر چلتے چلتے نافرمانی کی راہ پر پڑ جائے گی کبھی قناعت کو بالائے طاق رکھ کر طمع و حرص کے جال میں پھنس جائے گی غرضیکہ اسی طرح اس کے مزاج و عمل میں دوسرے تغیرات پیدا ہوتے رہیں گے۔

عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کرو

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْهَا اٰخَرَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کوئی مسلمان مرد کسی مسلمان عورت سے بغض نہ رکھے اگر اس کی نظر میں اس عورت کی کوئی خصلت و عادت ناپسندیدہ ہوگی تو کوئی دوسری خصلت و عادت پسندیدہ بھی ہوگی۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کے تمام افعال و خصائل برے نہیں ہوتے بلکہ اگر اس کے کچھ افعال و خصائل برے ہوتے ہیں تو اس میں کچھ اچھی عادتیں اور اچھے خصائل بھی ہوتے ہیں لہٰذا ہر مسلمان مرد کو چاہئے کہ وہ اپنی عورت کے ان اچھے افعال و اخلاق کو پیش نظر رکھے جو اس کی نظر میں پسندیدہ ہیں اور جو افعال و اخلاق برے ہوں ان پر صبر و تحمل کرے گویا اس ارشاد کا مقصد اس بات کی ترغیب دلانا ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کرو ان کی معیت میں خوشگوار و پر مسرت زندگی گزارنے کی کوشش کرو اور اگر ان کی طرف سے کوئی ایسی کوتاہی یا غلطی ہو جائے یا ان میں کوئی ایسی بری عادت و خصلت ہو جس سے تکلیف پہنچتی ہے تو اس تکلیف پر صبر کرو۔

اس حدیث میں ایک بہت بڑے لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ بے عیب یار اور اپنے مزاج کے بالکل موافق ہاتھ نہیں لگا کرتا۔ اگر کوئی شخص بالکل بے عیب یار ڈھونڈھنے لگے تو وہ ہمیشہ بے یار ہی رہے گا کیونکہ ایسا کوئی انسان نہیں ہے جس میں کوئی عیب اور کوئی ناپسندیدہ بات نہ ہو اس طرح کوئی انسان خصوصاً مسلمان اچھے خصائل اور اچھی عادتوں سے بالکل بھی خالی نہیں ہوتا لہٰذا عقل کا تقاضا یہی ہونا چاہئے۔ کہ اس کے ان اچھے خصائل کو تو پیش نظر رکھا جائے اور برے خصائل سے چشم پوشی کی جائے۔

کجی ہر عورت کو ورثہ میں ملی ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوْلَا بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ لَمْ يَخْنَزِ اللَّحْمُ وَلَوْلَا حَوَّاءُ لَمْ تَخُنْ اُنْثٰى زَوْجَهَا الدَّهْرَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت نہ سڑا کرتا اور اگر حوا نہ ہوتیں تو عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ان کی قوم بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کے لئے جنگل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے من و سلویٰ کا خوان نعمت اترا کرتا تھا اور اس کا یہ حکم تھا کہ انہیں جتنی ضرورت ہو اسی کے بقدر اس میں سے لے لیا کریں ضرورت سے زائد لے کر ذخیرہ نہ کریں مگر وہ یہودی کیا جو اپنی کج فطرتی اور خدا کی نافرمانی سے باز آجائیں چنانچہ اس موقع پر بھی انہوں نے حکم خداوندی کی نافرمانی کی اور اس خوان نعمت سے اپنی ضرورت سے زائد لے کر ذخیرہ کرنے لگے، مگر قدرت کا کرنا ایسا ہوتا کہ جب وہ ذخیرہ کرتے تو وہ گوشت سڑ جاتا تھا۔ چنانچہ یہ گوشت کا سڑنا ان کے اس فعل بد یعنی اللہ تعالیٰ پر توکل و اعتماد نہ کرنے اور محض حرص و طمع کی وجہ سے ذخیرہ کرنے کی سزا کے طور پر تھا اس کے بعد نظام قدرت نے ہمیشہ کے لئے گوشت کا سڑنا لازم کر دیا لہٰذا اس کے بارہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل اس بری عادت میں مبتلا نہ ہوتے اور ان کو یہ سزا نہ ملتی تو گوشت سڑا نہ کرتا بلکہ جب تک لوگ چاہتے اسے اپنی ضرورت کے مطابق رکھا کرتے۔

یہاں "خیانت" کے وہ معنی مراد نہیں ہیں۔ جو امانت و دیانت کی ضد ہے بلکہ "خیانت" سے ناراستی یعنی کجی مراد ہے لہٰذا حضرت حوا کی کجی یہ تھی کہ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت کا وہ درخت کھانے کی ترغیب دی جس سے اللہ تعالیٰ نے روک رکھا تھا۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو کجی حضرت حوا سے سرزد ہوگئی تھی وہ ہر ایک عورت کی سرشت کا جزو بن گئی ہے اگر حضرت حوا سے یہ کجی سرزد نہ ہوتی تو کسی بھی عورت میں کجی کا خمیر نہ ہوتا اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ کجروی کا کوئی بھی برتاؤ نہ کرتی۔

عورت کو مارنے کی ممانعت

⑤ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَمْعَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَجْلِدُ اَحَدُكُمْ اِمْرَاَتَهٗ جَلْدَ الْعَبْدِ ثُمَّ يُجَامِعُهَا فِیْ اٰخِرِ الْيَوْمِ وَفِیْ رِوَايَةٍ يَعْمِدُ اَحَدُكُمْ فَيَجْلِدُ امْرَاَتَهٗ جَلْدَ الْعَبْدِ فَلَعَلَّهٗ يُضَاجِعُهَا فِیْ اٰخِرِ يَوْمِهٖ ثُمَّ وَعَظَهُمْ

فِیْ ضَحِکِھِمْ مِنَ الضَّرْطَةِ فَقَالَ لِمَ یَضْحَكُ اَحَدُکُمْ مِمَّا یَفْعَلُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن زمعہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کوئی شخص اپنی بیوی کو غلام کی طرح (بد دلی سے) نہ مارے اور پھر دن کے آخری حصہ میں اس سے جماع کرے۔" ایک روایت میں یوں ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) تم میں ایک شخص اپنی بیوی کو غلام کی طرح مارتا ہے حالانکہ (یہ نہیں سوچتا کہ) شاید وہ اسی دن کے آخری حصہ میں اس سے ہم بستر ہو۔ پھر آپ ﷺ نے ریح خارج ہونے پر ہنسنے والوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس چیز پر کیوں ہنستا ہے جس کو وہ خود بھی کرتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اور پھر دن کے آخری حصہ میں اس سے جماع کرے۔" اس کے ذریعہ آپ ﷺ نے ایک بڑا نفسیاتی نکتہ بیان فرمایا کہ جو شخص اپنی بیوی سے جنسی لذت حاصل کرتا ہے اس کے لئے یہ بات کس طرح مناسب ہو سکتی ہے کہ ایک طرف تو اس کے ساتھ ایسا پر کیف معاملہ ہو دوسری طرف اس کے ساتھ اتنا وحشیانہ اور بے دردانہ سلوک کرے؟ اگرچہ اپنی بیوی کو اس کی مسلسل نافرمانی اور سرکشی پر مارنے کی اجازت ہے لیکن اس طرح نہیں کہ غلاموں کی طرح بے دردی سے اسے مارا پیٹا جائے یہ ایک غیر شرعی فعل ہی نہیں ہے بلکہ ایک انتہائی غیر انسانی اور غیر مہذب حرکت بھی ہے! اس سے معلوم ہوا کہ اپنی بیوی کے ساتھ پیار و محبت اور اتفاق و سلوک کے ساتھ رہنا چاہئے۔

حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا کسی ایسی عجیب بات پر ہنسنا تو اچھا معلوم ہوتا ہے جو عام طور پر نہ پائی جاتی ہو لیکن جب ایک چیز خود اپنے اندر موجود ہے تو پھر جب وہ کسی دوسرے سے سرزد ہوتی ہے۔ تو اس پر ہنسنے کا کیا موقع ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کی ریح خارج ہو جائے تو اسے تغافل کیا جائے تا کہ وہ خجالت اور شرمندگی کر کے کبید خاطر نہ ہو۔

اس سلسلہ میں یہ سبق آموز واقعہ پڑھنے کے قابل ہے کہ ایک بہت بڑے عالم گزرے ہیں جن کا نام عاصمؒ تھا یہ اگرچہ حقیقت میں بہرے نہیں تھے لیکن انہوں نے دنیا کی نظروں میں اپنے آپ کو بہرا بنا رکھا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن ایک عورت کوئی مسئلہ پوچھنے کے لئے ان کے پاس آئی جب وہ ان سے مسئلہ پوچھ رہی تھی تو اسی اثناء میں اس کی ریح خارج ہو گئی۔ عاصمؒ نے سوچا کہ یہ عورت ذات ہے اب یہ بہت زیادہ شرمندگی و خجالت محسوس کر رہی ہو گی لہٰذا انہوں نے اس کی شرمندگی و خجالت دور کرنے کے لئے کہا کہ ذرا زور سے کہو کیا کہہ رہی ہو؟ گویا انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ میں اونچا سنتا ہوں وہ عورت بڑی خوش ہوئی اس نے بتایا کہ یہ تو بہرے ہیں انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں اور اس طرح اس کی شرمندگی دور ہو گئی مگر عاصمؒ نے پھر اپنی اس بات کو نباہنے کے لئے اپنے آپ کو ہمیشہ بہرا بنائے رکھا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ تنبیہ پوشیدہ ہے کہ ہر عقل مند انسان کو چاہئے کہ جب وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیب گیری کا ارادہ کرے تو اپنے دل میں سوچے کہ آیا یہ عیب یا اسی طرح کا کوئی اور عیب میری ذات میں بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر وہ اپنے آپ کو کسی عیب سے پاک نہ پائے تو پھر اس کے لئے اس مسلمان بھائی کی عیب گیری سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس عیب سے پاک کرنے پر توجہ دے کسی مرد دانا نے کیا خوب کہا ہے کہ میں اکثر لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ دوسروں کے عیوب کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن خود ان کے اندر جو عیوب ہیں ان سے وہ اندھے ہیں۔

اپنی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو

(۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کُنْتُ اَلْعَبُ بِالْبَنَاتِ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَکَانَ لِیْ صَوَاحِبُ یَلْعَبْنَ مَعِیْ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ یَتَقَمَّعْنَ مِنْهُ فَیُسَرِّبُهُنَّ اِلَیَّ فَیَلْعَبْنَ مَعِیْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (جب میں چھوٹی تھی اور میری شادی کا ابتدائی دور تھا تو) میں رسول کریم ﷺ کے ہاں گڑیوں سے کھیلا

کرتی تھی اور میری ہمجولیاں بھی میرے ساتھ کھیلتی تھیں اور پھر جب رسول کریم ﷺ (گھر میں) تشریف لاتے تو میری ہم جولیاں (شرم کی وجہ سے) آپ ﷺ سے چھپ جاتی تھیں لیکن آنحضرت ﷺ ان کو میرے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور وہ میرے ساتھ کھیلنے لگتی تھیں۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں گویا اس بات کا بیان ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی رہنا اس کے جائز جذبات و شوق کا لحاظ رکھنا ایک پر مسرت زندگی کا بنیادی باب ہے جس کے بغیر انسان کو اطمینان و سکون کی دولت نصیب نہیں ہوتی۔ گڑیوں سے کھیلنے کے بارہ میں جو حکم و تفصیل ہے۔ باب الولی میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

⑦ وَعَنْهَا قَالَتْ وَاللّٰهِ لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْمُ عَلٰى بَابِ حُجْرَتِيْ وَالْحَبْشَةُ يَلْعَبُوْنَ بِالْحِرَابِ فِي الْمَسْجِدِ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتُرُنِيْ بِرِدَائِهِ لِاَنْظُرَ اِلٰى لَعِبِهِمْ بَيْنَ اُذُنِهٖ وَعَاتِقِهٖ ثُمَّ يَقُوْمُ مِنْ اَجْلِيْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَنَا الَّتِيْ اَنْصَرِفُ فَاقْدُرُوْا قَدْرَ الْجَارِيَةِ الْحَدِيْثَةِ السِّنِّ الْحَرِيْصَةِ عَلَى اللَّهْوِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے دیکھا (اور مجھے اچھی طرح یاد ہے) کہ رسول کریم ﷺ میرے حجرہ مبارک کے دروازہ پر کھڑے تھے اور حبشی لوگ مسجد میں اپنی برچھیوں کے کرتب دکھا رہے تھے اور رسول کریم ﷺ نے اپنی چادر سے میرے لئے پردہ کر رکھا تھا تاکہ میں بھی آپ ﷺ کے کان اور مونڈھے کے درمیان سے ان حبشیوں کا کھیل کرتب دیکھتی رہوں یہاں تک کہ آپ ﷺ اس وقت تک (پردہ کئے) کھڑے رہے جب تک کہ میں خود وہاں سے نہ ہٹ گئی اس سے تم اس عرصہ کا اندازہ کرلو جس میں ایک صغیر السن لڑکی جو کھیل تماشہ کی شائق ہو کھڑی رہ سکتی ہے (یعنی خیال کرو کہ خورد سال لڑکیاں کھیل تماشہ دیکھنے کی کتنی شائق ہوتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ دیر تک کھڑے رہنا بھی ان کے لئے ایک معمولی بات ہوتی ہے چنانچہ میں بھی اس وقت جتنی دیر تک کھڑی رہی، آپ ﷺ بھی میری وجہ سے پردہ کئے کھڑے رہے، حاصل یہ کہ آپ ﷺ بہت دیر تک وہاں کھڑے ہو کر مجھے ان حبشیوں کا کھیل کرتب دکھاتے رہے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مسجد" سے مراد "رحبہ مسجد" ہے جو مسجد سے ملا ہوا ایک چبوترہ تھا، یعنی وہ حبشی مسجد میں اپنا کرتب نہیں دکھا رہے تھے بلکہ مسجد سے متصل رحبہ میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کر رہے تھے اور اگر نفس مسجد ہی مراد لی جائے یعنی یہ کہا جائے کہ ان کا کھیل کرتب مسجد ہی کے اندر ہو رہا تھا تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ ان کا برچھیوں کا کرتب دکھانا گویا جہاد کی ایک علامتی مشق تھی لہٰذا تیر اندازی کی طرح ان کا یہ کھیل کرتب بھی عبادت کی مانند تھا، ایسے ہی ان کا کھیل دیکھنا بھی پسندیدہ تھا بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ پردہ واجب ہونے سے پہلے کا ہے۔

آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کی خوشی و ناخوشی کو کس طرح پہچانتے تھے

⑧ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ لَاَعْلَمُ اِذَا كُنْتِ عَنِّيْ رَاضِيَةً وَاِذَا كُنْتِ عَلَيَّ غَضْبٰى فَقُلْتُ مِنْ اَيْنَ تَعْرِفُ ذٰلِكَ فَقَالَ اِذَا كُنْتِ عَنِّيْ رَاضِيَةً فَاِنَّكِ تَقُوْلِيْنَ لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ وَاِذَا كُنْتِ عَلَيَّ غَضْبٰى قُلْتِ لَا وَرَبِّ اِبْرَاهِيْمَ قَالَتْ قُلْتُ اَجَلْ وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا اَهْجُرُ اِلَّا اسْمَكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ مجھ سے فرمانے لگے کہ جس وقت تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو میں جان جاتا ہوں اور جب تم (کسی دنیوی معاملہ میں) مجھ سے ناراض ہوتی ہو (جیسا کہ میاں بیوی کے درمیان کسی بات پر خفگی ہو جاتی ہے) تو مجھے وہ بھی معلوم ہو جاتا ہے میں نے عرض کیا کہ "آپ ﷺ یہ کس طرح پہچان لیتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (اس طرح کہ) جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو اس طرح کہا کرتی ہو" یہ بات نہیں ہے محمد ﷺ کے پروردگار کی قسم، اور جب تم مجھ سے خفا ہوتی ہو تو اس طرح کہتی ہو کہ یہ

بات نہیں ہے ابراہیم علیہ السلام کے پروردگار کی قسم (یعنی جب تم مجھ سے خفا ہونے کی حالت میں قسم کھاتی ہو تو میرا نام نہیں لیتیں بلکہ ابراہیم علیہ السلام کا پروردگار کہتی ہو) حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (یہ سن کر) میں نے عرض کیا کہ "ہاں یا رسول اللہ! یہ بات ٹھیک ہے، لیکن میں صرف آپ (ﷺ) کا نام ہی چھوڑتی ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "لیکن میں صرف آپ کا نام ہی چھوڑتی ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں مغلوب العقل ہو جاتی ہوں اگرچہ میں آپ ﷺ کا نام نہیں لیتی مگر میرے دل میں آپ ﷺ کے لئے پیار و محبت کا جو دریا موجزن ہے اس کے تلاطم میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوتی، بلکہ میرا دل آپ ﷺ کی محبت میں جوں کا توں مستغرق رہتا ہے۔

شوہر کی خواہش پر بیوی کو ہم بستر ہونے سے انکار نہ کرنا چاہیے

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَعَی الرَّجُلُ امْرَأَتَهٗ اِلٰی فِرَاشِهٖ فَاَبَتْ فَبَاتَ غَضْبَانَ لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰی تُصْبِحَ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهُمَا قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا مِنْ رَجُلٍ یَدْعُوْ امْرَأَتَهٗ اِلٰی فِرَاشِهٖ فَتَاْبٰی عَلَیْهِ اِلَّا کَانَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ سَاخِطًا عَلَیْهَا حَتّٰی یَرْضٰی عَنْهَا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی مرد اپنی عورت کو ہم بستر ہونے کے لئے بلائے اور وہ عورت انکار کر دے۔ اور پھر شوہر (اس کے انکار کی وجہ سے) رات بھر غصہ کی حالت میں رہے تو فرشتے اس عورت پر صبح تک لعنت بھیجتے رہتے ہیں (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں (یعنی جس کے قبضہ تصرف میں) میری جان ہے، جو شخص اپنی عورت کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کر دے تو وہ جو آسمان میں ہے اس سے اس وقت تک ناراض رہتا ہے جب تک اس کا شوہر اس سے راضی نہ ہو۔

تشریح: یہ وعید اس صورت میں ہے جب کہ بیوی کوئی شرعی عذر نہ ہونے کے باوجود شوہر کے بستر پر آنے سے انکار کر دے۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حیض ایسا عذر نہیں ہے جس کی موجودگی میں بیوی کو شوہر کے بستر پر آنے سے انکار کر دینے کا حق پہنچتا ہو، کیونکہ جمہور علماء کے نزدیک شوہر کو اس صورت میں بھی کپڑوں کے اوپر سے جنسی لطف حاصل کرنا (یعنی بدن سے بدن ملانا اور بوسہ وغیرہ لینا) جائز ہے اور بعض علماء کے نزدیک شرم گاہ کے علاوہ جسم کے بقیہ حصوں سے لطف اندوزی جائز ہے۔

"صبح تک" غالب کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے یعنی اکثر یہ صورت حال چونکہ رات میں پیش آتی ہے اس لئے "صبح تک" کا ذکر کیا گیا ورنہ اگر شوہر کی طرف سے خواہش اور بیوی کی طرف سے انکار کی یہ صورت حال دن میں پیش آئے اور اس کی وجہ سے شوہر دن بھر ناراض رہے تو فرشتے اسی طرح شام تک اس عورت پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

"وہ جو آسمان میں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جس کا حکم آسمانوں میں جاری ہے۔ یا وہ ذات جس کی آسمانوں میں عبادت کی جاتی ہے اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یوں تو اللہ تعالیٰ زمین اور زمین کی ساری مخلوقات کا بھی معبود اور آسمان اور آسمان کی ساری مخلوقات کا بھی معبود ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔

"اور وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے کہ جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے۔"

لیکن حدیث میں صرف آسمان کا معبود اس لئے کہا گیا ہے زمین کی بہ نسبت آسمان زیادہ شرف رکھتا ہے اور صرف آسمان کا ذکر اظہار مقصد کے لئے کافی ہے تاہم یہ بھی احتمال ہے کہ "وہ جو آسمان میں ہے" سے فرشتے مراد ہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خاوند کی ناراضگی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے اور جب جنسی جذبات کی تسکین کے بارہ میں خاوند کی ناراضگی کی یہ اہمیت ہے تو کسی دنیوی معاملہ میں خاوند کی ناراضگی کی کتنی اہمیت ہوگی۔

کوئی عورت خواہ مخواہ اپنی سوکن کو جلانے کے کام نہ کرے

(۱۰) وَعَنْ اَسْمَاءَ اَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ ضَرَّةً فَهَلْ عَلَيَّ جُنَاحٌ اِنْ تَشَبَّعْتُ مِنْ زَوْجِيْ غَيْرَ الَّذِيْ يُعْطِيْنِيْ فَقَالَ الْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ ایک عورت نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میری ایک سوکن ہے۔ اگر میں اس کے سامنے اپنے خاوند کی کسی ایسی چیز کا اظہار کروں جو اس نے مجھے نہیں دی ہے تو کیا یہ گناہ ہے؟ (یعنی میرا خاوند مجھے جو کچھ دیتا ہے اگر میں اپنی سوکن کو جلانے کے لئے اس کے سامنے اس چیز کو زیادہ کر کے بیان کروں کہ دیکھو مجھے تم سے زیادہ ملتا ہے تو کیا اس میں کوئی برائی ہے؟) آپ نے فرمایا" (ہاں یہ بہت بری بات ہے کیونکہ) نہ دی ہوئی چیز کا اظہار کرنے والا دو جھوٹ موٹ کے کپڑے پہننے والے کے مانند ہے۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: دو کپڑوں سے مراد چادر اور تہبند ہیں اور جھوٹ موٹ کے کپڑے پہننے والے سے وہ شخص مراد ہے جو کسی کا مانگا ہوا یا کسی کی امانت کا کپڑا پہنے اور ظاہر یہ کرے کہ گویا وہ کپڑے اسی کے ہیں یا وہ شخص مراد ہے جو زاہدوں اور بزرگوں کا لباس پہنے حالانکہ واقعۃً اسے زہد وبزرگی سے کوئی نسبت نہ ہو بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ حدیث میں اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ایسا قمیص وکرتہ پہنے جس کی آستینوں کے نیچے دو اور آستینیں لگی ہوئی ہوں تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ دو کپڑے پہن رکھے ہیں اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ عرب میں ایک شخص تھا جو محض اس لئے دو بہت عمدہ اور نفیس کپڑے پہنتا تھا تاکہ لوگ اسے عزت واحترام کی نظر دیکھیں اور اگر وہ کوئی جھوٹی گواہی دے تو کوئی آدمی اس کی کسی گواہی کو جھوٹی نہ جانے لہٰذا حدیث میں اسی شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

ایلاء کا مطلب

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اٰلٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ نِسَائِهٖ شَهْرًا وَكَانَتِ انْفَكَّتْ رِجْلُهٗ فَاَقَامَ فِيْ مَشْرُبَةٍ تِسْعًا وَعِشْرِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ نَزَلَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اٰلَيْتَ شَهْرًا فَقَالَ اِنَّ الشَّهْرَ يَكُوْنُ تِسْعًا وَعِشْرِيْنَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنی بیویوں سے ایک مہینہ کا ایلاء کیا اور اسی زمانہ میں آپ ﷺ کے پاؤں میں موچ آگئی تھی چنانچہ آپ ﷺ انتیس راتوں تک بالاخانہ ہی پر رہے پھر جب آپ ﷺ نیچے تشریف لائے تو لوگوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) نے تو ایک مہینہ کا ایلاء کیا تھا (اور مہینہ تیس دن کا ہوتا ہے پھر آپ انتیس دن کے بعد کیوں اتر آئے؟) آپ ﷺ نے فرمایا مہینہ تیس دن کا بھی ہوتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "ایلاء" کے لغوی معنی ہیں "قسم کھانا" اور اصطلاح شریعت میں ایلاء اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص اس بات کی قسم کھائے کہ میں چار مہینہ یا اس سے زیادہ تک اپنی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا یعنی اس سے جماع نہیں کروں گا اگر قسم پوری ہو جائے یعنی وہ شخص اپنی قسم کے مطابق چار مہینہ تک یا اس سے بھی زائد اس مدت تک جو اس نے متعین کی ہو، اپنی بیوی کے پاس نہ جائے تو طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے اور اگر وہ قسم پوری نہ کرے یعنی اس مدت کے پوری ہونے سے پہلے ہی بیوی کے پاس چلا جائے تو ایلاء ساقط ہو جاتا ہے اور اس پر قسم پوری نہ کرنے کا کفارہ واجب ہو جاتا ہے یا جزاء لازم ہو جاتی ہے اور اگر کسی شخص کے نکاح میں کسی کی لونڈی ہو یعنی اس کی بیوی آزاد عورت نہ ہو بلکہ کسی کی لونڈی ہو اور وہ اس سے ایلاء کرے تو اس کی کم سے کم مدت بجائے چار مہینہ کے دو مہینہ ہوگی اور اگر کسی شخص نے آزاد عورت کے حق میں چار مہینہ سے کم اور لونڈی کے حق میں دو مہینہ سے کم مدت کے لئے قسم کھائی تو یہ ایلاء شرعی نہیں کہلائے گا

چنانچہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کی طرف جس ایلاء کی نسبت کی گئی ہے وہ شرعی ایلاء نہیں ہے۔ بلکہ ایلاء لغوی مراد ہے یعنی آپ ﷺ نے یہ قسم کھائی تھی کہ میں اپنی بیویوں کے پاس ایک مہینہ تک نہیں جاؤں گا جس کا سبب یہ تھا کہ آپ ﷺ کی بیویوں نے آپ ﷺ سے کچھ زیادہ نفقہ کا مطالبہ کیا تھا جس سے آپ ﷺ کو سخت ناگواری ہوئی اور آپ ﷺ نے قسم کے ساتھ یہ عہد کیا کہ میں ان بیویوں کے پاس ایک مہینہ تک نہیں جاؤں گا انہیں دنوں میں یہ حادثہ پیش آیا کہ آپ ﷺ گھوڑے پر سے گر پڑے جس کی وجہ سے آپ ﷺ کے پائے مبارک میں چوٹ آگئی پھر آپ ﷺ ایک مہینہ بالاخانہ ہی پر رہے نیچے نہیں آئے مگر وہ مہینہ غالباً انتیس دن کا تھا اس لئے آپ ﷺ نے انتیس پر اکتفا کیا اور نیچے تشریف لے آئے۔

آنحضرت ﷺ کے ایلاء کا واقعہ

⑫ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ دَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ يَسْتَاْذِنُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ النَّاسَ جُلُوْسًا بِبَابِهٖ لَمْ يُؤْذَنْ لِاَحَدٍ مِنْهُمْ قَالَ فَاُذِنَ لِاَبِيْ بَكْرٍ فَدَخَلَ ثُمَّ اَقْبَلَ عُمَرُ فَاسْتَاْذَنَ فَاُذِنَ لَهٗ فَوَجَدَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا حَوْلَهٗ نِسَاءُهٗ وَاجِمًا سَاكِتًا قَالَ فَقُلْتُ لَاَقُوْلَنَّ شَيْئًا اُضْحِكُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ رَاَيْتَ بِنْتَ خَارِجَةَ سَاَلَتْنِي النَّفَقَةَ فَقُمْتُ اِلَيْهَا فَوَجَاْتُ عُنُقَهَا فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ هُنَّ حَوْلِيْ كَمَا تَرٰى يَسْاَلْنَنِي النَّفَقَةَ فَقَامَ اَبُوْبَكْرٍ اِلٰى عَائِشَةَ يَجَاُ عُنُقَهَا وَقَامَ عُمَرُ اِلٰى حَفْصَةَ يَجَاُ عُنُقَهَا كِلَاهُمَا يَقُوْلُ تَسْاَلِيْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَيْسَ عِنْدَهٗ فَقُلْنَ وَاللّٰهِ لَا نَسْاَلُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا اَبَدًا لَيْسَ عِنْدَهٗ ثُمَّ اعْتَزَلَهُنَّ شَهْرًا اَوْ تِسْعًا وَّعِشْرِيْنَ ثُمَّ نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ يَاۤ اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ حَتّٰى بَلَغَ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا قَالَ فَبَدَاَ بِعَائِشَةَ فَقَالَ يَا عَائِشَةُ اِنِّيْ اُرِيْدُ اَنْ اَعْرِضَ عَلَيْكِ اَمْرًا اُحِبُّ اَنْ لَا تَعْجَلِيْ فِيْهِ حَتّٰى تَسْتَشِيْرِيْ اَبَوَيْكِ قَالَتْ وَمَا هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَتَلَا عَلَيْهَا الْاٰيَةَ قَالَتْ اَفِيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَسْتَشِيْرُ اَبَوَيَّ بَلْ اَخْتَارُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَاَسْاَلُكَ اَنْ لَا تُخْبِرَ امْرَاَةً مِّنْ نِّسَائِكَ بِالَّذِيْ قُلْتُ قَالَ لَا تَسْاَلُنِي امْرَاَةٌ مِّنْهُنَّ اِلَّا اَخْبَرْتُهَا اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَبْعَثْنِيْ مُعَنِّتًا وَّلَا مُتَعَنِّتًا وَّلٰكِنْ بَعَثَنِيْ مُعَلِّمًا مُّيَسِّرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں آنحضرت ﷺ اپنی بیویوں سے ایک مہینہ کی علیحدگی اختیار کئے ہوئے مکان میں گوشہ نشین تھے تو ایک دن حضرت ابوبکرؓ آئے اور رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت کے طلب گار ہوئے انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کے دروازہ پر لوگ جمع ہیں۔ اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں مل رہی مگر حضرت ابوبکرؓ کو اجازت مل گئی اور وہ آپ ﷺ کی خدمت میں چلے گئے پھر حضرت عمر فاروقؓ آئے اور انہوں نے حاضر ہونے کی اجازت مانگی ان کو بھی اجازت مل گئی چنانچہ حضرت عمرؓ (جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں) نے آپ ﷺ کو اس حالت میں پایا کہ آپ ﷺ کے ارد گرد آپ ﷺ کی بیویاں بیٹھی ہوئی تھیں اور آپ ﷺ اس وقت غمگین اور خاموش تھے حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے (یہ صورت حال دیکھ کر اپنے دل میں) کہا کہ اس وقت مجھے کوئی ایسی بات کہنی چاہئے۔ جس سے نبی کریم ﷺ ہنس پڑیں، چنانچہ انہوں نے کہا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! اگر آپ دیکھیں کہ خارجہ کی بیٹی (یعنی میری بیوی) مجھ سے روٹی پانی کا خرچ (معمول سے) زیادہ طلب کرے تو میں کھڑا ہو کر اس کی گردن پر مار لگاؤں" (حضرت عمرؓ نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ) آنحضرت ﷺ ہنس پڑے اور پھر فرمایا کہ "یہ (میری) عورتیں جنہیں تم میرے ارد گرد بیٹھی دیکھ رہے ہو مجھ سے (معمول سے) زیادہ خرچ مانگ رہی ہیں (یہ سنتے ہی) حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوئے اور اپنی صاحبزادی) حضرت عائشہؓ کی گردن پر مارنے لگے، اسی طرح حضرت عمرؓ بھی کھڑے ہوئے اور وہ بھی (اپنی صاحبزادی) حضرت حفصہؓ کی گردن پر مارنے لگے اور پھر ان دونوں (یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ) نے کہا کہ کیا تم آنحضرت ﷺ سے

اس چیز کا مطالبہ کر رہی ہو جو آپ ﷺ کے پاس موجود نہیں ہے (یعنی یہ بات کتنی غیر مناسب ہے کہ تم آنحضرت ﷺ کی مالی حالت جانتی ہو اور اس کے باوجود آپ ﷺ سے اتنے خرچ کا مطالبہ کرتی ہو جس کو آپ ﷺ پورا کرنے پر قادر نہیں ہیں کیا تمہارا یہ مطالبہ آنحضرت ﷺ کو پریشانی میں مبتلا کرنے کے مرادف نہیں ہے؟) ان عورتوں نے کہا کہ "(بے شک ہم نے بے جا مطالبہ کیا تھا جس پر ہم نادم ہیں اور آئندہ کے لئے ہم عہد کرتی ہیں کہ) خدا کی قسم! اب ہم کبھی بھی آپ ﷺ سے اس چیز کا مطالبہ نہیں کریں گی جو آپ ﷺ کے پاس نہ ہو" لیکن (آپ ﷺ نے چونکہ علیحدگی کی قسم کھالی تھی اس لئے اس قسم کو پورا کرنے کے لئے) آپ ﷺ ایک مہینہ تک یا انتیس دن تک اپنی بیویوں سے علیحدہ رہے (اس جگہ حدیث کے کسی راوی کو شک ہوا کہ حضرت جابرؓ نے یہاں ایک مہینہ کہا تھا یا انتیس دن کہا تھا) پھر یہ آیت: قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ سے لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا تک نازل ہوئی! حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (اس آیت کے نازل ہونے کے بعد) آپ ﷺ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے رابطہ قائم کیا (کیونکہ تمام ازواج مطہرات میں وہی سب سے زیادہ عقل مند اور افضل تھیں) چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "عائشہؓ! میں تمہارے سامنے ایک بات پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم (اس کا جواب دینے میں) جلدی نہ کرو بلکہ اس کے بارہ میں اپنے والدین سے مشورہ کر لو۔" حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ) فرمایئے وہ کیا بات ہے؟ آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے مذکورۂ بالا آیت پڑھی، حضرت عائشہؓ نے (یہ آیت سن کر) کہا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) کیا میں آپ (ﷺ) کے معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ لوں (یعنی مشورہ تو اس معاملہ میں کیا جاتا ہے جس میں کوئی تردد ہو جب کہ اس معاملہ میں مجھے کوئی تردد نہیں ہے) بلکہ میں نے اللہ اور اللہ کے رسول اور آخرت کے گھر کو اختیار کر لیا ہے (یعنی میں اس معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی و خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہوں کہ اسی میں میرے لئے دنیا کی بھی بھلائی ہے اور آخرت کی کامیابی بھی ہے) مگر میں آپ ﷺ سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ اس وقت میں نے آپ ﷺ سے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا ذکر اپنی کسی اور بیوی سے نہ کریں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا (یہ بات ممکن نہیں ہے کیونکہ) اگر کوئی بیوی مجھ سے یہ پوچھے گی تو میں اس کے سامنے (ضرور) ذکر کروں گا، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ کسی کو رنج پہنچاؤں یا کسی کو خواہ مخواہ تکلیف میں مبتلا کروں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں مخلوق خدا کو دین کے احکام سکھاؤں اور آسانی (یعنی دینی و دنیوی راحت) سے ہمکنار کروں۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ کو اس حال میں پایا الخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ پردہ واجب ہونے سے پہلے کا ہے کیونکہ اگر پردہ واجب ہو چکا ہوتا تو نہ حضرت عمرؓ اس طرح زنانہ خانہ میں عورتوں کے سامنے جاتے اور نہ عورتیں ان کے سامنے ہوتیں۔

"جس سے نبی کریم ﷺ ہنس پڑیں" اس سے حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ میں کوئی دلچسپ بات کہہ دوں جس سے آنحضرت ﷺ کا غم و ملال زائل ہو جائے اور آپ ﷺ خوش ہو جائیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ مستحب ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی دوست و عزیز کو غمگین دیکھے تو وہ اس کے سامنے کوئی بات ذکر کرے جس سے وہ ہنس پڑے اور خوش ہو جائے اور خود بھی اس بات میں شریک ہو کر اپنا رنج و غم بھول جائے چنانچہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ جب اپنے کسی صحابیؓ کو غمگین دیکھتے تو اس کو خوش طبعی اور ہنسی مذاق کے ذریعہ خوش کر دیتے تھے۔

حدیث میں جس آیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ پوری یوں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۔ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (الاحزاب ۳۳: ۲۸، ۲۹)

"اے پیغمبر (ﷺ) آپ (ﷺ) اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ (میں نے تو فقر کو اختیار کیا ہے) اگر تم (میرے فقر پر راضی نہیں ہو بلکہ) دنیا کی (آرام دہ) زندگی اور اس کی زینت و آرائش کی خواستگار ہو تو (مجھے بتا دو اور) آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح رخصت کر دوں (یعنی

ہمیشہ کے لئے تم سے علیحدگی اختیار کرلوں) اور اگر تم (میرے فقر پر راضی ہو اور یہ) چاہتی ہو کہ تمہیں خدا اور اس کے رسول (ﷺ) کی رضا مندی حاصل ہو اور جنت تمہارا ٹھکانا بنے تو (سن لو کہ) تم میں جو نیکو کاری کرنے والی ہیں ان کے لئے خدا نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے (یعنی تمہاری اس مشقت کے عوض جو تمہیں میری فقر و فاقہ کی زندگی کی رفیق بننے میں اٹھانی پڑے گی اللہ تعالیٰ تمہیں بے اندازہ اجر و ثواب عطا کرے گا۔"

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی بیویوں میں سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے رابطہ قائم کیا اور ان کے سامنے اس آسمانی ہدایت کو رکھنے سے پہلے ان پر واضح کر دیا کہ میں تمہارے سامنے جو ہدایت و ضابطہ رکھنے والا ہوں میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے والدین سے مشورہ کا حکم اس لئے دیا کہ حضرت عائشہؓ اگرچہ سب سے زیادہ سمجھدار اور عقل مند تھیں مگر بہر حال صغیر السن تھیں آپ ﷺ کو یہ خوف تھا کہ کہیں عائشہؓ کم عمری کے جذبات میں نہ بہہ جائیں اور وہ دنیا کی عیش و عشرت کی خاطر مجھے چھوڑ کر آخرت کی ابدی سعادتوں سے منہ نہ موڑ لیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس سے صرف عائشہؓ ہی کو نقصان اور تباہی سے دو چار ہونا نہیں پڑے گا، بلکہ ان کے والدین کو بھی سخت اذیت اور تکلیف پہنچے گی لیکن اگر اس معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ کریں گی تو وہ انہیں وہی صلاح دیں گے جو ان کی دنیا اور ان کے دین کی بھلائی اور بہتری کے مطابق ہوگی۔ مگر یہ حضرت عائشہؓ کی فطری سعادت کی بات تھی کہ انہوں نے اپنے والدین کے مشورہ کے بغیر اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ میں دنیا کی آرام دہ زندگی پر آخرت کی ابدی سعادتوں کو ترجیح دیتی ہوں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی و منشاہی کو اختیار کرتی ہوں۔

حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ سے یہ جو درخواست کی کہ میں نے آپ ﷺ کو جو کچھ جواب دیا ہے وہ آپ ﷺ اپنی کسی اور بیوی سے ذکر نہ کریں تو ان کا یہ خیال تھا کہ شاید اس موقعہ پر کوئی بیوی آپ ﷺ کے فقر پر راضی نہ ہو کہ دنیا کی آرام دہ زندگی کے لئے آپ ﷺ سے علیحدہ ہو جائے اس لئے انہوں نے سوچا کہ اگر کسی بیوی کو میرے اس ایمان و یقین سے بھرپور فیصلہ کا علم ہوا تو شاید اسے بھی راہنمائی مل جائے اور وہ بھی ایسا ہی فیصلہ کرے لیکن اگر میرے اس فیصلہ سے لاعلمی رہے گی تو بہت ممکن ہے کہ کوئی بیوی دنیا کے عیش و آرام کو آنحضرت ﷺ کی پر مشقت رفاقت پر ترجیح دے اس لئے اچھا ہی ہوگا اگر کوئی بیوی آنحضرت ﷺ کے نکاح سے نکل جائے گویا حضرت عائشہؓ کی اس خواہش کا محرک آنحضرت ﷺ سے ان کی وہ بے پناہ محبت تھی جس میں وہ کسی دوسری عورت کو شریک دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھیں۔ لیکن بہر حال رسول کریم ﷺ کی نظر میں تمام بیویوں کی بھلائی و برائی یکساں حیثیت رکھتی تھی، آپ ﷺ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ایک بیوی تو آخرت کی سعادتوں سے نوازی جائے اور دوسری بیوی دنیا کو اختیار کر کے تباہی کے راستہ پر لگ جائے چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کی اس درخواست کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان پر واضح کر دیا، کہ مجھ سے جو بھی بیوی پوچھے گی میں اس کو بتا دوں گا کیونکہ اس کی بھلائی اسی میں پوشیدہ ہے اگر میں کسی کو نہ بتاؤں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اس کے تئیں شفقت کا رویہ نہیں اپنایا اور اس کو وہ راستہ نہیں دکھایا جو اس کی راحت، اس کی بھلائی اور اسکی اخروی فلاح کے لئے ضروری ہے حالانکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس لئے مبعوث نہیں کیا ہے کہ میں لوگوں کے حق میں بدخواہی کروں یا کسی کو تکلیف و مصیبت اور رنج و غم میں مبتلا کروں اس دنیا میں اس لئے آیا ہوں کہ کائنات انسانی کے ہر فرد کو دنیا و آخرت کی بھلائی کی تعلیم دوں اور ہر انسان کو اس کے دینی و دنیاوی معاملات میں آسانی و سہولت کی راہ دکھاؤں۔

(۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَغَارُ عَلَى اللَّائِي وَهَبْنَ اَنْفُسَهُنَّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اَتَهَبُ الْمَرْاَةُ نَفْسَهَا فَلَمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى تُرْجِىْ مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِىْ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ قُلْتُ مَا اَرٰى رَبَّكَ اِلَّا يُسَارِعُ فِيْ هَوَاكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں ان عورتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی جو اپنے نفس کو رسول اللہ ﷺ کے لئے ہبہ کر دیتی تھیں

چنانچہ میں کہا کرتی تھی کہ کوئی عورت اپنا نفس ہبہ کر سکتی ہے؟ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی۔ "(اے محمد ﷺ) ان عورتوں میں سے جس کو آپ (ﷺ) چاہیں علیحدہ کر دیں اور جس کو چاہیں اپنے پاس جگہ دیں اور جن عورتوں کو آپ (ﷺ) نے علیحدہ کر دیا ہے اگر ان میں سے بھی کسی کو آپ بلائیں تو کوئی گناہ نہیں"، تو میں نے (آنحضرت ﷺ سے) کہا کہ میں دیکھتی ہوں کہ آپ (ﷺ) کا پروردگار آپ (ﷺ) کی مرضی و خواہش کو جلد پورا کر دیتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جو عورتیں اپنا نفس آنحضرت ﷺ کو ہبہ کر دیتی تھیں ان کو حضرت عائشہؓ اس لئے اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھیں کہ کسی عورت کا اپنے نفس کو کسی غیر مرد کو ہبہ کر دینا گویا عورت کی عزّت و شرف کے منافی ہے اور اس کی حرص و قلّت حیاء پر دلالت کرتا ہے اگرچہ جو عورتیں آنحضرت ﷺ کو اپنا نفس ہبہ کر دیتی تھیں ان عورتوں کے نقطۂ نظر سے اور واقعۃً بھی ان کا یہ ہبہ ان کے لئے باعث عزت ہوتا تھا جسے وہ اپنی خوش قسمتی تصور کرتی تھیں۔

"کوئی عورت اپنا نفس ہبہ کر سکتی ہے" حضرت عائشہؓ یہ بات ان عورتوں کے ہبہ کی مخالفت میں کہا کرتی تھیں جس سے ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کسی عورت کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنا نفس کسی غیر مرد کو ہبہ کر دے اور ایک روایت میں حضرت عائشہؓ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ کیا عورت اپنا نفس ہبہ کرتے ہوئے کوئی شرم و حیا محسوس نہیں کرتی؟

مذکورہ آیت کا مطلب یا تو یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنی ازواج میں سے جس کو چاہیں اپنا ہم بستر بنائیں اور جس کو چاہیں اپنے سے الگ رکھیں یا یہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ اپنی ازواج میں سے جس کو چاہیں اپنے نکاح میں باقی رکھیں اور جس کو چاہیں اپنے نکاح سے الگ کر دیں یعنی طلاق دے دیں اور یا یہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ اپنی اُمت کی عورتوں میں جس سے چاہیں نکاح کر لیں اور جس سے چاہیں نکاح نہ کریں۔

اور امام بغویؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت دراصل اس آیت لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ کی ناسخ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کی وفات تک آپ ﷺ کے لئے ازواج مطہرات کے علاوہ اور بھی عورتیں مباح رکھی تھیں۔

مشہور مفسر امام بغویؒ یہ فرماتے ہیں کہ (حدیث میں مذکورہ آیت کے بارہ میں) سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ آیت دراصل آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کی باری کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی جس کی تفصیل یہ ہے کہ اپنی بیویوں کے لئے باری مقرر کرنا پہلے آنحضرت ﷺ پر بھی واجب تھا لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو یہ وجوب آپ کے حق میں ساقط ہو گیا اور آپ ﷺ کو اختیار مل گیا کہ اپنی بیویوں کو آپ ﷺ نے باری سے الگ کر دیا ہے اور ان میں سے بھی کسی کو اپنے پاس بلانا اور ہم بستر ہونا چاہیں تو آپ ﷺ ایسا کر سکتے ہیں اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اُمت کے دوسرے مردوں پر آپ ﷺ کی فضیلت و برتری ظاہر کرتے ہوئے اپنی بیویوں کے لئے باری مقرر کرنے کے حکم پر عمل نہ کرنا آپ ﷺ کے لئے مباح کر دیا کہ جس بیوی کے بارہ میں آپ (ﷺ) کی خواہش ہو اسے آپ (ﷺ) اس کی باری کے علاوہ بھی اپنا ہم بستر بنا سکتے ہیں اور اگر آپ (ﷺ) اپنی کسی بیوی کو اس باری میں بھی اپنے پاس سلانا نہ چاہیں تو آپ (ﷺ) کے لئے اس کی بھی اجازت ہے۔

مَا أَرَىٰ رَبَّكَ الخ کے معنی یہ ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ آپ (ﷺ) جس چیز کی خواہش کرتے ہیں آپ (ﷺ) کا پروردگار اسے جلد پورا کر دیتا ہے۔ علامہ نوویؒ کہتے ہیں اس بات سے حضرت عائشہؓ کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ بعض احکام کی پابندی کو آپ ﷺ کے حق میں نرم کر دیتا ہے اور آپ ﷺ کو اس پر عمل نہ کرنے کی آسانی فرما دیتا ہے اسی لئے مذکورہ بالا معاملہ میں بھی آپ ﷺ کو اپنی مرضی و خواہش کے مطابق عمل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون خاتون تھیں جنہوں نے اپنا نفس آپ ﷺ کو ہبہ کیا تھا؟ چنانچہ بعض علماء کے قول کے مطابق وہ حضرت میمونہؓ تھیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ حضرت اُمّ شریک تھیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ تھیں اور

بعض نے کہا ہے کہ خولہؓ بنت حکیم تھیں لیکن اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایک خاتون نہیں تھیں بلکہ وہ کئی عورتیں تھیں:

وَحَدِيْثُ جَابِرٍ اتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ ذُكِرَ فِي قِصَّةِ حَجَّةِ الْوَدَاعِ۔

"اور حضرت جابرؓ کی حدیث اتقوا اللّٰہ فی النساء الخ حجۃ الوداع کے بیان میں نقل کی جاچکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اپنی بیویوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا حسن معاشرت

(۱۴) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا كَانَتْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ قَالَتْ فَسَابَقْتُهُ فَسَبَقْتُهُ عَلٰى رِجْلَيَّ فَلَمَّا حَمَلْتُ اللَّحْمَ فَسَابَقْتُهُ فَسَبَقَنِي قَالَ هٰذِهٖ بِتِلْكَ السَّبْقَةِ۔ (رواه ابوداؤد)

"حضرت عائشہؓ جو ایک سفر میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ تھیں، کہتی ہیں کہ (اس سفر میں ایک موقع پر) میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ اپنے پیروں کے ذریعہ دوڑی (یعنی ہم دونوں نے دوڑ میں باہم مقابلہ کیا) اور میں آپ ﷺ سے آگے نکل گئی پھر جب میں (عرصہ دراز کے بعد) فربہ ہوگئی تو پھر ہم دونوں کی دوڑ ہوئی اور اس مرتبہ آنحضرت ﷺ مجھ سے آگے نکل گئے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس مرتبہ میرا آگے نکل جانا پہلی مرتبہ تمہارے آگے نکل جانے کے بدلہ میں ہے (یعنی پہلی مرتبہ تم جیت گئی تھیں اس مرتبہ میں جیت گیا لہٰذا دونوں برابر رہے)۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "اپنے پیروں کے ذریعہ" سے اس بات کو مؤکد کرنا مقصود ہے کہ میں کسی سواری پر بیٹھ کر نہیں دوڑی تھی بلکہ اپنے پیروں پر دوڑی تھی چنانچہ طیبیؒ نے یہی فرمایا ہے کہ اس جملہ سے تاکید مقصود ہے جیسا کہ کوئی یوں کہے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ یا میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

یہ روایت اپنی بیویوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے حسن معاشرت کی ایک مثال ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی ازواج کے ساتھ ایک مسرت اور خوشگوار زندگی بسر کرتے تھے اور اپنی بیویوں کے حق میں انتہائی مہربان اور ہنس مکھ تھے۔ نیز اس روایت میں اُمت کے لئے بھی یہ سبق ہے کہ اپنی عائلی زندگی میں آنحضرت ﷺ کے اس حسن معاشرت کی پیروی کی جائے اور اپنی بیویوں کے ساتھ ہنسی خوشی اور باہمی پیار و محبت کے ساتھ رہا جائے۔

قاضی خانؒ فرماتے ہیں کہ سباق یعنی باہمی دوڑ وغیرہ کا مقابلہ چار چیزوں میں جائز ہے اونٹ میں، گھوڑنے خچر میں، تیر اندازی میں اور پیادہ پا چلنے دوڑنے میں۔ نیز یہ مقابلہ اگر کسی شخص سے کسی شرط کے ساتھ ہو تو وہ ایسی صورت میں جائز ہوگا جب کہ دونوں مقابل میں سے صرف ایک طرف سے شرط ہو یعنی مثلاً زید اور بکر کے درمیان مقابلہ ہوا اور زید بکر سے یہ کہے کہ اگر میں جیت گیا تو میں اتنے روپیہ یا فلاں چیز لے لوں گا۔ اور اگر میرے مقابلہ میں تم جیت گئے تو تمہیں کچھ نہیں ملے گا اور اگر دونوں طرف سے شرط ہو یعنی دونوں مقابل ایک دوسرے کے ساتھ یہ شرط کریں کہ ہم دونوں میں سے جو بھی جیت جائے گا اسے اتنے روپے یا فلاں چیز ملے گی تو یہ حرام ہے کیونکہ یہ جوا ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر دونوں مقابل ایک محلل کو (یعنی دونوں کی شرط حلال کرانے والے ایک تیسرے شخص کو اپنے میں شامل کریں تو اس صورت میں دونوں طرف سے شرط بھی جائز ہو جائے گی، محلل کو اپنے میں شامل کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً زید اور بکر آپس میں یہ شرط کریں کہ ہماری باہمی دوڑ میں ہم دونوں سے جو بھی آگے نکل جائے گا تو اتنے روپے یا فلاں چیز اسے مل جائے گی اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک تیسرے شخص مثلاً خالد کو بھی اپنی دوڑ میں شامل کرلیں اور یہ طے ہو جائے کہ اگر یہ تیسرا شخص یعنی خالد آگے نکل جائے گا تو

اسے کچھ نہیں ملے گا۔ لہٰذا یہ صورت جائز ہے اور حلال ہے لیکن جائز ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں جیتنے والے کو جو چیز ملے گی وہ اس کے حق میں حلال اور طیب مال ہو گا نہ یہ کہ وہ اس چیز کا شرعی طور پر کوئی استحقاق رکھے گا کیونکہ شریعت کی نظر میں جیتنے والا محض اس مقابلہ سے اس روپیہ پر کوئی قانونی حق نہیں رکھتا دوڑ کے انعامی مقابلے جائز ہیں یعنی کسی فرد یا ادارہ کی طرف سے بطور انعام کچھ روپے یا کوئی چیز مقرر کر کے دوڑنے والوں سے کہا جاتا ہے کہ تم میں سے جو شخص بھی آگے نکل جائے گا اسے یہ روپے یا چیز دی جائے گی فقہاء نے اسے جائز کہا ہے۔

اپنے اہل و عیال کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا بہترین شخص ہے

(۱۵) وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي وَإِذَا مَاتَ صَاحِبُكُمْ فَدَعُوْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اِلٰى قَوْلِهٖ لِأَهْلِي۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل (بیوی) بچوں، اقرباء اور خدمت گاروں کے حق میں بہترین ہو اور میں اپنے اہل کے حق میں تم میں بہترین ہوں (یعنی اپنے اہل و عیال سے جتنا بہتر سلوک میں کرتا ہوں اپنے اہل و عیال کے ساتھ اتنا بہتر سلوک تم میں سے کوئی بھی نہیں کرتا) اور جب تمہارا صاحب مرجائے تو اس کو چھوڑ دو" (ترمذیؒ و دارمیؒ) اور ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت ابن عباسؓ سے لفظ لِأَهْلِي تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کے معنی یہ ہیں کہ خدا اور خدا کی مخلوق کے نزدیک تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنی بیوی اپنے بچوں، اپنے عزیزوں و اقارب اور اپنے خدمت گاروں و ماتحتوں کے ساتھ بھلائی اور اچھا سلوک کرتا ہے کیونکہ اس کا بھلائی اور اچھا سلوک کرنا اس کی خوش اخلاقی و خوش مزاجی پر دلالت کرتا ہے۔

"اور جب تمہارا صاحب مرجائے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا کوئی عزیز و رشتہ دار یا دوست وغیرہ مرجائے تو اس کی برائیوں کو ذکر کرنا چھوڑ دو۔ گویا اس جملہ کے ذریعہ یہ تعلیم مقصود ہے کہ جو لوگ اس دنیا سے اٹھ چکے ہیں ان کی غیبت نہ کرو۔ جیسا کہ ایک روایت میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ "اپنے مرے ہوئے لوگوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کرو" یعنی صرف ان کی خوبیاں ہی ذکر کرو ان کی برائیوں کا تذکرہ نہ کرو۔

بعض علماء نے اس جملہ کی یہ مراد بیان کی ہے کہ جب کوئی شخص مرجائے تو اس کی محبت اور اس کی موت پر رونا دھونا چھوڑ دو اور یہ سمجھ لو کہ اب اس کے ساتھ تمہارا کوئی جسمانی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس جملہ میں "صاحب" سے اپنی ذات مبارک مراد رکھی ہے جس کا مطلب اُمت کو یہ تلقین کرنا ہے کہ جب میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو تم تاسف اور تحیر و اضطراب کا اظہار نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے جس ذات پاک نے میری حیات کو تمہاری ہدایت و سعادت کا ذریعہ بنایا تھا، وہی ذات پاک میرے انتقال کے بعد بھی تمہیں اسی ہدایت و سعادت پر قائم رکھے گی۔

بعض حضرات نے اس جملہ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جب میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو تم مجھے چھوڑے رکھنا بایں معنی کہ میرے اہل بیت، میرے صحابہ اور میری شریعت کے متبعین یعنی علماء و اولیاء کو ایذا پہنچا کر مجھے ایذا پہنچانے کا سبب نہ بننا کیونکہ اگر تم انہیں تکلیف و ایذا پہنچاؤ گے تو ان کی تکلیف سے مجھے تکلیف پہنچے گی۔

فرمانبردار بیوی کو جنت کی بشارت

(۱۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَرْأَةُ اِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَاَحْصَنَتْ

فَرْجَهَا وَاَطَاعَتْ بَعْلَهَا فَلْتَدْخُلْ مِنْ اَيِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ۔ رَوَاهُ اَبُوْنُعَيْمٍ فِى الْحِلْيَةِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس عورت نے (اپنی پاکی کے دنوں میں پابندی کے ساتھ) پانچوں وقت کی نماز پڑھی، رمضان کے (ادا اور قضاء) روزے رکھے، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی (یعنی فواحش اور بری باتوں سے اپنے نفس کو محفوظ رکھا) اور اپنے خاوند کی (ان چیزوں میں) فرمانبرداری کی (جن میں فرمانبرداری کرنا اس کے لئے ضروری ہے) تو (اس عورت کے لئے یہ بشارت ہے کہ) وہ جس دروازہ سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے" اس روایت کو ابونعیم نے حلیۃ الابراء میں نقل کیا ہے۔"

اگر غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو خاوند کو بیوی کا مسجود قرار دیا جاتا

⑰ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْكُنْتُ اٰمُرُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر میں کسی کو یہ حکم کر سکتا کہ وہ کسی (غیر اللہ) کو سجدہ کرے تو میں یقیناً عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ رب معبود کے علاوہ اور کسی کو سجدہ کرنا درست نہیں ہے اگر کسی غیر اللہ کو سجدہ کرنا درست ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے کیونکہ بیوی پر اس کے خاوند کے بہت زیادہ حقوق ہیں جن کی ادائیگی شکر سے وہ عاجز ہے گویا اس ارشاد گرامی میں اس بات کی اہمیت و تاکید کو بیان کیا گیا ہے کہ بیوی پر اپنے شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری واجب ہے۔

شوہر کی خوشنودی کی اہمیت

⑱ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا امْرَاَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو عورت اس حال میں مرے کہ اس کا شوہر اس سے راضی و خوش ہو، تو وہ جنت میں داخل ہوگی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جو شوہر عالم و متقی ہو اس کی رضامندی اور خوشنودی کا یہ اجر بیان کیا گیا ہے، فاسق و جاہل شوہر کی رضامندی خوشنودی کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

شوہر کی اطاعت کرو

⑲ وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا الرَّجُلُ دَعَا زَوْجَتَهٗ لِحَاجَتِهٖ فَلْتَاْتِهٖ وَاِنْ كَانَتْ عَلَى التَّنُّوْرِ۔ (رواہ الترمذیؒ)

"اور حضرت طلق ابن علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے (یعنی جماع کے لئے) بلائے تو بیوی کو شوہر کے پاس پہنچ جانا چاہئے اگرچہ وہ چولہے کے پاس ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اگرچہ وہ چولہے کے پاس ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اگر بیوی کسی ضروری کام میں مشغول ہو اور کسی چیز کے نقصان کا احتمال بھی ہو تب بھی شوہر کی اطاعت کی جائے اور اس کے بلانے پر فوراً اس کے پاس پہنچ جانا چاہئے مثلاً بیوی چولہے کے پاس ہو اور روٹی توے پر ڈال رکھی ہو اور اسی حالت میں شوہر جماع کے لئے بلائے تو اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ آٹے روٹی کا نقصان ہو جائے گا شوہر کے حکم کی

فرمانبرداری کرتے ہوئے اس کے پاس پہنچ جائے۔

شوہر کو تکلیف مت پہنچاؤ

(۲۰) وَعَنْ مُعَاذٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُؤْذِي امْرَأَةٌ زَوْجَهَا فِي الدُّنْيَا اِلَّا قَالَتْ زَوْجَتُهُ مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ لَا تُؤْذِيْهِ قَاتَلَكِ اللّٰهُ فَاِنَّمَا هُوَ عِنْدَكِ دَخِيْلٌ يُوْشِكُ اَنْ يُفَارِقَكِ اِلَيْنَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت معاذؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب کوئی عورت دنیا میں اپنے شوہر کو تکلیف پہنچاتی ہے تو اس کی (جنت والی) بیوی یعنی بڑی آنکھوں والی حور کہتی ہے کہ تجھ پر اللہ کی مار پڑے (یعنی اللہ تجھے جنت اور اپنی رحمت سے دور رکھے) اپنے شوہر کو تکلیف نہ پہنچا کیونکہ وہ (دنیا میں) تیرا مہمان ہے جو جلد ہی تجھ سے جدا ہو کر ہمارے پاس (جنت میں) آئے گا" (ترمذیؒ) امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: ایک دوسری روایت میں یوں فرمایا گیا ہے کہ لَعَنَ الْمَلَائِكَةُ لِعَاصِيَةِ الزَّوْجِ یعنی فرشتے اس عورت پر لعنت بھیجتے ہیں جو اپنے شوہر کی نافرمانی کرتی ہے ان دونوں روایتوں سے جہاں شوہر کی نافرمانی کرنے یا اس کو تکلیف پہنچانے کی سخت برائی ثابت ہو رہی ہے وہیں یہ بھی واضح ہوا کہ اس دنیا میں انسان جو کچھ کرتا ہے وہ ملاء اعلی یعنی آسمان کے رہنے والوں کے علم میں آجاتا ہے۔

شوہر پر بیوی کا حق

(۲۱) وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ الْقُشَيْرِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَقُّ زَوْجَةِ اَحَدِنَا عَلَيْهِ قَالَ اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوْهَا اِذَا اكْتَسَيْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ۔ (رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت حکیم ابن معاویہ قشیری اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہم میں سے کسی کی بیوی کا اس کے شوہر پر کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کہ جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ جب تم پہنو تو اس کو بھی پہناؤ (یعنی جس طرح تم کھاؤ پہنو اسی طرح اپنی بیوی کو بھی کھلاؤ پہناؤ۔) اس کے منہ پر نہ مارو نہ اس کو برا کہو اور نہ یہ کہو کہ اللہ تیرا برا کرے اور اس سے صرف گھر کے اندر ہی علیحدگی اختیار کرو۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: بطور خاص منہ پر نہ مارنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ تمام اعضاء میں منہ ہی افضل ہے اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کسی معقول وجہ کی بنیاد پر مثلاً فواحش کے صدور پر یا فرائض ترک کر دینے پر اور یا مصلحت تادیب کے پیش نظر منہ کے علاوہ کسی اور جگہ پر مارے تو جائز ہے اور منہ پر مارنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

خاوند اپنی بیوی کو تادیباً مار سکتا ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مرد و عورت انسانی نقطۂ نظر سے یکساں مرتبہ کے حامل ہیں اور اسلام کی نظر میں عورت کو بھی وہی شرف و مرتبہ حاصل ہے جو ایک مرد کو ہوتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جب ایک مرد اور ایک عورت آپس میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر ایک دوسرے کے رفیق حیات بن جاتے ہیں تو ان دونوں کی شرعی اور معاشرتی حیثیت میں تھوڑا سا فرق ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ خاوند کو قدرتی طور پر ایک مخصوص قسم کی برتری حاصل ہو جاتی ہے جس کا تعلق انسانی شرف و مرتبہ کے فرق و امتیاز سے نہیں ہوتا بلکہ ان کے باہمی رشتہ کے تقاضوں اور ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی سے ہوتا ہے چنانچہ شوہر اپنی اسی مخصوص برتری کی بنیاد پر بیوی کو ان معاملات میں اپنے حکم کا پابند بنانے کا اختیار رکھتا ہے جن کا شریعت نے اسے استحقاق عطا کیا ہے یا جن کا تعلق شرعی فرائض و واجبات

کی ادائیگی سے ہے لہٰذا اگر کوئی بیوی ان معاملات میں اپنے شوہر کے حکم کی پابندی نہ کرے اور شوہر کے کہنے سننے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا ہو، یعنی زبانی نصیحت و تنبیہ کا کوئی اثر قبول نہ کرتی ہو اور شوہر کو یقین ہو جائے کہ اب یہ بغیر سختی کے راہ راست پر نہیں آئے گی تو اسے بیوی کو مارنے کی اجازت ہو گی لیکن اس بارہ میں یہ بات ملحوظ ہونی چاہئے۔ کہ بیوی کی ایسی نافرمانی کہ جس پر اس کا شوہر اس کو مار سکتا ہے صرف انہی امور میں معتبر ہو گی جن کی شریعت نے وضاحت کر دی چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو چار باتوں پر مار سکتا ہے۔

① شوہر کی خواہش و حکم کے باوجود بیوی زینت و آرائش نہ کرے۔

② شوہر جماع کا خواہش مند ہو مگر بیوی کوئی عذر (جیسے حیض وغیرہ) نہ ہونے کے باوجود انکار کر دے۔

③ اسلامی فرائض جیسے نماز پڑھنا چھوڑ دے، جنابت و ناپاکی کے بعد بیوی کا نہ نہانا بھی ترک فرائض کے حکم میں ہے یعنی اگر بیوی ناپاکی اور حیض کا غسل کرنے سے انکار کرتی ہو تو شوہر اس پر بھی مار سکتا ہے۔

④ بیوی کو اپنے شوہر کی اجازت و رضامندی کے بغیر گھر سے باہر جاتی ہو۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر بیوی کی کسی نافرمانی یا اس کی کسی بات پر ناراضگی کی وجہ سے اس سے جدائی اختیار کرنے ہی میں مصلحت ہو تو ہمیشہ کے لئے جدائی اختیار کرنے کی بجائے یہ زیادہ بہتر ہے کہ اپنے بستر پر اس سے جدائی اختیار کر لو یعنی ان کے ساتھ لیٹنا چھوڑ دو اور رات کو گھر میں نہ رہو تاکہ وہ تمہارے اس طرز عمل کو اپنے حق میں سزا سمجھ کر راہ راست پر آجائے اور ہمیشہ کی جدائی یعنی طلاق کی نوبت نہ آئے چنانچہ قرآن کریم میں اس بات کو یوں فرمایا گیا ہے کہ:

وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ط۔ (النساء ۴:۳۴)

"اگر جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بدماغی (یعنی نافرمانی) کا احتمال ہو تو ان کو (پہلے) زبانی نصیحت کرو اور پھر ان کو ان کے لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو۔ (یعنی ان کے پاس مت لیٹو) اور (پھر اعتدال سے) ان کو مارو۔"

بدزبان بیوی کو طلاق دے دو

(۲۲) وَعَنْ لَقِيْطِ بْنِ صَبِرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيَ امْرَأَةً فِيْ لِسَانِهَا شَيْءٌ يَعْنِي الْبَذَاءَ قَالَ طَلِّقْهَا قُلْتُ اِنَّ لِيْ مِنْهَا وَلَدًا وَلَهَا صُحْبَةٌ قَالَ فَمُرْهَا يَقُوْلُ عِظْهَا فَاِنْ يَكُ فِيْهَا خَيْرٌ فَسَتَقْبَلُ وَلَا تَضْرِبَنَّ ظَعِيْنَتَكَ ضَرْبَكَ اُمَيَّتَكَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت لقیط ابن صبرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری ایک عورت ہے جس کی زبان میں کچھ ہے یعنی وہ زبان دراز ہے اور فحش بکتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا۔ (اگر تم اس کی زبان درازی اور فحش گوئی کی ایذاء پر صبر نہیں کر سکتے تو بہتر یہ ہے کہ) تم اس کو طلاق دے دو (گویا آپ ﷺ نے یہ حکم بطور اباحت دیا) میں نے عرض کیا کہ اس (کے بطن) سے میرے ہاں اولاد ہے اور اس کے ساتھ (پرانی رفاقت اور) صحبت ہے (اس لئے اس کو طلاق دینا بھی میرے لئے مشکل ہے) آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر اس کو حکم کرو، یعنی اس کو زبان درست کرنے اور اپنی عادات و اطوار ٹھیک کرنے کی) نصیحت کرو، اگر اس میں کچھ بھی بھلائی ہو گی تو وہ تمہاری نصیحت کو قبول کر لے گی اور اس کو لونڈی کی مار نہ مارو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: يَقُوْلُ عِظْهَا کے الفاظ راوی کے ہیں جن کے ذریعہ وضاحت مقصود ہے کہ اس ارشاد فَمُرْهَا (تو پھر اس کو حکم کرو) سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اس کو نصیحت کرو۔

حدیث کے آخری جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ پہلے اپنی بیوی کو زبانی نصیحت و تنبیہ کے ذریعہ زبان درازی اور فحش گوئی سے باز

رکھنے کی کوشش کرو اگر اس پر زبانی نصیحت و تنبیہ کا کوئی اثر نہ ہو تو پھر اس کو مارو لیکن بے رحمی کے ساتھ نہ مارو بلکہ ہلکے سے اور تھوڑا سا مارو۔

عورتوں کو مارنے کی ممانعت

(۲۳) وَعَنْ اِیَاسِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَضْرِبُوْا اِمَاءَ اللّٰہِ فَجَاءَ عُمَرُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ذَئِرْنَ النِّسَاءُ عَلٰی اَزْوَاجِھِنَّ فَرَخَّصَ فِیْ ضَرْبِھِنَّ فَاَطَافَ بِاٰلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نِسَاءٌ کَثِیْرٌ یَشْکُوْنَ اَزْوَاجَھُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَقَدْ طَافَ بِاٰلِ مُحَمَّدٍ نِسَاءٌ کَثِیْرٌ یَشْکُوْنَ اَزْوَاجَھُنَّ لَیْسَ اُولٰٓئِکَ بِخِیَارِکُمْ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ایاس ابن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "خدا کی لونڈیوں (یعنی اپنی بیویوں) کو نہ مارو۔" پھر (اس حکم کے کچھ دنوں بعد) حضرت عمرؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ (آپ (ﷺ) نے چونکہ عورتوں کو مارنے سے منع فرمایا ہے اس لئے) عورتیں اپنے خاوند پر دلیر ہو گئی ہیں، آپ ﷺ نے عورتوں کو مارنے کی اجازت عطا فرمادی، اس کے بعد بہت سی عورتیں رسول کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے پاس جمع ہوئیں اور اپنے خاوندوں کی شکایت کی (کہ وہ ان کو مارتے ہیں) رسول کریم ﷺ (کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ) نے فرمایا محمد (ﷺ) کی بیویوں کے پاس بہت سی عورتیں اپنے خاوندوں کی شکایت لے کر آئی ہیں، یہ لوگ (جو اپنی بیویوں کو مارتے ہیں) تم میں سے بہتر لوگ نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو بہت مارتے ہیں یا مطلق مارتے ہیں تم میں کے بہتر لوگ نہیں ہیں بلکہ بہتر لوگ وہی ہیں جو اپنی بیویوں کو نہیں مارتے ان کی ایذاء اور تکلیف دہی پر صبر و تحمل کرتے ہیں یا ان کو اتنا زیادہ نہیں مارتے جو ان کی شکایت کا باعث ہو بلکہ بطور تادیب تھوڑا سا مار دیتے ہیں۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اس روایت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی بیوی اپنے شوہر کے حقوق نکاح کی ادائیگی سے انکار کرے تو اس کو مارنا مباح ہے لیکن بہت نہیں مارنا چاہیے۔

پچھلے صفحات میں حضرت حکیم ابن معاویہؓ کی جو روایت (۲۰) گزری ہے اور اس کی تشریح میں جو آیت نقل کی گئی ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بطور تادیب اپنی بیویوں کو مارنے کی اجازت دی گئی ہے جب کہ اس روایت سے اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے؟ گویا دونوں میں بظاہر تضاد و تعارض معلوم ہوتا ہے لہٰذا اس تضاد و تعارض کو حضرت امام شافعیؒ سے منقول اس وجہ تطبیق کے ذریعہ ختم کیا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے عورتوں کو مارنے سے منع کیا ہوگا پھر جب عورتیں شوہروں پر غالب ہو گئیں اور ان کی جرأت و دلیری بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے ان کو مارنے کی اجازت دے دی اور آپ ﷺ کے حکم کی توثیق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن اس کے بعد جب عورتوں کی طرف سے یہ شکایت کی گئی کہ ان کے خاوند ان کو بہت مارتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ اگرچہ بیوی کی بداطواری پر اس کو مارنا مباح ہے لیکن اس کی بداطواری پر صبر و تحمل کرنا اور ان کو نہ مارنا ہی بہتر اور افضل ہے۔

بیوی کو اس کے خاوند کے خلاف بہکانے کی مذمت

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ خَبَّبَ اِمْرَاَۃً عَلٰی زَوْجِھَا اَوْ عَبْدًا عَلٰی سَیِّدِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ شخص ہمارے تابعداروں میں سے نہیں ہے جو کسی عورت کو اس کے

خاوند کے خلاف یا کسی غلام کو اس کے آقا کے خلاف بدراہ کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: کسی بیوی کو اس کے خاوند کے خلاف یا کسی غلام ولونڈی کو اس کے مالک کے خلاف گمراہ کرنا انتہائی نازیبا فعل ہے، چنانچہ اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ وہ شخص ہمارے تابعداروں میں سے نہیں ہے جو کسی بیوی کا دل اس کے خاوند کی طرف سے برا کرے مثلاً بیوی کے سامنے اس کے خاوند کی برائی کرے یا اس کے سامنے کسی اجنبی شخص کی خوبیاں اور بڑائیاں بیان کرے۔ یا اس کو بہکائے کہ اپنے خاوند سے زیادہ مال و اسباب کا مطالبہ کرو، یا اپنے شوہر کی خدمت و اطاعت نہ کرو، اسی طرح کسی غلام و نوکر کو بہکائے کہ تم اپنے مالک کا گھر چھوڑ کر چلے جاؤ یا اس کی خدمت میں کوتاہی کرو۔ اسی طرح بیوی کے خلاف خاوند کو یا لونڈی کو اس کے مالک کے خلاف یا مالک کو اس کے غلام ولونڈی کے خلاف بہکانا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

اپنے اہل و عیال کے حق میں کمال مہربانی، کمال ایمان کی دلیل ہے

(۲۵) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَكْمَلِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنَهُمْ خُلُقًا وَاَلْطَفُهُمْ بِاَهْلِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمنین میں کامل ترین ایمان اس شخص کا ہے جو خوش اخلاق ہو اور اپنے اہل و عیال پر بہت مہربان ہو۔" (ترمذی)

تشریح: خوش اخلاق اور اپنے اہل و عیال پر بہت مہربان مسلمان کو کامل ترین مومن اس لئے فرمایا گیا ہے کہ کمال ایمان، خوش اخلاقی اور مخلوق خدا بالخصوص اپنے اہل و عیال کے حق میں سراپا مہربان و خوش اخلاق ہوگا۔

(۲۶) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ، رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ اِلٰى قَوْلِهٖ خُلُقًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مؤمنین میں کامل ترین ایمان اس شخص کا ہے جو ان میں بہت زیادہ خوش اخلاق ہو (یعنی پوری مخلوق خدا کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرے) اور تم میں بہتر وہ شخص ہے جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہے (کیونکہ عورتیں اپنے عجز و کمزوری کی بناء پر زیادہ مہربانی اور مروت کی مستحق ہیں) امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے نیز امام ابوداؤدؒ نے اس روایت کو لفظ خُلُقًا تک نقل کیا ہے۔"

حضرت عائشہؓ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا ایک پُرلطف واقعہ

(۲۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ اَوْ حُنَيْنٍ وَفِيْ سَهْوَتِهَا سِتْرٌ فَهَبَّتْ رِيْحٌ فَكَشَفَتْ نَاحِيَةَ السِّتْرِ عَنْ بَنَاتٍ لِعَائِشَةَ لُعَبٍ فَقَالَ مَا هٰذَا يَا عَائِشَةُ قَالَتْ بَنَاتِيْ وَرَاٰى بَيْنَهُنَّ فَرَسًا لَهٗ جَنَاحَانِ مِنْ رِقَاعٍ فَقَالَ مَا هٰذَا الَّذِيْ اَرٰى وَسْطَهُنَّ؟ قَالَتْ فَرَسٌ قَالَ وَمَا الَّذِيْ عَلَيْهِ قَالَتْ جَنَاحَانِ قَالَ فَرَسٌ لَهٗ جَنَاحَانِ؟ قَالَتْ اَمَا سَمِعْتَ اَنَّ لِسُلَيْمَانَ خَيْلًا لَهَا اَجْنِحَةٌ قَالَتْ فَضَحِكَ حَتّٰى رَاَيْتُ نَوَاجِذَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ غزوۂ تبوک یا غزوۂ حنین سے واپس گھر تشریف لائے تو (اس وقت) ان کے (یعنی عائشہؓ کے) گھر کے دریچہ پر پردہ پڑا ہوا تھا، جب ہوا چلی تو اس پردہ کا ایک کونا کھل گیا جس نے عائشہؓ کے کھیلنے کی گڑیاں نظر آئیں (جو اس دریچہ میں رکھی ہوئی تھیں آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ "عائشہؓ یہ کیا ہے" عائشہؓ نے کہا کہ "یہ میری گڑیاں ہیں" ان گڑیوں میں آنحضرت ﷺ نے ایک گھوڑا بھی دیکھا جس کے کپڑے یا کاغذ کے دو پر تھے چنانچہ آپ ﷺ نے پھر پوچھا کہ ان گڑیوں کے درمیان جو

چیز میں دیکھ رہا ہوں یہ کیا بات ہے؟ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ "کیا آپ ﷺ نے نہیں سنا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو گھوڑے تھے ان کے پر تھے) "حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ (میرا یہ جواب سن کر) ہنس پڑے یہاں تک کہ میں نے آپ ﷺ کی کچلیاں دیکھیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "تبوک یا حنین" میں حرف یا راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے یعنی راوی کو یقین کے ساتھ یاد نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس موقعہ پر غزوۂ تبوک کا ذکر کیا تھا یا غزوۂ حنین کا؟

"تبوک" ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے ۴۲۵ میل کے فاصلہ پر دمشق اور مدینہ کے درمیانی راستہ پر واقع ہے ۹ھ میں نبی کریم ﷺ یہاں فوج لے کر گئے تھے لیکن دشمن کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی اس لئے جنگ نہ ہو سکی۔

"حنین" ایک وادی کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے شمال مشرقی جانب طائف کے راستہ میں واقع ہے اس کو وادی او طاس بھی کہا جاتا ہے ۸ھ میں فتح مکہ کے کچھ ہی دنوں بعد مشہور "غزوہ حنین" یہیں ہوا تھا۔ گڑیوں سے بچیوں کے کھیلنے کا جو شرعی حکم ہے اس کی تفصیل باب الولی میں گزر چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز نہیں

(۲۸) وَعَنْ قَيْسِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ اَتَيْتُ الْحِيْرَةَ فَرَأَيْتُهُمْ يَسْجُدُوْنَ لِمَرْزُبَانٍ لَهُمْ فَقُلْتُ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَقُّ اَنْ يُسْجَدَ لَهٗ فَاَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اِنِّي اَتَيْتُ الْحِيْرَةَ فَرَأَيْتُهُمْ يَسْجُدُوْنَ لِمَرْزُبَانٍ لَهُمْ فَاَنْتَ اَحَقُّ بِاَنْ يُسْجَدَ لَكَ فَقَالَ لِي اَرَأَيْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِي اَكُنْتَ تَسْجُدُ لَهٗ فَقُلْتُ لَا فَقَالَ لَا تَفْعَلُوْا لَوْ كُنْتُ اٰمُرُ اَحَدًا اَنْ يَسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ النِّسَاءَ اَنْ يَسْجُدْنَ لِاَزْوَاجِهِنَّ لِمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ حَقٍّ. رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ۔

"حضرت قیس ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ میں (کوفہ کے قریب ایک شہر) حیرہ پہنچا تو میں نے وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ رسول کریم ﷺ بہت زیادہ اس کے مستحق ہیں کہ آپ ﷺ کو سجدہ کیا جائے، چنانچہ جب میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا کہ میں حیرہ گیا تو وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں، لہٰذا آپ (ﷺ) اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ (ﷺ) کو سجدہ کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھے بتاؤ اگر تم میری قبر پر جاؤ تو کیا تم میری قبر کو سجدہ کرو گے؟ میں نے عرض کیا کہ "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا (تو پھر میری زندگی میں بھی) ایسا نہ کرو، اگر میں کسی کو یہ حکم کر سکتا کہ وہ اللہ کے علاوہ) کسی کو سجدہ کرے تو میں عورتوں کو حکم کرتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کا (بہت زیادہ) حق مقرر کیا ہے۔ (ابوداؤدؒ) اس روایت کو احمدؒ نے بھی معاذ ابن جبلؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت قیس ابن سعدؓ نے جب حیرہ میں لوگوں کو اپنے سردار کو سجدہ کرتے دیکھا تو ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ اگر یہ لوگ اپنے سردار کی عظمت و مرتبہ کے پیش نظر اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں تو کائنات انسانی میں سرکار دو عالم ﷺ سے زیادہ عظمت و مرتبہ کا حامل کون شخص ہو سکتا ہے تو کیوں نہ آپ ﷺ کو سجدہ کیا جائے، چنانچہ ان کے اس خیال نے بارگاہ رسالت میں عرض کی صورت اختیار کر لی جہاں اس عرض کو بڑے لطیف انداز میں رد کر دیا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ انسان کی پیشانی اتنی مقدس ہے کہ وہ نہ صرف اپنے خالق ہی کے سامنے سجدہ ریز ہو سکتی ہے کسی مخلوق کے سامنے نہیں جھک سکتی خواہ وہ مخلوق کتنی ہی باعظمت و بافضیلت ذات

کیوں نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ۔ (فصلت ۴۱: ۳۷)

"نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو سجدہ کرو بلکہ صرف اللہ ہی کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے اگر تم اللہ کی عبادت کرتے ہو"۔

نافرمان بیوی کو مارنے پر مواخذہ نہیں ہوگا

(۲۹) وَعَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یُسْئَلُ الرَّجُلُ فِیْمَا ضَرَبَ امْرَاَتَہٗ عَلَیْہِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر مرد اپنی عورت کو کسی (معقول) چیز پر مارے تو قابل مواخذہ نہیں ہوتا۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہ)

تشریح: "قابل مواخذہ نہیں ہوتا" کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی کو مارنے سے کوئی گناہ لازم نہیں ہوتا کہ جس پر اس سے دنیا اور آخرت میں باز پرس ہو بشرطیکہ بیوی کو مارنے کی جو قیود و شرائط ہیں ان کو ملحوظ رکھا جائے اور حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔

لفظ علیہ کی ضمیر مجرور حرف ما کی طرف راجع ہے اور ما سے مراد نشوز (نافرمانی) ہے جو اس آیت وَاللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ الخ میں مذکور ہے لہٰذا اس جملہ "اس چیز پر مارنے" کا حاصل یہ ہوگا جو مرد اپنی بیوی کو اس کی نافرمانی پر مارے تو وہ گنہ گار نہیں ہوگا۔

بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے

(۳۰) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ جَاءَتْ امْرَاَۃٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَہٗ فَقَالَتْ زَوْجِیْ صَفْوَانُ بْنُ الْمُعَطَّلِ یَضْرِبُنِیْ اِذَا صَلَّیْتُ وَیُفَطِّرُنِیْ اِذَا صُمْتُ وَلَا یُصَلِّی الْفَجْرَ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ قَالَ وَصَفْوَانُ عِنْدَہٗ قَالَ فَسَاَلَہٗ عَمَّا قَالَتْ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَمَّا قَوْلُهَا یَضْرِبُنِیْ اِذَا صَلَّیْتُ فَاِنَّهَا تَقْرَاُ بِسُوْرَتَیْنِ وَقَدْ نَهَیْتُهَا قَالَ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَتْ سُوْرَۃً وَّاحِدَۃً لَكَفَتِ النَّاسَ قَالَ وَاَمَّا قَوْلُهَا یُفَطِّرُنِیْ اِذَا صُمْتُ فَاِنَّهَا تَنْطَلِقُ تَصُوْمُ وَاَنَا رَجُلٌ شَابٌّ فَلَا اَصْبِرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَصُوْمُ امْرَاَۃٌ اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِهَا وَاَمَّا قَوْلُهَا اِنِّیْ لَا اُصَلِّیْ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَاِنَّا اَهْلُ بَیْتٍ قَدْ عُرِفَ لَنَا ذَاكَ لَا نَكَادُ نَسْتَیْقِظُ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ قَالَ فَاِذَا اسْتَیْقَظْتَ یَا صَفْوَانُ فَصَلِّ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عورت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرا شوہر صفوان ابن معطل، جب میں نماز پڑھتی ہوں تو مجھے مارتا ہے اور جب روزہ رکھتی ہوں تو میرا روزہ تڑوا دیتا ہے اور وہ خود فجر کی نماز اس وقت پڑھتا ہے جب کہ سورج (یا تو نکلنے کے قریب ہوتا ہے یا) نکل چکا ہوتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ (جس وقت صفوان کی بیوی یہ شکایت کر رہی تھی اس وقت) صفوانؓ آنحضرت کے پاس ہی موجود تھے! راوی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صفوان سے ان کی بیوی کی ذکر کردہ باتوں کے بارہ میں پوچھا تو صفوان نے کہا کہ "یا رسول اللہ! میری بیوی کا کہنا کہ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو مجھ کو مارتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نماز (کی ایک ہی رکعت میں یا دو رکعتوں) میں دو (لمبی لمبی) سورتیں پڑھتی ہے حالانکہ میں نے اس کو (لمبی لمبی سورتیں پڑھنے) سے منع کیا ہے۔" راوی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے صفوان کی تصدیق کے لئے فرمایا "(سورۃ فاتحہ کے بعد) ایک سورۃ پڑھنا لوگوں کے لئے کافی ہوتا ہے" پھر صفوان نے کہا "اور اس کا کہنا کہ جب میں روزہ رکھتی ہوں تو میرا روزہ تڑوا دیتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روزے رکھے چلی جاتی ہے (یعنی ہمیشہ نفلی روزے رکھتی رہتی ہے) اور میں ایک جوان آدمی ہوں اور چونکہ رات میں مجھے مباشرت کا موقع نہیں ملتا، اس لئے اگر دن میں مجھے جماع کی خواہش ہوتی ہے تو) میں صبر نہیں کر سکتا" آپ ﷺ نے فرمایا "کوئی عورت

اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر (نفل) روزہ نہ رکھے۔" (پھر صفوان نے کہا کہ) اور اس کا یہ کہنا کہ میں سورج نکلنے کے وقت نماز پڑھتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ ہم کام کاج والے لوگ ہیں (زیادہ رات گئے تک اپنے کھیتوں اور باغوں میں پانی دیتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے رات میں سونا میسر نہیں ہوتا) اور ہم لوگوں کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ (جب ہم رات کے آخری حصہ میں سوتے ہیں تو) اس وقت جاگتے ہیں جب سورج (یا تو نکلنے کے قریب ہوتا ہے یا) نکل چکا ہوتا ہے" آپ ﷺ نے (یہ عذر سن کر) فرمایا کہ "صفوان! جس وقت آنکھ کھلے نماز پڑھ لو۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: صفوانؓ زراعت پیشہ آدمی تھے وہ بہت رات گئے تک اپنے کھیتوں اور باغوں میں پانی دیتے تھے اور پھر وہیں پڑ کر سو جاتے تھے اور چونکہ وہاں جگانے والا کوئی نہیں ہوتا تھا اس لئے ان کی آنکھ دیر سے کھلتی تھی اس اعتبار سے وہ گویا معذور رہتے تھے لہٰذا آپ ﷺ نے ان کے عذر کے بناء پر ان کو حکم دیا کہ اگر تمہاری آنکھ وقت پر نہ کھل سکے تو جب بھی جاگو پہلے نماز پڑھو اس کے بعد کسی اور کام میں لگو۔

سخت سے سخت حکم میں بھی شوہر کی اطاعت کرو

(۳۱) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ فِيْ نَفَرٍ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ فَجَاءَ بَعِيْرٌ فَسَجَدَلَهٗ فَقَالَ اَصْحَابُهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تَسْجُدُ لَكَ الْبَهَائِمُ وَالشَّجَرُ فَنَحْنُ اَحَقُّ اَنْ نَسْجُدَ لَكَ فَقَالَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ وَلَوْكُنْتُ اٰمُرُ اَحَدًا اَنْ يَسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا وَلَوْ اَمَرَهَا اَنْ تَنْقُلَ مِنْ جَبَلٍ اَصْفَرَ اِلٰى جَبَلٍ اَسْوَدَ وَمِنْ جَبَلٍ اَسْوَدَ اِلٰى جَبَلٍ اَبْيَضَ كَانَ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ تَفْعَلَهٗ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے درمیان تشریف فرما تھے کہ ایک اونٹ آیا اور آپ ﷺ کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا (یہ دیکھ کر) آپ ﷺ کے صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! (جب) چوپایہ (جانور) اور درخت آپ ﷺ کو سجدہ کرتے ہیں (جو ناسمجھ ہیں اور آپ ﷺ کی تعظیم و احترام کے مکلف بھی نہیں ہیں) تو ہم (ان سے) زیادہ اس لائق ہیں کہ آپ ﷺ کو سجدہ کریں" آپ ﷺ نے فرمایا "اپنے رب کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی (یعنی میری) تعظیم کرو، اگر میں کسی کو کسی (غیر اللہ) کا سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو یقیناً عورت کو یہ حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے! اگر اس کا شوہر اس کو یہ حکم دے کہ وہ زرد رنگ کے پہاڑ سے پتھر اٹھا کر سیاہ پہاڑ پر لے جائے اور سیاہ پہاڑ سے پتھر اٹھا کر سفید پہاڑ پر لے جائے تو اس عورت کے لئے یہی لائق ہے کہ وہ اپنے شوہر کا یہ حکم بجالائے۔" (احمدؒ)

تشریح: "اپنے پروردگار کی عبادت کرو" کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ دراصل عبادت ہے اور عبادت کا مستحق صرف پروردگار ہے اللہ کے علاوہ کوئی بھی ذات خواہ نبی ہی کیوں نہ ہو کسی کا معبود نہیں بن سکتی تو مجھے اپنا مسجود بنا کر گویا مجھے خدا کی بندگی میں شریک کرنا چاہتے ہو، حالانکہ خدا نے مجھے نبی بنا کر تمہارے درمیان اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ میں تم سے اپنی عبادت کرا کر تمہیں شرک کی آلائش میں مبتلا کروں بلکہ میں تو اس دنیا میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں شرک کی ظلمت سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی کے راستہ پر لگاؤں اور تمہیں یہ تعلیم دوں کہ تمہاری اس مقدس پیشانی کو صرف خدا کے سامنے جھکنا چاہئے چنانچہ آپ ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ گویا قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ۔ (ال عمران ۳:۷۹)

"کسی آدمی کو شایاں نہیں کہ خدا تو اسے کتاب، دین کا فہم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔ بلکہ (اس کو کہنا چاہئے کہ اے لوگو) تم اللہ والے بن جاؤ۔"

جہاں تک آپ ﷺ کو اونٹ کے سجدہ کرنے کا سوال ہے تو اس میں کوئی خلجان نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اونٹ کا سجدہ کرنا خرق عادت (یعنی عادت اور قانون قدرت کے خلاف ایک انوکھی بات ہونے) کے طور پر تھا جو اونٹ کو اللہ تعالیٰ کے مسخر کر دینے کے سبب واقع ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم و فعل میں آنحضرت ﷺ کا کوئی دخل نہیں تھا پھر یہ کہ اونٹ معذور محض تھا کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں اور فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا اس وجہ سے محل اشکال نہیں ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری پر مجبور تھے اسی طرح اونٹ کو بھی حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ آپ ﷺ کو سجدہ کرے اور وہ اس حکم کی تعمیل پر مجبور تھا۔

"اور اپنے بھائی کی یعنی میری تعظیم کرو" کا مطلب یہ ہے کہ میری ذات اور میرے منصب کے تئیں تمہاری عقیدت و محبت کا بس اتنا تقاضہ ہونا چاہئے کہ تم اپنے دل میں میری محبت رکھو اور ظاہر و باطن میں میری اطاعت کرو۔

پہاڑوں کے رنگ کا مقصد ان پہاڑوں کے درمیان فاصلہ کی مسافت و دوری کو زیادہ سے زیادہ بیان کرنا ہے کیونکہ اس طرح کے پہاڑ ایک دوسرے کے قریب نہیں پائے جاتے لہٰذا اس جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر دو پہاڑ ایک دوسرے سے بہت دور واقع ہوں اور خاوند اپنی بیوی کو یہ حکم دے کہ ایک پہاڑ سے پتھر اٹھا کر دوسرے پہاڑ پر جاؤ تو بیوی کو اس سخت حکم کی تعمیل کرنی چاہئے۔ حاصل یہ ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی کو اتنا سخت ترین حکم بھی دے تو بیوی کے لئے یہی لائق ہے کہ وہ اس حکم کو بجالائے۔

جس عورت کا خاوند ناراض ہو اس کی نماز پوری طرح قبول نہیں ہوتی

(۳۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا تُقْبَلُ لَهُمْ صَلَاةٌ وَلَا تُصْعَدُ لَهُمْ حَسَنَةٌ اَلْعَبْدُ الْاٰبِقُ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلٰى مَوَالِيْهِ فَيَضَعَ يَدَهٗ فِيْ اَيْدِيْهِمْ وَالْمَرْاَةُ السَّاخِطُ عَلَيْهَا زَوْجُهَا وَالسَّكْرَانُ حَتّٰى يَصْحُوَ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایسے تین شخص ہیں جن کی نماز (پوری طرح) قبول نہیں ہوتی اور نہ ان کی کوئی نیکی اوپر (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف) جاتی ہے ایک تو بھاگا ہوا غلام جب تک کہ وہ اپنے مالکوں کے پاس واپس آکر ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ نہ رکھ دے (یعنی جب تک واپس آکر اپنے آپ کو اپنے مالکوں کے حوالے نہ کر دے اور ان کی اطاعت نہ کرنے لگے۔ اس کی نماز پوری طرح قبول نہیں ہوتی) دوسری وہ عورت جس کا خاوند اس سے ناراض ہو اور تیسرا نشہ باز، جب تک ہوش میں نہ آئے۔ (اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح : "مالکوں" یعنی جمع کے صیغہ میں گویا مالک اور اس کی اولاد کی طرف اشارہ ہے کہ غلام کو صرف اپنے مالک ہی کی نہیں بلکہ اس کی اولاد کی بھی وفاداری کرنی چاہئے۔

ایک اور روایت میں لفظ زوجھا کے بعد حَتّٰى يَرْضَا عَنْهَا کے الفاظ بھی منقول ہیں یعنی جس عورت کا خاوند اس سے ناراض ہو اس کی نماز اس وقت تک پوری طرح قبول نہیں ہوتی اور اس کی کوئی نیکی اوپر نہیں چڑھتی جب تک کہ اس کا خاوند اس سے خوش نہ ہو جائے اس روایت میں ان الفاظ کو اس لئے نقل نہیں کیا کہ یہ مفہوم خود بخود واضح ہے اور مراد یہ ہے کہ یا تو اس کا خاوند اس سے خوش ہو جائے یا اس کو طلاق دے دے۔

بہترین بیوی کی پہچان

(۳۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ قَالَ الَّتِيْ تَسُرُّهٗ اِذَا نَظَرَ وَتُطِيْعُهٗ اِذَا

اَمَرَ وَلَا تُخَالِفُهُ فِي نَفْسِهَا وَلَا فِي مَالِهَا بِمَا يَكْرَهُ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَان۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سی بیوی بہتر ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ عورت جب اس کا خاوند اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور جب شوہر اس کو کوئی حکم دے تو اس کو بجالائے (بشرطیکہ وہ حکم خلاف شرع نہ ہو) اور اپنی ذات اور اپنے مال میں اس کے خلاف کوئی ایسی بات نہ کرے جس کو وہ پسند نہ کرتا ہو۔ (اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے)۔"

تشریح: اس روایت میں ایک اچھی بیوی کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جب اس کا شوہر اس کی طرف دیکھے یعنی اس کی خوش اخلاقی و خوش اطواری کو دیکھے تو وہ خوش ہو جائے، اور اگر کہیں وہ بیوی صورت و سیرت دونوں میں اچھی ہو تو پھر کیا کہنا، نور علی نور اور سرور علی سرور ہے اسی طرح ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے مال میں ایسی کوئی بات نہ کرے جو اس کے شوہر کی نظر میں پسندیدہ نہ ہو۔

"یہاں اپنے مال" سے خود اس بیوی کا مال بھی مراد ہو سکتا ہے یعنی جس مال کی حقیقت میں وہ خود مالک ہو اس مال کو بھی وہ اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف خرچ نہ کرے اور اس سے وہ مال بھی ہو سکتا ہے جو خود اس کی ملکیت نہ ہو بلکہ حقیقت میں مالک تو اس کا خاوند ہو البتہ اس عورت کے قبضہ تصرف میں ہو۔ اس صورت میں بھی یہ مطلب ہو گا کہ اس کا خاوند اس کو جو کچھ مال و اسباب اور روپیہ پیسہ دے وہ اس کو ایک امانت کے طور پر اپنے پاس رکھے اس میں نہ تو خیانت کرے اور نہ اپنے خاوند کی مرضی کے خلاف اس کو خرچ کرے۔

امانت دار بیوی کی فضیلت

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ مَنْ اُعْطِيَهُنَّ فَقَدْ اُعْطِيَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ قَلْبٌ شَاكِرٌ وَلِسَانٌ ذَاكِرٌ وَبَدَنٌ عَلَى الْبَلَاءِ صَابِرٌ وَزَوْجَةٌ لَا تَبْغِيْهِ خَوْنًا فِي نَفْسِهَا وَلَا مَالِهِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "چار چیزیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص کو مل جائیں اس کو دنیا و آخرت کی بھلائی نصیب ہو جائے اوّل (حق تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کا) شکر ادا کرنے والا دل، دوم (خوشی اور رنج ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کو) یاد کرنے والی زبان، سوم بلاؤں پر صبر کرنے والا جسم اور چہارم وہ عورت جو اپنی ذات اور اپنے خاوند کی مال میں خیانت نہ کرے۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

بَابُ الْخُلْعِ وَالطَّلَاقِ
خُلع اور طلاق کا بیان

خُلع کا مطلب: خُلع (خ کے پیش کے ساتھ) خلع (خ کے زبر کے ساتھ) اسم ہے خُلع کے لغوی معنی ہیں "کسی چیز کو نکالنا" اور عام طور پر یہ لفظ بدن سے کسی پہنی ہوئی چیز مثلاً کپڑے اور موزے وغیرہ اتارنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن شرعی اصطلاح میں اس لفظ کے معنی ہیں "ملکیت نکاح کو مال کے عوض میں لفظ خُلع کے ساتھ زائل کرنا۔ یا، ملکیت نکاح ختم کرنے کے لئے لفظ خُلع کے ساتھ اپنی عورت سے مال لینا" اس شرعی اصطلاح کی توضیح یہ ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے اور دونوں میں کسی طرح نباہ نہ ہو سکے اور مرد طلاق بھی نہ دیتا ہو تو عورت کو جائز ہے کہ کچھ مال دے کر اپنا مہر دے کر نجات حاصل کر لے مثلاً اپنے مرد سے کہے کہ اتنا روپیہ لے

کر خُلع کردو۔ یعنی میری جان چھوڑ دو۔ یا یوں کہے کہ جو مہر تمہارے ذمہ ہے اس کے عوض میری جان چھوڑ دو۔ اس کے جواب میں مرد کہے کہ میں نے چھوڑ دی تو اس سے عورت پر ایک طلاق بائن پڑ جائے گی اور دونوں میں جدائی ہو جائے گی۔

مظہرؒ نے لکھا ہے کہ اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ اگر مرد، عورت سے کہے کہ میں نے اتنے مال کے عوض تم سے خُلع کیا اور بیوی کہے کہ میں نے قبول کیا اور پھر میاں بیوی کے درمیان جدائی واقع ہو جائے تو آیا یہ طلاق ہے یا فسخ ہے؟ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ یہ طلاق بائن ہے حضرت امام شافعیؒ کا زیادہ صحیح قول بھی یہی ہے لیکن حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ یہ فسخ ہے اور حضرت امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

اگر میاں بیوی کے باہمی اختلاف کی بنیاد شوہر کی زیادتی و سرکشی ہو اور شوہر کی اس زیادتی و سرکشی کی وجہ سے بیوی خُلع چاہتی ہو تو اس صورت میں شوہر کے لئے یہ مکروہ ہے کہ وہ خُلع کے معاوضہ کے طور پر کوئی چیز مثلاً روپیہ وغیرہ لے اور اگر میاں بیوی کے باہمی اختلاف کی بنیاد بیوی کی نافرمانی و سرکشی ہو یعنی بیوی کی نافرمانی و بداطواری کی وجہ سے خُلع کی نوبت آئی ہو تو اس صورت میں شوہر کے لئے یہ مکروہ ہے کہ وہ اس خُلع کے عوض میں اس قدر رقم لے کہ اس نے عورتؓ کے مہر میں جو رقم دی ہے اس سے بھی زیادہ ہو۔

طلاق کے معنی: لغت میں طلاق کے معنی ہیں "کھولنا، چھوڑنا" لیکن اصطلاح شریعت میں "مرد کا عورت کو نکاح سے عائد ہونے والی پابندیوں سے آزاد کر دینا" طلاق کہلاتا ہے۔ طلاق کی قسمیں اور اس کے احکام انشاء اللہ آگے بیان ہوں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ناپسند شوہر سے طلاق حاصل کی جاسکتی ہے

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ امْرَأَةَ ثَابِتِ ابْنِ قَيْسٍ اَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ثَابِتُ بْنُ قَيْسٍ مَا اَعْتِبُ عَلَيْهِ فِيْ خُلُقٍ وَلَا دِيْنٍ وَلٰكِنِّيْ اَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَرُدِّيْنَ عَلَيْهِ حَدِيْقَتَهٗ قَالَتْ نَعَمْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِقْبَلِ الْحَدِيْقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيْقَةً۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ثابت ابن قیسؓ کی بیوی رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! ثابت ابن قیس پر مجھے غصہ نہیں آتا اور نہ میں ان کی عادات اور ان کے دین میں کوئی عیب لگاتی ہوں لیکن میں اسلام میں کفر (یعنی کفران نعمت یا گناہ) کو پسند نہیں کر سکتی، رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کیا تم ثابت ابن قیسؓ کا باغ (جو انہوں نے تمہیں مہر میں دیا ہے) ان کو واپس کر دو گی؟ ثابتؓ کی بیوی نے کہا کہ "ہاں" رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) ثابتؓ سے فرمایا کہ تم اپنا باغ لے لو اور اس کو ایک طلاق دے دو۔" (بخاری)

تشریح: ثابت ابن قیسؓ کی بیوی کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اپنے شوہر سے اس لئے جدائی اختیار کرنا نہیں چاہتی کہ وہ بداخلاق ہیں یا ان کی عادات مجھے پسند نہیں ہیں یا یہ کہ ان کے دین میں کچھ نقصان ہے بلکہ صورت حال یہ ہے کہ مجھے ان سے محبت نہیں ہے اور وہ طبعی طور پر مجھے ناپسند ہیں لیکن بہر حال وہ میرے شوہر ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان کے تئیں میری طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جو اسلامی حکم کے خلاف ہو مثلاً مجھ سے کوئی نافرمانی ہو جائے یا ان کی مرضی کے خلاف کوئی فعل سرزد ہو جائے تو ایسی صورت میں گویا کفران نعمت یا گناہ ہو گا جو مجھے گوارہ نہیں ہے اس لئے میں کیوں نہ ان سے جدائی اختیار کر لوں۔

کہا جاتا ہے کہ ثابت ابن قیسؓ بہت بد صورت اور ٹھگنے (پست قد) تھے اور ان کی بیوی کا نام جبیبہ یا جمیلہ تھا بہت خوبصورت اور حسین تھیں اسی لئے ان دونوں کا جوڑا بہت ناموزوں تھا اور ان کی بیوی ان کو پسند نہیں کرتی تھیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کی عرض کے

مطابق حضرت ثابتؓ کو مصلحۃً یہ حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کو ایک طلاق دے دیں اس سے معلوم ہوا کہ طلاق دینے والے کے حق میں یہ اولیٰ و افضل ہے کہ وہ ایک طلاق دے تاکہ اگر رجوع کرنا منظور ہو تو رجوع کر لے نیز اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ خُلع طلاق ہے فسخ نہیں ہے چنانچہ صاحب ہدایہ نے اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ سے ایک حدیث بھی نقل کی ہے کہ اَلْخُلْعُ تَطْلِیْقَۃٌ بَائِنَۃٌ یعنی خُلع طلاق بائن ہے۔

حالت حیض میں طلاق دینے کی ممانعت

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّہٗ طَلَّقَ امْرَأَۃً لَہٗ وَھِیَ حَائِضٌ فَذَکَرَ عُمَرُ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَتَغَیَّظَ فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ لِیُرَاجِعْھَا ثُمَّ یُمْسِکْھَا حَتّٰی تَطْھُرَ ثُمَّ تَحِیْضَ فَتَطْھُرَ فَاِنْ بَدَالَہٗ اَنْ یُطَلِّقَھَا فَلْیُطَلِّقْھَا طَاھِرًا قَبْلَ اَنْ یَمَسَّھَا فَتِلْکَ الْعِدَّۃُ الَّتِیْ اَمَرَ اللّٰہُ اَنْ تُطَلَّقَ لَھَا النِّسَاءُ وَفِیْ رِوَایَۃٍ مُرْہُ فَلْیُرَاجِعْھَا ثُمَّ لْیُطَلِّقْھَا طَاھِرًا اَوْ حَامِلًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے بارہ میں روایت ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی تو حضرت عمرؓ نے اس کا ذکر رسول کریم ﷺ سے کیا، آنحضرت ﷺ اس واقعہ سے بہت غصہ ہوئے اور فرمایا کہ (اس گناہ کا تدارک کرنے کے لئے) عبداللہ کو چاہئے کہ وہ اس عورت سے رجوع کرے (یعنی مثلاً یوں کہے کہ میں نے اس کو اپنے نکاح میں واپس لے لیا) اور پھر اس کو اپنے پاس رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے اور پھر جب وہ حائضہ ہو اور اس کے بعد پاک ہو جائے اور پھر جب وہ حائضہ ہو اور اس کے بعد پاک ہو جائے اور طلاق دینا ضروری ہو تو پاکی کی حالت میں اسے طلاق دے قبل اس کے کہ اس سے جماع کرے، پس یہی وہ عدت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس میں عورتوں کو طلاق دی جائے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ عبداللہ کو حکم دو کہ وہ اس عورت سے رجوع کرے اور پھر اس کو پاکی کی حالت میں (بشرطیکہ وہ حاملہ نہ ہو اور حیض آتا ہو) یا حمل کی حالت میں طلاق دے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: فَتَغَیَّظَ فِیْہِ (آنحضرت ﷺ اس واقعہ سے بہت غصہ ہوئے) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حالت حیض میں طلاق دینا حرام ہے۔ کیونکہ اگر یہ حرام نہ ہوتا تو آنحضرت ﷺ اس واقعہ پر غصہ نہ ہوتے۔ اور حالت حیض میں طلاق دینا حرام اس لئے ہے کہ ہو سکتا ہے کہ طلاق دینے والے نے حالت حیض میں محض کراہت طبع کے سبب طلاق دی ہو اور وہ مصلحت اس کے طلاق دینے کی وجہ نہ ہو جس کی بناء پر طلاق دینا حرام ہے۔ مگر کوئی شخص اگر حالت حیض میں طلاق دے دے تو طلاق پڑ جائے گی یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ کو رجوع کرنے کا حکم دیا اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ رجوع کرنا طلاق کے بعد ہی ہوتا ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں دوسرے طہر (یعنی دوسرے حیض کے بعد پاکی کی حالت) تک طلاق کو مؤخر کرنے میں کیا مصلحت ہے؟ سیدھی بات تو یہ ہے کہ حکم یہ ہوتا کہ جس حیض میں طلاق دی گئی ہے اور پھر رجوع کیا گیا ہے اسی حیض کے گزرنے کے بعد پاکی کی حالت میں طلاق دی جائے لیکن اس کے برعکس اس کو دوسرے طہر تک مؤخر کیا گیا؟ چنانچہ اس کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ اس کی کئی وجہیں ہیں اول تو یہ کہ رجوع کرنا صرف طلاق کی غرض سے نہ ہو لہٰذا طلاق دینے کو ایک ایسی مدت تک کے لئے مؤخر کر دینا چاہئے جس میں ایک طرف تو طلاق دینا حلال اور دوسری طرف طلاق کے فیصلہ پر نظر ثانی کا موقع بھی مل جائے اور شاید کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ طلاق دینے کی نوبت ہی نہ آئے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں مصلحتوں کی رعایت دوسرے طہر ہی میں ہو سکتی ہے۔

دوم یہ کہ اتنی مدت تک کے لئے طلاق دینے کو مؤخر کرنا دراصل طلاق دینے والے کے اس فعل بد (یعنی حالت حیض میں طلاق دینے) کی سزا ہے۔ سوم یہ کہ جس حیض کی حالت میں طلاق دی گئی ہے وہ اور اس کے بعد کا طہر (یعنی پاکی کی حالت) دونوں گویا ایک ہی

چیز کے حکم میں ہیں لہٰذا اگر پہلے طہر میں دی گئی تو گویا حیض ہی کی حالت میں دی لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ ان تینوں وجہوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دوسرے طہر تک طلاق سے باز رہنا واجب نہیں ہے بلکہ اولیٰ ہے۔

طلاق کی قسمیں: یہ بات جاننی چاہئے کہ وقت و محل کے اعتبار سے نفس طلاق کی تین قسمیں ہیں۔ ① احسن۔ ② حسن۔ حسن کو سنی بھی کہتے ہیں۔ ③ بدئی۔

طلاق احسن کی صورت یہ ہے کہ ایک طلاق رجعی ایسے طہر (پاکی کی حالت) میں دی جائے جس میں جماع نہ کیا ہو اور پھر اس کو اسی حالت میں چھوڑے (یعنی پھر نہ تو اس کو اور طلاق دے اور نہ اس سے جماع کرے) یہاں تک کہ اس کی عدت پوری ہو جائے۔ طلاق کی یہ پہلی قسم سب سے بہتر ہے۔

طلاق حسن کی یہ صورت ہے کہ ایک طلاق حسن رجعی ایسے طہر (پاکی کی حالت) میں دی جائے جس میں جماع نہ کیا ہو بشرطیکہ عورت مدخول بہا ہو اور اگر عورت غیر مدخول بہا ہو تو اس کے لئے ایک طلاق حسن ہے نیز اس کو حیض کی حالت میں بھی طلاق دی جا سکتی ہے اور آئسہ، صغیرہ اور حاملہ عورتوں کے لئے طلاق حسن یہ ہے کہ ان کو (تین مہینہ تک) ہر مہینہ میں ایک طلاق دی جائے نیز ان عورتوں کو جماع کے بعد بھی طلاق دینا جائز ہے طلاق کی یہ دوسری قسم بھی بہتر ہے۔

"طلاق بدئی" کی صورت یہ ہے کہ مدخول بہا کو ایک ہی طہر میں یا ایک ہی دفعہ میں تین طلاقیں دے دے یا ایسی دو طلاقیں دے جس میں رجعت کی گنجائش نہ ہو یا اس کو اس طہر میں طلاق دے جس میں جماع کر چکا ہو اس طرح اگر کسی شخص نے حیض کی حالت میں طلاق دی تو یہ بھی طلاق بدئی کے حکم میں ہے اور اگر وہ عورت کہ جس کو حیض کی حالت میں طلاق دی ہے مدخول بہا ہو تو صحیح تر روایت کے مطابق اس سے رجوع کرنا واجب ہے جب کہ بعض علماء نے رجوع کرنے کو مستحب کہا ہے، پھر جب وہ پاک ہو جائے اور اس کے بعد دوسرا حیض آئے اور پھر اس سے بھی پاک ہو جائے تب اگر طلاق دینا ہی ضروری ہو تو اس دوسرے طہر میں طلاق دی جائے۔ طلاق کی یہ تیسری قسم شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے گو طلاق واقع ہو جاتی ہے مگر طلاق دینے والا گنہ گار ہوتا ہے۔

وقوع کے اعتبار سے طلاق کی دو قسمیں ہیں ① رجعی۔ ② بائن۔ طلاق رجعی کی صورت تو یہ ہے کہ طلاق دینے والا ایک بار یا دو صریح الفاظ میں یوں کہے کہ اَنْتِ طَالِقٌ یا طَلَّقْتُكِ یا اردو میں یوں کہے "تجھ پر طلاق ہے یا میں نے تجھے طلاق دی اس طرح طلاق دینے سے طلاق دینے والا ایام عدت میں بغیر نکاح کے رجوع کر سکتا ہے یعنی اگر وہ یوں کہے کہ میں نے تجھ سے رجوع کیا یا اس کو ہاتھ لگائے یا مساس کرے اور یا اس سے جماع کرے تو اس سے رجوع ہو جاتا ہے جدید نکاح کی ضرورت نہیں ہوتی۔

"طلاق بائن" کی صورت یہ ہے کہ طلاق کے صریح الفاظ کی بجائے ایسے الفاظ کے ذریعہ طلاق دی جائے جو اگرچہ صراحۃً طلاق کے لئے استعمال نہ ہوتے ہوں مگر کنایۃً وہ طلاق کا مفہوم بھی ادا کرتے ہوں علاوہ ان تین الفاظ کنایات کے جن کو فقہاء نے صریح طلاق کے لئے تسلیم کر لیا، طلاق بائن کا حکم یہ ہے کہ عورت نکاح سے نکل جاتی ہے تجدید نکاح کے بغیر اس عورت کو بیوی بنا کر رکھنا حرام ہے۔

حکم اور نتیجہ کے اعتبار سے بھی طلاق کی دو قسمیں ہیں۔ ① مغلظہ۔ ② مخففہ۔ طلاق مغلظہ کی صورت یہ ہے کہ یکبارگی تین طلاقیں دی جائیں (مثلاً یوں کہے کہ میں نے طلاق دی) یا الگ الگ تین طلاقیں دی جائیں (مثلاً یوں کہے کہ میں نے طلاق دی میں نے طلاق دی میں نے طلاق دی) اس طلاق کے بعد طلاق دینے والا اس عورت کو دوبارہ اپنے نکاح میں بغیر حلالہ نہیں لا سکتا حلالہ کی صورت یہ ہے کہ وہ عورت عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح کر لے اور دوسرا مرد اس سے جماع کر کے اس کو طلاق دے دے اور پھر جب اس کی عدت پوری ہو جائے تو پہلا شوہر اس سے نکاح کر لے۔

"طلاق مخففہ" کی صورت یہ ہے کہ یک بارگی یا الگ الگ دو طلاقیں دے یا ایک طلاق دے پھر اگر یہ دو طلاقیں یا ایک طلاق الفاظ صریح کے ساتھ ہو تو عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے تجدید نکاح کی ضرورت نہیں اور اگر الفاظ کنایہ کے ساتھ ہو تو تجدید نکاح کے بعد

اس کو اپنی بیوی بنا سکتا ہے حلالہ کی ضرورت نہیں۔

کن لوگوں کی طلاق واقع ہوتی ہے اور کن لوگوں کی واقع نہیں ہوتی: ہر عاقل و بالغ کی دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے خواہ وہ آزاد ہو یا غلام اور خواہ وہ اپنی خوشی سے طلاق دے یا کسی کے جبر و اکراہ سے دے یا نشہ کی حالت میں دے۔

اسی طرح اگر عاقل و بالغ شوہر گونگا ہو اور وہ اشارہ معہودہ کے ذریعہ طلاق دے تو اس کی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے اور لڑکے اور دیوانے کی دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر سویا ہوا شخص طلاق دے اور بیدار ہونے کے بعد کہے کہ میں نے تجھے سوتے میں طلاق دی ہے تو اس کی طلاق بھی واقع نہیں ہوگی اگر کسی مالک نے اپنے غلام کی بیوی کو طلاق دی تو اس کی طلاق بھی واقع نہیں ہوگی۔

طلاق میں اصلی اعتبار عورت کا ہے چنانچہ آزاد عورت کے لئے تین طلاقیں ہیں اگرچہ وہ کسی غلام کے نکاح میں ہو۔ اسی طرح لونڈی کے لئے دو طلاقیں ہیں اگرچہ وہ کسی آزاد مرد کے نکاح میں ہو۔

اختیار کا مسئلہ

(۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَيَّرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاخْتَرْنَا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَلَمْ يَعُدَّ ذٰلِكَ عَلَيْنَا شَيْئًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں اختیار دے دیا تھا (کہ اگر تم دنیا اور دنیا کی زینت و آسائش کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دے کر چھوڑ دوں، اور اگر تم خدا، خدا کے رسول اور دار آخرت کی طلب گار ہو تو پھر جان لو کہ تمہارے لئے خدا کے ہاں بے شمار اجر عظیم ثواب ہے) چنانچہ ہم نے (دنیا اور دنیا کی زینت و آسائش کے مقابلہ میں) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اختیار کر لیا اور آنحضرت ﷺ نے اس اختیار کو ہمارے لئے (طلاق کی اقسام میں کوئی قسم جیسے ایک طلاق یا دو طلاق یا رجعی یا بائن۔) کچھ بھی اختیار نہیں کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے یوں کہے کہ "اپنے نفس کو اختیار کر لو یا مجھے اختیار کر لو" اور پھر بیوی خاوند کو اختیار کر لے تو اس سے کسی طرح کی طلاق واقع نہیں ہوتی چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ لیکن اگر بیوی اپنے نفس کو اختیار کر لے تو اس صورت میں حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک طلاق رجعی، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک طلاق بائن اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں۔

منقول ہے کہ صحابہؓ میں سے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس بات کے قائل تھے کہ بیوی کو شوہر کے محض اختیار دے دینے ہی سے طلاق رجعی واقع ہو جاتی ہے خواہ وہ اپنے شوہر ہی کو کیوں نہ اختیار کر لے۔

اور حضرت زید ابن ثابتؓ اس بات کے قائل تھے کہ طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ان دونوں ہی کے اقوال کی تردید میں یہ حدیث بیان کر کے گویا یہ واضح کیا کہ شوہر کے محض اختیار دے دینے سے کوئی بھی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے سے کفارہ لازم آتا ہے

(۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ فِي الْحَرَامِ يُكَفِّرُ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ (کسی چیز کو) حرام کر لینے پر کفارہ دے اور (اس سلسلہ میں) تمہارے لئے رسول کریم ﷺ کی پیروی ہی بہتر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اوپر کسی چیز خواہ وہ اپنی ہو یا کسی دوسری چیز کو، حرام کر لے تو اس پر قسم کا کفارہ لازم آتا ہے اور

وہ چیز حرام نہیں ہوتی حضرت ابن عباسؓ اسی کے قائل تھے۔ اور حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لے اگرچہ وہ چیز بذات خود حرام کیوں نہ ہو یا کسی دوسرے کی ملکیت کیوں نہ ہو مثلاً یوں کہے کہ مجھ پر شراب حرام ہے یا فلاں کا مال مجھ پر حرام ہے تو یہ بمنزلہ قسم ہے۔ بشرطیکہ اگر اس نے کسی حرام چیز کے بارہ میں یہ کہا کہ یہ چیز مجھ پر حرام ہے اور اس سے اس کا مقصد اس چیز کے حرام ہونے کی خبر دینا نہ ہو لہٰذا جب وہ اس چیز کو، جسے اس نے اپنے اوپر حرام کیا ہے کھائے یا استعمال کرے گا تو وہ گویا حانث یعنی قسم توڑنے والا ہوگا اور اس پر وہی کفارہ لازم آئے گا جو قسم توڑنے پر لازم آتا ہے ہاں اگر اس نے اس چیز کو صدقہ کر دیا یا کسی کو ہبہ کر دیا تو پھر حانث نہیں ہوگا اور اس پر کوئی کفارہ لازم نہیں آئے گا۔

چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے اپنی اس بات کی تائید میں یہ آیت لَقَدْ كَانَ لَكُمْ الآیۃ پڑھی اور اس طرف اشارہ کیا کہ جب آنحضرت ﷺ نے شہد کو اپنے اوپر حرام کیا تو اس آیت یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ کے ذریعہ آپ ﷺ کو کفارہ دینے کا حکم دیا گیا (جس کا تفصیلی ذکر اگلی روایت میں آئے گا) لہٰذا تم پر آنحضرت ﷺ کی پیروی لازم ہے کہ اگر تم نے کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور پھر اس چیز کو استعمال کر کے حانث ہو گئے تو کفارہ ادا کرو۔

اگر کوئی شخص یوں کہے کہ "تمام حلال مال مجھ پر حرام ہے یا خدا کی حلال کی ہوئی تمام چیزیں مجھ پر حرام ہیں" تو ایسے قول کے بارہ میں فتویٰ یہ ہے کہ اس طرح کہنے سے اس کی بیوی پر طلاق پڑ جائے گی اگرچہ اس نے طلاق کی نیت نہ کی ہو اور اگر اپنی بیوی سے یہ کہے کہ "تم مجھ پر حرام ہو" تو یہ ایلاء ہو جائے گا۔ بشرطیکہ اس نے واقعی حرام کرنے کی نیت کی ہو یا کچھ بھی نیت کی ہو اور اگر اس نے یہ کہتے وقت ظہار کی نیت کی ہوگی تو ظہار ہو جائے گا۔ ہاں اگر اس نے یہ کہتے وقت کہ "تم مجھ پر حرام ہو" جھوٹ کی نیت کی ہو تو بھی یہ کہنا ہدر (لغو) ہوگا یعنی اس کہنے سے عند اللہ تو کچھ نہیں ہوگا لیکن یہ معاملہ اگر حاکم کے ہاں پہنچا تو حاکم ایلاء کا حکم نافذ کر دے گا۔ اور اگر یہ کہتے وقت اس نے طلاق کی نیت کی، تو طلاق بائن پڑ جائے گی اور اگر تین طلاق کی نیت کی تو تین طلاقیں پڑ جائیں گی۔ اور فتویٰ اسی پر ہے کہ اگر طلاق کی نیت نہ بھی کرے تو بھی طلاق بائن پڑ جائے گی۔

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ یَمْكُثُ عِنْدَ زَیْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ وَشَرِبَ عِنْدَهَا عَسَلًا فَتَوَاصَیْتُ اَنَا وَحَفْصَةُ اَنَّ اَیَّتَنَا دَخَلَ عَلَیْهَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلْتَقُلْ اِنِّیْ اَجِدُ مِنْكَ رِیْحَ مَغَافِیْرَ اَكَلْتَ مَغَافِیْرَ؟ فَدَخَلَ عَلٰی اِحْدَاهُمَا فَقَالَتْ لَهٗ ذَالِكَ فَقَالَ لَا بَاْسَ شَرِبْتُ عَسَلًا عِنْدَ زَیْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ فَلَنْ اَعُوْدَ لَهٗ وَقَدْ حَلَفْتُ لَا تُخْبِرِیْ بِذَالِكِ اَحَدًا یَبْتَغِیْ مَرْضَاةَ اَزْوَاجِهٖ فَنَزَلَتْ یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ الْاٰیَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ (اپنی ایک بیوی) حضرت زینب بنت جحشؓ کے پاس ٹھہر جایا کرتے تھے اور وہاں شہد پیا کرتے تھے چنانچہ (ایک دن) میں نے اور حفصہؓ نے آپس میں یہ طے کیا کہ نبی کریم ﷺ ہم میں سے جس کے پاس تشریف لائیں وہ یہ کہے آپ (ﷺ) کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے کیا آپ (ﷺ) نے مغافیر کھایا ہے؟ چنانچہ جب ان دونوں میں سے ایک (یعنی حضرت عائشہؓ یا حضرت حفصہؓ) کے پاس تشریف لائے تو اس نے یہی کہا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں، میں نے زینب بنت جحشؓ کے ہاں شہد پیا ہے اب میں کبھی شہد نہیں پیوں گا۔ میں نے قسم کھالی ہے لیکن تم کسی کو یہ نہ بتانا (تاکہ اس بات سے زینبؓ کی دل شکنی نہ ہو کہ اب میں ان کے ہاں شہد نہیں پیوں گا) اور اس سے (یعنی شہد کو اپنے اوپر حرام کر لینے سے) آنحضرت ﷺ کا مقصد اپنی بیویوں کو خوش کرنا تھا چنانچہ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ الآیۃ (یعنی اے نبی! آپ محض اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لئے اپنے اوپر اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جس کو اللہ نے آپ (ﷺ) کے لئے حلال کیا ہے)۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "حضرت زینت بنت جحشؓ کے پاس ٹھہر جایا کرتے تھے"۔ یہ ان کی نوبت (باری) کے دن کا ذکر نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب اپنی ازواج مطہرات کے ہاں گشت کے لئے نکلتے اور حضرت زینبؓ کے گھر تشریف لاتے تو اس وقت ان کے پاس ٹھہر جایا کرتے تھے۔

"مغافیر" ایک درخت کے پھل کا نام ہے جو گوند کے مشابہ ہوتا ہے اس کی بو خراب ہوتی ہے اور ایک گونہ شہد کی بو کی مشابہت رکھتی ہے۔

اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو شہد بہت مرغوب تھا، جب آپ ﷺ گشت کے وقت حضرت زینبؓ کے تشریف لے جاتے تو وہ آنحضرت ﷺ کو شہد پلایا کرتی تھیں۔ اس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ حضرت زینبؓ کے ہاں کچھ زیادہ دیر ٹھہر جایا کرتے تھے۔ یہ بات حضرت عائشہؓ کو ناگوار گزری اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کی ایک اور بیوی حضرت حفصہؓ سے کہ جو حضرت عائشہؓ کے بہت قریب تھیں اور اکثر معاملات میں ان سے اتفاق کرتی تھیں، مذکورہ بالا بات کہنے کا مشورہ کیا تاکہ آنحضرت ﷺ حضرت زینبؓ کے ہاں ٹھہرنا اور ان کا شہد پینا چھوڑ دیں چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ ذکر کیا گیا لیکن حق تعالیٰ کے ہاں اس بات کو پسند نہیں کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ ایک حلال چیز کو محض اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لئے اپنے اوپر حرام کر لیں چنانچہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بلا ضرورت طلاق مانگنے والی عورت کے حق میں وعید

⑥ وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّمَا امْرَأَۃٍ سَأَلَتْ زَوْجَھَا طَلَاقًا فِیْ غَیْرِ مَا بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَیْھَا رَائِحَۃُ الْجَنَّۃِ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو عورت اپنے خاوند سے بلا ضرورت طلاق مانگے اس پر جنت کی بو حرام ہوگی (یعنی جب میدان حشر میں خدا کے نیک اور پیارے بندوں کو جنت کی خوشبو پہنچے گی تو یہ عورت اس خوشبو سے محروم رہے گی۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

طلاق کوئی اچھی چیز نہیں ہے

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مباح چیزوں میں سے خدا کے نزدیک مبغوض ترین (یعنی سب سے بری) چیز طلاق ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگرچہ طلاق، حلال و مباح ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض و مکروہ ہے چنانچہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو اگرچہ مباح ہیں مگر مکروہ (ناپسندیدہ) سمجھی جاتی ہیں مثلاً فرض نماز بلا عذر گھر میں پڑھنا، یا اسی طرح غصب کی ہوئی زمین پر نماز پڑھنا اگرچہ مباح ہے (کہ فرض ادا ہوتا ہے) لیکن مکروہ ہے۔

نکاح سے پہلے طلاق دینے کا مسئلہ

⑧ وَعَنْ عَلِیٍّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا طَلَاقَ قَبْلَ نِکَاحٍ وَلَا عِتَاقَ اِلَّا بَعْدَ مِلْکٍ وَلَا وِصَالَ فِیْ صِیَامٍ وَلَا یُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ وَلَا رِضَاعَ بَعْدَ فِطَامٍ وَلَا صَمْتَ یَوْمٍ اِلَی اللَّیْلِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہوتی مالک ہونے سے پہلے غلام کو آزاد نہیں کیا جاسکتا اور پے در پے کے روزے (یعنی رات کو افطار کئے بغیر مسلسل و پیہم روزے رکھے چلے جانا) جائز نہیں ہے (یہ صرف آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے تھا اور صرف آپ ﷺ ہی کے لئے جائز تھا) بالغ ہونے کے بعد کوئی یتیم نہیں رہتا (یعنی جس کے ماں باپ نہ ہوں اور وہ بالغ ہو جائے تو اسے یتیم نہیں کہیں گے) دودھ پینے کی مدت کے بعد دودھ پینا رضاعت میں شامل نہیں (یعنی دودھ پینے کی مدت دو سال یا ڈھائی سال ہے اور دودھ پینے کے سبب جو حرمت نکاح ہوتی ہے وہ اس مدت کے بعد دودھ پینے سے ثابت نہیں ہوتی) اور دن بھر چپ رہنا جائز نہیں ہے (یا یہ کہ اس کا کوئی ثواب نہیں ہے۔)" (شرح السنۃ)

تشریح: اس روایت میں چند اصولی باتوں کو ذکر کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص نکاح سے پہلے ہی طلاق دے تو وہ طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ طلاق در اصل نکاح کا جزء ہے کہ اگر نکاح کا وجود پایا جائے گا تو اس پر طلاق کا اثر بھی مرتب ہوگا اور جب سرے سے نکاح ہی نہیں ہوگا تو طلاق کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔

اسی طرح فرمایا گیا کہ غلام جب تک اپنی ملکیت میں نہ آجائے اس کو آزاد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوں گے، اگر کوئی شخص کسی ایسے غلام کو آزاد کردے جس کا وہ ابھی تک مالک نہیں بنا ہے تو وہ غلام آزاد نہیں ہوگا اس اعتبار سے یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے مسلک کی دلیل ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نکاح سے پہلے طلاق کی اضافت، سبب ملک کی طرف کرے تو درست ہے مثلاً زید کسی اجنبی عورت سے یوں کہے کہ اگر میں تم سے نکاح کروں تو تم پر طلاق ہے یا یہ کہے کہ میں جس عورت سے بھی نکاح کروں اس پر طلاق ہے تو اس صورت میں اگر زید اس عورت سے نکاح کرے گا تو نکاح کے وقت اس پر طلاق پڑ جائے گی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص آزادی کی اضافت، ملک کی طرف کرے مثلاً یوں کہے کہ اگر میں اس غلام کا مالک بنوں تو یہ آزاد ہے یا یہ کہے کہ میں جس غلام کا مالک بنوں وہ آزاد ہے تو اس صورت میں وہ غلام اس شخص کی ملکیت میں آتے ہی آزاد ہو جائے گا۔

لہٰذا یہ حدیث حنفیہ کے نزدیک نفی تنجیز پر محمول ہے یعنی اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ اس طلاق کا کبھی بھی کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس لمحہ اس نے طلاق دی ہے اس لمحہ طلاق نہیں پڑتی، اس طرح اس حدیث سے طلاق کی تعلیق کی نفی نہیں ہوتی۔

ایک بات یہ فرمائی گئی ہے کہ دن بھر چپ رہنا ناجائز یا لاحاصل ہے اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ پچھلی امتوں میں چپ رہنا عبادت کے زمرہ میں آتا تھا۔ اور دن بھر چپ رہنا تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ ہماری اُمت میں یہ درست نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے کچھ ثواب حاصل نہیں ہوتا، ہاں اپنی زبان کو لایعنی کلام اور بری باتوں میں مشغولیت کے بجائے یقیناً یہ زیادہ بہتر ہے کہ اپنی زبان کو ہر وقت خاموش رکھا جائے۔

⑨ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نَذْرَ لِابْنِ اٰدَمَ فِيْمَا لَا يَمْلِكُ وَلَا عِتْقَ فِيْمَا لَا يَمْلِكُ وَلَا طَلَاقَ فِيْمَا لَا يَمْلِكُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَزَادَ اَبُوْدَاؤُدَ وَلَا بَيْعَ اِلَّا فِيْمَا يَمْلِكُ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور حضرت شعیب اپنے دادا (حضرت عبداللہ ابن عمروؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ابن آدم کی نذر اس چیز میں صحیح نہیں ہوتی جس کا وہ مالک نہیں ہے نیز اس چیز (یعنی لونڈی و غلام کو آزاد کرنا بھی صحیح نہیں جس کا وہ مالک نہیں ہے نیز اس چیز (عورت) کو طلاق دینا بھی درست نہیں جس کا وہ مالک نہیں ہے۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) اور ابوداؤدؒ نے اپنی روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ اس چیز کو فروخت کرنا بھی صحیح نہیں جس (کی فروختگی کا معاملہ کرنے) کا وہ (اصالۃً یا وکالۃً یا ولایۃً) مالک نہیں ہے۔"

تشریح: نذر صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں اللہ کی خوشنودی کے لئے اس غلام کو آزاد کرنے کی نذر مانتا ہوں اور حالانکہ یہ نذر ماننے کے وقت وہ غلام اس کی ملکیت میں نہیں ہے تو یہ صحیح نذر نہیں ہوگی اور اگر اس کے بعد وہ اس غلام کا مالک ہو گیا تو وہ غلام آزاد نہیں ہوگا۔ طلاق اور آزاد کرنے کے سلسلہ میں اوپر کی حدیث کی تشریح میں وضاحت کی جا چکی ہے۔

طلاق بتہ کا مسئلہ

⑩ وَعَنْ رُكَانَةَ بْنِ عَبْدِ يَزِيْدَ اَنَّهُ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ سُهَيْمَةَ الْبَتَّةَ فَاُخْبِرَ بِذٰلِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ وَاللّٰهِ مَا اَرَدْتُ اِلَّا وَاحِدَةً فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ مَا اَرَدْتَ اِلَّا وَاحِدَةً؟ فَقَالَ رُكَانَةُ وَاللّٰهِ مَا اَرَدْتُ اِلَّا وَاحِدَةً فَرَدَّهَا اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَطَلَّقَهَا الثَّانِيَةَ فِيْ زَمَانِ عُمَرَ وَالثَّالِثَ فِيْ زَمَانِ عُثْمَانَ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ اِلَّا اَنَّهُمْ لَمْ يَذْكُرُوا الثَّانِيَةَ وَالثَّالِثَةَ۔

"اور حضرت رکانہؓ ابن عبد یزید کے بارہ میں روایت ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی سہیمہؓ کو طلاق بت دی اور پھر اس کا ذکر رسول کریم ﷺ سے کیا اور کہا کہ خدا کی قسم میں نے ایک طلاق کی نیت کی تھی آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ (کیا واقعی) خدا کی قسم تم نے ایک طلاق کی نیت کی تھی؟ رکانہؓ نے کہا کہ (ہاں) خدا کی قسم میں نے ایک طلاق کی نیت کی تھی، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان کی عورت کو ان کی طرف لوٹا دیا پھر رکانہؓ نے اس عورت کو دوسری طلاق حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اور تیسری طلاق حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں دی اس روایت کو ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہ اور دارمی نے نقل کیا ہے لیکن ترمذی ابن ماجہ اور دارمی نے اپنی روایت میں دوسری اور تیسری طلاق کا ذکر نہیں کیا ہے۔"

تشریح: "طلاق بت" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت رکانہؓ نے ان الفاظ میں طلاق دی اَنْتِ طَالِقٌ اَلْبَتَّةَ (یعنی تجھ پر طلاق البتہ ہے) لفظ البتۃ۔ بتہ کا اسم مرہ ہے جس کے معنی ہیں کاٹنا قطع کرنا لہٰذا "طلاق بت" کا مفہوم یہ ہوا کہ ایسی طلاق جو نکاح کا تعلق بالکل باقی نہیں رہنے دیتی اور عورت کو نکاح سے قطعی طور پر نکال دیتی ہے۔

"ان کی عورت کو ان کی طرف لوٹا دیا" کا مطلب حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہؓ کو رجوع کر لینے کا حکم دیا۔ اور گویا رکانہؓ نے رجوع کر لینے کے اس حکم کی بناء پر ان الفاظ رَاجَعْتُهَا اِلٰى نِكَاحِىْ (میں نے اس کو اپنے نکاح میں لوٹا لیا) کے ذریعہ اس عورت کو اپنے نکاح میں واپس کر لیا۔

حضرت امام شافعیؒ نے یہ مطلب اس لئے مراد لئے ہیں کہ ان کے نزدیک "طلاق بت" ایک طلاق رجعی ہے ہاں اگر اس کے ذریعہ دو یا تین طلاقوں کی نیت کی گئی ہو تو پھر نیت کے مطابق ہی دو یا تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک چونکہ اس لفظ کے ساتھ طلاق دینے سے ایک طلاق بائن پڑتی ہے خواہ ایک طلاق کی نیت کی گئی ہو یا دو طلاق کی یا اور کچھ بھی نیت نہ کی گئی ہو اس لئے ان کے نزدیک اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو جدید نکاح کے ذریعہ رکانہؓ کی طرف لوٹا دیا۔

نکاح و طلاق کے الفاظ ہنسی میں منہ سے نکالے جائیں تو حکم ثابت ہو جاتا ہے

⑪ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ النِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تین چیزیں ایسی ہیں جن کا قصد کرنا بھی قصد ہے اور ہنسی مذاق میں منہ سے نکالنا بھی قصد ہے ① نکاح۔ ② طلاق۔ ③ رجعت۔ (ترمذی، ابوداؤد) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: جد کے معنی ہیں "کسی کام میں سعی و کوشش کرنا" لیکن یہاں اس کے یہ معنی مراد ہیں کہ جو لفظ جس معنی کے لئے وضع کیا گیا ہو اس کو

زبان سے ادا کرتے وقت وہی معنی مراد لئے جائیں مثلاً لفظ نَکَحْتُ (میں نے نکاح کیا) زبان سے جب ادا کیا جائے تو اس کے معنی یعنی نکاح کرنا ہی مراد لیا جائے یا جب لفظ طَلَّقْتُ (میں نے طلاق دی) زبان سے ادا کیا جائے تو اس کے معنی یعنی طلاق دینا ہی مراد لیا جائے اور لفظ ھزل کے معنی یہ ہیں کہ کوئی لفظ زبان سے ادا کیا جائے مگر اس کے معنی مراد نہ ہوں۔

لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو زبان سے ادا ہوتے ہی وقوع پذیر ہو جاتی ہیں خواہ ان کے معنی مراد ہوں، یا مراد نہ ہوں، چنانچہ اگر دو اجنبی مرد و عورت کے درمیان ہنسی ہنسی میں دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول ہو جائے تو بھی نکاح ہو جاتا ہے اور وہ دونوں میاں بیوی بن جاتے ہیں یا اگر کوئی ہنسی مذاق میں طلاق دے دے تو بھی طلاق پڑ جائے گی اسی طرح طلاق رجعی کے بعد ہنسی ہنسی میں رجوع کرنے سے بھی رجعت ثابت ہو جاتی ہے ان تین چیزوں کے علاوہ اور چیزیں مثلاً بیع و شراء وغیرہ اس طرح ہنسی مذاق میں وقوع پذیر نہیں ہوتیں۔

زبردستی دلوائی جانے والی طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں

⑬ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا طَلَاقَ وَلَا عِتَاقَ فِيْ اِغْلَاقٍ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ قِيْلَ مَعْنَى الْاِغْلَاقِ الْاِكْرَاهُ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اکراہ کی حالت میں نہ تو طلاق واقع ہوتی ہے اور نہ آزادی (ابوداؤد، ابن ماجہ) اور بیان کیا جاتا ہے کہ اغلاق کے معنی اکراہ کے ہیں۔"

تشریح: "اکراہ" کے معنی ہیں "زبردستی کرنا" لہٰذا حدیث کا یہ مطلب ہوا کہ اگر کوئی کسی سے زبردستی طلاق دلوا دے یا اس کا غلام آزاد کرا دے تو نہ طلاق پڑے گی اور نہ وہ غلام آزاد ہوگا۔

گویا یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کے مسلک کی دلیل ہے کیونکہ ان تینوں آئمہ کے نزدیک یہ دونوں چیزیں زبردستی کی حالت میں واقع نہیں ہوتیں جب کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ واقع ہو جاتی ہیں انہوں نے اس کو ہزل پر قیاس کیا ہے۔ (جس کا بیان اوپر کی حدیث میں گزر چکا) ویسے حضرت امام اعظمؒ نے اپنے مسلک کی دلیل میں جو کچھ پیش کیا ہے وہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق زبردستی کی حالت میں بھی جن چیزوں کا حکم ثابت ہو جاتا ہے وہ گیارہ ہیں۔ ① نکاح۔ ② طلاق۔ ③ رجعت۔ ④ ایلاء۔ ⑤ فئی یعنی ایلاء سے رجوع کرنا۔ ⑥ ظہار۔ ⑦ عتاق۔ ⑧ عفو قصاص یعنی قصاص کو معاف کر دینا۔ ⑨ قسم۔ ⑩ نذر۔ ⑪ قبولیت اسلام۔

دیوانے کی طلاق واقع نہیں ہوتی

⑭ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ طَلَاقٍ جَائِزٌ اِلَّا طَلَاقَ الْمَعْتُوْهِ وَالْمَغْلُوْبِ عَلٰى عَقْلِهٖ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَعَطَاءُ بْنُ عَجْلَانَ الرَّاوِيْ ضَعِيْفٌ ذَاهِبُ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر طلاق واقع ہو جاتی ہے مگر بے عقل اور مغلوب العقل کی طلاق واقع نہیں ہوتی" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی عطاء بن عجلان (روایت حدیث میں) ضعیف شمار کئے جاتے ہیں کیونکہ ان کے حافظہ میں حدیث محفوظ نہیں رہتی تھی۔"

تشریح: امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک اس حدیث کے مطابق ہے کیونکہ ان کے نزدیک کبھی دیوانے کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ یہاں حدیث میں مَعْتُوْہ سے "دیوانہ" مراد ہے یعنی وہ شخص جو کبھی تو مسلوب العقل رہتا ہو اور کبھی اس کی عقل ٹھکانے رہتی ہو، قاموس میں لکھا ہے کہ عَتَہ (جو معتوہ کا مصدر ہے) کے معنی ہیں "کم عقل ہونا، مدہوش ہونا" اور صراح میں لکھا ہے کہ "معتوہ" الٹے ہوئے ڈول اور بے عقل شخص

کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ فقہ کی کتابوں میں اس کے یہی معنی بیان کئے گئے اس اعتبار سے حدیث کا یہ جملہ و المغلوب علی عقلہ گویا لفظ معتوہ کا عطف تفسیری ہے (یعنی اس جملہ میں معتوہ کی وضاحت مقصود ہے) اسی لئے بعض روایات میں المغلوب بغیر واو منقول ہے۔

اس تفصیل سے یہ ثابت ہوا کہ جب معتوہ کی طلاق واقع نہیں ہوتی تو مجنون مطلق (یعنی پاگل شخص) کہ جو سرے سے عقل و شعور رکھتا ہی نہیں اس کی طلاق بطریق اولی واقع نہیں ہوگی چنانچہ زین العرب ؒ نے کہا ہے کہ یوں تو "معتوہ" ناقص العقل اور مغلوب العقل کو کہتے ہیں لیکن مجنون، سویا ہوا شخص، مدہوش اور ایسا مریض کہ جس کی عقل اس کے مرض کی وجہ سے جاتی رہے وہ بھی اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہیں یعنی ان سب کی بھی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

لفظ "معتوہ" کے بارہ میں علامہ ابن ہمام ؒ نے بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ معتوہ اس شخص کو کہتے ہیں جو ناقص العقل و کم سمجھ اور پریشان کلام ہو (یعنی بے عقلی اور ناسمجھی کی باتیں کرتا ہو) اور فاسد التدبیر (یعنی بے عقلی اور بے سمجھی کے کام کرتا ہو) لیکن نہ تو مارتا پھرتا ہو اور نہ گالیاں بکتا پھرتا ہو بخلاف مجنوں کے (کہ لوگوں کو مارتا اور گالیاں بکتا پھرتا ہے)۔

امام ترمذی ؒ کے قول کے مطابق اس حدیث کا راوی اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ کُلُّ طَلَاقٍ جَائِزٌ اِلَّا طَلَاقَ الْمَعْتُوْہِ یعنی ہر طلاق واقع ہو جاتی ہے مگر معتوہ کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

تین شخص جو مرفوع القلم ہیں

⑭ وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَۃٍ عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَسْتَیْقِظَ وَعَنِ الصَّبِیِّ حَتّٰی یَبْلُغَ وَعَنِ الْمَعْتُوْہِ حَتّٰی یَعْقِلَ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالدَّارِمِیُّ عَنْ عَائِشَۃَ وَابْنُ مَاجَۃَ عَنْہُمَا۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تین شخص مرفوع القلم ہیں (یعنی ان تین شخصوں کے اعمال نامۂ اعمال میں نہیں لکھے جاتے کیونکہ ان کے کسی قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں اور وہ مواخذہ سے بری ہیں) ایک تو سویا ہوا شخص جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو، دوسرا لڑکا جب تک وہ بالغ نہ ہو تیسرا بے عقل شخص جب تک کہ اس کی عقل درست نہ ہو جائے" (ترمذی ؒ، ابوداؤد ؒ) دارمی ؒ نے اس روایت کو حضرت عائشہ ؓ سے اور ابن ماجہ ؒ نے حضرت عائشہ ؓ اور حضرت علی ؓ سے نقل کیا ہے۔"

لونڈی کے لئے دو طلاقیں ہیں

⑮ وَعَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ طَلَاقُ الْاَمَۃِ تَطْلِیْقَتَانِ وَعِدَّتُھَا حَیْضَتَانِ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عائشہ ؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "لونڈی کے لئے دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت (کی مدت دو حیض ہیں)۔"

(ترمذی ؒ، ابوداؤد ؒ، ابن ماجہ ؒ، دارمی ؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح آزاد عورت کی عدت تین حیض ہیں اور اگر اسے حیض نہ آتا ہو تو اس کی عدت کی مدت تین مہینہ ہے اسی طرح لونڈی کی عدت دو حیض ہیں اور اگر اسے حیض نہ آتا ہو تو اس کی عدت کی مدت ڈیڑھ مہینہ ہوگی۔

اس طرح یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ طلاق اور عدت میں عورت کا اعتبار ہے نہ مرد کا لہٰذا اگر عورت آزاد ہوگی تو اس کی طلاقیں تین ہوں گی اور اس کی عدت کی مدت تین حیض ہوں گے چاہے وہ کسی غلام ہی کے نکاح میں کیوں نہ ہو اور اگر عورت لونڈی ہوگی تو اس کی طلاقیں دو ہوں گی اور اس کی عدت کی مدت دو حیض ہوں گے خواہ اس کا خاوند کوئی آزاد شخص ہی کیوں نہ ہو چنانچہ حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے لیکن حضرت امام شافعی ؒ کے نزدیک طلاق اور عدت میں مرد کا اعتبار ہے اگر مرد آزاد ہوگا تو اس کی بیوی کی طلاقیں تین

ہوں گی اور اس کی عدت تین حیض ہوں گے اگرچہ اس کی بیوی لونڈی ہو اور اگر مرد غلام ہو گا تو اس کی بیوی کی طلاقیں دو ہوں گی اور اس کی عدت کی مدت دو حیض ہوں گے خواہ اس کی بیوی آزاد عورت ہی کیوں نہ ہو۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عدت کی مدت کا تعلق حیض سے ہے نہ کہ طہر سے جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے گویا یہ حدیث اس بات کی دلیل ہوئی کہ عدت کی مدت کے سلسلہ میں قرآن کریم میں جو ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ فرمایا گیا ہے تو اس سے تین حیض مراد ہیں تین طہر مراد نہیں ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اپنے خاوند سے طلاق یا خُلع چاہنے والی عورت کے بارہ میں وعید

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُنْتَزِعَاتُ وَالْمُخْتَلِعَاتُ هُنَّ الْمُنَافِقَاتُ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اپنے خاوند کی نافرمانی کرنے والی اور اپنے خاوند سے خُلع چاہنے والی عورتیں منافق ہیں۔" (نسائیؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ جو عورتیں بلاسبب اپنے شوہروں سے طلاق مانگتی ہیں یا ان سے خُلع چاہتی ہیں وہ منافق ہیں "منافق" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ظاہر میں تو احکام اسلام کی مطیع و فرمانبردار ہیں مگر باطنی طور پر گنہ گار و عاصی ہیں۔

عورت کے تمام مال کے عوض خُلع کرنا مکروہ ہے

(۱۷) وَعَنْ نَافِعٍ عَنْ مَوْلَاةٍ لِصَفِيَّةَ بِنْتِ اَبِیْ عُبَيْدٍ اَنَّهَا اخْتَلَعَتْ مِنْ زَوْجِهَا بِكُلِّ شَیْءٍ لَهَا فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت نافعؒ صفیہ بنت ابوعبید کی ایک آزاد کی ہوئی لونڈی سے روایت کرتے ہیں کہ صفیہؓ نے اپنی ہر اس چیز کے عوض جو ان کے پاس موجود تھی، اپنے خاوند (حضرت عبداللہ ابن عمرؓ) سے خُلع کیا اور عبداللہؓ نے اس سے انکار نہیں کیا۔" (مالکؒ)

تشریح: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اس لئے انکار نہیں کیا کہ خُلع بہرحال جائز تھا اگرچہ اس طرح (یعنی عورت کے تمام مال کے عوض) خُلع کرنا مکروہ ہے۔

بیک وقت تین طلاق دینا حرام ہیں

(۱۸) وَعَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ قَالَ اُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَاَتَهٗ ثَلَاثَ تَطْلِيْقَاتٍ جَمِيْعًا فَقَامَ غَضْبَانَ ثُمَّ قَالَ اَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ حَتّٰی قَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا اَقْتُلُهٗ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت محمود ابن لبیدؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کو اس شخص کے بارہ میں بتلایا گیا جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں تو آپ ﷺ غضبناک ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کیا اللہ عزوجل کی کتاب کے ساتھ کھیلا جاتا ہے (یعنی حکم خداوندی کے ساتھ استہزاء کیا جاتا ہے) درآنحالیکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟ (یہ سن کر مجلس نبوی میں موجود صحابہؓ میں سے) ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا میں اس شخص کو قتل نہ کر دوں؟۔" (نسائیؒ)

تشریح: "اللہ عزوجل کی کتاب" سے قرآن کریم کی یہ آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ تا وَلَا تَتَّخِذُوْا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا مراد ہے۔

اس آیت میں یہاں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ ایک ساتھ تین طلاقیں نہ دینی چاہئیں بلکہ متفرق طور پر دینی چاہئیں وہیں وَلَا تَتَّخِذُوْا الایة کے ذریعہ یہ تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو لہو ولعب کی طرح بے وقعت مت سمجھو، چنانچہ آپ ﷺ نے اسی آیت کی طرف اشارہ فرمایا کہ متفرق طور پر طلاق دینے کی بجائے ایک ساتھ تینوں طلاقیں دینا حق تعالیٰ کے حکم ومنشاء کی خلاف ورزی ہے اور یہ خلاف ورزی گویا حق تعالیٰ کے احکام کے ساتھ استہزاء ہے۔ کیونکہ جس شخص نے حق تعالیٰ کے حکم کے خلاف کیا اس نے درحقیقت اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ اس کی نظر میں حکم خداوندی کی کوئی وقعت نہیں ہے کہ اس پر عمل نہ کرنا اور کرنا دونوں برابر ہیں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تین طلاق ایک ساتھ دینا بدعت وحرام ہے۔ اور اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کسی شخص کے اس فعل پر غضب ناک ہوتے تھے۔ جو گناہ ومعصیت کا باعث ہوتا تھا، حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تین طلاق ایک ساتھ دینا حرام نہیں ہے بلکہ خلاف اولیٰ ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ تین طلاقیں؛ ایک ساتھ نہ دینے میں فائدہ یہ ہے۔ کہ ایک طلاق کے بعد شاید اللہ تعالیٰ خاوند کے دل کو اس کی بیوی کی طرف مائل کردے اور اس کے فیصلہ میں کوئی ایسی خوشگوار تبدیلی آجائے کہ وہ رجوع کرلے اور ان دونوں کے درمیان مستقل جدائی کی نوبت نہ آئے۔

علماء کے اس بارہ میں مختلف اقوال ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یوں کہے کہ اَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا (یعنی تجھ پر تین طلاق ہے) تو آیا اس کی بیوی پر ایک طلاق پڑے گی یا تین طلاق واقع ہوں گی چنانچہ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام احمدؒ اور جمہور علماء یہ فرماتے ہیں کہ تین طلاقیں پڑیں گی جب کہ طاؤس اور بعض اہل ظاہر یہ کہتے ہیں کہ ایک طلاق پڑے گی۔

ایک صحابیؓ کا یہ کہنا کہ "میں اس شخص کو قتل نہ کردوں" اس بناء پر تھا کہ رسول کریم ﷺ نے اس شخص کو کتاب اللہ کے ساتھ استہزاء کرنے والا کہا تھا جو کفر ہے اور اگر کوئی مسلمان کفر کی حد میں داخل ہوجائے تو اس کی سزا قتل ہے حالانکہ ان صحابیؓ نے یہ نہیں جانا کہ رسول کریم ﷺ نے اس شخص کے بارہ میں جو الفاظ ارشاد فرمائے ہیں وہ زجر وتوبیخ پر مبنی ہیں ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں۔

(۱۹) وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهٗ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اِنِّىْ طَلَّقْتُ امْرَاَتِىْ مِائَةَ تَطْلِيْقَةٍ فَمَاذَا تَرٰى عَلَیَّ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ طُلِّقَتْ مِنْكَ بِثَلَاثٍ وَسَبْعٌ وَّتِسْعُوْنَ اتَّخَذْتَ بِهَا اٰيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ (رواہ فی الموطا)

"اور حضرت مالکؒ راوی ہیں کہ ان تک یہ حدیث پہنچی کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں اس بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں؟ (یعنی کیا میری بیوی پر طلاق پڑگئی ہے یا نہیں) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا" کہ وہ عورت تین طلاقوں کے ذریعہ تم سے جدا ہوگئی اور جو ستانوے طلاقیں باقی بچیں ان کے ذریعہ تم نے (گویا) اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا مذاق اڑایا۔" (موطا)

تشریح: اوپر کی حدیث میں جس آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ تا وَلَا تَتَّخِذُوْا اٰيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا کا ذکر کیا گیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ تم نے اس طرح طلاق دے کر گویا حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی ہے۔

اللہ کے نزدیک طلاق ایک بری چیز ہے

(۲۰) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مُعَاذُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنَ الْعِتَاقِ وَلَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَبْغَضَ اِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ۔ (رواہ الدارقطنی)

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا "معاذ! اللہ تعالیٰ روئے زمین پر جتنی (مستحب) چیزیں پیدا کی ہیں ان میں سے اس کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ چیز غلام ولونڈی کو آزاد کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر جتنی (حلال) چیزیں پیدا کی ہیں ان میں سے اس کے نزدیک سب سے زیادہ بری چیز طلاق دینا ہے۔" (دارقطنیؒ)

تشریح: غلام ولونڈی کو آزاد کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ اس لئے ہے کہ اس کی وجہ سے ایک انسان کو اس کا پیدائشی اور فطری حق ملتا ہے اس کو ایک ایسی مخلوق کی غلامی سے نجات حاصل ہو جاتی ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے اسی کے مرتبہ کے برابر ہے اور وہ اپنے پروردگار کی عبادت و اطاعت کے لئے فارغ ہو جاتا ہے نیز اس کا مالک (جس نے اسے آزاد کیا ہے) اپنے اس ایثار و فراخ حوصلگی کی وجہ سے دوزخ کی آگ سے پروانۂ نجات حاصل کرتا ہے۔

"بری طلاق" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ طلاق بہت بری ہے جو کسی حاجت و ضرورت کے بغیر محض اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے دی گئی ہو چنانچہ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ بعض حالات میں طلاق دینا مستحب بھی ہے مثلاً اگر عورت نماز نہ پڑھتی ہو اور بدکار ہو تو اسے طلاق دینا ہی بہتر ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ اگر کسی کی بیوی نماز نہ پڑھتی ہو تو اسی لائق ہے کہ اسے طلاق دے دی جائے اگرچہ اس شخص کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ وہ اس کا مہر ادا کر سکے۔

ابوحفص بخاریؒ کا یہ قول منقول ہے کہ اگر کوئی بندہ اس حال میں خدا سے ملاقات کرے (یعنی اس کا انتقال ہو جائے) کہ اس کی گردن پر اس کی بیوی کا مہر ہو تو وہ میرے نزدیک اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ وہ ایک ایسی بیوی سے صحبت کرے جو نماز نہ پڑھتی ہو۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نکاح کرنا عبادت کے لئے گوشہ نشینی اختیار کرنے سے افضل ہے۔

بَابُ الْمُطَلَّقَةِ ثَلٰثًا

جس عورت کو تین طلاقیں دی جائیں اس کا بیان

جس عورت کو تین طلاقیں دی جائیں اس کا حکم اس باب میں بیان کیا گیا ہے کہ اس عورت کو اگر اس کا خاوند کہ جس نے اسے تین طلاقیں دی پھر اپنی بیوی بنا کر رکھنا چاہے تو اس صورت میں ممکن ہے جب کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے ہمبستر ہو پھر وہ مرد اس کو طلاق دے اور وہ عورت اپنی عدت کے دن پورے کر کے از سر نو پہلے خاوند سے نکاح کرے ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی وہ عورت اپنے پہلے خاوند کے لئے حلال ہوگی۔

مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں بَابُ الْمُطَلَّقَةِ ثَلٰثًا کے بعد یہ عبارت بھی لکھی ہے کہ وَفِيهِ ذكر الظهار والايلاء یعنی اس باب میں ظہار اور ایلاء کا ذکر بھی کیا گیا ہے، ظہار اور ایلاء کے معنی اور ان کے کچھ مسائل انشاء اللہ آگے مذکور ہوں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حلالہ کا صحیح ہونا دوسرے خاوند کے جماع کرنے پر موقوف ہے

(۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتِ امْرَأَةُ رِفَاعَةَ الْقُرَظِيِّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اِنِّیْ كُنْتُ عِنْدَ رِفَاعَةَ فَطَلَّقَنِیْ فَبَتَّ طَلَاقِیْ فَتَزَوَّجْتُ بَعْدَهٗ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ الزَّبِيْرِ وَمَا مَعَهٗ اِلَّا مِثْلُ هُدْبَةِ الثَّوْبِ فَقَالَ اَتُرِيْدِيْنَ اَنْ تَرْجِعِیْ اِلٰى رِفَاعَةَ قَالَتْ نَعَمْ قَالَ لَا حَتّٰى تَذُوْقِیْ عُسَيْلَتَهٗ وَيَذُوْقَ عُسَيْلَتَكِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رفاعہؓ قرظیؓ کی عورت رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میں رفاعہؓ کے نکاح میں تھی مگر انہوں نے مجھے طلاق دے دی اور طلاقیں بھی تین دیں چنانچہ میں نے رفاعہؓ کے بعد عبدالرحمن بن زبیر سے نکاح کر لیا لیکن عبدالرحمن کپڑے کے پھندنے کی مانند رکھتے ہیں (یعنی اس عورت نے از راہ شرم و حیاء عبدالرحمن کی نامردی کو کنایۃً ان الفاظ کے ذریعہ

بیان کہ وہ عورت کے قابل نہیں ہیں آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کیا تم پھر رفاعہؓ کے پاس جانا چاہتی ہو؟ اس نے عرض کیا کہ "ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس وقت تک رفاعہؓ سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتیں جب تک کہ عبدالرحمٰن تمہارا مزہ نہ چکھ لے اور تم اس کا مزہ نہ چکھ لو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تمہارا دوسرا شوہر تمہارے ساتھ جماع نہ کرے (اور پھر اس کی طلاق کے بعد تم عدت کے دن پورے نہ کر لو) تم اپنے سابق خاوند یعنی رفاعہؓ سے نکاح نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ یہ حدیث مشہور اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حلالہ یعنی سابق خاوند کے واسطے حلال ہونے کے لئے کسی دوسرے مرد سے محض نکاح کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مجامعت بھی ضروری ہے البتہ مجامعت میں صرف دخول کافی ہے انزال شرط نہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

محلل اور محلل لہ، پر آنحضرت ﷺ کی طرف سے لعنت

② وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ رَوَاهُ الدَّارِمِیُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ عَلِيٍّ وَابْنِ عَبَّاسٍ وَعُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ۔

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے محلل اور محلل لہ، پر لعنت فرمائی ہے۔ (دارمیؒ) ابن ماجہؒ نے اس روایت کو حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: فرض کیجئے دو شخص ہیں ایک کا نام زید ہے اور دوسرے کا نام بکر ہے، زید نے اپنی بیوی خالدہ کو تین طلاقیں دے دیں ہیں اور اس کی عدت کے دن پورے ہو گئے ہیں اب زید پھر چاہتا ہے کہ وہ خالدہ کو دوبارہ اپنی زوجیت میں لائے۔ لہٰذا دوسرا شخص یعنی بکر خالدہ سے اس شرط یا ارادہ کے ساتھ نکاح کرتا ہے کہ جماع کے بعد خالدہ کو طلاق دے دی جائے گی تاکہ خالدہ کا پہلا شوہر زید کہ جس نے اس کو تین طلاقیں دی تھیں اس سے دوبارہ نکاح کر سکے اور خالدہ کا پہلا شوہر محلل لہ (یعنی جس کے لئے حلالہ کیا گیا) کہلائے گا۔

حدیث میں انہی دونوں کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان پر لعنت فرمائی ہے حلالہ کرنے والے پر لعنت فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے زبان سے تحلیل کی شرط کا اظہار و اقرار کرنے کے بعد اور محض جدائی اختیار کرنے کے قصد سے اس عورت سے نکاح کیا جب کہ نکاح اس لئے شروع ہوا ہے کہ اس کے ذریعہ مرد و عورت ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے رفیق حیات اور دمساز رہیں، لہٰذا اس صورت میں نہ صرف یہ کہ نکاح کے اصل مقصد و منشا پر زد پڑتی ہے بلکہ عورت کی حرمت و عزت بھی مجروح ہوتی ہے اسی لئے ایک حدیث میں اس کو مستعار بکری سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اور محلل لہ، یعنی پہلے خاوند پر لعنت فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت حال اور اس نکاح کا اصل باعث وہی بنا ہے لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس صورت میں عقد باطل ہوتا ہے بلکہ حدیث کے الفاظ سے ثابت یہ ہوتا ہے۔ کہ عقد صحیح ہو جاتا ہے کیونکہ حدیث میں اس نکاح کرنے والے کو محلل کہا گیا ہے اور یہ ایک ظاہر بات ہے کہ کوئی شخص محلل اسی صورت میں ہوتا ہے جب کہ عقد صحیح ہو عقد فاسد سے محلل نہیں ہوتا لہٰذا ثابت ہوا کہ اس ارشاد گرامی میں "لعنت" کا حقیقی مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ یہاں مراد محلل اور محلل لہ کی خساست طبع کو ظاہر کرنا ہے اور یہ واضح کرنا ہے کہ یہ ایک قبیح فعل ہے جس کو کوئی سلیم الطبع انسان پسند نہیں کر سکتا ہے۔

حلالہ کے مکروہ تحریمی ہونے کی صورت: ہدایہ اور فقہ کی دیگر کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حلالہ کو زبان سے مشروط کیا گیا ہو یعنی

محلل اس عورت سے کہ جس کو اس کا خاوند تین طلاقیں دے چکا ہو یہ کہے کہ میں تم سے اس لئے نکاح کرتا ہوں کہ تمہیں اس خاوند کے لئے کہ جس نے تمہیں طلاق دی ہے، حلال کر دوں۔ (یعنی میں تم سے صرف اس لئے نکاح کرتا ہوں کہ میں جماع کے بعد تمہیں طلاق دے دوں تاکہ تمہارے پہلے خاوند کے لئے تم سے دوبارہ نکاح کرنا حلال ہو جائے) یا وہ عورت محلل سے یوں کہے کہ میں تم سے اس لئے نکاح کرتی ہوں کہ میں اپنے پہلے خاوند کے لئے حلال ہو جاؤں تو اس صورت میں حلالہ مکروہ تحریمی ہوگا۔ ہاں اگر زبان سے یہ نہ کہا جائے مگر نیت میں یہ بات ہو تو پھر محلل نہ قابل مواخذہ ہوگا اور نہ لعنت کا مورد ہوگا کیونکہ اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ اس کا مقصد دراصل اصلاح احوال ہے۔

ابن ہمامؒ نے کہا ہے کہ اس عورت نے کہ جس کو تین طلاقیں دی جا چکی ہیں غیر کفو سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیا اور پھر اس نے اس کے ساتھ جماع بھی کر لیا۔ تو اس صورت میں وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوگی، چنانچہ فتویٰ اسی قول پر ہے۔

ایلاء کا مسئلہ

(۳) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ اَدْرَكْتُ بِضْعَةَ عَشَرَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّهُمْ يَقُوْلُ يُوْقَفُ الْمُوْلِي۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت سلیمان ابن یسارؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کے دس بلکہ اس سے بھی زیادہ صحابیوں کو پایا ہے وہ سب یہ فرمایا کرتے تھے کہ ایلاء کرنے والے کو ٹھہرایا جائے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "ایلاء" اس کو کہتے ہیں کہ کوئی مرد یہ قسم کھائے کہ میں چار مہینہ یا اس سے زائد (مثلاً پانچ مہینہ یا چھ مہینہ) تک اپنی بیوی سے جماع نہیں کروں گا لہٰذا اگر اس مرد نے اپنی بیوی سے جماع نہیں کیا یہاں تک کہ چار مہینے گزر گئے تو اس صورت میں اکثر صحابہؓ کے قول کے مطابق اس مرد کی بیوی پر محض چار مہینے گزر جانے سے طلاق نہیں پڑے گی بلکہ ایلاء کرنے والے کو "ٹھہرایا" جائے گا یعنی حاکم وقاضی اس کو محبوس کرے گا اور اس سے یہ کہے گا۔ کہ یا تو اپنی عورت سے رجوع کرو۔ یعنی اس سے جماع کر لو اور اپنی قسم پوری نہ کرنے کا کفارہ دو یا اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ چنانچہ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہی ہے نیز حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ مرد، حاکم وقاضی کی اس بات پر عمل نہ کرے یعنی نہ تو عورت سے رجوع کرے اور نہ طلاق دے تو حاکم کو اختیار ہے کہ وہ اس کی بیوی کو طلاق دے دے۔

اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے اس صورت میں اگر اس مرد نے چار مہینے کے اندر اپنی بیوی سے جماع کر لیا تو اس کا ایلاء ساقط ہو جائے گا۔ مگر اس پر قسم پوری نہ کرنے کا کفارہ لازم آئے گا اور اگر اس نے جماع نہ کیا یہاں تک کہ چار مہینے گزر گئے تو اس کی بیوی پر ایک طلاق بائن پڑ جائے گی۔ ایلاء کے دیگر مسائل اور اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ظہار کا حکم

(۴) وَعَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ اَنَّ سُلَيْمَانَ ابْنَ صَخْرٍ وَّيُقَالُ لَهٗ سَلَمَةُ ابْنُ صَخْرِ الْبَيَاضِيُّ جَعَلَ امْرَاَتَهٗ عَلَيْهِ كَظَهْرِ اُمِّهٖ حَتّٰى يَمْضِيَ رَمَضَانُ فَلَمَّا مَضٰى نِصْفٌ مِّنْ رَمَضَانَ وَقَعَ عَلَيْهَا لَيْلًا فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْتِقْ رَقَبَةً قَالَ لَا اَجِدُهَا قَالَ فَصُمْ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ قَالَ لَا اَسْتَطِيْعُ قَالَ اَطْعِمْ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا قَالَ لَا اَجِدُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِفَرْوَةَ بْنِ عَمْرٍو اَعْطِهٖ ذٰلِكَ الْعَرَقَ وَهُوَ مِكْتَلٌ يَاْخُذُ خَمْسَةَ عَشَرَ صَاعًا اَوْ سِتَّةَ عَشَرَ صَاعًا لِيُطْعِمَ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوٰى اَبُوْدَاؤدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ صَخْرٍ نَحْوَهٗ قَالَ كُنْتُ امْرَاً اُصِيْبُ مِنَ النِّسَاءِ مَالَا يُصِيْبُ غَيْرِيْ وَفِيْ

رَوَایَتِهِمَا اَعْنِی اَبَادَاؤدَ وَالدَّارِمِیُّ فَاَطْعِمْ وَسْقًا مِنْ تَمْرٍ بَیْنَ سِتِّیْنَ مِسْکِیْنًا۔

"اور حضرت ابوسلمہؓ کہتے ہیں کہ (ایک صحابی) سلمانؓ ابن صخر نے کہ جن کو سلمہ ابن صخر بیاضی کہا جاتا تھا اپنی بیوی کو اپنے لئے اپنی ماں کی پشت کی مانند قرار دیا تاوقتیکہ رمضان ختم ہو (یعنی انہوں نے بیوی سے یوں کہا کہ ختم رمضان تک کے لئے تو مجھ پر میری ماں کی پشت کے مثل ہے گویا اس طرح انہوں نے اپنی بیوی کو رمضان کے ختم تک کے لئے اپنے اوپر حرام قرار دیا) مگر ابھی آدھا ہی رمضان گزرا تھا کہ انہوں ایک رات اپنی بیوی سے صحبت کرلی پھر (جب صبح ہوئی تو) وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ ماجرا بیان کیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ایک غلام آزاد کردو" انہوں نے عرض کیا کہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا" آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا" دو مہینے یعنی پے در پے روزے رکھو۔ انہوں نے عرض کیا کہ "مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے" (کیونکہ حکم خداوندی تو یہ ہے کہ دو مہینے مسلسل اس طرح روزے رکھے جائیں کہ ان مہینوں میں جماع سے کلیۃً اجتناب کیا جائے اور میں اپنے جنسی ہیجان کی وجہ سے اتنے دنوں تک جماع سے باز نہیں رہ سکتا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ" انہوں نے عرض کیا کہ میں اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے (ایک اور صحابی) حضرت فروہ ابن عمروؓ سے فرمایا کہ "ان کو کھجوروں کا فرق دے دو" (فرق کھجور کے درخت کے پتوں سے بنے ہوئے تھیلے چھابے) کو کہتے ہیں جس میں پندرہ صاع یا سولہ صاع (یعنی تقریباً ساڑھے باون سیر یا چھپن سیر) کھجوریں سماتی ہیں۔" (ترمذی) اور ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے اس روایت کو سلیمان ابن یسارؓ سے اور انہوں نے حضرت سلمہ ابن صخرؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے جس میں حضرت سلمہؓ کے یہ الفاظ بھی ہیں کہ میں اپنی عورتوں سے اس قدر قربت کیا کرتا تھا کہ کوئی شخص میری برابر قربت نہیں کرتا تھا (چنانچہ جنسی ہیجان کے اتنے زیادہ غلبہ ہی کی وجہ سے میں اپنی بیوی سے صحبت کرنے سے نہ رک سکا) اور ان دونوں یعنی ابوداؤدؒ اور دارمیؒ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، فرمانے کی جگہ) یہ فرمایا کہ ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجوریں کھلاؤ۔"

تشریح: اس حدیث میں ظہار کا حکم بیان کیا گیا ہے "ظہار" اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو یا اس جسم کے کسی ایسے عضو کو کہ اس کو بول کر پورا بدن مراد لیا جاتا ہو اور یا اس کے جسم کے کسی ایسے حصّہ کو جو شائع (غیر متعین) ہو محرمات ابدیہ (یعنی ماں بہن اور پھوپھی وغیرہ) کے جسم کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دے جس کی طرف نظر کرنا حلال نہ ہو، جیسے وہ اپنی بیوی سے یوں کہے کہ تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح حرام ہو، یا تمہارا سر یا تمہارے بدن کا نصف حصّہ میری ماں کی پیٹھ یا پیٹ کے مانند ہے یا میری ماں کی ران کے مانند ہے یا میری بہن یا میری پھوپھی کی پیٹھ کے مانند ہے اس طرح کہنے سے اس بیوی سے جماع کرنا یا ایسا کوئی بھی فعل کرنا جو جماع کا سبب بنتا ہے جیسے مساس کرنا یا بوسہ لینا اس وقت تک کے لئے حرام ہو جاتا ہے جب تک کہ کفارہ ظہار ادا نہ کردیا جائے اور اگر کسی شخص نے کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع کرلیا تو اس پر پہلے کفارہ کے علاوہ کچھ اور واجب نہیں ہوگا ہاں اسے چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے اور پھر جب تک کفارہ ادا نہ کرے دوبارہ جماع نہ کرے۔

یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ ظہار صرف بیوی سے ہوتا ہے اور بیوی خواہ آزاد عورت ہو اور خواہ کسی کی لونڈی ہو اسی طرح خواہ وہ مسلمان ہو یا کتابیہ یعنی عیسائی و یہودی ہو، ظہار کے باقی مسائل فقہ کی کتابوں میں دیکھنے چاہئیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ حَتّٰی یَمْضِیَ رمضان (جب تک کہ رمضان ختم ہو) کہ ظہار موقت صحیح ہو جاتا ہے اور قاضی خانؒ نے کہا ہے کہ جب کوئی شخص موقت (یعنی کسی متعین مدت و عرصہ کے لئے) ظہار کرتا ہے تو وہ اسی وقت ظہار کرنے والا ہو جاتا ہے اور جب وہ متعینہ عرصہ گزر جاتا ہے تو ظہار باطل ہو جاتا ہے۔

محقق علام حضرت ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ظہار کرے اور مثلاً جمعہ کے دن استثناء کردے تو صحیح نہیں ہوتا اور اگر ایک دن یا ایک مہینہ کے لئے ظہار کرے (یعنی کسی مدت متعین کے لئے ظہار کرے) تو اس مدت کی قید لگانی صحیح ہے اور پھر اس مدت کے گزر

جانے کے بعد ظہار باقی نہیں رہتا۔

اَطْعِمْ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا یعنی ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ سے دونوں باتیں مراد تھیں کہ یا تو تم ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلا دو یا ان میں سے ہر ایک کو صدقہ فطر کی مقدار کے برابر کچا اناج یا اس کی قیمت دے دو۔ اور جس طرح کفارہ ادا کرنے کے لئے غلام آزاد کرنے کی صورت میں جماع سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا ضروری ہے یا کفارہ ادا کرنے کے لئے دو مہینے کے روزے رکھنے کی صورت میں جماع سے پہلے دو مہینے مسلسل روزے رکھنا ضروری ہے اس طرح ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا بھی جماع کرنے سے پہلے ضروری ہے۔

حدیث کے اس جملہ "تاکہ یہ ساٹھ مسکینوں کو کھلادیں" کے بارے میں بظاہر ایک اشکال پیدا ہو سکتا ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ نے ساٹھ مسکینوں کو کھلانے کے لئے حضرت سلمہ ابن صخرؓ کو جو کھجوریں دلائیں ان کی مقدار خود روایت کی وضاحت کے مطابق پندرہ یا سولہ صاع تھی اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسکین کو ایک ایک صاع دینا واجب نہیں ہے جب کہ فقہ کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ اگر کھجوریں دی جائیں تو صدقہ فطر کی مقدار کے برابر یعنی ایک ایک صاع دی جائیں۔

گویا حدیث کے اس جملہ اور فقہی حکم میں تعارض واقع ہو گیا لیکن اگر اس جملہ کا یہ ترجمہ کیا جائے کہ "تاکہ یہ ان کھجوروں کو ساٹھ مسکینوں کو کھلانے میں صرف کریں" تو پھر کوئی تعارض باقی نہیں رہے گا کیونکہ اس طرح اس ارشاد کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کھجوروں میں اپنے پاس سے بھی کھجوریں ملا کر ساٹھ مسکینوں میں تقسیم کر دو۔

اس کے علاوہ ابوداؤد و دارمی کی دوسری روایت کے یہ الفاظ کہ "ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجوریں کھلاؤ" بھی اس بات کی دلیل ہیں کہ اس جملہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ صرف یہی کھجوریں ساٹھ مسکینوں کو کھلاؤ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کھجوروں میں اپنے پاس سے کھجوریں ملا کر ایک وسق کی مقدار پوری کر لو اور پھر ہر ایک مسکین کو ایک ایک صاع کھجور دے دو، واضح رہے کہ ایک وسق ساٹھ صاع کے برابر ہوتا ہے۔

اگر اظہار کرنے والا کفارہ دینے سے پہلے جماع کر لے تب بھی ایک ہی کفارہ واجب ہو گا

⑤ وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ صَخْرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمُظَاهِرِ يُوَاقِعُ قَبْلَ اَنْ يُكَفِّرَ قَالَ كَفَّارَةٌ وَاحِدَةٌ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت سلیمان ابن یسارؒ (تابعی) حضرت سلمہؓ ابن صخر سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس ظہار کرنے والے کے بارہ میں کہ جو کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع کر لے فرمایا کہ اس پر ایک ہی کفارہ واجب ہو گا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اکثر علماء کا یہی مسلک ہے کہ اگر کوئی شخص ظہار کرے اور پھر کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع کر لے تو اس پر بھی ایک ہی کفارہ واجب ہو گا لیکن بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع کر لینے کی صورت میں دو کفارے واجب ہو جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص اپنی ایک سے زائد دو یا تین اور چار بیویوں سے ظہار کرے یعنی ان سب سے یوں کہے کہ تم سب مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی مانند حرام ہو تو اس صورت میں متفقہ طور پر تمام علماء یہ کہتے ہیں کہ وہ شخص ان سب سے ظہار کرنے والا ہو جاتا ہے البتہ اس بارہ میں اختلافی اقوال ہیں کہ اس پر کفارہ ایک واجب ہو گا یا کئی واجب ہوں گے۔

چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو اس پر کئی کفارے واجب ہوں گے یعنی وہ ان بیویوں میں سے جس کسی کے ساتھ بھی جماع کا ارادہ کرے گا، پہلے کفارہ ادا کرنا واجب ہو گا، حسنؒ، زہریؒ اور ثوریؒ وغیرہ کا بھی یہی قول ہے جب کہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس پر ایک ہی کفارہ واجب ہو گا یعنی وہ پہلے ایک کفارہ ادا کر دے اس کے بعد ہر

بیوی کے ساتھ جماع کرنا جائز ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۶) وَعَنْ عِكْرَمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلاً ظَاهَرَ مِنِ امْرَاَتِهٖ فَغَشِيَهَا قَبْلَ اَنْ يُكَفِّرَ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذَالِكَ لَهٗ فَقَالَ مَا حَمَلَكَ عَلٰى ذَالِكَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَاَيْتُ بَيَاضَ حَجْلَيْهَا فِي الْقَمَرِ فَلَمْ اَمْلِكْ نَفْسِيْ اَنْ وَقَعْتُ عَلَيْهَا فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَمَرَهٗ اَنْ لَا يَقْرَبَهَا حَتّٰى يُكَفِّرَ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَهٗ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ وَرَوٰى اَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِيُّ نَحْوَهٗ مُسْنَدًا وَمُرْسَلاً وَقَالَ النَّسَائِيُّ الْمُرْسَلُ اَوْلٰى بِالصَّوَابِ مِنَ الْمُسْنَدِ۔

"حضرت عکرمہؒ، حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور پھر کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع کر لیا، اس کے بعد وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے یہ واقعہ ذکر کیا آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "کس چیز نے تمہیں ایسا کرنے پر آمادہ کیا (یعنی کیا وجہ پیش آئی کہ تم کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع کر بیٹھے) اس نے عرض کیا کہ "چاندنی میں اس کی پازیب کی سفیدی پر میری نظر پڑ گئی اور میں جماع کرنے سے پہلے اپنے آپ کو روک نہ سکا" (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ ہنس دیئے۔ اور اس کو یہ حکم دیا کہ اب دوبارہ اس سے اس وقت تک جماع نہ کرنا جب تک کفارہ ادا نہ کرو۔ (ابن ماجہؒ) ترمذی نے بھی اسی طرح کی (یعنی اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن، صحیح، غریب ہے، نیز ابوداؤد، اور نسائیؒ نے اس طرح کی روایت مسند اور مرسل نقل کی ہے اور نسائیؒ نے کہا ہے کہ مسند کی بہ نسبت مرسل زیادہ صحیح ہے۔"

بَابٌ

گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کفارۂ ظہار میں جو بردہ آزاد کیا جائے، اس کا مؤمن ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

(۱) عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ قَالَ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ جَارِيَةً كَانَتْ تَرْعٰى غَنَمًا لِيْ فَجِئْتُهَا وَقَدْ فَقَدَتْ شَاةً مِنَ الْغَنَمِ فَسَاَلْتُهَا عَنْهَا فَقَالَتْ اَكَلَهَا الذِّئْبُ فَاَسِفْتُ عَلَيْهَا وَكُنْتُ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ فَلَطَمْتُ وَجْهَهَا وَعَلَيَّ رَقَبَةٌ اَفَاُعْتِقُهَا فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيْنَ اللّٰهُ؟ فقالت فی السماء فقال من انا؟ فقالت انت رسول اللّٰه فقال رسول اللّٰه ﷺ اَعْتِقْهَا رَوَاهُ مَالِكٌ وَفِيْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ قَالَ كَانَتْ لِيْ جَارِيَةٌ تَرْعٰى غَنَمًا لِيْ قِبَلَ اُحُدٍ وَالْجَوَّانِيَّةِ فَاطَّلَعْتُ ذَاتَ يَوْمٍ فَاِذَا الذِّئْبُ قَدْ ذَهَبَ بِشَاةٍ مِنْ غَنَمِنَا وَاَنَا رَجُلٌ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ اٰسَفُ كَمَا يَاْسَفُوْنَ لٰكِنْ صَكَكْتُهَا صَكَّةً فَاَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَظَّمَ ذَالِكَ عَلَيَّ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُعْتِقُهَا قَالَ ائْتِنِيْ بِهَا فَاَتَيْتُهٗ بِهَا فَقَالَ لَهَا اَيْنَ اللّٰهُ قَالَتْ فِي السَّمَاءِ قَالَ مَنْ اَنَا قَالَتْ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَعْتِقْهَا فَاِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ۔

"حضرت معاویہ ابن حکمؓ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ میری ایک لونڈی ہے جو

میرا ریوڑ چراتی ہے میں جب اس کے پاس گیا اور ریوڑ میں اپنی ایک بکری کم پائی، تو میں نے اس سے بکری کے بارہ میں پوچھا کہ وہ کیا ہوئی؟ اس نے کہا کہ بھیڑیا لے گیا مجھ کو اس پر غصہ آگیا اور چونکہ میں بنی آدم میں سے ہوں (یعنی ایک انسان ہوں اور انسان بتقاضائے بشریت مغلوب الغضب ہو جاتا ہے) اس لئے میں نے اس لونڈی کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا اور اس وقت (کفارۂ ظہار، یا کفارہ قسم کے طور پر اور یا کسی اور سبب سے) مجھ پر ایک بردہ (یعنی ایک لونڈی یا ایک غلام آزاد کرنا واجب ہے تو کیا میں اسی لونڈی کو آزاد کر دوں (تاکہ میرے ذمہ سے وہ کفارہ بھی ادا ہو جائے اور اس کو تھپڑ مار دینے کی وجہ سے میں جس ندامت و شرمندگی میں مبتلا ہوں اس سے بھی نجات پا جاؤں) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) اس لونڈی کو طلب فرمایا (اور اس سے) پوچھا کہ "بتاؤ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ اس نے کہا آسمان میں، پھر آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ اس نے کہا کہ آپ (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں" اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اس کو آزاد کر دو" (مالکؒ) مسلم کی روایت میں یوں ہے کہ "حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میری ایک لونڈی تھی جو احد پہاڑ اور جوانیہ کے اطراف میں میرا ریوڑ چرایا کرتی تھی (جوانیہ احد پہاڑ کے قریب ہی ایک جگہ کا نام ہے) ایک دن جو میں نے اپنا ریوڑ دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ بھیڑیا میری ایک بکری کو ریوڑ میں سے اٹھا کر لے گیا ہے میں بنی آدم کا ایک مرد ہوں اور جس طرح (کسی نقصان و اتلاف کی وجہ سے) اولاد آدم کو غصہ آجاتا ہے اسی طرح مجھے بھی غصہ آگیا (چنانچہ اس غصہ کی وجہ سے میں نے چاہا کہ اس لونڈی کو خوب ماروں) لیکن میں اس کو ایک ہی تھپڑ مار کر رہ گیا پھر میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (اور آپ ﷺ کے سامنے یہ سارا ماجرا بیان کیا) آنحضرت ﷺ نے اس واقعہ کو میرے حق میں ایک امر اہم جانا اور فرمایا کہ "تم نے یہ بڑا گناہ کیا ہے" میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! تو کیا میں اس لونڈی کو آزاد کر دوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا اس کو میرے پاس بلاؤ۔ میں اس لونڈی کو آنحضرت ﷺ کے پاس بلا لایا، آنحضرت ﷺ نے اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے اس نے جواب دیا کہ "آسمان میں" پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ "میں کون ہوں؟" اس نے کہا کہ "آپ (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "اس لونڈی کو آزاد کر دو کیونکہ یہ مسلمان ہے!"

تشریح: اس باب میں اس حدیث کو نقل کرنے سے مصنف کتاب کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ظہار میں بطور کفارہ جو بردہ (یعنی غلام یا لونڈی) آزاد کیا جائے اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے لیکن حنفی مسلک میں چونکہ یہ ضروری نہیں ہے اس لئے حنفیہ اس حدیث کو افضلیت پر محمول کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک اس حدیث کی مراد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کفارۂ ظہار میں آزاد کیا جانے والا بردہ اگر مسلمان ہو تو افضل اور بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ ان الفاظ کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کا مقصد اللہ تعالیٰ کے مکان کے بارہ میں سوال نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو مکان و زمان کی قید سے پاک ہے بلکہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ کا مقصد یہ سوال کرنا تھا کہ بتاؤ اللہ تعالیٰ کا حکم کہاں جاری و ساری ہے اور اس کی بادشاہت و قدرت کس جگہ ظاہر و باہر ہے اور اس سوال کی ضرورت یہ تھی کہ اس وقت عرب کے کفار بتوں ہی کو معبود جانتے تھے اور جاہل لوگ ان بتوں کے علاوہ اور کسی کو معبود نہیں جانتے تھے لہٰذا آپ ﷺ نے یہ جاننا چاہا کہ آیا یہ لونڈی موحدہ یا مشرکہ ہے گویا آپ ﷺ کی مراد در اصل ان بے شمار معبودوں کی نفی کرنی تھی جو زمین پر موجود تھے نہ کہ آسمان کو اللہ تعالیٰ کا مکان ثابت کرنا تھا چنانچہ جب اس لونڈی نے مذکورہ جواب دیا تو آنحضرت ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ یہ موحدہ ہے مشرکہ نہیں ہے۔

مالکؒ کی روایت میں تو حضرت معاویہؓ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک بردہ آزاد کرنا مجھ پر کسی اور سبب سے واجب ہے تو کیا میں اس لونڈی کو آزاد کر دوں؟ تاکہ وہ کفارہ بھی ادا ہو جائے جو واجب ہے اور اس کو مارنے کی وجہ سے مجھے جو پشیمانی اور شرمندگی ہے وہ بھی جاتی رہے لیکن مسلمؒ نے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت معاویہؓ نے اس لونڈی کو محض اس وجہ سے آزاد کرنا چاہا کہ انہوں نے اس کو غصہ میں مار دیا تھا۔

گویا دونوں روایتوں کے مفہوم میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ان دونوں میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ

مالک ؒ کی روایت میں تو اس مفہوم کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ یوں تو کسی اور سبب سے مجھ پر بردہ آزاد کرنا واجب ہے لیکن مارنے کی وجہ سے بھی اس کو آزاد کرنا میرے لئے ضروری ہو گیا ہے تو اگر میں اس کو آزاد کر دوں تو ان دونوں سبب کا تقاضا پورا ہو جائے گا، اس کے برخلاف مسلم ؒ کی روایت اس بارہ میں مطلق ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہی کہا جائے گا کہ مسلم ؒ کی روایت کا مطلق مفہوم مالک ؒ کی روایت کے مقید مفہوم پر محمول ہے یعنی مسلم ؒ کی روایت کے الفاظ کا مطلب بھی وہی ہے جو مالک ؒ کی روایت کے الفاظ کا ہے کہ اگر میں اس لونڈی کو آزاد کر دوں تو کیا دونوں سبب پورے ہو جائیں گے یا نہیں؟

کفارۂ ظہار کے کچھ مسائل: حنفی مسلک کے مطابق ظہار کے کفارہ میں سب سے پہلا درجہ بردہ (لونڈی یا غلام) کو آزاد کرنے کا ہے بردہ خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا اور خواہ کانا و بہرا ہو لیکن اسی قدر بہرا ہو کہ اگر اس کو بآواز بلند مخاطب کیا جائے تو سن لے اور اگر کوئی ایسا بردہ ہو کہ اس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر کٹا ہوا ہو تو اس کو آزاد کرنا بھی درست ہوگا بشرطیکہ یہ دونوں عضو مختلف جانب کے کٹے ہوئے ہوں مثلاً اگر دایاں ہاتھ کٹا ہوا ہو تو پیر بایاں کٹا ہوا ہو اسی طرح اس مکاتب کو آزاد کرنا بھی درست ہے جس نے اپنا بدل کتابت کچھ بھی ادا نہ کیا ہو۔

جو بردہ گونگا ہو یا ایسا بہرا ہو کہ سرے سے کچھ سن ہی نہ سکتا ہو (خواہ اسے کتنی ہی بلند آواز میں مخاطب کیا جائے) تو اس کو آزاد کرنے سے کفارۂ ظہار ادا نہیں ہوگا، اسی طرح جس بردہ کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں یا دونوں پیر یا دونوں پیروں کے دونوں انگوٹھے کٹے ہوئے ہوں یا ایک ہاتھ اور ایک پیر دونوں ایک ہی طرف کے کٹے ہوئے ہوں مثلاً دایاں ہاتھ بھی کٹا ہوا ہو اور دایاں پیر بھی کٹا ہوا ہو تو ایسے بردہ کو آزاد کرنا بھی کافی نہیں ہوگا، ایسا بردہ جو مجنون ہو (یعنی جس پر ہمیشہ دیوانگی طاری رہتی ہو) یا جو مدبر یا اُمّ ولد ہو یا ایسا مکاتب ہو جس نے بدل کتابت میں سے کچھ ادا کر دیا ہو تو ان میں سے بھی کسی کو آزاد کرنے سے کفارۂ ظہار ادا نہیں ہوگا۔

دوسرا درجہ پے در پے روزے رکھنے کا ہے یعنی اگر ظہار کرنے والے کو بردہ نہ ملے تو پھر وہ دو مہینے مسلسل روزے رکھے اس طور پر کہ ان دونوں مہینوں میں نہ تو رمضان کا مہینہ آئے اور نہ وہ دن آئیں جن میں روزہ رکھنا ممنوع ہے جیسے عید اور بقر عید کا دن اور ایام تشریق اور جب تک روزے ختم نہ ہو جائیں (یعنی دو مہینے کے مسلسل روزے پورے نہ ہو جائیں) تب تک عورت سے صحبت نہ کرے اگر روزے ختم ہونے سے پہلے اس عورت سے (کہ جس سے ظہار کیا ہے) صحبت کر لی تو اب سب روزے پھر سے رکھے چاہے دن میں اس عورت سے صحبت کی ہو یا رات میں اور چاہے قصداً ایسا کیا ہو یا بھولے سے سب کا ایک ہی حکم ہے اسی طرح اگر کسی عذر کی وجہ سے یا بلا عذر روزہ افطار کر لیا تو بھی از سر نو سب روزے رکھے۔

تیسرا درجہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا ہے یعنی اگر کوئی شخص مذکورہ بالا شرائط و قیود کے ساتھ روزے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر وہ ساٹھ مسکینوں اور فقیروں کو دو وقت کھانا کھلائے یا ان کو کچا اناج دیدے کچا اناج دینے کی صورت یہ ہے کہ ہر مسکین و فقیر کو نصف صاع (پونے دو سیر یعنی ایک کلو ۶۳۳ گرام) گیہوں یا ایک صاع ساڑھے تین سیر یعنی تین کلو ۲۶۶ گرام جو یا کھجوریں یا ان میں سے کسی ایک مقدار کی قیمت دے دے اسی طرح اگر ان میں سے کوئی چیز دینے کی بجائے دو چیزیں دی جائیں تو بھی جائز ہے مثلاً چودہ چھٹانک یعنی ۸۱۷ گرام گیہوں کے ساتھ پونے دو سیر یعنی ایک کلو ۶۳۳ گرام جو دیا جاسکتا ہے۔

کفارہ میں اباحت جائز ہے: "اباحت" کا مطلب یہ ہے کہ کھانا پکا کر فقیر کے سامنے رکھ دیا جائے تاکہ وہ اس میں سے جس قدر کھانا چاہے کھالے، چنانچہ یہ اباحت کفارات اور (رمضان کے روزے کے بدلہ میں دیئے جانے والے) فدیہ میں تو جائز ہے لیکن صدقات واجبہ مثلاً زکوٰۃ وغیرہ میں جائز نہیں ہے کیونکہ صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ وغیرہ میں فقیر کو مال کا مالک بنا دینا ضروری ہے اس وضاحت کے بعد اب سمجھئے کہ ظہار کے کفارہ میں ساٹھ مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے خواہ ایک ہی دن میں دو وقت یعنی دوپہر اور رات میں کھلا دیا جائے۔ اسی طرح "کھلانے" میں پیٹ بھرنے کا اعتبار ہے خواہ کتنے ہی تھوڑے کھانے میں ان کا پیٹ بھر جائے جہاں تک کھانے

کی نوعیت کا سوال ہے تو اس کا انحصار کھلانے والے کی حیثیت و استطاعت پر ہے کہ وہ جیسا کھانا کھلا سکتا ہو کھلائے اگر کھانے میں جو کی روٹی ہو تو اس کے ساتھ سالن ہونا ضروری ہے البتہ گیہوں کی روٹی کے ساتھ سالن ضروری نہیں ہے اگر دو وقت ساٹھ فقیروں کو کھلانے کی بجائے ایک ہی فقیر کو ساٹھ دن تک دونوں وقت کھلائے تو بھی جائز ہے لیکن ایک ہی فقیر کو ایک ہی دن ساٹھ فقیروں کا کھانا دے دیا تو یہ جائز نہیں ہوگا اس صورت میں صرف ایک ہی دن کا ادا ہوگا۔

ظہار کرنے والے نے اگر کھانا کھلانے کے درمیان جماع کرلیا تو اس صورت میں اگرچہ وہ گنہ گار ہوگا مگر ازسرنو کھانا کھلانا نہ پڑے گا۔ اگر کسی شخص پر دو ظہار کے دو کفارے واجب ہوں اور وہ ساٹھ فقیروں کو مثلاً گیہوں نصف صاع فی کفارہ کا اعتبار کر کے ایک ایک صاع دے تو دونوں ظہار کا کفارہ ادا نہیں ہوگا بلکہ ایک ہی ظہار کا کفارہ ادا ہوگا۔ ہاں اگر کسی شخص پر ایک ایک کفارہ تو ظہار کا اور ایک کفارہ روزہ توڑنے کا واجب ہو اور وہ ہر فقیر کو ایک ایک صاع گیہوں دے تو یہ جائز ہوگا اور دونوں کفارے ادا ہو جائیں گے۔

بَابُ اللِّعَانِ

لعان کا بیان

لعان کے معنی و تعریف: لِعَانٌ اور مُلَاعَنَةٌ کے معنی ہیں "ایک دوسرے پر لعنت کرنا" شرعی اصطلاح میں "لعان" اس کو کہتے ہیں کہ جب شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے یا جو بچہ پیدا ہو اس کے بارہ میں یہ کہے کہ یہ میرا نہیں نہ معلوم کس کا ہے اور بیوی اس سے انکار کرے اور کہے کہ تم مجھ پر تہمت لگا رہے ہو پھر وہ قاضی اور شرعی حاکم کے پاس فریاد کرے، قاضی شوہر کو بلا کر اس الزام کو ثابت کرنے کے لئے کہے چنانچہ اگر شوہر گواہوں کے ذریعہ ثابت کردے تو قاضی اس کی بیوی پر زنا کی حد جاری کرے اور اگر شوہر چار گواہوں کے ذریعہ الزام ثابت نہ کرسکے تو پھر قاضی پہلے شوہر کو اس طرح کہلائے کہ "میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے جو زنا کی نسبت اس کی طرف کی ہے اس میں سچا ہوں" عورت کی طرف اشارہ کر کے چار دفعہ شوہر اسی طرح کہے پھر پانچویں دفعہ عورت کی طرف اشارہ کر کے یہ کہے کہ میں نے اس عورت کی طرف زنا کی جو نسبت کی ہے اگر میں اس میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔

جب شوہر پانچویں دفعہ کہہ چکے تو بیوی مرد کی طرف اشارہ کر کے چار دفعہ اس طرح کہے "میں خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ اس نے میری طرف جو زنا کی نسبت کی ہے اس میں یہ جھوٹا ہے" پھر پانچویں دفعہ مرد کی طرف اشارہ کر کے یوں کہے کہ "اس مرد نے میری طرف جو زنا کی نسبت کی ہے اگر اس میں یہ سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ٹوٹے۔"

جب دونوں اس طرح ملاعنت کریں تو حاکم دونوں میں جدائی کرادے گا اور ایک طلاق بائن پڑ جائے گی اور وہ عورت اس مرد کے لئے ہمیشہ کو حرام ہو جائے گی ہاں اگر اس کے بعد مرد خود اپنے کو جھٹلائے (یعنی یہ اقرار کرے کہ میں نے عورت پر جھوٹی تہمت لگائی تھی) تو اس صورت میں اس پر حد تہمت جاری کی جائے گی۔ اور عورت سے پھر نکاح کرنا اس کے لئے درست ہو جائے گا۔ لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر مرد خود اپنے کو جھٹلائے تب بھی عورت اس کے لئے ہمیشہ کو حرام رہے گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دربار رسالت میں لعان کا ایک واقعہ

① عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدِ السَّاعِدِيِّ قَالَ اِنَّ عُوَيْمِرَ الْعَجْلَانِيَّ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ رَجُلًا وَجَدَ مَعَ امْرَأَتِهٖ رَجُلًا اَيَقْتُلُهٗ فَيَقْتُلُوْنَهٗ اَمْ كَيْفَ يَفْعَلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اُنْزِلَ فِيْكَ وَصَاحِبَتِكَ فَاذْهَبْ فَأْتِ بِهَا

قَالَ سَعْدٌ فَتَلَا عَنَا فِي الْمَسْجِدِ وَاَنَا مَعَ النَّاسِ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا فَرَغَا قَالَ عُوَيْمِرٌ كَذَبْتُ عَلَيْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ اَمْسَكْتُهَا فَطَلَّقَهَا ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْظُرُوْا فَاِنْ جَاءَتْ بِهٖ اَسْحَمَ اَدْعَجَ الْعَيْنَيْنِ عَظِيْمَ الْاَلْيَتَيْنِ خَدَلَّجَ السَّاقَيْنِ فَلَا اَحْسِبُ عُوَيْمِرًا اِلَّا قَدْ صَدَقَ عَلَيْهَا وَاِنْ جَاءَتْ بِهٖ اُحَيْمِرَ كَاَنَّهٗ وَحَرَةٌ فَلَا اَحْسِبُ عُوَيْمِرًا اِلَّا قَدْ كَذَبَ عَلَيْهَا فَجَاءَتْ بِهٖ عَلَى النَّعْتِ الَّذِيْ نَعَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ تَصْدِيْقِ عُوَيْمِرٍ فَكَانَ بَعْدُ يُنْسَبُ اِلٰى اُمِّهٖ۔ (متفق علیہ)

''حضرت سہل ابن سعد ساعدیؓ کہتے ہیں کہ (ایک صحابی) عویمر عجلانیؓ نے (دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! مجھے اس شخص کے بارہ میں بتائیے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی اجنبی مرد کو پائے (اور اسے یہ یقین ہو کہ اس مرد نے اس کی بیوی کے ساتھ زنا کیا ہے) کیا وہ اس مرد کو قتل کر ڈالے؟ اگر وہ اس کو مار ڈالے گا تو مقتول کے وارث اس کو قتل کر دیں گے ایسی صورت میں وہ کیا کرے (آیا اس عار پر صبر کرے یا کوئی اقدام کرے؟) رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر اس سے فرمایا کہ ''تم میاں بیوی کے قضیہ میں وحی نازل کی گئی ہے۔ جاؤ اپنی بیوی کو بلا لاؤ'' حضرت سہلؓ کہتے ہیں کہ عویمرؓ اپنی بیوی کو بلا لائے اور میاں بیوی نے (مسجد نبوی میں لعان کیا اور میں بھی اس وقت دوسرے لوگوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے پاس ہی موجود تھا چنانچہ جب وہ دونوں میاں بیوی لعان سے فارغ ہوئے تو عویمرؓ (یعنی میاں نے کہا کہ اگر میں اس عورت کو اپنے پاس رکھوں تو گویا میں نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے اس کے بعد انہوں نے اس عورت کو تین بار طلاق دی پھر رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر یہ عورت (اپنے موجودہ حمل سے) ایسا بچہ جنے جس کا رنگ سیاہ آنکھیں بہت کالی ہوں، کولہے بڑے ہوں اور دونوں پنڈلیوں کا گوشت بھرا ہو تو میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھوں گا کہ عویمرؓ نے اس عورت کے بارہ میں جو کہا ہے سچ کہا ہے (کیونکہ عویمرؓ نے جس مرد کی طرف زنا کی نسبت کی وہ اسی رنگ وصورت کا ہے اور جب اسی کی شباہت کا بچہ پیدا ہوگا تو یہی کہا جائے گا کہ وہ اسی کے نطفہ سے ہے) اور اگر اس عورت نے ایسا بچہ جنا جس کا رنگ سرخ ہو اور بامنی کے رنگ کا معلوم ہوتا ہو تو پھر میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھوں گا کہ عویمرؓ نے اس کے بارہ میں جھوٹ بولا ہے'' (یعنی عویمرؓ چونکہ سرخ رنگ کے ہیں اس لئے بچہ کی رنگت بھی سرخ ہوئی تو سمجھا جائے گا کہ بچہ عویمرؓ ہی کے نطفہ سے ہے اور عویمرؓ نے اپنی بیوی کو جھوٹی تہمت لگائی ہے) چنانچہ جب اس عورت کا بچہ پیدا ہوا تو وہ اسی رنگ وصورت کا تھا جس کو رسول کریم ﷺ نے عویمرؓ کی تصدیق کے لئے ذکر کیا تھا (یعنی وہ بچہ اسی مرد کی شباہت کا تھا جس کی طرف سے عویمرؓ نے زنا کی نسبت کی تھی گویا عویمر کی بات سچ ثابت ہوئی) اس کے بعد وہ بچہ (آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق) اپنی ماں کی طرف منسوب کیا گیا۔'' (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اگر کوئی شخص کسی غیر مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ منہ کالا کرتا ہوا پائے اور وہ شخص اس مرد کو جان سے مار ڈالے تو اس کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا وہ شخص (جس نے اپنی بیوی کے ساتھ منہ کالا کرنے والے کو جان سے مار ڈالا ہے) اسلامی قانون کے مطابق قصاص یعنی سزا موت کا مستوجب ہے یا نہیں؟ چنانچہ جمہور علماء کا قول یہی ہے کہ اس کو سزائے موت دی جائے ہاں اگر وہ شخص اس بات کے ثبوت میں کہ مقتول نے اس کی بیوی کے ساتھ منہ کالا کیا تھا چار گواہ پیش کرے یا خود مقتول کے ورثاء اس بات کا اقرار کر لیں تو اس صورت میں اس کو سزائے موت نہیں دی جائے گی تاہم یہ ملحوظ رہے کہ اگر چار پیش نہ کرنے یا مقتول کے ورثاء کے اقرار نہ کرنے کی صورت میں اسے سزائے موت دے دی گئی تو واقع کے اعتبار سے وہ سچا تھا تو خدا کے نزدیک گنہ گار نہیں سمجھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کی ہے کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ الاية۔ (النساء ۲۴: ۶-۷)

"اور جو لوگ اپنی بیویوں پر (زنا کی) تہمت لگائیں اور ان کے پاس بجز اپنے (ہی دعوی کے) اور کوئی گواہ نہ ہو تو ان کی شہادت (جو کہ ان کو حد قذف سے بچاسکتی ہے) یہی ہے وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ دے بیشک میں سچا ہوں اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں۔ (آخر تک)۔"

بعض مفسرینؒ کے قول کے مطابق یہ آیات کریمہ ۹ ہجری کے ماہ شعبان میں نازل ہوئی ہیں، ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لعان کے بارہ میں مذکورہ بالا آیت حضرت عویمرؓ کے واقعہ پر نازل ہوئی ہے اور اسلام میں سب سے پہلا لعان انہی کی طرف سے ہوا تھا جب کہ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ایک دوسرے صحابیؓ حضرت ہلال ابن امیہؓ کے بارہ میں نازل ہوئی تھی اور اسلام میں سب سے پہلے ہلالؓ ہی نے لعان کیا ہے چنانچہ آگے حضرت ابن عباسؓ کی جو روایت آئے گی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے لہٰذا اس صورت میں ارشاد گرامی "تم میاں بیوی کے قضیہ میں وحی نازل کی گئی ہے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے قضیہ جیسے ایک قضیہ میں وحی نازل کی گئی ہے۔"

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ آیت دونوں ہی کے بارہ میں نازل ہوئی ہو جس کی صورت یہ ہوئی ہوگی کہ پہلے ان میں سے کسی ایک نے آنحضرت ﷺ سے اپنے بارہ میں سوال کیا ہوگا پھر بعد میں دوسرے کا قضیہ پیش آیا ہوگا اور اس نے بھی آنحضرت ﷺ سے سوال کیا ہوگا یہاں تک کہ ان دونوں کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی لیکن ان دونوں میں حضرت ہلالؓ نے پہلے لعان کیا۔

"گویا میں نے اس پر جھوٹ تہمت لگائی ہے" یہ حضرت عویمرؓ نے دراصل تین طلاق دینے کا سبب بیان کیا کہ اس صورت حال کے بعد بھی اگر میں اس عورت کو اپنے نکاح میں رکھوں اور طلاق نہ دوں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ میں نے اس کی طرف زنا کی جھوٹی نسبت کی ہے کیونکہ اس کو نکاح میں رکھنے کا مطلب یہی ہوگا کہ گویا میں نے جو کچھ کہا ہے سب جھوٹ ہے اور یہ عورت بدکاری کے گناہ سے پاک ہے۔

لعان کی صورت میں میاں بیوی کے درمیان تفریق کا مسئلہ

(۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاعَنَ بَيْنَ رَجُلٍ وَامْرَأَتِهِ فَانْتَفٰى مِنْ وَلَدِهَا فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا وَاَلْحَقَ الْوَلَدَ بِالْمَرْأَةِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ حَدِيْثِهِ لَهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَظَهٗ وَذَكَّرَهٗ وَاَخْبَرَهٗ اَنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا اَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْاٰخِرَةِ ثُمَّ دَعَاهَا فَوَعَظَهَا وَذَكَّرَهَا وَاَخْبَرَهَا اَنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا اَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْاٰخِرَةِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص اور اس کی بیوی کے مابین لعان کا حکم فرمایا چنانچہ (اس لعان کی وجہ سے) وہ شخص اس عورت کے بچہ سے دور ہوگیا، (یعنی بچہ کا نسب اس شخص سے ہٹا دیا گیا نیز آنحضرت ﷺ نے میاں بیوی کے درمیان تفریق (جدائی) کرادی اور بچہ کو عورت کے حوالہ کر دیا۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت ابن عمرؓ کی ایک اور روایت میں جو بخاری و مسلم ہی نے نقل کی ہے یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو نصیحت کی اور آخرت کا عذاب یاد دلایا (تاکہ وہ جھوٹ نہ بولے اور عورت اپنے الزام کو ناحق ثابت نہ کرے) اور اس کو اس بات سے آگاہ کیا کہ دنیا کا عذاب، آخرت کے عذاب سے سہل ہے پھر آپ ﷺ نے عورت کو بلایا، اس کو بھی نصیحت کی اور آخرت کا عذاب یاد دلایا اور آگاہ کیا کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے سہل ہے۔"

تشریح: "تفریق کرادی" کا مطلب یہ ہے کہ لعان کی صورت میں میاں بیوی کے درمیان تفریق (جدائی) حاکم وقاضی کے حکم ہی سے ہوتی ہے۔ نہ کہ محض لعان سے۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہی ہے نیز ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر نفس لعان ہی سے تفریق واقع ہو جاتی تو پھر تین طلاقیں کیوں دی جاتیں جیسا کہ اوپر کی حدیث میں گزرا کہ حضرت عویمرؓ نے لعان کے بعد اپنی بیوی کو تین طلاق

دی۔

دنیا کے عذاب سے مراد "حد یعنی شرعی سزا" ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر مرد کسی عورت کو (چاہے وہ اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہو) زنا کی تہمت لگائے اور اس کی تہمت جھوٹی ثابت ہو جائے تو شرعی قانون کے مطابق اس پر حد جاری کی جائے گی یعنی اس کو ایک پاکدامن عورت پر زنا کی جھوٹ تہمت لگانے کے جرم میں اسی کوڑے مارے جائیں گے اور اگر وہ مرد سچا ثابت ہو جائے یعنی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے کہ اس عورت نے بدکاری کرائی ہے تو پھر اس عورت پر حد جاری ہوگی کہ شادی شدہ ہونے کی صورت میں اس کو سنگسار کر دیا جائے گا اور غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں سو کوڑے مارے جائیں گے اس صورت میں یہ امکان ہو سکتا ہے کہ مرد نے کسی غلط فہمی کی بناء پر یا کسی خاص جذبہ کے تحت عورت کو تہمت لگادی ہو اور پھر اسے یہ یقین ہو گیا ہو کہ میں نے عورت پر جو الزام لگایا ہے وہ بے بنیاد ہے مگر اب اس خوف سے کہ ایک پاکدامن عورت پر جھوٹی تہمت لگائی تھی یا یہ کہ واقعۃً عورت نے بدکاری کرائی ہو مگر اس خوف سے کہ میں سنگسار کر دی جاؤں گی یا سو کوڑے ماری جاؤں گی اپنے اس گناہ کا اعتراف و اقرار نہیں کرتی بلکہ ملاعنت پر تیار ہو جاتی ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس امکانی صورت کے خلاف دونوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں دنیا کا عذاب (یعنی یہاں کی سزا) کہیں آسان اور سہل ہے اس لئے جو صورت حال ہو اور جو سچ بات ہو اس کا اعتراف و اقرار کر لو اور اس دنیا کے آسان عذاب کو اختیار کر کے آخرت کے سخت ترین عذاب سے بچو۔

لعان کرنے والوں کا محاسبہ آخرت میں ہو گا

(۳) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِلْمُتَلَاعِنَيْنِ حِسَابُكُمَا عَلَى اللّٰهِ اَحَدُكُمَا كَاذِبٌ لَا سَبِيْلَ لَكَ عَلَيْهَا قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَالِي قَالَ لَا مَالَ لَكَ اِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ عَلَيْهَا فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا وَاِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ عَلَيْهَا فَذَاكَ اَبْعَدُ وَاَبْعَدُ لَكَ مِنْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے لعان کرنے والے مرد و عورت سے فرمایا (ہم صرف ظاہری احوال و وجوہ کی بنیاد ہی پر کوئی حکم نافذ کر سکتے ہیں اور وہ ہم نے لعان کی صورت میں نافذ کر دیا ہے البتہ) تمہارا تمہارا حساب خدا کے ہاں ہو گا کیونکہ (نفس الامر اور حقیقت کے اعتبار سے) تم دونوں میں سے کوئی ایک ضرور جھوٹا ہے (پھر آپ ﷺ نے مرد سے فرمایا کہ) اب عورت کے بارہ میں تمہارے لئے کوئی راہ نہیں ہے (یعنی لعان کے بعد اب اس عورت کے ساتھ رہنا تمہارے لئے جائز نہیں ہے کیونکہ یہ تمہارے لئے ہمیشہ حرام ہو گئی ہے) مرد نے عرض کیا "یا رسول اللہ! اور میرا مال (یعنی میں نے اس عورت کو جو مہر دیا ہے کیا وہ مجھ سے جاتا رہے گا؟) آپ ﷺ نے فرمایا اس مال پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ (یعنی دیئے ہوئے مہر کو واپس لینے کا تمہیں کوئی حق حاصل نہیں کیونکہ) اگر تم نے اس عورت کے بارہ میں سچ کہا ہے (یعنی تمہارے کہنے کے مطابق اگر اس عورت نے واقعۃً بدکاری کرائی ہے) تو وہ مال اس چیز کا بدلہ ہو گیا کہ تم نے اس کی شرم گاہ کو حلال کیا ہے اگر تم نے اس عورت کے بارہ میں جھوٹ بولا ہے تو وہ اس صورت میں مہر کا واپس لے لینا اس سے بھی بعید ہے اور تم سے بھی بہت بعید ہے (یعنی جب سچ کی صورت میں مہر کو واپس لینے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے تو جھوٹ کی صورت میں تو بدرجۂ اولیٰ تمہیں وہ مہر واپس نہ لینا چاہئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: تمہارا حساب خدا کے ہاں ہو گا کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تو ہم نے تمہارے اس تنازعہ کو لعان کی صورت میں ختم کرا دیا ہے مگر تم دونوں کا حقیقی محاسبہ آخرت میں ہو گا کہ وہاں تمہارے معاملہ کی تحقیق کی جائے گی اور پھر تم میں سے جو جھوٹا ہو گا اس کو اس کی سزا اللہ تعالیٰ دے گا۔

"تو وہ مال اس چیز کا بدل ہو گیا الخ" اس بات کی دلیل کہ لعان کرنے والا مہر واپس نہ لے بشرطیکہ اس عورت کے ساتھ اس نے

دخول کیا ہو، چنانچہ اس بارہ میں تمام علماء کا متفقہ طور پر یہی مسلک ہے البتہ عدم دخول کے بارہ میں اختلافی اقوال ہیں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ اگر لعان کرنے والے نے اس عورت کے ساتھ دخول نہ کیا ہو تو اس صورت میں وہ آدھے مہر کی حقدار ہوگی۔

آیت لعان کا شان نزول

④ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ هِلَالَ بْنَ اُمَيَّةَ قَذَفَ امْرَاَتَهٗ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَرِيْكِ بْنِ سَحْمَاءَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْبَيِّنَةَ اَوْ حَدًّا فِيْ ظَهْرِكَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِذَا رَاٰى اَحَدُنَا عَلٰى امْرَاَتِهٖ رَجُلًا يَنْطَلِقُ يَلْتَمِسُ الْبَيِّنَةَ فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْبَيِّنَةُ وَاِلَّا حَدٌّ فِيْ ظَهْرِكَ فَقَالَ هِلَالٌ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ اِنِّيْ لَصَادِقٌ فَلَيُنْزِلَنَّ اللّٰهُ مَا يُبَرِّئُ ظَهْرِيْ مِنَ الْحَدِّ فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ فَقَرَاَ حَتّٰى بَلَغَ اِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ فَجَاءَ هِلَالٌ فَشَهِدَ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ اَنَّ اَحَدَكُمَا كَاذِبٌ فَهَلْ مِنْكُمَا تَائِبٌ ثُمَّ قَامَتْ فَشَهِدَتْ فَلَمَّا كَانَتْ عِنْدَ الْخَامِسَةِ وَقَفُوْهَا وَقَالُوْا اِنَّهَا مُوْجِبَةٌ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَتَلَكَّاَتْ وَنَكَصَتْ حَتّٰى ظَنَنَّا اَنَّهَا تَرْجِعُ ثُمَّ قَالَتْ لَا اَفْضَحُ قَوْمِيْ سَائِرَ الْيَوْمِ فَمَضَتْ وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْصِرُوْهَا فَاِنْ جَاءَتْ بِهٖ اَكْحَلَ الْعَيْنَيْنِ سَابِغَ الْاَلْيَتَيْنِ خَدَلَّجَ السَّاقَيْنِ فَهُوَ لِشَرِيْكِ ابْنِ سَحْمَاءَ فَجَاءَتْ بِهٖ كَذٰلِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْلَا مَا مَضٰى مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ لَكَانَ لِيْ وَلَهَا شَاْنٌ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک صحابی) ہلال ابن امیہؓ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنی بیوی پر شریکؓ ابن سحماء صحابی کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی (یعنی ہلالؓ نے کہا کہ شریک ابن سحماء نے میری بیوی کے ساتھ زنا کیا ہے) نبی کریم ﷺ نے (ہلالؓ سے) فرمایا کہ "(اپنے الزام کے ثبوت میں) گواہ پیش کرو ورنہ (جھوٹی تہمت لگانے کے جرم میں) تمہاری پیٹھ پر حد جاری کی جائے گی (یعنی اسی کوڑے مارے جائیں گے) ہلالؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر ہم میں سے کوئی کسی کو اپنی بیوی کے ساتھ بدکاری میں مبتلا دیکھے تو کیا وہ گواہ ڈھونڈھنے چلا جائے (یعنی اول تو ایسی صورت میں اتنا موقع کہاں کہ کسی کو گواہ کرے پھر یہ کہ کسی کو گواہ کرنے کی وہ جگہ کیا ہے) لیکن نبی کریم ﷺ یہی فرمائے جا رہے تھے کہ گواہ پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد جاری کی جائے گی پھر ہلالؓ نے عرض کیا کہ قسم ہے اس پاک ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا میں سچا ہوں مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا حکم ضرور نازل فرمائے گا جو میری پیٹھ کو حد سے بری رکھے گا، آخر کار (کچھ ہی عرصہ بعد) حضرت جبرئیل تشریف لائے اور آنحضرت ﷺ پر یہ آیتیں نازل کی گئی ہیں والذین یرمون ازواجھم الایۃ (یعنی اور جو لوگ کہ اپنی بیویوں کو تہمت لگاتے ہیں الخ پھر اس کے بعد کی آیتوں ان کان من الصادقین تک تلاوت کی، اس کے بعد ہلالؓ دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور گواہی دی (یعنی لعان کی جو تفصیل پیچھے بیان کی جا چکی ہے اس کے ساتھ انہوں نے پانچ مرتبہ گواہی کے ذریعہ لعان کیا) اور نبی کریم ﷺ فرماتے تھے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں تم سے کوئی ایک جھوٹا ہے سو تم میں سے کون ہے جو توبہ کرے اس کے بعد ہلالؓ کی بیوی کھڑی ہوئی اور لعان کیا (یعنی چار مرتبہ اپنی پاکدامنی کی شہادت دی) اور جب وہ پانچویں مرتبہ گواہی دینے چلی تو (صحابہؓ نے) اس کو روکا اور کہا کہ اچھی طرح سوچ سمجھ لو) یہ پانچویں گواہی (تم دونوں کے درمیان جدائی کو) واجب کر دے گی۔ (یا اگر تم جھوٹی ہوگی تو آخرت کے عذاب کو واجب کر دے گی) ابن عباسؓ کہتے ہیں (یہ سن کر) وہ عورت ٹھہر گئی اور پیچھے ہٹی (یعنی وہ پانچویں مرتبہ کچھ گواہی دینے میں متامل ہوئی) جس سے ہمیں یہ گمان ہوا کہ یہ اپنی بات سے پھر جائے گی لیکن پھر اس نے کہا کہ میں (لعان سے بچ کر اور اپنے خاوند کے الزام کی تصدیق کر کے) اپنی قوم کو ساری عمر کے لئے رسوا نہیں کروں گی (یہ کہہ کر) اس نے پانچویں گواہی کو بھی پورا کر دیا (اس طرح جب لعان پورا ہو گیا اور

آنحضرت ﷺ نے دونوں میاں بیوی کے درمیان جدائی کرادی تو آپ نے فرمایا "اس کو دیکھتے رہنا اگر اس نے ایسے بچہ کو جنم دیا جس کی آنکھیں سرمگی کو لہے بھاری اور پنڈلیاں موٹی ہوں تو وہ بچہ شریک ابن سحماء کا ہوگا (کیونکہ شریک اسی طرح کے ہیں) چنانچہ جب اس عورت نے ایسے ہی بچہ کو جنم دیا (جو شریک کے مشابہ تھا) تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اگر کتاب اللہ کا مذکورہ حکم نہ ہوتا (جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لعان کرنے والوں پر حد و تعزیر جاری نہیں ہوگی) تو پھر میں اس عورت کے ساتھ دوسرا ہی معاملہ کرتا (یعنی شریک کے ساتھ اس بچہ کی مشابہت اس عورت کی بدکاری کا ایک واضح قرینہ ہے۔ اس لئے اس کی اس بدکاری پر میں اس کو ایسی سزا دیتا کہ دیکھنے والوں کو بھی عبرت ہوتی)۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے حضرت ہلالؓ نے لعان کیا ہے اور اس موقع پر لعان کے سلسلہ میں مذکورہ آیت نازل ہوئی اس بارہ میں جو تحقیقی تفصیل ہے وہ حضرت سہلؓ کی روایت کی تشریح میں بیان ہو چکی ہے۔

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے الخ" بظاہر زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بات ان دونوں کے لعان سے فارغ ہونے کے بعد ارشاد فرمائی۔ اور اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ جو بھی شخص کوئی جھوٹی بات کہے یا کسی پر جھوٹی تہمت لگائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ توبہ کرے، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ بات لعان سے پہلے ان دونوں کو جھوٹ کے عواقب سے ڈرانے کے لئے ارشاد فرمائی۔

اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ حاکم و قاضی کسی بھی معاملہ میں اپنے گمان و خیال قرائن اور کسی علامت کی بنیاد پر کوئی حکم نہ دے بلکہ وہی حکم دے جس کا دلائل و شواہد تقاضا کریں۔

زنا کی تہمت چار گواہوں کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ سَعْدُبْنُ عُبَادَةَ لَوْ وَجَدْتُ مَعَ اَهْلِی رَجُلًا لَمْ اَمَسَّهُ حَتّٰی اٰتِیَ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ قَالَ كَلَّا وَالَّذِیْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ اِنْ كُنْتُ لَاُعَاجِلُهُ بِالسَّیْفِ قَبْلَ ذٰلِكَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اسْمَعُوْا اِلٰی مَایَقُوْلُ سَیِّدُكُمْ اِنَّهُ لَغَیُوْرٌ وَّاَنَا اَغْیَرُ مِنْهُ وَاللّٰهُ اَغْیَرُ مِنِّیْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک صحابی) سعدؓ نے کہا کہ اگر میں کسی غیر مرد کو اپنی بیوی کے پاس پاؤں تو جب تک کہ چار گواہ فراہم نہ کرلوں اس کو ہاتھ نہ لگاؤں؟ (یعنی نہ اس کو ماروں اور نہ قتل کروں؟) رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہاں" سعدؓ نے کہا کہ ہرگز نہیں قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ (ﷺ) کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں قبل اس کے کہ چار گواہ فراہم کروں فوری طور پر تلوار سے اس کا خاتمہ کردوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے (حاضرین مجلس کو مخاطب کرکے) فرمایا "سنو! تمہارا سردار (یعنی سعدؓ) کیا کہہ رہا ہے بلاشبہ وہ غیرت مند ہے میں اس سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہے۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا یہ جواب سن کر حضرت سعدؓ نے جو کچھ کہا اس سے نہ تو آنحضرت ﷺ کے قول کی تردید مقصود تھی اور نہ آنحضرت ﷺ کے حکم کی مخالفت منظور تھی بلکہ انہوں نے اپنی اس بات کے ذریعہ دراصل اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کے بارہ میں بتایا۔ کہ میرا حال تو یہ ہے۔ میرے غصہ اور میری غیرت کا یہ عالم ہے کہ اگر میں اپنی بیوی کے پاس کسی غیر مرد کو دیکھ لوں تو اس کو فوراً قتل کر دوں جب کہ اس بارہ میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب تک چار گواہ فراہم نہ کرلو۔ اس کو کچھ نہ کہو۔ تو اس صورت میں میرے لئے کونسا راستہ ہے؟ اس لئے آنحضرت ﷺ نے حضرت سعدؓ کی یہ بات سن کر لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کیا کہ سنو تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے۔ گویا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد "سنو تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے؟" کی مراد حضرت سعدؓ کے وصف کی تعریف کرنا ہے اور اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ طبیعت و مزاج میں اتنی غیرت کا ہونا بزرگوں کی صفات اور سرداروں کی عادات میں سے ہے اگرچہ اس معاملہ میں

شریعت کا حکم دوسرا ہے جس پر عمل کرنا غیرت مندی کے تقاضا پر عمل کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ حضرت سعدؓ کی بات کی تقریر (یعنی تائید و توثیق) نہیں فرمائی بلکہ آپ ﷺ نے ان کا عذر بیان کیا، کہ حضرت سعدؓ نے جو بات کہی ہے اور جس سے بظاہر میرے حکم کی مخالفت معلوم ہوتی ہے وہ دراصل ان کی غیر معمولی غیرتمندی کی وجہ سے ان کی زبان سے نکل گئی ہے۔

حضرت مظہرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سعدؓ کا آنحضرت ﷺ کو مذکورہ جواب دینا آنحضرت ﷺ کے حکم کی مخالفت یا آپ ﷺ کے ارشاد کو قبول کرنے سے انکار کر دینے کے طور پر نہیں تھا بلکہ در حقیقت ان کی اس خواہش کے اظہار کے طور پر تھا کہ اگر کوئی غیرت مند کسی غیر مرد کو اپنی بیوی کے پاس پائے۔ تو اس کو قتل کر دینے کی اجازت عطا ہو جائے چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے یہ اجازت دینے سے ایک بلیغ انداز میں انکار کر دیا تو انہوں نے سکوت اختیار کر لیا۔

"غیرت" آدمی کی اندرونی کیفیت و حالت کے اس تغیر کو کہتے ہیں جو اپنے اہل میں کسی ناگوار چیز کو دیکھنے پر پیدا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی غیرت کی نسبت اسی معنی کے اعتبار سے محال و ناممکن ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے "غیرت مند" ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے بندوں کو گناہوں سے روکنے والا ہے تاکہ وہ اس کی بارگاہ کی قربت و مقبولیت سے دور نہ جا پڑیں۔

اللہ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں ہے

⑥ وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ قَالَ قَالَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ لَوْ رَأَيْتُ رَجُلًا مَعَ امْرَأَتِي لَضَرَبْتُهُ بِالسَّيْفِ غَيْرَ مُصْفَحٍ فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَتَعْجَبُوْنَ مِنْ غَيْرَةِ سَعْدٍ وَاللّٰهِ لَاَنَا اَغْيَرُ مِنْهُ وَاللّٰهُ اَغْيَرُ مِنِّيْ وَمِنْ اَجْلِ غَيْرَةِ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا اَحَدٌ اَحَبَّ اِلَيْهِ الْعُذْرُ مِنَ اللّٰهِ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ بَعَثَ الْمُنْذِرِيْنَ وَالْمُبَشِّرِيْنَ وَلَا اَحَدٌ اَحَبَّ اِلَيْهِ الْمِدْحَةُ مِنَ اللّٰهِ وَمِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ وَعَدَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ حضرت سعدؓ نے یہ کہا کہ اگر میں کسی غیر مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھوں تو میں اس کو تلوار سے ماردوں اور تلوار کی پشت کی جانب سے نہیں بلکہ دھار والی جانب سے ماروں) (حاصل یہ کہ میں تلوار سے اس کا خاتمہ کر دوں) جب رسول کریم ﷺ تک یہ بات پہنچی (کہ سعد اس طرح کہتے ہیں) تو آپ ﷺ نے (صحابہؓ سے فرمایا کہ تمہیں سعدؓ کی اس غیر معمولی) غیرت مندی پر تعجب ہے؟ خدا کی قسم میں یقیناً ان سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہے اور اللہ نے اپنی غیرت ہی کی وجہ سے (تمام) گناہوں کو حرام کیا ہے خواہ وہ ظاہری گناہ ہوں یا پوشیدہ گناہ ہوں اور عذر کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں رکھتا اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ڈرانے والوں اور بشارت دینے والوں (یعنی پیغمبروں) کو بھیجا ہے نیز تعریف کرنے کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی پسند نہیں کرتا اور اسی کے سبب اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اور اللہ تعالیٰ نے اپنی غیرت ہی کی وجہ سے گناہوں کو حرام کیا ہے" یہ جملہ دراصل "اللہ تعالیٰ کی غیرت" کی وضاحت کے لئے ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی غیرت کے معنی یہ ہیں کہ اس نے لوگوں کو حرام امور اختیار کرنے سے منع کیا ہے اور حرام امور کو اختیار کرنے پر عذاب مقرر کیا ہے چنانچہ اصل میں "غیرت" کا مطلب یہی ہے کہ آدمی اس بات کو ناپسند کرے اور اس پر ناراض ہو کہ کوئی اس کی ملکیت میں تصرف کرے۔

اور "غیرت" کے مشہور معنی یہ ہیں کہ آدمی اس شخص پر غصہ کرے جو اس کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرے یا اس کو نظر بد سے دیکھے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی "غیرت" یہ ہے کہ وہ اس شخص پر غصہ کرے جو گناہ کا مرتکب ہو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "عذر کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں رکھتا" میں "عذر" اعزار یعنی ازالہ عذر کے معنی میں ہے مطلب

یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ عذر ختم کر دینے کو پسند کرتا ہے اس طرح کوئی اور عذر کو ختم کرنے کو پسند نہیں کرتا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیغمبروں اور رسولوں کو بھیجا ہے تاکہ اس طرف سے اتمام حجت ہو جائے اور بندوں کو عذر کرنے کا موقع نہ ملے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لِئَلاَّ یَکُوْنَ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔

"تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے۔"

"تعریف کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی پسند نہیں کرتا" کا مطلب یہ ہے کہ تعریف کرنے کو جتنا اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اتنا کوئی اور پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تعریف بھی فرمائی ہے اور اپنے محبوب بندوں کی بھی تعریف کی ہے اور ان لوگوں کو جنت میں داخل کرنے کا وعدہ کیا ہے جو اس کی حمد و تعریف کرتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔

اللہ کی غیرت کا تقاضا کیا ہے؟

⑦ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُغَارُ وَاِنَّ الْمُؤْمِنَ یُغَارُ وَغَیْرَۃُ اللّٰہِ اَنْ لاَّ یَاْتِیَ الْمُؤْمِنُ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تبارک و تعالیٰ غیرت مند ہے اور مؤمن (بھی) غیرت مند ہے (یعنی غیرت دراصل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو مؤمن میں بھی موجود ہے) اور اللہ تعالیٰ کی غیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ مؤمن وہ کام نہ کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

محض معمولی علامتوں کی بناء پر اپنے بچہ کا انکار نہ کرو

⑧ وَعَنْہُ اَنَّ اَعْرَابِیًّا اَتٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ امْرَأَتِیْ وَلَدَتْ غُلاَمًا اَسْوَدَ وَاِنِّیْ اَنْکَرْتُہٗ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ لَکَ مِنْ اِبِلٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَمَا اَلْوَانُھَا قَالَ حُمْرٌ قَالَ ھَلْ فِیْھَا مِنْ اَوْرَاقَ قَالَ اِنَّ فِیْھَا لَوُرْقًا قَالَ فَاَنّٰی تُرٰی ذٰلِکَ جَاءَھَا قَالَ عِرْقٌ نَزَعَھَا قَالَ فَلَعَلَّ ھٰذَا عِرْقٌ نَزَعَہٗ وَلَمْ یُرَخِّصْ لَہٗ فِی الْاِنْتِفَاءِ مِنْہُ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری بیوی نے ایک ایسے بچہ کو جنم دیا ہے جس کا رنگ کالا ہے اور (اس وجہ سے کہ وہ میرا ہم رنگ نہیں ہے) میں نے اس کا انکار کر دیا ہے (یعنی یہ کہہ دیا ہے کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے) رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "تمہارے پاس کچھ اونٹ ہیں"؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں! ان میں خاکسری رنگ کے بھی ہیں "آپ ﷺ نے فرمایا" تمہارا کیا خیال ہے یہ خاکستری رنگ کے اونٹ کہاں سے آ گئے (یعنی ان میں خاکستری رنگ کہاں سے آیا جب کہ ان کے ماں باپ خاکستری رنگ کے نہیں ہیں؟) اس نے عرض کیا" کوئی رگ ہوگی جس نے انہیں کھینچ لیا (یعنی ان کی اصل میں کوئی خاکستری کا رہا ہوگا جس کے مشابہ یہ بھی ہو گئے) آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر یہ بچہ بھی کسی ایسی رگ کے سبب کالا ہوا ہے جس نے اس کو کھینچ لیا ہے (یعنی اس بچہ کی اصل میں بھی کوئی شخص کالے رنگ کا رہا ہوگا جس کے مشابہ یہ بچہ ہو گیا ہے) اور اس طرح آنحضرت ﷺ نے اس دیہاتی کو اس بچہ کا انکار کرنے کی اجازت نہیں دی۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ محض معمولی اور ضعیف علامتوں کی بنا پر اپنے بچہ کا انکار کرنا یعنی یہ کہنا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے، ممنوع ہے بلکہ اس صورت میں مضبوط دلائل و وجوہ کا ہونا ضروری ہے مثلاً بیوی سے صحبت نہ کی ہو اور اس کے باوجود بچہ

کی ولادت ہوئی ہو یا صحبت کی ہو مگر صحبت کے بعد چھ مہینہ سے کم مدت میں بچہ پیدا ہوا ہو اور ان صورتوں میں اس بچہ کا انکار کر دینا جائز ہے۔

زنا کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچہ کا نسب زانی سے ثابت نہیں ہوتا

⑨ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ عُتْبَةُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ عَهِدَ اِلٰی اَخِیْهِ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّ ابْنَ وَلِیْدَةِ زَمْعَةَ مِنِّیْ فَاقْبِضْهُ اِلَیْكَ فَلَمَّا كَانَ عَامُ الْفَتْحِ اَخَذَهٗ سَعْدٌ فَقَالَ اِنَّهُ ابْنُ اَخِیْ وَقَالَ عَبْدُ بْنُ زَمْعَةَ اَخِیْ فَتَسَاوَقَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ سَعْدٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَخِیْ كَانَ عَهِدَ اِلَیَّ فِیْهِ وَقَالَ عَبْدُ ابْنُ زَمْعَةَ اَخِیْ وَابْنُ وَلِیْدَةِ اَبِیْ وُلِدَ عَلٰی فِرَاشِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هُوَ لَكَ یَا عَبْدَ ابْنَ زَمْعَةَ اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ ثُمَّ قَالَ بِسَوْدَةَ بِنْتِ زَمْعَةَ اِحْتَجِبِیْ مِنْهُ لِمَا رَاٰی مِنْ شِبْهِهٖ بِعُتْبَةَ فَمَا رَاٰهَا حَتّٰی لَقِیَ اللّٰهَ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ هُوَ اَخُوْكَ یَا عَبْدَ ابْنَ زَمْعَةَ مِنْ اَجْلِ اَنَّهٗ وُلِدَ عَلٰی فِرَاشِ اَبِیْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ عتبہ ابن ابی وقاص نے اپنے بھائی سعد ابن ابی وقاص کو وصیت کی کہ زمعہ کی لونڈی کا لڑکا میرے نطفہ سے ہے تم اس کو لے لینا چنانچہ فتح مکہ کے سال سعدؓ نے اس لڑکے کو لے لیا اور کہا کہ یہ میرا بھتیجا ہے جب کہ ابن زمعہؓ نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے پھر وہ دونوں اپنا معاملہ رسول کریم ﷺ کے پاس لے گئے اور سعدؓ نے کہا کہ (یہ لڑکا) میرا بھائی ہے اور میرے باپ کی لونڈی کا بیٹا ہے جو میرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے" رسول کریم ﷺ نے (دونوں کی بات سن کر) فرمایا "کہ عبد ابن زمعہؓ! اس بچہ کے تم ہی حقدار ہو کیونکہ بچہ صاحب فراش کی طرف سے منسوب ہوتا ہے اور زانی کے لئے (نسب و میراث سے) محرومی ہے (یا یہ کہ زانی سنگساری کا مستوجب ہے) پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت سودہؓ بنت زمعہؓ سے فرمایا کہ تم اس لڑکے سے پردہ کیا کرو کیونکہ اس میں عتبہ کی شباہت نظر آتی ہے چنانچہ حضرت سودہؓ اس لڑکے کے سامنے (کبھی نہیں آئیں یہاں تک کہ وہ واصل بحق ہو گیا۔" ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "عبد ابن زمعہ! وہ لڑکا تمہارا بھائی ہے اس لئے کہ وہ لڑکا ان کے باپ کے بستر پر پیدا ہوا تھا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث میں جو چند نام ذکر ہوئے ہیں پہلے ان کے بارہ میں بتا دینا ضروری ہے تاکہ صورت واقعہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ عتبہ، حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کا حقیقی بھائی تھا حضرت سعدؓ کو تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت سے بہرہ ور کیا اور وہ ایک جلیل القدر صحابیؓ ہوئے مگر عتبہ کفر کے اندھیرے سے نہ نکل سکا یہاں تک کہ کفر کی حالت میں مرگیا اور یہی وہ بدبخت تھا جس نے غزوہ احد کے موقع پر رحمت دو عالم ﷺ کا دندان مبارک شہید کیا تھا۔ زمعہ حضرت سودہؓ کے باپ تھے اور عبد اُن (زمعہ) کے بیٹے یعنی حضرت سودہؓ کے حقیقی بھائی تھے! حضرت سودہؓ نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں۔

اب حدیث کی طرف آیئے عتبہ نے زمعہ کی لونڈی سے زنا کیا جس کے نتیجہ میں لڑکا پیدا ہوا چونکہ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ زانی کے دعوی پر ولد الزنا (حرامی بچہ) کا نسب اسی زانی سے ثابت ہوتا تھا اس لئے عتبہ نے اس قدیم دستور کے مطابق اس لڑکے کے بارہ میں دعویٰ کیا کہ یہ میرا ہے اور اپنے بھائی حضرت سعدؓ کو وصیت کی کہ تم اس لڑکے کو اپنی تحویل میں لے کر اس کی پرورش کرنا چنانچہ حضرت سعدؓ نے فتح مکہ کے سال اپنے بھائی کی وصیت کے مطابق اس لڑکے کو اپنی تحویل میں لے لیا اور یہ اعلان کیا کہ یہ میرا بھتیجا ہے، ادھر زمعہ کے بیٹے عبدؓ نے یہ دعوی کیا کہ یہ میرا بھائی ہے کیونکہ اس کو میرے باپ نے اپنی لونڈی سے جنوایا ہے غرضکہ ان دونوں کے درمیان ایک تنازعہ کی صورت ہو گئی تو وہ دونوں اس معاملہ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے آنحضرت ﷺ نے عبد ابن زمعہؓ سے فرمایا کہ یہ تمہارا بھائی ہے کیونکہ بچہ کا نسب صاحب فراش ہی سے ثابت ہوتا ہے اور زانی اس سے محروم رہتا ہے۔

ل جملہ الولد للفراش وللعاہر الحجر (بچہ صاحب فراش کی طرف منسوب ہوتا ہے اور زانی کے لئے محرومی ہے) کی تفصیلی

وضاحت باب الوصایا کی پہلی فصل میں حضرت ابوامامہؓ کی روایت کے ضمن میں کی جاچکی ہے۔

ام المؤمنین حضرت سودہؓ کو آنحضرت کے اس حکم کہ (تم اس لڑکے سے پردہ کیا کرو) کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ یہ لڑکا شرعی حکم کے مطابق تمہارا بھائی ہوا بایں طور اس کا نسب تمہارے باپ زمعہ سے ثابت کیا گیا ہے اور یہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ شرعی معاملات میں مشابہت اور قیافہ وقرائن کا اعتبار نہیں لیکن وہ لڑکا چونکہ عتبہ کے مشابہ ہے اور عتبہ کے دعوی کی وجہ سے اس کا عتبہ کے نطفہ سے ہونا ایک حد تک حقیقت کے مطابق بھی ہے اس لئے احتیاط وورع کا تقاضا یہی ہے کہ تم اس کے سامنے نہ آؤ۔

دوسری روایت کے یہ آخری الفاظ اَنَّهٗ وُلِدَ عَلٰی فِرَاشِ اَبِيْهِ (اس لئے کہ وہ لڑکا ان کے باپ کے بستر پر پیدا ہوا تھا) دراصل حدیث کے راوی کا اپنا قول ہے، یعنی راوی نے ان الفاظ کے ذریعہ یہ واضح کیا کہ آنحضرت ﷺ نے عبدؓ ابن زمعہ کے حق میں یہ حکم کہ "وہ لڑکا تمہارا بھائی ہے" اس لئے صادر فرمایا تھا کہ وہ ان کے باپ (زمعہ) کے بستر پر پیدا ہوا تھا (ان کے بستر پر پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ استقرار حمل اور بچہ کی ولادت کے زمانہ میں وہ لونڈی زمعہ کی ملکیت میں اور ان کے زیر تصرف تھی نیز وہ لڑکا انہی کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔)

اثبات نسب میں قیافہ شناس کا قول معتبر ہے یا نہیں؟

(۱۰) وَعَنْهَا قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ وَهُوَ مَسْرُوْرٌ فَقَالَ اَیْ عَائِشَةُ اَلَمْ تَرَ اَنَّ مُجَزِّزًا الْمُدْلِجِيَّ دَخَلَ فَلَمَّا رَاٰى اُسَامَةَ وَزَيْدًا وَعَلَيْهِمَا قَطِيْفَةٌ قَدْ غَطَّيَا رُؤُوْسَهُمَا وَبَدَتْ اَقْدَامُهُمَا فَقَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْاَقْدَامَ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ بہت خوش خوش میرے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ "عائشہؓ کیا تمہیں معلوم نہیں (آج مجزز مدلجی (مسجد نبوی میں) آیا اور جب اس نے اسامہؓ اور زیدؓ کو دیکھا جو اس طرح چادر اوڑھے ہوئے لیٹے) تھے اور ان کے سر چھپے ہوئے تھے اور پیر کھلے ہوئے تھے تو اس نے کہا کہ ان دونوں کے پیر ایک دوسرے کے مطابق ہیں! (یعنی یہ پیر جن دو آدمیوں کے ہیں وہ آپس میں باپ بیٹے ہیں۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: حضرت زید ابن حارثہؓ جو آنحضرت ﷺ کے متبنی (لے پالک) تھے بہت گورے اور خوبصورت تھے جب کہ ان کے صاحبزادے، حضرت اسامہؓ کالے تھے اور اپنی ماں کے ہم رنگ تھے ان کی ماں جن کا نام اُمّ ایمنؓ تھا ایک لونڈی اور کالے رنگ کی تھیں باپ بیٹے رنگت کے اس فرق کی وجہ سے منافق حضرت اسامہ کے نسب میں عیب لگاتے تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ ایسے حسین اور خوبصورت باپ کا بیٹا اتنا کالا کیسے ہوسکتا ہے؟ چنانچہ آنحضرت ﷺ منافقوں کی اس بات سے بہت کبیدہ خاطر ہوتے تھے کہ اسی دوران میں یہ واقعہ پیش آیا۔

مجزز مدلجی عرب کا ایک مشہور قیافہ شناس اور اپنے فن میں یگانہ روزگار تھا، وہ آدمی کی صورت دیکھ کر اس کے حالات وکوائف اور اوصاف وخصوصیات معلوم کرلیا کرتا تھا چنانچہ وہ مسجد نبوی میں آیا اور اس نے حضرت زیدؓ اور حضرت اسامہؓ کے پیر دیکھے تو اس نے علم قیافہ کی رو سے یہ فیصلہ کیا کہ یہ پیر جن دو آدمیوں کے ہیں، ان دونوں کو آپس میں باپ بیٹا ہونا چاہیے۔ آنحضرت ﷺ اس بات سے بہت خوش ہوئے کیونکہ اہل عرب کے ہاں قیافہ شناس کا قول معتبر تھا اور اس کے فیصلہ کو سند کا درجہ دیا جاتا تھا لہٰذا آنحضرت ﷺ کو یہ بھی اطمینان ہوگیا کہ اب جب کہ اسامہؓ کا نسب اس سند سے ثابت ہوگیا ہے تو منافقین بھی ان کے نسب کے بارہ میں طعن کرنے کی ہمت نہیں کریں گے۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اس حدیث سے لازم نہیں آتا کہ شرعی احکام اور اثبات نسب میں قیافہ شناس کا قول معتبر ہوتا ہے، چنانچہ حضرت امام اعظمؒ ابوحنیفہ کا مسلک یہی ہے، البتہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، اور حضرت امام احمدؒ قیافہ شناس کے قول

کو معتبر مانتے ہیں یہاں تک کہ ان کے مسلک میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی لونڈی دو آدمیوں کی مشترک ملکیت ہو اور اس کے بچہ پیدا ہو اور پھر وہ دونوں شریک اس بچہ کے نسب کا دعوی کریں یعنی ہر ایک یہ کہے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اس صورت میں ان دونوں کو قیافہ شناس کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اور وہ قیافہ شناس اپنے قیافہ کی بنیاد پر جو فیصلہ کرے اس کو قبول کر لینا چاہئے۔ جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس صورت میں وہ بچہ شرعی حکم کے اعتبار سے دونوں کا ہو گا اگرچہ واقعہ کے اعتبار سے وہ کسی ایک کا ہو گا اور وہ لونڈی دونوں کی اُمّ ولد ہو گی۔

اپنے باپ کا انکار کرنے والے کے بارہ میں وعید

⑪ وَعَنْ سَعْدِبْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ وَّاَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْہِ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ غَیْرُ اَبِیْہِ فَالْجَنَّۃُ عَلَیْہِ حَرَامٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت ابوبکرہؓ دونوں راوی ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے آپ کو اپنے باپ کے بجائے کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب کرے، اور وہ یہ جانتا بھی ہو کہ یہ میرا باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: "اس پر جنت حرام ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر اپنے باپ کی بجائے کسی دوسرے شخص کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے اور وہ اس بات کو برا نہیں جانتا بلکہ اس کا اعتقاد یہ ہے کہ اپنے نسب میں اس طرح خلط ملط کرنا حلال ہے تو ایک حرام چیز کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھنے کی وجہ سے وہ کفر کی حد میں پہنچ گیا اور جب وہ کفر کی حد میں پہنچ گیا اور اسی حال میں مر گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس پر جنت کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند رہیں گے اور اگر وہ شخص کفریہ عقیدہ نہیں رکھتا (یعنی باپ کی بجائے کسی دوسرے شخص کی طرف اپنی نسبت کرنے کو حلال نہیں جانتا بلکہ حرام ہی جانتا ہے) تو اس صورت میں "اس پر جنت حرام ہے" کا مطلب یہ ہو گا کہ اس وقت اس پر جنت کے دروازے بند رہیں گے جب تک کہ وہ اپنے اس گناہ کی سزا نہ بھگت لے گا۔

یا پھر یہ کہا جائے گا۔ کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد کہ "اس پر جنت حرام ہے" زجر یعنی تنبیہ کے طور پر ہے جس کا مقصد لوگوں کو اس برائی سے روکنا ہے۔

⑫ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَرْغَبُوْا عَنْ اٰبَائِکُمْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ اَبِیْہِ فَقَدْ کَفَرَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم (غیر شخص سے اپنا نسب جوڑ کر) اپنے باپ سے منہ نہ پھیرو کیونکہ جس شخص نے اپنے باپ سے منہ پھیرا (یعنی اس سے اپنے نسب کا انکار کیا) تو اس نے در حقیقت کفران نعمت کیا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: زمانہ جاہلیت میں یہ ایک عام برائی تھی کہ لوگ اپنے اصل باپ سے اپنے نسب کا انکار کر کے دوسروں کو اپنا باپ قرار دیتے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس برائی سے منع فرمایا۔

اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ جان بوجھ کر اصل باپ کی بجائے کسی غیر شخص سے اپنا نسب قائم کرنا حرام ہے اور اگر کسی شخص نے غیر شخص سے اپنا نسب قائم کرنے کو مباح جانا اور اس کا عقیدہ رکھا تو وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ ایسی چیز کے حلال و مباح ہونے کا عقیدہ رکھنا جس کو پوری امت نے حرام قرار دیا ہے کفر ہے اس صورت میں حدیث کے الفاظ فقد کفر اپنے حقیقی معنی پر محمول ہوں گے۔ اور اگر ایسا کرنے والا مباح ہونے کا یقین نہیں رکھتا تو اس صورت میں کفر کے دو معنی ہوں گے ایک تو یہ کہ "اس شخص نے کفار کے فعل کی مشابہت اختیار کی" دوسرے یہ کہ "اس نے کفران نعمت کیا"۔

وَقَدْ ذُکِرَ حَدِیْثُ عَائِشَۃَ مَامِنْ اَحَدٍ اَغْیَرُ مِنَ اللّٰہِ فِیْ بَابِ صَلٰوۃِ الْخُسُوْفِ۔

اور حضرت عائشہؓ کی حدیث ماامن احد اغیر من اللہ، باب صلوۃ الخسوف میں نقل کی جاچکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اپنے بچہ کا انکار کرنے والا خدا تعالیٰ کے دیدار سے محروم رہے گا

⑬ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَمَّا نَزَلَتْ اٰیَةُ الْمُلَاعَنَةِ اَیُّمَا امْرَأَةٍ اَدْخَلَتْ عَلٰی قَوْمٍ مَنْ لَیْسَ مِنْهُمْ فَلَیْسَتْ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ وَلَنْ یُدْخِلَهَا اللّٰهُ جَنَّتَهٗ وَاَیُّمَا رَجُلٍ جَحَدَ وَلَدَهٗ وَهُوَ یَنْظُرُ اِلَیْهِ احْتَجَبَ اللّٰهُ مِنْهُ وَفَضَحَهٗ عَلٰی رُؤُوْسِ الْخَلَائِقِ فِی الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے لعان کی آیت نازل ہونے کے موقع پر رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو عورت کسی کو اس قوم میں داخل کرے جس میں سے وہ نہیں ہے (یعنی کسی عورت نے بدکاری کرائی اور پھر اس بدکاری کے نتیجہ میں بچہ کو جنم دیا اور اس بچہ کو اپنے خاوند کی طرف منسوب کر دیا) تو وہ خدا کے نزدیک کسی درجہ میں نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو (اپنے مقرب اور نیک بندوں کے ساتھ) ہرگز اپنی جنت میں داخل نہیں کرے گا اور جو شخص اپنے بچہ کا انکار کرے (یعنی اس کی بیوی نے جس بچہ کو جنم دیا ہے۔ اس کے بارہ میں کہے کہ میرا نہیں ہے) درآنحالیکہ وہ اس کی طرف دیکھتا ہے (یعنی وہ جانتا ہے کہ بچہ میرا ہی ہے) تو اللہ تعالیٰ اس سے پردہ کرے گا (یعنی اس کو خدا کا دیدار نصیب نہیں ہوگا) اور اللہ تعالیٰ اس کو تمام اگلے و پچھلے لوگوں میں رسوا کرے گا (یعنی جب میدان حشر میں تمام اگلی پچھلی مخلوق جمع ہوگی تو ان کے درمیان اس کو ذلیل و رسوا کرے گا۔" (ابوداؤد، نسائی، دارمی)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ نہ تو عورت کو چاہئے کہ وہ بدکاری کرائے اور اپنے حرامی بچہ کو اپنے خاوند کی طرف منسوب کرے اور نہ مرد کو چاہئے کہ دیدہ و دانستہ اپنے بچہ کا انکار کرے اور اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے۔

بدکار بیوی کو طلاق دے دینا اولیٰ ہے

⑭ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ لِیْ امْرَأَةً لَا تَرُدُّ یَدَ لَامِسٍ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ طَلِّقْهَا قَالَ اِنِّیْ اُحِبُّهَا قَالَ فَاَمْسِکْهَا اِذًا۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِیُّ وَقَالَ النَّسَائِیُّ رَفَعَهٗ اَحَدُ الرُّوَاةِ اِلَی ابْنِ عَبَّاسٍ وَاَحَدُهُمْ لَمْ یَرْفَعْهُ قَالَ وَهٰذَا الْحَدِیْثُ لَیْسَ بِثَابِتٍ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ "میری بیوی کسی چھونے والے ہاتھ کو جھٹکتی نہیں (یعنی جو بھی شخص اس سے بدکاری کا ارادہ کرتا ہے اس کو وہ انکار نہیں کرتی) نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اسے طلاق دے دو۔" اس نے عرض کیا "(یہ ممکن نہیں) کیونکہ میں اس سے (بہت) محبت کرتا ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر اس کی نگہبانی کرو (تاکہ وہ بدکاری میں مبتلا نہ ہو سکے) ابوداؤد نسائی اور نسائیؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کے راویوں میں سے ایک راوی نے تو اس کو حضرت ابن عباسؓ تک پہنچایا ہے اور وصل کیا ہے اور ایک راوی نے اس کو ابن عباسؓ تک نہیں پہنچایا ہے اور وصل نہیں کیا ہے نیز نسائیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے (یعنی یہ حدیث۔ متصل نہیں ہے بلکہ منقطع ہے)۔"

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بدکار بیوی کو طلاق دے دینا اولیٰ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے طلاق دینے کا حکم پہلے دیا اور نگہبانی کرنے کا حکم بعد میں دیا ہاں اگر کسی وجہ سے طلاق دینا آسان نہ ہو مثلاً اس سے اتنی زیادہ محبت ہو کہ اس کو اپنے سے جدا کرنا ناممکن ہو، یا اس کے بطن سے کوئی بچہ ہو جو ماں کی جدائی کو برداشت نہ کر سکتا ہو اور یا اس بیوی کا اپنے اوپر کوئی ایسا قرض و مطالبہ مثلاً مہر

واجب ہو کہ جس کو ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو ایسی صورتوں میں جائز ہے کہ اس کو طلاق نہ دے لیکن یہ شرط ہے کہ وہ اس کو بدکاری سے روکے اور اگر وہ اس کو بدکاری سے نہ روک سکا تو پھر طلاق نہ دینے کی صورت میں گنہ گار ہوگا۔

اثبات نسب کے سلسلہ میں ایک واضح ہدایت و ضابطہ

⑮ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى اَنَّ كُلَّ مُسْتَلْحَقٍ اسْتُلْحِقَ بَعْدَ اَبِيْهِ الَّذِيْ يُدْعٰى لَهٗ اِدَّعَاهُ وَرَثَتُهٗ فَقَضٰى اَنَّ كُلَّ مَنْ كَانَ مِنْ اَمَةٍ يَمْلِكُهَا يَوْمَ اَصَابَهَا فَقَدْ لَحِقَ بِمَنِ اسْتَلْحَقَهٗ وَلَيْسَ لَهٗ مِمَّا قُسِمَ قَبْلَهٗ مِنَ الْمِيْرَاثِ شَيْءٌ وَمَا اَدْرَكَ مِنْ مِيْرَاثٍ لَمْ يُقْسَمْ فَلَهٗ نَصِيْبُهٗ وَلَا يُلْحَقُ اِذَا كَانَ اَبُوْهُ الَّذِيْ يُدْعٰى لَهٗ اَنْكَرَهٗ فَاِنْ كَانَ مِنْ اَمَةٍ لَمْ يَمْلِكْهَا اَوْ مِنْ حُرَّةٍ عَاهَرَ بِهَا فَاِنَّهٗ لَا يَلْحَقُ وَلَا يَرِثُ وَاِنْ كَانَ الَّذِيْ يُدْعٰى لَهٗ هُوَ الَّذِيْ اِدَّعَاهُ فَهُوَ وَلَدُ زِنْيَةٍ مِنْ حُرَّةٍ كَانَ اَوْ اَمَةٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ (حکم دینے کا) فیصلہ کیا کہ جس لڑکے کا نسب اس۔ کے اس باپ کے مرنے کے بعد کہ جس کی طرف نسبت کی گئی ہے، ملایا گیا ہے اور اس کا دعوی، اس باپ کے وارثوں نے کیا ہے (یعنی مثلاً زید کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں نے ایک لڑکے بکر کے بارہ میں کہا کہ یہ زید کا بیٹا ہے، لہٰذا یہ بھی ہماری طرح زید کا وارث ہے) تو (اس کے بارے میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم صادر فرمایا کہ اگر وہ لڑکا (جس کا نسب ملایا گیا ہے) ایسی لونڈی کے بطن سے ہو جو صحبت کے دن اس کے باپ کی ملکیت میں تھی (یعنی اس لونڈی سے اس کے باپ کا جائز طریقہ پر جماع ہوا ہو) تو وہ اس شخص کے ساتھ نسب میں مل جائے گا۔ جس نے اس کو ملایا ہے (یعنی جو وارث اس کو ملائیں گے وہ ان وارثوں میں مل جائے گا اور ان کے ساتھ میراث کا حقدار ہوگا بایں طور کہ اگر اس کو سبھی وارث ملائیں گے تو سب کے حق میں وارث ہوگا اور اگر بعض وارثوں نے ملایا ہوگا تو انہی بعض کے حق میں وارث ہوگا) اور جو میراث اس کو ملانے سے پہلے تقسیم ہو چکی ہوگی اس میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا ہاں جو میراث ابھی تک تقسیم نہیں ہوئی اس میں سے اس کو حصہ ملے گا۔ اور وہ لڑکا ایسا ہو کہ اس کی نسبت جس باپ کی طرف جاتی ہے اس نے اس کا انکار کر دیا تھا (یعنی اس باپ نے اپنی زندگی میں اس کے اپنا بیٹا ہونے کا انکار کر دیا تھا) تو وہ لڑکا اس کے مرنے کے بعد وارثوں کے ملانے سے نہیں ملے گا اور اس باپ کا وارث نہیں ہوگا اسی طرح اگر وہ لڑکا کسی ایسی لونڈی کے بطن سے ہو جو صحبت کے دن اس باپ کی ملکیت میں نہ رہی ہو (یعنی اس نے کسی دوسرے شخص کی لونڈی سے زنا کیا تھا اور اس زنا کے نتیجہ میں یہ لڑکا پیدا ہوا تھا) یا کسی ایسی آزاد عورت کے بطن سے ہو جس سے اس باپ نے زنا کیا تھا تو وہ لڑکا اس باپ کے وارثوں میں شامل نہیں ہوگا اور نہ اسے میراث ملے گی اگرچہ خود اس شخص (یعنی باپ) نے کہ جس کی طرف اس لڑکے کی نسبت کی جاتی ہے اس کا دعوی کیا ہو۔ (یہ جملہ گویا پہلے حکم کی تاکید کے طور پر ہے کہ وہ لڑکا ولد الزنا ہو تو اس کو اس باپ یعنی زانی کے وارثوں میں کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اگر خود وہ زانی اپنی زندگی میں اس کے نسب کا دعوی کرتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے تب بھی اس کے ساتھ اس لڑکے کا نسب نہ ملتا چہ جائیکہ اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث اس لڑکے کو اپنے میں شامل کریں) لہٰذا وہ لڑکا حرام ہے خواہ وہ لونڈی کے بطن سے ہو یا آزاد عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: خطابیؒ کہتے ہیں کہ یہ وہ احکام ہیں جو شروع زمانہ اسلام میں آنحضرت ﷺ نے نافذ فرمائے تھے اس زمانہ میں لوگوں کی بدکار لونڈیاں تھیں جو زنا کراتی پھرتی تھیں اور ان کے مالک بھی ان سے صحبت کرتے تھے اور پھر جب ان کے کوئی بچہ ہوتا تو اس کا دعوی مالک بھی کرتا اور زانی بھی، اس قسم کے تنازعہ کو شرعی طور پر ختم کرنے کے لئے آپ ﷺ نے مذکورہ بالا احکام صادر فرمائے، چنانچہ اس بارہ میں آپ ﷺ نے جو شرعی ضابطہ مقرر فرمایا اور جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص زید کا انتقال ہو گیا، اس کے بعد زید کے وارثوں کا یہ دعوی تسلیم کر لیا جائے گا اور اس لڑکے کا نسب زید سے قائم کر کے اس کی میراث کا حقدار قرار دے دیا جائے گا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ لڑکا کسی ایسی لونڈی کے بطن سے ہو جو زید کی ملکیت میں رہی ہو اور زید کا

اس کے ساتھ جائز طور پر جماع ہوا ہو، یا وہ کسی آزاد عورت کے بطن سے ہو جو زید کے نکاح میں رہی ہو، اور خود زید نے بھی اپنی زندگی میں یہ اقرار و اعلان کیا ہو کہ یہ میرا لڑکا ہے۔

پھر جیسا کہ حدیث میں وضاحت ہے یہ لڑکا انہی وارثوں کے حق میں حصہ دار ہوگا جنہوں نے مذکورہ بالا دعوی کیا ہو اگر سب ہی وارثوں نے یہ دعوی کیا ہوگا وہ لڑکا سب وارثوں کے حق میں حصہ دار ہوگا اور اگر بعض وارثوں نے دعوی کیا ہوگا تو صرف انہی بعض وارثوں کے حق میں حصہ دار ہوگا۔ نیز یہ لڑکا صرف اس میراث میں حصہ دار ہوگا جو ابھی تقسیم نہیں ہوئی ہے جو میراث اس دعوی سے پہلے تقسیم ہو چکی ہوگی اس میں اسے کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اگر یہ صورت ہو کہ زید نے اپنی زندگی میں اس لڑکے کے نسب کا انکار کر دیا یعنی یہ کہا تھا کہ یہ لڑکا میرا نہیں ہے تو پھر اس کے مرنے کے بعد اگر اس کے وارث اس لڑکے کو اپنے میں شامل کرنا چاہیں تو وہ شامل نہیں ہو سکے گا اور نہ اس کو زید کی میراث میں سے کوئی حصہ ملے گا۔

اگر اسی طرح وہ لڑکا کسی ایسی لونڈی کے بطن سے ہو جو زید کی ملکیت میں نہیں تھی (جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں زمعہ کے بیٹے کے بارہ میں گزر چکا ہے) یا کسی ایسی آزاد عورت کے بطن سے جو زید کے نکاح میں نہیں تھی یعنی وہ لڑکا زید کے زنا کے نتیجہ میں پیدا ہوا تو اس صورت میں بھی وہ زید کے وارثوں میں شامل نہیں ہو سکے گا اور نہ اس کو زید کی میراث میں سے کچھ ملے گا بلکہ اگر زید اپنی زندگی میں خود بھی یہ چاہے کہ اس کے ساتھ اپنا نسب جوڑ کر اس کو اپنے وارثوں میں شامل کر دے تو بھی وہ شامل نہیں کیا جائے گا کیونکہ ولد الزنا کا نسب زانی سے قائم نہیں ہوتا اور نہ وہ زانی کا وارث ہوتا ہے۔

غیرت بعض صورتوں میں پسندیدہ اور بعض صورتوں میں ناپسندیدہ ہے

(۱۶) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَتِيكٍ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنَ الْغَيْرَةِ مَا يُحِبُّ اللّٰهُ وَمِنْهَا مَا يُبْغِضُ اللّٰهُ فَاَمَّا الَّتِي يُحِبُّهَا اللّٰهُ فَالْغَيْرَةُ فِي الرِّيبَةِ وَاَمَّا الَّتِي يُبْغِضُهَا اللّٰهُ فَالْغَيْرَةُ فِي غَيْرِ رِيبَةٍ وَاِنَّ مِنَ الْخُيَلَاءِ مَا يُبْغِضُ اللّٰهُ وَمِنْهَا مَا يُحِبُّ اللّٰهُ فَاَمَّا الْخُيَلَاءُ الَّتِي يُحِبُّ اللّٰهُ فَاخْتِيَالُ الرَّجُلِ عِنْدَ الْقِتَالِ وَاخْتِيَالُهُ عِنْدَ الصَّدَقَةِ وَاَمَّا الَّتِي يُبْغِضُ اللّٰهُ فَاخْتِيَالُهُ فِي الْفَخْرِ وَفِي رِوَايَةٍ فِي الْبَغْيِ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت جابر ابن عتیکؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (اپنی بیوی اور لونڈی کے بارہ میں) بعض غیرت کو تو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور بعض غیرت کو ناپسند کرتا ہے۔ چنانچہ جس غیرت کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ شک و شبہ کی جگہ پیدا ہونے والی غیرت ہے (مثلاً بیوی یا لونڈی غیر مردوں کے سامنے آتی ہے یا غیر مرد اس کے پاس آتے ہیں اور وہ ان سے ہنسی مزاق کرتی ہے تو اس موقع پر خاوند جو غیرت محسوس کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور جس غیرت کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ غیرت ہے جو کسی شک و شبہ کی وجہ کے بغیر پیدا ہوئی ہو (مثلاً کسی قرینہ و سبب کے بغیر خاوند کے دل میں بیوی کے کردار کے بارہ میں بدگمانی پیدا ہو جائے اور پھر اس پر غیرت محسوس کرے) اسی طرح بعض تکبر کو تو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسند فرماتا ہے چنانچہ جس تکبر کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے وہ لڑائی کے وقت آدمی کا تکبر کرنا ہے (یعنی جہاد میں جب کفار سے مقابلہ ہو تو اپنی قوت و برتری اور کفار کی حقارت و کمتری کے اظہار کے لئے خوب اکڑے اور اپنی بڑائی و شجاعت کو بڑے فخر و غرور کے ساتھ بیان کرے) اور وہ تکبر بھی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے جو خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کے سلسلہ میں ہو (یعنی جب صدقہ و خیرات دے تو خوش دلی اور بے پروائی کے ساتھ دے اور زیادہ سے زیادہ دینے کو بھی تھوڑا جانے) اور جس تکبر کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ (اپنے نسب پر) فخر کا تکبر ہے۔ اور ایک روایت میں (فی الفخر کی بجائے) فی البغی ہے یعنی جس تکبر کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ ظلم کا تکبر ہے (یعنی وہ تکبر جو بلا کسی حق استحقاق کیا جائے جس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں)۔"

(احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "اپنے نسب پر فخر کا تکبر" یہ ہے کہ جو شخص اعلی حسب ونسب اور اچھے خاندان کا ہو وہ یہ کہتا پھرے کہ مجھے نسب میں برتری اور امتیاز حاصل ہے اور میرے باپ دادا اعلی نسل و خاندان کے افراد ہونے کی وجہ سے بزرگ و افضل ہیں یہ ایسا تکبر ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو برتری و فوقیت اور بزرگی و فضیلت اسی شخص کو حاصل ہے جو دین کے اعتبار سے سب میں ممتاز ہو، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ۔

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے زیادہ بزرگ وبلند مرتبہ وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔"

مشکوٰۃ کے ایک نسخہ میں اس روایت میں فی الفخر کی بجائے فی الفقر ہے یعنی جس تکبر کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ فقر کا تکبر ہے، مطلب یہ کہ خدا کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ کوئی شخص حالت فقر میں اپنی قناعت اور اپنے صبرو توکل پر تکبر کرے چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ یہ تکبر اس تکبر سے بدتر ہے جو اپنے غنا اور اپنی ثروت پر کیا جاتا ہے لیکن فقر کا تکبر اس صورت میں برا اور خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے جب کہ وہ فقراء کے مقابلہ پر کیا جائے ہاں اگر وہ تکبر امراء و اغنیاء کے مقابلہ پر ہو تو اچھا اور پسندیدہ ہے کیونکہ ایسے تکبر کو تو صدقہ کہا گیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ولد الزنا کا نسب زانی سے ثابت نہیں ہوتا

⑰ وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ فُلَانًا ابْنِىْ عَاهَرْتُ بِاُمِّهٖ فِى الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا دِعْوَةَ فِى الْاِسْلَامِ ذَهَبَ اَمْرُ الْجَاهِلِيَّةِ اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد (حضرت شعیبؒ) سے اور حضرت شعیبؒ اپنے دادا (حضرت عبداللہ ابن عمروؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص (مجلس نبوی میں کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ "یارسول اللہ! فلاں میرا لڑکا ہے میں نے زمانہ جاہلیت میں اس کی ماں سے زنا کیا تھا" رسول کریم ﷺ نے فرمایا "زمانہ جاہلیت کی گئی گزری بات کا زمانہ اسلام میں دعوی نہیں ہو سکتا (یعنی یہ بات زمانہ جاہلیت ہی کے ساتھ مخصوص تھی اور جو بچہ زنا کے نتیجہ میں پیدا ہوا کرتا تھا اس کا نسب زانی اپنے ساتھ جوڑ لیتا تھا اب زمانہ اسلام میں یہ بات درست نہیں) بچہ صاحب فراش کا ہے اور زانی کے لئے پتھر یعنی محرومی ہے یا سنگساری۔" (ابوداؤد)

تشریح: "صاحب فراش" سے وہ شخص مراد ہے جو ولد الزنا کی ماں کا خاوند یا مالک ہو! مطلب یہ ہے کہ جو عورت کسی کے نکاح میں ہو، یا (لونڈی ہونے کی صورت میں) کسی کی ملک میں ہو تو اس کے زنا کے نتیجہ میں جو بچہ پیدا ہو گا اس کا نسب اس کے خاوند یا مالک سے ثابت ہو گا اور اگر وہ عورت کسی کے نکاح یا کسی کی ملک میں نہ ہو تو پھر بچہ ماں ہی کی طرف منسوب ہو گا، بہر صورت زانی کا اس بچہ سے کوئی نسبی تعلق نہیں ہو گا۔

وہ چار عورتیں جن سے لعان نہیں ہوتا

⑱ وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ مِنَ النِّسَاءِ لَا مُلَاعَنَةَ بَيْنَهُنَّ النَّصْرَانِيَّةُ تَحْتَ الْمُسْلِمِ وَالْيَهُوْدِيَّةُ تَحْتَ الْمُسْلِمِ وَالْحُرَّةُ تَحْتَ الْمَمْلُوْكِ وَالْمَمْلُوْكَةُ تَحْتَ الْحُرِّ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" چار طرح کی عورتیں ہیں کہ ان کے (اور ان کے شوہروں کے) درمیان لعان نہیں ہوتا ایک تو وہ نصرانیہ (یعنی عیسائی عورت) جو کسی مسلمان کے نکاح میں ہو اور دوسری یہودیہ (یعنی یہودی عورت) جو کسی مسلمان کے نکاح میں ہو اور تیسری وہ آزاد عورت جو کسی غلام کے نکاح میں ہو اور چوتھی وہ لونڈی جو کسی آزاد کے نکاح میں ہو۔" (ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی عیسائی یا یہودی عورت کسی مسلمان کے نکاح میں ہو اور اس کا خاوند اس پر زنا کی تہمت لگائے اور وہ اس کی تردید کرے تو اس صورت میں ان دونوں کے درمیان لعان نہیں کرایا جائے گا اسی طرح اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام کے نکاح میں ہو یا کوئی لونڈی کسی آزاد کے نکاح میں ہو تو اس کے درمیان بھی لعان نہیں ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لعان دراصل شہادت وگواہی ہے اس لئے لعان کی صورت میں مرد وعورت دونوں کا اہل شہادت (کہ جن کی شہادت شرعی طور پر معتبر ہوتی ہے) ہونا ضروری ہے جب کہ مملوک (یعنی غلام ولونڈی) اور کافر اہل شہادت نہیں ہیں یعنی کسی معاملہ میں (ان کی شہادت وگواہی شرعی طور پر معتبر نہیں ہے لہٰذا ان کے درمیان لعان کی کوئی صورت نہیں۔

آنحضرت ﷺ حتی الامکان لعان سے باز رکھنا چاہتے تھے

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ رَجُلاً حِيْنَ اَمَرَ الْمُتَلاَ عِنَيْنِ اَنْ يَتَلاَ عَنَا اَنْ يَّضَعَ يَدَهُ عِنْدَ الْخَامِسَةِ عَلٰى فِيْهِ وَقَالَ اِنَّهَا مُوْجِبَةٌ۔ (رواه النسائى)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) جب نبی کریم ﷺ کے حکم پر دو لعان کرنے والے (یعنی میاں بیوی لعان کر رہے تھے تو آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ پانچویں گواہی کے وقت لعان کرنے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ دے اور فرمایا کہ پانچویں گواہی واجب کرنے والی ہے۔" (نسائیؒ)

تشریح: کسی خاوند نے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائی ہوگی اور بیوی نے اس کی تردید کی ہوگی اور صورت حال کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے لعان کا ارادہ کیا ہوگا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کو لعان کا حکم دیا اور اسی وقت ایک دوسرے شخص کو یہ حکم فرمایا کہ جب پانچویں گواہی کی باری آئے تو لعان کرنے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ دینا تاکہ وہ پانچویں گواہی دے کر لعان کو پورا نہ کرے۔

اس حکم کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ جب اس کے منہ پر ہاتھ رکھا جائے گا تو اسے تنبہ اور احساس ہوگا اور جو سچ بات ہوگی اس کا اقرار کر کے پانچویں گواہی سے باز رہے گا اور جب پانچویں گواہی پوری نہیں ہوگی تو لعان واقع نہیں ہوگا یہ گویا اس بات کی علامت ہے کہ آنحضرت ﷺ حتی الامکان لعان سے روکنے کی کوشش کرتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ جو سچ بات ہو میاں بیوی اس کا اقرار کریں اور اس دنیا کے آسان عذاب (یعنی زنا یا تہمت کی حد) کو اختیار کر کے آخرت کے سخت ترین عذاب سے محفوظ رہیں۔

شیطان، میاں بیوی کو ایک دوسرے سے بدظن کرنے کی کوشش کرتا ہے

(۲۰) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ مِنْ عِنْدِهَا لَيْلاً قَالَتْ فَغِرْتُ عَلَيْهِ فَجَاءَ فَرَاٰى مَا اَصْنَعُ فَقَالَ مَالَكِ يَا عَائِشَةُ اَغِرْتِ فَقُلْتُ مَالِي لاَ يَغَارُ مِثْلِي عَلٰى مِثْلِكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ جَاءَكِ شَيْطَانُكِ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمَعِي شَيْطَانٌ قَالَ نَعَمْ قُلْتُ وَمَعَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ نَعَمْ وَلٰكِنْ اَعَانَنِي اللّٰهُ عَلَيْهِ حَتّٰى اَسْلَمَ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ ایک (مرتبہ شعبان کی پندرہویں) رات کو نبی کریم ﷺ ان کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے تو

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھے آپ ﷺ پر بڑی غیرت آئی پھر جب آنحضرت ﷺ واپس تشریف لائے اور میں جس کیفیت میں مبتلا تھی اس کو دیکھا تو فرمایا کہ "عائشہؓ! تمہیں کیا ہوا؟ کیا تم مجھ پر غیرت کرتی ہو؟ میں نے عرض کیا کہ "بھلا میری ایسی عورت کو آپ ﷺ جیسے مرد پر غیرت کیوں نہ آئے گی؟" آپ ﷺ نے فرمایا "دراصل تمہارے پاس تمہارا شیطان آگیا ہے (یعنی شیطان نے تمہیں شک و شبہ میں مبتلا کر دیا) میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا میرے ساتھ شیطان ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" میں نے کہا "یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ کے ساتھ بھی ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر حاوی کر دیا ہے یہاں تک کہ میں اس (وسوسہ) سے سالم (محفوظ) رہتا ہوں (حتّٰی اسلم) کا ترجمہ یہ ہے کہ یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ یعنی میرا تابع ہو گیا ہے۔" (مسلم)

تشریح: ایک مرتبہ شعبان کی پندرہویں شب میں آنحضرت ﷺ چپکے سے حضرت عائشہؓ کے پاس سے اٹھ کر جنت البقیع تشریف لے گئے تاکہ وہاں مردوں کے لئے ایصال ثواب اور دعاء مغفرت کریں لیکن حضرت عائشہؓ یہ سمجھیں کہ آپ ﷺ میرے پاس سے اٹھ کر اپنی کسی اور بیوی کے ہاں چلے گئے ہیں، یہ گویا شیطان کا فریب تھا جس نے انہیں اس شک میں مبتلا کر دیا، اس کی وجہ سے ان کو بڑی غیرت آئی ان کی قلبی کیفیت متغیر ہو گئی، چنانچہ وہ بھی گھبرا کر اٹھیں اور آنحضرت ﷺ کے پیچھے پیچھے چل پڑیں پھر انہوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی منزل کسی دوسری بیوی کا مکان نہیں ہے بلکہ جنت البقیع (مدینہ کا قبرستان) ہے جہاں آپ ﷺ اس دنیا سے چلے جانے والے مسلمانوں کے لئے دعاء مغفرت میں مشغول ہیں، یقینی بات ہے کہ جس شک و شبہ نے حضرت عائشہؓ کو اتنا اکسایا اور گھبراہٹ میں مبتلا کیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے واپس پہنچنے سے پہلے ہی گھر میں پہنچ جانا چاہتی ہوں گی چنانچہ وہ وہاں سے بھاگی دوڑتی گھر کی طرف چلیں جب گھر میں داخل ہوئیں تو کچھ دوڑنے کی وجہ سے اور کچھ ندامت کے سبب سینہ دھونکنی بن گیا اور دم پھولنے لگا ان کے بعد ہی آنحضرت ﷺ گھر میں آئے اور حضرت عائشہؓ کی یہ کیفیت دیکھی کہ دم چڑھ رہا ہے اور گھبراہٹ طاری ہے تو فرمایا آخر اتنی گھبراہٹ تم پر کیوں طاری ہو گئی کیا تم نے محض اس وجہ سے غیرت محسوس کی کہ میں اس طرح کیوں چلا گیا اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے جو کچھ کہا وہ دراصل عورت کے جذبات فطرت کی بڑی حسین اور دلچسپ ترجمانی تھی انہوں نے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ مجھ جیسی صورت آپ ﷺ جیسے مرد پر غیرت نہ کرے؟ یعنی اگرچہ مجھے آپ ﷺ کی بے پناہ محبت حاصل ہے لیکن میری سوکنیں بھی کئی ہیں اور پھر آپ ﷺ تمام ظاہری و باطنی جمال و کمال سے متصف ہیں ایسی صورت میں کیونکر رشک و غیرت میں مبتلا نہ ہوں۔

بَابُ الْعِدَّةِ

عدت کا بیان

عدت کے معنی: لغت میں عدت کے معنی ہیں "شمار کرنا" اور اصطلاح شریعت میں عدت اسے کہتے ہیں کہ جب کسی عورت کو اس کا خاوند طلاق دیدے یا خلع و ایلاء وغیرہ کے ذریعہ نکاح یا نکاح جیسی چیز (مثلاً نکاح فاسد) ٹوٹ جائے بشرطیکہ اس نکاح میں جماع یا خلوت صحیحہ ہو چکی ہو، یا شوہر مر جائے تو وہ مقررہ مدت تک (جس کی تفصیل آگے آئے گی) گھر میں رکی رہے جب تک وہ مدت ختم نہ ہو جائے تب تک نہ کہیں جائے اور نہ کسی دوسرے مرد سے ملاقات کرے، جب مدت پوری ہو جائے تو جہاں چاہے جائے اور جس طرح چاہے نکاح کرے۔

عدت کی مدت: جس آزاد عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی ہو یا نکاح فسخ ہو گیا ہو اور اس کو حیض آتا ہو تو اس کی عدت کی مدت تین حیض ہے یعنی وہ تین حیض آنے تک شوہر ہی کے گھر میں جہاں طلاق ملی ہو، بیٹھی رہے اس گھر سے باہر نہ نکلے اور نہ کسی سے نکاح کرے اسی طرح جس عورت کے ساتھ شبہ میں جماع ہو گیا ہو اس کی عدت کی مدت بھی تین حیض ہے یعنی کسی مرد نے کسی غیر

عورت کو اپنی بیوی سمجھ کر دھوکہ سے صحبت کرلی تو اس عورت کو بھی تین حیض آنے تک عدت میں بیٹھنا ہوگا جب تک عدت ختم نہ ہو جائے تب تک وہ اپنے شوہر کو جماع نہ کرنے دے جس عورت کے ساتھ بے قاعدہ یعنی فاسد نکاح ختم ہوا ہو، جیسے موقت نکاح اور پھر تفریق کرادی گئی یا تفریق کرانے سے پہلے ہی خاوند مر گیا ہو تو اس عدت کی مدت بھی تین حیض ہے۔ اُم ولد جب کہ آزاد کردی جائے یا اس کا مولی مرجائے تو اس کی عدت بھی تین حیض ہیں۔

اگر کسی عورت کو کم سن ہونے کی وجہ سے یا بانجھ ہونے کی وجہ سے اور یا بڑھاپے کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو تو اس کی عدت تین مہینہ ہے۔

جس آزاد عورت کا خاوند مر گیا اور اس کی عدت چار مہینہ دس دن ہے خواہ اس عورت سے جماع کیا گیا ہو یا جماع نہ کیا گیا ہو۔ خواہ وہ مسلمان عورت ہو یا مسلمان مرد کے نکاح میں یہودیہ اور نصرانیہ ہو، خواہ وہ بالغہ ہو نابالغہ اور یا آئسہ ہو خواہ اس کا شوہر آزاد ہو یا غلام ہو اور خواہ اس کی مدت میں اس کو حیض آئے یا نہ آئے۔

حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے خواہ اس عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دی ہو یا اس کا خاوند مر گیا ہو اور خواہ وہ عورت آزاد ہو یا لونڈی۔ ولادت ہوتے ہی اس کی عدت پوری ہو جائے گی اگرچہ خاوند کے طلاق دینے یا خاوند کے مرنے کے کچھ ہی دیر بعد ولادت ہو جائے، یہاں تک کہ کتاب مبسوط میں لکھا ہے کہ اگر حاملہ عورت کا شوہر مر گیا ہو اور وہ ابھی تختہ پر نہلایا جا رہا تھا یا کفنایا جا رہا تھا کہ اس عورت کے ولادت ہوگئی تو اس صورت میں بھی اس کی عدت پوری ہو جائے گی۔

جو عورت آزاد نہ ہو یعنی کسی کی لونڈی ہو اور اس کا خاوند اس کو طلاق دیدے تو اس کی عدت دو حیض ہے بشرطیکہ اس کو حیض آتا ہو اور اگر اس کو حیض نہ آتا ہو تو پھر اس کی عدت ڈیڑھ مہینہ ہوگی اور اگر اس کا خاوند مر جائے تو اس کی عدت دو مہینے پانچ دن ہوگی خواہ اس کو حیض آتا ہو یا نہ آتا ہو۔

عدت کی ابتداء کا وقت: طلاق کی صورت میں عدت کی ابتداء طلاق کے بعد سے ہوگی یعنی طلاق کے بعد جو تین حیض آئیں گے ان کا شمار ہوگا، اگر کسی نے حیض کی حالت میں طلاق دی ہوگی تو اس حیض کا شمار نہ ہوگا بلکہ اس کے بعد کے تین حیض کا اعتبار کیا جائے گا اور وفات میں عدت کا شمار شوہر کی وفات کے بعد سے ہوگا، اگر عورت کو طلاق یا وفات کی خبر نہیں ہوئی یہاں تک کہ عدت کی مدت گزر گئی، تو اس کی عدت پوری ہوگئی! عدت کے مسائل کی باقی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عدت کے دنوں میں شوہر پر نفقہ اور سکنی واجب ہے یا نہیں

① عَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَیْسٍ اَنَّ اَبَا عَمْرِو بْنَ حَفْصٍ طَلَّقَهَا الْبَتَّةَ وَهُوَ غَائِبٌ فَاَرْسَلَ اِلَیْهَا وَکِیْلُهُ الشَّعِیْرَ فَسَخِطَتْهُ فَقَالَ وَاللّٰهِ مَالَكِ عَلَیْنَا مِنْ شَیْءٍ فَجَاءَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَتْ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ لَیْسَ لَكِ نَفَقَةٌ فَاَمَرَهَا اَنْ تَعْتَدَّ فِیْ بَیْتِ اُمِّ شَرِیْكٍ ثُمَّ قَالَ تِلْكَ امْرَاَةٌ یَغْشَاهَا اَصْحَابِیْ اِعْتَدِّیْ عِنْدَ ابْنِ اُمِّ مَکْتُوْمٍ فَاِنَّهُ رَجُلٌ اَعْمٰی تَضَعِیْنَ ثِیَابَكِ فَاِذَا حَلَلْتِ فَاٰذِنِیْنِیْ قَالَتْ فَلَمَّا حَلَلْتُ ذَکَرْتُ لَهُ اَنَّ مُعَاوِیَةَ ابْنَ اَبِیْ سُفْیَانَ وَاَبَا جَهْمٍ خَطَبَانِیْ فَقَالَ اَمَّا اَبُو الْجَهْمِ فَلَا یَضَعُ عَصَاهُ عَنْ عَاتِقِهٖ وَاَمَّا مُعَاوِیَةُ فَصُعْلُوْكٌ لَا مَالَ لَهُ اِنْکِحِیْ اُسَامَةَ بْنَ زَیْدٍ فَکَرِهْتُهُ ثُمَّ قَالَ اِنْکِحِیْ اُسَامَةَ فَنَکَحْتُهُ فَجَعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا وَاغْتُبِطْتُ، وَفِیْ رِوَایَةٍ عَنْهَا فَاَمَّا اَبُوْجَهْمٍ فَرَجُلٌ ضَرَّابٌ لِلنِّسَاءِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَنَّ زَوْجَهَا طَلَّقَهَا ثَلَاثًا فَاَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا نَفَقَةَ لَكِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنِیْ حَامِلًا۔

"ابو سلمہؓ فاطمہ بن قیس سے نقل کرتے ہیں کہ ابو عمرو بن حفصؓ نے فاطمہ بن قیسؓ کو (جو ان کی بیوی تھیں) تین طلاقیں دیں جب کہ وہ خود موجود نہیں تھے (یعنی عمرو کہیں باہر تھے وہیں سے انہوں نے کسی کی زبانی کہلا کر بھیجا کہ میں نے طلاق دی) پھر ابو عمروؓ کے وکیل (کارندے) نے (بطور نفقہ) فاطمہؓ کے پاس کچھ جَو بھیجے۔ فاطمہؓ (کے خیال میں جو کی وہ مقدار بہت کم تھی اس لئے وہ اس پر ناراض ہوئیں وکیل نے کہا کہ "خدا کی قسم! ہم پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے" (کیونکہ تمہیں تین طلاقیں مل چکی اس کے نفقہ کا کوئی حکم نہیں ہے۔ اس وقت تمہیں جو کی جو بھی مقدار دی گئی ہے وہ محض احسان وسلوک کے طور پر ہے) فاطمہؓ (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا نفقہ (ابو عمرؓ پر) واجب نہیں ہے پھر آپ ﷺ نے فاطمہؓ کو یہ حکم دیا کہ وہ اُمّ شریک کے گھر عدت میں بیٹھ جائیں لیکن پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُمّ شریک کے گھر میں میرے صحابہؓ (جو اُمّ شریکؓ کے عزیز واقارب اور آل اولاد ہیں) آتے جاتے ہیں (اس لئے ان کے گھر میں تمہارا بیٹھنا مناسب نہیں ہوگا البتہ تم ابن مکتومؓ کے ہاں عدت کے دن گزار لو کیونکہ وہ ایک اندھے آدمی ہیں وہاں تم اپنے کپڑے رکھ سکتی ہو اور جب تم حلال ہو جاؤ (یعنی تمہاری عدت کے دن پورے ہو جائیں) تو مجھے اطلاع کر دینا (تاکہ میں تمہارے دوسرے نکاح کی فکر کروں) فاطمہؓ کہتی ہیں کہ پھر جب میں حلال ہو گئی تو میں نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا" کہ معاویہ ابن ابی سفیانؓ اور ابو جہمؓ نے میرے پاس نکاح کا پیغام بھیجا ہے (آپ ﷺ کی کیا رائے ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "ابو جہمؓ (کی بات تو یہ ہے کہ وہ) اپنی لاٹھی اپنے کاندھے سے (کبھی) رکھتے ہی نہیں اور معاویہؓ غریب آدمی ہیں جن کے پاس مال و اسباب نہیں ہے (لہٰذا میری رائے میں تو مناسب یہ ہے کہ) تم اسامہؓ ابن زیدؓ سے نکاح کر لو" چنانچہ میں نے اسامہؓ سے نکاح کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے اس (نکاح اور اسامہؓ کی رفاقت) میں خیر وبرکت عطا فرمائی اور مجھ پر رشک کیا جانے لگا (یعنی ہم دونوں کی رفاقت اتنی راس آئی اور ہم میں اتنی الفت و محبت پیدا ہوئی کہ جو بھی دیکھتا مجھ پر رشک کرتا) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ فاطمہؓ کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ابو جہمؓ ایک ایسا مرد ہے جو عورتوں کو بہت مارتا ہے" (مسلم) اور مسلمؒ ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ فاطمہؓ کے شوہر نے ان کو تین طلاقیں دی تھیں چنانچہ جب وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تمہارا نفقہ (تمہارے شوہر کے ذمہ) نہیں ہے ہاں اگر تم حاملہ ہوتیں (تو اس پر تمہارا نفقہ واجب ہوتا)۔"

تشریح: "وہاں تم اپنے کپڑے رکھ سکتی ہو" کا مطلب یہ ہے کہ ابن ام مکتوم چونکہ نابینا ہیں اس لئے تمہیں وہاں پردے کی احتیاط کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی اور اگر یہ ترجمہ کیا جائے کہ "وہاں تم اپنے کپڑے رکھ دو" تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ وہاں تم جب تک عدت میں رہو، زینت وآرائش کے کپڑے نہ پہننا! یا پھر اس جملہ کے ذریعہ کنایۃً یہ اظہار مقصود تھا کہ ایام عدت میں گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ عورت کو اجنبی مرد کی طرف دیکھنا جائز ہے بشرطیکہ وہ اجنبی مرد اس کو نہ دیکھے، لیکن یہ استدلال کمزور وضعیف ہے اور صحیح وہی بات ہے جو اکثر علماء کا قول ہے کہ جس طرح اجنبی مرد کو اجنبی عورت دیکھنا حرام ہے اسی طرح اجنبی عورت کو بھی اجنبی مرد کی طرف دیکھنا حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مردوں کے حق میں یہ حکم دیا ہے کہ:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (الآية)۔

"(اے محمد ﷺ) آپ (ﷺ) مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (آخر آیت تک)۔"

اسی طرح عورتوں کے حق میں بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ:

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ۔

"اور مسلمان عورتوں سے (بھی یہی) کہہ دیجئے کہ (وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (آخر آیت تک)۔"

نیز اس سلسلہ میں حضرت ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ سے متعلق اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت بھی ایک بڑی واضح دلیل ہے جس میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ وہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا آنحضرت کے پاس تھیں کہ اچانک حضرت ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ آگئے تو آنحضرت ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا کہ پردہ کرلو، حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یہ تو نابینا ہیں یہ ہمیں کہاں دیکھ رہے ہیں؟ کہ ہم ان سے پردہ کریں اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ:

اَفَعَمْیَاوَانِ اَنْتُمَا اَلَسْتُمَا تُبْصِرَانِهٖ۔

"کیا تم دونوں بھی اندھی ہو، کیا تم ان کو نہیں دیکھ رہی ہو؟۔"

پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا، کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو دیکھنا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے جائز قرار دیا تھا بلکہ دراصل آنحضرت ﷺ کا مقصد تو صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ تم ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کے ہاں امن وحفاظت کے ساتھ رہوگی کیونکہ ان کے ہاں تمہیں کوئی دیکھے گا نہیں، اور جہاں تک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا سوال ہے تو انہیں خود ہی کتاب اللہ کا یہ حکم معلوم تھا کہ اجنبی مرد کو دیکھنا ممنوع ہے اس لئے ان سے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کو دیکھتی ہوں گی؟

بہرکیف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے بعض علماء نے عورت کو اجنبی مرد کے دیکھنے کا جو جواز ثابت کیا ہے اس کے متعلق اکثر جمہور علماء کی طرف یہ سے جواب دیا جاتا ہے۔

اب رہی بات حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے فقہی مسلک کی تو یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ ان کے نزدیک اجنبی مرد کو اس کے زیر ناف سے زیر زانو تک کے حصہ کے علاوہ دیکھنا عورت کے لئے جائز ہے بشرطیکہ وہ جنسی ترغیب (شہوت) سے محفوظ و مامون ہو اگر جنسی ترغیب سے مامون نہ ہو تو پھر اجنبی مرد کے پورے جسم کو دیکھنا اس کے لئے حرام ہوگا۔

"ابوجہم رضی اللہ عنہ اپنی لاٹھی اپنے کاندھے سے رکھتے ہی نہیں" اس سے ابوجہم رضی اللہ عنہ کی تندخوئی اور درشت مزاجی کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ کہ ابوجہم رضی اللہ عنہ بہت سخت گیر اور تندخو ہیں، وہ عورتوں کو مارتے ہیں، ان سے تمہارا نباہ مشکل ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو مرد یا عورت کا کوئی عیب معلوم ہو تو منگنی کے وقت اس کا اظہار کردینا جائز ہے تاکہ شادی کے بعد وہ دونوں ہی کسی تکلیف اور پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔

فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے انتخاب کو اس لے ناپسند کیا کہ وہ اول تو آنحضرت ﷺ کے غلام کے بیٹے تھے، دوسرے ان کا رنگ سیاہ تھا جب کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا قریشی تھیں اور خوبصورت بھی تھیں لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ چونکہ آنحضرت ﷺ کو بہت محبوب تھے اور انہیں آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں ایک مخصوص فضیلت اور تقرب حاصل تھا اس لئے آپ ﷺ نے دوبارہ انکی سفارش کی جس کے بعد فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور حکم نبوی کے مطابق حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کرلیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نکاح میں خیروبرکت عطا فرمائی اور ان کو اسامہ رضی اللہ عنہ کی زوجیت و رفاقت میں چین و آرام نصیب ہوا۔

اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ جس عورت کو طلاق بائن دی گئی ہو اور وہ حاملہ نہ ہو تو عدت پوری ہونے تک اس کا نفقہ (کھانے پینے اور کپڑے کا خرچ) اور سکنی (رہنے کی جگہ) شوہر کے ذمہ ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض علماء کے نزدیک شوہر پر اس عورت کا نفقہ اور سکنی واجب ہے سکنی تو آیت سے ثابت ہے:

اَسْکِنُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِکُمْ۔

"تم ان (مطلقہ) کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو۔"

اور نفقہ کے اعتبار سے واجب ہے کہ وہ عورت اسی شوہر کی وجہ سے تمام پابندیوں کے ساتھ عدت میں بیٹھی ہوئی ہے۔ حضرت عمر

فاروق ؓ بھی اسی کے قائل تھے بلکہ وہ اس حدیث کے بارہ میں فرماتے تھے کہ ہم ایک عورت (فاطمہ بنت قیس ؓ) کے کہنے سے (کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارا نفقہ اور سکنی تمہارے شوہر کے ذمہ نہیں ہے) کتاب اللہ اور آنحضرت ﷺ کی سُنّت کو ترک نہیں کر سکتے (جس سے نفقہ اور سکنی کا واجب ہونا ثابت ہے) ہو سکتا ہے کہ فاطمہ ؓ کو اشتباہ ہوا ہو یا انہیں آپ کا اصل ارشاد یاد نہ رہا ہو چنانچہ میں نے خود رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس عورت کا نفقہ اور سکنی شوہر کے ذمہ ہے لیکن حضرت ابن ملک کہتے ہیں کہ یہ واقعہ صحابہ ؓ کے سامنے پیش آیا تھا (ان صحابہ ؓ میں سے کسی نے فاطمہ ؓ کے قول کی تردید نہیں کی ہے اس لئے یہ بمنزلہ اجماع کے ہوا)۔

حضرت امام احمد ؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس عورت کے لئے نہ تو نفقہ واجب ہے اور نہ سکنی اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے حضرت امام مالک ؒ، حضرت امام شافعی ؒ، اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس آیت اَسْكِنُوْهُنَّ الخ کے موجب اس عورت کے لئے سکنی واجب ہے نفقہ واجب نہیں ہے ہاں اگر اسے حمل کی حالت میں طلاق دی گئی ہو تو اس حدیث کے مطابق اس کے لئے نفقہ واجب ہو گا۔

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ فَاطِمَةَ كَانَتْ فِيْ مَكَانٍ وَحْشٍ فَخِيْفَ عَلٰى نَاحِيَتِهَا فَلِذٰلِكَ رَخَّصَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعْنِيْ فِي النُّقْلَةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَتْ مَا لِفَاطِمَةَ اَلَا تَتَّقِي اللّٰهَ تَعْنِيْ فِيْ قَوْلِهَا لَا سُكْنٰى وَلَا نَفَقَةَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہ ؓ کہتی ہیں کہ فاطمہ بنت قیس ؓ جس مقام میں رہتی تھی وہ ایک ویران جگہ تھی اور وہاں اس کے بارہ میں اندیشہ رہتا تھا اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس کو (عدت کے دنوں میں اپنے مکان سے ابن مکتوم ؓ کے مکان میں) منتقل ہونے کی آسانی عطا فرمادی تھی۔" "ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضرت عائشہ ؓ نے کہا" "کہ فاطمہ ؓ کو کیا ہوا ہے کہ وہ اللہ سے نہیں ڈرتی؟ اس سے حضرت کی مراد فاطمہ ؓ کے اس قول کہ نہ نفقہ واجب ہے اور نہ سکنی" کی تردید کرنا ہے۔" (بخاری)

تشریح: حدیث کے ابتدائی الفاظ کا مطلب ہے کہ فاطمہ بنت قیس ؓ جس مکان میں رہتی تھیں وہ ایک ویران جگہ میں تھا جہاں ہر وقت چور وغیرہ کا اندیشہ رہتا تھا اسی لئے آنحضرت ﷺ نے انہیں اس مکان سے حضرت ابن اُمّ مکتوم ؓ کے مکان میں منتقل ہونے کی اجازت مرحمت فرمادی اور اس بیان سے حضرت عائشہ ؓ کا مقصد یہ آگاہ کرنا تھا کہ فاطمہ ؓ اپنی عدت کے دنوں میں اپنے خاوند کے گھر کو چھوڑ کر غیر کے گھر میں جو بیٹھی تھیں اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ تین طلاقوں والی عورت کے لئے سکنی نہیں ہے اور وہ جہاں چاہے عدت میں بیٹھ جائے، بلکہ فاطمہ ؓ کا اپنے خاوند کے مکان کو چھوڑ کر ایک دوسرے شخص کے مکان میں عدت گزارنے کا سبب یہ ہے جو بیان کیا گیا۔

دوسری روایت کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ ؓ بنت قیس ؓ آنحضرت ﷺ سے یہ نقل کیا کرتی تھیں، کہ جس عورت کو طلاق بائن دی گئی ہو اس کے لئے نہ تو نفقہ ہے اور نہ سکنی ہے چنانچہ حضرت عائشہ ؓ نے ان کی اس بات کی تردید کی اور فرمایا کہ فاطمہ ؓ اس قول "نہ نفقہ اور نہ سکنی ہے" کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہوئے خدا سے نہیں ڈرتی، آنحضرت نے اس طرح ہرگز نہیں فرمایا ہو گا بلکہ فاطمہ ؓ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

گویا اس مسئلہ میں حضرت عائشہ ؓ کا بھی وہی مسلک تھا جو حضرت عمر ؓ کا تھا اور یہ حدیث حضرت امام اعظم ابوحنیفہ ؒ کے مسلک کی مؤید ہے کہ طلاق بائن والی عورت کے لئے سکنی بھی ہے اور نفقہ بھی ہے۔

(۳) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ اِنَّمَا نُقِلَتْ فَاطِمَةُ لِطُوْلِ لِسَانِهَا عَلٰى اَحْمَائِهَا۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت سعید ابن مسیب ؓ کہتے ہیں کہ فاطمہ ؓ کو (عدت کے زمانہ میں اس کے خاوند کے گھر سے) اس لئے منتقل کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنے خاوند کے عزیزوں سے زبان درازی کیا کرتی تھی۔" (شرح السنۃ)

تشریح: عدت کے زمانہ میں اپنے خاوند کے گھر سے فاطمہؓ کے اٹھ آنے کا ایک سبب تو وہ تھا جو اوپر کی حدیث میں بیان کیا گیا یعنی ان کے گھر کا ویران جگہ میں ہونا اور دوسرا سبب یہ ہے جو اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔

عدت کے زمانہ میں کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلنا جائز ہے یا نہیں

④ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ طُلِّقَتْ خَالَتِيْ ثَلاَثًا فَاَرَادَتْ اَنْ تَجُدَّ نَخْلَهَا فَزَجَرَهَا رَجُلٌ اَنْ تَخْرُجَ فَاَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ بَلٰى فَجُدِّيْ نَخْلَكِ فَاِنَّهُ عَسٰى اَنْ تَصَدَّقِيْ اَوْ تَفْعَلِيْ مَعْرُوْفًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میری خالہ کو تین طلاقیں دی گئی (اور وہ عدت میں بیٹھ گئیں) پھر (ایک دن) انہوں نے ارادہ کیا کہ (گھر سے باہر جا کر) کھجوریں توڑ لائیں تو ایک شخص نے انہیں گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا" وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور یہ واقعہ بیان کیا) اور آپ ﷺ نے فرمایا "اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جاؤ اور اپنے درخت سے کھجوریں توڑ لاؤ، کیونکہ شاید تم وہ کھجوریں اللہ تعالیٰ کی راہ میں دو یا ان کے ذریعہ احسان کرو۔" (مسلم)

تشریح: آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ کھجوریں اتنی مقدار میں ہو جائیں گی کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو جائے تم ان کی زکوٰۃ ادا کرو گی اور اگر بقدر نصاب نہیں ہوں گی تو پھر تم ان کے ذریعہ احسان وسلوک کرو گی بایں طور کہ اپنے ہمسایوں اور فقراء کو نفل صدقہ کے طور پر دو گی یا لوگوں کے پاس بطور تحفہ بھیجو گی اس سے معلوم ہوا کہ اگر وہ صدقہ نہ کرتیں تو ان کے لئے گھر سے باہر نکلنا جائز نہ ہوتا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو عورت طلاق بائن کی عدت میں بیٹھی ہو اس کو اپنی کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلنا جائز ہے اس مسئلہ میں حنفیہ کا جو مسلک ہے وہ اُمّ عطیہ کی روایت کے ضمن میں بیان ہوگا جو آگے آئے گی۔

حاملہ کی عدت، وضع حمل ہے

⑤ وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ اَنَّ سُبَيْعَةَ الْاَسْلَمِيَّةَ نُفِسَتْ بَعْدَ وَفَاةِ زَوْجِهَا بِلَيَالٍ فَجَاءَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَأْذَنَتْهُ اَنْ تَنْكِحَ فَاَذِنَ لَهَا فَنَكَحَتْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مسور ابن مخرمہ کہتے ہیں کہ سبیعہ اسلمیہ کے ہاں ان کے خاوند کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد ولادت ہوئی تو وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ ﷺ سے دوسرا نکاح کرنے کی اجازت مانگی آپ ﷺ نے ان کو اجازت عطا فرمائی، اور انہوں نے نکاح کر لیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: سبیعہ اسلمیہؓ اپنے خاوند کی وفات کے وقت حاملہ تھیں چنانچہ خاوند کی وفات کے چند ہی دنوں بعد ان کے ہاں ولادت ہوگئی تو آنحضرت ﷺ نے ان کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت عطا فرما دی۔

علماء لکھتے ہیں کہ اگر خاوند کی وفات یا طلاق کے بعد عورت کے ہاں ولادت ہو جائے تو وہ عدت سے نکل آتی ہے اور اس کے لئے دوسرا نکاح کرنا جائز ہو جاتا ہے اگرچہ ولادت یا وفات کے تھوڑی ہی دیر بعد ہو۔

عدت کے دنوں میں سرمہ لگانے کی ممانعت

⑥ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ جَاءَتِ امْرَاَةٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ بِنْتِيْ تُوُفِّيَ عَنْهَا زَوْجُهَا وَقَدِ اشْتَكَتْ عَيْنُهَا اَفَنَكْحُلُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لاَ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلاَثًا كُلُّ ذٰلِكَ يَقُوْلُ لاَ ثُمَّ قَالَ اِنَّمَا هِيَ اَرْبَعَةُ اَشْهُرٍ وَعَشْرٌ وَقَدْ كَانَتْ اِحْدَاكُنَّ فِي الْجَاهِلِيَّةِ تَرْمِيْ بِالْبَعْرَةِ عَلٰى رَأْسِ الْحَوْلِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میری لڑکی کا خاوند مرگیا ہے (جس کی وجہ سے وہ عدت میں ہے) اور اس کی آنکھیں دکھتی ہیں تو کیا میں اس کی آنکھوں میں سرمہ لگادوں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "نہیں" اس عورت نے یہ دوبار یا تین بار پوچھا اور آپ ﷺ ہر بار یہی جواب دیتے تھے کہ "نہیں" پھر فرمایا کہ "عدت چار مہینہ اور دس دن ہے جب کہ ایام جاہلیت میں تم میں کی ایک عورت (یعنی بیوہ) سال بھر کے بعد مینگنیاں پھینکتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث بظاہر امام احمدؒ کی دلیل ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس عورت کو سرمہ لگانا جائز نہیں ہے جس کا خاوند مرگیا ہو اور وہ عدت میں بیٹھی ہو، خواہ آنکھیں دکھنے کی وجہ سے اس کو سرمہ لگانے کی ضرورت ہو اور خواہ وہ محض زینت یا عادت کی بنا پر لگانا چاہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک مجبوری کی حالت میں مثلاً آنکھ دکھنے کی صورت میں سرمہ لگانا جائز ہے اور حضرت امام شافعیؒ بھی آنکھیں دکھنے کی صورت میں سرمہ لگانے کی اجازت دیتے ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ رات میں لگائے اور دن میں پونچھ ڈالے۔

اس حدیث کے بارہ میں حنفی علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس عورت نے زینت کے لئے سرمہ لگانا چاہا ہوگا مگر بہانہ کیا ہوگا آنکھ دکھنے کا اور چونکہ آپ ﷺ کو اس بات کا علم ہوگا اس لئے آپ ﷺ نے سرمہ لگانے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔

حدیث کے آخری جملہ کی وضاحت یہ ہے کہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ جس عورت کا خاوند مرجاتا وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بیٹھی رہتی اور بہت خراب کپڑے جو اکثر و بیشتر ٹاٹ اور نمدے کی صورت میں ہوتا تھا پہنے رہا کرتی تھی، زینت کی کوئی چیز استعمال نہیں کرتی تھی خوشبو بھی نہیں لگاتی تھی، غرض کہ پورے ایک سال تک اسی حالت میں رہتی پھر جس دن سال ختم ہوتا، اس دن اس کے پاس گدھا یا بکری اور یا کوئی بھی جانور و پرندہ لایا جاتا جس سے وہ اپنی شرمگاہ رگڑتی اور اس کے بعد اس کوٹھری سے باہر نکلتی پھر اس کے ہاتھ میں چند مینگنیاں دی جاتیں جن کو وہ پھینکتی اور اس کے ساتھ ہی عدت سے نکل آتی۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اسی رسم کی طرف اشارہ فرمایا کہ پچھلے زمانہ میں عدت کی مدت بھی بہت زیادہ تھی اور اس میں خرابیاں اور پریشانیاں بھی بہت تھیں جب کہ اسلام میں عدت کی مدت بھی بہت کم ہے یعنی چار مہینہ دس دن زیادہ تھی اور اس میں خرابی اور پریشانی بھی نہیں ہے تو پھر اتنا اضطراب کیوں ہے؟

زمانۂ عدت میں سوگ کرنے کا حکم

(۷) وَعَنْ اُمِّ حَبِیْبَةَ وَزَیْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَحِلُّ لِامْرَاَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تُحِدَّ عَلٰی مَیِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثِ لَیَالٍ اِلَّا عَلٰی زَوْجٍ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ حبیبہؓ اور حضرت زینب بنت جحشؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو بھی عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے ہاں اپنے شوہر کا سوگ چار مہینے دس دن تک کیا کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "سوگ" کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بناؤ سنگھار ترک کردے اور خوشبو و سرمہ وغیرہ لگانے سے پرہیز کرے؟ چنانچہ یہ سوگ کرنا کسی دوسری میت پر تو تین دن سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ لیکن اپنے شوہر کی وفات پر چار مہینے دس دن تک یعنی ایام عدت میں سوگ کرنا واجب ہے۔

اب رہی یہ بات کہ چار مہینہ دس دن یعنی عدت کی مدت کی ابتداء کب سے ہوگی تو جمہور علماء کے نزدیک اس مدت کی ابتداء خاوند کی موت کے بعد سے ہوگی، لیکن حضرت علیؓ اس کے قائل تھے کہ عدت کی ابتداء اس وقت سے ہوگی جس وقت کہ عورت کو خاوند کے انتقال کی خبر ہوئی ہے لہٰذا اگر کسی عورت کا خاوند کہیں باہر سفر وغیرہ میں مرگیا اور اس عورت کو اس کی خبر نہیں ہوئی یہاں تک کہ چار

مہینے دس دن گزر گئے تو جمہور علماء کے نزدیک عدت پوری ہوگئی جب کہ حضرت علیؓ کے قول کے مطابق اس کی عدت پوری نہیں ہوگی، بلکہ اس کو خبر ہونے کے وقت سے چار مہینے دس دن تک عدت میں بیٹھنا ہوگا۔

⑧ وَعَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُحِدُّ امْرَأَةٌ عَلٰى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثٍ اِلَّا عَلٰى زَوْجٍ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَعَشْرًا وَلَا تَلْبَسُ ثَوْبًا مَصْبُوْغًا اِلَّا ثَوْبَ عَصْبٍ وَلَا تَكْتَحِلُ وَلَا تَمَسُّ طِيْبًا اِلَّا اِذَا طَهُرَتْ نُبْذَةً مِنْ قُسْطٍ اَوْ اَظْفَارٍ۔ متفق عليه وزاد ابو داؤد ولا تختضب۔

"اور حضرت اُمّ عطیہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ کرے ہاں اپنے شوہر کے مرنے پر چار مہینے دس دن تک سوگ کرے اور (ان ایام یعنی زمانۂ عدت میں) عصب کے علاوہ نہ تو کوئی رنگین کپڑا پہنے، نہ سرمہ لگائے اور نہ خوشبو لگائے البتہ حیض سے پاک ہوتے وقت تھوڑا سا قسط یا اظفار استعمال کرے تو قباحت نہیں۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: "رنگین" کپڑے سے مراد وہ کپڑا ہے جو کسم، زعفران اور گیرو وغیرہ کے تیز اور شوخ رنگ میں رنگا گیا ہو اور عام طور پر زینت و آرائش کے طور پر پہنا جاتا ہو اور کتاب "کافی" میں لکھا ہے کہ اگر کسی عورت کے پاس رنگین کپڑوں کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہ ہو تو وہ رنگین کپڑا بھی پہن سکتی ہے کیونکہ اس کی ستر پوشی بہر حال زیادہ ضروری ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ان رنگین کپڑوں کو زیب و زینت کے مقصد سے استعمال نہ کرے۔

"عصب" اس زمانہ میں ایک خاص قسم کی چادر کو کہتے تھے جو اس طور پر بنی جاتی تھی کہ پہلے سوت کو جمع کر کے ایک جگہ باندھ لیتے تھے پھر اس کو کسم میں رنگتے تھے اور اس کے بعد اس کو بنتے تھے چنانچہ وہ سرخ رنگ کی ایک چادر ہو جاتی تھی جس میں سفید دھاریاں بھی ہوتی تھیں کیونکہ سوت کو باندھ کر رنگنے کی وجہ سے سوت کا وہ حصہ سفید رہ جاتا تھا جو بندھا ہوا ہوتا تھا۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ عدت والی عورت کو رنگین کپڑا پہننے کی جو ممانعت ہے اس کا تعلق اس کپڑے سے ہے جو بننے کے بعد رنگا گیا ہو تو اس کا پہننا بھی درست ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ حنفی یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء (حنفیہ) کے نزدیک عدت والی عورت کو عصب کا پہننا بھی درست نہیں ہے حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک عدت والی عورت کو عصب پہننا جائز ہے خواہ وہ موٹا ہو یا مہین ہو جب کہ حضرت امام مالکؒ مہین عصب کو پہننے سے منع کرتے ہیں موٹے عصب کو منع نہیں کرتے۔

سرمہ لگانے کے سلسلہ میں آئمہ کے جو اختلافی اقوال ہیں وہ پیچھے حضرت ام سلمہؓ کی روایت کے ضمن میں بیان کئے جا چکے ہیں، علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ (حنفی مسلک کے مطابق) عدت والی عورت کو مجبوری کی حالت میں سرمہ لگانا جائز ہے ویسے جائز نہیں ہے۔

"قسط اور اظفار" یہ دونوں ایک قسم کی خوشبو ہیں "قسط" تو عود کو کہتے ہیں جس کی عام طور پر عورتیں یا بچے دھونی لیتے ہیں کرمانیؒ نے کہا ہے کہ "قسط" عود ہندی کو کہتے ہیں جسے اگر یا کوٹ کہا جاتا ہے۔

"اظفار" ایک قسم کا عطر ہوتا تھا یہ دونوں خوشبوئیں اس زمانہ میں عام طور پر عرب کی عورتیں حیض سے پاک ہوتے وقت بدبو دور کرنے کے لئے شرمگاہ میں استعمال کیا کرتی تھیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے عدت والی عورت کو خوشبو استعمال کرنے سے منع فرمایا لیکن حائضہ کو حیض سے پاک ہوتے وقت بدبو دور کرنے کے لئے ان دونوں خوشبوؤں کے استعمال کی اجازت دیدی۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس عورت کا خاوند مر گیا ہو اس پر عدت کے زمانہ میں سوگ کرنا واجب ہے۔ چنانچہ اس پر تمام علماء کا اجماع و اتفاق ہے البتہ سوگ کی تفصیل میں اختلافی اقوال ہیں۔

حضرت امام شافعیؒ اور جمہور علماء تو یہ کہتے ہیں کہ خاوند کی وفات کے بعد ہر عدت والی عورت پر سوگ کرنا واجب ہے۔ خواہ وہ مدخول بہا ہو (یعنی جس کے ساتھ جماع ہو چکا ہو) یا غیر مدخول بہا ہو (یعنی جس کے ساتھ جماع نہ ہوا ہو) خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، خواہ باکرہ ہو یا

ثیبہ، خواہ آزاد ہو یا لونڈی اور خواہ مسلمہ ہو یا کافرہ۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک سات قسم کی عورتوں پر سوگ واجب نہیں ہے جس کی تفصیل در مختار کے مطابق یہ ہے ① کافرہ ② مجنونہ ③ صغیرہ ④ معتدہ عتق یعنی وہ اُمّ ولد جو اپنے مولیٰ کی طرف سے آزاد کئے جانے یا اپنے مولیٰ کے مرجانے کی وجہ سے عدت میں بیٹھی ہو۔ ⑤ وہ عورت جو نکاح فاسد کی عدت میں بیٹھی ہو۔ ⑥ وہ عورت جو وطی بالشبہ کی عدت میں بیٹھی ہو یعنی جس سے کسی غیر مرد نے غلط فہمی میں جماع کر لیا ہو اور اس کی وجہ سے عدت میں بیٹھی ہو۔ ⑦ وہ عورت جو طلاق رجعی کی عدت میں بیٹھی ہو۔

جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ خاوند کے علاوہ کسی کے مرنے پر عورت کو تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے اور تین دن تک بھی صرف مباح ہے واجب نہیں ہے چنانچہ اگر تین دنوں میں بھی خاوند سوگ کرنے سے منع کرے تو اس کو اس کا حق ہے کیونکہ بیوی کے بناؤ سنگار کا تعلق خاوند کے حق سے ہے اگر تین دنوں میں خاوند کی خواہش یہ ہو کہ وہ سوگ ترک کر کے بناؤ سنگار کرے اور بیوی، خاوند کا کہنا نہ مانے تو اس بات پر بیوی کو مارنا خاوند کے لئے جائز ہے کیونکہ سوگ کرنے میں خاوند کا حق فوت ہو جاتا ہے۔

سوگ کے احکام و مسائل: جس عورت کو طلاق رجعی ملی ہو اس کی عدت تو فقط اتنی ہی ہے کہ وہ مقررہ مدت تک گھر سے باہر نہ نکلے اور نہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے، اس کے لئے بناؤ سنگار وغیرہ درست ہے اور جس عورت کو جو مکلفہ و مسلمہ (یعنی بالغ و عاقل اور مسلمان) ہو تین طلاقیں مل گئیں یا ایک طلاق بائن یا اور کسی طرح سے نکاح ٹوٹ گیا یا خاوند مر گیا تو ان سب صورتوں میں اس کے لئے یہ حکم ہے کہ جب تک عدت میں رہے تب تک نہ تو گھر سے باہر نکلے نہ اپنا دوسرا نکاح کرے اور نہ بناؤ سنگار کرے یہ سب باتیں اس پر حرام ہیں۔ اس سنگار نہ کرنے اور میلے کچیلے رہنے کو سوگ کہتے ہیں۔

جب تک عدت ختم نہ ہو تب تک خوشبو لگانا، کپڑے بسانا زیور گہنا پہننا، پھول پہننا، سرمہ لگانا، پان کھا کر منہ لال کرنا، مسی ملنا، سر میں تیل ڈالنا، کنگھی کرنا، مہندی لگانا، اچھے کپڑے پہننا، ریشمی اور رنگے ہوئے بہار دار کپڑے پہننا یہ سب باتیں ممنوع ہیں۔ ہاں مجبوری کی حالت میں اگر ان میں سے کوئی چیز اختیار کی گئی تو کوئی مضائقہ نہیں مثلاً سر میں درد ہونے کی وجہ سے تیل ڈالنے کی ضرورت پڑے تو بغیر خوشبو کا تیل ڈالنا درست ہے۔ اسی طرح دوا کے لئے سرمہ لگانا بھی ضرورت کے وقت درست ہے۔

جس عورت کا نکاح صحیح نہیں ہوا تھا بلکہ بے قاعدہ ہو گیا تھا اور وہ فسخ کرا دیا گیا یا خاوند مر گیا تو ایسی عورت پر سوگ کرنا واجب نہیں ہے۔ اسی طرح جو عورت عتق (یعنی آزادی) کی عدت میں ہو جیسے اُمّ ولد کو اس کا مولیٰ آزاد کر دے اور وہ اس کی وجہ سے عدت میں بیٹھی ہو، تو اس پر بھی سوگ کرنا واجب نہیں ہے۔

جو عورت عدت میں بیٹھی ہو اس کے پاس نکاح کا پیغام بھیجنا جائز نہیں ہے ہاں نکاح کا کنایہ یعنی یہ کہنا کہ میں اس عورت سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتا ہوں، یا اس سے نکاح کرنے کا میں ارادہ رکھتا ہوں، جائز ہے، مگر یہ بھی اس صورت میں جائز ہے جب کہ وہ عورت وفات کی عدت میں بیٹھی ہو اگر طلاق کی عدت میں بیٹھی ہو تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔

جو عورت طلاق کی عدت میں بیٹھی ہو اس کو تو کسی بھی وقت گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے ہاں جو عورت وفات کی عدت میں بیٹھی ہو وہ دن میں نکل سکتی ہے اور کچھ رات تک نکل سکتی ہے مگر رات اپنے گھر سے علاوہ دوسری جگہ بسر نہ کرے لونڈی اپنے آقا کے کام سے گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔

معتدہ (عدت والی عورت) کو اپنی عدت کے دن اسی مکان میں گزارنے چاہئیں جس میں وہ فسخ و طلاق یا خاوند کی موت کے وقت سکونت پذیر ہو، ہاں اگر اس مکان سے زبردستی نکالا جائے اس مکان میں اپنے مال و اسباب کے ضائع ہو جانے کا خوف ہو یا اس مکان کے گر پڑنے کا خطرہ ہو اور یا اس مکان کا کرایہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو ان صورتوں میں کسی دوسرے مکان میں عدت بیٹھنا جائز ہے۔

اسی طرح اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ میاں بیوی ایک ہی مکان میں رہیں اگرچہ وہ طلاق بائن کی عدت میں بیٹھی ہو بشرطیکہ دونوں

کے درمیان پردہ حائل رہے ہاں اگر خاوند فاسق اور ناقابل اعتماد ہو یا مکان تنگ ہو تو عورت اس گھر سے منتقل ہو جائے اگرچہ خاوند کا منتقل ہونا اولیٰ ہے اور اگر میاں بیوی کے ایک ہی مکان میں رہنے کی صورت میں وہ دونوں اپنے ساتھ کسی ایسی معتمد عورت کو رکھ لیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے پر قادر ہو تو بہت ہی اچھا ہے۔

اگر مرد، عورت کو اپنے ساتھ سفر میں لے گیا اور پھر سفر کے دوران اس کو طلاق بائن یا تین طلاقیں دیدیں یا مرد مر گیا اور عورت کا شہر یعنی اس کا وطن اس جگہ سے کہ جہاں طلاق یا وفات واقع ہوئی ہے سفر شرعی (یعنی تین دن کے سفر) سے کم مسافت پر واقع ہو تو وہ اپنے شہر واپس آجائے اور اگر اس مقام سے جہاں طلاق یا وفات واقع ہوئی ہے اس کا شہر سفر شرعی (یعنی تین دن کی مسافت) کے بقدر یا اس سے زائد فاصلہ پر واقع ہے اور وہ منزل مقصود (جہاں کے لئے سفر اختیار کیا تھا) اس مسافت سے کم فاصلہ پر واقع ہے تو اپنے شہر واپس آنے کی بجائے منزل مقصود چلی جائے اور ان دونوں صورتوں میں خواہ اس کا ولی اس کے ساتھ ہو یا ساتھ نہ ہو لیکن بہتر یہ ہے کہ وہ عورت طلاق یا وفات کے وقت کسی شہر میں ہو تو وہاں سے عدت گزارے بغیر نہ نکلے اور نکلے تو کسی محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے لیکن صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کا کوئی محرم اس کے ساتھ ہو تو پھر عدت سے پہلے بھی اس شہر سے نکل سکتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

معتدہ کو بلا ضرورت ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہونا جائز نہیں

⑨ وَعَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ كَعْبٍ اَنَّ الْفُرَيْعَةَ بِنْتَ مَالِكِ بْنِ سِنَانٍ وَهِيَ اُخْتُ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ اَخْبَرَتْهَا اَنَّهَا جَاءَتْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسْأَلُهُ اَنْ تَرْجِعَ اِلٰى اَهْلِهَا فِيْ بَنِيْ خُدْرَةَ فَاِنَّ زَوْجَهَا خَرَجَ فِيْ طَلَبِ اَعْبُدٍ لَهُ اَبَقُوْا فَقَتَلُوْهُ قَالَتْ فَسَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَرْجِعَ اِلٰى اَهْلِيْ فَاِنَّ زَوْجِيْ لَمْ يَتْرُكْنِيْ فِيْ مَنْزِلٍ يَمْلِكُهُ وَلَا نَفَقَةٍ فَقَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ فَانْصَرَفْتُ حَتّٰى اِذَا كُنْتُ فِي الْحُجْرَةِ اَوْ فِي الْمَسْجِدِ دَعَانِيْ فَقَالَ اُمْكُثِيْ فِيْ بَيْتِكِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ اَجَلَهُ قَالَتْ فَاعْتَدَدْتُ فِيْهِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَعَشْرًا۔

(رواہ مالک والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"حضرت زینب بنت کعبؓ فرماتی ہیں کہ فریعہ بنت مالک بن سنان نے جو حضرت ابو سعید خدریؓ کی بہن ہیں، مجھے بتایا کہ وہ (فریعہ) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں یہ پوچھنے حاضر ہوئیں کہ کیا وہ (اپنی عدت گزارنے کے لئے) اپنے میکہ بنی خدرہ میں منتقل ہو سکتی ہیں کیونکہ ان کے شوہر اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کی تلاش میں گئے تھے کہ ان غلاموں نے انہیں مار ڈالا چنانچہ فریعہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے میکے میں آجاؤں کیونکہ میرے شوہر نے مجھے جس مکان میں چھوڑا ہے وہ اس کے مالک نہیں تھے (یعنی میں جس مکان میں رہتی ہوں وہ ان کی ملکیت میں نہیں تھا) اور نہ ہی میرے پاس کھانے پینے کے خرچ کا کوئی انتظام ہے۔ فریعہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "بہتر ہے کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ۔ چنانچہ میں (یہ اجازت حاصل کر کے) واپس ہوئی اور جب حجرۂ مبارکہ کے صحن میں یا مسجد نبوی میں پہنچی تو آپ ﷺ نے مجھے پھر بلایا اور فرمایا "تم اپنے اسی گھر میں عدت میں بیٹھو (جس میں تمہارے شوہر کے مرنے کی خبر آئی ہے اگرچہ وہ تمہارے شوہر کی ملکیت میں نہیں ہے) تا آنکہ کتاب (یعنی عدت) اپنی مدت تک پہنچ جائے" فریعہ کہتی ہیں کہ میں (آنحضرت ﷺ کے اس حکم کے مطابق) چار مہینہ دس دن تک اسی مکان میں عدت میں بیٹھی رہی۔"

(مالکؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معتدہ (یعنی عدت میں بیٹھی ہ[illegible]رت) کو بلا ضرورت ایک مکان سے دوسرے مکان میں اٹھ آنا

درست نہیں ہے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ جو عورت اپنے خاوند کے مرجانے کی وجہ سے عدت میں بیٹھی ہو، اس کے لئے سکنی (یعنی شوہر ہی کے مکان میں عدت گزارنا) ضروری ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت امام شافعیؒ کے دو قول ہیں جس میں زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اس کے لئے سکنی ضروری ہے، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ بھی اسی کے قائل تھے۔ ان کی طرف سے یہی حدیث بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے تو فریعہؓ کو مکان منتقل کرنے کی اجازت دیدی مگر پھر آپ ﷺ نے ان کو منتقل ہونے سے منع کردیا اور یہ حکم دیا کہ وہ اپنے شوہر کے اسی مکان میں عدت کے دن گزاریں، اس سے ثابت ہوا کہ فریعہؓ کو پہلے آپ ﷺ کا اجازت دینا آپ ﷺ کے اس امکثی فی بیتک الخ (تم اپنے اسی گھر میں عدت میں بیٹھو) کے ذریعہ منسوخ ہوگیا۔

حضرت امام شافعیؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ معتدہ وفات کے لئے سکنی ضروری نہیں ہے بلکہ وہ جہاں چاہے عدت میں بیٹھ جائے اور یہی قول حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کا بھی تھا اس قول کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فریعہؓ کو مکان میں منتقل ہونے کی اجازت عطا فرمادی تھی۔ اور پھر بعد میں آپ ﷺ نے ان کو اپنے ہی مکان میں عدت گزارنے کا جو حکم فرمایا وہ استحباب کے طور پر تھا، اس مسئلہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا جو مسلک ہے۔ وہ انشاء اللہ باب النفقات کے ابتداء میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

عدت کے دنوں میں بناؤ سنگار کی کوئی بھی چیز استعمال نہ کی جائے

(۱۰) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ تُوُفِّیَ اَبُوْسَلَمَةَ وَقَدْ جَعَلْتُ عَلَیَّ صَبِرًا فَقَالَ مَا ھٰذَا یَا اُمَّ سَلَمَةَ قُلْتُ اِنَّمَا ھُوَ صَبِرٌ لَیْسَ فِیْہِ طِیْبٌ فَقَالَ اِنَّہٗ یَشُبُّ الْوَجْہَ فَلَا تَجْعَلِیْہِ اِلَّا بِاللَّیْلِ وَتَنْزِعِیْہِ بِالنَّھَارِ وَلَا تَمْتَشِطِیْ بِالطِّیْبِ وَلَا بِالْحِنَاءِ فَاِنَّہٗ خِضَابٌ قُلْتُ بِاَیِّ شَیْءٍ اَمْتَشِطُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ بِالسِّدْرِ تُغَلِّفِیْنَ بِہٖ رَاْسَکِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت اُمِّ سلمہؓ (جو آنحضرت ﷺ کی زوجۂ مطہرہ ہیں) روایت کرتی ہیں کہ جب (میرے پہلے شوہر) ابوسلمہؓ کا انتقال ہوا (اور میں عدت میں بیٹھی ہوئی تھی) تو (ایک دن) رسول کریم ﷺ میرے گھر تشریف لائے، اس وقت میں نے اپنے منہ پر ایلوا لگا رکھا تھا، آپ ﷺ نے یہ (دیکھ کر) فرمایا کہ اُمِّ سلمہ! یہ کیا ہے؟ (یعنی تم نے عدت کے دنوں میں منہ پر یہ کیا لگا رکھا ہے؟) میں نے عرض کیا کہ "یہ تو ایلوا ہے جس میں کسی قسم کی کوئی خوشبو نہیں ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "مگر ایلوا چہرے کو جوان بنا دیتا ہے (یعنی ایلوا لگانے سے چہرہ چمکدار ہو جاتا ہے اور اس کا رنگ نکھر جاتا ہے) لہٰذا تم اس کو نہ لگاؤ ہاں اگر (کسی وجہ سے لگانا ضروری ہی ہو تو) رات میں لگالو اور دن میں صاف کر ڈالو (کیونکہ رات میں استعمال کرنے سے بناؤ سنگار کا گمان بھی ہوگا) اسی طرح خوشبودار کنگھی بھی نہ کرو اور نہ مہندی کے ساتھ کنگھی کرو کیونکہ مہندی (سرخ) رنگ لئے ہوتی ہے اور (اس میں خوشبو ہوتی ہے جب کہ یہ سوگ کی حالت میں ممنوع ہے) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر میں کس چیز کے ساتھ کنگھی کروں؟ (یعنی اپنے بالوں کو کس چیز سے صاف کروں) آپ ﷺ نے فرمایا بیری کے پتوں کے ساتھ کنگھی کرو اور ان پتوں سے اپنے سر کو غلاف کی طرح ڈھانپ لو (یعنی بیری کے پتے اپنے سر پر اتنی مقدار میں ڈالو کہ وہ تمہارے سر کو غلاف کی طرح ڈھانپ لیں۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: خوشبودار تیل کے بارہ میں تو علماء کا اتفاق و اجماع ہے کہ عدت والی عورت اس کا استعمال نہ کرے البتہ بغیر خوشبو کے تیل مثلاً روغن زیتون و تل کے بارہ میں اختلافی اقوال ہیں چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ تو بغیر خوشبو کا تیل لگانے سے بھی منع

کرتے ہیں البتہ ضرورت و مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دیتے ہیں اور حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ، اور علماء ظواہر نے عدت والی عورت کے لئے ایسے تیل کے استعمال کو جائز رکھا ہے جس میں خوشبو نہ ہو۔

(۱۱) وَعَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُتَوَفّٰى عَنْهَا زَوْجُهَا لَا تَلْبَسُ الْمُعَصْفَرَ مِنَ الثِّيَابِ وَلَا الْمُمَشَّقَةَ وَلَا الْحُلِيَّ وَلَا تَخْتَضِبُ وَلَا تَكْتَحِلُ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس عورت کا خاوند مرجائے وہ نہ کسم میں رنگا ہوا کپڑا پہنے نہ گیرو میں رنگا ہوا کپڑا پہنے، نہ زیور پہنے، نہ ہاتھ پاؤں اور بالوں پر مہندی لگائے اور نہ سرمہ لگائے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اگر سیاہ اور خاکستری رنگ کے کپڑے پہنے تو کوئی مضائقہ نہیں اسی طرح کسم میں زیادہ دنوں کا رنگا ہوا کپڑا کہ جس سے خوشبو نہ آتی ہو، پہننا بھی درست ہے، ہدایہ میں لکھا ہے کہ مذکورہ بالا عورت کو کسی عذر مثلاً کھجلی یا جوئیں یا کسی بیماری کی وجہ سے ریشمی کپڑا پہننا بھی جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مطلقہ کی عدت کے بارہ میں ایک بحث

(۱۲) عَنْ سُلَيْمَانَ ابْنِ يَسَارٍ اَنَّ الْاَحْوَصَ هَلَكَ بِالشَّامِ حِيْنَ دَخَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي الدَّمِ مِنَ الْحَيْضَةِ الثَّالِثَةِ وَقَدْ كَانَ طَلَّقَهَا فَكَتَبَ مُعَاوِيَةُ بْنُ اَبِيْ سُفْيَانَ اِلٰى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ يَسْأَلُهُ عَنْ ذٰلِكَ فَكَتَبَ اِلَيْهِ زَيْدٌ اَنَّهَا اِذَا دَخَلَتْ فِي الدَّمِ مِنَ الْحَيْضَةِ الثَّالِثَةِ فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ وَبَرِئَ مِنْهَا لَا يَرِثُهَا وَلَا تَرِثُهُ۔ (رواہ مالک)

"حضرت سلیمان ابن یسارؒ کہتے ہیں کہ احوصؒ نے ملک شام میں اس وقت وفات پائی جب کہ ان کی بیوی کا تیسرا حیض شروع ہوچکا تھا اور احوصؒ نے (اپنے مرنے سے پہلے) ان کو طلاق دیدی تھی چنانچہ حضرت معاویہ ابن ابوسفیانؓ نے اس مسئلہ کو دریافت کرنے کے لئے حضرت زید ابن ثابتؓ کو خط لکھا، حضرت زیدؓ نے حضرت معاویہؓ کو جواب میں لکھا کہ "جب اس عورت کا تیسرا حیض شروع ہوگیا تو وہ احوصؒ سے الگ ہوگئی اور احوصؒ اس سے الگ ہوگئے نہ تو احوصؒ اس کے وارث ہوئے اور نہ وہ احوصؒ کی وارث ہوئی۔" (مالکؒ)

تشریح: صورت مسئلہ یہ تھی کہ حضرت احوصؒ نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور وہ تین حیض آنے تک کے لئے عدت میں بیٹھ گئیں جیسا کہ طلاق کی عدت کا حکم ہے پھر ابھی ان کی عدت پوری نہیں ہوئی تھی (اور تیسرا حیض شروع ہوا تھا کہ احوص کا انتقال ہوگیا اس صورت میں انہیں چار مہینے دس دن تک وفات کی عدت میں بیٹھنا چاہئے تھا چنانچہ حضرت معاویہؓ نے حضرت زید ابن ثابتؓ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ اس صورت میں عورت، خاوند کی وارث ہوگی یا نہیں؟ حضرت زیدؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا کہ جب تیسرا حیض شروع ہوگیا ہے تو محض تیسرے حیض کا خون دیکھتے ہی اس کا تعلق منقطع ہوگیا۔ اور زوجیت کی پابندی سے آزاد ہوگئی کیونکہ اس صورت میں طلاق کی عدت یا تو اس اعتبار سے کہ اس کی عدت کا زیادہ حصہ گزر گیا ہے یا اس اعتبار سے کہ تیسرا حیض شروع ہوگیا۔ پوری ہوگئی ہے اس صورت میں وفات کی عدت ساقط ہوگئی لہٰذا جس طرح طلاق کی عدت پوری ہوجانے پر اگر مرد زندہ ہوتا تو وہ عورت کا وارث نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی طرح اب مذکورہ مسئلہ میں جب کہ مرد مرگیا ہو تو عورت اس کی وارث نہیں ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہؓ کا مقصد صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ عورت احوصؒ کی وارث ہوگی یا نہیں؟ جب کہ یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت معاویہؓ کا مقصد عدت کے بارہ میں معلوم کرنا تھا کہ آیا یہ عورت اپنی طلاق کی عدت جاری رکھے یعنی تیسرا حیض جو شروع ہوچکا ہے اس سے پاک ہوکر عدت سے نکل آئے یا اب وفات کی عدت بیٹھ جائے۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر طیبیؒ (شافعی) نے لکھا ہے کہ اس سے صریحاً یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مطلقہ عورت کی عدت کے بارہ میں جو یہ حکم دیا ہے کہ:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔ (البقرہ۲:۲۲۸)

"اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو روکے رکھیں تین حیض ختم ہونے تک۔"

تو اس میں قروء سے مراد طہر ہیں (گویا طیبیؒ کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ یہ حدیث شوافع کی دلیل ہے کیونکہ ان کے نزدیک مطلقہ کی عدت تین حیض نہیں بلکہ تین طہر ہیں) حالانکہ (طیبیؒ کی یہ بات کہ اس حدیث سے شوافع کا مسلک ثابت ہوتا ہے کوئی مضبوط بات نہیں ہے کیونکہ) اول تو یہ ایک صحابیؓ (حضرت زید بن ثابت) کا مسلک ہے دوسرے یہ کہ خود انہی (حضرت زیدؓ) سے اس امر کے برخلاف بھی منقول ہے (چنانچہ ان سے یہ منقول ہے کہ عدۃ الامۃ حیضتان یعنی لونڈی کی عدت دو حیض ہیں پھر اس کے علاوہ یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت زید کے قول پر عمل بھی کیا تھا یا نہیں۔

حنفیہ کے نزدیک ثلثۃ قروء سے مراد "تین حیض" ہیں چنانچہ خلفاء راشدین اور اکثر صحابہ کا بھی یہ قول ہے نیز تیرہ صحابیوں سے منقول ہے کہ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ بیوی (طلاق کی عدت میں) جب تک تیسرے حیض سے پاک نہ ہو جائے، مرد (یعنی خاوند کہ جس نے اس کو طلاق دی ہے) اس کا زیادہ حق رکھتا ہے (مطلب یہ کہ تیسرے حیض سے پاک ہونے کے بعد ہی عدت کی مدت پوری ہوتی ہے اور اس بیوی سے مرد کا مکمل انقطاع ہو جاتا ہے) اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ "قروء" سے "حیض" مراد ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے اپنی کتاب میں اس موقع پر تفصیلی بحث کی ہے اور حنفیہ کے بہت سے دلائل لکھے ہیں۔

مطلقہ کی عدت کا ایک مسئلہ

⑬ وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَيُّمَا امْرَاَةٍ طُلِّقَتْ فَحَاضَتْ حَيْضَةً اَوْ حَيْضَتَيْنِ ثُمَّ رُفِعَتْهَا حَيْضَتُهَا فَاِنَّهَا تَنْتَظِرُ تِسْعَةَ اَشْهُرٍ فَاِنْ بَانَ بِهَا حَمْلٌ فَذٰلِكَ وَاِلَّا اعْتَدَّتْ بَعْدَ التِّسْعَةِ الْاَشْهُرِ ثُمَّ حَلَّتْ۔ (رواہ مالک)

"اور سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا "جس عورت کو طلاق دی گئی ہو اور اس کو ایک یا دو بار حیض آ کر پھر موقوف ہو گیا ہو تو وہ نو مہینے تک انتظار کرے اگر (اس عرصہ میں) حمل ظاہر ہو جائے تو اس کا حکم ظاہر ہے کہ جب ولادت ہوگی تو عدت پوری ہوگی اور حمل ظاہر نہ ہو تو پھر نو مہینے کے بعد تین مہینہ تک عدت کے دن گزارے اور اس کے بعد حلال ہو (یعنی عدت سے نکل آئے)۔" (مالکؒ)

بَابُ الْاِسْتِبْرَاءِ

استبراء کا بیان

شریعت میں "استبراء" کا مطلب ہے لونڈی کے رحم کی حمل سے پاکی (صفائی) طلب کرنا اس کی فقہی تفصیل یہ ہے کہ جب کسی شخص کی ملکیت میں کوئی لونڈی آئے خواہ اس نے اس کو خریدا ہو یا کسی وصیت میں ملی ہو، یا کسی نے ہبہ کی ہو اور یا میراث میں ملی ہو تو اس شخص کو اس لونڈی سے اس وقت تک جماع کرنا یا مساس کرنا اور یا بوسہ لینا وغیرہ حرام ہے جب تک کہ استبراء نہ کر لے یعنی اس کے قبضہ میں آنے کے بعد ایک حیض نہ آ جائے اگر اس کو حیض آتا ہو، یا نہ آنے کی صورت میں اس پر ایک مہینہ کی مدت نہ گزر جائے اور یا حاملہ ہونے کی صورت میں ولادت نہ ہو جائے اور یہ استبراء ہر حال میں کرنا ضروری ہے خواہ وہ باکرہ ہی کیوں نہ ہو یا اس کو کسی عورت نے

کیوں نہ خریدا ہو یا وہ کسی محرم یا اپنے نابالغ بچہ کے مال سے بذریعہ وراثت وغیرہ کیوں نہ حاصل ہوئی ہو اگرچہ ان صورتوں میں قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ استبراء واجب نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ "استبراء" میں حکمت یہ ہے کہ اس طریقہ سے اس کے رحم کا کسی غیر کے نطفہ سے پاک ہونا معلوم ہو جائے تا کہ اس کے نطفہ کا کسی غیر کے نطفہ کے ساتھ اختلاط نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں کسی غیر کے نطفہ کا کوئی احتمال نہیں ہے لیکن چونکہ یہ صریح نص ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اوطاس کے غزوہ کے موقع پر حاصل ہونے والی لونڈیوں کے بارہ میں فرمایا کہ "خبردار! حاملہ لونڈی سے اس وقت تک صحبت نہ کی جائے جب کہ اس کے ولادت نہ ہو جائے اور غیر حاملہ سے اس وقت تک صحبت نہ کی جائے جب تک کہ اس کو ایک حیض نہ آجائے" اور ظاہر ہے کہ ان لونڈیوں میں باکرہ بھی ہوں گی اور ایسی لونڈیاں بھی ہوں گی جو باکرہ کی طرح نطفہ کے اختلاط کا احتمال نہیں رکھتی ہوں گی، اس لئے قیاس کو نظر انداز کر کے ان صورتوں میں بھی استبراء کو واجب قرار دیا گیا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

استبراء کے بغیر لونڈی سے جماع کرنے والا لعنت کا مستحق ہے

① عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِامْرَأَةٍ مُجِحٍّ فَسَأَلَ عَنْهَا فَقَالُوْا اَمَةٌ لِفُلَانٍ قَالَ اَيُلِمُّ بِهَا قَالُوْا نَعَمْ قَالَ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اَلْعَنَهٗ لَعْنًا يَدْخُلُ مَعَهٗ فِيْ قَبْرِهٖ كَيْفَ يَسْتَخْدِمُهٗ وَهُوَ لَا يَحِلُّ لَهٗ اَمْ كَيْفَ يُوَرِّثُهٗ وَهُوَ لَا يَحِلُّ لَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ ایک عورت کے قریب سے گزرے جس کے جلد ہی ولادت ہونے والی تھی، آپ ﷺ نے اس کے بارہ میں دریافت فرمایا (کہ یہ کوئی آزاد عورت ہے یا لونڈی ہے؟) صحابہؓ نے عرض کیا کہ "فلاں شخص کی لونڈی ہے" آپ ﷺ نے پوچھا "کیا وہ شخص اس سے صحبت کرتا ہے"؟ صحابہؓ نے عرض کیا "ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا "میں نے ارادہ کیا کہ اس شخص پر ایسی لعنت کروں جو اس کے ساتھ قبر میں بھی جائے (یعنی ایسی لعنت جو ہمیشہ رہے بایں طور کہ اس کا اثر اس کے مرنے کے بعد باقی رہے وہ کس طرح اپنے بیٹے سے خدمت کو کہے گا جب کہ بیٹے سے خدمت کے لئے کہنا یا اس کو غلام بنانا حلال نہیں ہے، یا اس کو کس طرح اپنا وارث قرار دے گا جب کہ غیر کے بیٹے کو اپنا وارث بنانا حلال نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اس شخص پر لعنت کا ارادہ اس لئے فرمایا کہ جب اس نے ایک لونڈی سے جماع کیا جو حالت حمل میں اس کی ملکیت میں آئی تو اس استبراء کو ترک کیا حالانکہ وہ فرض ہے۔ "وہ کس طرح اپنے بیٹے سے خدمت کو کہے گا الخ" آپ ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ ترک استبراء پر لعنت کے سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس کا حاصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی لونڈی سے بغیر استبراء کے صحبت کرے گا اور پھر اس سے بچہ پیدا ہو گا تو اس بچہ کے بارہ میں یا یہ احتمال ہو گا کہ وہ اس شخص کے نطفہ سے جس کی ملکیت سے نکل کر یہ لونڈی، بغیر استبراء کے صحبت کرنے والے کی ملکیت میں آئی ہے تو اس صورت میں اگر وہ شخص کہ جس نے بغیر استبراء کے اس لونڈی سے جماع کیا ہے اس بچہ کے نسب کا اقرار کرے گا یعنی یہ کہے گا کہ یہ بچہ میرا ہے (جب کہ حقیقت میں وہ اس کے نطفہ سے نہیں ہے) تو وہ بچہ اس شخص کا وارث ہو گا لہٰذا اس طرح ایک دوسرے شخص کے بچہ کو اپنا وارث بنانا لازم آئے گا جو حرام ہے اور اس پر وہ لعنت کا مستحق ہو گا یا پھر یہ صورت ہو گی کہ وہ اس بچہ کے نسب سے انکار کر دے گا (جب کہ اس احتمال کے مطابق حقیقت میں وہ بچہ اس کا بیٹا ہو گا) لہٰذا اس طرح اپنے ہی بیٹے سے غلامی کرانا اور اپنا نسب منقطع کرنا لازم آئے گا اور یہ بھی لعنت کو مستحق کرنے والی صورت ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ تحقیق حال کے لئے استبراء نہایت ضروری ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بغیر استبراء لونڈی سے صحبت کرنے کی ممانعت

④ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَفَعَهٗ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ سَبَایَا اَوْطَاسٍ لَا تُوْطَأُ حَامِلٌ حَتّٰی تَضَعَ وَلَا غَیْرُ ذَاتِ حَمْلٍ حَتّٰی تَحِیْضَ حَیْضَةً۔ (رواہ احمد وابوداؤد والداری)

"حضرت ابوسعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے بطریق مرفوع نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے غزوہ اوطاس میں گرفتار ہونے والی لونڈیوں کے بارہ میں فرمایا کہ کسی حاملہ عورت سے اس وقت تک صحبت نہ کی جائے جب تک کہ اس کے ولادت نہ ہو جائے اور غیر حاملہ سے بھی اس وقت تک صحبت نہ کی جائے جب تک کہ اس کو ایک حیض نہ آجائے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: اگر کسی غیر حاملہ کو اس کی کم عمری کی وجہ سے یا زیادہ عمر ہو جانے کے سبب سے حیض نہ آتا ہو تو اس کا استبراء یہ ہے کہ ایک مہینہ کی مدت تک اس کے پاس جانے سے اجتناب کرے جب ایک مہینہ گزر جائے تب اس سے جماع کرے اس صورت کو اس حدیث میں اس لئے ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ یہ قلیل الوجود اور نادر ہے۔

لونڈی حیض کی حالت میں کسی کی ملکیت میں آئے تو استبراء میں اس حیض کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ دوسرے پورے حیض کا اعتبار کیا جائے گا۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ لونڈی کے لئے نئی ملکیت کا پیدا ہو جانا استبراء کو واجب کرتا ہے چنانچہ چاروں آئمہؒ کا یہی مسلک ہے نیز یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ دارالحرب سے کسی کافرہ کو بطور لونڈی کے پکڑ لانے سے اس کا پہلا نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ (یعنی کفار سے جنگ وغیرہ کی صورت میں ان کی جو شادی شدہ عورتیں بطور لونڈی ہاتھ لگیں ان کے شوہروں سے ان کی زوجیت کا تعلق ختم ہو جائے گا) لیکن اس بارہ میں حدیث کا ظاہر مفہوم مطلق ہے خواہ ان کے خاوند بھی ان کے ساتھ نہ ہوں چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کا مسلک یہی ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر میاں بیوی دونوں ایک ساتھ پکڑ کر لائے جائیں تو اس صورت میں ان کا نکاح باقی رہتا ہے۔

③ وَعَنْ رُوَیْفِعِ بْنِ ثَابِتِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَوْمَ حُنَیْنٍ لَا یَحِلُّ لِامْرِءٍ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یَسْقِیَ مَاءَهٗ زَرْعَ غَیْرِهٖ یَعْنِیْ اِتْیَانَ الْحُبَالٰی وَلَا یَحِلُّ لِامْرِءٍ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یَقَعَ عَلَی امْرَاَةٍ مِنَ السَّبْیِ حَتّٰی یَسْتَبْرِءَهَا وَلَا یَحِلُّ لِامْرِءٍ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یَبِیْعَ مَغْنَمًا حَتّٰی یُقْسَمَ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ اِلٰی قَوْلِهٖ زَرْعَ غَیْرِهٖ۔

"اور حضرت رویفع ابن ثابت الانصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے غزوہ حنین کے دن فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کی کھیتی کو اپنے پانی سے سیراب کرے۔ (یعنی اس عورت سے جماع کرنا جو بطور باندی کے ہاتھ لگی ہے اور کسی دوسرے کے نطفہ سے حاملہ ہے، جائز نہیں ہے) اور جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ کفار سے جنگ میں گرفتار شدہ لونڈی سے اس وقت تک جماع کرے جب کہ ایک حیض آنے یا ایک مہینہ گزرنے کا انتظار کر کے) اس کا استبراء نہ کرلے اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے یہ بھی درست نہیں ہے کہ وہ مال غنیمت کو بیچے جب تک وہ تقسیم نہ ہو جائے (یعنی مال غنیمت میں کسی قسم کا تصرف اور خیانت نہ کرے) ابوداؤدؒ، اور امام ترمذیؒ، نے اس روایت کو لفظ زرع تک نقل کیا ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

غیر حائضہ لونڈی کے حق کے استبراء کی مدت

④ عَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِي اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُ بِاسْتِبْرَاءِ الْاِمَاءِ بِحَيْضَةٍ اِنْ كَانَتْ مِمَّنْ تَحِيْضُ وَثَلَاثَةِ اَشْهُرٍ اِنْ كَانَتْ مِمَّنْ لَا تَحِيْضُ وَيَنْهٰى عَنْ سَقْيِ مَاءِ الْغَيْرِ۔

"حضرت امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ ایک حیض کے ذریعہ لونڈیوں کے استبراء کا حکم فرماتے تھے بشرطیکہ ان لونڈیوں کو حیض آتا ہو اور اگر کوئی لونڈی ایسی ہوتی تھی جس کو حیض نہیں آتا تھا تو اس کے لئے تین مہینہ مدت کے ذریعہ استبراء کا حکم دیتے تھے (یعنی آپ ﷺ نے یہ حکم جاری فرمایا تھا کہ جن لونڈیوں کو حیض آتا ہے ان سے ان کے نئے مالک اس وقت تک جماع نہ کریں جب تک تین مہینہ کی مدت نہ گزر جائے) نیز آپ ﷺ نے غیر کو اپنا پانی پلانے سے منع کیا۔"

تشریح: حدیث کے آخری جملہ میں حاملہ لونڈی کے استبراء کا حکم ہے کہ اگر کوئی لونڈی حمل کی حالت میں اپنی ملکیت میں آئے تو اس سے اس وقت تک جماع نہ کیا جائے جب تک کہ وہ ولادت سے فارغ نہ ہو جائے تاکہ اس لونڈی کے رحم میں جو ایک دوسرے شخص کے نطفہ کا حمل ہے اس سے اپنے نطفہ ونسب کا اختلاط نہ ہو۔

غیر حائضہ لونڈی کے بارہ میں جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ جس لونڈی کو حیض نہ آتا ہو اس کا استبراء یہ ہے کہ اس کے ساتھ اس وقت جماع کیا جائے جب کہ اپنی ملکیت میں آنے کے بعد اس پر پورا ایک مہینہ یا اس سے زائد عرصہ گزر جائے اور بعض حضرات نے اس حدیث کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ غیر حائضہ کا استبراء یہ ہے کہ اس سے اس وقت جماع کیا جائے جب کہ اپنی ملکیت میں آنے کے بعد اس پر تین مہینے یا اس سے زائد عرصہ گزر جائے۔

باکرہ لونڈی کے لئے استبراء واجب ہے

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ اِذَا وُهِبَتِ الْوَلِيْدَةُ الَّتِي تُوْطَأُ اَوْ بِيْعَتْ اَوْ اُعْتِقَتْ فَلْتَسْتَبْرِئْ رَحِمَهَا بِحَيْضَةٍ وَلَا تَسْتَبْرِئُ الْعَذْرَاءُ رَوَاهُمَا رَزِيْنٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "جب کوئی ایسی لونڈی جس سے جماع کیا جاتا تھا ہبہ کی جائے، یا فروخت کی جائے یا آزاد کی جائے تو اس کو چاہئے کہ ایک حیض کے ذریعہ اپنے رحم کو پاک (صاف) کرے البتہ باکرہ (کنواری) کو پاک (صاف) کرنے کی ضرورت نہیں ہے" یہ دونوں روایتیں رزینؒ نے نقل کی ہیں۔"

تشریح: اس حدیث پر ابن شریحؒ نے عمل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ باکرہ لونڈی کے لئے استبراء واجب نہیں ہے جب کہ جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اس کے لئے بھی استبراء واجب ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے غزوہ اوطاس میں گرفتار ہونے والی لونڈیوں کے بارہ میں استبراء کا جو حکم دیا تھا وہ عام ہے اس میں باکرہ کا کوئی استثناء نہیں ہے۔

ام ولد کی عدت: صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ جس اُمّ ولد کا آقا مر جائے یا اس کو اس کا آقا آزاد کرے تو اس کی عدت کی مدت تین حیض ہیں اور اگر اس کو حیض نہ آتا ہو تو اس کی مدت تین مہینے ہوگی۔

اور علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ وہ اُمّ ولد نہ تو حاملہ ہو نہ کسی دوسرے شخص کے نکاح میں ہو اور نہ کسی کی عدت میں ہو، چنانچہ اگر وہ حاملہ ہوگی تو پھر اس کی عدت تاوضع حمل ہوگی اور اگر وہ کسی دوسرے شخص کے نکاح میں ہوگی یا کسی کی عدت میں ہوگی تو چونکہ ان صورتوں میں اس (مولیٰ) کے ساتھ اس کے جنسی اختلاط کا کوئی سوال ہی نہیں اس لئے آقا کے آزاد کر دینے کی

وجہ سے یا آقا کے مرجانے کے سبب سے اس پر عدت واجب نہیں ہوگی۔ یہ حنفیہ کا مسلک ہے اور حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ (آقا کی طرف سے آزاد کئے جانے یا آقا کے مرجانے کی صورت میں) اُمّ ولد کی عدت ایک حیض ہے، حنفیہ میں سے حضرت امام محمدؒ کا بھی قول یہی ہے۔

بَابُ النَّفَقَاتِ وَحَقُّ الْمَمْلُوْكِ

نفقات اور لونڈی غلام کے حقوق کا بیان

"نفقات" نفقہ کی جمع ہے اور نفقہ اس چیز کو کہتے ہیں جو خرچ کی جائے جب کہ شرعی اصطلاح میں طعام، لباس اور سکنی (مکان) کو "نفقہ" کہتے ہیں چونکہ "نفقہ" کی کئی نوعیتیں اور قسمیں ہوتی ہیں جیسے بیوی کا نفقہ، اولاد کا نفقہ، والدین کا نفقہ اور عزیز و اقارب کا نفقہ وغیرہ اس لئے نفقہ کی ان انواع کے اعتبار سے عنوان میں "نفقات" یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے نیز یہاں "نفقہ" سے اس کا عام مفہوم مراد ہے خواہ واجب ہو یا غیر واجب ہو۔

"لونڈی غلام کے حقوق" کا مطلب ہے ان کو کھلانا پہنانا اور ان پر ایسے کاموں کا بوجھ نہ ڈالنا جو ان کی طاقت و ہمت سے باہر ہوں۔

بیوی کے نفقہ کے احکام و مسائل: مرد پر اپنی بیوی کا نفقہ یعنی کھانے پینے کا خرچ لباس اور مکان دینا واجب ہے چاہے مرد عمر میں اپنی بیوی سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اور خواہ بیوی مسلمان ہو یا کافرہ ہو، خواہ بالغہ، ہو یا ایسی نابالغہ ہو جس سے جماع نہ کیا جاسکتا ہو لیکن نفقہ واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس بیوی نے اپنے آپ کو شوہر کے گھر میں شوہر کے سپرد کر دیا ہو یا اگر سپرد نہ کیا ہو تو اس کی وجہ یا تو اس کا کوئی حق ہو (کہ جس کو ادا کرنے سے انکار کرتا ہو) یا خود شوہر سپرد کرنے کا مطالبہ نہ کرتا ہو۔

بہتر یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو اپنا ہم پیالہ و ہم نوالہ بنائے، دونوں ایک ساتھ رہیں اور حیثیت کے مطابق جو کچھ میسر ہو اس میں دونوں گزارہ کریں اور جیسا کہ شریف گھرانوں کا قاعدہ ہے شوہر باہر کسب معاش کرے اور بیوی گھر کے انتظامات کی ذمہ دار بنے شوہر جو کچھ کمائے اس کے مطابق جنس و سامان گھر میں مہیا کرے اور بیوی اپنی سلیقہ شعاری کے ذریعہ اس جنس و سامان کو پورے گھر اور متعلقین کی ضرورتوں میں صرف کرے اور اگر کسی وجہ سے شوہر و بیوی کا اس طرح ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنا ممکن نہ ہو اور بیوی قاضی و حاکم کے یہاں یہ درخواست کرے کہ میرے لئے شوہر پر نفقہ مقرر کر دیا جائے تو حاکم و قاضی کی طرف سے بیوی کے لئے ماہانہ نفقہ (کھانے پینے کا خرچ) مقرر کر دیا جائے گا۔ اور وہ مقرر مقدار اس کے سپرد کرائی جائے گی اسی طرح ایک سال میں دو مرتبہ کپڑا دینا مقرر کیا جائے گا اور وہ مقرر کپڑا ہر ششماہی پر اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اگر قاضی و حاکم نے عورت کے لئے ماہانہ نفقہ مقرر کر دیا تو شوہر اس کو ماہانہ ادا کرے گا اور اگر شوہر نے ماہانہ نہ دیا اور عورت نے روزانہ طلب کیا تو شام کے وقت عورت کو مطالبہ کرنے کا اختیار ہوگا۔

نفقہ مقرر کرنے کے سلسلہ میں اس مقدار کا لحاظ رکھا جائے گا جو بیوی کے لئے کافی ہو اور بغیر کسی اسراف و تنگی کے اپنا گزارہ کر سکے۔ رہی معیار کی بات تو اس میں میاں بیوی دونوں کی حالت و حیثیت کا اعتبار ہوگا، اگر وہ دونوں مالی طور پر اچھی حالت و حیثیت کے مالک ہیں تو اچھی ہی حیثیت کا نفقہ بھی واجب ہوگا اور اگر وہ دونوں تنگ دست و مفلس ہوں تو نفقہ بھی اسی کے اعتبار سے واجب ہوگا اور اگر یہ صورت ہو کہ میاں تو خوش حال ہو اور بیوی تنگدست ہو یا میاں تنگدست ہو اور بیوی خوشحال ہو تو پھر درمیانی درجہ کا نفقہ واجب ہوگا یعنی وہ نفقہ دیا جائے گا جو خوشحالی کے درجہ سے کم ہو اور تنگدستی کے درجہ سے زیادہ ہو اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ بہر صورت شوہر ہی کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا وہ جس حالت و حیثیت کا ہوگا اسی کے مطابق نفقہ مقرر کیا جائے گا خواہ بیوی کسی بھی حیثیت و حالت کی مالک ہو۔

اگر شوہر و بیوی کے درمیان خوشحالی و تنگدستی کے بارہ میں اختلاف پیدا ہو یعنی شوہر تو کہے کہ میں تنگدست ہوں اس لئے تنگدستی کا نفقہ دوں گا۔ اور بیوی کہے کہ نہیں، تم خوشحال ہو اس لئے میں خوشحالی کا نفقہ لوں گی اور پھر یہ معاملہ حاکم وقاضی کی عدالت میں پہنچے اور بیوی اپنے دعوی کے گواہ پیش کردے تو ان گواہوں کا اعتبار کر کے بیوی کے لئے خوشحالی کا نفقہ مقرر کیا جائے گا۔ اور اگر بیوی نے گواہ پیش نہ کئے تو پھر شوہر کے قول کا اعتبار کیا جائے گا۔

اگر بیوی کے ساتھ کوئی خادم یا خادمہ بھی ہے اور شوہر خوشحال ہے تو عورت کے نفقہ کے ساتھ اس خادم یا خادمہ کا نفقہ بھی شوہر پر واجب ہوگا اور اگر شوہر تنگدست ہو تو اس خادم یا خادمہ کا نفقہ شوہر پر لازم نہیں ہوگا۔

اگر حاکم وقاضی نے شوہر کی تنگدستی کی وجہ سے اس کی بیوی کے لئے تنگدستی کا نفقہ مقرر کر دیا اور پھر شوہر خوش حال ہو گیا اور بیوی نے خوش حالی کے نفقہ کا دعوی کیا تو اس کے لئے خوش حالی کا نفقہ مقرر کیا جائے گا اور اگر شوہر کی خوش حالی کی وجہ سے بیوی کے لئے خوشحالی کا نفقہ مقرر کیا گیا تھا اور پھر شوہر تنگدست ہو گیا تو اب تنگدستی کا نفقہ مقرر کر دیا جائے گا۔

جو عورت شوہر کی وفات کی عدت میں ہو اس کو نفقہ نہیں ملتا خواہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ ہو اسی طرح جو بیوی نافرمان ہو جائے یعنی شوہر کی اجازت کے بغیر اور بلا کسی وجہ کے شوہر کے گھر سے چلی جائے تو اس کا نفقہ بھی شوہر پر واجب نہیں ہوگا، نیز جو بیوی کسی دین (یعنی قرض وغیرہ) کی عدم ادائیگی کی وجہ سے قید خانہ میں ڈال دی گئی ہو یا اپنے میکہ میں ایسی بیمار ہو کہ شادی کے بعد شوہر کے گھر نہ بھیجی گئی ہو، یا اس کو کوئی غاصب لے کر بھاگ گیا ہو یا وہ اتنی کم عمر ہو کہ اس کے ساتھ جماع نہ کیا جا سکتا ہو اور یا بغیر شوہر کے حج کو چلی گئی ہو تو اس کا نفقہ بھی شوہر پر واجب نہیں ہوگا ہاں جو بیوی، شوہر کے ساتھ حج کو جائے گی اس کا حضر کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا سفر کا خرچ اور سواری کا کرایہ واجب نہیں ہوگا

اگر بیوی اپنے میکہ میں بیمار ہوئی اور نکاح کے بعد بیمار ہی شوہر کے گھر بھیجی گئی تو اس کا نفقہ بھی شوہر پر واجب نہیں ہوگا البتہ جو بیوی اپنے شوہر کے گھر آکر بیمار ہوئی ہے اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا۔

شوہر کو چاہئے کہ بیوی کے رہنے کا ٹھکانہ و مکان، شرعی مقاصد کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق خود مقرر و مہیا کرے اور وہ مکان ایسا ہونا چاہئے جو خود اس کے اہل وعیال اور اس بیوی کے اہل وعیال سے خالی ہو اور اگر خود بیوی ان اہل وعیال کے ساتھ رہنا چاہے تو پھر اس طرح کا مکان بنا دینا واجب نہیں رہے گا۔

اگر شوہر کے گھر میں کئی کمرے ہوں اور ان میں سے ایک کمرہ کہ جس میں کواڑ اور تالہ کنجی وغیرہ ہو، خالی کر کے بیوی کو دیدے تو یہ کافی ہے بیوی کو دوسرے کمرے کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہوگا۔

اگر شوہر چاہے کہ گھر میں بیوی کے پاس اس کے عزیز و اقارب کو (اگرچہ دوسرے شوہر سے اس بیوی کا لڑکا ہی کیوں نہ ہو) آنے سے منع کر دے تو اس کو اس کا حق ہے ہاں اگر بیوی کے وہ عزیز و اقارب اس کے محرم ہوں تو ان کو بیوی کا سامنا کرنے یا اس سے بات چیت کرنے سے روکنے کا حق اس کو نہیں ہے اسی طرح شوہر کو یہ بھی حق نہیں ہے کہ وہ مہینہ میں ایک بار بیوی کو اپنے والدین کے پاس جانے یا والدین کو اس کے پاس آنے سے روک دے (یعنی ہفتہ میں ایک بار سے زائد آنے جانے سے روک سکتا ہے) اور والدین کے علاوہ دوسرے ذی رحم محرم رشتہ داروں کے پاس سال بھر میں ایک مرتبہ بیوی کے جانے یا بیوی کے پاس ان کے آنے پر پابندی عائد کرنے کا حق نہیں ہے (یعنی سال بھر میں ایک بار سے زائد ان کے آنے جانے پر پابندی عائد کر سکتا ہے)۔

جو عورت طلاق کی عدت میں ہو وہ شوہر سے نفقہ اور رہنے کے لئے مکان پانے کی مستحق ہے خواہ طلاق رجعی یا بائن ہو یا مغلظہ ہو اور خواہ عورت حاملہ ہو یا غیر حاملہ ہو، اسی طرح جو عورت ایسی تفریق (جدائی) کی عدت میں ہو جو کسی معصیت کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی شرعی حق کی وجہ سے واقع ہوئی ہو تو اس کا نفقہ و سکنی بھی شوہر کے ذمہ ہوگا، مثلاً کوئی اُمّ ولد یا مدبرہ کسی کے نکاح میں تھی اور پھر خیار عتق کی بناء پر

اس نے شوہر سے جدائی اختیار کرلی، یا کسی نابالغہ کا نکاح اس کے ولی نے کسی شخص کو دیا تھا اور پھر اس نے بالغ ہونے کے بعد خیار بلوغ کی بناء پر اس شوہر سے جدائی اختیار کرلی تو ان صورتوں میں بھی عورت نفقہ اور سکنی پانے کی مستحق ہوگی اور اگر عورت کسی ایسی تفریق (جدائی) کی عدت میں ہو، جو کسی معصیت کی بناء پر واقع ہوئی ہو اس کا نفقہ و سکنی شوہر کے ذمہ نہیں ہوگا، مثلاً عورت (نعوذ باللہ) مرتد ہوگئی یا اس نے اپنے شوہر کے بیٹے سے کوئی ایسا برا فعل کرالیا جس سے شوہر پر حرام ہوگئی جیسے اس سے ہم بستری کرلی یا اس کو شہوت سے چھولیا یا اس کا بوسہ لے لیا اور اس کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان جدائی واقع ہوگئی اور وہ عدت میں بیٹھ گئی تو ان صورتوں میں وہ شوہر سے کھانے پینے کا خرچ اور رہنے کے لئے مکان پانے کی مستحق نہیں ہوگی۔

اگر کسی عورت کو تین طلاقیں دی گئیں اور وہ عدت میں بیٹھ گئی نیز نفقہ و سکنی کی حقدار رہی لیکن پھر زمانۂ عدت میں نعوذ باللہ مرتد ہوگئی تو اس کے نفقہ و سکنی کا حق ساقط ہوجائے گا اور اگر عورت نے اپنے زمانۂ عدت میں شوہر کے لڑکے یا شوہر کے باپ سے ناجائز تعلق قائم کر لیا یا شہوت سے بوس و کنار کرالیا تو نفقہ و سکنی کی مستحق رہے گی بشرطیکہ وہ عدت طلاقِ رجعی کی نہ ہو بلکہ طلاق بائن مغلظہ کی ہو۔

اولاد کے نفقہ کے احکام و مسائل: نابالغ اولاد (جس کی ذاتی ملکیت میں کچھ بھی مال و (اسباب نہ ہو) کے اخراجات اس کے باپ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ باپ خود تنگدست و مفلس کیوں نہ ہو، کوئی دوسرا آدمی اس ذمہ داری میں شریک نہیں کیا جائے گا۔ اگر بچہ ابھی دودھ پیتا ہو اور اس کی ماں اس کے باپ کے نکاح میں ہو نیز وہ بچہ دوسری عورت کا دودھ پی لیتا ہو اور اس کی ماں اس کو دودھ پلانا نہ چاہتی ہو، تو اس ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا ہاں اگر بچہ کسی دوسری عورت کا دودھ پیتا ہی نہ ہو یا ماں کے علاوہ دودھ پلانے والی نہ ملے تو اس صورت میں وہ دودھ پلانے پر مجبور کی جائے گی۔

اگر ماں بچہ کو دودھ پلانے سے انکار کردے اور کوئی دوسری عورت دودھ پلانے والی ملتی ہو تو یہ حکم ہے کہ باپ دودھ پلانے والی کو مقرر کردے جو بچہ کو ماں کے پاس آکر دودھ پلائے اب اگر اس بچہ کی ذاتی ملکیت میں مال موجود ہو تو اس دودھ پلانے والی کی اجرت اس بچہ کے مال سے دی جائے گی۔ اگر بچہ کی ذاتی ملکیت میں مال موجود نہ ہو تو پھر دودھ پلانے کی اجرت باپ کے ذمہ ہوگی۔

اگر باپ بچہ کی ماں کو دودھ پلانے کے لئے اجارہ پر مقرر کرے اور وہ اس کے نکاح میں ہو یا طلاق رجعی کی عدت میں ہو تو یہ جائز نہیں ہے ہاں اگر وہ ماں طلاق بائن یا طلاق مغلظہ کی عدت میں ہو تو اس کو بھی دودھ پلانے کے لئے اجرت پر رکھنا بعض حضرات کے نزدیک تو ناجائز ہے اور بعض حضرات کے نزدیک جائز ہے اسی طرح عدت گزرنے کے بعد ماں کو دودھ پلانے کے لئے اجرت پر رکھ لینا جائز ہے، بلکہ اس صورت میں تو وہ ماں دودھ پلانے والی کسی دوسری عورت کی بہ نسبت زیادہ اجرت کا مطالبہ نہ کرے تو اس کی حماقت ہوگی۔

اگر کوئی شخص اپنی منکوحہ یا معتدہ کو اپنے اس بچہ کو دودھ پلانے کے لئے اجرت پر رکھے جو دوسری بیوی کے بطن سے ہو تو یہ اجارہ جائز ہے اگر کسی کی بالغ بیٹی بالکل مفلس و تنگدست ہو یا بالغ بیٹا اپاہج و معذور ہو تو ان کے اخراجات بھی باپ ہی کے ذمہ ہوں گے۔ چنانچہ فتویٰ اسی پر ہے۔ جب کہ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ان کے اخراجات کا دو تہائی حصہ باپ کے ذمہ اور ایک حصہ ماں کے ذمہ ہوگا۔

والدین کے نفقہ کے احکام و مسائل: اصول یعنی باپ، دادا، دادی نانا، نانی (خواہ اس کے اوپر کے درجہ کے ہوں) اگر محتاج ہوں تو ان کے اخراجات کی ذمہ داری اولاد پر ہے، بشرطیکہ اولاد خوشحال و تونگر ہو اور خوشحال و تونگر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اولاد مالی طور پر اس حیثیت و درجہ کی ہو کہ اس کو صدقہ و زکوٰۃ کا مال لینا حرام ہو۔ اگر تونگر اولاد میں مذکر و مونث (یعنی بیٹا اور بیٹی) دونوں ہوں تو اس نفقہ کی ذمہ داری دونوں پر برابر، برابر ہوگی۔

محتاج شخص کا نفقہ واجب ہونے کے سلسلہ میں قرب و جزئیت کا اعتبار ہے نہ کہ ارث کا، مثلاً اگر کسی محتاج شخص کی بیٹی اور پوتا دونوں مال دار ہوں تو اس کا نفقہ بیٹی پر واجب ہوگا باوجودیکہ اس شخص کی میراث دونوں کو پہنچتی ہے اسی طرح اگر کسی محتاج شخص کی نواسی اور بھائی دونوں مالدار ہوں تو اس کا نفقہ نواسی پر واجب ہوگا اگرچہ اس شخص کی میراث کا مستحق صرف بھائی ہوگا۔

ذوی الارحام کے نفقہ کے احکام و مسائل: ہر مالدار شخص پر اس کے ہر ذی رحم محرم کا نفقہ واجب ہے بشرطیکہ وہ ذی رحم محرم محتاج ہو یا نابالغ ہو یا مفلس عورت ہو یا اپاہج و معذور ہو یا اندھا ہو یا طالب علم ہو اور یا جاہل و بے وقوفی یا کسی اور عذر کی بنا پر کمانے پر قادر نہ ہو اور اگر وہ مالدار شخص ان لوگوں پر خرچ نہ کرے تو اس کو خرچ کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ ذی رحم محرم رشتہ داروں کا نفقہ مقدار میراث کے اعتبار سے واجب ہوتا ہے۔

اور میراث کی مقدار کے اعتبار کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی محتاجی و تنگدستی کی وجہ سے اپنے ذی رحم محرم رشتہ داروں سے نفقہ حاصل کرنے کا مستحق ہے اگر اس کو مردہ تصور کر لیا جائے اور اس کی میراث کو اس کے ان ذی رحم محرم وارثوں پر تقسیم کیا جائے تو جس وارث کے حصہ میں میراث کی جو مقدار آئے گی وہی مقدار اس کے نفقہ کے طور پر اس ذی رحم محرم پر واجب ہوگی مثلاً زید ایک محتاج و تنگدست شخص ہے اس کے قریبی اعزاء ہیں صرف تین متفرق بہنیں ہیں یعنی ایک تو حقیقی بہن ہے، ایک سوتیلی بہن ہے اور ایک اخیافی بہن ہے ان تینوں بہنوں پر زید کا نفقہ واجب ہے جس کو وہ تینوں اس طرح پورا کریں گی کہ زید کا پورا نفقہ پانچ برابر، برابر حصوں میں کر کے تین خمس تو حقیقی بہن کے ذمہ ہوگا، ایک خمس سوتیلی بہن کے ذمہ ہوگا اور ایک خمس اخیافی بہن کے ذمہ ہوگا مقدار کی یہ تقسیم بالکل اسی طرح ہے جس طرح زید کے ترکہ میں سے ان بہنوں کے حصہ کی میراث کی تقسیم ہوگی۔

نیز اس سلسلہ میں مقدار میراث کا درحقیقت ہر وقت متعین و معلوم ہونا شرط نہیں ہے بلکہ محض وراثت کی اہلیت کا ہونا شرط ہے، چنانچہ اگر زید (جو محتاج و مفلس ہے) کا ایک ماموں ہے اور ایک چچازاد بھائی ہے اور وہ دونوں ہی مالدار ہیں تو زید کا نفقہ اس کے ماموں پر واجب ہوگا۔

باپ کی بیوی کا نفقہ اس کے بیٹے پر واجب ہوتا ہے اور بہو (لڑکے کی بیوی) کا نفقہ سسر پر واجب ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ لڑکا نابالغ ہو یا اپاہج و معذور ہو۔

جو شخص محتاج و مفلس ہو اس پر کسی کا نفقہ واجب نہیں ہوتا خواہ وہ والدین ہوں یا ذی رحم محرم رشتہ دار لیکن بیوی اور اولاد کا نفقہ اس پر ہر حال میں واجب رہے گا۔

دین و مذہب کے اختلاف کی صورت میں ایک دوسرے پر نفقہ واجب نہیں ہوتا لیکن بیوی، والدین، دادا، دادی، اور اولاد اور اولاد کی اولاد خواہ مذکر ہوں یا مونث، یہ لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ان کا نفقہ دین و مذہب کے اختلاف کے باوجود واجب ہوتا ہے۔

محتاج باپ کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے نفقہ کے لئے اپنے لڑکے کا مال (یعنی اشیاء منقولہ) بیچ سکتا ہے لیکن عقار یعنی اشیاء غیر منقولہ جیسے زمین و باغات کو بیچنے کا اختیار نہیں ہوگا، اسی طرح اس لڑکے پر اگر باپ کا نفقہ کے علاوہ کوئی اور دین (یعنی قرض و مطالبہ) ہو تو اس کے لئے لڑکے کی اشیاء منقولہ کو بھی بیچنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ نیز ماں کو اپنے لڑکے کا بھی کوئی مال (خواہ اشیاء منقولہ ہو یا غیر منقولہ) بیچنے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا اور صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک تو باپ کو بھی اشیاء منقولہ کے بیچنے کا اختیار نہیں ہے۔

باندی اور غلام کے نفقہ کے احکام و مسائل: آقا پر اپنے غلام اور باندی کے اخراجات کی کفالت ضروری ہے خواہ ان میں ملکیت پوری ہو جیسے خالص غلام یا ادھوری ہو جیسے مدبرہ اور اُمّ ولد اور خواہ وہ کمسن ہوں یا بڑی عمر والے اور خواہ اپاہج و معذور ہوں۔ یا بالکل تندرست و توانا ہوں۔

اگر کوئی شخص اپنے غلاموں کی کفالت سے انکار کرے تو وہ غلام اس بات کے مختار ہوں گے کہ محنت و مزدوری کریں اور جو کچھ کمائیں اس سے اپنے اخراجات پورے کریں اور اگر ان کے لئے کوئی مزدوری کا کام نہ ہو اور وہ کما کر اپنے اخراجات پورے نہ کر سکتے ہوں تو پھر قاضی و حاکم کی طرف سے آقا کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ ان غلاموں کو فروخت کر دے۔

اگر کسی شخص نے کوئی جانور خریدا تو اس پر جانور کے چارہ پانی کا انتظام کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر ان کو چارہ پانی دینے سے انکار کر دیا، تو اس کو قانونی طور پر اس جانور کو فروخت کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن دیانۃً اور اخلاقی طور پر اس کو حکم دیا جائے گا۔ کہ وہ اس جانور کو فروخت کر دے۔ یا اس کے چارہ پانی کا انتظام کرے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بیوی اور اولاد کا بقدر ضرورت نفقہ خاوند پر واجب ہے

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ هِنْدًا بِنْتَ عُتْبَةَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ شَحِيْحٌ وَلَيْسَ يُعْطِيْنِيْ مَا يَكْفِيْنِيْ وَوَلَدِيْ اِلَّا مَا اَخَذْتُ مِنْهُ وَهُوَ لَا يَعْلَمُ فَقَالَ خُذِيْ مَا يَكْفِيْكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (متفق علیہ)

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہندہ بنت عتبہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! (میرا شوہر) ابوسفیان بہت بخیل اور حریص ہے وہ مجھ کو اتنا خرچ نہیں دیتا جو مجھے اور میری اولاد (کی ضروریات) کے لئے کافی ہو جائے البتہ اگر میں اس کے مال میں سے خود کچھ نکال لوں اس طرح اس کو خبر نہ ہو تو ہماری ضروریات پوری ہو جاتی ہیں (تو کیا یہ جائز ہے کہ میں شوہر کو خبر کئے بغیر اس کے مال میں سے اپنی اور اولاد کی ضروریات کے بقدر کچھ نکال لوں؟) آپ ﷺ نے فرمایا "اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریات کے بقدر کہ جو شریعت کے مطابق ہو (یعنی اوسط درجہ کا خرچ) اس کے مال میں سے لے لیا کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نفقہ بقدر ضرورت واجب ہے۔ چنانچہ تمام علماء کا اس پر اجماع و اتفاق ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے کئی مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ ① مرد پر اس کی بیوی اور نابالغ اولاد (جس کی ذاتی ملکیت میں مال نہ ہو) کا نفقہ واجب ہے۔ ② نفقہ ضرورت و حاجت کے بقدر واجب ہوتا ہے۔ ③ فتویٰ دیتے وقت یا کوئی شرعی حق نافذ کرتے وقت اجنبی عورت کا کلام سننا جائز ہے۔ ④ کسی شخص کے بارہ میں ایسی کوئی بات بیان کرنا کہ جس کو اگر وہ سنے تو ناگواری محسوس کرے جائز ہے، بشرطیکہ یہ بیان کرنا کسی مسئلہ پوچھنے یا فتویٰ لینے کی غرض سے ہو۔ ⑤ اگر کسی شخص پر کسی دوسرے شخص کا کوئی مالی مطالبہ ہو اور وہ اس کی ادائیگی نہ کرتا ہو تو مطالبہ والے کے لئے جائز ہے کہ وہ اس شخص کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے اپنے مطالبہ کے بقدر لے لے۔ ⑥ بیوی بھی اپنے شوہر کے مال کے ذریعہ اپنی اولاد پر خرچ کرنے اور ان کی کفالت کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ⑦ بیوی کو اپنی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلنا جائز ہے خواہ شوہر نے اس کی صریحاً اجازت دیدی ہو یا بیوی کو اس کی رضامندی کا علم ہو۔ ⑧ قاضی اور حاکم کو یہ اختیار ہے کہ اگر وہ کسی معاملہ میں مناسب سمجھے تو محض اپنے علم اور اپنی معلومات کی بنیاد پر حکم جاری کر دے جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے ہندہؓ سے گواہ طلب نہیں کئے بلکہ اپنی معلومات کی بنیاد پر حکم دے دیا۔

اللہ کی عطا کی ہوئی دولت کو پہلے اپنے اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو

② وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَعْطَى اللّٰهُ اَحَدَكُمْ خَيْرًا فَلْيَبْدَأْ بِنَفْسِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کو مال و دولت عطا کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ پہلے اپنی ذات پر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے) (پھر اس کے بعد حسب مراتب اپنے دیگر متعلقین و اعزاء اور فقراء و مساکین پر خرچ کرے۔" (مسلمؒ)

غلام کا نفقہ اس کے مالک پر واجب ہے

③ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِلْمَمْلُوْكِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ وَیُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا یُطِیْقُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے غلام کے بارہ میں فرمایا کہ اس کی روٹی کپڑا اس کے آقا کے ذمہ ہے اور یہ کہ اس سے صرف اتنا کام لیا جائے جو اس کی طاقت و ہمت کے مطابق ہو۔"

تشریح: اس حدیث میں غلام کے بارہ میں دو ہدایتیں ہیں ایک تو یہ کہ غلام کا نفقہ چونکہ اس کے مالک پر واجب ہے اس لئے مالک کو چاہئے کہ وہ اپنے غلام کو اس کی حاجت کے بقدر اور اپنے شہر کے عام دستور کے مطابق اس کو روٹی کپڑا دے یعنی اس کے شہر میں عام طور پر غلام کو جس مقدار میں اور جس معیار کا روٹی اور کپڑا دیا جاتا ہے اسی کے مطابق وہ بھی دے، دوسری ہدایت یہ ہے کہ اپنے غلام کو کوئی ایسا کام کرنے کا حکم نہ دیا جائے جس پر وہ مداومت نہ کر سکتا ہو اور جو اس کی ہمت و طاقت سے باہر ہو یا جس کی وجہ سے اس کے جسم کو کوئی ظاہری نقصان پہنچ سکتا ہو۔

گویا اس ہدایت کے ذریعہ یہ احساس دلایا گیا ہے کہ انسان اپنے غلام کے بارہ میں یہ حقیقت ذہن میں رکھے کہ جس طرح، مالک حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ان کی طاقت و ہمت سے زیادہ کسی عمل و فعل کا بار نہیں ڈالا ہے اور ان کو انہی احکام کا پابند کیا ہے جو ان کے قوائے فکر و عمل کے مطابق ہیں اسی طرح بندوں کو بھی کہ جو مالک مجازی ہیں یہی چاہئے کہ وہ اپنے مملوک یعنی غلام پر کہ جو انہی کی طرح انسان ہیں، ان کی طاقت و ہمت سے باہر کسی کام کا بار نہ ڈالیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے یہ حدیث مرفوع منقول ہے کہ "غلام کے تئیں مالک کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں۔ ① جب غلام نماز پڑھ رہا ہو تو اس کو جلد بازی کا حکم نہ دے۔ ② جب وہ کھانا کھا رہا ہو تو اس کو اپنے کسی کام کے لئے نہ اٹھائے۔ ③ اس کو اتنا کھانا دے جس سے اس کا پیٹ اچھی طرح بھر جائے۔

غلام کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم

④ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَیْدِیْكُمْ فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ اَخَاهُ تَحْتَ یَدَیْهِ فَلْیُطْعِمْهُ مِمَّا یَاْكُلُ وَلْیُلْبِسْهُ مِمَّا یَلْبَسُ وَلَا یُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا یَغْلِبُهُ فَاِنْ كَلَّفَهُ مَا یَغْلِبُهُ فَلْیُعِنْهُ عَلَیْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "غلام تمہارے بھائی ہیں اور (دین و خلقت کے اعتبار سے) تمہاری ہی طرح ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے (تمہاری آزمائش کے لئے) ماتحت بنایا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ جس شخص کے بھائی کو اس کا ماتحت بنائے (یعنی جو شخص کسی غلام کا مالک بنے) تو اس کو چاہئے کہ وہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے وہی اس کو بھی پہنائے نیز اس سے کوئی ایسا کام نہ لے جو اس کی طاقت سے باہر ہو اور اگر کوئی ایسا کام اس سے لیا جائے جو اس کی طاقت سے باہر ہو تو اس کام میں خود بھی اس کی مدد کرے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے ذریعہ مالک کو یہ حکم دینا کہ وہ اپنے غلام کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور اس کو وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے۔ وجوب کے طور پر نہیں بلکہ بطریق استحباب ہے چنانچہ مالک پر اس کے مملوک کا اسی حیثیت و مقدار کا نفقہ واجب ہے جو عرف عام اور رواج و دستور کے مطابق ہو خواہ وہ مالک کے کھانے کپڑے کے برابر ہو یا اس سے کم و زیادہ ہو یہاں تک کہ

اگر مالک خواہ اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر یا از راہ بخل، اپنے کھانے پینے اور پہننے میں اس طرح کی تنگی کرتا ہو جو اس حیثیت کے لوگوں کے معیار کے منافی ہے تو ایسی تنگی مملوک کے حق میں جائز نہیں ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو کام غلام کے لئے مشکل نظر آئے اور وہ اس کو پورا کرنے میں دقت محسوس کرے تو اس کام کی تکمیل میں غلام کی مدد کرو خواہ خود اس کا ہاتھ بٹاؤ یا کسی دوسرے شخص کو اس کی مدد کرنے پر متعین کر دو چنانچہ بعض بزرگوں کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ چکی پیسنے میں اپنی لونڈیوں کی مدد کرتے تھے بایں طور کہ ان لونڈیوں کے ساتھ مل کر چکی پیستے تھے۔

غلام کی روزی روکنا گناہ ہے

⑤ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو جَاءَہٗ قَھْرَمَانٌ لَہٗ فَقَالَ لَہٗ اَعْطَیْتَ الرَّقِیْقَ قُوْتَھُمْ قَالَ لَا قَالَ فَانْطَلِقْ فَاَعْطِھِمْ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کَفٰی بِالرَّجُلِ اِثْمًا اَنْ یَّحْبِسَ عَمَّنْ یَّمْلِکُ قُوْتَہٗ وَفِیْ رِوَایَۃٍ کَفٰی بِالْمَرْءِ اِثْمًا اَنْ یُّضَیِّعَ مَنْ یَّقُوْتُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ (ایک دن) ان کے پاس ان کا کارندہ آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے غلام اور لونڈیوں کو ان کا کھانا دے دیا ہے؟ اس نے کہا کہ "نہیں" انہوں نے فرمایا کہ "(فوراً) واپس جاؤ اور ان کو ان کا کھانا دو، کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آدمی کے گناہ کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مملوک کو کھانا نہ دے۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "آدمی کے گناہ کے لئے یہ کافی ہے کہ جس شخص کی روزی اس کے ہاتھ میں ہے (یعنی اپنے اہل و عیال اور غلام لونڈی) وہ اس کی روزی کو ضائع کر دے۔" (مسلمؒ)

اپنے خادم و نوکر کے ساتھ کھانا، کھانے میں عار محسوس نہ کرو

⑥ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا صَنَعَ لِاَحَدِکُمْ خَادِمُہٗ طَعَامَہٗ ثُمَّ جَاءَہٗ بِہٖ وَقَدْ وَلِیَ حَرَّہٗ وَدُخَانَہٗ فَلْیُقْعِدْہُ مَعَہٗ فَلْیَاْکُلْ فَاِنْ کَانَ الطَّعَامُ مَشْفُوْھًا قَلِیْلًا فَلْیَضَعْ فِیْ یَدِہٖ مِنْہُ اُکْلَۃً اَوْ اُکْلَتَیْنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم میں سے کسی کا خادم اس کے لئے کھانا تیار کرے اور پھر وہ کھانا لے کر اس کے پاس آئے تو جس کھانے کے لئے اس نے گرمی اور دھوپ میں تکلیف اٹھائی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ آقا، اس خادم کو اپنے ساتھ (دستر خوان پر) بٹھائے (اور اس کے ساتھ کھانا کھائے اور اگر کھانا تھوڑا ہو اور کھانے والے زیادہ ہوں تو اس کھانے میں سے ایک دو لقمہ لے کر اس خادم کے ہاتھ پر رکھ دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے خادموں اور نوکروں کے ساتھ کھانا کھانے میں عار محسوس نہ کرے کیونکہ خادم و نوکر بھی ایک انسان اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کا بھائی ہے پھر اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ ایک دستر خوان پر جتنے زیادہ لوگ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں اس کھانے میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے کہ افضل کھانا وہ ہے جس میں زیادہ ہاتھ پڑیں۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ حدیث میں خادم و نوکر کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھانے یا اس کھانے میں سے اس کو تھوڑا بہت دے دینے کا حکم دیا گیا ہے وہ استحباب کے طور پر ہے۔

غلام کے لئے دوہرا اجر

⑦ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا نَصَحَ لِسَیِّدِہٖ وَاَحْسَنَ عِبَادَۃَ اللّٰہِ فَلَہٗ اَجْرُہٗ مَرَّتَیْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی غلام اپنے آقا کی خیر خواہی کرتا ہے (یعنی اس کی دل و جان سے خدمت کرتا ہے) اور پھر اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی اچھی طرح کرتا ہے۔ تو اس کو دوہرا ثواب ملتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس کو دوہرا ثواب ملنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک ثواب تو اپنے آقا کی خدمت کی وجہ سے اور ایک ثواب اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سبب سے ملتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اپنے آقا کی خیر خواہی یعنی اس کی خدمت کرنا بھی عبادت ہے بلکہ حقیقت میں وہ بھی خدا کی عبادت ہے۔ کیونکہ عبادت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری کرنا، اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ اپنے آقا کی خدمت و خیر خواہی کی جائے اس لئے جو غلام اپنے آقا کی خدمت کرتا ہے۔ درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری کرتا ہے جیسا کہ ماں باپ کی خدمت و فرمانبرداری کرنے والے کو اسی لئے ثواب ملتا ہے کہ وہ والدین کی خدمت و اطاعت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری کرتا ہے، بعض حضرات اس حدیث کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ غلام کو اس کے ہر عمل پر دوہرا ثواب ملتا ہے۔

غلام کے لئے بہتر بات کیا ہے؟

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعِمَّا لِلْمَمْلُوْكِ اَنْ يَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ بِحُسْنِ عِبَادَةِ رَبِّهٖ وَطَاعَةِ سَيِّدِهٖ نِعِمَّا لَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایک غلام کے لئے اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے مالک کی بہترین خدمت اور اپنے پروردگار کی اچھی عبادت کرتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دے" (یعنی غلام کے لئے سب سے بڑی سعادت یہی ہے کہ اس کی پوری زندگی اپنے مالک حقیقی کی اطاعت و عبادت اور مالک مجازی کی خدمت و فرمانبرداری میں گزر جائے)۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

مفرور غلام کی نماز قبول نہیں ہوتی

⑨ وَعَنْ جَرِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَبَقَ الْعَبْدُ لَمْ تُقْبَلْ لَهٗ صَلَاةٌ وَفِیْ رِوَايَةٍ عَنْهُ قَالَ اَيُّمَا عَبْدٍ اَبَقَ فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ وَفِیْ رِوَايَةٍ عَنْهُ قَالَ اَيُّمَا عَبْدٍ اَبَقَ مِنْ مَوَالِيْهِ فَقَدْ كَفَرَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْهِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جریرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب غلام بھاگ جاتا ہے تو اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی" ایک روایت میں حضرت جریرؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو غلام بھاگ گیا اس سے ذمہ ختم ہو گیا ایک اور روایت میں حضرت جریرؓ ہی سے یہ منقول ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) جو غلام اپنے مالکوں کے ہاں سے بھاگا وہ کافر ہو گیا جب تک کہ ان کے پاس واپس نہ آجائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اس سے ذمہ ختم ہو گیا" کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی غلام بھاگ کر دار الحرب چلا گیا اور مرتد ہو گیا تو اس سے اسلام کی ذمہ داری ختم ہو گئی اور اس کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کے اسلام کے درمیان جو عہد و امان تھا اور جس کی وجہ سے اسلامی قانون اس کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن تھا وہ منقطع ہو گیا لہٰذا اس کو قتل کر دینا جائز ہو گیا، ہاں اگر وہ اپنے مالکوں کے ہاں سے بھاگ کر دار الحرب نہیں گیا بلکہ مسلمانوں ہی کے کسی شہر میں چلا گیا۔ اور مرتد نہیں ہوا تو اس کو قتل کرنا جائز نہیں ہو گا اس صورت میں یہ جملہ "اس سے ذمہ ختم ہو گیا" کا مطلب یہ ہو گا کہ اگر اس غلام کو بھاگنے کے جرم میں جائے تو نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ اسلامی قانون اس کی کوئی مدافعت نہیں کرے گا۔

"وہ کافر ہو گیا" کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس نے بھاگنے کو حلال جانا یعنی وہ اس عقیدہ کے ساتھ بھاگا کہ مالک کے ہاں سے میرا مفرور

ہو جانا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ جائز ہے تو وہ حقیقۃً کافر ہو گیا اور اگر اس نے بھاگنے کو حلال نہیں جانا تو پھر اس صورت میں اس جملہ کا مطلب یا تو یہ ہو گا کہ وہ کفر کے قریب پہنچ گیا یا یہ کہ اس کے دائرہ کفر میں داخل ہو جانے کا خوف ہے یا اس نے کافروں کا سا عمل کیا اور یا یہ کہ اس نے اپنے مالک کا کفران نعمت کیا۔

غلام پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانے والے کا مسئلہ

(۱۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قَذَفَ مَمْلُوْكَهُ وَهُوَ بَرِيْءٌ مِمَّا قَالَ جُلِدَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ كَمَا قَالَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا ابو القاسم (نبی کریم ﷺ) فرمایا کرتے تھے کہ "جو شخص اپنے بردہ پر زنا کی تہمت لگائے جب کہ حقیقت میں وہ اس بات سے پاک ہو جو اس کے بارہ میں کہی گئی ہے تو قیامت کے دن اس شخص کو کوڑے مارے جائیں گے ہاں اگر وہ غلام واقعۃً ایسا ہو جیسا کہ کہا گیا (یعنی اگر تہمت درست ہو تو پھر اس مالک کو کوڑے نہیں مارے جائیں گے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائے تو اس کی سزا میں اگرچہ دنیا میں اس کو کوڑے نہیں لگائے جائیں گے لیکن آخرت میں تمام مخلوق کے سامنے اس کو اس طرح ذلیل کیا جائے گا کہ اس کو کوڑے لگائیں جائیں گے اس سے معلوم ہوا کہ غلام کی عزت و آبرو کا بھی اتنا ہی خیال رکھنا چاہیے۔ جتنا ایک آزاد شخص کی عزت و حرمت کا لحاظ کیا جاتا ہے اور وہ لوگ بڑے نادان ہیں جو اپنے زیر دستوں۔ (نوکروں اور غلاموں) کو بے محابا گالیاں دیتے ہوئے آخرت کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔

غلام کو بلا خطا مارنے کا کفارہ

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ ضَرَبَ غُلَامًا لَهُ حَدًّا لَمْ يَاْتِهِ اَوْ لَطَمَهُ فَاِنَّ كَفَّارَتَهُ اَنْ يُعْتِقَهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو اپنے غلام کو ایسی سزا دے جس کا کوئی جرم ہی نہیں ہے (یعنی بے گناہ مارے) یا اس کو طمانچہ مارے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس غلام کو آزاد کر دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یوں تو بلا کسی وجہ کے کسی بھی شخص کو طمانچہ مارنا حرام ہے لیکن یہاں بطور خاص غلام کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس کو بلا گناہ مارنے یا اس کے منہ پر طمانچہ لگانے کا تاوان یہ ہے کہ وہ اس غلام کو آزاد کر دے۔

(۱۲) وَعَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ كُنْتُ اَضْرِبُ غُلَامًا لِيْ فَسَمِعْتُ مِنْ خَلْفِيْ صَوْتًا اِعْلَمْ اَبَا مَسْعُوْدٍ لَلّٰهُ اَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ فَالْتَفَتُّ فَاِذَا هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هُوَ حُرٌّ لِوَجْهِ اللّٰهِ فَقَالَ اَمَا لَوْ لَمْ تَفْعَلْ لَلَفَحَتْكَ النَّارُ اَوْ لَمَسَّتْكَ النَّارُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو مسعودؓ انصاری کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں اپنے غلام کو پیٹ رہا تھا۔ کہ میں نے اپنی پشت پر یہ آواز سنی "ابو مسعود! یاد رکھو! اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی قدرت تم اس غلام پر رکھتے ہو" جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، تو رسول کریم ﷺ تھے میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! (مجھے اپنے اس فعل پر ندامت ہے اب) میں اس غلام کو اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا "یاد رکھو! اگر تم اس غلام کو آزاد نہ کرتے تو تمہیں دوزخ کی آگ جلاتی" یا فرمایا کہ "تمہیں دوزخ کی آگ لگتی۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم نے اپنے غلام کو مار کر ایک بڑا گناہ کیا تھا، یہ اچھا ہوا کہ تم نے اس غلام کو آزاد کر دیا اور اس گناہ کے بار سے ہلکے ہو گئے ورنہ چونکہ تم نے اس کو ناحق مارا ہے اس لئے اگر یہ تمہارا قصور معاف نہ کرتا۔ تو اس کو آزاد نہ کرنے

کی صورت میں تمہیں دوزخ میں ڈالا جاتا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ دراصل اپنے مملوک کے حق میں نرمی کرنے اور ان کے ساتھ حلم و مروت کا معاملہ کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ جس غلام کو مارا گیا ہے اس کو آزاد کرنا واجب نہیں ہے۔ بلکہ مستحب ہے اور وہ بھی بایں امید کہ آزاد کرنا ناحق مارنے کے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اولاد کی کمائی پر باپ کا حق ہے

⑬ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَجُلًا اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ لِيْ مَالًا وَاِنَّ وَالِدِيْ يَحْتَاجُ اِلٰى مَالِيْ قَالَ اَنْتَ وَمَالُكَ لِوَالِدِكَ اِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ اَطْيَبِ كَسْبِكُمْ كُلُوْا مِنْ كَسْبِ اَوْلَادِكُمْ۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ (ایک دن) ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "میں مالدار ہوں اور میرا باپ میرے مال کا محتاج ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا" کہ تم اور تمہارا مال (دونوں) تمہارے باپ کے لئے ہیں کیونکہ تمہاری اولاد تمہاری سب سے بہتر کمائی ہے لہٰذا اپنی اولاد کی کمائی کھاؤ۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "تم اور تمہارا مال (دونوں) تمہارے باپ کے لئے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم پر اپنے باپ کی خدمت واطاعت واجب ہے اسی طرح تم پر بھی واجب ہے کہ اپنا مال اپنے باپ پر خرچ کرو اور اس کی ضروریات زندگی پوری کرو نیز تمہارے باپ کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ تمہارے مال میں تصرف کرے۔

گویا اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ باپ کا نفقہ بیٹے پر واجب ہوتا ہے اس حدیث کے ضمن میں یہ مسئلہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کے مال میں سے کچھ چرا لے یا اس کی لونڈی سے جماع کر لے تو بسبب شبہ ملکیت اس پر حد (شرعی سزا) جاری نہیں ہوتی۔

"تمہاری اولاد تمہاری سب سے بہتر کمائی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ انسان محنت و مشقت کر کے جو کچھ کماتا ہے اس میں سب سے حلال اور افضل کمائی اس کی اولاد ہوتی ہے لہٰذا اولاد جو کچھ کمائے وہ باپ کے لئے حلال ہے اور وہ باپ کے حق میں اپنی کمائی کے مثل ہے۔ اولاد کو باپ کی "کمائی" اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ دراصل اولاد باپ کے ذریعہ اور اس کی سعی و فعل کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے۔

مربی کے حق میں یتیم کے مال کا حکم

⑭ وَعَنْهُ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَجُلًا اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ فَقِيْرٌ لَيْسَ لِيْ شَيْءٌ وَلِيْ يَتِيْمٌ فَقَالَ كُلْ مِنْ مَالِ يَتِيْمِكَ غَيْرَ مُسْرِفٍ وَلَا مُبَادِرٍ وَلَا مُتَاَثِّلٍ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں ایک مفلس آدمی ہوں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور میری نگہداشت میں ایک یتیم ہے (تو کیا میں اس کے مال میں سے کچھ کھا لوں؟) آپ ﷺ نے فرمایا "تمہاری نگرانی میں جو یتیم ہے تم اس کے مال میں سے کھا سکتے ہو بشرطیکہ اسراف (فضول خرچی) نہ کرو، خرچ کرنے میں عجلت نہ کرو۔ اور نہ اپنے لئے جمع کرو۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ)

تشریح: یتیم بچہ کے مال میں سے یتیم کے مربی کو اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کی اجازت کو آنحضرت ﷺ نے تین باتوں سے

مشروط کیا۔ پہلی شرط تو یہ کہ اس کے مال میں سے صرف اتنا لیا جائے جو اصل ضروریات زندگی کے بقدر ہو اسراف اور اپنی ضرورت و حاجت سے زیادہ خرچ کر کے اس یتیم کے مال کو ضائع نہ کیا جائے دوسری شرط یہ کہ اس کے مال میں سے جو کچھ بھی لیا جائے ضرورت کے وقت لیا جائے چنانچہ اس خوف سے کہ اگر یتیم بچہ بالغ ہو گیا تو اپنا تمام مال اپنے قبضہ میں لے لے گا ضرورت سے پہلے ہرگز نہ لیا جائے اور تیسری شرط یہ کہ اپنی ضرورت و حاجت کے نام پر اس کے مال میں سے نکال نکال کر اپنے لئے جمع نہ کیا جائے۔

بہر حال حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ یتیم کے مربی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اگر محتاج و مفلس ہو تو اس یتیم کے مال میں سے اپنی ضرورت و حاجت کے بقدر اپنے اوپر خرچ کرے لیکن جو مربی خود خوشحال ہو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے چنانچہ یہ مسئلہ قرآن کریم سے بھی ثابت ہے۔

غلاموں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید

⑮ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ مَرَضِهِ الصَّلَاةَ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَرَوٰى اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاؤُدَ عَنْ عَلِيٍّ نَحْوَهُ۔

"اور حضرت اُم سلمہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ اپنے مرض الموت میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ نماز پر مضبوطی سے قائم رہو اور جو لوگ تمہاری ملکیت میں ہیں (یعنی لونڈی غلام) ان کے حقوق ادا کرو۔ (بیہقیؒ) اور احمدؒ و ابوداؤدؒ نے اسی طرح کی روایت حضرت علیؓ سے نقل کی ہے۔"

تشریح: "نماز پر مضبوطی سے قائم رہو" کا مطلب یہ ہے کہ نماز پر مداومت اختیار کرو، کوئی نماز بلاعذر شرعی قضا نہ کرو اور نماز کے جو حقوق و آداب ہیں ان کو پورے طور پر ادا کرو۔

لونڈی غلام کا حق یہ ہے کہ ان کا مالک ان کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے، حسب حیثیت کپڑے پہنائے، ناحق مارنے اور گالی گلوچ سے اجتناب کرے اور برا بھلا نہ کہے۔ اسی طرح جانوروں کا حق ادا کرنے کا بھی حکم ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں جانور ہوں ان کے چارہ پانی کا انتظام کرے اور ان کو ناحق مارنے پیٹنے سے پرہیز کرے چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن ذمی اور جانوروں کی خصومت، مسلمانوں کی خصومت سے زیادہ شدید ہو گی۔

اپنے مملوک کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے کے بارہ میں وعید

⑯ وَعَنْ اَبِيْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ سَيِّئُ الْمَلَكَةِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور ابوبکر صدیقؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اپنے مملوک (لونڈی غلام) کے ساتھ برائی و بدسلوکی کرنے والا جنت میں (ابتدائی مرحلہ پر نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ) داخل نہیں ہو گا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

اپنے مملوک کے ساتھ حسن سلوک خیر و برکت کا باعث ہے

⑰ وَعَنْ رَافِعِ بْنِ مَكِيْثٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حُسْنُ الْمَلَكَةِ يُمْنٌ وَسُوْءُ الْخُلُقِ شُؤْمٌ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَلَمْ اَرَ فِيْ غَيْرِ الْمَصَابِيْحِ مَازَادَ عَلَيْهِ فِيْهِ مِنْ قَوْلِهِ وَالصَّدَقَةُ تَمْنَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ وَالْبِرُّ زِيَادَةٌ فِي الْعُمُرِ۔

"اور حضرت رافع ابن مکیثؓ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اپنے مملوک کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک، خیر و برکت کا باعث ہے اور اپنے مملوک کے ساتھ بدسلوکی، بے برکتی کا باعث ہے۔ (ابوداؤدؒ) اور مشکوٰۃ کے مصنفؒ فرماتے ہیں کہ) میں نے مصابیح کے علاوہ اور کسی کتاب میں وہ الفاظ نہیں دیکھے ہیں جو صاحب مصابیح نے اس حدیث میں نقل کئے ہیں (اور وہ زائد الفاظ یہ ہیں) کہ

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا صدقہ و خیرات بری موت سے بچاتا ہے اور نیکی عمر کو بڑھاتی ہے۔"

تشریح: اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب مالک اپنے مملوک کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک کرتا ہے تو وہ اپنے مالک و آقا کے بہت زیادہ تابعدار اور خیر خواہ بن جاتے ہیں اور جو کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے اسے وہ پوری دلجمعی و محنت اور ایمانداری کے ساتھ کرتے ہیں اور یہی چیزیں خیر و برکت کا باعث ہوتی ہیں اس کے برعکس اگر اپنے مملوک کے ساتھ بد سلوکی و بدخواہی کا معاملہ کیا جاتا ہے تو ان کے دلوں میں مالک کی طرف سے بغض و نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور آخر کار وہ اپنے مالک کی جان و آبرو اور مال و دولت کی ہلاکت و نقصان کے ارتکاب سے بھی گریز نہیں کرتے۔

"بری موت" سے مراد یا تو "مرگ مفاجات یعنی اچانک موت" ہے یا "توحید اور یاد حق سے غفلت کے ساتھ مرنا" مراد ہے! "مرگ مفاجات" اس اعتبار سے "بری موت" ہے کہ انسان یکایک موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے نہ تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلہ میں سرزد کوتاہیوں کی تلافی کا موقع ملتا ہے اور نہ توبہ کرنے کی مہلت نصیب ہوتی ہے۔

"نیکی" سے مراد "مخلوق کے ساتھ احسان و سلوک کرنا" ہے اور "خالق کی طاعت و عبادت" بھی مراد ہو سکتی ہے۔ "نیکی" کی وجہ سے عمر کا بڑھنا حقیقۃً بھی ممکن ہے بایں طور کہ اللہ تعالیٰ کسی کی عمر کو معلق کر دے کہ اس بندہ کی عمر اتنے سال ہے لیکن اگر یہ نیکی کرے گا یعنی اپنے پروردگار کی طاعت و عبادت اور مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک و خیر خواہی میں مشغول رہے گا تو اس کی عمر میں اتنے سال کا اضافہ ہو جائے گا لہٰذا نیکی کرنے کی صورت میں اس کی عمر اتنے ہی سال بڑھ جائے گی۔

یہ وضاحت تو "زیادتی عمر" کے حقیقی مفہوم مراد لینے کی صورت میں ہے اور اس کا معنوی مفہوم یہ ہے کہ "نیکی" کی وجہ سے عمر میں خیر و برکت حاصل ہوتی ہے۔ یا نیکی کرنے والے کو اس کی موت کے بعد لوگ بھلائی کے ساتھ یاد کرتے ہیں پس معنوی طور پر یہ بھی عمر کا بڑھنا ہی ہے۔

روایت کے آخر میں مصنف مشکوٰۃ نے جو اعتراض کیا ہے وہ میرک کی تحقیق کے مطابق شیخ جزری کے اس قول سے ختم ہو جاتا ہے کہ اس روایت کو صاحب مصابیح نے جس طرح نقل کیا ہے بالکل اسی طرح پوری روایت امام احمد نے بھی نقل کی ہے۔

اگر غلام مار کھاتے ہوئے خدا کا واسطہ دے، تو اپنا ہاتھ روک لو

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا ضَرَبَ اَحَدُکُمْ خَادِمَہٗ فَذَکَرَ اللّٰہَ فَارْفَعُوْا اَیْدِیَکُمْ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ لٰکِنْ عِنْدَہٗ فَلْیُمْسِكْ بَدَلَ فَارْفَعُوْا اَیْدِیَکُمْ۔

"اور حضرت ابو سعید کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(مثال کے طور پر) اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام کو مارنے لگے اور وہ خدا کو یاد کرے (یعنی یوں کہے کہ تمہیں خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دو) تو تم (اس کو مارنے سے) اپنا ہاتھ روک لو۔" اس روایت کو ترمذی اور شعب الایمان میں بیہقی کی روایت میں فارفعوا ایدیکم کی بجائے فلیمسک نقل کیا گیا ہے (اور دونوں لفظ کا مطلب ایک ہی ہے)۔"

تشریح: طیبی کہتے ہیں کہ "تم اپنا ہاتھ روک لو" کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اس غلام کو مالک تادیباً مار رہا ہو اور اگر اس پر حد جاری کر رہا ہو یعنی شراب پینے یا کسی پر جھوٹی تہمت لگانے کی سزا میں اس کو کوڑے مار رہا ہو تو پھر ہاتھ نہ روکے بلکہ حد پوری کرے۔

کمسن بردہ کو اس کی ماں وغیرہ سے الگ نہ کرو

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ وَالِدَۃٍ وَوَلَدِھَا فَرَّقَ اللّٰہُ بَیْنَہٗ

وَبَيْنَ اَحِبَّتِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوایوبؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص ماں اور بیٹے کے درمیان جدائی کرائے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے عزیزوں کے درمیان جدائی کرادے گا۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: "ماں اور بیٹے" سے مراد "لونڈی اور اس کا بچہ" ہے اسی طرح "جدائی کرانے" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مالک مثلاً لونڈی کو تو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا کسی کو ہبہ کر دے اور بچہ کو اپنے پاس روک لے، یا بچہ کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا کسی کو ہبہ کر دے اور اس کی ماں کو اپنے پاس رہنے دے لہٰذا اگر کوئی شخص اس طرح سے ماں اور بیٹے کو ایک دوسرے سے جدا کرے گا تو قیامت کے دن اس موقف میں کہ جہاں تمام مخلوق اپنے تمام عزیزوں کے ساتھ جمع ہوگی اور لوگ اپنے پروردگار سے ایک دوسرے کی شفاعت کر رہے ہوں گے اللہ تعالیٰ اس شخص اور اس کے عزیزوں مثلاً ماں باپ یا اولاد وغیرہ کے درمیان جدائی کرادے گا۔

علماء لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں صرف "ماں بیٹے" کا ذکر محض اتفاقی ہے ورنہ تو ہر چھوٹے (کمسن) بردہ اور اس کے ذی رحم محرم رشتہ دار خواہ وہ ماں ہو، باپ دادا ہو یا دادی اور بھائی ہو یا بہن کے درمیان جدائی کرانے کا یہی حکم ہے حنفیہ کے ہاں دو چھوٹے بھائیوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دینا جائز ہے۔

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ "چھوٹے" کی قید سے بڑے کا استثناء ہو گیا، یعنی اگر بڑی عمر والے بردہ کو اس کی ماں یا اس کے باپ یا کسی اور ذی رحم محرم رشتہ دار سے جدا کر دیا جائے تو جائز ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "بڑے" کی تعریف کیا ہے تو اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ کس عمر کے بردہ کو بڑا کہیں گے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو سات برس یا آٹھ برس کی عمر والا "بڑا" کہلائے گا، جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ جو بالغ ہو جائے وہ بڑا کہلائے گا نیز حضرت امام اعظمؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک چھوٹے بچے اور اس کے ذی رحم محرم رشتہ دار کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے بیچنا مکروہ ہے جب کہ حضرت امام ابویوسفؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ان دونوں یعنی بچہ اور اس کے ذی رحم محرم رشتہ دار میں ولادت کی قرابت ہو (جیسے وہ دونوں ماں اور بیٹا ہوں یا باپ اور بیٹا ہوں) تو اس صورت میں ان دونوں کو جدا کر کے بیچنا سرے سے جائز ہی نہیں ہوگا اور ان کا قول یہ بھی ہے کہ ولادت کی قرابت کے استثناء کے بغیر تمام ذی رحم محرم رشتہ داروں کے بارے میں یہی حکم ہے۔

(۲۰) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ وَهَبَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُلَامَيْنِ اَخَوَيْنِ فَبِعْتُ اَحَدَهُمَا فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَلِيُّ مَا فَعَلَ غُلَامُكَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ رُدَّهٗ رُدَّهٗ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے دو غلام عطا فرمائے جو آپس میں بھائی بھائی تھے پھر (جب) میں نے ان میں سے ایک کو بیچ دیا تو رسول کریم ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ "علی! تمہارا (ایک) غلام کہاں گیا؟" میں نے آپ ﷺ کو بتادیا (کہ ایک غلام میں نے بیچ دیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس کو واپس کر لو، اس کو واپس کر لو۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "اس کو واپس کر لو" کا مطلب یہ تھا کہ تم نے جو بیع کی ہے اس کو فسخ کر دو اور اس غلام کو اپنے پاس لے آؤ، تاکہ دونوں بھائیوں کے درمیان جدائی واقع نہ ہو اس جملہ کو تاکیداً دو مرتبہ فرمانے میں اس طرف اشارہ تھا کہ جو حکم دیا جا رہا ہے وہ وجوب کے طور پر ہے اور بیع مکروہ تحریمی ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک دوسرے کے درمیان جدائی نہ کرانے کا حکم صرف ماں بیٹوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

(۲۱) وَعَنْهُ اَنَّهٗ فَرَّقَ بَيْنَ جَارِيَةٍ وَوَلَدِهَا فَنَهَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَالِكَ فَرَدَّ الْبَيْعَ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ مُنْقَطِعًا۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارہ میں منقول ہے کہ (ایک مرتبہ) انہوں نے ایک لونڈی اور اس کے بیٹے کو ایک دوسرے سے جدا کر

دیا (یعنی ان دونوں میں ایک کو بیچ دیا اور ایک کو اپنے پاس رہنے دیا) چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور انہوں نے (یعنی حضرت علیؓ نے) اس بیع کو فسخ کر دیا۔" ابوداؤدؒ نے اس روایت کو بطریق انقطاع نقل کیا ہے۔"

تشریح: مذکورہ بالا دونوں حدیثیں حضرت امام ابویوسفؒ کے اس مسلک کی دلیل ہیں کہ چھوٹے بردے اور اس کی ماں یا اس کے باپ کو ایک دوسرے سے الگ کر کے بیچنا ناجائز ہے۔

غلام پر احسان کرنے کا اجر

۲۲ وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ يَسَّرَ اللّٰهُ حَتْفَهُ وَاَدْخَلَهُ جَنَّتَهُ رِفْقٌ بِالضَّعِيْفِ وَشَفَقَةٌ عَلَى الْوَالِدَيْنِ وَاِحْسَانٌ اِلَى الْمَمْلُوْكِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص میں یہ تین باتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اس پر موت کو آسان کر دے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ ① کمزوروں اور ضعیفوں کے ساتھ نرمی کرنا ② ماں باپ پر شفقت کرنا ③ اپنے مملوک پر احسان کرنا۔ اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "ضعیف و کمزور" سے ہر وہ شخص مراد ہے جو خواہ جسم و جان کے اعتبار ضعیف و ناتواں ہو یا مالی حالت کے اعتبار سے اور یا عقل و خرد کے اعتبار سے کمزور ہو! "احسان کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ مالک پر اس کے غلام کے تئیں جو کچھ واجب ہے اس سے بھی زیادہ اس کے ساتھ سلوک کرے۔

نمازی کو مارنے کی ممانعت

۲۳ وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهَبَ لِعَلِيٍّ غُلَامًا فَقَالَ لَا تَضْرِبْهُ فَاِنِّيْ نُهِيْتُ عَنْ ضَرْبِ اَهْلِ الصَّلٰوةِ وَقَدْ رَاَيْتُهُ يُصَلِّيْ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ وَفِي الْمُجْتَبٰى لِلدَّارَقُطْنِيِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ نَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ضَرْبِ الْمُصَلِّيْنَ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو ایک غلام عطا کیا اور یہ حکم دیا کہ اس کو (بے حکم شرعی) مارنا نہیں کیونکہ (میرے رب کی طرف سے) مجھے نمازیوں کو مارنے سے منع کیا گیا ہے اور میں نے اس غلام کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔" یہ الفاظ (جو مشکوٰۃ میں مذکور ہیں) مصابیح کے ہیں اور دار قطنی کی تصنیف مجتبیٰ میں یہ منقول ہے کہ حضرت عمرؓ ابن خطاب نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں نمازیوں کو مارنے سے منع فرمایا ہے۔"

تشریح: نمازیوں کو مارنے سے ممانعت خدا کے نزدیک ان کے شرف و فضیلت کی بناء پر اور مخلوق خدا کے درمیان ان کی عزت و توقیر کو محفوظ رکھنے کے لئے ہے۔

طیبیؒ نے اس موقع پر یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نمازیوں کو مارنے سے منع کیا ہے تو اس کے بے پایاں فضل و کرم سے امید ہے کہ وہ آخرت میں ان کو عذاب میں مبتلا کر کے ذلیل و رسوا نہیں کرے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

مملوک کی خطائیں معاف کرنے کا حکم

۲۴ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمْ نَعْفُوْ عَنِ الْخَادِمِ فَسَكَتَ ثُمَّ اَعَادَ عَلَيْهِ الْكَلَامَ فَصَمَتَ فَلَمَّا كَانَتِ الثَّالِثَةُ قَالَ اُعْفُوْا عَنْهُ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ

التِّرْمِذِيُّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم کتنی مرتبہ (اپنے) غلام لونڈی کی خطائیں معاف کریں؟ آنحضرت ﷺ خاموش رہے (اور کوئی جواب نہیں دیا) اس شخص نے پھر یہی سوال کیا تو اس مرتبہ بھی خاموش رہے پھر جب اس نے تیسری مرتبہ یہی پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا "ہر روز ستر مرتبہ" (ابوداؤدؒ) ترمذیؒ نے اس روایت کو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ستر مرتبہ" سے یہ خاص عدد مراد نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اہل عرب کے ہاں کسی چیز کی زیادتی اور کثرت کو بیان کرنے کے لئے عام طور پر ستر کا عدد ذکر کیا جاتا تھا، آپ ﷺ کا مقصد بھی واضح کرنا تھا کہ زیادہ سے زیادہ مرتبہ ان کی خطائیں معاف کرو۔

سائل کے سوال پر آنحضرت ﷺ کا خاموش رہنا سوال کی رکاکت کی بناء پر تھا کہ عفو تو مستحب اور پسندیدہ ہے نہ کہ اس کو کسی خاص عدد کے ساتھ مقید کرنا مقصود ہے اور یہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے وحی کے انتظار میں خاموشی اختیار فرمائی ہو۔

مملوک کے بارہ میں ایک ہدایت

(۲۵) وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَا ئَمَكُمْ مِنْ مَمْلُوْكِكُمْ فَاَطْعِمُوْهُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ وَاكْسُوْهُ مِمَّا تَكْسُوْنَ وَمَنْ لَا يُلَائِمُكُمْ مِنْهُمْ فَبِيْعُوْهُ وَلَا تُعَذِّبُوْا خَلْقَ اللّٰهِ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تمہارے مملوک (لونڈی غلام) میں سے جو (لونڈی غلام) تمہاری اطاعت و خدمت (تمہاری خواہش کے مطابق) کرے (اور وہ تمہارے مزاج کے موافق ہو) تو اس کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور اس کو وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو (کیونکہ جب وہ تمہارا دل خوش کرتا ہے تو تم بھی اس کا دل خوش کرو) اور جو (لونڈی غلام) تمہارے مزاج کے موافق نہ ہو تو اس کو (تکلیف نہ دو بلکہ) بیچ ڈالو خدا کی مخلوق کو تکلیف دینا درست نہیں ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم

(۲۶) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ الْحَنْظَلِيَّةِ قَالَ مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعِيْرٍ قَدْ لَحِقَ ظَهْرُهُ بِبَطْنِهِ فَقَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ فِيْ هٰذِهِ الْبَهَائِمِ الْمُعْجَمَةِ فَارْكَبُوْهَا صَالِحَةً وَاتْرُكُوْهَا صَالِحَةً۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سہلؓ ابن حنظلیہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ ایک اونٹ کے قریب سے گزرے تو دیکھا کہ (بھوک و پیاس کی شدت اور سواری و باربرداری کی زیادتی سے) اس کی پیٹھ پیٹ سے لگ گئی تھی آپ ﷺ نے فرمایا "ان بے زبان چوپایوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور ان پر ایسی حالت میں سواری کرو، جب کہ وہ قوی اور سواری کے قابل ہوں اور ان کو اس اچھی حالت میں چھوڑ دو کہ وہ تھکے نہ ہوں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "ان بے زبان چوپایوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو" کا مطلب یہ ہے کہ یہ بولنے پر قادر نہیں ہیں کہ اپنی بھوک و پیاس وغیرہ کا حال اپنے مالک سے بیان کر سکیں اس لئے ان کے چارہ پانی کے جو بھی اوقات ہوں ان میں ان کو کھلانے پلانے میں کوتاہی نہ کرو۔ اس میں گویا اس بات کی دلیل ہے کہ چوپایوں کا چارہ پانی ان کے مالکوں پر واجب ہے۔

"ان پر ایسی حالت میں سواری نہ کرو الخ" کا مقصد گھاس دانہ کے ذریعہ کی خبرگیری رکھنے کی ترغیب دلانا ہے کہ ان کے گھاس دانہ میں کمی و کوتاہی نہ کرو تاکہ یہ قوی اور سواری کے قابل رہیں، نیز جب یہ تھکنے کے قریب ہوں تو ان کو چھوڑ دو اور گھاس دانہ دو جب وہ کھا پی لیں اور ان میں توانائی آجائے تو اس کے بعد ان پر سواری یا باربرداری کرو، کیونکہ اس طرح چوپائے فربہ ہوتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مال یتیم کے بارے حکم خداوندی

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَ قَوْلُهُ تَعَالٰی وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ وَقَوْلُهُ تَعَالٰی اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اَلْاٰیَته اِنْطَلَقَ مَنْ کَانَ عِنْدَهُ یَتِیْمٌ فَعَزَلَ طَعَامَهُ مِنْ طَعَامِه وَشَرَابَهُ مِنْ شَرَابِهٖ فَاِذَا فَضَلَ مِنْ طَعَامِ الْیَتِیْمِ وَشَرَابِهٖ شَیْءٌ حُبِسَ لَهُ حَتّٰی یَاْکُلَهُ اَوْ یَفْسُدَ فَاشْتَدَّ ذَالِکَ عَلَیْهِمْ فَذَکَرُوْا ذٰلِکَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُکُمْ فَخَلَطُوْا طَعَامَهُمْ بِطَعَامِهِمْ وَشَرَابَهُمْ بِشَرَابِهِمْ۔ (رواه ابوداؤد والنسائی)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔ "یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر اس عادت کے ساتھ جو نیکی پر مبنی ہے (یعنی امانت و دیانت کے ساتھ) اور بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال از راہ ظلم (بلا استحقاق) کھاتے (برتتے) ہیں تو جن لوگوں کے پاس (یعنی جن کی نگرانی و پرورش میں) یتیم تھے انہوں نے (سخت احتیاط برتنی) شروع کی اور ان کے کھانے کے سامان کو اپنے کھانے کے سامان سے اور ان کے پینے کی چیزوں کو اپنے پینے کی چیزوں سے الگ کر دیا یہاں تک کہ ان یتیموں کے کھانے پینے کی چیزوں میں سے جو کچھ بچ رہتا اس کو اٹھا کر رکھ دیا جاتا جس کو وہ یتیم یا دوسرے وقت کھا لیتا یا وہ خراب ہو جاتا تھا یہ بات ان نگرانوں کو بڑی شاق گزری چنانچہ انہوں نے رسول کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور جو لوگ آپ (ﷺ) سے یتیم بچوں کا حکم پوچھتے ہیں، فرما دیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا زیادہ بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو وہ بچے تمہارے (دینی) بھائی ہیں چنانچہ (اس آیت کے نازل ہونے کے بعد) ان نگرانوں نے یتیموں کے کھانے پینے کو اپنے کھانے میں ملا لیا۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: حدیث میں مذکورہ دوسری آیت پوری یوں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا۔ (النساء ۴: ۱۰)

"بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال از راہ ظلم (یعنی بلا استحقاق) کھاتے (برتتے) ہیں وہ در اصل اپنے پیٹ میں (دوزخ) کی آگ بھر رہے ہیں اور وہ عنقریب جلتی آگ میں داخل ہوں گے۔"

آخری آیت پوری یوں ہے:

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُکُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَکُمْ۔ (البقرہ ۲: ۲۲۰)

"اور لوگ آپ (ﷺ) سے یتیم بچوں کے (مال کو علیحدہ یا شامل رکھنے) کا حکم پوچھتے ہیں آپ (ﷺ) ان سے فرما دیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا زیادہ بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو وہ بچے تمہارے (دینی) بھائی ہیں اور اللہ تعالیٰ مصلحت کے ضائع کرنے والے اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو الگ الگ جانتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو سخت قانون مقرر کر کے تم کو مصیبت میں ڈال دیتے۔"

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ یتیموں کے مال کے بارہ میں جب قرآن کریم کی مذکورہ ہدایت کے مطابق یتیموں کے نگران اور مربیوں نے سخت احتیاط برتنی شروع کی۔ اور یتیموں کے مال کو اپنے مال و اسباب سے علیحدہ کر دینے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ذمہ داریوں کی

مشکلات میں اضافہ ہوا بلکہ یتیموں کے مال کا نقصان بھی ہونے لگا تو ان مربیوں کی عرض پر اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت عطا فرمائی کہ یتیموں کے نگران ان یتیموں کے مال کو اپنے مال و اسباب میں ملا سکتے ہیں اور وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ الخ کے ذریعہ اس طرف ارشاد فرمایا کہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ مخلوط تو کر لو لیکن ان کے خیر خواہ اور ہمدرد بہر صورت رہو اپنی نیتوں کو خراب نہ کرو اور ان کے مال کو فریب و دغا کے ذریعہ نقصان نہ پہنچاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ مصلحت کی رعایت رکھنے والوں اور نہ رکھنے والوں کو خوب جانتا ہے اگر کسی نگران نے بدنیتی، بدخواہی اور بددیانتی کے ساتھ یتیم کے مال پر تصرف کیا تو اس کو سخت سزا دی جائے گی۔

منقول ہے کہ حضرت امام محمدؒ کے ایک شاگرد کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے اس کی کتابیں فروخت کر کے اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ کے اس شاگرد نے اس کی وصیت تو کی نہیں تھی آپ نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت امام محمدؒ نے اس کے جواب میں یہی آیت وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ پڑھی۔

باپ بیٹوں یا دو بھائیوں میں جدائی نہ ڈالو

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ الْوَالِدِ وَوَلَدِہٖ وَبَیْنَ الْاَخِ وَبَیْنَ اَخِیْہِ۔ (رواہ ابن ماجۃ والدار قطنی)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو باپ اور اس کے بیٹے کے درمیان اور دو بھائیوں کے درمیان جدائی ڈالے۔" (ابن ماجہؒ، دار قطنیؒ)

تشریح: جدائی ڈالنے سے مراد ان دونوں میں سے کسی ایک کو بیچ ڈالنا یا ہبہ وغیرہ کر دینا ہے بشرطیکہ بیٹا یا ایک بھائی چھوٹا (کمسن) ہو اس کی تفصیل حضرت ابوایوبؓ کی روایت کی تشریح میں پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ یا جدائی ڈالنے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ کسی باپ بیٹے یا دو بھائیوں کے درمیان لگائی بجھائی کے ذریعہ خفگی و ناراضگی اور جدائی پیدا کر دی جائے۔

(۲۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِیَ بِالسَّبْیِ اَعْطَی اَھْلَ الْبَیْتِ جَمِیْعًا کَرَاھِیَۃَ اَنْ یُفَرِّقَ بَیْنَھُمْ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جب (کسی غزوہ وغیرہ میں) قیدی لائے جاتے تو نبی کریم ﷺ پورے گھر کو ہم میں سے کسی ایک شخص کو (بطور لونڈی غلام) عطا فرما دیتے تھے (یعنی قیدیوں میں ایک گھر کے جتنے بھی افراد ہوتے ان سب کو آپ کسی ایک ہی شخص کے حوالے کر دیتے تھے) کیونکہ ان کے درمیان جدائی ڈالنا آپ ﷺ کو ناپسند تھا۔" (ابن ماجہؒ)

کون لوگ برے ہیں

(۳۰) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِشِرَارِکُمُ الَّذِیْ یَاْکُلُ وَحْدَہٗ وَیَجْلِدُ عَبْدَہٗ وَیَمْنَعُ رِفْدَہٗ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں یہ نہ بتادوں کہ تم میں برے لوگ کون ہیں؟ (تو سنو) برا وہ شخص ہے جو کھانا تنہا کھائے، اپنے غلام کو (ناحق) مارے اور کسی اپنی بخشش و عطاء سے فائدہ نہ پہنچائے۔" (رزینؒ)

تشریح: اس حدیث میں چند ایسی چیزوں کو ذکر کیا گیا ہے جو ناپسندیدہ اور بری ہیں اور یہ چیزیں جن لوگوں کی خصلت بن جاتی ہیں وہ ناپسندیدہ اور برے سمجھے جاتے ہیں، چنانچہ سب سے تنہا ہو کر کھانا برا ہے، اپنے غلام کو بلا کسی جرم و خطا کے مارنا برا ہے اور کسی کو کچھ نہ دینا برا ہے حاصل یہ ہے کہ جو لوگ بدخلق اور بخیل ہوں وہ برے ہیں۔

جامع صغیر میں ابن عساکر نے حضرت معاویہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ (آنحضرت ﷺ نے) فرمایا "کیا میں تمہیں یہ نہ بتادوں کہ لوگوں میں برے کون ہیں؟ براوہ شخص ہے جو کھانا تنہا کھائے کسی کو اپنی بخشش و عطاء سے فائدہ نہ پہنچائے، تنہاء سفر کرے اور اپنے غلام کو (ناحق) مارے۔ اور کیا تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ اس سے بھی براکون شخص ہے؟ وہ شخص اس سے بھی برا ہے جو لوگوں سے بغض رکھے اور لوگ اس سے بغض رکھیں اور کیا تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ اس سے بھی براکون شخص ہے؟ اس سے بھی برا وہ شخص ہے جس کے شرو فتنہ سے لوگ ڈریں اور اس سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھیں اور کیا تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ اس سے بھی براکون شخص ہے؟ اس سے بھی براوہ شخص ہے جو اپنی آخرت کو دنیا کے عوض بیچ دے۔ اور کیا تمہیں نہ بتاؤں کہ اس سے بھی براکون شخص ہے؟ اس سے بھی براوہ شخص ہے جو دین کے ذریعہ دنیا کمائے۔

لونڈی غلاموں کو اپنی اولاد اور اپنے بھائی کی طرح رکھو

(۳۱) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ سَیِّئُ الْمَلَکَۃِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَلَیْسَ اَخْبَرْتَنَا اَنَّ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ اَکْثَرُ الْاُمَمِ مَمْلُوْکِیْنَ وَیَتَامٰی قَالَ نَعَمْ فَاَکْرِمُوْھُمْ کَکَرَامَۃِ اَوْلَادِکُمْ وَاَطْعِمُوْھُمْ مِمَّا تَاْکُلُوْنَ قَالُوْا فَمَا تَنْفَعُنَا الدُّنْیَا قَالَ فَرَسٌ تَرْتَبِطُہٗ تُقَاتِلُ عَلَیْہِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَمْلُوْکٌ یَکْفِیْکَ فَاِذَا صَلّٰی فَھُوَ اَخُوْکَ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے غلام لونڈی کے ساتھ برائی کرنے والا کبھی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (یہ سن کر) صحابہؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ! کیا آپ (ﷺ) نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ آپ (ﷺ) کی امت، غلام لونڈی اور یتیموں کے اعتبار سے پچھلی تمام امتوں سے بڑھی ہوئی ہوگی (یعنی آپ (ﷺ) کی اُمت میں غلام لونڈی اور یتیم بہت ہوں گے تو کیا اتنی کثرت کی حالت میں سب کے ساتھ خوش خلقی کا برتاؤ کرنا ممکن ہوگا؟) آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! (میری اُمت میں لونڈی غلام بہت ہوں گے اور اتنی کثرت کی حالت میں سب ہی کے ساتھ خوش خلقی کا برتاؤ کرنا مشکل بھی بہت ہوگا لیکن اگر تم جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو تم ان کے ساتھ دوسری طرح ایسے احسان کرو جو ان کے ساتھ تمہاری بدخلقی کا بدلہ ہو جائیں اور وہ احسان یہ ہے کہ) تم ان کو اپنے کی طرح عزیز رکھو (یعنی ان پر بایں طور نرمی و رحم کیا کرو کہ ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کے بس سے باہر ہو اور ان پر ظلم و زیادتی نہ کیا کرو) اور ان کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمیں دنیا میں نفع پہنچانے والی کون سی چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ایک گھوڑا جس کو تم اللہ کی راہ میں لڑنے کے لئے باندھ رکھو اور ایک غلام جو تمہیں کفایت کرے (یعنی وہ تمہارے دنیاوی امور کو انجام دیتا رہے تاکہ تم فارغ رہ کر آخرت کے امور انجام دے سکو اور اگر تمہارا غلام نماز پڑھے تو وہ تمہارا بھائی ہے۔ (لہٰذا اس کے ساتھ بھائی جیسا سلوک کرو)۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: یہ فرمایا گیا ہے کہ اُمت میں لونڈی غلام اور یتیم بہت زیادہ ہوں گے تو اس کا سبب یہ ہے کہ جب جہاد کثرت سے ہوگا تو کفار کے قیدی بھی کثرت سے ہاتھ آئیں گے اور جہاد کی کثرت ہی سے مسلمان شہید ہوں گے اور جب مسلمان شہید ہوں گے تو ان کے بچے یتیم ہو جائیں گے۔

بَابُ بُلُوْغِ الصَّغِیْرِ وَحِضَانَتِہٖ فِی الصِّغَرِ

چھوٹے بچوں کی تربیت و پرورش اور ان کے بالغ ہونے کا بیان

اس باب میں یہ بیان کیا جائے گا۔ کہ لڑکے اور لڑکی کے بالغ ہونے کی علامت اور حد کیا ہے اور یہ کہ بچے کی تربیت و پرورش کرنے کا

حق کس پر ہے؟

بلوغ کی علامت و عمر: لڑکے کے بالغ ہونے کی علامت یہ کہ اس کو احتلام ہونے لگے اور اس میں عورت کو حاملہ کر دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور انزال ہو سکتا ہو۔ اسی طرح لڑکی کے بالغ ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کو ماہواری آجائے احتلام ہو جائے اور اس کے حمل ہو سکتا ہو اگر یہ علامتیں نہ پائی جائیں تو پھر جب لڑکے اور لڑکی دونوں کی عمر پندرہ سال کی ہو جائے تو وہ بالغ کے حکم میں داخل ہو جائیں گے۔ فتویٰ اسی قول پر ہے لڑکے کے بالغ ہونے کی کم سے کم مدت بارہ برس کی عمر ہے اور لڑکی کے بالغ ہونے کی کم سے کم مدت نو برس ہے۔

اگر لڑکا لڑکی بالغ ہونے کے قریب ہوں اور وہ یہ کہیں کہ ہم بالغ ہو گئے ہیں تو ان دونوں کی اس بات کو صحیح سمجھا جائے گا اور وہ دونوں حکم میں بالغ کی مانند ہوں گے۔

بچہ کی پرورش کا حق کس کو ہے؟: چھوٹے بچے کی پرورش کا حق سب سے زیادہ ماں کو ہے خواہ وہ شادی قائم ہونے کی حالت میں ہو یا اس کو طلاق دے دی گئی ہو ہاں اگر ماں مرتد یا بدکار ہے۔ جس سے امن نہ ہو تو پھر اس کو حق سب سے زیادہ نہیں ہو گا۔ اگر ماں طلاق کے بعد بچہ کی پرورش کرنے سے انکار کر دے تو صحیح یہ ہے کہ اس کو مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ عاجز ہو لیکن اگر اس بچہ کا کوئی ذی رحم اس کی ماں کے علاوہ نہ ہو تو بچہ کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ماں کو پرورش کرنے کے لئے مجبور کیا جائے گا۔ اگر ماں نے (بچہ کے باپ کی وفات یا طلاق کے بعد) اس بچہ کے غیر محرم سے شادی کر لی تو پھر اس بچہ کی پرورش کا سب سے زیادہ حق اس کو نہیں ہو گا اور اس نے کسی محرم سے شادی کر لی ہے مثلاً بچہ کے چچا سے نکاح کر لیا ہے تو اس صورت میں اس کا حق ساقط نہیں ہو گا اسی طرح ماں نے پہلے کسی غیر محرم سے نکاح کر لیا، اور اس کی وجہ سے اس کا حق ساقط ہو گیا مگر پھر ماں نے (اس غیر محرم کی وفات یا طلاق کے بعد) کسی محرم سے جیسے بچہ کے چچا سے شادی کر لی تو اب اس کو پرورش کا سب سے زیادہ حق مل جائے گا۔

اگر بچہ کی ماں پرورش کا حق نہ رکھتی ہو، بایں سبب کہ اس نے غیر محرم سے شادی کر لی ہے یا مرتد ہو گئی اور یا وہ مر گئی ہو تو پھر اس بچہ کی پرورش کا حق سب سے زیادہ نانی کو ہو گا۔ اگر نانی موجود نہ ہو تو اس سے اوپر کے درجہ والی مثلاً پڑنانی وغیرہ کو ہو گا نانی و پرنانی وغیرہ کے بعد پرورش کرنے کی سب سے زیادہ مستحق دادی و پردادی وغیرہ ہو گی، اگر دادی و پردادی وغیرہ بھی موجود نہ ہو تو پرورش کا سب سے زیادہ حق بچہ کی حقیقی بہن اس کے بعد اخیافی بہن اور اس کے بعد سوتیلی بہن کو ہو گا اور اگر ان میں سے بھی کوئی موجود نہ ہو۔ یا پرورش کرنے کی اہلیت نہ رکھتی ہو تو پھر اسی ترتیب کے مطابق پرورش کرنے کا حق سب سے زیادہ بچہ کی خالہ کو اس کے بعد بچہ کی پھوپھی کو ہو گا اور بھانجیاں، بھتیجیوں اور بھتیجیاں پھوپھیوں سے اولی ہوں گی۔

استحقاق پرورش کے سلسلہ میں جن عزیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا آزاد ہونا شرط ہے لہٰذا باندی اور اُم ولد کو پرورش کا کوئی حق نہیں ہے لیکن ذمیہ مسلمہ کے حکم میں ہے کہ ذمیہ کو پرورش کا حق حاصل ہے بشرطیکہ بچہ دین کی سمجھ بوجھ کی عمر کو نہ پہنچ گیا ہو اگر ایسی کوئی بھی عورت موجود نہ ہو جس کو پرورش کا حق پہنچتا ہے تو پھر اس بچہ کی پرورش کا حق عصبات کو ہو گا اور ان کی ترتیب وہی ہو گی جو میراث پانے میں ہوتی ہے لیکن لڑکی کسی ایسے عصبہ کی پرورش میں نہ دی جائے جو غیر محرم ہو جیسا چچا کا لڑکا یا وہ فاسق و لاپرواہ ہو۔

حق پرورش کی مدت: حق پرورش کی مدت نو سال یا سات سال کی عمر مقرر کی گئی ہے اور قدوری نے لکھا ہے کہ جب بچہ تنہا کھانے پینے لگے کپڑا پہننے لگے اور خود استنجا کرنے لگے تو حق پرورش ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد اس بچہ کو اس کا باپ زبردستی اپنی تحویل و نگہداشت میں لے سکتا ہے اور لڑکی کی صورت میں ماں اور نانی اس وقت تک مستحق رہیں گی جب تک کہ اس کی لڑکی کو حیض نہ آجائے اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک لڑکی کے قابل شہوت ہونے تک ماں اور نانی کو پرورش کا استحقاق رہتا ہے جیسا کہ ماں، نانی اور دادی کے علاوہ دوسری عورتوں کے استحقاق کے بارہ میں یہ شرط ہے کہ جب لڑکی مرد کے قابل ہو جائے تو وہ ان کی پرورش سے نکل جائے گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عمر بلوغ پندرہ سال ہے

① وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ عُرِضْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ اُحُدٍ وَاَنَا ابْنُ اَرْبَعَ عَشْرَةَ سَنَةً فَرَدَّنِىْ ثُمَّ عُرِضْتُ عَلَيْهِ عَامَ الْخَنْدَقِ وَاَنَا ابْنُ خَمْسَ عَشْرَةَ سَنَةً فَاَجَازَنِىْ فَقَالَ عُمَرُ ابْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ هٰذَا فَرْقُ مَابَيْنَ الْمُقَاتِلَةِ وَالذُّرِّيَّةِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ (تین ہجری میں) غزوۂ احد کے موقع پر (جہاد میں جانے کے لئے) مجھے رسول کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا جب کہ میری عمر چودہ سال تھی مگر آنحضرت ﷺ نے مجھے واپس کر دیا۔ (یعنی جہاد میں شرکت کے لئے مجھ کو نہ لے گئے) پھر غزوۂ خندق کے موقع پر جب کہ میری عمر پندرہ سال تھی مجھے آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے مجھے (جہاد میں جانے کی) اجازت عطا فرما دی (کیونکہ بالغ ہونے کی عمر پندرہ سال ہے) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ "عمر لڑنے والوں اور لڑکوں کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ حدیث سنی تو مذکورہ بالا جملہ ارشاد فرمایا جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ جب لڑکا پندرہ سال کی عمر کو پہنچ جائے۔ اور جو پندرہ سال کی عمر کو نہ پہنچے اس کو نابالغ لڑکوں میں شمار کیا جائے اس سے معلوم ہوا کہ بالغ ہونے کی عمر پندرہ سال ہے۔

حضرت حمزہ کی صاحبزادی کی پرورش کا تنازعہ اور اس کا تصفیہ

② وَعَنِ الْبَرَاءِ ابْنِ عَازِبٍ قَالَ صَالَحَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ عَلٰى اَنَّ مَنْ اَتَاهُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ رَدَّهُ اِلَيْهِمْ وَمَنْ اَتَاهُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ لَمْ يَرُدُّوْهُ وَعَلٰى اَنْ يَدْخُلَهَا مِنْ قَابِلٍ وَيُقِيْمُ بِهَا ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَلَمَّا دَخَلَهَا وَمَضَى الْاَجَلُ خَرَجَ فَتَبِعَتْهُ ابْنَةُ حَمْزَةَ تُنَادِىْ يَا عَمِّ يَا عَمِّ فَتَنَاوَلَهَا عَلِىٌّ فَاَخَذَ بِيَدِهَا فَاخْتَصَمَ فِيْهَا عَلِىٌّ وَزَيْدٌ وَجَعْفَرٌ فَقَالَ عَلِىٌّ اَنَا اَخَذْتُهَا وَهِىَ بِنْتُ عَمِّىْ وَقَالَ جَعْفَرٌ بِنْتُ عَمِّىْ وَخَالَتُهَا تَحْتِىْ وَقَالَ زَيْدٌ بِنْتُ اَخِىْ فَقَضٰى بِهَا النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِخَالَتِهَا وَقَالَ الْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْاُمِّ وَقَالَ لِعَلِىٍّ اَنْتَ مِنِّىْ وَاَنَا مِنْكَ وَقَالَ لِجَعْفَرٍ اَشْبَهْتَ خَلْقِىْ وَخُلُقِىْ وَقَالَ لِزَيْدٍ اَنْتَ اَخُوْنَا وَمَوْلَانَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن (کفار مکہ سے) تین باتوں پر صلح کی تھی ایک تو یہ کہ مشرکوں میں سے جو شخص آپ کے پاس آجائے آپ ﷺ اسے واپس فرما دیں گے، دوسرے یہ کہ آپ ﷺ آئندہ سال (مدینہ سے) مکہ تشریف لائیں اور اپنا عمرہ قضا کریں اور (ارکان عمرہ کی ادائیگی اور استراحت کے لئے) مکہ میں صرف تین دن قیام فرمائیں، چنانچہ (آئندہ سال) جب آپ ﷺ مکہ تشریف لائے اور متعینہ مدت پوری ہو گئی (یعنی تین دن گزر گئے) اور آپ ﷺ نے (مکہ سے) واپسی کا ارادہ کیا تو حضرت حمزہ کی بیٹی، اے میرے چچا اے میرے چچا کہتی ہوئی آپ ﷺ کے پیچھے لگ گئی حضرت علیؓ نے اس کو پکڑنے (یعنی اپنے ہمراہ لینے) کا ارادہ کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا (یعنی اپنے ہمراہ لے لیا، اس کے بعد حضرت حمزہ کی اس بیٹی کی پرورش کے بارہ میں حضرت علیؓ حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کے درمیان تنازعہ پیدا ہو گیا حضرت علیؓ تو یہ کہتے تھے کہ پہلے میں نے اس بچی کو لیا ہے اور یہ میرے چچا کی بیٹی ہے (اس لئے اس کی پرورش کا سب سے زیادہ حق مجھ کو ہے) اور حضرت جعفرؓ یہ کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے (اس لئے اس کی پرورش کا سب سے زیادہ حق مجھ کو ہے) نبی کریم ﷺ نے (اس تنازعہ کا فیصلہ اس طرح کیا کہ) اس کو اس کی خالہ کے

سپرد کر دیا (جو جعفرؓ کے نکاح میں تھیں) اور فرمایا کہ خالہ ماں کے برابر ہے، پھر آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو (یعنی ہم دونوں میں کمال اخلاص و یگانگت ہے) اور حضرت جعفرؓ سے فرمایا کہ تم میری پیدائش اور میرے خلق میں مشابہ ہو۔ اور حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ "تم ہمارے بھائی اور ہمارے محبوب ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "حدیبیہ" مکہ سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر بجانب جدہ ایک جگہ کا نام ہے ۶ھ میں آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کی معیت میں عمرہ کرنے کے لئے مدینہ سے مکہ کو روانہ ہوئے جب حدیبیہ پہنچے تو کفار مکہ نے وہیں سے روک دیا اور مکہ میں نہ آنے دیا اور پھر اس مقام پر آنحضرت ﷺ اور کفار مکہ کے درمیان ایک معاہدہ کے تحت صلح ہوئی جس کی تین بنیادی دفعات کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے یہ "صلح حدیبیہ" بڑا مشہور واقعہ ہے اور اس کا تفصیلی بیان ان شاء اللہ کتاب الجہاد میں آئے گا۔

حضرت حمزہؓ آنحضرت ﷺ کے چچا اور دودھ شریک بھائی بھی تھے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اور حضرت حمزہؓ نے ابولہب کی لونڈی ثوبیہ کا دودھ پیا تھا اسی رشتہ رضاعت کی بناء پر حضرت حمزہؓ کی بیٹی نے آنحضرت ﷺ کو چچا کہا۔

حضرت جعفرؓ آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی یعنی ابوطالب کے لڑکے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بھائی تھے اور عمر میں حضرت علیؓ سے دس سال بڑے تھے۔

حضرت زید ابن ثابتؓ ایک غلام تھے جن کو آنحضرت ﷺ نے آزاد کیا تھا۔ اور اپنا متبنی (لے پالک) بنایا تھا ان سے آنحضرت ﷺ کو بہت محبت تھی چونکہ آپ ﷺ نے دوسرے صحابہؓ کی مانند حضرت حمزہ اور حضرت زیدؓ کے درمیان بھائی چارہ کا تعلق قائم کر دیا تھا، اس لئے حضرت زیدؓ نے حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو بھتیجی کہا۔

حضرت علیؓ جب حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو مدینہ لے آئے تو اس کی پرورش کے بارہ میں مذکورہ بالا تینوں حضرات کے درمیان تنازعہ ہوا ان میں سے ہر ایک یہ دعوی کرتا تھا کہ اس بچی کی پرورش کرنا سب سے زیادہ میرا حق ہے اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ یہ میری تربیت و کفالت میں رہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس تنازعہ کا فیصلہ اس طرح فرمایا کہ اس بچی کو اس کی خالہ کی پرورش میں دے دیا جو حضرت جعفرؓ کے نکاح میں تھیں اور ان تینوں حضرات کی تسلی اور ان کا دل خوش کرنے کے لئے مذکورہ کلمات ارشاد فرمائے تاکہ وہ آزردہ نہ ہوں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

کس بچہ کی پرورش کا سب سے زیادہ حق اس کی ماں کو ہے؟

(۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ ابْنِيْ هٰذَا كَانَ بَطْنِيْ لَهٗ وِعَاءً وَثَدْيِيْ لَهٗ سِقَاءً وَحِجْرِيْ لَهٗ حِوَاءً وَاِنَّ اَبَاهُ طَلَّقَنِيْ وَاَرَادَ اَنْ يَنْزِعَهٗ مِنِّيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْتِ اَحَقُّ بِهٖ مَالَمْ تَنْكِحِيْ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد مکرم (حضرت شعیبؒ) اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت نے عرض کیا "یارسول اللہ! میرا یہ بیٹا کہ (ایک مدت تک) میرا پیٹ اس کا برتن رہا (یعنی مدتوں یہ میرے پیٹ میں رہا) میری چھاتی اس کی مشک رہی (یعنی مدتوں میری چھاتی سے دودھ پیتا رہا) اور میری گود اس کا گہوارہ رہی (یعنی مدتوں میں نے اس کو اپنی گود میں پالا ہے) اب اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور میرے بیٹے کو بھی مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا۔ "جب تک تم کسی سے نکاح نہ کرو اس بچہ کی پرورش کرنے کی تم سب سے زیادہ مستحق ہو۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث کے بعد جو حدیث آرہی ہے اس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لڑکے کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی ماں کے پاس رہے اور چاہے اپنے باپ کے ہاں رہے اس طرح دونوں حدیثوں کے مفہوم میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے چنانچہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جس لڑکے کا ذکر ہے ہوسکتا ہے کہ وہ کم سن رہا ہو اور سن تمیز کو نہ پہنچا ہو اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی پرورش کا سب سے زیادہ حق ماں کو دیا جب کہ آگے آنے والی حدیث میں جس لڑکے کا ذکر کیا گیا ہے وہ سن تمیز کو پہنچ چکا تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس کو یہ حق دے دیا کہ وہ اپنے اختیار تمیزی کی بنا پر ماں باپ میں سے جس کو چاہے پسند کرے اور اس کے پاس چلا جائے "جب تک کہ تم کسی سے نکاح نہ کرو" اس بارہ میں یہ حدیث مطلق ہے لیکن علماء نے اس مسئلہ کو "غیر محرم" کے ساتھ مقید کیا ہے یعنی اگر مطلقہ ماں وغیرہ کسی ایسے شخص کے ساتھ شادی کرلے جو لڑکے کا غیر محرم ہے تو اس کو اس لڑکے کی پرورش کا حق نہیں رہتا۔ اور اگر کسی ایسے شخص سے شادی کرے جو لڑکے کا محرم ہے جیسے اس کے چچا سے نکاح، تو اس صورت میں اس کو پرورش کا حق رہتا ہے کیونکہ وہ محرم لڑکے کے حق میں یقیناً شفیق و مہربان ثابت ہوگا۔

مدت پرورش کے بعد لڑکے کو ماں باپ میں سے کسی کے بھی پاس رہنے کا اختیار ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيَّرَ غُلَامًا بَيْنَ اَبِيْهِ وَاُمِّهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک لڑکے کو یہ اختیار دیا کہ وہ چاہے اپنے باپ کے پاس رہے اور چاہے اپنی ماں کے پاس رہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جیسا کہ اس سے پہلے کی حدیث کی تشریح میں بتایا گیا ہے یہ لڑکا چونکہ سن تمیز کو پہنچ گیا تھا یعنی بالغ ہوگیا تھا۔ اس لئے اس کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ خواہ اپنے باپ کے پاس چلا جائے۔ خواہ وہ اپنی ماں کے پاس رہے لہٰذا اس کا تعلق "حضانۃ" (یعنی پرورش کرنے) کے باب اور مسئلہ سے نہیں ہے جب کہ پہلی حدیث میں جس لڑکے کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق "حضانۃ" کے مسئلہ سے ہے اس لئے آپ ﷺ نے حضانۃ یعنی پرورش کرنے کے حق کے بارہ میں ماں کو مقدم رکھا۔

چنانچہ حنفیہ کے نزدیک یہی مسئلہ ہے کہ "مدت پرورش" میں لڑکے کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ چاہے تو اپنی ماں کے پاس رہے اور چاہے باپ کے پاس رہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک لڑکے کو مدت پرورش میں بھی یہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔

⑤ وَعَنْهُ قَالَ جَاءَتِ امْرَاَةٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اِنَّ زَوْجِیْ يُرِيْدُ اَنْ يَّذْهَبَ بِابْنِیْ وَقَدْ سَقَانِیْ وَنفعَنِی فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا اَبُوْكَ وَهٰذِهٖ اُمُّكَ فَخُذْ بِيَدِ اَيِّهِمَا شِئْتَ فَاَخَذَ بِيَدِ اُمِّهٖ فَانْطَلَقَتْ بِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک عورت رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ "میرا خاوند چاہتا ہے کہ میرے بیٹے کو لے جائے حالانکہ وہ مجھے پانی پلاتا ہے اور نفع پہنچاتا ہے (یعنی وہ اب اس عمر کو پہنچ گیا ہے کہ میں اس کی خدمت سے فائدہ اٹھاتی ہوں) نبی کریم ﷺ نے (اس لڑکے سے) فرمایا کہ یہ تمہارا باپ اور یہ تمہاری ماں ہے ان میں سے تم جس کو پسند کرو اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ چنانچہ اس لڑکے نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اس کو اپنے ساتھ لے گئی۔" (ابوداؤد، نسائی، دارمیؒ)

⑥ وَعَنْ هِلَالِ بْنِ اُسَامَةَ عَنْ اَبِیْ مَيْمُوْنَةَ سُلَيْمَانَ مَوْلًى لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ قَالَ بَيْنَمَا اَنَا جَالِسٌ مَعَ اَبِیْ هُرَيْرَةَ جَاءَتْهُ امْرَاَةٌ فَارِسِيَّةٌ مَعَهَا ابْنٌ لَهَا وَقَدْ طَلَّقَهَا زَوْجُهَا فَادَّعَيَاهُ فَرَطَنَتْ لَهٗ تَقُوْلُ يَا اَبَاهُرَيْرَةَ زَوْجِیْ يُرِيْدُ اَنْ يَّذْهَبَ بِابْنِیْ فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ اسْتَهِمَا عَلَيْهِ رَطَنَ لَهَا بِذٰلِكَ فَجَاءَ زَوْجُهَا وَقَالَ مَنْ يُّحَاقُّنِیْ فِیْ ابْنِیْ فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ هٰذَا اِلَّا اَنِّیْ كُنْتُ قَاعِدًا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَتْهُ امْرَاَةٌ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ زَوْجِیْ يُرِيْدُ

اَنْ يَذْهَبَ بِابْنِي وَقَدْ نَفَعَنِي وَسَقَانِي مِنْ بِئْرِ اَبِي عِنَبَةَ وَعِنْدَ النَّسَائِيِّ مِنْ عَذْبِ الْمَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَهِمَا عَلَيْهِ فَقَالَ زَوْجُهَا مَنْ يُحَاقِّنِي فِي وَلَدِي فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا اَبُوْكَ وَهٰذِهِ اُمُّكَ فَخُذْ بِيَدِ اَيِّهِمَا شِئْتَ فَاَخَذَ بِيَدِ اُمِّهِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ لٰكِنَّهُ ذَكَرَ الْمُسْنَدَ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ هِلَالِ بْنِ اُسَامَةَ۔

"حضرت ہلال ابن اسامہؓ حضرت میمونہؓ سے کہ جن کا نام سلیمان تھا اور اہل مدینہ میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا (ایک دن) جب کہ میں حضرت ابوہریرہؓ کے ہاں بیٹھا ہوا تھا ان کے پاس فارس کی ایک عورت آئی جس کے ساتھ اس کا لڑکا بھی تھا اور اس کے خاوند نے اس کو طلاق دے دی تھی اور میاں بیوی کے درمیان اس لڑکے کے بارہ میں تنازعہ تھا اس عورت نے ابوہریرہؓ سے فارسی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ابوہریرہؓ میرا شوہر میرے بیٹے کو لے جانا چاہتا ہے! حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ تم دونوں اس پر قرعہ ڈالو (جس کے نام قرعہ نکل آئے وہ اس لڑکے کو لے لے) حضرت ابوہریرہؓ نے بھی اس عورت کے سامنے اسی مفہوم کو فارسی زبان میں ادا کیا پھر اس عورت کا خاوند آ گیا کہ میرے بیٹے کے بارہ میں مجھ سے کون جھگڑا کرتا ہے؟ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ "یا اللہ! میں یہ بات (اپنی طرف سے) نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک عورت آئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ میرا شوہر چاہتا ہے کہ میرے بیٹے کو مجھ سے چھین لے جب کہ یہ مجھے فائدہ پہنچاتا ہے اور ابوعنبہ کے کنوئیں سے مجھ کو پانی اور نسائیؒ میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ (شہر کے باہر کافی فاصلہ سے) میٹھا پانی (لاکر) مجھ کو پلاتا ہے۔ یہ سن کر رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "تم دونوں اس پر قرعہ ڈالو خاوند نے کہا کہ "میرے بیٹے کے بارہ میں مجھ سے کون جھگڑا کرتا ہے؟" پھر رسول کریم ﷺ نے (اس لڑکے سے) فرمایا "کہ یہ تمہارا باپ ہے اور یہ تمہاری ماں ہے ان دونوں میں سے تم جس کو پسند کرو، اس کا ہاتھ پکڑ لو! چنانچہ اس لڑکے نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ (اور وہ اس کو اپنے ساتھ لے گئی)۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: حضرت ابوہریرہؓ نے اس عورت سے جو فارسی زبان میں گفتگو کی اس سے معلوم ہوا کہ بعض صحابہؓ اہل عجم کے ساتھ میل جول رکھنے اور ان کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے ان کی زبان سیکھ گئے تھے۔

اس حدیث میں جس لڑکے کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی بالغ تھا اور چونکہ بالغ کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ چاہے ماں کے پاس رہے اور چاہے باپ کے ساتھ رہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کو یہ حق دے دیا اور اس نے ماں کے پاس رہنے کو اختیار کیا، اس لڑکے کے بالغ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ شہر کے باہر بہت دور دور سے پانی بھر کر لاتا تھا اگر وہ نابالغ ہوتا تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنی کمسنی کی وجہ سے شہر کے باہر اتنی دور سے پانی بھر لانے کی ہمت نہ کرتا بلکہ اس کی ماں بھی اس خوف سے کہ کہیں یہ اپنی نادانی کی وجہ سے کنوئیں میں گر نہ جائے۔ اس کو اتنی دور سے پانی لانے کے لئے ہرگز نہ بھیجتیں۔

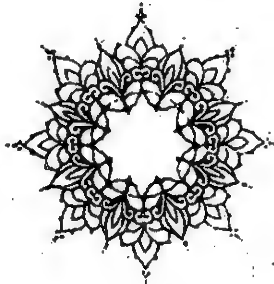

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب العتق

غلام کو آزاد کرنے کا بیان

آزادی کی شرعی حیثیت

شرعی نقطۂ نظر سے "آزادی" دراصل ایک ایسی قوت حکمیہ کا نام ہے جو انسان کو اس کا یہ فطری اور پیدائشی حق دیتی ہے کہ وہ مالک ہونے، سرپرست بننے اور شہادت (گواہی) دینے کا اہل بن جائے، چنانچہ جس انسان کا یہ فطری اور پیدائشی حق مسلوب ہوتا ہے بایں طور کہ وہ کسی غلامی میں ہوتا ہے اور پھر اسے آزادی کی صورت میں یہ قوت حکمیہ حاصل ہو جاتی ہے تو اس میں نہ صرف مالک ہونے کی لیاقت، سرپرست بننے کی قابلیت اور شہادت دینے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے بلکہ وہ اس قوت حکمیہ یا یہ کہئے کہ اس آزادی کی وجہ سے دوسروں پر تصرف کرنے اور دوسروں کے تصرف کو اپنے سے روکنے پر قادر ہو جاتا ہے اور وہ آزاد و خود مختار انسانوں کی صف میں آکھڑا ہوتا ہے۔

آزاد کرنے کی شرط

کسی بردہ (غلام باندی) کو آزاد کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ آزاد کرنے والا خود مختار ہو بالغ ہو، عقل مند ہو اور جس بردہ کو آزاد کر رہا ہے اس کا مالک ہو۔

آزاد کرنے کی قسمیں

غلام کو آزاد کرنا بعض صورتوں میں واجب ہے جیسے کفارہ، بعض صورتوں میں مستحب ہے اور بعض صورتوں میں گناہ بھی ہے، جیسے اگر یہ ظن غالب ہو کہ اگر اس غلام کو آزاد کر دیا جائے گا تو یہ دارالحرب بھاگ جائے گا یا مرتد ہو جائے گا یا یہ خوف ہو کہ چوری قزاقی کرنے لگے گا! بعض صورتوں میں مباح ہے۔ جیسے کسی شخص کی خاطر یا کسی شخص کو ثواب پہنچانے کے لئے بردہ کو آزاد کیا جائے اور بعض صورتوں میں عبادت ہے جیسے کسی بردہ کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے آزاد کیا جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بردہ (غلام یا باندی) کو آزاد کرنے کا اجر

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَعْتَقَ رَقَبَةً مُسْلِمَةً اَعْتَقَ اللّٰهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ

عُضْوًا مِنَ النَّارِ حَتّٰی فَرْجَهٗ بِفَرْجِهٖ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مسلمان بردہ کو غلامی سے نجات دے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کو اس بردہ کے ہر عضو کے بدلے دوزخ کی آگ سے نجات دے گا یہاں تک کہ اس کی شرمگاہ کو اس بردہ کی شرمگاہ کے بدلے (نجات دے گا)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مسلمان بردہ" میں اسلام کی قید اس لئے لگائی گئی ہے تاکہ اس فعل (آزاد کرنے) کا ثواب زیادہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو کسی بھی بردہ کو آزاد کرنا اجر کا باعث ہے لیکن اگر کسی مسلمان کو آزاد کیا جائے تو اس کے اجر کی حیثیت اور ثواب کی مقدار کہیں زیادہ ہوگی۔

"ہر عضو" کے ذکر کے بعد پھر "شرمگاہ" کو بطور خاص اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ زنا کی جگہ ہے اور زنا شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے لہٰذا وضاحت فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ جسم کے اس حصہ کو بھی نجات دے گا۔ اس کے پیش نظر بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ اس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ آزاد کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اس غلام کو آزاد کرے جو خصی یا ستر بریدہ نہ ہو، نیز یہ اولیٰ ہے کہ اگر آزاد کرنے والا مرد ہو تو وہ مرد (یعنی غلام) کو آزاد کرے اور اگر آزاد کرنے والی عورت ہو تو وہ عورت (یعنی باندی) کو آزاد کرے۔

گراں قیمت اور اپنا پسندیدہ غلام آزاد کرنا زیادہ بہتر ہے

(۲) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ سَاَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟ قَالَ اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ وَجِھَادٌ فِیْ سَبِیْلِہٖ۔ قَالَ قُلْتُ فَاَیُّ الرِّقَابِ اَفْضَلُ قَالَ اَغْلَاھَا ثَمَنًا وَاَنْفَسُھَا عِنْدَ اَھْلِھَا قُلْتُ فَاِنْ لَمْ اَفْعَلْ قَالَ تُعِیْنُ صَانِعًا اَوْ تَصْنَعُ لِاَخْرَقَ قُلْتُ فَاِنْ لَمْ اَفْعَلْ قَالَ تَدَعُ النَّاسَ مِنَ الشَّرِّ فَاِنَّھَا صَدَقَۃٌ تَصَدَّقُ بِھَا عَلٰی نَفْسِکَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ کون سا عمل بہتر ہے؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا" ابوذرؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے عرض کیا "کون سا بردہ آزاد کرنا بہتر ہے؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو گراں قیمت ہو اور اپنے مالک کو بہت پیارا ہو" میں نے عرض کیا کہ "اگر میں ایسا نہ کر سکوں؟ (یعنی ازراہ کسل نہیں بلکہ ازراہ عجز وعدم استطاعت ایسا غلام آزاد نہ کر سکوں؟)" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "کام کرنے والے کی مدد کرو یا جو شخص کسی چیز کو بنانا جانتا ہو اس کی وہ چیز بنا دو" میں نے عرض کیا "اگر میں یہ (بھی) نہ کر سکوں (تو کیا کروں؟)" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "لوگوں کو برائی پہنچانے سے اجتناب کرو یا در کھو یہ ایک اچھی خصلت ہے جس کے ذریعہ تم اپنے نفس کے ساتھ بھلائی کرتے ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ایمان کا بہتر ہونا تو بالکل بدیہی بات ہے کہ خیر و بھلائی کی بنیاد ہی ایمان ہے، اگر ایمان کی روشنی موجود نہ ہو تو پھر کوئی بھی عمل مقبول نہیں ہوتا خواہ وہ کتنا ہی اہم اور کتنا ہی افضل کیوں نہ ہو! اور جہاد اس اعتبار سے بہتر عمل ہے کہ وہ دین کی تقویت اور مسلمانوں کی برتری و عظمت اور غلبہ کا باعث ہوتا ہے۔

جہاں تک نماز، روزہ کا تعلق ہے وہ تو دوسری حیثیات اور دوسرے وجوہ کی بناء پر (ایک دوسرے) عمل سے برتر اور بہتر ہیں لہٰذا یہاں جہاد کو نماز و روزہ پر فوقیت دینا مراد نہیں ہے۔ یا پھر یہ کہ اس موقع پر "جہاد" سے مراد مطلق "مشقت برداشت کرنا" ہے جس کا تعلق جہاد سے بھی ہے اور دوسری طاعات و عبادات سے بھی، چنانچہ مامورات پر عمل کرنے اور منہیات سے بچنے کی نفسانی مشقت اور ریاضت کو "جہاد اکبر" فرمایا گیا ہے اس صورت میں آنحضرت ﷺ کے مذکورہ بالا جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ سب سے بہتر عمل، ایمان لانا اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ کام کرنے والے کی مدد کرو میں "کام سے" مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کے معاش کا ذریعہ ہو خواہ وہ صنعت و کاریگری ہو یا تجارت ہو۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی پیشہ و کسب میں لگا ہوا ہو اور اس کا وہ پیشہ و کسب اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضروریات کو پورا نہ کرتا ہو وہ شخص اپنے ضعف و مجبوری کی وجہ سے اس کسب و پیشہ

کو پوری طرح انجام نہ دے سکتا ہو تو تم اس شخص کی مدد کرو! اسی طرح "جو شخص کسی چیز کو بنانا نہ جانتا ہو الخ" کا مطلب بھی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے اپنے پیشے کے کام کو نہ کر سکتا ہو تو تم اس کا کام کر دو تاکہ وہ تمہارے سہارے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کر سکے۔

"لوگوں کو برائی پہنچانے سے اجتناب کرو" کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو برے کام میں مبتلا نہ کرو، کسی کو اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے ایذا نہ پہنچاؤ اور نہ کسی کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچاؤ کیونکہ لوگوں کو برائی پہنچانے سے اجتناب کرنا بھی خیر و بھلائی ہے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ برائی (یعنی کسی کو ایذاء و نقصان) پہنچانے پر قدرت بھی حاصل ہو۔

مراز خیر تو امید نیست شر مرساں

اس موقع پر عبارت کے ظاہری اسلوب کا تقاضہ یہ تھا کہ آپ ﷺ یوں فرماتے کہ "یہ ایک اچھی خصلت ہے جس کے ذریعہ تم لوگوں کے ساتھ بھلائی کرتے ہو" لیکن چونکہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا درحقیقت اپنے نفس کے ساتھ بھلائی کرنا ہے بایں طور کہ اس بھلائی کے مختلف فوائد اسے حاصل ہوتے ہیں اس لئے آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ "جس کے ذریعہ تم اپنے نفس کے ساتھ بھلائی کرتے ہو"۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بردہ کو آزاد کرنے یا بردہ کی آزادی میں مدد کرنے کی فضیلت

(۴) عن الْبراءِ بن عَازِبٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عَلِّمْنِی عَمَلاً یُدْخِلُنِی الْجَنَّةَ قَالَ لَئِنْ کُنْتَ اَقْصَرْتَ الْخُطْبَةَ لَقَدْ اَعْرَضْتَ الْمَسْئَلَةَ اَعْتِقِ النَّسَمَةَ وَفُکَّ الرَّقَبَةَ قَالَ اَوَلَیْسَا وَاحِدًا قَالَ لَا عِتْقُ النَّسَمَةِ اَنْ تَفَرَّدَ بِعِتْقِهَا وَفَکُّ الرَّقَبَةِ اَنْ تُعِیْنَ فِیْ ثَمَنِهَا وَالْمِنْحَةُ الْوَکُوْفُ وَالْفَیْءُ عَلٰی ذِی الرَّحِمِ الظَّالِمِ فَاِنْ لَمْ تُطِقْ ذٰلِكَ فَاَطْعِمِ الْجَائِعَ وَاسْقِ الظَّمْاٰنَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْکَرِ فَاِنْ لَمْ تُطِقْ ذٰلِكَ فَکُفَّ لِسَانَكَ اِلَّا مِنْ خَیْرٍ۔ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"حضرت براء ابن عازب ؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا کہ "مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جس کے ذریعہ میں (ابتدائی مرحلہ میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ) جنت میں داخل ہو جاؤں؟" آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ تم نے سوال کرنے میں بہت اختصار سے کام لیا ہے لیکن بڑی اہم بات دریافت کی ہے (پھر آپ ﷺ نے اس کو یہ عمل بتایا کہ) تم جان کو آزاد کرو اور بردہ کو نجات دو" دیہاتی نے عرض کیا کہ "کیا یہ دونوں باتیں (یعنی جان کو آزاد کرنے اور غلام کو نجات دینا) ایک ہی نہیں ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! جان کا آزاد کرنا تو یہ ہے کہ تم اس کو آزاد کرنے میں تنہا اور مستقل ہو اور بردہ کو نجات دینا یہ ہے کہ تم اس کی قیمت کی ادائیگی) میں اس کی مدد کرو (نیز جنت میں داخل کرنے والا یہ بھی عمل ہے کہ) تم کسی محتاج کو) شیر دار منحہ دو اور اس ظالم رشتہ دار پر مہربانی اور احسان کرو جو تم پر ظلم کرتا ہے! اگر تم سے یہ نہ ہو سکتے تو بھوکے کو کچھ کھلاؤ اور پیاسے کو پانی پلاؤ۔ نیز (لوگوں کو) بھلائی کی تلقین و تبلیغ کرو اور برائی سے روکو۔ اور اگر تم یہ (بھی) نہ کر سکو تو پھر (کم سے کم اتنا ہی کرو کہ) بھلی بات کے علاوہ اپنی زبان کو بند رکھو۔" (بیہقی)

تشریح: جان یعنی بردہ کو آزاد کرنا، اور بردہ کو نجات دینا، ان دونوں باتوں میں جو فرق واضح کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جان کو آزاد کرنا تو یہ ہے کہ تم خود اپنے بردہ کو آزاد کرو، اور بردہ کو نجات دینا یہ ہے کہ تم کسی دوسرے شخص کے بردہ کی آزادی کے لئے سعی و کوشش کرو، بایں طور کہ اس کی قیمت کی ادائیگی میں اس بردہ کی مدد کرو! مثال کے طور پر زید نے اپنے غلام کو لکھ کر دے دیا کہ جب تم مجھے اتنے

روپے ادا کر دو گے تو تم آزاد ہو جاؤ گے، اب اس غلام کی روپے پیسے سے امداد کرنا تاکہ وہ متعینہ رقم اپنے مالک زید کو ادا کر کے آزاد ہو جائے، دوسرے شخص کے بردہ کی آزادی کے لئے سعی و کوشش کرنا ہے، یاد رہے کہ ایسے غلام کو "مکاتب" کہا جاتا ہے۔

"منحہ" سے مراد وہ بکری یا اونٹنی ہے جو کسی محتاج کو اس مقصد سے عارضی طور پر دے دی جائے کہ وہ اس بکری یا اونٹنی کے دودھ یا ان کے بالوں سے نفع حاصل کرے اور "وکوف" بہت دودھ دینے والے جانور کو کہتے ہیں۔

"بھلی بات کے علاوہ اپنی زبان کو بند رکھو" اس مضمون کو ایک دوسری حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے۔

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْلِيَصْمُتْ۔

"جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اپنی زبان سے بھلائی (کی بات) نکالے یا خاموشی اختیار کرے۔"

ان دونوں فرمودات کا حاصل یہ ہے کہ اپنی زبان پر پوری طرح قابو رکھنا چاہئے۔ یاوہ گوئی، بدکلامی اور بری باتوں کا زبان سے صدور نہ ہونا چاہئے، زبان جب بھی حرکت میں آئے، اس سے بھلائی ہی کی بات نکلنی چاہئے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس پر عمل کر کے بہت سی خرابیوں اور دینی و دنیاوی نقصانات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں میں "بھلائی" سے مراد وہ چیز ہے جس میں ثواب ہو اس صورت میں وہ کلام جس پر مباح کا اطلاق ہوتا ہو، بھلائی کے زمرہ میں نہیں آئے گا لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "بھلائی" سے مراد وہ چیز ہے جو برائی کے مقابل ہو لہٰذا اس صورت میں مباح کلام بھلائی کے زمرہ میں آئے گا ورنہ حصر غیر موزوں رہے گا۔

④ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ بَنٰى مَسْجِدًا لِيُذْكَرَ اللّٰهُ فِيْهِ بُنِيَ لَهٗ بَيْتٌ فِي الْجَنَّةِ وَمَنْ اَعْتَقَ نَفْسًا مُسْلِمَةً كَانَتْ فِدْيَتَهٗ مِنْ جَهَنَّمَ وَمَنْ شَابَ شَيْبَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

(رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عمرو ابن عبسہؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کوئی (چھوٹی یا بڑی) مسجد (نام نمود کے لئے نہیں بلکہ اس نیت سے) بنائے کہ اس میں اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس کے لئے جنت میں ایک بڑا مکان بنایا جائے گا اور جو شخص کسی مسلمان بردہ کو آزاد کرے گا تو وہ بردہ اس شخص کے لئے دوزخ کی آگ سے نجات کا سبب ہوگا اور جو شخص خدا کی راہ میں (یعنی جہاد میں یا حج میں، یا طلب علم میں اور یا اسلام میں جیسا کہ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے) بوڑھا ہوا تو اس کا بڑھاپا قیامت کے دن اس کے لئے نور ہوگا (جس کے سبب وہ اس دن کی تاریکیوں سے نجات پائے گا۔) اس روایت کو صاحب مصابیح نے (اپنی اسناد کے ساتھ) شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: ان الفاظ "رواہ فی شرح السنۃ" میں اس طرف اشارہ ہے کہ مشکوٰۃ کے مصنف کو یہ حدیث شرح السنۃ کے علاوہ حدیث کی کسی اور کتاب میں نہیں ملی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑤ عَنِ الْغَرِيْفِ ابْنِ عَيَّاشِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ اَتَيْنَا وَاثِلَةَ بْنَ الْاَسْقَعِ فَقُلْنَا حَدِّثْنَا حَدِيْثًا لَيْسَ فِيْهِ زِيَادَةٌ وَلَا نُقْصَانٌ فَغَضِبَ وَقَالَ اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَقْرَأُ وَمُصْحَفُهٗ مُعَلَّقٌ فِيْ بَيْتِهٖ فَيَزِيْدُ وَيَنْقُصُ فَقُلْنَا اِنَّمَا اَرَدْنَا حَدِيْثًا سَمِعْتَهٗ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَتَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ صَاحِبٍ لَنَا اَوْجَبَ يَعْنِي النَّارَ بِالْقَتْلِ فَقَالَ اَعْتِقُوْا عَنْهُ يُعْتِقِ اللّٰهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْوًا مِنْهُ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت غریف ابن دیلمی (تابعی) کہتے ہیں کہ ہم حضرت واثلہؓ ابن اسقع (صحابی) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم سے کوئی

حدیث بیان کیجئے جس میں کمی بیشی نہ ہو۔" حضرت واثلہؓ (یہ بات سن کر) غصہ ہوئے اور کہنے لگے کہ تم لوگ (شب و روز) قرآن کریم پڑھتے ہو اور تمہارا قرآن کریم تمہارے گھر میں لٹکا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود (از راہ سہو و خطا) کمی بیشی ہو ہی جاتی ہے (یعنی جب کوئی شخص قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے تو اس کا قرآن کریم اس کے گھر میں یا اس کے پاس موجود ہوتا ہے اور اس صورت میں اگر اسے کہیں کوئی شبہ ہو تو وہ قرآن دیکھ سکتا ہے لیکن اس کے باوجود تلاوت میں غلطی سے کوئی لفظ چھوڑ دیتا ہے یا کوئی لفظ بڑھا دیتا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ ضبط و تکرار اور پوری احتیاط کے باوجود نقل روایت میں الفاظ کی کمی بیشی کا ہو جانا ضروری ہے) ہم نے عرض کیا کہ "ہمارا مطلب تو صرف یہ ہے کہ آپ نے آنحضرت ﷺ سے جو حدیث سنی ہو ہمیں سنائیے، چنانچہ حضرت واثلہؓ نے یہ حدیث بیان کی کہ (ایک دن) ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنے ایک دوست کا معاملہ لے کر آئے جس نے (خود کشی کر کے یا کسی دوسرے کو ناحق) قتل کر کے اپنے لئے دوزخ کی آگ کو واجب کر لیا تھا، آنحضرت ﷺ نے (واقعہ سن کر) فرمایا کہ "اس شخص کی طرف سے (غلام آزاد کر دو اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے قاتل کے ہر عضو کو (دوزخ) کی آگ سے نجات دے گا۔" (ابوداؤد)

تشریح: حضرت واثلہؓ سمجھے کہ غریفؒ کی مراد یہ ہے کہ حدیث بیان کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے الفاظ بعینہٖ روایت کئے جائیں۔ چنانچہ ان کو اس بات پر غصہ آیا اور مذکورہ بالا جواب دیا۔ لیکن حضرت غریفؒ نے اپنی بات کو وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مطلب یہ نہیں تھا جو آپ سمجھے ہیں بلکہ ہماری مراد تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث اس طرح بیان فرمائیں کہ اس کے مضمون و مفہوم میں کوئی تغیر نہ ہو اگرچہ الفاظ میں کمی بیشی ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث کو اس طرح بیان کرنا کہ اس کا مضمون و مفہوم بعینہٖ نقل ہو جائے گو الفاظ میں کچھ تضاد ہو تو جائز ہے۔

کسی غلام کے حق میں سفارش کرنا بہترین صدقہ ہے

⑥ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ الشَّفَاعَةُ بِهَا تُفَكُّ الرَّقَبَةُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت سمرہؓ ابن جندب کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بہترین صدقہ وہ سفارش ہے جس کے نتیجہ میں (بردہ کی) گردن کو نجات حاصل ہو جائے۔" (بیہقی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ سفارش کر کے کسی غلام کو آزاد کرا دینا یا کوئی شخص اپنے غلام کو قتل کر دینا چاہتا ہو یا اس کو مارتا دھاڑتا ہو تو سفارش کر کے اس غلام کو بچا دینا بہترین صدقہ ہے۔

بَابُ اِعْتَاقِ الْعَبْدِ الْمُشْتَرَكِ وَشِرَاءِ الْقَرِيْبِ وَالْعِتْقِ فِي الْمَرَضِ

مشترک غلام کو آزاد کرنے، قرابت دار کو خریدنے اور بیماری کی حالت میں آزاد کرنے کا بیان

اس باب میں جن مسائل و احکام سے متعلق احادیث نقل کی جائیں گی ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ اگر کوئی غلام مشترک ہو مثلاً دو شخص زید اور بکر مشترک طور پر ایک غلام کے مالک ہوں اور ان میں کا ایک شریک مثلاً زید اپنا حصہ آزاد کر دے تو دوسرا کیا کرے؟ چنانچہ اس بارہ میں جزوی آزادی (یعنی ایک غلام کا مثلاً آدھا حصہ آزاد ہو جائے اور آدھا حصہ غلام ہی رہے) معتبر ہے یا نہیں خود حنفیہ کے ہاں مختلف اقوال ہیں، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ "جزوی آزادی" معتبر ہے لیکن صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسف اور

حضرت امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ جزوی آزادی معتبر نہیں ہے، اقوال کے اس اختلاف کا تعلق مسئلہ کے صرف اسی ایک جزو سے نہیں ہے بلکہ اس سے دوسرے احکام و مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

باب کا دوسرا جزیہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے غلام کو خریدے جو اس کا قرابت دار ہو تو وہ غلام محض خرید لینے ہی سے آزاد ہو جائے گا خواہ وہ شخص اس کو آزاد کرے یا آزاد نہ کرے! البتہ اس بارہ میں اختلافی اقوال ہیں کہ "قرابت دار" سے کس کس رشتہ کے لوگ مراد ہیں اس کی تفصیل بھی آگے آئے گی۔

باب کا تیسرا جزء یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بیماری کی حالت میں غلام کو آزاد کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ چنانچہ اس کے متعلق احکام و مسائل بھی حسب موقع احادیث کی تشریح کے ضمن میں بیان کئے جائیں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مشترک غلام کو آزاد کرنے کے بارے میں ایک ہدایت

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَعْتَقَ شِرْكًا لَهٗ فِي عَبْدٍ وَكَانَ لَهٗ مَالٌ يَبْلُغُ ثَمَنَ الْعَبْدِ قُوِّمَ الْعَبْدُ عَلَيْهِ قِيْمَةَ عَدْلٍ فَاُعْطِيَ شُرَكَاءُهٗ حِصَصَهُمْ وَعَتَقَ عَلَيْهِ الْعَبْدُ وَاِلَّا فَقَدْ عَتَقَ مِنْهُ مَا عَتَقَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی (مشترک) غلام کے اپنے حصہ کو آزاد کرے (تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ) اگر اس کے پاس اتنا مال موجود ہو جو (اس غلام کے باقی حصوں) کی قیمت کے بقدر ہو تو انصاف کے ساتھ (یعنی بغیر کمی بیشی کے) اس غلام کے (باقی ان حصوں) کی قیمت لگائی جائے گی اور وہ اس غلام کے دوسرے شریکوں کو ان کے حصوں کی قیمت دے دے وہ غلام اس کی طرف سے آزاد ہو جائے گا اور اگر اس کے پاس اتنا مال نہ ہو تو پھر اس غلام کا جو حصہ اس شخص نے آزاد کیا ہے وہ آزاد ہو جائے گا (اور دوسرے شرکاء کے حصے مملوک رہیں گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر ایک غلام کے مثلاً دو مالک ہوں اور ان میں سے ایک حصہ دار اپنا حصہ آزاد کرنا چاہے تو اگر وہ آزاد کرنے والا شخص صاحب مقدور ہو تو وہ دوسرے شریک کو اس کے حصہ کے بقدر قیمت ادا کر دے اس صورت میں وہ غلام اس کی طرف سے آزاد ہو جائے گا اور اگر آزاد کرنے والا شخص صاحب مقدور نہ ہو (اور دوسرے شریک کو اس کے حصہ کی قیمت ادا نہ کر سکتا ہو) تو اس صورت میں وہ غلام اس شخص کے حصہ کے بقدر تو آزاد ہو جائے گا اور دوسرے شریک کے حصہ کے بقدر غلام رہے گا۔

نیز حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آزادی اور غلامی متجزی ہو سکتی ہیں (یعنی کسی غلام کا کچھ حصہ آزاد ہو جانا اور کچھ حصہ غلام رہنا جائز رہتا ہے) اور دوسرے شریک کو اپنا حصہ آزاد کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس غلام سے استسعاء (محنت) کرائی جائے! چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ باوجودیکہ آزادی اور غلامی کے متجزی ہونے کا قائل ہیں لیکن اس صورت میں ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر آزاد کرنے والا شخص صاحب مقدور ہو تو وہ دوسرے شریک کا حصہ بھر دے (یعنی وہ اس کو اس کے حصہ کی قیمت ادا کر دے) یا دوسرا شریک اپنے حصے کے بقدر اس غلام سے استسعاء کرائے یا وہ شریک بھی اپنا حصہ آزاد کر دے اور اگر آزاد کرنے والا شخص صاحب مقدور نہ ہو تو پھر وہ اپنے شریک کو اس کا حصہ نہ پھیر دے۔ بلکہ وہ شریک یا تو اس غلام سے استسعاء کے ذریعہ اپنے حصے کی قیمت وصول کر لے یا اپنا حصہ آزاد کر دے اس صورت میں حق ولاء دونوں کو حاصل ہو گا! اس بارہ صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا یہ قول ہے کہ آزاد کرنے والا شخص اگر صاحب مقدور ہو تو دوسرے شریک کا حصہ پھیر دے اور اگر صاحب مقدور نہ ہو دوسرا شریک

اس غلام سے استسعاء کے ذریعہ اپنے حصہ کی قیمت حاصل کرلے، اور چونکہ آزادی متجزی نہیں ہوتی اس لئے اس صورت میں حق ولاء صرف آزاد کرنے والے کو حاصل ہوگا۔

صاحبینؒ کی مستدل حدیث

(۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَعْتَقَ شِقْصًا فِيْ عَبْدٍ اُعْتِقَ كُلُّهُ اِنْ كَانَ لَهٗ مَالٌ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَهٗ مَالٌ اُسْتُسْعِيَ الْعَبْدُ غَيْرَ مَشْقُوْقٍ عَلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا" جو شخص (مشترک) غلام کے اپنے حصہ کو آزاد کرے گا تو وہ غلام پورا آزاد ہو جائے گا (اور یہ آزادی اس آزاد کرنے والے شخص کی طرف سے متصور ہوگی) اور اگر اس شخص کے پاس (اتنا) مال ہو (کہ وہ اپنے حصہ کے علاوہ باقی حصوں کی قیمت کی ادائیگی کر سکے تو دوسرے شرکاء کو ان کے حصوں کی قیمت دے دے) اور اگر اس کے پاس اتنا مال نہ ہو تو پھر وہ غلام (ان باقی حصوں) کے بقدر محنت مزدوری یا دوسرے شرکاء کی خدمت پر مامور کیا جائے لیکن غلام کو (کسی ایسے کام اور محنت کی) مشقت میں مبتلا نہ کیا جائے (جو اس کی طاقت سے باہر ہو)۔" (بخاری، مسلم)

مرض الموت میں اپنے تمام غلام آزاد کر کے اپنے ورثاء کی حق تلفی نہ کرو

(۳) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَجُلًا اَعْتَقَ سِتَّةَ مَمْلُوْكِيْنَ لَهٗ عِنْدَ مَوْتِهٖ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ مَالٌ غَيْرُهُمْ فَدَعَا بِهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَزَّاَهُمْ اَثْلَاثًا ثُمَّ اَقْرَعَ بَيْنَهُمْ فَاَعْتَقَ اثْنَيْنِ وَاَرَقَّ اَرْبَعَةً وَقَالَ لَهٗ قَوْلًا شَدِيْدًا رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ عَنْهُ وَذَكَرَ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ لَا اُصَلِّيَ عَلَيْهِ بَدَلَ وَقَالَ لَهٗ قَوْلًا شَدِيْدًا۔ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ دَاؤُدَ قَالَ لَوْ شَهِدْتُهٗ قَبْلَ اَنْ يُدْفَنَ لَمْ يُدْفَنْ فِيْ مَقَابِرِ الْمُسْلِمِيْنَ۔

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے اپنی موت کے وقت اپنے چھ غلام آزاد کر دیئے اور اس شخص کے پاس ان غلاموں کے علاوہ اور کوئی مال نہ تھا (پھر اس شخص کی وفات کے بعد جب) رسول کریم ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے ان غلاموں کو بلایا اور (دو دو کی تعداد میں) ان کے تین حصے کئے اور پھر ان کے درمیان قرعہ ڈالا، اس طرح ان سے دو کو تو آزاد کر دیا اور چار کو غلام رکھا اور آزاد کرنے والے کے حق میں (اظہار ناراضگی) کے لئے سخت الفاظ فرمائے۔" اور نسائیؒ کی روایت میں جو حضرت عمرانؓ ہی سے منقول ہے۔ ان الفاظ "سخت الفاظ فرمائے" کی بجائے یہ الفاظ ہیں "کہ میں نے تو یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس شخص کی نماز جنازہ نہ پڑھوں" اور ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ "آنحضرت ﷺ نے اس (شخص کے حق میں بطور تنبیہ و تہدید) یہ فرمایا کہ اگر میں اس کی تدفین سے پہلے اس کے جنازہ پر پہنچتا تو وہ مسلمانوں کے قبرستان میں نہ دفن کیا جاتا۔"

تشریح: "دو کو تو آزاد کر دیا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ جن دو کے نام قرعہ نکلا ہے وہ آزاد ہیں اور باقی چاروں غلام رہیں گے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے مرض الموت میں اپنے سارے غلاموں کو آزاد کر دے تو اس آزادی کا اجراء ان غلاموں کی صرف تہائی تعداد میں ہوگا کیونکہ مرض الموت میں اس کے مال کے ساتھ اس کے ورثاء کا حق متعلق ہو جاتا ہے، اسی طرح وصیت، صدقہ، ہبہ اور ان کے مثل کا اجراء بھی تہائی مال میں ہوگا۔

زین العربؒ نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حکم اس لئے جاری فرمایا کہ اس وقت عام طور پر غلام زنگی ہوا کرتے تھے جو قیمت میں مساوی ہوتے تھے۔ اور امام نوویؒ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایسی صورت میں (مساوی سلوک کے پیش نظر) ہر غلام کا تہائی حصہ تو آزاد متصور ہوگا اور باقی دو حصوں کے بقدر اس سے محنت یا خدمت لی جائے گی۔

آنحضرت ﷺ نے اس شخص پر اس لئے اظہار ناراضگی فرمایا کہ اس نے چھ کے چھ غلاموں کو آزاد کر کے اپنے ورثاء کو بالکل محروم کر دیا تھا جو آپ ﷺ کی نظر میں سخت مکروہ عمل تھا، اس لئے آپ ﷺ نے اس کے ورثاء پر اس طرح شفقت و کرم کیا کہ اس شخص کی طرف سے دی گئی آزادی کو دو غلاموں کے حق میں جاری کیا اور باقی چار کو ان کے ورثاء کا حق قرار دے دیا۔ حدیث کے اس جزو سے یہ معلوم ہوا کہ میت کو اس کے کسی نامشروع اور ظالمانہ عمل پر برا کہہ سکتے ہیں اور یہ اس ارشاد گرامی اُذْكُرُوْا اَمْوَاتَكُمْ بِالْخَيْرِ (اپنے مرے ہوئے لوگوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کرو) کے منافی نہیں ہے۔

غلام باپ کو خریدنے کا مسئلہ

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَجْزِیْ وَلَدٌ وَالِدَهٗ اِلَّا اَنْ یَجِدَهٗ مَمْلُوْكًا فَیَشْتَرِیَهٗ فَیُعْتِقَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی بیٹا اپنے باپ کا بدلہ نہیں اتار سکتا مگر اس صورت میں کہ وہ اپنے باپ کو کسی کا غلام پائے اور اس کو خرید کر آزاد کر دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ محض بیٹے کے خرید لینے سے ہی آزاد نہیں ہو جاتا بلکہ جب اسے اس کا بیٹا خرید کر آزاد کرے تب آزاد ہوتا ہے۔ چنانچہ اصحاب ظواہر کا یہی مسلک ہے۔ لیکن جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ باپ اپنے بیٹے کی محض ملکیت میں آجانے سے آزاد ہو جاتا ہے، اس کی صراحت دوسری فصل کی پہلی حدیث سے بھی ہوتی ہے اور اس حدیث کے معنی بھی یہی ہیں۔ چنانچہ حضرت مظہرؒ فرماتے ہیں کہ فیعتقه میں حرف فاسبب کے لئے ہے۔ اس صورت میں حدیث کے آخری جزء کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "جب کہ وہ اپنے باپ کو کسی کا غلام پائے اور اس کو آزاد کرنے کے لئے خرید لے" لہٰذا خریدنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں ہوگی کہ بیٹا اس باپ سے یوں کہے کہ میں نے تمہیں آزاد کیا بلکہ وہ محض بیٹے کے خرید لینے ہی سے آزاد ہو جائے گا۔

مدبر غلام کو بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ دَبَّرَ مَمْلُوْكًا وَلَمْ یَكُنْ لَهٗ مَالٌ غَیْرُهٗ فَبَلَغَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَنْ یَشْتَرِیْهِ مِنِّیْ فَاشْتَرَاهُ نُعَیْمُ بْنُ النَّحَّامِ بِثَمَانِ مِائَةِ دِرْهَمٍ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ فَاشْتَرَاهُ نُعَیْمُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ الْعَدَوِیُّ بِثَمَانِ مِائَةِ دِرْهَمٍ فَجَاءَ بِهَا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَدَفَعَهَا اِلَیْهِ ثُمَّ قَالَ ابْدَاْ بِنَفْسِكَ فَتَصَدَّقْ عَلَیْهَا فَاِنْ فَضَلَ شَیْءٌ فَلِاَهْلِكَ فَاِنْ فَضَلَ عَنْ اَهْلِكَ شَیْءٌ فَلِذِیْ قَرَابَتِكَ فَاِنْ فَضَلَ عَنْ ذِیْ قَرَابَتِكَ شَیْءٌ فَهٰكَذَا وَهٰكَذَا یَقُوْلُ فَبَیْنَ یَدَیْكَ وَعَنْ یَمِیْنِكَ وَعَنْ شِمَالِكَ۔

"اور جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک انصاری نے اپنے غلام کو مدبر کیا اور اس کے پاس اس غلام کے علاوہ اور کوئی مال نہیں تھا، جب نبی کریم ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ "اس غلام کو مجھ سے کون خریدتا ہے؟ چنانچہ ایک شخص نعیم ابن نحام نے اس غلام کو آٹھ سو درہم کے عوض خرید لیا۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ "چنانچہ نعیم ابن عبداللہ عدوی نے اس غلام کو آٹھ سو درہم کے عوض خرید لیا۔ انہوں نے آٹھ سو درہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کئے اور نبی کریم ﷺ نے وہ درہم اس شخص کو دے دیئے (جس کا وہ غلام تھا) اور فرمایا کہ تم اس رقم کو سب سے پہلے اپنی ذات پر خرچ کرو اور اس کے ذریعہ ثواب حاصل کرو اور اس کے بعد اگر کچھ بچ جائے تو اس کو اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو، اگر ان پر خرچ کرنے کے بعد بھی بچ جائے تو رشتہ داروں پر خرچ کرو اور اگر ان پر خرچ کرنے کے بعد بھی کچھ بچ جائے تو اس کو اس طرح اور اس طرح خرچ کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ اس طرح سے مراد یہ ہے کہ اس کو اپنے آگے،

اپنے دائیں اور اپنے بائیں خرچ کرو (یعنی تمہارے لئے آگے اور دائیں بائیں جو سائل جمع ہوں ان کو اللہ واسطے دے دو)۔"

تشریح: "مدبر" کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنے غلام سے یہ کہہ دے کہ تم میرے مرنے کے بعد آزاد ہو، چنانچہ اس حدیث کے ظاہری مفہوم کے مطابق ایسے غلام کو بیچنا حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ مدبر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو مدبر مطلق اور دوسرا مدبر مقید۔ مدبر مطلق تو وہ غلام ہے جس کا مالک اس سے یوں کہے کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو۔ اور مدبر مقید وہ غلام ہے جس سے اس کا مالک یوں کہے کہ اگر میں اس بیماری میں مرجاؤں تو تم آزاد ہو۔ "مدبر مطلق کا حکم تو یہ ہے کہ ایسے غلام کو آزادی کے علاوہ کسی اور صورت میں اپنی ملکیت سے نکالنا مالک کے لئے جائز نہیں ہے یعنی وہ مالک اس غلام کو آزاد تو کر سکتا ہے لیکن نہ تو اس کو فروخت کر سکتا ہے اور نہ ہبہ کر سکتا ہے، ہاں اس سے خدمت لینا جائز ہے، اسی طرح اگر لونڈی ہو تو اس سے جماع کرنا بھی جائز ہے اور اس کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح کرنا بھی جائز ہے ایسا غلام اپنے مالک کے مرنے کے بعد اس کے تہائی مال میں سے آزاد ہو جاتا ہے اور اگر تہائی مال میں سے پورا آزاد نہ ہو سکا ہو تو پھر تہائی مال کے بقدر (جزوی طور پر ہی آزاد ہو گا) مدبر مطلق کے برخلاف مدبر مقید کو بیچنا جائز ہے اور اگر وہ شرط پوری ہو جائے یعنی مالک اس مرض میں مرجائے تو پھر جس طرح مدبر مطلق اپنے مالک کے مرجانے کے بعد آزاد ہو جاتا ہے اسی طرح مدبر مقید بھی آزاد ہو جائے گا! لہٰذا امام ابوحنیفہؒ اس حدیث کے مفہوم میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جس مدبر کو فروخت فرمایا وہ مدبر مقید ہو گا۔

مشکوۃ کے تمام نسخوں میں نعیم ابن نحام لکھا ہے لیکن علماء نے یہ وضاحت کی ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے اصل میں نعیم ہی کا دوسرا نام نحام ہے، اس دوسرے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے بارہ میں فرمایا تھا کہ میں جنت میں داخل ہوا تو وہاں نعیم کی نحمہ (یعنی آواز سنی)" اس مناسبت سے انہیں نحام کہا جانے لگا"۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ذی رحم محرم ملکیت میں آتے ہی آزاد ہو جاتا ہے

(۶) وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ مَلَكَ ذَارَ حِمٍ مَحْرَمٍ فَهُوَ حُرٌّ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"حضرت حسن بصریؒ حضرت سمرہؓ سے اور وہ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "جو شخص خواہ خریدنے کی وجہ سے خواہ ہبہ یا وراثت کے ذریعہ) اپنے ذی رحم محرم کا مالک ہو گا تو وہ آزاد ہو جائے گا۔" (ترندی، ابن ماجہ)

تشریح: مثلاً باپ نے اپنے اس بیٹے کو خریدا جو کسی دوسرے شخص کی غلامی میں تھا یا بیٹے نے اپنے غلام باپ کو خریدا یا بھائی نے غلام خریدا تو محض خرید لینے کی وجہ سے وہ غلام آزاد ہو جائے گا۔

"ذی رحم" اس قرابت دار کو کہتے ہیں جو ولادت کی قرابت رکھے جس کا تعلق رحم سے ہوتا ہے ذی رحم میں بیٹا، باپ، بھائی چچا، بھتیجا اور اسی قسم کے دوسرے قرابت دار شامل ہیں "اور محرم" اس قرابت دار کو کہتے ہیں جس سے نکاح جائز نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ چچا کا بیٹا اور اسی قسم کے دوسرے رشتہ دار ذی رحم محرم کے زمرہ میں شامل نہیں ہیں۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں قرابت دار محض ملکیت میں آجانے کی وجہ سے آزاد ہو جاتا ہے یا نہیں؟ علماء کے اختلافی اقوال ہیں چنانچہ اہل ظواہر کا قول تو یہ ہے کہ ان قرابت داروں میں سے کوئی بھی محض ملکیت میں آجانے سے آزاد نہیں ہو جاتا بلکہ آزاد کرنا ضروری ہوتا ہے، ان کی دلیل حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے جو پہلی فصل میں گزری ہے۔

جمہور علماء یہ فرماتے ہیں کہ محض ملکیت میں آجانے کی وجہ سے اصول کے درجہ کے قرابت دار (جیسے باپ دادا، پردادا وغیرہ) اور فروع کے درجہ کے قرابت دار، (جیسے بیٹا، پوتا، پڑپوتا وغیرہ) آزاد ہو جاتے ہیں، البتہ اصول اور فروع کے علاوہ دوسرے قرابت داروں کے بارہ میں جمہور علماء کے بھی مختلف اقوال ہیں، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک تو یہ ہے کہ یہ خصوصیت صرف اصول وفروع کے قرابت داروں ہی کو حاصل ہے کہ وہ محض ملکیت میں آجانے کی وجہ سے آزاد ہو جاتے ہیں جب کہ حضرت امام مالکؒ نے اس خصوصیت میں بھائی کو بھی شامل کیا ہے، ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ تمام ذی رحم محرم آزاد ہو جاتے ہیں۔

نیز ان کی تیسری روایت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ ہر وہ قرابت دار جو ذی رحم محرم ہو محض ملکیت میں آجانے کی وجہ سے آزاد ہو جاتا ہے۔

ام ولد، اپنے آقا کی وفات کے بعد آزاد ہو جاتی ہے

⑦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وَلَدَتْ اَمَةُ الرَّجُلِ مِنْهُ فَهِيَ مُعْتَقَةٌ عَنْ دُبُرٍ مِنْهُ اَوْ بَعْدَهُ۔ (رواه الدارمی)

"اور حضرت عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب کسی شخص کی لونڈی اس کے (نطفہ) سے بچہ جنے تو وہ لونڈی اس شخص کے مرنے کے پیچھے۔ یا یہ فرمایا کہ اس شخص کے مرنے کے بعد آزاد ہو جائے گی۔" (دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو لونڈی اپنے مالک کے بچہ کو جنم دے وہ اس مالک کے مرنے کے بعد آزاد ہو جاتی ہے وہ مالک کی زندگی میں آزاد نہیں ہوتی لیکن مالک اس لونڈی کو نہ تو فروخت کر سکتا ہے اور نہ ہبہ کر سکتا ہے اس مسئلہ پر علماء کا اجماع و اتفاق ہے، اس کے برخلاف جو روایت منقول ہے وہ منسوخ ہے اس کی تفصیل اگلی حدیث کے ضمن میں آئے گی۔

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ بِعْنَا اُمَّهَاتِ الْاَوْلَادِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِيْ بَكْرٍ فَلَمَّا كَانَ عُمَرُ نَهَانَا عَنْهُ فَانْتَهَيْنَا۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں بچوں کی ماؤں کو بیچا لیکن حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ہمیں ان کو بیچنے سے منع کر دیا اور ہم اس سے باز رہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "بچوں کی ماؤں" سے مراد وہ لونڈیاں ہیں جن سے ان کے مالکوں کی اولاد ہو چکی تھی۔ یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں ان لونڈیوں کو بیچا جاتا تھا تو حضرت عمرؓ نے اس سے کیوں منع کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات کا قوی احتمال ہے کہ ان لونڈیوں کو بیچنے کی اجازت کی منسوخی کا حکم آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں عام لوگوں تک نہ پہنچا ہوگا اور ان لونڈیوں کو بیچے جانے کی خبر آنحضرت ﷺ تک نہیں پہنچی ہوگی۔ لہٰذا اس صورت میں حضرت جابرؓ کا یہ ارشاد ایسی لونڈیوں کے بیچنے کے جواز کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ دلیل تو جب ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ان لونڈیوں کے بیچے جانے کی اطلاع ہوتی اور آپ ﷺ اس کو جائز رکھتے۔

نیز ایک احتمال یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ان لونڈیوں کو بیچے جانے کا واقعہ اس کی اجازت کی منسوخ سے پہلے کا ہوگا، اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ کے بارے میں بھی یہ احتمال ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ خلافت چونکہ بہت قلیل تھا اس میں بھی وہ دوسری مہمات میں مشغول رہے اس لئے انہیں اس کا علم نہ ہوا ہوگا۔ اگر ان کو اس کی خبر ہوتی تو وہ اس فعل سے ضرور باز رکھتے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد جب عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو اس سے روک دیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ رسول کریم ﷺ نے اُمّ ولد کو بیچنے کی ممانعت فرما دی تھی۔

اگر آزادی کے وقت غلام کے پاس کچھ مال ہو تو آقا کی اجازت کے بعد ہی وہ اس مال کا مالک ہوگا

(۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَعْتَقَ عَبْدًا وَلَهٗ مَالٌ فَمَالُ الْعَبْدِ لَهٗ اِلَّا اَنْ يَشْتَرِطَ السَّيِّدُ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کرے اور اس غلام کے پاس کچھ مال ہو تو غلام کا وہ مال اس کے مالک ہی کا ہے ہاں اگر مالک اس کی شرط کر دے (تو پھر وہ مال اس غلام کا ہو جائے گا۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: ظاہر ہے کہ کوئی بھی غلام کسی بھی مال کا مالک ہوتا ہی نہیں تو اس کے پاس مال کہاں سے ہوگا" لہٰذا اور اس غلام کے پاس کچھ مال ہو" سے مراد یہ ہے کہ اس غلام نے اپنے مالک کی اجازت سے جو محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ کی ہے اور اس کے نتیجہ میں جو مال حاصل ہوا ہے اگر وہ مال اس غلام کے پاس ہو تو اس کے بارہ میں بھی حکم یہ ہے کہ وہ دراصل اس غلام کے آقا ہی کی ملکیت ہے، کیونکہ غلام اور اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے سب کا مالک اس کا آقا ہی ہوتا ہے لہٰذا یہ گمان نہ کیا جائے کہ غلام جب آزاد ہو جانے کی وجہ سے ملکیت قائم کرنے کا اہل ہو گیا ہے تو وہ مال جو اس کے پاس پہلے سے موجود تھا وہ اس کی ملکیت میں آ گیا ہے کیونکہ وہ مال تو پہلے بھی اس کے آقا کی ملکیت تھا اور اب اس کے آقا کی ملکیت رہے گا۔ غلام کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا، ہاں اگر اس کا آقا اس کو آزاد کرتے وقت یہ کہہ دے کہ یہ مال غلام کی ملکیت ہے تو اس صورت میں وہ مال اس آقا کی طرف سے اس غلام کے لئے صدقہ اور ہبہ ہو جائے گا اور وہ آزاد ہونے کے بعد اس کا مالک ہو جائے گا۔

آزادی جزوی طور پر واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

(۱۰) وَعَنْ اَبِی الْمَلِيْحِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَجُلًا اَعْتَقَ شِقْصًا مِنْ غُلَامٍ فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَيْسَ لِلّٰهِ شَرِيْكٌ فَاَجَازَ عِتْقَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوملیح (تابعی) اپنے والد مکرم (حضرت اسامہؓ ابن عمیر صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنے ایک غلام میں سے کچھ حصہ آزاد کیا، جب نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خدا کا کوئی شریک نہیں ہے" اور پھر یہ حکم دیا کہ اس غلام کو بالکل آزاد کر دیا جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ جو بھی کام اللہ تعالیٰ کے لئے کیا جائے اور وہ عبادت کی قسم سے ہو تو اس میں اپنے حصہ کو شریک نہ کرنا چاہئے۔ لہٰذا ایک غلام کے بعض حصوں کو آزاد کر دینا اور بعض حصوں کو بدستور غلام رکھنا مناسب نہیں ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آزادی اور غلامی متجزی نہیں ہوتی، لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ چونکہ متجزی کے قائل ہیں اس لئے ان کے نزدیک ان الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس غلام کو بالکل آزاد کر دینے کا حکم دیا بایں طور کہ آپ ﷺ نے اس کے مالک کو اس کی ترغیب دلائی کہ وہ اس غلام کو بالکل آزاد کر دے۔

مشروط آزادی کا ایک واقعہ

(۱۱) وَعَنْ سَفِيْنَةَ قَالَ كُنْتُ مَمْلُوْكًا لِاُمِّ سَلَمَةَ فَقَالَتْ اُعْتِقُكَ وَاَشْتَرِطُ عَلَيْكَ اَنْ تَخْدُمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا عِشْتَ فَقُلْتُ اِنْ لَمْ تَشْتَرِطِيْ عَلَيَّ مَا فَارَقْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا عِشْتُ فَاَعْتَقَتْنِيْ وَاشْتَرَطَتْ عَلَيَّ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت سفینہؓ کہتے ہیں کہ (ابتداءً) میں حضرت ام سلمہؓ کی ملکیت میں تھا (ایک دن) انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ "میں تمہیں آزاد کرنا

چاہتی ہوں، لیکن یہ شرط عائد کرتی ہوں کہ تم جب تک زندہ رہو رسول کریم ﷺ کی خدمت کرتے رہو گے" میں نے عرض کیا (کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت تو میرے لئے سعادت و خوش بختی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے) اگر آپ یہ شرط عائد نہ کرتی تب بھی میں اپنے جیتے جی رسول کریم ﷺ سے جدا نہ ہوتا" چنانچہ حضرت اُمّ سلمہؓ نے مجھے آزاد کر دیا اور آنحضرت ﷺ کی خدمت کی شرط مجھ پر عائد کر دی۔"

(ابوداؤد، ابن ماجہؒ)

تشریح: سفینہؓ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، لیکن بعض حضرات یہ فرماتے تھے کہ یہ حضرت اُمّ سلمہؓ کے غلام تھے جو آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں، پھر حضرت اُمّ سلمہؓ نے ان کو مذکورہ بالا شرط کے ساتھ آزاد کر دیا تھا سفینہ کا اصل نام مہران یا رومان اور یا رباح تھا ان کی کنیت ابو عبدالرحمٰن یا ابوالبختری تھی، سفینہ ان کا لقب تھا اور اسی نام کے ساتھ زیادہ مشہور تھے، اس لقب کا پس منظر یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی خدمت کرا کرتے تھے جب غزوات میں جاتے تو لوگوں کا سامان اپنی پیٹھ پر لاد کر اودھر اودھر پہنچاتے تھے۔

"سفینہؓ" کشتی کو کہتے ہیں جس طرح کشتی باربرداری کے کام آتی ہے اس طرح یہ بھی لوگوں کے بوجھ ڈھوتے تھے، اسی اعتبار سے ان کا لقب "سفینہ" ہو گیا۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سفینہ اسلامی لشکر کے ہمراہ تھے کہ قافلہ سے بچھڑ گئے اور جنگل میں راستہ بھول گئے، وہ راستہ کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ اتنے میں قریب کی جھاڑیوں سے ایک شیر نمودار ہوا اور ان کے سامنے آگیا، انہوں نے شیر کو دیکھتے ہی کہا کہ ابوالحارث! میں سفینہ ہوں جو رسول کریم ﷺ کا آزاد کردہ غلام ہے! یہ سنتے ہی شیر دم ہلانے لگا اور پھر ان کے آگے ہو لیا اور ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔

مکاتب جب تک پورا بدل کتابت ادا نہ کر دے غلام ہی رہے گا

⑫ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُكَاتَبُ عَبْدٌ مَا بَقِيَ عَلَيْهِ مِنْ مُكَاتَبَتِهٖ دِرْهَمٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ مکاتب (اس وقت تک) غلام رہے گا جب تک کہ اس کے بدل کتابت میں سے ایک درہم بھی باقی رہے گا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "مکاتب" اس غلام کو کہتے ہیں جس کو اس کا مالک یہ لکھ کر دے دے کہ جب تم اتنے روپے ادا کرو گے آزاد ہو جاؤ گے، چنانچہ اسی کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ مالک نے اس کی آزادی کے لئے جتنے روپے مقرر کئے ہیں جب تک وہ پورے مالک کو ادا نہ ہو جائیں گے وہ مکاتب، غلام ہی رہے گا، اگر اس مقدار میں سے مثلاً ایک روپیہ بھی باقی رہ گیا تھا تو وہ آزاد نہیں ہوگا، یہ نہیں ہوگا کہ اس نے جتنا روپیہ مالک کو ادا کر دیا ہے اس کے حساب سے اس کا کچھ حصّہ آزاد ہو جائے اور جو روپیہ باقی رہ گیا اس کے مطابق کچھ حصّہ غلام رہے۔

عورتوں کو اپنے مکاتب غلام سے پردہ کا حکم

⑬ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ عِنْدَ مُكَاتَبِ اِحْدَاكُنَّ وَفَاءٌ فَلْتَحْتَجِبْ مِنْهُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (عورتوں) سے فرمایا کہ "جب تم میں سے کسی (عورت) کے مکاتب غلام کے پاس اتنا روپیہ ہو جائے جس سے وہ اپنا پورا بدل کتابت ادا کر سکے تو اس (مالکہ) کو چاہئے کہ وہ اس مکاتب سے پردہ کرے۔"

(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مکاتب نے جب تک پورا بدل کتابت ادا نہیں کر دیا غلام اور محرم ہے اس سے پردہ کرنا ضروری نہیں ہے اگر اس کے پاس اتنا مال وزر ہو گیا ہے جس سے وہ اپنا پورا بدل کتابت ادا کر سکتا ہے تو از راہ تقویٰ و احتیاط اس سے پردہ کرنا چاہئے کیونکہ جب وہ پورا بدل کتابت ادا کرنے کی قدرت و استطاعت رکھتا ہے تو گویا اس نے واقعی اپنا بدل کتابت ادا کر دیا ہے۔

اس حدیث کے سلسلہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حکم مخصوص طور پر اپنی ازواج مطہرات کے لئے فرمایا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ کے مطابق ازواج مطہرات کا پردہ بھی دوسری عورتوں کی بہ نسبت زیادہ سخت تھا۔

مکاتب کی طرف سے بدل کتابت کی جزوی عدم ادائیگی کا مسئلہ

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَاتَبَ عَبْدَهٗ عَلٰى مِائَةِ اُوْقِيَةٍ فَادَّاهَا اِلَّا عَشَرَةَ اَوَاقٍ اَوْ قَالَ عَشَرَةَ دَنَانِيْرَ ثُمَّ عَجَزَ فَهُوَ رَقِيْقٌ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد (حضرت شعیبؒ) سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر کسی شخص نے اپنے غلام کو سو اوقیہ کے بدلے مکاتب کیا اور اس غلام نے سب اوقیے ادا کر دیئے مگر دس اوقیے ادا نہ کر سکا یا یہ فرمایا کہ "دس دینار ادا نہ کر سکا (یہاں راوی کو شک ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے دس اوقیہ فرمایا تھا یا دس دینار کا ذکر کیا تھا) اور پھر وہ اس باقی کی ادائیگی سے عاجز ہو گیا تو وہ مکاتب (بدستور) غلام ہی رہے گا۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مکاتب کا اپنے بدل کتابت کے کچھ حصے کی ادائیگی سے قاصر رہنا پورے بدل کتابت کی ادائیگی سے قاصر رہنا ہے لہٰذا ایسی صورت میں مالک کو اس کی کتابت فسخ کر دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور فسخ کتابت کے بعد وہ مکاتب بدستور غلام رہتا ہے، نیز حدیث کے الفاظ فَهُوَ رَقِيْقٌ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مکاتب نے اپنے بدل کتابت کا جو کچھ حصہ مالک کو ادا کر دیا ہے وہ اس مالک ہی کی ملکیت رہے گا۔

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَصَابَ الْمُكَاتَبُ حَدًّا اَوْ مِيْرَاثًا وَرِثَ بِحِسَابِ مَا عَتَقَ مِنْهُ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهٗ قَالَ يُؤَدِّي الْمُكَاتَبُ بِحِصَّةِ مَا اَدّٰى دِيَةَ حُرٍّ وَمَا بَقِيَ دِيَةَ عَبْدٍ وَضَعَّفَهٗ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی مکاتب" دیت یا میراث کا مستحق ہو جائے تو اس کو (اس دیت یا میراث کا) صرف اس قدر حصہ ملے گا جس قدر وہ آزاد ہوا ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی) اور ترمذی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ نے فرمایا "مکاتب کو دیت میں اس حصہ کے بقدر مال دیا جائے گا جو وہ اپنی آزادی کی قیمت (یعنی بدل کتابت) میں سے ادا کر چکا تھا، اور اس حصہ کے بقدر قیمت دی جائے گی اور ابھی بطور غلام باقی ہے، اس روایت کو ترمذیؒ نے ضعیف کہا ہے۔"

تشریح: "دیت یا میراث کا مستحق ہو جائے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مکاتب کسی دیت یا کسی میراث کا حقدار ہو جائے تو اس دیت یا میراث میں سے اس کو اسی قدر ملے گا جس قدر وہ آزاد ہوا ہے اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جاتا ہے کہ زید کسی شخص کا غلام تھا اس کے مالک نے اس کو مکاتب کیا، اور زید نے ابھی اپنے بدل کتابت میں سے آدھا ہی حصہ اپنے مالک کو ادا کیا تھا کہ اس کا باپ مر گیا جو ایک آزاد شخص تھا لیکن اس نے اپنے اس مکاتب بیٹے یعنی زید کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں چھوڑا تو اس صورت میں زید اپنے مرحوم باپ کی وراثت میں صرف آدھے حصہ کا حقدار ہو گا۔ یا دوسری صورت جس کو دوسروں نے بیان کیا ہے، یہ ہو کہ اس مکاتب نے اپنے بدل کتابت میں سے آدھا حصہ اپنے مالک کو ادا کیا تھا کہ کسی نے اس (زید) کو قتل کر دیا تھا، اس صورت میں قاتل اس مکاتب کے آدھے آزاد

حصہ کی دیت تو اس کے ورثاء کو ادا کرے گا اور اس کے آدھے غلام حصہ کی دیت جو اس کی قیمت کا بھی آدھا حصہ ہے، اس کے مالک کو ادا کرے، مثلاً بکر نے اپنے غلام زید کو ایک ہزار کے بدلے مکاتب کیا ویسے زید نے غلام ہونے کی حیثیت سے سو روپے کی قیمت کا تھا، مکاتب ہونے کے بعد زید اپنے مالک بکر کو اپنے بدل کتابت کے مقررہ ایک ہزار روپے میں سے پانچ سو روپے ہی ادا کر پایا تھا کہ کسی شخص نے اس کو قتل کر دیا، اس صورت میں قاتل زید کے ورثاء کو پانچ سو روپے ادا کرے گا جو اس کی آزادی کی قیمت (یعنی بدل کتابت) کا نصف حصہ ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے مالک بکر کو پچاس روپے ادا کرے گا جو اس کی اصل قیمت کا نصف حصہ ہے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکاتب اپنے بدل کتابت میں سے جو مقدار مالک کو ادا کر دے گا اس کے بقدر وہ آزاد ہو جائے گا اور جو مقدار ادا نہیں کرے گا اس کے بقدر غلام رہے گا چنانچہ اس حدیث پر صرف امام نخعیؒ نے عمل کیا ہے لیکن جمہور علماء یہ فرماتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ یہ حدیث ضعیف ہے جس کو کسی مسلک کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا بلکہ یہ ان دونوں صحیح حدیثوں کے معارض بھی ہے جو اس سے پہلے بروایت حضرت عمرو ابن شعیب نقل ہو چکی ہیں جن سے یہ بات بصراحت ثابت ہوتی ہے کہ مکاتب کے ذمہ جب تک بدل کتابت کا کچھ حصہ بھی باقی رہے گا وہ غلام ہی رہے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مالی عبادت کا ثواب میت کو پہنچتا ہے

(۱۶) عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِی عَمْرَۃَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ اُمَّہٗ اَرَادَتْ اَنْ تُعْتِقَ فَاَخَّرَتْ ذٰلِكَ اِلٰی اَنْ تُصْبِحَ فَمَاتَتْ قَالَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ فَقُلْتُ لِلْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ اَیَنْفَعُھَا اَنْ اُعْتِقَ عَنْھَا فَقَالَ الْقَاسِمُ اَتٰی سَعْدُ بْنُ عُبَادَۃَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اُمِّی ھَلَکَتْ فَھَلْ یَنْفَعُھَا اَنْ اُعْتِقَ عَنْھَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَعَمْ۔ (رواہ مالک)

"حضرت عبدالرحمٰن ابن ابو عمرہ انصاری (تابعی) کے بارہ میں منقول ہے کہ ان کی والدہ نے (ایک دن) بردے کو آزاد کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ اگلی صبح ہونے تک اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکی تھیں، کہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ عبدالرحمٰنؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت قاسم ابن محمد سے (اس صورت حال کو ذکر کیا اور ان سے پوچھا کہ اگر میں اپنی والدہ کی طرف سے (بردہ کو) آزاد کروں تو کیا اس سے ان کو نفع پہنچے گا؟ حضرت قاسمؒ نے فرمایا کہ (ایک مرتبہ) حضرت سعد ابن عبادہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری والدہ کا (اچانک) انتقال ہو گیا ہے، اگر میں ان کی طرف سے بردہ آزاد کروں تو کیا اس سے ان کو نفع پہنچے گا؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں نفع پہنچے گا۔" (مالک)

تشریح: حضرت قاسم ابن محمدؒ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پوتے تھے، اس وقت مدینہ میں جو سات فقہاء مشہور تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھے۔

"ہاں نفع پہنچے گا" کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کی طرف سے جو بردہ آزاد کرو گے اس کا ثواب تمہاری والدہ کو پہنچے گا، چنانچہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مالی عبادت کا ثواب میت کو پہنچتا ہے البتہ بدنی عبادت کے ثواب پہنچنے کے بارہ میں اختلافی اقوال ہیں لیکن زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ بدنی عبادت کا ثواب بھی پہنچتا ہے۔

(۱۷) وَعَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ قَالَ تُوُفِّیَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ اَبِی بَکْرٍ فِی نَوْمٍ نَامَہٗ فَاَعْتَقَتْ عَنْہُ عَائِشَۃُ اُخْتُہٗ رِقَابًا کَثِیْرَۃً۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت یحییٰ ابن سعید (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن ابن ابوبکرؓ سوئے ہوئے تھے کہ اسی سونے کی حالت میں (اچانک) انتقال

کر گئے. چنانچہ حضرت عائشہؓ جو ان کی بہن تھیں ان کی طرف سے بہت سے بردے آزاد کئے۔" (مالکؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ نے جو بہت سے بردے آزاد کئے ان کا سبب یا تو یہ تھا کہ حضرت عبدالرحمٰن پر کسی وجہ سے بردے آزاد کرنے واجب ہوں گے جس پر وہ اپنی زندگی میں عمل نہ کر سکے اور پھر ناگہانی موت کی وجہ سے اس کی وصیت بھی نہ کر سکے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے از خود ان کی طرف سے بردے آزاد کر دیئے، یا پھر یہ کہ بعض حالات میں ناگہانی موت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں عائشہؓ بہت زیادہ غمگین ہوئی ہوں گی، اس لئے انہوں نے بہت سارے بردے آزاد کئے تاکہ اس صورت میں نقصان کا تدارک ہو سکے۔

غیر مشروط طور پر غلام خریدنے والا اس غلام کے مال کا حقدار نہیں ہوگا

(۱۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اشْتَرٰى عَبْدًا فَلَمْ يَشْتَرِطْ مَالَهُ فَلَا شَىْءَ لَهُ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی غلام کو خریدے اور اس کے مال کی شرط نہ کرے تو خریدنے والے کو اس مال میں سے کچھ نہیں ملے گا۔" (دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے غلام کو خریدا اور خریداری کے معاملہ میں اس مال کو شامل نہیں کیا جو غلام کے ساتھ ہے تو وہ اس مال کا حقدار نہیں ہوگا کیونکہ وہ مال تو دراصل اس مالک کی ملکیت ہے۔ جس سے اس نے غلام کو خریدا ہے۔

بَابُ الْاَیْمَانِ وَالنُّذُوْرِ

قسموں اور نذروں کا بیان

قسم کی قسمیں اور ان کے احکام

قسم کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) غموس۔ (۲) لغو۔ (۳) منعقدہ۔ "غموس" اس قسم کو کہتے ہیں کہ کسی گزشتہ یا حالیہ بات پر جھوٹی قسم کھائی جائے، مثلاً یوں کہا جائے "خدا کی قسم" میں نے یہ کام کیا تھا" حالانکہ واقعۃً" وہ کام نہیں کیا تھا یا یوں کہا جائے "خدا کی قسم میں نے یہ کام نہیں کیا تھا" حالانکہ واقعۃً وہ کام کیا گیا تھا! اسی طرح مثلاً زید نے یہ کہا ہے کہ خدا کی قسم! خالد کے ذمہ میرے ہزار روپے ہیں۔ یا۔ خدا کی قسم! میرے ذمہ خالد کے ہزار روپے نہیں ہیں حالانکہ حقیقت میں خالد کے ذمہ اس کے ہزار روپے نہیں ہیں یا اس کے ذمہ خالد کے ہزار روپے ہیں۔ غموس کا حکم یہ ہے کہ اس طرح جھوٹی قسم کھانے والا شخص گناہ گار ہوتا ہے، لیکن اس پر کفارہ واجب نہیں ہوتا البتہ توبہ و استغفار ضروری ہوتا ہے۔

"لغو" اس قسم کو کہتے ہیں جو کسی گزشتہ یا حالیہ بات پر کھائی جائے اور قسم کھانے والے کو یہ گمان ہو کہ وہ اسی طرح ہے جس طرح میں کہہ رہا ہوں لیکن واقعہ کے اعتبار سے وہ بات اس طرح نہ ہو جس طرح وہ کہہ رہا ہے۔ مثلاً کوئی شخص یوں کہے کہ "واللہ! یہ کام میں نے نہیں کیا تھا" حالانکہ اس شخص نے یہ کام کیا تھا مگر اس کو یہی گمان ہے کہ میں نے کام نہیں کیا ہے! یا اس شخص نے دور سے کسی شخص کو دیکھا اور کہا کہ خدا کی قسم! یہ زید ہے حالانکہ وہ زید نہیں تھا۔ بلکہ خالد تھا لیکن! یہ قسم اس شخص نے یہی گمان کر کے کھائی تھی کہ وہ زید ہے۔ قسم کی اس نوعیت کا حکم یہ ہے کہ اس طرح کھانے والے کے بارہ میں امید یہی ہے کہ اس سے مواخذہ نہیں ہوگا۔

"منعقدہ" اس قسم کو کہتے ہیں کہ کسی آئندہ کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارہ میں قسم کھائی جائے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم کے خلاف

کیا جائے گا تو کفارہ واجب ہوگا۔ مثلاً زید نے یوں کہا کہ! خدا کی قسم، میں آنے والی کل میں خالد کو سو روپے دوں گا۔ اب اگر اس نے آنے والی کل میں خالد کو سو روپے نہیں دیئے تو اس پر قسم کو توڑنے کا کفارہ واجب ہوگا۔ منعقدہ قسم کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں قسم کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے، جیسے فرائض کے کرنے یا گناہ کو ترک کرنے کی قسم کھائی جائے، مثلاً یوں کہا جائے کہ خدا کی قسم! میں ظہر کی نماز پڑھوں گا۔ یا۔ خدا کی قسم! میں زنا کرنا چھوڑ دوں گا ان صورتوں میں قسم کو پورا کرنا واجب ہے۔

بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں قسم کو پورا نہ کرنا واجب ہوتا ہے، جیسے کوئی نادان کسی گناہ کو کرنے یا کسی واجب پر عمل نہ کرنے کی قسم کھائے تو اس قسم کو توڑنا ہی واجب ہے۔ اسی طرح منعقدہ قسم کی بعض صورتوں میں قسم کو توڑنا واجب تو نہیں ہوتا مگر بہتر ہوتا ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ "خدا کی قسم! میں کسی مسلمان سے ملاقات نہیں کروں گا" تو اس قسم کو پورا نہ کرنا بہتر ہے ان کے علاوہ اور صورتوں میں محافظت قسم کے پیش نظر قسم کو پورا کرنا افضل ہے۔

وجوب کفارہ کے سلسلے میں یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ "منعقدہ" قسم توڑنے پر بہر صورت کفارہ واجب ہوتا ہے۔ قسم خواہ قصداً کھائی گئی ہو اور خواہ قسم کھانے والے کو قسم کھانے پر یا قسم توڑنے پر زبردستی مجبور کیا گیا ہو۔

قسم کا کفارہ

قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ بردہ کو آزاد کیا جائے، یا دس مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ ان دونوں ہی صورتوں میں ان شرائط و احکام کو سامنے رکھا جائے جو کفارۂ ظہار میں بردہ کو آزاد کرنے یا مسکینوں کو کھانا کھلانے کے سلسلے میں منقول ہیں اور یا دس مسکینوں کو پہننے کا کپڑا دیا جائے اور ان میں سے ہر ایک کو ایسا کپڑا دیا جائے جس سے بدن کا اکثر حصہ چھپ جائے، لہٰذا اگر صرف پاجامہ دیا جائے گا تو یہ کافی نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص ان تینوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت پر بھی قادر نہ ہو یعنی نہ تو بردہ آزاد کر سکتا ہو، نہ دس مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہو اور نہ دس مسکینوں کو لباس دے سکتا ہو تو پھر وہ تین روزے پے در پے رکھے۔

قسم توڑنے سے پہلے کفارہ دے دینا جائز ہے، کافر کی قسم میں کفارہ واجب نہیں ہوتا اگرچہ وہ حالت اسلام میں اس قسم کو توڑے۔ اسی طرح چونکہ بچے، سوئے ہوئے شخص اور دیوانے کی قسم، سرے سے صحیح ہی نہیں ہوتی اس لئے ان پر قسم توڑنے کا کفارہ بھی واجب نہیں ہوتا۔

قسم کے دیگر احکام و مسائل

عربی میں قسم کے لئے تین حروف ہیں۔ ① و ② ب ③ ت مثلاً یوں کہا جائے واللہ یا باللہ یا تاللہ ان تینوں کا مفہوم یہ ہے۔ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں، عربی زبان و اسلوب کے مطابق بسا اوقات یہ حروف مقدر ہوتے ہیں یعنی لفظوں میں تو ان کا ذکر نہیں ہوتا لیکن حقیقت میں ان کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ جیسے یوں کہا جائے اللہ افعلہ۔ یہ معنی مفہوم کے اعتبار سے واللہ افعلہ ہے۔

قسم باری تعالیٰ کی اسم ذات اللہ کے ساتھ یا اس کے دوسرے ناموں میں سے کسی اور نام مثلاً۔ رحمٰن، رحیم اور حق وغیرہ کے ساتھ کھائی جاتی ہے اور ان ناموں میں سے نیت کی ضرورت نہیں ہوتی ہاں اگر ایسے ناموں کے ساتھ قسم کھائی جائے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کی ذات کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے علیم و حکیم وغیرہ تو ان میں نیت کی احتیاج ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ان صفات کے ساتھ قسم کھانا بھی صحیح ہے جن کے ساتھ عام طور پر قسم کھانے کا رواج ہو جیسے اللہ کی عزت و جلال کی قسم! اللہ کی بڑائی اور بزرگی کی قسم اور اللہ کی عظمت و قدرت کی قسم! ہاں ان صفات کے ساتھ قسم کھانا صحیح نہیں ہوتا۔ جن کے ساتھ قسم کھانے کا عام طور پر رواج نہ ہو، جیسے رحمت، علم، رضا، غضب اور عذاب۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا جائز نہیں ہے جیسے باپ اور دادا کی قسم، قرآن کی قسم، انبیاء کی قسم، ملائکہ کی قسم کعبہ کی قسم، نماز روزہ

کی قسم، مسجد حرام اور زمزم کی قسم اور دیگر تمام شعائر کی قسم یا اسی طرح بعض لوگ اس طرح قسم کھاتے ہیں اپنی جوانی کی قسم، اپنے سر کی قسم، تمہاری جان کی قسم، تمہاری قسم، اپنی اولاد کی قسم، یہ سب ناجائز ہیں، لیکن اگر اس طرح کی کوئی قسم کھائی جائے اور پھر اس کے خلاف کیا جائے تو قسم توڑنے کا کفارہ دینا پڑے گا۔

عربی میں لعمر اللہ قسم ہے، اسی طرح، "سوگند خدا" یا "خدا کی سوگند کھاتا ہوں" بھی قسم ہے، نیز عبد اللہ میثاق اللہ قسم کھاتا ہوں، حلف کرتا ہوں اور اشھد (اگرچہ اس کے ساتھ لفظ اللہ ذکر نہ کیا جائے) یہ سب بھی قسمیں ہیں۔

اسی طرح کہنا "مجھ پر نذر ہے" یا "مجھ پر یمین ہے" یا مجھ پر عہد ہے (اگرچہ اس کی اضافت اللہ کی طرف نہ کرے) بھی قسم ہے ایسے ہی اگر کوئی شخص یوں کہے کہ اگر میں فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں یا یہودی ہو جاؤں یا عیسائی ہو جاؤں یا یوں کہے کہ اگر میں فلاں کام کروں تو میں اللہ تعالیٰ سے بری ہوں تو اس طرح کہنے سے بھی قسم ہو جاتی ہے، اس کے خلاف کرنے سے قسم توڑنے کا حکم ثابت ہو جاتا ہے لیکن اپنے کہنے کے مطابق وہ کافر یا یہودی یا عیسائی نہیں ہو جاتا۔ خواہ اس فلاں کام کا تعلق گزشتہ زمانہ سے ہو یا آئندہ زمانہ سے، بشرطیکہ اسے یہ علم ہو کہ اس طرح کہنا قسم ہے، ہاں اگر اس طرح کہتے وقت اس کے ذہن میں قسم کا تصور نہ ہو بلکہ واقعۃً کفر ہی کا تصور رکھتا ہو پھر اس صورت میں اس وجہ سے کہ اس نے خود کفر کو اختیار کیا ہے وہ کافر ہو جائے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ "اگر فلاں شخص یہ کام کرے تو اس پر اللہ کا غضب ٹوٹے یا اس پر اللہ کی لعنت ہو" یا یوں کہے کہ اگر فلاں شخص یہ کام کرے تو وہ زانی ہے، یا چور ہے، یا شرابی ہے، یا سود خوار ہے، تو اس کو قسم نہیں کہیں گے، اسی طرح یہ کہنا "حقا" یا "وحق اللہ" بھی قسم نہیں ہے، لیکن اس میں حضرت امام ابو یوسفؒ کا اختلافی قول ہے۔

اسی طرح کہنا کہ "میں خدا کی سوگند کھاؤں یا۔ بیوی پر طلاق کی سوگند کھاؤں" بھی قسم نہیں ہے، اگر کوئی شخص اپنی کسی مملوکہ چیز کو اپنے اوپر حرام کرلے تو وہ چیز اس پر حرام نہیں ہو جاتی۔ لیکن اس کو استعمال کرنے سے کفارہ واجب نہیں ہو جاتا ہے مثلاً کوئی شخص یوں کہے کہ میں نے اپنے اوپر روٹی کو حرام کر لیا ہے، اس طرح کہنے سے اس پر روٹی حرام نہیں ہو جاتی، لیکن اگر وہ اس کے بعد روٹی کھائے گا تو قسم کا کفارہ دینا لازم ہے۔

اگر کوئی شخص یوں کہے کہ تمام حلال چیزیں مجھ پر حرام ہیں تو اس کا اطلاق کھانے پینے کی تمام چیزوں پر ہو گا یعنی اگر وہ کوئی حلال چیز کھائے گا تو اس پر قسم کا کفارہ واجب ہو جائے گا، نیز اس پر فتویٰ ہے کہ اس طرح کہنے سے بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی اگرچہ اس نے اس کی نیت نہ کی ہو، اسی طرح یوں کہنا کہ "حلال چیز مجھ پر حرام ہے" یا یہ کہنا کہ اپنے دائیں ہاتھ میں جو چیز بھی لوں وہ مجھ پر حرام ہے۔ کا بھی حکم یہی ہے۔

اگر کوئی شخص قسم کے ساتھ لفظ "انشاء اللہ" بھی ادا کرے تو وہ حانث نہیں ہو گا یعنی چونکہ وہ سرے سے قسم ہی نہیں ہو گی اس لئے اس کے خلاف کرنے سے کفارہ بھی واجب نہیں ہو گا۔

یہ تو قسموں کے بارے میں کچھ تفصیل تھی، اب باب کے دوسرے جزو "نذر" کے متعلق بھی چند باتیں ذہن نشین کر لیجئے۔

نذر اور اس کے احکام

"نذر" منت کو کہتے ہیں یعنی کسی ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینا جو واجب نہیں تھی مثلاً کوئی شخص یوں کہے کہ اے اللہ! "اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں پانچ روزے رکھوں گا"۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ تمام اہل علم کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ نذر ماننا صحیح ہے اور اس نذر کو پورا کرنا واجب ہے بشرطیکہ وہ نذر کوئی گناہ کی چیز نہ ہو اور اس نذر کا تعلق کسی گناہ کی چیز سے ہو تو حضرت امام شافعیؒ اور جمہور علماء کے نزدیک وہ نذر صحیح نہیں ہو گی، اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ نذر صحیح نہیں ہو گی بلکہ ایسی نذر ماننے والے پر قسم کا کفارہ

واجب ہوگا۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

لَا نَذْرَ فِیْ مَعْصِیَةٍ وَکَفَّارَتُهٗ کَفَّارَةُ یَمِیْنٍ۔

"معصیت کی نذر کا کوئی اعتبار نہیں لیکن اس پر قسم کا کفارہ واجب ہوگا۔"

ملتقی میں لکھا ہے کہ جس شخص نے مطلق نذر مانی یعنی اس نذر کو کسی شرط کے ساتھ معلق نہیں کیا مثلاً یوں کہا "کہ میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے روزے رکھوں گا"۔ یا ایسی نذر مانی جو کسی شرط کے ساتھ متعلق ہو اور وہ شرط بھی ایسی ہو جس کے پورے ہونے کی وہ خواہش و ارادہ رکھتا ہو مثلاً یوں کہے کہ اگر میں صحت یاب ہو جاؤں تو روزے رکھوں گا۔ اور پھر وہ شرط پوری ہو جائے۔ یعنی وہ صحتیاب ہو جائے تو ان دونوں ہی صورتوں میں اس نذر کو پورا کرنا ضروری ہوگا، اور اگر اس نے اپنی نذر کو کسی ایسی شرط کے ساتھ متعلق کیا جس کے پورا ہونے کی وہ خواہش نہ رکھتا ہو "مثلاً یوں کہے کہ" "اگر میں زنا کروں تو مجھ پر غلام آزاد کرنا واجب ہوگا"۔ تو اس صورت میں اسے اختیار ہے کہ چاہے تو قسم کا کفارہ دے اور چاہے اس نذر کو پورا کرے یعنی غلام آزاد کرے۔

نذر کے سلسلے میں دیگر مسائل و احکام تفصیل کے ساتھ فقہ کی کتابوں اور فتاویٰ عالمگیری میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں ان میں دیکھے جا سکتے ہیں البتہ اس موقع پر نذر کے سلسلہ میں بڑی اور اہم فائدے کی بات ذکر کر دینا یقیناً ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کی نذر ماننا جائز نہیں ہے، نہ نبی کی، نہ فرشتے کی، نہ اولیاء اللہ کی نہ کسی اور کی۔ مثلاً یوں کہنا کہ "اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو مولود پڑھاؤں گا۔ یا۔ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو فلاں بزرگ کے مزار پر چادر چڑھاؤں گا۔ یا اگر فلاں کام ہو گیا تو مولیٰ مشکل کشا کا روزہ رکھوں گا، اسی طرح غیر اللہ کی نذر ماننا بڑے گناہ کی بات ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مائۃ مسائل" معتبر و مستند کتابوں کے حوالہ سے جو مفید اور کارآمد باتیں لکھی ہیں ان سب کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ "اس طرح نذر ماننی کہ" اگر اللہ تعالیٰ نے میری فلاں حاجت پوری کر دی تو میں فلاں بزرگ کے مزار پر اتنے روپے یا اتنے کھانے چڑھاؤں گا درست نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نذر ماننے میں چند ایسی شرائط ہیں جو پائی جائیں تو نذر صحیح ہوتی ہے اور اگر وہ شرائط پوری نہ ہوں تو پھر نذر صحیح نہیں ہوتی۔ ایک شرط تو یہ ہے کہ جو چیز اپنی طرف سے نذر مانی جائے وہ ایسی ہونی چاہئے جس کی جنس شرعی طور پر واجب ہو (جیسے نماز روزہ وغیرہ) چنانچہ اسی لئے اگر کوئی شخص مریض کی عیادت کرنے کی نذر مانے (یعنی یوں کہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں فلاں فلاں مریض کی عیادت کروں گا) تو اس کی نذر صحیح نہیں ہوگی کیونکہ مریض کی عیادت ایسی جنس سے ہے جو شرعاً واجب نہیں ہے۔

تیسری شرط یہ کہ جو چیز نذر مانی جائے وہ فی الحال یا ثانی الحال اس پر واجب نہ ہو جیسے نماز پنجگانہ۔

اور چوتھی شرط یہ کہ جو چیز نذر مانی جائے وہ خود کوئی گناہ کی چیز نہ ہو۔ ان شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ثابت ہوا کہ اس طرح نذر ماننا کہ فلاں بزرگ کے مزار پر اتنے روپے یا اتنے کھانے چڑھاؤں گا، صحیح نہیں ہے کیونکہ کسی مزار پر روپے یا کھانا پہنچانا کوئی عبادت نہیں ہے، ہاں اگر اس طرح نذر مانی گئی کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے میری فلاں حاجت پوری کر دی تو میں فلاں بزرگ کے مزار کے خدام و فقراء کو کھانا کھلاؤں گا" تو یہ نذر صحیح ہوگی اور اس کو پورا کرنا لازم ہوگا، لیکن نذر کو پورا کرنے کے لئے اس مزار کے خدام و فقراء کے درمیان تخصیص کرنا ضروری نہیں ہوگا بلکہ جس خادم و فقیر کو بھی کھانا کھلا دے گا تو نذر پوری ہو جائے گی اور اگر یوں کہے کہ "اگر میری فلاں حاجت بر آئے گی تو میں فلاں بزرگ کے نام پر یا فلاں بزرگ کے واسطے اتنے روپے یا اتنا کھانا دوں گا نا جائز ہے، اس طرح کی نذر نہ صرف یہ کہ باطل و لغو ہے، بلکہ اس نذر کا روپیہ یا کھانا استعمال کرنا حرام بھی ہے اس مسئلہ کو بحرالرائق میں تفصیل کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَاَمَّا النَّذْرُ الَّذِیْ یَنْذُرُهٗ اَکْثَرُ الْعَوَامِ عَلٰی مَا هُوَ مُشَاهَدٌ کَاَنْ یَکُوْنَ الْاِنْسَانِ غَائِبٌ اَوْ مَرِیْضٌ اَوْلَهٗ حَاجَةٌ ضَرُوْرِیَّةٌ

فَيَاتِي فِي بَعْضِ مَزَارَاتِ الصُّلَحَاءِ فَيَجْعَلُ سِتْرَهُ عَلٰى رَأْسِهِ وَيَقُوْلُ يَا سَيِّدِيْ فُلَانٌ اِنْ رَدَّ غَائِبِي اَوْ عُوْفِيَ مَرِيْضِيْ اَوْ قَضَيْتَ حَاجَتِيْ فَلَكَ مِنَ الذَّهَبِ كَذَا اَوْ مِنَ الْفِضَّةِ كَذَا اَوْ مِنَ الطَّعَامِ كَذَا اَوْ مِنَ الْمَاءِ كَذَا اَوْ مِنَ الْقَمْحِ كَذَا اَوْ مِنَ الزَّيْتِ كَذَا فَهٰذِهِ النَّذْرُ بَاطِلٌ بِالْاِجْمَاعِ لِوُجُوْهٍ مِنْهَا اَنَّهُ نَذْرٌ لِمَخْلُوْقٍ وَالنَّذْرُ لِلْمَخْلُوْقِ لَا يَجُوْزُ لِاَنَّهُ عِبَادَةٌ وَالْعِبَادَةُ لَا يَكُوْنُ لِمَخْلُوْقٍ وَمِنْهَا اَنَّ الْمَنْذُوْرَ لَهُ مَيِّتٌ وَالْمَيِّتُ لَا يَمْلِكُ وَمِنْهَا اِنْ ظَنَّ اَنَّ الْمَيِّتَ يَتَصَرَّفُ فِي الْاُمُوْرِ دُوْنَ اللّٰهِ فَاعْتِقَادُهُ بِهِ ذٰلِكَ كُفْرٌ اَللّٰهُمَّ اِلَّا اَنْ يُقَالَ يَا اللّٰهُ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ اِنْ شَفَيْتَ مَرِيْضِيْ اَوْ رَدَدْتَ غَائِبِيْ اَوْ قَضَيْتَ حَاجَتِيْ اَنْ اُطْعِمَ الْفُقَرَاءَ الَّذِيْنَ بِبَابِ السَّيِّدَةِ نَفِيْسَةَ اَوِ الْفُقَرَاءَ الَّذِيْنَ بِبَابِ الْاِمَامِ الشَّافِعِيِّ اَوِ الْاِمَامِ اَبِي اللَّيْثِ اَوِ اشْتَرِيْ حَصِيْرًا لِمَسَاجِدِهِمْ اَوْ زَيْتًا بِوُقُوْدِهَا اَوْ دَرَاهِمَ لِمَنْ يَقُوْمُ بِشَعَائِرِهَا اِلٰى غَيْرِ ذٰلِكَ مِمَّا يَكُوْنُ فِيْهِ النَّفْعُ لِلْفُقَرَاءِ وَالنَّذْرُ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَذِكْرُ الشَّيْخِ اِنَّمَا هُوَ لِبَيَانِ مَحَلِّ تَصَرُّفِ النَّذْرِ لِمُسْتَحِقِّيْهِ الْقَاطِنِيْنَ بِرِبَاطِهِ اَوْ مَسْجِدِهِ اَوْ جَامِعِهِ فَيَجُوْزُ بِهٰذَا الْاِعْتِبَارِ اِذْ مَصْرَفُ النَّذْرِ الْفُقَرَاءُ وَقَدْ وُجِدَ الْمَصْرَفُ وَلَا يَجُوْزُ اَنْ يُصْرَفَ ذٰلِكَ لِغَنِيٍّ غَيْرِ مُحْتَاجٍ وَلَا لِشَرِيْفِ النَّسَبِ لِاَنَّهُ لَا يَحِلُّ لَهُ الْاَخْذُ مَالَمْ تَكُنْ مُحْتَاجًا وَلَا لِذِيْ مَنْصَبٍ لِاَجْلِ مَنْصَبِهِ مَا لَمْ يَكُنْ فَقِيْرًا وَلَا لِذِيْ عِلْمٍ لِاَجْلِ عِلْمِهِ مَالَمْ يَكُنْ فَقِيْرًا وَلَمْ يَثْبُتْ فِي الشَّرْعِ جَوَازُ التَّصَرُّفِ لِلْاَغْنِيَاءِ لِلْاِجْمَاعِ عَلٰى حُرْمَةِ النَّذْرِ لِلْمَخْلُوْقِ وَلَا يَنْعَقِدُ وَلَا يَشْتَغِلُ الذِّمَّةُ بِهِ وَاِنَّهُ حَرَامٌ بَلْ سُحْتٌ فَلَا يَجُوْزُ لِخَادِمِ الشَّيْخِ اَخْذُهُ وَلَا اَكْلُهُ وَلَا التَّصَرُّفُ فِيْهِ بِوَجْهٍ مِنَ الْوُجُوْهِ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ فَقِيْرًا وَلَهُ عِيَالٌ فُقَرَاءُ عَاجِزُوْنَ عَنِ الْكَسْبِ وَهُمْ مُضْطَرُّوْنَ فَيَاْخُذُوْنَهُ عَلٰى سَبِيْلِ الصَّدَقَةِ الْمُبْتَدَاَةِ وَاَخْذُهُ اَيْضًا مَكْرُوْهٌ مَالَمْ يَقْصُدْ بِهِ النَّاذِرُ التَّقَرُّبَ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَصَرْفَهُ اِلَى الْفُقَرَاءِ وَيَقْطَعُ النَّظَرَ عَنْ نَذْرِ الشَّيْخِ فَاِذَا عَلِمْتَ هٰذَا فَمَا يُؤْخَذُ مِنَ الدَّرَاهِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّيْتِ وَغَيْرِهَا وَيُنْقَلُ اِلٰى ضَرَائِحِ الْاَوْلِيَاءِ تَقَرُّبًا اِلَيْهِمْ فَحَرَامٌ بِاِجْمَاعِ الْمُسْلِمِيْنَ مَالَمْ يُقْصَدْ بِصَرْفِهَا الْفُقَرَاءُ الْاَحْيَاءُ قَوْلًا وَاحِدًا وَكَذَا فِي النَّهْرِ وَالدُّرِّ۔

"اور جہاں تک نذر کا سوال ہے تو جیسا کہ مشاہدہ ہے، عام طور پر (جاہل) لوگ اس طرح نذر مانتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا (کوئی عزیز) غائب ہو جاتا ہے، یا بیمار ہو جاتا ہے اور یا اس کی ضروری مراد ہوتی ہے تو وہ کسی بزرگ کے مزار پر آتا ہے اور اس کا پردہ اپنے سر پر ڈال کر (یا قبر کی چادر پکڑ کر) یوں کہتا ہے کہ "اے میرے فلاں سردار! اگر میرا وہ عزیز جو غائب ہو گیا ہے واپس ہو گیا، یا اس کو مرض سے صحت یابی ہو گئی اور یا میری فلاں مراد پوری ہو گئی تو میں آپ کے مزار پر اس قدر سونا چڑھاؤں یا اس قدر چاندی چڑھاؤں گا، یا اس قدر کھانا چڑھاؤں گا، یا اس قدر پانی چڑھاؤں گا، یا اس قدر شمع یا زیت (یعنی تیل) چڑھاؤں گا تو اس طرح نذر ماننا تمام علماء کے نزدیک باطل ہے اور اس کے باطل ہونے کے کئی سبب ہیں، اول تو یہ مخلوق (یعنی غیر اللہ) کی نذر ہے اور غیر اللہ کی نذر جائز نہیں ہے کیونکہ نذر (دراصل عبادت ہے) اور مخلوق کی عبادت جائز نہیں ہے، دوم یہ کہ جس کے نام کی (یعنی صاحب مزار) کی نذر مانی گئی ہے وہ ایک بے جان ہے اور بے جان مالک نہیں ہوتا۔ سوم یہ کہ اگر (اس طرح نذر ماننے کے وقت) یہ گمان کیا تھا کہ اللہ کے علاوہ یہ میت (یعنی صاحب مزار) بھی بندوں کے معاملات میں تصرف کرتا ہے تو ایسا اعتقاد رکھنا کفر ہے۔ لہٰذا اے اللہ (اس بات کی ہدایت دے کہ) اس طرح نذر ماننے کی بجائے یوں نذر مانی جائے کہ "اے خدا میں تیری نذر مانتا ہوں کہ اگر تو میرے بیمار کو شفا بخشے گا۔ یا میرے غائب عزیز کو واپس کرا دے گا، یا میری مراد کو پوری کرے گا تو میں (مثلاً) ان فقراء و خدام کو کھانا کھلاؤں گا، جو بی بی نفیسہ کے دروازے (یعنی مزار) پر ہیں، یا ان فقراء و خدام کو کھانا کھلاؤں گا جو حضرت امام شافعیؒ یا حضرت امام ابواللیثؒ کے دروازے (یعنی مزار) پر ہیں یا میں ان کی مسجدوں کے لئے بورئیے، یا ان کی مسجدوں کی روشنی کے لئے تیل خریدوں گا، یا میں ان لوگوں کو روپے دوں گا، جو ان بزرگوں کی مسجدوں کے شعائر قائم رکھتے ہیں (یعنی مؤذن اور ائمہ) یا ان کے علاوہ کسی بھی ایسی چیز کا ذکر کرے جس میں فقراء و مساکین کا نفع ہو۔ لہٰذا اس طرح نذر ماننے میں نذر تو دراصل اللہ عزوجل کے لئے ہو گی اور

بزرگ کا ذکر کرنا محض نذر کے مصرف کو بیان کرنے کے پیش نظر ہوگا اور وہ مصرف نذر کے وہ مستحقین ہیں جو ان بزرگ کی خانقاہ یا ان کی مسجد اور یا ان کی جامع مسجد میں رہتے ہیں پس اس طرح نذر مانی درست ہے، کیونکہ نذر کے مصرف فقراء ہی ہیں اور وہ مصرف یہاں پایا گیا، نیز نذر کی ہوئی چیز کو مستطیع (غیر محتاج) پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے اور نہ کسی شریف النسب پر خرچ کرنا جائز ہے کیونکہ جب تک کہ وہ محتاج نہ ہو اس کے لئے نذر کی ہوئی چیز کا لینا درست نہیں ہے، اور نہ کسی منصب والے پر خرچ کرنا جائز ہے اس کے منصب کی وجہ سے جب تک کہ وہ محتاج نہ ہو، اور نہ کسی اہل علم پر خرچ کرنا جائز ہے، اس کے علم کی وجہ سے جب تک وہ مستحق نہ ہو۔ اور شریعت میں نذر کی ہوئی چیز کا مستطیع لوگوں پر خرچ کرنے کا جواز ثابت نہیں ہے، نیز اس بات پر علماء اُمت کا اجماع و اتفاق ہے کہ مخلوق کی نذر ماننا حرام ہے، اور اگر کوئی شخص کسی مخلوق (یعنی بزرگ) کی نذر مانے تو وہ نذر صحیح نہیں ہوتی اور نہ اس نذر کو پورا کرنا اس پر واجب ہوتا ہے اور وہ نذر نہ صرف حرام بلکہ رشوت کے حکم میں ہے لہٰذا اس بزرگ کے خادم اور مجاور کے لئے اس نذر کا لینا اس کا کھانا اور اس میں کسی طرح کا تصرف کرنا جائز نہیں ہے ہاں اگر کوئی خادم یا مجاور محتاج ہو اور اپنے ان نادار بچوں کا کفیل ہو جو کمانے سے معذور ہوں اور وہ حالت اضطرار میں ہوں تو ان کو اس نذر کا مال ابتدائی صدقہ کے طور پر لینا جائز ہے لیکن اس صورت میں بھی اس مال کو اس وقت تک لینا مکروہ ہوگا جب کہ نذر کرنے والے کی نیت اس بزرگ کی نذر سے قطع نظر تقرب الی اللہ اور فقراء پر خرچ کرنے کی نہ ہو! پس جب کہ تمہیں یہ تفصیل معلوم ہوگئی تو (جان لو کہ) کہ اولیاء اللہ کے تقرب کی نیت سے جو روپے پیسے اور موم بتی و تیل وغیرہ ان کی قبروں پر چڑھایا جاتا ہے، وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر حرام ہے جب تک کہ نذر کرنے والا اس کو فقیروں پر خرچ کرنے کی نیت نہ کرے۔ (النہر الفائق۔ اور الدر المختار میں بھی اسی طرح منقول ہے۔"

حضرت مولانا محمد اسحٰق" کے مذکورہ منقولات کے علاوہ اس سلسلہ میں مولانا رشید الدین خاں مرحوم نے ایک سوال کا جو جواب لکھا ہے۔ وہ بھی اس قابل ہے کہ اس کو مع سوال کے یہاں نقل کر دیا جائے۔

سوال: جو کھانا بزرگوں کی نذر و نیاز کے طور پر مانا جاتا ہے اس کو کھانا اور اس طرح (یعنی بزرگوں کی نذر ماننا اور ان کی نیاز کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کس طرح؟ نیز بعض نذر بشرط حاجت براری مانی جاتی ہے اور بعض نذر بلا شرط مانی جاتی ہے ان دونوں میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

جواب: شریعت میں نذر کا مفہوم ہے اپنے اوپر کسی غیر واجب کو واجب کر لینا، چنانچہ جامع الرموز میں لکھا ہے کہ:

النذر ایجاب علی النفس مالیس علیها بالقبول۔

"کسی ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینے کو "نذر" کہتے ہیں جس پر عمل کرنا اس کے لئے ضروری نہیں تھا۔"

اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں آیت کریمہ اور نذر تم من نذر کی تفسیر کے تحت فرمایا ہے کہ:

النذر ما الزمه الانسان علی نفسه۔

"نذر وہ ہے جس کو انسان اپنے اوپر لازم کرے۔"

"نذر" کی مختصر توضیح تو یہ ہے اور اس کی تفصیل فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

"نیاز" فارسی کا لفظ ہے جس کے کتنے ہی معنی ہیں ان میں سے ایک معنی یہ بھی ہیں "تحفہ درویشاں وکذا فی البرہان القاطع ان دونوں لفظوں یعنی نذر و نیاز کے ان لغوی اور اصطلاحی معنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کا شرعی حکم ماننا چاہئے کہ نذر خدا کے علاوہ اور کسی کے لئے جائز نہیں ہے اور اگر کوئی شخص غیر اللہ کی نذر مانے تو وہ صحیح نہیں ہوگی، نیز ایسی نذر کی چیز کو لینا یا کھانا صحیح و مستند فقہی روایات کے بموجب قطعاً ناروا ہے یہ تو نذر کا حکم ہے اب رہا نیاز کا معاملہ تو جیسا کہ معلوم ہوا لفظ "نیاز کے معنی ہیں، تحفہ درویشاں" اور وہ بر وصلہ ہے (یعنی

بخشش وہدیہ ہے) لہٰذا اگر کوئی شخص کسی زندہ بزرگ کی خدمت میں کوئی چیز بطریق نیاز یعنی عطاء وہدیہ اور تحفہ کے طور پر پیش کرے تو وہ نیاز جائز ہے اور اس بزرگ کو وہ چیز کھانا یا استعمال کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی مرحوم بزرگ کی نیاز یعنی فاتحہ و ایصال ثواب کی جائے تو یہ نیاز بھی جائز ہے لیکن اس نیاز کی چیز کو کھانے کے سلسلے میں کچھ تفصیل ہے اور وہ یہ کہ اگر نیاز دینے والے نے وفات پائے ہوئے بزرگ کو صدقہ ماکولی کا ثواب پہنچانے کی نیت کی ہو تو اس چیز کو کھانا صرف فقراء کے لئے جائز ہے مستطیع لوگوں کے لئے جائز نہیں ہے، اگر نیاز دینے والے نے عام مسلمانوں کے حق میں "اباحت ماکولی" کا ثواب اس بزرگ کو پہنچانے کی نیت کی ہو تو اس صورت میں اس چیز کو کھانا ہر بھوکے کے لئے جائز ہے خواہ وہ مستطیع ہو یا فقیر ہو۔ حاصل یہ ہے کہ کسی بزرگ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے یا حاجت براری کی شرط کے ساتھ اس بزرگ کی جو نذر مانی جاتی ہے وہ منقولات بالا کی روشنی میں ناجائز ہے اور اس نذر کی چیز کو کھانا یا استعمال کرنا ناروا ہے۔ ہاں جس نذر کا تعلق نہ تو بزرگ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے ہوتا ہے اور نہ وہ کسی حاجت براری کے ساتھ مشروط ہوتی ہے بلکہ پہلے وہ چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے صدقہ کی جاتی ہے اور پھر اس بزرگ کو پہنچایا جاتا ہے تو اس چیز کو کھانا اور استعمال کرنا مستطیع لوگوں کے لئے تو جائز نہیں ہے بشرطیکہ نذر ماننے والے نے اس بزرگ کو صدقہ ماکولی کا ثواب پہنچانے کی نیت کی ہو اور اگر نذر ماننے والے نے اس بزرگ کو اباحت ماکولی کا ثواب پہنچانے کی نیت کی ہو تو اس چیز کا کھانا اور استعمال کرنا مستطیع لوگوں کے لئے بھی جائز ہے اور فقراء کے لئے بھی جائز ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسی طرح نیاز کا مسئلہ بھی یہ ہے کہ بزرگوں کی نیاز اگر محض ایصال ثواب کے طور پر ہو تو جائز ہے اور ان کا تقرب یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے کسی چیز کو ان کے نام پر اپنے اوپر واجب کرنا جائز نہیں ہے۔ خواہ اس چیز کو اپنے اوپر واجب کرنا کسی حاجت براری کے ساتھ معلق ہو اور خواہ اس کے بغیر ہو، کیونکہ یہ نذر ہے اور نذر خدا کے علاوہ کسی اور کے لئے جائز نہیں ہے۔ لہٰذا واضح ہو کہ خواہ حاجت براری کے ساتھ معلق کر کے اور خواہ اس کے بغیر کسی چیز کو اپنے اوپر خدا کے علاوہ کسی اور کے نام پر واجب کرنا دونوں ہی صورتوں میں ناجائز ہے۔ ہاں بزرگوں کی نیاز اس معنی میں جائز ہے کہ اس سے کسی بزرگ کا تقرب یا حاجت براری کی نیت نہ ہو بلکہ اس کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول اور اس کا ثواب اس بزرگ کو پہنچانا ہو اور نیاز کی ہوئی چیز کو مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں کھانا اور استعمال کرنا جائز ہے۔

دلیل الضالین میں لکھا ہے کہ "نذر" صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے اور کسی کے لئے نہیں ہوتی، لہٰذا اگر کسی شخص نے انبیاء میں سے کسی نبی یا اولیاء میں سے کسی ولی کی نذر مانی تو اس پر کچھ واجب نہیں ہوتا یعنی اس نذر کو پورا کرنا اس شخص پر لازم نہیں ہوتا، نیز اگر وہ شخص اس نذر کی چیز کو اپنی اسی نیت کے ساتھ کسی آدمی کو دیدے تو اس آدمی کو وہ چیز لینا جائز ہے اگر وہ کھانے کی کوئی چیز ہو تو اس کو کھانا حلال نہیں ہے اور اگر وہ چیز کوئی ذبح کیا ہوا جانور ہو تو وہ مردار کے حکم میں ہے بلکہ اگر لوگ اس کو بسم اللہ کر کے کھائیں تو سب کافر ہو جائیں گے، ہاں اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لئے نذر مانے اور پھر نذر کی ہوئی چیز کو لوگ کھائیں اور اس کا ثواب کسی میت کو بخشیں تو یہ جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَكْثَرُ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْلِفُ لَا وَمُقَلِّبِ الْقُلُوْبِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اکثر اس طرح قسم کھایا کرتے تھے "قسم ہے دلوں کو پھیرنے والے کی۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کی قسم کھانا جائز ہے۔

غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت

② وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ اَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ

اَوْلِیَصْمُتْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے منع فرماتا ہے کہ تم اپنے باپوں کی قسم کھاؤ! جس شخص کو قسم کھانا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اللہ (کے نام یا اس کی صفات) کی قسم کھائے یا چپ رہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: باپ کی قسم کھانے سے منع کرنا مثال کے طور پر ہے، اصل مقصد تو یہ ہدایت دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی قسم نہ کھایا کرو۔ بطور خاص "باپ" کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی عادت ہے کہ وہ باپ کی قسم بہت کھاتے ہیں! نیز عبداللہ کی قسم کھانے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کمال عظمت و جلالت کے سبب چونکہ قسم اسی کی ذات کے ساتھ مختص ہے، اس لئے کسی غیر اللہ کو اللہ کے مشابہ نہ قرار دیا جائے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھاؤں اور پھر اس کو توڑ ڈالوں، اس کو اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ کسی غیر اللہ کی قسم کھاؤں اور اس کو پورا کروں۔ ہاں جہاں تک حق تعالیٰ کی ذات پاک کا سوال ہے تو اس کو سزاوار ہے کہ وہ اپنی عظمت و جلالت کے اظہار کے لئے اپنی مخلوقات میں سے جس کی چاہے قسم کھائے۔

اس حدیث کے ضمن میں ایک اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ سے یوں منقول ہوا ہے اَفْلَحَ وَاَبِیْہِ یعنی آپ نے باپ کی قسم کھائی جب کہ یہ حدیث اس کے سراسر خلاف ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا باپ کی قسم کھانا اس ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہوگا۔ اس صورت میں دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد باقی نہیں رہتا، یا پھر یہ کہ آپ ﷺ نے یہ باپ کی قسم قصداً نہ کھائی ہوگی، بلکہ قسم کے یہ الفاظ قدیم عادت کی بنا پر اضطراراً آپ ﷺ کی زبان سے نکل گئے ہوں گے۔

(۳) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَحْلِفُوْا بِالطَّوَاغِیْ وَلَا بِاٰبَائِکُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" نہ بتوں کی قسم کھاؤ اور نہ اپنے باپوں کی قسم کھاؤ۔" (مسلمؒ)

تشریح: ایام جاہلیت میں عام طور پر لوگ بتوں اور باپوں کی قسم کھایا کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو قبولیت اسلام کے بعد اس سے منع فرمایا تاکہ وہ اس بارہ میں احتیاط رکھیں اور قدیم عادت کی بنا پر اس طرح کی قسمیں ان کی زبان پر نہ چڑھیں۔

(۴) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ حَلَفَ فَقَالَ فِیْ حَلْفِہٖ بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰی فَلْیَقُلْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَمَنْ قَالَ لِصَاحِبِہٖ تَعَالَ اُقَامِرْکَ فَلْیَتَصَدَّقْ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص قسم کھائے اور اپنی قسم میں یہ الفاظ ادا کرے" میں لات و عزیٰ کی قسم کھاتا ہوں تو اسے چاہئے کہ وہ لا الہ الا اللہ کہے۔ اور جو شخص اپنے کسی دوست سے یہ کہے کہ آؤ ہم دونوں جوا کھیلیں تو اس کو چاہئے کہ وہ صدقہ و خیرات کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "وہ لا الہ الا اللہ کہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرے۔ اس حکم کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ اگر لات و عزیٰ کے نام کسی نو مسلم کی زبان سے سہواً نکل جائیں تو اس کے کفارہ کے طور پر کلمہ پڑھے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ (ھود ۱۱: ۱۱۴)

"بلاشبہ نیکیاں، برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔"

پس اس صورت میں غفلت و سہو سے توبہ ہو جائے گی۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر ان کی زبان سے لات و عزیٰ کے نام ان بتوں کی تعظیم کے قصد سے نکلے ہوں گے تو یہ صراحۃً ارتداد اور کفر ہے لہٰذا اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ تجدید ایمان کے لئے کلمہ پڑھے اس

صورت میں معصیت سے توبہ ہوگی۔

"صدقہ و خیرات کرے" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے دوست کو جوا کھیلنے کی دعوت دے کر چونکہ ایک بڑی برائی کی ترغیب دی ہے، لہٰذا اس کے کفارہ کے طور پر وہ اپنے مال میں سے کچھ حصہ خدا کی راہ میں خرچ کرے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس نے جس مال کے ذریعہ جوا کھیلنے کا ارادہ کیا تھا اسی مال کو صدقہ و خیرات کر دے! اس سے معلوم ہوا کہ جب محض جوا کھیلنے کی دعوت دینے کا کفارہ یہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنا چاہئے تو یہ شخص واقعۃً کھیلے گا تو اس کا کیا حشر ہوگا۔

اسلام کے خلاف کسی دوسرے مذہب کی قسم کھانے کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ حَلَفَ عَلٰی مِلَّۃٍ غَیْرِ الْاِسْلَامِ کَاذِبًا فَھُوَ کَمَا قَالَ وَلَیْسَ عَلَی ابْنِ اٰدَمَ نَذْرٌ فِیْمَا لَا یَمْلِکُ وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَہٗ بِشَیْءٍ فِی الدُّنْیَا عُذِّبَ بِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَمَنْ لَعَنَ مُؤْمِنًا فَھُوَ کَقَتْلِہٖ وَمَنِ ادَّعٰی دَعْوًی کَاذِبَۃً لِیَتَکَثَّرَ بِھَا لَمْ یَزِدْہُ اللّٰہُ اِلَّا قِلَّۃً (متفق علیہ)

"اور حضرت ثابت ابن ضحاک کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اسلام کے خلاف کسی دوسرے مذہب کی جھوٹی قسم کھائے تو وہ ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ اس نے کہا، اور کسی انسان پر اس چیز کی نذر پوری کرنا واجب نہیں جس کا وہ مالک نہ ہو اور جس شخص نے (دنیا میں) اپنے آپ کو کسی چیز (مثلاً چھری وغیرہ) سے ہلاک کر لیا تو وہ قیامت کے دن اسی چیز کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا (یعنی اگر کسی شخص نے چھری گھونپ کر خودکشی کر لی تو قیامت میں اس کے ہاتھ میں وہی چھری دی جائے گی جس کو وہ اپنے جسم میں گھونپتا رہے گا اور جب تک کہ حق تعالیٰ کی طرف سے نجات کا حکم نہ ہوگا وہ مسلسل اسی عذاب میں مبتلا رہے گا اور جس شخص نے کسی مسلمان پر لعنت کی تو وہ (اصل گناہ کے اعتبار سے) ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے اس مسلمان کو قتل کر دیا ہو، اور اسی طرح جس شخص نے کسی مسلمان پر کفر کی تہمت لگائی تو گویا اس نے اس مسلمان کو قتل کر دیا (کیونکہ کفر کی تہمت لگانا اسباب قتل سے ہے لہٰذا کفر کی تہمت قتل کر دینے کے مانند ہے) اور جو شخص جھوٹا دعویٰ کرے تاکہ اس کے مال و دولت میں اضافہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے مال و دولت میں کمی کر دے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے مثلاً یوں قسم کھائی کہ "اگر میں فلاں کام کروں تو یہودی یا نصرانی ہوں، یا دین اسلام سے یا پیغمبر اسلام سے اور یا قرآن سے بیزار ہوں۔ اور پھر اس نے اس کے برخلاف کیا یعنی قسم کو جھوٹی کر دیا، بایں طور کہ اس نے وہ کام کر لیا جس کے نہ کرنے کی اس نے قسم کھائی تھی تو وہ ایسا ہی یہودی و نصرانی ہو گیا یا دین اسلام یا پیغمبر اسلام اور یا قرآن سے بیزار ہو گیا کیونکہ قسم دراصل اس کام کو روکنے کے واسطے ہوتی ہے جس کے لئے وہ قسم کھائی گئی ہے۔ لہٰذا قسم کا سچ ہونا تو یہ ہے کہ قسم کھانے والا وہ کام نہ کرے اور اگر وہ اس کام کو کرے گا تو اپنی قسم میں جھوٹا ہوگا اور اب جب جھوٹا ہوگا تو لامحالہ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ اس نے کہا ہے۔

حدیث کے اس ظاہری مفہوم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی قسم کھانے والا محض قسم کھانے کی وجہ سے اس قسم کو توڑنے کے بعد کافر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس طرح قسم کھا کر ایک صریح حرام فعل کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اس قسم کو جھوٹی کر کے گویا کفر کو برضا و رغبت اختیار کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ اس ارشاد گرامی کی مراد یہ بتانا نہ ہو کہ اس طرح کی قسم کھانے والا واقعۃً یہودی وغیرہ ہو جاتا ہے بلکہ اس کی مراد بطور تہدید و تنبیہ یہ ظاہر کرنا ہو کہ وہ شخص یہودیوں وغیرہ کی مانند عذاب کا مستوجب ہوتا ہے، چنانچہ اس کی نظیر آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ فَقَدْ کَفَرَ (یعنی جس شخص نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا) اس ارشاد کا بھی یہی مطلب ہے کہ نماز چھوڑنے والا کافروں کے سے عذاب کا مستوجب ہوتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس طرح قسم کھانا اگرچہ حرام ہے لیکن اگر کوئی شخص اس طرح قسم کھا ہی لے تو کیا شرعی طور پر اس کو قسم کہیں گے اور کیا اس قسم کو توڑنے کا کفارہ واجب ہو گیا یا نہیں؟ تو اس بارہ

میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض علماء کا قول تو یہ ہے کہ یہ قسم ہے اور اگر اس قسم کو توڑا جائے گا تو اس شخص پر کفارہ واجب ہوگا، ان کی دلیل ہدایہ وغیرہ میں منقول ہے۔ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس طرح کہنے پر قسم کا اطلاق نہیں ہوگا یعنی شرعی طور پر اس کو قسم نہیں کہیں گے اور جب یہ قسم ہی نہیں ہے تو اس کو توڑنے پر کفارہ بھی واجب نہیں ہوگا، ہاں اس طرح کہنے والا سخت گنہ گار ہوگا خواہ وہ اپنی بات کو پورا کرے یا توڑ ڈالے۔

در مختار میں لکھا ہے کہ (مذکورہ بالا مسئلہ میں) زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس طرح کی قسم کھانے والا (اس قسم کے برخلاف عمل کرنے کی صورت میں کافر نہیں ہوجاتا خواہ وہ اس طرح کا تعلق گزرے ہوئے زمانہ سے ہو یا آنے والے زمانہ سے ہو بشرطیکہ وہ اس طرح کہنے کے بارہ میں قسم ہی کا اعتقاد رکھتا ہو لیکن اگر وہ اس قسم کے ہونے سے لاعلم ہو اور اس اعتقاد کے ساتھ یہ الفاظ ادا کرے کہ اس طرح کہنے والا اپنی بات کو جھوٹا ہونے کی صورت میں کافر ہوجاتا ہے تو خواہ اس بات کا تعلق گزرے ہوئے زمانہ سے ہو یا آنے والے زمانہ میں کسی شرط کے پورا ہونے کے ساتھ وہ دونوں ہی صورتوں میں کفر کو خود برضا و رغبت اختیار کرنے کی وجہ سے کافر ہوجائے گا۔

"اور کسی انسان پر اس چیز کی نذر پوری کرنا واجب نہیں جس کا وہ مالک نہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً اگر کوئی شخص یوں کہے "اگر میرا فلاں عزیز صحت یاب ہوجائے تو میں فلاں غلام آزاد کردوں گا" جب کہ وہ فلاں غلام درحقیقت اس کی ملکیت میں نہ ہو، تو اس صورت میں اس نذر کو پورا کرنا واجب نہیں ہے، اگر اس کے بعد وہ غلام اس کی ملکیت ہی میں کیوں نہ آجائے ہاں اگر اس نے آزادی کو ملکیت کے ساتھ مشروط کردیا یعنی یوں کہا کہ "اگر میرا فلاں عزیز صحت یاب ہوگیا اور فلاں غلام میری ملکیت میں آگیا یا فلاں غلام کو میں نے خرید لیا تو میں اس کو آزاد کردوں گا" تو اس صورت میں وہ غلام ملکیت میں آنے کے بعد یا خریداری کے بعد اس نذر کے مطابق آزاد ہوجائے گا۔

"تاکہ اس کے مال و دولت میں اضافہ ہو" یہ اکثر کے اعتبار سے دعوی کی علت و سبب کی طرف اشارہ ہے کہ اکثر لوگ محض اپنے مال و دولت میں اضافہ کی خاطر جھوٹے وعدے کرتے ہیں مذکورہ ثمرہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے مال میں کمی کردیا جانا) مرتب ہوگا۔ جھوٹے وعدے کا مذکورہ ثمرہ محض مال و دولت ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہی ثمرہ ان لوگوں کے حق میں بھی مرتب ہوتا ہے جو اپنے احوال و فضائل اور کمالات کے بارہ میں محض اس مقصد سے جھوٹا دعوی کرتے ہیں کہ عام انسانوں کی نظروں میں ان کا جاہ و مرتبہ زیادہ سے زیادہ بڑھے جیسا کہ نام نہاد اور بناوٹی صوفیوں اور پیروں کا شیوہ ہے۔

اگر قسم کو توڑ دینے ہی میں بھلائی ہو تو اس قسم کو توڑ دینا چاہئے

⑥ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّی وَاللّٰہِ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ لَا اَحْلِفُ عَلٰی یَمِیْنٍ فَاَرٰی غَیْرَھَا خَیْرًا مِنْھَا اِلَّا کَفَّرْتُ عَنْ یَمِیْنِیْ وَاَتَیْتُ الَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر میں کسی چیز پر قسم کھاؤں اور پھر اس قسم کے خلاف کرنے ہی کو بہتر سمجھوں تو میں اپنی قسم توڑ دوں گا اور اس کا کفارہ ادا کردوں گا اس طرح اس چیز کو اختیار کروں گا جو بہتر ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر میں کسی کام کے بارہ میں قسم کھاؤں کہ وہ کام نہ کروں گا مگر پھر سمجھوں کہ اس کام کو کرنا ہی بہتر ہے تو میں قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کردوں گا اور اس کام کو کرلوں گا، اس مسئلہ کی مثالیں آگے آنے والی حدیث کی تشریح میں بیان ہوں گی۔

⑦ وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ سَمُرَۃَ لَا تَسْئَلِ الْاِمَارَۃَ فَاِنَّکَ اِنْ اُوْتِیْتَھَا عَنْ مَسْئَلَۃٍ وُکِلْتَ اِلَیْھَا وَاِنْ اُوْتِیْتَھَا عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَۃٍ اُعِنْتَ عَلَیْھَا وَاِذَا حَلَفْتَ عَلٰی یَمِیْنٍ فَرَاَیْتَ غَیْرَھَا خَیْرًا مِنْھَا فَکَفِّرْ عَنْ یَمِیْنِکَ وَائْتِ الَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَاْتِ الَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ وَکَفِّرْ عَنْ یَمِیْنِکَ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن سمرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک دن مجھ سے) فرمایا کہ "عبدالرحمٰن! سرداری کی خواہش نہ کرو (یعنی اس بات کی طلب نہ کرو کہ مجھے فلاں جگہ کا حاکم و سردار بنادیا جائے) کیونکہ اگر تمہاری طلب پر تمہیں سرداری دی جائے گی تو تم اس سرداری کے سپرد کردیئے جاؤ گے اور اگر بغیر طلب کے تمہیں سرداری ملے گی تو اس میں تمہاری مدد کی جائے گی، نیز اگر تم کسی بات پر قسم کھاؤ اور پھر دیکھو کہ اس قسم کا خلاف کرنا ہی اس قسم کو پوری کرنے سے بہتر ہے، تو تم اس قسم کا کفارہ دے دو اور وہی کام کرو جو بہتر ہے۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ اس چیز کو عمل میں لاؤ جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "سرداری کی خواہش نہ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ سرداری و سیادت کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی دشوار اور سخت ذمہ داری کی چیز ہے اس کے فرائض اور حقوق کی ادائیگی ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے بلکہ صرف چند ہی لوگ اس کا بار اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں لہٰذا نفس کی حرص میں مبتلا ہو کر سرداری و سیادت کی خواہش نہ کرو کیونکہ اگر تم اپنی طلب پر سرداری و سیادت پاؤ گے تو پھر تمہیں اسی کے سپرد کر دیا جائے گا بایں معنی کہ اس کے فرائض کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد نہیں کی جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر چہار طرف شر و فساد برپا ہوں گے اور تم مخلوق خدا کی نظروں میں بڑی بے آبروئی کے ساتھ اس منصب کے نااہل قرار دے دیئے جاؤ گے، ہاں اگر بلا طلب تمہیں سرداری و سیادت کے مرتبہ سے نوازا جائے گا تو اس صورت میں حق تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے معاملات انتظام و انصرام درست ہوں گے اور مخلوق خدا کی نظروں میں تمہاری بہت زیادہ عزت و وقعت ہوگی۔

"اور وہی کام کرو گے جو بہتر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی گناہ کی بات پر قسم کھاؤ مثلاً یوں کہو کہ خدا کی قسم! میں نماز نہیں پڑھوں گا۔ یا۔ خدا کی قسم میں فلاں شخص کو جان سے مار ڈالوں گا۔ یا۔ خدا کی قسم میں اپنے باپ سے کلام نہیں کروں گا۔ تو اس صورت میں اس قسم کو توڑ ڈالنا ہی واجب ہوگا اور اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا۔ اور اگر کسی ایسی بات پر قسم کھائی جائے جس کے خلاف کرنا، اس سے بہتر ہو مثلاً یوں کہا جائے کہ "خدا کی قسم! میں اپنی بیوی سے ایک مہینہ تک صحبت نہیں کروں گا" یا اسی طرح کی کسی اور بات پر قسم کھائی جائے تو اس صورت میں اس قسم کو توڑ دینا محض اولیٰ ہوگا۔ اس بارہ میں زیادہ تفصیل ابتداء باب میں گزر چکی ہے۔

یہاں جو روایتیں نقل کی گئی ہیں ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی روایت سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ قسم توڑنے سے پہلے کفارہ ادا کر دینا چاہئے۔ جب کہ دوسری روایت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کفارہ قسم توڑنے کے بعد ادا کرنا چاہئے، چنانچہ اس مسئلہ پر تینوں ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ کفارہ قسم توڑنے سے پہلے ادا کر دینا جائز ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ کے ہاں یہ جواز اس تفصیل کے ساتھ ہے کہ اگر کفارہ کی ادائیگی روزہ کی صورت میں ہو تو قسم توڑنے سے پہلے کفارہ ادا کرنا جائز نہیں ہوگا اور اگر کفارہ کی ادائیگی غلام آزاد کرنے، یا مستحقین کو کھانا کھلانے اور یا کپڑا پہنانے کی صورت میں ہو تو پھر قسم توڑنے سے پہلے کفارہ کی ادائیگی جائز ہوگی، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ قسم توڑنے سے پہلے کفارہ کی ادائیگی کسی صورت میں جائز نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جن احادیث سے تقدیم کفارہ مفہوم ہوتا ہے ان میں حرف واؤ محض جمع کے لئے ہے اس سے تقدیم و تاخیر کا مفہوم مراد نہیں ہے اور نہ حقیقۃً وہ احادیث تقدیم و تاخیر پر دلالت کرتی ہیں۔

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنٍ فَرَاٰى خَيْرًا مِنْهَا فَلْيُكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَلْيَفْعَلْ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور پھر وہ یہ سمجھے کہ (اس کے خلاف کرنا ہی) قسم پوری کرنے سے بہتر ہے تو اسے چاہئے کہ وہ کفارہ ادا کر دے اور اس کام کو کرلے (یعنی قسم توڑ دے)۔" (مسلمؒ)

⑨ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَاَنْ يَلَجَّ اَحَدُكُمْ بِيَمِيْنِهٖ فِیْ اَهْلِهٖ اٰثَمُ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ اَنْ يُعْطِيَ كَفَّارَتَهُ الَّتِیْ افْتَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خدا کی قسم! تم میں سے کسی شخص کا اپنی قسم پر اصرار کرنا (یعنی اس قسم کو پوری کرنے ہی کی ضد کرنا) جو اپنے اہل و عیال سے متعلق ہو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کو زیادہ گنہ گار بناتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اس قسم کو توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کر دے جو اس پر فرض کر دیا گیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر قسم توڑنے میں بظاہر حق تعالیٰ کے نام کی عزت و حرمت کی ہتک ہے اور قسم کھانے والا بھی اس کو اپنے خیال کے مطابق گناہ ہی سمجھتا ہے لیکن اس قسم کو پوری کرنے ہی پر اصرار کرنا جو اہل و عیال کی کسی حق تلفی کا باعث ہوتی ہے زیادہ گناہ کی بات ہے! گویا اس حدیث کا مقصد بھی یہ واضح کرنا ہے کہ قسم کے برخلاف عمل کی بھلائی ظاہر ہونے کی صورت میں قسم کو توڑ دینا اور اس کا کفارہ ادا کرنا لازم ہے۔

کسی تنازعہ کی صورت میں قسم دینے والے کی نیت کا اعتبار ہوگا

(۱۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمِيْنُكَ عَلٰى مَا يُصَدِّقُكَ عَلَيْهِ صَاحِبُكَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تمہاری قسم اس وقت صحیح ہوتی ہے جب تمہارا ساتھی (یعنی قسم دینے والا) تمہیں سچا سمجھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قسم سچی ثابت ہونے کے سلسلے میں اس شخص کی نیت و ارادہ کا اعتبار ہوگا جس نے تمہیں قسم دی ہے اس میں قسم کھانے والے کی نہ تو نیت کا اعتبار ہوگا اور نہ اس کے توریہ و تاویل کا اعتبار کیا جائے گا لیکن اس حکم کا تعلق کسی تنازعہ کی اس صورت سے ہے جب کہ، قسم دینے والے کا کوئی حق و مطالبہ قسم کھانے والے پر ہو اور قسم کھانے والے کے توریہ و تاویل سے اس کا حق ساقط ہوتا ہو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی مقدمہ کے سلسلہ میں اگر قاضی و حاکم مدعا علیہ کو قسم دلائے تو اس میں قاضی و حاکم کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے، ہاں اگر کسی کی حق تلفی کا کوئی معاملہ نہ ہو یا کوئی قسم دینے والا نہ ہو تو پھر توریہ میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بطور خاص جب کہ اس توریہ کی وجہ سے کسی کا فائدہ ہوتا ہو جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ یہ میری دینی بہن ہیں۔

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْيَمِيْنُ عَلٰى نِيَّةِ الْمُسْتَحْلِفِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قسم کا اعتبار، قسم دینے والے کی نیت پر ہوتا ہے۔" (مسلمؒ)

لغو قسم پر مواخذہ نہیں ہوگا

(۱۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ فِيْ قَوْلِ الرَّجُلِ لَا وَاللّٰهِ وَبَلٰى وَاللّٰهِ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ وَقَالَ رَفَعَهُ بَعْضُهُمْ عَنْ عَائِشَةَ۔

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرتا۔ اس شخص کے حق میں نازل ہوئی ہے جو لا واللہ اور بلی واللہ کہتا ہے۔ (بخاریؒ) شرح السنۃ میں یہ روایت بلفظ مصابیح نقل کی گئی ہے، نیز شرح السنۃ میں کہا گیا ہے کہ بعض راویوں نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً نقل کی ہے (یعنی ان راویوں کے مطابق یہ حدیث آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے)۔"

تشریح: اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ وہ آپس میں گفتگو کرتے وقت بات بات پر یہ کہا کرتے تھے کہ لا واللہ (خدا کی قسم ہم نے یہ کام نہیں کیا) یا اور بلی واللہ (خدا کی قسم ہم نے یہ کام کیا ہے) ان الفاظ سے ان کا مقصود قسم کھانا نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے یا بطور تکیہ کلام وہ ان الفاظ کو بیان کرتے تھے، چنانچہ اس صورت میں قسم واقع نہیں ہوتی اور اس کو "لغو قسم" کہتے ہیں۔ حضرت

امام شافعیؒ نے اس پر عمل کیا ہے، ان کے نزدیک "لغو قسم" اس قسم کو کہتے ہیں جو بلا قصد زمانہ ماضی یا زمانہ مستقبل، زبان سے سادر ہو جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک "لغو قسم" اس قسم کو کہتے ہیں جو کسی ایسی بات پر کھائی جائے جس کے بارہ میں قسم کھانے والے کا گمان تو یہ ہو کہ وہ صحیح ہے لیکن واقعۃً وہ صحیح نہ ہو، چنانچہ اس کی تفصیل ابتداء باب میں گزر چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت

(۱۳) عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ وَلَا بِاُمَّهَاتِكُمْ وَلَا بِالْاَنْدَادِ وَلَا تَحْلِفُوْا بِاللّٰهِ اِلَّا وَاَنْتُمْ صَادِقُوْنَ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم نہ تو اپنے باپوں کی قسم کھاؤ اور نہ اپنی ماؤں کی اور نہ بتوں کی اور خدا کی قسم بھی تم اسی صورت میں کھاؤ جب کہ تم سچے ہو (یعنی جھوٹی قسم نہ کھاؤ خواہ اس کا تعلق گزشتہ زمانہ سے ہو یا آئندہ زمانہ سے)۔" (ابوداؤد، نسائی)

(۱۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ (رواہ الترمذی)

"ابن عمر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جس نے اللہ کے غیر کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔ روایت کیا اس کو ترمذیؒ نے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے غیر اللہ کی قسم اس کی تعظیم کے اعتقاد کے ساتھ کھائی اس نے شرک جلی یا شرک خفی کا ارتکاب کیا، کیونکہ اس طرح اس نے اس تعظیم میں غیر اللہ کو شریک کیا جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے۔

عام طور پر لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے کسی عزیز یا تعلق والے کی انتہائی محبت میں اس کی قسم کھاتے ہیں جیسے یوں کہتے ہیں کہ بیٹے کی قسم، یا اس کے سر کی یا اس کی جان کی قسم تو یہ بھی گناہ سے خالی نہیں اگرچہ اس پر شرک کا حکم عائد نہ ہوتا ہو ہاں اگر قدیم عادت کی بنا پر کسی کی زبان سے بلاقصد مثلاً یوں نکل گیا کہ "اپنے باپ کی قسم، یا اپنے بیٹے کی قسم میں نے یہ کام نہیں کیا ہے تو اس پر گناہ اور شرک کا اطلاق نہیں ہوگا۔

(۱۵) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَلَفَ بِالْاَمَانَةِ فَلَيْسَ مِنَّا (رواہ ابوداود)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے امانت کی قسم کھائی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (ابوداؤد ونسائی)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت کئے بغیر محض امانت کی قسم کھائے گا اس کا شمار ہمارے متبعین میں نہیں ہوگا کیونکہ یہ اہل کتاب (یعنی غیر مسلموں) کی عادات میں سے ہے اور غیر اللہ کی قسم کے حکم میں ہے۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی میں "امانت" سے مراد "فرائض" ہیں گویا آپ ﷺ کا مقصد نماز اور حج جیسے فرائض کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، بہرکیف دونوں صورتوں میں تمام علماء کے نزدیک اس قسم کو توڑنے پر کفارہ واجب نہیں ہوتا اور اگر "امانت اللہ" (یعنی اللہ کی طرف سے اضافت کر کے امانت کی) قسم کھائی جائے تو اکثر علماء کے نزدیک اس میں بھی کفارہ واجب نہیں ہوتا لیکن حضرت امام اعظمؒ چونکہ اس کو تسلیم کرتے ہیں بایں وجہ کہ "امین" اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہونے کی بنا پر "امانت" اس کی صفات میں سے ہے اس لئے ان کے نزدیک اس میں کفارہ واجب ہوتا ہے یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "امانت اللہ" سے مراد کلمہ توحید ہے۔

اسلام سے بیزاری کی قسم کا مسئلہ

⑯ وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ اِنِّىْ بَرِیْئٌ مِنَ الْاِسْلَامِ فَاِنْ كَانَ كَاذِبًا فَهُوَ كَمَا قَالَ وَاِنْ كَانَ صَادِقًا فَلَنْ يَرْجِعَ اِلَى الْاِسْلَامِ سَالِمًا۔ (رواہ ابوداود والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جو شخص یوں کہے کہ (اگر میں نے ایسا کیا ہو یا ایسا نہ کیا ہو تو) میں اسلام سے بری ہوں، لہٰذا اگر وہ اپنی بات میں جھوٹا ہے تو وہ ایسا ہی ہو گیا جیسا کہ اس نے کہا ہے اور اگر وہ اپنی بات میں سچا ہے تب بھی وہ اسلام کی طرف پوری طرح واپس نہ آئے گا۔" (ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح قسم کھائے کہ "اگر میں نے فلاں کام کیا ہو تو میں اسلام سے بیزار ہوں"۔ تو اگر وہ اپنی بات میں جھوٹا ہے، یعنی واقعۃً اس نے وہ کام کیا ہے تو وہ اسلام سے بیزار ہو گیا۔ گویا یہ ارشاد تو اس طرح قسم کھانے کی شدید ممانعت کو ظاہر کرنے کے لئے بطور مبالغہ فرمایا گیا ہے۔ اگر وہ شخص اپنی بات میں سچا ہے یعنی واقعۃً اس نے وہ کام نہیں کیا ہے تو اس صورت میں بھی اس کا اس طرح کہنا گناہ سے خالی نہیں ہے کیونکہ اس طرح کی قسم کھانے سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس روایت میں مذکورہ قسم کو "منعقدہ قسم" پر محمول کیا ہے جیسا کہ انہوں نے حضرت ثابتؓ کی روایت نمبر پانچ) میں مذکور قسم کو بھی "منعقدہ قسم" پر محمول کیا ہے، چنانچہ اس کی وضاحت حضرت ثابتؓ کی روایت کی تشریح میں گزر چکی ہے، لیکن ملا علی قاریؒ نے اس کو "غموس قسم" پر محمول کیا ہے، اس کتاب کے مؤلف کے نزدیک یہ دونوں قسمیں "منعقدہ" پر بھی محمول ہو سکتی ہیں اور "غموس" پر بھی۔

آنحضرت ﷺ بعض مواقع پر کس طرح قسم کھاتے تھے

⑰ وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اجْتَهَدَ فِى الْيَمِيْنِ قَالَ وَالَّذِىْ نَفْسُ اَبِى الْقَاسِمِ بِيَدِهٖ (رواہ ابوداود)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب (بعض مواقع پر) اپنی قسم میں زور پیدا کرنا چاہتے تو اس طرح قسم کھاتے تھے "نہیں! قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں ابوالقاسم کی جان ہے (یہ بات نہیں بلکہ یہ بات ہے)۔" (ابوداؤد)

تشریح: "ابوالقاسم" سرکار دو عالم ﷺ کی کنیت مبارک تھی۔ آنحضرت ﷺ کی قسم کے ان الفاظ میں زور بیان اور شدت و تاکید بایں معنی ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور آنحضرت ﷺ کی عبودیت کامل نیز آپ ﷺ کے نفس مبارک کے مسخر و مطیع ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

⑱ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَتْ يَمِيْنُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا حَلَفَ لَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب قسم کھاتے تھے تو آپ ﷺ کی قسم اس طرح ہوتی تھی۔ لا و استغفر اللہ۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: ان الفاظ کو قسم کہنا بایں وجہ ہے کہ یہ الفاظ اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے قسم ہی کے مشابہ ہیں، کیونکہ ان الفاظ کے معنی ہیں "اگر یہ بات اس کے برخلاف ہو تو میں اللہ سے بخشش چاہتا ہوں" اور ظاہر ہے کہ اس طرح کہنا اپنی بات اور اپنے مطلب کو مضبوط و مؤکد کرنا ہے لہٰذا یہ قسم ہی کے حکم میں ہوا۔

قسم کے ساتھ "انشاء اللہ" کہنے کا مسئلہ

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ حَلَفَ عَلٰی یَمِیْنٍ فَقَالَ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ فَلَا حِنْثَ عَلَیْہِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَالدَّارِمِیُّ وَذَکَرَ التِّرْمِذِیُّ جَمَاعَۃً وَقَفُوْہُ عَلَی ابْنِ عُمَرَ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو کسی بات پر قسم کھائے اور قسم کے ساتھ ہی انشاء اللہ بھی کہہ دے تو اس پر حنث (کا اطلاق) نہیں ہوگا۔ (ترمذی) ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی) نیز امام ترمذیؒ نے کچھ محدثین کے بارہ میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اس روایت کو حضرت ابن عمرؓ پر موقوف کیا ہے (یعنی ان محدثین کے نزدیک یہ روایت حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے)۔"

تشریح: "حنث کے معنی ہیں" گناہ اور قسم توڑنا چنانچہ قسم توڑنے والے کو "حانث" کہا جاتا ہے، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس قسم کے الفاظ کے ساتھ لفظ "انشاء اللہ" کہہ دیا جائے وہ قسم منعقد نہیں ہوگی اور جب وہ قسم منعقد ہی نہیں ہوگی تو اس کو توڑنے پر کفارہ بھی واجب نہیں ہوگا، اسی طرح تمام عقد و معاملات کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر الفاظ عقد کے ساتھ لفظ "انشاء اللہ" متصل ہو تو وہ عقد والا معاملہ منعقد نہیں ہوگا، چنانچہ اکثر علماء اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے البتہ حضرت ابن عباسؓ کا قول یہ تھا کہ اگر لفظ "انشاء اللہ" متصل ہو تو بھی یہی حکم ہے۔

اس بارہ میں متصل اور منفصل کی حد یہ ہے کہ قسم کے الفاظ کے بعد کسی اور بات میں مشغول ہوئے بغیر فوراً انشاء اللہ کہا گیا تو یہ "متصل" ہے اور اگر اس قسم کے الفاظ کے بعد کسی دوسری بات میں مشغول ہوا تو پھر انشاء اللہ کہا تو "منفصل" ہے! بعض علماء نے "متصل" کی حد کچھ اور بھی بیان کی ہے جس کی تفصیل مرقات میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

غیر مناسب قسم توڑ دو اور اس کا کفارہ ادا کرو

(۲۰) عَنْ اَبِی الْاَحْوَصِ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَأَیْتَ ابْنَ عَمٍّ لِیْ اٰتِیْہِ اَسْأَلُہٗ فَلَا یُعْطِیْنِیْ وَلَا یَصِلُنِیْ ثُمَّ یَحْتَاجُ اِلَیَّ فَیَأْتِیْنِیْ فَیَسْأَلُنِیْ وَقَدْ حَلَفْتُ اَنْ لَا اُعْطِیَہٗ وَلَا اَصِلَہٗ فَاَمَرَنِیْ اَنْ اٰتِیَ الَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ وَاُکَفِّرَ عَنْ یَمِیْنِیْ رَوَاہُ النَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ یَاْتِیْنِی ابْنُ عَمِّیْ فَاَحْلِفُ اَنْ لَا اُعْطِیَہٗ وَلَا اَصِلَہٗ قَالَ کَفِّرْ عَنْ یَمِیْنِكَ۔

"اور ابوالاحوص عوف ابن مالک اپنے والد (حضرت مالکؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ میرے چچا کے بیٹے کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں کہ جب میں (اپنی کسی ضرورت کے موقع پر) اس سے (کچھ مال و اسباب) مانگتا ہوں تو وہ مجھ کو (کچھ) نہیں دیتا اور میرے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتا ہے۔ لیکن جب خود اس کو مجھ سے کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے مانگتا ہے مگر میں نے (اس کو اس کے عمل کی سزا دینے کے لئے کہ خود تو مجھ کو کچھ دیتا نہیں، لیکن مجھ سے مانگنے کے لئے آجاتا ہے) اس بات پر قسم کھالی ہے کہ میں نہ تو اس کو کچھ دوں گا اور نہ اس سے حسن سلوک کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) مجھے حکم فرمایا کہ "میں وہ کام کروں جو بہتر ہے (یعنی اس کی ضرورت پوری کروں اور اس کے ساتھ حسن سلوک کروں) اور قسم توڑنے کا کفارہ دوں۔ (نسائی، ابن ماجہ) اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "مالکؓ" نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میرے چچا کا بیٹا میرے پاس (کچھ مانگنے) آتا ہے تو میں یہ قسم کھالیتا ہوں کہ نہ تو میں اس کو کچھ دوں گا اور نہ اس کے ساتھ حسن سلوک کروں گا" آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا "تم اپنی قسم (توڑ دو اور اس) کا کفارہ دو۔"

بَابُ فِي النُّذُورِ

نذروں کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نذر کی ممانعت

(۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَنْذُرُوْا فَاِنَّ النَّذْرَ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْقَدْرِ شَيْئًا وَاِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِيْلِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ دونوں راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم نذر نہ مانو کیونکہ نذر تقدیر کی کسی چیز کو دور نہیں کرتی البتہ نذر کے ذریعہ بخیل کا (کچھ مال ضرور) خرچ ہوتا ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کے ذریعہ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کے سلسلہ میں سخی و بخیل کے درمیان ایک بڑا لطیف فرق بتایا گیا ہے کہ سخی کی شان تو یہ ہوتی ہے کہ وہ بلا واسطہ نذر، از خود خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے لیکن بخیل کو اس کی توفیق نہیں ہوتی، اگر اسے کچھ مال خرچ کرنا ہوتا ہے تو اس کے لئے نذر کو واسطہ بناتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں خدا کے نام پر اتنا مال خرچ کروں گا، اس طرح سخی تو "ایثار" کا وصف اختیار کرتا ہے اور بخیل "غرض" کی راہ اختیار کرتا ہے۔

اس حدیث کی بناء پر بعض علماء نے نذر کے ماننے کو بالکل مکروہ قرار دیا ہے، لیکن قاضیؒ نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ عام طور پر لوگوں کی عادت ہے کہ وہ نذر (یعنی خدا کی راہ میں اپنا کچھ مال خرچ کرنے) کو کسی فائدہ کے حصول اور کسی ضرورت و حاجت کے پوری ہونے پر معلق کر دیتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا کیونکہ یہ بخیلوں کا کام ہے، سخی تو جب اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس میں عجلت کرتا ہے اور فوراً ہی اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے، لیکن اس کے برخلاف بخیل کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کا دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ اپنے ہاتھ سے اپنا مال کسی کو دے ہاں اس کی کوئی غرض ہوتی ہے تو وہ اپنا مال خرچ کرتا ہے چنانچہ یا تو وہ اپنی حاجت پوری ہونے کے بعد اللہ کے نام پر اپنا کچھ مال نکال دیتا ہے یا خدا کی راہ میں اپنا کچھ مال نکالنے کو حصول نفع یا دفع مضرت پر معلق کر دیتا ہے یعنی یہ نذر مانتا ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا یا مجھے فلاں نقصان نہ پہنچا تو میں اپنا اتنا مال خدا کی راہ میں خرچ کروں گا اور ظاہر ہے کہ اس بات سے تقدیر کا فیصلہ نہیں بدل جاتا لہٰذا اس صورت میں بھی اس کو مال خرچ کرنے کی نوبت نہیں آتی، ہاں کبھی اس کی نذر، تقدیر کے فیصلہ کے موافق ہو جاتی ہے تو گویا وہ نذر اس بخیل کو اپنا وہ مال خرچ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کو وہ خرچ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں نذر سے منع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نذر ماننے کے بعد اس کو پورا کرنے میں سستی و کاہلی نہ کی جائے کیونکہ جب کسی نے نذر مانی تو اس نذر کو پورا کرنا اس کے ذمہ واجب ہو گیا لہٰذا اس واجب کی ادائیگی میں تاخیر مناسب نہیں ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک یہاں نذر کی ممانعت سے مراد یہ ہے کہ اس اعتقاد و خیال کے ساتھ نذر مانی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کو مقدر نہیں کیا ہے وہ نذر سے ہو جائے گا۔ لہٰذا نذر سے منع کرنا اس اعتبار سے ہے نہ کہ مطلق نذر سے منع کرنا مقصود ہے۔

جس نذر کو پورا کرنے میں گناہ ہوتا ہو اسے پورا نہ کرو

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ نَذَرَ اَنْ يُطِيْعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ وَمَنْ نَذَرَ اَنْ يَعْصِيَهٗ فَلَا

يَعْصِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص ایسی نذر مانے جس سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس کی اطاعت کرے (یعنی اس نذر کو پورا کرے) اور جو شخص ایسی نذر مانے جس سے اللہ تعالیٰ کی معصیت (نافرمانی) ہوتی ہو تو وہ اس کی معصیت نہ کرے (یعنی ایسی نذر کو پورا نہ کرے)۔" (بخاریؒ)

③ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِيْ مَعْصِيَةٍ وَلَا فِيْ مَالَا يَمْلِكُ الْعَبْدُ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا نَذْرَ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ۔

"اور حضرت عمرانؓ ابن حصین سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو نذر گناہ کا باعث ہو اس کو پورا کرنا جائز نہیں ہے اور نہ اس چیز کی نذر پوری کرنا جائز ہے جس کا وہ بندہ مالک نہ ہو۔ (مسلمؒ) اور مسلم ہی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس نذر سے اللہ تعالیٰ کی معصیت (نافرمانی) ہوتی ہو اس کو پورا کرنا جائز نہیں۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گناہ کرنے کی نذر مانے مثلاً یوں کہے کہ "اگر میری فلاں حاجت پوری ہو گئی تو میں ناچ گانے کی محفل منعقد کروں گا" یا یوں کہے کہ "میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کرنے کے لئے قوالی کرنے کو اپنے اوپر واجب کرتا ہوں" تو ایسی نذر کو پورا کرنا جائز نہیں ہے اور نہ اس صورت میں نذر کو پوری نہ کرنے میں کفارہ واجب ہوگا۔ چنانچہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا قول یہی ہے، جب کہ اس صورت میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک قسم کا کفارہ واجب ہوگا۔

حدیث کے دوسرے جزو کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کی نذر ماننا جو اپنی ملکیت میں نہ ہو اس نذر کو پورا کرنے کو جائز نہیں رکھتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے غلام یا کسی دوسرے شخص کی کسی چیز کے بارہ میں یہ نذر مانے کہ میں خدا کی راہ میں اس غلام کو آزاد کرتا ہوں یا اللہ کے واسطے اس چیز کو دینا اپنے اوپر واجب کرتا ہوں تو اس صورت میں اس نذر کے صحیح نہ ہونے کی وجہ سے اس غلام کو آزاد کرنا یا اس چیز کو اللہ واسطے دینا اس کے ذمہ لازم نہیں ہوگا۔

نذر کا کفارہ

④ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَفَّارَةُ النَّذْرِ كَفَّارَةُ الْيَمِيْنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عقبہؓ ابن عامر رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ "آپ ﷺ نے فرمایا "نذر کا کفارہ قسم کے کفارے جیسا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگر کوئی شخص کسی چیز کا نام لئے بغیر محض نذر مانے مثلاً صرف یوں کہے کہ "میں نذر مانتا ہوں" تو اس پر کفارہ واجب ہوگا اور اگر وہ نذر میں بلا تعین عدد کے روزے کی نیت کرے تو اس پر تین روزے رکھنے واجب ہوں گے اور اگر نذر میں صدقہ کی نیت کرے تو صدقہ فطر کے مانند دس مسکینوں کو کھانا کھلانا واجب ہوگا۔

نذر کی جن باتوں کو پورا کرنا ممکن نہ ہو ان کو پورا نہ کرنے کی اجازت

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ اِذَا هُوَ بِرَجُلٍ قَائِمٍ فَسَأَلَ عَنْهُ فَقَالُوْا اَبُوْ اِسْرَائِيْلَ نَذَرَ اَنْ يَقُوْمَ وَلَا يَقْعُدَ وَلَا يَسْتَظِلَّ وَلَا يَتَكَلَّمَ وَيَصُوْمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرُوْهُ فَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيَسْتَظِلَّ وَلْيَقْعُدْ وَلْيُتِمَّ صَوْمَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اچانک آپ کی نظر ایک شخص پر پڑی جو کھڑا

تھا، آپ ﷺ نے اس شخص کے بارہ میں دریافت فرمایا (اس کا نام کیا ہے اور یہ اس وقت کیوں کھڑا ہے؟) تو لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابواسرائیلؓ ہے اور اس نے یہ نذر مانی ہے کہ کھڑا رہے گا، نہ بیٹھے گا، نہ سائے میں آئے گا اور نہ (بالکل) بولے گا اور (ہمیشہ) روزے رکھے گا، رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ اس سے کہو، بولے، سایہ میں آئے، بیٹھے اور اپنا روزہ پورا کرے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس شخص نے جن باتوں کی نذر مانی تھی ان میں سے جس بات پر عمل کرنا اس کے لئے ممکن تھا اس کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا اور جن باتوں پر عمل کرنا کسی وجہ سے ممکن نہ تھا ان کو پورا نہ کرنے کا حکم دیا گیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ وہ روزے کو پورا کرے یعنی اپنی نذر کے مطابق ہمیشہ روزے رکھا کرے، کیونکہ طاعت و عبادات کی نذر کو پورا کرنا لازم ہے اور ہمیشہ روزے رکھنا اس شخص کے لئے ایک بہتر عمل ہے جو اس پر قادر ہو، لیکن واضح رہے کہ اس صورت میں وہ پانچ روزے مستثنیٰ ہوتے ہیں جو شرعاً و عرفاً ممنوع ہیں اور اگر وہ ان پانچ روزوں کی بھی نیت کرے گا تو ان روزوں کو توڑنا اس پر واجب ہوگا اور حنفیہ کے نزدیک روزہ توڑنے کا کفارہ اس پر واجب ہوگا۔

جن باتوں پر عمل کرنا ممکن نہ تھا ان میں سے ایک تو "بولنا" تھا کہ شرعی طور پر یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص بالکل ہی نہ بولے کیونکہ بعض مواقع پر "بولنا" واجب ہے۔ جیسے نماز میں قرأت، سلام کا جواب دینا اور اس کو ترک کرنا گناہ ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بولنے کا حکم دیا، اسی طرح بالکل نہ بیٹھنا اور سایہ میں نہ آنا انسان کے بس سے باہر ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اس کو بیٹھنے اور سایہ میں آنے کا حکم دیا۔

(۶) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَاٰی شَیْخًا یُھَادٰی بَیْنَ اِبْنَیْہِ فَقَالَ مَابَالُ ھٰذَا قَالُوْا نَذَرَ اَنْ یَّمْشِیَ اِلٰی بَیْتِ اللّٰہِ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی عَنْ تَعْذِیْبِ ھٰذَا نَفْسَہٗ لَغَنِیٌّ وَاَمَرَہٗ اَنْ یَّرْکَبَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ اِرْکَبْ اَیُّھَا الشَّیْخُ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنْکَ وَعَنْ نَذْرِکَ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (بیت اللہ کے سفر کے دوران) ایک بوڑھے کو دیکھا جو (ضعف و کمزوری کی وجہ سے) اپنے دو بیٹوں کے درمیان (ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھے) راستہ چل رہا تھا آپ ﷺ نے پوچھا کہ "اسے کیا ہوا؟" صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس شخص نے (بیت اللہ کو) پیادہ پا جانے کی منت مان رکھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اس طرح اپنے آپ کو عذاب (تکلیف) میں ڈالنے کی خدا کو پروا نہیں ہے" پھر آپ ﷺ نے اس شخص کو سواری پر چلنے کا حکم دیا۔ "بخاری، ومسلم اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے اس بوڑھے سے فرمایا کہ "بڑے میاں! سواری پر چلو کیونکہ اللہ تعالیٰ تم سے اور (تمہیں تکلیف میں ڈالنے والی) تمہاری اس منت سے بے نیاز ہے۔"

تشریح: چونکہ وہ شخص اپنے بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے پیادہ پا چلنے سے عاجز و معذور تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس کو سواری پر چلنے کا حکم فرمایا۔

حضرت امام شافعیؒ نے اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسی منت کی صورت میں سواری پر چلنے کی وجہ سے منت ماننے والے پر (بطور کفارہ) کوئی چیز واجب نہیں ہوتی لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس پر جانور (یعنی بکری یا اس کے مثل) ذبح کرنا واجب ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ایک چیز کو اپنے اوپر لازم کر لینے کے بعد اس کو پورا کرنے سے قاصر رہنا ہے، حضرت امام شافعیؒ کا دوسرا قول بھی یہی ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ نذر مانے کہ میں پیادہ پا بیت اللہ جاؤں گا تو اس کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں چنانچہ حضرت امام شافعیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ شخص بیت اللہ کا سفر پا پیادہ طے کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو وہ پیادہ پا جائے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بطور کفارہ جانور ذبح کرے اور سواری پر سفر طے کرے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص خواہ پیادہ پا

چلنے پر قادر ہو یہ نہ قادر ہو، بہر صورت سواری کے ذریعہ سفر کرے اور جانور ذبح کرے۔

حنفی علماء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ "میں پیادہ پا بیت اللہ جانا اپنے اوپر لازم کرتا ہوں" تو اس پر حج یا عمرہ واجب ہوتا ہے، اب وہ اپنی نیت کے مطابق ان دونوں میں سے جس کو چاہے پورا کرے۔ (یعنی اگر اس نے یہ کہتے وقت حج کی نیت کی تھی تو حج کرے اور اگر عمرہ کی نیت کی تھی تو عمرہ کرے) اور اگر یوں کہے کہ "میں پیادہ پا حرم جانا یا پیادہ پا مسجد حرام جانا اپنے اوپر لازم کرتا ہوں۔" تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پر کچھ واجب نہیں ہوتا مگر صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک اس پر حج یا عمرہ واجب ہو جاتا ہے۔ اور اگر یوں کہے کہ "میں بیت اللہ جانا اپنے اوپر لازم کرتا ہوں" تو اس صورت میں متفقہ طور پر مسئلہ یہ ہے کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا یعنی اس پر حج یا عمرہ واجب نہیں ہوگا۔

اگر کوئی شخص پیادہ پا حج کو جانے کی نذر مانے تو اس پر واجب ہے۔ کہ وہ گھر سے پیادہ پا روانہ ہو اور جب تک کہ طواف زیارت سے فارغ نہ ہو جائے کوئی سواری استعمال نہ کرے اور اگر پیادہ پا عمرے کو جانے کی نذر مانی ہو تو جب تک کہ سر نہ منڈالے سواری پر نہ چڑھے۔ اور اگر نذر ماننے والے نے کسی عذر کی وجہ سے یا بلا عذر پورا راستہ یا آدھے سے زیادہ سواری پر طے کیا تو جانور ذبح کرنا اس پر واجب ہوگا اور اگر آدھے راستہ سے کم سواری کا استعمال کیا تو اس کے بقدر ایک بکری کی قیمت میں سے صدقہ کرنا واجب ہوگا۔

نذر ماننے والے کے ورثاء پر نذر پوری کرنا واجب ہے یا نہیں؟

(۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ اِسْتَفْتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نَذْرٍ كَانَ عَلَى اُمِّهٖ فَتُوُفِّيَتْ قَبْلَ اَنْ تَقْضِيَهُ فَاَفْتَاهُ اَنْ يَقْضِيَهُ عَنْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے رسول کریم ﷺ سے اس نذر کے بارہ میں مسئلہ پوچھا جو ان کی ماں نے مانی تھی اور اس کو پورا کرنے سے پہلے وہ مرگئی تھیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے سعدؓ کو یہ فتویٰ دیا کہ وہ اپنی ماں کی طرف سے اس نذر کو پورا کریں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حضرت سعدؓ کی والدہ کی نذر کے بارہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے مطلق نذر مانی تھی، بعض یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے روزے کی نذر مانی تھی، بعض کا قول یہ ہے کہ ان کی نذر غلام کو آزاد کرنے کی تھی، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے صدقہ کی نذر مانی تھی، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انہوں نے یا تو مالی نذر مانی تھی یا ان کی نذر مبہم تھی چنانچہ اس کی تائید دار قطنیؒ کی روایت کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت سعدؓ سے فرمایا کہ "ان کی طرف سے پانی پلاؤ"۔

اگر کسی شخص نے کوئی نذر مانی ہو اور اس نذر کو پورا کرنے سے پہلے مر گیا ہو تو اس کے بارہ میں جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اس شخص کے وارث پر اس نذر کو پورا کرنا واجب نہیں ہے جب کہ وہ نذر غیر مالی ہو، اسی طرح اگر نذر مالی ہو اور اس میت نے کچھ ترکہ نہ چھوڑا ہو تو اس صورت میں بھی اس کے وارث پر اس نذر کو پورا کرنا واجب نہیں ہوگا، البتہ مستحب ہوگا، لیکن علماء ظواہر اس حدیث کے ظاہری مفہوم کے بموجب یہ کہتے ہیں کہ وارث پر اس نذر کو پورا کرنا واجب ہوگا۔ جمہور علماء کی دلیل یہ ہے کہ اس نذر کو خود وارث نے اپنے اوپر لازم نہیں کیا ہے کہ اس کو پورا کرنا واجب ہوگا۔ البتہ مستحب ہوگا۔ لیکن علماء ظواہر اس حدیث کے ظاہری مفہوم کے بموجب یہ کہتے ہیں کہ وارث پر اس نذر کو پورا کرنا واجب ہوگا۔ جمہور علماء کی دلیل یہ ہے کہ اس نذر کو خود وارث نے اپنے اوپر لازم نہیں کیا ہے کہ اس کو پورا کرنا اس پر واجب ہو، اور جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے تو اول تو یہ حدیث وجوب پر دلالت ہی نہیں کرتی دوسرے یہ کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت سعدؓ کی والدہ نے ترکہ چھوڑا ہو اور اس ترکہ میں سے ان کی نذر پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہو یا یہ کہ محض تبرعاً یہ حکم دیا گیا ہو۔

اپنا سارا مال خیرات کر دینے کی ممانعت

⑧ وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ اِنَّ مِنْ تَوْبَتِي اَنْ اَنْخَلِعَ مِنْ مَالِي صَدَقَةً اِلَى اللّٰهِ وَاِلَى رَسُولِهٖ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمْسِكْ بَعْضَ مَالِكَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ قُلْتُ فَاِنِّي اُمْسِكُ سَهْمِيَ الَّذِي بِخَيْبَرَ - مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَهٰذَا طَرَفٌ مِنْ حَدِيثٍ مُطَوَّلٍ۔

"اور حضرت کعبؓ ابن مالک کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری مکمل اور پوری طرح توبہ کا تقاضہ تو یہ ہے کہ میں اپنے سارے مال سے دست کش ہو جاؤں اور اس کو اللہ اور اس کے رسول کے لئے خیرات کر دوں۔ "رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ" تمہارے حق میں بہتر یہ ہے کہ تم کچھ مال روک لو۔ "میں نے عرض کیا" (اچھا!) میں اپنا خیبر کا حصّہ روک لیتا ہوں۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) یہ روایت ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔"

تشریح: جب رسول کریم ﷺ غزوہ تبوک میں تشریف لے گئے تو تین صحابہ، حضرت کعبؓ ابن مالک، حضرت مرارہؓ ابن ربیع اور حضرت ہلالؓ ابن امیہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہ گئے، جب آنحضرت ﷺ واپس تشریف لائے تو ان تینوں صحابہؓ پر بہت خفا ہوئے اور لوگوں کو ان تینوں سے بولنے اور بات چیت کرنے سے منع فرما دیا، یہ اس صورت حال سے سخت پریشان ہوئے اور اپنی اس کوتاہی اور ندامت و شرمساری کے ساتھ بارگاہ حق جل مجدہ میں دعا وزاری اور توبہ و استغفار کرنے لگے، چند دنوں کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی اور ان کے حق میں یہ آیت وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا الآیۃ نازل ہوئی چنانچہ اسی موقع پر حضرت مالکؓ نے جناب رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں عرض کیا کہ میں اس معافی کے شکرانہ کے طور پر اور اپنی توبہ کو کامل کرنے کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ میرے پاس جو کچھ مال ہے سب صدقہ و خیرات کر دوں جس پر انہیں یہ حکم دیا گیا کہ کچھ مال بچا کر رکھ لو۔ بظاہر اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ دو تہائی مال روک کر ایک تہائی مال صدقہ کر دو۔ نیز آنحضرت ﷺ نے ان کو سارا مال صدقہ کرنے سے اس لئے منع کیا کہ مبادہ انہیں اپنی ضروریات زندگی کے لئے کچھ مال کی احتیاج ہو اور اس صورت میں صبر و توکل کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے، اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ ایسے معاملات میں ہر شخص کے مرتبہ و مقام کو مد نظر رکھ کر ہی کوئی حکم دیتے تھے، چنانچہ ایک طرف تو حضرت کعبؓ کا یہ واقعہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو اپنا سارا مال صدقہ کرنے سے منع کر دیا، دوسری طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مثال ہے کہ جب انہوں نے اپنا سارا مال و اسباب آنحضرت ﷺ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا اور سب کچھ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا تو آپ نے ان کو اس سے منع نہیں کیا کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان بالکل جداگانہ تھی، وہ صبر و توکل راضی برضاء مولی کے جس اونچے مرتبہ پر فائز تھے اس کی بنا پر اس کا ہلکا سا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بھی مرحلہ پر اپنی اور اپنی کسی بھی سخت سے سخت ضرورت کے موقع پر صبر و توکل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں گے۔

کتاب کے مؤلف نے اس حدیث کو اس باب میں شاید اس لئے نقل کیا ہے کہ حضرت کعبؓ کا مذکورہ قول نذر کے مشابہ ہے بایں طور کہ حضرت کعبؓ نے اپنے اوپر ایک ایسے امر کو (یعنی اپنا مال خدا کی راہ میں دے دینے کو) واجب کیا۔ جو ایک مخصوص صورت حال (یعنی قبولیت توبہ) کی وجہ سے ان پر مطلقاً واجب نہیں تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِي

گناہ کی نذر کو پورا کرنا جائز نہیں

⑨ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نَذْرَ فِي مَعْصِيَةٍ وَكَفَّارَتُهٗ كَفَّارَةُ الْيَمِيْنِ.

(رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا گناہ کی نذر کو پورا کرنا جائز نہیں ہے اور اس نذر کا کفارہ قسم کے کفارہ جیسا ہے۔"

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

تشریح: گناہ کی نذر کے بارہ میں تفصیلی بحث پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے، یہ حدیث اس مسئلہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دلیل اور حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے بر خلاف ہے۔

غیر معین نذر کا کفارہ

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ يُسَمِّهِ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا فِيْ مَعْصِيَةٍ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَا يُطِيْقُهُ وَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ وَمَنْ نَذَرَ نَذْرَ اَطَاقَهُ فَلْيَفِ بِهِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَوَقَفَهُ بَعْضُهُمْ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص غیر معین نذر مانے (یعنی صرف یہ کہے کہ "میں نذر مانتا ہوں" اور اس بات کا تعین نہ کرے کہ کس چیز کی نذر مان رہا ہے۔ مثلاً روزہ کی نذر مان رہا ہے یا صدقہ کی؟) تو اس نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے (یعنی غیر معین نذر کی صورت میں اس کو وہ کفارہ ادا کرنا ہوگا جو قسم توڑنے کی صورت میں دیا جاتا ہے) اسی طرح جو شخص کسی ایسی چیز کی نذر مانے جو گناہ ہے تو (اس کو پورا کرنا جائز نہیں اور) اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے نیز جو شخص ایسی چیز کی نذر مانے جس کو پورا کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو (جیسے کوئی شخص پہاڑ اٹھانے یا پیادہ بیت اللہ جانے کی نذر مانے یا اسی طرح کی ناممکن العمل کسی بھی چیز کو اپنے اوپر بطور نذر واجب کرے) تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے، اور جو شخص ایسی چیز کی نذر مانے جس کو پورا کرنے کی وہ طاقت رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ اس نذر کو پورا کرے (ابوداؤد، ابن ماجہ) بعض راویوں نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس پر موقوف کیا ہے۔"

صرف اس نذر کو پورا کرو جو جائز ہے

(۱۱) وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ قَالَ نَذَرَ رَجُلٌ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَنْحَرَ اِبِلًا بِبُوَانَةَ فَاَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ كَانَ فِيْهَا وَثَنٌ مِنْ اَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ قَالُوْا لَا قَالَ فَهَلْ كَانَ فِيْهَا عِيْدٌ مِنْ اَعْيَادِهِمْ قَالُوْا لَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْفِ بِنَذْرِكَ فَاِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا فِيْمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ اٰدَمَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ثابت ابن ضحاک کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ وہ بوانہ میں (جو مکہ کے نشیبی علاقہ میں واقع ایک جگہ کا نام تھا) اونٹ ذبح کرے گا، پھر وہ شخص رسول کریم ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کو اپنی (نذر کی) خبر دی۔ رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) دریافت فرمایا کہ "زمانہ جاہلیت میں اس مقام پر کوئی بت تھا جس کی پرستش کی جاتی تھی؟" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "نہیں" پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا وہاں کفار کے میلوں میں سے کوئی میلا لگتا تھا؟ "صحابہؓ نے عرض کیا کہ "نہیں!" اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے (اس شخص کو مخاطب) کر کے فرمایا کہ "تم اپنی نذر کو پورا کرو، نیز ابن آدم پر اس چیز کی نذر کو پورا کرنا بھی ضروری نہیں ہے جو اس کی ملکیت میں نہ ہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس جگہ کے بارہ میں آپ ﷺ کے سوال کا مقصد یہ تھا کہ اگر وہاں زمانہ جاہلیت میں کوئی بت تھا جس کی پرستش کی جاتی تھی یا وہاں کفار کا کوئی میلا لگتا تھا جہاں وہ سیر تماشے اور ناچ گانے میں مشغول ہوتے تھے تو اس صورت میں اس شخص کو اپنی نذر پوری کرنے کی اجازت نہ دی جائے تاکہ اس طرح کفار کے ساتھ مشابہت نہ ہو لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ وہاں ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں

تھی تو آپ ﷺ نے اس شخص کو نذر پوری کرنے کا حکم دیا۔

دف بجانے کی نذر کو پورا کرنے کا حکم

⑫ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ اِمْرَأَةً قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ نَذَرْتُ اَنْ اَضْرِبَ عَلٰى رَأْسِكَ بِالدُّفِّ قَالَ اَوْفِيْ بِنَذْرِكِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَزَادَ رَزِيْنٌ قَالَتْ وَنَذَرْتُ اَنْ اَذْبَحَ بِمَكَانِ كَذَا وَكَذَا مَكَانٌ يَذْبَحُ فِيْهِ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ هَلْ كَانَ بِذٰلِكَ الْمَكَانِ وَثَنٌ مِنْ اَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ قَالَتْ لَا قَالَ هَلْ كَانَ فِيْهِ عِيْدٌ مِنْ اَعْيَادِهِمْ قَالَتْ لَا قَالَ اَوْفِيْ بِنَذْرِكِ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے (حضرت عبداللہ ابن عمرؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے یہ نذر مانی کہ (جب آپ ﷺ جہاد سے واپس تشریف لائیں تو) میں آپ ﷺ کے سامنے دف بجاؤں۔ "آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو"۔ (ابوداؤد) اور رزینؒ نے اس روایت میں یہ الفاظ مزید نقل کئے ہیں کہ اس عورت نے (یہ بھی) کہا کہ "اور میں نے یہ نذر مانی ہے کہ میں فلاں فلاں مقام پر جہاں زمانۂ جاہلیت میں لوگ ذبح کرتے تھے، جانور ذبح کروں۔" آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ "کیا وہاں زمانۂ جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تھا؟" اس عورت نے کہا کہ نہیں۔ "پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ "کیا وہاں کفار کے میلوں میں سے کوئی میلہ لگتا تھا؟ عورت نے کہا کہ "نہیں!" آپ ﷺ نے فرمایا "اپنی نذر پوری کرو۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دف بجانا مباح ہے! جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ صرف اس چیز کی نذر ماننی چاہے جو طاعت (یعنی بھلائی) کی قسم سے ہو وہ اس حدیث کے بارہ میں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ اگرچہ دف بجانا کوئی طاعت نہیں ہے بلکہ مباح ہے لیکن اس عورت نے چونکہ آنحضرت ﷺ کے لئے اپنے جذبات عقیدت و محبت کی بنا پر یہ نذر مانی تھی کہ آنحضرت ﷺ جب جہاد کے معرکوں سے فارغ ہو کر خیر و عافیت کے ساتھ واپس تشریف لائیں گے تو میں دف بجاؤں گی، لہٰذا اس اعتبار سے اس دف کا بجانا بھی گویا طاعت کی قسم سے ہوا۔

تہائی مال سے زیادہ صدقہ کرنے کی ممانعت

⑬ وَعَنْ اَبِيْ لُبَابَةَ اَنَّهٗ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ تَوْبَتِيْ اَنْ اَهْجُرَ دَارَ قَوْمِي الَّتِيْ اَصَبْتُ فِيْهَا الذَّنْبَ وَاَنْ اَنْخَلِعَ مِنْ مَالِيْ كُلِّهٖ صَدَقَةً قَالَ يُجْزِئُ عَنْكَ الثُّلُثُ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابولبابہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ "میری تمام و کمال توبہ یہ ہے کہ میں اپنی قوم کا گھر چھوڑ دوں جہاں مجھ سے گناہ سرزد ہوا ہے اور یہ کہ میں اپنے تمام مال کو خیرات کرنے کے لئے اس سے دست کش ہو جاؤں" آپ ﷺ نے فرمایا "تہائی مال کا صدقہ تمہارے لئے کافی ہے۔" (رزینؒ)

تشریح: حضرت ابولبابہؓ کا واقعہ اسلامی تاریخ کا ایک بہت بڑا عجیب، سبق آموز اور عدیم المثال واقعہ ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے بنو قریظہ کا محاصرہ کیا جو یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا۔ تو بنو قریظہ نے یہ پیغام بھیجا کہ آپ اپنے صحابی ابولبابہؓ کو ہمارے پاس بھیج دیجئے تاکہ ہم اپنے بارہ میں ان سے مشورہ کریں آنحضرت ﷺ نے اس پیغام کو منظور فرمایا اور ابولبابہؓ کو ان کے پاس بھیج دیا، جب بنو قریظہ نے ابولبابہؓ کو دیکھا تو ان کے مرد و عورت اور بچے بوڑھے سب ہی ان کے آگے رونے گڑگڑانے لگے ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر ابولبابہؓ کا دل پسیج گیا، پھر انہوں نے ابولبابہؓ سے پوچھا کہ اگر ہم حکم محمدی کو مان لیں اور اپنے آپ کو ان کے حوالہ کریں تو ہمارے ساتھ

کیا سلوک کریں گے؟ اس کے جواب میں ابولبابہؓ نے اپنے حلق پر ہاتھ پھیر کر ظاہر کیا کہ تمہیں ذبح کر ڈالیں گے۔ ابولبابہؓ کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات کہی اور ہنوز وہاں سے قدم نہیں اٹھایا تھا کہ میں متنبہ ہوا اور اس بات پر سخت نادم ہوا کہ تو نے خدا اور اس کے رسول کے بارہ میں خیانت کی۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ۔

"اے ایمان والو! نہ تو خدا اور رسول کی امانت (یعنی ان کے پیغام و احکام) میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔"

پھر کیا تھا، ایسا لگا جیسے احساس ندامت و شرمندگی نے ابولبابہؓ کے قلب و شعور پر بجلی گرادی ہو، وہ بے تاب ہو گئے اور دیوانہ وار مسجد نبوی پہنچے اور اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا اور یہ اعلان کیا کہ جب تک کہ میں توبہ نہ کر لوں اور پھر جب تک اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول نہ کر لے مجھ پر کھانا پینا حرام ہے! جب نماز کا وقت آتا تو ان کے بیٹے آتے اور ان کو کھول دیتے پھر جب وہ نماز پڑھ لیتے ان کے ہاتھ باندھ دیتے لوگ ان کے پاس آتے تو کھولنے کے لئے کہتے تو انکار کر دیتے اور فرماتے کہ جب تک رسول کریم ﷺ خود آکر نہ کھولیں گے میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا، چنانچہ مسلسل سات دن تک اسی طرح اس ستون سے بندھے کھڑے رہے یہاں تک کہ غش کھا کر گر پڑے، آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی، اس کے بعد لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی ہے اب تو اپنے آپ کو کھول ڈالو، انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم! جب تک رسول کریم ﷺ اپنے دست مبارک سے مجھے نہیں کھولیں گے میں خود اپنے آپ کو ہرگز نہیں کھولوں گا، چنانچہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور اپنے دست مبارک سے انہیں کھولا اسی موقع پر حضرت ابولبابہؓ نے بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ اپنی توبہ کو کامل کرنے کے لئے میں یہ محسوس کرتا ہوں مجھے اپنے سارے اثاثہ سے دست کش ہونا چاہئے چنانچہ اول تو میں اپنا وہ آبائی اور قومی گھر چھوڑتا ہوں جو بنی قریظہ کے قبیلے میں واقع ہے اور دوسرے میں اپنا وہ تمام مال و اسباب اللہ کی راہ میں خیرات کر دینا چاہتا ہوں۔

گھر چھوڑنے کے لئے ابولبابہؓ نے اس لئے کہا کہ وہ اس جگہ سے دور ہو جائیں جہاں شیطان نے ان پر غلبہ حاصل کر کے ان کو گناہ میں مبتلا کیا اور اس گناہ کا ظاہری سبب بنو قریظہ کے تئیں ان کا جذبہ ہمدردی تھا اور اس جذبہ ہمدردی کا اظہار انہوں نے اس لئے کیا کہ ان کے اہل و عیال اور مال و اسباب سب کچھ بنو قریظہ کے قبضہ میں تھا۔ گھر چھوڑنے کے بارہ میں آنحضرت ﷺ نے حکم دیا اس کا حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے، بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ابولبابہؓ کا گھر چھوڑ دینا طاعت کی قسم سے تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس کو جائز رکھا، البتہ صدقہ کے بارے میں آپ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ سارا مال خیرات کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے سارے مال کا تہائی حصہ خیرات کرنا حصول مقصد کے لئے کافی ہے۔

کسی خاص جگہ نماز پڑھنے کی نذر مانی جائے اور پھر اس نماز کو دوسری جگہ پڑھ لیا جائے تو نذر پوری ہو جائے گی

(۱۴) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ رَجُلًا قَامَ يَوْمَ الْفَتْحِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي نَذَرْتُ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اِنْ فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكَ مَكَّةَ اَنْ اُصَلِّيَ فِيْ بَيْتِ الْمَقْدِسِ رَكْعَتَيْنِ قَالَ صَلِّ هٰهُنَا ثُمَّ اَعَادَ عَلَيْهِ فَقَالَ صَلِّ هٰهُنَا ثُمَّ اَعَادَ عَلَيْهِ فَقَالَ شَاْنُكَ اِذًا۔

(رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت جابرؓ ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن ایک شخص مسجد نبوی ﷺ میں کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے عزوجل سے یہ نذر مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مکہ کی فتح عطا کرے گا تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز پڑھوں گا۔" آنحضرت ﷺ

نے فرمایا کہ تم اسی جگہ (مسجد حرام میں) نماز پڑھ لو (کیونکہ یہاں نماز پڑھنا افضل ہے باوجودیکہ بیت المقدس جا کر وہاں نماز پڑھنے کی بہ نسبت یہاں نماز پڑھ لینا زیادہ آسان و سہل ہے) اس شخص نے پھر یہی عرض کیا آنحضرت ﷺ نے یہی جواب دیا کہ اس جگہ نماز پڑھ لو، جب اس نے تیسری مرتبہ بھی یہی عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اب تمہیں اختیار ہے" (یعنی اگر تم یہاں نماز پڑھنا نہیں چاہتے تو تم جانو، تمہیں اپنی نذر کے مطابق بیت المقدس میں نماز پڑھنے کا اختیار ہے۔" (ابوداؤد، دارمی)

تشریح: شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی نذر مانے اور پھر اس نماز کو مسجد حرام میں پڑھ لے تو اس کی نذر پوری ہو جائے گی لیکن اگر اس نماز کو وہ مسجد اقصی یعنی بیت المقدس میں پڑھے گا تو نذر پوری نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مسجد اقصی میں نماز پڑھنے کی نذر مانے اور پھر اس نماز کو مسجد حرام میں یا مسجد نبوی میں پڑھ لے تو اس کی نذر پوری ہو جائے گی! گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی جگہ نماز پڑھنے کی نذر مانی جائے اور اس نماز کو کسی ایسی دوسری جگہ پڑھ لیا جائے جو اس جگہ سے زیادہ فضیلت کی حامل ہو تو نذر پوری ہو جائے گی۔ لیکن حنفی علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس بارہ میں ہمارا یہ مسلک ہے کہ اگر کوئی شخص کسی جگہ نماز پڑھنے کی نذر مانے اور پھر اس نماز کو کسی ایسی دوسری جگہ پڑھے جو اس جگہ سے کم فضیلت کی حامل ہو تو بھی نذر پوری ہو جائے گی۔

نذر کا کوئی جزو اگر ناممکن العمل ہو تو اس کا کفارہ

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ اُخْتَ عُقْبَةَ بْنَ عَامِرٍ نَذَرَتْ اَنْ تَحُجَّ مَاشِيَةً وَاَنَّهَا لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنْ مَشْيِ اُخْتِكَ فَلْتَرْكَبْ وَلْتُهْدِ بَدَنَةً رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالدَّارِمِيُّ وَفِي رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاؤُدَ فَاَمَرَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تَرْكَبَ وَتُهْدِيَ هَدْيًا وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَصْنَعُ بِشَقَاءِ اُخْتِكَ شَيْئًا فَلْتَرْكَبْ وَلْتَحُجَّ وَتُكَفِّرْ يَمِيْنَهَا۔

"اور حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ عقبہ ؓ ابن عامر کی بہن نے یہ نذر مانی کہ وہ پیدل حج کریں گی لیکن وہ اس کی طاقت نہیں رکھتی تھی، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے (حضرت عقبہ ؓ سے) فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری بہن کے پیدل جانے کی پرواہ نہیں ہے، لہٰذا انہیں چاہئے کہ وہ (جب پیدل نہ چل سکیں تو) سواری پر بیٹھ جائیں اور اس کے مال کا کفارہ کے طور پر بدنہ ذبح کریں (حنفیہ کے نزدیک بدنہ سے مراد اونٹ یا گائے ہے۔ لیکن شوافع کے نزدیک بدنہ کا اطلاق صرف اونٹ پر ہوتا ہے) (ابوداؤد، دارمی) ابوداؤد ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری بہن کو اس کی مشقت کا کوئی ثواب نہیں دے گا (یعنی تمہاری بہن جو اس طرح مشقت برداشت کریں گی اس کا انہیں کچھ ثواب نہیں ملے گا) لہٰذا انہیں چاہئے کہ وہ (جب پیدل نہ چل سکیں تو) سواری پر بیٹھ کر حج کا سفر پورا کریں اور اپنی قسم کا کفارہ دیں۔"

تشریح: "ہدی" اس جانور کو کہتے ہیں جو ذبح کرنے کے لئے حرم بھیجا جائے! ہدی کا کم سے کم درجہ بکری ہے اور اس کا اعلیٰ درجہ بدنہ یعنی اونٹ یا گائے ہے۔ اس حدیث میں بدنہ ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ بطور استحباب ہے! قاضی ؒ کہتے ہیں کہ پیادہ پا حج کے لئے جانا چونکہ طاعات کی قسم سے ہے اس لئے اس کی نذر پوری کرنا واجب ہے اور اس کے ساتھ ہر وہ عمل لاحق ہو جاتا ہے جس کو ترک کرنا جائز نہیں ہے الا یہ کہ کوئی شخص اس کی ادائیگی سے عاجز ہو۔ لہٰذا ترک کی صورت میں فدیہ (کفارہ) واجب ہوگا۔ اب اس بارہ میں اختلاف ہے کہ بطور کفارہ کس جانور کو ذبح کرنا واجب ہوگا؟ چنانچہ حضرت علی ؓ کا قول ہے۔ کہ اس حدیث کے بموجب بدنہ واجب ہوگا، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ جس طرح میقات سے تجاوز کر جانے کی وجہ سے بکری واجب ہوتی ہے اسی طرح اس صورت میں بھی بکری واجب ہوگی، انہوں نے اس حدیث میں بدنہ ذبح کرنے کے حکم کو استحباب پر محمول کیا ہے، یہی قول امام مالک ؒ کا بھی ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت امام شافعی ؒ کا قول بھی یہی ہے۔

"اور اپنی قسم کا کفارہ دیں" کے بارہ میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس حکم میں "کفارہ" سے مراد کفارہ جنایت ہے اور وہ ہدی ہے، یا روزہ ہے جو ہدی کا قائم مقام ہے اور جس کا ذکر بھی اگلی حدیث میں کیا گیا ہے "کفارہ" کے بارہ میں یہ تاویل اس لئے کی جاتی ہیں تاکہ یہ روایت اس بارہ میں منقول دوسری روایتوں کے مطابق ہو جائے، حاصل یہ کہ یہاں "قسم کے کفارہ" سے وہ کفارہ مراد نہیں ہے جو قسم توڑنے کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ عُقْبَةَ بْنَ عَامِرٍ سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اُخْتٍ لَهُ نَذَرَتْ اَنْ تَحُجَّ حَافِيَةً غَيْرَ مُخْتَمِرَةٍ فَقَالَ مُرُوْهَا فَلْتَخْتَمِرْ وَلْتَرْكَبْ وَلْتَصُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مالک کہتے ہیں کہ جب عقبہؓ ابن عامر نے (سفر حج کے دوران) اپنی بہن کے بارہ میں نبی کریم ﷺ سے پوچھا جنہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ پیادہ پا، ننگے پاؤں اور ننگے سر حج کو جائیں گی، تو آنحضرت نے فرمایا کہ "ان کو حکم دو کہ وہ اپنا سر ڈھانکیں اور سواری پر بیٹھ جائیں، نیز انہیں چاہئے کہ وہ تین روزے رکھیں۔" (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: سر ڈھانکنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ عورت کا سر اور بال ستر ہیں۔ یعنی اس کے جسم کے یہ وہ حصے ہیں جس کو چھپانا اس پر واجب ہے اور اس کا کھلا رکھنا گناہ ہے اور سواری پر بیٹھنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ وہ پیدل چلنے سے عاجز تھیں اور اس کی وجہ سے وہ سخت مشقت و تکلیف میں مبتلا تھیں۔

چونکہ اوپر کی حدیث میں ہدی کا ذکر ہے اس لئے یہاں وہ "تین روزے رکھیں" کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر وہ ہدی (یعنی جانور ذبح کرنے) سے عاجز ہوں تو تین روزے رکھ لیں۔ یا پھر روزے رکھنے کے لئے اس لئے فرمایا گیا کہ قسم کے کفارہ کی جو کئی قسمیں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کفارہ کی قسموں سے عاجز ہو تو وہ تین روزے رکھے اب ان تین روزوں کے بارہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تین روزے قسم کے کفارہ کے طور پر رکھے جائیں تو تین دن پے در پے رکھنے واجب ہیں اس کے علاوہ کی صورت میں اختیار ہے کہ جس طرح چاہے رکھے گا۔

ناجائز نذر کا کفارہ دینا واجب ہے

(۱۷) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ اَخَوَيْنِ مِنَ الْاَنْصَارِ كَانَ بَيْنَهُمَا مِيْرَاثٌ فَسَاَلَ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ الْقِسْمَةَ فَقَالَ اِنْ عُدْتَ تَسْاَلُنِي الْقِسْمَةَ فَكُلُّ مَالِي فِيْ رِتَاجِ الْكَعْبَةِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ اِنَّ الْكَعْبَةَ غَنِيَّةٌ عَنْ مَالِكَ كَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِكَ وَكَلِّمْ اَخَاكَ فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَمِيْنَ عَلَيْكَ وَلَا نَذْرَ فِيْ مَعْصِيَةِ الرَّبِّ وَلَا فِيْ قَطِيْعَةِ الرَّحِمِ وَلَا فِيْمَا لَا يَمْلِكُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سعیدؓ ابن مسیب کہتے ہیں کہ دو انصاری بھائیوں کو کسی کی میراث ملی تھی (جسے ان دونوں کے درمیان تقسیم ہونا باقی تھا) چنانچہ ان دونوں میں سے ایک بھائی نے ایک دوسرے بھائی سے اس میراث کو تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا تو اس دوسرے بھائی نے کہا کہ (میں یہ نذر مانتا ہوں کہ) اگر اب تم پھر مجھ سے تقسیم کا مطالبہ کرو گے تو میرا سارا مال کعبہ میں خرچ کیا جائے گا۔ جب یہ صورت حال حضرت عمر فاروقؓ (کے علم میں آئی تو انہوں) نے فرمایا کہ کعبہ تمہارے مال سے بے پرواہ ہے۔ (یعنی کعبہ کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اپنا مال اس کی نذر کرو) اور چونکہ تمہارے اوپر اس نذر کو پورا کرنا واجب نہیں ہے اس لئے تم اپنی قسم کا (یعنی اس ناجائز نذر کا) کفارہ ادا کرو اور (جب تمہارا بھائی اس میراث کو تقسیم کرنے کا مطالبہ کرے تو اس معاملہ میں) تم اپنے بھائی سے بات چیت کرو (یعنی اس میراث کو تقسیم کرکے اس کا مطالبہ پورا کرو) کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تم پر اس قسم (یعنی اس طرح کی نذر) کو پورا کرنا واجب نہیں ہے اور پروردگار کی معصیت کی نذر جائز نہیں ہے (یعنی جس نذر کا تعلق پروردگار کی نافرمانی اور کسی گناہ سے ہو اس کو پورا نہ

کرنا چاہئے) اور نہ اس نذر کو پورا کرنا چاہئے جو قرابت داری کو منقطع کرنے سے متعلق ہو اور جس چیز کا انسان مالک نہ ہو، اس کی نذر پوری کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ (بلکہ جو نذر ناجائز ہونے کی وجہ سے پوری نہ کی جائے اس کا کفارہ دینا واجب ہے)۔" (ابوداؤد)

تشریح: تاج الکعبۃ کا لفظی ترجمہ ہے "کعبہ کا دروازہ" کیونکہ "رتاج" بڑے دروازہ (پھاٹک) کو کہتے ہیں لیکن رتاج کعبہ سے کعبہ کا دروازہ مراد نہیں ہے، بلکہ نفس کعبہ مراد ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جائز اور ناجائز نذر

⑱ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ النَّذْرُ نَذْرَانِ فَمَنْ كَانَ نَذَرَ فِيْ طَاعَةٍ فَذٰلِكَ لِلّٰهِ فِيْهِ الْوَفَاءُ وَمَنْ كَانَ نَذَرَ فِيْ مَعْصِيَةٍ فَذٰلِكَ لِلشَّيْطَانِ وَلَا وَفَاءَ فِيْهِ وَيُكَفِّرُهُ مَا يُكَفِّرُ الْيَمِيْنَ۔

(رواہ النسائی)

"حضرت عمرانؓ ابن حصین کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ "نذر دو قسم کی ہے (ایک تو یہ کہ) کوئی شخص طاعت (یعنی حق تعالیٰ کی بندگی) کی نذر مانے، یہ نذر خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، اس طرح کی نذر کو پورا کرنا واجب ہے، اور دوسری یہ کہ کوئی شخص گناہ کی نذر مانے، یہ نذر شیطان کے لئے ہے، اس طرح کی نذر کو پورا کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ ایسی صورت میں وہ کفارہ ادا کیا جائے جو قسم توڑنے کی صورت میں دیا جاتا ہے۔" (نسائی)

جان قربان کرنے کی نذر کا مسئلہ

⑲ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْتَشِرِ قَالَ اِنَّ رَجُلًا نَذَرَ اَنْ يَنْحَرَ نَفْسَهُ اِنْ نَجَّاهُ اللّٰهُ مِنْ عَدُوِّهِ فَسَئَلَ ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ لَهُ سَلْ مَسْرُوْقًا فَسَأَلَهُ فَقَالَ لَهُ لَا تَنْحَرْ نَفْسَكَ فَاِنَّكَ اِنْ كُنْتَ مُؤْمِنًا قَتَلْتَ نَفْسًا مُؤْمِنَةً وَاِنْ كُنْتَ كَافِرًا تَعَجَّلْتَ اِلَى النَّارِ وَاشْتَرِ كَبْشًا فَاذْبَحْهُ لِلْمَسَاكِيْنِ فَاِنَّ اِسْحَاقَ خَيْرٌ مِنْكَ وَفُدِيَ بِكَبْشٍ فَاَخْبَرَ ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ هٰكَذَا كُنْتُ اَرَدْتُ اَنْ اُفْتِيَكَ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت محمد ابن منتشر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کو دشمن سے نجات دلا دے تو وہ اپنے آپ کو ذبح کر ڈالے گا، چنانچہ جب اس کو اپنے دشمن سے نجات مل گئی تو (اس نے اس مسئلہ میں حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا حضرت ابن عباسؓ نے اس سے فرمایا کہ یہ مسئلہ مسروقؒ (تابعی) سے پوچھو، اس شخص نے مسروقؒ سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ "تم اپنے آپ کو ذبح نہ کرو، کیونکہ اگر تم مسلمان ہو تو (اس صورت میں) تم ایک مسلمان کو قتل کرنے کے مرتکب ہو گے اور اگر تم کافر ہو تو (اس صورت میں گویا) تم دوزخ میں جانے میں جلدی کرو گے، لہٰذا اگر تمہارے بارہ میں یہ حکم ہے کہ (تم دنبہ خرید کر مسکینوں کے لئے اس کو ذبح کرو، حضرت اسحٰق علیہ السلام تم سے بہتر تھے جن کا بدلہ ایک دنبہ کو قرار دیا گیا، جب اس شخص نے حضرت ابن عباسؓ کو (حضرت مسروقؒ کے اس فتویٰ سے آگاہ کیا) تو انہوں نے فرمایا کہ حقیقت یہی ہے، میں خود تمہیں یہی فتویٰ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔" (رزین)

تشریح: حضرت مسروقؒ ابن اجدع کا شمار اونچے درجہ کے تابعین میں ہوتا ہے۔ ان کی علمی فضیلت اور فقہی حیثیت اپنے زمانہ میں ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ مرہ ابن شرحبیل کا قول ہے کہ کسی ہمدانی عورت نے مسروقؒ جیسا سپوت نہیں جنا، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی وفات سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر دربار رسالت میں حاضری کی سعادت سے محروم رہے تھے، چنانچہ انہوں نے چاروں خلفاء راشدین اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے تحصیل علم کیا تھا اس لئے جب اس شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے مسئلہ دریافت کیا تو انہوں

نے اپنی جلالت علم کے باوجود اس شخص کو حضرت مسروقؒ سے مسئلہ پوچھنے کے لئے کہا، اس سے جہاں حضرت مسروقؒ کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے، وہیں حضرت ابن عباسؓ کے جذبۂ احتیاط اور ان کے کمال صبرودیانت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

حدیث میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے اس کو اپنے دشمن کے ہاتھوں مرنا نہایت شدید اور فضیحت ناک معلوم ہوتا تھا، چنانچہ اس نے التجا کی کہ "پروردگار! اصل موت مجھ پر سخت نہیں ہے اور نہ میں اپنی زندگی کے خاتمہ سے گھبراتا ہوں، میں اپنی جان اپنے ہاتھوں تجھے سونپتا ہوں اور اپنے آپ کو تیرے نام پر قربان کرتا ہوں لیکن دشمن کے ہاتھوں مرنا مجھ پر سخت شاق ہے اس لئے اگر تو مجھے دشمن سے نجات دے گا تو میں اپنے آپ کو تیرے نام پر قربان کردوں گا"۔ یہ تو گویا اس کا جذبہ اور اس کی ایک طبعی خواہش تھی لیکن اس نے یہ نہیں جانا کہ اپنے آپ کو ہلاک کرلینا اس سے کہیں زیادہ سخت اور حرام ہے، چنانچہ حضرت مسروقؒ نے اس کے سامنے اس مسئلہ کو بڑے لطیف انداز میں واضح کیا کہ اگر تم مسلمان ہو اور اپنے آپ کو قتل کرڈالتے ہو تو اس طرح درحقیقت تم ایک مسلمان کو قتل کرنے کے مرتکب گردانے جاؤ گے اور یہ معلوم ہونا چاہئے کہ نفس مؤمن کو قتل کرنے والے کے بارہ میں اس آیت کریمہ۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا الخ کے بموجب دوزخ کے دائمی عذاب کی وعید بیان کی گئی ہے، اور اگر تم کافر ہو تو اس صورت میں تمہارا اپنے آپ کو قتل کردینا، اس بات کے مترادف ہوگا کہ تم دوزخ میں جانے میں جلدی کررہے ہو، کیونکہ اگر تم بقید حیات رہتے ہو تو عجب نہیں کہ حق تعالیٰ تمہیں راہ ہدایت سے نوازے اور تم اسلام قبول کرکے دائمی نجات پاؤ۔ بہرحال کسی بھی صورت میں تمہارا اپنے آپ کو قتل کردینا نہ صرف یہ کہ نامشروع ہے بلکہ غیر معقول بھی ہے۔

حدیث کا یہ جملہ "حضرت اسحٰق علیہ السلام تم سے بہتر تھے جن کا بدلہ ایک دنبہ کو قرار دیا گیا تھا"۔ بعض علماء کے اس قول پر مبنی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو خواب دیکھا تھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کررہا ہوں تو وہ بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے۔ لیکن اس بارہ میں مشہور و مختار اور صحیح قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔ چنانچہ جلال الدین سیوطیؒ نے وضاحت کی ہے کہ اس واقعہ میں اہل کتاب نے سخت تحریف و تکذیب سے کام لیا ہے، سابقہ آسمانی کتابوں میں اصل نام اسمٰعیل تھا جس کو اہل کتاب نے حذف کرکے اسحٰق بنادیا۔

درمختار میں لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی موافقت میں اس پر بکری ذبح کرنا واجب ہوگا لیکن حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ایسی نذر لغو ہوگی، اسی طرح اپنے آپ کو یا اپنے غلام کو ذبح کرنے کی نذر بھی لغو ہوگی لیکن حضرت امام محمدؒ کے نزدیک اس صورت میں ایک بکری ذبح کرنا واجب ہوگا! اور اگر کسی نے اپنے باپ یا اپنے دادا کو اور یا اپنی ماں کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو تمام علماء کے نزدیک اس کی نذر "لغو" ہوگی۔

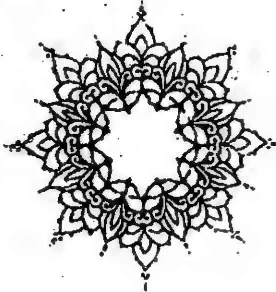

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب القصاص

قصاص کا بیان

اصطلاح شریعت میں "قصاص کا مفہوم ہے، قاتل کی جان لینا، جس شخص نے کسی کو ناحق قتل کر دیا ہو اس کو مقتول کے بدلے میں قتل کر دینا! یہ لفظ قص اور قصص سے" نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے جانا، چونکہ مقتول کا ولی قاتل کا پیچھا پکڑتا ہے۔ تاکہ اسے مقتول کے بدلے میں قتل کرائے اس لئے قاتل کی جان لینے کو قصاص کہا جاتا ہے، ویسے قصاصات کے معنی مساوات (برابری) کے بھی ہیں۔ "قصاص" پر اس معنی کا اطلاق اس طرح ہوتا ہے کہ جب قاتل کو مقتول کے بدلے میں قتل کر دیا جاتا ہے تو مقتول کا ولی اور قاتل یا مقتول اور قاتل برابر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ قصاص میں قاتل کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو قاتل نے مقتول کے ساتھ کیا تھا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خون مسلم کی حرمت

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّی رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ النَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالثَّيِّبُ الزَّانِی وَالْمَارِقُ لِدِيْنِهِ التَّارِكُ لِلْجَمَاعَةِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مسلم انسان کہ جو اس امر کی شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشک میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس کا خون بہانا جائز نہیں الا یہ کہ ان تین باتوں میں سے کوئی ایک بات پیش آجائے۔ ① ناحق قتل کرنا کہ خون کے بدلے خون (یعنی قصاص) لیا جائے (لیکن یہ مقتول کے ولی کا حق ہے کہ وہ اس بارہ میں شریعت کے مقرر کردہ اصول کے مطابق قاتل سے بدلہ لے)۔ ② شادی شدہ (مسلمان، مکلف اور آزاد) کا زنا کرنا (اس کو سنگسار کیا جائے۔ ③ اپنے دین سے نکلنے اور اپنی جماعت کو چھوڑنے والا (یعنی جو مسلمان مرتد ہو جائے اس کو قتل کرنا جائز ہے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ جملہ "جو اس امر کی شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشک میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں" دراصل لفظ مسلم کی وضاحت و بیان اور اس کے موکد کرنے کے لئے ارشاد فرمایا گیا ہے، نیز اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ محض کلمہ شہادت پڑھ لینا خون بہانے کے ناجائز ہونے کے لئے کافی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص (جو پہلے سے مسلمان نہ ہو یا جس کا مسلمان ہونا معلوم نہ ہو) محض زبان سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور آنحضرت ﷺ کی رسالت کی شہادت دے دے تو اس شخص کا ناحق خون بہانا بھی اسی طرح ناجائز ہو گا جس طرح کسی دوسرے جانے پہچانے مسلمان کا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان کا خون بہانا قطعاً جائز نہیں ہے الایہ کہ ان تینوں چیزوں میں سے کوئی ایک چیز پیش آجائے اول تو یہ کہ اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو ناحق قتل کر دے تو "خون کا بدلہ خون" کے اصول کے تحت اس کو قتل کیا جاسکتا ہے، دوم یہ کہ اگر کوئی شادی شدہ شخص جو مکلف، مسلمان اور آزاد ہو، زنا کا مرتکب ہو تو اس کو سنگسار کر دیا جائے اور سوم یہ کہ جو مسلمان دین سے نکل آئے یعنی مرتد ہو جائے اس کو قتل کر دینا بھی جائز ہے۔

"اپنی جماعت چھوڑنے والا" یہ مارق کی صفت مؤکدہ ہے یعنی جو شخص قولاً یا فعلاً اور یا اعتقاداً مرتد ہو جائے کہ وہ اسلام کو ترک کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کی قوم سے علیحدگی اختیار کرے تو اس شخص کو قتل کر دینا واجب ہے بشرطیکہ وہ اپنے ارتداد سے توبہ نہ کرلے۔ حدیث میں ایسے شخص (یعنی مرتد) کو "مسلمان" کے ذیل میں ذکر کرنا اس کی پہلی حالت کے اعتبار سے مجازاً ہے۔ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اگر کوئی عورت مرتد ہو جائے تو حنفیہ کے مسلک کے مطابق اس عورت کو قتل نہ کرنا چاہئے۔

خون ناحق کرنے والا رحمت خداوندی سے محروم رہتا ہے

(۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يَزَالَ الْمُؤْمِنُ فِي فُسْحَةٍ مِنْ دِيْنِهِ مَالَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تاوقتیکہ کوئی مسلمان خون حرام (یعنی ناحق) قتل کر مرتکب نہ ہو وہ ہمیشہ اپنے دین کی وسعت و کشادگی میں رہتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: یوں تو ہر برائی انسان کی دینی و اخلاقی زندگی کے لئے زوال کا باعث اور غضب خداوندی کا موجب ہوتی ہے لیکن یہاں بطور خاص خون ناحق کے مذموم ترین فعل کے بارہ میں واضح کیا گیا ہے کہ جب تک کوئی شخص کسی کے خون ناحق سے اپنا ہاتھ نہیں رنگتا اس پر رحمت خداوندی کا ہاتھ رہتا ہے اور اس کو حق تعالیٰ کی امید رحمت اور اس کی بخشش و مغفرت کا سہارا اپنے وسیع دامن میں لئے رہتا ہے لیکن جب کوئی شخص خون ناحق سے اپنے ہاتھ رنگ لیتا ہے تو اس پر تنگی مسلط ہو جاتی ہے اور وہ ان لوگوں کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے جو رحمت خداوندی سے ناامید و محروم ہیں۔

قیامت میں سب سے پہلے خون کے بارہ میں پرسش ہوگی

(۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَّلُ مَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي الدِّمَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن سب سے پہلے جس چیز کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا وہ خون ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے حقوق میں سے جس مقدمہ کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا، وہ انسان کے خون کا مقدمہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے جس چیز کے بارہ میں سب سے پہلے سوال کیا جائے گا وہ نماز ہوگی۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ منہیات میں سے جس چیز کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کا مقدمہ ہوگا اور مامورات میں سے جس چیز کے بارہ میں سب سے پہلے سوال کیا جائے گا وہ نماز ہوگی۔

جس شخص نے کلمہ پڑھ لیا وہ معصوم الدم ہو گیا

(۴) وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ اَنَّهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِنْ لَقِيْتُ رَجُلًا مِنَ الْكُفَّارِ فَاقْتَتَلْنَا فَضَرَبَ اِحْدٰى يَدَيَّ

بِالسَّیْفِ فَقَطَعَھَا ثُمَّ لَا ذَمَنِی بِشَجَرَۃٍ فَقَالَ اَسْلَمْتُ لِلّٰہِ وَفِی رِوَایَۃٍ فَلَمَّا اَھْوَیْتُ لِاَقْتُلَہٗ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ أَقْتُلُہٗ بَعْدَ اَنْ قَالَھَا قَالَ لَا تَقْتُلْہُ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّہٗ قَطَعَ اِحْدٰی یَدَیَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَقْتُلْہُ فَاِنْ قَتَلْتَہٗ فَاِنَّہٗ بِمَنْزِلَتِکَ قَبْلَ اَنْ تَقْتُلَہٗ وَاِنَّکَ بِمَنْزِلَتِہٖ قَبْلَ اَنْ یَقُوْلَ کَلِمَتَہُ الَّتِی قَالَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مقداد ابن اسود سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ! مجھے بتائیے کہ اگر (مجھے کوئی کافر مل جائے) اور ہمارے درمیان لڑائی چھڑ جائے اور وہ کافر میرے ایک ہاتھ پر تلوار کا وار کر کے اس کو کاٹ دے اور پھر ایک درخت کی آڑ میں مجھ سے پناہ پکڑ کر یہ کہے کہ میں خدا کے لئے مسلمان ہو گیا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اور جوں ہی میں اس کو مار ڈالنے کا ارادہ کروں تو وہ یہ کہے کہ لا الٰہ الا اللہ تو کیا میں اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے کے بعد اس کو قتل کر سکتا ہوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں اس کو قتل نہ کرو، "مقداد نے عرض کیا" یارسول اللہ اس نے جو میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا (اس کے باوجود) اس کو قتل نہ کرو، کیونکہ اگر تم اس کو قتل کرو گے تو وہ اس جگہ پہنچ جائے گا، جہاں تم اس کو قتل کرنے سے پہلے تھے اور تم اس جگہ پہنچ جاؤ گے جہاں وہ کلمہ پڑھنے سے پہلے تھا۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کر دیا تو جس طرح تم اس کو قتل کرنے سے پہلے معصوم الدم تھے اب وہ اسلام لانے کی وجہ سے معصوم الدم ہو گیا اور جس طرح وہ کلمہ اسلام پڑھنے سے پہلے غیر معصوم الدم تھا اب تم اس کو قتل کر دینے کی وجہ سے غیر معصوم الدم ہو گئے۔ اس کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ کلمۂ اسلام پڑھنے سے پہلے اس شخص کو اس کے کافر ہونے کی وجہ سے قتل کر دینا درست تھا اب اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد اس کو قتل کر دینے کی وجہ سے تمہیں قتل کر دینا درست ہو گا۔

⑤ وَعَنْ اُسَامَۃَ بْنِ زَیْدٍ قَالَ بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی اُنَاسٍ مِنْ جُھَیْنَۃَ فَاَتَیْتُ عَلٰی رَجُلٍ مِنْھُمْ فَذَھَبْتُ اَطْعَنُہٗ فَقَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَطَعَنْتُہٗ فَقَتَلْتُہٗ فَجِئْتُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرْتُہٗ فَقَالَ اَقَتَلْتَہٗ وَقَدْ شَھِدَ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ؟ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّمَا فَعَلَ ذٰلِکَ تَعَوُّذًا قَالَ فَھَلَّا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِہٖ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِی رِوَایَۃِ جُنْدَبِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ الْبَجَلِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کَیْفَ تَصْنَعُ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِذَا جَاءَتْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ قَالَہٗ مِرَارًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اسامہ بن زید ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں قبیلۂ جہینہ کے لوگوں کے مقابلہ پر بھیجا چنانچہ (ان کے مقابلہ کے دوران) میں ایک شخص پر جھپٹا اور اس پر نیزہ کا حملہ کرنا چاہا کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا لیکن میں نے اس میں اپنا نیزہ پیوست کر کے اس کو قتل کر دیا۔ پھر جب میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں واپس آیا اور آپ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا (صد افسوس) کہ تم نے اس کو اس صورت میں قتل کر دیا جب کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا تھا؟ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا اس نے محض قتل سے بچنے کے لئے کلمہ نہیں پڑھا تھا! آپ ﷺ نے فرمایا "تو تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہیں دیکھ لیا تھا؟"۔ اور جندب ؓ ابن عبد اللہ بجلی نے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب قیامت کے دن کلمہ لا الٰہ الا اللہ اپنے پڑھنے والے یعنی (مقتول) کی طرف سے جھگڑتا ہوا تمہارے پاس آئے گا تو اس وقت تم اس کو کیا جواب دو گے۔ آنحضرت ﷺ نے (خوف دلانے کے لئے) یہ الفاظ کئی بار ارشاد فرمائے۔" (مسلم)

تشریح: "تو تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا؟" آپ ﷺ نے یہ ارشاد اس شخص کے باطن کے مطابق فرمایا کہ اگر تم اس شخص کے باطن پر مطلع ہو سکتے تھے تو تم اس کا دل چیر کر دیکھ لیتے اور یہ معلوم کرتے کہ آیا اس شخص نے محض اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانے کے

لئے کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھا تھا یا واقعۃً یہ کلمہ اس کے قلب کے صدق و اخلاص کے ساتھ اس کی زبان سے نکلا تھا! لیکن ظاہر ہے کہ تم نہ اس کے دل کو چیر کر اس کے باطن کو دیکھ سکتے تھے اور نہ فوری طور پر اس کے باطن کا حال کسی اور ذریعہ سے تمہیں معلوم ہو سکتا تھا اس لئے معقول بات تو یہ تھی کہ تم اس کے ظاہر پر حکم لگاتے یعنی اس کے کلمہ پڑھ لینے کی وجہ سے اس کو مؤمن سمجھ لیتے اور اس کو قتل کرنے سے باز رہتے۔ ادھر حضرت اسامہؓ نے یہ گمان کیا کہ ایسی حالت میں جب میرا نیزہ موت بن کر اس کے سر پر پہنچ چکا ہے اب اس کا ایمان قبول کرنا فائدہ مند نہیں ہے اس لئے انہوں نے اس شخص کا کام تمام کر دیا، یہ گویا ان کا اجتہاد تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان پر یہ تو ظاہر فرمادیا کہ تم سے اجتہادی خطا ہوگئی ہے لیکن ان پر دیت لازم نہیں کی کیوں کہ مجتہد اپنی خطاء اجتہاد میں معذور ہوتا ہے، ہاں اس بات کے لئے آپ ﷺ نے بہرحال اپنی خفگی کا بھی اظہار فرمایا کہ اس کی اصل حیثیت و حقیقت ظاہر ہونے تک تم پر توقف لازم تھا، لیکن تم نے توقف نہ کر کے اپنے اجتہاد پر عمل کیا۔

معاہد کو قتل کرنے کی ممانعت

(۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَاِنَّ رِيْحَهَا تُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص عہد والے کو قتل کرے گا وہ جنت کی بو نہیں پائے گا اور جنت کی بو چالیس برس کی راہ سے آتی ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: معاہد یعنی عہد والا اس کافر کو کہتے ہیں جس نے امام وقت (سربراہ مملکت اسلامی) سے جنگ و جدل نہ کرنے کا عہد کر لیا ہو خواہ وہ ذمی ہو یا غیر ذمی۔

اس روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جنت کی بو چالیس برس کی راہ سے آتی ہے۔" جب کہ ایک روایت میں ستر برس" ایک روایت میں "سو برس" مؤطا میں "پانچ سو برس" اور فردوس میں "ہزار برس" کے الفاظ ہیں، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان روایتوں میں یہ فرق و اختلاف دراصل اشخاص و اعمال کے مختلف ہونے اور درجات کے تفاوت کی بناء پر ہے چنانچہ (میدان حشر میں) بعض لوگوں کو جنت کی بو ہزار برس کی راہ سے بعض لوگوں کو پانچ سو برس کی راہ سے آئے گی، اسی طرح بعض لوگ جنت کی اس بو کو ایک سو برس اور بعض لوگ ستر برس اور چالیس برس کی مسافت سے آتی ہوئی محسوس کریں گے۔ بہرکیف ان تمام مذکورہ اعداد سے تحدید مراد نہیں ہے بلکہ طول مسافت مراد ہے۔ نیز جنت کی بو نہ پانے سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ شخص ہمیشہ کے لئے جنت کی بو سے محروم رہے گا بلکہ یہ مراد ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں جب کہ مقربین اور علماء جنت کی بو پائیں گے۔ وہ شخص اس وقت جنت کی بو سے محروم رہے گا۔ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد سے مراد معاہد کو قتل کرنے کی سخت مذمت بیان کرنا اور قتل کرنے والے کے خلاف سخت الفاظ میں تنبیہ و تہدید کا اظہار کرنا ہے۔

خود کشی کرنے والے کے بارہ میں وعید

(۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَدّٰى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ يَتَرَدّٰى فِيْهَا خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا وَمَنْ تَحَسّٰى سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَسُمُّهٗ فِيْ يَدِهٖ يَتَحَسَّاهُ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ بِحَدِيْدَةٍ فَحَدِيْدَتُهٗ فِيْ يَدِهٖ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِيْ بَطْنِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر خود کشی کر لی وہ شخص ہمیشہ دوزخ

میں گرایا جائے گا اور وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور کبھی اس سے نہیں نکلے گا۔ جو شخص زہر پی کر خودکشی کرے گا اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا جسے وہ دوزخ کی آگ میں پئے گا وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اس سے کبھی نہیں نکلے گا۔ اور جس شخص نے لوہے کے (کسی) ہتھیار (جیسے چھری وغیرہ) سے اپنے آپ کو مار ڈالا اس کا وہ ہتھیار دوزخ کی آگ میں اس کے ہاتھ میں ہوگا جس کو وہ اپنے پیٹ میں بھونکے گا اور دوزخ میں ہمیشہ رہے گا اس سے کبھی نہیں نکلے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لفظ "مخلدا" اور "ابدًا خالدًا" کی تاکید ہیں۔ حاصل حدیث کا یہ ہے کہ اس دنیا میں جو شخص جس چیز کے ذریعہ خودکشی کرے گا آخرت میں اس کو ہمیشہ کے لئے اسی چیز کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ لیکن یہاں "ہمیشہ" سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ خودکشی کو حلال جان کر اس کا ارتکاب کریں گے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے، یا پھر "ہمیشہ" سے مراد یہ ہے کہ خودکشی کرنے والے مدت دراز تک عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَّذِی یَخْنِقُ نَفْسَهٗ یَخْنُقُهَا فِی النَّارِ وَالَّذِی یَطْعَنُهَا یَطْعَنُهَا فِی النَّارِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے گلا گھونٹ کر اپنے آپ کو مار ڈالا وہ دوزخ میں بھی اپنا گلا گھونٹے گا اور جس شخص نے اپنے آپ کو نیزہ مار کر خودکشی کرلی وہ دوزخ میں (بھی) اپنے آپ کو نیزے مارے گا۔"

⑨ وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ فِیْ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ رَجُلٌ بِهٖ جُرْحٌ فَجَزِعَ فَاَخَذَ سِکِّیْنًا فَحَزَّ بِهَا یَدَهٗ فَمَا رَقَأَ الدَّمُ حَتّٰی مَاتَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی بَادَرَنِیْ عَبْدِیْ بِنَفْسِهٖ فَحَرَّمْتُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جندبؓ ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک دن) فرمایا "تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص تھا (جو کسی طرح) زخمی ہو گیا تھا چنانچہ (جب زخم کی تکلیف شدید ہونے کی وجہ سے) اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو چھری اٹھائی اور اپنے (اس) ہاتھ کو کاٹ ڈالا (جس میں زخم تھا) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زخم نہ رکا اور وہ مر گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ میرے بندے نے اپنی جان کے بارہ میں میرے فیصلہ کا انتظار نہیں کیا (بلکہ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا) لہٰذا میں نے اس پر جنت کو حرام کر دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "میں نے اس پر جنت کو حرام کر دیا" اس بات پر محمول ہے کہ اس نے خودکشی کو حلال جانا تھا اور چونکہ ایک حرام چیز کے بارہ میں حلال کا عقیدہ رکھنا صریحاً کفر ہے اس لئے اس پر دخول جنت کو حرام کر دیا گیا۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک وہ دوزخ میں جاکر اپنے کئے کی سزا نہ چکھ لے، اس کو اول مرحلہ میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنت میں جانے سے محروم کر دیا گیا۔

خودکشی حرام ہے

خودکشی یعنی اپنے آپ کو ہلاک کرلینا دنیا کے کسی بھی مہذب قانون اور سماج میں جائز نہیں ہے۔ اس کا تعلق دراصل اس بات سے ہے کہ انسان جو کچھ ہے یعنی اس کا ظاہر بھی اور اس کا باطن بھی کیا وہ خود اس کا مالک ہے؟ یا اس کا ظاہر و باطن سب کچھ کسی اور کی ملکیت ہے؟ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ انسان بذات خود اپنے وجود کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کا وجود اس دنیا میں صرف ایک امانت کے طور پر ہے خود اس کے لئے بھی اور دنیا والوں کے لئے بھی اور اس کا مالک حقیقی وہ ذات پاک ہے جس نے اس کو تخلیق سے نوازا ہے اور اس دنیا میں پیدا کیا ہے۔ پھر کیا امانت میں خیانت نہیں ہے یہ کہ انسان اپنے وجود کو نقصان پہنچائے کیا یہ جرم نہیں ہے کہ بندہ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے جس کا ظاہر و باطن سب کچھ پروردگار کی ملکیت ہے؟ یقیناً یہ ایک بہت بڑا جرم ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا درحقیقت غیر کی ملکیت میں تصرف کرنا ہے اور کسی بندہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ پروردگار کی ملکیت میں تصرف کرے اسی

لئے شریعت نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے اور اسے گناہ کبیرہ کہا ہے اور اس کے مرتکب کو بڑے دردناک عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

خودکشی کے بارہ میں ایک سبق آموز واقعہ

(۱۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ الطُّفَيْلَ بْنَ عَمْرٍو الدَّوْسِيَّ لَمَّا هَاجَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ هَاجَرَ اِلَيْهِ وَهَاجَرَ مَعَهُ رَجُلٌ مِنْ قَوْمِهٖ فَمَرِضَ فَجَزِعَ فَاَخَذَ مَشَاقِصَ لَهُ فَقَطَعَ بِهَا بَرَاجِمَهُ فَشَخَبَتْ يَدَاهُ حَتّٰى مَاتَ فَرَآهُ الطُّفَيْلُ بْنُ عَمْرٍو فِيْ مَنَامِهٖ وَهَيْئَتُهُ حَسَنَةٌ وَرَاٰهُ مُغَطِّيًا يَدَيْهِ فَقَالَ لَهُ مَا صَنَعَ بِكَ رَبُّكَ فَقَالَ غَفَرَ لِيْ بِهِجْرَتِيْ اِلٰى نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَالِيْ اَرَاكَ مُغَطِّيًا يَدَيْكَ قَالَ قِيْلَ لِيْ لَنْ نُصْلِحَ مِنْكَ مَا اَفْسَدْتَ فَقَصَّهَا الطُّفَيْلُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو طفیل ابن عمرو دوسیؓ بھی ہجرت کر کے آنحضرت ﷺ کے پاس آگئے ان کے ساتھ ان کے قبیلے کے ایک اور شخص نے بھی ہجرت کی (اتفاق سے) وہ شخص مدینہ میں بیمار ہو گیا اور (جب مرض نے شدت اختیار کی) اس سے صبر نہ ہو سکا، چنانچہ اس نے تیر کی پیکان لے کر اس نے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ ڈالے، اس کی وجہ سے اس کے دونوں ہاتھوں سے اتنا خون جاری ہوا کہ وہ مر گیا (اس کے انتقال کے بعد ایک دن) طفیل بن عمروؓ نے اس شخص کو اپنے خواب میں اس حالت میں دیکھا کہ اس کی ہیئت تو اچھی تھی مگر اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھپا رکھے تھے۔ طفیلؓ نے اس سے پوچھا کہ "تمہارے رب نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس شخص نے کہا" اللہ تعالیٰ نے مجھے اس وجہ سے بخش دیا ہے کہ میں نے اس کے نبی ﷺ کی طرف ہجرت کی تھی"، پھر طفیلؓ نے کہا کہ "میں تمہیں اپنے دونوں ہاتھ چھپائے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ اس شخص نے (بڑی حسرت کے ساتھ) کہا کہ (پروردگار کی طرف سے) مجھ سے کہا گیا ہے کہ جس چیز کو تم نے خود خراب کیا ہے ہم اس کو درست نہیں کریں گے" جب طفیلؓ نے یہ خواب رسول کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "اے اللہ! اس کو اور اس کے دونوں ہاتھوں کو بخش دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ اپنے وطن سے ہجرت کر کے نبی کریم ﷺ کے پاس چلے جانے کی یہ برکت تھی کہ مہاجر کو حق تعالیٰ کی مغفرت و رحمت ہوتی ہے، اور اگر مہاجر کسی گناہ میں مبتلا ہو جاتا تھا تو آنحضرت ﷺ کے استغفار کی وجہ سے اس کی بخشش ہو جاتی تھی۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے روضۂ اطہر کی زیارت، آپ ﷺ کے حیات مبارک میں آپ کی جسمانی زیارت کے مانند ہے لہٰذا آپ کی حیات مبارک میں آپ کی زیارت کرنے والوں کو حق تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کی جو برکت ہوتی تھی آپ ﷺ کے روضۂ اطہر کے زیارت کرنے والے کو بھی اسی نعمت عظمیٰ کی امید رکھنی چاہیے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ تو کفر کا باعث ہے اور نہ دوزخ کے دائمی عذاب کا موجب ہے، چنانچہ اہل سُنّت والجماعت کا یہی مسلک ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب اپنے کئے کی سزا پالینے کے بعد جنّت میں داخل کر دیا جائے گا۔

مقتول کے ورثاء کو قصاص اور دیت دونوں میں سے کسی ایک کو لینے کا اختیار ہے

(۱۱) وَعَنْ اَبِيْ شُرَيْحٍ الْكَعْبِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثُمَّ اَنْتُمْ يَا خُزَاعَةُ قَدْ قَتَلْتُمْ هٰذَا الْقَتِيْلَ مِنْ هُذَيْلٍ وَاَنَا وَاللّٰهِ عَاقِلُهُ مَنْ قَتَلَ بَعْدَهُ قَتِيْلًا فَاَهْلُهُ بَيْنَ خِيَرَتَيْنِ اِنْ اَحَبُّوْا قَتَلُوْا وَاِنْ اَحَبُّوْا اَخَذُوا الْعَقْلَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالشَّافِعِيُّ وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِاِسْنَادِهٖ وَصَرَّحَ بِاَنَّهُ لَيْسَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنْ اَبِيْ شُرَيْحٍ وَقَالَ وَاَخْرَجَاهُ مِنْ رِوَايَةِ اَبِيْ هُرَيْرَةَ يَعْنِيْ بِمَعْنَاهُ۔

"اور حضرت ابوشریح کعبی رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (فتح مکہ کے دن جو خطبہ ارشاد فرمایا اور جس کا ابتدائی حصہ حرم مکہ کے باب میں گزر چکا ہے، اس کے آخری الفاظ یہ تھے) فرمایا "اے خزاعہ! تم نے اس مقتول کو جو قبیلہ ہذیل کا ایک فرد تھا، قتل کیا ہے اور میں خدا کی قسم، اس کا خون بہا دینے کا ذمہ دار ہوں، اب اس کے بعد (اس حکم سے مطلع کیا جاتا ہے کہ) اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو مقتول کے ورثاء کو دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ ① چاہے وہ قاتل کو مار ڈالیں۔ ② چاہے اس سے خون بہا لے لیں۔ (ترمذیؒ، شافعیؒ) شرح السنۃ میں یہ روایت شافعیؒ کی اسناد کے ساتھ مذکور ہے، اور شرح السنۃ کے مصنف علامہ بغویؒ نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ابوشریحؓ سے منقول نہیں ہے، لیکن بغوی نے کہا ہے کہ بخاری و مسلم میں یہ روایت ابوہریرہؓ سے منقول ہے حالانکہ اس میں بھی بالمعنی منقول ہے۔"

تشریح: حدیث کا واقعاتی پس منظر یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں قبیلہ ہذیل نے قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو مار ڈالا تھا، چنانچہ قبیلہ خزاعہ کے لوگوں نے اب آکر اپنے مقتول کے بدلے میں قبیلہ ہذیل کے ایک شخص کو قتل کر دیا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں قبیلوں کے درمیان متوقع فتنہ و فساد کو روکنے کے لئے قبیلہ ہذیل کے اس مقتول کا خون بہا دے دیا جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اور میں خدا کی قسم! اس خون بہا دینے کا ذمہ دار ہوں" پھر آپ ﷺ نے اس کے بعد اس سلسلہ میں یہ شرعی قانون بیان فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی کو ناحق مار دے تو مقتول کے ورثاء کا حق یہ ہے کہ چاہے وہ قاتل کو قتل کر دیں اور چاہے قاتل سے خون بہا لے لیں۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہی ہے اور اس اعتبار سے یہ ارشاد گرامی ان دونوں کے مسلک کی دلیل ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو قاتل سے خون بہا لینے کا حق اسی صورت میں حاصل ہوگا جب کہ قاتل خود بھی اس پر راضی ہو، اگر قاتل خون بہا دینے پر راضی نہ ہو تو مقتول کے ورثاء کو صرف یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ قاتل کو قتل کر دیں، کہا جاتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے، ان حضرات کے نزدیک اس ارشاد گرامی کی تاویل یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو اختیار ہے کہ چاہے وہ قاتل کو قتل کر دیں چاہے اس سے خون بہا لے لیں اگر خون بہا ان کو دیا جائے۔

"حالانکہ ان سے بھی بالمعنی منقول ہے" اس کے ذریعہ مصنف مشکوٰۃ نے گویا صاحب مصابیح امام بغویؒ پر اعتراض کیا ہے بخاری و مسلم میں یہ حدیث بالمعنی تو مذکور ہے لیکن اصل حالت میں یعنی یہاں کے مذکور الفاظ کے ساتھ نہ تو ابوشریحؓ سے اور نہ ابوہریرہؓ سے منقول ہے جیسا کہ خود بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت بخاری و مسلم میں نہیں ہے اور پھر اس روایت کو یوں فصل اول میں کیوں نقل کیا ہے کیونکہ فصل اول میں تو وہی حدیثیں نقل کی جاتی ہیں جو بخاری و مسلم میں مذکور ہوں۔

عورت کے مرد قاتل کو قتل کیا جاسکتا ہے

⑫ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ يَهُوْدِيًا رَضَّ رَاسَ جَارِيَةٍ بَيْنَ حَجَرَيْنِ فَقِيْلَ لَهَا مَنْ فَعَلَ بِكِ هٰذَا اَفُلَانٌ؟ اَفُلَانٌ؟ حَتّٰى سُمِّيَ الْيَهُوْدِيُّ فَاَوْمَأَتْ بِرَاسِهَا فَجِئَى بِالْيَهُوْدِيِّ فَاعْتَرَفَ فَاَمَرَبِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرُضَّ رَاْسُهٗ بِالْحِجَارَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل ڈالا (یعنی ایک پتھر پر اس کا سر رکھ کر دوسرے پتھر سے اس پر ضرب ماری) چنانچہ (جب لڑکی کا نزعی بیان لیا گیا تو) اس سے پوچھا گیا کہ تمہارے ساتھ کس نے یہ معاملہ کیا ہے، کیا فلاں شخص نے؟ کیا فلاں شخص نے؟ (یعنی جن جن لوگوں پر شبہ تھا ان کا نام لیا گیا یہاں تک کہ جب اس یہودی کا نام لیا گیا تو لڑکی نے اپنے سر کے اشارے سے بتایا کہ ہاں اس نے ایسا کیا ہے۔ پھر اس یہودی کو حاضر کیا گیا اور اس نے اپنے جرم کا اقرار کیا، لہٰذا رسول کریم ﷺ نے اسی طرح اس یہودی کا سر کچلنے کا حکم فرمایا اور اس کا سر پتھروں سے کچلا گیا۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: بظاہر یہ مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس یہودی نے لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچلا تھا اسی طرح اس یہودی کا بھی دو پتھروں کے درمیان کچلا گیا ہو۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح اگر کوئی عورت کسی مرد کو قتل کر دے تو مقتول مرد کے بدلے میں اس عورت کو قتل کیا جاسکتا ہے، اسی طرح مقتول عورت کے بدلے میں اس کے مرد قاتل کو بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اکثر علماء کا یہی قول ہے، نیز یہ حدیث اس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ایسے بھاری پتھر سے کسی کو ہلاک کر دینا جس کی ضرب سے عام طور پر ہلاکت واقع ہو جاتی ہو، قصاص کا موجب ہے۔ چنانچہ اکثر علماء اور تینوں ائمہ کا یہی قول ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر پتھر کی ضرب سے ہلاکت واقع ہو جائے تو اس کی وجہ سے قصاص لازم نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جہاں تک اس یہودی سے قصاص لینے کا سوال ہے تو اس کا تعلق سیاسی اور وقتی مصالح سے تھا۔

جو جیسا کرے اس کو ویسی ہی سزا دو

(۱۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَسَرَتِ الرُّبَيِّعُ وَهِيَ عَمَّةُ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ثَنِيَّةَ جَارِيَةٍ مِنَ الْاَنْصَارِ فَاَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَ بِالْقِصَاصِ فَقَالَ اَنَسُ بْنُ النَّضْرِ عَمُّ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ لَا وَاللّٰهِ لَا تُكْسَرُ ثَنِيَّتُهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَنَسُ كِتَابُ اللّٰهِ الْقِصَاصُ فَرَضِيَ الْقَوْمُ وَقَبِلُوا الْاَرْشَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ربیع نے جو حضرت انسؓ ابن مالک کی پھوپھی تھیں، ایک انصاری لڑکی کے دانت توڑ دیئے اس لڑکی کے رشتہ دار استغاثہ لے کر، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آنحضرت ﷺ نے بدلہ لینے کا حکم فرمایا (یعنی یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ ربیعؓ کے بھی دانت توڑے جائیں) انسؓ ابن نضر نے جو انسؓ ابن مالک کے چچا تھے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ایسا نہیں ہوگا، خدا کی قسم ربیعؓ کے دانت نہیں توڑے جائیں گے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ انسؓ! اللہ کا حکم بدلہ لینے کا ہے" لیکن (خدا نے ایسا کیا) کہ لڑکی کے خاندان والے (ربیعؓ کے دانت نہ توڑے جانے پر) راضی ہو گئے اور دیت (مالی معاوضہ) قبول کر لیا، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "بعض بندگان خدا ایسے ہیں کہ اگر وہ کسی بات پر خدا کی قسم کھا بیٹھیں تو خداوند تعالیٰ ان کی قسم پوری کرتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ربیعؓ، انسؓ اور مالکؓ یہ تینوں بہن بھائی تھے ان کے والد کا نام نضر تھا، مالک کے لڑکے کا نام بھی انس تھا گویا چچا اور بھتیجے دونوں ایک ہی نام سے موسوم تھے اس حدیث میں جن ربیعؓ کا ذکر ہے وہ ایک انس یعنی، حضرت انسؓ ابن مالک کی پھوپھی تھیں اور دوسرے انس یعنی حضرت انس ابن نضر کی بہن تھیں۔

حضرت انسؓ ابن نضر کا یہ کہنا کہ "یا رسول اللہ! ایسا نہیں ہوگا، رسول کریم ﷺ کے حکم کی مخالفت اور آپ کے فیصلہ کو ماننے کا انکار کرنے کے طور پر نہیں تھا بلکہ اس کی بنا حق تعالیٰ کے اس فضل و کرم کی توقع اور امید پر تھی کہ وہ مدعیوں کو راضی اور ان کے دل میں ڈال دے گا کہ وہ قصاص (یعنی بدلہ لینے) کو معاف کر دیں، چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی امید و توقع کو پورا کیا اور لڑکی کے خاندان والوں نے دیت قبول کر کے قصاص کو معاف کر دیا۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے حضرت انسؓ ابن نضر کے بارہ میں یہ مدحیہ کلمات ارشاد فرمائے کہ حضرت انس ابن نضر خدا کے ان بندگان خاص میں سے ہیں جو اگر کسی بات پر قسم کھا لیتے ہیں تو خدا ان کو حانث نہیں کرتا بلکہ ان کی اس بات کو پورا کرتا ہے اور قسم کو سچی کرتا ہے۔

"اے انس" اللہ کا حکم بدلہ لینے کا ہے اس ارشاد سے آنحضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ تا۔ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ کی طرف اشارہ فرمایا۔

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کسی ایسی بات پر قسم کھانا جائز ہے جس کے واقع ہونے کا قسم کھانے والے کو گمان ہو،

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ کسی شخص کے منہ پر اس کی تعریف و توصیف کا اظہار کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کی وجہ سے اس شخص کے کسی فتنہ و برائی میں مبتلا ہو جانے کا خوف نہ ہو اور تیسری بات یہ ثابت ہوئی کہ قصاص کو معاف کر دینا مستحب ہے۔

مقتول کافر کے بدلے میں قاتل مسلمان کو قتل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۱۴) وَعَنْ اَبِی جُحَیْفَةَ قَالَ سَأَلْتُ عَلِیًّا هَلْ عِنْدَكُمْ شَیْءٌ لَیْسَ فِی الْقُرْآنِ فَقَالَ وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ مَا عِنْدَنَا اِلَّا مَا فِی الْقُرْاٰنِ اِلَّا فَهْمًا یُعْطٰی رَجُلٌ فِیْ كِتَابِهٖ وَمَا فِی الصَّحِیْفَةِ قُلْتُ وَمَا فِی الصَّحِیْفَةِ قَالَ الْعَقْلُ وَفِكَاكُ الْاَسِیْرِ وَاَنْ لَّا یُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابو جحیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ انہوں نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس نے اناج کو پیدا کیا اور جان کو وجود بخشا، میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو قرآن میں موجود نہ ہو، ہاں قرآن کی وہ سمجھ (مجھ کو ضرور دی گئی) جو کسی انسان کو عطا ہو سکتی ہے، نیز ہمارے پاس کچھ ایسی چیزیں ہیں جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہیں" میں نے عرض کیا کہ "وہ کیا چیزیں ہیں جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہیں؟ انہوں نے فرمایا (ناحق قتل) کا خون بہا، اس کی مقدار اور اس کے احکام اور قیدی کو چھوڑنے (کا ثواب لکھا ہے) اور یہ لکھا ہے کہ کافر (جو ذمی نہ ہو) کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے۔" (بخاری)

تشریح: "ہاں قرآن کی وہ سمجھ جو کسی بھی انسان کو عطا ہو سکتی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ فہم عطا فرمایا ہے جس سے میں قرآن کے معنی و احکام کا استنباط کرتا ہوں، اس کے اجمال و اشارات سے مطلع ہو جاتا ہوں اور اسی فہم کے ذریعہ میری رسائی ان پوشیدہ علوم اور باطنی اسرار تک ہو جاتی ہے جو علماء راسخین اور ارباب یقین پر منکشف ہوتے ہیں"۔

ہمارے پاس کچھ ایسی چیزیں ہیں جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس سے وہ نوشتہ مراد ہے جس میں حضرت علیؓ نے خون بہا وغیرہ کے کچھ احکام و مسائل لکھ کر اس کو اپنی تلوار کی نیام میں رکھ رکھا تھا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس نوشتہ میں مذکورہ بالا تین چیزوں کے علاوہ اور بہت سی چیزوں کے احکام و مسائل لکھے ہوئے تھے، جن کو یہاں ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ اس باب میں صرف قصاص اور خون بہا کا ذکر کرنا مقصود ہے، البتہ قیدی بعض نوعیت کے اعتبار سے چونکہ قریب القتل ہوتا ہے اس مناسبت سے اس کا بھی ذکر کر دیا گیا۔

"کافر کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے گا" بہت سے صحابہ و تابعین، تبع تابعین اور تینوں اماموں کا مسلک یہی ہے کہ اگر کوئی مسلمان کافر کو قتل کر دے تو مقتول کافر کے بدلے میں قاتل مسلمان کو قتل نہ کیا جائے خواہ وہ مقتول کافر ذمی ہو یا حربی ہو لیکن حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور اکثر علماء کا مسلک یہ ہے کہ اگر وہ مقتول کافر، ذمی ہو تو اس کے بدلے میں قاتل مسلمان کو قتل کیا جا سکتا ہے جو حدیث ان کے مسلک کی دلیل ہے وہ مرقات میں مذکور ہے۔

حضرت ابو جحیفہؓ نے حضرت علیؓ سے جو سوال کیا اس کی بنیاد یہ تھی۔ کہ شیعہ جن کا وجود مختلف صورتوں میں اس زمانہ میں تھا کہا کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اہل بیت کے مخصوص افراد اور خاص طور پر حضرت علیؓ کو علم وحی کے کچھ ایسے اسرار و نکات بتائے ہیں جو ان کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں بتائے گئے! یا پھر حضرت ابو جحیفہؓ نے یہ سوال اس لئے کیا کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں کوئی بھی شخص علم و تحقیق میں حضرت علیؓ کا ہمسر نہیں تھا، ان کی اس غیر معمولی علمی خصوصیت و برتری نے سب ہی کو حیران کر رکھا تھا کہ آخر ان کے پاس اتنا علم کہاں سے آیا؟۔ بہرکیف حضرت علیؓ نے قسم کھا کر بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ نے میرے دامن علم و حکمت کو سب لوگوں سے زیادہ بھرا ہو یا دوسرے لوگوں کے سوا مجھے مخصوص طور پر تبلیغ و ارشاد سے نوازا ہو، بلکہ میرے پاس بھی وہی قرآن ہے۔ جو دوسروں کے پاس ہے اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، یا پھر وہ نوشتہ ہے۔ جس میں کچھ چیزوں کے احکام لکھے ہوئے ہیں اور وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔ ہاں مجھ میں اور دوسروں میں جو علمی تفاوت ہے اس کی بنیاد فہم اور استعداد و استنباط

ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے قرآن کی جو سمجھ عطا کی ہے اس کے ذریعہ میں قرآن کے علوم و معانی تک رسائی حاصل کرتا ہوں اور پھر اس سے احکام و مسائل نکالتا ہوں، اور یہ مجھ ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ جس شخص کو بھی یہ سمجھ، ادراک اور فضیلت عطا فرمادے گا اس پر قرآنی حکمت و علوم کی راہیں منکشف ہو جائیں گی۔ الحاصل تمام علوم و معنی کی بنیاد چونکہ قرآن کریم ہے۔ اسی لئے توفیق خداوندی اور تائید الٰہی سے جس شخص کو بھی قرآن کریم کا فہم حاصل ہو گیا اس پر تمام علوم اور حکمتوں کے دراز ے کھل گئے یہ اور بات ہے کہ حق تعالیٰ اس نعمت سے کسی کسی ہی کو نوازتا ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن میں تمام علوم ہیں لیکن (عام طور پر) لوگوں کے فہم (قرآن کی گہرائی تک پہنچنے سے، قاصر رہتے ہیں)۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ بْنِ مَسْعُوْدٍ لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا فِيْ كِتَابِ الْعِلْمِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث "ازراہ ظلم کسی کی جان نہ لی جائے" کتاب العلم میں نقل کی جاچکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

خون مسلم کی اہمیت

(۱۵) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَزَوَالُ الدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَوَقَفَهٗ بَعْضُهُمْ وَهُوَ الْاَصَحُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ۔

"حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کے نزدیک پوری دنیا کا ختم ہو جانا ایک مرد مؤمن کے قتل ہو جانے سے زیادہ سہل ہے۔ (ترمذی، نسائی) اور بعض راویوں نے اس حدیث کو موقوف بیان کیا ہے (یعنی یہ کہا ہے کہ یہ حدیث نبوی ﷺ نہیں ہے بلکہ عبداللہ ابن عمروؓ کا قول ہے) اور یہی زیادہ صحیح ہے، نیز ابن ماجہ نے اس روایت کو (حضرت عبداللہ ابن عمرو کی بجائے) حضرت براء ابن عازب سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: اللہ تعالیٰ نے دنیا کی چیزیں زمین و آسمان وغیرہ مسلمانوں کے لئے پیدا کی ہیں تاکہ وہ پروردگار کی عبادت کریں اور چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین رکھیں، لہٰذا جس شخص نے کسی مسلمان کو کہ جس کے لئے یہ دنیا پیدا کی گئی ہے، قتل کیا اس نے گویا پوری دنیا کو فنا کے گھاٹ اتار دیا، چنانچہ اسی نکتہ کی طرف قرآن کریم کی یہ آیت اشارہ کرتی ہے:

وَمَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔

"جس شخص نے کسی کو ناحق قتل کیا (یعنی بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے ملک میں فتنہ فساد پھیلانے کی سزا دی جائے، اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا۔"

(۱۶) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ وَاَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اشْتَرَكُوْا فِيْ دَمِ مُؤْمِنٍ لَاَكَبَّهُمُ اللّٰهُ فِي النَّارِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اگر (یہ ثابت ہو جائے کہ آسمان والے اور زمین والے سب کے سب کسی ایک مرد مؤمن کے قتل میں شریک ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو دوزخ کی آگ میں الٹا ڈال دے گا امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: بعض شارحین نے لکھا ہے لفظ اَكَبَّهُمْ فعل لازم ہے اور لفظ كَبَّهُمْ فعل متعدی ہے لہٰذا یہاں کسی راوی سے سہو ہو گیا ہے کہ

اس نے لَکَبَّھُمْ کی بجائے لَا کَبَّھُمْ نقل کر دیا ہے، لیکن ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ لفظ اَکَبَّہٗ قاموس میں لازمی اور متعدی دونوں طرح نقل کیا گیا ہے، اس اعتبار سے زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ ثقہ اور عادل راویوں کی طرف خطا اور سہو کی نسبت کرنے سے اولی اور احوط یہ ہے کہ بعض بلکہ تمام اہل لغت کی طرف خطا کی نسبت کر دی جائے! بہر کیف چونکہ یہاں لفظ اَکَبَّھُمْ ہے اس لئے اس موقع پر یہ تحقیق پیش کی گئی، جامع صغیر میں اس روایت کے یہ الفاظ منقول ہیں۔ لَکَبَّھُمُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ فِی النَّارِ۔

قیامت کے دن مقتول کا استغاثہ

⑰ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَجِیْئُ الْمَقْتُوْلُ بِالْقَاتِلِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ نَاصِیَتُہٗ وَرَأْسُہٗ بِیَدِہٖ وَاَوْدَاجُہٗ تَشْخَبُ دَمًا تَقُوْلُ یَارَبِّ قَتَلَنِیْ حَتّٰی یُدْنِیَہٗ مِنَ الْعَرْشِ۔ (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن مقتول اپنے قاتل کو اس طرح پکڑ کر لائے گا کہ قاتل کی پیشانی اور اس کا سر مقتول کے ہاتھ میں ہوگا اور خود اس کی رگوں سے خون بہہ رہا ہوگا اور اس کی زبان پر یہ الفاظ ہوں گے "پروردگار! (اس نے) مجھے قتل کیا ہے (میری فریادرسی) کر یہاں تک کہ مقتول اس قاتل کو (کھینچتا ہوا) عرش الٰہی کے قریب تک لے جائے گا۔" (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مقتول قیامت کے دن اپنا پورا حق طلب کرے گا، نیز یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عدل و انصاف سے مقتول کو راضی و مطمئن کر دے گا۔

اپنی مظلومیت کے دن حضرت عثمانؓ کی تقریر

⑱ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ بْنِ سَھْلِ بْنِ حُنَیْفٍ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اَشْرَفَ یَوْمَ الدَّارِ فَقَالَ اَنْشُدُکُمْ بِاللّٰہِ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَحِلُّ دَمُ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ زِنًی بَعْدَ اِحْصَانٍ اَوْ کُفْرٍ بَعْدَ اِسْلَامٍ اَوْ قَتْلِ نَفْسٍ بِغَیْرِ حَقٍّ فَقُتِلَ بِہٖ فَوَاللّٰہِ مَا زَنَیْتُ فِیْ جَاھِلِیَّۃٍ وَلَا اِسْلَامٍ وَلَا ارْتَدَدْتُّ مُنْذُ بَایَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَا قَتَلْتُ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ فَبِمَا تَقْتُلُوْنَنِیْ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَلِلدَّارِمِیِّ لَفْظُ الْحَدِیْثِ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ ابن سہل ابن حنیف کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ ابن عفان، دار کے دن مکان کی چھت پر چڑھے اور (بلوائیوں کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں) کہ کیا تم نہیں جانتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے "کسی مرد مؤمن کی خون ریزی (کسی صورت میں) جائز نہیں ہوتی الا یہ کہ تین باتوں میں سے کوئی ایک بات پیش آجائے" ① نکاح کرنے کے بعد زنا کرنا۔ ② اسلام لانے کے بعد کافر ہو جانا۔ ③ اور کسی کا ناحق قتل کر دینا کہ اس کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ پس قسم ہے خدا کی، میں نے نہ تو زمانہ جاہلیت میں زنا کیا ہے اور نہ زمانہ اسلام میں، اور جب سے رسول کریم ﷺ سے بیعت کی ہے آج تک اسلام سے نہیں پھرا ہوں اور نہ میں نے کسی ایسے شخص کو قتل کیا ہے جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو، تو (خدارا مجھے بتاؤ تم مجھے کس بناء پر قتل کرنا چاہتے ہو؟۔ اس روایت کو ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور حدیث کے الفاظ دارمی کے ہیں۔"

تشریح: یوم الدّار یعنی دار (گھر) کا دن، سے وہ دن مراد ہیں جن میں تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنیؓ کے مخالف بلوائیوں نے ان کے مکان کو محاصرہ میں لے رکھا تھا، چنانچہ انہی دنوں میں حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر بلوائیوں کے سامنے مذکورہ بالا جملے ارشاد فرمائے۔

"نکاح کرنے کے بعد زنا کرنا" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کا ارتکاب کرے اس کو سنگسار کرنا مشروع ہے۔ "محصن" اس شخص کو کہتے ہیں، جو مسلمان ہو، آزاد ہو، مکلف ہو اور نکاح صحیح کے ساتھ اپنی عورت سے جماع کر چکا ہو۔

"اور حدیث کے الفاظ دارمی کے ہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ روایت میں حضرت عثمانؓ کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے یعنی اَشْرَفَ یَوْمَ الدَّارِ الخ اس کے الفاظ دارمی نے نقل نہیں کئے ہیں بلکہ اس کی روایت میں صرف اصل حدیث کے الفاظ لا یحل دم امرء مسلم الخ ہیں۔

قاتل، توفیق خیر سے محروم رہتا ہے

(۱۹) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَزَالُ الْمُؤْمِنُ مُعْنِقًا صَالِحًا مَالَمْ یُصِبْ دَمًا حَرَامًا فَاِذَا اَصَابَ دَمًا حَرَامًا بَلَّحَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابو درداء رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مسلمان اس وقت تک نیکی کی طرف سبقت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں مشغول رہتا ہے جب تک کہ وہ خون حرام کا ارتکاب نہیں کرتا اور جب وہ خون حرام کا مرتکب ہوتا ہے تو تھک جاتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مومن جب تک ناحق خون سے اپنا ہاتھ نہیں رنگتا، اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کو برابر نیکی کرنے اور بھلائی کی طرف سبقت کرنے کی توفیق دی جاتی ہے لیکن جب وہ کسی کو ناحق قتل کر دیتا ہے تو وہ اس گناہ کی شامت سے نیکی و بھلائی حاصل کرنے سے باز رہتا ہے گویا یہ قتل ناحق کا وبال ہے کہ قاتل کا قلب سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ خیر کی توفیق سے محروم رہتا ہے اگرچہ سارے گناہوں کا یہی وبال ہوتا ہے لیکن یہ گناہ اور تمام گناہوں کی بہ نسبت زیادہ سخت ہے۔

قتل ناحق، ناقابل معافی جرم ہے

(۲۰) وَعَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ کُلُّ ذَنْبٍ عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَغْفِرَهٗ اِلَّا مَنْ مَاتَ مُشْرِکًا اَوْ مَنْ یَقْتُلُ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَرَوَاهُ النَّسَائِیُّ عَنْ مُعَاوِیَةَ۔

"اور حضرت ابو درداءؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ہر گناہ کے بارے میں یہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا مگر اس شخص کو نہیں بخشے گا، جو شرک کی حالت میں مرجائے یا جس نے کسی مسلمان کا قتل عمد کیا ہو۔ (ابوداؤد) نسائی نے اس روایت کو حضرت معاویہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: بظاہر اس حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس طرح شرک کا گناہ ناقابل معافی ہے اسی طرح قتل عمد کے گناہ کی بخشش نہیں ہوتی لیکن اہل سنت و الجماعت کا مسلک یہ ہے کہ قتل کا گناہ گار مدت دراز تک شدید ترین عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد بخش دیا جائے گا ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔

"اللہ تعالیٰ شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا، شرک کے علاوہ اور گناہوں کو، جس کو وہ چاہے بخش دیتا ہے۔"

جہاں تک اس حدیث کے ظاہری مفہوم کا سوال ہے تو یہ قتل کی شدید ترین مذمت اور اس کی سخت ترین سزا کے اظہار پر محمول ہے یا اس سے یہ مراد ہے کہ جو شخص قتل مسلم کو حلال جان کر کسی مسلمان کو قتل کرے گا اس کو نہیں بخشا جائے گا علاوہ ازیں لفظ مُتَعَمِّدًا کے (قتل عمد کی بجائے) یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ جو شخص کسی مؤمن کے قتل کا اس لئے قصد کرے کہ وہ مؤمن ہے تو اس شخص کی بخشش نہ

ہو گی۔

باپ سے اولاد کا قصاص نہ لیا جائے

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُقَامُ الْحُدُوْدُ فِی الْمَسَاجِدِ وَلَا یُقَادُ بِالْوَلَدِ الْوَالِدُ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مسجدوں میں حدود جاری نہ کی جائیں اور نہ اولاد کے (قتل کے) بدلے میں باپ کو قتل کیا جائے (بلکہ باپ سے دیت (یعنی مالی معاوضہ لیا جائے)۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ زنا، چوری، یا اسی قسم کے دوسرے جرائم حدود (یعنی ان کی شرعی سزائیں) مساجد میں جاری نہ کی جائیں، اسی طرح قصاص بھی اسی حکم میں داخل ہے کہ کسی قاتل کو بطور قصاص مسجد میں قتل نہ کیا جائے کیونکہ مسجدیں فرض نماز پڑھنے کے لئے ہیں یا فرض نماز کے توابع کے لئے ہیں جیسے نفل نمازیں یا ذکر و شغل اور دینی علوم کا پڑھنا پڑھانا۔

حدیث کے دوسرے جزو کا مطلب یہ ہے کہ اگر باپ اپنی اولاد کو قتل کر دے تو اس کو مقتول اولاد کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے اس بارہ میں فقہی تفصیل یہ ہے کہ اگر بیٹا اپنے ماں باپ کو قتل کر دے تو اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ بیٹے کو بطور قصاص قتل کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر ماں باپ، بیٹے کو مار ڈالے تو اس میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ باپ کو بطور قصاص قتل نہ کیا جائے، امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ اگر باپ نے بیٹے کو ذبح کر کے مار ڈالا ہے تو اس صورت میں باپ کو بطور قصاص قتل کیا جا سکتا ہے اور اگر اس نے بیٹے کو تلوار سے ختم کیا ہے تو پھر اس سے قصاص نہ لیا جائے! یہ ملحوظ رہے کہ اس بارہ میں ماں کا حکم بھی وہی ہے جو باپ کا ہے، نیز دادا دادی، اور نانا نانی بھی ماں اور باپ کے حکم میں ہیں۔

باپ بیٹے ایک دوسرے کے جرم میں قابل مواخذہ نہیں

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ رِمْثَۃَ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَعَ اَبِیْ فَقَالَ مَنْ ھٰذَا الَّذِیْ مَعَكَ قَالَ ابْنِیْ اشْھَدْ بِہٖ قَالَ اَمَا اِنَّہٗ لَا یَجْنِیْ عَلَیْكَ وَلَا تَجْنِیْ عَلَیْہِ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِیُّ وَزَادَ فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ فِیْ اَوَّلِہٖ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ اَبِیْ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَرَاٰی اَبِی الَّذِیْ بِظَھْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دَعْنِیْ اُعَالِجُ الَّذِیْ بِظَھْرِكَ فَاِنِّیْ طَبِیْبٌ فَقَالَ اَنْتَ رَفِیْقٌ وَاللّٰہُ الطَّبِیْبُ۔

"اور حضرت ابورمثہؓ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا "یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ والد نے کہا کہ "یہ میرا بیٹا ہے، آپ گواہ رہئے آپ ﷺ نے فرمایا "تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ نہ تو یہ تمہیں اپنے گناہ کی وجہ سے مبتلا کرے گا اور نہ تم اس کو اپنے گناہ کی وجہ سے مبتلا کرو گے۔ (ابوداؤد، نسائی) اور صاحب مصابیح نے شرح السنۃ میں اس روایت کے شروع میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "ابورمثہؓ نے کہا کہ جب میں نے اپنے والد کے ہمراہ رسول کریم ﷺ کی پشتِ مبارک پر مہر نبوت دیکھی تو وہ اس کی حقیقت نہ سمجھ سکے اور کہا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کی پشت پر جو چیز ہے میں اس کا علاج کروں کیونکہ میں طبیب ہوں۔ رسول کریم نے فرمایا "تم (تو بس) رفیق ہو، طبیب (تو) اللہ ہے"۔

تشریح: "آپ گواہ رہئے" کا مطلب یہ ہے کہ "کہ آپ اس بات کے گواہ رہئے کہ یہ میرا صلبی بیٹا ہے" اور اس گواہ بنانے سے مقصود یہ تھا کہ اگر مجھ سے کوئی جرم جیسے قتل وغیرہ سرزد ہو جائے "تو میرے اس بیٹے سے مواخذہ کیا جائے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ باپ بیٹے ایک دوسرے کے جرم میں قابل مواخذہ ہوتے تھے لیکن رسول کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد نہ تمہیں یہ اپنے گناہ کی وجہ سے

مبتلا کرے گا الخ کے ذریعہ ابورمثہؓ کے والد پر یہ واضح کر دیا کہ اگر تمہارے بیٹے نے کوئی جرم کیا تو اس کی وجہ سے تمہیں نہیں پکڑا جائے گا اور نہ اس کے گناہ کی وجہ سے آخرت میں تم سے پرستش ہوگی، اسی طرح اگر تم سے کوئی جرم و گناہ سرزد ہو جائے تو دنیا و آخرت میں تمہارے بیٹے سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، یہ صرف زمانہ جاہلیت کا رواج تھا کہ باپ بیٹے ایک دوسرے کے گناہ کی وجہ سے پکڑے جاتے تھے، یہ ایک غیر منصفانہ طرز عمل تھا جو اب ختم کر دیا گیا ہے۔

"کیونکہ میں طبیب ہوں" اس جملہ کے ذریعہ ابورمثہؓ کے والد نے گویا طب و دانائی کا دعویٰ کیا، ان کی یہ بات جس سے ان کی ناسمجھی اور بے ادبی مترشح تھی، آنحضرت ﷺ کو سخت ناپسند ہوئی، چنانچہ آپ نے ان سے فرمایا کہ تم تو بس رفیق ہو، بایں معنی کہ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ جب تم کسی مریض کو دیکھو تو اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر کوئی نسخہ اور دوا تجویز کر دو، اس کے علاج کے دوران اس کے ساتھ نرمی و مہربانی کی خو اختیار کرو اور جو چیز بظاہر اس کے لئے نقصان دہ ہوتی ہو اس سے اس کو دور رکھنے کی کوشش کرو، اس کے علاوہ اور تمہارے بس میں کیا ہے؟ کیا شفا تمہارے ہاتھ میں ہے؟ کیا مرض کی حقیقت تک تمہارے علم و فن کی رسائی ہو جاتی ہے؟ ہرگز نہیں طبیب تو خدا ہے کیونکہ مرض کی حقیقت بھی وہی جانتا ہے اور دوا کی حقیقت بھی اسی کے علم میں ہے اور شفا بھی صرف اسی ذات پاک کے ہاتھ میں ہے۔ جو بقا کے ساتھ موصوف ہے، اس ذات پاک کے علاوہ کوئی بڑی سے بڑی طاقت شفا نہیں دے سکتی۔

بیٹے سے باپ کا قصاص لیا جائے

(۲۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ قَالَ حَضَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُقِیْدُ الْاَبَ مِنِ ابْنِهٖ وَلَا یُقِیْدُ الْاِبْنَ مِنْ اَبِیْهِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَضَعَّفَهٗ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے، اور وہ حضرت سراقہؓ ابن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ بیٹے سے باپ کا قصاص لیتے تھے لیکن باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں لیتے تھے۔ ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔"

تشریح: یعنی اگر بیٹا اپنے باپ کو مار ڈالتا ہے تو باپ کے قصاص میں بیٹے کو قتل کر دیا جاتا ہے لیکن اگر باپ اپنے بیٹے کو مار ڈالتا ہے تو باپ کو بیٹے کے قصاص میں قتل نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس سے خون بہا (خون کا مالی معاوضہ) لیا جاتا تھا۔

غلام کے قصاص میں آزاد کو قتل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۲۴) وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَتَلَ عَبْدَهٗ قَتَلْنَاهُ وَمَنْ جَدَعَ عَبْدَهٗ جَدَعْنَاهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْ دَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ وَزَادَ النَّسَائِیُّ فِیْ رِوَایَةٍ اُخْرٰی وَمَنْ خَصٰی عَبْدَهٗ خَصَیْنَاهُ۔

"اور حضرت حسن بصریؒ (تابعی) حضرت سمرہؓ (صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اس کو قتل کر دیں گے اور جو شخص (اپنے غلام کے) اعضاء کاٹے گا، ہم اس کے اعضاء کاٹ دیں گے۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی) اور نسائی نے ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔ کہ جو شخص اپنے غلام کو خصی کرے گا ہم اس کو خصی کر دیں گے۔"

تشریح: جو شخص اپنے غلام کو قتل کر دے گا ہم اس کو قتل کر دیں گے۔ یہ آپ ﷺ نے بطور زجر و تشدید اور تنبیہ فرمایا کہ لوگ اپنے غلاموں کو مار ڈالنے سے باز رہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شخص نے سخت ترین ممانعت تنبیہ کے باوجود بھی جب چوتھی یا پانچویں بار شراب پی لی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو قتل کر دو، لیکن جب وہ آپ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے اس کو قتل نہیں کیا۔ بعض

حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں غلام سے مراد وہ شخص ہے جو غلام بھی رہا ہو، اور پھر آزاد کر دیا گیا ہو، اگرچہ ایسے شخص کو غلام نہیں کہا جاتا لیکن اس کے سابق حال کے اعتبار سے اس کو یہاں غلام تعبیر کیا گیا۔

اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس آیت کریمہ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ الخ کے ذریعہ منسوخ ہے! اس بارہ میں جہاں تک فقہی مسئلہ کا تعلق ہے تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے غلام کو قتل کر دے تو اس کو غلام کے بدلے میں قتل کیا جا سکتا ہے لیکن اگر اس نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو اس غلام کے بدلے میں اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام اعظمؒ کے سوا تینوں ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ آیت کریمہ الحر بالحر الخ کے بموجب کسی آزاد شخص کو نہ تو اپنے غلام کے بدلے میں قتل کیا جائے اور نہ کسی دوسرے کے بدلے میں۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ کا قول یہ ہے کہ مقتول غلام کے بدلے میں قاتل آزاد کو قتل کیا جائے خواہ وہ مقتول اس کا اپنا غلام ہو یا کسی دوسرے کا۔

"اور جو شخص اعضاء کاٹے گا الخ" شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ "تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی آزاد کسی غلام کے اعضاء جسم کاٹ ڈالے تو اس کے بدلے میں اس آزاد کے اعضاء جسم نہ کاٹے جائیں" علماء کے اس اتفاق سے یہ ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی "ہم اس کے اعضاء کاٹ دیں گے" یا تو زجر و تنبیہ پر محمول ہے یا منسوخ ہے۔

قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے

(۲۵) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَتَلَ مُتَعَمِّدًا دُفِعَ اِلٰى اَوْلِيَاءِ الْمَقْتُوْلِ فَاِنْ شَاءُوْا قَتَلُوْا وَاِنْ شَاءُوْا اَخَذُوا الدِّيَةَ وَهِيَ ثَلَاثُوْنَ حِقَّةً وَثَلَاثُوْنَ جَذَعَةً وَاَرْبَعُوْنَ خَلِفَةً وَمَا صَالَحُوْا عَلَيْهِ فَهُوَ لَهُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص قتل عمد کا ارتکاب کرے اس کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے چاہے وہ اس کو (مقتول کے بدلے میں) قتل کر دیں اور چاہے اس سے دیت یعنی خون بہا لے لیں، اور خون بہا (کی مقدار و تعداد) یہ ہے کہ تیس اونٹنیاں وہ ہوں جو (تین برس کی ہو کر) چوتھے برس میں لگی ہوں اور تیس اونٹنیاں وہ ہوں جو پانچویں برس میں لگی ہوں اور چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں (اس کے علاوہ) اور جس چیز پر صلح ہو جائے تو وہ اس کے حق دار ہوں گے (یعنی دیت جو مقتول کے ورثاء کا حق ہے اس کی اصل مقدار و تعداد تو یہ ہے ہاں اگر ورثاء اس سے کم پر راضی ہو جائیں تو قاتل پر وہی واجب ہو گا۔"

تشریح: دیت یعنی خون بہا کے بارہ میں حضرت امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مسلک بھی یہی ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ (دیت میں جو سو اونٹ مشروع ہیں وہ اس طرح کے ہونے چاہئیں پچیس بنت مخاض، پچیس بنت لبون پچیس حقہ اور پچیس جزعہ! ان کی دلیل حضرت سائبؓ ابن یزید کی یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (خون بہا میں) چار طرح کے اونٹ دینے کا حکم دیا ہے۔ اور یہ حدیث ثابت ہوتی تو صحابہؓ اختلاف کرنے کی بجائے متفقہ طور سے اسی حدیث پر عمل کرتے۔

قصاص و دیت کے بارہ میں سب مسلمان برابر ہیں

(۲۶) وَعَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاءُهُمْ وَيَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ اَدْنَاهُمْ وَيَرُدُّ عَلَيْهِمْ اَقْصَاهُمْ وَهُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ اَلَا لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ وَلَا ذُوْ عَهْدٍ فِيْ عَهْدِهٖ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا قصاص اور دیت میں سب مسلمان برابر ہیں اور ایک ادنی مسلمان بھی امان دے سکتا ہے اور دور والا مسلمان بھی حق رکھتا ہے اور سب مسلمان ایک ہاتھ کی طرح ہوتے ہیں (یعنی تمام مسلمان غیر مسلموں کے مقابلہ میں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہونے میں ایک ہاتھ کی مانند ہوتے ہیں کہ جس طرح کسی چیز کو پکڑنے یا سکون و حرکت کے موقع پر ایک ہاتھ کے تمام اجزاء میں کوئی مخالفت یا جدائی نہیں ہوتی اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ غیروں کے مقابلے پر متحد و متفق رہیں اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں) اور خبردار! کافر کے بدلے میں مسلمان نہ مارا جائے اور نہ عہد والے (یعنی ذمی) کو مارا جائے جب تک کہ وہ عہد و ضمان میں ہے۔ ابوداؤد، نسائی) اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "سب مسلمان برابر ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ قصاص اور خون بہا کے لینے دینے میں سب مسلمان برابر ہیں اور یکساں ہیں شریف اور رزیل میں، چھوٹے اور بڑے میں، عالم اور جاہل میں، امیر اور غریب میں اور مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ نہیں ہے کہ بڑے درجہ والے کو چھوٹے درجہ والا کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے، یا بڑی ذات والے کے خون بہا کی مقدار پوری دی جائے اور چھوٹی ذات والے کے خون بہا کی مقدار کم دی جائے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ اگر کوئی باحیثیت آدمی کسی کم حیثیت والے کو قتل کر دیتا تھا وہ تو قصاص میں اس کو قتل نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے عوض میں اس کے قبیلے کے ان چند آدمیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا جو زیردست ہوتے تھے۔

"اور ایک ادنی مسلمان بھی امان دے سکتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں کا کوئی ادنی ترین فرد جیسے غلام یا عورت کسی کافر کو امان دے دے تو سب مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کافر کو امان دیں اور اس کے جان و مال کی حفاظت کا جو عہد اس مسلمان کی طرف سے کیا گیا ہے اس کو نہ توڑیں۔

"اور دور والا مسلمان بھی حق رکھتا ہے" اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ ہے کہ اگر کسی ایسے مسلمان نے جو دار الحرب سے دور رہا ہے کسی کافر کو امان دے رکھی ہے تو ان مسلمانوں کے لئے جو دار الحرب کے قریب ہیں یہ جائز نہیں ہے کہ اس مسلمان کے عہد امان کو توڑ دیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب مسلمانوں کا لشکر دار الحرب میں داخل ہو جائے، اور مسلمانوں کا امیر لشکر کے ایک دستہ کو کسی دوسری سمت بھیج دے اور پھر وہ دستہ مال غنیمت لے کر واپس آئے تو وہ مال غنیمت صرف اسی دستہ کا حق نہیں ہوگا، بلکہ وہ سارے لشکر والوں کو تقسیم کیا جائے گا۔

"جب تک کہ وہ عہد و ضمان میں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جو کافر جزیہ (ٹیکس) ادا کر کے اسلامی سلطنت کا وفادار شہری بن گیا ہے اور اسلامی سلطنت نے اس کے جان و مال کی حفاظت کا عہد و ضمان کر لیا ہے تو جب تک وہ ذمی ہے اور اپنے ذمی ہونے کے منافی کوئی کام نہیں کرتا اس کو مسلمان قتل نہ کرے بلکہ اس کی حفاظت کو ذمہ داری سمجھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون حکومت کی نظر میں ایک ذمی کے خون کی بھی وہی قیمت ہے جو ایک مسلمان کے خون کی ہے لہٰذا اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو ناحق قتل کر دے تو اس کے قصاص میں اس کے قاتل مسلمان کو قتل کر دینا چاہئے جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔

اس نکتہ سے حدیث کے اس جملہ "کافر کے بدلے میں مسلمان کو نہ مارا جائے" کا مفہوم بھی واضح ہو گیا کہ یہاں "کافر" سے مراد حربی کافر ہے نہ کہ ذمی! حاصل یہ کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی مسلمان کو حربی کافر کے قصاص میں تو قتل نہ کیا جائے لیکن ذمی کے قصاص میں قتل کیا جائے اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک کسی مسلمان کو کسی بھی کافر کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے خواہ وہ کافر حربی ہو یا ذمی۔

مقتول یا زخم خوردہ کے ورثاء کا حق

㉗ وَعَنْ اَبِي شُرَيْحِ الْخُزَاعِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اُصِيْبَ بِدَمٍ اَوْ خَبْلٍ وَالْخَبْلُ الْجُرْحُ فَهُوَ بِالْخِيَارِ بَيْنَ اِحْدٰى ثَلَاثٍ فَاِنْ اَرَادَ الرَّابِعَةَ فَخُذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ بَيْنَ اَنْ يَقْتَصَّ اَوْ يَعْفُوَا اَوْ يَاْخُذَ الْعَقْلَ فَاِنْ اَخَذَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ عَدَا بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ النَّارُ خَالِدًا فِيْهَا مُخَلَّدًا اَبَدًا۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابوشریح خزاعیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص قتل ناحق یا زخم کی وجہ سے غم زدہ ہو (یعنی جس شخص کے مورث کو ناحق قتل کر دیا گیا ہو، یا اس کے جسم کا کوئی عضو کاٹ دیا گیا ہو) تو وہ تین چیزوں میں کسی ایک چیز کو اختیار کرنے کا حقدار ہے اور اگر وہ (ان تینوں چیزوں سے زائد) کسی چوتھی چیز کا طلب گار ہو تو اس کا ہاتھ پکڑ لو (یعنی اس کو وہ چوتھی چیز طلب کرنے سے منع کر دو) اور وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ ① یا تو وہ قصاص لے لے۔ ② یا معاف کر دے۔ ③ اور یا مالی معاوضہ لے لے۔ پھر اگر اس نے ان چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کیا اور اس کے بعد کسی دوسری چیز کا اضافہ کیا (یعنی مثلاً پہلے تو اس نے معاف کر دیا اور پھر بعد میں قصاص یا مالی معاوضہ کا مطالبہ کیا) تو اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس میں اس کو ہمیشہ رکھا جائے گا کبھی اس سے نہیں نکلے گا۔" (دارمیؒ)

تشریح: خَالِدًا فِيْهَا مُخَلَّدًا اس جملہ میں "تاکید کے بعد تاکید" کا اسلوب سخت زجر و تنبیہ اور شدید وعید کے اظہار کے لئے ہے، دوزخ میں ہمیشہ رہنے کے بارہ میں جو وضاحت پہلی فصل میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت نمبر سات کے ضمن میں کی جا چکی ہے وہی وضاحت یہاں بھی پیش نظر رہنی چاہئے۔

قتل خطاء کا حکم

㉘ وَعَنْ طَاؤُوْسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قُتِلَ فِيْ عِمِّيَّةٍ فِيْ رِمِّيٍّ يَكُوْنُ بَيْنَهُمْ بِالْحِجَارَةِ اَوْ جَلْدٍ بِالسِّيَاطِ اَوْ ضَرْبٍ بِعَصًا فَهُوَ خَطَاءٌ وَعَقْلُهٗ عَقْلُ الْخَطَاءِ وَمَنْ قَتَلَ عَمْدًا فَهُوَ قَوَدٌ وَمَنْ حَالَ دُوْنَهٗ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ غَضَبُهٗ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت طاؤسؒ ابن عباسؓ سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص لوگوں کے درمیان پتھراؤ میں یا کوڑوں اور لاٹھیوں کی اندھادھند مار میں مارا جائے، (یعنی یہ نہ پتہ چلے) کہ اس کا قاتل کون ہے) تو یہ قتل (گناہ نہ ہونے کے اعتبار سے) قتل خطاء کے حکم میں ہوگا (کیونکہ وہ بلا قصد قتل مارا گیا ہے) اور اس کی دیت، قتل خطا کی دیت ہے، اور جو شخص جان بوجھ کر مارا گیا تو اس کا قتل، قصاص کو واجب کرے گا اور جو شخص قصاص لینے میں حائل (مزاحم) ہو اس پر اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہے۔ نہ اس کے نفل قبول کئے جائیں گے اور نہ فرض۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "لوگوں کے درمیان پتھراؤ الخ" کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً زید کسی ایسی جگہ گھر گیا جہاں دو مخالف گروہ آپس میں لڑ رہے تھے۔ اور دونوں طرف سے ایک دوسرے پر پتھراؤ ہو رہا تھا کہ اچانک ایک پتھر اس (زید) کے آ کر لگا۔ اور وہ مر گیا۔ گویا اگر کوئی شخص پتھر کی ضرب سے مر جائے بلکہ یوں کہئے کہ یہاں "پتھر" کا ذکر محض اتفاقی ہے مراد یہ ہے کہ کسی بھی مثقل (بھاری) چیز کی ضرب سے مر جائے تو یہ قتل قصاص کو واجب نہیں کرتا بلکہ اس میں دیت واجب ہوتی ہے اور دیت بھی وہ جو قتل خطاء میں واجب ہوتی ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں اس قتل کو "شبہ عمد" کہتے ہیں، چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک شبہ عمد کی تعریف یہ ہے کہ "وہ قتل جو کسی غیر دھاردار چیز سے واقع ہوا ہو اگرچہ وہ کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے اکثر ہلاکت واقع ہو جاتی ہو" لیکن صاحبینؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک شبہ عمد کی

تعریف یہ ہے کہ وہ قتل جو بارادہ قتل کسی ایسی چیز سے ہوا ہو جس سے اکثر ہلاکت واقع نہ ہوتی ہو اور جو قتل کسی ایسی چیز سے ہوا جس سے اکثر ہلاکت واقع ہو جاتی ہو قتل عمد میں داخل ہو گا، لہٰذا حدیث میں مذکورہ چیزیں یعنی پتھر اور لاٹھی، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو اپنے مطلق معنی پر محمول ہیں کہ خواہ وہ ہلکی ہوں یا بھاری، جب کہ صاحبین اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک یہ چیزیں "ہلکی (غیر مثقل) ہونے پر محمول ہیں، گویا خلاصہ یہ نکلا کہ جو قتل مثقل (بھاری) چیز کے ذریعہ ہوا اس میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک قصاص واجب نہیں ہو گا اور صاحبینؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مذکورہ بالا تفصیل کا اعتبار کیا جائے گا۔

"جو شخص قصاص لینے میں حائل ہو الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مقتول کے وارثوں سے قصاص نہ لینے دے تو اس کے بارے میں بطور زجر تشدید اور تہدید وعید یہ فرمایا گیا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کا غضب نازل ہو گا یعنی وہ خدا کی ناراضگی کا موجب بنے گا۔

قتل کی قسمیں: فقہا کے نزدیک قتل کی پانچ قسمیں ہیں۔ ① قتل عمد۔ ② قتل شبہ عمد۔ ③ قتل خطا۔ ④ قتل جاری مجری خطا۔ ⑤ قتل بسبب۔ ① قتل عمد یہ ہے کہ مقتول کو کسی چیز سے مارا جائے جو اعضاء کو جدا کر دے (یا اجزاء جسم کو پھاڑ ڈالے) خواہ وہ ہتھیار کی قسم سے ہو یا پتھر، لکڑی، کھپاچ کی قسم سے کوئی تیز (دھار دار) چیز ہو اور مادہ آگ کا شعلہ ہو، صاحبینؒ کے نزدیک قتل عمد کی تعریف یہ ہے کہ "مقتول کو بارادہ قتل کسی بھی ایسی چیز سے مارا جائے جس سے عام طور پر انسان کو ہلاک کیا جا سکتا ہے" قتل عمد کا مرتکب سخت گناہ گار ہوتا ہے اور اس قتل کی سزا قصاص (یعنی مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کر دینا) ہے الا یہ کہ مقتول کے ورثاء اس کو معاف کر دیں یا دیت (مالی معاوضہ) لینے پر راضی ہو جائیں، اس میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔

② قتل شبہ عمد۔ یہ ہے کہ مقتول کو مذکورہ بالا چیزوں (ہتھیار اور دھار دار چیز وغیرہ) کے علاوہ کسی اور چیز سے قصداً ضرب پہنچائی گئی ہو قتل کی یہ صورت بھی (باعتبار ترک عزیمت اور عدم احتیاط) گنہ گار کرتی ہے، لیکن اس میں قصاص کی بجائے قاتل کے عاقلہ (برادری کے لوگوں) پر دیت مغلظہ واجب ہوتی ہے (دیت مغلظہ چار طرح کے سو اونٹوں کو کہتے ہیں. لیکن اگر ہلاکت واقع نہ ہو تو قصاص واجب ہوتا ہے یعنی اس کی وجہ سے مرنے کی بجائے مضروب کا کوئی عضو کٹ گیا ہو تو مارنے والے کا بھی وہی عضو کاٹا جائے گا۔ ③ قتل خطاء کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ "خطاء" کا تعلق "قصد" سے ہو، مثلاً ایک چیز کا شکار گمان کر کے تیر یا گولی کا نشان بنایا گیا مگر وہ آدمی نکلا، یا کسی شخص کو حربی کافر سمجھ کر تیر یا گولی کا نشانہ بنایا مگر وہ مسلمان نکلا۔ دوسرے یہ کہ "خطا" کا تعلق "فعل سے ہو مثلاً کسی خاص نشانہ پر تیر یا گولی چلائی گئی مگر وہ تیر یا گولی بہک کر کسی آدمی کے جا لگی"۔

④ قتل جاری مجریٰ خطاء کی صورت یہ ہے مثلاً ایک شخص سوتے میں کسی دوسرے شخص پر جا پڑا اور اس کو ہلاک کر ڈالا! قتل خطاء اور جاری مجریٰ خطاء میں کفارہ لازم آتا ہے اور عاقلہ پر دیت واجب ہوتی ہے، نیز ان صورتوں میں (باعتبار ترک عزیمت) گناہ بھی ہوتا ہے۔

⑤ قتل بسبب یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص نے دوسرے شخص کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر کنواں کھدایا کوئی پتھر رکھ دیا اور کوئی تیسرا شخص اس کنویں میں گر کر یا اس پتھر سے ٹھوکر کھا کر مر گیا۔ اس صورت میں عاقلہ پر دیت واجب ہوتی ہے کفارہ لازم نہیں آتا۔ یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ قتل کی پہلی چار قسمیں یعنی عمد، شبہ عمد، اور جاری مجریٰ خطاء میں قاتل، مقتول کی میراث سے محروم ہو جاتا ہے (اور وہ صورت کہ مقتول، قاتل کا مورث ہو) اور پانچویں قسم یعنی "قتل بسبب" میں قاتل، مقتول کی میراث سے محروم نہیں ہوتا۔

قاتل سے دیت لینے کے بعد پھر اس کو قتل کر دینا ناقابل معافی جرم ہے

(۲۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا أُعْفِي مَنْ قَتَلَ بَعْدَ اَخْذِ الدِّيَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(مقتول کے ولی اور وارثوں میں سے) جو شخص (قاتل سے) دیت (خون بہا) لینے

کے بعد اس کو قتل کرے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا (بلکہ اس کو بھی بطور قصاص قتل کرادوں گا۔" (ابوداؤد)

زخمی کر دینے والے کو معاف کرنے کا اجر

(۳۰) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ رَجُلٍ يُصَابُ بِشَیْءٍ فِیْ جَسَدِهٖ فَتَصَدَّقَ بِهٖ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهٖ دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْهُ خَطِيْئَةً۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جس شخص کے بدن کے کسی حصہ کو زخمی کیا گیا اور اس نے زخمی کرنے والے کو معاف کر دیا (یعنی اس سے کوئی بدلہ نہیں لیا بلکہ درگزر کیا اور تقدیر الٰہی پر صابر رہا) تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند کرے گا اور اس کا ایک گناہ معاف کر دے گا۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ایک آدمی کو کئی آدمی مل کر قتل کریں تو سب ہی قصاص کے سزاوار ہوں گے

(۳۱) عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَتَلَ نَفَرًا خَمْسَةً اَوْ سَبْعَةً بِرَجُلٍ وَاحِدٍ قَتَلُوْهُ قَتْلَ غِيْلَةٍ وَقَالَ عُمَرُ لَوْ تَمَالَا عَلَيْهِ اَهْلُ صَنْعَاءَ لَقَتَلْتُهُمْ جَمِيْعًا۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَرَوَى الْبُخَارِیُّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوَهٗ۔

"اور حضرت سعید ابن مسیبؒ راوی ہیں کہ حضرت عمر ابن خطابؓ (خلیفۃ المسلمین) نے ایسے پانچ یا سات آدمیوں کی ایک جماعت کو قتل کیا جنہوں نے فریب اور دھوکے سے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ نیز حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اگر صنعاء والے سب اس شخص کو قتل کر دیتے یا قاتلوں کی مدد کرتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا۔ (مالکؒ) امام بخاریؒ نے بھی حضرت ابن عمرؓ سے اسی کے مانند نقل کیا ہے۔"

تشریح: "صنعاء" یمن کا ایک مشہور شہر ہے جو آج کل اپنے ملک کا دارالحکومت بھی ہے، حضرت عمرؓ نے "صنعا" کا ذکر کیا تو اس لئے کیا کہ جن قاتلوں کو انہوں نے قتل کیا تھا قصاص میں، وہ سب ہی صنعا کے ہی رہنے والے تھے، یا یہ کہ اہل عرب کے ہاں کسی چیز کی زیادتی اور کثرت کو ظاہر کرنے کے لئے اپنے کلام میں "صنعا" مثل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ اگر ایک شخص کو قتل کرنے میں کئی آدمی شریک ہوں تو قصاص میں ان سب کو قتل کر دینا چاہئے۔

قیامت کے دن مقتول اپنے قاتل کو پکڑ کر خدا سے فریاد کرے گا

(۳۲) وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ فُلَانٌ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَجِیْءُ الْمَقْتُوْلُ بِقَاتِلِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَقُوْلُ سَلْ هٰذَا فِيْمَ قَتَلَنِیْ فَيَقُوْلُ قَتَلْتُهٗ عَلٰى مُلْكِ فُلَانٍ قَالَ جُنْدُبٌ فَاتَّقِهَا۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت جندبؓ کہتے ہیں کہ مجھے فلاں صحابی نے (کہ جن کا نام یا تو حضرت جندب ہی نے نہیں لیا یا انہوں نے نام لیا لیکن راوی کے ذہن میں وہ نام نہیں رہا) یہ حدیث بیان کی کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن مقتول اپنے قاتل کو (پکڑ کر) لائے گا اور (اللہ تعالیٰ سے) فریاد کرے گا کہ "اس سے پوچھئے کہ اس نے مجھ کو کس وجہ سے قتل کیا تھا؟ چنانچہ قاتل کہے گا کہ میں نے اس کو فلاں شخص کی سلطنت میں قتل کیا تھا" جندب نے (یہ حدیث بیان کرنے کے بعد) کہا کہ "تم اس سے بچو"۔" (نسائی)

تشریح: بظاہر مقتول کے سوال اور قاتل کے جواب میں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی، کیونکہ مقتول نے تو قتل کا سبب پوچھا تھا نہ کہ قتل کی جگہ کو دریافت کیا تھا؟ اس بارہ میں شارحین لکھتے ہیں کہ قاتل کے جملہ "میں نے اس کو فلاں شخص کی سلطنت میں قتل کیا تھا" کی مراد یہ ہے کہ میں فلاں حاکم یا فلاں بادشاہ یا فلاں دنیادار کے زمانہ میں اس کی مدد سے یا اس کے ایماء پر اس قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ "لیکن یہ معنی

اس صورت میں ہوں گے جب کہ روایت میں لفظ "ملک" میم کے پیش کے ساتھ (یعنی ملک) ہو اور اگر یہ لفظ میم کے زیر کے ساتھ (یعنی ملک) ہے تو پھر یہ معنی مراد ہوں گے کہ میں نے اس کو جھگڑے کے دوران قتل کیا تھا جو میرے اور اس کے درمیان فلاں شخص (مثلاً زید کی عملداری میں ہوا تھا" اس اعتبار سے قاتل کا مذکورہ جملہ بیان واقعہ کے لئے ہوگا۔

جندبؓ کے قول "تم اس سے بچو" سے مراد مخاطب کو قتل اور قتل میں مدد دینے سے نیز جھگڑا فساد کرنے سے جو عام طور پر قتل کا باعث ہوتا ہے، روکنا ہے، طیبیؒ کہتے ہیں کہ حضرت جندبؓ نے ایک بادشاہ کو نصیحت کرتے ہوئے یہ حدیث بیان کی تھی اور مذکورہ جملہ کا مخاطب وہی بادشاہ تھا، اس سے حضرت جندبؓ کا مقصود یہ تھا کہ بادشاہ کسی ظالم کی مدد نہ کرے۔

قاتل کی مدد کرنے والے کے بارہ میں وعید

(۳۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَعَانَ عَلٰی قَتْلِ مُؤْمِنٍ شَطْرَ کَلِمَةٍ لَقِیَ اللّٰهَ مَکْتُوْبٌ بَیْنَ عَیْنَیْهِ اٰیِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص آدھا جملہ کہہ کر بھی کسی مؤمن کے قتل میں مدد کرے گا (یعنی مثلاً اقتل پورا نہیں کہا بلکہ صرف اق کہا) تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان یہ لکھا ہوگا" یہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہے"۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مسلمان کو قتل کرنا گناہ کی شدت و سختی میں کفر کے مشابہ ہے، اس اعتبار سے یہ جملہ "یہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہے" گویا کفر کا کنایۃً پیرایۂ اظہار ہے کیونکہ آیت کریمہ: لَا یَیْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ ترجمہ۔ اللہ کی رحمت سے کافروں کی قوم ہی ناامید ہوتی ہے۔ کے بموجب اللہ کی رحمت سے ناامیدی صرف کافر کے لئے ہے۔

اس جملہ کا ماحصل یہ ہے کہ ایسا شخص قیامت کے دن مذکورہ علامت کے ذریعہ خلائق کے درمیان رسوا ہوگا۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ حدیث کا مفہوم یا تو ایسے شخص کے بارہ میں سخت وعید و تہدید پر محمول ہے، یا پھر اس کا محمول وہ شخص ہے جو قتل مؤمن میں معاونت کو حلال جان کر اس کا مرتکب ہو۔

قاتل کے مددگار کو تعزیراً قید کیا جائے

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَمْسَكَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ وَقَتَلَهُ الْاٰخَرُ یُقْتَلُ الَّذِیْ قَتَلَ وَیُحْبَسُ الَّذِیْ اَمْسَكَ۔ (رواہ الدار قطنی)

"اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "جب ایک شخص کسی آدمی کو پکڑے اور دوسرا اس کو قتل کردے تو (مقتول کے بدلہ میں) اس شخص کو قتل کیا جائے جس نے اس کو قتل کیا ہے اور پکڑنے والے کو سزائے قید دی جائے۔" (دار قطنی)

تشریح: جس طرح کسی عورت کو ایک شخص پکڑے اور دوسرا شخص اس سے زنا کرے تو پکڑنے والے پر حد جاری نہیں کی جاتی اسی طرح مقتول کو پکڑنے والے سے بھی قصاص نہیں لیا جائے گا بلکہ اس کو بطریق تعزیر قید کیا جائے گا اور قید کی مدت کا انحصار حاکم و قاضی کی رائے پر ہوگا کہ وہ جتنی مدت کے لئے مناسب سمجھے سزائے قید دے۔ یہ بعض شارحین کی تصریح ہے، لیکن یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ مقتول کو پکڑنا در اصل اس کے قتل میں معاونت کرنا ہے اور دوسری احادیث کی روشنی میں قتل کے مددگار کی سزا بھی قصاص ہی ہے، اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔

شمنیؒ نے ملتقی میں مذکور یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو شیر یا کسی اور درندے کے سامنے ڈال دے اور وہ شیر یا درندہ اس شخص

کو مار ڈالے تو اس صورت میں ڈالنے والے پر قصاص واجب ہوگا اور نہ دیت بلکہ اس کے لئے یہ سزا ہے کہ جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کو قید میں ڈالا جائے اور اس طرح مارا جائے کہ اس کا جسم درد کرنے لگے۔

بَابُ الدِّيَات

دیات کا بیان

دیت کے معنی اور اس کی قسمیں: "دیات" جمع ہے دیت کی جس کے معنی ہیں "مالی معاوضہ" گویا "دیت" اس مال کو کہتے ہیں جو جان کو ختم کرنے یا کسی شخص کے جسمانی اعضاء کو ناقص (مجروح) کرنے کے بدلہ میں دیا جاتا ہے! عنوان میں جمع کا لفظ "دیات" دیت کی انواع (قسموں) کے اعتبار سے لایا گیا ہے اس سے یہ اظہار مقصود ہے کہ دیت کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً ایک دیت تو وہ ہوتی ہے جو کسی کو جان سے مار ڈالنے کے بدلہ میں دی جاتی ہے اور ایک دیت وہ ہوتی ہے جو اعضاء کے نقصان کے بدلے میں دی جاتی ہے۔ پھر نوعیت و حیثیت کے اعتبار سے بھی دیت دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو مغلظہ کہلاتی ہے اور دوسری کو مخففہ کہتے ہیں۔

دیت مغلظہ تو یہ ہے کہ چار طرح کی سو اونٹنیاں ہوں یعنی پچیس بنت مخاض (جو ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگی ہو) پچیس بنت لبون (جو دو سال میں لگی ہوں) پچیس حقہ (جو تین سال کی ہو کر چوتھے سال میں لگی ہوں) اور پچیس جذعہ (جو چار سال کی ہو کر پانچویں سال میں لگی ہوں) یہ تفصیل حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ کے مسلک کے مطابق ہے، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک دیت مغلظہ یہ ہے کہ تین طرح کی سو اونٹنیاں ہوں یعنی تیس حقہ، تیس جذعہ اور چالیس مثنہ (جو پانچ سال کی ہو کر چھٹے سال میں لگی ہوں) اور سب حاملہ ہوں۔ دیت مغلظہ اس شخص پر واجب ہوتی ہے جو قتل شبہ عمد کا مرتکب پایا گیا ہو۔

دیت مخففہ یہ ہے کہ اگر سونے کی قسم سے دیت دی جائے تو اس کی مقدار ایک ہزار دینار (اشرفی) ہے اور اگر چاندی کی قسم سے دی جائے تو دس ہزار درہم دیئے جائیں گے اور اگر اونٹ کی قسم سے دے تو پانچ طرح کے سو اونٹ دینے ہوں گے یعنی بیس ابن مخاض (وہ اونٹ جو ایک سال کے ہو کر دوسرے سال میں لگے ہوں) بیس بنت مخاض، بیس بنت لبون، بیس حقہ اور بیس جذعہ دیت مخففہ اس شخص پر واجب ہوتی ہے جو قتل خطاء، یا قتل جاری مجریٰ خطا اور یا قتل تسبیب کا مرتکب پایا گیا ہو۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

انگلی کاٹنے کی دیت

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هٰذِهٖ وَهٰذِهٖ سَوَاءٌ يَعْنِي الْخِنْصَرَ وَ الْاِبْهَامَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "یہ اور یہ یعنی (آپ ﷺ نے سب سے چھوٹی انگلی اور انگوٹھے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ) چھنگلیا اور انگوٹھا (دیت کے اعتبار سے) دونوں برابر ہیں۔" (بخاری)

تشریح: اگر کوئی شخص کسی کے دونوں ہاتھ یا دونوں پاؤں کی تمام انگلیاں کاٹ دے تو چونکہ اس نے ایک انسان کو اس کی منفعت کے ایک بہت بڑے ذریعہ سے محروم کر دیا اس لئے اس پر (بطور سزا) پوری دیت واجب ہوگی اس اعتبار سے ہر انگلی کاٹنے پر پوری دیت (یعنی سو اونٹ) کا دسواں حصہ دینا واجب ہوگا، اسی کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ انگوٹھے اور چھنگلیا کی دیت برابر ہے اگرچہ انگوٹھے میں دو گانٹھ اور چھنگلیا میں تین گانٹھ ہوتی ہیں لیکن اصل منفعت میں دونوں انگلیوں کے مساوی ہونے کے اعتبار سے گانٹھ کی کمی زیادتی کا اعتبار نہیں ہوگا جس طرح کہ دائیں اور بائیں میں فرق نہیں ہوتا اور جب ہر انگلی میں پوری دیت کا دسواں حصہ واجب ہوگا تو انگلی کی ہر گانٹھ کی دیت

میں اسی حساب کا اعتبار ہوگا کہ انگلی کی دیت میں دسویں حصہ کا تہائی دینا ہوگا اور انگوٹھے کی ہر ایک گانٹھ کی دیت میں دسویں حصہ کا آدھا دینا ہوگا کیونکہ انگوٹھے میں دو گانٹھ ہوتی ہیں اور انگلیوں میں تین تین گانٹھیں ہوتی ہیں۔

حمل کے بچہ کی دیت

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ جَنِیْنِ امْرَأَةٍ مِنْ بَنِیْ لِحْیَانَ سَقَطَ مَیِّتًا بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ ثُمَّ اِنَّ الْمَرْأَةَ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا بِالْغُرَّةِ تُوُفِّیَتْ فَقَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاَنَّ مِیْرَاثَهَا لِبَنِیْهَا وَزَوْجِهَا وَالْعَقْلَ عَلٰی عَصَبَتِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بنی لحیان کی ایک عورت کے اس بچہ کی دیت میں جو مر کر اس کے پیٹ سے گر پڑا تھا (عاقلہ پر) غرہ واجب کیا تھا، اور غرہ سے مراد غلام یا لونڈی ہے، پھر جب وہ عورت (کہ جس کے عاقلہ پر غرہ واجب کیا تھا) مرگئی تو آپ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اس کی میراث اس کے بیٹوں اور خاوند کے لئے ہے اور اس کی دیت اس کے عصبہ پر ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں اور ان میں سے ایک نے دوسری عورت کے پتھر کھینچ مارا اتفاق سے وہ عورت حاملہ تھی اور پتھر اس کے پیٹ پر لگا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو بچہ اس کے پیٹ میں تھا اس پتھر کی چوٹ سے مر کر پیٹ سے باہر آگیا چنانچہ اس کی دیت میں پتھر مارنے والے کے عاقلہ (یعنی اہل خاندان) پر ایک غرہ یعنی ایک لونڈی یا ایک غلام واجب کیا گیا، اور اگر وہ بچہ زندہ پیدا ہو کر بعد میں مر جاتا یا اگر وہ بچہ زندہ پیدا ہوتا اور اس کے بعد وہ پتھر مارتی اور اس پتھر کی چوٹ سے وہ بچہ مر جاتا تو اس صورت میں پوری دیت واجب کی جاتی۔

غرہ اصل میں تو اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی پر ہوتی ہے، پھر سفید رنگ کے غلام یا لونڈی کو بھی غرہ کہا جانے لگا لیکن یہاں مراد مطلق غلام یا لونڈی ہے، ویسے فقہا کے نزدیک "غرہ" سے دیت کا بیسواں حصہ یعنی پانچ سو درہم مراد ہے۔

"اور اس کی دیت اس کے عصبہ پر ہے" میں عصبہ سے مراد عاقلہ ہیں اس جملہ سے یہ واضح کرنا مراد ہے کہ اگرچہ اس کی دیت اس کے عاقلہ یعنی خاندان اور برادری والوں پر واجب ہوگی مگر وہ خاندان اور برادری والے اس کی میراث کے وارث نہیں قرار پائیں گے کیونکہ کسی کی دیت کا ذمہ دار ہونے سے اس کی میراث کا حقدار ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ اس کی میراث تو انہی لوگوں کو ملے گی جو اس کے شرعی وارث ہیں، اب رہی یہ بات کہ یہاں وارثوں میں صرف بیٹوں اور خاوند کی تخصیص کیوں کی گئی تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جس عورت کا ذکر ہے اس کے ورثاء میں صرف یہی لوگ موجود ہوں گے اس لئے انہی کا ذکر کیا گیا ورنہ مقصود یہ ہے کہ میراث ہر اس وارث کو ملے گی جو موجود ہو جیسا کہ اگلی حدیث کے الفاظ ورثها ولدها ومن معهم سے واضح ہے۔

پتھر کے ذریعہ ہونے والے قتل میں دیت واجب ہوگی

(۳) وَعَنْهُ قَالَ اقْتَتَلَتِ امْرَأَتَانِ مِنْ هُذَیْلٍ فَرَمَتْ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰی بِحَجَرٍ فَقَتَلَتْهَا وَمَا فِیْ بَطْنِهَا فَقَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ دِیَةَ جَنِیْنِهَا غُرَّةٌ عَبْدٌ اَوْ وَلِیْدَةٌ وَقَضٰی بِدِیَةِ الْمَرْأَةِ عَلٰی عَاقِلَتِهَا وَرَّثَهَا وَلَدَهَا وَمَنْ مَعَهُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) قبیلہ ہذیل کی دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں چنانچہ ان میں سے ایک عورت نے دوسری کے پتھر کھینچ مارا جس سے وہ عورت بھی مرگئی اور اس کے پیٹ کا بچہ بھی مر گیا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے حکم دیا کہ مقتولہ کے اس بچہ کی دیت جو اس کے پیٹ میں مر گیا غرہ یعنی ایک لونڈی یا ایک غلام ہے، اور حکم فرمایا کہ مقتولہ کی دیت، قاتلہ کے خاندان و برادری والوں پر ہے نیز

آپ نے اس کی دیت کا وارث اس کے بیٹوں اور ان لوگوں کو بنایا جو بیٹوں کے ساتھ (وراثت میں شریک) تھے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی حدیث میں جو واقعہ گزرا ہے وہ کسی اور عورت کا ہے اور اس حدیث میں جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور عورت کا ہے۔ پہلی حدیث میں تو یہ ذکر تھا کہ پتھر مارنے سے عورت مرگئی تھی چنانچہ اس حدیث میں اس عورت کی وفات اور اس کی وفات کے بعد جو احکام نافذ ہونے تھے ان کا ذکر کرنا مقصود تھا اور اس حدیث میں اس عورت کا ذکر کیا گیا ہے جو پتھر کی چوٹ کھانے کی وجہ سے مرگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے پیٹ کا بچہ بھی مرگیا تھا چنانچہ یہاں اس کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ پتھر کے ذریعہ کسی کو ہلاک کر دینا دیت کا موجب ہے نہ کہ قصاص کا، نیز یہ قتل عمد کی قسم سے نہیں ہے بلکہ شبہ عمد کی قسم سے ہے جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے لیکن اس بارہ میں یہ حدیث چونکہ دوسرے ائمہ کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے وہ حدیث میں مذکورہ پتھر "کو چھوٹے پتھر" پر محمول کرتے ہیں۔

④ وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ اَنَّ امْرَاَتَيْنِ كَانَتَا ضَرَّتَيْنِ فَرَمَتْ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى بِحَجَرٍ اَوْ عَمُوْدِ فُسْطَاطٍ فَاَلْقَتْ جَنِيْنَهَا فَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى الْجَنِيْنِ غُرَّةً عَبْدًا اَوْ اَمَةً وَجَعَلَهُ عَلٰى عَصَبَةِ الْمَرْاَةِ۔ هٰذِهٖ رِوَايَةُ التِّرْمِذِيِّ وَفِىْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ قَالَ ضَرَبَتِ امْرَاَةٌ ضَرَّتَهَا بِعَمُوْدِ فُسْطَاطٍ وَهِىَ حُبْلٰى فَقَتَلَتْهَا قَالَ وَاِحْدٰهُمَا لِحْيَانِيَّةٌ قَالَ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِيَةَ الْمَقْتُوْلَةِ عَلٰى عَصَبَةِ الْقَاتِلَةِ وَغُرَّةً لِمَا فِىْ بَطْنِهَا۔

"اور حضرت مغیرہؓ ابن شعبہ کہتے ہیں دو عورتیں جو آپس میں سوکنیں تھیں (ایک دن باہم لڑ پڑیں) چنانچہ ان میں سے ایک نے دوسری کو (جو حاملہ تھی) پتھر یا خیمے کی چوب سے مارا جس کی وجہ سے اس کا حمل ساقط ہو گیا۔ لہٰذا رسول کریم ﷺ نے پیٹ کے بچہ کی دیت میں غرہ یعنی ایک لونڈی یا ایک غلام دینے کا حکم دیا اور دیت کو آپ نے مارنے والی عورت پر واجب کیا۔ یہ ترمذیؒ کی روایت ہے۔ اور مسلم کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت مغیرہ نے کہا" ایک عورت نے اپنی سوکن کو جو حاملہ تھی، خیمہ کی چوب سے مارا جس کی وجہ سے وہ مرگئی (اور اس کے پیٹ کا بچہ بھی مرگیا) مغیرہؓ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے ایک عورت لحیان کے خاندان سے تھی (جو قبیلہ ہذیل کی ایک شاخ ہے) مغیرہؓ کا بیان ہے کہ رسول کریم ﷺ نے مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عاقلہ پر واجب کی اور پیٹ کے بچہ کی دیت میں غرہ یعنی ایک لونڈی یا ایک غلام دینے کا حکم فرمایا۔"

تشریح: یہ حدیث بھی حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دلیل ہے کیونکہ خیمے چوب سے عام طور انسان کو ہلاک کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے باوجود اس عورت کو قتل عمد کا مرتکب قرار نہیں دیا گیا بلکہ شبہ عمد کا مرتکب گردانا گیا۔ حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ یہاں پتھر اور چوب سے مراد چھوٹا پتھر اور چوب ہے جس سے عام طور کسی انسان کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا جاتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

قتل خطاء اور شبہ عمد کی دیت

⑤ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اِنَّ دِيَةَ الْخَطَاءِ شِبْهِ الْعَمْدِ مَا كَانَ بِالسَّوْطِ وَالْعَصَا مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ مِنْهَا اَرْبَعُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهَا اَوْلَادُهَا۔ رَوَاهُ النَّسَائِىُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِىُّ وَرَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ عَنْهُ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَفِىْ شَرْحِ السُّنَّةِ لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ۔

"حضرت عبداللہؓ ابن عمرو کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جاننا چاہئے کہ قتل خطاء جس سے مراد شبہ عمد ہے اور جو کوڑے اور لاٹھی کے ذریعہ واقع ہوا ہو، اس کی دیت سو اونٹ ہیں جن میں سے چالیس ایسی اونٹنیاں بھی ہونی چاہئیں جن کے پیٹ میں بچے ہوں"

(نسائی، ابن ماجہ، دارمی) ابوداؤد نے اس روایت کو ابن عمرو اور ابن عمر دونوں سے نقل کیا ہے، نیز شرح السنۃ میں یہ روایت ابن عمرؓ سے بالفاظ مصابیح نقل کی گئی ہے۔"

تشریح: یہ روایت بالفاظ مصابیح یوں ہے الا ان فی قتل العمد الخطاء بالسوط والعصاء مائۃ من الابل مغلظۃ منہا اربعون خلفۃ فی بطونہا اولادھا یعنی جاننا چاہئے کہ قتل عمد خطاء جو کوڑے اور لاٹھی کے ذریعہ واقع ہوا ہو اس کی دیت سو اونٹ دیت مغلظہ ہے جن میں چالیس اونٹنیاں ایسی بھی ہونی چاہئیں جن کے پیٹ میں بچے ہوں۔ گویا اس روایت میں قتل عمد خطا سے مراد قتل خطا شبہ عمد ہے جو اوپر کی روایت میں مذکور ہوا۔

اس بارہ میں یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ ارتکاب میں یا عمد کا دخل ہوتا ہے یا شبہ عمد کا اور یا خطاء محض کا۔ قتل عمد سے تو یہ مراد ہوتا ہے کہ کسی شخص کو جان بوجھ کر کسی ایسی چیز (مثلاً ہتھیار یا دھار دار آلہ) سے ہلاک کیا جائے جو اعضاء جسم کو جدا کر دے، یا پھاڑ ڈالے، اور شبہ عمد کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو جان بوجھ کر کسی ایسی چیز سے ہلاک کیا جائے جو دھار دار اور ہتھیار کی قسم سے نہ ہو خواہ عام طور پر اس چیز سے انسان کو ہلاک کیا جاسکتا ہو، یا ہلاک نہ کیا جاسکتا ہو، اور قتل خطاء یہ ہے کہ کسی کو خطاءً (یعنی بلا قصد قتل یا نشانہ کی خطاء سے) ہلاک کر دیا جائے۔ ان تینوں کا ذکر پچھلے صفحات (گزشتہ قسط) میں گزر چکا ہے اور یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق ہے۔

چنانچہ وہ اس حدیث میں مذکورہ "لاٹھی" کو مطلق معنی پر محمول کرتے ہیں کہ خواہ وہ ہلکی ہو یا بھاری، جب کہ دوسرے ائمہ چونکہ یہ کہتے ہیں کہ کسی ایسی بھاری چیز سے قتل کرنا جس سے عام طور پر انسان کو قتل کیا جاسکتا ہو قتل عمد کے حکم میں ہے اس لئے وہ "لاٹھی" کو ہلکی لاٹھی پر محمول کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک یہاں وہ ہلکی لاٹھی (چھڑی) مراد ہے جس سے عام طور پر انسان کو ہلاک نہ کیا جاسکتا ہو۔

بعض روایتوں میں "دیت" کے ساتھ مغلظہ کا لفظ بھی منقول ہے جیسا کہ مذکورہ بالا مصابیح کی روایت میں بھی یہ لفظ موجود ہے، چنانچہ قتل شبہ عمد میں دیت کی تغلیظ حضرت ابن مسعودؓ، حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک تو یہ ہے کہ چار طرح کے سو اونٹ واجب ہوں جن کی تفصیل ابتداء باب میں گزر چکی ہے اور حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک تغلیظ یہ ہے کہ تین طرح کے سو اونٹ واجب ہوں ان کی تفصیل بھی ابتداء باب میں گزر چکی ہے لیکن قتل خطاء میں بالاتفاق دیت مغلظہ واجب نہیں ہوتی بلکہ اس میں پانچ طرح کے سو اونٹ واجب ہوتے ہیں یعنی بیس ابن مخاض، بیس بنت مخاض، بیس بنت لبون، بیس حقہ اور بیس جذعہ۔

دیت مغلظہ کی تفصیل کے سلسلہ میں یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام محمدؒ کے مسلک کی دلیل ہے، لیکن حنفیہ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث اس حدیث کے معارض ہے جو حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت سائبؓ ابن یزید سے مروی ہے لہٰذا ہم نے متعین پر عمل کیا ہے۔

مختلف اعضاء جسم کی دیت

⑥ وَعَنْ اَبِی بَکْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَتَبَ اِلٰی اَهْلِ الْیَمَنِ وَکَانَ فِیْ کِتَابِهٖ اَنَّ مَنِ اعْتَبَطَ مُؤْمِنًا قَتْلاً فَاِنَّهٗ قَوَدُیَدِهٖ اِلاَّ اَنْ یَّرْضٰی اَوْلِیَاءُ الْمَقْتُوْلِ وَفِیْهِ اَنَّ الرَّجُلَ یُقْتَلُ بِالْمَرْاَةِ وَفِیْهِ فِی النَّفْسِ الدِّیَةُ مِائَةٌ مِّنَ الْاِبِلِ وَعَلٰی اَهْلِ الذَّهَبِ اَلْفُ دِیْنَارٍ وَفِی الْاَنْفِ اِذَا اُوْعِبَ جَدْعُهُ الدِّیَةُ مِائَةٌ مِّنَ الْاِبِلِ وَفِی الْاَسْنَانِ الدِّیَةُ وَفِی الشَّفَتَیْنِ الدِّیَةُ وَفِی الْبَیْضَتَیْنِ الدِّیَةُ وَفِی الذَّکَرِ الدِّیَةُ وَفِی الصُّلْبِ الدِّیَةُ وَفِی الْعَیْنَیْنِ الدِّیَةُ وَفِی الرِّجْلِ الْوَاحِدَةِ نِصْفُ الدِّیَةِ وَفِی الْمَاْمُوْمَةِ ثُلُثُ الدِّیَةِ وَفِی الْجَائِفَةِ ثُلُثُ الدِّیَةِ وَفِی الْمُنَقِّلَةِ خَمْسَ عَشَرَةَ مِنَ الْاِبِلِ وفی کل اصبع من اصابع الید والرجل عشر من الابل وفی السن خمس من الابل رَوَاهُ

اَلنَّسَائِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃِ مَالِکٍ وَفِی الْعَیْنِ خَمْسُوْنَ وَفِی الْیَدِ خَمْسُوْنَ وَفِی الرِّجْلِ خَمْسُوْنَ وَفِی الْمُوْضِحَۃِ خَمْسٌ۔

"اور حضرت ابوبکر ابن محمد ابن عمرو ابن حزم اپنے والد (حضرت محمد ابن عمرو) سے اور وہ ابوبکر کے دادا (حضرت عمروؓ ابن حزم) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اہل یمن کے پاس ایک ہدایت نامہ بھیجا جس میں لکھا ہوا تھا کہ جو شخص قصداً کسی مسلمان کو ناحق مار ڈالے (یعنی قتل عمد کا ارتکاب کرے) تو اس کے ہاتھوں کے فعل کا قصاص ہے (یعنی اس نے اپنے ہاتھوں کے فعل اور تقصیر کے ذریعہ جو قتل عمد کیا ہے اس کی سزا میں اس کو بھی قتل کر دیا جائے) الا یہ کہ مقتول کے ورثاء راضی ہو جائیں (یعنی اگر مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیں یا اس سے خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو اس کو قتل نہ کیا جائے) اس ہدایت نامہ میں یہ بھی تھا کہ (مقتول) عورت کے بدلے میں (قاتل) مرد کو قصاص میں قتل کیا جائے" اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ "جان کا خون بہا سو اونٹ ہیں (یعنی جس کے پاس اونٹ ہوں وہ خون بہا میں مذکورہ تفصیل کے مطابق سو اونٹ دے) اور جس کے پاس سونا ہو وہ ایک ہزار دینار دے، اور ناک کی دیت (جب کہ وہ سب توڑ دیے گئے ہوں) پوری دیت (یعنی ایک سو اونٹ کی تعداد) ہے اور ہونٹوں کی دیت (جب کہ وہ پورے کاٹ دیئے گئے ہوں) پوری دیت ہے اور دونوں خصیوں کے کاٹے جانے کی بھی پوری دیت ہے اور پیٹھ کی ہڈی توڑے جانے کی پوری دیت ہے اور عضو خاص کے کاٹے جانے کی بھی پوری دیت ہے اور دونوں آنکھوں کو پھوڑ دینے کی بھی پوری دیت ہے، اور ایک پیر کاٹنے پر آدھی دیت ہے، اور سر کی جلد زخمی کرنے پر تہائی دیت ہے اور پیٹ میں زخم پہنچانے پر بھی تہائی دیت ہے اور اس طرح مجروح کرنے پر کہ ہڈی اپنی جگہ سے سرک گئی ہو پندرہ اونٹ دینے واجب ہیں، اور ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں سے ہر ایک انگلی (کاٹنے) پر دس اونٹ دینے واجب ہیں، اور ہر ہر دانت کا بدلہ پانچ پانچ اونٹ ہیں۔ (نسائی، دارمی) اور امام مالکؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ایک آنکھ (پھوڑنے) کی دیت پچاس اونٹ ہیں، اور ایک ہاتھ اور ایک پیر کی دیت پچاس پچاس اونٹ ہیں اور ایسا زخم پہنچانے کی دیت جس میں ہڈی نکل آئی ہو یا ظاہر ہو گئی ہو پانچ اونٹ ہیں۔"

تشریح: "جان کا خون بہا سو اونٹ ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اگر قتل عمد کے مرتکب کو مقتول کے وارث قصاص میں قتل نہ کرنا چاہیں بلکہ اس سے دیت یعنی خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تب دیت واجب ہوگی لیکن قتل شبہ عمد اور قتل خطاء کا مرتکب سرے سے قصاص کا سزاوار ہوتا ہی نہیں بلکہ اس پر صرف دیت واجب ہوتی ہے۔ دیت اونٹ کے ذریعہ بھی ادا کی جاسکتی ہے اور جن کے پاس سونا ہو وہ ایک ہزار دینار اور جن کے پاس چاندی ہو وہ دس ہزار درہم کے ذریعہ بھی دیت کی ادائیگی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں قیاس پر اکتفا کرتے ہوئے چاندی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ اگر اونٹ اور سونے کے علاوہ وہ چاندی کے ذریعہ دیت دی جائے تو وہ مقبول و محسوب نہیں ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء اور قاتل کے درمیان جس چیز پر اتفاق ہو جائے اسی کو بطور دیت لیا دیا جائے جس کے پاس اونٹ ہوں اور وہ اونٹ دینا چاہے اس سے اونٹ لے لئے جائیں اور جو زر نقد دینا چاہے اس سے زر نقد لے لیا جائے۔

اس سلسلہ میں جہاں تک فقہی مسئلہ کا تعلق ہے تو درہم اور دینار کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا دیت میں درہم و دینار قبول کئے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ کا قول یہ ہے کہ اگر دینے والے کے پاس اونٹ موجود ہوں لیکن وہ زر نقد کی صورت میں دیت ادا کرنا چاہتا ہو تو اس سے زر نقد لینا جائز ہے لیکن حضرت شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اونٹوں کی موجودگی میں زر نقد دے کر اونٹوں سے عدول نہ کیا جائے ہاں اگر طرفین راضی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

"اور دونوں آنکھوں کو پھوڑنے کی بھی پوری دیت ہے" ملحوظ رہے کہ قطع اعضاء (اعضاء جسم کو کاٹنے یا نقصان پہنچانے) کی دیت کے سلسلہ میں اصل ضابطہ یہ ہے کہ اگر اعضاء جسم کی جنس منفعت بالکل ختم کر دی جائے یا ان کی موزونیت اور خوبصورتی کو بالکل زائل کر دیا جائے جو جسم انسانی میں مقصود ہے تو ایسی صورت میں پوری دیت واجب ہوتی ہے کیونکہ یہ ایک طرح کا جانی نقصان ہے جسے انسانی

عظمت کی وجہ سے مکمل جانی نقصان کا درجہ دیا جاتا ہے، اس سے بڑھ کر اصل یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان مخصوص اعضاء کی کہ جن کے نقصان سے انسان کے جمال و کمال میں فرق آجاتا ہے اور آدمی کی عظمت تخلیق مجروح ہوتی ہے، جیسے ناک، زبان اور آنکھیں وغیرہ ان کی پوری دیت دینے کا حکم فرمایا ہے، پھر اس اصل سے اور بہت سے فروعی مسائل کا استنباط کیا جاتا ہے۔ منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک ایسے شخص پر چار دیتیں واجب کی تھیں جس نے ایک شخص کو اگرچہ ایک ہی زخم پہنچایا تھا مگر اس ایک زخم کی وجہ سے اس کی عقل، اس کی سماعت، اس کی بصارت اور اس کی بول چال یعنی چاروں چیزیں زائل ہو گئی تھیں، نیز یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی داڑھی مونڈ ڈالے اور پھر وہ نکلے تو اس کی وجہ سے مونڈنے والے پر دیت لازم ہوگی کیونکہ اس نے اپنی اس حرکت سے چہرۂ انسانی کے جمال و موزونیت کو ختم کر دیا، اسی طرح سر کے بالوں کا بھی یہی مسئلہ ہے۔

(۷) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى الْمَوَاضِحِ خَمْسًا خَمْسًا مِنَ الْاِبِلِ وَفِى الْاَسْنَانِ خَمْسًا خَمْسًا مِنَ الْاِبِلِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِىُّ وَالدَّارِمِىُّ وَرَوَى التِّرْمِذِىُّ وَابْنُ مَاجَةَ الْفَصْلَ الْاَوَّلَ۔

"اور حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ ایسے زخموں کی دیت جس میں ہڈی ظاہر ہو جائے پانچ پانچ اونٹ ہیں اور دانتوں کی (یعنی ہر دانت) کی دیت بھی پانچ پانچ اونٹ ہیں۔ (ابوداؤد، نسائی، دارمی) ترمذی اور ابن ماجہ نے (اس حدیث کا) پہلا جزو (یعنی جس میں زخموں کی دیت بیان کی گئی ہے) نقل کیا ہے۔"

تشریح: اگر یہ سوال پیدا ہو کہ جب سب دانتوں کی پوری دیت سو اونٹ ہیں تو ایک دانت کی دیت پانچ اونٹ کیسے ہوئے کیونکہ سب دانتوں کی تعداد بتیس یا اٹھائیس ہوتی ہے اور اس کے اعتبار سے ایک دانت کی دیت تو کچھ زیادہ تین اونٹ ہونی چاہئے؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ شارع نے جتنے احکام نافذ کئے ہیں عقل ان سب کا ادراک و احاطہ کر لے، بہت سے احکام ایسے ہیں جن میں عقل کے دخل کا کام نہیں، چنانچہ یہ مسئلہ بھی ایسا ہی ہے کہ شارع کا بس یہ حکم دے دینا ہی کافی اور واجب العمل ہونے کی معقول ترین وجہ ہے، ہاں دیت ہی کے بارہ میں بعض صورتیں ایسی ہیں جو حکم شارع کے بھی مطابق ہیں اور عقلی بھی ہیں جیسے آنکھوں کی دیت کا معاملہ ہے کہ دونوں آنکھوں کی دیت پوری ہے اور ایک آنکھ کی دیت آدھی ہے حاصل یہ کہ ہر حکم اور ہر مسئلہ کی بنیاد بس شارع کا حکم ہے جو بھی حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا ہی عقل کا سب سے بڑا تقاضہ ہونا چاہئے۔

دیت کے اعتبار سے انگلیاں برابر ہیں

(۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصَابِعَ الْيَدَيْنِ وَالرِّجْلَيْنِ سَوَاءً۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کی سب انگلیوں کو مساوی قرار دیا ہے (یہاں تک کہ انگوٹھے اور چھنگلیا کو بھی ایک دوسرے کے برابر قرار دیا ہے، اگرچہ گانٹھوں کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے)۔" (ابوداؤد، ترمذی)

(۹) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاَصَابِعُ سَوَاءٌ وَالْاَسْنَانُ سَوَاءٌ الثَّنِيَّةُ وَالضِّرْسُ سَوَاءٌ هٰذِهٖ وَهٰذِهٖ سَوَاءٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (دیت کے اعتبار سے) تمام انگلیاں برابر ہیں اور تمام دانت برابر ہیں (اگرچہ بعض دانت بڑے ہیں اور بعض دانت چھوٹے ہیں) اور آگے کے دانت اور داڑھیں برابر ہیں (اگرچہ داڑھیں آگے کے دانتوں سے بڑی ہیں مگر دیت دونوں کی برابر ہے) نیز آپ نے انگوٹھے اور چھنگلیا کی طرف سے اشارہ کر کے بتایا کہ) یہ اور یہ برابر ہیں۔" (ابوداؤد)

ذمی کافر کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے

⑮ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفَتْحِ ثُمَّ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَاحِلْفَ فِي الْاِسْلَامِ وَمَا كَانَ مِنْ حِلْفٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَاِنَّ الْاِسْلَامَ لَا يَزِيْدُهٗ اِلَّا شِدَّةً الْمُؤْمِنُوْنَ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ يُجِيْرُ عَلَيْهِمْ اَدْنَاهُمْ وَيَرُدُّ عَلَيْهِمْ اَقْصَاهُمْ يَرُدُّ سَرَايَاهُمْ عَلٰى قَعِيْدَتِهِمْ لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ دِيَةُ الْكَافِرِ نِصْفُ دِيَةِ الْمُسْلِمِ لَا جَلَبَ وَلَا جَنَبَ وَلَا تُؤْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ اِلَّا فِيْ دُوْرِهِمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ دِيَةُ الْمُعَاهِدِ نِصْفُ دِيَةِ الْحُرِّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد (حضرت شعیبؒ) سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فتح مکہ کے سال ایک خطبہ دیا اور اس (میں حمد و ثناء) کے بعد فرمایا کہ "لوگو! اسلام میں قسم اور عہد و پیمان کرنا جائز نہیں ہے لیکن وہ عہد و قسم جس کا رواج زمانۂ جاہلیت میں تھا، اس کو اسلام مضبوطی سے قائم کرتا ہے (یاد رکھو) تمام مسلمان اپنے غیر (یعنی کفار) کے مقابلے پر (بھلائیوں کو پھیلانے اور آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہونے میں) ایک ہاتھ کی طرح ہیں ایک ادنی ترین مسلمان بھی تمام مسلمانوں کی طرف سے پناہ دے سکتا ہے، اور وہ مسلمان بھی حق رکھتا ہے جو سب مسلمانوں سے کہیں دور ہو اور مسلمانوں کا لشکر ان مسلمانوں کو بھی (مال غنیمت کا) حقدار بناتا ہے جو (لشکر کے ساتھ نہ گئے ہوں بلکہ) بیٹھے رہے ہوں، (خبردار) کوئی مسلمان کسی (حربی) کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے (امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ذمی کافر کے بدلے میں بھی مسلمان کو قتل نہ کیا جائے) اور (ذمی کافر کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے اور (زکوٰۃ وصول کرنے والے کارکن بطور خاص سن لیں کہ) زکوٰۃ کے مویشیوں کو نہ کھنچوا منگایا جائے اور (زکوٰۃ دینے والے بھی سن لیں کہ وہ) اپنے مویشیوں کو کہیں دور لے کر نہ چلے جائیں، (زکوٰۃ وصول کرنے والے کو چاہیئے کہ) زکوٰۃ ان کے گھروں پر ہی لی جائے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ "عہد والے کی دیت، آزاد کی دیت کا نصف ہے"۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: لَاحِلْفَ فِي الْاِسْلَامِ اصل میں "حلف" کے معنی ہیں "عقد کرنا، عہد باندھنا" زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے عہد و پیمان باندھ لیا کرتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے لڑائی جھگڑے کے موقع پر ایک دوسرے کی مدد کی جائے گی، اور اگر کسی معاملہ میں ایک پر کوئی تاوان واجب ہوگا تو دوسرا تاوان کو ادا کرے گا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اپنے ارشاد گرامی لا حلف فی الاسلام کے ذریعہ اس قسم کی عہد و پیمان سے منع کیا کہ یہ ایک خالص غیر منصفانہ اور غیر معقول رواج ہے جس کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن زمانۂ جاہلیت ہی میں عہد و پیمان کی ایک یہ بھی صورت ہوتی تھی کہ لوگ آپس میں اس بات کا عہد کرتے تھے کہ وہ مظلوم کی مدد کریں گے، قرابتداروں سے حسن سلوک کریں گے اور انسانی حقوق کی حفاظت و تائید کریں گے۔ یہ عہد و پیمان چونکہ سماجی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے باہمی محبت و موانست اور انسانی بہبود و بھلائی کے لئے ایک بہترین صورت تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے مَا كَانَ مِنْ حِلْفٍ الخ کے ذریعہ اس کو اسلام میں بھی جائز رکھا۔

يَرُدُّ سَرَايَاهُمْ عَلٰى قَعِيْدَتِهِمْ یہ دراصل پہلے جملہ وَيَرُدُّ عَلَيْهِمْ اَقْصَاهُمْ کا بیان اور وضاحت ہے، اس عبارت کی تشریح کتاب القصاص کی دوسری فصل میں حضرت علیؓ کی روایت کے تحت کی جا چکی ہے اسی طرح لا یقتل مؤمن بکافر کی وضاحت بھی اسی حدیث کے ضمن میں کی جا چکی ہے۔

"کافر کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے" یہ حضرت امام مالکؒ کے مسلک کی دلیل ہے، حضرت امام شافعیؒ اور ایک قول کے مطابق حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ کافر کی دیت، مسلمان کی دیت کا ثلث (یعنی تہائی) ہے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ کافر کی دیت، مسلمان کی طرح پوری دیت ہے۔ ملحوظ رہے کہ یہ ساری بحث ذمی کافر کے بارہ میں ہے حربی کافر کی کوئی دیت نہیں

ہے۔ ہدایہ میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ ہر ذمی کی جس سے اسلامی مملکت کا معاہدہ ہو، جب تک کہ وہ معاہدہ باقی ہے اس کی دیت ایک ہزار دینار ہیں۔" اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا عمل بھی اسی حدیث کے مطابق رہا ہے لیکن جب حضرت امیر معاویہؓ کا زمانہ آیا تو اس کو نصف کر دیا گیا۔ ہدایہ نے حضرت علیؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ذمی اسی لئے جزیہ دیتے ہیں کہ ان کا خون ہمارے خون کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح محفوظ و مامون ہے" گویا صاحب ہدایہ نے ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ اصل یہی ہے کہ ذمی کی دیت بھی مسلمان کی دیت کی طرح پوری ہو۔ چنانچہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ دوسرے صحابہ سے اس کے خلاف جو کچھ منقول ہے وہ ان مشہور و مستند ترین آثار و اقوال کے معارض نہیں ہو سکتا۔

لاجلب ولاجنب کے متعلق کتاب الزکوۃ میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے، یہاں بھی اجمالی طور پر اتنا سمجھ لیجئے کہ "جلب" کے معنی یہ ہیں کہ زکوۃ وصول کرنے والا مویشیوں کی زکوۃ لینے کے لئے جائے تو وہ کسی ایسی جگہ مقام کرے جو مویشیوں کے مالکوں کے مکانات سے دور ہو اور ان کو حکم دے کہ اپنے اپنے جانور لے کر اس کے پاس حاضر ہوں۔ "جنب" کے معنی یہ ہیں کہ مویشیوں کے مالک اپنے مویشی لے کر زکوۃ وصول کرنے والے کی قیام گاہ سے دور چلے جائیں اور اس سے کہیں کہ وہ ان کے پاس پہنچ کر زکوۃ کے مویشی حاصل کرے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا کیونکہ پہلی صورت میں مویشیوں کے مالکوں کو تکلیف ہوگی اور دوسری صورت میں زکوۃ وصول کرنے والا تکلیف و مشقت میں مبتلا ہوگا۔

لَا یُؤخَذُ صَدَقَاتُهُمْ الخ دراصل پہلے جملہ لاجلب ولاجنب کی توضیح وتاکید کے طور پر ہے۔

قتل خطاء کی دیت

(۱۱) وَعَنْ خِشْفِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ دِيَةِ الْخَطَاءِ عِشْرِيْنَ بِنْتَ مَخَاضٍ وَعِشْرِيْنَ ابْنَ مَخَاضٍ ذُكُوْرٍ وَعِشْرِيْنَ بِنْتَ لَبُوْنٍ وَعِشْرِيْنَ جِذْعَةً وَعِشْرِيْنَ حِقَّةً۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ مَوْقُوْفٌ عَلَى ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَخِشْفٌ مَجْهُوْلٌ لَا يُعْرَفُ اِلَّا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ وَرَوٰى فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدٰى قَتِيْلَ خَيْبَرَ بِمِائَةٍ مِنْ اِبِلِ الصَّدَقَةِ وَلَيْسَ فِيْ اَسْنَانِ اِبِلِ الصَّدَقَةِ ابْنُ مَخَاضٍ اِنَّمَا فِيْهَا ابْنُ لَبُوْنٍ۔

"اور حضرت خشف ابن مالکؒ، حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "رسول کریم ﷺ نے قتل خطاء کی دیت یہ مقرر فرمائی کہ بیس اونٹنیاں وہ ہوں جو دوسرے سال میں لگی ہوں اور بیس اونٹ وہ ہوں جو دوسرے سال میں لگے ہوں، اور بیس اونٹنیاں وہ ہوں جو تیسرے سال میں لگی ہوں اور بیس اونٹنیاں وہ ہوں جو پانچویں سال میں لگی ہوں۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) اس حدیث کے بارہ میں صحیح بات یہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ پر موقوف ہے یعنی ان کا اپنا قول ہے اور (اس کے راوی) خشف ایک غیر معروف راوی ہیں جو صرف اس حدیث کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں (یعنی اس کے علاوہ اور کوئی روایت ان سے منقول ہی نہیں) بغویؒ نے شرح السنۃ میں یوں نقل کیا ہے کہ "رسول کریم ﷺ نے اس شخص کی دیت میں کہ جو خیبر میں قتل کر دیا گیا تھا (اور جس کا تفصیلی واقعہ باب القسامت میں بیان ہوگا) زکوۃ میں آئے ہوئے اونٹوں میں سو اونٹ دیئے تھے اور زکوۃ کے ان اونٹوں میں کوئی اونٹ ایک سال کا نہیں تھا بلکہ دو دو سال کے تھے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قتل خطاء کی دیت میں جو سو اونٹ دیئے جائیں وہ پانچ طرح کے ہونے چاہئیں، چنانچہ اس بارہ میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن ان کی تقسیم میں البتہ اختلاف ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک میں تو وہ سو اونٹ اس طرح کے

دیئے جاتے ہیں جس طرح اس حدیث میں مذکور ہیں، لیکن امام شافعیؒ کے مسلک میں اتنا سا فرق ہے کہ بیس ابن مخاض (پورے ایک سال کے بیس اونٹ) کی بجائے بیس ابن لبون (پورے دو سال کے بیس اونٹ) ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ کے خلاف حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی دلیل ہے چنانچہ شوافع کی طرف سے اس حدیث میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا جواب ملا علی قاری نے بڑی عمدگی سے دیا ہے اہل علم ان کی کتاب "مرقات" میں دیکھ سکتے ہیں، ان کے جوابات کے خلاصہ کے طور پر یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ شخص کی جو دیت دی تھی وہ بطریق وجوب یا بطور حکم نہیں تھی بلکہ آپ ﷺ نے محض ازراہ احسان دی تھی۔

آخر میں بغویؒ کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس کا مقصود پہلی روایت کی تردید ہے جس میں ابن مخاض کا اثبات ہے اور بغوی کی روایت میں ابن لبون کا اثبات ہے اور گویا یہ حضرت امام شافعی کے مسلک کی دلیل ہے، ملا علی قاری نے اس کا جواب بھی بڑی عمدگی کے ساتھ لکھا ہے۔

دیت کی بنیاد اونٹ پر ہے

⑫ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ كَانَتْ قِيْمَةُ الدِّيَةِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَمَانِ مِائَةِ دِيْنَارٍ اَوْ ثَمَانِيَةَ اٰلَافِ دِرْهَمٍ وَدِيَةُ اَهْلِ الْكِتَابِ يَوْمَئِذٍ نِصْفٌ مِنْ دِيَةِ الْمُسْلِمِيْنَ قَالَ فَكَانَ كَذٰلِكَ حَتّٰى اُسْتُخْلِفَ عُمَرُ فَقَامَ خَطِيْبًا فَقَالَ اِنَّ الْاِبِلَ قَدْ غَلَتْ قَالَ فَفَرَضَهَا عُمَرُ عَلٰى اَهْلِ الذَّهَبِ اَلْفَ دِيْنَارٍ وَعَلٰى اَهْلِ الْوَرِقِ اِثْنَيْ عَشَرَ اَلْفًا وَعَلٰى اَهْلِ الْبَقَرِ مِائَتَيْ بَقَرَةٍ وَعَلٰى اَهْلِ الشَّاءِ اَلْفَيْ شَاةٍ وَعَلٰى اَهْلِ الْحُلَلِ مِائَتَيْ حُلَّةٍ قَالَ وَتَرَكَ دِيَةَ اَهْلِ الذِّمَّةِ لَمْ يَرْفَعْهَا فِيْمَا رَفَعَ مِنَ الدِّيَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے داداؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں دیت (دیت کے سو اونٹوں) کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی، نیز اس زمانہ میں اہل کتاب (یعنی عیسائی اور یہودی) کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف تھی۔ ان کے دادا کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے خلیفہ ہونے تک اسی کے مطابق عمل در آمد ہوتا رہا۔ چنانچہ عمرؓ (خلیفہ ہونے کے بعد) خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ "اونٹ کی قیمت بڑھ گئی ہے" راوی کا بیان ہے کہ (اس کے بعد) حضرت عمرؓ نے جو دیت مقرر کی تھی اس کی تفصیل یہ ہے، سونا رکھنے والوں پر ایک ہزار دینار، چاندی رکھنے والوں پر بارہ ہزار درہم، گائے کے مالکوں پر دو سو گائیں، بکری کے مالکوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے کے جوڑوں (کی تجارت کرنے) والوں پر دو سو جوڑے۔ راوی نے کہا کہ "حضرت عمرؓ نے ذمیوں کی دیت جوں کی توں قائم رکھی تھی (یعنی آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ذمیوں کی دیت چار ہزار درہم تھی حضرت عمرؓ نے اسی کو برقرار رکھا) اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جیسا کہ اور دیتوں میں اضافہ ہوا۔" (ابوداؤد)

تشریح: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ دیت کی بنیاد اونٹ پر ہے، چنانچہ دیت میں سونا اور چاندی کی جو مقدار بیان کی گئی ہے وہ اس زمانہ میں سو اونٹ کی قیمت کا حساب لگا کر بیان کی گئی تھی، اسی لئے قول جدید کے مطابق شافعی مسلک یہ ہے کہ اختلاف قیمت کے اعتبار سے ان دونوں کی مقدار میں فرق ہو سکتا ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ کپڑے کے جوڑے سے مراد ایک تہبند اور ایک چادر ہے۔

"اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا الخ" کے بارہ میں طیبیؒ کہتے ہیں کہ جب مسلمان کی دیت بارہ ہزار درہم مقرر ہوئی اور ذمی کی دیت وہی رہی جو پہلے تھی یعنی چار ہزار درہم تو اس اعتبار سے ایک ذمی کی دیت، ایک مسلمان کی دیت کا ثلث (تہائی) ہوئی۔

چنانچہ اس سے شوافع اور ان کے ہمنوا یہ استدلال کرتے ہیں کہ ذمی کی دیت، مسلمان کی دیت کا ثلث ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک میں ذمی کی وہی دیت ہے جو مسلمان کی ہے۔

شمنیؒ نے کہا ہے کہ (اس بارہ میں جو فقہی مسئلہ ہے اور جس پر عمل ہے وہ یہ ہے کہ) سونے کی دیت ایک ہزار دینار، چاندی کی دیت دس ہزار درہم اور اونٹ کی دیت سو اونٹ ہیں لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک چاندی کی دیت بارہ ہزار درہم ہیں۔

امام شافعی کی مستدل حدیث

⑬ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهُ جَعَلَ الدِّيَةَ اِثْنَى عَشَرَ اَلْفًا۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے بارہ ہزار درہم کی دیت مقرر فرمائی۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، دارمی)

دیت مقتول کے ورثاء کا حق ہے

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَوِّمُ دِيَةَ الْخَطَاءِ عَلٰى اَهْلِ الْقُرٰى اَرْبَعَ مِائَةِ دِيْنَارٍ اَوْ عِدْلَهَا مِنَ الْوَرِقِ وَيُقَوِّمُهَا عَلٰى اَثْمَانِ الْاِبِلِ فَاِذَا غَلَتْ رَفَعَ فِيْ قِيْمَتِهَا وَاِذَا هَاجَتْ رُخْصٌ نَقَصَ مِنْ قِيْمَتِهَا وَبَلَغَتْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَيْنَ اَرْبَعِ مِائَةِ دِيْنَارٍ اِلٰى ثَمَانِ مِائَةِ دِيْنَارٍ وَعِدْلُهَا مِنَ الْوَرِقِ ثَمَانِيَةُ الْاٰفِ دِرْهَمٍ قَالَ وَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَهْلِ الْبَقَرِ مِائَتَىْ بَقَرَةٍ وَعَلٰى اَهْلِ الشَّاءِ اَلْفَىْ شَاةٍ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَقْلَ مِيْرَاثٌ بَيْنَ وَرَثَةِ الْقَتِيْلِ وَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ عَقْلَ الْمَرْاَةِ بَيْنَ عَصَبَتِهَا وَلَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ بستیوں والوں پر قتل خطاء کی دیت چار سو دینار یا اس کے مساوی قیمت (یعنی چاندی کے چار ہزار درہم) مقرر فرماتے اور یہ مقدار اونٹوں کی قیمت کے مطابق ہوتی تھی۔ چنانچہ جب اونٹوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا تو آپ ﷺ دیت کی مقدار میں بھی اضافہ کرتے تھے اور جب اونٹوں کی قیمت میں کمی واقع ہوتی تو آپ ﷺ دیت کی مقدار میں بھی کمی کر دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں دیت کی مقدار چار سو دینار سے آٹھ سو دینار یا اس کی مساوی قیمت (چاندی کے آٹھ ہزار درہم) تک رہی۔ راوی کہتے ہیں کہ "اور رسول کریم ﷺ نے گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکری والوں پر دو ہزار بکریاں (بطور دیت) مقرر فرمائی تھیں۔ نیز رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ دیت کا مال مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "عورت کی دیت اس کے عصبات پر ہے اور قاتل (نے اگر اپنے مورث ہی کو قتل کیا ہے تو وہ) مورث کی وراثت سے محروم رہے گا (نہ اسے مقتول کی دیت میں سے کوئی حصہ ملے گا اور نہ وہ اس کے ترکے میں سے کسی چیز کا حقدار ہوگا)۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دیت کی بنیاد اونٹ پر ہے یعنی دیت اصل میں تو اونٹ ہی کی صورت میں اور اس کی مذکورہ تعداد میں واجب ہوگی جیسا کہ قول جدید کے مطابق امام شافعی کا مسلک ہے۔

"عورت کی دیت اس کے عصبات پر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی عورت جنایت کی مرتکب ہوئی اور اس نے کسی کو مارا تو اس کی دیت اس کے عصبات یعنی اس کے مددگار اور خاندان والوں پر ہوگی جیسا کہ مرد کے بارے میں حکم ہے گویا یہاں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس بارہ میں عورت غلام کے مانند نہیں ہوگی کہ جس طرح غلام کی دیت خود اس پر واجب ہوتی ہے اس کے عصبات پر واجب نہیں ہوتی۔ اس طرح عورت کی دیت خود اس پر واجب نہیں ہوگی بلکہ اس کے عصبات پر واجب ہوگی۔

قتل شبہ عمد کے مرتکب کو سزائے موت نہیں دی جا سکتی

⑮ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عَقْلُ شِبْهِ الْعَمَدِ مُغَلَّظٌ مِثْلُ عَقْلِ

الْعَمَدِ وَلَا يُقْتَلُ صَاحِبُهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنی والدہ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "قتل شبہ عمد کی دیت قتل عمد کی دیت کی طرح سخت ہے لیکن شبہ عمد کے مرتکب کو قتل نہ کیا جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی کو بطریق شبہ عمد قتل کیا تو اس کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا! یہ بات اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمائی گئی ہے کہ حدیث کے پہلے جملہ کے مطابق قتل شبہ عمد کا مرتکب قتل عمد کے مرتکب کے مشابہ ہو تو چاہئے کہ جس طرح قتل عمد کے مرتکب کو سزاء موت دی جاتی ہے اسی طرح شبہ عمد کا مرتکب بھی سزاء موت کا مستوجب ہو لہٰذا اس شبہ کو دور کر دیا گیا کہ اس مشابہت کا یہ مطلب قطعًا نہیں ہے کہ اس کو قصاص میں قتل بھی کیا جائے۔

زخم خوردہ آنکھ کی دیت

(۱۶) وَعَنْهُ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْعَيْنِ الْقَائِمَةِ السَّادَّةِ لِمَكَانِهَا بِثُلُثِ الدِّيَةِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایسی آنکھ کے بارے میں کہ جو (زخمی ہونے کے بعد) اپنی جگہ باقی رہے لیکن روشنی سے محروم ہو جائے یہ حکم فرمایا کہ اس کی دیت (پوری دیت کا) ثلث (تہائی) ہے۔"

(ابوداؤد، نسائی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی آنکھ کو زخم پہنچایا گیا اور اس کی وجہ سے روشنی جاتی رہی مگر آنکھ اپنی جگہ سے باہر نہیں آئی اور اس کے چہرہ کو موزونیت و جمال میں کوئی خلل نہیں پڑا تو زخم پہنچانے والے پر تہائی دیت واجب ہوگی اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ دونوں آنکھ کے تلف ہو جانے کی صورت میں پوری دیت (کہ جس کی مقدار سو اونٹ ہے) واجب ہوگی اور اگر ایک آنکھ تلف ہوگی تو نصف دیت واجب ہوگی۔

اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں زخم خوردہ آنکھ کی دیت تہائی ہے اور بعض علماء کا مسلک بھی یہی ہے لیکن بعض علماء اس صورت میں عدل کی "حکومت" کو واجب قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ زخم پہنچانے کی یہ وہ صورت ہے جس میں منفعت بالکلیہ زائل نہیں ہوئی لہٰذا اس کی دیت بھی اس شخص کی ہونی چاہئے جس کو مارا گیا ہو اور اس مار کی وجہ سے (نہ تو اس کا کوئی عضو تلف ہوا ہو، اور نہ کوئی زخم پہنچا ہو) بلکہ اس کے بدن کا رنگ سیاہ ہو گیا ہو۔

"حکومت" دیت کے بارے میں ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ فرض کیجئے جو شخص زخمی ہوا ہے اگر وہ غلام ہوتا تو اس زخم کی وجہ سے اس کی قیمت میں سے کسی قدر کمی واقع ہو جاتی پس اسی قدر اس شخص کی دیت زخمی کرنے والے پر واجب ہوگی لہٰذا بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث "حکومت" پر محمول ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے یہاں تہائی دیت کا جو حکم فرمایا ہے وہ بطریق حکومت ہے نہ بطریق قاعدہ کلیہ۔

تورپشتیؒ نے اس حدیث کے سلسلہ میں جو بحث کی ہے وہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس حدیث کی صحت میں کلام ہے۔

پیٹ کے بچہ کی دیت

(۱۷) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْجَنِيْنِ بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ اَوْ فَرَسٍ اَوْ بَغْلٍ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ رَوٰى هٰذَا الْحَدِيْثَ حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ وَخَالِدُ الْوَاسِطِيُّ عَنْ مُحَمَّدٍ

بْنِ عَمْرٍو وَلَمْ يَذْكُرْ اَوْ فَرَسٍ اَوْ بَغْلٍ۔

"اور حضرت محمد ابن عمرو، حضرت ابوسلمہ سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (حاملہ کے) پیٹ کے بچہ کا خون بہا غرہ مقرر فرمایا۔ اور غرہ سے مراد ایک لونڈی یا ایک غلام یا ایک گھوڑا یا ایک خچر ہے۔ ابوداؤدؒ نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس روایت کو حماد ابن سلمہ اور خالد واسطی نے محمد ابن عمرو سے نقل کیا ہے لیکن ان دونوں میں سے کسی نے بھی لفظ فرس اور بغل (یعنی گھوڑا اور خچر) ذکر نہیں کیا ہے (لہٰذا اس روایت میں فرس اور بغل کا اضافہ شاذ ہے اور بایں اعتبار یہ حدیث ضعیف ہے)۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ یوں تو "غرہ" نہایت نفیس چیز کو کہتے ہیں لیکن اس باب میں اس لفظ کا اطلاق "انسان" پر بایں طور اعتبار کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اس حدیث میں "غرہ" کے مفہوم میں "فرس اور بغل" کو شامل کرنا راوی کا اپنا وہم ہے۔ کیونکہ غرہ کا اطلاق صرف اس انسان پر ہوتا ہے جو کسی کا مملوک ہو یعنی غلام یا لونڈی۔

جعلی طبیب اگر کسی کی موت کا باعث بنے تو وہ ضامن ہوگا

⑱ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَطَبَّبَ وَلَمْ يُعْلَمْ مِنْهُ طِبٌّ فَهُوَ ضَامِنٌ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے آپ کو طبیب ظاہر کرے درآنحالیکہ اس کا طبیب ہونا معلوم نہ ہو (یعنی وہ فن طب میں کوئی مہارت نہ رکھتا ہو) اور پھر کوئی اس کے ہاتھ سے مر گیا۔ تو وہ ضامن ہوگا۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص علم طب سے کورا ہو اور اس کے قواعد و فن سے واقفیت نہ رکھتا ہو اس کے باوجود وہ کسی مریض کا علاج کرے اور علاج خواہ ہاتھ کے ذریعہ کرے جیسے فصد کھولے یا آپریشن وغیرہ کرے اور خواہ کرنے کے ذریعہ کرے تو اگر وہ مریض مر جائے گا تو متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک وہ جعلی حکیم یا ڈاکٹر ضامن ہوگا۔ یعنی اس کی دیت اس کے عاقلہ پر واجب ہوگی مگر اس کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ بہرحال خود اس مریض کی اجازت اور اس کی رضامندی ہی سے اس نے اس کا علاج کیا ہوگا۔

دیت کی معافی کا ایک واقعہ

⑲ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ غُلَامًا لِاُنَاسٍ فُقَرَاءَ قَطَعَ اُذُنَ غُلَامٍ لِاُنَاسٍ اَغْنِيَاءَ فَاَتٰى اَهْلُهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا اِنَّا اُنَاسٌ فُقَرَاءُ فَلَمْ يَجْعَلْ عَلَيْهِمْ شَيْئًا۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عمرانؓ ابن حصین کہتے ہیں کہ ایک لڑکے نے جو مفلس خاندان سے تعلق رکھتا تھا، ایک ایسے لڑکے کا کان کاٹ ڈالا جو ایک دولت مند خاندان سے تھا، چنانچہ جس لڑکے نے کان کاٹا تھا، اس کے خاندان والے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم محتاج و مفلس ہیں (لہٰذا ہم پر دیت مقرر نہ کی جائے) رسول کریم ﷺ نے (ان کی درخواست منظور کرتے ہوئے) ان پر کوئی چیز مقرر نہیں فرمائی۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: اگر کسی لڑکے سے کوئی جنایت (یعنی کسی کو کوئی نقصان یا تکلیف پہنچانے کا کوئی قصور) سرزد ہو جائے تو "اختیار صحیح" کے فقدان کی وجہ سے وہ جنایت خطائی کے حکم میں ہوتی ہے اور اس کا تاوان لڑکے کے عاقلہ (یعنی اس کے خاندان و برادری والوں) پر واجب ہوتا ہے۔

اس لئے اگر کوئی لڑکا کسی شخص کو قتل کر دے تو اس کو قصاص میں قتل نہیں کیا جاتا۔ حدیث میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس میں قاعدہ کے اعتبار سے لڑکے کے عاقلہ پر تاوان واجب ہونا چاہئے تھا لیکن لڑکے کے عاقلہ چونکہ غریب و مفلس تھے اور غریب و مفلس کسی تاوان کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے رسول کریم ﷺ نے کان کاٹنے والے لڑکے کے خاندان والوں پر کوئی دیت واجب نہیں فرمائی۔

حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس لڑکے نے کان کاٹا تھا وہ "آزاد" تھا کیونکہ وہ غلام ہوتا تو اس کی جنایت و دیت خود اس کی ذات کے ساتھ متعلق کی جاتی اور اس کے مالکوں کا فقیر و مفلس ہونا اس کے وجوب کو اس کی ذات سے ختم نہ کرتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قتل شبہ عمد اور قتل خطاء کی دیت

(۲۰) عَنْ عَلِيٍّ اَنَّهٗ قَالَ دِيَةُ شِبْهِ الْعَمَدِ اَثْلَاثًا ثَلَاثٌ وَّثَلَاثُوْنَ حِقَّةً وَّثَلَاثٌ وَّثَلَاثُوْنَ جَذَعَةً وَاَرْبَعٌ وَّثَلَاثُوْنَ ثَنِيَّةً اِلٰی بَازِلِ عَامِهَا كُلُّهَا خَلِفَاتٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ فِي الْخَطَاءِ اَرْبَاعًا خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ حِقَّةً وَخَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ جَذَعَةً وَخَمْسٌ وَعِشْرُوْنَ بَنَاتُ لَبُوْنٍ وَخَمْسٌ وَعِشْرُوْنَ بَنَاتُ مَخَاضٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا قتل شبہ عمد کی دیت میں (سو) اونٹنیاں دینی واجب ہیں بایں تفصیل تینتیس اونٹنیاں وہ ہوں جو چوتھے برس میں لگی ہوں اور تینتیس اونٹنیاں وہ ہوں جو پانچویں برس میں لگی ہوں اور چونتیس اونٹنیاں وہ جو چھٹے برس میں ہی ہوں آٹھ برس تک وہ جو نویں برس میں لگی ہوں اور سب حاملہ ہوں۔ ایک اور روایت میں حضرت علیؓ سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا قتل خطاء کی دیت میں چار طرح کی (سو) اونٹنیاں دینی واجب ہیں، بایں تفصیل کہ پچیس وہ ہوں جو تین تین برس کی ہوں اور پچیس وہ ہوں جو چار چار برس کی ہوں اور پچیس وہ ہوں جو دو دو برس کی ہوں اور پچیس وہ ہوں جو ایک ایک برس کی ہوں۔" (ابوداؤد)

(۲۱) وَعَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ قَضٰی عُمَرُ فِيْ شِبْهِ الْعَمَدِ ثَلَاثِيْنَ حِقَّةً وَّثَلَاثِيْنَ جَذَعَةً وَّاَرْبَعِيْنَ خَلِفَةً مَا بَيْنَ ثَنِيَّةِ اِلٰی بَازِلِ عَامِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مجاہدؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے قتل شبہ عمد کی دیت میں تیس اونٹنیاں تین تین برس کی اور تیس اونٹنیاں چار چار برس کی اور چالیس اونٹنیاں حاملہ جو پانچ برس کی ہوں دینے کا حکم فرمایا۔ (گویا یہ روایت حضرت امام شافعی کے مسلک کے موافق ہے)۔"

(ابوداؤد)

پیٹ کے بچہ کی دیت

(۲۲) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰی فِي الْجَنِيْنِ يُقْتَلُ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ وَلِيْدَةٍ فَقَالَ الَّذِيْ قُضِيَ عَلَيْهِ كَيْفَ اَغْرَمُ مَنْ لَّا شَرِبَ وَلَا اَكَلَ وَلَا نَطَقَ وَلَا اسْتَهَلَّ وَمِثْلُ ذٰلِكَ يُطَلُّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا هٰذَا مِنْ اِخْوَانِ الْكُهَّانِ رَوَاهُ مَالِكٌ وَالنَّسَائِيُّ مُرْسَلًا وَرَوَاهُ اَبُوْ دَاؤدَ عَنْهُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ مُتَّصِلًا۔

"اور حضرت سعید ابن مسیب کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے پیٹ کے اس بچہ کی دیت جو مارا جائے ایک غرہ یعنی ایک غلام یا ایک لونڈی مقرر فرمائی۔ "جس شخص پر یہ دیت واجب کی گئی تھی اس نے عرض کیا کہ میں اس شخص کا تاوان کس طرح بھروں جس نے کوئی چیز پی اور نہ کھائی ہو اور نہ بولا نہ چلایا، اس قسم کا قتل تو ساقط کیا جاتا ہے" رسول کریم ﷺ نے (اس شخص کی یہ بات سن کر حاضرین سے) فرمایا کہ "اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے کہ یہ شخص کاہنوں کا بھائی ہے"۔ (امام مالکؒ اور امام نسائیؒ نے تو اس روایت کو بطریق ارسال (یعنی راوی

صحابی کا ذکر کئے بغیر نقل کیا ہے لیکن ابوداؤد نے حضرت سعیدؓ سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے بطریق اتصال نقل کیا ہے۔"

تشریح: "کاہن" اس شخص کو کہتے ہیں جو غیب دانی کا دعوی کرتا ہے اور لوگوں کی غیب کی باتیں بتاتا ہے اور وہ لوگوں کو فریفتہ کرنے کے لئے اپنی جھوٹی اور غلط سلط باتوں کو مسجع اور مقفّی عبارتوں کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ حدیث میں مذکورہ شخص نے بھی چونکہ اپنے ایک غلط خیال کو بڑے مسجع اور مقفّی الفاظ کے ذریعہ پیش کیا تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس مناسبت سے اس کو کاہنوں کا بھائی فرمایا ورنہ تو جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے مطلق مسجع و مقفّی عبارتیں بذات خود مذموم نہیں ہیں بلکہ انسان کے کلام کی فصاحت وبلاغت اور قابلیت کا پر تو ہوتی ہیں چنانچہ خود رسول کریم ﷺ کا انداز بیان اور آپ کا کلام بڑی مسجع و مقفّی عبارتوں سے مزین ہوتا تھا۔ بطور خاص آپ سے جو دعائیں منقول ہیں ان کے الفاظ کی جامعیت مسجع و مقفّی عبارتوں کی بہترین مثال ہیں جیسے یہ دعا ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا یَخْشَعُ الخ اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ ہو اور اس قلب سے جو ترساں نہ ہو الخ حاصل یہ کہ وہ مسجع عبارت مذموم ہے جو بہ تکلف زبان و قلم سے ادا ہو اور جس کا مقصد باطل کو رواج دینا ہو جیسا کہ مذکورہ شخص نے کہا۔

شمنیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں مذکورہ مسئلہ کے بارے میں فقہی مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی حاملہ کے پیٹ پر مارے اور اس کی وجہ سے اس کے پیٹ کا بچہ مردہ ہو کر باہر آجائے تو اس کی دیت میں غرہ یعنی پانچ سو درہم مارنے والے کے عاقلہ پر واجب ہوں گے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے "غرہ" سے مراد پانچ سو درہم لئے ہیں اور وہ اس لئے کہ اکثر روایتوں میں غرہ کی توضیح یہی کی گئی ہے اور اگر حاملہ کے پیٹ مارنے کی وجہ سے زندہ بچہ باہر آجائے اور پھر مرجائے تو اس صورت میں پوری دیت واجب ہوگی۔

بَابُ مَالَا یُضْمَنُ مِنَ الْجِنَایَاتِ

جنایات کی جن صورتوں میں تاوان واجب نہیں ہوتا ان کا بیان

"جنایات" جمع ہے جنایت کی۔ جنایت کے معنی ہیں "قصور کرنا، جرم کرنا" اس سے قبل وہ ابواب گزرے ہیں جن میں جنایات کی سزائیں تاوان اور قصاص وغیرہ کے سلسلہ میں احادیث گزری ہیں، اس باب کا مقصد جنایات کی ان صورتوں کو بیان کرنا ہے جن میں معاوضہ اور تاوان واجب نہیں ہوتا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جانور کے مارنے، کان میں دب جانے اور کنویں میں گر پڑنے کا کوئی تاوان نہیں

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْعَجْمَاءُ جُرْحُهَا جُبَارٌ وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ وَالْبِئْرُ جُبَارٌ۔ (متفق علیه)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (چوپایوں کا زخمی کر دینا معاف ہے، کان میں دب جانا بھی معاف ہے، اور کنویں میں گر پڑنا بھی معاف ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اگر کسی کا جانور کسی آدمی کو اپنے پاؤں سے روندے یا کسی کو سینگ یا دم مار کر یا منہ سے کاٹ کر زخمی کردے اور وہ آدمی مرجائے یا جو جانور کسی چیز کو نقصان وضائع کردے تو اس کا کوئی تاوان نہیں ہے بشرطیکہ اس جانور کے ساتھ کوئی آدمی نہ ہو، ہاں اگر جانور کے ساتھ کوئی ہانکنے والا یا کھینچنے والا یا اس جانور پر کوئی سوار ہو اور اس جانور سے کوئی چیز ضائع ہوگئی ہو تو اس صورت میں اس جانور کے ساتھ جو بھی آدمی ہوگا اس پر تاوان واجب ہوگا۔ یہ حضرت امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے۔

اس بارہ میں حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر جانور نے دن میں کسی چیز کو ضائع کیا ہے تو اس کے مالک پر کوئی تاوان وغیرہ واجب نہیں ہوگا لیکن اگر جانور نے رات میں کسی چیز کو ضائع کیا ہے مثلاً کسی کا کھیت چر گیا یا کسی کے باغ کو نقصان پہنچایا تو اس صورت میں جانور کے مالک پر تاوان واجب ہوگا کیونکہ رات میں جانوروں کی نگہبانی ان کے مالکوں پر لازم ہے اور دن میں اپنے کھیت و باغات اور دوسری چیزوں کی حفاظت کرنا ان کے مالکوں پر لازم ہے۔

ہدایہ میں لکھا ہے کہ (جانور سے کسی چیز کا نقصان ہو جانے کی صورت میں) جانور کو ہانکنے والے پر اسی چیز کا تاوان واجب ہوگا جو جانور کے ہاتھوں اور پیروں کے ذریعہ تلف ہوئی ہے، اور جو شخص جانور کو پکڑ کر کھینچتا ہوا لے جا رہا ہو وہ اس چیز کے تاوان کا ذمہ دار ہوگا جو جانور کے پیروں کے ذریعہ نہیں بلکہ صرف ہاتھوں کے ذریعہ نقصان ہوئی ہے، اور اگر کسی ایسے جانور نے کسی چیز کو ضائع کیا ہے جس پر کوئی شخص سوار ہو تو اس سوار پر اس چیز کا تاوان واجب ہوگا جو اس جانور کے ہاتھ یا پیر یا سر کے ذریعہ تلف ہوئی ہے۔ نیز اگر نقصان کرنے والا کوئی جانور ہو جس کے ساتھ اس کو ہانکنے والا بھی ہو اور اس پر کوئی سوار بھی ہو اس کو کھینچنے والا بھی ہو (یا) اس پر کوئی سوار بھی ہو تو اس نقصان کا تاوان دونوں پر واجب ہوگا۔

"کان میں دب جانا معاف ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کھدی ہوئی کان میں جائے یا اس کے اوپر کھڑا ہو اور پھر کان میں بیٹھ جائے جس کی وجہ سے وہ شخص ہلاک ہو جائے تو اس شخص پر کوئی تاوان واجب نہیں ہوگا جس نے کان کھودی ہے یا کسی مزدور کو کان کھودنے کے لئے اجرت پر لگایا اور اتفاق سے وہ مزدور کان میں دب کر مر گیا تو کان کے مالک پر کوئی تاوان واجب نہیں ہوگا یہ دوسری نوعیت صرف کان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ حکم اجارہ (مزدوری) کی دیگر صورتوں میں بھی نافذ ہوگا جب کہ پہلی نوعیت صرف اس صورت سے متعلق ہے جو حدیث کے آخری جزو والبئر جبار (کنویں میں گر پڑنا معاف ہے) کے مطابق ہو چنانچہ "کنویں میں گر پڑنا معاف ہے" کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص نے اپنی زمین یا کسی اور مباح زمین میں کنواں کھودا اور پھر اس میں کوئی شخص گر کر مر گیا تو کنواں کھودنے والے پر کوئی تاوان واجب نہیں ہوگا۔

مدافعت میں کوئی تاوان واجب نہیں ہوتا

(۴) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ اُمَيَّةَ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَيْشَ الْعُسْرَةِ وَكَانَ لِي اَجِيْرٌ فَقَاتَلَ اِنْسَانًا فَعَضَّ اَحَدُهُمَا يَدَ الْاٰخَرِ فَانْتَزَعَ الْمَعْضُوْضُ يَدَهُ مِنْ فِي الْعَاضِّ فَاَنْدَرَ ثَنِيَّتَهُ فَسَقَطَتْ فَانْطَلَقَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَهْدَرَ ثَنِيَّتَهُ وَقَالَ اَيَدَعُ يَدَهُ فِيْ فِيْكَ تَقْضَمُهَا كَالْفَحْلِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت یعلی ابن امیہ کہتے ہیں کہ (غزوہ تبوک کے) صبر آزما لشکر کے ساتھ رسول کریم ﷺ کے ہمراہ (جہاد میں) شریک تھا، میرے ساتھ ایک نوکر بھی تھا، چنانچہ وہ (کسی بات پر) ایک شخص سے لڑ پڑا اور ان دونوں میں سے ایک نے دوسرے کا ہاتھ کاٹ کھایا مگر اس نے اپنا ہاتھ کاٹنے والے کے منہ سے (اس طرح) کھینچا کہ اس کے دانت جھڑ کر گر پڑے۔ وہ شخص کہ جس کے دانت گر پڑے تھے (دادرسی کے لئے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (تاکہ آپ ﷺ اس کے حق میں فیصلہ کریں) لیکن آپ ﷺ نے اس کے دانتوں کا کوئی تاوان واجب نہیں کیا اور اس سے فرمایا کہ وہ شخص اپنا ہاتھ تمہارے منہ میں چھوڑ دیتا تاکہ اس کو اسی طرح چباتے رہتے جس طرح اونٹ چباتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "کیا وہ شخص اپنا ہاتھ تمہارے منہ میں چھوڑ دیتا الخ" اس ارشاد کے ذریعہ آپ ﷺ نے اس کے دانتوں کا تاوان واجب نہ کرنے کے سبب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس شخص کی وجہ سے تمہارے دانت ٹوٹ کر گرے ہیں وہ اس مدافعتی کاروائی پر مجبور تھا کہ اس نے دراصل اپنا ہاتھ بچانے کے لئے تمہارے منہ سے کھینچا۔ شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اسی طرح اگر کوئی مرد کسی عورت سے بدکاری

کرنا چاہے اور وہ عورت اپنی آبرو بچانے کے لئے اس پر حملہ کرے جس کے نتیجہ میں وہ مرد ہلاک ہو جائے تو اس کی وجہ سے عورت پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ چنانچہ منقول ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس یہ مقدمہ آیا کہ ایک لڑکی (کہیں جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہی تھی کہ ایک شخص نے اس کا پیچھا کیا اور اس سے منہ کالا کرنا چاہا، لڑکی نے اپنی آبرو خطرہ میں دیکھ کر ایک پتھر اٹھایا اور اس شخص کے کھینچ مارا جس سے وہ مر گیا، حضرت عمرؓ نے اس کے بارے میں یہ فیصلہ دیا کہ "یہ قتل (حقیقت میں) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے (کہ اس نے اس شخص کو سزا دے کر ایک پاک دامن لڑکی کی عصمت کو محفوظ رکھا) لہٰذا خدا کی قسم اس کی کوئی دیت نہیں دلوائی جائے گی" حضرت امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کا مال لوٹنے، خوں ریزی کرنے اور اس کے گھر والوں کو تباہ و برباد کرنے کا ارادہ کرے تو اس قسم کا ارادہ کرنے والے اور قتل کرنے والے کی مدافعت کرنا جائز ہے، لہٰذا پہلے تو یہ چاہئے کہ ایسے شخص کو انسانیت کے ساتھ اس کے ارادہ و فعل سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے لیکن اگر وہ اپنے ارادہ قتل و قتال سے باز نہ آئے اور اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اس کو مار ڈالا جائے تو اس کا خون معاف ہوگا۔

اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جانے والا شہید ہے

(۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنے مال کے لئے مارا جائے تو وہ شہید ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مال و اسباب کی حفاظت کر رہا تھا کہ کسی نے اس کو قتل کر دیا تو وہ شہید ہے یہی حکم اس شخص کے بارہ میں ہے جو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے۔

(۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِنْ جَاءَ رَجُلٌ يُرِيْدُ اَخْذَ مَالِيْ قَالَ فَلَا تُعْطِهٖ مَالَكَ قَالَ اَرَأَيْتَ اِنْ قَاتَلَنِيْ قَالَ قَاتِلْهُ قَالَ اَرَأَيْتَ اِنْ قَتَلَنِيْ قَالَ فَاَنْتَ شَهِيْدٌ قَالَ اَرَأَيْتَ اِنْ قَتَلْتُهٗ قَالَ هُوَ فِي النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے (جناب رسالت مآب میں حاضر ہو کر) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مجھے بتائیے اگر کوئی شخص میرے پاس میرا مال (زبردستی) لینے آئے (تو کیا میں اپنا مال اس کے حوالے کر دوں؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "نہیں تم اس کو اپنا مال نہ دو" اس نے عرض کیا "یہ بتائیے اگر وہ مجھ سے لڑ پڑے (تو کیا کروں) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تم بھی اس سے لڑو" اس نے عرض کیا "بتائیے اگر اس نے مجھے مار ڈالا آپ نے فرمایا تم شہید ہو گے دریافت کیا اگر وہ مر جائے (تو اس کا کیا حشر ہو گا؟) آپ ﷺ نے فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا (اور تم پر اس کا کوئی وبال نہیں ہو گا)۔" (مسلم)

تشریح: یہ حدیث مسلمانوں کو اپنی جان و مال اور عزت و آبرو بچانے کے لئے حملہ آور کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی تلقین کرتی ہے اور اللہ کے نام لیواؤں کے شعور یہ احساس جاگزیں کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ وہ کسی بھی ایسے شخص کے مقابلہ میں کم ہمتی اور بزدلی کا ثبوت دے جو اس کے مال کو لوٹنا چاہتا ہے اور اس کی زندگی کو تباہ و برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ بلکہ ایک مسلمان کو ایمان و یقین اور اعتماد علی اللہ کی جو طاقت حاصل ہوتی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حملہ آور اور فسادی کا پوری مردانگی سے مقابلہ کرے اور ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دے کر شہادت کا مرتبہ حاصل کرے یا اس حملہ آور فسادی کو ختم کر کے اس کو جہنم رسید کر دے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر قاتل و فسادی مسلمان بھی ہو تو اس کی مدافعت کرنا اور اس مدافعت میں اس کو ہلاک کر دینا مباح ہے۔

گھر میں جھانکنے والے کو زخمی کر دینا معاف ہے

⑤ وَعَنْهُ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَوِ اطَّلَعَ فِيْ بَيْتِكَ اَحَدٌ وَلَمْ تَاْذَنْ لَهُ فَخَذَفْتَهُ بِحَصَاةٍ فَفَقَأْتَ عَيْنَهُ مَا كَانَ عَلَيْكَ مِنْ جُنَاحٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اگر (تمہارا دروازہ بند ہو اور اس کی دراز میں سے) کوئی شخص تمہارے گھر میں جھانکے درانحالیکہ تم نے اس کو (گھر میں آنے کی) اجازت نہیں دے رکھی ہے اور تم اس کے کنکری مارو اور اس کنکری سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تم پر کوئی گناہ (تاوان) نہیں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: امام شافعیؒ نے اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے ایسے شخص پر سے آنکھ کے تاوان کو ساقط کیا ہے جب کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس پر تاوان واجب ہوگا، انہوں نے اس حدیث کو مبالغہ اور سخت تنبیہ پر محمول کیا ہے۔

⑥ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ اَنَّ رَجُلًا اطَّلَعَ فِيْ جُحْرٍ فِيْ بَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِدْرًى يَحُكُّ بِهِ رَأْسَهُ فَقَالَ لَوْ اَعْلَمُ اَنَّكَ تَنْظُرُنِيْ لَطَعَنْتُ بِهِ فِيْ عَيْنَيْكَ اِنَّمَا جُعِلَ الْاِسْتِئْذَانُ مِنْ اَجْلِ الْبَصَرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہلؓ ابن سعد کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ کے دروازے سے جھانکا اور اس وقت رسول کریم ﷺ پشت خار (کنگھے) سے اپنا سر کھجار ہے تھے آپ ﷺ نے (جب اس شخص کو جھانکتے ہوئے دیکھا تو) فرمایا کہ اگر میں جانتا (یعنی مجھ کو یقین ہوتا) کہ تم (قصداً جھانک کر) مجھ کو دیکھ رہے ہو تو میں (یہ کنگھا تمہاری آنکھ میں جھونک دیتا (کیا تم نہیں جانتے کہ کسی غیر کے گھر میں آنے کے وقت) اجازت لینے کا حکم اسی آنکھ کی وجہ سے دیا گیا ہے (کہ وہ کسی غیر محرم پر نہ پڑ جائے)۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح بغیر اجازت کے کسی کے گھر میں داخل ہونا برا ہے اسی طرح بغیر اجازت کے کسی گھر میں جھانکنا بھی برا ہے، نیز طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص بلا قصد کسی کے گھر میں جھانکنے کا مرتکب ہو جائے مثلاً کوئی شخص کسی کے گھر کے سامنے سے گزر رہا ہو اور اضطراراً اس کی نظر گھر میں چلی جائے تو اس پر کوئی برائی نہیں ہے۔

خواہ مخواہ کنکریاں نہ پھینکو

⑦ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ اَنَّهُ رَاٰى رَجُلًا يَخْذِفُ فَقَالَ لَا تَخْذِفْ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْخَذْفِ وَقَالَ اِنَّهُ لَا يُصَادُ بِهِ صَيْدٌ وَلَا يُنْكَاُ بِهِ عَدُوٌّ وَلٰكِنَّهَا قَدْ تَكْسِرُ السِّنَّ وَتَفْقَاُ الْعَيْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مغفل سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پکڑ کر کنکریاں پھینکتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ کنکریاں نہ پھینکو کیونکہ رسول کریم ﷺ اس طرح کنکریاں پھینکنے سے منع کیا ہے اور فرمایا کہ اس طرح کنکری پھینک کر نہ تو شکار کیا جا سکتا ہے اور نہ (دین کے) دشمن کو زخمی کیا جا سکتا ہے (بلکہ یہ محض لہو ولعب ہے جس سے نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے اور نہ دین کا اور مستزاد یہ کہ لوگوں کو اس سے ضرر پہنچتا ہے جیسا کہ خود آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ) البتہ اس طرح کنکریاں پھینکنا دانت کو توڑ دیتا ہے اور آنکھ کو پھوڑ دیتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس طرح بلا قصد کنکریاں پھینکنے سے اس لئے منع فرمایا کہ اس میں کوئی مصلحت اور فائدہ تو ہوتا نہیں البتہ فتنہ وفساد پھوٹ پڑنے اور لڑائی جھگڑا ہو جانے کا خوف ضرور رہتا ہے چنانچہ یہی حکم ہر ایسے عمل کے بارہ میں ہے جس میں یہ بات موجود ہو۔

مجمع اور بازار میں ہتھیاروں کو احتیاط کے ساتھ رکھو

⑧ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا مَرَّ اَحَدُکُمْ فِیْ مَسْجِدِنَا وَفِیْ سُوْقِنَا وَمَعَہٗ نَبْلٌ فَلْیُمْسِكْ عَلٰی نِصَالِھَا اَنْ یُّصِیْبَ اَحَدًا مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْھَا بِشَیْءٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص ہماری مسجد اور ہمارے بازار میں آئے یا وہاں سے گزرے اور اس کے پاس تیر ہوں تو اس کو چاہئے کہ ان کو بند کرے (یعنی ان کے پیکانوں پر ہاتھ رکھ لے) تاکہ اس سے کسی مسلمان کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مساجد اور بازار ایسے تمام مقامات جہاں مسلمان جمع ہوں وہاں ہتھیاروں کو بہت دیکھ بھال کے ساتھ اپنے پاس رکھنا چاہئے خواہ وہ تیر ہوں یا دوسرے ہتھیار جیسے بندوق، تلوار نیزہ اور بلم وغیرہ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کسی چوک اور غلطی سے کوئی مسلمان کسی کے ہتھیار سے زخمی گھائل ہو جائے۔

کسی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرو

⑨ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُشِیْرُ اَحَدُکُمْ عَلٰی اَخِیْہِ بِالسِّلَاحِ فَاِنَّہٗ لَا یَدْرِیْ لَعَلَّ الشَّیْطَانَ یَنْزِعُ فِیْ یَدِہٖ فَیَقَعُ فِیْ حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے اس لئے کہ اس کو نہیں معلوم کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے ہتھیار کھینچ لے اور اس کی وجہ سے وہ ہتھیار کا مالک دوزخ کی آگ میں ڈال دیا جائے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: شیطان تو تاک میں رہتا ہی ہے کہ جہاں کوئی انسان چوکا اور اس لعین نے اس کو گناہ میں مبتلا کیا اسی لئے فرمایا گیا کہ کسی مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرو کہ مبادا شیطان تم پر اثر انداز ہو جائے اور وہ ہتھیار اشارے اشارے میں مسلمان بھائی کے جا لگے اور اس کی وجہ سے تم دوزخ کے سزاوار بنو۔

⑩ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَشَارَ اِلٰی اَخِیْہِ بِحَدِیْدَۃٍ فَاِنَّ الْمَلٰئِکَۃَ تَلْعَنُہٗ حَتّٰی یَضَعَھَا وَاِنْ کَانَ اَخَاہُ لِاَبِیْہِ وَاُمِّہٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی طرف لوہے (یعنی ہتھیار وغیرہ) سے اشارہ کرتا ہے اس پر فرشتے اس وقت تک لعنت بھیجتے ہیں جب تک کہ وہ اس لوہے کو رکھ نہیں دیتا اگرچہ وہ اس کا حقیقی بھائی کیوں نہ ہو۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے حقیقی بھائی کی طرف لوہے سے اشارہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو قتل کرنے یا اس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے بلکہ اس کا تعلق ہنسی مذاق ہی سے ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اس ارشاد گرامی کا مقصد گویا کسی مسلمان پر اشارۃً ہتھیار یا لوہا اٹھانے کی ممانعت کو بطور مبالغہ بیان کرنا ہے۔

⑪ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ حَمَلَ عَلَیْنَا السِّلَاحَ فَلَیْسَ مِنَّا۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَزَادَ مُسْلِمٌ وَمَنْ غَشَّنَا فَلَیْسَ مِنَّا۔

"اور حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "جو شخص (ہنسی مذاق کے طور پر بھی) ہم پر

ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی ہمارے طریقہ پر عامل نہیں ہے" (بخاری و مسلم) اور مسلمؒ نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ (جو شخص اپنی کوئی چیز فروخت کرتے وقت فروخت کی جانے والی چیز کے کسی عیب و نقصان کو چھپا کر) ہمیں فریب دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

⑫ وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَلَّ عَلَيْنَا السَّيْفَ فَلَيْسَ مِنَّا۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت سلمہ ابن اکوع کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے (بلا ارادہ قتل ہنسی مذاق میں بھی) ہمارے اوپر تلوار کھینچی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

دنیا میں کسی کو سخت اذیت میں مبتلا کرنے والا خود آخرت میں عذاب الٰہی میں گرفتار ہوگا

⑬ وَعَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ هِشَامَ بْنَ حَكِيْمٍ مَرَّ بِالشَّامِ عَلٰى اُنَاسٍ مِنَ الْاَنْبَاطِ وَقَدْ اُقِيْمُوْا فِي الشَّمْسِ وَصُبَّ عَلٰى رُءُوْسِهِمُ الزَّيْتُ فَقَالَ مَا هٰذَا قِيْلَ يُعَذَّبُوْنَ فِي الْخَرَاجِ فَقَالَ هِشَامٌ اَشْهَدُ لَسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ يُعَذِّبُ الَّذِيْنَ يُعَذِّبُوْنَ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ہشام ابن عروہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ہشام ابن حکیم نے ملک شام (کے سفر کے دوران) انبطی قوم کے کچھ افراد کو اس حال میں دیکھا کہ انہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کے سروں پر گرم گرم تیل ڈالا گیا تھا، ہشام ابن حکیم نے (یہ روح فرسا منظر دیکھ کر) کہا کہ یہ کیا ہے؟" (یعنی ان لوگوں کو کس جرم کی پاداش میں یہ غیر انسانی سزا دی جارہی ہے؟) انہیں بتایا گیا کہ "خراج (زرعی ٹیکس نہ دینے) کی وجہ سے ان کو اس عذاب میں مبتلا کیا گیا ہے؟ حضرت ہشام نے فرمایا "میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ (آخرت میں) ان لوگوں کو عذاب میں مبتلا کرے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب میں مبتلا کرتے ہیں۔" (مسلم)

تشریح: یعنی جو شخص کسی کو دنیا میں ناحق کسی چیز کے عذاب میں مبتلا کرے گا مثلاً کسی کو دھوپ میں کھڑا کر کے اس کے اوپر گرم تیل ڈالے گا تو اللہ تعالیٰ عقبی میں اس کو اسی چیز کے عذاب میں گرفتار کرے گا۔

ظلم کے حاشیہ برداروں پر غضب خداوندی

⑭ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ اِنْ طَالَتْ بِكَ مُدَّةٌ اَنْ تَرٰى قَوْمًا فِيْ اَيْدِيْهِمْ مِثْلُ اَذْنَابِ الْبَقَرِ يَغْدُوْنَ فِيْ غَضَبِ اللّٰهِ وَيَرُوْحُوْنَ فِيْ سَخَطِ اللّٰهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ يَرُوْحُوْنَ فِيْ لَعْنَةِ اللّٰهِ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر تمہاری عمر دراز ہوئی تو تم عنقریب ان لوگوں کو دیکھو گے جن کے ہاتھوں میں گائے کی دم کی مانند ایک ایسی چیز یعنی کوڑے ہوں گے، ان کی صبح اللہ کے غضب میں اور ان کی شام اللہ کی شدید ناراضگی میں گزرے گی (یعنی ان لوگوں پر ہمہ وقت اللہ کا عذاب نازل ہوتا رہے گا) اور ایک روایت میں یہ ہے کہ "ان کی شام اللہ کی لعنت میں گزرے گی"۔" (مسلم)

تشریح: "ان لوگوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی ظالم و جابر یا کسی صاحب اقتدار کے حاشیہ نشین ہوتے ہیں یا ان کے دروازوں پر پڑے رہتے ہیں اور ان کے آگے پیچھے لگے رہتے ہیں اور پھر اس ظالم و جابر کے بل بوتے پر وہ لوگ عام انسانوں کو ڈراتے دھمکاتے پھرتے ہیں غریبوں کو مارتے پیٹتے ہیں، کمزوروں کو گالیاں دیتے ہیں اور نادار شرفاء کی عزت و آبرو کو پامال کرتے ہیں اور کٹ کھنے کتے کی طرح ہر ایک کو کاٹنے دوڑتے ہیں۔

ناروا فیشن کرنے والی عورتوں کے بارے میں وعید

⑮ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صِنْفَانِ مِنْ اَهْلِ النَّارِ لَمْ اَرَهُمَا قَوْمٌ مَّعَهُمْ سِيَاطٌ كَاَذْنَابِ الْبَقَرِ يَضْرِبُوْنَ بِهَا النَّاسَ وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيْلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُءُوْسُهُنَّ كَاَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيْحَهَا وَاِنَّ رِيْحَهَا لَتُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ كَذَا وَكَذَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" دوزخیوں کے دو گروہ ایسے ہیں جنہیں میں نے نہیں دیکھا (اور نہ میں دیکھوں گا) ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جن کے ہاتھوں میں گائے کی مانند کوڑے ہوں گے جس سے وہ (لوگوں کو ناحق) ماریں گے، اور دوسرا وہ گروہ ان عورتوں کا ہے جو بظاہر تو کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی مگر حقیقت میں ننگی ہوں گی وہ مردوں کو اپنی طرف مائل کریں گی اور خود مردوں کی طرف مائل ہوں گی ان کے سر بختی اونٹ کے کوہان کی طرح ہلتے ہوں گے ایسی عورتیں نہ تو جنت میں داخل ہوں گی اور نہ جنت کی بو پائیں گی حالانکہ جنت کی بو اتنی اتنی (یعنی مثلاً سو برس) دوری سے آتی ہے۔" (مسلم)

تشریح: "مگر حقیقت میں ننگی ہوں گی" اس میں ان عورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اتنے باریک اور مہین کپڑے پہنتی ہیں کہ ان کا بدن جھلکتا ہے، یا اس طرح کپڑے پہنتی ہیں کہ جسم کا کچھ حصہ چھپا رہتا ہے اور کچھ حصہ کھلا رہتا ہے (جیسا کہ آجکل ساڑھی اور بلاؤز کا رواج ہے) یا دوپٹہ سے اپنے پیٹ اور سینہ وغیرہ کو ڈھانکنے کی بجائے اس کو گلے میں یا پیٹھ پر ڈال لیتی ہیں، ان تمام صورتوں میں عورت بظاہر تو کپڑے پہنے ہوئے نظر آتی ہے مگر حقیقت میں وہ ننگی ہوتی ہے۔

اس جملہ سے ایسی عورتوں کی طرف بھی اشارہ مقصود ہو سکتا ہے جو دنیا میں تو انواع و اقسام کے لباس زیب تن کرتی ہیں مگر تقویٰ و عمل صالح کے لباس سے محروم رہتی ہیں کہ وہ تقویٰ اور عمل صالح ہی کی وجہ سے آخرت میں جنت کے لباس کی مستحق ہوں گی۔

"ممیلات" اور "مائلات" سے مراد وہ عورتیں ہیں جو اپنے بناؤ سنگار اور اپنی سج دھج کے ذریعہ مردوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ اور خود بھی مردوں کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ یا "ممیلات" سے مراد وہ عورتیں ہیں جو اپنے دوپٹے اپنے سروں سے اتار پھینکتی ہیں۔ تاکہ مرد ان کے چہرے دیکھیں، اور "مائلات" سے مراد وہ عورتیں ہیں جو مٹک مٹک کر چلتی ہیں تاکہ لوگوں کے دل فریفتہ کریں۔

"ان کے سر بختی اونٹ کے کوہان کی طرح ہلتے ہوں گے" سے مراد وہ عورتیں ہیں جو اپنی چوٹیوں کو جوڑے کی صورت میں سر پر باندھ لیتی ہیں اور جس طرح بختی اونٹ کے کوہان فربہی کی وجہ سے ادھر ادھر ہلتے رہتے ہیں اسی طرح ان کے سر کے جوڑے بھی ادھر ادھر ہلتے رہتے ہیں۔ اس حدیث میں عورتوں کے جس خاص طبقہ کی نشان دہی کی گئی ہے اس کا وجود آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ میں نہیں تھا بلکہ یہ آپ کا معجزہ ہے کہ آپ ﷺ نے آنے والے زمانہ میں اس قسم کی عورتوں کے پیدا ہونے کی خبر دی۔

"نہ تو جنت میں داخل ہوں گی الخ" یہ عورتوں کے گروہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے مردوں کے گروہ کے بارے میں اس طرح کی بات محض اختصار کے پیش نظر نہیں فرمائی گئی ہے، قاضی عیاضؒ کے کہنے کے مطابق اس جملہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسی عورتیں کبھی بھی جنت میں داخل نہیں ہوں گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس وقت نیک و پارسا اور پرہیزگار عورتیں جنت میں داخل ہوں گی اور جنت کی بو پائیں گی اس وقت ایسی عورتیں نہ تو جنت میں داخل ہوں گی اور نہ جنت کی بو پائیں گی، ہاں اپنی اپنی سزا بھگتنے کے بعد ان کو بھی جنت کی سعادت سے نواز دیا جائے گا۔ یا پھر یہ کہ یہ بات ان عورتوں کے بارہ میں فرمائی گئی ہے جو ان چیزوں کو حلال جان کر ان کا ارتکاب کریں گی، نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس جملہ سے سخت زجر و تنبیہ مراد ہے۔

کسی کے منہ پر نہ مارو

⑯ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَاتَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَجْتَنِبِ الْوَجْهَ فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى

صُوْرَتِہٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم سے کوئی شخص (کسی کو) مارے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کے چہرے کو بچائے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صفات پر پیدا کیا اور اس کو اپنی صفات جلالیہ و جمالیہ کا مظہر بنایا۔ یا یہ مراد ہے کہ آدم کو اس صورت خاصہ پر پیدا کیا گیا جس کو حق تعالیٰ نے صرف انسانوں کے لئے اختراع کیا اور پیدا کیا۔ اس اعتبار سے "اپنی" کی طرف "صورت" کی اضافت، انسانی شرف وکرامت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے جیسا کہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي میں حق تعالیٰ نے روح کی اضافت اپنی طرف فرما کر روح انسانی کی عظمت و فضیلت کو ظاہر کیا ہے۔ اور بعضوں نے یہ کہا کہ صورتہ کی ضمیر دراصل آدم کی طرف راجع ہے یعنی آدم کو اس صورت پر پیدا کیا جو آدم کے ساتھ مخصوص ہے اور جو تمام مخلوقات سے ممتاز ہے اور خصائص وکرامات پر مشتمل ہے۔

اس طرح حدیث کا حاصل یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات میں اشرف پیدا کیا ہے اور اس کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ اشرف ومکرم اور انسانی صورت وکمال کے ظہور کا محل ہے لہٰذا انسان کے چہرہ پر مارنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ حکم استحباب کے طور پر ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

غیر کے گھر میں بلا اجازت جھانکنے اور داخل ہونے والا قابل تعزیر ہے

(۱۷) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَشَفَ سِتْرًا فَاَدْخَلَ بَصَرَهٗ فِي الْبَيْتِ قَبْلَ اَنْ يُّؤْذَنَ لَهٗ فَرَاٰى عَوْرَةَ اَهْلِهٖ فَقَدْ اَتٰى حَدًّا لَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يَّاْتِيَهٗ وَلَوْ اَنَّهٗ حِيْنَ اَدْخَلَ بَصَرَهٗ فَاسْتَقْبَلَهٗ رَجُلٌ فَفَقَاَ عَيْنَهٗ مَا عَيَّرْتُ عَلَيْهِ وَاِنْ مَرَّ الرَّجُلُ عَلٰى بَابٍ لَا سِتْرَ لَهٗ غَيْرُ مُغْلَقٍ فَنَظَرَ فَلَا خَطِيْئَةَ عَلَيْهِ اِنَّمَا الْخَطِيْئَةُ عَلٰى اَهْلِ الْبَيْتِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر کسی شخص نے کسی کے گھر کا پردہ کھولا اور اس کے گھر میں اپنی نظر ڈالی جب کہ اس کو (اس گھر میں جھانکنے اور داخل ہونے کی) اجازت حاصل نہیں تھی اور اس نے اس کی گھروالی کو دیکھا تو (اس نے ایک ایسی چیز کا ارتکاب کیا جس کی وجہ سے) وہ قابل تعزیر ہوا، اس کے لئے یہ (ہرگز) جائز نہیں ہے کہ وہ (بلا اجازت کسی کے گھر پر) آئے (اور اس کے گھر میں جھانکے) اگر اس نے گھر میں جھانک کر دیکھا اور گھروالوں میں سے کوئی شخص سامنے آگیا اور اس نے اس (جھانکنے والے) کی آنکھ پھوڑ ڈالی تو میں اس (آنکھ پھوڑنے والے) کو سرزنش نہیں کروں گا اور نہ (بطور تاوان) اس پر کوئی چیز واجب کروں گا، ہاں اگر کوئی مرد کسی ایسے دروازے پر سے گزرے جس پر نہ کوئی پردہ پڑا ہوا ہو اور نہ وہ بند ہو اور اس کی نظر گھر کے آدمیوں پر جا پڑے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بلکہ گناہ تو گھروالوں پر ہوگا۔ کہ انہوں نے دروازے کو بند کیوں نہیں کیا اور اس پر پردہ کیوں نہیں ڈالا۔ (ترمذیؒ) نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "اس کے لئے یہ (ہرگز) جائز نہیں ہے الخ" یہ استیناف ہے جو علت کو متضمن ہے، یعنی یہ جملہ ایک الگ عبارت کو شروع کرتا ہے جس کا مقصد پہلی عبارت کے مفہوم کی علت کو بیان کرنا ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اہل خانہ پر واجب ہے کہ وہ اپنے مکان کا دروازہ بند رکھے یا دروازے پر پردہ ڈالے رکھے۔

ہاتھ میں ننگی تلوار رکھنے کی ممانعت

⑱ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُتَعَاطَى السَّيْفُ مَسْلُوْلًا۔ (رواه الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بے نیام تلوار کو ہاتھ میں رکھنے سے منع کیا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: بے نیام تلوار کو ہاتھ میں رکھنے سے اس خوف کے پیش نظر منع فرمایا گیا ہے کہ مبادا وہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے اور کسی کے جا لگے یا لوگ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر خوف و دہشت میں پڑ جائیں۔

انگلیوں کے درمیان تسمہ چیرنے کی ممانعت

⑲ وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى اَنْ يُقَدَّ السَّيْرُ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت حسنؒ حضرت سمرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ تسمہ کو دونوں انگلیوں کے درمیان چیرا جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس ممانعت کا سبب یہ ہے کہ اس طرح تسمہ چیرنے سے انگلیاں زخمی نہ ہو جائیں۔ یہ حدیث اور اس سے پہلی حدیث دونوں میں مذکور ممانعت تنزیہی ہے اور از راہ شفقت و ہمدردی ہے۔

اپنے دین، اپنی جان، اپنے مال اور اپنے اہل و عیال کی محافظت میں مارا جانے والا شہید ہے

⑳ وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ دِيْنِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ اَهْلِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت سعید ابن زید راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے دین کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے گا وہ شہید ہے جو شخص اپنی جان کی حفاظت کرتا ہوا مارے جائے گا وہ شہید ہے جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے گا وہ شہید ہے اور جو شخص اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے گا وہ شہید ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: دین کی محافظت میں مارے جانے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی مسلمان کے سامنے کسی کافر یا کسی مبتدع نے اس کے دین کی توہین و حقارت کی اور وہ مسلمان اس سے لڑ پڑا اور مارا گیا۔ تو اس کو شہادت کا درجہ ملے گا۔

اکثر علماء کا مسلک یہ ہے کہ اگر مثلاً زید کا مال کوئی شخص لوٹنے کا ارادہ کرے یا اس کو قتل کرنے پر اتر آئے اور یا اس کے اہل و عیال کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچانے کا قصد کرے تو زید کو چاہئے کہ وہ اس طرح کا برا ارادہ رکھنے والوں کی مدافعت کرے یعنی پہلے تو اس کو اچھے اور نرم انداز میں اس کے برے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرے لیکن اگر وہ بغیر لڑائی جھگڑے کے اپنے ارادہ سے باز نہ آئے اور زید اس کو مار ڈالے تو زید پر (بطور تاوان) کوئی چیز نہیں ہوگی۔ اور اگر زید مارا گیا تو وہ شہید کا درجہ پائے گا۔

مسلمان پر تلوار اٹھانے والے کے بارہ میں وعید

㉑ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِجَهَنَّمَ سَبْعَةُ اَبْوَابٍ بَابٌ مِنْهَا لِمَنْ سَلَّ السَّيْفَ عَلٰى اُمَّتِيْ اَوْ قَالَ عَلٰى اُمَّةِ مُحَمَّدٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "دوزخ کے سات دروازے ہیں، ان میں سے ایک دروازہ اس شخص کے لئے ہے جو میری اُمت (کے لوگوں) پر۔ یا یہ فرمایا۔ اُمت محمدیہ پر (ناحق) تلوار اٹھائے" اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور

کہا ہے کہ حدیث غریب ہے۔"

وَحَدِیْثُ اَبِیْ هُرَیْرَةَ الرَّجُلُ جُبَارٌ ذُكِرَ فِیْ بَابِ الْغَصَبِ۔

"اور حضرت ابوہریرۃؓ کی حدیث الرجل جبار الخ باب الغصب میں نقل کی جاچکی ہے۔"

بَابُ الْقَسَامَةِ

قسامت کا بیان

"قسامت" ق کے زبر کے ساتھ قسم کے معنی میں ہے یعنی سوگند کھانا۔ شرعی اصطلاح میں "قسامت" کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی آبادی و محلہ میں یا اس کی آبادی و محلہ کے قریب میں کسی شخص کا قتل ہو جائے اور قاتل کا پتہ نہ چلے تو حکومت واقعات کی تحقیق کرے اگر قاتل کا پتہ چل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اس آبادی یا محلہ کے باشندوں میں سے پچاس آدمیوں سے قسم لی جائے اس طرح کہ ان میں سے ہر آدمی یہ قسم کھائے کہ "خدا کی قسم! نہ میں نے اس کو قتل کیا ہے اور نہ اس کے قاتل کا مجھے علم ہے" یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے جس کی بنیاد یہ مشہور حدیث ہے کہ اَلْبَیِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ چنانچہ اس باب کی تیسری فصل میں حضرت رافع ابن خدیج سے منقول روایت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔

حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کے نزدیک "قسامت" کا مفہوم یہ ہے کہ جس آبادی و محلہ میں یا جس آبادی و محلہ کے قریب میں لاش پائی گئی ہے اگر اس کے باشندوں اور مقتول کے درمیان کوئی عداوت و دشمنی رہی ہو یا کوئی ایسی علامت پائی گئی ہو۔ جس سے یہ ظن غالب ہو کہ اس آبادی و محلہ کے لوگوں نے اس کو قتل کیا ہے جیسے اس آبادی یا محلہ میں لاش کا پایا جانا، تو مقتول کے وارثوں سے قسم لی جائے یعنی ان سے کہا جائے کہ وہ یہ قسم کھائیں کہ "خدا کی قسم! تم نے (یعنی اس آبادی یا محلہ کے لوگوں نے) اس کو قتل کیا ہے" اگر مقتول کے وارث یہ قسم کھانے سے انکار کر دیں تو پھر ان لوگوں سے قسم لی جائے جن پر قتل کا شبہ کیا گیا ہے" چنانچہ اس باب کی پہلی حدیث جو حضرت رافعؓ سے منقول ہے اسی پر دلالت کرتی ہے۔

قسامت میں قصاص واجب نہیں ہوتا اگرچہ قتل عمد کا دعوی ہو بلکہ اس میں دیت واجب ہوتی ہے خواہ قتل عمد کا دعوی ہو یا قتل خطاء کا۔ لیکن حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر قتل عمد کا دعوی ہو تو پھر قصاص کا حکم نافذ کرنا چاہئے اور حضرت امام شافعیؒ کا قدیم قول بھی یہی ہے۔

قسامت کے بارہ میں یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ قسامت کا یہ طریقہ زمانہ جاہلیت میں بھی رائج تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس طریقہ کو باقی رکھا اور اسی کے مطابق انصاریوں میں اس مقتول کا فیصلہ کیا جس کے قتل کا انہوں نے خیبر کے یہودیوں پر دعوی کیا تھا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قسامت میں مدعی سے قسم لی جائے یا مدعا علیہ سے

① وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ وَسَهْلِ بْنِ اَبِیْ حَثْمَةَ اَنَّهُمَا حَدَّثَا اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ سَهْلٍ وَمُحَیِّصَةَ بْنَ مَسْعُوْدٍ اَتَیَا خَیْبَرَ فَتَفَرَّقَا فِی النَّخْلِ فَقُتِلَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَهْلٍ فَجَاءَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ سَهْلٍ وَحُوَیِّصَةُ وَمُحَیِّصَةُ ابْنَا مَسْعُوْدٍ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَتَكَلَّمُوْا فِیْ اَمْرِ صَاحِبِهِمْ فَبَدَاَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ وَكَانَ اَصْغَرَ الْقَوْمِ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَبِّرِ الْكُبْرَ قَالَ یَحْیَى بْنُ سَعِیْدٍ یَعْنِیْ لِیَلِیَ الْكَلَامَ الْاَكْبَرُ فَتَكَلَّمُوْا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَسْتَحِقُّوْا

قَتِيْلَكُمْ اَوْقَالَ صَاحِبَكُمْ بِاَيْمَانِ خَمْسِيْنَ مِنْكُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمْرٌ لَمْ نَرَهُ قَالَ فَتُبْرِئُكُمْ يَهُوْدُ فِيْ اَيْمَانِ خَمْسِيْنَ مِنْهُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَوْمٌ كُفَّارٌ فَفَدَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قِبَلِهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ تَحْلِفُوْنَ خَمْسِيْنَ يَمِيْنًا وَتَسْتَحِقُّوْنَ قَاتِلَكُمْ اَوْصَاحِبَكُمْ فَوَادَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ عِنْدِهِ بِمِائَةِ نَاقَةٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت رافعؓ ابن خدیج اور حضرت سہلؓ ابن حثمہ دونوں بیان کرتے ہیں کہ عبداللہؓ ابن سہل اور محیصہؓ ابن مسعود خیبر آئے تو (ایک دن سیر کرتے ہوئے) دونوں کھجور کے درختوں میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے (یعنی ایک کسی اور سمت کو نکل گیا اور دوسرا کسی اور سمت چلا گیا) چنانچہ عبداللہ ابن سہل کو (اکیلا پاکر) کسی نے قتل کر دیا (اس حادثہ کے بعد (عبدالرحمٰنؓ ابن سہل (جو مقتول کے حقیقی بھائی تھے) اور مسعود کے دونوں بیٹے حویصہؓ اور محیصہؓ (جو مقتول کے چچازاد بھائی تھے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے عزیز مقتول کے بارہ میں مقدمہ پیش کیا، جب عبدالرحمٰن نے گفتگو کی ابتداء کی (جو مقتول کے حقیقی بھائی تھے اور) تینوں میں سب سے چھوٹے تھے تو نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اپنے بڑے کی بڑائی کو ملحوظ رکھو، یعنی تم تینوں میں جو شخص سب سے بڑا ہے اس کو گفتگو کی ابتداء کرنے دو) حضرت یحیٰی ابن سعید (جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جو شخص سب سے بڑا ہو وہ گفتگو کا ذمہ دار ہو، چنانچہ (اس کے بعد) انہوں نے (یعنی ان کے بڑے نے) گفتگو کی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اگر تم میں سے پچاس آدمی قسم کھالیں تو تم اپنے مقتول یا (اپنے مقتول کی بجائے) یہ فرمایا کہ اپنے ساتھی کا خون بہا یا قصاص لینے کے مستحق ہو۔" انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ! یہ تو ایسی چیز ہے جس کو ہم نے نہیں دیکھا ہے (یعنی ہم یہ قطعاً نہیں جانتے کہ مقتول کو کس شخص نے قتل کیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا، پچاس یہودی قسم کھا کر (تمہارے اس شبہ سے) تمہیں پاک کر دیں گے (یعنی وہ یہ قسم کھالیں گے کہ مقتول کو ہم نے قتل نہیں کیا ہے اور اس طرح ان پر جو قتل کا شبہ یا الزام ہے اس کو وہ ختم کر دیں گے) انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ وہ تو کافر ہیں (ان کی قسموں کا کیا اعتبار) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے (فتنہ دفع کرنے کے لئے) مقتول کے ورثاء کو اپنی طرف سے خون بہا ادا کر دیا" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) تم پچاس قسمیں کھاؤ اور اپنے مقتول۔ یا یہ۔ فرمایا کہ اپنے ساتھی کے خون بہا کے مستحق ہو جاؤ (اس کے بعد) آپ ﷺ نے اپنی طرف سے سو اونٹ خون بہا میں ادا کر دیئے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "جو شخص سب سے بڑا ہو وہ گفتگو کا ذمہ دار ہو" سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہو اس کا اکرام و احترام ضروری ہے اور گفتگو کی ابتداء اسی کی طرف سے ہونی چاہئے۔

یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ حدود میں وکالت جائز ہے، نیز اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ حاضر کی وکالت بھی جائز ہے کیونکہ مقتول کے خون کے ولی ان کے حقیقی بھائی یعنی عبدالرحمٰن ابن سہلؓ تھے اور حویصہؓ اور محیصہؓ ان کے چچازاد بھائی تھے۔ اس حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ قسامت میں پہلے مدعی سے قسم لی جائے جب کہ حنفی مسلک یہ ہے کہ پہلے مدعا علیہ سے قسم لی جائے۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِيْ۔

"اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قسم کی ابتداء مدعا علیہ سے ہونی چاہئے

(۴) عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ اَصْبَحَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ مَقْتُوْلًا بِخَيْبَرَ فَانْطَلَقَ اَوْلِيَاءُهُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ اَلَكُمْ شَاهِدَانِ يَشْهَدَانِ عَلٰى قَاتِلِ صَاحِبِكُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَمْ يَكُنْ ثَمَّ اَحَدٌ مِنَ

الْمُسْلِمِيْنَ وَاِنَّمَا هُمْ يَهُوْدُ وَقَدْ يَجْتَرِئُوْنَ عَلٰى اَعْظَمَ مِنْ هٰذَا قَالَ فَاخْتَارُوْا مِنْهُمْ خَمْسِيْنَ فَاسْتَحْلِفُوْا هُمْ فَاَبَوْا فَوَدَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ عِنْدِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت رافع ابن خدیج کہتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص (یعنی عبداللہ ابن سہل) خیبر میں قتل کر دیئے گئے چنانچہ ان کے ورثاء (یعنی ان کے بیٹے اور چچازاد بھائی) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مقدمہ پیش کیا، آنحضرت ﷺ نے (ان سے) فرمایا کہ "کیا تمہارے پاس دو گواہ ہیں جو تمہارے مقتول کے قاتل کے بارہ میں گواہی دیں انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہاں کوئی مسلمان تو موجود نہیں تھا البتہ یہود تھے (جو ظلم کرنے، فتنہ و فساد پھیلانے اور حیلہ گری میں بہت مشہور ہیں) وہ تو اس سے بھی بڑے کام کی جرأت رکھتے ہیں (جیسے انبیاء کو قتل کر دینا، کلام اللہ میں تحریف کرنا اور احکام خداوندی سے صریحاً سرکشی کرنا) آپ نے فرمایا "اچھا تم ان میں پچاس آدمیوں کو منتخب کر لو اور ان سے قسمیں لو" لیکن مقتول کے ورثاء نے یہودیوں سے قسم لینے سے انکار کر دیا (کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اتنے مکار ہیں کہ جھوٹی قسمیں کھالیں گے) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس مقتول کا خون بہا اپنے پاس سے دے دیا"۔ (ابوداؤد)

تشریح: ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا ظاہری مفہوم حنفیہ کے اس مسلک کی واضح دلیل ہے کہ قسامت میں پہلے مدعا علیہ سے قسم لینی چاہئے۔

ملا علی قاریؒ نے اس موقع پر تمام ائمہ کے مسلک کو نقل کرنے کے بعد حنفیہ مسلک کے دلائل بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

بَابُ قَتْلِ اَهْلِ الرِّدَّةِ وَالسُّعَاةِ بِالْفَسَادِ
مرتدوں اور فساد برپا کرنے والوں کو قتل کر دینے کا بیان

مرتد کسے کہتے ہیں؟: "مرتد" اس شخص کو کہتے ہیں جو دین اسلام سے پھر جائے یعنی ایمان و اسلام کے نورانی دائرہ سے نکل کر کفر و شرک کے ظلمت کدوں میں چلا جائے۔

مرتد کے بارہ میں حکم: جب کوئی مسلمان نعوذ باللہ، اسلام سے پھر جائے تو اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جائے اگر وہ اسلام کے بارہ میں کسی شک و شبہ کا شکار ہو تو اس کا شک و شبہ رفع کیا جائے گا، اگرچہ اسلام کی دعوت دینا اور اس کا شک و شبہ دور کرنا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے کیونکہ اسلام کی دعوت اس کو پہلے ہی پہنچ چکی ہے اب اس کی تجدید دعوت کی احتیاج نہیں ہے۔ نیز مستحب یہ ہے کہ ایسے شخص کو تین دن کے لئے قید میں ڈال دیا جائے اگر وہ ان تین دنوں میں توبہ کر کے دائرہ اسلام میں لوٹ آئے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے کیونکہ اسلام نے مرتد کی سزا قتل مقرر کی ہے اور بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ اگر وہ مہلت طلب کرے تب اس کو مہلت دی جائے ورنہ مہلت دینے کی ضرورت نہیں لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک امام وقت (حکومت) پر تین دن کی مہلت دینی واجب ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (مشرکوں کو قتل کردو) اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد من بدل دینہ فاقتلوہ (جس شخص نے اپنا دین اسلام تبدیل کر دیا اس کو قتل کر دو) سے یہی ثابت ہوتا کہ مرتد کو مہلت دینا واجب نہیں ہے۔

فساد برپا کرنے والے کون ہیں؟: حدیث کے دوسرے جزو کا تعلق فساد برپا کرنے والوں سے ہے یوں تو عام طور پر فساد برپا کرنے والے سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو زمین پر فتنہ و فساد اور لوٹ مچاتے ہیں اور قتل و غارت گری کے ذریعہ لوگوں کے امن و سکون کو تباہ و برباد کرتے ہیں لیکن یہاں بطور خاص قطاع الطریق یعنی قزاق مراد ہیں کہ انکی سزا بھی قتل ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا۔

"جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑتے ہیں اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔"

ارتداد اور مرتد کے بارہ میں کچھ تفصیلی مسائل واحکام: آج کل ہماری روز مرہ زندگی بڑی بے اعتدالیوں کی شکار ہے نہ ہمیں اپنی زبان پر قابو رہتا ہے، نہ ہم اپنے اعتقادات ونظریات کے دائرہ میں پوری طرح رہتے ہیں اور نہ ہمارے افعال و اعمال پابند احتیاط ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی بہت سی باتیں ہماری زبانوں سے نکلتی رہتی ہیں جنہیں ہم بظاہر بالکل غیر اہم سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ باتیں ہمیں کفر کے دائرہ تک پہنچادیتی ہیں اسی طرح ایسے بہت سے افعال و اعمال ہم سے سرزد ہوتے رہتے ہیں جنہیں ہم بہت معمولی سمجھتے ہیں لیکن مآل کار وہ ہمارے لئے سخت خسران آخرت کا ذریعہ بن جاتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ اس موقع پر اس بارہ میں تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کیا جائے۔

فتاویٰ عالمگیریؒ کے ایک باب میں مرتد کے احکام ومسائل بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اس پورے باب کو علاوہ چند نادر الوجود مسائل کو یہاں نقل کیا جاتا ہے اس میں جو مسائل ہیں ان کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے تاکہ مرتد کے بارہ میں احکام ومسائل ہونے کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوجائے کہ وہ کون سے الفاظ ہیں جو زبان سے ادا ہونے پر کفر تک پہنچادیتے ہیں یا وہ کون سے عقائد و اعمال ہیں جن کو اختیار کرنے والا کفر تک پہنچ جاتا ہے۔

"مرتد" عرف عام میں اس شخص کو کہتے ہیں جو دین اسلام سے پھر جائے۔ وجود ایمان کے بعد کلمہ کفر کا زبان سے ادا ہونا مرتد ہونے کا رکن ہے اور مرتد کا حکم صحیح ہونے کے لئے عقل کا ہونا شرط ہے لہٰذا مجنوں اور بے عقل بچے پر مرتد کا حکم لگانا صحیح نہیں ہے اور جس شخص پر جنون کی کیفیت مستقل طور پر طاری رہتی ہو تو اس پر مرتد کا حکم اس صورت میں لگے گا جب کہ وہ اپنے صحیح الدماغ ہونے کی حالت میں ارتداد کا مرتکب ہو، اگر وہ اس وقت ارتداد کا مرتکب ہو جب کہ اس پر جنون کی کیفیت طاری تھی تو اس پر مرتد کا حکم نہیں لگے گا اسی طرح اس شخص پر بھی مرتد کا حکم لگانا صحیح نہیں ہوگا جو ہر وقت نشے کی حالت میں رہتا ہو اور اس کی عقل ماؤف ہو چکی ہو۔

مرتد کا حکم نافذ ہونے کے لئے بالغ ہونا شرط نہیں ہے یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص حالت بلوغ میں ارتداد کا مرتکب ہو، اسی کو مرتد قرار دیا جائے جب کہ نابالغ پر بھی مرتد کا حکم لگ سکتا ہے اسی طرح مرد ہونا بھی مرتد کے حکم نافذ ہونے کے لئے شرط نہیں ہے بلکہ اگر عورت ارتداد کی مرتکب ہوگی تو اس پر بھی مرتد کا حکم لگے گا۔

مرتد کا حکم نافذ ہونے کے لئے رضا ورغبت شرط ہے لہٰذا اس شخص پر مرتد ہونے کا حکم نافذ نہیں ہوسکتا جس کو مرتد ہوجانے پر مجبور کیا گیا ہو۔

جس شخص کو برسام کی بیماری ہو اس کو کوئی ایسی چیز کھلادی جائے جس سے اس کی عقل جاتی رہی اور ہزیان بکنے لگے، اور پھر اسی حالت میں وہ مرتد ہوجائے تو اس پر مرتد کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اسی طرح جو شخص مجنوں ہو یا سوداوی ہو یا کسی بھی قسم کا مغلوب العقل ہو تو اس پر بھی مرتد کا حکم نہیں لگے گا۔

جیسا کہ ابتداء باب میں بیان کیا گیا، جو شخص مرتد ہوجائے اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جائے اور اگر اس کو کوئی شک و شبہ ہو تو اسے دور کیا جائے۔ اور پھر جب وہ دائرہ اسلام میں آنا چاہے تو کلمہ شہادت پڑھے اور مذہب اسلام کے سوا اور سب مذاہب سے بیزاری کا اظہار کرے، اور اگر اسی مذہب سے بیزاری کا اظہار کرے جس کے دائرہ میں وہ اسلام کو چھوڑ کر گیا تھا تو یہ بھی کافی ہوگا۔

اگر کوئی شخص مرتد ہونے کے بعد پھر اسلام میں لوٹ آئے اور پھر کفر کی طرف لوٹ جائے، اسی طرح تین مرتبہ کرے اور ہر مرتبہ امام وقت سے مہلت چاہے تو امام وقت اس کو تین تین دن کی تینوں مرتبہ تو مہلت دے دے لیکن اگر وہ پھر چوتھی بار کفر کی طرف لوٹے اور مہلت طلب کرے تو اب چوتھی بار امام وقت اس کو مہلت نہ دے بلکہ اگر وہ آخری طور پر دائرہ اسلام واپس آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو قتل کردیا جائے۔

اگر کوئی صاحب عقل لڑکا مرتد ہوجائے تو اس کا مرتد ہونا حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک معتبر ہوگا لہٰذا اس

کو دائرہ اسلام میں آجانے پر مجبور کیا جائے اور اس کو قتل نہ کیا جائے یہی حکم اس لڑکے کا ہے جو قریب البلوغ ہو۔ صاحب عقل لڑکے سے مراد ایسی عمر کا لڑکا ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ اسلام نجات کا ذریعہ ہے اور وہ اچھے اور برے میں اور میٹھے اور کڑوے میں تمیز کر سکتا ہو۔ بعض حضرات کے نزدیک وہ لڑکا مراد ہے جو سات سال کی عمر کو پہنچ گیا ہو۔

اگر کوئی عورت مرتد ہو جائے تو اس کو قتل نہ کیا جائے بلکہ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو قید میں ڈالے رکھا جائے اور ہر تیسرے دن اس کو بطور تنبیہ مارا جائے تاکہ وہ اپنے ارتداد سے توبہ کر کے دائرہ اسلام میں آجائے لیکن اگر کوئی شخص کسی مرتد عورت کو قتل کر دے تو قاتل پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔

کوئی باندی مرتد ہو جائے تو اس کا مالک اس کو اسلام قبول کرنے پر بایں طور مجبور کرے کہ اس کو اپنے گھر میں محبوس کر دے اس سے اپنی خدمت لینے کے ساتھ ساتھ سزاءً کچھ دوسرے کام بھی اس کے سپرد کر دے اور وہ مالک اس کے ساتھ صحبت نہ کرے۔

عاقلہ لڑکی کا وہی حکم ہے جو بالغہ کا ہے اسی طرح خنثیٰ مشکل بھی عورت کے حکم میں ہے۔ آزاد عورت جو مرتد ہو جائے اس کو اس وقت تک بطور باندی گرفتار نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ دارالاسلام میں ہے ہاں اگر وہ دارالحرب میں چلی جائے اور پھر وہاں سے وہ (اسلامی لشکر کے) قیدیوں میں آئے تو اس کو باندی بنایا جا سکتا ہے۔

اور امام ابوحنیفہؒ کے نوادر میں سے ایک قول یہ ہے کہ مرتدہ کو دارالاسلام میں بھی بطور باندی گرفتار کیا جا سکتا ہے چنانچہ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اگر اس قول پر اس عورت کے بارہ میں فتویٰ دیا جائے جو خاوند والی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ مناسب یہ ہے کہ اس عورت کا خاوند حکومت وقت سے اس کو باندی بنالینے کی درخواست کرے یا اگر وہ خاوند اس کا مصرف (یعنی مسلمان) ہو تو حکومت وقت اس عورت کو خاوند کے تئیں ہدیہ کر دے۔ اس صورت میں خاوند اس عورت کو محبوس کرنے اور اسلام لانے کے لئے اس کو سزاءً مارنے کا ذمہ دار ہوگا۔

جب کوئی مرتد اپنے ارتداد سے انکار کر دے تو اللہ تعالیٰ کی واحدانیت محمد ﷺ کی رسالت اور دین اسلام کی حقانیت کا اقرار کرے تو یہ گویا اس کی طرف سے توبہ کا مظہر ہوگا اور اس صورت میں وہ مسلمان سمجھا جائے گا۔

جب کوئی شخص مرتد ہو جاتا ہے تو اس کے مال سے اس کی ملکیت زائل ہو جاتی ہے لیکن یہ ملکیت کا زائل ہونا موقوف رہتا ہے اگر اس شخص کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے اور پھر وہ مسلمان ہو جائے تو اس کی ملکیت بھی واپس آجاتی ہے اور اگر وہ اسی حالت ارتداد میں مر جائے یا اس کو قتل کر دیا جائے تو اس کے اس مال کے جو اس نے اسلام کی حالت میں کمایا تھا اس کے مسلمان وارث اور حقدار ہوں گے اور ان کو اس مال کا وہی حصہ ملے گا جو اس زمانہ میں اس کے دین (قرض وغیرہ) کی ادائیگی کے بعد بچے گا اور جو مال اس نے حالت ارتداد میں کمایا ہوگا اس میں سے اس کے زمانہ ارتداد کے دین کی ادائیگی کے بعد جو کچھ بچے گا وہ فئی شمار ہوگا۔ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا قول ہے، صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک مرتد کی ملکیت زائل نہیں ہوتی۔

مرتد کی میراث پانے والے کے بارہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مختلف اقوال بیان کئے جاتے ہیں، چنانچہ حضرت امام محمدؒ نے، حضرت امام اعظم سے نقل کیا ہے اور یہی قول زیادہ صحیح ہے کہ جب مرتد مر جائے یا اس کو قتل کر دیا جائے اور یا وہ دارالحرب بھاگ جائے تو اس کا مسلمان وارث اس کی میراث پائے گا اسی طرح اس کے مر جانے یا قتل کئے جانے یا دارالحرب بھاگ جانے کے بعد اس کی مسلمان بیوی بھی اس کے مال کی وارث ہوگی بشرطیکہ اس (مرتد کی وفات یا قتل یا دارالحرب بھاگ جانے کے) وقت وہ بیوی عدت میں ہو کیونکہ وہ مرتد اپنے ارتداد کے ذریعہ گویا (اپنی بیوی کو اپنی میراث دینے سے) راہ فرار اختیار کرنے والا ہوا لہٰذا اس کا ارتداد مرض الموت کی مانند ہوا (کہ جس طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے مرض الموت میں طلاق مغلظہ دے دے تو شریعت اس امر کے پیش نظر کہ اس کے شوہر نے اس کو اپنی میراث سے محروم رکھنے ہی کے لئے مرض الموت میں طلاق دی ہے اس کو اس کے شوہر کی میراث کی حقدار تسلیم

کرتی ہے اسی طرح مرتد بھی اپنے ارتداد کے ذریعہ گویا اپنی بیوی کو اپنی میراث سے محروم رکھنا چاہتا ہے اس لئے شریعت اس کے علی الرغم اس کی بیوی کو اس کی میراث کا حقدار تسلیم کرتی ہے، اگر کوئی عورت مرتد ہو جائے تو (اس کے مرنے کے بعد) اس کا خاوند اس کی میراث کا حقدار نہیں ہوتا، ہاں اگر بیوی بیماری کی حالت میں مرتد ہوئی (پھر مرگئی) تو اس کا شوہر اس کی میراث پائے گا اسی طرح تمام اقرباء اس کے سارے مال کے وارث ہوں گے یہاں تک کہ اس نے حالت ارتداد میں جو مال جمع کیا ہو گا وہ بھی ان وارثوں کو ملے گا۔

اگر کوئی شخص مرتد ہو کر دار الحرب میں چلا گیا یا حاکم نے اس کے دار الحرب چلے جانے کا حکم نافذ کر دیا تو اس کا مدبر غلام آزاد ہو جائے گا اور اس کی امہات اولاد بھی آزاد ہو جائیں گی اور اس کے جو دیون موجلہ ہوں گے وہ فوری طور پر قابل ادائیگی ہوں گے اور اس نے حالت اسلام میں جو مال پیدا کیا تھا وہ سب اس کے مسلمان ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گا اور اگر کسی مرتد نے اپنے زمانۂ اسلام میں کوئی وصیت کی ہوگی تو مبسوط وغیرہ کی ظاہری روایت کے بموجب وہ وصیت مطلقاً باطل ہوگی یعنی اس کی وصیت کا اجراء نہیں ہو گا خواہ وہ اس وصیت کا تعلق کسی قرابت دار سے ہو یا غیر قرابت دار سے۔

مرتد جب تک دار السلام میں گھومتا پھرتا نظر آئے اس کے بارہ میں قاضی ان احکام میں سے کوئی بھی حکم نافذ نہ کرے جو ذکر کئے گئے ہیں۔

جو شخص مرتد ہو جائے، معاملات وعقودات میں اس کے تصرف کرنے کی چار قسمیں ہیں۔ اول تو وہ تصرف ہے جو سب کے نزدیک پوری طرح جاری و نافذ ہوتا ہے جیسے اگر اس کو کوئی چیز ہبہ کی جائے اور وہ اس ہبہ کو قبول کر لے، یا وہ اپنی لونڈی کو اُمّ ولد بنا دے، یا جب اس کی لونڈی کسی بچے کو جنم دے اور وہ مرتد اس بچے کے نسب کا دعوی کرے (یعنی یہ کہے کہ یہ میرا بچہ ہے) تو اس بچہ کا نسب اس سے ثابت ہو جائے گا اور وہ بچہ اس کے دوسرے وارثوں کے ساتھ اس کی میراث کا حقدار ہو گا اور وہ لونڈی (جس کے بطن سے بچہ پیدا ہوا ہے) اس مرتد کی اُمّ ولد ہوگی نیز مرتد کی طرف سے تسلیم شفعہ کو قبول و نافذ کیا جائے گا، اسی طرح اگر مرتد اپنے ماذون غلام پر "حجر" نافذ کرے تو اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

دوسرا تصرف وہ ہے جو بالاتفاق باطل ہوتا ہے یعنی شریعت کی نظر میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا جیسے نکاح کرنا کہ یہ مطلقاً جائز نہیں ہے کہ کوئی مرتد کسی عورت سے نکاح کرے خواہ وہ مسلمان ہو، مرتد ہو، ذمیہ ہو یا مملوکہ ہو اسی طرح مرتد کا ذبیحہ بھی حرام ہے اور اگر اس نے کوئی شکار پکڑا خواہ وہ شکار کتے کے ذریعہ پکڑا گیا ہو یا باز کے ذریعہ اور یا بندوق کے ذریعہ مارا گیا ہو تو وہ بھی حرام ہو گا۔

تیسرا تصرف وہ ہے جو سب کے نزدیک موقوف رہتا ہے جیسے شرکت مفاوضت چنانچہ اگر کوئی مرتد کسی مسلمان سے شرکت و مفاوضت کرے تو اس کا حکم موقوف (معلق) رہتا ہے کہ اگر وہ مرتد مسلمان ہو گیا تو وہ شرکت مفاوضت بھی نافذ ہو جائے گی اور اگر وہ ارتداد کی حالت میں مرگیا یا اس کو قتل کر دیا گیا یا وہ دار الحرب چلا گیا اور قاضی و حاکم نے اس کے دار الحرب چلے جانا کا حکم نافذ کر دیا تو اس صورت میں وہ شرکت مفاوضت شروع سے شرکت عنان میں تبدیل ہو جائے گی، یہ صاحبین کا مسلک ہے لیکن حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک شرکت مفاوضت سرے سے باطل ہی نہیں ہوتی۔

چوتھا تصرف وہ ہے جس کے موقوف رہنے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں جیسے خرید و فروخت کے معاملات اجارہ کرنا، غلام کو آزاد کرنا، مدبر کرنا یا مکاتب کرنا، وصیت کرنا اور قبض دیون وغیرہ، چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ ان سب معاملات میں مرتد کے تصرفات موقوف رہتے ہیں اگر وہ اسلام قبول کرے تو نافذ ہو جاتے ہیں، اور اگر مرجائے، یا قتل کر دیا جائے یا قاضی و حاکم اس کے دار الحرب چلے جانے کا حکم نافذ کر دے تو یہ سارے تصرفات باطل ہو جاتے ہیں۔

ارتداد کے دوران مکاتب کے سارے تصرفات نافذ ہوتے ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے مرتد غلام یا باندی کو فروخت کرے تو اس کی بیع جائز ہوتی ہے۔

اگر کوئی مرتد اپنے ارتداد سے تائب ہو کر دار الاسلام واپس آجائے اور یہ واپسی قاضی و حاکم کی طرف سے اس کے دار الحرب چلے جانے کے حکم کے نفاذ سے پہلے ہو تو اس کے مال و اسباب کے بارہ میں اس کے مرتد ہو جانے کا حکم باطل ہو جاتا ہے اور وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا کہ مسلمان ہی تھا اور نہ اس کی کوئی اُمّ ولد آزاد ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی مدبر آزاد ہوتا ہے اور اگر اس کی واپسی قاضی و حاکم کے حکم کے نفاذ کے بعد ہوتی تو وہ اپنے وارثوں کے پاس اپنی جو چیز پائے اس کو لے لے اور جو مال و اسباب اس کے وارثوں نے بیع، ہبہ اور عتاق وغیرہ کے ذریعہ اپنی ملکیت سے نکال دیا ہے اس کے مطالبہ کا حق اس کو نہیں پہنچے گا اور اپنے وارثوں سے اس کو ایسے مال کا بدلہ و معاوضہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔

جو شخص اپنے ماں باپ کی اتباع میں مسلمان تھا (یعنی وہ بچہ تھا اور اپنے مسلمان ماں باپ کی وجہ سے مسلمان کے حکم میں تھا) اور پھر ارتداد کے ساتھ بالغ ہوا تو اگرچہ قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو قتل کیا جائے مگر اس کے بارہ میں ازراہ استحسان یہ حکم ہے کہ اس کو قتل نہ کیا جائے (کیونکہ بلوغ سے پہلے وہ مستقل بالذات مسلمان نہیں تھا بلکہ اپنے ماں باپ کی اتباع میں مسلمان کے حکم میں تھا) اسی طرح یہی حکم اس شخص کے بارہ میں ہے جو چھوٹی عمر میں مسلمان ہو گیا تھا مگر جب بالغ ہوا تو مرتد تھا، نیز اگر کسی شخص کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تھا اور پھر وہ اسلام سے پھر گیا تو اس کو بھی ازراہ استحسان قتل نہ کیا جائے لیکن ان تمام صورتوں میں حکم یہ ہے کہ اس کو اسلام قبول کر لینے پر مجبور کیا جائے اور اگر اسلام قبول کرنے سے پہلے کسی نے اس کو مار ڈالا تو مارنے والے پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔

لقیط (وہ بچہ جو کہیں پڑا ہوا پایا جائے) اگر دار الاسلام میں ہو تو اس کے مسلمان ہونے کا حکم نافذ کیا جائے اور اگر کفر کی حالت میں بالغ ہو تو اس کو اسلام لانے پر مجبور کیا جائے لیکن اس کو قتل نہ کیا جائے۔

یہاں تک تو مرتد کے بارہ میں کچھ احکام و مسائل کا ذکر تھا، اب کچھ ان باتوں کو بیان کر دینا ضروری ہے جن کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے چنانچہ ان میں سے بعض باتیں وہ ہیں جن کا تعلق ایمان و اسلام سے ہے بعض باتیں وہ ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات وغیرہ سے ہے، بعض باتیں وہ ہیں جن کا تعلق نماز، روزے اور زکوٰۃ سے ہے، بعض باتیں وہ ہیں جن کا تعلق علم اور علماء سے ہے بعض باتیں وہ ہیں جن کا تعلق حلال و حرام وغیرہ سے ہے، بعض باتیں وہ جن کا تعلق قیامت وغیرہ سے ہے اور بعض باتیں وہ ہیں جن کا تعلق کفر کی تلقین کرنے سے ہے۔ چونکہ یہ ایک طویل سلسلہ ہے اس لئے ان باتوں کو یعنی موجبات کفر کو ترتیب کے ساتھ الگ الگ عنوان کے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

وہ موجبات کفر جن کا تعلق ایمان و اسلام سے ہے: ایمان و اسلام کے بارہ میں وہ باتیں جن کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے، یہ ہیں۔

اگر کوئی شخص یوں کہے کہ "مجھے نہیں معلوم، میرا ایمان ہے یا نہیں؟" تو یہ خطائے عظیم ہے، ہاں اور اس بات کا مقصد اپنے شک کی نفی کرنا ہو تو خطائے عظیم نہیں ہے۔ جس شخص نے اپنے ایمان میں شک کیا اور یہ کہا کہ "میں مؤمن ہوں انشاء اللہ" تو وہ کافر ہے ہاں اگر وہ یہ تاویل کرے کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس دنیا سے ایمان کے ساتھ اٹھوں گا یا نہیں؟ تو اس صورت میں وہ کافر نہیں ہوگا جس شخص نے یہ کہا کہ "قرآن مخلوق ہے، یا ایمان مخلوق ہے" تو وہ کافر ہو گیا۔ جس شخص نے یہ عقیدہ رکھا کہ ایمان و کفر ایک ہیں تو وہ کافر ہے۔ جو شخص ایمان پر راضی و مطمئن نہ ہوا وہ کافر ہے جو شخص اپنے نفس کے کفر پر راضی ہوا وہ کافر ہے، اور جو شخص اپنے غیر کے کفر پر راضی ہوا اس کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں اور فتویٰ اس قول پر ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے غیر کے کفر پر اس لئے راضی ہوا تا کہ وہ (کافر) ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے تو وہ کافر نہیں ہوگا، اور اگر وہ اس کے کفر پر اس لئے راضی ہوا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں اس چیز کا اظہار کرے جو اس کی صفات کے لائق نہیں ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ جس شخص نے یہ کہا کہ اسلام کی صفت نہیں جانتا، تو وہ کافر ہو گیا۔ شمس الائمہ حلوائی نے اس مسئلہ کو بڑے سخت انداز میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس طرح کہنے والا ایسا شخص ہے جس کے لئے نہ دین ہے، نہ نماز ہے، نہ روزہ، نہ طاعت و عبادت ہے نہ نکاح ہے اور اس کی اولاد زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد ہے۔

• ایک مسلمان نے کسی عیسائی لڑکی سے نکاح کیا جس کے ماں باپ بھی عیسائی ہیں اور پھر وہ اس حال میں بڑی ہوئی کہ وہ کسی مذہب اور دین کو نہیں جانتی یعنی نہ تو وہ دین کو دل سے پہچانتی ہے اور نہ اس کو زبان سے بیان کر سکتی ہے اور وہ دیوانی بھی نہیں ہے تو اس صورت میں اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان تفریق ہو جائے گی۔ اسی طرح کسی مسلم بچی سے نکاح کیا، اور پھر جب وہ حالت عقل میں بالغ ہوئی تو نہ وہ اسلام کو دل سے جانتی پہچانتی ہے اور اس کو زبان سے بیان کر سکتی ہے اور وہ دیوانی بھی نہیں ہے تو اس صورت میں بھی اس کے شوہر کے درمیان جدائی ہو جائے گی۔

اگر کسی عورت سے پوچھا گیا کہ "توحید کیا ہے" اس نے جواب میں کہا "میں نہیں جانتی" تو اس جواب سے اس امر کی مراد اگر یہ ہو کہ مجھے وہ توحید (یعنی کلمۂ توحید) یاد نہیں ہے جو بچے مکتب میں پڑھا کرتے ہیں، تو اس میں اس کا کوئی نقصان نہیں۔ لیکن اگر وہ اس جواب سے یہ مراد رکھتی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو نہیں پہچانتی تو اس صورت میں وہ مؤمنہ نہیں رہے گی، اور اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔

اگر کوئی شخص اس حالت میں مرا کہ وہ یہ نہیں پہچانتا تھا کہ کوئی میرا خالق ہے، اس کے گھر کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اور گھر بھی ہے اور یہ کہ ظلم حرام ہے تو وہ مؤمن نہیں تھا۔ ایک شخص گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ (گناہ کے ذریعہ) اپنے اسلام کو ظاہر کرنا چاہئے تو وہ کافر ہے۔ ایک شخص نے کسی سے کہا کہ میں مسلمان ہوں تو اس نے جواب میں کہا کہ تجھ پر بھی لعنت اور تیری مسلمانی پر بھی لعنت، تو وہ کافر ہو گیا۔ ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا، اس کے بعد اس کا (عیسائی) باپ مر گیا، اس نے کہا کہ کاش میں اس وقت مسلمان نہ ہوتا تو اپنے باپ کا مال پا جاتا، وہ کافر ہو گیا۔ ایک عیسائی کسی مسلمان کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ میرے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرو تاکہ میں تمہارے ہاتھ پر اسلام قبول کر لوں اس مسلمان نے جواب دیا کہ "تم فلاں عالم کے پاس چلے جاؤ تاکہ وہ تمہارے سامنے اسلام پیش کرے۔ اور تم اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کرو" اس طرح کہنے والے کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔ ابو جعفر کہتے ہیں کہ اس طرح کہنے والا کافر نہیں ہوگا۔

ایک کافر نے اسلام قبول کیا تو ایک مسلمان نے اس سے کہا کہ تمہیں اپنے دین میں کیا برائی نظر آئی تھی (جو تم نے اسلام قبول کر لیا؟) یہ کہنے والا کافر ہو جائے گا۔

وہ موجبات کفر جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے ہے: وہ شخص کافر ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی ایسے وصف کی نسبت کرے جو اس کی شان کے لائق نہیں، یا کسی کو اس کا شریک یا بیٹا اور یا بیوی ٹھہرائے، یا اس کی طرف جہل کی یا عجز کی یا کسی اور خرابی کی نسبت کرے۔ یہ کہنے والا بھی کافر ہے کہ "یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا کام کرے جس میں کوئی حکمت نہ ہو" جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کفر پر راضی ہوتا ہے تو وہ کافر ہے۔ اور کوئی شخص یوں کہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ مجھے یہ کام کرنے کا حکم دے تو میں جب بھی یہ کام نہ کروں" تو وہ کافر ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی طرف جو "ید" اور "وجہ" کی نسبت کی گئی ہے درآنحالیکہ وہ جارحہ نہیں، تو کیا کسی دوسری زبان میں ان چیزوں کا اطلاق جائز ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں بعض علماء نے فرمایا کہ جائز ہے بشرطیکہ ان چیزوں سے (ان کے حقیقی مفہوم یعنی) اعضاء مراد نہ ہوں، اور اکثر علماء یہ فرماتے ہیں کہ جائز نہیں اور یہی معتمد علیہ قول ہے۔

اگر کسی شخص نے یوں کہا کہ "فلاں شخص میری آنکھ میں ایسا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں یہودی، تو جمہور علماء کے نزدیک وہ شخص کافر ہو جائے گا (کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف آنکھ کے اصل معنی یعنی ایک انسانی عضو کی نسبت کی ہے) لیکن بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اگر اس جملہ سے کہنے والے کی مراد اس فلاں شخص کے افعال کی برائی کو ظاہر کرنا مقصود ہو تو کافر نہیں ہوگا۔

ایک انسان کی وفات ہو گئی ایک دوسرے شخص نے کہا کہ خدا کو ایسا نہیں چاہئے تھا۔ تو یہ کفر ہے۔

ایک شخص نے اپنے دشمن سے کہا کہ "میں خدا کے حکم سے تیرے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہوں" دشمن نے جواب میں کہا کہ "میں خدا کا حکم نہیں جانتا یا یہ کہا کہ اس جگہ خدا کا حکم نہیں چلتا یا یہ کہا کہ۔ اس جگہ کوئی حکم نہیں ہے۔ یا یہ کہا کہ خدا حکم کرنے کے لائق نہیں ہے۔ یا یہ کہا کہ اس جگہ تو دیو ہی کا حکم چلے گا"۔ یہ سب جملے کفر کو لازم کرتے ہیں۔

حاکم عبدالرحمنؒ سے اس شخص کے بارہ میں پوچھا گیا جو یہ کہے کہ "میں فلاں کام رواج کے مطابق کر رہا ہوں خدا کے حکم سے نہیں کرتا" تو کیا ایسا شخص کافر ہو جائے گا؟ انہوں نے فرمایا کہ اگر اس جملہ سے اس کی مراد صرف فساد حق، ترک شریعت، اور اتباع رسم ہے نہ کہ اس کا مقصد خدا کے حکم کو رد کرنا ہے تو وہ کافر نہیں ہوگا۔

اگر کوئی شخص کسی ایسے آدمی کے بارہ میں جو کبھی بیمار نہ ہوتا ہو یہ کہے کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھول گیا ہے" یا یہ کہا کہ یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ بھول گیا ہے" تو یہ کفر ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی سے یوں کہا کہ "تیری زبان سے تو خدا بھی بس میں نہیں آتا میں کس طرح بس میں آؤں گا"۔ تو وہ کافر ہو جائے گا۔ کسی شخص نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ "تم تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب ہو" تو وہ کافر ہو جائے گا۔ یہ کہنا کہ "فلاں شخص بری تقدیر میں پھنس گیا ہے" خطائے عظیم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لئے مکان کو ثابت کرنا کفر ہے چنانچہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ "اللہ تعالیٰ سے کوئی مکان خالی نہیں ہے" تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اور اگر کسی نے یوں کہا کہ "اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے" تو دیکھا جائے گا کہ یہ بات اس نے کس مقصد سے کہی ہے، اگر اس کا مقصد اس چیز کی حکایت کرنا ہے جو ظاہری طور پر منقول ہے تو کافر نہیں ہوگا اور اگر اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی طرف مکان کی نسبت کرنا ہے تو پھر کافر ہو جائے گا اور اکثر علماء کے نزدیک اگر اس کی نیت کچھ بھی نہ ہو تو بھی کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح یہ کہنے والا بھی کافر ہو جائے گا کہ "اللہ تعالیٰ انصاف کے لئے بیٹھا یا اللہ تعالیٰ انصاف کے لئے کھڑا ہوا" کیونکہ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف فوق اور تحت کی نسبت کی گئی ہے۔ یہ کہنا بھی کفر ہے کہ "(میرا حامی و مددگار) آسمان پر خدا ہے اور زمین پر فلاں شخص ہے۔

اکثر علماء کے نزدیک یہ کہنا بھی کفر ہے کہ "خدا آسمان پر سے نیچے دیکھ رہا ہے" یا صرف یہ کہا کہ "خدا آسمان پر سے دیکھ رہا ہے۔ یا یہ کہا کہ "خدا عرش پر سے دیکھ رہا ہے"۔

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت کی وہ کافر ہو گیا۔ اگر کسی شخص نے یوں کہا کہ "اے اللہ! یہ ظلم مت پسند کر" تو بعض علماء کے نزدیک وہ کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص سے یوں کہا کہ "اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے انصاف کیا تو مجھے تم سے انصاف ملے گا" تو وہ کافر ہو جائے گا۔ ہاں لفظ "اگر" کی بجائے "جس وقت" کہا تو کافر نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی سے یوں کہا کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن حق اور عدل کے ساتھ حکم کیا تو میں تم سے اپنا حق لے لوں گا" کافر ہو جائے گا۔

اگر کسی نے یوں کہا کہ "اے اللہ! جب ایک ظالم ظلم کرتا ہے تو اس کا ظلم قبول مت کر، اگر تو نے اس کا ظلم قبول کیا تو میں قبول نہیں کروں گا" یہ کفر ہے، کیونکہ اس شخص نے گویا یہ کہا کہ اے اللہ! اگر تو اس کے ظلم پر راضی ہوگا تو میں راضی نہیں ہوں گا۔

ایک شخص نے کسی سے کہا کہ "جھوٹ مت کہو" اس شخص نے جواب میں کہا کہ "جھوٹ کس لئے ہے، کہنے ہی کے لئے تو ہے" یہ کفر ہے۔

کسی شخص سے کہا گیا کہ "اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرو" اس نے کہا کہ "مجھے نہیں چاہئے" یا کسی نے کہا کہ "اگر اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کرے، غارت کروں" یا کسی سے کہا گیا کہ "اللہ تعالیٰ کی نافرمانی مت کرو کیونکہ اگر تم نافرمانی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دوزخ میں داخل کرے گا" اس نے کہا کہ "میں دوزخ سے نہیں ڈرتا" یا کسی سے یہ کہا کہ "زیادہ مت کھاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوست نہیں رکھے گا" اس نے کہا کہ "میں تو کھاؤں گا چاہے دشمن رکھے چاہے دوست رکھے" یہ باتیں کفر کو لازم کرتی ہیں۔ اسی طرح اگر کسی سے یہ کہا گیا کہ "زیادہ مت ہنسو۔ یا زیادہ مت سوؤ" اس کے جواب میں اس نے کہا کہ "میں اتنا کھاؤں گا، اتنا سوؤں گا اور اتنا ہنسوں گا کہ جتنا

چاہوں گا۔" یہ کفر ہے۔

ایک شخص سے یہ کہا کہ "گناہ مت کرو کیونکہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے" اس نے کہا کہ "میں عذاب کو ایک ہاتھ پر اٹھالوں گا" یہ کفر ہے۔

اگر کسی شخص سے یہ کہا گیا کہ "اپنے ماں باپ کو مت ستاؤ" اس نے کہا کہ "ان کا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے" یہ اگرچہ کفر نہیں ہے لیکن سخت گناہ کی بات ہے۔ ایک شخص نے ابلیس لعین سے کہا کہ "اے ابلیس! تو میرا فلاں کام کردے تاکہ میں تیرا کہنا مانوں اور اپنے باپ کو ستاؤں اور تو جس چیز سے منع کرے اس سے باز رہوں" یہ کفر ہے۔

اگر کسی شخص نے کسی سے یہ کہا کہ "اگر خدا یہ دونوں جہاں نہ بناتا تو میں تم سے اپنا حق لے لیتا" یہ کفر ہے۔ ایک شخص نے کوئی جھوٹی بات کہی اور ایک سننے والے نے کہا کہ "میرا خدا تمہارے اس جھوٹ کو سچ کردے۔ یا یہ کہا کہ خدا تمہارے اس جھوٹ کے ساتھ برکت دے۔" تو یہ کفر کے قریب ہے اسی طرح ایک شخص نے جھوٹ بولا اور سننے والے نے کہا کہ "خدا تمہارے جھوٹ میں برکت دے" تو وہ کافر ہو گیا۔

ایک شخص نے کسی سے کہا کہ "فلاں شخص تمہارے ساتھ سیدھا نہیں چلتا" اس نے جواب میں کہا کہ "اس کے ساتھ تو خدا بھی سیدھا نہیں چلے گا" تو یہ کہنے والا کافر ہو جائے گا۔

اگر کسی نے یہ کہا کہ "اللہ تعالیٰ زر کو محبوب رکھتا ہے اس لئے اس نے مجھے زر نہیں دیا" تو وہ کافر ہو جائے گا بشرطیکہ اس کہنے سے اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی طرف بخل کی نسبت کرنا ہو۔ ہاں صرف اتنا کہنا کفر کو لازم نہیں کرتا کہ "اللہ تعالیٰ زر کو پسند نہیں کرتا ہے"۔

ایک شخص نے کسی سے کہا کہ "انشاء اللہ تم یہ فلاں کام کرو" اس نے جواب دیا کہ "میں ان شاء اللہ کے بغیر یہ کام کروں گا" تو یہ کفر ہے۔

ایک مظلوم نے کہا کہ "(میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے) تقدیر الٰہی کے مطابق ہے" ظالم نے یہ سن کر کہا کہ "میں جو کچھ کر رہا ہوں تقدیر الٰہی کے بغیر کر رہا ہوں" یہ کفر ہے۔ اگر کسی نے یہ کہا کہ "اے خدا! مجھ پر رحمت کرنے سے دریغ نہ کیجئے" تو یہ کفریہ الفاظ میں سے ہے۔

میاں بیوی آپس میں گفتگو کر رہے تھے (بیوی کی طرف سے) جب گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو میاں نے کہا کہ "خدا سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو" بیوی نے جواب میں کہا کہ "میں اللہ سے نہیں ڈرتی" یہ کہنے سے بیوی مرتد ہو جائے گی۔ اور ان دونوں (میاں بیوی) کے درمیان جدائی واقع ہو جائے گی بشرطیکہ میاں نے بیوی کو اس کی کسی صریح معصیت پر ٹوکا ہو اور اس کو خدا سے ڈرایا ہو اور اس کے جواب میں بیوی نے مذکورہ جملہ کہا ہو، ہاں اگر میاں نے بیوی کو اس کی کسی ایسی بات پر ٹوکا ہو جس میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا کوئی موقع نہ ہو (یعنی بیوی نے کوئی معصیت نہ کی ہو) تو اس صورت میں وہ کافر نہیں ہوگی۔ البتہ اگر اس صورت میں بھی اس جملہ سے بیوی کا مقصد خوف خدا اور تقویٰ کی اہانت ہو تو دونوں کے درمیان جدائی واقع ہو جائے گی۔

ایک شخص نے کسی کو مارنے کا ارادہ کیا اور اس سے کہا کہ "تم خدا سے نہیں ڈرتے" اس نے مارنے والے سے کہا کہ "نہیں" یہ کفر نہیں ہے کیونکہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کہے کہ خدا سے ڈرنے کا سوال تو اس چیز میں پیدا ہوتا ہے جس کو میں کروں۔

ایک شخص کسی گناہ کا ارتکاب کر رہا تھا کہ کسی نے اس کو ٹوکا اور کہا کہ "کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟" اس نے جواب دیا کہ "نہیں" وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے، اسی طرح کسی اور شخص سے کہا گیا کہ "کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے" اور اس نے غصہ کی حالت میں جواب دیا کہ "نہیں" تو وہ کافر ہو جائے گا۔

اگر کوئی شخص خدا کے کسی حکم کو یا پیغمبر کی شریعت کو پسند نہ کرے مثلاً زید سے بکر نے کہا کہ خدا نے چار بیویاں حلال کی ہیں اور زید کہے

کہ میں اس حکم کو پسند نہیں کرتا تو یہ کفر ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "صرف خدا کا وجود ہونا چاہئے اور کسی چیز کا وجود نہیں ہونا چاہئے" تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ "میرے حق میں تمام نیکیاں خدا نے پیدا کی ہیں اور برائی کا خالق میں ہوں" تو وہ کافر ہو جائے گا۔

ایک شخص سے کہا گیا کہ "یار! تم اپنی بیوی کے بس میں نہیں آئے" اس نے جواب دیا کہ "عورتوں کے بس میں خدا بھی نہیں آتا میں کیونکر بس میں آجاؤں گا" یہ کفر ہے۔

اگر کسی شخص نے کسی سے یہ کہا کہ "خدا کی طرف سے دیکھتا ہوں اور تمہاری طرف سے دیکھتا ہوں (یعنی جو چیز مجھے ملی ہے وہ خدا کی جانب سے ہے اور تمہاری جانب سے ہے) یا یہ کہا کہ "میں خدا سے امید رکھتا ہوں اور تم سے امید رکھتا ہوں" تو یہ برا ہے ہاں اگر یوں کہے کہ "میں خدا کی طرف سے دیکھتا ہوں اور اس کا ظاہری سبب تمہیں سمجھتا ہوں" تو یہ ایک اچھی بات ہے۔

ایک شخص نے اپنے کسی مخالف سے کسی بات میں قسم کھلوانی چاہی، اس مخالف نے کہا کہ "میں خدا کی قسم کھاتا ہوں" لیکن قسم کھلوانے والے نے کہا کہ "میں خدا کی قسم نہیں چاہتا بلکہ طلاق یا عتاق کی قسم لینا چاہتا ہوں" تو وہ بعض علماء کے نزدیک کافر ہو جائے گا لیکن اکثر علماء کے نزدیک کافر نہیں ہوگا اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

اگر کسی شخص نے کسی سے کہا کہ "خدا جانتا ہے کہ میں تمہیں ہمیشہ دعا کے ساتھ یاد رکھتا ہوں" تو اس کے کفر کے بارے میں مشائخ کے اختلافی اقوال ہیں۔

اگر کسی شخص نے بطور ہنسی مزاق فارسی میں کہ "من خدایم" یعنی اس کا مطلب یہ کہنا تھا کہ خدا آئیم تو وہ کافر ہو جائے گا۔

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ "تمہیں ہمسایہ کے حق کی پراہ نہیں" بیوی نے کہا "نہیں" شوہر نے کہا "تمہیں خاوند کے حق کی پرواہ نہیں؟ بیوی نے کہا" نہیں! پھر شوہر نے کہا "تمہیں خدا کے حق کی پرواہ نہیں" بیوی نے اس کے جواب میں بھی کہا "نہیں" تو وہ کافر ہو جائے گی۔

اگر کسی شخص نے اپنی بیماری سے پریشان ہو کر یا تنگی معاش کے ابتلاء کی وجہ سے کہا کہ "نہ معلوم خدا نے مجھے پیدا کیوں کیا ہے جب کہ دنیا کی لذتوں اور راحتوں سے میں محروم ہوں" تو اس کے بارہ میں بعض علماء تو یہ کہتے ہیں کہ وہ کافر نہیں ہوگا لیکن اس کی یہ بات ایک خطائے عظیم ہے۔

ایک شخص نے کسی سے کہا کہ "تم نے جو برائیاں کی ہیں ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب میں مبتلا کرے گا"۔ اس نے جواب میں کہا کہ "کیا خدا تم نے مقرر کر رکھا ہے کہ خدا وہی کرے گا جو تم کہو" وہ کافر ہو جائے گا۔

اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ "خدا دوزخ بنانے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے" تو وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی بد نما جانور یا بد نما انسان کو دیکھ کر کہا کہ "کیا کوئی خدا کا کار پرداز نہیں ہے کہ اس نے اس قسم کا جانور یا انسان پیدا کیا" تو وہ کافر ہو جائے گا۔

ایک مفلس نے شدت افلاس میں کہا کہ "فلاں شخص بھی اللہ کا بندہ ہے اور اس کو اس قدر نعمتیں حاصل ہیں اور میں بھی اللہ کا بندہ ہوں اور اتنے رنج و آلام میں مبتلا ہوں، کیا یہ انصاف ہے" یہ کہنے سے وہ کافر ہو گیا۔ اسی طرح ایک شخص سے کہا گیا کہ خدا سے ڈرو، اس نے جواب دیا کہ "خدا کہاں ہے" تو وہ کافر ہو گیا۔ نیز اگر کسی نے یہ کہا کہ "پیغمبر اپنی قبر میں نہیں ہیں" یا یہ کہا کہ "خدا کا علم قدیم نہیں ہے" یا یہ کہا کہ "معدوم کا علم اللہ کو نہیں ہے" تو وہ بھی کافر ہو گیا۔

اگر کسی شخص کا نام عبداللہ ہو اور ایک اور شخص اس کو پکارتے وقت لفظ اللہ کے بجائے حرف کاف کا اضافہ کر دے تو وہ کافر ہو جائے گا بشرطیکہ وہ پکارنے والا عالم ہو۔ اسی طرح اگر کوئی عالم لفظ خالق کی عمداً تصغیر کرے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ "خدا تمہارے دل پر رحم کرے میرے دل پر نہیں" تو وہ کافر ہو جائے گا بشرطیکہ اس نے یہ بات رحمت الٰہی

سے بے نیازی کے پیش نظر کہی ہو۔ اور اگر اس بات سے اس کا مطلب یہ ہو کہ میرا دل ثابت باثبات اللہ ہے مضطرب نہیں ہے، تو وہ کافر نہیں ہوگا۔

اگر کسی شخص نے یوں قسم کھائی کہ "خدا کی قسم اور تیری خاک پاک کی قسم" تو وہ کافر ہو جائے گا۔ ہاں اگر کسی نے یوں قسم کھائی کہ خدا کی قسم اور تیرے سر، تیری جان کی قسم، تو اس کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔

وہ موجبات کفر جن کا تعلق انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہے: جو شخص انبیاء میں سے کسی بھی نبی کا اقرار نہیں کرے گا یا رسولوں میں سے کسی بھی رسول کی کسی بھی سُنّت پر ناراضگی یا عدم اعتقاد و اطمینان کا اظہار کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔ ابن مقاتلؒ سے اس شخص کے بارہ میں پوچھا گیا جو حضرت خضر یا حضرت ذی الکفل کی نبوت کا انکار کرے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ کسی ایسے نبی کی نبوت کا انکار کہ جس کی نبوت پر اس کی اُمت کے لوگ متفق نہ ہوئے ہوں، نقصان دہ نہیں ہے۔

اگر کسی شخص نے یوں کہا کہ اگر فلاں نبی ہوتا تو میں اس پر ایمان لاتا تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اور حضرت جعفرؒ سے منقول ہے کہ اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ "میں اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء پر ایمان لایا اور مجھے نہیں معلوم کہ آدم علیہ السلام نبی تھے یا نہیں" تو وہ کافر ہو جائے گا۔

حضرت جعفرؒ سے اس شخص کے بارہ پوچھا گیا جو انبیاء کی طرف فواحش کی نسبت کرے جیسے کسی نبی کی طرف عزم زنا کی نسبت کرنا یا اسی طرح کی کوئی اور بات کہنا جیسا کہ حشویہ (ایک باطل فرقہ) حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہ میں اس قسم کا اظہار کرتے ہیں، تو انہوں نے فرمایا کہ ایسا شخص کافر ہے، کیونکہ یہ انبیاء کے حق میں بدگوئی ہے اور ان کی اہانت کے مترادف ہے۔

ابوذر کہتے ہیں کہ جس شخص نے یہ کہا کہ "ہر نافرمانی کفر ہے" اور پھر یہ کہا کہ انبیاء علیہم السلام نے نافرمانی کی" تو وہ کافر ہے کیونکہ اس نے انبیاء کے حق میں بدگوئی کی، اور اگر یہ کہا کہ "انبیاء علیہم السلام نے کبھی کوئی نافرمانی نہیں کی نہ حالت نبوت میں اور نہ اس سے پہلے" تو بھی وہ کافر ہے کیونکہ اس نے یہ بات کہہ کر گویا نصوص (قرآن کریم کی آیات عصی ربہ الایہ وغیرہ) کی تردید کی۔

بعض علماء سے یہ منقول ہے کہ "جس شخص نے یہ نہیں جانا کہ محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں، وہ مسلمان نہیں ہے، جو شخص اپنے قلب میں کسی بھی نبی کے بارہ میں بغض رکھے وہ کافر ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے یوں کہا کہ "اگر فلاں اللہ کا رسول ہوتا تو میں اس پر ایمان نہ لاتا" تو وہ کافر ہو جائے گا جیسا کہ یہ کہنے والا کافر ہو جاتا ہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ بھی مجھے فلاں کام کا حکم دیتا تو میں نہ کرتا"۔

جس شخص نے یہ کہا کہ "انبیاء نے جو کچھ فرمایا ہے اگر وہ سچ اور مبنی بر حقیقت ہوتا تو ہم نجات پا جاتے" وہ کافر ہو گیا۔

اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ "میں اللہ کا رسول ہوں" یا فارسی میں کہا کہ "من پیغمبرم" اور اس سے اس کی مراد بھی یہ ہے کہ "میں اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہوں" تو وہ کافر ہو جائے گا اور جس وقت اس نے یہ بات کہی اور کسی دوسرے شخص نے اس سے معجزہ کا مطالبہ کیا تو بعض علماء کے نزدیک معجزہ کا مطالبہ کرنے والا بھی کافر ہو جائے گا۔ جب کہ متاخرین علماء کہتے ہیں کہ اگر معجزہ طلب کرنے والے کا مقصد اس شخص کو ذلیل کرنا اور اس کو عاجز کرنا ہے تو وہ کافر نہیں ہوگا۔

اگر کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کے بال مبارک کو "چھوٹا سا بال" کہا تو وہ بعض علماء کے نزدیک کافر ہو جائے گا اور بعض علماء کے نزدیک کافر نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اس نے یہ بات اہانت کے طور پر کہی ہے تو ان کے نزدیک بھی کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ "میں نہیں جانتا کہ محمد ﷺ انسان تھے یا جن" تو وہ کافر ہو جائے گا۔

اگر کسی نے یوں کہا کہ "اگر فلاں شخص پیغمبر ہے تو میں اس سے اپنا حق لوں گا" وہ کافر نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی نے یہ کہا کہ محمد درویشک بود (یعنی محمدؐ ایک چھوٹے فقیر تھے) یا یہ کہا کہ "پیغمبر کا کپڑا بدبودار اور میلا کچیلا تھا۔ یا یہ کہ آنحضرت ﷺ کے ناخن بڑھ رہے تھے" تو بعض علماء کے نزدیک وہ بلا کسی قید کے کافر ہو جائے گا جب کہ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ وہ اس صورت میں کافر ہوگا جب کہ وہ یہ بات بطریق اہانت کہے۔

اگر کسی نے کسی ایسے شخص کو گالی دی جس کا نام محمد یا احمد تھا یا اس کی کنیت ابوالقاسم تھی اور اس کو یوں مخاطب کیا کہ "اے زانیہ کی اولاد، تو وہ کافر ہو گیا بشرطیکہ (اس کا مقصد ہر اس شخص کو یہ گالی دینا ہو جس کا نام محمد یا احمد اور یا اس کی کنیت ابوالقاسم ہو اور اس طرح) نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی بھی اس کے پیش نظر ہو۔

یہ کہنے سے کوئی کافر نہیں ہوتا کہ "ہر گناہ کبیرہ ہے لیکن انبیاء کے گناہ صغیرہ ہیں" اور اگر کسی نے یہ کہا کہ "ہر برائی کا کام جو قصدًا کیا جائے گناہ کبیرہ ہے اس کام کا کرنے والا فاسق ہے" اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ "انبیاء کے معاصی قصدًا تھے" تو وہ کافر ہو گیا کیونکہ اس نے انبیاء کی شان میں بدگوئی کی۔ ہاں اگر اس نے یہ کہا کہ "انبیاء کے معاصی قصدًا نہیں تھے" تو وہ کافر نہیں ہوگا۔

جو رافضی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی شان میں بدزبانی کرے اور نعوذ باللہ ان پر لعنت بھیجے تو وہ کافر ہے ہاں اگر اس نے حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ پر فضیلت دی تو وہ کافر نہیں ہوگا لیکن اس کو مبتدع کہا جائے گا، معتزلی بھی مبتدع ہے لیکن اگر وہ یہ کہے کہ خدا کا دیدار محال ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

حضرت عائشہؓ پر زنا کی تہمت لگانے والے اللہ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے ہاں اگر کسی نے آنحضرت ﷺ کی دوسری ازواج مطہرات پر زنا کی تہمت لگائی تو وہ کافر نہیں ہوتا لیکن مستحق لعنت ہوتا ہے اسی طرح جو شخص یہ کہے کہ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ رسول کریم ﷺ کے صحابہ نہیں تھے تو وہ کافر نہیں ہوگا لیکن مستحق لعنت ہوگا۔

حضرت ابوبکرؓ کی امامت و خلافت کا انکار کرنے والا بعض علماء کے نزدیک تو کافر ہو جاتا ہے اور بعض علماء کے نزدیک کافر نہیں ہوتا بلکہ مبتدع ہوتا ہے لیکن صحیح قول یہی ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے، اسی طرح حضرت عمرؓ کی خلافت کا انکار کرنے والا بھی صحیح قول کے مطابق کافر ہو جاتا ہے۔

جو لوگ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ کو نعوذ باللہ کافر کہیں، خود ان کو کافر کہنا لازم ہے، اسی طرح فرقہ زیدیہ کے تمام لوگوں کو بھی کافر کہنا واجب ہے کیونکہ وہ یہ باطل اعتقاد رکھتے ہیں کہ نعوذ باللہ کسی عجمی ملک میں ایک نبی کا ظہور ہوگا جو ہمارے نبی ﷺ کے دین کو منسوخ کرے گا اور ہمارے سردار محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو کالعدم کرے گا۔

ان روافض کو بھی کافر کہنا واجب ہے جو تناسخ ارواح کے قائل ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مرجانے والا دوبارہ دنیا میں لوٹ آئے گا اور ائمہ میں اللہ تعالیٰ کی روح حلول کئے ہوئے ہے، امام باطن کا ظہور ہوگا، جب تک اس امام باطن کا ظہور نہ ہو اوامر و نواہی معطل ہیں اور یہ کہ جبرئیل علیہ السلام نے وحی لانے میں غلطی کی کیونکہ انہیں محمد ﷺ کی بجائے حضرت علیؓ کے پاس وحی لانی چاہئے تھی: یہ فرقہ ملت اسلامیہ سے خارج ہے اور جو احکام مرتدوں کے بارہ میں ہیں وہی اس فرقہ کے لوگوں پر نافذ ہوتے ہیں۔

جس شخص کو آنحضرت ﷺ کی شان میں بدزبانی کرنے پر مجبور کیا گیا ہو اس کی تین صورتیں ہیں۔

① اگر وہ یہ اقرار کرے کہ میرے دل میں محمد ﷺ کی برائی کا کوئی خطرہ بھی نہیں گزرا بلکہ میں نے اپنی زبان سے صرف وہی الفاظ ادا کئے جن کو ادا کرنے پر مجھے مجبور کیا گیا تھا درانحالیکہ ان الفاظ کی ادائیگی بھی مجھ پر سخت شاق تھی، تو وہ کافر نہیں ہوگا اور اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی جس کو اپنی زبان سے کلمۂ کفر کی ادائیگی پر مجبور کیا گیا ہو اور اس نے وہ کلمۂ کفر اپنی زبان سے ادا کیا ہو مگر اس کا قلب ایمان پر ثابت و مطمئن رہا ہو۔

② اگر وہ اقرار کرے کہ (جب مجھے محمد کو برا کہنے پر مجبور کیا گیا تو) میرے دل میں اس عیسائی کا خیال آ گیا جس کا نام محمد تھا چنانچہ جب میں نے اپنی زبان سے محمد کے بارہ میں برے الفاظ کہے تو میری مراد وہی عیسائی تھا، اس صورت میں بھی وہ کافر نہیں ہوگا۔

③ اور اگر وہ یہ اقرار کرے کہ (جب مجھے محمد کے بارہ میں برے الفاظ کہنے پر مجبور کیا گیا تو) میرے دل میں اس عیسائی کا بھی خیال آ گیا جس کا نام محمد ہے لیکن میں نے اپنی زبان سے جو برے الفاظ ادا کئے وہ اس عیسائی کے بارہ میں نہیں تھے بلکہ محمد ﷺ کے بارہ میں تھے، اس

صورت میں وہ کافر ہو جائے گا قانوناً بھی اور عند اللہ بھی۔

جس شخص نے یہ کہا کہ محمد ﷺ مجنوں تھے، وہ کافر ہے، ہاں یہ کہنے والا کہ محمد ﷺ بیہوش ہو گئے تھے، کافر نہیں ہو گا۔

اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ "اگر حضرت آدم علیہ السلام (جنت میں) گیہوں نہ کھاتے تھے تو ہم اشقیاء نہ ہوتے" تو وہ کافر ہو جائے گا۔

جس شخص نے حدیث متواتر کا انکار کیا وہ کافر ہو گیا، جس شخص نے حدیث مشہور کا انکار کیا وہ بعض علماء کے مطابق تو کافر ہو گیا لیکن بعض علماء کے مطابق گمراہ ہوا کافر نہیں ہوا، اور جس شخص نے خبر واحد کا انکار کیا وہ بھی کافر نہیں ہوتا مگر اس کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی نبی کے بارہ میں اپنی اس خواہش کا اظہار کرے کہ "وہ نبی نہ ہوتا" تو اس کے متعلق علماء کہتے ہیں کہ اگر اس کی مراد یہ ہو کہ اس نبی کا مبعوث ہونا خارج از حکمت نہ ہوتا تو وہ کافر نہیں ہو گا اور اگر اس کی مراد اس نبی کی توہین اور اپنے کسی بغض کا اظہار ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

ایک شخص نے کسی کے سامنے کہا کہ "آنحضرت ﷺ فلاں چیز مثلاً کدو کو بہت پسند فرماتے تھے" اگر سننے والے نے جواب میں کہا کہ "میں اس کو پسند نہیں کرتا" تو یہ کفر ہے، حضرت امام ابو یوسفؒ سے بھی یہی منقول ہے لیکن بعض متاخرین علماء فرماتے ہیں کہ اگر اس نے یہ بات کہ "میں اس کو پسند نہیں کرتا" بطور اہانت کہی ہے تو وہ کافر ہو جائے گا ورنہ کافر نہیں ہو گا۔

اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ "حضرت آدم علیہ السلام نے کپڑا بنا تھا اس لئے ہم سب جولاہے زادے ہیں" یہ کفر ہے۔ ایک شخص نے کسی کے سامنے کہا کہ "آنحضرت ﷺ جب کھانا کھاتے تھے تو اپنی تینوں انگلیاں چاٹ لیتے تھے" اگر سننے والے نے یہ کہا "یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے" تو وہ کافر ہو گیا۔

جس شخص نے یہ کہا کہ "گنواروں میں عجیب رواج ہے کہ کھانا کھاتے ہیں اور ہاتھ نہیں دھوتے" تو اگر اس نے یہ بات آنحضرت ﷺ کے عمل کی حقارت کے پیش نظر کہی ہے تو وہ کافر ہو گیا اسی طرح جس شخص نے یہ کہا کہ "مونچھیں پست (ہلکی) کرانے اور عمامہ (کا سرا یعنی شملہ) گلے کے نیچے تک لٹکانے کا نہ معلوم کیسا رواج ہے؟" تو اگر اس نے یہ بات رسول کریم ﷺ کی سُنت پر طنز کے طور پر کہی ہے تو وہ کافر ہو گیا۔

ایک شخص نے کوئی بات کہی اس پر دوسرے نے اس سے کہا کہ "جھوٹ کہتا ہے اگرچہ ساری بات پیغمبرانہ ہے" اس کہنے سے اس پر کفر لازم ہو جائے گا ایسے ہی اگر یہ کہا کہ میں اس کی بات کو نہیں مانوں گا اگرچہ اس کی ساری بات پیغمبرانہ ہے تو اس سے بھی کفر لازم آئے گا۔

ایک شخص نے اپنے غلام کو مارنے پیٹنے کا ارادہ کیا، اس سے دوسرے نے کہا کہ اسے مت مارو، اس نے کہا کہ تم تو تم، اگر محمد مصطفیٰ ﷺ بھی کہیں تو بھی نہیں چھوڑ سکتا، یا یہ کہا کہ اگر آسمان سے آواز آئے کہ "اس کو مت مارو" تو بھی میں نہیں چھوڑ سکتا، ماروں گا، یہ کہنے سے اس پر کفر لازم آئے گا۔

کسی نے احادیث نبوی ﷺ سے کوئی حدیث پڑھی جس کو سن کر ایک شخص نے کہا کہ "ہمہ روز خلشہا خواند" یعنی ہر روز الجھن کی چیز پڑھتا ہے، تو اگرچہ اس نے اس کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف نہ کی ہو بلکہ پڑھنے والے کی طرف کی ہو لیکن وہ کافر ہو جائے گا بشرطیکہ اس حدیث کا تعلق احکام شریعت میں سے کسی حکم کے ساتھ ہو یا دین کے ساتھ ہو، اور اگر وہ ایسی حدیث تھی کہ جس کا تعلق دین و شریعت سے نہیں تھا تو اس کی تکفیر نہیں ہو گی، اور اس کے اس قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ وہ اس کا پڑھنا غیر اولیٰ بتا رہا تھا۔

اگر کسی نے کہا "بحرمت جوانک عربی" اور اس جملہ سے اس کی مراد آنحضرت ﷺ تھے تو اس کی تکفیر کی جائے گی کسی نے کہا کہ "نبی کریم ﷺ ایک وقت پیغمبر تھے۔ اور ایک وقت ایسا تھا کہ پیغمبر نہ تھے" یا اس طرح کہا کہ "میں نہیں جانتا کہ آنحضرت ﷺ قبر میں

مؤمن ہیں یا کافر" تو یہ کہنے سے کافر ہو جائے گا۔
کسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ "خلاف بات نہ کہو" اس عورت نے کہا کہ "پیغمبروں نے خلاف کہا ہے" تو اس کا یہ کہنا کفر ہے توبہ کرے اور پھر نکاح کی تجدید کرے! کسی نے کسی سے کہا کہ مجھے تیرا دیکھنا گویا ملک الموت کا دیکھنا معلوم ہوتا ہے، تو اس کا ایسا کہنا بہت بڑی غلطی ہے اور اس کے کفر میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ بعضوں نے کہا کہ کافر ہو جائے گا اور اکثر علماء کہتے ہیں کہ اس کہنے سے وہ کافر نہیں ہو گا۔

اور فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ بعضوں نے یہ کہا ہے کہ اگر اس نے یہ جملہ ملک الموت سے عداوت کی بنیاد پر کہا تو وہ کافر ہو جائے گا اور اگر موت سے ناگواری کی بنا پر کہا ہے تو کافر نہیں ہو گا، اور اگر یہ کہا کہ فلاں کے منہ کو ملک الموت کی طرح دشمن سمجھتا ہوں تو اکثر مشائخ کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ کافر ہو جائے گا، کسی نے کہا کہ میں فلاں کی گواہی نہیں سنتا خواہ وہ جبریل و میکائیل ہو تو اس صورت میں اس کی تکفیر کی جائے گی۔ اگر کسی نے فرشتوں میں سے کسی فرشتے کو عیب لگایا تو اس کی تکفیر کی جائے گی، اگر کوئی کہے کہ میں فرشتہ ہوں تو اس کہنے سے وہ کافر نہیں ہوتا، اور اگر یہ کہے کہ میں نبی ہوں تو اس کہنے سے وہ کافر ہو جائے گا۔
ایک شخص نے ایک عورت سے بغیر کسی شخص کی موجودگی کے نکاح کیا اور کہا کہ میں نے خدا اور رسول کو گواہ بنایا، یا یہ کہا کہ خدا اور فرشتہ کو گواہ بنایا تو اس صورت میں وہ کافر ہو جائے گا، اور اگر کہا کہ دائیں اور بائیں والے فرشتوں کو گواہ بنایا تو اس صورت میں کافر نہ ہو گا۔

وہ موجبات کفر جن کا تعلق قرآن پاک سے ہے: اگر کسی نے کہا کہ قرآن مخلوق ہے تو وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح اگر کسی نے کسی آیت قرآنی کا انکار کیا یا اس کے ساتھ ٹھٹھا مخول کیا، یا عیب لگایا تو ان تمام صورتوں میں وہ کافر ہو جائے گا۔ کسی نے دف کی تھاپ پر یا بانسری کی لے پر قرآن پڑھا تو اس نے کفر کیا، ایک شخص قرآن پڑھ رہا تھا دوسرے نے سن کر کہا کہ "یہ کیا طوفان کی آواز ہے" تو اس کا یہ کہنا کفر ہے، اور اگر کسی نے کہا کہ میں نے بہت قرآن پڑھا اور مجھ سے گناہ معاف نہیں کیا گیا تو اس کہنے سے وہ کافر ہو گیا۔
کسی نے کسی سے کہا کہ تو نے قل ھو اللہ کی کھال کھینچ لی، یا یہ کہا کہ تو نے الم نشرح کا گریبان پکڑ لیا، یا اس شخص سے جو کسی بیمار کے پاس سورۂ یٰس پڑھ رہا تھا کہا "یٰس مردہ کے منہ میں مت رکھو" یا کسی سے کہا اے انا اعطینک الکوثر سے بھی زیادہ کوتاہ۔ یا ایک شخص قرآن پڑھ رہا تھا اور اس کو کوئی کلمہ یاد نہیں آرہا تھا اس سے کہا و التفت الساق بالساق یا کسی کے پاس بھرا ہوا پیالہ لایا اور کہا کاسا دھاقا یا کسی سے مذاق کے طور پر کہا فکانت سرابا یا ناپ تول کے وقت مذاق کے طور پر کہا و اذا کالو ھم او وزنو ھم یخسرون یا کسی سے یہ کہا کہ تو نے الم نشرح کی پگڑی باندھ لی ہے اور اس کی مراد یہ تھی کہ تو نے علم کا اظہار کیا ہے یا کسی نے کسی جگہ کے لوگوں کو جمع کیا اور کہا فجمعناھم جمیعا یا یہ کہا و حشرناھم فلم نغادر منھم احدا یا کسی سے کہا کہ تو و النازعات نزعا کیونکر پڑھتا ہے نون کے پیش کے ساتھ یا اسے زیر دے کر اور مراد اس کی طنز کرنا تھی، یا کسی گنجے شخص سے کہا میں تو تجھ کو اس لئے برا کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کلا بل ران یا کسی سے کہا گیا کہ نماز پڑھنے چلو یا جماعت کی نماز میں چلو، اس نے جواب میں کہا کہ میں تنہا پڑھتا ہوں اللہ تعالیٰ کا قول ہے ان الصلوۃ تنھا تو ان تمام صورتوں میں کافر ہو گا۔
ایک شخص نے کسی سے کہا کہ تو نے ایسا گھر پاک صاف کیا ہے جیسے و السماء و الطارق تو بعضوں نے کہا کہ اس کہنے سے وہ کافر ہو جائے گا، اور امام ابوبکر اسحاق نے کہا کہ یہ کہنے والا اگر جاہل ہے تو کافر نہیں ہو گا اور اگر وہ عالم ہے تو کافر ہو گا۔ اور اگر کسی نے کہا قاعا صفصفا ہو گیا ہے تو اس جملہ میں بڑا خطرہ ہے کہ وہ کافر ہو جائے، یا دیگ میں کچھ لگا رہ گیا اس وقت کہا و الباقیات الصالحات تو یہ بھی بڑے خطرے کی چیز ہے۔
اور جب کسی نے یہ کہا کہ قرآن عجمی ہے تو وہ کافر ہو گیا، اور اگر یہ کہا کہ قرآن میں ایک کلمہ عجمی ہے تو اسے کافر کہنے میں عجلت نہ کرنی

چاہئے یہ قابل غور ہے، کسی سے کسی نے کہا تو قرآن پاک کیوں نہیں پڑھتا ہے، اس نے جواب میں کہا کہ میں قرآن سے بیزار ہو چکا تو اس کی تکفیر کی جائے گی، ایک شخص کو قرآن پاک کی کوئی ایسی سورت یاد ہے جسے وہ بکثرت پڑھتا رہتا ہے، دوسرے نے اس پڑھنے والے سے کہا کہ تو نے اس سورت کو کمزور روزیوں پالیا ہے تو وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا، اگر کسی نے قرآن پاک کو مثلاً فارسی میں نظم کیا، تو اس کو قتل کیا جائے گا اس لئے کہ وہ کافر ہو گیا۔

وہ موجبات کفر جن کا تعلق نماز روزہ اور زکوٰۃ سے ہے: کسی نے کسی بیمار مسلمان سے کہا کہ تو نماز پڑھ لے اس نے اس کے جواب میں کہا خدا کی قسم میں کبھی نماز نہیں پڑھوں گا اور اس نے پھر کبھی نماز پڑھی بھی نہیں یہاں تک کہ مر گیا تو وہ کافر کہا جائے گا، اور اگر صرف یہ کہا کہ نہیں پڑھوں گا تو اس کے اس کہنے میں چار احتمال ہیں۔ ① ایک تو یہ کہ نماز نہیں پڑھتا اس لئے کہ پڑھ چکا۔ ② دوسرے یہ کہ نماز نہیں پڑھتا یعنی تیرے حکم سے نہیں پڑھتا اس لئے کہ تجھ سے جو بہتر ہے وہ حکم کر چکا ہے۔ ③ تیسرے یہ کہ نہیں پڑھتا یعنی بے باکی اور فسق کے طور پر کہا، ان تینوں صورتوں میں وہ کافر نہیں ہو گا۔ ④ چوتھے یہ کہ نماز نہیں پڑھتا اس وجہ سے کہ مجھ پر نماز واجب نہیں ہے اور نہ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے، اس چوتھی صورت میں وہ کافر ہو جائے گا اور اگر اس نے جواب میں مطلقاً یہ کہا کہ میں نماز نہیں پڑھتا تو وہ ان وجوہ کی وجہ سے کافر نہیں ہو گا۔ کسی سے کہا گیا کہ نماز پڑھ لے اس نے جواب میں کہا کہ میں پاگل ہوں جو نماز پڑھوں اور اپنے اوپر کام بڑھاؤں یا اس طرح کہ مدت گزری کہ میں نے بیگار نہیں کی، یا یہ کہا کہ یہ کام کون آخر تک پورا کر سکتا ہے، یا یہ کہ عقل مند کو ایسے کام میں نہ پڑنا چاہئے جس کو آخر تک نباہ نہ سکے، یا یہ کہا کہ میرے واسطے اور لوگ کر لیتے ہیں یا یہ کہا کہ نماز پڑھنے سے مجھے کوئی سرفرازی نہیں مل جاتی ہے، یا کہا کہ تو نے نماز پڑھ لی تو کیا سربلندی حاصل کر لی، یا کہا کہ میں نماز کس لئے پڑھوں میرے ماں باپ تو مر چکے ہیں، یا کہا کہ نماز پڑھنی نہ پڑھنی دونوں برابر ہے یا کہا کہ اس قدر نماز پڑھ چکا کہ دل اکتا گیا، یا کہا کہ نماز ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ باقی رہے گی تو سڑ جائے گی۔ یہ تمام جوابات کفریہ ہیں۔

اسی طرح ایک شخص نے کسی سے کہا کہ آؤ فلاں کام کے لئے نماز پڑھیں، اس نے کہا میں نے بہت نماز پڑھی میری کوئی حاجت پوری نہیں ہوئی اور جواب میں یہ بات بطور طنز و استخفاف کہی تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا، ایک فاسق نمازیوں کو مخاطب کر کے کہے آؤ مسلمانی دیکھو اور اس کے بعد وہ فسق کی مجلس کی طرف اشارہ کرے تو وہ کافر ہو جائے گا، اور اگر کسی نے کہا کہ بے نمازی ہونا کیا ہی بہتر ہے تو وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا، ایک شخص نے کسی سے کہا کہ نماز پڑھو تاکہ تمہیں بندگی کا مٹھاس حاصل ہو، یا فارسی میں کہے نماز بخوان تا حلاوت نماز یابی۔ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ "تو مکن کہ حلاوت بے نمازی بہ بینی" یعنی تم نماز نہ پڑھو تاکہ نماز نہ پڑھنے کی لذت محسوس کر سکو، تو اس کہنے سے وہ کافر ہو جائے گا۔

غلام سے کسی نے کہا کہ نماز پڑھ اس نے کہا میں نہیں پڑھتا اس لئے کہ اس کا ثواب میرے آقا کو حاصل ہو گا وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا۔ ایک شخص سے کسی نے کہا کہ نماز پڑھ لے اس نے جواب میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے مال میں نقصان دیا لہٰذا میں اس کے حق میں نقصان کروں گا تو یہ جواب بھی کفر ہے۔

ایک شخص صرف رمضان میں نماز پڑھتا ہے پھر بعد میں نہیں پڑھتا اور کہتا ہے کہ یہی بہت ہے، یا کہتا ہے یہی بہت زیادہ ہو گی اس لئے کہ رمضان کی ہر نماز ستر نمازوں کے برابر ہے تو وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا، کوئی جان بوجھ کر قبلہ کے سوا کسی اور طرف منہ کر کے نماز پڑھے مگر اتفاق سے وہ قبلہ نکل گیا تو امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ وہ کافر ہو گیا اور اسی پر فقیہ ابواللیث نے عمل کیا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی نماز بغیر وضو پڑھے یا ناپاک کپڑوں میں پڑھے تو کافر ہو جائے گا، اور اگر کوئی جان بوجھ کر اس طرح نماز پڑھا کرتا ہے تو وہ بھی کافر ہے۔ ایک شخص کو قبلہ کا پتہ نہیں چلا اس نے تحری کی یعنی غور و فکر کیا کہ قبلہ کس طرف ہے، دل نے یہ مان لیا کہ اس طرف قبلہ ہے، پھر اس نے اس طرف کو چھوڑ کر دوسری طرف منہ کر کے نماز پڑھی، امام ابوحنیفہؒ ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں

اس کے حق میں کفر کا خوف رکھتا ہوں اس لئے کہ اس نے قبلہ سے اعراض کیا اور دوسرے مشائخ کا اس کے کفر میں اختلاف ہے شمس الائمہ حلوائیؒ فرماتے ہیں کہ جب اس نے قبلہ چھوڑ کر بطور استہزاء واہانت دوسری طرف نماز پڑھی تو ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر ہو جائے گا۔

اور اگر کوئی ایسی صورت میں کسی وجہ سے مبتلا ہو گیا مثلاً چند لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ اسے حدث ہو گیا اور شرم کی وجہ سے اس نے سوچا کہ ظاہر نہ ہونے پائے چنانچہ چھپانے کے لئے بغیر وضو نماز پڑھتا رہا یا دشمن کے پاس تھا اور کھڑے ہو کر اس حالت میں نماز پڑھی کہ وہ پاک نہ تھا، بعض مشائخ نے یہ کہا کہ اس صورت میں وہ کافر نہیں ہو گا اس لئے کہ اس نے ایسا استہزاء کے طور پر نہیں کیا ہے لیکن اگر کوئی ضرورت یا حیا کی وجہ سے ایسی صورت میں مبتلا ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ اپنے اس قیام سے نماز کے قیام کا ارادہ نہ کرے اور نہ کچھ پڑھے اور جب ان کے ساتھ رکوع میں جائے تو وہ رکوع کا قصد نہ کرے اور نہ اس کی تسبیح پڑھے تاکہ وہ کسی کے نزدیک کافر نہ ہونے پائے اور ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھنے سے بعض علماء کہتے ہیں کہ کافر نہیں ہوتا۔

کسی نے کہا کہ نماز فرض ہے لیکن رکوع اور سجدہ فرض نہیں تو اس کہنے سے کافر نہ ہو گا، اس لئے اس کو تاویل کی گنجائش ہے کہ نماز سے میری مراد جنازہ کی نماز تھی جس میں رکوع سجدے فرض نہیں ہیں۔ اگر کوئی رکوع اور سجدوں کی فرضیت کا بالکلیہ انکار کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا حتی کہ اگر صرف دوسرے سجدے کی فرضیت کا بھی انکار کرے گا تو وہ کافر ہو گا اس لئے کہ اس نے اجماع اور تواتر کا رد کیا۔

کسی نے کہا کہ اگر کعبہ مکرمہ قبلہ نہ ہوتا اور اس کی جگہ بیت المقدس قبلہ ہوتا تو بھی میں کعبہ ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا اور بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نہ پڑھتا، یا اس طرح کہا کہ اگر فلاں قبلہ ہوتا تو اس کی طرف میں منہ نہ کرتا، یا یوں کہا کہ اگر فلاں جانب کعبہ ہوتا تو میں اس طرف منہ نہ کرتا، یا یہ کہا کہ قبلے دو ہیں ایک کعبہ، دوسرا بیت المقدس، تو ان تمام صورتوں میں وہ کافر ہو جائے گا۔

ابراہیم بن یوسفؒ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے دکھلانے کے لئے نماز پڑھی تو اس کو ثواب نہیں ملے گا بلکہ اس کے نامہ اعمال میں گناہ لکھا جائے گا، اور بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے کافر ہو جاتا ہے اور بعضوں نے کہا کہ اس صورت میں اس پر نہ گناہ ہے اور نہ اس کے لئے ثواب ہی ہے اور وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے نماز نہیں پڑھی۔

ایک شخص کسی کافر کے پاس آیا اور ایک دو وقت کی نماز چھوڑ دی نہیں پڑھی، اگر اس نے ایسا اس کافر کی تعظیم کی وجہ سے کیا ہے تو کافر ہو گا اور اس پر ان نمازوں کی قضا نہیں ہے، اور اگر ایسا فسق و فجور کی وجہ سے کیا ہے تو کافر نہ ہو گا اور اس کو ان نمازوں کی قضاء کرنی ہو گی۔ ایک شخص نے دار الاسلام میں اسلام قبول کیا ایک ماہ کے بعد اس سے پنج وقتہ نماز کے متعلق سوال کیا گیا، اس نے جواب میں کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ مجھ پر فرض ہے تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا، ہاں اگر وہ نو مسلموں میں رہتا ہے تو کافر نہ ہو گا۔

اگر کوئی مؤذن سے اذان دیتے وقت کہے کہ تو نے جھوٹ کہا تو وہ کافر ہو جائے گا، اگر کوئی اذان سن کر یہ کہے کہ گھنٹے کی آواز ہے تو وہ کافر ہے ایک شخص سے کہا گیا کہ تم زکوۃ ادا کرو، اس نے یہ سن کر کہا کہ میں ادا نہیں کرتا تو وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا، بعض حضرات علماء نے کہا کہ مطلقاً اس جواب سے کافر ہو جائے گا، اور بعض کہتے ہیں کہ احوال ظاہرہ میں اس جواب سے کافر ہو گا لیکن احوال باطنہ میں اس جواب سے کافر نہ ہو گا، اور مناسب یہ ہے کہ یہاں بھی نماز کی طرح چار احتمال ہونے چاہئیں اور تین صورتوں میں کافر نہ ہو گا اور ایک صورت میں ہو جائے گا، اگر کوئی کہے کہ کاش رمضان فرض نہ ہوتا تو اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ کہنے والے کی نیت پر موقوف ہو گا۔ اگر اس نیت سے یہ کہا کہ رمضان کے حقوق اس سے ادا نہیں ہو سکتے تو کافر نہ ہو گا، اگر کوئی رمضان آتے وقت یہ کہے کہ بھاری مہینہ یا بھاری مہمان آیا تو کافر ہو گا، جب رجب کا مہینہ آیا اور کسی نے کہا کہ اس کے بعد خرابی میں مبتلا ہوں گے تو اگر اس نے یہ محترم مہینوں کے لئے حقارت کے طور پر کہا ہے تو کافر ہو گا اور اگر اپنے نفس پر گرانی کو ظاہر کرنے کے لئے کہا ہے تو کافر نہ ہو گا اور اس سے پہلے مسئلہ میں بھی جواب اسی تفصیل کے ساتھ ہونا چاہئے۔

ایک شخص نے کہا کہ "رمضان کا روزہ جلد گزر جائے" تو بعض کہتے ہیں کہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا اور بعض کہتے ہیں کہ کافر نہیں

ہو گا، اور اگر کوئی کہے چند ازیں روزہ کہ مرادل بہ گرفت یعنی اتنے روزے کب تک؟ میرا تو اس سے دل اکتا گیا تو اس کا یہ کہنا کفر ہے، اور اسی طرح کوئی کہے کہ "اللہ تعالیٰ نے طاعات کو ہمارے لئے عذاب بنا دیا ہے" اس جملہ کی اگر تاویل کی تو کافر نہ ہوگا، یا اسی طرح یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ اگر ان طاعات کو فرض نہ کرتا تو ہمارے لئے بہتر ہوتا، اگر اس جملہ کی کوئی تاویل کرے تو کافر نہ ہو گا۔

کوئی کہے کہ "نماز میرے لائق نہیں ہے" یا "حلال میرے مناسب نہیں ہے" یا یہ کہا کہ "کس لئے نماز پڑھوں بیوی نیچے تو میں رکھتا ہی نہیں" یا اس طرح کہا کہ "نماز کو میں نے طاق پر رکھ دیا" تو ان تمام صورتوں میں کافر ہو جائے گا۔

وہ موجبات کفر جن کا تعلق علم اور علماء سے ہے: اگر کوئی بغیر کسی ظاہر سبب کے کسی عالم دین سے بغض رکھے تو اس کے کافر ہو جانے کا خوف ہے، ایک شخص نے باہم صلح کروانے والے کے متعلق کہا کہ اس کا دیکھنا میرے لئے ایسا ہے جیسے خنزیر (سور) کا دیکھنا، تو اس کے کافر ہو جانے کا بھی خوف ہے، اور اس پر بھی کفر کا خوف ہے جو کسی عالم یا فقیہ کو بغیر سبب برا کہے، اور وہ کافر ہو جاتا ہے جو کسی کو اس طرح کہے کہ "تیرے علم کے مقعد میں گدھے کا ذکر" اور اس علم سے اس کی مراد علم دین ہو۔

ایک جاہل نے علم سیکھنے والے کو اس طرح کہا کہ "یہ جو کچھ سیکھتے ہیں وہ کہانیاں اور داستانیں ہیں" یا یہ کہا کہ یہ سب فریب ہے یا یہ کہا کہ میں علم حیلہ کا منکر ہوں۔ تو واضح رہے کہ یہ سب جملے کفریہ ہیں۔

ایک شخص اونچی جگہ پر بیٹھ جائے اور پھر لوگ اس سے بطور مذاق اور استہزاء مسائل پوچھنے لگیں اور اس کے بعد اس کو تکیوں سے مارنے لگیں اور سب ہنسنے لگیں تو وہ سب اس فعل کی وجہ سے کافر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی علم کی مجلس میں واپس آرہا تھا اس کو کسی نے کہا کہ تو بت خانہ سے آرہا ہے تو وہ اس کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے، یا اسی طرح یہ کہا کہ مجھے علم کی مجلس سے کیا کام، یا یہ کہا کون شخص ان چیزوں کے ادا کرنے پر قدرت رکھتا ہے جو علماء کہتے ہیں تو وہ کافر ہو گا۔

اگر کوئی کہے کہ علم کو کاسہ اور کیسہ میں نہیں رکھ سکتے یعنی یہ علم نہ کھانے کے پیالہ میں رکھنے کے لائق ہے اور نہ روپے کی تھیلی میں اور ضرورت انہی دونوں کی ہے، یا یہ کہا کہ علم کا کیا کروں گا مجھے جیب میں چاندی چاہئے تو اس کہنے سے وہ کافر ہو جائے گا۔ اگر کوئی کہے کہ مجھے بال بچوں کی اتنی مصروفیات ہے کہ علم کی مجلس میں نہیں پہنچ سکتا اور اس نے اس سے علم کی اہانت کا ارادہ کیا تو اس جملہ سے بھی کفر کا خطرہ ہے۔

کوئی عالم فقیہ، علم کا تذکرہ کر رہا تھا یا کوئی صحیح حدیث بیان کر رہا تھا کسی نے اسے سن کر کہا کہ یہ کچھ نہیں ہے اور اسے رد کر دیا یا کہا کہ یہ بات کیا کام آوے گی روپیہ چاہئے، کہ آج اسی کو عظمت حاصل ہے علم کیا کام آتا ہے، تو یہ کفر ہے۔

اگر کسی نے کہا کہ دانشمندی سے بہتر فساد برپا کرنا ہے تو یہ کفر ہے، کوئی عورت جس کا شوہر عالم ہو اگر یوں کہے کہ عالم شوہر کے اوپر لعنت ہو تو وہ کافر ہو جائے گی کسی نے کہا کہ عالموں کا فعل وہی ہے جیسے کافروں کا تو وہ اس کہنے سے اس وقت کافر ہو جائے گا جب تمام افعال میں برابری ظاہر کرے کہ اس طرح حق و باطل میں اس نے برابری کو ظاہر کیا۔

ایک شخص کا کسی فقیہ سے کسی بات میں جھگڑا ہو گیا، اس فقیہ نے اس کی کوئی شرعی وجہ بیان کی، اسے سن کر جھگڑنے والے نے کہا، یہ عالمانہ پن نہ کر، یہاں کچھ نہیں چل سکتی، تو ایسے شخص پر کفر کا خوف ہے، اگر کسی نے فقیہ سے کہا "اے دانشمندک" "یا اے علویک" تو اس سے کافر نہ ہو گا اگر اس کی نیت اہانت دین کی نہیں ہے۔

ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک فقیہ عالم نے اپنی کتاب ایک دوکاندار کی دوکان میں رکھ دی اور کسی کام سے چلا گیا پھر جب وہ دوکان سے گزرا تو دوکاندار نے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ تم بسولہ بھول گئے، فقیہ نے کہا تیری دوکان میں میری کتاب ہے بسولہ نہیں، دوکاندار نے کہا کہ بڑھئی بسولہ سے لکڑی کاٹتا ہے اور تم کتاب سے لوگوں کی گردن کاٹتے ہو۔ فقیہ نے شیخ امام ابوبکر محمد بن فضل سے اس واقعہ کا شکوہ کیا۔ انہوں نے اس شخص کے قتل کا حکم کیا۔

ایک شخص نے بیوی پر غصہ کیا اور کہا کہ تو خدا کی اطاعت کر، اور ساتھ ہی گناہ سے منع کیا، بیوی نے جواب میں کہا میں اللہ اور علم کیا جانوں میں نے اپنے کو دوزخ میں رکھ چھوڑا ہے تو وہ اس کی وجہ سے کافر ہوگئی، ایک شخص سے کہا گیا کہ علم دین کے طلب کرنے والے فرشتوں کے بازوؤں پر چلتے ہیں، اس نے کہا یہ جھوٹ ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اگر کوئی کہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا قیاس صحیح نہیں تو وہ کافر ہو جائے گا اس لئے کہ اس نے مطلقاً قیاس کی صحت کا انکار کیا کسی نے کہا کہ ثرید پلاؤ کا پیالہ علم سے بہتر ہے تو وہ کافر ہو جائے گا، اور کہا کہ پلاؤ کا پیالہ اللہ سے بہتر ہے تو وہ کافر نہ ہوگا۔ یہ اس وجہ سے کہ "اللہ سے" کا مطلب "اللہ کی طرف سے" ہو سکتا ہے اور علم میں یہ تاویل نہیں ہو سکتا۔

ایک شخص نے اپنے دشمن سے کہا کہ "میرے ساتھ شریعت کی طرف چلو" اس نے کہا کہ کوئی سپاہی بلاؤ تو چلوں بے جبر و اکراہ نہیں جا سکتا تو وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا کیونکہ اس نے شریعت کا مقابلہ کیا، اور اگر اس نے یہ کہا کہ میرے ساتھ قاضی کے پاس چل اور اس نے یہی جواب دیا تو کافر نہ ہوگا، اور اگر اس نے یہ کہا کہ میرے ساتھ شریعت اور حیلہ مفید نہیں ہوگا، یا یہ کہا کہ "یہ پیش نہ جاویں گے۔ یا یہ کہا کہ میرے لئے کھجور کا حلوہ ہے شریعت کیا کروں گا، یہ ساری صورتیں کفر کی ہیں، اور اگر یہ کہا کہ "جس وقت تو نے چاندی لی تھی اس وقت شریعت اور قاضی کہاں تھا" تو اس کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔ اور علماء متاخرین میں سے بعض نے کہا کہ اگر اس نے قاضی سے شہر کے قاضی کو مراد لیا ہے۔ تو کافر نہ ہوگا۔

کسی شخص سے کہا گیا کہ "اس بارہ میں شریعت کا حکم یہ ہے" اس نے جواب دیا کہ "میں رسم پر عمل کرتا ہوں نہ کہ شریعت پر" تو اس کہنے سے بعض کے نزدیک کافر ہو جائے گا، ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ "تو کیا کہتی ہے شریعت کا کیا حکم ہے" بیوی نے بلند آواز سے ڈکار لی اور کہا "اینک شرع را" تو وہ کافر ہو جائے گی اور اس کا نکاح جاتا رہے گا۔ ایک شخص نے اپنے مخالف کے سامنے ائمہ کا فتویٰ پیش کیا، اس نے اس فتویٰ کو رد کر دیا اور کہا "یہ فتوؤں کا انبار تو کیا لے آیا ہے؟" بعضوں نے کہا کہ وہ کافر ہو جائے گا اس لئے اس نے شریعت کا حکم رد کر دیا۔ اسی طرح اگر اس فتویٰ کے بارے میں کچھ نہ کہا مگر فتویٰ لے کر زمین پر ڈال دیا اور کہا "یہ کیا شریعت ہے؟" تو بھی کافر ہو جائے گا۔

ایک شخص نے ایک عالم سے اپنی بیوی کے متعلق کا مسئلہ دریافت کیا، اس نے جواب دیا کہ تمہاری بیوی پر طلاق واقع ہوگئی پوچھنے والے نے کہا "میں طلاق ملاق کو کیا جانوں ماں بچے گھر میں ہونے چاہئیں" تو وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا۔ دو شخصوں میں جھگڑا ہوا، اس میں سے ایک دوسرے کے پاس علماء کا فتویٰ لے کر آیا اس نے کہا "ایسا نہیں جیسا کہ فتویٰ دیا" یا یہ کہا کہ میں اس پر عمل نہیں کرتا تو اس کو تعزیر (سزا) دی جائے گی۔

وہ موجبات کفر جن کا تعلق حلال و حرام اور فاسق و فاجر وغیرہ کے کلام سے ہے: جو کوئی حلال کے حرام ہونے کا یا حرام کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھے گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔ لیکن اگر کوئی حرام و حلال اس لئے بتائے کہ یہ سامان رائج ہو جائے یا ایسا جہالت کی وجہ سے کیا تو وہ کافر نہ ہوگا، لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ وہ حرام حرام لعینہ ہو، اور وہ اس کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھے تب کافر ہوگا اور اگر حرام، حرام لغیرہ ہو اور اس کو حلال بتائے تو کافر نہ ہوگا، اور اس حرام لعینہ کو حلال سمجھنے میں کافر ہوگا جب اس کی لعینہ حرام کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہو، لیکن اگر حرام لعینہ کی حرمت خبر احاد سے ثابت ہوگی تو اس کے حلال کا عقیدہ رکھنے میں کافر نہ ہوگا۔

ایک شخص سے کہا گیا کہ ایک حلال تم کو زیادہ پسند ہے یا دو حرام، اس نے کہا دونوں میں سے جو جلد پہنچ جائے، تو اس کے بارہ میں کفر کا خوف ہے، اسی طرح اس وقت بھی خوف کفر ہے جب کہے کہ ہمیں مال چاہئے خواہ حلال ہو خواہ حرام ہو، اور اگر یہ کہا کہ جب تک میں حرام پاؤں گا حلال کے پاس نہیں پھٹکوں گا تو اس کہنے سے کافر نہ ہوگا۔

اگر کوئی شخص حرام مال کسی فقیر کو ثواب کی نیت سے دے اور ثواب کی امید رکھے تو وہ کافر ہو جاتا ہے، اور اگر فقیر کو یہ معلوم تھا کہ یہ

مال حرام ہے اور اس کے باوجود اس نے وہ مال لے لیا اور دینے والے کو دعا دی اور اس دینے والے نے آمین کہی تو وہ کافر ہو گا، ایک شخص سے کہا گیا کہ "حلال مال کھاؤ" اس نے کہا کہ "مجھے تو حرام مال بہت پیارا ہے" تو وہ کافر ہو جائے گا، اور اگر اس کے جواب میں یہ کہا کہ "اس دنیا میں کسی ایک حلال کھانے والے کو لاؤ تاکہ میں اسے سجدہ کروں" تو وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا، کسی نے ایک شخص سے کہا کہ "حلال کھایا کرو" جواب میں اس نے کہا کہ "مجھے تو حرام چاہئے" تو وہ کافر ہو گیا۔

کسی فاسق کے لڑکے نے شراب پی۔ پھر اس کے عزیز و اقارب آکر اس پر روپے نچھاور کرنے لگے تو وہ سب کافر ہو گئے، اور اگر نچھاور نہیں کیا بلکہ کہا کہ "تمہیں مبارک ہو" تو بھی کافر ہو جائیں گے۔ اگر کسی نے کہا کہ شراب کی حرمت قرآن سے نہیں ثابت ہوتی تو وہ کافر ہو جائے گا۔

کسی نے شراب پینے والے سے کہا کہ قرآن سے شراب کی حرمت ثابت ہے پھر تو شراب کیوں پیتے ہو توبہ کیوں نہیں کرتے؟ تو اس کے جواب میں شرابی نے کہا کہ "از شیر مادر شکیبد" یعنی کیا ماں کے دودھ سے صبر ہو سکتا ہے؟ تو وہ اس کہنے سے کافر نہیں ہو گا، اس وجہ سے کہ یا تو یہ استفہام ہے یا شراب اور دودھ میں شغف کے اندر برابری ظاہر کرنا ہے۔

اگر کوئی حالت حیض میں اپنی بیوی سے جماع (صحبت) کو حلال سمجھے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح وہ بھی کافر سمجھا جائے گا جو اپنی بیوی سے اغلام (لواطت) کو جائز جانے، اور نوادر میں امام محمدؒ سے روایت ہے کہ ان دونوں صورتوں میں کافر نہیں ہوتا اور اس حکم کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔

ایک شخص نے شراب پی اور پھر کہا کہ "جو شخص ہمارے اس کیف میں ہمارا شریک مسرت ہے اصل مسرت اسی کی ہے اور جو شخص ہمارے اس کیف و مسرت سے ناراض ہے وہ گھاٹے میں ہے" تو وہ کافر ہو گیا۔ اسی طرح جب وہ شراب پینے میں مشغول تھا تو اس نے کہا کہ مسلمان ہونے کو آشکارا کر رہا ہوں یا مسلمان ہونا ظاہر ہو رہا ہے تو اس سے کافر ہو جائے گا۔ اگر کسی بدکار اور شرابی نے یہ کہا کہ اگر شراب کا کوئی قطرہ گر جائے گا۔ تو جبریل علیہ السلام اپنے پیروں سے اٹھائیں گے تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا۔

ایک فاسق سے کسی نے کہا کہ تو ہر دن اس طرح صبح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق خدا کو تکلیف دیتا ہے، اس نے کہا خوب کرتا ہوں تو وہ کافر ہو جائے گا۔ گناہوں کے متعلق کسی نے کہا کہ یہ بھی ایک مذہب ہے تو وہ اس کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔ محیط میں ایسا ہی ہے اور تجنیس ناطقی میں ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ کہنے والا کافر نہیں ہوتا،

اسی طرح وہ بھی کافر ہو گا جو تسبیح و تہلیل کے وقت یہ جملے کہے۔ ایک شخص نے سبحان اللہ کہا، دوسرے نے کہا کہ تو نے سبحان اللہ کی رونق ختم کر دی، یا کہا کہ تو نے اس کی کھال ادھیڑ دی تو وہ کافر ہو جائے گا کسی سے کہا گیا کہ تم لا الٰہ الا اللہ کہو اس نے کہا میں نہیں کہتا بعض مشائخ کہتے ہیں کہ یہ کفر ہے، اور بعضوں نے یہ کہا ہے کہ اگر اس کی مراد اس سے یہ تھی کہ ترے حکم سے میں لا الٰہ الا اللہ نہیں کہتا تو وہ کافر نہیں ہو گا، اور بعضوں نے کہا کہ مطلقاً کافر ہو جائے گا اور اگر جواب میں یہ کہا کہ تو نے یہ کلمہ پڑھ کر کیا بلندی حاصل کر لی کہ میں کہوں، تو بھی کافر ہو جائے گا، ایک بادشاہ کو چھینک آئی، اس کی چھینک پر کسی نے کہا یرحمک اللہ۔ دوسرے نے یرحمک اللہ کہنے والے سے کہا کہ بادشاہ کے لئے اس طرح مت کہو تو یہ کہنے والا کافر ہو جائے گا۔

وہ موجبات کفر جن کا تعلق یوم قیامت اور قیامت سے متعلق چیزوں سے ہے: جو کوئی قیامت یا جنت دوزخ یا میزان و پل صراط اور نامہ اعمال کا انکار کر دے تو وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح کوئی مرنے کے بعد پھر جی اٹھنے کا انکار کر دے تو وہ بھی کافر ہے۔

کوئی شخص یہ کہے "میں یہ نہیں جانتا کہ یہود و انصاری قیامت میں جب اٹھائے جائیں گے تو وہ آگ کے عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے یا نہیں تو اس کہنے سے وہ کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح وہ شخص بھی کافر ہو جاتا ہے جو جنت میں داخل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دیدار کا انکار کر دے۔ یا مرنے کے بعد عذاب قبر کا انکار کرے یا انسان کے حشر و نشر کا انکار کر لے، لیکن انسان کے علاوہ دوسری مخلوق کے حشر کا

انکار کرنے والا کافر نہیں ہوتا اسی طرح وہ بھی کافر نہیں ہوتا جو یہ کہے کہ عذاب اور ثواب کا تعلق صرف روح سے مخصوص ہے۔

ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ گناہ نہ کرو اس لئے کہ ایک دوسری دنیا بھی ہے جہاں حساب و کتاب ہوگا اس نے جواب دیا کہ اس دنیا کی کس کو خبر ہے تو کافر ہو جائے گا ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ قرض باقی تھا، اس نے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر یہاں تم نہیں دیتے ہو تو قیامت میں تم سے وصول کرلوں گا اس نے جواب میں کہا جی ہاں قیامت قائم ہوگی؟ تو اگر اس نے قیامت کی توہین کے ارادہ سے ایسا کہا تو کافر ہو جائے گا۔

ایک شخص نے دوسرے پر ظلم و ستم ڈھایا، اس پر مظلوم نے کہا آخر قیامت کا دن آنے والا ہے، اس لئے ڈرو اس نے جواب میں کہا فلاں گدھا قیامت میں ہوگا تو اس سے کافر ہو جائے گا ایک شخص نے اپنے قرضدار سے کہا میرے روپے دنیا میں دیدے قیامت میں روپیہ نہ ہوگا اس نے کہا کہ اچھا دس روپے اور دیدو اس دنیا میں لے لینا یا میں تمہیں وہاں دے دوں گا تو وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا کسی نے کہا کہ مجھے حشر سے کیا کام ہے، یا یہ کہا کہ میں قیامت سے نہیں ڈرتا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

کسی نے اپنے دشمن سے کہا کہ میں اپنا حق تجھ سے قیامت میں وصول کرلوں گا اس نے کہا اس دن اس بھیڑ میں مجھے کہاں پائے گا؟ مشائخ کو اس کے کفر میں اختلاف ہے فقیہ ابو اللیث کہتے ہیں کہ وہ اس کہنے سے کافر نہ ہوگا۔

کسی نے کہا اس دنیا میں سب اچھا رہنا چاہئے اس دنیا میں جو ہوگا سو ہوگا تو وہ کافر ہو جائے گا ایک شخص سے کہا گیا کہ تم آخرت کے پیش نظر دنیا سے گریز کرو اس نے کہا کہ نقد چھوڑ کر ادھار پر کون بھروسہ کرے؟ تو وہ کافر ہو جائے گا۔

کسی نے کہا کہ جو اس دنیا میں بے عقل و خرد ہوگا وہ اس دنیا میں اس شخص کی طرح ہوگا جس کی تھیلی پھٹی ہوئی ہے یعنی ناکارہ ہوگا امام ابوبکر محمد بن الفضل نے کہا کہ اگر اس سے اس کا منشا آخرت کے ساتھ تمسخر اور طنز ہے تو یہ باعث تکفیر ہوگا۔ کسی نے کسی سے کہا کہ میں تیرے ساتھ دوزخ میں جاؤں گا لیکن اندر نہیں آسکتا تو کافر ہو جائے گا۔

اگر کسی نے کہا کہ جب تک تم رضوان جنت کے لئے کچھ نہیں لے جاؤ گے تو وہ جنت کا دروازہ نہیں کھولے گا تو اس کہنے سے کافر ہو جائے گا۔ کسی نے بھلائی کا حکم دینے والوں سے کہا کہ یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے اگر یہ انکار ورد کے طور پر کہا ہے تو اس کے کافر ہو جانے کا خوف ہے کسی نے ایک شخص سے کہا کہ فلاں کے گھر جا کر بھلی بات کا حکم کرو، جواب میں کہا کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے یا مجھے اس کو اذیت دینے کی کیا وجہ ہے؟ یا کہا میں الگ تھلگ ہوں اس فضول کام سے کیا واسطہ؟ تو یہ سب کفریہ الفاظ ہیں۔

کسی نے ایک شخص سے تعزیت کرتے ہوئے کہا جو اس کی جان سے کم ہوا وہ تم پر زیادہ ہو تو اس سے بھی کفر کا خوف ہے۔ یا کہا کہ تم پر زیادہ کیا جائے تو یہ جہالت اور غلطی ہے یا کہا کہ فلاں کی جان کم ہو کر تیری جان پر آگیا، تو یہ بھی جہالت ہے اور اگر یہ کہا کہ وہ مر گیا لیکن اپنی جان تیرے سپرد کر گیا تو کافر ہو جائے گا۔ ایک شخص بیمار تھا وہ اچھا ہوا دوسرے نے اس سے کہا فلاں گدھا پھر بھیجدیا تو یہ بھی کفر ہے۔ ایک شخص بیمار ہوا اور اس کی بیماری بہت بڑھ گئی اور اس نے طول کھینچا بیمار نے اکتا کر خدا کو خطاب کر کے کہا کہ خواہ تو حالت اسلام پر موت دے یا حالت کفر پر تو یہ بھی باعث کفر ہے۔

وہ موجبات کفر جن کا تعلق تلقین کفر وارتداد وغیرہ سے ہے: جب کوئی کسی کو کلمہ کفر کی تلقین کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا خواہ یہ کھیل کود اور ہنسی مذاق ہی کے طور پر کیوں نہ ہو اسی طرح وہ بھی کافر ہو جائے گا جو کسی کی بیوی کو حکم دے کہ تو مرتد ہو جا اور اس طرح اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلے، امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ سے یہی روایت ہے ایک شخص نے کسی کو حکم دیا کہ تو کافر ہو جا تو حکم دینے والا کافر ہو جائے گا خواہ جس کو حکم دیا گیا ہے وہ کافر ہو یا نہ ہو۔ امام ابو اللیثؒ فرماتے ہیں کہ جس وقت کوئی شخص کسی کو کلمہ کفر کی تعلیم دے گا وہ کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی مرد یا عورت کو مرتد ہونے کا حکم دے گا تو بھی وہ کافر ہوگا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص کو مجبور کیا گیا کہ وہ کلمہ کفر زبان سے نکالے ورنہ اس کے ساتھ ایسا ایسا کرے گا یعنی جان یا کسی عضو

کے تلف کرنے کی دھمکی دی گئی اس نے اس خوف سے کلمہ کفر زبان سے کہدیا تو اس کی چند صورتیں ہوں گی اگر اس نے کلمہ کفر اس طرح زبان سے ادا کیا کہ اس کا دل ایمان پر بالکل مطمئن ہے دل میں کفر کا کھٹکا تک بھی نہیں گذرا صرف زبان سے کلمہ کفر سرزد ہوا ہے تو اس صورت میں نہ قضاءً اس کی تکفیر کی جائے گی اور نہ وہ عند اللہ کافر ہوگا، اور اگر کلمہ کفر زبان سے کہنے والا کہے کہ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ اپنے بارہ میں زمانہ ماضی میں کفر کی جھوٹی خبر دے کر چھٹکارا حاصل کرلوں میں نے مستقل کفر کا ارادہ نہیں کیا تھا تو اس صورت میں قضاء یعنی قانونا اس کے کفر کا فیصلہ دیا جائے گا اور قاضی اس میں اور اس کی بیوی میں تفریق کردے گا اور اگر وہ یہ کہے کہ کلمہ کفر کہتے وقت میرے دل میں یہ بات گذری کہ گذرے ہوئے زمانہ میں کفر کی جھوٹی خبر دے دوں لیکن زمانہ ماضی میں جھوٹے کفر کا میں نے ارادہ نہیں کیا بلکہ ایام مستقبل میں ارادہ کیا تو اس صورت میں خدا کے نزدیک بھی کافر ہو جائے گا اور دنیا کے حکم میں بھی۔

ایک شخص کو مجبور کیا گیا کہ وہ صلیب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے چنانچہ اس نے پڑھی تو اس کی تین صورتیں ہوں گی۔ ① اگر وہ یہ کہتا ہے کہ زبردستی کی وجہ سے صلیب کی طرف نماز پڑھ لی ہے لیکن دل میں کوئی وہم اس کی عقیدت کا نہیں گذرا ہے تو وہ کافر نہیں ہوگا نہ قضاءً اور نہ فی ما بینہ وبین اللہ۔ ② اگر وہ یہ کہتا ہے کہ میرے دل میں یہ بات گذری کہ اللہ تعالیٰ کے لئے نماز پڑھ رہا ہوں نہ کہ صلیب کے لئے تو اس صورت میں بھی وہ کافر نہیں ہوگا۔ ③ اگر وہ یہ کہتا ہے کہ میرے دل میں یہ بات گذری کہ میں اللہ کے لئے نماز پڑھوں لیکن میں نے اس کو چھوڑ دیا اور صلیب کے لئے نماز پڑھی تو اس صورت میں وہ قضاء بھی کافر ہوگا اور فی ما بینہ وبین اللہ بھی۔

ایک مسلمان سے کہا گیا کہ تم بادشاہ کو سجدہ کرو ورنہ ہم تمہیں قتل کر ڈالیں گے تو افضل یہ ہے کہ سجدہ نہ کرے ایک شخص نے کلمہ کفر زبان سے جان بوجھ کر نکالا لیکن کفر کا اعتقاد پیدا نہیں ہوا تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ کافر نہیں ہوگا اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو جائے گا اور یہی صحیح ہے۔ ایک شخص نے کلمہ کفر زبان سے ادا کیا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کفر کا کلمہ ہے مگر اس نے یہ اپنے اختیار سے کہا ہے تو تمام علماء کے نزدیک وہ کافر ہو جائے گا۔ اور جہالت عذر شمار نہ ہوگی اور بعض لوگوں نے کہا کہ کافر نہیں ہوگا مذاق کرنے والا یا ٹھٹھا مخول کرنے والا جب کلمہ کفر استخفاف کے طور پر بالذات آفرینی کے طور پر بکے گا تو وہ تمام کے نزدیک کافر قرار دیا جائے گا اگرچہ اس کا اعتقاد اس کے خلاف ہو۔

ایک شخص کی زبان سے کلمہ کفر غلطی سے جاری ہو گیا اس طرح کہ وہ دوسرا کلمہ بولنا چاہئے تھا لیکن آ گیا کفر کا کلمہ تو وہ کافر نہیں ہوگا مجوسیوں کی ٹوپی سر پر رکھنے سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے البتہ گرمی یا سردی سے بچنے کے لئے ایسا کرے تو کافر نہ ہوگا زنار یعنی جینئو پہننے سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے لیکن اگر لڑائی میں جاسوسی کے لئے ایسا کرے تو کافر نہ ہوگا۔

کسی نے کہا کہ تو جو کچھ کر رہا ہے اس سے بہتر کفر کرنے والا ہے، اگر اس سے اس کی نیت کفر کا اچھا جاننا ہے تو وہ کافر ہو جائے گا اور بعض علماء جیسے فقیہ ابو اللیث" کہتے ہیں کہ صرف اس جملہ سے آدمی کافر ہو جاتا ہے خواہ اس کی نیت کچھ بھی ہو۔ مجوس نوروز کے دن جو کچھ کرتے ہیں اگر کوئی مسلمان اس کی موافقت میں ان کے ساتھ نکلے گا تو کافر ہو جائے گا، اسی طرح اگر اس نوروز کے دن ایسی چیز خریدے گا جو کبھی نہ خریدتا تھا اور یہ خریدنا نوروز کی تعظیم کے لئے ہو تو کافر ہو جائے گا، کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی چیز خریدنے سے کافر نہیں ہوگا، اس دن اگر کوئی مسلمان مشرکوں کو اس دن کی تعظیم کے اظہار کے لئے کوئی تحفہ بھیجے خواہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو تو وہ کافر ہو جائے گا ہاں اگر ان کے بچوں کی رسم مونڈن میں دعوت قبول کرے تو اس سے کافر نہ ہوگا۔

کفار کی باتوں اور معاملہ کو اچھا جاننے والا کافر ہو جاتا ہے مثلاً یہ کہے کہ کھانے کے وقت مجوس کا یہ مذہب بہتر ہے کہ اس وقت گفتگو نہ کی جائے یا مجوس کے یہاں یہ اچھا ہے کہ حالت حیض میں بیوی کو ساتھ لیٹنے بھی نہ دیا جائے، اس کہنے سے کافر ہو جائے گا، کسی نے کسی شخص کی عزت و جاہ کی وجہ سے اس کے جوڑے پہننے کے وقت جانور ذبح کیا تو وہ کافر ہو جائے گا اور یہ ذبیحہ مردار ہے اس کا کھانا جائز نہیں۔ اسی طرح غیر اللہ کی عظمت کے اظہار کے لئے گائے، اونٹ یا کسی جانور کا ذبح کرنا یا غازیوں اور حاجیوں کی واپسی پر اس کی عظمت

کے اظہار کے لئے ایسا کرنا باعث کفر ہے۔

جو جانور کسی دیوی دیوتا یا بزرگ کے نام پر چھوڑا گیا اور نامزد کر کے اس کو شہرت دیدی گئی جیسے جاہل اور بد عقیدہ لوگ کوئی جانور مثلاً بکرا چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے پھرتے ہیں کہ یہ بکرا شیخ سدو کے نام پر ہے یا یہ گائے احمد کبیر کی ہے یا یہ مرغا مدار صاحب کا ہے وغیرہ وغیرہ یا کسی غیر اللہ کے نام کی عظمت اور تقریب کے لئے ایسا کیا گیا تو یہ سب کفر کی باتیں ہیں، اسی طرح بزرگوں کی قبر پر یا دریا کے کنارے جانور ذبح کرنا یا کسی دیوی دیوتا کو بھوگ دینا یہ سب کام ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی کافر ہو جاتا ہے اور ایسا ذبیح مردار کے حکم میں ہے اس کا کھانا درست نہیں اس سے کوئی فرق نہیں ہوتا کہ ان مواقع پر جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو دونوں صورتوں میں وہ حرام ہے کیونکہ جب غیر اللہ کے نام پر نامزد ہو چکا ہے تو بسم اللہ پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا ایسا ہی الاشباہ والنظائر، تنویر الابصار، درمختار، منح الغفار، فتاوی عالمگیری اور مطالب المومنین وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے۔

ان میں سے بعض کتابوں میں یہ بھی صراحت ہے کہ ایسے غیر اللہ کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں کا ذبح کرنے والا کافر ہے اور یہ ذبیحہ حرام ہے علماء میں ابو حفص کبیر ابو علی دقاق" عبد اللہ کاتب"، عبد الواحد"، اور ابوالحسن نووی" وغیرہ مشہور علماء نے یہی لکھا ہے۔ اور اس کو صحیح کہا ہے اور تفسیر نیشاپوری میں ہے کہ تمام علما کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ جو مسلمان کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی اور کے تقرب و تعظیم کے لئے ذبح کرے وہ مرتد ہے اور اس کے ذبح کئے ہوئے جانور کا وہی حکم ہے جو ایک مرتد کے ذبح کئے ہوئے جانور کا ہے اور صحیح حدیث میں آیا ہے کہ وہ شخص ملعون ہے جو غیر اللہ کے تقرب و تعظیم کے لئے جانور ذبح کرے جیسا کہ حدیث کی مشہور کتاب مشکوۃ شریف میں ہے اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی" نے اپنی کتاب تفسیر عزیزی میں آیت وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جانور جو غیر اللہ کے نام کے ساتھ شہرت دیا گیا ہے وہ خنزیر سے بدتر ہے اور مردار ہے جن حضرات کو تفصیل مطلوب ہو ان کو چاہیئے کہ وہ تفسیر عزیزی کے مطالعہ کریں انشاء اللہ اس کے مطالعہ سے یہ مسئلہ منقح ہو کر ان کے ذہن نشین ہو جائے گا۔

ایک عورت نے اپنی کمر پر رسی باندھ کر کہا کہ یہ زنار (جینئو) ہے تو وہ کافر ہو گئی ایک شخص نے اس طرح کہا کہ خیانت کرنے سے بہتر کافر ہی ہے تو اکثر علماء کہتے ہیں کہ وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا اس اور اسی پر ابو القاسم صفار کا فتویٰ ہے ایک شخص نے کسی عورت کو مارا اس عورت نے کہا تو مسلمان نہیں ہے مرد نے یہ سن کر کہا ہاں میں مسلمان نہیں ہوں تو وہ اس کہنے سے کافر ہو جائے گا ایک شخص نے کہا کیا تو مسلمان نہیں ہے اس نے کہا نہیں تو یہ بھی کفر ہے ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا کہ تمہارے اندر دینی حمیت اور اسلامی غیرت نہیں کہ تم اسے پسند کرتے ہو کہ میں اجنبی مردوں کے ساتھ خلوت کروں؟ خاوند نے جواب میں کہا ہاں مجھ میں دینی حمیت اور اسلامی غیرت نہیں ہے تو وہ اس سے کافر ہو جائے گا۔

ایک مرد نے اپنی بیوی کو اس طرح مخاطب کیا اے یہودیہ، اے مجوسیہ اے کافرہ! عورت نے یہ سن کر کہا کہ میں ایسی ہی ہوں یا کہا ایسی ہوں تو مجھے طلاق دے دو یا یہ کہا کہ اگر ایسی نہ ہوتی تو تمہارے ساتھ کیسی رہتی یا نہ رہتی یا یہ کہا کہ اگر ایسی نہ ہوتی تو تمہارے ساتھ صحبت نہ کرتی یا تم مجھے نہ رکھتے تو اس کہنے سے وہ عورت کافر ہو جائے گی، اور اگر اس کے جواب میں یہ کہا کہ اگر میں ایسی ہوں تو تم مجھے نہ رکھو تو اس سے کافر نہ ہوگی۔ اور اگر کسی بیوی نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا اے کافر اے یہودی، اے مجوسی! پس شوہر نے اس کے جواب میں کہا اگر ایسا نہ ہوتا تو تم کو نہ رکھتا تو وہ اسی کیوجہ سے کافر ہو گیا، اور اگر کہا کہ اگر میں ایسا ہوں تو تم میرے ساتھ نہ رہو تو اس صورت میں وہ کافر نہ ہوگا۔

اور اگر کسی اجنبی سے کہا اے کافر یہودی! اس نے کہا کہ میں ایسا ہی ہوں میرے ساتھ تم مت رہو یا کہا اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ نہ رہتا یا اسی طرح کا کوئی جملہ کہا تو وہ کافر ہو جائے گا ایک شخص نے ایک کام کا ارادہ کیا اس کی بیوی نے اس سے کہا کہ اگر تم یہ کام کرو گے تو کافر ہو جاؤ گے اس شوہر نے وہ کام کیا اور عورت کی بات پر توجہ نہ دی تو وہ شوہر کافر نہ ہوگا۔ اپنی بیوی کو کسی نے مخاطب کر کے کہا اے کافرہ! بیوی نے کہا میں نہیں تم ہو، کسی عورت نے اپنے شوہر سے کہا اے کافر! شوہر نے کہا کہ میں نہیں بلکہ تم کافرہ ہو تو اس سے میاں بیوی میں جدائی واقع نہیں ہوگی اور اگر کسی اجنبی مسلمان سے کہا اے کافر یا اجنبی عورت کو کہا اے کافرہ اور مخاطب مرد و عورت نے

جواب میں کچھ نہیں کہا یا کسی شوہر نے اپنی بیوی کو کہا اے کافرہ! اور عورت نے کچھ جواب نہ دیا یا بیوی نے اپنے شوہر کو کافر کے ساتھ خطاب کیا اور شوہر نے کچھ جواب نہ دیا تو اس صورت میں ابوبکر اعمش بلخی کا قول ہے کہ کہنے والا کافر ہے اور بقیہ دوسرے علماء بلخ کہتے ہیں کہ وہ کافر نہیں ہوتا، اور صحیح جواب یہ ہے کہ اگر کہنے والے کا ارادہ صرف برا بھلا کہنا مقصد ہے تو وہ کافر نہیں ہوتا اور اگر وہ اعتقاد بھی یہ ہی رکھتا ہے کہ یہ مسلمان کافر ہے اور پھر اس کو کافر سے خطاب کرتا ہے تو البتہ وہ اس کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

اگر کوئی عورت اپنے بچے کو کافر بچہ کے ساتھ خطاب کرے تو یہ باعث کفر نہیں ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ یہ کفر ہے اسی طرح کوئی مرد اپنے بچہ کو ان الفاظ سے خطاب کرے تو وہ بھی کافر نہیں ہے اور اگر اپنے جانور کو کہا اے کافر تو اس سے کافر نہ ہوگا اور کسی شخص نے کسی مسلمان کو اے کافر اے یہودی یا اے مجوسی کہہ کر خطاب کیا اور اس مسلمان نے جواب میں لبیک کہا تو وہ کافر ہو گا۔ اگر یوں کہے کہ میں ڈر گیا کہ کہیں کافر نہ ہو جاؤں تو اس سے کافر نہ ہو گا اگر کسی نے کسی سے کہا کہ تو نے مجھے اتنا ستایا کہ میرا جی چاہا کہ کافر ہو جاؤں تو وہ کافر ہو جائے گا کسی نے کہا کہ یہ زمانہ مسلمان رہنے کا نہیں ہے بلکہ یہ زمانہ کافری کا ہے۔ بعضوں نے کہا اس سے کافر ہو جائے گا اور صاحب محیط نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ کافر نہ ہو گا۔

ایک مجوسی اور ایک مسلمان ایک جگہ ساتھ ساتھ تھے ایک شخص نے مجوسی کو پکارا کہ اے مجوسی اب اگر مسلمان نے یہ سمجھ کر جواب دیا کہ مجھے پکار رہا ہے تو وہ کافر نہیں ہو گا بشرطیکہ وہ دونوں اس پکارنے والے کے کسی ایک کام میں مشغول تھے، اور اگر دونوں کسی ایک کام میں مشغول نہ تھے بلکہ الگ الگ کاموں میں مشغول تھے تو اس پر کفر کا خوف ہے۔ اگر کوئی مسلمان کہے کہ میں ملحد ہوں تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اور اگر وہ کہے کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس جملہ سے آدمی کافر ہو جاتا ہے تو اسے اس کی وجہ سے معذور قرار نہیں دیا جائے گا ایک شخص نے ایک جملہ زبان سے نکالا جسے لوگوں نے کفر یہ کلمہ سمجھا حالانکہ درحقیقت وہ کلمہ کفر نہ تھا مگر اس سے ان لوگوں نے کہا کہ تو کافر ہو گیا اور تیرے اور تیری بیوی کے درمیان جدائی واقع ہو گئی، اس کے جواب میں اس نے کہا کافر شدہ گیر، وزن طلاق شدہ گیر، تو کافر ہو جائے گا اور اس کی بیوی اور اس کے درمیان جدائی واقع ہو جائے گی۔

ایک شخص نے کہا کہ میں فرعون ہوں یا کہا کہ میں ابلیس ہوں تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا ایک شخص نے ایک بدکار کو نصیحت کی اور توبہ کی ترغیب دی اس کے جواب میں اس نے کہا از پس ایں ہمہ کلاہ مغاں بر سرہم تو وہ اس سے کافر ہو جائے گا ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا کہ تمہارے ساتھ رہنے سے کافر ہونا بہتر ہے تو وہ کافر ہو جائے گی ایک عورت نے کہا کہ اگر میں ایسا کام کروں تو کافر ہوں ابوبکر محمد بن الفضل کہتے ہیں کہ اس کہنے سے وہ عورت کافر ہو گئی اور اس کا نکاح ٹوٹ گیا اور قاضی علی السعدی کا کہنا ہے کہ یہ جملہ تعلیق ویمین ہے کفر نہیں ہے ایک عورت نے اپنے خاوند سے کہا کہ تم اس کے بعد مجھ پر ظلم کرو گے یا یہ کہا کہ اگر تم میرے لئے ایسی چیز نہ خریدو گے تو میں کافر ہو جاؤں گی تو وہ فوراً یہ کہتے ہی کافر ہو گئی۔

ایک شخص نے تمثیل کے طور پر کہا کہ میں مجوسی تھا مگر مسلمان ہو گیا یہ صرف زبان سے بطور حکایت کہا اعتقاداً نہ کہا تو بھی وہ کافر ہو جائے گا اگر کوئی مسلمان کسی آدمی کو سجدہ تحیتہ کریگا تو وہ اس سے کافر نہ ہو گا ایک شخص نے کسی مسلمان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہارا ایمان چھین لے اس نے اس کے جواب میں آمین کہا تو وہ دونوں کافر ہو جائیں گے کسی شخص نے کسی کو تکلیف دی اس نے کہا کہ مجھے مت ستاؤ میں مسلمان ہوں ستانے والے نے جواب دیا چاہے مسلمان رہو چاہے کافر تو وہ ایذا دینے والا کافر ہو جائے گا یا کہا کہ اگر تو کافر بھی ہو جائے تو میرا کیا نقصان تو اس سے بھی کافر ہو جائے گا۔

ایک کافر نے اسلام قبول کیا لوگوں نے اس کو تحفے ہدیئے دیئے ایک مسلمان نے یہ دیکھ کر کہا کہ کاش میں بھی کافر ہوتا اور پھر مسلمان ہوتا تو لوگ مجھ کو بھی تحفے ہدیئے دیتے یا اس نے یہ بات کہی نہیں لیکن دل میں اس کی آرزو کی تو وہ کافر ہو گیا۔ ایک شخص نے آرزو کی کہ اللہ تعالیٰ شراب کو حرام نہ کرتا تو اس سے وہ کافر نہ ہو گا۔ اور اگر کسی نے یہ آرزو کی کہ اللہ تعالیٰ ظلم وزنا کو حرام نہ کرتا یا ناحق قتل وخوں ریزی کو حرام نہ کرتا تو وہ کافر ہو جائے گا اس لئے کہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ کبھی بھی حلال نہ رہیں گویا پہلی صورت میں ایسی چیز کی آرزو کی جو

محال نہیں اور دوسری میں ایسی چیز کی آرزو کی جو محال ہے اسی طرح اگر کوئی آرزو کرے کہ بھائی بہن کے درمیان نکاح حرام نہ ہوتا تو اس سے کافر نہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہ شروع میں حلال رہ چکا ہے لہٰذا محال نہیں کہا جائے گا۔ ماحصل یہ ہوا کہ جو چیز کبھی حلال تھی اور بعد میں حرام ہوگئی اس کے حلال ہونے کی تمنا کرنا موجب کفر نہیں ہے۔

ایک مسلمان نے کسی خوبصورت گداز بدن عیسائی عورت کو دیکھ کر آرزو کی کہ کاش میں عیسائی ہوتا کہ اس سے بیاہ کر سکتا، تو وہ کافر ہو جائے گا ایک شخص نے کسی سے کہا حق بات پر میری مدد کرو اس نے کہا کہ کہیں مدد حق پر کی جاتی ہے میں ناحق پر البتہ تیری مدد کروں گا تو وہ اس کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے اس درخت کو پیدا کیا ہے تو وہ اس کہنے سے کافر نہیں ہوا اس لئے کہ اس کی مراد درخت لگانا سمجھی جائے گی ہاں اگر کوئی حقیقتاً پیدا کرنا مراد لے تو کافر ہو جائے گا ایک شخص نے کہا کہ جب تک میرے یہ بازو موجود ہیں میری روزی کم نہ ہوگی تو بعض مشائخ نے کہا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ کافر ہو جائے گا اور بعضوں نے کہا ہے کہ اس پر کفر کا خوف ہے! اگر کوئی یہ کہے کہ درویشی یا تصوف بدبختی ہے تو یہ بہت بری بات ہے۔

کسی نے چاند کے گرد کوئی دائرہ دیکھا اور دعوی کیا کہ بارش ہوگی اور اس طرح اس نے غیب کا دعوی کیا تو وہ کافر ہو جائے گا ایک نجومی نے کسی سے کہا کہ تیری بیوی حاملہ ہے اور اس نے اس پر اعتقاد جمالیا تو وہ کافر ہوگیا۔ ایک شخص نے الو کی آواز سنی اور پھر کسی سے کہا کہ بیمار مرجائے گا یا کوئی مصیبت آئے گی یا اسی طرح کوا بولا اور اس کی آواز سن کر کسی نے کہا کہ کوئی سفر سے آرہا ہے تو ایسے شخص کے کفر میں مشائخ کے اختلافی اقوال ہیں۔ کسی نے کوئی ناجائز بات کہی دوسرے نے اس سے کہا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس کہنے سے تم کافر ہو جاؤ گے! اس نے کہا کہ پھر میں کیا کروں کافر ہوتا ہوں گا تو ہو جاؤں گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

ایک شخص نے قرات کے دوران حرف ضاد کی جگہ زا پڑھا یا اصحاب الجنہ کی جگہ اصحاب النار پڑھا تو ایسے شخص کی امامت جائز نہیں ہے اگر کوئی قصداً ایسا پڑھے گا تو کافر ہو جائے گا۔ جو شخص کہے قسم ہے تیری زندگانی کی یا میری زندگانی کی یا اسی طرح کی کوئی اور قسم کھائے تو اس پر کفر کا خوف ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ رزق تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے مگر وہ بندے سے حرکت چاہتا ہے تو بعضوں نے کہا یہ شرک ہے ایک شخص نے کہا کہ میں ثواب وعذاب سے بری ہوں تو کہا گیا کہ وہ اس سے کافر ہو جائے گا اگر کسی نے کہا کہ فلاں شخص جو کچھ بھی کہے گا میں کروں گا اگرچہ وہ کفر ہی کیوں نہ ہو تو وہ کافر ہو جائے گا اگر کوئی کہے کہ میں مسلمان ہونے سے بیزار ہوں تو وہ کافر ہو جائے گا۔

مامون رشید کے زمانے کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ خلیفہ وقت نے ایک فقیہ سے اس شخص کے متعلق سوال کیا جس نے کسی کپڑا بننے والے کو قتل کر دیا تھا کہ اس قاتل پر کیا واجب ہوگا فقیہ نے کہا تعزیر واجب ہے مامون نے حکم دیا کہ فقیہ کو پیٹا جائے چنانچہ اسے پیٹا گیا یہاں تک کہ وہ مرگیا، پھر مامون نے کہا کہ میں نے یہ حکم اس لئے دیا تھا کہ اس نے شریعت کے ساتھ استہزا کیا اور شریعت کے ساتھ اس طرح کا مذاق کفر ہے ایک فقیر کالی کملی اوڑھے ہوئے تھا کسی نے اس کو دیکھ کر مذر کہا تو یہ کفر ہے۔

جو ظالم بادشاہ کو عادل کہے وہ کافر ہے اور بعضوں نے کہا کہ وہ کافر نہیں ہوتا ہے اگر کوئی کسی ظالم کو اے خدا سے خطاب کریگا تو وہ کافر ہو جائے گا اور اگر کہے اے بار خدا تو اکثر مشائخ کہتے ہیں اس سے کافر نہیں ہوگا ایک عالم صغار[رح] نامی سے ان خطیبوں کے متعلق سوال کیا گیا جو جمعہ کے دن منبروں پر خطبہ پڑھتے ہیں اور سلطان کو العادل الاعظم یا شہنشاہ الاعظم یا مالک رقاب الامم یا سلطان ارض اللہ یا مالک بلاد اللہ یا معین خلیفۃ اللہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں کیا بادشاہوں کو خطبہ میں ان القاب کے ساتھ یاد کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ تحقیق اس مسئلہ میں کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ جائز نہیں ہے اس لئے کہ ان القاب کے بعض الفاظ کفر ہیں اور بعض معصیت اور کذب ہیں۔ اور شہنشاہ کا لفظ بغیر اعظم کی صفت کے اللہ تعالیٰ کے اسماء کے لئے مخصوص ہے اس کے ساتھ بندوں کی صفت بیان کرنا جائز نہیں ہے اور مالک رقاب الامم کا جملہ بادشاہ کے لئے صریح جھوٹ ہے اسی طرح بادشاہ کو سلطان ارض اللہ یا اس طرح کے لقب سے یاد کرنا بھی

جھوٹ ہے۔

امام ابو منصور نے کہا کہ اگر کوئی کسی کے آگے زمین بوسی کرے یا اس کے سامنے جھکے، یا اپنا سر جھکائے تو وہ کافر نہیں ہوگا اس لئے کہ اس کا منشا تعظیم و تکریم ہے عبادت نہیں ہے اور دوسرے مشائخ نے کہا کہ جابروں کے سامنے سجدہ ریز ہونا گناہ کبیرہ ہے اور بعض عالموں نے کہا کہ اس سے وہ مطلقاً کافر ہو جاتا ہے اور بعضوں نے کہا کہ اس میں تفصیل ہے اگر عبادت کا ارادہ کیا تو کافر ہو جائے گا اور اگر تعظیم کا ارادہ کیا تو کافر نہ ہوگا مگر اس کا یہ فعل حرام ہوگا اور اگر کوئی ارادہ سرے سے پایا ہی نہ جائے تو بھی اکثر کے نزدیک کافر ہوگا زمین چومنا سجدہ کرنے کے برابر ہے ہاں زمین پر پیشانی یا رخسار رکھنے سے ہلکا جرم ہے، اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ خراج، سلطان کی ملکیت ہے تو یہ کفر ہے! اگر کوئی کسی کے ساتھ برائی سے پیش آئے اور وہ یہ کہے کہ یہ سب تیری لائی ہوئی مصیبت ہے خدا کو اس میں دخل نہیں ہے تو یہ بھی کفر ہے اگر کوئی بادشاہ کے خلعت زیب تن کرتے وقت اس کی خوشنودی اور مبارکبادی کے لئے قربانی کرے گا تو کافر ہوگا اور یہ قربانی مردار کے حکم میں ہوگی اور اس کا کھانا درست نہ ہوگا۔

کہیں کہیں یہ جو ہندوانہ رواج ہے کہ جب کسی کے چیچک نکلتی ہے تو عورتیں کسی پتھر کا نام چیچک رکھ دیتی ہیں اور اس کی پوجا کر کے بچوں کی چیچک سے شفا چاہتی ہیں اور اعتقاد رکھتی ہیں کہ اس سے بچہ اچھا ہو جائے گا یہ باعث کفر ہے اور وہ عورتیں کافر ہو جاتی ہیں اور اگر ان کے شوہر بھی اسے پسند کریں تو وہ بھی کافر ہیں۔ اسی طرح دریا کے کنارے جا کر پانی کو پوجنا اور وہاں بکری وغیرہ ذبح کرنا بھی خالص مشرکانہ رسم ہے اور باعث تکفیر ہے اور وہ بکری مردار کے حکم میں ہے اور اس کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے ایسے ہی گھر میں تصویر بنا کر رکھنا اور اس کی پرستش کرنا جیسا کہ آتش پرست کرتے ہیں۔ یا بچہ پیدا ہونے کے وقت شنگرف سے نقشہ بنانا اور اس میں تیل ڈالنا اور پھر بھوانی بت کے نام سے اس کی پوجا کرنا یا اس طرح اور جو دوسرے کام کئے جاتے ہیں یہ سب مشرکانہ رسم اور کفر کا باعث ہیں چنانچہ جو عورتیں یہ سب کچھ کرتی ہیں وہ کافر ہو جاتی ہیں اور ان کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ آجکل جب تک خیانت نہ کرو اور جھوٹ نہ بولو گزارہ نہیں ہو سکتا، یا کہتا ہے کہ جب تک خرید و فروخت میں تم جھوٹ نہ بولو گے روٹی نہیں ملے گی، یا کسی سے کوئی کہے کہ تم کیوں خیانت کرتے ہو، یا کیوں جھوٹ بولتے ہو، وہ جواب دے کہ اس کے علاوہ چارہ نہیں ہے تو ان الفاظ سے وہ کافر ہو جائے گا! اگر کوئی کسی سے کہے کہ تم جھوٹ نہ بولا کرو اور وہ اس کے جواب میں کہے کہ یہ بات تو کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے زیادہ درست ہے تو وہ کافر ہو جائے گا اگر کسی کو غصہ آئے اور دوسرا اس کا غصہ دیکھ کر کہے کہ غصہ سے بہتر تو کافر ہی ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص ایک ناجائز بات کہنے لگے دوسرا کہے یہ تم کیا کہہ رہے ہو اس سے تو تم پر کفر لازم آ رہا ہے وہ جواب میں کہے کہ اگر مجھ پر کفر لازم آتا ہے تو تم کیا کرو گے۔ تو وہ اس کی وجہ سے کافر ہو جائے گا کسی کے دل میں ایسی چیز کا خطرہ گذرا جو باعث کفر ہے اگر وہ اس کو اس حالت میں زبان پر لایا کہ وہ اسے برا جانتا ہے تو یہ ایمان کی علامت ہے اور اگر کفر کے ارادہ سے اس کو زبان پر لایا تو اسی وقت وہ کافر ہو جائے گا اگرچہ سو برس کے بعد کفر اختیار کرے اگر کوئی شخص بخوشی اپنی زبان پر کلمہ کفر لایا مگر اس کا دل ایمان پر قائم ہے تو وہ کافر ہو جائے گا

اور عند اللہ مؤمن باقی نہ رہے گا اور جو شخص بھول کر ایسے الفاظ زبان پر لائے جو باعث کفر نہیں ہیں تو وہ علی حالہ مؤمن ہے اور اس کو نہ توبہ کا حکم دیا جائے گا اور نہ تجدید نکاح کا اگر کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہی یا کوئی ایسا عمل کیا جس میں کئی صورتیں کفر کی ہوں اور ایک صورت ایسی ہو کہ کفر لازم نہ آتا ہو تو مفتی پر لازم ہے کہ اسی عدم کفر کی طرف رجحان رکھے ہاں اگر وہ شخص صراحت کے ساتھ اس صورت کو اختیار کرے جو باعث کفر ہے تو اس وقت کوئی تاویل مفید نہیں ہوگی، لیکن اگر کہنے والے کی نیت میں وہ صورت ہو جس سے آدمی کافر نہیں ہوتا ہے تو وہ مسلمان ہے اور اگر وہ صورت اختیار کرے جو باعث کفر ہے تو کسی قسم کا فتویٰ اس کے لئے کار آمد نہ ہوگا اور اسے حکم دیا جائے گا کہ وہ توبہ کرے اور اس بات سے رجوع کرے اور اپنی بیوی سے دوبارہ نکاح کرے۔

مسلمان کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ صبح وشام ذیل کی دعا پڑھتا رہے انشاء اللہ وہ کفر و شرک کی ہر صورت سے محفوظ رہے گا اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا ہی فرمایا ہے وہ دعا یہ ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ شَیْئًا وَاَنَا اَعْلَمُ بِهٖ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَالَا اَعْلَمُ بِهٖ فتاوی عالمگیری سے ماخوذ یہ بات کفر کی جو بحث نقل کی جا رہی تھی الحمد للہ وہ پوری ہوئی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مرتد کی سزا قتل ہے

(۱) عَنْ عِکْرِمَةَ قَالَ اُتِیَ عَلِیٌّ بِزَنَادِقَةٍ فَاَحْرَقَهُمْ فَبَلَغَ ذٰلِكَ ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ لَوْكُنْتُ اَنَا لَمْ اُحْرِقْهُمْ لِنَهْیِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُعَذِّبُوْا بِعَذَابِ اللّٰهِ وَلَقَتَلْتُهُمْ لِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَدَّلَ دِیْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کچھ زندیق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں لائے گئے تو انہوں نے ان کو جلا ڈالا پھر جب اس بات کی خبر حضرت ابن عباسؓ کو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو ان کو نہ جلاتا کیونکہ رسول کریم ﷺ نے یہ ممانعت فرمائی ہے کہ کسی شخص کو ایسے عذاب میں مبتلا نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرح ہو جیسے کسی کو آگ میں جلانا بلکہ میں ان کو قتل کر دیتا کیونکہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنا دین بدل ڈالے اس کو قتل کر دو۔" (بخاریؒ)

تشریح: اصل میں "زندیق" مجوسیوں کی ایک قوم کا نام ہے جو زردشت مجوس کی اختراع کی ہوئی کتاب زند کے پیروکار ہیں لیکن اصطلاح عام میں ہر ملحد فی الدین کو زندیق کہا جاتا ہے، چنانچہ یہاں بھی زندیق سے وہ لوگ مراد ہیں جو دین اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گئے تھے۔ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں جن لوگوں کو زندیق کہا گیا ہے وہ در اصل عبد اللہ ابن سبا کی قوم میں سے کچھ لوگ تھے جو حدود اسلام میں فتنہ و فساد برپا کرنے اور اُمت کو گمراہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارہ میں خدائی کا دعوی کرتے تھے، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کے اس عظیم فتنہ کا سر کچلنے کے لئے ان سب کو پکڑوا بلایا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ سب توبہ کریں اور یہ فتنہ پھیلانے سے باز رہیں لیکن جب انہوں نے اس سے انکار کر دیا تو حضرت علیؓ نے ایک گڑھا کھدوا کر اس میں آگ جلوائی اور ان سب کو آگ کے اس گڑھے میں ڈلوا دیا۔

منقول ہے کہ جب حضرت ابن عباسؓ کا مذکورہ قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچا تو انہوں نے فرمایا کہ بیشک ابن عباسؓ نے سچ کہا اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ نے اس مسئلہ میں اپنے اجتہاد پر عمل کیا اور اس مصلحت کے پیش نظر ان سب کو جلوا دیا کہ یہی لوگ نہیں بلکہ ان کا عبرتناک انجام دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس قسم کی مفسدہ پردازی سے باز رہیں۔

کسی کو آگ میں جلانے کی سزا نہ دو

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ النَّارَ لَا یُعَذِّبُ بِهَا اِلَّا اللّٰهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا آگ کے عذاب میں تو صرف اللہ تعالیٰ مبتلا کرتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی انسان کو اس کے کسی جرم کی وجہ سے آگ میں جلانے کی سزا دے۔" (بخاریؒ)

فرقہ خوارج کی نشاندہی

(۳) وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ سَیَخْرُجُ قَوْمٌ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ حُدَاثُ الْاَسْنَانِ

سُفَهَاءُ الْاَحْلَامِ يَقُوْلُ مِنْ خَيْرِ قَوْلِ الْبَرِيَّةِ لَا يُجَاوِزُ اِيْمَانُهُمْ حَنَاجِرَهُمْ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ فَاَيْنَمَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ فَاِنَّ فِيْ قَتْلِهِمْ اَجْرًا لِمَنْ قَتَلَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عنقریب اس زمانہ کے آخر میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو نوجوان ہوں گے ہلکی عقل والے ہوں گے لوگوں کی اچھی باتیں بیان کریں گے لیکن ان کا ایمان ان کے حلق سے آگے نہیں جائے گا ایمان سے مراد نماز ہے یعنی ان کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی اور وہ لوگ دین یعنی امام وقت اور علماء حق کی اطاعت سے اس طرح نکل بھاگیں گے جس طرح تیر شکار کے درمیان سے نکل جاتا ہے لہٰذا تم میں سے جس شخص کی ایسے لوگوں سے مڈ بھیڑ ہو جائے وہ انہیں قتل کر دے کیونکہ ان کے قتل کرنے کا اس شخص کو قیامت کے دن انعام ملے گا جو انہیں قتل کرے گا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: لوگوں کی اچھی باتیں بیان کریں گے اس سے مراد یہ ہے کہ مذکورہ لوگ وہ بہترین اقوال اور اچھی باتیں بیان کریں گے جو عام طور پر خدا کے نیک بندوں کی زبانوں پر رہتی ہیں یعنی قرآن کریم کی آیات لیکن ملحوظ رہے کہ مشکوٰۃ کے نسخوں میں تو من خیر قول البریہ ہے یعنی خیر کا تعلق قول سے ہے چنانچہ یہاں اسی کے مطابق ترجمہ و مطلب بیان کیا گیا ہے جب کہ مصابیح میں من قول خیر البریہ ہے یعنی اس میں خیر کا تعلق البریہ سے ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ بہترین انسان کے اقوال بیان کریں گے اس صورت میں قرآن کریم کی آیات کی بجائے رسول کریم ﷺ کی احادیث مراد ہوں گی۔ لیکن علماء کہتے ہیں کہ جملہ کی زیادہ مناسب اور موزوں ترکیب وہی ہے جو یہاں مشکوٰۃ میں نقل کی گئی ہے کیونکہ احادیث میں خوارج کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ قرآن کریم کی آیات پڑھیں گے اور ان سے اپنے غلط عقائد و نظریات پر استدلال کریں گے اور ان آیات کی غلط سلط تاویل کریں گے۔

جس طرح تیر شکار کے درمیان سے نکل جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی تیر شکار کے درمیان نکل جاتا ہے اور پھر شکار میں جلدی پیوست ہو کر فوراً نکل جانے کی وجہ سے وہ تیر شکار کے خون وغیرہ سے آلودہ نہیں ہوتا اسی طرح وہ لوگ بھی امام وقت اور علماء حق کی اطاعت سے نکل جائیں گے! طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کی مراد ان لوگوں کا دین کے دائرہ میں داخل ہونے پھر دین کے دائرہ سے نکل جانے اور اس تیر کی مانند کہ جو شکار میں پیوست ہو کر نکل جائے اور آلودہ نہ ہو ان لوگوں پر دین کی کسی بات کے اثر نہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے نیز اس کا منشاء ان خوارج کی نشان دہی کرنا ہے جو امام وقت اور اسلامی حکومت کے اطاعت گذار نہیں ہوتے اور لوگوں پر ہتھیار اٹھاتے ہیں چنانچہ ابتداء میں ان خوارج کا ظہور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں ہوا جن میں سے اکثر کو حضرت علی کرم وجہہ نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

خوارج کے بارہ میں علماء کا فیصلہ: خطابیؒ کہتے ہیں کہ علمائے اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خوارج کی جماعت باوجود گمراہی کے مسلمانوں ہی کے فرقوں میں سے ایک فرقہ ہے ان کے ہاں نکاح کرنا بھی جائز ہے اور ان کا ذبیحہ کھانا بھی درست ہے نیز ان کی گواہی بھی معتبر ہے چنانچہ منقول ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ان لوگوں کے بارہ میں پوچھا گیا کہ کیا وہ لوگ کافر ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ وہ تو کفر سے بھاگ کر آئے ہیں پھر ہم ان کو کافر کس طرح کہہ سکتے ہیں اس کے بعد پوچھا گیا کہ کیا وہ منافق ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ منافق تو اللہ تعالیٰ کو بہت تھوڑا یاد کرتے ہیں اس لئے انہیں منافق بھی نہیں کہا جاسکتا پھر پوچھا گیا کہ تو آخر وہ کیا ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ وہ مسلمانوں میں سے ایک فرقہ کے لوگ ہیں فتنہ و گمراہی نے ان کو گھیر لیا ہے چنانچہ وہ اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں۔

جیسا کہ بتایا گیا خوارج مسلمانوں کے ایک فرقہ کا نام ہے جو گمراہی میں مبتلا ہے اس فرقہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ بندہ نہ صرف گناہ کبیرہ بلکہ صغیرہ گناہوں کے ارتکاب سے بھی کافر ہو جاتا ہے۔

خوارج کے بارہ میں آنحضرت کی پیش گوئی

④ وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكُوْنُ اُمَّتِيْ فِرْقَتَيْنِ فَيَخْرُجُ مِنْ بَيْنِهِمَا

مَارِقَةٌ يَلِي قَتْلَهُمْ أَوْلَاهُمْ بِالْحَقِّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کچھ دنوں بعد میری اُمت دو فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی ان دونوں فرقوں میں سے ایک ایسی جماعت پیدا ہوگی جو حق کی اطاعت سے نکلنے والی ہوگی اس جماعت کو موت کے گھاٹ اتارنے کی ذمہ داری ان دونوں فرقوں میں سے وہ شخص پورا کرے گا جو حق سے زیادہ قریب ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: دو فرقوں سے مراد ایک تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حامیوں کی جماعت ہے اور دوسری حضرت امیر معاویہؓ کے حامیوں کی جماعت ہے ان دونوں کے درمیان سے جو ایک تیسری جماعت پیدا ہوئی اسی کو خوارج کہا گیا ہے خوارج کو فنا کے گھاٹ اتارنے اور ان کے فتنہ و فساد کا دفعیہ کرنے کی طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ متوجہ ہوئے کیونکہ اس وقت انہی کی شخصیت حق سے زیادہ قریب کا سب سے بڑا مصداق تھی۔

مسلمان کا مسلمان کو قتل کرنا کفر کے قریب پہنچ جانا ہے

⑤ وَعَنْ جَرِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ لَا تَرْجِعُنَّ بَعْدِيْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جریرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ خبردار میرے بعد کفر کے ذریعہ پیچھے نہ پھر جانا کہ تم میں سے ایک دوسرے کی گردن مارنے لگے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: تم میں سے ایک دوسرے کی گردن مارنے لگے یہ استیناف ہے یعنی ایک الگ جملہ ہے جو اس ممانعت کفر کے ذریعہ پیچھے نہ پھر جانا کی وضاحت اور بیان ہے گویا سوال کرنے والے نے سوال کیا کہ کفر کے ذریعہ پیچھے پھر جانا کیونکر ممکن ہے؟ تو جواب میں فرمایا گیا کہ مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کی گردن مارنا یعنی یہ ایک ایسا عمل ہے جو کافروں کے عمل کے مشابہ ہے یا یہ عمل کفر کے قریب پہنچا دیتا ہے۔

⑥ وَعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ حَمَلَ أَحَدُهُمَا عَلَى أَخِيْهِ السِّلَاحَ فَهُمَا فِيْ جُرُفِ جَهَنَّمَ فَإِذَا قَتَلَ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ دَخَلَاهَا جَمِيْعًا وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنْهُ قَالَ إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ قُلْتُ هٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ قَالَ إِنَّهُ كَانَ حَرِيْصًا عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوبکرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب دو مسلمانوں کی آپس میں اس طرح مڈبھیڑ ہو کہ ان میں کا ایک اپنے دوسرے (مسلمان) بھائی پر ہتھیار اٹھائے تو وہ دونوں دوزخ کے کنارے پر پہنچ جاتے ہیں اور پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دے تو دونوں ایک ساتھ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ ایک روایت میں ابوبکرہؓ ہی سے یوں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اگر دو مسلمانوں کی آپس میں تلوار کے ساتھ مڈبھیڑ ہو اور ان میں کا ایک دوسرے کو قتل کر دے تو قاتل و مقتول دونوں ہی دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے میں نے عرض کیا کہ قاتل کا دوزخ میں جانا تو ظاہر ہے کہ اس نے چونکہ ظلم کیا ہے اس لئے وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا مگر مقتول کے بارہ میں ایسا کیوں ہے؟ کہ وہ تو مظلوم ہے اس کو دوزخ میں کیوں ڈالا جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس لئے کہ وہ بھی تو اپنے ساتھی یعنی حریف کو قتل کرنے پر آمادہ تھا یہ اور بات ہے کہ اس کا وار خالی گیا اور دوسرے کا وار بھرپور پڑا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: دونوں ایک ساتھ دوزخ میں ڈالے جائیں گے کے بارہ میں علماء لکھتے ہیں کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ ان دونوں میں سے ایک بھی حق پر نہ ہو، ہاں اگر ان میں سے ایک حق پر ہوگا تو دوزخ کی آگ میں اسی کو ڈالا جائے گا جو ناحق پر ہوگا، لیکن یہ بھی اسی

صورت میں ہے جب کہ اشتباہ، التباس اور تاویل سے قتل سرزد نہ ہو۔

وہ بھی تو اپنے ساتھی کو قتل کرنے پر آمادہ تھا اور ابن ملک کہتے ہیں کہ یہ ارشاد اس بات کی دلیل ہے کہ کسی حرام چیز کے ارتکاب کی محض آمادگی پر بھی مواخذہ ہوتا ہے چنانچہ صورت مذکورہ میں یہی نوعیت ہے کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی جان کے طلب گار ہوتے ہیں ہاں اگر مقتول محض اپنے دفاع کا ارادہ رکھتا ہو اور اس کی نیت میں دوسرے کے قتل کی خواہش وارادہ کا دخل نہ ہوتا تو اس سے مواخذہ نہ ہوتا کیونکہ شریعت نے "دفاعی کاروائی" کی اجازت دی ہے۔

مرتد اور قزاقوں کی سزا

⑦ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفَرٌ مِنْ عُكْلٍ فَاَسْلَمُوْا فَاجْتَوَوُا الْمَدِيْنَةَ فَاَمَرَهُمْ اَنْ يَاْتُوْا اِبِلَ الصَّدَقَةِ فَيَشْرَبُوْا مِنْ اَبْوَالِهَا وَاَلْبَانِهَا فَفَعَلُوْا فَصَحُّوْا فَارْتَدُّوْا وَقَتَلُوْا رُعَاتَهَا وَاسْتَاقُوا الْاِبِلَ فَبَعَثَ فِيْ اٰثَارِهِمْ فَاُتِيَ بِهِمْ فَقَطَعَ اَيْدِيَهُمْ وَاَرْجُلَهُمْ وَسَمَلَ اَعْيُنَهُمْ ثُمَّ لَمْ يَحْسِمْهُمْ حَتّٰى مَاتُوْا وَفِيْ رِوَايَةٍ فَسَمَّرُوْا اَعْيُنَهُمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَمَرَ بِمَسَامِيْرَ فَاُحْمِيَتْ فَكَحَلَهُمْ بِهَا وَطَرَحَهُمْ بِالْحَرَّةِ يَسْتَسْقُوْنَ فَمَا يُسْقَوْنَ حَتّٰى مَاتُوْا (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ عکل کے کچھ لوگ آئے اور اسلام قبول کیا لیکن ان کو مدینہ کی آب وہوا موافق نہیں آئی جس کی وجہ سے وہ اس مرض میں مبتلا ہو گئے کہ ان کے پیٹ پھول گئے اور رنگ زرد ہو گیا آنحضرت ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ شہر سے باہر زکوۃ کے اونٹوں کے رہنے کی جگہ چلے جائیں اور وہاں ان اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پیا کریں، چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور اچھے ہو گئے پھر وہ ایسی گمراہی میں مبتلا ہوئے کہ مرتد ہو گئے اور مستزاد یہ کہ ان اونٹوں کے چرواہوں کو قتل کر کے اونٹوں کو ہانک کر لے گئے جب رسول کریم ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے ان کے پیچھے چند سواروں کو بھیجا جو ان سب کو پکڑ لائے۔ ان کے اس جرم کی سزاء کے طور پر آنحضرت ﷺ کے حکم سے ان کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیئے گئے اور ان کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں اور پیروں کو گرم تیل میں داغا بھی نہیں گیا یعنی جیسا کہ قاعدہ ہے کہ ان اعضاء کو کاٹنے کے بعد گرم تیل میں داغ دیا جاتا ہے تاکہ خون بند ہو جائے لیکن ان کے ساتھ یہ بھی نہیں کیا گیا) آخر کار وہ سب مر گئے!۔"

تشریح: ان اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پیا کریں اس ارشاد گرامی سے حضرت امام محمدؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت حلال ہے ان کا پیشاب بھی پاک ہے یہی قول امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کا ہے، لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک ان جانوروں کا پیشاب نجس (ناپاک) ہے ان کی طرف سے اس ارشاد گرامی کی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کے مرض کی نوعیت کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہوا ہو گا کہ ان کے مرض کا علاج صرف اونٹ کا پیشاب ہے اس لئے آپ ﷺ نے مخصوص طور پر ان لوگوں کو اس کا حکم دیا۔ پھر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اونٹ کا پیشاب پینا دوا کے علاوہ حلال نہیں ہے اسی طرح دوا کے طور پر پینا بھی حلال نہیں ہے، کیونکہ اس بات پر کوئی بھی متفق نہیں ہے کہ پیشاب میں کسی مرض کی شفا ہے، لیکن حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک کسی مرض کے علاج کے لئے پینا حلال ہے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ آنحضرت ﷺ نے مثلہ سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ نے ان لوگوں کو اس طرح کی سزا دی، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے اونٹوں کے چرواہوں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا تھا اس لئے آنحضرت نے بطور قصاص ان لوگوں کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ کیا یا یہ وجہ تھی کہ چونکہ ان مفسدوں نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا تھا یعنی مرتد بھی ہوئے، چرواہوں کو قتل بھی کیا ہے اور قزاقی بھی کی کہ لوٹ مار کر کے سارے اونٹ لے گئے اور امام وقت کو حق پہنچتا ہے کہ اس قسم کے جرم کی صورت میں بطور زجر و تنبیہ اور بمصلحت امن وانتظام مجرم کو مختلف طرح کی سزائیں دے چنانچہ آپ ﷺ نے اسی کے پیش نظر ان لوگوں کے ساتھ اس

طرح کا معاملہ کیا۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے معنی و منشاء کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جو واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ ان آیات کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے جن میں حدود کی شرعی سزاؤں اور قزاقوں کی سزا کے بارہ میں صریح احکام بیان کئے گئے ہیں اسی طرح آنحضرت ﷺ نے مثلہ کی جو ممانعت فرمائی ہے وہ بھی اس واقعہ کے بعد کا حکم ہے اس اعتبار سے یہ حدیث منسوخ ہے، لیکن دوسرے بعض حضرات کا قول یہی ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے، بلکہ اسی موقعہ پر وہ آیت نازل ہوئی تھی جس میں قزاقوں کی یہ سزا بیان کی گئی ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا سولی دے دی جائے اور یا ان کا ایک ہاتھ اور پیر کاٹ دیا جائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو جو سزا دی وہ بطور قصاص تھی کہ انہوں نے اونٹوں کے چرواہوں کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا گیا۔

اب رہی یہ بات کہ آخری وقت میں ان مفسدوں کو پانی کیوں نہیں دیا گیا، تو اس کے بارہ میں بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ یہ بھی قصاص کے طور پر تھا کہ ان مفسدوں نے بھی اونٹوں کے چرواہوں کو اسی طرح بغیر پانی کے تڑپا تڑپا کر مار ڈالا تھا چنانچہ ان کے ساتھ بھی یہی کیا گیا کہ جب انہوں نے پانی مانگا تو انہیں پانی نہیں دیا گیا، لیکن بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان کو پانی نہ دینے کا حکم آنحضرت ﷺ نے نہیں دیا تھا بلکہ لوگوں نے ان مفسدوں کے تئیں انتہائی نفرت اور غصہ کے اظہار کے طور پر از خود ان کو پانی نہیں دیا۔ اس بارہ میں جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص سزا موت کا مستوجب ہو چکا ہو اور اس کو قتل کرنا واجب ہو وہ اگر پانی مانگے تو پانی دینے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

مثلہ کی ممانعت

(۸) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحُثُّنَا عَلَى الصَّدَقَةِ وَيَنْهَانَا عَنِ الْمُثْلَةِ۔ رَوَاهُ اَبُوْ دَاؤدَ وَرَوَاهُ النَّسَائِیُّ عَنْ اَنَسٍ۔

"حضرت عمران ابن حصین کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صدقہ خیرات دینے پر ہمیں رغبت دلاتے تھے اور مثلہ سے منع فرماتے تھے (ابوداؤد) نسائی نے اس روایت کو حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: جسم کے کسی عضو جیسے ناک، کان، ستر یا کسی اور حصہ جسم کے کاٹ ڈالنے کو مثلہ سے منع فرمانا بعض حضرات کے نزدیک تو بطور تحریم ہے یعنی یہ مکروہ تحریمی ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ بطور تنزیہی ہے یعنی یہ مکروہ تنزیہی ہے لیکن زیادہ صحیح قول تحریم ہی کا ہے جہاں تک اس سے پہلی حدیث میں مذکور واقعہ کا تعلق ہے تو یہ بات وہاں بھی بتائی جا چکی ہے کہ آپ کی طرف سے ان مفسدوں کے اعضاء جسم کا کاٹا جانا قصاص کے طور پر تھا۔

جانوروں کے ساتھ آنحضرت کا جذبہ رحمت

(۹) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفَرٍ فَانْطَلَقَ لِحَاجَتِهٖ فَرَاَيْنَا حُمَّرَةً مَعَهَا فَرْخَانِ فَاَخَذْنَا فَرْخَيْهَا فَجَاءَتِ الْحُمَّرَةُ فَجَعَلَتْ تُفَرِّشُ فَجَاءَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَنْ فَجَعَ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا رُدُّوْا وَلَدَهَا اِلَيْهَا وَرَاٰى قَرْيَةَ نَمْلٍ قَدْ حَرَّقْنَاهَا قَالَ مَنْ حَرَّقَ هٰذِهٖ فَقُلْنَا نَحْنُ قَالَ اِنَّهٗ لَا يَنْبَغِیْ اَنْ يُّعَذِّبَ بِالنَّارِ اِلَّا رَبُّ النَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمن ابن عبداللہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ایک مرتبہ ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھے جب ایک موقع پر آنحضرت ﷺ قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے تو ہم نے ایک حمرہ کو دیکھا جس کے ساتھ دو بچے تھے ہم نے ان دونوں بچوں کو پکڑلیا، اس کے بعد حمرہ آئی اور اپنے بچوں کی گرفتاری پر احتجاج شروع کیا جبھی نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، آپ ﷺ نے جب حمرہ کو اس طرح بیتاب دیکھا تو فرمایا کہ کس نے اس کے بچوں کو پکڑ کر اس کو مضطرب کر رکھا ہے؟ اس کے بچے اس کو واپس کردو پھر آپ ﷺ نے ان چیونٹیوں کے رہنے کی جگہ کو دیکھا جس کو ہم نے جلادیا تھا اور فرمایا کہ ان چیونٹوں کو کس نے جلایا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم نے جلایا ہے آپ ﷺ نے فرمایا پروردگار کے علاوہ کہ جو آگ کا بھی مالک ہے اور کسی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی کو آگ کے عذاب میں مبتلا کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "حمرہ" ح پر پیش اور میم پر تشدید وزبر ایک پرندے کا نام ہے جو سرخ رنگ کا اور چڑیا کی مانند چھوٹا ہوتا ہے، حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ آگ کے ذریعہ کسی کو عذاب دینا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے شایاں ہے اور چونکہ یہ سب سے بڑا عذاب ہے اس لئے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو آگ میں جلائے۔

چیونٹیوں کے بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر چیونٹیاں تکلیف پہنچانے میں ابتدا کریں یعنی از خود کسی کو کاٹنے لگیں تو ان کو مار ڈالنا چاہئے ورنہ ان کو مارنا مناسب نہیں ہے، اسی طرح چیونٹیوں کے بلوں کو آگ سے جلانا بھی ممنوع ہے، نیز چیونٹیوں کو پانی میں ڈالنا مکروہ ہے اگر ایک چیونٹی کاٹے تو صرف اسی کو مارا جائے اس کے ساتھ اور چیونٹیوں کو مار ڈالنے کی ممانعت ہے۔

ایک باطل فرقہ کے بارہ میں پیش گوئی

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ وَاَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ سَیَکُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ اِخْتِلَافٌ وَ فُرْقَۃٌ قَوْمٌ یُحْسِنُوْنَ الْقِیْلَ وَیُسِیْئُوْنَ الْفِعْلَ یَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَایُجَاوِزُ تَرَاقِیَھُمْ یَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّیْنِ کَمَا یَمْرُقُ السَّھْمُ مِنَ الرَّمِیَّۃِ لَایَرْجِعُوْنَ حَتّٰی یَرْتَدَّ السَّھْمُ عَلٰی فُوْقِہٖ ھُمْ شَرُّ الْخَلْقِ وَالْخَلِیْقَۃِ طُوْبٰی لِمَنْ قَتَلَھُمْ وَقَتَلُوْہُ یَدْعُوْنَ اِلٰی کِتَابِ اللّٰہِ وَلَیْسُوْا مِنَّا فِیْ شَیْءٍ مَنْ قَاتَلَھُمْ کَانَ اَوْلٰی بِاللّٰہِ مِنْھُمْ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا سِیْمَاھُمْ قَالَ التَّحْلِیْقُ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدری اور حضرت انس ابن مالک رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "عنقریب میری اُمّت میں اختلاف و افتراق پیدا ہوگا ایک فرقہ جو باتیں تو اچھی کرے گا مگر اس کا عمل برا ہوگا اس فرقہ کے لوگ قرآن کریم پڑھیں گے لیکن ان کا وہ پڑھنا ان کے حلق سے نیچے نہیں جائے گا یعنی قبول نہیں ہوگا اور وہ لوگ دین یعنی امام وقت اور علماء حق کی اطاعت سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر، شکار کے درمیان سے نکل جاتا ہے اور وہ دین کی طرف اس وقت تک نہیں لوٹیں گے جب تک کہ تیر اپنے سوفار کی طرف نہ لوٹ آئے اور وہ لوگ آدمیوں اور جانوروں میں سب سے بدترین ہوں گے۔ خوشخبری ہے اس شخص کے لئے جو ان لوگوں کو قتل کردے یا وہ لوگ اس کو قتل کردیں۔ یعنی جو شخص ان لوگوں کے فتنہ اور ان کی گمراہی کا سر کچلنے کے لئے ان کا مقابلہ کرے یہاں تک کہ یا تو وہ ان لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتار دے یا وہ ان لوگوں سے حق کے لئے لڑتا ہوا خود قتل ہوجائے تو دونوں صورتوں میں اس کے لئے حق تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کی سعادتوں کی خوشخبری ہے کہ پہلی صورت میں تو وہ غازی کا لقب پائے گا اور دوسری صورت میں شہادت کا عظیم مرتبہ حاصل کرے گا وہ لوگ بظاہر تو انسانوں کو کتاب اللہ کی دعوت دیں گے لیکن رسول کریم ﷺ کی سُنّت اور ان کی احادیث کو ترک کرنے پر اکسائیں گے حالانکہ احادیث نبوی ﷺ قرآن کریم کی تفسیر و تشریح ہیں کہ احادیث کے بغیر قرآن کریم کو سمجھنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا ناممکن ہے وہ لوگ کسی معاملہ میں ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہیں یعنی وہ کسی بات میں مسلمان شمار نہیں ہوں گے جو

شخص ان لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتارے گا وہ اپنی جماعت میں خدا کے سب سے زیادہ قریب ہو گا صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! ان لوگوں کی پہچان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "سر منڈانا۔" (ابوداؤد)

تشریح: میری اُمت میں اختلاف و افتراق پیدا ہو گا کا مطلب یہ ہے کہ میری اُمت میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو آپس میں اختلاف و افتراق کو ہوا دیں گے اور اپنی اغراض کے لئے اُمت کے اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے! یہ جملہ ایک فرقہ باتیں تو اچھی کرے گا ماقبل کے جملہ کی وضاحت اور بیان ہے یعنی اُمت میں جو لوگ اختلاف و افتراق پیدا کرنے کی کوشش کریں گے ان کی ایک خاص علامت یہ ہو گی کہ وہ باتیں تو بڑی اچھی اچھی کریں گے لیکن ان کا عمل بہت ہی برا ہو گا ان کی زبان سے تو یہ ظاہر ہو گا کہ پوری امت میں یہی لوگ ہیں جو دین کے شیدائی ہیں، خدا اور رسول ﷺ کے سچے اطاعت گذار ہیں، اور مسلمانوں کے بہی خواہ ہیں لیکن ان کے عمل و کردار کا یہ حال ہو گا کہ وہ اپنی اغراض کے لئے مسلم دشمن طاقتوں کا آلۂ کار، اپنے نفس کے غلام اپنی خواہشات کے بندے اور مال و جاہ کی حرص میں مبتلا ہوں گے اور ان کا بنیادی مقصد اتحاد اُمت کی جڑیں کھوکھلی کرنا ہو گا۔

یہ جملہ یَقْرَؤُوْنَ الْقُرْاٰنَ اس فرقہ کے لوگ قرآن پڑھیں گے یا تو استیناف یعنی ایک الگ جملہ ہے جو ماقبل کی عبارت کی توضیح و بیان ہے یا شاطبیؒ کے مسلک کے مطابق بدل ہے یا پھر اس سے نفس اختلاف کی وضاحت مراد ہے کہ عنقریب میری اُمت کے لوگوں میں اختلاف و افتراق پیدا ہو جائے گا اور وہ دو فرقوں میں تقسیم ہو جائیں گے ان میں سے ایک فرقہ حق پر ہو گا اور ایک فرقہ باطل پر ہو گا طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس تاویل کی تائید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو اسی باب کی پہلی فصل میں نقل ہو چکا ہے کہ تَكُوْنُ اُمَّتِیْ فِرْقَتَيْنِ فَتَخْرُجُ مِنْ بَيْنِهِمَا مَارِقَةٌ يَلِيْ قَتْلَهُمْ اَوْلَاهُمْ بِالْحَقِّ اس صورت میں کہا جائے گا کہ لفظ قَوْمٌ مابعد کے جملہ کا موصوف ہے اور اس کی خبر جملہ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ ہے اور اس جملہ کا مقصد ان دونوں فرقوں میں سے ایک فرقہ کی (جو باطل ہے) نشان دہی کرنا ہے جب کہ دوسرے فرقہ کے ذکر کو اس لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود بخود مفہوم ہو جاتا ہے۔

لا یجاوز تراقیھم ان کا پڑھنا ان کے حلق سے نیچے نہیں جائے گا کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ وہ لوگ بنیادی طور پر گمراہی میں مبتلا ہوں گے اور محض آلۂ کار کے طور پر قرآن کریم کو پڑھیں گے اس لئے ان کی قرات کا اثر ان مخارج حروف اور ان کی آوازوں سے آگے نہیں جائے گا جس کی وجہ سے قرآن کریم کی آیات کا کوئی بھی اثر نہ ان کے دل پر ہو گا اور نہ ان کے دوسرے اعضاء حرکت و عمل اثر پذیر ہوں گے چنانچہ قرآن کریم کی جن باتوں پر یقین و اعتقاد کرنا لازم ہے ان پر وہ اعتقاد و یقین نہیں رکھیں گے اور قرآن کریم کی جن باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے وہ ان پر عمل نہیں کریں گے۔ یا اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی قرات کو اس دنیا سے اوپر نہیں اٹھائے گا یعنی اس کو قبول نہیں کرے گا گویا ان کی قرات ان کے حلقوم سے آگے نہیں بڑھے گی۔

حتّٰی یرتد السھم علی فوقه جب تک کہ تیر اپنے سوفار کی طرف نہ لوٹ آئے یہ تعلیق بالمحال ہے یعنی جس طرح تیر کا اپنے سوفار اپنی چٹکی کی جگہ واپس آنا محال ہے اسی طرح ان لوگوں کا دین کی طرف پھر آنا بھی محال ہے گویا یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِيَاطِ کی مانند ہے اور اس جملے کا منشاء اس بات کو تاکید اور شدت کے ساتھ بیان کرنا ہے کیونکہ وہ لوگ سخت قسم کی جہالت اور گمراہی میں مبتلا ہوں گے اور یہ غلط گمان ان کے قلب و دماغ میں بیٹھ چکا ہو گا کہ ہم حق اور ہدایت پر ہیں اس لئے ان کا دین کے دائرہ میں لوٹ آنا ناممکن ہو گا۔

"سر منڈانا" آپ ﷺ نے یہ بات شائد اس لئے فرمائی کہ اس زمانہ میں عرب میں سر منڈانے کا رواج نہیں تھا، بلکہ اکثر لوگ سروں پر بال رکھا کرتے تھے، اس ارشاد کا مقصد سر منڈانے کی برائی یا تحقیر کرنا نہیں ہے کیونکہ سر منڈانا تو خدا کے شعار اور اس کی طاعت میں سے ایک عمل ہے اور ان لوگوں کی عادات میں سے ہے جو خدا کے نیک و صالح بندے ہیں۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ تحلیق سے مراد سر منڈانا نہیں ہے بلکہ لوگوں کو "حلقه در حلقه بٹھانا" مراد ہے جو ان لوگوں کی طرف سے محض نمائش اور تکلف کے طور

پر ہو گا۔

وہ تین صورتیں جن میں ایک مسلمان کو سزائے موت دی جا سکتی ہے

⑪ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِىءٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اِلَّا بِاِحْدٰى ثَلَاثٍ زِنًى بَعْدَ اِحْصَانٍ فَاِنَّهٗ يُرْجَمُ وَرَجُلٌ خَرَجَ مُحَارِبًا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّهٗ يُقْتَلُ اَوْ يُصْلَبُ اَوْ يُنْفٰى مِنَ الْاَرْضِ اَوْ يَقْتُلُ نَفْسًا فَيُقْتَلُ بِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا نفس مسلمان کہ جو اس امر کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اس کا خون حلال نہیں ہے ہاں ان تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت واقع ہو جانے کی وجہ سے اس کا خون حلال ہو جاتا ہے ایک تو یہ کہ وہ محصن ہونے کے بعد زنا کرے تو اس کو سنگسار کر دیا جائے دوسری صورت یہ کہ کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے نکلے یعنی جو مسلمان قزاقی کرے یا بغاوت کی راہ پر لگ جائے تو اس کو قتل کر دیا جائے یا سولی دے دی جائے اور یا اس کو قید میں ڈال دیا جائے اور تیسری صورت قتل نفس کی ہے کہ جو مسلمان کسی کو عمداً قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اس کو قتل کر دیا جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "محصن" ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمان جو آزاد ہو مکلّف ہو اور نکاح صحیح کے ساتھ صحبت کر چکا ہو یعنی شادی شدہ ہو اور پھر اس کے بعد زنا کا مرتکب ہو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو سنگسار کر کے ختم کر دیا جائے۔

قزاقی کرنے والے کے بارہ میں تین سزائیں بیان کی گئی ہیں ① قتل کر دیا جائے ② سولی دیا جائے۔ ③ قید میں ڈالا جائے ان تینوں میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ قزاق مال تو نہ لوٹ سکا ہو مگر اس نے کسی کو جان سے مار ڈالا ہو تو اس صورت میں اس کو قتل کیا جائے گا اور اگر اس نے مال بھی لوٹا ہو اور کسی کو قتل بھی کیا ہو تو اس صورت میں اس کو سولی دی جائے گی۔ اب اس کے متعلق حضرت امام مالکؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ اس کو زندہ سولی پر لٹکا دیا جائے تاکہ وہ مر جائے لیکن حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس کو قتل کر کے اس کی لاش سولی پر لٹکا دی جائے تاکہ دوسرے لوگوں کو اس کے انجام سے عبرت ہو۔

تیسری سزا قید کی ہے اس کے لئے حدیث میں يُنْفٰى فِي الْاَرْضِ کے الفاظ ہیں اس کے معنی حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو یہ ہیں کہ اس کو مسلسل شہر بدر کیا جاتا رہے یعنی اسے کسی ایک شہر میں ٹھہرنے اور رہنے نہ دیا جائے بلکہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف نکالا جاتا رہے تاکہ اسے قرار و آرام نہ مل سکے۔ لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ اس کو قید میں ڈال دیا جائے اور یہ قید کی سزا اس صورت میں ہے جب کہ اس نے نہ تو مال لوٹا ہو اور نہ کسی کو قتل کیا ہو بلکہ راہگیروں کو ڈرایا دھمکایا ہو اور اس طرح اس نے راستے کے امن و عافیت کی طرف سے لوگوں کو خوف و تشویش میں مبتلا کیا ہو حدیث کا یہ جز جس میں قزاقوں اور راہزنوں کی مذکورہ بالا سزاؤں کا حکم ہے؟ دراصل قرآن کریم کی اس آیت سے مستنبط ہے کہ:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔ (المائدہ ۵: ۳۳)

"جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد یعنی بدامنی پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا سولی دیئے جائیں، یا ان میں سے ہر ایک کا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ دیا جائے یا زمین سے نکال کر جیل خانہ بھیج دیئے جائیں اس اعتبار سے بظاہر حدیث میں اَوْ يُنْفٰى فِي الْاَرْضِ سے پہلے یہ عبارت اَوْ يُقْطَعَ يَدُهٗ وَرِجْلُهٗ مِنْ خِلَافٍ بھی ہونی چاہئے تھی تاکہ یہ حدیث مذکورہ آیت کے پوری مطابق ہو جاتی لیکن یہ قوی احتمال ہے کہ اصل حدیث میں تو یہ عبارت رہی ہو البتہ یہاں حدیث کے

راوی کی بھول سے نقل ہونے سے رہ گئی ہو یا راوی نے اختصار کے پیش نظر اس کو قصداً حذف کر دیا ہے۔"

حرف اَوْ حدیث میں بھی قرآن کی آیت میں بھی اظہار تفصیل کے لئے ہے لیکن بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ تخییر کے لئے ہے یعنی یہ ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ امام وقت اور حاکم کو یہ اختیار ہے کہ وہ مذکورہ تفصیل کا لحاظ کئے بغیر ان سزاؤں میں سے جو سزا مناسب جانے قزاق کو دے۔

کسی مسلمان کو خوف و دہشت میں مبتلا کرنے کی ممانعت

⑫ وَعَنِ ابْنِ اَبِیْ لَیْلٰی قَالَ حَدَّثَنَا اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّھُمْ کَانُوْا یَسِیْرُوْنَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَنَامَ رَجُلٌ مِّنْھُمْ فَانْطَلَقَ بَعْضُھُمْ اِلٰی حَبْلٍ مَعَہٗ فَاَخَذَہٗ فَفَزِعَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یُّرَوِّعَ مُسْلِمًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن ابی لیلی (تابعی) کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کے صحابہؓ نے ہم سے یہ حدیث بیان کی کہ وہ کسی موقع پر رات میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھے ان میں سے ایک شخص جب کسی پڑاؤ پر سو گیا تو ان میں کا ایک دوسرا شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر چلا اور سونے والا اس سے ڈر گیا، آنحضرت ﷺ نے بھی اس کی یہ حرکت دیکھ لی یا آپ ﷺ نے اس کے بارہ میں سنا تو فرمایا کہ کسی مسلمان کے لئے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو ڈرائے۔" (ابوداؤد)

اسلام کی عزت کا کفر کی ذلت سے سودا نہ کرو

⑬ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَخَذَ اَرْضًا بِجِزْیَتِھَا فَقَدِ اسْتَقَالَ ھِجْرَتَہٗ وَمَنْ نَزَعَ صَغَارَ کَافِرٍ مِنْ عُنُقِہٖ فَجَعَلَہٗ فِیْ عُنُقِہٖ فَقَدْ وَلَّی الْاِسْلَامَ ظَھْرَہٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابودرداءؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی جزیہ والی زمین کو خریدا اس نے اپنی ہجرت کو توڑ دیا اور جس نے کافر کی ذلت کو اس کی گردن سے نکال کر اپنی گردن میں ڈال لیا اس نے اسلام کو پس پشت ڈال دیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کسی ذمی سے کوئی خراجی جزیہ والی زمین خریدی تو اس مسلمان پر اس زمین کا وہ جزیہ عائد ہوگا جو اس زمین کے پہلے مالک ذمی پر عائد تھا۔ اور طرح گویا وہ مسلمان دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے کی وجہ سے جن حقوق اور جس شرف وعزت کے دائرہ میں تھا اس سے نکل جائے گا اور ایک کافر کی ذلت یعنی جزیہ کی تختی کو اپنے ہاتھوں اپنے گلے میں ڈالنے والا ہوگا۔

اور جس نے کافر کی ذلت کو اس کی گردن سے نکال کر...الخ حدیث کا یہ جزء دراصل پہلے جزء کا بیان اور اس کی وضاحت ہے کہ جس مسلمان نے ایک کافر کے جزیہ کو اپنے ذمہ لے لیا اس نے گویا اسلام کی عطا کی ہوئی عزت دے کر کفر کی ذلت و رسوائی مول لے لی اور اس طرح اس نے کفر کو اسلام کا بدل قرار دیا۔

خطابیؒ کہتے ہیں کہ یہاں "جزیہ" سے مراد "خراج" ہے یعنی اگر کوئی مسلمان کسی کافر سے کوئی خراجی زمین خریدے گا تو اس زمین کا خراج ساقط نہیں ہوگا بلکہ اب وہ اس مسلمان پر عائد ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

مسلمان، کافروں میں مخلوط نہ رہیں

⑭ وَعَنْ جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَرِیَّۃً اِلٰی خَثْعَمَ فَاعْتَصَمَ نَاسٌ مِنْھُمْ بِالسُّجُوْدِ فَاَسْرَعَ فِیْھِمُ الْقَتْلُ فَبَلَغَ ذٰلِکَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَ لَھُمْ بِنِصْفِ الْعَقْلِ وَقَالَ اَنَا بَرِیْءٌ مِنْ کُلِّ مُسْلِمٍ مُقِیْمٍ بَیْنَ اَظْھُرِ الْمُشْرِکِیْنَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لِمَ؟ قَالَ لَا تَتَرَاءٰی نَارَاھُمَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جریر ابن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قبیلہ خثعم کے مقابلہ پر ایک لشکر بھیجا تو اس قبیلہ کے کچھ لوگ (جو اسلام قبول کر چکے تھے لیکن ان کا رہن سہن قبیلہ کے کافروں ہی کے ساتھ تھا نماز کی پناہ پکڑنے لگے) یعنی لشکر والوں کو علم ہو جائے کہ یہ مسلمان ہیں اور اس طرح وہ حملہ سے بچ جائیں لیکن ان کے قتل میں عجلت سے کام لیا گیا یعنی لشکر والوں نے ان کے سجدوں کا اعتبار نہ کیا اور یہ گمان کر کے کہ یہ بھی کافر ہیں اور محض قتل سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہے ہیں ان کو بھی قتل کر دیا جب اس واقعہ کی اطلاع رسول کریم ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے ان مسلمان مقتولین کے ورثاء کو آدھی دیت دیئے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میں اس مسلمان سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں جو مشرکوں کے درمیان اقامت اختیار کرے صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی بیزاری کا سبب کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا مسلمانوں کو کافروں سے اتنی دور رہنا چاہئے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکیں (لیکن اگر کوئی مسلمان کافروں میں مخلوط رہا تو گویا اس نے حکم کی پرواہ نہیں کی)۔" (ابوداؤد)

تشریح: رسول کریم ﷺ نے ان مقتولین کے مسلمان ہونے کا علم ہو جانے کے باوجود ان کے ورثاء کو پوری دیت کا حقدار قرار نہیں دیا بلکہ آدھی دیت دیئے جانے کا حکم فرمایا اس کا سبب یہ تھا کہ ان لوگوں نے مشرکین کے درمیان اقامت اختیار کر کے گویا خود اپنے قتل میں معاونت کی جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے اس کا اظہار بھی فرمایا کہ میں ہر اس مسلمان سے اپنی بیزاری اور برات کا اظہار کرتا ہوں جو مشرکین اور کفار کے درمیان اقامت پذیر ہو۔

"وہ آپس میں ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکیں۔" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اور کافر ایک دوسرے سے اتنی دور اقامت اختیار کریں کہ اگر دونوں طرف آگ جلائی جائے تو مسلمانوں کی آگ کافر نہ دیکھ سکیں اور کافروں کی آگ مسلمان نہ دیکھ سکیں۔ جیسا کہ ترجمہ میں وضاحت کی گئی ہے اس جملہ میں آنحضرت ﷺ کی اس بیزاری کی علت مذکور ہے جو آپ ﷺ نے کافروں کے درمیان رہنے والے مسلمانوں کے متعلق ظاہر فرمائی ہے۔

بلا تحقیق حال کسی کو قتل نہ کرو

⑮ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاِيْمَانُ قَيْدَ الْفَتْكِ لَا يَفْتِكُ مُؤْمِنٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ایمان اپنے حامل یعنی مؤمن کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ کسی کو ناگہاں قتل کر دے، لہٰذا کوئی مؤمن ناگہاں قتل نہ کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ کسی مسلمان کو یہ نہ چاہئے کہ وہ غفلت میں کسی کی جان لے لے اور کسی کو اس کے حال کی تحقیق کے بغیر کہ وہ مسلمان ہے یا کافر، قتل کر دے۔ چونکہ ذمی کافر، اسلامی حکومت کی طرف سے جان و مال کی حفاظت کے عہد و یقین دہانی کے زیر سایہ ہوتا ہے اس لئے اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کو بھی قتل نہ کیا جائے ہاں اگر کوئی مفسد و غدار ہو کہ وہ مسلمانوں کے درپے آزار ہو اور فتنہ و فساد اور بدامنی پھیلاتا ہو تو اس کی بات دوسری ہے، جیسا کہ کعب ابن اشرف یہودی یا ابورافع کو ناگہاں قتل کیا گیا، علاوہ ازیں ان دونوں کو آنحضرت ﷺ نے جو قتل کیا وہ خاص بحکم الٰہی تھا۔ نیز بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان دونوں کا قتل، اس ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہے۔

دار الحرب بھاگ جانے والے غلام کو قتل کر دینے والا مستوجب مواخذہ نہیں

⑯ وَعَنْ جَرِيْرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَبَقَ الْعَبْدُ اِلَى الشِّرْكِ فَقَدْ حَلَّ دَمُهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جریرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب کوئی غلام، شرک یعنی دار الحرب کی جانب بھاگ

جائے تو اس کا خون حلال ہوگا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "اس کا خون حلال ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایسے غلام کو کوئی قتل کردے تو قاتل سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا اور نہ اس پر کچھ واجب ہوگا بایں سبب کہ اس غلام نے مشرکوں کی محافظت اختیار کی اور دارالاسلام کو ترک کیا۔ اور اگر کوئی غلام نہ صرف یہ کہ دارالحرب بھاگ جائے بلکہ مرتد بھی ہوجائے تو اس کا خون بطریق اولی حلال ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والا ذمی مباح الدم ہے یا نہیں؟

⑰ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ يَهُوْدِيَّةً كَانَتْ تَشْتِمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَقَعُ فِيْهِ فَخَنَقَهَا رَجُلٌ حَتّٰى مَاتَتْ فَاَبْطَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَمَهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی عورت نبی کریم ﷺ کو برا بھلا کہا کرتی تھی اور آپ میں عیب نکال کر طعن کیا کرتی تھی، چنانچہ آپ ﷺ کی شان اقدس میں یہ گستاخی ایک شخص برداشت نہ کرسکا اور اس نے اس عورت کا گلا گھونٹ ڈالا جس سے وہ مرگئی، نبی کریم ﷺ نے اس کا خون معاف کردیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی ذمی کافر آنحضرت ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کرنے لگے تو وہ اس عہد وذمہ کو توڑ دیتا ہے جس کی وجہ سے اسلامی حکومت میں اس کو اپنی جان ومال کی حفاظت حاصل تھی، اور وہ مباح الدم حربی وہ کافر جس کا خون مباح ہو اس کی مانند ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک ہے، لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اس ذمی کا عہد وذمہ نہیں ٹوٹتا چنانچہ یہ مسلک فقہ کی کتابوں میں "کتاب الجزیہ" کے آخر میں مذکور ہے اور ہدایہ میں اس کے دلائل بھی لکھے ہوئے ہیں۔

ساحر کو قتل کردیا جائے

⑱ وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَةٌ بِالسَّيْفِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جادوگر کی حد (شرعی سزا) یہ ہے کہ اس کو تلوار سے قتل کردیا جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: علماء کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ جادو کرنا حرام ہے۔ ویسے جادو کے مسئلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، حضرت امام شافعیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ جادوگر کو قتل کردیا جائے بشرطیکہ اس کا جادو موجب کفر ہو اور وہ توبہ نہ کرے۔ حضرت امام مالکؒ اور بعض دوسرے علماء کا قول یہ ہے کہ ساحر کافر ہے، سحر کفر ہے، سحر سیکھنا سکھانا بھی کفر ہے ساحر کو قتل کردیا جائے اور اس سے توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے خواہ اس نے کسی مسلمان پر سحر کیا ہو یا کسی ذمی پر۔

اور حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ساحر کا یہ عقیدہ ہو کہ کارساز، شیطان کی ذات ہے کہ وہ میرے لئے جو چاہتا ہے کرتا ہے تو وہ کافر ہے اور اگر یہ عقیدہ ہو کہ سحر، مجرد خیال ہے تو وہ کافر نہیں ہے بلکہ فاسق ہے اور سحر کا سیکھنا حرام ہے۔

درمختار کے حاشیہ طحطاوی میں یہ لکھا ہے کہ سحر کی تین قسمیں ہیں ① فرض ② حرام ③ جائز اگر کوئی شخص اہل حرب کے ساحر کے توڑ کے لئے سحر سیکھے تو وہ فرض ہے، اگر کوئی شخص اس مقصد کے لئے سیکھے کہ اس کے ذریعہ میاں بیوی کے درمیان تفریق کرادے گا تو حرام ہے، اور اگر اس مقصد کے لئے سیکھے کہ اس کے ذریعہ میاں بیوی کے درمیان پیار و محبت پیدا کرے گا تو جائز ہے۔

سحر کے کفر ہونے میں اگرچہ حنبلی علماء کے اختلافی اقوال ہیں لیکن تنقیح میں ان کی کتابوں کے حوالہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ ساحر کی توبہ

کا اعتبار نہ کیا جائے، ساحر اپنے سحر کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان پر سحر کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔
سحر کی طرح کہانت، نجوم، رمل اور علم شعبدہ کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہے اور اس کے ذریعہ کمایا ہوا مال بھی حرام ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۹) عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ خَرَجَ يُفَرِّقُ بَيْنَ اُمَّتِىْ فَاضْرِبُوْا عُنُقَهٗ۔ (رواہ النسائی)

"حضرت اسامہؓ ابن شریک کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص امام وقت کے خلاف خروج کرے اور اس طرح وہ میری اُمت میں تفرقہ ڈالے تو اس کی گردن اڑا دو۔" (نسائیؒ)

تشریح: امام وقت، اُمت کے اتحاد و اجتماعیت کا بنیادی محور ہوتا ہے اس کی اطاعت و فرمانبرداری ہر مسلمان پر اسی لئے لازم ہے کہ اس کی وجہ سے نہ صرف اسلام کی تعلیم اجتماعیت کا تقاضہ پورا ہوتا ہے بلکہ مسلمان ایک جھنڈے کے نیچے متفق و متحدہ کر اسلام دشمن و مسلم مخالف طاقتوں کے مقابلہ پر ایک مضبوط چٹان بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ اسلام کی شان و شوکت کو باقی رکھنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس اجتماعی دائرہ سے نکلتا ہے تو وہ صرف ایک برائی کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ پوری اُمت کے اتفاق و اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی اعتراض ہو تو اس کے اس شک وشبہ اور اعتراض کو دور کیا جائے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی حرکت سے باز نہ آئے اور اصلاح کی کوئی کوشش اس کو سرکشی و بغاوت کی راہ سے واپس نہ لاسکے تو پھر اس کو مار ڈالا جائے جیسا کہ حضرت علیؓ نے خوارج کے ساتھ کیا۔

خوارج کے متعلق پیشین گوئی

(۲۰) وَعَنْ شَرِيْكِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ كُنْتُ اَتَمَنّٰى اَنْ اَلْقٰى رَجُلًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْاَلُهٗ عَنِ الْخَوَارِجِ فَلَقِيْتُ اَبَابَرْزَةَ فِىْ يَوْمِ عِيْدٍ فِىْ نَفَرٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ فَقُلْتُ لَهٗ هَلْ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ الْخَوَارِجَ قَالَ نَعَمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاُذُنَىَّ وَرَاَيْتُهٗ بِعَيْنَىَّ اُتِىَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَالٍ فَقَسَمَهٗ فَاَعْطٰى مَنْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَمَنْ عَنْ شِمَالِهٖ وَلَمْ يُعْطِ مَنْ وَرَاءَهٗ شَيْئًا فَقَامَ رَجُلٌ مِنْ وَرَائِهٖ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ مَا عَدَلْتَ فِى الْقِسْمَةِ رَجُلٌ اَسْوَدُ مَطْمُوْمُ الشَّعْرِ عَلَيْهِ ثَوْبَانِ اَبْيَضَانِ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَضَبًا شَدِيْدًا وَقَالَ وَاللّٰهِ لَا تَجِدُوْنَ بَعْدِىْ رَجُلًا هُوَ اَعْدَلُ مِنِّىْ ثُمَّ قَالَ يَخْرُجُ فِىْ اٰخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ كَاَنَّ هٰذَا مِنْهُمْ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الْاِسْلَامِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ سِيْمَاهُمُ التَّحْلِيْقُ لَا يَزَالُوْنَ يَخْرُجُوْنَ حَتّٰى يَخْرُجَ اٰخِرُهُمْ مَعَ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ فَاِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ هُمْ شَرُّ الْخَلْقِ وَالْخَلِيْقَةِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت شریکؒ ابن شہاب تابعی کہتے ہیں کہ میری ایک یہ بڑی آرزو تھی کہ میں نبی کریم ﷺ کے کسی صحابیؓ سے ملاقات کی سعادت حاصل کروں اور ان سے خوارج کے بارہ میں پوچھوں کہ آج کل جو خوارج پیدا ہو رہے ہیں کیا آنحضرت ﷺ نے ان کے متعلق کوئی پیشین گوئی کی تھی؟ چنانچہ میں ایک صحابی حضرت ابوبرزہؓ سے عید کے دن ان کے دوستوں کی موجودگی میں ملا اور ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول کریم ﷺ کو خوارج کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! میں نے اپنے کانوں سے رسول کریم ﷺ کو خوارج کا ذکر کرتے ہوئے بھی سنا ہے اور اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ بھی دیکھا ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں کچھ مال لایا گیا، آپ ﷺ نے اس مال کو حاضرین مجلس میں اس طرح تقسیم فرمایا کہ جو لوگ آپ کی داہنی جانب بیٹھے ہوئے تھے ان کو دیا اور جو لوگ

بائیں جانب بیٹھے تھے ان کو دیا لیکن جو لوگ آپ کے پیچھے تھے ان کو کچھ نہیں دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اے محمد (ﷺ) آپ (ﷺ) نے تقسیم میں انصاف نہیں کیا۔ وہ شخص کالے رنگ کا تھا، اس کے سر کے بال منڈے ہوئے تھے اور دو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ (اس کی بات سن کر) رسول کریم ﷺ سخت غضبناک ہوگئے اور فرمایا کہ "خدا کی قسم" !تم میرے بعد کسی شخص کو مجھ سے زیادہ انصاف کرنے والا نہیں پاؤ گے اور پھر فرمایا کہ آخر زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہوگا اور یہ شخص گویا اسی گروہ کا ایک فرد ہے اس گروہ کے لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن ان کا پڑھنا ان کے حلق سے آگے نہیں جائے گا اور وہ لوگ امام وقت کے خلاف خروج و سرکشی کے ذریعہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کے درمیان سے نکل جاتا ہے ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ ان کے سر منڈے ہوئے ہوں گے اس گروہ کے لوگ ہر زمانہ میں پائے جائیں گے اور ہمیشہ خروج کرتے رہیں گے یہاں تک کہ ان کا آخری شخص مسیح دجال یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف خروج کرے گا جب کہ وہ قیامت کے قریب دنیا میں نازل ہوں گے، لہٰذا جب بھی تمہارا ان سے سامنا ہو جائے ان کو قتل کر ڈالو، وہ لوگ آدمیوں اور جانوروں میں بدترین مخلوق ہیں۔" (نسائی)

قیامت کے دن اہل حق کے چہرے منور اور اہل باطل کے چہرے سیاہ ہوں گے

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ غَالِبٍ رَأَی اَبُوْاُمَامَةَ رُءُوْسًا مَنْصُوْبَةً عَلٰی دَرَجِ دِمَشْقَ فَقَالَ اَبُوْاُمَامَةَ كِلَابُ النَّارِ شَرُّ قَتْلٰی تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ خَيْرُ قَتْلٰی مَنْ قَتَلُوْهُ ثُمَّ قَرَأَ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ الْاٰيَةَ قِيْلَ لِاَبِیْ اُمَامَةَ اَنْتَ سَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْلَمْ اَسْمَعْهُ اِلَّا مَرَّةً اَوْمَرَّتَيْنِ اَوْثَلَاثًا حَتّٰی عَدَّ سَبْعًا مَا حَدَّثْتُكُمُوْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت ابوغالبؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت ابوامامہؓ (صحابی) نے (ایک دن) دمشق کی شاہراہ پر (خوارج کے) سر پڑے ہوئے دیکھے یا وہ سولی پر لٹکے ہوئے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ دوزخ کے کتے ہیں اور آسمان کے نیچے بدترین مقتول ہیں اور بہترین مقتول وہ ہے جس کو انہوں نے قتل کیا ہو۔ اور پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی۔ اس قیامت کے دن کہ بہت سے منہ سفید منور ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ ہوں گے ابوغالبؒ نے حضرت ابوامامہؓ سے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ بات رسول کریم ﷺ سے سنی ہے؟ ابوامامہؓ نے فرمایا اگر میں نے یہ بات ایک بار دو بار تین بار یہاں تک کہ انہوں نے سات بار گنا نہ سنی ہوتی تو تمہارے سامنے بیان نہ کرتا یعنی اگر میں اس بات کو آنحضرت ﷺ سے اتنی کثرت سے بار بار نہ سنتا تو میں تمہارے سامنے بیان نہ کرتا۔ ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔"

تشریح: حضرت ابوامامہؓ نے جو آیت پڑھی وہ پوری یوں ہے:

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۔ (آل عمران ۳:۱۰۶)

"اس دن کو بہت سے منہ سفید (منور) ہوں گے اور بہت سے منہ کالے ہوں گے پس جن کے منہ کالے ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ تم ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہوگئے تھے؟ تو تم نے جو کچھ کفر کیا ہے اس کے بدلے میں عذاب چکھو۔"

حدیث میں جن لوگوں کے سروں کا ذکر ہے ان کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ وہ مرتد تھے، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بدعتی تھے۔ جب کہ حضرت ابوامامہؓ سے منقول ہے کہ وہ خوارج تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الحدود

حدود کا بیان

حد کے معنی: حدود حد کی جمع ہے اور حد کے اصل معنی ہیں ممنوع نیز اس چیز کو بھی حد کہا جاتا ہے جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو اصطلاح شریعت میں "حدود" ان سزاؤں کو کہتے ہیں جو کتاب اللہ اور سُنت رسول اللہ سے ثابت ہیں اور ساتھ ہی متعین ہیں جیسے چوری، زنا، شراب نوشی کی سزائیں۔ لفظ حد کے اصل معنی ممنوع یا حائل اگر پیش نظر ہوں تو واضح ہو گا کہ شرعی سزاؤں کو "حدود" اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ سزائیں بندوں کو گناہوں میں مبتلا ہونے سے روکتی ہیں اور ان کا خوف انسان اور جرم کے درمیان حائل رہتا ہے۔

"حدود اللہ" محارم کے معنی میں بھی منقول ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا اسی طرح مقادیر شرعی یعنی تین طلاقوں کا مقرر ہونا وغیرہ کے معنی میں بھی منقول ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا لیکن واضح رہے کہ ان دونوں میں بھی "حدود" کا اطلاق اصل معنی "ممنوع" ہی کے اعتبار سے ہے کہ محارم کی قربت (یعنی ان سے نکاح وخلوت) بھی ممنوع ہے اور مقادیر شرعی سے تجاوز کرنا بھی ممنوع ہے۔

سزا کی تفصیل: شرعی قانون نے "جرم و سزاء" کا جو ضابطہ مقرر کیا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں سزائیں تین طرح کی ہیں۔

① وہ سزائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے متعین کر دیا ہے مگر ان کے اجراء کو خود بندوں پر چھوڑ دیا ہے ان میں کسی خارجی طاقت جیسے حاکم یا حکومت کو دخل انداز ہونے کا حکم نہیں ہے، شریعت نے اس طرح کی سزا کا نام کفارہ رکھا ہے جیسے قسم کی خلاف ورزی یا رمضان میں بلا عذر شرعی روزہ توڑ دینے کا کفارہ! ② وہ سزائیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ثابت ہیں اور ساتھ ہی متعین ہیں، ان سزاؤں کو جاری کرنے کا اختیار تو حاکم یا حکومت کو ہے مگر ان میں قانون سازی کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے، اس طرح کی سزا کو شریعت میں حد کہتے ہیں جیسے چوری، زنا، اور شراب نوشی کی سزائیں۔ ③ وہ سزائیں جنہیں کتاب وسُنت نے متعین تو نہیں کیا ہے مگر جن برے کاموں کی یہ سزائیں ہیں ان کو جرائم کی فہرست میں داخل کیا ہے اور سزا کے تعین کا مسئلہ حاکم یا حکومت کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ موقع ومحل اور ضرورت کے مطابق سزا خود متعین کریں گویا اس قسم کی سزاؤں میں حکومت کو قانون سازی کا حق بھی حاصل ہے مگر اس دائرہ کے اندر رہ کر جو شریعت نے متعین کر رکھا ہے اس طرح کی سزا شریعت میں "تعزیر" کہلاتی ہے۔

حد اور تعزیر میں فرق: حد اور تعزیر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حد تو شریعت میں "عقوبت" ہے جو اللہ کا حق قرار دی گئی ہے اسی لئے اس کو حق اللہ کہا جاتا ہے بایں وجہ کہ اس میں کوئی بندہ تصرف نہیں کر سکتا، اور تعزیر کو حق اللہ کہا جاتا ہے بایں وجہ کہ بندہ اس میں تصرف

کر سکتا ہے یعنی اگر وہ کوئی مصلحت دیکھے تو قابل تعزیر مجرم کو معاف بھی کر سکتا ہے اور موقع و محل اور جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزا میں کمی زیادتی اور تغیرو تبدل بھی کر سکتا ہے، حاصل یہ کہ حد تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعیّن ہے جس میں کوئی تصرف ممکن نہیں اور تعزیر قاضی یا حکومت کے سپرد ہے اسی عدم تقدیر و تحقیق کی بنا پر تعزیر کو حد نہیں کہا جاتا۔

چونکہ "قصاص" بھی بندہ کا حق ہے کہ وہ اپنے اختیار سے مجرم کو معاف کر سکتا ہے اس لئے اس کو بھی "حد" نہیں کہا جاتا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بارگاہ نبوت سے زنا کے ایک مقدمہ کا فیصلہ

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَزَیْدِ بْنِ خَالِدٍ اَنَّ رَجُلَیْنِ اِخْتَصَمَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَحَدُهُمَا اقْضِ بَیْنَنَا بِکِتَابِ اللّٰهِ وَقَالَ الْاٰخَرُ اَجَلْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاقْضِ بَیْنَنَا بِکِتَابِ اللّٰهِ وَائْذَنْ لِیْ اَنْ اَتَکَلَّمَ قَالَ تَکَلَّمْ قَالَ اِنَّ ابْنِیْ کَانَ عَسِیْفًا عَلٰی هٰذَا فَزَنٰی بِامْرَاَتِهٖ فَاَخْبَرُوْنِیْ اَنَّ عَلَی ابْنِی الرَّجْمَ فَافْتَدَیْتُ مِنْهُ بِمِائَةِ شَاةٍ وَبِجَارِیَةٍ لِّیْ ثُمَّ اِنِّیْ سَاَلْتُ اَهْلَ الْعِلْمِ فَاَخْبَرُوْنِیْ اَنَّ عَلَی ابْنِیْ جَلْدَ مِائَةٍ وَتَغْرِیْبَ عَامٍ وَاِنَّمَا الرَّجْمُ عَلَی امْرَاَتِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَاَقْضِیَنَّ بَیْنَکُمَا بِکِتَابِ اللّٰهِ اَمَّا غَنَمُكَ وَجَارِیَتُكَ فَرَدٌّ عَلَیْكَ وَاَمَّا ابْنُكَ فَعَلَیْهِ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِیْبُ عَامٍ وَاَمَّا اَنْتَ یَا اُنَیْسُ فَاغْدُ عَلَی امْرَاَةِ هٰذَا فَاِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا فَاعْتَرَفَتْ فَرَجَمَهَا۔

(متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت زید ابن خالدؓ کہتے ہیں ایک دن رسول کریم ﷺ کی خدمت میں دو آدمی اپنا قضیہ لے کر آئے، ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے موافق حکم کیجئے دوسرے نے بھی عرض کیا کہ ہاں، یارسول اللہ (ﷺ) ہمارے درمیان کتاب اللہ کے موافق حکم کیجئے اور مجھے اجازت دیجئے کہ میں بیان کروں کہ قضیہ کی صورت کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا بیان کرو اس شخص نے بیان کیا کہ میرا بیٹا اس شخص کے ہاں مزدور تھا اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا، لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے بیٹے کی سزا سنگساری ہے لیکن میں نے اس کو سنگسار کرنے کے بدلے میں سو بکریاں اور ایک لونڈی دیدی، پھر جب میں نے اس بارہ میں علماء سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہارا بیٹا چونکہ محصن یعنی شادی شدہ نہیں ہے اس لئے اس کی سزا سو کوڑے ہیں اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور اس شخص کی عورت کی سزا سنگساری ہے کیونکہ وہ شادی شدہ ہے رسول کریم ﷺ نے یہ قصہ سن کر فرمایا کہ آگاہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ یعنی قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں تمہارے درمیان کتاب اللہ ہی کے موافق فیصلہ کرونگا تو سنو کہ تمہاری بکریاں اور تمہاری لونڈی تمہیں واپس مل جائے گی اور اگر خود ملزم کے اقرار یا چار گواہوں کی شہادت سے زنا کا جرم ثابت ہے تو تمہارے بیٹے کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی اور ایک سال کے لئے جلاوطن کر دیا جائے گا پھر آپ ﷺ نے حضرت انیسؓ کو فرمایا کہ انیس تم اس شخص کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ زنا کا اقرار کرلے تو اس کو سنگسار کر دو چنانچہ اس عورت نے زنا کا اقرار کر لیا اور حضرت انیس نے اس کو سنگسار کر دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کتاب اللہ" سے مراد قرآن کریم نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم مراد ہے کیونکہ قرآن کریم میں رجم و سنگساری کا حکم مذکور نہیں ہے، لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ کتاب اللہ سے قرآن کریم ہی مراد ہو اس صورت میں کہا جائے گا کہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ آیت رجم کے الفاظ قرآن کریم سے منسوخ التلاوت نہیں ہوئے تھے۔

ایک سال کے لئے جلاوطن کر دیا جائے گا کے بارہ میں حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ایک سال کی جلاوطنی بھی حد میں داخل ہے یعنی ان کے نزدیک غیر شادی شدہ زنا کار کی حد شرعی سزا یہ ہے کہ اس کو سو کوڑے بھی مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلاوطن

بھی کر دیا جائے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ ایک سال کی جلاوطنی کے حکم کو مصلحت پر محمول فرماتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ایک سال کی جلاوطنی حد کے طور پر نہیں ہے بلکہ بطور مصلحت ہے کہ اگر امام وقت اور حکومت کسی سیاسی اور حکومتی مصلحت کے پیش نظر ضروری سمجھے تو ایک سال کے لئے جلاوطن بھی کیا جاسکتا ہے، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں یہی حکم نافذ جاری تھا مگر جب یہ آیت کریمہ الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ (یعنی زانی اور زانیہ کو کوڑے مارے جائیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارے جائیں) نازل ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

فاعترفت فرجمھا چنانچہ اس عورت نے اقرار کیا اور حضرت انیسؓ نے اس کو سنگسار کر دیا اس سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حد زنا کے جاری ہونے کے لئے ایک مرتبہ اقرار کرنا کافی ہے جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے، لیکن حضرت امام حنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ چار مجلسوں میں چار بار اقرار کرنا ضروری ہے، یہاں حدیث میں جس "اقرار" کا ذکر کیا گیا ہے اس سے امام اعظمؒ وہی اقرار یعنی چار مرتبہ مراد لیتے ہیں جو اس سلسلہ میں معتبر و مقرر ہے چنانچہ دوسری احادیث سے یہ صراحۃ ثابت ہے کہ چار مرتبہ اقرار کرنا ضروری ہے۔

غیر محصن زانی کی سزا

(۲) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُ فِيْمَنْ زَنٰى وَلَمْ يُحْصِنْ جَلْدَ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبَ عَامٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت زید ابن خالدؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو غیر محصن زانی کے بارہ میں یہ حکم دیتے سنا ہے کہ اس کو سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلاوطن کیا جائے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "محصن" اس عاقل بالغ مسلمان کو کہتے ہیں جس کی شادی ہو چکی ہو اور اپنی بیوی سے ہمبستری کر چکا ہو۔ غیر محصن اگر زنا کا مرتکب ہو تو اس کی سزا اس حدیث کے مطابق سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے، جلاوطنی کے بارہ میں جو تفصیل ہے وہ پہلے بیان ہو چکی۔ کوڑے مارنے کے سلسلہ میں یہ حکم ہے کہ سر، منہ اور ستر پر کوڑے نہ مارے جائیں۔

محصن زانی کی سزا

(۳) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) بِالْحَقِّ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى اٰيَةُ الرَّجْمِ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهٗ وَالرَّجْمُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلٰى مَنْ زَنٰى اِذَا اَحْصَنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ اِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ اَوْ كَانَ الْحَبَلُ اَوِ الْاِعْتِرَافُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور ان پر اپنی کتاب نازل کی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں جو کچھ نازل کیا ہے اس میں آیت رجم بھی ہے۔ اور کتاب اللہ میں اس شخص کو رجم کرنے کا حکم ثابت ہے جو محصن ہونے کے باوجود زنا کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو اور یہ رجم کی سزا اس وقت دی جائے گی، جب کہ زنا کا جرم گواہوں کے ذریعہ یا حمل کے ذریعہ اور یا اعتراف و اقرار کے ذریعہ ثابت ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اوپر کی حدیث میں اس زانی کی سزا بیان کی گئی تھی جو غیر محصن ہو۔ اس حدیث میں اس زانی کی سزا بیان کی گئی ہے جو محصن ہو۔ محصن کی وضاحت اوپر کی حدیث کے ضمن میں کی جاچکی ہے چنانچہ جو شخص محصن ہونے کے باوجود زنا کا مرتکب ہو اور اس کا جرم ثابت ہو جائے اس کی سزا رجم یعنی سنگساری ہے کہ اس شخص کو پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔

جس آیت سے رجم کا حکم ثابت ہے وہ پہلے قرآن کریم میں موجود تھی لیکن بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی یعنی اس کے الفاظ قرآن

میں باقی نہیں رکھے گئے لیکن اس کا حکم بحالہ باقی رہا، وہ آیت یہ ہے:

اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالاً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔

حدیث کے آخر میں زنا کے ثبوت جرم کے لئے تین چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو ضروری قرار دیا گیا ہے یعنی (۱) گواہ (۲) حمل (۳) اقرار، ان تینوں میں سے حمل کا تعلق اس عورت سے ہے جو بغیر خاوند والی ہو لیکن اس کا حکم بھی منسوخ ہو گیا ہے، گواہوں اور اقرار کا حکم جوں کا توں ہے کہ محصن زانی کو اسی وقت رجم (سنگسار) کیا جائے گا جب کہ اس کا جرم یا تو گواہوں کے ذریعہ ثابت ہو یا وہ خود اپنے جرم کا اعتراف و اقرار کرے۔

شادی شدہ زانی اور زانیہ کو سنگسار کیا جائے

(۴) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خُذُوْا عَنِّىْ خُذُوْا عَنِّىْ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلاً اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَامٍ وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبادہؓ ابن صامت راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا زانیہ کے بارہ میں مجھ سے یہ حکم حاصل کرو، مجھ سے یہ حکم حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے راہ مقرر کر دی ہے، جو غیر محصن مرد کسی غیر محصنہ عورت سے زنا کرے تو سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلاوطن کر دیا جائے۔ اور جو محصن مرد کسی محصنہ عورت سے زنا کرے تو سو کوڑے مارے جائیں اور سنگسار کیا جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے راہ مقرر کر دی ہے" یہ دراصل اس آیت کریمہ تا اَوْيَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلاً ۝ کی وضاحت ہے۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب زانی اور زانیہ کے لئے "حد" مشروع ہوئی تھی چنانچہ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں "راہ سے مراد حد ہے جو اس سے پہلے تک مشروع نہیں تھی بلکہ اس بارہ میں وہ حکم مشروع تھا جو اس آیت کریمہ میں مذکور ہے"۔

وَالّٰتِىْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِى الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْيَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلاً ۝۔ (النساء ۴:۱۵)

"تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کو گواہ کر لو، سو اگر وہ گواہی دے دیں تو تم ان کو گھروں کے اندر مقید رکھو۔ یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر دے، یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی راہ مقرر کر دے۔"

حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ فرمایا تھا کہ اگر عورتیں زنا کی مرتکب ہوں اور گواہوں کے ذریعہ ان کا یہ جرم ثابت ہو جائے تو ان کو گھر میں قید کر دیا جائے یا آنکہ اسی قید کی حالت میں وہ مر جائیں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے کوئی راہ یعنی حد مقرر کی جائے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے "حد" کا حکم نازل فرمایا تو آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے یہ راہ یعنی حد مقرر فرما دی ہے اور پھر اس کے بعد آپ نے "حد" کی وضاحت فرمائی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی محصن (شادی شدہ) زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو سو کوڑے بھی مارے جائیں اور سنگسار بھی کیا جائے، چنانچہ علماء ظواہر نے اور صحابہ و تابعین میں سے بعض نے اس پر عمل کیا ہے جب کہ جمہور علماء کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ جو زانی سنگساری کا مستوجب قرار پا چکا ہو اس کے حق میں سو کوڑے مارے جانے کی سزا کالعدم ہو گی یعنی اس کو صرف سنگسار کیا جائے گا۔ سو

کوڑے نہیں مارے جائیں گے کیونکہ یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص ماعز کو جو شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کے مرتکب قرار دیئے گئے تھے صرف سنگسار کیا تھا ان کو سو کوڑے مارنے کا حکم نہیں تھا، اسی طرح آگے آنے والی ایک حدیث میں ایک غامدیہ عورت کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے یا حضرت انیسؓ کی جو حدیث پیچھے گذری ہے ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

⑤ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ الْيَهُوْدَ جَاءُوْا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرُوْا لَهُ اَنَّ رَجُلاً مِنْهُمْ وَامْرَأَةً زَنَيَا فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاتَجِدُوْنَ فِي التَّوْرَاةِ فِيْ شَأْنِ الرَّجْمِ قَالُوْا نَفْضَحُهُمْ وَيُجْلَدُوْنَ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ كَذَبْتُمْ اِنَّ فِيْهَا الرَّجْمَ فَاَتَوْا بِالتَّوْرٰةِ فَنَشَرُوْهَا فَوَضَعَ اَحَدُهُمْ يَدَهُ عَلٰى اٰيَةِ الرَّجْمِ فَقَرَأَ مَا قَبْلَهَا وَمَا بَعْدَهَا فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ اِرْفَعْ يَدَكَ فَرَفَعَ فَاِذَا فِيْهَا اٰيَةُ الرَّجْمِ فَقَالُوْا صَدَقَ يَا مُحَمَّدُ فِيْهَا اٰيَةُ الرَّجْمِ فَاَمَرَ بِهِمَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرُجِمَا وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ ارْفَعْ يَدَكَ فَرَفَعَ فَاِذَا اٰيَةُ الرَّجْمِ تَلُوْحُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ فِيْهَا اٰيَةَ الرَّجْمِ وَلٰكِنَّا نَتَكَاتَمُهُ بَيْنَنَا فَاَمَرَ بِهِمَا فَرُجِمَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن یہودیوں کی ایک جماعت رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور انہوں نے آپ کے سامنے یہ بیان کیا کہ ان کی قوم میں سے یک عورت اور ایک مرد نے جو دونوں محصن یعنی شادی شدہ تھے نے زنا کیا؟ آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے تورات میں رجم کے بارہ میں کیا پڑھا ہے؟ یہودیوں نے کہا کہ ہم زنا کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں اور ان کو کوڑے مارے جاتے ہیں ان کی یہ بات سن کر حضرت عبداللہ ابن سلام نے کہا کہ تم لوگ جھوٹ بولتے ہو، تورات میں بھی رجم کا حکم مذکور ہے تورات لاؤ میں تمہیں رجم کا حکم دکھاتا ہوں چنانچہ جب تورات لائی گئی اور اس کو کھولا گیا تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے جھٹ سے اس جگہ اپنا ہاتھ رکھ دیا جہاں رجم کے بارہ میں آیت تھی یعنی اس نے اپنے ہاتھوں سے رجم کی آیت کو چھپانے کی کوشش کی اور اس کے آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنے لگا یہ دیکھ کر حضرت عبداللہ ابن سلام نے اس سے کہا کہ اپنا ہاتھ ہٹاؤ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو دیکھا گیا کہ وہاں رجم کی آیت موجود تھی، اس آیت کو چھپانے والے نے کہا کہ اے محمد! تورات میں رجم کی آیت موجود ہے مگر ہم آپس میں اس کو ظاہر نہیں کرتے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان دونوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور وہ دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔

ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے اس شخص سے (کہ جس نے رجم کی آیت کو اپنے ہاتھ کے نیچے چھپانے کی کوشش کی تھی) کہا کہ اپنا ہاتھ ہٹاؤ، اور پھر جب اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو دیکھا گیا کہ وہاں رجم کی آیت موجود تھی، اس آیت کو چھپانے والے نے کہا کہ "اے محمد! تورات میں رجم کی آیت موجود ہے مگر ہم آپس میں اس کو ظاہر نہیں کرتے۔" اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان دونوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کر دیئے گئے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حضرت عبداللہ ابن سلام پہلے یہودی تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو راہ ہدایت پر گامزن کیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ ان کا شمار بڑے اونچے درجہ کے علماء یہود میں ہوتا تھا تورات پر عبور رکھتے تھے، چنانچہ مجلس نبوی میں جب یہودیوں نے اپنی روایتی تلبیس و تحریف سے کام لیا اور آنحضرت ﷺ سے یہ کہا کہ تورات میں زنا کے مرتکب کو سنگسار کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ ہم نے تورات میں یہ پڑھا ہے کہ جو شخص زنا کا ارتکاب کرے اس کو تعزیر کے ذریعہ ذلیل و رسوا کیا جائے اور کوڑے مارے جائیں تو حضرت عبداللہ ابن اسلام نے اس کی تکذیب کی اور یہ بتایا کہ تم جو بات کہہ رہے ہو وہ سراسر تحریف ہے تورات میں رجم کا حکم موجود ہے اور پھر جب انہوں نے تورات منگائی اس میں مذکور رجم کی آیت دکھانی چاہی تو اس موقع پر بھی یہودیوں نے اپنی عیاری و مکاری دکھانی چاہی اور ان میں سے ایک شخص نے ایک روایت کے مطابق جس کا نام عبداللہ ابن صوریا تھا، اس جگہ اپنا ہاتھ رکھ دیا جہاں رجم کی آیت مذکور تھی۔ اور اس کے آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنے لگا مگر عبداللہ ابن سلام نے ان کی اس عیاری کا راز بھی طشت ازبام کر دیا۔

اگر یہاں یہ اشکال پیدا ہو کہ رجم (سنگساری) کا سزاوار ہونے کے لئے محصن شادی شدہ ہونا شرط ہے اور محصن ہونے کے لئے مسلمان

ہونا شرط ہے یعنی سنگساری کی سزا اسی زانی کو دی جاسکتی ہے جو محصن ہو اور محصن کا اطلاق اسی شخص پر ہو سکتا ہے جو مسلمان ہو تو آنحضرت ﷺ نے ان یہودیوں کو جو مسلمان نہیں تھے رجم کا حکم کیوں دیا؟

اس کا جواب ہے یہ کہ آنحضرت ﷺ نے ان یہود کو رجم کا جو حکم دیا وہ تورات کے حکم کے تحت تھا اور یہودیوں کے مذہب میں رجم کے سزاوار کے لئے محصن ہونا شرط نہیں تھا، پھر یہ کہ آنحضرت ﷺ اس بارہ میں پہلے تورات کے حکم پر عمل کرتے تھے مگر جب قرآن میں اس کا حکم نازل ہو گیا تو تورات کا حکم منسوخ ہو گیا۔

اس موقع پر یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک محصن ہونے کے لئے مسلمان ہونا شرط نہیں ہے یعنی ان کے مسلک کے مطابق "محصن" کا اطلاق اس شادی شدہ آدمی پر بھی ہو سکتا ہو جو مسلمان نہ ہو، نیز حنفیہ میں سے حضرت امام ابو یوسفؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

ایک اشکال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے محض یہودیوں کے کہنے پر ان دونوں کو کیسے سنگسار کرا دیا کیونکہ یہودیوں کی گواہی سرے سے معتبر ہی نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صرف ان یہودیوں کے کہنے پر ہی حکم نافذ کیا ہو، بلکہ بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ یا تو خود ان دونوں نے زنا کا اقرار کیا ہو گا یا ان کے زنا کی چار مسلمانوں نے گواہی دی ہو گی اور اسی پر آنحضرت ﷺ نے ان دونوں کو سنگسار کرایا ہو گا۔

اس موقع پر ملا علی قاری نے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے یہاں اس کا خلاصہ نقل کیا گیا ہے اہل علم ان کی کتاب "مرقات" سے مراجعت کر سکتے ہیں۔

زنا کے اقراری مجرم کے بارہ میں آنحضرت ﷺ کا فیصلہ رجم

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ وَهُوَ فِی الْمَسْجِدِ فَنَادَاهُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ زَنَیْتُ فَاَعْرَضَ عَنْهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَتَنَحّٰی لِشِقِّ وَجْهِهِ الَّذِیْ اَعْرَضَ قِبَلَهٗ فَقَالَ اِنِّیْ زَنَیْتُ فَاَعْرَضَ عَنْهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا شَهِدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ دَعَاهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَبِكَ جُنُوْنٌ قَالَ لَا فَقَالَ اَحْصَنْتَ؟ قَالَ نَعَمْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اذْهَبُوْا بِهٖ فَارْجُمُوْهُ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَاَخْبَرَنِیْ مَنْ سَمِعَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ یَقُوْلُ فَرَجَمْنَاهُ بِالْمَدِیْنَةِ فَلَمَّا اَذْلَقَتْهُ الْحِجَارَةُ هَرَبَ حَتّٰی اَدْرَكْنَاهُ بِالْحَرَّةِ فَرَجَمْنَاهُ حَتّٰی مَاتَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِلْبُخَارِیِّ عَنْ جَابِرٍ بَعْدَ قَوْلِهٖ قَالَ نَعَمْ فَاَمَرَ بِهٖ فَرُجِمَ بِالْمُصَلّٰی فَلَمَّا اَذْلَقَتْهُ الْحِجَارَةُ فَرَّ فَاُدْرِكَ فَرُجِمَ حَتّٰی مَاتَ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْرًا وَصَلّٰی عَلَیْهِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا جب کہ آپ ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، اس شخص نے آواز دی "یارسول اللہ! مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے" آپ ﷺ نے یہ سن کر اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیا وہ شخص پھر اس سمت آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا جدھر آپ ﷺ نے اپنا منہ پھیرا تھا اور کہا کہ مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے آپ ﷺ نے پھر اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیا، یہاں تک کہ جب اس نے اس طرح چار مرتبہ اپنے جرم کا اقرار کیا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ کیا تو دیوانہ ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں! پھر آپ ﷺ نے پوچھا کیا تو محصن ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں یارسول اللہ اس کے بعد آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اس شخص کو لے جاؤ اور اس کو سنگسار کر دو۔ اس حدیث کے ایک راوی ابن شہاب کا بیان ہے کہ جس شخص نے اس حدیث کو حضرت جابرؓ ابن عبداللہ سے سنا تھا، اس نے مجھے بتایا کہ حضرت جابرؓ نے کہا کہ ہم نے آنحضرت ﷺ کے اس حکم کے بعد اس شخص کو مدینہ میں سنگسار کیا چنانچہ جب ہم نے اس کو پتھر مارنے شروع کئے اور

اس کو پتھر لگنے لگے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا یہاں تک کہ ہم نے اس کو "حرہ" میں جا کر پکڑا مدینہ کا وہ مضافاتی علاقہ جو کالے پتھروں والا تھا حرہ کہلاتا تھا اور پھر اس کو سنگسار کیا تا آنکہ وہ مرگیا۔" (بخاری ومسلم)

اور امام بخاری کی ایک اور روایت میں جو حضرت جابرؓ سے منقول ہے آنحضرت ﷺ کے پوچھنے پر کہ کیا تو محصن ہے؟ اس شخص کے جواب "ہاں" کے بعد یہ الفاظ ہیں کہ اس کے بعد آپ نے اس شخص کو سنگسار کئے جانے کا حکم دیا چنانچہ اس کو عید گاہ میں سنگسار کیا گیا، جب اس کو پتھر لگنے لگے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا مگر پھر پکڑ لیا گیا اور سنگسار کیا گیا یہاں تک کہ مرگیا، اس کے مرنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے بھلائی بیان کی یعنی اس کی تعریف و توصیف کی اور اس کی نماز جنازہ پڑھی یا و صلی علیہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے دعا کی)۔

تشریح: اور اس نے چار مرتبہ اقرار کیا یعنی اس شخص نے چاروں طرف سے آپ ﷺ کے سامنے آکر اپنے جرم کا اقرار کر کے اور گویا ہر دفعہ میں تبدیل مجلس کر کے اس طرح چار مجلسوں میں چار مرتبہ اپنے جرم کا اقرار کیا۔ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس کے آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک کے سامنے چاروں طرف سے آکر اقرار کرنے سے یہ استدلال کیا ہے کہ زنا کے ثبوت جرم کے لئے ملزم کا چار مجلسوں میں چار بار اقرار کرنا شرط ہے۔

"کیا تو دیوانہ ہے؟" یعنی کیا تم پر دیوانگی طاری ہے کہ تم اپنے گناہ کا خود افشاء کر رہے ہو اور سنگساری کے ذریعہ خود اپنی ہلاکت کا باعث بن رہے ہو حالانکہ چاہئے تو یہ کہ تم خدا سے توبہ استغفار کرو اور آئندہ کے لئے ہر برائی سے بچنے کا پختہ عہد و عزم کرو۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس ارشاد کا مقصد اس شخص کے حال کی تحقیق تھا کیونکہ عام طور پر کوئی بھی انسان اپنے کسی بھی ایسے جرم و گناہ کے اقرار پر مصر نہیں ہوتا جس کی سزا میں اس کو موت کا منہ دیکھنا پڑے بلکہ وہ اسی میں اپنی راہ نجات دیکھتا ہے کہ اپنے جرم و گناہ پر شرمسار و نادم ہو کر خدا سے توبہ و استغفار کرے اور اس کے ذریعہ اپنے گناہ کو ختم کرائے۔

حاصل یہ کہ یہ ارشاد جہاں اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ایسے معاملات میں مسلمان کی حالت کی تحقیق و تفتیش میں پوری پوری سعی کرنی چاہئے تاکہ فیصلہ میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ نہ رہے وہیں اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی جرم کی سزا میں ایک مسلمان کی جان بچانے کے لئے اس کو جو بھی قانونی فائدہ پہنچایا جا سکتا ہو اس سے صرف نظر نہ کیا جائے، نیز یہ جملہ اس طرف بھی ارشارہ کرتا ہے کہ اگر کوئی دیوانہ یہ کہے کہ میں نے زنا کیا ہے تو اس کے اقرار کا اعتبار نہیں ہوگا اور نہ اس پر حد جاری کی جائے گی۔

"کیا تو محصن ہے؟" امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ امام وقت و حاکم یا قاضی پر لازم ہے کہ وہ ان چیزوں کے بارہ میں تحقیق کرلے جو سزا رجم (سنگساری) کے نفاذ کے لئے شرط ہیں جیسے محصن ہونا وغیرہ، خواہ زنا کا جرم خود اس کے اقرار سے ثابت ہو چکا ہو یا گواہوں کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہو۔ نیز اس ارشاد سے کنایۃً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایسا شخص اپنے اقرار سے رجوع کرلے تو اس کو معافی دے کر زنا کی حد ساقط کر دی جائے۔

"وہ بھاگ کھڑا ہوا۔" ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مرد کو کسی بھی حد یا تعزیر میں مارا جائے تو کھڑا کر کے مارا جائے لٹکا کر نہ مارا جائے اور عورت کو بٹھا کر مارا جائے بلکہ اگر کسی عورت کو رجم کی سزا دی جا رہی ہو تو بہتر یہ ہے کہ ایک گڑھا کھود کر اس میں اس کو (سینہ تک) گاڑ کر سنگسار کیا جائے کیونکہ اس میں اس کے ستر (پردہ پوشی) کی زیادہ رعایت ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے غامدیہ کے لئے گڑھا کھدوایا تھا۔

"یہاں تک کہ ہم نے اس کو حرہ میں جا کر پکڑا" اس بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر سنگسار کیا جانے والا سنگساری کے دوران بھاگ کھڑا ہو تو اس کا پیچھا نہ کیا جائے بشرطیکہ اس کے جرم زنا خود اس کے اقرار سے ثابت ہوا ہو اور اگر اس کا جرم زنا گواہوں کے ذریعہ ثابت ہوا ہو تو پھر اس کا پیچھا کیا جائے اور اس کو سنگسار کیا جائے یہاں تک کہ وہ مرجائے کیونکہ اس کا بھاگنا دراصل اس کے رجوع

(جرم سے انکار) کو ظاہر کرتا ہے اور یہ رجوع کار آمد نہیں ہوگا۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ علماء نے لکھا ہے کہ اس جملہ فرجم بالمصلی (چنانچہ اس کو عیدگاہ میں سنگسار کیا گیا) میں مصلی سے مراد وہ جگہ ہے جہاں جنازے کی نماز پڑھی جاتی تھی، چنانچہ ایک روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

بخاریؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس جگہ جنازے اور عیدین کی نماز پڑھی جاتی ہو اگر اس کو مسجد قرار نہ دیا گیا ہو تو وہ جگہ مسجد کے حکم میں نہیں ہوتی کیونکہ جنازہ یا عیدین کی نماز پڑھنے کی جگہ کا وہی حکم ہوتا جو مسجد کا ہوتا ہے تو اس جگہ کو خون سے آلودہ ہونے سے بچانے کے لئے اور اس کی تقدیس و احترام کے پیش نظر وہاں زانی کو سنگسار نہ کیا جاتا۔

مساجد میں حدود تعزیر جاری نہ کی جائیں: علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ مسجد میں کسی پر کوئی حد جاری کی جائے اور نہ کسی کو کوئی تعزیر دی جائے کیونکہ اس پر تمام علماء کا اجماع و اتفاق ہے اور اس کی بنیاد آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے۔

قال جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم ورفع اصواتکم وشرائکم وبیع واقامة حدودکم وجمروھافی جمعکم وضعو اعلی ابوابھا المطاھر۔

"آپ ﷺ نے فرمایا تم اپنی مسجدوں کو اپنے بچوں سے، دیوانوں سے، شور مچانے سے، خرید و فروخت کرنے سے اور حد قائم کرنے سے بچائے رکھو، اور جمعہ کے دن مسجدوں کو اگر کی دھونی دو نیز مسجدوں کے دروازوں پر طہارت (وضو) کی جگہ بناؤ۔"

جب تک زانی کے بارہ میں پوری تحقیق نہ کر لو اس کی سزا کا فیصلہ نہ کرو

⑦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا اَتٰی مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ لَعَلَّكَ قَبَّلْتَ اَوْغَمَزْتَ اَوْنَظَرْتَ قَالَ لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَنِكْتَهَا لَا يَكْنِىْ قَالَ نَعَمْ فَعِنْدَ ذٰلِكَ اَمَرَ بِرَجْمِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب ماعز ابن مالک، نبی کریم ﷺ کے پاس (مسجد نبوی میں) آئے اور کہا کہ "مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ شائد تم نے اجنبیہ کا بوسہ لیا ہوگا، یا اس کو شہوت کے ساتھ چھوا ہوگا یا دیکھا ہوگا یعنی یہ چیزیں زنا کا باعث بنتی ہیں تم ان میں سے کوئی حرکت کر گذرے ہوں گے اور اب اسی کو زنا سے تعبیر کر رہے ہو!" انہوں نے عرض کیا کہ "نہیں" یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے جماع کیا ہے۔ اور راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ بات اشارے میں نہیں پوچھی بلکہ صاف لفظوں میں پوچھا کہ کیا واقعی تم نے زنا کیا ہے؟ ماعزؓ نے کہا کہ ہاں میں نے جماع کیا ہو۔" اس (تحقیق و تفتیش) کے بعد آپ ﷺ نے ماعز کو سنگسار کئے جانے کا حکم فرمایا۔" (بخاریؒ)

اقامت حد گناہ کو ساقط کر دیتی ہے

⑧ وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ جَاءَ مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ طَهِّرْنِىْ فَقَالَ وَيْحَكَ اِرْجِعْ فَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ وَتُبْ اِلَيْهِ قَالَ فَرَجَعَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ طَهِّرْنِىْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلُ ذٰلِكَ حَتّٰى اِذَا كَانَتِ الرَّابِعَةُ قَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَ اُطَهِّرُكَ قَالَ مِنَ الزِّنَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبِهٖ جُنُوْنٌ فَاُخْبِرَ اَنَّهٗ لَيْسَ بِمَجْنُوْنٍ فَقَالَ اَشَرِبَ خَمْرًا فَقَامَ رَجُلٌ فَاسْتَنْكَهَهٗ فَلَمْ يَجِدْ مِنْهُ رِيْحَ خَمْرٍ فَقَالَ اَزَنَيْتَ قَالَ نَعَمْ فَاَمَرَ بِهٖ فَرُجِمَ فَلَبِثُوْا يَوْمَيْنِ اَوْثَلَاثَةً ثُمَّ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اسْتَغْفِرُوْا لِمَاعِزِ بْنِ مَالِكٍ لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ اُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ ثُمَّ جَاءَتْهُ امْرَاَةٌ مِّنْ غَامِدٍ مِنَ الْاَزْدِ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ طَهِّرْنِىْ فَقَالَ وَيْحَكِ ارْجِعِىْ فَاسْتَغْفِرِى اللّٰهَ وَتُوْبِىْ اِلَيْهِ فَقَالَتْ تُرِيْدُ اَنْ تُرَدِّدَنِىْ كَمَا رَدَدْتَّ مَاعِزَ بْنَ

مَالِكِ اِنَّهَا حُبْلٰى مِنَ الزِّنٰى فَقَالَ اَنْتِ؟ قَالَتْ نَعَمْ قَالَ لَهَا حَتّٰى تَضَعِيْ مَافِيْ بَطْنِكِ قَالَ فَكَفَلَهَا رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ حَتّٰى وَضَعَتْ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ قَدْ وَضَعَتِ الْغَامِدِيَّةُ فَقَالَ اِذًا لَا نَرْجُمُهَا وَنَدَعُ وَلَدَهَا صَغِيْرًا لَيْسَ لَهُ مَنْ يُرْضِعُهُ فَقَامَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ اِلَيَّ رَضَاعُهُ يَانَبِيَّ اللّٰهِ قَالَ فَرَجَمَهَا وَفِيْ رِوَايَةٍ اِنَّهُ قَالَ لَهَا اذْهَبِيْ حَتّٰى تَلِدِيْ فَلَمَّا وَلَدَتْ قَالَ اذْهَبِيْ فَاَرْضِعِيْهِ حَتّٰى تَفْطِمِيْهِ فَلَمَّا فَطَمَتْهُ اَتَتْهُ بِالصَّبِيِّ وَفِيْ يَدِهٖ كِسْرَةُ خُبْزٍ فَقَالَتْ هٰذَا يَانَبِيَّ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) قَدْ فَطَمْتُهُ وَقَدْ اَكَلَ الطَّعَامَ فَدَفَعَ الصَّبِيَّ اِلٰى رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ثُمَّ اَمَرَ بِهَا فَحُفِرَلَهَا اِلٰى صَدْرِهَا وَاَمَرَ النَّاسَ فَرَجَمُوْهَا فَيُقْبِلُ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ بِحَجَرٍ فَرَمٰى رَأْسَهَا فَتَنَضَّحَ الدَّمُ عَلٰى وَجْهِ خَالِدٍ فَسَبَّهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَهْلًا يَا خَالِدُ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْتَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَلَهُ ثُمَّ اَمَرَ بِهَا فَصَلّٰى عَلَيْهَا وَدُفِنَتْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت ماعز ابن مالک آیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے پاک کر دیجئے یعنی (مجھ سے جو گناہ سرزد ہوگیا ہے اس کی حد جاری کر کے میرے اس گناہ کی معافی کا سبب بن جائے) آپ ﷺ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہے واپس جا یعنی زبان کے ذریعہ استغفار کر اور دل سے توبہ کر راوی کہتے ہیں وہ چلا گیا اور تھوڑی دور جا کر پھر واپس آگیا اور کہا کہ یارسول اللہ! مجھے پاک کر دیجئے، نبی کریم ﷺ نے وہی الفاظ فرمائے جو پہلے فرمائے تھے، چار مرتبہ اسی طرح ہوا، اور (جب چوتھی بار ماعز نے کہا کہ یارسول اللہ! مجھے پاک کر دیجئے) تو رسول کریم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ میں تجھے کس چیز سے اور کس وجہ سے پاک کروں؟ اس نے کہا کہ (حد جاری کر کے) زنا کے گناہ سے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی بات سن کر صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا یہ دیوانہ ہے؟ (صحابہؓ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو بتایا گیا کہ یہ دیوانہ نہیں ہے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ (یہ سن کر ایک شخص نے کھڑے ہو کر اس کا منہ سونگھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس نے شراب پی رکھی ہے یا نہیں) لیکن شراب کی بو نہیں پائی گئی، آنحضرت ﷺ نے پھر ماعز سے پوچھا کہ کیا (واقعی) تو نے زنا کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں! اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس کو سنگسار کئے جانے کا حکم دیا چنانچہ اس کو سنگسار کر دیا گیا دو یا تین روز اسی طرح گذر گئے یعنی مجلس نبوی میں ماعز کی سنگساری کے بارے میں دو تین دن تک کوئی ذکر نہیں ہوا پھر (ایک دن) رسول کریم ﷺ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ ماعز کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کرو بلاشبہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کے ثواب کو پوری اُمت پر تقسیم کیا جائے تو وہ سب کے لئے کافی ہو جائے۔ پھر اس کے بعد (ایک دن) ایک عورت جو قبیلہ ازد کے ایک خاندان غامد میں سے تھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے پاک کر دیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تجھ پر افسوس ہے، واپس جا اور اللہ سے استغفار توبہ کر۔ اس عورت نے عرض کیا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ جس طرح آپ ﷺ نے ماعز ابن مالک کو پہلی دفعہ واپس کر دیا تھا اسی طرح مجھ کو بھی واپس کر دیں؟ اور درانحالیکہ (میں) وہ عورت (ہوں جو) زنا کے ذریعہ حاملہ ہے لہٰذا اس اقرار کے بعد میرے انکار کی گنجائش تھی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تو! (یعنی آنحضرت ﷺ نے ایک طرح سے اپنے تغافل کو ظاہر کرنے اور اس کو اقرار زنا سے رجوع کرنے کا ایک اور موقع دینے کے لئے فرمایا کہ یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ کیا تو زنا کے ذریعہ حاملہ ہے!) اس عورت نے اس کے باوجود اپنے اقرار پر اصرار کیا اور کہا کہ "ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا اچھا تو اس وقت تک انتظار کر جب تک کہ تو اپنے بچہ کی ولادت سے فارغ نہ ہو جائے۔ راوی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے بعد ایک انصاری نے اس عورت کی خبر گیری اور کفالت کا اس وقت تک کے لئے ذمہ لے لیا جب تک کہ وہ ولادت سے فارغ نہ ہو جائے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد اس شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ وہ غامدیہ عورت ولادت سے فارغ ہوگئی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہم ابھی اس کو سنگسار نہیں کریں گے اور اس کے کمسن بچے کو اس حالت میں نہیں چھوڑیں گے کہ کوئی اس کو دودھ پلانے والا نہ ہو۔ یعنی اگر ہم نے اس کو ابھی سنگسار کر دیا تو اس کا بچہ جو شیر خوار اور بہت چھوٹا ہے ہلاک ہو جائے گا

کیونکہ اس کی ماں کے بعد اس کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہے اس لئے ابھی اس کو سنگسار کرنا مناسب نہیں ہے۔) ایک اور انصاری (یہ سن کر) کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! اس بچہ کے دودھ پلانے اور اس کی خبر گیری کا میں ذمہ دار ہوں" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو سنگسار کیا یعنی اس کو سنگسار کئے جانے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کی گئی۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت سے فرمایا کہ جا جب تک کہ تو ولادت سے فارغ نہ ہو جائے (انتظار کر) پھر جب وہ ولادت سے فارغ ہو گئی تو آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا جا اس بچہ کو دودھ پلا تا آنکہ تو اس کا دودھ چھڑائے اور پھر جب اس نے بچہ کا دودھ بھی چھڑا دیا تو اس بچہ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئی اس وقت اس کے بچہ کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے اس بچہ کا دودھ چھڑا دیا ہے یہ اب روٹی کھانے لگا ہے! آنحضرت ﷺ نے اس بچہ کو ایک مسلمان کے حوالے کیا اور اس عورت کے لئے حکم فرمایا کہ ایک گڑھا کھودا جائے جو اس کے سینہ تک کھودا جائے جب اس کے سینہ تک گڑھا کھود دیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور اس کو سنگسار کیا گیا اس کی سنگساری کے دوران جب حضرت خالد ابن ولیدؓ نے ایک پتھر اس کے سر پر مارا اور اس کے سر کا خون حضرت خالدؓ کے منہ پر آ کر پڑا تو حضرت خالدؓ اس کو برا بھلا کہنے لگے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خالد! اس کی بخشش ہو چکی ہے اس کو برا بھلا مت کہو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایسی توبہ (ناروا) ٹیکس لینے والا کرے تو اس کی مغفرت و بخشش ہو جائے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے اس کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا چنانچہ اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور وہ دفن کی گئی۔" (مسلم)

تشریح: بلاشبہ ماعز نے ایسی توبہ کی اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے ماعزؓ کی سعادت اور اس کی توبہ کی فضیلت کو ظاہر فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے جو اس مغفرت اور رحمت کو لازم کرتی ہے جس کا دامن، مخلوق خدا کی ایک بہت بڑی جماعت پر سایہ فگن ہو سکتا ہے۔

یہاں اقامت حد (حد کے قائم ہونے) کو توبہ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ جس طرح توبہ کے ذریعہ گناہ ڈھل جاتے ہیں اسی طرح حد جاری ہونے سے بھی گناہ ختم ہو جاتا ہے۔

جب تک کہ تو اپنے بچہ کی ولادت سے فارغ نہ ہو جائے "ابن مالک" کہتے ہیں کہ اس ارشاد سے یہ معلوم ہوا کہ حاملہ جب تک کہ ولادت سے فارغ نہ ہو جائے اس پر حد قائم نہ کی جائے تاکہ ایک بے گناہ کو جو اس کے پیٹ میں ہے ہلاک کرنا لازم نہ آئے۔

میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ زانیہ کو سنگسار کرنے میں اس وقت تک کی مہلت دی جائے جب تک کہ اس کا وہ بچہ جو اس کے زنا کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اس سے مستغنی نہ ہو جائے بشرطیکہ اس کی پرورش اور دیکھ بھال کرنے والا اور کوئی نہ ہو، چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے۔

اگر ایسی توبہ (ناروا) ٹیکس لینے والا کرے اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ غیر شرعی طور پر اور نامناسب طریقوں سے لوگوں سے محصول ٹیکس وصول کرتے ہیں وہ بڑے گناہگار ہیں کیونکہ اس طرح کے محصول و ٹیکس وصول کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا مال زور زبردستی سے اور ظلم کر کے چھین لیا جائے۔

حدیث کے آخری جملہ میں لفظ صلی مسلم کے تمام راویوں سے صاد اور لام کے زبر یعنی صیغہ معروف کے ساتھ منقول ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت کی نماز جنازہ پڑھی تھی جب کہ طبری کے نزدیک اور ابن ابی شیبہ اور ابوداؤد کی روایت میں یہ لفظ صاد کے پیش اور لام کے زیر یعنی صیغہ مجہول کے ساتھ منقول ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی نماز جنازہ دوسرے لوگوں نے پڑھی آنحضرت ﷺ نے نہیں پڑھی چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں تو صراحت کے ساتھ یہ منقول ہے کہ لم یصل علیہا یعنی آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی بلکہ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا، اسی وجہ سے ائمہ کے ہاں سنگسار کئے جانے والے کی نماز جنازہ پڑھنے کے بارہ میں اختلافی اقوال ہیں۔ چنانچہ امام مالکؒ کے ہاں اس کی نماز جنازہ

پڑھنا مکروہ ہے اور حضرت امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ امام وقت اور اہل فضل نہ پڑھیں دوسرے لوگ پڑھ سکتے ہیں لیکن حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے بلکہ ہر اس شخص کی نماز جنازہ پڑھی جائے جو کلمہ گو اور اہل قبلہ ہو اگرچہ وہ فاسق وفاجر ہو یا اس پر حد قائم کی گئی ہو نیز ایک روایت میں حضرت امام احمدؒ سے بھی یہی منقول ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کے تمام راویوں نے لفظ "صلی" کو صاد اور لام کے زبر یعنی صیغہ معروف کے ساتھ نقل کیا ہے جب کہ طبریؒ کے نزدیک یہ لفظ صاد کے پیش یعنی صیغہ مجہول کے ساتھ ہے نیز ابن ابی شیبہ ابوداؤد اور امام نوویؒ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے لہٰذا اس بارہ میں یہ بات کہنی زیادہ مناسب ہے کہ یہ لفظ اصل میں تو صیغہ معروف ہی کے ساتھ ہے البتہ ماقبل کے الفاظ ثم امر بہا اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کی مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو اس عورت کے جنازہ کو نہلانے کفنانے اور نماز جنازہ پڑھنے کی جگہ لانے کا حکم دیا، چنانچہ اس کی تائید اس عبارت سے ہوتی ہے جو مسلم کی روایت میں ہے کہ امر بہا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فرجمت ثم صلی علیہا فقال لہ عمر تصلی علیہا یانبی اللہ وقد زنت یہ روایت صراحت کے ساتھ یہ ثابت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اس کے جنازہ کی نماز پڑھی تھی۔ اور ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ثم امرھم یصلوا علیہا (یعنی پھر آپ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے، قاضی عیاض نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ اگرچہ مسلمؒ نے اپنی روایت میں آنحضرت ﷺ کا معاذ ابن مالک کے جنازے کی نماز پڑھنا ذکر نہیں کیا ہے لیکن بخاریؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ جب مسلم کے اکثر راویوں نے لفظ "صلی" صیغہ معروف کے ساتھ نقل کیا ہے تو یہاں صاحب مشکوٰۃ نے اس لفظ کو صیغہ مجہول کے ساتھ کیوں نقل کیا؟ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اگرچہ اثبات، نفی پر مقدم ہوتا ہے اس اعتبار سے صاحب مشکوٰۃ کو یہ لفظ صیغہ معروف کے ساتھ نقل کر کے اثبات کو ترجیح دینا چاہئے تھا لیکن جب انہوں نے معتمد وصحیح نسخوں میں دیکھا کہ اس بارہ میں مختلف روایات ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت کے جنازے کی نماز پڑھی یا نہیں پڑھی تو انہوں نے لفظ صلی کو صیغہ مجہول کے ساتھ نقل کرنے کو ترجیح دی تاکہ اس صورت میں دونوں ہی احتمال ملحوظ رہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ صورت ابہام سے خالی نہیں ہے اس لئے اس بارہ میں اولیٰ اور بہتر یہی ہے کہ جمہور کی متابعت اور نقل مشہور کی موافقت کے پیش نظر اس لفظ کو صیغہ معروف ہی کے ساتھ قبول کیا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔

بہرکیف یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حد، اس گناہ کو ختم کر دیتی ہے جس کی سزا میں اس کا نفاذ و اجراء ہوتا ہے مثلاً اگر زید زنا کا مرتکب ہوا اور اس کے اس جرم کی سزا میں اس پر حد جاری کی جائے تو وہ زنا کے گناہ سے بری ہو جائے گا اور آخرت میں اس سے اس زنا پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

ایک بات اور نوویؒ کہتے ہیں کہ (یہاں اس عورت کے بارے میں دو روایتیں نقل کی گئی ہیں اور) بظاہر دوسری روایت پہلی روایت کے مخالف ہے کیونکہ دوسری روایت سے تو صراحۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کو اس وقت سنگسار کیا گیا جب اس عورت نے اپنے بچے کا دودھ چھڑا دیا تھا اور وہ روٹی کھانے لگا تھا لیکن پہلی روایت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بچے کی ولادت کے بعد ہی سنگسار کر دیا گیا تھا، لہٰذا دوسری روایت کے صریح مفہوم کے پیش نظر پہلی روایت کی تاویل کرنی ضروری ہوئی تاکہ دونوں روایتوں کا مفہوم یکساں ہو جائے کیونکہ دونوں روایتوں کا تعلق ایک ہی واقعہ سے ہے اور دونوں ہی روایتیں صحیح ہیں۔ پس تاویل یہ ہے کہ پہلی روایت میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک انصاری نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں اس بچے کو دودھ پلانے کا ذمہ دار ہوں تو انہوں نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب کہ اس عورت نے اپنے بچے کا دودھ چھڑا دیا تھا، اور دودھ پلانے کا ذمہ دار ہونے سے اس کی مراد یہ تھی کہ میں اس بچہ کی کفالت اور پرورش کی ذمہ داری لیتا ہوں اور اپنے اس مفہوم کو انہوں نے مجازاً دودھ پلانے سے تعبیر کیا۔

بدکار لونڈی کی سزا

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا زَنَتْ اَمَةُ اَحَدِکُمْ فَتَبَیَّنَ زِنَاهَا فَلْیَجْلِدْهَا الْحَدَّ وَلَا یُثَرِّبْ عَلَیْهَا ثُمَّ اِنْ زَنَتْ فَلْیَجْلِدْهَا الْحَدَّ وَلَا یُثَرِّبْ ثُمَّ اِنْ زَنَتِ الثَّالِثَةَ فَتَبَیَّنَ زِنَاهَا فَلْیَبِعْهَا وَلَوْ بِحَبْلٍ مِنْ شَعَرٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اگر تم میں سے کسی شخص کی لونڈی، زنا کی مرتکب ہو اور اس کا زنا ظاہر ہو جائے (یعنی اس کی زنا کاری ثابت ہو جائے) تو وہ اس پر حد جاری کرے اور اس کو عار نہ دلائے اگر وہ پھر زنا کی مرتکب ہو تو اس پر حد جاری کرے اور اس کو عار نہ دلائے، اور اگر وہ تیسری مرتبہ زنا کی مرتکب ہو اور اس کی زنا کاری ظاہر ثابت ہو جائے تو اب اس کو چاہئے کہ وہ اس لونڈی کو بیچ ڈالے اگرچہ بالوں کی رسی (یعنی حقیر ترین چیز) ہی کے بدلے کیوں نہ بیچنا پڑے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: تو (وہ اس پر حد جاری کرے۔ یعنی اس کو پچاس کوڑے مارے! یہ واضح رہے کہ لونڈی غلام کی حد، آزاد مرد عورت کی بہ نسبت آدھی حد ہے اور لونڈی غلام کے لئے سنگساری کی سزا مشروع نہیں ہے۔ حضرت امام شافعیؒ نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ آقا کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مملوک پر خود بخود حد جاری کرے جب کہ حنفی علماء کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے، ان کے نزدیک یہ حکم وہ اس پر حد جاری کرے در اصل سبب پر محمول ہے یعنی اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ آقا اپنی زنا کار لونڈی پر حد جاری ہونے کا سبب اور واسطہ بنے بایں طور کہ وہ اس لونڈی کو حاکم کے سامنے پیش کر دے تاکہ وہ اس پر حد جاری کرے۔

اور اس کو عار نہ دلائے کا مطلب یہ ہے کہ حد جاری ہو جانے کے بعد اس لونڈی پر لعن طعن نہ کرے اور نہ اس کو حد جاری ہونے کی عار وغیرہ دلائے کیونکہ جب اس نے حد کی صورت میں اپنے گناہ کا کفارہ بھر دیا اور وہ گناہ سے پاک ہو گئی تو اب اس پر لعن طعن کیا اور اسے عار کیوں دلائی جائے! اور یہ حکم خاص طور پر لونڈی ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ آزاد کا بھی یہی حکم ہے لیکن لونڈیاں چونکہ توبیخ و سرزنش کا محل ہوتی ہیں اس لئے خاص طور پر لونڈی کے بارہ میں یہ حکم بیان کیا گیا۔

وہ اس لونڈی کو بیچ ڈالے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے تو حد جاری کرنے کے بعد اس کو بیچے اور چاہے حد جاری کرنے سے پہلے ہی بیچ دے لیکن حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حد جاری کرنے سے پہلے ہی بیچ دینا چاہئے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ فاسق و فاجر اور اہل معاصی کے ساتھ رہن سہن کو ترک کر دینا اور اس طرح کی لونڈی کو بیچ دینا مستحب ہے لیکن علماء ظواہر کے نزدیک واجب ہے۔

مریض پر حد جاری کرنے کا مسئلہ

⑩ وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ یَا اَیُّهَا النَّاسُ اَقِیْمُوْا عَلٰی اَرِقَّائِکُمُ الْحَدَّ مَنْ اَحْصَنَ مِنْهُمْ وَمَنْ لَمْ یُحْصِنْ فَاِنَّ اَمَةً لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ زَنَتْ فَاَمَرَنِیْ اَنْ اَجْلِدَهَا فَاِذَا هِیَ حَدِیْثُ عَهْدٍ بِنِفَاسٍ فَخَشِیْتُ اِنْ اَنَا جَلَدْتُهَا اَنْ اَقْتُلَهَا فَذَکَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَحْسَنْتَ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ دَاوٗدَ قَالَ دَعْهَا حَتّٰی یَنْقَطِعَ دَمُهَا ثُمَّ اَقِمْ عَلَیْهَا الْحَدَّ وَاَقِیْمُوا الْحُدُوْدَ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔

"اور حضرت علیؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "لوگو! اپنے غلام لونڈیوں پر حد جاری کرو یعنی اگر وہ زنا کے مرتکب ہوں تو پچاس کوڑے مارو خواہ وہ محصن یعنی شادی شدہ ہوں یا غیر محصن۔" رسول کریم ﷺ کی ایک لونڈی نے زنا کا ارتکاب کیا تو آنحضرت ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس پر حد جاری کروں مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ ابھی حال ہی میں اس کے ولادت ہوئی ہے تو مجھے

اندیشہ ہوا کہ اگر میں اس کے پچاس کوڑے مارتا ہوں تو وہ مرجائے گی چنانچہ میں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اچھا کیا کہ اس حالت میں اس پر حد جاری نہیں کی۔" (مسلمؒ)

اور ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (جب حضرت علیؓ نے آنحضرت ﷺ سے اس بارہ میں ذکر کیا تو) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تک کہ اس کا نفاس کا خون بند نہ ہو جائے اس وقت تک کے لئے اسے چھوڑ دو اس کے بعد اس پر حد جاری کرو اور اپنے بردوں غلام لونڈیوں پر حد جاری کیا کرو۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حد کی سزا اور عورت اگر نفاس کی حالت میں ہو تو اس پر اس وقت تک حد جاری نہ کی جائے جب تک کہ وہ نفاس سے فارغ نہ ہو جائے کیونکہ نفاس ایک طرح کا مرض ہے اور مریض کو اس کے اچھا ہونے تک مہلت دینی چاہئے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مریض، زنا کا مرتکب ہو اور اس کے محصن شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اس کو رجم سنگساری کا سزا اور گردانا جا چکا ہو تو اس کو اسی مرض کی حالت میں رجم کیا جائے اور اگر اس کے غیر محصن غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اس کو کوڑے مارے جانے کا سزا وار گردانا گیا ہو تو پھر اس کو اس وقت تک کوڑے نہ مارے جائیں جب تک کہ وہ اچھا نہ ہو جائے ہاں اگر وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جس سے بچنے کی امید نہ کی جاتی ہو جیسے دق وسل وغیرہ یا وہ ناقص وضعیف الخلقت ہو تو اس صورت میں حضرت امام اعظمؒ ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ سزا پوری کرنے کے لئے اس کو کھجور کی کسی ایسی بڑی شاخ سے مارا جائے جس میں چھوٹی چھوٹی سو ٹہنیاں ہوں اور وہ شاخ اس کو ایک دفعہ اس طرح ماری جائے کہ اس کی ایک ایک ٹہنی اس کے بدن پر لگ جائے اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس مقصد کے لئے پھیلی ہوئی شاخ استعمال کرنا ضروری ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ تلف کے خوف سے کوڑے مارنے کی حد نہ تو شدید گرمی میں جاری کی جائے اور نہ سخت جاڑے میں بلکہ اس کے لئے معتدل موسم کا انتظار کیا جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اگر زنا کا اقراری مجرم اپنے اقرار سے رجوع کرلے تو حد ساقط ہو جائے گی یا نہیں؟

(۱۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ جَآءَ مَاعِزُ الْاَسْلَمِیُّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّهٗ قَدْ زَنٰی فَاَعْرَضَ عَنْهُ ثُمَّ جَآءَ مِنْ شِقِّهِ الْاٰخَرِ فَقَالَ اِنَّهٗ قَدْ زَنٰی فَاَعْرَضَ عَنْهُ ثُمَّ جَآءَ مِنْ شِقِّهِ الْاٰخَرِ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهٗ قَدْ زَنٰی فَاَمَرَ بِهٖ فِی الرَّابِعَةِ فَاُخْرِجَ اِلَی الْحَرَّةِ فَرُجِمَ بِالْحِجَارَةِ فَلَمَّا وَجَدَ مَسَّ الْحِجَارَةِ فَرَّ یَشْتَدُّ حَتّٰی مَرَّ بِرَجُلٍ مَعَهٗ لَحْیُ جَمَلٍ فَضَرَبَهٗ بِهٖ وَضَرَبَهُ النَّاسُ حَتّٰی مَاتَ فَذَکَرُوْا ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ فَرَّ حِیْنَ وَجَدَ مَسَّ الْحِجَارَةِ وَمَسَّ الْمَوْتِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هَلَّا تَرَکْتُمُوْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِیْ رِوَایَةٍ هَلَّا تَرَکْتُمُوْهُ لَعَلَّهٗ اَنْ یَّتُوْبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ماعز اسلمیؓ نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ اس نے (یعنی میں نے) زنا کیا ہے، یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیا وہ دوسری جانب سے گھوم کر یعنی تبدیل مجلس کر کے پھر آپ ﷺ کے سامنے آیا اور کہا کہ اس نے زنا کیا ہے آنحضرت ﷺ نے پھر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور وہ بھی پھر دوسری جانب سے گھوم کر آپ ﷺ کے سامنے آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! اس نے زنا کیا ہے! آخرکار چوتھی مرتبہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کی سنگساری کا حکم صادر فرمایا، چنانچہ اس کو حرہ میں لایا گیا جو مدینہ کا کالے پتھروں والا مضافاتی علاقہ ہے اور اس کو پتھر مارے جانے لگے جب اسے پتھروں کی چوٹ لگنے لگی تو بھاگ کھڑا ہوا یہاں تک کہ وہ ایک شخص کے پاس سے گذرا جس کے ہاتھ میں اونٹ کے جبڑے کی ہڈی تھی، اس شخص نے اسی جبڑے کی ہڈی

سے اس کو مارا اور دوسرے لوگوں نے بھی دوسری چیزوں سے اس کو مارا تا آنکہ وہ مرگیا۔ جب صحابہؓ نے رسول کریم ﷺ سے یہ ذکر کیا کہ وہ پتھروں کی چوٹ کھا کر اور موت کی سختی دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا لیکن ہم نے اس کا پیچھا کر کے سنگسار کر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیا؟" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ ذکر سن کر فرمایا کہ تم لوگوں نے اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیا، بہت ممکن تھا کہ وہ توبہ کر لیتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا۔

تشریح: یَتُوْبُ فیتوب اللّٰہ علیه کا مطلب یہ ہے کہ وہ تو اپنے اس برے فعل سے رجوع کرتا (یعنی ندامت و شرمساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے اس گناہ کی معافی چاہتا اور اللہ تعالیٰ قبولیت توبہ کے ساتھ اس پر رجوع کرتا یعنی بنظر رحمت اس کی طرح متوجہ ہوتا اور اس کے گناہ کو معاف کر دیتا۔)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے اپنے ارتکاب زنا کا خود اقرار کرے۔ اور پھر بعد میں یہ کہے کہ میں نے زنا کا ارتکاب نہیں کیا ہے یا میں نے جھوٹ بولا ہے یا میں اب اپنے اقرار سے رجوع کرتا ہوں تو اس صورت میں اس سے حد ساقط ہو جائے گی، اسی طرح اگر وہ حد قائم ہونے کے درمیان اپنے اقرار سے رجوع کرے تو حد کا جو حصہ باقی رہ گیا ہے وہ ساقط ہو جائے گا جب کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس سے حد ساقط نہیں ہوگی۔

ماعزؓ کا اعتراف جرم

⑫ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِمَاعِزِ بْنِ مَالِكٍ اَحَقٌّ مَابَلَغَنِي عَنْكَ قَالَ وَمَا بَلَغَكَ عَنِّي قَالَ بَلَغَنِي اَنَّكَ قَدْوَقَعْتَ عَلٰى جَارِيَةِ اٰلِ فُلَانٍ قَالَ نَعَمْ فَشَهِدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ فَاَمَرَ بِهٖ فَرُجِمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ماعزؓ ابن مالک سے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے فلاں شخص کی لونڈی سے زنا کیا ہے؟ ماعزؓ نے عرض کیا کہ ہاں (یہ سچ ہے) اور اس نے یہ (چار مجلسوں میں) چار مرتبہ اقرار کیا۔ لہٰذا رسول کریم ﷺ نے اس کی سنگساری کا حکم فرمایا اور ان کو سنگسار کر دیا گیا!" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے بارے میں صاحب مصابیح پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو پہلی فصل کے بجائے یہاں دوسری فصل میں کیوں نقل کیا؟

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ماعزؓ کے ارتکاب زنا کا علم تھا اور پھر آپ ﷺ نے اس سے اعتراف جرم کرایا جب کہ دوسری احادیث سے اس کے برخلاف ثابت ہوتا ہے؟ گویا اس اعتبار سے ان احادیث میں باہم تضاد نظر آتا ہے لہٰذا ان کے درمیان وجہ تطبیق یہ ہوگی کہ دراصل اس حدیث میں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور پورا واقعہ نقل کئے بغیر صرف رجم کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ دوسری احادیث میں واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا چنانچہ یہ اغلب ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ماعزؓ کے ارتکاب زنا کا علم پہلے سے ہو گا پھر بعد میں آپ ﷺ نے خود ماعزؓ سے اس کا اقرار کرایا اور صورت وہ اختیار کی جو دوسری احایث میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کہ جب ماعزؓ اپنے ارتکاب زنا کا اقرار کرتا تو آپ ﷺ اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتے تھے، اس طرح آپ ﷺ نے جب گویا چار مجلسوں میں چار مرتبہ اقرار کرا لیا تب سنگساری کا حکم صادر فرمایا، اس اعتبار سے ان احادیث میں باہم کوئی تضاد نہیں رہا۔

دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی کرو

⑬ وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ نُعَيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ مَاعِزًا اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَقَرَّ عِنْدَهٗ اَرْبَعَ مَرَّاتٍ فَاَمَرَ بِرَجْمِهٖ وَقَالَ

لِهَزَّالٍ لَوْسَتَرْتَهُ بِثَوْبِكَ كَانَ خَيْرًا لَكَ قَالَ ابْنُ الْمُنْكَدِرِ اِنَّ هَزَّالاً اَمَرَمَا عِزًا اَنْ يَاتِيَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُخْبِرَهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت یزید ابن نعیم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ماعزؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے (چار مجلسوں) چار مرتبہ (اپنے زنا) کا اقرار کیا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور اس کو سنگسار کر دیا گیا نیز آنحضرت ﷺ نے ہزالؓ سے فرمایا کہ اگر تم ماعزؓ کو اپنے کپڑے سے چھپا لیتے یعنی اس کے زنا کے واقعہ پر پردہ ڈال دیتے اور اس کو ظاہر نہ کرتے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا ابن منکدرؒ جو تابعی اور اس حدیث کے ایک راوی ہیں کہتے ہیں کہ ہزالؓ ہی نے ماعزؓ سے کہا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کو اپنے واقعہ سے آگاہ کر دو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ہزالؓ کی ایک لونڈی تھی جس کا نام فاطمہ تھا اس کو انہوں نے آزاد کر دیا تھا اسی فاطمہ سے ماعزؓ نے زنا کا ارتکاب کیا اور جب ہزالؓ کو اس کا علم ہو گیا تو انہوں نے ماعزؓ کو آمادہ کیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس جا کر واقعہ کی اطلاع دے اور اپنے جرم کا اعتراف کر لے اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے ہزالؓ سے فرمایا کہ اگر تم اس کے گناہ کا افشاء نہ کرتے بلکہ اس پر پردہ ڈال دیتے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا کہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ تمہیں خیر و بھلائی سے نوازتا اور تمہارے گناہوں کی پردہ پوشی کرتا۔

کسی حاکم کو حد معاف کرنے کا اختیار حاصل نہیں

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَعَافَوُا الْحُدُوْدَ فِيْمَا بَيْنَكُمْ فَمَا بَلَغَنِيْ مِنْ حَدٍّ فَقَدْ وَجَبَ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن العاص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم آپس میں اپنی حدود کو معاف و محو کر دیا کرو اس سے پہلے کہ ان کی خبر مجھ تک پہنچے ہاں اگر جرم کی اطلاع مجھ تک پہنچ جائے گی اور وہ ثابت ہو جائے گا تو پھر اس پر حد جاری کرنا واجب یعنی فرض ہو جائے گا۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: حدود کو معاف و محو کر دیا کرو یہ دراصل عوام سے خطاب ہے چنانچہ ان کو اس احسان کی تلقین کی جا رہی ہے کہ اگر تم میں سے کسی شخص سے کوئی گناہ جرم سرزد ہو جائے تو اس کا قضیہ حاکم کے سامنے نہ لے جاؤ بلکہ اس سے درگذر کرو۔ ہاں اگر وہ قضیہ حاکم کے پاس پہنچ جائے گا تو پھر حاکم کے لئے یہ جائز نہیں ہوتا کہ وہ اس کو معاف کر دے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اپنے ارشاد اگر جرم کی اطلاع مجھ تک پہنچ جائے گی کے ذریعہ اسی کو واضح کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اگر وہ قضیہ حاکم کے پاس پہنچ جائے اور اس میں حد واجب ہوتی ہو تو اس حد کو معاف کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہو گا۔

حدیث کا مطلق مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر کسی مملوک (غلام یا لونڈی) سے اس قسم کا کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے آقا کو نہ تو خود اس مملوک پر حد جاری کرنا چاہئے اور نہ اس کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ اس مملوک کو حاکم کے سامنے پیش کرے بلکہ چاہئے کہ وہ اس کو معاف کر دے۔

یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ حدیث میں "معاف کرنے" کا حکم دیا گیا ہے وہ وجوب کے طور پر نہیں ہے بلکہ استحباب کے طور پر ہے۔

عزت داروں کی لغزشوں سے درگذر کرنا چاہئے

⑮ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَقِيْلُوْا ذَوِى الْهَيْئَاتِ عَثَرَاتِهِمْ اِلَّا الْحُدُوْدَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا عزت داروں کی خطائیں معاف کرو علاوہ حدوں کے کہ ان کی معافی جائز نہیں

ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر ان سے بھول چوک میں کوئی گناہ سرزد ہو جائے اور ناگہانی طور پر کسی لغزش میں مبتلا ہو جائیں تو ان کو معاف کر دیا جائے، سزا و عقوبت میں مبتلا کر کے ظاہری طور پر ان کو ذلیل و رسوا مت کرو خواہ ان کی اس لغزش و گناہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے ہاں اگر ان سے کوئی ایسا جرم صادر ہو جس کی وجہ سے ان پر حد جاری کرنا واجب ہوتا ہو تو اس جرم کو معاف کرنے کی اجازت نہیں ہے خواہ اس جرم کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے۔ گویا اس حکم کے مخاطب دوسرے لوگ بھی ہیں نیز یہ حکم بھی استحباب کے طور پر ہے۔

شبہ کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہئے

(۱۹) وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِدْرَأُوا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فَاِنْ كَانَ لَهٗ مَخْرَجٌ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهٗ فَاِنَّ الْاِمَامَ اَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعَفْوِ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعُقُوْبَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ قَدْرُوِيَ عَنْهَا وَلَمْ يَرْفَعْ وَهُوَ اَصَحُّ۔

"اور حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کو حد کی سزا سے بچاؤ، اگر مسلمان (ملزم) کے لئے بچاؤ کا ذرا بھی کوئی موقع نکل آئے تو اس کی راہ چھوڑ دو یعنی اس کو بری کر دو کیونکہ امام یعنی حاکم و منصف کا معاف کرنے میں خطا کرنا، سزا دینے میں خطا کرنے سے بہتر ہے امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے روایت کی گئی ہے اور اس کا سلسلہ رواۃ آنحضرت ﷺ تک نہیں پہنچایا گیا ہے اور یہی قول زیادہ صحیح ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہؓ کا اپنا ارشاد ہے حدیث نبوی ﷺ نہیں ہے کیونکہ جس سلسلہ سند سے یہ حدیث موقوف ثابت ہوتی ہے وہ اس سلسلہ سند سے زیادہ صحیح اور قوی ہے جس سے اس کا حدیث مرفوع ہونا معلوم ہوتا ہے۔"

تشریح: اس ارشاد کے مخاطب دراصل حکام ہیں جنہیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر کسی مسلمان کے بارے میں کوئی ایسا قضیہ ان کے پاس آئے جس کی سزا حد ہے مثلاً زنا کا قضیہ، تو انہیں چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے اس مسلمان کو "حد" سے بچانے کی کوشش کریں اور شبہ کا جو بھی موقع نکلتا ہو اس کا فائدہ ملزم کو پہنچائیں، یہی نہیں بلکہ وہ ملزم کو عذر کی تلقین کریں یعنی اس سے پوچھیں کہ کیا تم دیوانے ہو؟ کیا تم نے شراب پی رکھی ہے؟ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے اس عورت سے زنا کے ارتکاب کی بجائے اس کا بوسہ لے لیا ہو یا شہوت کے ساتھ اس کو چھو لیا ہو۔ اور اب تم اس کو اپنے اقرار میں زنا سے تعبیر کر رہے ہو غرضیکہ اس سے اس قسم کے سوالات کئے جائیں تاکہ وہ اس تلقین عذر کی بنا پر کوئی عذر بیان کر دے جس سے حد کا اجراء نہ ہو سکے اور وہ بری ہو جائے، چنانچہ ماعزؓ وغیرہ سے آنحضرت ﷺ نے جو اس قسم کے سوالات کئے ان کا مقصد بھی تلقین عذر تھا۔

آخر میں نے جو یہ فرمایا کہ امام کے معاف کرنے میں خطاء سزا دینے میں خطا کرنے سے بہتر ہے تو اس کا منشاء بھی مذکورہ بالا بات کو مبالغہ و تاکید کے ساتھ بیان کرنا ہے اور یہ واضح کرنا ہے کہ اگر کوئی حاکم کسی مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے ملزم کو بری کر دے اور اس کے اس فیصلہ میں کوئی غلطی ہو جائے یا وہ ملزم کو سزا دینے کا فیصلہ کرے اور اس میں کوئی غلطی ہو جائے تو اگرچہ غلطی کے اعتبار سے دونوں ہی فیصلے محل نظر ہوں گے اور انصاف کے معیار پر پورے نہیں اتریں گے لیکن چونکہ ملزم کی برآت میں بہر حال ایک مسلمان کی جان و عزت بچ جائے گی۔ اس لئے یہ غلطی اس غلطی سے بہتر ہو گی جو سزا کے فیصلہ میں سرزد ہو اور جس کے نتیجے میں ایک مسلمان کو اپنی جان اور عزت سے ہاتھ دھونا پڑے۔

زنا بالجبر میں صرف مرد پر حد جاری ہوگی

(۱۷) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ اسْتُكْرِهَتِ امْرَأَةٌ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَرَأَ عَنْهَا الْحُدُوْدَ وَاَقَامَهٗ عَلَى الَّذِيْ اَصَابَهَا وَلَمْ يَذْكُرْ اَنَّهٗ جَعَلَ لَهَا مَهْرًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت وائل ابن حجر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت کے ساتھ زبردستی کی گئی یعنی ایک مرد نے اس سے زبردستی زنا کیا اس عورت کو تو حد سے برات دی گئی لیکن اس زنا کرنے والے پر حد جاری کی گئی۔ راوی نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو زنا کرنے والے سے مہر بھی دلوایا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: راوی کے ذکر نہ کرنے سے لازم نہیں آتا کہ ایسی صورت میں مہر واجب نہیں ہوتا کیونکہ دوسری احادیث سے یہ ثابت ہے کہ جس عورت سے زنا بالجبر کیا گیا ہو اس کے لئے مہر واجب ہوتا ہے اور یہاں "مہر" سے مراد "عقر" ہے اور "عقر" صحبت حرام اور صحبت تشبہ کے مابین (عوض اور بدلہ) کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق ایک ایسی مقدار پر ہوتا ہے کہ اگر حرام صحبت کی اجرت یعنی حلال ہوتی تو وہ مقدار واجب ہوتی۔ برجندی فتاویٰ عالمگیری میں یہ لکھا ہے کہ "عقر" مہر مثل کو کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ زنا بالجبر کی صورت میں زنا کرنے والے مرد سے عورت کو جو رقم دلوائی جائے گی اس کی مقدار اس عورت کے مہر مثل کے برابر ہونی چاہیے۔

(۱۸) وَعَنْهُ اَنَّ امْرَاَةً خَرَجَتْ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُرِيْدُ الصَّلٰوةَ فَتَلَقَّهَا رَجُلٌ فَتَجَلَّلَهَا فَقَضٰى حَاجَتَهٗ مِنْهَا فَصَاحَتْ وَانْطَلَقَ وَمَرَّتْ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ فَقَالَتْ اِنَّ ذٰلِكَ الرَّجُلَ فَعَلَ بِيْ كَذَا وَكَذَا فَاَخَذُوْا الرَّجُلَ فَاَتَوْا بِهٖ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهَا اذْهَبِيْ فَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكِ وَقَالَ لِلرَّجُلِ الَّذِيْ وَقَعَ عَلَيْهَا اُرْجُمُوْهُ وَقَالَ لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ لَقُبِلَ مِنْهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت وائلؓ ابن حجر کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک دن ایک عورت نماز کے لئے گھر سے نکلی تو راستہ میں اس کو ایک شخص ملا جس نے اس پر کپڑا ڈال کر اس سے اپنی حاجت پوری کرلی یعنی اس کے ساتھ زبردستی زنا کیا وہ عورت چلائی اور وہ مرد اس کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا، جب کچھ مہاجر صحابہؓ ادھر سے گزرے تو اس عورت نے ان سے بتایا کہ اس شخص نے میرے ساتھ ایسا ایسا کیا ہے یعنی میرے اوپر کپڑا ڈال کر مجھے بے بس کردیا اور پھر مجھ سے بدکاری کی لوگوں نے اس شخص کو پکڑ لیا اور رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لائے اور سارا واقعہ بیان کیا آنحضرت ﷺ نے اس عورت سے تو یہ فرمایا کہ جاؤ تمہیں اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے۔ (کیونکہ اس بدکاری میں نہ صرف یہ کہ تمہاری خواہش و رضا کا دخل نہیں تھا بلکہ تمہیں مجبور و بے بس بھی کردیا گیا تھا) اور جس شخص نے اس عورت سے بدکاری کی تھی اس کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ اس کو سنگسار کردیا جائے یعنی اس نے اپنے جرم کا اقرار کیا اور چونکہ وہ محصن تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ اس کو سنگسار کردو چنانچہ اس کو سنگسار کردیا گیا۔ اس سنگسار کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے اپنے اوپر حد جاری کرا کر ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس طرح کی توبہ مدینہ والے کرتے تو ان کی توبہ قبول کی جاتی۔"

(ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے اپنے جرم کی سزا بھگت کر ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس توبہ کو اہل مدینہ کے درمیان تقسیم کیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ ان سب کی توبہ قبول کی جاتی بلکہ اس کا ثواب سارے مدینے والوں کے لئے کافی ہو جاتا۔ گویا اس ارشاد کے ذریعہ آپ نے یہ واضح کیا کہ اس شخص نے اگرچہ شروع میں ایک بڑی بے حیائی کا ارتکاب کیا اور سخت برا کام کیا مگر جب اس پر حد جاری کردی گئی تو وہ اپنے جرم سے پاک ہوگیا اور بخش دیا گیا۔

ایک زنا کی دو سزائیں

⑲ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَجُلاً زَنٰی بِامْرَاَۃٍ فَاَمَرَبِہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجُلِدَ الْحَدَّثُمَّ اُخْبِرَ اَنَّہٗ مُحْصَنٌ فَاَمَرَ بِہٖ فَرُجِمَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک عورت سے زنا کیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کو کوڑے مارے جانے کا حکم دیا، چنانچہ اس کو بطور حد، کوڑے مارے گئے، اس کے بعد جب آپ کو بتایا گیا کہ وہ شخص محصن ہے تو آپ ﷺ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کر دیا گیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے پہلے کوڑے مارنے کا جو حکم دیا اس کے بارے میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ کو یہ بتایا گیا ہوگا کہ وہ شخص غیر محصن غیر شادی شدہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ کو بتایا نہیں گیا ہوگا بلکہ خود آپ ﷺ نے ہی گمان کیا ہوگا کہ یہ غیر محصن ہے اس لئے آپ ﷺ نے اس کو کوڑے کی سزا دی، لیکن جب بعد میں یہ ثابت ہوا کہ یہ شخص محصن ہے اور محصن ہونے کی وجہ سے سنگساری کا سزاوار ہے تو اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگر امام وقت (حاکم شرعی) کسی کو حد کی کوئی سزا دے اور پھر بعد میں اسے معلوم ہو کہ یہ مجرم حد کی اس سزا کا نہیں بلکہ حد کی کسی دوسری سزا کا مستوجب ہے مثلاً اس کو کوڑے مارنے کی سزا دی مگر بعد میں ثابت ہوا کہ حقیقت میں یہ سنگساری کا سزاوار ہے تو اس حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوبارہ اس سزا کو جاری کرے جس کا وہ مجرم شرعی طور پر مستوجب ہے۔

بیمار مجرم پر حد جاری کرنے کا طریقہ

⑳ وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَۃَ اَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَۃَ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِرَجُلٍ کَانَ فِی الْحَیِّ مُخْدَجٍ سَقِیْمٍ فَوُجِدَ عَلٰی اَمَۃٍ مِنْ اِمَائِھِمْ یَخْبُثُ بِھَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خُذُوْالَہٗ عِثْکَالاً فِیْہِ مِائَۃُ شِمْرَاخٍ فَاضْرِبُوْہُ ضَرْبَۃً۔ رَوَاہُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ وَفِیْ رِوَایَۃِ ابْنِ مَاجَۃَ نَحْوُہٗ۔

"اور حضرت سعید بن سعد ابن عبادہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت سعد ابن عبادہ ایک ایسے شخص کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائے جو اپنے محلہ کا ایک ناقص الخلقت کمزور اور بیمار شخص تھا (اور ایسا بیمار تھا کہ اس کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہ تھی اس شخص کو اہل محلہ کو لونڈیوں میں سے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا)، نبی کریم ﷺ نے اس کے بارہ میں یہ حکم صادر فرمایا کہ کھجور کی ایک ایسی (بڑی) ٹہنی لو جس میں سو چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں ہوں اور پھر اس ٹہنی سے اس شخص کو ایک دفعہ مارو (شرح السنۃ) ابن ماجہؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: "ایک دفعہ مارو" کا مطلب یہ ہے کہ اس بڑی ٹہنی کو اس طرح ایک دفعہ مارو کہ اس کی ساری سو ٹہنیوں کی چوٹ اس کے جسم کو پہنچ جائے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام حاکم کو اس بات کی نگہبانی کرنی چاہئے کہ جس شخص کو کوڑے مارنے کی سزا دی جارہی ہو وہ مر نہ جائے۔ اور یہ مسئلہ پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ اگر کوئی مریض کسی حد کا مستوجب ہو تو اس پر اس وقت تک حد جاری نہ کی جائے جب تک کہ وہ اچھا نہ ہو جائے اور جس مریض کے اچھا ہونے کی توقع ہی نہ ہو اس پر اس طرح حد جاری کی جائے جس طرح اس حدیث میں مذکور ہے۔

اغلام کی سزا

㉑ وَعَنْ عِکْرِمَۃَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ وَجَدْ تُّمُوْہُ یَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ

فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر تم کسی شخص کو قوم لوط کا سا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو مار ڈالو۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اغلام کی حد کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے زیادہ صحیح قول اور صاحبینؒ حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ فاعل غلام کرنے والے کی حد وہی ہے جو زانی کی حد ہے یعنی اگر وہ محصن ہو تو اس کو سنگسار کیا جائے اور اگر غیر محصن ہو تو سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلاوطن کر دیا جائے خواہ وہ مرد ہو یا عورت جب کہ ایک جماعت کا رجحان اس طرف ہے کہ اغلام کرنے والے کو بہر صورت سنگسار کیا جائے خواہ وہ محصن ہو یا غیر محصن ہو حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کا قول بھی یہی ہے حضرت امام شافعیؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ فاعل و مفعول اغلام کرنے والے اور غلام کرانے والے دونوں ہی کو قتل کر دیا جائے جیسا کہ اس حدیث کے ظاہر مفہوم سے معلوم ہوتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ان کے قتل کا طریقہ کیا ہو تو بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں پر مکان گرا دیا جائے تاکہ وہ اس کے نیچے دب کر مر جائیں اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ان کو پہاڑ کے اوپر لے جا کر وہاں سے نیچے پھینک دیا جائے۔

اس بارہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اغلام کی سزا کے تعین کا اختیار حاکم وقت کے سپرد ہے کہ اگر وہ چاہے تو اغلام کرنے والے کو قتل کر دے جب کہ یہ برائی اس کی عادت بن چکی ہو، نیز چاہے اس کو مارے اور چاہے قید خانہ میں ڈال دے۔

جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے والے کی سزا

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَتٰى بَهِيْمَةً فَاقْتُلُوْهُ وَاقْتُلُوْهَا مَعَهٗ قِيْلَ لِابْنِ عَبَّاسٍ مَاشَأْنُ الْبَهِيْمَةِ قَالَ مَاسَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذٰلِكَ شَيْئًا وَلٰكِنْ اَرَاهُ كَرِهَ اَنْ يُّؤْكَلَ لَحْمُهَا اَوْ يُنْتَفَعَ بِهَا وَقَدْ فُعِلَ بِهَا ذٰلِكَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی جانور کے ساتھ بدفعلی کرے اس کو قتل کر دو اور اس کے ساتھ اس جانور کو بھی قتل کر دو۔ حضرت ابن عباسؓ سے کہا گیا کہ جانور کے بارہ میں یہ حکم کیوں ہے یعنی جانور نہ تو عقل رکھتا ہے اور نہ وہ مکلف ہے تو اس کو قتل کرنے کا کیوں حکم ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں نے اس کی حکمت و مصلحت کے بارہ میں رسول کریم ﷺ سے تو کچھ نہیں سنا ہے البتہ میرا گمان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ جس جانور کے ساتھ بدفعلی کی گئی ہے اس کا گوشت کھایا جائے یا اس کے دودھ بالوں اور اس کی افزائش نسل سے فائدہ اٹھایا جائے اور جب اس جانور سے کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھانا مکروہ ہوا تو پھر اس کو قتل کر دینا ہی ضروری ہے۔" (ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس کو قتل کر دو سے مراد یہ ہے کہ اس کی بہت سخت پٹائی کرو۔ گویا اس کو قتل کر دینے کا حکم سخت زجر و تہدید کے طور پر ہے اس کو واقعۃً قتل کر دینا مراد نہیں ہے۔

"اس کے جانور کو بھی قتل کر دو" اس حکم کی حکمت و علت بعض حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ اگر وہ جانور زندہ رکھا گیا تو ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے اس کے ساتھ بدفعلی کی ہے اس کا نطفہ اس کے رحم میں قرار پا جائے اور اس کے نتیجہ میں ایک حیوان بصورت انسان پیدا ہو جائے اس لئے اس صورت حال سے بچنے کے لئے اس کو مار ڈالنا ہی ضروری ہے یا یہ کہ اس جانور کی موجودگی اس کے مالک کو دنیاوی ذلت و رسوائی سے دوچار کر سکتی ہے لہٰذا اس کو مار ڈالا جائے۔

شرح مظہر میں لکھا ہے کہ چاروں امام اس بات پر متفق ہیں کہ جو شخص کسی جانور کے ساتھ بدفعلی کرے اس کو قتل نہ کیا جائے بلکہ

تعزیرًا کوئی دوسری سزا دی جائے اور یہ حدیث زجر و توبیخ پر محمول ہے رہی جانور کی بات تو بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ جانور ایسا ہے جس کا گوشت کھایا جاتا ہے تو اس کو قتل کر دیا جائے اور اگر اس کا گوشت نہیں کھایا جاتا تو اس کے بارہ میں دونوں صورتیں ہیں کہ اگر اس حدیث کا ظاہری مفہوم پیش نظر ہو تو اسکو قتل کر دیا جائے اور اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے کہ جانور کا گوشت کھانا مقصود یا حلال نہ ہو اس کو ذبح کرنے کی ممانعت منقول ہے تو اس جانور کو قتل نہ کیا جائے۔

اغلام، بدترین برائی ہے

(۲۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِیْ عَمَلُ قَوْمِ لُوْطٍ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اپنی اُمت کے بارے میں مجھے سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ قوم لوط کا عمل (یعنی اغلام) ہے۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: یعنی مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں میری اُمت کے لوگ خواہشات نفسانی کا شکار ہو کر بے صبری نہ کر بیٹھیں اور اس برائی میں مبتلا ہو جائیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ یہ کام نہایت برا اور سخت قبیح ہے اور اس کی حرمت بڑی شدید ہے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میری اُمت کے لوگ اس میں مبتلا نہ ہو جائیں اور اس کی وجہ سے انہیں عذاب الٰہی میں گرفتار ہونا پڑے۔

ایک ہی شخص کو پہلے زنا کی سزا اور پھر تہمت زنا کی سزا

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلاً مِنْ بَنِیْ بَکْرِ بْنِ لَیْثٍ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَقَرَّ اَنَّہٗ زَنٰی بِامْرَاَۃٍ اَرْبَعَ مَرَّاتٍ فَجَلَدَہٗ مِائَۃً وَکَانَ بِکْرًا ثُمَّ سَاَلَہُ الْبَیِّنَۃَ عَلَی الْمَرْاَۃِ فَقَالَتْ کَذَبَ وَاللّٰہِ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَجُلِدَ حَدَّ الْفِرْیَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دن بکر بن لیث کے خاندان کا ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور اقرار کیا کہ اس نے (یعنی میں نے) ایک عورت کے ساتھ چار بار یعنی چار مجلسوں میں زنا کیا ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کو سو کوڑے لگوائے اور وہ شخص غیر محصن یعنی کنوارہ تھا پھر آنحضرت ﷺ نے اس سے اس عورت کی زنا کاری پر گواہ طلب کئے، عورت نے عرض کیا کہ "خدا کی قسم یارسول اللہ! یہ شخص جھوٹ بولتا ہے" اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس شخص پر تہمت لگانے کی حد جاری کی۔" (ابوداؤد)

تشریح: "گواہ طلب کئے" کا مطلب یہ ہے کہ جب اس شخص نے ایک عورت کے ساتھ زنا کا اقرار کیا تو اس کے اس اقرار پر اس کو زنا کی سزا دی گئی یعنی اس کے سو کوڑے مارے گئے اور چونکہ یہ بات اس عورت کو بھی زنا کا مرتکب گردانتی تھی اس لئے آنحضرتؐ نے اس شخص سے کہا کہ اب تم ایسے گواہوں کو پیش کرو جو اس عورت کے ساتھ تمہارے زنا کو ثابت کریں مگر جب وہ شخص گواہ پیش کرنے سے عاجز رہا تو اس عورت نے کہا کہ خدا کی قسم یہ شخص جھوٹا ہے یہ میری طرف زنا کی نسبت کر رہا ہے حالانکہ میں اس برائی سے پاک ہوں اس طرح اس عورت نے یہ ثابت کیا کہ اس مرد نے اس پر تہمت لگائی ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو دوسری سزا تہمت لگانے کی دی یعنی اسی کوڑے مارے۔

حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے والوں کو سزا

(۲۵) وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ لَمَّا نَزَلَ عُذْرِیْ قَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَذَکَرَ ذٰلِکَ فَلَمَّا نَزَلَ مِنَ الْمِنْبَرِ اَمَرَ بِالرَّجُلَیْنِ وَالْمَرْاَۃِ فَضُرِبُوْا حَدَّھُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب میری برات نازل ہوئی یعنی عفت و پاکدامنی کے ثبوت میں آیتیں نازل ہوئیں تو نبی کریم ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا اور اس کا ذکر کیا اور پھر جب آپ ﷺ منبر سے اترے تو دو مردوں اور ایک عورت کو سزا دینے کا فیصلہ کیا چنانچہ تہمت لگانے کی ان پر حد جاری کی گئی۔" (ابوداؤد)

تشریح: بعض لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر نعوذ باللہ زنا کا بہتان لگایا تھا اور آنحضرت ﷺ کے دل میں بھی ان کی طرف سے کچھ شک پڑ گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی برات نازل کی جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ان کے دامن عفت و عصمت پر تہمت کے جو چھینٹے ڈالے گئے ان کا تعلق محض ایک سازش اور چند لوگوں کی مفسدہ پردازی سے تھا، چنانچہ جب حضرت عائشہؓ کی عفت و پاکدامنی کے ثبوت میں آیتیں نازل ہوئیں جو سورہ نور میں ہیں تو آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حرم نبوی ﷺ کی تقدیس و حرمت کی لاج رکھ لی ہے اور عائشہ کو عفت مآب و پاک دامن قرار دیا ہے اور اس کے ثبوت میں آپ نے نازل ہونے والی آیتوں کا ذکر کیا پھر منبر سے اترتے ہی آپ نے ان لوگوں پر حد قذف تہمت لگانے کی شرعی سزا کہ وہ اسی کوڑے ہیں جاری کرنے کا حکم دیا جنہوں نے اس ناپاک سازش میں حصہ لیا تھا، ان میں دو مرد تھے جن کا نام مسطح اور حسان ابن ثابت تھا اور ایک عورت تھی جس کا نام حمنہ بنت جحش تھا اور جو اس واقعہ میں سب سے بڑی فتنہ پرداز تھی ان سب کو اسی اسی کوڑے مارے گئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

زنا بالجبر میں صرف زانی حد کا سزاوار ہوگا

(۲۶) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ صَفِيَّةَ بِنْتَ اَبِي عُبَيْدٍ اَخْبَرَتْهُ اَنَّ عَبْدًا مِنْ رَقِيْقِ الْاِمَارَةِ وَقَعَ عَلٰى وَلِيْدَةٍ مِنَ الْخُمُسِ فَاسْتَكْرَهَهَا حَتّٰى اقْتَضَّهَا فَجَلَدَهُ عُمَرُ وَلَمْ يَجْلِدْهَا مِنْ اَجْلِ اَنَّهُ اسْتَكْرَهَهَا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرت صفیہؓ بنت ابوعبید نے ان سے بیان کیا کہ امارت و خلافت یعنی حضرت عمرؓ کی حکومت کے ایک غلام نے ایک ایسی لونڈی سے زنا کرنا چاہا جو مال غنیمت کے خمس میں سے تھی اور جب وہ لونڈی اس بدکاری کے لئے تیار نہیں ہوئی تو اس نے اس کے ساتھ زبردستی جماع کیا یہاں تک کہ اس کی بکارت یعنی اس کے کنوارپنے کو زائل کر دیا چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کو پچاس درے لگوائے اور اس لونڈی کے درے نہیں لگوائے یعنی اس کو اس بدکاری کی سزا نہیں دی کیونکہ اس غلام نے اس کے ساتھ زبردستی جماع کیا تھا۔" (بخاری)

ماعز کے واقعہ زنا کی ایک اور تفصیل

(۲۷) وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ نُعَيْمِ بْنِ هَزَّالٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ يَتِيْمًا فِيْ حَجْرِ اَبِيْ فَاَصَابَ جَارِيَةً مِنَ الْحَيِّ فَقَالَ لَهُ اَبِي ائْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبِرْهُ بِمَا صَنَعْتَ لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ لَكَ وَاِنَّمَا يُرِيْدُ بِذٰلِكَ رَجَاءَ اَنْ يَكُوْنَ لَهُ مَخْرَجًا فَاَتَاهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ زَنَيْتُ فَاَقِمْ عَلَيَّ كِتَابَ اللّٰهِ فَاَعْرَضَ عَنْهُ فَعَادَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ زَنَيْتُ فَاَقِمْ عَلَيَّ كِتَابَ اللّٰهِ حَتّٰى قَالَ اَرْبَعَ مَرَّاتٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكَ قَدْ قُلْتَهَا اَرْبَعَ مَرَّاتٍ فَبِمَنْ قَالَ بِفُلَانَةٍ قَالَ هَلْ ضَاجَعْتَهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ بَاشَرْتَهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ جَامَعْتَهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاَمَرَ بِهِ اَنْ يُرْجَمَ فَاُخْرِجَ بِهِ اِلَى الْحَرَّةِ فَلَمَّا رُجِمَ فَوَجَدَ مَسَّ الْحِجَارَةِ فَجَزِعَ فَخَرَجَ يَشْتَدُّ فَلَقِيَهُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اُنَيْسٍ وَقَدْ عَجَزَ اَصْحَابُهُ فَنَزَعَ لَهُ بِوَظِيْفِ بَعِيْرٍ فَرَمَاهُ بِهِ فَقَتَلَهُ ثُمَّ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ هَلَّا تَرَكْتُمُوْهُ لَعَلَّهُ اَنْ يَّتُوْبَ فَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت یزید ابن نعیم ابن ہزال اپنے والد حضرت نعیم ابن ہزال سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے یعنی حضرت نعیم نے کہا کہ ماعز ابن مالک یتیم تھا اور میرے والد حضرت ہزال کی پرورش میں تھا اس نے جوان ہو کر محلہ کی ایک لونڈی سے زنا کر لیا جب میرے والد کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے کہا کہ تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں چلا جا اور جو کچھ تو نے کیا ہے وہ آپ ﷺ کو بتا دے شاید آنحضرت ﷺ تیری مغفرت کی دعا کر دیں اور میرے والد کے اس کہنے کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں تھا کہ استغفار گناہ سے اس کی نجات کا سبب بن جائے یعنی میرے والد کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس جائے اور آنحضرت ﷺ اس کو سنگسار کئے جانے کا حکم دیں جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے ماعزؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے آپ مجھ پر کتاب اللہ کا حکم جاری کیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی یہ بات سن کر اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیا وہ وہاں سے ہٹ گیا اور پھر آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے آپ مجھ پر کتاب اللہ کا حکم جاری کیجئے یہاں تک کہ اس نے یہ بات چار بار یعنی چار مجلسوں میں کہی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تو نے یہ بات چار بار کہی ہے یعنی چار بار اقرار کرنے سے تیرا جرم زنا ثابت ہو گیا ہے اب یہ بتا کہ تو نے کس کے ساتھ زنا کیا ہے اس نے نام لے کر کہا کہ فلاں عورت کے ساتھ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو اس کے ساتھ ہمخواب یعنی ہم آغوش ہوا تھا اس نے کہا ہاں آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو نے اس کے بدن کو اپنے بدن سے لپٹایا تھا؟ اس نے کہ ہاں آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو نے اس کے ساتھ جماع کیا تھا؟ اس نے کہا ہاں اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کو حرہ لے جایا گیا اور جب وہاں سنگسار کیا جانے لگا اور اسے پتھروں کی چوٹ لگنے لگی تو وہ بدحواس ہو گیا یعنی وہ پتھروں کی چوٹ برداشت نہ کر سکا اور جہاں سنگسار کیا جا رہا تھا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا راستہ میں اس کو عبداللہؓ ابن انیس ملے جن کے ساتھی یا ماعزؓ کو سنگسار کرنے والے تھک گئے تھے عبداللہؓ نے اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھائی اور اس سے ماعزؓ کو مارا یہاں تک کہ انہوں نے اس کو ختم کو ڈالا اس کے بعد عبداللہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ ﷺ کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیا شاید وہ اپنے اقرار سے رجوع کر لیتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر کے سنگساری کئے بغیر ہی اس کا گناہ معاف کر دیتا۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس کو حرہ لے جایا گیا۔ ابن ہمام کہتے ہیں کہ صحیح بخاری کی روایت میں تو یہ ہے کہ ماعزؓ کو مصلی میں سنگسار کیا گیا اور مسلم اور ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ ہے کہ اس کو بقیع غرقد لے جایا گیا ان دونوں روایتوں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے لیکن اگر یہ بات ملحوظ رہے کہ مصلی سے نماز جنازہ پڑھنے کی جگہ مراد ہے اور نماز جنازہ پڑھنے کی جگہ وہیں بقیع غرقد میں تھی تو پھر کوئی تضاد نہیں رہے گا رہی یہ بات کہ ترمذی کی روایت میں جو یہ منقول ہے کہ ماعزؓ کے چوتھی بار اقرار کرنے کے بعد اس کی سنگساری کا حکم جاری کیا گیا چنانچہ اس کو حرہ لے جایا گیا اور وہاں سنگسار کیا گیا جیسا کہ یہاں ابوداؤد کی روایت میں بھی یہی ہے کہ اس کو حرہ لے جایا گیا تو اس کی تاویل یہ کی جائے گی کہ جب وہ پتھروں کی چوٹ کھا کر بھاگا تو اس کا پیچھا کیا گیا تا آنکہ اس کو حرہ لے جایا گیا یہ تاویل اس لئے ضروری ہے کہ پھر یہ بات صحیح ثابت نہیں ہوگی کہ ماعزؓ کو سنگسار کرنے کے لئے حرہ لے جایا گیا تھا کیونکہ صحاح اور حسان کی روایتیں اس بات کی موید ہیں کہ شروع میں ماعزؓ کو سنگسار کرنے کے لئے حرہ کی طرف نہیں لے جایا گیا تھا بلکہ جب اس کو سنگسار کیا جانے لگا تو وہ خود بھاگ کر حرہ چلا گیا تھا یا یہ توجیہ کی جائے کہ مصلی جہاں ماعز کو سنگسار کیا گیا حرہ ہی کے آس پاس ہوگا لہٰذا کسی راوی نے تو مصلی کا ذکر کیا اور کسی راوی نے حرہ کا اس صورت میں دونوں احادیث کے مفہوم میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی۔

زنا کی کثرت کا وبال

(۲۸) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ قَوْمٍ يَظْهَرُ فِيْهِمُ الزِّنَا اِلَّا

اُخِذُوْا بِالسَّنَةِ وَمَامِنْ قَوْمٍ يَظْهَرُ فِيْهِمُ الرُّشَا اِلَّا اُخِذُوْا بِالرُّعْبِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عمروؓ ابن العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس قوم میں زنا کی کثرت ہو جاتی ہے اس کو قحط اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور جس قوم میں رشوت کی وبا عام ہو جاتی ہے اس پر رعب (وخوف) مسلط کر دیا جاتا ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: "رشوت" اس مال کو کہتے ہیں جو کسی شخص کو اس شرط کے ساتھ دیا جائے کہ وہ اس کے کام میں مدد کرے۔ بعض حضرات نے اس تعریف میں اس قید کا بھی اضافہ کیا ہے کہ اس کام میں اتنی مشقت و محنت نہ ہو جس کی اجرت عام طور پر دیئے گئے مال کے بقدر دی جاتی ہو جیسے کسی بادشاہ یا حاکم کے سامنے کوئی بات سفارش کے طور پر کہہ دینی یا اس میں سعی و کوشش کرنی اس سے معلوم ہوا کہ محنت و مشقت کے بقدر مال دینا رشوت نہیں کہلائے گا اسی طرح اگر بلاشرط مال دیا جائے تو بھی رشوت کے حکم میں نہیں ہوگا۔

بہرکیف اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رشوت محض ایک سماجی برائی اور ایک شرعی گناہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ظلم بھی ہے کہ جس کی سزا آخرت میں تو ملے ہی گی اس کا وبال مختلف صورتوں میں اس دنیا میں بھی ظاہر ہوتا ہے چنانچہ یہاں حدیث میں اسی ذکر کیا گیا ہے کہ رشوت کی نحوست ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ... را سے بزدل بنا کر غیروں کی ہیبت میں اور اپنوں کے خوف میں مبتلا کر دیتی ہے۔

غیروں کی ہیبت تو یوں مسلط ہو جاتی ہے کہ راشی رشوت لینے والا اپنا ضمیر و ایمان بیچ ڈالتا ہے اور جب وہ ضمیر و ایمانداری کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کے اندر سے وہ ساری توانائی اور قوت ختم ہو جاتی ہے جو اس کو غیروں کے مقابلہ پر عظمت و برتری کا احساس دلاتی ہے۔ اپنوں کا خوف اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی حاکم و کارکن رشوت نہیں لیتا تو وہ اپنا حکم اپنے ہر ادنی و اعلی پر جاری کرتا ہے اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا لیکن جب وہ رشوت سے آلودہ ہو جاتا ہے تو پھر اس پر ایک خوف مسلط ہو جاتا ہے جو اسے قدم قدم پر اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی اور اجرائے احکام سے جھجکاتا رہتا ہے کہ اس کے کسی حکم یا کسی کاروائی سے کوئی ایسا شخص ناراض نہ ہو جائے جس سے کہ اس کو رشوت کی صورت میں ناجائز مالی فائدے حاصل ہیں یا جو اس کو رشوت ستانی کے جرم کا رازدار ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب رشوت کی وبا عام ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے ہر حاکم و کارکن ہیبت و خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پورا نظام حکومت، بہت خوفناک قسم کی بدحالی و بے اعتمادی اور لاقانونیت کا شکار ہو جاتا ہے اور ساری قوم بے اطمینانی اور مصائب و پریشانیوں میں گھر کر رہ جاتی ہے۔

اغلام لعنت کا باعث ہے

(۲۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَاَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَلْعُوْنٌ مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ۔ رَوَاهُ رَزِيْنٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهٗ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ عَلِيًّا اَحْرَقَهُمَا وَاَبَابَكْرٍ هَدَمَ عَلَيْهِمَا حَائِطًا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص قوم لوط کا سا عمل یعنی اغلام کرے وہ ملعون ہے۔" (رزین)

اور رزینؒ ہی کی ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ "حضرت علیؓ نے بطور سزا اغلام کرنے والے اور کرانے والے دونوں کو جلوا دیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے ان پر دیوار گروا دی تھی۔"

تشریح: جامع صغیر میں امام احمدؒ نے حضرت حسنؒ کی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص اپنی ماں کو برا کہے وہ ملعون ہے جو شخص غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرے وہ ملعون ہے جو شخص اسلامی سلطنت کی زمین کی سرحدوں میں رد و بدل کرے وہ ملعون ہے جو شخص کسی اندھے کو غلط راستہ بتائے وہ ملعون ہے جو شخص جانور سے بدفعلی کرے وہ ملعون ہے

اور جو شخص قوم لوط کا سا عمل کرے یعنی اغلام کرے وہ ملعون ہے۔

(۳۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی رَجُلٍ اَتٰی رَجُلًا اَوِامْرَأَۃً فِیْ دُبُرِھَا۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ عزوجل اس شخص پر نظر رحمت نہیں کرتا جو کسی مرد یا عورت کے ساتھ بد فعلی کرے۔" اس روایت کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

جانور کے ساتھ بد فعلی کرنے والا حد کا سزاوار نہیں ہوتا

(۳۱) وَعَنْہُ اَنَّہٗ قَالَ مَنْ اَتٰی بَھِیْمَۃً فَلَا حَدَّ عَلَیْہِ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ عَنْ سُفْیَانَ الثَّوْرِیِّ اَنَّہٗ قَالَ وَھٰذَا اَصَحُّ مِنَ الْحَدِیْثِ الْاَوَّلِ وَھُوَ مَنْ اَتٰی بَھِیْمَۃً فَاقْتُلُوْہُ وَالْعَمَلُ عَلٰی ھٰذَا عِنْدَ اَھْلِ الْعِلْمِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے (بطریق مرفوع) کہا کہ جو شخص جانور کے ساتھ بد فعلی کرے وہ حد کا سزاوار نہیں لیکن قابل تعزیر ہے اس روایت کو ترمذیؒ اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے نیز ترمذیؒ سفیان ثوری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی سفیان نے) کہا کہ یہ حدیث ابن عباسؓ کی اس پہلی حدیث سے زیادہ صحیح ہے جو دوسری فصل میں ان سے نقل کی گئی ہے اور وہ پہلی حدیث یہ ہے کہ جو شخص جانور سے بد فعلی کرے اس کو مار ڈالو چنانچہ علماء نے اسی پر عمل کیا ہے کہ جانور کے ساتھ بد فعلی کرنے والا حد کا سزاوار نہیں ہوتا البتہ بطور تعزیر اس کو کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔"

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کا اپنا قول ہے لیکن اس صورت میں سفیان ثوریؒ کے اس قول کہ یہ حدیث پہلی حدیث سے زیادہ صحیح ہے کے کوئی معنی نہیں رہیں گے لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ یہ حضرت ابن عباسؓ کا اپنا قول نہیں ہے بلکہ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

حد جاری کرنے میں کوئی فرق و امتیاز نہ کرو

(۳۲) وَعَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقِیْمُوْا حُدُوْدَ اللّٰہِ فِی الْقَرِیْبِ وَالْبَعِیْدِ وَلَا تَاْخُذْکُمْ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃُ لَائِمٍ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبادہؓ ابن صامت راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قریب و بعید سب پر حدود اللہ جاری کرو اور خبردار اللہ کا حکم یعنی حد جاری کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت تمہارے آڑے نہ آئے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: قریب و بعید سے نزدیک کے اور دور کے رشتے دار مراد ہیں کہ اگر مجرم تمہارا دور کا جاننے والا ہے تو اس پر بھی حد جاری کرو اور اگر نزدیکی رشتہ دار ہے تو اس پر بھی حد جاری کرو ایسا نہ ہو کہ دور کے جاننے والے پر تو حد جاری کر دو اور نزدیکی رشتہ دار پر حد جاری کرنے سے باز رہو یا یہ کہ قریب سے مراد کمزور ہے کہ اس تک پہنچنا نزدیک اور اس پر حد جاری کرنا آسان ہوتا ہے اور بعید سے مراد قوی ہے کہ اس تک پہنچنا بعید اور اس پر حد جاری کرنا دشوار ہوتا ہے اور یہی مراد حدیث کی منشاء کے زیادہ قریب ہے کیونکہ یہاں بھی ہدایت دینا مقصد ہے کہ حد ہر مجرم پر جاری کرو خواہ وہ امیر ہو یا غریب، شاہ ہو یا گدا کمزور ہو یا قوی اور اپنا عزیز ہو یا غیر عزیز ہو۔

حد جاری کرنے کے دور رس فوائد

(۳۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِقَامَۃُ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنْ مَّطَرِ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً فِیْ

بِلاَدِ اللّٰہِ۔ رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَرَوَاہُ النِّسَائِی عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ حدود اللہ میں سے کسی ایک حد کا جاری کرنا خدا کے تمام شہروں پر چالیس رات تک بارش برسنے سے بہتر ہے (ابن ماجہ) نسائی نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس کی وجہ یہ ہے کہ حد جاری کرنا گویا مخلوق کو گناہ اور معاصی کے ارتکاب سے روکنا ہے اور یہ آسمان کے دروازوں کے کھلنے یعنی نزول برکات کا سبب ہے، اس کے برخلاف حدود کو معاف کرنا یا ان کو جاری کونے میں سستی کرنا گویا مخلوق کو گناہ ومعاصی میں مبتلا ہونے کا موقع دینا ہے اور یہ چیز یعنی گناہ و معاصی کا پھیل جانا قحط سالی میں گرفتار ہونے کا سبب اور انسان ہی نہیں بلکہ غیر انسانی مخلوق کو بھی ہلاکت وبربادی کے دروازے پر پہنچانے کا ذریعہ ہے جیسا کہ منقول ہے کہ حباری بنی آدم کے گناہوں کے سبب مارے دبلاپے کے مرجاتا ہے یعنی انسان عمومی طور پر برائیوں کی راہ پر لگ جاتا ہے اور گناہ و معاصی کے ارتکاب کی کثرت ہوجاتی ہے تو اس کی نحوست سے اللہ تعالیٰ بارش نہیں برساتا اور جب بارش نہیں ہوتی تو صرف انسانوں ہی کے لئے قحط نہیں پھیلتا بلکہ اس کی وجہ سے چرند وپرند بھی اپنے رزق سے محروم ہوجاتے ہیں اور وہ مرنے لگتے ہیں۔

"حباری" ایک جانور کا نام ہے یہاں خاص طور پر اس کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ دور دور سے اپنے چارہ تلاش کر کے لاتا ہے۔

بَابُ قَطْعِ السَّرِقَۃِ
چور کے ہاتھ کاٹنے کا بیان

طیبیؒ نے کہا ہے کہ قطع السرقۃ میں اضافت بحذف مضاف مفعول کی طرف ہے یعنی معنی کے اعتبار سے یہ عنوان یوں ہے باب قطع اھل السرقۃ۔

سرقہ کے معنی: سرقہ سین کے زبر اور را کے زیر کے ساتھ چوری کے معنی میں ہے اور اصطلاح شریعت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی مکلف کسی کے ایسے محرز مال میں سے کچھ یا سب خفیہ طور پر لے لے جس میں نہ تو اس کی ملکیت ہو اور نہ شبہ ملکیت۔

چوری کی سزا اور اس کا نصاب: یہ بات تو عنوان ہی سے معلوم ہوگئی کہ اسلامی قانون میں چور کی سزا قطع ید ہاتھ کاٹ دینا ہے لیکن اس بارہ میں فقہا کا باہم اختلاف ہے کہ کتنی مالیت کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے؟ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ نصاب سرقہ مال کی وہ مقدار جس پر قطع ید کی سزا دی جائے گی کم از کم دس درہم تقریباً ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے اس سے کم مالیت کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی اور حضرت امام شافعیؒ چوتھائی دینار سونا یا تین درہم چاندی اور یا اس قیمت کی کسی بھی چیز کو نصاب سرقہ قرار دیتے ہیں ان کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں چوتھائی دینار چرانے والے کو قطع ید کی سزا دینا مذکور ہے اور اس وقت چوتھائی دینار تین درہم کے برابر تھا اور ایک دینار کی مالیت بارہ درہم کے برابر تھی۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ:

لَاقَطْعَ اِلَّا فِیْ دِیْنَارٍ اَوْعَشَرَۃِ دَرَاھِمَ

"ایک دینار یا دس درہم سے کم کی چوری پر قطع ید نہیں ہے۔"

نیز ہدایہ کے قول کے مطابق اس بارہ میں "اکثر" پر عمل کرنا "اقل" پر عمل کرنے سے بہتر ہے کیونکہ معاملہ ایک انسانی عضو کے کاٹنے کا ہے اور "اقل" میں عدم جنایت کا شبہ ہوسکتا ہے۔

واضح رہے کہ فقہاء کے اس اختلاف کی بنیاد اس پر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ایک ڈھال کی چوری پر دی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کی طرف سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ایک ڈھال کی قیمت تین درہم تھی جب کہ حنفیہ کی طرف سے شمنیؒ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں اس کی قیمت دس درہم تھی حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ سے ابن ابی شیبہؒ نے یہی نقل کیا ہے نیز کافی میں بھی یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جس ڈھال کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی گئی تھی تو اس کی قیمت دس درہم تھی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نصاب سرقہ کے بارہ میں امام شافعیؒ کی مستدل حدیث

(۱) عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُقْطَعُ يَدُ السَّارِقِ اِلَّا بِرُبُعِ دِيْنَارٍ فَصَاعِدًا۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "چور کا ہاتھ اسی صورت میں کاٹا جائے جب کہ اس نے چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی مالیت کی چوری کی ہو۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ کے اس مسلک کی دلیل ہے کہ چوتھائی دینار سے کم مالیت کی چوری پر ہاتھ نہ کاٹا جائے گویا ان کے نزدیک نصاب سرقہ کی کم سے کم مقدار چوتھائی دینار ہے ملا علی قاریؒ نے اپنی کتاب میں اس حدیث کے تحت بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور اس مسئلہ میں علماء کے جو اختلافی اقوال ہیں ان کو نقل کر کے حنفیہ کے مسلک کو بڑی مضبوط دلیلوں سے ثابت کیا ہے۔

ڈھال کی قیمت کے تعیّن میں اختلافی اقوال

(۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَطَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَ سَارِقٍ فِيْ مِجَنٍّ ثَمَنُهُ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک ڈھال کے چرانے پر جس کی قیمت تین درہم تھی، چور کا داہنا ہاتھ کٹوا دیا تھا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: شمنیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس روایت کے معارض ہے جو ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہؓ ابن عمرو ابن العاص سے نقل کی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ اس ڈھال کی قیمت دس درہم تھی حضرت ابن عباسؓ اور عمرو ابن شعیب سے بھی اسی طرح منقول ہے نیز شیخ ابن ہمامؒ نے بھی ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے یہی بات نقل کی ہے کہ اس ڈھال کی قیمت دس درہم تھی اور عینیؒ نے ہدایہ کے حاشیہ میں بھی یہی لکھا ہے چنانچہ اسی بنیاد پر حنفیہ کا یہ مسلک ہے کہ قطع ید ہاتھ کاٹنے کی سزا اسی چور پر نافذ ہوگی جس نے کم سے کم دس درہم کے بقدر مال کی چوری کی ہو اس سے کم مالیت کی چوری پر یہ سزا نہیں دی جائے گی جہاں تک ابن عمرؓ کی اس روایت کا تعلق ہے جس سے اس ڈھال کی قیمت تین درہم متعیّن کی حالانکہ حقیقت میں وہ ڈھال دس درہم کی مالیت کی تھی جیسا کہ اکثر روایتوں سے ثابت ہوا اس موقع پر شیخ عبدالحقؒ اور ملا علی قاریؒ نے اپنی اپنی شرح میں بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اہل علم ان کی کتابوں سے مراجعت کر سکتے ہیں۔

تمام ائمہ کے مسلک کے خلاف ایک حدیث اور اس کی وضاحت

(۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ السَّارِقَ يَسْرِقُ الْبَيْضَةَ فَتُقْطَعُ يَدُهٗ وَيَسْرِقُ الْحَبْلَ فَتُقْطَعُ يَدُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا چور پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ وہ بیضہ چراتا ہے اور اس کا

ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور رسی چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بلا تعین گنہگاروں پر لعنت بھیجنا جائز ہے اور یہی بات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَلَا لَعْنَتُ اللّٰہِ عَلَی الظَّالِمِیْنَ سے بھی ثابت ہوتی ہے ہاں کسی شخص کو متعین کر کے یعنی اس کا نام لے کر اس پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے۔

نصاب سرقہ کے سلسلے میں یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ چوتھائی دینار یا تین درہم سے بھی کم مالیت کی چوری پر قطع ید کی سزا جاری ہو سکتی ہے جب کہ چاروں ائمہ میں سے کسی کے بھی مسلک میں چوتھائی دینار یا تین درہم سے کم میں قطع ید کی سزا نہیں ہے اس اعتبار سے یہ حدیث تمام ائمہ کے مسلک کے خلاف ہے لہٰذا ان سب کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں بیضہ سے بیضہ آہن مراد ہے کہ جسے خود کہا جاتا ہے اور جس کو مجاہدین اور فوجی اپنے سروں پر پہنتے ہیں اسی طرح رسی سے کشتی کی رسی مراد ہے جو بڑی قیمتی ہوتی ہے علاوہ ازیں بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں انڈے اور رسی کے چرانے پر قطع ید کی سزا دی جاتی تھی مگر بعد میں اس کو منسوخ قرار دے دیا گیا۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کی مراد یہ ہے کہ اس کو چوری کی عادت اسی طرح پڑتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی اور کمتر چیزیں چراتے چراتے بڑی بڑی اور قیمتی چیزیں چرانے لگتا ہے جس کے نتیجے میں اس کو قطع ید کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

پھل وغیرہ کی چوری میں قطع ید کی سزا ہے یا نہیں؟

④ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا قَطْعَ فِیْ ثَمَرٍ وَلَا کَثَرٍ۔

(رواہ مالک والترمذی وابوداؤد والنسائی والدارمی وابن ماجۃ)

"حضرت رافعؓ ابن خدیج نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا درخت پر لگے ہوئے میوے اور کھجور کے سفید گابھے کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے۔" (مالکؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یہ حدیث حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی مستدل ہے وہ اس کی بنیاد پر فرماتے ہیں کہ تر میوہ پھل چرانے پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا خواہ وہ میوہ محرز ہو یا غیر محرز ہو محرز کی تعریف پیچھے گذر چکی ہے اسی طرح خشک میوہ جو درخت پر لگا ہوا ہو اور وہ کھیتی جو کاٹ کر کھلیان میں جمع نہ کی گئی ہو ان کی چوری میں بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے اسی پر گوشت دودھ اور ان چیزوں کو بھی قیاس کیا گیا ہے جو دیرپا نہ ہوں اور جلدی ہی خراب و متغیر ہو جاتی ہوں کہ ان کی چوری میں بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا امام اعظم کے علاوہ دوسروں نے ان سب چیزوں کی چوری میں قطع ید کی سزا کو واجب کیا ہے چنانچہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ وہ چیزیں جو بہت معمولی اور حقیر ہوں اور جو دار اسلام میں ہر شخص کے لئے مباح کے درجہ میں ہوں جیسے گھاس لکڑی نرسل مچھلی پرندہ ہڑتال اور چونا وغیرہ ان کی چوری کرنے والا بھی قطع ید کا سزاوار نہیں ہوگا۔

⑤ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ سُئِلَ عَنِ الثَّمَرِ الْمُعَلَّقِ قَالَ مَنْ سَرَقَ مِنْہُ شَیْئًا بَعْدَ اَنْ یُّؤْوِیَہُ الْجَرِیْنُ فَبَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ فَعَلَیْہِ الْقَطْعُ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے

ہیں کہ آپ ﷺ سے درخت پر لگے ہوئے پھلوں کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ان پھلوں میں سے کچھ اس وقت چرائے جب کہ ان کو درختوں سے توڑ کر جمع کر لیا گیا ہو اور ان (چرائے ہوئے پھلوں) کی قیمت ایک ڈھال کی قیمت کے برابر ہو تو وہ قطع ید کا سزاوار ہوگا۔" (ابو داود، نسائی)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے کیونکہ وہ محرز نہیں ہے ہاں جب وہ پھل درخت پر سے توڑ لئے گئے اور ان کو خشک ہونے کے لئے کھلیان میں جمع کر دیا گیا تو اب ان کی چوری میں قطع ید کی سزا واجب ہوگی کیونکہ اس صورت میں وہ محرز ہو گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حدیث امام ابوحنیفہؒ کے سوا جمہور علماء کی دلیل ہے کیونکہ امام ابوحنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ پھل جب تک خشک نہیں ہوا ہے اس کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے خواہ وہ پھل محرز ہو یا غیر محرز۔ اس حدیث کے بارہ میں حنفیہ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ حدیث میں "جب کہ ان کو توڑ کر جمع کر لیا گیا ہو" کی قید کا تعلق ان پھلوں کے خشک ہو جانے کے بعد سے ہے جیسا کہ عرب میں رواج تھا (کہ جس طرح درخت سے پھلوں کو توڑ کر خشک ہونے کے لئے ان کو کھلیان وغیرہ میں پھیلا دیا جاتا تھا اس طرح پھلوں کو ان کے خشک ہونے کے بعد کسی جگہ جمع بھی کر دیا جاتا تھا) اور حنفیہ کے نزدیک بھی ان پھلوں کی چوری میں قطع ید کی سزا جاری ہوگی جو خشک ہونے کے بعد کھلیان وغیرہ میں جمع کئے گئے ہیں۔ پھل جب تک خشک نہ ہوں اس وقت تک ان کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہوگی خواہ وہ درخت پر لگے ہوئے ہوں یا ان کو توڑ کر کھلیان وغیرہ میں جمع کر دیا گیا ہو جیسا کہ "ثمر" (تازہ پھل) کے بارہ میں پچھلی حدیث میں بیان کیا جا چکا ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات مدنظر رہنی چاہئے کہ یہ حدیث نہ صرف پچھلی حدیث لاقطع فی ثمر ولا کثر کے مطلق مفہوم کے معارض ہے بلکہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد ولاقطع فی الطعام (کھانے کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے) کے بھی معارض ہے چونکہ حدود کے باب میں ضروری ہے کہ مسلمان کی جان اور اس کے اعضاء کے تحفظ کے پیش نظر حد جاری کرنے میں حتی الامکان احتیاط و رعایت کے تمام گوشوں کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر ایسے نکتہ و پہلو کو ترجیح دی جائے جس سے نفاذ حد، کم سے کم قابل عمل رہے اس لئے ان احادیث کے تعارض کی صورت میں اس حدیث کو ترجیح دی جانی چاہئے جس کا مفہوم پھل کی چوری کے سلسلے میں بالکل مطلق ہے۔ اس موقع پر بھی ملا علی قاری نے اپنی کتاب مرقات میں بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اہل علم ان کی کتاب سے مراجعت کر سکتے ہیں۔

غیر مملوکہ پہاڑی جانوروں پر چوری کا اطلاق نہیں ہوگا

(۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ حُسَیْنِ الْمَکِّیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاقَطْعَ فِیْ ثَمَرٍ مُعَلَّقٍ وَلَا فِیْ حَرِیْسَةِ جَبَلٍ فَاِذَا اٰوَاهُ الْمُرَاحُ وَالْجَرِیْنُ فَالْقَطْعُ فِیْمَا بَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت عبداللہ ابن عبدالرحمن ابن ابوحسین مکی سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "درخت پر لگے ہوئے میوے اور پہاڑوں پر چرنے والے جانوروں کے مقدمہ میں قطع ید کی سزا نہیں ہے ہاں اگر کوئی شخص کسی پہاڑی جانور کو جانوروں کے بندھنے کی جگہ لاکر باندھ دے یا میوے کو (خشک ہونے کے بعد) کھلیان میں جمع کر دے تو اس کی چوری میں قطع ید کی سزا دی جائے گی بشرطیکہ شئے مسروقہ کی مالیت ایک ڈھال کی قیمت کے بقدر یا اس سے زائد ہو۔" (مالکؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ لفظ حَرِیْسَةِ دراصل مفعول کے معنی میں ہے گویا حریسة جبل معنی کے اعتبار سے محروسة جبل ہے اور محروسة جبل اس جانور کو کہتے ہیں جو پہاڑوں پر چرتا پھرتا ہو اور کوئی شخص اس کی حفاظت نہ کرتا ہو یعنی وہ کسی کی ملکیت میں نہ ہو، ایسے ہی جانور کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کو پکڑ لائے تو اس پر چوری کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ نہ تو وہ جانور محرز ہے اور نہ کسی کی ملکیت میں ہے، ہاں اگر پہلے سے کسی شخص نے اس جانور کو پکڑ کر اپنے یہاں باندھ رکھا ہے تو چونکہ اب وہ جانور ایک شخص کی

ملکیت میں آگیا ہے اس لئے اگر کوئی دوسرا شخص اس کو وہاں سے چرائے گا اور اس کی قیمت ایک ڈھال کی قیمت کے بقدر یا اس سے زائد ہوگی تو چرانے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

لٹیرے کی سزا قطع ید نہیں ہے

⑦ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ عَلَى الْمُنْتَهِبِ قَطْعٌ وَمَنِ انْتَهَبَ نُهْبَةً مَشْهُوْرَةً فَلَيْسَ مِنَّا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "لٹیرے کی سزا قطع ید نہیں ہے اور جو شخص لوگوں کو لوٹے وہ ہم میں سے نہیں ہے (یعنی ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والا نہیں ہے)۔" (ابوداؤد)

تشریح: "لٹیرا" (لوٹنے والا) اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں کا مال زبردستی حاصل کرے اس طرح لوگوں کا مال لوٹنا اگرچہ چوری چھپے مال اڑانے سے بدتر ہے لیکن ایسے شخص پر "چور" کا اطلاق نہ ہونے کی وجہ سے اس کو قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ چور اس شخص کو کہتے ہیں جو چھپ چھپا کر لوگوں کا مال اڑائے۔

خائن قطع ید کا سزاوار نہیں

⑧ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ عَلَى خَائِنٍ وَلَا مُنْتَهِبٍ وَلَا مُخْتَلِسٍ قَطْعٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَرَوَى فِي شَرْحِ السُّنَّةِ اَنَّ صَفْوَانَ بْنَ اُمَيَّةَ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَنَامَ فِي الْمَسْجِدِ وَتَوَسَّدَ رِدَاءَهُ فَجَاءَ سَارِقٌ وَاَخَذَ رِدَاءَهُ فَاَخَذَهُ صَفْوَانُ فَجَاءَ بِهِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَ اَنْ تُقْطَعَ يَدُهُ فَقَالَ صَفْوَانُ اِنِّيْ لَمْ اُرِدْ هٰذَا هُوَ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَلَّا قَبْلَ اَنْ تَاْتِيَنِيْ بِهِ وَرَوٰى نَحْوَهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ صَفْوَانَ عَنْ اَبِيْهِ وَالدَّارِمِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خیانت کرنے والے، لوٹنے والے اور اچکے کا ہاتھ کاٹنا مشروع نہیں ہے۔" (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی) اور صاحب مصابیح نے شرح السنۃ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ (ایک دن) حضرت صفوان ابن امیہ مدینہ تشریف لائے اور مسجد میں سر کے نیچے اپنی چادر رکھ کر سو گئے اسی (دوران) ایک چور آیا اور اس نے ان کی وہ چادر (آہستہ سے کھینچ لی (اور بھاگنا چاہا) مگر صفوانؓ نے اس کو پکڑ لیا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائے (اور واقعہ بیان کیا، آنحضرت ﷺ نے (خود مجرم کے اقرار یا گواہوں کے ذریعہ چوری ثابت ہو جانے پر) اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ (یہ فیصلہ سن کر) حضرت صفوانؓ (کو رحم آگیا اور انہوں نے کہا کہ "اس کو آپ ﷺ کی خدمت میں لانے سے میرا یہ ارادہ نہیں تھا (کہ صرف میری چادر کی وجہ سے اس کے ہاتھ کاٹے جائیں اس لئے میں سفارش کرتا ہوں کہ آپ ﷺ اس کو معاف فرمادیں) میں نے اپنی چادر اس کو صدقہ کر دی۔" رسول کریم ﷺ نے فرمایا "پھر اس کو میرے پاس لانے سے پہلے ہی تم نے اپنی چادر اس کو صدقہ کیوں نہ کر دی تھی اور اس کو معاف کیوں نہیں کر دیا تھا۔" اسی طرح کی روایت ابن ماجہ نے عبداللہ ابن صفوان سے اور انہوں نے اپنے والد (حضرت صفوانؓ سے) اور دارمیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی۔"

تشریح: "خائن" اس شخص کو کہتے ہیں جس کو کوئی چیز بطور عاریت کے یا امانت رکھنے کے لئے دی جائے اور وہ اس کی چیزیں کچھ یا سب ہضم کر جائے اور یہ دعویٰ کرے کہ وہ چیز ضائع ہوگئی ہے یا سرے سے اس کا انکار کر دے یعنی یہ کہے کہ وہ چیز مجھے نہیں دی گئی ہے۔ اگرچہ ایسا شخص بہت گنہ گار ہوتا ہے مگر قطع ید کا مستوجب نہیں ہوتا کیونکہ خائن جس چیز کو ہتھیاتا ہے وہ پوری طرح "محرز" یعنی محفوظ مال کے حکم میں نہیں ہوتی ہدایہ میں یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح لٹیرے اور اچکے کو بھی قطع ید کی سزا اس لئے نہیں دی جاتی کہ وہ غیر کا مال چھپ چھپا کر نہیں لیتے جیسا کہ پچھلی حدیث کی تشریح میں اس کی وضاحت کی گئی۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ چاروں ائمہ کا یہی مسلک ہے۔

"سر کے نیچے چادر رکھنے" کے بارے میں ہدایہ میں لکھا ہے کہ صحیح تر بات یہ ہے کہ کسی چیز کا اپنے سر کے نیچے رکھنا "حرز" ہے حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اس کو پہلے ہی کیوں نہ معاف کر دیا تھا اور اپنا حق کیوں نہیں چھوڑ دیا تھا اب جب تم اس کو میرے پاس لے آئے اور اس کا جرم ثابت ہو جانے پر میں نے اس کا ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دے دیا تو اس کا ہاتھ کاٹنا واجب ہو گیا ہے، اب اس معاملہ میں تمہارا کوئی حق باقی نہیں رہ گیا ہے بلکہ یہ اللہ کا حق ہو گیا ہے لہٰذا تمہارے معاف کرنے سے اس کا جرم معاف نہیں ہو گا! اس سے معلوم ہوا کہ چور جب حاکم کے سامنے پیش ہو جائے اور اس کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر اسے کوئی بھی سزا سے نہیں بچا سکتا، خود مدعی اور صاحب مال کے معاف کرنے سے بھی اس کی سزا معاف نہیں ہو گی، ہاں حاکم کے پاس قضیہ پہنچنے سے پہلے اس کو معاف کر دینا جائز ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو چوری کی وجہ سے اس کے ہاتھ کاٹنے کی سزا سنا دی جائے اور پھر اسے چوری کی ہوئی چیز کو اس کا مالک اس شخص (چور) کو ہبہ کر کے اس کے سپرد کر دے یا اس چیز کو اس کے ہاتھ فروخت کر دے تو اس صورت میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ لیکن امام زفرؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور حضرت امام ابویوسفؒ کا بھی ایک قول یہی ہے اور حضرت صفوانؓ کی مذکورہ حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے چنانچہ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک روایت میں تو یہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح یہاں نقل کی گئی لیکن حاکم وغیرہ کی روایت میں اس طرح نہیں ہے بلکہ کچھ اضافہ وزیادتی کے ساتھ ہے لہٰذا اس اضافہ وزیادتی کی وجہ سے اضطراب واقع ہو گیا اور اضطراب حدیث کے ضعیف ہونے کا موجب ہو جاتا ہے۔

سفر جہاد میں چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے

⑨ وَعَنْ بُسْرِ بْنِ اَرْطَاةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تُقْطَعُ الْاَيْدِيْ فِي الْغَزْوِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ اِلَّا اَنَّهُمَا قَالَا فِي السَّفَرِ بَدَلَ الْغَزْوِ۔

"اور حضرت بسرؓ ابن ارطاۃ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ "غزوہ میں قطع ید کی سزا نافذ نہیں ہو گی۔" (اس روایت کو ترمذی، دارمی، ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے لیکن ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں "غزوہ" کی بجائے "سفر" کا لفظ ہے۔"

تشریح: ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب ہے کہ جب اسلامی لشکر دارالحرب میں کفار سے برسر جہاد ہو اور امام وقت ان میں موجود نہ ہو بلکہ امیر لشکر ان کا کارپرداز ہو اور اس وقت (جہاد میں) کوئی شخص چوری کا مرتکب ہو جائے تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے، اس طرح دوسری حدود بھی جاری نہ کی جائیں۔ چنانچہ بعض فقہاء نے اس پر عمل کیا ہے اور اس کی بنیاد یہ احتمال ہے۔ کہ مبادا وہ شخص (اس سزا کے خوف سے) دارالحرب ہی کو اپنا مستقل مسکن بنا لے اور اس طرح وہ فتنہ وگمراہی میں مبتلا ہو جائے یا یہ خوف بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے مجاہدین میں بددلی اور تفرقہ نہ پیدا ہو جائے۔ طیبیؒ نے وضاحت کی ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہ مسلک ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ "غزوہ میں قطع ید کی سزا نافذ نہ ہونے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسلامی لشکر کا کوئی فرد مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے اس میں سے کچھ چرائے تو اس کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں کیونکہ اس مال غنیمت میں اس کا بھی حق ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں "سفر" کا جو لفظ مطلق نقل کیا گیا ہے اس کو مقید پر محمول کیا جائے یعنی "سفر" سے "سفر جہاد" مراد لیا جائے۔

دوبارہ اور سہ بارہ چوری کرنے کی سزا

⑩ وَعَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي السَّارِقِ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا يَدَهُ ثُمَّ اِنْ

سَرَقَ فَاقْطَعُوْا رِجْلَهٗ ثُمَّ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا يَدَهٗ ثُمَّ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا رِجْلَهٗ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوسلمہ حضرت ابوہریرہ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے چور کے بارے میں فرمایا کہ "جب وہ چوری کرے تو اس کا (دایاں) ہاتھ کاٹا جائے، پھر اگر چوری کرے تو اس کا (بایاں) ہاتھ کاٹا جائے اور پھر اگر چوری کرے تو اس کا (دایاں) پیر کاٹا جائے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: پہلی مرتبہ چوری کرنے پر دایاں ہاتھ کاٹنا اور پھر دوبارہ چوری کرنے پر بایاں پیر کاٹنا تو علماء کا متفقہ مسلک ہے لیکن پھر تیسری مرتبہ چوری کرنے پر بایاں ہاتھ کاٹنے اور چوتھی مرتبہ چوری کرنے پر دایاں پیر کاٹنے کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطابق تیسری اور چوتھی مرتبہ چوری کرنے پر دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے، لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ تیسری مرتبہ چوری کرنے پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بلکہ اس کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے گا تاآنکہ وہ اسی میں مرجائے یا توبہ کرے امام اعظمؒ کے اس مسلک کی دلیل یہ ہے کہ اول تو اس بات پر صحابہؓ کا اجماع و اتفاق ہو گیا تھا، دوم یہ کہ کسی شخص کو اس کے چاروں ہاتھ پیر سے محروم کر دینا گویا اس کو اپنے وجود کی بقاء کے سارے ذرائع و اسباب سے محروم کر دینا ہے جو اس کے حق میں "سزا" سے بڑھ کر ایک قسم کی "زیادتی" ہے جہاں تک اس حدیث کا سوال ہے تو پہلی بات یہ ہے کہ اصل میں یہ حدیث تہدید و سیاسی مصالح پر محمول ہے، دوسری بات یہ کہ محدثین نے اس کے صحیح ہونے میں کلام کیا ہے چنانچہ طحاویؒ نے اس حدیث پر ان الفاظ میں طعن کیا ہے کہ میں نے صحابہؓ کے بہت سارے آثار و قضایا (اور نظائر و فیصلے) دیکھے لیکن انتہائی تلاش کے باوجود مجھے اس حدیث کی کوئی بنیاد نہیں مل سکی، علاوہ ازیں میں نے بہت سے حفاظ حدیث سے ملاقات کی وہ سب اس حدیث (کی واقفیت) سے انکار کرتے تھے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ پیر کاٹنے کے بارے میں اکثر علما کا قول یہ ہے کہ گھٹنے کے پاس سے پاؤں کاٹا جائے۔

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جِیْءَ بِسَارِقٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِقْطَعُوْهُ فَقُطِعَ ثُمَّ جِیْءَ بِهٖ الثَّانِيَةَ فَقَالَ اقْطَعُوْهُ ثُمَّ جِیْءَ بِهٖ الثَّالِثَةَ فَقَالَ اقْطَعُوْهُ فَقُطِعَ ثُمَّ جِیْءَ بِهٖ الرَّابِعَةَ فَقَالَ اِقْطَعُوْهُ فَقُطِعَ فَاُتِيَ بِهٖ الْخَامِسَةَ فَقَالَ اقْتُلُوْهُ فَانْطَلَقْنَا بِهٖ فَقَتَلْنَاهُ ثُمَّ اجْتَرَرْنَاهُ فَاَلْقَيْنَاهُ فِيْ بِئْرٍ وَرَمَيْنَا عَلَيْهِ الْحِجَارَةَ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَ النَّسَائِيُّ وَرَوٰى فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ فِيْ قَطْعِ السَّارِقِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اقْطَعُوْهُ ثُمَّ احْسِمُوْهُ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک چور کو لایا گیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کا (دایاں) ہاتھ کاٹ دو، چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، دوبارہ اس کو پھر لایا گیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ (اس کا بایاں پیر) کاٹ دو، چنانچہ (اس کا بایاں پاؤں) کاٹ دیا گیا، پھر تیسری مرتبہ اس کو لایا گیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا (اس کا بایاں ہاتھ) کاٹ دو، چنانچہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا پھر چوتھی مرتبہ لایا گیا تو فرمایا کہ (اس کا دایاں پیر) کاٹ دو، چنانچہ (اس کا دایاں پیر) کاٹ دیا گیا، اور پھر جب پانچویں مرتبہ اس کو لایا گیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو مار ڈالو، چنانچہ ہم اس کو (پکڑ کر) لے گئے اور مار ڈالا، اس کے بعد ہم اس کی لاش کو کھینچتے ہوئے لائے اور کنوئیں میں ڈال کر اوپر سے پتھر پھینک دیئے (ابوداؤدؒ، نسائی) اور بغویؒ نے شرح السنۃ میں چور کے ہاتھ کاٹنے کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ "اس کا ہاتھ کاٹو اور پھر اس (ہاتھ کو داغ دو۔"

تشریح: "اور پھر اس کو داغ دو" کا مطلب یہ ہے کہ جس ہاتھ کو کاٹا گیا ہے اس کو گرم تیل یا گرم لوہے سے داغ دو تاکہ خون بند ہو جائے اگر داغا نہ جائے گا تو جسم کا تمام خون بہہ جائے گا اور چور ہلاک ہو جائے گا۔

خطابیؒ فرماتے ہیں کہ میرے علم میں ایسا کوئی فقیہ و عالم نہیں ہے جس نے چور کو مار ڈالنا مباح رکھا ہو خواہ وہ کتنی ہی بار چوری کیوں نہ کرے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی لایحل دم امرء الا باحدی ثلث کے ذریعہ منسوخ ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس چور کو مار ڈالنے کا جو حکم دیا وہ سیاسی وانتظامی مصالح کی بناء پر تھا، چنانچہ امام وقت (حاکم) کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مفسدہ پردازوں، چور اچکوں اور ملکی امن وقانون کے مجرموں کی تعزیر میں اپنی رائے واجتہاد پر عمل کرے اور جس طرح چاہے ان کو سزا دے۔ اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو یہ معلوم ہوا ہو گا کہ یہ شخص مرتد ہو گیا ہے اس لئے آپ ﷺ نے اس کا خون مباح کر دیا اور اس کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔

اسی طرح بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو اس بات پر محمول کرنا اولی ہے کہ وہ شخص چوری کو حلال جانتا تھا اس لئے بار بار اس کا ارتکاب کرتا تھا اسی وجہ سے اس کو اتنی سخت سزا دی گئی بہر کیف ان تاویلات میں سے کسی بھی ایک تاویل کو اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس کو مار ڈالنے کے بعد اس کی لاش کو اس طرح کھینچ کر کنوئیں میں ڈال دینا ہرگز مباح نہ ہوتا۔

چور کا کٹا ہوا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دینے کا مسئلہ

⑫ وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ قَالَ أُتِىَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَارِقٍ فَقُطِعَتْ يَدُهٗ ثُمَّ أَمَرَ بِهَا فَعُلِّقَتْ فِيْ عُنُقِهٖ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت فضالہ ابن عبید کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک چور لایا گیا چنانچہ (آنحضرت ﷺ کے حکم سے) اس کا ہاتھ کاٹا گیا پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کا کٹا ہوا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دیا جائے (تاکہ اس سے دوسرے عبرت پکڑیں) چنانچہ وہ ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دیا گیا۔" (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ سے یہ منقول ہے کہ چور کا کٹا ہوا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دینا سنت ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ امام (حاکم) کی مرضی پر موقوف ہے کہ اگر وہ مناسب جانے تو چور کا کٹا ہوا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دے، یہ سنت نہیں ہے کیونکہ یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چور کا کٹا ہوا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکایا ہو۔

جو غلام چوری کرنے لگے اس کو بیچ ڈالو

⑬ وَعَنْ أَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَرَقَ الْمَمْلُوْكُ فَبِعْهُ وَلَوْ بِنَشٍّ۔
(رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا "اگر غلام چوری کرے تو اس کو بیچ ڈالو اگرچہ نش کے بدلے میں اس کو بیچنا پڑے۔" (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: نش نون کے زبر اور شین کے پیش کے ساتھ) نصف اوقیہ یعنی بیس درہم کو کہتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ چوری کرنے والے غلام کو بیچ ڈالو اگرچہ اس کو کتنی ہی کم قیمت میں کیوں نہ بیچنا پڑے کیونکہ چوری کا ارتکاب کر کے وہ "عیب دار" ہو گیا ہے اور عیب دار غلام کو اپنے پاس رکھنا مناسب نہیں ہے۔

حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور اکثر اہل علم یہ فرماتے ہیں کہ اگر غلام چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے خواہ وہ بھگوڑا ہو یا غیر بھگوڑا۔ اس بارہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ اگر خاوند بیوی میں سے کوئی ایک دوسرے کا مال چرائے یا کوئی غلام اپنے مالک یا اپنے مالک کی بیوی اور یا اپنی مالکہ کے خاوند کے مال کی چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ عام طور پر خاوند بیوی کو ایک دوسرے کے مال پر اور غلام کو اپنے آقا اور اس کے گھر والوں کے مال واسباب پر خود ان کی اجازت سے دسترس حاصل ہوتی

ہے اس صورت میں "حرز" کی شرط پوری طرح نہیں پائی جاتی جو قطع ید کی سزا کے لئے ضروری ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مجرم کو معاف کردینے کا حق حاکم کو حاصل نہیں ہے

(۱۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِسَارِقٍ فَقَطَعَهٗ فَقَالُوْا مَا كُنَّا نَرَاكَ تَبْلُغُ بِهٖ هٰذَا قَالَ لَوْ كَانَتْ فَاطِمَةُ لَقَطَعْتُهَا۔ (رواه النسائی)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک چور لایا گیا اور جب آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہمیں یہ خیال نہ تھا کہ آپ ﷺ اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمائیں گے (بلکہ ہمارا گمان تو یہ تھا کہ آپ اس کو معاف کردیں گے) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا "اگر فاطمہ (بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ کٹوا دیتا۔"

(نسائی)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چور کوئی ایسا شخص تھا جس سے آنحضرت ﷺ کی کوئی قرابت تھی، یا آپ ﷺ کے متعلقین میں سے کوئی فرد تھا اور اسی وجہ سے صحابہؓ کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ نرمی اور رعایت کئے جانے کا امکان تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے واضح کردیا کو قطع ید کی سزا اللہ تعالیٰ کا حق ہے جس کو نافذ کرنا مجھ پر واجب ہے، اس میں چشم پوشی کرنا نہ صرف یہ کہ عدل وانصاف کے منافی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی اور اس کے حق میں بے جا مداخلت کے مترادف بھی ہے اگر بالفرض میرے جگر کا ٹکڑا فاطمہؓ سے بھی یہ فعل صادر ہوتا تو میں اس پر بھی یہ سزا نافذ کرتا اور اس کے ہاتھ کٹوا دیتا۔

اگر غلام اپنے مالک کی چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا

(۱۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی عُمَرَ بِغُلَامٍ لَهٗ فَقَالَ اقْطَعْ يَدَهٗ فَاِنَّهٗ سَرَقَ مِرْاٰةً لِامْرَاَتِیْ فَقَالَ عُمَرُ لَا قَطْعَ عَلَیْهِ وَهُوَ خَادِمُكُمْ اَخَذَ مَتَاعَكُمْ۔ (رواه مالک)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر فاروقؓ کے پاس اپنے غلام کو لے کر آیا اور کہا کہ اس کے ہاتھ کٹوا دیجئے کیونکہ اس نے میری بیوی کا آئینہ چرا لیا ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "یہ قطع ید کا مستوجب نہیں ہے کیونکہ یہ تمہارا خدمت گار ہے اور تمہاری ہی چیز اس نے لی ہے۔" (مالکؒ)

تشریح: گویا حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ کے ذریعہ اس پر قطع ید کی سزا نافذ نہ کرنے کی علت ووجہ کی طرف اشارہ کیا اور وہ اذن (یعنی اجازت) کا پایا جانا ہے کہ تمہارے خادم ہونے کی حیثیت سے جب اس کو تمہارے ساتھ رہنے سہنے اور تمہارے مال واسباب کی دیکھ بھال کرنے کی اجازت حاصل ہے اور اس اعتبار سے تمہارے اور تمہارے گھر کا مال خود تمہاری مرضی سے اس کی دسترس میں ہے تو اس صورت میں "احراز یعنی مال کا غیر کی دسترس سے محفوظ ہونا" نہ رہا اور جب "احراز" نہ رہا تو پھر یہ قطع ید کا سزاوار بھی نہیں ہوگا چنانچہ حنفیہ اور حضرت امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے جب کہ دوسرے علماء کا مسلک اس کے برخلاف ہے۔

کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے یا نہیں؟

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا ذَرٍّ قُلْتُ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ كَيْفَ اَنْتَ اِذَا اَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ يَكُوْنُ الْبَيْتُ فِيْهِ بِالْوَصِيْفِ يَعْنِی الْقَبْرَ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ عَلَيْكَ بِالصَّبْرِ قَالَ

حَمَّادُ بْنُ اَبِی سُلَیْمَانَ تُقْطَعُ یَدُ النَّبَّاشِ لِاَنَّهٗ دَخَلَ عَلَی الْمَیِّتِ بَیْتَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا "اے ابوذرؓ!" میں نے عرض کیا "میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! اور فرمانبردار ہوں، فرمایئے کیا ارشاد ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس وقت کیا کرو گے جب لوگوں کو موت (یعنی کوئی وبا اپنی لپیٹ میں لے لے گی (کیا) اس وقت تم موت سے بھاگ کھڑے ہوگے یا صبرواستقامت کی راہ اختیار کرو گے؟" اور گھر یعنی قبر کی جگہ ایک غلام کے برابر ہو جائے گی (یعنی اس وقت وبا کی وجہ سے اتنی کثرت سے اموات ہوں گی کہ ایک ایک قبر کی جگہ ایک ایک غلام کی قیمت کے برابر خریدی جائے گی میں نے عرض کیا اس کے بارے میں اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں (یعنی میں نہیں جانتا کہ اس وقت میرا کیا ہوگا، آیا میں صبرواستقامت کی راہ اختیار کروں یا اپنا مسکن چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اس وقت تم پر صبر لازم ہے" حضرت حماد ابن سلمہ کہتے ہیں کہ کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے کیونکہ وہ میت کے گھر میں داخل ہوا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت حماد ابن ابوسلیمان نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے بظاہر بڑا لطیف نکتہ پیدا کیا اور یہ استدلال کیا کہ آنحضرت ﷺ نے چونکہ قبر کو گھر" کہا ہے اس طرح گھر کی طرح قبر بھی "حرز" ہوئی جیسے اور کوئی شخص گھر میں سے کوئی چیز چرائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے ایسے ہی اگر کوئی شخص قبر میں سے کفن چرائے گا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت حمادؒ کا یہ استدلال مضبوط نہیں ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جگہ "حرز" کے حکم میں ہو جس پر "گھر" کا اطلاق ہوتا ہو مثال کے طور پر فرض کیجئے اگر کوئی شخص کسی ایسے گھر میں سے کچھ مال چراتا ہے جس کا دروازہ بند نہ ہو یا جس میں کوئی نگہبان موجود نہ ہو تو متفقہ طور پر تمام علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اگرچہ اس نے ایک گھر کے اندر سے مال کی چوری کی ہے مگر اس گھر کے عدم محفوظ ہونے کی وجہ سے وہ "حرز" نہیں رہا، اور جب اس صورت میں "حرز" کی شرط نہیں پائی گئی تو اس پر قطع ید کی سزا بھی نافذ نہیں ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح "قبر" کو اگرچہ "گھر" فرمایا گیا ہے لیکن چونکہ وہ "حرز" یعنی محفوظ نہیں ہے اس لئے اس میں سے کفن چرانے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا کفن چور پر نافذ نہیں ہوگی جب کہ تینوں ائمہ اور حنفیہ میں سے) حضرت امام ابویوسفؒ کا قول یہ ہے کہ کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا اس مسئلہ کی باقی تفصیل "مرقات" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بَابُ الشَّفَاعَةِ فِی الْحُدُوْدِ

حدود کے مقدمہ میں سفارش کا بیان

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے یہ معلوم ہوگا کہ امام یعنی حاکم کو سفارش کرنا کہ وہ فلاں مجرم کو معاف کر دے اور اس پر حد جاری نہ کرے، جائز ہے یا نہیں اور یہ کہ حاکم اس سفارش کو قبول کرنے کا اختیار رکھتا ہے یا نہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حدود میں سفارش نہیں قبول کی جا سکتی

① عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ قُرَیْشًا اَهَمَّهُمْ شَانُ الْمَرْاَةِ الْمَخْزُوْمِیَّةِ الَّتِیْ سَرَقَتْ فَقَالُوْا وَمَنْ تَکَلَّمَ فِیْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا وَمَنْ یَجْتَرِئُ عَلَیْهِ اِلَّا اُسَامَةُ بْنُ زَیْدٍ حِبُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَکَلَّمَهٗ اُسَامَةُ فَقَالَ

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَتَشْفَعُ فِیْ حَدٍ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ ثُمَّ قَامَ فَاخْتَطَبَ ثُمَّ قَالَ اِنَّمَا اَھْلَكَ الَّذِیْنَ قَبْلَکُمْ اَنَّھُمْ کَانُوْا اِذَا سَرَقَ فِیْھِمُ الشَّرِیْفُ تَرَکُوْہُ وَاِذَا سَرَقَ فِیْھِمُ الضَّعِیْفُ اَقَامُوْا عَلَیْہِ الْحَدَّ وَایْمُ اللّٰہِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِمُسْلِمٍ قَالَتْ کَانَتِ امْرَأَۃٌ مَخْزُوْمِیَّۃٌ تَسْتَعِیْرُ الْمَتَاعَ وَتَجْحَدُہُ فَاَمَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِقَطْعِ یَدِھَا فَاَتٰی اَھْلُھَا اُسَامَۃَ فَکَلَّمُوْہُ فَکَلَّمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْھَا ثُمَّ ذَکَرَ الْحَدِیْثَ بِنَحْوِ مَا تَقَدَّمَ۔

"حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ (ایک مرتبہ) قریشی صحابہؓ ایک مخزومی عورت کے بارے میں بہت فکر مند تھے جس نے چوری کی تھی (اور لوگوں سے عاریۃً) سامان لے کر مکر بھی جاتی تھی اور آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا) ان قریشی صحابہؓ نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ اس عورت کے مقدمہ میں کون شخص آنحضرت ﷺ سے گفتگو (یعنی سفارش) کر سکتا ہے، اور پھر انہوں نے یہ کہا کہ حضرت اسامہ ابن زیدؓ سے رسول کریم ﷺ کو بہت محبت و تعلق ہے اس لئے اس بارہ میں آپ سے کچھ کہنے کی جرأت اسامہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہو سکتی (چنانچہ ان سب نے حضرت اسامہؓ کو اس پر تیار کیا کہ وہ اس عورت کے بارہ میں آنحضرت ﷺ سے گفتگو کریں) حضرت اسامہؓ نے (ان لوگوں کے کہنے پر) آنحضرت ﷺ سے گفتگو کی، رسول کریم ﷺ نے (ان کی بات سن کر) فرمایا کہ "تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو!؟" اور پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا اور (حمد و ثنا کے بعد اس خطبہ میں) فرمایا کہ "تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں ان کو اسی چیز نے ہلاک کیا کہ ان میں سے اگر کوئی شریف آدمی (یعنی دنیاوی عزت و طاقت رکھنے والا) چوری کرتا تو وہ اس کو (سزا دیئے بغیر) چھوڑ دیتے تھے اور اگر ان میں سے کوئی کمزور و غریب آدمی چوری کرتا تو سزا دیتے تھے، قسم ہے خدا کی! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں۔" (بخاری و مسلم) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے بیان کیا "ایک مخزومی عورت (کی یہ عادت) تھی کہ وہ لوگوں سے عاریۃً کوئی چیز لیتی اور پھر اس سے انکار کر دیتی تھی، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالنے کا حکم دے دیا (جب) اس عورت کے اعزا (کو اس کا علم ہوا تو وہ) حضرت اسامہؓ کے پاس آئے اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی (کہ وہ آنحضرت ﷺ سے سفارش کریں) اور پھر حضرت اسامہؓ نے آنحضرت ﷺ سے اس کے متعلق عرض کیا۔" اس کے بعد حدیث کے وہی الفاظ مذکور ہیں جو اوپر کی حدیث میں نقل کئے گئے ہیں"

تشریح: حدیث میں جس عورت کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام فاطمہ بنت اسود ابن عبدالاسد تھا اور وہ حضرت ابوسلمہؓ کے بھائی کی بیٹی تھی، چونکہ وہ بنی مخزوم سے تھی جو قریش کا ایک بڑا قبیلہ تھا۔ اس لئے قبیلہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کو "مخزومیہ" کہا گیا ہے۔

اس حدیث کے بموجب تمام علماء کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ جب حد کا کوئی قضیہ امام (حاکم) کے پاس پہنچ جائے تو اس کے بعد مجرم کے حق میں امام سے سفارش کرنا بھی حرام ہے اور کسی دوسرے سے سفارش کرانا بھی حرام ہے۔ ہاں امام کے پاس قضیہ پہنچنے سے پہلے سفارش کرنے کرانے کی اکثر علماء نے اجازت دی ہے بشرطیکہ جس شخص کے حق میں سفارش کی جائے وہ شریف اور لوگوں کو ایذا پہنچانے والا نہ ہو۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی ایسے جرم و گناہ کا ارتکاب کیا ہو جس میں حد جاری نہ ہوتی ہو بلکہ "تعزیر" نافذ ہوتی ہو تو اس کے حق میں سفارش کرنا اور سفارش کرانا بہر صورت جائز ہے خواہ اس کا قضیہ امام کے پاس پہنچ چکا ہو یا نہ پہنچا ہو کیونکہ ایسی صورت میں سفارش کرنا نہ صرف یہ کہ آسان ہے بلکہ مستحب بھی ہے بشرطیکہ جس شخص کے حق میں سفارش کی جائے وہ کوئی شریف اور لوگوں کو ایذا پہنچانے والا نہ ہو۔

مسلمؒ کی جو دوسری روایت نقل کی گئی ہے اس کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو اس جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی تھی کہ وہ لوگوں سے عاریۃً چیزیں لے کر مکر جاتی تھی حالانکہ یہ واقعہ کے بھی خلاف ہے اور شرعی مسئلہ کے بھی منافی ہے، چنانچہ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری روایت میں "انکار کا ذکر محض اس عورت کا حال بتانے کے لئے ہے کہ وہ عورت اس قسم کی تھی

اور اس کو قطع ید کی جو سزا دی گئی اس کا تعلق اس کے چوری کے جرم سے تھا جیسا کہ پہلی روایت (جس کو بخاری و مسلم دونوں نے نقل کیا ہے) میں بیان ہوا۔ گویا حاصل یہ نکلا کہ دوسری روایت لفظ و تجحدہ کے بعد لفظ فسرقت مقدر ہے، یعنی یہ لفظ "فسرقت" اگرچہ عبارت میں نہیں ہے مگر اس کے معنی مراد لئے جائیں گے۔ جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص کسی سے عاریۃ کوئی چیز لے کر اس سے مکر جائے اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی جب کہ حضرت امام احمدؒ اور اسحٰقؒ کا قول یہ ہے کہ ایسے شخص کا بھی ہاتھ کاٹنا واجب ہے۔

هذا الباب خال عن الفصل الثاني۔ اس باب میں دوسری نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حد میں سفارش کرنے والا گویا خدا کے حکم کی مخالفت کرنے والا ہے

(۲) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ حَالَتْ شَفَاعَتُہٗ دُوْنَ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ فَقَدْ ضَادَّ اللّٰہَ وَمَنْ خَاصَمَ فِیْ بَاطِلٍ وَھُوَ یَعْلَمُہٗ لَمْ یَزَلْ فِیْ سَخَطِ اللّٰہِ تَعَالٰی حَتّٰی یَنْزِعَ وَمَنْ قَالَ فِیْ مُؤْمِنٍ مَالَیْسَ فِیْہِ اَسْکَنَہُ اللّٰہُ رَدْغَۃَ الْخَبَالِ حَتّٰی یَخْرُجَ مِمَّا قَالَ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِلْبَیْھَقِیِّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ مَنْ اَعَانَ عَلٰی خُصُوْمَۃٍ لَا یَدْرِیْ اَحَقٌّ اَمْ بَاطِلٌ فَھُوَ فِیْ سَخَطِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنْزِعَ۔

"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جس شخص کی سفارش اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کسی حد کے درمیان حائل ہو (یعنی جو شخص اپنی سفارش کے ذریعہ حاکم کو نفاذ حد سے روکے) اس نے اللہ تعالیٰ سے ضد کی (اور گویا اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی خلاف ورزی کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ حد جاری کی جائے) اور جو شخص جانتے ہوئے بھی کسی ناحق اور جھوٹی بات میں کسی سے جھگڑتا ہے) تو وہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے غضب میں رہتا ہے جب تک کہ اس سے باز نہ آجائے۔ اور جس نے کسی مؤمن کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی جو اس میں نہیں پائی جاتی (یعنی کسی مؤمن کو کوئی عیب لگائے یا اس کی طرف کسی غلط بات کی تہمت کر کے اس کو نقصان پہنچائے) تو اس کو اللہ تعالیٰ اس وقت تک دوزخیوں کے کیچڑ، پیپ اور خون میں رکھے گا جب تک کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے نہ نکل آئے یعنی جب تک کہ وہ توبہ کر کے اس گناہ سے نہ نکل آئے وہ دوزخیوں کی سی حالت میں رہے گا، یا یہ کہ جب تک کہ وہ اس گناہ عذاب کو بھگت کر پاک نہ ہو جائے دوزخیوں کے درمیان رہے گا) اس روایت کو احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔ اور بیہقی نے شعب الایمان میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "جو شخص کسی ایسے جھگڑے میں مدد کرے جس کے حق و ناحق ہونے کا اس کو علم نہیں تو جب تک کہ وہ اپنی مدد سے باز نہ آجائے اللہ تعالیٰ کے غضب میں رہے گا۔"

اقرار جرم پر چوری کی سزا

(۳) وَعَنْ اَبِیْ اُمَیَّۃَ الْمَخْزُوْمِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُتِیَ بِلِصٍّ قَدِ اعْتَرَفَ اعْتِرَافًا وَلَمْ یُوْجَدْ مَعَہٗ مَتَاعٌ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اِخَالُکَ سَرَقْتَ قَالَ بَلٰی فَاَعَادَ عَلَیْہِ مَرَّتَیْنِ اَوْثَلَاثًا کُلُّ ذٰلِکَ یَعْتَرِفُ فَاَمَرَ بِہٖ فَقُطِعَ فَجِیْئَ بِہٖ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِسْتَغْفِرِ اللّٰہَ وَتُبْ اِلَیْہِ فَقَالَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰھُمَّ تُبْ عَلَیْہِ ثَلَاثًا۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَالدَّارِمِیُّ ھٰکَذَا وَجَدْتُ فِی الْاُصُوْلِ الْاَرْبَعَۃِ وَجَامِعِ الْاُصُوْلِ وَشُعَبِ الْاِیْمَانِ وَمَعَالِمِ السُّنَنِ عَنْ اَبِیْ اُمَیَّۃَ وَفِیْ نُسَخِ الْمَصَابِیْحِ عَنْ اَبِیْ رِمْثَۃَ بِالرَّاءِ وَالثَّاءِ الْمُثَلَّثَۃِ بَدَلَ الْھَمْزَۃِ وَالْیَاءِ۔

"اور حضرت ابوامیہ مخزومیؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا جس نے اپنے جرم کا صریح

اعتراف واقرار کیا لیکن (چوری کے مال میں سے) کوئی چیز اس کے پاس نہیں نکلی چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "میرا خیال نہیں ہے کہ تم نے چوری کی ہے" اس نے کہا کہ "ہاں! میں نے چوری کی ہے" آنحضرت نے دوبار یا تین بار یہ کہا (کہ میرا خیال نہیں ہے کہ تم نے چوری کی ہے) مگر وہ ہر بار یہ اعتراف و اقرار کرتا تھا (کہ میں نے چوری کی ہے) آخر کار آنحضرت ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم جاری کیا پھر کٹنے کے بعد) اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو رسول کریم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "(اپنی زبان کے ذریعہ) اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرو (اور اپنے دل کے ذریعہ) اس کی طرف متوجہ ہو۔" اس نے کہا میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں اور اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں (یعنی توبہ کرتا ہوں) رسول کریم ﷺ نے تین بار فرمایا "اے اللہ! اس کی توبہ قبول فرما۔" (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ دارمی) اور (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ) میں نے اس روایت کو ان چاروں اصل کتابوں (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی) میں جامع الاصول میں، اور بیہقیؒ کی شعب الایمان میں، اور خطابی کی معالم السنن میں اسی طرح یعنی ابوامیہؓ سے منقول پایا ہے لیکن مصابیح کے بعض نسخوں میں اس روایت میں ابورمثہ (ہمزہ اور یا کی بجائے راء مکسورہ اور ثا مثلثہ کے ساتھ) منقول ہے مگر حضرت شیخ حافظ ابن حجر عسقلانی نے وضاحت کی ہے کہ اس روایت کا ابورمثہ سے منقول ہونا غلط ہے، اور ابورمثہؓ اگرچہ صحابی ہیں لیکن یہ روایت ان سے منقول نہیں ہے۔"

تشریح: "اس ارشاد میں "میں خیال نہیں کرتا الخ" سے آنحضرت ﷺ کا منشاء یہ تھا کہ وہ شخص اپنے اعتراف سے رجوع کرے تاکہ اس پر سے حد ساقط ہو جائے اور اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ زنا کا اقرار کرنے والوں کے سامنے اس طرح کے جملے ارشاد فرماتے تھے جن کا مقصد "تلقین عذر" ہوتا تھا۔ یہ حضرت امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اس طرح کی "تلقین عذر" اور "تلقین رجوع" صرف زنا کی حد کے ساتھ مخصوص ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو جو استغفار کا حکم دیا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جس شخص پر حد جاری ہوئی ہے اس کو وہ حد بالکل (یعنی تمام گناہوں سے) پاک نہیں کرتی بلکہ اس کے اسی اصل گناہ کو ختم کرتی ہے جس کی وجہ سے اس پر حد جاری ہوئی ہے کہ حد جاری ہو جانے کے بعد وہ پروردگار کی جانب سے اس کے سبب دوبارہ عذاب میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔

بَابُ حَدِّ الْخَمْرِ
شراب کی حد کا بیان

شراب کی حرمت: شراب جس کو "ام الخبائث" کہا گیا ہے، بعثت نبوی ﷺ سے پہلے ہی جزو زندگی کا درجہ رکھتی تھی اس لئے بعثت نبوی کے بعد ابتداء اسلام میں بھی اس کا رواج برقرار رہا، اور عام طور پر لوگ اس کو پینے پلانے میں مبتلا رہے لیکن اس کی برائی اور اس کے نقصان کی وجہ سے مسلمانوں کے دل میں کھٹک بھی پیدا ہوتی تھی، اور حضرت عمرؓ کے قول انها تذهب المال و تذهب العقل (یہ شراب مال کو بھی برباد کرتی ہے اور عقل کو بھی ختم کرتی ہے) کے پیش نظر لوگوں میں یہ احساس تمنا بھی روز بروز بڑھتا جاتا تھا کہ اس کی اباحت جتنی جلد ختم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے، ادھر چونکہ پوری سوسائٹی اس لعنت میں گرفتار تھی اور یہ ایک ایسی عادت تھی جس کی جڑیں پورے معاشرہ میں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں اس لئے مصلحت شریعت یہ تھی کہ اس کی حرمت کا نفاذ دفعتاً کرنے کی بجائے بتدریج روبہ عمل لایا جائے اور عام لوگوں کے دلوں میں اس کی نفرت اس طرح جاگزیں کی جائے کہ شریعت کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور لوگ اس لعنت سے بھی نجات پا جائیں، چنانچہ جب کچھ صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے شراب کے بارے میں دریافت کیا تو اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔

"(اے محمد ﷺ) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور (بظاہر) ان میں لوگوں کے لئے کچھ فائدے ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدوں سے بہت بڑھا ہوا ہے۔"

جو سعید روحیں پہلے ہی سے شراب کے مضر اثرات کا احساس رکھتی تھیں اور جو لوگ اس کی برائی سے طبعًا بیزار تھے ان کے لئے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ قرآن کریم نے "شراب" کو گناہ کہہ دیا لہٰذا انہوں نے شراب نوشی قطعاترک کر دی، لیکن چونکہ اس آیت میں شراب کی حرمت کا کوئی واضح اور قطعی حکم نہیں ہے اس لئے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے مے نوشی کا مشغلہ بدستور جاری رکھا۔ اور پھر اس سلسلہ میں یہ دوسری آیت نازل ہوئی:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔

"اے ایمان والو! تم ایسی حالت میں نماز کے پاس مت جاؤ کہ تم نشہ کی حالت میں مست ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو۔"

اس آیت نے شراب نوشی کے جاری مشغلہ پر ایک اور ضرب لگائی، اور نماز کے اوقات میں شراب نوشی بالکل ترک کر دی گئی البتہ نماز کے علاوہ اوقات میں بعض لوگوں کے یہاں اب بھی شراب نوشی کا مشغلہ بند نہیں ہوا اور آخر کار ۳ھ میں یہ تیسری آیت نازل ہوئی جس میں حرمت شراب کو واضح کر دیا گیا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

"اے ایمان والو! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شراب اور جوا اور بت اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی چیزیں شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد شراب نوشی بالکل بند ہو گئی، شراب کے مٹکے توڑ ڈالے گئے اور شراب مدینہ کی گلیوں میں پانی کی طرح بہنے لگی اور اس شراب کی حرمت کا حکم نافذ ہو گیا۔

شراب نوشی کی سزا: تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن وسنت کے حکم اور اجماع امت کے مطابق شراب حرام ہے اور جو شخص شراب پئے وہ "حد" (شرعی سزا) کا مستوجب ہے جو جمہور علما کے قول کے مطابق "اسی ۸۰ کوڑے مارنا" ہے حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے اور حضرت امام شافعیؒ اور کچھ دوسرے علماء کے قول کے مطابق "چالیس کوڑے مارنا" ہے

سزا کا نفاذ: اگر کوئی شخص شراب پئے اگرچہ اس نے ایک ہی قطرہ پی ہو اور پھر اس کو حاکم وقاضی کے سامنے پیش کیا جائے اور اس وقت شراب کی بو موجود ہو یا اس کو نشے کی حالت میں پیش کیا گیا ہو اگرچہ وہ نشہ نبیذ پینے کی وجہ سے ہو اور دو شخص اس کی شراب نوشی کی گواہی دیں یا وہ خود اپنی شراب نوشی کا ایک مرتبہ اور امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق دو مرتبہ اقرار کرے نیز یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے اپنی خوشی سے شراب پی ہے کسی کی زبردستی سے نہیں پی ہے تو اس پر حد جاری کی جائے یعنی اگر وہ شخص آزاد ہو تو اس کو اسی ۸۰ کوڑے مارے جائیں اور اگر غلام ہو تو چالیس کوڑے مارے جائیں اور یہ کوڑے اس وقت مارے جائیں جب کہ اس کا نشہ ختم ہو جائے نیز زنا کی حد اور اس حد میں بھی اس طرح کوڑے مارے جائیں کہ بدن کے مختلف حصوں پر چوٹ آئے یعنی پورے کوڑے بدن کے کسی ایک ہی حصہ پر نہ مارے جائیں بلکہ مختلف حصوں پر مارے جائیں۔

اگر کسی شخص نے اپنی شراب نوشی کا اقرار اس وقت کیا جب کہ شراب کی بو ختم ہو گئی ہو یا دو آدمیوں نے کسی کی شراب نوشی کی گواہی اس وقت دی جب کہ بو ختم ہو گئی ہو تو اس پر حد جاری نہ کی جائے اس طرح اگر کسی شخص میں صرف شراب کی بو پائی گئی یا اس نے صرف شراب کی قے کی، یا اس نے پہلے تو اپنی شراب نوشی کا اقرار کیا مگر بعد میں مکر گیا۔ اور یا اس نے نشے کی حالت میں اقرار کیا تو ان صورتوں میں بھی اس پر حد جاری نہ کی جائے۔

واضح رہے کہ جو نشہ حد کو واجب کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ شخص مرد و عورت اور زمین و آسمان کے درمیان امتیاز نہ کر سکے۔ لیکن صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ "نشہ" سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص ہزیان اور واہی تباہی باتیں بکنے لگے۔ حنفی مسلک میں فتویٰ اسی قول پر ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں شراب نوشی کی سزا

① وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَرَبَ فِي الْخَمْرِ بِالْجَرِيْدِ وَالنِّعَالِ وَجَلَدَ اَبُوْبَكْرٍ اَرْبَعِيْنَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَضْرِبُ فِي الْخَمْرِ بِالنِّعَالِ وَالْجَرِيْدِ اَرْبَعِيْنَ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے شراب نوشی کی حد (سزا میں کھجور کی ٹہنیوں (چھڑیوں) اور جوتوں سے مارا (یعنی مارنے کا حکم دیا) اور حضرت ابوبکرؓ نے (اپنے دور خلافت میں شراب پینے والے کو چالیس کوڑے مارے۔" (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں حضرت انسؓ ہی سے یوں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ شراب نوشی کی حد (سزا) میں چالیس کھجور کی ٹہنیوں اور جوتوں سے مارتے تھے یعنی مارنے کا حکم دیتے تھے۔"

تشریح: پہلی روایت میں تو حد کا ذکر عدد کے تعین کے بغیر ہے اس اعتبار سے وہ مجمل ہے جس کی وضاحت دوسری روایت نے کی ہے۔ جس میں عدد کا تعین کیا گیا ہے اور وہ چالیس ہے چنانچہ یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی دلیل ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے مسلک کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں مے نوشی کی شرعی سزا اسی کوڑے مارنا بیان کیا گیا ہے ملا علی قاریؒ نے ان احادیث کو اپنی کتاب مرقات میں نقل کیا ہے۔

اسی کوڑے کی سزا عہد صحابہ میں متعین ہوئی ہے

② وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ يُؤْتٰى بِالشَّارِبِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِمْرَةِ اَبِيْ بَكْرٍ وَصَدْرًا مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ فَنَقُوْمُ عَلَيْهِ بِاَيْدِيْنَا وَنِعَالِنَا وَاَرْدِيَتِنَا حَتّٰى كَانَ اٰخِرُ اِمْرَةِ عُمَرَ فَجَلَدَ اَرْبَعِيْنَ حَتّٰى اِذَا عَتَوْا وَفَسَقُوْا جَلَدَ ثَمَانِيْنَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سائب ابن یزید کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں حضرت ابوبکرؓ کے ایام خلافت میں اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت کے ابتدائی دور میں یہ معمول تھا کہ جب کوئی شراب پینے والا لایا جاتا تو ہم اٹھ کر اس کو اپنے ہاتھوں اپنے جوتوں اور اپنی چادروں سے یعنی چادروں سے کوڑے بنا کر اس کی پٹائی کرتے پھر حضرت عمر فاروقؓ اپنی خلافت کے آخری دور میں چالیس کوڑے مارنے کی سزا دینے لگے یہاں تک کہ جب شراب پینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور سرکشی بڑھ گئی تو حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے کی سزا متعین کی۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت سائب ابن یزید کی مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس وقت شراب نوشی کی حد کا نفاذ عدد کے تعین کئے بغیر ہوتا تھا لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان کی مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس زمانہ میں شراب پینے کی سزا چالیس کوڑوں سے بھی کم تھی جیسا کہ ان کے قول پھر حضرت عمر فاروقؓ اپنی خلافت کے دور میں چالیس کوڑے مارنے کی سزا دینے لگے سے ثابت ہوتا ہے۔

بہرکیف اس حدیث سے واضح ہوا کہ شراب کی حد کے طور پر اسی کوڑے کی سزا عہد نبوی ﷺ میں نافذ نہیں تھی بلکہ عہد صحابہ میں طے پائی ہے چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے شراب کے معاملہ میں بڑھتی ہوئی سرکشی کو دیکھتے ہوئے اور قانونی و انتظامی مصالح کے پیش نظر

شراب پینے والے کو اسی ۸۰ کوڑے مارنے کی سزا متعین کی اور اسی پر تمام صحابہ کا اجماع و اتفاق ہو گیا لہٰذا اب کسی کے لئے جائز نہیں ہے چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ ارشاد ہے کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شراب پینے والے کو چالیس کوڑے کی سزا دی اور اس سزا کو حضرت عمر فاروقؓ نے کامل کیا بایں طور کہ انہوں نے اسی کوڑے کی سزا متعین کی اور اگرچہ سب سُنّت ہے لیکن اسی کوڑے ہی پر اجماع و اتفاق ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

شرابی کو قتل کر دینے کا حکم منسوخ ہے

(۳) عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فَاجْلِدُوْہُ فَاِنْ عَادَ فِی الرَّابِعَۃِ فَاقْتُلُوْہُ قَالَ ثُمَّ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذٰلِکَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ فِی الرَّابِعَۃِ فَضَرَبَہٗ وَلَمْ یَقْتُلْہُ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ عَنْ قَبِیْصَۃَ بْنِ ذُؤَیْبٍ وَفِیْ اُخْرٰی لَھُمَا وَلِلنَّسَائِیِّ وَابْنِ مَاجَۃَ وَالدَّارِمِیِّ عَنْ نَفَرٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْھُمْ ابْنُ عُمَرَ وَمُعَاوِیَۃُ وَاَبُوْھُرَیْرَۃَ وَالشَّرِیْدُ اِلٰی قَوْلِہٖ فَاقْتُلُوْہُ۔

"حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو شخص شراب پئے اس کو کوڑے مارو اور جو شخص بار بار پئے یہاں تک کہ چوتھی مرتبہ پیتا ہوا پایا جائے تو اس کو قتل کر ڈالو حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی کے بعد ایک دن آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک ایسے شخص کو پیش کیا گیا جس نے چوتھی مرتبہ شراب پی تھی تو آپ ﷺ نے اس کی پٹائی کی اور اس کو قتل نہیں کیا۔ (ترمذی) ابوداؤد کی ایک اور روایت میں اور نسائی، ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں جو انہوں نے رسول کریم ﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت سے نقل کی ہے جس میں حضرت ابن عمرو، حضرت معاویہ، حضرت ابوہریرہ اور حضرت شریدؓ بھی شامل ہیں یہ حدیث لفظ فاقتلوہ تک منقول ہے یعنی ان روایتوں میں ثُمَّ اُتِیَ الخ کی عبارت نہیں ہے۔"

تشریح: تو اس کو قتل کر ڈالو اس حکم سے یا تو یہ مراد ہے کہ اس شخص کی بہت پٹائی کرو اور خوب مارو، یا پھر یہ کہ آپ ﷺ نے یہ حکم زجر و تہدید کے طور پر اور قانونی و انتظامی مصالح کے پیش نظر دیا تھا اس کا تعلق کسی مستقل قانون اور وجوب سے نہیں تھا نیز بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں یہی حکم تھا مگر بعد میں منسوخ ہو گیا۔

اس کو قتل نہیں کیا اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قتل کر دینے کا حکم یا تو زجر و تہدید اور قانونی و انتظامی مصلحتوں کی بناء پر تھا یا پہلے تو یہی حکم تھا مگر بعد میں آپ نے خود اپنے اس عمل سے کہ اس کو قتل نہیں کیا یہ حکم منسوخ قرار دے دیا۔

نوویؒ نے امام ترمذی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میری کتاب میں دو حدیثوں کے علاوہ اور کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جس کو متروک العمل قرار دینے پر پوری اُمت کا اجماع و اتفاق ہو ان دونوں میں سے ایک حدیث تو وہ ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی خوف و دہشت یا بارش نہ ہو تب بھی جمع بین الصلوتین کی اجازت ہے اور دوسری حدیث یہ ہے جس میں چوتھی بار شراب پینے والے کو قتل کر دینے کا حکم ہے گویا امام ترمذی کے اس قول کو نقل کرنے کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ حدیث جس میں چوتھی بار شراب پینے والے کو قتل کر دینے کا حکم ہے منسوخ ہے اور اس کی منسوخی پر سب کا اتفاق و اجماع ہے۔

شرابی کی تحقیر

(۴) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَزْھَرَ قَالَ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِیَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ الْخَمْرَ فَقَالَ لِلنَّاسِ اضْرِبُوْہُ فَمِنْھُمْ مَنْ ضَرَبَہٗ بِالنِّعَالِ وَمِنْھُمْ مَنْ ضَرَبَہٗ بِالْعَصَاءِ وَمِنْھُمْ مَنْ ضَرَبَہٗ بِالْمِیْتَخَۃِ قَالَ ابْنُ

وَهْبٍ يَعْنِي الْجَرِيْدَةَ الرَّطْبَةَ ثُمَّ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُرَابًا مِنَ الْاَرْضِ فَرَمٰى بِهٖ فِيْ وَجْهِهٖ۔

(رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن ازہر کہتے ہیں کہ گویا وہ منظر اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک ایسے شخص کو پیش کیا گیا جس نے شراب پی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی پٹائی کرو چنانچہ ان لوگوں میں سے بعض نے اس کو جوتوں سے مارا اور بعض نے کھجور کی ٹہنی (چھڑی) سے مارا۔ حضرت ابن وہبؒ جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن نے میتخہ سے کھجور کی ہری ٹہنی جس پر پتے نہ ہوں یعنی چھڑی مراد لی تھی۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن نے بیان کیا کہ جب سب لوگ اس شرابی کی پٹائی کر چکے تو آنحضرت ﷺ نے زمین سے مٹی اٹھائی اور اس کے منہ پر پھینک دی اس کے منہ پر مٹی پھینک کر گویا آپ ﷺ نے اس کے تئیں حقارت کا اظہار کیا کیونکہ اس نے شراب پی کر ایک بہت ہی شنیع فعل کا ارتکاب کیا تھا۔" (ابوداؤد)

شرابی کو سزا دو اس کو عار دلاؤ لیکن اس کے حق میں بددعا نہ کرو

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ الْخَمْرَ فَقَالَ اضْرِبُوْهُ فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهٖ وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهٖ وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهٖ ثُمَّ قَالَ بَكِّتُوْهُ فَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِ يَقُوْلُوْنَ مَا اتَّقَيْتَ اللّٰهَ مَا خَشِيْتَ اللّٰهَ وَمَا اسْتَحْيَيْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ اَخْزَاكَ اللّٰهُ قَالَ لَا تَقُوْلُوْا هٰكَذَا لَا تُعِيْنُوْا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی آنحضرت ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ اس کی پٹائی کرو۔ چنانچہ ہم میں سے بعض نے اپنی جوتیوں سے اس کی پٹائی کی پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب زبان سے اس کو تنبیہ کردو اور عار دلاؤ۔ چنانچہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہنا شروع کیا کہ تو نے اللہ کی مخالفت سے اجتناب نہیں کیا تو خدا سے نہیں ڈرا اور تو رسول اللہ ﷺ کی متابعت ترک کرنے یا اس حالت میں آپ کے سامنے آنے سے بھی نہیں شرمایا۔ اور پھر جب بعض لوگوں نے یہ کہا اللہ تعالیٰ تجھ کو (دنیا و آخرت دونوں جگہ یا آخرت میں) ذلیل و رسوا کرے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح نہ کہو اور اس پر شیطان کے غالب ہو جانے میں مدد نہ کرو بلکہ یوں کہو کہ اے اللہ! اس کا گناہ مٹا کر اس کو بخش دے اور اس کو طاعت و نیکی کی توفیق عطا فرما کر اس پر رحم کر یا اس کو دنیا میں بخش دے اور عاقبت میں اس پر اپنا رحم فرما۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے زبان سے تنبیہ کرنے کا جو حکم دیا وہ استحباب کے طور پر تھا جب کہ آپ ﷺ کا پہلا حکم کہ اس کی پٹائی کرو وجوب کے طور پر تھا۔

اس پر شیطان کے غالب ہو جانے میں مدد نہ کرو کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی بددعا کر کے شیطان کی اعانت نہ کرو کیونکہ جو اللہ تعالیٰ اسکو ذلیل و رسوا کر دے گا تو اس پر شیطان کا تسلط ہو جائے گا یا جب وہ تم کو یہ بددعا کرتے ہوئے سنے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید و مایوس ہو جائے گا اور یہ مایوسی و ناامیدی اس کو گناہوں میں منہمک رکھے گی اس طرح اس پر اپنا غلبہ رکھنے کا شیطان کا مقصد بھی پورا ہو گا اور اس کا گناہوں پر اصرار و تکرار اللہ کے غضب کا سبب بھی ہو گا لہٰذا اس اعتبار سے تمہاری بددعا شیطان کے بہکانے میں مددگار ہو گی۔

بلکہ یوں کہو اس حکم کا مطلب یا تو یہ تھا کہ شروع ہی میں اس کے لئے مغفرت و رحمت کی دعا کرنی چاہئے یا یہ کہ اب اس کے لئے دعاء مغفرت و رحمت کرو، اور زیادہ صحیح یہی بات ہے کیونکہ شروع میں تو اس کو عار دلانا مطلوب تھا اور ظاہر ہے کہ اس دعا اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ کے ساتھ عار دلانے یا اس کو تنبیہ کرنے کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

ثبوت جرم کے بغیر سزا نہیں

⑥ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ شَرِبَ رَجُلٌ فَسَكِرَ فَلُقِيَ يَمِيْلُ فِي الْفَجِّ فَانْطُلِقَ بِهِ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا حَاذَى دَارَ الْعَبَّاسِ انْفَلَتَ فَدَخَلَ عَلَى الْعَبَّاسِ فَالْتَزَمَهُ فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَحِكَ فَقَالَ اَفَعَلَهَا وَلَمْ يَأْمُرْ فِيْهِ بِشَيْءٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے شراب پی اور بدمست ہو گیا یہاں تک کہ لوگوں نے اس کو راستہ میں اس حال میں پایا کہ وہ جھومتا چلا جاتا تھا جیسا کہ شرابیوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نشہ کی حالت میں لڑکھڑاتے جھومتے راستہ چلتے ہیں، چنانچہ لوگوں نے اس کو پکڑ لیا اور رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لے چلے، لیکن جب وہ حضرت عباسؓ کے مکان کے قریب پہنچا تو لوگوں کے ہاتھ سے چھٹ گیا اور حضرت عباسؓ کے پاس پہنچ کر ان سے چمٹ گیا یعنی اس نے اس طرح حضرت عباسؓ سے سفارش اور پناہ چاہی جب نبی کریم ﷺ سے یہ بیان کیا گیا تو آپ ﷺ ہنس دیئے اور فرمایا کیا اس نے ایسا کیا اور پھر آپ ﷺ نے اس کے بارہ کوئی حکم نہیں دیا۔"

(ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے نہ تو اس شخص پر حد جاری کرنے کا حکم دیا اور نہ اس کو کوئی دوسری سزا دی اس کا سبب یہ تھا کہ اس کا شراب پینا نہ تو خود اس کے اقرار سے اور نہ عادل گواہوں کی گواہی کے ذریعہ ثابت ہوا۔ اگر وہ دربار رسالت میں حاضر ہو کر اپنی شراب نوشی کا اعتراف و اقرار کرتا یا گواہوں کے ذریعہ اس کی شراب نوشی کا جرم ثابت ہوتا تو یقیناً اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا جاتا۔ اور جہاں تک اس شخص کا راستہ میں نشہ کی حالت میں پائے جانے کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ ہے کہ شرعی قانون کی نظر میں کسی شخص کا محض راستہ میں لڑکھڑاتے اور جھومتے ہوئے چلنا اس نشہ کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے جو اس پر حد کے جاری ہونے کو واجب کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

جو شخص سزاء کوڑے کھاتے ہوئے مرجائے اس کی دیت واجب نہیں ہوگی

⑦ عَنْ عُمَيْرِ بْنِ سَعِيْدِ النَّخَعِيِّ قَالَ سَمِعْتُ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ يَقُوْلُ مَا كُنْتُ لِاُقِيْمَ عَلٰى اَحَدٍ حَدًّا فَيَمُوْتَ فَاَجِدُ فِيْ نَفْسِيْ مِنْهُ شَيْئًا اِلَّا صَاحِبَ الْخَمْرِ فَاِنَّهُ لَوْ مَاتَ وَدَيْتُهُ وَذٰلِكَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَسُنَّهُ۔

(متفق علیہ)

"حضرت عمیر ابن سعید نخعی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اگر میں کسی شخص پر حد جاری کروں اور وہ شخص حد مارے جانے کی وجہ سے مرجائے تو مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا یعنی مجھے کوئی غم نہیں ہوگا کیونکہ اس پر حد جاری کرنا شریعت کے حکم کے مطابق ہوگا اور شریعت کے حکم کے نفاذ میں رحم و شفقت کا کوئی محل نہیں ہے ہاں شراب پینے والے کی بات دوسری ہے کہ اگر وہ چالیس سے زیادہ کوڑے مارے جانے کی وجہ سے مرجائے تو میں اس کی دیت بھروں گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شراب پینے کی حد سزا متعین نہیں فرمائی۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حد مقرر نہیں فرمائی ہے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شراب پینے کی حد سزا کو متعین نہیں کیا ہے کہ اتنے کوڑے مارنے چاہئیں اگرچہ بعض احادیث میں چالیس یا چالیس کے مانند کے عدد کا ذکر ہے اس لئے اگر میں نے کسی شراب پینے والے کو اسی ۸۰ کوڑے مارے اور وہ مرگیا تو میں ڈرتا ہوں کہ شاید یہ زیادتی میری طرف سے منسوب ہو جائے اس اعتبار سے میں اس مرنے والے کی دیت ادا کروں گا۔ حضرت علیؓ کی یہ بات محض احتیاط پسندی پر محمول ہے حالانکہ جب عمرؓ نے شراب پینے والے کو سزاء مارے جانے والے

کوڑوں کی تعداد متعین کرنی چاہی اور صحابہؓ نے اس بارہ میں مشورہ کیا تو خود حضرت علیؓ نے یہ فرمایا کہ شرابی کو اسی کوڑے مارنا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

حضرت عمرؓ کی طرف سے شراب نوشی کا سزا کا تعین

(۸) وَعَنْ ثَوْرِبْنِ زَيْدِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ اِنَّ عُمَرَ اسْتَشَارَ فِيْ حَدِّ الْخَمْرِ فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ اَرٰى اَنْ تَجْلِدَهُ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً فَاِنَّهُ اِذَا شَرِبَ سَكِرَ وَاِذَا سَكِرَ هَذٰى وَاِذَا هَذٰى افْتَرٰى فَجَلَدَ عُمَرُ فِيْ حَدِّ الْخَمْرِ ثَمَانِيْنَ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت ثور ابن زید دیلمی کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے شراب کی حد سزا کے تعین کے بارے میں صحابہؓ سے مشورہ کیا تو حضرت علیؓ نے ان سے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ شرابی کو اسی کوڑے مارے جائیں کیونکہ جب وہ شراب پیتا ہے تو بدمست ہو جاتا ہے اور ہذیان بکتا ہے اور جب ہذیان بکتا ہے تو بہتان لگاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا کہ شراب پینے والے کو اسی کوڑے مارے جائیں۔" (مالکؒ)

تشریح: حضرت علیؓ نے اپنی رائے کی دلیل میں بڑی جاندار بات فرمائی کہ شراب پینے والے کی عقل ماؤف ہو جاتی ہے اور وہ نشہ کی حالت میں اول فول بکتا ہے اور خواہ مخواہ کسی پر الزام لگاتا پھرتا ہے یہاں تک کہ نیک پارسا اور پاکدامن عورتوں پر زنا کا بہتان لگانے سے بھی باز نہیں رہتا، اس اعتبار سے اس کا نشہ گویا قذف وافتراء پردازی پاکدامن پر زنا کی تہمت لگانے کا باعث ہوتا ہے اور چونکہ قذف بہتان تراشی کی سزا اسی کوڑے ہے لہٰذا قذف پر قیاس کرتے ہوئے شرابی کی سزا بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتی ہے گویا حضرت علیؓ نے یہ بات اغلب کا اعتبار کرتے ہوئے فرمائی کہ زیادہ تر شرابی اپنے نشے کی حالت میں اول فول بکتے ہیں اور دوسروں پر الزام لگاتے ہیں اور چونکہ حکم کا انحصار اغلب پر ہوتا ہے اس لئے ہر شرابی کے لئے یہ ایک ہی سزا مقرر ہو گی خواہ نشہ کی حالت میں اول فول بکے یا نہ بکے اور کسی پر الزام لگائے یا نہ لگائے بہرحال حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی اس رائے کو تسلیم کیا اور شراب پینے کی سزا اسی کوڑے متعین فرمائی جس پر تمام صحابہؓ نے اجماع و اتفاق کیا۔

بَابُ مَالَا يُدْعٰى عَلَى الْمَحْدُوْدِ

جس پر حد جاری کی جائے اس کے حق میں بددعا نہ کرنے کا بیان

اس باب میں یہ بیان کیا جائے گا کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کرے جس کی وجہ سے وہ حد (شرعی سزا) کا مستوجب ہوتا ہو اور پھر اس پر وہ حد جاری ہو جائے تو اس کے حق میں کسی طرح کی بددعا نہ کی جائے جیسا کہ جب ایک شخص نے ایک شراب پینے والے کے حق میں یہ بددعا کی اخزاک اللہ یعنی اللہ تعالیٰ تجھ کو ذلیل و رسوا کرے تو آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا کہ یوں نہ کہو بلکہ اس کے حق میں مغفرت و رحمت کی دعا کرو۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کسی گناہگار پر لعنت بھیجنا ناجائز ہے

(۱) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ رَجُلًا اسْمُهُ عَبْدُاللّٰهِ يُلَقَّبُ حِمَارًا كَانَ يُضْحِكُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ جَلَدَهُ فِي الشَّرَابِ فَاُتِيَ بِهٖ يَوْمًا فَاَمَرَ بِهٖ فَجُلِدَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ اَللّٰهُمَّ الْعَنْهُ مَا

اَكْثَرَ مَايُؤْتٰى بِهٖ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلْعَنُوْهُ فَوَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُ اَنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص تھا جس کا نام تو عبد اللہ تھا مگر اس کی بیوقوفی کی وجہ سے اس کو حمار یعنی گدھا کہا جاتا تھا وہ اپنی حماقت آمیز باتوں سے نبی کریم ﷺ کو ہنسایا کرتا تھا نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ شراب پینے کے جرم میں اس پر حد جاری فرما چکے تھے پھر وہ ایک اور دن آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو کوڑے مارنے کا حکم دیا اور اس کو کوڑے مارے گئے حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے کہا اے اللہ اس پر تیری لعنت ہو، اس کو کتنی کثرت کے ساتھ بار بار شراب پینے کے جرم میں پکڑ کر لایا جاتا ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس پر لعنت نہ بھیجو خدا کی قسم میں یہ جانتا ہوں کہ یہ شخص اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ کسی گنہگار کو مخصوص کر کے اس پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت قرب الٰہی کا سبب ہے لہٰذا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت رکھنے والے پر لعنت بھیجنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے کیونکہ لعنت کے معنی ہیں اللہ کی رحمت سے دور کرنا۔

(۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ فَقَالَ اضْرِبُوْهُ فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهٖ وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهٖ وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهٖ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ اَخْزَاكَ اللّٰهُ قَالَ لَا تَقُوْلُوْا هٰكَذَا لَا تُعِيْنُوْا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک ایسے شخص کو پیش کیا گیا جس نے شراب نوشی کا ارتکاب کیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا اس کی پٹائی کرو چنانچہ ہم میں سے بعض نے اس کو اپنے ہاتھ سے مارا بعض نے اپنے جوتوں سے مارا اور بعض نے اپنے کپڑے کا کوڑا بنا کر اس سے مارا جب وہ شخص واپس جانے لگا تو بعض لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو ذلیل و رسوا کرے آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس طرح نہ کہو اور اس پر غالب ہونے میں شیطان کی مدد نہ کرو۔" (بخاریؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

جو مجرم سزا پا چکا ہے اس کی آبروریزی مردار کھانے کے مترادف ہے

(۳) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ الْاَسْلَمِيُّ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَشَهِدَ عَلٰى نَفْسِهٖ اَنَّهٗ اَصَابَ امْرَاَةً حَرَامًا اَرْبَعَ مَرَّاتٍ كُلَّ ذٰلِكَ يُعْرِضُ عَنْهُ فَاَقْبَلَ فِي الْخَامِسَةِ فَقَالَ اَنِكْتَهَا؟ قَالَ نَعَمْ وَقَالَ حَتّٰى غَابَ ذٰلِكَ مِنْكَ فِيْ ذٰلِكَ مِنْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ كَمَا يَغِيْبُ الْمِرْوَدُ فِي الْمُكْحُلَةِ وَالرِّشَاءُ فِي الْبِئْرِ قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ تَدْرِيْ مَا الزِّنَا قَالَ نَعَمْ اَتَيْتُ مِنْهَا حَرَامًا مَا يَاْتِي الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِهٖ حَلَالًا قَالَ فَمَا تُرِيْدُ بِهٰذَا الْقَوْلِ قَالَ اُرِيْدُ اَنْ تُطَهِّرَنِيْ فَاَمَرَ بِهٖ فَرُجِمَ فَسَمِعَ النَّبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَيْنِ مِنْ اَصْحَابِهٖ يَقُوْلُ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهٖ اُنْظُرْ اِلٰى هٰذَا الَّذِيْ سَتَرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَلَمْ تَدَعْهُ نَفْسُهٗ حَتّٰى رُجِمَ رَجْمَ الْكَلْبِ فَسَكَتَ عَنْهُمَا ثُمَّ سَارَ سَاعَةً حَتّٰى مَرَّ بِجِيْفَةِ حِمَارٍ شَائِلٍ بِرِجْلِهٖ فَقَالَ اَيْنَ فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَقَالَا نَحْنُ ذَانِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ انْزِلَا فَكُلَا مِنْ جِيْفَةِ هٰذَا الْحِمَارِ فَقَالَا يَا نَبِيَّ اللّٰهِ مَنْ يَاْكُلُ مِنْ هٰذَا قَالَ فَمَا نِلْتُمَا مِنْ عِرْضِ اَخِيْكُمَا اٰنِفًا اَشَدُّ مِنْ اَكْلٍ مِنْهُ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّهُ الْاٰنَ لَفِيْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ فِيْهَا۔

(رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ماعز اسلمیؓ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بارہ میں چار بار یعنی چار مجلسوں میں یہ گواہی دی (یعنی یہ اقرار کیا) کہ اس نے ایک عورت کے ساتھ بطریق زنا، جماع کیا ہے، اور آنحضرت ﷺ ہر بار (اس کے اقرار کرنے پر) منہ پھیر لیتے

تھے (تاکہ وہ اپنے اقرار سے رجوع کرے اور حد سے بچ جائے) اور پھر پانچویں بار اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "کیا تو نے اس عورت کے ساتھ صحبت کی ہے؟" اس نے کہا کہ "ہاں!" آپ ﷺ نے فرمایا (کیا تو نے اس طرح صحبت کی کہ وہ (یعنی تیرا عضو مخصوص) اس (عورت کے حصہ مخصوص) میں غائب ہو گیا؟" اس نے کہا کہ "ہاں!" آپ ﷺ نے فرمایا "(کیا اس طرح) جس طرح سلائی، سرمہ دانی میں اور رسی کنویں میں غائب ہو جاتی ہے؟" اس نے کہا کہ "ہاں! آپ نے پوچھا جانتے ہو زنا کیا ہے کہا" ہاں! میں نے اس عورت کے ساتھ حرام طور پر وہ کام کیا ہے جو ایک مرد اپنی بیوی کے ساتھ حلال طور پر کرتا ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا "(اچھا یہ بتا) یہ جو کچھ تو نے کہا ہے اس سے تیرا مقصد کیا ہے؟" اس نے کہا کہ "میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ (مجھ پر حد جاری فرما کر) مجھ کو (اس گناہ سے) پاک کر دیجئے۔" چنانچہ (اتنی جرح کرنے کے بعد جب اس کا جرم زنا بالکل ثابت ہو گیا تو) آنحضرت ﷺ نے (اس کی سنگساری کا) حکم جاری فرمایا اور اس کو سنگسار کر دیا گیا پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ میں سے دو آدمیوں کو یہ گفتگو کرتے ہوئے سنا کہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے یہ کہہ رہا تھا "اس شخص کو دیکھو، اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تھی لیکن اس کے نفس نے اس کو (اپنے اقرار گناہ سے) باز نہ رکھا یہاں تک کہ وہ ایک کتے کی مانند سنگسار کیا گیا۔" آپ ﷺ نے (یہ سن کر اس وقت) تو ان دونوں سے کچھ نہیں کہا البتہ کچھ دیر تک چلنے کے بعد ایک مرے ہوئے گدھے کے قریب سے گذرے جس کے پاؤں (اس کا جسم بہت زیادہ پھول جانے کے سبب) اوپر اٹھے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ فلاں فلاں (یعنی وہ دونوں) شخص کہاں ہیں (جنہوں نے ماعزؓ کی اس وجہ سے تحقیر کی تھی کہ اس کو سنگسار کیا گیا تھا) انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! "ہم دونوں (حاضر) ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا تم دونوں اترو اور اس گدھے کا مردار گوشت کھاؤ۔" انہوں نے (بڑی حیرت کے ساتھ) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس کا گوشت کون کھاتا ہے؟ (یعنی اس کا گوشت کھائے جانے کے قابل نہیں ہے آپ ہم سے اس کے کھانے کو کیوں فرماتے ہیں؟) آپ ﷺ فرمایا تم نے ابھی اپنے بھائی کی جو آبروریزی کی ہے وہ اس گدھے کا گوشت کھانے سے بھی زیادہ سخت (بری بات) ہے، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے بلاشبہ وہ (ماعزؓ) جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

④ وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصَابَ ذَنْبًا اُقِيْمَ عَلَيْهِ حَدُّ ذٰلِكَ الذَّنْبِ فَهُوَ كَفَّارَتُهُ۔ رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"اور حضرت خزیمہؓ ابن ثابت کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جو حد کو واجب کرنے والا ہو اور پھر اس پر اس گناہ کی حد جاری کی جائے مثلاً کسی شخص نے زنا کیا اور اس کو کوڑے مارے گئے، یا کسی شخص نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا) تو وہ حد اس کے اس گناہ کا کفارہ ہے (یعنی حد جاری ہونے کے بعد وہ شخص اس گناہ سے پاک و صاف ہو جائے گا) (شرح السنۃ)

جس گناہ پر سزا جاری ہو چکی ہے اس پر آخرت میں مواخذہ نہیں ہو گا

⑤ وَعَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَصَابَ حَدًّا فَعُجِّلَ عُقُوْبَتُهُ فِي الدُّنْيَا فَاللّٰهُ اَعْدَلُ مِنْ اَنْ يُثَنِّيَ عَلٰى عَبْدِهِ الْعُقُوْبَةَ فِي الْاٰخِرَةِ وَمَنْ اَصَابَ حَدًّا فَسَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَفَا عَنْهُ فَاللّٰهُ اَكْرَمُ مِنْ اَنْ يَعُوْدَ فِي شَيْءٍ قَدْ عَفَا عَنْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص، حد کا سزاوار ہو (یعنی کوئی ایسا گناہ کرے جس پر حد متعین ہے) اور پھر اسی دنیا میں اس کو اس کی سزا دے دی گئی (یعنی اس پر حد جاری کی گئی یا تعزیری یعنی کوئی اور سزا دی گئی تو) (آخرت میں اس کو اس گناہ کی کوئی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی شان عدل سے یہ بعید ہے کہ وہ آخرت میں اپنے بندے کو دوبارہ سزا دے، اور جو شخص کسی حد (یعنی گناہ) کا مرتکب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اس گناہ کو چھپا لیا اور اس کو معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ

کی شان کریمی سے یہ بعید ہے کہ وہ اس چیز پر دوبارہ مواخذہ کرے جس کو وہ معاف کر چکا ہے (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اس گناہ کو چھپالیا الخ کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے ندامت و شرم ساری کے ساتھ اپنے گناہ سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت و بخشش کا طلب گار ہوا یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے اس کے اس گناہ کی پردہ پوشی فرمائی اور اس طرح اس کو اسی دنیا میں معاف کر دیا تو اللہ اس کی شان کریمی سے یہ امید ہے کہ آخرت میں بھی اس کو معاف کردے۔

اپنے گناہ کی پردہ پوشی کرنا اس کو ظاہر کرنے سے بہتر ہے

جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ اگر کوئی بندہ کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو (اسی دنیا میں اس کی سزا بھگتنے کے لئے) اس کو ظاہر کرنا (یعنی حاکم کے سامنے خود اپنے گناہ کا اقرار کرنا) اگرچہ اس کے ایمان کی پختگی، اس کے قلب و احساس کی سلامتی اور اس خدا ترسی کا مظہر ہو گا لیکن اس کے حق میں زیادہ بہتر اور اولیٰ بات یہی ہے کہ وہ اپنے گناہ کو چھپا کر اپنے نفس کی پردہ پوشی کرے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ و طلب مغفرت و بخشش کرے۔

بَابُ التَّعْزِيْرِ

تعزیر کا بیان

"تعزیر" کی اصل ہے "عزر" جس کے لغوی معنی ہیں منع کرنا، باز رکھنا، ملامت کرنا۔ اصطلاح شریعت میں اس لفظ (تعزیر) کا استعمال اس سزا کے مفہوم میں کیا جاتا ہے جو حد سے کم درجہ کی ہو اور تنبیہ اور تادیب کے طور پر کسی کو دی جائے۔ اور اس سزا کو "تعزیر" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ آدمی کو اس فعل (گناہ و جرم) کے دوبارہ ارتکاب سے باز رکھتی ہے جس کی وجہ سے اسے وہ سزا (تعزیر) بھگتنی پڑی ہے۔

حد اور تعزیر میں فرق: حد اور تعزیر میں فرق یہ ہے کہ "حد" تو وہ خاص سزا ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور ساتھ ہی متعین ہے، حاکم کو صرف اس سزا کے نفاذ کا اختیار حاصل ہے اس کی قانون سازی یا اس میں کسی تغیر و تبدل کا حق اس کو حاصل نہیں ہے، اس کے برخلاف "تعزیر" وہ سزا ہے جس کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ نے متعین نہیں کیا ہے بلکہ اس کا تعین حاکم کی رائے پر موقوف رکھا گیا ہے کہ وہ موقع و محل اور اقتضاء وقت و ضرورت کے مطابق جو سزا چاہے متعین کرے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بطور تعزیر زیادہ سے زیادہ کتنی سزا دی جاسکتی ہے

(۱) عَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ بْنِ نِیَارٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یُجْلَدُ فَوْقَ عَشْرِ جَلَدَاتٍ اِلَّا فِیْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوبردہؓ ابن نیار، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ نے جو حدود مقرر کی ہیں ان میں دس کوڑوں سے زیادہ کی سزا نہ دی جائے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بطور تعزیر دس سے زیادہ کوڑے مارنے کی سزا دینا جائز نہیں ہے لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔

اس بارے میں فقہاء کے اختلافی اقوال ہیں کہ بطور تعزیر زیادہ سے زیادہ کتنے کوڑے مارنے کی سزا دی جاسکتی ہے؟ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ انتالیس سے زیادہ نہ ہو، جب کہ حضرت امام ابویوسفؒ یہ فرماتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ پچھتر کوڑے ہوسکتے ہیں، البتہ کم سے کم تعداد کے بارے میں تین کوڑے پر سب کا اتفاق ہے، اسی طرح اس مسلہ پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ تعزیر میں جو کوڑے مارے جائیں ان کی تعداد حد میں مارے جانے والی تعداد تک نہ پہنچے لیکن سختی و شدت میں اس سے بھی بڑھ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

مجرم کے منہ پر نہ مارو

② عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا ضَرَبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَّقِ الْوَجْهَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص (کسی مجرم کو سزاء) مارے تو اس کو چاہئے کہ وہ (اس مجرم کے) منہ کو بچائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو بطور حد کوڑے مارے جائیں یا بطور تعزیر و تادیب اس کی پٹائی کی جائے تو بہر صورت یہ ضروری ہے کہ اس کے چہرے کو بچایا جائے یعنی اس کے چہرے پر نہ مارا جائے۔

بدزبانی کی سزا

③ وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِلرَّجُلِ يَا يَهُوْدِيُّ فَاضْرِبُوْهُ عِشْرِيْنَ وَاِذَا قَالَ يَا مُخَنَّثُ فَاضْرِبُوْهُ عِشْرِيْنَ وَمَنْ وَقَعَ عَلٰى ذَاتِ مَحْرَمٍ فَاقْتُلُوْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی شخص کسی (مسلمان) کو کہے "اے یہودی" تو اس کو بیس کوڑے مارو، اور اگر اے مخنث" کہے تب بھی اس کو بیس کوڑے مارو اور جو شخص محرم عورت سے زنا کا مرتکب ہوا اس کو مار ڈالو۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "مخنث" اس کو کہتے ہیں جس کے اعضاء اور بات چیت کے انداز میں زنانہ پن ہو اور حرکات و سکنات میں عورتوں کے مشابہ ہوا جس کو زنخا اور زنانہ بھی کہا جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی غلام پر یا کسی کافر پر زنا کی تہمت لگائے تو اس کو تعزیر (کوئی سزا) دی جانی چاہئے۔ اسی طرح اس شخص کو بھی تعزیر دی جائے جو کسی مسلمان پر زنا کے علاوہ کسی اور برائی کی تہمت لگائے مثلاً ان الفاظ کے ذریعہ اس کو مخاطب کرے اے فاسق، اے فاجر، اے کافر، اے خبیث اے چور، اے منافق، اے لوطی یعنی اغلام باز، اے یہودی، اے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے والے، اے سود خوار، اے دیوث اے مخنث، اے خائن، اے رنڈی کی اولاد اے بدکار عورت کے بچے، اے زندیق، اے کتے، اے زانیوں یا چوروں کے پشت پناہ اور اے حرامزادے۔

اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو ان الفاظ کے ذریعہ مخاطب کرے تو وہ قابل تعزیر نہیں ہوگا، اے گدھے، اے کتے، اے بندر، اے بکرے، اے الو، اے سانپ، اے سور، اے بیل، اے بھیڑیئے، اے حجام، اے حجام کی اولاد (درانحالیکہ وہ کسی حجام کی اولاد نہ ہو) اے ولد الحرام، اے ناکس، اے منکوس، اے مسخرے، اے ٹھٹھے باز، عیار اے بیوقوف اور اے وہمی۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ واضح رہے کہ علماء نے اس شخص کو تعزیر دینا پسند کیا ہے جو مذکورہ بالا الفاظ کے ذریعہ کسی ایسے شخص کو مخاطب کرے جو شرفاء میں سے ہو۔

خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو تعزیر (کوئی سزا) دے جب کہ وہ کہنے کے باوجود اس کے سامنے زینت و آرائش کرنے سے اجتناب کرتی ہو یا وہ اس کو اپنے بستر پر (ہمبستری کے لئے) بلائے اور وہ انکار کردے، یا وہ نماز نہ پڑھتی ہو، یا غسل جنابت ترک کرتی ہو اور یا اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے باہر آتی جاتی ہو۔

"جو شخص محرم عورت سے زنا کا مرتکب ہو اس کو مار ڈالو۔" حضرت امام احمدؒ نے اس ارشاد کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا ہے جب کہ جمہور علماء کے نزدیک اس کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف زجرا تہدید سے ہے۔ بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ یہ ارشاد اس بات پر محمول ہے کہ جو شخص حلال اور ہلکا جان کر کسی محرم عورت سے زنا کرے اس کو مار ڈالا جائے ورنہ محرم عورت کے ساتھ زنا کا بھی وہی حکم ہے جو دوسری عورتوں کے ساتھ زنا کا ہے کہ اگر زانی محصن (شادی شدہ) ہو تو اس کو سنگسار کیا جائے اور اگر غیر محصن (کنوارا) ہو تو کوڑے مارے جائیں۔

مال غنیمت میں خیانت کرنے والے کی سزا

④ وَعَنْ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وَجَدْتُمُ الرَّجُلَ قَدْ غَلَّ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاَحْرِقُوْا مَتَاعَهٗ وَاضْرِبُوْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عمر فاروقؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر تم کسی ایسے شخص کو پکڑو جس نے خدا کی راہ میں خیانت کی ہو (یعنی اس نے مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے اس میں سے کچھ چرا لیا ہو) تو اس کا مال و اسباب جلا ڈالو اور اس کی پٹائی کرو۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "اس کا مال و اسباب جلا ڈالو" کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔ بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ جو شخص مال غنیمت میں سے کچھ چرائے بطور سزا اس کا مال و اسباب جلانا جائز نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم کہ "اس کا مال و اسباب جلا ڈالو" اسلام سے ابتدائی زمانہ میں نافذ تھا مگر بعد میں منسوخ قرار دے دیا گیا۔ یا یہ کہ یہ ارشاد دراصل تغلیظ اور تشدید پر محمول ہے حضرت امام احمدؒ نے اس حکم کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس شخص کا تمام مال و اسباب جلا دیا جائے۔ البتہ اگر اس کے سامان میں قرآن کریم، ہتھیار اور جانور بھی ہوں تو ان کو نہ جلایا جائے۔ نیز بطریق تعزیر اس کی پٹائی کی جائے اور یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ مال غنیمت کی چوری کرنے والا قطع ید کا سزاوار نہیں ہوتا۔

بَابُ بَيَانِ الْخَمْرِ وَوَعِيْدِ شَارِبِهَا

شراب کی حقیقت اور شراب پینے والے کے بارے میں وعید کا بیان

اس باب میں ایک تو خمر یعنی شراب کی حقیقت کو بیان کیا جائے گا کہ خمر کس کو کہتے ہیں۔ دوسری چیز یہ بیان ہوگی کہ شراب پینے والے کے بارے میں کس چیز کا خوف ہے اور اس کے حق میں کیا کیا وعیدیں منقول ہیں۔

خمر کسے کہتے ہیں؟: قاموس میں لکھا ہے کہ خمر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے استعمال (یعنی جس کو پینے) سے نشہ و مستی پیدا ہو جائے۔ اور وہ انگور کے شیرے کی صورت میں ہو یا عام کہ وہ انگور کا شیرہ ہو یا اور کسی چیز کا عرق و کاڑھا وغیرہ ہو، زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس کا عام مفہوم مراد لیا جائے (یعنی نشہ لانے والی چیز خواہ وہ انگور کا شیرہ ہو یا کسی دوسری چیز کا شیرہ وغیرہ کیونکہ شراب مدینہ میں حرام ہوئی ہے اور اس زمانہ میں انگور کی شراب کا کوئی وجود نہیں تھا بلکہ وہ کھجور سے بنائی جاتی تھی خمر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لغت میں "خمر" کے معنی ہیں "ڈھانپنا، چھپانا، خلط

کرنا" اور چونکہ شراب انسان کی عقل کو ڈھانپ دیتی ہے اور اس کے فہم و شعور کی قوتوں کو خلط و خبط کر دیتی ہے اس لئے اس کو "خمر" کہا گیا۔

نشہ آور چیزوں کی قسمیں: جو چیزیں نشہ پیدا کرتی ہیں ان کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو شراب کی ہے جو انگور سے اس طرح بنتی ہے کہ انگور کا عرق نکال کر کسی برتن میں رکھ دیتے ہیں، کچھ دنوں کے بعد وہ گاڑھا ہو جاتا ہے اور اس میں ابال پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ نشہ آور ہو جاتا ہے، صحیح تر اور مختار قول کے مطابق اس میں جھاگ کا پیدا ہونا شرط نہیں ہے اس کو عربی میں "خمر" کہتے ہیں۔

دوسری قسم یہ کہ انگور کے عرق کو قدرے جوش دے کر رکھ دیتے ہیں اس کو عربی میں "باذق" اور فارسی میں "بادہ" کہتے ہیں اور انگور کا وہ عرق جس کو اتنا پکایا جاتا ہے کہ اس کا چوتھائی حصہ جل کر صرف تین چوتھائی حصہ رہ جاتا ہے۔ "طلا" کہلاتا ہے۔

تیسری قسم "نقیع التمر" ہے جس کو "سکر" بھی کہتے ہیں یعنی تر خرما کا وہ شربت جو گاڑھا ہو جائے اور اس میں جھاگ پیدا ہو جائے اور چوتھی قسم "نقیع الزبیب" ہے یعنی منقی اور کشمش وغیرہ کا وہ شربت جس میں ابال اور جھاگ پیدا ہو جائے۔

ان چاروں قسموں میں سے پہلی قسم تو بلا کسی قید کے حرام ہے اور باقی تین قسمیں اس صورت میں بہ اتفاق حرام ہیں جب کہ ان کو جوش دے کر رکھ دیا جائے اور ان میں گاڑھا پن آجائے کیونکہ اس صورت میں ان چیزوں میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر ان میں مذکورہ چیزیں نہ پائی جائیں تو ان کو حرام نہیں کہیں گے مثلاً کچھ دیر کے لئے پانی میں خرما بھگو کر رکھ دیا جائے یہاں تک کہ وہ پانی شربت کی طرح ہو جائے اور اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر واقع نہ ہو تو اس کا پینا درست ہوگا۔

ان کے علاوہ پینے کے چار مشروب اور ہیں جن کا پینا امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک حلال ہے بشرطیکہ ان کو معمولی طور پر اس طرح جوش دیا گیا ان میں نشہ پیدا نہ ہوا ہو اور اگر ان میں نشہ پیدا ہو گیا ہو تو یہ قسمیں بھی حرام ہوں گی، اسی طرح اگر ان کو جوش دیئے بغیر کافی عرصہ کے لئے رکھ دیا گیا ان میں جھاگ پیدا ہو گیا تب بھی ان کا پینا حرام ہوگا۔ ان چاروں میں سے ایک قسم تو "نبیذ" ہے۔ یعنی وہ مشروب جو خرما سے بنایا گیا ہو اور اس کو قدرے جوش دیا گیا ہو، اگر اس میں کچھ گاڑھا پن بھی آ گیا ہو تو اس کا پینا جائز ہے۔

دوسری قسم "خلیط" ہے یعنی وہ شربت جو خرما اور منقی کو قدرے جوش دے کر ان سے نکالا گیا ہو۔

تیسری قسم وہ نبیذ ہے جو شہد، گیہوں، جو اور جوار وغیرہ کو پانی میں قدرے جوش دے کر مشروب کی صورت میں بنائی گئی ہو۔

اور چوتھی قسم مثلث یمنی ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انگور کے عرق کو اتنا پکایا جاتا ہے کہ اس کا دو حصہ خشک ہو جاتا ہے اور ایک حصہ شراب کی شکل میں باقی رہ جاتا ہے۔

ان چاروں چیزوں کے بارہ میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو عبادت کے لئے طاقت حاصل کرنے کی غرض سے پئے تو جائز ہے اور اگر لہو و لعب کے طور پر اور جنسی لذت کے لئے پئے تو حرام ہے لیکن حضرت امام محمدؒ کے نزدیک عبادت کے لئے طاقت حاصل کرنے کی غرض سے بھی ان کا پینا حرام ہے۔ چنانچہ حنفی مسلک میں اہل تحقیق کا فتویٰ حضرت امام محمدؒ ہی کے قول پر ہے جیسا کہ یمنی شرح کنز میں لکھا ہے کہ "حضرت امام مالکؒ"، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمدؒ اور حنفیہ میں سے حضرت امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو اور بدمست بنا دیتی ہو اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے خواہ کسی طرح کا نشہ ہو کیونکہ ابن ماجہ اور دار قطنی کی روایت کے مطابق رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو چیز نشہ آور ہو وہ شراب ہے اور ساری نشہ آور چیزیں حرام ہیں، لہٰذا حنفی مسلک میں فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر نشہ آور چیز "شراب" ہے اور حرام ہے خواہ وہ "مشروب" کی صورت میں ہو اور انگور یا کھجور یا منقی یا شہد سے بنے یا گیہوں، جو، باجرہ یا جوار سے بنے اور خواہ وہ کسی درخت کا عرق ہو جیسے تاڑی وغیرہ یا کوئی گھاس ہو جیسے بھنگ وغیرہ اسی طرح وہ ہر مقدار میں حرام ہے خواہ تھوڑی ہو یا بہت ہو، نیز اگر کوئی شخص نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے تو مفتی بہ قول کے مطابق اس کی طلاق واقع

ہو جائے گی خواہ شراب کا نشہ ہو یا نبیذ وغیرہ کا۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور حنفیہ میں سے حضرت امام محمدؒ نیز محدثین کرام کا مسلک یہ ہے کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے خواہ تھوڑی ہو یا بہت ہو، اور اگرچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ مشروب نجس و حرام اور شراب کے حکم میں ہے جس میں ابال، گاڑھاپن اور جھاگ پیدا ہو گیا ہو، اس کے علاوہ اور چیزیں جب تک کہ ان میں نشہ نہ ہو حرام نہیں ہیں۔ لیکن حنفی مسلک کے احتیاط پسند مصنفین کے ہاں فتوی حضرت امام محمدؒ ہی کے قول پر ہے جیسا کہ نہایہ، عینی، ذیلعی، درمختار، الاشباہ والنظائر، فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ حمادیہ اور شرح مواہب الرحمٰن میں مذکورہ ہے بلکہ شرح وہبانیہ وغیرہ میں تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا قول بھی حضرت امام محمدؒ کے قول کے مطابق ہی منقول ہے، اس صورت میں یہ مسلہ تمام ائمہ مجتہدین کا متفقہ ہو جاتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا عبد العلی لکھنوی نے ایک استفتاء کے جواب میں تاڑی اور نان پاؤ (ایک قسم کی خمیری روٹی) کی حرمت کو ظاہر کرتے ہوئے اس مسلہ پر بڑی تحقیق و تفصیل اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے اور تیس چالیس حنفی و شافعی علماء نے تصدیق کی مہریں ثبت کی ہیں۔

نشہ آور چیزوں میں ایک قسم بھنگ، نشہ لانے والی گھاس اور جڑی بوٹیاں اور افیون ہیں کہ ان کو کھانا پینا بھی حرام ہے کیونکہ یہ چیزیں بھی انسان کی عقل کو تباہ کرتی ہیں اور ذکر اللہ و نماز وغیرہ سے باز رکھتی ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ جو شخص بھنگ وغیرہ کو حلال جانے وہ زندیق و بدعتی ہے، بلکہ فقیہ نجم الدین زاہدیؒ نے تو ایسے شخص پر کفر کا حکم لگایا ہے اور اس کو قتل کو دینا مباح جانا ہے۔

اسی طرح تمباکو بھی حرام ہے جیسا کہ درمختار میں لکھا ہے اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے حقہ نوشی کو مکروہ تنزیہی کہا ہے کیونکہ حقہ پینے والے کے منہ سے پیاز و لہسن کے مانند بدبو ہی نہیں بلکہ اس میں ایک طرح سے دوزخیوں کی مشابہت بھی ہے۔ کہ جس طرح دوزخیوں کے منہ سے دھواں نکلے گا اسی طرح حقہ پینے والے کے منہ سے بھی دھواں نکلتا ہے، علاوہ ازیں حقہ نوشی ایک ایسی عادت ہے جس کو سلیم طبع، مکروہ جانتی ہے اور حقہ پینے سے بدن میں بہت زیادہ سستی پیدا ہو جاتی ہے اور بعضوں پر غشی بھی طاری ہوتی ہے اور یہ چیز "مفتر" میں داخل ہے اور ایک روایت کے مطابق جس کو حضرت امام احمدؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

جو چیز مفتر یعنی سستی پیدا کرنے والی ہو وہ حرام ہے۔ صاحب صراح اور صحاح نے "مفتر" کے معنی "سستی پیدا کرنے والا" لکھا ہے اور حضرت امام ابوالقاسم حسین ابن محمد ابن مفضل راغب نے اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں "فتر" اور "فتور" کے معنی یہ لکھے ہیں کہ "تیزی کے بعد تھم جانا، شدت (چستی) کے بعد نرم (صحت کے بعد کمزور ہو جانا" چنانچہ یہ معنی حقہ پینے والے پر صادق آتے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ مفتر کے معنی میں "بدن کا گرم ہو جانا" بھی داخل ہے تو یہ شاذ معنی ہے جو اکثر علماء لغت کی تحقیق کے خلاف ہے یا اس سے "اندر کی گرمی" مراد ہے۔ بہرحال حقہ نوشی حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی سے بعید ہے کیونکہ حقہ، مسواک کی سنت کے منافی ہے باایں وجہ کہ مسواک منہ کو بدبو سے پاک کرتی ہے جب کہ حقہ منہ کو بدبودار بناتا ہے اور مسواک کے بارہ میں یہ حدیث صحاح وغیرہ میں منقول ہے کہ:

اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ وَمَرْضَاتٌ لِلرَّبِّ۔

"مسواک منہ کی صفائی و پاکیزگی کا ذریعہ اور حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا سبب ہے۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

شراب کن چیزوں سے بنتی ہے

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْخَمْرُ مِنْ هَاتَيْنِ الشَّجَرَتَيْنِ: النخلةِ وَالْعِنَبَةِ۔ متفق

علیه۔

"حضرت ابوہریرہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "شراب ان دو درختوں یعنی انگور اور کھجور سے بنتی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مراد یہ ہے کہ اکثر انہی دو چیزوں سے شراب بنتی ہے، گویا یہاں حصر یعنی یہ ظاہر کرنا مراد نہیں ہے کہ شراب بس انہی دو چیزوں سے بنتی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ کُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ یعنی ہر نشہ آور چیز شراب ہے چنانچہ اس ارشاد میں جو عمومیت ہے اس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے۔

② وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ خَطَبَ عُمَرُ عَلٰى مِنْبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّهٗ قَدْ نَزَلَ تَحْرِيْمُ الْخَمْرِ وَهِيَ مِنْ خَمْسَةِ اَشْيَاءَ الْعِنَبِ وَالتَّمْرِ وَالْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَالْعَسَلِ وَالْخَمْرُ مَاخَامَرَ الْعَقْلَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت عمر فاروقؓ نے رسول کریم ﷺ کے منبر پر (کھڑے ہو کر) خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ "شراب کی حرمت نازل ہوگئی ہے اور شراب پانچ چیزوں سے بنتی ہے یعنی انگور سے، کھجور سے، گیہوں، سے جو سے اور شہد سے، اور شراب وہ ہے جو عقل کو ڈھانپ لے۔" (بخاریؒ)

تشریح: علماء نے وضاحت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے "اور شراب وہ ہے جو عقل کو ڈھانپ لے۔" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا کہ شراب کا انحصار انہی پانچ چیزوں میں نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ کسی بھی چیز سے بنا ہوا ہر وہ مشروب، شراب ہے جس میں نشہ ہو اور اس کے پینے سے عقل و شعور پر پردہ پڑ جاتا ہو۔

پہلے زیادہ تر کھجور سے شراب بنتی تھی

③ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ لَقَدْ حُرِّمَتِ الْخَمْرُ حِيْنَ حُرِّمَتْ وَمَا نَجِدُ خَمْرَ الْاَعْنَابِ اِلَّا قَلِيْلًا وَعَامَّةُ خَمْرِنَا الْبُسْرُ وَالتَّمْرُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تھی اسی قت اس کی حرمت (نافذ) ہوگئی تھی اور (اس وقت) ہمیں انگور کی شراب کم ملتی تھی ہماری شراب زیادہ تر کچی کھجور اور خشک کھجور سے بنتی تھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: کھجور کے درخت پر پہلے جو شگوفہ لگتا ہے اس کو عربی میں "طلع" کہتے ہیں اور وہ کھجور کی ابتدائی حالت ہوتی ہے پھر اس کے بعد "خلال" پھر "بسر" پھر (رطب) اور پھر خشک ہو جانے کے بعد اس کی آخری شکل "تمر" ہوتی ہے۔

ہر نشہ آور مشروب حرام ہے

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِتْعِ وَهُوَ نَبِيْذُ الْعَسَلِ فَقَالَ كُلُّ شَرَابٍ اَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے بتع یعنی شہد کی نبیذ کے بارہ میں پوچھا گیا (کہ آیا اس کا پینا جائز ہے یا نہیں؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ مشروب جو نشہ لائے، حرام ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس حدیث میں تو "بتع" کو با کے زیر اور تا کے جزم کے ساتھ یعنی "بتع" نقل کیا گیا ہے جب کہ یہ بعض جگہ تا کے زیر کے ساتھ منقول ہے "شہد کی نبیذ" اس شہد کو کہتے ہیں جس کو کسی برتن میں ڈال کر رکھ چھوڑا جائے تاکہ کھجور کی نبیذ کی طرح اس میں ایک خاص قسم کی تیزی پیدا ہو جائے، چنانچہ اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر شہد کی نبیذ بھی نشہ لائے تو وہ بھی حرام ہے اور

تمر کی نبیذ کا بھی یہی حکم ہے کہا جاتا ہے کہ اہل یمن کی شراب یہی بتع ہوتی ہے۔

جو شخص اس دنیا میں شراب پیئے گا وہ شراب طہور سے محروم رہیگا

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ وَمَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا فَمَاتَ وَهُوَ يُدْمِنُهَا لَمْ يَتُبْ لَمْ يَشْرَبْهَا فِي الْآخِرَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو چیز نشہ لائے وہ شراب ہے اور جو چیز نشہ لانے والی ہے وہ حرام ہے (خواہ مقدار میں تھوڑی ہو یا زیادہ ہو) اور جو شخص دنیا میں شراب پیئے گا اور ہمیشہ پیتا رہے گا یہاں تک کہ بغیر توبہ کئے مرجائے گا تو اس کو آخرت میں شراب پینا نصیب نہ ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اس کو آخرت میں شراب پینا نصیب نہ ہوگا" سے مراد یا تو اس شخص کی حالت کو بیان کرنا ہے جو شراب کو حلال جانتے ہوئے ہمیشہ پیتا تھا۔ یا یہ ارشاد زجر و توبیخ اور شراب پینے کی شدید ممانعت پر محمول ہے، اور یا یہ مراد ہے کہ اس شخص کو آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ شراب طہور پینا نصیب نہیں ہوگا جو نجات یافتہ اور جنت میں پہلے داخل ہونے والوں میں ہوں گے۔

شرابی کے بارے میں وعید

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَجُلًا قَدِمَ مِنَ الْيَمَنِ فَسَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَرَابٍ يَشْرَبُوْنَهُ بِاَرْضِهِمْ مِنَ الذُّرَةِ يُقَالُ لَهُ الْمِزْرُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَ مُسْكِرٌ هُوَ؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ اِنَّ عَلَى اللّٰهِ عَهْدًا لِمَنْ يَشْرَبُ الْمُسْكِرَ اَنْ يَسْقِيَهُ مِنْ طِيْنَةِ الْخَبَالِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا طِيْنَةُ الْخَبَالِ قَالَ عَرَقُ اَهْلِ النَّارِ اَوْ عُصَارَةُ اَهْلِ النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ یمن کا ایک شخص (دربار نبوی ﷺ میں آیا اور نبی کریم ﷺ سے جوار کی شراب کے بارہ میں پوچھا جو یمن میں پی جاتی تھی اور جس کو "مزر" کہا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا کہ "کیا وہ نشہ لاتی ہے؟" اس نے کہا کہ "ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا "نشہ لانے والی ہر چیز حرام ہے، اور (یاد رکھو) کہ اللہ تعالیٰ کا یہ عہد ہے کہ جو شخص نشہ لانے والی کوئی بھی چیز پئے گا وہ اس کو طینہ الخبال "پلائے گا۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! طینۃ الخبال کیا ہے؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "خبال" دوزخیوں کا پسینہ ہے۔ یا فرمایا کہ۔ خبال وہ پیپ اور لہو ہے جو دوزخیوں کے زخموں سے بہتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے ترجمہ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ دوزخیوں کا پسینہ۔ یا۔ ان کے زخموں سے بہنے والا لہو اور پیپ "خبال کے معنی ہیں۔ اور "طینت" کے معنی ہیں تلچھٹ۔

نبیذ کے بارے میں ایک حکم

⑦ وَعَنْ اَبِي قَتَادَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ خَلِيْطِ التَّمْرِ وَالْبُسْرِ وَعَنْ خَلِيْطِ الزَّبِيْبِ وَالتَّمْرِ وَعَنْ خَلِيْطِ الزَّهْوِ وَالرُّطَبِ وَقَالَ انْتَبِذُوْا كُلَّ وَاحِدٍ عَلٰى حِدَةٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خشک کھجور اور کچی کھجور کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے، خشک کھجور اور خشک انگور کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے اور کچی کھجور اور تر کھجور کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے کہ (اگر نبیذ بنانا ہی ہو تو) ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ نبیذ بناؤ۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے دو پھلوں کو ملا کر بھگونے (یعنی ان کا نبیذ بنانے) سے منع فرمایا اور الگ الگ کر کے بھگونے (اور اس کی نبیذ بنانے) کو جائز رکھا اس میں حکمت یہ ہے کہ جب دو مختلف طرح کے پھل ایک ساتھ بھگوئے جائیں گے تو ایک پر پانی جلد اثر کرے گا۔ اور دوسرے پر دیر سے، نتیجہ یہ ہو گا جو پانی سے جلد تغیر قبول کرے گا اس میں نشہ پیدا ہو جائے گا اور اس کا اثر دوسرے تک پہنچے گا، اس طرح جو نبیذ تیار ہو گی اس میں ایک نشہ آور چیز کے مخلوط ہو جانے کا قوی امکان ہو گا جس کا امتیاز کرنا ممکن نہیں ہو گا لہٰذا جب اس نبیذ کو پیا جائے گا تو گویا ایک حرام چیز کو پینا لازم آئے گا۔ چنانچہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ نے اسی بنیاد پر اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا ہے اور کہا ہے کہ ایسی نبیذ پینا جو دو پھلوں کو باہم بھگو کر بنائی گئی ہو، حرام ہے خواہ اس میں نشہ ہو یا نشہ نہ ہو لیکن جمہور علماء یہ فرماتے ہیں کہ ایسی نبیذ کا پینا اسی صورت میں حرام ہو گا جب کہ وہ نشہ آور ہو۔

شراب کا سرکہ بنا کر اس کو کھانے پینے کے کام میں لانا جائز ہے

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْخَمْرِ یُتَّخَذُ خَلًّا؟ فَقَالَ لَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر شراب (میں نمک و پیاز وغیرہ ڈال کر اس) کا سرکہ بنا لیا جائے تو وہ حلال ہے یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں۔" (مسلم)

تشریح: حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر شراب، سرکہ میں تبدیل ہو جائے تو اس کو کھانے پینے کے مصرف میں لانا جائز ہو گا خواہ شراب میں کوئی چیز ڈال کر اس کا سرکہ بنا لیا گیا ہو یا اس میں کوئی چیز ڈالے بغیر مثلاً زیادہ دن رکھے رہنے یا دھوپ میں رکھ دینے کی وجہ سے خود بخود اس کا سرکہ بن گیا ہو۔ حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر شراب میں کوئی چیز ڈال کر اس کا سرکہ بنایا تو وہ حلال نہیں ہے۔ اور اگر کچھ ڈالے بغیر مثلاً دھوپ میں رکھ دینے کی وجہ سے اس کا سرکہ بن گیا ہو تو اس کے بارہ میں ان کے دو قول ہیں جس میں سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ شراب، شراب نہیں رہے گی بلکہ اس میں پاکی آ جائے گی اور اس کو کھانے پینے کے کام میں لانا جائز ہو گا۔

حنفیہ کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اول تو بلا کسی قید کے یہ فرمایا ہے کہ نِعْمَ الْاِدَامُ الْخَلُّ (بہترین سالن، سرکہ ہے) لہٰذا جو چیز بھی سرکہ ہو گی اس کا استعمال حلال ہو گا، دوسرے جب شراب میں سے وہ بری خاصیت نکل گئی جس کی وجہ سے وہ حرام تھی اور اس میں اچھی خاصیت پیدا ہو گئی تو اب وہ ایک مباح چیز کے درجہ میں آ گئی لہٰذا اس کا کھانا پینا حلال ہو گا جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو اس کے بارہ میں حنفیہ کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کو حلال اس لئے نہیں فرمایا تھا کہ اس وقت شراب کی حرمت نازل ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا اور لوگوں نے بڑی طویل عادت کو ترک کر کے شراب سے منہ موڑا تھا، اور یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان جس کو ایک طویل عادت کے بعد چھوڑتا ہے اس کی طرف اس کی طبیعت اور خواہش کا میلان کافی عرصہ تک رہتا ہے، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس وقت شیطان کی مداخلت سے خوف محسوس فرما کر کہ مبادا شیطان لعین کو اپنا حربہ آزمانے کا موقع مل جائے اور اس کے نتیجہ میں لوگ اس چیز کو شراب پینے کا وسیلہ بنالیں، آپ نے اس کو حلال نہیں فرمایا لیکن شراب کی حرمت پر طویل عرصہ گذر جانے اور شراب کی طرف لوگوں کے میلان کے ہلکے سے بھی شائبے کی جڑیں تک اکھڑ جانے کے بعد جب اس قسم کا کوئی خوف نہ رہا اور اس طرح وہ "مصلحت" ختم ہو گئی جس کی بناء اس کو حلال نہ فرمایا گیا تھا تو وہ حرمت زائل ہو گئی اور پھر شراب سے بنے ہوئے سرکہ کو استعمال کرنا بھی حلال ہو گیا۔ علاوہ ازیں صاحب ہدایہ نے ایک روایت بھی نقل کی ہے جس کو بیہقیؒ نے اپنی کتاب معرفت میں حضرت جابرؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ:

خَیْرُ خَلِّکُمْ خَلُّ خَمْرِکُمْ۔ (بیہقی)

"یعنی تمہارے سرکوں میں بہترین سرکہ وہ ہے۔ جو شراب سے بنا ہو۔"

شراب کو دوا کے طور پر بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے

⑨ وَعَنْ وائلِ الحضرمی اَنَّ طَارِقَ بْنَ سُوَيْد سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَمْرِ فَنَهَاهُ فَقَالَ اِنَّمَا اَصْنَعُهَا لِلدَّوَاءِ فَقَالَ اِنَّهُ لَيْسَ بِدَوَاءٍ وَلٰكِنَّهُ دَاءٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت وائل حضرمیؓ روایت کرتے ہیں کہ طارق ابن سوید نے نبی کریم ﷺ سے شراب نوشی کے بارے میں پوچھا تو آپ نے ان کو منع فرمایا، پھر طارقؓ نے کہا کہ ہم تو شراب کو دوا کے طور پر استعمال کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "وہ دوا نہیں ہے بلکہ (خود ایک) بیماری ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اکثر علماء نے شراب کو دوا کے طور پر بھی استعمال کرنے سے منع کیا ہے جب کہ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر حاذق طبیب و معالج کے کہنے کے مطابق شراب ہی کسی مرض کا واحد علاج ہو یعنی معالج یہ کہے کہ اس مرض کی بس شراب ہی دوا ہے اور کوئی دوا نہیں ہے تو اس صورت میں اس کا استعمال مباح ہوگا۔ اسی طرح اگر حلق میں کوئی لقمہ وغیرہ اٹک جائے اور اس کی وجہ سے جان کی ہلاکت کا خوف ہو نیز اس وقت پانی یا ایسی اور کوئی چیز موجود نہ ہو جس سے وہ لقمہ وغیرہ حلق سے اتر جائے تو اس صورت میں تمام علماء کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ صرف اتنی شراب پی لینا حلال ہے جس سے وہ لقمہ وغیرہ حلق سے نیچے چلا جائے۔

کسی حرام چیز میں اللہ نے شفا نہیں رکھی ہے: پچھلے باب کے ابتدا میں بتایا گیا تھا کہ شراب کی حرمت دفعۃً نازل ہونے کی بجائے بتدریج نازل ہوئی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں جو پہلی آیت نازل ہوئی ہے وہ بھی اس موقع پر نقل کی گئی ہے، اس آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ و منافع للناس یعنی اس شراب میں لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں۔" وہ فائدے کیا ہیں، اس بارے میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن بعض مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ "فائدے" سے مراد انسانی بدن کی صحت ہے کہ شراب انسان کی جسم کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا اس کے ذریعہ کسی مرض سے نجات مل سکتی ہے۔ اس ضمن میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ "اللہ تعالیٰ نے کسی حرام چیز میں شفا نہیں رکھی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

شراب نوشی کا وبال

⑩ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهُ صَلَاةً اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا فَاِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَاِنْ عَادَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهُ صَلَاةً اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا فَاِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَاِنْ عَادَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهُ صَلَاةً اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا فَاِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَاِنْ عَادَ فِی الرَّابِعَةِ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهُ صَلَاةً اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا فَاِنْ تَابَ لَمْ يَتُبِ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَقَاهُ مِنْ نَّهْرِ الْخَبَالِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاهُ النَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو۔

"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص (پہلی مرتبہ) شراب پیتا ہے (اور توبہ نہیں کرتا) تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں کرتا، پھر اگر وہ (خلوص دل سے) توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے، پھر اگر وہ (دوسری مرتبہ) شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں کرتا اور پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے پھر اگر وہ (تیسری مرتبہ) شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں کرتا اور پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ

چوتھی مرتبہ شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ (نہ صرف یہ کہ) چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں کرتا (بلکہ) اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ (بھی) قبول نہیں کرتا اور (آخرت میں) اس کو دوزخیوں کی پیپ اور لہو کی نہر سے پلائے گا۔" (ترمذیؒ) نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے اس روایت کو عبداللہ ابن عمروؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "اس کی نماز قبول نہیں کرتا" کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو اپنی نماز کا ثواب نہیں ملتا اگرچہ وقت پر نماز کی ادائیگی کا فرض اس پر سے ساقط ہو جاتا ہے۔ یہاں خاص طور پر نماز کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب نماز جیسی عبادت قبول نہیں ہوتی جو تمام بدنی عبادتوں میں سب سے افضل ہے تو دوسری عباد تیں بطریق اولی قبول نہیں ہوں گی نیز "چالیس دن" کی تعداد شاید اس لئے لگائی گئی ہے کہ شراب پینے والے کے باطن میں شراب کا اثر مختلف نوعیتوں سے اتنی ہی مدت تک رہتا ہے۔

یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ چوتھی مرتبہ میں توبہ قبول نہیں کی جاتی دراصل زجر و تشدید اور تحت تنبیہ پر محمول ہے کیونکہ ایک جگہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "جس شخص نے گناہ سے توبہ کی اور نادم ہوا اور اللہ تعالیٰ سے بخشش کی امید رکھی تو اس نے اصرار نہیں کیا (یعنی ایسے شخص کو "مصر" نہیں کہہ سکتے اور اس کی توبہ قبول ہوگی) اگرچہ ایک ہی دن میں وہی گناہ ستر بار کرے" یا یہ مراد ہے کہ جو شخص بار بار شراب پیتا ہے تو اس اُمّ الخبیث کے ارتکاب کی نحوست کی وجہ سے اس کو حقیقی توبہ کی توفیق عطا نہیں ہوتی اور آخر کار وہ "مصر" مر جاتا ہے۔

نشہ آور چیز کی قلیل مقدار بھی حرام ہے

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو چیز نشہ لاتی ہو اس کی قلیل ترین مقدار بھی حرام ہے۔"

(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر مثلاً شراب کی کوئی ایسی قسم ہے جس کی زیادہ مقدار نشہ لاتی ہے، کم مقدار نشہ نہیں لاتی تو یہ نہیں ہے کہ اس کو کم مقدار میں پینا جائز ہوگا بلکہ اس کی کم مقدار بھی حرام ہوگی کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ پہلے جس چیز کی کم مقدار کو اختیار کرتا ہے وہی کم مقدار اس کو زیادہ مقدار تک پہنچا دیتی ہے لہٰذا اس کم مقدار سے بھی اجتناب کرنا ضروری ہوگا۔

مسکر چیز کا ایک چلو بھی حرام ہے

(۱۲) وَعَنْ عَائِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اَسْكَرَ مِنْهُ الْفَرَقُ فَمِلْءُ الْكَفِّ مِنْهُ حَرَامٌ۔

(رواہ احمد والترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس چیز (مثلاً شراب) کا ایک "فرق" (یعنی آٹھ سیر کی مقدار) نشہ لائے اس کا ایک بھرا ہوا چلو بھی حرام ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ جس نشہ آور چیز کی زیادہ مقدار حرام ہے۔ اس کی قلیل ترین مقدار بھی حرام ہے۔

شراب کن چیزوں سے بنتی ہے

(۱) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الْحِنْطَةِ خَمْرًا وَمِنَ الشَّعِيْرِ خَمْرًا وَمِنَ التَّمْرِ خَمْرًا وَمِنَ الزَّبِيْبِ خَمْرًا وَمِنَ الْعَسَلِ خَمْرًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ

غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت نعمان ابن بشیر کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" گیہوں کی بھی شراب ہوتی ہے، جو کی بھی شراب ہوتی ہے، کھجور کی بھی شراب ہوتی ہے، انگور کی بھی شراب ہوتی ہے اور شہد کی بھی شراب ہوتی ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ یہاں حصر مراد نہیں ہے کہ بس انہی چیزوں سے شراب بنتی ہے، بلکہ ان چیزوں کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ عام طور پر شراب انہی چیزوں سے بنتی ہے۔ اس ارشاد میں اس بات کی دلیل ہے کہ خمر صرف انگوری شراب کو نہیں کہتے جب کہ ابن ملک" کہتے ہیں کہ یہاں انگوری شراب کے علاوہ دوسری چیزوں کی شراب کو بھی خمر مجازاً کہا گیا ہے اور اس میں مناسبت یہ ہے کہ ان چیزوں کی شراب (یا نشہ آور نبیذ) بھی انسان کی عقل کو زائل کر دیتی ہے۔

شراب مال متقوم نہیں ہے

⑭ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ عِنْدَنَا خَمْرٌ لِیَتِیْمٍ فَلَمَّا نَزَلَتِ الْمَائِدَةُ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْهُ وَقُلْتُ اِنَّهٗ لِیَتِیْمٍ فَقَالَ اَهْرِیْقُوْهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدری" کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک یتیم کی شراب رکھی ہوئی تھی (یعنی ہمارے گھر میں ایک یتیم رہا کرتا تھا جو ہماری پرورش میں تھا اس کی ملکیت میں جہاں اور بہت سامال واسباب تھا وہیں شراب بھی تھی کیونکہ اس زمانہ میں شراب مباح تھی) چنانچہ سورہ مائدہ (کی وہ آیت انما الخمر الایہ نازل ہوئی (جس میں شراب کی حرمت کا بیان ہے اور جو باب حد الخمر کے ابتدا میں نقل کی جا چکی ہے) تو میں نے اس یتیم کی شراب کے بارے میں رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا اور عرض کیا کہ وہ ایک یتیم کا مال ہے (اور چونکہ یتیم کا مال ضائع نہیں کرنا چاہئے اس لئے اب کیا حکم ہے) آپ ﷺ نے فرمایا" اس کو پھینک دو۔" (ترمذی")

تشریح: آپ ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ واضح فرمایا کہ شراب متقوم مال نہیں ہے نہ صرف یہ کہ اس سے کوئی نفع حاصل کرنا کسی بھی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے بلکہ ہمیں اس کی اہانت کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں اس شراب کو پھینک دینا ہی ضروری ہے۔

⑮ وَعَنْ اَنَسٍ عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ اَنَّهٗ قَالَ یَانَبِیَّ اللّٰهِ اِنِّیْ اشْتَرَیْتُ خَمْرًا لِاَیْتَامٍ فِیْ حِجْرِیْ فَقَالَ اَهْرِقِ الْخَمْرَ وَاکْسِرِ الدِّنَانَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَضَعَّفَهٗ وَفِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ دَاوُدَ اَنَّهٗ سَاَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَیْتَامٍ وَرِثُوْا خَمْرًا قَالَ اَهْرِقْهَا قَالَ اَفَلَا اَجْعَلُهَا خَلًّا قَالَ لَا۔

"اور حضرت انس" حضرت ابوطلحہ" سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی ابوطلحہ" نے) عرض کیا کہ "یا نبی اللہ! میں نے ان یتیموں کے لئے شراب خریدی تھی جو میری پرورش میں ہیں؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "شراب کو پھینک دو اور اس کے برتن کو توڑ ڈالو۔" ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے۔"

تشریح: حضرت ابوطلحہ" نے شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے اپنے زیر پرورش یتیموں کے لئے جو شراب خریدی تھی اس کے بارہ میں پوچھا کہ اب شراب حرام ہو گئی ہے میں اس شراب کا کیا کروں؟ آیا اس کو پھینک دوں یا رہنے دوں؟ آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ اس کو بہا ڈالو۔ اس کے ساتھ ہی اس کے برتن کو توڑ ڈالنے کا حکم اس لئے دیا کہ شراب کی نجاست اس میں سرایت کر گئی تھی اور اس کا پاک کرنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ یا یہ کہ آپ ﷺ نے شراب کی ممانعت میں شدت کو ظاہر کرنے کے لئے یہ حکم دیا کہ جس برتن میں وہ

شراب رکھی ہے اس کو بھی توڑ ڈالو، اسی طرح آپ ﷺ نے اس شراب کا سرکہ بنالینے سے جو منع فرمایا اس کا تعلق بھی یا تو زجر و تنبیہ سے ہے یا یہ ممانعت "نہی تنزیہی" کے طور پر ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ہر مسکر و مفتر چیز حرام ہے

⑯ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ وَّ مُفْتِرٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہر اس چیز (کو کھانے پینے) سے منع فرمایا ہے جو نشہ آور اور مفتر ہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: نہایہ میں لکھا ہے کہ "مفتر" اس چیز کو کہتے ہیں جس کو پینے سے قلب و دماغ میں گرمی سرایت کر جائے اور ان اعضاء رئیسہ میں فتور یعنی ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے چنانچہ "افتر الرجل" کسی شخص کے بارے میں اس وقت کہا جاتا ہے جب کہ اس کی پلکیں کمزور ہو جاتی ہیں اور گوشہ چشم مضمحل ہو جاتا ہے جیسے جو شخص بہت بوڑھا ہو جاتا ہے اس کی پلکیں کمزور ہو جاتی ہیں یا ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے آنکھیں چندھیائی سی رہتی ہیں۔

اس ارشاد گرامی سے بنج (خراسانی اجوائن یا بھنگ) اور دوسری مغیرات اور مفتر چیزوں کی حرمت پر استدلال کیا جاتا ہے۔

شراب نوشی کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے

⑰ وَعَنْ دَيْلَمِ الْحِمْيَرِيِّ قَالَ قُلْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا بِاَرْضٍ بَارِدَةٍ وَّنُعَالِجُ فِيْهَا عَمَلًا شَدِيْدًا وَّاِنَّا نَتَّخِذُ شَرَابًا مِّنْ هٰذَا الْقَمْحِ نَتَقَوّٰى بِهٖ عَلٰى اَعْمَالِنَا وَعَلٰى بَرْدِ بِلَادِنَا قَالَ هَلْ يُسْكِرُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَاجْتَنِبُوْهُ قُلْتُ اِنَّ النَّاسَ غَيْرُ تَارِكِيْهِ قَالَ اِنْ لَّمْ يَتْرُكُوْهُ فَقَاتِلُوْهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت دیلم حمیریؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہم لوگ ایک سرد علاقے کے باشندے ہیں جہاں ہمیں سخت محنت کے کام کرنے پڑتے ہیں (اور وہ سخت محنت بہت زیادہ جسمانی مشقت کے متقاضی ہوتی ہے۔ اس لئے) ہم لوگ گیہوں سے شراب تیار کرتے ہیں جس کے ذریعہ ہم اپنی محنت کے لئے طاقت حاصل کرتے ہیں اور اس کی قوت سے اپنے علاقے کی سردی پر قابو پاتے ہیں۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "کیا وہ شراب نشہ لاتی ہے؟" میں نے عرض کیا "ہاں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تو پھر اس سے اجتناب کرو۔" میں نے عرض کیا "لوگ اس کو چھوڑنے والے نہیں ہیں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اگر لوگ اس کو پینا بند نہ کریں (اور اس کو حلال جانیں) تو ان سے قتال کرو۔" (ابوداؤد)

شراب اور جوئے کی ممانعت

⑱ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَالْكُوْبَةِ وَالْغُبَيْرَاءِ وَقَالَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے شراب پینے اور جوا کھیلنے سے منع فرمایا اور کوبہ اور غُبیرا سے بھی منع کیا ہے، نیز فرمایا کہ "جو چیز بھی نشہ لائے وہ حرام ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: قاموس میں لکھا ہے کہ "کوبہ" نرد (ایک کھیل) اور شطرنج کو کہتے ہیں، اسی طرح طبل یعنی نقارے سے اور بربط کو بھی "کوبہ" کہتے ہیں، چونکہ یہ ساری ہی چیزیں ممنوع ہیں اس لئے یہاں کوبہ سے جو بھی چیز مراد لی جائے صحیح ہے۔ "غبیرا" ایک قسم کی شراب کا نام ہے جو چنے سے بنتی تھی اور عام طور پر حبشی بنایا کرتے تھے۔

شرابی جنت میں داخل نہیں ہو گا

(۱۹) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَاقٌّ وَلَا قَمَّارٌ وَلَا مَنَّانٌ وَلَا مُدْمِنُ خَمْرٍ۔ رَوَاهُ الدَّارِمِي وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ وَلَا وَلَدُ زِنْيَةٍ بَدَلَ قَمَّارٍ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (جو بندگان خاص نجات پا کر شروع میں جنت میں داخل ہوں گے ان کے ساتھ) جنت میں نہ تو وہ شخص داخل ہوگا جو اپنے ماں باپ کی (بلا وجہ شرع) نافرمانی کرتا ہے، نہ جواری داخل ہوگا، نہ وہ شخص داخل ہوگا جو فقراء کو صدقہ دے کر احسان جتاتا ہے، اور نہ وہ شخص داخل ہوگا جو ہمیشہ شراب پیتا ہے (دارمی) اور دارمی ہی کی ایک روایت میں "نہ جواری داخل ہوگا" کے بجائے یہ ہے کہ "نہ ولد الزنا (جنت میں) داخل ہوگا۔"

تشریح: موجودہ زمانے کے اعتبار سے ہر وہ کھیل جوا ہے جس میں عام طور پر شرط باندھی جاتی ہے کہ جیتنے والا ہارنے والے سے اتنے روپے یا فلاں چیز لے لے گا جیسے تاش و نرد اور شطرنج وغیرہ، اسی طرح "سٹہ" بھی جوئے کے حکم میں داخل ہے۔

طیبیؒ کے قول کے مطابق منان کے ایک معنی تو وہ ہیں جو ترجمہ سے ظاہر ہیں یعنی "کسی فقیر و محتاج کو صدقہ و خیرات دے کر اس پر احسان جتانا" لیکن ایک احتمال یہ بھی ہے کہ مَنَّانَ دراصل مَن سے ہو جس کے معنی "قطع" کے ہیں اس طرح منان وہ شخص ہوا جو رشتوں ناتوں کو قطع کرنے والا ہو۔

یہ حدیث کہ "ولد الزنا جنت میں داخل نہیں ہوگا" نہ تو صحیح ہے اور نہ اس کو موضوع ہی قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ ایک ضعیف روایت ہے، تاہم اگر اس کے کسی درجہ میں صحیح ہونے کا احتمال بھی ہو تو اس صورت میں اس کی تأویل اور وضاحت یہ ہے کہ جو اولاد زنا کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے وہ چونکہ باپ کی تربیت و نگرانی سے محروم رہتی ہے اور ماں کی بد کرداری کا سایہ اس کے اوپر ہوتا ہے اس لئے وہ عام طور پر بگڑ جاتی ہے اور ظاہری و باطنی تربیت نہ پانے کی وجہ سے مختلف طرح کی برائیوں اور بد اعمالیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے اور مآل کار وہ عذاب خداوندی میں گرفتار رہتی ہے، مزید برآں جس طرح حرام ذرائع مثلاً جوئے اور سود سے کمائے جانے والے مال میں ایک طرح کی "نحوست" ہوتی ہے اس طرح ولد الزنا میں بھی ایک طرح کی نحوست ہوتی ہے کیونکہ وہ ایسے نطفے سے وجود میں آتا ہے جو "حرام جگہ" میں "حرام ذریعہ" سے قرار پایا تھا۔ یا یہ کہا جائے کہ اس ارشاد "ولد الزنا جنت میں داخل نہیں ہوگا" کے ذریعہ دراصل زانی پر تعریض و تشدید مقصود ہے جو اس (ولد الزنا) کی پیدائش کا سبب بنا ہے۔

علاوہ ازیں بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہاں "ولد الزنا" سے مراد وہ شخص ہے جو زنا پر مواظبت و مداومت اختیار کرتا ہے اور بدکاری اس کی عادت بن جاتی ہے جیسے بہادروں کو "بنو الحرب" (یعنی جنگ کی اولاد) یا مسلمانوں کو بنو الاسلام (یعنی اسلام کی اولاد) کہہ دیتے ہیں۔ حاصل یہ کہ اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ولد الزنا محض اس وجہ سے کہ وہ زنا کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، عذاب خداوندی میں گرفتار ہوگا یا اس کو جنت کی سعادت سے محروم رکھا جائے گا کیونکہ جس برائی نے اس کو جنم دیا ہے اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔

شرابی کے بارے میں ایک وعید

(۲۰) وَعَنْ اَبِي اُمَامَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِي رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ وَاَمَرَنِي رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ بِمَحْقِ الْمَعَازِفِ وَالْمَزَامِيرِ وَالْاَوْثَانِ وَالصُّلُبِ وَاَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ وَحَلَفَ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ بِعِزَّتِي لَا يَشْرَبُ عَبْدٌ مِنْ عَبِيدِي جُرْعَةً مِنْ خَمْرٍ اِلَّا سَقَيْتُهُ مِنَ الصَّدِيدِ مِثْلَهَا وَلَا يَتْرُكُهَا مِنْ مَخَافَتِي اِلَّا سَقَيْتُهُ مِنْ حِيَاضِ الْقُدُسِ۔

(رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پوری دنیا کے لئے رحمت اور تمام عالم کے لئے ہادی بنا کر بھیجا ہے، اور میرے بزرگ و برتر خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں باجوں، مزامیر، بتوں، سولیوں اور زمانہ جاہلیت (یعنی حالت کفر) کے تمام رسوم و عادات کو مٹادوں، اور میرے بزرگ و برتر خدا نے اپنی عزت کی قسم کھائی ہے کہ میرے بندوں میں سے جو بھی بندہ شراب کا ایک گھونٹ بھی پئے گا میں اس کو (آخرت میں) اسی کے بقدر دوزخیوں کی پیپ پلاؤں گا، اور جو بندہ میرے خوف سے شراب پینا چھوڑ دیگا میں اس کو (آخرت میں) پاک حوضوں (یعنی جنت کی نہروں) سے (شراب طہور) پلاؤں گا۔" (احمدؒ)

تشریح: "باجوں" سے ڈھول، ڈھولکی، نقارہ، تاشہ، طبلہ، طنبورہ، سارنگی، ستار اور اسی قسم کے دوسرے باجے مراد ہیں۔ اسی طرح "مزامیر" سے شہنائی، چنگ، بانسری اور اس قسم کی دوسری چیزیں مراد ہیں۔

یہ حدیث باجوں اور مزامیر کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ یہ چیزیں زمانہ قدیم سے اہل فسق اور گمراہ لوگوں کے رسوم و عادات میں داخل رہی ہیں۔

فقہاء لکھتے ہیں کہ راگ و نغمہ، باجوں اور مزامیر کے ساتھ تو حرام ہے اور محض آواز کے ساتھ مکروہ ہے، نیز اجنبی عورتوں سے سننا سخت حرام ہے۔

"سولی" سے مراد وہ صلیبی نشان (کراس) ہے جو عیسائیوں کے ہاں ایک مقدس علامت اور قومی و مذہبی نشان ہے جو اس شکل میں ہوتا ہے یعنی ایک خط دوسرے خط کو کاٹتا ہے۔ یہ دراصل اس سولی کا نشان ہے جس پر عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چڑھایا گیا تھا، اسی مناسبت سے عیسائی اس نشان کو بہت ہی مقدس اور بابرکت سمجھتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ ان کے مرد عورت اس نشان کو مختلف صورتوں میں اپنے جسم پر آویزاں رکھتے ہیں بلکہ اپنی اور تمام چیزوں پر بھی یہ نشان بناتے ہیں، اس سے ان کا مقصد حصول برکت بھی ہوتا ہے اور اس واقعہ کی حسرتناکی اور غمگینی کو یاد رکھنا بھی ہوتا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کو اس نشان کے نیست و نابود کرنے کا بھی حکم دیا گیا اور مسلمانوں کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا کہ وہ کسی بھی ایسی چیز کو استعمال نہ کریں جس پر یہ نشان ہو اور نہ اپنی کسی چیز پر یہ نشان بنائیں کیونکہ اس سے ایک غیر قوم کی مشابہت ہوگی ہے جو اسلام میں سخت حرام ہے۔

زمانہ جاہلیت کی رسوم و عادات سے مراد وہ چیزیں ہیں جو سراسر باطل ہیں اور جو زمانہ اسلام سے قبل کثرت سے رائج تھیں جیسے نوحہ و بین کرنا، اپنی نسل یا اپنے خاندان پر بے جا فخر کرنا اور دوسروں کے نسب میں طعن و طنز کرنا وغیرہ وغیرہ۔

والدین کی نافرمانی کرنے والے، دیوث اور شرابی پر جنت کے دروازے بند ہیں

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثَةٌ قَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَنَّةَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ وَالْعَاقُّ وَالدَّيُّوْثُ الَّذِیْ يُقِرُّ فِیْ اَهْلِهِ الْخُبْثَ۔ (رواہ احمد والنسائی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تین طرح کے آدمیوں پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو حرام کر دیا ہے (یہ نجات یافتہ بندوں کے ساتھ ابتداءً جنت میں داخل ہونا ان تینوں پر حرام قرار دیا ہے) ایک تو وہ شخص جو ہمیشہ شراب پئے، دوسرا وہ شخص جو اپنے والدین کی نافرمانی کرے، اور تیسرا وہ دیوث کہ جو اپنے اہل و عیال میں ناپاکی پیدا کرے۔" (احمد، نسائی)

تشریح: "جو اپنے اہل و عیال میں ناپاکی پیدا کرے۔" کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اپنی بیوی، اپنی لونڈی یا اپنی کسی اور رشتہ دار کو برائی اور بدچلنی کی راہ پر لگائے یعنی انہیں غیر مردوں کے ساتھ ہم بستر ہونے یا مقدمات زنا جیسے بوس و کنار اور غیر حجابانہ اختلاط وغیرہ پر مجبور کرے، یا انہیں اس کا موقع دے۔ اسی حکم میں اور تمام گناہ جیسے شراب نوشی، اور غسل جنابت کا ترک وغیرہ بھی شامل ہیں، یعنی اگر وہ شخص اپنی بیوی

کو شراب پیتے دیکھے یا اس کو غسل جنابت ترک کرتے دیکھے یا اسی طرح کے کسی اور گناہ میں مبتلا دیکھے اور اس کو اس سے منع نہ کرے تو یہ بھی دیوثی ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ "دیوث" اس بے غیرت شخص کو کہتے ہیں جو اپنے اہل یعنی اپنی عورت کو کسی برائی میں مبتلا دیکھے لیکن نہ تو اس کو اس کی وجہ سے کوئی غیرت محسوس ہو اور نہ اس کو اس برائی سے منع کرے (یعنی اپنی عورت کے پاس غیر مردوں کا آنا گوارا کرے۔

مجمع البحرین میں لکھا ہے کہ "دیوث" کو "کشخان" اور "قرنان" بھی کہتے ہیں، لیکن بعض حضرات نے دیوث، کشخان اور قرنان کے مفہوم میں تھوڑا سا فرق و امتیاز پیدا کیا ہے، یعنی دیوث وہ ہے جو غیر مرد کو اپنی عورت کے پاس آنے دے کشخان وہ ہے جو اپنی بہنوں کے پاس غیر مردوں کو آنے دے اور قرنان وہ ہے جو اپنی بیٹیوں کے پاس غیر مردوں کو آنے دے۔

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَ شْعَرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثَۃٌ لَاتَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ وَقَاطِعُ الرَّحِمِ وَمُصَدِّقٌ بِالسِّحْرِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تین طرح کے لوگ جنت میں (ابتداءً) داخل ہونے سے محروم رہیں گے۔ (۱) ہمیشہ شراب پینے والا۔ (۲) ناتے کا توڑنے والا۔ (۳) سحر پر یقین کرنے والا۔" (احمدؒ)

تشریح: "سحر پر یقین کرنے والا" سے وہ شخص مراد ہے جو سحر کو مؤثر بالذات جانے، ورنہ سحر پر بایں معنی یقین کرنا صحیح ہے۔ کہ وہ حق تعالیٰ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کے حکم سے اس کا اثر انداز واقع ہونا ثابت ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ اَلسِّحْرُ حَقٌّ یعنی سحر ایک حقیقت ہے۔

شراب نوشی بت پرستی کے مترادف ہے

(۲۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ اِنْ مَاتَ لَقِیَ اللّٰہَ تَعَالٰی کَعَابِدِ وَثَنٍ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَرَوَی ابْنُ مَاجَۃَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ عَنْ مُحَمَّدِبْنِ عُبَیْدِ اللّٰہِ عَنْ اَبِیْہِ وَقَالَ ذَکَرَ الْبُخَارِیُّ فِی التَّارِیْخِ عَنْ مُحَمَّدِبْنِ عَبْدِ اللّٰہِ عَنْ اَبِیْہِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص ہمیشہ شراب نوشی میں مبتلا رہے اور پھر مرجائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں بت پرست کی طرح حاضر ہوگا۔" (احمدؒ) ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ سے اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں محمد ابن عبداللہ سے اور انہوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے نیز بیہقی نے کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس روایت کو اپنی تاریخ میں محمد ابن عبید اللہ سے اور انہوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے۔"

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ مَا اُبَالِیْ شَرِبْتُ الْخَمْرَ اَوْعَبَدْتُّ ھٰذِہِ السَّارِیَۃَ دُوْنَ اللّٰہِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے "میں اس میں کوئی فکر (فرق) نہیں کرتا کہ میں شراب پیوں یا اللہ کے سوا اس ستون (یعنی پتھر کے بت) کو پوجوں۔" (نسائی)

تشریح: اس ارشاد سے حضرت ابوموسیٰؓ کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرے نزدیک شراب نوشی اور بت پرستی دونوں ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الامارۃ والقضاء

امارت وقضاء کا بیان

امارت سے مراد "سرداری و حکمرانی" ہے اور قضا سے مراد "شرعی عدالت" ہے اسلامی نظام حکومت کی عمارت کے یہ دو بنیادی ستون ہیں! امیر وامام (یعنی سربراہ مملکت) اسلام کے قانون اساسی کا محافظ، نظم حکومت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذمہ دار حفاظتِ مذہب اور اُمت اسلامیہ کی طاقت وقوت کا امین، اور امور عامہ کا نگہبان ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کے افراد کا تعلق جن امور سے ہے ان سب پر امیر وامام ہی کا اختیار کارفرما ہوتا ہے۔

قاضی، اسلامی عدالت کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے شہریوں کے حقوق (امن، آزادی، مساوات) کا محافظ ہوتا ہے اور وہ معاملات کا فیصلہ کرنے میں شریعت کی طرف سے حَکم کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے نزاعی مقدمات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرے اور اس کا اس سے بڑا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ عدل وانصاف، دیانت داری اور ایمانداری کے تقاضوں کو ہر حالت میں مدنظر رکھے۔

اسلام اور حکومت

اسلام، دنیا کا یگانہ مذہب بھی ہے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی اسلام جس طرح انسانیت عامہ کی دینی، مذہبی اور اخلاقی، اخروی فلاح کا سب سے آخری اور مکمل قانون ہدایت ہے اس طرح وہ ایک ایسی لافانی سیاسی طاقت بھی ہے جو انسانوں کے عام فائدے، عام بہتری اور عام تنظیم کے لئے حکومت وسیاست سے اپنے تعلق کو برملا اظہار کرتی ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ مذہب کی حیثیت سے کچھ اور بھی ہے اس کو حکومت حاکمیت، سیاست اور سلطنت سے وہی تعلق ہے جو اس کائنات کی کسی بھی بڑی حقیقت سے ہوسکتا ہے اس کو محض ایک ایسا نظام نہیں کہا جاسکتا ہے جو صرف باطن کی اصلاح کا فرض انجام دیتا ہے بلکہ اس کو ایسا دینی نظام بھی سمجھنا چاہئے جو خدا ترس وخدا شناس روح کی قوت سے دنیا کے مادی نظام پر عالمگیر غلبہ کا دعوی رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جو اسلامی تصورات ونظریات کا سرچشمہ ہے اور احادیث نبوی ﷺ جو قرآنی ہدایات کی شارح وترجمان ہیں، ان کا ایک بہت بڑا حصّہ اسلام اور حکومت وسیاست کے تعلق کو ثابت کرتا ہے کہیں تاریخی انداز میں، کہیں تعلیمات کے پیرایہ میں اور کہیں نعمت الٰہی کو ظاہر کرتے ہوئے ہم پر یہ واضح کیا جاتا ہے کہ اسلام اور حکومت کے درمیان تعلق ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کے بنیادی عقیدے وتصور کے مطابق چونکہ یہ زمین خدا کی ملکیت ہے اور اس زمین میں حکومت خدا کا حق ہے اس لئے اسلام کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ اس زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے اور اس کا اتارا ہوا قانون نافذ کیا

جائے۔

ہم میں سے جو کج فکر لوگ "مذہب اور سیاست" کے درمیان تفریق کی دیوار حائل کر کے اسلام کو سیاست و حکومت سے بالکل بے تعلق و بے واسطہ رکھنا چاہتے ہیں وہ دراصل مسلم مخالف عناصر کے اس شاطر دماغ کی سازش کا شکار ہیں جو خود تو حقیقی معنے میں آج تک حکومت کو "مذہب" سے آزاد نہ کر سکا لیکن مسلمانوں کی سیاسی پرواز اور ہمہ گیر پیش قدمی کو مضمحل کرنے کے لئے "مذہب" اور سیاست و حکومت" کی مستقل بحثیں پیدا کر کے مسلمانوں کے چشمہ فکر و عمل میں دین اور دنیا کی پلید گی کا زہر گھول رہا ہے۔

کتاب الامارة و القضاء سے اس کتاب کا جو حصہ شروع ہو رہا ہے اور اس میں جو احادیث نقل ہوں گی وہ اس دعوی کی واضح دلیل ہیں کہ اسلام اور حکومت و سیاست دو متضاد چیزیں نہیں ہیں ان احادیث میں امیر و خلیفہ قاضی و منصف، عوام اور رعایا، ملک و فوج اور نظم مملکت کے دیگر گوشوں سے متعلق جو ہدایات و احکام بیان کئے جائیں گے ان سے واضح ہو گا کہ حکومت و سیاست بھی اسلام کا ایک موضوع ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

امیر کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَطَاعَنِی فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِی فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ وَمَنْ یُطِعِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِی وَمَنْ یَعْصِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِی وَاِنَّمَا الْاِمَامُ جُنَّةٌ یُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ وَیُتَّقٰی بِهٖ فَاِنْ اَمَرَ بِتَقْوَی اللّٰهِ وَعَدَلَ فَاِنَّ لَهٗ بِذَالِكَ اَجْرًا وَاِنْ قَالَ بِغَیْرِهٖ فَاِنَّ عَلَیْهِ مِنْهُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص میری فرمانبرداری کرتا ہے اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی اور جس شخص نے میری نافرمانی کی اس شخص نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس شخص نے اپنے امیر (سردار) کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس شخص نے اپنے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی! اور یاد رکھو، امام یعنی سربراہ مملکت (مسلمانوں کے لئے) ڈھال کی مانند ہے جس کے پیچھے سے (یعنی اس کی طاقت کے بل بوتہ پر) جنگ کی جاتی ہے اور جس کے ذریعہ (دشمنوں کی آفات و بلیات سے) حفاظت حاصل کی جاتی ہے! پس (اگر وہ (امام) اللہ سے ڈر کر (اس کے قانون کے مطابق) فیصلہ کرے اور عدل و انصاف سے کام لے تو اس کی وجہ سے وہ امام بڑے اجر و ثواب کا مستحق ہو گا اور اگر وہ ایسا نہ کرے۔ (یعنی اس کے احکام و فیصلے، اللہ کے خوف، قانون الٰہی کی روح اور عدل و انصاف سے خالی ہوں) تو اس کی وجہ سے وہ سخت گنہ گار ہو گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: امام (سربراہ مملکت) کو ڈھال کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ڈھال جنگ میں (دشمن کے تیر و تلوار سے بچاتی ہے اسی طرح امام کا وجود، مسلمانوں کو دشمنان دین کے حملوں اور ان کی آفات و بلاؤں سے بچانے کا باعث ہے۔

اگر کسی کمتر شخص کو امیر بنایا جائے تو اس کی اطاعت بھی ضروری ہے

(۲) وَعَنْ اُمِّ الْحُصَیْنِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنْ اُمِّرَ عَلَیْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ یَقُوْدُكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ام حصینؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر کسی نکٹے اور کن کٹے غلام کو بھی تمہارا حاکم بنایا جائے اور وہ اللہ کے "قانون کے مطابق تم پر حکمرانی کرے تو تم اس کا حکم سنو اور اس کی اطاعت کرو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مقصد اولو الامر کی اطاعت و فرمانبرداری کی اہمیت کو واضح کرنا ہے اور اس اہمیت کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کے لئے "غلام" کا ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا ہے "جو شخص مسجد بنائے اگرچہ وہ چڑیا کے گھونسلے کی

مانند ہوالخ" سے ظاہر ہے کہ مسجد چڑیا کے گھونسلے کی مانند کبھی نہیں ہو سکتی بلکہ اس ارشاد کا مقصد مسجد بنانے کی اہمیت اور اس کی فضیلت کو زیادہ سے زیادہ بیان کرنا ہے اسی طرح یہاں بھی "غلام" کے ذکر سے مبالغہ مقصود ہے یا پھر یہ مراد ہے کہ وہ غلام جو بادشاہ یا خلیفۂ اعظم (سربراہ مملکت) کا نائب ہو یا اسے کسی خاص علاقہ کا حاکم بنایا گیا ہو۔ اس ساری تاویل کی بنیاد یہ ہے کہ "غلام" کو امیر و امام (سربراہ مملکت) بنانا جائز نہیں ہے۔

واضح رہے کہ ان تمام احادیث میں بھی یہی تاویل کی جائے گی جن میں غلام کی امارت و سرداری کا ذکر ہے۔

"نکٹا اور کن کٹا" کے الفاظ بھی مقصد کو مؤکد کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور ان سے مراد "حقیر و کمتر" غلام ہے حاصل یہ کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے امیر و امام کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور اس کے منصب امارت و امت کی پوری عزت و توقیر کریں خواہ وہ امیر اپنی ذاتی حیثیت میں کتنا ہی کمتر کیوں نہ ہوں۔

③ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَاَنَّ رَأْسَهٗ زَبِيْبَةٌ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (اپنے امیر و حاکم کا فرمان سنو) اور (اس کے اوامر و نواہی کی) اطاعت کرو۔ تاوقتیکہ اس کا کوئی حکم و فرمان اللہ کے اور اس کے رسول کے خلاف نہ ہو) اگرچہ تم پر کسی ایسے غلام ہی کو حکمران کیوں نہ بنایا گیا ہو جس کا سر (چھوٹے پن اور سیاہی میں) انگور (کی مانند) ہو۔" (بخاریؒ)

غیر شرعی حکم کی اطاعت واجب نہیں

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ۔ (متفق علیہ)۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اپنے امیر و حاکم کی بات کو" سننا اور (اس کے احکام کی) فرمانبرداری کرنا ہر حالت میں مرد مسلم پر واجب ہے خواہ (اس کا کوئی حکم اس کو پسند ہو نا پسند ہو۔ تاوقتیکہ کسی گناہ کی بات کا حکم نہ کیا جائے۔ لہٰذا جب حاکم کوئی ایسا حکم دے جس (پر عمل کرنے میں گناہ ہو تو اس کی اطاعت کرنا واجب نہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: امیر و حاکم کی بات کو سننا اور اس کے احکام و فرامین کی اطاعت کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ اس کا حکم و فرمان طبیعت و پسند کے موافق ہو یا غیر موافق ہو لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی حکم شریعت کی حدود سے متجاوز نہ ہو لہٰذا اگر امیر و حاکم کوئی ایسا حکم و فرمان جاری کرے جس پر عمل کرنے سے گناہ لازم آتا ہو۔ اس کی اطاعت و فرمانبرداری واجب نہیں ہوگی لیکن اس صورت میں بھی امیر و حاکم کے خلاف بغاوت کرنا یا اس سے جنگ و جدال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

⑤ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا طَاعَةَ فِيْ مَعْصِيَةٍ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کسی بھی ایسے حکم کی اطاعت و فرمانبرداری جائز نہیں ہے جس کا تعلق گناہ سے ہو (خواہ وہ حکم امیر و حاکم کی طرف سے ہو یا ماں باپ اور استاد پیر وغیرہ کی جانب سے ہو) اطاعت و فرمانبرداری تو صرف اچھے حکم میں واجب ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اطاعت و فرمانبرداری کا عہد

⑥ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِى اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَفِىْ رِوَايَةٍ وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبادہؓ ابن صامت کہتے ہیں کہ ہم نے رسول کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی یعنی آپ کے روبرو ان امور کا عہد کیا کہ "ہم (آپ کی ہدایات کو توجہ سے) سنیں گے (اور ہر قسم کے حالات میں آپ ﷺ کے احکام کی) اطاعت کریں گے تنگی اور سخت حالات میں بھی اور آسان و خوش آئند زمانہ میں بھی، خوشی کے موقع پر بھی اور ناخوشی کی حالت میں بھی ہم پر ترجیح دی جائے گی (تو ہم صبر کریں گے۔ ہم امر کو اس کی جگہ سے نہیں نکالیں گے، ہم (جب زبان سے کوئی بات کہیں گے تو) حق کہیں گے خواہ ہم کسی جگہ ہوں (اور کسی حال میں ہوں) اور ہم اللہ کے معاملے میں (یعنی دین پہنچانے اور حق بات کہنے میں) کسی ملامت کرنے والے شخص کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ (ہم نے اس بات کا عہد کیا کہ ہم امر کو جگہ سے نہیں نکالیں گے۔" (چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ امر کو اس کی جگہ سے نہ نکالو) ہاں اگر تم صریح کفر دیکھو جس پر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے (یعنی قرآن کی کسی آیت یا کسی حدیث کی صورت میں، دلیل ہو (اور اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو تو اس صورت میں امر کو اس کی جگہ سے نکالنے کی اجازت ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ہم پر ترجیح دی جائے گی" کا مطلب یہ ہے کہ ہم انصار نے یہ بھی عہد کیا کہ اگر ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے گی ہم صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے۔ ایک روایت میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار سے فرمایا تھا کہ (میرے بعد تم لوگوں سے ترجیحی سلوک ہوگا یعنی بخشش و انعام اور اعزاز مناصب کی تقسیم کے وقت تم پر دوسرے لوگوں کو ترجیح و تفضیل دی جائے گی ایسے موقع پر تم لوگ صبر کرنا" چنانچہ آپ کی یہ پیش گوئی ثابت ہوئی کہ خلفائے راشدین کے زمانے کے بعد جب امراء کا عہد حکومت شروع ہوا تو انصار کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا گیا اور انصار نے بھی آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اور اپنا عہد نباہتے ہوئے اس ترجیحی سلوک کے خلاف شکوہ شکایت کرنے کی بجائے صبر و تحمل کی راہ کو اختیار کیا۔

"ہم امر کو اس کی جگہ سے نہیں نکالیں گے" کا مطلب یہ ہے کہ ہم امارت و حکومت کی طلب و خواہش نہیں کرینگے ہم پر جس شخص کو امیر و حاکم بنادیا جائیگا ہم اس کو معزول نہیں کرینگے اور اپنے امیر و حاکم کے خلاف ہنگامہ آرائی کر کے کوئی شورش پیدا نہیں کریں گے۔

روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر امیر و حاکم کے قول و فعل میں صریح کفر دیکھو تو اس کو معزول کر دینے کی اجازت ہے اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا واجب ہو گا۔

فسق و فجور، عزل منصب کی بنیاد بن سکتا ہے یا نہیں؟

اس ارشاد گرامی سے یہ واضح ہوا کہ امام یعنی سربراہ مملکت کو معزول کرنے کی اسی صورت میں اجازت ہے جب کہ وہ صریح طور پر کفر کا مرتکب ہو اور اس کا کفر قرآن و حدیث کی روشنی میں اتنے واضح طور پر ثابت ہو کہ اس امام کے لئے اس کفر کی کوئی بھی تاویل کرنا ممکن نہ ہو۔ چنانچہ حضرت امام اعظمؒ ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر امام فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے تو اس کو معزول کیا جاسکتا ہے یہی مسئلہ ہر قاضی و امیر کا ہے۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں ان ائمہ کے اختلافی اقوال کی بنیاد یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو فاسق شخص اس بات کا اہل نہیں ہو گا کہ اس کو ولایت (کسی کا ولی ہونے) کی ذمہ داری سونپی جائے جب کہ امام اعظمؒ ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ فاسق، ولایت کا اہل ہو سکتا ہے چنانچہ ان کے نزدیک فاسق باپ کے لئے اپنی نابالغ لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے۔

فرمانبرداری بقدر طاقت

Ⓛ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا اِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا

اسْتَطَعْتُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب ہم رسول کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے (یعنی اس بات کا عہد کرتے) کہ ہم (آپ کی ہدایات کو توجہ سے سنیں گے اور (آپ کے احکام کی) اطاعت کریں گے تو آپ ﷺ ہم سے فرماتے کہ "ان امور میں جن کی تم طاقت رکھتے ہو۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے یا تو اپنے مذکورہ ارشاد کے ذریعہ صحابہ کو یہ رخصت (یعنی آسانی و سہولت) عطا فرمائی کہ تم سے جس قدر فرمانبرداری ہو سکے اس قدر کرو۔ یا یہ ارشاد اسی بات کی تاکید و تشدید کے لئے تھا کہ تم جتنی فرمانبرداری کر سکو اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی یا قصور واقع نہ ہونا چاہئے۔

ملت کی اجتماعیت میں رخنہ ڈالنے والے کے بارے میں وعید

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَاٰى مِنْ اَمِيْرِهٖ شَيْئًا يَكْرَهُهٗ فَلْيَصْبِرْ فَاِنَّهٗ لَيْسَ اَحَدٌ يُفَارِقُ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَيَمُوْتُ اِلَّا مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی شخص اپنے امیر و سردار کی طرف سے کوئی ایسی بات دیکھے جو اس کو (شرعاً یا طبعاً) پسند نہ ہو تو اس کو اس پر صبر کرنا چاہئے اور اس کی وجہ سے امام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند نہ کرنا چاہئے کیونکہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر (بھی) جدا ہوا اور (توبہ کئے بغیر اسی حالت میں) مر گیا تو اس کی موت، اہل جاہلیت کی موت کی مانند ہوگی۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے امام و امیر کی اطاعت و فرمانبرداری سے اپنے کو آزاد کر لیا اور مسلمانوں کی جماعت (تنظیم) سے علیحدگی اختیار کر لی اور تمام مسلمانوں کے اجتماع و اتحاد کی مخالفت پر کمربستہ رہا اور پھر اسی حالت میں وہ مر گیا تو گویا زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کی موت مرا اور اس مشابہت کی بنیاد ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ چونکہ دین سے بے بہرہ تھے اس لئے وہ اپنے امیر و سردار کی اطاعت کرتے تھے نہ اپنے امام (رہنما) کی ہدایت کو مانتے تھے بلکہ ان سے وہ علی الاعلان بیزاری کا اظہار کرتے تھے اسی طرح چونکہ ان کے یہاں ملی شیرازہ بندی اور اجتماعی تنظیم کا کوئی اہتمام نہیں تھا اس لئے وہ نہ کسی چیز پر اجتماع و اتحاد کا مظاہرہ کرتے تھے اور نہ کسی رائے پر متفق ہوتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں ملت کی شیرازہ بندی، مسلمانوں کی مضبوط اجتماعی تنظیم، لیڈر شپ پر مکمل اعتماد اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور ملی امور میں آپس میں اتفاق و اتحاد کی بڑی اہمیت ہے بلکہ یہ چیزیں دین کا مطلوب ہیں اور دین کی سربلندی کا بنیادی عنصر ہیں۔

تعصب کے خلاف تنبیہ

⑨ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً وَمَنْ قَاتَلَ تَحْتَ رَايَةٍ عِمِّيَّةٍ يَغْضَبُ لِعَصَبِيَّةٍ اَوْيَدْعُوْ لِعَصَبِيَّةٍ اَوْيَنْصُرُ عَصَبِيَّةً فَقُتِلَ فَقِتْلَةٌ جَاهِلِيَّةٌ وَمَنْ خَرَجَ عَلٰى اُمَّتِيْ بِسَيْفِهٖ يَضْرِبُ بَرَّهَا وَفَاجِرَهَا وَلَا يَتَحَاشٰى مِنْ مُؤْمِنِهَا وَلَا يَفِيْ لِذِيْ عَهْدٍ عَهْدَهٗ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَلَسْتُ مِنْهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص، امام (سربراہ مملکت) کی اطاعت

وفرمانبرداری سے نکل جائے اور اسلام کی جماعت (ملت کی اجتماعی ہیئت) سے علیحدگی اختیار کرے اور پھر اس حالت میں مرجائے تو اس کا مرنا جاہلیت پر مرنے کے مرادف ہوگا، جو شخص کسی ایسے جھنڈے کے نیچے یعنی کسی ایسے مقصد کے لئے) لڑا جس کا حق وباطل ہونا ظاہر نہ ہو درانحالیکہ وہ تعصب سے غضبناک ہوا اور متعصب ہوا اور تعصب کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف بلایا یا تعصب کی وجہ سے کسی کی مدد کی (یعنی اس کا لڑنا غضبناک ہونا لوگوں کو اپنی مدد کے لئے بلانا یا کسی کی مدد کرنا اعلاء کلمۃ الحق اور دین سے اظہار کے لئے نہیں تھا بلکہ محض تعصب یعنی اپنی قوم کے ظلم کی حمایت اور اس کی ناروا جانب داری کی بنیاد پر تھا) اور اسی حالت میں) وہ مارا گیا تو اس کا مرنا جاہلیت پر مرنے کے مترادف ہوگا اور جس شخص نے میری اُمت کے خلاف تلوار اٹھائی اور اس کے ذریعہ میری اُمت کے اچھے اور برے آدمیوں کو مارا اور میری اُمت کے مسلمان کی پرواہ نہیں کی (یعنی اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ ایک مسلمان کو مارنا کتنا بڑا جرم ہے اور اس کا وبال وعذاب کتنا سخت ہے) اور نہ اس نے عہد والے کے عہد کو پورا کیا تو نہ وہ میری اُمت میں سے ہے (یعنی میرے راستے پر چلنے والوں میں سے نہیں ہے اور نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے۔" (مسلمؒ)

بہترین اور بدترین حاکم

⑩ وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكِ الْاَشْجَعِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَيَلْعَنُوْنَكُمْ قَالَ قُلْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَ ذٰلِكَ قَالَ لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ اِلَّا مَنْ وُلِّيَ عَلَيْهِ وَالٍ فَرَاٰهُ يَاْتِيْ شَيْئًا مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَلْيَكْرَهْ مَا يَاْتِيْ مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عوف ابن مالک اشجعیؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "تمہارے حاکموں میں سے بہترین حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور تم ان کے لئے اور وہ تمہارے لئے دعا کریں اور اس کی وجہ سے آپس میں ربط وتعلق اور محبت پیدا ہو) اور تمہارے حاکموں میں سے بدترین حاکم وہ ہیں جن سے تم بغض وعداوت رکھو اور وہ تم سے بغض وعداوت رکھیں اور تم ان پر اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔" حضرت عوف کہتے ہیں کہ ہم (صحابہؓ) نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! کیا اس صورت میں ہم ان سے کئے ہوئے عہد وفاداری کو توڑ نہ ڈالیں (یعنی کیا ان بدترین حاکموں کو معزول نہ کردیں اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کردیں؟) آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کریں، نہیں! جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کریں! خبردار! جس شخص کو تم پر حاکم مقرر کیا جائے اور تم اس کا کوئی ایسا فعل دیکھو۔ جو خدا کی نافرمانی (گناہ) پر مبنی ہو تو اس کے اس گناہ کے فعل کو برا سمجھنا چاہئے۔ لیکن اس کی اطاعت وفرمانبرداری سے دست بردار نہ ہونا چاہئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کریں" اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کا نماز کو ترک کردینا مسلمانوں کے کئے ہوئے عہد وفاداری کو توڑ ڈالنے کا موجب اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری سے دست بردار ہوجانے کا سبب ہے کہ جس طرح اگر سربراہ مملکت صریح کفر کا مرتکب ہوجائے تو مسلمان اپنا عہد وفاداری توڑ کر اس کو معزول کرسکتے ہیں اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری سے دست بردار ہوسکتے ہیں، اسی طرح اگر وہ نماز پڑھنا چھوڑ دیں تو مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کے تئیں اپنا عہد وفاداری توڑ دیں اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری سے انکار کردیں! کیونکہ نماز دین کا ستون ہے اور کفر وایمان کے درمیان فرق وامتیاز کرنے والی ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے گناہ چونکہ ترک نماز کی طرح نہیں ہیں اس لئے ان کا ارتکاب عہد وفاداری کو توڑنے اور اطاعت وفرمانبرداری سے دست بردار ہونے کا موجب نہیں ہوسکتا۔ اس ارشاد گرامی میں ترک نماز پر سخت ترین زجر وتنبیہ اور عظیم تہدید ہے۔

حاکم کی بے راہ روی پر اس کو ٹوکنا ہر مسلمان کی ایک ذمہ داری ہے

(۱۱) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكُوْنُ عَلَيْكُمْ اُمَرَاءُ تَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ فَمَنْ اَنْكَرَ فَقَدْ بَرِئَ وَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ سَلِمَ وَلٰكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ قَالُوْا اَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ قَالَ لَا مَاصَلُّوْا الا ما صَلُّوْا اَىْ مَنْ كَرِهَ بِقَلْبِهٖ وَاَنْكَرَ بِقَلْبِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایسے لوگ بھی تم پر حاکم مقرر کئے جائیں گے جو اچھے برے دونوں قسم کے کام کریں گے لہٰذا جس شخص نے انکار کیا (یعنی جو شخص اپنے حاکم کے سامنے زبان سے یہ کہنے پر قادر ہو کہ تمہارا یہ فعل برا ہے اور اس نے اس طرح کہہ بھی دیا) تو وہ نفاق اور مداہنت سے پاک اور (اپنی ذمہ داری سے) بری ہو گیا، اور جس شخص نے مکروہ جانا (یعنی جو شخص حاکم کے منہ پر اس کے کسی برے فعل کو بیان کر دینے پر قادر نہ ہو لیکن اپنے دل سے اس کے اس فعل کو برا سمجھے) تو وہ سالم رہا (یعنی اس فعل کی برائی و گناہ اور اس کے وبال میں شریک ہونے سے محفوظ رہا) لیکن جو شخص (حاکم کے برے افعال پر دل سے) خوش ہوا اور (خود بھی ان برے افعال میں مبتلا ہو کر گویا حاکم کی اتباع کی (تو وہ گناہ اور اس کے وبال میں شریک ہوا صحابہؓ نے عرض کیا کہ "(ایسی صورت میں جب کہ حکام برائیوں میں مبتلا ہو جائیں اور ان کی بے راہ روی کا اثر عوام پر بھی پڑنے لگے تو) کیا ہم ان کے خلاف جنگ نہ کریں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں!" جب تک وہ نماز پڑھیں، نہیں! جب تک وہ نماز پڑھیں۔" یعنی جس شخص نے اپنے دل سے برا سمجھا اور اپنے دل سے انکار کیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: روایت کے آخری الفاظ "یعنی جس شخص نے اپنے دل سے برا سمجھا اور اپنے دل سے انکار کیا" کے بارہ میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تو یہ لکھا ہے کہ راوی کی عبارت ہے جس کے ذریعہ انہوں نے حدیث کے الفاظ و من کرہ فقد سلم کی توضیح کی ہے، جب کہ ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ راوی نے اس عبارت کے ذریعہ حدیث کے ان دونوں جملوں فمن انکر اور و من کرہ الخ کی توضیح کی ہے۔

اگر حاکم کی طرف سے کسی کی حق تلفی ہو تب بھی اس کی فرمانبرداری کی جائے

(۱۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ بَعْدِىْ اَثَرَةً وَّاُمُوْرًا تُنْكِرُوْنَهَا قَالُوْا فَمَا تَامُرُنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَدُّوْا اِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ وَسَلُوا اللّٰهَ حَقَّكُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ "تم میرے بعد اپنے ساتھ ترجیحی سلوک اور بہت سی ایسی چیزوں کو دیکھو گے جس کو تم برا سمجھو گے۔" صحابہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! پھر آپ ہمیں کیا ہدایت دیتے ہیں (کہ اس وقت ہمارا رویہ کیا ہو؟) آپ ﷺ نے فرمایا "تم ان (حاکموں) کا حق ادا کرو اور اپنا حق اللہ تعالیٰ سے مانگو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے حاکم تمہارے ساتھ ترجیحی سلوک کریں بایں طور کہ تمہاری حق تلفی کریں تو ایسی صورت میں بھی ان کے تئیں تمہارا رویہ یہی ہونا چاہئے کہ تم ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو یعنی ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرو اور ان کے مدد گار و معین بنے رہو اور وہ تمہارے حق کی ادائیگی میں جو کوتاہی کریں ان پر صبر کرو اور بارگاہ کبریائی میں التجا کرو کہ وہ تمہیں تمہارے حق کا نعم البدل عطا کرے۔

(۱۳) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ سَاَلَ سَلَمَةُ بْنُ يَزِيْدَ الْجُعْفِيُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَانَبِىَّ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ قَامَتْ عَلَيْنَا اُمَرَاءُ يَسْاَلُوْنَا حَقَّهُمْ وَيَمْنَعُوْنَا حَقَّنَا فَمَا تَامُرُنَا قَالَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَاحُمِّلُوْا

وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت وائلؓ ابن حجر کہتے ہیں کہ حضرت سلمہ ابن یزید جعفی نے رسول کریم ﷺ سے سوال کیا اور کہا کہ "یا رسول اللہ! اس بارہ میں ہمارے لئے آپ (ﷺ) کی کیا ہدایت ہے کہ اگر ہم پر ایسے حاکم مقرر ہوں جو ہم سے تو اپنے حق (یعنی اطاعت و فرمانبرداری کا مطالبہ کریں لیکن ہمیں ہمارا حق (یعنی عدل و انصاف اور مال غنیمت کا حصہ نہ دیں؟ آپ نے فرمایا "تم ظاہر میں ان کی بات سنو اور باطن میں) ان کی فرمانبرداری کرو (یعنی ان کی بات اور ان کے احکام کو سننا ظاہری اطاعت ہے) اور ان احکام پر عمل کرنا باطنی فرمانبرداری ہے) یاد رکھو! ان پر وہ چیز فرض ہے جو ان کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے (یعنی رعایا کو عدل و انصاف دینا اور ان کے حقوق ادا کرنا اور تم پر وہ چیز فرض ہے جو تمہارے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے (یعنی اپنے حاکم و سردار کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا اور اگر ان حاکموں کی طرف سے تمہاری حق تلفی ہو یا اور کوئی مصیبت پیش آئے تو اس پر صبر کرنا۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حاکم و رعایا میں سے ہر ایک کے سپرد جو ذمہ داریاں ہیں ان کو پورا کرنا ہر ایک پر واجب ہے جس طرح حاکم کے کاندھوں پر عوام کے حقوق کا تحفظ اور ان کو عدل و انصاف دینے کی ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنا اس پر واجب ہے، اسی طرح رعایا کے کاندھوں پر اپنے حاکم کی مدد و اعانت اور اس اطاعت کی فرمانبرداری ہے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنا رعایا پر واجب ہے لہٰذا دونوں ہی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز نہ کریں۔

امام کی اطاعت سے دست بردار ہونے والے کے بارے میں وعید

(۱۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا حُجَّةَ لَهٗ وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص امام یعنی اسلامی مملکت کے سربراہ کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لے وہ قیامت کے دن بارگاہ رب العزت میں اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے پاس (ایمان کی) دلیل نہیں ہوگی اور جو شخص اس حال میں مرے کہ اس کی گردن امام کی بیعت (یعنی امام برحق کی اطاعت) سے آزاد ہو (یعنی وہ امام برحق کا باغی ہو کر ما جائے) تو اس کی موت جاہلیت پر مرنے کے مرادف ہوگی۔" (مسلمؒ)

خلیفہ و امیر کی موجودگی میں اگر کوئی دوسرا شخص خلافت و امارت کا دعوی کرے تو اس کو تسلیم نہ کرو

(۱۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُوْنَ قَالُوْا فَمَا تَأْمُرُنَا قَالَ فُوْا بِبَيْعَةِ الْاَوَّلِ فَالْاَوَّلِ اَعْطُوْهُمْ حَقَّهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "بنی اسرائیل کو انبیاء ادب و تہذیب سکھایا کرتے تھے چنانچہ جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو اس کا جانشین کوئی دوسرا نبی ہو جاتا (اس طرح یکے بعد دیگرے انبیاء اپنی قوم کی تربیت کیا کرتے تھے۔) لیکن میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے البتہ میرے بعد امراء و خلفاء ہونگے اور بہت ہوں گے (جن کے ذمے) اُمت کی راہنمائی و نگہبانی ہوگی صحابہؓ نے عرض کیا کہ "جب بیک وقت متعدد امراء ملک و امت کی سیادت کے دعویدار ہوں گے اور آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کریں گے تو) اس وقت کے لئے آپ ہمیں کیا ہدایت فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا" پہلے امیر کی بیعت پوری کرو (پھر دوسرے زمانہ میں) پہلے امیر کی (یعنی جب بھی بیک وقت مثلاً دو امیر اپنی سیادت کا دعویٰ کریں تو اس امیر کی بیعت و طاعت کرو جو پہلے

مقرر ہوا ہو اور دوسرے کی مطلق پیروی نہ کرو) اور ان کے حقوق ادا کرو اور جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی مخلوق کی نگہداشت وحکومت کی ذمہ داری سونپی ہے اس کے بارہ میں وہ خود ان سے پوچھ لے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: فوا بیعة الاول فالاول کا مطلب یہ کہ اس خلیفہ و امیر کی بیعت پوری کرو جو پہلے مقرر ہوا پھر اس خلیفہ و امیر کی واطاعت کرو جو اس کے بعد مقرر ہوا! اور اس دوسرے خلیفہ وامیر کو "اول" اس امیرؒ خلیفہ کی نسبت سے فرمایا گیا ہے جو اس کے بعد مقرر ہوگا۔ گویا حاصل یہ ہے کہ جس طرح علی الترتیب ایک کے بعد دوسرا خلیفہ مقرر ہو اسی طرح تم بھی ترتیب کے ساتھ ایک کے بعد دوسرے خلیفہ کی بیعت واطاعت کرنا۔ ہاں اگر ایک ہی وقت میں دو شخص امارت و خلافت کا دعوی کریں تو تم اس شخص کی بیعت وطاعت کرو جو پہلے مقرر ہوا ہے اور دوسرے کے بارہ میں یہ سمجھو کہ یہ شخص حکومت و سیاست کے لالچ میں غلط دعوی کر رہا ہے لہٰذا اس کو اپنا خلیفہ وامیر ماننے سے انکار کردو، چنانچہ آگے جو حدیث آرہی ہے اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے۔

اعطوھم حقھم (ان کے حقوق ادا کرو) گویا پہلے جملہ فوا بیعة الاول (پہلے امیر کی اطاعت پوری کرو) کا بدل ہے اور حدیث کے آخری الفاظ یعنی فَاِنَّ اللّٰہَ سائلھم الخ دراصل پہلے جملہ کی علت کو بیان کرتے ہیں جس میں خلیفہ و امیر کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، گویا اس جملہ میں اختصار کو اختیار کیا گیا ہے، پورا مفہوم یہ ہے کہ تم ان کے حقوق ادا کرو اگرچہ وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کریں۔

حدیث کے آخر میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ خلیفہ وامیر (سربراہ مملکت) کو رعایا کے حقوق کی حفاظت و ادائیگی کی جو (ذمہ داری سونپی گئی ہے وہ اس کے لئے قیامت کے دن احکم الحاکمین کی بارگاہ میں جواب دہ ہوگا، اس نے دنیا میں جن لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہوگی اس سے ان لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کرائی جائے گی اور وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا تو سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

⑯ وَعَنْ اَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا بُوْيِعَ لِخَلِيْفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الْاٰخِرَ مِنْهُمَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے جو بعد کا ہے اس کو قتل کر ڈالو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ پہلے سے مقرر خلیفہ وامیر کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص اپنی خلافت و امارت کا اعلان کر دے اور لوگوں سے بیعت لینے لگے تو اس سے جنگ کی جائے یہاں تک کہ وہ راہ راست پر آجائے اور خدا کے حکم کے مطابق پہلے سے مقرر خلیفہ و امیر کی اطاعت قبول کر لے یا اسی حالت میں مارا جائے کیونکہ وہ خدا کے حکم اور اسلامی مملکت کا باغی ہے اور باغی کی یہی سزا ہے کہ اگر وہ اپنی بغاوت سے باز نہ آئے تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

بعض حضرات نے "اس کو قتل کر ڈالو" کی مراد یہ بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری کا عہد کر لیا ہے اور وہ اپنی بیعت اور اپنا عہد فسخ کر دیں اور اس شخص کو اس طرح کمزور کر دیں کہ وہ خلیفہ کے خلاف شورش نہ پھیلا سکے۔

جو شخص اُمت میں تفرقہ پیدا کرے اس کو موت کے گھاٹ اتار دو

⑰ وَعَنْ عَرْفَجَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهُ سَيَكُوْنُ هَنَاتٌ وَهَنَاتٌ فَمَنْ اَرَادَ اَنْ يُفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَهِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عرفجہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "عنقریب تخریب وفساد رونما ہوں گے، لہٰذا جو شخص اس

اُمت میں تفریق پیدا کرنا چاہے درانحالیکہ اُمت آپس میں متحد و متفق ہو تو اس شخص کو تلوار سے اڑا دو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: "عنقریب تخریب وفساد رونما ہوں گے" کا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا توں توں دین کے مخالف اور دشمن طاقتوں کی فتنہ پردازیاں بڑھتی جائیں گی، وہ مختلف طریقے سے اُمت میں انتشار پیدا کر کے تخریب وفساد کے شعلے بھڑکائیں گے وہ کوشش کریں گے کہ ملت اسلامیہ کے درمیان سے اتحاد و اتفاق کی رو کو نکال لیں اور چونکہ "امارت وسیادت انسان کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے اس لئے کچھ مسلمان اس انسانی کمزوری سے مجبور ہو کر ان کی سازشوں کا شکار ہو جائیں گے اور طلب امارت و حصول جاہ کے لئے مسلم مخالف طاقتوں کا آلۂ کار بن کر طرح طرح کے فتنوں کو جگائیں گے۔ جس کا انجام یہ ہوگا کہ تمام بدامنی و انتشار کی فضا پیدا ہو جائے گی اور اُمت گروہ بندیوں اور تفرقوں کا شکار ہو جائے گی۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کو چاہئے کو جو شخص پہلے سے ان کی قیادت کے مرتبہ پر فائز ہے اور جس کو وہ شروع میں اپنا مرجع اطاعت بنا چکے ہیں اسی کے جھنڈے کے نیچے جمع رہیں اور اس کی قیادت میں ہر اس طبقہ اور فرد کے فتنوں کی سرکوبی کریں جو اُمت کے اتحاد و اتفاق میں رخنہ اندازی کر رہا ہو، کیونکہ (اصل میں امیر و خلیفہ وہی شخص ہے اور اسی کی قیادت قابل اطاعت ہے۔

"خواہ وہ کوئی بھی ہو" کے ذریعے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اُمت کا اتحاد، فرد کی حیثیت و شخصیت پر مقدم ہے اگر اُمت۔ کے اتحاد اور ملت کی اجتماعی حیثیت کو بچانے کے لئے کسی بھی بڑے سے بڑے فرد کو راستہ سے ہٹانا پڑے تو اس میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرنی چاہئے خواہ وہ شخص کتنا ہی کوئی بڑا عالم کیوں نہ ہو۔ اور دیکھنے میں کتنا ہی بڑا شیخ طریقت اور کتنا ہی معزز و حیثیت دار کیوں نہ ہو بلکہ یہاں تک ملحوظ رہنا چاہئے کہ اگر کوئی ایسا شخص امارت وسیادت کا دعوی کرے جو حقیقت میں بھی اس منصب کا زیادہ سے زیادہ اہل ہے تو علماء لکھتے ہیں کہ اس کو بھی قتل کر دینا چاہئے کیونکہ فتنہ وفساد اور اُمت میں تفریق پیدا کرنے کا باعث ہونے کی وجہ سے وہ قتل ہی کا مستحق ہے بشرطیکہ جو شخص پہلے منصب امارت و امامت پر فائز ہے وہ اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا اہل ہو اور اس کو معزول کرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔

(۱۸) وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَتَاكُمْ وَاَمْرُكُمْ جَمِيْعٌ عَلٰى رَجُلٍ وَاحِدٍ يُرِيْدُ اَنْ يَشُقَّ عَصَاكُمْ اَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوْهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عرفجہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص (امام وقت کے خلاف بغاوت کر کے اور اپنی خلافت و امارت کا اعلان کر کے) تمہارے پاس آئے درآنحالیکہ تم سب (پہلے سے) ایک شخص پر متفق اور ایک خلیفہ پر متحد ہو اور وہ شخص تمہاری لاٹھی کو چیرے یا تمہاری اجتمائی تنظیم میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتا ہو تو تم اس کو قتل کر دو۔" (مسلمؒ)

تشریح: "لاٹھی چیرنے" کو کنایۃ "مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے" کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، گویا مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد اور کسی ایک رائے پر مجتمع ہو جانے کو "لاٹھی" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس، اتفاق و اتحاد اور اجتماعیت میں رخنہ اندازی کو "چیرنے" کا مفہوم دیا گیا ہے۔

اَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ (یا تمہاری اجتمائی تنظیم میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتا ہو) بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روای نے اپنے شک کو ظاہر کیا ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو پہلا جملہ ان یشق عصاکم ارشاد فرمایا تھا یا یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا، لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں ہی جملے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمائے تھے، اس صورت میں پہلے جملہ کو دنیاوی امور یعنی مسلمانوں کی سیاسی طاقت میں انتشار پیدا کرنے پر محمول کیا جائے اور دوسرے جملہ کو دینی احکام یعنی مسلمانوں کی دینی زندگی اور ان کے مذہبی معاملات میں فتنہ پردازی پر محمول کیا جائے۔

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَايَعَ اِمَامًا فَاَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهٖ وَثَمَرَةَ قَلْبِهٖ

فَلْيُطِعْهُ اِنِ اسْتَطَاعَ فَاِنْ جَاءَ اٰخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوْا عُنُقَ الْاٰخَرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے امام سے بیعت کی بایں طور کہ اس کو اپنا ہاتھ دے کر اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کیا اور خلوص دل سے بھی اس کی حاکمیت و قیادت کو قبول کیا) تو اس کو چاہئے کہ وہ (حتی المقدور) اس امام کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اور پھر اگر کوئی دوسرا شخص اپنی امامت کا اعلان کردے اور اپنے امام کے خلاف بغاوت کرے تو اس کی گردن اڑادو۔" (مسلمؒ)

حکومت وامارت کے طلب گار نہ بنو

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْأَلِ الْاِمَارَةَ فَاِنَّكَ اِنْ اُعْطِيْتَهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُكِلْتَ اِلَيْهَا وَاِنْ اُعْطِيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَيْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن سمرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ تم حکومت و سیادت کو طلب نہ کرو کیونکہ اگر تمہاری خواہش اور طلب پر تم کو حکومت و سیادت دی گئی تو تمہیں اسی کے سپرد کردیا جائے گا (تاکہ تم اس منصب کی ذمہ داریوں کو انجام دو درآنحالیکہ منصب وامارت کی ذمہ داریاں اتنی دشوار اور مشقت طلب ہیں کہ بغیر مدد الٰہی کے کوئی شخص ان کو انجام نہیں دے سکتا اور اگر تمہاری خواہش و طلب کے بغیر تمہیں حکومت و سیادت ملے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائیگی (یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے تمہیں یہ توفیق بخشی جائے گی کہ تم عدل وانصاف اور نظم و ضبط کے ساتھ اس کی ذمہ داریوں کو انجام دے سکو۔" (مسلمؒ)

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّكُمْ سَتَحْرِصُوْنَ عَلَى الْاِمَارَةِ وَسَتَكُوْنُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَنِعْمَ الْمُرْضِعَةُ وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "(میں دیکھ رہا ہوں کہ) تم (آنے والے زمانہ میں) حکومت و سیادت کی حرص میں مبتلا ہوگے حالانکہ وہ حکومت و سیادت (جو حرص و طلب کے ساتھ ملے) قیامت کے دن پشیمانی کا موجب ہے (یاد رکھو) حکومت و سیادت دودھ پلانے والی بھی ہے اور دودھ چھڑانے والی بھی ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حکومت و سیادت کی ابتداء دودھ پلانے والی عورت کے ساتھ اور اس کی انتہا کو دودھ چھڑانے والی عورت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جب کسی شخص کے پاس حکومت و سیادت آتی ہے تو وہ دودھ پلانے والی عورت کی طرح بہت اچھی لگتی ہے اور جب موت کا آہنی پنجہ اس کو حکومت و سیادت سے جدا کردیتا ہے یا اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص راج گدی سنبھال لیتا ہے تو وہی حکومت و سیادت اس وقت دودھ چھڑانے والی عورت کی طرح بری لگتی ہے لہٰذا یہ بات مرد دانا کے لائق نہیں ہے کہ وہ ایسی لذت کے حصول کی خواہش و کوشش کرے جس کا انجام حسرت و غم ہے۔

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا تَسْتَعْمِلُنِیْ قَالَ فَضَرَبَ بِيَدِهٖ عَلٰى مَنْكِبِیْ ثُمَّ قَالَ يَا اَبَا ذَرٍّ اِنَّكَ ضَعِيْفٌ وَاِنَّهَا اَمَانَةٌ وَاِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْیٌ وَنَدَامَةٌ اِلَّا مَنْ اَخَذَهَا بِحَقِّهَا وَاَدَّى الَّذِیْ عَلَيْهِ فِيْهَا، وَفِیْ رِوَايَةٍ قَالَ لَهٗ يَا اَبَا ذَرٍّ اِنِّیْ اَرَاكَ ضَعِيْفًا وَاِنِّیْ اُحِبُّ لَكَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِیْ لَا تَاَمَّرَنَّ عَلَى اثْنَيْنِ وَلَا تَوَلَّيَنَّ مَالَ يَتِيْمٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن) میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ (ﷺ) مجھے (کسی جگہ کا) عامل (حاکم) کیوں نہیں بنادیتے؟ حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے (میری یہ بات سن کر) آنحضرت ﷺ نے (ازراہ لطف و شفقت) میرے مونڈھے پر اپنا ہاتھ مارا اور پھر فرمایا کہ "ابوذرؓ! تم ناتواں ہو اور یہ سرداری (خدا کی طرف سے) ایک امانت ہے) جس کے ساتھ بندوں کے حقوق متعلق ہیں اور اس میں خیانت نہیں کرنی چاہئے) اور (تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ) سرداری قیامت کے دن رسوائی و پشیمانی کا باعث ہوگی الا یہ کہ جس شخص نے اس

(سرداری کو حق کے ساتھ حاصل کیا اور اس حق کو ادا کیا جو اس سرداری کے تئیں اس پر ہے (یعنی جو شخص مستحق ہونے کی وجہ سے سردار بنایا گیا اور پھر اس نے اپنے زمانہ میں حکومت میں عدل و انصاف کا نام روشن کیا اور رعایا کے ساتھ احسان و خیر خواہی کا برتاؤ کیا تو وہ سرداری اس کے لئے رسوائی اور وبال کا باعث نہیں ہوگی) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ابوذر! میں تمہیں ناتواں دیکھتا ہوں (کہ سرداری کا بار برداشت نہیں کر سکو گے) اور میں تمہارے لئے اس چیز کو پسند کرتا ہوں جو میں اپنے نفس کے لئے پسند کرتا ہوں۔ تم دو آدمیوں کا بھی سردار و عامل نہ بننا اور کسی یتیم کے بھی مال کی کارپردازی و نگرانی نہ کرنا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جو میں اپنے نفس کے لئے پسند کرتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں تمہاری طرح ضعیف و ناتواں ہوتا تو میں اس سرداری و حاکمیت کے بوجھ کو نہ اٹھاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے قوت بھی دی ہے اور پھر تحمل بھی عطا کیا ہے، اگر حق تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو تحمل عطا نہ ہوتا تو میں ہرگز اس بار کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حکومت و سیادت سے پرہیز کرنے کے بارے میں یہ حدیث اصل عظیم اور سب سے بڑی رہنما ہے بطور خاص اس شخص کے لئے جو اس منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی قوت نہ رکھتا ہو!۔"

جو شخص خود کسی عہدہ و منصب کا طلب گار ہو اس کو اس منصب پر فائز نہ کرو

(۲۳) وَعَنْ اَبِی مُوسٰی قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِی عَمِّی فَقَالَ اَحَدُ ھُمَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَمِّرْنَا عَلٰی بَعْضِ مَا وَلَّاکَ اللّٰہُ وَقَالَ الْاٰخَرُ مِثْلَ ذٰلِکَ فَقَالَ اِنَّا وَاللّٰہِ لَا نُوَلِّی عَلٰی ھٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَاَلَہٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ لَا نَسْتَعْمِلُ عَلٰی عَمَلِنَا مَنْ اَرَادَہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں اور میرے چچا کی اولاد میں سے دو شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو (تمام مسلمانوں اور روئے زمین کا) حاکم بنایا ہے، مجھ کو کسی جگہ یا کسی کام کا حاکم و والی مقرر فرما دیجئے۔" دوسرے نے بھی اسی طرح کی خواہش کا اظہار کیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "خدا کی قسم! ہم (دین و شریعت کے) ان امور میں کسی بھی ایسے شخص کو والی اور ذمہ دار نہیں بناتے جو ہم سے ولایت و ذمہ داری کا طلب گار ہو یا اس کی حرص رکھتا ہو۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ہم اپنے کام پر اس شخص کو (عامل کارپرداز) مقرر نہیں کرتے جو اس کا ارادہ (یعنی عامل ہونے کی خواہش رکھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جو شخص کسی خدمت و ذمہ داری کا طالب ہوتا اور آپ ﷺ سے اس کی درخواست کرتا تو آپ ﷺ اس کو اس کام پر مقرر نہ فرماتے کیونکہ کسی منصب کا طالب ہونا حب جاہ پر دلالت کرتا ہے جو آخر کار طالب کے حق میں خرابی کا باعث ہوتا ہے۔

حکومت و امارت سے انکار کرنے والا بہترین شخص ہے

(۲۴) وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَجِدُوْنَ مِنْ خَیْرِ النَّاسِ اَشَدَّھُمْ کَرَاھِیَۃً لِھٰذَا الْاَمْرِ حَتّٰی یَقَعَ فِیْہِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "لوگوں میں بہتر تم اس شخص کو پاؤ گے جو اس چیز (یعنی حکومت و سیادت) کو ناپسند کرنے کے معاملہ میں سب سے زیادہ سخت ہو یہاں تک کہ وہ اس میں مبتلا ہو جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص حکومت و سیادت کے منصب و اختیارات کو قبول کرنا سخت ناپسند کرے اس کو لوگوں میں کا بہترین شخص

جانو یہاں تک کہ وہ اگر کسی وجہ سے اس منصب کو قبول کر بیٹھا تو اس کو بھی آخر کار وہی ندامت و پشیمانی ہوگی جو اس منصب کا آخری انجام ہے۔

طیبیؒ نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ایسے شخص کو جو حکومت و سیادت سے سخت متنفر ہو) تم ایک بہترین شخص پاؤ گے یہاں تک کہ اگر وہ اپنی اس نفرت پر قائم نہ رہ سکا اور حکومت و سیادت کی طلب میں مبتلا ہو گیا تو اس وقت وہ لوگوں میں کا بہترین نہیں بلکہ بدترین شخص ہوگا۔

قیامت کے دن ہر شخص کو اپنی ذمہ داری کی جواب دہی کرنی ہوگی

(۲۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ فَالْاِمَامُ الَّذِىْ عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِىَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ اَلَا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خبردار تم میں سے ہر شخص اپنی رعیت کا نگہبان ہے اور (قیامت کے دن) تم میں سے ہر شخص کو اپنی رعیت کے بارہ میں جوابدہ ہونا پڑے گا، لہٰذا امام یعنی سربراہ مملکت و حکومت جو لوگوں کا نگہبان ہے اس کو اپنی رعیت کے بارہ میں جوابدہی کرنا ہوگی، مرد جو اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اس کو اپنے گھر والوں کے بارہ میں جواب دہی کرنا ہوگی عورت جو اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی نگہبان ہے، اس کو ان کے حقوق کے بارہ میں جوابدہی کرنی ہوگی اور غلام مرد جو اپنے مالک کے مال کا نگہبان ہے اس کو اس کے مال کے بارے میں جوابدہی کرنا ہوگی لہٰذا آگاہ رہو! تم میں سے ہر ایک شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص اپنی رعیت کے بارہ میں جواب دہ ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "رعیت" اس چیز کو کہتے ہیں جو نگہبان کی حفاظت و نگرانی میں ہو، چنانچہ کسی ملک کے باشندوں کو اس ملک کے حکمران کی رعیت اور رعایا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سب حکمران کی حفاظت و نگرانی میں ہوتے ہیں اور اسی اعتبار سے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اپنی اپنی جگہ پر ہر شخص نگہبان ہے کہ مرد کے لئے گھر والے اس کی رعیت ہیں، عورت کے لئے خاوند کا گھربار اور اس کے بچے اس کی رعیت ہیں اور غلام کے مالک کا مال اس کی رعیت ہے۔ یہاں تک کہ علماء نے لکھا ہے کہ ہر شخص اپنے جسم کے اعضاء حواس کا نگہبان ہے اور وہ اعضاء اس کی رعیت ہیں لہٰذا قیامت کے دن ہر شخص سے اس کے اعضاء حواس کے بارے میں بھی جواب طلب کیا جائے گا کہ تم نے ان اعضاء کو کہاں اور کس کس طرح استعمال کیا؟ اور اس کو حدیث میں اس لئے نقل نہیں کیا گیا کہ یہ بالکل ظاہر بات ہے۔

خائن و ظالم حاکم کے بارے میں وعید

(۲۶) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ وَالٍ يَلِىْ رَعِيَّةً مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَيَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٌّ لَهُمْ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت معقلؓ ابن یسار کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو بھی شخص حکومت و سیادت حاصل کر کے اپنی رعیت پر حکمرانی کرے اور پھر اس حالت میں مرجائے کہ وہ اپنی رعیت پر ظلم اور ان کے حقوق میں خیانت کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جنت کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ ابتداء میں جنت میں داخل ہونے سے محروم کر دیا جائے گا۔ یا یہ ارشاد گرامی "مستحل" یعنی اس حاکم پر محمول ہے جو خیانت اور ظلم کو حلال جان کر ظالم و خائن بنا ہو اور یا یہ کہ آپ نے

زجر و تنبیہ اور سخت وعید کے طور پر یہ فرمایا ہو۔

رعایا کے حق میں بھلائی و خیر خواہی نہ کرنے والا حاکم جنت کی بو سے محروم رکھا جائے گا

(۲۷) وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيْهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيْحَةٍ اِلَّالَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت معقل ابن یسارؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "اللہ تعالیٰ جس شخص سے رعیت کی نگہبانی کرائے یعنی جس شخص کو رعیت کا حاکم و نگہبان بنائے) اور وہ بھلائی و خیر خواہی کے ساتھ نگہبانی نہ کرے تو وہ بہشت کی بو نہ پائے گا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "تو وہ جنت کی بو نہ پائے گا۔" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن بہشت کی بو پانے والوں کے ساتھ بو نہ پائے گا حالانکہ بہشت کی بو پانچ سو برس کی مسافت کے فاصلے سے بھی آئے گی یا یہ مطلب ہے کہ وہ نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ بہشت کی بو نہیں پائے گا اور یا یہ کہ اگر وہ کفر پر مرے گا یا رعایا پر ظلم کرنے کو حلال جانے اور اسی عقیدے پر مر جائے تو اس کو مطلق بہشت کی بو میسر نہیں ہوگی۔

بدترین حاکم وہ ہے جو اپنی رعایا پر ظلم کرے

(۲۸) وَعَنْ عَائِذِبْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (بارگاہ قاضی الحاجات میں یہ عرض کی "اے میرے پروردگار! جس شخص کو میری امت کے (دینی و دنیاوی) امور میں سے کسی کا ولی و متصرف بنایا گیا اور پھر اس نے (اپنے اختیار و ولایت و تصرف کے ذریعہ) میری اُمت کے لوگوں پر مشقت و سختی مسلط کر دی تو اس شخص پر تو بھی، مشقت و سختی مسلط کر دے اور جس شخص کو میری اُمت کے امور میں کسی چیز کا والی و متصرف بنایا گیا اور اس نے میری اُمت کے لوگوں کے ساتھ نرمی و بھلائی کا برتاؤ کیا تو اس شخص کے ساتھ تو بھی نرمی و عنایت کا معاملہ فرما۔" (مسلمؒ)

عادل حکمران کا مرتبۂ عظیم

(۳۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُقْسِطِيْنَ عِنْدَاللّٰهِ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ عَنْ يَمِيْنِ الرَّحْمٰنِ وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ الَّذِيْنَ يَعْدِلُوْنَ فِيْ حُكْمِهِمْ وَاَهْلِيْهِمْ وَمَاوَلُوا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہؓ ابن عمرو ابن العاص کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بلاشک عادل حکمران، اللہ کے ہاں نور کے منبروں پر جگہ پائیں گے جو رحمٰن (اللہ) کے داہنے ہاتھ کی طرف ہوں گے اور اللہ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں (اور عادل حکمران وہ ہیں) جو اپنے احکام اپنے اہل اور اپنے زیر تصرف معاملات میں عدل و انصاف کرتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "داہنے ہاتھ کی طرف الخ" یہ اللہ کے نزدیک عادل حکمران کے مرتبۂ عظیم اور جلالت قدر کا کنایہ پیرایۂ بیان ہے کیونکہ جو شخص عظیم قدر ہوتا ہے۔ وہ دائیں طرف کھڑا ہوتا یا بیٹھتا ہے۔

"اور اللہ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں" یہ دفع توہم کے لئے فرمایا گیا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ داہنا ہاتھ، بائیں ہاتھ کے مقابل میں کہا گیا ہے کیونکہ بایاں ہاتھ نسبتاً کمزور ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی کمزوری اور نقصان سے پاک و منزہ ہے واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہاتھ کی نسبت متشابہات میں سے ہے کہ اس کی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تاہم ظاہری طور پر "ہاتھ" سے مراد قوت و غلبہ ہے۔

"حکام میں عدل و انصاف" کا مطلب یہ ہے کہ حکومت و امارت کے تعلق سے ان کے ذمے جو امور ہیں ان کی انجام دہی میں وہ انصاف، ایمان داری اور دیانت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اہل میں عدل و انصاف کا مطلب یہ ہے کہ ان کے زیر تسلط جو لوگ ہیں خواہ وہ ان کے اہل و عیال ہوں یا رعیت کے عام لوگ ہوں سب کے حقوق کی ادائیگی میں جو ان پر واجب ہیں پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔

اسی طرح "زیر تصرف معاملات میں عدل و انصاف" کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں ان کی ولایت و نگہبانی میں ہیں جیسے یتیم اور غربا کی پرورش اور وقف کے مال کی خبر گیری وغیرہ، ان میں وہ پوری دیانت داری اور انصاف کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔

ایک مرد حق گو کا قول ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے نفس کے بارے میں بھی عدل و انصاف کرے بایں طور کہ اپنے اوقات ایسی چیزوں میں ضائع نہ کرے جن میں اپنا وقت صرف کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا ہے بلکہ اپنے تمام اوقات کو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی چیزوں اور مخلوق خدا کے حقوق کی ادائیگی میں مشغول رکھے اور حق تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری اور ممنوع چیزوں سے اجتناب پر مداومت اختیار کرے جیسا کہ اولیاء کرام اور اہل اللہ کا طریقہ ہے، یا اپنے وقت کا اکثر حصہ ان چیزوں میں مشغول رکھے جیسا کہ مؤمنین و صالحین کا معمول ہے۔

ہر حاکم و امیر کے ہمراہ ہمیشہ دو متضاد طاقتیں رہتی ہیں

(۳۱) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَابَعَثَ اللّٰہُ مِنْ نَبِیٍّ وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِیْفَۃٍ اِلَّا کَانَتْ لَہٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَۃٌ تَامُرُہٗ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَبِطَانَۃٌ تَامُرُہٗ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَالْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوسعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی نبی نہیں بھیجا اور ایسا کوئی خلیفہ مقرر نہیں کیا جس کے لئے دو چھپے ہوئے رفیق نہ ہوں، ایک چھپا ہوا رفیق تو نیک کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور نیکی کی طرف راغب کرتا ہے اور دوسرا چھپا ہوا رفیق برائی کا حکم دیتا ہے اور برائی کی طرف راغب کرتا ہے اور معصوم (بے گناہ) وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے محفوظ رکھا۔" (بخاریؒ)

تشریح: دو چھپے ہوئے رفیقوں سے مراد فرشتہ اور شیطان ہیں یہ دونوں انسان کے باطن میں رہتے ہیں چنانچہ فرشتہ تو نیک کام کرنے کی ہدایت کرتا رہتا ہے اور نیکی کی ترغیب دیتا ہے جب کہ شیطان برے کام کرنے پر اکساتا رہتا ہے اور برائی کی طرف ڈھکیلتا رہتا ہے۔

"اور معصوم وہ ہے الخ" کے ذریعہ انبیاء کرام صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین، خلفاء راشدین اور بعض دوسرے خلفاء و امراء کا حال بیان کیا گیا ہے جن کو اللہ نے شیطان کے شر و فتنہ سے محفوظ رکھا ہے۔

"دو رفیقوں" سے مراد وزیر و مشیر ہو سکتے ہیں جو خلیفہ کے ساتھ ہر دم رہنے کی وجہ سے بطانہ (استر) سے مشابہ ہو گئے ہیں، چنانچہ ہر نبی اور خلیفہ کے ساتھ جو مشیر کار اور مصاحب رہتے تھے ان میں دو مختلف خیالات کے حامل افراد بھی ہوتے تھے یا ان کے ساتھ دو جماعتیں ہوتی تھیں جو آپس میں مختلف الرائے ہوتی تھیں جیسا کہ عام طور پر امراء و سلاطین اور والیان ریاست کے یہاں دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ ان کے مصاحب، مشیران کار اور کار پرداز ہوتے ہیں ان کے خیالات اور آراء کا بعد بین المشرقین ہوتا ہے، چنانچہ ان میں سے جو لوگ اچھے خیالات کے اور صائب الرائے ہوتے ہیں وہ اپنے والی و امیر کو اچھے مشورے دیتے ہیں اور جن کے خیالات فاسد ہوتے ہیں یا جن کے طبائع میں برائی کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے والی و امیر کو غلط مشورے دیتے ہیں اور ان کو برائی کی راہ پر چلانا چاہتے ہیں آگے اللہ کی مصلحت کار فرما ہوتی ہے کہ وہ جس والی و امیر کو چاہتا ہے برے مصاحبین کے خیالات اور ان کے مشورے قبول کرنے سے بچاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ہاں حضرت قیس ابن سعدؓ کا منصب

(۳۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ قَيْسُ بْنُ سَعْدٍ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْزِلَةِ صَاحِبِ الشُّرَطِ مِنَ الْاَمِيْرِ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ہاں حضرت قیسؓ ابن سعد کے سپرد وہ خدمت تھی جو امراء و سلاطین کے ہاں کوتوال انجام دیتے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ حضرت قیسؓ ابن سعد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے تاکہ آنحضرت ﷺ جو احکام دیں وہ ان کو جاری و نافذ کریں جیسا کہ امراء و سلاطین کے ہاں کوتوال اس خدمت پر مقرر رہتے ہیں۔

عورت کو اپنا حاکم بنانے والی قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی

(۳۳) وَعَنْ اَبِي بَكْرَةَ قَالَ لَمَّا بَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ اَهْلَ فَارِسَ قَدْ مَلَّكُوْا عَلَيْهِمْ بِنْتَ كِسْرٰى قَالَ لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کے پاس یہ خبر پہنچی کہ فارس والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حکمران بنالیا ہے تو فرمایا کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے (ملک کے) امور کا حاکم و والی کسی عورت کو بنایا ہو۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ولایت و حکمرانی کا اہل مرد ہی ہو سکتا ہے عورت حکمرانی و سربراہی کے منصب کی اہل نہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

ملت کی اجتماعی ہیئت سے علیحدگی اختیار کرنے والے کے بارے میں وعید

(۳۴) عَنِ الْحَارِثِ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ اِلَّا اَنْ يُّرَاجِعَ وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ مِنْ جُثٰى جَهَنَّمَ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ۔ (رواه احمد والترمذی)

"حضرت حارث اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں۔ (۱) مسلمانوں کی جماعت کا (قول و عمل اور اعتقاد میں) اطاعت کرو یعنی ملت کی اجتماعی ہیئت کو بہر صورت برقرار کرو اور سربراہان ملت کی طرف سے جو احکام جاری ہوں ان کو ہر حالت میں تسلیم کرو اور ان کی اطاعت کرو (۲) امراء علماء (شریعت کے مطابق) جو ہدایت دیں ان کو سنو اور تسلیم کرو (۳) علماء کے احکام کی اطاعت و فرمانبرداری کرو (۴) ہجرت کرو (۵) اللہ کی راہ میں جہاد کرو! اور یاد رکھو) جو شخص ملت کی اجتماعی ہیئت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے (گویا) اسلام کی رسی کو اپنی گردن سے نکال دیا الا یہ کہ وہ واپس آجائے اور جس شخص نے پکار اجاہلیت کا سا پکارنا، وہ (گویا) دوزخیوں کی جماعت کا فرد ہے اگرچہ وہ روزے رکھے، نماز پڑھے اور یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: "ہجرت کرو" اس حکم میں "ہجرت" سے مراد ہے کہ دار الکفر میں رہنے والا مسلمان ترک وطن کر کے دار الاسلام چلا جائے یا اگر کسی ایسے مسلم ملک یا شہر میں ہو جو بدعات و منہیات کا گڑھ ہونے کی وجہ سے "دار البدعۃ" کے حکم میں ہو تو اس کو چھوڑ کر ملک یا ایسے شہر میں چلا جائے جو سُنّت دین کا مرکز ہونے کی وجہ سے دار السنۃ کے حکم میں ہو! اسی طرح گناہ معصیت کی زندگی کو چھوڑ کر توبہ و انابت الی اللہ کی راہ کو اختیار کر لینا بھی "ہجرت" کے حکم میں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ۔

"وہ شخص (بھی) مہاجر ہے جس نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا جس سے اللہ نے روکا۔"

"اللہ کی راہ میں جہاد کرو" اس حکم میں "جہاد" سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی ترقی و شوکت، دین کی سربلندی اور روئے زمین پر قانون الٰہی کے غلبہ کے لئے اسلام دشمن طاقتوں اور کافروں سے جنگ کرو، نیز اپنے نفس کو اس کی خواہشات سے باز رکھ کر اس کو مارنا بھی "جہاد" ہے کیونکہ انسان کے ساتھ اس کے نفس کی دشمنی سے زیادہ سخت اور نقصان دہ اور چیز نہیں ہے۔

"جو شخص ملت کی اجتماعی ہیئت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا الخ" یعنی جس مسلمان نے اس چیز کو ترک کیا جس پر پوری ملت عمل پیرا ہے جیسے سُنّت کو اختیار کرنا، بدعات سے اجتناب کرنا، امام و امیر کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا اور اگرچہ اس نے ان چیزوں کو بہت معمولی درجے میں ترک کیا ہو تو اس نے گویا اسلام کی فرمانبرداری کا پٹہ اپنی گردن سے نکال دیا یعنی اس نے اسلام کے تئیں اپنے کئے ہوئے عہد کو توڑ دیا اور اپنی اس ذمہ داری کو ختم کر دیا جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس پر واجب تھی۔ یا یہ کہ خود (اسلام اس سے بری الذمہ ہو گیا۔ ہاں اگر وہ اپنے اس (فعل) (ملت کی اجتماعی ہیئت سے علیحدگی) سے باز آ گیا اور اس نے اپنی بدعملی سے رجوع کر لیا تو پھر وہ پہلے ہی کی طرح اسلام کا ایک فرمانبردار فرد ہو جائے گا۔

"اور جس شخص نے پکارا جاہلیت کا سا پکارنا الخ سے مراد یہ ہے کہ جس شخص نے زمانہ جاہلیت کے رسم و رواج کی طرف بلایا اور اس طرح وہ مخلوق کو اسلام مخالف عقائد و نظریات اور باطل رسوم و عادات میں مبتلا کرنے کا باعث ہوا اور بعض حضرات یہ مراد بیان کرتے ہیں کہ اس نے کسی حادثہ و حملہ کے وقت اس طرح لوگوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ جب کسی شخص پر دشمن غالب آ جاتا تھا تو اپنی مدد کے لئے لوگوں سے باآواز بلند یوں فریاد کرتا "اے فلاں شخص کے خاندان والو! اے فلاں شخص کے خاندان والو۔ چنانچہ وہ لوگ اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑتے قطع نظر اس بات کے وہ شخص ظالم ہے یا مظلوم ہے۔"

امیر و والی کی اہانت کرو

(۳۵) وَعَنْ زِيَادِ بْنِ كُسَيْبِ الْعَدَوِيِّ قَالَ كُنْتُ مَعَ اَبِي بَكْرَةَ تَحْتَ مِنْبَرِ ابْنِ عَامِرٍ وَهُوَ يَخْطُبُ وَعَلَيْهِ ثِيَابٌ رِقَاقٌ فَقَالَ اَبُوْ بِلَالٍ اُنْظُرُوْا اِلَى اَمِيْرِنَا يَلْبَسُ ثِيَابَ الْفُسَّاقِ فَقَالَ اَبُوْ بَكْرَةَ اسْكُتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَهَانَ سُلْطَانَ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ اَهَانَهُ اللّٰهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت زیاد ابن کسیبؒ عدوی (تابعی) کہتے ہیں (ایک دن) میں حضرت ابوبکرہؓ (صحابی) کے ہمراہ حضرت عامرؓ کے منبر کے نیچے بیٹھا تھا جب کہ وہ (ابن عامر) خطبہ دے رہے تھے اور انہوں نے باریک کپڑے پہن رکھے تھے (اسی موقع پر ایک تابعی) ابوبلالؒ نے کہا کہ "ذرا تم ہمارے اس امیر کو تو دیکھو، اس نے فاسقوں کے سے کپڑے پہن رکھے ہیں!؟ حضرت ابوبکرہؓ نے کہا "خاموش! میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو شخص بادشاہ کی اہانت کرے گا جس کو اللہ نے (اپنی مخلوق کے کاموں کی انجام دہی کے لئے) زمین پر مقرر کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو سبک و خوار کرے گا اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: "اس نے فاسقوں کے سے کپڑے پہن رکھے ہیں۔" بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت ابن عامر نے کسی ایسے کپڑے کا لباس زیب تن کر رکھا تھا جس کا پہننا مردوں کے لئے حرام ہے جیسے حریر یا کوئی دوسرا ریشمی کپڑا... حضرت ابوبکرہؓ نے حضرت بلال کو اس بات سے منع کیا کہ وہ حضرت ابن عامر کو مطعون نہ کریں تو اس کی بنیاد یہ تھی کی ایسے موقع پر ابوبلالؓ کی نصیحت کہیں تکا فضیحتی اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد پیدا ہو جانے کا باعث نہ بن جائے۔

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے کپڑے ریشمی نہ رہے ہوں بلکہ بہت اعلیٰ قسم کے اور بہت زیادہ باریک رہے ہوں جو عام طور پر اہل

عیش و تنعم کا لباس ہوتا ہے اور زاہد و عابد لوگ جس سے پرہیز کرتے ہیں اس لئے حضرت ابو بلالؒ نے اس کپڑے کو فاسقوں کے لباس سے تشبیہ دی ہے بعض عارفین کا یہ قول ہے کہ مَنْ رَقَّ ثَوْبُهٗ رَقَّ دِيْنُهٗ
"جس شخص نے بہت باریک کپڑے پہنے اس نے اپنے دین کو باریک کیا۔"

اگر امیر و حاکم کسی گناہ کا حکم دے تو اس کی اطاعت نہ کرو

(۳۶) وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔

"اور حضرت نواسؓ ابن سمعان کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مخلوق کے کسی ایسے حکم کی بھی تابعداری جائز نہیں جس سے خالق کی نافرمانی ہو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: مطلب یہ ہے اگر مخلوق (کوئی انسان) خواہ وہ امیر و حاکم ہی کیوں نہ ہو، کوئی ایسا حکم دے جس پر عمل کرنے سے خالق (یعنی اللہ تعالیٰ) کی نافرمانی ہوتی ہو اور گناہ لازم آتا ہو تو اس حکم کو مطلقاً نہ ماننا چاہئے۔ ہاں اگر کسی شخص کو اس کی اطاعت پر بزور طاقت مجبور کیا گیا ہو تو اس صورت میں گناہ نہیں۔

امیر و حاکم کا انجام

(۳۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اَمِيْرِ عَشَرَةٍ اِلَّا يُؤْتٰى بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَغْلُوْلًا حَتّٰى يَفُكَّ عَنْهُ الْعَدْلُ اَوْ يُوْبِقَهُ الْجَوْرُ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر امیر و حاکم، خواہ وہ دس ہی آدمیوں کا امیر و حاکم کیوں نہ ہو قیامت کے دن اس طرح لایا جائے گا اس کی گردن میں طوق ہوگا یہاں تک کہ اس کو اس طوق سے یا تو اس کا عدل نجات دلائے گا یا اس کا ظلم ہلاک کرے گا۔" (دارمی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ایک بار تو ہر حاکم خواہ وہ عادل ہو یا ظالم، بارگاہ رب العزت میں باندھ کر لایا جائے گا اور پھر تحقیق کے بعد اگر وہ عادل ثابت ہوگا اس کو نجات دے دی جائے گی اور اگر ظالم ثابت ہوگا تو ہلاکت یعنی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

قیامت کے دن امراء و حکام کی حسرت ناکی

(۳۸) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيْلٌ لِّلْاُمَرَاءِ وَيْلٌ لِّلْعُرَفَاءِ وَيْلٌ لِّلْاُمَنَاءِ لَيَتَمَنَّيَنَّ اَقْوَامٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنَّ نَوَاصِيَهُمْ مُعَلَّقَةٌ بِالثُّرَيَّا يَتَجَلْجَلُوْنَ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَاَنَّهُمْ لَمْ يَلُوْا عَمَلًا۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ اَنَّ ذَوَائِبَهُمْ كَانَتْ مُعَلَّقَةً بِالثُّرَيَّا يَتَذَبْذَبُوْنَ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَكُوْنُوْا عُمِّلُوْا عَلٰى شَيْءٍ۔

"اور حضرت ابوہرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "افسوس ہے امراء و حکام پر، افسوس ہے چودھریوں پر، افسوس ہے امینوں پر! بہت سے لوگ قیامت کے دن آرزو کریں گے کہ (کاش دنیا میں) ان کی پیشانیوں کے بال ثریا میں باندھ کر ان کو لٹکا دیا جاتا اور زمین و آسمان کے درمیان جھولتے رہتے لیکن ان کو کسی کام کی ولایت و سرداری نہ ملتی۔" (شرح السنۃ)

تشریح: لفظ "ویل" کے معنی ہیں "وہ غم، ہلاکت اور دکھ و تکلیف جو عذاب کی وجہ سے ہو۔" اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "ویل" دوزخ کے ایک (نالے) کھائی کا نام ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ "ویل" دوزخ کا ایک نالا ہے جس میں کافر چالیس برس تک گرتا لڑھکتا چلا جائے گا۔ مگر تہ تک نہیں پہنچے گا۔"

"امین" اس کارپرداز کو کہتے ہیں جس کو حاکم نے صدقات اور خراج محصولات لینے پر مقرر کیا ہو۔ یا وہ مسلمانوں کے دوسرے قسم کے مال و اسباب کا نگران و محافظ بنایا گیا ہو۔ اور یا حاکم کے علاوہ کسی اور شخص نے اس کو اپنے مال کا امانت دار بنایا ہو۔

"ثریا" ان پانچ ستاروں کا مجموعہ کا نام ہے جو پاس پاس رہتے ہیں اور جن میں روشنی کم ہوتی ہے۔ پیشانی کے بل دریا میں باندھ کر لٹکانا دراصل ذلت و خواری کی تمثیل ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب امراء و حکام قیامت کے دن یہ دیکھیں گے کہ دنیا میں ہمیں لوگوں میں جو برتری و حاکیت، شان و شوکت اور عزت و ریاست حاصل تھی آج اس کے بدلے میں ہمیں یہاں کی ذلت و خواری اور سبکی و سزا مل رہی ہے تو وہ آرزو کریں گے کہ کاش ہمیں دنیا میں لوگوں پر وہ برتری و فوقیت اور عزت و ریاست حاصل نہ ہوتی بلکہ ان کے مقابلہ میں ذلت و خواری اور کمتری ملتی جو یہاں کی ذلت و خواری سے کہیں کم و ہلکی ہوتی، یہاں تک کہ ہمارے سر کے بالوں کو کسی بلند چیز سے باندھ کر ہمیں معلق کر دیا جاتا اور لوگ ہماری عزت و ریاست اور رفعت کی بجائے اس ذلت و کمتری کا مشاہدہ کرتے۔

حدیث کا مقصد یہ تلقین کرنا ہے کہ اگر کسی شخص کے ذمہ کوئی خدمت سپرد کی جائے یا اس کو کسی جگہ کا یا کچھ لوگوں کا امیر و والی بنایا جائے تو وہ عدل انصاف کرے کہ عادل و منصف امیر و حاکم کے حق میں بہت زیادہ ثواب کی بشارتیں ہیں اور نہ کسی کے ساتھ ظلم و جور کا معاملہ کرے اور نہ کسی کی حق تلفی کرے کہ ظلم و جبر اور حق تلفی کرنے والوں کا یہ حشر ہوگا جو حدیث میں مذکور ہوا۔

امیر و چودھریوں اور امینوں پر افسوس کا اظہار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مناصب اور ذمہ داریاں عام طور پر لغزش میں مبتلا کر دیتی ہیں اور باطل کی طرف مائل کرتی ہیں اور ان کے امور کی انجام دہی میں عدل و انصاف اور راہ راست پر جمے رہنے کے تقاضے کم ہی پورے ہوتے ہیں۔ ہاں جن کو حق تعالیٰ کی حفاظت و مدد اور توفیق نیک حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے مناصب کی ذمہ داریوں کو ان کے شرائط کے مطابق پورا کرتے ہیں۔

اکثر چودھری دوزخ میں جائیں گے

(۳۹) وَعَنْ غَالِبِ الْقَطَّانِ عَنْ رَجُلٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعِرَافَةَ حَقٌّ وَلَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ عُرَفَاءَ وَلٰكِنَّ الْعُرَفَاءَ فِى النَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت غالب قطان ایک شخص سے اور وہ شخص اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "چودھرائت ایک حقیقت ہے اور لوگوں کے لئے چودھریوں کا ہونا ضروری ہے لیکن چودھری دوزخ میں جائیں گے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "چودھرایت ایک حقیقت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے چودھری ہونا ایک امر واقع ہے اور ان کی طرف لوگوں کی احتیاج مسلم ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ (اکثر) چودھری دوزخ میں جائیں گے کیونکہ وہ اپنی چودھرأیت میں حق و انصاف سے کام نہیں لیں گے اور عدل و ایمانداری کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھیں گے۔ اس اعتبار سے چودھرائت کو قبول کرنا ہلاکت و عذاب کا سخت خطرہ مول لینا ہے لہٰذا عاقل و دانا کو چاہئے کہ وہ اس بارے میں ہوشیار رہے اور اس منصب کو قبول کرنے سے حتی الامکان پرہیز کرے تاکہ وہ کسی ایسے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے جو اس کو دوزخ کے عذاب کا مستوجب بنا دے۔"

احمق سردار و حاکم سے خدا کی پناہ چاہو

(۴۰) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ قَالَ لِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُعِيْذُكَ بِاللّٰهِ مِنْ اِمَارَةِ السُّفَهَاءِ قَالَ وَمَاذَاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اُمَرَاءُ سَيَكُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِىْ مَنْ دَخَلَ عَلَيْهِمْ فَصَدَّقَهُمْ بِكَذِبِهِمْ وَاَعَانَهُمْ عَلٰى ظُلْمِهِمْ فَلَيْسُوْا مِنِّىْ وَلَسْتُ مِنْهُمْ وَلَنْ يَرِدُوْا عَلَىَّ الْحَوْضَ وَمَنْ لَمْ يَدْخُلْ عَلَيْهِمْ وَلَمْ يُصَدِّقْهُمْ بِكَذِبِهِمْ وَلَمْ يُعِنْهُمْ عَلٰى ظُلْمِهِمْ فَاُولٰئِكَ مِنِّىْ وَاَنَا مِنْهُمْ وَاُولٰئِكَ يَرِدُوْنَ عَلَىَّ الْحَوْضَ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت کعبؓ ابن عجرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا" میں تمکو بیوقوف لوگوں کی سرداری کے طور طریقوں سے یا ان کی مصاحبت وحمایت) سے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں۔" کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا" یا رسول اللہ! یہ کیا ہے؟ (یعنی اس طرح کی سرداری کب ہوگی اور کیونکر ہوگی اور وہ کون لوگ ہوں گے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا" میرے بعد (بعض زمانوں میں) جو لوگ امیر و حاکم ہوں گے (وہ احمق و نادان آئین جہانبانی سے نابلد اور جھوٹے اور ظالم ہوں گے، لہٰذا جو لوگ ان (احمق و نادان اور کذاب و ظالم امیروں وحاکموں) کے پاس گئے (یعنی ان کی مصاحبت اختیار کی اور ان کے جھوٹ کو سچ کہا (اور اپنے قول و فعل کے ذریعہ) ان کے ظلم کی امداد وحمایت کی تو نہ ان کا مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ میں ان سے کوئی تعلق رکھتا ہوں (بلکہ ان سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہوں) اور نہ وہ لوگ حوض پر میرے پاس آئیں گے اور جو لوگ نہ تو ان امیروں اور حاکموں کے پاس گئے اور نہ ان کے جھوٹ کو سچ کہا اور نہ ان کے ظلم کی امداد وحمایت کی تو وہ لوگ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں اور وہ حوض پر میرے پاس آئیں گے۔" (ترمذیؒ ونسائیؒ)

تشریح: "اور نہ وہ لوگ میرے پاس حوض پر آئیں گے" میں "حوض" سے مراد یا تو "حوض کوثر" ہے کہ ان لوگوں کو حوض کوثر پر میرے پاس آنے کی اجازت نہیں ہوگی یا "جنت" مراد ہے کہ ان لوگوں کو جنت میں میرے پاس نہیں آنے دیا جائے گا۔ یہ ارشاد گرامی گویا اس بات کو سخت وعید کے طور پر واضح کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی حکومت اور نظام مملکت کی رکنیت اختیار کرتا ہے یا اس کی امداد وحمایت کو اپنا شیوہ بناتا ہے جس کی باگ ڈور کم ظرف اور احمق لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور جس کا سایہ میں خدا کے بندوں پر ظلم وجور کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس شخص میں ایمان کا فقدان ہے اور وہ شخص مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

سربراہان حکومت کی حاشیہ نشینی دین ودنیا کی تباہی کا باعث ہے

(۴۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ سَكَنَ الْبَادِيَةَ جَفَا وَمَنِ اتَّبَعَ الصَّيْدَ غَفَلَ وَمَنْ اَتَى السُّلْطَانَ اُفْتُتِنَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ دَاوٗدَ مَنْ لَزِمَ السُّلْطَانَ اُفْتُتِنَ وَمَا ازْدَادَ عَبْدٌ مِنَ السُّلْطَانِ دُنُوًّا اِلَّا ازْدَادَ مِنَ اللّٰهِ بُعْدًا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا" جو شخص جنگل (دیہات) میں رہتا ہے وہ جاہل ہوتا ہے، جو شخص شکار کے پیچھے پڑا رہتا ہے وہ غافل ہوتا ہے اور جو شخص بادشاہ کے پاس آتا جاتا ہے وہ فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے (احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ) اور ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ (جو شخص بادشاہ کی ملازمت میں رہتا ہے (یعنی اس کے ہاں ہر وقت حاضر باش و حاشیہ نشین اور مددگار رہتا ہے وہ فتنہ میں مبتلا ہوتا ہے اور جو شخص بادشاہ کا جتنا زیادہ قرب چاہتا ہے اتنا ہی اللہ سے دور ہو جاتا ہے۔

تشریح: "جو شخص جنگل (دیہات) میں رہتا ہے الخ" سے دیہات میں رہنے والوں کی ہتک و تضحیک مراد نہیں ہے اور نہ ان کو کمتر بنانا مقصود ہے بلکہ یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ دیہات و گاؤں میں رہنے والے لوگوں کو چونکہ علماء و صلحاء اور اولیاء اللہ کی صحبت میسر نہیں ہوتی اس لئے ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور ان میں علم و معروفت عقل و دانش اور فہم و ذکاوت کی روشنی پیدا نہیں ہو پاتی۔

"جو شخص شکار کے پیچھے پڑا رہتا ہے الخ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص از راہ لہو و لعب اور حصول لذت و خوشی کی خاطر ہر وقت شکار کی دھن میں رہتا ہے وہ طاعات و عبادت اور جمعہ اور جماعت نماز کے التزام سے غافل ہو جاتا ہے نیز اس میں شفقت و محبت اور نرم خوئی کی صفات ختم ہو جاتی ہیں۔

واضح رہے کہ اس ارشاد کے ذریعہ ان لوگوں کو متنبہ کرنا مقصود ہے جو شکار کو عادت بنالیتے ہیں اور حلال رزق حاصل کرنے کی نیت سے نہیں بلکہ محض تفریح اور وقت گزاری کے لئے اپنے اوقات کا اکثر حصہ اس میں مصروف رکھتے ہیں، ورنہ تو جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے مطلق شکار کے مباح و حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور بعض صحابہؓ نے شکار کیا ہے البتہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں علماء

نے لکھا ہے کہ آپ نے خود بہ نفس نفیس کبھی شکار نہیں کیا ہے لیکن کسی کو شکار کرنے سے منع نہیں کیا ہے۔

حدیث کے آخر میں بادشاہ وحاکم کی حاشیہ نشینی اور دربار حکومت میں حاضر باشی کی خرابی کو واضح کیا گیا ہے کہ جو شخص بغیر کسی ضرورت وحاجت کے بادشاہ وحاکم کی چوکھٹ پر گیا وہ فتنہ میں مبتلا ہو گیا کیونکہ اگر وہ بادشاہ وحاکم کے ان افعال و اعمال کی موافقت وحمایت کرے گا جو خلاف شرع ہوں تو اس کا دین خطرہ میں پڑے گا اور اگر ان کی مخالفت کرے گا تو اپنی دنیا خراب کرے گا مظہرؒ کہتے ہیں کہ جو شخص بادشاہ وحاکم کے دربار میں حاضر ہوا اور وہاں مداہنت اختیار کی (یعنی ان کے خلاف شرع امور پر ان کو ٹوکا نہیں) تو اس نے فتنہ میں اپنے آپ کو مبتلا کیا (یعنی اپنا دین خطرے میں ڈالا) اور اگر اس نے مداہنت اختیار نہیں کی بلکہ انکو نصیحت کی اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا تو اس صورت میں دربار حکومت میں اس کی حاضری جہاد سے بھی افضل ہوگی۔

دہلویؒ نے مسند فردوس میں حضرت علیؓ سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ:

مَنِ ازْدَادَ عِلْمًا وَلَمْ يَزْدَدْ فِي الدُّنْيَا زُهْدًا لَمْ يَزْدَدْ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا بُعْدًا۔

"جس شخص نے اپنا علم تو زیادہ کیا لیکن دنیا کے (مال ومتاع) میں بے رغبتی کو زیادہ نہیں کیا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے دوری کو زیادہ کیا۔"

گمنامی راحت کا باعث ہے اور شہرت، آفت کا باعث

(۴۲) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَرَبَ عَلٰى مَنْكِبَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَفْلَحْتَ يَا قُدَيْمُ اِنْ مُتَّ وَلَمْ تَكُنْ اَمِيْرًا وَلَا كَاتِبًا وَلَا عَرِيْفًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مقدامؓ ابن معدیکرب روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ان (یعنی مقدامؓ) کے مونڈھے پر اپنے ہاتھ) مار کر فرمایا اے قُدیم! اگر اس حالت میں تمہاری موت ہو کہ نہ تو تم امیر وحاکم ہو، نہ منشی ہو اور نہ چودھری تو تم نے فلاح پائی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گمنامی وبے منصبی راحت ہے اور شہرت ومنصب آفت ہے۔

لوگوں سے خلاف شرع محصول وٹیکس وصول کرنے والا حاکم جنت سے محروم رہے گا

(۴۳) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ صَاحِبُ مَكْسٍ يَعْنِي الَّذِيْ يُعَشِّرُ النَّاسَ۔ (رواہ احمد وابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت عقبہؓ ابن عامر کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "صاحب مکس جنت میں داخل نہیں ہوگا" صاحب مکس سے آنحضرت ﷺ کی مراد (حاکم کا کارپرداز) ہے جو لوگوں سے خلاف شرع محصولات وٹیکس وصول کرتا ہے۔" (احمد، ابوداؤد، دارمی)

امام عادل کی فضیلت

(۴۴) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَقْرَبَهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اِمَامٌ عَادِلٌ وَاِنَّ اَبْغَضَ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَشَدَّهُمْ عَذَابًا وَفِيْ رِوَايَةٍ وَاَبْعَدَهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اِمَامٌ جَائِرٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب اور مجلس (یعنی مرتبہ) کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب جو شخص ہوگا وہ عادل امام وحاکم ہے اور قیامت کے دن اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ نفرت کا مستحق اور سب سے زیادہ عذاب کا سزاوار! اور ایک روایت میں یہ ہے کہ۔ اللہ سے سب سے زیادہ دور جو شخص

وہ ظالم امام و حاکم ہے۔" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

ظالم حاکم کے سامنے حق گوئی سب سے بہتر جہاد ہے

۴۵ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الْجِہَادِ مَنْ قَالَ کَلِمَۃَ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَۃَ وَرَوَاہُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِیُّ عَنْ طَارِقِ بْنِ شِہَابٍ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سب سے بہتر جہاد اس شخص کا ہے جو ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ) اور احمد و نسائی نے اس روایت کو طارق ابن شہابؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: جابر و ظالم حکمران کے سامنے حق گوئی کو بہترین جہاد اس لئے فرمایا گیا کہ جو شخص کسی دشمن سے جہاد کرتا ہے وہ خوف و امید دونوں کے درمیان رہتا ہے اگر اس کو یہ خوف ہوتا کہ شاید دشمن مجھ پر غالب آجائے اور میں مجروح یا شہید ہو جاؤں تو اس کے ساتھ ہی اس کو یہ امید ہوتی ہے کہ میں اس دشمن کو زیر کر کے اپنی جان کو پوری طرح بچالوں گا۔ اس کے برخلاف جو شخص ظالم و جابر حکمران کے سامنے حق بات کہنے کا ارادہ رکھتا ہے اس کے لئے امید کی کوئی ہلکی سی کرن بھی نہیں ہوتی بلکہ خوف ہی خوف ہوتا ہے چنانچہ وہ اس حکمران کے مکمل اختیار و قبضہ میں ہونے کی وجہ سے اس یقین کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ادا کرتا ہے کہ اس کا انجام دنیا میں نری تباہی و نقصان کے علاوہ اور کچھ نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس مہم میں انسان کو اپنی زندگی اور اپنے مال و متاع کے باقی رہنے کی ہلکی سی امید بھی نہ ہو اس کو انجام دینا اس مہم کو انجام دینے سے کہیں زیادہ صبر آزما، ہمت طلب اور مردانگی کا کام اور بدرجہا افضل ہو گا جس کی انجام دہی میں اپنی زندگی اور اپنے مال و متاع کے باقی رہنے کی بہتر حد تک امید ہو۔ اس کو بہترین جہاد اس لئے فرمایا گیا ہے کہ حکمران کا ظلم و جور ان تمام لوگوں کو متاثر کرتا ہے جو اس کی رعیت میں ہوتے ہیں وہ کوئی دو چار دس آدمی نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں بندگان خدا ہوتے ہیں لہٰذا جب کوئی شخص اس حکمران کو اس کے ظلم و جور سے روکے گا وہ اپنے اس عمل سے خدا کی کثیر مخلوق کو فائدہ پہنچائے گا۔ جب کہ دشمن سے جہاد کرنے میں یہ بات نہیں۔

ظالم حکمران کے سامنے حق گوئی کا انداز

شیخ ابوحامد نے احیاء میں لکھا ہے کہ بادشاہ و حکمران کو امر بالمعروف یہ ہے کہ اس کو اس کی بے راہ روی سے روکا جائے اور اس کے جو اعمال و افعال مبنی بر غلط ہوں۔ ان کو اس پر واضح کیا جائے یعنی اسے یہ بتایا جائے کہ تمہارا یہ کام عدل و انصاف کے خلاف ہے، تمہارا یہ فیصلہ یا یہ فرمان، قانون اور نظام حکمرانی کے مطابق نہیں ہے اور تمہارا یہ فعل دین و اخلاق اور خدا کے حکم کے منافی ہے، لیکن رعایا کے کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ حکمران کو اس کے کسی غلط کام و فعل سے تشدد کے ذریعہ روکے کیونکہ یہ ملک میں فتنہ و فساد اور قوم میں انتشار و افتراق کا باعث ہو گا اب رہی یہ بات کہ اگر کوئی شخص کسی حکمران کو اس کی غلط روی سے روکنے کے لئے تند و تیز الفاظ، درشت و غضبناک لب و لہجہ اور سخت کلامی اختیار کرے مثلاً وہ اس کو "ظالم" کہہ کر مخاطب کرے یا یوں کہے مَنْ لَا یَخَافُ اللّٰہَ (اے خدا سے نہ ڈرنے والے شخص) وغیرہ وغیرہ، تو اس بارے میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر اس شخص کا درشت لب و لہجہ اور اس کے تند و تیز الفاظ اس شخص کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی اس حکمران کے عتاب کا نشانہ بن جانے کا باعث ہوں تو یہ (سخت کلامی) جائز نہیں۔ اور اگر اس شخص کو اس کا خوف نہیں کہ میری سخت کلامی کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی حکمران کے عتاب کا نشانہ بن جائیں گے بلکہ صرف میری ہی جان پر بنے گی تو یہ جائز ہے بلکہ مستحب ہے کیونکہ سلف (پہلے زمانوں کے مردان حق آگاہ) کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ اپنی جان کی ہلاکت کا خوف لئے بغیر حکمرانوں کو ان کی غلط روی سے پوری پوری سختی سے ٹوکا کرتے تھے اس لئے وہ جانتے تھے کہ اگر اس کے نتیجہ میں حکمران کا عتاب، جان کی ہلاکت کا باعث بن گیا تو اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے۔ کہ جہاد میں شہادت کا درجہ نصیب ہو گا۔

حکمران کے صالح مشیر کار اس کی فلاح کا باعث ہوتے ہیں

(۴۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِالْأَمِيْرِ خَيْرًا جَعَلَ لَهُ وَزِيْرَ صِدْقٍ إِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهُ وَإِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ وَإِذَا أَرَادَ بِهِ غَيْرَ ذٰلِكَ جَعَلَ لَهُ وَزِيْرَ سُوْءٍ إِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرْهُ وَإِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنْهُ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ" کسی امیر (حکمران) کی (دینی و دنیاوی) بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے سچا (یعنی راست گفتار و راست کردار) وزیر و مشیر مقرر فرما دیتا ہے کہ جب وہ امیر (خدا کے احکام کو) بھول جاتا ہے تو وہ وزیر اس کو یاد دلاتا ہے (اور اگر وہ یاد رکھتا ہے تو وہ وزیر اس کو (یاد رکھنے میں) مدد دیتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی امیر کی بھلائی کا ارادہ نہیں کرتا تو اس پر بد وزیر و مشیر مسلط کر دیتا ہے۔ اور اگر امیر خدا کے احکام کو فراموش کر دیتا ہے تو وہ وزیر اس کو یاد نہیں دلاتا اگر وہ فراموش نہیں کرتا تو وہ وزیر اس کی مدد نہیں کرتا۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

رعایا کے تئیں حکمران کا شک و شبہ عام انتشار و بددلی کا باعث ہے

(۴۷) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ الْأَمِيْرَ إِذَا ابْتَغَى الرِّيْبَةَ فِي النَّاسِ أَفْسَدَهُمْ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "حکمران جب لوگوں میں شک و شبہ کی بات ڈھونڈتا ہے تو لوگوں کو خراب کر دیتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کے ذریعہ آئین جہانبانی کے ایک بڑے اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ ملک و قوم کی سالمیت عوام کی فلاح و بہبودی اور عام اطمینان و امن کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکمران اور رعایا کے درمیان مکمل اعتماد ہو بطور خاص حکمران کو یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس کو اپنی رعایا کے تئیں اپنے اعتماد کا اظہار کرنا ہے! جو تنگ نظر اور کم ظرف حکمران اپنی مملکت کے عام لوگوں یا کسی خاص طبقے کے بارے میں مستقل طور پر شک و شبہ میں مبتلا رہتے ہیں اور ان کی وفاداری پر یا ان کی حرکات و سکنات پر بدگمانی کرتے ہیں اور ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کر کے ان سے مواخذہ کرتے ہیں اور ان کو مختلف قسم کی سزاؤں اور عقوبتوں میں گرفتار کرتے ہیں وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی حکمرانی کی جڑیں کھودتے ہیں کیونکہ اس صورت حال سے نہ صرف یہ کہ جن طبقوں پر مستقل شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے ان کے حالات دگرگوں ہو جاتے ہیں بلکہ ملک و قوم میں بے اطمینانی اور اضطراب و انتشار کی عام فضا پیدا ہو جاتی ہے۔

اس حدیث کا مقصد جہاں لوگوں کے احوال کے تجسس اور ان کے عیوب تلاش کرنے سے منع کرنا ہے وہیں اس بات کا حکم دینا بھی ہے کہ اگر لوگوں میں کچھ عیوب ہوں تو ان کی پردہ پوشی کی جائے اور ان سے جو گناہ و لغزشیں سرزد ہوں ان سے درگزر کیا جائے۔

(۴۸) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّكَ إِذَا اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ أَفْسَدْتَهُمْ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ۔

"اور حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ "جب تم لوگوں کے (پوشیدہ) عیوب کو تلاش کرو گے تو ان کو خرابی میں مبتلا کرو گے۔" (بیہقیؒ)

حق تلفی کرنے والے حاکم کے خلاف تلوار اٹھانے سے صبر کرنا بہتر ہے

(۴۹) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ أَنْتُمْ وَأَئِمَّةٌ مِنْ بَعْدِي يَسْتَأْثِرُوْنَ بِهٰذَا الْفَيْءِ قُلْتُ أَمَا وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ أَضَعُ سَيْفِي عَلَى عَاتِقِي ثُمَّ أَضْرِبُ بِهِ حَتّٰى أَلْقَاكَ قَالَ أَوَلَا أَدُلُّكَ عَلَى خَيْرٍ مِنْ ذٰلِكَ

تَصْبِرُ حَتّٰی تَلْقَانِي۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ہمیں مخاطب کر کے) فرمایا "میرے بعد تم حاکموں اور سرداروں کے ساتھ اس وقت کیا برتاؤ کرو گے جب کہ وہ اس فئی کو خود رکھ لیں گے (آیا صبر کی راہ اختیار کرو گے یا ان کے خلاف تلوار اٹھاؤ گے ؟) میں نے عرض کیا "سن لیجئے، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے میں! اپنی تلوار کاندھے پر رکھوں گا اور پھر اس کے سبب) آپ سے جاملوں گا۔" آپ ﷺ نے فرمایا "کیا میں تمہیں اس (تلوار اٹھانے) سے بہتر بات نہ بتادوں؟ (تو سنو) تم اس وقت صبر کی راہ اختیار کرنا یہاں تک کہ تم مجھ سے آملو! (کیونکہ کسی دنیاوی حق کے تلف ہونے کی صورت میں تلوار اٹھانے سے صبر کرنا اور خاموش رہنا بہتر بھی ہے اور دنیا کی چیزوں سے بے رغبتی اور زہد کے شایان شان بھی ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: فئی اس مال کو کہتے ہیں جو کفار سے بغیر جنگ و جدل کے حاصل ہو جیسے خراج و جزیہ یا اس قسم کے وہ دوسرے ٹیکس جو اسلامی مملکت میں غیر مسلموں سے وصول کئے جاتے ہیں اور کفار سے جو مال جنگ و جدل سے حاصل ہوتا ہے اس کو "غنیمت" کہتے ہیں۔ فئی کا حکم یہ ہے کہ حاصل شدہ مال کے چار حصے تو تمام مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ ان کے درمیان تقسیم کیا جائے اور پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کر دیا جائے جب کہ غنیمت میں جو مال حاصل ہوتا ہے اس کے چار حصے بیت المال میں داخل ہوتے ہیں اور پانچواں حصہ مسلمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اس فئی کے بارے میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ اگر کوئی حکمران اس کو اپنے تصرف میں لے آئے اور مستحقین میں تقسیم نہ کرے تو اگرچہ یہ حق تلفی ہے اور مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس حکمران سے اپنا اپنا حصہ وصول کریں لیکن محض اس مال کے لئے اس حکمران کے خلاف تلوار اٹھانے اور تشدد کی راہ اختیار کرنے سے بہتر یہ ہے کہ صبر کی راہ اختیار کی جائے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی کے مفہوم میں فئی اور غنیمت دونوں شامل ہیں، نیز اس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جو حکمران فئی یا غنیمت کے سارے مال کو اپنے تصرف میں لا کر بیت المال کو نقصان پہنچائے گا اور مسلمانوں کی حق تلفی کرے گا وہ ظالم ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

امام عادل کی فضیلت

(۵۰) عَنْ عَائِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَنِ السَّابِقُوْنَ اِلٰى ظِلِّ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالُوا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ الَّذِيْنَ اِذَا اُعْطُوا الْحَقَّ قَبِلُوْهُ وَاِذَا سُئِلُوْهُ بَذَلُوْهُ وَحَكَمُوْا لِلنَّاسِ كَحُكْمِهِمْ لِاَنْفُسِهِمْ۔

"حضرت عائشہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا "جانتے ہو قیامت کے دن اللہ عزوجل (کے عرش یا اس کے لطف و کرم) کے سایہ کی طرف سبقت لے جانے والے کون لوگ ہیں؟ (یعنی قیامت کے دن سب سے پہلے کون لوگ اللہ تعالیٰ کے عرش یا اس کے فضل و کرم کے سایہ میں جائیں گے؟") صحابہؓ نے عرض کیا "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جاننے والے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "سبقت لے جانے والے وہ لوگ ہیں جن کے سامنے حق بات رکھی جاتی ہے تو وہ قبول کرتے ہیں، جب ان سے حق کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ خرچ کرتے ہیں اور لوگوں کے حق میں وہی فیصلہ کرتے ہیں جو اپنی ذات کے بارے میں کرتے ہیں۔"

تشریح: اس حدیث میں عادل حکمرانوں کے تین اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ان کی وجہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عنایات و کرم اور اس کے سایہ کے سب سے پہلے مستحق ہوں گے عادل حکمرانوں کا پہلا وصف تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب ان کے سامنے رعایا کی بھلائی و بہتری اور عدل و مساوات کے تعلق سے کوئی صحیح اور حق بات پیش کی جاتی ہے تو وہ اس کو قبول کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

دوسرا وصف یہ ہے کہ جب رعایا ان سے اپنا حق مانگتی ہے تو وہ اس کا حق دیتے ہیں اور لوگوں کی بھلائی اور بہتری اور ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور تیسرا وصف یہ ہے کہ وہ جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں اسی کو رعایا کے لئے بھی پسند کرتے ہیں اگر وہ اپنی راحت اور اپنا چین چاہتے ہیں تو رعایا کے حق میں بھی وہ یہی چاہتے ہیں کہ عام لوگ راحت و چین اور امن و سکون کے ساتھ رہیں، خود غرض اور عیش کوش حکمرانوں کی طرح کا شیوہ یہ نہیں ہوتا کہ خود تو عیش و عشرت اور شہوت رانیوں میں مبتلا رہیں اور رعایا کو سختی اور تنگی اور بدحالی میں رہنے دیں۔

حکمرانوں کے ظلم سے آنحضرت ﷺ کا خوف

(۵۱) وَعَنْ جَابِرِ ابْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ ثَلَاثٌ اَخَافُ عَلٰى اُمَّتِي الْاِسْتِسْقَاءُ بِالْاَنْوَاءِ وَحَيْفُ السُّلْطَانِ وَتَكْذِيْبٌ بِالْقَدْرِ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "میں اپنی اُمت کے حق میں تین باتوں سے ڈرتا ہوں کہ (کہیں وہ ان کو اختیار کر کے گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائے) ایک تو چاند کی منازل کے حساب سے بارش مانگنا، دوسرے بادشاہ کا ظلم کرنا اور تیسرے تقدیر کا جھٹلانا (یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ تقدیر الٰہی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ انسان جو بھی فعل کرتا ہے وہ خود اس کا خالق ہوتا ہے جیسا کہ ایک جماعت قدریہ کا مسلک ہے۔"

تشریح: اَنْوَاءُ۔ نَوء۔ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی تو "اٹھنا" اور (گرنا) ہیں لیکن عام طور پر اس کا استعمال چاند کی منازل کے مفہوم میں ہوتا ہے! قدیم علماء فلکیات کے مطابق چاند کی اٹھائیس منزلیں ہوتی ہیں کہ وہ ہر شب ایک منزل میں رہتا ہے غالباً اسی لئے "اٹھنے اور گرنے" سے "طلوع اور غروب" مراد لے کر "انواء" کو چاند کی منازل کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال عرب کے مشرکین بارش کو ان منازل کی طرف منسوب کرتے تھے اور جب بارش ہوتی تو وہ یہ کہتے کہ چاند کی فلاں منزل کی وجہ سے بارش ہوئی ہے۔ چونکہ یہ ایک باطل عقیدہ ہے اس لئے دوسری احادیث میں یہ عقیدہ رکھنے سے صریح ممانعت مذکور ہے۔ توحید کی اہمیت کو واضح کرنے اور شرک کے ایہام سے دور رکھنے کے لئے اس پر لفظ "کفر" کا اطلاق کیا گیا ہے۔

بلاوجہ نہ تو امین بنو اور نہ حاکم بنو

(۵۲) وَعَنْ اَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةَ اَيَّامٍ اَعْقِلْ يَا اَبَا ذَرٍّ مَا يُقَالُ لَكَ بَعْدُ فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ السَّابِعُ قَالَ اُوْصِيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ فِي سِرِّ اَمْرِكَ وَعَلَانِيَتِهٖ وَاِذَا اَسَاْتَ فَاَحْسِنْ وَلَا تَسْاَلَنَّ اَحَدًا شَيْئًا وَاِنْ سَقَطَ سَوْطُكَ وَلَا تَقْبِضْ اَمَانَةً وَلَا تَقْضِ بَيْنَ اثْنَيْنِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ چھ دن تک مجھ سے یہ فرماتے رہے کہ "ابوذر! بعد میں جو بات تم سے کہی جانے والی ہے اس کے لئے تیار رہو (یعنی آنحضرت ﷺ چھ دن تک مجھے آگاہ کرتے رہے کہ میں تمہیں ایک ہدایت دوں گا تم اس پر خوب غور کرنا اس کو یاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا) چنانچہ جب ساتواں دن ہوا تو آپ نے فرمایا "میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرتے رہنا، جب تم سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو ساتھ ہی نیکی بھی کرنا کیونکہ وہ برائی کو مٹا دیتی ہے یا یہ مقصد ہے کہ اگر تم کسی کے ساتھ کوئی برا سلوک کر بیٹھو تو اس کے ساتھ (نیکی کا) سلوک بھی کرو) کسی (مخلوق) کے آگے دست سوال دراز نہ کرنا اگرچہ تمہارا کوڑا ہی کیوں نہ گر پڑا ہو (یعنی اگر کوڑا گرے تو اس کو اٹھانے کے لئے بھی کسی سے نہ کہو) کسی کی امانت اپنے پاس نہ رکھنا اور دو آدمیوں کے حکم نہ بننا۔"

تشریح: "کسی کی امانت اپنے پاس نہ رکھنا" کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت کسی کی امانت اپنے پاس رکھنا احتیاط اور دور اندیشی کے

خلاف ہے کیونکہ نفس کا کوئی بھروسہ نہیں کہ وسوسہ اور شیطان کے فریب میں مبتلا ہو جائے اور امانت میں خیانت کا ارتکاب ہو جائے یا اگر خیانت کا ارتکاب نہ بھی ہو تو یہ چیز تہمت کا محل تو ہے ہی کہ کسی وجہ سے خود امانت کا مالک یا کوئی دوسرا شخص تم پر خیانت کی تہمت لگا دے۔

حکمران کے حق میں حکومت کے تین تدریجی مرحلے

(۵۳) وَعَنْ اَبِي اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ مَا مِنْ رَجُلٍ يَلِي اَمْرَ عَشْرَةٍ فَمَا فَوقَ ذٰلِكَ اِلاَّ اَتَاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مَغْلُوْلاً يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَدُهُ اِلَى عُنُقِهِ فَكَّهُ بِرُّهُ اَوْ اَوْبَقَهُ اِثْمُهُ اَوَّلُهَا مَلاَمَةٌ وَ اَوْسَطُهَا نَدَامَةٌ وَاٰخِرُهَا خِزْيٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے (دس آدمیوں کی (بھی) یا اس سے زائد لوگوں کی حکمرانی قبول کی اس کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس طرح طوق میں جکڑا ہوا حاضر کرے گا (یعنی میدان حشر میں اٹھائے گا) کہ اس کے ہاتھ نے اس کی گردن کو جکڑ رکھا ہو گا یہاں تک کہ یا تو اس کی نیکی اس کو چھڑائے گی (یعنی اگر اس نے دنیا میں اپنے زیر دستوں کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اور حسن سلوک کیا ہو گا تو یہ اس کی نجات کا باعث بنے گا یا اس کا گناہ (یعنی اپنے زیر دستوں پر اس کا کیا ہوا ظلم وغیرہ) اس کو ہلاکت (عذاب) میں مبتلا کر دیگا۔ (یاد رکھو) سرداری و حکمرانی کی ابتداء ملامت ہے اس کا درمیان پشیمانی و ندامت ہے اور اس کا آخر قیامت کے دن کی ذلت و رسوائی ہے۔"

تشریح: حکومت و سرداری اگرچہ انسان کی طبعی خواہش ہے اور کم ہی انسان ایسے ہوں گے جن کو اس کے حصول کی تمنا نہیں ہو گی لیکن اس حکومت و سرداری کی حقیقت اور اس کا آل کیا ہے؟ اس کو یہ حدیث واضح کر رہی ہے کہ جب کوئی شخص حکومت و سیادت کی مسند پر فائز ہوتا ہے تو اس کا ابتدائی مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہر طرف سے ملامت کے تیر کا نشانہ بننا پڑتا ہے، لوگ مطعون کرتے ہیں کہ اس نے ایسا کیا ویسا کیا، کوئی اختیارات کے ناجائز استعمال کا الزام عائد کرتا ہے، کوئی خویش پروری اور جنبہ داری کی تہمت لگاتا ہے تو کوئی فرائض حکومت کی انجام دہی میں غفلت کا ملزم گردانتا ہے غرضیکہ ہر طرف سے طعن و تشنیع، سب و شتم اور اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی ہے اس کے بعد درمیانی مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ حکمران حکومت کی سخت کوشیوں اور لوگوں کے طعن و تشنیع سے بددل ہو کر سخت ندامت و پشیمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس منصب کو کیوں قبول کیا اور اس محنت و مصیبت میں اپنے آپ کو کیوں مبتلا کیا اور پھر اس کا آخری حصہ ذلت و رسوائی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ دنیا کی ذلت و رسوائی بھی اور آخرت کی ذلت و رسوائی بھی! دنیا کی ذلت و رسوائی تو یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے اس کو اس منصب سے معزول کر دیا جاتا ہے تو اس کی خواری و تحقیر ہوتی ہے یا اگر رعایا اس کے طرز حکومت اور انتظام سلطنت سے مطمئن نہیں ہوتی تو ان کے دلوں میں اس کے تئیں سخت قسم کی نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک حکمران کے لئے اس سے بڑھ کر دنیا میں ذلت و رسوائی اور کیا ہو سکتی ہے اور آخرت کی ذلت و رسوائی یہ ہے کہ وہ اپنے دور حکومت میں جو کچھ کرتا ہے اس کی جوابدہی احکم الحاکمین کی بارگاہ میں کرنی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس سے جو کوتاہیاں، جو ظلم اور جو غلط افعال سرزد ہوئے ہیں ان کی وجہ سے عذاب میں گرفتار ہونا پڑتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

یہاں حدیث میں صرف قیامت کے دن کی ذلت و رسوائی کا ذکر کیا گیا ہے دنیا کی خواری مذکور نہیں ہے اس کی وجہ یہ کہ قیامت کے دن کی ذلت و رسوائی دنیا کی ذلت و رسوائی سے کہیں زیادہ سخت ہے اسی لئے اس کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔

حضرت معاویہؓ کے حق میں آنحضرت ﷺ کی پیش گوئی

(۵۴) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مُعَاوِيَةُ اِنْ وُلِّيْتَ اَمْرًا فَاتَّقِ اللّٰهَ وَاعْدِلْ قَالَ فَمَازِلْتُ

اَظُنُّ اَنِّی مُبْتَلًی بِعَمَلٍ لِقَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی ابْتُلِیْتُ۔

"اور حضرت امیر معاویہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا "معاویہ! اگر تمہیں کسی کام (یا کسی جگہ) امیر و حاکم بنایا جائے تو امور حکومت کی انجام دہی میں) اللہ سے ڈرتے رہنا اور عدل و انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔" حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ برابر خیال کرتا رہا کہ آنحضرت ﷺ کے فرمانے کے بموجب میں کسی کام (یعنی امارت و سرداری میں مبتلا کیا جاؤں گا۔ یہاں تک کہ میں مبتلا کیا گیا (یعنی آنحضرت ﷺ کا فرمان صحیح ہوا اور امارت و سرداری میرا نصیب ہوئی۔"

آنے والے زمانے کے بارے میں پیشین گوئی

(۵۵) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰہِ مِنْ رَأْسِ السَّبْعِیْنَ وَاِمَارَۃِ الصِّبْیَانِ۔ رَوَی الْاَحَادِیْثَ السِّتَّۃَ اَحْمَدُ وَرَوَی الْبَیْھَقِیُّ حَدِیْثَ مُعَاوِیَۃَ فِیْ دَلَائِلِ النُّبُوَّۃِ۔

"اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ستر سال کی ابتداء سے اور بچوں کی حکومت سے اللہ کی پناہ مانگو۔ مذکورہ بالا چھ حدیثوں کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو بیہقی نے بھی دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ستر سال کی ابتداء" سے مراد سن ہجری کی ساتویں دہائی ہے جس کی ابتداء ۶۱ھ سے ہو جاتی ہے ۶۰ھ کے آخر میں حضرت معاویہؓ کا دور حکومت ان کی وفات پر پورا ہوا اور یزید ابن معاویہؓ کی امارت قائم ہوئی اس کے ساتھ ہی حکومت پر سے "صحابیت" کا بابرکت سایہ اقتدار مکمل طور پر اٹھ گیا اور اس کے بعد سے اُمت کی تاریخ حکومت کا وہ دور شروع ہو گیا جو افتراق اور انتشار، فتنہ و فساد، ظلم و جور، حصول اقتدار کی کشمکش اور ملوکیت کی فتنہ سامانیاں اپنے دامن میں لے کر آیا۔ یزید کل تین سال آٹھ ماہ تخت حکومت پر رہا اس دوران میں اس کی حکومت کا سب سے شرمناک واقعہ "سانحہ کربلا" ہے۔ یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ ابن یزید ابن معاویہ برائے نام تخت نشین ہوا اور آخر میں حکومت کی باگ ڈور بنو امیہ کے سفیانی خاندان سے نکل کر بنی مروان کے ہاتھ آ گئی۔

حدیث میں انہی بنی مروان کی حکومت کو "بچوں کی حکومت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنی مروان کے زمانہ حکومت میں اقتدار کی رسہ کشی، استبداد و جبر، مذہبی انتشار و تشتت، دین سے برگشتگی، خاندانی و قبائلی عصبیت، اسلامی شعائر سے لاپرواہی اور بزرگان حق کے ساتھ سختی و تشدد کا جو مظاہرہ ہوا اس نے پورے نظام حکومت و مملکت کو "بازیچہ اطفال" بنا کر رکھ دیا تھا۔ رسوائے تاریخ ظالم حجاج ابن یوسف، بنی مروان ہی کے عہد حکومت کا سب سے بڑا معتمد والی تھا جو اپنے ظلم و ستم میں چنگیز و ہلاکو سے کم بدنام نہیں ہے۔

سن ہجری کی ساتویں دہائی کی ابتداء سے یزید ابن معاویہ کی امارت کی صورت میں رونما ہونے والی ہولناکیوں اور اس کے بعد کے عرصہ میں بنی مروان کی حکومت کی ستم رانیاں وقوع پزیر ہونے سے سالہا سال پہلے نگاہ نبوت کے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند تھیں اور آپ ﷺ کی فراست محکم آنے والے اس زمانہ کا ادراک کر رہی تھی جس میں اُمت کی اجتماعی ہیئت اور اس کی ملی خصوصیات کو چند خود غرض، مفاد پرست اور دنیا دار حکمران اپنے اقتدار طلبی اور عیش رانیوں پر قربان کرنے والے تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا اس وقت پیش آنے والے سخت ترین حالات اور عاقبت نا اندیش حکمرانوں کے عہد حکومت سے خدا کی پناہ مانگو کہ خدا تم میں سے کسی کو وہ زمانہ نہ دکھلائے۔

جیسے عمل کرو گے ویسے ہی حکمران مقرر ہوں گے

(۵۶) وَعَنْ یَحْیَی بْنِ ھَاشِمٍ عَنْ یُوْنُسَ ابْنِ اَبِیْ اِسْحَاقَ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

كَمَا تَكُوْنُوْنَ كَذٰلِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ۔

"اور حضرت یحییٰ بن ہاشم، حضرت یونس ابن اسحاق سے اور وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں۔ کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جیسے تم ہوگے ویسے ہی تمہارے اوپر حکمران مقرر کئے جائیں گے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تمہارے طور طریقے اور تمہارے اعمال جیسے ہوں گے ویسے ہی تم پر حاکم و عامل مقرر ہوں گے اگر تمہارے اعمال اچھے ہوں گے تو تمہارے حاکم بھی اچھے ہوں گے اور اگر تم برے اعمال کرو گے تو تمہارے حاکم بھی برے ہوں گے۔

بادشاہ روئے زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے

۵۷ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ السُّلْطَانَ ظِلُّ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ يَأْوِي اِلَيْهِ كُلُّ مَظْلُوْمٍ مِنْ عِبَادِهٖ فَاِذَا عَدَلَ كَانَ لَهُ الْاَجْرُ وَعَلَى الرَّعِيَّةِ الشُّكْرُ وَاِذَا جَارَ كَانَ عَلَيْهِ الْاِصْرُ وَعَلَى الرَّعِيَّةِ الصَّبْرُ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "بادشاہ، روئے زمین پر خدا کا سایہ ہے جس کے نیچے خدا کے بندوں میں سے مظلوم بندہ پناہ حاصل کرتا ہے لہٰذا جب بادشاہ عدل وانصاف کرتا ہے تو اس کو ثواب ملتا ہے اور رعایا پر اس کا شکر واجب ہوتا ہے اور جب وہ ظلم وطغیانی کرتا ہے تو وہ گنہ گار ہوتا ہے اور رعایا پر صبر لازم ہوتا ہے۔"

تشریح: بادشاہ کے وجود کو "خدا کا سایہ" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے جس طرح کسی چیز کا سایہ سورج کی تپش وگرمی کی ایذا سے بچاتا ہے اسی طرح بادشاہ اپنی رعیت کے لوگوں کو مختلف قسم کی ایذاؤں اور سختیوں سے بچاتا ہے! نیز بسا اوقات "لفظ سایہ" سے کنایۃً "محافظت وحمایت" کا مفہوم بھی مراد لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو بادشاہ کے وجود کا بجا طور پر اپنی رعایا کے لئے "محافظت وحمایت" کا سب سے بڑا ذریعہ ہونا بالکل ظاہر ہے۔

طیبیؒ نے یہ وضاحت کی ہے کہ لفظ "ظل اللّٰه" ایک تشبیہ ہے اور عبارت يَأْوِي اِلَيْهِ كُلُّ مَظْلُوْمٍ الخ اس تشبیہ کی وضاحت اور مراد بیان کرتی ہے یعنی لوگ جس طرح سایہ کی ٹھنڈک میں سورج کی گرمی سے راحت پاتے ہیں اسی طرح بادشاہ کے عدل کی ٹھنڈک میں ظلم وجور کی گرمی سے راحت پاتے ہیں۔

"ظل اللہ" میں اللہ کی طرف ظل (سایہ) کی نسبت اس (سایہ) کی عظمت وبرتری کے اظہار کے لئے ہے جیسا کہ بیت اللہ میں اللہ کی طرف بیت کی نسبت اس (بیت) کی عظمت وبرتری کو ظاہر کرنے کے لئے ہے، اور اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ سایہ (یعنی بادشاہ) دوسرے سایوں کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کے تعلق سے اپنی الگ شان اور خصوصیت وبرتری رکھتا ہے کیونکہ اس کو روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ (نائب) قرار دیا گیا ہے کہ اس کا فریضہ اللہ تعالیٰ کے عدل و احسان کو اس کے بندوں پر پھیلانا ہے۔

قیامت کے دن سب سے بلند مرتبہ نرم خو اور عادل حکمران ہوگا

۵۸ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَفْضَلَ عِبَادِ اللّٰهِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِمَامٌ عَادِلٌ رَفِيْقٌ وَاِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِمَامٌ جَائِرٌ خَرِقٌ۔

"اور حضرت عمرؓ ابن خطاب کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بندوں میں بلند مرتبہ کے اعتبار سے سب سے بہتر جو شخص ہوگا وہ عادل اور نرمی کرنے والا حاکم ہے اور قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بندوں میں مرتبہ کے اعتبار سے سب سے بدتر جو شخص ہوگا وہ ظالم اور سختی کرنے والا حاکم ہے۔"

کسی مسلمان کو محض ڈرانا دھمکانا بھی عذاب کا سزاوار کرتا ہے

(۵۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ نَظَرَ اِلٰی اَخِیْہِ نَظْرَۃً یُخِیْفُہٗ اَخَافَہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ رَوَی الْاَحَادِیْثَ اَرْبَعَۃَ الْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَقَالَ فِیْ حَدِیْثِ یَحْیٰی ھٰذَا مُنْقَطِعٌ وَرِوَایَتُہٗ ضَعِیْفٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے کسی بھائی کی طرف ڈراوے والی نظر سے دیکھے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ڈرائے گا۔" مذکورہ چاروں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور یحییٰ ابن ہاشم کی روایت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ منقطع ہے اور یحییٰ کی روایت ضعیف (سمجھی جاتی) ہے۔"

تشریح: اس حدیث کو اس باب میں نقل کرنے سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ جب کسی مسلمان کو محض ڈرانا دھمکانا قیامت کے دن عذاب کا سزاوار بنائے گا تو مسلمانوں پر ظلم وستم کرنے والے کا کیا حشر ہوگا۔؟

حکمران کے ظلم پر اس کو برا بھلا کہنے کی بجائے اپنے اعمال درست کرو

(۶۰) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا مَالِکُ الْمُلُوْکِ وَ مَلِکُ الْمُلُوْکِ قُلُوْبُ الْمُلُوْکِ فِیْ یَدِیْ وَ اِنَّ الْعِبَادَ اِذَا اَطَاعُوْنِیْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَ مُلُوْکِھِمْ عَلَیْھِمْ بِالرَّحْمَۃِ وَالرَّاْفَۃِ وَاِنَّ الْعِبَادَ اِذَا عَصَوْنِیْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَھُمْ بِالسَّخْطَۃِ وَالنِّقْمَۃِ فَسَامُوْھُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ فَلَا تَشْغَلُوْا اَنْفُسَکُمْ بِالدُّعَاءِ عَلَی الْمُلُوْکِ وَلٰکِنِ اشْغَلُوْا اَنْفُسَکُمْ بِالذِّکْرِ وَالتَّضَرُّعِ کَیْ اَکْفِیَکُمْ مُلُوْکَکُمْ۔ رَوَاہُ اَبُوْنُعَیْمٍ فِی الْحِلْیَۃِ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ (حدیث قدسی) میں ارشاد فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں بادشاہوں کا مالک اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ (یعنی میرے قبضہ قدرت) میں ہیں لہٰذا جب میرے (اکثر) بندے میری اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں تو میں ان کے حق میں (ظالم) بادشاہوں کے دلوں کو رحمت وشفقت کی طرف پھیر دیتا ہوں اور جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حق میں (عادل ونرم خو) بادشاہوں کے دلوں کو غضبناکی اور سخت گیری کی طرف پھیر دیتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ (بادشاہ) ان کو سخت عقوبتوں میں مبتلا کرتے ہیں، اس لئے (ایسی صورت میں) تم اپنے آپ کو ان بادشاہوں کے لئے بددعا کرنے میں مشغول نہ کرو بلکہ (میری بارگاہ میں تضرع وزاری کر کے اپنے آپ کو (میرے) ذکر میں مشغول کرو تاکہ میں تمہارے ان بادشاہوں کے شر سے تمہیں بچاؤں۔" اس روایت کو ابونعیم نے اپنی کتاب حلیۃ الاولیاء میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ رعایا کے تئیں حکمرانوں کے رویہ کا تعلق باطنی طور پر لوگوں کے اعمال وکردار سے ہوتا ہے کہ اگر رعایا کے لوگ خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں اور ان کے اعمال ومعاملات بالعموم راست بازی ونیک کرداری کے پابند ہوتے ہیں تو ان کا ظالم حکمران بھی ان کے حق میں عادل، نرم خو اور شفیق وکرم گستر بن جاتا ہے اور اگر رعایا کے لوگ خدا کی سرکشی وطغیانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کے اعمال ومعاملات عام طور پر بدخوئی وبدکرداری کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں تو پھر ان کا عادل ونرم خو حکمران بھی ان کے حق میں غضبناک اور سخت گیر ہو جاتا ہے لہٰذا حکمران کے ظلم وستم اور اس کی سخت گیری وناانصافی پر اس کو برا بھلا کہنے اور اس کے لئے بددعا کرنے کی بجائے یہ راہ اختیار کرنی چاہئے کہ اللہ کی طرف رجوع کیا جائے، اپنی بداعمالیوں پر ندامت کے ساتھ توبہ واستغفار کیا جائے، اللہ کے دربار میں عاجزی وزاری کے ساتھ التجا وفریاد کی جائے اور اپنے اعمال واپنے معاملات کو مکمل طور پر اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے تابع کر دیا جائے تاکہ رحمت خداوندی متوجہ ہو اور ظالم حکمران کے دل کو عدل وانصاف اور نرمی وشفقت کی طرف پھیر دے۔

بَابُ مَا عَلَى الْوُلَاةِ مِنَ التَّيْسِيْرِ

حاکموں پر آسانی و نرمی کے واجب ہونے کا بیان

گزشتہ باب میں اس بات کا ذکر تھا کہ رعایا کو اپنے حاکموں کی اطاعت و فرمانبرداری کرنی چاہئے اب اس باب میں یہ بیان کیا جائے گا کہ حاکموں کو بھی اپنی رعایا کے لوگوں پر نرمی و شفقت کرنی چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حکمران کو اپنی رعایا کے تئیں نرم روی اختیار کرنی چاہئے

① عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا بَعَثَ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِہٖ فِیْ بَعْضِ اَمْرِہٖ قَالَ بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا وَیَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ جب اپنے کسی صحابیؓ کو اپنے کسی کام پر مامور کر کے (یعنی کسی جگہ کا حاکم بنا کر) بھیجتے تو ان کو یہ ہدایت فرماتے کہ لوگوں کو طاعات و عبادات اور نیک کام کرنے پر اجر و ثواب کی بشارت دیتے رہنا اور ان کو ان کے گناہوں پر خدا کے عذاب سے (اتنا زیادہ) مت ڈرانا کہ وہ رحمت خداوندی سے مایوس ہو جائیں) نیز (لوگوں کے ساتھ) آسانی کا برتاؤ کرنا (یعنی ان سے زکوٰۃ وغیرہ کی وصولی میں نرمی و آسانی کا طریقہ اختیار کرنا) اور (لوگوں سے زکوٰۃ وغیرہ کا واجب مقدار سے زیادہ وصول کر کے) ان کو دشواری و تنگی میں مبتلا نہ کرنا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

② وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَسَکِّنُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (حاکموں اور عاملوں کے لئے) فرمایا "(لوگوں کے ساتھ) آسانی کا برتاؤ کرو (ان کو مشکلات اور سختیوں میں مبتلا نہ کرو (ان کو خدا کی نعمتوں کی بشارت کے ذریعہ) تسکین و تسلی دو، اور ان کو خدا کے عذاب سے بہت زیادہ ڈرانے کے ذریعہ یا ان پر ایسے دشوار اور سخت بوجھ ڈال کر کہ جو ان کو خدا کی نافرمانی پر مجبور کر دے) نفرت و خوف میں مبتلا نہ کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

③ وَعَنْ اَبِیْ بُرْدَۃَ قَالَ بَعَثَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَدَّہٗ اَبَا مُوْسٰی وَمُعَاذًا اِلَی الْیَمَنِ فَقَالَ یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوبردہؒ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان کے دادا یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا اور ان سے "فرمایا کہ آسانی کا برتاؤ کرنا، مشکلات اور سختیوں میں مبتلا نہ کرنا بشارت دیتے رہنا، خوف و مایوسی میں مبتلا نہ کرنا، باہم اتفاق و اتحاد کے ساتھ کام کرنا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: صحیح یہ ہے کہ مؤلف مشکوٰۃ یہاں یوں نقل کرتے ہیں عن ابن ابی بردۃ الخ یعنی ابی بردہ کے ساتھ "ابن" کا لفظ بھی لاتے کیونکہ ابوبردہؒ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے بیٹے ہیں نہ کہ پوتے، اور ان (ابوبردہ) سے ان کے صاحبزادگان عبداللہ، یوسف، سعید اور بلال روایت حدیث کرتے ہیں، چنانچہ یہاں جو حدیث نقل ہوئی ہے سعید ابن ابوبردہ سے مروی ہے جیسا کہ صحیح بخاری نے نقل کیا ہے کہ حضرت سعید ابن ابوبردہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ (حضرت ابوبردہؒ) سے سنا وہ کہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے میرے باپ یعنی

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا۔"

قیامت کے دن عہد شکن کی رسوائی

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْغَادِرَ يُنْصَبُ لَهٗ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ هٰذِهٖ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن عہد شکن (کی فضیحت و رسوائی کے لئے) ایک نشان کھڑا کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں ابن فلاں کی عہد شکنی کی علامت ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُعْرَفُ بِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر عہد شکن کے لئے ایک نشان (مقرر) ہوگا جس کے ذریعہ وہ پہچانا جائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

⑥ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ عِنْدَ اِسْتِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرْفَعُ لَهٗ بِقَدْرِ غَدْرِهٖ اَلَا وَلَا غَادِرَ اَعْظَمُ غَدْرًا مِنْ اَمِيْرِ عَامَّةٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعیدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر عہد شکن (کی رسوائی و فضیحت کی تشہیر) کے لئے اس کے مقعد کے قریب ایک نشان ہوگا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ "قیامت کے دن ہر عہد شکن کے لئے ایک نشان ہوگا جو اس کی عہد شکنی کے بقدر بلند کیا جائے گا (یعنی اس کی جتنی زیادہ عہد شکنی ہوگی اسی قدر وہ نشان اور اس کی تشہیر زیادہ ہوگی) خبردار! کوئی عہد شکن، عہد شکنی کے اعتبار سے امام عام (یعنی حکمران وقت) سے بڑا نہیں (یعنی حکمران کی عہد شکنی سب سے بڑی عہد شکنی ہے۔" (مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

رعایا کی ضروریات پوری نہ کرنے والے حکمران کے بارے میں وعید

⑦ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ اَنَّهٗ قَالَ لِمُعَاوِيَةَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ شَيْئًا مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ اِحْتَجَبَ اللّٰهُ دُوْنَ حَاجَتِهٖ وَخَلَّتِهٖ وَفَقْرِهٖ فَجَعَلَ مُعَاوِيَةُ رَجُلًا عَلٰى حَوَائِجِ النَّاسِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهٗ وَلِاَحْمَدَ اَغْلَقَ اللّٰهُ لَهٗ اَبْوَابَ السَّمَاءِ دُوْنَ خَلَّتِهٖ وَحَاجَتِهٖ وَمَسْكَنَتِهٖ۔

"حضرت عمرو بن مرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ سے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کسی کام کا ولی و حاکم بنایا اور اس نے (مسلمانوں کی حاجت، عرضداشت اور محتاجگی سے حجاب کیا (یعنی اس کی ضرورت و حاجت کو پورا نہیں کیا) تو اللہ تعالیٰ اس (والی و حاکم) کی حاجت عرضداشت اور محتاجگی سے حجاب فرمائے گا یعنی اس کو اس کے مطلوب سے دور رکھے گا۔ اور اس کی دعا قبول نہیں کرے گا)" حضرت امیر معاویہؓ (یہ حدیث سن کر بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے ایک شخص کو (اس کام) پر مقرر کر دیا کہ وہ لوگوں کی ضروریات پر نظر رکھے اور ان کی حاجتوں کو پورا کرتا رہے۔ (ابوداؤدؒ و ترمذیؒ) اور ترمذیؒ کی ایک اور روایت میں اور احمدؒ کی روایت میں یوں ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس (والی حاکم) کی حاجت، عرضداشت اور محتاجگی پر آسمان کے دروازے بند کر دے گا۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

رعایا پر اپنے دروازے رکھنے والے حاکم پر رحمت خداوندی کے دروازے بند ہونگے

(۸) عَنْ اَبِی الشَّمَّاخِ الْاَزْدِیِّ عَنِ ابْنِ عَمٍّ لَهٗ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ اَتٰی مُعَاوِیَةَ فَدَخَلَ عَلَیْهِ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ وَلِیَ مِنْ اَمْرِ النَّاسِ شَیْئًا ثُمَّ اَغْلَقَ بَابَهٗ دُوْنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَوِ الْمَظْلُوْمِ اَوْذِی الْحَاجَةِ اَغْلَقَ اللّٰهُ دُوْنَهٗ اَبْوَابَ رَحْمَتِهٖ عِنْدَ حَاجَتِهٖ وَفَقْرِهٖ اَفْقَرَ مَا یَكُوْنُ اِلَیْهِ۔

"حضرت ابوشماخ ازدی سے روایت ہے کہ ان کے چچازاد بھائی جو نبی کریم ﷺ کے ایک صحابیؓ تھے (ایک دن حضرت امیر معاویہؓ کے پاس آئے! اور جب ان کی خدمت میں باریاب ہوئے تو کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کو لوگوں کے کسی کام کا ولی ووالی بنایا گیا اور اس نے مسلمانوں پر یا کسی مظلوم پر، اور یا کسی حاجت مند پر اپنے دروازے بند رکھے (یعنی ان کو ان کی اپنی حاجت وضرورت کے وقت اپنے پاس نہ آنے دیا یا اس کی حاجت روائی نہ کی) تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کی ضرورت وحاجت اور محتاجگی کے وقت جب کہ وہ اس کی طرف بہت زیادہ حاجت مند محتاج ہو اپنی رحمت کے دروازے بند رکھے گا (یعنی اگر وہ کسی وقت اپنی دنیا یا اپنی عقبی کے بارے میں اللہ کی بارگاہ میں اپنی حاجت وضرورت کا اظہار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی اس حاجت وضرورت کو پورا نہیں کرے گا یا اگر وہ دنیا میں کسی مخلوق سے اپنی کسی احتیاج کا اظہار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی اس حاجت وضرورت کو بھی پورا نہیں ہونے دے گا۔"

اپنے حکام کو حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایات

(۹) وَعَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا بَعَثَ عُمَّالَهٗ شَرَطَ عَلَیْهِمْ اَنْ لَّاتَرْكَبُوا بِرْذَوْنًا وَلَا تَاْكُلُوْا نَقِیًّا وَلَا تَلْبَسُوا رَقِیْقًا وَلَا تُغْلِقُوا اَبْوَابَكُمْ دُوْنَ حَوَائِجِ النَّاسِ فَاِنْ فَعَلْتُمْ شَیْئًا مِنْ ذٰلِكَ فَقَدْ حَلَّتْ بِكُمُ الْعُقُوْبَةُ ثُمَّ یُشَیِّعُهُمْ رَوَاهُمَا الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عمر ابن خطابؓ کے بارے میں منقول ہے کہ جب عمال (حکام) کو روانہ کرتے تو ان سے یہ شرط کر لیتے (یعنی ان کو یہ ہدایات دیتے) کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہونا (میدہ وباریک آٹے کی روٹی وغیرہ نہ کھانا باریک کپڑے نہ پہننا اور لوگوں کی حاجت وضرورت کے وقت ان پر اپنے دروازے بند نہ کرنا (یاد رکھو!) اگر تم نے ان میں سے کوئی چیز اختیار کی تو تم دنیا وعاقبت) میں سزا کے مستحق ہو جاؤ گے، اس کے بعد حضرت عمرؓ ان کو (کچھ دور تک) پہنچانے جاتے۔ یہ دونوں حدیثیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں۔" (بیہقی)

تشریح: ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہونے کی ممانعت کی علت چونکہ تکبر اور اتراہٹ ہے اس لئے عربی گھوڑے پر سوار ہونے کی ممانعت بطریق اولی ہوگی۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ترکی گھوڑے پر سوار ہونے سے منع کرنا در اصل تکبر واتراہٹ سے منع کرنا ہے میدہ کھانے اور باریک کپڑے پہننے سے منع کرنا، اسراف اور عیش وعشرت کی زندگی اختیار کرنے سے منع کرنا ہے اور حاجتوں پر اپنے دروازے بند رکھنے سے منع کرنا، مسلمانوں کی حاجت روائی نہ کرنے سے منع کرنا ہے۔

بَابُ الْعَمَلِ فِی الْقَضَاءِ وَالْخَوْفِ مِنْهُ

منصب قضاء کی انجام دہی اور اس سے ڈرنے کا بیان

جیسا کہ کتاب الامارۃ وقضاء کے ابتدائیہ میں بتایا گیا تھا کہ اسلامی نظام حکومت کا اصل محور امام وامیر یعنی سربراہ مملکت اور قاضی

ہوتے ہیں، چنانچہ گزشتہ دونوں الواب میں امام وامیر کے متعلقات کو بیان کیا گیا اب اس باب میں منصب قضاء کا بیان ہوگا اور اس سلسلہ میں بطور خاص دونوں کا ذکر کیا جائے گا ایک تو یہ کہ قاضی اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں صرف اسلامی قانون کے مآخذ یعنی کتاب وسنت اور اجتہاد کو رہنما بنائے اور اس کا کوئی فیصلہ وحکم ان چیزوں کے خلاف نہیں ہونا چاہئے دوسری بات یہ ہے کہ منصب قضاء اپنی اہمیت وعظمت اور اپنی بھرپور ذمہ داریوں کے اعتبار سے اتنا اونچا ہے۔ کہ نہ صرف یہ کہ ہر شخص کو اس تک پہنچنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے، بلکہ جہاں تک ہوسکے۔ اس منصب کو قبول کرنے سے ڈرنا اور اجتناب کرنا چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

غصہ کی حالت میں کسی قضیہ کا فیصلہ نہ کیا جائے

(۱) عَنْ اَبِی بَکْرَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَقْضِیَنَّ حَکَمٌ بَیْنَ اثْنَیْنِ وَھُوَ غَضْبَانُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جب کوئی حاکم وقاضی غصہ کی حالت میں ہو تو وہ اس وقت دو آدمیوں (کے نزاعی معاملے) میں فیصلہ نہ دے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: غصہ کی حالت میں چونکہ غور وفکر کی قوت مغلوب ہوجاتی ہے اور ایسی صورت میں مبنی بر انصاف کے فیصلے کا صادر ہونا محل نظر ہوجاتا ہے اس لئے حکم دیا گیا ہے کہ کوئی حاکم وقاضی غیض وغضب کی حالت میں کسی قضیہ کا فیصلہ نہ کرے تاکہ اس کا غیض وغضب، اس کے غور وفکر اور اجتہاد میں رکاوٹ نہ بنے اور وہ منصفانہ فیصلہ دے سکے اسی طرح سخت گرمی وسخت سردی، بھوک پیاس اور بیماری کی حالت میں بھی کوئی حکم وفیصلہ نہ دے کیونکہ ان اوقات میں بھی حواس پوری طرح قابو میں نہیں ہوتے اور دماغ حاضر نہیں رہتا۔ لہٰذا اگر کوئی حاکم وقاضی ان احوال میں حکم وفیصلہ دے گا تو وہ کراہت کے ساتھ جاری ونافذ ہوگا۔

قاضی کو اجتہاد کا اختیار

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو وَاَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا حَکَمَ الْحَاکِمُ فَاجْتَھَدَ وَاَصَابَ فَلَہٗ اَجْرَانِ وَاِذَا حَکَمَ فَاجْتَھَدَ وَاَخْطَأَ فَلَہٗ اَجْرٌ وَاحِدٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت ابوہریرہؓ دونوں کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی حاکم فیصلہ دینے کا ارادہ کرے اور اجتہاد کرے یعنی غور وفکر کے ذریعہ حکم وفیصلہ دے) اور پھر اس کا وہ حکم وفیصلہ صحیح یعنی کتاب وسنت کے موافق ہو تو اس کا دوہرا اجر ملے گا (ایک اجر تو اجتہاد کرنے کا اور دوسرا اجر صحیح فیصلہ پر پہنچنے کا) اور اگر اس نے کوئی ایسا حکم وفیصلہ دیا جس میں اس نے اجتہاد کیا لیکن (نتیجہ اخذ کرنے میں) چوک گیا (یعنی صحیح حکم تک پہنچنے میں خطا کر گیا) تو اس کو ایک اجر ملے گا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر حاکم وقاضی کسی سے قضیہ ومعاملہ کا حکم وفیصلہ دینا چاہے جس کے بارے میں کتاب وسنت اور اسلامی فقہ میں کوئی صریح اور واضح ہدایت نہیں ہے اور پھر وہ اجتہاد کرے یعنی کتاب وسنت کے احکام وتعلیمات وفقہ اسلامی کے مسائل اور اسلامی عدالتوں کے نظائر میں پوری طرح غور وفکر کرنے کے بعد وہ کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جائے جس کے بارے میں اس کے ضمیر کی رہنمائی یہ ہو کہ یہ مبنی بر حق ہے اور پھر وہی نتیجہ اس کا حکم وفیصلہ بن جائے تو وہ حکم وفیصلہ ظاہری قانون کے اعتبار سے تو بالکل صحیح تسلیم کیا جائے گا البتہ عقبیٰ کے لحاظ سے اس کی دو صورتیں ہوں گی ایک تو یہ کہ اگر حقیقت میں بھی وہ فیصلہ کتاب وسنت کی منشاء کے موافق رہا تو اس کو دو اجر ملیں گے، اور اگر اس کا فیصلہ کتاب وسنت کے موافق نہیں ہوا ہے تو اس کو ایک ہی اجر ملے گا۔ بالکل یہی حکم مجتہد کا ہے کہ اگر وہ

استنباط مسائل کے وقت اپنے اجتہاد کے نتیجے میں کتاب و سُنت کی منشاء تک پہنچ گیا تو اس کو دو اجر ملیں گے اور اگر کتاب و سنت کی منشاء تک پہنچنے میں خطا کر گیا تو اس کو ایک ثواب ملے گا۔ لہٰذا یہ حدیث جہاں اس بات کی دلیل ہے کہ قاضی اسلام کو ایسی جزئیات میں اجتہاد کا اختیار حاصل ہے جو اسلامی قانون کے ماخذ میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہیں اور جن کا کوئی حکم واضح نہیں ہے وہیں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مجتہد اپنے اجتہاد میں کبھی تو صحیح حکم تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی خطا کر جاتا ہے یعنی صحیح حکم تک نہیں پہنچ پاتا لیکن اجر و ثواب اس کو بہر صورت ملتا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی چیز کا حکم و مسئلہ، نصوص یعنی کتاب اللہ، احادیث رسول اللہ اور اجماع اُمّت میں مذکور نہ ہونے کی وجہ سے قیاس پر عمل کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو تو اس صورت میں قیاس پر عمل کرنا تحری قبلہ کی مانند ہوگا (جس طرح اگر کسی شخص کو کسی وجہ سے قبلہ کی سمت کا پتہ نہ چلے اور وہ نماز کے وقت غور و فکر اور تحری کر کے اپنے گمان غالب کے مطابق قبلہ کی کوئی سمت مقرر کر لے اور اس طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہو گی اگرچہ حقیقت میں قبلہ اس سمت نہ ہو اسی طرح) قیاس پر عمل کرنے والا، مصیبت یعنی درست عمل کرنے والا ہو گا اگرچہ اس قیاس میں اس سے خطا (غلطی) ہو گئی ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

منصب قضاء ایک ابتلاء ہے

③ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جُعِلَ قَاضِیًا بَیْنَ النَّاسِ فَقَدْ ذُبِحَ بِغَیْرِ سِکِّیْنٍ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص لوگوں کے درمیان قاضی مقرر کیا گیا (گویا) اس کو بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔" (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: "ذبح" سے اس کے متعارف معنی (یعنی ہلاکت بدن) مراد نہیں ہے بلکہ غیر متعارف معنی "ذہنی و روحانی ہلاکت" مراد ہے۔ چنانچہ جس شخص کو قاضی مقرر کیا جاتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ ہمہ وقت کی الجھن و پریشانی اور روحانی، (اذیت) یا یوں کہئے۔ کہ درد بے دوا اور مفت کی بیماری میں مبتلا رہتا ہے بلکہ اس کو اپنی عاقبت کی خرابی کا خوف بھی رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ چھری سے ذبح ہو جانا صرف لمحہ بھر کے لئے اذیت برداشت کرنا ہے جب کہ یہ اذیت عمر بھر کی ہے بلکہ اس کی حسرت و پشیمانی قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔

قاضی بننے کی خواہش نہ کرو

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنِ ابْتَغَی الْقَضَاءَ وَسَاَلَ وُکِلَ اِلٰی نَفْسِهٖ وَمَنْ اُکْرِهَ عَلَیْهِ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْهِ مَلَکًا یُسَدِّدُهٗ۔ (رواہ الترمذی ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص (اپنے دل میں) منصب قضا کی طلب و خواہش کرے اور پھر (سربراہ مملکت سے) اس کا خواستگار ہو (یہاں تک کہ اس کی خواست گاری پر اس کو قاضی بنا دیا جائے) تو وہ منصب اس کے نفس کے حوالے کر دیا جاتا ہے (یعنی اس کو اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق حاصل نہیں ہوتی) اور جس کو (اس کی طلب و خواہش کے بغیر) زبردستی اس منصب پر فائز کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتے کو مقرر کر دیتا ہے جو اس کو گفتار و کردار میں راست و درست رکھتا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

جنتی اور دوزخی قاضی!

⑤ وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ وَاثْنَانِ فِي النَّارِ فَاَمَّا الَّذِي فِي الْجَنَّةِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضٰى بِهٖ وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ قَضٰى لِلنَّاسِ عَلٰى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ۔ (رواہ ابو داؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں ایک طرح کے تو جنت میں جانے والے اور دو طرح کے دوزخ میں جانے والے! لہٰذا جنت میں جانے والا قاضی تو وہ شخص ہے جس نے حق کو جانا (یعنی یہ جانا کہ حق اس بات میں ہے) اور پھر حق ہی کے مطابق فیصلہ کیا اور جس نے حق کو جانا مگر (اس کے باوجود) اپنے حکم و فیصلہ میں ظلم کیا (یعنی اس نے دیدہ دانستہ حق کو پامال کیا تو وہ دوزخی ہے، اسی طرح جو اپنی جہالت کی وجہ سے حق کو نہیں پہچانا اور اسی حالت میں لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کیا تو وہ بھی دوزخی ہے (کیونکہ اس نے حق رسی میں کوتاہی اور تقصیر کی)۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

⑥ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ قَضَاءَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى يَنَالَهٗ ثُمَّ غَلَبَ عَدْلُهٗ جَوْرَهٗ فَلَهُ الْجَنَّةُ وَمَنْ غَلَبَ جَوْرُهٗ عَدْلَهٗ فَلَهُ النَّارُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص مسلمانوں کے منصب قضاء کا طالب اور خواستگار ہوا یہاں تک کہ اس نے اس کو حاصل بھی کر لیا اور پھر اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں) اس کا عدل و انصاف ظلم پر غالب رہا تو وہ جنت کا مستحق ہوگا اور جس شخص کا ظلم اس کے عدل و انصاف پر غالب رہا تو وہ دوزخ کا سزاوار ہوگا۔" (ابوداؤد)

تشریح: ظاہری مفہوم کے مطابق ظلم پر عدل کے اور عدل پر ظلم کے غلبہ سے مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے سے زیادہ ہو اور وہ دوسرا بھی وجود رکھتا ہو اور چونکہ حکم غالب کے مطابق ہوتا ہے اس لئے اگر عدل وانصاف غالب ہوگا تو جنت ملے گی اور اگر ظلم غالب ہوگا تو دوزخ ملے گی۔ لیکن علماء نے لکھا ہے کہ دونوں ہی صورتوں میں "غالب" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس درجہ کا ہو کہ دوسرے کے لئے رکاوٹ بن جائے۔ مثلاً اس کے عدل و انصاف کا وصف اس طرح حاوی ہو کہ اس کا ظلم سر نہ اٹھا سکے۔ یا اس کے ظلم کی خصلت اتنی حاوی ہو کہ اس کے مقابلہ پر اس کا عدل ظاہر نہ ہو سکے۔

قیاس واجتہاد برحق ہے

⑦ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَهٗ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ كَيْفَ تَقْضِيْ اِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ؟ قَالَ اَقْضِيْ بِكِتَابِ اللّٰهِ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَالَ اَجْتَهِدُ رَأْيِيْ وَلَا اٰلُوْ قَالَ فَضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى صَدْرِهٖ وَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا يَرْضٰى بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے جب ان (معاذؓ) کو (قاضی و حاکم بنا کر) یمن بھیجا تو ان سے (بطور امتحان) پوچھا کہ جب تمہارے سامنے کوئی قضیہ پیش ہوگا تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ "میں کتاب اللہ (قرآن کریم) کے موافق فیصلہ کروں گا۔" "فرمایا" اگر تمہیں وہ مسئلہ (صراحۃ) کتاب اللہ میں نہ ملا؟" انہوں نے کہا "پھر میں سُنّت رسول اللہؐ (حدیث نبوی) کے موافق فیصلہ کروں گا" فرمایا "اگر تمہیں وہ مسئلہ سُنّت رسول اللہ (ﷺ) میں بھی نہ ملا؟" انہوں نے کہا تو پھر میں اپنی عقل سے اجتہاد کرونگا اور (اپنے اجتہاد و حقیقت رسی میں) کوتاہی نہیں کروں گا۔" معاذؓ (یا وہ راوی جنہوں نے یہ حدیث معاذ سے روایت کی ہے،

کہتے ہیں کہ آنحضرت نے (یہ سن کر) اپنا دست مبارک معاذؓ کے سینے پر مارا (تاکہ اس کی برکت سے وہ اپنی بات پر ثابت قدم رہیں اور ان کے علم میں اضافہ ہو، اور فرمایا) "تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں جس نے رسول اللہ (ﷺ) کے رسول (یعنی معاذؓ) کو اس چیز کی توفیق عطا کی جس سے اس (اللہ) کا رسول (ﷺ) راضی ہو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمی)

تشریح: "میں اپنی عقل سے اجتہاد کروں گا" کا مطلب یہ ہے کہ میں اس قضیہ کا حکم ان مسائل پر قیاس کے ذریعہ حاصل کروں گا جو نصوص یعنی کتاب و سنت میں مذکور ہیں بایں طور کہ کتاب و سنت میں اس قضیہ کے مشابہ جو مسائل مذکور ہیں ان کے مطابق اس قضیہ کا حکم و فیصلہ کروں گا۔

مظہرؒ نے بھی اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے۔ کہ پہلے میں غور و فکر کروں گا کہ میرے سامنے جو قضیہ پیش ہوا ہے کہ جس کا کوئی حکم کتاب و سنت میں مذکور نہیں ہے وہ کونسے ایسے مسئلہ سے مشابہ ہے جو کتاب و سنت میں مذکور ہے جب میں ان دونوں کے درمیان مشابہت پاؤں گا تو اس کا وہی حکم و فیصلہ کروں گا جو کتاب اللہ یا سُنّت رسول اللہ میں مذکور مسئلہ کا ہے، چنانچہ ائمہ مجتہدینؒ کے یہاں اس قیاس پر بہت سے مسائل کا استنباط کیا گیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان ائمہ مجتہدین نے قیاس کی علت و بنیاد میں اختلاف کیا ہے مثلاً گیہوں کے ربوٰ (سود) کے حرام ہونے کے بارے میں نص (یعنی صریح حکم) ہے جب کہ تربوز کے بارے میں ایسی نص نہیں ہے۔ لہٰذا حضرت امام شافعیؒ نے تربوز کو گیہوں پر قیاس کرتے ہوئے اس کے ربوا کو بھی حرام قرار دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک گیہوں کے ربٰو کے حرام ہونے کی علت اس کا "کھائی جانے والی چیز" ہونا ہے اور چونکہ تربوز بھی "کھائی جانے والی چیز ہے" اس لئے گیہوں کے حکم پر قیاس کرتے ہوئے اس کا ربٰو بھی حرام ہوگا۔ جب کہ حضرت امام اعظمؒ، ابوحنیفہؒ کے نزدیک گیہوں کے ربو کے حرام ہونے کی علت چونکہ اس کا مکیل (یا موزون) ہونا ہے اس لئے انہوں نے گیہوں پر چونے کو قیاس کیا اور یہ مسئلہ اخذ کیا کہ چونے کا ربٰو بھی حرام ہے۔

بہرحال یہ حدیث قیاس و اجتہاد کے مشروع ہونے کی بہت مضبوط دلیل ہے اور اصحاب ظواہر (غیر مقلدین) کے مسلک کے خلاف ہے جو قیاس و اجتہاد کے منکر ہیں۔

مدعا علیہ کا بیان سنے بغیر مدعی کے حق میں فیصلہ نہ کیا جائے

⑧ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ بَعَثَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْيَمَنِ قَاضِيًا فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تُرْسِلُنِيْ وَاَنَا حَدِيْثُ السِّنِّ وَلَا عِلْمَ لِيْ بِالْقَضَاءِ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ سَيَهْدِيْ قَلْبَكَ وَيُثَبِّتُ لِسَانَكَ اِذَا تَقَاضٰى اِلَيْكَ رَجُلَانِ فَلَا تَقْضِ لِلْاَوَّلِ حَتّٰى تَسْمَعَ كَلَامَ الْاٰخَرِ فَاِنَّهٗ اَحْرٰى اَنْ يَّتَبَيَّنَ لَكَ الْقَضَاءُ قَالَ فَمَا شَكَكْتُ فِيْ قَضَاءٍ بَعْدُ وسنذكر حديث ام سلمة انما اقضي بينكم برأيي في باب الاقضية والشهادات ان شاء الله تعالى۔ (رواه الترمذي وابوداؤد وابن ماجة)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ (جب) رسول کریم ﷺ نے مجھے قاضی بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ آپ مجھ نوجوان کو (قاضی بنا کر) بھیج رہے ہیں (جو اپنی کم عمری کی وجہ سے ناتجربہ کار بھی ہے اور) جس کو (منصب قضا کی ذمہ داریوں کا پوری طرح علم بھی نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا (تم اس بارے میں کچھ فکر نہ کرو) اللہ تمہارے دل کو فہم و فراست کی ہدایت عطا کرے گا اور تمہاری زبان کو صحیح اور برحق حکم و فیصلہ کرنے پر) ثابت رکھے گا۔ (پھر آنحضرت ﷺ نے منصب قضاء کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے سلسلہ میں یہ تعلیم وہدایت دی کہ جب تمہارے پاس دو آدمی اپنا قضیہ لے کر آئیں تو تم پہلے آدمی (یعنی مدعا علیہ) کا بیان نہ سن لو کیونکہ یہ (مدعا علیہ کا بیان تمہیں صحیح حکم و فیصلہ دینے میں اچھی مدد دے گا۔" حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کی) اس مبارک دعا کی برکت سے اور آپ ﷺ کی اس ہدایت و تعلیم پر عمل کرنے کے بعد میں کسی بھی قضیہ کا حکم و فیصلہ کرنے میں مذبذب نہیں ہوا۔"

(ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قیامت کے دن ظالم حاکم کا انجام

⑨ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ حَاكِمٍ يَحْكُمُ بَيْنَ النَّاسِ اِلَّا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ مَلَكٌ اٰخِذٌ بِقَفَاهُ ثُمَّ يَرْفَعُ رَاسَهُ اِلَى السَّمَاءِ فَاِنْ قَالَ اَلْقِهِ اَلْقَاهُ فِيْ مَهْوَاةٍ اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا۔

(رواہ احمد وابن ماجۃ والبیہقی فی شعب الایمان)

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر وہ حاکم جو لوگوں پر اپنا حکم و فیصلہ جاری و نافذ کرتا ہے قیامت کے دن (احکم الحاکمین کی بارگاہ میں) اس طرح پیش کیا جائے گا کہ ایک فرشتہ اس کی گدی پکڑے ہوگا۔ پھر وہ فرشتہ اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے (کھڑا رہے گا، یہاں تک کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ حکم دے گا کہ اس کو (دوزخ میں) ڈال دو تو وہ اس کو دوزخ کے) گڑھے میں ڈال دے گا جو چالیس برس کی مسافت) کے بقدر (گہرا) ہوگا۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ، بیہقیؒ در شعب الایمان)

تشریح: "پھر وہ فرشتہ اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے گا" سے مراد فرشتہ کی اس حالت کو بیان کرنا ہے جس میں وہ حکم خداوندی کا منتظر ہوگا، یعنی جس طرح بادشاہ کے ہاں یہ درباری آداب میں سے ہے کہ جب وہاں کوئی ملزم پیش کیا جاتا ہے کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ انتظار کرتا ہے کہ بادشاہ حاکم کی طرف سے کیا حکم و فیصلہ صادر ہوتا ہے، اسی طرح وہ فرشتہ بھی اس حاکم کو بارگاہ رب العزت میں پیش کر کے اس انتظار میں کھڑا رہے گا کہ اس کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔

"چالیس برس کے بقدر" سے مراد اس گڑھے کی گہرائی کو زیادہ سے زیادہ کر کے بیان کرنا ہے نہ کہ اس سے اس مدت کی تعیین و تحدید مراد ہے۔ اس حدیث میں جس حاکم کا انجام بیان کیا گیا ظالم حاکم ہے، عدل و انصاف پرور حاکم کے بارے میں یہ حکم دیا جائے گا کہ اس کو بہشت میں پہنچایا جائے۔ جیسا کہ کتاب الامارۃ والقضاء میں حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے واضح ہو چکا ہے۔"

قیامت کے دن قاضی کی حسرتناک آرزو؟

⑩ وَعَنْ عَائِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيَأْتِيَنَّ عَلَى الْقَاضِى الْعَدْلِ يَوْمُ الْقِيَامَةِ يَتَمَنّٰى اَنَّهُ لَمْ يَقْضِ بَيْنَ اثْنَيْنِ فِيْ تَمْرَةٍ قَطُّ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن (جب حاکموں، سرداروں، اور قانون وانصاف کے ذمہ داروں سے سخت مواخذہ ہو رہا ہوگا تو) عادل و منصف قاضی کے لئے بھی ایک ایسا لمحہ آئے گا جس میں وہ یہ آرزو کرے گا کہ کاش اس کو دو آدمیوں کے درمیان ایک کھجور کے (بھی) قضیہ کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری انجام نہ دینا پڑتی ہو۔" (احمدؒ)

عادل و منصف کو حق تعالیٰ کی توفیق و تائید حاصل رہتی ہے

⑪ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِى اَوْفٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْقَاضِىْ مَالَمْ يَجُرْ فَاِذَا جَارَ تَخَلّٰى عَنْهُ وَلَزِمَهُ الشَّيْطَانُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ، وَفِيْ رِوَايَةٍ فَاِذَا جَارَ وَكَلَهُ اِلٰى نَفْسِهٖ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیٰ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قاضی جب تک ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار نہیں کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوتا ہے یعنی حق تعالیٰ کی توفیق و تائید اس کے شامل حال ہوتی ہے لیکن جب وہ ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے الگ ہو جاتا ہے (یعنی اس کے اوپر سے حق تعالیٰ کی تائید و توفیق کا سایہ ہٹ جاتا ہے اور شیطان اس کا ساتھی بن جاتا ہے

(ترمذی "ابن ماجہ") اور ابن ماجہ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ قاضی جب ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو (اللہ تعالیٰ) اس کے کام کو اس کے سپرد کر دیتا ہے (یعنی اس کو اپنی توفیق و تائید سے محروم کر دیتا ہے۔"

(۱۲) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ مُسْلِمًا وَيَهُوْدِيًّا اخْتَصَمَا اِلَى عُمَرَ فَرَاَى الْحَقَّ لِلْيَهُوْدِيِّ فَقَضٰى لَهٗ عُمَرُ بِهٖ فَقَالَ لَهُ الْيَهُوْدِيُّ وَاللّٰهِ لَقَدْ قَضَيْتَ بِالْحَقِّ فَضَرَبَهٗ عُمَرُ بِالدِّرَّةِ وَقَالَ وَمَا يُدْرِيْكَ فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ وَاللّٰهِ اِنَّا نَجِدُ فِي التَّوْرَاةِ اَنَّهٗ لَيْسَ قَاضٍ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ اِلَّا كَانَ عَنْ يَمِيْنِهٖ مَلَكٌ وَعَنْ شِمَالِهٖ مَلَكٌ يُسَدِّدَانِهٖ وَيُوَفِّقَانِهٖ لِلْحَقِّ مَادَامَ مَعَ الْحَقِّ فَاِذَا تَرَكَ الْحَقَّ عَرَجَا وَتَرَكَاهُ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت سعید ابن مسیب راوی ہیں کہ (ایک دن) حضرت عمر فاروق کی خدمت میں ایک مسلمان اور ایک یہودی اپنا جھگڑا لے کر آئے حضرت عمر نے جب (قضیہ کی تحقیق کے بعد) یہ دیکھا کہ یہودی حق پر ہے تو انہوں نے اس (یہودی) کے حق میں فیصلہ دیا اس یہودی نے (اپنے حق میں فیصلہ سن کر) کہا "خدا کی قسم! آپ نے حق کے مطابق فیصلہ دیا ہے حضرت عمر نے (یہ سن کر) اس کے ایک درہ مارا اور فرمایا تجھے کیسے علم ہوا کہ میں نے حق کے مطابق فیصلہ دیا ہے؟ یہودی نے کہا "خدا کی قسم! ہم نے توراۃ میں (یہ لکھا ہوا) پایا ہے کہ جو بھی قاضی حق کے مطابق فیصلہ دیتا ہے اس کے دائیں ایک فرشتہ ہوتا ہے اور اس کے بائیں ایک فرشتہ ہوتا ہے وہ دونوں فرشتے اس کو تقویت پہنچاتے ہیں اور حق کی توفیق دیتے ہیں جب تک وہ حق پر رہتا ہے، اور جب قاضی حق کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ فرشتے آسمان پر چلے جاتے ہیں اور اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔" (مالک)

تشریح: ایک خلجان تو یہ واقع ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر نے اس یہودی کو اپنے درے سے کیوں مارا در آنحالیکہ اس نے ان کے فیصلہ کے منصفانہ اور برحق ہونے کا اقرار و اعتراف کیا تھا؟ اور ایک اشکال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ عمر کے سوال "تجھ کو یہ کیسے معلوم ہوا الخ" اور یہودی کے جواب "ہم نے توراۃ میں پایا ہے الخ" میں مطابقت کیا ہوئی۔" پہلے خلجان کا جواب تو یہ ہے کہ حضرت عمر نے یہودی کو کسی سزا یا غصہ کے طور پر نہیں مارا تھا بلکہ نرمی اور خوش طبعی کے طور پر مارا تھا اور دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس بات کو یہودی سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا کہ اس تنازعہ میں حق پر کون ہے، لہٰذا جب اس یہودی نے دیکھا کہ اگر حضرت عمر حق سے انحراف کرتے تو فریق مخالف یعنی مسلمان کے حق میں فیصلہ کرتے، اس صورت میں ان کا فیصلہ مبنی بر انصاف ہوتا اور نہ ان کا حق پر قائم رہنا ظاہر ہوتا۔ لہٰذا جب انہوں نے مسلمان کے خلاف یہودی کے حق میں فیصلہ دیا تو معلوم ہوا کہ حضرت عمر حق پر قائم ہیں اور انہوں نے انصاف سے انحراف نہیں کیا ہے۔

منصب قضا قبول کرنے سے حضرت ابن عمر کا انکار

(۱۳) وَعَنِ ابْنِ مَوْهَبٍ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَالَ لِابْنِ عُمَرَ اقْضِ بَيْنَ النَّاسِ قَالَ اَوَتُعَافِيْنِيْ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ مَاتَكْرَهُ مِنْ ذٰلِكَ وَقَدْ كَانَ اَبُوْكَ يَقْضِيْ قَالَ لِاَنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ كَانَ قَاضِيًا فَقَضٰى بِالْعَدْلِ فَبِالْحَرِيِّ اَنْ يَنْقَلِبَ مِنْهُ كَفَافًا فَمَا رَاجَعَهٗ بَعْدَ ذٰلِكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَفِيْ رِوَايَةِ رَزِيْنٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ قَالَ لِعُثْمَانَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَا اَقْضِيْ بَيْنَ رَجُلَيْنِ قَالَ فَاِنَّ اَبَاكَ كَانَ يَقْضِيْ فَقَالَ اِنَّ اَبِيْ لَوْ اَشْكَلَ عَلَيْهِ شَيْءٌ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَوْ اَشْكَلَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ سَاَلَ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاِنِّيْ لَا اَجِدُ مَنْ اَسْاَلُهٗ وَسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَقَدْ عَاذَ بِعَظِيْمٍ وَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَاَعِيْذُوْهُ وَاِنِّيْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ تَجْعَلَنِيْ قَاضِيًا فَاَعْفَاهُ وَقَالَ لَا تُخْبِرْ اَحَدًا۔

"اور حضرت ابن موہب کہتے ہیں کہ حضرت عثمان ابن عفان نے (اپنے زمانہ خلافت میں حضرت ابن عمر سے کہا کہ "لوگوں کا قاضی

بن جاؤ (یعنی حضرت عثمانؓ نے حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں منصب قضا کی پیش کش کی) حضرت ابن عمرؓ نے کہا "امیر المؤمنین! مجھ کو تو اس کام سے معاف رکھئے۔" حضرت عثمانؓ نے فرمایا "تم اس منصب کو کیوں ناپسند کرتے ہو! حالانکہ تمہارے والد حضرت عمر فاروقؓ تو (اپنے دور خلافت کے علاوہ بھی نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں) قضاء کا کام کرتے تھے؟" حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو شخص منصب قضاء پر فائز ہو اور مبنی بر انصاف فیصلے کرے تو وہ اس لائق ہے کہ وہ اس منصب سے برابر سرابر جدا ہو (یعنی نہ نقصان پہنچائے نہ فائدہ، نہ ثواب پائے نہ عذاب۔") اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے حضرت ابن عمرؓ سے اس بارہ میں کوئی بات نہیں کی (ترمذیؒ) اور رزین کی روایت میں جو انہوں نے حضرت نافعؒ سے نقل کی ہے یہ الفاظ ہیں "کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا "امیر المؤمنین" میں (تو) دو آدمیوں کے درمیان (بھی) کوئی حکم و فیصلہ نہیں کروں گا (چہ جائیکہ بہت زیادہ لوگوں کا قاضی بنوں۔" حضرت عثمانؓ نے فرمایا "تمہارے والد (حضرت عمرؓ) تو لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے؟" حضرت ابن عمرؓ نے کہا "میرے (والد کی بات تو یہ تھی کہ) اگر ان کو کوئی دشواری پیش آتی تھی تو وہ رسول کریم ﷺ سے پوچھ لیا کرتے تھے اور اگر رسول کریم ﷺ کو کوئی دشواری پیش آتی تو آپ ﷺ جبرئیل علیہ السلام سے پوچھ لیا کرتے تھے جب کہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں پاتا جس سے پوچھ لیا کروں گا اور میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی اس نے بڑی ذات کی پناہ مانگی۔" نیز میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ (بھی) فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذریعہ پناہ مانگے اس کو پناہ دو۔" لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کے ذریعے اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ آپ مجھے قاضی مقرر کریں" چنانچہ حضرت عثمانؓ نے ان کو معاف کیا، لیکن ان سے فرمایا کہ "کسی) اور کو آگاہ نہ کرنا کہ وہ منصب قضا قبول نہ کرے ورنہ لوگ عام طور پر اس منصب کو قبول کرنے سے گریز کرنے لگیں گے اور نظام حکومت معطل ہو کر رہ جائے گا۔"

بَابُ رِزْقِ الْوُلَاةِ وَهَدَايَاهُمْ

حکام کو تنخواہ اور ہدایا و تحائف دینے کا بیان

اس باب میں یہ بیان ہوگا کہ حکام و عمال کے لئے بیت المال سے بطور تنخواہ و اجرت کچھ مقرر کیا جائے یا نہیں اور یہ کہ اگر کوئی شخص حاکم کے لئے بطور ہدیہ و تحفہ کوئی چیز لائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بارگاہ رسالت سے مال کی تقسیم

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اُعْطِیْکُمْ وَلَا اَمْنَعُکُمْ اَنَا قَاسِمٌ اَضَعُ حَیْثُ اُمِرْتُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں نہ تو تمہیں عطا کرتا ہوں اور نہ تمہیں محروم رکھتا ہوں، میں تو صرف بانٹنے والا ہوں کہ جس جگہ مجھے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے میں وہاں رکھ دیتا ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کے درمیان مال تقسیم کرتے ہوئے مذکورہ بالا جملے ارشاد فرمائے تاکہ وہ تقسیم و کمی بیشی کی وجہ سے اپنے دل میں کوئی خیال نہ لائیں، چنانچہ "مَا اُعْطِیْکُمْ الخ" کا مطلب یہ ہے کہ نہ عطا کرنا میرے بس میں ہے اور نہ تمہیں محروم رکھنا میرے اختیار میں ہے کہ اگر میں کسی کو کچھ دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اپنی خواہش اور اپنی مرضی سے اس کو دیا ہے یا اگر کسی کو نہیں

دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرا دل اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ اس لئے میں نے اس کو نہیں دیا، بلکہ میں صرف بانٹنے والا ہوں اس لئے جو کچھ بھی دیتا ہوں یا نہیں دیتا ہوں یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر ہے، جہاں اور جس کو دینے کا مجھے حکم دیا گیا ہے وہاں اور اس کو دیتا ہوں اور جہاں اور جس کو نہ دینے کی ہدایت کی گئی ہے میں وہاں اور اس کو نہیں دیتا۔

قومی خزانے اور بیت المال میں ناحق تصرف کرنے والوں کے بارے میں وعید

(۲) وَعَنْ خَوْلَةَ الْاَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رِجَالًا يَتَخَوَّضُوْنَ فِىْ مَالِ اللّٰهِ بِغَيْرِ حَقٍّ فَلَهُمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت خولہ انصاریؓ یہ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بہت سے لوگ خدا کے مال میں ناحق تصرف کرتے ہیں (یعنی زکوۃ، غنیمت اور بیت المال کے مال میں امام و حکمران کی اجازت کے بغیر تصرف کرتے ہیں اور اپنے حق اور اپنی محنت سے زیادہ وصول کرتے ہیں وہ قیامت کے دن دوزخ کی آگ کے سزاوار ہوں گے۔" (بخاریؒ)

امام وقت بیت المال سے اپنی تنخواہ لینے کا حقدار ہے

(۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا اسْتُخْلِفَ اَبُوْبَكْرٍ قَالَ لَقَدْ عَلِمَ قَوْمِىْ اَنَّ حِرْفَتِىْ لَمْ تَكُنْ تَعْجِزُ عَنْ مُؤْنَةِ اَهْلِىْ وَشُغِلْتُ بِاَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَسَيَاْكُلُ اٰلُ اَبِىْ بَكْرٍ مِنْ هٰذَا الْمَالِ وَيَحْتَرِفُ لِلْمُسْلِمِيْنَ فِيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جب خلیفہ بنائے گئے تو فرمایا کہ "میری قوم کے لوگ (یعنی مسلمان) جانتے ہیں کہ میرا کاروبار میرے اہل عیال کے اخراجات کے لئے کافی تھا، اب میں مسلمانوں کے امور میں مشغول ہو گیا ہوں (اور اس کی وجہ سے ابوبکر کے اہل و عیال بیت المال) کے مال سے کھائیں گے اور ابوبکر اس بیت المال کی آمدنی میں اضافہ کرنے اس کی حفاظت کرنے اور اس کو مسلمانوں کی ضروریات و دیگر مصارف میں اس کو خرچ کرنے کے ذریعہ مسلمانوں کی خدمت کرے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت ابوبکر صدیقؓ بازار میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور اس کے ذریعہ اپنے اہل و عیال کے مصارف پورے کرتے تھے، لیکن جب مسلمانوں نے ان کو منصب خلافت پر فائز کیا تو انہوں نے صحابہؓ کو اطلاع دے دی کہ اب میں امور خلافت کی انجام دہی اور مسلمانوں کی خدمت میں مشغول ہو گیا ہوں اس لئے اپنا کاروبار جاری نہیں رکھ سکتا، لہٰذا اپنے اور اپنے اہل و عیال کے اخراجات کے بقدر بیت المال سے تنخواہ لیا کروں گا۔

جلیل القدر صحابہؓ کی تجارتیں

حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں تو معلوم ہوا کہ وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے، اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ غلہ کی تجارت کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے ہاں کھجوروں اور کپڑے کا کاروبار ہوتا تھا اور حضرت عباسؓ عطاری کرتے تھے۔

علماء نے لکھا ہے کہ تجارت کی انواع میں سب سے بہتر تجارت کپڑے کی اور پھر عطر کی ہے، نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر جنتی تجارت کرتے تو کپڑے کی تجارت کرتے اور دوزخی تجارت کرتے تو صرف یعنی سونے چاندی کی تجارت کرتے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

تنخواہ سے زیادہ لینا خیانت ہے

(۴) وَعَنْ بُرَيْدَةَ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَرَزَقْنٰهُ رِزْقًا فَمَا اَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ

غُلُوْلٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت بریدہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو ہم نے کسی کام پر مامور کیا اور اس کو رزق دیا (یعنی اس کے اس کام کی اجرت و تنخواہ مقرر کردی اس بعد اگر وہ (اپنی تنخواہ سے زائد) کچھ وصول کرے گا تو یہ مال غنیمت میں خیانت ہے۔"

(ابوداؤد)

عامل کی اجرت

⑤ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ عَمِلْتُ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَمَّلَنِيْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں مجھے عامل بنایا گیا اور اس کی اجرت (تنخواہ) مجھ کو دی گئی۔" (ابوداؤدؒ)

حضرت معاذؓ کو ہدایت

⑥ وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ بَعَثَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَی الْيَمَنِ فَلَمَّا سِرْتُ اَرْسَلَ فِيْ اَثَرِيْ فَرُدِدْتُ فَقَالَ اَتَدْرِيْ لِمَ بَعَثْتُ اِلَيْكَ تُصِيْبَنَّ شَيْئًا بِغَيْرِ اِذْنِيْ فَاِنَّهُ غُلُوْلٌ وَمَنْ يَغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِهٰذَا دَعَوْتُكَ فَامْضِ لِعَمَلِكَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے (عامل) بنا کر یمن بھیجا (جب میں یمن جانے کے لئے روانہ ہوا اور کچھ دور چلا گیا) تو آپ ﷺ نے (مجھے بلانے کے لئے ایک شخص کو) میرے پیچھے بھیجا میں لوٹ کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم جانتے ہو، میں نے تمہیں بلانے کے لئے (آدمی) کیوں بھیجا تھا؟ (میں نے یہ آگاہی دینے کے لئے تمہیں بلایا ہے کہ) تم (اپنی مدت ملازمت کے دوران) میری اجازت کے بغیر کچھ نہ لینا کیونکہ یہ خیانت ہے، اور جو شخص خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن وہ چیز لے کر آئے گا جس میں اس نے خیانت کی ہے یہی کہنے کے لئے میں نے تمہیں بلایا تھا، اب تم اپنے کام پر جاؤ۔" (ترمذیؒ)

بلا تنخواہ حاکم کے مصارف کا بیت المال کفیل ہوگا

⑦ وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ كَانَ لَنَا عَامِلًا فَلْيَكْتَسِبْ زَوْجَةً فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ خَادِمٌ فَلْيَكْتَسِبْ خَادِمًا فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ مَسْكَنٌ فَلْيَكْتَسِبْ مَسْكَنًا۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَنِ اتَّخَذَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَهُوَ غَالٌّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مستوردؓ ابن شداد کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جس شخص کو ہم نے عامل (کسی جگہ کا حاکم و کارپرداز) بنایا (اگر اس کے بیوی نہ ہو تو) اس کو چاہئے کہ وہ ایک بیوی بیاہ لے، اگر اس کے پاس کوئی خادم (غلام ولونڈی) نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ ایک خادم خرید لے، اور اگر اس کا کوئی گھر نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ ایک گھر بنا لے یا خرید لے۔" اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ "اگر وہ اس کے علاوہ کچھ لے گا تو وہ خیانت کرنے والا ہوگا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ عامل کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے زیر تصرف بیت المال سے اپنی بیوی کے مہر، اس کے نان نفقے اور اس کے لباس کے بقدر حاجت (بلا اسراف) روپیہ و مال لے سکتا ہے، اسی طرح وہ اپنی رہائشی ضروریات کے مطابق ایک مکان اور خدمت کے لئے خادم (کی قیمت و اجرت کے بقدر بھی اس بیت المال سے لے سکتا ہے البتہ اگر وہ ان ضرورت و حاجت سے زیادہ لے گا تو وہ اس کے حق میں حرام ہوگا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ اس عامل کے لئے کوئی تنخواہ و اجرت مقرر نہ کی گئی ہو اور بیت المال اس کی (تنخواہ و اجرت کا اور اس کے مذکورہ مصارف) کا کفیل ہو سکتا ہو۔

قومی محاصل و بیت المال میں خیانت نہ کرو

⑧ وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ عَمِيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ مَنْ عُمِّلَ مِنْكُمْ لَنَا عَلٰى عَمَلٍ فَكَتَمَنَا مِنْهُ مِخْيَطًا فَمَا فَوْقَهُ فَهُوَ غَالٌّ يَاْتِيْ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اقْبَلْ عَنِّيْ عَمَلَكَ قَالَ وَمَا ذَاكَ قَالَ سَمِعْتُكَ تَقُوْلُ كَذَا وَكَذَا قَالَ وَاَنَا اَقُوْلُ ذٰلِكَ مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَلْيَاْتِ بِقَلِيْلِهٖ وَكَثِيْرِهٖ فَمَا اُوْتِيَ مِنْهُ اَخَذَهُ وَمَا نُهِيَ عَنْهُ انْتَهٰى۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَاَبُوْ دَاؤُدَ وَاللَّفْظُ لَهٗ۔

"اور حضرت عدیؓ ابن عمیرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک دن مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے) فرمایا "لوگو! تم میں سے جو شخص ہماری طرف سے کسی کام کا عامل بنایا جائے (یعنی جس کو ہم کسی خدمت مثلاً زکوۃ وغیرہ وصول کرنے پر مامور کریں) اور وہ اپنے اس کام کے حاصل (آمدنی) میں سے سوئی برابر یا اس سے زائد ہم سے چھپائے (یعنی وہ جو کچھ وصول تحصیل کرے اس میں سے ہماری اجازت اور ہمارے علم کے بغیر تھوڑا یا بہت لے لے) تو وہ خیانت کرنے والا ہے اور وہ قیامت کے دن اس (خیانت کی ہوئی چیز) کو لے کر آئے گا۔" (یہ سن کر) ایک انصاری شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! آپ نے (وصول تحصیل کا) جو کام میرے سپرد کیا ہے وہ مجھ سے واپس لے لیجئے۔" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کیوں؟" اس نے عرض کیا کہ میں نے جو آپ کو اس اس طرح فرماتے ہوئے سنا ہے (یعنی آپ ﷺ نے اس کام کے سلسلے میں جو وعید بیان فرمائی ہے اس کی وجہ سے میں بہت خوفزدہ ہو گیا ہوں، کیونکہ یہ کام لغزش سے تو خالی نہیں ہے، اگر میں کسی لغزش میں مبتلا ہو گیا تو قیامت کے دن کیا جواب دوں گا)؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں، میں پھر یہی کہتا ہوں کہ ہم جس شخص کو عامل مقرر کریں اس کو چاہئے کہ وہ جو کچھ وصول کریں، وہ تھوڑا ہو یا زیادہ سب ہمارے پاس لے کر آئے اور اس میں سے اس کو (اس کی اجرت تنخواہ کے طور پر) جس قدر دیا جائے وہ اس کو لے لے اور جو نہ دیا جائے اس سے باز رہے (اب اس واضح ہدایت و تنبیہ کے بعد جو شخص اس کام کو انجام دے سکے وہ اس کی ذمہ داری قبول کرے اور جو شخص ان شرائط کے ساتھ اس کی انجام دہی میں اپنے کو معذور سمجھے وہ اس کی ذمہ داری کو قبول نہ کرے۔" مسلمؒ و ابوداؤدؒ۔ الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔"

رشوت دینے، لینے والے پر آنحضرت ﷺ کی لعنت

⑨ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ۔ رَوَاهُ اَبُوْ دَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْهُ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ ثَوْبَانَ وَزَادَ وَالرَّائِشَ يَعْنِي الَّذِيْ يَمْشِيْ بَيْنَهُمَا۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے رشوت لینے اور رشوت دینے والے (دونوں) پر لعنت فرمائی ہے۔" ابوداؤد ابن ماجہ۔" ترمذیؒ" نے اس روایت کو حضرت عبداللہ ابن عمرو اور حضرت ابوہریرہؓ سے اور بیہقیؒ" نے شعب الایمان میں حضرت ثوبانؓ سے نقل کیا ہے نیز بیہقیؒ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے رائش یعنی وہ شخص جو رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے کے درمیان واسطہ وذریعہ بنے اس پر بھی لعنت فرمائی ہے۔"

تشریح: رشوت (یا راء کے پیش کے ساتھ یعنی رُشوت) اس مال کو کہتے ہیں جو کسی (حاکم و عامل وغیرہ) کو اس مقصد کے لئے دیا جائے کہ وہ باطل (ناحق) کو حق کردے اور حق کو باطل کردے۔ ہاں اگر اپنا حق ثابت کرنے یا اپنے اوپر ہونے والے کے دفعیہ کے لئے کچھ دیا

جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حلال ذرائع سے کمایا ہوا مال ایک اچھی چیز ہے

⑩ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ اَرْسَلَ اِلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنِ اجْمَعْ عَلَیْکَ سِلَاحَکَ وَثِیَابَکَ ثُمَّ ائْتِنِی قَالَ فَاَتَیْتُہٗ وَھُوَ یَتَوَضَّأُ فَقَالَ یَا عَمْرُو اِنِّی اَرْسَلْتُ اِلَیْکَ لِاَبْعَثَکَ فِیْ وَجْہٍ یُسَلِّمُکَ اللّٰہُ وَیُغْنِمُکَ وَاَزْعَبُ لَکَ زَعْبَۃً مِنَ الْمَالِ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا کَانَتْ ھِجْرَتِیْ لِلْمَالِ وَمَا کَانَتْ اِلَّا لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہٖ قَالَ نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ رَوَاہُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ وَرَوٰی اَحْمَدُ نَحْوَہٗ وَفِیْ رِوَایَتِہٖ قَالَ نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ۔

"اور حضرت عمرو بن العاص ؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے کسی شخص کے ذریعہ میرے پاس یہ کہلا بھیجا کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے کپڑوں کو اکٹھا کر لو (یعنی سفر کی تیاری کر لو) اور پھر میرے پاس آ جاؤ حضرت عمروؓ کہتے ہیں کہ میں (آنحضرت ﷺ کے فرمان کے مطابق سفر کی تیاری کر کے) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ اس وقت وضو کر رہے تھے، (مجھے دیکھ کر فرمایا کہ عمروؓ! میں نے تمہارے پاس آدمی بھیج کر تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ میں تمہیں ایک طرف (یعنی کسی جگہ کا حاکم یا عامل بنا کر) بھیجوں، اللہ تعالیٰ تمہیں عافیت و سلامتی کے ساتھ رکھے، تمہیں مال غنیمت عطا فرمائے اور میں بھی تمہیں کچھ مال دوں۔" میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! میرا ہجرت کرنا (یعنی میرا ایمان قبول کرنا اور اپنا وطن چھوڑ کر آپ ﷺ کے پاس آ جانا) مال کی خاطر نہیں تھا (بلکہ میرا ایمان قبول کرنا خالصۃً للہ تھا اور) میری ہجرت صرف اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی و رضا) کے لئے تھی۔" آپ ﷺ نے فرمایا "نیک بخت آدمی کے لئے اچھا مال اچھی چیز ہے۔" شرح السنۃ) امام احمدؒ نے بھی اس طرح کی روایت نقل کی ہے اور ان کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (نیک مرد کے لئے اچھا مال اچھی چیز ہے۔"

تشریح: حضرت عمرو بن العاص ؓ نے ۵ھ میں اسلام قبول کیا اور حضرت خالد ابن ولیدؓ کی ہمراہی میں حبشہ سے مدینہ کو ہجرت کی بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ۸ھ میں اسلام قبول کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو عمان کا حاکم مقرر فرمایا تھا، اغلب ہے کہ اس روایت کا تعلق اس وقت سے ہے جب کہ ان کو بطور حاکم عامل عمان بھیجا جا رہا تھا۔

اچھا مال وہ ہے جو حلال ذریعہ سے کمایا گیا ہو اور اچھی جگہوں اور نیک مصارف میں خرچ کیا گیا ہو" اور نیک بخت مرد" وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے حقوق کو بھی ادا کرے اور بندوں کے حقوق کی بھی ادائیگی کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سفارش کرنے والا کوئی ہدیہ و تحفہ قبول نہ کرے

⑪ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ شَفَعَ لِاَحَدٍ شَفَاعَۃً فَاَھْدٰی لَہٗ ھَدِیَّۃً عَلَیْھَا فَقَبِلَھَا فَقَدْ اَتٰی بَابًا عَظِیْمًا مِنْ اَبْوَابِ الرِّبَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص (کسی بادشاہ و حاکم سے) کسی شخص مثلاً زید کی سفارش کرے اور وہ (زید) اس (سفارش کرنے والے) کے پاس سفارش کے عوض کوئی چیز بطور ہدیہ و تحفہ بھیجے اور وہ سفارش کرنے والا) اس تحفہ کو قبول کرنے تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازہ میں داخل ہوا۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس طرح کا تحفہ ہدیہ اگرچہ "رشوت" کی تعریف میں آتا ہے مگر اس کو "سود" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ وہ سفارش کرنے والے کو بلا کسی عوض کے حاصل ہوا ہے۔

بَابُ الْاَقْضِيَةِ وَالشَّهَادَاتِ

قضیوں اور شہادتوں کا بیان

"قضیہ" اس نزاعی معاملے کو کہتے ہیں جو حاکم (وقاضی) کے پاس اس غرض سے لے جایا جائے کہ وہ فریقین کے درمیان کوئی حکم و فیصلہ کرے۔ اور "شہادت" گواہی دینے کو کہتے ہیں اور "گواہی" کا مطلب ہے "دو فریقوں میں سے ایک فریق کے مقابلہ پر دوسرے فریق کے حق کا اقرار، واثبات کرنا۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مدعی کا دعوی گواہوں کے بغیر معتبر نہیں

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَو يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَ اَمْوَالِهِمْ وَلٰكِنَّ الْيَمِيْنَ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِي شَرْحِهِ لِلنَّوَوِيِّ اَنَّهٗ قَالَ وَجَاءَ فِيْ رِوَايَةِ الْبَيْهَقِيِّ بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ اَوْصَحِيْحٍ زِيَادَةٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوْعًا لٰكِنَّ الْبَيِّنَةَ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ۔

"حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر لوگوں کو محض ان کے دعوی پر (ان کا مدعا) دیا جائے (یعنی اگر مدعی سے نہ تو گواہ طلب کئے جائیں اور نہ مدعا علیہ سے تصدیق کی جائے بلکہ محض اس کے دعوی پر اس کا از قسم مال و جان مدعا کو دے، دیا جائے) تو لوگ اپنے آدمیوں کے خون اور اپنے مال کا (جھوٹا) دعوی کرنے لگیں (لہذا صرف مدعی کا بلا گواہی کے بیان معتبر نہیں ہے) لیکن قسم کھانا مدعا علیہ پر ضروری ہے (مسلمؒ) اور نوویؒ نے اپنی کتاب شرح مسلم میں لکھا ہے کہ بیہقی کی روایت میں جو حسن یا صحیح اسناد سے منقول ہے حضرت ابن عباسؓ سے (مذکورہ بالا حدیث میں بطریق مرفوع ان الفاظ کا اضافہ بھی منقول ہے کہ "گواہ پیش کرنا مدعی کے ذمہ ہے اور قسم کھانا اس شخص کا حق ہے جو انکار کرے یعنی مدعا علیہ۔"

تشریح: "لیکن قسم کھانا مدعا علیہ کا حق ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر فریق دوم یعنی مدعا علیہ، فریق اول یعنی مدعی کے دعوی سے انکار کرے اور مدعی اس سے قسم کا مطالبہ کرے تو اس (مدعا علیہ) پر قسم کھانا ضروری ہے اس (مسلم کی) روایت میں مدعی سے گواہ طلب کرنے کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ یہ یعنی مدعی کا گواہ پیش کرنے کا ذمہ دار ہونا شریعت کا ثابت شدہ اور بالکل ظاہری ضابطہ ہے اس اعتبار سے گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ گواہ پیش کرنے کی ذمہ داری مدعی پر ہے، اگر مدعی گواہ پیش نہ کرے تو پھر مدعا علیہ قسم اور جحد (انکار) کے ذریعہ اپنی صفائی پیش کرنے کا حق رکھتا ہے، یہ مفہوم حضرت ابن عباسؓ کی دوسری روایت سے ظاہر ہے۔

عدالت میں جھوٹی قسم کھانے والے کے بارے میں وعید

② وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنِ صَبْرٍ وَهُوَ فِيْهَا فَاجِرٌ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِيْقَ ذٰلِكَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلاً اِلٰى اٰخِرِ الْاٰيَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی چیز پر مقید ہو کر (یعنی حاکم کی مجلس میں) قسم کھائے اور وہ اپنی قسم میں جھوٹا ہو کہ اس کا مقصد قسم کھا کر کسی مسلمان شخص کا مال حاصل کرنا ہو تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات

کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا۔" چنانچہ اس ارشاد کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا الی آخر الآیة۔" (بخاریؒ)

تشریح: پوری آیت اور اس کا ترجمہ یہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ (ال عمران ۳:۷۷)

"یقیناً جو لوگ معاوضہ حقیر لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو اللہ تعالیٰ سے (انہوں نے) کیا ہے اور (بمقابلہ اپنی قسموں کے، ان لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) نہیں ملے گا اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ ان سے (لطف کا) کلام فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف (نظر محبت سے، دیکھیں گے۔ اور نہ (ان کے گناہوں کو معاف کر کے) ان کو پاک کریں گے۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔"

حدیث کی عبارت من حلف علی یمین "صبر" کے لغوی معنی ہیں "حبس، روکنا، لزوم" اور "یمین صبر" سے مراد یہ ہے کہ حاکم عدالت میں کسی شخص کو اس وقت تک کے لئے محبوس (مقید) کر دے جب تک کہ وہ قسم نہ کھائے اس صورت میں مسلم حاکم کی اطاعت میں اس شخص پر قسم کھانا لازم ہے گویا علی یمین صبر میں "علی" حرف با کے معنی میں ہے اور اس سے مراد محلوف علیہ ہے! بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ "یمین صبر" یہ ہے کہ کسی چیز پر قسم کھانے والا اس مقصد سے دیدہ ودانستہ غلط بیانی کرتا ہے کہ ایک مسلمان کا مال تلف کر دے یا اس کو ہڑپ کر لے، چنانچہ وَهُوَ فِیْهَا فَاجِرٌ اور وہ اپنی قسم میں جھوٹا ہو، کے الفاظ سے اسی مفہوم کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

(۳) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ بِیَمِیْنِهٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ وَاِنْ كَانَ شَیْئًا یَسِیْرًا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاِنْ كَانَ قَضِیْبًا مِنْ اَرَاكٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت امامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اپنی (جھوٹی) قسم کے ذریعہ کسی مسلمان شخص کا حق غصب کیا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آگ کو واجب کیا اور اس پر بہشت کو حرام کر دیا۔" ایک شخص نے (یہ سن کر) آپ ﷺ سے عرض کیا" اگرچہ وہ حق کوئی معمولی ہی چیز ہو۔" آپ ﷺ نے فرمایا" (ہاں) اگرچہ پیلو کے درخت کا ایک ٹکڑا (یعنی مسواک) ہی کیوں نہ ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آگ کو واجب کیا" اس جملہ کی دو تاویلیں ہیں ایک تو یہ کہ یہ حکم اس شخص پر محمول ہے جو جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی مسلمان کا حق غصب کرنا حلال جانے اور اسی عقیدہ پر اس کی موت ہو جائے دوسری تاویل یہ ہے کہ ایسا شخص اگرچہ دوزخ کی آگ کا یقیناً سزاوار ہوگا لیکن یہ بھی غیر بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کو معاف کر دے! اسی طرح "بہشت کو اس پر حرام کر دیا۔" کی تاویل یہ ہے کہ ایسا شخص اول وہلہ میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل ہونے سے محروم قرار دیا جائے گا۔

واضح رہے کہ جس طرح جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی مسلمان کے حق کو ہڑپ کرنے والے کے بارے میں مذکورہ وعید ہے اسی طرح وہ شخص بھی اس وعید میں شامل ہے جو جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی ذمی کا حق مارے۔

مدعی کو ایک ہدایت

(۴) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَاِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ یَكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیَ لَهٗ عَلٰی نَحْوِ مَا اَسْمَعُ مِنْهُ فَمَنْ قَضَیْتُ لَهٗ بِشَیْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِیْهِ فَلَا یَاْخُذَنَّهٗ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے قضیئے (جھگڑے) لے کر میرے پاس آتے ہو، ممکن ہے تم میں کوئی شخص اپنے دلائل پیش کرنے میں دوسرے سے زیادہ فصیح و بلیغ بیان کا حامل ہو اور میں اس کا (مدلل) بیان سن کر اسی کے مطابق فیصلہ کر دوں لہٰذا وہ شخص کہ میں جس کے حق میں کسی ایسی چیز کا فیصلہ کروں جو حقیقت میں اس کے بھائی مسلمان کی ہو، اس چیز کو نہ لے کیونکہ (ایسی صورت میں گویا) میں اس کے حق میں آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کروں گا۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "میں ایک انسان ہوں" کے ذریعہ اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ سہو اور نسیان کسی انسان سے بعید نہیں ہے اور انسان کی فطرت اور وضع بشری کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ کسی معاملہ کے صرف اسی پہلو کو دیکھے جو ظاہری طور پر عیاں ہو اور اس کے متعلق اسی بات کو قبول کرے جو ایک کھلی ہوئی دلیل کی صورت میں اس کے سامنے آئے اور چونکہ میں بھی ایک انسان ہوں اور اس حیثیت سے وہ تمام احکام و عوارض مجھ پر بھی پیش آتے ہیں جو بشریت کا خاصہ ہیں اور جن کا تعلق انسانی جبلت سے ہے، لہٰذا جن معاملات میں مجھے وحی کے ذریعہ براہ راست بارگاہ الوہیت سے حقیقت رسی کی قوت عطا کی جاتی ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ کی جانب سے مجھے تعلیم وہدایت دی جاتی ہے ان کے علاوہ دوسرے امور میں مجھے انہی ضابطوں اور قاعدوں کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے جن کی بنیاد انسانی عقل اور بشری تقاضوں پر ہے۔ چنانچہ جب میرے سامنے کوئی قضیہ آتا ہے تو میں اس کے ظاہری پہلوؤں کے مطابق ہی فیصلہ کرتا ہوں۔ اگر مدعی اپنے دلائل، اپنے گواہ اور اپنے زور بیان سے میرے سامنے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس کا دعوی صحیح ہے اور اس نے جس چیز کا مطالبہ کیا ہے وہ اسی کا حق ہے تو میں اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں کہ ظاہری حکم کا تقاضہ یہی ہے اب اس کے بعد مدعی جانے کہ اگر حقیقت میں اس کا دعوی صحیح ہے اور جس چیز کا اس نے مطالبہ کیا ہے وہ اسی کا حق ہے تو وہ اپنی مراد پالے۔ لیکن اگر حقیقت میں اس کا دعوی صحیح نہ تھا اور جس چیز کا اس نے مطالبہ کیا تھا وہ اس کا حق نہیں تھا بلکہ کسی دوسرے کا حق تھا اور میں نے اس کے ظاہری دلائل و ثبوت اور اس کی چرب زبانی اور قوت لسانی سے یہ سمجھا کہ اس کا دعوی صحیح ہے۔ اور اس کا مدعا اس کو دلوا دیا تو اس کو چاہئے کہ وہ اس چیز کو اپنے حق میں حلال نہ جانے بلکہ یہ سمجھ کر کہ یہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو ملا ہے۔ اس سے اجتناب کرے۔

ناحق مقدمہ بازی کرنے والے کے بارے میں وعید

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَبْغَضَ الرِّجَالِ اِلَى اللّٰهِ الْاَلَدُّ الْخَصِمُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں بدترین اور مبغوض ترین وہ شخص ہے جو بہت زیادہ ناحق جھگڑے والا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

کیا مدعی ایک گواہ اور ایک قسم کے ذریعہ اپنا دعوی ثابت کر سکتا ہے

⑥ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بِيَمِيْنٍ وَشَاهِدٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک قضیہ میں) ایک گواہ اور ایک قسم پر فیصلہ صادر فرمایا۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا ظاہری مفہوم یہ بتاتا ہے کہ اگر مدعی اپنے دعوی کے ثبوت میں صرف ایک گواہ پیش کر سکے تو اس (مدعی) سے دوسرے گواہ کے بدلے ایک قسم نے لی جائے اور اس قسم کو ایک گواہ کا قائم مقام قرار دے کر اس کا دعوی تسلیم کر لیا جائے چنانچہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ تینوں کا یہی مسلک ہے۔ لیکن حضرت امام اعظمؒ ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ ایک گواہ اور ایک قسم پر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے بلکہ دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے، اور چونکہ قرآن کے حکم کو خبر واحد

کے ذریعہ منسوخ کرنا جائز نہیں ہے اس لئے اس روایت کی بناء پر ایسے کسی مسلک کی بنیاد صحیح نہیں ہو سکتی جو قرآن کے حکم کے منافی ہو، درآنحالیکہ اس روایت کے بارے میں یہ احتمال بھی ہے جب مدعی اپنا دعوی لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا ہو اور وہ اپنے دعوی کے ثبوت میں صرف ایک گواہ پیش کر سکا ہو تو چونکہ وہ اپنے ثبوت شہادت کی تکمیل نہ کر سکا اور آنحضرت ﷺ نے صرف ایک گواہ کے وجود کا اعتبار نہیں کیا اس لئے مدعا علیہ کو قسم کھانے کا حکم دیا، مدعا علیہ کے قسم کھانے کے بعد آپ ﷺ نے اس قضیہ کا فیصلہ دیا۔ اسی کو راوی نے "ایک گواہ اور ایک قسم پر فیصلہ دینے سے تعبیر کیا۔

طیبیؒ کہتے ہیں ائمہ کا یہ اختلاف بھی اس صورت میں ہے جب کہ قضیہ کا تعلق کسی مالی دعوی سے ہو اگر دعوی کا تعلق مال کے علاوہ کسی اور معاملہ سے ہو تو اس صورت میں متفقہ طور پر تمام ائمہ کا مسلک یہی ہے کہ گواہ اور قسم (یعنی مدعی) کی طرف سے مثلاً ایک گواہ پیش کرنے اور ایک قسم کھانے کا اعتبار نہ کیا جائے۔

مدعا علیہ کی قسم کا اعتبار کیا جائے خواہ وہ حقیقت میں جھوٹی قسم کیوں نہ ہو

(۷) وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَائِلٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ مِنْ حَضْرَ مَوْتَ وَرَجُلٌ مِنْ كِنْدَةَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ هٰذَا غَلَبَنِي عَلٰى اَرْضٍ لِي فَقَالَ الْكِنْدِيُّ هِيَ اَرْضِيْ وَفِيْ يَدِيْ لَيْسَ لَهُ فِيْهَا حَقٌّ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْحَضْرَمِيِّ اَلَكَ بَيِّنَةٌ قَالَ لَا قَالَ فَلَكَ يَمِيْنُهُ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الرَّجُلَ فَاجِرٌ لَا يُبَالِيْ عَلٰى مَا حَلَفَ عَلَيْهِ وَلَيْسَ يَتَوَرَّعُ مِنْ شَيْءٍ قَالَ لَيْسَ لَكَ مِنْهُ اِلَّا ذٰلِكَ فَانْطَلَقَ لِيَحْلِفَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا اَدْبَرَ لَئِنْ حَلَفَ عَلٰى مَالِهِ لِيَاْكُلَهُ ظُلْمًا لَيَلْقَيَنَّ اللّٰهَ وَهُوَ عَنْهُ مُعْرِضٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت علقمہ ابن وائلؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حضرموت کا رہنے والا اور ایک شخص کندہ کا۔ دونوں حاضر ہوئے حضرمی (یعنی حضرموت کے رہنے والے) نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! اس شخص نے میری زمین (کو غصب کر کے اس) پر قبضہ کر لیا ہے۔ "کندی نے کہا کہ "وہ میری زمین ہے اور میرے ہاتھ (یعنی میرے قبضے) میں ہے، اس شخص کا اس زمین پر کوئی حق نہیں ہے۔" رسول کریم ﷺ نے "دونوں فریق کا بیان سن کر حضرمی سے فرمایا کہ "کیا تمہارے پاس گواہ ہیں؟" اس نے کہا کہ "نہیں!" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تو اب تمہارے دعوی کا دارومدار اس (مدعا علیہ کی قسم پر ہے (کہ اگر یہ قسم کھانے سے انکار کر دے گا تو تمہارا دعوی تسلیم کر لیا جائے گا اور اگر اس نے قسم کھالی تو تمہارا دعوی باطل کر دیا جائے گا)" اس (حضرمی) نے کہا کہ "یا رسول اللہ! یہ شخص تو فاجر (جھوٹا ہے) اس کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس نے جس چیز کی قسم کھائی ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ اور اس کو کسی چیز سے پرہیز نہیں۔" آپ نے فرمایا۔ "(بہر حال) تمہارے لئے اس شخص کی طرف سے سوائے اس (قسم) کے اور کچھ نہیں ہے۔" (یہ سن کر) وہ (کندی) شخص قسم کھانے کے لئے چلا اور جب اس نے پیٹھ پھیری تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر یہ شخص اس حضرمی) کے مال پر قسم کھائے گا تاکہ اس کا مال زبردستی ہضم کر جائے تو اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گے کہ وہ (اللہ) اس سے بیزار ہوگا۔" (مسلم)

تشریح: "وہ شخص قسم کھانے کے لئے چلا" ممکن ہے کہ اس کا چلنا اس اعتبار سے ہے کہ جیسے شافعیہ کے یہاں یہ مسئلہ ہے کہ یہ قسم کھانے والا پہلے وضو کرتا ہے اور پھر ایک خاص وقت میں یعنی جمعہ کے روز عصر کے بعد قسم کھاتا ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ مدعی کی طرف سے پیٹھ پھیر کر آنحضرت ﷺ کی طرف چلا، تاکہ آپ کے پاس پہنچ کر قسم کھائے۔"

نوویؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے کئی مسئلے نکلتے ہیں کہ ایک تو یہ کہ اس طرح کے قضیے میں اس اجنبی سے قبضے والا اولی ہے۔ جو اس کے زیر چیز پر دعوی کرے۔

دوسرا یہ کہ مدعا علیہ پر قسم کھانا لازم ہے جب کہ وہ مدعی کے دعوی کو تسلیم نہ کرے۔
اور تیسرا یہ کہ فاجر مدعا علیہ کی قسم کو بھی اس طرح تسلیم و قبول کیا جائے جس طرح عادل مدعا علیہ کی قسم تسلیم و قبول کی جاتی ہے نیز اس قسم کھالینے کی وجہ سے اس پر سے مدعی کا مطالبہ ساقط ہو جاتا ہے (لیکن یہ واضح رہے کہ اگر عدالت میں سچی گواہی سے مدعا علیہ کی قسم کا جھوٹ معلوم ہو جائے تو پھر اس کی قسم کالعدم قرار پائے گی۔)

جھوٹا دعوی کرنے والے کا ٹھکانا دوزخ ہے

⑧ وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ ادَّعٰى مَا لَيْسَ لَهٗ فَلَيْسَ مِنَّا وَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "جو شخص کسی ایسی چیز کا دعوی کرے جو اس کی نہیں ہے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے اور اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں ڈھونڈھ لے۔" (مسلمؒ)

بہترین گواہ کون ہے

⑨ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ الَّذِيْ يَاْتِيْ بِشَهَادَتِهٖ قَبْلَ اَنْ يُسْئَلَهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور زید ابن خالدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کیا میں تمہیں بہترین گواہوں کے بارے میں نہ بتادوں؟ (تو سنو کہ) گواہوں میں بہترین گواہ وہ ہے جو گواہی طلب کئے جانے سے پہلے گواہی دے دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ گواہی دراصل "بیان حقیقت" کا دوسرا نام ہے اور حقیقت بیان کرنے کو طلب و درخواست پر موقوف رکھنا غیر موزوں بات ہے۔ لہٰذا بہترین گواہ وہ ہے جو گواہی طلب کئے جانے سے پہلے اور قبل اس کے اس سے پوچھا جائے کہ کیا تم وہ ہو اور یہ کہ کیا تم گواہی دینا چاہتے ہو، وہ از خود گواہی دیدے اور اس طرح حق کو ظاہر کرنے کی ذمہ داری پوری کرے۔

بغیر طلب کے گواہی دینی چاہئے یا نہیں؟

لیکن اس کے برعکس ایک دوسری حدیث میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو بغیر طلب کے گواہی دیں۔ چنانچہ حنفی مسلک کی ہدایت یہی ہے کہ جب تک گواہی طلب نہ کی جائے اس وقت تک گواہی نہ دی جائے، گواہی طلب کئے جانے کے بعد گواہی دینا واجب ہے اور حدود میں گواہی کا چھپانا افضل ہے۔

جہاں تک مذکورہ بالا روایت کا تعلق ہے کہ جس سے بغیر طلب کے گواہی دینے والے کا بہترین گواہ ہونا ثابت ہوتا ہے تو اس کے بارہ میں حنفیہ کی طرف سے دو تاویلیں کی جاتی ہیں ایک تو یہ کہ یہ ارشاد گرامی دراصل اس شخص پر محمول ہے جو کسی کے حق کا گواہ ہے لیکن مدعی کو اس کے گواہ ہونے کا علم نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو چاہئے کہ وہ مدعی کو بتادے کہ میں اس قضیہ میں تمہارا گواہ ہوں۔

دوسری تاویل یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق حق تعالیٰ کے حقوق میں گواہی دینے سے ہے۔ جیسے زکوٰۃ، کفارہ رویت ہلال اور وصیت اور اسی طرح کی دوسری چیزیں، لہٰذا جو شخص ان میں سے کسی چیز کا شاہد ہو۔ مثلاً اس نے چاند دیکھا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ حاکم و قاضی کے ہاں حاضر ہو اور گواہی دے۔

ان دونوں تاویلوں کے علاوہ ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ارشاد گرامی اس حکم کو بطور مبالغہ بیان کرنے پر محمول ہے کہ جو شخص کسی قضیہ میں گواہ کی حیثیت رکھتا ہو اور اس سے گواہی طلب کی گئی ہو تو اس طلب گواہی کے بعد اس کو چاہئے کہ وہ گواہی دینے کی اپنی ذمہ

داری کو جلد سے جلد پورا کرے اور بغیر طلب کے گواہی دینے کی جو مذمت منقول ہے وہ اس کے عکس پر محمول ہے۔

جھوٹی گواہی دینے والوں کے بارے میں پیشین گوئی

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ يَجِيْئُ قَوْمٌ تَسْبِقُ شَهَادَةُ اَحَدِهِمْ يَمِيْنَهُ وَيَمِيْنُهُ شَهَادَتَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو میرے زمانے میں ہیں یعنی صحابہؓ پھر وہ جو ان کے متصل ہیں یعنی تابعین اور پھر وہ لوگ جو ان کے متصل ہیں یعنی تبع تابعین اور پھر (آخر میں) ایسے لوگ پیدا ہوں گے کہ ان میں سے ایک کی گواہی اس کی قسم سے پہلے اور اس کی قسم اس کی گواہی سے پہلے ہوگی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "گواہی قسم سے پہلے اور قسم گواہی سے پہلے ہوگی۔" سے گواہی و قسم میں عجالت پسندی وزیادتی کو بطور کنایہ بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ عجلت وزیادتی کی وجہ سے گواہی دینے اور قسم کھانے میں اس قدر لاپرواہ ہوگا کہ کبھی گواہی سے پہلے قسم کھائے گا اور کبھی پہلے گواہی دے گا اور پھر قسم کھائے گا۔

مظہرؒ نے کہا ہے کہ یہ جملہ گواہی و قسم میں تیزروی و عجلت پسندی کی تمثیل کے طور پر ہے یعنی وہ گواہی دینے اور قسم کھانے میں اتنی تیزی اور پھرتی دکھایا کرے گا کہ نہ تو اس کو دین کی کوئی پرواہ ہوگی اور نہ وہ ان چیزوں میں کوئی پرواہ کرے گا۔ یہاں تک کہ اس کو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ پہلے قسم کھائے یا پہلے گواہی دے۔ یا یہ کہ اس کو یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ اس نے پہلے قسم کھائی ہے یا پہلے گواہی دی ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی دراصل جھوٹی گواہی اور جھوٹی قسم کے عام ہو جانے کی خبر دینے کے طور پر ہے کہ ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں لوگ گواہی دینے کو پیشہ بنالیں گے اور جھوٹی قسم کھانا ان کا تکیہ کلام بن جائے گا۔ جیسا کہ آجکل عام طور پر رواج ہے کہ پیشہ ور گواہ عدالتوں میں جھوٹی گواہی دیتے پھرتے ہیں اور ان کو اس بات کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا کہ وہ چند روپوں کی خاطر عدالت میں جھوٹی قسم کھا کر اور جھوٹی گواہی دے کر اپنی آخرت کو کس طرح برباد کر رہے ہیں۔

اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ وہ شخص کبھی تو قسم کے ذریعہ اپنی گواہی کو ترویج دے گا یعنی یوں کہے گا کہ "خدا کی قسم! میں سچا گواہ ہوں۔" اور کبھی گواہی کے ذریعہ اپنی قسم کو ترویج دے گا یعنی یہ اعلان کرتا پھرے گا کہ "لوگ میری قسم کے سچے ہونے پر گواہ رہیں۔

قسم کے لئے قرعہ ڈالنے کا ذکر

(۱۱) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلٰى قَوْمٍ الْيَمِيْنَ فَاَسْرَعُوْا فَاَمَرَ اَنْ يُسْهَمَ بَيْنَهُمْ فِي الْيَمِيْنِ اَيُّهُمْ يَحْلِفُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کچھ لوگوں پر قسم کو پیش کیا (یعنی ان سے کہا کہ قسم کھاؤ کہ مدعی صحیح نہیں ہے) چنانچہ ان لوگوں نے قسم کھانے میں) جلدی دکھائی تو آپ نے فرمایا کہ قسم کھانے کے لئے ان لوگوں کے درمیان قرعہ ڈالا جائے کہ ان میں سے کون شخص قسم کھائے۔" (بخاریؒ)

تشریح: عبارت کے ظاہری مفہوم سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک شخص نے دربار رسالت میں کچھ لوگوں کے خلاف دعوی دائر کیا۔ ان لوگوں (مدعا علیہم) نے مدعی کو صحیح ماننے سے انکار کیا۔ آنحضرت۔ نے ان لوگوں کو قسم کھانے کا حکم دیا ان لوگوں نے قسم کھانے میں جلدی

دکھائی، یعنی ہر شخص قسم کھانے کے لئے مستعد نظر آنے لگا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے سب لوگوں سے قسم نہیں کھلوائی بلکہ یہ حکم دیا کہ تم اپنے درمیان قرعہ ڈالو، قرعہ میں جس کا نام نکلے وہی قسم کھائے۔

لیکن شارحین نے اس مسئلہ کی یہ صورت لکھی ہے کہ مثلاً دو مختلف آدمیوں نے کسی ایسی چیز کا دعوی کیا جو تیسرے شخص کے پاس ہے۔ ان دونوں (مدعیوں) میں سے ہر شخص یہ کہتا ہے کہ وہ چیز میری ہے لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی گواہ نہیں رکھتا، یا یہ کہ دونوں ہی کے پاس گواہ ہیں لیکن وہ تیسرا شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ چیز ان دونوں میں سے کس کی ہے، لہٰذا اس صورت میں ان دونوں مدعیوں کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ان کے درمیان قرعہ ڈالا جائے اور ان میں سے جس کے نام قرعہ نکلے اس سے قسم کھانے کے لئے کہا جائے جب وہ قسم کھائے تو وہ چیز اس شخص کے حوالے کرنے کا حکم دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ اس صورت میں قسم کھانے کی ذمہ داری مدعی پر عائد ہوتی ہے۔ جب کہ قسم مدعا علیہ کو کھانی چاہئے تو بظاہر اس (مدعی) سے قسم کھلوانا اس اعتبار سے ہے کہ ان دونوں مدعیوں میں سے ہر ایک دوسرے کے حق کا منکر ہوتا ہے اور ضابطہ یہی ہے کہ والیمین علی من انکر یعنی قسم اس شخص کو کھانی چاہئے جو منکر ہو۔"

بہر حال مذکورہ بالا دونوں صورتیں حدیث کے ظاہری مفہوم کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں لیکن جہاں تک فقہی مسئلہ کا تعلق ہے تو حضرت علیؓ اس کے قائل تھے جو مذکورہ صورت میں بیان ہوا لیکن حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ایسے قضیہ میں حاکم عدالت کو چاہئے کہ وہ چیز اسی تیسرے شخص کے پاس چھوڑ دے اور دونوں مدعیوں میں سے کسی کو بھی نہ دلوائے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس چیز کو ان دونوں مدعیوں کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم کر دیا جائے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں امامؒ اور امام شافعیؒ کے دو قول ہیں ایک قول حضرت علیؓ کے قول کے مطابق ہے اور دوسرا قول حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق ہے۔ آگے حضرت ام سلمہؓ کی جو روایت آرہی ہے وہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین کی موید ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

گواہ پیش کرنا مدعی کے ذمہ اور قسم کھانا مدعا علیہ کے ذمہ ہے

(۱۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ۔ (رواه الترمذی)

"حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" گواہ مدعی کے ذمہ ہے اور قسم مدعا علیہ کے ذمہ۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اپنے دعوی کے ثبوت میں گواہ پیش کرنا مدعی کا حق ہے اور اگر مدعا علیہ مدعی کے دعوی کو صحیح ماننے سے انکار کر دے اور مدعی اس سے قسم کھانے کا مطالبہ کرے تو مدعا علیہ پر قسم کھانا لازم ہے۔

اگر ایک ہی چیز کے دو مدعی ہوں تو وہ چیز ان دونوں کے درمیان تقسیم کر دی جائے

(۱۳) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا اِلَيْهِ فِيْ مَوَارِيْثَ لَمْ تَكُنْ لَهُمَا بَيِّنَةٌ اِلَّا دَعْوَاهُمَا فَقَالَ مَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِشَيْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِيْهِ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ فَقَالَ الرَّجُلَانِ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَقِّيْ هٰذَا لِصَاحِبِيْ فَقَالَ لَا وَلٰكِنِ اذْهَبَا فَاقْتَسِمَا وَتَوَخَّيَا الْحَقَّ ثُمَّ اسْتَهِمَا ثُمَّ لِيُحَلِّلْ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْكُمَا صَاحِبَهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ اِنَّمَا اَقْضِيْ بَيْنَكُمَا بِرَاْيِيْ فِيْمَا لَمْ يُنْزَلْ عَلَيَّ فِيْهِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ام سلمہؓ نبی کریم ﷺ سے دو آدمیوں کے قضیہ کے بارے میں نقل کرتے ہیں جو اپنا ایک میراث کا معاملہ لے کر

آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تھے اور ان دونوں میں سے کسی کا کوئی گواہ نہیں تھا بلکہ صرف دعوی ہی دعوی تھا (یعنی ان میں سے ایک شخص نے دربار رسالت میں دعوی کیا کہ فلاں چیز میری ہے جو مجھے میراث میں ملی ہے اور دوسرے شخص نے بھی اسی چیز کے بارے میں یہی دعوی کیا اور دونوں میں سے کوئی بھی اپنے دعوی کے ثبوت میں گواہ نہیں رکھتا تھا) آپ ﷺ نے (ان دونوں کے جواب سن کر) فرمایا۔" (یادرکھو) میں جس شخص کے لئے کسی ایسی چیز کا فیصلہ کردوں جو اس کے بھائی کا حق ہو تو وہ چیز اس کے لئے آگ کے ایک ٹکڑے کے علاوہ کچھ نہیں ہوگی (یعنی اگر مثلاً مدعی نے کسی ایسی چیز کا دعوی کیا ہے جس کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی نہیں ہے بلکہ واقعۃً مدعاعلیہ کی ہے لیکن اس نے جھوٹے گواہوں یا جھوٹی قسم کے ذریعہ اپنا دعوی ثابت کردیا اور میں نے ظاہری قانون کے مطابق اس کی گواہیوں اور قسم پر اعتبار کر کے اس کے حق میں فیصلہ کردیا اور وہ چیز اس کو دلوادی تو اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ چیز اس کے حق میں آگ کا ایک ٹکڑا ثابت ہوگی یعنی اس کو دوزخ کی آگ کا سزاوار بنائے گی) ان دونوں میں سے ہر ایک نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "یارسول اللہ! میرا حق میرے ساتھی (یعنی فریق مخالف) کے لئے ہے (میں اپنا دعوی ترک کرتا ہوں)" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! (یہ کیسے ممکن ہے کہ چیز ایک ہو اور اس کے حق دار دو ہوں) بلکہ تم دونوں جاؤ اس چیز کو (آدھوں آدھ) تقسیم کرلو اور اپنا اپنا حق لے لو (یعنی تقسیم میں عدل و ایمانداری کو ملحوظ رکھو) اور (یہ طریقہ اختیار کرو کہ پہلے اس چیز کے دو حصے کو لو (اور اگر یہ تنازعہ ہو کہ ان دونوں حصوں میں سے کون سا حصہ کس کو ملے تو) ان دونوں حصوں کو قرعہ پر ڈال لو (تاکہ طے ہو جائے کہ ان دونوں حصوں میں کون سا حصہ کس شخص کو ملے گا اس طرح تم دونوں میں سے ہر ایک اس حصہ کو لے لے جس پر اس کا قرعہ نکلا ہے اور پھر تم میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ وہ اپنا (وہ) حق اپنے ساتھی کو معاف کردے (جو اس کی طرف سے چلا گیا ہو۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "میں تم دونوں کے درمیان یہ فیصلہ اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے کر رہا ہوں۔ اس معاملہ میں مجھ پر وحی نازل نہیں ہوئی ہے۔" (ابوداؤد)

قابض کے حق میں فیصلہ

⑭ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ رَجُلَيْنِ تَدَاعَيَادَابَّةً فَاَقَامَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا الْبَيِّنَةَ اِنَّهَا دَابَّتُهُ نَتَجَهَا فَقَضٰى بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ يَدِهِ۔ (رواه فی شرح السنۃ)

"اور حضرت جابر ابن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے دربار رسالت میں) ایک جانور کے بارے میں دعوی کیا اور ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے گواہ پیش کئے کہ یہ جانور اس کا (یعنی میں نے ہی اس کی ماں پر نر کو چھوڑا تھا جس کے نتیجہ میں یہ پیدا ہوا اور اس طرح اس کے پیدا ہونے کا میں ہی سبب بنا تھا گویا ان دونوں میں سے ہر ایک نے یہی دعوی کیا) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس جانور کو اس شخص کا حق قرار دیا جس کے وہ قبضے میں تھا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کوئی ایسا قضیہ ہو جس میں کسی چیز کی ملکیت کو ثابت کرنے لئے دونوں فریق اپنے اپنے گواہ پیش کریں تو دونوں میں سے اس فریق کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی۔ جس کے قبضے میں وہ چیز ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حکم اس صورت کے لئے ہے جب کہ وہ قضیہ کسی جانور کے متعلق ہو اور ہر فریق یہ دعوی کرے کہ اس جانور کو اسی نے جنوایا ہے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ علماء نے کہا ہے کہ اگر کوئی ایسا قضیہ پیش ہو جس میں دو آدمیوں نے ایک جانور یا کسی چیز کی ملکیت کا دعوی کیا اور وہ جانور کسی ایک کے قبضے میں ہو تو اس جانور یا اس چیز پر قابض کا حق تسلیم کیا جائے گا اور اس سے قسم کھلوائی جائے گی۔ ہاں اگر فریق مخالف نے اپنے گواہ پیش کردیئے جنہوں نے یہ گواہی دی کہ یہ جانور یا یہ چیز قابض کی نہیں ہے بلکہ اس فریق کی ہے تو وہ جانور یا وہ چیز قابض سے لے کر دوسرے فریق کے حوالے کرادی جائے گی اور اگر یہ صورت ہو کہ دونوں ہی فریق اپنے اپنے گواہ پیش کردیں تو پھر

قابض کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی۔

حنفی مسلک میں یہ مسئلہ اس طرح ہے کہ مذکورہ صورت میں (یعنی جب کہ دونوں فریق اپنے اپنے گواہ پیش کریں) قابض کے گواہوں کا اعتبار نہ کیا جائے بلکہ دوسرے فریق کے گواہوں کا اعتبار کیا جائے اور وہ چیز قابض کے قبضے سے نکلوا کہ دوسرے فریق کے سپرد کر دی جائے، لیکن اگر دعوی کا تعلق جانور کے جنوانے سے ہو یعنی ہر فریق یہ دعوی کرے کہ یہ جانور میری ملکیت ہے اور میں نے اس کو جنوایا ہے اور پھر ہر ایک اپنے دعوی پر گواہ پیش کرے تو پھر قابض کے لئے فیصلہ کیا جائے گا اور اگر قضیہ کا تعلق کسی ایسی چیز سے ہو جو دونوں فریق کے قبضے میں ہو اور دونوں فریق اس کے پورے حصے پر اپنی اپنی ملکیت کا دعوی کریں تو دونوں سے قسم کھلوائی جائے اور اس چیز کو دونوں کے درمیان ہر ایک کے قبضے کے مطابق تقسیم کر دی جائے اسی طرح اگر وہ چیز ان میں سے کسی ایک کے بھی قبضے میں نہ ہو مگر دونوں ہی اپنے اپنے دعوی کے ثبوت میں گواہ پیش کریں تو اس چیز کو دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔

دو مدعیوں کے درمیان متنازعہ مال کی تقسیم

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ اَنَّ رَجُلَیْنِ ادَّعَیَا بَعِیْرًا عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَبَعَثَ کُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا شَاهِدَیْنِ فَقَسَمَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَیْنَهُمَا نِصْفَیْنِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ۔ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهُ وَلِلنَّسَائِیِّ وَابْنِ مَاجَةَ اَنَّ رَجُلَیْنِ ادَّعَیَا بَعِیْرًا لَیْسَتْ لِوَاحِدٍ مِنْهُمَا بَیِّنَةٌ فَجَعَلَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَیْنَهُمَا۔

"اور حضرت ابوموسی اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے بارے میں دعوی کیا (یعنی ہر ایک نے کہا یہ اونٹ میرا ہے) اور پھر ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے (اپنے دعوی کے ثبوت میں) دو دو گواہ پیش کئے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس اونٹ کو ان دونوں کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم کر دیا۔" (ابوداؤد) اور ابوداؤد کی ایک اور روایت نیز نسائی وابن ماجہ کی روایت میں یوں ہے کہ دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے بارے میں دعوی کیا لیکن ان دونوں میں سے کسی کے پاس گواہ نہیں تھے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس اونٹ کو دونوں کا مشترکہ حق قرار دیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "اس اونٹ کو ان دونوں میں آدھوں آدھ تقسیم کر دیا۔" کے بارے میں خطابیؒ کہتے ہیں کہ شاید وہ اونٹ دونوں کے قبضے میں ہو گا۔ اور ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ۔ یا وہ اونٹ کسی ایسے تیسرے آدمی کے قبضہ میں ہو گا جو اس اونٹ کے بارے میں ان دونوں سے کوئی تنازعہ رکھتا تھا۔

پہلی روایت میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ دونوں مدعی اپنے اپنے گواہ رکھتے تھے جب کہ دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کے پاس بھی گواہ نہیں تھے؟ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ دونوں روایتوں میں مذکور قضیئے الگ الگ ہوں، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں ہے کہ روایتوں کا تعلق ایک ہی قضیئے سے ہو۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ پہلی روایت میں تو نفس واقعہ کا بیان ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے دعوی کے ثبوت میں گواہ رکھتا ہے اور دوسری روایت میں حقیقت حکم کا بیان ہے کہ جب دونوں نے گواہ پیش کئے تو دونوں کی گواہیاں باہم متعارض ہونے کی بنا پر ساقط قرار پائیں لہٰذا وہ دونوں ہی ایسے دو مدعیوں کی مانند ہوئے جو گواہ نہ رکھتے ہوں۔ "اس اعتبار سے "ان دونوں میں سے کسی کے پاس گواہ نہیں تھے۔" کے معنی یہ ہوں گے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی اس طرح کے گواہ نہیں تھے جن کو دوسرے کے گواہوں پر ترجیح دی جا سکتی ہو۔

"اس اونٹ کو ان دونوں کا مشترکہ حق قرار دیا" کے بارے میں ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر دو آدمی کسی ایک چیز کی ملکیت کا دعوی کریں اور ان میں سے کسی کے پاس گواہ نہ ہوں یا ان میں سے ہر ایک کے پاس گواہ ہوں اور وہ چیز دونوں کے قبضے میں ہو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کے بھی قبضے میں نہ ہوں تو اس چیز کو ان دونوں کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم کیا

جائے۔

⑯ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَجُلَیْنِ اِخْتَصَمَا فِیْ دَابَّۃٍ وَلَیْسَ لَھُمَا بَیِّنَۃٌ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اسْتَھِمَا عَلَی الْیَمِیْنِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں کا ایک جانور کے بارے میں تنازعہ ہوا (کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اس جانور کو اپنی ملکیت کہتا تھا) اور ان دونوں کے پاس گواہ نہیں تھے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "قسم کھانے پر قرعہ ڈال لو (جس کے نام قرعہ نکل آئے وہ قسم کھا کر کہے کہ یہ جانور میرا ہے اسی کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے گا۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس روایت میں جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ اس روایت کے حکم کی مانند ہے جو پہلی فصل کے آخر میں ذکر کی گئی ہے اور جس کو حضرت ابوہریرہؓ ہی نے نقل کیا ہے۔

مدعاعلیہ کی قسم

⑰ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِرَجُلٍ حَلَّفَہٗ اِحْلِفْ بِاللّٰہِ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَمَالَہٗ عِنْدَکَ شَیْءٌ یَعْنِی لِلْمُدَّعِیْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (ایک قضیہ میں) جس شخص یعنی مدعاعلیہ) سے قسم کھلوائی جاتی تھی اس سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم اس بات پر اللہ کی قسم کھاؤ جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ اس شخص (یعنی مدعی) کا تم پر کوئی حق نہیں ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: جیسا کہ پہلے بتایا گیا اگر مدعی اپنے دعوی کے ثبوت میں گواہ پیش نہ کر سکے اور مدعاعلیہ اس کے دعوی سے انکار کرے تو اس کے مطالبہ پر مدعاعلیہ کو قسم کھانا ضروری ہوگا اور وہ اس طرح قسم کھائے گا کہ "میں اس خدائے واحد کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ اس شخص (یعنی مدعی) نے مجھ پر اپنے جس حق کا دعوی کیا ہے وہ مبنی بر صداقت نہیں ہے اور اس کا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے۔"

قسم وحلف کے سلسلے میں یہ ضابطہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ حلف، قاضی یعنی حاکم عدالت دے گا مسلمان سے خدائے واحد کا حلف لیا جائے گا، عیسائی کو خدائے انجیل کا، یہودی کو خدائے تورات کا اور مجوسی وغیرہ کو صرف خدا کا حلف دیا جائے گا۔

یہ بات بھی پہلے بتائی جا چکی ہے کہ مدعاعلیہ کی قسم کا بہر صورت اعتبار ہو گا خواہ وہ عادل (سچا) ہو یا فاجر (جھوٹا) ہو ہاں اگر قاضی یعنی حاکم عدالت کو سچی گواہی کے ذریعہ اس کے حلف کا جھوٹ معلوم ہو جائے گا تو اس صورت میں اس کا حلف کالعدم ہو جائے گا۔

مدعاعلیہ کو حلف کا حق دیا جائے گا خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو

⑱ وَعَنِ الْاَشْعَثِ بْنِ قَیْسٍ قَالَ کَانَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ رَجُلٍ مِنَ الْیَھُوْدِ اَرْضٌ فَجَحَدَنِیْ فَقَدَّمْتُہٗ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلَکَ بَیِّنَۃٌ قُلْتُ لَا قَالَ لِلْیَھُوْدِیِّ اِحْلِفْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِذَنْ یَحْلِفُ وَیَذْھَبُ بِمَالِیْ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا الْاٰیَۃَ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

"اور حضرت اشعثؓ ابن قیس سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا "ایک زمین میرے اور ایک یہودی کے درمیان مشترک تھی لیکن یہودی نے (اس زمین پر) میرے حصے (کو تسلیم کرنے) سے انکار کر دیا، چنانچہ میں اس کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گیا اور اپنا معاملہ پیش کیا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "کیا تمہارے پاس گواہ ہیں؟" میں نے عرض کیا "نہیں" آنحضرت ﷺ نے یہودی سے فرمایا کہ "تم قسم کھاؤ" میں نے یہ (سن کر) عرض کیا کہ "یارسول اللہ! یہ اس وقت قسم کھالے گا اور میرا مال ہڑپ کر لے گا۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اسی طرح کے ایک قضیہ کے سلسلے میں جس کا ذکر حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں گزر چکا ہے) یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا

قَلِیلاً (الآیۃ) یقیناً جو لوگ معاوضہ حقیر لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو اللہ تعالیٰ سے انہوں نے کیا ہے اور (بمقابلہ) اپنی قسموں کے الخ اس روایت کو ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حدیث میں جو آیت نقل کی گئی ہے وہ دراصل اس قضیہ کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی جو حضرت ابن مسعودؓ کی روایت (نمبر ۲) میں بیان ہوا ہے، چونکہ اس روایت میں جو قضیہ ذکر کیا گیا ہے وہ بھی اس قضیہ کی مانند ہے اس لئے یہاں اسی آیت کا حوالہ دیا گیا۔ پوری روایت حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کی تشریح میں نقل کی جا چکی ہے۔

حضرت اشعثؓ کا نقطہ اعتراض یہ تھا کہ اس یہودی کو قسم کھانے کا حکم دیا جارہا ہے اور اس کی قسم پر فیصلہ کا انحصار ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ بطور خاص مالی معاملات میں یہودیوں کی فطرت کیا ہے، اس یہودی کے لئے اس میں کوئی باک نہیں ہے کہ یہ میرا مال ہڑپ کرنے کے لئے جھوٹی قسم کھالے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس کی قسم پر فیصلہ کا انحصار نہ رکھا جائے۔ حضرت اشعثؓ کے اس نقطہ اعتراض کے جواب میں صرف اس آیت کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے جو اس سلسلہ میں نازل ہوئی تھی، لہٰذا اس آیت کو ذکر کرنا گویا آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا ہے کہ شریعت نے اس صورت کے لئے جو ضابطہ مقرر کیا ہے وہ یہی ہے کہ مدعا علیہ سے قسم لی جائے اور چونکہ اس طرح کے قضیہ میں قسم کھانا مدعا علیہ کا حق ہے اس لئے کسی نقطۂ اعتراض کی بنا پر مدعا علیہ کو اس حق سے محروم کرنا اس مقررہ ضابطہ کی خلاف ورزی کرنا ہے جو ہمارے لئے غیر موزوں بات ہے۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی مدعا علیہ اپنے اس حق سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور اس مقصد سے جھوٹی قسم کھاتا ہے کہ مدعی کا مال ہڑپ کرے تو اس کو آگاہ ہو جانا چاہئے کہ اس کی اس جھوٹی قسم کا وبال اس کی گردن پر ہوگا، اور جیسا کہ قرآن مجید نے اعلان کیا ہے۔ اس شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

جھوٹی قسم کے ذریعہ دوسرے کا مال ہڑپ کرنے والے کے بارے میں وعید

(۱۹) وَعَنْهُ اَنَّ رَجُلاً مِنْ كِنْدَةَ وَرَجُلاً مَنْ حَضْرَ مُوْتَ اخْتَصَمَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ اَرْضٍ مِنَ الْيَمَنِ فَقَالَ الْحَضْرَمِىُّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَرْضِىْ اِغْتَصَبَنِيْهَا اَبُوْ هٰذَا وَهِىَ فِىْ يَدِهٖ قَالَ هَلْ لَكَ بَيِّنَةٌ قَالَ لَا وَلٰكِنْ اُحَلِّفُهٗ وَاللّٰهِ مَايَعْلَمُ اَنَّهَا اَرْضِىْ اِغْتَصَبَنِيْهَا اَبُوْهُ فَتَهَيَّأَ الْكِنْدِىُّ لِلْيَمِيْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْطَعُ اَحَدٌ مَالاً بِيَمِيْنٍ اِلَّا لَقِىَ اللّٰهَ وَهُوَ اَجْذَمُ فَقَالَ الْكِنْدِىُّ هِىَ اَرْضُهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت اشعثؓ ابن قیس سے روایت ہے کہ قبیلہ کندہ کا ایک شخص اور حضر موت کا ایک شخص دونوں یمن کی ایک زمین کے بارے میں اپنا قضیہ لے کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرمی نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! اس شخص کے باپ نے میری زمین مجھ سے چھین لی تھی اور اب وہ اس کے قبضہ میں ہے" (میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری وہ زمین مجھ کو واپس دلوائی جائے)" آنحضرت ﷺ نے حضرمی سے فرمایا کہ "کیا تمہارے پاس گواہ ہیں (جو گواہی دے سکیں کہ وہ زمین واقعۃً تمہاری تھی؟) اس نے عرض کیا کہ "نہیں! لیکن میں اس سے خدا کی قسم کھلوا کر یہ اقرار کراؤں گا کہ وہ نہیں جانتا کہ وہ زمین میری (حضرمی کی) ہے جس کو اس کے باپ نے مجھ سے چھین لیا ہے۔" چنانچہ وہ (کندی) قسم کھانے کے لئے تیار ہو گیا (اور جب قسم کھانے چلا) تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "(یاد رکھو) جو بھی شخص (جھوٹی) قسم کھا کر کسی کا مال ہڑپ کرے گا وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا اس کا ہاتھ کٹا ہوگا۔" کندی نے یہ (سن کر) کہا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ) وہ زمین اسی شخص کی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: الا لقی اللہ وھو اجذم جذام ایک مشہور بیماری کا نام ہے جس میں اعضائے جسمانی سڑ گل جاتے ہیں ویسے لغت میں "جذام" کی اصل "جذم" ہے جس کے معنی ہیں "کاٹنا۔ جلدی سے کاٹنا۔" نیز یہ لفظ قطع ید یعنی ہاتھ کاٹنے یا کٹے ہوئے ہاتھ" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں حدیث میں یہ لفظ "قطع ید" ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس سے مراد ہے "برکت ہونا اور بھلائی سے

خالی ہونا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا:

مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ثُمَّ نَسِيَهٗ لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ اَجْذَمُ۔

"یعنی جس شخص نے قرآن سیکھا (یاد کیا) پھر اس کو بھول گیا تو اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہو گا۔ یعنی بے برکت۔"

بعض حضرات یہ کہتے ہیں یہاں اجذم سے مراد "مقطوع الحجۃ" (بے دلیل) ہے یعنی وہ شخص اس حال میں بارگاہ رب العزت میں حاضر ہو گا کہ اس کے پاس نہ تو اپنے دین و دیانت کی اور خدا ترسی و حقوق شناسی کی بظاہر کوئی دلیل ہو گی جس سے وہ اپنی نجات کا راستہ تلاش کر سکے اور نہ اس کے پاس ایسی زبان ہو گی جس کے ذریعہ وہ عرض معروض کی جرأت کر سکے۔

جھوٹی قسم کھانا ایک بڑا گناہ ہے

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اُنَيْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَكْبَرِ الْكَبَائِرِ الشِّرْكَ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقَ الْوَالِدَيْنِ وَالْيَمِيْنَ الْغَمُوْسَ وَمَا حَلَفَ حَالِفٌ بِاللّٰهِ يَمِيْنَ صَبْرٍ فَاَدْخَلَ فِيْهَا مِثْلَ جَنَاحِ بَعُوْضَةٍ اِلَّا جُعِلَتْ نُكْتَةً فِيْ قَلْبِهٖ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہؓ بن انیسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بڑے گناہوں میں سب سے بڑے گناہ یہ ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا (۲) ماں باپ کی نافرمانی کرنا (۳) اور جھوٹی قسم کھانی (یاد رکھو) جس قسم کھانے والے نے بھی مجبوری و قید کی حالت میں خدا کی قسم کھائی اور اس قسم میں مچھر کے بازو کے برابر (یعنی تھوڑا سا) بھی جھوٹ شامل کیا تو اس کے دل میں قیامت تک کے لئے ایک نکتہ پیدا ہو جائے گا (جس کا وبال آخرت میں ظاہر ہو گا)" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "غموس" دراصل "غمس" سے ہے جس کے معنی ہیں "غوطہ دینا" اور "یمین غموس" کسی گذری بات پر دیدہ و دانستہ جھوٹی قسم کھانے کو کہتے ہیں۔ حنفی مسلک کے مطابق ایسی قسم کھانے والے پر کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ لیکن اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ توبہ استغفار کرے اور آیندہ اس طرح جھوٹی قسم نہ کھانے کا پختہ عہد کرے کیونکہ یمین غموس کے بارے میں دوزخ کی آگ سے ڈرایا گیا ہے چنانچہ ایسی قسم "کو غموس" اسی اعتبار سے کہتے ہیں کہ وہ ایسی قسم کھانے والے کو دوزخ کی آگ میں غوطہ دے گی۔ نیز غیر کا حق دوسرے کا مال ہڑپ کرنے کے لئے جو جھوٹی قسم کھائی جاتی ہے وہ اسی قبیل سے (یعنی یمین غموسؒ کی قسم سے) ہے۔

یمین صبر (یعنی مجبوری و قید کی حالت میں قسم کھانا، کی تفصیل پہلی فصل (حدیث نمبر۲) کی تشریح میں گذر چکی ہے نتیجہ کے اعتبار سے "یمین صبر" بھی "یمین غموس" کے مفہوم میں داخل ہے کہ جس طرح یمین غموس میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ بلکہ آخرت کی سزا (یعنی دوزخ کی آگ) ملتی ہے اسی طرح "یمین صبر" میں بھی کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی سزا بھی آخرت ہی میں ملے گی۔

جعلت نکتۃ فی قلبہ الی یوم القیامۃ (اس کے دل میں قیامت تک کے لئے ایک نکتہ پیدا ہو جائے گا) کا مطلب یہ ہے کہ اس نکتہ (داغ) کا اثر زنگ کی طرح ہے کہ وہ اپنی قسم میں تھوڑے سے بھی جھوٹ کی آمیزش کرنے والے شخص کے دل پر قیامت تک ہو گا پھر قیامت میں اس کا وبال اس طرح ظاہر ہو گا کہ اس کو عذاب خداوندی میں مبتلا کیا جائے گا۔ اس سے عبرت پکڑنی چاہئے جب کہ تھوڑے سے جھوٹ کی آمیزش کرنے کا انجام یہ ہے تو اس صورت میں کیا حشر ہو گا جب کہ جس بات پر قسم کھائی جائے وہ سرے جھوٹ ہو۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں تین چیزوں کو ذکر کیا جو بڑے گناہوں میں سب سے بڑے گناہ ہیں اور پھر ان تینوں میں سے صرف آخر کے بارے میں وعید بیان فرمائی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ بھی سب سے بڑے گناہوں میں داخل ہے اور لوگ یہ گمان کر کے عدالت میں جھوٹی قسم کھانا گناہ کے اعتبار سے شرک اور ماں باپ کی نافرمانی کی طرح نہیں ہے اس کو کمتر نہ جانیں اسی طرح آگے حضرت

خزیمہؓ ابن فاتک کی جو روایت آئے گی اس کے یہ الفاظ عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاكِ بِاللّٰهِ سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ یہ بھی "اکبر کبائر" میں داخل ہے۔

(۲۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحْلِفُ اَحَدٌ عِنْدَ مِنْبَرِيْ هٰذَا عَلٰى يَمِيْنٍ اٰثِمَةٍ وَلَوْ عَلٰى سِوَاكٍ اَخْضَرَ اِلَّا تَبَوَّاَ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ اَوْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ۔ (رواہ مالک وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو بھی شخص میرے اس منبر کے پاس قسم کھاتا ہے اور اس کی وہ قسم جھوٹی ہوتی ہے اگرچہ وہ ایک سبز مسواک ہی کے لئے کیوں نہ ہو تو وہ (دوزخ کی) آگ میں اپنا ٹھکانہ تیار کرتا ہے۔ یا یہ فرمایا کہ۔ اس کے لئے (دوزخ کی) آگ واجب ہوتی ہے۔" (مالکؒ ، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: منبر کے پاس قسم کھانے کی قید اس لئے لگائی کہ وہ ایک مقدس و باعظمت جگہ ہے وہاں جھوٹی قسم کھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ ورنہ مطلق جھوٹی قسم کھانا خواہ جہاں بھی کھائی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے عذاب کو واجب کرتا ہے۔

"سبز مسواک" کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ وہ ایک حقیر ترین چیز ہوتی ہے جب کہ خشک ہو جانے کے بعد اس میں قدر و قیمت پیدا ہو جاتی ہے۔ حاصل یہ کہ مسواک بذات خود بہت معمولی و حقیر چیز ہے۔ جب کہ خشک ہونے سے پہلے تو اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی۔ جب اس کے لئے جھوٹی قسم کھانا اتنی بڑی وعید کا محمول ہے تو جو لوگ عدالتوں میں بڑی بے باکی کے ساتھ بڑی سے بڑی چیز کے لئے جھوٹی قسمیں کھاتے پھرتے ہیں ان کا حشر کیا ہوگا ؟

جھوٹی گواہی، شرک کے برابر ہے

(۲۲) وَعَنْ خُرَيْمِ بْنِ فَاتِكٍ قَالَ صَلّٰى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الصُّبْحِ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَامَ قَائِمًا فَقَالَ عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاكِ بِاللّٰهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَرَاَ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ عَنْ اَيْمَنَ بْنِ خُرَيْمٍ اِلَّا اَنَّ ابْنَ مَاجَةَ لَمْ يَذْكُرِ الْقِرَاءَةَ۔

"اور حضرت خریمؓ ابن فاتک کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ جب صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو (صحابہؓ سے خطاب کرنے کے لئے کھڑے ہوئے اور تین مرتبہ یہ الفاظ فرمائے کہ "جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر کی گئی ہے۔" اس کے بعد آپ ﷺ نے (بطور دلیل) یہ آیت تلاوت فرمائی فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ پلیدی (بتوں کی پرستش) سے بچو اور جھوٹ بولنے سے اجتناب کرو، کیونکہ تم باطل سے حق کی طرف رجوع کرنے والے ہو نہ کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے ہو۔ اس روایت کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے نیز اس روایت کو احمد و ترمذی نے بھی ایمن ابن خریم سے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ کی نقل کردہ روایت میں آیت شریفہ کا تلاوت کرنا مذکور نہیں ہے۔"

تشریح: "جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر کی گئی ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ شرک کرنا اور جھوٹی گواہی دینا دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ کیونکہ شرک کا مطلب ہے "اللہ تعالیٰ کی طرف اس چیز کا جھوٹ بولنا جو جائز نہیں ہے۔" اس اعتبار سے چونکہ ان دونوں کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا لہٰذا حکم میں بھی دونوں برابر ہوئے۔

کن لوگوں کی گواہی کا اعتبار نہیں؟

(۲۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ وَلَا مَجْلُوْدٍ حَدًّا وَلَا ذِيْ غِمْرٍ عَلٰى اَخِيْهِ وَلَا ظَنِيْنٍ فِيْ وَلَاءٍ وَلَا قَرَابَةٍ وَلَا الْقَانِعِ مَعَ اَهْلِ الْبَيْتِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ

وَيَزِيْدُ بْنُ زِيَادِ الدِّمَشْقِيُّ الرَّاوِيْ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ان لوگوں کی گواہی جائز و معتبر نہیں۔ ① خیانت کرنے والے مرد اور خیانت کرنے والی عورت ② جس شخص پر تہمت کی حد جاری کی گئی ہو ③ دشمن، جو اپنے (مسلمان) بھائی کے خلاف ہو ④ وہ شخص جو ولاء کے بارے میں متہم ہو ⑤ وہ شخص جو قرابت کے بارے میں متہم ہو۔ ⑥ وہ شخص جو کسی ایک گھر پر قانع ہو۔" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے نیز اس حدیث کا ایک راوی یزید ابن زیاد دمشقی منکر الحدیث ہے۔"

تشریح: اسلام کی رو سے گواہ کا عادل ہونا اتنا ہی ضروری ہے جس قدر حاکم کا عادل ہونا کیونکہ گواہی ایک ایسا اہم درمیانی وسیلہ ہے جو عدالت کو عدل تک پہنچنے میں فیصلہ کن مدد دیتا ہے، اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حدیث میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ چونکہ عدل کے معیار پر پورے نہیں اترتے اس لئے ان کی گواہی کو ناقابل اعتبار قرار دیا گیا ہے خیانت کرنے والا مرد الخ میں "خیانت سے" لوگوں کی امانتوں میں خیانت مراد ہے، یعنی ان مردوں اور عورتوں کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا جو لوگوں کی امانتوں میں خیانت کرنے والے مشہور ہوں اور ان کا جرم خیانت بار بار سرزد ہونے کی وجہ سے لوگوں پر عیاں ہو۔ ورنہ تو ظاہر ہے کہ (خیانت) ایک ایسا مخفی جرم ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ہوتا ہے مگر عام طور سے بندوں پر عیاں نہیں ہوتا۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہاں "خیانت" سے مراد فسق ہے خواہ وہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب اور گناہ صغیرہ پر اصرار کی صورت میں ہو یا احکام دین اور فرائض دین کی عدم بجا آوری کی شکل میں ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دین کے حکام کو بھی "امانت" فرمایا ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ارشاد ہے

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (الاحزاب ۳۳:۷۲)

"تحقیق ہم نے امانت (یعنی اپنے دین کے بار کو) آسمانوں اور زمین پر پیش کیا الخ۔"

اور دین کے احکام کو بجا نہ لانے کو "خیانت" فرمایا جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ارشاد ہے۔

لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْآ اَمٰنٰتِكُمْ۔ (الانفال ۸:۲۷)

"نہ تو خدا اور اس کے رسول کی امانت (یعنی دین کے امور) میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔"

اس صورت میں اول تو حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ جو مرد و عورت احکام شرع اور فرائض دین کی بجا آوری نہ کرتے ہوں یا گناہ کبیرہ کے ارتکاب اور گناہ صغیرہ پر اصرار کرتے ہوں ان کی گواہی معتبر نہیں ہوگی۔ دوسرے یہ کہ آگے آنے والی حدیث میں "خیانت کے بعد "زنا" کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ "تخصیص بعد تعمیم" کے طور پر ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ یہ تاویل (یعنی خیانت سے فسق مراد لینا، اولیٰ ہے ورنہ دوسری صورت میں ان تمام برائیوں اور گناہوں کا ذکر باقی رہ جائے گا۔ جن کا ارتکاب قبول گواہی سے مانع ہے اور ان سب کو چھوڑ کی صرف خیانت کا ذکر کرنا سمجھ میں نہیں آئے گا۔

جس شخص پر تہمت کی حد جاری کی گئی ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی پاکدامن پر زنا کی تہمت لگائی ہو اور اس کی سزا میں اس پر حد قذف جاری کی گئی ہو تو اس شخص کی گواہی قابل قبول نہیں ہوگی اگرچہ وہ اس سے توبہ بھی کرلے۔

اس بارہ میں فقہی مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ حد قذف کے علاوہ اور دوسرے تمام حدود میں یہ رعایت حاصل ہے کہ جس شخص پر حد جاری ہوئی ہو اگر وہ توبہ کرے تو اس کی گواہی قبول ہوگی، توبہ سے پہلے تو اس کی گواہی ناقابل اعتبار قرار پائے گی جب کہ حد قذف میں یہ سزا ہے کہ جس شخص پر یہ حد جاری ہوئی اگر وہ توبہ بھی کرے تو اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی لیکن دوسرے آئمہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ تمام ہی حدود سے متعلق ہے کہ اگر کسی شخص پر حد جاری ہوگئی تو اس کے توبہ کر لینے

کے بعد اس کی گواہی قبول کی جائے گی خواہ وہ حد تہمت کے جرم میں جاری ہوئی ہو یا کسی اور گناہ (جیسے زنا) کی وجہ سے۔
"دشمن جو اپنے خلاف ہو" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آپس میں ایک دوسرے سے دشمنی و عداوت رکھتے ہوں ان کی ایک دوسرے کے بارے میں گواہی معتبر نہیں ہوگی خواہ وہ دونوں آپس میں نسبی بھائی ہوں یا اجنبی "یعنی دینی بھائی" ہوں۔
"وہ شخص جو ولاء کے بارے میں متہم ہو۔" کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص زید ایک دوسرے بکر کا غلام تھا اور بکر نے اس کو آزاد کر دیا تھا اب زید اپنی آزادی کو ایک تیسرے شخص کی طرف منسوب کرتا یعنی یوں کہتا ہے کہ میں عمرو کا آزاد کیا ہوا ہوں، حالانکہ وہ اپنی بات میں جھوٹا ہے اور وہ اپنے اس جھوٹ میں مشہور ہے کہ لوگ عام طور پر اس کے جھوٹے انساب پر اس کو متہم کرتے ہیں اور اس کی تکذیب کرتے ہیں ایسے شخص کی گواہی بھی قابل قبول نہیں ہوگی کیونکہ وہ اپنے اس کہنے کی وجہ سے "فاسق" ہے چنانچہ آزاد کرنے والے کے ولاء (یعنی آزاد کرنے پر حاصل ہونے والے حق کو قطع کرنا اور اس کی ولاء کی نسبت کسی ایسے شخص کی طرف کرنا جس نے حقیقت میں اس کو آزاد نہیں کیا ہے گناہ کبیرہ ہے اور اس کے مرتکب کے بارے میں سخت وعید وتنبیہ وارد ہے۔ یہ حکم قرابت کے بارے میں بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی قرابت میں غلط بیانی کرے یعنی یوں کہے کہ میں فلاں شخص مثلاً زید کا بیٹا ہوں لیکن اس کی غلط بیانی پر لوگ اس کو متہم کرتے ہوں اور اس کی تکذیب کرتے ہوئے کہتے ہوں کہ یہ زید کا بیٹا نہیں ہے بلکہ حقیقت میں بکر کا بیٹا ہے تو اس کی گواہی بھی قابل قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس کا یہ جھوٹ بھی "فسق" ہے اور اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف اپنی نسبت کرنے والے کے بارے میں لعنت وارد ہوئی ہے۔
وہ شخص جو کسی ایک گھر پر قانع ہو۔" ایسا شخص وہ سائل ہے جو کم سے کم پیٹ بھرنے پر قناعت کر لیتا ہو یا جس کی روزی کسی ایک گھر سے متعلق ہو اور یا جو کسی ایک گھر کا ہو رہا ہو۔ لیکن یہاں وہ شخص مراد ہے جو کسی کے زیر نفقہ ہو یعنی جس کا گزر کسی کے دینے پر ہوتا ہو جیسے خادم و تابع۔ ایسے شخص کی گواہی اس کے مخدوم و متبوع کے حق میں قابل قبل نہیں ہوگی کیونکہ اول تو یہ احتمال ہے کہ وہ اپنی محتاجی کی وجہ سے اپنے مخدوم و متبوع کی ناروا طرف داری کرے اور سچی بات نہ کہے اور دوسرے یہ کہ اپنے مخدوم و متبوع کے حق میں گواہی دینے کا مطلب یہ ہے کہ گویا وہ اپنی گواہی کے ذریعہ اس چیز کے منافع کو اپنی ذات سے متعلق کرتا ہے جو اس کی گواہی کے نتیجہ میں اس کے مخدوم و متبوع کو حاصل ہوگی یا بایں طور کہ جب اس کا کھانا پینا اس کے مخدوم و متبوع کے ذمہ ہے جس کے حق میں وہ گواہی دے رہا ہے تو اس مخدوم و متبوع کو اس کی گواہی کے ذریعہ جو مال حاصل ہوگا اس کے منافع اس کی ذات کو بھی حاصل ہوں گے۔ لہٰذا اپنے متبوع و مخدوم کے حق میں تابع و خادم کی گواہی کا وہی حکم ہوگا جو باپ اور بیٹے یا شوہر اور بیوی کی گواہی کا حکم ہے کہ جس طرح اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کے حق میں یا بیٹا اپنے باپ کے حق میں گواہی دے یا شوہر اپنی بیوی کے حق میں یا بیوی اپنے شوہر کے حق میں گواہی دے تو اس کی گواہی درست نہیں ہوگی اور اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان کا آپس میں ایک دوسرے کے حق میں گواہی دینا گویا اپنی ذات کے فائدے کے لئے گواہی دینا ہے اسی طرح مخدوم و متبوع کے حق میں تابع و خادم کی گواہی بھی درست نہیں ہے اور اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا! البتہ یہ واضح رہے کہ بھائی کے حق میں بھائی کی گواہی درست رہے گی اور اس کا اعتبار کیا جائے گا۔
"نیز اس حدیث کا ایک راوی یزید ابن زیاد دمشقی منکر الحدیث ہے" میں "منکر الحدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حدیث منکر ہے شرح نخبہ میں لکھا ہے کہ جس راوی سے کوئی فحش غلطی صادر ہوئی ہو یا اس پر غفلت و نسیان کا غلبہ ہو اور یا اس کا فسق ظاہر ہو تو اس صورت میں اس کی روایت کردہ حدیث "منکر" کہلائے گی۔"

۲۴ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ وَلَا زَانٍ وَلَا زَانِيَةٍ وَلَا ذِي غِمْرٍ عَلَى أَخِيهِ وَرَدَّ شَهَادَةَ الْقَانِعِ لِأَهْلِ الْبَيْتِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور ان کے والد اپنے دادا سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا نہ تو

خیانت کرنے والے مرد اور خیانت کرنے والی عورت کی گواہی درست ہے اور نہ زنا کرنے والے مرد اور زنا کرنے والی عورت کی گواہی درست ہے اسی طرح دشمن کی گواہی (اپنے) دشمن کے خلاف مقبول نہیں۔" نیز آنحضرت ﷺ نے (ایک مقدمہ میں) اس شخص کی گواہی کو رد کر دیا جو ایک گھر کی کفالت و پرورش میں تھا اور اس نے وہ گواہی اس کے گھر والوں کے حق میں دی تھی۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث کی وضاحت اس سے قبل کی حدیث کے ضمن میں کی جا چکی ہے۔

شہری کے حق میں یا اس کے خلاف جنگلی کی شہادت قبول ہوگی یا نہیں؟

(۲۵) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ بَدَوِيٍّ عَلٰى صَاحِبِ قَرْيَةٍ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "بستی میں رہنے والے کے حق میں یا اس کے خلاف، جنگل میں رہنے والے کی گواہی درست نہیں ہوگی۔" (ابوداؤد، ابن ماجہؒ)

تشریح: جنگل میں رہنے والے کی گواہی اس لئے درست نہیں کہ عام طور پر وہ نہ تو شریعت کے احکام کا علم رکھتا ہے اور نہ گواہی دینے کی شرائط و کیفیت کی واقفیت رکھتا ہے اسی طرح اس پر غفلت و نسیان کا غلبہ زیادہ رہتا ہے لہٰذا اگر جنگل میں رہنے والا گواہی کی ذمہ داریوں کا احساس رکھتا ہو اور دینے کی جو شرائط و کیفیات ہیں ان سے واقف ہو نیز عادل اہل شہادت کے زمرے میں آتا ہو تو اس کی گواہی درست و معتبر ہوگی۔

حضرت امام مالکؒ نے اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا ہے چنانچہ ان کے نزدیک کسی شہری کے حق میں یا اس کے خلاف جنگل میں رہنے والے کی گواہی جائز نہیں ہوگی، جب کہ اکثر ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ جنگل میں رہنے والا اگر عادل ہو اور گواہی کے معیار پر پورا اترتا ہو تو شہری کے حق یا اس کے خلاف اس کی گواہی درست و معتبر ہوگی۔ ان ائمہ کے نزدیک حدیث کے الفاظ لا یجوز گویا لا یحسن کے معنی میں ہیں اور "جنگلی کی گواہی کا جائز نہ ہونا" صفات مذکورہ کے نہ پائے جائے کے ساتھ مقید ہے۔

اپنے معاملے مقدمے میں دانائی و ہوشیاری کو ملحوظ رکھو

(۲۶) وَعَنْ عَوْفِ ابْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بَيْنَ رَجُلَيْنِ فَقَالَ الْمَقْضِيُّ عَلَيْهِ لَمَّا اَدْبَرَ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَلُوْمُ عَلَى الْعَجْزِ وَلٰكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَيْسِ فَاِذَا غَلَبَكَ اَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عوفؓ ابن مالک کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے دو شخصوں کے درمیان ایک مقدمہ کا فیصلہ دیا (جو ایک شخص کے خلاف اور دوسرے شخص کے حق میں تھا۔ چنانچہ مقدمہ کا فیصلہ جس شخص کے خلاف ہوا تھا اس نے مجلس نبوی ﷺ سے اٹھ کر) واپس جاتے ہوئے کہا کہ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ یعنی مجھ کو میرا اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کار ساز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ (سن کر) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نادانی و لاپرواہی پر ملامت کرتا ہے، تم کو چالاکی اور ہوشیاری ضروری ہے اگر تم پر کوئی مصیبت آپڑے تو حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے کچھ قرض لیا ہوگا اور وہ قرض اس نے ادا بھی کر دیا ہوگا لیکن اس سے یہ نادانی اور حماقت ہوئی کہ اس نے قرض واپس کرتے وقت قرض خواہ سے کوئی رسید نہ لی اور نہ کسی کو گواہ کیا، آخر مدعی (قرض خواہ)

نے بارگاہ رسالت میں اس شخص پر دعوی کر دیا چونکہ اس (مدعی) نے قرض دینے کا ثبوت پیش کر دیا ہوگا لیکن یہ شخص (مدعا علیہ) واپسی قرض کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا اس لئے مقدمہ فیصلہ اس کے خلاف ہوا اور مدعی نے ڈگری حاصل کرلی۔ جب وہ مقدمہ ہار کر دربار رسالت سے نکلا تو اس نے ازراہ غم وحسرت "حسبی اللہ ونعم الوکیل" کہا اور اس طرح اس نے یہ اشارہ کیا کہ مدعی نے مجھ سے ناحق مال لے لیا اور میں خواہ مخواہ نقصان اٹھا بیٹھا۔

اس پر رسول کریم ﷺ نے غصہ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنے کاروبار زندگی اور اپنے معاملات میں لاپرواہی نادانی اور غفلت وکوتاہی کوئی اچھی چیز نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے والے پر اللہ تعالیٰ ملامت کرتا ہے، پھر آپ نے تنبیہ فرمائی کہ تم کو لازم ہے کہ اپنے کاروبار اور اپنے معاملات میں ہوشیار وچوکس رہو اور احتیاط و دانائی اختیار کرو۔

حاصل یہ کہ غفلت وکوتاہی سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا کیونکہ حق تعالیٰ نے انسان کو عقل سلیم کی جس دولت سے نوازا ہے اس کا صحیح مقتضیٰ یہی ہے کہ بندہ اپنے تمام دینی ودنیاوی معاملات میں دانائی وہوشیاری کو ملحوظ رکھے لہٰذا اس معاملہ میں تم سے جو کوتاہی وغفلت سرزد ہوئی ہے اس کو اپنے عجز پر محمول کر کے حسبی اللہ ونعم الوکیل نہ کہو بلکہ آئندہ کے لئے اس بات کا عہد کرلو کہ پھر کبھی اس طرح کی غفلت وکوتاہی نہیں کرو گے اور احتیاط وہوشیاری کو بہرصورت ملحوظ رکھو گے۔

طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ گویا اس شخص پر یہ واضح کیا کہ لازم تو یہ تھا کہ تم اپنے، معاملے میں ہوشیار رہتے اور کسی کو گواہ بنا کر یا اس کے مانند کوئی اور ثبوت رکھ کر کوتاہی وغفلت میں مبتلا نہ ہوتے تاکہ جب تمہارا مقدمہ پیش ہوتا اور تم فیصلے کے لئے یہاں حاضر ہوتے تو گواہوں اور ثبوت کے ذریعہ مدعی کو ناحق ثابت کرنے پر قادر ہوتے مگر اب جب کہ تم اپنی غفلت وکوتاہی کی وجہ سے مدعی کے دعوی کو ناحق ثابت کرنے سے عاجز ہو تو حسبی اللہ ونعم الوکیل کہتے ہو حالانکہ حسبی اللہ ونعم الوکیل اس وقت کہا جاتا ہے جب کہ حصول مقصد کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور اپنی تمام تدابیر واحتیاط کے باوجود کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا، لہٰذا یہ ذہن نشین رہے کہ جب کوئی معاملہ کیا جائے اس میں پوری پوری احتیاط اور ہوشیاری کو ملحوظ رکھا جائے اور جب تمام تر امکانی احتیاط وہوشیاری کے باوجود حصول مقصد کا کوئی راستہ ہاتھ نہ آئے اور اس طرح عجز ومعذوری کے درجہ پر پہنچ جائے تو اس وقت حسبی اللہ ونعم الوکیل کہے۔

ملزم کو قید کرنا شرعی سزا ہے

(۲۷) وَعَنْ بَهْزِبْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَبَسَ رَجُلًا فِي تُهْمَةٍ- رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ ثُمَّ خَلّٰى عَنْهُ- (ابوداؤد)

"اور حضرت بہزابن حکیم اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو تہمت کی بنا پر قید کر دیا تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "تہمت کی بنا پر" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے اس پر اپنے دیئے ہوئے قرض کا دعوی کیا تھا یا اس پر کسی گناہ کا الزام عائد کیا تھا، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کو قید (حوالات) میں رکھا تاکہ اس دوران میں گواہوں کے ذریعہ مدعی کے دعوی کا صحیح ہونا معلوم ہو جائے۔ لیکن مدعی اپنے دعوی کے ثبوت میں گواہ پیش کرنے سے عاجز رہا تو آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو الزام سے بری قرار دے کر رہا کر دیا۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ملزم کو قید کرنا شرعی حکم کے مطابق ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مدعی اور مدعا علیہ دونوں حاکم کے سامنے موجود رہیں

(۲۸) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ الزُّبَیْرِ قَالَ قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ الْخَصْمَیْنِ یَقْعُدَانِ بَیْنَ یَدَیِ الْحَاکِمِ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے یہ فرمان (عدالتی ضابطہ) جاری فرمایا کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں حاکم کے روبرو بیٹھیں۔" (احمدؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ قاضی (حاکم عدالت) کے لئے اس سے دشوار اور سخت ترین مرحلہ کوئی نہیں ہے کہ جب اس کے سامنے مقدمہ پیش ہو تو وہ دونوں فریق یعنی مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان پوری برابری رکھے۔

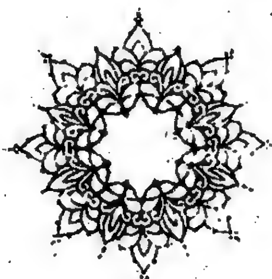

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الجہاد

جہاد کا بیان

جہاد کے معنی

جَہْد اور جِہَادْ کے لغوی معنی ہیں مشقت اٹھانا اور طاقت سے زیادہ بوجھ لادنا" امام راغب نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ:

الجہاد استفراغ الوسع فی مدافعۃ العدو۔

"جہاد کا مطلب ہے، انتہائی قوت سے حملہ آور دشمن کی مدافعت کرنا۔"

اصطلاح شریعت میں "جہاد" کا مفہوم ہے۔ "کفار کے ساتھ لڑی جانے والی جنگ میں اپنی طاقت خرچ کرنا بایں طور کہ خواہ اپنی جان کو پیش کیا جائے یا اپنے مال کے ذریعہ مدد کی جائے اور خواہ اپنی عقل وتدبیر (یعنی اپنی رائے اور مشوروں کا) تعاون دیا جائے یا محض اسلامی لشکر میں شامل ہو کر اس کی نفری میں اضافہ کیا جائے اور یا ان کے علاوہ کسی بھی طریقے سے دشمنان اسلام کے مقابلے میں اسلامی لشکر کی معاونت وحمایت کی جائے۔

جہاد کا نصب العین

جہاد کا نصب العین یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ خدا کا بول بالا رہے، خدا کی اس سرزمین پر اس کا جھنڈا سربلند اور اس کے باغی منکروں کا دعویٰ سرنگوں رہے۔

جہاد کا حکم

جہاد فرض کفایہ ہے۔ اگر نفیر عام (اعلان جنگ) نہ ہو اور اگر نفیر عام ہو بایں طور کہ کفار مسلمانوں کے کسی شہر پر ٹوٹ پڑیں یا اسلامی مملکت کے خلاف جنگ شروع کر دیں اور مسلمانوں کی طرف سے جنگ کا عام اعلان کر دیا جائے تو اس صورت میں ہر مسلمان پر جہاد فرض عین ہو گا خواہ نفیر کرنے والا (یعنی اعلان جنگ کرنے والا عادل ہو یا فاسق، لہٰذا اس صورت میں دشمنوں کا مقابلہ کرنا اور جہاد میں شرکت کرنا اس شہر اور اس مملکت کے تمام باشندوں پر واجب ہو گا اور ایسے ہی ان لوگوں پر بھی واجب ہو گا جو اس شہر یا مملکت کے قریب رہتے ہوں بشرطیکہ اس شہر یا مملکت کے رہنے والے اپنے شہر اور اپنے ملک کی حفاظت اور دشمنوں کے مقابلہ کرنے کے لئے کافی نہ ہوں یا وہ اپنی جنگی ودفاعی ذمہ داریوں کو انجام دینے میں کسل وسستی کریں اور گنہگار ہوں چنانچہ جس طرح میت کا مسئلہ ہے کہ اس کی تجہیز وتکفین اور نماز جنازہ پہلے اس کے اہل محلہ پر واجب ہے اگر وہ اس کی انجام دہی سے عاجز ہوں تو پھر یہ چیزیں اس کے شہر والوں پر واجب ہوں گی

اسی طرح جہاد کا بھی مسئلہ ہے کہ جس شہر ملک کے مسلمانوں کو کفار اور دشمنان دین کی جارحیت اور جنگی حملوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو اگر وہ اپنے دفاع سے عاجز ہوں اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں کوتاہ یا ناکام رہے ہوں تو اس وقت ان کے پڑوسی شہر و ملک کے مسلمانوں بلکہ مابین المشرق والمغرب کے تمام مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ وہ جہاد میں شریک ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے وقار کا تحفظ اور دشمنان دین کا دعویٰ سرنگوں کریں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کون سا جہاد افضل ہے؟

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَقَامَ الصَّلَاةَ وَصَامَ رَمَضَانَ كَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰهِ اَنْ یُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ جَاهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْجَلَسَ فِیْ اَرْضِهِ الَّتِیْ وُلِدَ فِیْهَا قَالُوْا اَفَلَا نُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ قَالَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ اَعَدَّهَا اللّٰهُ لِلْمُجَاهِدِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَابَیْنَ الدَّرَجَتَیْنِ كَمَابَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَسْاَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ فَاِنَّهٗ اَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَاَعْلَی الْجَنَّةِ وَفَوْقَهٗ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ وَمِنْهُ تَفَجَّرُ اَنْهَارُ الْجَنَّةِ۔

(رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ذریعہ دنیا میں بھیجی (یعنی شریعت پر ایمان لایا اور نماز قائم کی اور رمضان کے روزے رکھے تو اللہ تعالیٰ پر (ازراہ فضل و کرم بحسب اپنے وعدے کے) واجب ہے کہ وہ اس شخص کو جنت میں داخل کرے خواہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرے (اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اور خواہ ہجرت کرے) اور خواہ اپنے وطن و گھر میں جہاں پیدا ہوا ہے بیٹھا رہے (یعنی نہ جہاد کرے اور نہ ہجرت کرے)" صحابہؓ نے (سن کر) عرض کیا کہ "کیا لوگوں کو ہم یہ خوشخبری نہ سنا دیں؟" آنحضرت نے فرمایا "(لیکن جہاد کرنے والے کی یہ فضیلت بھی سن لو کہ) جنت میں سو درجے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے تیار کیا ہے جو خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور ان کے دو درجوں کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان فاصلہ ہے۔ لہٰذا جب تم اللہ سے (جہاد پر درجہ عالی) مانگو تو فردوس کو مانگو کیونکہ وہ (فردوس) اوسط جنت ہے (یعنی جنت کے تمام درجات میں سب سے بہتر و افضل ہے) اور سب سے بلند جنت ہے اور اس کے اوپر خدا کا عرش ہے (گویا وہ عرش الٰہی کے سایہ میں ہے) اور وہیں سے جنت کی نہریں بہتی ہیں (یعنی جو چار چیزیں جنت کی نہروں کی اصل ہیں جیسے پانی، دودھ، شراب اور شہد وہ جنت الفردوس ہی سے جاری ہوتی ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں نماز اور روزے کا تو ذکر کیا گیا ہے لیکن حج اور زکوٰۃ کا ذکر نہیں ہے اس کی وجہ اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ یہ دو عبادتیں یعنی نماز اور روزہ دیگر عبادتوں کی نسبت اپنی امتیازی اور برتری شان رکھتی نہیں دوسرے یہ کہ ان دونوں عبادات کا تعلق ہر مسلمان سے ہے کہ وہ سب ہی مسلمانوں پر واجب ہیں جب کہ حج اور زکوٰۃ ایسی عبادتیں ہیں جو ہر مسلمان پر واجب نہیں ہیں بلکہ اسی مسلمان پر واجب ہیں جو مالدار صاحب استطاعت ہو۔

خواہ اپنے گھر و وطن میں بیٹھا رہے۔" اس عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حدیث فتح مکہ کے دن ارشاد فرمائی تھی کیونکہ فتح مکہ کے دن سے پہلے ہجرت ہر مؤمن پر فرض تھی۔

② وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الْقَانِتِ بِاٰیَاتِ اللّٰهِ لَا یَفْتُرُ مِنْ صِیَامٍ وَلَا صَلَاةٍ حَتّٰی یَرْجِعَ الْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ روزہ رکھنے والا (نماز اور طاعت وعبادات میں) منہمک رہنے والا اور اللہ کی آیتوں یعنی قرآن کریم کی تلاوت کرنے والا جو روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے (یعنی عبادات میں منہمک رہنے) سے کبھی نہیں تھکتا، یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا اپنے گھر واپس آجائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جب مجاہد اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے گھر سے نکلتا ہے اور پھر جہاد کر کے گھر واپس آتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس دوران میں وہ ہمہ وقت جہاد ہی میں مصروف نہیں رہتا بلکہ اس کے اوقات کا کچھ حصہ جہاد سے خالی بھی گزرتا ہے کہ جن میں وہ کھاتا پیتا بھی ہے اور سوتا لیٹتا بھی ہے اور ایسے ہی دوسرے کاموں میں بھی وقت گذارتا ہے مگر اس کے باوجود اس کو یہ درجہ عطا کیا گیا ہے کہ گویا وہ کبھی بھی اور کسی وقت بھی عبادت سے خالی نہیں رہتا۔ چنانچہ ہر حرکت وسکون پر اور ہر عیش وآرام پر اس کے نامۂ اعمال میں ثواب ہی لکھا جاتا ہے۔

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْتَدَبَ اللّٰهُ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيْلِهِ لَا يُخْرِجُهُ اِلَّا اِيْمَانٌ بِيْ وَتَصْدِيْقٌ بِرُسُلِيْ اَنْ اَرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِيْمَةٍ اَوْ اُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) جو شخص اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) نکلا اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہوگیا، اس کو (جہاد کے لئے) مجھ پر اس کے ایمان اور میرے رسولوں کی تصدیق کے علاوہ اور کسی نے نہیں نکالا (یعنی اس کا جہاد میں جانا دکھاوے سنانے کے لئے یا دنیا میں کسی طلب وخواہش کے پیش نظر نہیں بلکہ وہ محض میری رضا وخوشنودی طلب کرنے کے لئے نکلا ہے) تو میں اس کو (یا تو بغیر غنیمت کے محض) آخرت کے اجر وثواب کے ساتھ یا مال غنیمت کے ساتھ واپس کروں گا اور یا (اگر شہید ہوگیا تو) میں اس کو (بغیر حساب وعذاب کے سب سے پہلے جنت میں جانے والوں کے ساتھ، جنت میں داخل کروں گا (یا اس کی موت کے بعد ہی قیامت کے دن سے بھی پہلے جنت میں داخل کروں گا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوگئے ہیں ان کو مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

آنحضرت ﷺ کا جذبۂ جہاد اور شوق شہادت

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ لَا اَنَّ رِجَالًا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَا تَطِيْبُ اَنْفُسُهُمْ اَنْ يَتَخَلَّفُوْا عَنِّيْ وَلَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُهُمْ عَلَيْهِ مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِيَّةٍ تَغْزُوْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر مجھے یہ خوف ولحاظ نہ ہوتا کہ بہت سے (وہ) مسلمان (جو مفلس ونادار ہیں) اپنے بارے میں اس بات سے خوش نہیں ہوں گے کہ وہ مجھ سے پیچھے اور مجھ سے جدا رہیں اور مجھے ایسی کوئی سواری میسر نہیں ہے جس پر ان سب کو سوار کردوں تو میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کسی بھی لشکر سے پیچھے نہ رہتا! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری خواہش وتمنا تو یہی ہے کہ میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں (یعنی بار بار زندہ کیا جاؤں اور بار بار مارا جاؤں تاکہ ہر بار نیا ثواب پاؤں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی سے جہاں آنحضرت ﷺ کے بے پناہ جذبۂ جہاد اور شوق شہادت کا اظہار ہوتا ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں کفار سے جتنی بھی جنگیں ہوئیں آپ چند کے علاوہ اور سب میں بنفس نفیس شریک کیوں نہ ہوئے۔ چنانچہ آپ نے اس کی علت بیان فرمائی کہ میں کفار سے جنگ کرنے کے لئے جانے والے ہر لشکر اور ہر فوج میں اس لئے

شریک نہیں ہوتا کہ اگر میں جنگ میں شریک ہونے کے لئے ہر لشکر کے ہمراہ جاؤں تو یقیناً وہ بہت سے مسلمان جو نادار اور بے سروسامان ہونے کی وجہ سے اپنی سواریاں نہیں رکھتے جنگ میں شریک ہونے سے محروم بھی رہ جائیں گے اور میری جدائی کا غم بھی اٹھائیں گے۔ اور خود میں اتنی سواریوں کا انتظام کرنے پر قادر نہیں ہوں کہ ان پر سب مسلمانوں کو سوار کر کے اپنے ہمراہ لے جاؤں، اس لئے اگر مجھے یہ لحاظ نہ ہو کہ بہت سے مسلمان جنگ میں شریک ہونے سے محروم رہ جانے اور پھر مجھ سے جدا ہو جانے کی وجہ سے افسردہ دل اور شکستہ خاطر ہوں گے اور وہ اس کا بہت زیادہ غم محسوس کریں گے تو میرے اندر جہاد کا جذبہ اور اللہ کی راہ میں شہید ہو جانے کا شوق اتنا زیادہ ہے کہ میں کسی بھی لشکر کے ہمراہ جانے سے باز نہیں رہنا چاہتا اور اس بات کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں کہ میں بار بار زندہ کیا جاؤں اور ہر بار خدا کی راہ میں مارا جاؤں۔

جہاد میں معمولی درجہ کی شرکت بھی دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر

⑤ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رِبَاطُ يَوْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ کی راہ میں ایک دن کی چوکیداری دنیا سے اور دنیا کی چیزوں سے بہتر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یا تو یہ مطلب ہے کہ جہاد میں ایک دن کے لئے بھی چوکیداری جیسی معمولی خدمت کو انجام دینا اس مال سے بہتر ہے جو اللہ کے نام پر خرچ کیا جائے، یا یہ مطلب ہے کہ جہاد میں محض ایکدن کی چوکیداری کے عوض جو اجر ملے گا وہ دنیا اور دنیا کی چیزوں سے کہیں زیادہ بہتر اور افضل ہے۔

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَغَدْوَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" "ایک صبح کے لئے یا ایک شام کے لئے خدا کی راہ میں شرکت جہاد کی غرض سے) جانا دنیا اور دنیا کی چیزوں سے بہتر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص محض ایک صبح کے لئے یا ایک شام کے لئے بھی جہاد میں شریک ہوا تو اس پر اس کو جو اجر ملے گا اور اس کی جو فضیلت حاصل ہوگی وہ دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے کیونکہ دنیا کی تمام نعمتیں فنا ہو جانے والی ہیں اور آخرت کی نعمت باقی رہنے والی ہے۔

جہاد میں ایک دن اور ایک رات کی چوکیداری ایک مہینے کے روزے اور شب بیداری سے بہتر ہے

⑦ وَعَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهٖ وَاِنْ مَاتَ جَرٰى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِيْ كَانَ يَعْمَلُهٗ وَاُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ وَاَمِنَ الْفَتَّانَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جہاد میں ایک دن اور ایک رات کی چوکیداری کی خدمت انجام دینا ایک مہینے کے روزے اور شب بیداری سے بہتر ہے اور اگر وہ چوکیدار (اس خدمت کی انجام دہی کے دوران) مرجائے تو اس کے اس عمل کا ثواب کہ جس پر وہ (اپنی زندگی میں) عامل تھا، جاری رہتا ہے (یعنی اپنی زندگی میں وہ جس نیک عمل پر عامل تھا اس کا ثواب اس کو مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہے گا) اور اس کے لئے (جنت کے طعام و شراب سے اس کا رزق کر دیا جاتا ہے اور وہ شیطان یا

دجال کے مکروفریب اور یا قبر میں عذاب کے فرشتے کے) فتنے سے محفوظ رہتا ہے۔" (مسلم)

جہاد میں شرکت، دوزخ سے محفوظ رکھنے کی ضامن ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ عَبْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَمَسَّہُ النَّارُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوعبس ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس بندے کے پاؤں خدا کی راہ (یعنی جہاد) میں گرد آلودہ ہو جاتے ہیں تو پھر اس کو (دوزخ کی) آگ نہیں چھوتی۔" (بخاری)

تشریح: یہ ارشاد گرامی دراصل راہ جہاد میں سعی و مشقت کے اظہار کا کنایہ پیرایہ بیان ہے اس بات کو زیادہ سے زیادہ بیان کرتا ہے کہ جب جہاد کے راستے میں محض قدموں کا گرد آلودہ ہو جانا دوزخ کی آگ سے حفاظت کا ضامن ہے تو نفس جہاد کے ثواب اور اس شخص کی فضیلت کا کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو راہ جہاد کی مشقتیں برداشت کرتا ہوا میدان جنگ میں پہنچے اور جہاد میں شریک ہو۔

کافر کو مارنے والے مجاہد کے بارے میں ایک خاص بشارت

⑨ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَجْتَمِعُ کَافِرٌ وَقَاتِلُہٗ فِی النَّارِ اَبَدًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کافر اور اس کو مارنے والا (مسلمان) کبھی بھی دوزخ میں ایک جا نہیں ہو سکتے۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں بطور خاص اس مسلمان کے لئے بشارت ہے جو جہاد میں کسی کافر کو مارے کہ وہ (مسلمان) ہرگز دوزخ میں نہیں جائے گا۔ اور حقیقت میں یہ ارشاد گرامی جہاد کی فضیلت کو ظاہر کرتا ہے جو مسلمان جہاد میں شریک ہوگا وہ غالباً کسی کافر کو مارے گا اور جب کافر کو مارے گا تو وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا اگرچہ اس کی جزا بھی جنت ہے جو جہاد میں شریک ہوا اور اس میں پوری جدوجہد کرے لیکن کسی کافر کو قتل نہ کر سکے۔

بہترین زندگی کون سی ہے؟

⑩ وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ خَیْرِ مَعَاشِ النَّاسِ لَھُمْ رَجُلٌ مُمْسِکٌ عِنَانَ فَرَسِہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یَطِیْرُ عَلٰی مَتْنِہٖ کُلَّمَا سَمِعَ ھَیْعَۃً اَوْفَزْعَۃً طَارَ عَلَیْہِ یَبْتَغِی الْقَتْلَ وَالْمَوْتَ مَظَانَّہٗ اَوْ رَجُلٌ فِیْ غُنَیْمَۃٍ فِیْ رَأْسِ شَعَفَۃٍ مِنْ ھٰذِہِ الشَّعَفِ اَوْبَطْنِ وَادٍ مِنْ ھٰذِہِ الْاَوْدِیَۃِ یُقِیْمُ الصَّلَاۃَ وَیُؤْتِی الزَّکٰوۃَ وَیَعْبُدُ رَبَّہٗ حَتّٰی یَاْتِیَہُ الْیَقِیْنُ لَیْسَ مِنَ النَّاسِ اِلَّا فِیْ خَیْرٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "انسانی زندگی میں بہترین زندگی اس شخص کی ہے جو خدا کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ لے اور جب کسی کی خوفزدہ آواز یا کسی کے فریاد کرنے کی آواز سنے تو عجلت کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر سوار ہو جائے اور (اس خوفزدہ یا فریاد رس کی آواز کی طرف دوڑتا ہوا چلا جائے اور اپنی موت کو یا اس جگہ کو تلاش کرتا پھرے جہاں موت کا گمان ہو (یعنی جب وہ کسی کی خوفزدہ چیخ و پکار یا فریاد و مدد چاہنے والے کی آواز سنے تو عجلت کے ساتھ چل پڑے اور اس آواز کو تلاش کرتا پھرے تاکہ موقع پر پہنچ کر فریاد کرنے والے کی مدد کرے اور اس بات سے نہ ڈرے کہ کہیں میری جان پر نہ بن جائے اور مجھے اپنی ہی زندگی سے ہاتھ نہ دھونا پڑے یا بہترین زندگی اس شخص کی ہے جو کچھ بکریوں کے ساتھ ان پہاڑوں میں سے کسی ایک پہاڑ کی چوٹی پر یا ان وادیوں میں سے کسی ایک

وادی میں اقامت گزین ہے اور نماز پڑھتا ہے اور "اگر وہ بکریاں حد نصاب کو پہنچتی ہیں تو ان کی زکوۃ ادا کرتا ہے اور پروردگار کی عبادت وبندگی میں مشغول رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو موت آجائے اور یہ شخص انسانوں کا شریک نہیں ہے بلکہ صرف بھلائی کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص دنیا والوں سے الگ تھلگ رہ کر ان کی برائیوں اور ان کے فتنہ وشر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے اور اپنے فتنہ وشر سے دنیا والوں کو بچاتا ہے۔

اس حدیث کا حاصل دراصل دشمنان دین کے مقابلہ پر جہاد، اپنے نفس وشیطان سے مجاہدہ اور دنیا کی فانی لذتوں اور نفس کی باطل خواہشات وشہوات سے اجتناب کی طرف راغب کرتا ہے نیز اس بات کی آگاہی دیتا ہے کہ اگر دین کی تائید اور شریعت کی تقویت کے لئے لوگوں کے درمیان رہن سہن اختیار کرے تو بہتر ہے ورنہ (اگر دنیا والوں کے درمیان رہنے سہنے سے دین وشریعت کو نقصان پہنچنے اور ایمان کے کمزور ہو جانے کا خوف ہو) تو گوشہ عافیت اختیار کرے۔

گوشہ گزینی افضل ہے یا مخالطت؟

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ان لوگوں کے مسلک کی دلیل ہے جو مخالطت (یعنی دنیا والوں کے درمیان رہن سہن پر گوشہ گزینی کو فضیلت دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مشہور اختلافی اقوال یہ ہیں کہ حضرت امام شافعیؒ اور اکثر علماء کے نزدیک اختلاط (یعنی دنیا والوں کے درمیان رہنا سہنا) افضل ہے بشرطیکہ (دین میں) فتنہ فساد سے محفوظ ومامون رہنے کی امید ہو جب کہ زاہد ان طریقت کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ دنیا والوں سے کنارہ کشی کر کے گوشہ گزینی اختیار کرنا افضل ہے۔ انہوں نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے لیکن جمہور علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث یا تو فتنوں سے بھرپور زمانہ پر محمول ہے۔ یا اس کے علاوہ اس کا تعلق اس شخص سے ہے جو لوگوں کی ایذاء پر صبر نہ کر سکتا ہو - یا لوگ خود اس کی وجہ سے سلامت نہ رہتے ہوں، پھر ان کی سب سے بڑی دلیل یہ کہ انبیاء صلوات اللہ علیہم اکثر صحابہ کرام، تابعین عظام، علماء ومشائخ اور زاہد ان طریقت کا معمول یہی رہا ہے کہ انہوں نے دنیا سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی سے احتراز کر کے اسی دنیا میں اور اسی دنیا والوں کے درمیان رہن سہن کو اختیار کیا اور اس کے ذریعہ وہ بہت سارے دینی فوائد حاصل کرتے رہے جو گوشہ گزینی کی صورت میں ناممکن الحصول تھے جیسے نماز جمعہ وجماعت نماز جنازہ اور عیادت مریض وغیرہ وغیرہ۔

مجاہد کا سامان تیار کرنے والے اور مجاہد کے اہل وعیال کی نگہبانی کرنے والے کی فضیلت

(۱۱) وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ خَالِدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَدْ غَزَا وَمَنْ خَلَفَ غَازِيًا فِيْ اَهْلِهٖ فَقَدْ غَزَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت زیدؓ ابن خالد کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا سامان درست کیا اس نے (گویا) جہاد (ہی) کیا (یعنی وہ بھی جہاد کرنے والوں کے حکم میں داخل ہے اور جہاد کے ثواب میں شریک ہے) اور جو شخص کسی غازی ومجاہد کا اس کے اہل وعیال کے لئے نائب وخلیفہ بنا (یعنی جو شخص کسی غازی ومجاہد کے جہاد میں چلے جانے کے بعد اس کے اہل وعیال کا خدمت گذار ہوا اور نگہبان بنا اُس نے بھی گویا) (جہاد ہی) کیا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

مجاہدین کی عورتوں کے احترام کا حکم

(۱۲) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُرْمَةُ نِسَاءِ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ كَحُرْمَةِ اُمَّهَاتِهِمْ وَمَا مِنْ رَجُلٍ مِنَ الْقَاعِدِيْنَ يَخْلُفُ رَجُلًا مِنَ الْمُجَاهِدِيْنَ فِيْ اَهْلِهٖ فَيَخُوْنُهٗ فِيْهِمْ اِلَّا وُقِفَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

فَيَاخُذُ مِنْ عَمَلِهٖ مَاشَاءَ فَمَاظَنُّكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مجاہدین کی عورتوں کی عزت و حرمت (گھروں میں) بیٹھنے والوں (یعنی جہاد کے لئے نہ جانے والوں) پر اسی طرح لازم ہے جس طرح کہ ان کی ماؤں کی عزت و حرمت ان پر لازم ہے (یعنی جو لوگ کسی وجہ سے جہاد پر نہیں جاسکتے ہیں اور اپنے گھروں میں رہ گئے ہیں ان کو چاہئے کو جو لوگ جہاد میں گئے ہوں ان مسلمانوں کی عورتوں کی عزت و آبرو میں خیانت نہ کریں اور ان کی طرف نظر بد سے نہ دیکھیں بلکہ ان کو اپنے حق میں ایسا حرام جانیں گویا وہ ان کی مائیں ہیں) لہٰذا اس کے اہل و عیال (یعنی اس کی بیوی اور لونڈیوں یا دوسرے قرابتیوں) کے لئے نائب و خلیفہ بنا یعنی ان کا نگران بنا اور پھر اس نے اس (مجاہد) کے اہل و عیال (کی عزت و آبرو) میں خیانت کی تو اس کو قیامت کے دن اس مجاہد کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور مجاہد اس کے (نیک) اعمال میں سے جس قدر چاہے گا لے لیگا" ایسی حالت میں تمہارا کیا خیال ہے؟ "(مسلمؒ)

تشریح: "ایسی حالت میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم یہ خیال کرسکتے ہو کہ ایسی حالت میں وہ مجاہد قیامت کے دن اس شخص کی نیکیوں کو لے لینے میں کم راغب ہوگا؟ نہیں، بلکہ وہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑے گا اور اس کی تمام ہی نیکیاں لے لیگا یا اس شخص نے اس مجاہد کے حق میں جو خیانت کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ خیانت کرنے والے کے نیکیوں کی صورت میں مجاہد کو جو عوض و بدلہ دے گا اس میں تمہیں کوئی شک ہے؟ اگر تمہیں کوئی شک نہیں ہے اور تم یہ یقین رکھتے ہو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ قطعی سچ ہے تو پھر تم پر لازم ہے کہ تم مجاہدین کی عورتوں کی عزت و آبرو میں خیانت کرنے سے احتراز نہ کرو مبادا اس کی وجہ سے تمہیں آخرت میں اپنی ساری نیکیوں سے ہاتھ دھونا پڑ جائے۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجاہد کو جو یہ مرتبہ عظیم عطا فرمایا ہے اور اس کو اس فضیلت کے ساتھ جو مخصوص کیا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اس مجاہد کو بس یہی مرتبہ ملے گا؟ نہیں بلکہ اس مرتبہ اور اس مخصوص فضیلت کے علاوہ بھی اس کو اور بہت عظمتیں اور بزرگیاں ملیں گی اور اس سے بھی بڑے بڑے درجات اس کو نصیب ہوں گے۔

جہاد میں مالی مدد کرنے کی فضیلت

(۱۳) وَعَنْ اَبِی مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ بِنَاقَةٍ مَخْطُوْمَةٍ فَقَالَ هٰذِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَكَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعُ مِائَةِ نَاقَةٍ كُلُّهَا مَخْطُوْمَةٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ (دربار نبوت میں) ایک شخص نکیل پکڑی ہوئی اونٹنی لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اللہ کی راہ کے لئے ہے یعنی میں اس اونٹنی کو اللہ کی رضا کے لئے جہاد میں پیش کرتا ہوں رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(میں تمہاری اس پیشکش کو بہ تحسین قبول کرتا ہوں اور تمہیں یہ بشارت دیتا ہوں کہ (اس کے بدلے میں قیامت کے دن تمہیں سات سو اونٹنیاں ملیں گی اور سب کے نکیل پڑی ہوگی۔" (مسلمؒ)

مجاہد کے گھر بار کی نگہبانی کرنے کی فضیلت

(۱۴) وَعَنْ اَبِی سَعِيْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بَعْثًا اِلٰى بَنِىْ لِحْيَانَ مِنْ هُذَيْلٍ فَقَالَ لِيَنْبَعِثْ مِنْ كُلِّ رَجُلَيْنِ اَحَدُهُمَا وَالْاَجْرُ بَيْنَهُمَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قبیلہ ہذیل کی ایک شاخ بنو لحیان کے مقابلہ پر جہاد (کے لئے) ایک لشکر روانہ کرنے کا ارادہ کیا تو حکم دیا کہ دو شخصوں میں ایک شخص جہاد میں جانے کے لئے نکلے (یعنی ہر قبیلے میں سے آدھے آدمی جہاد میں جائیں اور

آدھے آدمی رہ جائیں تاکہ وہ جہاد میں جانے والوں کے اہل وعیال کی خبر گیری کریں) اور جہاد کا ثواب دونوں کو برابر ملے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ جو لوگ جہاد میں جائیں گے ان کو تو جہاد کا ثواب ملے ہی گا لیکن جو لوگ اپنے گھروں پر رہ کر مجاہدین کے گھر بار کی نگرانی اور ان کے اہل وعیال کی پرورش و دیکھ بھال کریں گے۔ تو ان کو بھی مجاہدین جیسا ثواب ملے گا۔

ہمیشہ اُمت محمدی کی کوئی نہ کوئی جماعت برسر جہاد رہے گی

⑮ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يَبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن ؓ سمرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا اور مسلمانوں میں سے ایک نہ ایک جماعت اس دین کی حفاظت کے لئے قیامت (قائم ہونے کے قریب) تک لڑتی رہے گی (یعنی روئے زمین جہاد سے خالی نہیں رہے گی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ جہاد ہوتا رہے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ عبارت یقاتل علیہ الخ جملہ مستانفہ ہے جس کا مقصد پہلی عبارت کی وضاحت کرنا ہے اس طرح حاصل یہ ہوگا کہ یہ دین اسی سبب سے قائم رہے گا کہ مسلمانوں میں سے کوئی نہ کوئی جماعت اور کوئی نہ کوئی قوم ہمیشہ دین کے دشمنوں سے لڑتی رہے گی اور خدا کے باغیوں کا دعوی سرنگوں کرتی رہے گی۔

خدا کی راہ میں زخمی ہونے والا مجاہد قیامت کے دن اسی حال میں اٹھے گا

⑯ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُكْلَمُ اَحَدٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ يُكْلَمُ فِيْ سَبِيْلِهٖ اِلَّا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَجُرْحُهٗ يَثْعَبُ دَمًا اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ وَالرِّيْحُ الْمِسْكِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص خدا کی راہ (یعنی جہاد) میں زخمی کیا جاتا ہے، اور خدا اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ میں زخمی کیا جاتا ہے تو وہ مجاہد قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہتا ہوگا اور اس خون کا رنگ خون کے رنگ کا سا ہوگا اور اس کی بو مشک کی خوشبو کی طرح ہوگی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

شہادت کی فضیلت

⑰ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ اَحَدٍ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ يُحِبُّ اَنْ يَرْجِعَ اِلَى الدُّنْيَا وَلَهٗ مَافِي الْاَرْضِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا الشَّهِيْدُ يَتَمَنّٰى اَنْ يَرْجِعَ اِلَى الدُّنْيَا فَيُقْتَلَ عَشْرَ مَرَّاتٍ لِمَا يَرٰى مِنَ الْكَرَامَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا "جنت میں داخل ہونے والا کوئی شخص بھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس جائے اور (جنت کی نعمتوں کے عوض دنیا کی تمام) چیزوں کو قبول کرے مگر شہید یہ آرزو کرتا ہے کہ وہ دنیا میں واپس جائے اور دس بار خدا کی راہ میں شہید ہو کیونکہ وہ شہادت کی عظمت اور اس کے ثواب کو جانتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

شہداء کی حیات بعد الموت کے بارے میں آیت کریمہ کی تفسیر

⑱ وَعَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ سَاَلْنَا عَبْدَاللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ الْاٰيَةَ قَالَ اِنَّا قَدْ سَاَلْنَا عَنْ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَرْوَاحُهُمْ فِيْ اَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ لَهَا قَنَادِيْلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ ثُمَّ تَاْوِيْ اِلٰى تِلْكَ الْقَنَادِيْلِ فَاطَّلَعَ

اِلَیْھِمْ رَبُّھُمْ اِطِّلَاعَۃً فَقَالَ ھَلْ تَشْتَھُوْنَ شَیْئًا قَالُوْا اَیَّ شَیْءٍ نَشْتَھِی وَنَحْنُ نَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّۃِ حَیْثُ شِئْنَا فَفَعَلَ ذٰلِکَ بِھِمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَلَمَّا رَاَوْا اَنَّھُمْ لَنْ یُتْرَکُوْا مِنْ اَنْ یَسْئَلُوْا قَالُوْا یَا رَبِّ نُرِیْدُ اَنْ تَرُدَّ اَرْوَاحَنَا فِیْ اَجْسَادِنَا حَتّٰی نُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِکَ مَرَّۃً اُخْرٰی فَلَمَّا رَاٰی اَنْ لَیْسَ لَھُمْ حَاجَۃٌ تُرِکُوْا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مسروق ؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے اس آیت کریمہ کی تفسیر پوچھی۔ وَلَا تحسبن الذین قتلوا فِیْ سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون (الایۃ) جو لوگ خدا کی راہ جہاد میں مارے گئے ہیں ان کو تم مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے الخ۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم نے رسول کریم ﷺ سے اس آیت کریمہ کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ (ان شہداء) کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قلب میں ہیں ان کے (رہنے) کے لئے عرش الٰہی کے نیچے (بمنزلہ گھونسلوں) کے قندیلیں لٹکائی گئی ہیں وہ (روحیں) بہشت میں سے جہاں سے ان کا جی چاہتا ہے میوے کھاتی ہیں پھر ان قندیلوں میں جاکر بسیرا کرتی ہیں تب پروردگار ان (شہدا) طرف جھانکتا ہے فرماتا ہے کہ "کیا تم کو کسی چیز کی خواہش ہے؟" وہ عرض کرتے ہیں "کہ ہم کس چیز کی خواہش کریں درانحالیکہ ہم بہشت میں سے جہاں سے ہمارا جی چاہتا ہے میوے کھاتے ہیں۔" اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ تین مرتبہ یہی معاملہ کرتا ہے (یعنی تین بار ان سے یہی سول کرتا ہے) اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہمیں پوچھے جانے والے سے چھوڑا نہیں جائے گا (یعنی جب وہ یہ جانتے ہیں کہ پروردگار کی مراد یہ ہے کہ ہم کسی خواہش کا اظہار کریں) تو وہ عرض کرتے ہیں کہ "اے ہمارے پروردگار! ہماری بس یہی خواہش ہے تو ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں واپس کردے (اور ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے) تاکہ ہم ایک بار اور تیری راہ میں مارے جائیں" جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ ان کی کوئی (متعین) خواہش وحاجت نہیں ہے (کیونکہ انہوں نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے اس کو پورا کرنا اللہ کے ارادہ اور مصلحت کے خلاف ہے دوسرے یہ کہ ان کو پہلی ہی بار میں جو عظیم ثواب اور عظیم اجر ملا ہے اور اسی وجہ سے ان کی کوئی حاجت و خواہش نہیں ہے اگر وہ دوبارہ دنیا میں بھیج دیئے جائیں تو وہی اجر وانعام انہیں دوبارہ بھی ملے گا اور اس کی انہیں حاجت ہی نہیں ہے کیونکہ شہید کا اجر وثواب ایک ہی ہے جو انہیں حاصل ہے) تو ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ ان سے پوچھنا چھوڑ دیتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: کسی کے ذہن میں اعتراض پیدا ہوسکتا ہے کہ ترجمہ میں بین القوسین عبارت کے مطابق اگر دوسری بار میں بھی پہلی ہی بار جیسا ثواب ملے تو پھر ان شہداء کی خواہش کا کیا فائدہ کہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں واپس کرکے دنیا میں بھجدیا جائے تاکہ ہم دوبارہ خدا کی راہ میں مارے جائیں

علماء نے اس کا جواب یہ لکھا ہے کہ اس خواہش کے اظہار سے اس کی مراد حقیقت میں اپنی روحوں کو جسموں میں واپس کئے جانے کی درخواست کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کے ان انعامات واکرامات کا شکر ادا کرنا ہے جس سے ان کو نوازا گیا "گویا اپنی اس خواہش کے ذریعے وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ اے اللہ! تونے ہمیں اپنی جو نعمتیں عطا کی ہیں اور ہمیں جن عظیم درجات سے نوازا ہے اور ان کی وجہ سے ہم پر جو تیرا شکر ادا کرنا واجب ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر دنیا میں واپس جائیں اور تیری راہ میں اپنی جان قربان کردیں۔

یا پھر وہ اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے گمان کے مطابق کرتے ہوں کہ ہم چونکہ دوسری مرتبہ میں اور زیادہ مستعدی ہمت اور جان نثاری کے فزوں تر جذبے کے ساتھ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کریں گے اس لئے کیا عجب کہ دوسری مرتبہ میں ہمیں اور زیادہ بہتر اور کامل تر جزا ملے لیکن نظام قدرت اور جاری معمول چونکہ اس کے خلاف ہے اور حق تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہے کہ ان کو دوسری مرتبہ میں وہی اجر ملے گا جو پہلی مرتبہ مل چکا ہے اور اس کی انہیں حاجت نہیں ہے تو ان سے پوچھنا چھوڑ دیا جاتا ہے۔

تنبیہ: علماء نے یہ لکھا ہے کہ شہداء کی ارواح کو پرندوں کے قالب میں رکھنا ان ارواح کی عزت و توقیر اور تکریم کی بنا پر ہے جیسا کہ جواہرات کو ان کی حفاظت و احتیاط کے لئے صندوق میں رکھا جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ مقصد ہوتا ہے کہ ان ارواح کو ان کے دنیاوی جسم کے بغیر اس صورت (یعنی پرندوں کے قلب میں جنّت میں داخل کیا جائے، چنانچہ وہ ارواح ان پرندوں کے قالب میں جنّت کے مرغزاروں میں سیر کرتی ہیں، وہاں کی فضاؤں میں گھومتی ہیں جنّت کی پاکیزہ ترین خوشبوؤں اور کیف آور ہواؤں سے لطف اندوز ہوتی ہیں، وہاں کے انوار و برکات کا مشاہدہ کرتی ہیں، وہاں کی نعمتوں اور لذتوں سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں اور ان کو صرف ان ہی چیزوں کے ذریعہ ہمہ وقت کی خوش طبعی و آسودہ خاطری حاصل نہیں ہوتی بلکہ حق جل مجدہ کے مقرب ملائکہ کے قرب و جوار کی عظیم ترین سعادت بھی میسر ہوتی ہے جو بجائے خود سب سے بڑی نعمت اور فرحت و انبساط کا سبب ہے چنانچہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی یہی مراد ہے کہ:

یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ۔

"وہ رزق دیئے جاتے ہیں اور جو کچھ خدا نے ان کو اپنے فضل سے بخش رکھا ہے اس میں خوش ہیں۔"

اس موقع پر یہ بات بطور خاص ملحوظ رہنی چاہئے کہ اس حدیث سے تناسخ (آواگون) کا نظریہ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ جو لوگ تناسخ کے قائل ہیں ان کے نزدیک تناسخ اس کو کہتے ہیں کہ "اس عالم میں روح کا کسی قالب و بدن میں لوٹنا" گویا ان کے نزدیک کسی قالب و بدن میں روح کے لوٹنے کا نظریہ آخرت سے متعلق نہیں ہے اور یہ یوں بھی ممکن نہیں ہے کہ ان کے نزدیک آخرت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ آخرت کے منکر ہیں۔

ایک بات اور اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ جنّت مخلوق ہے اور موجود ہے۔ جیسا کہ اہل سُنّت والجماعت کا مسلک ہے۔

جہاد، حقوق العباد کے علاوہ تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَامَ فِیْھِمْ فَذَکَرَ لَھُمْ اَنَّ الْجِھَادَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْاِیْمَانَ بِاللّٰہِ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ یُکَفِّرُ عَنِّیْ خَطَایَایَ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَعَمْ اِنْ قُتِلْتَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ مُقْبِلٌ غَیْرُ مُدْبِرٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَیْفَ قُلْتَ فَقَالَ اَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَیُکَفِّرُ عَنِّیْ خَطَایَایَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَعَمْ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ مُقْبِلٌ غَیْرُ مُدْبِرٍ اِلَّا الدَّیْنَ فَاِنَّ جِبْرِیْلَ قَالَ لِیْ ذٰلِکَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا اور (اس خطبہ میں) ان کو آگاہ کیا کہ "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا سب سے بہتر اعمال ہیں۔" (یہ سن کر) ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ "یارسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے؟ رسول کریم ﷺ نے اس نے فرمایا کہ ہاں۔" بشرطیکہ تم اللہ کی راہ میں اس حال میں مارے گئے کہ تم (سختیوں پر) صبر کرنے والے ہو، ثواب کے طالب ہو اور پیٹھ دکھا کر بھاگنے والے نہ ہو بلکہ دشمن کے مقابلے پر جمے رہنے والے ہو۔" پھر رسول کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ "تم نے کیا کہا تھا؟ اس نے عرض کیا کہ "مجھے یہ بتائیں کہ اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" ہاں! بشرطیکہ تم صبر کرنے والے ہو، ثواب کے طالب ہو اور پیٹھ دکھا کر بھاگنے والے نہ ہو بلکہ دشمن کے مقابلے پر جمنے والے ہو مگر دین (یعنی وہ قرض معاف نہیں ہوگا جس کی ادائیگی کی نیت ہی نہ ہو) اور مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے یہی فرمایا ہے۔" (مسلم)

تشریح: ایمان کا سب سے بہتر عمل ہونا تو ظاہر ہی ہے اس کے لئے کسی توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ رہی جہاد کی بات تو اس عمل

(یعنی جہاد) کو اس اعتبار سے سب سے بہتر عمل فرمایا گیا ہے کہ تمام نیک اعمال میں یہی ایک عمل ایسا ہے جس کے ذریعہ اعلاء کلمۃ اللہ (اللہ کے دین کو سربلند کرنے) کا فریضہ سرانجام پاتا ہے، خدا کے باغیوں اور دین کے دشمنوں کی بیخ کنی ہوتی ہے؛ جان و مال کی قربانی پیش کی جاتی ہے اور مختلف قسم کی تکلیفیں مشقتیں اور پریشانیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں گویا یہ اعمال اللہ کے حضور میں اور اس کی راہ میں بندے کے جذبۂ عبودیت اور بندگی اور کمال ایثار و قربانی کا سب سے بڑا مظہر ہوتا ہے اور جو دوسری احادیث میں نماز کو سب سے بہتر عمل فرمایا گیا ہے تو وہ اس اعتبار سے ہے کہ نماز ہی ایک ایسا عمل ہے جس میں مداومت و ہمیشگی ہے اور جو ایک عمل ہونے کے باوجود عبادات کثیرہ پر مشتمل ہے۔

"مگر دین" کے بارے میں علامہ تورپشتیؒ لکھتے ہیں کہ یہاں "دین" سے مراد "مسلمانوں کے حقوق" ہیں لہٰذا اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ جہاد سے حقوق العباد کے علاوہ تمام گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں۔

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْقَتْلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُكَفِّرُ كُلَّ شَيْءٍ اِلَّا الدَّيْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ کی راہ (یعنی جہاد میں) مارا جانا، دین (حقوق العباد) کے علاوہ تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ بحری جہاز (پانی میں لڑی جانے والی جنگ) کے شہدا اس حکم سے مستثنیٰ ہیں یعنی ان کے ذمے جو حقوق العباد ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

وہ قاتل و مقتول جو جنت میں جائیں گے

(۲۱) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَضْحَكُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلٰى رَجُلَيْنِ يَقْتُلُ اَحَدُهُمَا الْاٰخَرَ يَدْخُلَانِ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُ هٰذَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلُ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَى الْقَاتِلِ فَيُسْتَشْهَدُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ ان دو شخصوں پر ہنستا ہے (یعنی ان سے ایک تو وہ ہے جو جنت میں داخل ہوتا ہے) پھر اللہ تعالیٰ اس کے قاتل کو توبہ کی توفیق عطا کرتا ہے (اور وہ کفر سے تائب ہو کر ایمان لے آتا ہے) اور پھر خدا کی راہ میں جہاد کر کے شہید ہو جاتا ہے (لہٰذا اس کو بھی جنت میں داخل کیا جاتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

شہادت کی طلب صادق کی فضیلت

(۲۲) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَاِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سہلؓ ابن حنیف کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص سچے دل (یعنی طلب صادق کے جذبے سے) اللہ تعالیٰ سے شہادت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے شہیدوں کے درجہ پر پہنچاتا ہے اگرچہ وہ اپنے بستر پر مرے (یعنی وہ صدق نیت اور طلب صادق کی وجہ سے شہیدوں جیسا ثواب پاتا ہے۔" (مسلمؒ)

شہداء کا مسکن فردوس اعلیٰ ہے

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ الرُّبَيِّعَ بِنْتَ الْبَرَاءِ وَهِيَ اُمُّ حَارِثَةَ بْنِ سُرَاقَةَ اَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اَلَا تُحَدِّثُنِيْ عَنْ حَارِثَةَ وَكَانَ قُتِلَ يَوْمَ بَدْرٍ اَصَابَهٗ سَهْمٌ غَرْبٌ فَاِنْ كَانَ فِي الْجَنَّةِ صَبَرْتُ وَاِنْ كَانَ غَيْرَ ذٰلِكَ اجْتَهَدْتُ

عَلَيْهِ فِي الْبُكَاءِ فَقَالَ يَا اُمَّ حَارِثَةَ اِنَّهَا جِنَانٌ فِي الْجَنَّةِ وَاِنَّ ابْنَكِ اَصَابَ الْفِرْدَوْسَ الْاَعْلٰى۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (میری پھوپھی) حضرت ربیعؓ بنت براء جو حضرت حارثہؓ بن سراقہ کی ماں ہیں (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں کہ (یا نبی اللہ! کیا آپ مجھ سے میرے بیٹے حارثہؓ کا حال بیان نہیں کریں گے اور حارثہؓ بدر کے دن (یعنی جنگ بدر میں) شہید ہو گئے اور ان کو ایسا تیر لگا تھا جس کا چلانے والا معلوم نہ ہوا کہ کون تھا، اگر وہ جنّت میں ہو تو میں صبر کروں اور اگر وہ کسی اور جگہ ہو تو میں رونے کی کوشش کروں (یعنی خوب رؤوں جیسا کہ عورتوں کی عادت ہے)" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "حارثہؓ کی ماں! حقیقت یہ ہے کہ جنت میں بہت سے باغ ہیں اور تمہارا بیٹا فردوس اعلیٰ میں پہنچا ہوا ہے (جو جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے)۔" (بخاری)

شہید کی منزل جنّت ہے

(۲۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ انْطَلَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهٗ حَتّٰى سَبَقُوا الْمُشْرِكِيْنَ اِلٰى بَدْرٍ وَجَاءَ الْمُشْرِكُوْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُوْمُوْا اِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ قَالَ عُمَيْرُ بْنُ الْحُمَامِ بَخٍ بَخٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَحْمِلُكَ عَلٰى قَوْلِكَ بَخٍ بَخٍ قَالَ لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِلَّا رَجَاءَ اَنْ اَكُوْنَ مِنْ اَهْلِهَا قَالَ فَاِنَّكَ مِنْ اَهْلِهَا قَالَ فَاَخْرَجَ تَمَرَاتٍ مِنْ قَرَنِهٖ فَجَعَلَ يَاْكُلُ مِنْهُنَّ ثُمَّ قَالَ لَئِنْ اَنَا حَيِيْتُ حَتّٰى اٰكُلَ تَمَرَاتِيْ اِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيْلَةٌ قَالَ فَرَمٰى بِمَا كَانَ مَعَهٗ مِنَ التَّمْرِ ثُمَّ قَاتَلَهُمْ حَتّٰى قُتِلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور انسؓ کہتے ہیں (غزوہ بدر کے موقع پر) رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ (مدینہ سے) روانہ ہوئے اور مشرکوں سے پہلے بدر (کے میدان جنگ) میں پہنچ گئے پھر (جب اسلامی مجاہدین کے پہنچنے کے بعد) مشرکین کا لشکر آیا اور (مقابلہ کی تیاری شروع ہوئی) تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جنّت کے راستے پر کھڑے ہو جاؤ، وہ جنّت جس کا عرض زمین و آسمان کے عرض کے برابر ہے، (ایک صحابی) حضرت عمیرؓ ابن حمام انصاری نے (یہ ارشاد سن کر کہا کہ "خوب! خوب!" یا رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، تم نے خوب خوب کیوں کہا؟ عمیرؓ نے کہا کہ "یا رسول اللہ! میں نے یہ الفاظ (اظہار تعجب یا کسی اور مطلب سے نہیں کہے بلکہ میں نے (درحقیقت ان الفاظ کے ذریعہ اپنی اس آرزو کا اظہار کیا ہے کہ میں بھی جنتی بنوں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس میں کوئی شک نہیں تم جنتی ہو۔" راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمیرؓ نے سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے یہ بشارت سن کر اپنے ترکش سے کچھ کھجوریں نکالیں اور ان کو کھانا شروع کیا اور پھر کہنے لگے کہ اگر میں ان (ساری کھجوروں کو کھانے تک زندہ رہا تو زندگی طویل ہو گی چنانچہ انہوں نے ان کھجوروں کو جو ان کے پاس تھیں پھینک دیا اور کفار سے لڑنے لگے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جنّت کے راستے پر کھڑے ہو جاؤ" کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل کی راہ کو اختیار کرو۔ جو جنّت میں لے جانے کا باعث ہے۔ اور وہ جہاد ہے۔

"جس کا عرض زمین و آسمان کے عرض کے برابر ہے" اس ارشاد کے ذریعہ در حقیقت جنّت کی وسعت و کشادگی کو بیان کرنا ہے چنانچہ اس مقصد کے لئے ایسی چیز (یعنی زمین و آسمان کے درمیانی فاصلے) کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس سے زیادہ وسیع و عریض چیز انسان کے فہم میں اور کوئی نہیں آسکتی، نیز اس ارشاد میں صرف عرض کو ذکر کیا گیا ہے طول کو بیان نہیں کیا گیا تاکہ انسانی فہم خود اندازہ کرلے کہ جس چیز کا عرض اتنا ہے اس کے طول کا کیا حال ہو گا۔

"تم نے خوب خوب کیوں کہا" گویا آنحضرت ﷺ نے یہ خیال فرمایا کہ عمیرؓ نے جو یہ الفاظ کہے ہیں وہ بغیر کسی نیت و ارادہ کے اور بغیر سوچے سمجھے ان کی زبان سے ادا ہوئے ہیں جیسا کہ اس قسم کے الفاظ یا تو اس شخص کی زبان سے صادر ہوتے ہیں جو کسی کی کسی بات پر اپنے ہزل و مزاح اور استہزاء کا اظہار کرتا ہے۔ یا اپنے قتل کے خوف میں مبتلا ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب عمیرؓ سے ان

الفاظ کی وضاحت طلب کی تو انہوں نے ان دونوں باتوں سے انکار کیا اور خدا کی قسم کھا کر اپنا اصل مطلب بیان کیا۔

"تو زندگی طویل ہوگی۔" سے حضرت عمیرؓ کی مراد یہ تھی کہ اگر میں ساری کھجوریں کھانے کا انتظار کروں اور جب تک جیوں تو زندگی طویل ہو جائے گی۔ جب کہ آرزو یہ ہے کہ اب ایک منٹ گنوائے بغیر خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کر دوں اور شہادت کا مرتبہ حاصل کر کے جنّت کی راہ پکڑ لوں۔ گویا انہوں نے حصول شہادت کے شوق کی وجہ سے اپنی زندگی کو اور کفار سے نبرد آزمائی میں تاخیر کو اپنے حق میں وبال جانا۔

شہداء کی اقسام

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَاتَعُدُّوْنَ الشَّهِیْدَ فِیْکُمْ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَهُوَ شَهِیْدٌ قَالَ اِنَّ شُهَدَاءَ اُمَّتِیْ اِذًا لَقَلِیْلٌ مَنْ قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَهُوَ شَهِیْدٌ وَمَنْ مَاتَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَهُوَ شَهِیْدٌ وَمَنْ مَاتَ فِی الطَّاعُوْنِ فَهُوَ شَهِیْدٌ وَمَنْ مَاتَ فِی الْبَطْنِ فَهُوَ شَهِیْدٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ) سے پوچھا کہ تم اپنے آپ میں سے کس کو شہید شمار کرتے ہو؟" صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! جو شخص اللہ کی راہ میں مارا جائے وہ شہید ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس صورت میں میری امت کے اندر شہیدوں کی تعداد کم ہو جائے گی جو شخص اللہ کی راہ میں مارا جائے وہ تو (حقیقی شہید ہے) لیکن جو شخص اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں (بغیر قتل وقتال کے خود اپنی موت سے) مر جائے وہ بھی شہید ہے جو شخص وباء میں مرے وہ بھی شہید ہے اور جو شخص پیٹ کی بیماری (یعنی استسقاء اور اسہال وغیرہ) میں مرے وہ بھی شہید ہے یعنی یہ سب بھی حقیقی شہداء کے درجات وثواب میں ہیں نہ یہ کہ ان کے جمیع احکام میں۔ (مسلمؒ)

مجاہد کے اجر کی تقسیم

(۲۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ غَازِیَةٍ اَوْسَرِیَّةٍ تَغْزُوْ فَتَغْنَمُ وَتَسْلَمُ اِلَّا کَانُوْا قَدْ تَعَجَّلُوْا ثُلُثَیْ اُجُوْرِهِمْ وَمَامِنْ غَازِیَةٍ اَوْسَرِیَّةٍ تُخْفِقُ وَتُصَابُ اِلَّا تَمَّ اُجُوْرُهُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جہاد کرنے والی جس جماعت یا جہاد کرنے والے جس لشکر نے جہاد کیا اور مال غنیمت لے کر صحیح وسالم واپس آگیا اس کو اس کا دو تہائی اجر جلدی یعنی اسی دنیا میں) مل گیا اور جہاد کرنے والی جس جماعت یا جہاد کرنے والے جس لشکر نے جہاد کیا اور نہ صرف یہ کہ اس کو مال غنیمت نہیں ملا بلکہ اس جماعت ولشکر کے لوگ زخمی کئے گئے یا شہید کر دیئے گئے تو ان کا اجر پورا باقی رہا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اسلام کے جو مجاہد کفار سے جنگ کرنے کے لئے نکلیں گے ان کی تین صورتیں ہوں گی ایک تو یہ کہ وہ کفار سے جنگ کے بعد صحیح وسالم لوٹ کر بھی آئیں گے اور جو مال غنیمت ان کو ہاتھ لگے گا اس کے بھی حقدار ہوں گے۔ ایسے ہی مجاہدین کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی محنت و مشقت کا دو تہائی اجر کہ سلامتی کے ساتھ لوٹنا اور مال غنیمت حاصل کرنا ہے اسی دنیا میں حاصل کر لیا ایک تہائی اجر جو باقی رہا ہے یعنی جہاد کا ثواب وہ انہیں قیامت کے دن ملیگا دوسرے یہ کہ جو مجاہد صحیح وسلامت لوٹ کر تو آئے مگر مال غنیمت ان کے ہاتھ نہیں لگا تو انہوں نے گویا اس دنیا میں ایک تہائی اجر پالیا ہے اور جو دو تہائی باقی رہا ہے وہ قیامت کے دن پائیں گے، تیسرے وہ مجاہد ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور میدان جنگ میں زخمی ہو گئے یا شہید کر دیئے گئے اور ان کے ہاتھ مال غنیمت بھی نہیں لگا تو ان کا پورا اجر باقی ہے جو انہیں پوری طرح قیامت کے دن ملے گا۔

جس مؤمن کے دل میں جذبہ جہاد نہ ہو وہ منافق کی طرح ہے

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰی

شُعْبَةٍ مِنْ نَفَاقٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص (مؤمن) مرجائے اور جہاد نہ کرے اور نہ اس کے دل میں جہاد کرنے کا خیال گزرا ہو تو اس کی موت ایک طرح کے نفاق پر ہوگی۔" (مسلمؒ)

تشریح: اور نہ اس کے دل میں جہاد کرنے کا خیال گزرا ہو کا مطلب یہ ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ اپنی پوری زندگی میں کبھی جہاد نہیں کیا بلکہ کبھی جہاد کرنے کا قصد و ارادہ بھی نہیں کیا اور نہ کسی موقع پر یہ کہا کہ کاش! میں بھی جہاد کرتا اور چونکہ یہ منافقین کی خصلت ہے کہ وہ جہاد کے وقت منہ چھپا کر گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے دل میں جہاد کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ کے مطابق ایسا مؤمن بھی منافق کے مشابہ ہوا۔

امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جو شخص کوئی واجب عبادت کرنے کی نیت و ارادہ کرے اور پھر اس عبادت کو کرنے سے پہلے مرجائے تو اس عبادت کے نہ کرنے کا وبال اتنا زیادہ اس کے حق میں ظاہر نہیں ہوگا۔ جتنا اس صورت میں ظاہر ہوتا کہ وہ اس عبادت کے کرنے کی نیت بھی نہ کرتا اور مرجاتا۔

نیز نوویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمارے علماء شوافع کا اس شخص کے بارے میں اختلاف اقوال ہے جو نماز کو اس کے اول وقت میں ادا کرنے پر قادر ہو اور اس کو پڑھنے کی نیت بھی رکھتا ہو مگر اس کی ادائیگی میں تاخیر کرے اور اس نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے مرجائے اسی طرح حج کا معاملہ ہے کہ اس پر حج فرض ہو اور وہ شروع ہی میں اس فرض کی ادائیگی پر قادر تھا مگر اس میں تاخیر کی یہاں تک کہ مر گیا تو بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ وہ نماز و حج دونوں صورتوں میں گناہ گار ہوگا۔ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ وہ دونوں ہی صورتوں میں گناہ گار نہیں ہوگا اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ وہ حج کی صورت میں تو گناہ گار ہوگا لیکن نماز کی صورت میں گناہ گار نہیں ہوگا۔ حنفی علماء کا مسلک بھی اسی آخری قول کے مطابق ہے۔

حقیقی مجاہد کون ہے؟

(۲۸) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرٰى مَكَانَهٗ فَمَنْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ایک تو وہ شخص ہے جو مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے ایک وہ شخص ہے جو ذکر یعنی آوازہ اور شہرت کہ جس کو سمعہ کہتے ہیں کہ لئے جنگ کرتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو اس لئے جنگ کرتا ہے تاکہ اس کا مرتبہ دیکھا جائے یعنی اپنی شجاعت و بہادری دکھانے کے لئے جنگ کرتا ہے کہ جس کو ریا کہتے ہیں تو ان تینوں میں کون اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو شخص اس لئے جنگ کرے تاکہ اللہ کا دین سربلند ہو حقیقت میں وہی اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

عذر کی بنا پر جہاد میں نہ جانے والے کا حکم

(۲۹) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجَعَ مِنْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ فَدَنَا مِنَ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ اِنَّ بِالْمَدِيْنَةِ اَقْوَامًا مَاسِرْتُمْ مَسِيْرًا وَلَا قَطَعْتُمْ وَادِيًا اِلَّا كَانُوْا مَعَكُمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِلَّا شَرَكُوْكُمْ فِي الْاَجْرِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَهُمْ بِالْمَدِيْنَةِ قَالَ وَهُمْ بِالْمَدِيْنَةِ حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ جَابِرٍ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ غزوہ تبوک سے واپس آرہے تھے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا کہ مدینے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس سفر جہاد میں بظاہر تمہارے ساتھ نہیں تھے لیکن تم نے ایسا کوئی راستہ طے نہیں کیا اور کسی ایسی وادی و جنگل کو عبور نہیں کیا جس میں وہ تمہارے ساتھ نہ رہے ہوں یعنی ان کے جسم تو ان کے گھروں میں تھے لیکن ان کی دعائیں ان کے دل اور ان کی ہمتیں تمہارے ساتھ تھیں۔ اور ایک روایت میں اِلَّا کَانُوْا مَعَکُمْ یعنی جس میں تمہارے شریک نہ ہوں صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اور وہ لوگ مدینہ ہی میں ہیں؟ یعنی جب کہ وہ ہمارے ساتھ جہاد میں نہیں گئے اور اپنے گھروں میں موجود رہے پھر وہ ہمارے ساتھ ——————— کیسے رہے اور ہمارے اجر وثواب میں کیسے شریک ہوئے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہاں وہ مدینہ میں ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اجر وثواب میں تمہارے شریک ہیں کیونکہ ان کے عذر نے ان کو روکا ہے یعنی وہ اپنے اعذار کے سبب سے تمہارے ساتھ جہاد میں نہیں جاسکے ہیں۔ بخاریؒ اور مسلمؒ نے اس روایت کو حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: جو لوگ عذر کی بنا پر جہاد میں نہیں جاسکے اور مدینہ میں رہ گئے وہ جہاد کرنے والوں کے ثواب میں شریک تھے نہ یہ کہ مرتبہ و درجہ کے اعتبار سے وہ مجاہدین کے برابر تھے کیونکہ جن لوگوں نے بنفس نفیس جہاد میں شرکت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کی قربانی پیش کی وہ افضل ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً۔

"مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ نے درجہ میں فضیلت بخشی ہے۔"

ماں باپ کی خدمت کا درجہ

(۳۰) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَاْذَنَهٗ فِي الْجِهَادِ فَقَالَ اَحَيٌّ وَالِدَاكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَفِيْهِمَا فَجَاهِدْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَارْجِعْ اِلٰى وَالِدَيْكَ فَاَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا۔ (بخاری ومسلم)

"اور حضرت عبداللہؓ ابن عمرو کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر جہاد پر جانے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا ہاں آپ ﷺ نے فرمایا پھر تم انہیں کے درمیان رہ کر جہاد کرو یعنی پوری محنت و تندہی کے ساتھ ان کی خدمت کرو کہ تمہارے حق میں یہی جہاد ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے فرمایا کہ تو پھر اپنے ماں باپ کے پاس جاؤ اور ان کی صحبت کو بہتر بناؤ یعنی ان کی خدمت اور ان کے حقوق کی ادائیگی اچھی طرح کرو۔

تشریح: شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے جو حکم ثابت ہوتا ہے اس کا تعلق نفل جہاد سے ہے کہ جس شخص کے والدین زندہ ہوں اور مسلمان ہوں وہ ان کی اجازت کے بغیر نفل جہاد میں شرکت کے لئے گھر سے نہ جائے ہاں اگر جہاد فرض ہو تو پھر اس صورت میں ان والدین کی اجازت کی حاجت نہیں ہے۔ بلکہ اگر وہ منع بھی کریں اور جہاد میں جانے سے روکیں تو ان کا حکم نہ مانا جائے اور جہاد میں شریک ہو کر اپنا فرض ادء کیا جائے نیز اگر والدین کو خدا نے اسلام کی ہدایت نہ بخشی ہو اور وہ کافر ہوں تو جہاد میں شریک ہونے کے لئے ان کی اجازت کی کسی حال میں بھی حاجت نہیں ہے خواہ جہاد فرض ہو یا نفل اسی طرح علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر مسلمان ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کو ناگوار خاطر ہو تو ان کی اجازت کے بغیر کسی بھی نفل عبادت جیسے نفل حج و عمرہ کے لئے نہ جائے اور نہ نفل روزہ رکھے۔

فتح مکہ کے بعد ہجرت کی فرضیت ختم ہوگئی

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّنِيَّةٌ وَاِذَا

اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا اب فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت باقی ہے لہٰذا جب تم کو جہاد کے لئے بلایا جائے تو تم سب فوراً چلے جاؤ۔ کیونکہ نفیر عام کے موقع پر جہاد میں جانا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی ہر ایک پر ضروری ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ہجرت نہیں ہے کا مطلب یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے تو مکہ سے بلکہ ہر دار الکفر سے مدینہ کو ہجرت کرنی فرض عین تھی کیونکہ مدینہ میں دین کے نام لیواؤں کی تعداد بہت کم تھی اور وہ ہر اعتبار سے بہت کمزور و ضعیف تھے لہٰذا ہجرت کو فرض قرار دیا گیا تاکہ ہر طرف سے مسلمان مدینہ پہنچ کر وہاں کے مسلمانوں کی مدد و اعانت کریں اور اس طرح مشرکوں اور خدا کے باغیوں کی طاقت زائل و مفلوج ہو پھر جب اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے ذریعہ مسلمانوں کو عام غلبہ عطا فرمایا اور ان کی شوکت بڑھائی تو وہ علت یعنی مدینہ کے مسلمانوں کا کمزور اور قلیل المقدار ہونا" زائل ہو گئی اور اس وقت سے ہجرت کی فرضیت ختم ہو گئی لیکن کچھ صورتوں میں ہجرت کا استحباب باقی ہے جیسے جہاد کے لئے اپنے وطن سے نکلنا حصول علم کی خاطر کسی دوسری جگہ چلے جانا اور دار الکفر و دار الفتنہ سے یا کسی ایسے ملک و شہر سے نکل بھاگنا جہاں بھلائیاں متروک ہو چکی ہوں اور برائیاں مروج ہو گئی ہوں۔

لیکن جہاد اور نیت باقی ہے کا مطلب یہ ہے کہ دین کے دشمنوں اور خدا کے باغیوں کا دعویٰ سرنگوں کرنے کے لئے جہاد کی نیت رکھنے اور اخلاص عمل پیدا کرنے کا حکم باقی ہے حاصل یہ کہ ہجرت یعنی اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ چلے جانا پہلے ہر مسلمان پر فرض تھا پھر یہ حکم ختم ہو گیا لیکن جہاد کے سبب سے یا نیت صالحہ کی بنا پر کفار کے یا اور جاہل و بدعت اور فتنوں کے گڑھ سے نکل بھاگنے یا طلب علم کے لئے اپنا وطن چھوڑ دینا باقی رہا اور اس کا حکم منسوخ نہیں ہوا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

دین کی سربلندی کے لئے اُمت محمدی ﷺ کی کوئی نہ کوئی جماعت ہمیشہ برسر جہاد رہے گی

(۳۲) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ طَائِفَۃٌ مِنْ اُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلَی الْحَقِّ ظَاھِرِیْنَ عَلٰی مَنْ نَاوَاھُمْ حَتّٰی یُقَاتِلَ اٰخِرُھُمُ الْمَسِیْحَ الدَّجَّالَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عمرانؓ ابن حصین کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میری اُمت کی کوئی نہ کوئی جماعت ہمیشہ حق کی حمایت و حفاظت کے لئے برسر جنگ رہے گی اور جو بھی شخص اس جماعت سے دشمنی کریگا وہ اس پر غالب رہے گی، یہاں تک کہ اس امت کے آخری لوگ مسیح دجال سے جنگ کریں گے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اُمت کسی بھی زمانے میں ایسے سرفروشوں اور جانبازوں سے خالی نہیں رہے گی جو دین کی سربلندی حق کی حمایت و حفاظت اور ملت کے تحفظ کے لئے اپنے جان و مال کی قربانی پیش کریں گے اور دشمنان اسلام کا دعویٰ سرنگوں کریں گے وہیں یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ مجاہدین اسلام کے مقابلہ پر آنے والے کو آخر کار ہزیمت اور شکست کی رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا خواہ وہ کوئی فرد ہو یا کوئی جماعتی طاقت، ہو سکتا ہے کہ وقت کی نزاکت اور حالات کی رفتار کسی مرحلہ پر مسلمانوں کے لئے بظاہر کسی پسپائی کا موقعہ پیدا کر دے لیکن آخر کار فتح و کامرانی مسلمانوں کا ہی نصیب بنے گی۔

اس اُمت کے آخری لوگ سے حضرت امام مہدیؓ اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے تابعین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو قرب قیامت میں دجال کے ذریات سے جنگ کریں گے۔ اور آخر کار حضرت عیسیٰ اس کو فنا کے گھاٹ اتاریں گے، دجال کے قتل کے بعد پھر کوئی

جہد نہیں ہوگا۔ کیونکہ یاجوج ماجوج کے خلاف تو جہاد اس لئے نہیں ہوگا کہ ان سے جنگ کرنے کی طاقت کسی کو حاصل نہیں ہوگی اور جب اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کردے گا تو پھر جب تک عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں موجود رہیں گے روئے زمین پر کوئی کافر باقی نہیں رہے گا آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بعض لوگ کافر ہو جائیں گے اور اس وقت تمام مسلمان ایک پاکیزہ ہوا کے ذریعہ وفات پا جائیں گے اور دنیا میں صرف کافر ہی رہ جائیں گے اس طرح جب قیامت آئے گی تو اس وقت روئے زمین پر کوئی بھی اللہ کا نام لیوا باقی موجود نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے بعض احادیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ لا تزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق حتى تقوم الساعة یعنی میری اُمّت کی کوئی نہ کوئی جماعت ہمیشہ حق کی حمایت و حفاظت کرتی رہے گی یہاں تک کہ قیامت قائم ہو تو یہ قرب قیامت پر محمول ہے کہ قرب قیامت تک اس روئے زمین پر حق کی حفاظت کرنے والی کوئی نہ کوئی جماعت موجود رہے گی، چنانچہ حق کی حمایت میں حق والوں کا آخری معرکہ دجال سے ہوگا اور دجال کا خروج علامات قیامت میں سے ہے۔

جہاد میں کسی طرح سے بھی شرکت نہ کرنے والے کے بارے میں وعید

(۳۳) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَّمْ يَغْزُ وَلَمْ يُجَهِّزْ غَازِيًا اَوْ يَخْلُفْ غَازِيًا فِیْ اَهْلِهٖ بِخَيْرٍ اَصَابَهُ اللّٰهُ بِقَارِعَةٍ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے نہ تو (بنفس خود) جہاد کیا اور نہ کسی مجاہد کا سامان درست کیا اور نہ کسی غازی کے (جہاد میں ہونے کے دوران اس کے) اہل و عیال کے حق میں بھلائی کے ساتھ اس کا نائب بنا تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے پہلے دن کسی سخت مصیبت میں مبتلا کرے گا۔" (ابوداؤدؒ)

(۳۴) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ جَاهِدُوا الْمُشْرِكِيْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ۔

(رواہ ابوداؤد و النسائی والدارمی)

"اور حضرت ابوامامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مشرکین یعنی دشمنان اسلام سے تم اپنی جان اپنے مال اور اپنی زبان کے ذریعہ جہاد کرو۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: جان و مال کے ذریعہ جہاد کرنا تو یہ ہے کہ حق و باطل کے درمیان ہونے والے معرکہ کے موقع پر میدان جنگ میں اپنی جان کو پیش کرے اور زخمی ہو اور اپنے مال کو جہاد کی ضروریات میں خرچ کرے زبان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ دشمنان اسلام کے عقائد و نظریات اور ان کے بتوں کی مذمت کرے ان کے حق میں بددعا کرے کہ انہیں حق کے مقابلہ پر ذلت و رسوائی اور شکست کا سامنا کرنا پڑے ان کو قتل و قید کرنے یا اسی طرح کی اور چیزوں سے ڈرائے دھمکائے مسلمانوں کی فتح و کامرانی اور ان کو مال غنیمت ملنے کی دعا کرے اور لوگوں کو جہاد میں شریک ہونے کی ترغیب دلائے۔

جنّت کے وارث

(۳۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَاضْرِبُوا الْهَامَ تُوْرَثُوا الْجِنَانَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سلام کو عام یعنی ہر آشنا و ناآشنا کو سلام کرو اور غریب و محتاج لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور کفار کے فتنہ و فساد کا سر کچلو جنّت کے وارث بنائے جاؤ گے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

جہاد میں پاسبانی کی فضیلت

(۳۶) عَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُلُّ مَيِّتٍ يُخْتَمُ عَلٰى عَمَلِهٖ اِلَّا الَّذِيْ مَاتَ مُرَابِطًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنَّهٗ يُنْمٰى لَهٗ عَمَلُهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَيَاْمَنُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ۔

"اور حضرت فضالہ ابن عبید رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہر میت اپنے عمل پر اختتام پذیر ہوتی ہے یعنی ہر شخص کا عمل اس کی زندگی تک رہتا ہے مرنے کا بعد اس کا عمل باایں طور باقی نہیں رہتا کہ اس کو نیا ثواب ملتا رہے لیکن جو شخص اللہ کی راہ یعنی جہاد میں پاسبانی کرتا ہوا مرے تو اس کے لئے اس کا عمل قیامت کے دن تک بڑھا دیا جاتا ہے اور قبر کے فتنہ و عذاب سے مامون رہتا ہے ترمذی، ابوداؤد اور دارمی نے اس روایت کو عقبہؓ ابن عامر سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس کا عمل قیامت تک کے لئے بڑھا دیا جاتا ہے کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کو ہر لحظہ اس کے اس عمل کا نیا ثواب ملتا رہتا ہے کیونکہ اس نے ایک ایسے عمل پر اپنی جان نذر کی ہے جس کا فائدہ ہمیشہ مسلمانوں کو پہنچتا رہے گا اور وہ عمل ہے دین کو زندہ سربلند رکھنا جو اس شخص نے جہاد میں پاسبانی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو دشمنوں سے محفوظ و محتاط رکھ کر انجام دیا۔

جہاد میں شرکت کرنے والے کی فضیلت

(۳۷) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قَاتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَوَاقَ نَاقَةٍ فَقَدْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ وَمَنْ جُرِحَ جُرْحًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْنُكِبَ نَكْبَةً فَاِنَّهَا تَجِيْئُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَاَغْزَرِ مَا كَانَتْ لَوْنُهَا الزَّعْفَرَانُ وَرِيْحُهَا الْمِسْكُ وَمَنْ خَرَجَ بِهٖ خُرَاجٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنَّ عَلَيْهِ طَابَعَ الشُّهَدَاءِ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد والنسائی)

"اور حضرت معاذؓ ابن جبل سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد میں اونٹنی کے فواق کے بقدر یعنی تھوڑی دیر کے لئے بھی لڑا اس کے لئے ابتداءً ہی جنت واجب ہوگئی جو شخص اللہ کی راہ (جہاد) میں دشمنوں کے ہتھیاروں سے زخمی ہوا یا وہ کسی زخم کی تکلیف میں مبتلا ہوا تو وہ زخم قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا جیسا کہ وہ دنیا میں تھا (یعنی وہ شخص قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا وہ زخم زیادہ تازہ حالت میں ہوگا) اور اس زخم کا رنگ زعفران جیسا اور اس کی بو مشک جیسی ہوگی اور جس شخص کے بدن میں اللہ کی راہ (جہاد) میں پھوڑا نکلا تو قیامت کے دن اس پھوڑے پر یا پھوڑے والے پر شہیدوں کی مہر ہوگی یعنی اس شخص کے ساتھ شہیدوں کی علامت ہوگی تاکہ جانا جائے کہ اس شخص نے دین کی سربلندی و حفاظت کے لئے جدوجہد کی تھی چنانچہ اس کو وہی اجر و انعام دیا جائے گا جو مجاہدین اسلام کو ملے گا۔"

تشریح: فواق اس وقفہ کو کہتے ہیں جو اونٹنی کے دودھ دوہنے کے درمیان ہوتا ہے یعنی پہلے ایک مرتبہ اونٹنی کا دودھ دوہا اس کے بعد پھر تھوڑی دیر میں پھر دوہا ان دونوں مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے اس کو عربی میں فواق کہتے ہیں یہاں حدیث میں "فواق" سے مراد تھوڑی دیر ہے۔

جہاد میں اپنا مال و اسباب خرچ کرنے کی فضیلت

(۳۸) وَعَنْ خُرَيْمِ بْنِ فَاتِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَنْفَقَ نَفَقَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كُتِبَ لَهٗ بِسَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت خریمؓ ابن فاتک کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص خدا کی راہ یعنی جہاد میں اپنے مال میں سے جو کچھ بھی خرچ

کرے گا اس کے لئے سات سو گنا ثواب لکھا جائے گا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: خدا کی راہ میں اپنے مال و اسباب کو خرچ کرنے کا جو ثواب ہے اس کا ادنیٰ درجہ یہاں ذکر گیا ہے کہ جہاد میں خرچ کیا جانے والا مال اپنے مالک کو سات سو گنا ثواب کا حقدار کرے گا ویسے یہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر موقوف ہے کہ وہ جس کو چاہے گا اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرمائے گا۔

(۳۹) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الصَّدَقَاتِ ظِلُّ فُسْطَاطٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمِنْحَةُ خَادِمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ طَرُوْقَةُ فَحْلٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بہترین صدقہ اس خیمہ کا سایہ ہے جو خدا کی راہ میں یعنی کسی مجاہد یا حاجی اور یا طالب علم دین وغیرہ کو دیا جائے اور بہترین صدقہ وہ خادم ہے۔ جو خدا کی راہ میں (کلیۃً یا عاریۃً) دیا جائے اور بہترین صدقہ اللہ کی راہ میں ایسی اونٹنی کا دینا ہے جو نر کی جفتی کے قابل ہو یعنی خدا کی راہ میں ایسی اونٹنی کا دینا افضل ہے جو نر کے ساتھ جفتی کی عمر کو پہنچ گئی ہے تاکہ وہ سواروں کے کام آسکے۔" (ترمذیؒ)

مجاہد کی فضیلت

(۴۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَلِجُ النَّارَ مَنْ بَکٰی مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ حَتّٰی یَعُوْدَ اللَّبَنُ فِی الضَّرْعِ وَلَا یَجْتَمِعُ عَلٰی عَبْدٍ غُبَارٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَدُخَانُ جَهَنَّمَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَزَادَ النَّسَائِیُّ فِیْ اُخْرٰی فِیْ مَنْخَرَیْ مُسْلِمٍ اَبَدًا وَفِیْ اُخْرٰی لَهٗ فِیْ جَوْفِ عَبْدٍ اَبَدًا وَلَا یَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْاِیْمَانُ فِیْ قَلْبِ عَبْدٍ اَبَدًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص دوزخ میں نہیں جائے گا جو خدا کے خوف سے رویا ہو یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس نہ چلا جائے اور کسی بندے میں اللہ کی راہ کا غبار اور دوزخ کا دھواں یک جا نہیں ہو سکتے یعنی جس مسلمان کا جسم خدا کی راہ یعنی جہاد میں غبار آلود ہوا اس کو دوزخ کا دھواں چھو بھی نہیں سکتا۔ حاصل یہ کہ مجاہد دوزخ میں نہیں جائے گا۔ (ترمذیؒ) اور نسائی نے ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ اور کسی مسلمان کی ناک کے دونوں نتھنوں میں خدا کی راہ کا غبار اور دوزخ کا دھواں کبھی بھی یک جا نہیں ہو سکتے اور نسائی ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ بندے کے پیٹ میں خدا کی راہ کا غبار اور دوزخ کا دھواں کبھی بھی یک جا نہیں ہو سکتے اور کسی بندے کے دل میں (کامل) ایمان اور بخل کبھی بھی یک جا نہیں ہو سکتے۔"

تشریح: یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس نہ چلا جائے یہ جملہ تعلیق بالمحال کے طور پر ہے یعنی جس طرح دوہے ہوئے دودھ کا تھنوں میں واپس جانا محال ہے۔ اس طرح اس شخص کا دوزخ میں جانا محال ہے۔

(۴۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَیْنَانِ لَا تَمَسُّهُمَا النَّارُ عَیْنٌ بَکَتْ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَعَیْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا دو آنکھیں ایسی ہیں جن کو دوزخ کی آگ چھو بھی نہ سکے گی ایک تو وہ آنکھ جو خدا کے خوف سے روئی ہو۔ اور دوسری وہ آنکھ ہے جس نے خدا کی راہ یعنی جہاد میں کفار سے مجاہدین کی نگہبانی کرتے ہوئے رات گزاری ہو۔" (ترمذیؒ)

جہاد کی برتری و فضیلت

(۴۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِشِعْبٍ فِیْهِ عُیَیْنَةٌ مِنْ مَاءٍ عَذْبَةٍ

فَاَعْجَبَتْهُ فَقَالَ لَوِ اعْتَزَلْتُ النَّاسَ فَاَقَمْتُ فِي هٰذَا الشِّعْبِ فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَاتَفْعَلْ فَاِنَّ مَقَامَ اَحَدِكُمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهٖ فِي بَيْتِهٖ سَبْعِيْنَ عَامًا اَلَاتُحِبُّوْنَ اَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَيُدْخِلَكُمُ الْجَنَّةَ اُغْزُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ قَاتَلَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَوَاقَ نَاقَةٍ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران رسول کریم ﷺ کے ایک صحابیؓ پہاڑی کے درہ سے گزرے جس میں شیریں پانی کا ایک چشمہ تھا تو وہ چشمہ ان کو بہت اچھا لگا وہ کہنے لگے کہ کاش میں لوگوں سے علیحدگی اختیار کرلوں اور اس درے میں آرہا؟ جب رسول کریم ﷺ کے سامنے اس بات کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے ان صحابی سے فرمایا کہ تم ایسا نہ کرنا کیونکہ تم میں سے کسی شخص کا اللہ کی راہ یعنی جہاد میں قیام کرنا اس کا گھر میں ستر برس نماز پڑھنے سے بہتر ہے کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کامل طور پر بخش دے اور تمہیں ابتداءً ہی میں جنت میں داخل کردے خدا کی راہ میں جہاد کرو کیونکہ جس شخص نے خدا کی راہ میں اونٹنی کے فواق کے بقدر (یعنی تھوڑی دیر کے لئے بھی) جہاد کیا اس کے لئے جنت واجب ہوگئی۔" (ترمذی)

تشریح: ستر برس سے تحدید مراد نہیں ہے بلکہ کثرت مراد ہے چنانچہ یہ ارشاد گرامی اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

مقام الرجل فی الصف فی سبیل اللّٰہ افضل عنداللّٰہ من عبادۃ الرجل ستین سنۃ۔

"کسی شخص کا اللہ کی راہ میں دشمن کے مقابلہ پر صف میں کھڑا ہونا خدا کے نزدیک کسی شخص کی ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے۔"

اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے چونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں سے گوشہ گزینی اختیار کرنے اور جنگل و کوہستان میں عبادت خداوندی میں مشغول رہنے سے بخشش و مغفرت حاصل نہیں ہوتی اس لئے علماء اس ارشاد گرامی کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ چونکہ اس زمانے میں جہاد واجب تھا۔ اور کسی نفل کے لئے واجب کو ترک کرنا گناہ ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ ان صحابیؓ پر گویا یہ واضح کیا کہ اگر تم نے دنیا اور دنیا والوں سے ترک تعلق کر کے اس پہاڑی درے میں گوشہ گزینی اختیار کی اور اگرچہ اس کا مقصد محض مکمل تنہائی و خلوت میں خدا کی عبادت میں مشغول رہنا ہو تو اس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ تم ان بہت سی سعادتوں اور فضیلتوں سے محروم رہ جاؤ گے جو دنیا والوں کے درمیان رہ کر دینی فرائض و ذمہ داریوں کو انجام دینے کی صورت میں حاصل ہوتی ہیں بلکہ تمہارا یہ نفل عمل ایک واجب عمل اور ایک اہم دینی فریضہ یعنی جہاد کے ترک کا باعث بھی ہوگا جس سے تم گنہ گاروں کے زمرے میں شامل ہو جاؤ گے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ترجمہ میں واضح کیا گیا ہے اس ارشاد گرامی سے کامل مغفرت اور ابتداءً جنت میں جانے والوں کے ساتھ جنت میں داخل ہونے پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کے درمیان رہنا گوشہ گزینی سے افضل ہے خصوصاً آنحضرت ﷺ کے زمانہ سعادت نشان میں تو یہ افضلیت کہیں زیادہ تھی البتہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ کے بعد کبھی کبھی گوشہ گزینی ہی کو افضلیت حاصل ہوتی ہے جب کہ لوگوں کے درمیان رہنے سے فتنہ و شر کے غلبہ کا خوف ہو۔

جہاد میں پاسبانی کی فضیلت

(۴۳) وَعَنْ عُثْمَانَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ يَوْمٍ فِيْمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَنَازِلِ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت عثمان رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کی راہ یعنی جہاد میں کفر کی سرحدوں پر ایک دن کے

لئے بھی پاسبانی کی خدمت اس (پاسبانی کے) منصب و خدمت کے علاوہ اور عبادتوں کے میں ہزار دن تک مشغول رہنے سے بہتر ہے۔" (ترمذی ونسائی)

تشریح: "اس منصب و خدمت کے علاوہ" کے ذریعہ اقامت دین کے لئے خدا کی راہ میں جدوجہد کرنے کی خدمت کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

بظاہر اس حدیث کا تعلق اس شخص سے ہے جو جہاد میں اسلامی سرحدوں کی حفاظت و نگہبانی کی خدمت پر مامور کیا گیا ہو اور پاسبانی کی ذمہ داریوں کو انجام دینا اس پر واجب ہو کیونکہ اس شخص کا اسی مفوضہ خدمت کے علاوہ کسی اور عبادت وغیرہ میں مشغول ہونا معصیت ہے اگرچہ وہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں مسجد ہی میں کیوں نہ بیٹھے کہ اس عمل کی بھی بہت فضیلت ہے اور اس کو بھی رباط کہا گیا ہے۔

شہداء ابتداءً ہی جنت میں داخل کئے جائیں گے

(۴۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عُرِضَ عَلَیَّ اَوَّلُ ثَلَاثَةٍ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ شَهِیْدٌ وَعَفِیْفٌ مُتَعَفِّفٌ وَعَبْدٌ اَحْسَنَ عِبَادَةَ اللّٰهِ وَنَصَحَ لِمَوَالِیْهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میرے سامنے وہ پہلے تین شخص پیش کئے گئے جو شروع ہی میں جنت میں داخل ہوں گے ان میں سے ایک شخص تو شہید ہے دوسرا وہ شخص ہے جو حرام سے بچے اور سوال نہ کرے (یعنی فسق و فجور سے بچنے والا اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے والا) اور تیسرا شخص وہ غلام ہے جس نے اپنے اللہ کی بھی اچھی اطاعت و عبادت کی اور اپنے مالکوں کا بھی خیر خواہ رہا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: پہلے تین شخص سے مراد یہ ہے کہ بالکل شروع میں جنت میں جو تین تین شخص داخل ہوں گے ان میں سے یہ تین شخص پہلے داخل ہوں گے لیکن انبیاء کے بعد کیونکہ انبیاء سب سے مقدم ہوں گے اور وہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے نیز تین تین شخص سے تین تین جماعتیں مراد ہیں۔

افضل مجاہد اور افضل شہید

(۴۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ حُبْشِیٍّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ قَالَ طُوْلُ الْقِیَامِ قِیْلَ فَاَیُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ قَالَ جُهْدُ الْمُقِلِّ قِیْلَ فَاَیُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ هَجَرَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ قِیْلَ فَاَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ جَاهَدَ الْمُشْرِكِیْنَ بِمَالِهٖ وَنَفْسِهٖ قِیْلَ فَاَیُّ الْقَتْلِ اَشْرَفُ قَالَ مَنْ اُهْرِیْقَ دَمُهٗ وَعُقِرَ جَوَادُهٗ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَفِیْ رِوَایَةِ النَّسَائِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ قَالَ اِیْمَانٌ لَا شَكَّ فِیْهِ وَجِهَادٌ لَا غُلُوْلَ فِیْهِ وَحَجَّةٌ مَبْرُوْرَةٌ قِیْلَ فَاَیُّ الصَّلَاةِ اَفْضَلُ قَالَ طُوْلُ الْقُنُوْتِ ثُمَّ اتَّفَقَا فِی الْبَاقِیْ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن حبشی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ نماز کے اعمال (ارکان) میں سے کونسا عمل (رکن) افضل ہے آپ ﷺ نے فرمایا طویل قیام کرنا پوچھا گیا کون سا صدقہ افضل ہے فرمایا مفلس و محتاج اپنے فقر و افلاس کے باوجود محنت و مشقت کر کے نکالے پوچھا گیا کون سی ہجرت بہتر ہے فرمایا اس شخص کی ہجرت جو اس چیز کو چھوڑ دے جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے یعنی اگرچہ ہجرت کے معنی دار الکفر کو چھوڑ کر دار الاسلام میں چلے جانا ہیں لیکن حرام چیزوں کو چھوڑ کر حلال چیزوں کو اختیار کرنا بھی ہجرت ہی کہلاتا ہے بلکہ یہی ہجرت بہتر ہے پوچھا گیا کون سا جہاد بہتر ہے فرمایا اس شخص کا جہاد جو اپنے مال اور اپنی جان کے ذریعہ مشرکین سے جہاد کرے پوچھا گیا جہاد میں

کون سا مارا جانا بہتر ہے یعنی کون سا شہید افضل ہے فرمایا اس شخص کا مارا جانا جس کا خون بہایا جائے اور جس کے گھوڑے کی کونچیں کاٹی جائیں یعنی وہ شہید افضل ہے جو خود بھی مارا جائے اور اس کا گھوڑا بھی مارا جائے ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں یوں ہے کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ اعمال میں کون سا عمل افضل ہے آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایمان جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہ ہو۔ وہ جہاد جس میں حاصل شدہ مال غنیمت کے بارے میں کسی طرح کی خیانت نہ کی گئی ہو اور حج مقبول پھر پوچھا گیا کہ نماز میں کونسی چیز افضل ہے؟ فرمایا قیام کو طویل کرنا س کے بعد حدیث کے الفاظ ابوداؤد و نسائی نے یکساں نقل کئے ہیں۔"

تشریح: جو اپنے جان اور مال کے ذریعہ الخ کا مطلب یہ ہے کہ وہی جہاد افضل ہے جس میں مجاہد نے اپنا مال و اسباب اور اپنا روپیہ پیسہ بھی اپنے اور دوسرے مجاہدین کی ضروریات جہاد میں صرف کیا ہو اور میدان جنگ میں اپنی جان کو بھی پیش کیا ہو یہاں تک کہ زخمی ہوا اور مارا گیا۔

افضل اعمال کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ احادیث میں افضل اعمال کے تعین و بیان کے سلسلے میں مختلف ارشاد منقول ہیں کہیں کسی عمل کو افضل فرمایا گیا ہے اور کہیں کسی عمل کو اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے افضل عمل کے بارے میں کئے جانے والے سوالات کے جوابات سائل کی حیثیت اور اس کے احوال کے مناسب ارشاد فرمائے چنانچہ جس سائل میں تکبر و درشتی کے آثار دیکھے اس کو جواب دیا کہ سب سے بہتر عمل تواضع و نرم خوئی ہے جیسے سلام کو ظاہر کرنا اور نرم گوئی اختیار کرنا ۔ جس سے سائل میں بخل اور خست کے آثار پائے ان سے فرمایا کہ سب سے بہتر عمل سخاوت ہے جیسے محتاجوں اور فقیروں کو کھانا کھلانا وغیرہ اسی طرح جس سائل میں عبادت کے معاملے میں سستی کے آثار پائے اس کو جواب دیا کہ سب سے بہتر عمل تہجد کی نماز ہے غرضیکہ جس سائل کو جس حالت میں پایا اس کا جواب اسی کے مناسب حال دیا۔ اس اعتبار اعمال کی افضلیت کی مراد گویا درحقیقت سائل......کے حق میں ہے کہ مثلاً جس سائل میں بخل و خست کی خصلتیں تھیں اس کے حق میں سب سے بہتر عمل سخاوت ہی تھا یا پھر یہ کہا جائے گا کہ جس موقع پر جس عمل کو سب سے بہتر عمل فرمایا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ عمل افضل اعمال میں سے ایک افضل عمل ہے۔

شہداء پر حق تعالیٰ کے انعامات

(۴۶) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلشَّهِيْدِ عِنْدَ اللّٰهِ سِتُّ خِصَالٍ يُغْفَرُ لَهٗ فِيْ اَوَّلِ دَفْعَةٍ وَيُرٰى مَقْعَدَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ وَيُجَارُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَيَاْمَنُ مِنَ الْفَزَعِ الْاَكْبَرِ وَيُوْضَعُ عَلٰى رَاْسِهٖ تَاجُ الْوَقَارِ اَلْيَاقُوْتَةُ مِنْهَا خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا وَيُزَوَّجُ ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ زَوْجَةً مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ وَيُشَفَّعُ فِيْ سَبْعِيْنَ مِنْ اَقْرِبَائِهٖ۔

(رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت مقدام ابن معدیکرب کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حق تعالیٰ کے ہاں شہید کے لئے چھ امتیازی انعامات ہیں۔ (۱) اس کو پہلی مرتبہ میں ہی (یعنی اس کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی) بخش دیا جاتا ہے (۲) اس کو جان نکلتے وقت ہی جنت میں اپنا ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے (۳) وہ قبر کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے (۴) وہ بڑی گھبراہٹ یعنی آگ کے عذاب سے مامون رہے گا (۵) اس کے سر پر عظمت و وقار کا تاج رکھا جائے گا جس کا یاقوت دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر و گرانمایہ ہوگا (۶) اس کی زوجیت میں بڑی آنکھوں والی بہتر حوریں دی جائیں گی اور اس کے عزیز و اقرباء میں سے ستر آدمیوں کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔"

جہاد میں شرکت نہ کرنے والے کے بارے میں وعید

(۴۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ بِغَيْرِ اَثَرٍ مِنْ جِهَادٍ لَقِيَ اللّٰهَ وَفِيْهِ ثُلْمَةٌ۔

(رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ تعالیٰ کے حضور اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس پر جہاد کا کوئی اثر نہیں ہوگا تو وہ گویا اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا دین ناقص ہوگا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہ)

تشریح: "اثر" سے مراد "علامت و نشان" ہے حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص اس حال میں اس دنیا سے رخصت ہوگا کہ نہ تو اس کے جسم پر جہاد کی کوئی علامت ہوگی جیسے زخم یا غبار راہ یا کسی اور جسمانی تکلیف کا کوئی نشان۔ اور نہ اس کے نامہ اعمال میں شرکت جہاد کا کوئی ثبوت ہوگا جیسے جہاد اور مجاہدین کی ضرورت میں اپنا مال خرچ کرنا یا مجاہدین کو سامان جہاد مہیا کرنا تو وہ گویا اس حالت پر مرے گا کہ اس کے دین میں رخنہ ہوگا ہو سکتا ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس شخص سے ہو جس پر جہاد فرض ہوا اور وہ نہ صرف یہ کہ اس فرض کی ادائیگی سے عملی طور پر محروم رہا ہو بلکہ اس نے جہاد میں شریک ہونے اور مستعد رہنے کا ارادہ بھی نہ کیا ہو۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہاں جس "جہاد" کا ذکر کیا گیا ہے اس سے کفار کے مقابلہ میں لڑی جانے والی جنگ بھی مراد ہے اور اپنے نفس و شیطان سے لڑنا بھی مراد ہے جس کو مجاہدہ کہتے ہیں، چنانچہ اس کی تائید حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو آگے آ رہی ہے۔

شہید، قتل کی اذیت سے محفوظ رہتا ہے

(۴۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشَّهِيْدُ لَا يَجِدُ اَلَمَ الْقَتْلِ اِلَّا كَمَا يَجِدُ اَحَدُكُمْ اَلَمَ الْقَرْصَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا شہید اپنے قتل کی بس اتنی تکلیف محسوس کرتا ہے جتنی تکلیف تم میں سے کوئی شخص چیونٹی کے کاٹنے پر محسوس کرتا ہے ترمذی، نسائی، دارمی، اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ اس شہید کا حال بیان کیا گیا ہے جو خدا کی راہ میں اپنی جان دینے میں لذت و کیف محسوس کرتا ہے اور اس قربانی پر اس کا نفس خوش و مطمئن ہوتا ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ مراد یہ ہو کہ شہید کو موت کے بعد حق تعالیٰ کی نعمتوں اور رحمتوں کی وجہ سے جو لذتیں حاصل ہوتی ہیں ان کی بہ نسبت اس کو اپنے قتل کی تکلیف چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی لہٰذا دانا مؤمن کو چاہئے کہ وہ خدا کی راہ میں جان دینے سے نہ گھبرائے اور نہ ڈرے بلکہ ہنسی خوشی کے ساتھ شہادت کو گلے لگائے۔

جہاد میں مؤمن کا بہنے والا قطرۂ خون خدا کے نزدیک محبوب ترین چیز ہے

(۴۹) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ قَطْرَتَيْنِ وَاَثَرَيْنِ قَطْرَةُ دُمُوْعٍ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَقَطْرَةُ دَمٍ يُهْرَاقُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَمَّا الْاَثَرَانِ فَاَثَرٌ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَثَرٌ فِیْ فَرِيْضَةٍ مِنْ فَرَائِضِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا خدا کے نزدیک دو قطروں اور دو نشانوں سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں ہے ایک تو خدا کے خوف سے بہا ہوا آنسوؤں کا قطرہ ہے اور دوسرا قطرہ خون ہے جو خدا کی راہ میں بہایا گیا ہو۔ اور دو نشانوں میں سے ایک نشان تو وہ ہے جو اللہ کی راہ میں قائم ہوا ہو۔ اور دوسرا نشان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کی ہوئی چیزوں میں سے کسی فرض چیز کے سلسلے میں پیدا ہوا ہو امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: اللہ کی راہ میں قائم ہونے والے نشان کا مطلب یہ ہے کہ جیسے مجاہد جہاد میں جائے اور راستہ میں اس کے قدم کے نشان پڑ جائیں یا اس کے جسم پر غبار راہ کا اثر قائم ہو جائے یا اس کے بدن پر کوئی زخم آ جائے اور یا طلب علم دین کے کپڑوں یا جسم کے کسی حصہ پر روشنائی کے داغ دھبے پڑ جائیں کہ علم دین کی راہ بھی خدا ہی کی راہ ہے اور اس راہ کا راہی بھی مجاہد ہی کی طرح ہے۔

کسی فرض چیز کے سلسلے میں پیدا ہونے والے نشان کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جاڑے کے موسم میں وضو کی وجہ سے نمازی کے ہاتھ پیر پھٹ جائیں، نماز میں سجدوں کی وجہ سے پیشانی پر داغ پڑ جائے یا گرمی میں سجدہ کے وقت تپتے ہوئے فرش سے نمازی کی پیشانی جل جائے اور اس کا کوئی دھبہ پڑ جائے، یا روزے میں روزے دار کے منہ سے بو آنے لگے اور یا سفر حج میں حاجی کے بدن پر راستے کی گرد و غبار کی تہیں جم جائیں۔

بلاضرورت شرعی بحری سفر کی ممانعت

(۵۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَرْكَبِ الْبَحْرَ اِلَّا حَاجًا اَوْ مُعْتَمِرًا اَوْ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنَّ تَحْتَ الْبَحْرِ نَارًا وَ تَحْتَ النَّارِ بَحْرًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم بارادہ حج یا عمرہ اور یا اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے جانے کے علاوہ دریا میں سفر نہ کرو کیونکہ دریا کے نیچے آگ ہے اور آگ کے نیچے دریا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ پانی میں سفر کرنا ایک خطرناک مہم ہے اور عقلمند آدمی کو چاہئے کہ وہ اس خطرناک مہم کے ذریعہ اپنے آپ کو ہلاکت و خوف میں نہ ڈالے کیونکہ کسی شرعی ضرورت کی بناء پر کہ جو تقرب بارگاہ الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے کسی خطرناک و ہلاکت خیز مہم میں اپنے آپ کو ڈالنا ایک مستحسن فعل ہے لیکن بلاضرورت شرعی ایسا کوئی بھی فعل عقل و دانش کے منافی ہے۔

اس حدیث سے ان لوگوں کے قول کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ترک حج کے لئے سمندر و دریا ایک عذر شرعی ہے چنانچہ اس سلسلے میں سب سے بہتر اور قابل عمل بات مشہور فقیہ حضرت ابواللیث سمرقندی کی ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ جب دریائی سفر میں سلامتی کا پہلو غالب ہو تو حج پر جانا فرض ہوتا ہے اور اگر سلامتی کا پہلو غالب نہ ہو تو پھر حج کا ارادہ کرنے والا مختار ہے کہ اگر اس کو ہمت ساتھ نہ دے تو نہ جائے اور اگر وہ سلامتی کا ظن غالب نہ ہونے کے باوجود جانا چاہے تو چلا جائے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اس موقع پر اس آیت کریمہ:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔

"اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی و ہلاکت میں مت ڈالو۔"

کے بارہ میں بھی یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ آیت اس صورت پر محمول ہے جب کہ اس جگہ کوئی شرعی غرض اور دینی کام نہ ہو چنانچہ اسی لئے بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر میں تباہی و ہلاکت کی کچھ صورتیں بیان کی ہیں کہ جیسے اپنے مال کا اسراف کرنا یا اپنی معاش کے ذریعہ مثلاً نوکری یا تجارت وغیرہ کو اپنے ہاتھوں ضائع و ختم کر دینا اور جہاد میں شرکت کرنے یا اپنا مال خرچ کرنے سے باز رہنا دراصل دشمن کو قوت پہنچانا اور ان کو اپنی ہلاکت کے لئے اپنے اوپر مسلط کر لینا ہے۔

"دریا کے نیچے آگ ہے" اس جملہ کا مقصد لوگوں کو سمندر و دریا سے ڈرانا اور اس بات کو اہمیت کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ سمندر و دریا کے سفر میں بڑا خطرہ ہے کیونکہ سمندر و دریا میں سفر کرنے والا مختلف قسم کے آفات سے دوچار رہتا ہے اور خصوصاً پہلے زمانے میں تو پانی کا سفر اپنے دامن میں بہت ہی خطرے رکھتا تھا اور مسافر کو یکے بعد دیگرے ایسی مختلف خطرناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا تھا جس کی وجہ سے ہر لمحے موت و ہلاکت بالکل سامنے کھڑی نظر آتی تھی۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کو اس کے اصل معنی پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

پانی کے سفر میں مرنے والا شہید کا درجہ پائے گا

(۵۱) وَعَنْ اُمِّ حَرَامٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمَائِدُ فِي الْبَحْرِ الَّذِيْ يُصِيْبُهُ الْقَيْئُ لَهٗ اَجْرُ شَهِيْدٍ وَالْغَرِيْقُ

لَهٗ اَجْرُ شَهِيْدَيْنِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور اُمّ حرامؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا دریا و سمندر کے سفر میں جس شخص کا سر گھومنے لگے اور اس کی وجہ سے اس کو قے ہو تو اس کو ایک شہید کا ثواب ملے گا اور جو شخص سفر کے دوران دریا میں ڈوب جائے تو اس کو دو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ان دونوں کو شہید کا ثواب اس صورت میں ملے گا جب کہ وہ جہاد کے لئے یا طلب علم اور حج جیسے مقاصد کے لئے کشتی وغیرہ کے ذریعہ دریا و سمندر میں سفر کر رہا ہو نیز اگر اس کے سفر کا مقصد تجارت ہو اور اس تجارت کی غرض محض اپنے جسم کو زندہ و طاقت ور رکھنا اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی کو پورا کرنا ہو اور وہ تجارت اس دریائی سفر کے بغیر ممکن الحصول نہ ہو تو اس صورت میں بھی یہی حکم ہے۔

جہاد میں کسی بھی طرح مرنے والا شہید ہے

(۵۳) وَعَنْ اَبِىْ مَالِكٍ نِ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ فَصَلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمَاتَ اَوْ قُتِلَ اَوْ وَقَصَهٗ فَرَسُهٗ اَوْ بَعِيْرُهٗ اَوْ لَدَغَتْهُ هَامَّةٌ اَوْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ بِاَيِّ حَتْفٍ شَاءَ اللّٰهُ فَاِنَّهٗ شَهِيْدٌ وَاِنَّ لَهُ الْجَنَّةَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابومالک اشعریؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ یعنی جہاد جیسے مقاصد میں گھر سے نکلا اور زخمی ہو جانے کی وجہ سے مر گیا یا اس کو جان سے مار ڈالا گیا یا اس کے گھوڑے یا اس کے اونٹ نے اس کو کچل ڈالا یا کسی زہریلے جانور جیسے سانپ وغیرہ نے اس کو ڈس لیا اور یا کسی بیماری کی وجہ سے یا اچانک یوں ہی اللہ کی مرضی سے اپنے بستر پر مار گیا تو وہ ہر صورت میں شہید ہے یعنی یا تو وہ حقیقی شہید ہے یا شہید کے حکم میں ہے اور اس کے لئے جنت ہے یعنی وہ ابتداء ہی میں شہداء و صالحین کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا۔" (ابوداؤدؒ)

مجاہد اپنے گھر لوٹ آنے پر بھی جہاد کا ثواب پاتا ہے

(۵۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَفْلَةٌ كَغَزْوَةٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جہاد سے لوٹ کر آنا بھی جہاد کے مانند ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مجاہد اور غازی جب جہاد سے فارغ ہو کر اپنے گھر لوٹ آتا ہے تو اس کے لوٹنے میں بھی اتنا ہی اجر ملتا ہے جتنا جہاد کرنے میں کیونکہ مجاہد و غازی تو ہر وقت اللہ کی راہ میں اپنی جان پیش کرنے کی نیت رکھتا ہے چنانچہ جب وہ کسی جہاد سے فارغ ہو کر گھر آتا ہے تو اس کی نیت یہی ہوتی ہے کہ کچھ دن راحت لے کر پھر جہاد کرنے کی طاقت و قوت پیدا کروں اور جوں ہی اللہ کی راہ کا بلاوا آجائے فوراً میدان جنگ میں پہنچ کر نئے حوصلوں اور نئی امنگوں کے ساتھ دشمنان دین کے ساتھ نبرد آزمائی کروں۔

جاعل کو جہاد کا دوہرا ثواب ملتا ہے

(۵۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْغَازِىْ اَجْرُهٗ وَلِلْجَاعِلِ اَجْرُهٗ وَاَجْرُ الْغَازِىْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جہاد کرنے والے کو اس کا اپنا اجر ملتا ہے یعنی مجاہد کے لئے جہاد کا جو

مخصوص اجر ہے وہ اس کو پورا ملتا ہے اور جاعل (یعنی مال دینے والے) کو اس کا اپنا اجر بھی ملتا ہے اور جہاد کرنے والے کا بھی۔" (ابوداؤد)

تشریح: "جاعل" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو کسی غازی کو مال دے اور اس کی مدد کرے تاکہ وہ جہاد کرے لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جاعل کو دوہرا ثواب ملتا ہے ایک ثواب تو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا اور دوسرا ثواب اس بات کا ملتا ہے کہ وہ اس غازی کے جہاد کرنے کا سبب و ذریعہ بنا ہے اس اعتبار سے جعل سے مراد ہے غازی کی مالی مدد کرنا اور اس کے لئے جہاد کا سامان و ضرورت مہیا کرنا چنانچہ اس عمل یعنی جعل کے جائز ہونے اور اس کی فضیلت کے بارے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے اور تمام ہی علماء اس پر متفق ہیں۔

لیکن ابن ملک کہتے ہیں کہ جاعل سے مراد ہے وہ شخص جو کسی غازی کو اجرت دے کر جہاد کرائے حنفی علماء کے نزدیک یہ بھی جائز ہے اور اس صورت میں غازی کو جہاد میں اس کی جدوجہد اور مشقت کا ثواب ملے گا اور جاعل یعنی اجرت دینے والے کو دوہرا ثواب ملے گا ایک ثواب تو مال دینے کا اور دوسرا ثواب اس غازی کے جہاد کرنے کا سبب و ذریعہ بننے کا مگر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک میں یہ یعنی کسی شخص کا اجرت دے کر جہاد کرانا منع ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی غازی نے کسی شخص سے اسی طرح کی اجرت لے لی ہے تو اس کو واپس کر دینا واجب ہے۔

بلا اجرت جہاد نہ کرنے والے کے بارے میں وعید

(۵۵) وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ سَتُفْتَحُ عَلَیْکُمُ الْاَمْصَارُ وَسَتَکُوْنُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ یُقْطَعُ عَلَیْکُمْ فِیْهَا بُعُوْثٌ فَیَکْرَهُ الرَّجُلُ الْبَعْثَ فَیَتَخَلَّصُ مِنْ قَوْمِهٖ ثُمَّ یَتَصَفَّحُ الْقَبَائِلَ یَعْرِضُ نَفْسَهٗ عَلَیْهِمْ مَنْ اَکْفِیْهِ بَعْثَ کَذَا اَلَا وَذٰلِكَ الْاَجِیْرُ اِلٰی اٰخِرِ قَطْرَةٍ مِنْ دَمِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوایوب سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عنقریب تمہارے لئے بڑے بڑے شہر فتح ہوں گے اور لشکر کے جدا جدا گئی جھنڈے ہوں گے جن میں تمہارے لئے فوجیں معین کی جائیں گی تو جو شخص امام یعنی سربراہ مملکت کی طرف سے اپنے آپ کو بلا معاوضہ فوج کے ہمراہ جہاد میں بھیجے جانے کو ناپسند کرے گا تو وہ اپنی قوم سے نکل بھاگے گا تاکہ جہاد میں جانے سے بچ جائے اور پھر دوسرے قبیلوں کو تلاش کرتا پھرے گا اور ان کے سامنے اپنی خدمات پیش کرے گا اور کہے گا کہ کون شخص ہے جس کو میں ایسے لشکر سے کفایت کروں یعنی وہ کون ہے جو میری خدمات کو اجرت پر حاصل کرے اور مجھے نوکر رکھے تاکہ میں اس کی طرف سے لشکر میں جاکر لڑائی کی محنت و مشقت اپنے ذمہ لوں حاصل یہ کہ وہ شخص بغیر اجرت کے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جہاد میں جانے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ ایسے شخص کی مذمت فرماتے ہیں کہ خبردار وہ شخص اپنے آخری قطرہ خون تک مزدور ہی رہے گا یعنی ایسے شخص کو غازی یا مجاہد مت سمجھنا بلکہ وہ کرایہ کا ٹٹو ہوگا جو دوسروں کی طرف سے میدان جنگ میں لڑے گا یہاں تک کہ مارا بھی جائے گا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "جن میں تمہارے لئے فوجیں معین کی جائیں گی" کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے سربراہ اس بات کو ضروری قرار دیں گے کہ اپنے ملک کی ہر قوم اور ہر جماعت کے لوگوں کی فوجیں بنا کر انہیں جہاد کے لئے بھیجیں۔

اور مظہر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جب اسلام کی آواز دنیا کی ہر سمت میں پہنچ جائے گی تو امام وقت یعنی اسلامی مملکت کا سربراہ اس بات کی ضرورت سمجھے گا کہ وہ اسلامی فوج کے لشکر تیار کرا کر ہر سمت کو بھیجے تاکہ وہ لشکر ان کفار کا قلع قمع کرے جو اسی سمت میں موجود مسلمانوں کے قریب ہوں اور مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے ریشہ دوانیاں کر رہے ہوں۔

اجرت پر جہاد میں جانے والے کا مسئلہ

(۵۶) وَعَنْ یَعْلَی بْنِ اُمَیَّةَ قَالَ اَذَّنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِالْغَزْوِ وَاَنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ لَیْسَ لِیْ خَادِمٌ فَالْتَمَسْتُ

اجیرًا یکفینی فوجدت رجلاً سمّیت لہٗ ثلاثۃ دنانیر فلمّا حضرت غنیمۃٌ اردت ان اجری لہٗ سھمہٗ فجئت النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت لہٗ فقال ما اجد لہٗ فی غزوتہٖ ھذہٖ فی الدنیا والآخرۃ الّا دنانیرہُ التی تسمّٰی۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت یعلیؓ ابن امیہ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو جہاد پر جانے کے لئے آگاہ کیا تو چونکہ میں بڑا بوڑھا تھا اور میرے پاس کوئی خادم نہیں تھا اس لئے میں نے کوئی ایسا مزدور تلاش کیا جو دوران جہاد میری دیکھ بھال کر سکے چنانچہ مجھ کو ایک شخص مل گیا جس کی اجرت تین دینار میں نے مقرر کر دی پھر (جہاد کے فراغت کے بعد) جب مال غنیمت آیا تو میں نے ارادہ کیا کہ اس مال غنیمت میں سے اس شخص کا بھی حصہ لگاؤں اور اس بارے میں مسئلہ دریافت کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے صورت حال بیان کی آپ ﷺ نے فرمایا مجھے شریعت کے حکم میں اس شخص کے لئے اس جہاد کے تعلق سے دنیا و آخرت میں علاوہ اس دینار کے جو متعین کئے گئے ہیں اور کوئی چیز نہیں ملتی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آپ ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ اس شخص کے لئے نہ تو مال غنیمت میں سے کوئی حصہ ہے اور نہ اس کو جہاد کا کوئی ثواب ملے گا۔ علماء لکھتے ہیں یہ حکم اس اجیر کے حق میں ہے جس کو کسی مجاہد و غازی نے جہاد کے دوران اپنی خدمت و دیکھ بھال کے لئے رکھا ہو ہاں جس اجیر کو جہاد کرنے کے لئے رکھا گیا ہو اس کو مال غنیمت میں سے حصہ ملے گا اگرچہ بعض علماء کے قول کے مطابق وہ جہاد کے ثواب سے محروم رہے گا۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ علماء کے اس شخص کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں جس کو کام کاج کے لئے یا جانوروں کی حفاظت و دیکھ بھال کے لئے بطور اجیر رکھا گیا ہو اور پھر وہ میدان جنگ میں لڑنے کے لئے بھیجا گیا ہو کہ آیا اس کو مال غنیمت میں سے حصہ ملے گا یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے حصہ نہیں ہے خواہ وہ قتال کرے یا نہ کرے بلکہ وہ صرف اپنی خدمات کی مقررہ اجرت کا ہی حقدار ہوگا۔ یہ قول اوزاعیؒ و اسحٰق کا ہے اور حضرت امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول بھی یہی ہے جب کہ حضرت امام مالکؒ اور امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو حصہ دیا جائے گا اگرچہ اس نے قتال نہ کیا ہو مگر قتال کے وقت مجاہدین کے ساتھ رہا ہو۔

کسی دنیاوی غرض سے جہاد کرنے والا ثواب سے محروم رہتا ہے

(۵۷) وعن ابی ھریرۃ ان رجلاً قال یارسول اللہ رجلٌ یرید الجھاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضًا من عرض الدنیا فقال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم لا اجر لہٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حالانکہ وہ اس جہاد کے ذریعہ دنیا کے مال و اسباب کا خواہشمند ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اس کے نصیب میں ثواب نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس شخص کے ثواب سے محروم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے اس عمل کا ثواب ملتا ہے جو اس نے اخلاص نیت کے ساتھ یعنی محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے کیا ہو اور چونکہ اس شخص نے جہاد میں اس غرض سے شرکت کا ارادہ کیا کہ اس کے ذریعہ مال غنیمت حاصل کرے اور اس اعتبار سے اس کا مقصود اصلی گویا رضا الٰہی نہیں بلکہ مال و متاع تھا اس لئے وہ ثواب سے محروم رہے گا ہاں اگر کوئی شخص جہاد میں شریک ہو تو محض اللہ تعالیٰ کے لئے ہو لیکن مال غنیمت کا حصول بھی اس کا مقصود ہو تو اس کو ثواب ملے گا اگرچہ اس کو بھی اس شخص سے کم ثواب ملے گا جو محض اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے جہاد میں شریک ہوا اور مال غنیمت کا حصول اس کا مقصود نہ ہو۔

حقیقی جہاد کس کا ہے

(۵۸) وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغَزْوُ غَزْوَانِ فَاَمَّا مَنِ ابْتَغٰى وَجْهَ اللّٰهِ وَاَطَاعَ الْاِمَامَ وَاَنْفَقَ الْكَرِيْمَةَ وَيَاسَرَ الشَّرِيْكَ وَاجْتَنَبَ الْفَسَادَ فَاِنَّ نَوْمَهٗ وَنَبْهَهٗ اَجْرٌ كُلُّهٗ وَاَمَّا مَنْ غَزَا فَخْرًا وَرِيَاءً وَسُمْعَةً وَعَصَى الْاِمَامَ وَاَفْسَدَ فِي الْاَرْضِ فَاِنَّهٗ لَمْ يَرْجِعْ بِالْكَفَافِ۔ (رواہ مالک وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جہاد دو طرح کا ہوتا ہے چنانچہ جس شخص نے مولی کی رضا طلب کرنے کے لئے جہاد میں شرکت کی امام یعنی سربراہ مملکت اور قانون حکومت اسلامی کی اطاعت کی اپنے پاک مال اور اپنی پاک جان کو خدا کی راہ صرف کیا اور اپنے شریک کار سے اچھا معاملہ رکھا اور فتنہ فساد کرنے سے بچتا رہا یعنی لوٹ مار کرنے ویرانی پھیلانے اور خیانت کرنے کے ذریعہ حدود شریعت سے تجاوز نہیں کیا تو اس کا سونا اور اس کا جاگنا سب کچھ اجر و ثواب کا موجب ہے اور جس شخص نے بطریق فخر یعنی ناموری اور دکھانے سنانے کے لئے جہاد کیا امام کی نافرمانی کی اور روئے زمین پر فتنہ وفساد پھیلایا تو وہ کوئی بدلہ لے کر واپس نہیں آئے گا یعنی اسطرح کے جہاد سے نہ تو اس کے گناہ بخشے جائیں گے اور نہ اس کو کوئی ثواب ملے گا۔" (مالک، ابوداؤد، نسائی)

ناموری کے لئے جہاد کرنے والے کے بارے میں وعید

(۵۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْجِهَادِ فَقَالَ يَا عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو اِنْ قَاتَلْتَ صَابِرًا مُحْتَسِبًا بَعَثَكَ اللّٰهُ صَابِرًا مُحْتَسِبًا وَاِنْ قَاتَلْتَ مُرَائِيًا مُكَاثِرًا بَعَثَكَ اللّٰهُ مُرَائِيًا مُكَاثِرًا يَا عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو عَلٰى اَيِّ حَالٍ قَاتَلْتَ اَوْ قُتِلْتَ بَعَثَكَ اللّٰهُ عَلٰى تِلْكَ الْحَالِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے جہاد کے بارے میں بتائیے کہ کس طرح کا جہاد موجب ثواب ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا عبداللہ ابن عمرو! اگر تم اس حال میں لڑو کہ صبر کرنے والے اور ثواب چاہنے والے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں (قیامت کے دن) صبر کرنے والا ہی اٹھائے گا یعنی تم جس طرح ان صفات کے ساتھ جہاد کرو گے اور ان صفات پر مرو گے اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہیں ان صفات کے ساتھ اٹھائے گا اور تمہیں ان کا ثواب عطا فرمائے گا جیسا کہ ایک روایت میں ہے کَمَا تَعِيْشُوْنَ تَمُوْتُوْنَ وَكَمَا تَمُوْتُوْنَ تُحْشَرُوْنَ یعنی تم جس حالت پر جیتے ہو اسی حالت پر مرو گے اور جس حالت پر مرو گے اسی حالت پر اٹھائے جاؤ گے اور اگر تم نمائش کی نیت سے اور اپنا زور جتلانے کے لئے لڑو گے یعنی اگر تم لوگوں میں یہ فخر کرنے کے لئے لڑو گے کہ میں مال اور طاقت اور لشکر کے اعتبار سے تم سے بڑھ کر ہوں اور جہاد کے حکم کی اتباع تم سے زیادہ کرنے والا ہوں تو اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت کے دن نمائش کرنے والا اور زور جتلانے والا اٹھائے گا یعنی میدان حشر میں تمہارے بارے میں اعلان کیا جائے گا کہ یہ شخص کون ہے جو نمائش کی نیت سے اور فخر کرنے اور زیادہ مال و منال حاصل کرنے کے لئے لڑا تھا۔ اے عبداللہ ابن عمرو یاد رکھو تم جس حال میں لڑو گے یا جس حال میں مارے جاؤ گے اللہ تعالیٰ تمہیں اسی حال میں اٹھائے گا۔" (ابوداؤد)

امیر کو معزول کر دینا چاہئے

(۶۰) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَعَجَزْتُمْ اِذَا بَعَثْتُ رَجُلًا فَلَمْ يَمْضِ لِاَمْرِيْ اَنْ تَجْعَلُوْا مَكَانَهٗ مَنْ يَمْضِيْ لِاَمْرِيْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عقبہؓ ابن مالک نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس سے عاجز ہو کہ جب میں کسی شخص کو تمہارا امیر و حاکم بنا کر بھیجوں اور وہ میرے حکم کی فرمانبرداری نہ کرے یعنی وہ میرے کسی حکم یا میری کسی ممانعت کی مخالفت کرے تو تم اس کو

معزول کردو اور اس کی جگہ کسی ایسے شخص کو مقرر کردو جو میرے مفوضہ کام کو انجام دے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ واضح کرنا ہے کہ اگر میں کسی شخص کو کسی کام کے لئے مثلاً حاکم ووالی بنا کر کہیں بھیجوں اور وہ وہاں نہ جائے یا وہاں جا کر میرے حکم کی تعمیل نہ کرے اور میری بتائی ہوئی راہ سے ہٹ کر اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلنے لگے تو تم اس کو معزول کردو اور اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو میرے حکم کے مطابق اپنا حاکم چن لو۔ اس حکم پر قیاس کرتے ہوئے علماء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی امیر وحاکم رعیت پر ظلم کرنے لگے اور عوام کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے لگے تو عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس امیر کو معزول کر کے اور اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو امیر وحاکم چن لیں۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ فَضَالَةَ وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي كِتَابِ الْاِيْمَانِ

اور حضرت فضالہ کی روایت والمجاہد من جاہد نفسہ کتاب الایمان میں نقل کی جاچکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اسلام میں رہبانیت کی گنجائش نہیں

(۶۱) عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَرِيَّةٍ فَمَرَّ رَجُلٌ بِغَارٍ فِيْهِ شَيْءٌ مِنْ مَاءٍ وَبَقْلٍ فَحَدَّثَ نَفْسَهُ بِاَنْ يُقِيْمَ فِيْهِ وَيَتَخَلّٰى مِنَ الدُّنْيَا فَاسْتَاْذَنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ ذٰلِكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ لَمْ اُبْعَثْ بِالْيَهُوْدِيَّةِ وَلَا بِالنَّصْرَانِيَّةِ وَلٰكِنِّيْ بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السَّمْحَةِ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَغَدْوَةٌ اَوْ رَوْحَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا وَلَمُقَامُ اَحَدِكُمْ فِي الصَّفِّ خَيْرٌ مِنْ صَلَاتِهٖ سِتِّيْنَ سَنَةً۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے ساتھ ایک لشکر میں نکلے تو دوران سفر جب ہم میں سے ایک شخص ایک ایسے غار (وادی) کے درمیان سے گزرا جس میں کچھ پانی اور سبزہ تھا تو اس نے اپنے دل میں سوچا کہ وہ اپنی غار میں رہ جائے اور دنیا سے کنارہ کشی کرلے۔ چنانچہ اس نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے جازت چاہی آپ ﷺ نے فرمایا یاد رکھو! نہ تو میں دین یہودیت دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہوں اور نہ دین عیسائیت دے کر کہ میں تم لوگوں کو رہبانیت کی تعلیم دوں، بیجا مشقت وتکلیف میں مبتلا کروں اور لوگوں کے ساتھ رہن سہن اور لذات دنیا سے مطلقاً کنارہ کشی کی اجازت دوں بلکہ میں تو دین حنفیہ دے کر بھیجا گیا ہوں جو ایک آسان دین ہے جس میں نہ تو انسانیت عامہ کے لئے بیجا تکلیف وحرج ہے اور نہ زائد از ضرورت مشقت ومحنت ہے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے دن کے صرف ابتدائی یا آخری حصے میں یعنی صبح وشام کو خدا کی راہ جہاد میں چلے جانا دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے اور تم میں سے کسی کا میدان جنگ کی جماعت نماز کی صف میں کھڑا ہونا اس کی ساٹھ سال کی تنہا پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔" (احمدؒ)

جہاد میں اخلاص نیت کا آخری درجہ

(۶۲) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ غَزَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَمْ يَنْوِ اِلَّا عِقَالًا فَلَهُ مَانَوٰى۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت عبادہ ابن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے ایک رسی (کے بھی حصول) کی نیت کے ساتھ اللہ

کی راہ میں جہاد کیا تو اس کو وہی چیز حاصل ہوگی جس کی اس نے نیت کی ہے۔" (نسائی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر جہاد میں دنیا کی کوئی حقیر ترین چیز بھی مد نظر ہو تو یہ اخلاص کے منافی ہے گویا اس ارشاد گرامی کا مقصد اس بات کو زیادہ سے زیادہ کر کے بیان کرنا ہے اور یہ ترغیب دینا ہے کہ جہاد میں مالی غنیمت کے حصول سے کلیۃً قطع نظر کیا جائے اور نیت میں اس درجہ اخلاص پیدا کیا جائے کہ اس میں دنیا کی کسی بھی غرض کی ہلکی سی بھی آمیزش نہ ہو لیکن یہ واضح رہے کہ جہاد میں اخلاص نیت کا یہ آخری درجہ ہے۔

چنانچہ یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ جہاد میں رضائے الٰہی اور سربلندی دین کے ساتھ مال غنیمت کے حصول کا مقصد بھی شامل ہو تو یہ جائز ہے اور اس صورت میں بھی جہاد کا ثواب ملتا ہے اسی طرح اگر اس نیت میں نمائش کا جذبہ شامل ہو تو اس کی وجہ سے بھی جہاد کا ثواب کلیۃً باطل نہیں ہوگا۔

جہاد جنت میں ترقی درجات کا باعث ہے

(۶۳) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ رَضِیَ بِاللّٰہِ رَبًّا بِالْاِ سْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ فَعَجِبَ لَھَا اَبُوْ سَعِیْدٍ فَقَالَ اَعِدْھَا عَلَیَّ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَاَعَادَھَا عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ وَاُخْرٰی یَرْفَعُ اللّٰہُ بِھَا الْعَبْدَ مِائَۃَ دَرَجَۃٍ فِی الْجَنَّۃِ مَابَیْنَ کُلِّ دَرَجَتَیْنِ کَمَا بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ قَالَ وَمَا ھِیَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَلْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَلْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین برحق ہونے پر اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہو یعنی دل سے ان سب کو مانا تو اس کے لئے جنت واجب ہوگئی ابوسعیدؓ نے یہ ارشاد سنا تو ان کو اس پر بڑا تعجب ہوا انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ!! ان کلمات کو ایک مرتبہ پھر میرے سامنے ارشاد فرمائیے: آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے پھر یہی کلمات ارشاد فرمائے۔ اور پھر فرمایا کہ ایک چیز اور ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ جنت میں بندے کو سو درجے کی بلندی پر پہنچاتا ہے اور ان میں کے ہر درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ آسمان و زمین کے درمیان ہے ابوسعید نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کیا چیز ہے آپ ﷺ نے فرمایا وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔" (مسلم)

جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ میں ہیں

(۶۴) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَبْوَابَ الْجَنَّۃِ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ فَقَامَ رَجُلٌ رَثُّ الْھَیْئَۃِ فَقَالَ یَا اَبَا مُوْسٰی اَنْتَ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ ھٰذَا قَالَ نَعَمْ فَرَجَعَ اِلٰی اَصْحَابِہٖ فَقَالَ اَقْرَأُ عَلَیْکُمُ السَّلَامَ ثُمَّ کَسَرَ جَفْنَ سَیْفِہٖ فَاَلْقَاہُ ثُمَّ مَشٰی بِسَیْفِہٖ اِلَی الْعَدُوِّ فَضَرَبَ بِہٖ حَتّٰی قُتِلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک مجلس میں یہ بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے جنت کے دروازے تلواروں کے سائے میں ہیں (یہ سن کر) ایک خستہ حال شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ ابوموسیٰ! کیا تم نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ یعنی آنحضرت ﷺ سے تمہارا یہ سننا جزم و یقین کے طور پر ہے؟ انہوں نے کہا ہاں یہ سنتے ہی وہ شخص اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا اور کہا کہ میں تمہیں (آخری) سلام کرتا ہوں اور پھر اسنے اپنی تلوار کا نیام توڑ کر پھینک دیا (یعنی اس کے ذریعہ اس نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ اب میں لوٹ کر نہیں آؤں گا) یعنی اپنی تلوار لے کر دشمنوں کی طرف روانہ ہوا اور ان سے لڑا یہاں تک کہ شہید ہوگیا۔" (مسلم)

تشریح: جنت کے دروازے تلواروں کے سائے میں ہیں کا مطلب یہ ہے کہ مجاہد و غازی کا میدان جنگ میں اس　　　طرح ہونا

کہ کفار کی تلواریں اس کے اوپر اٹھی ہوئی ہوں اس کے جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے اور وہ حالت گویا اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ جنت کے دروازے اس مجاہد و غازی کے ساتھ ہیں کہ ادھر اس نے کفار کی تلواروں کے ذریعہ جام شہادت نوش کیا اور ادھر جنت میں داخل ہوا۔

شہداء احد کے بارے میں بشارت

(۶۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ لِاَصْحَابِہٖ اِنَّہٗ لَمَّا اُصِیْبَ اِخْوَانُکُمْ یَوْمَ اُحُدٍ جَعَلَ اللّٰہُ اَرْوَاحَھُمْ فِیْ جَوْفِ طَیْرٍ خُضْرٍ تَرِدُ اَنْھَارَ الْجَنَّۃِ تَاْکُلُ مِنْ ثِمَارِھَا وَتَاْوِیْ اِلٰی قَنَادِیْلَ مِنْ ذَھَبٍ مُعَلَّقَۃٍ فِیْ ظِلِّ الْعَرْشِ فَلَمَّا وَجَدُوْا طِیْبَ مَاْکَلِھِمْ وَمَشْرَبِھِمْ وَمَقِیْلِھِمْ قَالُوْا مَنْ یُبَلِّغُ اِخْوَانَنَا عَنَّا اَنَّا اَحْیَاءٌ فِی الْجَنَّۃِ لِئَلَّا یَزْھَدُوْا فِی الْجَنَّۃِ وَلَا یَنْکُلُوْا عِنْدَ الْحَرْبِ فَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَا اُبَلِّغُھُمْ عَنْکُمْ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ اِلٰی اٰخِرِ الْاٰیَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا جب تمہارے بھائی غزوہ احد میں شہید کئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں جنت منتقل کر دیا، چنانچہ وہ روحیں (ان پرندوں کے قالب) جنت کی نہروں پر آتی ہیں وہاں کے میوے کھاتی ہیں اور پھر ان سونے کی قندیلوں میں جا کر بسیرا کرتی ہیں جو عرش کے سایہ میں لٹکی ہوئی ہیں۔ تو جب ان روحوں نے اپنے کھانے پینے اور اپنے بسیرے کی لطف اندوزی کو پایا تو کہنے لگیں کہ کون ہے جو ہماری طرف سے ہمارے بھائیوں کو یہ پیغام پہنچا دے کہ ہم جنت میں زندہ ہیں اور حق تعالیٰ کی ایسی ایسی عظیم نعمتوں سے لطف اندوز ہیں تاکہ وہ جنت کو حاصل کرنے میں بے رغبتی و کوتاہی نہ کریں بلکہ جنت کے ان درجات کو حاصل کرنے میں راغب ہوں اور لڑائی کے وقت سستی نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ بات سن کر فرمایا گھبراؤ نہیں تمہاری طرف سے میں ان کو پیغام پہنچاؤں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ آخر آیت تک۔

تشریح: پوری آیت یوں ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (آل عمران ۳: ۱۶۹، ۱۷۰) (ترجمہ) جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا وہ مرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے جو خدا نے اپنے فضل سے بخش رکھا ہے اس میں خوش ہیں اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے ہیں اور شہید ہو کر ان میں شامل نہیں ہو سکے ان کی نسبت خوشیاں منا رہے ہیں کہ قیامت کے دن ان کو بھی نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

مؤمنین کی اعلیٰ جماعت

(۶۶) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُوْنَ فِی الدُّنْیَا عَلٰی ثَلٰثَۃِ اَجْزَاءٍ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْ یَاْمَنُہُ النَّاسُ عَلٰی اَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ ثُمَّ الَّذِیْ اِذَا اَشْرَفَ عَلٰی طَمَعٍ تَرَکَہٗ لِلّٰہِ عَزَّوَجَلَّ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا دنیا میں تین طرح کے مؤمن ہیں ایک تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوئے نیز انہوں نے اپنی جانوں اور اپنے اموال کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کیا یعنی مؤمنین کی یہ وہ جماعت ہے جس نے اپنے ایمان کو کامل اور اپنے نفس کو مہذب پاکیزہ بنایا اور اس کے ساتھ ہی مخلوق خدا کی فلاح

وبہبودی اور ان کی پاکیزگی کے لئے بھی جدوجہد کی اور یہی وہ جماعت ہے جو مرتبہ کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ واشرف ہے دوسرا مؤمن وہ شخص ہے جس سے لوگوں کے مال اور ان کی جان محفوظ ہیں یعنی اگرچہ اس نے مخلوق خدا کی فلاح وبہبودی کے لئے جدوجہد نہیں کی لیکن اس کے ذریعہ لوگوں کو کسی طرح کا نقصان وضرر بھی نہیں پہنچایا نیز نہ تو اس نے اختلاط رکھا اور نہ طمع وحرص میں مبتلا ہوا اور پھر تیسرا مؤمن وہ شخص ہے کہ جب اس کے دل میں طمع پیدا ہو جائے تو اللہ کے خوف سے اس طمع کو چھوڑے۔" (احمدؒ)

تشریح: مؤمنین کی اس آخری جماعت کا وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر اس کے دل میں دنیا کی کسی چیز کی طمع وحرص پیدا ہوتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا بلکہ خدا کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس طمع وحرص کو چھوڑ دیتا ہے گویا یہ وہ جماعت ہے جس نے اگرچہ دنیاداروں کے ساتھ اختلاط رکھا اور اس اختلاط کی وجہ سے اس کے دل میں طمع وحرص پیدا ہوئی لیکن عین وقت پر خدا نے اس کو طمع وحرص پر عمل کرنے سے بچالیا یہ جماعت مرتبہ کے اعتبار سے پہلی دونوں جماعتوں سے ادنیٰ ہے پھر اس تیسری جماعت کے بعد مؤمنین کی اور بھی قسمیں ہیں۔ لیکن وہ سب مرتبہ کے اعتبار سے ساقط ہیں۔

شہید کی تمنّا

(۶۷) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِی عَمِیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ نَفْسٍ مُسْلِمَۃٍ یَقْبِضُھَا رَبُّھَا تُحِبُّ اَنْ تَرْجِعَ اِلَیْکُمْ وَاَنَّ لَھَا الدُّنْیَا وَمَافِیْھَا غَیْرُ الشَّھِیْدِ قَالَ ابْنُ اَبِی عَمِیْرَۃَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ یَکُوْنَ لِی اَھْلُ الْوَبَرِ وَالْمَدَرِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا شہید کے علاوہ اور ایسا کوئی مسلمان شخص نہیں ہے جو اپنے پروردگار کی طرف سے اپنی روح قبض کئے جانے کے بعد اس بات کو پسند کرے کہ وہ لوٹ کر تمہارے پاس آئے اور دنیا ومافیہا کی چیزوں کو حاصل کرے (یعنی شہید حق تعالیٰ کے ہاں پہنچنے کے بعد جب شہادت کے عظیم مرتبہ کی سعادتوں اور عظمتوں کو دیکھتا ہے تو پروردگار سے اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ وہ لوٹ کر دوبارہ دنیا میں آئے اور اللہ کی راہ میں پھر مارا جائے) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ خدا کی قسم! میرا خدا کی راہ میں مارا جانا میرے نزدیک اس چیز سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ خیمے والے اور حویلیوں والے میرے مملوک ومحکوم ہوں۔" (نسائی)

تشریح: "خیمے والے" سے جنگل میں اقامت پذیر لوگ مراد ہیں کیونکہ وہ خیموں میں رہا کرتے ہیں اور "حویلی والے" سے شہر وگاؤں یعنی آبادی میں رہنے والے لوگ مراد ہیں ان دونوں کے مجموعے سے پوری دنیا اور دنیا بھر کے لوگ مراد ہیں؟ اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اگر مجھے پوری دنیا کا امیر وحاکم بنا دیا جائے اور پھر دنیا بھر کے لوگ میری محکومی ورعیت میں آجائیں تو میں اس کے مقابلہ پر اس چیز کو زیادہ پسند کروں گا کہ مجھے جہاد میں جانے کا موقع مل جائے اور میں خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کر دوں۔

ہر مؤمن پر شہید کا اطلاق

(۶۸) وَعَنْ حَسْنَاءَ بِنْتِ مُعَاوِیَۃَ قَالَتْ حَدَّثَنَا عَمِّی قَالَ قُلْتُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ فِی الْجَنَّۃِ قَالَ النَّبِیُّ فِی الْجَنَّۃِ وَالشَّھِیْدُ فِی الْجَنَّۃِ وَالْمَوْلُوْدُ فِی الْجَنَّۃِ وَالْوَئِیْدُ فِی الْجَنَّۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حسناء بنت معاویہ (ابن سلیم) کہتی ہیں کہ مجھ سے میرے چچا حضرت اسلمؓ ابن سلیم، نے بیان کیا (کہ ایک دن) میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ جنت میں کون کون لوگ ہوں گے؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں نبی ہوں گے شہید ہوں گے، جنت میں بچے ہوں گے اور جنت میں وہ ہوں گے جن کو جیتے جی گاڑ دیا گیا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "یہاں شہید" سے مراد صرف وہ شخص نہیں ہے جو خدا کی راہ میں مارا گیا ہو بلکہ "مؤمن" مراد ہے کہ خواہ وہ حقیقۃً شہید ہو یا حکماً شہید ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی اس آیت میں ایمان لانے والوں پر شہید کا اطلاق کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔

"اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے نزدیک صدیق اور شہداء ہیں۔"

"اور جنت میں بچے ہوں گے" یعنی بچہ خواہ مؤمن کا ہو یا کافر کا جنت میں داخل کیا جائے گا اسی طرح وہ کچا بچہ بھی جنت ہی میں داخل کیا جائے گا جو اسقاط حمل کی صورت میں ختم ہو گیا ہے۔

"جن کو جیتے جی گاڑ دیا گیا ہے" یعنی جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی زندہ لڑکیوں کو زمین میں گاڑ دیا کرتے تھے۔ بلکہ بعض لوگ معاشی تنگیوں اور دوسری پریشانیوں کے وقت اپنے زندہ لڑکوں کو بھی گاڑ دیتے تھے تو ایسے لڑکے اور لڑکیاں بھی جنت میں داخل کی جائیں گی۔

حدیث میں بطور خاص صرف چار طرح کے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے تو شاید اول الذکر دونوں کی تخصیص ان کے فضل و شرف کے اعتبار سے ہے اور آخر الذکر دونوں کی تخصیص اس سبب سے ہے کہ یہ کسی کسب و عمل کے بغیر جنت میں داخل ہونگے۔

جہاد میں مال و جان دونوں سے شرکت کرنے والوں کی فضیلت

(۶۹) وَعَنْ عَلِيٍّ وَاَبِي الدَّرْدَاءِ وَاَبِي هُرَيْرَةَ وَاُمَامَةَ وَعَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ وَعَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَجَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ وَعِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ كُلُّهُمْ يُحَدِّثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ مَنْ اَرْسَلَ نَفَقَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَقَامَ فِيْ بَيْتِهٖ فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ دِرْهَمٍ وَمَنْ غَزَا بِنَفْسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَنْفَقَ فِيْ وَجْهِهٖ ذٰلِكَ فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ اَلْفِ دِرْهَمٍ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت علیؓ، حضرت ابودرداءؓ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوامامہ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ حضرت عبداللہ ابن عمروؓ، حضرت جابر ابن عبداللہ اور حضرت عمران ابن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین یہ سب رسول کریم ﷺ سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ کی راہ یعنی جہاد میں روپیہ پیسہ اور سامان و اسباب بھیجا اور خود اپنے گھر میں بیٹھا رہا یعنی جہاد میں خود شریک نہیں ہوا بلکہ روپے پیسے اور سامان سے جہاد میں مدد کی تو اس کو ہر درہم کے بدلے سات سو درہم کا ثواب ملے گا اور جس شخص نے بنفس خود جہاد بھی کیا اور جہاد میں روپیہ پیسہ اور مال بھی خرچ کیا یعنی لڑائی میں خود شریک بھی ہوا اور مالی مدد بھی پہنچائی تو اس کو ہر درہم کے بدلے سات لاکھ درہم کا ثواب ملے گا کیونکہ اس نے اپنے نفس کو بھی مشقت و دکھ میں مبتلا کیا اور اپنا مال بھی خرچ کیا پھر آنحضرت ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے چاہتا ہے اس کے ثواب میں اور اضافہ کرتا ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: آیت تلاوت فرما کر گویا آپ ﷺ نے اس طرف اشارہ کیا کہ یہاں ثواب کی جو مقدار بیان کی گئی ہے وہ کوئی آخری حد نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے کہ اگر وہ چاہے گا تو اس مقدار سے بھی زیادہ اور کہیں زیادہ ثواب عطا فرمائے گا۔

شہداء کی قسمیں

(۷۰) وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الشُّهَدَاءُ اَرْبَعَةٌ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْاِيْمَانِ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَرْفَعُ النَّاسُ اِلَيْهِ اَعْيُنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ هٰكَذَا وَرَفَعَ رَاْسَهٗ حَتّٰى سَقَطَتْ قَلَنْسُوَتُهٗ فَمَا اَدْرِيْ اَقَلَنْسُوَةُ عُمَرَ اَرَادَ اَمْ قَلَنْسُوَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ قَالَ وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْإِيْمَانِ لَقِيَ الْعَدُوَّ كَأَنَّمَا ضُرِبَ جِلْدُهُ بِشَوْكِ طَلْحٍ مِنَ الْجُبْنِ أَتَاهُ سَهْمٌ غَرْبٌ فَقَتَلَهُ فَهُوَ فِي الدَّرَجَةِ الثَّانِيَةِ وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ خَلَطَ عَمَلًا صَالِحًا وَاٰخَرَ سَيِّئًا لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَالِكَ فِي الدَّرَجَةِ الثَّالِثَةِ وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ اَسْرَفَ عَلٰى نَفْسِهٖ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَالِكَ فِي الدَّرَجَةِ الرَّابِعَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت فضالہ ابن عبید کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن خطابؓ سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ شہید چار طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ شخص جو کامل الایمان مسلمان تھا اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے اللہ تعالیٰ کو سچ کر دکھایا یہاں تک کہ لڑتے لڑتے مارا گیا تو یہ وہ شخص ہے جس کی طرف قیامت کے دن لوگ اس طرح سر اٹھا اٹھا کر دیکھیں گے یہ کہہ کر انہوں نے اپنا سر اٹھایا یہاں تک کہ ان کی ٹوپی گر پڑی حدیث کے وہ راوی جنہوں نے اس روایت کو حضرت فضالہؓ سے نقل کیا ہے کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ حضرت فضالہؓ کی مراد کس کی ٹوپی تھی یعنی انہوں نے یہ واضح نہیں کیا کہ حضرت عمرؓ نے حدیث بیان کرتے وقت آنحضرت ﷺ کی طرح سر اٹھا کر دکھلایا تو ان کی ٹوپی گری تھی یا انہوں نے روایت حدیث کے وقت یہ بتلایا نبی کریم ﷺ کی ٹوپی گری تھی بہر کیف حاصل یہ کہ قیامت کے دن یہ شخص اتنا عالی مرتبہ ہوگا کہ لوگ اس کی طرف اچک اچک کر دیکھیں گے پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اور دوسرا وہ شخص جو جید الایمان مؤمن تھا اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو وہ اپنی بزدلی کی وجہ سے ایسا نظر آنے لگا جیسے اس کے بدن میں خاردار درخت کے کانٹے ہوں (یعنی یہ اس شخص کے خوف کی وجہ سے تھر تھر کانپنے اور دہشت سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جانے کی کیفیت کو کنایۃ بیان کیا گیا ہے) اور پھر ایک تیر آکر اس کو لگا جس کو چلانے والا نا معلوم تھا اور اس نے اس کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا تو یہ شخص پہلے شخص کی بہ نسبت دوسرے درجہ کا ہے اور تیسرا شخص وہ مؤمن تھا جس نے کچھ اچھے اور کچھ برے اعمال کئے تھے اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو اللہ تعالیٰ کو سچ کر دکھایا یہاں تک کہ لڑتے لڑتے مارا گیا تو یہ شخص تیسرے درجہ کا ہے اور چوتھا شخص وہ مسلمان ہے جس نے اپنی جان پر بہت اسراف کیا تھا (یعنی جس نے بہت زیادہ گناہ کئے تھے) اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے اللہ کو سچ کر کے دکھایا یہاں تک کہ لڑتے لڑتے مارا گیا تو یہ شخص چوتھے درجے کا ہے۔ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: اس نے اللہ تعالیٰ کو سچ کر دکھایا کے بارے میں واضح ہو کہ اگر لفظ صدق میں دال پر تشدید نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس شخص نے اپنی شجاعت و بہادری کے ذریعہ اس چیز کو سچا کیا جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر عائد ہوئی تھی یعنی خدا کی راہ میں ثابت قدم رہنا اور دشمن کو پیٹھ نہ دکھانا اور اگر دال پر تشدید ہو تو اس صورت میں معنی ہوں گے کہ اس شخص نے اپنے عمل اور اپنی شجاعت و بہادری کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو راست گو ثابت کیا اور اس کے قول کی تصدیق کی بایں طور کہ اس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا، اور اس راہ کی تمام مشقتوں، تکلیفوں اور مصائب کو برداشت کیا اور حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والے اجر و ثواب کا امیدوار ہوا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے جو مجاہدین اسلام کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں پیش آنے والی ہر مصیبت و تکلیف پر صبر کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی طرف سے اجر و ثواب کے طلب گار ہوتے ہیں تو جب وہ شخص لڑا اور طلب ثواب کی خاطر صبر و استقامت کی راہ اختیار کی تو گویا اس نے اپنے اس عمل کے ذریعہ حق تعالیٰ کی بات کی تصدیق کی۔

حدیث میں شہداء کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ جس مسلمان نے خدا کی راہ میں شہادت پائی ہے وہ یا تو متقی و پرہیز گار بھی تھا اور شجاع و بہادر بھی اور یہ پہلی قسم ہے یا وہ متقی و پرہیز گار تو تھا لیکن شجاع و بہادر نہیں تھا یہ دوسری قسم ہے اور یا وہ شجاع بہادر تو تھا مگر متقی و پرہیز گار نہیں تھا پھر اس کی بھی دو قسمیں ہوں گی ایک یہ کہ یا تو وہ ایسا غیر متقی و غیر پرہیز گار تھا کہ اس کے اعمال محفوظ تھے۔ لیکن زندگی میں اس سے نیک عمل بھی صادر ہوئے تھے اور برے عمل بھی سرزد ہوئے تھے لیکن اس کے برے اعمال اتنے زیادہ

نہیں تھے کہ اس کو فاسق و مسرف کہا گیا ہو۔ اور یہ حدیث میں بیان کی گئی تیسری قسم ہے اور یا وہ ایسا غیر متقی و غیر پرہیزگار تھا کہ اس کی بدعملیاں اس کی زندگی میں غالب رہی تھیں یعنی اس نے اتنے زیادہ برے اعمال کئے تھے کہ فاسق و مسرف مانا گیا تھا اور یہ چوتھی قسم ہے لہٰذا دوسری قسم کے علاوہ اور ساری قسموں میں اللہ کی راہ کی تصدیق حاصل ہوتی ہے نیز اس وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی تصدیق کرنے سے "صبر اور طلب ثواب کے وعدے کی تصدیق مراد ہے" کیونکہ وہ دوسری قسم میں بھی حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس دوسری قسم کے شہید کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو سچ کر دکھایا۔"

منافق اگر جہاد میں شہید بھی ہو جائے تو جنت کا حقدار نہیں ہو گا

(۷۱) وَعَنْ عُتْبَةَ بْنِ عَبْدٍ السُّلَمِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقَتْلٰى ثَلَاثَةٌ مُؤْمِنٌ جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَإِذَا لَقِيَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰى يُقْتَلَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهِ فَذَالِكَ الشَّهِيْدُ الْمُمْتَحَنُ فِيْ خَيْمَةِ اللّٰهِ تَحْتَ عَرْشِهٖ لَا يَفْضُلُهُ النَّبِيُّوْنَ اِلَّا بِدَرَجَةِ النُّبُوَّةِ وَمُؤْمِنٌ خَلَطَ عَمَلًا صَالِحًا وَاٰخَرَ سَيِّئًا جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِذَا لَقِيَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰى يُقْتَلَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهِ مُمَصْمِصَةٌ مَحَتْ ذُنُوْبَهٗ وَخَطَايَاهُ اِنَّ السَّيْفَ مَحَّاءٌ لِلْخَطَايَا وَاُدْخِلَ مِنْ اَيِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَ وَمُنَافِقٌ جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فَإِذَا لَقِيَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰى يُقْتَلَ فَذَاكَ فِي النَّارِ اِنَّ السَّيْفَ لَا يَمْحُو النِّفَاقَ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عتبہؓ ابن عبدالسلمی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو لوگ جہاد میں مارے جاتے ہیں وہ تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ کامل مؤمن جس نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کیا چنانچہ جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی (تو وہ پوری بہادری اور شجاعت) کے ساتھ لڑا یہاں تک کہ مارا گیا نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا کہ یہ وہ شہید ہے جس کو جہاد کی مشقتوں اور مصائب پر صبر کرنے کی آزمائش میں مبتلا کیا گیا یہ شہید آخرت میں عرش الٰہی کے نیچے اللہ کے خیمے میں ہو گا یعنی اس کو حق تعالیٰ کا کمال قرب اور اس کے حضور میں درجہ خاص حاصل ہو گا اور انبیاء اس سے صرف درجہ نبوت میں زیادہ ہوں گے اور دوسرا شخص وہ مؤمن ہے جس کے اعمال ملے جلے ہوں کہ اس نے کچھ نیک عمل کئے ہوں اور کچھ برے عمل چنانچہ اس نے اپنی جان اور اپنے مال کے ذریعہ خدا کی راہ میں جہاد کیا اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو پوری بہادری اور شجاعت کے ساتھ لڑا یہاں تک کہ مارا گیا نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا کہ شہادت یا خصلت، پاک کرنے والی ہے کہ اس کے گناہوں اور خطاؤں کو مٹاتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تلوار خطاؤں کو بہت زیادہ مٹانے والی ہے یہ وہ شہید ہے کہ جس دروازے سے جانا چاہے گا جنت میں داخل کیا جائے گا اور تیسرا شخص منافق ہے کہ (اگرچہ) اس نے بھی اپنی جان اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کیا اور جب دشمن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو (خوب) لڑا یہاں تک کہ مارا گیا (لیکن) یہ شخص دوزخ میں جائے گا کیونکہ تلوار نفاق کو نہیں مٹاتی۔" (دارمیؒ)

جہاد میں پاسبانی کی خدمت انجام دینا بدعملیوں کا کفارہ اور نجات ابدی کا ذریعہ ہے

(۷۲) وَعَنِ ابْنِ عَائِذٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جَنَازَةِ رَجُلٍ فَلَمَّا وُضِعَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَا تُصَلِّ عَلَيْهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَإِنَّهٗ رَجُلٌ فَاجِرٌ فَالْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى النَّاسِ فَقَالَ هَلْ رَآهُ اَحَدٌ مِنْكُمْ عَلٰى عَمَلِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَجُلٌ نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَرَسَ لَيْلَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَصَلّٰى عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَثٰى عَلَيْهِ التُّرَابَ وَقَالَ اَصْحَابُكَ يَظُنُّوْنَ اَنَّكَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَاَنَا اَشْهَدُ اَنَّكَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَقَالَ يَا عُمَرُ اِنَّكَ لَا تُسْئَالُ عَنْ اَعْمَالِ النَّاسِ وَلٰكِنْ تُسْئَالُ عَنِ الْفِطْرَةِ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عائذؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ ایک شخص کے جنازے کے ساتھ چلے تاکہ اس کی نماز پڑھیں جب جنازہ

رکھا گیا تو حضرت عمر ابن خطابؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ اس جنازے کی نماز نہ پڑھیئے کیونکہ یہ ایک فاسق شخص تھا (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی شخص نے اس کو اسلام کا کوئی کام کرتے دیکھا ہے؟ (یعنی اگر تم میں سے کسی نے اس کو اپنی زندگی میں کوئی ایسا عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے جو حقیقی اسلام پر دلالت کرے تو وہ ہمیں بتائے) ایک شخص نے عرض کیا "ہاں، یا رسول اللہ! اس شخص نے ایک رات اللہ کی راہ یعنی جہاد میں پاسبانی کی خدمت انجام دی تھی"۔ (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ نے اس جنازہ کی نماز پڑھی اور (تدفین کے وقت اس کے قبر پر) مٹی ڈالی اور (گویا میت کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ تیرے ساتھیوں کا تو یہ گمان ہے کہ تو دوزخی ہے اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ تو جنتی ہے اور پھر حضرت عمرؓ سے فرمایا عمر! تم سے لوگوں کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ تم سے دین اسلام کی بابت پوچھا جائے گا۔" (اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے)

تشریح: "بلکہ تم سے دین اسلام کی بابت پوچھا جائے گا" یعنی اس چیز کے بارے میں پوچھا جائے گا جو شعار دین اور علامات یقین میں سے ہونے کی وجہ سے اسلام پر دلالت کرے۔

اس ارشاد کا مقصد دراصل حضرت عمرؓ کو اس جرات سے باز رکھنا تھا جو انہوں نے اس میت کے فسق کا تذکرہ کر کے کی تھی اور وہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے چنانچہ ان الفاظ کے ذریعہ گویا آنحضرت ﷺ نے یہ واضح کیا کہ کسی مسلمان کی محض ظاہری زندگی اور اس کے اعمال کو دیکھ کر اس کی اخروی حیثیت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس چیز کو معیار بنانا چاہئے جو اس کے دین و اسلام پر کامل یقین و اعتقاد کی غمازی کرے اور یہ ثابت کرے کہ اس کے اصل ایمان میں کوئی کھوٹ اور اس کے بنیادی عقائد میں کوئی کجی نہیں ہے جہاں تک اعمال کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بے نیاز ہے۔ اور وہ اپنے بندوں پر بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

طیبیؒ نے حدیث کے مذکورہ جملہ کی وضاحت یہ کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کو یہ متنبہ کیا کہ عمر! تمہیں اس موقع پر میت کے برے اعمال اور اس کے ظاہری فسق کا ذکر نہیں کرنا چاہئے بلکہ تمہیں یہ چاہئے کہ تم اس کے نیک اعمال اور اس کی اچھی باتوں کو سامنے لاؤ۔ جیسا کہ ایک جگہ یوں فرمایا گیا ہے کہ:

اُذْكُرُوا اَمْوَاتَكُمْ بِالْخَيْرِ۔

"تم اپنے مرے ہوئے لوگوں کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ کرو۔"

نیز حضرت عمرؓ کو ان کے اس اقدام و جرات سے روکنا مقصود تھا جس کا انہوں نے اس موقع پر مظاہرہ کیا تھا۔ یعنی اس کے فسق کا ذکر و اظہار کیونکہ کسی انسان کی اخروی فلاح اور ابدی نجات کا دارمدار اصل میں فطرت یعنی اسلام اور اس کے عقائد پر ہے، جب کہ اس شخص نے ایک ایسا عمل بھی کیا تھا۔ جو اعمال اسلام میں سے ہے اور اس کے مسلمان ہونے کو ثابت کرنے کے لئے تنہا وہی عمل کافی ہے۔

بَابُ اِعْدَادِ اٰلَةِ الْجِهَادِ

سامان جہاد کی تیاری کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جہاد کے لئے بقدر استطاعت، قوت طاقت فراہم کرنیکا حکم

(۱) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا

اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ اَلاَ اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ اَلاَ اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ اَلاَ اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اور تم کافروں سے جنگ کرنے کے لئے اپنی طاقت وقوت کی جو (بھی) چیز تیار و فراہم کرسکتے ہو کرو۔ یاد رکھو! تیر اندازی قوت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "تیر اندازی قوت ہے" کے ذریعہ اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم میں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ یعنی تم کفار سے جنگ کرنے کے لئے اپنی طاقت وقوت کی جو بھی چیز تیار و فراہم کرسکتے ہو کرو، تو اس آیت میں "قوت" سے مراد تیر اندازی ہے۔

اور بیضاوی وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ "قوت" سے مراد ہر وہ چیز جس کے ذریعہ انسان لڑائی میں طاقت وقوت حاصل کرسکتا ہو! اس صورت میں کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ کا "قوت" سے تیر اندازی مراد لینا شاید اس بناء پر ہے کہ اس زمانہ میں اور چیزوں کی بہ نسبت یہ چیز یعنی تیر اندازی سب سے زیادہ طاقت وقوت کا ذریعہ بھی تھی اور سہل العمل بھی۔

دشمن جس چیز کو اپنی طاقت کا ذریعہ بنائے تم بھی اس میں مہارت حاصل کرو

(۲) وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ سَتُفْتَحُ عَلَيْكُمُ الرُّوْمُ وَيَكْفِيْكُمُ اللّٰهُ فَلَا يَعْجِزُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّلْهُوَ بِاَسْهُمِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عقبہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عنقریب تمہارے لئے روم کو فتح کردیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ تمہیں اہل روم کی شرانگیزیوں سے کفایت کرے گا لہٰذا خبردار! تم میں سے کوئی شخص اپنے تیروں کے ساتھ کھیلنے میں سستی نہ کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں رومؒ والے عام طور پر تیر اندازی ہی کے ذریعہ جنگ کرتے ہیں اور چونکہ تمہیں ان کے ساتھ جنگ کرنی ہے اس لئے ضروری ہے کہ تم لوگ تیر اندازی کو اپنا مشغلہ بنالو اور اس کی مشق کے ذریعہ اس کے گر اور کمالات سیکھتے رہو تاکہ تم ان سے جنگ کرنے پر قادر ہوسکو اور اللہ تمہیں ان سے مڈبھیڑ کے وقت اپنی مدد و نصرت کے ساتھ میں رکھے۔ یا آنحضرت ﷺ کی یہ مراد تھی کہ تیر اندازی کی مشق کو ترک نہ کرو بلکہ جنگ میں فتح کے بعد بھی اس کا مشغلہ جاری رکھو اور اس بات پر غرور اور اطمینان کرکے نہ بیٹھ جاؤ کہ اب تو روم فتح ہوگیا ہے اس مشغلہ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی کیونکہ تیر اندازی کی ضرورت ہمیشہ اور ہر جنگ کے وقت پڑنے والی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے یہ ہدایت پیش بندی کے طور پر دی تھی، چنانچہ اس پر پوری طرح عمل کیا گیا اگرچہ اہل روم کے قتال کے موقع پر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو روم پر بڑی آسانی کے ساتھ فتح عطا فرمادی تھی۔

تیر اندازی کی مشق کو "لہو" یعنی کھیل سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ کسی بھی چیز کی مشق صورت کے اعتبار سے کھیل ہی کے درجے کی چیز ہوتی ہے دوسرے اس کے ذریعہ لوگوں کو تیر اندازی کی مشق کی ترغیب دلانا مقصود تھا کہ کسی چیز پر "کھیل" کا نام آجائے تو اس کی طرف جلدی مائل ہوجانا انسانی خصلت میں داخل ہے۔

تیر اندازی کی اہمیت

(۳) وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ عَلِمَ الرَّمْيَ ثُمَّ تَرَكَهٗ فَلَيْسَ مِنَّا اَوْ قَدْ عَصٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عقبہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے تیراندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی ہمارے طریقہ پر چلنے والوں میں شامل نہیں ہے۔ یا پھر یہ کہ اسنے نافرمانی کی۔" (مسلمؒ)

تشریح: "وہ ہم میں سے نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے، کہ وہ ہم سے قریب نہیں ہے اور ایک ایسے شخص کی مانند ہے جس کا شمار ہمارے زمرے میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک تو یہ کہ تیراندازی سیکھے ہی نہیں لیکن اس کو سیکھ کر پھر چھوڑ دینا نہ سیکھنے کی بہ نسبت کہیں زیادہ برا ہے کیونکہ جس شخص نے تیراندازی نہیں سیکھی وہ تو گویا آپ ﷺ کے زمرے میں داخل ہی نہیں ہوا لیکن یہ تو وہ شخص ہے جو آپ ﷺ کے زمرے میں داخل ہوا اور پھر نکل گیا گویا اس نے اس کام میں کوئی نقصان دیکھا یا اس کو کوئی برائی محسوس ہوئی اور یا اس نے ایسا استہزا کے طور پر کیا اور ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں ایک بڑی نعمت کا کفران کرنے کا مرادف ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی طرف سے تیراندازی کی عملی ترغیب

④ وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى قَوْمٍ مِنْ اَسْلَمَ يَتَنَاضَلُوْنَ بِالسُّوْقِ فَقَالَ اِرْمُوْا بَنِىْ اِسْمَاعِيْلَ فَاِنَّ اَبَاكُمْ كَانَ رَامِيًا وَاَنَا مَعَ بَنِىْ فُلَانٍ لِاَحَدِ الْفَرِيْقَيْنِ فَاَمْسَكُوْا بِاَيْدِيْهِمْ فَقَالَ مَالَكُمْ قَالُوْا كَيْفَ نَرْمِىْ وَاَنْتَ مَعَ بَنِىْ فُلَانٍ قَالَ اِرْمُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ كُلِّكُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سلمہؓ ابن اکوع کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ بنی اسلم کے ایک قبیلہ میں تشریف لائے اور وہ لوگ اس وقت بازار میں آپس میں تیراندازی (کی مشق) کر رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس حالت میں دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اے اولاد اسمٰعیل (یعنی اے عربو) تیراندازی کرو، کیونکہ تمہارے باپ (حضرت اسماعیل علیہ السلام) تیرانداز تھے۔ اور میں (بھی) فلاں قبیلے کے ساتھ ہوں (یعنی اس وقت بنی اسلم کے جو دو فریق آپس میں تیراندازی کی مشق کر رہے تھے آپ ﷺ نے ان میں ایک کا نام لے کر فرمایا کہ اس مشق میں میں اس فریق کی طرف ہوں) لیکن دوسرے فریق نے اپنے ہاتھ روک لئے (یعنی جب آنحضرت ﷺ ایک فریق کی طرف ہو گئے تو مقابل فریق نے تیراندازی سے اپنے ہاتھ کھینچ لئے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں کیا ہوا؟ یعنی تم نے تیر پھینکے کیوں بند کر دیئے؟ انہوں نے کہا کہ ہم اس صورت میں کیسے تیراندازی کر سکتے ہیں جب کہ آپ فلاں (فریق) کے ساتھ ہیں یعنی ہمیں یہ گوارا نہیں ہے کہ آپ ﷺ ہمیں چھوڑ کر دوسرے فریق کی طرف ہو جائیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا (اچھا) تم تیراندازی کرو میں تم سب کے ساتھ ہوں۔" (بخاریؒ)

حضرت ابوطلحہؓ کی تیراندازی

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَبُوْطَلْحَةَ يَتَتَرَّسُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتُرْسٍ وَاحِدٍ وَكَانَ اَبُوْطَلْحَةَ حَسَنَ الرَّمْىِ فَكَانَ اِذَا رَمٰى تَشَرَّفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَنْظُرُ اِلٰى مَوْضِعِ نَبْلِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ابوطلحہؓ (میدان جنگ میں) ایک ڈھال کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کا بچاؤ کر رہے تھے ابوطلحہؓ ایک بہترین تیرانداز تھے چنانچہ (وہ دشمنوں پر بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ تیراندازی بھی کر رہے تھے اور آنحضرت ﷺ کی حفاظت بھی) جب وہ تیر پھینکتے تو نبی کریم ﷺ جھانک کر دیکھتے کہ تیر کہاں پڑا ہے اور کس کو لگا ہے۔" (بخاریؒ)

گھوڑوں کی فضیلت

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْبَرَكَةُ فِىْ نَوَاصِى الْخَيْلِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا گھوڑوں کی پیشانیوں میں برکت ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: پیشانی سے مراد "ذات" ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں میں ایک خاص قسم کی برکت رکھی ہے کیونکہ گھوڑوں کے ذریعہ جہاد کیا جاتا ہے جس میں دنیا و آخرت کی خیر و بھلائی ہے۔

⑦ وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْوِى نَاصِيَةَ فَرَسٍ بِاَصْبَعِهٖ وَهُوَ يَقُوْلُ الْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ بِنَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ الْاَجْرُ وَالْغَنِيْمَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جریر ابن عبداللہ بجلی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ایک گھوڑے کی پیشانی کے بالوں کو اپنی انگلی سے بل دیتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ گھوڑے (وہ جانور ہیں) جن کی پیشانیوں میں قیامت تک کے لئے خیر و بھلائی بندھی ہوئی ہے کیونکہ گھوڑوں کے ذریعہ جہاد کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے جس میں دنیا کا مال غنیمت حاصل ہوتا ہے۔" (مسلمؒ)

⑧ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَبَسَ فَرَسًا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِيْمَانًا بِاللّٰهِ وَتَصْدِيْقًا بِوَعْدِهٖ فَاِنَّ شِبَعَهٗ وَرِيَّهٗ وَرَوْثَهٗ وَبَوْلَهٗ فِىْ مِيْزَانِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کے وعدے کو سچ جاننے کی وجہ سے خدا کی راہ میں (کام لینے کے لئے اپنے گھر) گھوڑا باندھا تو اس گھوڑے کی سیری و سیرابی (یعنی اس نے دنیا میں جو کچھ کھایا اور پیا ہے وہ) اور اس کی لید اور اس کا پیشاب قیامت کے دن اس شخص کے اعمال کی ترازو میں تولے جائیں گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "اللہ پر ایمان لانے اور اس کے وعدے کو سچ جاننے کی وجہ سے" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جہاد میں جانے اور دشمنوں سے لڑائی کے لئے جو گھوڑا اپنے ہاں باندھا ہو اس میں اس کی نیت محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول اور اس کے حکم کی فرمانبرداری کی ہو اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لئے جس عظیم اجرت و ثواب کا وعدہ کیا ہے اس کی طلب گاری کی خاطر ہو۔

"سیری اور سیرابی" سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے جانور کا پیٹ بھرتا ہے اور سیراب ہوتا ہے یعنی گھاس، دانہ، پانی وغیرہ لہٰذا یہ ساری چیزیں بھی ثواب ملنے کے اعتبار سے اس شخص کے نامہ اعمال میں لکھی جائیں گی کہ قیامت کے دن یہ چیزیں ثواب کی شکل میں اس کو حاصل ہوں گی اور اس کے میزان اعمال میں تولی جائیں گی۔

اشکل گھوڑا ناپسندیدہ

⑨ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُ الشِّكَالَ فِى الْخَيْلِ وَالشِّكَالُ اَنْ يَكُوْنَ الْفَرَسُ فِىْ رِجْلِهِ الْيُمْنٰى بَيَاضٌ وَفِىْ يَدِهِ الْيُسْرٰى اَوْفِىْ يَدِهِ الْيُمْنٰى وَرِجْلِهِ الْيُسْرٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ گھوڑے میں شکال کو ناپسند کرتے تھے، اور شکال یہ ہے کہ گھوڑے کے دائیں پاؤں اور بائیں ہاتھ پر سفیدی ہو یا دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں پر سفیدی ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: راوی نے تو شکال کی وضاحت یہ کی ہے کہ گھوڑا جس کے ایک ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں پر سفیدی ہو لیکن صاحب قاموس اور دوسرے تمام اہل لغت کے نزدیک گھوڑے میں شکال کا مطلب یہ ہے کہ اس گھوڑے کے تین پاؤں تو سفید ہوں اور ایک پاؤں باقی تمام بدن کا ہم رنگ ہو یا اس کے برعکس ہو یعنی ایک پاؤں سفید ہو اور تین پاؤں بدن کے ہم رنگ ہوں۔

اصل میں "شکل" لغت میں اس رسی کو کہتے ہیں جس پر چوپائے کے پیر باندھے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس طرح کے گھوڑے کو اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور آنحضرت ﷺ ایسے گھوڑے کو از راہ تفاؤل کے ناپسند فرماتے تھے کہ وہ گھوڑا گویا بصورت شکول ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ کو تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہو کہ اس جنس کا گھوڑا اصیل نہیں ہوتا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر اشکل گھوڑے کی پیشانی پر اتنی سفیدی ہو کہ جو ہاتھ کے انگوٹھے سے نہ چھپ سکے تو اس کا عیب دور

ہو جاتا ہے اور پھر وہ ناپسندیدہ نہیں رہتا۔

گھوڑ دوڑ کا ذکر

⑩ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِى اُضْمِرَتْ مِنَ الْحَفْيَاءِ وَاَمَدُهَا ثَنِيَّةُ الْوَدَاعِ وَبَيْنَهُمَا سِتَّةُ اَمْيَالٍ وَسَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِى لَمْ تُضْمَرْ مِنَ الثَّنِيَّةِ اِلٰى مَسْجِدِ بَنِى زُرَيْقٍ وَبَيْنَهُمَا مِيْلٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان دونوں گھوڑوں کے درمیان مسابقت گھوڑ دوڑ کرائی جو اضمار کئے گئے تھے اور یہ مسابقت حفیاء سے شروع ہوئی اور ثنیۃ الوداع پر ختم ہوئی اور ان دونوں مقامات (یعنی حفیاء اور ثنیۃ الوداع) کے درمیان چھ میل کا فاصلہ تھا اور جن گھوڑوں کا اضمار نہیں کیا گیا تھا ان کے درمیان ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک مسابقت کرائی اور ان دونوں مقامات (یعنی ثنیۃ الوداع اور مسجد بنی زریق) کا درمیانی فاصلہ ایک میل تھا۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: "گھوڑوں کے درمیان مسابقت" گویا گھوڑ دوڑ کے مفہوم کے مرادف ہے یعنی دو آدمی اپنے گھوڑوں کو اس لئے دوڑائیں کہ دیکھیں کہ کس کا گھوڑا آگے نکل جاتا ہے۔

"اضمار" اس کو کہتے ہیں کہ پہلے تو گھوڑے کو خوب گھاس دانہ کھلا پلا کر بہت قوی اور فربہ کیا جاتا ہے اس کے بعد اس کا گھاس دانہ بتدریج کم کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کو اصلی خوراک پر لے آتے ہیں اور پھر اس کو ایک مکان پر بند کر کے اس پر گردنی ڈال دیتے ہیں اس کی وجہ سے وہ گرم ہو جاتا ہے اور پسینہ چھوڑتا ہے اور جب پسینہ خشک ہو جاتا ہے تو وہ گھوڑا سبک ہو جاتا ہے یعنی اس کا گوشت تو ہلکا ہو جاتا ہے لیکن دوڑنے میں قوی رہتا ہے۔

"حفیاء" ایک جگہ کا نام ہے۔ جو مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ثنیۃ الوداع ایک پہاڑ کا نام ہے اہل مدینہ اپنے مسافروں کو پہنچانے کے لئے اس پہاڑ تک جاتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کی ایک اونٹنی کا ذکر

⑪ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَتْ نَاقَةٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُسَمَّى الْعَضْبَاءَ وَكَانَتْ لَا تُسْبَقُ فَجَاءَ اَعْرَابِيٌّ عَلٰى قَعُوْدٍ لَهُ فَسَبَقَهَا فَاشْتَدَّ ذٰلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَا يَرْتَفِعَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا وَضَعَهُ۔ (رواہ البخاریؒ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے پاس ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا اور وہ کبھی پیچھے نہیں رہتی تھی (یعنی اس کا جس اونٹ سے بھی دوڑ میں مقابلہ ہوتا اس کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتی تھی) لیکن (ایک دن) ایک دیہاتی اپنے اونٹ پر آیا اور (جب اس نے عضباء سے اپنا اونٹ دوڑایا تو) اس کا اونٹ آگے نکل گیا یہ بات مسلمانوں پر سخت گزری تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا یہ ایک ثابت شدہ فیصلہ ہے کہ دنیا کی جو بھی چیز سر بلند ہوتی ہے خدا اس کو پست کر دیتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اصل میں "عضباء" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے کان کٹے ہوئے یا چرے ہوئے ہوں۔ آنحضرت ﷺ کی اس اونٹنی کا کان گو کٹا ہوا یا چرا ہوا نہیں تھا مگر اس کا نام "عضباء" تھا البتہ خلقی طور پر اس کے کان چھوٹے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی یہ وہی اونٹنی ہے جس کو "قصواء" بھی کہتے ہیں، لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اونٹنی اور تھی اور "عصواء" ایک دوسری اونٹنی تھی۔

"قعود" اس جوان اونٹ کو کہتے ہیں جو نیا نیا سواری میں آیا ہو اور سواری کے لائق ہو گیا ہو ایسا اونٹ دو برس سے چھ برس تک کی

عمر کا ہوتا ہے جس اونٹ کی عمر چھ برس سے زائد ہو اس کو "جمل" کہتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

جہاد میں کام آنے والا ہتھیار اپنے بنانے والے کو بھی جنّت میں لے جائے گا

(۱۲) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُدْخِلُ بِالسَّهْمِ الْوَاحِدِ ثَلَاثَةَ نَفَرٍ الْجَنَّةَ صَانِعَهٗ يَحْتَسِبُ فِيْ صَنْعَتِهِ الْخَيْرَ وَالرَّامِيَ بِهٖ مُنَبِّلَهٗ فَارْمُوْا وَارْكَبُوْا وَاَنْ تَرْمُوْا اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ تَرْكَبُوْا كُلُّ شَيْءٍ يَلْهُوْ بِهِ الرَّجُلُ بَاطِلٌ اِلَّا رَمْيَهٗ بِقَوْسِهٖ وَتَادِيْبَهٗ فَرَسَهٗ وَمُلَاعَبَتَهُ امْرَاَتَهٗ فَاِنَّهُنَّ مِنَ الْحَقِّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَزَادَ اَبُوْدَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ وَمَنْ تَرَكَ الرَّمْيَ بَعْدَ مَا عَلِمَهٗ رَغْبَةً عَنْهُ فَاِنَّهٗ نِعْمَةٌ تَرَكَهَا اَوْ قَالَ كَفَرَهَا۔

"حضرت عقبہؓ ابن عامر کہتے ہیں میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ (کفار پر چلائے جانے والے) ایک تیر کے بدلے میں تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے ایک تو اس تیر کے بنانے والے کو جب کہ وہ اپنے روزگار کے ساتھ ثواب کی بھی امید رکھے (یعنی جب وہ تیر بنائے تو اپنے روزگار کے ساتھ نیت بھی رکھے کہ میں یہ تیر جہاد میں کام آنے کے لئے بنارہا ہوں) (دوسرے) جہاد میں تیر چلانے والے کو اور (تیسرے) تیر دینے والے کو (یعنی وہ شخص جو تیر انداز کے ہاتھ میں اپنایا اسی کا تیر دے اور خواہ پہلے ہی دے یا نشانے پر سے اٹھا کر دے) لہٰذا تم تیر اندازی کرو اور گھوڑوں پر سواری کرو یعنی تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی مشق کرو اور تمہاری تیر اندازی میرے نزدیک سواری کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہے اور یاد رکھو انسان جس چیز کو لہو ولعب (یعنی محض کھیل اور تفریح) کے طور پر اختیار کرے وہ باطل اور ناروا ہے مگر اپنی کمان سے تیر اندازی کرنا اپنے گھوڑے کو سدھارنا اور اپنی بیوی کے ساتھ کھیل و تفریح کرنا یہ سب چیزیں حق ہیں ترمذیؒ ابن ماجہؒ ابوداؤدؒ اور دارمیؒ نے (اپنی روایت میں) یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ اور جو شخص تیر اندازی سیکھنے کے بعد اس کو بے نیازی اور بیزاری کے جذبہ سے چھوڑ دے تو وہ تیر اندازی ایک نعمت ہے جس کو اس نے چھوڑ دیا ہے یا یہ فرمایا کہ اس نے اس نعمت کا کفران کیا۔"

تشریح: "یہ چیزیں حق ہیں" ان چیزوں کے حکم میں ہر وہ چیز داخل ہے جو حق و بھلائی کی راہ میں معاون ہو خواہ وہ علم کے قبیل سے ہو یا عمل کے قبیل سے جب کہ وہ مقابلہ بازی کی قسم سے ہو جیسے پیدل چلنے اور دوڑنے، گھوڑ سواری اور اونٹوں کی دوڑ کا مقابلہ وغیرہ۔

تیر انداز کے ثواب کا ذکر

(۱۳) وَعَنْ اَبِيْ نَجِيْحٍ السُّلَمِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ بَلَغَ بِسَهْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَ لَهٗ دَرَجَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَمَنْ رَمٰى بِسَهْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَ لَهٗ عِدْلُ مُحَرَّرٍ وَمَنْ شَابَ شَيْبَةً فِي الْاِسْلَامِ كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَرَوٰى اَبُوْدَاوُدَ اَلْفَصْلَ الْاَوَّلَ وَالنَّسَائِيُّ الْاَوَّلَ وَالثَّانِيَ وَالتِّرْمِذِيُّ الثَّانِيَ وَالثَّالِثَ وَفِيْ رِوَايَتِهِمَا مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بَدَلَ فِي الْاِسْلَامِ۔

"اور حضرت ابو نجیح سلمیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں ایک تیر (نشانے پر) پہنچایا (یعنی اس نے تیر چلا کر کافر کو مار ڈالا تو) اس کے لئے جنت میں ایک بڑا درجہ ہے اور جس شخص نے اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد) میں تیر پھینکا (خواہ وہ کافر کو لگا یا نہ لگا) تو وہ اس کے لئے ایک بردہ (غلام یا لونڈی) آزاد کرنے کے برابر ہے اور جو شخص اسلام (کی حالت) میں بوڑھا ہو گیا اور مر گیا) تو وہ بڑھاپا قیامت کے دن اس کے لئے نور ہوگا۔ (اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے) ابوداؤد نے (روایت کا صرف) پہلا جزو یعنی من بلغ بسهم في سبيل الله فهو له درجة في الجنة نقل کیا ہے) نسائی نے پہلا اور

دوسرا جزء (کہ جن میں تیر اندازی کی فضیلت بیان کی گئی ہے) نقل کیا ہے اور ترمذی نے دوسرا اور تیسرا جز نقل کیا ہے۔ نیز بیہقی اور ترمذی کی روایت میں "فی الاسلام" یعنی اسلام کی حالت میں کے بجائے "فی سبیل اللہ" یعنی "اللہ کی راہ میں" ہے۔"

تشریح: "جو شخص اسلام کی (حالت) میں بوڑھا ہو گیا الخ" سے واضح ہوا کہ کسی شخص کا ایمان و اسلام کی حالت میں بوڑھا ہو جانا یا اس پر بڑھاپے کی علامات کا ظاہر ہو جانا گویا اس کی اخروی سعادت کی نشانی ہے کیونکہ زندگی آخری منزلوں تک اسلام وایمان کی حالت پر قائم رہنا اللہ کا ایک بڑا فضل وکرم ہے۔

ایک بڑے بزرگ حضرت ابویزیدؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دن انہوں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو وہاں ان کو بڑھاپے کی علامات نظر آئیں بے اختیار ان کے منہ سے یہ نکلا کہ ظهر الشيب ولم يظهر العيب وما ادري مافي الغيب یعنی خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر بڑھاپا ظاہر ہوا ہے، کوئی عیب ظاہر نہیں ہوا، اور پردہ غیب میں کیا چیز ہے مجھے کچھ معلوم نہیں۔

ایک بات یہ واضح رہے کہ کتاب کی عبارت میں روایتھا کی ضمیر بظاہر نسائی اور ترمذی کی طرف لوٹنی چاہئے کیونکہ ماقبل کی عبارت میں یہی دونوں پاس پاس مذکور ہیں لیکن حقیقت میں یہ (نسائی اور ترمذی کی طرف ضمیر لوٹانا) اس وجہ سے صحیح نہیں ہوگا کہ نسائی نے تیسرا جزو نقل ہی نہیں کیا، لہٰذا ضمیر بیہقی اور ترمذی کی طرف راجع ہوگی اور فی روایتھما کے یہی معنی ہوں گے۔ کہ "بیہقی اور ترمذی کی روایت میں الخ" البتہ اس صورت میں ایک اشکال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اصل روایت میں کہ جس کو بیہقی ہی نے نقل کیا ہے "فی الاسلام" کے لفظ مذکور ہیں تو پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ بیہقی اور ترمذی کی روایت میں "فی الاسلام" کے بجائے فی سبیل اللّٰہ کے الفاظ ہیں؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فی روایتھما اصل میں مفہوم کے اعتبار سے یوں ہے کہ وفی روایة للبیهقی وروایة الترمذی یعنی بیہقی کی ایک اور روایت میں اور ترمذی کی روایت میں (فی الاسلام کے بجائے فی سبیل اللہ ہے)" اس طرح بات صاف ہو جائے گی کہ بیہقی کی ایک روایت میں جو یہاں متن میں نقل کی گئی ہے فی الاسلام ہے اور ایک دوسری روایت میں فی الاسلام کے بجائے فی سبیل اللّٰہ ہے۔

جہاد کی چیزوں میں شرط کا مال لینا جائز ہے

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا سَبَقَ اِلَّا فِیْ نَصْلٍ اَوْ خُفٍّ اَوْ حَافِرٍ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مسابقت کی شرط کا مال لینا صرف تین چیزوں (یعنی) تیر چلانے، اونٹ دوڑانے، اور گھوڑ دوڑ میں جائز ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "سَبَق" شرط کی رقم کو کہتے ہیں، یعنی وہ مال جو آگے بڑھ جانے کی شرط جیتنے والے کو دیا جاتا ہے۔ اس حدیث سے بظاہر یہ واضح ہوتا ہے کہ ان تین چیزوں کے علاوہ اور کسی چیز میں مسابقت یعنی آگے بڑھ جانے کی بازی لگانا اور اس کا مال لینا جائز نہیں ہے، لیکن فقہاء نے ان تینوں کے حکم میں ان چیزوں کو بھی شامل کیا ہے جو جہاد کا سامان و ذریعہ ہیں جیسے گدھا اور خچر، گھوڑے کے حکم میں ہیں اور ہاتھی، اونٹ کے حکم میں ہے۔ بعض حضرات نے پیدل دوڑنے اور بعض نے پتھر پھینکنے کی مسابقت کو جواز کے حکم میں شامل کیا ہے کیونکہ یہ چیزیں تیر" کے مفہوم میں داخل ہیں۔

جو چیزیں جہاد کے ذرائع میں شامل ہیں ان کی مسابقت میں شرط باندھنا اور بازی لگانا اور شرط کی رقم لینا دراصل جہاد کی ترغیب دینے کے پیش نظر ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا جواز کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ ہاں جو چیزیں جہاد کے اسباب و ذرائع میں سے نہیں ہیں ان میں مسابقت کی بازی لگانا اور شرط باندھنا چونکہ ایسے کسی صالح مقصد کے لئے نہیں ہوتا اس لئے نہ تو ان چیزوں میں مسابقت ہی جائز ہے اور نہ اس کی

شرط کا مال لینا جائز ہے۔

بازی لگانے کا مسئلہ

واضح رہے کہ کسی چیز کی مسابقت اور ہار جیت کے مقابلہ میں رقم کی شرط باندھنا دراصل قمار یعنی جوئے کا مفہوم ہے، کیونکہ اس صورت میں ملکیت بھی مشتبہ رہتی ہے اور نفع و نقصان کے درمیان بھی شک رہتا ہے اور قمار کے یہی معنی ہیں ہاں اگر کسی مسابقت اور ہار جیت کے مقابلہ میں امیر و حاکم یا کسی اور تیسرے شخص کی طرف سے کسی رقم یا کسی مال کی شرط باندھی جائے مثلاً وہ (امیر و حاکم یا تیسرا شخص) یہ کہے کہ ان دونوں میں سے جو شخص آگے بڑھ جائے گا یا جو شخص جیت جائے گا میں اس کو اتنی رقم یا فلاں چیز دوں گا تو یہ جائز ہوگا، اسی طرح دونوں مقابل میں سے صرف کسی ایک کی جانب سے کی رقم یا مال کی شرط باندھی جائے مثلاً ان میں سے کوئی ایک یوں کہے کہ "اگر تم مجھ سے آگے بڑھ گئے یا میرے مقابلہ پر جیت گئے تو میں تمہیں اتنی رقم یا فلاں چیز دوں گا اور اگر میں آگے بڑھ گیا یا میں جیت گیا تو تمہیں کچھ نہ دینا ہوگا۔" تو اس کے جواز میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ ناجائز تو اس صورت میں ہوگا جب کہ دونوں کی طرف سے بازی لگے۔ جیسے یوں کہا جائے کہ اگر میں آگے بڑھ گیا یا میں جیت گیا تو تمہیں اتنی رقم یا فلاں چیز دینی ہوگی اور اگر تم آگے بڑھ گئے یا جیت گئے تو میں اتنی رقم یا فلاں چیز دوں گا۔" کیونکہ حقیقت میں یہی قمار یعنی جوا ہے لیکن یہ صورت بھی اس طرح سے جائز ہو سکتی ہے۔ جب کہ دونوں کے درمیان "محلل" شامل ہو جائے۔ جیسا کہ اگلی حدیث میں بیان ہوگا۔"

مسابقت میں محلل کے شامل ہونے کا مسئلہ

⑮ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْخَلَ فَرَسًا بَیْنَ فَرَسَیْنِ فَاِنْ کَانَ یَاْمَنُ اَنْ یُسْبَقَ فَلَا خَیْرَ فِیْهِ فَاِنْ کَانَ لَا یَاْمَنُ اَنْ یُسْبَقَ فَلَا بَاْسَ بِهٖ رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَفِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ دَاوٗدَ قَالَ مَنْ اَدْخَلَ فَرَسًا بَیْنَ فَرَسَیْنِ یَعْنِیْ وَهُوَ لَا یَاْمَنُ اَنْ یُسْبَقَ فَلَیْسَ بِقِمَارٍ وَمَنْ اَدْخَلَ فَرَسًا بَیْنَ فَرَسَیْنِ وَقَدْ اَمِنَ اَنْ یُسْبَقَ فَهُوَ قِمَارٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص دو گھوڑوں کے درمیان اپنا گھوڑا شامل کرے تو اگر وہ گھوڑا ایسا ہے کہ (جس کے تیز رو ہونے کی وجہ سے) اس کے بارے میں یہ یقین ہے کہ وہ (ان دونوں گھوڑوں سے) آگے نکل جائے گا تو اس میں بھلائی نہیں ہے اور اگر یہ یقین نہیں ہے کہ وہ آگے نکل جائے گا تو پھر اس میں مضائقہ نہیں۔" (شرح السنۃ) اور ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا) اگر کوئی شخص دو گھوڑوں کے درمیان اپنا گھوڑا شامل کرے یعنی جس کے بارے میں یہ یقین نہیں ہے کہ اگر وہ آگے نکل جائے گا تو یہ قمار (جوا) نہیں ہے اور اگر کوئی شخص دو گھوڑوں کے درمیان اپنا (ایسا) گھوڑا شامل کرے جس کے بارے میں یہ یقین ہے کہ وہ آگے نکل جائے گا تو یہ قمار ہے۔"

تشریح: "جو شخص دو گھوڑوں کے درمیان اپنا گھوڑا شامل کرے۔" یہ تحلیل کی صورت ہے جو مسابقت (یعنی گھوڑ دوڑ کے ہونے والے مقابلہ) میں بازی لگانے اور شرط باندھنے کو جائز کرتی ہے اور ایسے شخص کو (کہ جو دو گھوڑوں کے درمیان ہونے والے مقابلہ میں اپنا گھوڑا شامل کرے "محلل کہتے ہیں۔ اس صورت کی وضاحت یہ ہے کہ مثلاً دو شخص یعنی زید اور بکر نے مقابلے کے لئے اپنے اپنے گھوڑے دوڑائے اور دونوں نے ہار جیت کی شرط باندھی کہ جس کا گھوڑا آگے نکل جائے گا وہ پیچھے رہ جانے والے گھوڑے کے مالک سے اتنی رقم یا فلاں چیز لے لیگا۔ اس طرح انہوں نے ایک قمار (جوئے) کا معاملہ کیا، اب ایک تیسرا شخص یعنی خالد آتا ہے اور وہ ان دونوں کی گھوڑوں کی دوڑ میں شرط کے ساتھ اپنا گھوڑا بھی شامل کر دیتا ہے کہ اگر یہ تیسرا (میرا) گھوڑا ان دونوں گھوڑوں سے آگے نکل گیا تو میں تم دونوں سے اتنی رقم یا فلاں چیز لے لوں گا اور پیچھے رہ گیا تو مجھے کچھ نہیں دینا ہوگا۔

یہی صورت تحلیل کی ہے اور اس تیسرے شخص یعنی خالد کو "محلل" (حلال کرنے والا) کہیں گے۔ ایسے شخص کو "محلل" اس لئے کہتے

ہیں کہ اس کی وجہ سے وہ "معاملہ" حلال و جائز ہو گیا جو پہلے جانبین کی طرف سے شرط و بازی لگانے کی وجہ سے ایک "حرام" معاملہ "یعنی قمار تھی، چنانچہ مذکورہ صورت میں اگر محلل کا گھوڑا آگے نکل جائے تو وہ ان دونوں سے متعینہ رقم یا مقررہ چیز لے لے اور اگر ان دونوں کے گھوڑے اس کے گھوڑے سے آگے نکل جائیں تو وہ ان کو کچھ نہ دے البتہ جو ان دونوں میں سے ایک کا گھوڑا آگے نکلے گا اس کو دوسرے سے متعینہ رقم یا مقررہ چیز لینا جائز ہو گا۔

واضح رہے کہ علماء نے لکھا ہے اور جیسا کہ اس حدیث سے بھی واضح ہوتا ہے کہ تحلیل کی صورت میں محلل کو چاہئے کہ وہ اس گھوڑدوڑ میں ایسے گھوڑے کو شامل کرے جو دوڑنے میں ان دونوں کے گھوڑے کے برابر یا تقریباً برابر ہو، چنانچہ اگر محلل کا گھوڑا ان دونوں کے گھوڑے سے آگے اس طرح کا تیز رو ہو کہ وہ "محلل" جانتا ہے کہ ان دونوں کے گھوڑے میرے گھوڑے سے آگے نہیں نکل سکتے تو نہ صرف یہ کہ یہ جائز نہیں بلکہ اس کا اپنے گھوڑے کو اس گھوڑدوڑ میں شامل کرنا اور نہ کرنا برابر ہو گا یعنی یہ صورت تحلیل کی نہیں ہو گی۔ ہاں اگر وہ یہ نہیں جانتا کہ میرا گھوڑا ان دونوں کے آگے نکل جائے گا اور نہ یہ جانتا ہے کہ میرا گھوڑا ان دونوں کے گھوڑے سے پیچھے رہ جائے گا تو یہ جائز ہے اور یہ صورت تحلیل کی مانی جائے گی۔ حاصل یہ کہ اگر محلل کا گھوڑا ایسا ہے کہ وہ آگے نکل جانے کا بھی احتمال رکھتا ہے اور پیچھے رہ جانے کا بھی احتمال رکھتا ہے تو جائز ہو گا ورنہ نہیں۔

گھوڑدوڑ میں "جلب" اور "جنب" کی ممانعت

(۱۶) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاجَلَبَ وَلَا جَنَبَ زَادَ يَحْيىٰ فِيْ حَدِيْثِهٖ فِي الرِّهَانِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ مَعَ زِيَادَةٍ فِيْ بَابِ الْغَصَبِ۔

"اور حضرت عمران ابن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "نہ جلب (جائز) ہے اور نہ جنب اور (ایک راوی) یحییٰ نے اپنی روایت میں لفظ "فی الرہان" بھی نقل کیا ہے (یعنی ان کی روایت میں یہ ہے کہ رہان یعنی گھوڑوں کی شرط و مسابقت میں نہ جلب جائز ہے اور نہ جنب) اس روایت کو ابوداؤد ونسائی نے نقل کیا ہے۔ نیز ترمذی نے بھی اس روایت کو کچھ زائد الفاظ و معانی کے ساتھ باب الغصب میں نقل کیا۔"

تشریح: "جلب اور جنب" یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا زکوٰۃ دینے والوں کی قیام گاہوں سے کہیں دور ٹھہرے اور ان کو یہ حکم دے کہ وہ اپنی زکوٰۃ کا مال جیسے مویشی لے کر یہاں آجائیں۔ اور "جنب" یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے اپنے زکوٰۃ کے مال جیسے مویشیوں کو لے کر اپنی قیامگاہوں سے کہیں دور چلے جائیں اور زکوٰۃ وصول کرنے والے کو اس مشقت میں مبتلا کریں کہ وہ ان کے پاس پہنچ کر زکوٰۃ وصول کرے۔ لہٰذا یہ دونوں ہی ممنوع و مکروہ ہیں۔

گھوڑدوڑ میں "جلب" یہ ہے کہ گھوڑدوڑ میں شریک ہونے والا کوئی سوار کسی دوسرے شخص کو اس مقصد سے اپنے گھوڑے کے پیچھے لگا لے کہ وہ اس کے گھوڑے کو ڈانٹتا اور جھڑکتا رہے تاکہ وہ آگے بڑھ جائے۔ اور "جنب" یہ ہے کہ اپنے گھوڑے کے پہلو بہ پہلو ایک دوسرا گھوڑا رکھے تاکہ جب سواری کا گھوڑا تھک جائے تو اس گھوڑے پر سوار ہو جائے، یہ دونوں باتیں بھی ممنوع ہیں۔"

بہترین گھوڑے کی علامات

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُ الْخَيْلِ الْاَدْهَمُ الْاَقْرَحُ الْاَرْثَمُ ثُمَّ الْاَقْرَحُ الْمُحَجَّلُ طَلْقُ الْيَمِيْنِ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ اَدْهَمَ فَكُمَيْتٌ عَلٰى هٰذِهِ الشِّيَةِ۔ (رواه الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بہترین گھوڑا سیاہ گھوڑا ہے جس کی پیشانی پر تھوڑی سی سفیدی ہو اور ناک کی جانب سفیدی ہو پھر وہ گھوڑا بہتر ہے جس کی پیشانی پر تھوڑی سی سفیدی ہو اور ہاتھ پاؤں سفید ہوں لیکن دایاں ہاتھ

سفید نہ ہو اور اگر سیاہ گھوڑا نہ ہو پھر اسی قسم کا کمیت (بھی بہتر گھوڑا ہے۔" (ترمذی، دارمی)

تشریح: "کمیت" اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی دم اور ایال سیاہ ہوں اور باقی بدن سرخ ہو اور "اسی قسم" کا مطلب یہ ہے کہ جو علامتیں سیاہ گھوڑے میں بیان کی گئی ہیں یعنی پیشانی پر سفیدی وغیرہ۔ وہی "کمیت" میں بھی ہوں تو یہ گھوڑا بھی ایک بہترین گھوڑا ہے۔

⑱ وَعَنْ اَبِي وَهْبٍ الْجُشَمِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِكُلِّ كُمَيْتٍ اَغَرَّ مُحَجَّلٍ اَوْ اَشْقَرَ اَغَرَّ مُحَجَّلٍ اَوْ اَدْهَمَ اَغَرَّ مُحَجَّلٍ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابووہبؓ جشمی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تمہارے لئے سفید پیشانی اور سفید ہاتھ پاؤں والا کمیت گھوڑا ضروری ہے (یعنی اگر تم گھوڑا رکھو تو اس طرح کا گھوڑا رکھو) پھر اشقر گھوڑا ہونا چاہئے جس کی پیشانی بھی سفید ہو اور ہاتھ پاؤں بھی سفید ہوں یا سیاہ سفید پیشانی ہو اور سفید ہاتھ پاؤں ہوں۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "اشقر سرخ رنگ کے گھوڑے کو کہتے ہیں۔ کمیت اور اشقر میں فرق یہ ہے کہ کمیت کی دم اور ایال سیاہ ہوتی ہے اور اشقر کی سرخ۔

⑲ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُمْنُ الْخَيْلِ فِي الشُّقْرِ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "گھوڑوں کی برکت سرخ رنگ کے گھوڑوں میں ہوتی ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

گھوڑوں کی پیشانی کے بال اور ان کی ایال ودم نہ کاٹو

⑳ وَعَنْ عُتْبَةَ بْنِ عَبْدٍ السُّلَمِيِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَقُصُّوْا نَوَاصِيَ الْخَيْلِ وَلَا مَعَارِفَهَا وَلَا اَذْنَابَهَا فَاِنَّ اَذْنَابَهَا مَذَابُّهَا وَمَعَارِفَهَا دِفَاءُهَا وَنَوَاصِيَهَا مَعْقُوْدٌ فِيْهَا الْخَيْرُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عتبہؓ ابن عبدالسلمی سے روایت ہے انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "گھوڑوں کی پیشانی کے بال، ان کی ایال اور انکی دموں کو نہ کاٹو کیونکہ ان کی دمیں، ان کے مورچھل ہیں (کہ جن کو وہ ہلا ہلا کر مکھیوں اور کیڑوں کو اڑاتے ہیں) اور ان کی ایالیں ان کو گرمی پہنچانے کی چیز ہیں، تو ان کی پیشانی کے بالوں میں بھلائی بندھی ہوئی ہے۔" (ابوداؤد)

گھوڑوں کے بارے میں چند ہدایات

㉑ وَعَنْ اَبِي وَهْبٍ الْجُشَمِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ارْتَبِطُوا الْخَيْلَ وَامْسَحُوْا بِنَوَاصِيْهَا وَاَعْجَازِهَا اَوْ قَالَ اَكْفَالِهَا وَقَلِّدُوْهَا وَلَا تُقَلِّدُوْهَا الْاَوْتَارَ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت وہب جشمیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "گھوڑوں کو باندھ کر رکھو، ان کی پیشانیوں اور ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا کرو۔ یا (اعجازھا کی جگہ) اکفالھا فرمایا (اور دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں (یعنی پیٹھ) ان کی گردن میں کنڈا (پٹا) باندھو لیکن ان کی گردن میں کمان کی تانت نہ باندھو۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "باندھ رکھو" یہ گھوڑوں کو جہاد کے لئے فربہ اور چاق وچوبند رکھنے سے کنایہ ہے! یعنی اس کے ذریعہ گویا یہ حکم دیا گیا ہے کہ گھوڑوں کی اچھی طرح دیکھ بھال رکھو اور ان کو خوب کھلاؤ پلاؤ تاکہ وہ موٹے تازے رہیں اور جہاد میں اچھی طرح کام آئیں۔

"ہاتھ پھیرنے" کا مقصد یہ ہے کہ ان کو گرد وغبار سے صاف ستھرا رکھا جائے اور ان کی فربہی معلوم ہوتی رہے نیز اس کے ذریعہ گھوڑوں کو انس وراحت بھی حاصل ہوتی ہے۔

زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کا معمول تھا کہ وہ اپنے گھوڑوں کی گردنوں میں کمان کے تانت باندھ دیا کرتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ اس کی وجہ سے گھوڑے نظر بد سے محفوظ رہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ چیز تقدیر کو بدل نہیں سکتی۔ یا اس لئے منع فرمایا کہ تانت باندھنے سے ان کا گلا نہ گھٹے۔

اہل بیت رسول ﷺ کو تین مخصوص احکام

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَبْدًا مَامُوْرًا مَا اخْتَصَّنَا دُوْنَ النَّاسِ بِشَيْءٍ اِلَّا بِثَلَاثٍ اَمَرَنَا اَنْ نُسْبِغَ الْوُضُوْءَ وَاَنْ لَا نَاْكُلَ الصَّدَقَةَ وَاَنْ لَا نُنْزِيَ حِمَارًا عَلٰى فَرَسٍ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ایک مامور بندے تھے آپ ﷺ نے ہم کو (یعنی اپنے اہل بیت کو) دوسرے لوگوں سے الگ کر کے تین باتوں کے علاوہ اور کسی بات کا مخصوص طور پر حکم نہیں دیا اور وہ (تین باتیں جن کا خاص طور پر اہل بیت کو حکم دیا) یہ ہیں کہ (۱) ہم وضو کو پورا کریں (۲) ہم صدقہ کا مال نہ کھائیں (۳) ہم گھوڑیوں پر گدھے نہ چھوڑیں۔" (ترمذی ونسائی)

تشریح: "رسول کریم ایک مامور بندے تھے" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو خدا کی طرف سے جس بات کا حکم ہوتا تھا وہی کرتے تھے اپنی طرف سے نہ کوئی قانون بناتے تھے اور نہ اپنی خواہش نفس کے تحت کوئی حکم دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کسی بھی طبقہ وجماعت یا کسی بھی شخص وخاندان کے لئے خواہ وہ آپ کے نزدیک کتنا ہی محبوب کیوں نہ ہو الگ سے کسی چیز کا حکم دے کر اس کو دوسرے لوگوں پر ترجیح نہیں دیتے تھے، یہاں تک کہ اہل بیت جو اخص واقرب تھے ان کے لئے بھی احکام میں کسی امتیاز وخصوصیت کو روا نہیں رکھتے تھے جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے وضاحت کی ہے کہ آنحضرت نے ہم اہل بیت کو بھی کسی چیز کا مخصوص طور پر حکم نہیں دیا ہاں تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں اہل بیت کو بھی خصوصی حکم دیا گیا۔

گھوڑیوں (سے خچر پیدا کرنے کے لئے) پر گدھے چھوڑنے سے اس لئے منع فرمایا کہ اول تو اس سے نسل کو قطع کرنا لازم آتا ہے دوسرے یہ ایک اچھی چیز کے بدلے ایک گھٹیا چیز چاہنا ہے کیونکہ گھوڑے کے مقابلہ میں خچر ایک ادنی جانور ہے جو نہ گھوڑے کی طرح کارآمد ہوتا ہے اور نہ جہاد وغیرہ کے کام آتا ہے، لہٰذا ایسا کرنا مکروہ ہے۔

اس موقع پر ایک سوال اٹھتا ہے کہ صدقے کا مال کھانے کا مسئلہ تو بالکل صاف ہے کہ اس سے صرف اہل بیت کو منع کیا گیا ہے باقی اُمت اس کے حکم میں داخل نہیں ہے لیکن باقی دو حکم (یعنی وضو کو پورا کرنا اور گھوڑیوں پر گدھے نہ چھوڑنا) تو ایسے ہیں جن میں پوری اُمت داخل ہے کہ سارے ہی مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وضو کو پورا کرو (یعنی اچھی طرح) کریں اور اپنی گھوڑیوں پر گدھے نہ چھوڑیں پھر ان دونوں چیزوں کو صرف اہل بیت کے ساتھ مخصوص کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس سے مراد ان دونوں چیزوں کو اہل بیت پر واجب ولازم کرنا ہے، یا یہ کہ ان احکام کو اہل بیت کے حق میں زیادہ سے زیادہ اہمیت اور تاکید کے ساتھ نافذ کرنا مقصد ہے۔

یہ حدیث اپنے مفہوم کے اعتبار سے شیعوں کے اس نظریہ کی واضح تردید کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اہل بیت کو کچھ ایسے مخصوص علوم سے نوازا تھا جن میں باقی اُمت کا کوئی حصہ نہیں تھا! اسی طرح وہ حدیث بھی شیعوں کے اس نظریہ کی تردید میں ایک مضبوط دلیل ہے۔ جو پیچھے گزر چکی ہے۔ اور جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں منقول ہے۔

هل عند كم شيئ ليس في القران فقال والذي فلق الحبّة وبرأ النسمة ماعندنا الا مافي القران الا فهما يعطى الرجل في كتابه ومافي الصحيفة۔ الحديث۔

"(جب حضرت علیؓ سے یہ پوچھا گیا کہ) کیا آپ کے پاس ایسا کوئی علم ہے جو قرآن میں موجود نہیں ہے تو انہوں نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو چیرا اور جان کو پیدا کیا قرآن میں جو علوم ہیں ان کے علاوہ ہمارے پاس اور کچھ نہیں ہے ہاں مجھے بے شک کتاب اللہ کا وہ فہم

ملا جو کسی انسان کو عطا ہوتا ہے (اور میرے پاس کچھ) وہ چیزیں (مسائل) ہیں جو اس صحیفہ میں لکھے ہوئے ہیں۔ آخر حدیث تک۔"

گھوڑی پر گدھا چھوڑنے کی ممانعت

(۲۳) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اُهْدِيَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَغْلَةٌ فَرَكِبَهَا فَقَالَ عَلِيٌّ لَوْ حَمَلْنَا الْحَمِيْرَ عَلَى الْخَيْلِ فَكَانَتْ لَنَا مِثْلُ هٰذِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ (ایک موقع پر) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک خچر بطور ہدیہ پیش کیا گیا تو آپ ﷺ اس پر سوار ہوئے، حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ "اگر ہم گھوڑیوں پر گدھے چھوڑیں تو ہمیں (بھی) ایسے خچر مل جائیں؟" رسول کریم ﷺ نے یہ (سن کر) فرمایا کہ "یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو ناواقف ہیں۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ یہ غیر دانشمندانہ کام تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ اس (گھوڑیوں پر گدھے چھوڑنے) سے بہتر گھوڑی پر گھوڑا ہی چھوڑنا ہے کیونکہ جو فوائد گھوڑی سے اس کی نسل پیدا ہونے کی صورت میں حاصل ہوتے ہیں وہ اس کے پیٹ سے خچر پیدا ہونے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ یا یہ مراد ہے کہ یہ کام وہی نادان کر سکتے ہیں جو شریعت کے احکام سے واقف نہیں ہیں اور ان کو اس چیز کا راستہ نظر نہیں آتا جو ان کے حق میں اولیٰ اور بہتر ہے۔

اس حدیث میں گویا گھوڑی پر گدھا چھوڑنے کی ممانعت مذکور ہے، اور یہ ممانعت "نہی کراہت" کے طور پر ہے۔

تلوار کو تھوڑی بہت چاندی سے مزین کرنا جائز ہے

(۲۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَتْ قَبِيْعَةُ سَيْفِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فِضَّةٍ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار کے قبضے کی ٹوپی چاندی کی تھی۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، دارمی)

تشریح: شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ تلوار کو تھوڑی بہت چاندی کے ساتھ مزین و آراستہ کرنا جائز ہے، یہی حکم پٹی کا بھی ہے۔ البتہ ان میں سے کسی میں بھی سونے کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔

(۲۵) وَعَنْ هُوْدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ جَدِّهٖ مَزِيْدَةَ قَالَ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَعَلٰى سَيْفِهٖ ذَهَبٌ وَفِضَّةٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ہود ابن عبداللہ بن سعد اپنے دادا سے کہ جن کا نام مزیدہ تھا نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ فتح کے دن (مکہ میں) داخل ہوئے تو اس وقت آپ کے پاس جو تلوار تھی اس پر سونے اور چاندی کا کام تھا۔" امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے کہا یہ حدیث غریب۔"

تشریح: "اس حدیث کی بنیاد پر ہتھیار و اسلحہ جات میں سونے کے استعمال کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس حدیث کی سند مضبوط نہیں ہے۔"

جنگ میں حفاظت کے زیادہ سے زیادہ سامان استعمال کرنا توکل کے منافی نہیں ہے

(۲۶) وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عَلَيْهِ يَوْمَ اُحُدٍ دِرْعَانِ قَدْ ظَاهَرَ بَيْنَهُمَا۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت سائب ابن یزید سے روایت ہے کہ غزوہ احد کے دن نبی کریم ﷺ (کے جسم مبارک) پر دو زرہیں تھیں آپ ﷺ نے ایک دوسرے پر پہن رکھا تھا۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جنگ کے کارآمد زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کرنا اور میدان جنگ میں اپنی حفاظت کے لئے حتی الوسعت زیادہ سے زیادہ چیزوں کو اختیار کرنا جائز ہے۔ اور یہ توکل کے منافی نہیں ہے۔"

آنحضرت ﷺ کے جھنڈے کا ذکر

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ رَايَةُ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَوْدَاءُ وَالِوَاؤُهُ اَبْيَضُ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا بڑا جھنڈا سیاہ رنگ کا تھا اور چھوٹا جھنڈا سفید رنگ کا۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

(۲۸) وَعَنْ مُوْسَى بْنِ عُبَيْدَةَ مَوْلَى مُحَمَّدِ بْنِ الْقَاسِمِ قَالَ بَعَثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ الْقَاسِمِ اِلَى الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ لِيَسْأَلَهُ عَنْ رَايَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كَانَتْ سَوْدَاءَ مُرَبَّعَةً مِنْ نَمِرَةٍ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت موسیٰ ابن عبیدہ جو حضرت محمد ابن قاسم (تابعی) کے آزاد کردہ غلام تھے کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت محمد ابن قاسم نے مجھے حضرت براء ابن عازب (صحابی) کے پاس بھیجا تاکہ یہ دریافت ہو سکے کہ رسول کریم ﷺ کا جھنڈا کیسا تھا۔ چنانچہ حضرت براء نے فرمایا کہ (آنحضرت ﷺ کا) جھنڈا سیاہ رنگ کا تھا (اس کا کپڑا) چوکور اور نمرہ کی طرح تھا۔" (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: چونکہ جھنڈے کے کپڑا کو "نمرہ" کی طرح بیان کیا گیا ہے اس لئے "سیاہ رنگ کا تھا" سے مراد یہ ہے کہ اس کا اکثر حصہ سیاہ رنگ کا تھا جس کی وجہ سے وہ دور سے سیاہ ہی معلوم ہوتا تھا نہ کہ خالص سیاہ رنگ کا تھا۔"

"نمرہ" اس کملی یا چادر کو کہتے ہیں جس میں سیاہ اور سفید دھاریاں اور خط ہوں)۔ ویسے لغت میں "نمر" مشہور درندہ چیتے کو کہتے ہیں اسی لئے ایسے کپڑے کو چیتے سے تشبیہ دی ہے کہ اسی کھال پر سیاہ وسفید دھاریاں ہوتی ہیں۔

(۲۹) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ مَكَّةَ وَلِوَاؤُهُ اَبْيَضُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (فتح مکہ کے دن) مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ سفید جھنڈا تھا۔"

(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ کی نظر میں گھوڑوں کی قدر وقیمت

(۳۰) عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمْ يَكُنْ شَيْئٌ اَحَبَّ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ النِّسَاءِ مِنَ الْخَيْلِ۔ (رواہ النسائی)

"حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی نظر میں عورتوں کے بعد (جہاد کے مقاصد کے لئے) گھوڑوں سے زیادہ محبوب وپسندیدہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔" (نسائی)

جنگ میں حقیقی طاقت حق تعالیٰ کی مدد ونصرت سے حاصل ہوتی ہے

(۳۱) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَتْ بِيَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْسٌ عَرَبِيَّةٌ فَرَاٰى رُجُلًا بِيَدِهٖ قَوْسٌ فَارِسِيَّةٌ قَالَ مَاهٰذِهٖ اَلْقِهَا وَعَلَيْكُمْ بِهٰذِهٖ وَاَشْبَاهِهَا وَرِمَاحِ الْقَنَا فَاِنَّهَا يُؤَيِّدُ اللّٰهُ لَكُمْ بِهَا فِي الدِّيْنِ وَيُمَكِّنُ لَكُمْ فِي الْبِلَادِ۔

(رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں (کسی میدان میں یا ویسے ہی کسی موقع پر) رسول کریم ﷺ کے ہاتھ میں عربی کمان تھی، جب آپ ﷺ نے ایک شخص (صحابی) کے ہاتھ میں فارسی (ایرانی کمان دیکھی تو فرمایا کہ "یہ کیا ہے؟ اس کو پھینک دو، تمہیں ایسی (یعنی عربی) کمان رکھنی چاہئے۔ اور اس طرح (یعنی اس وضع کی) رکھنی چاہئے۔ نیز تمہیں کامل نیزے رکھنے چاہئیں، یقیناً ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دین (کو سربلند کرنے) میں تمہاری مدد کرے گا اور (دشمنوں کے) شہروں میں تمہیں جمادے گا۔" (ابن ماجہ)

تشریح: گویا ان صحابی نے جب یہ دیکھا ہو گا کہ فارسی (ایرانی) کمان زیادہ مضبوط اور زیادہ سخت ہوتی ہے تو انہوں نے اس کمان کو عربی کمان پر ترجیح دی، نیز پھر انہوں نے یہ گمان کیا ہو گا کہ ایسی کمان جنگ میں بہت کارآمد ہوتی ہے اور دشمنوں کے شہروں کو فتح کرنے کا مضبوط ذریعہ ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان پر واضح کیا کہ تمہارا جو خیال ہے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ آلات حرب خواہ کسی قسم کے ہوں اور دیکھنے میں کتنے ہی مضبوط و عمدہ ہوں حقیقت میں میدان جنگ کی کامیابی کا ان پر انحصار نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی مرضی پر موقوف ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے اپنے دین کی سربلندی کی جدوجہد میں مدد و نصرت دے کر کامیاب و کامران کرتا ہے۔ حقیقی مدد و نصرت اسی کی طرف سے اور اسی کی قوت و قدرت کے ساتھ ہوتی ہے، نہ تمہاری قوت و طاقت سے دین کی سربلندی میں نصرت حاصل ہوتی ہے اور نہ محض تمہارے ساز و سامان اور آلات حرب کی مضبوطی و عمدگی سے دشمنوں کے مقابلے پر مدد ملتی ہے۔

بَابُ اٰدَابِ السَّفَرِ

آداب سفر کا بیان

اس باب میں احادیث نقل ہوں گی جن سے سفر کے آداب اور طور طریقے معلوم ہوں گے، سفر خواہ جہاد کا ہو یا حج کا اور یا ان کے علاوہ اور کسی طرح کا۔

واضح رہے کہ "سفر کے آداب" بہت ہیں بعض تو اس طرح کے ہیں کہ ان کا تعلق سفر شروع کرنے سے پہلے سے ہے اور بعض آداب اس نوعیت کے ہیں کہ ان کا لحاظ سفر کے دوران ہونا چاہئے اور بعض آداب ایسے ہیں جو سفر سے واپس آنے پر ملحوظ رہنے چاہئیں، ان میں سے کچھ کے بارے میں اس باب میں منقول احادیث اور ان کی تشریحات سے معلوم ہو گا لیکن اس کی سب سے عمدہ تفصیل احیاء العلوم میں مذکور ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جہاد کے لئے جمعرات کے دن نکلنا آنحضرت ﷺ کے نزدیک پسندیدہ تھا

① عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ وَكَانَ يُحِبُّ اَنْ يَّخْرُجَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت کعبؓ ابن مالک راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے جمعرات کے دن روانہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے کہ جہاد کے سفر کی ابتداء جمعرات کے دن سے کریں۔" (بخاری)

تشریح: "تبوک ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ اور دمشق کے درمیانی راستہ پر خیبر اور العلاء کے خط پر واقع ہے، یہ پہلے شام کے علاقہ میں تھا اب حجاز کی حدود میں ہے۔ مدینہ سے اس کا فاصلہ ۶۵۴ میل ہے، اس وقت یہ جگہ مدینہ سے ایک مہینہ کی مسافت کے بقدر تھی،

آنحضرت ﷺ ۹ھ میں اس جگہ پر فوج لے کر گئے تھے اسی کو غزوۂ تبوک کہا جاتا ہے، یہ آنحضرت ﷺ کا آخری غزوہ تھا۔

ابوداؤد نے حضرت کعب ؓ ابن مالک ؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یوں ہے کہ "ایسا کم ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ جہاد کے لئے اپنے سفر کی ابتداء جمعرات کے دن سے نہ کرتے ہوں۔"

آنحضرت ﷺ جہاد کے سفر میں جمعرات ہی کے دن روانہ ہونا کیوں پسند کرتے تھے؟ اس میں کئی احتمال ہیں ایک تو یہ کہ چونکہ بندوں کے نیک اعمال جمعرات ہی کے دن سے اللہ تعالیٰ تک اٹھائے جاتے ہیں اس لئے آنحضرت ﷺ یہ چاہا کرتے تھے کہ جہاد کا عمل آج ہی اللہ تعالیٰ تک اٹھایا جائے کہ وہ افضل اعمال ہے اور دوسرے یہ کہ "خمیس" لشکر کو بھی کہتے ہیں (اور جمعرات کا دن بھی یوم الخمیس کہلاتا ہے) لہٰذا آپ جمعرات کے دن سفر جہاد کی ابتداء کر کے یہ فال نیک لیتے تھے کہ جس لشکر کے مقابلہ پر جا رہے ہیں اس پر فتح حاصل ہوگی۔

بہرکیف اس سلسلے میں سنت نبوی ﷺ کے مطابق جو چیز ہے وہ یہی ہے کہ جب جہاد کے لئے سفر اختیار کیا جائے تو جمعرات کے دن روانگی عمل میں لائی جائے لیکن اصل مدار استخارہ، اور تفویض اور توکل پر ہے۔

یہ واضح رہے کہ سلف (صحابہ ؓ) سے یہ قطعاً منقول نہیں ہے کہ وہ سفر کی ابتداء کرنے کے سلسلے میں علم نجوم کا اتباع کرتے ہوں اور روانگی سفر کے لئے وہی ساعت اختیار کرتے ہوں جو حوتش کا حساب ظاہر کرتا ہو! حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دن ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص سے کہا کہ تم سفر میں فلاں روز جانا، فلاں روز روانہ نہ ہونا، یہ سن کر حضرت علی ؓ نے اس شخص سے فرمایا کہ اگر اس وقت میرے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو میں (اتنی غلط اور خلاف اسلام بات کہنے پر) تمہاری گردن اڑا دیتا، ہم حضرت ابوالقاسم محمد ﷺ کی خدمت میں (برابر) حاضر رہا کرتے تھے، ہم نے تو کبھی بھی آپ کی مجلس میں یہ ذکر ہوتے نہیں سنا کہ فلاں روز سفر کرنا چاہئے اور فلاں روز سفر نہ کرنا چاہئے۔

اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے "قمر در عقرب" اور "محاق" کے سلسلے میں جو کچھ روایت کیا جاتا ہے وہ پایۂ صحت کو پہنچا ہوا نہیں ہے۔

تنہا سفر کرنے کی ممانعت

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْيَعْلَمُ النَّاسُ مَافِي الْوَحْدَةِ مَا اَعْلَمُ مَا سَارَ رَاكِبٌ بِلَيْلٍ وَحْدَهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمر ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر لوگ اس چیز کو جو تنہا سفر کرنے سے پیش آتی ہے اتنا جان لیں جتنا میں جانتا ہوں تو کوئی سوار رات میں کبھی سفر (کرنے کی ہمت) نہ کرے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "اس چیز سے" دینی اور دنیاوی نقصانات" مراد ہیں۔ چنانچہ دینی نقصان تو یہ ہے کہ تنہائی کی وجہ سے نماز کی جماعت میسر نہیں ہوتی اور دنیوی نقصان یہ ہے کہ کوئی غم خوار و مددگار نہیں ہوتا کہ اگر کوئی ضرورت یا کوئی حادثہ پیش آئے تو اس سے مدد مل سکے۔ "سوار" اور "رات" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ سوار کو پیادہ کی بہ نسبت زیادہ خطرہ رہتا ہے اور خصوصاً رات میں۔

جس قافلہ میں کتا اور گھنٹال ہوتا ہے اس کے ساتھ رحمت کے فرشتے نہیں ہوتے

(۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةُ رُفْقَةً فِيْهَا كَلْبٌ وَلَا جَرَسٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اس قافلہ کے ساتھ فرشتے نہیں ہوتے جس میں کتا اور گھنٹال ہو۔" (مسلم)

تشریح: "فرشتے" سے کتبہ یعنی اعمال لکھنے والے فرشتے اور حفظ یعنی حفاظت کرنے والے مراد نہیں ہیں بلکہ رحمت کے فرشتے مراد ہیں۔ کتے سے مراد وہ کتا ہے جو پاسبانی کے لئے نہ ہو، لہٰذا پاسبانی اور مویشیوں کی حفاظت کے لئے کتا رکھنا مباح ہے۔

جرس (گھنٹال) ان گھنٹیوں اور گھنگروؤں کو کہتے ہیں جو جانوروں کے گلے میں باندھی جاتی ہے۔ اس (جرس) کے ممنوع ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ ناقوس کی مشابہت رکھتا ہے یا اس لئے ممنوع ہے کہ یہ ان لٹکانے والی چیزوں میں سے ہے جن کی آواز کی ناپسندیدگی و کراہت کی وجہ سے ان کا لٹکانا ممنوع ہے۔ چنانچہ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو آگے آرہی ہے اور جس میں جرس کو مزامیر الشیطان" کہا گیا ہے۔ نیز شرح السنۃ میں یہ روایت مذکور ہے کہ ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک لڑکی آئی جس کے پاؤں میں جھانجیں یا گھنگرو تھے، حضرت عائشہؓ نے کہا کہ میرے پاس سے وہ چیز ہٹاؤ جو ملائکہ کو دور کرنے والی ہے" نیز منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہر جرس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔

گھنگرو اور گھنٹیاں شیطانی باجہ ہیں

④ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْجَرَسُ مَزَامِيْرُ الشَّيْطَانِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جرس (یعنی گھنگرو اور گھنٹی) مزامیر شیطان (یعنی شیطانی باجہ) ہے۔" (مسلم)

تشریح: "مزامیر" دراصل "مزمار" کی جمع ہے اور مزمار "بانسری" کو کہتے ہیں جو بجائی جاتی ہے، نیز "زمر" اور "تزمیر" بانسری کے ساتھ گانے کو کہتے ہیں۔ مزامیر بلفظ جمع اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اس کی آواز میں اس طرح کا تسلسل ہوتا ہے کہ وہ منقطع نہیں ہوتی گویا اس آواز کی ہر لے اور ہر سلسلہ ایک مزمار ہے۔ نیز "جرس" کو مزامیر شیطان اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ وہ انسان کو ذکر و استغراق اور مشغولیت عبادت سے باز رکھتا ہے۔

اونٹ کے گلے میں تانت کا پٹا باندھنے کی ممانعت

⑤ وَعَنْ اَبِىْ بَشِيْرِنِ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّهٗ كَانَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ بَعْضِ اَسْفَارِهٖ فَاَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُوْلًا لَاتُبْقَيَنَّ فِىْ رَقَبَةِ بَعِيْرٍ قِلَادَةٌ مِنْ وَتَرٍ اَوْ قِلَادَةٌ اِلَّا قُطِعَتْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوبشیر انصاریؓ سے روایت ہے کہ وہ کسی سفر میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ تھے، تو (وہ بیان کرتے ہیں کہ اس سفر کے موقع پر) رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو قافلہ کے اندر اس حکم کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا کہ کسی اونٹ کی گردن میں کمان کی تانت کے قلادے (پٹے) کو باقی نہ رکھا جائے۔ فرمایا کہ قلادے کو باقی نہ رکھا جائے بلکہ کاٹ ڈالا جائے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "یا یہ فرمایا کہ" یہ دراصل راوی کا شک ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قلادۃ من وتر یعنی کمان کی تانت کا قلادہ فرمایا تھا یا صرف "قلادہ" فرمایا تھا۔

قلادے کو کاٹ دینے کا حکم اس لئے فرمایا کہ لوگ اس میں گھنگرو اور گھنٹیاں باندھ دیتے تھے اور یہ چیز "مزامیر الشیطان ہے جیسا کہ پچھلی حدیث میں گزرا، یا اس لئے منع فرمایا کہ بعض کمزور عقیدہ لوگ کمان کی تانت میں منکے (مالے کے دانے) وغیرہ باندھ کر اور اس کا قلادہ (پٹا) بناکر جانوروں کے گلے میں ڈال دیا کرتے تھے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ اس کے ذریعہ جانور آفات وغیرہ سے محفوظ رہیں گے، لہٰذا

آنحضرت ﷺ نے اس چیز سے منع فرمایا کیونکہ ایسا کوئی بھی ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم و فیصلہ اور تقدیر کے لکھے کو ٹال نہیں سکتا۔

جانوروں پر سفر کرنے کے بارے میں چند ہدایات

⑥ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَافَرْتُمْ فِی الْخِصْبِ فَاَعْطُوا الْاِبِلَ حَقَّهَا مِنَ الْاَرْضِ وَاِذَا سَافَرْتُمْ فِی السَّنَةِ فَاَسْرِعُوْا عَلَیْهَا السَّیْرَ وَاِذَا عَرَّسْتُمْ بِاللَّیْلِ فَاجْتَنِبُوا الطَّرِیْقَ فَاِنَّهَا طُرُقُ الدَّوَابِّ وَمَاْوَی الْهَوَامِّ بِاللَّیْلِ وَفِیْ رِوَایَةٍ اِذَا سَافَرْتُمْ فِی السَّنَةِ فَبَادِرُوْا بِهَا نِقْیَهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم ارزانی کے زمانے میں (اونٹوں پر) سفر کرو تو ان اونٹوں کو ان کا زمین (سے کھانے) کا حق دو (یعنی ان کو گھاس کھانے کا موقع دو بایں طور کہ سفر کے دوران ان کو تھوڑی دیر کے بعد چرنے کے لئے چھوڑ دیا کرو تاکہ وہ پیٹ بھر کر چریں اور تیز چلیں) اور جب تم قحط سالی کے زمانے میں سفر کرو تو ان پر بلد سفر کرو (یعنی سفر کے دوران راستہ میں تاخیر نہ کرو تاکہ اونٹ پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے ضعف و نقاہت میں مبتلا ہونے سے پہلے تمہیں منزل مقصود پر پہنچا ئیں) نیز جب تم کہیں رات میں پڑاؤ ڈالو تو راستے پر پڑاؤ نہ ڈالو کیونکہ ان پر چوپائے چلتے ہیں اور وہ موذی (زہریلے) جانوروں (جیسے سانپ و بچھو وغیرہ) کا مسکن اور ان کی گزرگاہیں ہیں)" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب تم قحط سالی کے زمانے (اونٹوں پر) سفر کرو تو تیزی کے ساتھ سفر طے کرو جب کہ اونٹوں میں گودا (یعنی بدن کی طاقت) موجود ہو۔" (مسلم)

ضرورت مند رفیق سفر کی خبر گیری کرو

⑦ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ فِیْ سَفَرٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَ رَجُلٌ عَلٰی رَاحِلَةٍ فَجَعَلَ یَضْرِبُ یَمِیْنًا وَشِمَالًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَ مَعَهٗ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْیَعُدْ بِهٖ عَلٰی مَنْ لَا ظَهْرَ لَهٗ وَمَنْ کَانَ لَهٗ فَضْلُ زَادٍ فَلْیَعُدْ بِهٖ عَلٰی مَنْ لَا زَادَ لَهٗ قَالَ فَذَکَرَ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ حَتّٰی رَاَیْنَا اَنَّهٗ لَا حَقَّ لِاَحَدٍ مِّنَّا فِیْ فَضْلٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر جب کہ ہم ایک سفر میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ تھے۔ اچانک ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس اونٹ پر آیا اور اونٹ کو دائیں بائیں پھیرنے موڑنے لگا، چنانچہ یہ (دیکھ کر) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جس شخص کے پاس (اپنی ضرورت سے) زائد سواری ہو اس کو چاہئے کہ وہ سواری اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس شخص کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کھانے پینے کا سامان ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ کھانے پینے کا سامان اس شخص کو دیدے جس کے پاس کھانے پینے کا سامان نہیں ہے۔" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے مال اور چیزوں کی اقسام کو ذکر کیا (یعنی آپ نے چیزوں کا نام لے کر فرمایا کہ جس کے پاس فلاں چیز اور فلاں چیز جیسے کپڑا وغیرہ اپنی حاجت سے زائد ہو تو اس کو اس شخص پر خرچ کیا جانا چاہئے جس کے پاس وہ چیز نہ ہو) یہاں تک کہ (آپ کی ترغیب و نصیحت سے) ہمیں احساس ہو گیا کہ ہم میں سے کسی کا اپنی اس چیز پر کوئی حق نہیں ہے جو اس کے پاس اس کی ضرورت سے زائد ہے (بلکہ اس چیز کا حقیقی مستحق وہ شخص ہے جو اس وقت اس چیز سے محروم ہے۔" (مسلم)

تشریح: "دائیں بائیں پھیرنے موڑنے لگا" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اس کا اونٹ اتنا تھک گیا تھا یا پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے اتنا لاغر ہو گیا تھا کہ وہ شخص اس اونٹ کو کسی ایک جگہ پر کھڑا کر دینے پر قادر نہیں ہو رہا تھا بلکہ کبھی اس کو دائیں موڑ دیتا تھا اور کبھی بائیں گھما دیتا تھا۔ یا مطلب ہے کہ وہ شخص اپنی آنکھوں کو چاروں طرف پھیرتا تھا اور ان کو دائیں بائیں گھما کر یہ دیکھتا تھا کہ کہیں سے اس کو وہ چیزیں مل جائیں جو اس کی ضروریات اور حاجتوں کو پورا کر دیں۔ اس صورت میں حاصل یہ ہو گا کہ اس شخص کے پاس نہ تو سواری کے لئے کوئی

مناسب انتظام تھا اور نہ اس کے ساتھ کھانے پینے اور اوڑھنے بچھونے کا کوئی سامان تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی اس بے سروسامانی کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور پھر ترغیب دلائی کہ وہ اس ضرورت مند اور درماندہ کی خبرگیری کریں۔

مقصد سفر پورا ہو جانے پر گھر لوٹنے میں تاخیر نہ کرو

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ السَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ الْعَذَابِ یَمْنَعُ اَحَدَکُمْ نَوْمَهٗ وَطَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ فَاِذَا قَضٰی نَهْمَتَهٗ مِنْ وَجْهِهٖ فَلْیُعَجِّلْ اِلٰی اَهْلِهٖ۔ (متفق علیه)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے جو تمہیں نہ تو (آرام وراحت سے) سونے دیتا ہے اور نہ (ڈھنگ سے) کھانے پینے دیتا ہے، لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص (کہیں سفر میں جائے اور) اپنے سفر کی غرض کو پورا کرے (یعنی جس مقصد کے لئے سفر کیا ہے وہ مقصد پورا ہو جائے) تو اس کو چاہئے کہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس آجانے میں جلدی کرے۔"

(بخاری و مسلمؒ)

تشریح: "سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ سفر اپنی صورت کے اعتبار سے جہنم کے عذاب کی انواع میں سے ایک نوع ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا۔

جیسے بھی جسمانی تکلیف اور روحانی اذیت کے اعتبار سے کسی شخص کے حق میں سفر، پریشانیوں اور صعوبتوں کا ذریعہ ہونے سے کم نہیں ہوتا۔ خصوصاً اس دور میں جب کہ آج کی طرح سفر کے تیز رفتار اور اطمینان بخش ذرائع نہیں تھے، لوگ سفر کے دوران کیسی کیسی مشقتیں برداشت کرتے تھے۔ اور کیسی کیسی مصیبتوں سے دوچار ہوتے تھے اس کا اندازہ بھی آج کے دور میں نہیں لگایا جاسکتا۔

حدیث میں سفر کی بطور خاص دو پریشانیوں کا جو ذکر کیا گیا ہے کہ سفر کے دوران نہ تو وقت پر اور طبیعت کے موافق کھانا پینا ملتا ہے اور نہ آرام وچین کی نیند نصیب ہوتی ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے ورنہ سفر میں تو نہ معلوم کتنے ہی دینی اور دنیاوی امور فوت ہوتے ہیں جیسے جمعہ وجماعت کی نماز سے محرومی رہتی ہے، اہل بیت اور دیگر قرابت داروں کے حقوق بروقت ادا نہیں ہوتے اور گرمی سردی کی مشقت وتکلیف اور اسی طرح کی دوسری پریشانیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

مسافر کا اپنے گھر واپس آنے پر بچوں کے ذریعہ استقبال

⑨ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ تُلُقِّیَ بِصِبْیَانِ اَهْلِ بَیْتِهٖ وَاِنَّهٗ قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَسُبِقَ بِیْ اِلَیْهِ فَحَمَلَنِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ ثُمَّ جِیْءَ بِاَحَدِ ابْنَیْ فَاطِمَةَ فَاَرْدَفَهٗ خَلْفَهٗ قَالَ فَاُدْخِلْنَا الْمَدِیْنَةَ ثَلَاثَةً عَلٰی دَابَّةٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ سفر سے تشریف لاتے تو آپ ﷺ کے اہل بیت کے بچوں کے ذریعہ آپ کا استقبال کیا جاتا (یعنی آپ ﷺ کے اہل بیت اپنے بچوں کو آپ ﷺ کی خدمت میں لے جاتے) چنانچہ (ایک روز) آنحضرت ﷺ جب سفر سے واپس تشریف لائے (اور مدینہ کے قریب پہنچے) تو مجھ کو آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے مجھے اٹھالیا اور اپنے آگے سوار کرلیا پھر حضرت فاطمہؓ کے دونوں بیٹوں میں سے ایک بیٹے (یعنی حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ کو لایا گیا) تو آپ ﷺ نے ان کو اپنے پیچھے بٹھالیا اور پھر (اس طرح ہم تینوں ایک جانور پر (سوار) مدینہ میں داخل ہوئے۔" (مسلمؒ)

⑩ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّهٗ اَقْبَلَ هُوَ وَاَبُوْطَلْحَةَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَفِیَّةُ مُرْدِفُهَا عَلٰی رَاحِلَتِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ وہ (انسؓ) اور حضرت طلحہؓ رسول کریم ﷺ کے ہمراہ (خیبر کے سفر سے) واپس آئے تو اس موقع پر حضرت صفیہؓ بنی کریم ﷺ کے ساتھ تھیں اور آپ ﷺ نے ان کو اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ خیبر سے واپس ہونے کے وقت کا واقعہ ہے کہ حضرت صفیہؓ خیبر کے مال غنیمت میں سے تھیں اور پہلے حضرت دحیہ کلبیؓ کے ہاتھ لگی تھیں جن سے آنحضرت ﷺ نے ان کو لے لیا اور پھر انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا اور سواری پر اپنے ساتھ بٹھا کر مدینہ لائے۔

سفر سے آنحضرت ﷺ کی واپسی کا وقت

⑪ وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَطْرُقُ اَهْلَهٗ لَيْلًا وَكَانَ لَا يَدْخُلُ اِلَّا غُدْوَةً اَوْ عَشِيَّةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے گھر والوں کے پاس (سفر سے) رات کے وقت واپس نہیں آیا کرتے تھے بلکہ دن کے ابتدائی حصہ میں یعنی صبح کے وقت، یا آخری حصہ میں یعنی شام کے وقت (گھر میں) داخل ہوا کرتے تھے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

رات کے وقت سفر سے واپس نہ آنے کی ہدایت

⑫ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَطَالَ اَحَدُكُمُ الْغَيْبَةَ فَلَا يَطْرُقْ اَهْلَهٗ لَيْلًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کی غیر حاضری کا عرصہ طویل ہو جائے (یعنی اس کو سفر میں زیادہ دن لگ جائیں) تو وہ (سفر سے واپسی کے وقت) اپنے (گھر میں) رات کے وقت داخل نہ ہو۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: شرح السنۃ میں ایک یہ روایت منقول ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے اس ممانعت کے بعد (کا واقعہ ہے کہ) دو آدمیوں نے (آنحضرت ﷺ کے اس حکم پر عمل نہیں کیا اور) اپنے سفر سے واپسی پر گھر میں داخل ہونے کے لئے رات ہی کا وقت اختیار کیا تو (جب وہ اپنے اپنے گھر میں داخل ہوئے تو وہاں) ان میں سے ہر ایک نے اپنی بیوی کے ساتھ غیر مردوں کو پایا۔

⑬ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دَخَلْتَ لَيْلًا فَلَا تَدْخُلْ عَلٰى اَهْلِكَ حَتّٰى تَسْتَحِدَّ الْمُغِيْبَةُ وَتَمْتَشِطَ الشَّعِثَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اگر تم (سفر سے واپسی پر اپنے شہر و آبادی میں) رات کے وقت پہنچو تو اپنے گھر میں داخل نہ ہو جب تک کہ بیوی زیر ناف بالوں کو صاف نہ کر لے اور وہ بیوی کہ جس کے بال پراگندہ ہوں کنگھی چوٹی نہ کر لے۔"

(بخاری و مسلمؒ)

تشریح: ان احادیث کا مطلب یہ واضح کرنا ہے کہ سفر سے واپسی کے لئے رات کا وقت اختیار کرنا مناسب نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ سفر سے واپسی کی ابتداء ایسے وقت کی جائے کہ اپنے گھر والوں کے پاس رات ہونے سے پہلے پہنچ جائے تاکہ رات کے وقت گھر پہنچنے کی وجہ سے گھر والے بے آرام نہ ہوں اور ان کی نیندوں میں خلل نہ پڑے، اور اگر اپنے شہر اور اپنی آبادی میں پہنچتے رات ہو جائے تو ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کے لئے اس وقت تک صبر و انتظار کرے جب تک کہ اس کی بیوی کو اس کا آنا معلوم نہ ہو جائے اور وہ بناؤ سنگار کے ذریعہ اپنے آپ کو آراستہ اور جنسی اختلاط کے لئے تیار نہ کر لے تاکہ شوہر جب اس کے پاس پہنچ جائے تو سفر کی تکان اور جدائی کی پژمردگی، جسمانی انبساط و نشاط میں تبدیل ہو جائے۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں (یعنی رات کے وقت سفر سے واپسی اور کچھ دیر انتظار و صبر کئے بغیر گھر میں داخل ہو جانا) اس شخص کے حق

میں مکروہ ہیں جو لمبے سفر سے واپس آرہا ہو، ہاں جو شخص کسی چھوٹے سفر سے واپس آرہا ہو یا اس کے گھر والوں کو رات کے وقت اس کے پہنچنے کی اطلاع سے ہو تو اس کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر کی ایک حدیث (نمبر ۱۲) سے واضح ہوا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی بڑے لشکر یا بڑے قافلہ میں ہو اور اس لشکر و قافلہ کی واپسی کی خبر مشہور ہو چکی ہو اور اس کی بیوی کو بھی اس کے آنے کا علم ہو (کہ وہ لشکر و قافلہ کے ساتھ فلاں رات میں آئے گا) تو اس کے لئے بھی رات کے وقت آنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس لئے کہ اصل مقصد تو بیوی کا اس کے آنے سے پہلے تیار و مستعد رہنا ہے سو وہ اس صورت حال میں حاصل ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی گھر پہنچ کر پہلے دروازہ کھٹکھٹانا اور جواب کا انتظار کرنا ضروری ہو گا۔

سفر سے واپس آنے پر دعوت کرنے مسنون ہے

(۱۴) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ نَحَرَ جَزُوْرًا اَوْبَقَرَةً۔ (رواہ البخاری ومسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اونٹ یا گائیں ذبح کیں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سفر سے واپس آنے کے بعد ضیافت کرنا اور لوگوں کو اپنے یہاں کھانے وغیرہ پر مدعو کرنا مسنون ہے۔

آنحضرت ﷺ کا سفر سے واپس آنے کا وقت

(۱۵) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْدَمُ مِنْ سَفَرٍ اِلَّا نَهَارًا فِي الضُّحٰى فَاِذَا قَدِمَ بَدَأَ بِالْمَسْجِدِ فَصَلّٰى فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِ لِلنَّاسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت کعبؓ ابن مالک کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ چاشت کے وقت کے علاوہ اور کسی وقت سفر سے واپس نہیں آیا کرتے تھے، چنانچہ جب آپ (سفر سے) واپس آتے تو پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے اور وہاں بیٹھنے سے پہلے تحیۃ المسجد یا چاشت کی) دو رکعت نماز پڑھتے اور پھر لوگوں سے ملاقات کرنے کے لئے وہاں بیٹھتے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "چاشت کے وقت الخ" یہ اکثر کے اعتبار سے کہا گیا ہے یعنی چونکہ آپ اکثر و بیشتر چاشت ہی کے وقت واپس تشریف لاتے تھے اس لئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ چاشت کے وقت کے علاوہ اور وقت واپس نہیں آتے تھے، ورنہ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ آپ ﷺ دن کے ابتدائی حصہ یعنی صبح اور آخری حصہ شام کے وقت ہی سفر سے آیا کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ صرف صبح ہی کے وقت واپس نہیں آیا کرتے تھے بلکہ شام کے وقت بھی واپس آجایا کرتے تھے۔

سفر سے واپس آنے پر پہلے مسجد میں جانے کا حکم

(۱۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ قَالَ لِي ادْخُلِ الْمَسْجِدَ فَصَلِّ فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں (ایک) سفر میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھا، چنانچہ جب ہم مدینہ واپس آئے تو آپ نے مجھ سے فرمایا کہ "مسجد میں جاؤ اور وہاں دو رکعت نماز پڑھو۔" (بخاریؒ)

تشریح: مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کے پیش نظر مسافر کا سفر سے واپس آنے پر پہلے مسجد میں جانا آنحضرت ﷺ سے فعلاً بھی ثابت ہوا اور قولاً بھی نیز مذکورہ بالا حکم میں نہ صرف شعائر اللہ کی تعظیم کی طرف اشارہ ہے بلکہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ مسجد گویا اللہ کے گھروں

میں سے ایک گھر ہے اور مسجد میں جانے والا گویا اللہ سبحانہ سے ملاقات کرنے والا ہے لہٰذا جو شخص سفر سے واپس آئے اس کے حق میں اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کہ وہ سب سے پہلے اللہ کے گھر میں جائے اور اللہ سے ملاقات کرے جس نے اس کو سفر کی آفات سے محفوظ رکھ کر بعافیت اس کے اہل و عیال کے درمیان واپس پہنچایا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

امت کے حق میں صبح کے وقت کے لئے آنحضرت کی دعاء برکت

(۱۷) عَنْ صَخْرِ بْنِ وَدَاعَةَ الْغَامِدِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لِاُمَّتِیْ فِیْ بُکُوْرِھَا وَکَانَ اِذَا بَعَثَ سَرِیَّةً اَوْجَیْشًا بَعَثَھُمْ مِنْ اَوَّلِ النَّھَارِ وَکَانَ صَخْرٌ تَاجِرًا فَکَانَ یَبْعَثُ تِجَارَتَهٗ اَوَّلَ النَّھَارِ فَاَثْرٰی وَکَثُرَ مَالُهٗ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد والدارمی)

"حضرت صخرؓ بن وداعہ الغامدی کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے یہ فرمایا (یعنی یوں دعا فرمائی "اے اللہ! میری اُمت کے لئے دن کے ابتدائی حصہ میں برکت عطا فرما، یعنی اگر میری اُمت کے لوگ دن کے ابتدائی حصہ (صبح) میں طلب علم میں مشغول ہوں یا اپنے ذریعہ معاش میں منہمک اور یا سفر وغیرہ کریں تو اس میں انہیں برکت حاصل ہو۔" چنانچہ آنحضرت ﷺ جب کوئی چھوٹا بڑا لشکر روانہ فرماتے تو اس کو دن کے ابتدائی حصہ میں روانہ فرماتے۔ اور صخرؓ جو ایک تاجر (سوداگر) تھے (اس دعا کی برکت حاصل کرنے کے پیش نظر) اپنا تجارتی مال دن کے ابتدائی حصہ ہی میں روانہ کرتے تھے، چنانچہ وہ مال دار ہوئے اور ان کے مال میں بہت اضافہ ہوا۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

رات کے وقت سفر کرنے کا حکم

(۱۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیْکُمْ بِالدُّلْجَةِ فَاِنَّ الْاَرْضَ تُطْوٰی بِاللَّیْلِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم رات کے وقت چلنا اپنے لئے ضروری سمجھو کیونکہ رات کے وقت زمین لپیٹ دی جاتی ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی سفر کے لئے گھر سے نکلو تو محض دن کے وقت چلنے پر قناعت نہ کرو بلکہ تھوڑا سا رات کے وقت بھی چلا کرو کیونکہ رات میں سفر آسانی کے ساتھ طے ہوتا ہے اور اس خیال سے مسافر کی ہمت سفر پر کوئی بار نہیں ہوتا کہ ابھی میں نے بہت تھوڑا فاصلہ کیا ہے جب کہ حقیقت میں وہ کافی فاصلہ طے کر چکا ہوتا ہے ور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اول تو رات کے وقت چلنے کے علاوہ اور کوئی شغل نہیں ہوتا دوسرے فاصلے کی علامات و نشانات پر نظر نہیں پڑتی اور یہ چیزیں راستہ چلنے والے کی نظر میں سفر کو بھاری کر دیتی ہے چنانچہ اسی مفہوم کو زمین کے لپیٹ دیئے جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو کہ یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ دن کے وقت بالکل چلو ہی مت، چنانچہ دوسری احادیث میں یہ حکم بیان فرمایا گیا ہے کہ اپنا سفر دن کے ابتدائی حصہ اور آخری حصہ میں طے (کرنے کی کوشش) کرو اور کچھ حصہ رات کے وقت بھی چلو۔

سفر میں کم سے کم تین آدمیوں کا ساتھ ہونا چاہئے

(۱۹) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الرَّاکِبُ شَیْطَانٌ وَالرَّاکِبَانِ شَیْطَانَانِ وَالثَّلَاثَةُ رَکْبٌ رَوَاہُ مَالِكٌ وَالتِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِیُّ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؓ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" ایک سوار ایک شیطان ہے، دو سوار دو شیطان ہیں اور تین سوار، سوار ہیں۔" (مالک، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: "تین سوار، سوار ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ تین سوار اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو سوار کہا جائے کیونکہ وہ شیطان کی فریب کاریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ گویا اس طرح ایک یا دو سوار کو سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ سفر میں کم سے کم تین ساتھیوں کا ہونا ضروری ہے اس لئے کہ تنہا سفر کرنے میں ایک نقصان تو یہ ہے کہ جماعت فوت ہو جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ اگر اس کو کوئی ضرورت وحادثہ پیش آجائے تو اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا اور وہ ہر معاملے میں درماندہ رہتا ہے، اسی طرح اگر محض دو ساتھی سفر کریں تو اس صورت میں اگر خدانخواستہ یہ بات پیش آجائے کہ ایک ساتھی بیمار ہو جائے یا مرجائے تو دوسرا ساتھی سخت مضطرو پریشان ہو گا اور یہ چیز شیطان کی خوشی کا باعث ہے۔ یا یہ مراد ہے کہ اگر کوئی شخص تنہا سفر کرے یا سفر کے دو ہی ساتھی ہوں تو شیطان کو بڑی آسانی کے ساتھ یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ان کو گمراہ کرے اور برائی میں مبتلا کرے، اسی بات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے ایک سوار یا دو سوار کو شیطان فرمایا گیا ہے۔

بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ سفر میں کم سے کم تین آدمی ہونے چاہئیں تاکہ اول تو وہ جماعت سے نماز ادا کریں اور دوسرے یہ کہ اگر ایک شخص کو دوران سفر کسی ضرورت سے کہیں جانا پڑے تو دو باقی رہیں اور آپس میں ایک دوسرے کی دلبستگی و اطمینان کا ذریعہ بنیں اور اگر اس شخص کے آنے میں تاخیر ہو جائے تو ان دونوں میں سے ایک اس کی خبر لینے اور تاخیر کا سبب جاننے کے لئے چلا جائے اور دوسرا سامان وغیرہ کی دیکھ بھال کرتا رہے۔

سفر میں ایک سے زائد لوگ ہونے کی صورت میں کسی ایک رفیق سفر کو امیر بنا لیا جائے

(۲۰) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا كَانَ ثَلَاثَةٌ فِيْ سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوْا اَحَدَهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اگر (مثلاً سفر میں) تین شخص ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو امیر بنا لینا چاہئے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "تین شخص" سے مراد جماعت ہے کہ جس کا ادنیٰ درجہ تین ہے، ویسے یہ حکم اس صورت کے متعلق بھی ہے جب کہ دو آدمی بھی ساتھ سفر کر رہے ہوں، یہاں تین کے ذکر پر اکتفا اس لئے کیا گیا ہے کہ پہلے ایک حدیث میں بیان فرمایا جا چکا ہے کہ دو سوار شیطان ہوتے ہیں۔ بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی سفر میں ایک سے زائد لوگ ہوں تو اس صورت میں ان میں سے ایک شخص کو اپنا امیر و سردار مقرر کر لیا جائے جو سب سے افضل ہو اور کسی کو امیر و سردار بنا لینے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ اگر دوران سفر کسی معاملہ میں آپس میں کوئی نزاعی صورت پیدا ہو جائے تو اس امیر و سردار کی طرف رجوع کر لیا جائے اور وہ جو فیصلہ کرے اس کو تسلیم کر کے اپنے نزاع کو ختم کر دیا جائے۔ امیر و سردار کے لئے یہ ضروری ہو گا کہ وہ اپنے تمام رفقاء سفر کے حق میں خیر خواہ، مہربان اور غمگسار ہو اور اپنی سرداری کو اپنے لئے محض وجہ افتخار سمجھ کر کسی بڑائی میں مبتلا نہ ہو بلکہ حقیقی معنی میں اپنے آپ کو اس کا خادم سمجھے جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ سید القوم خادمھم یعنی کسی جماعت کا سردار اصل میں اپنی جماعت کا خدمت گزار ہوتا ہے۔

بہترین رفقاء سفر

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُ الصَّحَابَةِ اَرْبَعَةٌ وَخَيْرُ السَّرَايَا اَرْبَعُمِائَةٍ وَخَيْرُ

الْجُیُوْشِ اَرْبَعَۃُ اٰلَافٍ وَلَنْ یُغْلَبَ اثْنَا عَشَرَ اَلْفًا مِنْ قِلَّۃٍ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا" (مثلاً کسی سفر کے) بہترین ساتھی اور رفقاء وہ ہیں جو (کم سے کم) چار کی تعداد میں ہوں، چھوٹے لشکروں میں بہترین لشکر وہ ہے جس میں چار سو (مجاہد ہوں) اور بڑے لشکروں میں بہترین لشکر وہ ہے جس میں بارہ ہزار (مجاہد) ہوں اور بارہ ہزار (مجاہد) کم ہونے کی وجہ سے کبھی مغلوب نہیں ہوتے" (ترمذی، ابوداؤد، دارمی) نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: چار رفقاء اور ساتھیوں کو "بہترین" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ فرض کیجیے اگر ان چاروں میں سے کوئی ایک بیمار ہو جائے اور وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے ان تین ساتھیوں میں سے کسی ایک ساتھی کو کوئی وصیت کرے تو باقی دو ساتھی اس کی وصیت کے گواہ ہو جائیں۔ ویسے علماء نے لکھا ہے پانچ ساتھی۔ چار ساتھیوں سے بہتر ہوتے ہیں بلکہ پانچ سے بھی جتنے زیادہ ہوں گے اتنے ہی بہتر ہوں گے اور یہاں حدیث میں چار کا ذکر کر کے گویا ادنیٰ درجہ بیان کیا گیا ہے۔

"مغلوب نہیں ہوتے" کا مطلب یہ ہے کہ بارہ ہزار مجاہدین کے لشکر کی طاقت ایک بڑی طاقت ہوتی ہے، اتنے زیادہ مجاہدین دشمن کے مقابلے پر بھی مغلوب نہیں ہوں گے، اور اگر مغلوب بھی ہوں گے تو تعداد کی کمی کی وجہ سے تو ہوں گے نہیں کیونکہ بارہ ہزار کا عدد کمی کی حد سے نکل گیا ہے البتہ کسی اور سبب سے مغلوب ہوں گے۔ جیسے اپنی تعداد و طاقت پر بیجا اتراہٹ اور غرور و تکبر وغیرہ۔

اپنے رفقاء سفر کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا معمول

(۲۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَتَخَلَّفُ فِی الْمَسِیْرِ فَیُزْجِی الضَّعِیْفَ وَیُرْدِفُ وَیَدْعُوْلَھُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (سفر کے دوران) چلتے وقت (تواضع وانکسار کی وجہ سے اور دوسروں کی مدد و خبرگیری کے پیش نظر قافلے سے) پیچھے رہا کرتے تھے چنانچہ آپ ﷺ کمزور (کی سواری) کو ہانکا کرتے (تاکہ وہ ہمراہیوں کے ساتھ مل جائے) اور جو کمزور و ضعیف شخص سواری سے محروم ہونے کی وجہ سے پیدل چلتا ہو اس کو اپنے پیچھے سوار کر لیتے اور ان (قافلہ والوں) کے لئے دعا کرتے رہتے۔" (ابوداؤد)

منزل پر پہنچ کر تمام رفقاء سفر کو ایک جگہ ٹھہرنا چاہئے

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَۃَ الْخُشَنِیِّ قَالَ کَانَ النَّاسُ اِذَا نَزَلُوْا مَنْزِلًا تَفَرَّقُوْا فِی الشِّعَابِ وَالْاَوْدِیَۃِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ تَفَرُّقَکُمْ فِیْ ھٰذِہِ الشِّعَابِ وَالْاَوْدِیَۃِ اِنَّمَا ذٰلِکُمْ مِنَ الشَّیْطَانِ فَلَمْ یَنْزِلُوْا بَعْدَ ذٰلِکَ مَنْزِلًا اِلَّا انْضَمَّ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ حَتّٰی یُقَالَ لَوْ بُسِطَ عَلَیْھِمْ ثَوْبٌ لَعَمَّھُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ثعلبہؓ خشنی کہتے ہیں کہ (پہلے عام طور پر ایسا ہوتا تھا کہ لوگ یعنی صحابہؓ) جب کسی منزل پر اترتے تو الگ الگ ہو کر پہاڑی دروں اور وادیوں میں پھیل جاتے تھے (یعنی کوئی کہیں اترتا اور کوئی کہیں) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے (اس طریقہ کو ختم کرنے کے لئے یا اس طور فرمایا) کہ سمجھ لو تمہارا اس طرح ان دروں اور وادیوں میں الگ الگ ہو کر اترنا محض شیطان کی طرف سے ہے (یعنی یہ شیطان کے فریب کے سبب سے ہے کہ وہ تمہیں الگ الگ کر دینا چاہتا ہے تاکہ دشمن تم پر قابو پالے اور تمہیں نقصان اور آزار پہنچائے اس ارشاد کے بعد لوگ جب بھی کسی منزل پر اترتے تو آپس میں اتنے پاس پاس ٹھہرتے کہ کہا جانے لگا کہ اگر ان سب پر ایک ہی کپڑا پھیلا دیا جائے تو

وہ سب کو ڈھانک لے۔" (ابوداؤد)

آنحضرت ﷺ کے کمال انکسار کا مظہر ایک واقعہ

(۲۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنَّا يَوْمَ بَدْرٍ كُلُّ ثَلَاثَةٍ عَلٰى بَعِيْرٍ كَانَ اَبُوْلُبَابَةَ وَعَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ زَمِيْلَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَكَانَتْ اِذَا جَاءَتْ عُقْبَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَحْنُ نَمْشِيْ عَنْكَ قَالَ مَا اَنْتُمَا بِاَقْوٰى مِنِّيْ وَمَا اَنَا بِاَغْنٰى عَنِ الْاَجْرِ مِنْكُمَا۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ بدر کے دن (یعنی جنگ بدر کے موقع پر) ہماری یہ حالت تھی کہ ہم میں سے ہر تین آدمی ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے "یعنی تین تین آدمیوں میں ایک اونٹ تھا کہ وہ تینوں باری باری ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے) اور ابولبابہؓ اور حضرت علیؓ رسول کریم ﷺ کے اونٹ میں شریک سفر تھے! حضرت عبداللہ نے بیان کیا کہ صورت حال یہ تھی کہ جب (اس اونٹ پر) رسول کریم ﷺ کے اترنے کی باری آتی تو ابولبابہؓ اور حضرت علیؓ عرض کرتے کہ آپ ﷺ کے بدلے ہم پیدل چلیں گے۔ (آپ ﷺ اونٹ ہی پر سوار رہیں)" لیکن آنحضرت ﷺ فرماتے کہ "نہ تو تم (اس دنیا کی مجھ سے زیادہ طاقت رکھتے ہو (کہ بس تم پیدل چلنے کی طاقت رکھتے ہو اور میں پیدل نہیں چل سکتا) اور نہ میں (آخرت کا) زیادہ ثواب حاصل کرنے میں تم سے بے پرواہ ہوں (یعنی میں آخرت کے اجر و ثواب کا تم سے کم محتاج نہیں ہوں۔" شرح السنۃ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کمال انکسار و تواضع کے کس بلند مقام پر تھے اور یہ کہ آپ ﷺ اپنے رفقاء اور ساتھیوں کے حق میں کس قدر مہربان اور خیر خواہ تھے کہ ان کی راحت کو کبھی ترجیح نہیں دیتے تھے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر آنحضرت ﷺ اللہ کے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے معصوم عن الخطا تھے اور خدا کے محبوب بندے تھے مگر اس کے باوجود آپ ﷺ بارگاہ الوہیت میں اپنی عبدیت کے اقرار کے طور پر خدا کی طرف سے اپنے احتیاج اور اس کے حضور میں اپنی مکمل بیچارگی کو ظاہر فرمایا کرتے تھے۔

سواری کے جانوروں کے بارے میں ایک حکم

(۲۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَتَّخِذُوْا ظُهُوْرَ دَوَابِّكُمْ مَنَابِرَ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِنَّمَا سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُبَلِّغَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ وَجَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فَعَلَيْهَا فَاقْضُوْا حَاجَاتِكُمْ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جانوروں کی پشت کو منبر نہ بناؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو محض اس لئے تمہارے تابع کیا ہے کہ وہ تمہیں ان شہروں اور علاقوں میں پہنچا دیں جہاں تم (پیدل چلنے کے ذریعہ) جانی مشقت و محنت کے ساتھ ہی پہنچ سکتے تھے) یعنی جانوروں سے مقصود ان پر سواری کرنا اور ان کے ذریعہ اپنے مقصد کو حاصل کرنا ہے لہٰذا ان کو ایذا پہنچانا روا نہیں ہے) اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمہارے لئے (اسی غرض سے) پیدا کیا ہے لہٰذا تم اس پر اپنے کاموں اور اپنی حاجتوں کو پورا کرو۔" (ابوداؤد)

تشریح: "جانوروں کی پشت کو منبر نہ بناؤ" کا مطلب یہ ہے کہ باتیں کرنے کے لئے جانور کی پشت پر سوار ہو کے نہ کھڑے رہو بلکہ اگر کسی سے بات کرنی ہے تو اس کی پشت پر سے اتر کر اپنی حاجت پوری کرو اور پھر اس پر سوار ہو، لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ سواری کے علاوہ جانور کی اور کوئی حاجت یا اس کے ساتھ کوئی اور صحیح غرض متعلق نہ ہو، ہاں اگر اس جانور سے کوئی اور صحیح غرض متعلق

ہو گو اس میں کوئی ضائقہ نہیں جیسا کہ یہ ثابت ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس لئے پیدا کیا کہ تم اس پر اٹھو بیٹھو اور کھڑے ہو اور ان کے علاوہ اپنی ضرورتیں پوری کرو، لہٰذا اپنے کام زمین پر ہی کرو سواری کے جانور کی پشت پر سوائے سوار ہونے کے، کہ وہ تمہیں منزل مقصود پر پہنچادے اور کوئی کام نہ کرو۔

صحابہؓ کے نزدیک سواری کے جانوروں کی دیکھ بھال کی اہمیت

(۲۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا اِذَا نَزَلْنَا مَنْزِلًا لَا نُسَبِّحُ حَتّٰى تُحَلَّ الرِّحَالَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب ہم (دوران سفر یا سفر کے بعد) کسی منزل پر اترتے تو اس وقت تک نفل نماز نہ پڑھتے تھے جب کہ جانوروں پر سے سامان نہ کھول لیا جاتا۔" (ابوداؤد)

تشریح: سبحہ اور تسبیح کا اطلاق اکثر نفل نماز پر ہوتا ہے لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں نماز چاشت ہی مراد ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر منزلوں پر اترنے کا وقت یہی چاشت کا وقت ہوتا تھا۔ بہر حال حدیث کا مطلب یہ بتانا ہے کہ باوجودیکہ صحابہؓ نماز کا بہت زیادہ اہتمام وخیال رکھتے تھے لیکن وہ اپنے جانوروں کی دیکھ بھال کے اہتمام کو بھی پہلے ملحوظ رکھتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کی حق شناسی

(۲۷) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِي اِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ مَعَهُ حِمَارٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ارْكَبْ وَتَأَخَّرَ الرَّجُلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا اَنْتَ اَحَقُّ بِصَدْرِ دَابَّتِكَ اِلَّا اَنْ تَجْعَلَهُ لِي قَالَ جَعَلْتُهُ لَكَ فَرَكِبَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ (ایک سفر میں) پیدل راستہ طے کر رہے تھے کہ اس دوران اچانک ایک شخص اپنے گدھے کے ساتھ، (یعنی اس پر سوار) آپ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! (میرے گدھے پر) سوار ہو جائیے۔" اور (یہ کہہ کر) وہ شخص گدھے کی پشت پر) پیچھے سرک گیا (تاکہ آنحضرت ﷺ آگے بیٹھ جائیں) لیکن آپ نے فرمایا کہ میں آگے نہیں بیٹھوں گا کیونکہ (اپنی سواری کے) جانور پر آگے بیٹھنے کے تم ہی مستحق ہو الا یہ کہ تم مجھے اس کا حقدار بنا دو (یعنی اگرچہ اس شخص کا پیچھے سرکنا اسی لئے تھا۔ کہ گویا اس نے آپ کو آگے بیٹھے رہنے کا حقدار بنا دیا تھا مگر آنحضرت ﷺ نے کمال احتیاط کے پیش نظر اس پر واضح کیا کہ میں تمہاری سواری پر آگے اسی وقت بیٹھ سکتا ہوں جب کہ تم صریح الفاظ میں مجھ سے آگے بیٹھنے کے لئے کہو، اس شخص نے کہا کہ (میں صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ) آپ کو میں نے اس کا حقدار بنا دیا۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ (اس کے آگے بیٹھ گئے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے جہاں آنحضرت ﷺ کا یہ احساس انصاف وحق شناسی ظاہر ہوا کہ آپ ﷺ نے اس وقت تک اس شخص کی سواری پر آگے بیٹھنے سے انکار کر دیا جب تک کہ اس نے صراحت کے ساتھ اپنی سواری پر آگے بیٹھنے کے اپنے حق کو آپ کی طرف منتقل نہ کر دیا وہیں آنحضرت ﷺ کا وصف تواضع وانکسار بھی پورے کمال کے ساتھ ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے اس شخص کے پیچھے بیٹھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا اور اس پر راضی ہوئے۔

شیطانی اونٹ اور شیطانی گھر

(۲۸) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِي هِنْدٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَكُوْنُ اِبِلٌ لِلشَّيَاطِيْنِ وَبُيُوْتٌ لِلشَّيَاطِيْنِ فَاَمَّا اِبِلُ الشَّيَاطِيْنِ فَقَدْ رَأَيْتُهَا يَخْرُجُ اَحَدُكُمْ بِنَجِيْبَاتٍ مَعَهُ قَدْ اَسْمَنَهَا فَلَا يَعْلُوْ بَعِيْرًا مِنْهَا وَيَمُرُّ بِاَخِيْهِ

قَدِانْقَطَعَ بِهٖ فَلَا يَحْمِلُهٗ وَاَمَّا بُيُوْتُ الشَّيَاطِيْنِ فَلَمْ اَرَهَا كَانَ سَعِيْدٌ يَقُوْلُ لَا اُرَاهَا اِلَّا هٰذِهِ الْاَقْفَاصَ الَّتِىْ يَسْتُرُ النَّاسُ بِالدِّيْبَاجِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سعید ابن ابوہند (تابعی) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (کچھ) اونٹ شیطانوں کے لئے ہوجاتے ہیں اور (کچھ) گھر شیطانوں کے لئے ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ جو اونٹ شیطانوں کے لئے ہوجاتے ہیں ان کو میں نے دیکھا ہے (جیسے) تم سے کوئی شخص عمدہ قسم کی اونٹنیوں کو لے کر نکلتا ہے جن کو اس نے خوب فربہ کیا لیکن ان میں سے کسی اونٹ پر سوار نہیں ہوتا ہے اور جب (کسی سفر میں) اپنے اس مسلمان بھائی کے ساتھ راستہ طے کرتا ہے جو (اپنی کمزوری اور سواری سے محرومی کی وجہ سے) چلتے چلتے تھک گیا ہے تو اس کو (بھی) اس اونٹ پر سوار نہیں کرتا۔ اور جو گھر شیطانوں کے لئے ہوجاتے ہیں ان کو میں نے نہیں دیکھا ہے۔" حدیث کے راوی حضرت سعیدؒ کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ گھر (جو شیطانوں کے لئے ہوجاتے ہیں) وہ پنجرے ہیں جن کو لوگ ریشمی کپڑوں (کے پردوں سے) ڈھانکتے ہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: "جو اونٹ شیطانوں کے ہوجاتے ہیں الخ" کا حاصل یہ ہے کہ اونٹوں کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ ان کو اپنی سواری اور باربرداری کے مصرف میں لایا جائے اور خدا نے اس کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ ان کے ذریعہ اپنی بھی سفری ضروریات پوری کی جائیں اور دوسرے ضرورت مند مسلمانوں کو بھی ان سے نفع پہنچایا جائے، لیکن اگر کوئی شخص ان کو خوب موٹا تازہ کر کے محض اظہار تفاخر اور نام آوری کے لئے رکھتا ہے اور ان کو اپنے سفر میں اپنی یا اپنے کسی ضرورت مند مسلمان بھائی کے رفع احتیاج کے لئے نہیں بلکہ "کوتل" رکھتا ہے تو اسطرح اس نے اس اونٹ کو نہ تو اپنے مصرف میں لاکر اور نہ کسی تھکے ہوئے مسلمان بھائی کی راحت کا ذریعہ بناکر گویا شیطان کی اطاعت کی اور شیطان کو خوش کیا اس لئے وہ اونٹ گویا شیطان کے لئے ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوتل گھوڑا ممنوع ہے اور گویا وہ شیطانی گھوڑا ہوتا ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا جزء فَاَمَّا اِبِلُ الشَّيٰطِيْنِ (چنانچہ جو اونٹ شیطانوں کے لئے ہوتے ہیں الخ) دراصل حدیث کے راوی یعنی حضرت ابوہریرہؓ کے اپنے الفاظ ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی اصل حدیث صرف ماقبل کی مجمل عبارت ہے یعنی یکون ابل للشیاطین وبیوت للشیاطین اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ (جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہوا) اصل حدیث فلم ارھا (ان کو میں نے نہیں دیکھا ہے) تک ہے! اسی قول کو ملا علی قاری نے بھی پسند کیا ہے۔

شیطانی گھروں سے مراد یا تو عماریاں اور ہودج ہیں جن کو بعض لوگ ریشمی کپڑوں سے آراستہ پیراستہ رکھتے ہیں یا وہ گھر ہیں جن کو ریشمی کپڑوں کی دیوار گیریوں کے ساتھ مزین کیا گیا ہو، ظاہر ہے جہاں خود ان ہودجوں یا گھروں کی ممانعت مقصود نہیں ہے بلکہ ان کو ریشمی کپڑوں کے ساتھ سجانے اور مزین کرنے کے سبب سے ان کی برائی بیان کی گئی ہے جس میں نہ صرف مال کی بربادی اور اسراف ہی ہے بلکہ اظہار تفاخر اور ریا بھی ہے۔

کہیں پڑاؤ ڈالو تو وہاں نہ زیادہ جگہ گھیرو اور نہ راستہ روکو

(۲۹) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَضَيَّقَ النَّاسُ الْمَنَازِلَ وَقَطَعُوا الطَّرِيْقَ فَبَعَثَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنَادِيًا يُنَادِىْ فِى النَّاسِ اِنَّ مَنْ ضَيَّقَ مَنْزِلًا اَوْقَطَعَ طَرِيْقًا فَلَا جِهَادَ لَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سہل ابن معاذ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ "ایک مرتبہ جب ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ جہاد میں گئے (اور منزل پر قیام کیا) تو لوگوں نے (اس) منزل کی (ساری جگہوں) کو تنگ کردیا اور راستہ کو کاٹ دیا (یعنی بعض لوگوں نے بلاضرورت یا ضرورت سے زیادہ جگہوں پر قبضہ کرلیا جسکی وجہ سے دوسرے لوگوں کو جگہ کی تنگی ہوگئی اسطرح راستہ بھی تنگ ہوگیا جس سے آنے جانے

والوں کو پریشانی ہونے لگی) چنانچہ (یہ دیکھ کر) نبی کریم ﷺ نے ایک منادی کرنے والے کو لوگوں کے درمیان بھیج کر یہ اعلان کرایا کہ "جس شخص نے منزل کی (جگہوں) کو تنگ کیا یا راستے کو کاٹا تو لوگوں کو ضرر و تکلیف پہنچانے کی وجہ سے) اس کو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا۔"

(ابوداؤد)

سفر سے واپسی کا بہترین وقت

(۳۰) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَحْسَنَ مَادَخَلَ الرَّجُلُ اَهْلَهٗ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ اَوَّلُ اللَّيْلِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "سفر سے واپس آنے والے مرد کے لئے اپنے گھر والوں کے پاس پہنچنے کا بہترین وقت رات کا ابتدائی حصہ ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: یہ اس صورت میں ہے جب کہ قریب کا سفر ہو چنانچہ پہلے جو یہ گذرا ہے کہ سفر سے واپسی میں رات کے وقت اپنے گھر نہ آنا چاہئے تو اس کا تعلق دور کے سفر سے ہے! اور نوویؒ یہ کہتے ہیں کہ اگر دور کا بھی سفر ہو اور اس کے آنے کی اطلاع اس کے گھر والوں کو دن میں مل چکی ہو تو رات کے وقت آنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ "گھر والوں کے پاس پہنچنے" سے گھر والی کے پاس آنا" یعنی جماع مراد ہے کیونکہ مسافر کا جنسی جذبہ بہت زیادہ بیدار ہو جاتا ہے لہٰذا جب وہ سفر سے واپس ہو کر رات کے ابتدائی حصہ ہی میں جماع سے فارغ ہو جائے گا تو پھر سکون و آرام کے ساتھ سوئے گا بھی اور بیوی کا حق بھی جلدی ادا ہو جائے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سفر کے دوران رات میں آنحضرت ﷺ کے آرام کرنے کی کیفیت

(۳۱) عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ فِيْ سَفَرٍ فَعَرَّسَ بِلَيْلٍ اِضْطَجَعَ عَلٰى يَمِيْنِهٖ وَاِذَا عَرَّسَ قُبَيْلَ الصُّبْحِ نَصَبَ ذِرَاعَهٗ وَوَضَعَ رَاْسَهٗ عَلٰى كَفِّهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب سفر میں ہوتے تو (کسی پڑاؤ پر) رات کے آخری حصہ میں (یعنی طلوع سحر سے) پہلے اترتے اور دائیں کروٹ پر لیٹ رہتے اور جب صبح سے کچھ پہلے اترتے تو اپنا (داہنا) ہاتھ کھڑا کر کے اس کی ہتھیلی پر اپنا سر رکھ کر لیٹتے (یعنی کچھ دیر کے لئے اس انداز میں آرام فرماتے تاکہ نیند غالب نہ آجائے۔" (مسلمؒ)

صبح کے وقت سفر شروع کرنے کی فضیلت

(۳۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ رَوَاحَةَ فِيْ سَرِيَّةٍ فَوَافَقَ ذٰلِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَغَدَا اَصْحَابُهٗ وَقَالَ اَتَخَلَّفُ وَاُصَلِّيْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اَلْحَقُهُمْ فَلَمَّا صَلّٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰهُ فَقَالَ مَامَنَعَكَ اَنْ تَغْدُوَ مَعَ اَصْحَابِكَ فَقَالَ اَرَدْتُ اَنْ اُصَلِّيَ مَعَكَ ثُمَّ اَلْحَقَهُمْ فَقَالَ لَوْ اَنْفَقْتَ مَافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَا اَدْرَكْتَ فَضْلَ غَدْوَتِهِمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن رواحہؓ (جہاد) کے لئے ایک چھوٹے لشکر کے ساتھ روانہ کیا، اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا جس (میں آنحضرت ﷺ نے ان کو جہاد کے لئے جانے کا حکم دیا تھا) چنانچہ ان کے ساتھی (یعنی لشکر کے لوگ) صبح کے وقت روانہ ہو گئے لیکن عبداللہؓ نے (اپنے دل میں سوچا یا کسی ساتھی سے کہا کہ "میں بعد میں روانہ ہوں گا میں (پہلے یہاں مدینہ میں) رسول

کریم ﷺ کے ہمراہ جمعہ کی نماز پڑھوں گا پھر لشکر والوں سے جاملوں گا۔ جب عبداللہؓ رسول کریم ﷺ کے ہمراہ جمعہ کی نماز پڑھ چکے اور آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھا (کہ وہ ابھی یہاں ہی موجود ہیں) تو فرمایا کہ تمہیں صبح کے وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ جانے سے کس چیز نے روکا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے یہ چاہا (میں جمعہ کی نماز آپ کے ساتھ پڑھ لوں اور پھر اپنے ساتھیوں سے جاملوں۔" آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا "تم روئے زمین پر ساری چیزوں کو بھی خرچ کرو تو صبح کے وقت جانے والے اپنے ساتھیوں کے برابر ثواب حاصل نہیں کر سکو گے۔" (ترمذیؒ)

چیتے کی کھال استعمال کرنا ممنوع ہے

(۳۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِکَةُ رُفْقَةً فِیْهَا جِلْدُ نَمِرٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اس قافلے کے ساتھ رحمت کے فرشتے نہیں ہوتے جس میں چیتے کی کھال ہو۔ یعنی چیتے کی کھال پر سوار کو بیٹھنا یا اس کو استعمال کرنا ممنوع ہے کیونکہ اس سے تکبر کی شان پیدا ہوتی ہے۔" (ابوداؤد)

امیر سفر کو رفقاء سفر کا خادم ہونا چاہئے

(۳۴) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَیِّدُ الْقَوْمِ فِی السَّفَرِ خَادِمُهُمْ فَمَنْ سَبَقَهُمْ بِخِدْمَةٍ لَمْ یَسْبِقُوْهُ بِعَمَلٍ اِلَّا الشَّهَادَةَ۔ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سفر میں جماعت (یعنی سفر کرنے والوں) کا امیر و سردار ان کا خادم ہے۔ لہٰذا جو شخص ان (سفر کرنے ——— والوں) کی خدمت میں سبقت لے گیا اس کے مقابلہ میں کوئی شخص شہادت کے علاوہ اور کسی عمل کے ذریعہ سبقت نہیں لے جا سکتا۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ امیر و حاکم کو چاہئے کہ وہ قوم کی خدمت کرے، ان کے مصالح پر نظر رکھے ان کے ظاہری و باطنی حالات کی رعایت ملحوظ رکھے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جو بھی شخص اپنی قوم اور اپنی جماعت کی خدمت میں لگا رہے۔ تو حقیقت میں وہی شخص کثرت ثواب کی بنا پر اس قوم و جماعت کا سردار ہے اگرچہ دیکھنے میں وہ پوری قوم و جماعت میں کتنی ہی کمتر حیثیت کا کیوں نہ ہو کیونکہ خدمت قوم کے علاوہ اور کوئی عمل افضل نہیں الا یہ کہ کوئی شخص خدا کی راہ میں لڑے اور شہادت کا درجہ پائے۔

بَابُ الْکِتَابِ اِلَی الْکُفَّارِ وَدُعَائِهِمْ اِلَی الْاِسْلَامِ

کفار کو خطوط لکھنے اور ان کو اسلام کی دعوت دینے کا بیان

جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اس کائنات کا حقیقی مالک و فرمانروا مانتے ہیں اور اس کے اتارے ہوئے قانون کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں ان کو اس بات کا ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ وہ پوری کائنات کو خدائے بزرگ و برتر کے احکام کی تبلیغ کریں اور گم کردہ گان راہ ہدایت کو ضلالت و تباہی کے راستوں سے ہٹا کر خدائے واحد کی اطاعت و فرمانبرداری کی صراط مستقیم پر لے آئیں اور اس طرح روئے زمین پر خدا کا نام اور اس کے دین جھنڈا سر بلند کریں اور جو لوگ (کفار) اس تبلیغ کے باوجود سرکشی و تمرد سے باز نہ آئیں اور خدا کے دین کے جھنڈے کو سرنگوں کرنے کی ناپاک جسارت کریں اور اس روئے زمین پر مالک حقیقی کے احکام کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالیں اور گویا دوسرے لفظوں میں وہ اپنے عقائد و کردار کے ذریعہ خدا کی سرزمین پر فتنہ و فساد کا بازار گرم کریں ان کے خلاف تلوار اٹھائی جائے اور ان سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک کہ وہ اپنے تمرد اور اپنی سرکشی سے باز آ کر خدائے واحد کی حاکمیت اعلیٰ کا اقرار نہ کر لیں۔ یا جزیہ (ٹیکس) ادا کر کے

اسلامی مملکت کا وفادار شہری بننا قبول نہ کرلیں۔

کفار کے خلاف اعلان جنگ سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دینا واجب ہے: اسلام نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ مخالفین اسلام کے خلاف اس وقت اعلان جنگ نہ کیا جائے جب تک کہ ان کو اسلام کی دعوت نہ دی جائے۔ چنانچہ اسلامی قانون کے مطابق کفار سے جنگ کرنے سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دینا واجب ہے اور ان کو اسلام کی دعوت دینے سے پہلے ان سے جنگ کرنا حرام ہے بشرطیکہ ان کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو۔ اور اگر ان کو اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے تو اس صورت میں جنگ سے پہلے ان کو پھر دو بارہ اسلام کی دعوت دینا مستحب ہے۔

اسلام کی دعوت دینے کے مختلف طریقے ہیں انھی میں سے ایک طریقہ خط و کتابت بھی ہے خاص طور پر سربراہان مملکت، سلاطین اور امراء کو عام طور پر خط و کتابت ہی کے ذریعہ اسلام کی طرف بلایا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مختلف غیر مسلم بادشاہوں اور سربراہان مملکت و قوم جیسے قیصر، کسریٰ اور نجاشی کو مکتوبات گرامی ارسال فرمائے جن میں انہیں ضلالت و تباہی کا راستہ چھوڑ کر اسلام کے سیدھے راستے پر آنے کی دعوت دی گئی۔

منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ جب صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ تشریف لائے اور قیصر روم کو مکتوب بھیجنے کا ارادہ کیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ شاہان روم و ایران کا دستور یہ ہے کہ وہ کسی تحریر کو اس وقت تک مستند نہیں مانتے جب تک اس پر مہر نہ لگی ہوئی ہو۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مہر کے لئے چاندی کی انگوٹھی تیار کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور اس میں تین سطریں کندہ کرائیں اور ان تینوں سطروں میں اپنا اسم مبارک ﷺ اس طرح نقش کرایا کہ اوپر کی سطر میں "اللہ" درمیانی سطر میں "رسول" اور نیچے کی سطر میں "محمد" تھا! اس طرح آپ ﷺ نے بادشاہوں کے نام جو مکتوب ارسال فرمائے ان پر یہ مہر ثبت فرمائی۔

طبرانی نے یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ کرامۃ الکتاب ختمہ یعنی مکتوب کی عظمت اس کی مہر ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قیصر روم کے نام مکتوب نبوی ﷺ

① وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اِلٰى قَيْصَرَ يَدْعُوْهُ اِلَى الْاِسْلَامِ وَبَعَثَ بِكِتَابِهٖ اِلَيْهِ دِحْيَةَ الْكَلْبِيَّ وَاَمَرَهٗ اَنْ يَّدْفَعَهٗ اِلٰى عَظِيْمِ بُصْرٰى لِيَدْفَعَهٗ اِلٰى قَيْصَرَ فَاِذَا فِيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ بِدَاعِيَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ وَاَسْلِمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ وَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْاَرِيْسِيِّيْنَ وَيَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَقَالَ اِثْمُ الْيَرِيْسِيِّيْنَ وَقَالَ بِدَعَايَةِ الْاِسْلَامِ۔ (بخاری و مسلم)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قیصر یعنی روم کے بادشاہ کو ایک گرامی نامہ لکھا جس میں اس کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی اور آپ ﷺ نے اپنا وہ گرامی نامہ لکھا جس میں اس کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی اور آپ ﷺ نے اپنا وہ گرامی نامہ دحیہ کلبیؓ (صحابی) کے ہاتھ روانہ فرمایا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اس گرامی نامہ کو بصریٰ کے حاکم کے پاس پہنچا دیں تاکہ وہ حاکم بصریٰ اس کو قیصر کے پاس پہنچا دے۔ اس گرامی نامہ میں یہ لکھا تھا۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ محمد کی جانب سے جو خدا کا بندہ خاص اور رسول ہے۔ ہرقل کے نام جو روم کا حکمران اعلیٰ ہے۔ اس پر سلامتی ہو (جو قبولیت اسلام اور اپنے نیک کردار و اعمال کے ذریعہ) ہدایت کا پیرو ہے۔ بعد ازاں میں آپ کو اسلام کلمہ شہادت کی دعوت دیتا ہوں آپ اسلام قبول کر لیجئے دنیا کے اور آخرت کے عذاب سے

محفوظ و مامون رہے گا، آپ مسلمان ہو جائیے اللہ تعالیٰ آپ کو دوہرا اجر عطا فرمائے گا کہ ایک اجر تو اپنے نبی علیہ السلام پر ایمان لانے کا اور ایک اجر مجھ (ﷺ) پر ایمان لانے کا اور اگر آپ منہ پھیریں گے یعنی اسلام قبول نہیں کریں گے تو آپ کو واضح رہنا چاہئے کہ اس انکار و اعراض کی وجہ سے آپ پر صرف اپنے ہی گناہ کا وبال نہیں ہوگا بلکہ، آپ کے ملک والوں اور آپ کی رعیت کا گناہ (بھی) آپ پر ہوگا کیونکہ آپ کے اسلام نہ لانے سے وہ بھی کفر میں مبتلا رہیں گے اس لئے ان کی گمراہی کی ذمہ داری بھی آپ ہی پر ہوگی) اے اہل کتاب! ایسے کلمے اور ایسے دین کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں اور مشترک ہے۔ (یعنی اس کلمہ اور دین میں ہمارے اور تمہارے رسولوں اور کتابوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور وہ کلمہ و دین یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا رب نہ بنائے (جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب بنالیا ہے) پس اگر اہل کتاب اس بات کو قبول کرنے سے اعراض و انکار کریں تو (اے مؤمنو) تم یہ اعلان کردو کہ (اے کافرو!) گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔" (بخاری ومسلم)

اور مسلم کی ایک روایت میں مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ کی جگہ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ ہے اور اِثْمُ الْاَرِيْسِيِّيْنَ کی جگہ اِثْمُ الْيَرِيْسِيِّيْنَ ہے اور بِدَاعِيَةِ الْاِسْلَامِ کی جگہ بِدِعَايَةِ الْاِسْلَامِ ہے۔

تشریح: آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت روم (رومن امپائر) کی حکومت اپنی سطوت وجبروت اور طاقت وعظمت کے لحاظ سے دنیا کی ایک بڑی عظیم طاقت اور پرشوکت حکومت تھی۔ روم کی حکومت کا دارالسلطنت قسطنطنیہ تھا اور اس وقت یورپ کے مختلف ممالک کے علاوہ شام و فلسطین اور مصر بھی اسی کے زیر اقتدار تھے۔ قیصر روم کے بادشاہ کا لقب ہوا کرتا تھا جیسا کہ فارس (ایران) کے بادشاہ کو کسریٰ حبش کے بادشاہ کو "نجاشی" ترک بادشاہ کو "خاقان" قبط کے بادشاہ کو فرعون مصر کے بادشاہ کے عزیز اور حمیر کے بادشاہ کو تبع کہا جاتا تھا۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کے زمانے میں روم کا جو قیصر تھا اور جس کو آپ ﷺ نے یہ گرامی نامہ بھیجا تھا اس کا نام ہرقل (ہرل یوس) تھا یہ ہرقل جس طرح اپنی شاہی شان وشوکت میں ممتاز سمجھا جاتا تھا اسی طرح مذہبی علوم یعنی تورات وانجیل کا بھی زبردست عالم تھا۔

دحیہ کلبی ایک صحابی تھے ان کی سب سے بڑی امتیازی شان یہ تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام اکثر انہیں کی صورت میں اترتے تھے۔

"بصریٰ" شام کے ایک شہر کا نام تھا جو ایک بڑا متمدن اور تجارتی مرکز تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی ابتدائی زندگی میں جو دو تجارتی سفر فرمائے تھے اس میں سے ایک سفر میں آپ ﷺ بصریٰ بھی تشریف لے گئے تھے۔

حضرت دحیہ کلبیؓ کا سفارت پر مامور ہو کر قیصر کے نام آنحضرت ﷺ کا مکتوب گرامی لے جانا سنہ ۶ھ یا سنہ ۷ھ کے شروع کا واقعہ ہے۔ روایات اور تاریخ سے ثابت ہے کہ قیصر روم نے اس نامہ مبارک سے اس حد تک اثر قبول کیا تھا کہ اس نے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی تھی اور اس کے دل میں نور اسلام جلوہ فگن ہو چکا تھا مگر رعایا اور اہل دربار کے خوف سے اور تخت وتاج کی محبت میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی اور مسلمان نہیں ہو سکا۔ چنانچہ منقول ہے کہ اس نے نامہ مبارک پڑھے جانے کے بعد اپنے اہل دربار کی برہمی دیکھ کر حضرت دحیہؓ سے کہا کہ اگر مجھے اپنے لوگوں سے اپنی جان کا خوف نہ ہوتا تو میں ضرور تمہارے نبی کا اتباع کرتا وہ محمد ﷺ بلاشبہ وہی نبی ہیں جن کے ہم منتظر تھے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ خط لکھنے کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ تحریر کی ابتداء بسم اللہ سے ہو اور خط لکھنے والے کا نام بھی پہلے لکھا جائے۔ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں یہ بات حدیث ہی سے ثابت نہیں بلکہ قرآن کریم کی اس آیت اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے بھی مفہوم ہوتی ہے۔

ہرقل چونکہ غیر مسلم تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے نامہ مبارک میں اس کو خطاب کرتے ہوئے سَلَامٌ عَلَيْكَ تم پر سلامتی ہو، نہیں لکھا بلکہ یہ بلیغ اسلوب اختیار فرمایا کہ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اس پر سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے اس میں گویا اس طرف

اشارہ ہے کہ غیر مسلم کے ساتھ تخاطب کی ابتداء کنایۃً سلام کے ساتھ کرنا جائز ہے۔

مکتوب نبوی ﷺ کے ساتھ شہنشاہ ایران کا نخوت آمیز معاملہ اور اس پر اس کا وبال

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بِكِتَابِهٖ اِلٰى كِسْرٰى مَعَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ حُذَافَةَ السَّهْمِيِّ فَاَمَرَهٗ اَنْ يَّدْفَعَهٗ اِلٰى عَظِيْمِ الْبَحْرَيْنِ فَدَفَعَهٗ عَظِيْمُ الْبَحْرَيْنِ اِلٰى كِسْرٰى فَلَمَّا قَرَأَ مَزَّقَهٗ قَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ فَدَعَا عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّمَزَّقُوْا كُلَّ مُمَزَّقٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کسریٰ کے نام اپنا نامہ مبارک عبداللہ ابن خدافہ سہمیؓ کے ہاتھ روانہ کیا جو تقریبا اسی مضمون پر مشتمل تھا جو قیصر وغیرہ کو بھیجا گیا تھا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اس نامہ مبارک کو بحرین کے حاکم کے پاس لے جائیں تاکہ وہ اس کو کسریٰ تک پہنچا دے چنانچہ عبداللہ ابن حزافہؓ نامہ مبارک بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے اور بحرین کے حاکم نے اس کو کسریٰ کے پاس پہنچا دیا جب کسریٰ نے وہ نامہ مبارک پڑھا تو بجائے اس پر عمل کرنے کے اس کو پھاڑ ڈالا۔ حدیث کے ایک راوی ابن مسیب کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کسریٰ اور اس کی رعایا کے لئے یہ بددعا فرمائی کہ وہ پارہ پارہ کر دیئے جائیں بالکل پارہ پارہ۔" (بخاری)

تشریح: روم کی طرح فارس (ایران) بھی قدیم ترین شہنشاہیت کا گہوارہ تھا اور ایشیاء کی ایک عظیم الشان سلطنت تھی اس وقت اس کی حدود سلطنت ایک طرف سندھ تک پھیلی ہوئی تھیں اور دوسری جانب عرق اور عرب کے اکثر حصے یمن، بحرین اور عمان بھی فارس ہی کے زیر اقتدار تھے اس کی اخلاقی حالت بھی گرد و پیش کے ممالک کی طرح نہایت ابتر تھی یزدان اور اہرمن نیکی اور بدی کے دو خدا سمجھے جاتے تھے آتش پرستی ملک کا عام مذہب تھا اس سلطنت کے شہنشاہ کا لقب خسرو ہوا کرتا تھا جس کا عربی لفظ کسریٰ بنا لیا گیا تھا آنحضرت ﷺ نے جس خسرو یا کسریٰ کے پاس نامہ مبارک بھیجا تھا اس کا نام پرویز تھا جو ہرمز ابن نوشیرواں کا بیٹا تھا۔ تاریخی روایات میں آتا ہے کہ اس وقت ایران کا دستور یہ تھا کہ بادشاہوں کو جو خطوط لکھے جاتے تھے ان میں سب سے پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا لیکن چونکہ نامہ مبارک کو خدا کے نام (بسم اللہ) سے شروع کیا گیا تھا، پھر سرور کائنات ﷺ کا نام تھا اس لئے جب وہ خسرو پرویز کے سامنے پڑھا گیا تو وہ سخت غضب ناک ہوا اور کہنے لگا کہ میرے غلام کو یہ جرات ہے کہ وہ میرے نام اس طرح خط لکھے۔ اور پھر طیش میں آکر نامہ مبارک کو پرزے پرزے کر دیا۔ قاصد رسول ﷺ نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسطرح اس کی حکومت کے بھی پرزے پرزے ہو جائیں گے چنانچہ نامہ مبارک کے ساتھ خسرو پرویز کے اس نخوت آمیز رویہ پر سرکار عالم ﷺ کی بددعا کا یہ نتیجہ نکلا کہ کچھ ہی عرصہ بعد طبری کی روایت کے مطابق ۱۳۔ جمادی الاول ۶۲۹ء کی شب میں پرویز کو اسی کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا اور پھر چھ مہینے کے بعد ہی اس کا بیٹا شیرویہ بھی مر گیا اور اس طرح اس کی حکومت و سلطنت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسا وبال پڑا اور ایسی لعنت نازل ہوئی کہ تھوڑی ہی مدت کے بعد ہزاروں برس کی اس عظیم الشان سلطنت کے پرزے پرزے اڑ گئے۔

آنحضور ﷺ نے تمام سربراہان مملکت کو خطوط لکھ کر اسلام کی دعوت دی

③ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اِلٰى كِسْرٰى وَاِلٰى قَيْصَرَ وَاِلَى النَّجَاشِيِّ وَاِلٰى كُلِّ جَبَّارٍ يَدْعُوْهُمْ اِلَى اللّٰهِ وَلَيْسَ بِالنَّجَاشِيِّ الَّذِيْ صَلّٰى عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فارس یعنی ایران کے بادشاہ کسریٰ روم کے بادشاہ قیصر اور حبش کے بادشاہ نجاشی اور ہر متکبر و مقتدر بادشاہ کو خطوط لکھے جن میں انہیں اللہ یعنی دین اسلام کی طرف بلایا گیا تھا۔ اور یہ نجاشی کہ جس کو آپ ﷺ نے یہ خط بھیجا تھا وہ نجاشی نہیں ہے جس کے لئے نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں غائبانہ نماز جنازہ پڑھی تھی۔" (مسلم)

تشریح: روایت کے آخری جزء کا مقصد ان لوگوں کے خیال کی تردید کرتا ہے جن کے نزدیک یہ نجاشی کہ جس کو مکتوب بھیجا گیا تھا وہی نجاشی ہے جس کا نام اصحمہ تھا اور جو آنحضرت ﷺ کا مطیع و فرمبردار اور آپ ﷺ کے اصحاب ؓ کا اپنے ملک میں خادم و نگہبان تھا جب مدینہ میں اس کے انتقال کی خبر آئی تو آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ مرد صالح اور تمہارا بھائی اصحمہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے، اٹھو اور اس کی نماز جنازہ پڑھو چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی غائبانہ جنازہ پڑھائی۔

لیکن بعض محققین کے نزدیک اس تردید کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے دونوں نجاشیوں کو مکتوب بھیجے، پہلے تو اصحمہ کے نام بھیجا تھا اور پھر اصحمہ کے بعد جو شخص نجاشی ہوا اس کے پاس بھی آپ ﷺ نے مکتوب بھیجا۔

اب رہی یہ بات کہ جس طرح پہلا نجاشی یعنی اصحمہ مسلمان ہو گیا تھا اسی طرح دوسرا نجاشی بھی مسلمان ہو گیا تھا یا نہیں؟ اس بارہ میں تحقیقی روایات مختلف ہیں بعض کے نزدیک وہ بھی مسلمان ہو گیا تھا مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ مسلمان نہیں ہوا تھا۔

چونکہ پہلے قیصر اور کسریٰ کے بارے میں ذکر کیا جا چکا ہے اس لئے نجاشی کے بارے مین بھی کچھ باتیں ذکر کر دینا ضروری ہے حبش عرب کی جنوبی سمت میں مشرقی افریقہ میں واقع ایک ملک ہے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت اس ملک پر جو شخص حکمران تھا اس کا نام "اصحمہ" اور پورا ملک عیسائیت کا پیرو تھا۔

"حبش" اصل میں عربی نام ہے یونانی میں اسے "اتھوپیا" کہتے ہیں اور دنیا کے موجودہ نقشہ میں بھی یہ اتھوپیا ہی کے نام سے موسوم ہے۔ حبشی زبان میں بادشاہ کو نجوس کہتے ہیں نجاشی اسی نجوس کا معرب ہے۔

اسلامی تاریخ میں اس وقت کے حبش کا ذکر نہایت ہی عزت و احترام اور شکر گذاری و ممنونیت کے انتہائی جذبات کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی بعثت کے فوراً بعد دنیا کو اللہ کے آخری دین اسلام کی طرف بلایا اور اپنی رسالت کا اعلان کر کے دنیا والوں کو اپنی اطاعت کی دعوت دی اور رفتہ رفتہ مکہ کے لوگ آپ ﷺ کے حلقہ اطاعت میں داخل ہونے لگے اور اس طرح اللہ کے نام کا جھنڈا سربلند ہونے لگا تو مکہ کے کفار اس کو برداشت نہ کر سکے اور ان کی طرف سے مکہ مکرمہ کی وسیع سرزمین حلقہ بگوشان اسلام پر خدائے واحد کا نام لینے کے جرم میں تنگ کر دی گئی چنانچہ اس وقت جب قریش مکہ کے مظالم انسانیت کی تمام حدوں کو پیچھے چھوڑ گئے اور پرستاران توحید پر ظلم و ستم اور بربریت کی انتہا ہو گئی اور آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو مکہ سے ہجرت کر کے چلے جانے کی اجازت دی تو یہ حبش ہی تھا جس نے اپنے ملک کے دروازے ان مظلوموں کے لئے پوری فراخدلی کے ساتھ کھول دیئے اور ان کو اپنی سرزمین پر انتہائی عزت و احترام کے ساتھ پناہ دی۔

مسلمانوں کا پہلا قافلہ جس نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کی حضرت عثمان غنیؓ کی سربراہی میں حبش پہنچا اس کے بعد جب دوسرا قافلہ حبشہ پہنچا اور جس کے قائد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بڑے بھائی حضرت جعفر طیارؓ تھے تو اس مرتبہ آنحضرت ﷺ نے شاہ حبش کے نام ایک مکتوب گرامی بھی ارسال فرمایا اور بعض مورخین کے قول کے مطابق مکتوبات نبوی ﷺ میں یہ پہلا نامہ مبارک ہے اس میں نجاشی کو صرف اسلام کی دعوت ہی نہیں دی گئی تھی بلکہ اس بات کی نصیحت کی گئی تھی کہ وہ حکومت کے غرور و تکبر کو ترک کر کے حبش میں پناہ لینے کے لئے جانے والے مظلوم مکی مسلمانوں کے ساتھ تواضع سے پیش آئے۔ قریش مکہ کو چونکہ یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ مسلمان حبش میں امن و سکون کی زندگی گذار سکیں اس لئے انہوں نے معززین مکہ کا ایک وفد عمروبن العاص جیسے زبردست موقع شناس اور دانش مند سیاستدان کی سربراہی میں شاہ حبش کے دربار میں بھیجا تا کہ وہ ان مہاجر مسلمانوں کو حبش سے واپس لے آئے اور مکہ مین انہیں پھر سے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جائے اس وفد نے شاہ حبش کے سامنے مسلمانوں کی شکایت کی اور نجاشی کو مشتعل کرنے کے لئے یہ کہا کہ۔

"یہ لوگ عجیب و غریب عقائد رکھتے ہیں جن سے نہ ہم واقف ہیں اور نہ آپ"۔

نجاشی شاہ حبش نے وفد کی اس شکایت پر مہاجرین سے حقیقت حال کی وضاحت کے لئے کہا اور ان سے ان کے عقائد دریافت کئے تو

اس موقع پر حضرت جعفر طیارؓ نے جو معرکۃ آلاراء تقریر کی وہ حق گوئی و بے باکی اور ایک شاہی دربار میں اسلامی عقائد ونظریات کا جرات مندانہ ذریعہ تعارف ہونے کی وجہ سے صرف اسلامی تاریخ ہی کا ایک بیش بہا سرمایہ نہیں ہے بلکہ دنیا کی ادبی تاریخ کا ایک زریں ورق اور فن خطابت وتقریر کا ایک انمول شاہ کار بھی ہے انہوں نے شاہ حبش کا مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"شاہ ذی جاہ! ہم ایک سخت جاہل قوم تھے، مصنوعی اور خود ساختہ بتوں کی پرستش ہمارا مذہبی شعار تھا مردار خوری، بدکاری اور بے رحمی ہماری معاشرت کا اہم جزو بن گیا تھا ہم نہ ہمسایہ کے حقوق سے واقف تھے اور نہ اخوت وہمدردی کے جذبہ سے آشنا، ہر طاقتور، کمزوروں کو ہڑپ کر جانے پر فخر کرتا تھا۔ یہ تھا ہمارا معیار زندگی۔

ہماری اس تباہ حالی کا دور عرصہ دراز سے قائم تھا کہ یک بیک خدائے برتر نے ہماری قسمت کا پانسہ پلٹ دیا، اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر بھیجا جس کے نسب وحسب سے ہم واقف ہیں جس کی سچائی اور امانت کا حال ہم پر روشن ہے اور جس کی عفت وپاک دامنی ہر وقت ہماری نظروں میں رہی ہے وہ آیا اور اس نے ہمیں ہدایت کی وہ روشن شمع دکھلائی جس نے ہماری آنکھوں سے ہماری بدکرداری اور جہالت کی تاریکی کے تمام پردے چاک کر دیئے۔

اس پیغمبر نے ہمیں بتایا کہ تم صرف خدائے واحد کی پرستش کرو اور اسی کو اپنا خالق ومالک سمجھو، بت پرستی کو چھوڑ دو، تمہارے یہ خود ساختہ معبود نہ تمہیں کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان! (یاد رکھو) گمراہی کی بنیاد باپ دادا کی کورانہ تقلید ہے

اس نے ہمیں تعلیم دی کہ "ہمیشہ سچ بولو" امانت میں کبھی خیانت نہ کرو، ہمسایہ کے ساتھ ہمدردی اور حسن سلوک کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھو، خون ریزی اور خدا کی حرام کی ہوئی باتوں سے بچو، فحش کاموں اور جھوٹ کے قریب نہ جاؤ، یتیم کا مال نہ کھاؤ اور پاکدامن کو تہمت نہ لگاؤ، خدائے واحد کی عبادت کرو، روزہ رکھو اور اموال کی زکوٰۃ دیا کرو۔

بادشاہ سلامت! اس نبی ﷺ نے اس قسم کے اور بہت سے بہترین امور کی ہمیں تعلیم دی ہے ہم نے اس کی تصدیق کی، اس کو خدا کا پیغمبر سمجھا، اور اس پر ایمان لائے اور جو کچھ اس نے خدا کا حکم ہمیں سنایا، ہم نے اس کی پیروی کی، ہم نے خدا کو ایک جانا، شرک سے توبہ کی، حلال کو حلال سمجھا اور حرام کو حرام جانا۔ یہ ہے ہمارا جرم جس پر ہمارے ہم وطنوں نے ہمیں اپنا گھربار چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا اور ہم نے آپ کے ملک میں آکر پناہ لی ہے۔

شاہ حبش اس پر حقائق اور بصیرت افروز تقریر کا بہت اثر ہوا، اس نے قریش کے وفد کے صاف جواب دے دیا کہ "ایسے پاکیزہ عقائد رکھنے والے نیکوکار لوگوں کو میں واپس کر کے ظالموں کے ظلم وستم کا شکار ہرگز ہرگز نہ بننے دوں گا۔"

۶ھ کے آخر میں آنحضرت ﷺ حدیبیہ کے بعد مدینہ واپس آئے اور محرم ۷ھ = ۶۲۹ء میں آپ ﷺ نے شاہان عالم کے نام نامہ ہائے مبارک روانہ فرمائے تو شاہ حبش کو پھر ایک مکتوب گرامی ارسال فرمایا، بارگاہ رسالت کے سفیر حضرت عمرو ابن امیہ ضمریؓ آپ ﷺ کا نامہ مبارک لے کر شاہ حبش کے دربار میں پہنچے تو پہلے انہوں نے نجاشی کے سامنے ایک اثر انگیز تقریر کی جس میں انہوں نے نجاشی کے اس مشفقانہ رویہ پر اظہار اطمینان کیا جو اس نے مکہ کے مظلوم مسلمانوں کے تئیں اختیار کیا ہوا تھا اور پھر اسلامی عقائد اور آنحضرت ﷺ کی پیروی اختیار کرنے کی مؤثر تبلیغ کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ۔

میری طرح رسول اللہ ﷺ کی جانب سے بعض دیگر اشخاص مختلف بادشاہوں کے پاس دعوت اسلام کے لئے قاصد بنا کر بھیجے گئے ہیں مگر سرور کائنات ﷺ کو جو امید آپ کی ذات سے وابستہ ہے دوسروں سے ایسی امید نہیں ہے آپ سے اس بارے میں پورا اطمینان ہے کہ آپ اپنے اور خدا کے درمیان اپنی گذشتہ نیکی اور آئندہ کے اجر وثواب کا خیال رکھیں گے۔

کچھ عرصہ پہلے حضرت جعفر طیارؓ کی معجز بیانی سے نجاشی اسلام کی دعوت سے واقف ہو چکا تھا اب حضرت عمرو ابن امیہ کی اثر انگیز تبلیغ نے اس کے سینے میں ایمان کی شمع روشن کر دی، وہ تخت شاہی سے نیچے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا، نامہ مبارک کو ہاتھ میں لے کر تعظیما اس

کو چوما اور دونوں آنکھوں سے لگایا اور پھر ترجمان کو بلوا کر پڑھنے کا حکم دیا، نجاشی فرمان رسالت ﷺ کو سنتا جاتا تھا اور متأثر ہوتا جاتا تھا جوں ہی مضمون ختم ہوا اور وہ اس کے مندرجات پر مطلع ہوا فرط شوق میں نامہ مبارک کو بوسہ دے کر سر پر رکھ لیا اور کہا اَشْهَدُ اَنْ لاَّ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ اور پھر کہا کہ اگر میں خود جاسکتا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوتا پھر اس نے اپنے بیٹے آرہا کو تحفے تحائف دے کر بارگاہ رسالت میں بھیجا مگر بدقسمتی سے آرہا راستہ میں ہی انتقال کر گیا اور بارگاہ رسالت میں نہیں پہنچ سکا۔

اس کے بعد پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرو ابن امیہ ضمری کو نجاشی کے نام اپنے ایک اور مکتوب گرامی دے کر حبش بھیجا نجاشی نے ان مبارک ناموں کو احتیاط کے ساتھ ہاتھی دانت کے ایک صندوق میں محفوظ کر کے اپنے خزانہ میں ______ رکھ دیئے اور کہا کہ جب تک یہ فرمان موجود ہیں مجھے یقین ہے کہ اہل حبش مامون و محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ یہ مبارک نامے جب تک حبشہ کے خزانے میں موجود رہے ہر والئ سلطنت اس مکتوب گرامی کی انتہائی تعظیم و تکریم کرتا اور پورے ملک کے لوگ اس کے ذریعہ برکت حاصل کرتے۔

جہاد کرنے والوں کے بارے میں چند ہدایات

۴ وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَّرَ اَمِيْرًا عَلٰى جَيْشٍ اَوْسَرِيَّةٍ اَوْصَاهُ فِيْ خَاصَّتِهٖ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَمَنْ مَعَهٗ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا ثُمَّ قَالَ اُغْزُوْا بِاسْمِ اللّٰهِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَاتِلُوْا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ اُغْزُوْا فَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تَمْثُلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا وَاِذَا لَقِيْتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَادْعُهُمْ اِلٰى ثَلَاثِ خِصَالٍ اَوْ خِلَالٍ فَاَيَّتُهُنَّ مَا اَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ فَاِنْ اَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ اِلٰى دَارِ الْمُهَاجِرِيْنَ وَاَخْبِرْهُمْ اَنَّهُمْ اِنْ فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِيْنَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِيْنَ فَاِنْ اَبَوْا اَنْ يَتَحَوَّلُوْا مِنْهَا فَاَخْبِرْهُمْ اَنَّهُمْ يَكُوْنُوْنَ كَاَعْرَابِ الْمُسْلِمِيْنَ يَجْرِيْ عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللّٰهِ الَّذِيْ يَجْرِيْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَكُوْنُ لَهُمْ فِي الْغَنِيْمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ اِلَّا اَنْ يُجَاهِدُوْا مَعَ الْمُسْلِمِيْنَ فَاِنْ هُمْ اَبَوْا فَسَلْهُمُ الْجِزْيَةَ فَاِنْ هُمْ اَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ فَاِنْ هُمْ اَبَوْا فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَقَاتِلْهُمْ وَاِذَا حَاصَرْتَ اَهْلَ حِصْنٍ فَاَرَادُوْكَ اَنْ تَجْعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهٖ وَلَا تَجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَلَا ذِمَّةَ نَبِيِّهٖ وَلٰكِنِ اجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّتَكَ وَذِمَّةَ اَصْحَابِكَ فَاِنَّكُمْ اِنْ تُخْفِرُوْا ذِمَمَكُمْ وَذِمَمَ اَصْحَابِكُمْ اَهْوَنُ مِنْ اَنْ تُخْفِرُوْا ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ رَسُوْلِهٖ وَاِنْ حَاصَرْتَ اَهْلَ حِصْنٍ فَاَرَادُوْكَ اَنْ تُنْزِلَهُمْ عَلٰى حُكْمِ اللّٰهِ فَلَا تُنْزِلْهُمْ عَلٰى حُكْمِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَنْزِلْهُمْ عَلٰى حُكْمِكَ فَاِنَّكَ لَا تَدْرِيْ اَتُصِيْبُ حُكْمَ اللّٰهِ فِيْهِمْ اَمْ لَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سلیمان بن بریدہ اپنے والد (حضرت بریدہؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ جب کسی شخص کو کسی چھوٹے یا بڑے لشکر کا امیر مقرر فرماتے تو خاص طور پر اس کی ذات سے متعلق تو اس کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی اور اس کے ساتھ (جہاد میں) جانے والے مسلمانوں کے متعلق اس کو نیکی و بھلائی کرنے کی نصیحت فرماتے (کہ مجاہدین کا جو لشکر تمہاری کمان میں جا رہا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ خیر و بھلائی کا معاملہ کرنا اور ان کے حق میں حسن سلوک و احسان اور نرمی و ملاطفت کا رویہ اختیار کرنا) اور اس کے بعد یہ فرماتے کہ جاؤ خدا کا نام لے کر خدا کی راہ میں جہاد کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے اور اس کے دین کا جھنڈا سربلند کرنے کی غرض سے اسلام دشمن طاقتوں سے جنگ کرو اس شخص کے خلاف جہاد کرو جس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے جہاد کرو، غنیمت کے مال میں خیانت نہ کرنا، عہد شکنی نہ کرنا مثلہ نہ کرنا یعنی کسی کے اعضاء جسم جیسے ناک کان وغیرہ نہ کاٹنا اور بچوں کو قتل نہ کرنا اور (اے امیر لشکر) جب تم اپنے مشرک دشمنوں کے سامنے پہنچو تو پہلے ان کو تین چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لینے کی دعوت دو یا حدیث کے راوی اپنے شک کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ نے ثلث خصال کے بجائے ثلث خلال فرمایا (خصال اور خلال دونوں کے ایک ہی معنی ہیں) ان تین چیزوں میں سے وہ مشرک جس چیز کو تم سے اختیار کریں اور اپنے لئے پسند کریں تم اس کو منظور کر لو اور ان کو اس سے زیادہ کسی اور چیز پر مجبور کرنے سے باز

رہو، پھر یعنی ان تین چیزوں میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ان کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ اس دعوت کو قبول کریں تو تم بھی اس کو منظور کرلو اور ان سے جنگ کرنے سے باز رہو، (پھر وہ اسلام قبول کریں تو) ان کو اپنے ملک یعنی (دار الحرب سے) مہاجرین کے ملک (یعنی دار الاسلام) کو منتقل ہو جانے یعنی ہجرت کرنے کی دعوت دو اور ان کو یہ بتادو کہ ایسا کریں گے یعنی ہجرت کر کے دار الاسلام آجائیں گے تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مہاجرین کو حاصل ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو مہاجرین پر عائد ہیں، اگر وہ ترک سکونت اختیار کرنے پر تیار نہ ہوں تو ان کو بتادو کہ ایسی صورت میں وہ دیہاتی مسلمانوں کی طرح ہوں گے اور ان پر خدا کا ایسا حکم کیا جائے گا جو تمام مسلمانوں پر نافذ ہوتا ہے یعنی نماز زکوٰۃ وغیرہ کا واجب ہونا اور قصاص و دیت جیسے احکام کا نافذ ہونا اور غنیمت و فئی کے مال میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا البتہ اس وقت حصہ ملے گا جب کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر جہاد کریں اور اگر وہ اسلام کی دعوت قبول نہ کریں اور مسلمان ہونے سے انکار کریں تو دوسری چیز یہ ہے کہ ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو اگر وہ جزیہ دینا قبول کریں تو تم بھی اس کو منظور کرلو اور ان سے (جنگ کرنے) سے باز رہو اور اگر وہ جزیہ دینا بھی قبول نہ کریں تو تیسری چیز یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر کے ان سے جنگ شروع کردو۔ اور جب تم کسی قلعہ یا بستی کے لوگوں یعنی دشمن کا محاصرہ کرو اور وہ قلعہ یا بستی والے تم سے اللہ اور اس کے نبی ﷺ کا عہد امان لینا چاہیں تو تم ان کو اللہ اور اس کے نبی کی طرف سے امان دینے کا عہد نہ کرنا البتہ اپنے اور اپنے رفقاء جہاد کی طرف سے عہد امان دے دینا کیونکہ اگر تم اپنے اپنے رفقاء کے دیئے ہوئے عہد امان کو توڑ دو گے تو یہ اللہ اور اس کے رسول کے عہد امان کو توڑنے سے زیادہ سہل ہوگا۔ اور جب تم کسی قلعہ کے لوگوں کا محاصرہ کرو اور وہ قلعہ والے تم سے اللہ کے حکم پر اپنا محاصرہ اٹھالینے کی درخواست کریں تو تم اللہ کے حکم پر ان کا محاصرہ نہ اٹھانا بلکہ اپنے حکم پر ان کا محاصرہ اٹھانا کیونکہ تمہیں یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ تم ان کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اللہ کے حکم تک پہنچ گئے ہو یا نہیں (یعنی تمہیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ تم نے ان کا محاصرہ اٹھالینے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ خدا کے نزدیک صحیح بھی ہے یا نہیں اور اس کے حکم کے مطابق بھی ہے یا نہیں اور ہو سکتا ہے کہ تم سے چوک ہو جائے جیسا کہ مجتہد کی شان ہے کہ وہ صحیح حکم تک بھی پہنچ جاتا ہے اور خطاء میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے)۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں اس ضابطہ کا اظہار کیا گیا ہے جو اسلام کے دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے کے سلسلہ میں شریعت نے نافذ کیا ہے اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ جب دشمن (مخالفین اسلام) سامنے آئیں تو سب سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دو، اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کریں تو ان سے یہ مطالبہ کرو کہ جزیہ ادا کر کے اسلامی مملکت کے وفادار شہری بن جاؤ اور اگر اس پر بھی تیار نہ ہوں تو پھر آخری صورت یہ ہے کہ ان کے خلاف جہاد کرو۔

ثُمَّ ادْعُهُمْ (پھر ان کو اسلام کی دعوت دو) اس جملہ سے ان تین چیزوں کا اظہار شروع کیا گیا ہے جن کا تعلق مذکورہ بالا ضابطہ سے ہے اور لفظ "ثُمَّ" (پھر) ذکر فرما کر گویا مخاطب امیر لشکر کو آگاہ کرنا مقصود ہے کہ جب تم نے ان تین چیزوں کو اجمالی طور پر جان لیا تو اب ان تینوں چیزوں کا تفصیلی حکم جان لو اور وہ یہ کہ پہلے ان کو اسلام کی دعوت دو پھر ان کے خلاف جہاد کرو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ تمام صحیح نسخوں میں ثُمَّ ادْعُهُمْ ہی ہے لیکن قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ روایت کی زیادہ صحت اور موزونیت اسی میں معلوم ہوتی ہے کہ یہ یعنی ابتداء میں ادعهم بغیر لفظ ثُمَّ کے ہو چنانچہ کتاب ابوعبید اور سنن ابوداؤد وغیرہ میں بھی یہ لفظ "ثم" کے بغیر ہے کیونکہ اس جملہ سے دراصل ثلث خصال (تین چیزوں) کی وضاحت بیان کی جارہی ہے نہ کہ ان تین چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کی وضاحت مقصود ہے، مازریؒ یہ کہتے ہیں کہ یہاں لفظ "ثم" معنی کے اعتبار سے تو زائد ہے لیکن جملہ میں اس کا استعمال آگے کی جانے والی بات کے ابتدائیہ کے طور پر ہے اور گویا یہ ان تین چیزوں میں سے پہلی چیز کی توضیح و بیان کے لئے ہے اور لفظ "مع المسلمین" تک اسی کا تتمہ ہے اس کے بعد دوسری چیز یعنی جزیہ کا مطالبہ کرنا اور پھر تیسری چیز یعنی جہاد کرنا کیا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے جو یہ حکم فرمایا کہ (اگر وہ لوگ اسلام کی دعوت قبول کریں تو) ان کو ہجرت کرنے کی دعوت دو تو بعض حضرات

کے نزدیک اس حکم کی بنیاد یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ہجرت کرنا اسلام کا ایک رکن تھا۔

ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے یعنی مدینہ کے مہاجرین کو جو ثواب و فضیلت اور مال فیٔ کا جو استحقاق حاصل ہے یہی سب کچھ تمہیں بھی حاصل ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں مہاجرین کو استحقاق بایں طور حاصل تھا کہ ان کو امام کی طرف سے جہاد کا حکم ہو جانے پر جہاد کے لئے نکلنے کے وقت ہی سے ان پر مال فیٔ خرچ کیا جاتا تھا اور دشمن کے مقابلہ پر لڑنے والے مسلمانوں کی تعداد کافی ہونے کی صورت میں ان پر جہاد کے لئے نکلنا واجب نہیں تھا چنانچہ اس ارشاد گرامی۔

وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِيْنَ (اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی)

کا مطلب بھی یہی ہے کیونکہ ذمہ داری سے مراد "جہاد" ہے۔

"دیہاتی مسلمانوں" سے مراد وہ مسلمان ہیں جو دار الاسلام کے دیہات و جنگلات میں رہتے ہوں نہ کہ دار الکفر میں بسنے والے دیہاتی مسلمان۔

"غنیمت اور فیٔ" کے ایک ہی معنی ہیں یعنی وہ مال جو کفار سے مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ لیکن بعض حضرات نے ان دونوں میں فرق کیا ہے کہ "غنیمت" اس مال کو کہتے ہیں جو جنگ کے ذریعہ اور محنت و مشقت کے ساتھ کفار سے حاصل ہو اور "فیٔ" اس مال کو کہتے ہیں جو جنگ اور مشقت کے بغیر کفار سے ہاتھ لگے۔

اگر تم اپنے اور اپنے رفقاء کے دیئے ہوئے عہد امان کو توڑ دو گے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے عہد امان دو گے اور وہ کفار اس عہد امان کو کسی وقت توڑیں بایں طور کہ وہ ان شرائط کو پورا کرنے سے انکار کریں جن کی بنیاد پر ان کو وہ عہد امان ملا ہے تو اس صورت میں تمہارے لئے ان کے تئیں کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا تا آنکہ تمہیں وحی یا دربار رسالت ﷺ کے ذریعے ان کے حق میں کوئی فیصلہ کرنے کی اجازت دی جائے جو اس وقت ممکن نہیں ہوگا۔ کیونکہ تم وحی یعنی دربار رسالت سے دور رہو گے اس کے برخلاف اگر تم ان کو اپنی اور اپنے رفقاء جہاد کی طرف سے عہد امان دو گے اور وہ شرائط و معاہدہ کے خلاف ورزی کر کے اس عہد امان کو توڑیں گے تو اس صورت میں تمہارے لئے ان کے تئیں فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ تم ان کا پھر محاصرہ کر کے چاہے تو ان کو قتل کر دو گے، چاہے جزیہ کا مطالبہ کر دو گے، چاہے ان کو قیدی بنا لو گے اور یا ان کے علاوہ ان کے خلاف ازروئے مصلحت جو بھی اقدام کرنا چاہو گے اس میں تمہیں مکمل اختیار حاصل ہوگا۔

سورج ڈھلنے کے بعد جنگ شروع کرنے کی حکمت

⑤ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِىْ اَوْفٰى اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ بَعْضِ اَيَّامِهِ الَّتِىْ لَقِىَ فِيْهَا الْعَدُوَّ اِنْتَظَرَ حَتّٰى مَالَتِ الشَّمْسُ ثُمَّ قَامَ فِى النَّاسِ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْأَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ فَاِذَا لَقِيْتُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ وَمُجْرِىَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْاَحْزَابِ اهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ۔

"اور حضرت عبد اللہؓ بن ابی اوفی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے دنوں میں سے ایک دن جب کہ آپ ﷺ دشمن کے مقابلہ پر تھے (یعنی جہاد کے موقع پر میدان جنگ میں تھے) سورج ڈھلنے تک جنگ شروع کرنے کا انتظار کرتے رہے پھر جب سورج ڈھل گیا تو آپ ﷺ لوگوں کے سامنے (خطبہ دینے کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو! تم اپنے دشمن سے مقابلہ کی آرزو نہ کرو (یعنی یہ نہ چاہو کہ کفار سے قتل و قتال کا بازار گرم ہو کیونکہ یہ چاہنا گویا ابتلاء و مصیبت کی خواہش کرنا ہے جو ممنوع ہے) بلکہ اللہ تعالیٰ سے امن و عافیت کے طالب رہو، ہاں جب دشمن سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو پھر پوری بہادری کے ساتھ ڈٹ جاؤ اور صبر و استقامت سے کام لو اور اس بات کو

جان لو کہ جنت، تلواروں کے سائے کے نیچے ہے (یعنی تم جنت کے بالکل قریب ہو) اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی۔ اے اللہ! کتاب کو نازل فرمانے والے بادلوں کو چلانے والے اور کفار کی جماعت کو شکست دینے والے ان دشمنوں کو شکست دے اور ہم کو ان پر فتح عطا فرما۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: سورج ڈھلنے تک جنگ کی ابتداء نہ کرنے میں یہ حکمت تھی کہ تپتی ہوئی دوپہر کے بعد جب سورج ڈھل جاتا ہے، تو تمازت و تپش میں کمی آجاتی ہے، ہوا چلنے لگتی ہے جو فرحت پہنچاتی ہے اور اس طرح وہ وقت طبیعت کے انبساط و نشاط کا ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ نماز و دعا کا بھی وقت ہوتا ہے۔

نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس وقت آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور انسانوں کے اعمال اوپر محل قبولیت میں اٹھائے جاتے ہیں لہٰذا ایسے وقت میں جب کہ انوار و برکات اور فتح و نصرت کے نزول کی امید ہوتی ہے آنحضرت ﷺ نے چاہا کہ جہاد جو افضل ترین عمل ہے اسی بابرکت وقت میں واقع ہو۔

آنحضرت ﷺ صبح ہونے سے پہلے دشمن آبادی پر حملے نہیں کرتے تھے

(۶) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا غَزَا بِنَا قَوْمًا لَمْ يَكُنْ يَغْزُوْ بِنَا حَتّٰى يُصْبِحَ وَيَنْظُرَ اِلَيْهِمْ فَاِنْ سَمِعَ اَذَانًا كَفَّ عَنْهُمْ وَاِنْ لَمْ يَسْمَعْ اَذَانًا اَغَارَ عَلَيْهِمْ قَالَ فَخَرَجْنَا اِلٰى خَيْبَرَ فَانْتَهَيْنَا اِلَيْهِمْ لَيْلًا فَلَمَّا اَصْبَحَ وَلَمْ يَسْمَعْ اَذَانًا رَكِبَ وَرَكِبْتُ خَلْفَ اَبِيْ طَلْحَةَ وَاِنَّ قَدَمِيْ لَتَمَسُّ قَدَمَ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَخَرَجُوْا اِلَيْنَا بِمَكَاتِلِهِمْ وَمَسَاحِيْهِمْ فَلَمَّا رَاَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا مُحَمَّدٌ وَاللّٰهِ مُحَمَّدٌ وَالْخَمِيْسُ فَلَجَؤُوْا اِلَى الْحِصْنِ فَلَمَّا رَاٰهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ اَكْبَرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ خَرِبَتْ خَيْبَرُ اِنَّا اِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ ہمارے ساتھ کسی (دشمن) قوم سے جہاد کرتے (یعنی جب جہاد کے موقع پر کسی ایسی دشمن آبادی پر حملہ آور ہونے کا ارادہ فرماتے جس کے حالات کا علم نہیں ہوتا اور ہم لوگ آپ ﷺ کے ہمراہ شریک جہاد ہوتے) تو صبح ہونے سے پہلے ہمارے ساتھ ان پر حملہ آور نہیں ہوتے، پھر جب صبح ہو جاتی تو ان (دشمنوں کی آبادی اور ان کے ٹھکانوں) پر نظر ڈالتے (تاکہ مشاہدہ یا قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کون لوگ ہیں) اگر (ان کی طرف سے) اذان کی آواز سنتے تو ان سے (جنگ کرنے سے) باز رہتے اور اگر اذان کی آواز نہیں سنتے (اور اس پر قرینہ سے یہ ثابت ہو جاتا کہ (ان لوگوں میں مسلمان نہیں ہیں) تو ان پر حملہ کر دیتے۔ حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ چنانچہ جب ہم (آنحضرت ﷺ کے ہمراہ جہاد کے لئے) خیبر روانہ ہوئے تو ان کی سرحدوں پر رات کے وقت پہنچے، جب صبح ہوگئی اور (ان کی طرف سے) اذان سنائی نہ دی تو آنحضرت ﷺ سواری پر سوار ہوئے اور میں ابو طلحہ ؓ کی سواری پر ان کے پیچھے بیٹھا اور (ہماری سواری آنحضرت ﷺ کی سواری کے اتنے قریب تھی کہ) میرے پاؤں آنحضرت ﷺ کے قدم مبارک سے لگتے تھے، حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ جب صبح ہونے پر) خیبر والے (ہماری آمد سے بے خبر اپنے کھیتوں میں جانے کے لئے) اپنے پھاوڑے تھیلے (یعنی کھیتی باڑی کا سامان) لئے ہوئے (اپنے گھروں سے نکلے اور ہماری طرف آئے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو (چیخ چیخ کر) کہنے لگے، محمد ﷺ آگئے، خدا کی قسم محمد ﷺ اور ان کا لشکر آگئے، یہ کہتے ہوئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور قلعہ میں پناہ گزیں ہوگئے، جب رسول کریم ﷺ نے ان کو اس طرح بھاگتے ہوئے دیکھا تو (گویا اس کو ان کی شکست سے تعبیر کرتے ہوئے اور ازراہ تفاؤل) فرمایا "اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے، خیبر برباد ہوگیا، اس میں کوئی شک نہیں، ہم (مسلمانوں کی جماعت یا انبیاء) جب کسی قوم کے میدان میں (جنگ کے لئے) اترتے ہیں تو اس ڈرائی گئی قوم کی صبح بڑی خراب ہو جاتی ہے۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کا یہ جنگی معمول بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ جب دشمنوں کی آبادی پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتے تو طلوع فجر کے بعد اس آبادی کے بارے میں غور و تامل فرماتے اور آبادی والوں کی حرکات و سکنات اور ان کے افعال کے ذریعہ ان کے عقائد کا پتہ چلاتے کہ یہ کون لوگ ہیں، اگرچہ آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ کفار کی آبادی ہے لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ محض اس احتمال کے پیش نظر یہ تامل فرماتے کہ شاید اس آبادی میں مسلمان بھی ہوں اگر آپ ﷺ کو اس آبادی کی طرف سے (فجر کی) اذان سنائی دیتی تو اس کو اس بات کی علامت اور قرینہ سمجھ کر کہ یا تو یہ آبادی مسلمانوں ہی کی ہے یا اس آبادی میں مسلمان بھی ہیں آپ ﷺ حملہ آور ہونے کا ارادہ موقوف فرما دیتے اور اس آبادی کو جنگی شعلوں کے حوالے نہ کرتے، ہاں اگر اذان نہ سنائی دیتی تو پھر آپ ﷺ اس پر حملہ کر دیتے اور اس کو جنگی میدان میں تبدیل کر دیتے، کیونکہ اس زمانے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مسلمان اذان ترک کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس آبادی کی طرف سے اذان کی آواز نہ آنا اس بات کی واضح دلیل ہوتی کہ یہ آبادی اللہ کے نام لیواؤں سے بالکل خالی ہے اور یہاں صرف کفر کا ٹھکانا ہے۔

خطابیؒ کہتے ہیں کہ یہ اس بات کی مستحکم دلیل ہے کہ اذان اسلام کے شعار میں سے ہے اور اس کو ترک کرنا قطعاً جائز نہیں ہے بلکہ اگر کسی آبادی و شہر کے لوگ اذان ترک کرنے پر اتفاق کر کے بیٹھ جائیں اور اذان دینا چھوڑ دیں تو اس صورت میں امام وقت (اسلامی مملکت کے سربراہ) پر واجب ہوگا کہ ان سے جنگ و قتال کرے اور ان کو اس عام گمراہی سے بچائے، چنانچہ حنفی فقہاء نے بھی یہی لکھا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہم جب کسی قوم کے میدان میں اترتے ہیں الخ" یہ جملہ مستانفہ ہے، جس کا مقصد ماقبل کی بات "خیبر کی بربادی" کی وضاحت کرنا اور اس کی وجہ بیان کرنا ہے۔

"ڈرائی گئی قوم" سے مراد کفار ہیں۔ اس جملہ سے آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ ان پر قتل و غارت گری کی صورت میں اللہ کی طرف سے نازل ہونے والے عذاب کی وجہ سے ان کی صبح بڑی بھیانک ہوگئی ہے۔ نیز آپ ﷺ نے یہ بات قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے پیدا کی کہ:

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ. فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ. (الصافات۔ ۱۷۶:۳۷۔۱۷۷)

"کیا یہ (کفار) ہمارے عذاب کے لئے جلدی کر رہے ہیں؟ پس جب ان کے میدان میں ہمارا عذاب اترے گا تو ان کی صبح بڑی خراب ہوگی جن کو ڈرایا گیا ہے۔"

نوویؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دشمن کے مقابلہ پر پہنچنے کے وقت (یعنی میدان جنگ میں) نعرہ تکبیر (اللہ اکبر) بلند کرنا مستحب ہے اور ایسے موقع کے مثل حالات کے امور محققہ میں قرآن کریم کے ذریعہ استشہاد جائز ہے چنانچہ اسی کے مثل وہ صورت تھی جب کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے وقت کہا تھا:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ. (الاسراء ۸۱:۱۷)

"حق آیا اور باطل گیا گزرا ہوا۔"

نیز علماء نے کہا ہے کہ قرآن کریم سے ایسا استشہاد جو محاورات میں بطریق ضرب المثل ہو یا لغو و بے فائدہ گفتگو و کلام کے دوران ہو، مکروہ ہے۔ بلکہ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ ہمارے بعض علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ کسی شخص کا اپنے کسی مفہوم و ادائیگی کے لئے اپنے الفاظ، استعمال کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا کلام یعنی قرآن کریم کی کوئی آیت یا کسی آیت کا ٹکڑا استعمال کرنا کفر ہے جیسے کوئی شخص اپنے مخاطب کو جس کا نام یحییٰ ہو: کوئی کتاب دیتے وقت یوں خطاب کرے۔ يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ (یہ دراصل ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس

کا ترجمہ یہ ہے کہ اے یحییٰ! اس کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو) یا کوئی شخص اپنے مخاطب کو مثلاً کھانا کھانے کے لئے یا آگے بڑھنے کے لے کہنا چاہتا ہے مگر اپنے الفاظ "کھاؤ" یا "آگے بڑھو" کی بجائے "بسم اللہ" کہتا ہے اور یا اسی طرح کی کسی بھی صورت میں قرآن کریم کے الفاظ کو استعمال کرنا۔

نیز ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ فرمانا کہ استشہاد کے طور پر نہیں تھا بلکہ دراصل امتثال امر (اطاعت حکم) کے طور پر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا تھا۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ (الاسراء ۱۷: ۸۱)

"یعنی (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے کہ (دین) حق (غالب ہونے کو) آیا اور باطل گیا گزرا ہوا۔"

اسی طرح آپ ﷺ کا رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا کہنا اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق تھا کہ:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ (طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴)

"یعنی (اے محمد ﷺ) یوں دعا کیجئے کہ اے میرے رب! مجھے زیادہ سے زیادہ علم عطا فرما۔"

غرضیکہ اس طرح کے جتنے منقولات آپ ﷺ سے ثابت ہیں وہ سب دراصل حکم الٰہی کی اطاعت و بجا آوری ہے اور یہ مستحب ہے۔

ظہر کے وقت آنحضرت ﷺ کی طرف سے جنگ کی ابتداء

⑦ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ مُقَرِّنٍ قَالَ شَهِدْتُ الْقِتَالَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اِذَا لَمْ يُقَاتِلِ الْقِتَالَ اَوَّلَ النَّهَارِ اِنْتَظَرَ حَتّٰى تَهُبَّ الْاَرْوَاحُ وَتَحْضُرَ الصَّلَاةُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت نعمانؓ بن مقرن کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا ہوں، چنانچہ جب (کسی دن) آپ ﷺ صبح کے وقت جنگ شروع نہ کرتے تو اس وقت کا انتظار فرماتے جب کہ ہوا چل پڑے اور (ظہر کی) نماز کا وقت آجائے۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظہر کی نماز کے وقت جنگ کی ابتداء اس صورت میں ہوتی جب کہ کسی وجہ سے صبح کے وقت جنگ شروع نہ ہو پاتی، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کی ابتداء حالات و مصلحت کے مطابق کی جاتی تھی، اگر حالات کا تقاضہ صبح کے وقت جنگ چھیڑنے کا ہوتا تو صبح کے وقت لڑائی شروع کی جاتی اور اگر کسی وجہ سے صبح کے وقت جنگ چھیڑنا مناسب نہیں ہوتا تو پھر دوپہر ڈھلے جنگ کی ابتداء کی جاتی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

دوپہر ڈھلے جنگ کی ابتداء

⑧ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ مُقَرِّنٍ قَالَ شَهِدْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اِذَا لَمْ يُقَاتِلْ اَوَّلَ النَّهَارِ اِنْتَظَرَ حَتّٰى تَزُوْلَ الشَّمْسُ وَتَهُبَّ الرِّيَاحُ وَيَنْزِلَ النَّصْرُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت نعمانؓ ابن مقرن کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ (لڑائیوں میں) شریک ہوا ہوں، چنانچہ آنحضرت ﷺ جب دن کے ابتدائی حصہ میں (یعنی صبح کے وقت) جنگ نہ چھیڑتے تو اس وقت تک (جنگ کی ابتداء کرنے کا) انتظار کرتے جب تک کہ سورج نہ ڈھل جاتا ہوا نہ چلنے لگتی، اور نصرت (یعنی فتح کی ہوا) نازل نہ ہو جاتی، (یا نصرت نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک ظہر کی نماز کے بعد مجاہدین اسلامؓ کے لئے مسلمانوں کی دعا کی برکت سے فتح کے آثار ظاہر نہ ہو جاتے)۔" (ابوداؤدؒ)

آنحضرت ﷺ کی جنگ کے اوقات

⑨ وَعَنْ قَتَادَةَ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ مُقَرِّنٍ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ اَمْسَكَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَاِذَا طَلَعَتْ قَاتَلَ فَاِذَا انْتَصَفَ النَّهَارُ اَمْسَكَ حَتّٰى تَزُوْلَ الشَّمْسُ فَاِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ قَاتَلَ حَتَّى الْعَصْرِ ثُمَّ اَمْسَكَ حَتّٰى يُصَلِّيَ الْعَصْرَ ثُمَّ يُقَاتِلُ قَالَ قَتَادَةُ كَانَ يُقَالُ عِنْدَ ذٰلِكَ تَهِيْجُ رِيَاحُ النَّصْرِ وَيَدْعُو الْمُؤْمِنُوْنَ لِجُيُوْشِهِمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت قتادہؒ، حضرت نعمان ابن مقرنؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "میں نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جہاد کیا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ طلوع فجر کے بعد اس وقت تک (جنگ شروع کرنے سے) رکے رہتے جب تک کہ (آپ ﷺ فجر کی نماز سے فارغ نہ ہو جاتے اور سورج نہ نکل آتا، پھر جب سورج نکل آتا تو جنگ شروع کر دیتے اور جب دوپہر ہو جاتی (یعنی شرعی دوپہر کہ ؤہ چاشت کا وقت ہے جو دوپہر کے قریب ہوتا ہے) تو دوپہر ڈھلنے تک کے لئے (جنگ سے) رک جاتے۔ پھر جب دوپہر ڈھل جاتی (اور ظہر کی نماز پڑھ لیتے) تو عصر تک جنگ کرتے اور پھر رک جاتے یہاں تک کہ عصر کی نماز پڑھنے کے بعد پھر جنگ میں مشغول ہو جاتے" قتادہؒ کہتے ہیں کہ کہا جاتا تھا (یعنی صحابہؓ آنحضرت ﷺ کے اس جنگی نظام الاوقات کی حکمت کے بارے میں کہا کرتے تھے) کہ یہ اس وجہ سے تھا کہ ان اوقات میں نصرت کی ہوائیں چلتی ہیں اور مسلمان اپنی نماز میں اپنے لشکروں کے لئے (فتح و کامرانی کی) دعائیں کرتے ہیں (یعنی نماز کے بعد دعائیں مانگتے ہیں یا نماز کے دوران ہی دعائیں کرتے ہیں جیسا کہ قنوت پڑھنے کے سلسلہ میں احادیث منقول ہیں)۔" (ترمذیؒ)

مجاہدین اسلام کو ایک خاص ہدایت

⑩ وَعَنْ عِصَامِ نِ الْمُزَنِيِّ قَالَ بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَرِيَّةٍ فَقَالَ اِذَا رَاَيْتُمْ مَسْجِدًا اَوْ سَمِعْتُمْ مُؤَذِّنًا فَلَا تَقْتُلُوْا اَحَدًا۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عصام مزنیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں (جہاد کے لئے) ایک چھوٹے لشکر میں روانہ کیا، اور فرمایا کہ "جب (کسی جگہ) تم کوئی مسجد دیکھو یا مؤذن کو اذان دیتے سنو تو وہاں کسی کو قتل نہ کرنا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی جگہ شعار اسلام میں کوئی قولی یا فعلی علامت پاؤ تو اس وقت تک کسی کو قتل نہ کرو جب کہ یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ کون مؤمن ہے اور کون کافر ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

زعماء ایران کے نام حضرت خالد بن ولیدؓ کا مکتوب

⑪ عَنْ اَبِيْ وَائِلٍ قَالَ كَتَبَ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ اِلٰى اَهْلِ فَارِسَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنْ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ اِلٰى رُسْتَمَ وَمِهْرَانَ فِيْ مَلَاءِ فَارِسَ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّا نَدْعُوْكُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ فَاِنْ اَبَيْتُمْ فَاَعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَاَنْتُمْ صَاغِرُوْنَ فَاِنْ اَبَيْتُمْ فَاِنَّ مَعِيْ قَوْمًا يُحِبُّوْنَ الْقَتْلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَا يُحِبُّ فَارِسُ الْخَمْرَ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت ابووائلؓ کہتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے فارس یعنی ایران کے لوگوں (یعنی ان کے زعماء اور سرداروں) کو یہ مکتوب بھیجا:
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ خالد ابن ولید کی طرف سے رستم و مہران کے نام جو زعماء ایران میں سے ہیں اس شخص پر سلامتی ہو جو حق و

ہدایت کی پیروی کرے۔ بعد ازاں! واضح ہو کہ ہم تمہیں اسلام (قبول کرنے) کی دعوت دیتے ہیں، اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو ذلت و خواری کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کرو اور اگر تم اس (جزیہ ادا کرنے) سے (بھی) انکار کرو گے تو تمہیں آگاہ ہو جانا چاہئے کہ ہلاکت و پشیمانی تمہارا مقدر بن چکی ہے کیونکہ) بلاشک وشبہ میرے ساتھ ایسے لوگوں کی جماعت ہے جو خون بہانے کو (یا خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کر دینے کو) اسی طرح پسند کرتے ہیں جس طرح ایران کے لوگ شراب کو پسند کرتے ہیں (یعنی جس طرح تم ایران والوں کو شراب کے نشہ میں کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اسی طرح میری جماعت کے لوگوں کو قتل وقتال میں سرمستی و سرشاری حاصل ہوتی ہے یا ان کو جان لینے اور جان دینے میں وہی خوشی اور وہی لذت حاصل ہوتی ہے جو تم شراب میں محسوس کرتے ہو) اور سلامتی ہو اس پر جو حق وہدایت کی پیروی کرے۔" (شرح السنۃ)

بَابُ الْقِتَالِ فِی الْجِهَادِ

جہاد میں لڑنے کا بیان

اس باب میں وہ احادیث نقل ہوں گی جن میں آنحضرت ﷺ نے جہاد کی ترغیب دی ہے اور جہاد کے فضائل و ثواب بیان فرمائے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

شہید کی منزل جنّت ہے

(۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَوْمَ اُحُدٍ اَرَاَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فَاَیْنَ اَنَا قَالَ فِی الْجَنَّةِ فَاَلْقٰی تَمَرَاتٍ فِیْ یَدِهٖ ثُمَّ قَاتَلَ حَتّٰی قُتِلَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ احد کی جنگ کے دن (میدان جنگ میں) ایک شخص، نبی کریم ﷺ سے کہنے لگا کہ "آپ بتائیے! اگر میں مارا جاؤں (یعنی دشمنان اسلام سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں) تو میں کہاں ہوں گا یعنی جنت میں جاؤں گا یا دوزخ میں؟ آنحضرت نے فرمایا "جنت میں" (یہ سنتے ہی) اس شخص نے (جنت میں پہنچ جانے کی تمنا میں مرتبہ شہادت جلد سے جلد حاصل کرنے کے لئے) وہ کھجوریں پھینک دیں جو (کھانے کے لئے) اس کے ہاتھ میں تھیں اور لڑائی میں مشغول ہو گیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اعلان جہاد کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ کی جنگی حکمت عملی

(۲) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُرِیْدُ غَزْوَةً اِلَّا وَرّٰی بِغَیْرِهَا حَتّٰی كَانَتْ تِلْكَ الْغَزْوَةُ یَعْنِیْ غَزْوَةَ تَبُوْكَ غَزَاهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ حَرٍّ شَدِیْدٍ وَاسْتَقْبَلَ سَفَرًا بَعِیْدًا وَمَفَازًا وَعَدُوًّا كَثِیْرًا فَجَلّٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ اَمْرَهُمْ لِیَتَاَهَّبُوْا اُهْبَةَ غَزْوِهِمْ فَاَخْبَرَهُمْ بِوَجْهِهِ الَّذِیْ یُرِیْدُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت کعب ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کسی غزوہ (یعنی جہاد کرنے) کا ارادہ کرتے تو اس کے بجائے دوسرے کا توریہ فرماتے یہاں تک کہ یہ غزوہ یعنی غزوۂ تبوک واقع ہوا رسول کریم ﷺ نے غزوۂ تبوک سخت ترین گرمی کے زمانے میں کیا، آپ ﷺ نے اس کے لئے دور دراز کا سفر فرمایا اور بے آب وگیاہ جنگلات کو طے کیا۔ نیز اس میں دشمنوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی، چنانچہ آنحضرت نے (جب اس غزوے کا ارادہ فرمایا تو) اس کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان صاف صاف اعلان کیا۔ (اور اس

غزوے کے دوران پیش آنے والی مشکلات اور پریشانیوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا) تاکہ وہ لوگ (جنگ کے لئے) اچھی طرح تیار ہو جائیں اور) اپنے سامان جہاد کو درست کرلیں! نیز آپ ﷺ نے صحابہؓ کو ان رستوں اور مقامات کے بارے میں بھی بتادیا تھا جن کو آپ ﷺ (تبوک پہنچنے کے لئے) اختیار کرنا چاہتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "توریہ" کے معنی ہیں "خبر کو چھپانا بایں طور کہ اصل بات کو چھپایا جائے اور دوسری بات کو ظاہر کیا جائے" چنانچہ آنحضرت ﷺ ارادۂ جہاد کے موقع پر یہ جنگی حکمت عملی اختیار فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کو جس مقام پر جہاد کے لئے جانا ہوتا اس کا اعلان نہ کرتے بلکہ اسی دوسرے مقام کے بارے میں مشہور کرادیتے کہ وہاں جہاد کے لئے جانا ہے اور یہ حکمت عملی آپ ﷺ اس لئے اختیار فرماتے تھے تاکہ دشمن کو آپ ﷺ کے ارادہ کا پتہ نہ چلے اور وہ غافل رہے! اس طرح کی حکمت عملیاں دراصل جنگ جیتنے کے لئے انتہائی ضروری ہوتی ہیں اور دنیا کا ہر قانون ان کو روا رکھتا ہے، اسی لئے اسلام نے بھی "الحرب خدعۃ" (لڑائی مکر و فریب کا نام ہے) کہہ کر جنگ میں اس طرح کے "فریب دینے کو جائز رکھا ہے، چنانچہ آنحضرت کا یہ توریہ بھی اگرچہ "خدعہ" کی قسم سے تھا لیکن آپ ﷺ اس کو صریح قول کے ذریعہ اختیار نہیں فرماتے تھے بلکہ بطریق تعریض و کنایہ اختیار فرماتے تھے جیسے اگر آپ ﷺ کسی مقام پر جہاد کے لئے جانے کا ارادہ فرماتے کہ لوگوں کو آپ ﷺ کے حقیقی ارادے کا علم نہیں ہوتا تھا، آپ ﷺ صریح الفاظ میں کسی دوسرے مقام کا نام لے کر یہ بالکل نہیں کہتے تھے کہ میں فلاں جگہ کے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں، تاکہ جھوٹ بولنا لازم نہ آئے

یہاں تک کہ یہ غزوہ الخ" حضرت کعبؓ ابن مالک نے اس کے ذریعہ اس غزوہ یعنی غزوۂ تبوک کی طرف اشارہ کیا جو ان کی ذات کے تعلق سے مشہور و معروف تھا۔ حضرت کعبؓ ابن مالک بذات خود اس غزوہ میں شریک نہیں ہوئے تھے چنانچہ ان کا واقعہ بہت مشہور ہے جو قرآن کریم میں بھی مذکور ہے۔

"دور دراز کا سفر فرمایا" جہاد کرنے کے لئے تبوک جانے کو دور دراز کا سفر اس لئے فرمایا گیا ہے کہ تبوک جو دمشق (شام) اور مدینہ کے درمیانی پر خیبر اور البلاد کے خطہ پر واقع ایک جگہ کا نام ہے، مدینہ سے اس زمانہ کی مسافت کے اعتبار سے چودہ منزل اور آج کل کے حساب کے مطابق تقریباً ۴۲۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں جن غزوات میں بہ نفس نفیس شرکت فرمائی ان میں یہ غزوۂ تبوک واقع ۹ھ آخری غزوہ تھا۔ اس غزوہ کے موقع پر صحابہؓ کو بڑی سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔

جنگ مکر و فریب کا نام ہے

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَرْبُ خُدْعَةٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جنگ مکر و فریب (کا نام) ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جنگ میں لشکر کی زیادہ تعداد اور بہت لڑنا اتنا کار آمد و مفید نہیں ہوتا جتنا مکر و فریب مفید ہوتا ہے، جس کو آج کے مہذب الفاظ میں "حکمت عملی" بھی کہتے ہیں۔ اسی مکر و فریب یا حکمت عملی کا کرشمہ ہوتا ہے کہ پوری جنگ ایک ہی داؤ سے ختم ہو جاتی ہے، جو داؤ کھاتا ہے مارا جاتا ہے اور داؤ مارنے والا جنگ پر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ بہترین کمانڈر وہی کہلاتا ہے جو میدان جنگ میں اپنی تدبیر اور حکمت عملی سے دشمن کی بڑی سے بڑی فوج کو پسپا ہونے پر مجبور کردے۔

اگرچہ علماء اسلام نے متفقہ طور پر کفار کے ساتھ کی جانے والی جنگ میں مکر و فریب کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس بارے میں کچھ حدود بھی مقرر کی ہیں تاکہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر کوئی حرف نہ آئے، چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ مکر و فریب کا رستہ اختیار کرنے کی صورت میں پہلی بات تو یہ ملحوظ ہونی چاہئے کہ کھلا ہوا جھوٹ نہ بولا جائے اور یہ کہ کسی بھی ایسی صورت میں مکر و فریب نہ کیا جائے جس

میں مسلمانوں کی طرف سے دیا ہوا عہد امان توڑا جائے۔ پھر علماء نے "فریب دینے" کی کچھ صورتیں بھی متعین کر دی ہیں مثلاً اس طرح فریب دیا جائے کہ اسلامی لشکر میدان جنگ سے ہٹ جائے یا جنگ بند کر دے تاکہ دشمن غافل ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ اسلامی لشکر جنگ سے بھاگ گیا ہے اور پھر دشمن کی اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس پر یکبارگی حملہ کر دیا جائے، اس طرح کی ایسی کوئی بھی حکمت عملی اختیار کی جائے جس میں مذکورہ بالا دونوں امور کا لحاظ ہو۔

حدیث میں مذکور لفظ "خدعة" اصل میں تو خ کے پیش اور دال کے جزم کے ساتھ یعنی خُدْعَةٌ ہے لیکن زیادہ فصیح خ کے زبر کے ساتھ یعنی خَدْعَةٌ ہے جس کے معنی یہی ہیں کہ لڑائی ایک ہی فریب (داؤ) سے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ لفظ خ کے زیر کے ساتھ (یعنی لفظ فریب کا اہم نوع خِدْعَةٌ اور خ کے پیش اور دال کے زبر کے ساتھ یعنی خُدَعَةٌ بھی منقول ہے، اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ "جنگ بہت دھوکے میں ڈالنے والی ہے" یعنی جو لوگ دشمن کے مقابلہ پر جاتے ہیں ان کے دل میں طرح طرح کے خیال پیدا ہوتے ہیں لیکن جب وہ میدان جنگ میں پہنچتے ہیں اور لڑائی ہوتی ہے تو ان خیالات کے برعکس نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ کوئی شخص فتح پانے اور دشمن کو مار ڈالنے کا خیال لے کر جاتا ہے مگر میدان جنگ میں شکست کا سامنا کرتا ہے اور خود مارا جاتا ہے اسی طرح کوئی شخص شکست و ناکامی کے مایوس کن خیالات لے کر جاتا ہے مگر وہاں جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا ہے اور وہ کامیاب و کامران ہو کر آتا ہے، غرضیکہ جنگ اسی طرح دھوکے اور فریب میں مبتلا کرنے والی چیز ہے۔

جہاد میں عورتوں کو لے جانے کا مسئلہ

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْزُوْ بِاُمِّ سُلَيْمٍ وَنِسْوَةٍ مِنَ الْاَنْصَارِ مَعَهٗ اِذَا غَزَا يَسْقِيْنَ الْمَاءَ وَيُدَاوِيْنَ الْجَرْحٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب (صحابہ کے ہمراہ جہاد میں تشریف لے جاتے تو اپنے ساتھ اُم سلیمؓ اور انصار کی دوسری عورتوں کو بھی لے جاتے، وہ عورتیں (غازیان اسلام کو) پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کرتیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مجاہدین کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کرنے کی غرض سے زیادہ عمر والی عورتوں کو اپنے ساتھ لے جانا جائز ہے اور اگر مباشرت و صحبت کی غرض سے لے جانا ہو تو پھر آزاد عورتوں (یعنی اپنی بیویوں) کی بہ نسبت لونڈیوں کو لے جانا بہتر ہے۔ (یہ حکم اس وقت تھا جب کہ ایسی لونڈیاں رکھنے کا رواج تھا جن کے ساتھ صحبت و مباشرت جائز تھی)۔

⑤ وَعَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَ غَزَوَاتٍ اَخْلُفُهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ فَاَصْنَعُ لَهُمُ الطَّعَامَ وَاُدَاوِی الْجَرْحٰى وَاَقُوْمُ عَلَى الْمَرْضٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اُم عطیہؓ کہتی ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ سات غزووں میں شریک ہوئی ہوں میں (میدان جنگ میں) ان (مجاہدین) کے پیچھے ان کے ڈیروں میں رہا کرتی تھی جہاد میں ان کے لئے کھانا پکاتی، زخمیوں کی مرہم پٹی اور دوا دارو کرتی اور بیماروں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔" (مسلمؒ)

جہاد میں عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کا مسئلہ

⑥ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَآءِ وَالصِّبْيَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے عورتوں اور لڑکوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ہدایہ میں لکھا ہے کہ عورت، لڑکے، جاماندہ، اندھے اور شیخ فانی (بڈھے کھوسٹ) کو قتل نہ کیا جائے ہاں اگر کوئی لڑکا یا دیوانہ

جنگ میں شریک ہوں اور قتال کر رہے ہوں تو ان کو قتل کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ملکہ عورت کو بھی قتل کیا جا سکتا ہے، نیز اس لڑکے کو بھی قتل کرنا جائز ہے جو بادشاہ و سردار ہو کیونکہ دشمن کے بادشاہ و سردار کے قتل ہو جانے سے ان کی شان و شوکت ٹوٹ جاتی ہے۔

(۷) وَعَنِ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَهْلِ الدِّيَارِ يُبَيَّتُوْنَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَيُصَابُ مِنْ نِّسَائِهِمْ وَذَرَارِيْهِمْ قَالَ هُمْ مِنْهُمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ هُمْ مِنْ اٰبَآئِهِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت صعب ابن جثامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے ان مشرکین کے بارے میں پوچھا گیا جو گھروں والے ہیں، (یعنی جو آبادیوں میں رہتے ہیں) کہ اگر ان پر شبخون مارا جائے اور اس کے نتیجے میں ان کی عورت اور بچے مارے جائیں (تو کیا حکم ہے؟) آنحضرت ﷺ نے (اس کے جواب میں) فرمایا کہ "وہ بھی انہیں میں سے ہیں۔" اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جہاد میں عورتوں اور بچوں کو قصداً قتل نہ کیا جائے ہاں اگر وہ شبخون کی صورت میں مارے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ ان کے جو لڑنے والے بڑے مرد ہیں ان سے ان کا امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی قتل کے حکم میں اپنے بڑوں کے مانند ہیں۔

دشمن کے درختوں کو کاٹنے اور جلانے کا مسئلہ

(۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطَعَ نَخْلَ بَنِي النَّضِيْرِ وَحَرَّقَ وَلَهَا يَقُوْلُ حَسَّانُ

وَهَانَ عَلٰى سَرَاةِ بَنِيْ لُؤَيٍّ حَرِيْقٌ بِالْبُوَيْرَةِ مُسْتَطِيْرُ

وَفِيْ ذٰلِكَ نَزَلَتْ۔ مَاقَطَعْتُمْ مِنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ۔ متفق علیه۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بنی نضیر کے کھجوروں کے درختوں کو کاٹنے اور جلانے کا حکم فرمایا، اسی کے بارے میں (دربار رسالت ﷺ کے صحابی شاعر حضرت حسان ابن ثابت انصاریؓ نے یہ شعر کہا۔"

وَهَانَ عَلٰى سَرَاةِ بَنِيْ لُؤَيٍّ حَرِيْقٌ بِالْبُوَيْرَةِ مُسْتَطِيْرُ

یعنی بنی لُوَیؔ کے سرداروں کے لئے پھیلے ہوئے بویرہ کو جلا ڈالنا آسان ہو گیا۔

نیز اسی کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

مَاقَطَعْتُمْ مِنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ۔

"تم نے کھجور کے درخت پر سے جو کچھ کاٹا یا جو کچھ اس کی جڑ پر کھڑا ہوا چھوڑ دیا (یعنی جو کچھ نہیں کاٹا) یہ سب خدا کے حکم سے ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہودیوں سے بھی واسطہ پڑا، اس وقت مدینہ میں ان (یہودیوں) کے تین قبائل آباد تھے، بنو نضیر، بنو قریظہ، اور بنو قینقاع، آنحضرت ﷺ نے ایک باہمی معاہدہ کیا جس کے تحت مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان بہت اہم سماجی اور معاشرتی معاملات سے متعلق اور آپس میں میل ملاپ سے رہنے کے بارے میں کچھ دفعات طے ہوئیں جن میں یہودیوں کو مسلمانوں کے سیاسی اور تمدنی حقوق میں صراحت کے ساتھ مساوات دے کر "پورے حقوق شہریت" عطا کئے گئے اور ان کو مذہبی آزادی دے کر نہایت فیاضانہ رواداری کا رویہ برتا گیا اور مسلمانوں کی طرف سے ان پر عمل بھی کیا گیا، مگر یہودیوں کی طرف سے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی یہاں تک کہ بنو نضیر کے یہودیوں کی طرف سے اس حد تک عہد شکنی کا مظاہرہ ہوا کہ ان کی جانب سے آنحضرت ﷺ کے قتل کی سازش بھی تیار کر لی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کو اس ناپاک سازش پر مطلع کر دیا، چنانچہ ان یہودیوں کو مدینہ سے جلاوطن کر کے خیبر بھگا دیا گیا، ان کے کھجوروں کے باغات جلا ڈالے گئے اور ان کے مکانات کو

تہس نہس کردیا گیا۔

لُؤی لام کے پیش اور ہمزہ کے زبر اور یاء کے تشدید کے ساتھ، نضر ابن کنانہ کی اولاد میں سے ایک شخص کا نام تھا جو آنحضرت ﷺ کے اجداد میں سے ہیں۔ اور بنی لُؤی سے مراد قریش کے اشراف ہیں، جو آنحضرت ﷺ کے صحابہ تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے۔

"بویرہ" ایک جگہ کا نام تھا جہاں بنو نضیر کے یہودیوں کے باغات تھے اور جن کو صحابہ نے جلا ڈالا تھا۔

منقول ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے بنو نضیر کے کھجوروں کے درختوں کو کاٹنے اور جلا ڈالنے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا کہ "محمدؐ! آپ تو زمین پر فساد برپا کرنے سے منع کرتے تھے پھر آپ ﷺ نے ہمارے کھجوروں کے ان درختوں کو کیوں کٹوایا اور جلوا ڈالا؟" چنانچہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس نے آنحضرت ﷺ نے حکم کی توثیق کردی اور یہ واضح کردیا کہ ان یہودیوں کو جو سزا دی گئی ہے وہ حکم الٰہی کے مطابق ہے اور اسلام دشمن لوگوں کے درختوں کو کاٹنا اور جلانا جائز ہے۔

دشمن کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر اس کا قتل اور غارتگری جائز ہے

⑨ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَوْنٍ اَنَّ نَافِعًا كَتَبَ اِلَيْهِ يُخْبِرُهُ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ اَخْبَرَهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَغَارَ عَلٰى بَنِي الْمُصْطَلِقِ غَارِّيْنَ فِيْ نَعَمِهِمْ بِالْمُرَيْسِيْعِ فَقَتَلَ الْمُقَاتِلَةَ وَسَبَى الذُّرِّيَّةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبد اللہ ابن عونؒ سے روایت ہے کہ (حضرت ابن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام) حضرت نافعؒ نے ان (عبد اللہ ابن عون) کو ایک مکتوب بھیجا جس میں حضرت نافعؒ نے ان کو مطلع کیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے ان (نافعؒ) سے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ مصطلق پر اس وقت ٹوٹ پڑے تھے جب وہ مریسیع میں اپنے مویشیوں کے درمیان غافل پڑے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کے لڑنے والوں کو قتل کردیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر لے آئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "بنی مطلق" قبیلۂ خزاع کی ایک شاخ تھی۔ اور "مریسیع" ایک جگہ کا نام تھا جو مکہ و مدینہ کے درمیان مدینہ منورہ سے تقریباً ستر ۷۰، اسی ۸۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، یہاں کافی مقدار میں پانی موجود تھا جس پر بنی مصطلق کا تسلط تھا۔

"لڑنے والوں" سے وہ لوگ مراد ہیں جو لڑنے کی صلاحیت و اہلیت رکھتے تھے یعنی عاقل و بالغ مرد اور "ذریت" سے ان کی عورتیں اور بچے مراد ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام دشمن اگر کہیں غافل پڑے ہوں تو ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان پر اچانک ٹوٹ پڑنا اور ان کی حالت غفلت میں ان کو قتل کردینا، نیز ان کے مال و اسباب پر قبضہ کرلینا جائز ہے۔

میدان جنگ سے متعلق ایک فوجی حکم

⑩ وَعَنْ اَبِيْ اُسَيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَنَا يَوْمَ بَدْرٍ حِيْنَ صَفَفْنَا لِقُرَيْشٍ وَصَفُّوْا لَنَا اِذَا اَكْثَبُوْكُمْ فَعَلَيْكُمْ بِالنَّبْلِ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِذَا اَكْثَبُوْكُمْ فَارْمُوْهُمْ وَاسْتَبْقُوْا نَبْلَكُمْ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَحَدِيْثُ سَعْدٍ هَلْ تُنْصَرُوْنَ سَنَذْكُرُ فِيْ بَابِ فَضْلِ الْفُقَرَاءِ وَحَدِيْثُ الْبَرَاءِ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَهْطًا فِيْ بَابِ الْمُعْجِزَاتِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت ابو اسیدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر کے دن (میدان جنگ میں) جب کہ ہم قریش کے خلاف اور قریش مکہ ہمارے خلاف صف آراء ہو گئے تو ہمیں، یہ حکم دیا کہ "جب وہ (دشمن یعنی قریش مکہ) تمہارے (اتنے) قریب آجائیں (کہ تمہارے تیر ان تک پہنچ

سکیں) تو ان پر تیر چلاؤ جب وہ تمہارے قریب آجائیں اور اپنے تیروں کو باقی رکھو یعنی اپنے سب تیر ختم نہ کر ڈالو بلکہ ان کو احتیاط کے ساتھ استعمال کر کے کچھ باقی بھی رکھو تاکہ دشمن تمہارے نہتے ہونے کا فائدہ اٹھا کر تم پر غالب نہ آجائے۔" (بخاری)

وَحَدِيْثُ سَعْدٍ هَلْ تُنْصَرُوْنَ سَنَذْكُرُ فِيْ بَابِ فَضْلِ الْفُقَرَاءِ وَحَدِيْثُ الْبَرَاءِ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَهْطًا فِيْ بَابِ الْمُعْجِزَاتِ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت سعدؓ کی روایت هَلْ تُنْصَرُوْنَ باب فضل الفقراء میں اور حضرت براء کی روایت بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَهْطًا باب المعجزات میں ہم انشاء اللہ، ذکر کریں گے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

میدان جنگ میں لشکر کی تیاری

(۱۱) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ عَبَّانَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَدْرٍ لَيْلًا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت عبد الرحمٰن ابن عوفؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بدر میں ہمیں رات کو تعبیہ کیا۔" (ترمذی)

تشریح: تَعْبِیَۃٌ کے لغوی معنی ہیں "تیار کرنا" لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے غزوۂ بدر کے موقع پر جنگ شروع ہونے سے پہلے رات میں اپنے لشکر کو باں طور تیار و مرتب کیا کہ مجاہدین اسلام کے بدن پر ہتھیار لگائے، ان کی صفیں قائم کیں اور ہر ایک مجاہد کو اپنے اپنے مقام پر جمایا یعنی جس کو جس جگہ مناسب سمجھا وہاں کھڑا کر کے بتایا کہ دن میں جب جنگ شروع ہو تو ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اسی طرح قائم رہے۔

مجاہدین اسلام کے لئے امتیازی علامات

(۱۲) وَعَنِ الْمُهَلَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنْ بَيَّتَكُمُ الْعَدُوُّ فَلْيَكُنْ شِعَارُكُمْ حٰمٓ لَا يُنْصَرُوْنَ۔

(رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت مہلبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (غزوۂ خندق میں) ہم سے فرمایا کہ اگر دشمن تم پر شبخون مارے تو تمہاری (یعنی مسلمانوں کی) علامت حٰمٓ لَا يُنْصَرُوْنَ کے الفاظ ہونے چاہئیں۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: فوجی اور جنگی قواعد وضوابط میں عام طور سے یہ معمول ہوتا ہے کہ فوجیوں کے لئے کچھ مخصوص علامتیں اور نشان متعین کر دیئے جاتے ہیں جن سے موافق و مخالف کے درمیان امتیاز کیا جا سکے، یہ علامتیں غیر لفظی نشانات کی صورتوں میں بھی متعین ہوتی ہیں جو فوجیوں کے بدن اور وردیوں پر لگائے جاتے ہیں اور لفظی اشارات کی صورت میں بھی ہوتی ہیں جن کو زبان سے ادا کر کے اپنی حیثیت و حقیقت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سربراہ لشکر کی طرف سے اپنے لشکر والوں کو پہلے سے یہ بتا دیا جاتا ہے کہ اگر میدان جنگ میں یا کسی اور موقع پر تم سے پوچھا جائے کہ تم کون ہو تو یہ فلاں لفظ اپنی زبان سے ادا کرنا تاکہ اگر پوچھنے والا اپنے ہی لشکر کا فرد ہو تو تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ خاص طور پر شبخون مارے جانے کے وقت جب کہ عام افراتفری کا عالم ہوتا ہے اور اس موقع پر اپنے اور غیروں کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے اور اکثر اشتباہ ہو جاتا ہے ایسی علامات اور اشاراتی الفاظ کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کل کی رائج الوقت اصطلاحات میں ایسے اشاراتی الفاظ کو انگریزی میں "کوڈ ورڈ" (code werd) کہتے ہیں۔ لہٰذا غزوۂ حنین کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ کو دشمن کی طرف سے شبخون مارے جانے کا خطرہ پیدا ہوا تو آپ نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ وہ ایسی حالت میں اپنی

علامت حٰمٓ لَا یُنْصَرُوْنَ کے الفاظ کو قرار دیں تاکہ اس کے ذریعہ یہ پہچانا جائے کہ کون مسلمان ہے اور کون کافر ہے۔ ان الفاظ کے معنی یہ ہیں (اے حم کے اتارنے والے! دشمنوں کو کوئی مدد کو نہ ملے۔

(۱۳) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ شِعَارُ الْمُهَاجِرِيْنَ عَبْدُ اللّٰهِ وَشِعَارُ الْاَنْصَارِ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سمرہ ابن جندب کہتے ہیں کہ (کسی اور غزوے میں) لفظ "عبداللہ" تو مہاجرین کی علامت تھی اور لفظ "عبدالرحمٰن" انصار کی علامت تھی۔" (ابوداؤد)

(۱۴) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ اَبِيْ بَكْرٍ فِيْ زَمَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَيَّتْنَاهُمْ نَقْتُلُهُمْ وَكَانَ شِعَارُنَا تِلْكَ اللَّيْلَةَ اَمِتْ اَمِتْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سلمہ ابن اکوع کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں ہم نے (ایک مرتبہ) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ (یعنی انکی سربراہی میں) جہاد کیا، چنانچہ ہم نے ان (دشمنوں) پر شبخون مارا اور ان کو قتل کیا اور اس رات میں ہماری شناختی علامت امت امت کے الفاظ تھے (ان الفاظ کے معنی ہیں "اے اللہ! دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔" (ابوداؤد)

صحابۂ کرامؓ جنگ کے وقت شور و شغب ناپسند کرتے تھے

(۱۵) وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عُبَادٍ قَالَ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُوْنَ الصَّوْتَ عِنْدَ الْقِتَالِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت قیس ابن عبادؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ (میدان جنگ میں) لڑائی کے وقت (اللہ کا نام لینے کے علاوہ) آواز کے (شور و شغب) کو ناپسند کرتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: فوجیوں کی عام عادت ہوتی ہے کہ وہ میدان جنگ میں لڑائی کے وقت شور و شغب چیخ و پکار اور بے مقصد نعرہ بازی کرتے ہیں اور اپنی شجاعت و بہادری کے نعرے بلند کرتے ہیں تاکہ دشمن پر ہیبت و رعب پڑے لیکن صحابہؓ اس بات کی کوئی حقیقت نہیں جانتے تھے بلکہ وہ صرف اللہ کا نام بلند کرتے تھے (یعنی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا کرتے تھے) اور اگر انکے منہ سے آواز بلند ہوتی تھی تو وہ صرف ذکر الٰہی پر مشتمل ہوتی تھی کیونکہ در حقیقت صرف اللہ ہی کا نام بلند کرنے میں دنیا و آخرت کی مطلب بر آری ہے۔

دشمن کے بڑی عمر والوں کو قتل کرو اور چھوٹوں کو باقی رکھو

(۱۶) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اقْتُلُوْا شُيُوْخَ الْمُشْرِكِيْنَ وَاسْتَحْيُوْا شَرْخَهُمْ اَيْ صِبْيَانَهُمْ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مشرکین (یعنی دشمنوں) کے بڑی عمر والے لوگوں کو قتل کرو اور چھوٹی عمر والوں یعنی ان (دشمنوں) کے بچوں کو زندہ رہنے دو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "بڑی عمر والوں" سے مراد یا تو وہ نوجوان ہیں جو بچوں کے مقابلے میں بڑے ہوتے ہیں یا وہ بڈھے مراد ہیں جو مضبوط قویٰ کے مالک ہوں اور لڑنے کی طاقت و قوت رکھتے ہوں۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، شیخ فانی (یعنی بڈھے کھوسٹ) کو قتل کرنا درست نہیں ہے۔ جو شیخ فانی جنگ میں اپنی عقل اور اپنی رائے کو مؤثر رکھتا ہو اور دشمن، لڑائی میں اس کی بتائی ہوئی تدبیروں پر عمل کرتا ہو تو اس کو قتل کرنا جائز ہے۔

دشمن کے شہر اور ان کے کھیت کھلیان وغیرہ کو جلاڈالنا جائز ہے

⑰ وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ حَدَّثَنِيْ أُسَامَةُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عَهِدَ إِلَيْهِ قَالَ أَغِرْ عَلٰى أُبْنٰى صَبَاحًا وَحَرِّقْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عروہؒ کہتے ہیں کہ حضرت اسامہؓ نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ (جب رسول کریم ﷺ نے ان (اسامہؓ) کو (ایک لشکر کا امیر بنا کر جہاد کے لئے بھیجا تو) یہ ہدایت وتاکید کی کہ "تم ابنا پر صبح کے وقت دھاوا بول دینا اور (دشمن کے گھربار، کھیت کھلیان، اور درخت وباغات کو) جلاڈالنا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اُبنا ایک آبادی کا نام ہے۔ جو ملک شام میں واقع تھی، اور جہاں حضرت اسامہؓ ابن زید کو مجاہدین اسلام کا سردار بنا کر جہاد کے لئے بھیجا گیا تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام کے دشمنوں کے شہروں کو تاخت وتاراج کر دینا، ان کے گھربار، کھیت کھلیان اور درخت وباغات کو جلادینا جائز ہے۔

دشمن پر اس وقت حملہ کرو جب وہ بالکل قریب آجائے

⑱ وَعَنْ أَبِيْ أُسَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ بَدْرٍ إِذَا أَكْثَبُوْكُمْ فَارْمُوْهُمْ وَلَا تَسُلُّوا السُّيُوْفَ حَتّٰى يَغْشُوْكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابواسیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جنگ بدر کے دن (مجاہدین اسلام سے) فرمایا کہ (میدان جنگ میں) جب کفار (یعنی دشمن) تمہارے بالکل قریب آجائیں تو ان پر تیر چلانا اور تلوار اس وقت تک نیام سے نہ کھینچنا جب تک کہ وہ تمہارے بالکل قریب نہ پہنچ جائیں۔" (ابوداؤدؒ)

دشمن کے مزدوروں کو قتل کرنے کی ممانعت

⑲ وَعَنْ رَبَاحِ بْنِ الرَّبِيْعِ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةٍ فَرَأَى النَّاسَ مُجْتَمِعِيْنَ عَلٰى شَيْءٍ فَبَعَثَ رَجُلًا فَقَالَ انْظُرْ عَلٰى مَا اجْتَمَعَ هٰؤُلَاءِ فَجَاءَ فَقَالَ عَلَى امْرَأَةٍ قَتِيْلٍ فَقَالَ مَا كَانَتْ هٰذِهٖ لِتُقَاتِلَ وَعَلَى الْمُقَدَّمَةِ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ فَبَعَثَ رَجُلًا فَقَالَ قُلْ لِخَالِدٍ لَا تَقْتُلِ امْرَأَةً وَلَا عَسِيْفًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت رباح ابن ربیعؓ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک غزوے میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ (میدان جنگ میں تھے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ کچھ لوگ (ایک جگہ) کسی چیز کے پاس جمع ہو رہے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا اور فرمایا کہ وہاں جا کر دیکھو، لوگ کس چیز کے پاس جمع ہو رہے ہیں، اس شخص نے واپس آکر عرض کیا کہ ایک عورت کو قتل کر دیا گیا ہے، لوگ اس (کی نعش) کے پاس جمع ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا "وہ عورت تو نہیں لڑ رہی تھی (پھر اس کو کیوں قتل کر دیا گیا؟")۔ لشکر کی اگلی صفوں کی کمان حضرت خالد ابن ولیدؓ کے سپرد تھی، آپ ﷺ نے پھر اس شخص کو (ان کے پاس) بھیجا کہ وہ جا کر خالدؓ سے یہ کہہ دے کہ "کسی عورت اور مزدور کو قتل نہ کرو۔" (ابواودؒ)

تشریح: "مزدور" سے مراد وہ مزدور ہے جس کو میدان جنگ میں لڑنے کے لئے نہ لایا گیا ہو بلکہ خدمت اور دوسرے کام کاج کے لئے لایا گیا ہو۔

مجاہدین کو میدان جنگ بھیجتے وقت آنحضرت ﷺ کی ہدایات

(۲۰) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ انْطَلِقُوْا بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا وَلَا طِفْلًا صَغِيْرًا وَلَا امْرَأَةً وَلَا تَغُلُّوْا وَضُمُّوا غَنَائِمَكُمْ وَ اَصْلِحُوْا وَاَحْسِنُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجاہدین کو (جہاد کے لئے روانہ کرتے وقت) یہ ہدایت دیں کہ "جاؤ! اللہ کا نام لے کر، اللہ کی تائید وتوفیق کے ساتھ اور اللہ کے رسول ﷺ کے دین پر، یہاں سے کوچ کرو! (یاد رکھو!) شیخ فانی (یعنی بڈھے کھوسٹ) کی جان نہ مارنا، نہ چھوٹے لڑکے اور نہ عورت کو قتل کرنا، مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا، مال غنیمت کو جمع کرنا، آپس میں صلح صفائی رکھنا (اصلحوا کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ ہم مجاہدین اپنے آپس کے تنازعات کو ختم کرکے ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ سے رہنا یا یہ معنی ہیں کہ اگر تم مصلحت دیکھو تو دشمن سے صلح کر لینا اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اپنے دینی اور دنیاوی معاملات کو ٹھیک ٹھاک رکھنا) اور آپس میں (ایک دوسرے کے ساتھ) نیکی و بھلائی کرتے رہنا کیونکہ اللہ تعالٰی نیکی اور بھلائی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "شیخ فانی کی جان نہ مارنا" لیکن اگر کوئی بڈھا لڑنے کی صلاحیت رکھتا ہو یا اس کی رائے اور اس کی جنگی تدابیر دشمن کے لئے نفع بخش اور مؤثر ہوں تو اس کی جان مارنا جائز ہے

"طفلا صغیرا" میں "صغیرا" بدل اور بیان ہے لفظ "طفلا" یعنی وہ لڑکا جو حد بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔ اس حکم سے وہ لڑکا مستثنیٰ ہے جو دشمن کی قوم کا بادشاہ و سردار ہو یا جنگ میں حصہ لیتا ہو، اسی طرح سے عورت کو قتل کرنا ممنوع ہے، جو لڑائی میں شریک نہ ہو اور نہ اپنی قوم کی ملکہ اور جنگی معاملات میں رائے اور تدبیر پیش کرنے والی ہو۔

بدر کے میدان جنگ میں زعماء مکہ کی دعوت مبارزت

(۲۱) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ بَدْرٍ تَقَدَّمَ عُتْبَةُ بْنُ رَبِيْعَةَ وَتَبِعَهُ ابْنُهُ وَاَخُوْهُ فَنَادٰى مَنْ يُبَارِزُ فَانْتَدَبَ لَهُ شَبَابٌ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ مَنْ اَنْتُمْ فَاَخْبَرُوْهُ فَقَالَ لَا حَاجَةَ لَنَا فِيْكُمْ اِنَّمَا اَرَدْنَا بَنِيْ عَمِّنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُمْ يَا حَمْزَةُ قُمْ يَا عَلِيُّ قُمْ يَا عُبَيْدَةُ بْنُ الْحَارِثِ فَاَقْبَلَ حَمْزَةُ اِلٰى عُتْبَةَ وَاَقْبَلْتُ اِلٰى شَيْبَةَ وَاخْتَلَفَ بَيْنَ عُبَيْدَةَ وَالْوَلِيْدِ ضَرْبَتَانِ فَاَثْخَنَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا صَاحِبَهُ ثُمَّ مِلْنَا عَلَى الْوَلِيْدِ فَقَتَلْنَاهُ وَاحْتَمَلْنَا عُبَيْدَةَ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کہتے ہیں کہ جب معرکہ بدر کا دن آیا (اور میدان جنگ میں مجاہدین اسلام اور کفار مکہ، ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہو گئے تو (کفار مکہ میں سے) ابن ربیعہ (لڑنے کے لئے صف میں سے نکل کر) آگے بڑھا، اس کا بھائی (یعنی شیبہ ابن ربیعہ) بھی آیا، عتبہ نے پکار کر کہا "کون ہے جو (ہمارے مقابلہ پر) لڑنے کے لئے میدان میں آئے؟ (مجاہدین اسلام کی جانب سے) اس کا جوب انصار کے کئی جوانوں نے دیا (یعنی وہ عتبہ اور اس کے ساتھیوں سے لڑنے کے لئے صف میں سے نکل کی میدان میں آئے) عتبہ نے (ان کو دیکھا تو) پوچھا کہ "تم کون ہو؟" ان جوانوں نے عتبہ کو بتایا کہ ہم (مدینہ کے) انصار ہیں، عتبہ نے کہا کہ "ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے (یعنی ہم تمہارے ساتھ لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے) بلکہ تو اپنے چچا کے بیٹوں (یعنی مکہ سے ہجرت کرکے چلے جانے والے قریشی مسلمانوں) سے لڑنا چاہتے ہیں۔" (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ نے (اپنی صف کی طرف مخاطب ہو کر) فرمایا "حمزہؓ! تم کھڑے ہو جاؤ، علیؓ! تم کھڑے ہو جاؤ) عبیدہ ابن حارث! تم کھڑے ہو جاؤ (اور آگے بڑھ کر ان نشہ طاقت کے سرمستوں کا سر غرور و تکبر کچل دو)" چنانچہ حمزہؓ عتبہ کے مقابلہ پر گئے (اور اس کو مار ڈالا) میں (یعنی علیؓ) شیبہ کے مقابلہ پر گیا (اور اس کو مار ڈالا اور عبیدہؓ و ولید کے درمیان دو سخت وار ہوئے اور ان میں سے ایک

نے اپنے مقابل کو زخمی اور نڈھال کر دیا، پھر ہم نے ولید پر حملہ کیا اور اس کو مار ڈالا اور عبیدہؓ کو (جو ولید کے وار سے سخت زخمی ہو گئے تھے معرکہ کے میدان سے) اٹھا لائے۔" (احمد، ابوداؤد)

نئی کمک لانے کی غرض سے میدان جنگ سے بھاگ آنا جائز ہے

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَرِيَّةٍ فَحَاصَ النَّاسُ حَيْصَةً فَاَتَيْنَا الْمَدِيْنَةَ فَاخْتَفَيْنَا بِهَا وَ قُلْنَا هَلَكْنَا ثُمَّ اَتَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ نَحْنُ الْفَرَّارُوْنَ قَالَ بَلْ اَنْتُمُ الْعَكَّارُوْنَ وَاَنَا فِئَتُكُمْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ دَاوُدَ نَحْوُهُ وَقَالَ لَا بَلْ اَنْتُمُ الْعَكَّارُوْنَ قَالَ فَدَنَوْنَا فَقَبَّلْنَا يَدَهُ فَقَالَ اَنَا فِئَةُ الْمُسْلِمِيْنَ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ اُمَيَّةَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ كَانَ يَسْتَفْتِحُ وَحَدِيْثُ اَبِي الدَّرْدَاءِ اَبْغُوْنِيْ فِيْ ضُعَفَائِكُمْ فِيْ بَابِ فَضْلِ الْفُقَرَاءِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے (کسی جگہ جہاد کرنے کے لئے) ہمارا ایک لشکر بھیجا (وہاں پہنچ کر ہمارے لشکر کے) لوگ بھاگ کھڑے ہوئے، چنانچہ ہم مدینہ واپس آئے تو (مارے شرم وندامت کے) اپنے گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور ہم نے (آپس میں اپنے دل میں) کہا کہ "دشمنوں کے مقابلہ سے بھاگ کر ہم نے جو گناہ کیا ہے اس کی وجہ سے گویا" ہم تو ہلاک ہو گئے پھر ہم رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کیا کہ (یارسول اللہ ﷺ) ہم تو میدان چھوڑ کر بھاگ آنے والے لوگ ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا کے "(نہیں) بلکہ تم دوبارہ حملہ کرنے والے لوگ ہو اور میں تمہاری جماعت ہوں۔" (ترمذیؒ)

اور ابوداؤد نے بھی ایسی روایت نقل کی ہے۔ اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ "نہیں" بلکہ تم دوبارہ حملہ کرنے والے لوگ ہو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں (جب ہم نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم سے کوئی جواب طلب کرنے یا کوئی سرزنش کرنے کے بجائے اس شفقت آمیز انداز میں ہماری ہمت بڑھائی ہے تو فرط عقیدت و محبت سے) ہم آپ ﷺ کے قریب پہنچے۔ اور آپ ﷺ کے دست مبارک کا بوسہ لیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "میں مسلمانوں کی جماعت ہوں۔"

تشریح: "عکر" کے معنی ہیں "لوٹنا" جنگ میں واپس چلے جانا" اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی لشکر اپنی کمزوری محسوس کرتا ہو اور وہ دشمن کے مقابلہ سے اس نیت کے ساتھ بھاگ آئے کہ اپنے مرکز سے نئی کمک اور نئی مدد لے کر پھر میدان جنگ میں آئیں گے تو یہ گناہ نہیں اور چونکہ تم لوگ اسی نیت کے ساتھ میدان جنگ سے بھاگے ہو اس لئے ندامت اور شرمندگی محسوس کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

"میں مسلمانوں کی جماعت ہوں" آپ ﷺ نے اپنی عظمت و برکت کی بناء پر اپنی تنہا ذات شریف کو ایک پوری جماعت قرار دیا جیسا کہ قران مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً، نیز آپ ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ گویا اپنی مرکزیت کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ میری ذات مسلمانوں کے لئے منبع قوت وطاقت ہے، جہاں سے انہیں مدد ونصرت حاصل ہوتی ہے لہٰذا اے ابن عمرؓ تم اس عارضی پسپائی سے ہراساں اور دل گرفتہ نہ ہو، میں تمہارا بھی مددگار و حامی اور ناصر ہوں

وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ اُمَيَّةَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ كَانَ يَسْتَفْتِحُ وَحَدِيْثُ اَبِي الدَّرْدَاءِ اَبْغُوْنِيْ فِيْ ضُعَفَائِكُمْ فِيْ بَابِ فَضْلِ الْفُقَرَاءِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور امیہ ابن عبداللہ کی روایت كَانَ يَسْتَفْتِحُ اور ابودرداءؓ کی روایت ابْغُوْنِيْ فِيْ ضُعَفَائِكُمْ ہم انشاء اللہ فضل الفقراء کے باب میں ذکر کریں گے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

غزوۂ طائف میں منجنیق کا استعمال

(۲۳) عَنْ ثَوْبَانَ بْنِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَصَبَ الْمَنْجَنِيْقَ عَلٰى اَهْلِ الطَّائِفِ۔ (رواہ الترمذی مرسلا)

"اور حضرت ثوبان ابن یزید سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل طائف کے مقابلہ پر منجنیق نصب کی۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: قدیم آلات حرب میں "منجنیق" کی حیثیت آج کل کی گولے پھینکنے والی توپ کی سی تھی۔ چنانچہ یہ ایک ایسی دستی مشین تھی جس سے بڑے بڑے پتھر پھینکے جاتے تھے۔ بطور خاص جب کسی قلعہ وغیرہ کا محاصرہ کیا جاتا تو اس پر منجنیق کے ذریعہ پتھر برسائے جاتے تھے۔

"طائف" آج بھی حجاز کا ایک بڑا شہر ہے جو مکہ مکرمہ سے اصلاتو ۴۰۔۴۵ میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق میں واقع ہے لیکن ابھی کچھ دنوں پہلے تک وہاں پہنچنے کے لئے ایسا کوئی سیدھا راستہ نہیں تھا جس سے گاڑیاں آجا سکیں اور پختہ یا خام سڑک ہو، مکہ مکرمہ سے طائف کے لئے جو سڑک گئی تھی وہ پہاڑوں کا چکر کھاتی ہوئی جاتی تھی اس لئے یہ راستہ طویل ہو جاتا تھا اس راستہ سے مکہ مکرمہ سے طائف کا فاصلہ ۸۵ میل بتایا جاتا ہے، اسی راستہ میں منی وعرفات ملتے ہیں اور محققین کے نزدیک یہی وہ راستہ تھا جس سے آنحضرت ﷺ ابتداء میں تبلیغ کی غرض سے طائف تشریف لے گئے تھے۔

موجودہ طائف سے ڈھائی تین میل کے فاصلے پر جنوب مغرب کی طرف ایک چھوٹی سی بستی "مثناۃ" ہے، یہ طائف ہی کا ایک حصہ سمجھی جاتی ہے، یہ بستی اس جگہ بتائی جاتی ہے جس کے قریب آنحضرت ﷺ کے زمانے میں اصل طائف آباد تھا۔

یہاں ذوباغوں میں دو چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنی ہوئی ہیں ان میں سے ایک کو مسجد علی کہتے ہیں اور دوسرے کو مسجد الجعشی، ان دونوں مسجدوں کے درمیان ایک وادی ہے جو وادی اوج کہلاتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے غزوۂ طائف میں طائف کا محاصرہ اسی جگہ فرمایا تھا اور غالبا یہی وہ جگہ ہے جہاں آپ ﷺ نے منجنیق نصب کی تھی۔

بَابُ حُكْمِ الْاُسَرَاءِ

قیدیوں کے احکام کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

وہ کفار قیدی جو جنت میں داخل ہوں گے

(۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عَجِبَ اللّٰهُ مِنْ قَوْمٍ يُدْخَلُوْنَ الْجَنَّةَ فِي السَّلَاسِلِ وَفِيْ رِوَايَةٍ يُقَادُوْنَ اِلَى الْجَنَّةِ بِالسَّلَاسِلِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ اس قوم پر تعجب کرتا ہے یعنی ان لوگوں سے خوش ہوتا ہے جو زنجیروں میں بندھے ہوئے جنت میں داخل ہوتے ہیں۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے خوش ہوتا ہے) جو زنجیروں میں باندھ کر جنت کی طرف لے جائے جاتے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کفار (دشمن) کے جو لوگ جہاد وغیرہ کے موقع پر قیدی بنائے جاتے ہیں اور ان کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر دار الاسلام میں لایا جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ ان کو ایمان نصیب فرماتا ہے تو ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا اس اعتبار سے اگرچہ ان کے دخول جنت کا سبب ان کا ایمان قبول کر لینا ہے لیکن ظاہر میں گویا وہ زنجیروں اور بیڑیوں میں باندھ کر جنت میں داخل کئے گئے ہیں۔

دشمن کے جاسوس کو قتل کرنے کا حکم

(۲) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَيْنٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَهُوَ فِيْ سَفَرٍ فَجَلَسَ عِنْدَ اَصْحَابِهٖ يَتَحَدَّثُ ثُمَّ انْفَتَلَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اطْلُبُوْهُ وَاقْتُلُوْهُ فَقَتَلْتُهٗ فَنَفَّلَنِيْ سَلَبَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سلمہ ابن اکوع کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) مشرکین، (دشمن) کا ایک جاسوس نبی کریم ﷺ کے پاس آیا جب کہ آپ ﷺ سفر کے دوران تھے، چنانچہ اس جاسوس نے (ٹوہ لینے کے لئے) آنحضرت ﷺ کے صحابہ کے پاس بیٹھ کر باتیں کیں اور پھر چلا گیا، نبی کریم ﷺ کو جب اس کے بارے میں معلوم ہوا تو (آپ ﷺ) نے فرمایا "اس کو تلاش کرو اور قتل کر ڈالو" چنانچہ میں نے اس کو (ڈھونڈھ نکالا اور) قتل کر ڈالا، آنحضرت ﷺ نے اس کا سامان واسباب مجھے مرحمت فرمایا۔" (بخاری ومسلم)

(۳) وَعَنْهُ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَوَازِنَ فَبَيْنَا نَحْنُ نَتَضَحّٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَآءَ رَجُلٌ عَلٰى جَمَلٍ اَحْمَرَ فَاَنَاخَهٗ وَجَعَلَ يَنْظُرُ وَفِيْنَا ضَعْفَةٌ وَرِقَّةٌ مِنَ الظَّهْرِ وَبَعْضُنَا مُشَاةٌ اِذْ خَرَجَ يَشْتَدُّ فَاَتٰى جَمَلَهٗ فَاَثَارَهٗ فَاشْتَدَّ بِهِ الْجَمَلُ فَخَرَجْتُ اَشْتَدُّ حَتّٰى اَخَذْتُ بِخِطَامِ الْجَمَلِ فَاَنَخْتُهٗ ثُمَّ اخْتَرَطْتُ سَيْفِيْ فَضَرَبْتُ رَاْسَ الرَّجُلِ ثُمَّ جِئْتُ بِالْجَمَلِ اَقُوْدُهٗ وَعَلَيْهِ رَحْلُهٗ وَسِلَاحُهٗ فَاسْتَقْبَلَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسُ فَقَالَ مَنْ قَتَلَ الرَّجُلَ قَالُوا ابْنُ الْاَكْوَعِ قَالَ لَهٗ سَلَبُهٗ اَجْمَعُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سلمہ ابن اکوع کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ (قبیلہ قیس کی ایک شاخ) ہوازن کے خلاف جہاد میں شریک تھے، (ایک دن) اس وقت جب کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے، اچانک ایک شخص جو (دشمن کا جاسوس تھا اور) سرخ اونٹ پر سوار تھا آیا، اس نے اونٹ کو بٹھادیا اور (ادھر ادھر) دیکھنے لگا (یعنی وہ ہماری حالت وکیفیت کی ٹوہ لینے لگا) اس وقت ہم (اپنی خستہ حالی اور پیادہ پائی کی وجہ سے) بہت نڈھال ہو رہے تھے، ہمارے پاس سواریوں کی کمی تھی اور ہم میں سے بعض لوگ پیدل تھے۔ چنانچہ (جب اس شخص نے ہماری اس کمزوری کا اندازہ لگا لیا کہ ہم سواریوں کی کمی اور اپنی خستہ حالی کی وجہ سے سخت پریشان اور نڈھال ہیں تو دشمن کو اس کی اطلاع دینے کے لئے) وہ اچانک (ہمارے درمیان سے) دوڑتا ہوا نکلا اور اپنے اونٹ کے پاس پہنچ کر (اس پر سوار ہونے کے بعد) اس کو کھڑا کیا اور وہ اونٹ اس کو لے کر تیزی سے دوڑنے لگا، میں (نے جب یہ صورت حال دیکھی تو میں بھی اپنے لوگوں کے درمیان سے نکلا اور (اس شخص کے پیچھے) دوڑا یہاں تک کہ میں نے (اس کو جالیا اور) اونٹ کی مہار پکڑ لی اور اس کو بٹھادیا اور پھر اپنی تلوار سونت کر اس شخص کے سر پر (بھرپور) وار کیا (جس سے اس کا کام تمام ہو گیا) اس کے بعد اونٹ کو، جس پر اس شخص کا سامان اور اس کے ہتھیار تھے، کھینچتا ہوا لایا، جب رسول کریم ﷺ اور دوسرے لوگ میرے سامنے آئے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس شخص کو کس نے قتل کیا ہے؟" صحابہ نے کہا کہ "سلمہ ابن اکوع نے!" آپ ﷺ نے فرمایا "اس سارے سامان کے حقدار یہی (سلمہ) ہیں۔" (بخاری ومسلم)

مدینہ کے عہد شکن یہودیوں کے متعلق فیصلہ

(۴) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ بَنُوْ قُرَيْظَةَ عَلٰى حُكْمِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَآءَ عَلٰى حِمَارٍ فَلَمَّا دَنَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُوْمُوْا اِلٰى سَيِّدِكُمْ فَجَآءَ فَجَلَسَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰؤُلَآءِ نَزَلُوْا عَلٰى حُكْمِكَ قَالَ فَاِنِّيْ اَحْكُمُ اَنْ تُقْتَلَ الْمُقَاتِلَةُ وَاَنْ تُسْبَى الذُّرِّيَّةُ

قَالَ لَقَدْ حَكَمْتَ فِيهِمْ بِحُكْمِ الْمَلِكِ وَفِي رِوَايَةٍ بِحُكْمِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ جب (مدینہ میں آباد) بنو قریظہ (کے یہودی) حضرت سعد ابن معاذؓ کو حکم تسلیم کرلینے پر اتر آئے (یعنی وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ سعد ابن معاذؓ جو فیصلہ کریں گے ہم اس کو تسلیم کرلیں گے، تو رسول کریم ﷺ نے حضرت سعد ؓ کو بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا، سعد ابن معاذؓ ایک گدھے پر سوار ہو کر آئے اور جب وہ قریب پہنچے تو رسول کریم ﷺ نے (حاضرین سے) کہا کہ "تم لوگ اپنے سردار کی تعظیم یا ان کی مدد" کے لئے کھڑے ہو جاؤ" سعد ابن معاذؓ (آپ ﷺ کے قریب) آکر بیٹھ گئے تو رسول کریم ﷺ نے (ان کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ "یہ لوگ (یعنی بنو قریظہ کے یہودی) تمہیں حَکَم ماننے پر راضی ہو گئے ہیں۔" سعد ابن معاذؓ نے کہا کہ "میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ ان (یہودیوں) میں سے جو لوگ لڑنے (کی صلاحیت رکھنے) والے ہیں ان کو قتل کر دیا جائے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے۔" آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا "تم نے ان کے بارے میں بادشاہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے یعنی تم نے ایسا فیصلہ کیا ہے جس سے اللہ تعالیٰ بھی راضی ہے) اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے"۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ بڑے اونچے درجہ کے صحابیؓ اور مشاہیر انصار میں سے ہیں، مدینہ کے انصار ان کو اپنا سردار اور بڑا مانتے تھے۔

"بنو قریظہ" مدینہ کے یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا، یہ قبیلہ حضرت سعد ابن معاذؓ کا حلیف اور اس کے یہودی ان کے عہد و امان میں تھے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ پہنچ کر وہاں کے قبائل یہود سے ایک باہمی معاہدہ کیا تھا جس کے تحت یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان، باہمی میل ملاپ کے ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کے شہری اور سیاسی حقوق و مفادات کے تحفظ کے معاملات طے پائے تھے لیکن یہودیوں نے کچھ ہی دنوں بعد اس معاہدہ کو بالائے طاق رکھ دیا، اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور ان کو نقصان پہنچانے کے اقدامات میں مشغول ہو گئے، چنانچہ دوسرے یہودی قبائل کی طرح "بنو قریظہ" بھی اس عہد شکنی کے مرتکب ہوئے اور آنحضرت ﷺ نے ۵ھ میں غزوۂ خندق کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان (بنو قریظہ) کے خلاف جہاد کا ارادہ کیا اور ان کا محاصرہ کر لیا، اور یہ محاصرہ پچیس ۲۵ روز تک جاری رہا جب بنو قریظہ بالکل مجبور ہو گئے تو انہوں نے کہا کہ سعد ابن معاذؓ ہمارے بارے میں جو فیصلہ کر دیں گے ہم اس کو منظور کریں گے، ان کا خیال تھا کہ چونکہ ہم سعدؓ کے حلیف اور ان کے عہد و امان میں ہیں اس لئے وہ ہماری رعایت کریں گے اور ہمیں اس محاصرہ سے نجات دلانے کی کوشش کریں گے، لیکن حضرت سعدؓ نے اس تعلق کا لحاظ کئے بغیر وہی فیصلہ دیا جو ان یہودیوں کے حسب حال اور مصلحت و حکمت کے عین مطابق تھا۔

"تم اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ" اس حکم کے بارے میں نوویؒ کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ صاحب فضل کی تعظیم و توقیر کی جائے اور اس کے آنے پر تعظیماً کھڑا ہو جانا چاہئے چنانچہ اکثر علماء نے اس مسئلہ میں اس ارشاد گرامی کو دلیل قرار دیا ہے، اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا یہ حکم حضرت سعدؓ کی تعظیم کرنے کی غرض سے نہیں تھا بلکہ اس بنا پر تھا کہ ان (سعدؓ) کی ران پر تیر کا زخم تھا جو غزوۂ خندق میں ان کو لگا تھا اور اس کی وجہ سے وہ سواری پر سے خود اترنے سے مجبور تھے، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جاؤ اور سواری پر سے اترنے میں سعدؓ کی مدد کرو۔

سردار یمامہ کے اسلام لانے کا واقعہ

⑤ وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْلًا قِبَلَ نَجْدٍ فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ مِنْ بَنِي حَنِيفَةَ يُقَالُ لَهُ ثُمَامَةُ بْنُ اُثَالٍ سَيِّدُ اَهْلِ الْيَمَامَةِ فَرَبَطُوْهُ بِسَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ فَخَرَجَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ فَقَالَ مَاذَا عِنْدَكَ يَا ثُمَامَةُ فَقَالَ عِنْدِيْ يَا مُحَمَّدُ خَيْرٌ اِنْ تَقْتُلْ تَقْتُلْ ذَادَمٍ وَ اِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلٰى شَاكِرٍ وَاِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْمَالَ فَسَلْ تُعْطَ مِنْهُ مَاشِئْتَ فَتَرَكَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى كَانَ الْغَدُ فَقَالَ لَهُ مَاعِنْدَكَ يَا ثُمَامَةُ فَقَالَ عِنْدِيْ مَا قُلْتُ لَكَ اِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلٰى شَاكِرٍ وَاِنْ تَقْتُلْ تَقْتُلْ ذَادَمٍ وَاِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْمَالَ فَسَلْ تُعْطَ مِنْهُ مَاشِئْتَ فَتَرَكَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى كَانَ بَعْدَ الْغَدِ فَقَالَ لَهُ مَا عِنْدَكَ يَاثُمَامَةُ؟ فَقَالَ عِنْدِيْ مَا قُلْتُ لَكَ اِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلٰى شَاكِرٍ وَاِنْ تَقْتُلْ تَقْتُلْ ذَادَمٍ وَاِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْمَالَ فَسَلْ تُعْطَ مِنْهُ مَا شِئْتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَطْلِقُوْا ثُمَامَةَ فَانْطَلَقَ اِلٰى نَخْلٍ قَرِيْبٍ مِنَ الْمَسْجِدِ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَفَقَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ يَا مُحَمَّدُ وَاللّٰهِ مَاكَانَ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ وَجْهٌ اَبْغَضَ اِلَيَّ مِنْ وَجْهِكَ فَقَدْ اَصْبَحَ وَجْهُكَ اَحَبَّ الْوُجُوْهِ كُلِّهَا اِلَيَّ وَاللّٰهِ مَاكَانَ مِنْ دِيْنٍ اَبْغَضَ اِلَيَّ مِنْ دِيْنِكَ فَاَصْبَحَ دِيْنُكَ اَحَبَّ الدِّيْنِ كُلِّهٖ اِلَيَّ وَاللّٰهِ مَاكَانَ مِنْ بَلَدٍ اَبْغَضَ اِلَيَّ مِنْ بَلَدِكَ فَاَصْبَحَ بَلَدُكَ اَحَبَّ الْبِلَادِ كُلِّهَا اِلَيَّ وَاِنَّ خَيْلَكَ اَخَذَتْنِيْ وَاَنَا اُرِيْدُ الْعُمْرَةَ فَمَاذَا تَرٰى فَبَشَّرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَمَرَهٗ اَنْ يَعْتَمِرَ فَلَمَّا قَدِمَ مَكَّةَ قَالَ لَهٗ قَائِلٌ اَصَبَوْتَ فَقَالَ لَا وَلٰكِنِّيْ اَسْلَمْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا وَاللّٰهِ لَا يَاتِيْكُمْ مِنَ الْيَمَامَةِ حَبَّةُ حِنْطَةٍ حَتّٰى يَاْذَنَ فِيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ (رواہ مسلم واختصرہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک لشکر کو (جہاد کرنے کے لئے) نجد کی طرف روانہ کیا، لشکر کے لوگ (قبیلہ) بنوحنیفہ کے ایک شخص کو پکڑ کر (مدینہ) لائے جس کا نام ثمامہ ابن اثال تھا اور جو شہر یمامہ کے لوگوں کا سردار تھا، اس شخص کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا (تاکہ وہ بھاگ نہ سکے) رسول کریم ﷺ اس کے پاس تشریف لائے اور اس سے پوچھا کہ "کہو ثمامہ! تمہارے پاس (کہنے سننے کو) کیا ہے؟ (یعنی بتاؤ تمہارا کیا حال ہے میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کس طرح کا سلوک کروں گا؟) ثمامہ نے کہا کہ "میرے پاس بھلائی ہی بھلائی ہے یا میرے پاس، بہت مال ہے، اگر آپ ﷺ (مجھ کو) قتل کریں گے تو ایک خون والے شخص کو قتل کریں گے (جو قتل ہی کئے جانے کا مستحق ہے، ان الفاظ کے ذریعہ گویا ثمام نے اپنی تقصیر کا اعتراف واقرار کیا، یا اس کے ان الفاظ کا یہ مطلب تھا کہ اگر آپ ﷺ مجھے قتل کردیں گے تو ایک ایسے شخص کو قتل کریں گے جس کا خون رائیگاں نہیں جائے گا کیونکہ میری قوم میرا خون معاف نہیں کرے گی بلکہ آپ سے بدلہ لے گی، اس صورت میں اس نے گویا اپنی امارت اور اپنی ریاست ووجاہت کا دعوی کیا) اور اگر آپ (مجھے باعزت رہائی دے کر میرے ساتھ) اچھا سلوک کریں گے تو ایک شخص کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے جو شکر گذار وقدردان ہے، (یعنی میں بھی اس اچھے سلوک کا آپ ﷺ کو بدلہ دوں گا) اور اگر آپ ﷺ مال چاہتے ہیں تو مانگئے، جتنا مال چاہیں گے دیا جائے گا۔" (یہ باتیں سن کر) آنحضرت ﷺ نے اس کو (اس کے حال پر) چھوڑ دیا جب دوسرا دن آیا تو آنحضرت ﷺ نے پھر اس سے پوچھا کہ (کہو ثمامہ! تمہارے پاس (کہنے سننے کو) کیا ہے؟" اس نے کہا کہ "میرے پاس وہی چیز ہے جو میں کہہ چکا ہوں کہ اگر آپ اچھا سلوک کریں گے تو ایک ایسے شخص کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے جو شکر گزار وقدردان ہے، اگر آپ قتل کریں گے تو ایک خون والے شخص کو قتل کریں گے اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو مانگئے جتنا مال چاہیں گے دیا جائے گا۔" آنحضرت ﷺ نے (اس دن بھی یہ سن کر) اس کو (اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور جب تیسرا دن آیا تو آپ ﷺ نے پھر اس سے پوچھا کہ (کہو ثمامہ تمہارے پاس کیا ہے؟" اس نے کہا کہ "میرے پاس وہی چیز ہے جو میں کہہ چکا ہوں کہ "اگر آپ اچھا سلوک کریں گے تو ایک ایسے شخص کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے جو شکر گذار وقدردان ہے، اگر قتل کریں گے تو ایک خون والے شخص کو قتل کریں گے اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو مانگئے، جتنا مال چاہیں گے دیا جائے گا، رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) حکم دیا کہ "ثمامہ کو رہا کر دیا جائے۔" چنانچہ (رہائی پانے کے بعد کچھ کہے سنے بغیر) کھجوروں کے ان درختوں (کے جھنڈ) میں چلا گیا جو مسجد نبوی ﷺ کے قریب تھے اور وہاں سے نہا دھو کر پھر مسجد نبوی میں آیا اور (آنحضرت ﷺ کے سامنے) کہا "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" یعنی میں (سچے دل کے اعتراف واقرار کے

ساتھ) گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور (پھر کہنے لگا کہ) اے محمد (ﷺ)! خدا کی قسم میرے نزدیک روئے زمین پر آپ ﷺ کے چہرے سے زیادہ نفرت انگیز کوئی چہرہ نہیں تھا لیکن اب آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک میرے نزدیک (دنیا کے) سارے چہروں سے زیادہ پیارا ہے، خدا کی قسم! میرے نزدیک آپ ﷺ کے دین سے زیادہ نفرت انگیز کوئی دین نہیں تھا لیکن اب آپ ﷺ کا دین میرے نزدیک سارے دینوں سے زیادہ پیارا ہے اور خدا کی قسم! میرے نزدیک آپ ﷺ کے شہر سے زیادہ نفرت انگیز کوئی شہر نہیں تھے لیکن اب میرے نزدیک آپ ﷺ کا شہر (دنیا کے) سارے شہروں سے زیادہ پیارا ہے۔ پھر (اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ!) آپ (ﷺ) کے لشکر نے مجھے اس وقت گرفتار کیا تھا جب کہ میں عمرہ (کرنے کے لئے مکہ جانے) کا ارادہ کر رہا تھا تو اب آپ (ﷺ) مجھ کو کیا حکم دیتے ہیں (آیا میں عمرہ کے لئے مکہ جاؤں یا نہیں؟)" رسول کریم ﷺ نے (پہلے تو) اس کو بشارت دی (کہ اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے تمہیں شرف و عظمت انسانیت حاصل ہو گئی ہے اور تمہارے پہلے سارے گناہ بخش دیئے گئے ہیں) اور پھر ان کو عمرہ کرنے کا حکم دیا۔

اس کے بعد ثمامہ جب (عمرہ کرنے کے لئے) مکہ پہنچے تو کسی کہنے والے نے ان سے کہا کہ "تم تو بے دین ہو گئے ہو"، ثمامہ نے جواب دیا کہ "نہیں! میں نے رسول کریم ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے، میں بے دین نہیں ہوا ہوں اور (یاد رکھو!) خدا کی قسم! اب یمامہ سے تم کو گیہوں کا ایک دانہ بھی نہیں بھیجا جائے گا جب تک کہ رسول کریم ﷺ اس کی اجازت نہ دیں۔" (مسلمؒ) اس روایت کو بخاریؒ نے بھی اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

جبیر ابن مطعمؓ کو آنحضرت ﷺ کی طرف سے ترغیب اسلام

⑥ وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ اُسَارٰى بَدْرٍ لَوْ كَانَ الْمُطْعِمُ بْنُ عَدِيٍّ حَيًّا ثُمَّ كَلَّمَنِيْ فِيْ هٰٓؤُلَاءِ النَّتْنٰى لَتَرَكْتُهُمْ لَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جبیر ابن مطعمؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں فرمایا کہ اگر مطعم ابن عدی زندہ ہوتے اور مجھ سے ان ناپاک قیدیوں کے حق میں سفارش کرتے، تو میں ان (قیدیوں) کو ان (مطعم) کی سفارش پر رہا کر دیتا۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت جبیرؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے جنگ بدر کے موقع پر کفار مکہ کے ساتھ تھے اور مسلمانوں کے مقابلے پر لڑ رہے تھے، جنگ کے بعد ان کفار میں سے جو لوگ قیدی بنا کر مدینہ لائے گئے ان میں حضرت جبیرؓ بھی تھے اس طرح حضرت جبیرؓ نے آنحضرت ﷺ سے یہ حدیث سنی تو کفر کی حالت میں، مگر اس کو بیان کیا اسلام قبول کرنے کے بعد۔

مطعم ابن عدی، حضرت جبیرؓ کے والد تھے اور نوفل ابن عبد مناف کا پوتا ہونے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے ہم جد قرابتی تھے، ان (مطعم) کا آنحضرت ﷺ پر ایک یہ احسان تھا کہ جب آنحضرت ﷺ تبلیغ اسلام کے لئے طائف تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس آئے تو مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو پھر اپنے نرغے میں لے کر نقصان پہنچانا چاہا مگر مطعم نے ان مشرکین کو آنحضرت ﷺ سے دور کیا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے جبیرؓ کے سامنے مذکورہ کلمات ارشاد فرمائے جس کا ایک بڑا مقصد جبیرؓ کی تالیف قلب اور ان کو اسلام کی طرف راغب کرنا تھا۔

حدیبیہ میں آنحضرت ﷺ پر حملے کا ارادہ کرنے والے کفار مکہ کو گرفتار کر کے چھوڑ دینے کا واقعہ

⑦ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ ثَمَانِيْنَ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ مَكَّةَ هَبَطُوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ جَبَلِ التَّنْعِيْمِ

مُتَسَلِّحِيْنَ يُرِيْدُوْنَ غِرَّةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابِهٖ فَاَخَذَهُمْ سِلْمًا فَاسْتَحْيَاهُمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَاَعْتَقَهُمْ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے سال) نبی کریم ﷺ کے خلاف مکہ کے اسی آدمی ہتھیاروں سے لیس ہو کر تنعیم کے پہاڑ سے اتر آئے جن کا ارادہ یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ پر اچانک حملہ کر کے ان کو نقصان پہنچائیں لیکن آنحضرت ﷺ نے (لڑے بھڑے بغیر) ان سب کو بے بس اور ذلیل کر کے گرفتار کر لیا اور پھر ان کو زندہ چھوڑ دیا۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ۔ "اور پھر ان کو رہا کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ اور وہ اللہ ایسا ہے جس نے نواح مکہ میں ان (کفار) کا ہاتھ تمہارے خلاف اور تمہارا ہاتھ ان کے خلاف بند رکھا۔" (مسلمؒ)

جنگ بدر کے بعد مقتولین مکہ سے آنحضرت ﷺ کا خطاب

⑧ وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ ذَكَرَ لَنَا اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ عَنْ اَبِيْ طَلْحَةَ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ يَوْمَ بَدْرٍ بِاَرْبَعَةٍ وَعِشْرِيْنَ رَجُلًا مِنْ صَنَادِيْدِ قُرَيْشٍ فَقُذِفُوْا فِيْ طَوِيٍّ مِنْ اَطْوَاءِ بَدْرٍ خَبِيْثٍ مُخْبِثٍ وَكَانَ اِذَا ظَهَرَ عَلٰى قَوْمٍ اَقَامَ بِالْعَرْصَةِ ثَلَاثَ لَيَالٍ فَلَمَّا كَانَ بِبَدْرٍ الْيَوْمَ الثَّالِثَ اَمَرَ بِرَاحِلَتِهٖ فَشُدَّ عَلَيْهَا رَحْلُهَا ثُمَّ مَشٰى وَاتَّبَعَهٗ اَصْحَابُهٗ حَتّٰى قَامَ عَلٰى شَفَةِ الرَّكِيِّ فَجَعَلَ يُنَادِيْهِمْ بِاَسْمَائِهِمْ وَاَسْمَاءِ اٰبَائِهِمْ يَا فُلَانُ ابْنُ فُلَانٍ وَيَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ اَيَسُرُّكُمْ اَنَّكُمْ اَطَعْتُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا تُكَلِّمُ مِنْ اَجْسَادٍ لَا اَرْوَاحَ لَهَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَا اَقُوْلُ مِنْهُمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لَا يُجِيْبُوْنَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ الْبُخَارِيُّ قَالَ قَتَادَةُ اَحْيَاهُمُ اللّٰهُ حَتّٰى اَسْمَعَهُمْ قَوْلَهٗ تَوْبِيْخًا وَتَصْغِيْرًا وَنِقْمَةً وَحَسْرَةً وَنَدَمًا۔

"اور حضرت قتادہؓ کہتے ہیں حضرت انس بن مالکؓ نے حضرت ابوطلحہؓ کے حوالہ سے ہمارے سامنے یہ بیان کیا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے جنگ بدر کے دن (مکہ کے) کفار قریش کے چوبیس (مقتولین) سرداروں کے بارے میں حکم دیا (کہ ان کو ٹھکانے لگا دیا جائے) چنانچہ ان کی نعشوں کو بدر کے ایک ایسے کنویں میں ڈال دیا گیا جو ناپاک تھا اور ناپاک کرنے والا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی یہ عادت تھی کہ جب آپ ﷺ (جنگ میں (کسی قوم (یعنی دشمنوں) پر غلبہ اور فتح پالیتے تھے تو اس میدان جنگ میں تین راتیں قیام فرماتے تھے چنانچہ (اسی عادت کے مطابق آپ ﷺ جنگ جیت لینے کے بعد بدر کے میدان جنگ میں بھی تین راتیں قیام فرما رہے اور) جب تین دن گذر گئے تو آپ ﷺ نے اپنی سواری کے اونٹ پر کجاوہ باندھنے کا حکم دیا، چنانچہ کجاوہ باندھ دیا گیا اور وہاں سے روانہ ہوئے اور آپ کے صحابہؓ بھی آپ ﷺ کے پیچھے ہو لئے (جب اس کنوئے پر پہنچے جس میں سرداران قریش کی نعشیں ڈالی گئی تھیں تو) آپ ﷺ اس کنوئیں کے کنارے کھڑے ہو گئے اور ان سرداروں کو ان کا اور ان کے باپوں کا نام لے کر پکارنا شروع کیا کہ اے فلاں ابن فلاں اور اے فلاں ابن فلاں (اور پھر گویا ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ) (اب) تمہیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے؟ بلاشبہ ہمیں تو وہ چیز حاصل ہو گئی جس کا ہم سے ہمارے رب نے قطعی وعدہ کیا تھا (یعنی تمہارے مقابلہ پر ہماری فتح اور باطل طاقتوں پر ہمارے غلبہ کا) اور کیا تم نے بھی وہ چیز پالی جس کا تم سے تمہارے پروردگار نے قطعی وعدہ کیا تھا یعنی تمہارے عذاب کا (مطلب یہ کہ ہم کو تو خدا کے وعدے کے مطابق فتح و کامیابی حاصل ہو گئی کیا تم کو بھی عذاب ملا جس سے تمہارے پروردگار نے تمہیں ڈرایا تھا؟ گویا آنحضرت ﷺ کا یہ سوال از راہ توبیخ تھا) حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! کیا آپ ایسے جسموں کو مخاطب کر رہے ہیں جن میں روحیں نہیں ہیں!؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے، ان (جسموں) سے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اس کو زیادہ سننے والے نہیں

ہو۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ۔ تم انسے زیادہ سننے والے نہیں ہو لیکن (فرق صرف اتنا ہے کہ تم جواب دینے پر قادر ہو اور) یہ جواب نہیں دے سکتے۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

بخاریؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت قتادہؒ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ان (سرداران قریش) کو آنحضرت ﷺ کے خطاب کے وقت) زندہ کر دیا تھا تاکہ وہ آنحضرت ﷺ کی بات کو سن لیں جس سے (اسی دنیا میں آنحضرت ﷺ کے سامنے) ان کو سرزنش ہو اور وہ ذلت وخواری، عذاب اور افسوس وپشیمانی کو محسوس کریں۔"

تشریح: حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ وغیرہ نے اس حدیث کے ذریعہ سماع موتی کے مسئلہ کو ثابت کیا ہے جب کہ اکثر حنفی علماء نے اس (سماع موتی) کا انکار کیا ہے، ان علماء کی طرف سے مختلف انداز میں جواب دیئے گئے ہیں جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں جیسے فتح القدیر وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

غزوۂ حنین کے قیدیوں کی واپسی

(۹) وَعَنْ مَرْوَانَ وَالْمِسْوَرِبْنِ مَخْرَمَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ حِيْنَ جَاءَهُ وَفْدُهَوَازِنَ مُسْلِمِيْنَ فَسَأَلُوْهُ اَنْ يَرُدَّ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَسَبْيَهُمْ فَقَالَ فَاخْتَارُوْا اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ اِمَّاالسَّبْيَ وَ اِمَّا الْمَالَ قَالُوْافَاِنَّا نَخْتَارُ سَبْيَنَا فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَثْنٰى عَلَى اللّٰهِ بِمَاهُوَاَهْلُهُ ثُمَّ قَالَ اَمَّابَعْدُ فَاِنَّ اِخْوَانَكُمْ قَدْجَاءُ وْاتَائِبِيْنَ وَاِنِّي قَدْرَأَيْتُ اَنْ اَرُدَّاِلَيْهِمْ سَبْيَهُمْ فَمَنْ اَحَبَّ مِنْكُمْ اَنْ يُّطَيِّبَ ذٰلِكَ فَلْيَفْعَلْ وَمَنْ اَحَبَّ مِنْكُمْ اَنْ يَّكُوْنَ عَلٰى حَظِّهٖ حَتّٰى نُعْطِيَهٗ اِيَّاهُ مِنْ اَوَّلِ مَايُفِيْئُ اللّٰهُ عَلَيْنَا فَلْيَفْعَلْ فَقَالَ النَّاسُ قَدْطَيَّبْنَا ذٰلِكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا لَانَدْرِيْ مَنْ اَذِنَ مِنْكُمْ مِمَّنْ لَمْ يَأْذَنْ فَارْجِعُوْا حَتّٰى يَرْفَعَ اِلَيْنَا عُرَفَاءُ كُمْ اَمْرَكُمْ فَرَجَعَ النَّاسُ فَكَلَّمَهُمْ عُرَفَاءُهُمْ ثُمَّ رَجَعُوْا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرُوْهُ اَنَّهُمْ قَدْطَيَّبُوْا وَاَذِنُوْا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مروان اور حضرت مسور ابن مخرمہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اس وقت (خطبہ ارشاد کرنے کے لئے) کھڑے ہوئے جب قبیلہ ہوازن کے لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ ان کا مال اور ان کے قیدی واپس کر دیئے جائیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ دونوں چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کر لو یعنی یا تو قیدیوں کو رہا کرا لے جاؤ یا مال واپس لے لو؟" انہوں نے عرض کیا کہ "ہم اپنے قیدیوں کو رہا کرانا پسند کرتے ہیں" تب رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ کے سامنے) یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی جس کا وہ مستحق ہے اور پھر فرمایا کہ! بعد ازاں! یہ (قبیلہ ہوازن کے لوگ) جو تمہارے (دینی یا نسبی) بھائی ہیں (اپنے کفر وشرک سے) توبہ کر کے (اور مسلمان ہو کر) تمہارے پاس آئے ہیں، میں نے اس چیز کو مناسب سمجھا ہے کہ ان کو ان کے قیدی واپس کر دوں، لہٰذا تم میں سے جو شخص خوشی کے ساتھ قیدیوں کو واپس کرنا چاہے تو وہ ایسا ہی کرے (یعنی اس کے پاس جو قیدی ہے اس کو واپس کر دے) اور جو شخص اپنے حصہ پر قائم رہنا چاہے تاوقتیکہ ہم اس کو اس کا عوض اس پہلے آنے والے مال میں سے نہ دے دیں جو اللہ تعالیٰ ہمیں غنیمت کے طور پر عطا کرے تو وہ ایسا ہی کرے (یعنی جو شخص اپنے حصے کے قیدی کو بغیر معاوضہ نہ دینا چاہے تو وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیا معاوضہ لے گا تاکہ ہم یہ انتظام کر دیں کہ اب کہیں سے جو سب سے پہلے مال غنیمت آئے اس میں سے اس کا وہ معاوضہ ادا کر دیا جائے! لوگوں نے (یعنی بعض صحابہؓ یا بلا امتیاز تمام صحابہؓ نے) عرض کیا کہ "یارسول اللہ! ہم اس پر (یعنی قیدیوں کو واپس کر دینے پر) خوشی کے ساتھ آمادہ ہیں۔" رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہمیں (اس مجمع میں) یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ تم میں سے کون شخص راضی ہے اور جو شخص راضی نہیں ہے اس کا امتیاز نہیں کیا جاسکتا لہٰذا تم سب لوگ (اپنے اپنے گھر) لوٹ جاؤ (اور اپنے خاندان وقبیلہ کے سرداروں سے اس بارے میں مشورہ کر لو) تاآنکہ تمہارے (وہ)

سردار تفصیل کے ساتھ) ہمارے سامنے تمہارا فیصلہ پیش کریں۔" چنانچہ سب لوگ لوٹ کر چلے گئے اور جب ان کے سرداروں نے ان سے گفتگو کرلی تو وہ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں واپس آئے اور آپ ﷺ کو بتایا کہ وہ (قیدیوں کو واپس کردینے پر) راضی ہیں اور انہوں نے (اس امر کی) اجازت دے دی ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مکہ مکرمہ سے شمال مشرقی جانب طائف کے لئے جو راستہ جاتا ہے اس راستے پر ایک وسیع میدان ملتا ہے جس کے اطراف میں پہاڑیاں ہیں اور اس سے گذرنے کے بعد ایک چھوٹی سی بستی ملتی ہے، اس میدان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے اس پاس قبیلہ ہوازن کے لوگ آباد تھے اور یہیں فتح مکہ کے بعد وہ غزوہ ہوا تھا جس کو غزوۂ حنین یا غزوۂ ہوازن کہتے ہیں۔ اس غزوہ میں غنیمت کا بہت زیادہ مال مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور دشمن کے بے شمار بال بچے قیدی بنا کر مدینے لائے گئے تھے جن کو صحابہؓ کے درمیان تقسیم کردیا گیا تھا چنانچہ جب اس غزوہ کے بعد قبیلہ ہوازن کے لوگ مشرف بہ اسلام ہوگئے تو وہ دربار رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے اور اپنے مال اور اپنے قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا، چونکہ ان کا مال اور قیدی مجاہدین اسلام (یعنی صحابہؓ) کی ملکیت ہوگئے تھے اور ان کی اجازت کے بغیر ان کی ملکیت کو واپس کرنا جائز نہیں تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس سلسلے میں صحابہؓ کے سامنے مذکورہ بالا ارشاد فرمایا اور ان سے مذکورہ اجازت طلب کی۔

گرفتاری کے بدلے گرفتاری

(۱۵) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ كَانَ ثَقِيفٌ حَلِيفًا لِبَنِي عُقَيْلٍ فَاَسَرَتْ ثَقِيفٌ رَجُلَيْنِ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَسَرَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ رَجُلًا مِنْ بَنِي عُقَيْلٍ فَاَوْثَقُوْهُ فَطَرَحُوْهُ فِي الْحَرَّةِ فَمَرَّ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَادَاهُ يَا مُحَمَّدُ يَا مُحَمَّدُ فِيْمَ اُخِذْتُ قَالَ بِجَرِيْرَةِ حُلَفَائِكُمْ ثَقِيْفٍ فَتَرَكَهٗ وَمَضٰى فَنَادَاهُ يَا مُحَمَّدُ يَا مُحَمَّدُ فَرَحِمَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَجَعَ قَالَ مَا شَاْنُكَ قَالَ اِنِّيْ مُسْلِمٌ فَقَالَ لَوْ قُلْتَهَا وَاَنْتَ تَمْلِكُ اَمْرَكَ اَفْلَحْتَ كُلَّ الْفَلَاحِ قَالَ فَفَدَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالرَّجُلَيْنِ الَّذَيْنِ اَسَرَتْهُمَا ثَقِيْفٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرانؓ ابن حصین کہتے ہیں کہ قبیلۂ ثقیف، بنو عقیل کا حلیف تھا، چنانچہ جو قبیلہ ثقیف کے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں کو گرفتار کرلیا تو رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ نے بنو عقیل کے ایک آدمی کو گرفتار کرلیا اور اس کو مضبوطی سے باندھ کر حرہ میں ڈال دیا۔ رسول کریم ﷺ ادھر سے گذرے تو اس (قیدی) نے پکارا "محمد (ﷺ)! محمد (ﷺ)! مجھے کس جرم میں گرفتار کرلیا گیا ہے؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اپنے حلیف، قبیلہ ثقیف (کے لوگوں کے جرم میں یعنی قبیلہ ثقیف کے لوگوں نے ہمارے دو مسلمانوں کو پکڑلیا ہے، ان کے بدلے میں تمہیں پکڑلیا گیا ہے۔" (یہ کہہ کر) آپ ﷺ نے اس کو اس کے حال پر (اس کی جگہ) چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گئے، اس نے آنحضرت ﷺ کو پھر پکارا "محمد (ﷺ)! محمد!" رسول کریم ﷺ کو اس پر رحم آگیا، آپ ﷺ اس کے پاس واپس آئے اور فرمایا کہ تم "کس حال میں ہو؟" اس نے کہا کہ "میں مسلمان ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا (کاش!) تم یہ بات اس وقت کہتے، جب تم خود اپنے اختیار کے مالک تھے (یعنی جب کہ تم قید ہونے سے پہلے اپنے اوپر اختیار رکھتے تھے اور تم پر کوئی دباؤ نہیں تھا اگر اس وقت بطریق رغبت کے یہ کہتے کہ میں مسلمان ہوں" تو تم نجات پا جاتے کامل نجات (یعنی دنیا میں تو یہ نجات ملتی کہ قید نہ ہوتے اور آخرت میں دوزخ کے عذاب سے چھٹکارا پاتے)" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے اس کو ان دونوں آدمیوں کے بدلے میں جن کو ثقیف نے گرفتار کیا تھا چھوڑ دیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ثقیف" عرب کے ایک بڑے اور مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ جو بنو ہوازن کی ایک شاخ اور طائف میں آباد تھا، اسی طرح "بنو عقیل" بھی ایک قبیلہ تھا، یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب میں یہ دستور تھا کہ قبائل آپس میں

ایک دوسرے کے درمیان حلف وقسم کے ساتھ یہ عہدو پیمان کیا کرتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے برے بھلے کام کے ساتھی ہوں گے اور ہم میں سے کسی ایک کا دشمن دوسرے کا بھی دشمن اور کسی ایک کا دوست دوسرے کا بھی دوست ہوگا، لیکن جب اسلام کا زمانہ آیا تو زمانۂ جاہلیت کے دستور کے مطابق وہ قسما قسمی تو جائز رہی جس کا تعلق حق اور جائز باتوں سے تھا لیکن جس کا تعلق ناحق اور ناجائز باتوں سے تھا اس کو ختم کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اسلام کا جو حلف ہے وہ کافی ہے۔

"بنو عقیل کے ایک آدمی کو گرفتار کر لیا" یعنی قبیلہ ثقیف کے لوگوں نے جن دو صحابہؓ کو پکڑ کر اپنے یہاں قید کر لیا تھا ان کے بدلے میں مسلمانوں نے بنو عقیل کا ایک آدمی پکڑ کر اپنے یہاں باندھ دیا۔ کیونکہ اس وقت قبائل کا باہمی دستور یہی تھا کہ ایک حلیف کے جرم میں دوسرے حلیف کے آدمی کو پکڑ لیا جاتا تھا چنانچہ مسلمانوں نے بھی اسی دستور کے مطابق عمل کیا اور بظاہر اس میں مصلحت بھی تھی۔

"حرہ" مدینہ کے مضافات میں پہاڑی علاقہ کے اس قطعہ کو کہا جاتا تھا جس کی زمین کالی پتھریلی تھی۔

"میں مسلمان ہوں الخ" ان الفاظ کے ذریعہ اس شخص نے گویا یہ بتانا چاہا کہ میں پہلے ہی سے مسلمان ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو غیر مسلم، مسلمانوں کی قید میں ہو اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں مسلمان ہوں تو اس کی بات کو اس وقت تک تسلیم نہ کیا جائے جب تک کہ اس کا دعویٰ گواہی کے ذریعہ ثابت نہ ہو جائے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان الفاظ کے ذریعہ اس شخص کی یہ مراد ہو میں اب اسلام قبول کرتا ہوں۔ بہر حال آنحضرت ﷺ نے اس کے دعویٰ اسلام کو قبول نہیں کیا کیونکہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہ یا تو ازراہ نفاق اپنے اسلام کا دعویٰ کر رہا ہے یا بطریق اضطرار وہ اس دعوے پر مجبور ہے اسی لئے آپ ﷺ نے اسے جھوٹا سمجھتے ہوئے دار الحرب جانے دیا۔ اس اعتبار سے اس شخص کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا یہ معاملہ گویا آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جنگ بدر کے قیدیوں میں سے آنحضرت ﷺ کے داماد ابوالعاص کی رہائی کا واقعہ

(۱۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا بَعَثَ اَهْلُ مَكَّةَ فِيْ فِدَاءِ اُسَرَائِهِمْ بَعَثَتْ زَيْنَبُ فِيْ فِدَاءِ اَبِي الْعَاصِ بِمَالٍ وَبَعَثَتْ فِيْهِ بِقِلَادَةٍ لَهَا كَانَتْ عِنْدَ خَدِيْجَةَ اَدْخَلَتْهَا بِهَا عَلٰى اَبِي الْعَاصِ فَلَمَّا رَآهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَقَّ لَهَا رِقَّةً شَدِيْدَةً وَقَالَ اِنْ رَأَيْتُمْ اَنْ تُطْلِقُوْا لَهَا اَسِيْرَهَا وَتَرُدُّوْا عَلَيْهَا الَّذِيْ لَهَا فَقَالُوْا نَعَمْ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخَذَ عَلَيْهِ اَنْ يُخَلِّيَ سَبِيْلَ زَيْنَبَ اِلَيْهِ وَبَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ وَرَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ كُوْنَا بِبَطْنِ يَأْجِجَ حَتّٰى تَمُرَّ بِكُمَا زَيْنَبُ فَتَصْحَبَاهَا حَتّٰى تَأْتِيَا بِهَا۔ (رواه احمد وابوداؤد)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب (جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو کفار مکہ پر غلبہ اور فتح عطا فرمائی اور ان میں سے کچھ تو قتل کر دیئے گئے اور کچھ قیدی بنا کر مدینہ لائے گئے اور پھر آنحضرت ﷺ نے ان کی رہائی کے بدلے میں مال طلب کیا تو) اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کی رہائی کا معاوضہ روانہ کیا، (آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی) حضرت زینبؓ نے بھی (اپنے شوہر) ابوالعاص کی رہائی کے بدلے میں کچھ مال بھیجا جس میں ان کا وہ ہار بھی تھا جو (پہلے) حضرت خدیجہؓ کے پاس تھا اور اس کو انہوں نے ابوالعاص کے ساتھ زینبؓ کے نکاح کے وقت ان کو (جہیز میں) دیا تھا، جب رسول کریم ﷺ نے وہ ہار دیکھا تو زینبؓ کے لئے آپ ﷺ پر سخت رقت طاری ہوگئی (یعنی) اس وقت اپنی بیٹی حضرت زینبؓ کی غربت و تنہائی کا احساس کر کے اور حضرت خدیجہؓ کی رفاقت کی یاد تازہ ہو جانے کی وجہ سے جن کے گلے میں وہ ہار رہتا تھا آپ ﷺ کا دل امنڈ آیا) اور آپ ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ "اگر تم مناسب سمجھو تو زینبؓ کی خاطر اس کے قیدی (ابوالعاص) کو (بلا معاوضہ) رہا کر دو اور اس (زینبؓ) کو اس کی (وہ سب) چیزیں (جو اس نے ابوالعاص کی رہائی کے لئے بھیجی ہیں) واپس کر دو۔" صحابہ نے عرض کیا کہ بہتر ہے (ہم زینبؓ کا مال واپس کر کے ابوالعاص کو بلا معاوضہ رہا کر دیتے ہیں) چنانچہ (ابوالعاص کو رہا کر دیا

گیا اور رہائی کے وقت) آنحضرت ﷺ نے ابوالعاص سے یہ عہد وعدہ لیا کہ وہ آپ ﷺ کے پاس زینبؓ کے آنے کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالیں (یعنی آپ ﷺ نے ابوالعاص کو رہا کرتے وقت ان سے کہا کہ یہ پختہ وعدہ کرو کہ مکہ پہنچ کر زینبؓ کو میرے پاس مدینہ آنے دوگے اور اس کا راستہ نہیں روگے) اور پھر رسول کریم ﷺ نے زید ابن حارثہؓ اور انصار میں سے ایک شخص کو (مکہ) روانہ کیا اور ان سے کہا کہ تم لوگ بطن یاجج میں ٹھہر جانا، جب زینبؓ (مکہ سے روانہ ہو کر) وہاں تمہارے پاس آجائے تو تم اس کے ساتھ ہو جانا اور (مدینہ) لے آنا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت زینبؓ آنحضرت ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں، اور ابوالعاص ابن ربیع جو عبدالعزیٰ ابن عبد شمس ابن عبد مناف کے پوتے تھے، اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے اور حضرت زینبؓ کے شوہر ہونے کی وجہ سے داماد بھی تھے۔

حضرت خدیجہؓ، آنحضرت ﷺ کی سب سے پہلی زوجہ مطہرہ ہیں، آپ ﷺ کی ساری اولاد علاوہ ابراہیمؓ کے حضرت خدیجہؓ ہی کے بطن سے تھی۔ ابراہیم جن کا کم سنی میں انتقال ہو گیا تھا حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے۔

حضرت زینبؓ جو ایک کافر یعنی ابوالعاص کے نکاح میں تھیں تو اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت مسلمان عورت کا کافر مرد کے ساتھ نکاح جائز تھا، نیز مکہ سے حضرت زینبؓ کو لانے کے لئے آنحضرت ﷺ کی طرف سے ایسے دو آدمیوں کا بھیجا جانا جو حضرت زینبؓ کے شرعی محرم نہیں تھے ایک بالکل مخصوص نوعیت کا معاملہ تھا اور وہ ایک ایسی صورت تھی جو (امن) کی صورت کہلائی جاسکتی ہے کہ حضرت زینبؓ چونکہ صاحبزادیٔ رسول تھیں اس لئے ان کے ساتھ کسی غیر محرم کا ہونا کسی قسم کے شک وشبہ سے بالاتر تھا اور کسی خوف وخطرہ کے پیدا ہونے کا سوال نہیں تھا۔ ویسے یہ ایک عام مسئلہ ہے کہ عورت کو کسی نامحرم کے ساتھ سفر کرنا جائز نہیں ہے

"بطن یاجج" ایک جگہ کا نام تھا جو مکہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس لفظ "یاجج" کو صاحب قاموس نے یا اور دونوں جیم کے ساتھ یعنی "یاجج" لکھا ہے، اور علماء نے اس کو نون اور یا و جیم کے ساتھ یعنی "ناجج" بھی نقل کیا ہے، چنانچہ مشکوٰۃ المصابیح کے اکثر قدیم نسخوں میں یہ لفظ "ناجج" ہی مذکور ہے۔

حضرت زینبؓ جب مکہ سے مدینہ آگئیں تو ابوالعاص مکہ ہی میں رہے اور کفر کی حالت پر قائم رہے، کچھ دنوں کے بعد ان کو تجارت کی غرض سے شام کا سفر کرنا پڑا، جب مدینہ کے مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ابوالعاص اس سفر میں مدینہ کے قریب سے گذرنے والے ہیں تو انہوں نے یہ اسکیم بنائی کہ ابوالعاص جیسے ہی مدینہ کے علاقہ میں داخل ہوں ان کا سارا مال چھین لیا جائے، اس اسکیم کی خبر حضرت زینبؓ کو پہنچی تو ان کا دل شوہر کی محبت میں بے تاب ہو گیا، فوراً آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں کہ "یارسول اللہ (ﷺ) کیا مسلمانوں میں سے کسی ایک کے عہد امان کا اعتبار نہیں ہے؟ یعنی اگر کوئی ایک مسلمان کسی کافر کو عہد امان دے دے تو پھر یہ سارے ہی مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی تاکہ وہ اس کافر کو امان و پناہ دیں؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں! ایک مسلمان کے عہد امان کا اعتبار ہے۔" حضرت زینبؓ نے کہا کہ "تو پھر یارسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) گواہ رہئے کہ میں ابوالعاص کو عہد امان دیتی ہوں۔" جب صحابہؓ نے یہ حال دیکھا تو ان کے لئے اپنی اسکیم پر عمل کرنا قطعاً ممکن نہیں رہا تاہم وہ بغیر ہتھیار و اسلحہ کے مدینہ کے قریب ابوالعاص کی گذرگاہ پر پہنچے اور ان سے ملے تو کہا کہ "ابوالعاص! تم قریش کے ایک معزز و شریف اور صاحب حیثیت" فرد ہو اور پیغمبر اسلام ﷺ کے چچا کے بیٹے بھی ہو (اس نسبت سے تمہارے حق میں اس سے بہتر اور کوئی راہ نہیں ہے کہ) تم مسلمان ہو جاؤ تاکہ (تمہیں آخرت کی فلاح و نجات تو ملے ہی گی) تمہارا یہ سب مال بھی تمہارے ہی پاس رہے۔" ابوالعاص نے (یہ سن کر) کہا کہ "تم نے جو یہ کہا ہے (کہ مسلمان ہو جانے کی وجہ سے مال محفوظ رہے گا) تو یہ ایک قطعی نامناسب اور غیر موزوں بات ہے میں اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ اپنے اسلام کو مال و دولت (کی کثافت) سے گندہ کروں!" اس کے بعد ابوالعاص مکہ روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر لوگوں کا مال ان کے سپرد کیا اور پھر (سب کو جمع کر کے) کہا کہ مکہ والو! تم لوگوں کے مال تمہارے پاس پہنچ گئے؟ انہوں نے کہا کہ "ہاں، پہنچ گئے۔" پھر ابوالعاص

نے ان کے سامنے اعلان کیا کہ "تم سب گواہ رہو!" میں مسلمان ہوگیا ہوں اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

اس کے بعد حضرت ابوالعاص نے مکہ میں اپنا گھربار، دوست عزیز، اور مال و اسباب سب کچھ چھوڑ کر راہ ہجرت اختیار کی اور مدینہ پہنچ کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے، آنحضرت ﷺ نے بکمال محبت و الفت ان کو خوش آمدید کہا، اور حضرت زینب کو ان کی سپردگی میں دے دیا۔

اس بارہ میں اختلافی قوال ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اُبوالعاص کے مدینہ پہنچنے پر حضرت زینب سے ان کا دوبارہ (از سرنو) نکاح کیا تھا یا پہلا ہی نکاح باقی رکھا تھا۔

آنحضرت ﷺ کو ابوالعاص سے بہت زیادہ تعلق تھا، خاص طور سے ان کے مسلمان ہوجانے کے بعد تو آپ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور ان سے بہت خوش رہا کرتے تھے۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق کے دور خلافت میں جنگ یمامہ کے دوران شہید ہوئے۔

جنگ بدر کے قیدیوں میں سے قتل کئے جانے والے کفار

(۱۲) وَعَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا اَسَرَ اَهْلَ بَدْرٍ قَتَلَ عُقْبَةَ بْنَ اَبِيْ مُعَيْطٍ وَالنَّضْرَ بْنَ الْحَارِثِ وَمَنَّ عَلٰى اَبِيْ عَزَّةَ الْجُمَحِيِّ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عائشہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بدر (کی جنگ میں مجاہدین اسلام کے خلاف لڑنے) والوں (میں سے جن کفار) کو قید کیا تھا ان میں سے عقبہ ابن ابومعیط اور نضر ابن حارث کو قتل کرادیا اور ابوعزہ کو (بلا معاوضہ رہا کر کے) ممنون کیا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: امام وقت (یعنی اسلامی مملکت کے سربراہ) کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جو غیر مسلم (دشمن کے لوگ) اس کی قید میں ہوں اور وہ اسلام قبول نہ کریں تو وہ چاہے ان کو موت کے گھاٹ اتار دے، چاہے غلام بنا کر رکھے اور چاہے مسلمانوں کے عہد امان کی بناء پر ان کو آزاد کر کے چھوڑ دے، البتہ ان کو ممنون کرنا یعنی بلا کسی معاوضہ کے ان کو رہا کر دینا جائز نہیں ہے کیونکہ اس کا جواز منسوخ ہوگیا ہے۔

(۱۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا اَرَادَ قَتْلَ عُقْبَةَ بْنِ اَبِيْ مُعَيْطٍ قَالَ مَنْ لِلصِّبْيَةِ قَالَ النَّارُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جب عقبہ ابن ابومعیط کو مار ڈالنے کا ارادہ کیا تو (اس نے) کہا کہ (میرے) بچوں کو کون پالے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "آگ"۔ (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ بچوں کو آگ پالے گی، گویا ان بچوں کے ضائع ہوجانے کے مفہوم کا حامل ہے، یعنی اگر آگ اس چیز کی صلاحیت رکھتی کہ وہ کسی کی مددگار و غمخوار ہوسکتی تو یقیناً وہ بچوں کی بھی مددگار و کفیل ہوتی لیکن چونکہ وہ ایسی صلاحیت ہی نہیں رکھتی اس لئے بچوں کا کوئی دوسرا مددگار و کفیل نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تباہی لازمی ہے۔

یا آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ تو اب اپنی فکر کر کہ دوزخ کی آگ تیرا ٹھکانا بننے والی ہے، بچوں کی فکر میں مبتلا نہ ہو کہ ان کی پرورش نہ تجھ پر منحصر ہے اور نہ کسی دوسرے پر، ان کا مددگار و کفیل خدا کی ذات ہے، وہی ان کی پرورش کرائے گا۔

جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں دیا گیا اختیار

(۱۴) وَعَنْ عَلِيٍّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ جِبْرِيْلَ هَبَطَ عَلَيْهِ فَقَالَ لَهٗ خَيِّرْهُمْ يَعْنِيْ اَصْحَابَكَ فِيْ اُسَارٰى بَدْرٍ الْقَتْلَ اَوِ الْفِدَاءَ عَلٰى اَنْ يُّقْتَلَ مِنْهُمْ قَابِلًا مِّثْلُهُمْ قَالُوا الْفِدَاءَ وَيُقْتَلُ مِنَّا۔ (رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث غریب)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام، آنحضرت کے پاس تشریف لائے اور

کہا کہ آپ (ﷺ) اپنے صحابہؓ کو جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں اختیار دے دیجئے کہ خواہ وہ ان قیدیوں کو قتل کر دیں یا فدیہ لے لیں (یعنی مال لے کر ان کو چھوڑ دیں) لیکن فدیہ لینے کی صورت میں آئندہ سال ان (صحابہؓ) کے اتنے ہی (یعنی ستر) آدمی مارے جائیں گے۔ صحابہؓ نے (اس اختیار کو سن کر) عرض کیا کہ "ہم فدیہ لینے کو اور اپنے ستر آدمیوں کے مارے جانے کو اختیار کرتے ہیں۔" اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: جنگ بدر میں مکہ کے جو کفار قریش مسلمانوں کے مقابلہ پر آئے تھے ان میں سے ستر کفار قریش قتل کر دیئے گئے تھے اور ستر ہی کی تعداد گرفتار کر کے مدینہ لائی گئی تھی، جب یہ ستر قیدی مدینہ پہنچے تو آنحضرت ﷺ نے ان کے بارے میں صائب الرائے صحابہ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جائے، آیا ان کو قتل کر دیا جائے یا فدیہ یعنی مالی معاوضہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے؟ حضرت ابوبکرؓ نے یہ مشورہ دیا کہ آپ ﷺ ان کو قتل نہ کرائیے بلکہ زندہ چھوڑ دیجئے، عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو کفر سے توبہ کی توفیق عطا فرمادے اور یہ مسلمان ہو جائیں، البتہ ان سے فدیہ لے لیجئے تاکہ ان سے فدیہ کے طور پر جو مال حاصل ہو وہ آپ کے رفقاء (یعنی مسلمانوں کی تقویت اور ان کی کچھ دینی و دنیوی ضروریات کے تکمیل کا ذریعہ بن جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا کہ "میری رائے یہ ہے کہ آپ ﷺ ان سب کی گردن اڑا دیجئے کیونکہ یہ کفر و شرک کے پیشوا اور سردار ہیں (ان کی موت سے کفر و شرک پر کاری ضرب لگے گی) اور (جہاں تک ان کی رہائی کے ذریعہ کچھ مالی منفعت حاصل ہو جانے کا سوال ہے تو) اللہ تعالے نے آپ (ﷺ) کو مال حاصل کرنے سے مستغنی و بے نیاز بنا رکھا ہے! آنحضرت ﷺ نے یہ اختلاف آراء دیکھتے ہوئے (حضرت جبرئیل علیہ السلام کے مشورہ پر) صحابہؓ کو اختیار دے دیا کہ تم لوگ دونوں چیزوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو کہ چاہے تو اپنے قیدیوں کی گردن اڑا دو اور چاہے فدیہ لے کر ان کو آزاد کر دو لیکن یہ واضح رہے کہ فدیہ لینے کی صورت میں یہ مقدر ہو چکا ہے کہ آئندہ سال تم میں ستر آدمی شہید ہوں گے اور فی الجملہ کفار کو فتح بھی حاصل ہوگی۔ صحابہؓ نے اس انتباہ کے باوجود فدیہ لینے کو اختیار کیا۔ جب آئندہ سال غزوۂ احد ہوا اور میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو زبردست مقابلہ کا سامان کرنا پڑا یہاں تک کہ ایک موقع پر پسپائی کی صورت بھی اختیار کرنی پڑی، تو آنحضرت ﷺ نے ایک سال پہلے جس چیز سے متنبہ کیا تھا وہ سامنے آئی یعنی اس غزوہ میں مسلمانوں کو اپنی ستر قیمتی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور ان ستر شہیدوں میں حضرت حمزہؓ ابن عبدالمطلب اور حضرت مصعبؓ ابن عمیر جیسے جلیل القدر صحابہؓ بھی شامل تھے۔

ہنگامۂ جنگ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ، دونوں رو رہے ہیں، انہوں نے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ مجھے بھی بتائیے تاکہ میں بھی رووں! آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھیوں پر رو رہا ہوں جنہوں نے فدیہ لینے کو اختیار کیا تھا اور (آپ کے نزدیک ایک درخت کھڑا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ) مجھے اس درخت سے بھی زیادہ قریب سے ان کا عذاب دکھایا گیا ہے۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر ان پر عذاب نازل کیا جاتا تو اس عذاب سے عمرؓ اور سعدؓ ابن معاذ کے علاوہ اور کسی کو نجات نہ ملتی (حضرت سعدؓ ابن معاذ بھی حضرت عمرؓ کی اس رائے کے حامی تھے کہ ان قیدیوں سے فدیہ نہیں لینا چاہئے بلکہ ان کو قتل کر دینا ہی مناسب ہے)۔

بہرحال۔ صحابۂ کرامؓ نے فدیہ لینے کو جو اختیار کیا تو اس کی بنیاد ان قیدیوں کے تئیں ان (صحابہؓ) کی یہ انتہائی خواہش اور رغبت تھی کہ اگر یہ قتل ہونے سے بچ گئے تو شاید کبھی نہ کبھی مسلمان ہو جائیں نیز آئندہ سال خود اپنے شہید ہو جانے کی تمنا بھی اس کا محرک بنی اس کے ساتھ ہی ان قیدیوں کے اہل و عیال اور ان کے اقرباء کے ساتھ ان (صحابہ) کا جذبہ ترحم بھی اس کا متقاضی ہوا کہ یہ قیدی قتل نہ کئے جائیں۔

اس موقع پر ایک یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کو دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو پسند کرنے کا اختیار دے دیا گیا تھا اور

اسی اختیار کی بناء پر انہوں نے ایک چیز کو پسند کر لیا تو پھر ان پر عتاب کیوں ہوا، یہ عتاب اس اختیار کے منافی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اختیار دینا دراصل بطریق امتحان و آزمائش تھا کہ دیکھیں یہ لوگ (مسلمان) اس چیز کو اختیار کرتے ہیں جو پسندیدۂ حق ہے یا اس چیز کو اختیار کرتے ہیں جو ان کے دل کی خواہش کے مطابق ہے۔ اسی اعتبار سے وہ لوگ گویا اس امتحان و آزمائش میں کامیاب نہیں رہے کیونکہ انہوں نے اس چیز کو اختیار کیا جس کو ان دل نے چاہا، لہٰذا ان پر عذاب ہوا۔

علامہ تورپشتیؒ نے اس (اختیار دینے والی) حدیث کو بعید جانا ہے کیونکہ یہ بظاہر اس بات کے مخالف ہے جو قرآن کریم سے مفہوم ہوتی ہے نیز ترمذیؒ نے اس روایت پر "غرابت" کا حکم لگایا ہے، لیکن میں نے کہا ہے کہ غریب روایت کے ذریعہ کوئی بات ثابت کرنا موجب طعن نہیں ہے کیونکہ غریب روایت کبھی صحیح بھی ہوتی ہے

قیدیوں کی تحقیق و تفتیش

(۱۵) وَعَنْ عَطِيَّةَ الْقُرَظِيِّ قَالَ كُنْتُ فِيْ سَبْيِ قُرَيْظَةَ عُرِضْنَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانُوْا يَنْظُرُوْنَ فَمَنْ اَنْبَتَ الشَّعْرَ قُتِلَ وَمَنْ لَمْ يُنْبِتْ لَمْ يُقْتَلْ فَكَشَفُوْا عَانَتِيْ فَوَجَدُوْهَا لَمْ تُنْبِتْ فَجَعَلُوْنِيْ فِي السَّبْيِ۔

(رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت عطیہ قرظیؒ کہتے ہیں کہ بنو قریظہ کے جو لوگ قیدی بنا کر لائے گئے تھے ان میں میں بھی تھا، ہمیں نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت صحابہؓ نے (یہ طریقہ اختیار کیا کہ قیدیوں میں جو چھوٹی عمر والے تھے ان کے زیر ناف حصے کو کھول کھول کر دیکھ رہے تھے جس کے (زیر ناف حصے پر بال اگ آئے تھے اس کو قتل کر دیا جاتا، کیونکہ زیر ناف حصے پر بال اگ آنا، بلوغ کی علامت ہے، لہٰذا ایسے شخص کو مسلمانوں سے لڑنے والا شمار کیا جاتا تھا) اور جس کے بال نہ اگے ہوئے تھے اس کو قتل نہیں کیا جاتا تھا (کیونکہ اس کو "ذریت" یعنی بچوں میں شمار کیا جاتا تھا چنانچہ میرے زیر ناف حصے کو بھی کھولا گیا اور جب وہاں اگے ہوئے بال نہیں پائے گئے تو مجھ کو قیدیوں ہی میں (زندہ) رکھا گیا۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ زیر ناف حصے پر بالوں کے اگ آنے کو بلوغ کی علامت قرار دینا ضروری مصلحت کی بناء پر تھا کیونکہ اگر ان قیدیوں سے بلوغ کی واقعی علامت یعنی احتلام اور عمر بلوغ کو پوچھا جاتا تو وہ اپنی ہلاکت کے خوف سے یقیناً صحیح بات نہ بتاتے۔

کفار مکہ کے مسلمان ہو جانے والے غلاموں کو واپس کرنے سے آنحضرت ﷺ کا انکار

(۱۶) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ خَرَجَ عُبْدَانٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِيْ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ قَبْلَ الصُّلْحِ فَكَتَبَ اِلَيْهِ مَوَالِيْهِمْ قَالُوْا يَا مُحَمَّدُ وَاللّٰهِ مَا خَرَجُوْا اِلَيْكَ رَغْبَةً فِيْ دِيْنِكَ وَاِنَّمَا خَرَجُوْا هَرَبًا مِنَ الرِّقِّ فَقَالَ نَاسٌ صَدَقُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رُدَّهُمْ اِلَيْهِمْ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ مَا اَرَاكُمْ تَنْتَهُوْنَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ حَتّٰى يَبْعَثَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ مَنْ يَضْرِبُ رِقَابَكُمْ عَلٰى هٰذَا وَاَبٰى اَنْ يَرُدَّهُمْ وَقَالَ هُمْ عُتَقَاءُ اللّٰهِ۔ (رواہ ابوداود)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے دن (مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان) معاہدہ لکھے جانے سے پہلے کچھ غلام (مکہ سے آکر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے، ان کے مالکوں نے آنحضرت ﷺ کو لکھا کہ "محمد ﷺ! خدا کی قسم یہ غلام تمہارے پاس اس لئے نہیں پہنچے ہیں کہ وہ تمہارے دین کی طرف رغبت رکھتے ہیں بلکہ یہ لوگ غلامی (سے نجات پانے کی غرض سے بھاگ کر گئے ہیں" (جب صحابہؓ میں سے) چند لوگوں نے (یہ مکتوب دیکھا تو) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ان کے مالکوں نے بالکل صحیح لکھا ہے،

آپ ﷺ ان غلاموں کو ان کے مالکوں کے پاس واپس بھیج دیجئے" (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ غضب ناک ہو گئے اور فرمایا کہ "قریش والو! میں دیکھتا ہوں کہ تم (اپنی سرکشی اور نافرمانی سے) باز نہیں آؤ گے تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ تم پر اس شخص کو مسلط نہ کر دے جو تمہارے اس فیصلے (کہ ان غلاموں کو ان کے مالکوں کے پاس واپس بھیج دیا جائے اور اس طرح ان کے مسلمان ہو جانے کے بعد ان کو دار الحرب کے حوالے کر دیا جائے) کی بناء پر تمہاری گردن اڑا دے" اور پھر آپ ﷺ نے ان غلاموں کی واپسی کے مطالبہ کو رد کر دیا اور فرمایا کہ "یہ اللہ تعالیٰ کے آزاد کردہ ہیں"۔ (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ اس لئے غضبناک ہوئے کہ صحابہؓ نے ان غلاموں کے حق میں اپنی ذاتی رائے کو شرعی حکم کے مقابل کیا اور گویا ان کے مالکوں کے دعوے کی گواہی دی، چنانچہ ان غلاموں کے حق میں شرعی حکم یہ تھا کہ وہ چونکہ دار الحرب سے نکل آنے کے سبب محض اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے معصوم اور آزاد ہو گئے تھے، ان کو ان کے پاس دار الحرب واپس کر دینا جائز نہیں تھا، لہٰذا صحابہؓ کا ان کی واپسی کے مطالبہ کی تائید کرنا، جبر و زیادتی پر ان کے مالکوں کی مدد کرنے کے مترادف تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت خالدؓ کی طرف سے عدم احتیاط کا ایک واقعہ

⑰ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَالِدَبْنَ الْوَلِيْدِ اِلٰى بَنِي جَذِيْمَةَ فَدَعَاهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ فَلَمْ يُحْسِنُوْا اَنْ يَقُوْلُوْا اَسْلَمْنَا فَجَعَلُوْا يَقُوْلُوْنَ صَبَأْنَا صَبَأْنَا فَجَعَلَ خَالِدٌ يَقْتُلُ وَيَأْسِرُ وَدَفَعَ اِلٰى كُلِّ رَجُلٍ مِنَّا اَسِيْرَهُ حَتّٰى اِذَا كَانَ يَوْمٌ اَمَرَ خَالِدٌ اَنْ يَقْتُلَ كُلُّ رَجُلٍ مِنَّا اَسِيْرَهُ فَقُلْتُ وَاللّٰهِ لَا اَقْتُلُ اَسِيْرِيْ وَلَا يَقْتُلُ رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِيْ اَسِيْرَهُ حَتّٰى قَدِمْنَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرْنَاهُ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَبْرَأُ اِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ مَرَّتَيْنِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خالدؓ ابن ولید کو (ایک قبیلہ) بنی جذیمہ میں بھیجا، خالدؓ نے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، وہ لوگ اضطراب و سراسیمگی کے عالم میں یہ اچھی طرح سے نہیں کہہ سکے کہ ہم اسلام لائے (یعنی وہ اپنی زبانوں سے اسلام کا کلمہ پوری طرح ادا نہیں کر سکے) بلکہ انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ صبانا صبانا یعنی ہم نے اپنا دین چھوڑ دیا، اپنا دین چھوڑ دیا" خالدؓ نے (جب ان کی زبان سے یہ سنا تو) ان (کے بعض لوگوں) کو قتل کرنا اور (بعض کو) گرفتار کرنا شروع کر دیا اور پھر ہم (لوگ جو ان کے ساتھ تھے ان) میں سے ہر شخص کو اس کا قیدی سپرد کر دیا (یعنی جو لوگ قیدی بنائے گئے ان کو ہمارے درمیان تقسیم کر کے ایک ایک قیدی ہر ایک کے سپرد کر دیا اور یہ حکم دیا کہ ہم ان قیدیوں کی اس وقت تک حفاظت و نگرانی کریں جب تک کہ ہمیں ان کو قتل کر دینے کا حکم نہ دیا جائے) چنانچہ جب ایک (وہ) دن آیا (جس میں خالدؓ نے ان قیدیوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا) تو انہوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے قیدی کو قتل کر دے (یہ حکم سن کر) میں (یعنی ابن عمرؓ) نے کہا کہ "خدا کی قسم! میں اپنے قیدی کو قتل نہیں کروں گا اور نہ میرے ساتھیوں میں سے کوئی شخص اپنے قیدی کو قتل کرے گا (بلکہ ہم لوگ اپنے قیدیوں کو اس وقت تک اپنی حفاظت میں رکھیں گے جب تک کہ ہم دربار رسالت میں نہ پہنچ جائیں اور اس بارے میں کوئی آخری حکم حاصل نہ کریں چنانچہ ہم نے اپنے قیدیوں کو اپنی حفاظت میں رکھا) یہاں تک کہ ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے سامنے پورا واقعہ بیان کیا، آنحضرت ﷺ نے (واقعہ کی تفصیل سن کر) اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے یہ کہا کہ "اے اللہ! میں تیرے حضور میں خالد کے عمل سے اپنی بیزاری و بے رضائی کا اظہار کرتا ہوں۔" آپ نے یہ الفاظ دو مرتبہ ارشاد فرمائے۔" (بخاریؒ)

تشریح: خطابیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بارگاہ رب العزت میں حضرت خالدؓ کے عمل سے اس لئے اظہار بیزاری فرمایا کہ خالدؓ نے اس موقع پر احتیاط کی راہ اختیار نہیں کی اور اس بات میں غور و تأمل نہیں کیا کہ وہ لوگ "صبأنا" سے کیا مراد رکھتے تھے کیونکہ یہ لفظ "صبأنا" دین اسلام اختیار کر لینے کے مفہوم کا بھی احتمال رکھتا تھا لیکن خالدؓ نے محض یہ دیکھ کر کہ ان لوگوں نے قبولیت اسلام کے مفہوم کو واضح طور پر ظاہر کرنے والے الفاظ "اسلمنا" استعمال کرنے سے روگردانی کی ہے اس لئے انہوں نے ان لوگوں کی بات کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے کہے ہوئے مذکورہ الفاظ کو ان کے بددین ہو جانے پر محمول کر کے ان کو قتل کرنا اور قیدی بنانا شروع کر دیا۔

بَابُ الْاَمَانِ

امان دینے کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ام ہانیؓ کی طرف سے اپنے ایک عزیز کو امان دینے کا واقعہ

① عَنْ اُمِّ هَانِئٍ بِنْتِ اَبِی طَالِبٍ قَالَتْ ذَهَبْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَامَ الْفَتْحِ فَوَجَدْتُهٗ يَغْتَسِلُ وَ فَاطِمَةُ ابْنَتُهٗ تَسْتُرُهٗ بِثَوْبٍ فَسَلَّمْتُ فَقَالَ مَنْ هٰذِهٖ فَقُلْتُ اَنَا اُمُّ هَانِئٍ بِنْتُ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَالَ مَرْحَبًا بِاُمِّ هَانِئٍ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ غُسْلِهٖ قَامَ فَصَلّٰی ثَمَانِیَ رَكَعَاتٍ مُلْتَحِفًا فِیْ ثَوْبٍ ثُمَّ انْصَرَفَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ زَعَمَ ابْنُ اُمِّیْ عَلِیٌّ اَنَّهٗ قَاتِلٌ رَجُلًا اَجَرْتُهٗ فُلَانَ بْنَ هُبَيْرَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَجَرْنَا مَنْ اَجَرْتِ يَا اُمَّ هَانِئٍ قَالَتْ اُمُّ هَانِئٍ وَذٰلِكَ ضُحًی۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ لِلتِّرْمِذِیِّ قَالَتْ اَجَرْتُ رَجُلَيْنِ مِنْ اَحْمَائِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اٰمَنَّا مَنْ اٰمَنْتِ۔

"حضرت اُمّ ہانیؓ بنت ابوطالب کہتی ہیں کہ فتح مکہ کے سال (یعنی فتح مکہ کے موقع پر) میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، آنحضرت ﷺ اس وقت غسل فرما رہے تھے اور آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کپڑے سے آپ ﷺ کا پردہ کئے ہوئے تھیں۔ میں نے سلام عرض کیا، آپ ﷺ نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "میں ہوں، اُمّ ہانی بنت ابوطالب!" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ام ہانی کو خوش آمدید!" پھر جب آپ ﷺ غسل سے فارغ ہوئے تو جسم پر کپڑا لپیٹے ہوئے آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور (نماز چاشت کی) آٹھ رکعتیں پڑھیں اور جب نماز پڑھ چکے تو میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میری ماں کے بیٹے یعنی حضرت علیؓ نے بتایا ہے کہ وہ اس شخص کو قتل کرنے والے ہیں جس کو میں نے اپنے گھر میں پناہ دی ہے یعنی فلاں شخص کو جو ہبیرہ کا بیٹا ہے؟" رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ام ہانیؓ، جس کو تم نے پناہ دی ہے (گویا) اس کو ہم نے پناہ دی۔" حضرت اُمّ ہانیؓ کہتی ہیں کہ "یہ واقعہ چاشت کے وقت کا ہے!۔"

اور ترمذیؒ کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت اُمّ ہانیؓ نے (آنحضرت ﷺ سے) عرض کیا کہ "میں نے دو آدمیوں کو پناہ دی ہے جو میرے خاوند کے رشتہ دار ہیں!؟" رسول کریم ﷺ وسلم نے فرمایا "ہماری طرف سے اس شخص کے لئے امان ہے جس کو تم نے امان دی ہے۔"

تشریح: حضرت اُمّ ہانیؓ کا اصل نام "فاختہ" تھا اور بعض نے "عاتکہ" بیان کیا ہے۔ یہ ابوطالب کی بیٹی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حقیقی بہن ہیں، ہبیرہ ان کے خاوند کا نام ہے، جب اُمّ ہانیؓ نے فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا تو ہبیرہ سے ان کی جدائی واقع ہو گئی کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہوا۔

جس شخص کو حضرت اُمّ ہانیؓ نے پناہ دی تھی وہ ان کے خاوند ہبیرہ کی اولاد میں سے تھا، اغلب یہ ہے کہ وہ اُمّ ہانیؓ کے علاوہ ہبیرہ کی کسی اور بیوی کے بطن سے تھا، حضرت علیؓ نے ان کی پناہ کو قبول نہ کرتے ہوئے اس شخص کو قتل کرڈالنا چاہا تو اُمّ ہانیؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر صورت حال بیان کی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کی پناہ کو قبول کیا اور وہ شخص حضرت علیؓ کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گیا۔

ترمذیؒ نے جو روایت نقل کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس وقت اُمّ ہانیؓ ہی کے مکان میں غسل فرمارہے تھے، لیکن یہاں بخاریؒ و مسلمؒ کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے مکان میں یا حضرت فاطمہؓ کے گھر میں نہا رہے تھے، اس صورت میں دونوں روایتوں کے درمیان یوں مطابقت ہوگی کہ بخاریؒ و مسلمؒ کی روایت میں یہ عبارت مقدر مانی جائے کہ "آنحضرت ﷺ میرے گھر میں غسل فرمارہے تھے" یا پھر یہ کہا جائے کہ ترمذیؒ کی روایت میں جو واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ کسی اور موقع کا ہے اور بخاریؒ و مسلمؒ کی روایت کسی اور موقع سے متعلق ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

عورت کے عہد امان کی پاسداری سارے مسلمانوں پر لازم ہے

﴿۲﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْمَرْاَةَ لَتَاخُذُ لِلْقَوْمِ یَعْنِیْ تُجِیْرُ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم نے فرمایا "عورت کسی قوم کے لئے (عہد) لیتی ہے یعنی وہ مسلمانوں کی طرف سے پناہ دے سکتی ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان عورت، کسی کافر کو یا کافروں کی کسی جماعت کو امان و پناہ دے دے تو یہ سارے مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس عورت کے عہد امان کو ملحوظ رکھ کر اس کافر کو یا کافروں کی اس جماعت کو امان و پناہ دیں اور اس عہد امان کو توڑیں نہیں۔

اپنے عہد امان کو توڑنے والے کے بارے میں وعید

﴿۳﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْحَمِقِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ اٰمَنَ رَجُلًا عَلٰی نَفْسِهٖ فَقَتَلَهٗ اُعْطِیَ لِوَاءَ الْغَدْرِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عمرو بن حمق کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص کسی کو اس کی جان کی امان دے اور پھر اس کو مار ڈالے تو قیامت کے دن اس کو بدعہدی کا نشان دیا جائے گا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "اس کو بدعہدی کا نشان دیا جائے گا" اس جملہ کے ذریعہ کنایۃً یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس شخص کو میدان حشر میں تمام مخلوق کے سامنے ذلیل و رسوا کیا جائے گا۔ دوسری حدیثوں میں یہ بیان کیا گیا ہے قیامت کے دن عہد شکن کو ایک ایسا نشان دیا جائے گا جس کے ذریعہ اس کو پہچانا جائے گا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔

معاہدہ کی پوری طرح پابندی کرنی چاہئے

﴿۴﴾ وَعَنْ سُلَیْمِ بْنِ عَامِرٍ قَالَ کَانَ بَیْنَ مُعَاوِیَةَ وَبَیْنَ الرُّوْمِ عَهْدٌ وَکَانَ یَسِیْرُ نَحْوَ بِلَادِهِمْ حَتّٰی اِذَا انْقَضَی الْعَهْدُ اَغَارَ

عَلَيْهِمْ فَجَاءَ رَجُلٌ عَلٰى فَرَسٍ اَوْبِرْذَوْنٍ وَهُوَ يَقُوْلُ اللّٰهُ اَكْبَرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ فَنَظَرُوْا فَاِذَا هُوَعَمْرُو بْنُ عَبَسَةَ فَسَأَلَهُ مُعَاوِيَةُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحُلَّنَّ عَهْدًا وَلَا يَشُدَّنَّهُ حَتّٰى يَمْضِيَ اَمَدُهُ اَوْيَنْبِذَ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ قَالَ فَرَجَعَ مُعَاوِيَةُ بِالنَّاسِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت سلیمؒ ابن عامر (تابعی) کہتے ہیں کہ امیر معاویہؓ اور رومیوں کے درمیان (یہ) معاہدہ ہوا تھا کہ (اتنے دنوں تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے) اور حضرت معاویہؓ (اس معاہدہ کے زمانہ میں) رومیوں کے شہروں میں گشت (کرکے حالات کا اندازہ) لگایا کرتے تھے تاکہ جب معاہدہ کی مدت گذر جائے تو وہ ان (رومیوں) پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں (اور ان کے ٹھکانوں کو تاخت وتاراج کردیں جب کہ اگر وہ گشت کے ذریعہ ان کے حالات اور ٹھکانوں کا جائزہ لینے کی بجائے اطمینان کے ساتھ اپنے کیمپ میں پڑے رہتے اور پھر معاہدہ کی مدت ختم ہونے پر حملہ کرتے تو ان رومیوں کے چوکنا ہونے کی وجہ سے خاطر خواہ جنگی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا پھر (انہی دنوں میں جب کہ امیر معاویہؓ اپنے لشکر والوں کے ساتھ رومیوں کے شہر میں پھر رہے تھے) ایک شخص عربی یا ترکی گھوڑے پر سوار یہ کہتے ہوئے آئے کہ "اللہ اکبر، اللہ اکبر، وفا کو ملحوظ رکھو نہ کہ بدعہدی کو! یعنی تم پر معاہدہ کو پورا کرنا لازم ہے نہ کہ تم معاہدہ کی خلاف ورزی کرو (گویا انہوں نے یہ واضح کیا کہ تم لوگ معاہدہ کے زمانے میں دشمنوں کے شہروں میں گشت لگاتے پھرتے ہو تو یہ اپنے عہد کی پاسداری کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ عہد شکنی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کے حکم میں داخل ہے) جب لوگوں نے دیکھا تو معلوم ہو کہ یہ شخص (ایک صحابیؓ) حضرت عمرو ابن عبسہؓ ہیں، حضرت امیر معاویہؓ نے ان سے اس بات کو پوچھا (کہ رومیوں کے شہروں میں ہمارا پھرنا، عہد شکنی کے مرادف کیسے ہے؟) تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جس شخص اور کسی قوم کے درمیان معاہدہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے عہد کو نہ توڑے اور نہ باندھے، تا آنکہ اس معاہدہ کی مدت گذر جائے یا وہ ان کو مطلع کر کے برابری کی بنیاد پر اپنا عہد توڑ دے (یعنی اس معاہدہ کے خلاف کرنا، یا تو اس صورت میں جائز ہے جب کہ اس معاہدہ کی مدت ختم ہو گئی ہو یا اس صورت میں جائز ہے جب کہ کسی مجبوری یا مصلحت کی بناء پر مدت کے دوران ہی معاہدہ توڑنا ضروری ہو گیا ہو اور فریق مخالف کو پہلے سے آگاہ کر دیا گیا ہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا ہم اس کو توڑتے ہیں، اب ہم اور تم دونوں برابر ہیں کہ جس کی (جو مرضی ہو کرے) حدیث کے راوی حضرت سلیم ابن عامر کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ! حضرت ابن عبسہ کی یہ بات اور آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث سن کر" اپنے لوگوں کے ساتھ (رومیوں کے شہر سے اپنے کیمپ میں) واپس چلے آئے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "اور نہ باندھے" کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کسی بھی فعل سے معاہدہ کے مقصد ومنشاء میں کوئی تغیر وتبدیلی نہ کرے! گویا اس جملہ کی مراد ایفاء عہد میں کسی طرح کا تغیر نہ کرنا ہے، ورنہ عقد عہد کہ جس کے معنی اپنے عہد کو باندھنا اور مستحکم کرنا ہے، شریعت کی نظر میں مستحسن ومطلوب ہے۔

ایفاء عہد اور احترام قاصد کی اہمیت

⑤ وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ بَعَثَنِیْ قُرَيْشٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُلْقِیَ فِیْ قَلْبِیَ الْاِسْلَامُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ وَاللّٰهِ لَا اَرْجِعُ اِلَيْهِمْ اَبَدًا قَالَ اِنِّیْ لَا اَخِيْسُ بِالْعَهْدِ وَلَا اَحْبِسُ الْبُرُدَ وَلٰكِنِ ارْجِعْ فَاِنْ كَانَ فِیْ نَفْسِكَ الَّذِیْ فِیْ نَفْسِكَ الْاٰنَ فَارْجِعْ قَالَ فَذَهَبْتُ ثُمَّ اَتَيْتُ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَسْلَمْتُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابورافع کہتے ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے موقع پر) کفار قریش نے مجھے (اپنا قاصد بنا کر) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا، جب میری نظر رسول کریم ﷺ پر پڑی، تو (بے اختیار) میرے دل میں اسلام (کی صداقت وحقانیت) نے گھر کر لیا، میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ

خدا کی قسم، میں اب بھی ان (کفار قریش) کے پاس واپس نہیں جاؤں گا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "میں نہ تو عہد کو توڑا کرتا ہوں اور نہ قاصدوں کو روکا کرتا ہوں، البتہ تم (اب تو) واپس چلے جاؤ، اگر تمہارے دل میں وہ چیز (یعنی اسلام) قائم رہے جو اس وقت موجود ہے تو پھر (میرے پاس) چلے آنا۔" حضرت ابورافع ؓ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق، میں (مکہ) واپس ہو گیا اور پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آگیا اور اسلام قبول کر لیا (یعنی اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: چونکہ ابورافع ؓ کفار مکہ کی طرف سے کوئی پیغام لے کر آئے تھے اس لئے آنحضرت نے ان کو اپنے پاس نہیں روکا، تاکہ وہ مکہ واپس جاکر کفار قریش کو ان کے پیغام کا جواب دے دیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کو جو حکم دیا اس کا مطلب یہی تھا کہ اسلام نے تمہارے دل میں گھر لیا ہے، اور اب مسلمان ہونے سے تمہیں کوئی چیز نہیں روک سکتی، لیکن احتیاط اور ایفاء عہد کا تقاضا یہ ہے کہ تم ابھی اپنے اسلام کا اظہار و اعلان نہ کرو بلکہ پہلے تم مکہ واپس جاؤ اور کفار قریش نے جو ذمہ داری تمہارے سپرد کی تھی اس کو پورا کر آؤ، یعنی انہوں نے تمہیں جس بات کا جواب لانے کے لئے یہاں بھیجا تھا ان کو وہ جواب پہنچاؤ اور پھر اس کے بعد وہاں سے ہمارے پاس آکر اپنے اسلام کا اظہار و اعلان کرنا۔

⑥ وَعَنْ نُعَيْمِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِرَجُلَيْنِ جَاءَ مِنْ عِنْدِ مُسَيْلِمَةَ اَمَا وَاللّٰهِ لَوْ لَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ اَعْنَاقَكُمَا۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت نعیم ابن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان دونوں آدمیوں سے فرمایا جو مسیلمہ کے پاس سے آئے تھے کہ "یاد رکھو! خدا کی قسم اگر قاصد کو مارنا شرعی طور پر ممنوع نہ ہوتا تو میں تمہاری گردنیں اڑا دیتا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مسیلمہ ایک شخص کا نام ہے جس نے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اپنی نبوت کا دعویٰ کیا تھا اسی لئے اس کو مسیلمہ کذاب کہا جاتا ہے۔ وہ دو شخص جو مسیلمہ کذاب کے پاس سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے تھے ان میں سے ایک کا نام عبداللہ ابن نواحہ تھا اور دوسرے کا نام ابن اثال تھا ان دونوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے یہ کہا تھا کہ نشهد ان مسيلمة رسول الله ہم گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے خفا ہو کر مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

زمانۂ جاہلیت کے ان معاہدوں کو پورا کرنے کا حکم جو اسلام کے منافی نہ ہوں

⑦ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ خُطْبَتِهٖ اَوْفُوْا بِحِلْفِ الْجَاهِلِيَّةِ فَاِنَّهٗ لَا يَزِيْدُهٗ يَعْنِى الْاِسْلَامَ اِلَّا شِدَّةً وَلَا تُحْدِثُوْا حِلْفًا فِى الْاِسْلَامِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ مِنْ طَرِيْقِ حُسَيْنِ بْنِ ذَكْوَانَ عَنْ عَمْرٍو وَقَالَ حَسَنٌ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک دن) اپنے خطبہ کے دوران یہ فرمایا کہ "زمانۂ جاہلیت کی قسم کو پورا کرو، کیونکہ وہ یعنی اسلام اس قسم کو زیادہ ہی (مضبوط) کرتا ہے (مطلب یہ ہے کہ اپنے قسم اور اپنے عہد کو پورا کرنا اسلام میں کہیں زیادہ ضروری ہے اس اعتبار سے اسلامی احکام اور ایفاء عہد و حلف میں کوئی تضاد نہیں ہے) اور اسلام میں حلف یعنی قسما قسمی کو رواج نہ دو۔" امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسین ابن ذکوان کی سند سے بروایت حضرت عمرو ؓ نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔"

تشریح: "قسم کو پورا کرو" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگوں نے اسلام قبول کرنے سے قبل اپنے زمانۂ جاہلیت میں اپنے مابین ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد و پیمان باندھا ہو یا قسما قسمی کی ہو تو اللہ تعالیٰ کے اس حکم اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (اپنے معاہدوں کو پورا کرو) کے بموجب اس عہد و پیمان اور قسما قسمی کو پورا کرو، لیکن انہی عہد و پیمان اور قسموں کو پورا کرو جو اسلام کی تعلیمات و عقائد کے منفی اور دین میں

نقصان کا سبب نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے کہ:

وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ۔ (المائدہ ۵:۲)

"اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔"

حاصل یہ کہ اسلام لانے کے بعد زمانۂ جاہلیت کے اس عہد و پیمان اور قسم کو پورا کرنا ممنوع ہے جس کا تعلق فتنہ و فساد اور خون ریزی وغیرہ سے ہو جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے لَا حَلْفَ فِي الْاِسْلَامِ اور زمانۂ جاہلیت کے جس عہد و پیمان اور قسم کا تعلق مظلوم و بے کس لوگوں کی امداد و اعانت، قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک اور اسی طرح کے دوسرے نیک امور سے ہو، اسلام ان کا موید اور مضبوط کرنے والا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے ایما حلف کان في الجاهية لَمْ یزده الاسلام الا شدة

"اسلام میں حلف یعنی قسما قسمی کو رواج نہ دو" کیونکہ مسلمانوں پر ایک دوسرے کی مدد و اعانت اور باہمی حسن سلوک واجب ہونے کے لئے ان کے مذہب اسلام کی تعلیم و تلقین کافی ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ "اسلام میں حلف کو رواج نہ دو" میں جو ممانعت بیان کی گئی ہے اس کے بارے میں دونوں احتمال ہیں، ایک تو یہ کہ یہ ممانعت، جنس کے لئے ہو، لیکن ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک دوسرا ہی احتمال زیادہ قوی اور صائب ہے، چنانچہ مظہر کا یہ قول بھی اس بات کی تائید کرتا ہے جو مذکورہ بالا حدیث کی وضاحت کے طور پر ہے کہ اس ارشاد گرامی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اگر تم نے اپنے زمانۂ جاہلیت میں (یعنی مسلمان ہونے سے پہلے) یہ قسم کھائی ہو کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے تو (اب مسلمان ہو جانے کے بعد بھی) اس قسم کو پورا کرو یعنی اپنے باہمی معاہدہ و حلف کے مطابق ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو بشرطیکہ جس کی مدد کی جائے وہ حق پر ہو لیکن اسلام میں اس طرح کی قسم کو رواج نہ دو جس کا تعلق تمہیں ایک دوسرے کا وارث قرار دینے سے ہو (جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا کہ کوئی بھی دو شخص آپس میں ایک دوسرے سے قسم کے ساتھ یہ عہد کیا کرتے تھے کہ اگر میں پہلے مرگیا تو تم میرے وارث ہوگے اور اگر تم پہلے مرگئے تو میں تمہارا وارث ہوں گا)

وَ ذُكِرَ حَدِيْثُ عَلِيٍّ الْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَائُهُمْ فِي كِتَابِ الْقِصَاصِ۔ اور حضرت علیؓ کی یہ روایت کہ، المسلمون تتکافأ دمائھم کتاب القصاص میں نقل کی جاچکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قاصد اور ایلچیوں کو قتل نہیں کیا جاسکتا

(٨) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ جَاءَ ابْنُ النَّوَاحَةِ وَ ابْنُ اُثَالٍ رَسُوْلَا مُسَيْلِمَةَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُمَا اَتَشْهَدَانِ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَا نَشْهَدُ اَنَّ مُسَيْلِمَةَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لَوْ كُنْتُ قَاتِلًا رَسُوْلًا لَقَتَلْتُكُمَا قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ فَمَضَتِ السُّنَّةُ اَنَّ الرَّسُوْلَ لَا يُقْتَلُ۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ مسیلمہ (مدعیٔ نبوت) کے دو قاصد ابن نواحہ اور ابن اثال نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "کیا تم اس حقیقت کی گواہی" دیتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں؟" ان دونوں نے کہا کہ "نہیں! بلکہ" ہم اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ، خدا کا رسول ہے۔" نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ (میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا!) اگر میں قاصدوں اور ایلچیوں کو قتل کرنے والا ہوتا تو یقیناً میں تم دونوں کو بھی قتل کر دیتا۔" حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کے پیش نظر) پھر یہ سنت جاری ہوگئی (یعنی یہ ضابطہ قرار پایا) کہ کسی قاصد و ایلچی کو قتل نہ کیا جائے

(خواہ وہ کتنی ہی غیر مناسب بات کیوں نہ کرے اور قتل ہی کا سزاوار کیوں نہ ہو۔" (احمد)

تشریح: ان ایلچیوں نے جو جواب دیا اس کے ذریعہ انہوں نے گویا آنحضرت ﷺ کی رسالت کا انکار اور مسیلمہ کذاب کے خود ساختہ رسالت کا اقرار کیا اور پھر آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ "میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا" تو اس کے ذریعہ گویا آپ ﷺ نے اپنے جذبۂ طلب حق، صفت حلم و بردباری، اور ان کے عذاب خداوندی میں جلد ہی مبتلا ہونے کا اظہار کیا نیز ان الفاظ کے ذریعہ آپ ﷺ نے اس یعنی (مسیلمہ کذاب) کی نبوت کے انکار اور اس کے دعوے کے جھوٹا ہونے کی طرف اشارہ فرمایا۔

بَابُ قِسْمَةِ الْغَنَائِمِ وَالْغُلُوْلِ فِيْهَا

مال غنیمت کی تقسیم اور اس میں خیانت کرنے کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

غنیمت کا مال مسلمانوں کے لئے حلال کیا گیا ہے

(۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فَلَمْ تَحِلَّ الْغَنَائِمُ لِاَحَدٍ مِنْ قَبْلِنَا ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ رَاٰى ضَعْفَنَا وَعِجْزَنَا فَطَيَّبَهَا لَنَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ، رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "پس غنیمت کا مال ہم سے پہلے کسی (امت کے لئے حلال نہیں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں (مالی طور پر) کمزور و عاجز دیکھا تو اس (مال غنیمت) کو ہمارے لئے حلال قرار دیا۔"

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ "فلم تحل" میں حرف فا (پس) عاطفہ ہے جس کے ذریعہ ارشاد گرامی کے ان جملوں پر عطف کیا گیا ہے جو اس سے پہلے فرمائے گئے تھے، حاصل یہ کہ یہاں جو حدیث نقل کی گئی ہے وہ دراصل اس ارشاد گرامی کا تتمہ ہے جو یہاں نقل نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس باب کی تیسری فصل میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں منقول ہے۔

مقتول سے چھینا ہوا مال قاتل کا ہے

(۲) وَعَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَامَ حُنَيْنٍ فَلَمَّا الْتَقَيْنَا كَانَتْ لِلْمُسْلِمِيْنَ جَوْلَةٌ فَرَاَيْتُ رَجُلًا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَدْ عَلَا رَجُلًا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَضَرَبْتُهُ مِنْ وَّرَائِهِ عَلٰى حَبْلِ عَاتِقِهِ بِالسَّيْفِ فَقَطَعْتُ الدِّرْعَ وَاَقْبَلَ عَلَيَّ فَضَمَّنِيْ ضَمَّةً وَجَدْتُ مِنْهَا رِيْحَ الْمَوْتِ ثُمَّ اَدْرَكَهُ الْمَوْتُ فَاَرْسَلَنِيْ فَلَحِقْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَقُلْتُ مَا بَالُ النَّاسِ قَالَ اَمْرُ اللّٰهِ ثُمَّ رَجَعُوْا وَجَلَسَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَنْ قَتَلَ قَتِيْلًا لَهٗ عَلَيْهِ بَيِّنَةٌ فَلَهٗ سَلَبُهٗ فَقُلْتُ مَنْ يَّشْهَدُ لِيْ ثُمَّ جَلَسْتُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَهٗ فَقُمْتُ مَنْ يَّشْهَدُ لِيْ ثُمَّ جَلَسْتُ ثُمَّ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَهٗ فَقُلْتُ فَقَالَ مَا لَكَ يَا اَبَا قَتَادَةَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ رَجُلٌ صَدَقَ وَسَلَبُهٗ عِنْدِيْ فَاَرْضِهٖ مِنِّيْ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ لَاهَا اللّٰهِ اِذًا لَا يَعْمِدُ اِلٰى اَسَدٍ مِنْ اُسْدِ اللّٰهِ يُقَاتِلُ عَنِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَيُعْطِيْكَ سَلَبَهٗ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَدَقَ فَاَعْطِهٖ فَاَعْطَانِيْهِ فَابْتَعْتُ بِهٖ مَخْرَفًا فِيْ بَنِيْ سَلِمَةَ فَاِنَّهٗ لَاَوَّلُ مَالٍ تَاَثَّلْتُهٗ فِي الْاِسْلَامِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ (فتح مکہ کے بعد) غزوۂ حنین کے سال ہم (جہاد کے لئے) نبی کریم ﷺ کے ہمراہ روانہ ہوئے، جب کافروں

سے ہمارا مقابلہ ہوا تو (کچھ دیر کے لئے) مسلمانوں کو شکست کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، میں نے دیکھا کہ ایک مشرک ایک مسلمان پر غالب آگیا ہے، میں نے اس کے پیچھے سے اس کی گردن کی رگ پر تلوار کا (بھرپور) وار کر کے اس کی زرہ کاٹ ڈالی، وہ مشرک مجھ پر جھپٹ پڑا اور اس نے اتنے زور سے مجھے دبوچا کہ اس کی وجہ سے موت کا مزہ آگیا (یعنی میں مرنے کے قریب ہو گیا، پھر (میرے ایک اور وار سے) موت نے اسے دبالیا اور میں اس سے چھوٹ گیا، اس کے بعد میں حضرت عمر ابن خطابؓ سے ملا اور کہا کہ "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے (کہ دشمن کے مقابلہ سے بھاگ رہے!؟") انہوں نے کہا کہ "اللہ کا حکم یہی ہے یعنی یہ جو کچھ ہو رہا ہے قضاء و قدر الٰہی کے مطابق ہو رہا ہے۔" پھر لوگ (اس عارضی پسپائی کے بعد دوبارہ لڑنے کے لئے میدان جنگ میں) واپس آگئے اور نبی کریم ﷺ (ایک جگہ) بیٹھ گئے اور فرمایا کہ "جو شخص دشمن کے) کسی آدمی کو قتل کر دے اور اس کے قتل کرنے کا کوئی گواہ ہو (اور خواہ ایک ہی گواہ ہو) تو مقتول کا چھینا ہوا مال اسی (قتل کرنے والے) شخص کا ہوگا۔" (یہ سن کر میں کھڑا ہوا اور ارادہ کیا کہ اس مشرک کو قتل کرنے کا واقعہ بیان کروں، لیکن (دل میں) میں نے کہا کہ "میری گواہی کون شخص دے گا (کہ میں نے اس مشرک کو قتل کیا ہے۔") آخر میں بیٹھ گیا، نبی کریم ﷺ نے اسی طرح پھر فرمایا (کہ جو شخص دشمن کے کسی آدمی کو قتل کرنے کا کوئی گواہ ہو تو مقتول کا چھینا ہوا مال اسی کا ہوگا) میں نے پھر (کھڑے ہو کر اپنے واقعہ بیان کرنا چاہا لیکن میں نے دل میں) کہا کہ "میری گواہی کون شخص دے گا!؟ اور میں پھر بیٹھ گیا، نبی کریم ﷺ نے پھر اسی طرح (تیسری مرتبہ) فرمایا، میں (جب اس مرتبہ بھی) کھڑا ہوا (لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا) تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ابو قتادہ! کیا بات ہے (تم کسی غرض مند اور طالب حاجت کی طرح بار بار کھڑے ہوتے ہو اور بیٹھ جاتے ہو مگر زبان سے کچھ نہیں کہتے؟)" تب میں نے آنحضرت ﷺ کو بتایا (کہ میں نے فلاں مشرک کو قتل کیا ہے)" ایک شخص نے (میری بات سن کر) کہا کہ "ابو قتادہؓ سچ کہتے ہیں اور اس مشرک کا مال میرے پاس موجود ہے، آپ ﷺ ان کو میری طرف سے راضی کر دیجئے (کہ یہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں اور ان کو اس مشرک کے مال کے عوض کوئی اور چیز دے دی جائے یا ان کو اس بات پر رضامند کر دیجئے کہ یہ میرے ساتھ کسی اور طرح مصالحت کر لیں)۔" حضرت ابو بکر صدیقؓ نے (یہ سن کر اس شخص سے) کہا کہ "نہیں، خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا، رسول کریم ﷺ اس معاملہ میں ان (ابو قتادہؓ) کی مرضی کے خلاف کوئی ارادہ نہیں کریں گے ابو قتادہؓ اللہ کے شیروں میں سے ایک شیر ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لئے (دشمن سے) لڑتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس مال پر ان (ابو قتادہؓ) کا حق ہے وہ تمہیں دے دیں!؟ نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے فرمایا کہ "ابو بکرؓ ٹھیک کہتے ہیں، تم ابو قتادہ کو اس مشرک (مقتول) کا مال دے دو۔" چنانچہ اس شخص نے اس کا مال مجھ کو دے دیا اور میں نے (بعد میں) اس مال کے ذریعہ ایک باغ خریدا جو قبیلہ بنو سلمہ میں واقع تھا اور یہ سب سے پہلا مال تھا جو مجھے اسلام لانے کے بعد حاصل ہوا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس غزوہ (جنگ) میں مسلمانوں کو کچھ دیر کے لئے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ اسلامی لشکر کے کچھ لوگوں نے ایک موقع پر پسپائی اختیار کی جس سے دشمن کے لشکر کو بظاہر حاوی ہونے کا موقع مل گیا لیکن آنحضرت ﷺ میدان جنگ میں اپنی جگہ پر قائم رہے، آپ ﷺ ایک خچر پر سوار تھے جس کی باگ حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب اور حضرت ابو سفیانؓ بن الحارث نے تھام رکھی تھی۔ اس عارضی پسپائی کے موقع پر جب کہ اسلامی لشکر میں تقریباً افراتفری کا عالم تھا آپ ﷺ نہ صرف بڑی بہادری کے ساتھ دشمن کے مقابلے پر ڈٹے رہے بلکہ آگے بڑھ بڑھ کر دشمن کے لشکر پر تن تنہا حملہ کرنے کا ارادہ کرتے تھے اور یہ فرماتے جاتے تھے۔

انا النبی لا کذب، انا ابن عبد المطلب۔

"یعنی میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں، اور جھوٹ نہیں کہتا سچا نبی ہوں۔"

لیکن یہ دونوں حضرات جنہوں نے آپ ﷺ کے خچر کی باگ تھام رکھی تھی آپ ﷺ کو روک دیتے تھے، آخر کار حق تعالیٰ نے اسلامی لشکر کو ثابت قدمی بخشی اور اس نے دوبارہ دشمن پر حملہ کر کے اس کے لشکر کو تہس نہس کر دیا اور آخری فتح حاصل کی۔

مال غنیمت کی تقسیم

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَسْھَمَ لِلرَّجُلِ وَلِفَرَسِہٖ ثَلَاثَۃَ اَسْھُمٍ سَھْمًا لَہٗ وَسَھْمَیْنِ لِفَرَسِہٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (مال غنیمت میں سے) ایک شخص اور اس کے گھوڑے کے لئے تین حصے دیئے یعنی ایک حصہ تو خود اس کا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اکثر علماء کا مسلک اسی حدیث کے مطابق ہے، جب کہ بعض علماء کے نزدیک مال غنیمت میں سوار مجاہد کے دو حصے ہیں، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک بھی یہی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے سوار مجاہد کو دو حصے دیئے جیسا کہ اسی باب کی دوسری فصل میں منقول روایت سے واضح ہوگا، نیز حضرت علیؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے بھی یہی منقول ہے بلکہ ہدایہ نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے بھی یہی نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب اس بارے میں خود حضرت ابن عمرؓ کی دو روایتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس روایت کو ترجیح دی جائے گی جو ان کے علاوہ دوسرے نے نقل کی ہے

مال غنیمت میں غلام اور عورتوں کا کوئی حصہ مقرر نہیں

(۴) وَعَنْ یَزِیْدَ بْنِ ھُرْمُزَ قَالَ کَتَبَ نَجْدَۃُ الْحَرُوْرِیُّ اِلَی ابْنِ عَبَّاسٍ یَسْأَلُہٗ عَنِ الْعَبْدِ وَ الْمَرْأَۃِ یَحْضُرَانِ الْغَنَمَ ھَلْ یُقْسَمُ لَھُمَا فَقَالَ لِیَزِیْدَ اُکْتُبْ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَیْسَ لَھُمَا سَھْمٌ اِلَّا اَنْ یُحْذَیَا۔ وَفِیْ رِوَایَۃٍ کَتَبَ اِلَیْہِ ابْنُ عَبَّاسٍ اَنَّکَ کَتَبْتَ تَسْأَلُنِیْ ھَلْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَغْزُوْا بِالنِّسَاءِ وَھَلْ کَانَ یَضْرِبُ لَھُنَّ بِسَھْمٍ فَقَدْ کَانَ یَغْزُوْا بِھِنَّ یُدَاوِیْنَ الْمَرْضٰی وَیُحْذَیْنَ مِنَ الْغَنِیْمَۃِ وَ اَمَّا السَّھْمُ فَلَمْ یَضْرِبْ لَھُنَّ بِسَھْمٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت یزید ابن ہرمز کہتے ہیں کہ نجدہ حروری نے حضرت ابن عباسؓ کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے غلام اور عورت کے بارے میں یہ دریافت کیا تھا کہ جب وہ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت موجود ہوں تو ان کو بھی اس مال غنیمت سے حصہ دیا جائے یا نہیں؟ حضرت ابن عباسؓ نے یزید سے (یعنی مجھ سے) فرمایا کہ تم (میری طرف سے) نجدہ کو یہ جواب لکھ دو کہ ان دونوں کا حصہ مقرر نہیں ہے البتہ (تقسیم کے وقت) ان کو یوں ہی کچھ دے دیا جائے۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس (نجدہ) کو یہ جواب لکھا کہ "تم نے خط لکھ کر مجھ سے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا رسول کریم ﷺ جہاد میں عورتوں کو ساتھ لے جایا کرتے تھے اور کیا آپ ﷺ ان (عورتوں) کو مال غنیمت میں سے حصہ دیتے تھے؟ تو (اس کا جواب یہ ہے کہ) آنحضرت جہاد میں عورتوں کو ساتھ لے جاتے تھے جو بیماروں کی دوا دارو کرتی تھیں (اور زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں) اور ان کو مال غنیمت میں سے یوں ہی کچھ دے دیا جاتا تھا لیکن ان کے لئے حصہ مقرر نہیں کیا گیا تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "نجدہ" اس شخص کا نام ہے جو خوارج یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے مخالفین کا سردار تھا، اور حروری دراصل حروراء کی طرف منسوب ہے جو کوفہ کے نواح میں ایک آبادی کا نام تھا، کہا جاتا ہے کہ خوارج کا سب سے پہلا اجتماع اسی آبادی میں ہوا تھا

اکثر علماء کا یہی مسلک ہے کہ غلام بچوں اور عورتوں کو مال غنیمت میں سے یوں ہی کچھ دے دیا جائے۔ یعنی حصہ سے کم دیا جائے پورا حصہ نہ دیا جائے، حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ اور ہدایہ میں لکھا ہے کہ غلام کو مال غنیمت میں سے کچھ اس صورت میں دیا جائے جب کہ وہ جنگ میں شریک رہ کر دشمن سے لڑا ہو، اسی طرح عورت کو بھی اس صورت میں دیا جائے جب کہ وہ بیمار اور زخمی مجاہدین کی تیمارداری اور ان کی دوا دارو کرے۔

مخصوص طور پر بعض مجاہدوں کو ان کے حصے سے زائد دیا جاسکتا ہے

⑤ وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِظَهْرِهٖ مَعَ رَبَاحٍ غُلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا مَعَهٗ فَلَمَّا اَصْبَحْنَا اِذَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ الْفَزَارِيُّ قَدْ اَغَارَ عَلٰى ظَهْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُمْتُ عَلٰى اَكَمَةٍ فَاسْتَقْبَلْتُ الْمَدِيْنَةَ فَنَادَيْتُ ثَلَاثًا يَا صَبَاحَاهُ ثُمَّ خَرَجْتُ فِيْ اٰثَارِ الْقَوْمِ اَرْمِيْهِمْ بِالنَّبْلِ وَاَرْتَجِزُ اَقُوْلُ اَنَا ابْنُ الْاَكْوَعِ وَالْيَوْمُ يَوْمُ الرُّضَّعِ۔ فَمَازِلْتُ اَرْمِيْهِمْ وَاَعْقِرُ بِهِمْ حَتّٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ بَعِيْرٍ مِنْ ظَهْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا خَلَّفْتُهٗ وَرَاءَ ظَهْرِيْ ثُمَّ اتَّبَعْتُهُمْ اَرْمِيْهِمْ حَتّٰى اَلْقَوْا اَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثِيْنَ بُرْدَةً وَّثَلَاثِيْنَ رُمْحًا يَسْتَخِفُّوْنَ وَلَا يَطْرَحُوْنَ شَيْئًا اِلَّا جَعَلْتُ عَلَيْهِ اٰرَامًا مِنَ الْحِجَارَةِ يَعْرِفُهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهٗ حَتّٰى رَاَيْتُ فَوَارِسَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَحِقَ اَبُوْقَتَادَةَ فَارِسُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ فَقَتَلَهٗ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ فُرْسَانِنَا الْيَوْمَ اَبُوْقَتَادَةَ وَخَيْرُ رُجَالَتِنَا سَلَمَةُ قَالَ ثُمَّ اَعْطَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَهْمَيْنِ سَهْمَ الْفَارِسِ وَسَهْمَ الرَّاجِلِ فَجَمَعَهُمَا لِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ اَرْدَفَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَاءَهٗ عَلَى الْعَضْبَاءِ رَاجِعِيْنَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سلمہ ابن اکوعؓ کہتے ہیں کہ (مسلمانوں اور کفار قریش کے درمیان معاہدہ ہو جانے کا بعد حدیبیہ سے واپسی کے دوران راستہ میں) رسول کریم ﷺ نے اپنی، سواری کے اونٹ رباح کے ساتھ، جو رسول کریم ﷺ کے غلام تھے، آگے روانہ کر دیئے میں بھی رباح کے ساتھ ہو لیا، (ہم دونوں نے رات میں ایک جگہ قیام کیا اور) جب صبح ہوئی تو ہمیں معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن فزاری نے (جو مسلمانوں کا ایک مشہور دشمن اور کافر تھا) رسول کریم ﷺ کے اونٹوں پر چھاپہ مارا اور ان کو ہنکا کرلے گیا، میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور مدین کی طرف منہ کر کے تین مرتبہ یا صباحاہ (یعنی خبردار! دشمن آپہنچا) کا نعرہ بلند کیا اور تیر پر تیر پھینکتا ہوا اس قوم یعنی عبدالرحمٰن اور اس کے ساتھیوں کے نشانات قدم پر (یعنی ان کے پیچھے) چل پڑا اس وقت میری زبان پر (بلند آواز میں) رجز یعنی رزمیہ شعر تھے، میں نے کہا تھا انا ابن الاکوع والیوم یوم الرضع یعنی (اے دین کے دشمنو! کان کھول کر سن لو) میں اکوع کا بیٹا ہوں، آج کا دن برے لوگوں (یعنی تم دشمنان دین) کے ہلاک ہونے کا دن ہے! میں اسی طرح برابر تیر مارتا اور ان کی سواریوں کی کونچیں کاٹتا (آگے بڑھتا) رہا یہاں تک کہ رسول کریم ﷺ کے اونٹوں میں سے اللہ کا پیدا کیا ہوا ایسا کوئی اونٹ باقی نہیں بچا جس کو میں نے اپنے پیچھے نہ چھوڑ دیا ہو، میں تیر برساتا ہوا ان کا تعاقب جاری رکھے ہوئے تھا یہاں تک کہ انہوں نے ہلکا ہو جانے کے خیال سے اپنی تیس سے زیادہ چادریں اور تیس کپڑے پھینک دیئے (یعنی وہ بھاگتے ہوئے اپنی چادریں اور اپنے کپڑے بھی پھینکتے جا رہے تھے تا کہ جسم ہلکا ہو جانے کی وجہ سے بھاگنے میں آسانی ہو) اور وہ جس چیز کو بھی پھینکتے تھے میں اس پر نشان کے طور پر پتھر رکھ دیتا تھا تا کہ رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء (اگر پیچھے سے آئیں تو) اس کو پہچان لیں یہاں تک میں نے رسول کریم ﷺ کے سواروں کو (آتے) دیکھا اور پھر (یہ دیکھا کہ) حضرت ابوقتادہؓ نے جنہیں رسول کریم ﷺ کا سوار کہا جاتا تھا، عبدالرحمٰن کو جا لیا (جس نے آنحضرت ﷺ کے اونٹوں کو ہنکا لے جانا چاہا تھا) اور اس کو قتل کر دیا۔ پھر (اس ہنگامہ کے ختم ہونے کے بعد) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "آج ہمارے سواروں میں سب سے بہتر سوار ابوقتادہؓ ہیں اور پیادوں میں سب سے بہتر پیادہ سلمہ ابن اکوع ہیں۔" اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے (جب ان کافروں سے ہاتھ لگے ہوئے مال کو ہمارے درمیان تقسیم فرمایا تو) مجھ کو دو حصے دیئے (ایک حصہ سوار کا (کہ وہ بحسب اختلاف مسلک دو حصے ہیں یا تین حصے) اور ایک حصہ پیادہ کا، دونوں حصے اکٹھا کر کے مجھے عطا فرمائے اور پھر رسول کریم ﷺ نے اپنی اونٹنی عضباء پر مجھے اپنے پیچھے بٹھا لیا اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔" (مسلم)

تشریح: "رضع" دراصل راضع کی جمع ہے جیسے ارکع کی جمع رکع ہے! راضع پاجی اور کمینہ شخص کو کہتے ہیں آرام (پہلے الف کے مد کے ساتھ) ارم کی جمع ہے جیسے عنب کی جمع اعناب ہے! ارم اس پتھر کو کہتے ہیں جو جنگل و میدان میں راستہ یا کسی دفینہ کے نشان و علامت کے طور پر نصب کیا گیا ہو۔ اہل عرب کی یہ عادت تھی جب وہ راستہ میں کوئی چیز پاتے اور اس کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکتے تو اس پر بطور نشان کو یا پتھر رکھ دینے یا پتھروں کا ڈھیر کر کے اس کے نیچے اس کو چھپا دیتے اور پھر آ کر اسی نشان سے وہ چیز نکال کر لے جاتے۔

حضرت سلمہؓ اگرچہ پیادہ تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو پیادہ کا حصہ دینے کے ساتھ سوار کا حصہ بھی دیا کیونکہ یہ سارا معرکہ ایک طرح سے انہی کی جدوجہد سے سر ہوا گویا وہ اس غزوے کے ایک بڑے منتظم بھی تھے، اس سے معلوم ہوا کہ امام وقت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ مال غنیمت میں سے کسی ایسے مجاہد کو اس کے حصے سے زیادہ دیدے۔ جس نے جہاد میں بہت زیادہ محنت وجدوجہد کی ہو تا کہ لوگ جہاد میں زیادہ سے زیادہ محنت وجدوجہد کرنے کی طرف راغب ہوں

(۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُنَفِّلُ بَعْضَ مَنْ يَبْعَثُ مِنَ السَّرَايَا لِاَنْفُسِهِمْ خَاصَّةً سِوٰى قِسْمَةِ عَامَّةِ الْجَيْشِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جن لوگوں کو جہاد کے لئے بھیجتے تھے ان میں سے بعض لوگوں کے لئے عام لشکر والوں کی بہ نسبت مخصوص طور پر کچھ زیادہ حصہ لگا دیا کرتے تھے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت بعض مجاہدوں کو ان کے مقررہ حصوں سے کچھ زیادہ دے دیا کرتے تھے تا کہ انہیں دشمنوں کے مقابلہ پر لڑنے کی ترغیب ہو۔

(۷) وَعَنْهُ قَالَ نَفَّلَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفْلًا سِوٰى نَصِيْبِنَا مِنَ الْخُمْسِ فَاَصَابَنِيْ شَارِفٌ وَالشَّارِفُ الْمُسِنُّ الْكَبِيْرُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے ہم لوگوں کو خمس مال میں سے ہمارے مقررہ حصوں کے علاوہ بھی کچھ زیادہ مرحمت فرمایا، چنانچہ میرے حصے میں ایک شارف آئی اور شارف اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو بوڑھی اور بڑی ہو۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

مسلمانوں کے ان جانوروں اور غلاموں کا حکم جو دشمنوں کے ہاتھ لگ جائیں اور پھر مال غنیمت میں واپس آئیں

(۸) وَعَنْهُ قَالَ ذَهَبَتْ فَرَسٌ لَهُ فَاَخَذَهُ الْعَدُوُّ فَظَهَرَ عَلَيْهِمُ الْمُسْلِمُوْنَ فَرُدَّ عَلَيْهِ فِيْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَبَقَ عَبْدٌ لَهُ فَلَحِقَ بِالرُّوْمِ فَظَهَرَ عَلَيْهِمُ الْمُسْلِمُوْنَ فَرَدَّ عَلَيْهِ خَالِدُ ابْنُ الْوَلِيْدِ بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ (ایک مرتبہ) ان کا گھوڑا بھاگ گیا جس کو دشمنوں (یعنی کافروں) نے پکڑ لیا، پھر جب مسلمانوں کو ان دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی (اور ان کے مال غنیمت میں وہ گھوڑا بھی آیا) تو ابن عمرؓ کو ان کا گھوڑا واپس کر دیا گیا (اور اس کو مال غنیمت میں شمار نہیں کیا گیا) یہ واقعہ رسول کریم ﷺ کے زمانے کا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ "ابن عمرؓ کا غلام بھاگ کر روم پہنچ گیا، پھر جب مسلمانوں کو رومیوں پر فتح حاصل ہوئی تو خالد بن ولیدؓ نے ابن عمرؓ کو (ان کا غلام) واپس کر دیا۔ یہ نبی کریم ﷺ کے زمانے کے بعد کا واقعہ ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا اگر کافر مسلمانوں کے بھاگے ہوئے غلام کو پکڑ لیں تو وہ اس کے مالک نہیں

ہوتے، چنانچہ ان کافروں پر مسلمانوں کے غلبہ حاصل کرلینے کی صورت میں اگر وہ غلام مال غنیمت کے ساتھ مسلمانوں کے قبضے میں آجائے تو یہ واجب ہے کہ وہ غلام اس کے مالک کو واپس کردیا جائے خواہ یہ واپسی مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے عمل میں آجائے یا تقسیم کے بعد واپس کرنا پڑے۔ اور ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان یا ذمی کا مسلمان غلام بھاگ کر دار الحرب پہنچ جائے اور وہاں کے کافر اس کو پکڑلیں تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ کافر اس کے مالک نہیں قرار پائیں گے جب کہ صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک وہ کافر اس کے مالک ہوجائیں گے، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے لیکن اگر وہ غلام مرتد ہوکر بھاگا ہو اور کافروں نے اس کو پکڑلیا ہو تو اس صورت میں تمام آئمہؒ کے نزدیک وہ اس کے مالک قرار پائیں گے۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان یا ذمی کا کوئی اونٹ بھاگ کر چلا گیا اور کافروں نے اس کو پکڑلیا تو وہ اس کے مالک ہوجائیں گے۔

خیبر کے مال خمس میں سے بنو عبد شمس اور بنو نوفل کی محرومی

⑨ وَعَنْ جُبَيْرِ ابْنِ مُطْعِمٍ قَالَ مَشَيْتُ اَنَا وَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا اَعْطَيْتَ بَنِي الْمُطَّلِبِ مِنْ خُمُسِ خَيْبَرَ وَ تَرَكْتَنَا وَنَحْنُ بِمَنْزِلَةٍ وَاحِدَةٍ مِنْكَ فَقَالَ اِنَّمَا بَنُوْهَاشِمٍ وَ بَنُو الْمُطَّلِبِ شَيْءٌ وَاحِدٌ قَالَ جُبَيْرٌ وَلَمْ يَقْسِمِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِبَنِيْ عَبْدِ شَمْسٍ وَبَنِيْ نَوْفَلٍ شَيْئًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جبیر ابن مطعمؓ کہتے ہیں کہ میں اور حضرت عثمان ابن عفانؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ ﷺ نے خیبر کے خمس میں سے بنو مطلب کو حصہ دیا اور ہم کو نہیں دیا حالانکہ آپ ﷺ کے اعتبار سے ہم سب ایک ہی مرتبہ کے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ (میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں (جانتا) کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک ہیں۔" حضرت جبیرؓ کہتے ہیں کہ "اور نبی کریم ﷺ نے بنو عبد شمس (یعنی حضرت عثمانؓ وغیرہ) اور بنو نوفل (یعنی حضرت جبیرؓ وغیرہ) کو کوئی حصہ نہیں دیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "ہم سب ایک ہی مرتبہ کے ہیں" کا مطلب یہ تھا کہ میں، حضرت عثمان، بنوہاشم اور بنو مطلب، آپ ﷺ کے اعتبار سے ایک ہی درجہ کے ہیں بایں طور کہ ہم سب ایک ہی جد اعلیٰ یعنی عبد مناف کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک ہی سلسلہ کی کڑی ہیں، اور وہ یوں کہ ہاشم، مطلب، نوفل اور عبد شمس، یہ چاروں عبد مناف کے بیٹے تھے جو ہمارے اور آپ ﷺ کے چوتھے جد ہیں، چنانچہ میں، جبیر ابن مطعم ابن عدی ابن نوفل ابن عبد مناف ہوں، حضرت عثمان ابن عفان ابن ابوالعاص ابن امیر ابن عبد شمس ابن عبد مناف ہیں اور آپ ﷺ محمد ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب ابن ہاشم ابن عبد مناف ہیں۔ اس طرح ہم سب ایک ہی سلسلہ نسب کی کڑی ہیں تو پھر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ ﷺ نے خیبر سے آئے ہوئے مال کے خمس میں سے اس سلسلہ نسب کی ایک شاخ بنو مطلب کو تو حصہ دیا لیکن ہمیں یعنی عبد شمس اور بنو نوفل کو کیوں محروم رکھا؟ اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ جو یہ فرمایا کہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ بنوہاشم اور بنو مطلب ایک ہیں" تو اس کا حاصل یہ تھا کہ اگرچہ یہ چاروں ایک ہی سلسلہ نسب کی کڑی اور ایک ہی جد علی عبد مناف کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک ہی خاندان کے فرد ہیں لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ تعلقات و معاملات کے اعتبار سے اصل میں صرف بنوہاشم اور بنو مطلب ہی ایک مرتبہ کے اور شئی واحد کے مانند ہیں کیونکہ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے مدد و معاون رفیق و غمگسار اور ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں۔ ان دونوں کے درمیان نہ زمانہ جاہلیت میں مخالفت و منافرت تھی اور نہ اب زمانہ اسلام میں کوئی اختلاف و انتشار ہے جب کہ تم دونوں یعنی بنو عبد شمس اور بنو نوفل زمانہ جاہلیت میں بنوہاشم اور بنو مطلب کے حریف و مخالف رہے ہو چنانچہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مرتبۂ نبوت پر فائز ہونے کے بعد مکہ میں اسلام کی تبلیغ شروع کی اور کفار قریش کو اللہ کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی طرف بلایا تو بنو عبد شمس اور بنو نوفل (کے لوگوں) نے آپ ﷺ کی دعوت و تبلیغ کی سخت مخالفت ہی نہیں کی بلکہ آپ ﷺ کے درپئے آزار بھی ہوئے، یہاں تک کہ ان دونوں یعنی بنو عبد شمس اور بنو نوفل نے اسی مخالفت

وعداوت کی بناء پر آپس میں ایک دوسرے سے عہد کی کہ جب تک بنو ہاشم کے لوگ، محمد (ﷺ) کو ہم میں سے کسی ایک کے حوالے نہ کردیں اس وقت تک ہم بنو ہاشم کے ساتھ بیاہ شادی، لین دین اور خرید وفروخت کا کوئی معاملہ نہیں کریں گے۔ اس وقت بنو مطلب نے بنو ہاشم کے ساتھ پورا تعاون کیا اور ان کے ساتھ متفق ومتحد رہے! لہٰذا آنحضرت ﷺ نے بنو عبد شمس (یعنی حضرت عثمان وغیرہ) بنو نوفل (یعنی حضرت جبیر وغیرہ) کو خیبر کے خمس میں سے کوئی حصہ نہیں دیا باوجودیکہ وہ آنحضرت ﷺ کے ذوی القربی میں سے تھے کیونکہ ان کے اور بنو ہاشم کے درمیان کوئی اتفاق واتحاد نہیں تھا جب کہ بظاہر دونوں کے درمیان مخالفت ومنافرت تھی۔

مال فئی کا حکم

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا قَرْيَةٍ اَتَيْتُمُوْهَا وَاَقَمْتُمْ فِيْهَا فَسَهْمُكُمْ فِيْهَا وَاَيُّمَا قَرْيَةٍ عَصَتِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ خُمُسَهَا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ ثُمَّ هِيَ لَكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس بستی میں تم جاؤ اور اس میں قیام کرو تو اس (کے مال) میں تمہارا حصہ ہے اور جو بستی خدا اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے تو اس (کے مال) میں پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے، اور بقیہ تمہارا ہے۔" (مسلم)

تشریح: "اور اس میں قیام کرو" کا مطلب یہ ہے کہ تم جہاد کے لئے کسی بستی میں گئے اور بستی والے لڑے بھڑے بغیر اس بستی کو چھوڑ کر بھاگ گئے یا انہوں نے تمہارے ساتھ مصالحت کر کے اس بستی اور اپنے آپ کو تمہارے حوالے کردیا اور تم اس میں قیام پذیر ہوگئے۔

"تو اس میں تمہارا حصہ ہے" کے ذریعہ یہ واضح کیا گیا ہے کہ مذکورہ بستی سے جو مال واسباب تمہارے ہاتھ لگے گا وہ صرف تمہارا حق نہیں ہوگا بلکہ تمہارے اور ان مجاہدین کے درمیان مشترک رہے گا جو تمہارے ساتھ جہاد کے لئے نہیں جاسکے ہیں بلکہ اپنے گھروں میں رہ گئے ہیں کیونکہ اس طرح کا مال (جو مسلمانوں کو کفار سے جنگ وجدل کے بغیر حاصل ہو) "فئی" کہلاتا ہے اور مال فئی کا حکم یہ ہے کہ وہ صرف انہی مجاہدین کے لئے مخصوص نہیں ہوتا جو جنگ میں شریک ہونے کے لئے اپنے گھروں سے نکلے ہوں۔

"جو بستی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جس بستی کے لوگوں نے نہ تو دعوت اسلام قبول کی اور نہ مصالحت کے ذریعہ اپنے آپ کو تمہارے حوالے کیا بلکہ تمرد وسرکشی کی راہ اختیار کر کے تمہارے ساتھ جنگ کی اور تم نے لڑائی اور طاقت کے ذریعہ ان پر غلبہ حاصل کرلیا تو اس صورت میں اس بستی سے جو مال اسباب ہاتھ لگے گا وہ "مال غنیمت" کہلائے گا، اس مال میں سے پہلے خمس یعنی پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے علیحدہ کردیا جائے گا اور پھر جو باقی بچے گا وہ اس جنگ میں شریک ہونے والے مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ خمس صرف مال غنیمت میں سے نکالا جائے گا، مال فئی میں سے بھی نکالا جائے اس اعتبار سے یہ حدیث حضرت امام شافعیؒ کے خلاف مسلک کی دلیل ہے۔

بعض حنفی علماء نے اس حدیث کی تشریح یوں کی ہے پہلے جزو سے مراد وہ صورت ہے جس میں مسلمانوں نے کسی آبادی وبستی کو اس حال میں فتح کیا ہو کہ ان کے ساتھ رسول کریم ﷺ نہ رہے ہوں اور دوسرے جزو سے مراد وہ صورت ہے جس میں مسلمانوں نے کسی آبادی وبستی کو اس حال میں فتح کیا ہو کہ آنحضرت ﷺ بذات خود اس جہاد میں شریک رہے ہوں، لہٰذا اس دوسری صورت میں آنحضرت ﷺ خمس وصول فرماتے تھے اور باقی لشکر والوں کے درمیان تقسیم ہوتا تھا۔

مال غنیمت میں خیانت کرنے والوں کے بارے میں وعید

(۱۱) وَعَنْ خَوْلَةَ الْاَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ رِجَالًا يَتَخَوَّضُوْنَ فِیْ مَالِ اللّٰهِ بِغَيْرِ حَقٍّ فَلَهُمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت خولہؓ انصاریہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بعض لوگ اللہ کا مال یعنی غنیمت فئی اور زکوٰۃ کے مال میں ناحق یعنی بغیر کسی استحقاق کے تصرف کرتے ہیں، لہٰذا ایسے لوگ قیامت کے دن آگ کے سزاوار ہوں گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: یعنی اگر انہوں نے حلال جان کر ناحق تصرف کیا ہوگا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ کی آگ میں جلیں گے اور اگر انہوں نے اس گناہ کا ارتکاب اس کو حلال جان کر نہیں کیا ہوگا پھر حق تعالیٰ جتنی مدت کے لئے چاہے گا ان کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا رکھے گا۔

(۱۴) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَذَكَرَ الْغُلُوْلَ فَعَظَّمَهٗ وَعَظَّمَ اَمْرَهٗ ثُمَّ قَالَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ بَعِيْرٌ لَهٗ رُغَاءٌ يَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ فَرَسٌ لَهٗ حَمْحَمَةٌ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ شَاةٌ لَهَا ثُغَاءٌ يَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ نَفْسٌ لَهَا صِيَاحٌ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ رِقَاعٌ تَخْفِقُ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ صَامِتٌ فَيَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِيْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ وَهُوَ اَتَمُّ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک دن ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا اور (اس خطبہ کے دوران) مال غنیمت میں خیانت کا ذکر فرمایا، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بہت بڑا گناہ بتایا، اور بڑی اہمیت کے ساتھ اس کو بیان کیا اور پھر فرمایا کہ "خبردار" میں تم سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر بلبلاتے ہوئے اونٹ کو لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے (یعنی جو شخص مال غنیمت میں سے مثلاً اونٹ کی خیانت کرے گا تو وہ شخص میدان حشر میں اس حالت میں آئے گا کہ اس کی گردن پر وہی اونٹ سوار ہوگا اور بلبلا رہا ہوگا) اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی (شفاعت) کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں (یعنی میں تمہیں اللہ کے عذاب سے چھٹکارا نہیں دلا سکتا) کیونکہ میں نے تمہیں (دنیا میں) شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (اور خبردار!) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر ہنہناتے ہوئے گھوڑے کو لادے ہوئے (میدان حشر میں آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے (یعنی تمہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ مال غنیمت میں خیانت یا کسی چیز میں ناحق تصرف بہت بڑا گناہ ہے)۔ (اور خبردار) میں تم سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر ممیاتی ہوئی بکری لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی کی جائے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (او ر خبردار!) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر کسی چلاتے ہوئے آدمی کو (یعنی اس غلام یا باندی کو جو اس نے غنیمت کے قیدیوں میں سے خیانت کر کے لئے ہو) لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئیے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (اور خبردار!) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر لہراتے ہوئے کپڑے رکھے ہوئے (میدان حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (خبردار!) میں تم میں کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر سونا چاندی لادے ہوئے (میدان حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ

یارسول اللہ! میری فریاد رسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے۔" اس روایت کو (معنی و مضمون کے اعتبار سے) بخاری و مسلم دونوں نے نقل کیا ہے، الفاظ مسلم کے ہیں جو بخاری کے الفاظ کی بہ نسبت) پورے و مکمل ہیں۔"

جس مال سے مسلمانوں کے حقوق متعلق ہوں اس میں ناحق تصرف کرنے والے کے بارے میں وعید

(۱۳) وَعَنْهُ قَالَ اَهْدٰى رَجُلٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُلَامًا يُقَالُ لَهٗ مِدْعَمٌ فَبَيْنَمَا مِدْعَمٌ يَحُطُّ رَحْلًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَصَابَهٗ سَهْمٌ عَائِرٌ فَقَتَلَهٗ فَقَالَ النَّاسُ هَنِيْئًا لَهُ الْجَنَّةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِيْ اَخَذَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ الْمَغَانِمِ لَمْ تُصِبْهَا الْمَقَاسِمُ لَتَشْتَعِلُ عَلَيْهِ نَارًا فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ النَّاسُ جَاءَ رَجُلٌ بِشِرَاكٍ اَوْ شِرَاكَيْنِ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ شِرَاكٌ مِنْ نَارٍ اَوْ شِرَاكَانِ مِنْ نَارٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک غلام ہدیہ کے طور پر پیش کیا جس کا نام مدعم تھا (ایک دن غالباً کسی میدان جنگ میں) وہ رسول کریم ﷺ کا کجاوہ اتار رہا تھا کہ اچانک کسی نامعلوم شخص کا تیر آکر اس کو لگا جس سے جان بحق ہو گیا، لوگوں نے کہا "مدعم کو جنت مبارک ہو یعنی مدعم خوش قسمت رہا کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتے ہوئے شہید ہوا اور جنت میں پہنچ گیا" (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "نہیں! ایسا نہیں ہے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں جان ہے، وہ چادر جس کو مدعم نے خیبر کے دن مال غنیمت میں سے اس کی تقسیم سے قبل لے لیا تھا، آگ بن کر مدعم پر شعلے برسا رہی ہے۔" جب (ان) لوگوں نے (اس شدید وعید و تنبیہ کو) سنا (جنہوں نے مال غنیمت میں خیانت کرنے کو سہل سمجھ لیا تھا اور یہ گمان کر لیا تھا کہ چھوٹی موٹی اور حقیر چیزوں کو لے لینے پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا تو وہ کانپ گئے اور انہوں نے مال غنیمت میں سے جو چھوٹی موٹی چیزیں لے لی تھیں ان کو لا لا کر واپس کرنے لگے یہاں تک کہ) ایک شخص ایک تسمہ یا دو تسمے (واپس کرنے کے لئے) نبی کریم ﷺ کی خدمت" میں لایا۔ آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ "یہ آگ کا ایک تسمہ ہے یا آگ کے دو تسمے ہیں یعنی خیانت کی چیز ہر حالت میں دوزخ کی آگ کا سزاوار کرے گی خواہ وہ کتنی ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث میں اس شخص کے لئے سخت تنبیہ اور شدید وعید ہے جو کسی ایسے مال میں سے کھائے جس کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق متعلق ہوں۔ جیسے اوقاف اور بیت المال وغیرہ کیونکہ کسی ایک شخص کا حق تو واپس کیا جا سکتا ہے لیکن بہت سوں کے حقوق کی واپسی اور ان کی حق تلفیوں کی تلافی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔

(۱۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ كَانَ عَلٰى ثَقَلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهٗ كِرْكِرَةُ فَمَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ فِي النَّارِ فَذَهَبُوْا يَنْظُرُوْنَ فَوَجَدُوْا عَبَاءَةً قَدْ غَلَّهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس کا نام کرکرہ تھا (کسی غزوے میں) رسول کریم ﷺ (کی طرف سے سامان و اسباب) کا نگران مقرر ہوا، جب اس کا انتقال ہوا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "وہ (کرکرہ) دوزخ میں ڈالا گیا ہے۔" چنانچہ لوگوں نے (اس کے سامان کو) دیکھنا شروع کیا تو اس میں ایک کملی پائی گئی جس کو اس نے مال غنیمت میں سے خیانت کر کے لیا تھا۔" (بخاری)

تشریح: یحییٰ کہتے ہیں کہ لفظ فذھبوا میں حرف فاعاطفہ ہے، گویا اس لفظ سے پہلے یہ مفہوم محذوف ہے کہ "صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سنا تو انہیں معلوم ہوا کہ کرکرہ کے حق میں یہ وعید اس سبب سے ہے کہ اس نے مال غنیمت میں خیانت کی تھی چنانچہ انہوں نے اس کے سامان کو دیکھنا شروع کیا الخ"

مجاہدین کو مال غنیمت میں سے خورد ونوش کی چیزوں کو تقسیم سے پہلے استعمال کرنے کی اجازت

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نُصِيْبُ فِيْ مَغَازِيْنَا الْعَسَلَ وَالْعِنَبَ فَنَأْكُلُهُ وَلَا نَرْفَعُهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہمیں غزوات میں شہد اور انگور ملتے تو ہم ان کو کھاتے تھے اٹھا کر لے نہیں جاتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: یعنی ہم اس شہد اور انگور کو تقسیم کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کے پاس اٹھا کر نہیں لے جاتے تھے! گویا اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ آنحضرت ﷺ ہمارے اس فعل کو جائز رکھتے تھے، چنانچہ اس مسئلہ پر علماء کا اتفاق ہے، کہ مجاہدین اسلام جب تک دار الحرب یعنی دشمن کے محاذ جنگ پر رہیں اس وقت ان کو مال غنیمت میں سے خورد ونوش کی چیزوں کو ان کی تقسیم سے پہلے بقدر ضرورت و حاجت کھانے پینے کے مصرف میں لانا جائز ہے

⑯ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ اَصَبْتُ جِرَابًا مِنْ شَحْمٍ يَوْمَ خَيْبَرَ فَالْتَزَمْتُهُ فَقُلْتُ لَا اُعْطِي الْيَوْمَ اَحَدًا مِنْ هٰذَا شَيْئًا فَالْتَفَتُّ فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَبَسَّمُ اِلَيَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مغفل کہتے ہیں کہ خیبر کے دن مجھ کو چربی سے بھری ہوئی ایک تھیلی ملی میں نے اس کو اٹھا کر اپنے (سینے سے) لگالیا اور (دل میں زبان سے) کہا کہ آج میں اس چربی میں سے کسی کو کچھ نہیں دوں گا پھر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو رسول کریم ﷺ (کھڑے ہوئے) مجھ پر (یعنی میرے اس فعل پر) مسکرا رہے تھے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: جیسا کہ اوپر کی حدیث کے ضمن میں بیان کیا گیا، اس روایت سے بھی یہی معلوم ہوا کہ مجاہدوں کو مال غنیمت میں سے بقدر ضرورت کھانے پینے کی چیز لے لینا جائز ہے۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِيْ هُرَيْرَةَ مَا اُعْطِيْكُمْ فِيْ بَابِ رِزْقِ الْوُلَاةِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ما اعطیکم الخ "رزق ولاۃ" کے باب میں ذکر کی جا چکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

مال غنیمت کے جواز کے ذریعہ اُمّت محمدی ﷺ کو دوسری امتوں پر فضیلت

⑰ وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ فَضَّلَنِيْ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ اَوْ قَالَ فَضَّلَ اُمَّتِيْ عَلَى الْاُمَمِ وَاَحَلَّ لَنَا الْغَنَائِمَ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوامامہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو انبیاء پر فضیلت وبزرگی عطا فرمائی ہے۔ یا یہ فرمایا کہ میری اُمّت کو دوسری امتوں پر فضیلت وبزرگی عطا کی ہے اور مال غنیمت کو ہمارے لئے حلال قرار دیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حدیث کا آخری جملہ مذکورہ فضیلت وبزرگی کی وضاحت کے طور پر ہے یعنی حق تعالیٰ نے ہمارے لئے مال غنیمت کو مخصوص طور پر حلال قرار دے کر ہمیں دوسری امتوں پر فضیلت وبزرگی عطا کی ہے۔ یا یہ مراد ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں دوسری امتوں پر جہاں اور بہت سی فضیلتیں عطا کی ہیں وہیں ایک فضیلت یہ بھی عطا کی ہے کہ ہمارے لئے مال غنیمت کو حلال کیا ہے۔

مقتول کا مال قاتل کو ملے گا

⑱ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَئِذٍ يَعْنِيْ يَوْمَ حُنَيْنٍ مَنْ قَتَلَ كَافِرًا فَلَهٗ سَلَبُهٗ فَقَتَلَ

اَبُوْطَلْحَةَ یَوْمَئِذٍ عِشْرِیْنَ رَجُلاً وَاَخَذَ اَسْلَابَهُمْ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس روز یعنی غزوہ حنین کے دن فرمایا جو شخص کسی کافر (دشمن) کو قتل کرے گا اس (مقتول) کا مال واسباب اسی (قاتل) کو ملے گا۔ "چنانچہ ابو طلحہؓ نے اس دن (دشمن کے) بیس آدمیوں کو قتل کیا اور ان کا سب مال اور اسباب حاصل کیا!۔" (دارمیؒ)

(۱۹) وَعَنْ عَوْفِ ابْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِیِّ وَخَالِدِ بْنِ الْوَلِیْدِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَضٰی فِی السَّلَبِ لِلْقَاتِلِ وَلَمْ یُخَمِّسِ السَّلَبَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عوفؓ ابن مالک اشجعی اور حضرت خالدؓ ابن الولید سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے مقتول کے مال و اسباب کے بارے میں حکم فرمایا کہ وہ قتل کرنے والے کا حق ہے، نیز اس مال واسباب میں سے آپ ﷺ نے خمس نہیں نکالا (جیسا کہ مال غنیمت میں سے نکالتے تھے)۔" (ابوداؤدؒ)

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ نَفَّلَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَوْمَ بَدْرٍ سَیْفَ اَبِیْ جَهْلٍ وَكَانَ قَتَلَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہؓ ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جنگ بدر کے دن مجھ کو ابوجہل کی تلوار (میری حصہ سے) زائد دی۔ واضح ہو کہ ابوجہل کو عبداللہ بن مسعود ہی نے قتل کیا تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: جنگ بدر میں ابوجہل کو اصل میں تو انصار مدینہ کے دونو عمروں نے قتل کیا تھا لیکن حضرت ابن مسعودؓ اس کے قتل کرنے میں ان کے شریک تھے بایں طور کہ اس کا سر تن سے انہوں نے ہی جدا کیا تھا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کے سامان کی ایک چیز یعنی تلوار حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو عطا فرمائی۔

غلام کو مال غنیمت میں سے تھوڑا بہت دیا جاسکتا ہے

(۲۱) وَعَنْ عُمَیْرٍ مَوْلٰی اَبِی اللَّحْمِ قَالَ شَهِدْتُ خَیْبَرَ مَعَ سَادَتِیْ فَكَلَّمُوْا فِیَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَكَلَّمُوْهُ اَنِّیْ مَمْلُوْكٌ فَاَمَرَنِیْ فَقُلِّدْتُ سَیْفًا فَاِذَا اَنَا اَجُرُّهٗ فَاَمَرَلِیْ بِشَیْءٍ مِنْ خُرْثِیِّ الْمَتَاعِ وَعَرَضْتُ عَلَیْهِ رُقْیَةً كُنْتُ اَرْقِیْ بِهَا الْمَجَانِیْنَ فَاَمَرَنِیْ بِطَرْحِ بَعْضِهَا وَحَبْسِ بَعْضِهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ اِلاَّ اَنَّ رِوَایَتَهٗ انْتَهَتْ عِنْدَ قَوْلِهٖ الْمَتَاعِ۔

"اور حضرت عمیرؓ ابی اللحمؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، کہتے ہیں کہ میں اپنے مالکوں کے ساتھ غزوہ خیبر میں شریک ہوا ہوں (اس غزوہ کے لئے روانگی کے وقت) میرے مالکوں نے میرے بارے میں رسول کریم ﷺ سے گفتگو کی (یعنی انہوں نے میری تعریف و توصیف کی اور عرض کیا کہ میدان جنگ میں لڑنے کے لئے یا خدمت کی غرض سے عمیرؓ کو بھی ساتھ لے چلئے) نیز انہوں نے آنحضرت ﷺ کو یہ بھی بتایا کہ میں ایک مملوک (غلام) ہوں، آپ ﷺ نے (میرے مالکوں کی درخواست منظور فرمائی اور) مجھ کو حکم دیا کہ میں مسلح ہو جاؤں اور مجاہدین کے ساتھ شامل رہوں، چنانچہ مجھے تلوار سے مسلح کیا گیا (یعنی ایک تلوار میری گردن میں ڈال دی گئی) میں (جب چلتا تو صغر سنی کی وجہ سے یا اپنے کوتاہ قد ہونے کے سبب) اس تلوار کو زمین پر گھسیٹتا ہوا چلتا، پھر (دشمنوں پر غلبہ حاصل کر لینے کے بعد مال غنیمت کی تقسیم شروع ہوئی تو) آنحضرت ﷺ نے اس مال غنیمت میں سے تھوڑا بہت مجھے بھی دیئے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ نیز (ایک موقع پر) میں نے آنحضرت ﷺ کو اپنا وہ منتر پڑھ کر سنایا جو میں دیوانگی کے مریضوں پر پڑھا کرتا تھا (اور آپ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، تو آپ ﷺ نے مجھے اس کے بعض حصوں کو موقوف کر دینے اور بعض حصوں کو باقی رکھنے کا حکم دیا۔ اس روایت کو ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے لیکن ابوداؤدؒ کی روایت لفظ "المتاع" پر پوری ہوگئی ہے۔"

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمیر جو منتر جانتے تھے اس سے بعض کلمات اسلامی عقائد کے منافی ہوں گے، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کلمات کو ترک کر دینے کا حکم دیا البتہ جو کلمات اسلامی عقائد و تعلیمات کے منافی نہیں تھے ان کو باقی رکھنے کی اجازت دے دی۔

خیبر کے مال غنیمت کی تقسیم

(۲۲) وَعَنْ مُجَمِّعِ بْنِ جَارِيَةَ قَالَ قُسِمَتْ خَيْبَرُ عَلٰى اَهْلِ الْحُدَيْبِيَةِ فَقَسَمَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ سَهْمًا وَكَانَ الْجَيْشُ اَلْفًا وَّ خَمْسَمِائَةٍ فِيْهِمْ ثَلَاثُمِائَةِ فَارِسٍ فَاَعْطَى الْفَارِسَ سَهْمَيْنِ وَالرَّاجِلَ سَهْمًا۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ حَدِيْثُ ابْنِ عُمَرَ اَصَحُّ وَالْعَمَلُ عَلَيْهِ وَاَتَى الْوَهْمُ فِيْ حَدِيْثِ مُجَمِّعٍ اَنَّهٗ قَالَ ثَلَاثُمِائَةِ فَارِسٍ وَاِنَّمَا كَانُوْا مِائَتَيْ فَارِسٍ۔

"اور حضرت مجمع بن جاریہ کہتے ہیں کہ خیبر (میں حاصل شدہ مال غنیمت اور زمین) کو ان لوگوں کے درمیان تقسیم کیا گیا جو حدیبیہ ~~(صلح میں)~~ شریک تھے، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس (خیبر کے مال غنیمت اور زمین) کو اٹھارہ حصوں پر تقسیم کیا، اور (صلح حدیبیہ میں شریک) لشکر کی تعداد پندرہ سو آدمیوں پر مشتمل تھی جن میں تین سو سوار تھے، اس طرح سوار کو آپ ﷺ نے دو حصے دیئے اور پیادہ کو ایک حصہ۔ ابوداؤد نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس بارہ میں ابن عمرؓ کی روایت زیادہ صحیح ہے اور اسی پر اکثر ائمہ نے عمل کیا ہے نیز مجمعؓ کی (اس) روایت میں واہمہ واقع ہوا ہے کہ انہوں (مجمعؓ) نے کہا ہے کہ تین سو سوار تھے حالانکہ سواروں کی تعداد دو سو تھی۔"

تشریح: جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ مال غنیمت میں اسلامی لشکر کے سوار مجاہد کے دو حصے ہیں جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے، وہ اس حدیث مجمعؓ کو اپنے مسلک کی دلیل قرار دیتے ہیں، کیونکہ جب اٹھارہ حصوں میں سے تین سو سواروں میں ہر سو سوار کو دو دو حصے دیئے گئے تو چھ حصے ہو گئے اور بارہ حصے باقی بچے۔ چنانچہ ان بارہ حصوں کو بارہ سو پیادوں کے درمیان اس طرح تقسیم کیا گیا کہ ہر سو پیادوں کو ایک حصہ ملا۔ جب کہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ مال غنیمت میں سوار مجاہد کے تین حصے ہیں، ان کے اعتبار سے یہ حساب درست نہیں بیٹھتا، کیونکہ اس صورت میں سواروں پر نو حصوں کی تقسیم لازم آتی ہے اور بارہ حصے پیادوں کے ہوئے، اس حساب سے ان حصوں کی مجموعی تعداد اکیس ہوتی ہے حالانکہ حدیث میں مجموعی تعداد اٹھارہ بیان کی گئی ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابن عباسؓ اور خود حضرت ابن عمرؓ سے بھی حضرت مجمعؓ جیسی روایت منقول ہے، ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ سواروں کو دو دو ہی حصے دیئے گئے تاہم جن حضرات کے نزدیک سواروں کے تین حصے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حضرت ابن عمرؓ ہی کی روایت (جو اسی باب کی پہلی فصل میں نقل کی جا چکی ہے) زیادہ صحیح و ثابت اور فیصلہ کن ہے۔ جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے، وہ حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت پر جس وجہ سے عمل نہیں کرتے وہ اس روایت کی تشریح میں بیان کی جا چکی ہے۔

روایت کے آخر میں جس "واہمہ" کا ذکر کیا گیا ہے اس کی بنیاد اختلاف روایت پر ہے، چنانچہ اس بارہ میں مختلف روایتیں منقول ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر اسلامی لشکر کی تعداد کتنی تھی، ایک روایت تو یہی ہے جو حضرت مجمعؓ نے نقل کی ہے کہ پندرہ سو کی تعداد تھی جس میں تین سو سوار تھے لیکن ایک روایت میں یہ تعداد چودہ سو بیان کی گئی ہے جو بارہ سو پیادوں اور دو سو سواروں پر مشتمل تھی۔

جہاد میں زیادہ سعی و محنت کرنے والوں کے لئے مال غنیمت میں سے خصوصی حصہ

(۲۳) وَعَنْ حَبِيْبِ بْنِ مَسْلَمَةَ الْفِهْرِيِّ قَالَ شَهِدْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفَّلَ الرُّبُعَ فِي الْبَدْاَةِ وَالثُّلُثَ فِي الرَّجْعَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حبیب ابن مسلمہؓ فہری کہتے ہیں کہ (کسی غزوے کے موقع پر) میں نبی کریم ﷺ خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے جنگ کی

ابتداء میں (لڑنے والوں کو) مال غنیمت میں سے چوتھائی حصہ زائد عطا کیا اور واپسی کے وقت (لڑنے والوں کو) تہائی حصہ زائد عطا کیا۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث میں مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ایک مخصوص نوعیت کے معاملہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر میدان جنگ میں جہاد کے شروع ہونے کے وقت اسلامی لشکر کا کوئی دستہ اپنے لشکر سے آگے نکل کر دشمن کے مقابلہ پر پہنچ جاتا اور اپنے پورے لشکر کے پہنچنے سے پہلے دشمن کے ساتھ جنگ میں مشغول ہو جاتا تو آنحضرت ﷺ اس دستہ کو مخصوص طور پر مال غنیمت کا چوتھائی حصہ عطا فرماتے اور پھر جب باقی تین چوتھائی حصے تقسیم ہوتے تو اس میں بھی پورے لشکر کے ساتھ اس دستہ کو شریک کرتے، اسی طرح میدان جنگ میں دشمن کے مقابلہ سے اسلامی لشکر کے واپس آنے کے بعد اگر مجاہدین کا کوئی دستہ بدستور جنگ میں مشغول رہتا تو آنحضرت ﷺ اس دستہ کو مخصوص طور پر مال غنیمت کا تہائی حصہ عطا فرماتے اور پھر جب باقی دو تہائی حصے تقسیم ہوتے تو اس میں بھی پورے لشکر کے ساتھ اس دستہ کو شریک کرتے۔ اور اس دستہ کو تہائی حصہ اس لئے عطا فرماتے کہ پورے لشکر کی واپسی کے بعد صرف چند مجاہدین کا دشمن کے مقابلہ پر جمے رہنا اور لڑائی جاری رکھنا ایک انتہائی سخت مرحلہ اور نہایت خطرناک اقدام اور غیر معمولی حوصلے کا کام ہوتا تھا جب کہ ابتداء میں اتنا سخت مرحلہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس وقت تو پورا لشکر آجاتا تھا اور ان مجاہدین کی مدد کرتا تھا، اس کے برخلاف لشکر کی واپسی کی صورت میں جب کہ سارے مجاہدین واپس آجاتے تھے تو اس وقت جنگ کرنا اور دشمن کا مقابلہ کرنا سخت مشکل اور انتہائی سخت ہوتا تھا

بہرحال ان مجاہدین کو مال غنیمت میں سے ان کے حصے سے زیادہ عطا کرنا جنگ میں ان کی بہادری، غیر معمولی حوصلہ اور سخت ترین جدوجہد کے امتیازی کارنامے کی بناء پر تھا

(۲۴) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُنَفِّلُ الرُّبُعَ بَعْدَ الْخُمُسِ وَالثُّلُثَ بَعْدَ الْخُمُسِ اِذَاقَفَلَ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حبیب ابن مسلمہ فہریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (جنگ کی ابتداء میں اسلامی لشکر کے پہنچنے سے پہلے لڑنے والے مجاہدین کو مال غنیمت میں سے خمس نکالنے کے بعد چوتھائی حصہ زیادہ دیتے تھے اور (لشکر کے) واپس آجانے کی صورت میں (لڑنے والے مجاہدین کو) خمس نکلنے کے بعد تہائی حصہ زیادہ دیتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اوپر کی حدیث میں یہ تو بیان کیا گیا تھا کہ ابتدائے جنگ میں لڑنے والے مجاہدین کو چوتھائی حصہ اور لشکر کے واپس آجانے کے بعد لڑنے والے مجاہدین کو تہائی حصہ دیا جاتا تھا لیکن یہ وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ یہ چوتھائی یا تہائی حصہ خمس نکالنے کے بعد دیا جاتا تھا یا اس سے پہلے؟ چنانچہ اس حدیث میں اسی کو واضح کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ پورے مال غنیمت میں سے پہلے خمس نکالتے، اس کے بعد چوتھائی یا تہائی حصہ دیتے اور پھر اس کو پورے لشکر کے درمیان تقسیم فرماتے۔

مال فئی میں کوئی خصوصی حصہ نہیں

(۲۵) وَعَنْ اَبِى الْجُوَيْرِيَةِ الْجَرْمِيِّ قَالَ اَصَبْتُ بِاَرْضِ الرُّوْمِ جَرَّةً حَمْرَاءَ فِيْهَا دَنَانِيْرُ فِىْ اِمْرَةِ مُعَاوِيَةَ وَعَلَيْنَا رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَنِىْ سُلَيْمٍ يُقَالُ لَهٗ مَعْنُ بْنُ يَزِيْدَ فَاَتَيْتُهٗ بِهَا فَقَسَمَهَا بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَعْطَانِىْ مِنْهَا مِثْلَ مَا اَعْطٰى رَجُلًا مِنْهُمْ ثُمَّ قَالَ لَوْلَا اَنِّىْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا نَفَلَ اِلَّا بَعْدَ الْخُمُسِ لَاَعْطَيْتُكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوجویریہؓ کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کے زمانہ میں (ایک دن) میں نے روم کی زمین میں ایک سرخ رنگ کی

ٹھلیاپائی جس میں دینار (بھرے ہوئے) تھے، اس وقت ہمارے علاقے کے حاکم، رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے ایک شخص تھے جن کا نام معن ابن یزید تھا، میں وہ ٹھلیالے کر ان کے پاس آیا، انہوں نے ان دیناروں کو مسلمانوں (یعنی مجاہدین اسلام) کے درمیان تقسیم کر دیا اور ان میں سے مجھ کو بھی اتنا ہی دیا، جتنا کسی ایک شخص کے حصے میں آیا تھا (یعنی مجھے بھی سب کے برابر دیا کوئی زیادہ حصہ نہیں دیا) اور پھر انہوں نے فرمایا کہ اگر میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ "خمس نکالنے کے بعد ہی حصے سے زیادہ دیا جاسکتا ہے۔" تو یقیناً میں بھی تمہیں دوسروں سے زیادہ دیتا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت معن ابن یزیدؓ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق کسی مجاہد کو مخصوص طور پر کوئی زیادہ حصہ اس مال میں سے دیا جاسکتا ہے جس میں سے خمس نکالنا ضروری ہو اور وہ خمس نکالا جاچکا ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ خمس اس مال میں سے نکالا جاتا ہے جو کفار سے جنگ وجدال کے بعد ہاتھ لگا ہو جس کو مال غنیمت کہتے ہیں جب کہ یہ مال جو تمہارے ہاتھ لگا ہے "مال فئی" ہے، اور "مال فئی" میں کوئی زائد حصہ نہیں لگتا اس لئے تمہیں بھی اس مال میں سے دوسرے سے زیادہ نہیں ملے گا۔

شریک معرکہ نہ ہونے والوں کو مال غنیمت میں سے خصوصی عطیہ

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَدِمْنَا فَوَافَقْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ افْتَتَحَ خَیْبَرَ فَاَسْھَمَ لَنَا اَوْ قَالَ فَاَعْطَانَا مِنْھَا وَمَاقَسَمَ لِاَحَدٍ غَابَ عَنْ فَتْحِ خَیْبَرَ مِنْھَا شَیْئًا اِلَّا لِمَنْ شَھِدَ مَعَہٗ اِلَّا اَصْحَابَ سَفِیْنَتِنَا جَعْفَرًا وَاَصْحَابَہٗ اَسْھَمَ لَھُمْ مَعَھُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ (جب) ہم (حبشہ سے) آئے اور رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ اس وقت خیبر کو فتح کر چکے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے (خیبر کے مال غنیمت میں سے) ہمیں بھی حصہ عطا فرمایا۔ یا ابوموسیٰ اشعریؓ نے یہ کہا کہ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خیبر کے مال غنیمت میں سے ہمیں بھی عطا فرمایا اور آپ ﷺ نے اس (مال غنیمت) میں سے کسی بھی ایسے شخص کو کوئی حصہ نہیں دیا جو فتح خیبر کے موقع پر موجود نہ رہا ہو علاوہ اس شخص کے جو (غزوۂ خیبر کے وقت) آپ ﷺ کے ساتھ تھا اور علاوہ ہم کشتی والوں یعنی حضرت جعفرؓ اور ان کے رفقاء کے کہ آپ ﷺ نے (ہم) کشتی والوں کو بھی ان (غزوۂ خیبر میں شریک ہونے والے مجاہدوں) کے ساتھ حصہ دیا (باوجودیکہ ہم اس غزوہ میں شریک نہیں تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ دعوت اسلام کے بالکل ابتدائی زمانہ میں یمن سے مکہ آئے اور اسلام قبول کیا اور پھر ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے جہاں حضرت جعفر ابن ابوطالبؓ اور دوسرے صحابہؓ بھی مکہ سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے، جب ان سب لوگوں نے حبشہ میں یہ خبر سنی کہ آنحضرت ﷺ بھی مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ چلے گئے ہیں تو یہ لوگ بھی حبشہ سے کشتیوں کے ذریعہ مدینہ کے لئے روانہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے پاس اس وقت پہنچے۔ جب کہ آپ ﷺ خیبر کو فتح کر چکے تھے

بعض حضرات یہ کہتے ہی کہ حبشہ سے آنے والے ان لوگوں کو خیبر کے مال غنیمت میں سے اس لئے حصہ دیا گیا کہ اگرچہ ان کا آنا جنگ کے بعد ہوا تھا لیکن وہ مال غنیمت کے جمع کرنے اور اس کی تقسیم سے پہلے پہنچ گئے تھے، یہ تاویل ان علماء کی طرف سے کی جاتی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی مجاہد جنگ میں شریک نہ ہو سکے مگر مال غنیمت کے جمع ہونے اور اس کی تقسیم کے وقت موجود ہو تو اس مال غنیمت میں سے اس کو بھی لشکر والوں کے ساتھ حصہ ملے گا جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کا ایک قول ہے لیکن جو علماء اس بات کے قائل نہیں ہیں وہ یہ کہتے کہ ان لوگوں کو خیبر کے مال غنیمت میں سے حصہ دینا آنحضرت ﷺ کی طرف سے ایک خصوصی نوعیت کا عطیہ تھا جو غزوۂ خیبر میں شریک ہونے والے مجاہدین کی رضامندی سے دیا گیا تھا اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

مال غنیمت میں خیانت کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنے سے آنحضرت ﷺ کا انکار

(۲۷) وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ خَالِدٍ اَنَّ رَجُلًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُوُفِّيَ يَوْمَ خَيْبَرَ فَذَكَرُوْا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ فَتَغَيَّرَتْ وُجُوْهُ النَّاسِ لِذٰلِكَ فَقَالَ اِنَّ صَاحِبَكُمْ غَلَّ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَفَتَّشْنَا مَتَاعَهُ فَوَجَدْنَا خَرَزًا مِنْ خَرَزِ يَهُوْدَ لَا يُسَاوِيْ دِرْهَمَيْنِ (رواہ مالک و ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت یزید ابن خالدؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ میںؓ سے ایک شخص کا خیبر کے دن انتقال ہوگیا، صحابہؓ نے رسول کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا (یعنی آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ فلاں شخص کا انتقال ہوگیا ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تم لوگ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ لو (میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا) لوگوں (کا یہ سننا تھا کہ ان) کے چہروں کا رنگ اس (خوف کی) وجہ سے بدل گیا (کہ نہ معلوم کیوں آنحضرت ﷺ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھیں گے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا (میں اس کی نماز جنازہ اس وجہ سے نہیں پڑھوں گا کہ) تمہارے (اس) ساتھی نے اللہ کی راہ میں (یعنی مال غنیمت میں) خیانت کا ارتکاب کیا تھا۔" چنانچہ جب ہم نے اس اسباب کی تلاشی لی تو اس میں ہمیں یہودیوں (یعنی یہودی عورتوں) کے پہننے کے (گلے کے) ہار ملے جو دو درہموں کے برابر بھی نہیں تھے (یعنی ان کی قیمت دو درہم سے کم تھی۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

مال غنیمت جمع کرنے میں تاخیر کرنے والے کے بارے میں وعید

(۲۸) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَصَابَ غَنِيْمَةً اَمَرَ بِلَالًا فَنَادٰى فِي النَّاسِ فَيَجِيْئُوْنَ بِغَنَائِمِهِمْ فَيُخَمِّسُهُ وَيُقَسِّمُهُ فَجَاءَ رَجُلٌ يَوْمًا بَعْدَ ذٰلِكَ بِزِمَامٍ مِنْ شَعَرٍ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا فِيْمَا كُنَّا اَصَبْنَاهُ مِنَ الْغَنِيْمَةِ قَالَ اَسَمِعْتَ بِلَالًا نَادٰى ثَلَاثًا قَالَ نَعَمْ فَمَا مَنَعَكَ اَنْ تَجِيْئَ بِهٖ فَاعْتَذَرَ قَالَ كُنْ اَنْتَ تَجِيْئُ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَلَنْ اَقْبَلَهُ عَنْكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب مال غنیمت کو جمع کرا کر تقسیم کرنے کا اردہ فرماتے تو حضرت بلالؓ کو (اعلان کرنے کا) حکم دیتے چنانچہ وہ لوگوں کے درمیان اعلان کردیتے اور (اس اعلان کو سنتے ہی) لوگ اپنی اپنی غنیمت لے آتے (یعنی جس کے (پاس مال غنیمت کی جو بھی چیز ہوتی وہ اس کو لا کر دربار رسالت میں جمع کردیتا) پھر آنحضرت ﷺ (پہلے) خمس یعنی پانچواں حصہ نکالتے اور اس کے بعد (اس مال غنیمت کو) لوگوں (یعنی مجاہدین) کے درمیان تقسیم فرمادیتے۔ (ایک دفعہ ایسا ہوا کہ) ایک شخص (مال غنیمت میں سے خمس نکالنے اور اس کو مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے کے) ایک دن بعد بالوں کی بنی ہوئی ایک مہار لے کر آیا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ ﷺ! جو مال غنیمت ہمارے ہاتھ لگا تھا اس میں یہ مہار بھی تھی۔" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بلالؓ نے تین بار جو اعلان کیا تھا اس کو تم نے سنا تھا؟" اس نے کہا کہ "ہاں! میں نے سنا تھا۔" آپ ﷺ نے فرمایا "پھر اس کو (اسی وقت) لانے سے تمہیں کس چیز نے روکا تھا؟" اس نے (اس تاخیر کے لئے) کوئی عذر بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا "بس (اب) یوں ہی رہو (یعنی اس کو اپنے پاس ہی رکھو، اب تو) کل قیامت کے دن ہی" اس کو لے کر آنا (اور تب خدا کو اس تاخیر کا جواب دینا) میں (اب) اس کو تم سے ہرگز نہ لوں گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اس مہار کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ اس میں سارے مجاہدوں کا حق تھا، اور اس وقت چونکہ سارے مجاہد منتشر ہوگئے تھے اس لئے اس میں سے ہر ایک کو اس کا حصہ پہنچانا مشکل تھا۔

مال غنیمت میں خیانت کی سزا

(۲۹) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ حَرَّقُوْا مَتَاعَ الْغَالِّ

وَضَرَبُوْهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد (حضرت شعیبؒ) سے اور وہ (شعیبؒ) اپنے دادا (حضرت عبداللہ ابن عمرو) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے مال غنیمت میں خیانت کرنے والے کا سامان واسباب جلاڈالا اور اس کی پٹائی (بھی) کی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس خیانت کی سزا یہ دی کہ اس کا سامان واسباب نذر آتش کر دیا اور ازراہ تعزیر اس کی پٹائی بھی کی۔ بعض علماء جیسے حضرت امام احمدؒ ابن حنبل وغیرہ نے اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا ہے اور کہا ہے کہ جو شخص مال غنیمت میں خیانت کرے اس کی سزا یہ ہے کہ اس کے گھر کا سارا سامان واسباب جلا دیا جائے، علاوہ جانوروں اور مصحف مجید (قرآن کریم) کے، نیز اس چیز کو بھی نہ جلایا جائے جس کو اس نے مال غنیمت میں سے خیانت کر کے لیا ہے کیونکہ وہ (اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہے بلکہ) مجاہدین کا حق ہے۔ جب کہ تینوں ائمہ یعنی حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ یہ کہتے ہیں کہ اس کا سامان و اسباب نہ جلایا جائے بلکہ اس کو کوئی اور تعزیر جو حاکم وقاضی مناسب جانے دے۔ ان حضرات نے اس حدیث کو سخت تنبیہ ووعید پر محمول کیا ہے۔

خائن کی اطلاع نہ دینے والا بھی خائن کے حکم میں ہے

(۳۰) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ يَكْتُمْ غَالًّا فَاِنَّهٗ مِثْلُهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے مال غنیمت میں خیانت کرنے والے کی خیانت کو چھپایا (یعنی وہ امیر و حاکم کے علم میں یہ بات نہیں لایا کہ فلاں شخص نے خیانت کی ہے)۔ تو (گنہ گار ہونے کے اعتبار سے) وہ (بھی) خیانت کرنے والے کی طرح ہے۔" (ابوداؤدؒ)

غنیمت کا مال تقسیم ہونے سے پہلے اس کی خرید و فروخت کی ممانعت

(۳۱) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شِرَى الْمَغَانِمِ حَتّٰى تُقْسَمَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے غنیمت کا مال تقسیم ہونے سے پہلے اس کو خریدنے سے منع فرمایا ہے (کیونکہ تقسیم سے پہلے اس کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔" (ترمذیؒ)

(۳۲) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ نَهٰى اَنْ تُبَاعَ السِّهَامُ حَتّٰى تُقْسَمَ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابوامامہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس ممانعت کا اعلان فرمایا کہ (مال غنیمت کے) حصے جب تک تقسیم نہ ہو جائیں ان کو فروخت نہ کیا جائے۔" (دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مال غنیمت کے اپنے حصہ کو تقسیم سے پہلے بیچنے لگے تو یہ جائز نہیں ہوگا ایک تو اس وجہ سے کہ جس حصہ کو وہ بیچنا چاہتا ہے ابھی وہ اس کی ملکیت میں نہیں آیا ہے (جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے کہ تقسیم سے پہلے کسی بھی حصہ کی ملکیت موقوف رہتی ہے) دوسرے اس وجہ سے کہ (حصہ دار کو تقسیم سے پہلے مالک مان بھی لیا جائے تو) خود اس (مالک) کو تقسیم سے پہلے تک یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے حصے میں کیا چیز آئے گی اور وہ چیز کیسی ہوگی، اس صورت میں اس حصے کو بیچنا گویا ایک ایسی چیز کو بیچنا لازم آئے گا جو غیر معلوم و غیر متعین ہے اور یہ ناجائز ہے۔

مال غنیمت میں ناحق تصرف کرنے والے دوزخ کی آگ کے سزاوار ہوں گے

(۳۳) وَعَنْ خَوْلَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ فَمَنْ

اَصَابَهٗ بِحَقِّهٖ بُوْرِكَ لَهٗ فِيْهِ وَرُبَّ مُتَخَوِّضٍ فِيْمَا شَاءَتْ بِهٖ نَفْسُهٗ مِنْ مَالِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لَيْسَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا النَّارُ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت خولہ بنت قیسؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "بلاشبہ یہ مال ایک سبز و شیریں چیز ہے (یعنی مال ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی نظر کو بھاتا ہے اور دل کو لبھاتا ہے) لہٰذا جو شخص اس (مال کو حق یعنی حلال ذریعہ سے حاصل کرتا ہے اس کے لئے) اس میں برکت عطا کی جاتی ہے۔ اور یاد رکھو) بہت سے لوگ ایسے ہیں جو خدا اور اس کے رسول ﷺ کے مال یعنی مال غنیمت میں سے جس چیز کو ان کا دل چاہتا ہے اپنے تصرف میں لے آتے ہیں، قیامت کے دن ان کے لئے صرف دوزخ کی آگ ہوگی۔" (ترمذیؒ)

ذوالفقار تلوار کا ذکر

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَنَفَّلَ سَيْفَهٗ ذَا الْفَقَارِ يَوْمَ بَدْرٍ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ وَهُوَ الَّذِيْ رَاٰى فِيْهِ الرُّؤْيَا يَوْمَ اُحُدٍ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی تلوار جس کا نام ذوالفقار تھا، جنگ بدر کے دن حصے سے زیادہ لی تھی۔ (ابن ماجہؒ) اور ترمذی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "اور یہ وہی تلوار ہے جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے جنگ احد کے دن خواب دیکھا تھا۔"

تشریح: "حصے سے زیادہ لی تھی" کا مطلب یہ ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر جو مال غنیمت ہاتھ لگا تھا اس میں یہ تلوار بھی تھی، جس کو آنحضرت ﷺ نے پسند کر کے اپنے حصے سے زائد لے لیا تھا۔ یہ بات صرف آنحضرت ﷺ کے لئے جائز تھی اور کسی کے لئے جائز نہیں۔ جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوا، اس تلوار کا نام "ذوالفقار" تھا، جو ایک کافر منبہ ابن حجاج کی ملکیت تھی، وہ جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا، آنحضرت ﷺ کو یہ تلوار پسند آگئی، چنانچہ آپ ﷺ نے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت اس کو اپنے حصے سے زائد اپنے پاس رکھ لیا۔ چنانچہ کتنی ہی جنگوں میں اور تلواروں کے ساتھ یہ تلوار بھی آنحضرت ﷺ کے پاس رہی۔ اور قاموس میں یہ لکھا ہے کہ یہ تلوار منبہ کے بیٹے عاص کی ملکیت تھی جو جنگ بدر میں (حضرت علیؓ کے ہاتھوں) مارا گیا، پھر آنحضرت ﷺ نے وہ تلوار حضرت علیؓ ہی کو عطا فرما دی۔

اس تلوار کا نام "ذوالفقار" اس مناسبت سے تھا کہ اصل میں "فقار" پشت کی ہڈی کو کہتے ہیں، چونکہ اس تلوار کی پشت پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت گڑھے تھے یا پشت کی ہڈیوں کی طرح جوڑ تھے، اس لئے اس کو "ذوالفقار" کہا جانے لگا۔

غزوۂ احد کے موقع پر ذوالفقار سے متعلق خواب دیکھنے کا قصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک خواب میں یہ دیکھا کہ آپ ﷺ نے اس تلوار (ذوالفقار) کو ہلایا تو وہ درمیان سے ٹوٹ گئی، پھر دوبارہ اس کو ہلایا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ اچھی ہو گئی چنانچہ غزوۂ احد کے دن اس خواب کی یہ تعبیر سامنے آئی کہ پہلے کو شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخر میں فتح و کامرانی حاصل ہوئی۔

تقسیم سے پہلے مال غنیمت کی کسی چیز کو استعمال کرنے کی ممانعت

(۳۵) وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَرْكَبْ دَابَّةً مِنْ فَيْءِ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى اِذَا اَعْجَفَهَا رَدَّهَا فِيْهِ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَلْبَسْ ثَوْبًا مِنْ فَيْءِ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى اِذَا اَخْلَقَهٗ رَدَّهٗ فِيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت رویفع ابن ثابتؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے قطعاً روا نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے (مشترک) مال غنیمت کے کسی جانور پر (بلا ضرورت شرعی) سوار ہو اور پھر جب وہ (جانور) دبلا

ہو جائے تو اس کو مال غنیمت میں واپس کر دے اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے یہ قطعا روا نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے (مشترک) مال غنیمت کے کسی کپڑے کو (بلا ضرورت شرع) پہنے اور پھر جب وہ (کپڑا) پرانا ہو جائے تو اس کو مال غنیمت میں واپس کر دے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اگر اپنی سواری کے مصرف میں لانے کی وجہ سے وہ جانور دبلا نہ ہو تو اس صورت میں اس پر سوار ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن حقیقت میں نہ یہ مفہوم مراد ہے اور نہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بات محض محاورۃً فرمائی گئی ہے کہ عام طور پر جانور سواری کے کام آنے سے دبلے ہو جاتے۔

مال غنیمت میں کھانے کی جو چیزیں ہاتھ آئیں ان کا حکم

(۳۶) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِي الْمُجَالِدِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي اَوْفٰى قَالَ قُلْتُ هَلْ كُنْتُمْ تُخَمِّسُوْنَ الطَّعَامَ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَصَبْنَا طَعَامًا يَوْمَ خَيْبَرَ فَكَانَ الرَّجُلُ يَجِيْءُ فَيَاْخُذُ مِنْهُ مِقْدَارَ مَا يَكْفِيْهِ ثُمَّ يَنْصَرِفُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت محمد ابن ابوالمجالد، حضرت عبداللہ بن اوفیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے (حضرت عبداللہؓ) سے پوچھا کہ "کیا آپ لوگ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں کھانے کی چیزوں میں سے بھی خمس یعنی پانچواں حصہ نکالتے تھے؟" انہوں نے فرمایا کہ "غزوہ خیبر کے دن کھانے کی چیزیں بھی ہمارے ہاتھ لگی تھیں، چنانچہ ہر کوئی شخص آتا اور ان میں سے بقدر کفایت لے کر واپس چلا جاتا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: سوال کا مطلب یہ تھا کہ آیا ان چیزوں میں سے بھی خمس نکالا جاتا تھا یا جو چیزیں کھانے کی قسم سے ہوتیں، ان کو تقسیم سے مستثنیٰ رکھا جاتا تھا کہ جو شخص چاہتا ان کو اپنے مصرف میں لے آتا؟ جواب کا حاصل یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزوں میں سے خمس نہیں نکالنا چاہئے لیکن اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ ایسی چیزوں میں سے جو کچھ بھی لیا جائے وہ بس اتنی ہی مقدار میں ہو کہ ضرورت و حاجت پوری ہو جائے

(۳۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ جَيْشًا غَنِمُوْا فِيْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامًا وَعَسَلًا فَلَمْ يُؤْخَذْ مِنْهُمُ الْخُمُسُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ کے زمانے میں (مسلمانوں کا) لشکر (جب جہاد سے واپس آیا تو) مال غنیمت میں کھانے کی چیزیں اور شہد لے کر آیا۔ چنانچہ (ان لشکر والوں نے ان چیزوں میں سے جو کچھ کھا پی لیا تھا یا وہ جو کچھ بچا کر لے لئے تھے اس میں سے) ان سے خمس یعنی پانچواں حصہ نہیں لیا گیا۔" (ابوداؤدؒ)

(۳۸) وَعَنِ الْقَاسِمِ مَوْلٰى عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ بَعْضِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنَّا نَاْكُلُ الْجَزُوْرَ فِي الْغَزْوِ وَلَا نَقْسِمُهُ حَتّٰى اِذَا كُنَّا نَرْجِعُ اِلٰى رِحَالِنَا وَاَخْرِجَتُنَا مِنْهُ مَمْلُوْءَةٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت قاسمؒ (تابعی) جو عبدالرحمٰن کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے بعض صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی ان بعض صحابہؓ نے) بیان کیا کہ "ہم غزوں میں اونٹ (کا گوشت) کھاتے اور اس کو تقسیم نہ کرتے (یعنی ہم محاذ جنگ پر ضرورت کے وقت مال غنیمت کے اونٹوں کو ذبح کرتے اور اس کا گوشت تقسیم کئے بغیر اپنی اپنی حاجت کے بقدر لے لیتے) یہاں تک کہ جب ہم (سفر کے دوران) اپنے ڈیروں، خیموں میں واپس آتے تو ہمارے تھیلے گوشت سے بھرے ہوئے ہوتے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان (جہاد کے بعد) دارالاسلام واپس آتے ہوئے دارالحرب کی سرحدوں سے پار ہو جائیں تو

اس کے بعد ان کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ اپنے جانوروں کو مال غنیمت میں سے گھاس دانہ کھلائیں یا مال غنیمت کی کھانے پینے کی چیزوں میں سے خود کچھ کھائیں کیونکہ اس صورت میں وہ ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے جس کی بناء پر دار الحرب میں مال غنیمت کی کھانے پینے کی چیزوں کا اپنے مصرف میں لانا مجاہدین کے لئے مباح تھا۔ نیز جس شخص کے پاس دار الحرب میں غیر تقسیم شدہ مال غنیمت کا گھاس دانہ یا کھانے پینے کی چیزیں اس کی ضرورت وحاجب سے زائد ہوں وہ ان کو مال غنیمت میں واپس کردے۔

خیانت کرنے والوں کو قیامت کے دن بے عزت ہونا پڑے گا

(۳۹) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَدُّوا الْخِيَاطَ وَ الْمِخْيَطَ وَ اِيَّاكُمْ وَالْغُلُوْلَ فَاِنَّهٗ عَارٌ عَلٰى اَهْلِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ۔

"اور حضرت عبادہ ابن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ "تاگے اور سوئی کی (بھی) ادائیگی کرو (یعنی مال غنیمت میں سے اس قدر معمولی چیزیں بھی چھپا کر نہ رکھو) اور تم (مال غنیمت میں یا مطلق) خیانت کرنے سے اجتناب کرو کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خیانت کرنا خیانت کے مرتکب لوگوں کے لئے قیامت کے دن بے عزتی لانے والا ہوگا۔" "دارمیؒ" اور نسائیؒ نے اس روایت کو عمرو ابن شعیب سے اور انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے نقل کیا ہے۔"

مال غنیمت میں حقیر ترین چیز کی خیانت مستوجب مواخذہ ہے

(۴۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ دَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَعِيْرٍ فَاَخَذَ وَبَرَةً مِنْ سَنَامِهٖ ثُمَّ قَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَيْسَ لِيْ مِنْ هٰذَا الْفَيْءِ شَيْءٌ وَلَا هٰذَا وَرَفَعَ اِصْبَعَهٗ اِلَّا الْخُمُسَ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ عَلَيْكُمْ فَاَدُّوا الْخِيَاطَ وَ الْمِخْيَطَ فَقَامَ رَجُلٌ فِيْ يَدِهٖ كُبَّةٌ مِنْ شَعَرٍ فَقَالَ اَخَذْتُ هٰذِهٖ لِاُصْلِحَ بِهَا بَرْدَعَةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا مَا كَانَ لِيْ وَلِبَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَهُوَ لَكَ فَقَالَ اَمَّا اِذَا بَلَغَتْ مَا اَرٰى فَلَا اَرَبَ لِيْ فِيْهَا وَ نَبَذَهَا (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا (ایک دن) نبی کریم ﷺ (مال فئی میں آئے ہوئے) ایک اونٹ کے پاس تشریف لائے اور اس کے کوہان کے (دو ایک) بال اکھاڑ کر فرمایا "لوگو! حقیقت یہ ہے کہ اس مال فئی میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے اور۔ (آپ ﷺ کی جس انگلی پر وہ بال تھے، لوگوں کو دکھانے کے لئے) اس انگلی کو اٹھا کر فرمایا کہ یہ (مال بھی اتنا معمولی حصہ بھی) میرے لئے نہیں ہے البتہ خمس یعنی پانچویں حصے کا میں حقدار ہوں لیکن خمس بھی (میری ذات پر خرچ نہیں ہوتا بلکہ تمہارے ہی اوپر خرچ کیا جاتا ہے (یعنی خمس کا مال تمہاری ہی بھلائی میں خرچ ہوتا ہے بایں طور کہ اس سے تمہارے لئے ہتھیار اور گھوڑے وغیرہ حاصل کئے جاتے ہیں) لہٰذا (اگر تمہارے پاس مال غنیمت میں کا) سوئی تاگہ بھی ہو تو اس کو) لاکر جمع کرادو۔" (ایک شخص جس کے ہاتھ میں بالوں کی رسی کا ایک ٹکڑا تھا، کھڑا ہوا اور کہا کہ "میں نے رسی کے اس ٹکڑے کو اپنے پاس رکھ لیا تھا تاکہ اس کے ذریعہ بالان کے نیچے کی کملی کو (گانٹھ کر) ٹھیک کرلوں (اب) اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟") نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جہاں تک اس چیز کا سوال ہے جو میرے اور بنو عبدالمطلب کے حصے کی ہے تو وہ تمہاری ہے (یعنی اس ٹکڑے میں سے جو کچھ میرے خاندان بنو ہاشم اور ان کے حلیف وساتھی بنو عبدالمطلب کے لوگوں کے حصے کا ہے وہ تو ہم نے تمہیں بخش دیا لیکن اس میں سے جو کچھ ہمارے علاوہ دوسرے مجاہدین کا حصہ ہے اس کے بارے میں تم جانو، کہ اگر تم ان سے بھی ان کے حصے معاف کرالو گے تو کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، اور اگر ان کے حصے معاف نہیں کرائے تو قیامت کے دن پکڑے جاؤ گے ہے۔" اس شخص نے (یہ سن کر کہا) کہ جب یہ رسی (گناہ کی) اسں حد تک پہنچ گئی ہے جو میرے سامنے ہے تو پھر مجھ کو اس کی ضرورت نہیں ہے اور (یہ کہہ کر) اس نے اس رسی کو پھینک دیا۔" (ابوداؤد)

آنحضرت ﷺ خمس کا مال بھی مسلمانوں ہی کے اجتماعی مفاد میں خرچ کرتے تھے

(۴۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی بَعِیْرٍ مِنَ الْمَغْنَمِ فَلَمَّا سَلَّمَ اَخَذَ وَبَرَۃً مِنْ جَنْبِ الْبَعِیْرِ ثُمَّ قَالَ وَلَا یَحِلُّ لِیْ مِنْ غَنَائِمِکُمْ مِثْلُ ھٰذَا اِلَّا الْخُمُسَ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ فِیْکُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن عبسہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک موقع پر) مالِ غنیمت کے ایک اونٹ کو سترہ قرار دے کر ہمیں نماز پڑھائی، جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا (اور نماز سے فارغ ہوگئے) تو اس اونٹ کے پہلو سے (دو ایک) بال اکھاڑے اور پھر فرمایا کہ "تمہارے مال غنیمت میں میرے لئے اتنا (یعنی ان بالوں کے بقدر) بھی حصہ نہیں ہے علاوہ خمس کے اور وہ خمس بھی تمہاری ہی ضرورتوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اگر "پہلو" سے یہ مراد ہو کہ آپ ﷺ نے اس اونٹ کے کوہان کی کسی جانب سے بال اکھاڑے تو اس صورت میں یہ وہی واقعہ ہوگا جس کا ذکر اوپر کی حدیث میں تھا اور اگر ظاہری مفہوم یعنی "اونٹ کا پہلو" مراد لیا جائے تو اس صورت میں یہ کوئی دوسرا واقعہ ہوگا۔

ذوی القربٰی میں مال خمس کی تقسیم کے موقع پر حضرت عثمانؓ وغیرہ کی محرومی

(۴۲) وَعَنْ جُبَیْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ لَمَّا قَسَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَھْمَ ذَوِی الْقُرْبٰی بَیْنَ بَنِیْ ھَاشِمٍ وَبَنِی الْمُطَّلِبِ اَتَیْتُہٗ اَنَا وَعُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ھٰؤُلَاءِ اِخْوَانُنَا مِنْ بَنِیْ ھَاشِمٍ لَا نُنْکِرُ فَضْلَھُمْ لِمَکَانِکَ الَّذِیْ وَضَعَکَ اللّٰہُ مِنْھُمْ اَرَاَیْتَ اِخْوَانَنَا مِنْ بَنِی الْمُطَّلِبِ اَعْطَیْتَھُمْ وَتَرَکْتَنَا وَاِنَّمَا قَرَابَتُنَا وَقَرَابَتُھُمْ وَاحِدَۃٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا بَنُوْ ھَاشِمٍ وَبَنُو الْمُطَّلِبِ شَیْءٌ وَاحِدٌ ھٰکَذَا وَشَبَّکَ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ رَوَاہُ الشَّافِعِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ دَاؤدَ وَالنَّسَائِیِّ نَحْوَہٗ وَفِیْہِ اَنَا وَبَنُو الْمُطَّلِبِ لَا نَفْتَرِقُ فِیْ جَاھِلِیَّۃٍ وَلَا اِسْلَامٍ وَاِنَّمَا نَحْنُ وَھُمْ شَیْءٌ وَاحِدٌ وَشَبَّکَ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ۔

"اور حضرت جبیر ابن مطعم کہتے ہیں کہ جب سول کریم ﷺ نے (مال غنیمت میں سے اپنے قرابت داروں کا حصہ (یعنی خمس کہ جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے) بنوہاشم اور بنو مطلب کے درمیان تقسیم کیا تو میں یعنی جبیرؓ (بنو نوفل کی طرف سے) اور عثمان ابن عفانؓ (بنو عبد شمس کی طرف سے) آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! ہمارے یہ بھائی جن کا تعلق بنوہاشم سے ہے، ہم ان کی فضیلت وبزرگی کا تو انکار نہیں کرتے کیونکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ان میں پیدا کیا ہے لہٰذا اس اعتبار سے ہماری بہ نسبت وہ آپ کے زیادہ (قریب ہیں کیونکہ ان کے اور آپ ﷺ کے جد ایک ہی ہیں یعنی ہاشم، اگرچہ ہمارے اور ان کے جد اعلیٰ بھی ایک ہی ہیں یعنی عبد مناف) لیکن ہمیں یہ بتائیے کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ ﷺ نے (خمس کے مال میں سے جو ذوی القربٰی کا حصہ ہے) ہمارے ان بھائیوں کو تو حصہ دیا جن کا تعلق بنو مطلب سے ہے اور ہمیں محروم رکھا جب کہ ہماری یعنی بنو نوفل اور بنی عبد شمس کی اور ان کی یعنی بنی مطلب کی قرابت ایک ہی ہے (بایں طور کہ جس طرح ان کے دادا ہاشم کے بھائی تھے اسی طرح ہمارے دادا بھی ہاشم کے بھائی تھے گویا ان دونوں حضرات کی غرض کا حاصل یہ تھا کہ مال غنیمت میں سے جو خمس نکالا جاتا ہے وہ قرآن کریم کے حکم کے مطابق آپ ﷺ کے قرابت داروں کا حصہ ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے قرابت داروں کی ایک شاخ بنو مطلب کو مال خمس میں سے دیا لیکن دوسری دو شاخوں یعنی بنو نوفل اور بنو عبد شمس کو کچھ نہیں دیا، جب کہ یہ سارے شاخیں ایک ہی جد اعلیٰ یعنی عبد مناف کی اولاد ہیں، تو اس امتیازی سلوک کی کیا وجہ ہے؟) آنحضرت ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان داخل کرکے (اور اس کی طرف اشارہ کرکے) فرمایا کہ "(میں) اس کے علاوہ اور کچھ نہیں (جانتا) کہ (جس طرح دونوں ہاتھوں کی یہ انگلیاں باہم مل کر ایک چیز ہوگئی ہیں اسی طرح) بنوہاشم

اور بنو مطلب بھی ایک چیز ہیں۔" (شافعیؒ) ابوداؤدؒ اور نسائیؒ کی روایت بھی اسی طرح ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ہم اور مطلب کی اولاد، نہ زمانۂ جاہلیت میں کبھی ایک دوسرے کے مخالف ہوئے اور نہ زمانۂ اسلام میں، لہٰذا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہم اور وہ، دونوں ایک چیز ہیں" یہ کہہ کر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ابوجہل کے قتل کا واقعہ

(۴۴) عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ اِنِّیْ لَوَاقِفٌ فِی الصَّفِّ يَوْمَ بَدْرٍ فَنَظَرْتُ عَنْ يَمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِیْ فَاِذَا اَنَا بِغُلَامَيْنِ مِنَ الْاَنْصَارِ حَدِيْثَةٍ اَسْنَانُهُمَا فَتَمَنَّيْتُ اَنْ اَكُوْنَ بَيْنَ اَضْلَعَ مِنْهُمَا فَغَمَزَنِیْ اَحَدُهُمَا فَقَالَ اَیْ عَمِّ هَلْ تَعْرِفُ اَبَا جَهْلٍ قُلْتُ نَعَمْ فَمَا حَاجَتُكَ اِلَيْهِ يَا ابْنَ اَخِیْ قَالَ اُخْبِرْتُ اَنَّهٗ يَسُبُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَئِنْ رَاَيْتُهٗ لَا يُفَارِقُ سَوَادِیْ سَوَادَهٗ حَتّٰی يَمُوْتَ الْاَعْجَلُ مِنَّا قَالَ فَتَعَجَّبْتُ لِذٰلِكَ قَالَ وَغَمَزَنِی الْاٰخَرُ فَقَالَ لِیْ مِثْلَهَا فَلَمْ اَنْشَبْ اَنْ نَظَرْتُ اِلٰی اَبِیْ جَهْلٍ يَجُوْلُ فِی النَّاسِ فَقُلْتُ اَلَا تَرَيَانِ هٰذَا صَاحِبُكُمَا الَّذِیْ تَسْاَلَانِّیْ عَنْهُ قَالَ فَابْتَدَرَاهُ بِسَيْفَيْهِمَا فَضَرَبَاهُ حَتّٰی قَتَلَاهُ ثُمَّ انْصَرَفَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَاهُ فَقَالَ اَيُّكُمَا قَتَلَهٗ فَقَالَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا اَنَا قَتَلْتُهٗ فَقَالَ هَلْ مَسَحْتُمَا سَيْفَيْكُمَا فَقَالَا لَا فَنَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَی السَّيْفَيْنِ فَقَالَ كِلَاكُمَا قَتَلَهٗ وَقَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَلَبِهٖ لِمُعَاذِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْجَمُوْحِ وَالرَّجُلَانِ مُعَاذُ بْنُ عَمْرِو بْنِ الْجَمُوْحِ وَمُعَاذُ بْنُ عَفْرَاءَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن عوف کہتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے دن میں (دشمن کی مقابل) صف میں کھڑا تھا، جب میں نے دائیں بائیں نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں دو انصار لڑکوں کے درمیان کھڑا ہوں، جو بالکل نو عمر تھے، مجھے یہ تمنا ہوئی کہ کاش (اس وقت) میں ان دونوں سے زیادہ طاقتور اور تجربہ کار دو آدمیوں کے درمیان کھڑا ہوتا (یعنی) میں نے دونوں نو عمروں کو حوصلہ و شجاعت کے اعتبار سے بے وقعت جانا اور یہ خیال کیا کہ چونکہ یہ نو عمر اور نا آزمودہ کار ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ دشمن کے حملہ کی تاب نہ لائیں اور معرکہ کے وقت بھاگ کھڑے ہوں جس سے میری ذات کو بھی بٹہ لگے، میں انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ) اچانک ان دونوں میں سے ایک نے مجھ کو ٹھوکا دیا اور کہا کہ "چچا جان! کیا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں، وہ کونسا ہے اور کہاں ہے؟" میں نے کہا کہ "ہاں! میں جانتا ہوں، لیکن میرے بھتیجے! تمہیں ابوجہل سے کیا غرض ہے؟ اس نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ (لعین ابوجہل) رسول کریم ﷺ کو گالیاں دیا کرتا ہے، اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں اس کو دیکھ لوں تو میرا جسم اس کے جسم سے اس وقت تک جدا نہ ہو گا جب تک کہ ہم میں سے کوئی ایک موت کی طرف بڑھنے میں جلدی نہ کرے (یعنی ابوجہل کے خلاف میرے دل میں اتنی نفرت ہے کہ میں اس کو دیکھتے ہی اس پر جھپٹ پڑوں گا اور اس وقت تک اس سے لڑوں گا جب تک کہ ہم دونوں میں سے جس کی موت پہلے آنے والی ہوگی وہ نہ مرجائے خواہ میں شہید ہو جاؤں، خواہ میں اس کو جہنم رسید کردوں)۔" حضرت عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ میں اس نو عمر کی اس بات کو سن کر حیران رہ گیا (کہ خدایا، ان نو عمروں کے دل میں آنحضرت ﷺ کی کتنی محبت ہے اور ان کے جذبات میں ہمت و حوصلہ اور شجاعت و بہادری کا کیسا محشر بپا ہے) عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ (پھر دوسرے لڑکے نے مجھ کو ٹھوکا دیا اور اس نے بھی وہی الفاظ کہے جو پہلے نے کہے تھے، اس کے بعد میں نے کوئی توقف نہیں کیا، اور ابوجہل کو دیکھا جو (دشمن کے) لوگوں میں پھر رہا تھا، میں نے (اس کی طرف اشارہ کر کے) ان لڑکوں سے کہا کیا تم اس شخص کو نہیں دیکھ رہے جو (دشمن کے گروہ میں) پھر رہا ہے؟ یہی تمہارا وہ مطلوب ہے جس کے بارے میں تم مجھ سے پوچھ رہے تھے (یعنی اس شخص کو پہچان لو یہی ابوجہل ہے)۔" عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ (یہ سنتے ہی) وہ دونوں لڑکے اپنی تلوار سنبھال کر فوراً

ابو جہل کی طرف لپکے اور اس پر حملہ کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کو قتل کر ڈالا، پھر دونوں رسول کریم ﷺ کے پاس لوٹ کر آئے اور آپ کو (اس واقعہ سے) آگاہ کیا، آپ ﷺ نے پوچھا کہ "تم دونوں میں سے کس نے اس کو قتل کیا ہے؟" ان میں سے ہر ایک نے عرض کیا کہ اس کو میں نے قتل کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تم دونوں نے اپنی تلواریں پونچھ ڈالی ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں چنانچہ آپ ﷺ نے ان دونوں کی تلواروں کو دیکھا اور فرمایا کہ "تم دونوں ہی نے اس کو قتل کیا ہے۔" نیز رسول کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ابو جہل کا سامان معاذ ابن عمرو ابن جموح کو دیا جائے۔ اور وہ دونوں لڑکے (جنہوں نے ابوجہل کو موت کے گھاٹ اتارا) معاذ ابن عمرو ؓ ابن جموح اور معاذ ؓ ابن عفراء تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: صحیح بخاری کی روایت میں معاذ ابن عفراء کی بجائے معوذ ابن عفراء ہے۔ نیز آگے جو روایت آرہی ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابو جہل کو عفراء کے دونوں بیٹوں نے قتل کیا، جب کہ اوپر جو روایت نقل کی گئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں قتل کرنے والوں میں صرف ایک ہی عفراء کا بیٹا تھا، اس طرح دونوں روایتوں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے چنانچہ علماء محققین نے اس تضاد کو اس توجیہہ کے ذریعہ دور کیا ہے کہ وہ دونوں ایک ماں کے بیٹے تھے لیکن ان کے باپ الگ الگ تھے، اس اعتبار سے وہ دونوں ماں کی طرف سے تو حقیقی بھائی تھے اور باپ کی طرف سے سوتیلے بھائی تھے، ان کی ماں کا نام عفراء تھا۔ ان میں سے ایک کے باپ کا نام عمرو ابن جموح تھا اور دوسرے کے باپ کا نام قسطلانی کے قول کے مطابق حارث تھا، چنانچہ ان میں سے ایک کو اس کے باپ کی طرف منسوب کر کے معاذ ابن عمرو ابن جموح کہا گیا اور دوسرے کو اس کی ماں کی طرف منسوب کر کے معاذ ابن عفراء یا معوذ ابن عفراء کہا گیا۔

اس موقع پر دو سوال اور بھی پیدا ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابو جہل کو تم دونوں ہی نے قتل کیا ہے تو پھر آپ ﷺ نے ابو جہل کا سامان ان دونوں کو دینے کی بجائے ان میں سے ایک ہی کو دیئے جانے کا حکم کیوں دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ابو جہل کو قتل کرنے میں شریک تو شاید دونوں ہی رہے ہوں گے لیکن اصل میں جس نے پہلے ابو جہل پر حملہ کر کے اس کو بھاگنے اور چلنے پھرنے وغیرہ سے مجبور اور بے دم بنا دیا ہو گا وہ ایک ہی رہا ہو گا پھر بعد میں دوسرے نے بھی آکر اس پر مزید وار کر کے اس کو اور زیادہ زخمی کر دیا ہو گا، اس اعتبار سے اس کے سامان کا مستحق اسی کو قرار دیا گیا جس نے پہلے حملہ کر کے اس کو بھاگنے یا مدافعتی حملہ کرنے سے ناکارہ کر دیا تھا لیکن آپ ﷺ نے دوسرے کو بھی خوش کرنے کے لئے یہ فرما دیا کہ اس کو تم دونوں نے قتل کیا ہے۔

دوسرا سوال وہی ہے جو دوسری فصل میں حضرت ابن مسعود ؓ کی اس روایت کے ضمن میں بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابو جہل کی تلوار میرے حصے سے زائد مجھ کو عطا کی، اس روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ ابو جہل کو حضرت ابن مسعود ؓ نے قتل کیا، اس اعتبار سے گویا ان دونوں روایتوں میں تضاد واقع ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں نو عمروں نے ابو جہل کو زخمی کر کے زمین پر ڈال دیا، جب ابن مسعود ؓ نے دیکھا کہ اس میں زندگی کی رمق موجود ہے تو انہوں نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا، اس طرح، حضرت ابن مسعود کے اس عمل کو ابو جہل کے قتل سے تعبیر کیا گیا، نیز آنحضرت ﷺ نے اس بناء پر کہ اس کے قتل میں بہر حال ابن مسعود ؓ کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ تھا اس لئے ان کو بھی اس کے سامان کی ایک چیز یعنی تلوار عطا فرمائی۔ ایک بات یہ بھی ملحوظ رہنی چاہئے، کہ حضرت امام مالکؒ کے بعض متبعین کا یہ قول ہے کہ اس بارے میں امام سردار کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جو چاہے فیصلہ کرے اور مقتول کا سامان جس کو چاہے دے دے، اس صورت میں مذکورہ بالا دونوں سوالوں کے پیدا ہونے کا بھی موقع باقی نہیں رہ جاتا۔

(۴۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ بَدْرٍ مَنْ يَنْظُرُ لَنَا مَاصَنَعَ اَبُوْجَهْلٍ فَانْطَلَقَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ فَوَجَدَهُ قَدْ ضَرَبَهُ ابْنَا عَفْرَاءَ حَتّٰى بَرَدَ قَالَ فَاَخَذَ بِلِحْيَتِهِ فَقَالَ اَنْتَ اَبُوْجَهْلٍ فَقَالَ وَهَلْ فَوْقَ رَجُلٍ قَتَلْتُمُوْهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ فَلَوْ غَيْرُ اَكَّارٍ قَتَلَنِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جنگ بدر کے دن (میدان جنگ میں) فرمایا کہ کون شخص ہے جو دیکھ کر ہمیں بتائے کہ

ابو جہل نے کیا کیا (یعنی اس کا کیا حشر ہوا، آیا وہ مارا گیا، یا زندہ ہے؟) چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ گئے اور انہوں نے ابو جہل کو اس حالت میں پایا کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اس کو مار مار کر ٹھنڈا یعنی قریب المرگ کر دیا تھا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے (یہ دیکھ کر) ابو جہل کی ڈاڑھی پکڑلی اور اس سے کہا کہ "تو ابو جہل ہی ہے نا!؟۔ ابو جہل نے (ابن مسعودؓ کے اس سوال کے پیچھے چھپے ہوئے طنز اور حقارت کو محسوس کر لیا اور) کہا کہ "(بے شک میں ابو جہل ہی ہوں لیکن) کیا تو اس شخص سے زیادہ بڑے مرتبہ کے ہو جس کو تم نے قتل کیا ہے؟ یعنی جس شخص کو تم نے قتل کیا ہے (اس سے زیادہ بڑے مرتبے کا کوئی شخص نہیں ہے (ان الفاظ کے ذریعہ گویا ابو جہل نے یہ دعویٰ کیا کہ قریش میں مجھ سے زیادہ بڑے مرتبہ کا کوئی شخص نہیں ہے)۔" اور ایک روایت میں یہ ہے کہ ابو جہل نے (اس موقع پر) کہا کہ اگر غیر زراعت پیشہ لوگ مجھے قتل کرتے تو بہت بہتر ہوتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اگر غیر زراعت پیشہ لوگ مجھے قتل کرتے الخ" سے ابو جہل کر مطلب یہ تھا کہ مجھے اس میں کوئی عار محسوس نہیں ہوا ہے کہ تم لوگوں نے مجھے قتل کر دیا ہے لیکن اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ مجھے ان آدمیوں نے مارا ہے جو کھیتی باڑی کرنے والے ہیں اگر کاش! مجھے ان کے علاوہ دوسرے لوگ مارتے تو میرے نزدیک یہ زیادہ بہتر ہوتا۔ گویا ابو جہل نے عفراء کے دونوں بیٹوں کی طرف اشارہ کیا جنہوں نے اس کو قتل کیا تھا چنانچہ وہ دونوں انصار سے تعلق رکھتے تھے اور انصار کھیتی باڑی کرتے تھے۔ بایں طور کہ ان کے پاس کھیت بھی تھے اور کھجور کے باغات بھی۔

کسی کو مال دینے سے اس کی دینی فضیلت لازم نہیں آتی

(۴۵) عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ اَعْطٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَھْطًا وَاَنَا جَالِسٌ فَتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْھُمْ رَجُلاً ھُوَ اَعْجَبُھُمْ اِلَیَّ فَقُمْتُ فَقُلْتُ مَالَكَ عَنْ فُلَانٍ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاُرَاہُ مُؤْمِنًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوْمُسْلِمًا ذَکَرَ ذٰلِكَ سَعْدٌ ثَلَاثًا وَاَجَابَہٗ بِمِثْلِ ذٰلِكَ ثُمَّ قَالَ اِنِّیْ لَاُعْطِی الرَّجُلَ وَغَیْرُہٗ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْہُ خَشْیَةَ اَنْ یُّکَبَّ فِی النَّارِ عَلٰی وَجْھِہٖ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ، وَفِیْ رِوَایَةٍ لَھُمَا قَالَ الزُّھْرِیُّ فَنَرٰی اَنَّ الْاِسْلَامَ الْکَلِمَةُ وَالْاِیْمَانَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ۔

"حضرت ابن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) جب کہ میں مجلس نبویؐ میں) بیٹھا ہوا تھا، رسول کریم ﷺ نے ایک جماعت کو کچھ مال) عطا فرمایا اور (اس جماعت میں سے) ایک شخص کو رسول کریم ﷺ نے چھوڑ دیا (یعنی اس کو کچھ نہیں دیا) حالانکہ وہ شخص میرے نزدیک (دین کے اعتبار سے ان میں سب سے بہتر تھا، (یہ دیکھ کر) میں کھڑا ہوا اور (آنحضرت ﷺ) سے عرض کیا کہ "فلاں شخص کے لئے کیا ہے یعنی آپ ﷺ نے اس کو اپنے عطیہ سے کیوں محروم رکھا؟ خدا کی قسم! میں (تو) اس کو مؤمن صادق سمجھتا ہوں۔" رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "یوں نہ کہو کہ میں اس کو مؤمن صادق سمجھتا ہوں" بلکہ یہ کہو کہ میں اس کو مسلمان سمجھتا ہوں۔" سعدؓ نے (آپ ﷺ کے سامنے) تین بار یہ بات کہی اور آنحضرت ﷺ نے بھی (ہربار) اسی طرح جواب دیا اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "میں ایک شخص کو (مال) دیتا ہوں درآنحالیکہ اس کی نسبت دوسرا شخص میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ شخص منہ کے بل دوزخ میں نہ ڈالا جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "بلکہ یہ کہو الخ اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے یہ واضح کیا کہ ایمان حقیقی کہ جس کا تعلق قلب کی گہرائیوں اور صدق باطن سے ہوتا ہے، بہت اعلیٰ مرتبہ ہے اور چونکہ یہ کوئی ظاہری چیز نہیں ہوتی اس لئے اس پر مطلع ہونا ممکن نہیں ہے (یعنی کسی شخص کے ظاہری احوال کو دیکھ کر فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ اس کے باطنی اعمال کیسے ہیں اور اس کا ایمان کس درجہ کا ہے، کیونکہ ایمان حقیقی کوئی نظر آنے والی چیز نہیں ہے)۔ اس کے برخلاف اسلام، ایک نظر آنے والی چیز ہے کیونکہ اسلام نام ہے ظاہری اطاعت و فرمانبرداری کا، اس لئے اگر تمہاری نظروں میں اس شخص کے ظاہری اعمال بہت اچھے ہیں تو تم اس کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ تو کہہ سکتے ہو کہ میں اس کو

اچھا مسلمان سمجھتا ہوں لیکن یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں اس کو مؤمن صادق سمجھتا ہوں۔ گویا اس طرح آنحضرت ﷺ کا مقصد سعدؓ کو اس غیر مناسب بات پر متنبّہ کرنا تھا کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے اس شخص کے مستحق مال ہونے کو اپنی دلیل کے ساتھ بیان کیا اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے اس شخص کو مال نہ دیئے جانے کو بعید از حقیقت جانا نیز انہوں نے اس شخص کے ایمان حقیقی کا دعویٰ کیا۔

"اس کی وجہ یہ اندیشہ ہوتا ہے الخ" اس سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ کسی شخص کو مال دینے سے اس کو پسندیدہ سمجھنا یا اس کو افضل جاننا لازم نہیں آتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ مال کا دیا جانا دینی فضیلت و امتیاز کے اعتبار سے ہو بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص کا ایمان کمزور ہوتا ہے اس کو تالیف قلب کے پیش نظر مال عطا کیا جاتا ہے تاکہ وہ محض مال نہ پانے کی وجہ سے کسی مایوسی اور غصہ کا شکار ہو کر کفر کے اندھیروں میں نہ چلا جائے اور پھر دوزخ میں ڈالا جائے۔ لہٰذا اے سعد! اس شخص کو مال دیئے جانے کا مطالبہ اتنے بڑے دعوے کے ساتھ نہ کرو کہ وہ کامل الایمان مؤمن ہے جب کہ اس کے حقیقی و کامل ایمان کا یقین کرنا بھی تمہارے لئے ممکن نہیں ہے۔

"اسلام کلمہ کا نام ہے الخ۔" واضح رہے کہ اصل میں تو زہریؒ کو یوں کہنا چاہئے تھا کہ اسلام، عمل صالح اور احکام شریعت کی اطاعت وفرمانبرداری سے عبارت ہے اور ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، لیکن انہوں نے اس مشہور تعریف کی بجائے اسلام کو کلمہ سے اور ایمان کو عمل صالح سے تعبیر کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اقرار اسلام کا تعلق کلمہ شہادت کو زبان سے ادا کرنے سے ہے، جس شخص نے کلمۂ شہادت پڑھا اس نے گویا اپنے اسلام کا اقرار کیا اور یہ اقرار اس بات کے لئے کافی ہے کہ اس کو ظاہری طور پر مسلمان مانا جائے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت سعدؓ سے یہی فرمایا تھا کہ تم اس شخص کے مسلمان ہونے کا تو یقین کر سکتے ہو کیونکہ اس نے اپنی زبان سے کلمہ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اقرار کیا ہے اور اس کا یہ اقرار اس کو بظاہر مسلمان ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، اسی بات کو زہریؒ نے اس سے تعبیر کیا کہ اسلام کلمہ کا نام ہے کہ جس شخص نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا اس پر مسلمان ہونے کا حکم لگا دیا جائے گا، اب رہی ایمان کو عمل صلح سے تعبیر کرنے کی بات، تو اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ عمل صالح صادر ہونے کی بنیاد کیا ہوتی ہے؟ بالکل ظاہر بات ہے کہ اس کی بنیاد تصدیق قلبی یعنی دل سے ایمان لانا ہے، جو شخص اخلاص کے ساتھ عمل صالح کرتا ہے وہ گویا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کے قلب میں ایمان جاگزیں ہے اور اس سے عمل صالح کا صادر ہونا تصدیق قلبی اور کمال ایمان کی بناء پر ہے، اس اعتبار سے زہریؒ نے "ایمان" کی وضاحت عمل صالح سے کی۔

جنگ میں شریک نہ ہونے کے باوجود مال غنیمت میں سے حضرت عثمانؓ کا حصہ

(۴۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ يَعْنِىْ يَوْمَ بَدْرٍ فَقَالَ اِنَّ عُثْمَانَ انْطَلَقَ فِىْ حَاجَةِ اللّٰهِ وَحَاجَةِ رَسُوْلِهٖ وَاِنِّىْ اُبَايِعُ لَهٗ فَضَرَبَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِسَهْمٍ وَلَمْ يَضْرِبْ لِاَحَدٍ غَابَ غَيْرَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ جنگ بدر کے دن (خطبہ دینے کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ بلاشبہ "عثمانؓ، اللہ اور اس کے رسول کے کام سے گئے ہیں اس لئے میں (خود) ان کی طرف سے بیعت کرتا ہوں۔" پھر رسول کریم ﷺ نے حضرت عثمانؓ کے لئے (جنگ بدر کے مال غنیمت میں سے" حصہ مقرر کیا اور آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کے علاوہ اور کسی ایسے شخص کے لئے حصہ مقرر نہیں کیا جو جنگ میں شریک نہیں تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ جب اپنے صحابہؓ کے ہمراہ بدر پہنچے تو اس وقت آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ جو حضرت عثمانؓ کے نکاح میں تھیں سخت بیمار تھیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے عثمانؓ کو مدینہ بھیج دیا تاکہ وہ وہاں جا کر حضرت رقیہؓ کی تیمارداری کریں۔ اور پھر جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس جنگ کے تئیں عثمانؓ پر جو ذمہ داری عائد ہوئی تھی اس کو انہوں

نے پورا کیا اور وہ جنگ میں شریک ہونے کے لئے یہاں آئے، لیکن خدا اور اس کے رسول ﷺ کا یہ حکم ہوا کہ وہ مدینہ واپس چلے جائیں اور رقیہؓ کی دیکھ بھال کریں، اس اعتبار سے وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ ہی کے کام سے گئے ہیں، لہٰذا میں خود ان کی طرف سے بیعت کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ پر مارا اور فرمایا کہ یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے، اور پھر آپ ﷺ نے مال غنیمت میں حضرت عثمانؓ کا بھی حصہ لگایا۔

ایک اونٹ دس بکریوں کے برابر ہے

(۴۷) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْعَلُ فِيْ قَسْمِ الْمَغَانِمِ عَشْرًا مِنَ الشَّاءِ بِبَعِيْرٍ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت رافع ابن خدیجؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر قرار دیتے۔" (نسائی)

پہلی امتوں میں مال غنیمت کو آسمانی آگ جلا ڈالتی تھی

(۴۸) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَزَا نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ فَقَالَ لِقَوْمِهِ لَا يَتَّبِعْنِيْ رَجُلٌ مَلَكَ بُضْعَ امْرَأَةٍ وَهُوَ يُرِيْدُ اَنْ يَّبْنِيَ بِهَا وَلَمَّا يَبْنِ بِهَا وَلَا اَحَدٌ بَنٰى بُيُوْتًا وَلَمْ يَرْفَعْ سُقُوْفَهَا وَلَا رَجُلٌ اشْتَرٰى غَنَمًا اَوْ خَلِفَاتٍ وَهُوَ يَنْتَظِرُ اَوْلَادَهَا فَغَزَا فَدَنَا مِنَ الْقَرْيَةِ صَلٰوةَ الْعَصْرِ اَوْ قَرِيْبًا مِنْ ذٰلِكَ فَقَالَ لِلشَّمْسِ اِنَّكِ مَأْمُوْرَةٌ وَاَنَا مَأْمُوْرٌ اَللّٰهُمَّ احْبِسْهَا عَلَيْنَا فَحُبِسَتْ حَتّٰى فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَجَمَعَ الْغَنَائِمَ فَجَاءَتْ يَعْنِي النَّارَ لِتَأْكُلَهَا فَلَمْ تَطْعَمْهَا فَقَالَ اِنَّ فِيْكُمْ غُلُوْلًا فَلْيُبَايِعْنِيْ مِنْ كُلِّ قَبِيْلَةٍ رَجُلٌ فَلَزِقَتْ يَدُ رَجُلٍ بِيَدِهٖ فَقَالَ فِيْكُمُ الْغُلُوْلُ فَجَاءُوْا بِرَأْسٍ مِثْلِ رَأْسِ بَقَرَةٍ مِنَ الذَّهَبِ فَوَضَعَهَا فَجَاءَتِ النَّارُ فَاَكَلَتْهَا وَزَادَ فِيْ رِوَايَةٍ فَلَمْ تَحِلَّ الْغَنَائِمُ لِاَحَدٍ قَبْلَنَا ثُمَّ اَحَلَّ اللّٰهُ لَنَا الْغَنَائِمَ رَاٰى ضَعْفَنَا وَعَجْزَنَا فَاَحَلَّهَا لَنَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "انبیاء میں سے ایک نبی (یعنی حضرت یوشع ابن نون علیہ السلام کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ انہوں) نے جہاد کا ارادہ کیا اور جب وہ جہاد کے لئے روانہ ہونے لگے تو) انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ میرے ساتھ وہ شخص نہ چلے جس نے کسی عورت سے نکاح کیا ہو اور اس عورت کو اپنے گھر لا کر اس سے مجامعت کا ارادہ رکھتا ہو اور ابھی تک اس سے مجامعت نہ کی ہو اور میرے ساتھ نہ وہ شخص چلے جس نے گھر بنایا ہو لیکن (ابھی تک) اس کی چھت نہ ڈال سکا ہو نیز وہ شخص (بھی) میرے ساتھ نہ چلے جس نے گابھن بکریاں یا گابھن اونٹنیاں خریدی ہوں اور وہ ان کے بچے جننے کا منتظر ہو۔ اس کے بعد وہ نبی ﷺ (اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ) جہاد کے لئے روانہ ہوئے اور جب اس بستی کے قریب پہنچے کہ جہاں وہ جہاد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تو نماز عصر کا وقت ہو چکا تھا (یعنی وہ ایسے وقت اس بستی کے قریب پہنچے جب کہ عصر کی نماز کا وقت ختم ہوتا ہے یا ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے) اس نبی علیہ السلام نے آفتاب کو مخاطب کر کے کہا کہ تو بھی (چلنے پر) مامور ہے اور میں بھی (اس بستی کو فتح کرنے پر) مامور ہوں۔ اے اللہ! تو اس آفتاب کو ٹھہرا دے۔" چنانچہ آفتاب ٹھہرا دیا گیا (یعنی قدیم ماہرین فلکیات کے نظریہ کے مطابق آفتاب کی رفتار کو یا جدید نظریہ کے مطابق زمین کی گردش کو حکم الٰہی سے روک دیا گیا تاکہ رات کی تاریکی سے پہلے پہلے وہ نبی جہاد کر لیں) تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اس نبی علیہ السلام کو فتح عطا فرما دی۔ پھر جب مال غنیمت جمع کیا گیا اور اس کو جلا ڈالنے کے لئے آگ آئی تو اس آگ نے مال غنیمت کو نہیں جلایا، (یہ دیکھ کر) اس نبی علیہ السلام نے (اپنے ساتھیوں سے) فرمایا کہ (یقیناً تمہارے اندر مال غنیمت میں خیانت واقع ہوئی ہے یعنی تم میں سے کسی نے مال غنیمت کے اندر خیانت کی ہے (جس کی وجہ سے یہ آگ اپنا کام نہیں کر رہی ہے) لہٰذا تم میں سے ہر قبیلہ کے ایک ایک شخص کو چاہئے کہ وہ بیعت کرے، چنانچہ (جب بیعت شروع ہوئی اور ہر

قبیلہ کا ایک ایک آدمی اپنا ہاتھ اس نبی علیہ السلام کے ہاتھ میں دینے لگا تو) ایک شخص کا ہاتھ اس نبی کے ہاتھ کو چپک کر رہ گیا، نبی علیہ السلام نے (اس شخص سے) فرمایا کہ "(اس ذریعہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ) خیانت، تمہارے قبیلہ کی طرف سے ہوئی ہے۔" پھر اس قبیلہ کے لوگ سونے کا ایک سر لائے جو بیل کے سر کی مانند تھا اور اس کو رکھ دیا، اس کے بعد آگ آئی اور اس نے اس کو جلا دیا۔ اور ایک روایت میں راوی سے یہ عبارت بھی نقل کی ہے کہ "(آنحضرت نے یہ فرمایا کہ) چنانچہ ہم سے پہلے کسی کے لئے مال غنیمت حلال نہیں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت کو ہمارے لئے حلال قرار دیا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں (مالی طور پر) ضعیف و کمزور دیکھا تو مال غنیمت کو ہمارے لئے حلال کر دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت یوشع علیہ السلام نے جہاد کے لئے روانگی کے وقت ان چند لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے سے اس لئے روک دیا تھا کہ جب دل کسی اور چیز میں اٹکا ہوا ہوتا ہے تو اس چیز کے علاوہ کسی اور کام میں طبیعت نہیں لگتی لہٰذا اگر مذکورہ لوگوں کو جانے والے لشکر میں شریک کیا جاتا تو وہ پورے جوش و جذبہ اور چستی و تندہی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا جس کے لئے ان کو لے جایا جاتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنگی مہمات وغیرہ کے موقع پر اپنے تمام ضروری امور و معاملات سے فراغت و یکسوئی حاصل کر لینی چاہئے تاکہ جس مہم میں نکلا جائے اس کو بخوبی سرانجام دیا جا سکے۔

"آفتاب ٹھہرا دیا گیا الخ۔" مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ (نظام شمسی کی پوری مدت عمر) میں حضرت یوشع ابن نون علیہ السلام کے علاوہ اور کسی کے لئے سورج کو کبھی نہیں ٹھہرایا گیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ سورج کا ٹھہر جانا صرف حضرت یوشع علیہ السلام کے خصائص میں سے ہے حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی سورج کا ٹھہرایا جانا ثابت ہے! اس طرح ان دونوں باتوں میں جو ظاہری تضاد ہے اس کو اس توجیہہ کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے (کہ یوشع کے علاوہ اور کسی کے لئے سورج نہیں ٹھہرایا گیا)۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ پیغمبروں میں حضرت یوشع کے سوا اور کوئی ایسا پیغمبر نہیں ہے جس کے لئے سورج ٹھہرایا گیا ہو علاوہ میرے۔ نیز یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سورج ٹھہرایا گیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے یہ ارشاد فرمایا ہو۔

موہب لدنیہ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سورج ٹھہرنے کا واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہے۔ ایک بار تو شب معراج کے دوسرے دن اور دوسری بار غزوۂ خندق کے دن جب کہ کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ میں الجھائے رکھ کر عصر کی نماز پڑھنے سے روک دیا تھا یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سورج کو واپس کیا (یعنی عصر کا وقت لوٹایا) تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھی۔ اسی طرح ایک مرتبہ آنحضرت کے حکم سے حضرت علیؓ کے لئے بھی سورج واپس ہوا ہے وہ یوں کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے زانوں پر سر رکھ کر لیٹے ہوئے تھے کہ اسی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول شروع ہو گیا، اس صورت میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک اپنے زانوں پر سے نہ اٹھا سکے یہاں تک کہ عصر کا وقت ختم ہو گیا اور وہ نماز نہیں پڑھ پائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے سورج کو واپس کیا، تب انہوں نے عصر کی نماز وقت پر ادا کی، مواہب لدنیہ نے اس واقعہ کو بھی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن علماء نے اس واقعہ میں کلام بھی کیا ہے۔

"اس کو جلا ڈالنے کے لئے آگ آئی الخ" جیسا کہ پہلے بھی معلوم ہو چکا ہے، یہ صرف اس اُمّت محمدیہ کی خصوصیت ہے کہ اس کے لئے مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ پچھلی امتوں کو غنیمت کا مال اپنے مصرف میں لانے کی اجازت نہیں تھی۔ بلکہ حکم الٰہی کے مطابق یہ دستور تھا کہ جنگ کے بعد غنیمت کا سارا مال جمع کر کے جنگل میں رکھ دیا جاتا تھا، اس کے بعد آسمان سے آگ آتی اور اس کو جلا دیتی، جو قبولیت کی علامت ہوتی۔

مال غنیمت میں خیانت کرنے والا دوزخ میں ڈالا جائے گا

(۴۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ عُمَرُ قَالَ لَمَّا کَانَ یَوْمُ خَیْبَرَ اَقْبَلَ نَفَرٌ مِنْ صَحَابَۃِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَہِیْدٌ وَ فُلَانٌ شَہِیْدٌ حَتّٰی مَرُّوْا عَلٰی رَجُلٍ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَہِیْدٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَلَّا اِنِّیْ رَاَیْتُہٗ فِی النَّارِ فِیْ بُرْدَۃٍ غَلَّھَا اَوْعَبَاءَۃٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ اِذْھَبْ فَنَادِ فِی النَّاسِ اَنَّہٗ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ ثَلَاثًا قَالَ فَخَرَجْتُ فَنَادَیْتُ اَلَا اِنَّہٗ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ ثَلَاثًا۔

(رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر ابن خطابؓ نے ہم سے یہ بیان کیا کہ جب خیبر کا دن آیا (یعنی جب غزوۂ خیبر ختم ہو گیا) تو نبی کریم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے چند لوگ آئے اور (آپس میں) کہنے لگے کہ فلاں شخص شہید ہو گئے تھے ان کے نام لے لے کر ان کی شہادت کا ذکر کرتے تھے) یہاں تک کہ وہ لوگ ایک شخص (کی لاش) پر سے گذرے اور کہا کہ (یہ) فلاں شخص شہید ہے، رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "ہرگز نہیں، (تم لوگ جس معنی میں اس کو شہید کہتے ہو وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ) میں نے اس شخص کو مال غنیمت میں سے ایک چادر یا فرمایا کہ ایک دھاری دار کملی چرانے کے سبب دوزخ میں (جلتے) دیکھا ہے۔" پھر رسول کریم ﷺ نے (مجھ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ "ابن خطاب! جاؤ اور لوگوں کے درمیان تین مرتبہ یہ منادی کر دو کہ "جنت میں (ابتداء) صرف مؤمن (یعنی کامل مؤمن) ہی داخل ہوں گے۔" حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ چنانچہ میں نکلا اور تین مرتبہ یہ منادی کی کہ "خبردار! جنت میں صرف مؤمن ہی داخل ہوں گے۔" (مسلم)

تشریح: "جنت میں صرف مؤمن ہی داخل ہوں گے۔" ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ شرعی اصطلاح اور عرف عام میں "مؤمن" اس شخص کو کہتے ہیں جو آنحضرت ﷺ پر اور آپ ﷺ کی شریعت پر ایمان لائے۔ اس اعتبار سے جس شخص نے خیانت کا ارتکاب کیا اس نے گویا آنحضرت ﷺ کی رسالت و شریعت کی تصدیق سے انکار کیا بایں طور کہ اس تصدیق کے نتیجہ میں اس پر جو احکام نافذ ہوتے ہیں اس نے ان پر عمل نہیں کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بہر حال نہیں ہو سکتا کہ جس شخص نے خیانت کا ارتکاب کر کے آنحضرت ﷺ کی تصدیق کے منافی عمل کیا وہ سرے سے مؤمن نہیں رہا، لہٰذا اس اعلان کے ذریعہ کہ "جنت میں صرف مؤمن ہی داخل ہوں گے۔" آنحضرت ﷺ کا اس شخص کو بظاہر زمرۂ مؤمنین سے خارج کرنا اصل میں سخت زجر و تنبیہ اور وعید کے طور پر تھا یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس ارشاد میں "مؤمن" سے مراد "متقی و پرہیزگار مؤمن" ہے اور "داخل ہونے" سے مراد بلا عذاب داخل ہونا ہے، اس طرح اس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ جو مؤمن، تقویٰ و پرہیزگاری کی راہ پر گامزن ہوں گے وہ جنت میں بغیر عذاب کے داخل کئے جائیں گے، لیکن جو مؤمن متقی و پرہیزگار نہیں ہوں گے اور گناہ کا ارتکاب کریں گے انہیں پہلے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا تاکہ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت لیں اور پھر بعد میں انہیں بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا

چونکہ یہ ارشاد "میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے" بظاہر ان نصوص کے خلاف ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کسی کا حقیقۃ دوزخ میں ڈالا جانا، حشر کے بعد ہی واقع ہو گا۔ لہٰذا اس ارشاد گرامی کو "تمثیل" پر محمول کیا جائے، یعنی آنحضرت ﷺ نے اس اسلوب بیان کے ذریعہ درحقیقت اس طرف اشارہ فرمایا کہ یہ شخص دوزخ میں ڈالا جائے گا جیسا کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ کے انتقال سے پہلے ہی ان کے جنت میں داخل ہونے کو تمثیل کے طور پر بیان فرمایا تھا، میرے نزدیک یہ احتمال بھی ہے کہ یہ ارشاد مجازی اسلوب بیان کا مظہر ہو، یعنی آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ میں اس شخص کو ایک ایسے گناہ کا مرتکب جانتا ہوں جو دوزخ کے عذاب کو واجب کرنے والا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ ان الابرار لفی نعیم (نیک لوگ جنت میں ہیں) ظاہر ہے کہ اس آیت کا

مطلب یہ نہیں ہے کہ نیک لوگ ابھی سے جنت میں پہنچ گئے ہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ نیک لوگ ان اوصاف حمیدہ کے حامل ہوتے ہیں جو ان کو جنت میں لے جائیں گے۔

بَابُ الْجِزْیَةِ

جزیہ کا بیان

جزیہ کس کو کہتے ہیں؟: "جزیہ" اسلامی قانون کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کا اطلاق اس خاص محصول (ٹیکس) پر ہوتا ہے جو اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلم افراد (ذمیوں) سے ان کی طے شدہ مرضی کے مطابق لیا جاتا ہے۔

"جزیہ" اصل میں "جزاء" سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی "بدلہ کے ہیں! اس خاص محصول (ٹیکس) کو جزیہ اسی لئے کہا جاتا ہے وہ گویا اسلامی ریاست میں ترک اسلام اور کفر پر قائم رہنے کا ایک بدلہ اور عوض ہے جو ان کے مال، جائداد، عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے وصول کیا جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مجوسیوں سے جزیہ لیا جاسکتا ہے

① عَنْ بَجَالَةَ قَالَ کُنْتُ کَاتِبًا لِجَزْءِ بْنِ مُعَاوِیَةَ عَمِّ الْاَحْنَفِ فَاَتَانَا کِتَابُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَبْلَ مَوْتِہٖ بِسَنَةٍ فَرِّقُوْا بَیْنَ کُلِّ ذِیْ مَحْرَمٍ مِنَ الْمَجُوْسِ وَلَمْ یَکُنْ عُمَرُ اَخَذَ الْجِزْیَةَ مِنَ الْمَجُوْسِ حَتّٰی شَھِدَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخَذَھَا مِنْ مَجُوْسِ ھَجَرَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت بجالہ" (تابعی) کہتے ہیں کہ میں حضرت جزء ابن معاویہ" (تابعی) کے ہاں جو حضرت احنف (صحابی) کے چچا تھے، منشی تھا۔ ایک مرتبہ ہمارے پاس حضرت (امیر المؤمنین) عمر بن خطاب کا ان کی وفات سے ایک سال پہلے ایک مکتوب آیا جس میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ "مجوسیوں یعنی آتش پرستوں میں ان کے محارم کے درمیان تفریق کرا دو۔" نیز (راوی کہتے ہیں کہ) عمر (پہلے) مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیا کرتے تھے یہاں تک کہ جب حضرت عبدالرحمن ابن عوف نے گواہی دی (یعنی انہوں نے یہ بیان کیا) کہ رسول کریم ﷺ نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا (تب حضرت عمر نے مجوسیوں سے جزیہ لینا شروع کیا۔" (بخاری)

تشریح: "محرم" اس قریبی رشتہ دار کو کہتے ہیں جس سے نکاح جائز ہو جیسے ماں، بیٹی اور بہن وغیرہ۔ مجوسیوں میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے محرم سے شادی کر لیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت عمر فاروق نے یہ حکم بھیجا کہ جن مجوسیوں نے اپنے محارم سے شادی کر رکھی ہو ان میاں بیوی کے درمیان تفریق کرا دو یعنی ان کی شادی فسخ قرار دے دو۔ اگرچہ اسلامی قانون کا یہ ضابطہ ہے کہ جو غیر مسلم اسلامی ریاست کے ذمہ و حفاظت میں ہوں ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے بلکہ ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی دی جائے اور یہ بات (یعنی اپنے محرم سے شادی) چونکہ ان کے مذہب میں جائز تھی اس لئے حضرت عمر کا یہ حکم دینا بظاہر ایک سوالیہ نشان ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اسلامی ریاست کی طرف سے ذمیوں کو اپنے مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امام وقت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اسلامی قلمرو میں جہاں صرف خدا کا اتارا ہوا قانون نافذ و جاری ہوتا ہے کسی بھی ایسے عمل کو روک دے جو براہ راست اسلامی شعار کے منافی اور دین کے بنیادی اصولوں اور قانون حکومت کے مخالف ہو۔ چنانچہ مجوسیوں کا اپنے محرم سے شادی کرنا بھی چونکہ نہ صرف اسلامی شعار کے صریح مخالف ہی تھا بلکہ اخلاقی اور سماجی طور پر بھی نہایت مذموم اور شنیع فعل تھا اس لئے حضرت عمر نے اس طرح کی شادیوں کو ختم کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔

مجوسیوں کے بارہ میں جمہور علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان سے جزیہ لیا جائے بلکہ حنفیہ کے نزدیک عجمی بت پرستوں سے بھی جزیہ لیا جائے لیکن اس میں حضرت امام شافعیؒ کا اختلافی قول ہے۔

"ہجر" ایک جگہ کا نام ہے جو بعض حضرات کے نزدیک یمن میں بحرین کے قریب ایک شہر تھا، مگر موجودہ محققین کے مطابق جزیرہ نمائے عرب کا مشرقی ساحل جو "احساء" کہلاتا ہے پہلے "ہجر" کے نام سے موسوم تھا اور اسی کو "بحرین" بھی کہتے تھے۔

وَذُكِرَ حَدِيْثُ بُرَيْدَةَ اِذَا اَمَّرَ اَمِيْرًا عَلٰى جَيْشٍ فِيْ بَابِ الْكِتَابِ اِلَى الْكُفَّارِ اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت اِذَا اَمَّرَ اَمِيْرًا الخ باب الکتاب الی الکفار میں نقل کی جا چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

جزیہ کی مقدار

(۴) عَنْ مُعَاذٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا وَجَّهَهُ اِلَى الْيَمَنِ اَمَرَهُ اَنْ يَاْخُذَ مِنْ كُلِّ حَالِمٍ يَعْنِيْ مُحْتَلِمٍ دِيْنَارًا اَوْ عَدْلَهُ مِنَ الْمُعَافِرِيِّ ثِيَابٌ تَكُوْنُ بِالْيَمَنِ۔ (ابوداؤد)

"حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ جب رسول کریم ﷺ نے ان (معاذؓ) کو (قاضی و حاکم بنا کر) یمن روانہ کیا تو ان کو یہ ہدایت کی کہ وہ (وہاں کے) ہر حالم یعنی ہر بالغ سے ایک دینار یا ایک دینار کی قیمت کا معافی کپڑا جو یمن میں تیار ہوتا ہے (جزیہ کے طور پر) لیں" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ جزیہ نہ تو عورت پر عائد ہوتا ہے اور نہ بچے پر۔ (اسی طرح مجنون، اندھے، اور فالج زدہ پر بھی) جزیہ واجب نہیں ہوتا۔ نیز وہ بڈھا جو لڑنے اور کام کرنے پر قادر نہ ہو اور وہ محتاج جو کوئی کام کرنے پر قادر نہ ہو جزیہ سے مستثنیٰ ہے

یہ حدیث بظاہر حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی دلیل ہے جن کے نزدیک جزیہ کی واجب مقدار کے بارے میں غنی اور فقیر (یعنی امیر و غریب) برابر ہیں کیونکہ اس حدیث میں کوئی تخصیص ذکر نہیں ہے۔ لیکن حنفیہ کے نزدیک غنی (امیر) پر ہر سال اڑتالیس درہم واجب ہوتے ہیں جو ہر مہینے چار درہم کے حساب سے ادا کرنے ہوتے ہیں، درمیانی درجہ والے پر ہر سال چوبیس درہم ہوتے ہیں جنہیں وہ ہر ماہ دو دو درہم کر کے ادا کرے گا اور فقیر یعنی نچلے طبقہ والے پر جو کمانے والا ہو ہر سال بارہ درہم واجب ہوتے ہیں جنہیں وہ ہر ماہ ایک ایک درہم کر کے ادا کرے گا۔

اسی حنفی مسلک کے بارہ میں ہدایہ میں لکھا ہے کہ یہ مسلک حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ سے منقول ہے نیز انصار و مہاجرین میں سے کسی سے بھی اس کے خلاف منقول نہیں ہے اور جہاں تک اس حدیث کا سوال ہے جس میں ہر بالغ سے ایک ایک دینار لینا روایت کیا گیا ہے تو یہ صلح کی صورت پر محمول ہے کہ یمن چونکہ جنگ و جدال کے ذریعہ فتح نہیں ہوا تھا بلکہ باہمی صلح کے ذریعہ یمن والوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے تسلط و اقتدار میں دے دیا تھا لہٰذا جزیہ کے بارے میں بھی ان کے ساتھ مذکورہ مقدار پر مصالحت ہوئی۔ یا یہ اس پر محمول ہے کہ اہل یمن چونکہ مالی طور پر بہت پس ماندہ اور خستہ حال تھے اس لئے ان پر جزیہ کی وہی مقدار واجب کی گئی جو فقراء (غریبوں) پر واجب کی جانی چاہئے تھی۔

مسلمانوں پر جزیہ واجب نہیں

(۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَصْلُحُ قِبْلَتَانِ فِيْ اَرْضٍ وَاحِدَةٍ وَلَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ جِزْيَةٌ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایک زمین میں دو قبلے نہیں ہونے چاہئیں اور مسلمان پر جزیہ عائد

نہیں ہو سکتا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "ایک زمین میں دو قبلے" کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک علاقے میں دو مذہب برادری کی بنیاد پر نہیں ہونے چاہئیں۔ گویا اس کے ذریعہ مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ کافرں یعنی اپنے دین کے دشمنوں کے درمیان دار الحرب میں سکونت اختیار نہ کریں اور نہ اس کے ذریعہ اپنے آپ کو ذلیل ورسوا کریں۔ اسی طرح اسلامی ریاست کو چاہئے کہ وہ اپنی حدود میں کافروں یعنی دشمنان دین کو بغیر جزیہ کے سکونت اختیار نہ کرنے دے اور ان کے جزیہ دینے کی صورت میں ان کو اس طرح سر اٹھانے کا موقع نہ دے کہ وہ علی الاعلان اسلامی ریاست کے بنیادی اصول وقوانین اور دینی عقائد ونظریات کے خلاف امور انجام دیں اور یہ آگاہی اس حقیقت کے پیش نظر ہے کہ ان دونوں ہی صورتوں میں دین اسلام اور کفر دونوں کا مساوی ہو جانا لازم آتا ہے جب کہ اسلام کی نظر میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اسلام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ مسلمان جہاں بھی رہیں، قوت وشوکت اور عزت ورفعت کے مقام پر ہوں اور اسلام دشمن عناصر ضعیف وکمزور اور بے وقعت رہیں۔

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث میں یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دینے کی طرف اشارہ ہے جو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے اہل قبلہ بھی ہیں اور ان دونوں کا الگ الگ قبلہ ہے جو اہل اسلام کے قبلہ کے خلاف ہے، تاکہ اس علاقے میں دو قبلوں کو ماننے والوں کا وجود نہ رہے بلکہ صرف ایک قبلۂ حقیقی کو ماننے والے یعنی مسلمان ہی رہیں۔

"مسلمان پر جزیہ عائد نہیں ہو سکتا۔" میں اس صورت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مثلاً کوئی غیر مسلم، ذمی ہونے کی حیثیت میں اسلامی ریاست کا شہری بنا لیکن پھر وہ جزیہ ادا کرنے سے پہلے مسلمان، ہو گیا تو اب اس سے جزیہ کا مطالبہ نہ کیا جائے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان پر جزیہ عائد نہیں ہوتا۔

جزیہ پر صلح

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَالِدَ بْنَ الْوَلِیْدِ اِلٰی اُکَیْدِرِ دُوْمَۃَ فَاَخَذُوْہُ فَاَتَوْا بِہٖ فَحَقَنَ لَہٗ دَمَہٗ وَصَالَحَہٗ عَلَی الْجِزْیَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو اکیدر دومہ کے مقابلہ پر بھیجا، چنانچہ حضرت خالدؓ اور ان کے ساتھیوں نے اس کو پکڑ لیا اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے، آنحضرت ﷺ نے اس کا خون معاف کر دیا اور جزیہ پر اس سے صلح کر لی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اکیدر الف کے پیش، کاف کے زیر یا کے جزم اور دال کے زیر کے ساتھ۔ دومہ کا بادشاہ تھا اور دومہ ایک شہر کا نام تھا۔ جو شام میں تبوک کے پاس واقع تھا۔ اکیدر ایک نصرانی (عیسائی) تھا اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے یہ حکم دیا تھا کہ اس کو قتل نہ کیا جائے بلکہ زندہ پکڑ کر میرے پاس لایا جائے۔ چنانچہ جب اس کو دربار رسالت میں لایا گیا آپ ﷺ نے اس پر جزیہ مقرر کیا۔ پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو ہدایت بخشی اور وہ کامل مسلمان ہو گیا۔

یہود ونصاریٰ سے مال تجارت پر محصول لینے کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ حَرْبِ بْنِ عُبَیْدِ اللّٰہِ عَنْ جَدِّہٖ اَبِیْ اُمِّہٖ عَنْ اَبِیْہِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا الْعُشُوْرُ عَلَی الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی وَلَیْسَ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ عُشُوْرٌ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت حرب ابن عبید اللہ اپنے جد (نانا) سے اور وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہود ونصاریٰ پر عشر یعنی دسواں حصہ واجب ہے مسلمانوں پر (چالیسواں حصہ واجب ہے، ان پر عشر واجب نہیں ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: یہاں عشر یعنی دسویں حصے کا تعلق مال تجارت سے ہے صدقات واجبہ (یعنی زمینی پیداوار) کا عشر مراد نہیں ہے، کیونکہ مسلمانوں پر زمینی پیداوار کا عشر واجب ہوتا ہے۔

خطابیؒ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ پر عشر کی قسم سے جو چیز واجب ہوتی ہے وہ بس وہی ہے جس پر ان کو ذمی بناتے وقت صلح ہوئی ہو اور جس کا ان کے ساتھ معاہدہ ہوا ہو۔ اور اگر ان کو ذمی بناتے وقت ان سے کسی چیز پر صلح نہیں ہوتی ہے تو اس صورت میں ان پر جزیہ کے علاوہ اور کچھ واجب نہیں ہوگا۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے۔

اس سلسلے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ اپنے شہروں میں مسلمانوں کے داخل ہونے کے وقت ان کے مال تجارت پر محصول (ٹیکس) وغیرہ لیتے ہوں تو مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل ہوگا کہ جب ان کے شہروں میں یہود و نصاریٰ آئیں تو ان کے تجارت پر مسلمان بھی ان سے محصول لیں اور اگر وہ مسلمانوں سے کسی طرح کا کوئی محصول نہ لیتے ہوں تو پھر مسلمان بھی ان سے کوئی محصول نہیں لیں گے۔

ذمیوں سے معاہدہ کی شرائط زبردستی کرائی جاسکتی ہیں

⑥ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَمُرُّ بِقَوْمٍ فَلَا هُمْ يُضَيِّفُوْنَا وَلَا هُمْ يُؤَدُّوْنَ مَالَنَا عَلَيْهِمْ مِنَ الْحَقِّ وَلَا نَحْنُ نَاْخُذُ مِنْهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ اَبَوْا اِلَّا اَنْ تَاْخُذُوْا كُرْهًا فَخُذُوْا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم جب (جہاد کو جاتے) ہوئے ایک (فلاں) قوم (کی آبادی) میں سے گذرتے ہیں تو وہ لوگ نہ ہماری میزبانی کرتے ہیں اور نہ ہمیں وہ چیز دیتے ہیں جس کا ہم (از روئے اسلام) ان پر حق رکھتے ہیں (یعنی اسلام کی رو سے ان پر ہمارا جو یہ حق ہے کہ وہ قرض وغیرہ دے کر ہماری ضرورتیں پوری کریں اور ہماری دیکھ بھال کریں وہ اس کو پورا نہیں کرتے) اور (چونکہ) ہم ان سے کوئی چیز (زبردستی) حاصل نہیں کرتے (اس لئے ہم سخت پریشان ہوتے ہیں اور ان کے اس رویہ کی وجہ سے ہمیں بڑی اضطراری حالت اور بڑے نقصان میں مبتلا ہونا پڑتا ہے) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اگر وہ لوگ (تمہاری میزبانی کرنے یا تمہارے ہاتھ نقد و ادھار کوئی چیز فروخت کرنے سے انکار کریں اور (اس صورت میں) ان سے کوئی چیز زبردستی لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو (زبردستی) لے لو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جن لوگوں کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے وہ دراصل ذمی تھے (جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا بلکہ جزیہ ادا کر کے اسلامی قلمرو میں آباد تھے) اور ان کو ذمی بناتے وقت ان کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس میں ان پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ جو مسلمان جہاد کے لئے جاتا ہو اور ان کے ہاں سے گذرے وہ اس کی میزبانی کریں، لیکن انہوں نے اس شرط سے روگردانی کی چنانچہ جو مسلمان جہاد کو جاتے ہوئے ان کے ہاں ٹھہرتے وہ نہ صرف یہ کہ ان کی میزبانی نہ کرتے بلکہ ان کے ہاتھ غلہ وغیرہ بھی فروخت نہیں کرتے تھے، جب مسلمانوں نے اس صورت حال سے تنگ آکر آنحضرت ﷺ سے اس کے بارے میں عرض کیا تو آپ ﷺ نے مذکورہ حکم ارشاد فرمایا۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ ان ذمیوں پر پہلے سے اس طرح کی کوئی شرط عائد نہ کی گئی ہو تو اس صورت میں ان کے ہاں ٹھہرنے والے مسلمان کے لئے جو غیر مضطر ہو، یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ ان کے مال و اسباب ان کی رضا و خوشی کے بغیر لے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ذمیوں پر جزیہ کی مقررہ مقدار کے علاوہ مسلمانوں کی ضیافت بھی واجب کی جاسکتی ہے

⑦ وَعَنْ اَسْلَمَ اَنَّ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ ضَرَبَ الْجِزْيَةَ عَلٰى اَهْلِ الذَّهَبِ اَرْبَعَةَ دَنَانِيْرَ وَعَلٰى اَهْلِ الْوَرِقِ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا مَعَ ذٰلِكَ اَرْزَاقُ الْمُسْلِمِيْنَ وَضِيَافَةُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ۔ (رواہ مالک)

"حضرت اسلمؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت عمر ابن خطابؓ نے (اپنے دور خلافت میں) ان (ذمیوں) پر، جو (بہت زیادہ) سونا رکھتے تھے، چار دینار جزیہ مقرر کیا اور جو (ذمی) چاندی رکھتے تھے ان پر چالیس درہم جزیہ مقرر کیا اور اس کے علاوہ ان پر مسلمانوں کا خورد ونوش اور تین دن کی میزبانی بھی مقرر کی تھی۔" (مالکؒ)

تشریح: "اور تین دن کی میزبانی الخ" یہ اصل میں "خورد ونوش" کی وضاحت ہے، یعنی ان غیر مسلموں کو ذمی بناتے وقت ان پر جزیہ کی جو مذکورہ مقدار مقرر کی گئی تھی اس کے ساتھ ہی ان کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا تھا کہ جب ان کے ہاں کوئی مسلمان پہنچے تو وہ کم سے کم تین دن تک اس کی میزبانی کے فرائض انجام دیں۔

چنانچہ شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ ذمیوں سے ایک دینار سے زائد کی مقدار پر مصالحت کرنا نیز ان پر یہ شرط عائد کرنا کہ اگر ان کے ہاں سے مسلمان گذریں تو ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیں، یہ جائز ہے اور اس میزبانی کے اخراجات اصلی جزیہ سے وضع نہیں ہوں گے بلکہ وہ جزیہ کی مقررہ مقدار سے ایک زائد چیز ہوگی۔ اس مسئلہ کی باقی تفصیل مرقات وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بَابُ الصُّلْحِ
صلح کا بیان

"صلح" اصل میں صلاح اور صلوح کا اسم ہے جو فساد بمعنی تباہی کے مقابلہ پر استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت کے سربراہ کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ نظریہ توحید کر مطابق عالمگیر امن کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے، تبلیغ اسلام کے مطمح نظر کی خاطر انسانی سلامتی و آزادی کی حفاظت اور سیاسی و جنگی مصلحت کے پیش نظر دشمن اقوام سے معاہدۂ صلح و امن کرلے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ۶ھ میں اپنے سب سے بڑے دشمن کفار مکہ سے صلح کی جو "صلح حدیبیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدۂ صلح کی مدت دس سال مقرر کی گئی تھی اور حدیث و تاریخ کے اس متفقہ فیصلہ کے مطابق کہ حدیبیہ کا یہی وہ معاہدۂ صلح ہے جس نے نہ صرف اسلام کی تبلیغ واشاعت کی راہ میں بڑی آسانیاں پیدا کیں بلکہ دنیا کو معلوم ہوگیا کہ اسلام، انسانیت اور امن کے قیام کا حقیقی علمبردار ہے اور مسلمان اس راہ میں اس حد تک صادق ہیں کہ جنگ جو عرب اور بالخصوص کفار مکہ کے وحشیانہ تشدد اور عیارانہ سازشوں کے بوجود اس معاہدہ کی پوری پوری پابندی کرتے رہے لیکن اس معاہدۂ صلح کی مدت پر تین سال ہی گزرے تھے کہ کفار مکہ نے آنحضرت ﷺ کے حلیف بنو خزاعہ کے مقابلہ پر جنگ کرنے والے بنو بکر کی مدد کرکے اس معاہدہ کو توڑ ڈالا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

صلح حدیبیہ

(۱) عَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ وَ مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ قَالَا خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ فِي بِضْعَ عَشَرَةَ مِائَةً مِنْ اَصْحَابِهٖ فَلَمَّا اَتٰى ذَا الْحُلَيْفَةِ قَلَّدَ الْهَدْيَ وَاَشْعَرَ وَاَحْرَمَ مِنْهَا بِعُمْرَةٍ وَسَارَ حَتّٰى اِذَا كَانَ بِالثَّنِيَّةِ الَّتِي يُهْبَطُ عَلَيْهِمْ مِنْهَا بَرَكَتْ بِهٖ رَاحِلَتُهٗ فَقَالَ النَّاسُ حَلْ حَلْ خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ وَمَا ذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ وَلٰكِنْ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيْلِ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَا يَسْأَلُوْنِي خُطَّةً يُعَظِّمُوْنَ فِيْهَا حُرُمَاتِ اللّٰهِ اِلَّا اَعْطَيْتُهُمْ اِيَّاهُمْ ثُمَّ زَجَرَهَا فَوَثَبَتْ فَعَدَلَ عَنْهُمْ حَتّٰى نَزَلَ بِاَقْصَى الْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى ثَمَدٍ قَلِيْلِ الْمَاءِ يَتَبَرَّضُهُ النَّاسُ تَبَرُّضًا فَلَمْ يُلَبِّثْهُ النَّاسُ حَتّٰى نَزَحُوْهُ وَشُكِيَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

الْعَطَشُ فَانْتَزَعَ سَهْمًا مِنْ كِنَانَتِهِ ثُمَّ اَمَرَهُمْ اَنْ يَجْعَلُوْهُ فِيْهِ فَوَاللّٰهِ مَازَالَ يَجِيْشُ لَهُمْ بِالرِّيِّ حَتّٰى صَدَرُوْا عَنْهُ فَبَيْنَاهُمْ كَذٰلِكَ اِذْجَاءَ بُدَيْلُ بْنُ وَرْقَاءَ الْخُزَاعِيُّ فِيْ نَفَرٍ مِنْ خُزَاعَةَ ثُمَّ اَتَاهُ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ وَسَاقَ الْحَدِيْثَ اِلٰى اَنْ قَالَ اِذْجَاءَ سُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اكْتُبْ هٰذَا مَاقَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ سُهَيْلٌ وَاللّٰهِ لَوْكُنَّا نَعْلَمُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَاصَدَدْنَاكَ عَنِ الْبَيْتِ وَلَا قَاتَلْنَاكَ وَلٰكِنْ اكْتُبْ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاِنْ كَذَّبْتُمُوْنِيْ اكْتُبْ مُحَمَّدُ ابْنُ عَبْدِاللّٰهِ فَقَالَ سُهَيْلٌ وَعَلٰى اَنْ لَا يَاْتِيَكَ مِنَّا رَجُلٌ وَاِنْ كَانَ عَلٰى دِيْنِكَ اِلَّا رَدَدْتَهُ عَلَيْنَا فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ قَضِيَّةِ الْكِتَابِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِهٖ قُوْمُوْا فَانْحَرُوْا ثُمَّ احْلِقُوْا ثُمَّ جَاءَ نِسْوَةٌ مُؤْمِنَاتٌ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٌ الْاٰيَةَ فَنَهَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْ يَرُدُّوْهُنَّ وَاَمَرَهُمْ اَنْ يَرُدُّوا الصِّدَاقَ ثُمَّ رَجَعَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَجَاءَهُ اَبُوْبَصِيْرٍ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ وَهُوَ مُسْلِمٌ فَاَرْسَلُوْا فِيْ طَلَبِهٖ رَجُلَيْنِ فَدَفَعَهُ اِلَى الرَّجُلَيْنِ فَخَرَجَابِهٖ حَتّٰى اِذَا بَلَغَا ذَا الْحُلَيْفَةِ نَزَلُوْا يَاْكُلُوْنَ مِنْ تَمْرٍ لَهُمْ فَقَالَ اَبُوْبَصِيْرٍ لِاَحَدِ الرَّجُلَيْنِ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَرٰى سَيْفَكَ هٰذَا يَافُلَانُ جَيِّدًا اَرِنِيْ اَنْظُرْ اِلَيْهِ فَاَمْكَنَهُ مِنْهُ فَضَرَبَهُ حَتّٰى بَرَدَ وَفَرَّ الْاٰخَرُ مِنْهُ حَتّٰى اَتَى الْمَدِيْنَةَ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ يَعْدُوْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ رَاٰى هٰذَا ذُعْرًا فَقَالَ قُتِلَ وَاللّٰهِ صَاحِبِيْ وَاِنِّيْ لَمَقْتُوْلٌ فَجَاءَ اَبُوْبَصِيْرٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيْلُ اُمِّهٖ مِسْعَرُ حَرْبٍ لَوْكَانَ لَهٗ اَحَدٌ فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ عَرَفَ اَنَّهٗ سَيَرُدُّهٗ اِلَيْهِمْ فَخَرَجَ حَتّٰى اَتٰى سِيْفَ الْبَحْرِ قَالَ وَانْفَلَتَ اَبُوْجَنْدَلِ بْنُ سُهَيْلٍ فَلَحِقَ بِاَبِيْ بَصِيْرٍ فَجَعَلَ لَا يَخْرُجُ مِنْ قُرَيْشٍ رَجُلٌ قَدْ اَسْلَمَ اِلَّا لَحِقَ بِاَبِيْ بَصِيْرٍ حَتّٰى اجْتَمَعَتْ مِنْهُمْ عِصَابَةٌ فَوَاللّٰهِ مَايَسْمَعُوْنَ بِعِيْرٍ خَرَجَتْ لِقُرَيْشٍ اِلَى الشَّامِ اِلَّا اعْتَرَضُوْالَهَا فَقَتَلُوْهُمْ وَاَخَذُوْا اَمْوَالَهُمْ فَاَرْسَلَتْ قُرَيْشٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُنَاشِدُهُ اللّٰهَ وَالرَّحِمَ لَمَّا اَرْسَلَ اِلَيْهِمْ فَمَنْ اَتَاهُ فَهُوَ اٰمِنٌ فَاَرْسَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْهِمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مسور ابن مخرمہ اور حضرت مروان ابن حکمؓ سے روایت ہے۔ یہ دونوں کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ حدیبیہ کے سال اپنے ایک ہزار کچھ سو صحابہؓ کو لے کر (مدینہ سے) روانہ ہوئے، جب آپ ﷺ ذوالحلیفہ پہنچے (جو مدینہ منورہ سے جنوب میں تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے اور جس کو ابیار علی بھی کہتے ہیں) تو ہدی (یعنی اپنی قربانی کے جانور) کی گردن میں قلادہ باندھا اور اشعار کیا اور پھر ذوالحلیفہ (ہی) سے عمرہ کے لئے احرام باندھ کر آگے روانہ ہوئے، یہاں تک کہ جب ثنیہ (یعنی اس گھاٹی پر) پہنچے جس طرف سے اہل مکہ پر اترا جاتا ہے تو آنحضرت ﷺ کی اونٹنی (جس کا نام قصواء تھا) آپ ﷺ کو لے کر بیٹھ گئی، (جب) لوگوں نے (یہ دیکھا تو) کہنا شروع کیا کہ "حل حل (یہ لفظ اونٹ کو اٹھانے کے لئے کہا جاتا تھا) قصواء اڑ گئی قصواء اڑ گئی۔" نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "نہیں! قصواء نے اڑ نہیں کی ہے اور نہ اس کو اڑنے کی عادت ہے، بلکہ اس کو اس ذات (اللہ تعالیٰ) نے روک دیا ہے جس نے ہاتھی کو روکا تھا۔" اور پھر فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے قریش مجھ سے ایسی جو بات بھی چاہیں گے جس میں اللہ تعالیٰ (کے حرم) کی عظمت ہو تو میں ان کی اس بات کو پورا کروں گا یعنی آج مکہ کے لوگ صلح کے وقت ایسی جس بات کا بھی مطالبہ کریں گے جس میں حرم مکہ کی عظمت کا لحاظ ہو تو میں اس کو پورا کروں گا۔" پھر آپ ﷺ نے اونٹنی کو اٹھایا جو فوراً اٹھ گئی اور آپ ﷺ اہل مکہ کا راستہ چھوڑ کر دوسری سمت کو چلنے لگے تاآنکہ حدیبیہ کے آخری کنارہ پر پہنچ کر جہاں (ایک گڑھا میں) تھوڑا سا پانی تھا اتر گئے (اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا) لوگوں نے اس گڑھے میں سے تھوڑا تھوڑا سا پانی لے کر استعمال کرنا شروع کیا یہاں تک کہ ذرا ہی دیر میں سارے پانی کو کھینچ ڈالا (یعنی اس گڑھے میں پانی چونکہ بہت تھوڑا تھا اس لئے لوگوں کے کم سے کم مقدار لینے کے باوجود وہ پانی بہت جلد ختم ہو گیا) لوگوں نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں پیاس کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکالا اور صحابہؓ کو حکم دیا کہ تیر کو کو پانی کے (اس گڑھے) میں

ڈال دیا جائے۔ اور پھر (راوی کہتے ہیں کہ) خدا کی قسم! (اس تیر کی برکت سے) ان لوگوں کو سیراب کرنے کے لئے کبھی ختم نہ ہونے والا پانی (گویا) موجیں مارتا رہا تا آنکہ سب اس پانی پر سے ہٹ گئے (یعنی اللہ تعالیٰ نے اس گڑھے میں اتنا زیادہ پانی پیدا فرمایا کہ سب لوگوں کی ضرورتیں نہایت اطمینان سے پوری ہوتی رہیں بلکہ جب وہاں سے واپسی ہوئی تو اس وقت بھی پانی باقی رہا) بہرحال صحابہؓ اسی حالت میں تھے، کہ اچانک بدیل ابن ورقاء خزاعی، خزاعہ کے کچھ لوگوں کے ساتھ (کفار مکّہ کی طرف سے مصالحت کے لئے) آیا، پھر عروہ ابن مسعود بھی آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ اس کے بعد بخاری نے (وہ طویل گفت وشنید نقل کی، جو آنحضرت ﷺ اور بدیل وعروہ کے درمیان ہوئی، جس کو صاحب مصابیح نے اختصار کے پیش نظر یہاں نقل نہیں کیا اور پھر یہ) بیان کیا کہ آخر کار جب سہیل ابن عمرو (اہل مکّہ کا آخری سفیر اور نمائندہ بن کر) آیا تو نبی کریم ﷺ نے (حضرت علیؓ) سے فرمایا کہ، لکھو۔ "یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہ (ﷺ) نے صلح کی ہے۔" سہیل نے (یہ الفاظ دیکھ کر) کہا کہ "بخدا! اگر ہم یہ مانتے کہ تم اللہ کے رسول ہو تو نہ ہم تمہیں خانہ کعبہ (میں جانے) سے روکتے اور نہ جنگ کرتے۔ لہٰذا یوں لکھو کہ (یہ وہ معاہدہ ہے جس پر) محمد ابن عبداللہ (نے صلح کی ہے)۔" نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "خدا کی قسم! میں اللہ کا رسول ہوں اگرچہ تم مجھ کو جھوٹا سمجھتے ہو (خیر میں مصالحت کی خاطر الفاظ میں تمہاری اس ترمیم کو تسلیم کئے لیتا ہوں) علیؓ! تم محمد ابن عبداللہ ہی لکھ دو۔" پھر سہیل نے یہ کہا کہ "اور اس معاہدۂ صلح میں اس بات کو بھی تسلیم کرو کہ (تم میں سے جو شخص ہمارے ہاں آجائے گا ہم تو اس کو واپس نہ جانے دیں گے لیکن) ہم میں سے جو شخص تمہارے ہاں چلا جائے گا اگرچہ وہ تمہارے دین کو قبول کر چکا ہو اس کو تم ہمارے ہاں واپس کر دو گے۔" (چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو بھی قبول کر لیا، اس موقعہ پر بھی واقعہ میں اختصار سے کام لیا گیا ہے یعنی صاحب مصابیح نے اسی معاہدہ سے متعلق بخاری کی بیان کردہ ساری تفصیل کو نقل نہیں کیا ہے یا یہ بخاری کی کوئی اور روایت ہے جس میں صرف اسی قدر بیان کیا گیا ہے) بہرحال جب آنحضرت ﷺ (یا حضرت علیؓ) صلح نامہ لکھے جانے سے فارغ ہوئے تو رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ "اٹھو جاؤ، اب (ہدی کے جانوروں کو) ذبح کر ڈالو اور پھر سر منڈواؤ۔" اس کے بعد (مکّہ سے) کئی عورتیں مسلمان ہو کر آئیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ الخ۔ (الممتحنہ ۶۰: ۱۰)

"اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں الخ۔"

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے (اس آیت کے ذریعہ) مسلمانوں کو اس بات سے منع کیا کہ وہ ان عورتوں کو (کفار مکّہ کے ہاں) واپس کر دیں اور انہیں اس بات کا حکم دیا کہ ان کا مہر واپس کر دیں، اس کے بعد آنحضرت ﷺ مدینہ واپس تشریف لے آئے (کچھ دنوں بعد) قریش کے ایک شخص ابوبصیر جو مسلمان ہو گئے تھے (مکہ سے نکل کر) آنحضرت کے پاس آئے، قریش مکّہ نے دو آدمیوں کو ان کی تلاش میں (مدینہ) بھیجا، آنحضرت ﷺ نے (معاہدۂ صلح کے مطابق) ابوبصیرؓ کو ان دونوں آدمیوں کے حوالہ کر دیا، وہ دونوں آدمی ابوبصیرؓ کو لے کر (مکہ) روانہ ہوئے اور جب (پہلی منزل) ذوالحلیفہ میں قیام کیا اور ان کے پاس جو کھجوریں تھیں ان کو کھانے لگے تو ابوبصیرؓ نے ان میں سے ایک شخص کو مخاطب کر کے کہا کہ "خدا کی قسم، اے فلاں شخص! میرا خیال ہے کہ تمہاری یہ تلوار (بہت اچھی ہے) ذرا مجھے تو دکھلاؤ میں بھی اس کو دیکھوں، اس شخص نے ابوبصیرؓ کو وہ تلوار دیکھنے کا موقع دے دیا یعنی (اس نے اپنی تلوار ابوبصیرؓ کے ہاتھ دے دی، بس اتنا موقع کافی تھا) ابوبصیرؓ نے اس پر (اس تلوار سے اتنا بھرپور) وار کیا کہ وہ فوراً ٹھنڈا ہو گیا (یعنی مر گیا) اور دوسرا شخص (یہ دیکھتے ہی وہاں سے) بھاگ کھڑا ہوا یہاں تک کہ مدینہ میں (واپس آگیا اور اپنے قتل کے خوف سے) دوڑتا ہوا مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوا رسول کریم ﷺ نے (اس کی حالت دیکھ کر) فرمایا کہ "یہ شخص خوفزدہ معلوم ہوتا ہے۔" اس شخص نے کہا کہ (جی ہاں) خدا کی قسم میرا ساتھی تو مارا گیا اور میرے بھی مارے جانے میں کوئی شبہ نہیں ہے (یعنی مجھ پر خوف سوار ہے کہ میں بھی مارا جاؤں گا یا میں بس بچ ہی گیا ورنہ میں بھی مارا جاتا) پھر ابوبصیرؓ بھی آگئے، نبی کریم ﷺ نے (ان کو دیکھ کر) فرمایا کہ، افسوس ہے اس کی ماں پر! (یعنی تعجب و حیرت کا مقام ہے) یہ ابوبصیر تو لڑائی

کی آگ بھڑکانے والا ہے اگر اس کا کوئی مدد گار ہوتا، تو وہ اس کی مدد کرتا)۔" جب ابوبصیرؓ نے آنحضرت ﷺ کی یہ بات سنی تو وہ سمجھ گئے کہ آنحضرت ﷺ مجھے (پھر) کافروں کے پاس واپس بھیج دیں گے چنانچہ ابوبصیرؓ (دوبارہ کافروں کے حوالے کئے جانے کے خوف سے روپوش ہونے کے لئے) مدینہ سے نکل گئے یہاں تک کہ وہ سمندر کے ساحل پر ایک علاقہ میں پہنچ گئے۔

راوی کہتے ہیں کہ ابوجندلؓ ابن سہیل بھی کفار کے قبضے سے نکل بھاگے اور ابوبصیرؓ سے آکر مل گئے اور پھر تو یہ حال ہوا کہ (مکہ میں) جو بھی شخص اسلام قبول کر کے قریش کے قبضہ سے نکل بھاگتا وہ ابوبصیرؓ سے جا ملتا یہاں تک کہ (چند ہی روز میں ابوبصیرؓ کے پاس) قریش سے چھوٹ کر آنے والوں کا ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا، اور خدا کی قسم! جب بھی یہ لوگ سنتے کہ قریش کا کوئی قافلہ (تجارت وغیرہ کے لئے) شام کی طرف روانہ ہوا ہے، وہ اس کا پیچھا کرتے اور اس کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کا سارا مال و اسباب لے لیتے آخر کار (جب ان لوگوں کی وجہ سے) قریش (کا ناطقہ بند ہو گیا اور وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے تو انکو احساس ہوا کہ ہم نے مسلمانوں سے ایک انتہائی غیر معقول شرط منوا کر کتنی بڑی نادانی کی ہے اور اس کی خمیازہ کس طرح بھگتنا پڑ رہا ہے لہٰذا انہوں) نے کسی شخص کو (اپنا سفیر و نمائندہ بنا کر) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور اس کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کو اللہ کی قسم دلائی، اور (اس) قرابت کے حق کا واسطہ دیا (جو ان میں اور آنحضرت ﷺ میں تھی اور یہ التجا کی کہ آپ کسی نہ کسی طرح صرف اتنا کرم ضرور کر دیں کہ اپنے کسی آدمی کو ابوبصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کے پاس بھیج کر یہ حکم دیں کہ وہ مدینہ میں آجائیں اور ہمارے کسی قافلہ کے ساتھ تعرض نہ کریں) اور جب آپ ان کو یہ حکم بھیج دیں (اور وہ لوگ آپ کے پاس چلے آئیں) تو پھر (ہم اہل مکہ میں سے) جو بھی شخص (مسلمان ہو کر) آپ کے پاس آئے گا وہ امن میں رہے گا (یعنی نہ صرف یہ کہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی بلکہ اس کو ہمارے پاس) واپس بھیجنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ نیز انہوں نے کہا کہ آپ ابوبصیرؓ کو ان کے طریقہ کار سے روک دیں ہم معاہدۂ صلح کی اس شرط سے باز آئے) چنانچہ نبی کریم ﷺ نے کسی شخص کو ابوبصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کے پاس بھیجا (جس کے ذریعہ ان کو یہ حکم دیا کہ وہ قریش کے قافلوں سے کوئی تعرض نہ کریں اور میرے پاس چلے آئیں)۔ (بخاریؒ)

تشریح: "حدیبیہ" مکہ مکرمہ سے مغربی جانب تقریباً پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر واقع ایک جگہ کا نام ہے یہیں جبل الشمیسی نامی ایک پہاڑ ہے جس کی وجہ سے اب اس کو شمیسیہ بھی کہتے ہیں، حدود حرم یہاں سے بھی گزرتے ہیں بلکہ اس جگہ کا اکثر حرم ہی میں داخل ہے۔

"ایک ہزار کچھ سو صحابہ الخ" میں "بضع" کا اطلاق تین سے نو تک کی تعداد پر ہوتا ہے۔ یہاں تعداد کو متعین کی بجائے مبہم اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اس موقع پر صحابہ کی جو تعداد آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تھی اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ بعض روایتوں میں چودہ سو کی تعداد بیان کی گئی ہے بعض میں پندرہ سو اور بعض روایتوں میں "ایک ہزار چار سو یا اس سے زیادہ" کے الفاظ بھی ہیں۔ علماء نے ان روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کی ہے کہ ابتداء میں تو آنحضرت ﷺ چودہ سو صحابہؓ کے ساتھ روانہ ہوئے تھے لیکن بعد میں مختلف مراحل پر اس تعداد میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ جس راوی نے سو سے پہلے شمار کیا اس نے چودہ سو کی تعداد پائی اور پھر بعد میں جن لوگوں کا اضافہ ہوا اس نے ان کو نہیں دیکھا لہٰذا اس نے اپنی روایت میں چودہ سو کی تعداد بیان کی لیکن جس راوی نے بعد میں آنے والے لوگوں کو بھی دیکھا اس نے پندرہ سو کی تعداد کا ذکر کیا اور جس راوی نے تعداد کی تعین و تحقیق نہیں کی اس نے اپنی روایت میں ایک ہزار چار سو یا اس سے زیادہ" کو بیان کیا۔

"ذبح کر ڈالو اور پھر منڈاؤ" احصار یعنی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لینے کے بعد اس حج یا عمرہ کی ادائیگی سے روک دیئے جانے کی صورت میں یہی حکم ہے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس کو حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اس حج یا عمرہ سے روک دیا گیا ہو جس کو "محصر" کہتے ہیں۔ تو وہ اپنے ہدی کو اسی جگہ ذبح کر ڈالے جہاں وہ روک دیا ہے اگرچہ وہ جگہ حدود حرم میں واقع نہ ہو وہ اپنے

قول کی دلیل میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر حدیبیہ میں ہدی کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا جب کہ حدیبیہ حدود حرم میں نہیں ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہدی کا چونکہ حدود حرم میں ذبح ہونا شرط ہے اس لئے ان کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ حدیبیہ کا سارا علاقہ حدود حرم سے باہر نہیں ہے بلکہ اس کا بعض حصہ بلکہ اکثر حدود حرم ہی میں داخل ہے اور ظاہر ہے کہ اس موقع پر ہدی اسی حصے میں ذبح کی گئی تھی جو حدود حرم میں ہے۔

"ان کا مہر واپس کردیں" اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ اگر ان مسلمان عورتوں کے کافر خاوند ان کو لینے کے لئے آئیں اور وہ انکے مہر ادا کر چکے ہوں تو وہ مہران کو واپس کردیا جائے۔ تفسیر مدارک وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر کو واپس کردینے کا یہ حکم اسی موقع کے لئے مخصوص تھا پھر بعد میں اس کو منسوخ قرار دے دیا گیا۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ معاہدہ صلح کی یہ شرط کہ "مکہ سے جو شخص آپ کے پاس آئے گا اگرچہ وہ مسلمان ہو کر آئے تو اس کو کفار مکہ کے حوالے کرنا ضروری ہوگا۔" صرف مردوں سے متعلق تھی اسی لئے جب مکہ کی یہ عورتیں مسلمان ہو کر آپ کے پاس آئیں تو اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمایا کہ صلح نامہ میں صرف مردوں کو واپس کرنا طے پایا تھا نہ کہ عورتوں کو بھی، اس لئے ان عورتوں کو جو اپنے آپ کو بڑی آزمائش اور سخت ابتلاء میں ڈال کی آئی ہیں واپس نہ کیا جائے

"اگر اس کا کوئی مددگار ہوتا الخ" کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ترجمہ سے واضح ہوا، اور ایک مطلب یہ کہ "کاش! اس وقت کوئی خیر خواہ ابوبصیرؓ کے پاس ہوتا جو اس کو یہ بتادیتا کہ وہ اب میرے پاس نہ آئے تاکہ میں اس کو دوبارہ واپس نہ کردوں۔" حدیث کے سیاق کے مطابق یہی مطلب زیادہ مناسب ہے۔

"جب ابوبصیرؓ نے آنحضرت ﷺ کی یہ بات سنی الخ" یعنی جب آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ "یہ ابوبصیر تو لڑائی کی آگ بھڑکانے والا ہے۔" تو وہ سمجھ گئے کہ یہاں مدینہ میں مجھے پناہ نہیں ملے گی بلکہ مجھے دوبارہ کفار کے حوالے کردیا جائے گا کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد صریحاً اس طرف اشارہ کررہا تھا کہ آپ ﷺ ہر حالت میں صلح کی پابندی کریں گے اور نہ تو ابوبصیرؓ کو اپنے پاس رکھیں گے اور نہ ان کی کوئی مدد کریں گے۔

حضرت ابوجندلؓ اسی سہیل کے بیٹے تھے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش مکہ کا سفیر اور نمائندہ بن کر آیا اور جس نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ معاہدۂ صلح کیا تھا) حضرت ابوجندلؓ مکہ ہی میں اسلام قبول کرچکے تھے جس کے نتیجہ میں ان کے باپ سہیل نے ان کو قید کردیا تھا چنانچہ پہلے تو وہ کسی نہ کسی طرح مکہ سے بھاگ کر حدیبیہ گئے تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے معاہدۂ صلح کی مذکورہ شرط کے مطابق انہیں تسلی، دلاسہ کے ذریعہ سمجھا بجھا کر اور بڑی بحث و تکرار کے بعد مکہ واپس کردیا تھا مگر پھر دوبارہ وہ مکہ سے بھاگ نکلے، اور ابوبصیر سے آکر مل گئے تھے۔

صلح حدیبیہ کی تین خاص شرطیں

(۲) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ صَالَحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُشْرِكِيْنَ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ عَلٰى اَنَّ مَنْ اَتَاهُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ رَدَّهُ اِلَيْهِمْ وَمَنْ اَتَاهُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ لَمْ يَرُدُّوْهُ وَعَلٰى اَنْ يَدْخُلَهَا مِنْ قَابِلٍ وَيُقِيْمَ بِهَا ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ وَلَا يَدْخُلَهَا اِلَّا بِجُلُبَّانِ السِّلَاحِ وَالسَّيْفِ وَالْقَوْسِ وَنَحْوِهِ فَجَاءَ اَبُوْ جُنْدَلٍ يَحْجُلُ فِيْ قُيُوْدِهٖ فَرَدَّهُ اِلَيْهِمْ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن تین باتوں پر صلح کی تھی۔ اول تو یہ کہ (مکہ کے) مشرکین میں سے جو شخص (مسلمان ہو کر) آنحضرت ﷺ کے پاس آئے گا آنحضرت ﷺ اس کو مشرکین کے پاس واپس کردیں گے اور مسلمانوں میں سے جو

شخص مشرکین کے پاس آئے گا اس کو مشرکین واپس نہیں کریں گے، دوم یہ کہ آنحضرت ﷺ (حج و عمرہ کے لئے اس سال مکہ میں داخل نہ ہوں بلکہ) آئندہ سال مکہ آئیں اور صرف تین دن مکہ میں ٹھہریں اور سوم یہ کہ (آئندہ سال) مکہ میں جب داخل ہوں تو اپنے تمام ہتھیار، تلوار، کمان اور اسی طرح کی دوسری چیزیں غلاف میں رکھ کر لائیں۔ اس موقع پر ابوجندل آنحضرت ﷺ کے پاس اس حال میں پہنچے کہ ان کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے وہ کود (کود کر چل رہے تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو مشرکین کے پاس واپس بھیج دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جلبان چمڑے کا ایک تھیلا ہوتا تھا جس کا مصرف یہ تھا کہ جب لوگ سفر کرتے تو نیام سمیت تلواریں اور دوسرے ہتھیار وغیرہ اس میں رکھ کر گھوڑے کی زین کے پچھلے حصہ میں لٹکا دیتے تھے۔ یہاں جلبان یعنی غلاف میں ہتھیاروں کو رکھ کر لانے کی شرط سے مشرکین کی مراد یہ تھی کہ جب آئندہ سال مسلمان مکہ آئیں تو اپنے ہتھیار ننگے کھلے لے کر شہر میں داخل نہ ہوں بلکہ ان کو نیام وغیرہ میں رکھیں تاکہ اس طرح مسلمانوں کے غلبہ، ان کی طاقت کی فوقیت و برتری اور ان کے جنگی ارادوں کا اظہار نہ ہو۔

حضرت ابوجندلؓ ابن سہیل جن کے بارے میں پچھلی حدیث کے ضمن میں بھی بیان کیا جاچکا ہے، مکہ ہی میں اسلام قبول کر چکے تھے اور جن دنوں صلح حدیبیہ ہوئی ہے وہ مشرکین مکہ کی قید میں تھے، چنانچہ وہ کسی طرح مکہ سے بھاگ کر آنحضرت ﷺ کے پاس حدیبیہ پہنچے لیکن آنحضرت ﷺ نے معاہدۂ صلح کے پیش نظر ان کو مشرکین کے حوالے کر دیا اور انہیں صبر و استقامت کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ ابوجندل! صبر و استقامت کی راہ اختیار کرو اور آخرت کے اجر و ثواب کی امید رکھو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بھی اور دوسرے ضعیف و بے بس لوگوں کے لئے بھی (جلد ہی) خلاصی و نجات اور شادمانی کے سامان پیدا کر دے گا۔

علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا اہل مکہ کی ان شرائط کو قبول کرنا جو بظاہر مسلمانوں کے لئے سوہان روح اور ان کی ملی جمعیت و وقار کے منافی تھیں، اس وجہ سے تھا کہ ایک تو اس وقت مسلمان بہرحال کمزور و خستہ حال تھے اور ان میں اتنی مادی طاقت اور ان کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے جن کے ذریعہ وہ اہل مکہ کا مقابلہ کر پاتے، دوسرے یہ کہ آنحضرت ﷺ بھی مدینہ سے کسی جنگ کے ارادے سے نہیں چلے تھے بلکہ عمرہ کے لئے روانہ ہوئے تھے اور اس کے لئے احرام بھی باندھ چکے تھے، ادھر حدود حرم کی عظمت اور ان کے شرعی تقاضوں کا لحاظ بھی ضروری تھا، نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کرنے کا حکم بھی نازل نہیں ہوا تھا ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مصلحتیں تھیں جو آپ ﷺ کے پیش نظر تھیں۔ چنانچہ انجام کار اس معاہدہ صلح کے بہت زیادہ فائدے ظاہر ہوئے کہ (اسلام کی) اشاعت و تبلیغ کے ایسے مواقع میسر آئے جنہوں نے دور دراز تک کی فضا کو مسلمانوں کے حق میں بدل دیا اور اسلام کی آواز حق چار دانگ عالم میں پھیل گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے مکہ کی فتح عظیم عطا فرمائی، وہاں کے لوگوں کو اسلام کے دامن میں پہنچا دیا، اور اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے اہل مکہ کی پیش کردہ شرائط پر معاہدۂ صلح کر کے اپنے جذبہ امن پسندی و انسانیت نوازی ہی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اپنی بے مثال سیاسی بصیرت و بالغ نظری اور دور اندیشی کا نمونہ بھی پیش کیا اور سب سے بڑھ کر حقیقت میں منشاء خداوندی اور حکم الٰہی کی فرمانبرداری کی اور کمال عبودیت کا اظہار کیا۔

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ قُرَيْشًا صَالَحُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاشْتَرَطُوْا عَلَي النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ مَنْ جَاءَ نَا مِنْكُمْ لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكُمْ وَمَنْ جَاءَ كُمْ مِنَّا رَدَدْتُمُوْهُ عَلَيْنَا فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَكْتُبُ هٰذَا قَالَ نَعَمْ اِنَّهُ مَنْ ذَهَبَ مِنَّا اِلَيْهِمْ فَاَبْعَدَهُ اللّٰهُ وَمَنْ جَاءَ نَا مِنْهُمْ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ لَهُ فَرَجًا وَمَخْرَجًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (مکہ کے) قریش نے نبی کریم ﷺ سے مصالحت کی۔ چنانچہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یہ شرط منوائی کہ آپ میں سے جو شخص ہمارے پاس آئے ہم اس کو واپس نہیں کریں گے اور ہم میں سے جو شخص آپ کے پاس آئے آپ (ﷺ) اس کو ہمارے پاس واپس کر دیں گے۔ صحابہؓ نے (اس شرط کو اپنی ملی حمیت و وقار کے منافی اور اصول مصالحت کے تقاضوں سے بعید جان کر)

عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا ہم ان شرائط کو لکھ دیں یعنی کیا یہ شرائط آپ تسلیم کرتے ہیں؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں! بات یہ ہے کہ ہم میں سے جو شخص ان کے پاس جائے گا، تو (ظاہر ہے کہ وہ مرتد ہو کر بھاگے گا اس اعتبار سے) وہ (ایک ایسا) شخص ہو گا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہو گا، اور ان میں سے جو شخص ہمارے پاس آئے گا (اس کو اگرچہ اس وقت ہم واپس کر دینے پر مجبور ہوں گے لیکن آخر کار) اللہ تعالیٰ جلد ہی اس کے لئے شادمانی و کشادگی اور خلاصی و نجات کے سامان پیدا کر دے گا۔" (مسلم)

عورتوں کی بیعت

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ فِي بَيْعَةِ النِّسَاءِ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَمْتَحِنُهُنَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ فَمَنْ اَقَرَّتْ بِهٰذَا الشَّرْطِ مِنْهُنَّ قَالَ لَهَا قَدْ بَايَعْتُكِ كَلَامًا يُكَلِّمُهَا بِهِ وَاللّٰهِ مَامَسَّتْ يَدُهُ يَدَ امْرَأَةٍ قَطُّ فِي الْمُبَايَعَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ عورتوں کی بیعت کے بارے میں فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ ان عورتوں کو (جو مکہ سے آتیں اور قبولیت اسلام کا اظہار کرتیں) اس آیت کریمہ کی روشنی میں پرکھتے تھے یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ اے نبی! جب مؤمن عورتیں آپ (ﷺ) کے پاس بیعت کے لئے حاضر ہوں الخ۔ چنانچہ ان میں سے جو عورت اس آیت میں مذکورہ شرائط کو ماننے کا اقرار کرتی آپ اس سے فرماتے کہ "میں نے تم کو بیعت کیا۔" درآنحالیکہ آپ گفتگو کرتے اور عورت سے یہ بات فرماتے مگر خدا کی قسم! کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی عورت کو بیعت کیا ہو اور اس کے ہاتھ کو آپ ﷺ کے ہاتھ نے چھوا ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اس آیت کریمہ کی روشنی میں پرکھتے تھے۔" یعنی اس آیت میں عورتوں کے لئے جن احکام کی پابندی کو بیعت کی شرط قرار دیا گیا ہے آپ ﷺ ان عورتوں سے ان احکام پر عمل کرنے کا عہد کرتے جن وہ عہد و اقرار کرتیں تو آپ ﷺ ان کو بیعت کرتے چنانچہ اس پوری آیت کا مفہوم و مضمون یہ ہے کہ مسلمان عورتیں ان شرائط پر (یعنی ان احکام پر عمل کرنے کی) بیعت کریں کہ وہ (عورتیں) کسی ذات اور کسی چیز کو خدا کا شریک نہیں مانیں گی (یعنی ہر طرح کے شرک سے کلیۃ اجتناب کریں گی) چوری نہیں کریں گی، زنا کی مرتکب نہیں ہوں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی (جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ بیٹیوں کو مار ڈالا جاتا تھا) کسی پر تہمت نہیں لگائیں گی اور عصیان نہیں کریں گی (یعنی خدا اور اس کے رسول کے احکام سے روگردانی نہیں کریں گی، اس اعتبار سے یہ آیت اس آیت کریمہ کی تفسیر و وضاحت ہے جو پہلی حدیث میں گزر چکی ہے یعنی یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ الخ۔

حدیث کے آخری جزء کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ بیعت، ہاتھ میں ہاتھ لے کر یا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر لی جاتی ہے لیکن آنحضرت ﷺ عورتوں سے زبانی بیعت لیتے تھے یعنی ان سے یہ فرماتے تھے کہ "میں نے تمہاری بیعت قبول کی۔" اس سے معلوم ہوا کہ بعض مشائخ عورتوں سے بیعت لینے کا جو یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ مرید کرتے وقت کسی برتن میں رکھے ہوئے پانی میں اپنے ہاتھ ڈالتے ہیں اور وہ عورت بھی اس پانی میں اپنا ہاتھ ڈالتی ہے، یا بعض حضرات یہ کرتے ہیں کہ کسی کپڑے کا ایک آنچل اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہیں اور دوسرا آنچل عورت پکڑ لیتی ہے، تو اس طرح کے تکلفات کی ضرورت نہیں بلکہ جو طریقہ آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے اسی پر اکتفا کرنا افضل و احسن ہے۔

مؤلف کتاب نے بیعت سے متعلق اس حدیث کو یہاں "باب الصلح" میں اس لئے نقل کیا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر آنحضرت ﷺ کا صحابہؓ سے بیعت لینے کا مرحلہ بھی آیا تھا جو "بیعت الرضوان" کے نام سے مشہور ہے اور جس کو قرآن کریم نے بھی اس آیت لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ الخ میں بیان کیا ہے اسی مناسبت سے عورتوں کی بیعت سے متعلق اس حدیث کو یہاں نقل کیا گیا ہے اگرچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر عورتوں سے بیعت نہیں لی گئی تھی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

معاہدۂ حدیبیہ کی کچھ اور دفعات

⑤ عَنِ الْمِسْوَرِ وَ مَرْوَانَ اَنَّھُمْ اصْطَلَحُوْا عَلٰی وَضْعِ الْحَرْبِ عَشْرَ سِنِیْنَ یَأمَنُ فِیْھِنَّ النَّاسُ وَعَلٰی اَنَّ بَیْنَنَا عَیْبَۃً مَکْفُوْفَۃً وَاَنَّہٗ لَا اِسْلَالَ وَلَا اِغْلَالَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت مسورؓ اور حضرت مروانؓ سے روایت ہے، کہ قریش مکہ نے (حدیبیہ میں) جن باتوں پر مصالحت کی تھی ان میں سے ایک بات (یہ بھی) تھی کہ دس سال تک (فریقین کے درمیان) کوئی جنگ نہیں ہوگی تاکہ ان دنوں میں لوگ امن وامان کے ساتھ رہیں۔ یہ بات بھی معاہدۂ صلح میں شامل تھی کہ ہمارے درمیان بندھی ہوئی گٹھری رہے اور یہ کہ ہم آپس میں نہ تو چھپی ہوئی چوری کریں اور نہ خیانت۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "بندھی ہوئی گٹھری" سے مراد یہ تھی کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے لئے اپنے سینوں کو مکروفریب، کینہ وعداوت اور شروفساد سے پاک رکھیں اور صلح ووفا کا ہر وقت خیال رکھیں۔

"نہ چھپی ہوئی چوری کریں اور نہ خیانت" کا مطلب یہ تھا کہ ہر فریق اس بات کو ملحوظ رکھے کہ اس کا کوئی فرد دوسرے فریق کے کسی فرد کا کوئی مال اور اس کی کوئی چیز نہ تو چوری چھپی ہتھیائے اور نہ کھلا غصب کرے۔

غیر مسلموں سے کئے ہوئے معاہدوں کی پابندی نہ کرنے والوں کے خلاف آنحضرت ﷺ کا انتباہ

⑥ وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَیْمٍ عَنْ عِدَّۃٍ مِنْ اَبْنَاءِ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ اٰبَائِھِمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاھِدًا اَوِ انْتَقَصَہٗ اَوْ کَلَّفَہٗ فَوْقَ طَاقَتِہٖ اَوْ اَخَذَ مِنْہُ شَیْئًا بِغَیْرِ طِیْبِ نَفْسٍ فَاَنَا حَجِیْجُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت صفوان ابن سلیم رسول کریم ﷺ کے کچھ صحابہؓ کے صاحبزادوں سے، وہ (صاحبزادے) اپنے (صحابی) باپوں سے اور وہ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "یاد رکھو! جس شخص نے اس (غیر مسلم) شخص پر ظلم کیا جس سے معاہدہ ہو چکا ہے (جیسے ذمی اور مستامن) یا اس کے حقوق کو نقصان پہنچایا، یا اس پر اس کی طاقت واستطاعت سے زیادہ بار ڈالا (جیسے کسی ذمی سے اس کی حیثیت واستطاعت سے زیادہ جزیہ لیا یا اس حربی مستامن سے جو دارالاسلام میں تجارت کی غرض سے آیا ہو اس کے مال تجارت میں سے عشر یعنی دسویں حصے سے زیادہ لیا) اور یا اس کی مرضی وخوشنودی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے دن اس شخص کے خلاف احتجاج کروں گا۔" (ابوداؤدؒ)

عورتوں کی اجتماعی بیعت کا مسنون طریقہ

⑦ وَعَنْ اُمَیْمَۃَ بِنْتِ رُقَیْقَۃَ قَالَتْ بَایَعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ نِسْوَۃٍ فَقَالَ لَنَا فِیْمَا اسْتَطَعْتُنَّ وَاَطَقْتُنَّ قُلْتُ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَرْحَمُ بِنَا مِنَّا بِاَنْفُسِنَا قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ بَایِعْنَا تَعْنِیْ صَافِحْنَا قَالَ اِنَّمَا قَوْلِیْ لِمِائَۃِ امْرَأَۃٍ کَقَوْلِیْ لِامْرَأَۃٍ وَاحِدَۃٍ رَوَاہُ۔

"اور حضرت امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کچھ عورتوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے بیعت کی (یعنی ہم چند عورتوں نے اجتماعی طور پر آپ سے بیعت کی) چنانچہ (اس وقت) آپ نے ہم سے فرمایا کہ (اے خواتین! میں نے تمہیں اسی چیز پر بیعت کیا ہے) جس (پر عمل کرنے) کی تم طاقت واستطاعت رکھتی ہو (یعنی آنحضرت ﷺ نے ازراہ شفقت ان عورتوں کی بیعت کو انکی عملی استطاعت وہمت

تک محدود رکھا)۔" میں نے کہا کہ (بیشک) اپنی ذات پر ہم خود مہربان اور رحم دل ہو سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہمارے حق میں اللہ اور اس کا رسول رحم کرنے والے ہیں اور پھر میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہمیں بیعت کر لیجئے۔" اس بات سے ان کی مراد یہ تھی کہ ہم سے مصافحہ کیجئے یعنی بیعت کرتے وقت ہمارا ہاتھ اپنے دست مبارک میں پکڑیئے۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میرا سو عورتوں سے کچھ کہنا ایک عورت سے کہہ دینے کی طرح ہے، یعنی اول تو عورتوں کو بیعت کرتے وقت صرف زبان سے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے تمہیں بیعت کیا ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوم یہ کہ اگر کچھ عورتیں اجتماعی طور پر بیعت ہو رہی ہوں تو زبان سے یہ کہنے کے لئے بھی الگ الگ ہر عورت سے مخاطب ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ صرف ایک عورت سے کہہ دینا سب عورتوں کے لئے کافی ہے۔"

تشریح: مشکوٰۃ کے اصل نسخے میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف مشکوٰۃ کو اس حدیث کے مآخذ کی تحقیق نہیں ہو سکی ہے، لیکن حاشیہ میں بعض شارحین نے یہ عبارت لکھ دی ہے کہ رواہ الترمذی و النسائی و ابن ماجۃ و مالک فی المؤطا کلھم من حدیث محمد بن المنکدر اِنَّہٗ سمع من ائمۃ الحدیث وَقَالَ الترمذی حدیث حسن صحیح لا یعرف الا من حدیث ابن المنکدر۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

معاہدۂ حدیبیہ کی کتابت آنحضرت ﷺ کے قلم سے

⑧ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ اعْتَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی ذِی الْقَعْدَۃِ فَاَبٰی اَھْلُ مَکَّۃَ اَنْ یَدَعُوْہُ یَدْخُلُ مَکَّۃَ حَتّٰی قَاضَاھُمْ عَلٰی اَنْ یَدْخُلَ یَعْنِی مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ یُقِیْمُ بِھَا ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ فَلَمَّا کَتَبُوا الْکِتَابَ کَتَبُوْا ھٰذَا مَاقَاضٰی عَلَیْہِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَقَالُوْا لَا نُقِرُّبِھَا فَلَوْ نَعْلَمُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ مَامَنَعْنَاکَ وَلٰکِنْ اَنْتَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰہِ فَقَالَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰہِ ثُمَّ قَالَ لِعَلِیِّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ امْحُ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ لَا وَاللّٰہِ لَا اَمْحُوْکَ اَبَدًا فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَیْسَ یُحْسِنُ یَکْتُبُ فَکَتَبَ ھٰذَا مَا قَاضٰی عَلَیْہِ مُحَمَّدُ ابْنُ عَبْدِاللّٰہِ لَا یَدْخُلُ مَکَّۃَ بِالسَّلَاحِ اِلَّا السَّیْفُ فِی الْقِرَابِ وَاَنْ لَا یَخْرُجَ مِنْ اَھْلِھَا بِاَحَدٍ اِنْ اَرَادَ اَنْ یَتْبَعَہٗ وَاَنْ لَا یَمْنَعَ مِنْ اَصْحَابِہٖ اَحَدًا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُقِیْمَ بِھَا فَلَمَّا دَخَلَھَا وَمَضَی الْاَجَلُ اَتَوْا عَلِیًّا فَقَالُوْا قُلْ لِصَاحِبِکَ اخْرُجْ عَنَّا فَقَدْ مَضَی الْاَجَلُ فَخَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ماہ ذی قعدہ (سن ۶ ہجری) میں عمرہ کے لئے (مدینہ سے) تشریف لے گئے مگر اہل مکہ نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے کا موقع دے دیں (یعنی انہوں نے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کو مکہ میں آنے سے روک دیا) تاآنکہ آنحضرت ﷺ نے اہل مکہ سے اس بات پر مصالحت کر لی کہ آپ ﷺ (آئندہ سال) مکہ میں آئیں اور اس وقت بھی (صرف) تین دن مکہ میں قیام کریں، چنانچہ جب صلح نامہ لکھا گیا تو (آنحضرت ﷺ کی طرف سے) صحابہؓ نے (آنحضرت ﷺ کا اسم گرامی اس طرح لکھا کہ "یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے مصالحت کی ہے اہل مکہ نے (یہ الفاظ دیکھ کر آنحضرت ﷺ سے کہا "ہم تمہاری رسالت کو تسلیم نہیں کرتے اگر ہمارا علم یہ ہوتا (یعنی ہمیں اس پر اعتقاد ہوتا) کہ تم اللہ کے رسول ہو تو ہم تمہیں (مکہ میں داخل ہونے سے) روکتے ہی کیوں، البتہ (ہم تو صرف اتنا مانتے ہیں کہ) تم محمد ہو جو عبداللہ کے بیٹے ہیں، لہٰذا اس صلح نامہ میں محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھو۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "میں اللہ کا رسول بھی ہوں اور محمد بن عبداللہ بھی ہوں (یہ محض تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی ہے ورنہ تم خوب جانتے ہو میری یہ دونوں صفتیں یعنی اللہ کا رسول ہونا اور محمد ابن عبداللہ ہونا آپس میں اس طرح لازم ملزوم ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتیں، لہٰذا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نوں کو ذکر کیا جائے یا ایک

ہی کو ذکر کر دیا جائے)" پھر آپ ﷺ نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے فرمایا (جو صلح نامہ لکھ رہے تھے) کہ "رسول اللہ لفظ کو ہٹا دو۔" حضرت علیؓ نے کہا کہ "خدا کی قسم! میں تو آپ کا نام کبھی بھی نہیں مٹا سکتا۔" (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے (حضرت علیؓ کے ہاتھ سے وہ صلح نامہ) لے لیا اور باوجودیکہ آپ ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن آپ ﷺ نے (رسول اللہ کا لفظ مٹا کر) یہ لکھا کہ "یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد ابن عبداللہ نے مصالحت کی ہے (اور اس معاہدہ میں یہ شرطیں تھیں) کہ وہ (آنحضرت ﷺ اور صحابہ) مکہ میں ہتھیاروں کے ساتھ داخل نہیں ہوں گے الا یہ کہ ان کی تلواریں نیاموں میں ہوں، اور یہ کہ اگر اہل مکہ میں سے کوئی شخص آپ کے ساتھ جانے کا ارادہ کرے تو اس کو مکہ سے جانے نہیں دیا جائے گا (یعنی جب آپ ﷺ مکہ میں آئیں اور پھر واپس جانے لگیں تو اہل مکہ میں سے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے کر نہ جائیں) اور یہ کہ اگر آپ ﷺ کے صحابہ میں سے کوئی شخص مکہ میں ٹھہر جانے کا ارادہ کرے تو آپ ﷺ اس کو (مکہ میں ٹھہرنے سے) منع نہیں کریں گے۔" چنانچہ جب (اگلے سال) آنحضرت ﷺ مکہ میں تشریف لائے اور (مکہ میں ٹھہرنے کی تین دن کی) وہ مدت (جو معاہدۂ صلح میں طے پائی تھی) گذر گئی (یعنی تین دن پورے ہونے کو ہوئے) تو اہل مکہ حضرت علیؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ "تم اپنے سردار (یعنی آنحضرت ﷺ) سے کہو کہ (طے شدہ) مدت پوری ہو گئی ہے اب ہمارے شہر سے چلے جاؤ۔" چنانچہ نبی کریم ﷺ مکہ سے روانہ ہو گئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت علیؓ نے رسول اللہ کے لفظ کو مٹانے سے جو انکار کیا گویا وہ یہ سمجھے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ حکم بطریق وجوب نہیں ہے ورنہ وہ ہرگز انکار نہ کرتے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ انکار نہیں تھا بلکہ عین اتباع کے درجہ کی چیز تھی کیونکہ اس انکار کی بنیاد آنحضرت ﷺ کے تئیں وہ غایت محبت اور انتہائی عقیدت تھی جو حضرت علیؓ کا واحد سرمایہ روح وجان بھی تھی اور ان کی کائنات تسلیم و رضا بھی، آخر وہ کس دل سے یہ گوارا کر سکتے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس سب سے بڑی حقیقت کو مٹا دیں جس کو صفحہ قرطاس پر انہی کے قلم نے الفاظ کی صورت میں مرتسم کیا تھا اور جس کی ابدی سچائی کو دنیا بھر کے قلب وذہن میں راسخ کرنا ہی ان کا حاصل ایمان بھی تھا اور مقصد حیات بھی۔

یہ بات علماء کے درمیان اختلافی نوعیت کی ہے کہ اس صلح نامہ کو آنحضرت ﷺ نے خود لکھا تھا جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ یہ صلح نامہ آنحضرت ﷺ نے خود قطعاً نہیں لکھا تھا اور نہ آپ ﷺ لکھ ہی سکتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو "امی" فرمایا ہے اور امی وہی شخص ہوتا ہے جو نہ لکھ سکے اور نہ پڑھ سکے۔ جب کہ دوسرے حضرات یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا اس صلح نامہ کو لکھنا ایک حقیقت ہے کیونکہ اگرچہ آپ کو نبی امی فرمایا گیا ہے لیکن جب آپ کی نبوت ورسالت کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات ختم ہو گئے اور آپ ﷺ کے رسول اللہ ہونے کے دلائل روز روشن کی طرح عیاں ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو لکھنے پر قادر کر دیا، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت آپ ﷺ کا لکھنا بطریق معجزہ کے تھا۔ اس حدیث کا ظاہری مفہوم ان حضرات کی دلیل ہے۔

لیکن اول الذکر حضرات کی طرف سے اس حدیث کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ "آپ نے لکھا" سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو لکھنے کا حکم دیا اور یہ جملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ کہا جائے کہ بادشاہ نے فلاں شہر کو تعمیر کیا۔ ظاہر ہے اس جملہ کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ باشاہ نے اپنے ہاتھ سے شہر کو تعمیر کیا بلکہ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس شہر کو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔

بَابُ اِخْرَاجِ الْیَهُوْدِ مِنْ جَزِیْرَةِ الْعَرَبِ

یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دینے کا بیان

"جزیرہ" اصل میں زمین و خشکی کے اس قطعہ کو کہتے ہیں جس کو چاروں طرف سے پانی نے گھیر رکھا ہو اور "جزیرۃ العرب" اس

علاقے کو کہتے ہیں جس کو بحر ہند، بحر شام اور دجلہ و فرات نے گھیر رکھا ہے، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ "جزیرۃ العرب" کا اطلاق عرب دنیا کے اس خطہ ارض پر ہوتا ہے جو لمبائی میں عدن سے شام کی سرحد تک اور چوڑائی میں جدہ سے ریف عراق تک پر مشتمل ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جزیرۃ العرب سے یہودیوں کا اخراج

① عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَا نَحْنُ فِي الْمَسْجِدِ خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ انْطَلِقُوْا اِلٰى يَهُوْدَ فَخَرَجْنَا مَعَهُ حَتّٰى جِئْنَا بَيْتَ الْمِدْرَاسِ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ يَهُوْدَ اَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا اعْلَمُوْا اَنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَاِنِّي اُرِيْدُ اَنْ اُجْلِيَكُمْ مِنْ هٰذِهِ الْاَرْضِ فَمَنْ وَجَدَ مِنْكُمْ بِمَالِهٖ شَيْئًا فَلْيَبِعْهُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) جب کہ ہم لوگ مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھے ہوئے تھے نبی کریم ﷺ (اپنے حجرۂ مبارکہ سے) برآمد ہوئے اور فرمایا کہ "یہودیوں کے پاس چلو۔" چنانچہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ روانہ ہوئے یہاں تک کہ یہودیوں کے مدرسہ میں پہنچے، نبی کریم ﷺ کھڑے ہوگئے اور فرمایا "اے جماعت یہود! تم لوگ مسلمان ہو جاؤ تاکہ (دنیا کی پریشانیوں اور آخرت کے عذاب سے) سلامتی پاؤ! تمہیں جان لینا چاہئے کہ زمین خدا اور اس کے رسول کی ہے (یعنی اس زمین کا خالق و مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا رسول اس کا نائب و خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اس زمین پر متصرف و حکمران ہے) لہٰذا (اگر تم مسلمان ہونے سے انکار کرتے ہو تو پھر) سن لو کہ (میں نے یہ ارادہ کرلیا ہے کہ تم کو اس زمین (یعنی جزیرۃ العرب) سے جلاوطن کردوں، پس تم میں سے کوئی شخص اپنے مال و اسباب میں سے (کوئی ایسی) چیز رکھتا ہو (جس کو اپنے ساتھ لے جانا ممکن نہ ہو جیسے جائیداد غیر منقولہ وغیرہ) تو اس کو چاہئے کہ وہ اسے فروخت کر دے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

② وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَامَ عُمَرُ خَطِيْبًا فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عَامَلَ يَهُوْدَ خَيْبَرَ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَقَالَ نُقِرُّكُمْ مَا اَقَرَّكُمُ اللّٰهُ وَقَدْ رَأَيْتُ اِجْلَائَهُمْ فَلَمَّا اَجْمَعَ عُمَرُ عَلٰى ذٰلِكَ اَتَاهُ اَحَدُ بَنِي اَبِي الْحُقَيْقِ فَقَالَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُخْرِجُنَا وَقَدْ اَقَرَّنَا مُحَمَّدٌ وَعَامَلَنَا عَلَى الْاَمْوَالِ فَقَالَ عُمَرُ اَظَنَنْتَ اَنِّي نَسِيْتُ قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ بِكَ اِذَا اُخْرِجْتَ مِنْ خَيْبَرَ تَعْدُوْ بِكَ قَلُوْصُكَ لَيْلَةً بَعْدَ لَيْلَةٍ فَقَالَ هٰذِهٖ كَانَتْ هُزَيْلَةً مِنْ اَبِي الْقَاسِمِ فَقَالَ كَذَبْتَ يَا عَدُوَّ اللّٰهِ فَاَجْلَاهُمْ عُمَرُ وَاَعْطَاهُمْ قِيْمَةَ مَا كَانَ لَهُمْ مِنَ الثَّمَرِ مَالًا وَاِبِلًا وَعُرُوْضًا مِنْ اَقْتَابٍ وَحِبَالٍ وَغَيْرِ ذٰلِكَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور (اس خطبہ میں) فرمایا کہ "(تم سب جانتے ہوگے کہ) رسول کریم ﷺ نے خیبر کے یہودیوں سے انکے مال و جائیداد سے متعلق ایک معاملہ طے فرمایا تھا (اور وہ یہ کہ ان یہودیوں کو خیبر ہی میں رہنے دیا جائے گا نیز ان کے کھجوروں کے باغات اور کھیت کھلیان کو بھی انہی کی تحویل و ملکیت میں باقی رکھا جائے گا البتہ ان کی پیداوار اور آمدنی میں سے آدھا حصہ لیا جایا کرے گا اور آنحضرت ﷺ نے ان پر اسی طرح جزیہ بھی مقرر کیا تھا) اور آپ نے (اسی وقت) ان یہودیوں سے فرما دیا تھا کہ ہم تمہیں (خیبر میں) اس وقت تک رہنے دیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں رہنے دے گا (یعنی تم لوگ اس وقت تک خیبر میں مقیم رہنے کے حقدار ہوگے جب تک کہ ہمیں اللہ تعالیٰ تم کو جلاوطن کردینے کا حکم نہ دے دے) لہٰذا (حضرت عمرؓ نے کہا کہ) اب میں ان کو جلاوطن کردینا مناسب سمجھتا ہوں۔"

پھر جب حضرت عمرؓ نے اس بات کا فیصلہ کرلیا (کہ ان کو جلاوطن کردیا جائے) تو (ان یہودیوں کے) قبیلہ بنی ابی الحقیق کا ایک شخص (جو اپنی قوم کا بڑا بوڑھا سردار تھا) حضرت عمرؓ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ امیر المؤمنین! کیا آپ ہمیں جلاوطن کر رہے ہیں حالانکہ محمد (ﷺ) نے ہمیں

(خیبر میں) رہنے دیا تھا، اور ہمارے مال و اسباب سے متعلق ہم سے ایک معاملہ بھی طے کیا تھا!؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ میں رسول کریم ﷺ کی (یہ) بات بھول گیا ہوں (جو آپ ﷺ نے تم کو مخاطب کر کے کہی تھی) کہ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا اور تو کیا کرے گا جب تجھ کو خیبر سے جلاوطن کر دیا جائے گا اور رات کے بعد رات میں تیری اونٹنی تیرے پیچھے دوڑ رہی ہوگی (گویا آنحضرت ﷺ نے تجھ کو اس آنے والے وقت سے ڈرایا تھا جب تجھ کو راتوں رات خیبر سے نکل جانا پڑے گا)" اس شخص نے (یہ سن کر) کہا کہ "یہ بات تو ابوالقاسم نے بطور مذاق کہی تھی۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اے خدا کے دشمن، تم جھوٹ بکتے ہو (آنحضرت ﷺ نے یہ بات مذاق کے طور پر نہیں کہی تھی بلکہ ازراہ معجزہ تمہیں ایک غیبی بات کی خبر دی تھی) اور پھر حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا اور ان کے پاس از قسم میوہ جو کچھ تھا جیسے کھجوریں وغیرہ ان کی قیمت میں ان کو مال، اونٹ اور اسباب جیسے رسیاں اور پالان وغیرہ دے دیئے۔ (بخاری)

مشرکین کو جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دینے کیلئے آنحضرت ﷺ کی وصیت

(۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصٰى بِثَلَاثَةٍ قَالَ اَخْرِجُوا الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَاَجِيْزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَاكُنْتُ اُجِيْزُهُمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَسَكَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ اَوْ قَالَ فَاُنْسِيْتُهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (وفات کے وقت) تین باتوں کی وصیت کی چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "مشرکوں کو جزیرۂ عرب (یعنی مکہ اور مدینہ سے باہر نکال دینا اور قاصدوں اور ایلچیوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو میں کیا کرتا تھا (یعنی وہ جب تک تمہارے پاس رہیں ان کی دیکھ بھال کرنا اور انہیں ان کی ضروریات زندگی مہیا کرنا)"۔ راوی کہتے ہیں یا حضرت ابن عباسؓ نے تیسری بات سے خاموشی اختیار کی، یا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تیسری بات کو میں بھول گیا ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ وہ تیسری بات آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہو کر لا تتخذو اقبری وثنا یعبد یعنی میری قبر کو بت (کی طرح) نہ قرار دینا جس کی پوجا کی جائے۔" اس ارشاد کو امام مالکؒ نے اپنی کتاب موطا میں نقل کیا ہے۔

جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کی جلاوطنی

(۴) وَعَنْ جَابِرِبْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَاُخْرِجَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ حَتّٰى لَا اَدَعَ فِيْهَا اِلَّا مُسْلِمًا۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَئِنْ عِشْتُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَاُخْرِجَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ۔

"اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ "میں یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرہ عرب سے ضرور باہر نکال دوں گا یہاں تک کہ مسلمانوں کے سوا (جزیرۂ عرب میں) کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔" (مسلمؒ)

اور روایت میں ہے کہ آپ نے یوں فرمایا کہ "اگر میری زندگی رہی تو میں انشاء اللہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۂ عرب سے ضرور باہر نکال دوں گا۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

لَيْسَ فِيْهِ اِلَّا حَدِيْثُ ابْنِ عَبَّاسٍ لَا يَكُوْنُ قِبْلَتَانِ وَقَدْ مَرَّ فِيْ بَابِ الْجِزْيَةِ۔

(مصابیح کی) دوسری فصل میں ابن عباسؓ کی صرف یہ ایک حدیث لا یکون قبلتان الخ تھی اور وہ جزیہ کے بیان میں نقل کی جا چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حجاز سے یہود و نصاریٰ کی جلاوطنی کا کام حضرت عمرؓ کے ہاتھوں انجام پایا

⑤ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ اَجْلَى الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى مِنْ اَرْضِ الْحِجَازِ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا ظَهَرَ عَلٰى اَهْلِ خَيْبَرَ اَرَادَ اَنْ يُخْرِجَ الْيَهُوْدَ مِنْهَا وَكَانَتِ الْاَرْضُ لَمَّا ظُهِرَ عَلَيْهَا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُسْلِمِيْنَ فَسَأَلَ الْيَهُوْدُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَتْرُكَهُمْ عَلٰى اَنْ يَكْفُوا الْعَمَلَ وَلَهُمْ نِصْفُ الثَّمَرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُقِرُّكُمْ عَلٰى ذٰلِكَ مَاشِئْنَا فَاُقِرُّوْا حَتّٰى اَجْلَاهُمْ عُمَرُ فِىْ اِمَارَتِهٖ اِلٰى تَيْمَاءَ وَاَرِيْحَاءَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ سرزمین حجاز یعنی جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کی جلاوطنی کا کام حضرت عمر ابن خطابؓ کے ہاتھوں انجام پایا۔ (اس سے پہلے) جب رسول کریم ﷺ کو اہل خیبر پر غلبہ حاصل ہوا تھا تو آپ نے یہودیوں کو خیبر سے نکال دینے کا ارادہ کیا تھا کیونکہ (جس بھی) زمین پر (دین حق کو) غلبہ حاصل ہوتا ہے وہ زمین اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کی ہو جاتی ہے (کہ وہاں صرف اللہ ہی کا دین غالب اور مسلمانوں ہی کو حق تصرف و حکمرانی حاصل ہوتا ہے) لیکن یہودیوں نے رسول کریم ﷺ سے یہ درخواست کی کہ آپ ﷺ ان (یہودیوں کو) اس شرط پر (خیبر کی زمینوں پر قابض و متصرف) رہنے دیں کہ وہ محنت کریں (یعنی باغات کی دیکھ بھال اور ان کی سیرابی وغیرہ کا سارا کام کریں گے) اور (ان سے پیدا ہونے والے) پھلوں کا آدھا حصہ آپ ﷺ کا ہوگا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے (ان کی یہ درخواست منظور کر لی لیکن یہ) فرمایا کہ "ہم تمہیں اس شرط پر (خیبر میں) اسی وقت رہنے دیں گے جب تک کہ ہم چاہیں گے" اس کے بعد ان کو خیبر میں رہنے دیا گیا یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ان سب کو تیماء اور اریحا کی طرف جلاوطن کر دیا۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

بَابُ الْفَيْءِ

فئی کا بیان

فئی کس کو کہتے ہیں؟: "فئی" اس مال کو کہا جاتا ہے جو مسلمانوں کو کفار سے جنگ کے بغیر حاصل ہوا ہو، اس مال کا حکم یہ ہے کہ وہ سب کا سب مسلمانوں کا حق ہے، اس میں سے نہ تو خمس نکالا جاتا ہے اور نہ اس کو مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں جب کوئی لشکر کسی جگہ سے مال فئی لے کر آتا تو اس پر آنحضرت ﷺ کو پورا اختیار حاصل ہوتا تھا کہ اس میں سے جس کو چاہتے دیتے اور جس کو چاہتے نہ دیتے، اسی طرح جس کو چاہتے زیادہ دیتے اور جس کو چاہتے کم دیتے۔

اور جو مال جنگ کے ذریعہ کفار پر غالب آنے کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوتا ہے اس کو "مال غنیمت" کہتے ہیں۔ اس مال کا یہ حکم ہے کہ پہلے اس میں سے خمس نکالا جائے اور پھر بقیہ کو مجاہدین کے درمیان اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ پیادے کو ایک اور سوار کو دو حصے ملیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مال فئی کا مصرف

① عَنْ مَالِكِ بْنِ اَوْسِ بْنِ الْحَدَثَانِ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ خَصَّ رَسُوْلَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ

هٰذَا الْفَيْءِ بِشَيْءٍ لَمْ يُعْطِهِ اَحَدًا غَيْرَهُ ثُمَّ قَرَأَ مَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ اِلٰى قَوْلِهٖ قَدِيْرٌ فَكَانَتْ هٰذِهٖ خَالِصَةً لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنْفِقُ عَلٰى اَهْلِهٖ نَفَقَةَ سَنَتِهِمْ مِنْ هٰذَا الْمَالِ ثُمَّ يَاْخُذُ مَابَقِيَ فَيَجْعَلُهُ مَجْعَلَ مَالِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت مالک ابن اوس بن حدثان کہتے ہیں کہ حضرت عمر ابن خطابؓ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اس مال فئی کے سلسلے میں اپنے رسول ﷺ کو ایک خاص خصوصیت عطا کی تھی کہ آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو وہ خصوصیت عطا نہیں کی۔" پھر حضرت عمرؓ نے یہ آیت ما افاء اللّٰہ علی رسولہ منھم...... تا قدیرٌ پڑھی اور فرمایا کہ چنانچہ یہ مال صرف رسول کریم ﷺ کے لئے مخصوص ہو گیا تھا، جس میں سے آنحضرت ﷺ اپنے گھر والوں کے سال بھر کا خرچ دیا کرتے تھے اس کے بعد اس میں سے جو کچھ بچ رہتا تھا اس کو ان جگہوں میں خرچ کرتے جو اللہ کا مال خرچ کئے جانے کی جگہیں ہیں (یعنی اس باقی مال کو مسلمانوں کے مفاد و مصالح جیسے ہتھیاروں اور گھوڑوں وغیرہ کی خریداری پر خرچ کر دیا کرتے تھے، نیز محتاج و مساکین میں سے جس کو چاہتے اس کی مدد کرتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مذکورہ آیت کریمہ سورۂ حشر کی ہے جو پوری اس طرح ہے۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

"اور جو کچھ (مال) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان سے دلوایا ہے وہ رسول کے لئے مخصوص ہو گیا ہے) کیونکہ تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ (یعنی تم نے اس کے حصول کے لئے کسی جنگ وجدال کی مشقت برداشت نہیں کی ہے نہ سفر کی پریشانیاں جھیلی ہیں، بلکہ پیدل ہی چلے گئے تھے) لیکن اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) اپنے رسولوں کو جس پر چاہے (خاص طور پر) مسلط فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت حاصل ہے۔"

اس آیت کریمہ کے ذریعہ گویا مسلمانوں پر یہ واضح کیا گیا تھا کہ اللہ نے آنحضرت ﷺ کو یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر کے مال و جائیداد کا جو مالک و متصرف بنایا ہے تو وہ مال اس طرح کا ہے جس کو تم نے جنگ وجدال کے ذریعہ ان (بنو نضیر) پر غلبہ پا کر اور دور دراز کے سفر کی مشقت برداشت کر کے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ بلا کسی جدوجہد کے ہاتھ لگا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب بنو نضیر کو مدینہ سے جلاوطن کر دینے کا حکم دیا گیا اور بنو نضیر نے اس حکم کی تعمیل کرنے میں چون وچرا کی تو آنحضرت ﷺ اپنے صحابہؓ کو لے کر اس جگہ کے لئے روانہ ہوئے جہاں بنو نضیر کے محلات، قلعے اور جائیدادیں تھیں۔ وہ جگہ چونکہ مدینہ سے صرف دو میل کے فاصلے پر تھی اس لئے آنحضرت ﷺ کے علاوہ اور سب ہی لوگ پیدل تھے، وہاں پہنچنے پر جنگ وجدال کی نوبت نہیں آئی، کچھ عرصہ کے محاصرہ کے بعد بنو نضیر نے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ جو کچھ سامان اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے اونٹوں پر لاد کر خیبر کو روانہ ہو گئے اس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو ان پر غلبہ و تسلط فرمایا جیسا کہ حق تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ وہ اپنے رسولوں اور دین کے علمبرداروں کو دشمنان دین پر غلبہ و تسلط عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ ان کی جائیداد و زمین وغیرہ بحق آنحضرت ﷺ ضبط کر لی گئیں اور وہاں کا سارا مال (فئی) کے حکم میں ہونے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے تصرف و اختیار میں آ گیا۔ اسی لئے جب مسلمانوں نے اس مال کو تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا تو مذکورہ آیت نازل ہوئی اور اس مال کا یہ حکم بتایا گیا کہ اس طرح کا مال "مال غنیمت" کی طرح تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے تصرف و خرچ کا سارا اختیار صرف آنحضرت ﷺ کو ہے کہ آپ ﷺ جس طرح چاہیں خرچ کریں اور جس کو چاہیں اس میں سے دیں۔ چنانچہ احادیث میں اس مال کے مصرف بھی بیان کئے گئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اس مال میں سے اپنی بیویوں کو ان کا سال بھر کا خرچ دے دیا کرتے تھے اور پھر جو باقی بچتا اس کو مسلمانوں کے اجتماعی مفاد و مصالح میں خرچ کرتے اور جن فقراء و مساکین وغیرہ کو چاہتے ان کو دیتے۔

مال فئی کے مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے جو اوپر بیان ہوا لیکن طیبیؒ نے حضرت امام شافعیؒ کا مسلک اس طرح بیان کیا ہے کہ مال فئی میں چار خمس اور ایک خمس کے پانچویں حصے پر آنحضرت ﷺ کا حق ہوتا تھا، یعنی وہ مال پچیس حصوں میں تقسیم ہو کر اکیس حصے تو آنحضرت ﷺ کے ذاتی تصرف و اختیار میں آتا اور باقی چار حصے آپ اپنے ذوی القربیٰ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرتے تھے۔

تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد مال فئی کے مصرف کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔ چنانچہ ایک جماعت کا قول تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد مال فئی اسلامی مملکت و خلافت کے سرابرہ کا حق ہے۔ امام شافعیؒ کے دو قول ہیں ایک قول تو یہ ہے کہ وہ مجاہدین و مقاتلین کا حق ہے کہ اس کو ان کے درمیان تقسیم کیا جائے۔ اور دوسرا قول ہے کہ اس مال کو عام مسلمانوں کے اجتماعی مفاد و مصالح میں خرچ کیا جائے۔

"سال بھر کا خرچ دیا کرتے تھے۔" اس موقع پر ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ احادیث میں تو یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کل تک کے لئے بھی کوئی چیز بچا کر نہیں رکھتے تھے تو پھر سال بھر کا خرچ کس طرح جمع کر کے رکھتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن احادیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کل تک کے لئے بھی کوئی چیز بچا کر نہیں رکھتے تھے تو اس کا تعلق آپ ﷺ کی ذات سے ہے کہ آپ ﷺ اپنی ذات کے لئے کسی چیز کو بچا کر یا جمع کر کے رکھنا گوارا نہیں کرتے تھے اور یہاں جس بات کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق آپ ﷺ کے اہل و عیال سے ہے۔

لیکن واضح رہے کہ آپ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کو سال بھر خرچ کبھی کبھی دیتے تھے مستقل طور پر یہ معمول نہیں تھا، تاہم امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ سال بھر کی ضروریات زندگی کی چیزیں مہیا کر کے رکھ لینا جائز ہے اور یہ توکل کے منافی نہیں ہے۔

② وَعَنْ عُمَرَ قَالَ كَانَتْ اَمْوَالُ بَنِي النَّضِيرِ مِمَّا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِمَّالَمْ يُوْجِفِ الْمُسْلِمُوْنَ عَلَيْهِ بِخَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ فَكَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاصَّةً يُنْفِقُ عَلٰى اَهْلِهٖ نَفَقَةَ سَنَةٍ ثُمَّ يَجْعَلُ مَابَقِيَ فِي السِّلَاحِ وَالْكُرَاعِ عُدَّةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ "(یہود کے قبیلہ) بنو نضیر کا مال اس قسم کے مال میں سے تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو (کسی جدوجہد کے بغیر) عطا فرمایا تھا اس کے لئے نہ تو مسلمانوں نے گھوڑے دوڑائے تھے اور نہ اونٹ، اس لئے وہ مال آنحضرت ﷺ کے لئے مخصوص ہو گیا تھا کہ جس میں سے آپ اپنے گھر والوں کی سال بھر کی ضروریات میں خرچ کرتے تھے اور پھر اس میں سے جو کچھ بچ رہتا تھا اس کو ہتھیاروں اور گھوڑوں کی خریداری پر خرچ کر دیا کرتے تھے تاکہ وہ اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں کام آئیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آنحضرت ﷺ کی طرف سے مال فئی کی تقسیم

③ عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَتَاهُ الْفَيْءُ قَسَمَهُ فِيْ يَوْمِهٖ فَاَعْطَى الْاٰهِلَ حَظَّيْنِ وَاَعْطَى الْاَعْزَبَ حَظًّا فَدُعِيْتُ فَاَعْطَانِيْ حَظَّيْنِ وَكَانَ لِيْ اَهْلٌ ثُمَّ دُعِيَ بَعْدِيْ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ فَاُعْطِيَ حَظًّا وَاحِدًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عوف ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کے پاس مال فئی آتا تو آپ ﷺ اس کو اسی دن (ضرورتمندوں کے درمیان) تقسیم فرما دیتے تھے، جو بیوی والا ہوتا اس کو تو دو حصے دیتے اور مجرد کو ایک حصہ عطا فرماتے، چنانچہ (ایک مرتبہ) مجھ کو بھی بلایا اور آپ ﷺ نے مجھے دو حصے عطا فرمائے کیونکہ میری بیوی تھی اور پھر میرے بعد عمار ابن یاسرؓ کو بلایا گیا (جن کی بیوی نہیں تھی) ان کو

آپ ﷺ نے ایک حصہ دیا۔" (ابوداؤد)

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوَّلَ مَاجَاءَهُ شَيْءٌ بَدَأَ بِالْمُحَرَّرِيْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسول کریم ﷺ مال فئی کے آنے کے بعد اس میں سے سب سے پہلے ان لوگوں کو مرحمت فرماتے جن کو (حال ہی میں غلامی سے آزاد کیا گیا ہوتا۔" (ابوداؤد)

تشریح: مال فئی میں سے سب سے پہلے حال ہی میں غلامی سے نجات پائے ہوئے لوگوں کو اس لئے عطا کیا جاتا کہ وہ بے ٹھکانہ اور بے سہارا ہوتے تھے، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "آزاد کئے گئے لوگوں" سے مراد "مکاتب" ہیں۔ نیز بعض حضرات کے نزدیک "منفردین لطاعۃ اللہ" مراد ہیں۔

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِظَبْيَةٍ فِيْهَا خَرَزٌ فَقَسَمَهَا لِلْحُرَّةِ وَالْاَمَةِ قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ اَبِيْ يَقْسِمُ لِلْحُرِّ وَالْعَبْدِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے پاس ایک تھیلا آیا جس میں نگینے بھرے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے ان نگینوں کو بیبیوں (یعنی آزاد عورتوں) اور باندیوں کو بانٹ دیا۔" حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "میرے والد یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ (کے پاس نگینے آتے تو وہ ان نگینوں کو) آزاد اور غلام مردوں کو (بھی) بانٹتے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اگرچہ آنحضرت ﷺ نگینوں کی تقسیم کو صرف عورتوں تک محدود رکھتے تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ کے عمل سے معلوم ہوا کہ نگینوں کی تقسیم صرف عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی تھی بلکہ مردوں کو بھی بانٹا کرتے تھے۔

مال فئی کی تقسیم میں فرق مراتب کا لحاظ

⑥ وَعَنْ مَالِكِ بْنِ اَوْسِ بْنِ الْحَدَثَانِ قَالَ ذَكَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَوْمًا الْفَيْءَ فَقَالَ مَا اَنَا بِاَحَقَّ بِهٰذَا الْفَيْءِ مِنْكُمْ وَمَا اَحَدٌ مِنَّا بِاَحَقَّ بِهِ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا اَنَا عَلٰى مَنَازِلِنَا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَقَسْمِ رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَالرَّجُلُ وَقِدَمُهٗ وَالرَّجُلُ وَبَلَاؤُهٗ وَالرَّجُلُ وَعِيَالُهٗ وَالرَّجُلُ وَحَاجَتُهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مالک ابن اوس ابن حدثان کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر فاروقؓ نے مال فئی کا ذکر کیا اور فرمایا کہ "اس مال" فئی کا میں تم سے زیادہ مستحق نہیں ہوں اور نہ ہم میں سے کوئی شخص اس مال فئی کا کسی دوسرے شخص سے زیادہ مستحق ہے البتہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی تقسیم کے مطابق اپنے اپنے مرتبہ پر ہیں چنانچہ ایک وہ شخص ہے جو (قبولیت اسلام) قدامت رکھتا ہے، ایک وہ شخص ہے جو (دین کی راہ میں) شجاعت و بہادری کے (کارہائے نمایاں) اور سعی و مشقت (کے اوصاف) رکھتا ہے، ایک وہ شخص ہے جو اہل و عیال رکھتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو ضرورت و حاجت رکھتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "میں تم سے زیادہ مستحق نہیں ہوں۔" حضرت عمرؓ نے یہ بات اس وہم و گمان کو دور کرنے کے لئے فرمائی کہ وہ چونکہ خلیفہ رسول ہیں اس لئے جس طرح آنحضرت ﷺ اس مال کا سب سے زیادہ استحقاق رکھتے تھے ہو سکتا ہے کہ آپ کے بعد اب وہ (حضرت عمرؓ) اس کے سب سے زیادہ مستحق ہوں! حضرت عمرؓ نے اسی کی نفی کی کہ کسی دوسرے مسلمان کی طرح میں بھی اس مال کا سب سے زیادہ مستحق نہیں ہوں، پھر انہوں نے اس مال کا سب سے زیادہ استحقاق رکھنے کی نفی عمومیت کے طور پر فرمائی کہ ہم میں سے کوئی بھی شخص دوسرے شخص سے زیادہ حق دار نہیں ہے بلکہ اس مال کے استحقاق کی اصل بنیاد وہی فرق مراتب ہے جو کتاب اللہ کے اس ارشاد لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ تین آیتوں تک اور وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ آخر آیت تک، یا ان آیتوں سے ظاہر ہے جو اس

بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مسلمانوں کے مراتب میں تفاوت ہے کہ ہر شخص کو اس کے مرتبے کے مطابق کم یا زیادہ دیا جائے گا۔

"اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی تقسیم" میں "رسول اللہ کی تقسیم" کا عطف "کتاب اللہ" پر کیا گیا ہے، یعنی جس طرح کتاب اللہ کی مذکورہ آیتوں سے مسلمانوں کے فرق مراتب کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح آنحضرت ﷺ کے طریقہ تقسیم سے بھی مراتب میں تفاوت کا پتہ چلتا ہے کہ آپ اس مال کی تقسیم کے وقت دوسرے مسلمانوں کے بہ نسبت جنگ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کو زیادہ حصہ دیا کرتے تھے، اسی طرح جو صحابہ (صلح حدیبیہ کے موقع پر) بیعۃ الرضوان میں شریک تھے، ان کا لحاظ عام مسلمانوں سے زیادہ رکھتے تھے، یا جو شخص اہل وعیال والا ہوتا تھا اس کو مجرد شخص سے زیادہ دیتے تھے۔

"ایک وہ شخص ہے الخ" حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ اوپر کی بات کو اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ مال فئی کی تقسیم کے وقت ہر شخص کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اگر کوئی شخص قدیم الاسلام ہے تو اس کی اس خصوصیت کو دیکھنا چاہئے۔ اگر کوئی شخص خدا کی راہ میں شجاعت و بہادری کے کارنامے انجام دینے والا اور دین کو پھیلانے میں سخت جدوجہد کرنے اور مشقت برداشت کرنے والا ہے تو اس کے اس وصف کو سامنے رکھنا چاہئے، اسی طرح اگر کوئی اہل وعیال والا زیادہ حاجت مند ہے تو اس کی اس حیثیت وحالت کا خیال کیا جانا چاہے غرضیکہ جس شخص کو جس طرح کی احتیاج وضرورت ہو، اس کو اسی کے مطابق دینا چاہئے۔

(۷) وَعَنْهُ قَالَ قَرَأَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ حَتّٰى بَلَغَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ فَقَالَ هٰذِهٖ لِهٰؤُلَاءِ ثُمَّ قَرَأَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ حَتّٰى بَلَغَ وَابْنِ السَّبِيْلِ ثُمَّ قَالَ هٰذَا لِهٰؤُلَاءِ ثُمَّ قَرَأَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى حَتّٰى بَلَغَ لِلْفُقَرَآءِ ثُمَّ قَرَأَ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ ثُمَّ قَالَ هٰذِهٖ اسْتَوْعَبَتِ الْمُسْلِمِيْنَ عَامَّةً فَلَئِنْ عِشْتُ فَلَيَاتِيَنَّ الرَّاعِيَ وَهُوَ بِسَرْوِ حِمْيَرَ نَصِيْبُهٗ مِنْهَا لَمْ يَعْرَقْ فِيْهَا جَبِيْنُهٗ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت مالکؓ ابن اوس کہتے ہیں کہ (ایک موقع پر) حضرت عمر فاروقؓ نے یہ آیت پڑھی (جس میں زکوٰۃ کے مصارف کا بیان ہے) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ اور اس آیت کو انہوں نے عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ تک پڑھا اور فرمایا کہ اس (زکوٰۃ کے مال) کو پانے کے مستحق یہی لوگ ہیں (جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے یعنی فقراء مساکین وغیرہ) پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ اور اس آیت کو وَابْنِ السَّبِيْلِ تک پڑھا اور فرمایا کہ یہ (خمس کا مال) انہی لوگوں کا حق ہے (جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے یعنی ذوی القربیٰ وغیرہ) اس کے بعد انہوں نے یہ آیت پڑھی (جس میں مال فئی کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ وہ کس کس کو دیا جائے) مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى اس آیت کو لِلْفُقَرَآءِ.... وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ تک پڑھا (ایک نسخہ میں یہ عبارت ہے کہ حَتّٰى بَلَغَ لِلْفُقَرَآءِ ثُمَّ قَرَأَ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا اس کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ انہوں نے اس آیت مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ کو پڑھنا شروع کیا اور لِلْفُقَرَآءِ تک کی دو آیتوں کو پڑھا اور پھر یہ آیت وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ پڑھی) اور فرمایا کہ اس آیت نے سارے مسلمانوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ لہٰذا اگر میری زندگی رہی تو (میری حدود خلافت میں کوئی ایسا مسلمان نہیں بچے گا جس کو اس کے حصہ کا مال نہ پہنچے یہاں تک کہ) اس چرواہے کو بھی مال فئی میں سے اس کا حصہ پہنچے گا جو مقام بسر اور حمیر میں ہوگا درانحالیکہ اس (مال کے حاصل کرنے) میں اس کی پیشانی بھی عرق آلود نہیں ہوئی ہوگی۔"

(شرح السنۃ)

تشریح: "اس آیت نے سارے مسلمانوں کا احاطہ کر لیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جن لوگوں کو دینے کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سارے ہی مسلمان آجاتے ہیں بخلاف پہلی دونوں آیتوں کے کہ ایک میں تو صرف مستحقین زکوٰۃ کا ذکر ہے اور دوسری میں مستحقین خمس کا۔

حضرت عمرؓ مال فئی میں سے خمس نکالنے کے قائل نہیں تھے جیسا کہ مال غنیمت میں سے خمس نکالا جاتا ہے، ان کے نزدیک پورا مال فئی مسلمانوں کے اجتماعی مفاد و مصالح اور ان کی فلاح و عانت میں خرچ کیا جانا چاہئے جو قرآن و حدیث میں مذکور فرق مراتب کے ساتھ

ان کا حق ہے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کے سوا اکثر ائمہ فقہ کا مسلک بھی یہی ہے، نیز حضرت عمرؓ اس کے بھی قائل تھے کہ مال فیئ کی تقسیم کے سلسلے میں مسلمانوں کے درجات و مراتب کے تفاوت کا لحاظ ضروری ہے جب کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہر مسلمان کا برابر، برابر حصہ لگاتے تھے وہ قدامت اسلام اور نسب کی برتری وغیرہ کا لحاظ ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ اس چیز کا تعلق آخرت سے ہے اگر کوئی شخص پہلے مسلمان ہوا ہے اور کسی شخص نے دین کی راہ میں زیادہ شجاعت و بہادری اور زیادہ سعی و مشقت اختیار کی ہے تو ان کا یہ عمل اللہ کے لئے ہے اور ان کا اجر بھی اللہ ہی پر موقوف ہے ان چیزوں کو زیادہ مال کے استحقاق کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے لیکن حضرت عمرؓ چونکہ فرق مراتب اور تفاوت درجات کو ملحوظ رکھتے تھے اس لئے وہ جب مال تقسیم کرتے تو حضرت عائشہؓ کو زیادہ دیتے اور حضرت حفصہؓ کو کم، اور ان (حضرت حفصہؓ) سے فرماتے کہ "بیٹی! تمہاری بہ نسبت عائشہؓ کو اس خصوصیت کی بناء پر زیادہ دیتا ہوں کہ) آنحضرت ﷺ کے نزدیک وہ (عائشہؓ) تم سے زیادہ چہیتی تھیں اور آنحضرت ﷺ کو تمہارے باپ کی (یعنی میری) بہ نسبت عائشہؓ کے باپ (یعنی حضرت ابوبکرؓ) سے زیادہ تعلق خاطر تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ (اپنے بیٹے) حضرت ابن عمرؓ کی بہ نسبت حضرت اسامہ ابن زیدؓ کا حصہ زیادہ لگایا کرتے تھے اور ان (ابن عمرؓ) سے بھی یہی فرماتے تھے کہ اسامہؓ کو تمہارے اوپر یہ فضیلت حاصل ہے کہ) آنحضرت ﷺ کو تمہاری بہ نسبت اسامہؓ سے زیادہ تعلق خاطر تھا اور تمہارے باپ سے زیادہ ان کا باپ آپ ﷺ کی نظر میں پسندیدہ تھا۔

"حمیر" یمن کے ایک علاقہ کا نام ہے جہاں یمن کے مشہور قبیلہ حمیر کے لوگ آباد تھے۔ اسی طرح "سرو" ایک جگہ کا نام تھا، جو "حمیر" کے علاقہ میں تھا۔

روایت کے آخر میں حضرت عمرؓ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے زندہ رکھا اور میری خلافت کے زمانے میں اسلام کو زیادہ سے زیادہ شہروں اور ملکوں پر تسلط و غلبہ حاصل ہوا اور اس کے نتیجہ میں مال فیئ بھی بہت ہاتھ لگا تو ان میں سے تمام مسلمانوں کو ان کا حصہ پہنچے گا خواہ وہ کتنے ہی دور دراز کے شہروں اور دیہاتوں میں کیوں نہ رہتے ہوں اور اس کے باوجود کہ اس مال کو حاصل کرنے میں انہیں ذرا سی بھی محنت مشقت برداشت نہیں کرنا پڑی ہوگی۔

قضیہ فدک میں حضرت عمرؓ کا استدلال

⑧ وَعَنْهُ قَالَ كَانَ فِيمَا احْتَجَّ بِهِ عُمَرُ اَنْ قَالَ كَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثُ صَفَايَا بَنُو النَّضِيْرِ وَخَيْبَرُ وَفَدَكُ فَاَمَّا بَنُو النَّضِيْرِ فَكَانَتْ حُبُسًا لِنَوَائِبِهٖ وَاَمَّا فَدَكُ فَكَانَتْ حُبُسًا لِاَبْنَاءِ السَّبِيْلِ وَاَمَّا خَيْبَرُ فَجَزَّاَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةَ اَجْزَاءٍ جُزْئَيْنِ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَجُزْءً نَفَقَةً لِاَهْلِهٖ فَمَا فَضَلَ عَنْ نَفَقَةِ اَهْلِهٖ جَعَلَهٗ بَيْنَ فُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مالکؓ ابن اوس کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے جس بات سے استدلال کیا وہ یہ تھی کہ انہوں نے فرمایا کہ "رسول کریم ﷺ کے پاس تین صفایا تھیں۔ ① بنو نضیر۔ ② خیبر۔ ③ فدک۔ چنانچہ بنو نضیر (کے جلاوطن ہو جانے کے بعد ان کی جو زمین جائیداد قبضے میں آئی تھی اسے حاصل ہونے والا مال) آنحضرت ﷺ کے اخراجات (جیسے مہمانوں کی ضیافت و تواضع اور مجاہدین کے لئے ہتھیاروں اور گھوڑوں کی خریداری وغیرہ) کے لئے مخصوص تھا، فدک کے محاصل (ان) مسافروں (کی امداد و اعانت کرنے کے لئے) مخصوص تھے (جو اگرچہ اپنے وطن میں تو مال رکھتے ہوں مگر سفر کے دوران ان کے پاس مال و اسباب ختم ہو گیا ہو)۔ اور خیبر (کے محاصل) کے رسول کریم ﷺ نے تین حصے کر رکھے تھے، ان میں سے دو حصے تو آپ مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ایک حصہ اپنے اہل و عیال کے اخراجات کے لئے رکھتے تھے اور اس میں سے بھی اہل اعیال کے خرچ سے جو کچھ بچ جاتا اس کو آپ ﷺ نادار مہاجرین پر خرچ کر دیتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "جس بات سے استدلال کیا الخ یعنی جب حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ فدک کے مال کے بارے میں اپنا مطالبہ لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو حضرت عمرؓ نے ان کے مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا، اور جن جائیدادوزمینوں پر آنحضرت ﷺ کا ذاتی حق تھا (جیسے بنو نضیر، خیبر اور فدک کی زمین، جائیدادیں) ان کے بارے میں مذکورہ بالا تفصیل بیان کی اور چونکہ اس تفصیل کے بیان کے وقت دوسرے صحابہؓ بھی موجود تھے جن میں سے کسی نے بھی حضرت عمرؓ کی بیان کردہ تفصیل کی تردید نہیں کی اس لئے گویا یہ بات ان کے فیصلے کی دلیل قرار پائی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اتنا ضرور کیا کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کو فدک کے محاصل کا متولی بنادیا کہ وہ دونوں اس محاصل کو اسی طرح صرف کریں جس طرح آنحضرت ﷺ صرف کیا کرتے تھے۔

"صفایا" صفیہ کی جمع ہے اور "صفیہ" اس کو کہتے ہیں کہ امام وقت (اسلامی مملکت کا سربراہ) مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے اس میں سے کوئی چیز چھانٹ کر اپنے لئے مخصوص کرے۔ یہ بات صرف آنحضرت ﷺ کے لئے مخصوص تھی کہ آپ ﷺ مال غنیمت میں سے خمس کے علاوہ اور بھی جو چیز جیسے لونڈی، غلام، تلوار اور گھوڑا وغیرہ چاہتے اس کو لے لینے کا حق رکھتے تھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے بعد کسی دوسرے امام وقت کے لئے یہ بات جائز نہیں۔

"فدک" ایک بستی کا نام تھا جو خیبر کے مواضعات میں سے تھی اور مدینہ سے دو روز کے فاصلہ پر واقع تھی یہ ایک شاداب اور سرسبز جگہ تھی جہاں زیادہ تر کھجور کے اور تھوڑے، بہت دوسرے پھلوں کے باغات تھے۔ رسول کریم ﷺ کو فدک پر صلح کے ذریعہ تسلط حاصل ہوا تھا اور صلح کی بنیاد یہ معاہدہ تھا کہ وہاں کی آدھی زمین تو فدک والوں کی رہے گی آدھی زمین پر آنحضرت ﷺ کا حق ہوگا، چنانچہ فدک کی وہ آدھی زمین آنحضرت ﷺ کی ذاتی ملکیت میں رہی جس کی آمدنی اور پیداوار سے آپ ﷺ حدیث کے مطابق محتاج مسافرین کی امداد واعانت فرماتے تھے۔

خیبر کے محاصل کو آپ ﷺ تین حصوں میں اس لئے تقسیم کرتے تھے کہ خیبر کا علاقہ اصل میں بہت سارے مواضعات اور بستیوں پر مشتمل تھا ان میں سے بعض گاؤں تو بزور طاقت فتح کئے گئے تھے اور بعض گاؤں بغیر جنگ وجدال کے صلح کے ذریعہ قبضہ و اختیار میں آئے تھے، چنانچہ جو گاؤں بزور طاقت فتح کئے گئے تھے ان سے حاصل ہونے والا مال چونکہ "مال غنیمت" تھا اس لئے اس میں سے آپ ﷺ خمس لیتے تھے اور جو گاؤں بذریعہ صلح قبضہ واختیار میں آئے تھے ان سے حاصل ہونے والا مال چونکہ "مال فئی" تھا اس لئے وہ تمام تر آپ ﷺ کی ذاتی ملکیت تھا جس کو آپ ﷺ اپنی ضروریات، اپنے اہل وعیال کے اخراجات اور عام مسلمانوں کے اجتماعی مفاد ومصالح میں جہاں مناسب سمجھتے صرف کرتے تھے۔ لہٰذا اس بنا پر تقسیم ومساوات کا تقاضہ یہی تھا کہ آپ ﷺ خیبر کے سارے مال کو اپنے اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کے لئے تین حصوں میں کرکے دو حصے مسلمانوں کو دیں اور ایک حصہ اپنے پاس رکھیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قضیہ فدک وغیرہ کی تفصیل

⑨ عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ اِنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ جَمَعَ بَنِىْ مَرْوَانَ حِيْنَ اسْتُخْلِفَ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهُ فَدَكُ فَكَانَ يُنْفِقُ مِنْهَا وَيَعُوْدُ مِنْهَا عَلٰى صَغِيْرِ بَنِىْ هَاشِمٍ وَيُزَوِّجُ مِنْهَا اَيِّمَهُمْ وَاَنَّ فَاطِمَةَ سَاَلَتْهُ اَنْ يَجْعَلَهَا لَهَا فَاَبٰى فَكَانَتْ كَذٰلِكَ فِىْ حَيَاتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى مَضٰى لِسَبِيْلِهِ فَلَمَّا اَنْ وُلِّىَ اَبُوْبَكْرٍ عَمِلَ فِيْهَا بِمَا عَمِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اَنْ وُلِّىَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَمِلَ فِيْهَا بِمِثْلِ مَا عَمِلَ حَتّٰى مَضٰى لِسَبِيْلِهِ ثُمَّ اقْتَطَعَهَا مَرْوَانُ ثُمَّ صَارَتْ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِ فَرَاَيْتُ اَمْرًا مَنَعَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ وَاِنِّىْ اُشْهِدُكُمْ اَنِّىْ رَدَدْتُهَا عَلٰى مَا كَانَتْ يَعْنِىْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ وَاَبِی بَکْرٍ وَعُمَرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر ابن عبدالعزیز ابن مروان ابن حکم رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے مروان کے بیٹوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ "رسول کریم ﷺ فدک (کی زمین وجائیداد) پر اپنا ذاتی حق رکھتے تھے جس کے محاصل (آمدنی۔ وپیداوار) کو آپ ﷺ (اپنے اہل وعیال اور فقراء ومساکین پر) خرچ کرتے تھے، اسی میں سے بنوہاشم کے چھوٹے بچوں (کی امداد واعانت پر خرچ کر کے ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے اور بے شوہر عورتوں اور بغیر زن مردوں کی شادی کرتے تھے! (ایک مرتبہ) حضرت فاطمہ نے آنحضرت ﷺ سے یہ درخواست کی تھی کہ فدک (کی زمین وجائیداد دیجئے لیکن آپ ﷺ نے ان کی درخواست کو رد کر دیا، رسول کریم ﷺ کی زندگی میں اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ بنایا گیا تو ان کا معمول بھی وہی رہا جو رسول کریم ﷺ کا اپنی حیات مبارکہ میں رہا تھا یعنی آنحضرت کے مذکورہ معمول کی طرح حضرت ابوبکرؓ بھی فدک کے محاصل کو آنحضرت ﷺ کے اہل وعیال اور بنوہاشم کے بچوں پر اور نادار مرد وعورتوں کی شادی میں خرچ کرتے تھے) یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ اللہ کو پیارے ہو گئے اور (ان کے بعد) جب حضرت عمر ابن خطابؓ کو خلیفہ بنایا گیا تو اس سلسلہ میں ان کا بھی عمل وہی رہا جو ان دونوں (یعنی آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ) کا رہا تھا یہاں تک کہ حضرت عمرؓ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور پھر مروان نے (حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں یا اپنی حکمرانی کے دور میں) اس (فدک) کو اپنی (اور اپنے وارثین کی) جاگیر قرار دیا چنانچہ (اب) وہ جاگیر عمر ابن عبدالعزیز ابن مروان کی ہو گئی ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ جس چیز کو رسول کریم ﷺ نے (اپنی بیٹی) فاطمہؓ کو نہیں دیا اس کا مستحق میں بھی نہیں ہو سکتا، لہٰذا میں تمہیں (اپنے اس فیصلہ کا) گواہ بناتا ہوں کہ میں نے فدک کو اس کی اسی حیثیت پر واپس کر دیا ہے۔ جس پر وہ تھا یعنی رسول کریم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں (جس طریقہ پر اس کے محاصل کو خرچ کیا جاتا تھا اب پھر اسی طریقہ پر خرچ کیا جائے گا اور فدک کسی شخص کی ذاتی جاگیر نہیں بنے گا۔" (ابوداؤد)

تشریح: جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے بنونضیر، فدک اور خیبر کی زمین جائیدادیں آنحضرت ﷺ کی ذاتی ملکیت تھیں چونکہ وہ زمین ، جائیدادیں آنحضرت ﷺ کے بعد بھی باقی رہی تھیں اس لئے آپ کے اہل بیت اور خاندان کے کچھ افراد نے ان پر اپنی میراث کا دعوی کیا اور خلفت سے اس کا مطالبہ کیا، پھر ان میں آپس میں بھی کچھ اختلافات پیدا ہوئے اس طرح ان زمین جائیدادوں کا قصہ بڑا عجیب وغریب ہو گیا اگرچہ وہ ایک وقتی قضیہ تھا جس کی بنیاد کسی غلط جذبہ پر نہیں تھی لیکن پھر بھی بعد کے زمانوں میں کم فہم اور کج رو لوگوں نے اس سے غلط نتائج اخذ کرنے شروع کر دیئے اور ایسے ایسے افسانے تراشے جن سے دوسرے لوگوں کے ذہن بھی فاسد ہوئے اس سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتب صحاح سے منتخب کر کے اس قضیہ کی کچھ تفصیل اور اس کے بارے میں کچھ باتیں نقل کر دی جائیں۔

صحیح بخاری میں حضرت مالکؓ ابن عوس ابن حدثان سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک دن امیرالمؤمنین حضرت عمر ابن خطابؓ نے مجھ کو اپنے پاس بلا بھیجا، میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ان کا غلام یرفاء آیا اور کہا کہ "امیرالمؤمنین" حضرت عثمان ابن عفانؓ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ حضرت زبیر بن عوامؓ اور حضرت سعد ابن ابووقاصؓ دروازہ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور حاضری کی اجازت چاہتے ہیں" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "آجانے دو!" وہ سب حضرات آ گئے، تھوڑی دیر بعد یرفاء پھر آیا اور کہا کہ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ (حاضری کی) اجازت چاہتے ہیں، اگر حکم ہو تو آنے دیا جائے" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "آنے دو!" جب وہ بھی آ گئے تو حضرت عباسؓ نے کہا کہ "امیرالمؤمنین! ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کیجئے (یعنی میرے اور علیؓ کے قضیہ کو نمٹائیے) یہ بنونضیر کے اس مال وجائیداد کے بارے میں جھگڑے کی صورت اختیار کرتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے حق میں فئی قرار دیا تھا۔" پھر حضرت عباسؓ اور علیؓ آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے، وہاں موجود دوسرے لوگوں (یعنی حضرت عثمانؓ وغیرہ) نے بھی کہا کہ "ہاں امیرالمؤمنین! ان دونوں کے معاملہ کا تصفیہ کر دیجئے اور ان کو ایک دوسرے (کے جھگڑے) سے نجات دلائیے" (یہ سن کر) حضرت عمرؓ

نے فرمایا کہ "ذرا صبر و سکون سے کام لو، میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے آسمان و زمین قائم ہیں، کیا تم جانتے ہو کہ رسول کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ ہم یعنی انبیاء میراث نہیں چھوڑتے (یعنی ہمارا چھوڑا ہوا مال کسی کا ورثہ نہیں ہوتا) ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔" حاضرین نے کہا کہ ہاں! (ہم کو یاد ہے) بیشک آپ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔" پھر حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔" میں تم دونوں کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو نہیں معلوم کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا؟" حضرت علیؓ و حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ "ہاں! (ہم کو بھی یاد ہے) آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔" حضرتؓ نے فرمایا کہ "تو میں تم کو اس بات سے (بھی آگاہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مال فئی کے بارے میں اپنے رسول کو وہ خاص خصوصیت عطا کی تھی جو آپ ﷺ کے علاوہ اور کسی کو عطا نہیں کی پھر حضرت عمرؓ نے یہ آیت مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ آخر تک پڑھی اور فرمایا کہ۔ پس یہ سارا مال آنحضرت ﷺ کے لئے مخصوص تھا، لیکن خدا کی قسم! آپ ﷺ نے اس مال کو تمہارے پاس جمع نہیں کیا اور نہ اس کے ذریعہ تم پر کوئی ایثار کیا، (بلکہ) آپ ﷺ وہ مال تمہیں (ہی) دیا کرتے تھے اور تمہارے درمیان تقسیم کرتے تھے، پھر جو کچھ بچتا آپ ﷺ اس میں سے اپنے اہل و عیال کا خرچ چلاتے اس کے بعد بھی جو بچ جاتا اس کو آپ ﷺ نیک کاموں (جیسے فقراء و مساکین کی امداد و اعانت) اور عام مسلمانوں کے اجتماعی مفاد و مصالح (جیسے ہتھیاروں اور گھوڑوں وغیرہ کی خریداری) میں صرف کرتے۔ رسول کریم ﷺ کا اپنی زندگی کے آخر تک یہی معمول رہا، پھر آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر کہ "میں رسول خدا کا خلیفہ ہوں۔" اس مال کو اپنے قبضے میں لے لیا اور اس کے خرچ و تصرف کا وہی نظام باقی رکھا جو آنحضرت ﷺ نے جاری کیا۔"

(اس موقعہ پر) حضرت علی و حضرت عباسؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ "تم اس وقت حضرت ابوبکرؓ کا ذکر برائی کے ساتھ کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس بارے میں ابوبکرؓ صحیح راستے پر نہیں ہیں، حالانکہ تم جو کچھ کہتے تھے ویسا نہیں تھا اور خدا خوب جانتا ہے کہ ابوبکرؓ اپنے اس عمل میں صادق، نیکوکار، ہدایت یافتہ اور حق کے تابع تھے، پھر جب حضرت ابوبکرؓ اللہ کو پیارے ہو گئے (اور میں خلیفہ بنا) تو میں نے کہا کہ میں رسول خدا کا خلیفہ اور حضرت ابوبکرؓ کا ولی (جانشین) ہوں، اس لئے میں نے اس مال و جائیداد کو دو سال تک اپنے اختیار و قبضے میں رکھا اور اس کے خرچ و تصرف کا وہی نظم و طریقہ اختیار کیا جو آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا تھا اور خدا خوب جانتا ہے کہ میں اپنی اس بات اور اپنے اس عمل میں صادق، نیکوکار، ہدایت یافتہ اور حق کے تابع ہوں، ڈیڑھ دو سال کے بعد تم دونوں (علیؓ و عباسؓ) میرے پاس آئے اور تم دونوں نے ایک ہی بات کہی (کہ آنحضرت ﷺ کا مال ہم کو دے دو) میں نے (تمہارے مطالبہ کے جواب میں) تم سے کہا تھا کہ رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ "ہم (انبیاء) میراث نہیں چھوڑتے بلکہ ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ (ہوتا) ہے۔" لیکن جب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ مجھے اس مال و جائیداد کو تمہارے سپرد کر دینا چاہئے تو میں نے تم سے کہا کہ "اگر تم چاہتے ہو تو میں یہ مال و جائیداد اس شرط پر تمہارے سپرد کر سکتا ہوں کہ تم (اس بات کا عہد کرو کہ) اس مال کو خرچ کرنے کا وہی نظم و طریقہ باقی رکھو گے جو آنحضرت ﷺ نے جاری کیا تھا اور جس پر حضرت ابوبکرؓ نے اور خلیفہ ہونے کے بعد میں نے عمل کیا تھا اور اگر تم لوگوں کو یہ شرط منظور نہ ہو تو پھر آئندہ اس بارے میں مجھ سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" تم نے (اس شرط کو منظور کر لیا اور) کہا کہ "آپ اس مال و جائیداد کو اس شرط پر ہمارے حوالے کر دیجئے۔" چنانچہ میں نے تمہارے سپرد کر دیا۔ (تم لوگوں کو یہ ساری بات اچھی طرح یاد ہوگی) تو کیا تم لوگ اب مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ (اس سلسلے میں جو بات میرے اور تمہارے درمیان طے ہو چکی ہے) میں اس کے خلاف فیصلہ کروں؟ نہیں! اس خدا کی قسم جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں، میں قیامت تک بھی اس کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتا، ہاں اگر تم اس مال و جائیداد کے انتظام سے عاجز آ گئے ہو تو اس کو دوبارہ میرے حوالے کر دو میں تمہیں اس کے انتظامی جھمیلوں سے بے پروا کر دوں گا اور خود مشقت اٹھا کر (بھی) اس کا انتظام کروں گا۔"

اس روایت کے راوی حضرت امام زہریؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے بارے میں حضرت عروہ ابن زبیرؓ سے بیان کیا تو

انہوں نے کہا کہ مالک ابن اوس نے بالکل صحیح بیان کیا ہے، میں نے حضرت عائشہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد (کچھ) ازواج مطہرات نے حضرت عثمان کو حضرت ابوبکر صدیق کے پاس بھیج کر اس مال و جائیداد کی اپنی میراث کا مطالبہ کیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مال فئی کے طور پر عطا کیا تھا (جب مجھے یہ معلوم ہوا تو) میں نے ان کی مخالفت کی اور ان سے کہا کہ تمہیں خدا کا خوف محسوس نہیں ہوتا؟ کیا رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد تمہارے علم میں نہیں ہے کہ "ہم میراث نہیں چھوڑتے بلکہ ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ (ہوتا) ہے اور آل محمد اس میں سے کھائے گی۔" تب ازواج مطہرات آنحضرت ﷺ کی میراث کے مطالبہ سے باز آئیں اور میرے بیان کی ہوئی حدیث کی بناء پر انہوں نے رجوع کر لیا۔

حضرت عروہ کہتے تھے (حضرت عمر نے جب آنحضرت کا وہ صدقہ یعنی بنو نضیر کا وہ مال جو مدینہ میں تھا اور جس کے بارے میں مذکورہ بالا قضیہ تھا حضرت علی و حضرت عباس کی تولیت میں دے دیا تھا تو کچھ دنوں کے بعد) حضرت علی نے حضرت عباس پر غلبہ حاصل کر کے اس کو تنہا اپنے قبضۂ تولیت میں لے لیا تھا، ان کے بعد حضرت حسن ابن علی کے قبضے میں آیا، حضرت حسن کے بعد حضرت حسین کے قبضے میں آیا۔ ان کے بعد علی ابن حسین اور حسن ابن حسین کے قبضے میں رہا کہ یہ دونوں باری باری اس کو اپنے قبضے میں رکھتے تھے، ان کے بعد زید ابن حسن کے پاس آ گیا۔ اور ایمانداری و سچائی کے ساتھ یہ (مال و جائیداد) رسول کریم ﷺ کا صدقہ ہے کسی شخص کی میراث و ملکیت نہیں ہے۔"

یہ بخاری کی حدیث کا اختصار ہے جس کو انہوں نے کتاب المغازی میں بنو نضیر کے واقعہ کے تحت نقل کیا ہے۔ کتاب الخمس میں بھی بعض الفاظ کے فرق کے ساتھ اسی طرح کی حدیث بیان کی ہے۔

یہ روایت بھی بخاری کی ہے کہ حضرت عائشہ بیان فرماتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ اور عباس، حضرت ابوبکر کے پاس فدک کی زمین و جائیداد و خیبر کے حصے کی میراث کا مطالبہ لے کر آئے، حضرت ابوبکر نے ان سے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ہم کسی کو اپنے مال کا وارث نہیں چھوڑتے، ہم جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہے۔ اس مال میں سے آل محمد ﷺ کھائے گی۔" خدا کی قسم میرے نزدیک رسول خدا کی قرابت والوں کے حقوق کی حفاظت کرنا) اور ان کے ساتھ حسن سلوک و بھلائی کا معاملہ کرنا اپنے قرابت والوں کے ساتھ حسن سلوک سے زیادہ محبوب اور عزیز تر ہے۔

پیچھے جو طویل حدیث نقل کی گئی ہے اور جس میں حضرت عمر کی خدمت میں حضرت عباس اور حضرت علی کے اپنا قضیہ لے کر آنے کا ذکر ہے اس کو صاحب جامع الاصول نے بھی اپنی کتاب میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ (اس حدیث کے سلسلے میں) ابوداؤد نے یہ وضاحت کی ہے کہ حضرت عباس اور حضرت علی نے حضرت عمر فاروق سے جو مطالبہ کیا تھا اس کا مقصد صرف یہ درخواست کرنا تھا کہ آپ نے جس مال و جائیداد کو مشترکہ طور پر ہم دونوں کی تولیت میں دیا تھا اب اس کو آدھوں آدھ بانٹ کر ہم دونوں کی تولیت اور سپردگی میں الگ الگ حصہ دے دیجئے، نہ کہ وہ دونوں حضرات آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد "ہم (انبیاء) میراث نہیں چھوڑتے۔" سے غافل و لاعلم تھے اور واقعۃً ان کا مقصد اس مال و جائیداد کو اپنی میراث قرار دینا تھا۔ چنانچہ ان دونوں کی نیت بھی صادق تھی اور ان کا مطالبہ بھی ایک درست عمل (یعنی اس مال و جائیداد کے انتظام میں زیادہ بہتری پیدا کرنے کے تقاضے کے پیش نظر تھا تاہم اس کے باوجود حضرت عمر نے ان کے مطالبہ کو پورا نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہ واضح کر دیا کہ میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ کسی بھی صورت میں اس مال و جائیداد پر تقسیم کا نام آئے بلکہ اس کو جوں کا توں رکھنا ہی میرے نزدیک زیادہ ضروری ہے۔

بخاری نے کتاب الخمس میں حضرت عروہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ان (عروہ) سے حضرت عائشہ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ نے حضرت ابوبکر صدیق سے مطالبہ کیا کہ ان کو وہ میراث دی جائے جو رسول کریم ﷺ اس مال و جائیداد میں سے چھوڑ گئے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مال فئی کے طور پر عطا فرمایا تھا۔" حضرت ابوبکر

صدیقؓ نے ان کو جواب دیا کہ "(تمہارا یہ مطالبہ قابل تسلیم نہیں ہے کیونکہ) رسول کریم ﷺ گرامی کا یہ ارشاد ہے کہ:

لَانُوْرَثُ مَاتَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ۔

"یعنی ہم انبیاء میراث نہیں چھوڑتے ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہے۔"

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ مال میرے قبضہ واختیار میں ہے اور جب میں مرجاؤں گا تو اس شخص کے قبضہ واختیار میں ہوگا جو میرے بعد خلافت وامارت کی ذمہ داریاں سنبھالے گا۔ حضرت فاطمہؓ کو اس بات سے سخت ناگواری ہوئی یہاں تک کہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے ہجران (یعنی ترک سلام وکلام) کرلیا اور اپنی وفات تک اسی ترک سلام وکلام پر قائم رہیں۔ واضح رہے کہ حضرت فاطمہؓ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد صرف چھ مہینے تک بقید حیات رہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

حضرت فاطمہؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اس مال وجائداد میں سے اپنے مال وحصے کا مطالبہ کیا کرتی تھیں جو آنحضرت ﷺ نے خیبر وفدک کی زمین وباغات اور مدینہ میں اپنے صدقہ (یعنی بنو نضیر کے مال وجائیداد) کی صورت میں چھوڑا تھا، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی ایسی چیز کو ترک نہیں کروں گا جس پر آنحضرت ﷺ کا معمول رہا ہو، اس مال وجائیداد کے بارے میں میرا وہی عمل رہے گا جو آنحضرت ﷺ کا رہا ہے، مجھے خوف محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں کسی ایسی چیز پر عمل کرنے سے باز رہوں جو آنحضرت ﷺ کے حکم ومنشا کے مطابق ہے تو یقیناً میرا یہ فعل راہ حق سے اعراض وگریز کے مرادف ہوگا۔"

چنانچہ (حضرت ابوبکرؓ آخر تک اپنے اسی فیصلے پر قائم رہے اور پھر ان کی وفات کے بعد) حضرت عمر فاروقؓ نے یہ صورت اختیار کی کہ آنحضرت نے مدینہ میں جو صدقہ چھوڑا تھا (یعنی بنو نضیر کی زمین جائداد) اس کو تو حضرت عباسؓ اور علیؓ کے سپرد کردیا (کہ وہ دونوں حضرات مشترکہ طور پر اس کی تولیت کے فرائض انجام دیں) اور خیبر وفدک کی زمین، جائیداد کو اپنی تولیت میں رکھا اور فرمایا کہ "یہ رسول خدا ﷺ کا (چھوڑا ہوا) صدقہ ہے، جس سے آپ ﷺ کے حقوق متعلق تھے۔" نیز انہوں نے (کسی فرمان یا وصیت کے ذریعہ) ان زمین، جائیدادوں کا متولی ونگراں اسی شخص کو قرار دیا جو خلافت وامارت کی ذمہ داریاں سنبھالے۔ چنانچہ وہ اب تک اسی صورت حال کے مطابق ہیں۔

بہرحال، اس بارے میں اوپر جو احادیث نقل کی گئیں یا وہ احادیث جو اسی مفہوم ومضمون سے متعلق صحاح ستہ میں متعدد طرق واسانید سے منقول ہیں ان سب سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ارشاد گرامی لا نورث ماترکناہ صدقة کا صحیح تر ثابت اور معمول بہ ہونا، آنحضرت ﷺ نے مال وجائیداد کی قسم سے جو کچھ چھوڑا اس کا عام مسلمانوں کے درمیان مشترک ہونا اور ان کے اجتماعی مفاد ومصالح میں خرچ کیا جانا اور اس کا اس شخص کے قبضہ واختیار میں ہونا جو خلافت وامارت کا منصب سنبھالے ہوئے ہو تمام صحابہ حتی کہ حضرت عباسؓ کے نزدیک بھی ایک متفق علیہ مسئلہ تھا۔

لیکن یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس مال وجائیداد کو حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی تولیت میں دیا جانا ایک درست عمل اور بہتر طریقہ تھا تو حضرت عمرؓ نے شروع ہی میں یہ صورت اختیار کیوں نہ کرلی اور اگر وہ کوئی درست عمل اور بہتر طریقہ نہیں تھا تو پھر انہوں نے بعد میں اس مال وجائیداد کو ان لوگوں کی تولیت میں کیوں دیا؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شروع میں ان دونوں کا مطالبہ چونکہ یہ تھا کہ اس مال وجائیداد کو ان کی ملکیت میں دے دیا جائے اس لئے حضرت عمرؓ نے ان کے مطالبہ کو منظور نہیں کیا اور پھر بعد میں جو ان لوگوں کو دیا تو اس کی بنیاد یہ تھی کہ ان لوگوں کو اس مال وجائیداد کا مالک نہیں بنایا گیا بلکہ صرف متولی ومنتظم بنایا گیا تھا اور یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ اس کو انہی مصارف میں خرچ کیا جائے گا جن میں

آنحضرت ﷺ خرچ کرتے تھے۔ مگر بات یہیں صاف نہیں ہوجاتی بلکہ جیسا کہ خطابیؒ نے کہا ہے، مسئلہ میں ایک دوسری طرف سے الجھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس سوال کی صورت میں کہ جب حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ نے اس مال و جائیداد کو مذکورہ شرط پر قبضے میں لیا تھا اور ان لوگوں نے یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ یہ مال و جائیداد آنحضرت ﷺ کا ورثہ نہیں ہے اور جلیل القدر مہاجر صحابہؓ نے اس کی تصدیق بھی کی تھی تو پھر آخر ان لوگوں کے درمیان یہ اختلاف و خصومت کی شکل کیوں پیدا ہوئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس تولیت میں شرکت دونوں ہی پر شاق گزر رہی تھی لہٰذا انہوں نے یہ درخواست کی کہ اس مال و جائیداد کو تقسیم کرکے ہر ایک کو ایک ایک حصے کا منتظم و متولی بنادیا جائے تاکہ دونوں ایک دوسرے سے کوئی واسطہ رکھے بغیر اپنے اپنے حصے کی دیکھ بھال اور اس کے خرچ و تصرف کا انتظام آزادی و یکسوئی کے ساتھ کرتے رہیں، لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی درخواست کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ مبادا یہ تقسیم ملکیت کی صورت کے مشابہ ہوجائے کیونکہ تقسیم املاک میں ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ فی الوقت نہ سہی لیکن طویل زمانہ گذر جانے پر اس میں خود بخود ملکیت کا شائبہ ہونے لگتا ہے۔

حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ سے زیادہ الجھا ہوا مسئلہ حضرت فاطمہؓ کا ہے کیونکہ اگر ان کے مطالبہ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی اس حدیث اور آپ ﷺ کے اس عمل سے قطعا لاعلم تھیں تو یہ بات بعید از حقیقت ہوگی اور اگر یہ کہا جائے کہ بہر حال ممکن ہے کہ ان کو آنحضرت ﷺ سے یہ ارشاد سننے کا اتفاق نہ پڑا ہو تو پھر یہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کے سامنے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد بیان فرمایا اور دوسرے صحابہؓ نے بھی اس کی تصدیق کی تو پھر انہوں نے اس بات کو قبول کرنے سے کیوں انکار کیا اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اس قدر ناراضگی کی صورت کیوں اختیار کی یا اگر ناراضگی کی صورت اس حدیث کو سننے سے پہلے پیدا ہوچکی تھی تو سننے کے بعد انہوں نے اس کو ختم کیوں نہیں کیا جس نے اتنا طول کھینچا کہ وہ زندگی کے آخری لمحہ تک حضرت ابوبکرؓ سے ترک سلام و کلام پر قائم رہیں؟۔

کرمانیؒ نے بخاری کی شرح میں اس کا جواب یہ لکھا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی ناراضگی اصل میں ایک ایسی صورت تھی جو ان میں بتقاضائے بشریت پیدا ہوگئی تھی اور "ہجران" سے ہجران محرم یعنی ترک سلام و کلام اور انقطاع تعلق مراد نہیں ہے بلکہ ملنے جلنے سے طبیعت میں انقباض و کوفت کا پیدا ہوجانا مراد ہے۔

علاوہ ازیں بعض روایات میں منقول ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان مذکورہ صورت حال پیدا ہوگئی (کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے حضرت فاطمہؓ کا مطالبہ تسلیم نہ کئے جانے کی وجہ سے وہ ان سے ناراض ہوگئیں) تو (ایک دن) حضرت ابوبکرؓ حضرت فاطمہؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور آفتاب کی سخت گرمی اور دھوپ کی شدید تمازت کے باوجود ان کے دروازے پر کھڑے رہے اور ان سے عذر خواہی کرتے رہے اور یہ فرمایا کہ "خدا کی قسم! رسول خدا ﷺ کی قرابت (کے حقوق کی رعایت و حفاظت) مجھے اپنی قرابت سے زیادہ محبوب اور عزیز تر ہے لیکن میں کیا کروں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے اس حدیث کو سنا ہے اور دوسرے صحابہؓ اس پر گواہ ہیں۔" تب حضرت فاطمہؓ (کا دل صاف ہوگیا اور ان) کی ناراضگی ختم ہوگئی۔

تمت بالخیر

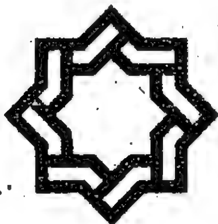

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الصید و الذبائح

شکار اور ذبیحوں کا بیان

شکار کا حکم: حدود حرم سے باہر ہر جگہ شکار کرنا حلال ہے بشرطیکہ شکار کرنے والا حالت احرام میں نہ ہو، چنانچہ شکار کا مباح ہونا کتاب وسنت (یعنی قرآن مجید اور احادیث نبوی) سے ثابت ہے اور اجماع اُمت بھی اسی پر ہے البتہ حضرت امام مالکؒ کے مسلک کی ایک کتاب "رسالہ ابن ابوزید" میں لکھا ہے کہ محض لہو ولعب کی خاطر شکار کرنا مکروہ ہے اور لہو ولعب کے قصدوارادے کے بغیر مباح ہے۔ جہاں تک آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے تو یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے بنفس خود کبھی شکار کیا ہو لیکن یہ ثابت ہے کہ اگر کبھی آپ ﷺ کے سامنے کسی نے شکار کیا تو آپ ﷺ نے اس کو منع نہیں فرمایا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کتے اور تیر کے ذریعہ کئے گئے شکار کا مسئلہ

① عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اَرْسَلْتَ كَلْبَكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ فَاِنْ اَمْسَكَ عَلَيْكَ فَاَدْرَكْتَهُ حَيًّا فَاذْبَحْهُ وَاِنْ اَدْرَكْتَهُ قَدْ قَتَلَ وَلَمْ يَاْكُلْ مِنْهُ فَكُلْهُ وَاِنْ اَكَلَ فَلَا تَكُلْ فَاِنَّمَا اَمْسَكَ عَلٰى نَفْسِهٖ فَاِنْ وَجَدْتَّ مَعَ كَلْبِكَ كَلْبًا غَيْرَهُ وَقَدْ قَتَلَ فَلَا تَاْكُلْ فَاِنَّكَ لَا تَدْرِي اَيُّهُمَا قَتَلَهُ وَاِذَا رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ فَاِنْ غَابَ عَنْكَ يَوْمًا فَلَمْ تَجِدْ فِيْهِ اِلَّا اَثَرَ سَهْمِكَ فَكُلْ اِنْ شِئْتَ وَاِنْ وَجَدْتَهُ غَرِيْقًا فِي الْمَاءِ فَلَا تَاْكُلْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عدی ابن حاتمؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "جب تم اپنے کتے کو چھوڑو تو اللہ کا نام ذکر کرو (یعنی جب تم شکار کے لئے اپنے سکھائے ہوئے کتے کو چھوڑنے کا ارادہ کرو تو اس کو بسم اللہ اکبر کہہ کر چھوڑو) اور پھر اگر اس کتے نے تمہارے لئے شکار کو پکڑ لیا ہو اور وہ شکار تم کو زندہ ملے تو اس کو ذبح کر لو، (اگر اس کو قصداً ذبح نہیں کرو گے تو اس کا کھانا حرام ہوگا کیونکہ اس صورت میں وہ مردار ہوگا) اور اگر تم اس شکار کو اس حالت میں پاؤ کہ کتے نے اس کو مار ڈالا ہے لیکن اس نے اس میں سے کچھ کھایا نہیں ہے تو اس (شکار) کو کھاؤ لیکن اگر کتے نے اس میں سے کچھ کھا لیا ہے تو پھر تم اس کو نہ کھاؤ کیونکہ اس صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتے نے اس شکار کو اپنے لئے پکڑا ہوگا (جو اس بات کی علامت ہوگی کہ کتا سکھایا ہوا نہیں ہے جب کہ اس کتے کا پکڑا ہوا شکار حلال ہے جو سکھایا ہوا ہو) اور اگر تم شکار کے پاس) اپنے کتے کے ساتھ کسی دوسرے کا کتا بھی پاؤ، درآنحالیکہ (ان دونوں میں سے کسی ایک کتے نے) اس شکار کو

مار ڈالا ہو تو اس صورت میں بھی اس شکار کو مت کھاؤ کیونکہ تمہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اس شکار کو ان دونوں کتوں میں سے کس نے مارا ہوگا تو ہو سکتا ہے کہ وہ سکھایا ہوا نہ ہو یا اس کو چھوڑنے والے نے چھوڑتے وقت بسم اللہ نہ کہی ہو اور یا اس کو کسی ایسے شخص نے چھوڑا ہو جس کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال نہیں ہوتا جیسے مجوسی یا بت پرست وغیرہ) اور جب تم (کسی شکار پر) اپنا تیر چلاؤ تو (اس وقت) اللہ کا نام ذکر کرو یعنی بسم اللہ کہہ کر تیر چلاؤ اور پھر اگر وہ شکار ایک دن تک تم سے اوجھل رہا (اور اس کے بعد تمہیں ملا) تو تم چاہو تو اس کو کھالو بشرطیکہ تم نے اس شکار میں اپنے تیر کے نشان کے علاوہ اور کوئی نشان نہ پایا ہو اور اگر وہ شکار تمہیں پانی میں ڈوبا ہوا ملے (اور اس میں تمہارے تیر کا نشان بھی موجود ہو) تو تم اس کو نہ کھاؤ (کیونکہ ممکن ہے وہ تمہارے تیر سے نہ مرا ہو بلکہ پانی میں ڈوب کر مرا ہو۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "اللہ کا نام ذکر کرو" کا مطلب یہ ہے کہ کتے کا چھوڑنا بمنزلہ چھری چلانے کے ہے اس لئے جس طرح چھری کے ذریعہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جاتا ہے اس طرح شکار پر سکھایا ہوا کتا چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیا جانا یعنی بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ضروری ہے۔ اگر کسی نے بھول کر بسم اللہ اللہ اکبر نہیں کہا تو اس صورت میں اس شکار کو کھانا حلال ہوگا اور اگر یہ صورت ہے کہ کتا چھوڑتے وقت قصداً بسم اللہ اللہ اکبر نہیں کہا پھر اس نے کتے کو ڈانٹا کتا جہاں تھا وہیں رک گیا، اب (کتے کے رکنے کے بعد اس نے بسم اللہ اللہ اکبر کہا اور اس کے بعد کتے نے شکار کو پکڑ کر مار ڈالا تو وہ شکار حلال نہیں رہے گا۔

یہ ضروری ہے کہ کتے کو چھوڑنے والا مسلمان یا اہل کتاب (جیسے عیسائی یا یہودی) ہو اگر کتا کسی کے چھوڑے بغیر خود بخود جائے اور شکار کو زخمی کر دے تو وہ حلال نہیں رہے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کتے کو چھوڑتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر نہیں کہا مگر اس نے شکار کو زندہ پایا اور اس کو ذبح کر لیا تو وہ شکار کے حکم میں نہیں ہوگا۔

جس طرح سکھائے ہوئے ذی ناب جانوروں جیسے کتے اور چیتے وغیرہ کا پکڑا ہوا شکار حلال ہے اسی طرح سکھائے ہوئے ذی مخلب جانوروں جیسے باز اور شاہین وغیرہ کا پکڑا ہوا شکار بھی حلال ہے۔

ذی مخلب جانور کے سکھائے ہوئے ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ تین دفعہ شکار کو پکڑ کر چھوڑ دے خود نہ کھائے اور ذی مخلب جانور کے سکھائے ہوئے ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کو چھوڑنے کے بعد بلایا جائے تو فوراً واپس آجائے، لہٰذا اگر ذی مخلب جانور یعنی باز وغیرہ نے شکار میں سے کچھ خود کھالیا تو بھی وہ شکار حلال رہے گا اور اس کو کھانا درست ہوگا جب کہ اگر ذی ناب جانور یعنی کتا وغیرہ شکار میں سے کچھ خود کھالے تو وہ شکار حلال نہیں رہے گا۔ اسی طرح اگر کسی سکھائے ہوئے کتے وغیرہ نے تین بار شکار کو پکڑ کر چھوڑ دینے کے بعد ایک بار بھی شکار میں سے کچھ کھالیا تو وہ بے سیکھے ہوئے کتے کے حکم میں ہے یہاں تک کہ وہ دوبارہ سیکھا ہوا ہو جائے۔

اور پھر وہ شکار ایک دن تک تم سے اوجھل رہا الخ، حنفی علماء کے نزدیک تیر کے ذریعہ مارے گئے شکار کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ تیر پھینکتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہا گیا ہو اس تیر نے شکار کو زخمی کر دیا ہو اور یہ کہ اگر وہ شکار اس تیر کے ذریعہ زخمی ہو کر شکاری کی نظر سے غائب ہو گیا تو اس کو تلاش کرنے سے بیٹھ نہ رہا جائے کیونکہ ابن ابی شیبہؒ نے اپنی کتاب مصنف میں اور طبرانیؒ نے اپنی معجم میں ابورزینؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس شکار کے سلسلے میں کہ جو شکاری کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا، رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا لعل ھوام الارض قتلہ نیز عبدالرحمٰن نے بھی اسی طرح کی روایت حضرت عائشہؓ سے بطریق مرفوع نقل کی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شکار پر کوئی کتا یا چیتا یا باز وغیرہ چھوڑا گیا اور اس نے شکار کو مار ڈالا تو وہ (شکار) حلال ہوگا بشرطیکہ وہ کتا وغیرہ معلم یعنی سیکھا ہوا ہو۔ غیر معلم کتے وغیرہ کا مارا ہوا شکار حلال نہیں ہوگا۔

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نُرْسِلُ الْكِلَابَ الْمُعَلَّمَةَ قَالَ كُلْ مَا اَمْسَكْنَ عَلَيْكَ قُلْتُ وَاِنْ قَتَلْنَ قَالَ وَاِنْ قَتَلْنَ قُلْتُ اِنَّا نَرْمِي بِالْمِعْرَاضِ قَالَ كُلْ مَا خَزَقَ وَمَا اَصَابَ بِعَرْضِهِ فَقَتَلَ فَاِنَّهٗ وَقِيْذٌ فَلَا تَاْكُلْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ہم تربیت یافتہ (یعنی سکھائے ہوئے) کتوں کو (شکار کے پیچھے) چھوڑتے ہیں!؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تمہارے کتے تمہارے لئے جو شکار پکڑ کر رکھیں اس کو کھالو۔" میں نے عرض کیا "اگرچہ وہ کتے شکار کو مار ڈالیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں اگرچہ مار ڈالیں!" پھر میں نے عرض کیا کہ "ہم شکار پر بغیر پر کا تیر چلاتے ہیں (اور اس کے ذریعہ شکار کر لیتے ہیں تو کیا وہ شکار کھانا درست ہے؟)" آپ ﷺ نے فرمایا جس شکار کو وہ تیر زخمی کر دے (یعنی اگر وہ تیر سیدھا جاکر نوک کی جانب سے شکار کو لگے اور وہ مر جائے) تو اس کو کھالو اور اگر وہ تیر (نوک کی جانب سے نہیں بلکہ) عرض یعنی چوڑائی کی جانب سے جاکر اس شکار کو (اس طرح) لگے (کہ وہ شکار کو زخمی نہ کرے) اور وہ مر جائے تو وہ وقیذ ہے اس کو نہ کھاؤ۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: معراض "اس تیر کو کہتے ہیں جو بے پر کا ہو۔ ایسا تیر سیدھا جاکر نوک کی طرف سے نہیں بلکہ چوڑائی کی طرف سے جاکر لگتا ہے۔

"وہ وقیذ ہے۔" اصل میں وقیذ اور موقوذ اس جانور کو کہتے ہیں جو غیر دھار دار چیز سے مارا جائے خواہ وہ لکڑی ہو یا پتھر یا اور کوئی چیز۔ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معراض یعنی بغیر پر کے تیر کے ذریعہ شکار کرنے کی صورت میں اگر وہ (معراض) اس شکار کو اپنی دھار کے ذریعہ مار ڈالے تو وہ حلال ہوگا اور اگر معراض نے اس کو اپنی چوڑائی کے ذریعہ مارا ہے تو وہ حلال نہیں ہوگا، نیز علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس حدیث معراض سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ شکار حلال نہیں ہے جس کو بندقہ یعنی گولی اور غلہ کے ذریعہ مار ڈالا گیا ہو۔

اور وہ شکار جو معراض کے چوڑان کی طرف سے (چوٹ کھا کر) مرا ہو اس لئے حلال نہیں ہوتا کہ مذکورہ صورت میں شکار کا زخمی ہونا ضروری ہے تاکہ ذبح کے معنی متحقق ہو جائیں جب کہ معراض کا چوڑان شکار کو زخمی نہیں کرتا اسی لئے وہ شکار بھی حلال نہیں ہوتا، جو موٹی دھار کے بندقہ کے ذریعہ مار ڈالا گیا ہو۔ کیونکہ بندقہ ہڈی کو توڑ دیتا ہے زخمی نہیں کرتا اس لئے وہ معراض کے حکم میں ہوتا ہے ہاں اگر بندقہ میں ہلکی دھار ہو اور شکار اس کے ذریعہ مر گیا ہو تو وہ حرام نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں اس کی موت زخم کے ساتھ محقق ہوئی ہے۔

اگر کسی شخص نے شکار پر چھری یا تلوار پھینک کر ماری اور وہ شکار مر گیا تو وہ حلال ہوگا بشرطیکہ وہ چھری یا تلوار دھار کی طرف سے جاکر لگی ہو ورنہ حلال نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر شکار کے کوئی ایسا ہلکا پتھر پھینک کر مارا گیا ہو جس میں دھار ہو اور شکار کو زخمی کر دے تو اس شکار کو بھی کھایا جاسکتا ہے کیونکہ اس صورت میں اس شکار کی موت زخم کے ذریعہ متیقن ہوگی جب کہ اگر شکار کو بھاری پتھر پھینک کر مارا گیا ہو تو اس کو کھانا جائز نہیں ہوگا اگرچہ وہ زخمی بھی کر دے، کیونکہ اس صورت میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ شکار اس پتھر کی چوٹ کے ذریعہ (جیسے ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کی وجہ سے) مرا ہو۔

حاصل یہ ہے کہ اگر شکار کی موت اس کے زخمی ہو جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہو اور اس کا یقین بھی ہو تو اس کو کھایا جاسکتا ہے اور اگر اس کی موت چوٹ کے اثر سے واقع ہوئی اور اس کا یقین ہو تو اس شکار کو قطعاً نہ کھایا جائے اور اگر شک کی صورت ہو (کہ اس کا مرنا زخمی ہونے کی وجہ سے بھی محتمل ہو اور چوٹ کے اثر سے بھی محتمل ہو) تو بھی احتیاطاً اس کو نہ کھایا جائے۔

(۳) وَعَنْ اَبِی ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِیِّ قَالَ قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ اِنَّ بِاَرْضِ قَوْمٍ اَھْلِ الْکِتَابِ اَفَنَاْکُلُ فِی اٰنِیَتِھِمْ وَبِاَرْضِ صَیْدٍ اَصِیْدُ بِقَوْسِیْ وَبِکَلْبِیَ الَّذِی لَیْسَ بِمُعَلَّمٍ وَبِکَلْبِی الْمُعَلَّمِ فَمَا یَصْلُحُ لِی قَالَ اَمَّا مَا ذَکَرْتَ مِنْ اٰنِیَةِ اَھْلِ الْکِتَابِ فَاِنْ وَجَدْتُمْ غَیْرَھَا فَلَا تَاْکُلُوْا فِیْھَا وَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاغْسِلُوْھَا وَکُلُوْا فِیْھَا وَمَا صِدْتَ بِقَوْسِكَ فَذَکَرْتَ اسْمَ اللّٰہِ فَکُلْ وَمَا صِدْتَ بِکَلْبِكَ الْمُعَلَّمِ فَذَکَرْتَ اسْمَ اللّٰہِ فَکُلْ وَمَا صِدْتَ بِکَلْبِكَ غَیْرَ مُعَلَّمٍ فَاَدْرَکْتَ ذَکَاتَہٗ فَکُلْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "اے اللہ کے نبی! ہم ایک ایسی قوم کے درمیان سکونت پذیر ہیں جو اہل کتاب ہے، تو کیا ہم ان کے برتنوں میں کھا پی سکتے ہیں، اور ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں شکار بہت ہیں میں اپنی کمان (یعنی تیر) اور تربیت یافتہ کتے کے ذریعہ بھی شکار مارتا ہوں اور غیر تربیت یافتہ کتے کے ذریعہ بھی شکار مار لیا کرتا ہوں تو میرے لئے کون سی چیز درست ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے جو تم نے اہل کتاب کے برتنوں کے بارے میں پوچھی ہے تو (ان کے متعلق یہ حکم ہے کہ) اگر ان

برتنوں کے علاوہ اور برتن مل سکیں تو پھر ان کے برتنوں میں مت کھاؤ پیو اور اگر دوسرے برتن نہ مل سکیں تو (پہلے) ان کو دھومانج لو اور پھر ان میں کھاپی لو۔ رہی شکار کی بات تو جس جانور کو تم نے اپنے تیر سے شکار کیا ہے اور (تیر چھوڑتے وقت) اللہ کا نام لیا ہے اس کو کھالو اسی طرح جس جانور کو تم نے تربیت یافتہ کتے کے ذریعہ شکار کیا ہے اور (اس کتے کو چھوڑتے وقت) اللہ کا نام لیا ہے تو اس کو بھی کھالو اور نیز جو شکار تم نے غیر تربیت یافتہ کتے کے ذریعہ پکڑا اور اس کو ذبح کرنے کے قابل (یعنی زندہ) پایا (اور پھر اس کو ذبح کرلیا ہے) تو اس کو بھی کھاسکتے ہو۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: "ان کے برتنوں میں مت کھاؤ" یہ حکم احتیاط کے پیش نظر ہے اور اس کے کئی سبب ہیں ایک تو یہ کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے دع مایریبک الی مالایریبک دوسرے اس بات سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ حتی الامکان ان کے مستعمل برتنوں میں کھانے پینے سے احتراز کیا جائے اگرچہ ان کو دھولیا گیا ہو۔ اور تیسرے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ راسخ کرنا بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ان کا یہ ملی تقاضہ بہر صورت رہنا چاہئے کہ وہ ان (اہل کتاب) کے ساتھ رہن سہن اور باہمی اختلاط رکھنے سے نفرت کریں۔ تاہم یہ حکم کہ "ان کے برتنوں میں مت کھاؤ" دراصل تقویٰ کی راہ ہے اور اس بارے میں جو کچھ فتویٰ ہے وہ خود حدیث نے آگے بیان کردیا ہے۔

"ان کو دھومانج لو" یہ حکم اس صورت میں تو بطریق وجوب ہوگا جب کہ ان برتنوں کے نجس وناپاک ہونے کا ظن غالب ہو اور اس صورت میں بطریق استحباب ہوگا جب کہ ان کی نجاست کا ظن غالب نہ ہو۔

ابن مالکؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے غیر مسلموں کے ان برتنوں کو دھونے کا حکم دیا ہے جن کی نجاست وناپاکی کا یقین ہو اور یہ یقین نہ ہو تو پھر ان برتنوں کو بغیر دھوئے استعمال کرنا بھی مکروہ تنزیہی ہوگا۔

برماویؒ نے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر ان (اہل کتاب) کے برتنوں کے علاوہ اور دوسرے برتن مل سکتے ہوں تو اس صورت میں ان کے برتنوں کو دھو کر بھی اپنے کھانے پینے کے استعمال میں نہیں لانا چاہئے۔ جب کہ فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ ان کے برتنوں کے دھولینے کے بعد استعمال کرنا بہر صورت جائز ہے۔ خواہ اور دوسرے برتن مل سکتے ہوں یا نہ مل سکتے ہوں۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ حدیث سے جو کراہت ثابت ہوتی ہے وہ ان برتنوں پر محمول ہے جن میں وہ لوگ سؤر کا گوشت پکاتے کھاتے ہوں یا جن میں شراب پینے کے لئے رکھتے ہوں، لہٰذا ایسے برتن چونکہ ایمانی نقطۂ نظر سے بے حد گھناؤنے ہوتے ہیں، اس لئے ان کو اپنے استعمال میں لانا مکروہ ہے خواہ ان کو کتنا ہی دھومانج کیوں نہ لیا جائے اور فقہاء نے جو مسئلہ بیان کیا ہے وہ ان برتنوں پر محمول ہے جو سور کے گوشت جیسی نجاستوں اور ناپاکیوں میں زیادہ مستعمل نہیں ہوتے۔

بدبودار گوشت کا حکم

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ فَغَابَ عَنْكَ فَاَدْرَكْتَهُ فَكُلْ مَالَمْ يُنْتِنْ۔

(رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر تم (اللہ کا نام لے کر کسی شکار پر) اپنا تیر چلاؤ اور پھر وہ (شکار تیر کھا کر) تمہاری نظروں سے اوجھل ہوجائے، (یعنی کسی ایسی جگہ گر کر مرجائے جو اس وقت تمہیں نہ مل سکے) اور پھر وہ تمہارے ہاتھ لگ جائے (اور تم اس میں اپنے تیر کا نشان دیکھ کر یہ یقین کرلو کہ یہ تمہارے اس تیر کے لگنے سے مرا ہے) تم اس کو کھاسکتے ہو جب تک کہ اس (کی بو) میں تغیر پیدا نہ ہوجائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حنفی علماء لکھتے ہیں کہ "جب تک کہ اس میں تغیر پیدا نہ ہوجائے" کا حکم بطریق استحباب ہے، ورنہ تو گوشت میں بو کا پیدا ہوجانا اس

گوشت کے حرام ہونے کو واجب نہیں کرتا۔ چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا گوشت کھایا ہے جس میں بو پیدا ہو چکی تھی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بدبودار گوشت کھانے کی ممانعت، محض نہی تنزیہہ پر محمول ہے نہ کہ نہی تحریم پر، بلکہ یہی حکم ہر اس کھانے کا ہے جو بدبودار ہو گیا ہو الایہ کہ اس کو کھانے کی وجہ سے کسی تکلیف و نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

⑤ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي الَّذِيْ يُدْرِكُ صَيْدَهٗ بَعْدَ ثَلَاثٍ فَكُلْهُ مَالَمْ يُنْتِنْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس شکاری کے حق میں کہ جو اپنے شکار کو تین دن کے بعد پائے فرمایا (اس کو کھالو تاوقتیکہ اس میں بو پیدا نہ ہو گئی ہو۔" (مسلم)

مشتبہ ذبیحہ کا حکم

⑥ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ هُنَا أَقْوَامًا حَدِيْثُ عَهْدِهِمْ بِشِرْكٍ يَأْتُوْنَنَا بِلُحْمَانٍ لَا نَدْرِيْ أَيَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا أَمْ لَا قَالَ اُذْكُرُوْا أَنْتُمْ اسْمَ اللّٰهِ وَكُلُوْا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) صحابہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ (ﷺ)! یہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے شرک کا زمانہ بہت قریب کا ہے (یعنی وہ نومسلم جنہوں نے اسلام کے احکام اور دینی مسائل پوری طرح ابھی نہیں سیکھے ہیں) وہ لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں اور ہمیں اس کا علم نہیں ہوتا کہ آیا انہوں نے اس کے ذبح کے وقت خدا کا نام لیا ہے یا نہیں (تو کیا ان کا لایا ہوا گوشت ہم کھاسکتے ہیں یا نہیں؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تم اللہ کا نام لے لیا کرو اور اس کو کھالیا کرو" (بخاریؒ)

تشریح: "تم اللہ کا نام لے لیا کرو الخ" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم بسم اللہ پڑھ کر اس گوشت کو کھالو تو اس وقت تمہارا بسم اللہ پڑھنا ذبح کرنے والے کے بسم اللہ پڑھنے کے قائم مقام ہو جائے گا بلکہ دراصل اس ارشاد کے ذریعہ آپ ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے، کہ کھانے کے وقت بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جو گوشت تمہارے پاس لایا گیا ہے اس کے بارے میں تم یہ نہیں جانتے کہ آیا وہ اس ذبیحہ کا ہے جو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا گیا ہے یا بسم اللہ پڑھے بغیر ذبح کر دیا گیا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس گوشت کو کھانا جائز ہے بشرطیکہ اس کو ذبح کرنے والا ان میں سے ہو جن کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا شرعاً جائز ہے اور یہ جواز اس حسن ظن کی بنیاد ہے جو ایک مسلمان کی حالت و کیفیت کو صلاح و نیکی ہی پر محمول کرنے کا متقاضی ہوتا ہے لہٰذا اگر اس طرح کا کوئی شخص تمہیں گوشت دے جائے تو تم یہی حسن ظن رکھو کہ وہ چونکہ بہرحال مسلمان ہے اس لئے اس نے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام ضرور لیا ہوگا۔

غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام ہے

⑦ وَعَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ قَالَ سُئِلَ عَلِيٌّ هَلْ خَصَّكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَيْءٍ فَقَالَ مَاخَصَّنَا بِشَيْءٍ لَمْ يَعُمَّ بِهِ النَّاسَ إِلَّا مَا فِي قِرَابِ سَيْفِيْ هٰذَا فَأَخْرَجَ صَحِيْفَةً فِيْهَا لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ سَرَقَ مَنَارَ الْأَرْضِ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَنْ غَيَّرَ مَنَارَ الْأَرْضِ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَهٗ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ اٰوٰى مُحْدِثًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوطفیل کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ "کیا رسول کریم ﷺ نے آپ (اہل بیت) کو کسی چیز کے ذریعہ خصوصیت و امتیاز عطا کیا ہے یعنی کیا یہ صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آپ لوگوں کو جو اہل بیت رسول ﷺ ہیں کچھ ایسے احکام دیئے ہیں جو اور دوسرے لوگوں کو نہیں دیئے ہیں؟" حضرت علیؓ نے فرمایا "(نہیں!) آنحضرت ﷺ نے ہمارے لئے کوئی ایسی چیز مخصوص نہیں کی ہے جو اور دوسروں کے لئے عام نہ کی گئی ہو، علاوہ اس چیز کے جو میری تلوار کی نیام میں (چند احکام کے مجموعہ کی صورت میں) موجود ہے

(لیکن ان احکام کے بارے میں بھی، میں یہ نہیں جانتا کہ وہ احکام آیا محض ہم اہل بیت کے لئے خاص ہیں یا ان کا تعلق عمومی طور پر پوری امت سے ہے)'' پھر حضرت علیؓ نے (اپنی تلوار کی نیام میں سے) ایک کاغذ نکالا جن میں یہ احکام درج تھے کہ ''اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جو غیر اللہ کے نام پر کسی جانور کو ذبح کرے، اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جو زمین کا نشان چرائے۔'' اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو) جو زمین کے نشان میں تغیر و تبدل کرے۔ اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جو اپنے باپ پر لعنت کرے اور اس شخص پر لعنت ہو جو کسی بدعتی کو ٹھکانا دے۔'' (مسلم)

تشریح: ''زمین کے نشان'' سے مراد وہ علامتی پتھر وغیرہ ہے جو زمین کی حدود پر نصب ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ ایک دوسرے کی زمین کے درمیان فرق و امتیاز کیا جاتا ہے۔ اور اس نشان کو چرانے یا اس میں تغیر و تبدل کرنے کا مطلب یہ ہے، کہ وہ شخص بزور و زبردستی اپنے ہمسایہ کی زمین دبالینا چاہتا ہو۔

''جو اپنے باپ پر لعنت کرے'' یعنی یا تو اپنے باپ پر خود صریحاً لعنت کرے یا کسی دوسرے شخص کے باپ پر لعنت کرے اور وہ شخص انتقاماً اس کے باپ پر لعنت کرے، اس دوسری صورت میں اس نے اگرچہ اپنے باپ پر خود صریحاً لعنت نہیں کی ہے مگر اس لعنت کا سبب چونکہ وہی بنا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ گویا اس نے اپنے باپ پر لعنت کی ہے۔

''جو کسی بدعتی کو ٹھکانا دے'' بدعتی اس شخص کو کہتے ہیں جو دین میں کوئی ایسی بات پیدا کرے جس کی کچھ اصل موجود نہ ہو اور وہ بات شریعت کے خلاف اور سُنت میں تبدیلی پیدا کرنے والی ہو۔ ایسے شخص یعنی بدعتی کو ٹھکانا دینا اس کی عزت و تعظیم کرنا اور اس کی مدد و حمایت کرنا، شریعت کی نظر میں قابل مواخذہ ہے۔

جو چیز بھی خون بہادے اس سے ذبح کرنا جائز ہے

⑧ وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّا لَاقُوا الْعَدُوَّ غَدًا وَلَيْسَتْ مَعَنَا مُدًى اَفَنَذْبَحُ بِالْقَصَبِ قَالَ مَا اَنْهَرَ الدَّمَ وَذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ فَكُلْ لَيْسَ السِّنَّ وَالظُّفُرَ وَسَاُحَدِّثُكَ عَنْهُ اَمَّا السِّنُّ فَعَظْمٌ وَاَمَّا الظُّفُرُ فَمُدَى الْحَبْشِ وَ اَصَبْنَا نَهْبَ اِبِلٍ وَغَنَمٍ فَنَدَّ مِنْهَا بَعِيْرٌ فَرَمَاهُ رَجُلٌ بِسَهْمٍ فَحَبَسَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِهٰذِهِ الْاِبِلِ اَوَابِدَ كَاَوَابِدِ الْوَحْشِ فَاِذَا غَلَبَكُمْ مِنْهَا شَيْءٌ فَافْعَلُوْا بِهٖ هٰكَذَا۔ (متفق علیہ)

''اور حضرت رافعؓ بن خدیج کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ! کل دشمن (یعنی کفار) سے ہمارا مقابلہ ہونے والا ہے اور ہمارے پاس چھریاں نہیں ہیں (یعنی ہوسکتا ہے کہ جنگی ہنگاموں کی وجہ سے ہمارے پاس چھریاں موجود نہ رہیں اور ہمیں جانوروں کو ذبح کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس صورت میں) کیا ہم کھپچ (کھپچی) سے ذبح کرسکتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس چیز سے خون بہہ جائے اور اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو تو اس کو کھا سکتے ہو (یعنی اس جانور کو کھانا جائز ہے جو کسی بھی ایسی چیز سے ذبح کیا گیا ہو جس سے خون بہہ جائے خواہ وہ لوہا ہو یا کوئی اور چیز) مگر دانت اور ناخن کے ذریعہ (ذبح کرنا جائز نہیں ہے اور میں تمہیں ان دونوں کے بارے میں بتاتا ہوں (کہ ان کے ذریعہ ذبح کرنا کیوں جائز نہیں ہے) تو (سنو کہ) دانت تو ہڈی ہے اور جہاں تک ناخن کا تعلق ہے تو وہ حبشیوں کی چھری ہے۔ (حضرت رافعؓ کہتے ہیں کہ دشمن کے) کچھ اونٹ اور بکریاں لوٹ میں ہمارے ہاتھ آئیں، ان میں سے ایک اونٹ (بھڑک کر) بھاگ نکلا، لیکن (ہم میں سے) ایک شخص نے تیر مار کر اس کو روک دیا (یعنی وہ اونٹ تیر کھا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا) آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا ''ان اونٹوں میں بعض اونٹ بھی اس طرح انسانوں سے بھڑکنے والے ہوتے ہیں جس طرح جنگلی جانور، انسانوں سے بھڑکتے ہیں، لہٰذا اگر ان اونٹوں میں سے کوئی اونٹ تمہارے قبضے سے نکل بھاگے تو اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرو۔'' (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ''دانت تو ہڈی ہے'' یعنی دانت چونکہ ہڈی ہے اور ہڈی سے ذبح کرنا درست نہیں ہے اس لئے دانت کے ذریعہ ذبح کیا ہوا جانور

کھانا جائز نہیں ہوگا۔

شیخ ابن صلاح'' کہتے ہیں کہ اس موضوع پر بہت زیادہ تحقیق و تفتیش اور غور و فکر کے باوجود میں یہ جاننے میں ناکام رہا ہوں کہ ہڈی کے ذریعہ ذبح کرنے کی ممانعت کا کیا مطلب ہے اور اس کی کیا وجہ ہے! شیخ عبدالسلام'' سے بھی اس طرح کی بات منقول ہے، جہاں تک حدیث کا تعلق ہے اس میں بھی صرف یہی فرمایا گیا ہے کہ دانت سے ذبح کرنا اس لئے درست نہیں ہے کہ وہ ہڈی ہے اس کے علاوہ اور کسی ظاہری علت و سبب کی طرف اشارہ نہیں ہے لیکن حضرت امام نووی'' نے ہڈی سے ذبح کرنے کی ممانعت کی یہ علت بیان کی ہے کہ اگر ہڈی سے ذبح کیا جائے گا تو وہ ہڈی، ذبیحہ کے خون سے نجس ہو جائے گی اور ہڈی کو نجس و ناپاک کرنے کی ممانعت منقول ہے کیونکہ اس (ہڈی) کو جنات کی خوراک بتایا گیا ہے۔

''وہ حبشیوں کی چھری ہیں'' یہ گویا ناخن سے ذبح کرنے کی ممانعت کی علت ہے، یعنی اگر ناخن کے ذریعہ ذبح کیا جائے گا تو اس میں حبشیوں کی مشابہت اختیار کرنا لازم آئے گا کیونکہ ناخن کے ذریعہ جانوروں کو چیر پھاڑ کر کھانا حبشیوں کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ حبشی غیر مسلم ہیں، جب کہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے طور طریقوں کو اختیار نہ کریں بلکہ ان کے خلاف کریں!

واضح رہے کہ دانت اور ناخن کے ذریعہ ذبح کرنے کی ممانعت تینوں آئمہ کے نزدیک مطلق ہے، جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ'' کا مسلک یہ ہے کہ ان دانتوں اور ناخنوں سے ذبح کرنا تو جائز نہیں ہے جو اپنی جگہ پر یعنی منہ اور انگلیوں میں ہوں ہاں جو دانت اور ناخن اپنی جگہ سے اکھڑ کر (منہ اور انگلیوں سے) الگ ہو چکے ہوں ان کے ذریعہ ذبح کرنا جائز ہے لیکن یہ جواز کراہت کے ساتھ ہے تاہم اس ذبیحہ کا گوشت کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تینوں آئمہ کی دلیل مذکورہ حدیث ہے جس میں دانت اور ناخن کے ذریعہ ذبح کرنے کی ممانعت کسی قید اور کسی استثناء کے بغیر منقول ہے، جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ'' کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ انہر الدم بماشئت اور وافر الاوداج۔ اور جہاں تک حضرت رافع'' کی اس روایت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں حضرت امام اعظم'' کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث بغیر اکھڑے ہوئے دانت اور ناخن کے ذریعہ ذبح کرنے پر محمول ہے کیونکہ حبشیوں کا یہی طریقہ تھا۔

''تو اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرو'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر گھر کا پالتو کوئی جانور جیسے اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ بھاگ کھڑا ہو تو وہ ذبح کے معاملہ میں وحشی جانور کے شکار کی مانند ہوگا کہ جس طرح وحشی جانور پر بسم اللہ پڑھ کر مثلاً تیر چلایا جائے تو وہ تیر اس جانور کے جسم کے جس حصہ پر بھی لگ کر اس کو ختم کر دے گا وہ ذبیحہ کے حکم میں ہو جائے گا، اسی طرح اس بھاگنے والے پالتو جانور کا سارا جسم اور اس کے سارے اعضاء بھی ''ذبح کی جگہ'' ہوں گے، چنانچہ بسم اللہ پڑھ کر اس پر چلایا جانے والا تیر اس کے جسم کے جس حصے میں لگ کر اس کو ختم کر دے گا اس کا گوشت حلال ہوگا۔ اور یہی حکم اس صورت میں ہے جب کہ اونٹ وغیرہ کنوئیں یا اس طرح کے کسی اور کھڈ وغیرہ میں گر پڑیں! یہاں خاص طور پر صرف اونٹ کا ذکر شاید اس لئے کیا گیا ہو کہ اس میں توحش بہت زیادہ ہوتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ''ذبح'' کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم تو اختیاری ہے اور دوسری قسم اضطراری ہے اختیاری کی ایک صورت تو جانور کے لیہ اور لحیتین کے درمیان کسی دھار دار چیز جیسے چھری وغیرہ سے جراحت کے ساتھ رگوں کو کاٹنے کی ہوتی ہے اور دوسری صورت نحر کے ساتھ یعنی اونٹ کے سینے میں نیزہ وغیرہ مارنے کی ہوتی ہے، اور اضطراری کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جانور کے جسم کے کسی بھی حصے کو زخمی کر کے مار دیا جائے۔

پتھر کے ذریعہ ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے

(۹) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهُ كَانَ لَهُ غَنَمٌ تَرْعٰى بِسَلْعٍ فَاَبْصَرَتْ جَارِيَةٌ لَنَا بِشَاةٍ مِنْ غَنَمِنَا مَوْتًا فَكَسَرَتْ حَجَرًا فَذَبَحَتْهَا بِهٖ فَسَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَهُ بِاَكْلِهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت کعب ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ ان (کعبؓ) کے پاس (بکریوں کا) ایک ریوڑ تھا جو مدینہ کی ایک پہاڑی سلع پر چرا کرتا تھا، (ایک دن) ہماری ایک لونڈی نے ایک بکری کو دیکھا کہ وہ مرا ہی چاہتی ہے تو اس نے ایک پتھر کا ٹکڑا توڑا اور اس ٹکڑے کے ذریعہ اس بکری کو ذبح کر دیا، پھر (کعبؓ نے) نبی کریم ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا (اس صورت میں اس بکری کا گوشت کھانا حلال ہے یہ نہیں؟)۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو اس بکری (کے گوشت) کو کھانے کا حکم دے دیا۔" (بخاریؒ)

ذبح کئے جانے والے جانوروں کو خوبی و نرمی کے ساتھ ذبح کرو

(۱۰) وَعَنْ شَدَّادِبْنِ اَوْسٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذَّبْحَ وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهٗ وَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت شداد ابن اوسؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنے کو لازم کیا ہے یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کو حسن و خوبی اور نرمی کے ساتھ انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ سزاءً" کسی کو قتل کرنے یا جانوروں کو ذبح کرنے میں بھی مہربانی و نرم دلی اور خوبی و نرمی کا طریقہ اختیار کرنا لازم ہے) لہٰذا جب تم (کسی شخص کو قصاص یا حد کے طور پر) قتل کرو تو اس کو نرمی و خوبی کے ساتھ کرو (تاکہ اس کو ایذاء نہ ہو جیسے تیز تلوار استعمال کرو اور قتل کرنے میں جلدی کرو) اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو خوبی و نرمی کے ساتھ ذبح کرو لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تم میں سے کوئی بھی شخص (جو جانور کو ذبح کرنا چاہتا ہو) اپنی چھری کو (خوب تیز کرلے اور ذبح کئے جانے والے جانور کو آرام دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "آرام دے" کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرنے کے بعد اس جانور کو چھوڑ دے تاکہ اس کا دم نکل جائے اور وہ ٹھنڈا ہو جائے! گویا اوپر کی عبارت اور یہ جملہ اصل میں "ذبح کرنے میں احسان کرنے" کی توضیح ہے کہ خوبی و نرمی کے ساتھ ذبح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس جانور کو تیز چھری سے ذبح کرے اور جلدی ذبح کر ڈالے نیز ذبح کے بعد اس کو اچھی طرح ٹھنڈا ہو جانے دے۔

حنفی علماء فرماتے ہیں کہ ذبح کئے ہوئے جانور کی کھال اتارنا اس وقت تک مکروہ ہے جب تک کہ وہ اچھی طرح ٹھنڈا نہ ہو جائے! نیز مستحب یہ ہے کہ جس جانور کو ذبح کیا جانے والا ہے اس کے سامنے چھری تیز نہ کی جائے، اگر ایک سے زائد جانور ذبح کئے جانے والے ہیں تو ان کو ایک دوسرے کے سامنے ذبح نہ کیا جائے اور ذبح کئے جانے والے جانور کے پاؤں پکڑ کر کھینچتے ہوئے ذبح کی جگہ نہ لے جایا جائے۔

جانور کو باندھ کر نشانہ لگانے کی ممانعت

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى اَنْ تُصْبَرَ بَهِيْمَةٌ اَوْغَيْرُهَا لِلْقَتْلِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا ہے، آپ ﷺ اس بات سے منع فرماتے تھے کہ کسی چوپایہ وغیرہ کو مارنے کے لئے باندھ کر اس پر نشانہ لگایا جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس کے یا تو یہ معنی ہے کہ کسی جانور کو باندھ کر پھر اس کو تیروں پتھروں یا گولیوں سے مارنا ممنوع ہے یا یہ معنی ہیں کہ کسی جانور کو بغیر دانے پانی کے بند کر کے مار ڈالنا ممنوع ہے۔

(۱۲) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ مَنِ اتَّخَذَ شَيْئًا فِيْهِ الرُّوْحُ غَرَضًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو کسی جاندار چیز کو باندھ کر اس پر نشانہ لگائے۔" (مسلمؒ)

(۱۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَتَّخِذُوْا شَيْئًا فِيْهِ الرُّوْحُ غَرَضًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "کسی جاندار چیز کو (باندھ کر) نشانہ نہ بناؤ۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ ممانعت نہی تحریم کے طور پر ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے "جس شخص نے ایسا کیا اس پر اللہ کی لعنت ہو۔" اور اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس فعل کے ذریعہ نہ صرف ایک ذی روح (جانور) کو اذیت و تکلیف میں مبتلا کرنا ہے بلکہ مال کا ضائع کرنا بھی ہے۔

منہ پر مارنے یا منہ کو داغنے کی ممانعت

⑭ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الضَّرْبِ فِي الْوَجْهِ وَعَنِ الْوَسْمِ فِي الْوَجْهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے منہ پر مارنے اور منہ پر داغ دینے سے منع فرمایا ہے یعنی کسی آدمی یا جانور کے منہ پر طمانچہ یا کوڑا وغیرہ نہ مارا جائے اور نہ کسی کے منہ پر داغ دیا جائے۔" (مسلمؒ)

⑮ وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلَيْهِ حِمَارٌ وَقَدْ وُسِمَ فِي وَجْهِهٖ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الَّذِيْ وَسَمَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے سامنے سے ایک گدھا گزرا جس پر داغ دیا گیا تھا آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ "اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جس نے اس کو داغا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگر یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ آنحضرت ﷺ نے اس گدھے کے منہ پر داغ دینے والے پر لعنت فرمائی حالانکہ مسلمانوں پر لعنت کرنے سے منع کیا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہو سکتا ہے کہ داغنے والا مسلمان نہ رہا ہو یا منافقین میں سے ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ کا یہ لعنت کرنا بددعا کے طور پر نہ ہو بلکہ "اخبار بالغیب" کے طور پر ہو یعنی آپ ﷺ نے اس جملہ کے ذریعہ گویا یہ خبر دی کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں لعنت کا مستوجب قرار پا گیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ کسی بھی جاندار کے منہ پر داغ دینا متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک ممنوع ہے، خواہ آدمی ہو یا کوئی بھی جانور و حیوان! جانور کے منہ کے علاوہ اس کے جسم کے کسی اور حصہ پر داغ دینے کا مسئلہ یہ ہے کہ امتیاز و تعین کے مقصد سے زکوٰۃ اور جزیہ کے جانوروں کو داغنے کو تو بعض علماء نے مستحب کہا ہے اور ان کے علاوہ دوسرے جانوروں کو داغنا بھی محض جائز ہے۔

جہاں تک آدمیوں پر داغ دینے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ وغیرہ کے مختلف اخبار و آثار قولاً اور فعلاً منقول ہیں۔ بعض اقوال اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ کوئی اچھا فعل نہیں ہے، بعض اقوال مدح ترک پر دلالت کرتے ہیں اور بعض اقوال صریح ممانعت کو ثابت کرتے ہیں، جب کہ آنحضرت ﷺ کا یہ عمل جواز پر دلالت کرتا ہے آپ ﷺ نے ایک طبیب کو حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس بھیجا جس نے ان کی فصد کھولی اور داغا، اسی طرح جب حضرت سعد ابن معاذؓ زخمی ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے ان پر داغ دینے کی اجازت دی، بلکہ جب ورم ہوا تو ان پر اور داغ دیا گیا، نیز حضرت جابرؓ اور حضرت ابوزرارہؓ کے جسم پر داغ دیا جانا بھی منقول ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جن اقوال میں انسانی جسم کو داغنے کی مانعت مذکور ہے ان کا تعلق قصداً بلا ضرورت و احتیاج داغنے سے ہے، ہاں اگر کسی مرض وغیرہ کے سلسلے میں داغ دینے کی ضرورت ہو تو جائز ہے۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ (علاج کی نیت سے) انسانی جسم کے کسی حصہ کو داغنا، اسباب وہمیہ میں سے ہے کہ اس کو اختیار کرنا جذبہ توکل و اعتماد علی اللہ کے اعتبار سے مناسب نہیں ہے جب کہ دوسرے علاج اسباب ظنیہ میں سے ہونے کی وجہ سے توکل کے قطعاً منافی نہیں ہیں، ہاں اگر اس بات کا ظن غالب ہو کہ داغنا، مرض کے دفعیہ کے لئے ایک سود مند علاج ہوگا تو اس صورت میں اس کو اختیار کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا۔ چنانچہ اہل فتویٰ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ داغنا بذاتہ مکروہ تحریمی ہے مگر ظن غالب حاصل ہونے کی صورت

میں بایں طور کہ طبیب حاذق یہ کہہ دے کہ مرض کے دفعیہ کا انحصار صرف داغنے پر ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا علاج نہیں ہے تو داغنا مکروہ تحریمی نہیں ہوگا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ داغنے کی ممانعت اس بنیاد پر ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب اس بات کا پختہ عقیدہ رکھتے تھے کہ داغنا مرض کے دفعیہ کے لئے ایک قطعی اور یقینی علاج ہے، ظاہر ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ایک باطل عقیدہ تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا تاکہ وہ اس کو اختیار کرنے سے شرک خفی کے جال میں نہ پھنس جائیں۔

جانوروں کو کسی ضرورت و مصلحت کی وجہ سے داغنا جائز ہے

(۱۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ غَدَوْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِىْ طَلْحَةَ لِيُحَنِّكَهٗ فَوَافَيْتُهٗ فِىْ يَدِهِ الْمِيْسَمَ يَسِمُ اِبِلَ الصَّدَقَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں (ایک دن) صبح کے وقت عبداللہ ابن ابوطلحہ کو رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لے گیا تاکہ آپ ﷺ کھجور چبا کر اس کے تالو میں لگادیں، چنانچہ اس وقت میں نے آپ ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ ﷺ کے دست مبارک میں داغنے کا آلہ تھا جس کے ذریعہ زکوٰۃ کے اونٹوں کو داغ رہے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عبداللہ ابن طلحہؓ ماں کی طرف سے حضرت انسؓ کے بھائی تھے" یعنی ماں کی طرف سے حقیقی بھائی تھے اور باپ کی طرف سے سوتیلے بھائی تھے اور ابوطلحہؓ، حضرت انسؓ کی ماں کے دوسرے خاوند تھے جن سے عبداللہ پیدا ہوئے تھے کھجور چبا کر اس کا لعاب بچے کے تالو میں لگانا سُنّت ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ان اونٹوں کو داغنا کسی خلجان کا باعث نہیں بننا چاہئے کیونکہ آپ ﷺ منہ کے علاوہ جسم کے دوسرے حصوں پر داغ دے رہے تھے اور داغنے کی جو ممانعت منقول ہے اس کا تعلق خاص طور پر منہ سے ہے، یا بلا ضرورت داغنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جب کہ زکوٰۃ کے اونٹوں کو اس ضرورت کے تحت داغا جا رہا تھا کہ ان کے اور دوسرے اونٹوں کے درمیان فرق و امتیاز کیا جاسکے۔

(۱۷) وَعَنْ هِشَامِ بْنِ زَيْدٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِىْ مِرْبَدٍ فَرَاَيْتُهٗ يَسِمُ شَاءً حَسِبْتُهٗ قَالَ فِىْ اٰذَانِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ہشام ابن زید، حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ ﷺ جانوروں کے باڑے میں تھے، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ بکریوں وغیرہ کے کسی عضو پر داغ دے رہے تھے۔" ہشام کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ حضرت انسؓ نے یہ بیان کیا تھا کہ (آپ ﷺ) ان بکریوں وغیرہ کے کان پر (داغ دے رہے تھے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منہ یعنی چہرہ میں کان شامل نہیں ہے، کیونکہ (چہرہ) پر داغ دینے سے تو منع فرمایا گیا ہے اگر کان کا تعلق بھی چہرہ سے ہوتا تو آپ ﷺ کان پر داغ کیوں دیتے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

جو چیز خون بہادے اس کے ذریعہ ذبح کرنا درست ہے

(۱۸) عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اَحَدُنَا اَصَابَ صَيْدًا وَلَيْسَ مَعَهٗ سِكِّيْنٌ اَيَذْبَحُ بِالْمَرْوَةِ وَشِقَّةِ الْعَصَا فَقَالَ اَمْرِرِ الدَّمَ بِمَ شِئْتَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عدی ابن حاتمؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص (کسی جانور کا) شکار پکڑے اور اس وقت اس کے پاس چھری نہ ہو تو کیا وہ کسی پتھر کے ٹکڑے یا کسی لکڑی کی کھپچ سے اس شکار کو ذبح کر سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "تم جس چیز سے چاہو بسم اللہ پڑھ کر خون بہا دو۔" (ابوداؤد، نسائی)

ذبح اضطراری کا حکم

⑲ وَعَنْ اَبِی الْعُشَرَاءِ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّهٗ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمَا تَکُوْنُ الذَّکَاةُ اِلَّا فِی الْحَلْقِ وَاللَّبَّةِ فَقَالَ لَوْ طَعَنْتَ فِی فَخِذِهَا لَاَجْزَأَ عَنْكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ اَبُوْدَاوٗدَ هٰذَا ذَکَاةُ الْمُتَرَدِّیِ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا فِی الضَّرُوْرَةِ۔

"اور حضرت ابوالعشراء اپنے والد محترم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا (شرعی) ذبح کا تعلق حلق اور سینہ کے سرے کے درمیانی حصے سے ہے؟ یعنی کیا شرعی طور پر ذبح صرف اسی کو کہا جائے گا کہ جانور کے حلق اور سینے کے سرے کے درمیان جراحت کے ساتھ خون بہایا جائے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تم شکار کی ران میں بھی جراحت پہنچا دو گے تو تمہارے لئے کافی ہوگا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ یہ (یعنی حدیث میں مذکورہ ذبح کی اجازت دینا، اس جانور سے متعلق ہے جو کنویں میں گر پڑا ہو یعنی یہ "ذبح اضطراری" کی صورت کا حکم ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ ضرورت کی حالت کا حکم ہے۔"

تشریح: امام ترمذیؒ نے گویا امام ابوداؤد کی وضاحت کو اور زیادہ توسع کے ساتھ بیان کیا تاکہ اس حکم میں بھاگے ہوئے اونٹ کو ذبح کرنے کی صورت بھی شامل ہو جائے۔

اگر تربیت یافتہ کتے وغیرہ کا پکڑا ہوا شکار مر بھی جائے تو اس کا کھانا جائز ہے

⑳ وَعَنْ عَدِیِّ بْنِ حَاتِمٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا عَلَّمْتَ مِنْ کَلْبٍ اَوْ بَازٍ ثُمَّ اَرْسَلْتَهٗ وَذَکَرْتَ اسْمَ اللّٰهِ فَکُلْ مِمَّا اَمْسَكَ عَلَیْكَ قُلْتُ وَاِنْ قَتَلَ قَالَ اِذَا قَتَلَهٗ وَلَمْ یَاْکُلْ مِنْهُ شَیْئًا فَاِنَّمَا اَمْسَکَهٗ عَلَیْكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عدی ابن حاتمؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس جانور کو تم نے سکھلایا خواہ وہ کتا ہو یا باز اور پھر تم نے (ان میں سے) کسی کو شکار پر چھوڑا اور (چھوڑتے وقت) اللہ کا نام لیا تو تم اس جانور کو کھا لو جس کو اس (کتے یا باز نے) تمہارے لئے پکڑا ہے۔" میں نے عرض کیا کہ "اگرچہ اس نے اس (شکار) کو مار ڈالا ہو؟" آپ ﷺ نے فرمایا "جب کہ وہ کتا یا باز شکار کو مار ڈالے اور خود اس میں سے کچھ نہ کھائے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس نے اس شکار کو تمہارے (ہی) لئے پکڑ رکھا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تیر کے شکار کا حکم

㉑ وَعَنْهُ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرْمِی الصَّیْدَ فَاَجِدُ فِیْهِ مِنَ الْغَدِ سَهْمِیْ قَالَ اِذَا عَلِمْتَ اَنَّ سَهْمَكَ قَتَلَهٗ وَلَمْ تَرَ فِیْهِ اَثَرَ سَبُعٍ فَکُلْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عدی ابن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں شکار پر اپنا تیر چلاتا ہوں اور پھر اگلے دن (جب وہ شکار کہیں پڑا ہوا مجھے ملتا ہے تو) اس میں میں اپنا تیر پاتا ہوں (کیا میں وہ شکار کھا سکتا ہوں؟)" آپ ﷺ نے فرمایا "اس صورت میں اگر تم یہ جانو کہ اس شکار کو تمہارے ہی تیر نے مار ڈالا ہے اور اس (شکار) میں تم کسی درندے کا کوئی نشان نہ پاؤ تو اس کو کھا سکتے ہو (اور اگر اس شکار میں کسی

درندے کے دانت یا پنجے وغیرہ کا کوئی نشان پاؤ یا کسی دوسرے کے تیر کی علامت پاؤ تو اس صورت میں اس کو مت کھاؤ۔" (ابوداؤد)

جس غیر مسلم کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال نہیں، اس کا کتے وغیرہ کے ذریعہ پکڑا ہوا شکار بھی حلال نہیں

(۲۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نُهِيْنَا عَنْ صَيْدِ كَلْبِ الْمَجُوْسِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہمیں مجوسیوں کے کتے کا پکڑا ہوا شکار کھانے سے منع کیا گیا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شکار کو مجوسی اپنے کتے یا کسی مسلمان کے کتے کے ذریعہ پکڑے اس کو کھانا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ شکار زندہ ہاتھ لگے اور اس کو ذبح کر لیا جائے تو اس صورت میں اس کو کھانا جائز ہوگا، اور اسی طرح اگر مسلمان نے مجوسی کے کتے کے ذریعہ شکار مارا ہے تو اس کو کھانا بھی جائز ہوگا اور اگر کتے چھوڑنے یا تیر چلانے میں مسلمان اور مجوسی دونوں شریک ہوں، اور وہ شکار مار لیں تو وہ شکار حلال نہیں ہوگا۔

یہ حدیث گویا اس بات کی دلیل ہے کہ جس غیر مسلم کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال نہیں ہے اگر وہ کتے وغیرہ کے ذریعہ شکار مارے تو وہ شکار بھی حلال نہیں ہوگا۔

غیر مسلم کے برتن میں کھانے پینے کی مشروط اجازت

(۲۳) وَعَنْ اَبِىْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِىِّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا اَهْلُ سَفَرٍ نَمُرُّ بِالْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى وَالْمَجُوْسِ فَلَا نَجِدُ غَيْرَ اٰنِيَتِهِمْ قَالَ فَاِنْ لَمْ تَجِدُوْا غَيْرَهَا فَاغْسِلُوْهَا بِالْمَاءِ ثُمَّ كُلُوْا فِيْهَا وَاشْرَبُوْا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں میں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم (اکثر) سفر کرنے والے لوگوں میں سے ہیں، ہمارا گزر یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں (کی آبادیوں) پر سے (بھی) ہوتا ہے، اس وقت ان کے برتنوں کے علاوہ اور برتن ہمارے پاس نہیں ہوتے (تو کیا ہم ان کے برتنوں میں کھا پی سکتے ہیں؟)" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اگر تمہیں ان کے برتنوں کے علاوہ برتن دستیاب نہ ہوں تو ان کے برتنوں کو پانی سے دھو مانج لو اور پھر ان میں کھاؤ پیو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: غیر مسلم کے برتن میں کھانے پینے کے سلسلے میں الفصل الاول میں بھی حدیث گزری ہے اور اس موقع پر اس مسئلہ کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

غیر مسلموں کے ہاں کا کھانا حلال ہے

(۲۴) وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ هُلْبٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سَاَلْتُ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ النَّصَارٰى، وَفِىْ رِوَايَةٍ سَاَلَهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنَّ مِنَ الطَّعَامِ طَعَامًا اَتَحَرَّجُ مِنْهُ فَقَالَ لَا يَتَخَلَّجَنَّ فِىْ صَدْرِكَ شَيْءٌ ضَارَعْتَ فِيْهِ النَّصْرَانِيَّةَ۔

(رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت قبیصہؓ بن ہلب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے عیسائیوں کے کھانوں کے بارے میں دریافت کیا (کہ ہم لوگ کھائیں یا نہیں؟) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ (اس بارے میں) ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے مسئلہ پوچھا، چنانچہ اس نے عرض کیا کہ کھانوں میں سے ایک کھانا (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کا کھانا) ایسا ہے جس سے میں پرہیز کرتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے دل میں کسی چیز یعنی شک وشبہ کی کھٹک نہ پیدا ہونی چاہئے، تم نے اپنے اس عمل کے ذریعہ عیسائیت کی مشابہت اختیار کی ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "تم نے اپنے اس عمل کے ذریعہ عیسائیت کی مشابہت اختیار کی" کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے سائل پر یہ واضح کیا کہ تمہارا عیسائیوں کے تیار کئے ہوئے کھانے سے پرہیز کرنا ایک ایسا عمل ہے جس نے تمہیں عیسائیوں کے مشابہ کر دیا ہے کیونکہ یہ عیسائیوں ہی کا شیوہ ہے کہ انہوں نے کھانے پینے کے معاملہ میں اپنے اوپر بے جا پابندیاں عائد کر لی ہیں اور ان کے پادریوں نے دین میں سختی پیدا کر دی ہے چنانچہ اگر ان کے دل میں کسی بھی اچھے خاصے اور حلال کھانے کے بارے میں یہ کھٹک پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ حرام ہے یا مکروہ ہے تو وہ بلا سوچے سمجھے اس سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا تم بلا دلیل شک و شبہ میں پڑ کر ان کے کھانے سے پرہیز نہ کرو، تم مسلمان ہو اور تمہارا دین نہایت سیدھا سادا اور آسان ہے اس میں سختی اور دشواری کا نام نہیں ہے، تمہیں اپنے عمل سے اپنے دین کی نرمی اور آسانی کو ظاہر کرنا چاہئے، اگر تم بلا تحقیق کسی کھانے کو حرام سمجھنے لگو گے تو یہ اپنے اوپر بے جا قسم کی پابندی عائد کرنے اور اپنے دین کو سخت ظاہر کرنے کے مرادف ہی نہیں ہو گا بلکہ عیسائیت کی مشابہت اختیار کرنے کے برابر بھی ہو گا۔

بعض حضرات نے حدیث کے آخری جزو کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ "تمہارے دل میں کوئی خدشہ اس بات کا نہ گزرے کہ عیسائیوں کا کھانا کھانے سے تم ان کے مشابہ ہو گئے۔" اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ کسی کھانے کو محض اس لئے اپنے اوپر حرام نہ کر لو کہ وہ کسی غیر مسلم کا تیار کیا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے اس غیر مسلم کی مشابہت لازم آئے گی کیونکہ کھانے پینے کی چیزوں میں کسی قوم کی مشابہت ضرر نہیں کرتی بشرطیکہ تشبیہ کی نیت نہ ہو۔

اس ارشاد گرامی میں "عیسائیت" کی تخصیص محض اس بنیاد پر ہے کہ سوال کرنے والے صحابی حضرت عدی بن حاتمؓ تھے جو اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائیت کے پیرو تھے۔

بہر حال! حدیث سے یہ واضح ہوا کہ جب تک کسی کھانے کی حرمت کا یقین نہ ہو محض شک کی وجہ سے اس سے پرہیز کرنا یا اس کو کھانے میں تردد کرنا مناسب نہیں ہے، غیر مسلم اقوام کی طرح اسلام میں کھانے پینے کا پرہیز نہیں ہے کہ ذرا کسی کا ہاتھ لگ گیا تو وہ کھانا چھوت ہو گیا، بلکہ مسلمانوں کو اجازت ہے کہ وہ ہر قوم کا پکا ہوا کھانا کھا سکتے ہیں، بشرطیکہ یہ یقین نہ ہو کہ اس کھانے میں کوئی حرام چیز ملائی گئی ہے یا وہ نجس برتنوں میں پکایا گیا ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کوئی حرام چیز پکائے مثلاً غیر مذبوحہ گوشت یا مردار یا سؤر اور یا کھانے میں شراب ملائے تو اس کو بھی کھا لیا جائے۔

مجثمہ کا کھانا ممنوع ہے

(۲۵) وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الْمُجَثَّمَةِ وَهِيَ الَّتِيْ تُصْبَرُ بِالنَّبْلِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجثمہ کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اور "مجثمہ" اس جانور کو کہتے ہیں، جس کو باندھ کر نشانہ کی مانند کھڑا کیا جائے اور پھر اس پر تیر مارا جائے۔" (ترمذی)

تشریح: روایت میں "مجثمہ" کی وضاحت کے لئے جو الفاظ منقول ہیں وہ کسی راوی کے ہیں۔ یہ جاہل اور بے رحم لوگ کیا کرتے ہیں، کہ بے زبان پرندوں اور جانوروں کو باندھ کر ان کو نشانہ بناتے ہیں، شریعت نے اس عمل سے بھی منع کیا ہے اور ایسے جانور کا گوشت کھانا بھی ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ اس طرح قتل کئے جانے سے "ذبح" کا مقصد اور مفہوم حاصل نہیں ہوتا اور جب وہ جانور شرعی طور پر ذبیحہ نہیں ہو گا تو اس کا کھانا بھی حرام ہو گا۔

وہ جانور جن کا کھانا حرام ہے

(۲۶) وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ كُلِّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَعَنْ

كُلِّ ذِی مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ وَعَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ وَعَنِ الْمُجَثَّمَةِ وَعَنِ الْخَلِيْسَةِ وَاَنْ تُوْطَأَ الْحَبَالٰی حَتّٰی يَضَعْنَ مَافِی بُطُوْنِهِنَّ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيٰی سُئِلَ اَبُوْعَاصِمٍ عَنِ الْمُجَثَّمَةِ فَقَالَ اَنْ يُنْصَبَ الطَّيْرُ اَوِ الشَّیْءُ فَيُرْمٰی وَسُئِلَ عَنِ الْخَلِيْسَةِ فَقَالَ الذِّئْبُ اَوِ السَّبُعُ يُدْرِكُهُ الرَّجُلُ فَيَأْخُذُ مِنْهُ فَيَمُوْتُ فِی يَدِهِ قَبْلَ اَنْ يُذَكِّيَهَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عرباض ابن ساریہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کے دن ان جانوروں کو کھانے سے منع فرمایا، کچلی والا درندہ، پنجہ والا پرندہ، گھر کے پالتو گدھوں کا گوشت، مجثمہ اور خلیسہ۔ نیز آپ نے (جہاد میں پکڑی گئی) ان لونڈیوں سے جماع کرنے سے بھی منع فرمایا جو حاملہ ہوں جب تک کہ وہ اس بچہ کو نہ جن لیں جو ان کے پیٹ میں ہے۔ حضرت محمد ابن یحیٰی (جو امام ترمذیؒ کے شیخ واستاد ہیں اور حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ (میرے شیخ واستاد) حضرت ابوعاصمؒ سے مجثمہ کے معنی دریافت کئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ (مجثمہ کا مطلب یہ ہے کہ) کسی پرندہ یا چرندہ کو (باندھ کر) کھڑا کیا جائے اور پھر اس پر تیر مارا جائے۔" اسی طرح حضرت ابوعاصمؒ سے خلیسہ کے معنی دریافت کئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ (اس کا مطلب یہ ہے کہ) بھیڑیئے یا کسی اور درندے نے کسی جانور کو پکڑ لیا ہو اور پھر کوئی شخص اس (درندے) سے وہ جانور چھین لے اور وہ جانور ذبح کئے جانے سے پہلے ہی اس (شخص) کے ہاتھ میں مرجائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "خیبر کے دن" سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ چیزوں کی ممانعت کا حکم اس سال جاری فرمایا جس میں خیبر فتح ہوا تھا، یا عین خیبر کی فتح کے وقت جاری فرمایا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جن دنوں میں خیبر میں جہاد جاری تھا انہی دنوں میں سے کسی ایک دن یہ حکم جاری فرمایا گیا۔

"ذی ناب" اس درندے کو کہتے ہیں جس کے کچلی یعنی نوکدار دانت ہوں اور اپنی کچلی کے ذریعہ (جانور وغیرہ) کو پھاڑتا ہو جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا، ریچھ، بندر، سؤر، لومڑی اور بجو وغیرہ۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر لومڑی اور بجو درندوں میں شامل نہیں ہیں تو وہ حلال ہیں۔

"ذی مخلب" اس پرندے کو کہتے ہیں جو اپنے پنجے سے شکار کرتا ہے، جیسے باز، بحری شکرہ، چرغ، الو، چیل اور گدھ وغیرہ۔

"گھر کے پالتو گدھوں" سے مراد وہ گدھے ہیں جو بستی میں رہتے ہیں، چنانچہ جنگلی گدھے کا گوشت حلال ہے، حدیث میں مذکورہ ممانعت سے پہلے پالتو گدھے کا گوشت بھی حلال تھا۔

"لونڈیوں سے جماع کرنے سے بھی منع فرمایا الخ" یہ حکم ان لونڈیوں کا ہے جو حاملہ ہونے کی حالت میں کسی کے شرعی قبضہ وتسلط میں آئی ہوں، اور جو لونڈی ایسی حالت میں کسی کے شرعی قبضہ وتسلط میں آئی ہو کہ وہ حاملہ نہ ہو تو اس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اس کے ساتھ اس وقت تک ہم بستری نہ کی جائے جب تک کہ اس کو ایک حیض نہ آجائے۔

شریطہ کا کھانا ممنوع ہے

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَاَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ شَرِيْطَةِ الشَّيْطَانِ زَادَ ابْنُ عِيْسٰی هِیَ الذَّبِيْحَةُ يُقْطَعُ مِنْهَا الْجِلْدُ وَلَا تُفْرَی الْاَوْدَاجُ ثُمَّ تُتْرَكُ حَتّٰی تَمُوْتَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے شریطہ شیطان سے منع فرمایا ہے۔ ابن عیسیٰ (حدیث کے ایک راوی) نے یہ مزید بیان کیا کہ شریطہ شیطان یہ ہے کہ جانور (کے حلق کے اوپر) کی کھال کاٹ دی جائے اور اس کی پوری رگیں نہ کاٹی جائیں اور پھر اس کو چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ مرجائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: زمانۂ جاہلیت میں مشرک ایسا کرتے تھے کہ جانور حلق کے اوپر کی ٹھوڑی کی کھال کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے چونکہ ان کی رگیں پوری نہیں کٹتی تھیں اس لئے وہ آسانی کے ساتھ مرنے کی بجائے بڑی سختی کے ساتھ تڑپ تڑپ کر مرجاتا تھا۔ اس کو "شریط" اس سبب سے

فرمایا گیا ہے کہ "شرط" جو "شرط حجام" سے ماخوذ ہے، کے معنی نشتر مارنے کے ہیں، یا "شرط" علامت کے معنی میں ہے اور اس کی نسبت شیطان کی طرف اس اعتبار سے کی گئی ہے کہ اس فعل شنیع کا باعث وہی (شیطان) ہے، اور وہ اس طرح کا ذبیحہ کرنے والے سے بہت خوش ہوتا ہے۔

ذبیحہ کے پیٹ کے بچہ کا حکم

(۲۸) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَكَاةُ الْجَنِيْنِ ذَكَاةُ اُمِّهٖ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَالدَّارِمِيُّ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ۔

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ماں کا ذبح کرنا اس کے پیٹ کا بھی ذبح کرنا ہے۔" (ابوداؤدؒ، دارمیؒ)۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو حضرت ابوسعیدؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حدیث کا ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ ماں کا ذبح ہونا اس کے پیٹ کے بچہ کے حلال ہونے کے لئے کافی ہے، مثلاً کسی شخص نے اونٹنی کو نحر کیا یا بکری کو ذبح کیا اور اس کے پیٹ سے مرا ہوا بچہ نکلا تو اس کو کھانا جائز ہے، چنانچہ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ، اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا یہ مسلک ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو اس بچہ کا کھانا ہر حال میں درست ہوگا، خواہ اس کے جسم پر بال ہوں یا نہ ہوں اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک اس بچہ کو کھانا اسی صورت میں جائز ہوگا جب کہ اس کی جسمانی ساخت مکمل ہو چکی ہو، اور اس کے بدن پر بال نکل چکے ہوں۔

ان تینوں ائمہ کے بر خلاف حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس بچہ کو کھانا حلال نہیں ہے ہاں اگر وہ بچہ ماں کے پیٹ سے زندہ نکلے اور پھر اس کو ذبح کیا جائے تو اس صورت میں اس کو کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، حنفیہ میں سے امام زفرؒ اور حضرت امام حسنؒ ابن زیاد کا بھی یہی قول ہے، ان حضرات کی طرف سے اپنے مسلک کی دلیل کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر شکار (گولی یا تیر وغیرہ کھا کر) پانی میں گر پڑے اور پھر اس میں سے مردہ نکلے تو اس کو کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ احتمال ہے کہ وہ شکار پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے مرا ہو۔ جب آنحضرت ﷺ نے جان نکلنے کے سبب میں شک واقع ہو جانے کی وجہ سے اس شکار کو کھانا حرام قرار دیا تو چونکہ وہی چیز یعنی جان نکلنے کے سبب میں شک کا واقع ہونا، ذبیحہ کے پیٹ سے نکلنے والے مردہ بچہ کے بارے میں بھی موجود ہے اس لئے وہ بھی حرام ہوگا کیونکہ جس طرح پانی میں گر جائے اور شکار کی موت کا سبب معلوم نہیں ہو سکتا اسی طرح اس مردہ بچہ کی موت کا سبب بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ آیا وہ اپنی ماں کے ذبح کئے جانے کے سبب سے مرا ہے یا دم گھٹنے کی وجہ سے مر گیا ہے۔

جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک اس حدیث کے صحیح ہونے میں کلام کیا گیا ہے۔

(۲۹) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَنْحَرُ النَّاقَةَ وَنَذْبَحُ الْبَقَرَةَ وَالشَّاةَ فَنَجِدُ فِيْ بَطْنِهَا الْجَنِيْنَ اَنُلْقِيْهِ اَمْ نَاْكُلُهٗ قَالَ كُلُوْهُ اِنْ شِئْتُمْ فَاِنَّ ذَكَاتَهٗ ذَكَاةُ اُمِّهٖ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا "یا رسول اللہ جب ہم اونٹنی کو نحر کرتے ہیں یا گائے اور بکری کو ذبح کرتے ہیں تو (بسا اوقات) ہم اس ذبیحہ کے پیٹ میں مردہ بچہ پاتے ہیں، آیا ہم اس بچہ کو پھینک دیا کریں یا کھا لیا کریں؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اگر تم چاہو تو اس کو کھا لیا کرو کیونکہ اس کی ماں کا ذبح کرنا اس بچہ کا بھی ذبح کرنا ہے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مفہوم کے اعتبار سے یہ روایت بھی وہی ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں ائمہ کے جو اختلافی اقوال ہیں ان کو بھی اوپر ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔

نحر اور ذبح کی تفصیل: پہلے صفحات میں بتایا گیا تھا کہ "ذبح" کرنے کی دو قسمیں ہیں ایک تو اختیاری اور دوسری اضطراری، پھر اختیاری

کی بھی دو صورتیں ہیں ایک تو "نحر" اور دوسری "ذبح" چنانچہ نحر تو یہ ہے کہ اونٹ کے سینہ میں نیزہ مارا جائے (یعنی اس کے سینے کو نیزہ سے چیرا دیا جائے) اور اونٹ میں مستحب نحر کرنا ہے اگرچہ اس کو ذبح کرنا جائز ہے لیکن کراہت کے ساتھ۔

اور "ذبح یہ ہے کہ جانور کی حلق کی رگ کو کاٹا جائے، ذبح کی صورت میں جانور کی حلق کی جو رگیں کاٹی جاتی ہیں وہ چار ہیں۔ ایک تو نرخرہ کہ جس کے ذریعہ سانس کی آمد ورفت ہوتی ہے، دوسری مری یعنی وہ رگ جس سے منہ سے پانی جاتا ہے اور دو شہ رگیں جو نرخرہ کے دائیں بائیں ہوتی ہیں۔ ان چاروں رگوں کو کاٹنا ہی شرعی طور پر "ذبح" کہلاتا ہے، اگر ان چاروں میں سے تین ہی رگیں کٹ جائیں تب بھی ذبح درست ہے اور اس جانور کا کھانا حلال ہے اور اگر دو ہی رگیں کٹیں تو وہ جانور مردار ہو جائے گا جس کا کھانا حلال نہیں ہوگا۔

جس طرح اونٹوں میں نحر کرنا مستحب ہے اسی طرح گائے اور بکریوں وغیرہ میں ذبح کرنا مستحب ہے لیکن اگر کسی نے ان کو نحر کر لیا تب بھی جائز ہوگا مگر کراہت کے ساتھ۔

اگر کسی شخص نے بکری وغیرہ کو گدی کی طرف سے ذبح کیا تو اگر وہ اتنی دیر تک زندہ رہی کہ اس شخص نے اس کی رگیں کاٹ دیں تو اس کا کھانا جائز ہے لیکن کراہت کے ساتھ کیونکہ اس طرح ذبح کرنا سُنّت کے خلاف ہے اور اگر وہ رگوں کے کٹنے سے پہلے ہی مرگئی تو اس کا کھانا جائز نہیں۔

اگر کسی شخص نے کسی جانور مثلاً مرغی کو ذبح کرتے ہوئے چھری کو حرام مغز تک پہنچا دیا اور سر کٹ کر جدا ہو گیا تو اس کا کھانا جائز ہے ور مکروہ بھی نہیں ہے لیکن اتنا زیادہ ذبح کرنا یا اس طرح ذبح کرنا کہ سر جدا ہو جائے مکروہ ہے۔

بلاوجہ کسی جانور و پرندہ کو مار دینا ناجائز ہے

(۳۰) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو ابْنِ الْعَاصِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَتَلَ عُصْفُوْرًا فَمَا فَوْقَهَا بِغَيْرِ حَقِّهَا سَأَلَهُ اللّٰهُ عَنْ قَتْلِهِ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا حَقُّهَا قَالَ اَنْ يَّذْبَحَهَا فَيَاْكُلَهَا وَلَا يَقْطَعَ رَأْسَهَا فَيَرْمِيَ بِهَا۔

(رواہ احمد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اگر کوئی شخص کسی چڑیا یا اس سے چھوٹے بڑے کسی اور جانور و پرندہ کو ناحق مار ڈالے گا تو اللہ تعالیٰ اس شخص سے اس (ناحق مارنے) کے بارے میں باز پرس کرے گا۔" عرض کیا گیا "یارسول اللہ ﷺ اور اس (چڑیا وغیرہ) کا حق کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کہ اس کو ذبح کیا جائے (کسی اور طرح اس کی جان نہ ماری جائے) اور پھر اس کو کھایا جائے، یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا جائے۔" (احمدؒ، النسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: اسلامی تعلیمات کے مطابق خدا کی اس وسیع کائنات میں ہر جاندار اپنی جان کی حفاظت کا حق رکھتا ہے خواہ وہ اشرف المخلوقات انسان ہو یا حیوان، جس طرح کسی انسان کی جان کو ناحق مارنا شریعت کی نظر میں بہت بڑا گناہ اور بہت بڑا ظلم ہے، اسی طرح کسی حیوان کی جان ناحق ختم کرنا بھی ایک انتہائی غیر مناسب فعل اور ایک انتہائی بے رحمی کی بات ہے۔

اگر قادر مطلق نے انسان کو طاقت و قوت عطا کر کے حیوانات پر تسلط و اختیار عطا کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنی اس طاقت اور اپنے اس اختیار کے بل پر محض اپنا شوق پورا کرنے کے لئے یا محض تفریح طبع کی خاطر بے زبان جانوروں کو اپنا تختۂ مشق بنائے۔ اور ان کی جانوں کو کھلونا بنا کر ان کو ناحق مارتا رہے۔

جس جانور کے گوشت کو حق تعالیٰ نے انسان کے لئے حلال قرار دیا ہے اگر وہ اس جانور کو بطور شکار مار کر یا اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھاتا ہے اور اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے اختیار کا جائز استعمال کرتا ہے اور اگر محض لہو و لعب اور تفریح طبع کے لئے ان جانور کی جان ناحق یعنی بلا فائدہ ختم کرتا ہے اور اس کے گوشت وغیرہ سے کوئی نفع حاصل کئے بغیر اس کو مار کر پھینک دیتا ہے تو اس

طرح نہ صرف وہ اپنے اختیار کا ناجائز استعمال کرتا ہے بلکہ ایک جاندار پر ظلم کرنے والے کے برابر ہوتا ہے اس لئے حدیث میں ایسے شخص کو آگاہ کیا گیا ہے کہ تمہارا یہ فعل (یعنی جانوروں اور پرندوں کو ناحق مارنا) بارگاہ احکم الحاکمین میں قابل مواخذہ ہے۔ اور کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم سے اس بارے میں سخت باز پرس کرے گا اور تمہیں عتاب وعذاب میں مبتلا کرے گا۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی جانور کو کھانے کے مقصد کے علاوہ ذبح کرنا یا کسی اور طرح اس کی جان مارنا مکروہ ہے۔ لیکن دوسرے علماء لکھتے ہیں کہ یہ کراہت بھی تحریمی ہے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے جانوروں کی جان مارنے سے منع فرمایا ہے جو کھائے نہیں جاتے یا جن کا کھانا حلال نہیں ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ کسی جانور کا حق، اس سے منتفع ہونے سے عبارت ہے، جس طرح کہ بلا مقصد اس کا سر کاٹ کر پھینک دینا، اس کا حق ضائع کرنے سے عبارت ہے، لہٰذا کہا جائے گا کہ حدیث کے یہ الفاظ و لا یقطع رسھا فیرمی بھا ماسبق کی عبارت کی گویا تاکید و توثیق کے طور پر ہے

زندہ جانور کے جسم سے کاٹا گیا کوئی بھی حصہ مردار ہے

(۳۱) وَعَنْ اَبِی وَاقِدِ اللَّیْثِیِّ قَالَ قَدِمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمَدِیْنَۃَ وَھُمْ یَجُبُّوْنَ اَسْنِمَۃَ الْاِبِلِ وَیَقْطَعُوْنَ اَلْیَاتِ الْغَنَمِ فَقَالَ مَا یُقْطَعُ مِنَ الْبَھِیْمَۃِ وَھِیَ حَیَّۃٌ فَھِیَ مَیْتَۃٌ لَا تُؤْکَلُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابو واقد لیثیؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ (مکہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ تشریف لائے تو اس وقت مدینہ کے لوگ (ایسا کرتے تھے کہ) اونٹ کے کوہان اور دنبوں کی چکتیاں کاٹ لیا کرتے تھے (اور پھر اس کو کھاتے تھے) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو چیز بھی کہ ایسے جانور کے جسم سے کاٹی جائے جو زندہ ہو تو وہ (کاٹی گئی چیز) مردار ہے، اس کو نہ کھایا جائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: زمانہ اسلام سے قبل چونکہ جاہلیت نے انسانی عقل وطبائع کو ماؤف کر رکھا تھا اس لئے اس وقت کے انسان ایسے ایسے طور طریقوں میں مبتلا تھے جن سے انسانیت بھی پناہ مانگتی تھی، انھی طور طریقوں میں ایک رواج مدینہ والوں میں یہ بھی جاری تھا کہ وہ جب چاہتے اپنے زندہ اونٹوں کے کوہان، زندہ دنبوں کی چکتیاں کاٹ لیتے تھے اور ان کو بھون پکا کر کھا لیتے تھے۔ یہ جانوروں کے تئیں ایک انتہائی بے رحمانہ طریقہ ہی نہیں تھا بلکہ طبع سلیم کے منافی بھی تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو اس مذموم فعل سے باز رکھا اور ان پر واضح کیا کہ زندہ جانور کے جسم سے جو بھی عضو کاٹا جائے گا وہ مردار ہوگا، اور اس کا کھانا حرام ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ذبح کی اصل، جراحت کے ساتھ خون کا بہنا ہے

(۳۲) عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِی حَارِثَۃَ اَنَّہٗ کَانَ یَرْعٰی لِقْحَۃً بِشِعْبٍ مِنْ شِعَابِ اُحُدٍ فَرَاٰی بِھَا الْمَوْتَ فَلَمْ یَجِدْ مَا یَنْحَرُھَا بِہٖ فَاَخَذَ وَتِدًا فَوَجَاَ بِہٖ فِیْ لَبَّتِھَا حَتّٰی اَھْرَاقَ دَمَھَا ثُمَّ اَخْبَرَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَہٗ بِاَکْلِھَا رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَمَالِکٌ۔ وَفِیْ رِوَایَتِہٖ قَالَ فَذَکَّاھَا بِشِظَاظٍ۔

"حضرت عطاء ابن یسار قبیلہ بنی حارثہ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (ایک دن) اونٹنی کو جو بیانے کے قریب تھی احد پہاڑ کے ایک درہ میں چرا رہا تھا کہ اس نے اونٹنی میں موت کے آثار پائے یعنی اس نے دیکھا کہ اونٹنی کسی وجہ سے مرا ہی چاہتی ہے، (اس وقت) اس کو کوئی ایسی چیز دستیاب نہیں ہو سکی جس کے ذریعہ وہ اونٹنی کو نحر کرتا، آخر کار اس نے ایک میخ اٹھائی اور اس کو نوک کی طرف سے) اس کو اونٹنی کے سینے میں بھونک دیا، تاآنکہ اس کا خون بہا دیا، پھر اس نے (اس واقعہ کو) رسول کریم ﷺ سے بیان کیا (اور اس کے گوشت

کے بارہ میں دریافت کیا کہ اس صورت میں اس کا کھانا کیسا ہے؟) آنحضرت ﷺ نے اس کو اس (کے گوشت) کے کھانے کی اجازت دی (ابوداؤدؒ، مالکؒ) اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "آخر کار اس نے ایک دھار دار لکڑی سے ذبح کر دیا۔"

تشریح: "وتد" لکڑی کی اس میخ یا کھونٹی کو کہتے ہیں جو زمین یا دیوار میں گاڑی جاتی ہے۔ اور "شظاظ" اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے نوکدار ہوتے ہیں اس کو دونوں تھیلوں کے درمیان اڑا کر اونٹ پر لادتے ہیں تاکہ وہ دونوں تھیلے الگ الگ ہو کر گریں نہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شرعی طور پر ذبح یا نحر کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جراحت کے ساتھ خون بہایا جائے، اور یہ بات جس چیز سے بھی حاصل ہو جائے اس کے ذریعہ جانور کو ذبح یا نحر کیا جا سکتا ہے خواہ وہ لوہے کی چھری وغیرہ ہو، یا کوئی دھار دار اور نوکدار لکڑی وغیرہ ہو۔

دریائی جانوروں میں سے صرف مچھلی حلال ہے

(۳۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ دَابَّةٍ فِي الْبَحْرِ اِلَّا وَقَدْ ذَكَّاهَا اللّٰهُ لِبَنِيْ اٰدَمَ۔ (رواہ الدارقطنی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "پانی کا ایسا کوئی جانور نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے لئے ذبح نہ کر دیا ہو۔" (دار قطنیؒ)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دریائی جانوروں کو بغیر ذبح کئے ہوئے کھانا حلال ہے، ان کو محض شکار کر لینا اور پانی میں سے زندہ نکال لینا ذبح کا حکم رکھتا ہے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام دریائی جانور حلال ہیں، خواہ وہ خود سے مر جائیں اور خواہ ان کا شکار کیا جائے۔ لیکن جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے وہ یوں نہیں ہے، بلکہ مچھلی کے حلال ہونے پر تو تمام علماء کا اتفاق ہے اور مچھلی کے علاوہ دوسرے جانوروں کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں۔

چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ دریائی جانوروں میں سے مچھلی کے علاوہ اور کوئی جانور حلال نہیں ہے اور وہ مچھلی بھی حلال نہیں ہے جو سردی و گرمی کی آفت کے بغیر خود بخود مر کر پانی کے اوپر آجائے اور الٹی تیرنے لگے۔ اور جو مچھلی سردی و گرمی کی آفت سے مر کر پانی کے اوپر آجائے تو وہ حلال ہے۔

ذبیحہ سے متعلق چند مسائل: جو جانور اور جو پرندے شکار کر کے کھاتے رہتے ہیں یا ان کی غذا صرف گندگی ہے، ان کا کھانا جائز نہیں ہے جیسے شیر، بھیڑیا، گیدڑ، بلی، کتا، بندر، شکرا، باز اور گدھ وغیرہ اور جو جانور اس طرح کے نہ ہوں جیسے طوطا، مینا، فاختہ، چڑیا، بیڑ، مرغابی، کبوتر، نیل گائے، ہرن، بطخ، اور خرگوش وغیرہ ان کا کھانا جائز ہے۔

بجو، گوہ، کچھوا، خچر اور گدھا، گدھی کا گوشت کھانا اور گدھی کا دودھ پینا جائز نہیں ہے، گھوڑا اگرچہ حلال ہے اور اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے مگر اس کا کھانا بہتر نہیں ہے۔

مچھلی اور ٹڈی کے علاوہ اور کوئی جانور بغیر ذبح کئے ہوئے کھانا درست نہیں ہے، جو حلال جانور (بغیر ذبح کئے ہوئے) خود بخود مر جائے گا وہ مردار ہو گا اس کا کھانا حرام ہے۔

اگر کسی چیز میں چیونٹیاں گر کر مر جائیں تو ان چیونٹیوں کو نکالے بغیر اس چیز کو کھانا درست نہیں ہے، اگر قصداً ایک آدھ چیونٹی کو بھی حلق کے نیچے جانے دیا تو مردار کھانے کا گناہ ہو گا۔

مسلمان کا ذبح کرنا ہر حالت میں درست ہے چاہے عورت ذبح کرے اور چاہے مرد، اسی طرح خواہ پاک ہو یا ناپاک، ہر حال میں اس

کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا حلال ہے۔ کافر یعنی مرتد، آتش پرست اور بت پرست وغیرہ کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا حرام ہے۔

اگر کوئی کافر گوشت بیچتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں نے مسلمان سے ذبح کرایا ہے تو اس سے گوشت خرید کر کھانا درست نہیں، البتہ جس وقت مسلمان نے ذبح کیا ہے اگر اسی وقت سے کوئی مسلمان اس گوشت کے پاس برابر بیٹھا دیکھ رہا ہے، یا وہ جانے لگا تو کوئی دوسرا مسلمان اس کی جگہ بیٹھ گیا ہے، تب اس گوشت کا کھانا درست ہوگا۔

اگر کسی ایسے جانور کو ذبح کیا گیا جس کا کھانا حلال نہیں ہے تو اس کی کھال اور گوشت پاک ہو جاتے ہیں (کہ ان کو کھانے کے علاوہ کسی اور استعمال میں لانا بلا کراہت درست ہوتا ہے) علاوہ آدمی اور سوّر کے کہ ان دونوں میں ذبح کرنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا، آدمی کی کھال کا ناپاک ہونا تو اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے ہے اور سور کی کھال وغیرہ کا ناپاک ہونا اس کے نجس ہونے ہی کی وجہ سے ہے کہ وہ پاک کرنے سے بھی ہرگز پاک نہیں ہوسکتی۔

جو مرغی، گندی اور پلید چیزیں کھاتی پھرتی ہو، اس کو تین دن بند رکھ کر ذبح کرنا چاہئے، اس کو بغیر بند کئے ذبح کر کے اس کا گوشت کھانا مکروہ ہے۔

جانور کو کند چھری سے ذبح کرنا مکروہ اور ممنوع ہے کیونکہ اس میں جانور کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح ذبح کے بعد ٹھنڈا ہونے سے پہلے اس کی کھال کھینچنا، ہاتھ پاؤں توڑنا کاٹنا، اور ذبح میں جن چار رگوں کو کاٹنا چاہئے ان کے کٹ جانے کے بعد بھی گلا کاٹے جانا، یہ سب مکروہ ہے۔

ٹڈی کو کھانا جائز ہے اور مچھلی کی طرح اس کو بھی ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے اور جن کا نہیں کھایا جاتا، شکار دونوں کا کرنا جائز ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ شکار کا مقصد محض لہو ولعب اور تفریح طبع نہ ہو بلکہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کی نیت ہو، جو جانور حلال ہیں ان کا گوشت کھانا ہی ان سے سب سے بڑا نفع حاصل کرنا ہے، ہاں جو جانور حلال نہیں ہیں ان کا شکار اگر اس مقصد سے کیا جائے کہ ان کی کھال وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جائے گا تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حاصل یہ کہ جانوروں کی جان کی بھی قدر کرنی چاہئے، ان کو خواہ مخواہ کے لئے مار ڈالنا اور بلا ضرورت وبلا مقصد کے ان کا شکار کرتے پھرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

ذبح کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے تیز چھری ہاتھ میں لے کر بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کے اس کے گلے کو کاٹا جائے، یہاں تک کہ چاروں رگیں کٹ جائیں۔

بَابُ ذِكْرِ الْكَلْبِ

کتے سے متعلق احکام کا بیان

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے کتوں سے متعلق احکام معلوم ہوں گے کہ کن مقاصد کے لئے، اور کون سا کتا پالنا جائز ہے اور کون سا ناجائز ہے، اور یہ کہ کس کتے کا مارنا جائز ہے اور کس کا مارنا جائز نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بلا ضرورت کتا پالنا، اپنے ذخیرۂ ثواب میں کمی کرنا ہے

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اقْتَنٰى كَلْبًا اِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ اَوْ ضَارٍ نُقِصَ مِنْ عَمَلِهٖ

كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطَانِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، جو شخص مویشیوں کی حفاظت کرنے والے کتے اور شکاری کتے کے علاوہ کوئی کتا پالتا ہے اس کے اعمال (کے ثواب) میں سے روزانہ دو قیراط کے برابر کمی کردی جاتی ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "قیراط" اصل میں ایک وزن کا نام ہے جو آدھے دانگ، یا بقول بعض، دینار کے ۶/۱۴ اور بقول بعض دینار کے دسویں حصے کے آدھے حصے کے برابر ہوتا ہے، اور ایک دانگ چہ رتی کے وزن، یا ایک درم کے چھٹے حصے کے برابر ہوتا ہے، لیکن حدیث میں "قیراط" کا استعمال اس مقدار کے لئے کیا گیا ہے جس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اگرچہ بعض احادیث میں اس "مقدار" کو احد پہاڑ کے برابر بتایا گیا ہے، اس بنیاد پر اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ شریعت نے جن مقاصد کے لئے کتوں کو پالنے کی اجازت دی ہے جیسے مویشیوں (یا گھر، کھیت) کی حفاظت اور شکار، ان کے علاوہ محض تفریح طبع اور شوق کی خاطر اگر کوئی شخص کتا پالے گا تو اس نے جو نیک اعمال کئے ہیں اور حق تعالیٰ نے ان اعمال کی بناء پر اپنے فضل و کرم سے اس کے نامۂ اعمال میں اجر و ثواب کے جو ذخیرے رکھے ہیں، ان میں سے روزانہ اس مقدار میں کمی آتی رہے گی کہ اگر اس مقدار کو جسم تصور کیا جائے تو وہ دو احد پہاڑ کے برابر ہو! یا یہ کہ دو قیراط سے مراد اس شخص کی نیکیوں کے حصول میں سے دو حصے کی کمی و نقصان ہے۔

بہر حال "دو قیراط" سے کچھ ہی مراد لیا جائے، حدیث کا اصل منشاء تو صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ بلا ضرورت شرعی، کتا پالنا اپنے اعمال کے اجر و ثواب کے ایک بہت بڑے حصے سے ہاتھ دھونا ہے۔

جہاں تک اس سبب کا تعلق ہے جو کتے پالنے کی وجہ سے ثواب اعمال میں کمی ہونے کی بنیاد ہے تو اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔

چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک اس کمی و نقصان کا سبب ملائکہ رحمت کا گھر میں نہ آنا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔

اور بعض حضرات نے یہ سبب بیان کیا ہے کہ وہ شخص (کتا پال کر) دوسرے لوگوں کو ایذاء پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ کمی و نقصان اس سبب سے ہے کہ جب گھر میں کتا پلا ہوا ہوتا ہے تو وہ گھر والوں کی بے خبری میں کھانے پینے کے برتن باسن میں منہ ڈالتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ گھر والے چونکہ بے خبر ہوتے ہی اس لئے وہ ان برتنوں کو دھوئے مانجے بغیر ان میں کھاتے پیتے ہیں۔

(۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا اِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ اَوْصَيْدٍ اَوْزَرْعٍ اِنْتَقَصَ مِنْ اَجْرِهٖ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مویشیوں کی حفاظت کرنے والے شکار پکڑنے والے اور کھیت کھلیان کی چوکسی کرنے والے کتے کے علاوہ کوئی کتا پالتا ہے تو اس کے ثواب میں سے ہر روز ایک قیراط کے برابر کمی کردی جاتی ہے۔"
(بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مضمون و مفہوم کے اعتبار سے یہ حدیث بھی پہلی حدیث کی طرح ہے، البتہ اس حدیث میں اس کتے کے استثناء کو بھی ذکر کیا گیا ہے جو کھیت کھلیان کی حفاظت کرنے کے لئے پالا جاتا ہے، نیز اس حدیث میں "ایک قیراط" کا ذکر ہے جب کہ پہلی حدیث میں دو قیراط کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ فرق کتوں کی مختلف اقسام کی بنیاد پر ہے کہ بلا ضرورت پالے جانے والے کتوں میں بعض کتے ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو کم ایذاء پہنچاتے ہیں، ان کو پالنے کی صورت میں ایک قیراط کے برابر کمی کی جاتی ہے یا یہ فرق "مقام و جگہ" کے اعتبار سے ہے کہ

بعض جگہ توبلاضرورت کتے پالنے کی وجہ سے ثواب میں دو قیرط کے برابر کمی کی جاتی ہے۔ جیسے مکہ اور مدینہ کہ دونوں مقدس شہر اپنی عظمت وبزرگی کے لحاظ سے ایسے ہیں کہ اگر ان کی حدود میں رہنے والا کوئی شخص بلاضرورت کتا پالتا ہے تو وہ زیادہ گنہگار ہوتا ہے اس لئے اس کے ذخیرۂ ثواب میں روزانہ دو قیراط کے برابر کمی ہو جاتی ہے جب کہ ان دونوں مقدس شہروں کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں کتا پالنے والا نسبتاً کم گنہ گار ہوتا ہے، اس لئے اس کے ثواب میں سے ایک قیراط کے برابر کم کیا جاتا ہے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ شہر یا دیہات (کسی بھی آبادی) میں کتا پالتے ہیں ان کے ثواب میں دو قیراط کے برابر کمی ہوتی ہے اور جو لوگ جنگل و بیابان میں کتا پالتے ہیں ان کے ثواب میں ایک قیراط کی کمی ہوتی ہے کیونکہ آبادی میں کتے پالنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایذاء پہنچانے کا ذریعہ پیدا ہو جب کہ جنگل و بیابان میں یہ صورت نہیں ہوتی۔

اور یا یہ فرق اختلاف زمانہ کے سبب سے ہے کہ پہلے تو ایک ہی قیراط کے برابر کم ہونے کے ساتھ تنبیہ کی گئی تھی، مگر جب بعد میں لوگوں نے کتوں کو زیادہ پالنا شروع کر دیا اور ان کے ساتھ رہن سہن اختیار کیا، نیز ان کی طرف زیادہ رغبت و شوق رکھنے لگے تو شریعت کی طرف سے زجر و تنبیہ میں بھی زیادتی اور شدت اختیار کی گئی اور ثواب میں روزانہ دو قیراط کے برابر کمی ہو جانے کی وعید بیان فرمائی گئی۔

کتوں کو مار ڈالنے کا حکم

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ حَتّٰى اِنَّ الْمَرْاَةَ تَقْدَمُ مِنَ الْبَادِيَةِ بِكَلْبِهَا فَنَقْتُلُهٗ ثُمَّ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِهَا وَقَالَ عَلَيْكُمْ بِالْاَسْوَدِ الْبَهِيْمِ ذِى النُّقْطَتَيْنِ فَاِنَّهٗ شَيْطَانٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں (مدینہ کے) کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا تھا چنانچہ (ہم مدینہ اور اطراف مدینہ کے کتوں کو مار ڈالتے تھے) یہاں تک کہ جو عورت جنگل سے آتی اور اس کا کتا اس کے ساتھ ہوتا تو ہم اس کو بھی ختم کر دیتے تھے، پھر بعد میں آنحضرت ﷺ نے عام کتوں کو مار ڈالنے سے منع فرما دیا اور یہ حکم دیا کے خالص سیاہ کتے کو جو دو نقطوں والا ہو مار ڈالنا تمہارے لئے ضروری ہے کیونکہ وہ شیطان ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ کتوں کو مار ڈالنے کا حکم صرف مدینہ منورہ کے ساتھ مخصوص تھا کیونکہ وہ شہر مقدس محض اسی اعتبار سے تقدیس کا حامل نہیں تھا کہ اس میں سرکار دو عالم ﷺ اقامت پذیر تھے بلکہ اس اعتبار سے بھی اس کو پاکیزگی کی عظمت حاصل تھی کہ وہ وحی کے نازل ہونے اور ملائکہ کی آمد و رفت کی جگہ تھا، لہٰذا یہ بات بالکل موزوں اور مناسب تھی کہ اس کی سرزمین کو کتوں کے وجود سے پاک رکھا جاتا۔

عورتوں کی تخصیص یا تو اس وجہ سے ہے کہ جو عورتیں جنگل میں بود و باش رکھتی تھیں ان کو (مویشیوں وغیرہ کی حفاظت کے لئے) کتوں کی زیادہ ضرورت ہوتی تھی، اور جب وہ شہر میں آتیں تو اس وقت بھی ان کا کتا ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔

یا یہ کہا جائے کہ یہاں عورت کی قید محض اتفاقی ہے اور مراد یہ ہے کہ ان کتوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جاتا تھا جو جنگل سے شہر آجاتے تھے خواہ وہ کسی عورت کے ساتھ آتے یا کسی مرد وغیرہ کے ساتھ۔

"جو دو نقطوں والا ہو" یعنی وہ کالا بھجنگ کتا جس کی دونوں آنکھوں پر دو سفید نقطے (ٹپکے) ہوتے ہیں۔ اس قسم کا کتا چونکہ انتہائی شریر اور لوگوں کے لئے سخت تکلیف اور ایذاء پہنچانے والا ہوتا ہے اس لئے اس کو "شیطان" فرمایا گیا ہے۔

اس کو "شیطان" کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایسا کتا نہ نگہبانی کے کام کا ہوتا ہے اور نہ شکار پکڑنے کے مصرف کا، چنانچہ اسی سبب سے حضرت امام احمدؒ و اسحٰقؒ نے یہ کہا ہے کہ سیاہ کتے کا پکڑا ہوا شکار حلال نہیں کیونکہ وہ شیطان ہے۔

حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ عقور یعنی کٹ کھنے کتے کو مار ڈالنے پر تو علماء کا اتفاق ہے اگرچہ وہ سیاہ رنگ کا نہ ہو لیکن اس کتے کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں جو نقصان و ضرر پہنچانے والا نہ ہو۔

امام حرمین کہتے ہیں کہ کتوں کو مار ڈالنے کے حکم کی اصل صورت حال یہ ہے کہ پہلے تو نبی کریم ﷺ نے ہر قسم کے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا تھا، بعد میں اس حکم کی عمومیت منسوخ کر کے اس کے صرف یک رنگ سیاہ کتے تک محدود کر دیا گیا اور پھر آخری طور پر ان تمام کتوں کو مار ڈالنے کی ممانعت نافذ ہوئی جو نقصان و ضرر پہنچانے والے نہ ہوں، یہاں تک کہ یک رنگ سیاہ کتے کو بھی اس حکم میں شامل کر دیا گیا اگر اس سے نقصان و ضرر پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو اس کو بھی ختم نہ کیا جائے۔

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِقَتْلِ الْکِلَابِ اِلَّا کَلْبَ صَیْدٍ اَوْ کَلْبَ غَنَمٍ اَوْ مَاشِیَةٍ۔ (متفق علیه)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو (سارے کتوں کے یا مدینہ کے) کتوں کے مار ڈالنے کا حکم دیا۔ لیکن شکاری کتوں اور بکریوں کی حفاظت کرنے والے کتوں اور مویشیوں کی حفاظت کرنے والے کتوں کو مستثنیٰ رکھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اَوْ مَاشِیَةٍ" (اور مویشیوں کی حفاظت کرنے والے کتے)" یہ جملہ تعمیم بعد تخصیص کے طور پر ہے۔ یعنی استثناء کے سلسلے میں پہلے تو خاص طور پر بکریوں کو حفاظت کرنے والے کتوں کا ذکر کیا پھر اور بعد میں عمومی طور پر تمام جانوروں کی حفاظت کرنے والے کتوں کا ذکر کر دیا، لہٰذا اس صورت میں حرف "اَوْ" تنویع کے لئے ہوگا جیسا کہ ماقبل کی عبارت میں ہے۔

یا یہ کہ "اَوْ مَاشِیَةٍ" میں حرف "اَوْ" راوی کے شک کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی اس کے ذریعہ حدیث کے راوی نے بتانا چاہا ہے کہ مجھے صحیح یاد نہیں ہے کہ اس موقع پر "الا کلب صید او کلب...." کے بعد "غَنَمٍ" فرمایا گیا تھا یا "مَاشِیَةٍ"۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

سارے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم نہ دینے کی علت

⑤ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْلَا اِنَّ الْکِلَابَ اُمَّةٌ مِنَ الْاُمَمِ لَاَمَرْتُ بِقَتْلِهَا کُلِّهَا فَاقْتُلُوْا مِنْهَا کُلَّ اَسْوَدَ بَهِیْمٍ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالدَّارِمِیُّ وَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَمَا مِنْ اَهْلِ بَیْتٍ یَرْتَبِطُوْنَ کَلْبًا اِلَّا نُقِصَ مِنْ عَمَلِهِمْ کُلَّ یَوْمٍ قِیْرَاطٌ اِلَّا کَلْبَ صَیْدٍ اَوْ کَلْبَ حَرْثٍ اَوْ کَلْبَ غَنَمٍ۔

"حضرت عبداللہ ابن مغفلؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر یہ بات نہ ہوتی کہ کتے (بھی) گروہوں میں سے ایک گروہ ہیں تو میں یقیناً یہ حکم دے دیتا کہ ان سب کو مار ڈالا جائے پس ان میں جو (بھی) کتا خالص سیاہ رنگ کا ہو اس کو مار ڈالو (ابوداؤدؒ، دارمیؒ) اور ترمذیؒ ونسائیؒ نے یہ عبارت مزید نقل کی ہے کہ "اور جو گھر والے "بلا ضرورت" کتا پالتے ہیں ان کے عمل (کے ثواب میں سے روزانہ ایک قیراط کے بقدر کمی کر دی جاتی ہے، ہاں شکاری کتا اور کھیت کی حفاظت کرنے والا اور ریوڑ کی چوکسی کرنے والا کتا اس سے مستثنیٰ ہے۔"

تشریح: "کتے (بھی) گروہوں میں سے ایک گروہ ہیں الخ" اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے گویا قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ۔

"اور جتنی قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنی قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تمہاری طرح گروہ نہ ہوں۔"

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان ایک اُمت اور ایک جنس ہیں اسی طرح جانور بھی ایک اُمت اور ایک جنس ہیں، خواہ وہ زمین پر چلنے والے ہوں یا فضا میں اڑنے والے ہوں، جس طرح انسان اپنے مختلف نام اور اپنے مختلف انواع کے ذریعہ ایک دوسرے سے پہچانے جاتے ہیں، اسی طرح جانوروں کے بھی مختلف نام اور مختلف نوع ہیں جن کے ذریعہ ایک دوسرے کے درمیان فرق امتیاز کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح انسان اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہیں۔ کہ ہر شخص کو اپنے اپنے مقدر کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق ملتا ہے، اسی طرح جانوروں کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے رزق ملتا ہے، نیز یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی خاص مصلحت و حکمت کی بناء پر پیدا کیا ہے اسی طرح جانوروں کو بھی مصلحت و حکمت ہی کے مطابق پیدا کیا ہے، اس اعتبار سے جس طرح انسان کی جان کی اہمیت ہے، اسی طرح جانوروں کی جان کی بھی اہمیت ہے کہ ان کو بلا ضرورت اور بلا مقصد مار ڈالنا تخلیق خداوندی کی مصلحت و حکمت کے منافی ہے۔

لہٰذا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس آیت کریمہ کے بموجب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ سارے کتوں کو مار ڈالا جائے کیونکہ مخلوق خداوندی میں جتنے گروہ اور جتنی جماعتیں ہیں ان میں ایک گروہ اور ایک جماعت کتے بھی ہیں اور کسی جماعت کے گروہ کو فنا کر دینا اللہ تعالیٰ کی اس حکمت و مصلحت کے بالکل منافی ہے جو ہر جاندار کی تخلیق میں کارفرما ہے، البتہ ان کتوں میں جو کتے خالص سیاہ رنگ کے ہوں ان کو مار ڈالنا چاہئے کیونکہ اس قسم کے کتے نہایت شریر اور سخت خطرناک ہوتے ہیں جن سے لوگوں کو سوائے تکلیف و ایذاء کے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اور باقی دوسری قسم کے کتے چونکہ کھیت کھلیان اور مویشیوں کی چوکسی کرنے وغیرہ کے کام میں آتے ہیں اور وہ ایک طرح سے انسان کی خدمت کرتے ہیں اس لئے آیت کریمہ کی تعلیم کے علاوہ یوں بھی مفاد عامہ کے پیش نظر ان کو زندہ رکھنا ہی زیادہ بہتر اور فائدہ مند ہے۔

حدیث میں لفظ "فاقتلوا" ترکیب نحوی کے اعتبار سے جواب ہے شرط محذوف کا، گویا آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ جب مذکورہ سبب (آیت کریمہ کے بموجب) تمام کتوں کو مار ڈالنے کا کوئی راستہ نظر آتا تو کم سے کم ان کتوں کو مار ڈالو جو خالص سیاہ رنگ کے ہوں۔

جانوروں کو لڑانے کی ممانعت

(۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ التَّحْرِيْشِ بَيْنَ الْبَهَائِمِ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جانوروں کو ایک دوسرے پر ابھارنے (یعنی ان کو آپس میں لڑانے سے) منع فرمایا ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اونٹوں، ہاتھیوں، مینڈھوں، بیلوں، بھینسوں اور ان کے علاوہ دوسرے چوپایوں کو آپس میں لڑانا نہیں چاہئے، اسی طرح پرند جانوروں کا بھی یہی حکم ہے۔ مرغوں اور بٹیروں وغیرہ کو بھی آپس میں لڑانا ممنوع ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب جانوروں کو لڑانے کی ممانعت ہے تو آدمیوں کو آپس میں لڑانا بطریق اولی ممنوع ہوگا۔

بَابُ مَا يَحِلُّ أَكْلُهُ وَمَا يَحْرُمُ

جن جانوروں کا کھانا حلال ہے اور جن جانوروں کا کھانا حرام ہے ان کا بیان

واضح رہے کہ جس چیز کا حرام ہونا کتاب اللہ (یعنی قرآن مجید) سے ثابت ہے وہ اول تو میتة یعنی مردار ہے۔ دوم دم مسفوح یعنی بہتا ہوا خون ہے، سوم سؤر کا گوشت ہے اور چہارم اس جانور کا گوشت ہے جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو چنانچہ اس آیت کریمہ سے یہی

ثابت ہے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ط (سورہ الانعام)

"(اے محمد ﷺ!) کہہ دیجئے کہ جو احکام (بذریعہ وحی) میرے پاس آئے ہیں ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے مگر یہ کہ وہ مردار (مرا ہوا جانور) ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے یا جو (جانور) شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو۔"

اس کے بعد سُنّت نبوی ﷺ نے ان حرام چیزوں میں کچھ اور جانوروں کا اضافہ کیا جیسے ذی ناب، ذی مخلب اور گھر کے پلے ہوئے گدھے وغیرہ۔ چنانچہ جن جانوروں کا احادیث نبوی کے ذریعہ حرام قرار پانا ثابت ہے ان میں سے بعض جانور تو بسبب قطعیت احادیث کے متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک حرام ہیں اور بعض جانوروں کے بارے میں ائمہ حضرات کے اختلافی مسلک ہیں کیونکہ ان کے سلسلے میں احادیث بھی مختلف منقول ہیں بعض جانوروں کے سلسلے میں اس آیت کریمہ کی بناء پر بھی علماء کے درمیان اختلاف پیدا ہوا ہے۔

وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔

"اور وہ (رسول کریم ﷺ) پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں۔"

چنانچہ حنفی علماء نے اسی آیت کی بنیاد پر مچھلی کے علاوہ پانی کے اور تمام جانوروں کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ ان حضرات کے نزدیک مچھلی کے علاوہ پانی کا اور جو بھی جانور ہے وہ خبیث یعنی گندا ہے۔ بایں دلیل کہ "خبیث" سے مراد وہ چیز ہے جس کو طبیعت سلیم، طیب کی ضد یعنی گندی اور گھناؤنی جانے اور پانی میں مچھلی کے علاوہ جو بھی جاندار چیز ہوتی ہے اس کو طبیعت سلیم گھناؤنی جانتی ہے؟

ہدایہ میں لکھا ہے کہ حضرت امام مالکؒ اور علماء کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ پانی کے تمام جانور مطلق حلال ہیں لیکن ان میں سے بعض علماء نے دریائی سور، دریائی کتے اور دریائی انسان کا استثناء کیا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مطلق دریا کے جانور حلال ہیں۔ ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ۔

"تمہارے نزدیک دریا کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے۔"

نیز وہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے بھی استدلال کرتے ہیں جو آپ ﷺ نے دریا کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

هو الطهور ماؤه والحل میتته۔

"اس (دریا) کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ذی ناب درندہ حرام ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کُلُّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ فَاَکْلُهٗ حَرَامٌ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "درندوں میں جو جانور کچلی والا ہو (یعنی جو دانت سے اپنا شکار پکڑتا ہو جیسے شیر اور بھیڑیا وغیرہ) اس کا کھانا حرام ہے۔" (مسلم)

ذی مخلب پرندہ کا گوشت کھانا حرام ہے

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كُلِّ ذِىْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَكُلِّ ذِى مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہر اس درندے (کے گوشت) کو کھانے سے منع فرمایا ہے جو کچلی والا ہو اور ہر اس پرندے (کا گوشت کھانے) سے منع فرمایا ہے جو چنگل گیر ہو یعنی جو اپنے پنجہ سے شکار کرتا ہو جیسے باز وغیرہ۔" (مسلم)

گھریلو گدھے کا گوشت کھانا حرام ہے

③ وَعَنْ اَبِىْ ثَعْلَبَةَ قَالَ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لُحُوْمَ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو ثعلبہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے گھریلو گدھوں کا گوشت حرام قرار دیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لیکن جنگلی گدھے کہ جن کو گورخر کہتے ہیں بالاتفاق تمام علماء کے نزدیک حلال ہیں۔

گھوڑا حلال ہے

④ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ وَاَذِنَ فِىْ لُحُوْمِ الْخَيْلِ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کے دن گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے کی ممانعت جاری فرمائی تھی اور گھوڑوں کا گوشت کھانے کی اجازت دی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: دیگر ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ گھوڑے کا گوشت کھانا مباح ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ گھوڑے کا گوشت کھانا مکروہ ہے، بعضے کہتے ہیں کہ کراہت تحریمی مراد ہے اور بعضے کراہت تنزیہی مراد لیتے ہی لیکن کفایت المنتہی میں منقول ہے کہ بعض علماء نے واضح کیا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اپنے انتقال سے تین دن پہلے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا یعنی دیگر ائمہ کی طرح وہ بھی گھوڑے کے گوشت کی اباحت کے قائل ہو گئے تھے چنانچہ حنفی مسلک میں اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح فقہ حنفی کی مشہور اور معتبر کتاب در مختار میں بھی یہ لکھا ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت حلال نہیں ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ اور حنفیہ میں سے حضرت امام ابو یوسف "اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک حلال ہے اور بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنے انتقال سے تین دن پہلے حرمت کے قول سے رجوع کر لیا تھا چنانچہ اسی پر فتوے ہے۔"

حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے کہ حضرت امام اعظمؒ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا اور حنفی مسلک میں گھوڑے کا گوشت کھانا حلال ہے۔

گورخر کا گوشت حلال ہے

⑤ وَعَنْ اَبِىْ قَتَادَةَ اَنَّهٗ رَاٰى حِمَارًا وَحْشِيًّا فَعَقَرَهٗ فَقَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ مَعَكُمْ مِنْ لَحْمِهٖ شَىْءٌ قَالَ مَعَنَا رِجْلُهٗ فَاَخَذَهَا فَاَكَلَهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے گورخر کو دیکھا اور اس کو مار ڈالا (اور پھر رسول کریم ﷺ سے اس کا گوشت کھانے کا مسئلہ پوچھا) تو نبی کریم ﷺ نے دریافت کیا کہ "کیا تمہارے پاس اس کے گوشت میں سے کچھ موجود ہے؟ ابوقتادہؓ نے کہا کہ "" ہمارے

پاس اس کے پائے موجود ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے وہ پائے لے لئے اور اس کو کھایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

خرگوش حلال ہے

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اَنْفَجْنَا اَرْنَبًا بِمَرِّ الظَّهْرَانِ فَاَخَذْتُهَا فَاَتَيْتُ بِهَا اَبَا طَلْحَةَ فَذَبَحَهَا وَبَعَثَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَرِكِهَا وَفَخِذَيْهَا فَقَبِلَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم نے مقام مرالظہران میں (شکار کے لئے) ایک خرگوش تعاقب کیا چنانچہ میں نے (دوڑ کر) اس کو پکڑ لیا اور پھر اس کو ابوطلحہؓ کے پاس لایا۔ ابوطلحہؓ نے اس کو ذبح کیا اور اس کا ایک سرین اور دونوں رانیں رسول کریم ﷺ کے پاس بھیجیں آنحضرت ﷺ نے اس کو قبول فرمالیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ خرگوش ایک حلال جانور ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس کا گوشت قبول فرمایا، اگر اس کا گوشت کھانا حلال نہ ہوتا تو آپ ﷺ اس کو قبول نہ فرماتے بلکہ دوسروں کو بھی اس کے کھانے سے منع فرماتے۔ چنانچہ کتاب الرحمۃ فی اختلاف الائمۃ میں لکھا ہے کہ بالاتفاق تمام علماء کے نزدیک خرگوش حلال ہے۔

گوہ کا گوشت کھانے کا مسئلہ

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلضَّبُّ لَسْتُ اٰكُلُهٗ وَلَا اُحَرِّمُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "گوہ کو نہ میں کھاتا ہوں اور نہ اس کو حرام قرار دیتا ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: گوہ کو گورپھوڑ بھی کہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس کی عمر سات سو سال تک کی ہوتی ہے، اس کی بڑی عجیب خصوصیات بیان کی جاتی ہیں مثلاً یہ پانی نہیں پیتی بلکہ ہوا کے سہارے زندہ رہتی ہے، چالیس دن میں ایک قطرہ پیشاب کرتی ہے، اور اس کے دانت کبھی نہیں ٹوٹتے۔

بعض علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا گوہ کو نہ کھانا کراہت طبعی کی بناء پر تھا اور اس کو حرام قرار نہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک آنحضرت ﷺ کے پاس وحی کے ذریعہ اس کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ آگے وہ حدیث آرہی ہے جو گوہ کی حرمت پر دلالت کرتی ہے چنانچہ اسی حدیث کے بموجب حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک گوہ کا کھانا حرام ہے، جب کہ حضرت امام احمدؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيْدِ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ دَخَلَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مَيْمُوْنَةَ وَهِيَ خَالَتُهٗ وَخَالَةُ ابْنِ عَبَّاسٍ فَوَجَدَ عِنْدَهَا ضَبًّا مَحْنُوْذًا فَقَدَّمَتِ الضَّبَّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهٗ عَنِ الضَّبِّ فَقَالَ خَالِدٌ اَحَرَامٌ الضَّبُّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا وَلٰكِنْ لَمْ يَكُنْ بِاَرْضِ قَوْمِيْ فَاَجِدُنِيْ اَعَافُهٗ قَالَ خَالِدٌ فَاجْتَرَرْتُهٗ فَاَكَلْتُهٗ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ اِلَيَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان سے بیان کیا کہ (ایک دن) وہ (خالدؓ) رسول کریم ﷺ کے ہمراہ حضرت میمونہؓ کے گھر گئے جو ان (خالدؓ) کی بھی خالہ تھیں اور حضرت ابن عباسؓ کی بھی وہاں ان کے پاس انہوں نے (یعنی آنحضرت ﷺ نے یا حضرت خالدؓ نے) ایک گوہ بھنی ہوئی رکھی پائی! حضرت میمونہؓ نے اس گوہ کو رسول کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا لیکن رسول کریم ﷺ نے اس گوہ کی طرف سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا حضرت خالدؓ نے (یہ دیکھا تو) پوچھا کہ "یارسول اللہ! کیا گوہ حرام ہے؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "نہیں بلکہ یہ میری قوم کی زمین (یعنی حجاز) میں نہیں پائی جاتی اس لئے میں اس سے اپنے اندر کراہت (یعنی طبعی

کراہت) محسوس کرتا ہوں۔" حضرت خالدؓ کا بیان ہے کہ (یہ سن کر) میں نے اس گوہ کو اپنی طرف کھینچ لیا اور کھانے لگا اور آنحضرت ﷺ میری طرف دیکھتے رہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: آگے جو حدیث آئے گی اور جس میں گوہ کو کھانے کی ممانعت منقول ہے، یہ واقعہ اس سے پہلے کا ہے اس اعتبار سے یہ حدیث منسوخ قرار پائے گی۔

مرغ کا گوشت کھانا حلال ہے

(۹) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْكُلُ لَحْمَ الدَّجَاجِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو مرغ کا گوشت کھاتے دیکھا ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

ٹڈی کا کھانا جائز ہے

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ اَبِيْ اَوْفٰى قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَ غَزَوَاتٍ كُنَّا نَاْكُلُ مَعَهُ الْجَرَادَ۔ (متفق علیہ)

"اور ابن ابی اوفیٰؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول کریم ﷺ کے ہمراہ سات جہاد کئے، ہم (ان موقعوں پر) آنحضرت ﷺ کے ساتھ ٹڈی کھاتے تھے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: کنا نأکل معه الجراد میں لفظ معه (آنحضرت ﷺ کے ساتھ) نہ تو مسلم کی اصل روایت میں ہے اور نہ ترمذی میں، بلکہ اس حدیث کو جن اور محدثین نے نقل کیا ہے ان میں سے اکثر کی روایت اس لفظ سے خالی ہے، تاہم جن محدثین نے اپنی روایت میں یہ لفظ مزید نقل کیا ہے انہوں نے اس عبارت کے یہ معنی مراد لئے ہیں کہ "ہم آنحضرت ﷺ کے ہمراہ رہتے ہوئے ٹڈی کھاتے تھے۔ اور آنحضرت ﷺ ہمیں اس سے منع نہیں فرماتے تھے۔" نہ یہ کہ ہم اور آنحضرت ﷺ ساتھ ٹڈی کھاتے تھے۔" یہ تاویل اگرچہ حدیث میں منقول الفاظ کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے لیکن یہ ضروری اس لئے ہے کہ یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ٹڈی نہیں کھائی ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ "نہ میں کھاتا ہوں اور نہ حرام قرار دیتا ہوں۔"

دریا کے مرے ہوئے جانور کو کھانے کا واقعہ

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ غَزَوْتُ جَيْشَ الْخَبَطِ وَاُمِّرَ اَبُوْ عُبَيْدَةَ فَجُعْنَا جُوْعًا شَدِيْدًا فَاَلْقَى الْبَحْرُ حُوْتًا مَيِّتًا لَمْ نَرَ مِثْلَهُ يُقَالُ لَهُ الْعَنْبَرُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ نِصْفَ شَهْرٍ فَاَخَذَ اَبُوْ عُبَيْدَةَ عَظْمًا مِنْ عِظَامِهِ فَمَرَّ الرَّاكِبُ تَحْتَهُ فَلَمَّا قَدِمْنَا ذَكَرْنَا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كُلُوْا رِزْقًا اَخْرَجَهُ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ وَاَطْعِمُوْنَا اِنْ كَانَ مَعَكُمْ قَالَ فَاَرْسَلْنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُ فَاَكَلَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جیش الخبط یعنی پتے جھاڑ کر کھانے والے لشکر کے ساتھ جہاد کے لئے جانے والوں میں میں بھی شریک تھا، حضرت ابوعبیدہؓ اس لشکر کے امیر (سپہ سالار) بنائے گئے تھے چنانچہ (جب) ہم سخت بھوکے ہوئے تو دریا (سمندر) نے ایک مری ہوئی مچھلی (اپنے کنارے پر) پھینک دی ہم نے اتنی بڑی مچھلی کبھی نہیں دیکھی تھی اس قسم کی مچھلی کو عنبر کہا جاتا تھا، چنانچہ ہم نے اس میں سے آدھے مہینے تک (بڑی فراخی کے ساتھ) کھایا، پھر حضرت ابوعبیدہؓ نے اس کی ہڈیوں میں سے ایک ہڈی یعنی اس کی ایک پسلی کھڑی کی تو اس کے نیچے سے ایک اونٹ سوار (بڑی آسانی کے ساتھ) گذر گیا، اس کے بعد جب ہم (مدینہ واپس) آئے تو ہم نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اس واقعہ کا ذکر

کیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "جس رزق کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بہم پہنچایا ہے اس کو کھاؤ (یعنی تم نے یہ اچھا کیا کہ اس مچھلی کو کھایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہارا رزق بنا کر تمہارے لئے بہم پہنچایا تھا۔ یا یہ کہ اگر اس طرح کا کوئی اور رزق پاؤ تو اس کو کھاؤ) اور اگر اس مچھلی میں کا کوئی حصہ تمہارے پاس (باقی رہا) ہو تو ہم کو بھی کھلاؤ (یہ بات گویا آپ ﷺ نے ان کا دل خوش کرنے کے لئے اور اس مچھلی کے حلال ہونے کے حکم کو مؤکد کرنے کی غرض سے فرمائی تاکہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ وہ مچھلی اصل میں تو جائز نہیں تھی مگر ہماری اضطراری حالت کے پیش نظر اس کو ہمارے لئے حلال کر دیا گیا ہے)" حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ "چنانچہ ہم نے اس مچھلی کا کچھ حصہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا اور آپ ﷺ نے اس میں سے کھایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: خبط اصل میں تو خ اور ب کے زبر کے ساتھ ہے لیکن ب کے جزم کے ساتھ بھی منقول ہے۔ اس کے معنی ہیں "درخت کے پتے جو لاٹھی وڈنڈے سے مار کر گرائے جائیں۔"

حدیث میں مذکورہ واقعہ کا تعلق جس اسلامی لشکر سے ہے اس کو اتنی سخت صورت حال سے دوچار ہونا پڑا تھا کہ زادراہ کے فقدان کی وجہ سے لشکر والوں کو اپنی زندگیاں بچانے کے لئے مجبوراً درختوں کے پتے جھاڑ جھاڑ کر کھانے پڑتے تھے یہاں تک کہ اس کی وجہ سے ان کے منہ اور ہونٹ زخمی ہو گئے تھے بلکہ ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کے مشابہ ہو گئے تھے۔ اسی بناء پر اس لشکر کا نام "جیش الخبط" یعنی پتے جھاڑ کر کھانے والا لشکر مشہور ہو گیا۔ یہ واقعہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ سے پہلے کا ہے۔

"عنبر" ایک خوشبو کا نام ہے جس کے بارے میں قاموس میں لکھا کہ یہ اصل میں ایک سمندری جانور کا فضلہ ہوتا ہے، یا یہ ایک خاص قسم کے چشمے سے برآمد ہوتا ہے جو سمندر کی تہ میں ہے۔ اور ایک قسم کی بڑی سمندری مچھلی کو بھی عنبر کہتے ہیں جس کی کھال سے ڈھال بنائی جاتی ہے۔

"آدھے مہینہ تک۔" بعض روایتوں میں "ایک مہینہ تک" کے الفاظ ہیں اور بعض روایت میں یہ آیا ہے کہ لشکر والوں نے اس مچھلی میں سے اٹھارہ دن تک کھایا۔ ان تمام روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کی جائے کہ اس مچھلی میں سے آدھے مہینہ تک تو پورا لشکر کھاتا رہا اس کے بعد لشکر میں سے کچھ لوگ اٹھارہ دن تک اور کچھ لوگ پورے مہینے تک کھاتے رہے۔

کھانے پینے کی چیز میں مکھی گر پڑے تو اس کا حکم

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِیْ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ فَلْیَغْمِسْهُ كُلَّهٗ ثُمَّ لِیَطْرَحْهُ فَاِنَّ فِیْ اَحَدِ جَنَاحَیْهِ شِفَاءً وَفِی الْاٰخَرِ دَاءً۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں (کہ جس میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو) مکھی گر پڑے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس پوری مکھی کو غوطہ دے اور پھر نکال کر پھینک دے کیونکہ اس (مکھی کے دونوں پروں میں سے ایک پر میں شفا ہے اور دوسرے پر میں بیماری ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اسی طرح کی ایک حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ ہی سے منقول ہے دوسری فصل میں بھی نقل ہوگی۔ اس میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مکھی بیماری کے پر کو پہلے ڈالتی ہے لہٰذا پوری مکھی کو غوطہ دے لو تاکہ اس کا دوا والا پر بھی ڈوب جائے اور اس طرح اس کھانے پینے کی چیز سے وہ مضر اثرات زائل ہو جائیں جو بیماری والے پر کے ذریعہ پہنچے ہیں۔

جس گھی میں چوہا گر جائے اس کا حکم

⑬ وَعَنْ مَیْمُوْنَةَ اَنَّ فَارَةً وَقَعَتْ فِیْ سَمْنٍ فَمَاتَتْ فَسُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهَا فَقَالَ اَلْقُوْهَا

وَمَاحَوۡلَهَا وَكُلُوۡهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت میمونہؓ سے روایت ہے کہ ایک چوہا گھی میں گر پڑا اور مر گیا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا (اس گھی کا کیا کیا جائے) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس چوہے کو اور اس کے ارد گرد کے گھی کو نکال کر پھینک دو اور (باقی) گھی کو کھاؤ۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ اس گھی کا حکم ہے جو جما ہوا ہو اور جو گھی پگھلا ہوا ہو وہ اس صورت میں سارا نجس ہو جاتا ہے اور بالاتفاق تمام علماء کے نزدیک اس کا کھانا جائز نہیں، اس طرح اس گھی کو بیچنا بھی اکثر ائمہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ البتہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس کے بیچنے کو جائز رکھا ہے۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا اس گھی سے کوئی اور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک اس سے کوئی بھی فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، جب کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس کو چراغ میں جلانے، کشتیوں پر ملنے یا اس طرح کے کسی اور مصرف میں لاکر اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ قول حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ہے، اور حضرت امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول جو زیادہ مشہور ہے، بھی یہی ہے۔ لیکن یہ جواز کراہت کے ساتھ ہے۔ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ سے دو روایتیں منقول ہیں۔ حضرت امام مالکؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس گھی کو مسجد کے چراغ میں جلانا جائز نہیں ہے۔

سانپ کو مار ڈالنے کا حکم

(۱۴) وَعَنِ ابۡنِ عُمَرَ اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ يَقُوۡلُ اقۡتُلُوا الۡحَيَّاتِ وَاقۡتُلُوا ذَا الطُّفۡيَتَيۡنِ وَالۡاَبۡتَرَ فَاِنَّهُمَا يَطۡمِسَانِ الۡبَصَرَ وَيَسۡتَسۡقِطَانِ الۡحَبَلَ قَالَ عَبۡدُ اللّٰهِ فَبَيۡنَا اَنَا اُطَارِدُ حَيَّةً اَقۡتُلُهَا نَادَانِيۡ اَبُوۡ لُبَابَةَ لَا تَقۡتُلۡهَا فَقُلۡتُ اِنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِقَتۡلِ الۡحَيَّاتِ فَقَالَ اِنَّهٗ نَهٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ عَنۡ ذَوَاتِ الۡبُيُوۡتِ وَهُنَّ الۡعَوَامِرُ۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "(عموماً تمام) سانپوں کو مار ڈالو، اور (خصوصاً) اس سانپ کو کہ جس کی پشت پر دو سیاہ دھاریاں ہوں اور اس سانپ کو جس کو بتر کہتے ہیں مار ڈالو کیونکہ یہ دونوں قسم کے سانپ بینائی کو زائل کر دیتے ہیں (یعنی محض ان کو دیکھنے سے آدمی اندھا ہو جاتا ہے اور اس کا سبب اس زہر کی خاصیت ہے جو ان سانپوں میں ہوتا ہے اسی طرح (یہ دونوں سانپ) حمل کو گرا دیتے ہیں (یعنی اگر حاملہ عورت ان کو دیکھے تو اس زہر کی خاصیت کے سبب سے یا خوف و دہشت کی وجہ سے اس کا حمل گر جاتا ہے۔" حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) جب کہ میں ایک سانپ پر حملہ کر کے اس کو مار ڈالنے کے درپے تھا کہ (ایک صحابی) حضرت ابولبابہ انصاریؓ نے مجھ کو آواز دے کر کہا کہ اس کو مت مارو، میں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے تمام سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابولبابہؓ نے کہا کہ لیکن آنحضرت ﷺ نے اس (عام حکم) کے بعد گھر میں رہنے والے سانپوں کو مار ڈالنے سے منع فرما دیا تھا کیونکہ وہ گھر کو آباد کرنے والے ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "وہ گھر کو آباد کرنے والے ہیں۔" اصل میں عَمۡرٌ اور عُمۡرٌ کے معنی ہیں آباد کرنا، مدت دراز تک زندہ رہنا، چنانچہ ان سانپوں کو "عوامر" اسی لئے کہا گیا ہے کہ ان کی عمر بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ ہمیشہ گھر میں رہتے ہیں، ہمارے یہاں اس قسم کے سانپ کو "بھومیا" کہا جاتا ہے۔

اور تورپشتیؒ نے کہا ہے کہ اصل میں "عوامر" کا اطلاق جنات پر ہوتا ہے، اس اعتبار سے وہ "گھر کو آباد کرنے والے ہیں۔" سے مراد یہ ہوگی کہ گھروں میں اکثر و بیشتر جو سانپ نظر آتے ہیں وہ حقیقت میں جنات ہوتے ہیں جو سانپ کی صورت اختیار کئے ہوتے ہیں، لہٰذا گھروں میں رہنے والے سانپوں کو قتل کرنے میں احتیاط کرنی چاہئے کہ مبادا جس سانپ کو مار ڈالا گیا ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے گھر

میں رہنے والا جن رہا ہو اور اس کے قتل سے گھر والوں کو کوئی نقصان وضرر پہنچ جائے۔
طبرانیؒ نے ابن عباسؓ سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اقتلو الحیة و العقرب و ان کنتم فی الصلوة۔

"سانپ اور بچھو کو مار ڈالو اگرچہ تم نماز کی حالت میں کیوں نہ ہو۔"

اسی طرح ابوداؤد ونسائی نے حضرت ابن مسعودؓ سے اور طبرانی نے جریر سے اور انہوں نے حضرت عثمان بن ابوالعاص سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اقتلوا الحیات کلهن فمن خاف ثارهن فلیس منی۔

ہر قسم کے سانپوں کو مار ڈالو جو شخص ان (سانپوں کے بدلے انتقام سے ڈرا اسکی وجہ سے ان کو نہیں مارا) تو وہ مجھ سے نہیں ہے۔"

لیکن یہ روایتیں کہ جن سے مطلق سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم ثابت ہوتا ہے، اصل میں یہ گھروں میں رہنے والے سانپوں کے علاوہ دوسرے سانپوں پر محمول ہیں جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ بالا روایت یا آگے آنے والی دوسری روایتوں سے واضح ہوتا ہے۔

⑮ وَعَنْ اَبِی السَّائِبِ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰی اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ فَبَیْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ اِذَا سَمِعْنَا تَحْتَ سَرِیْرِہٖ حَرَکَۃً فَنَظَرْنَا فَاِذَا فِیْہِ حَیَّۃٌ فَوَثَبْتُ لِاَ قْتُلَهَا وَاَبُوْ سَعِیْدٍ یُصَلِّی فَاَشَارَ اِلَیَّ اَنْ اَجْلِسْ فَجَلَسْتُ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَشَارَ اِلٰی بَیْتٍ فِی الدَّارِ فَقَالَ اَتَرٰی هٰذَا الْبَیْتَ فَقُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ کَانَ فِیْہِ فَتًی مِنَّا حَدِیْثُ عَهْدٍ بِعُرْسٍ قَالَ فَخَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَی الْخَنْدَقِ فَکَانَ ذٰلِکَ الْفَتٰی یَسْتَاْذِنُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِاَنْصَافِ النَّهَارِ فَیَرْجِعُ اِلٰی اَهْلِہٖ فَاسْتَاْذَنَہٗ یَوْمًا فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خُذْ عَلَیْکَ سِلَاحَکَ فَاِنِّیْ اَخْشٰی عَلَیْکَ قُرَیْظَۃَ فَاَخَذَ الرَّجُلُ سِلَاحَہٗ ثُمَّ رَجَعَ فَاِذَا امْرَاَتُہٗ بَیْنَ الْبَابَیْنِ قَائِمَۃٌ فَاَهْوٰی اِلَیْهَا بِالرُّمْحِ لِیَطْعَنَهَا بِہٖ وَاَصَابَتْہُ غَیْرَۃٌ فَقَالَتْ لَہٗ اُکْفُفْ عَلَیْکَ رُمْحَکَ وَادْخُلِ الْبَیْتَ حَتّٰی تَنْظُرَ مَا الَّذِیْ اَخْرَجَنِیْ فَدَخَلَ فَاِذَا بِحَیَّۃٍ عَظِیْمَۃٍ مُنْطَوِیَۃٍ عَلَی الْفِرَاشِ فَاَهْوٰی اِلَیْهَا بِالرُّمْحِ فَانْتَظَمَهَا بِہٖ ثُمَّ خَرَجَ فَرَکَزَہٗ فِی الدَّارِ فَاضْطَرَبَتْ عَلَیْہِ فَمَا یُدْرٰی اَیُّهُمَا کَانَ اَسْرَعَ مَوْتًا الْحَیَّۃُ اَمِ الْفَتٰی قَالَ فَجِئْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَذَکَرْنَا ذٰلِکَ لَہٗ وَقُلْنَا اُدْعُ اللّٰہَ یُحْیِیْہِ لَنَا فَقَالَ اسْتَغْفِرُوْا لِصَاحِبِکُمْ ثُمَّ قَالَ اِنَّ لِهٰذِہِ الْبُیُوْتِ عَوَامِرَ فَاِذَا رَاَیْتُمْ مِنْهُمْ شَیْئًا فَحَرِّجُوْا عَلَیْهَا ثَلَاثًا فَاِنْ ذَهَبَ وَاِلَّا فَاقْتُلُوْہُ فَاِنَّہٗ کَافِرٌ وَقَالَ لَهُمْ اذْهَبُوا فَادْفِنُوْا صَاحِبَکُمْ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ اِنَّ بِالْمَدِیْنَۃِ جِنًّا قَدْ اَسْلَمُوا فَاِذَا رَاَیْتُمْ مِنْهُمْ شَیْأً فَاٰذِنُوْہُ ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ فَاِنْ بَدَا لَکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاقْتُلُوْہُ فَاِنَّمَا هُوَ شَیْطَانٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سائبؒ (جو حضرت ہشام ابن زہرہؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور تابعی ہیں) کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم حضرت ابوسعید خدریؓ کے پاس ان کے گھر گئے، چنانچہ جب کہ ہم وہاں بیٹھے ہوئے تھے اچانک ہم نے ان (ابوسعیدؓ) کے تخت کے نیچے ایک سرسراہٹ سنی، ہم نے دیکھا تو وہاں ایک سانپ تھا، میں اس کو مارنے کے لئے جھپٹا، مگر حضرت ابوسعیدؓ نماز پڑھ چکے تو انہوں نے مکان کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ "کیا تم نے اس کمرے کو دیکھا ہے؟" میں نے کہا کہ "ہاں!" پھر حضرت ابوسعیدؓ نے کہا کہ "اس کمرے میں ہمارے خاندان کا ایک نوجوان رہا کرتا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔" حضرت ابوسعیدؓ نے کہا کہ "ہم سب لوگ (یعنی وہ نوجوان بھی) رسول کریم ﷺ کے ہمراہ غزوۂ خندق میں گئے، (جس کا محاذ مدینہ کے مضافات میں قائم کیا گیا تھا) (روزانہ) دوپہر کے وقت رسول کریم ﷺ سے (گھر جانے کی) اجازت مانگ لیا کرتا تھا (کیونکہ دلہن کی محبت اس کو اس پر مجبور کرتی تھی) چنانچہ (اجازت ملنے پر) وہ اپنے اہل خانہ کے پاس چلا جاتا (اور رات گھر میں گزار کر صبح کے وقت پھر آ کر مجاہدین میں شامل ہو جاتا) ایک دن حسب معمول، اس نے رسول کریم ﷺ

سے اجازت طلب کی تو آنحضرت ﷺ نے (اس کو اجازت دیتے ہوئے) فرمایا کہ اپنے ہتھیار اپنے ساتھ رکھو، کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں بنو قریظہ تم پر حملہ نہ کردیں (بنو قریظہ مدینہ میں یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو اس موقع پر قریش مکہ کا حلیف بن کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک تھا اس نوجوان نے ہتھیار لے لئے اور (اپنے) گھر کو) روانہ ہوگیا (جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو) کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی (گھر کے) دونوں دروازوں (یعنی اندر اور باہر کے دروازے) کے درمیان کھڑی ہے، نوجوان نے عورت کو مار ڈالنے کے لئے اس کی طرف نیزہ اٹھایا کیونکہ (یہ دیکھ کر کہ اس کی بیوی باہر کھڑی ہے) اس کو بڑی غیرت آئی لیکن عورت نے (جبھی) اس سے کہا کہ "اپنے نیزے کو اپنے پاس روک لو اور ذرا گھر میں جاکر دیکھو کہ کیا چیز میرے باہر نکلنے کا سبب ہوئی ہے۔" (یہ سن کر) وہ نوجوان گھر میں داخل ہوا، وہاں یکبارگی اس کی نظر ایک بڑے سانپ پر پڑی جو بستر پر کنڈلی مارے پڑا تھا۔ نوجوان نیزہ لے کر سانپ پر جھپٹا اور اس کو نیزہ میں پرو لیا پھر اندر سے نکل کر باہر آیا اور نیزے کو گھر کے صحن میں گاڑ دیا، سانپ نے تڑپ کر نوجوان پر حملہ کیا، پھر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ دونوں میں سے پہلے کون مرا، سانپ یا نوجوان؟ (یعنی وہ دونوں اس طرح ساتھ مرے کہ یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ پہلے کس کی موت واقع ہوئی)۔

حضرت ابوسعید ؓ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد ہم رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے سامنے یہ ماجرا بیان کرکے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ اس نوجوان کو ہمارے لئے زندہ کردے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اپنے ساتھی اور رفیق کے لئے مغفرت طلب کرو۔" اور پھر فرمایا کہ۔ "(مدینہ کے ان گھروں میں "عوامر" یعنی جنات رہتے ہیں (جن میں مؤمن بھی ہیں اور کافر بھی) لہٰذا جب تم ان میں سے کسی کو (سانپ کی صورت میں) دیکھو تو تین بار یا تین دن اس پر تنگی اختیار کرو پھر اگر وہ چلا جائے تو فبہا ورنہ اس کو مار ڈالو کیونکہ (اس صورت میں یہی سمجھا جائے گا کہ) وہ (جنات میں کا) کافر ہے۔" پھر آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا کہ۔ "جاؤ اپنے ساتھی کی تکفین وتدفین کرو۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "مدینہ میں (کچھ) جن ہیں (اور ان میں وہ بھی ہیں) جو مسلمان ہوگئے ہیں ان میں سے۔ جب تم کسی کو (سانپ کی صورت میں) دیکھو تو تین دن اس کو خبردار کرو، پھر تین دن کے بعد بھی اگر وہ دکھائی دے تو اس کو مار ڈالو کہ وہ شیطان ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے۔" علماء نے لکھا ہے کہ صحابہ ؓ کی یہ روش نہیں تھی کہ وہ اس طرح کی کوئی استدعا آنحضرت ﷺ سے کریں۔ اس موقع پر ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ نوجوان حقیقت میں مرا نہیں ہے بلکہ زہر کے اثر سے بیہوش ہوگیا ہے۔ اس خیال سے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس دعا کی استدعا کی تھی۔

"مغفرت طلب کرو۔" اس ارشاد سے آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ اس کو زندہ کرنے کی دعا کی درخواست کیوں کرتے ہو کیونکہ وہ تو اپنی راہ پر چل کر موت کی گود میں پہنچ گیا ہے جس کے حق میں زندگی کی دعا قطعاً فائدہ مند نہیں ہے، اب تو اس کے حق میں سب سے مفید چیز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی مغفرت اور بخشش کی درخواست کرو۔

"اس پر تنگی اختیار کرو یا اس کو خبردار کرو۔" کا مطلب یہ ہے کہ جب سانپ نظر آئے تو اس سے کہو کہ تو تنگی اور گھیرے میں ہے اب نہ نکلنا اگر پھر نکلے گا تو ہم تجھ پر حملہ کریں گے اور تجھ کو مار ڈالیں گے، آگے تو جان۔

ایک روایت میں آنحضرت ﷺ سے یہ منقول ہے کہ سانپ کو دیکھ کر یہ کہا جائے:

انشد کم بالعھد الذی اخذ علیکم سلیمان بن داؤد علیھما السلام لا تاذونا ولا تظھروا لنا۔

"میں تجھ کو اس عہد کی قسم دیتا ہوں جو حضرت سلیمان ابن داؤد علیہما السلام نے تجھ سے لیا تھا کہ ہم کو ایذاء نہ دے اور ہمارے سامنے مت آ۔"

"وہ شیطان ہے۔" یعنی خبردار کر دینے کے بعد بھی وہ غائب ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مسلمان جن نہیں ہے بلکہ یا تو کافر جن ہے یا حقیقت میں سانپ ہے اور یا ابلیس کی ذریات میں سے ہے اس صورت میں اس کو فوراً مار ڈالنا چاہئے۔ اس کو "شیطان" اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ آگاہی کے بعد بھی نظروں سے غائب نہ ہو کر اس نے اپنے آپ کو سرکش ثابت کیا ہے اور عام بات کہ جو بھی سرکش ہوتا ہے خواہ وہ جنات میں کا ہو یا آدمیوں میں کا اور یا جانوروں میں کا اس کو شیطان کہا جاتا ہے۔

گرگٹ کو مار ڈالنے کا حکم

⑯ وَعَنْ اُمِّ شَرِيْكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزَغِ وَقَالَ كَانَ يَنْفُخُ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ شریکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے گرگٹ کو مار ڈالنے کے حکم دیا اور فرمایا کہ "وہ (گرگٹ) حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ پھونکتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "آگ پھونکتا تھا" یہ گویا گرگٹ کی خباثت کو بیان کیا گیا ہے کہ جب نمرود نے حضرت ابرہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا تو یہ (گرگٹ) اس آگ کو بھڑکانے کے لئے اس میں پھونک مارتا تھا۔

یوں بھی تجربہ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ یہ جانور بڑا زہریلا اور موذی ہوتا ہے، اگر کھانے پینے کی چیزوں میں اس کے زہریلے جراثیم پہنچ جائیں تو اس سے لوگوں کو بہت سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔

⑰ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزَغِ وَسَمَّاهُ فُوَيْسِقًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے گرگٹ کو مار ڈالنے کا حکم دیا اور اس کا نام فویسق رکھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "فویسق" اصل میں "فاسق" کی تصغیر ہے جس کے معنی ہیں "چھوٹا فاسق۔" گرگٹ کو فویسق یعنی چھوٹا فاسق اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ یہ فواسق خمسہ یعنی ان پانچ بد جانوروں کی قسم سے ہے جن کو ہر حالت میں مار ڈالنے کا حکم ہے خواہ وہ حل میں یعنی حدود حرم سے باہر ہوں یا حرم میں ہوں۔ ویسے لغت میں "فسق" کے معنی "خروج" کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں فسق سے مراد ہوتا ہے "اطاعت حق سے نکل جانا اور صحیح راستہ سے روگردانی کرنا۔"

⑱ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَتَلَ وَزَغًا فِیْ اَوَّلِ ضَرْبَةٍ كُتِبَتْ لَهٗ مِائَةُ حَسَنَةٍ وَفِی الثَّانِيَةِ دُوْنَ ذٰلِكَ وَفِی الثَّالِثَةِ دُوْنَ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص گرگٹ کو ایک ہی وار میں مار ڈالے۔ اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی، دوسرے وار میں اس سے کم اور تیسرے وار میں اس سے بھی کم نیکیاں لکھی جائیں گی۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ گویا اس بات کی طرف راغب کیا گیا ہے کہ گرگٹ کو جلد سے جلد مار ڈالا جائے۔

چیونٹی کو مارنے کا مسئلہ

⑲ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَصَتْ نَمْلَةٌ نَبِيًّا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ فَاَمَرَ بِقَرْيَةِ النَّمْلِ فَاُحْرِقَتْ فَاَوْحَى اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَيْهِ اَنْ قَرَصَتْكَ نَمْلَةٌ اَحْرَقْتَ اُمَّةً مِنَ الْاُمَمِ تُسَبِّحُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(اللہ کے جو) انبیاء (پہلے گزر چکے ہیں ان میں سے کسی نبی (کا واقعہ ہے کہ ایک دن ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انہوں نے چیونٹیوں کے بل کے بارے میں حکم دیا کہ اس کو جلا دیا جائے، چنانچہ بل کو جلا دیا گیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ وحی نازل کی کہ تمہیں ایک چیونٹی نے کاٹا تھا اور تم نے جماعتوں میں سے ایک جماعت کو جلا ڈالا جو تسبیح (یعنی اللہ کی پاکی

بیان کرنے) میں مشغول رہتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "چنانچہ بل کو جلادیا گیا" کے بارے میں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی نے اس درخت کو جلانے کا حکم دیا تھا جس میں چیونٹیوں کا بل تھا، چنانچہ اس درخت کو جلاڈالا گیا۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ ان نبی علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا تھا کہ (پروردگار!) تو کسی آبادی کو اس کے باشندوں کے گناہوں کے سبب عذاب میں مبتلا کرتا ہے اور وہ پوری آبادی تہس نہس ہوجاتی ہے، درآنحالیکہ اس آبادی میں مطیع و فرمانبردار لوگوں کی بھی کچھ تعداد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کرلیا کہ ان کی عبرت کے لئے کوئی مثال پیش ہونی چاہئے۔ چنانچہ ان نبی علیہ السلام پر سخت ترین گرمی مسلط کردی گئی، یہاں تک کہ وہ اس گرمی سے نجات پانے کے لئے ایک سایہ دار درخت کے نیچے چلے گئے، وہاں ان پر نیند کا غلبہ ہوگیا اور وہ سو رہے۔ تھے تو ایک چیونٹی نے ان کو کاٹ لیا، انہوں نے حکم دیا کہ ساری چیونٹیوں کو جلادیا جائے، کیونکہ ان کے لئے یہ آسان نہیں تھا کہ وہ اس خاص چیونٹی کو پہچان کر جلواتے جس نے ان کو کاٹا تھا یا یہ کہ ان کے نزدیک ساری چیونٹیاں موذی تھیں اور موذی کی پوری جنس کو مارڈالنا جائز ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ "قریۃ نمل" سے چیونٹیوں کا بل مراد ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی الخ" یہ گویا ان نبی پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ اس بات پر محمول ہے کہ نبی علیہ السلام کی شریعت میں چیونٹیوں کو مارڈالنا یا جلاڈالنا جائز تھا، اور عتاب اس سبب سے ہوا کہ انہوں نے ایک چیونٹی سے زیادہ کو جلایا۔ لیکن واضح رہے کہ شریعت محمدی ﷺ میں کسی بھی حیوان و جانور کو جلانا جائز نہیں ہے اگرچہ جوئیں اور کھٹمل وغیرہ ہی کیوں نہ ہوں، نیز موذی جانوروں کے علاوہ دوسرے جانوروں کو مارڈالنا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کسی بھی جاندار کو مارڈالنے سے منع فرمایا ہے الا یہ کہ وہ ایذا پہنچانے والا ہو۔

مطالب المؤمنین میں محمد ابن مسلمؒ سے چیونٹی کا مارڈالنے کے بارے میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ اگر چیونٹی نے تمہیں ایذاء پہنچائی ہے تو اس کو مارڈالو، اور اگر اس نے کوئی ایذا نہیں پہنچائی ہے تو مت مارو، چنانچہ فقہاء نے کہا ہے کہ ہم اسی قول پر فتویٰ دیتے ہیں۔

اسی طرح چیونٹی کو پانی میں ڈالنا بھی مکروہ ہے۔ نیز کسی ایک چیونٹی کو (جس نے ایذاء پہنچائی ہو) مارڈالنے کے لئے ساری چیونٹیوں کے بل کو نہ جلایا جائے اور نہ تباہ کیا جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

گھی میں چوہے کے گرجانے کا مسئلہ

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَقَعَتِ الْفَارَةُ فِی السَّمَنِ فَاِنْ کَانَ جَامِدًا فَاَلْقُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا وَاِنْ کَانَ مَائِعًا فَلَا تَقْرَبُوْهُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْ دَاوُدَ وَرَوَاهُ الدَّارِمِیُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر گھی میں چوہا گرجائے (اور مرجائے) اور وہ گھی جما ہوا ہو تو اس چوہے کو اور اس کے چاروں طرف کے گھی کو نکال کر پھینک دو (اور باقی گھی کھانے کے مصرف میں لاؤ) اور اگر وہ گھی پتلا یعنی پگھلا ہوا ہو تو پھر اس کے نزدیک (بھی) مت جاؤ یعنی اس کو مطلقاً نہ کھاؤ) احمدؒ، ابوداؤدؒ، اور دارمیؒ نے اس روایت کو ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔"

سرخاب کا گوشت کھانا جائز ہے

(۲۱) وَعَنْ سَفِیْنَةَ قَالَ اَکَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَحْمَ حُبَارٰی۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سفینہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کے ساتھ حباری کا گوشت کھایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "حباری" یعنی تغذری وہ جانور (پرندہ) ہے جس کے بارے میں عربی میں مشہور ہے کہ وہ احمق ترین پرندہ ہوتا ہے اسی وجہ سے کسی شخص کی حماقت ظاہر کرنے کے لئے حباری کی مثال دی جاتی ہے اردو میں حباری سرخاب کو کہتے ہیں۔

جلالہ کا گوشت کھانے کی ممانعت

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الْجَلَّالَةِ وَاَلْبَانِهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِي رِوَايَةِ اَبِيْ دَاؤُدَ قَالَ نَهٰى عَنْ رُكُوْبِ الْجَلَّالَةِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں، رسول کریم ﷺ نے جلالہ کا گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے (ترمذیؒ) اور ابوداؤدؒ کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا۔ "آنحضرت ﷺ نے جلالہ پر سوار ہونے سے منع فرمایا ہے۔"

تشریح: "جلالہ" اس جانور کو کہتے ہیں۔ جس کا گوشت کھانا حلال ہو، لیکن اس کو نجاست، پلیدی کھانے کی عادت ہو، اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ جانور کبھی کبھی نجاست وپلیدی کھاتا ہو تو اس کو "جلالہ" نہیں کہیں گے، اور اس کا گوشت کھانا حرام نہیں ہوگا۔ جیسے مرغی، اور اگر وہ جانور ایسا ہو کہ اس کی خوراک ہی عام طور پر نجاست وپلیدی ہو، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے اس کے گوشت اور دودھ میں بدبو آنے لگے۔ تو اس کا گوشت کھانا حلال نہیں ہوگا۔ الا یہ کہ اس کو باندھ کر یا بند کر کے رکھا جائے اور اس کو غیر نجس چیزیں کھلائی جائیں تا آنکہ اس کا گوشت اور دودھ ٹھیک ہو جائے تو اس کا گوشت کھانا اور دودھ پینا درست ہوگا۔ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام محمدؒ کا قول ہے لیکن حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد بھی یعنی اس کو بند کر کے رکھنے اور غیر نجس چیزیں کھلانے کے بعد اس کا گوشت مبالغہ کی حد تک دھونا ضروری ہوگا۔ فتاویٰ کبریٰ میں لکھا ہے کہ جب تک مخلات مرغ کو تین روز تک اور جلالہ کو دس روز تک بند کر کے یا باندھ کر نہ رکھا جائے اس وقت تک اس کا گوشت کھانا حلال نہیں ہوگا۔

"جلالہ" پر سواری کرنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس کا پسینہ جو گوشت کے پیدا ہونے کی وجہ سے گندا اور پلید ہوتا ہے سوار کے جسم کو لگے گا۔

گوہ کا گوشت کھانا حرام ہے

(۲۳) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ شِبْلٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ اَكْلِ لَحْمِ الضَّبِّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن شبلؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے گوہ کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ حدیث گوہ کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔ اور شاید کہ پہلے گوہ کا کھانا مباح رہا ہو اور پھر بعد میں اس حکم ممانعت کے ذریعہ اس اباحت کو منسوخ قرار دیا گیا ہو۔

بلی حرام ہے

(۲۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ اَكْلِ الْهِرَّةِ وَاَكْلِ ثَمَنِهَا (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے بلی کا گوشت اور اس کی قیمت کھانے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤد، ترمذیؒ)

تشریح: بلی کا گوشت کھانا تو بالاتفاق تمام علماء کرام کے نزدیک حرام ہے البتہ بلی کو بیچنا اور اس کی قیمت کو کھانے پینے کی چیزوں میں خرچ کرنا حرام نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے۔

گھریلو گدھے، خچر اور درندوں اور ذی مخلب پرندوں کا گوشت حرام ہے

(۲۵) وَعَنْهُ قَالَ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِي يَوْمَ خَيْبَرَ الْحُمُرَ الْاِنْسِيَّةَ وَلُحُوْمَ الْبِغَالِ وَكُلَّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَكُلَّ ذِي مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کے دن گھر میں پلے ہوئے گدھوں، خچر، ہر کچلی والے درندے اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے کا گوشت حرام قرار دیا تھا امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

گھوڑے کا گوشت کھانے کی ممانعت

(۲۶) وَعَنْ خَالِدِبْنِ الْوَلِيْدِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ اَكْلِ لُحُوْمِ الْخَيْلِ وَ الْبِغَالِ وَ الْحَمِيْرِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت خالد بن ولیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے گھوڑے، خچروں اور گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: یہ حدیث کہ جس سے گھوڑے کا گوشت کھانے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے ضعیف ہے اس لئے یہ حضرت جابرؓ کی اس حدیث کے معارض نہیں ہو سکتی جو پہلے گزر چکی ہے اور جس سے گھوڑے کے گوشت کی اباحت ثابت ہوتی ہے، تاہم گھوڑے کے گوشت کھانے کی یہ ممانعت اکثر علماء کے نزدیک اس حدیث کے ذریعہ منسوخ قرار پائی ہے جو پہلے گزر چکی ہے جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت کی تشریح میں یہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔

معاہد کے مال کا حکم

(۲۷) وَعَنْهُ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ خَيْبَرَ فَاَتَتِ الْيَهُوْدُ فَشَكَوْا اَنَّ النَّاسَ قَدْ اَسْرَعُوْا اِلٰى خَضَائِرِهِمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا لَا يَحِلُّ اَمْوَالُ الْمُعَاهِدِيْنَ اِلَّا بِحَقِّهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت خالد بن ولیدؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ خیبر کے دن جہاد میں شریک تھا (ایک موقع پر) یہودی آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور یہ شکایت کی کہ لوگوں نے ان کی کھجوروں کی طرف جلد روی اختیار کی ہے (یعنی مسلمانوں نے ہمارے کھجور کے درختوں پر سے پھل توڑ لئے ہیں جب کہ ہم معاہد ہیں) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خبردار! ان لوگوں کا مال حلال نہیں ہے جن سے عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ علاوہ اس حق کے جو اس مال سے متعلق۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "معاہد" اس شخص کو کہتے ہیں جس سے عہد و پیمان ہوا ہو، چنانچہ اگر وہ معاہد ذمی ہے تو وہ حق جو اس کے مال سے متعلق ہے جزیہ ہے اور اگر وہ معاہد مستامن ہے اور اس کے پاس مال تجارت ہے۔ تو اس کے مال سے جو حق متعلق ہوگا وہ اس پر لاگو ہونے والا عشر ہے۔

مچھلی، ٹڈی، کلیجی اور تلی حلال ہے

(۲۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ اَلْمَيْتَتَانِ الْحُوْتُ وَالْجَرَادُ وَالدَّمَانِ الْكَبِدُ وَالطِّحَالُ۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ والدار قطنی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ "ہمارے لئے دو بغیر ذبح کے مری ہوئی چیزیں اور دو خون حلال ہیں۔ دو

بغیر ذبح کے مری ہوئی چیزیں تو مچھلی اور ٹڈی ہیں اور دو خون کلیجی اور تلی ہیں (کہ یہ دونوں اصل میں بستہ خون ہیں نہ کہ گوشت۔"

(احمدؒ، ابن ماجہؒ، دار قطنیؒ)

جو مچھلی پانی میں مر کر اوپر آجائے اس کا مسئلہ

(۲۹) وَعَنْ اَبِی الزُّبَیْرِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَلْقَاہُ الْبَحْرُ وَجَزَرَ عَنْہُ الْمَآءُ فَکُلُوْہُ وَمَا مَاتَ فِیْہِ وَطَفَا فَلَا تَاْکُلُوْہُ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ مُحْیُ السُّنَّۃِ الْاَکْثَرُوْنَ عَلٰی اَنَّہٗ مَوْقُوْفٌ عَلٰی جَابِرٍ۔

"اور حضرت ابوزبیرؒ، حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جس (مچھلی) کو دریا نے کنارے پر پھینک دیا ہو، یا پانی سے اس کا ساتھ چھوٹ گیا ہو (یعنی دریا کا پانی بالکل خشک ہو گیا ہو یا کسی دوسری طرف چلا گیا ہو) تو اس مچھلی کو کھالو، اور جو مچھلی دریا میں مر کر پانی کے اوپر آجائے اس کو مت کھاؤ۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) اور محی السنۃ نے کہا ہے کہ اکثر (محدثینؒ) اس بات کے قائل ہیں کہ یہ حدیث حضرت جابرؓ پر موقوف ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں ہے بلکہ حضرت جابرؓ کا اپنا قول ہے۔

تشریح: یہ حدیث حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مسلک کی دلیل ہے کہ طافی مچھلی (یعنی وہ مچھلی جو پانی میں مر کر اوپر آجائے حرام ہے، چنانچہ صحابہؓ کی ایک جماعت سے بھی اسی طرح منقول ہے، لیکن حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس مچھلی کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ آنحضرت ﷺ مطلق (بلاقید اور استثناء کے) احل لکم المیتتان (تمہارے لئے دو بغیر ذبح کے مری ہوئی چیزیں حلال ہیں، فرمایا ہے لہٰذا میتہ بحر یعنی پانی کی مری ہوئی چیز (مچھلی) مطلق حلال ہوگی (خواہ وہ پانی سے نکلنے کے بعد مری ہو، یا پانی میں مر کر اوپر آگئی ہو) جب کہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ میتہ بحر سے وہ مچھلی مراد ہے جس کو بحر یعنی دریا باہر پھینک دے اور وہ اس کی وجہ سے مر جائے نہ کہ وہ مچھلی مراد ہے جو بغیر کسی آفت کے پانی میں خود مر گئی ہو۔

ٹڈی کا حکم

(۳۰) وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْجَرَادِ فَقَالَ اَکْثَرُ جُنُوْدِ اللّٰہِ لَا اٰکُلُہٗ وَلَا اُحَرِّمُہٗ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ وَقَالَ مُحْیُ السُّنَّۃِ ضَعِیْفٌ۔

"اور حضرت سلمانؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ٹڈی کے (کھانے اور اس کی حقیقت کے) بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ٹڈیاں اللہ تعالیٰ کا (پرندوں میں) سب سے بڑا لشکر ہیں، نہ تو میں اس کو کھاتا ہوں (کیونکہ طبعاً مجھے کراہت محسوس ہوتی ہے) اور نہ (دوسروں پر) شرعاً اس کو حرام قرار دیتا ہوں (کیوں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حلال کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے یہ حدیث گزری ہے کہ احلت لنا میتتان ابوداؤدؒ! اور محی السنۃ نے کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔"

تشریح: ٹڈیاں اللہ تعالیٰ کا لشکر اس اعتبار سے ہیں کہ جب کسی گروہ اور کسی قوم پر غضب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی طرف ٹڈیوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیجتا ہے تاکہ وہ اس قوم کی کھیتوں اور ان کے درختوں کو کھا جائیں، جس سے ان میں قحط پھیل جائے، چنانچہ پچھلے زمانوں میں ایسا بار ہا ہوا ہے کہ جب کسی جگہ کے کھیتوں اور باغات کو غضب خداوندی کی بنا پر ٹڈیوں نے نیست و نابود کر دیا اور اس کی وجہ سے وہاں قحط پھیل گیا تو ایک انسان دوسرے انسان کو کھانے لگا اس طرح وہاں کی پوری کو پوری آبادی تباہ و برباد ہو گئی۔

جہاں تک ٹڈی کا مسئلہ ہے تو اس کا کھانا اکثر احادیث کے بموجب حلال ہے، چنانچہ چاروں ائمہؒ کا یہ مسلک ہے کہ ٹڈی کو کھانا حلال ہے، خواہ وہ خود سے مر گئی ہو یا اس کو ذبح کیا گیا ہو، یا شکار کے ذریعہ مری ہو، اور شکار بھی خواہ کسی مسلمان نے کیا ہو، یا مجوسی نے اور خواہ اس میں سے کچھ کاٹا جائے یا نہیں۔

مرغ کو برا کہنے کی ممانعت

(۳۱) وَعَنْ زَيْدِبْنِ خَالِدٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ سَبِّ الدِّيْكِ وَقَالَ اِنَّهٗ يُؤَذِّنُ لِلصَّلٰوةِ۔ (رواه فی شرح السنة)

"اور حضرت زید ابن خالدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مرغ کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بلاشبہ وہ (مرغ) نماز کے لئے آگاہ کرتا ہے۔" (شرح السنة)

تشریح: نماز سے تہجد کی نماز مراد ہے! حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ تہجد کی نماز کے لئے اس وقت اٹھتے تھے جب کہ مرغ بانگ دیا کرتا تھا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ فجر کی نماز مراد ہو، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی بانگ کے ذریعہ آگاہ کرتا ہے کہ فجر کی نماز کا وقت قریب آگیا ہے اور پھر دوبارہ اس کی بانگ تاکید و تنبیہ کے لئے ہوتی ہے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب حیوان میں بھی پائی جانے والی اچھی خصلتیں اس کو برا کہنے سے روکتی ہیں، تو کسی مؤمن کو برا کہنے والے کا کیا حشر ہوگا؟

(۳۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسُبُّوا الدِّيْكَ فَاِنَّهٗ يُوْقِظُ لِلصَّلٰوةِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مرغ کو برا نہ کہو، کیوں کہ وہ نماز کے لئے جگاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

گھر میں سانپ دکھائی دے تو اس سے کیا کیا جائے

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ اَبِىْ لَيْلٰى قَالَ قَالَ اَبُوْلَيْلٰى قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا ظَهَرَتِ الْحَيَّةُ فِى الْمَسْكَنِ فَقُوْلُوْا لَهَا اِنَّا نَسْئَلُكَ بِعَهْدِ نُوْحٍ وَّبِعَهْدِ سُلَيْمَانَ ابْنِ دَاوُدَ اَنْ لَّا تُؤْذِيْنَا فَاِنْ عَادَتْ فَاقْتُلُوْهَا۔

(رواه الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰنؒ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ حضرت ابولیلیٰ نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب گھر میں سانپ نکلے تو اس کے سامنے کہا جائے کہ۔ "ہم تجھ سے حضرت نوح (علیہ السلام) کے عہد اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) ابن داؤد (علیہ السلام) کے عہد کا واسطہ دے کر یہ چاہتے ہیں کہ تو ہمیں ایذاء نہ پہنچا۔" اگر اس کے بعد وہ پھر نظر آئے تو اس کو مار ڈالو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت نوح علیہ السلام نے سانپ سے عہد اس وقت لیا تھا جب کہ انہوں نے اپنی کشتی میں حیوانات کو داخل کیا تھا۔

انتقام کے خوف سے سانپ کو نہ مارنے والے کے بارے میں وعید

(۳۴) وَعَنْ عِكْرَمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَا اَعْلَمُهٗ اِلَّا رَفَعَ الْحَدِيْثَ اَنَّهٗ كَانَ يَاْمُرُ بِقَتْلِ الْحَيَّاتِ وَقَالَ مَنْ تَرَكَهُنَّ خَشْيَةَ ثَائِرٍ فَلَيْسَ مِنَّا۔ (رواه فی شرح السنة)

"اور حضرت عکرمہؒ، حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ حضرت ابن عباسؓ نے بطریق مرفوع یہ حدیث بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "جو شخص بدلے (انتقام) کے خوف سے ان (سانپوں) کو مارنا چھوڑ دے تو وہ ایک موذی کو نہ مارنے اور قضا و قدر الٰہی پر بھروسہ نہ کرنے کے سبب) ہم میں سے نہیں ہے۔ یعنی ہمارے راستے پر گامزن نہیں ہے۔" (شرح السنة)

تشریح: "بدلے کے خوف" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس ڈر کی وجہ سے سانپ کو نہ مارے کہ کہیں اس کا جوڑا مجھ سے انتقام نہ لے، چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے کسی سانپ کو مار ڈالا اور پھر اس کے جوڑے نے آکر اس شخص کو کاٹ لیا اور بدلہ لیا، مارا جانے والا

سانپ اگر نر ہوتا ہے تو اس کی مادہ انتقام لینے آتی ہے اور اگر وہ مادہ تھی تو اس کا نر بدلہ لینے آتا ہے، زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کے ہاں یہ خوف ایک عقیدے کی حد تک تھا وہ کہا کرتے تھے کہ سانپ کو ہرگز نہیں مارنا چاہئے، اگر اس کو مارا جائے گا تو اس کا جوڑا آکر انتقام لے گا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس طرح کے قول واعتقاد سے منع فرمایا۔

(۳۵) وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا سَالَمْنَاهُمْ مُنْذُ حَارَبْنَاهُمْ وَمَنْ تَرَكَ شَيْئاً مِّنْهُمْ خِيْفَةً فَلَيْسَ مِنَّا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جب سے ہم نے سانپوں سے لڑائی شروع کی ہے اس وقت سے ہم نے ان سے مصالحت نہیں کی ہے۔ لہٰذا جو شخص ان سانپوں میں سے کسی سانپ کو (اس) خوف کی وجہ سے (مارنے سے) باز رہے (کہ خود وہ سانپ یا اس کا جوڑا نقصان پہنچائے گا اور بدلہ لے گا، تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ایک دوسری روایت میں منذ حاربناهم کے بجائے منذ عادیناهم کے الفاظ منقول ہیں۔ "یعنی جب سے ہمارے اور سانپوں کے درمیان لڑائی اور دشمنی واقع ہوئی ہے" بہرحال مراد یہ کہ انسان اور سانپ کے درمیان دشمنی اور لڑائی ایک طبعی اور جبلی چیز ہے کہ ہر ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتا ہے، اگر انسان سانپ کو دیکھتا ہے تو اس کو ضرور مار ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر سانپ موقع پاتا ہے تو اس کو کاٹے اور ڈسے بغیر نہیں رہتا، بلکہ بعض علماء نے تو یہ کہا ہے کہ اس لڑائی اور دشمنی سے مراد دراصل وہ عداوت ہے جو اولاد آدم علیہ السلام کی تخلیق سے بھی پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور سانپ کے درمیان قائم ہوئی تھی، جیسا کہ ایک روایت میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے جنت میں داخل ہونا چاہا، تو جنت کے داروغہ نے اس کو روک دیا چنانچہ یہ سانپ ہی تھا جو ابلیس کا کام آیا اس نے ابلیس کو اپنے منہ کے اندر لے کر جنت میں پہنچا دیا اور پھر ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام وحوا کے لئے اپنے مکروفریب کا جال پھیلا کر ان کو وسوسہ میں ڈال دیا اور ان دونوں نے جنت کے اس درخت سے کھالیا، جس کے پاس جانے سے بھی ان کو منع کر دیا تھا اور آخر کار ان دونوں کو جنت سے نکال دیا گیا اور حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام وحوا علیہا ، اور ابلیس وسانپ کو خطاب کر کے فرمایا اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے سانپ کی شکل وصورت بہت اچھی اور خوشنما تھی مگر اس کے اس سخت جرم کے عذاب میں کہ وہ ابلیس کا آلہ کار بنا اس کی صورت مسخ کر دی گئی، لہٰذا سانپ اس کے مستحق ہے کہ اس کے تئیں یہ عداوت ونفرت ہمیشہ باقی رکھی جائے۔

واضح رہے کہ ماسلمنا‌ھم منذحاربناھم میں سانپوں کے لئے ذوی العقول کی ضمیر اس لئے استعمال ہوئی ہے کہ ان کی طرف صلح کی نسبت کی گئی ہے جو ذوی العقول کے افعال میں سے ہے۔ جیسے کہ اس آیت کریمہ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ میں سورج اور چاند کے لئے ذوی العقول کی ضمیر لائی گئی ہے ورنہ قاعدے کے اعتبار سے ان کے لئے غیر ذوی العقول کی ضمیر استعمال کرتے ہوئے یہ کہنا چاہئے تھا ماسالمناھن منذحاربناھن۔

(۳۶) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُقْتُلُوا الْحَيَّاتِ كُلَّهُنَّ فَمَنْ خَافَ ثَارَهُنَّ فَلَيْسَ مِنِّيْ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" تمام سانپوں کو قتل کر دو اگر کوئی شخص ان کے انتقام کے خوف زدہ ہوا تو وہ مجھ سے نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے تو یہ واضح ہوتا ہے ہر قسم کے سانپوں کو مارنا چاہئے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس عمومی حکم سے عوامر یعنی گھروں میں رہنے والے سانپوں کا استثناء کیا جانا چاہئے یا پھر یہ کہا جائے کہ "قتل" سے مراد یہ ہے کہ آگاہ کرنے کے بعد مارو، جیسا کہ

پہلے حضرت ابوسائب ؓ کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔

(۳۷) وَعَنِ الْعَبَّاسِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نُرِيْدُ اَنْ نَكْنُسَ زَمْزَمَ وَاِنَّ فِيْهَا مِنْ هٰذِهِ الْجِنَانِ يَعْنِى الْحَيَّاتِ الصِّغَارِ فَاَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِهِنَّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عباس ؓ سے روایت ہے انہوں نے (ایک دن) عرض کیا کہ "یارسول اللہ! ہم زمزم کے کنوئیں کی صفائی کرنا چاہتے ہیں لیکن اس میں سانپ یعنی چھوٹے سانپ ہیں؟" چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہر قسم کے چھوٹے سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا تھا، لیکن آگے جو حدیث آرہی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان میں سے ایک قسم کے سانپوں کو مارنے سے منع فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موقع پر چاہ زمزم کو صاف کرنا ان سب سانپوں کو مار ڈالنے بغیر ممکن نہیں تھا، جب کہ دوسری صورتوں میں ان میں سے بعض قسم کے سانپوں کا استثناء ممکن ہے۔

سفید چھوٹے سانپ کو مارنے کی ممانعت

(۳۸) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُقْتُلُوا الْحَيَّاتِ كُلَّهَا اِلَّا الْجَانَّ الْاَبْيَضَ الَّذِىْ كَاَنَّهٗ قَضِيْبُ فِضَّةٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تمام سانپوں کو مارو علاوہ جان یعنی سفید چھوٹے سانپ کے جو چاندی کی چھڑی کی طرح ہوتا ہے۔" (ابوداؤد ؒ)

تشریح: اس سانپ کو مارنے سے شاید اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ وہ ضرر نہیں پہنچاتا۔

کھانے پینے کی چیز میں مکھی گر جائے تو اس کو غوطہ دے کر نکال دو

(۳۹) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِىْ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ فَامْقُلُوْهُ فَاِنَّ فِىْ اَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءً وَفِى الْاُخْرِ شِفَاءً فَاِنَّهٗ يَتَّقِىْ بِجَنَاحِهِ الَّذِىْ فِيْهِ الدَّاءُ فَلْيَغْمِسْهُ كُلَّهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں (کہ جس میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو) مکھی گر جائے تو اس کو غوطہ دو کیوں کہ اس کے ایک بازو میں بیماری ہے اور دوسرے بازو میں شفاء، اور مکھی (کسی چیز میں) پہلے اپنے اسی بازو کو ڈالتی ہے جس میں بیماری ہے لہذا پوری مکھی کو غوطہ دینا چاہئے (تاکہ شفا والے بازو سے ان جراثیم کا دفعیہ ہو جائے جو بیمار والے بازو کی وجہ سے کھانے پینے کی چیز میں پہنچ گئے ہیں۔" (ابوداؤد ؒ)

(۴۰) وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ الْخُدْرِىِّ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِى الطَّعَامِ فَامْقُلُوْهُ فَاِنَّ فِىْ اَحَدِ جَنَاحَيْهِ سَمًّا وَفِى الْاُخْرِ شِفَاءً فَاِنَّهٗ يُقَدِّمُ السَّمَّ وَيُؤَخِّرُ الشِّفَاءَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری ؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب کھانے میں مکھی گر جائے تو اس کو غوطہ دے لو۔ کیونکہ اس کے ایک بازو میں زہر ہے اور دوسرے بازو میں شفا ہے اور مکھی اپنے زہر والے بازو کو پہلے ڈالتی ہے اور پھر شفاء والے بازو کو۔" (شرح السنۃ)

وہ چار جانور جن کا مارنا ممنوع ہے

(۴۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ اَرْبَعٍ مِنَ الدَّوَابِّ النَّمْلَةِ وَالنَّحْلَةِ وَالْهُدْهُدِ

وَالصُّرَدِ۔ (رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ان) چار جانوروں کو مارنے سے منع فرمایا ہے چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور کلچڑی۔" (ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: چیونٹی کو مارنے سے منع کرنے کی مراد یہ ہے کہ اس کو اس وقت تک نہ مارا جائے جب تک کہ وہ نہ کاٹے، اگر وہ کاٹے تو پھر اس کو مارنا جائز ہوگا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جس چیونٹی کو مارنے سے منع فرمایا گیا ہے اس سے وہ بڑی چیونٹی مراد ہے جس کے پیر لمبے لمبے ہوتے ہیں اور اس کو مارنا ممنوع اس لئے ہے کہ اس کے کاٹنے سے ضرر نہیں پہنچتا۔

شہد کی مکھی کو مارنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے انسان کو بہت زیادہ فوائد پہنچتے ہیں بایں طور کہ شہد اور موم اسی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

"ہدہد" ایک پرندہ ہے جس کو کھٹ بڑھئی کہتے ہیں "صرد" بھی ایک پرندہ ہے جو بڑے سر، بڑی چونچ اور بڑے بڑے پروالا ہوتا ہے، وہ آدھا سیاہ ہوتا ہے اور آدھا سفید، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ شکاری پرندہ ہوتا ہے جو چڑیوں کا شکار کرتا ہے، ان دونوں پرندوں کو مارنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ ان کا گوشت کھانا حرام ہے اور جو جانور و پرندہ کھایا نہ جاتا ہو اس کو مارنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہدہد میں بدبو ہوتی ہے اس لئے وہ جلالہ کے حکم میں ہوگا۔ اہل عرب ہدہد اور صرد کی آوازوں کو منحوس اور بدفالی سمجھتے تھے، اس لئے بھی آنحضرت ﷺ نے ان کو مارنے سے منع فرمایا کہ لوگوں کے دلوں سے ان کی نحوست کا اعتقاد نکل جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حلت و حرمت کے احکام میں خواہش نفس کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے

(۴۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَاْكُلُوْنَ اَشْيَاءَ وَيَتْرُكُوْنَ اَشْيَاءَ تَقَذُّرًا فَبَعَثَ اللّٰهُ نَبِيَّهٗ وَاَنْزَلَ كِتَابَهٗ وَاَحَلَّ حَلَالَهٗ وَحَرَّمَ حَرَامَهٗ فَمَا اَحَلَّ فَهُوَ حَلَالٌ وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَفْوٌ وَتَلَا قُلْ لَّا اَجِدُ فِيْمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَتًا اَوْ دَمًا الْاٰيَةَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ (اپنی خواہش نفس کے مطابق) کچھ چیزوں کو کھاتے تھے، اور کچھ چیزوں کو چھوڑ دیتے تھے، یعنی جن چیزوں سے ان کو نفرت ہوتی ان کو نہیں کھاتے تھے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا اور (ان نبی ﷺ پر اور ان کے ذریعہ ان کی اُمت پر) اپنی کتاب نازل کی اور اپنی حلال چیزوں کو حلال قرار دیا اور اپنی حرام چیزوں کو حرام قرار دیا (یعنی یہ بیان کر دیا کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے نیز اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حلال کیا ہے وہی حلال ہے اس کے علاوہ حلال نہیں ہے) اور جس چیز کو حرام کہا ہے وہی حرام ہے اور جس چیز سے سکوت اختیار کیا (یعنی جس چیز کے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ یہ حلال ہے یا حرام) تو وہ چیز معاف ہے (کہ اس پر مواخذہ نہیں) اور پھر حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت پڑھی "اے محمد (ﷺ) کہہ دیجئے کہ جو احکام بذریعہ وحی میرے پاس آتے ہیں ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا خون۔ الخ۔" (ابوداؤد)

تشریح: لفظ "حلالہ" میں مصدر استعمال کیا گیا ہے جو مفعول کے قائم مقام ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی بعثت اور اپنی کتاب ہدایت (قرآن مجید) کے نزول کے ذریعہ اس چیز کو ظاہر و واضح کر دیا جو حلال کی گئی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے جو آیت تلاوت کی وہ پوری یوں ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ (الانعام ۶: ۱۴۵)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے کہ جو احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں ان میں تو کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے مگر یہ کہ وہ مردار (مرا ہوا جانور) ہو یا بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے یا جو جانور شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو۔"

یہ آیت کریمہ حضرت ابن عباسؓ نے ان لوگوں کی تردید میں پڑھی جو محض اپنی خواہش نفس کی بنا پر کسی چیز کی حلت و حرمت کے فیصلہ کرتے تھے، کہ جس چیز کی طرف ان کی طبیعت راغب ہوئی اس کو حلال جان کر کھاتے اور جس چیز سے ان کو کراہت و نفرت ہوتی، اس کو حرام سمجھ کر ترک کر دیتے، لہٰذا حضرت ابن عباسؓ نے ان لوگوں پر اس آیت کے ذریعہ گویا یہ واضح کیا کہ حلال وہی چیز ہے، جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام نے حلال قرار دیا ہو اور حرام وہی چیز ہے، جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہو نہ کہ حلت و حرمت کا تعلق خواہش نفس سے ہے۔

از قسم جانور و گوشت جن چیزوں کے حرام ہونے کا حکم کتاب اللہ میں بیان کیا گیا ہے، وہ بس یہی ہیں جو اس آیت میں ذکر ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ اور دوسری چیزوں کی حرمت سُنّت نبوی ﷺ سے ثابت ہوئی ہے۔ اور وہ چونکہ زیادہ ہیں اس لئے حضرت ابن عباسؓ نے ان کے بارے میں منقول احادیث بیان نہیں کیں، محض اس آیت کی تلاوت پر اکتفا کیا۔

گدھے کا گوشت کھانے کی ممانعت

(۴۳) وَعَنْ زَاهِرٍ الْاَسْلَمِيِّ قَالَ اِنِّيْ لَاُوْقِدُ تَحْتَ الْقُدُوْرِ بِلُحُوْمِ الْحُمُرِ اِذْ نَادٰى مُنَادِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَاكُمْ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت زاہر اسلمیؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں اس ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہا تھا، جس میں گدھے کا گوشت (پکنے کے لئے رکھا ہوا) تھا کہ اچانک رسول کریم ﷺ کی طرف سے اعلان کرنے والے نے یہ اعلان کیا کہ "رسول اللہ ﷺ تمہیں گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرماتے ہیں۔" (بخاریؒ)

جنات کی قسمیں

(۴۴) وَعَنْ اَبِيْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ يَرْفَعُهُ الْجِنُّ ثَلَاثَةُ اَصْنَافٍ صِنْفٌ لَهُمْ اَجْنِحَةٌ يَطِيْرُوْنَ فِي الْهَوَاءِ وَصِنْفٌ حَيَّاتٌ وَكِلَابٌ وَصِنْفٌ يَحُلُّوْنَ وَيَظْعَنُوْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ بطریق مرفوع نقل کرتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ نے فرمایا جنات کی تین قسمیں ہیں، ایک تو وہ جن کے پر ہوتے ہیں اور وہ ہوا میں اڑتے ہیں، دوسری قسم وہ ہیں جو سانپ اور کتے (کی شکل میں نظر آتے ہیں، اور تیسری قسم وہ ہیں جو منزل پر اترتے اور کوچ کرتے ہیں۔" (شرح السنۃ)

بَابُ الْعَقِيْقَةِ

عقیقہ کا بیان

عقیقہ "عقٌ" سے مشتق ہے، لغت میں عق کے معنی ہیں "چیرنا، پھاڑنا" اصلاح میں عقیقہ ان بالوں کو کہتے ہیں جو نوزائیدہ کے سر پر

ہوتے ہیں۔ ان بالوں کو عقیقہ اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ بال ساتویں دن مونڈے جاتے ہیں اور اس مناسبت سے عقیقہ اس بکری کو بھی کہتے ہیں جو بچے کے سر مونڈنے کے وقت ذبح کی جاتی ہے۔

عقیقہ کی شرعی حیثیت: عقیقہ کی شرعی حیثیت کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں، ائمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام احمدؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک عقیقہ سُنّت ہے اور اکثر احادیث سے بھی اس کا سُنّت ہونا معلوم ہوتا ہے حضرت امام احمدؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ عقیقہ واجب ہے۔ جہاں تک حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک عقیقہ سُنّت نہیں ہیں بلکہ مستحب ہے جو سُنّت سے ثابت ہے۔ مشہور حنفی مجتہد حضرت امام محمدؒ نے اپنی کتاب مؤطا میں یہ لکھا ہے کہ "ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ عقیقہ (اصل میں) زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی رائج رہی مگر پھر قربانی نے ہر اس ذبح (کے وجوب) کو منسوخ قرار دیا جو قربانی سے پہلے رائج تھا، رمضان کے روزوں نے ہر اس روزے (کے وجوب) کو منسوخ قرار دیا جو اس سے پہلے رائج تھا، غسل جنابت نے ہر اس غسل (کے وجوب کو) منسوخ قرار دے دیا جو اس سے پہلے رائج تھا، زکوۃ نے ہر اس صدقہ (کے وجوب) کو منسوخ قرار دے دیا جو اس سے پہلے رائج تھا۔

عقیقہ کے احکام: جو احکام و شرائط قربانی کے سلسلے میں منقول و معتبر ہیں وہی احکام و شرائط عقیقہ کے بارے میں بھی مقبول و معتبر ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عقیقہ کرنے کا حکم

① عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرِ الضَّبِّیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَعَ الْغُلَامِ عَقِیْقَۃٌ فَاھْرِیْقُوْا عَنْہُ دَمًا وَاَمِیْطُوْا عَنْہُ الْاَذٰی۔ (رواہ البخاری)

"حضرت سلمان ابن عامر ضبیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "لڑکے کی پیدائش پر عقیقہ کرنا (مسنون یا مستحب) ہے لہٰذا اس کی طرف سے جانور ذبح کرو اور اس سے ایذا (یعنی اس کے سر کے بال اور میل کچیل) دور کرو۔" (بخاریؒ)

تحنیک ایک مسنون عمل ہے

② وَعَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُؤْتٰی بِالصِّبْیَانِ فَیُبَرِّکُ عَلَیْھِمْ وَیُحَنِّکُھُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے پاس (نوزائیدہ) بچے لائے جاتے چنانچہ آپ ﷺ ان کے لئے برکت کی دعا کرتے یعنی ان کے سامنے فرماتے، بَارَكَ اللّٰہُ عَلَیْكَ اللہ تعالیٰ تجھ پر برکت و رحمت نازل فرمائے) اور ان کے تحنیک کرتے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "تحنیک" یہ ہے کہ کھجور یا کسی اور میٹھی چیز کو چبا کر بچے کے تالو میں لگایا جائے چنانچہ یہ تحنیک ایک مسنون عمل ہے اور بہتر یہ ہے کہ تحنیک کرنے والا کوئی نیک اور صالح آدمی ہو۔

③ وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ اَنَّھَا حَمَلَتْ بِعَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الزُّبَیْرِ بِمَکَّۃَ قَالَتْ فَوَلَدْتُّ بِقُبَاءٍ ثُمَّ اَتَیْتُ بِہٖ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَوَضَعْتُہٗ فِیْ حَجْرِہٖ ثُمَّ دَعَا بِتَمْرَۃٍ فَمَضَغَھَا ثُمَّ تَفَلَ فِیْ فِیْہِ ثُمَّ حَنَّکَہٗ ثُمَّ دَعَا لَہٗ وَبَرَّكَ عَلَیْہِ وَکَانَ اَوَّلَ مَوْلُوْدٍ وُّلِدَ فِی الْاِسْلَامِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ مکہ میں عبداللہ ابن زبیرؓ ان کے پیٹ میں آئے، حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ قباء کے مقام پر میرے ولادت ہوئی تو میں ان (عبداللہؓ) کو لے کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں آئی، اور ان کو آنحضرت ﷺ کی گود میں دے دیا

آنحضرت ﷺ نے کھجور منگائی، اور اس کو چبایا، پھر اپنا آب دہن ان کے منہ میں ڈالا یعنی آپ ﷺ نے، اس کھجور کو جو آپ ﷺ کے لعاب مبارک کے ساتھ مخلوط ہوگئی تھی، عبداللہؓ کے منہ میں رکھا اور پھر وہ کھجور ان کے تالو میں لگائی، اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے لئے دعا کی اور برکت چاہی (یعنی یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس پر برکت نازل فرمائے) چنانچہ عبداللہ ابن زبیرؓ پہلے شخص تھے، جو اسلام (کے عہد) میں پیدا ہوئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "قبا" مدینہ شہر سے جنوب مغربی سمت تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک آبادی ہے۔ مکہ سے مدینہ کے لئے سفر ہجرت میں آنحضرت ﷺ کی یہ آخری منزل تھی، جہاں آپ ﷺ مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے اترے اور تین دن یا چار دن قیام فرمایا، جس جگہ آپ ﷺ نے قیام فرمایا تھا اس جگہ آپ ﷺ نے ایک مسجد کی بنیاد رکھی، جس کو مسجد قبا کہتے ہیں، قبا اگرچہ مدینہ منورہ سے باہر ہے، لیکن اس کا تعلق ایک طرح سے ایسا ہی ہے جیسا کہ محلہ کا ہوتا ہے۔ اس جگہ بڑی شادابی ہے۔ اور مختلف پھلوں اور میووں کے باغات ہیں، اسی قبا میں بئر اریس نامی کنواں ہے، جہاں آپ ﷺ نے چند صحابہؓ کو جنت کی بشارت دی تھی، اور جس میں حضرت عثمانؓ کے عہد میں آنحضرت کی وہ انگوٹھی گر گئی تھی، جس سے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدینؓ مہر لگایا کرتے تھے، اس کنویں کا پانی بہت کھارا تھا، کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنا لعاب دہن شامل فرمایا جب سے اس کا پانی میٹھا ہے، مگر اب یہ کنواں خشک ہو گیا ہے۔

عبداللہ ابن زبیرؓ پہلے شخص تھے الخ کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کے بعد مہاجرین میں جو سب سے پہلا بچہ پیدا ہوا وہ عبداللہ ابن زبیرؓ تھے، "مہاجرین" کی قید اس لئے لگائی گئی کہ ہجرت کے بعد حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی پیدائش سے بھی پہلے مدینہ میں مسلمانوں کے یہاں سب سے پہلا پیدا ہونے والا بچہ نعمان ابن بشیر انصاریؓ تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

عقیقہ کے جانوروں کی تعداد

④ عَنْ اُمِّ كُرْزٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَقِرُّوا الطَّيْرَ عَلٰى مَكِنَاتِهَا قَالَتْ وَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ وَلَا يَضُرُّكُمْ ذُكْرَانًا كُنَّا اَوْ اِنَاثًا رواه ابو داؤد والترمذی والنسائی من قوله يقول عن الغلام الی اٰخره وقال الترمذی هذا حديث صحيح۔

"حضرت اُم کرزؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں قرار دو، اُم کرزؓ کہتی ہیں کہ۔ اور میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ "(عقیقہ میں) لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ہے، اور اس میں تمہارے لئے کوئی نقصان نہیں ہے کہ وہ (بکری) نر ہو یا مادہ، یعنی اس بات کا لحاظ ضروری نہیں کہ لڑکے کے عقیقہ میں بکرے ذبح کئے جائیں اور لڑکی کے عقیقہ میں بکری ذبح کی جائے (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ) نسائی کی روایت میں یقول عن الغلام سے آخر تک ہے۔ نیز ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: "مَكِنَات" میم کے زبر اور کاف کے زیر اور زبر دونوں کے ساتھ ہے اور مشکوٰۃ کے ایک نسخہ میں کاف کے پیش کے ساتھ بھی منقول ہے۔ اس کے معنی "مکان" کے ہیں۔

اس ارشاد گرامی "پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں قرار دو" کا مطلب یہ ہے کہ ان (پرندوں) کو ان کے گھونسلوں میں رہنے دو اڑاؤ نہیں۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مَكِنَات اصل میں جمع ہے مَكِنَة کی جس کے معنی "سوسمار (گوہ) کے انڈے" کے ہیں، لیکن یہاں

یہ لفظ مطلق انڈوں کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اس صورت میں اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر پرندے انڈوں پر بیٹھے ہوں تو ان کے گھونسلوں کو ہلا کر ان کو ستاؤمت۔ یا پھر اس ارشاد گرامی کا تعلق تطیر اور فال بد لینے کی ممانعت سے ہے، جیسا کہ عرب میں لوگوں کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی کام کا قصد کرتا، یا کہیں کا سفر کرنے کا ارادہ کرتا، تو پرندے کے گھونسلے پر آتا اور اس کو چھیڑ کر اڑاتا، اگر وہ پرندہ داہنی طرف اڑتا تو مبارک جان کر اور فال نیک سمجھ کر اس کام کو کرتا، یا سفر پر روانہ ہو جاتا، اور اگر وہ پرندہ بائیں طرف اڑتا تو اس کو منحوس سمجھ کر اس کام یا سفر سے باز رہتا، اس کو تطیر کہتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا، کہ پرندہ جہاں ہو اس کو وہیں رہنے دو کہ اس کو مت اڑاؤ اور نہ اس سے بدفالی لو۔

عقیقہ کی اہمیت

⑤ وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْغُلَامُ مُرْتَهَنٌ بِعَقِيْقَتِهٖ يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ وَيُسَمّٰى وَيُحْلَقُ رَأْسُهٗ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ لٰكِنَّ فِي رِوَايَتِهِمَا رَهِيْنَةٌ بَدَلَ مُرْتَهَنٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَحْمَدَ وَاَبِيْ دَاوُدَ وَيُدَمّٰى مَكَانَ وَيُسَمّٰى وَقَالَ اَبُوْدَاوُدَ وَيُسَمّٰى اَصَحُّ۔

"اور حضرت حسن بصریؒ حضرت سمرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر (بچہ) اپنے عقیقہ کے بدلے گروی ہے (اس کی پیدائش کے) ساتویں دن اس کے (عقیقہ کے) لئے (جانور) ذبح کیا جائے (ساتویں ہی دن) اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر مونڈا جائے۔" اس روایت کو احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ نے نقل کیا ہے لیکن ابوداؤدؒ نسائیؒ کی روایت میں مرتھن کے بجائے رَهِيْنَةٌ ہے اور احمدؒ وابوداؤدؒ کی ایک روایت میں يُسَمّٰى کے بجائے وَيُدَمّٰى ہے اور ابوداؤدؒ نے کہا ہے کہ لفظ یسمی ہی زیادہ صحیح ہے۔"

تشریح: ظاہر ہے کہ بچہ چونکہ مکلف نہیں ہے کہ اگر اس کا عقیقہ نہ کیا جائے تو اس کے ماخوذ و معتوب ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، اس صورت میں بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر عقیقہ کے عوض بچے کے گروی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ چنانچہ حضرت امام احمدؒ نے تو اس ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ بیان کیا ہے، کہ جس بچے کا عقیقہ نہیں ہوتا اور وہ کم سنی میں مر جاتا ہے تو اس کو اپنے والدین کی شفاعت کرنے سے روک دیا جاتا ہے کہ جب تک والدین اس کا عقیقہ نہ کردیں وہ اس کے حق میں شفاعت کرنے کا اہل نہیں ہوگا۔ بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جب تک والدین بچہ کا عقیقہ نہیں کرتے اس کو بھلائیوں سلامتی آفات اور بہتر نشو و نما سے باز رکھا جاتا ہے اور پھر اس کے جو برے نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ حقیقت میں والدین کے مواخذہ کا سبب بنتے ہیں کہ ترک عقیقہ انہوں نے ہی کیا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ گروی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ بچہ اپنے بالوں وغیرہ کی گندگی و اذیت میں مبتلا رہتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ فَاَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى (بچے کو اذیت سے ہٹاؤ) یعنی اس کے بال میل کچیل اور خون وغیرہ صاف کرو) لہٰذا جب بچہ کا عقیقہ ہوتا ہے تو وہ گویا سر کے بال وغیرہ صاف ہو جانے سے اس اذیت سے نجات پا جاتا ہے۔

لفظ يُدَمّٰى۔ یا کے پیش دال کے زبر اور میم مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ تدمیہ سے مشتق ہے جس کے معنی "خون آلود کرنے۔" کے ہیں۔ لہٰذا ایک روایت میں ویسمی (اور اس کا نام رکھا جائے) کی جگہ وَيُدَمّٰى ہے۔ لیکن جیسا کہ ابوداؤدؒ نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس جگہ لفظ ویسمی ہی ہونا چاہئے۔ تاہم قتادہؒ نے وَيُدَمّٰى کی تشریح یہ کی ہے کہ جب عقیقہ کے جانور کو ذبح کیا جائے تو اس کے تھوڑے سے بال لے کر اس کی گردن کے سامنے رکھ دیا جائے تاکہ وہ (بال) اس کے خون سے آلودہ ہو جائیں جو ذبح کے وقت اس جانور کی گردن کی رگوں سے نکلے اور پھر وہ خون آلودہ بال اس بچے کی چندیا پر اس طرح رکھ دیا جائے کہ خون اس کی چندیا پر ایک لکیر کی صورت میں بہے اور اس کے بعد بچہ کا سر دھو کر منڈوا دیا جائے۔ سفر السعادة کے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ (تدمیہ) نہ کیا جائے کیونکہ روایت میں لفظ یدمی دراصل کسی راوی کی طرف سے تحریف ہے جس کا آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ

آنحضرت ﷺ سے تدمیہ ثابت ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کا عقیقہ کیا، لیکن یہ عملی (تدمیہ) نہیں کیا تھا، نیز یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عمل دراصل زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی جس کو منسوخ قرار دیا گیا، جیسا کہ اس باب کی تیسری فصل میں آنے والی حدیث سے واضح ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ ابوداؤدؒ کی روایت میں لفظ یدمی کا منقول ہونا حدیث کے ایک راوی ہمامؒ کا وہم ہے اور قتادہؒ نے اس لفظ کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے وہ منسوخ ہے، خطابیؒ نے کہا کہ جب آنحضرت ﷺ نے بچے کے بدن سے اذیت اور سوکھی پلیدی کو دور کرنے کا حکم فرمایا تو اس کے سر کو تر خون سے آلودہ کر کے نجس کرنے کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے، تاہم بعض علماء نے بچے کے سر کو خون سے آلودہ کرنے کے بجائے خلوق اور زعفران جیسی خوشبوؤں سے لتھیڑنا نقل کیا ہے۔

لڑکے کے عقیقہ میں ایک بکری ذبح کرنے کا مسئلہ

⑥ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ قَالَ عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْحَسَنِ بِشَاةٍ وَقَالَ يَا فَاطِمَةُ اَحْلِقِیْ رَأْسَهٗ وَ تَصَدَّقِیْ بِزِنَةِ شَعْرِهٖ فِضَّةً فَوَزَنَّاهُ فَكَانَ وَزْنُهٗ دِرْهَمًا اَوْبَعْضَ دِرْهَمٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ وَاِسْنَادُهٗ لَيْسَ بِمُتَّصِلٍ لِاَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ لَمْ يُدْرِكْ عَلِيَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ۔

"حضرت محمد ابن علی ابن حسینؓ (یعنی حضرت امام محمد باقر ابن امام زین العابدینؒ ابن امام حسین شہیدؓ) حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "رسول کریم ﷺ نے (اپنے نواسے اور میرے بچے) حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری ذبح کی تھی اور فرمایا کہ "فاطمہؓ! اس (حسنؓ) کا سر مونڈو اور اس کے بال کے ہم وزن چاندی صدقہ کردو۔" چنانچہ ہم نے ان بالوں کا وزن کیا تو وہ ایک درہم یا ایک درہم سے کم وزن کے تھے۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور اس کی اسناد متصل یعنی مسلسل نہیں ہے۔ کیونکہ محمد ابن علی ابن حسین نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لڑکے کے عقیقہ میں ایک بکری یا بکرا بھی ذبح کیا جا سکتا ہے، نیز ابوداؤدؒ نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی طرف سے عقیقہ میں ایک ایک مینڈھا ذبح کیا، یہ حدیث آگے آرہی ہے، لیکن نسائیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے دو دو مینڈھے روایت کئے ہیں اور حضرت بریدہؓ نے مطلق نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی طرف سے عقیقہ کیا۔ سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اگرچہ ایک بکری کی روایت بھی صحیح ہے۔ لیکن زیادہ مضبوط اور زیادہ صحیح وہی روایت ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ لڑکے کے عقیقہ میں دو بکریاں ذبح کی جائیں، کیونکہ اس روایت کو صحابہؓ کی ایک پوری جماعت نے نقل کیا ہے نیز لڑکے کے عقیقہ میں دو بکری کو ذبح کرنے کو ترجیح دینے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایک بکری ذبح کرنا آپ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ اور دو بکریاں ذبح کرنا آپ ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز قول سے ثابت ہو وہ فعل سے کہیں زیادہ مضبوط اور کہیں زیادہ مکمل سمجھی جاتی ہے، کیوں کہ فعل کے بارے میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص حالت سے متعلق ہو، جب کہ قول میں عمومیت واکملیت ہوتی ہے، اور ایک بات یہ بھی ہے کہ فعل تو محض جواز پر دلالت کرتا ہے اور قول سے جواز کے ساتھ استحباب بھی ثابت ہوتا ہے، ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس سلسلے میں جن صحابہؓ کی روایتیں منقول ہیں، وہ یہ ہیں، حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت اُمّ کرزؓ، حضرت بریدہؓ، حضرت سمرہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت سلمان ابن عامرؓ اور حضرت ابن عباسؓ۔

اور ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے، احتمال ہے کہ لڑکے کے حق میں استحباب کا کم سے کم درجہ ایک بکری ہو اور کمال استحباب دو بکری ہو

جس حدیث میں ایک بکری یا ایک مینڈھے کا ذکر ہے اس کے بارے میں احتمال ہے کہ یہ حدیث کم سے کم درجہ یا اکتفا کرنے کے جواز کو ظاہر کرنے کے لئے ہو یا یہ کہ یہ حدیث دراصل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ لازم اور ضروری نہیں ہے کہ لڑکے کے عقیقہ میں جو دو بکری یا جو دو مینڈھے ذبح کئے جاتے ہیں، وہ دونوں ساتویں ہی دن ذبح ہوں، لہٰذا ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حسنؓ و حسینؓ کی طرف سے ایک ایک بکری یا ایک ایک مینڈھا تو ان کی پیدائش کے دن ہی ذبح کر دیا ہو اور دوسری بکری یا دوسرے مینڈھے کو ساتویں دن ذبح کیا ہو اس تاویل و توضیح کی صورت میں تمام روایتوں کے درمیان مطابقت و یکسانیت پیدا ہو جائے گی اور کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک ہی مینڈھا یا ایک بکری کے ذریعہ عقیقہ کیا اور اس کے ساتھ حضرت علیؓ یا حضرت فاطمہؓ کو حکم فرمایا کہ دوسرا مینڈھا یا دوسری بکری وہ ذبح کر دیں، لہٰذا جس روایت میں ایک بکری یا ایک مینڈھے کا ذکر ہے اس میں تو گویا آنحضرت ﷺ کی طرف یہ نسبت کہ آپ ﷺ نے ایک بکری یا ایک مینڈھے کے ذریعہ عقیقہ کیا حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ اور جس روایت میں آپ ﷺ کی طرف دو بکری یا دو دنبے کو ذبح کرنے کی نسبت کی گئی ہے وہ مجازاً ہے۔

"اس کا سر مونڈو"۔ یہ حکم یا تو حقیقۃً تھا کہ فاطمہؓ تم اپنے ہاتھ سے اس کا سر مونڈو، یا یہ مطلب تھا کہ کسی دوسرے شخص کو حکم دو کہ اس کا سر مونڈ دے۔ یہ امر (یعنی آنحضرت ﷺ کی طرف سے سر مونڈنے کا حکم دیا جانا، استحباب کے طور پر ہے۔ اسی طرح بالوں کو وزن کرنے کا حکم بھی بطریق استحباب کے ہے۔

⑦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ كَبْشًا كَبْشًا رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَعِنْدَ النَّسَائِيِّ كَبْشَيْنِ كَبْشَيْنِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے عقیقہ میں ایک ایک مینڈھا ذبح کیا۔ (ابوداؤدؒ) اور نسائیؒ نے دو دو مینڈھے نقل کئے ہیں۔"

بچے کو عقوق سے بچانے کے لئے اس کا عقیقہ کرو

⑧ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْعَقِيْقَةِ فَقَالَ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْعُقُوْقَ كَاَنَّهٗ كَرِهَ الْاِسْمَ وَقَالَ مَنْ وُلِدَ لَهٗ وَلَدٌ فَاَحَبَّ اَنْ يَّنْسُكَ عَنْهُ فَلْيَنْسُكْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَيْنِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةً۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول کریم ﷺ سے عقیقہ کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عقوق کو پسند نہیں کرتا۔ گویا آنحضرت ﷺ نے اس فعل کو لفظ عقیقہ سے موسوم کئے جانے کو ناپسند فرمایا۔ اور پھر فرمایا کہ جس شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہو اس کو چاہئے، کہ وہ اس لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "اللہ تعالیٰ عقوق کو پسند نہیں کرتا" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کا لڑکا بڑی عمر میں پہنچ کر والدین کے حق میں عاق نہ ہو یعنی والدین کی نافرمانی کرنے والا نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کی چھوٹی عمر میں عقیقہ (کا جانور) ذبح کرے۔ کیونکہ والدین کا عقوق (یعنی والدین کا اپنے بچے کا عقیقہ نہ کرکے گویا ایک طرح کی نافرمانی کرنا) دراصل لڑکے کے عقوق (یعنی لڑکے کے نافرمان بردار ہو جانے کا باعث ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ عقوق کو کسی حالت میں پسند نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے حدیث کے الفاظ گویا من ولد لہ (جس شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہوا الخ) کی تمہید کے طور پر ہیں۔

"گویا آنحضرت ﷺ نے اس فعل کو لفظ عقیقہ سے موسوم کئے جانے کو ناپسند فرمایا۔" روایت کے یہ الفاظ کسی راوی کے اپنے ہیں کہ

آنحضرت ﷺ نے عقیقہ کو "عقیقہ" کے لفظ سے موسوم کئے جانے کو پسند نہیں فرمایا۔ تاکہ یہ گمان نہ ہو کہ یہ "عقیقہ" عقوق سے مشتق ہے، جس کے معنی والدین سے سرکشی اور ان کی نافرمانی کرنا ہیں) جب کہ آپ ﷺ نے یہ پسند فرمایا کہ اس کو اس سے بہتر نام جیسے ذبیحہ یا نسیکہ سے موسوم کیا جائے (نہایہ) لیکن تورپشی نے کہا ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اس بات کی نسبت کہ (گویا آپ ﷺ نے "عقیقہ" کہے جانے کو ناپسند فرمایا) غیر موزوں ہے۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے کتنے ہی ارشادات میں "عقیقہ" ہی کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اگر آپ ﷺ کے نزدیک یہ لفظ ناپسندیدہ ہوتا، تو آپ ﷺ اس کا ذکر کیوں فرماتے، لیکن اس سلسلے میں اگر یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔ کہ یہ احتمال ہے کہ سوال کرنے والے نے یہ گمان کیا ہو کہ مادۂ اشتقاق میں عقیقہ اور عقوق کا مشترک ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ حکم کے اعتبار سے عقیقہ کی زیادہ اہمیت نہ ہو۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنے جواب کے ذریعہ یہ واضح کر دیا کہ امر واقعی اس کے خلاف ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے نہایہ کی مذکورہ بالا وضاحت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جن احادیث میں آنحضرت کا عقیقہ کا لفظ ذکر کرنا منقول ہے وہ اس کراہت سے پہلے کی ہوں گی۔

بچے کے کان میں اذان دینا مسنون ہے

(۹) وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَذَّنَ فِیْ اُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیٍّ حِیْنَ وَلَدَتْہُ فَاطِمَۃُ بِالصَّلٰوۃِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے حسنؓ ابن علیؓ کے کان میں اذان دی، جب کہ حضرت فاطمہؓ کے ہاں ان کی ولادت ہوئی، اور وہ اذان نماز کی اذان کی طرح تھی۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے کان میں اذان دینا سُنّت ہے۔ مسند ابویعلی موصلی میں حضرت حسینؓ نے بطریق مرفوع (یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد) نقل کیا ہے کہ "جس شخص کے ہاں بچہ پیدا ہو اور وہ اس کے دائیں کان میں اذان دے اور بائیں کان میں تکبیر کہے، تو اس کو ام الصبیان سے ضرر نہیں پہنچے گا۔ نیز امام نوویؒ کے کتاب الروضہ میں لکھا ہے کہ بچے کے کان میں یہ الفاظ کہنے بھی مستحب ہیں۔ اِنِّیْ اُعِیْذُھَا بِكَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عقیقہ کا دن

(۱۰) عَنْ بُرَیْدَۃَ قَالَ کُنَّا فِی الْجَاھِلِیَّۃِ اِذَا وُلِدَ لِاَحَدِنَا غُلَامٌ ذَبَحَ شَاۃً وَلَطَخَ رَاْسَہٗ بِدَمِھَا فَلَمَّا جَآءَ الْاِسْلَامُ کُنَّا نَذْبَحُ الشَّاۃَ یَوْمَ السَّابِعِ وَنَحْلِقُ رَاْسَہٗ وَنَلْطَخُہٗ بِزَعْفَرَانٍ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَزَادَ رَزِیْنٌ وَنُسَمِّیْہِ۔

"حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں ہمارا یہ دستور تھا کہ جب ہم میں سے کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بکری ذبح کرتا اور اس (بکری) کا خون اس (لڑکے) کے سر پر لگاتا، لیکن جب اسلام کا زمانہ آیا، تو ہم (بچے کی پیدائش کے) ساتویں دن بکری ذبح کرتے، اس کا سر مونڈتے اور اس کے سر پر زعفران لگاتے (ابوداؤدؒ) اور زرینؒ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ہم (ساتویں ہی دن) اس کا نام رکھتے۔"

تشریح: واضح رہے.... کہ اکثر احادیث کے بموجب بچہ کا عقیقہ اس کی پیدائش کے ساتویں دن ہونا چاہئے، اور حضرت امام شافعیؒ و حضرت امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ساتویں دن عقیقہ کرنا ممکن نہ ہوسکے تو پھر چودھویں دن کیا جائے، اگر چودھویں دن بھی نہ کرسکے تو اکیسویں دن، ورنہ اٹھائیسویں دن، پھر پینتیسویں دن علی ہذا القیاس۔

ایک راویت میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنا عقیقہ ظہور نبوت کے بعد کیا تھا، کیوں کہ آپ ﷺ کو یہ علم نہیں ہوسکا تھا کہ پیدائش کے دن آپ ﷺ کا عقیقہ ہوا تھا یا نہیں۔ لیکن اول تو اس روایت کی اسناد ضعیف ہے، دوسرے معنوی طور پر بھی یہ روایت بعد سے خالی نہیں ہے۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک عقیقہ کی ہڈیاں توڑنی درست نہیں (بلکہ گوشت نکال کر ہڈیوں کو دفن کردیا جائے، جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی ہڈیاں توڑنا درست ہے۔ نیز شوافع کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر عقیقہ کا گوشت پکا کر صدقہ کیا جائے تو بہتر ہے، اور اگر حلاوت یعنی لڑکے کے اچھے اخلاق و طوار کے ساتھ تفاول کے پیش نظر اس گوشت کی کوئی میٹھی چیز پکا کر صدقہ کی جائے تو اور بہتر ہے۔

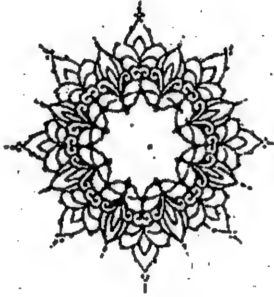

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الاطعمة

کھانوں کا بیان

"کتاب الاطعمہ" کے تحت جو ابواب آئیں گے اور ان میں جو احادیث نقل کی جائیں گی ان سے یہ واضح ہو گا کہ آنحضرت ﷺ نے کیا کیا چیزیں کھائی ہیں اور کون کون سی چیزیں نہیں کھائی ہیں، نیز کھانے پینے کے جو آداب و قواعد ہیں وہ بھی ان احادیث سے معلوم ہوں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کھانے کے تین آداب

① عَنْ عُمَرَ بْنِ اَبِیْ سَلَمَةَ قَالَ کُنْتُ غُلَامًا فِیْ حِجْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَکَانَتْ یَدِیْ تَطِیْشُ فِی الصَّحْفَةِ فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَمِّ اللّٰہَ وَکُلْ بِیَمِیْنِكَ وَکُلْ مِمَّا یَلِیْكَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عمر ابن ابی سلمہؓ کہتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور رسول کریم ﷺ کی پرورش و تربیت میں تھا (ایک دن میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا) اور میرا ہاتھ رکابی میں جلدی جلدی گھوم رہا تھا (یعنی جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے، میں اپنے سامنے سے کھانے کے بجائے ادھر ادھر ہاتھ ڈال رہا تھا) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "بسم اللہ کہو دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اس جانب سے کھاؤ جو تمہارے نزدیک ہے (یعنی اپنے سامنے سے کھاؤ۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں کھانے کے تین بنیادی آداب کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلا ادب تو یہ ہے کہ کھانے کی ابتداء بسم اللہ کہہ کر ہونی چاہئے۔ دوسرا ادب یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھانا چاہئے اور تیسرا ادب یہ ہے کہ کھانے کے برتن میں اپنے سامنے سے کھانا چاہئے۔ جمہور علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ بالا تینوں باتوں کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ استحباب کے طور پر ہے۔ اسی طرح دوسری روایت میں کھانے کے بعد خدا کی حمد و شکر کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بھی مسئلہ ہے کہ اگر ایک دسترخوان پر کئی آدمی کھانے بیٹھیں تو سب لوگ بسم اللہ کہیں! جب کہ بعض علماء کے نزدیک کہ جن میں حضرت امام شافعیؒ بھی شامل ہیں یہ کہتے ہیں کہ محض ایک آدمی کا بسم اللہ کہہ لینا سب کے لئے کافی ہو جائے گا۔ پانی یا دوا وغیرہ پینے کے وقت بسم اللہ کہنے کا بھی وہی حکم ہے جو کھانے کے شروع میں بسم اللہ کہنے کا ہے۔

کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنے کی اہمیت

② وَعَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّیْطَانَ یَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ اَنْ لَّا یُذْکَرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس کھانے پر خدا کا نام نہ لیا جائے، اس کو شیطان اپنے لئے حلال سمجھتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "حلال سمجھتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ (شیطان) اس کے کھانے پر قادر ہو جاتا ہے (یعنی کھانے والے کے ساتھ وہ بھی اس میں سے کھاتا ہے) یہ مطلب اس صورت میں ہے جب کہ حدیث کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کیا جائے، اور بعض حضرات نے یہ تاویل بیان کی ہے کہ جو کھانا بسم اللہ پڑھ کر نہ کھایا گیا ہو وہ ایسا ہے گویا اس کو شیطان کھا گیا ہے، یا یہ مراد ہو کہ اس کھانے کو اللہ تعالیٰ کی غیر مرضی کی جگہ صرف کرنا ہے۔

③ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ فَذَكَرَ اللّٰهَ عِنْدَ دُخُوْلِهِ وَعِنْدَ طَعَامِهِ قَالَ الشَّيْطَانُ لَا مَبِيْتَ لَكُمْ وَلَا عَشَاءَ وَإِذَا دَخَلَ فَلَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ عِنْدَ دُخُوْلِهِ قَالَ الشَّيْطَانُ أَدْرَكْتُمُ الْمَبِيْتَ وَإِذَا لَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ عِنْدَ طَعَامِهِ قَالَ أَدْرَكْتُمُ الْمَبِيْتَ وَالْعَشَاءَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب آدمی اپنے گھر (یعنی اپنی خواب گاہ) میں داخل ہوتا ہے اور داخل ہوتے وقت خدا کا نام لیتا ہے (یعنی بسم اللہ کہہ کر خواب گاہ میں داخل ہوتا ہے) اور پھر کھانا کھاتے وقت ہی خدا کا نام لیتا ہے تو شیطان (اپنے تابعداروں سے کہتا ہے کہ اس گھر میں تمہارے لئے نہ کوئی جگہ ہے نہ کھانا ہے۔ اور جب آدمی گھر و خوابگاہ میں داخل ہوتے وقت خدا کا نام نہیں لیتا تو شیطان اپنے تابعداروں سے) کہتا ہے کہ (اس گھر میں) تمہیں جگہ مل گئی اور جب آدمی کھانا کھاتے وقت خدا کا نام نہیں لیتا، تو شیطان (اپنے تابعداروں سے) کہتا ہے کہ (اس گھر میں تمہیں جگہ بھی مل گئی اور کھانا بھی مل گیا۔" (مسلمؒ)

دائیں ہاتھ سے کھانا پینا چاہئے

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَأْكُلْ بِيَمِيْنِهٖ وَإِذَا شَرِبَ فَلْيَشْرَبْ بِيَمِيْنِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے، تو داہنے ہاتھ سے کھائے اور جب کوئی چیز پئے، تو دائیں ہاتھ سے پئے یعنی پانی وغیرہ کا برتن داہنے ہاتھ سے پکڑے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں جو حکم دیا گیا ہے وہ بظاہر وجوب کے لئے ہے۔ جیسا کہ بعض علماء کا مسلک ہے اس کی تائید صحیح مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو سلمہ ابن اکوعؓ نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو بائیں ہاتھ سے کھاتے دیکھا تو فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اس شخص نے کہا کہ میں داہنے ہاتھ سے کھانے کی قدرت نہیں رکھتا (راوی کا بیان ہے کہ اس شخص کا داہنا ہاتھ درست تھا، اس نے محض تکبر سے یہ الفاظ کہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا (خدا کرے) تجھے داہنے ہاتھ سے کھانے کی طاقت نصیب نہ ہو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ شخص (کبھی بھی) اپنا داہنا ہاتھ اپنے منہ کی طرف نہیں اٹھا سکا اس طرح طبرانیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (ایک دن) سلیبہ اسلمیہ کو بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے دیکھا تو اس کے لئے بددعا فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طاعون میں مبتلا ہو کر مر گئی! تاہم جمہور علماء جن کے نزدیک دائیں ہاتھ سے کھانا کھانے کا حکم وجوب کے طور پر نہیں ہے بطریق استحباب ہے وہ ان روایتوں کو زجر و تنبیہ اور مصالح شریعت پر محمول کرتے ہیں۔

بائیں ہاتھ سے کھانے پینے کی ممانعت

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَأْكُلَنَّ أَحَدُكُمْ بِشِمَالِهٖ وَلَا يَشْرَبَنَّ بِهَا فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ

بِشِمَالِهٖ وَيَشْرَبُ بِهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص بائیں ہاتھ سے کھانا نہ کھائے اور نہ بائیں ہاتھ سے (کوئی چیز) پئے کیوں کہ (یہ) شیطان کا شیوہ ہے کہ وہ) اپنے بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: تورپشتی نے۔ "بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو لوگ شیطان کے زیر اثر اور اس کے تابعدار ہوتے ہیں، وہ ان کو بائیں ہاتھ سے کھانے پینے پر ابھارتا ہے جب کہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے یعنی حقیقت میں شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا پیتا ہے۔

حسن ابن سفیانؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہؓ سے بسند حسن یہ روایت نقل کی ہے کہ "جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے، تو اس کو چاہئے کہ دائیں ہاتھ سے کھائے اور دائیں ہاتھ سے پئے (اگر کسی کو کوئی چیز دے یا کسی سے کوئی چیز لے تو) دائیں ہاتھ سے لے اور دائیں ہاتھ سے دے کیوں کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے۔ بائیں ہاتھ سے پیتا ہے اور بائیں ہاتھ سے لیتا دیتا ہے۔

تین انگلیوں سے کھانا اور انگلیاں چاٹنا سُنّت ہے

⑥ وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْكُلُ بِثَلَاثَةِ اَصَابِعَ وَيَلْعَقُ يَدَهٗ قَبْلَ اَنْ يَّمْسَحَهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ تین انگلیوں سے (یعنی انگوٹھے، شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کے ساتھ) کھانا کھایا کرتے تھے اور (کھانے سے فراغت کے بعد) اپنا ہاتھ (کسی رومال وغیرہ سے) پونچھنے۔ (یا دھونے) سے پہلے چاٹ لیا کرتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: نوویؒ کہتے ہیں کہ انگلیوں سے کھانا سُنّت ہے، لہٰذا ان تینوں کے ساتھ چوتھی اور پانچویں انگلی نہ ملائی جائے، الا یہ کہ چوتھی اور پانچویں انگلی کو ملانا ضروری ہو۔

"ہاتھ کو چاٹنے" سے مراد یہ ہے کہ جن انگلیوں سے کھاتے تھے، ان کو چاٹ لیا کرتے تھے، چنانچہ پہلے بیچ کی انگلی کو چاٹتے، پھر اس کے پاس کی انگلی کو، پھر انگوٹھے کو چاٹتے تھے۔

طبرانیؒ نے عامر ابن ربیعہ سے اس طرح نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ تین انگلیوں سے کھاتے تھے، اور ان کی مدد کے لئے چوتھی انگلی بھی ملا لیا کرتے تھے! نیز ایک حدیث مرسل میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ پانچوں انگلیوں سے کھاتے تھے۔" یا تو یہ پتلی چیز کھانے پر محمول ہے یہ کہ آپ ﷺ بیان جواز کی خاطر کبھی کبھی اس طرح بھی کھاتے تھے، لیکن اکثر اوقات تین ہی انگلیوں سے کھانے کی عادت تھی۔

بعض روایت میں یمسحها کے بعد بشیء کا لفظ بھی منقول ہے اور یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں کہ ثم یغسلها یعنی (ہاتھ کو چاٹتے اور) پھر اس کو دھو لیتے۔

⑦ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِلَعْقِ الْاَصَابِعِ وَالصَّحْفَةِ وَقَالَ اِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِيْ اَيَّةِ الْبَرَكَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت کہ نبی کریم ﷺ نے انگلیوں اور رکابی کو چاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم نہیں جانتے کہ کس انگلی یا نوالے میں برکت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "والصحفة" میں حرف واو مطلق جمع کے لئے ہے لہٰذا پہلے رکابی و برتن وغیرہ کو صاف کیا جائے اور پھر انگلی کو چاٹا جائے۔

لفظ "ایۃ" تاء تانیث کے ساتھ منقول ہے اس لئے ترجمہ "انگلی یا نوالہ" کیا گیا ہے۔ لیکن بعض نسخوں میں یہ لفظ "ہ" (یعنی مذکر) ضمیر کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ (تم نہیں جانتے کہ) کس کھانے میں برکت ہے (آیا اس کھانے میں جو کھا چکے ہو یا اس کھانے میں جو چاٹو گے) اس کی تائید آگے آنے والی حدیث کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ کہ فانہ لا یدری فی ای طعام تکون البرکۃ اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں سُنّت انگلیوں کو چاٹنا ہے اور اس چیز کو صاف کرنا ہے جو انگلیوں کو لگی ہے نہ کہ محض انگلیوں کو بمبالغہ منہ میں داخل کرنا۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَلَا يَمْسَحْ يَدَهٗ حَتّٰى يَلْعَقَهَا اَوْ يُلْعِقَهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھا چکے تو وہ ہاتھ کو اس وقت تک (کسی چیز سے) نہ پونچھے (اور نہ دھوئے) جب تک کہ ہاتھ کی انگلیوں کو چاٹ نہ لے یا چٹوا نہ دے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "چٹوا نہ دے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر انگلیوں کو خود نہ چاٹے تو ان لوگوں میں سے کسی کو چٹوا دے جو اس سے گھن اور کراہت محسوس نہ کریں، جیسے بیوی، بچے، لونڈی، اور خادم و غلام وغیرہ، کیونکہ ان کو اپنے طبعی تعلق و محبت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اس سے کوئی گھن اور کراہت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتے ہیں، انہیں کے حکم میں شاگرد اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس کو حصول سعادت سمجھتے ہوں۔

کھاتے وقت کوئی لقمہ گر جائے تو اس کو صاف کر کے کھا لینا چاہئے

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ اَحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَاْنِهٖ حَتّٰى يَحْضُرَهٗ عِنْدَ طَعَامِهٖ فَاِذَا سَقَطَتْ مِنْ اَحَدِكُمُ اللُّقْمَةُ فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ اَذًى ثُمَّ لِيَاْكُلْهَا وَلَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ فَاِذَا فَرَغَ فَلْيَلْعَقْ اَصَابِعَهٗ فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ فِيْ اَيِّ طَعَامِهٖ يَكُوْنُ الْبَرَكَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ شیطان تمہارے ہر کام کے وقت تمہارے پاس موجود ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے کھانے کے وقت بھی تمہارے پاس موجود رہتا ہے، لہٰذا تم میں سے جب کسی شخص کا کوئی نوالہ گر جائے تو چاہئے کہ (اس کو اٹھا لے اور از قسم مٹی وغیرہ) جو چیز اس کو لگ گئی ہو اس کو صاف کر کے کھا لے، اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے، نیز جب کھانا کھا چکے تو چاہئے کہ اپنی انگلیاں چاٹ لیں کیوں کہ اس کو یہ نہیں معلوم کہ اس کے کون سے کھانے میں (یعنی کھانے کے کس حصہ میں) برکت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اس کو صاف کر کے کھا لے"، لیکن اگر وہ لقمہ کسی نجاست و گندگی پر گرا ہو تو اس کو دھو کر کھائے، بشرطیکہ اس کو دھونا ممکن ہو۔ یا طبیعت اس پر آمادہ ہو، اور اگر یہ ممکن نہ ہو، تو پھر اس کو کتے یا بلی وغیرہ کو کھلا دے۔

"اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے" یہ یا تو حقیقت پر محمول ہے کہ وہ واقعۃً کھاتا ہے، یا یہ کنایہ ہے اس لقمہ کو ضائع کرنے اور اس کو حقیر جاننے سے۔ نیز اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایسا کرنا (یعنی اس گرے ہوئے لقمہ کو حقیر و کمتر جان کر نہ اٹھانا) دراصل متکبر لوگوں کی مشابہت اور ان کی عادت کو اختیار کرنا ہے، کیونکہ وہ (متکبر لوگ) گرے ہوئے لقمہ کو اٹھا کر کھانا عار سمجھتے ہیں اور یہ ساری چیزیں (یعنی اس لقمہ کو ضائع کرنا اور اس کو حقیر جاننا، اور متکبر لوگوں کی عادت اختیار کرنا) شیطانی افعال میں سے ہیں۔

"نیز جب کھانا کھا چکے تو الخ" یہ اگرچہ ایک علیحدہ حکم ہے۔ مگر حقیقت میں پہلے حکم سے حاصل ہونے والے مفہوم "تکبر کو ترک کرنے اور تواضع و انکساری کو اختیار کرنے" کو مؤکد کرنے کے لئے ہے کہ کھانا کھا چکنے کے بعد ہاتھ کو دھونے سے پہلے انگلیوں کو چاٹ لیا

جائے تاکہ اللہ کے رزق کے تئیں اپنے کامل احتیاج اور تواضع وانکساری کا اظہار ہو اور تکبر ونخوت کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔

ٹیک لگا کر کھانا کھانے کی ممانعت

(۱۰) وَعَنْ اَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا اٰكُلُ مُتَّكِئًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوجحیفہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "سفر السعادت" کے مصنف نے لکھا ہے کہ کھانا کھاتے وقت ٹیک لگانے کی تین صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ پہلو زمین پر رکھا جائے، دوسرے یہ کہ چارزانو بیٹھا جائے، اور تیسرے یہ کہ ایک ہاتھ ٹیک کر بیٹھا جائے، اور دوسرے ہاتھ سے کھانا کھایا جائے، یہ تینوں صورتیں مذموم ہیں اور بعض حضرات نے چوتھی صورت یہ بیان کی ہے کہ تکیہ یا دیوار اور اسی طرح کی کسی اور چیز سے ٹیک لگا کر بیٹھا جائے! مسنون یہ ہے کہ کھاتے وقت کھانے کی طرف جھک کر اور متوجہ ہو کر بیٹھا جائے اور اکثر حضرات نے "ٹیک لگانے" کی وضاحت یہ کی ہے کہ دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف جھک کر اور اس پر سہارا لے کر بیٹھا جائے۔ کھاتے وقت بیٹھنے کی یہ صورت اس لئے غیر مسنون ہے کہ ایسی حالت میں کھانا ضرر پہنچاتا ہے بایں طور کہ وہ بدن میں اپنی جگہ پر ٹھیک طرح سے نہیں پہنچتا، جو طبیعت پر گراں ہو کر سوءِ ہضم کی شکایت پیدا کرتا ہے۔

سیوطیؒ نے کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں لکھا ہے کہ ٹیک لگا کر، منہ کے بل پڑ کر اور کھڑے ہو کر کھانا نہ کھایا جائے۔ بلکہ اس طرح بیٹھ کر کھائے کہ یا تو دوزانو ہو یا بصورت اقعاء ہو یعنی دونوں کولہے ٹیک لے اور دونوں زانو کھڑے کر لے یا دونوں پاؤں پر بیٹھے اکڑوں اور یا داہنا زانو کھڑا کر لے اور بائیں زانو پر بیٹھ جائے۔

منبر و چوکی پر کھانا رکھ کر کھانے کا مسئلہ

(۱۱) وَعَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا اَكَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى خِوَانٍ وَلَا فِي سُكُرُّجَةٍ وَلَا خُبِزَ لَهٗ مُرَقَّقٌ قِيْلَ لِقَتَادَةَ عَلٰى مَا يَاْكُلُوْنَ قَالَ عَلَى السُّفَرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی خوان پر کھانا نہیں کھایا اور نہ تشتری میں کھایا اور نہ آپ ﷺ کے لئے چپاتی پکائی گئی! حضرت قتادہؒ سے پوچھا گیا کہ وہ کس چیز پر کھانا کھاتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ دسترخوان پر۔"

(بخاریؒ)

تشریح: "خِوان" یا "خُوان" کے معنی دسترخوان کے ہیں، لیکن خوان سے مراد چوکی یا میز ہے جس پر کھانا رکھ کر کھایا جائے تاکہ کھانے میں جھکنا نہ پڑے، چنانچہ یہ مال دار، عیش پسند، متکبر اور غیر اسلامی تہذیب کے حامل لوگوں کا شیوہ ہے کہ وہ میز پر یا چوکی پر کھانا رکھ کر کھاتے ہیں اسی لئے آنحضرت ﷺ نے کبھی بھی اس طریقہ سے کھانا پسند نہیں فرمایا۔

"سُكُرُّجَة" یا جیسا کہ بعض حضرات نے سُكُرَّجَة کو زیادہ فصیح کہا ہے، کے معنی چھوٹی پیالی یا تشتری کے ہیں جس میں دسترخوان پر چٹنی اچار اور جوارش ومربہ وغیرہ رکھا جاتا ہے اس غرض سے کہ کھانے کے ساتھ اس کو کھاتے جائیں تاکہ بھوک بڑھے، کھانے کی طرف رغبت زیادہ ہو اور جو کچھ کھایا جائے ہضم ہو، چنانچہ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دسترخوان پر کوئی طشتری یا پیالی نہیں ہوتی تھی جیسا کہ عام طور پر مال دار، عیش پسند اور متکبر لوگوں کے دسترخوان پر ایسی تشتریاں رکھنے کا رواج ہے۔

"اور نہ آپ ﷺ کے لئے چپاتی پکائی گئی۔" کا مطلب یہ ہے نہ تو کبھی خاص طور پر آپ ﷺ کے لئے چپاتی پکائی گئی اور نہ کبھی آپ ﷺ نے چپاتی کھائی، خواہ آپ ﷺ کے لئے پکائی گئی ہو یا دوسروں کے لئے پکائی گئی ہو، جیسا کہ دوسری حدیث میں بیان کیا گیا

ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی چپاتی نہیں کھائی! حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے اپنی کتاب میں اس موقع پر جو قول نقل کیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے لئے چاپاتی نہیں پکائی جاتی تھی لیکن اگر کوئی شخص اپنے لئے چپاتی پکاتا یا پکواتا اور پھر وہ چپاتی آپ ﷺ کے سامنے لاتا تو آپ ﷺ اس کو تناول فرمالیتے تھے۔ اس کو کھانے سے انکار نہیں فرماتے تھے! مگر یہ قول آگے آنے والی حدیث کے منافی ہے، جو حضرت انس ؓ نے بیان کی ہے۔ حدیث میں چپاتی کے علاوہ دو چیزوں کی نفی بیان کی گئی ہے، ایک تو خوان پر کھانے کی اور دوسری طشتری میں کھانے کی، ان دونوں میں سے طشتری میں کھانے کی نفی کے بیان کے وقت کسی سوال کا کوئی موقع نہ تھا کیوں کہ اس کی نفی مطلق ہے، جب کہ خوان پر کھانے کی نفی کے بیان کے وقت سوال کا موقع تھا کہ پھر کھانا کس چیز پر رکھ کر کھاتے تھے آیا خوان کے علاوہ کوئی اور چیز تھی جس پر کھانا رکھا جاتا تھا یا کوئی بھی چیز نہیں ہوتی تھی، چنانچہ یہ سوال کیا گیا، اور حضرت قتادہ ؒ نے جواب دیا کہ دسترخوان پر۔ چنانچہ مسنون طریقہ یہی ہے کہ کھانے والا جہاں بھی بیٹھے وہاں دسترخوان بچھا کر اس پر کھانا رکھ کر کھائے۔

"وہ کس چیز پر کھانا کھاتے تھے" سے سائل کی مراد صحابہ ؓ کے بارے میں معلوم کرنا تھا، کیونکہ صحابہ ؓ اصل میں آنحضرت ﷺ کی سُنّت ہی کے پیرو اور آپ ﷺ کے طریقہ پر عامل تھے اس لئے صحابہ ؓ کے بارے میں سوال کرنا حقیقت میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں سوال کرنا تھا، یا یہ بھی صحیح ہے کہ یاکلون کی ضمیر آنحضرت ﷺ اور صحابہ ؓ دونوں کی طرف راجع کی جائے۔

روایت کے آخری جزء سے ثابت ہوا کہ دسترخوان پر کھانا رکھ کر کھانا سُنّت ہے اور خالص اسلامی تہذیب ہے، جب کہ خوان (یعنی میز یا چوکی وغیرہ پر) کھانا رکھ کر کھانا بدعت اور تکلّفات محض میں سے ہے، ہاں اگر میز و چوکی پر کھانے کی صورت میں کسی تکبر و نخوت کی نیت کارفرما نہ ہو، تو پھر مجبوری کے تحت میز و چوکی پر کھانا رکھ کر کھانا بھی جائز ہوگا۔

آنحضرت ﷺ نے کبھی چپاتی دیکھی بھی نہیں

⑫ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا اَعْلَمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى رَغِيْفًا مُرَقَّقًا حَتّٰى لَحِقَ بِاللّٰهِ وَلَا رَاٰى شَاةً سَمِيْطًا بِعَيْنِهٖ قَطُّ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی پتلی روٹی یعنی چپاتی دیکھی ہو، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اللہ سے ملاقات کی (یعنی آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی چپاتی کی صورت بھی نہیں دیکھی چہ جائیکہ کبھی چپاتی کھائی ہو) اسی طرح آپ ﷺ نے دم پخت بکری بھی کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔" (بخاری ؒ)

تشریح: "سَمِيْط" اس بکری یا بکری کے بچے کو کہتے ہیں جس کو بال صاف کرنے کے بعد چمڑے سمیت پانی کی بھاپ کے ذریعہ بھونا یا پکایا گیا ہو۔ یہ اس زمانہ میں اہل چین کا خاص کھانا تھا جو اپنے دور میں انتہائی متمول و متمدن اور عیش پرست تھے، اسی لئے خاص طور پر اس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، لفظ بعینہ محض تاکید کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کتب بیدہ (اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا) یا مشی برجلہ (وہ اپنے پیروں کے ذریعہ چلا)

آنحضرت ﷺ نے میدہ کی تیار کی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائی

⑬ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ مَا رَاٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّقِيَّ مِنْ حِيْنَ ابْتَعَثَهُ اللّٰهُ حَتّٰى قَبَضَهُ اللّٰهُ وَقَالَ مَا رَاٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْخُلًا مِنْ حِيْنَ ابْتَعَثَهُ اللّٰهُ حَتّٰى قَبَضَهُ اللّٰهُ قِيْلَ كَيْفَ كُنْتُمْ تَاْكُلُوْنَ الشَّعِيْرَ غَيْرَ مَنْخُوْلٍ قَالَ كُنَّا نَطْحَنُهٗ وَنَنْفُخُهٗ فَيَطِيْرُ مَا طَارَ وَمَا بَقِيَ ثَرَّيْنَاهُ فَاَكَلْنَاهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سہل ابن سعد ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جب رسول بنایا آپ ﷺ نے اس وقت سے کبھی میدہ کو

نہیں دیکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی روح قبض کی، نیز حضرت سہلؓ نے کہا کہ رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جب سے رسول بنایا آپ ﷺ نے اس وقت سے کبھی چھلنی کو نہیں دیکھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح قبض کی (یعنی آنحضرت ﷺ مرتبۂ رسالت پر فائز ہونے کے وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک میدہ کی تیار کی ہوئی کوئی چیز یا چھلنی کے چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کیا کھاتے کہ کبھی آپ ﷺ نے ان چیزوں کی صورت بھی نہیں دیکھی) حضرت سہلؓ سے پوچھا گیا پھر آپ لوگ جو (کے بغیر چھنے آٹے کی روٹی) کسی طرح کھاتے تھے؟ حضرت سہلؓ نے کہا کہ ہم جو کو پیسنے کے بعد اس میں پھونک مارتے، چنانچہ اس میں سے جو چیز اڑنے والی ہوتی (یعنی بھوسی) وہ اڑ جاتی اور جو چیز باقی رہتی (یعنی آٹا) اس کو ہم پانی میں گوندھ لیتے، (اور پھر اس کی روٹی پکا کر) کھا لیتے۔" (بخاری)

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے جب سے رسول بنایا آپ ﷺ اس وقت سے..... الخ۔" عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ حضرت سہلؓ نے ان الفاظ کے ذریعہ اس زمانہ کو ذکر کرنے سے احتراز کیا ہے، جو مرتبہ رسالت پر فائز ہونے سے پہلے گزرا تھا، اور اس احتراز کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو دو مرتبہ ملک شام کا تجارتی سفر اختیار فرمایا تھا وہ بعثت رسالت کے قبل کے زمانہ ہی کا واقعہ ہے اور اس سفر کے دوران بحیرہ راہب نے آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل کیا اور آپ ﷺ نے اس کے یہاں دعوت کھائی، اور چونکہ وہاں کے لوگ خوش حال و مالدار تھے اس لئے بظاہر یہ امکان ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے یہاں چیزیں ضرور دیکھی ہوں گی، لیکن آپ ﷺ نے بعثت رسالت کے بعد سے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک جو زمانہ گذارا، وہ تنگی معاش اور اقتصادی زبوں حالی کے لئے مشہور و معروف ہے ظاہر ہے کہ اس میں ایسی چیزوں کا کیا ذکر تھا۔

یہ حدیث دراصل آنحضرت ﷺ کی سادہ طبیعت اور بے تکلف زندگی کی واضح غماز ہے کہ آپ ﷺ کو اپنے کھانے پینے کا اتنا اہتمام بھی عزیز نہیں تھا، جتنا عام طور پر ایک معمولی حیثیت کے انسان کے یہاں بھی ہوتا ہے اور یہی وہ بنیادی سبق ہے جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کی طرف متوجہ رہنا محض مقصد ناآشنا، بے وقوف اور غافل لوگوں کا شیوۂ زندگی ہے۔

آنحضرت ﷺ کسی کھانے کو برا نہیں کہتے تھے

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ مَا عَابَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَعَامًا قَطُّ اِنِ اشْتَھَاہُ اَکَلَہٗ وَاِنْ کَرِھَہٗ تَرَکَہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کبھی بھی کسی کھانے کو برا نہیں کہا اگر آپ ﷺ کو رغبت ہوتی تو اس کو کھا لیتے اور اگر ناپسند فرماتے تو اس کو چھوڑ دیتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کھانے کی چیزوں کے سلسلہ میں آپ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جو چیز آپ ﷺ کی پسندیدہ ہوتی، اس کو آپ ﷺ رغبت کے ساتھ کھا لیتے، اور جو چیز آپ ﷺ کو مرغوب و پسندیدہ نہ ہوتی تھی، اس کو نہیں کھاتے تھے، یہ نہیں تھا کہ جو چیز پسندیدہ نہ ہوتی اس کو برا کہتے اس میں عیب نکالتے۔

مؤمن ایک آنت سے اور کافر سات آنتوں سے کھاتا ہے

(۱۵) وَعَنْہُ اَنَّ رَجُلًا کَانَ یَاْکُلُ اَکْلًا کَثِیْرًا فَاَسْلَمَ وَکَانَ یَاْکُلُ قَلِیْلًا فَذُکِرَ ذٰلِکَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ یَاْکُلُ فِیْ مِعًا وَاحِدٍ وَاِنَّ الْکَافِرَ یَاْکُلُ فِیْ سَبْعَۃِ اَمْعَاءٍ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَرَوٰی مُسْلِمٌ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی وَابْنِ عُمَرَ الْمُسْنَدَ مِنْہُ فَقَطْ وَفِیْ اُخْرٰی لَہٗ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ضَافَہٗ ضَیْفٌ وَھُوَ کَافِرٌ فَاَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِشَاۃٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَھَا ثُمَّ اُخْرٰی فَشَرِبَہٗ ثُمَّ اُخْرٰی فَشَرِبَہٗ حَتّٰی شَرِبَ حِلَابَ سَبْعِ شِیَاہٍ ثُمَّ اِنَّہٗ اَصْبَحَ فَاَسْلَمَ فَاَمَرَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِشَاۃٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَھَا ثُمَّ

اَمَرَ بِاُخْرٰی فَلَمْ یَسْتَتِمَّهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ يَشْرَبُ فِیْ مِعًا وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَشْرَبُ فِیْ سَبْعَةِ اَمْعَاءٍ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص تھا، جو (پہلے تو) بہت زیادہ کھایا کرتا تھا، مگر جب مسلمان ہوا تو کم کھانے لگا، چنانچہ نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "حقیقت یہ ہے کہ مؤمن تو ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے (بخاریؒ) اور مسلمؒ نے اس روایت کو حضرت ابوموسیٰؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے جس میں (یہ واقعہ مذکور نہیں ہے بلکہ) محض آنحضرت ﷺ کا ارشاد مذکور ہے، لیکن مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں یوں ہے۔ کہ "(ایک دن) رسول کریم ﷺ کے ہاں ایک مہمان آیا جو کافر تھا، رسول کریم ﷺ نے اس کے لئے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا، بکری دوہی گئی اور اس کافر نے اس دودھ کو پی لیا، پھر آپ ﷺ کے حکم سے دوسری بکری دوہی گئی، وہ اس دودھ کو بھی پی گیا، پھر جب صبح ہوئی تو وہ مسلمان ہوگیا، رسول کریم ﷺ نے (اس وقت بھی) اس کے لئے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا۔ بکری دوہی گئی اور اس نے اس کا دودھ پی لیا پھر آپ ﷺ نے دوسری بکری دوہنے کا حکم دیا (بکری دوہی گئی) لیکن (اب) وہ اس کا پورا دودھ نہ پی سکا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" مؤمن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔"

تشریح: کہا جاتا ہے کہ انسان کے پیٹ میں سات آنتیں ہوتی ہیں لیکن اس سے قطع نظر یہاں ایک آنت اور سات آنت سے مراد قلب حرص اور کثرت حرص ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کھانے پینے میں کم حرص رکھتا ہے، اور کافر زیادہ حرص رکھتا ہے اور یہ بات اکثر واغلب کے اعتبار سے ہے یا اس مخصوص شخص کی حالت بیان کرنا مراد ہے، جس کا روایت میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جب مسلمان ہوا تو کم کھانے لگا، لیکن جب کافر تھا تو زیادہ کھاتا، یا کامل الایمان مؤمن مراد ہے کہ وہ ذکر الٰہی کی برکت اور نور و معرفت ایمان کے سبب ہمہ وقت سیر رہتا ہے کہ اس کو نہ کھانے پینے کی حرص ہوتی ہے اور نہ کھانے پینے کے اہتمام کی طرف رغبت، اس کے برعکس کافر کا حال دوسرا ہوتا ہے! درحقیقت اس حدیث میں یہ تنبیہ ہے کہ مؤمن کی شان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صبر و قناعت کو لازم جانے، زہد و ریاضت کی راہ کو اختیار کرنے، خورد و نوش کی اسی حد پر اکتفا کرے جو زندگی کی بقاء کے لئے ضروری ہو، اور اپنے معدے کو اتنا خالی رکھے۔ جو نورانیت دل، صفائی باطن اور شب بیداری وغیرہ کے لئے ممد و معاون ہو۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک فقیر حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آیا اور بہت زیادہ کھا کر اٹھا، حضرت عمرؓ نے جب اس کو اتنا زیادہ کھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کے آئندہ اس کو میرے پاس نہ آنے دیا جائے، علماء نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جب اس فقیر نے اس قدر غیر معمولی طور پر کھایا تو گویا وہ کفار کے مشابہ ہوا، اور جو شخص کافروں کی مشابہت اختیار کرے اس سے ملنا جلنا ترک کر دینا چاہئے، واضح رہے کہ کم کھانے کی عادت اختیار کرنا، عقلاء باہمت اور اہل حقیقت کے نزدیک مستحسن و محمود ہے، اور اس کا برعکس مذموم ہے، لیکن وہ بھوک جو حد افراط کو پہنچ جائے، ضعف بدن اور قوائے جسمانی کے اختلال کا باعث ہو اور جس کی وجہ سے دین و دنیا کے امور کی انجام دہی میں رکاوٹ پیدا ہو، وہ ممنوع اور طریقہ حکمت کے منافی ہے۔

تھوڑے کھانے میں بھی دوسروں کو شریک کر لینا بہتر ہے

(۱۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامُ الْاِثْنَيْنِ كَافِی الثَّلَاثَةِ وَطَعَامُ الثَّلَاثَةِ كَافِی الْاَرْبَعَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کو اور تین کا کھانا چار کو کافی ہوتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کھانا دو آدمیوں کو سیر کر دیتا ہے وہ تین آدمیوں کو بھی سیر کر دیتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس کھانے کو دو آدمی سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ وہ تین آدمیوں کے لئے بطور قناعت کافی ہو جاتا ہے، کہ وہ تینوں کی بھوک ختم کر دیتا ہے ان کو عبادت و طاعت کی طاقت و قوت عطا کر دیتا ہے اور ان کے ضعف کو دور کر دیتا ہے اس پر مابعد کی عبارت "تین آدمیوں کا کھانا چار کو کافی ہوتا ہے" کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے، اصل میں حدیث کی غرض اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ اگر تمہیں اتنا کھانا میسر ہو جو تمہارا پیٹ پوری طرح بھر سکتا ہے تو اس کو محض اپنے پیٹ بھرنے میں صرف نہ کرو، بلکہ درجہ قناعت اختیار کر کے اس میں سے اتنا ہی کھاؤ جو تمہاری غذائی ضرورت کے بقدر ہو، جو تمہاری ضرورت واقعی سے زائد ہو، اس کو کسی دوسرے محتاج کو کھلا دو۔

⑰ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ طَعَامُ الْوَاحِدِ يَكْفِي الْاِثْنَيْنِ وَطَعَامُ الْاِثْنَيْنِ يَكْفِي الْاَرْبَعَةَ وَطَعَامُ الْاَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا، کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کو، دو کا کھانا چار کو، اور چار کا کھانا آٹھ کو کافی ہوتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں بھی وہی تاویل ہوگی جو اوپر بیان ہوئی، لیکن اوپر کی حدیث میں ثلث و ربع کے حساب سے فرمایا گیا ہے۔ (کہ ایک کا کھانا دو کو اور دو کا تین کو کافی ہوتا ہے) اور اس حدیث میں بطریق تضاعف (دگنے کے حساب سے) فرمایا گیا ہے (کہ ایک کا کھانا دو کو اور دو کا چار کو کافی ہوتا ہے) یہ اختلاف اشخاص و احوال کے تفاوت کے سبب سے ہے، کہ جس جذبہ قناعت اور ایثار کی صورت میں دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کے لئے کافی ہوتا ہے، بعض حالات اور بعض آدمیوں کی صورت میں وہی جذبہ قناعت و ایثار کچھ اور بڑھ کر دو آدمیوں کا کھانا چار آدمیوں کے لئے بھی کافی قرار دے دیتا ہے۔

منقول ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ قحط سالی کے دنوں میں فرمایا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں ہر گھر والوں کے پاس ان کی تعداد کے بقدر آدمی بھیج دوں، کیونکہ آدمی آدھا پیٹ کھانے سے ہلاک نہیں ہوتا (حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ اس قحط کے زمانہ میں بھی کچھ لوگوں کو اسباب معیشت میسر ہیں اور وہ دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں، جب کہ کتنے ہی بندگان خدا ایسے ہیں جنہیں بقاء زندگی کے بقدر بھی خوراک میسر نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ جن گھروں کو خدا نے پیٹ بھر کھانے کے بقدر میسر کر رکھا ہے، ان میں سے ہر گھر کے ذمہ اتنے محتاج نادار لوگوں کا کھانا کر دوں، جتنے خود گھر والے ہیں، مثلاً جس گھر میں پانچ آدمی ہیں، اس گھر کے ذمہ پانچ ہی ناداروں کا کھانا کر دوں، کہ وہ اپنے اتنے ہی کھانے میں کہ جو وہ اپنے لئے تیار کرتے ہیں، ان پانچوں ناداروں کو بھی شریک کر لیں۔ اس طرح وہ اپنا آدھا پیٹ کاٹ کر ان ناداروں کی زندگی کی بقاء کا ذریعہ بن جائیں گے جن کو کچھ بھی کھانے کے لئے میسر نہیں تھا، اور ظاہر ہے کہ آدھا پیٹ بھرنے سے جسم کی توانائی میں کچھ کمی بے شک آجائے مگر اس کی وجہ سے آدمی ہلاک نہیں ہوتا۔

بہر حال ان احادیث و روایات کا اصل مقصد غرباء کی خبر گیری اور اپنی تئیں ایثار و قناعت کو اختیار کرنے کی طرف راغب کرنا ہے اور اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ نفس امارہ کا تقاضا تو ہو سکتا ہے کہ جو کچھ بھی میسر ہو وہ اپنے پیٹ میں ڈال لیا جائے، لیکن انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ خدا نے تمہیں جو کچھ دیا ہے کہ اس میں ان لوگوں کو بھی شریک کرو، جنہیں کچھ بھی میسر نہیں ہو سکا ہے۔

تلبینہ بیمار کے لئے بہترین چیز ہے

⑱ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلتَّلْبِيْنَةُ مُجِمَّةٌ لِفُؤَادِ الْمَرِيْضِ تَذْهَبُ بِبَعْضِ الْحُزْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "تلبینہ" بیمار کے دل کو تسکین و قوت دیتا ہے اور بعض

غموں کو دور کرتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: تلبینہ اس حریرے کو کہتے ہیں، جو آٹے اور دودھ سے بنایا جاتا ہے، کبھی اس میں شہد بھی ملا دیتے ہیں، چونکہ اس حریرہ کا خاص جز دودھ ہوتا ہے اور دودھ کی طرح سفید بھی ہوتا ہے اس لئے اس کو تلبینہ کہتے ہیں "لبن" (دودھ) سے مشتق ہے۔

(۱۹) وعن انس ان خیاطا دعا النبی صلی اللہ علیہ وسلم لطعام صنعہ فذھبت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقرب خبز شعیر ومرقا فیہ دباء وقدید فرایت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتتبع الدباء من حوالی القصعۃ فلم ازل احب الدباء بعد یومئذ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک درزی نے نبی کریم ﷺ کو اپنے تیار کئے ہوئے کھانے پر مدعو کیا، نبی کریم ﷺ کے ہمراہ میں بھی گیا، اس نے جو کی روٹی اور شوربا لا کر (دسترخوان پر) رکھا جس میں کدو اور خشک گوشت تھا، چنانچہ میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ (کو کدو چونکہ بہت مرغوب تھا اس لئے آپ ﷺ) پیالے کے کناروں میں سے کدو کو تلاش کر کر کے کھاتے تھے، اسی لئے اس دن کے بعد سے میں کدو کو بہت پسند کرتا ہوں (کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کو بہت پسند تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت انسؓ کا اس دعوت میں جانا یا تو اس بنا پر تھا، کہ ان کو بھی مدعو کیا گیا ہو گا یا وہ چونکہ آنحضرت ﷺ کے خادم خاص تھے اور کسی بھی دعوت میں خادم کے ساتھ ہونے کی اجازت راعی کی طرف سے عام طور پر ہوتی ہے، اس لئے حضرت انسؓ، آنحضرت ﷺ کے ہمراہ اس دعوت میں شریک ہوئے، اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اگر دسترخوان پر کسی پیالے یا برتن میں کھانے کی مختلف چیزیں ایک ساتھ ہوں تو اس پیالے یا برتن کے دوسرے کنارہ تک ہاتھ بڑھانا جائز ہے، اس صورت میں محض اپنے سامنے کے کنارے تک اپنے ہاتھ کو محدود رکھنا ضروری نہیں ہو گا، بشرطیکہ دسترخوان پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ اس کو ناپسند کریں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ غرباء اور دست کاروں کی دعوت قبول کرنا چاہئے اور وہ دسترخوان پر کھانے کی جو بھی چیز لا کر رکھیں اس کو برضا و رغبت کھانا چاہئے، تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کھانے کے وقت اپنا خادم ساتھ ہو تو اس کو اپنے ساتھ ہی کھانا کھلانا چاہئے، یہ خالص دنیا داروں کا طریقہ ہے کہ خود تو الگ بیٹھ کر کھائیں اور خادم کو دوسری جگہ بٹھا کر کھلائیں۔ اور چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ کدو کو اپنی پسندیدہ غذا قرار دینا مسنون ہے، اور اس طرح ہر اس چیز کو پسند و مرغوب رکھنا مسنون ہے، جس کو آنحضرت ﷺ پسندیدہ و مرغوب رکھتے تھے۔

چھری کانٹے سے کھانے کا مسئلہ

(۲۰) وعن عمرو بن امیۃ انہ رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحتز من کتف شاۃ فی یدہ فدعی الی الصلوۃ فالقاھا والسکین التی یحتز بھا ثم قام فصلی ولم یتوضا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرو ابن امیہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا، کہ آپ بکری کا شانہ جو آپ کے ہاتھ میں تھا چھری سے کاٹتے تھے، پھر آپ ﷺ کو (اسی دوران) نماز کے لئے بلایا گیا، تو آپ ﷺ شانے کو اور اس چھری کو کہ جس سے وہ شانہ کاٹ رہے تھے وہیں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور نماز ادا کی، آپ ﷺ نے (اس وقت) وضو نہیں کیا (کیونکہ آپ وضو سے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھاتے وقت گوشت یا کھانے کی کوئی بھی چیز کاٹ کاٹ کر کھانا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو اور اگر وہ گوشت یا کوئی بھی چیز گلی ہوئی اور نرم ہو کہ اس کو چھری سے کاٹنے کی ضرورت نہ ہوتی ہو، تو پھر چھری سے کاٹ کر کھانا مکروہ ہو گا، کیوں کہ اس طرح بلا ضرورت چھری کانٹے سے کھانا عجمیوں (یعنی غیر مسلموں کے) تکلفات میں شمار کیا گیا ہے، جیسا کہ دوسری فصل میں بیان ہو گا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ داعی حق (نماز کے لئے بلانے والے یا اذان) کی آواز سن کر کھڑے ہو جانا اور نماز میں پہنچ جانا

چاہئے اگرچہ کھانا سامنے رکھا ہوا ہو، لیکن یہ اس صورت کا حکم ہے جب کہ کھانے کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو، اس کھانے کی طرف شدید احتیاج نہ ہو، یعنی اتنی سخت بھوک نہ ہو کہ اگر وہ کھانا کھائے بغیر اٹھ کر نماز کے لئے چلا گیا تو نماز میں جی نہ لگے اور اس بات کا خوف نہ ہو کہ نماز سے واپس آنے کے بعد پھر کھانا نہیں ملے گا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرنا ضروری نہیں ہوتا جیسا کہ بعض علماء کا مسلک ہے کہ ان کے نزدیک آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو میٹھی چیز بہت پسند تھی

(۲۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ الْحَلْوَآءَ وَالْعَسَلَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ میٹھی چیز اور شہد کو بہت پسند فرماتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: عربی میں حَلْوآءَ (مد کے ساتھ) اور حَلْوَاءَ (قصر کے ساتھ) دونوں کا اطلاق اس میٹھی چیز پر ہوتا ہے جو مٹھاس اور چکنائی کے ذریعہ بنے، جس کو اردو میں حلوہ کہا جاتا ہے، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مطلق یعنی ہر میٹھی چیز کو حلوا کہتے ہیں اس صورت میں الحلواء کے بعد لفظ والعسل کا ذکر تخصیص بعد تعمیم کے طور پر ہوگا (یعنی پہلے تو حلوہ کا ذکر کیا) جو ایک عام لفظ ہے اور جس کے حکم میں شہد بھی داخل ہے، لیکن پھر بعد میں خاص طور پر شہد کو بھی ذکر کر دیا، خطابیؒ نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا میٹھی چیز کو بہت پسند کرنا طبعی خواہش کی زیادتی کی بنا پر نہیں تھا کہ آپ ﷺ اکثر و بیشتر میٹھی چیز کھانا پسند فرماتے ہوں بلکہ "بہت پسند کرنے" کا مطلب محض یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے سامنے دسترخوان پر میٹھی چیز آتی تو آپ ﷺ اس کو اتنی رغبت کے ساتھ تناول فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ یہ آپ ﷺ کو بہت مرغوب ہے۔

سرکہ ایک بہترین سالن ہے

(۲۲) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَ اَهْلَهُ الْاُدُمَ فَقَالُوْا مَاعِنْدَنَا اِلَّا خَلٌّ فَدَعَابِهٖ فَجَعَلَ يَاْكُلُ بِهٖ وَيَقُوْلُ نِعْمَ الْاِدَامُ الْخَلُّ نِعْمَ الْاِدَامُ الْخَلُّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے اپنے گھر والوں سے سالن مانگا، گھر والوں نے کہا کہ ہمارے پاس سالن نہیں ہے البتہ سرکہ ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے سرکہ منگوایا اور اس کے ساتھ روٹی کھانے لگیں اور یہ فرماتے جاتے تھے کہ "سرکہ بہترین ہے، سرکہ بہترین سالن ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "سرکہ بہترین سالن ہے" یہ بار بار آپ ﷺ نے اس لئے فرمایا کہ سرکہ کی زیادہ سے زیادہ تعریف ہو، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرنا اور اپنے نفس کو لذیذ چیزوں سے باز رکھنا اچھی بات ہے۔ حدیث سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ میں سالن سے روٹی نہیں کھاؤں گا اور پھر سرکہ سے روٹی کھالے تو وہ حانث (یعنی قسم کو توڑنے والا) ہوگا کیونکہ سرکہ کا سالن ہونا اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ سرکہ انبیاء کرام صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کا سالن ہے اور طبی طور پر سرکہ کے جو منافع و فوائد ہیں، وہ بہت زیادہ ہیں، جن کی تصدیق طبی کتابوں اور اطباء کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔

کھنبی کی فضیلت و خاصیت

(۲۳) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاؤُهَا شِفَآءٌ لِلْعَيْنِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ

رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ مِنَ الْمَنِّ الَّذِیْ اَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ۔

"اور حضرت سعید ابن زید کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کھنبی من کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ کھنبی اس من میں سے ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا۔"

تشریح: "کَمْأَةَ" کاف کے زبر، میم کے جزم اور ہمزہ کے زبر کے ساتھ۔ رحمت کے وزن پر ہے، کماۃ، کھنبی کو کہتے ہیں، جو از قسم نباتات چربی کی مانند ایک چیز ہوتی ہے اور اکثر برسات میں از خود پیدا ہو جاتی ہے، عربی میں اس کو شحم الارض (زمین کی چربی) بھی کہتے ہیں اور ہمارے یہاں عام طور پر اس کو سانپ کی چھتری کہا جاتا ہے۔ کھنبی حلال ہے اور بہت لوگ اس کو تل کر کھاتے بھی ہیں اگرچہ بعض مقامات پر اس کو کھانا طبعی طور پر مکروہ سمجھا جاتا ہے کیوں کہ وہاں اس کو کھانے کی عادت نہیں ہوتی۔

"کھنبی من کی ایک قسم ہے" کا مطلب یہ نہیں ہے، کھنبی اصل میں وہ من ہے جو اس آیت کریمہ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی (اور ہم نے بنی اسرائیل پر من و سلویٰ اتارا) کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل پر اترتا تھا، کیونکہ من تو ترنجبین کی طرح کی ایک چیز تھی جو آسمان سے اترتی تھی، اور یہ کھنبی زمین سے اگتی ہے، بلکہ "کھنبی، من کی ایک قسم ہے) کہ جس طرح من اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت تھی، جو بلا محنت و مشقت آسمان سے نازل ہوتی تھی اس طرح کھنبی بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو بلا محنت و مشقت زمین سے پیدا ہوتی ہیں، یا یہ مراد ہے کہ کھنبی اپنے منافع و فوائد کے لحاظ سے من کے مشابہ ہے۔

"اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے" بعض علماء نے کہا ہے اس کا پانی آنکھ کے لئے اس صورت میں شفاء کا حکم رکھتا ہے جب کہ اس کو دوسری دواؤں (جیسے سرمہ یا طوطیا وغیرہ) میں ملا کر آنکھوں میں لگایا جائے، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ فقط کھنبی کا پانی بھی آنکھ کے لئے فائدہ ہے، اور حدیث کے مطلق مفہوم کی بناء پر یہی بات زیادہ صحیح ہے، بعض علماء نے اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا، جس کی بصارت جاتی رہی تھی اس نے کھنبی کا پانی لگایا تو اس کی بصارت درست ہو گئی۔

حضرت ابوہریرہؓ کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ میں نے تین یا پانچ کھنبیاں لے کر ان کو نچوڑا اور ان کا پانی ایک شیشی میں رکھا، ایک چھوکری نے اس کو آنکھوں میں لگایا تو وہ اچھی ہو گئی، بہر حال اس سلسلے میں تفصیل انشاء اللہ باب الطب والرقی میں بیان ہوگی۔

ککڑی اور کھجور کو ملا کر کھانے کا ذکر

(۴۴) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْکُلُ الرُّطَبَ بِالْقِثَّاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو ککڑی اور تازہ کھجور ملا کر کھاتے دیکھا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ککڑی اور کھجور کو ملا کر کھانے کی صورت یا تو یہ ہوتی تھی، کہ دونوں کو ملا کر ایک ساتھ منہ میں رکھتے اور کھاتے تھے، یا یہ کہ پہلے ایک کھجور منہ میں رکھ لیتے اور پھر ایک ٹکڑا ککڑی کا رکھتے اور دونوں کو ساتھ کھاتے، آپ ﷺ دونوں کو ملا کر اس لئے کھاتے کہ دونوں مل کر معتدل ہو جائیں کیوں کہ کھجوریں حرارت ہوتی ہے اور ککڑی میں برودت اور مرکبات کی سب سے بڑی اصل اعتدال ہے کہ معتدل چیز تعدیل مزاج کی باعث بھی ہوتی ہے اور بہت زیادہ نفع بھی بخشتی ہے۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ایک وقت میں کھانے کی دو چیزوں کو غذا بنانا، یا کھانے پینے میں وسعت و فراخی اختیار کرنا، یعنی کھانے کی ایک سے زائد چیزیں تیار کرانا اور کھانا جائز ہے، چنانچہ اس کے جواز کے بارے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ جن علماء نے اس کو مکروہ کہا ہے وہ اس صورت پر محمول ہے جب کہ کھانوں کی زیادہ مقدار و قسمیں تیار کرانا اور کھانا اور عمدہ اقسام و انواع کے کھانوں کو غذا بنانا بطور عادت اختیار کیا جائے اور کھانے کی اس تنوع و کثرت کی بنیاد کسی دینی مصلحت و فائدے کے بجائے محض لذت کام

بود وہن اور حصول عیش پر ہو۔

پیلو کے پھل کی فضیلت

(۲۵) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَرِّ الظَّهْرَانِ نَجْنِي الْكَبَاثَ فَقَالَ عَلَيْكُمْ بِالْاَسْوَدِ مِنْهُ فَاِنَّهٗ اَطْيَبُ فَقِيْلَ اَكُنْتَ تَرْعَى الْغَنَمَ قَالَ نَعَمْ وَهَلْ مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا رَعَاهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک موقع پر) ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ مقام مرالظہران میں تھے (جو مکہ کے قریب ایک جگہ ہے) اور پیلو کے پکے پکے پھل جمع کر رہے تھے، کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس کا جو پھل سیاہ ہو، وہ لے لو) کیونکہ وہ اچھا ہوتا ہے اور فائدہ بھی پہنچاتا ہے" ہم نے عرض کیا (یا رسول اللہ ﷺ) کیا آپ (ﷺ) نے بکریاں چرائی ہیں؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ہاں! اور کونسا نبی ہے جس نے بکریاں نہیں چرائی ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کیا آپ ﷺ نے بکریاں چرائی ہیں" اس سوال کا مطلب یہ تھا کہ پیلو کے پھل چونکہ ان لوگوں کی خاص خوراک و غذا ہے جو جنگل میں بود و باش رکھتے ہیں، یا بکریاں چرایا کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے وہی لوگ اس پھل کے اچھے برے کی تمیز رکھتے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟

"اور کون سا نبی ہے جس نے بکریاں نہیں چرائی ہیں" اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبوت کا منصب کبھی بھی دنیا داروں، بادشاہوں اور متکبر و مغرور لوگوں کے طبقہ کو عطا نہیں فرمایا، بلکہ دین و دنیا کے اس سب سے بڑے منصب کی ذمہ داری ہمیشہ ان لوگوں کے سپرد کی گئی جو بکریاں چراتے تھے، مفلس و نادار ہوتے تھے، اور انتہائی تواضع و انکساری کے ساتھ دست کاری و کاریگری کا پیشہ اختیار کئے ہوتے تھے، چنانچہ منقول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام خیاطی کا کام کرتے تھے، حضرت زکریا علیہ السلام بخاری کرتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اجرت پر، حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرایا کرتے تھے، اور اس میں حق تعالیٰ کی مصلحت و حکمت یہ ہوتی تھی کہ طبقہ انسانی کے ان برگزیدہ ترین لوگوں کی پرورش و نمو حلال رزق کے ذریعہ ہو جو عام طور پر سخت محنت و مشقت ہی کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے عمل صالح کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہوں، اور وہ زیادہ زیادہ نیک کام کریں، اور خاص طور پر بکریاں چرانے میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ لوگوں سے یکسوئی اور حق تعالیٰ جل شانہ کے ساتھ خلوت کا موقع حاصل ہوتا نیز رعایا پروری کے طور طریقے، اور کمزور و نادار لوگوں کے ساتھ شفقت و نرمی کا برتاؤ رکھنے کا سبق ملتا تھا۔

چنانچہ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ (ایک دن) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل کی کہ "موسیٰ (علیہ السلام)! جانتے ہو ہم نے تمہیں نبوت کا منصب اعظم کیوں عطا کیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا "پروردگارا! تو ہی جانتا ہے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اس دن کو یاد کرو.... جب تم وادی الایمن میں بکریاں چرا رہے تھے، اور ایک بکری بھاگ کھڑی ہوئی تھی، تم اس کے پیچھے دوڑے، جس کی وجہ سے تمہیں بہت زیادہ تکلیف و مشقت برداشت کرنا پڑی، پھر جب تم نے اس بکری کو جالیا، تو تم نے نہ اس بکری کو مارا، اور نہ اس پر غیظ و غضب کا اظہار کیا، بلکہ اس کے ساتھ شفقت و نرمی کا برتاؤ کیا، اور اس کو مخاطب کر کے کہا کہ اوہ بیچاری! تو نے اپنے آپ کو بھی تکلیف و مصیبت میں مبتلا کیا اور مجھے بھی کلفت و تعب میں ڈالا۔ جب ہم نے اس حیوان کے تئیں تمہاری یہ شفقت و رحم پروری دیکھی، تو ہم پر ہماری رحمت متوجہ ہوئی، کہ تمہیں نبوت سے سرفراز کیا اور اپنا برگزیدہ بندہ قرار دیا۔"

آنحضرت ﷺ کس طرح بیٹھ کر کھاتے تھے

(۲۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُقْعِيًا يَاْكُلُ تَمْرًا وَفِيْ رِوَايَةٍ يَاْكُلُ مِنْهُ اَكْلًا ذَرِيْعًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو بہ ہیئت اقعاء بیٹھ کر کھجوریں کھاتے دیکھا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ کھجوروں کو جلدی جلدی کھا رہے تھے۔" (مسلم)

تشریح: "بہ ہیئت اقعاء" سے مراد بیٹھنے کی وہ صورت ہے، جس میں دونوں سرین زمین پر رکھے جائیں اور دونوں زانو کھڑے کر لئے جائیں۔

کھجوروں کو جلدی جلدی کھانے کا سبب یہ تھا کہ اس وقت آپ ﷺ کو کوئی کام درپیش ہوگا اس لئے آپ ﷺ نے کھجوروں کو جلدی جلدی کھایا تاکہ اس سے فارغ ہو کر اس کام میں مشغول ہو جائیں۔

کئی آدمی ہوں تو دو دو کھجوریں ساتھ ساتھ نہ کھاؤ

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّقْرِنَ الرَّجُلُ بَيْنَ التَّمْرَ تَيْنِ حَتّٰى يَسْتَأْذِ نَ اَصْحَابَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص دو کھجوروں کو جمع کرے، یعنی ایک ساتھ دو دو کھجوریں کھائے الا یہ کہ وہ اپنے ساتھیوں سے اجازت لے لے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: سیوطی کہتے ہیں کہ اس ممانعت کا تعلق اس وقت سے تھا، جب کہ مسلمان فقر و افلاس اور تنگی معاش میں مبتلا تھے، لیکن جب انہیں خدا نے معاش میں وسعت و فراخی اور خوشحالی عطا فرمائی، تو آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ ممانعت منسوخ ہو گئی کہ۔ "میں تمہیں کھجوروں کو جمع کرنے سے (یعنی ایک سے زائد کھجوروں کو ایک ساتھ کھانے سے) منع کرتا تھا، مگر اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق کی وسعت و فراخی عطا فرمائی ہے تو جمع کرو، یعنی اگر تم اب ایک سے زائد کھجوریں ایک ساتھ کھاؤ تو یہ حرام یا مکروہ نہیں ہوگا۔" لیکن اس سلسلے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر چند لوگ کسی بھی کھانے کی چیز اپنی غذائی ضرورت میں صرف کرنے کا مشترکہ طور پر یکساں حق رکھتے ہوں اور ان کی طرف سے اس چیز کو خرچ سے مقررہ مقدار سے زیادہ کھانے پر پابندی) نہ ہو تو اس صورت میں بھی مروت و ادب کا تقاضا بہر حال یہی ہوگا کہ ایسا نہ کیا جائے (یعنی دوسرے ساتھیوں سے زیادہ کھانے مقررہ مقدار سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کی جائے کہ یہ کھانے کے آداب کے بھی منافی ہے اور مروت کے بھی خلاف ہے، ہاں اگر تمام ساتھی ایسا کرنے کی صریح اجازت دے دیں یا کوئی ایسی چیز ہو جو ان کی طرف سے اجازت پر دلالت کرے تو کوئی مضائقہ نہیں، لہٰذا سابقہ ممانعت کا تعلق دونوں صورتوں (یعنی حالت فقر و افلاس اور شرکت) سے ہوگا اور اباحت و استثناء کا تعلق شرکت کے علاوہ دوسری صورت سے ہوگا۔

کھجور کی فضیلت

(۲۸) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَجُوْعُ اَهْلُ بَيْتٍ عِنْدَهُمُ التَّمْرُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ يَا عَائِشَةُ بَيْتٌ لَا تَمْرَ فِيْهِ جِيَاعٌ اَهْلُهٗ قَالَهَا مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اس گھر کے لوگ بھوکے نہیں رہتے جس گھر میں کھجور ہو۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "عائشہ! جس گھر میں کھجور نہ ہو اس گھر کے رہنے والے بھوکے ہیں۔" آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین مرتبہ فرمائے۔" (مسلم)

تشریح: بعض علماء نے وضاحت کی ہے کہ "اس گھر کے رہنے والوں" سے مراد اہل مدینہ اور وہ لوگ ہیں جن کی غذا کھجور ہے۔ نووی نے کہا ہے کہ اس حدیث میں درحقیقت کھجوروں کی فضیلت و اہمیت کا بیان ہے، اور اس کے ذریعہ اپنے گھر والوں کی غذائی ضروریات

کے لئے کھجوروں کا ذخیرہ کرنے کے جواز کا اظہار اور اس کی ترغیب دینا مقصود ہے۔

عجوہ کھجور کی تاثیر

(۲۹) وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَصَبَّحَ بِسَبْعِ تَمَرَاتٍ عَجْوَةٍ لَمْ يَضُرَّهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ سَمٌّ وَّلَا سِحْرٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص صبح کے وقت (کوئی اور چیز کھانے سے پہلے) سات عجوہ کھجوریں کھائے گا اس کو اس دن کوئی زہر اور جادو نقصان نہیں پہنچائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "عجوہ" مدینہ کی کھجوروں میں سے ایک قسم ہے جو صیحانی سے بڑی اور مائل بہ سیاہی ہوتی ہے، یہ قسم مدینہ کی کھجوروں میں سب سے عمدہ اور اعلے ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کھجور کا اصل درخت آنحضرت ﷺ نے لگایا تھا۔

"زہر" سے مراد وہی زہر ہے جو مشہور ہے (یعنی وہ چیز جس کو کھانے سے آدمی مرجاتا ہے) یا سانپ، بچھو اور ان جیسے دوسرے زہریلے جانوروں کا زہر بھی مراد ہو سکتا ہے مذکورہ خاصیت (یعنی دافع سحر و زہر ہونا) اس کھجور میں حق تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی گئی ہے جیسا کہ قدرت نے از قسم نباتات دوسری چیزوں (جڑی بوٹیوں وغیرہ) میں مختلف اقسام کی خاصیتیں رکھی ہیں، اور یہ بات آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہوئی ہوگی کہ کھجور میں یہ خاصیت ہے، یا یہ کہ آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت سے اس کھجور میں یہ خاصیت ہے۔ جہاں تک سات کے عدد کی تخصیص کا سوال ہے تو اس کی وجہ شارع کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں، بلکہ اس کا علم توقیفی ہے یعنی آنحضرت ﷺ سے سماعت پر موقوف ہے، کہ آپ ﷺ نے سات ہی کا عدد فرمایا اور سننے والوں نے اسی کو نقل کیا، نہ تو آنحضرت ﷺ نے اس تخصیص کی وجہ بیان فرمائی اور نہ سننے والوں نے دریافت کیا جیسا کہ رکعات وغیرہ کے اعداد کا مسئلہ ہے۔

(۳۰) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ فِىْ عَجْوَةِ الْعَالِيَةِ شِفَاءً وَاِنَّهَا تِرْيَاقٌ اَوَّلَ الْبُكْرَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عالیہ کی عجوہ (کھجوروں) میں شفا ہے اور وہ (زہر وغیرہ کے لئے) تریاق کی خاصیت رکھتی ہے۔ جب کہ اس کو دن کے ابتدائی حصے میں (یعنی نہار منہ کھایا جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مدینہ منورہ کے اطراف میں قبا کی جانب جو علاقہ بلندی پر واقع ہے وہ عالیہ یا عوالی کہلاتا ہے، اسی مناسبت سے ان اطراف میں جتنے گاؤں اور دیہات ہیں ان سب کو عالیہ یا عوالی کہتے ہیں، اسی سمت نجد کا علاقہ ہے اور اس کے مقابل سمت میں جو علاقہ ہے وہ نشیبی ہے اور اس کو سافلہ کہا جاتا تھا۔ اس سمت میں تہامہ کا علاقہ ہے۔ اس زمانہ میں عالیہ یا عوالی کا سب سے نزدیک والا گاؤں مدینہ سے تین یا چار میل اور سب سے دور والا گاؤں سات یا آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔

"عالیہ کی عجوہ میں شفا ہے" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ دوسری جگہوں کی عجوہ کھجوروں کی بہ نسبت عالیہ کی عجوہ کھجوروں میں زیادہ شفا ہے، یا اس سے حدیث سابق کے مطلق مفہوم کی تقیید مراد ہے، یعنی پچھلی حدیث میں مطلق عجوہ کھجور کی جو تاثیر و خاصیت بیان کی گئی ہے اس کو اس حدیث کے ذریعہ واضح فرمادیا گیا ہے کہ مذکورہ تاثیر و خاصیت عالیہ کی عجوہ کھجوروں میں ہوتی ہے۔

تریاق: ت کے پیش اور زیر دونوں کے ساتھ۔ وہ مشہور دوا ہے جو دافع زہر وغیرہ ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تنگیٔ معاش

(۳۱) وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ يَاْتِىْ عَلَيْنَا الشَّهْرُ مَا نُوْقِدُ فِيْهِ نَارًا اِنَّمَا هُوَ التَّمْرُ وَالْمَآءُ اِلَّا اَنْ يُّؤْتٰى بِاللُّحَيْمِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ بعض مہینہ ہم پر ایسا گزرتا تھا کہ ہم اس میں آگ نہ جلاتے تھے (یعنی بعض مرتبہ پورا پورا مہینہ ایسا گزرتا تھا کہ ہمارے گھر میں سامان خوارک نہ ہونے کی وجہ سے چھولھے میں آگ بھی نہیں جلتی تھی) اور (اس عرصہ میں) ہماری غذا کا انحصار (صرف) کھجور اور پانی پر ہوتا تھا۔ الا یہ کہ کہیں سے تھوڑا سا گوشت آجاتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "الا یہ کہ کہیں سے تھوڑا سا گوشت آجاتا تھا" کا مطلب یہ ہے کہ تنگی معاش کے اس عرصہ میں ہم صرف کھجوریں کھا کھا کر اور پانی پی پی کر گزر کر لیا کرتے تھے، یا اگر کوئی شخص تھوڑا بہت گوشت بھیج دیا کرتا تھا تو اس کو کھالیتے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ گھر میں خوراک کا کوئی سامان نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے چولھے میں آگ نہیں جلتی تھی، ہاں اگر کہیں سے کچھ گوشت آجاتا تو اس کو پکانے کے لئے آگ جلالیا کرتے تھے۔

(۳۲) وعنہا قالت مَاشَبِعَ اٰلُ مُحَمَّدٍ یَوْمَیْنِ مِنْ خُبْزِ بُرٍّ اِلاَّ وَاَحَدُھُمَا تَمْرٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایسا (کبھی نہیں ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے گھر والوں نے دو دن گیہوں کی روٹی سے اپنا پیٹ بھرا ہو، اور ان دو دنوں میں سے ایک دن کی غذا کھجور نہ ہوئی ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے اہل و عیال کبھی بھی مسلسل دو دونوں تک گیہوں کی روٹی نہیں کھاتے تھے، جہاں تک گیہوں کی روٹی کی قید لگانے کا سوال ہے تو ہو سکتا ہے کہ جو کی روٹی میسر ہو جاتی ہو۔

(۳۳) وَعَنْہَا قَالَتْ تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَاشَبِعْنَا مِنَ الْاَسْوَدَیْنِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور ہم نے (آپ ﷺ کی حیات میں کبھی) دو سیاہ چیزوں یعنی کھجور اور پانی سے پیٹ نہیں بھرا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث بھی واضح کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے اہل و عیال کس تنگی و سختی کے ساتھ اپنی زندگی گذارتے تھے اور باوجویکہ اگر آپ چاہتے تو دنیا کی تمام لذات اور ایک خوش حال، بافراغت زندگی گذارنے کے سارے وسائل و ذرائع آپ ﷺ کے قدموں میں ہوتے مگر آپ ﷺ ہمیشہ کمال ایثار و استغناء اور نفس کشی و ترک لذات پر عامل رہے۔

اسودین (دو سیاہ چیزوں) میں سے ایک سیاہ چیز کھجور ہے اور دوسری سیاہ چیز پانی! کو سیاہ چیز سے تعبیر کرنا مجاورت و مقارنت کی وجہ سے ہے اور اس طرح کا طرز کلام اہل عرب کی یہاں مستعمل ہے، جیسا کہ ماں اور باپ کو ابوین یا چاند اور سورج کو قمرین کہتے ہیں، اس کو عربی میں "تغلیب" کہتے ہیں۔ تاہم واضح رہے کہ اس ارشاد میں "پانی کا ذکر کھجور کے ضمن و طفیل میں ہے، اصل مقصد کھجور ہی کا ذکر کرنا ہے، کیوں کہ پانی نہ تو پیٹ بھرنے کے مصرف میں آتا ہے اور نہ اس کی کوئی کمی ہی تھی، اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ آنحضرت ﷺ اور ان کے گھر والوں کو غذا کے طور پر کھجوریں بھی اتنی مقدار میں مہیا نہیں ہوتی تھیں جو پیٹ بھرنے کے بقدر رہوں، بلکہ بس اتنی ہی مہیا ہو جاتی تھیں جس سے پیٹ کو سہارا مل جاتا تھا۔

(۳۴) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ قَالَ اَلَسْتُمْ فِیْ طَعَامٍ وَّشَرَابٍ مَاشِئْتُمْ لَقَدْ رَاَیْتُ نَبِیَّکُمْ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَایَجِدُ مِنَ الدَّقَلِ مَایَمْلَاُ بَطْنَہٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (ایک موقع پر) فرمایا۔ "کیا تم لوگ اپنے کھانے پینے میں جس طرح چاہتے ہو عیش نہیں کرتے (یعنی تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں اپنی خواہش کے مطابق وسعت و افراط اختیار کر کے عیش و راحت کی زندگی گذار رہے ہو) جب کہ میں نے تمہارے نبی ﷺ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ آپ ﷺ کو ناکارہ کھجوریں۔ بھی اس قدر میسر نہیں ہوتی تھیں جو آپ ﷺ کا پیٹ بھر دیتیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "کیا تم ..... الخ، حضرت نعمان ابن بشیرؓ نے یہ بات یا تو تابعین کو مخاطب کر کے کہی، یا آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد صحابۂ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہی۔

"تمہارے نبی ﷺ ..... الخ" مخاطبین کی طرف نبی ﷺ کی اضافت و نسبت ان کو الزام دینے یا یوں کہا جائے کہ غیرت دلانے کے لئے کی، کہ تم جس نبی ﷺ کی اُمت میں ہو اور جن کا نام لیوا ہونے پر فخر کرتے ہو، ان نبی ﷺ کا تو یہ حال تھا کہ ان کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ناکارہ کھجوریں بھی میسر نہیں آتی تھیں اور ایک تم ہو کہ انواع و اقسام کے کھانے کھاتے ہو، اور عیش و عشرت کی زندگی اختیار کئے ہوئے ہو، اور اس طرح گویا تم نے دنیا اور دنیا کی لذتوں سے اجتناب کرنے کے اپنے نبی ﷺ کے طریقہ کو اختیار کرنے سے اعراض کیا ہے۔

واضح رہے کہ پہلی حدیث میں تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر بعض ایام ایسے گزرتے تھے جن میں آپ ﷺ کی غذا محض کھجوریں ہوتی تھیں، دوسری حدیث میں بیان کیا گیا کہ وہ کھجوریں بھی اتنی مقدار میں میسر نہیں ہوتی تھیں جس سے پیٹ ہی بھر لیا جاتا، اور یہاں یہ بیان کیا گیا کہ وہ قلیل مقدار بھی اچھی کھجوروں پر مشتمل نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ ناکارہ کھجوریں ہوتی تھیں جن کو بالکل ہی محتاج و مفلس شخص کے علاوہ کوئی دوسرا کھانا بھی پسند نہ کرے اور یہ ساری باتیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے نزدیک لذات دنیا کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں تھی، اور آپ ﷺ معمولی درجہ کی بھی خوش حال و راحت بخش زندگی گذارنے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے، بلکہ آپ ﷺ نے بنیادی طور پر فقرا اور ترک لذات کو اختیار کیا تھا اور یہی آپ ﷺ کا معمول بن گیا تھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہر حالت میں قائم رکھا، جب اسلام اور اہل اسلام پر سخت عسرت و تنگی کا زمانہ تھا اس وقت بھی آپ ﷺ اس پر عامل رہے اور جب اسلام و اہل اسلام کو شوکت نصیب ہوئی اور دنیا کے خزانے آپ ﷺ کے قدموں میں آگئے اس حالت میں بھی آپ ﷺ نے اسی فقر و عسرت کی زندگی گذارنے پر قناعت کی ایسا کیوں تھا؟ محض اس لئے نہیں کہ آپ ﷺ واقعۃً مفلس و محتاج تھے اور آپ ﷺ خواہش و طلب کے باوجود ایک خوش گوار و خوش حال زندگی کے اسباب و وسائل مہیا کرنے پر قادر نہیں تھے، کیوں کہ یہ بتایا جا چکا ہے کہ بعد میں مسلمانوں کو اسباب معیشت کی بڑی وسعت و فراوانی نصیب ہوئی بلکہ بجا طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عسرت و تنگی کے زمانہ میں بھی اگر آپ ﷺ چاہتے تو عیش و تنعم کے وہ کون سے وسائل تھے جو آپ ﷺ کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کا اتنی سخت و تنگ زندگی گذارنا اس سخاوت کی بناء پر تھا کہ گھر میں جو کچھ بھی آیا دوسروں پر صرف کر دیا، اس ایثار کی بناء پر تھا جو خود کو سخت سے سخت تکلیف میں مبتلا کر کے بھی دوسروں کی راحت چاہتا تھا، اس زہد و تقویٰ اور قناعت و توکل کی بنا پر تھا جس نے آخرت کی سربلندی اپنے پروردگار کی رضا جوئی اور اپنی عبدیت و بے چارگی کے مکمل اظہار کے لئے دنیا کی ہر لذت، دنیا کا ہر عیش و تنعم اور دنیا کی ہر خواہش کو کلیۃً پس پشت ڈال دیا تھا، اور ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ اپنی اس عملی زندگی کے ذریعہ اپنی اُمت کو عیش و تنعم کی زندگی سے اجتناب کرنے قناعت و توکل اور ایثار کا وصف پیدا کرنے اور اپنے حقیقی مقصد حیات کی راہ میں سختی و مشقت برداشت کرنے کی تعلیم و تربیت دیں۔

لہسن کھانا جائز ہے

(۳۵) وَعَنْ اَبِی اَیُّوْبَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِیَ بِطَعَامٍ اَکَلَ مِنْہُ وَ بَعَثَ بِفَضْلِہٖ اِلَیَّ وَ اِنَّہٗ بَعَثَ اِلَیَّ یَوْمًا بِقَصْعَۃٍ لَمْ یَاْکُلْ مِنْھَا لِاَنَّ فِیْھَا ثُوْمًا فَسَاَلْتُہٗ اَحَرَامٌ ھُوَ قَالَ لَا وَلٰکِنْ اَکْرَھُہٗ مِنْ اَجْلِ رِیْحِہٖ قَالَ فَاِنِّیْ اَکْرَہُ مَا کَرِھْتَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جب کھانا لایا جاتا تو آپ ﷺ اس میں سے کھاتے، اور باقی بچا ہوا

میرے پاس بھیج دیتے۔ ایک روز آپ ﷺ نے میرے پاس (ایسا) پیالہ بھیجا (جس میں کھانا تھا) اور اس میں سے خود کچھ نہیں کھایا تھا اس لئے کہ اس میں لہسن تھا، میں نے پوچھا کہ کیا لہسن حرام ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "نہیں! بلکہ اس کی بو کے سبب میں اس کو (کھانا) پسند نہیں کرتا۔" حضرت ابوایوب ؓ نے عرض کیا۔ "تو پھر (میں بھی اس کھانے کو نہیں کھاؤں گا کیونکہ) جس چیز کو آپ ﷺ نے ناپسند کیا ہے اس کو میں بھی ناپسند کرتا ہوں۔" (مسلم)

تشریح : حضرت ابوایوب انصاری ؓ بڑے جلیل القدر انصاری صحابی ہیں ان کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے اپنے گھربار چھوڑ کر مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ تشریف لائے، تو سب سے پہلے حضرت ابوایوب انصاری ؓ ہی کے ہاں اترے اور ان کو میزبان رسول ؐ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اور ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوایوب ؓ نے جس معمول کا ذکر کیا ہے، (کہ آنحضرت ﷺ باقی بچا ہوا کھانا ان کے پاس بھجواتے تھے) وہ انہی دنوں کا ہو جب کہ آپ ﷺ حضرت ابوایوب ؓ کے ہاں قیام فرما تھے۔

"میں اس کو پسند نہیں کرتا" اس ارشاد میں کھانے کو عیب لگانا مقصود نہیں ہے، بلکہ اصل میں اس چیز کا اظہار مقصود ہے کہ اس کی بو مسجد میں جانے اور ملائکہ کے سامنے آنے سے روکتی ہے۔

نووی ؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ لہسن کا کھانا مباح ہے، لیکن اس شخص کے لئے مکروہ ہے جو جماعت میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتا ہو (یعنی لہسن کھا کر نماز کے لئے مسجد میں جانا مکروہ ہے) اور یہی حکم ہر اس چیز کا ہے جس سے بدبو پیدا ہوتی ہو، جہاں تک آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے تو چونکہ آپ ﷺ ہر لمحہ وحی کے نازل ہونے کے متوقع رہتے تھے، اس لئے آپ ﷺ کبھی بھی لہسن نہیں کھاتے اور اس سے مکمل اجتناب فرماتے تھے۔

اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، کہ پیاز، لہسن اور گندنا کا حکم آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کے لئے کیا تھا، آیا یہ چیزیں آپ ﷺ کے لئے حرام تھیں یا نہیں؟ چنانچہ بعض حنفی علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ چیزیں آنحضرت ﷺ کی ذات خاص کے لئے حرام نہیں تھیں ان کے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی تھیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے والے اور پینے والے کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ جو چیز کھا یا پی رہا ہو اس میں سے کچھ باقی چھوڑ دے، اور پھر اس کو اپنے محتاج ہمسایوں میں تقسیم کر دے۔

"جس چیز کو آپ ﷺ نے ناپسند کیا ہے..... الخ اس بات میں یا تو آنحضرت ﷺ کی اتباع کامل کی طرف اشارہ ہے، کہ آپ لہسن کو چونکہ ناپسند کرتے ہیں اس لئے میں بھی اس کو ہمیشہ ناپسند کروں گا، یا یہ کہ حضرت ابوایوب ؓ نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ جماعت میں شریک ہونے کے لئے مسجد جاتے وقت میں لہسن کا استعمال نہیں کروں گا۔

لہسن، پیاز کھا کر مسجد و مجالس ذکر وغیرہ میں مت جاؤ

(۳۶) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَكَلَ ثُوْمًا اَوْ بَصَلاً فَلْيَعْتَزِلْنَا اَوْ قَالَ فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا اَوْ لِيَقْعُدْ فِي بَيْتِهِ وَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِقِدْرٍ فِيْهِ خَضِرَاتٌ مِنْ بُقُوْلٍ فَوَجَدَ لَهَا رِيْحًا فَقَالَ قَرِّبُوْهَا اِلٰى بَعْضِ اَصْحَابِهِ وَقَالَ كُلْ فَاِنِّيْ اُنَاجِيْ مَنْ لَا تُنَاجِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص لہسن یا (کچی) پیاز کھائے ہوئے ہو، تو اس کو چاہئے کو وہ ہم سے الگ رہے یعنی ہماری مجالس میں نہ آئے یا یہ فرمایا کہ تو اس کو چاہئے کہ وہ (کہیں جانے کے بجائے) اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔" اور (ایک دن کا واقعہ ہے کہ) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک ہانڈی لائی گئی جس میں از قسم ترکاری سبزیاں تھیں (یعنی لہسن، پیاز اور گندنا وغیرہ) آپ ﷺ کو اس میں بو محسوس ہوئی تو اپنے صحابہ میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے (کسی خادم سے) فرمایا کہ اس کو اس (فلاں

شخص) کے پاس لے جاؤ اور پھر (اس شخص کو) مخاطب کر کے) فرمایا کہ اس کو تم کھاؤ، میں نہیں کھاؤں گا کیونکہ میں جس ہستی کے ساتھ سرگوشیاں کرتا ہوں اس کے ساتھ تم سرگوشی نہیں کرتے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "ہماری مسجد" میں مفرد لفظ یعنی "مسجد" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف مسجد نبوی ﷺ کے لئے ہے۔ اور صیغہ متکلم میں مع الغیر کا استعمال (یعنی میری مسجد کہنے کے بجائے ہماری مسجد کہنا) مسجد نبوی ﷺ کی تعظیم و اکرام کے پیش نظر ہے لیکن چونکہ اس حکم کی علت اور اس کے سبب میں تمام ہی مساجد بلکہ مجالس خیر جیسے مجلس ذکر وغیرہ، مجلس درس و تدریس اور اولیاء اللہ و علماء دین کی مجالس بھی شامل ہیں اس لئے جو حکم مسجد نبوی ﷺ کا ہے کہ لہسن وغیرہ کھا کر اس میں نہ جایا جائے یہی حکم دیگر مساجد و مجالس خیر کا بھی ہوگا اور اگر اس احتمال کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ اس ارشاد گرامی میں مفرد لفظ مسجد سے مراد جنس ہے (کہ آپ ﷺ نے لفظ مسجد بول کر تمام مساجد مراد لی ہیں) تو پھر اس تاویل کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، علاوہ ازیں بعض روایت میں مساجدنا یعنی ہماری مساجد کا لفظ منقول ہے، اس صورت میں تو تمام مساجد کے لئے یہ حکم بالکل صریح ہوگا۔

اولیقعد فی بیتہ میں حرف او (یعنی یا) اگر راوی کے شک کے اظہار کے لئے ہے تو مراد یہ ہوگی کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو فلیعتزلنا تو اس کو چاہئے کہ وہ ہم سے الگ رہے) فرمایا تھا، یا یہ فرمایا تھا کہ فلیعتزل مسجدنا (تو اس کو چاہئے کہ ہماری مسجد سے دور رہے) اور یا یہ فرمایا تھا کہ من اکل ثوما او بصلا فلیقعد فی بیتہ یعنی جو شخص لہسن یا پیاز کھائے ہوئے ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا رہے، کسی دوسرے کے پاس نہ جائے خواہ مسجد میں خواہ مسجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اولیقعد فی بیتہ میں حرف او راوی کے شک کے اظہار کے لئے نہ ہو، بلکہ تنویع و تقسیم کے لئے ہو اور اس کا تعلق ماقبل کے فقرہ یعنی فلیعتزل مسجدنا سے ہو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ لہسن، پیاز کھا کر مسجد میں آنا مکروہ ہے، کہ وہاں ملائکہ، رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ موجود رہتے ہیں اور ان چیزوں کو کھا کر عام لوگوں کے ساتھ اختلاط و مجالست مباح ہے اور یا اس سے بھی پرہیز کرنا چاہئے کہ اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور مطلق اختلاط و مجالست سے باز رہے کیونکہ یہ زیادہ بہتر ہے۔

"اس ہستی" سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام اور ملائکہ ہیں، مطلب یہ تھا، کہ یہ فرشتے میرے پاس آتے رہتے ہیں اور میں ان سے بات چیت کرتا ہوں جب کہ تمہارے ساتھ یہ چیز نہیں ہے، اس لئے جو چیز (یعنی لہسن پیاز وغیرہ کھانا) میرے لئے جائز نہیں وہ تمہارے لئے جائز ہے، اس ارشاد گرامی میں گویا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے ہم نشین و مصاحب کی طبیعت و عادات اور اس کے حل کی رعایت ملحوظ رکھے اور اس کی جائز خوشی و مرضی کو پورا کرے۔

اشیاء خوراک کو ماپ تول کر لینے دینے اور پکانے کا حکم

(۳۷) وَعَنِ الْمِقْدَامِ ابْنِ مَعْدِيْكَرِبَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كِيْلُوْا طَعَامَكُمْ يُبَارَكْ لَكُمْ فِيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مقداد ابن معدیکربؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "کھانے پینے کی چیزوں کو) ناپ تول لیا کرو تمہارے لئے اس میں برکت عطا کی جائے گی۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو چیز پیمانہ و اوزان کے ذریعہ ناپی تولی جاتی ہے اس کو قرض، لین دین، بیچنے خریدنے اور پکانے کے لئے دیتے وقت ناپ تول لیا کرو تا کہ اس کا صحیح اندازہ و توازن قائم رہ سکے اور کمی بیشی کا کوئی خدشہ نہ رہے، چنانچہ یہ چیز (یعنی اناج و غلہ وغیرہ کا ناپنا تولنا) شارع علیہ السلام کے اس حکم کی بناء پر خیر و برکت میں اضافہ کی خاصیت و تاثیر رکھتی ہے، خاص طور پر جب کہ سُنّت کی رعایت ملحوظ ہو اور آنحضرت ﷺ کے حکم کی بجا آوری کا قصد ہو۔ (شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ)

ملا علی قاریؒ نے بھی مظہر سے اسی طرح کی بات نقل کر کے یہ لکھا ہے کہ اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ اس حدیث اور اس حدیث کے

درمیان مطابقت کیوں کر ہوگی جو حضرت عائشہؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے بیان کیا۔" جب رسول کریم ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا جو کوئی جاندار کھاتا علاوہ اس تھوڑے سے جو کے جو بخاری میں تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو کی اس تھوڑی سی مقدار میں اتنی برکت عطا فرما رکھی تھی کہ) میں ایک مدت تک اس میں سے نکال نکال کر اپنے کھانے کا انتظام کرتی رہی پھر (ایک دن) میں نے اس کو ماپ ڈالا۔ بس جب ہی سے اس کی برکت جاتی رہی اس کا جواب یہ ہے اصل میں خرید و فروخت کے وقت ماپنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ برابری اور توازن قائم رہے اور خرچ کے وقت ناپنا در حقیقت احصار و ضبط ہے جو ایک طرح سے بخل اور تنگی قلب کا مظہر ہوتا ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے، چنانچہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا "بلال! تم بس خرچ کرو صاحب عرش (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے کمی کئے جانے کا خوف نہ کرو۔" پس شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے حوالہ سے جو مطلب نقل کیا گیا ہے، اس کے مطابق ناپنے تولنے کا حکم مطلق ناپ تول پر محمول ہے کہ لین دین اور خرید و فروخت کے وقت بھی ناپنا تولنا چاہئے اور خرچ کے وقت بھی ناپ تول کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ جب کہ ملا علی قاریؒ سے منقول مذکورہ بلا اشکال اور اس کا جواب یہ واضح کرتا ہے کہ ناپ تول کرنے کا حکم محض لین دین اور خرید و فروخت کی صورت پر محمول ہے۔ واللہ اعلم۔

کھانے کے بعد اللہ کی حمد و ثنا

(۳۸) وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا رُفِعَ مَائِدَتُهٗ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبٰرَکًا فِیْهِ غَیْرَ مَکْفِیٍّ وَّلَا مُوَدَّعٍ وَّلَا مُسْتَغْنًی عَنْهُ رَبَّنَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے سے جب دسترخوان اٹھایا جاتا یعنی جب آپ ﷺ کھانا کھا کر فارغ ہوتے تو (اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں اس طرح) فرماتے۔ "سب تعریف اللہ کے لئے ہے ایسی تعریف جو بہت ہے اور پاکیزہ (یعنی ظاہر داری اور دکھاوے سے خالی ہے) جس میں برکت عطا کی گئی ہے، یعنی وہ ایسی بابرکت حمد ہے کہ ہمیشہ جاری و قائم رہے اور کبھی منقطع نہ ہو، وہ نہ کفایت کی گئی ہے اور نہ اس سے بے پروائی ہو اے رب ہمارے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "غیر مکفی" کو علماء نے کئی طرح سے صحیح کہا ہے اور اس کے معنی بیان کئے ہیں، اگر ان کی پوری تفصیل کو یہاں نقل کیا جائے تو غیر معمولی طوالت اختیار کرنی پڑے گی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ غیر اور ربنا کو مرفوع بھی قرار دیا گیا ہے اور منصوب بھی، یا ان دونوں میں سے ایک کو منصوب اور دوسرے کو مرفوع۔ اسی طرح علماء نے جو معنی و مطلب بیان کئے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ یہ الفاظ "وہ نہ کفایت کی گئی ہے اور نہ متروک اور نہ اس سے بے پروائی ہو" یا تو حمد و تعریف کے احوال و صفات کے اظہار کے لئے ہیں کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے پروردگار کی اس طرح تعریف و ثنا بیان کرے کہ وہ کسی بھی درجہ پر کافی نہ سمجھی جائے نہ حمد و ثنا بیان کرنے کو ترک کیا جائے اور نہ اس سے بے نیازی برتی جائے بلکہ جس طرح حق تعالیٰ ہمہ وقت انسان پر اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ رہتا ہے اور ہر لحہ تسلسل و دوام کے ساتھ اس کو اپنی نعمتیں عطا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی ہر لحہ اور ہمہ وقت تسلسل و دوام کے ساتھ حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا رہے کہ یہ اپنے منعم حقیقی۔ کے حضور ادائیگی شکر بھی ہے اور اپنے پروردگار کی تعریف بھی۔ یا یہ کہ یہ الفاظ اصل میں کھانے کے حق میں درجہ صفت رکھتے ہیں کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ اس کو کسی بھی درجہ میں اپنے لئے کافی نہ سمجھا جائے بلکہ ہمہ وقت اپنے آپ کو رزق الٰہی کا محتاج تصور کیا جائے کہ اس کی خواہش و طلب کو ترک نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے بے نیازی برتی جا سکتی ہے۔ اور یا یہ کہ یہ الفاظ حق تعالیٰ شانہ کے اوصاف جلیلہ کے اظہار کے لئے ہیں کہ ایسی کوئی ذات یا ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ جو اس ذات کبریائی کو کافی ہو بلکہ وہ خود سارے جہان اور ساری چیزوں کے لئے کافی ہے، اس کی قربت کی طلب و خواہش کو ترک نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کے فضل و کرم سے مستغنی و بے نیاز ہو سکتے ہیں۔

(۳۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَیَرْضٰی عَنِ الْعَبْدِ اَنْ یَّاکُلَ الْاَکْلَۃَ فَیَحْمَدَہٗ عَلَیْھَا اَوْیَشْرَبَ الشَّرْبَۃَ فَیَحْمَدَہٗ عَلَیْھَا رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَیْ عَائِشَۃَ وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ مَاشَبِعَ اٰلُ مُحَمَّدٍ وَخَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الدُّنْیَا، فِیْ بَابِ فَضْلِ الْفُقَرَآءِ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ بندے کی اس بات سے راضی وخوش ہوتا ہے کہ وہ ایک لقمہ کھائے اور اس پر خدا کی حمد وثنا کرے یا ایک مرتبہ پئے اور اس پر خدا کی حمد وثنا کرے۔" (مسلمؒ) اور دو روایتیں جن میں سے ایک روایت حضرت عائشہؓ کی ہے ماشبع ال محمد صلی اللہ علیہ وسلم الخ اور دوسری روایت خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ حضرت ابوہریرہؓ کی ہے۔ ان دونوں روایتوں کو ہم انشاء باب فضل الفقراء میں نقل کریں گے۔ یعنی یہ دونوں روایتیں صاحب مصابیح نے کتاب الاطعمہ میں نقل کیں تھیں لیکن ہم نے ان کو باب فضل الفقراء میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "اکلہ" الف کے زبر کے ساتھ، کے معنی ہیں "ایک بار سیر ہو کر کھانا۔" ویسے یہ لفظ الف کے پیش کے ساتھ بھی منقول ہے جس کے معنی لقمہ کے ہیں۔

حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص کھانا کھا کر فارغ ہو جاتا ہے یا کوئی چیز پیتا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہے اور اس کی حمد وثنا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل سے بہت خوش ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرنا کھانے میں برکت کا باعث ہوتا ہے

(۴۰) عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ کُنَّا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُرِّبَ اِلَیْہِ طَعَامٌ فَلَمْ اَرَ طَعَامًا کَانَ اَعْظَمَ بَرَکَۃً مِنْہُ اَوَّلَ مَا اَکَلْنَا وَلَا اَقَلَّ بَرَکَۃً فِیْ اٰخِرِہٖ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ ھٰذَا قَالَ اِنَّا ذَکَرْنَا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ حِیْنَ اَکَلْنَا ثُمَّ قَعَدَ مَنْ اَکَلَ وَلَمْ یُسَمِّ اللّٰہَ فَاَکَلَ مَعَہُ الشَّیْطَانُ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس تھے کہ کھانا سامنے لایا گیا (کھانے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ) میں نے اس کھانے میں اس وقت جو بڑی برکت دیکھی جب کہ ہم نے کھانا شروع کیا تھا ایسی برکت میں نے کسی اور کھانے میں نہیں دیکھی اور اس کھانے کے آخر میں میں نے جو کمتر برکت دیکھی ایسی کم برکت بھی اور کسی کھانے میں نہیں دیکھی، چنانچہ ہم نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! اس کا کیا سبب تھا (کہ اس کھانے میں شروع میں تو اتنی زیادہ برکت دیکھی گئی اور آخر میں اس طرح بے برکتی نظر آئی)؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا درحقیقت کھانے کے شروع میں ہم نے اللہ کا نام لیا تھا لیکن بعد میں ایک ایسا شخص آکر بیٹھ گیا جس نے کھانا کھایا مگر اللہ کا نام نہیں لیا لہٰذا اس کے ساتھ شیطان نے بھی کھانا کھایا (اس سبب سے آخر میں بے برکتی ہوئی۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "ہم نے اللہ کا نام لیا تھا" اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بسم اللہ پڑھنے کی سُنّت محض "بسم اللہ" کہہ لینے سے حاصل ہو جاتی ہے لیکن افضل یہ ہے کہ پوری بسم اللہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی جائے۔

کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ کہنا مستحب ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص جنبی (حالت ناپاکی میں) ہو یا کوئی عورت ایام حیض یا حالت نفاس میں ہو تو یہ استحباب اس کے لئے بھی ہے بشرطیکہ بسم اللہ پڑھتے وقت تلاوت کی نیت نہ کرے بلکہ ذکر کی نیت سے پڑھے ورنہ حرام ہوگا (کیونکہ ناپاکی اور حیض ونفاس کی حالت میں قرآن کریم کی تلاوت حرام ہے اور بسم اللہ بھی قرآن کریم ہی کا ایک فقرہ ہے۔)

جن چیزوں کو کھانا پینا شریعت کی رو سے مکروہ یا حرام ہے ان کو کھاتے پیتے وقت بسم اللہ پڑھنا مستحب نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص شراب

پیتے وقت بسم اللہ پڑھے گا تو وہ کافر ہو جائے گا (بعض علماء نے مطلق کسی بھی حرام چیز کو کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنے کو کفر کہا ہے۔
شیطان کا کھانے میں شریک ہونا اکثر علماء سلف وخلف کے نزدیک حقیقت پر محمول ہے کہ وہ بسم اللہ نہ پڑھ کر، کھانے والے کے ساتھ کھانے میں حقیقۃً شریک ہوتا ہے جس کی وجہ سے کھانے میں بے برکتی ہو جاتی ہے۔
پہلے جو یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک اجتماعی طور پر کھانا کھانے کی صورت میں کسی ایک شخص کا بسم اللہ پڑھ لینا اس کھانے پر موجود سب لوگوں کے لئے کافی ہے اور ہر ایک شخص کا بسم اللہ پڑھنا ضروری نہیں ہے تو یہ حدیث ان علماء کے مسلک کے خلاف ایک دلیل ہے۔

کھانے کے درمیان بھی بسم اللہ پڑھی جاسکتی ہے

(۴۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَنَسِيَ اَنْ يَذْكُرَ اللّٰهَ عَلٰى طَعَامِهٖ فَلْيَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھانے بیٹھے اور (شروع میں) اپنے کھانے پر اللہ کا نام لینا بھول جائے (اور کھانے کے درمیان یاد آئے) تو اس کو چاہئے کہ وہ یہ کہے بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ۔" (ترمذیؒ، ابوداؤد)

تشریح: اللہ کا نام لینا بھول جائے الخ سے یہ معلوم ہوا کہ کھانا شروع کرتے وقت محض اللہ کے نام کا ذکر کافی ہے لیکن بسم اللہ کہنا افضل ہے۔
محیط میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کرتے وقت (بسم اللہ کے بجائے) لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور یا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے تو وہ سُنّت ادا کرنے والا کہلائے گا اسی طرح کھانے کی صورت میں بھی یہ مسئلہ ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص ابتداء وضو میں بسم اللہ کہنا بھول جائے اور پھر درمیان وضو (یاد آنے پر) بسم اللہ کہہ لے تو اس کو سُنّت پر عمل کرنے کا درجہ حاصل نہیں ہوگا بخلاف کھانے کے (کہ کھانے کے درمیان یاد آنے پر بسم اللہ کہہ لینا ادائیگی سُنّت کے لئے کافی ہو جائے گا۔)

(۴۲) وَعَنْ اُمَيَّةَ ابْنِ مَخْشِيٍّ قَالَ كَانَ رَجُلٌ يَاْكُلُ فَلَمْ يُسَمِّ حَتّٰى لَمْ يَبْقَ مِنْ طَعَامِهٖ اِلَّا لُقْمَةٌ فَلَمَّا رَفَعَهَا اِلٰى فِيْهِ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ فَضَحِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ مَازَالَ الشَّيْطَانُ يَاْكُلُ مَعَهٗ فَلَمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ اسْتَقَاءَ مَافِيْ بَطْنِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت امیہ ابن مخشیؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک شخص کھانا کھانے بیٹھا تو اس نے اللہ کا نام نہیں لیا (یعنی بسم اللہ کہے بغیر کھانا کھانے لگا) یہاں تک کہ جب اس کھانے میں سوائے ایک لقمہ کے کچھ باقی نہیں رہا (اور اس کو یاد آیا کہ میں کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ کہنا بھول گیا ہوں) تو اس نے وہ آخری لقمہ اپنے منہ میں لے جاتے وقت کہا بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ۔ رسول کریم ﷺ (یہ دیکھ کر) ہنسے اور پھر فرمایا کہ شیطان اس شخص کے ساتھ برابر کھانا کھا رہا تھا لیکن جب اس نے اللہ کا نام لیا تو اس (شیطان) نے وہ سب کچھ اگل دیا جو اس کے پیٹ میں تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: شیطان کا اپنے پیٹ کا سارا کھانا اگل دینا، حقیقت پر محمول ہے۔ یا یہ مراد ہے کہ کھاتے وقت بسم اللہ نہ کہنے کی وجہ سے جو برکت جاتی رہی تھی اس نے اس کو واپس کر دیا۔ گویا وہ برکت اس شیطان کے پیٹ میں امانت تھی جب اس شخص نے بسم اللہ کہی تو وہ برکت بھی کھانے میں واپس آگئی۔

کھانے کے بعد شکر وحمد

(۴۳) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَرَغَ مِنْ طَعَامِهٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلْنَا مُسْلِمِيْنَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کھانے سے فارغ ہوتے تو فرماتے۔ ہر طرح کی تعریف اس اللہ کو سزاوار ہے جس نے ہمیں کھانے کو دیا۔ ہمیں پینے کو دیا اور ہمیں مسلمان بنایا۔" (ترمذیؒ ،ابوداؤدؒ ،ابن ماجہؒ)

(۴۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّاعِمُ الشَّاكِرُ كَالصَّائِمِ الصَّابِرِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ عَنْ سِنَانِ بْنِ سَنَّةَ عَنْ اَبِيْهِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" کھانا کھا کر (اللہ تعالیٰ کا) شکر ادا کرنے والا صابر روزہ دار کی طرح ہے۔ " (ترمذیؒ) ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے اس روایت کو سنان بن سنہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: ادائیگی شکر کا ادنی درجہ یہ ہے کہ کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ کہے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور " صابر روزہ دار" ہونے کا ادنی درجہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو مفسدات صوم سے باز رکھے۔

" صابر روزہ دار کی طرح ہے۔" یہ تشبیہ اصل ثواب میں ہے کہ دونوں اصل ثواب میں شریک ہیں نہ یہ کہ مقدار میں تشبیہ دینا مراد ہے اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جائے کہ کہا جاتا ہے زَیْدٌ کَعَمْرو یعنی زید، عمرو کی طرح ہے اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ زید بعض خصائل وعادات میں عمرو کے مشابہ ہے نہ کہ وہ تمام خصائل وعادات میں عمرو کے ہم مثل ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صابر فقیر، شاکر مالدار سے افضل ہے کیونکہ مشبہ بہ، مشبہ سے اقوی ہوتا ہے۔

(۴۵) وَعَنْ اَبِیْ اَيُّوْبَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَكَلَ اَوْشَرِبَ قَالَ الْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَ وَسَقٰى وَسَوَّغَهٗ وَجَعَلَ لَهٗ مَخْرَجًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوایوبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کھاتے اور پیتے تو فرماتے "ہر طرح کی تعریف اللہ کو سزاوار ہے جس نے کھلایا پلایا اور اس کھانے پینے کی چیز کو آسانی کے ساتھ حلق سے اتارا اور اس کے نکلنے کی راہ پیدا فرمائی۔" (ابوداؤدؒ)

کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھونا کھانے میں برکت کا ذریعہ ہے

(۴۶) وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَرَأْتُ فِی التَّوْرَاةِ اِنَّ بَرَكَةَ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ بَعْدَهٗ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَرَكَةُ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ قَبْلَهٗ وَالْوُضُوْءُ بَعْدَهٗ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت سلمان کہتے ہیں کہ میں نے (اسلام قبول کرنے سے پہلے) تورات میں پڑھا تھا کہ کھانے میں برکت کا ذریعہ کھانے کے بعد وضو کرنا چنانچہ (قبولیت اسلام) کے بعد (ایک دن) میں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے (تورات کے اس مضمون کا) ذکر کیا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کھانے میں برکت کا ذریعہ کھانے سے پہلے وضو کرنا ہے اور کھانے کے بعد وضو کرنا ہے۔" (ترمذیؒ ،ابوداؤدؒ)

تشریح: "وضو" سے مراد کھانے سے پہلے ہاتھوں کو اور کھانے کے بعد دونوں ہاتھوں اور منہ کو دھونا ہے۔ کھانے سے پہلے وضو یعنی ہاتھ دھونا اس کھانے میں برکت کا ذریعہ اس طور پر ہوتا ہے کہ اس (ہاتھ دھونے) کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کھانے میں زیادتی عطا فرماتا ہے اور کھانے کے بعد وضو کا اس کھانے میں برکت کا ذریعہ ہونا یہ ہے کہ اس کی وجہ سے طبیعت کو سکون حاصل ہوتا ہے اور یہ (یعنی کھانے کے بعد ہاتھ منہ کا دھونا یا ہاتھ منہ دھونے سے طبیعت کو سکون حاصل ہونا) عبادات، اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ میں تقویت و دل جمعی کا سبب ہوتا ہے۔

(۴۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ فَقُدِّمَ اِلَيْهِ طَعَامٌ فَقَالُوْا اَلَا نَاْتِيْكَ بِوَضُوْءٍ قَالَ

اِنَّمَا اُمِرْتُ بِالْوُضُوْءِ اِذَا قُمْتُ اِلَی الصَّلٰوۃِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِیُّ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ بیت الخلاء سے واپس آئے تو آپ ﷺ کے سامنے کھانا لایا گیا۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا ہم آپ کے سامنے وضو کا پانی لائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "مجھے (حدث کے بعد) وضو کرنے کا حکم (بطریق وجوب) اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ میں نماز کے لئے کھڑا ہونے کا ارادہ کروں" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ،) اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: یہ آپ ﷺ نے اغلب واکثر کے اعتبار سے فرمایا کہ بطریق وجوب وضو کرنے کا حکم صرف نماز کے لئے ہے ورنہ سجدۂ تلاوت کرنے، قرآن مجید کو چھونے اور طواف کرنے کے لئے بھی وضو کرنا واجب ہے۔ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے گویا یہ سمجھا کہ صحابہؓ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ کھانے سے پہلے وضو شرعی کرنا واجب ہے چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے اس اعتقاد کی نفی کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے اپنے ارشاد میں حصر کا اسلوب اختیار فرمایا اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ کھانے سے پہلے وضو کرنا جائز بلکہ مستحب ہے۔ لہٰذا یہاں "وضو" سے مراد وہی وضو ہے جو نماز کے لئے کیا جاتا ہے نہ کہ کھانے کا وضو یعنی ہاتھ اور منہ دھونا حدیث کا سیاق بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم اگر اس جملہ اَلَا نَاْتِیْكَ بِوَضُوْءٍ (کیا ہم آپ کے لئے وضو کا پانی لائیں؟) میں وضو سے مراد کھانے کا وضو اور اس جملہ اِنَّمَا اُمِرْتُ بِالْوُضُوْءِ (مجھے وضو کرنے کا حکم اس صورت میں دیا گیا ہے الخ) میں وضو سے مراد نماز کا وضو لیا جائے تو یہ بھی ہو سکتا ہے اور چونکہ کھانے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا سنن اور آداب میں سے ہے نہ کہ واجب، اس لئے آپ ﷺ نے اس موقع پر تعلیم جواز کے پیش نظر اس کو ترک کیا اور اس صورت میں حدیث کا حاصل یہ ہوگا کہ یہ وضو یعنی کھانے سے پہلے ہاتھوں کو دھونا کہ جس کے لئے تم مجھ سے درخواست کرتے ہو کوئی واجب اور مامور نہیں ہے اگر میں اس کو ترک کروں یعنی کھانے سے پہلے اپنے ہاتھ نہ دھوؤں تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا ہاں یہاں ایک اور وضو ہے اور وہ نماز کا وضو ہے جو واجب ہے۔

اپنے آگے سے کھانے کا حکم

(۴۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ اُتِیَ بِقَصْعَۃٍ مِنْ ثَرِیْدٍ فَقَالَ کُلُوْا مِنْ جَوَانِبِھَا وَلَا تَاْکُلُوْا مِنْ وَسْطِھَا فَاِنَّ الْبَرَکَۃَ تَنْزِلُ فِیْ وَسْطِھَا رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ دَاؤُدَ قَالَ اِذَا اَکَلَ اَحَدُکُمْ طَعَامًا فَلَا یَاْکُلْ مِنْ اَعْلَی الصَّحْفَۃِ وَلٰکِنْ یَاْکُلُ مِنْ اَسْفَلِھَا فَاِنَّ الْبَرَکَۃَ تَنْزِلُ مِنْ اَعْلَاھَا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ (ایک دن) آپ ﷺ کی خدمت میں ثرید کا ایک پیالہ لایا گیا۔ آپ ﷺ نے (مجلس میں موجود صحابہؓ سے) فرمایا کہ اس پیالے کے کناروں سے کھاؤ۔ اس کے درمیان میں سے نہ کھاؤ کیونکہ برکت اس کے درمیان میں نازل ہوتی ہے (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، اور ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھانے بیٹھے تو اس کو چاہئے کہ وہ پیالہ کے اوپر سے نہ کھائے البتہ پیالے کے نیچے سے کھائے کیونکہ برکت اوپر کے حصے میں نازل ہوتی ہے۔"

تشریح: "ثرید" اس کھانے کو کہتے ہیں جو روٹی کو شوربے میں تیار کیا گیا ہو۔ "کناروں" جمع کا لفظ "　　" جمع کے صیغے کے مقابلے میں لایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے سامنے کے کنارے سے کھائے۔ درمیان کے حصے میں برکت کا نازل ہونا اس سبب سے ہے کہ کسی بھی چیز کا درمیانی حصہ اس کے اور حصوں کی بہ نسبت افضل ہوتا ہے لہٰذا کھانے کے برتن کا درمیانی حصہ ہی اس کا مستحق ہے کہ خیر و برکت کا نزول اس پر ہو اور جب کھانے کا درمیانی حصہ خیر و برکت کے اترنے کی جگہ قرار پایا تو اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ

وہ حصہ آخر کھانے تک باقی رہے تاکہ کھانے کی برکت بھی آخر تک برقرار رہے لہٰذا اپنے سامنے کے کناروں کو چھوڑ کر پہلے درمیانی حصہ پر ہاتھ ڈالنا اور اس کو ختم کر دینا مناسب نہیں ہے۔

"پیالہ کے اوپر" سے مراد اس کا درمیانی حصہ ہے اور "اس کے نیچے" سے مراد اس کے کنارے ہیں اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اپنے سامنے سے کھانا چاہئے۔

آنحضرت ﷺ نے کبھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا

(۴۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ مَارُؤِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَأْکُلُ مُتَّکِئًا قَطُّ وَلَا یَطَأُ عَقِبَهُ رَجُلَانِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کبھی ٹیک لگا کر کھانا کھاتے ہوئے نہیں دیکھے گئے اور آنحضرت ﷺ کے پیچھے دو آدمی بھی نہیں چلتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ٹیک لگا کر کھانا کھانے کے سلسلے میں تفصیلی بات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ پیچھے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کہیں جاتے آتے تو آپ ﷺ کے پیچھے زیادہ آدمیوں کا تو ذکر ہی نہیں دو آدمی بھی نہیں چلتے تھے، بلکہ آپ ﷺ انتہائی تواضع اور انکسار کے تحت اپنے صحابہ کے ساتھ اس طرح چلتے کہ یا تو آپ ﷺ سب کے درمیان میں رہتے یا سب سے پیچھے رہتے جیسا کہ ایک اور حدیث میں الفاظ منقول ہیں کہ ویسوق اصحابہ (آپ ﷺ اپنے صحابہؓ سے پیچھے چلتے تھے) آپ ﷺ اپنے ہم اور صحابہؓ کبھی آگے ہو کر نہیں چلتے تھے۔ جیسے امراء و سلاطین متکبر و جاہ پرست لوگوں اور دنیا دار پیروں کا طریقہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ہمراہیوں کے آگے آگے چلنے ہی میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں بلکہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا ہجوم ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ "دو" کی قید سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھار ایک آدھ آدمی جیسے حضرت انسؓ وغیرہ آنحضرت ﷺ کے پیچھے رہا کرتے تھے، اور یہ بھی ضرورت کے تحت اور یہ تواضع و انکسار کے منافی بھی نہیں۔

مسجد میں کھانے پینے کا مسئلہ

(۵۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ ابْنِ جَزْءٍ قَالَ اُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِخُبْزٍ وَلَحْمٍ وَهُوَ فِی الْمَسْجِدِ فَاَکَلَ وَاَکَلْنَا مَعَهٗ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰی وَصَلَّیْنَا مَعَهٗ وَلَمْ نَزِدْ عَلٰی اَنْ مَسَحْنَا اَیْدِیَنَا بِالْحَصْبَاءِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں روٹی اور گوشت (پر مشتمل کھانا) لایا گیا جب کہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، چنانچہ (اس کھانے کو) آنحضرت ﷺ نے بھی کھایا اور آنحضرت کے ہمراہ ہم نے بھی کھایا، پھر کھڑے ہوئے اور آنحضرت ﷺ نے نماز پڑھی، آپ ﷺ کے ساتھ ہم نے بھی نماز ادا کی اور اس سے زیادہ ہم نے کچھ نہیں کیا کہ (کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاتھوں کو ان کنکریوں سے پونچھ ڈالا تھا جو مسجد میں تھیں ابن ماجہؒ۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کھانا کھانے کے بعد ہم نے اپنے ہاتھوں کو پانی سے دھویا نہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کھانے میں چکنائی نہیں تھی یا یہ کہ نماز کے لئے ہمیں جلدی تھی اور یا اس کا سبب یہ تھا کہ ہم نے تکلّف کو ترک کر کے رخصت (آسانی) پر عمل کرنا چاہا تھا کیوں کہ غیر واجب امور میں کبھی کبھی رخصت پر عمل کر لینا بھی حق تعالیٰ کے نزدیک اسی طرح پسندیدہ ہے جس طرح وہ اکثر اوقات میں عزیمت پر عمل کرنے کو محبوب رکھتا ہے۔

احیاء العلوم میں بعض صحابہؓ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا۔ "کھانے کے بعد ہمارے پاؤں کی پاشنی (ایڑی) ہمارے لئے رومال" کا کام دیا کرتی تھی یعنی ہم کھانا کھا کر اپنے ہاتھوں کو اپنے پاؤں کی ایڑیوں سے پونچھ لیا کرتے تھے جیسا کہ رومال سے پونچھا جاتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے الفاظ لم نزد اور مسحنا میں متکلم مع الغیر کا صیغہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ سب کو شامل ہے یعنی آنحضرت ﷺ اور وہاں موجود سارے صحابہؓ نے اپنے ہاتھ کنکریوں سے پونچھے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں کھانا پینا جائز ہے اور یہ بات اکثر احادیث میں منقول ہے خاص طور پر کھجوروں اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے بارے میں زیادہ منقولات ہیں لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ جواز اس امر کے ساتھ مقید ہے کہ اس کی وجہ سے مسجد میں گندگی وغیرہ پیدا نہ ہو ورنہ (گندگی پیدا ہونے کی صورت میں) مسجد میں کھانا پینا حرام یا مکروہ ہوگا اور فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے جو شخص اعتکاف کی حالت میں نہ ہو وہ مسجد میں نہ تو کھائے پئے نہ سوئے اور نہ خرید و فروخت کرے کہ یہ مکروہ ہے، ہاں اس مسافر کے لئے اجازت ہے جس کا مسجد کے علاوہ اور کوئی ٹھکانا نہ ہو۔

علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کو چاہئے کو وہ جب مسجد میں داخل ہو تو اعتکاف کی نیت کر لیا کرے تا کہ یہ چیزیں (مسجد میں کھانا پینا وغیرہ) اس کے لئے مباح بھی ہو جائیں اور اس کو (اعتکاف کا) ثواب بھی مل جائے۔

آنحضرت ﷺ کو دست کا گوشت بہت پسند تھا

(۵۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَحْمٍ فَرُفِعَ اِلَيْهِ الذِّرَاعُ وَكَانَتْ تَعْجِبُهُ فَنَهَسَ مِنْهَا۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں (پکایا بھنا ہوا) گوشت لایا گیا، اس میں سے آپ ﷺ کو دست کا حصہ دیا گیا کیونکہ دست کا گوشت آپ ﷺ کو بہت پسند تھا چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو دانتوں سے نوچ نوچ کے کھایا۔"

(ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: آپ ﷺ نے بے تکلفی و سادگی اور تواضع کے سبب دست کی ہڈیوں سے گوشت کو دانتوں کے ذریعہ نوچ نوچ کر کھایا، چنانچہ اس طرح گوشت کھانا مستحب ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا دست کے گوشت کو پسند کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ اچھی طرح گل جاتا ہے جلد ہضم ہوتا ہے اور زیادہ لذیذ ہوتا ہے یا اس پسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ دست کا گوشت نجاست کی جگہوں (جیسے آنت وغیرہ) سے دور ہوتا ہے۔ شمائل ترمذی میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ دست کا گوشت آنحضرت ﷺ کو زیادہ پسند نہیں تھا لیکن چونکہ آپ کو گوشت مدت کے بعد (کبھی کبھی) میسر آتا تھا اور دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اس لئے آپ دست کے گوشت کو پسند فرماتے تھے۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "مزیدار اور زیادہ پسند آنے والا گوشت، پشت کا گوشت ہے۔

چھری سے کاٹ کر گوشت کھانا غیر پسندیدہ طریقہ ہے

(۵۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقْطَعُوا اللَّحْمَ بِالسِّكِّيْنِ فَاِنَّهُ مِنْ صُنْعِ الْاَعَاجِمِ وَانْهَسُوْهُ فَاِنَّهُ اَهْنَأُ وَاَمْرَأُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَا لَيْسَ هُوَ بِالْقَوِیِّ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "گوشت کو چھری سے نہ کاٹو یعنی چھری سے کاٹ کاٹ کر نہ کھاؤ کیونکہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے بلکہ گوشت کو دانتوں سے نوچ نوچ کر کھاؤ کیوں کہ دانتوں سے نوچ کر کھانا زیادہ لذت بخش اور زیادہ خوش گوار ہے۔"

اس روایت کو ابوداؤدؒ نے اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث (باعتبار سند کے) قوی نہیں ہے (بلکہ ضعیف ہے۔"

تشریح: عرب کے لوگ اپنے علاوہ دنیا کے اور سارے ہی لوگوں کو عجمی (گونگا) کہا کرتے تھے لیکن یہاں اہل فارس (ایرانی) مراد ہیں کہ وہ

لوگ ازراہ تکبر و غرور گوشت وغیرہ چھریوں سے کاٹ کر کھاتے تھے، مگر بعض مواقع پر آنحضرت ﷺ سے بھی یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے چھری سے کاٹ کر کھایا ہے لہٰذا ان دونوں روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کی جائے گی کہ اگر گوشت نرم اور گلا ہوا ہو تو اس کو چھری کے بجائے دانتوں سے کاٹ کر کھانا چاہئے اور اگر سخت ہو تو پھر چھری سے کاٹ کر کھانا جائز ہوگا واضح رہے کہ مذکورہ بالا ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔

بیمار کے لئے پرہیز ضروری ہے

(۵۳) وَعَنْ اُمِّ الْمُنْذِرِ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَهُ عَلِيٌّ وَلَنَا دَوَالٍ مُعَلَّقَةٌ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْكُلُ وَعَلِيٌّ مَعَهُ يَاْكُلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ مَهْ يَا عَلِيُّ فَاِنَّكَ نَاقِةٌ قَالَتْ فَجَعَلْتُ لَهُمْ سِلْقًا وَشَعِيْرًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَلِيُّ مِنْ هٰذَا فَاَصِبْ فَاِنَّهٗ اَوْفَقُ لَكَ۔

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت اُمّ منذر انصاریہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ میرے یہاں تشریف لائے، آپ کے ہمراہ حضرت علیؓ بھی تھے (اس وقت) ہمارے گھر میں کھجوروں کے خوشے لٹکے ہوئے تھے چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان خوشوں میں سے کھانا شروع کیا، اور آپ کے ساتھ حضرت علیؓ بھی کھانے لگے۔ رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ "علی! تم ان کھجوروں کو کھانے سے اجتناب کرو کیونکہ تمہیں کمزوری لاحق ہے یعنی تم ابھی بیماری سے اٹھے ہو اور تم پر ضعف کا اثر غالب ہے اس لئے تمہارے لئے پرہیز ضروری ہے۔" حضرت اُمّ منذرؓ کہتی ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ اور آنحضرت ﷺ کے رفقاءؓ کے لئے چقندر اور جو تیار کئے تھے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "علی! تم اس میں سے کھاؤ اس لئے کہ یہ تمہارے لئے بہت مفید اور موافق ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیمار اور بیماری سے اٹھے ہوئے شخص کے لئے پرہیز بہت ضروری ہے بلکہ بعض اطباء نے کہا ہے کہ جو شخص بیماری سے اٹھا ہو اور اس پر ضعف و کمزوری کا غلبہ ہو اس کے لئے پرہیز بہت ہی فائدہ مند ہوتا ہے، جب کہ تندرست کے لئے پرہیز کرنا مضر ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو کھرچن پسند تھی

(۵۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهُ الثُّفْلُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو کھرچن یعنی تہ دیگی اچھی طرح لگتی تھی۔" (ترمذیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی عادت یہ تھی کہ آپ ﷺ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے تھے چنانچہ پہلے تو آپ اوپر کا کھانا اپنے اہل و عیال، مہمانوں اور محتاج و فقراء کو بانٹ دیتے تھے اور نیچے کا جو کھانا بچتا اس کو اپنے لئے رکھتے، یہ آپ ﷺ کے جذبۂ ایثار و سخاوت کا غماز بھی تھا اور آپ ﷺ کے وصف تواضع و انکسار اور صبر و قناعت کا مظہر بھی! نیز یہ بات ان مالداروں کے لئے ایک واضح دلیل بھی ہے جو عام طور پر ازراہ تکبر و نخوت نیچے کے کھانے کو عار سمجھتے ہیں اور اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

کھانے کے بعد پیالہ و تشتری کو صاف کرنا مغفرت و بخشش کا ذریعہ ہے

(۵۵) وَعَنْ نُبَيْشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَكَلَ فِيْ قَصْعَةٍ فَلَحِسَهَا اِسْتَغْفَرَتْ لَهُ الْقَصْعَةُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت نبیشہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی پیالے (یا تشتری) میں کھائے اور پھر اس کو (انگلیوں سے) چاٹ لے تو وہ پیالہ اس کے لئے استغفار کرتا ہے (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی) ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: ظاہریات یہ ہے کہ پیالہ حقیقت میں استغفار کرتا ہے! علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ تشتری پیالے کو چاٹنا اصل میں تواضع کو اختیار کرنا اور تکبر سے بری ہونا ہے اور یہ چیز گناہوں سے مغفرت و بخشش کا سبب ہے اور پیالہ کی طرف استغفار کی نسبت اس اعتبار سے ہے کہ بظاہر اس مغفرت و بخشش کا سبب پیالہ ہی ہوتا ہے۔

کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے بغیر نہ سوؤ

(۵۶) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَاتَ وَفِی یَدِهٖ غَمَرٌ لَمْ یَغْسِلْهُ فَاَصَابَهٗ شَیْءٌ فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ۔ (رواه الترمذی والبوداود وابن ماجة)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اس حالت میں رات گذارے کہ اس کے ہاتھ میں چکنائی لگی ہوئی ہو کہ (کھانے کے بعد) اس نے اس کو دھویا نہ ہو اور پھر اس کو کوئی ضرر پہنچ جائے (یعنی ایذا پہنچانے والے جو جانور کھانے کی بو یا چکنائی پر آتے ہیں وہ اس کو ضرر پہنچائیں) تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے (کیونکہ چکنے ہاتھوں کے ساتھ سو کر وہ اس ضرر کا خود سبب بنا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ثرید آنحضرت ﷺ کا پسندیدہ کھانا تھا

(۵۷) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ اَحَبَّ الطَّعَامِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الثَّرِیْدُ مِنَ الْخُبْزِ وَالثَّرِیْدُ مِنَ الْحَیْسِ۔ (رواه ابوداود)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے نزدیک روٹی کا ثرید اور حیس کا ثرید سب سے زیادہ پسندیدہ کھانا تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "روٹی کا ثرید" یعنی روٹی کے ٹکڑے شوربے میں بھیگے ہوئے۔ اور حیس کا ثرید اس کھانے کو کہتے ہیں۔ جو چھوہارے گھی اور قردت (یعنی دہی کے بنے ہوئے پنیر) کو ملا کر مالیدہ کی طرح بنایا جائے۔

زیتون کی فضیلت

(۵۸) وَعَنْ اَبِی اُسَیْدٍ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كُلُوا الزَّیْتَ وَادَّهِنُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

"اور حضرت ابواسید انصاری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "زیت یعنی روغن زیتون کو کھایا اور بدن پر اس کی مالش کیا کرو کیونکہ وہ ایک بابرکت درخت (زیتون) کا تیل ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "زیتون" بابرکت درخت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں بہت زیادہ خیر و برکت اور منافع ہیں چنانچہ قرآن کریم کی اس آیت اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں جس درخت کو "شجرۂ مبارک" کہا گیا ہے اس سے زیتون ہی کا درخت مراد ہے جس کی سب سے عمدہ قسم ملک شام میں پیدا ہوتی ہے نیز سورۂ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ میں اللہ تعالیٰ اس درخت کی قسم کھائی ہے۔ عرب کے لوگ خصوصاً اہل شام اس درخت کے میٹھے تیل کو کھانے کے مصرف میں لاتے ہیں اور اس کے کڑوے تیل کو چراغ وغیرہ میں جلانے کے کام میں لاتے ہیں۔

طبی طور پر یہ ثابت ہے کہ جسم پر زیتون کے تیل کی مالش کرنے سے جسم کو بہت زیادہ فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

سرکہ کی فضیلت

(۵۹) وَعَنْ اُمِّ هَانِىءٍ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعِنْدَكِ شَيْءٌ قُلْتُ لَا اِلَّا خُبْزٌ يَابِسٌ وَخَلٌّ فَقَالَ هَاتِي مَا اَقْفَرَ بَيْتٌ مِنْ اُدُمٍ فِيْهِ خَلٌّ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت اُمّ ہانیؓ (جو ابوطالب کی بیٹی اور حضرت علیؓ کی ہمشیرہ تھیں) کہتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ میرے گھر تشریف لائے، آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ (کھانے کے لئے) تمہارے پاس کیا چیز ہے؟ میں نے کہا کہ سوکھی روٹی اور سرکے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "وہی لے آؤ وہ گھر سالن سے خالی نہیں جس میں سرکہ ہو۔" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے انتہائی بے تکلفی کے ساتھ جو مذکورہ کھانا طلب فرمایا اس کا سبب یہ تھا کہ اُمّ ہانی کا دل بھی خوش ہو جائے اور ان پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ گھر میں موجود جو بھی کم سے کم چیز غذائی ضرورت کو پورا کر دے اس پر قناعت کرنا چاہئے۔

کھجور سالن کی جگہ

(۶۰) وَعَنْ يُوْسُفَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخَذَ كِسْرَةً مِنْ خُبْزِ الشَّعِيْرِ فَوَضَعَ عَلَيْهَا تَمْرَةً فَقَالَ هٰذِهِ اِدَامُ هٰذِهِ وَاَكَلَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت یوسف بن عبداللہ ابن سلامؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن کہ نبی کریم ﷺ نے جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر کھجور رکھ کر فرمایا کہ یہ اس روٹی کے ٹکڑے کا سالن ہے۔" (ابوداؤد)

غیر مسلم معالج سے رجوع کرنا جائز ہے

(۶۱) وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ مَرِضْتُ مَرَضًا اَتَانِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُنِيْ فَوَضَعَ يَدَهٗ بَيْنَ ثَدْيَيَّ حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَهَا عَلٰى فُؤَادِيْ وَقَالَ اِنَّكَ رَجُلٌ مَفْؤُوْدٌ اِئْتِ الْحَارِثَ بْنَ كَلَدَةَ اَخَا ثَقِيْفٍ فَاِنَّهٗ رَجُلٌ يَتَطَبَّبُ فَلْيَاْخُذْ سَبْعَ تَمَرَاتٍ مِنْ عَجْوَةِ الْمَدِيْنَةِ فَلْيَجَاْهُنَّ بِنَوَاهُنَّ ثُمَّ لِيَلُدَّكَ بِهِنَّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میں بہت سخت بیمار ہوا (تو نبی کریم ﷺ عیادت کی غرض سے میرے پاس تشریف لائے، آپ ﷺ نے (اس وقت) میری دونوں چھاتیوں کے درمیان (یعنی سینہ پر) اپنا دست مبارک رکھا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے دل پر محسوس کی پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ایک ایسے شخص ہو جو دل کے درد میں مبتلا ہے (یعنی تم قلب کے مریض ہو) لہٰذا تم حارث بن کلدہ کے پاس جاؤ جو قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ وہ شخص طب (علاج معالجہ کرنا) جانتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ مدینہ کی (سب سے اعلیٰ قسم کی کھجور) عجوہ میں سے سات کھجوریں لے۔ پھر ان کو گٹھلیوں سمیت کوٹ لے اور اس کے بعد ان کو (دوا کی صورت میں تمہارے منہ میں ڈالے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اگر یہ سوال پیدا ہو کہ اس کا کیا سبب تھا کہ آپ نے سعد کو پہلے تو ایک معالج کے پاس جانے کا حکم دیا اور پھر خود ہی علاج بھی تجویز کیا لیکن دوا بنانے کا کام معالج کے سپرد کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو آپ نے سعد کو معالج کے پاس جانے کا مشورہ دیا تاکہ وہ ان کو دیکھ کر ان کا علاج کرے، پھر جب آپ ﷺ کو ان کے مرض کا ایک آسان علاج یاد آگیا جو جلد فائدہ کرنے والا تھا تو آپ ﷺ

نے ازراہ شفقت و تعلق اس کو تجویز کیا۔ گویا ان کو معالج کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا کہ وہ مبادا ان کو دور دراز کے علاج میں ڈال دے اور چونکہ اس دوا کا بنانا اور اس کو استعمال کرانا معالج کے لئے زیادہ آسان تھا اس لئے اس کام کو اس کے سپرد فرمایا۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ غیر مسلم معالج سے رجوع و مشورہ کرنا جائز ہے کیوں کہ حارث بن کلدہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مرا ہے اس کا اسلام قبول کرنا ثابت نہیں ہے۔

غذا کو معتدل کر کے کھاؤ

(۶۲) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاكُلُ الْبِطِّيْخَ بِالرُّطَبِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَزَادَ اَبُوْدَاوُدَ وَيَقُوْلُ يُكْسَرُ حَرُّ هٰذَا بِبَرْدِ هٰذَا وَبَرْدُ هٰذَا بِحَرِّ هٰذَا وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ خربزہ، تازہ کھجوروں کے ساتھ کھاتے تھے۔ (ترمذیؒ) اور ابوداؤد نے اس روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "اور آپ یہ فرماتے تھے کہ اس (کھجور) کی گرمی اس (خربزے) کی سردی سے توڑی جاتی ہے اور خربزے کی سردی کھجور کی گرمی سے توڑی جاتی ہے۔ نیز ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: مذکورہ بالا دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر کھانے میں بڑی حکمت یہ ہے کہ ایک سرد دوسری گرم ہے۔ دونوں ملا کر معتدل غذا ہو جاتی ہے! طیبی نے کہا ہے خربزے سے مراد شاید کچا خربزہ ہو گا کیونکہ وہ سرد تر ہوتا ہے ورنہ پکا خربزہ گرم ہوتا ہے لیکن کھجور کی بہ نسبت وہ بھی سرد ہوتا ہے۔ اکثر علماء نے یہ لکھا ہے کہ "بطیخ" سے مراد خربزہ نہیں ہے بلکہ تربوز ہے کہ وہ سرد ہوتا ہے۔

کھانے پینے کی چیز میں کیڑے پڑ جانے کا مسئلہ

(۶۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَمْرٍ عَتِيْقٍ فَجَعَلَ يُفَتِّشُهُ وَيُخْرِجُ السُّوْسَ مِنْهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پرانی کھجور لائی گئی (جس میں کیڑے پڑ گئے تھے چنانچہ آپ ﷺ اس کو چیرتے اور اس میں سے کیڑا نکال (کر پھینک) دیتے۔" (ابوداؤد)

تشریح: طبرانیؒ نے بسند حسن حضرت ابن عمرؓ سے بطریق مرفوع یہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کھجور کو چیرنے سے منع فرمایا ہے! اس صورت میں چونکہ آنحضرت ﷺ کے فعل اور قول میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ حضرت ابن عمرؓ سے جو ممانعت منقول ہے اس کا تعلق نئی کھجوروں سے ہے اور اس کا مقصد وہم و وسوسہ سے بچانا ہے۔ یا یہ کہ حضرت انسؓ سے جو فعل منقول ہے، وہ بیان جواز پر محمول ہے اور مذکورہ بالا ممانعت نہیں تنزیہی کے طور پر ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کھانے میں کیڑا پڑ جائے تو وہ کھانا نجس نہیں ہوتا اور مطالب المؤمنین، میں یہ لکھا ہے کہ اگر کیڑا پنیر یا سیب میں پڑ جائے (اور کھاتے وقت پیٹ میں چلا جائے) تو وہ حلال ہو گا کیونکہ اس سے احتراز ممکن نہیں، ہاں اگر ان چیزوں سے نکل دیا گیا ہو تو پھر اس کا حکم مکھی، بھڑ، پسہ اور ہر اس جانور کا سا ہو گا جو دم مسفوح (جاری خون) نہیں رکھتا کہ اس کا کھانا حرام ہو گا لیکن اگر وہ پانی یا کھانے میں پڑ جائے تو وہ ناپاک نہیں ہو گا۔

چستہ پاک ہوتا ہے

(۶۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِجُبْنَةٍ فِيْ تَبُوْكَ فَدَعَا بِالسِّكِّيْنِ فَسَمّٰى وَقَطَعَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے دوران (ایک موقعہ پر) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پنیر کا ایک ٹکڑا لایا گیا تو آپ ﷺ

نے چھری منگوائی اور بسم اللہ کہہ کر اس کو کاٹا۔" (ابوداؤد)

تشریح: یہ بسم اللہ کہنا کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کی جگہ تھا نہ کہ وہ بسم اللہ جو ذبح کرتے وقت پڑھی جاتی ہے جیسا کہ بعض جاہل لوگ کدو کو کاٹتے وقت ذبح کی نیت سے بسم اللہ کہتے ہیں۔ مظہرؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ چستہ یعنی اونٹ یا بکری کے بچہ کا اوجھ پاک ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ ناپاک ہوتا تو پنیر کو بھی ناپاک ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ پنیر اس کے بغیر نہیں بنتا تھا۔

جن چیزوں کو شریعت نے حلال یا حرام نہیں کہا ہے ان کا استعمال مباح ہے

(۶۵) وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ السَّمْنِ وَالْجُبْنِ وَالْفِرَاءِ فَقَالَ الْحَلَالُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ فِي كِتَابِهِ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فِي كِتَابِهِ وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنْهُ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَمَوْقُوْفٌ عَلَى الْاَصَحِّ۔

"اور حضرت سلمانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے گھی پنیر اور پوستین یا گور خر کے بارے میں پوچھا گیا (کہ یہ چیزیں حلال ہیں یا حرام ہیں؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (حلت وحرمت کے سلسلے میں یہ اصول مد نظر رکھو کہ) حلال وہی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے (یعنی جس کا حلال ہونا قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے) اور حرام وہی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے، اور جس چیز سے سکوت فرمایا (یعنی جس چیز کو نہ حلال فرمایا نہ حرام) وہ اس قسم سے ہے جس کو معاف رکھا گیا ہے (یعنی اس کے استعمال کرنے کو مباح رکھا ہے) اس روایت کو ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور (ترمذی نے) کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے لیکن زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔"

تشریح: گھی کے بارے میں تو اس لئے پوچھا گیا کہ بظاہر ابتداء اسلام میں بعض لوگوں کو اس کے حلال ہونے میں شبہ ہوا ہوگا۔ پنیر کا معاملہ بذات خود محل اشتباہ وسوال تھا کیونکہ اس زمانہ میں وہ چستہ (یعنی اونٹ یا بکری کے اوجھ) کے ذریعہ بنتا تھا تیسری چیز جس کے بارے میں سوال کیا گیا فراء تھی۔ اس لفظ فراء کے بارے میں اکثر شارحین نے کہا ہے کہ یہ فَرَئِی کی جمع ہے جس کے معنی گور خر کے ہیں۔ اور بعضوں نے اس کو فرو کی جمع کہا ہے جس کے معنی پوستین (جانور کی کھال کے کوٹ) کے ہیں۔ اسی لئے ترمذی نے اس روایت کو باب اللباس میں نقل کیا ہے، اس صورت میں کہا جائے گا کہ فراء کے بارے میں سوال کفار کے عمل سے اجتناب کرنے کے جذبہ سے کیا گیا تھا، کیونکہ وہ (کفار) مردار کی کھال کو دباغت دیئے بغیر اس کی پوستین بنایا کرتے تھے۔

"اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ چیزیں حرام ہیں جن کے حرام ہونے کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے یا اس آیت کریمہ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کے ذریعہ بطریق اجمال بیان کیا۔ ہے یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے تاکہ ان اکثر چیزوں کے بارے میں اشکال پیدا نہ ہو جو حرام ہیں مگر ان کی حرمت کتاب اللہ میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کا حرام ہونا احادیث نبوی کے ذریعہ ثابت ہے۔ حدیث کا آخری جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمام چیزیں اپنی اصل کے اعتبار سے مباح ہیں لہٰذا جن چیزوں کو شریعت نے حرام قرار نہیں دیا ہے وہ مباح ہوں گی۔

"یہ حدیث موقوف ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرت سلمان کا اپنا قول ہے نہ کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ چنانچہ فن حدیث کی اصطلاح میں صحابہؓ کے قول وفعل کو موقوف کہا جاتا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے قول وفعل کو مرفوع کہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی طرف سے عمدہ کھانے کی خواہش کا اظہار

(۶۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدِدْتُ اَنَّ عِنْدِيْ خُبْزَةً بَيْضَاءَ مِنْ بُرَّةٍ سَمْرَاءَ مُلَبَّقَةً

بِسَمْنٍ وَلَبَنٍ فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ فَاتَّخَذَهُ فَجَاءَ بِهِ فَقَالَ فِي اَيِّ شَيْءٍ كَانَ هٰذَا قَالَ فِي عُكَّةِ ضَبٍّ قَالَ ارْفَعْهُ رَوَاهُ اَبُوْ دَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ اَبُوْ دَاؤُدَ وَهٰذَا حَدِيْثٌ مُنْكَرٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (مجلس میں) فرمایا کہ "میں پسند کرتا ہوں کہ میرے سامنے سفید گیہوں کی روٹی ہو جس کو گھی اور دودھ میں تر کیا گیا ہو۔" (یہ سن کر) جماعت میں سے ایک شخص اٹھ کر چلا گیا اور مذکورہ روٹی تیار کر کے لایا، آنحضرت ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ "اس روٹی کو جو گھی لگا ہوا ہے وہ کس برتن میں تھا؟" اس نے کہا کہ گوہ کی کھال کے کپے میں تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا (میں نہیں کھاؤں گا) اس کو میرے سامنے سے اٹھالو (ابوداؤد، ابن ماجہ) اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اس روٹی کو اپنے سامنے سے اٹھانے کا حکم اس بنا پر دیا کہ آپ ﷺ گوہ سے طبعی نفرت رکھتے تھے کیونکہ وہ آپ ﷺ کی قوم کے علاقے میں نہیں پائی جاتی تھی جیسا کہ پچھلے صفحات میں حضرت خالد کی روایت اس کے متعلق گزر چکی ہے، نہ کہ اس کے اٹھانے کا حکم اس سبب سے تھا کہ گوہ کی کھال نجس ہوتی ہے کیونکہ اگر گوہ کی کھال نجس ہوتی تو اس کھال کے کپے میں رکھے ہوئے گھی سے ترکی ہوئی روٹی کو آپ ﷺ پھینک دینے کا حکم دیتے اور دوسروں کو بھی اس کے کھانے سے منع فرما دیتے۔

آنحضرت ﷺ کا مذکورہ روٹی کو طلب کرنا اور خواہش نفس کے مطابق اس طرح کی تمنا کا اظہار کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جو آپ ﷺ کی عادت مبارکہ اور آپ ﷺ کے مزاج کے بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے ابوداؤدؒ نے اس روایت کو منکر کہا ہے اور اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس صورت میں یہی توجیہ ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح کی خواہش کا اظہار محض بیان جواز کی خاطر کیا۔

کچا لہسن کھانے کی ممانعت

(۶۷) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الثُّوْمِ اِلَّا مَطْبُوْخًا۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے لہسن کھانے سے منع فرمایا الا یہ کہ وہ پکا ہوا ہو۔" (ترمذی، ابوداؤدؒ)

تشریح: پکے ہوئے لہسن کو کھانے سے اس لئے منع نہیں فرمایا گیا ہے کہ پکنے سے اس کی بو جاتی رہتی ہے۔ یہی حکم پیاز اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا بھی ہے لیکن واضح رہے کہ مذکورہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پیاز کھانے کا مسئلہ

(۶۸) وَعَنْ اَبِيْ زِيَادٍ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَةَ عَنِ الْبَصَلِ فَقَالَتْ اِنَّ اٰخِرَ طَعَامٍ اَكَلَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامٌ فِيْهِ بَصَلٌ۔ (رواہ البوداؤد)

"اور حضرت ابوزیاد کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے (پکی ہوئی) پیاز کے بارے میں پوچھا گیا (کہ وہ حرام ہے یا حلال؟) تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے (اپنی زندگی میں) جو سب سے آخری کھانا کھایا تھا اس میں (پکی ہوئی) پیاز تھی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس مسئلہ میں تفصیل یہ ہے کہ روایتوں میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پیاز و لہسن نہیں کھایا بلکہ بعض روایت میں یہ ہے، کہ اُمّت کو بھی اس سے منع فرمایا ہے لیکن حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے پیاز کھائی ہے لہذا بعض حضرات کہتے ہیں کہ پیاز و لہسن کھانے کی جو ممانعت منقول ہے اس کا تعلق کچی پیاز اور لہسن سے ہے نہ کہ اس لہسن و پیاز سے جو کھانے میں پکا ہوا ہو۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کچے کے بارے میں ممانعت بھی محض نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔ بطور تحریمی نہیں ہے، چنانچہ یہ

چیزیں نہ تو آنحضرت ﷺ پر حرام تھیں اور نہ اُمت پر حرام ہیں بلکہ طحاوی نے شرح آثار میں ایسی احادیث نقل کی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ پیاز و لہسن اور گندنا وغیرہ کھانا مباح ہے خواہ وہ کچے ہوں یا کھانے کے ساتھ پکے ہوئے ہوں، لیکن یہ اباحت اس شخص کے لئے ہے جو ان کو کھانے کے بعد گھر میں بیٹھا رہے اور ان کی بو آنے تک مسجد میں نہ جائے کیونکہ ان چیزوں کو کھا کر مسجد میں جانا مکروہ ہے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا قول بھی یہی ہے۔ ابن ملک کہتے ہیں کہ جہاں تک آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے کہ آپ کا اپنی زندگی کے آخر میں ایسے کھانے کو کھانا جس میں پیاز تھی بیان جواز کی خاطر تھا اور یہ واضح کرنا تھا کہ ان چیزوں کے کھانے کی ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے نہ کہ بطور تحریمی۔

مکھن آنحضرت ﷺ کو پسند تھا

(۶۹) وَعَنِ ابْنَيْ بُسْرٍ السُّلَمِيَّيْنِ قَالَا دَخَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدَّمْنَا زُبْدًا اَوْ تَمْرًا وَكَانَ يُحِبُّ الزُّبْدَ وَالتَّمْرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور بسر کے دونوں بیٹوں (یعنی حضرت عبداللہ اور حضرت عطیہ) سے جو سلمی (اور صحابی) ہیں روایت ہے کہ ان دونوں نے کہا (ایک دن رسول کریم ﷺ) ہمارے گھر تشریف لائے تو ہم نے آپ ﷺ کے سامنے مسکہ (مکھن) اور کھجوریں پیش کیں (جن کو آپ ﷺ نے کھایا) آنحضرت ﷺ مسکہ اور کھجور کو پسند فرماتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

ایک برتن میں کھانے کی چیز مختلف قسموں کی ہو تو اپنے سامنے سے کھانے کی قید نہیں ہوگی

(۷۰) وَعَنْ عِكْرَاشِ بْنِ ذُؤَيْبٍ قَالَ اُتِيْنَا بِجَفْنَةٍ كَثِيْرَةِ الثَّرِيْدِ وَالْوَذْرِ فَخَبَطْتُ بِيَدِيْ فِيْ نَوَاحِيْهَا وَاَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ فَقَبَضَ بِيَدِهِ الْيُسْرٰى عَلٰى يَدِي الْيُمْنٰى ثُمَّ قَالَ يَا عِكْرَاشُ كُلْ مِنْ مَوْضِعٍ وَاحِدٍ فَاِنَّهُ طَعَامٌ وَاحِدٌ ثُمَّ اُتِيْنَا بِطَبَقٍ فِيْهِ اَلْوَانُ التَّمْرِ فَجَعَلْتُ اٰكُلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَجَالَتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الطَّبَقِ فَقَالَ يَا عِكْرَاشُ كُلْ مِنْ حَيْثُ شِئْتَ فَاِنَّهُ غَيْرُ لَوْنٍ وَاحِدٍ ثُمَّ اُتِيْنَا بِمَاءٍ فَغَسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَيْهِ وَمَسَحَ بِبَلَلِ كَفَّيْهِ وَجْهَهُ وَذِرَاعَيْهِ وَرَاْسَهُ وَقَالَ يَا عِكْرَاشُ هٰذَا الْوُضُوْءُ مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت عکراش بن ذویبؓ کہتے ہیں کہ (ایک موقع پر) ہمارے سامنے ایک بڑا پیالہ لایا گیا جس میں بہت سا ثرید (یعنی شوربے میں بھیگے ہوئے روٹی کے ٹکڑے) اور (گوشت کی) بوٹیاں تھیں، (کھانے کے دوران) میں اپنا ہاتھ پیالے کے ہر طرف دوڑانے لگا۔ (یعنی اپنے سامنے سے لقمہ اٹھانے کے بجائے ہر طرف ہاتھ ڈالنے لگا) جب کہ رسول کریم ﷺ اپنے آگے سے کھا رہے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے بائیں ہاتھ سے میرا داہنا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ عکراش۔ ایک جگہ سے (یعنی اپنے آگے سے) کھاؤ، کیونکہ یہ ایک (ہی طرح کا کھانا ہے۔" پھر ہمارے آگے ایک طباق لایا گیا جس میں قسم قسم کی کھجوریں تھیں، میں نے (آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے مطابق) اپنے سامنے سے (کھجوریں اٹھا اٹھا کر) کھانا شروع کیا لیکن (اب) رسول کریم ﷺ کا ہاتھ طباق میں (ہر طرف) گردش کرنے لگا (یعنی آپ ﷺ اپنی طبعی پسند کے مطابق طباق کے ہر کنارے سے کھجوریں اٹھا اٹھا کر کھانے لگے اور اس کا مقصد لوگوں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو کھجوریں ہر طرف سے اٹھا کر کھا سکتے ہیں اور پھر آپ ﷺ نے محض اپنے اس فعل کے ذریعہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ قول کے ذریعہ بھی تعلیم دی کہ) پھر فرمایا، عکراش! جس طرف سے چاہو کھاؤ کیونکہ یہ کھجوریں ایک (ہی) قسم کی نہیں ہیں۔" اس کے بعد ہمارے پاس پانی لایا گیا چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے اور اپنے ہاتھوں کی تری (اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھوں پر اور سر پر مل لی اور فرمایا" عکراش: یہ اس کھانے کے بعد کا وضو ہے جس کو آگ نے متغیر کیا ہے (یعنی یہ ہاتھ اور منہ دھونا کہ جس کو وضو طعام کہا جاتا ہے اس کھانے کی وجہ سے

ہے جس کو آگ پر پکایا گیا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "ایک طرح کا کھانا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جب پورے پیالے میں یکساں قسم کا کھانا ہے اور اس کی ہر طرف ایک ہی طرح کی چیز ہے تو پھر پیالے کی ساری اطراف میں ہاتھ پکانا طمع و حرص کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے یعنی اگر کھانا کئی طرح کا ہوتا یا ایک ہی ہوتا لیکن پیالے کے ہر حصے میں الگ الگ رنگ ہوتا تو اپنی طبیعت کے میلان کی بناء پر ہر طرف سے کھانا مناسب معلوم ہوتا مگر جب کہ کھانا ایک ہی طرح کا ہے اور یکساں رنگ کا ہے تو پھر ہر طرف ہاتھ دوڑانا معیوب و مکروہ ہے! "جس طرف سے چاہو کھاؤ" میں بظاہر درمیان کی جگہ مستثنیٰ ہے کیونکہ برکت نازل ہونے کی وہی جگہ ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ درمیان کی جگہ سے نہ کھایا جانا اس کھانے کے ساتھ مخصوص ہو جو ایک رنگ کا ہو اور چونکہ یہاں (کھجور کھانے کی صورت میں) ایک رنگت نہیں تھی اس لئے درمیان میں سے بھی کھجور اٹھا کر کھانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا گیا ہو! ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد سے یہ مفہوم بھی لیا گیا ہے کہ اگر کھانے کی چیز از قسم میوہ و پھل ہو اور وہ ایک ہی طرح اور ایک ہی رنگ کی ہو تو اس صورت میں برتن کے ہر طرف ہاتھ نہ لپکانا چاہئے۔ جیسا کہ طعام کا حکم ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ایک برتن میں کھانا مختلف رنگت کا ہو تو صرف اپنے سامنے سے کھانے کی قید نہیں ہوگی بلکہ جس طرف سے جی چاہے کھایا جا سکتا ہے۔

حریرے کا فائدہ

(۷۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَخَذَ اَهْلَهُ الْوَعْكُ اَمَرَ بِالْحَسَاءِ فَصُنِعَ ثُمَّ اَمَرَهُمْ فَحَسَوْا مِنْهُ وَكَانَ يَقُوْلُ اِنَّهُ لَيَرْتُوْ فُؤَادَ الْحَزِيْنِ وَيَسْرُوْ عَنْ فُؤَادِ السَّقِيْمِ كَمَا تَسْرُوْ اِحْدَاكُنَّ الْوَسَخَ بِالْمَاءِ عَنْ وَجْهِهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کے گھر والوں کو بخار آجاتا تو آپ حساء تیار کرنے کا حکم دیتے چنانچہ وہ تیار کیا جاتا اور پھر آپ ﷺ مریضوں کو اس حساء کے پینے کا حکم دیتے جس کو وہ (مریض) پیتے، آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ "درحقیقت حساء غمزدہ دل کو طاقت پہنچاتا ہے اور بیمار کے دل سے رنج و کلفت کو اس طرح دور کر دیتا ہے جس طرح (عورتوں) میں سے کوئی اپنے منہ کے میل کو پانی سے صاف کر ڈالتی ہے۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: حساء کھانے کی قسم سے ایک رقیق چیز ہوتی ہے جو آٹا، پانی اور گھی کو ملا کر پکائی جاتی ہے کبھی اس میں شکر بھی ملا دی جاتی ہے، مکہ کے لوگ اس کو حریرہ بھی کہتے تھے اور تبینہ بھی، جس کا ذکر فصل اول کی ایک حدیث میں گزر چکا ہے، آنحضرت ﷺ سے اس ارشاد میں حریرے کے فائدے کو ظاہر کرنے کے لئے اپنا روئے سخن عورتوں کی طرف اُس لئے منعطف کیا کہ اصل میں عورتیں اپنے جسم کا میل دھونے اور اپنے چہرے کو صاف رکھنے کی زیادہ سے زیادہ سعی کرتی ہیں یا یہ کہ جس وقت آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس وقت عورتیں موجود تھیں اس لئے انہی کو خطاب کیا۔

عجوہ جنّت کی کھجور ہے

(۷۲) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَفِيْهَا شِفَاءٌ مِّنَ السَّمِّ وَالْكُمْاَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاءُهَا شِفَاءٌ لِّلْعَيْنِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عجوہ (جو کھجور کی سب سے اچھی قسم ہے) جنّت کی (کھجور) ہے اور اس میں زہر کی شفاء ہے اور کھنبی، من (کی قسم) سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "عجوہ جنت کی کھجور ہے" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ عجوہ کی اصل جنت سے آتی ہے یا یہ کہ جنت میں جو کھجور ہوگی وہ عجوہ ہے اور یا یہ کہ عجوہ ایسی سودمند اور راحت بخش کھجور ہے گویا وہ جنت کا میوہ ہے، زیادہ صحیح مطلب پہلا ہی ہے حدیث کے باقی حصے کی وضاحت پہلی فصل میں گزر چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

چھری سے گوشت کاٹ کر کھانا جائز ہے

(۷۳) عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ ضِفْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَاَمَرَ بِجَنْبٍ فَشُوِيَ ثُمَّ اَخَذَ الشَّفْرَةَ فَجَعَلَ يَحُزُّ لِيْ بِهَا مِنْهُ فَجَآءَ بِلَالٌ يُؤْذِنُهُ بِالصَّلَاةِ فَاَلْقَى الشَّفْرَةَ فَقَالَ مَالَهُ تَرِبَتْ يَدَاهُ قَالَ وَكَانَ شَارِبُهُ وَفَاءً فَقَالَ لِيْ اُقُصُّهُ لَكَ عَلٰى سِوَاكٍ اَوْقُصَّهُ عَلٰى سِوَاكٍ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ ایک رات میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ "کسی شخص کے ہاں" مہمان ہوا۔ اس شخص نے (ہمارے لئے) ایک بکری ذبح کی اور رسول کریم ﷺ نے اس (بکری) کا ایک پہلو بھوننے کا حکم دیا۔ جب وہ پہلو بھون دیا گیا آنحضرت ﷺ نے ایک چھری لی۔ پھر اس کے ذریعہ اس پہلو میں سے میرے لئے (بوٹیاں کاٹنے لگے، اتنے میں حضرت بلال آنحضرت ﷺ کو نماز کی اطلاع دینے کے لئے آگئے، آپ ﷺ نے چھری کو ڈال دیا اور (بطریق تعجب) فرمایا کہ بلال کو کیا ہوا؟ (کہ ایسے وقت بلانے آگیا) اس کے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں۔" حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ (اس وقت) اس کی لبیں (یعنی مونچھیں) بڑھی ہوئی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔" میں تمہارے لئے (تمہاری) لبیں مسواک پر کتر دوں۔ یا یہ فرمایا کہ۔ لبیں مسواک پر) کتر ڈالو۔" (ترمذی)

تشریح: "اس کے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں۔" یہ اصل میں ذلت و خواری اور فقر و افلاس سے کنایہ ہے اور ایک طرح بددعا کے مراوف ہے اس جملہ کا استعمال عام طور پر اہل عرب کے ہاں اس شخص کے لئے کیا جاتا ہے جس کو ملامت کرنا مقصود ہوتا ہے اور حقیقت میں اس بددعا کے واقع ہو جانے کی طلب و خواہش نہیں ہوتی بلکہ روزمرہ کے محاورے کے طور پر اس جملہ کو بولتے ہیں اس سے مراد محض سرزنش و ملامت ہوتی ہے چنانچہ اس موقعہ پر بھی گویا آنحضرت ﷺ کو یہ ناگوار گزرا کہ جب نماز کا ابھی کافی وقت باقی ہے تو بلالؓ نے کھانے کی مشغولیت کے دوران نماز کے لئے کیوں اٹھانا چاہا اور یہ بھی احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس جملہ کا استعمال میزبان کی کیفیات و حالات کو دیکھتے ہوئے فرمایا ہو کہ اس وقت یقیناً میزبان کو بڑی ذہنی اذیت و کوفت ہوئی ہوگی اس لئے آپ ﷺ نے ان کی طرف سے یا ان کی دلجوئی کے لئے حضرت بلالؓ پر اس جملہ کے ذریعہ اظہار ناگواری فرمایا۔

"اس کی لبیں بڑھی ہوئی تھیں" شارحین نے اس جملہ کی وضاحت کئی طرح کی ہے، ایک یہ کہ شاربہ کی ضمیر حدیث کے راوی حضرت مغیرہ کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں اگرچہ ظاہری اسلوب کا تقاضا یہ تھا کہ یوں کہا جاتا وَكَانَ شَارِبِيْ (اور میری لبیں بڑھی ہوئی تھیں) یعنی ضمیر متکلم کا استعمال ہوتا لیکن اس کے بجائے و شاربہ کہہ کر غائب کی ضمیر استعمال کی اس کی وجہ محض تفنن کلام ہے جس کو اہل معانی کی اصطلاح میں تجرید والتفات کہا جاتا ہے، لہٰذا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میری لبیں بڑھی ہوئی تھیں، "نیز مسواک پر کترنے" کا مطلب یہ تھا کہ لبوں کے نیچے مسواک رکھ کر لبوں کو چھری سے کاٹ ڈالوں۔

"اور یا یہ فرمایا۔" یہ اصل میں راوی کا اپنے شک کو ظاہر کرنا ہے کہ یا تو آپ ﷺ نے پہلا جملہ ارشاد فرمایا کہ لبیں مسواک پر رکھ کا کاٹ ڈالو یعنی آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تمہاری لبیں کاٹوں بلکہ انہیں (حضرت مغیرہ) کو حکم فرمایا کہ خود اپنی لبیں کاٹ ڈالیں۔ شارحین نے دوسری وضاحت یہ بیان کی ہے کہ شاربہ کی ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف راجع کی جائے یعنی حضرت مغیرہؓ کے کہنے کا

مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی لبیں بڑھی ہوئی تھیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میں اپنی لبوں کو تمہارے لئے کترواں گا کہ وہ بال مجھ سے جدا ہوکر تمہارے پاس رہیں اور تم ان سے برکت حاصل کرو، یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت مغیرہؓ کو حکم دیا کہ تم میری لبوں کے بال کتر دو۔

بسم اللہ پڑھ کر کھانا نہ کھانا شیطانی اثر ہے

(۷۴) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كُنَّا اِذَا حَضَرْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامًا لَمْ نَضَعْ اَيْدِيَنَا حَتّٰى يَبْدَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَضَعُ يَدَهٗ وَاِنَّا حَضَرْنَا مَعَهٗ مَرَّةً طَعَامًا فَجَائَتْ جَارِيَةٌ كَاَنَّهَا تُدْفَعُ فَذَهَبَتْ لِتَضَعَ يَدَهَا فِي الطَّعَامِ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهَا ثُمَّ جَآءَ اَعْرَابِيٌّ كَاَنَّمَا يُدْفَعُ فَاَخَذَ بِيَدِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ اَنْ لَّا يُذْكَرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ جَآءَ بِهٰذِهِ الْجَارِيَةِ لِيَسْتَحِلَّ بِهَا فَاَخَذْتُ بِيَدِهَا فَجَآءَ بِهٰذَا الْاَعْرَابِيِّ لِيَسْتَحِلَّ بِهٖ فَاَخَذْتُ بِيَدِهٖ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّ يَدَهٗ فِيْ يَدَيَّ مَعَ يَدِهَا. زَادَ فِيْ رِوَايَةٍ ثُمَّ ذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ وَاَكَلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ کسی کھانے پر ہوتے تو ہم اس وقت تک کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے جب تک رسول کریم ﷺ شروع نہ فرماتے، آپ ﷺ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے (تو اس کے بعد ہم اپنا ہاتھ بڑھاتے) چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ کھانے پر بیٹھے، اتنے میں ایک لڑکی (کھانے پر) اس طرح آئی گویا وہ ڈھکیل دی گئی ہے (یعنی وہ بھوک کی شدت سے بے اختیار ہوکر کھانے پر اس طرح ٹوٹی جیسے اس کو کسی نے پیچھے سے دسترخوان پر ڈھکیل دیا ہو) پھر اس نے (جوں ہی) یہ چاہا کہ (بسم اللہ کہے بغیر) کھانے پر ہاتھ ڈالے، تو رسول کریم ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر ایک دیہاتی (بھی اسی طرح بیتابی کے ساتھ) آیا کہ گویا اس کو (کھانے پر) ڈھکیل دیا گیا ہے (اور اس نے بھی بسم اللہ کہے بغیر کھانے پر ہاتھ ڈالنا چاہا کہ) آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ (بھی) پکڑ لیا۔ اور پھر رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ شیطان اس کھانے کو اپنے لئے حلال کرتا ہے (اور اس کے کھانے پر قادر ہوتا ہے) جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا جاتا چنانچہ شیطان اس لڑکی کو لے کر آیا تاکہ اس (کے بسم اللہ نہ پڑھنے کے سبب اس کھانے کو اپنے لئے حلال کرے لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر شیطان اس دیہاتی کو لایا تاکہ اس کے ذریعہ کھانے کو اپنے لئے حلال کرے مگر میں نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، بلاشبہ (اس وقت) شیطان کا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔" ایک روایت میں (حذیفہ یا مسلم نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ۔ "اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اللہ کا نام لیا (یعنی بسم اللہ پڑھی) اور کھانا کھایا۔" (مسلم)

تشریح: ایک روایت میں مع یدھا (اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ) کے بجائے مع یدیھما (اس لڑکی اور اس اعرابی کے ہاتھ کے ساتھ) کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے تاہم جس روایت میں لفظ یدھا ہے وہ گویا اس لڑکی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اس اعرابی کا ہاتھ بھی آپ کے ہاتھ میں ہو کیوں کہ پہلے آپ نے یہ فرمایا تھا کہ میں نے اس اعرابی کا ہاتھ بھی پکڑ لیا البتہ چونکہ پہلے لڑکی ہی کا ہاتھ پکڑا تھا اس لئے خاص طور پر محض اس کا ذکر کیا۔

زیادہ کھانا بے برکتی کی علامت ہے

(۷۵) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَادَ اَنْ يَشْتَرِيَ غُلَامًا فَاَلْقٰى بَيْنَ يَدَيْهِ تَمْرًا فَاَكَلَ الْغُلَامُ فَاَكْثَرَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ كَثْرَةَ الْاَكْلِ شُؤْمٌ وَاَمَرَ بِرَدِّهٖ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے ایک غلام کو خریدنے کا ارادہ فرمایا تو (آزمائش کے طور پر) اس کے آگے کھجوریں رکھ دیں، چنانچہ وہ غلام (خوراک سے) بہت زیادہ کھجوریں کھا گیا، رسول کریم ﷺ نے (یہ دیکھ کر فرمایا کہ "زیادہ کھانا، بے برکتی کا سبب اور بے برکتی کی علامت ہے۔" پھر آپ ﷺ نے اس غلام کو واپس کر دینے کا حکم دیا۔" (بیہقیؒ)

نمک بہترین سالن ہے

(۷۶) وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيِّدُ اِدَامِكُمُ الْمِلْحُ۔ (رواه ابن ماجة)

"اور حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارے سالنوں میں بہترین سالن نمک ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: نمک کو "بہترین سالن" اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ کم سے کم محنت اور بڑی آسانی کے ساتھ دستیاب ہو جاتا ہے اور قناعت کا سب سے قریبی ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اکثر عارفین اور اہل اللہ نمک ہی پر قناعت کرتے تھے، اس اعتبار سے یہ ارشاد آنحضرت ﷺ کے اس قول کے منافی نہیں ہے کہ سید الادم فی الدنیا والاخرة اللحم (یعنی دنیا و آخرت میں سالنوں کا سردار گوشت ہے)۔

جوتا اتار کر کھانا کھاؤ

(۷۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَ الطَّعَامُ فَاخْلَعُوْا نِعَالَكُمْ فَاِنَّهُ اَرْوَحُ لِاَقْدَامِكُمْ۔

"اور حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب (تمہارے سامنے کھانا رکھا جائے (اور تم کھانے بیٹھو) تو اپنے جوتے اتار دو کیونکہ جوتے اتار دینا پیروں کے لئے بہت راحت بخش ہے۔"

کھانا ٹھنڈا کر کے کھانا چاہئے

(۷۸) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ اَنَّهَا كَانَتْ اِذَا اُتِيَتْ بِثَرِيْدٍ اَمَرَتْ بِهٖ فَغُطِّيَ حَتّٰى تَذْهَبَ فَوْرَةُ دُخَانِهٖ وَتَقُوْلُ اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ هُوَ اَعْظَمُ لِلْبَرَكَةِ رَوَاهُمَا الدَّارِمِيُّ۔

"اور حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ جب ان کے سامنے ثرید لایا جاتا تو وہ اس کو ڈھانک دینے کا حکم دیتیں، چنانچہ اس کو ڈھانک کر رکھ دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کے دھوئیں اور بھاپ کا جوش نکل جاتا تھا (یعنی اس کی گرمی کی شدت ختم ہو جاتی تھی اس کے بعد وہ اس کو کھاتی تھیں) نیز وہ فرماتی تھیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "کھانے میں سے گرمی کا نکل جانا برکت میں زیادتی کا موجب ہے۔" (ان دونوں روایتوں کو دارمی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ثرید" کا ذکر محض اتفاقی ہے کہ اس وقت کا عام کھانا ثرید ہی ہوتا تھا اس لئے اس کا ذکر کیا ورنہ دوسرے کھانوں کا بھی یہی حکم ہے، چنانچہ جامع الصغیر میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ابردوا بالطعام فان الحار لا برکة فیه (کھانے کو ٹھنڈا کر کے کھاؤ کیوں کہ گرم میں برکت نہیں ہوتی) اسی طرح بیہقی نے بطریق ارسال یہ روایت نقل کی ہے کہ نهی عن الطعام الحار حتی یبرد (آنحضرت ﷺ نے گرم کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے)۔

کھانے کے برتن کو چاٹ لینا چاہئے

(۷۹) وَعَنْ نُبَيْشَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَكَلَ فِيْ قَصْعَةٍ لَحِسَهَا تَقُوْلُ لَهُ الْقَصْعَةُ اَعْتَقَكَ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ كَمَا اَعْتَقْتَنِيْ مِنَ الشَّيْطَانِ۔ (رواه رزین)

"اور حضرت نبیشہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص پیالے (یا طشتری وغیرہ) میں کھائے اور پھر اس کو (انگلیوں سے) چاٹ

لے تو وہ پیالہ (زبان حال سے یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ زبان قال سے) اس شخص سے کہتا ہے کہ جس طرح تو نے شیطان کے (کھانے یا اس کے خوش ہونے) سے مجھ کو نجات دی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تجھ کو دوزخ کی آگ سے نجات دے" (رزین)

تشریح: ترمذی، احمد، ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ استغفرت له القصعة (وہ پیالہ اس شخص کے لئے بخشش و مغفرت طلب کرتا ہے اور طبرانی نے حضرت عرباض سے یہ نقل کیا ہے من لعق الصحفة ولعق صابعه اشبعه اللّٰه فی الدنیا والاخرة (یعنی جس شخص نے رکابی اور اپنی انگلیوں کو چاٹا اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت میں سیر کرے)

بَابُ الضِّيَافَةِ

ضیافت کا بیان

ضاف کے معنی ہیں مہمان ہونا۔ اضاف کے معنی ہیں مہمان داری کرنا، ضیف کے معنی ہیں مہمان اور مضیف کے معنی ہیں میزبان اس عنوان کے تحت جو احادیث نقل ہوں گی ان سے معلوم ہوگا کہ ضیافت اور مہمان داری کی کیا فضیلت ہے؟ شریعت کی نظر میں اس کے کیا طور طریقے اور آداب ہیں اور یہ کہ مہمان و میزبان کے درمیان حفظ مراتب اور ان دونوں سے متعلق تہذیب و شائستگی کی کیا حدود ہیں؟

ضیافت کا حکم: اکثر علماء کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ ضیافت (مہمان داری) کے حقوق و آداب کی رعایت، اچھے اخلاق اور تہذیب و شائستگی کی علامت بھی ہے اور مستحب بھی۔ چنانچہ اکثر احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ایک دن کی مہمان داری کرنا تو واجب ہے اور ایک دن کے بعد مستحب ہے۔ ضیافت کی جو آٹھ قسمیں علماء نے بیان کی ہیں ان کی تفصیل باب الولیمہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مہمان کی خاطر کرنا کمال ایمان کی علامت ہے

① عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهٗ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْلِيَصْمُتْ وَفِىْ رِوَايَةٍ بَدَلَ الْجَارِ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی خاطر کرے، جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے، اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ بھلی بات کہے یا چپ رہے۔" اور (بخاری کی) ایک روایت میں (یعنی پڑوسی کا ذکر کرنے کے بجائے یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے ناتے کو باقی رکھے، یعنی اپنے ناتے داروں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا معاملہ کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے الخ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایمان کا پایا جانا مذکورہ باتوں پر موقوف ہے اور یہ کہ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے مہمان کی خاطر نہیں کرتا یا اپنے پڑوسی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو وہ مؤمن نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ اصل مقصد ان

چیزوں کی اہمیت کو بیان کرنا اور ان پر عمل کرنے کی زیادہ سے زیادہ تاکید کرنا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے کو اطاعت وفرماں برداری کی راہ پر لگانے کے لئے یوں کہے کہ اگر تو میرا بیٹا ہے تو اطاعت وفرماں برداری کر ظاہر ہے کہ اگر وہ اطاعت وفرماں برداری نہ کرے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔

یا یہ مراد ہے کہ جس شخص کا ایمان درجہ کمال کا ہوگا (یعنی جو مسلمان کامل الایمان ہوگا) اس کی شان یہی ہوگی کہ وہ ان باتوں پر عمل کرے گا گویا ان چیزوں کو اختیار کرنا کمال ایمان کی علامت ہے۔

اکرام ضیف یعنی مہمان کی خاطر کرنا شرعی طور پر یہ ہے، کہ جب کوئی مہمان آئے تو اس کے ساتھ کشادہ پیشانی، خوش خلقی اور ہنس مکھ چہرے کے ساتھ پیش آئے، اس کے ساتھ خوش گفتاری، نرم گوئی اور ملاطفت کے ساتھ بات چیت کرے؛ اور اس کو تین دن تک اس طرح کھلائے پلائے کہ پہلے دن تو اپنی حیثیت واستطاعت کے مطابق کچھ پر تکلف میزبانی کرے بشرطیکہ اس کی وجہ سے اپنے متعلقین و لواحقین کی حق تلفی نہ ہو اور پھر تین دن کے بعد (بھی اگر مہمان ٹھہرا رہے تو) اس کو کھلانا پلانا، "صدقہ" کے حکم میں ہوگا کہ میزبان چاہے تو کھلائے پلائے اور چاہے کھلانے پلانے سے انکار کر دے۔

"اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے" یعنی یہ پڑوسی کا سب سے کم درجہ ہے کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے، ورنہ تو جہاں تک حقوق ہمسائیگی کا تعلق ہے وہ بہت ہمہ گیری نوعیت کے ہیں چنانچہ بخاری ومسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ فلیکرم جارہ (تو اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ تکریم کا معاملہ کرے) اور بخاری ومسلم ہی کی ایک روایت میں یوں منقول ہے کہ فلیحسن الی جارہ یعنی اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی اس چیز میں مدد کرے جس کا وہ اس سے حاجت مند ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرے۔ اسی طرح امام غزالیؒ نے اربعین میں یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ۔ "تم جانتے بھی ہو پڑوسی کا کیا حق ہے؟ اگر وہ (پڑوسی) تم سے مدد چاہے تو تم اس کی مدد کرو، اور اگر وہ تم سے قرض مانگے تو اس کو قرض دو، اگر وہ محتاج ومفلس ہو تو اس کو کچھ دو، اور وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو، اور اگر وہ تم سے قرض مانگے تو اس کو قرض دو، اگر اس کو کوئی خوشی حاصل ہو تو اس کو مبارک باد دو، اگر اس کو کوئی مصیبت پہنچے تو اس کو تسلی دو، مثلاً اس کے ہاں کوئی موت ہو جائے تو اس کے گھر جا کر تعزیت کرو، اس کے مکان کے پاس اونچا مکان نہ بناؤ، کہ اس کی ہوا وغیرہ رک جائے، اگر تم پھل وغیرہ خریدو تو تحفہ کے طور پر اس کے یہاں بھی بھجوا دو اور یہ ممکن نہ ہو سکے تو پھر تم اس (پھل وغیرہ) کو گھر میں پوشیدہ طور پر لے آؤ اور اپنے بچوں کو بھی تاکید کر دو کہ وہ اس (پھل وغیرہ کو لے کر گھر سے باہر نہ نکلیں تاکہ تمہارے پڑوسی کے بچے (تمہارے بچوں کو پھل وغیرہ کھاتا دیکھ کر اپنی محرومی کی بناپر) رنج وافسوس نہ کریں، اور تم اپنی ہانڈی (چولھے) کے دھوئیں سے اس کو تکلیف نہ پہنچاؤ اور یہ کہ اس ہانڈی میں سے کچھ اس کے یہاں بھی بھجواؤ۔ اور کیا تم جانتے ہو کہ پڑوسی کا حق کیا ہے؟ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اپنے پڑوسی کا حق وہی شخص پہچانتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے۔"

"بھلی بات کہے یا چپ رہے" کا مطلب یہ ہے کہ جب زبان سے کوئی بات نکالنے کا اردہ کرے اور یہ معلوم ہو کہ وہ بات خیر وبھلائی کی ہے کہ جس پر ثواب ملتا ہے خواہ وہ واجب ہو یا مستحب، تب اس کو زبان سے نکالے اور اگر اس بات کی بھلائی اس پر عیاں نہ ہو اور یا اس کو یہ معلوم ہو کہ یہ بات حرام ہے یا مکروہ ہے تو اس کو زبان سے نہ نکالے، حاصل یہ کہ بھلائی اس میں ہے کہ زبان کو حتی الامکان خاموش رکھا جائے، اگر بولنا ضروری ہی ہو تو زبان سے وہی بات نکالی جائے جو خیر وبھلائی کی حامل ہو، نہ صرف یہ کہ حرام ومکروہ باتوں میں زبان کو مشغول رکھنا ممنوع ہے بلکہ مباح باتوں سے بھی زبان کو بچانا دانشمندی کا تقاضا ہے کہ مبادا مباح باتیں ہی زبان کو حرام باتوں تک کھینچ کر لے جائیں۔

"اپنے ناتے کو باقی رکھے" میں اس طرف اشارہ ہے کہ صلہ رحمی ایمان کی علامت ہے کہ جس شخص نے ناتوں کو توڑ ڈالا، وہ گویا اللہ

اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والا نہیں ہے کیونکہ ناتا توڑنے پر جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے اس کی پرواہ نہ کرنا اپنے ایمان کی خود نفی کرنے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

مہمان کو تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے

(۲) وَعَنْ اَبِی شُرَیْحِ الْکَعْبِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ جَائِزَتَہٗ یَوْمٌ وَّ لَیْلَۃٌ وَ الضِّیَافَۃُ ثَلَاثَۃُ اَیَّامٍ فَمَا بَعْدَ ذٰلِکَ فَھُوَ صَدَقَۃٌ وَلَا یَحِلُّ لَہٗ اَنْ یَّثْوِیَ عِنْدَہٗ حَتّٰی یُحْرِجَہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت شریح کعبیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی تعظیم و خاطرداری کرے مہمان کے ساتھ تکلف و احسان کرنے کا زمانہ ایک دن و ایک رات ہے اور مہمان داری کرنے کا زمانہ تین دن ہے، اس (تین دن کے بعد جو دیا جائے گا وہ ہدیہ و خیرات ہو گا اور مہمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ میزبان کے ہاں تین دن کے بعد اس کی استدعا کے بغیر) ٹھہرے کہ وہ تنگی میں مبتلا ہو جائے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: نہایہ جزری میں اس حدیث کی وضاحت میں لکھا ہے کہ مہمان کی تین دن اس طرح مہمان داری کی جائے کہ پہلے دن اس کے کھانے پینے کی چیزوں میں جو تکلّف و اہتمام ہو سکے وہ کیا جائے، اور پھر دوسرے و تیسرے دن بلا تکلف و اہتمام جو کچھ حاضر ہو اس کو مہمان کے سامنے پیش کر دے، اس کے بعد اس کو کھانے پینے کی اتنی چیزیں دے دے جن کے سہارے وہ ایک دن اور ایک رات کا سفر طے کر سکے۔

حدیث میں "جائزہ" کا...... جو لفظ آیا ہے اس کا مفہوم یہی ہے، ویسے لغت کے اعتبار سے "جائزہ" کے معنی بخشش تحفہ اور انعام کے ہیں، لیکن یہاں وہ چیز مراد ہے جو ایک دن کی غذا کی ضرورت کے بقدر ہو اس کے سہارے منزل تک پہنچ جائے مہمان کو "جائزہ" کے بعد جو کچھ دیا جائے گا وہ ایک زائد چیز ہو گی اور صدقہ بھلائی اور احسان کے حکم میں ہو گا۔ اس وضاحت کے مطابق "جائزہ" یعنی مہمان کو ایک دن کے بقدر زادراہ دینا ضیافت یعنی مہمان داری کے بعد ہو گا (جب کہ حدیث میں اس کا ذکر ضیافت سے پہلے کیا گیا ہے) نیز یہ جائزہ، مہمان داری کرنے سے ایک زاہد چیز ہو گا۔

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ "جائزہ" تین دن مہمان داری کرنے سے زائد کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ حدیث میں اس کا ذکر اس تکلّف و اہتمام اور الطاف و عنایات کی وضاحت کے طور پر ہے جو میزبان مہمان داری کے تین دنوں میں سے پہلے دن اپنے مہمان کے لئے کرتا ہے، چنانچہ ابوداؤدؒ کی عبارت سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ "جائزہ" مہمان کی اس خاطرداری اور تواضع و مدارات کو کہا گیا ہے جو پہلے دن کی جاتی ہے اسی طرح حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی یہی فرماتے تھے کہ ہمارا علم بھی یہ ہے کہ "جائزہ" کے یہی معنی ہیں۔

"مہمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے..... الخ" سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی کے ہاں مہمان جائے اس کے لئے یہ مطلقاً مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے میزبان کے ہاں تین دن سے زائد ٹھہرے، ہاں اگر خود میزبان کی خواہش ہو اور وہ درخواست کرے تو اس کی استدعا پر تین دن سے زائد ٹھہرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہو گا! اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مسافر (مہمان) کسی کے یہاں ٹھہرے اور کسی عذر مثلاً بیماری وغیرہ کے سبب اس کو تین دن سے زائد قیام کرنا پڑ جائے تو وہ تین دن کے بعد اپنے پاس سے کھائے پیئے صاحب خانہ کو تنگی و کلفت میں نہ ڈالے۔

مہمان داری کرنا واجب نہیں ہے

(۳) وَعَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قُلْتُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّکَ تَبْعَثُنَا فَنَنْزِلُ بِقَوْمٍ لَا یَقْرُوْنَنَا فَمَا تَرٰی فَقَالَ لَنَا اِنْ

نَزَلْتُمْ بِقَوْمٍ فَاَمَرُوْا لَكُمْ بِمَا يَنْبَغِي لِلضَّيْفِ فَاقْبَلُوْا فَاِنْ لَمْ يَفْعَلُوْا فَخُذُوْا مِنْهُمْ حَقَّ الضَّيْفِ الَّذِيْ يَنْبَغِي لَهُمْ (متفق علیہ)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ جب آپ ﷺ ہمیں (جہاد یا کسی اور کام کے لئے) کہیں بھیجتے ہیں تو (ایسا بھی ہوتا ہے کہ) ہمیں ایسے لوگوں میں (بھی) قیام کرنا پڑتا ہے جو ہماری مہمان داری نہیں کرتے (ایسی صورت میں) آپ ﷺ کیا حکم دیتے ہیں (آیا ہم ان سے زبردستی اپنی مہمان داری کرا سکتے ہیں یا نہیں؟) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ "اگر تم (اپنے سفر کے دوران) کسی قوم کے درمیان قیام کرو، اور وہ تمہیں وہ چیز دیں جو ایک مہمان (کو دینے) کے لائق ہے تو تم اس کو قبول کرو، اور اگر وہ ایسا نہ کریں (یعنی مہمان داری کا حق ادا نہ کریں) تو تم ان سے مہمان کا وہ حق لے سکتے ہو جو ایک مہمان کے لائق ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر میزبان مہمان داری کے حقوق ادا نہ کرے تو مہمان اس سے اپنا حق زبردستی لے سکتا ہے، اس اعتبار سے یہ حدیث ان حضرات کے مسلک کی دلیل بھی ہے جو ضیافت یعنی مہمان کو کھلانا پلانا ایک واجب حق قرار دیتے ہیں، لیکن جمہور علماء کا مسلک چوں کہ یہ نہیں ہے اس لئے ان کی طرف سے اس حدیث کی کئی تاویلیں کی جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ حدیث اصل میں مخمصہ (خالی پیٹ ہونے) اور اضطرار بھوک کی وجہ سے بیتاب و مضطر ہونے) کی صورت پر محمول ہے اور ایسی صورت میں جب کہ مہمان سخت بھوکا اور مضطر ہو اس کی ضیافت کرنا بلاشبہ میزبان پر واجب ہوگا کہ اگر وہ (میزبان) اس حق کو ادا نہ کرے تو یہ حق اس سے زبردستی لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا اس وقت محتاج اور فقراء کی خبرگیری کرنی واجب تھی مگر جب بعد میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں عام طور پر فقر و احتیاج کی جگہ وسعت و فراخی پیدا فرما دی تو یہ حکم منسوخ قرار دیا گیا، اور تیسرے یہ کہ اس ارشاد گرامی کا تعلق اہل ذمہ وہ غیر مسلم جن کا مسلمان سے جان و مال کی مصالحت کا معاہدہ ہو چکا ہو) کے یہاں قیام کرنے سے تھا جب کہ ان کے ساتھ معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مسلمان ان کے یہاں قیام کریں تو ان (مسلمانوں) کی ضیافت کرنا ان (اہل ذمہ) کے لئے ضروری ہوگا، چنانچہ اس شرط کی بنا پر مسلمانوں کی مہمان داری کرنا ان پر واجب تھا اور جو حق واجب ہو اس کو زبردستی بھی لیا جا سکتا ہے، اور چوتھے یہ کہ یہ حدیث "معاوضہ اور بدلہ" کی صورت پر محمول ہے یعنی اگر کچھ لوگ (مثلاً مسافر) کسی جگہ قیام کریں، اور وہاں کے لوگ (نہ صرف یہ کہ ان کی ضیافت نہ کریں بلکہ ان کے ہاتھ ایسی چیز فروخت کرنے سے انکار کریں جو ان (مہمان مسافروں) کے پاس نہیں ہے۔ نیز وہ اضطرار (بیتابی) کی حالت میں ہوں تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ (وہاں کے لوگوں سے) اس چیز کو زبردستی خرید لیں۔

جس میزبان پر اعتماد ہو اس کے ہاں دوسرے آدمیوں کو ہمراہ لے جانا درست ہے

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ اَوْ لَيْلَةٍ فَاِذَا هُوَ بِاَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ فَقَالَ مَا اَخْرَجَكُمَا مِنْ بُيُوْتِكُمَا هٰذِهِ السَّاعَةَ قَالَا الْجُوْعُ قَالَ وَاَنَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَاَخْرَجَنِي الَّذِيْ اَخْرَجَكُمَا قُوْمُوْا فَقَامُوْا مَعَهٗ فَاَتٰى رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ فَاِذَا هُوَ لَيْسَ فِيْ بَيْتِهٖ فَلَمَّا رَاَتْهُ الْمَرْاَةُ قَالَتْ مَرْحَبًا وَّاَهْلًا فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيْنَ فُلَانٌ قَالَتْ ذَهَبَ يَسْتَعْذِبُ لَنَا مِنَ الْمَاءِ اِذْ جَاءَ الْاَنْصَارِيُّ فَنَظَرَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَاحِبَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مَا اَحَدٌ الْيَوْمَ اَكْرَمُ اَضْيَافًا مِنِّيْ قَالَ فَانْطَلَقَ فَجَاءَهُمْ بِعِذْقٍ فِيْهِ بُسْرٌ وَتَمْرٌ وَرُطَبٌ فَقَالَ كُلُوْا مِنْ هٰذِهٖ وَاَخَذَ الْمُدْيَةَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكَ وَالْحَلُوْبَ فَذَبَحَ لَهُمْ فَاَكَلُوْا مِنَ الشَّاةِ وَمِنْ ذٰلِكَ الْعِذْقِ وَشَرِبُوْا فَلَمَّا اَنْ شَبِعُوْا وَرَوُوْا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتُسْاَلُنَّ عَنْ هٰذَا النَّعِيْمِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمُ الْجُوْعُ ثُمَّ لَمْ تَرْجِعُوْا حَتّٰى اَصَابَكُمْ هٰذَا النَّعِيْمُ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ كَانَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ فِيْ بَابِ الْوَلِيْمَةِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ دن یارات کے وقت (کہیں جانے کے لئے گھر سے) نکلے کہ اچانک حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوگئی۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم کو کس چیز نے تمہارے گھروں سے نکال دیا ہے (یعنی اس وقت چوں کہ گھر سے نکلنے کی تم لوگوں کی عادت نہیں ہے اس لئے ایسی کیا ضرورت پیش آگئی جو تمہارے گھر سے نکلنے کا باعث ہوئی ہے) ان دونوں نے عرض کیا کہ "بھوک نے ہمیں گھر سے نکلنے پر مجبور کیا ہے، یعنی ہم بھوک کی شدت سے بیتاب ہوکر گھر سے نکلے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اور مجھے بھی اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اسی چیز نے (گھر سے) نکالا ہے، جس چیز نے تمہیں نکالا ہے یعنی میں بھی بھوک ہی کہ وجہ سے گھر سے نکلا ہوں، اٹھو (میرے ساتھ چلو)" چنانچہ وہ دونوں (بھی) اٹھے (اور آپ ﷺ کے ساتھ ہوئے) پھر آپ ﷺ ایک انصاری کے گھر پہنچے (جن کا نام ابو الہیثمؓ تھا) مگر وہ اپنے گھر میں موجود نہیں تھے، ان کی بیوی نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو کہا کہ "خوش آمدید! آپ ﷺ اپنے ہی لوگوں میں آئے ہیں، آپ ﷺ کا تشریف لانا مبارک)"؛ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "فلاں شخص یعنی تمہارے شوہر کہاں ہیں؟" اس نے عرض کیا کہ "وہ ہمارے لئے میٹھا پانی لانے گئے ہیں۔" اتنے میں وہ انصاری (یعنی صاحب خانہ بھی) آگئے، انہوں نے جب رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے دونوں صحابہؓ (حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کو اپنے گھر میں) دیکھا تو (اپنی اس خوش بختی پر پھولے نہیں سمائے اور) کہنے لگے "الحمد للہ! خدا کا شکر ہے) بزرگ تر مہمانوں کے اعتبار سے آج کے دن مجھ سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہیں ہے، یعنی آج کے دن میرے مہمان دوسرے لوگوں کے مہمانوں سے زیادہ بزرگ ومعزز ہیں۔" راوی (یعنی حضرت ابوہریرہؓ) کہتے ہیں کہ "اس کے بعد وہ انصاری (ان حضرات کو لے کر اپنے باغ میں گئے، جہاں ان کے لئے ایک بچھونا بچھا کر ان کو اس پر بٹھایا، اور خود کھجوروں کے درختوں کے پاس) گئے اور ان (مہمانوں) کے لئے کھجوروں کا ایک خوشہ لے کر آئے، جس میں نیم پختہ، پختہ اور تروتازہ (ہر طرح کی) کھجوریں تھیں، پھر انہوں نے کہا کہ "آپ لوگ اس میں سے کھایئے" اس کے بعد انہوں نے چھری لی (اور ایک بکری کو ذبح کرنا چاہا) رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "دودھ والی بکری ذبح کرنے سے اجتناب کرنا" آخرکار انہوں نے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے لئے ایک بکری ذبح کی (اور جب اس کا گوشت پک گیا تو) سب نے اس بکری کا گوشت کھایا، اس خوشہ میں سے کھجوریں کھائیں، اور پانی پیا، اس طرح جب کھانے پینے سے پیٹ بھر گیا تو رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے، قیامت کے دن تم سے ان نعمتوں کی بابت پوچھا جائے گا، بھوک نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا تھا، لیکن تم اپنے گھروں کو واپس (بھی) نہ ہوئے تھے کہ (خدا کی طرف سے) تمہیں یہ نعمتیں مرحمت ہوگئیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے کئی مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس میزبان پر اعتماد ہو اس کے ہاں دوسرے آدمیوں کو اپنے ہمرہ لے جانا درست ہے، دوسرے یہ کہ اپنے احباب سے رنج والم اور تکلیف وپریشانی کا اظہار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اظہار شکوہ وشکایت، عدم رضا اور بے صبری وجزع فزع کے طور پر نہ ہو، خاص طور پر جب کو گھر میں کھانے پینے کو کچھ میسر نہ ہو، اور بھوک کی شدت نہ صرف یہ کہ جسمانی طور پر اذیت پہنچائے بلکہ عبادت کے کیف ونشاط میں رکاوٹ ڈالے، طاعات کے ذریعہ حاصل ہونے والی روحانی لذت سے پوری طرح محظوظ نہ ہونے دے اور قلب کو (یاد خدا اور حضوری عبادات سے پھیر کر) ادھر ادھر مشغول کردے، تو ایسی صورت میں گھر سے نکل کر مباح اسباب ووسائل کے ذریعہ اس (بھوک) کو مٹانے کا علاج کرنا اور اس سلسلہ میں سعی وکوشش کی راہ اختیار کرنا محض جائز ہی نہیں بلکہ لازم ہو جاتا ہے۔ نیز ایسے وقت میں اپنے احباب کے پاس جانا اور اس یقین کے ہوتے ہوئے کہ وہ انکار نہیں کریں گے ان سے بے تکلف کھانے پینے کی چیز مانگنا مباح ہی نہیں ہے بلکہ آپس کی محبت ومروت میں زیادتی کا باعث بھی ہوتا ہے۔

منقول ہے کہ جب نادار صحابہؓ کو کھانا پینا میسر نہ آتا اور ان کو بھوک کی شدت پریشان کرتی، تو وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور جب روئے انور ﷺ کی زیارت کرتے اور جمال باکمال پر نظر پڑتی تو ان کی بھوک وغیرہ کی ساری کلفت جاتی رہتی اور

جلوۂ حق کی نورانیت انہیں کھانے پینے سے بے نیاز کر دیتی تیسرے یہ کہ ضرورت کی بنا پر اجنبی عورت سے بات کرنا اور اس کی بات کو سننا جائز ہے، اسی طرح عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ اگر اس کا شوہر گھر میں موجود نہ ہو تو وہ اپنے ہاں آنے والے مہمان کو گھر میں آنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ اول تو اس مہمان کے گھر میں آنے سے کسی بات کا کوئی خطرہ و خدشہ نہ ہو اور دوسرے یہ کہ اپنے شوہر کی رضامندی کا یقین ہو، یعنی اس بات کا کوئی شبہ نہ ہو کہ شوہر اس مہمان کے گھر میں آنے سے کسی ناگواری یا ناراضگی کا اظہار کرے گا۔

چوتھے یہ کہ ان انصاریؓ کا اپنے گھر میں ان معزز بزرگ ترین مہمانوں کو دیکھ کر اپنے حق میں ایک عظیم نعمت تصور کرنا اور اس پر ان کا "الحمد للہ" کہنا اس بات کی علامت ہے کہ کسی نعمت کے ظاہر ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا مستحب ہے، نیز یہ بھی مستحب ہے کہ جب مہمان آئے تو اس کے سامنے خوشی کا اظہار کیا جائے۔

اور پانچویں یہ کہ جب کوئی مہمان اپنے ہاں آئے تو کھانے سے پہلے اس کے سامنے میوہ و پھل لانا یا گھر میں جو بھی چیز (مثلاً مٹھائی وغیرہ) موجود ہو اس کے سامنے جلد پیش کر دینا مستحب ہے۔

"جب کھانے پینے سے پیٹ بھر گیا" اس کے بارے میں نوویؒ کہتے ہیں کہ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ پیٹ بھر کر کھانا آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی کھایا جاتا تھا، اور یہ (یعنی پیٹ بھر کر کھانا) جائز ہے، جہاں تک ان اقوال کا تعلق ہے جو پیٹ بھر کر کھانے کی کراہت کے سلسلے میں منقول ہیں تو وہ عادت و امداومت پر محمول ہیں کہ عادت و مداومت کے طور پر پیٹ بھر کر کھانا گویا محتاج اور غرباء کے حال سے فراموشی اور ان کے تئیں سنگدلی اختیار کرنے کا مظہر ہے۔

"قیامت کے دن تم سے ان نعمتوں کی بابت پوچھا جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس دنیا میں جو نعمتیں عطا فرماتا ہے ان کے بارے میں وہ قیامت کے دن سوال کرے گا اور یہ سوال بعض کے حق میں تو توبیخ و سرزنش کے طور پر ہوگا، اور بعضوں سے احسان جتانے اور اظہار نعمت و کرامت کے طور پر ہوگا، گویا ہر صورت میں اللہ تعالیٰ اپنی ہر نعمت پر بندوں سے سوال و پرسش کرے گا کہ ہم نے تمہیں دنیا میں یہ جو فلاں فلاں نعمت عطا کی تھی تم نے اس پر ادائیگی شکر کا حق ادا کیا یا نہیں؟

وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ كَانَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ فِيْ بَابِ الْوَلِيْمَةِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت كَانَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ (کتاب النکاح کے) باب الولیمہ میں ذکر کی جا چکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

مہمان نوازی کی اہمیت

⑤ وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَيُّمَا مُسْلِمٍ ضَافَ قَوْمًا فَاَصْبَحَ الضَّيْفُ مَحْرُوْمًا كَانَ حَقًّا عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ نَصْرُهٗ حَتّٰى يَاْخُذَ لَهٗ بِقِرَاهُ مِنْ مَالِهٖ وَزَرْعِهٖ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَّهٗ وَاَيُّمَا رَجُلٍ ضَافَ قَوْمًا فَلَمْ يَقْرُوْهُ كَانَ لَهٗ اَنْ يُّعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَاهُ۔

"حضرت مقدام ابن معدیکربؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص کسی قوم میں (کسی کے یہاں) مہمان ہوا اور اس نے محرومی کی حالت میں صبح کی (یعنی اس کے میزبان نے رات میں اس کی مہمان داری نہیں کی، تو اس کا ہر مسلمان پر یہ حق ہوگا کہ وہ اس کی مدد کرے، یہاں تک کہ وہ (جس شخص کے یہاں مہمان ہوا ہے) اس کے مال اور اس کی کھیتی باڑی سے مہمانداری کے بقدر (یعنی ایک مہمان کے کھانے پینے کے بقدر) وصول کرے۔" (دارمیؒ ابوداؤد) اور ابوداؤدؒ کی ایک اور روایت میں یوں ہے، کہ جو شخص کسی قوم میں مہمان ہوا، اور ان لوگوں نے اس کی مہمان داری نہیں کی تو اس کو یہ حق حاصل ہوگا، کہ وہ ان لوگوں کا پیچھا پکڑ لے اور ان

کے مال و اسباب سے اپنی مہمان داری) کے بقدر وصول کرلے۔"

تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے بھی مطلق ضیافت (مہمان داری) کرنے کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس حدیث کی بھی وہی تاویل و توجیہ کی جائے گی، جو پیچھے حضرت عقبہ ابن عامرؓ کی روایت میں کی گئی ہے۔

برائی کا بدلہ برائی نہیں ہے

(۶) وَعَنْ اَبِی الْاَحْوَصِ الْجُشَمِیِّ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَیْتَ اِنْ مَرَرْتُ بِرَجُلٍ فَلَمْ یَقْرِنِیْ وَلَمْ یُضِفْنِیْ ثُمَّ مَرَّ بِیْ بَعْدَ ذٰلِكَ اَقْرِیْهِ اَمْ اَجْزِیْهِ قَالَ بَلْ اَقْرِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوالاحوص جشمیؒ اپنے والد حضرت مالک ابن فضلہؓ صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا، میں نے (ایک دن) عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! اگر میں کسی شخص کے ہاں سے گزروں یعنی اس کے یہاں مہمان ہوں اور وہ میری مہمانداری نہ کرے اور نہ میری مہمان داری کا حق ادا کرے اور پھر اس کے بعد اس کا گزر میرے یہاں ہو یعنی وہ میرے یہاں آکر مہمان ہو، تو کیا میں اس کی مہمان داری کروں یا اس سے بدلہ لوں یعنی میں بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کروں جو وہ میرے ساتھ کرچکا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "(نہیں اس سے بدلہ نہ لو) بلکہ اس کی مہمان داری کرو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ برائی کا بدلہ یہ نہیں ہے کہ تم بھی برائی کرو، بلکہ جس شخص نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا ہے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہی سب سے اچھا بدلہ ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

بدی را بدی سہل باشد جزا اگر مردے احسن الی من اساء

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لئے طلب اجازت کا جواب نہ ملے تو واپس چلے آؤ

(۷) وَعَنْ اَنَسٍ اَوْغَیْرِهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَاْذَنَ عَلٰی سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ فَقَالَ سَعْدٌ وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَلَمْ یُسْمِعِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی سَلَّمَ ثَلَاثًا وَرَدَّ عَلَیْهِ سَعْدٌ ثَلَاثًا وَلَمْ یُسْمِعْهُ فَرَجَعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاتَّبَعَهٗ سَعْدٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ مَاسَلَّمْتَ تَسْلِیْمَةً اِلَّا وَهِیَ بِاُذُنِیْ وَلَقَدْ رَدَدْتُ عَلَیْكَ وَلَمْ اُسْمِعْكَ اَحْبَبْتُ اَنْ اَسْتَکْثِرَ مِنْ سَلَامِكَ وَمِنَ الْبَرَکَةِ ثُمَّ دَخَلُوا الْبَیْتَ فَقَرَّبَ لَهٗ زَبِیْبًا فَاَکَلَ نَبِیُّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ اَکَلَ طَعَامَکُمُ الْاَبْرَارُ وَصَلَّتْ عَلَیْکُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَاَفْطَرَ عِنْدَکُمُ الصَّآئِمُوْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انسؓ یا ان کے علاوہ کسی اور (صحابیؓ) سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے حضرت سعد ابن عبادہؓ کے (ہاں پہنچ کر ان سے) گھر میں آنے کی اجازت طلب کی، چنانچہ آپ ﷺ نے (دروازہ پر کھڑے ہو کر) فرمایا کہ " السلام علیکم ورحمة اللہ تم پر اللہ کی سلامتی اور اس کی رحمت نازل ہو (کیا میں اندر آسکتا ہوں؟)" سعدؓ نے (گھر میں سے) جواب دیا کہ " وعلیکم السلام ورحمة اللہ اور آپ ﷺ پر بھی اللہ کی سلامتی اور اس کی رحمت نازل ہو۔" لیکن انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ جواب نہیں سنایا یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے تین مرتبہ سلام کیا اور سعدؓ نے بھی آپ ﷺ کو تین مرتبہ جواب دیا، لیکن آپ ﷺ کو سنایا نہیں، یعنی حضرت سعدؓ نے آپ ﷺ کے سلام کا جواب تینوں مرتبہ قصداً بہت آہستہ آواز میں دیا تاکہ آپ ﷺ سن نہ سکیں، چنانچہ نبی کریم ﷺ (ان کا جواب نہ سن کر) واپس لوٹ پڑے اور حضرت سعدؓ نے جب یہ دیکھا کہ جس چیز کو میں نے حصول سعادت میں زیادتی کا ذریعہ بنانا چاہا تھا وہ میرے لئے بالکل ہی محرومی کا باعث بنی جارہی ہے اور ایک طرح سے سوء ادبی کی صورت بھی پیدا ہوگئی ہے تو وہ لپک

کر گھر سے نکلے، اور آنحضرت ﷺ کے پیچھے پیچھے آئے اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان، آپ ﷺ نے جتنی بار بھی سلام کیا میرے دونوں کانوں نے سنا اور حقیقت یہ ہے کہ میں (ہر بار) جواب بھی دیتا تھا البتہ میں اس جواب کو آپ ﷺ کے کانوں تک نہیں پہنچنے دیتا تھا، کیوں کہ میں آپ ﷺ کے زیادہ سے زیادہ سلام و برکت کا خواہش مند تھا (یعنی میرا مقصد یہ تھا کہ میرا جواب آپ ﷺ کے کانوں تک پہنچے، تاکہ آپ جتنا زیادہ سلام کریں گے میرے حق میں اتنا ہی زیادہ حصول برکت و سعادت کا ذریعہ ہوگا) چنانچہ (حضرت سعدؓ کی طرف سے اس اظہار حقیقت اور عذر خواہی کے بعد) آنحضرت ﷺ اور حضرت سعدؓ مکان میں داخل ہوئے، اور حضرت سعدؓ نے آپ ﷺ کے لئے خشک انگور پیش کئے جن کو نبی کریم ﷺ نے کھایا، جب آپ ﷺ کھانے سے فارغ ہوئے تو (حضرت سعدؓ کے حق میں دعا کرتے ہوئے) فرمایا کہ "اللہ کے نیک بندے تمہارا کھانا کھائیں، فرشتے تمہارے لئے استغفار کریں، اور روزے دار تمہارے ہاں افطار کریں۔" (شرح السنۃ)

پرہیزگار لوگوں کی ضیافت کرنا زیادہ بہتر ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ وَمَثَلُ الْاِیْمَانِ کَمَثَلِ الْفَرَسِ فِیْ اٰخِیَّتِہٖ یَجُوْلُ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی اٰخِیَّتِہٖ وَاِنَّ الْمُؤْمِنَ یَسْھُوْ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلَی الْاِیْمَانِ فَاَطْعِمُوْا طَعَامَکُمُ الْاَتْقِیَاءَ وَاَوْلُوْا مَعْرُوْفَکُمُ الْمُؤْمِنِیْنَ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَاَبُوْنُعَیْمٍ فِی الْحِلْیَۃِ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مؤمن اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو اپنی رسی میں بندھا ہوا ہوتا ہے اور ادھر ادھر چکر لگانے کے بعد پھر اپنی رسی کے پاس آجاتا ہے، اور (اسی طرح مؤمن غفلت و کوتاہی کرتا ہے لیکن پھر ایمان کی طرف لوٹ آتا ہے، لہٰذا تم اپنا کھانا متقی و پرہیزگار لوگوں کو کھلاؤ، اور اپنے عطایا سے سب مسلمانوں کو نوازو۔" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں اور ابونعیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: اُخیۃ اصل میں اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے دونوں سروں کو کنڈے کی طرح دیوار میں مضبوطی سے گاڑ دیتے ہیں اور پھر اس لکڑی میں رسی سے گھوڑے وغیرہ کو باندھ دیتے ہیں اور اس کے پاس گھاس وغیرہ ڈال دیتے ہیں، لہٰذا فرمایا گیا کہ جس طرح کوئی گھوڑا اپنے اخیہ یعنی کنڈے سے بندھا ہوا ادھر ادھر چکر لگاتا ہے اور پھر اپنے اخیہ کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے نیز یہ تو ہوتا ہے کہ وہ اپنے کنڈے سے کبھی نزدیک ہو جاتا ہے کبھی دور، مگر اس سے بالکل جدا نہیں ہو سکتا ٹھیک یہی حال ایمان اور مؤمن کے درمیان تعلق کا ہوتا ہے کہ کبھی تو اعمال صالحہ کے ذریعہ اس کو قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اور کبھی گناہوں کی وجہ سے بعد ہو جاتا ہے مگر اصل ایمان سے جدا نہیں ہوتا، چنانچہ اگر وہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو آخر کار اس گناہ پر نادم ہو کر استغفار کرتا ہے اور اپنی فوت شدہ عبادات کا تدارک کر کے کمال ایمان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

"لہٰذا تم اپنا کھانا پرہیزگار لوگوں کو کھلاؤ" یہ جملہ اصل میں جزا ہے شرط محذوف کی، اس اعتبار سے پورا مفہوم یوں ہوگا کہ اس مثال کے مطابق جب "ایمان" کی وہی حیثیت ہوئی جو اخیہ یعنی کنڈے کی ہے تو ان چیزوں کو مضبوط و قوی کرنے کے طریقے اختیار کرو جو تمہارے اور ایمان کے درمیان وسائل کا درجہ رکھتے ہیں اور اس کا ایک بہترین و سہل طریقہ ضیافت کرنا (کھانا کھلانا) ہے۔ رہی یہ بات کہ کھانا کھلانے کے سلسلے میں "پرہیزگاری" کی تخصیص کیوں ہے، تو اس کا سبب یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگرچہ ہر بھوکے کو کھانا کھلانا جائز اور ایک نیک عمل ہے خواہ وہ پرہیزگار ہو یا غیر پرہیزگار، لیکن اول تو اولی یہ ہے کہ اگر کسی بھوکے کو کھانا کھلانا جائز منظور ہے تو ایسے بھوکے کو کھلاؤ جو پرہیزگار اور خدا ترس ہو دوسرے یہ کہ جب تم پرہیزگاروں کو کھانا کھلاؤ گے تو نہ صرف یہ کہ تمہیں اس نیک عمل پر ثواب ملے گا بلکہ وہ تمہارا کھانا کھا کر جو عبادت کریں گے اس کا ثواب تمہیں بھی ملے گا اور وہ تمہارے حق میں جو دعا کریں گے وہ بھی قبول ہوگی لہٰذا پرہیز

گاروں کی تخصیص مذکورہ سبب سے ہے ورنہ جہاں تک مطلق احسان واعانت کا تعلق ہے وہ سب مسلمانوں کے ساتھ کرنی چاہیے، جیسا کہ فرمایا گیا "اور اپنے عطایا سے سب مسلمانوں کو نوازو۔"

کھانا کھاتے وقت زانو کے بل بیٹھنا تواضع وانکساری کی علامت ہے

⑨ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ بُسْرٍ قَالَ كَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَصْعَةٌ يَحْمِلُهَا اَرْبَعَةُ رِجَالٍ يُقَالُ لَهَا الْغَرَّاءُ فَلَمَّا اَضْحُوْا وَسَجَدُوا الضُّحٰى اُتِيَ بِتِلْكَ الْقَصْعَةِ وَقَدْ ثُرِدَ فِيْهَا فَالْتَفُّوْا عَلَيْهَا فَلَمَّا كَثُرُوْا جَثٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعْرَابِيٌّ مَاهٰذِهِ الْجِلْسَةُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَنِيْ عَبْدًا كَرِيْمًا وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا عَنِيْدًا ثُمَّ قَالَ كُلُوْا مِنْ جَوَانِبِهَا وَدَعُوْا ذُرْوَتَهَا يُبَارَكُ فِيْهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کے ہاں ایک کٹھڑا (چوبی ناند) تھا جس کو چار آدمی اٹھاتے تھے (یعنی جب اس میں کھانا رکھا جاتا تو وہ اتنا بھاری ہو جاتا تھا کہ اس کو چار آدمی اٹھاتے تھے یا وہ خالی ہی اتنا بڑا یا بھاری تھا کہ چار آدمیوں کے بغیر نہیں اٹھتا تھا) اس (کٹھڑے) کو "غرا" کہا جاتا تھا، چنانچہ جب چاشت کا وقت ہو جاتا اور لوگ چاشت کی نماز پڑھ لیتے تو وہ کٹھڑا لایا جاتا اور اس میں ثرید تیار کیا جاتا، پھر لوگ جمع ہو کر اس کے گرد بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ جب لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی تھی (اور بیٹھنے کی جگہ تنگ ہو جاتی) تو رسول کریم ﷺ گھٹنوں پر بیٹھتے (ایک دن آپ ﷺ کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر) ایک دیہاتی نے کہا کہ "یہ نشست کیسی ہے؟ یعنی اس طرح بیٹھنا آپ ﷺ کے شایان شان نہیں ہے۔" (یہ سن کر) نبی کریم ﷺ نے فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تواضع وانکسار کرنے والا بنایا ہے سرکش وضدی نہیں بنایا ہے (اور اس طرح بیٹھنا تواضع وانکسار اختیار کرنے کا قریبی راستہ ہے)۔" پھر آپ ﷺ نے (سب کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ "اس کے کناروں (یعنی اپنے سامنے) سے کھاؤ اس کی بلندی کو چھوڑ دو یعنی درمیانی حصے کے کھانے پر پہلے ہاتھ نہ ڈالو تمہارے لئے اس میں برکت عطا کی جائے گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: غرا کے لغوی معنی ہیں روشن وچمکدار۔ اس بڑے برتن (کٹھڑا یا ناند) کو غرا اس مناسبت سے کہا جاتا تھا کہ وہ بڑا ہونے کی وجہ سے کھلا ہوا اور کشادہ تھا۔

"اس میں برکت عطا کی جائے گی" کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم اس طرح کھاؤ گے تو یہ اس کٹھڑے کے کھانے میں برکت کا باعث ہوگا اس کے برخلاف جب درمیان کے حصہ سے کھایا جاتا ہے تو نیچے کے حصے سے برکت منقطع ہو جاتی ہے۔

جمع ہو کر کھانا کھانے سے برکت نازل ہوتی ہے

⑩ وَعَنْ وَحْشِيِّ بْنِ حَرْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَاْكُلُ وَلَا نَشْبَعُ قَالَ فَلَعَلَّكُمْ تَفْتَرِقُوْنَ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ فَاجْتَمِعُوْا عَلٰى طَعَامِكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ يُبَارَكْ لَكُمْ فِيْهِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت وحشی ابن حربؓ اپنے والد سے اور وہ (اپنے والد اور) وحشیؒ کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے (کچھ) صحابہؓ نے (ایک دن) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہم (اگرچہ خاصی تعداد میں کھانا) کھاتے ہیں لیکن ہمارا پیٹ نہیں بھرتا (جب کہ ہم چاہتے ہیں کہ یا تو ہمارا پیٹ بھر جایا کرے کہ ہم عبادت وطاعت کی طاقت حاصل کر سکیں، یا پھر ہمیں قناعت کی دولت میسر ہو جائے)" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "(خاصی مقدار میں کھانا کھانے کے باوجود پیٹ نہ بھرنے کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ) تم لوگ شاید الگ الگ کھانا کھاتے ہو؟" انہوں نے عرض کیا کہ "جی ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تو پھر تم لوگ اپنے کھانے پر اکٹھے بیٹھا کرو اور اس پر (یعنی کھاتے وقت) اللہ کا نام لیا کرو تمہارے لئے اس (کھانے) میں برکت عطا کی جائے گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے راوی وحشی ابن حرب، کے دادا کا نام بھی وحشی ابن حرب ہی تھا یہ (وحشیؓ ابن حرب جو حدیث کے راوی وحشی کے دادا ہیں) وہی وحشی ہیں جنہوں نے غزوہ احد کے دن آنحضرت ﷺ کے چچا، سید الشہداء حضرت حمزہؓ ابن عبد المطلب کو قتل کیا تھا اس وقت وحشی کافر تھے اور کفار مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما تھے! لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت بخشی اور وہ مشرف باسلام ہو گئے، اسلام لانے کے بعد ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ کہ انہوں نے مشہور مدعیٔ نبوت، مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے جہنم رسید کیا تھا!
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ الگ الگ کھانا، کھانا بے برکتی کا باعث ہے جب کہ اکٹھے ہو کر کھانے پر بیٹھنا اس کھانے میں برکت کا ذریعہ ہے، نیز کھانے پر اکٹھے ہو کر بیٹھنا اور کھاتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا یعنی بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرنا ان دونوں میں سے ہر ایک برکت کا باعث ہے اور اگر دونوں جمع ہوں کہ کھانے پر اکٹھے بیٹھا بھی جائے اور کھاتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام بھی لیا جائے تو یہ برکت میں زیادتی کا باعث بھی ہوگا اور ذکر اللہ کی کثرت کا ذریعہ بھی، رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو یہ فرمایا ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوْا جَمِيْعًا أَوْ أَشْتَاتًا (یعنی اس بارے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم الگ الگ کھانا کھاؤ یا اکٹھے ہو کر) تو اصل میں یہ آیت یا تو رخصت (آسانی) پر محمول ہے یا اس کا تعلق ان لوگوں کو تنگی سے بچانے سے ہے جو اکیلے ہی رہتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

روٹی، کپڑا اور مکان انسان کی بنیادی ضرورت بھی ہے اور اس کا پیدائشی حق بھی

(۱۱) عَنْ اَبِیْ عَسِیْبٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلًا فَمَرَّبِیْ فَدَعَانِیْ فَخَرَجْتُ اِلَيْهِ ثُمَّ مَرَّبِاَبِیْ بَكْرٍ فَدَعَاهُ فَخَرَجَ اِلَيْهِ ثُمَّ مَرَّبِعُمَرَ فَدَعَاهُ فَخَرَجَ اِلَيْهِ فَانْطَلَقَ حَتّٰى دَخَلَ حَائِطًا لِبَعْضِ الْاَنْصَارِ فَقَالَ لِصَاحِبِ الْحَائِطِ اَطْعِمْنَا بُسْرًا فَجَاءَ بِعِذْقٍ فَوَضَعَهُ فَاَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهُ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ بَارِدٍ فَشَرِبَ فَقَالَ لَتُسْاَلُنَّ عَنْ هٰذَا النَّعِيْمِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قَالَ فَاَخَذَ عُمَرُ الْعِذْقَ فَضَرَبَ بِهِ الْاَرْضَ حَتّٰى تَنَاثَرَ الْبُسْرُ قِبَلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا لَمَسْئُوْلُوْنَ عَنْ هٰذَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ نَعَمْ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ خِرْقَةٍ لَفَّ بِهَا الرَّجُلُ عَوْرَتَهُ اَوْ كِسْرَةٍ سَدَّبِهَا جَوْعَتَهُ اَوْ حُجْرٍ يَتَدَخَّلُ فِيْهِ مِنَ الْحَرِّ وَالْقَرِّ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"حضرت ابو عسیبؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ) رات کے وقت رسول کریم ﷺ گھر سے باہر نکلے اور میرے ہاں تشریف لائے اور مجھے بلایا میں (اپنے گھر سے) نکل کر آپ ﷺ کے ساتھ ہو لیا، پھر آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور ان کو بلایا وہ بھی (اپنے گھر سے) نکل کر آپ ﷺ کے ساتھ ہو لئے، اس کے بعد آپ ﷺ حضرت عمرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور ان کو بلایا وہ بھی (اپنے گھر سے) نکل کر آپ ﷺ کے ساتھ ہو لئے، پھر آپ ﷺ (ہم سب کو لے کر) روانہ ہوئے یہاں تک کہ ایک باغ میں پہنچے جو ایک انصاری (صحابیؓ) کا تھا آپ ﷺ نے باغ کے مالک سے فرمایا کہ "ہمیں کھجوریں کھلاؤ۔" باغ کے مالک نے کھجوروں کا ایک خوشہ لا کر (ہمارے سامنے) رکھ دیا اس میں سے رسول کریم ﷺ نے (بھی) کھایا اور آپ ﷺ کے صحابہ (یعنی ہم لوگوں) نے (بھی) کھایا، پھر آپ ﷺ نے ٹھنڈا پانی منگوایا جس کو (آپ ﷺ نے اور ہم نے) پیا اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یقیناً قیامت کے دن تم سے اس نعمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔" راوی کہتے ہیں کہ (یہ سن کر) حضرت عمرؓ نے کھجوروں کا خوشہ لیا اور اس کو زمین پر دے مارا یہاں تک کہ اس کی کچی کھجوریں رسول کریم ﷺ کے سامنے بکھر گئیں، پھر انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا قیامت کے دن ہم سے اس کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا؟" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! (ہر نعمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا خواہ وہ کم ہو یا زیادہ البتہ تین چیزوں کے بارے میں سوال نہیں ہوگا ایک تو کپڑا کہ جس سے آدمی اپنا ستر ڈھانکے اور دوسری روٹی کا ٹکڑا کہ جس

کے ذریعہ اپنی بھوک کو دور کرے، اور تیسرے بل کہ جس میں گرمی اور سردی سے (بچنے کے لئے) گھس جائے۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: "ایک انصاریؓ" کے بارے میں احتمال ہے کہ وہی ابوالہیثمؓ ہوں جن کے باغ میں جانے کا ذکر پہلی فصل کی ایک حدیث میں بھی گزر چکا ہے، اور یہ واقعہ (جو یہاں حدیث میں بیان کیا گیا ہے" دوسری مرتبہ کا ہے گویا ایک واقعہ تو وہ ہے جس کا ذکر پہلی فصل کی حدیث (نمبر ۳) میں گزرا اور دوسرا واقعہ ہے جو یہاں حدیث میں بیان کیا گیا ہے، اور یہ احتمال بھی ہے کہ "ایک انصاری" سے مراد ابوالہیثمؓ نہ ہوں بلکہ کوئی دوسرے انصاری صحابیؓ مراد ہوں۔

اور اس کو زمین پر دے مارا" حضرت عمرؓ کا یہ عمل گویا ان کی حالت جذب کا مظہر تھا جو قیامت کے دن ہر چھوٹی بڑی چیز اور ہر طرح کے جزئی وکلی امور کے سوال و پرسش کے سلسلہ میں خوف خدا اور مواخذہ آخرت کی ہیبت کی وجہ سے ان پر طاری ہو گئی تھی۔

"حجر" کا لفظ حاء کے پیش اور جیم کے سکون کے ساتھ بھی صحیح ہے، جس کے معنی حجرہ (کمرہ) کے ہیں، لیکن مشکوۃ کے ایک صحیح نسخہ میں یہ لفظ "جحر" یعنی جیم کے پیش اور حاء کے سکون کے ساتھ منقول ہے جس کے معنی سوراخ اور بل کے آتے ہیں، اس صورت میں یہ مراد ہو گا کہ ایک ایسا چھوٹا سا مکان جس کو اس کے انتہائی، چھوٹا اور حقیر ہونے کی وجہ سے "چوہے کے بل" سے تعبیر کیا جا سکتا ہو اور جس میں سردی و گرمی سے بچاؤ کے لئے مشکل اور تنگی کے ساتھ رہا جا سکتا ہو۔

اجتماعی طور پر کھانا کھانے کی صورت میں سب کے ساتھ ہی کھانے سے ہاتھ کھینچو

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَتِ الْمَائِدَةُ فَلَا يَقُوْمُ رَجُلٌ حَتّٰى تُرْفَعَ الْمَائِدَةُ وَلَا يَرْفَعُ يَدَهٗ وَاِنْ شَبِعَ حَتّٰى يَفْرُغَ الْقَوْمُ وَلْيُعْذِرْ فَاِنَّ ذٰلِكَ يُخْجِلُ جَلِيْسَهٗ فَيَقْبِضُ يَدَهٗ وَعَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ فِى الطَّعَامِ حَاجَةٌ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ۔ وَالْبَيْهَقِيُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جب دستر خوان بچھا دیا جائے (اور لوگ اس پر کھانے کے لئے بیٹھیں) تو کوئی شخص اس وقت تک نہ اٹھے جب تک کہ دستر خوان نہ اٹھا دیا جائے، اور (کھانے سے) اس وقت تک اپنا ہاتھ نہ کھینچے جب تک کہ سب لوگ کھانے سے فارغ نہ ہو جائیں اگرچہ اس کا پیٹ بھر گیا اور اگر کسی عذر کی بنا پر دستر خوان سے پہلے اٹھنا ضروری ہو، یا دوسرے لوگوں کے کھانے سے فارغ ہونے سے پہلے اپنا ہاتھ کھینچنا ہو تو) چاہئے کہ اس عذر کو بیان کر دے (یعنی معذرت طلب کر کے دستر خوان پر سے اٹھے یا اپنا ہاتھ کھینچے) کیوں کہ یہ (یعنی اس صورت میں کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لینا جب کہ دوسرے لوگ ابھی کھانے میں مشغول ہوں) اپنے ہم نشین کو شرمندہ کر دینا ہے، چنانچہ (جب ایک شخص یہ دیکھے گا کہ اس کے ساتھی نے کھانا چھوڑ دیا ہے تو شرما حضوری میں) وہ (بھی) اپنا ہاتھ کھینچ لے گا جب کہ بہت ممکن ہے کہ ابھی اور کھانے کی خواہش رکھتا ہو (یعنی اس کا پیٹ نہ بھرا ہو۔" (ابن ماجہ، بیہقیؒ)

تشریح: اس حدیث سے علماء نے مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر دستر خوان پر ایک سے زائد آدمی ہوں تو ان میں سے کسی شخص کو دوسرے ساتھیوں سے پہلے اپنا ہاتھ کھانے سے نہ کھینچنا چاہئے، بشرطیکہ اس کے ہاتھ کھینچنے کے بعد وہ (ساتھی) بھی شرما شرمی میں کھانا چھوڑ دیں۔ اور اگر کوئی شخص کم خوراک ہو (کہ کم خور ہونے کی وجہ سے دستر خوان کے دوسرے ساتھیوں کا آخر تک ساتھ دینا اس کے لئے مشکل ہو) تو اس صورت میں اس کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ آہستہ اور تھوڑا تھوڑا کھائے تاکہ آخر تک دوسرے لوگوں کا ساتھ دے سکے۔

(۱۳) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَكَلَ مَعَ قَوْمٍ كَانَ اٰخِرَهُمْ اَكْلًا رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت امام جعفر صادقؒ ابن محمدؒ اپنے والد یعنی امام محمد باقرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "رسول کریم ﷺ لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتے تو آپ ﷺ سب سے آخر تک کھانے والے شخص ہوتے تھے۔" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں بطریق

ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت امام محمد باقرؒ اصل میں تابعی ہیں، اور ان کو اپنے والد بزرگوار حضرت امام زین العابدینؒ اور حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے سماعت حدیث کا شرف حاصل ہے اس اعتبار سے یہ حدیث مرسل ہے! حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ دسترخوان پر موجود دوسرے لوگوں سے پہلے اپنا ہاتھ کھانے سے نہیں کھینچتے تھے بلکہ آخر تک کھاتے رہتے تھے، اور یا تو یہ کہ آپ ﷺ ابتداء میں نہیں کھاتے تھے یا بہت آہستہ آہستہ اور کم کم کھاتے تھے اور اس طرح کھانے کے آخر تک سب کا ساتھ دیتے تھے تاکہ دوسرے لوگ بھی شرم دلحاظ میں کھانا نہ چھوڑ دیں۔

بھوک ہونے کے باوجود کھانے سے تکلّفا انکار کرنا جھوٹ بولنے کے مترادف ہے

⑭ وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ اُتِىَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِطَعَامٍ فَعُرِضَ عَلَيْنَا فَقُلْنَا لَا نَشْتَهِيْهِ قَالَ لَا تَجْتَمِعْنَ جُوْعًا وَكِذْبًا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت اسماء بنت یزید کہتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے پاس کھانا لایا گیا اور پھر وہ کھانا ہمارے سامنے رکھا گیا (ہم اگرچہ بھوکے تھے اور کھانے کی خواہش رکھتے تھے مگر جیسا کہ عادت ہوتی ہے محض تکلّفا) ہم نے کہا کہ ہم کو کھانے کی خواہش نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "بھوک اور جھوٹ کو جمع نہ کرو۔" (ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک اور کھانے کی خواہش کے باوجود بطور تکلّف کھانے سے انکار کرے اور یہ کہے کہ مجھے کھانے کی خواہش نہیں ہے جو حقیقت میں جھوٹ بولنا ہے تو اس سے بڑا نادان کون ہوگا کہ دو نقصان برداشت کرنے پر تیار ہو جائے، ایک تو دنیا کا نقصان کہ بھوک کی کلفت اٹھائے اور دوسرا دین کا نقصان کہ جھوٹ بولے۔

مل کر کھانا کھانا برکت کا باعث ہے

⑮ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُوْا جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا فَاِنَّ الْبَرَكَةَ مَعَ الْجَمَاعَةِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عمر ابن خطابؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(کھانا) مل کر کھاؤ، الگ الگ مت کھاؤ، کیوں کہ برکت، جماعت کے ساتھ ہوتی ہے۔" (ابن ماجہ)

مہمان کے استقبال و وداع کے لئے گھر کے دروازے تک جانا مسنون ہے

⑯ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ السُّنَّةِ اَنْ يَّخْرُجَ الرَّجُلُ مَعَ ضَيْفِهٖ اِلٰى بَابِ الدَّارِ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْهُ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَالَ فِيْ اِسْنَادِهٖ ضُعْفٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" یہ سُنّت ہے کہ آدمی اپنے مہمان (کا استقبال کرنے یا اس کو رخصت کرنے) کے لئے گھر کے دروازے تک نکل کر آئے۔" (ابن ماجہ) بیہقیؒ نے شعب الایمان میں اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے، نیز بیہقیؒ نے کہا ہے کہ اس کے سلسلہ سند میں ضعف ہے۔"

تشریح: یہ بھی مہمان کی خاطر داری اور اس کا اکرام ہے کہ جب وہ آئے تو گھر کے دروازے پر اس کا استقبال کیا جائے اور جب وہ جانے لگے تو دروازے تک نکل کر اس کو رخصت کیا جائے، اس میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے دوسرے لوگ گھر میں ایک اجنبی کے آنے سے کسی وہم و وسوسہ کا شکار نہیں ہوں گے۔

"یہ سُنّت ہے" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ یہ عمل (یعنی مہمان کے استقبال وو داع کے لئے گھر کے دروازے تک جانا) ایک قدیم عادت ہے جس کو ہمیشہ سے تہذیب و شائستگی کا مظہر بھی سمجھا گیا ہے اور انسان کی فطرت سلیم کا غماز بھی یا یہ مطلب ہے کہ یہ عمل میری سُنّت اور میرے طریقے کے مطابق ہے۔

"اس سلسلۂ سند میں ضعف ہے" اس سے نفس حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ یہ روایت متعدد اسناد سے منقول ہے اور اگر کوئی روایت متعدد اسناد سے منقول ہو اور اس میں سے کسی سلسلۂ میں ضعف بھی ہو تو تعدد اسناد کی وجہ سے اس کو تقویت حاصل ہو جاتی ہے، ویسے بھی یہ بات ملحوظ رہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف روایت بھی قابل قبول ہوتی ہے۔

کھانا کھلانے کی فضیلت

⑰ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْخَيْرُ اَسْرَعُ اِلَى الْبَيْتِ الَّذِيْ يُؤْكَلُ فِيْهِ مِنَ الشَّفْرَةِ اِلٰى سَنَامِ الْبَعِيْرِ۔ (رواه ابن ماجة)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس گھر میں (مہمانوں کو) کھانا کھلایا جاتا ہے، وہاں خیر یعنی رزق، برکت اور بھلائی اتنی تیزی سے پہنچتی ہے جتنی تیزی سے چھری بھی اونٹ کے کوہان کی طرف نہیں پہنچتی۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: جب اونٹ کا گوشت کاٹا جاتا ہے تو اس کے سب اعضاء سے پہلے اس کے کوہان کو کاٹتے ہیں اور چونکہ کوہان کا گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے اس لئے وہ شوق کے ساتھ کھایا بھی جاتا ہے، پس فرمایا کہ جس طرح کوہان پر چھری جلد پہنچتی ہے اس سے بھی زیادہ جلد اس گھر میں خیر و بھلائی پہنچتی ہے جس میں مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

باب
گزشتہ باب کے متعلّقات کا بیان

یہاں باب کو کسی عنوان کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے باب میں جو موضوع چل رہا تھا اس باب میں بھی اسی سے متعلّق احادیث نقل ہوں گی، تاہم مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں یہاں یہ عنوان قائم کیا گیا ہے باب فی اکل المضطر یعنی مضطر کے کھانے کا بیان۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الاولِ

اور اس باب میں پہلی فصل نہیں ہے

یعنی اس باب میں صاحب مصابیح نے بخاریؒ و مسلمؒ کی کوئی راویت نقل نہیں کی ہے اس لئے انہوں نے اس باب کو فصل اول سے خالی رکھا ہے! واضح رہے کہ بعض نسخوں میں لفظ الاول کے بعد الثالث کا لفظ بھی ہے کیوں کہ اس باب میں تیسری فصل بھی نہیں ہے لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے الثالث کا لفظ نہ ہونا چاہئے، کیوں کہ مصنف مشکوٰۃ کا اصل مقصد صاحب مصابیح کے بارے میں بیان کرنا ہے کہ انہوں نے اس باب کو پہلی فصل سے خالی رکھا ہے جب کہ تیسری فصل کو شامل کرنے یا شامل نہ کرنے کا تعلق خود مصنف مشکوٰۃ کی ذات سے ہے اگر وہ کسی باب کو تیسری فصل سے خالی رکھیں تو اس کو بیان کرنا غیر ضروری سی بات ہوگی اور یہ بات ہے بھی کہ مصنف مشکوٰۃ نے اس کو بیان کرنے کا معمول نہیں رکھا ہے، جیسا کہ آگے آنے والے ایک باب "باب تغطیة الاوانی" سے واضح ہوگا کہ اس باب میں مصنف مشکوٰۃ نے تیسری فصل کو شامل نہیں کیا ہے اور یہ بیان نہیں کیا کہ اس باب میں تیسری فصل نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حالت اضطرار کا مسئلہ

① عَنِ الْفُجَیْعِ الْعَامِرِیِّ اَنَّہٗ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَایَحِلُّ لَنَا مِنَ الْمَیْتَةِ قَالَ مَاطَعَامُکُمْ قُلْنَا نَغْتَبِقُ وَنَصْطَبِحُ قَالَ اَبُوْنُعَیْمٍ فَسَّرَہٗ لِیْ عُقْبَةُ قَدَحٌ غُدْوَةً وَقَدَحٌ عَشِیَّةً قَالَ ذَاكَ وَاَبِی الْجُوْعُ فَاَحَلَّ لَھُمُ الْمَیْتَةَ عَلٰی ھٰذِہِ الْحَالِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت فجیع عامریؓ سے روایت ہے کہ وہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "(حضرت! یہ بتائیں کہ) ہمارے لئے مردار میں سے کیا حلال ہے؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "(پہلے یہ بتاؤ کہ) تم لوگوں کو کھانا کس مقدار میں ملتا ہے؟" ہم نے عرض کیا کہ "ہم کو ایک پیالہ دودھ کا شام کو اور ایک پیالہ دودھ کا صبح کو ملتا ہے۔" (حدیث کے راوی ابونعیمؒ کہتے ہیں کہ (میرے استاد و شیخ حضرت عقبہؒ نے نغتبق اور نصطبح کی) یہی وضاحت کی ہے کہ "ایک پیالہ دودھ کا صبح کو اور ایک پیالہ دودھ کا شام کو۔" (بہرحال رسول کریم ﷺ نے (فجیعؓ کا جواب سن کر) فرمایا کہ "کھانے کی یہ مقدار، اپنے باپ کی قسم، بھوک کو واجب کرتی ہے یعنی صبح و شام محض ایک ایک پیالہ دودھ کا ملنا بھوک کو ختم کر کے انسانی زندگی کی بقا کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس صورت میں ان کے لئے مردار کو حلال قرار دیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: غذا، انسان کی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے ایک ضروری چیز ہے انسان کو غذا کا نہ ملنا یا اتنی کم مقدار میں ملنا جس سے نہ صرف یہ کہ بھوک کو ختم نہ کیا جا سکتا ہو بلکہ زندگی کا وجود بھی خطرہ میں پڑ جائے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دیتا ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں "حالت اضطرار" سے تعبیر کیا جاتا ہے، حالت اضطرار میں شریعت یہ اجازت دیتی ہے کہ انسان اگر کسی حرام چیز کو کھا کر اپنی زندگی بچا سکتا ہے تو وہ کھا لینی چاہئے، چنانچہ سائل نے یہ سوال کر کے کہ ہمارے لئے مردار میں سے کیا حلال ہے؟" اصل میں یہی معلوم کرنا چاہا تھا کہ وہ کون سی صورت حال ہے جس پر "حالت اضطرار" کا اطلاق کیا جائے کہ اس صورت میں مردار یا کسی بھی حرام چیز کو کھایا جا سکتا ہے، یعنی اضطرار کی حد کیا ہے اور بھوک کی نوعیت کس درجہ کی ہو کہ جس کی وجہ سے حرام چیز کا کھانا مباح ہو سکتا ہے؟ اگرچہ سائل نے سوال کے لئے جو اسلوب و الفاظ اختیار کئے ہیں ان کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے گویا مردار کے کھانے کے بارے میں دریافت کیا تھا کہ مردار چیزوں میں سے کونسی چیز یا یہ کہ اس کی کونسی مقدار ایسی ہے جس کو کھانا ہمارے لئے حلال ہے، لیکن حقیقت میں نہ تو سائل کا مقصد یہ تھا اور نہ جواب اس کا دیا گیا ہے بلکہ مقصود یہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا یعنی حالت اضطرار کے بارے میں سوال کرنا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جواب بھی اسی کے بارے میں دیا۔ علاوہ ازیں یہ عبارت مَایَحِلُّ لَنَا الْمَیْتَةَ کہ جس سے مردار کے بارے میں سوال کرنا معلوم ہوتا ہے، ابوداؤدؒ کی ہے، لیکن طبرانی وغیرہ نے اس روایت کو جس طرح نقل کیا ہے اس میں یہ عبارت (یحل میں یاء کے پیش کے ساتھ) یوں ہے مَایُحِلُّ لَنَا الْمَیْتَةَ یعنی وہ کون سی حالت ہو جو ہمارے لئے مردار کے کھانے کو حلال قرار دیتی ہے! یہ عبارت سائل کے اصل مقصود کو زیادہ صاف اسلوب میں واضح کرتی ہے۔

"تم لوگوں کو کھانا کس مقدار میں ملتا ہے؟" اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ تمہیں غذا کے نام پر کوئی چیز بھی کسی بھی مقدار میں میسر نہ ہو، اس صورت میں کوئی الجھاؤ ہی نہیں ہے، جب پیٹ میں ڈالنے کے لئے کوئی بھی چیز کسی بھی مقدار میں میسر نہ ہو تو "حالت اضطرار" بالکل واضح طور پر متحقق ہو جاتی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ غذا کے نام پر کوئی نہ کوئی چیز اور کسی نہ کسی مقدار میں تمہیں میسر ہو اس صورت میں دیکھنا ہو گا کہ اس مقدار کی نوعیت کیا ہے کہ اس کے مطابق حالت اضطرار کے بارے میں فیصلہ ہو گا لہٰذا تم بتاؤ کہ اگر تمہیں کھانے کی قسم سے کوئی چیز دستیاب ہوتی ہے اس کی مقدار کیا ہے، تاکہ اس مقدار کو معلوم کر کے یہ اندازہ لیا

جاسکے کہ اس کے ذریعہ تمہارے پیٹ کو کتنا سہارا مل سکتا ہے اور تمہاری بھوک، اضطرار کی حد کو پہنچی ہے یا نہیں؟ آنحضرت ﷺ نے یہ سوال کرتے وقت "مخاطب کے لئے جمع" کا صیغہ استعمال کر کے گویا جماعت کو مخاطب کیا جب کہ سوال کرنے والے وہی ایک شخص (یعنی فجیع عامری) تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ جو حکم بیان کرنا چاہتے تھے وہ اگرچہ ایک شخص کے سوال کے پیش نظر تھا مگر حقیقت میں اس کا تعلق سب ہی لوگوں سے تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس طرح اس حکم کی عمومی حیثیت کو واضح فرمایا یہی وجہ ہے کہ فجیع نے بھی اپنے جواب میں جمع کا صیغہ لائے یعنی یوں کہا کہ "ہم نے عرض کیا....الخ"

"نصطبح" کا مادہ اشتقاق "صبوح" ہے صبح کے معنی صبح کے کھانے پینے" کے ہیں اسی طرح "نغتبق" کا مادہ اشتقاق "غبوق" ہے جس کے معنی شام کے کھانے پینے" کے ہیں یہاں روایت میں ان دونوں الفاظ سے مراد صبح و شام ایک ایک پیالہ دودھ پینا لیا گیا ہے جیسا کہ حدیث کے ایک راوی ابو نعیم نے حضرت عقبہ سے یہ وضاحت نقل کی ہے، اور ہو سکتا ہے کہ ابو نعیم کی نقل کردہ وضاحت حضرت عقبہ ہی سے ساعت پر مبنی ہو یا دوسری روایتوں میں بھی یہ وضاحت منقول ہو، بہر صورت راوی کی یہ وضاحت مستند بھی ہے اور لائق اعتبار بھی۔

آنحضرت ﷺ کا "اپنے باپ کی قسم کھانا" بظاہر ایک تعجب خیز امر ہے جس کی تاویل یہ کی جائے گی کہ آپ ﷺ کا یہ قسم کھانا اصل میں اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت نازل نہیں ہوئی تھی، یا یہ کہ پہلے اہل عرب عام طور پر چوں کہ اسی قسم کی قسمیں کھایا کرتے تھے اور ایسی قسموں کے الفاظ ان کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے اس لئے اس عادت کے مطابق آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے بھی یہ قسم اضطرارًا (یعنی بلا قصد و ارادہ) نکل گئی۔

"آپ ﷺ نے اس صورت میں ان کے لئے مردار کو حلال قرار دیا۔" میں "اس صورت" سے مراد صبح و شام ایک ایک پیالہ دودھ پینے کی صورت ہے یعنی گویا آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ غذا کی اتنی تھوڑی سی مقدار تم لوگوں کو یقینًا کافی نہیں ہوگی اور تم سب بھوکے رہے ہوگے اس لئے یہ صورت حالت اضطرار کی ہے جس میں مردار کھانا حلال ہے لہٰذا تم مجبورًا مردار بھی کھا کر اپنی جان بچا سکتے ہو۔

(۴) وَعَنْ اَبِیْ وَاقِدِ اللَّیْثِیِّ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّا نَکُوْنُ بِاَرْضٍ فَتُصِیْبُنَا بِھَا الْمَخْمَصَۃُ فَمَتٰی یَحِلُّ لَنَا الْمَیْتَۃُ قَالَ مَالَمْ تَصْطَبِحُوْا اَوْ تَغْتَبِقُوْا اَوْ تَحْتَفِؤُا بِھَا بَقْلًا فَشَاْنُکُمْ بِھَا مَعْنَاہُ اِذَا لَمْ تَجِدُوْا صَبُوْحًا اَوْ غَبُوْقًا وَلَمْ تَجِدُوْا بَقْلَۃً تَاْکُلُوْنَھَا حَلَّتْ لَکُمُ الْمَیْتَۃُ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابو واقد لیثی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا "یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم (کبھی) ایسی زمین میں (یعنی ایسی جگہ پہنچ جاتے) ہیں کہ (یہاں ہمیں کھانا کو کچھ نہیں ملتا جس کی وجہ سے) ہم وہاں مخمصہ (بھوک) کی حالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس صورت میں مردار کھانا ہمارے لئے کب حلال ہو جاتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا جب کہ تم صبح تک یا شام تک (کھانے پینے کی کوئی چیز) نہ پاؤ یا اس زمین (یعنی اس جگہ کہ جہاں تم ہو) تو تمہاری حالت مردار سے متعلق ہوگی یعنی ایسی صورت پیش آنے پر مردار کھانا تمہارے لئے حلال ہوگا (اب اس کے بعد راوی حدیث کا ماحصل بیان کرتے ہیں کہ) اس ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دن بھر میں اور رات بھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ پاؤ اسی طرح تمہیں ترکاری کی قسم سے بھی کوئی چیز (یہاں تک کہ گھاس اور درخت کے پتے بھی) میسر نہ ہوں جس کو تم کھا سکو (اور اپنی جان بچا سکو) تو اس صورت میں تمہارے لئے مردار حلال ہوگا۔" (دارمی)

تشریح: دونوں حدیثوں میں بظاہر تعارض محسوس ہوتا ہے کیوں کہ پہلی حدیث میں تو صبح و شام کو دودھ ملنے کی صورت کو بھی بھوک اور مخمصہ یعنی اضطرار کی حالت پر محمول کیا اور مردار کھانے کو مباح قرار دیا جب کہ اس دوسری حدیث میں حالت اضطرار کے پائے جانے کو اس امر کے ساتھ مشروط کیا کہ صبح یا شام تک کھانے پینے کی کوئی بھی چیز میسر نہ ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ اس دائرے کو اتنا تنگ کیا کہ اگر ترکاری و سبزی اور اس کی مانند چیزیں جیسے گھاس اور درخت کے پتے وغیرہ ہی مہیا ہو جائیں اور ان کو پیٹ میں ڈالا جا سکے تو اس صورت

میں حالت اضطرار متحقق نہیں ہوگی اور مردار کھانا مباح نہیں ہوگا۔ ان احادیث کے باہمی تعارض واختلاف ہی کی بنا پر علماء کے مسلک واقوال میں بھی اختلاف پیدا ہوا ہے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک تو یہ ہے کہ سدرمق یعنی جان بچانے کی خاطر از قسم مردار کوئی چیز کھانا اس صورت میں حلال ہوگا جب کہ بھوک کی وجہ سے جان کی ہلاکت کا خوف پیدا ہو جائے، اور اسی قدر کھانا حلال ہوگا جس سے بس جان بچ جائے۔ حضرت امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے، یہ مسلک وقول بظاہر "سختی وتنگی" پر محمول ہے، لیکن حقیقت میں احتیاط وتقویٰ اسی میں ہے۔

اس کے برخلاف حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ اور ایک قول کے مطابق حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اتنی مقدار میں کھانا نہ پائے جس سے وہ سیر ہو جائے اور اس کی طبعی خواہش حاجت مند ومتقاضی ہو تو اس کے لئے مردار کھانا حلال ہوگا، تا آنکہ وہ اپنی حاجت طبع پوری کرے، یعنی وہ سیر ہو جائے، اور اس مسلک میں زیادہ نرمی وآسانی ہے۔ حاصل یہ کہ حالت، اضطرار میں از قسم مردار کوئی چیز کھانے کے سلسلے میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو سدرمق کا اعتبار ہے، کہ مضطر بس اتنا مردار کھا سکتا ہے جس سے جان بچی رہے، جب کہ دوسرے آئمہ کے نزدیک حصول قوت یعنی شکم سیر ہو کر کھانے کا اعتبار ہے ان ائمہؒ کی دلیل پہلی حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس حالت میں مردار کھانے کو حلال قرار دیا، جب کہ سائل کو ایک پیالہ دودھ دن میں، اور ایک پیالہ دودھ رات میں میسر ہوتا تھا اور دن ورات میں ملنے والا ایک ایک پیالہ دودھ بلاشک وشبہ سدرمق یعنی جان بچانے کی حد تک کافی ہو سکتا ہے، اگرچہ اس کے ذریعہ شکم سیری نہ ہو سکتی ہو، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اضطرار کی حد کی وجہ سے مردار کھانا مباح ہو جاتا ہے اصل میں شکم سیری کا حاصل نہ ہونا ہے اور بقدر حصول قوت مردار کھانا حلال ہے۔

ان ائمہؒ کے برخلاف حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اپنے مسلک کو دوسری حدیث سے ثابت کرتے ہیں جس کی وضاحت اوپر بیان کی گئی ہے۔ ان (حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ) کے نزدیک جہاں تک پہلی حدیث کا تعلق ہے کہ جس سے دوسرے آئمہ استدلال کرتے ہیں اس کے بارے میں ان کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس حدیث میں صبح وشام ایک ایک پیالہ دودھ پوری قوم کو ملتا تھا، نہ کہ ایک ایک شخص ایک ایک پیالہ دودھ پاتا تھا، چنانچہ لفظ طعامکم میں جمع کا صیغہ اس بات کی واضح دلیل ہے۔

اسی طرح حضرت فجیع عامری کا سوال کرنا محض اپنی ذات کی طرف سے نہیں تھا، بلکہ درحقیقت انہوں نے اپنی پوری قوم کی طرف سے سوال کیا تھا اسی لئے انہوں نے یہ الفاظ کہے مایحل لنا (ہمارے لئے مردار میں سے کیا حلال ہے) انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ میرے لئے مردار میں سے کیا حلال ہے؟ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک کثیر جماعت کے لئے محض ایک پیالہ دودھ سدرمق یعنی جان بچانے کے لئے بھی ہرگز کافی نہیں ہو سکتا، اور نہ وہ کسی ایک کی بھی بھوک کو ذرا برابر بھی ختم کرنے میں مددگار بن سکتا ہے، ہاں اگر ہر ایک کو ایک ایک پیالہ دودھ ملے تو وہ بے شک جان بچانے کے بقدر غذا بن سکتا ہے۔

بَابُ الْاَشْرِبَةِ
پینے کی چیزوں کا بیان
اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ
پانی کو تین سانس میں پینے کی خاصیت

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَنَفَّسُ فِي الشَّرَابِ ثَلَاثًا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ مُسْلِمٌ فِي

رِوَايَةٍ وَيَقُوْلُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ اَرْوٰى وَاَبْرَأُ وَاَمْرَأُ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ پانی پینے کے درمیان تین مرتبہ سانس لیتے تھے (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلمؒ نے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "..... اور آپ ﷺ فرماتے کہ اس طرح (کئی سانس میں پانی پینا اچھی طرح سیراب کرتا ہے اور پیاس کو بجھاتا ہے، بدن کو صحت بخشتا ہے اور خوب ہضم ہوتا ہے، اور معدہ میں بڑی آسانی کے ساتھ جاتا ہے۔"

تشریح: "تین مرتبہ سانس لیتے تھے" یعنی آپ ﷺ پانی تین سانس میں پیتے تھے، حضرت انسؓ نے یہ بات اکثر کے اعتبار سے بیان کی ہے کہ آپ ﷺ اکثر و بیشتر اسی طرح پانی پیتے تھے، اور بعض روایتوں میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں دو سانس میں بھی پینے کا ذکر آیا ہے۔ بہر حال تین یا دو سانس میں پینے کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ﷺ ہر مرتبہ برتن کو منہ سے جدا کر لیتے تھے۔

مشک کے منہ سے پانی پینے کی ممانعت

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشُّرْبِ مِنْ فِيِ السِّقَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مشک کے دہانے سے پانی پینے سے منع فرمایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مشک یا اس جیسی دوسری چیزوں (جیسے ہینڈ پمپ یا گھڑے وغیرہ) کے دہانہ (منہ) سے پانی پینے کی ممانعت اس بنا پر ہے کہ اس طریقہ سے اول تو پانی ضرورت سے زائد صرف ہوتا ہے، دوسرے وہ پانی کپڑوں وغیرہ پر گر کر ان کو خراب کرتا ہے تیسرے یہ کہ اس طرح پانی پینا کہ زیادہ مقدار میں دفعتاً پیٹ میں جائے معدہ کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے اور چوتھے یہ کہ پانی پینے کا جو مسنون طریقہ ہے اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

(۳) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اِخْتِنَاثِ الْاَسْقِيَةِ وَزَادَ فِيْ رِوَايَةٍ وَاخْتِنَاثُهَا اَنْ يُّقْلَبَ رَأْسُهَا ثُمَّ يُشْرَبَ مِنْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مشک کا منہ موڑنے یعنی اس کا منہ موڑ کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ اور راوی نے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ مشک کا منہ موڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اس مشک کا سرا (یعنی منہ) الٹ دیا جائے، اور پھر اس سے پانی پیا جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ممانعت کی وجہ بھی وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی، مشک کا منہ موڑ کر پانی پینے کی صورت میں ایک خدشہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس مشک میں کوئی کیڑا پتنگا ہو، یا کوئی زہریلا جانور اندر بیٹھا ہو اور وہ یکبارگی منہ کے اندر چلا جائے، اور کوئی ضرر پہنچائے۔ ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مشک کے منہ سے پانی پیا ہے، یہ روایت دوسری فصل میں آئے گی اس سے مشک کے منہ سے پانی پینے کا جواز ثابت ہوتا ہے، چنانچہ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جن روایتوں سے ممانعت ثابت ہوتی ہے ان کا تعلق بڑی مشک سے ہے جن کا منہ زیادہ فراخ ہوتا ہے، اور جہاں تک آنحضرت ﷺ کے عمل کا تعلق ہے تو وہ چھوٹی مشک پر محمول ہے، کہ آپ ﷺ نے کسی ایسی مشک کے منہ سے پانی پیا ہو گا جو چھوٹی ہو گی اور اس کا دہانہ تنگ ہو گا۔ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ ممانعت کا تعلق دوام اور عادت سے ہے یعنی مشک کے منہ سے پانی پینے کی عادت نہ ڈالنی چاہئے، کیوں کہ اس کی وجہ سے مشک کے منہ میں رفتہ رفتہ بد بو پیدا ہونے لگے گی اور اگر گاہ بگاہ مشک کے منہ سے پانی پی لیا جائے تو یہ ممنوع نہیں ہو گا، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اباحت کا تعلق ضرورت و احتیاج سے ہے کہ اگر فرض کیجئے، پانی پینے کی ضرورت ہو اور اس وقت کوئی ایسا برتن موجود نہ ہو جس میں پانی انڈیل کر پیا جا سکتا ہو تو پھر اس صورت میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہو گا کہ مشک یا گھڑے کے منہ سے پانی پی لیا جائے، ہاں بغیر ضرورت و احتیاج کے اس طرح پانی پینا ممنوع ہو گا، کیونکہ

اس طریقہ سے پانی پینے میں مذکورہ بالا مضرات کا خدشہ ہو سکتا ہے، خاص طور پر اس مشک کے اندر کسی زہریلے جانور کی موجودگی کے خطرہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص نے (مشک کے) دہانہ سے پانی پیا، تو اس کے اندر سے ایک سانپ نکل آیا۔ اور آخر میں ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس طرح پانی پینا پہلے مباح تھا مگر بعد میں اس ممانعت کے ذریعہ اس اباحت کو منسوخ قرار دے دیا گیا۔

کھڑے ہو کر پانی مت پیو

④ وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ نَهٰى اَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص کھڑے ہو کر پئے۔" (مسلمؒ)

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَشْرَبَنَّ اَحَدٌ مِّنْكُمْ قَائِمًا فَمَنْ نَسِيَ مِنْكُمْ فَلْيَسْتَقِئْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص کھڑا ہو کر نہ پئے، اگر کسی شخص نے بھول سے کھڑے ہو کر پی لیا تو اس کو چاہئے کہ وہ قے کر ڈالے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث میں قے کر ڈالنے کا جو امر (حکم) بیان کیا گیا ہے، وہ وجوب کے طور پر نہیں ہے، بلکہ بطریق استحباب ہے، چنانچہ اس حدیث کی صراحت کے مطابق اگر کسی شخص نے بھول سے کھڑے ہو کر پانی پیا ہے تو اس کے لئے یہ مستحب ہے، وہ قے کر ڈالے۔

قاضیؒ نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کی یہ ممانعت اصل میں اولی و بہتر طریقہ (یعنی بیٹھ کر پانی پینے) کی تلقین اور اس کی خلاف پر تادیب و تنبیہ کے طور پر ہے نہ کہ یہ ممانعت، نہی تحریمی کے طور پر ہے، حاصل یہ کہ اس ارشاد سے یہ نہ سمجھا جائے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا حرام ہے، اس اعتبار سے یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہوگی جس میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک یا دو مرتبہ اس کے برخلاف عمل کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پیا

⑥ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِدَلْوٍ مِنْ مَّاءِ زَمْزَمَ فَشَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں زمزم کے پانی کا ایک ڈول لے کر آیا تو آپ ﷺ نے اس کو اس حالت میں پیا کہ آپ ﷺ کھڑے ہوئے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آپ ﷺ کا زم زم کے پانی کو کھڑے ہو کر پینا یا تو تبرک کی بنا پر تھا، یا اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کے اژدہام کی وجہ سے آپ ﷺ کے لئے وہاں بیٹھنا ممکن نہیں تھا، اور یا جہاں (زم زم کے کنویں کے پاس) آپ ﷺ کھڑے تھے وہاں آس پاس پانی گرنے کی وجہ سے کیچڑ ہو گیا تھا، اور اس کیچڑ میں کس طرح بیٹھ سکتے تھے، اور یا یہ کہ آپ ﷺ کے کھڑے ہو کر پانی پینے کا مقصد محض بیان جواز تھا۔

وضو کا پانی اور آب زم زم کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے

⑦ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهُ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ قَعَدَ فِيْ حَوَائِجِ النَّاسِ فِيْ رَحْبَةِ الْكُوْفَةِ حَتّٰى حَضَرَتْ صَلٰوةُ الْعَصْرِ ثُمَّ اُتِيَ بِمَاءٍ فَشَرِبَ وَغَسَلَ وَجْهَهٗ وَيَدَيْهِ وَذَكَرَ رَاْسَهٗ وَرِجْلَيْهِ ثُمَّ قَامَ فَشَرِبَ فَضْلَهٗ وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اُنَاسًا يَكْرَهُوْنَ الشُّرْبَ قَائِمًا وَاِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور پھر لوگوں کے معاملات و مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے کوفہ کی ایک بلند و کشادہ جگہ پر اپنی مجلس قائم کی (اور وہاں لوگوں کے جھگڑوں اور معاملوں کو سن سن کر فیصلہ کرتے رہے) یہاں تک کہ عصر کا وقت آگیا، جب (وضو کے لئے) پانی لایا گیا تو انہوں نے (اپنی پیاس بجھانے کے لئے وضو سے پہلے اس پانی میں سے) پیا اور پھر انہوں نے (وضو کے لئے) اپنا منہ اور اپنے ہاتھ دھوئے، اور راوی نے یہ ذکر کیا کہ (انہوں نے) اپنا سر کا مسح اور اپنے پاؤں (دھوئے) اس کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور وضو کا بچا ہوا پانی اس حالت میں پیا کہ وہ کھڑے ہوئے تھے اور پھر فرمایا کہ بعض لوگ کھڑے ہو کر پینے کو کراہت پر محمول کرتے ہیں یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پانی پینا مکروہ ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا ہی کیا ہے جیسا کہ (ابھی) میں نے کیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "اور راوی نے یہ ذکر کیا الخ" کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اوپر کے (یعنی پہلے) راوی نے جہاں ہاتھ اور منہ دھونے کا ذکر کیا تھا وہیں سر اور پیروں کے بارے میں بھی ذکر کیا تھا، لیکن جب نیچے کے (یعنی بعد کے) راوی نے حدیث نقل کی تو وہ پہلے راوی کے قول کی تفصیل بھول گیا اور اسے یہ یاد نہیں رہا کہ پہلے راوی نے یہ کہا تھا (کہ حضرت علیؓ نے اپنے سر کا مسح کیا اور اپنے پیروں کو دھویا، جیسا کہ بظاہر یہی واضح ہوتا ہے، یا یہ کہ پہلے راوی نے یہ بیان کیا تھا کہ انہوں نے اپنے سر کا بھی مسح کیا، اور پیروں کا بھی مسح کیا، جیسا کہ اسی واقعہ کے بارے میں حضرت علیؓ سے منقول ایک اور روایت میں یہی ذکر کیا گیا ہے، اس صورت میں کہا جائے گا کہ پیروں کے مسح سے مراد پیروں کو ہلکے طور پر دھونا ہے، اور یا یہ کہ حضرت علیؓ نے اس وقت موزے پہن رکھے ہوں گے، اس لئے انہوں نے پیروں پر مسح کیا۔

"اس حالت میں پیا کہ وہ کھڑے ہوئے تھے" یہ جملہ دراصل تاکید کے طور پر ہے تاکہ یہ گمان نہ ہو کہ کھڑے ہونے کے بعد پھر بیٹھ کر انہوں نے پانی پیا ہوگا، چنانچہ اس بات کو مکرر واضح کیا گیا کہ انہوں نے اسی طرح کھڑے کھڑے وضو کا بچا ہوا پانی پیا۔

واضح رہے کہ احادیث میں کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت بیان کی گئی ہے، جب کہ آنحضرت ﷺ اور اکابر صحابہؓ کا عمل اس کے برخلاف بھی ثابت ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں پہلے گزر ہی چکا ہے اور مواہب لدنیہ میں حضرت جبیر بن مطعمؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیکھا کہ وہ کھڑے ہو کر پانی پی رہے تھے، اسی طرح حضرت امام مالکؒ نے بیان کیا ہے کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ نے کھڑے ہو کو پانی پیا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں جو اس طرح کا تضاد و تعارض واقع ہوا ہے، اس کو دور کرنے کے لئے علماء نے یہ کہا ہے کہ اس بارے میں جو ممانعت منقول ہے وہ اصل میں نہی تنزیہہ کے طور پر ہے، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ لوگ کھڑے ہو کر پانی پینے کو ایک عادت و معمول بنالیں (ویسے گاہ بگاہ یا کسی عذر کی بنا پر کھڑے ہو کر پانی پی لینے میں کوئی مضائقہ نہیں) اسی لئے آنحضرت ﷺ نے جو کھڑے ہو کر پانی پیا اس کا مقصد محض اس جواز کو بیان کرنا تھا، علاوہ ازیں آب زمزم اور وضو کا بچا ہوا پانی اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے، بلکہ ان کو تو کھڑے ہی ہو کر پینا مستحب ہے، چنانچہ بعض فقہی روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ آب زمزم اور وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پیا جائے البتہ اور پانی کھڑے ہو کر نہ پیا جائے۔

جانوروں کی طرح منہ ڈال کر پانی پینا مکروہ ہے

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ وَمَعَهٗ صَاحِبٌ لَّهٗ فَسَلَّمَ فَرَدَّ الرَّجُلُ وَهُوَ يُحَوِّلُ الْمَآءَ فِيْ حَائِطٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كَانَ عِنْدِيْ مَآءٌ بَاتَ فِيْ شَنَّةٍ وَاِلَّا كَرَعْنَا فَقَالَ عِنْدِيْ مَآءٌ بَاتَ فِيْ شَنٍّ فَانْطَلَقَ اِلَى الْعَرِيْشِ فَسَكَبَ فِيْ قَدَحٍ مَآءً ثُمَّ حَلَبَ عَلَيْهِ مِنْ دَاجِنٍ فَشَرِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اَعَادَ فَشَرِبَ الرَّجُلُ الَّذِيْ جَآءَ مَعَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ ایک انصاری (یعنی ابوالہیثم جن کا ذکر پہلے بھی گزرا ہے) کے باغ میں تشریف لے گئے آپ ﷺ کے ہمراہ آپ ﷺ کے ایک صحابی (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ) بھی تھے، آنحضرت ﷺ نے (باغ میں پہنچ کر) سلام علیک کی، ان انصاریؓ نے جو اس وقت باغ میں پانی دے رہے تھے آپکے سلام کا جواب دیا، نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا "اگر تمہارے پاس پرانی مشک میں باسی پانی ہو (تو لاؤ تاکہ ہم پئیں) اور اگر تمہارے پاس ایسا پانی نہ ہو تو پھر ہم ندی یا نہر سے منہ لگا کر پانی پی لیں گے۔" انہوں نے عرض کیا کہ "(جی ہاں!) میرے پاس پرانی مشک میں باسی پانی موجود ہے۔" چنانچہ وہ جھونپڑی میں گئے جو (انہوں نے اس باغ میں ڈال رکھی تھی) اور ایک پیالہ میں پانی لے کر پھر اس پر (یعنی اس پیالہ میں) گھر کی پلی ہوئی بکری کا دودھ دوہا (اور اس پیالہ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا) جس کو نبی کریم ﷺ نے نوش فرمایا اس کے بعد وہ انصاری پہلے پیالہ کی طرح ایک اور پیالہ لے کر آئے۔ جس کو ان صاحب نے پیا جو آنحضرت ﷺ کے ہمراہ آئے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: کرعنا کے معنی ہیں "ہم کرع میں سے پانی پی لیں گے" اور "کرع" اس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے، اسی طرح چھوٹی سی نہر اور تالاب کو بھی کرع کہتے ہیں اس اعتبار سے کرعنا کا مفہوم یہ ہوا کہ ہم بغیر کسی برتن کے اور بغیر ہاتھ لگائے نہر یا تالاب وغیرہ سے منہ لگا کر پانی پی لیں گے۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ کرع اس کو کہتے ہیں کہ بغیر برتن اور ہاتھ کے منہ ڈال کر پانی پیا جائے جس طرح چوپائے تالاب وغیرہ میں اپنے پاؤں ڈال کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر منہ لگا کر پانی پیتے ہیں۔

سیوطیؒ کہتے ہیں کہ (اس حدیث سے مفہوم ہوتا ہے کہ کرع یعنی منہ ڈال کر پانی پینا جائز ہے جب کہ) ابن ماجہ کی ایک روایت میں کرع کی ممانعت منقول ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ ابن ماجہ کی روایت کا تعلق نہی تنزیہی سے ہے اور یہاں جو بیان کیا گیا ہے وہ جواز کو ظاہر کرنے کے لئے تھا (مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں تو اس طرح جانوروں کے طریقہ پر پانی پینا مکروہ ہے لیکن مخصوص حالات میں اس طرح پانی پینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔)

سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا حرام ہے

⑨ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الَّذِیْ يَشْرَبُ فِیْ اٰنِيَةِ الْفِضَّةِ اِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِیْ بَطْنِهٖ نَارَ جَهَنَّمَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ۔ اِنَّ الَّذِیْ يَاْكُلُ وَيَشْرَبُ فِیْ اٰنِيَةِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ۔

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص چاندی کے برتن میں پینے کی کوئی چیز پیتا ہے تو اس کا یہ پینا اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرے گا کہ اس کے پیٹ میں دوزخ کی آگ کو غٹ غٹ اتارے گا (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے کہ جو شخص چاندی اور سونے کے برتن میں کھاتا اور پیتا ہے (اس کا حشر بھی یہی ہوگا۔"

تشریح: تمام علماء اور ائمہ کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے لئے چاندی اور سونے کے برتن میں کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح ان کے برتنوں میں پانی بھر کر وضو کرنے، یا ان میں عطر رکھ کر ان سے عطر لگانے، اور یا ان میں حقہ رکھ کر حقہ پینے وغیرہ جیسے کاموں میں استعمال کرنا بھی حرام ہے، اگر کسی چاندی یا سونے کے برتن میں کھانے پینے کی کوئی چیز رکھی ہو تو اس کو پہلے اس میں سے نکال کر کسی دوسرے برتن میں رکھ لیا جائے اور پھر اس کو کھایا جائے، اسی طرح تیل یا عطر وغیرہ ہو تو پہلے اس تیل یا عطر کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر نکال لیا جائے اور پھر اس کو دائیں ہاتھ سے لگایا جائے، اور اگر یہ صورت اختیار کی گئی کہ اس تیل یا عطر وغیرہ کو اس چاندی یا سونے کے برتن میں سے کسی ہاتھ کی ہتھیلی پر نکالا گیا اور پھر اسی ہتھیلی سے لگایا گیا تو یہ جائز نہیں ہوگا۔

ہدایہ میں لکھا ہے کہ مفضض برتن میں پانی پینا جائز ہے بشرطیکہ منہ لگانے کی جگہ چاندی نہ ہو، اسی طرح سونے یا چاندی کے مضبب پیالہ میں بھی پانی پینا جائز ہے کیوں کہ پیالہ پر ضباب کا ہونا (یعنی اس پر سونے یا چاندی کا پتر چڑھا ہوا ہونا) اس پیالہ کی مضبوطی کے

لئے ہونا ہے نہ کہ زینت و آرائش کے مقصد سے۔

(۱۰) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَلْبَسُوا الْحَرِيْرَ وَلَا الدِّيْبَاجَ وَلَا تَشْرَبُوْا فِي اٰنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَا تَأْكُلُوْا فِي صِحَافِهَا فَإِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَهِيَ لَكُمْ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "ریشمی کپڑا نہ پہنو، اور نہ دیباج پہنو۔ (جو ایک طرح کا ریشمی ہی کپڑا ہوتا ہے) اسی طرح نہ سونے اور چاندی کے برتن میں پینے کی کوئی چیز پیو، اور نہ سونے چاندی کی رکابیوں اور پیالوں میں کھاؤ، کیوں کہ یہ ساری چیزیں دنیا میں کافروں کے لئے ہیں اور تمہارے لئے آخرت میں ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ریشمی کپڑا نہ پہنو" اس حکم سے چار انگشت کے بقدر ریشمی کپڑا مستثنیٰ ہے جو دوسرے کپڑے کے کنارے پر لگایا جائے، مثلاً الحالق (یعنی روئی کی عبا یا انگرکھے) وغیرہ کی سنجاف یعنی گوٹ یا جھالر ریشمی کپڑے کی لگانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ چار انگشت سے زائد چوڑی نہ ہو۔ اسی طرح وہ کپڑا پہننا جائز ہے جس کے تانے میں ریشم ہو اور بانے میں سوت، اور اگر سوت تانے میں ہو اور ریشم بانے میں ہو تو اس کا پہننا جائز نہیں ہوگا، لیکن لڑائی کے موقع پر اس کا پہننا بھی جائز ہوگا، اسی طرح اگر کسی کو خارش کا مرض لاحق ہو، یا جوؤں کی کثرت ہو گئی تو اس صورت میں ریشمی کپڑا پہننا جائز ہوگا۔

دائیں طرف سے دینا شروع کرو

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ حُلِبَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاةٌ دَاجِنٌ وَشِيْبَ لَبَنُهَا بِمَاءٍ مِنَ الْبِئْرِ الَّتِيْ فِيْ دَارِ اَنَسٍ فَاُعْطِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقَدَحَ فَشَرِبَ وَعَلٰى يَسَارِهٖ اَبُوْبَكْرٍ وَعَنْ يَمِيْنِهٖ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ عُمَرُ اَعْطِ اَبَابَكْرٍ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَعْطَى الْاَعْرَابِيَّ الَّذِيْ عَنْ يَمِيْنِهٖ ثُمَّ قَالَ الْاَيْمَنُ فَالْاَيْمَنُ وَفِيْ رِوَايَةٍ الْاَيْمَنُوْنَ الْاَيْمَنُوْنَ اَلَا فَيَمِّنُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ (جب ہمارے گھر تشریف لائے تو آپ ﷺ) کے لئے گھر کی پلی ہوئی ایک بکری کا دودھ دوہا گیا اور اس دودھ کو اس کنویں کے پانی میں ملایا گیا جو انسؓ کے گھر میں تھا، پھر یہ دودھ کا پیالہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا جس میں سے آپ ﷺ نے کچھ دودھ پیا۔ (اس وقت) آنحضرت ﷺ کے بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ بیٹھے تھے، اور دائیں طرف ایک دیہاتی بیٹھا تھا حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! یہ بچا ہوا دودھ حضرت ابوبکرؓ کو دیجئے" لیکن آپ ﷺ نے اس دیہاتی کو عنایت فرمایا جو آپ ﷺ کی دائیں طرف بیٹھا تھا، پھر فرمایا کہ "دایاں مقدم ہے اور پھر دایاں۔" اور ایک روایت میں یہ ہے کہ (آپ ﷺ نے اس موقع پر یہ فرمایا کہ) "یاد رکھو! دائیں طرف کے زیادہ حق دار ہیں دائیں طرف کے زیادہ حقدار ہیں، لہٰذا دائیں طرف والوں کو دیا کرو (یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ دائیں طرف والے زیادہ حق دار ہیں تو تم بھی دائیں طرف والوں کی رعایت ملحوظ رکھا کرو کہ دینے میں انہی سے ابتداء کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جو انسؓ کے گھر میں تھا" ظاہری اسلوب کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضرت انسؓ یہاں یہ کہتے کہ "جو ہمارے گھر میں تھا" کیوں کہ حضرت انسؓ نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ انہی کے گھر کا ہے، جس بکری کا دودھ دوہا گیا تھا وہ بھی حضرت انسؓ کے گھر میں تھی اور وہ کنواں بھی ان ہی کے گھر میں تھا اور خود حضرت انسؓ ہی اس واقعہ کو بیان کرنے والے ہیں، لیکن انہوں نے ظاہری اسلوب کے تقاضے کے برخلاف یہ کہہ کر کہ "جو انسؓ کے گھر میں تھا" گویا تفنن عبارت کے اسلوب کو اختیار کیا جس کو علم عربیت میں "وضع مظہر، موضع مضمر" کہتے ہیں۔

دونوں لفظ ایمن نون کے پیش کے ساتھ ہیں جن کا ترجمہ یہی ہے کہ "دایاں مقدم ہے اور پھر دایاں" یعنی سب سے پہلے اس شخص

کو دیا جائے جو داہنی طرف ہو اور پھر اس شخص کو دیا جائے جو پہلے شخص کے برابر میں اسی طرف ہو، اسی ترتیب سے دیتا چلا جائے، یہاں تک کہ سب سے آخر میں اس شخص کا نمبر آئے جو بائیں طرف ہے۔ ایک روایت میں یہ دونوں لفظ ایمن نون کے زبر کے ساتھ ہیں اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ میں دائیں طرف والے کو دوں گا پھر دائیں طرف والے کو، لیکن نون کے پیش والی روایت کی تائید مذکورہ بالا دوسری روایت الایمنون الایمنون سے بھی ہوتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے دینے میں اپنی داہنی طرف کی رعایت ملحوظ رکھنا مستحب ہے یعنی اگرچہ داہنی طرف کا شخص بائیں طرف کے شخص کی بہ نسبت کم رتبہ بھی ہو تو تب بھی پہلے اسی کو دیا جائے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے اس دیہاتی کو حضرت ابوبکر صدیق ؓ پر اسی لئے مقدم رکھا کہ وہ دائیں طرف تھا۔ نیز یہ حدیث آنحضرت ﷺ کے کمال عدل و انصاف اور آپ ﷺ کے وصف حق شناسی پر بھی دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر ؓ کے افضل اور مقرب ترین ہونے اور حضرت عمر ؓ کی سفارش کے باوجود دیہاتی کے حق کو نظر انداز نہیں کیا، جہاں تک حضرت عمر ؓ کے عرض کرنے کا تعلق ہے تو انہوں نے محض یاد دہانی کے لئے عرض کیا تھا کہ شاید آنحضرت ﷺ کو وہاں حضرت ابوبکر ؓ کی موجودگی یاد نہ رہی ہو۔

⑫ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ أُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَدَحٍ فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَمِيْنِهٖ غُلَامٌ أَصْغَرُ الْقَوْمِ وَالْأَشْيَاخُ عَنْ يَسَارِهٖ فَقَالَ يَا غُلَامُ أَتَأْذَنُ أَنْ أُعْطِيَهُ الْأَشْيَاخَ فَقَالَ مَا كُنْتُ لِأُوْثِرَ بِفَضْلٍ مِنْكَ أَحَدًا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَحَدِيْثُ أَبِيْ قَتَادَةَ سَنَذْكُرُ فِيْ بَابِ الْمُعْجِزَاتِ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت سہل ابن سعد ؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں (دودھ یا پانی) کا ایک پیالہ لایا گیا، جس میں سے آپ ﷺ نے پیا، اس وقت آپ ﷺ کے دائیں طرف ایک نوعمر تھا جو (حاضرین مجلس میں) سب سے چھوٹا تھا (یعنی حضرت ابن عباس ؓ) اور جو بڑے بوڑھے لوگ تھے وہ بائیں طرف تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اے لڑکے، کیا تم اجازت دیتے ہو کہ میں اس (باقی ماندہ دودھ یا پانی) کو ان بوڑھوں کو دے دوں؟" اس نوعمر نے کہا کہ "(نہیں) یا رسول اللہ! میں آپ ﷺ کے بچے ہوئے (دودھ یا پانی) کو دینے کے سلسلے میں اپنے پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔" چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس بچے ہوئے (دودھ یا پانی) کو اسی نوعمر کو دے دیا۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

اور حضرت ابو قتادہ ؓ کی روایت (جس کو صاحب مصابیح نے یہاں نقل کیا تھا) ہم انشاء اللہ باب المعجزات میں نقل کریں گے۔

تشریح: اس حدیث سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اگر مجلس میں ایک سے زائد لوگ موجود ہوں اور ان کو کوئی چیز دینی ہو تو دائیں طرف کا شخص اس بات کا اولی اور زیادہ حق دار ہے کہ دینے کی ابتداء اسی سے کی جائے ہاں اگر کسی مصلحت کا یہ تقاضا ہو کہ پہلے اس شخص کو دیا جائے جو بائیں طرف ہے تو دائیں طرف والے سے اس کی اجازت لینی چاہئے، اگر وہ اجازت دے دے تب بائیں طرف والے کو دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ اس موقعے پر تو آنحضرت ﷺ نے ابن عباس ؓ سے اجازت مانگی لیکن پچھلی حدیث میں جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے اس موقع پر آپ ﷺ نے دیہاتی سے اجازت نہیں مانگی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ کے دائیں طرف جو بڑی عمر والے لوگ بیٹھے تھے ان کا تعلق قریش سے تھا اور ابن عباس ؓ آپ ﷺ کے قرابتدار تھے، لہٰذا آپ ﷺ نے سوچا کہ اگر ابن عباس ؓ سے اجازت لے کر ان لوگوں کو دے دیا جائے تو ابن عباس ؓ کو کوئی ناگواری بھی نہ ہوگی اور ان بڑی عمر والے لوگوں کی تالیف قلوب بھی ہو جائے گی، جب کہ اس موقعہ پر آنحضرت ﷺ کے بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق ؓ تھے جن کا آنحضرت ﷺ سے پختہ تعلق تھا، اور محبت و اخلاص راسخ تھا ان کی تالیف قلب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، دوسری طرف اس دیہاتی کے بارے میں بھی یہ خیال تھا کہ اگر اس سے اجازت لے کر ابوبکر ؓ کو دیا گیا، تو شاید وہ اس بات کو اپنی حق تلفی سمجھتے ہوئے کسی وحشت و بیگانگی کا شکار ہو جائے، کیونکہ وہ نیا نیا حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا گویا آپ ﷺ نے اس کی تالیف قلب اسی میں دیکھی کہ اس سے اجازت نہ لی جائے۔

فقہاء اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ طاعات (یعنی دینی امور اور عبادات) میں ایثار جائز نہیں ہے۔ یہ تو فقہاء کا قول ہے، لیکن اس مسئلہ کا زیادہ واضح پہلو یہ ہے کہ اگر ایثار، واجبات میں ہو تو حرام ہے، اور اگر فضائل و مستحبات میں ہو تو مکروہ ہے، اس کو اور واضح طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً ایک شخص کے پاس صرف اتنا پانی ہے جس سے وہ خود وضو کر سکے لیکن اس نے وہ پانی کسی دوسرے شخص کو دے دیا، اور خود تیمم کر کے نماز پڑھی یا اس کے پاس محض اتنا کپڑا تھا جو اس کی ستر پوشی کے بقدر تھا لیکن اس نے وہ کپڑا کسی دوسرے شخص کو دے دیا اور خود ننگے بدن نماز پڑھی، اسی طرح کا ایثار جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے، یہ تو واجبات میں ایثار کی صورت تھی، فضائل و مستحبات میں ایثار کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص باجماعت نماز پڑھنے کے لئے پہلی صف میں امام کے قریب بیٹھا تھا، لیکن اس نے وہ جگہ کسی دوسرے شخص کو دے دی اور خود پچھلی صف میں آکر نماز پڑھی اس طرح ایثار اچھا نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے، طاعات کے برعکس دنیاوی امور میں ایثار ایک محمود و مستحسن عمل ہے، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بعض صوفیاء کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے بعض مواقع پر طاعات میں ایثار کی صورتیں اختیار کیں تو غالباً انہوں نے ایسا غلبۂ حال کے سبب کیا ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

چلتے پھرتے کھانا اور کھڑے ہو کر پینا اصل کے اعتبار سے جائز ہے

⑬ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ کُنَّا نَاکُلُ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَمْشِیْ وَنَشْرَبُ وَنَحْنُ قِیَامٌ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں (ایسا بھی ہوتا تھا کہ) ہم چلتے پھرتے کھاتے تھے اور کھڑے ہونے کی حالت میں (پانی وغیرہ) پی لیا کرتے تھے (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) اور ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔"

تشریح: علماء نے کہا ہے چلتے پھرتے کھانا اور کھڑے ہو کر پینا اصل میں تو جائز ہے، لیکن زیادہ بہتر اور پسندیدہ بات یہ ہے کہ چلتے پھرتے ہوئے کھانے سے اجتناب کیا جائے، کیوں کہ یہ خلاف ادب ہے یہی بات کھڑے ہو کر پانی پینے کی بھی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَشْرَبُ قَائِمًا وَقَاعِدًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "میں نے رسول کریم ﷺ کو کھڑے ہو کر بھی پیتے دیکھا ہے اور بیٹھے ہوئے بھی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پیتے ہوئے تو ایک بار یا دو بار دیکھا ہے اور وہ بھی یا تو بیان جواز کی خاطر تھا، یا کسی ضرورت و عذر کی بنا پر تھا، اس ایک یا دو بار کے علاوہ اور تمام مواقع پر بیٹھ کر ہی پیتے دیکھا ہے۔

پیتے وقت برتن میں سانس نہ لو

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّتَنَفَّسَ فِی الْاِنَاءِ اَوْ یُنْفَخَ فِیْہِ (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ (پانی وغیرہ پیتے وقت) برتن میں یا پیالہ وغیرہ میں سانس لیا جائے، یا پھونک ماری جائے۔" (ابوداؤدؒ وابن ماجہؒ)

تشریح: پیتے وقت برتن میں سانس لینے یا پھونک مارنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے تاکہ پئے جانے والے پانی وغیرہ میں تھوک نہ گر

جائے اور دوسرے شخص کو اس سے کراہت محسوس نہ ہو، نیز بسا اوقات منہ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور اس صورت میں اگر برتن میں سانس لیا جائے گا یا پھونگ ماری جائے گی تو ہو سکتا ہے کہ اس پی جانے والی چیز میں بھی بدبو پہنچ جائے، علاوہ ازیں پانی میں سانس لینا اصل میں چوپایوں کا طریقہ ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ اگر اس پی جانے والی چیز کو ٹھنڈا کرنے کیلئے بھی پھونک مارنے کی ضرورت ہو تو اس صورت میں بھی پھوک نہ ماری جائے بلکہ اس وقت تک پینے میں صبر کیا جائے جب تک کہ وہ ٹھنڈی نہ ہو جائے نیز اگر پانی میں کوئی تنکا وغیرہ پڑ جائے، تو اس کو کسی تنکے وغیرہ سے نکالا جائے، انگلی سے یا پھونک مار کر نہ نکالا جائے کیونکہ اس سے طبیعت نفرت و کراہت محسوس کرتی ہے۔

ایک سانس میں پانی مت پیو

(۱۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَشْرَبُوْا وَاحِدًا كَشُرْبِ الْبَعِيْرِ وَلٰكِنِ اشْرَبُوْا مَثْنٰى وَثُلَاثَ وَسَمُّوْا اِذَا اَنْتُمْ شَرِبْتُمْ وَاحْمَدُوْا اِذَا اَنْتُمْ رَفَعْتُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ تم ایک سانس میں پانی مت پیو جس طرح اونٹ پیتا ہے بلکہ دو سانس میں پیو، اور جب تم پانی پینے لگو تو بسم اللہ کہو اور جب (پینے کے بعد) برتن کو اپنے منہ سے ہٹاؤ تو حمد کرو، (یعنی ہر بار میں یا آخری بار میں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: ادنی درجہ یہ ہے کہ پانی دو سانس میں پیا جائے تاکہ اونٹ کی مشابہت لازم نہ آئے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تین سانس میں پینا بہتر اور زیادہ پسندیدہ ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اور اکثر اوقات میں آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا۔

"تو حمد کرو" کے سلسلہ میں احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ پہلے سانس کے بعد الحمد للہ کہے، دوسری سانس کے بعد رب العلمین کا اضافہ کرے، اور تیسرے سانس کے بعد الرحمٰن الرحیم۔ نیز پانی پینے کے بعد پڑھی جانے والی یہ دعا بھی منقول ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَهُ عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهٖ وَلَمْ يَجْعَلْهُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا۔

تنکا وغیرہ نکالنے کے لئے بھی پانی میں پھونک نہ مارو

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ النَّفْخِ فِي الشَّرَابِ فَقَالَ رَجُلُ الْقَذَاةَ اَرَاهَا فِي الْاِنَاءِ قَالَ اَهْرِقْهَا قَالَ فَاِنِّيْ لَا اَرْوٰى مِنْ نَفَسٍ وَاحِدٍ قَالَ فَاَبِنِ الْقَدَحَ فِيْكَ ثُمَّ تَنَفَّسْ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پانی میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ایک شخص نے (یہ ممانعت سن کر) عرض کیا کہ اگر میں پانی میں تنکے و نکے پڑے ہوئے دیکھوں (تو کیا کروں؟ کیونکہ اگر پھونک نہیں ماروں گا تو وہ تنکے کیسے نکلیں گے) آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس کو پھینک دو، یعنی اوپر سے تھوڑا سا پانی پھینک دو تاکہ وہ تنکے وغیرہ نکل جائیں (اور چونکہ وہ شخص پھونک مارنے کی ممانعت سے یہ بھی سمجھا ہوگا کہ اس سے یہ بات بھی ضروری ہوئی کہ پانی پیتے وقت درمیان میں سانس نہ لیا جائے بلکہ ایک ہی سانس میں پانی پیا جائے اس لئے) اس نے عرض کیا کہ "میں ایک دم یعنی ایک سانس میں پینے سے سیراب نہیں ہوتا؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "(اس طرح پانی پیو کہ پہلے تھوڑا سا پی کر) پیالہ کو منہ سے ہٹاؤ اور (برتن سے باہر) سانس لو (اور پھر ایسے ہی دوسرے اور تیسرے سانس میں باقی پانی پی لو۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

پینے کا برتن اگر کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہو تو وہاں منہ لگا کر نہ پیو

(۱۸) وَعَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشُّرْبِ مِنْ ثُلْمَةِ الْقَدَحِ وَاَنْ يَنْفُخَ فِي الشَّرَابِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے پیالہ کے سوراخ سے پانی پینے سے منع فرمایا، نیز آپ ﷺ نے پانی میں پھونک مارنے سے بھی منع فرمایا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "سوراخ" سے مراد برتن کی ٹوٹی ہوئی جگہ ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر پینے کا برتن کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہو تو اس جگہ سے منہ لگا کر پانی نہ پیو، کیوں کہ اس جگہ ہونٹوں کی گرفت اچھی طرح نہیں ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں سے پانی نکل کر بدن اور کپڑوں پر گرے گا، دوسرے یہ کہ برتن کی دھلائی کے وقت اس کی ٹوٹی ہوئی جگہ اچھی طرح صاف نہیں ہو پاتی وہاں مٹی وغیرہ لگی رہ جاتی ہے اس صورت میں پاکیزگی و صفائی کا تقاضا بھی یہی ہے اس جگہ منہ نہ لگایا جائے۔

حدیث کے مفہوم اور مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ "سوراخ" سے ٹوٹا ہوا برتن مراد نہیں ہے بلکہ اس کی ٹوٹی ہوئی جگہ مراد ہے یعنی اس ممانعت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ٹوٹے ہوئے برتن میں پانی نہ پیا جائے بلکہ یہ مراد ہے کہ برتن کی ٹوٹی ہوئی جگہ پر منہ لگا کر پانی نہ پیا جائے۔

کبھی کبھار مشک وغیرہ کے منہ سے پانی پینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

(۱۹) وَعَنْ كَبْشَةَ قَالَ دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَشَرِبَ مِنْ فِيْ قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ قَائِمًا فَقُمْتُ اِلٰى فِيْهَا فَقَطَعْتُهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت کبشہؓ (صحابیہ) کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ میرے یہاں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے لٹکی ہوئی مشک کے منہ سے پانی پیا، چنانچہ میں مشک کے منہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی اور اس کو کاٹ لیا۔ (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مشک کے منہ کے جتنے حصے پر آپ ﷺ کا دہن مبارک لگا تھا میں نے اتنے حصے کا چمڑہ کاٹ کر رکھ لیا اور یہ میں نے تبرک یعنی حصول برکت کی غرض سے کیا یا اس احساس ادب کی بنا پر کیا تاکہ اس حصے پر کسی اور کا منہ نہ لگے جیسا کہ اسی طرح کے ایک واقعہ کے سلسلے میں حضرت امّ سلمہؓ نے جو روایت بیان کی ہے اس میں انہوں نے صراحت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ میں نے مشک کا منہ کاٹ دیا تاکہ آنحضرت ﷺ کے پینے کے بعد کوئی دوسرا شخص اس جگہ منہ لگا کر نہ پیئے۔

آنحضرت ﷺ کو میٹھا اور ٹھنڈا مشروب بہت پسند تھا

(۲۰) وَعَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ اَحَبُّ الشَّرَابِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحُلْوَ الْبَارِدُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ وَالصَّحِيْحُ مَارُوِيَ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت زہریؒ، حضرت عروہؒ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے یعنی حضرت عائشہؓ نے کہا کہ رسول کریم ﷺ کے نزدیک پینے کی چیزوں میں ٹھنڈی میٹھی چیز بہت زیادہ پسندیدہ تھی۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ روایت صحیح ہے جو بحوالہ زہریؒ آنحضرت ﷺ سے بطریق ارسال نقل کی گئی ہے۔"

تشریح: "میٹھی چیز" سے عموم مراد ہے کہ آپ ﷺ کو ہر میٹھا مشروب بہت زیادہ پسند تھا، خواہ وہ میٹھا پانی ہوتا تھا یا میٹھا دودھ، اور خواہ شہد وغیرہ کا شربت! اس وضاحت سے اس حدیث اور ان دونوں حدیثوں کے درمیان مطابقت و یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے، جن میں سے ایک میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو پینے کی چیزوں میں دودھ سب سے زیادہ پسند تھا اور دوسری روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو پینے کی چیزوں میں شہد سب سے زیادہ پسند تھا۔

"وہ روایت صحیح ہے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ زہریؒ نے اس روایت کو دو طریق سے نقل کیا ہے ایک تو مسند یعنی سند کے ساتھ جس طرح اوپر نقل کی گئی ہے کہ عن الزهری عن عروة عن عائشة..... الخ اور دوسرے مرسل یعنی بغیر سند کے ذکر کیا ہے اس طرح کہ اس میں انہوں نے عائشہؓ کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ عبارت کے ظاہری مفہوم سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ عروہ کا ذکر بھی نہیں کیا ہے، کیونکہ زہریؒ خود بھی تابعی ہیں اگرچہ صغیر تابعی ہیں۔ لہٰذا ترمذیؒ کہتے ہیں، کہ زہریؒ کی روایت جو بطریق ارسال ہم تک پہنچی ہے اس کے سلسلہ سند میں جن راویوں کا ذکر ہے وہ حدیث کی اصطلاح میں قوی تر اور ضابطہ تر ہیں، بخلاف اس روایت کے سلسلہ سند کے کہ جو متصل ہے اس کے بعض راوی ضعیف ہیں۔

کھانے پینے میں دودھ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَاَطْعِمْنَا خَيْرًا مِنْهُ وَاِذَا سُقِيَ لَبَنًا فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ فَاِنَّهُ لَيْسَ شَيْءٌ يُجْزِئُ مِنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ اِلَّا اللَّبَنُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو یوں کہے یعنی یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَاَطْعِمْنَا خَيْرًا مِنْهُ (اے اللہ ہمیں، ہمارے اس کھانے میں برکت عطا فرما اور ہم کو اس سے بھی اچھا کھانے کو دے) اور جب تم میں سے کسی شخص کو دودھ پینے کو ملے تو وہ یوں کہے، یعنی یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ (اے اللہ ہمیں ہمارے اس دودھ میں برکت عطا فرما، اور ہم کو اس سے زیادہ پینے کو دے اور (دودھ پینے کی اس دعا "اس سے بھی اچھا پینے کو دے" کے الفاظ نہ کہے، کیوں کہ دودھ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے، جو خدا سے مانگی جا سکے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ) ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو کھانے اور پینے کا بدل بن سکے علاوہ دودھ کے (کہ وہ شکم سیر کرنے کی بھی خاصیت رکھتا ہے، اور سیراب کرنے کی بھی)۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

آنحضرت ﷺ کے لئے میٹھے پانی کا خاص اہتمام

(۲۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْتَعْذَبُ لَهُ الْمَآءُ مِنَ السُّقْيَا قِيْلَ هِيَ عَيْنٌ بَيْنَهَا وَبَيْنَ الْمَدِيْنَةِ يَوْمَانِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی ﷺ کے لئے میٹھا پانی سقیا سے لایا جاتا تھا، بعض حضرات نے بیان کیا کہ سقیا ایک چشمہ کا نام ہے، جو مدینہ سے دو منزل کے فاصلہ پر واقع تھا۔" (ابوداؤدؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سونے چاندی کے برتن میں نہ پیو

(۲۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ شَرِبَ فِيْ اِنَاءِ ذَهَبٍ اَوْ فِضَّةٍ اَوْ اِنَاءٍ فِيْهِ شَيْءٌ مِنْ ذٰلِكَ فَاِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِيْ بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ۔ (رواہ الدارقطنی)

"حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص سونے یا چاندی کے برتن میں پئے گا یا کسی ایسے برتن میں پئے گا (جو اگرچہ کلیۃً سونے چاندی کا نہ ہو مگر) اس میں سونے یا چاندی کا کچھ حصہ ہو تو اس کا یہ پینا اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرے گا کہ اس کے پیٹ میں دوزخ کی آگ کو غٹ غٹ اتارے گا۔" (دارقطنیؒ)

تشریح: "اس میں سونے یا چاندی کا کچھ حصہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں سونے یا چاندی کی کیلیں وغیرہ لگی ہوئی ہوں۔ اور طیبیؒ نے نوویؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر وہ کیلیں وغیرہ چھوٹی چھوٹی ہوں اور اتنی ہی مقدار و تعداد میں استعمال کی گئی ہوں جو ضرورت و حاجت کے بقدر ہوں تو وہ حرام و مکروہ کے حکم میں داخل نہیں ہوں گی، لیکن اگر زیادہ مقدار و تعداد میں بھی ہوں اور بڑی بڑی یا چوڑی ہوں تو پھر وہ حرام کے حکم میں ہوں گی۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اس سلسلے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ جس برتن میں سونے یا چاندی کی کیلیں وغیرہ لگی ہوئی ہوں اس میں پانی وغیرہ پینا جائز ہے بشرطیکہ جس جگہ منہ لگا کر پیا جائے وہاں سونا یا چاندی نہ ہو۔

بَابُ النَّقِيعِ وَالْأَنْبِذَةِ

نقیع اور نبیذوں کا بیان

آنحضرت ﷺ جو چیزیں پیا کرتے تھے ان میں ایک نقیع اور نبیذ بھی ہے۔ یہ دونوں چیزیں شربت کی قسم سے ہوتی ہیں ان میں سے نقیع کو بنانے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انگور یا کھجوروں کو پانی میں محض بھگو دیا جاتا ہے اس کو جوش نہیں دیا جاتا، اس طرح انگور یا کھجوروں کی مٹھاس اس پانی میں آجاتی ہے اور ایک عمدہ قسم کا شربت بن جاتا ہے اور یہ شربت بہت مزیدار بھی ہوتا ہے اور بدن کو فائدہ بھی پہنچاتا ہے، چنانچہ خرما کا نقیع معدہ کے نظام کو درست کرتا ہے اور کھانے کو جلد ہضم کرتا ہے جب کہ انگور کا نقیع جسم کی زائد حرارت کو دفع کرنے کی خاصیت رکھتا ہے۔

نبیذ بھی اسی طرح بنتا ہے فرق محض یہ ہوتا ہے کہ نبیذ کی صورت میں انگور یا کھجوروں کو پانی میں بھگو کر کچھ عرصہ تک کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اس میں کچھ ہلکی سی تیزی اور تغیر پیدا ہو جائے، لیکن اتنی تیزی یا اتنا زیادہ تغیر نہیں جو نشہ آور ہو جانے کی حد تک پہنچ جائے، کیونکہ جس نبیذ میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے اس کا پینا قطعاً حرام ہے اسی لئے رسول کریم ﷺ اس نبیذ کو ہرگز نہیں پیتے تھے جس پر تین دن سے زاید کا عرصہ گزر جاتا تھا، جیسا کہ آگے آئے گا، نقیع کی طرح نبیذ بھی ایک فائدہ مند مشروب ہے یہ جسم کی طاقت و قوت میں اضافہ کرتا ہے اور عام صحت کی محافظت کرتا ہے۔

واضح رہے کہ نبیذ انگور اور کھجور کے علاوہ دوسری چیزوں سے بھی بنتی ہے، چنانچہ نہایہ میں لکھا ہے کہ نبیذ کھجور سے بھی بنتی ہے اور انگور سے بھی، شہد سے بھی بنتی ہے اور گیہوں اور جو وغیرہ سے بھی، مصنف مشکوۃ نے اوپر عنوان میں انبذہ جمع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا ہے تاکہ اس کی متعدد اقسام و انواع کی طرف اشارہ ہو جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضرت انسؓ کا پیالہ

(۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَقَدْ سَقَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَدَحِيْ هٰذَا الشَّرَابَ كُلَّهُ الْعَسَلَ وَالنَّبِيْذَ وَالْمَآءَ وَاللَّبَنَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا۔ "میں نے رسول کریم ﷺ کو اپنے اس پیالہ میں پینے کی ساری چیزیں پلائی ہیں، جیسے شہد، نبیذ، پانی اور دودھ۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ جس پیالہ میں پینے کی چیزیں پیا کرتے تھے وہ حضرت انسؓ کے پاس تھا، منقول ہے کہ نصر ابن انسؓ نے اس پیالہ کو حضرت انسؓ کی میراث میں سے آٹھ لاکھ درہم کے عوض خریدا تھا، حضرت امام بخاریؒ نے اس پیالہ کو بصرہ میں دیکھا تھا اور ان

کی خوش بختی کے کیا کہنے کہ ان کو اس مبارک پیالے میں پانی پینے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

آنحضرت ﷺ کے لئے نبیذ بنانے کا ذکر

② وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنَّا نَنْبِذُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سِقَاءٍ يُوْكَأُ اَعْلَاهُ وَلَهٗ عَزْلَاهُ نَنْبِذُهٗ غُدْوَةً فَيَشْرَبُهٗ عِشَاءً وَنَنْبِذُهٗ عِشَاءً فَيَشْرَبُهٗ غُدْوَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے لئے ایک مشک میں نبیذ بنایا کرتے تھے جس کو اوپر سے (باندھ کر) بند کر دیا جاتا تھا اور اس کے نیچے کے حصے میں بھی اس کا دہانہ تھا ہم اس مشک میں کھجور وغیرہ صبح کے وقت ڈال دیتے تھے تو آپ ﷺ رات کے وقت اس کو پیتے اور اگر اس میں کھجور وغیرہ رات میں ڈالتے تھے تو آپ ﷺ اس کو صبح کے وقت پیتے تھے۔" (مسلم)

تشریح: "عزلاء" اصل میں توشہ دان کے دہانہ کو کہتے ہیں، لیکن یہاں مشک کا دہانہ مراد ہے جو اس کے نیچے کی طرف ہو، حاصل یہ کہ اس مشک کے اوپر کی جانب تو منہ تھا ہی، لیکن اس کے نیچے کے حصے میں بھی ایک دہانہ تھا اس کے اوپر کے منہ کو تو باندھ دیا جاتا تھا اور اس کے نیچے کے منہ سے نکال کر پیا جاتا تھا، نبیذ بنانے کے لئے کھجوروں کو ایک دن اور ایک رات سے زائد تک، حتی کہ تین دن و تین رات تک بھگوئے رکھنے کا ذکر ہے، ان کا تعلق جاڑے کے موسم سے ہوگا۔

③ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنْبَذُ لَهٗ اَوَّلَ اللَّيْلِ فَيَشْرَبُهٗ اِذَا اَصْبَحَ يَوْمَهٗ ذٰلِكَ اللَّيْلَةَ الَّتِيْ تَجِيْءُ وَالْغَدَوَ اللَّيْلَةَ الْاُخْرٰى وَالْغَدَ اِلَى الْعَصْرِ فَاِنْ بَقِيَ شَيْءٌ سَقَاهُ الْخَادِمَ اَوْ اَمَرَ بِهٖ فَصُبَّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے لئے جو نبیذ رات کے ابتدائی حصے میں ڈالی جاتی تھی اس کو آپ ﷺ آنے والے دن کی صبح کو پیتے، پھر آنے والی رات میں پیتے، پھر دوسرے دن اور دوسری رات میں پیتے، اور پھر اس کے بعد آنے والے (یعنی تیسرے) دن، عصر کے وقت تک پیتے اور اگر اس کے بعد بھی اس میں سے کچھ باقی رہ جاتی تو خادم کو پلا دیتے یا پھینک دینے کا حکم دے دیتے چنانچہ وہ پھینک دی جاتی تھی۔" (مسلم)

تشریح: سقاہ الخادم او امر بہ میں حرف او (یا) اظہار شک کے لئے نہیں ہے بلکہ تنویع کے لئے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسرے دن عصر کے وقت تک پینے کے بعد جو نبیذ بچ جاتی وہ چونکہ تلچھٹ رہ جاتی تھی اس لئے آپ ﷺ اس کو خود نہیں پیتے تھے بلکہ خادم کو پینے کے لئے دے دیتے تھے۔

اور اگر اس میں نشہ کا اثر آ جاتا تو پھر خادم کو بھی پینے کے لئے نہیں دیتے تھے بلکہ پھینکوا دیتے تھے۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ مالک و آقا کے لئے جائز ہے کہ وہ خود اوپر کا کھانا کھائے، اور نیچے کا کھانا غلام و خادم کو کھلائے۔

④ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ يُنْبَذُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سِقَاءٍ فَاِذَا لَمْ يَجِدُوْا سِقَاءً يُنْبَذُ لَهٗ فِيْ تَوْرٍ مِنْ حِجَارَةٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے مشک میں نبیذ بنائی جاتی تھی اور اگر کسی وقت مشک نہ ملتی تو پھر آپ ﷺ کے لئے پتھر کے برتن میں نبیذ بنائی جاتی تھی۔" (مسلم)

نبیذ کن برتنوں میں نہ بنائی جائے

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الدُّبَّاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالْمُزَفَّتِ وَالنَّقِيْرِ وَاَمَرَ اَنْ يُّنْبَذَ فِيْ

اَسْقِيَةِ الْاٰدَمِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کدو کے تو بنے، سبز لاکھی گھڑے، رال ملے ہوئے برتن اور لکڑی کے برتن میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا اور یہ حکم دیا، کہ چمڑے کے مشک میں نبیذ بنائی جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اسلام کے ابتدائی دور میں ان برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت فرمائی تھی اور اس ممانعت کی بنیاد یہ خوف تھا، کہ کہیں ان برتنوں میں بنائی جانے والی نبیذ میں جلد نشہ پیدا نہ ہو جائے اور اس کے بارے میں معلوم بھی نہ ہو سکے، لیکن جب نشہ کی حرمت نازل ہونے پر اچھی خاصی مدت گزر گئی اور لوگوں کے ذہن میں بھی یہ حرمت اچھی طرح راسخ اور مشہور ہوگئی تو پھر ہر طرح کے برتن میں نبیذ کا بنانا مباح کر دیا گیا جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے معلوم ہوگا اور اس مسئلہ کی مفصل تحقیق کتاب الایمان میں بھی گزر چکی ہے۔

اس حکم کی منسوخی جس کے ذریعہ بعض برتنوں میں نبیذ کا بنانا ممنوع قرار دیا گیا تھا

(۶) وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَهَيْتُكُمْ عَنِ الظُّرُوْفِ فَاِنَّ ظَرْفًا لَا يُحِلُّ شَيْئًا وَّلَا يُحَرِّمُهٗ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ نَهَيْتُكُمْ عَنِ الْاَشْرِبَةِ اِلَّا فِيْ ظُرُوْفِ الْاٰدَمِ فَاشْرَبُوْا فِيْ كُلِّ وِعَاءٍ غَيْرَ اَنْ لَا تَشْرَبُوْا مُسْكِرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے تمہیں (مذکورہ بالا) بعض برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا تھا اور تم نے یہ گمان کر لیا تھا کہ حلت و حرمت کا حکم برتنوں سے تعلق رکھتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو چیز حرام ہے اس کو کوئی حلال نہیں کر دیتا اور جو چیز حلال ہے اس کو کوئی برتن حرام نہیں کر دیتا۔ اصل حکم تو یہ ہے کہ جو چیز نشہ پیدا کرے وہ حرام ہے (خواہ وہ کسی بھی برتن میں پی جائے، جو چیز نشہ پیدا نہ کرے وہ حلال ہے خواہ وہ کسی بھی برتن میں ہو)۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "میں نے (مذکورہ بالا بعض برتنوں میں" تمہیں (نبیذ بنانے اور) پینے سے منع کیا تھا علاوہ چمڑے کے برتنوں کے (لیکن اب میں اس حکم کو منسوخ قرار دے کر ہر طرح کے برتن میں نبیذ بنانے اور پینے کو مباح قرار دیتا ہوں) لہٰذا تم ہر طرح کے برتن میں پی سکتے ہو، لیکن جو چیز نشہ پیدا کرنے والی ہو اس کو (ہرگز) مت پیو۔" (مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

ہر نشہ آور مشروب حرام ہے خواہ اس کو شراب کہا جائے یا کچھ اور

(۷) عَنْ اَبِيْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِيِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِنْ اُمَّتِي الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت ابومالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "(ایسا زمانہ آنے والا ہے جب) میری امت کے بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام شراب کے بجائے کچھ اور رکھیں گے" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے ذہن میں کجی اور فساد ہوگا، وہ شراب پینے کے سلسلے میں مختلف حیلے بہانے کریں گے، خاص طور پر نام کو بڑا پردہ بنائیں گے، مثلاً نبیذ یا مباح شربت جیسے ماء العسل وغیرہ کو نشہ آور بنا کر پئیں گے اور یہ گمان کریں گے کہ یہ حرام نہیں ہے کیونکہ نہ اس کو انگور کے ذریعہ بنایا گیا ہے اور نہ کھجور کے ذریعہ، حالاں کہ ان کا اس طرح گمان کرنا ان کے حق میں ان مشروبات

کے مباح وحلال ہونے کے لئے کارگر نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت میں وہ شراب پینے والے شمار ہوں گے، اور اس کی ان کو سزا ملے گی کیوں کہ اصل حکم یہ ہے کہ ہر نشہ آور شراب حرام ہے خواہ وہ کسی بھی چیز سے بنا ہو۔

ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ وہ شراب ہی پئیں گے، لیکن اپنی طرف سے اس کا کوئی دوسرا نام رکھ لیں گے اس کو شراب نہیں کہیں گے تاکہ لوگ شراب پینے کا الزام عائد نہ کریں، لیکن حقیقت میں نام کی یہ تبدیلی ان کے حق میں قطعا کارگر نہیں ہوگی اصل میں اعتبار تو مسمی کا ہے نہ کہ اسم کا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑧ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِی اَوْفٰی قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نَبِيْذِ الْجَرِّ الْاَخْضَرِ قُلْتُ اَنَشْرَبُ فِی الْاَبْيَضِ قَالَ لَا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عبداللہ بن اوفیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے سبز ٹھلیا میں بنی ہوئی نبیذ پینے سے منع فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ "کیا ہم سفید ٹھلیا میں بنی ہوئی نبیذ پی سکتے ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: "سبز ٹھلیا" سے مراد "حنتم" یعنی سبز لاکھی (روغنی) گھڑا ہے! چونکہ عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سبز کی قید سے یہ سمجھے کہ جو ٹھلیا سبز نہ ہو اس میں بنی ہوئی نبیذ کا پینا مباح ہوگا اس لئے انہوں نے پوچھا کہ کیا ہم سفید ٹھلیا کی پی سکتے ہیں؟ لیکن آنحضرت ﷺ نے سفید ٹھلیا کی نبیذ پینے سے بھی منع فرما کر گویا اس طرف اشارہ کیا، کہ "سبز" کی قید محض اتفاقی ہے اور اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں جن ٹھلیوں میں نبیذ بنائی جاتی تھی عام طور پر سبز ہی ہوتی تھی، اس لئے سبز ہی کا ذکر کر دیا، ورنہ سبز سفید کا حکم ایک ہی ہے، کہ جو بھی لاکھی یعنی روغنی ٹھلیا ہو خواہ وہ سبز رنگ کی ہو یا کسی اور رنگ کی ہو اس میں بنی ہوئی نبیذ پینے سے اجتناب کرو! لیکن واضح رہے کہ اس حدیث کا حکم بھی منسوخ ہے، جیسا کہ پیچھے ذکر کیا گیا۔

بَابُ تَغْطِيَةِ الْاَوَانِی وَغَيْرِهَا

برتنوں وغیرہ کو ڈھانکنے کا بیان

اس باب میں وہ احادیث مذکور ہوں گی جو رات کو سوتے وقت برتنوں کو ڈھانکنے، دروازوں کو بند کر دینے اور چراغ کو بجھا دینے جیسے امور کے سلسلے میں منقول ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

رات آنے پر کن چیزوں کا خیال رکھا جائے

① عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ جُنْحُ اللَّيْلِ اَوْ اَمْسَيْتُمْ فَكُفُّوْا صِبْيَانَكُمْ فَاِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْتَشِرُ حِيْنَئِذٍ فَاِذَا ذَهَبَ سَاعَةٌ مِنَ اللَّيْلِ فَخَلُّوْهُمْ وَاَغْلِقُوا الْاَبْوَابَ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فَاِنَّ الشَّيْطٰنَ لَا يَفْتَحُ بَابًا مُغْلَقًا وَاَوْكُوْا قِرَبَكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ وَخَمِّرُوْا اٰنِيَتَكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ وَلَوْ اَنْ تَعْرُضُوْا عَلَيْهِ شَيْئًا وَاَطْفِئُوْا مَصَابِيْحَكُمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِیِّ قَالَ خَمِّرُوا الْاٰنِيَةَ وَاَوْكُوا الْاَسْقِيَةَ وَاَجِيْفُوا الْاَبْوَابَ وَاكْفِتُوْا صِبْيَانَكُمْ عِنْدَ الْمَسَاءِ فَاِنَّ لِلْجِنِّ اِنْتِشَارًا وَخَطْفَةً وَاَطْفِئُوا الْمَصَابِيْحَ عِنْدَ الرُّقَادِ فَاِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ رُبَّمَا اجْتَرَّتِ

الْفَتِيْلَةَ فَاحْرَقَتْ اَهْلَ الْبَيْتِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ غَطُّوا الْاِ نَاءَ وَاَوْ كُوا السِّقَاءَ وَاَغْلِقُوا الْاَبْوَابَ وَاَطْفِؤُ السِّرَاجَ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَحِلُّ سِقَاءً وَلَا يَفْتَحُ بَابًا وَلَا يَكْشِفُ اِنَاءً فَاِنْ لَمْ يَجِدْ اَحَدُكُمْ اِلَّا اَنْ يُعْرِضَ عَلٰى اِنَائِهٖ عُوْدًا وَيَذْكُرُ واسْمَ اللّٰهِ فَلْيَفْعَلْ فَاِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ تُضْرِمُ عَلٰى اَهْلِ الْبَيْتِ بَيْتَهُمْ وَفِي رِوَايَةٍ لَهٗ قَالَ لَا تُرْسِلُوْا فَوَاشِيَكُمْ وَصِبْيَانَكُمْ اِذَا غَابَتِ الشَّمْسُ حَتّٰى تَذْهَبَ فَحْمَةُ الْعِشَاءِ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يُبْعَثُ اِذَا غَابَتِ الشَّمْسُ حَتّٰى تَذْهَبَ فَحْمَةُ الْعِشَاءِ وَفِي رِوَايَةٍ لَهٗ قَالَ غَطُّوا الْاِنَاءَ وَاَوْكُوا السِّقَاءَ فَاِنَّ فِي السَّنَةِ لَيْلَةً يَنْزِلُ فِيْهَا وَبَاءٌ لَا يَمُرُّ بِاِنَاءٍ لَيْسَ عَلَيْهِ غِطَاءٌ اَوْسِقَاءٍ لَيْسَ عَلَيْهِ وِكَاءٌ اِلَّا نَزَلَ فِيْهِ مِنْ ذٰلِكَ الْوَبَاءِ۔

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب رات کی تاریکی پھیل جائے، یا یہ فرمایا کہ جب شام ہو جائے تو تم اپنے بچوں کو (گھر سے نکلنے اور گلی کوچوں میں پھرنے سے) روک دو کیونکہ اس وقت شیطان یعنی جنات چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ پھر جب رات کی ایک گھڑی گزر جائے تو بچوں کو (کہیں آنے جانے کے لئے) چھوڑ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، نیز اللہ کا نام لے کر (یعنی بسم اللہ پڑھ کر) دروازوں کو بند کر دو، کیونکہ (بسم اللہ پڑھ کر) بند (کئے گئے) دروازوں کو شیطان نہیں کھولتا (باوجودیکہ شیاطین اور جنات کو اس پر قدرت حاصل ہے کہ وہ دروازوں اور دیواروں میں بیٹھ جائیں، لیکن اللہ کے ذکر کے سبب وہ بیٹھنے کی مجال نہیں رکھتے) اور اللہ کا نام لے کر (ان) مشکیزوں کے منہ باندھ دو (جن میں پانی موجود ہوتا کہ ان میں کیڑا و پتنگا وغیرہ نہ گھس جائے) اور اللہ کا نام لے کر اپنے برتنوں کو ڈھانک دو اور خواہ برتن پر عرضا ہی کوئی چیز رکھ دو (یعنی اگر برتن پر ڈھکنے کے لئے کوئی ایسی چیز موجود نہ ہو جس سے اس برتن کا پورا منہ چھپ سکے تو اس پر عرضا کوئی لکڑی وغیرہ رکھ دو اگرچہ اس صورت میں برتن پوری طرح نہیں ڈھکے گا لیکن اس طرح کم سے کم کراہت تو ختم ہو ہی جائے گی اور اس حکم کی برکت سے برتن میں موجود کھانے پینے کی چیز اس ضرر و نقصان سے بچ جائے گی جو برتن کے بالکل کھلے ہوئے ہونے کی صورت میں یقینی ہوتا جیسے شیطان کا تصرف) اور (سوتے وقت) اپنے چراغوں کو بجھا دو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مذکورہ بالا روایت تو یکساں الفاظ میں بخاری و مسلم میں منقول ہے ہی لیکن یہ مضمون مختلف الفاظ کے ساتھ بخاری و مسلم نے الگ الگ بھی نقل کیا ہے چنانچہ) بخاری کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "برتنوں کو ڈھانک دیا کرو، مشکیزوں کے منہ باندھ دیا کرو، دروازوں کو بند کر دیا کرو اور اپنے بچوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھو (ان کو ادھر ادھر نہ جانے دو) جب کہ شام ہو جائے کیونکہ (اس وقت) جنات چاروں طرف پھیل جاتے ہیں اور اچک لیتے ہیں، اور سوتے سوتے چراغوں کو بجھا دیا کرو کیوں کہ (اکثر یا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ) چوہا بتی کو کھینچ لے جاتا ہے اور گھر والوں کو جلا دیتا ہے۔"

اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا۔ "برتنوں کو ڈھانک دیا کرو" مشکیزوں کے منہ باندھ دیا کرو دروازوں کو بند کر دیا کرو، اور چراغوں کو بجھا دیا کرو، کیوں کہ (اللہ کا نام لینے کی وجہ سے) شیطان (بندھے ہوئے، مشکیزوں کو نہیں کھولتا، اور نہ (بند) دروازوں کو کھولتا ہے اور نہ ڈھانکے ہوئے) برتنوں کو کھولتا ہے۔ اگر تم میں سے کسی کو (ڈھانکنے کے لئے کوئی چیز) نہ ملے الا یہ کہ وہ اللہ کا نام لے کر برتن کے منہ پر عرضا کوئی لکڑی ہی رکھ سکتا ہو تو وہ ایسا ہی کر لے (یعنی بسم اللہ پڑھ کر برتن کے منہ پر کوئی لکڑی ہی رکھ دے) اور (سوتے وقت چراغ کو اس لئے بجھا دیا کرو) کہ (چوہا چراغ کی بتی کو کھینچ کر) گھر والوں پر ان کے گھر کو بھڑکا دیتا ہے (یعنی چوہا جلی ہوئی بتی کو لے جا کر کسی ایسی جگہ ڈال دیتا ہے، جہاں کسی چیز میں آگ لگ جاتی ہے اور پھر سارا گھر جل جاتا ہے۔

اور مسلم کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "برتن کو ڈھانک دیا کرو، اور مشکیزہ (کے منہ) کو باندھ دیا کرو، کیونکہ سال بھر میں ایک ایسی رات آتی ہے جس میں وبا نازل ہوتی ہے اور جو برتن کھولا ہوا ہوتا ہے یا جس مشکیزہ کا منہ بند نہیں ہوتا اس وبا کا کچھ حصہ اس میں بھی داخل ہو جاتا ہے۔"

تشریح: متفق علیہ روایت کے بعد بخاری کی جو روایت نقل کی گئی ہے اور اس میں عند المساء (جب کہ شام ہو جائے) کا جو لفظ مذکور ہوا

ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا تعلق ساری مذکورہ چیزوں سے ہو (یعنی جب رات شروع ہو جائے تو برتنوں کو ڈھانک دیا جائے، مشکیزوں کے منہ بھی باندھ دیئے جائیں، دروازے بھی بند کر دیئے جائیں اور بچوں کو باہر نکلنے سے روک دیا جائے، اس صورت میں "شام" سے مراد وہ وقت ہوگا جو ابتداء شام سے عشاء تک رہتا ہے کہ دروازوں کو بند رکھنے اور برتنوں کو ڈھانکنے کا یہی وقت ہے اور اگر یہ مراد لیا جائے کہ عند المساء کا تعلق صرف واکفتو اصبیانکم (اپنے بچوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھو) سے ہے جیسا کہ حدیث کا سیاق ابھی اسی پر دلالت کرتا ہے تو مراد انسب ہوگی اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ رات میں ان سب چیزوں کا اس طرح خیال رکھو کہ رات کے ابتدائی حصے میں یعنی سورج ڈوبنے کے فوراً بعد بچوں کو باہر نکلنے اور ادھر ادھر ہونے سے روک دو، کیونکہ یہ وقت جنات کے پھیلنے کا ہے اور جب رات کی ایک گھڑی (یعنی ایک گھنٹہ) گزر جائے تو یہ سب کام کرو، یعنی برتن کو ڈھانک دو اور دروازے بند کر دو نیز اس وقت بچوں کو باہر جانے دینے میں کوئی حرج نہیں اس توجیہ سے اس روایت کی متفق علیہ روایت کے ساتھ بھی مطابقت ہو جائے گی۔

"اور اچک لیتے ہیں" شیاطین کا بچوں کو اچک لینا ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق بعض واقعات سے بھی ہوئی ہے اگرچہ یہ قلیل الوقوع ہے، یا پھر اچک لینے سے مراد بچوں کے ہوش و حواس کو زائل کر دینا یا ان کو کھیل کود میں لگا دینا ہے۔

"جنات وشیاطین" اصل میں یہ دونوں ایک ہی ہیں" جنات میں سے جو سرکش و فاسق ہیں ان کو شیطان کہتے ہیں! فحمه شروع رات میں یعنی مغرب و عشاء کے درمیان جو تاریکی چھا جاتی ہے اس کو فحمه کہتے ہیں اور عشاء کی نماز سے صبح ہونے تک جو تاریکی رہتی ہے اس کو عَسْعَسَةُ کہتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم کی آیت وَاللَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ الخ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے

واضح رہے کہ اس حدیث میں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ بطریق وجوب نہیں ہیں، بلکہ ان کا مقصد محض ان امور کی ہدایت کرنا ہے جو ہماری روزمرہ زندگی میں بھلائی و مصلحت اندیشی کے متقاضی ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان احکام کا تعلق استحباب سے ہے یعنی حدیث میں مذکورہ ہدایت پر عمل کرنا مستحب ہے۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ (اگر بنظر عمیق اس حدیث کے مضمون پر غور کیا جائے اور ان ہدایات پر عمل کیا جائے تو واضح ہوگا کہ) اس ارشاد میں مختلف قسم کی بھلائیاں اور کتنے ہی جامع آداب اور تہذیب کے رموز پنہاں ہیں خاص طور سے ان میں سے جو سب سے بہتر تعلیم ہے وہ یہ ہے کہ ہر حرکت و سکون کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا یعنی بسم اللہ پڑھنا ایک ایسا سہل ذریعہ ہے جو دنیا و آخرت کی آفات و بلاؤں سے سلامتی و حفاظت کا ضامن قرار دیا جا سکتا ہے۔

جس برتن میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو اس کو ڈھانک کر لاؤ لے جاؤ

(۲) وَعَنْهُ قَالَ جَاءَ اَبُوْ حُمَيْدٍ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ مِنَ النَّقِيْعِ بِاِنَآءٍ مِنْ لَبَنٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَّا خَمَّرْتَهُ وَلَوْ اَنْ تَعْرِضَ عَلَيْهِ عُوْدًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ابوحمید جو ایک انصاری شخص تھے، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مقام نقیع سے دودھ سے بھرا ہوا ایک برتن لے کر آئے آنحضرت ﷺ نے (جب اس برتن کو کھلا ہوا دیکھا تو) فرمایا کہ "تم نے اس برتن کو ڈھانکا کیوں نہیں، اگرچہ ڈھانکنے کی یہ صورت کیوں نہ ہوتی کہ تم اس برتن پر عرضاً کوئی لکڑی رکھ دیتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

سوتے وقت آگ بجھا دو

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَتْرُكُوا النَّارَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ حِيْنَ تَنَامُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "جب تم سونے لگو تو گھروں میں آگ نہ چھوڑو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "آگ" سے مراد وہ آگ ہے جس سے کسی چیز کے جل جانے کا خوف ہو، خواہ وہ چراغ ہو یا چولھے وغیرہ کی آگ، لہٰذا روشنی کی جو چیزیں قندیل وغیرہ کی صورت میں لٹکی ہوئی ہوں اور ان سے آگ لگنے کا کوئی خطرہ نہ ہو تو اس کو چھوڑے رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لہٰذا ایسی چیزیں اس ممانعت کے حکم میں داخل نہیں ہوں گی، کیونکہ اس ممانعت کی جو اصل علت ہے (یعنی آگ لگنے کا خطرہ) جب وہی نہیں پائی جائے گی تو اس حکم پر عمل بھی ضروری نہیں ہوگا، بلکہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر آگ کو بھی گھر میں اس طرح رکھ چھوڑا جائے کہ اس سے کسی چیز کے جلنے کا خوف نہ ہو، جیسے جاڑے کے موسم میں شب بیداری کی غرض سے، یا کسی دوسری مصلحت و ضرورت کے تحت چولھے وغیرہ میں آگ دبا دیتے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا وضاحت پر قیاس کرتے ہوئے یہ بھی ممنوع نہیں ہوگا۔

④ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ احْتَرَقَ بَیْتٌ بِالْمَدِیْنَةِ عَلٰی اَھْلِہٖ مِنَ اللَّیْلِ فَحُدِّثَ بِشَاْنِہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ ھٰذِہِ النَّارَ اِنَّمَا ھِیَ عَدُوٌّ لَّکُمْ فَاِذَا نِمْتُمْ فَاَطْفِئُوْھَا عَنْکُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رات میں ایسا ہوا کہ مدینہ میں ایک شخص کا گھر جل گیا اور گھر والوں پر گر پڑا، چنانچہ اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔ "یہ آگ، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ یہ تمہارے حق میں ایک دشمن ہے (جو جان و مال کو جلا دیتی ہے) لہٰذا جب تم سونے لگو تو اس کو بجھا دو اور اس کے ضرر و نقصان سے اپنے کو محفوظ رکھو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

کتے اور گدھے کی آواز سنو تو خدا کی پناہ چاہو

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا سَمِعْتُمْ نُبَاحَ الْکِلَابِ وَنَھِیْقَ الْحَمِیْرِ مِنَ اللَّیْلِ فَتَعَوَّذُوْا بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ فَاِنَّھُنَّ یَرَیْنَ مَالَا تَرَوْنَ وَاَقِلُّوا الْخُرُوْجَ اِذَا اَھْدَاَتِ الْاَرْجُلُ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یَبُثُّ مِنْ خَلْقِہٖ فِیْ لَیْلَةٍ مَا یَشَاءُ وَاَجِیْفُوا الْاَبْوَابَ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَفْتَحُ بَابًا اِذَا اُجِیْفَ وَذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَغَطُّوا الْجِرَارَ وَاکْفِئُوا الْاٰنِیَةَ وَاَوْکُوا الْقِرَبَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم رات میں کتوں کے بھونکنے اور گدھوں کے رینگنے کی آواز سنو تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو کیونکہ وہ (کتے اور گدھے) جس چیز کو دیکھتے ہیں (یعنی شیطان اور اس کی ذریات کو) اس کو تم نہیں دیکھتے اور جب لوگوں کا چلنا پھرنا بند ہو جائے تو اس وقت تم بھی (گھر سے) کم نکلو، کیوں کہ (اس وقت) رات میں اللہ عزوجل اپنی مخلوقات میں سے جن کو چاہتا ہے (یعنی جنات و شیاطین اور موذی جانور وغیرہ) ان کو چاروں طرف پھیل جانے دیتا ہے، اور اپنے دروازوں کو اللہ کا نام لے کر یعنی بسم اللہ پڑھ کر بند کیا کرو، کیونکہ جس دروازے کو اللہ کا نام لے کر بند کیا جاتا ہے اس کو شیطان کھولنے پر قادر نہیں ہوتا، اور (ان) برتنوں کو ڈھانک دیا کرو (جن میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو) اور (جن) برتنوں (میں کچھ نہ ہو یعنی وہ خالی ہوں ان) کو الٹ دیا کرو، اور مشکیزوں کے منہ باندھ دیا کرو۔" (شرح السنۃ)

چوہے کی شرارت سے بچنے کے لئے سوتے وقت چراغ کو بجھا دو

⑥ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَآءَتْ فَارَةٌ تَجُرُّ الْفَتِیْلَةَ فَاَلْقَتْھَا بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْخُمْرَةِ الَّتِیْ کَانَ قَاعِدًا عَلَیْھَا فَاَحْرَقَتْ مِنْھَا مِثْلَ مَوْضِعِ الدِّرْھَمِ فَقَالَ اِذَا نِمْتُمْ فَاَطْفِئُوْا سُرُجَکُمْ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَدُلُّ مِثْلَ ھٰذِہٖ عَلٰی ھٰذِہٖ فَیُحْرِقُکُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن کا واقعہ ہے کہ) ایک چوہا چراغ کی (جلتی ہوئی بتی کھینچ لایا اور اس کو رسول کریم ﷺ کے سامنے اس چٹائی پر ڈال دیا جس پر آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ (اس طرح) اس نے ایک درہم کے بقدر چٹائی کو جلا دیا آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا کہ "جب تم سونے لگو، تو چراغ کو گل کر دو کیونکہ شیطان اس چوہے جیسے موذی کو ایسی حرکت پر آمادہ کرتا ہے اور (اس صورت میں گویا) وہ شیطان تمہیں جلا دیتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مصنف مشکوۃ نے اس باب میں تیسری فصل شامل نہیں کی ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ "یہ باب تیسری فصل سے خالی ہے۔" چنانچہ یہ نہ کہنے کی وجہ پیچھے (کتاب الاشربہ سے پہلے باب میں بیان کی جا چکی ہے۔

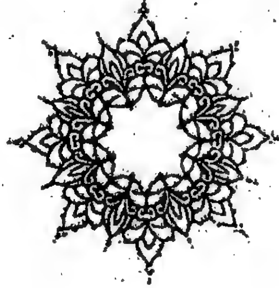

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب اللباس

لباس کا بیان

"لباس" اصل میں تو مصدر ہے، لیکن استعمال "ملبوس" کے معنی میں ہوتا ہے، جیسا کہ "کتاب" کا لفظ مصدر ہونے کے باوجود "مکتوب" کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، "لباس" کے ماضی اور مضارع کے صیغے باب علم یعلم سے آتے ہیں، ویسے اس کا مصدر لُبس (لام کے پیش کے ساتھ) بھی آتا ہے! اور لبس جو لام کے زبر کے ساتھ آتا ہے اس کے معنی التباس وخلط کے ہیں جس کا باب ضرب یضرب ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حبرہ آنحضرت ﷺ کا پسندیدہ کپڑا تھا

(۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ اَحَبُّ الثِّیَابِ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّلْبَسَھَا الْحِبَرَۃَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو سب کپڑوں میں پہننے کے لئے (نہ کہ کسی دوسری ضرورت جیسے بستر پر بچھانے یا کسی کو دینے وغیرہ کے لئے) حبرہ (چادر) سب سے زیادہ پسند تھی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حبرہ (با کے زبر کے ساتھ بروزن زِغَبَۃٌ) ایک خاص قسم کی یمنی چادر کو کہتے ہیں جو اس زمانہ میں بننے والی چادروں میں سب سے عمدہ ہوتی تھی اس چادر میں اکثر سرخ دھاریاں ہوتی تھیں، بعض ایسی بھی ہوتی تھیں جن میں سبز دھاریاں ہوتی تھیں اس کی بناوٹ میں خالص سوت ہوتا تھا۔ علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اس چادر کو اسی وجہ سے پسند فرماتے تھے، جب کہ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ اس پسندیدگی کا سبب اس کا سبز رنگ ہوتا تھا کیوں کہ سبز کپڑا اہل جنّت کے ملبوسات میں سے ہے، اور یہ بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ کو سبز رنگ بہت زیادہ پسند تھا جیسا کہ طبرانیؒ نے اوسط میں اور ابن سنی اور ابو نعیم نے محب میں یہ روایت نقل کی ہے کہ۔

اِنَّہٗ کَانَ اَحَبُّ الْاَلْوَانِ اِلَیْہِ الْخُضْرَۃُ۔

"آنحضرت ﷺ کو تمام رنگوں میں سبز رنگ سب سے زیادہ پسند تھا۔"

اور بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس چادر کو اس لئے پسند فرماتے تھے کہ اس کی دھاریاں سرخ ہوتی تھیں اور سرخ رنگ میل خورا ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی نقشی چادر

② وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ غَدَاةٍ وَعَلَيْهِ مِرْطٌ مُرَجَّلٌ مِنْ شَعْرٍ اَسْوَدَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (ایک دن) صبح کے وقت سیاہ بالوں کی نقشی چادر اوڑھے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ لفظ "مرجل" کے بجائے "مرحل" زیادہ صحیح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس چادر پر اونٹ کے پالان جیسے نقش و نگار تھے۔

آنحضرت ﷺ نے تنگ آستینوں کا جبہ پہنا ہے

③ وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَبِسَ جُبَّةً رُوْمِيَّةً ضَيِّقَةَ الْكُمَّيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک رومی جبہ پہنا جس کی آستین تنگ تھی۔" (بخاریؒ ، مسلمؒ)

تشریح: یہ ایک سفر کے دوران کا واقعہ ہے جب کہ آپ ﷺ نے تنگ آستینوں والا جبہ پہنا، چنانچہ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کی آستینیں اتنی تنگ تھیں کہ جب آپ ﷺ وضو فرمانے لگے تو وہ آستینیں اوپر نہ چڑھ سکیں۔ اس لئے آپ ﷺ کو اپنے ہاتھوں کو دھونے کے لئے ان آستینوں کے نیچے سے نکالنا پڑا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے کرتے وجبہ وغیرہ کی آستینیں تنگ بنوانا سفر کے دوران تو مستحب ہے، سفر کے علاوہ (حضر میں) مستحب نہیں ہے کیوں کہ صحابہ کرامؓ فراخ آستینیں بنوایا کرتے تھے جب کہ ابن حجرؒ نے یہ کہا ہے کہ اس بارے میں آئمہؒ کا قول یہ ہے کہ آستینوں کو فراخ رکھنا ایک قسم کی مذموم بدعت ہے، انہوں نے صحابہؓ کی آستینوں کے فراخ ہونے کے دوسرے معنی لکھے ہیں، جس کی تفصیل ان کی شرح میں دیکھی جا سکتی ہے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئمہ کا قول مفرط یعنی حد سے زیادہ فراخی پر محمول ہے اور صحابہؓ کی آستینوں کے فراخ ہونے کے بارے میں جو کچھ منقول ہے غیر مفرط (یعنی حد کے اندر) پر محمول ہے۔ اسی لئے منتقی میں، جو ائمہ کی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے، یہ لکھا ہے کہ آستینوں کو ایک بالشت کے بقدر فراخ رکھنا مستحب ہے۔

وہ کپڑے جن میں سرکار دو عالم ﷺ نے سفر آخرت اختیار فرمایا

④ وَعَنْ اَبِيْ بُرْدَةَ قَالَ اَخْرَجَتْ اِلَيْنَا عَائِشَةُ كِسَاءً مُلَبَّدًا وَاِزَارًا غَلِيْظًا فَقَالَتْ قُبِضَ رُوْحُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ هٰذَيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت عائشہؓ نے ہمیں دکھانے کے لئے ایک پیوند لگی چادر اور ایک موٹا تہبند نکالا اور فرمایا کہ جب رسول کریم ﷺ کی روح مبارک قبض کی گئی تو آپ ﷺ ... ان ہی دو کپڑوں میں تھے۔" (بخاریؒ ، مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اپنے حق میں یہ دعا کی تھی کہ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا یعنی یا اللہ مجھے مسکین (غریب) رکھ کر جلا اور مسکین رکھ کر موت دے۔ تو یہ اس کا اثر تھا کہ جب آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے جسم مبارک پر یہ دو انتہائی معمولی کپڑے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیا اور دنیا کے زرق برق سے بے رغبتی و بے اعتنائی ایک پاکیزہ زندگی کا بہترین سرمایہ ہوتا ہے، لہٰذا

اُمت کو لازم ہے کہ ہر خصلت و عادت میں آنحضرت ﷺ کی پیروی کو اختیار کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ کا بچھونا

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَ كَانَ فِرَاشُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِىْ يَنَامُ عَلَيْهِ اَدَمَ حَشْوُهُ لِيْفٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا بچھونا جس پر آپ ﷺ سوتے تھے چمڑے کا تھا اور اس میں (روئی کی جگہ) کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: شمائل ترمذی میں حضرت حفصہؓ سے جو روایت منقول ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کا بچھونا ٹاٹ کا تھا، لہٰذا ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد و تناقض نہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کے پاس کسی زمانے میں چمڑے کا بچھونا رہا ہوگا، اور کسی زمانے میں ٹاٹ کا یا یہ کہ سونے کا بچھونا تو چمڑے کا ہوگا اور بیٹھنے کا بچھونا ٹاٹ کا ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کا تکیہ

⑥ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ وِسَادُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِىْ يَتَّكِئُ عَلَيْهِ مِنْ اَدَمٍ حَشْوُهُ لِيْفٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا تکیہ، کہ جس پر آپ ﷺ تکیہ فرماتے تھے چمڑے کا تھا اور اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔" (مسلمؒ)

تشریح: "تکیہ کرتے تھے" یعنی اس پر ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے یا سوتے وقت اس کو سر کے نیچے رکھتے تھے۔ ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ سونے کے لئے اور آرام کی خاطر، بچھونا اور تکیہ بنانا مستحب ہے، بشرطیکہ عیش و عشرت اور آسودگیٔ نفس میں انہماک اور اسراف کے طور پر نہ ہو۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ تکیہ کو پسند کرتے تھے اور سوتے وقت اس کو سر کے نیچے رکھتے تھے اور اس پر ٹیک لگا کر بیٹھتے بھی تھے، نیز آپ ﷺ فرماتے کہ اگر کوئی شخص تکیہ اور خوشبو دے تو اس کو قبول کرنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔

یہ اور ان جیسی دوسری روایتوں سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ دنیا کی زندگی میں زہد و استغناء اختیار کئے ہوئے تھے اور دنیا کی متاع اور لذتوں سے اعراض کرتے تھے اس لئے آپ ﷺ کا لباس بھی موٹے جھوٹے اور پھٹے پرانے کپڑوں پر مشتمل ہوتا تھا، منقول ہے آپ ﷺ کو جیسا بھی لباس میسر آجاتا اس کو پہن لیتے اس میں کسی تکلف و اہتمام کے روادار نہیں ہوتے تھے، البتہ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی نفیس و عمدہ کپڑا آگیا، تو بیان جواز کے لئے اس کو بھی زیب تن فرمالیا لیکن پھر فوراً ہی وہ کپڑا کسی دوسرے شخص کو عنایت فرمادیا، لہٰذا عمدہ و نفیس ہی کپڑا پہننے کی قید اپنے اوپر عائد کر لینا، یا عمدہ و نفیس کپڑا پہننے کی عادت اختیار کر لینا اور اس سلسلے میں بیجا تکلف و اہتمام کرنا سنت کے خلاف ہے اگرچہ اصل کے اعتبار سے مباح ہے، لیکن یہ بھی واضح رہے کہ اگر کوئی اچھے کپڑے پہننے کی استطاعت و حیثیت کے باوجود محض بخل اور خست کی بنا پر موٹے جھوٹے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے، یا لوگوں پر اپنے زہد و تقویٰ کا سکہ جمانے کے لئے اور یا حرص و طمع کے تحت لوگوں سے مانگنے کے لئے ریاکاری کے طور پر معمولی قسم کے خستہ و بوسیدہ کپڑے پہنے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، بلکہ بعض ارباب خیر و مشیخت کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے اپنی پرہیزگاری اور اپنے بلند مقام روحانیت کو چشم اغیار سے چھپانے کے لئے، یا تحدیث نعمت کے طور پر اپنی خوش حالی کو ظاہر کرنے کے لئے عمدہ اور نفیس کپڑے پہنے۔ حاصل یہ کہ اگر خدا نے کسی کو خوشحالی کی نعمت عطا کی ہے، اور وہ مالی طور پر اچھی حیثیت و استطاعت رکھتا ہے تو اس کو اعلیٰ و نفیس کپڑے پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ اسراف و تکبر کی حد کو نہ پہنچے کیونکہ میانہ روی ہر جگہ اور ہر عمل میں محمود و مطلوب ہے۔

جب آنحضرت ﷺ ہجرت کا حکم سنانے کے لئے ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے

⓻ وَعَنْهَا قَالَتْ بَيْنَ نَحْنُ جُلُوْسٌ فِيْ بَيْتِنَا فِيْ حَرِّ الظَّهِيْرَةِ قَالَ قَائِلٌ لِاَبِيْ بَكْرٍ هٰذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُقْبِلاً مُتَقَنِّعًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ہجرت) سے قبل ایک دن) جب کہ ہم دوپہر کی گرمی میں اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کسی کہنے والے نے (حضرت ابوبکرؓ سے) کہا کہ (دیکھو) وہ رسول کریم ﷺ چادر کے کونے سے اپنا سر مبارک چھپائے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا اپنے سر مبارک کو چادر کے کونے سے ڈھانکنا یا تو دھوپ کی تمازت و تپش سے بچنے کے لئے تھا، یا آپ ﷺ نے اپنا سر اس لئے ڈھانک رکھا تھا کہ چہرہ چھپا رہے اور لوگ (دشمنان دین) پہچان نہ سکیں۔

یہ حدیث اصل میں اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس میں ہجرت نبوی ﷺ کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے کہ (مکہ میں) بیعت العقبہ کے بعد آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کے حکم کے منتظر تھے ادھر حضرت ابوبکر صدیقؓ اس بات کے درخواست گزار تھے کہ اس سفر میں ان کو رفاقت کا شرف حاصل ہو، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان سے فرماتے تھے کہ اگر ہجرت کا حکم نازل ہوا تو ایسا ہی ہوگا (کہ اس سفر میں تم ہی رفیق بنو گے) چنانچہ ایک دن اچانک ہجرت کا حکم نازل ہوا تو آپ ﷺ دوپہر میں حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے اور ان کو بتایا کہ ہجرت کا حکم نازل ہو گیا ہے اور یہ ہدایت ملی ہے کہ میں ہجرت کے لئے مکہ سے نکل جاؤں اور تم میرے رفیق بنو، پھر آنحضرت ﷺ رات میں حضرت ابوبکرؓ کو لے کر ان کے مکان کی اس کھڑکی سے نکلے جو مکہ کے نشیبی علاقہ میں واقع ثور پہاڑ کی سمت میں تھی اور غار ثور میں جا کر چھپ گئے.....الخ

گھر میں تین سے زائد بچھونے نہ رکھو

⓼ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ فِرَاشٌ لِلرَّجُلِ وَفِرَاشٌ لِاِمْرَأَتِهٖ وَالثَّالِثُ لِلضَّيْفِ وَالرَّابِعُ لِلشَّيْطَانِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا "ایک بچھونا مرد کے لئے، دوسرا بچھونا اس کی بیوی کے لئے، تیسرا بچھونا مہمان کے لئے اور چوتھا بچھونا شیطان کے لئے ہوتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی گھر میں محض میاں بیوی ہوں اور وہ استطاعت رکھتے ہوں تو ان کو اپنے یہاں تین بستر رکھنے چاہئیں، ایک تو میاں کے لئے، دوسرا بیوی کے لئے کہ شاید کسی وقت بیماری وغیرہ کی وجہ سے وہ تنہا سونا چاہے ورنہ میاں بیوی کو ایک بستر پر سونا اولی ہے اور سُنّت کے مطابق ہے کیوں کہ آنحضرت ﷺ، ازواج مطہراتؓ کے ساتھ سویا کرتے تھے، اور تیسرا بستر اس مقصد کے لئے ہو کہ اگر کوئی مہمان آجائے تو وہ رات میں اس پر سوئے، بس یہ تین بستر کافی ہیں ان سے زیادہ جو بھی بستر ہوگا وہ اسراف کی حد میں آئے گا، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا، کہ اگر چوتھا بستر ہوگا تو وہ شیطان کے لئے ہوگا شیطان کی طرف نسبت اسی لئے گئی ہے کہ وہ (چوتھا بستر) یقیناً ضرورت و حاجت سے زائد ہوگا اور ضرورت سے زائد چیز کا ہونا "فخر و مباحات" کے دائرے میں آنے کی وجہ سے مذموم ہے اور ہر مذموم چیز کی نسبت شیطان ہی کی طرف ہوتی ہے، یا اس نسبت کا سبب یہ ہے کہ وہ چوتھا بستر چونکہ ضرورت سے زائد ہوتا ہے اس لئے شیطان اس پر رات گزارتا ہے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ جو شخص سخی اور فراخدل ہو اور کرم نواز طبیعت کا مالک ہو اور اس وجہ سے اس کے یہاں مہمانوں کی آمد کثرت سے ہوتی ہو تو اس کے یہاں بستر اور دوسرے اسباب کی زیادتی بظاہر مذموم نہیں ہوگی، مذموم تو وہ زیادتی و کثرت ہوگی جو محض اپنی بڑائی کے اظہار اور مفاخرت کے تحت ہو۔

ازراہ تکبر ٹخنوں سے نیچے پائجامہ وغیرہ لٹکانا حرام ہے

(۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلٰى مَنْ جَرَّ اِزَارَهُ بَطَرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کی طرف (رحمت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا، جو غرور و تکبر سے اپنی ازار (یعنی پائجامہ و تہبند) کو (ٹخنوں سے نیچے) لٹکائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "غرور و تکبر" کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص غرور و تکبر کے بغیر اپنے پائجامے یا تہبند کو ٹخنوں سے لٹکائے تو یہ حرام نہیں، تاہم مکروہ تنزیہی یہ بھی ہے۔ اور کسی عذر کے سبب جیسے سردی یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے پائجامہ و تہبند کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا مکروہ تنزیہی بھی نہیں ہے۔

تکبر کے طور پر کپڑے کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلنا ممنوع ہے

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص غرور و تکبر کے طور پر اپنے (بدن کے) کپڑے کو زمین پر گھسیٹتا ہوا چلے گا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف (رحمت و عنایت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کپڑے" میں عمومیت ہے کہ خواہ تہبند ہو یا پائجامہ ہو، خواہ کرتا ہو یا انگرکھا ہو اور خواہ فرغل ہو یا دوپٹہ ہو ان سب کا یہی حکم ہے۔

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَمَا رَجُلٌ يَجُرُّ اِزَارَهُ مِنَ الْخُيَلَاءِ خُسِفَ بِهٖ فَهُوَ يَتَجَلْجَلُ فِى الْاَرْضِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس وقت ایک شخص غرور تکبر کے طور پر اپنی ازار (یعنی تہبند یا پاجامہ) کو زمین پر گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا تو اس کو زمین میں دھنسا دیا گیا اب وہ قیامت تک (اسی طرح) زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: جس شخص کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اسی اُمت کا کوئی فرد ہو گا اور آنحضرت ﷺ نے یہ بات بطور پیشین گوئی کے فرمائی، کہ کسی آنے والے زمانہ میں ایسا ہو گا اور چونکہ اس واقعہ کا وقوع پذیر ہونا ایک یقینی امر تھا اس لئے آپ نے اس بات کی خبر دینے کے لئے ماضی کا پیرایہ بیان اختیار فرمایا۔ یا کسی ایسے شخص کا واقعہ ہے جو پچھلی کسی اُمت میں رہا ہو گا اس اعتبار سے حدیث کا ظاہری مفہوم اپنی جگہ برقرار رہے گا کہ آپ ﷺ نے ایک گزرے ہوئے واقعہ کی خبر دی بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس شخص سے مراد قارون ہے (لیکن حدیث کے ظاہری مفہوم اور اس شخص کا نام لئے بغیر ذکر کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ شخص قارون کے علاوہ کوئی اور ہو گا۔)

لباس میں ضرورت سے زائد کپڑا صرف کرنا ممنوع ہے

(۱۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْاِزَارِ فِى النَّارِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "از قسم ازار (یعنی پائجامہ وغیرہ) کا جو حصّہ ٹخنوں سے نیچے ہو گا، وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ٹخنوں سے نیچے پیر کے جتنے حصّہ پر تہبند وغیرہ لٹکا ہوا ہو گا وہ پورا حصّہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ بعض حضرات

نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یہ عمل یعنی ٹخنے سے نیچے تہبند وغیرہ لٹکانا) ایک مذموم عمل ہے اور دوزخیوں کا کام ہے۔ ٹخنے سے نیچے ازار وغیرہ لٹکانے کے مسئلہ میں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس سلسلے میں جو احادیث منقول ہیں ان میں زیادہ تر ازار کے لٹکانے کا ذکر ہے اور ازار لٹکانے والے کے حق میں بہت سخت وعیدیں بھی بیان کی گئی ہے، یہاں تک کہ ایک روایت کے مطابق، نبی کریم ﷺ نے ایک دن ایک شخص کو اس حال میں نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کے پائنچے ٹخنوں سے نیچے تھے، تو آپ ﷺ نے اس کو دوبارہ وضو کرنے اور نماز لوٹانے کا حکم دیا، اسی طرح ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ۔ "شعبان کی پندرھویں شب میں سب (مسلمانوں) کی بخشش کی جاتی ہے، علاوہ عاق، مدمن خمر، اور مسبل ازار کے کہ ان لوگوں کی بخشش نہیں ہوتی۔" لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ساری عیدوں اور ممانعت کا تعلق محض ازار ہی سے نہیں ہے بلکہ سب کپڑوں سے ہے، یعنی بدن پر جو بھی کپڑا ضرورت سے زائد اور سُنّت کے دائرے سے باہر ہوگا اس پر مذکورہ ممانعت کا حکم عائد ہوگا، جہاں تک ازار کی تخصیص کا تعلق ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس زمانہ میں چادر اور ازار عام طور پر لباس ہوتا تھا اس لئے اس کے استعمال کی کثرت کی بنا پر اس کا ذکر کیا گیا، ویسے بعض روایتوں میں ازار کے ساتھ دوسرے کپڑوں جیسے قمیص اور پگڑی کا بھی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ آگے دوسری فصل میں حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل ہوگی کہ الاسبال فی الازار والقمیص والعمامة من جر منها شیئا خیلاء الخ اسی طرح اسی فصل میں ابھی اوپر حضرت ابن عمرؓ ہی کی جو روایت گزری ہے اس میں مطلق کپڑے کا ذکر ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ لباس میں ضرورت سے زائد کپڑا رکھنے کی ممانعت کا تعلق ہر کپڑے سے ہے۔

بہر حال عزیمت یعنی اولیٰ درجہ یہ ہے کہ ازار یعنی تہبند و پائجامہ کو نصف پنڈلی تک رکھا جائے، چنانچہ آنحضرت ﷺ اپنا تہبند نصف پنڈلی ہی تک رکھتے تھے البتہ رخصت یعنی اجازت و آسانی کا درجہ ٹخنوں تک ہے کہ تہبند و پائجامے کو زیادہ سے زیادہ ٹخنوں تک رکھا جاسکتا ہے، کرتے، وقمیص اور عبا و شیروانی وغیرہ کے دامن کا بھی یہی حکم ہے، اسی طرح قمیص و کرتے وغیرہ کی آستینوں کی مسنون لمبائی یہ ہے کہ وہ بند دست یعنی ہاتھ کے جوڑ تک ہوں عمامہ کا شملہ زیادہ سے زیادہ اتنا چھوڑا جانا چاہئے جو نصف پشت تک رہے، جو شملہ لمبائی یا چوڑائی میں اس سے زائد ہوگا وہ بدعت اور اس زائد لٹکانے میں شمار ہوگا جو ممنوع ہے، چنانچہ بعض علاقوں اور شہروں کے لوگ اپنے لباس میں جو زائد از ضرورت کپڑا استعمال کرتے ہیں، جیسے ضرورت سے زائد لمبی لمبی آستینوں اور وسیع و عریض دامنوں والے کرتے، کئی کئی گز کے پاجامے اور شلواروں اور بڑے بڑے عمامے اور پگڑ کا رواج بعض جگہ پایا جاتا ہے وہ خلاف سُنّت ہے بلکہ یہ زائد از ضرورت کپڑے صرف کرنا اگر تکبر و غرور کی نیت سے ہوگا تو اس کو حرام کہیں گے اور اگر لوگوں کی دیکھا دیکھی یا کسی رواج کے تحت ہوگا تو اس کو مکروہ کہا جائے گا۔ کپڑوں میں ضرورت سے زائد لمبائی چوڑائی رکھنا عورتوں کے لئے بھی ممنوع ہے لیکن مردوں کی بہ نسبت ایک بالشت یا دو بالشت کے بقدر زائد ہونا جائز ہے۔ بلکہ اتنی زائد مقدار تو مستحب ہے جو پردہ پوشی کے بقدر ہو، جیسا کہ حضرت اُمّ سلمہؓ کی روایت سے معلوم ہوگا جو دوسری فصل میں نقل ہوگی۔

کپڑے پہننے کے بعض ممنوع طریقے

(۱۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّاْكُلَ الرَّجُلُ بِشِمَالِهٖ اَوْ يَمْشِىَ فِىْ نَعْلٍ وَّاحِدَةٍ وَّاَنْ يَّشْتَمِلَ الصَّمَّاءَ اَوْ يَحْتَبِىَ فِىْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ كَاشِفًا عَنْ فَرْجِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص بائیں ہاتھ سے کھائے یا ایک (پیر میں) جوتا پہن کر چلے، اور یہ کہ کپڑے کو بدن پر اس طرح لپٹ لے کہ دونوں ہاتھ کپڑے کے اندر آجائیں، یا بدن پر کوئی ایک کپڑا لپیٹ کر اس طرح گوٹ مار کر بیٹھے کہ اس کا ستر کھلا ہوا ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: بائیں ہاتھ سے کھانے کی ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے اور بعض حضرات کے نزدیک نہی تحریمی کے طور پر ہے۔ ایک پیر میں جوتا پہن کر چلنا ایک طرح کی بد ہیئتی ہے اور وقار کے خلاف ہے، دوسرے اگر وہ جوتا اونچی اڑی کا ہوگا تو اس صورت میں قدم کے ڈگمگانے اور زمین پر گر پڑنے کا باعث ہوگا لہذا اس سے منع فرمایا گیا۔

"کپڑے کو بدن پر اس طرح لپیٹ لے... الخ۔" اس کو عربی میں اشتمال الصماء کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی ایک کپڑے جیسے چادر وغیرہ کو اس طرح اوڑھے یا بدن پر لپیٹ لے کہ پورا جسم ڈھک جائے کسی طرف سے کھلا نہ رہے، دونوں ہاتھ بھی بند ہو جائیں اور کسی طرف سے کپڑے کے اٹھنے کی گنجائش نہ رہے کہ اس سے ہاتھ نکالا جائے۔ اس طرح کوئی کپڑا اوڑھنے یا لپیٹنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس صورت میں آدمی ایسا ہو جاتا ہے، جیسے اس کو طوق پہنا دیا گیا ہو، چنانچہ اس کو "صماء" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اعضاء جسم کی نقل و حرکت اور منافذ کو بند کر دیتا ہے جیسے "صخرۂ صماء" اس سخت و سپاٹ پتھر کو کہتے ہیں جس میں کوئی سوراخ یا شگاف وغیرہ نہیں ہوتا۔ ابن ہمامؒ نے ہدایہ کی شرح میں لکھا ہے کہ نماز میں "اشتمال صماء" مکروہ ہے جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص ایک کپڑے میں اپنا سر اور اپنا پورا بدن اس طرح لپیٹ لے کہ ہاتھ نکلنے کی بھی کوئی جگہ نہ چھوڑے۔ لیکن امام محمدؒ نے اس کراہت کے لئے اس کو شرط قرار دیا ہے کہ اس نے ازار (تہبند) بھی نہ پہن رکھا ہو جب کہ دوسروں کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔ اور نوویؒ نے شرح مسلم میں یہ لکھا ہے کہ فقہاءؒ کے نزدیک اشتمال صماء کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایک کپڑے کو اپنے پورے بدن پر لپیٹ لے اور کوئی دوسرا کپڑا (جیسے تہبند و پاجامہ وغیرہ) اس کے جسم پر نہ ہو اور پھر اس لپیٹے ہوئے کپڑے کا کوئی کنارہ اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لے۔ یہ صورت حرام ہے کیوں کہ اس میں ستر کا کچھ حصہ کھل جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ اگر ستر کا کھل جانا یقینی ہو اشتمال صماء حرام ہوگا اور اگر ستر کا کھلنا محض احتمال کا درجہ رکھتا ہو تو مکروہ ہوگا۔

"گوٹ مار کر بیٹھنا" اس ہیئت میں بیٹھنے کو کہتے ہیں کہ دونوں کولہوں کو زمین پر ٹیک کر پنڈلیوں کو کھڑا کرے اور دونوں ہاتھ ان کے گرد باندھ لے، یا اس طرح بیٹھ کر کوئی کپڑا پیٹھ اور پنڈلیوں پر لپیٹ لے (جب کہ اس کپڑے کے علاوہ اور کوئی کپڑا پہنے ہوئے نہ ہو) چنانچہ اس طرح بیٹھنا اس صورت میں ممنوع ہے جب کہ اس کے پاس صرف چادر ہو کہ اگر اس کو اس طرح لپیٹے گا تو ستر کھل جائے گا اور اگر چادر کے علاوہ اس نے کوئی اور کپڑا پہن رکھا ہو تو اس طرح بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ نماز کے علاوہ دوسری حالتوں میں اس طرح بیٹھنا مستحب بھی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ خانہ کعبہ کے سامنے ایک چادر میں اور ہاتھوں کے ذریعہ بھی گوٹ مار کر بیٹھے تھے، اور اگر چادر اتنی بڑی اور چوڑی ہو کہ اس کو لپیٹنے سے ستر کھلنے کا احتمال نہ ہو تو صرف ایک چادر میں بھی اس طرح بیٹھنا جائز ہے۔

ریشمی کپڑا پہننے والے مرد کے بارے میں وعید

(۱۴) وَعَنْ عُمَرَ وَاَنَسٍ وَابْنِ الزُّبَيْرِ وَاَبِي اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابن زبیرؓ اور حضرت ابوامامہؓ (یہ چاروں صحابہ کرامؓ) نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے دنیا میں (غیر مشروع ریشم پہنا وہ آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا تعلق اس شخص سے ہے جو مردوں کے لئے ریشم کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوئے ریشمی کپڑا پہنے، یا یہ زجر و تہدید پر محمول ہے، اور یا اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ایسا شخص ایک خاص مدت تک جنت میں داخل ہونے سے پہلے ریشمی کپڑا پہننے سے محروم رہے گا کیوں کہ جنت میں جنتیوں کا لباس ریشمی ہوگا۔ اور حافظ سیوطیؒ کے قول کے مطابق اکثر علماء نے اس حدیث کی یہ تاویل

بیان کی ہے کہ جو شخص دنیا میں ریشمی کپڑا پہنے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوگا جو ابتداء ہی میں جائز المرام قرار پا کر جنت میں جائیں گے چنانچہ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت جویریہؓ سے نقل کی ہے کہ من لبس الحریر فی الدنیا البسہ اللہ یوم القیمۃ ثوبا من نار، یعنی جس شخص نے دنیا میں ریشمی کپڑا پہنا اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آگ کا لباس پہنائے گا۔

(۱۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا يَلْبَسُ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا مَنْ لَا خَلَاقَ لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں وہی شخص ریشم پہنتا ہے جس کے لئے آخرت میں حصہ نہیں ہوتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ریشم پہننے والا شخص آخرت کے عقیدہ کا حصہ دار نہیں ہوتا، یا یہ کہ دنیا میں ریشم پہننے والے کو آخرت (جنت) میں ریشم پہننا نصیب نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اوپر کی حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لم یلبسہ فی الاخرۃ یعنی وہ آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا اس اعتبار سے اس ارشاد گرامی کا مقصد کنایۃً یہ بیان کرنا ہے کہ ایسا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ لہٰذا کافر کے حق میں تو یہ بات بالکل ظاہر ہے البتہ مسلمانوں کے حق میں یہ بات بطریق تغلیظ کے ہوگی کہ اس بات کے ذریعہ اس حقیقت کو شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جو مسلمان دنیا میں ریشم پہنے گا وہ شروع میں جنت میں داخل نہیں ہوگا، یا یہ کہ وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ دوسرے بدکاروں کے ساتھ وہ بھی دوزخ کی آگ کے لباس کا عذاب نہ بھگت لے گا۔

سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا اور ریشمی کپڑے پہننا مردوں کے لئے ناجائز ہے

(۱۶) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ نَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَشْرَبَ فِيْ اٰنِيَةِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ وَاَنْ نَّاْكُلَ فِيْهَا وَعَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ وَالدِّيْبَاجِ وَاَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرمایا کہ ہم سونے چاندی کے برتنوں میں پئیں اور ان میں کھائیں نیز آپ ﷺ نے حریر و دیبا (ایک قسم کا ریشمی کپڑا) پہننے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سونے چاندی کے برتنوں وغیرہ میں کھانے پینے اور ریشمی کپڑے پہننے کے بارے میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ ریشمی کپڑے کا استعمال جس طرح مردوں کے لئے حرام ہے اسی طرح اس کو بچوں کو بھی پہنانا حرام ہے اور پہنانے والوں کو گناہ ہوتا ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ ریشمی کپڑے کو بچھونے میں استعمال کرنا اور اس پر سونا کوئی مضائقہ نہیں رکھتا اسی طرح اگر تکیہ کے غلاف اور پردے ریشمی کپڑے کے ہوں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ جب کہ حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ نے ان سب کو مکروہ کہا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ (حدیث میں مردوں کے لئے ریشمی کپڑے پہننے اور ریشمی کپڑے پر بیٹھنے کی جو ممانعت منقول ہے اس میں پہننے کی ممانعت تو متفقہ طور پر سب کے نزدیک تحریم پر محمول ہے لیکن ریشمی کپڑے پر بیٹھنے کی) ممانعت صاحبینؒ کے نزدیک تو تحریم ہی پر محمول ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تنزیہہ پر محمول ہے کیونکہ ابھی اوپر ان کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ وہ ریشمی کپڑے کو بچھونے وغیرہ میں استعمال کرنے کے مسئلہ میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جس کا مطلب یہ کہ ان چیزوں میں ریشمی کپڑے کا استعمال بہرحال احتیاط و تقویٰ کے خلاف ہے، کیوں کہ کسی عمل کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کے کرنے میں "کوئی مضائقہ نہیں ہے" اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ ہونے کے شک سے بچنے کے لئے اس عمل

کو نہ کرنا ہی بہتر ہے اس خوف کے سبب کہ شاید اس میں کوئی مضائقہ ہو اور یہی معنی اس مشہور حدیث کے بھی ہیں! دع مالا یریبک الی مالا یریبک یعنی اس کام کو چھوڑ دو جسے میں شک ہو اور اس کام کو اختیار کرو جس میں شک نہ ہو۔ بہرحال حضرت امام اعظم ابوحنیفہ" کو چونکہ ایسی کوئی دلیل قطعی حاصل نہیں ہوئی جس کی بنیاد پر ریشمی کپڑے پر بیٹھنے یا سونے کو حرام قرار دیا جاسکے اور کپڑے پہننے کی ممانعت میں جو صریح نصوص (یعنی اس کی حرمت کے واضح احکام) منقول ہیں ان کے دائرہ حکم میں ریشمی کپڑے پر بیٹھنے کا مسئلہ نہیں آتا کیوں کہ پہننا اور بیٹھنا دو الگ الگ چیزیں ہیں کہ پہنے کا اطلاق بیٹھنے پر نہیں ہو سکتا اس لئے انہوں نے اس حدیث میں (ریشمی کپڑے پر بیٹھنے کی ممانعت کو نہی تنزیہہ پر محمول کیا ہے۔

⑰ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اُهْدِيَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُلَّةٌ سِيَرَاءُ فَبَعَثَ بِهَا اِلَيَّ فَلَبِسْتُهَا فَعَرَفْتُ الْغَضَبَ فِيْ وَجْهِهِ فَقَالَ اِنِّيْ لَمْ اَبْعَثْ بِهَا اِلَيْكَ لِتَلْبِسَهَا اِنَّمَا بَعَثْتُ بِهَا اِلَيْكَ لِتُشَقِّقَهَا خُمُرًا بَيْنَ النِّسَآءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دھاری دار ریشمی جوڑا (جو تہبند اور چادر پر مشتمل تھا بطور ہدیہ پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو میرے پاس بھیج دیا اور میں نے اس کو پہن لیا، لیکن میں نے دیکھا کہ (اس جوڑے کو میرے بدن پر دیکھ کر) آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر غصہ کے آثار پیدا ہو گئے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے اس جوڑے کو تمہارے پاس اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ تم اس کو پہن لو، بلکہ میں نے تو اس جوڑے کو تمہارے پاس اس لئے بھیجا تھا کہ تم اس کو پھاڑ کر اوڑھنیاں بنالو اور ان اوڑھنیوں کو عورتوں میں تقسیم کر دو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے جب اس جوڑے کو حضرت علیؓ کے پاس بھیجا تو وہ یہ سمجھے کہ آپ ﷺ نے اس جوڑے کو میرے پہننے کے لئے بھیجا ہے، کیوں کہ اگر اس کا پہننا جائز نہ ہوتا تو آپ ﷺ میرے پاس کیوں بھیجتے چنانچہ انہوں نے پہن لیا اور جہاں تک آنحضرت ﷺ کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کے غصہ کا سبب یہ تھا کہ اس کپڑے میں اکثر حصہ یا سب کا سب ریشم تھا اس صورت میں حضرت علیؓ نے اس کو پہن کر ایک شرعی حکم کی خلاف ورزی کی، یا یہ کہ اگر اس میں ریشم کم مقدار میں تھا اور اس وجہ سے اگرچہ اس کا پہننا جائز تھا لیکن بہرحال حضرت علیؓ کی شان یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو پہنتے اس لئے آپ ﷺ خفا ہوئے کہ انہوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ یہ کپڑا متقی و پرہیز گار لوگوں کا لباس نہیں ہو سکتا۔

⑱ وَعَنْ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ اِلَّا هٰكَذَا وَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِصْبَعَيْهِ الْوُسْطٰى وَالسَّبَّابَةَ وَضَمَّهُمَا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ اَنَّهٗ خَطَبَ بِالْجَابِيَةِ فَقَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ اِلَّا مَوْضِعَ اِصْبَعَيْنِ اَوْ ثَلَاثٍ اَوْ اَرْبَعٍ۔

"اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ریشم (کے کپڑے) پہننے سے منع فرمایا علاوہ اتنی (یعنی دو انگشت) مقدار کے اور آنحضرت ﷺ نے (یہ ممانعت بیان فرماتے ہوئے مذکورہ مقدار کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی کو اٹھایا اور دونوں کو ملایا (یعنی آپ ﷺ نے ان دونوں انگلیوں کو ملا کر دکھایا اور بتایا کہ اس قدر یعنی دو انگشت کے بقدر ریشمی کپڑا لباس میں ہو تو مباح ہے) (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے (ملک شام کے ایک شہر) جابیہ میں اپنے خطبہ کے دوران یہ فرمایا کہ رسول کریم ﷺ نے ریشمی کپڑا پہننے سے منع فرمایا ہے علاوہ بقدر دو یا تین اور یا چار انگل کے۔

تشریح: پہلی روایت سے مردوں کے لئے ریشمی کپڑے کی مباح مقدار دو انگشت معلوم ہوئی، اور دوسری روایت سے معلوم ہوا کہ چار انگشت تک کی مقدار مباح ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ اگر چار انگشت تک کے بقدر ریشمی کپڑا مردوں کے لباس میں استعمال ہو تو جائز ہے چنانچہ

اکثر علماء کا یہی قول ہے۔

آنحضرت ﷺ کا طیلسانی جبہ

⑲ وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِي بَكْرٍ اَنَّهَا اَخْرَجَتْ جُبَّةَ طَيَالِسَةٍ كِسْرَوَانِيَّةٍ لَهَا لِبْنَةُ دِيْبَاجٍ وَفُرْجَيْهَا مَكْفُوْفَيْنِ بِالدِّيْبَاجِ وَقَالَتْ هٰذِهِ جُبَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ فَلَمَّا قُبِضَتْ قَبَضْتُهَا وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُهَا وَنَحْنُ نَغْسِلُهَا لِلْمَرْضٰى نَسْتَشْفِيْ بِهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اسماءؓ بنت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے طیلسان کا کسروانی جبہ نکالا، اس کے گریبان پر (سنجاف یعنی گوٹ کے طور پر) ریشمی کپڑے کا ٹکڑا سلا ہوا تھا اور اس کی دونوں کشادگیوں پر بھی ریشمی بیل ٹکی ہوئی تھی پھر انہوں نے فرمایا کہ یہ رسول کریم ﷺ کا جبہ ہے جو حضرت عائشہؓ کے پاس تھا اور جب ان کی وفات ہوئی تو (حضرت عائشہؓ کی میراث سے جو میری بہن تھیں) میرے قبضے میں آگیا رسول کریم ﷺ اس جبہ کو (کبھی کبھی) پہن لیا کرتے تھے، ہم اس کو بیماروں کے لئے دھوتے ہیں (یعنی اس کے دھوئے ہوئے پانی کو بیماروں کو پلاتے ہیں) اور اس کے ذریعہ شفا حاصل کرتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "طیالس" اصل میں "طَیْلَسَان" کی جمع ہے اور طیلسان، ایک دوسری زبان کے لفظ "تالسان" کا معرب ہے جو ایک خاص قسم کی چادر کو کہتے ہیں، یہ چادر سیاہ رنگ کی ہوتی ہے اور صوف (اون) سے بنتی ہے پہلے زمانہ میں اس چادر کو عام طور پر یہودی لوگ اوڑھا کرتے تھے، یہاں حدیث میں جس جبہ (چغہ) کا ذکر کیا گیا ہے وہ اسی چادر کا بنایا گیا تھا، اور سیاہ رنگ کا مدور تھا چونکہ اس طرح کا جبہ فارس (ایران) کے بادشاہ خسرو کی طرف منسوب ہوتا تھا اور خسرو کا عربی لفظ کسریٰ یا بعض کے مطابق کسریٰ ہے اس لئے اس جبہ کو کسروانی کہا گیا ہے۔

"دونوں کشادگیوں" سے مراد جبہ کے وہ دونوں کنارے ہیں جہاں سے جبہ کھلا ہوتا ہے اور جو ایک آگے اور ایک پیچھے ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر بعض جبوں کے آگے اور پیچھے دامن میں چاک کھلے ہوتے ہیں انہی دونوں چاکوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان پر جو سنجاف (گوٹ یا بیل) ٹکی ہوئی تھی وہ ریشم کی تھی۔

حضرت اسماءؓ نے اس جبہ کو اس لے نکالا تھا کہ لوگوں کو اس نعمت و برکت کا ان (اسماءؓ) کے پاس ہونا معلوم ہوا اور یہ ظاہر کرنا بھی مقصد تھا کہ اگر جبہ پر اس طرح کی ریشمی سنجاف ٹکی ہوئی ہو تو اس کو پہننا جائز ہے۔

واضح رہے کہ اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ریشمی سنجاف لگے ہوئے جبہ کو پہنا ہے، جب کہ اسی باب کی دوسری فصل میں حضرت عمران ابن حصین سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ "میں ایسا کرتا نہیں پہنتا جس پر ریشمی سنجاف ٹکا ہو۔" لہٰذا ان دونوں روایتوں میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے اس کو اس توجیہ کے ذریعہ دور کیا جائے گا کہ حضرت عمرانؓ کی روایت اس صورت پر محمول ہے جب کہ وہ ریشمی سنجاف چار انگشت سے زائد ہو اور یہاں جو روایت نقل کی گئی ہے یہ چار انگشت یا اس سے کم ریشمی سنجاف کے ٹکے ہوئے ہونے پر محمول ہے یا یہ کہ حضرت عمرانؓ کی روایت کا منشاء احتیاط و تقویٰ کی صورت کو بیان کرنا ہے اور حضرت اسماءؓ کی اس حدیث کا مقصد اصل جواز کو ظاہر کرنا ہے۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بعض اعتبار سے کرتے میں جبہ کی بہ نسبت زیادہ ٹھاٹ باٹ اور آسودگی کا اظہار ہوتا ہے (اس لئے آنحضرت ﷺ نے ریشمی سنجاف کے ٹکے ہوئے کرتے کو پہننا پسند نہیں فرمایا اور ریشمی سنجاف ٹکا ہوا جبہ پہنا۔

"اور اس کے ذریعہ شفا حاصل کرتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ یا تو اس کے دھوئے ہوئے پانی کو بیماروں کو پلاتے ہیں، جس سے ان کو شفا ملتی ہے یا اس شفایابی کے مقصد سے اس جبہ کو مریض کے سر پر اور آنکھوں پر رکھتے لگاتے ہیں اور یا اس جبہ کو ہاتھ سے چھو کر یا اس

کو بوسہ دے کر اس کی برکت سے شفا حاصل کرتے ہیں۔

کسی عذر کی بنا پر ریشمی کپڑا پہننا جائز ہے

(۲۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَخَّصَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلزُّبَیْرِ وَعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ فِیْ لُبْسِ الْحَرِیْرِ لِحِکَّۃٍ بِھِمَا مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّھُمَا شَکَوَا الْقُمَّلَ فَرَخَّصَ لَھُمَا فِیْ قُمُصِ الْحَرِیْرِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کو ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت دے دی کیوں کہ ان کے خارش ہوگئی تھی (اور یہ خارش جوئیں پڑ جانے کی وجہ سے تھی جیسا کہ آگے کی روایت سے معلوم ہوگا) (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ ان دونوں (حضرت زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ) نے جوئیں پڑ جانے کی شکایت کی تو آنحضرت ﷺ نے ان کو ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت دے دی۔"

تشریح: موجز میں لکھا ہے کہ ریشم اپنی اصل کے اعتبار سے گرم اور مفرح ہوتا ہے اور ریشمی کپڑا پہننے سے جوئیں ختم ہو جاتی ہیں۔

کسم کا رنگا ہوا کپڑا نہ پہنو

(۲۱) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ الْعَاصِ قَالَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیَّ ثَوْبَیْنِ مُعَصْفَرَیْنِ فَقَالَ اِنَّ ھٰذِہٖ مِنْ ثِیَابِ الْکُفَّارِ فَلَا تَلْبَسْھُمَا وَفِیْ رِوَایَۃٍ قُلْتُ اَغْسِلُھُمَا قَالَ بَلْ اَحْرِقْھُمَا رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ عَائِشَۃَ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ غَدَاۃٍ فِیْ بَابِ مَنَاقِبِ اَھْلِ بَیْتِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

"اور حضرت عبداللہؓ ابن عمروؓ ابن عاص کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو کسم کے رنگے ہوئے دو کپڑوں میں دیکھا تو فرمایا کہ۔ "یہ کافروں کا لباس ہے (کہ نہ وہ حلال و حرام میں تمیز کرتے ہیں اور نہ مرد و عورت کے لباس میں فرق کرتے ہیں) لہٰذا تم ان کو نہ پہنو۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ میں نے عرض کیا کہ "کیا ان کو دھو ڈالوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "(نہیں) بلکہ ان کو جلا ڈالو۔" (مسلمؒ) اور حضرت عائشہؓ کی یہ روایت خرج النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذات غداۃ الخ انشاء اللہ ہم مناقب اہل بیت نبوی ﷺ کے باب میں نقل کریں گے۔"

تشریح: شارحینؒ نے لکھا ہے کے جلا ڈالنے سے آنحضرت ﷺ کی مراد اس بات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا تھا کہ ان کپڑوں کو کسی بھی صورت سے اپنی ملکیت اور اپنے قبضے سے نکال دو، خواہ اس کو کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دو، یا کسی کو ہبہ کر دو، غرضکہ جس طرح بھی ہو ان کو اپنے پاس سے جدا کر دو۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ ﷺ نے ان کپڑوں کو دھو ڈالنے کا حکم کیوں نہیں دیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ کسم کا رنگا ہوا کپڑا اگرچہ مردوں کے لئے حرام و مکروہ ہے لیکن عورتوں کے لئے مکروہ نہیں ہے لہٰذا اس کو دھو ڈالنے کی صورت میں گویا اپنے مال کو ناقص کر دینا یا ضائع کر ڈالنا تھا اس لئے آپ ﷺ نے مذکورہ حکم کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ان کپڑوں کو چاہے اپنی عورتوں کو دے دو، چاہے بیچ ڈالو، اور چاہے دوسروں کی عورتوں کو ہبہ کر دو کہ وہ ان کپڑوں سے فائدہ اٹھائیں۔

ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کو بہ نظر ظاہر یہ حکم دیا گیا اور انہوں نے ان کپڑوں کو جلا دیا۔ اور پھر جب اگلے دن وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس کے بارے میں عرض کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے وہ کپڑے اپنی عورتوں کو کیوں نہیں پہنا دیئے کیونکہ ایسے کپڑوں کا پہننا عورتوں کے لئے درست ہے۔" اس روایت کی بنا پر شارحینؒ نے "جلا ڈالنے" کو اس کے ظاہری حکم کے خلاف پر محمول کیا ہے۔ اور بعض حضرات نے جو یہ کہا ہے کہ جلا ڈالنے کا حکم اصل میں اس بات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ ان کپڑوں سے کسم کے رنگ کو ختم کر دیا جائے تو یہ قول روایت کے مفہوم سے بھی مطابقت نہیں رکھتا اور

روایت کے بھی خلاف ہے۔

واضح رہے کہ مردوں کو کسم کے رنگے ہوئے کپڑے پہننے کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، بعض علماء اس کو مطلق حرام کہتے ہیں، اور بعض حضرات مباح کہتے ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اگر کپڑے کو بننے کے بعد کسم میں رنگا گیا ہو تو اس کا پہننا حرام ہوگا اور اگر سوت کو رنگنے کے بعد اس کا کپڑا بنا گیا ہو تو اس کا پہننا مباح ہوگا، بعض یہ کہتے ہیں کہ اگر اس (کسم) کی بو زائل ہو گئی ہو تو مباح ہوگا ورنہ حرام، اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ کسم کے رنگے ہوئے کپڑوں کو مجلسوں وغیرہ میں پہننا تو مکروہ ہے، البتہ اگر گھر میں پہنا جائے تو درست ہے جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے تو ان کے مسلک میں مختار قول یہ ہے کہ کسم کا رنگا ہوا کپڑا پہننا مکروہ تحریمی ہے اور اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ کسم کے علاوہ دوسرے سرخ رنگ کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں، شیخ قاسم حنفیؒ نے جو مصر کے متاخرین علماء حنفیہ میں بہت بڑی حیثیت کے مالک گزرے ہیں، اور قسطلانیؒ کے استاد ہیں، فتویٰ دیا ہے کہ اصل حرمت رنگ کے سبب سے ہے، لہٰذا ہر سرخ رنگ مردوں کے لئے حرام و مکروہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

کُرتے کی فضیلت

(۲۲) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ اَحَبُّ الثِّيَابِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقَمِيْصَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو تمام کپڑوں میں کُرتا سب سے زیادہ پسند تھا۔" (ترمذیؒ ابوداؤدؒ)

تشریح: کُرتے کی پسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو اس کے پہننے سے جسم کے اعضاء اچھی طرح ڈھک جاتے ہیں اور دوسرے وہ بہت ہلکا اور جسم کے لئے آرام دہ ہوتا ہے، اور تیسرے یہ کہ کرتا پہننے سے آدمی متواضع و منکسر معلوم ہوتا ہے اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو چیز آنحضرت ﷺ کو پسندیدہ و مرغوب رہی ہوگی اس میں یقیناً وہ اسرار و انوار ہوں گے جو اس کے علاوہ کسی چیز میں نہیں ہوں گے جیسا کہ تمام مستحبات کا حکم ہے۔

آنحضرت ﷺ کے کرتے اور اس کی آستینوں کی لمبائی

(۲۳) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ كَانَ كُمُّ قَمِيْصِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الرُّصْغِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے کرتے کی آستینیں پہنچوں تک (بھی) تھیں۔" ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: بعض روایتوں میں آنحضرت ﷺ کے کرتے کی آستینوں کا ہاتھ کی انگلیوں کے سر تک کی ہونا بھی منقول ہے، اسی طرح بعض روایتوں میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کا کرتا لمبائی میں ٹخنوں سے اونچا تھا۔

کپڑے کو دائیں طرف سے پہننا شروع کیا جائے

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا لَبِسَ قَمِيْصًا بَدَاَ بِمَيَامِنِهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کرتا پہنتے تو دائیں طرف سے پہننا شروع کرتے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: میامن میمنہ کی جمع ہے جس کے معنی "دائیں جانب" کے ہیں، حدیث میں یہ لفظ جمع کے صیغہ کے ساتھ اس لئے لایا گیا ہے کہ

کرتے کی دائیں جانب کا تعلق آستین اور کرتے کے نیچے تک کی بھی دوسری چیزوں جیسے گلے وغیرہ سے ہے۔

تہبند و پائجامہ کا نصف ساق تک ہونا اولیٰ ہے

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِزْرَۃُ الْمُؤْمِنِ اِلٰی اَنْصَافِ سَاقَیْہِ لَا جُنَاحَ عَلَیْہِ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْکَعْبَیْنِ وَمَا اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِکَ فَفِی النَّارِ قَالَ ذٰلِکَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلَا یَنْظُرُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِلٰی مَنْ جَرَّ اِزَارَہٗ بَطَرًا۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "ایک مؤمن کے تہبند و پائجامہ کی سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ وہ آدھی پنڈلیوں تک ہو اور آدھی پنڈلیوں سے ٹخنوں تک (کے درمیان) ہونے میں (بھی) کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اس (ٹخنے) سے نیچے جو حصہ (لٹکا ہوا) ہوگا وہ دوزخ کی آگ میں لے جائے گا۔ حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔ اور (پھر فرمایا کہ) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو (رحمت وعنایت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا جو غرور و تکبر سے اپنے تہبند و پائجامہ کو (ٹخنوں سے) نیچے لٹکائے گا۔" (ابوداؤد، ترمذی)

اسبال ہر کپڑے میں ممنوع ہے

(۲۶) وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاِسْبَالُ فِی الْاِزَارِ وَالْقَمِیْصِ وَالْعِمَامَۃِ مَنْ جَرَّ مِنْھَا شَیْئًا خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰہُ اِلَیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت سالم اپنے والد (یعنی حضرت عبداللہ ابن عمرؓ) سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اسبال یعنی لٹکانا، ازار، کرتے اور عمامے میں ہے، جو شخص ان (کپڑوں) سے کچھ لٹکا کر غرور و تکبر سے کھینچے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف (بنظر کرم) نہیں دیکھے گا")۔ (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: اسبال یعنی کپڑے کو شرعی مقدار سے زائد لٹکانے کی جو حرمت و کراہت منقول ہے اس کا تعلق محض ازار یعنی تہبند و پائجامہ ہی سے نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں بلکہ کرتے اور پگڑی میں کپڑے کا اسراف کرنا اور ان کو شرعی مقدار سے زائد لٹکانا حرام و مکروہ ہے، چنانچہ اس مسئلہ کی تفصیلی بحث پہلی فصل میں حضرت ابوہریرہؓ عنہ کی روایت کے تحت گزر چکی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کی ٹوپیاں

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ کَبْشَۃَ قَالَ کَانَ کِمَامُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُطْحًا رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ مُنْکَرٌ۔

"اور حضرت ابوکبشہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ کی ٹوپیاں اس طرح کی ہوتی تھیں کی وہ سروں سے چپکی رہتی تھیں۔" ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔"

تشریح: اکثر شارحین نے کہا ہے کہ کمام اصل میں کمہ کی جمع ہے جیسے قبہ کی جمع قباب اور کمہ مدور یعنی گول ٹوپی کو کہتے ہیں۔ اور بطح بطحا کی جمع ہے جس کے معنی ہموار پتھریلی زمین کے ہیں، اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ صحابہ کرامؓ جو ٹوپیاں استعمال کرتے تھے وہ گول اور پھیلی ہوئی ہوتی تھیں کہ وہ سروں سے چپکی رہتی تھیں نہ کہ ہوا میں اوپر اٹھی ہوئی بلند و دراز، جیسے اس زمانہ میں ترکی اور ایرانی ٹوپیاں ہوتی ہیں۔

اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "کمام" کمه کی جمع نہیں بلکہ "کم" کی جمع ہے جس کے معنی "آستین کے ہیں جیسے "قف" کی جمع "قفاف" (قف کے معنی بلند زمین کے ہیں) اس صورت میں "بطحا" کے معنی "فراخ وکشادہ" کے ہوں گے، کیونکہ بطحا یعنی ہموار پتھریلی زمین، کشادہ بھی ہوتی ہے، اس طرح حدیث کا مطلب یہ ہو جائے گا کہ "آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ اپنے کرتوں میں تنگ آستین نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے کرتوں کی آستینیں ایک بالشت کے بقدر چوڑی ہوتی تھیں۔

عورتیں اپنے لباس میں مردوں سے زائد کپڑا رکھ سکتی ہیں

(۲۸) وَعَنْ اُمِّ سَلْمَةَ قَالَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ ذَكَرَ الْاِزَارَ فَالْمَرْأَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ تُرْخِيْ شِبْرًا فَقَالَتْ اِذًا تَنْكَشِفُ عَنْهَا قَالَ فَذِرَاعًا لَا تَزِيْدُ عَلَيْهِ رَوَاهُ مَالِكٌ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِيْ رِوَايَةِ التِّرْمِذِيِّ وَالنَّسَائِيِّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَتْ اِذًا تَنْكَشِفُ اَقْدَامُهُنَّ قَالَ فَيُرْخِيْنَ ذِرَاعًا لَا يَزِدْنَ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ جس وقت رسول کریم ﷺ ازار بند (تہبند و پائجامہ) کا حکم بیان فرما رہے تھے (کہ اس کا لٹکانا ممنوع ہے) تو انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! اور عورت (کے بارے میں کیا حکم ہے؟ یعنی اگر وہ اپنے ازار کو نیچا نہ رکھے تو اس کا ستر پوری طرح نہیں چھپے گا) آپ ﷺ نے فرمایا عورت اپنا تہبند یا پائجامہ (اپنی آدھی پنڈلیوں یا بعض کے قول کے مطابق اپنے ٹخنوں سے) ایک بالشت نیچا لٹکا سکتی ہے۔" حضرت اُمّ سلمہؓ نے عرض کیا کہ "اس صورت میں بھی کھلا رہے گا یعنی مثلاً اس کی پنڈلیاں زیادہ لمبی ہوں اور وہ اپنی آدھی پنڈلیوں سے ایک بالشت اور نیچے تک اپنا پائجامہ لٹکالے تب بھی اس کا ستر کھلنے کا احتمال رہے گا۔" آپ ﷺ نے فرمایا "(اگر اس صورت میں بھی اس کا ستر کھلا رہے تو) وہ ایک گز اور نیچے لٹکالے (گز سے شرعی گز یعنی ایک ہاتھ مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں وہ اپنے پائجامہ وغیرہ کو اتنا نیچے لٹکا سکتی ہے کہ وہ زمین تک پہنچ جائے تاکہ اس کے پیر چھپے رہیں اور وہ ایک بالشت کے بقدر زائد ہو یا ایک گز کے بقدر، اس کے بعد آپ ﷺ نے حد سے زیادہ لٹکانے کی ممانعت کو تاکیدا بیان کرنے کے لئے یہ فرمایا کہ) کوئی عورت اس ایک گز سے زیادہ نیچے نہ لٹکائے۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ، نسائی، ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نسائی کی ایک روایت میں جو حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے، یوں ہے کہ حضرت اُمّ سلمہؓ نے یہ کہا کہ اس صورت میں ان کے پیر کھلے رہیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ ہاتھ بھر اور نیچے لٹکالیں لیکن اس سے زائد نہ لٹکائیں۔"

آنحضرت ﷺ کے کُرتے میں گریبان کس جگہ تھا

(۲۹) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ رَهْطٍ مِنْ مُزَيْنَةَ فَبَايَعُوْهُ وَاِنَّهٗ لَمُطْلَقُ الْاِزَارِ فَاَدْخَلْتُ يَدِيْ فِيْ جَيْبِ قَمِيْصِهٖ فَمَسِسْتُ الْخَاتَمَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت معاویہ بن قرہؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ (ایک دن) میں مزینہ قوم کی ایک جماعت کے ساتھ (جو اسلام قبول کرنے آئی تھی) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا چنانچہ اس جماعت کے لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے (اسلام پر بیعت کی، اس وقت آنحضرت ﷺ (اپنے کرتے کی) گھنڈیاں کھولے ہوئے بیٹھے تھے، میں نے (موقع غنیمت جانا اور حصول برکت وسعادت کے لئے) اپنا ہاتھ آپ ﷺ کے کرتے کے گریبان میں ڈال کر مہر نبوت پر ہاتھ پھیر لیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے کرتے کا گریبان سینہ مبارک پر تھا، چنانچہ اس پر بہت حدیثیں دلالت کرتی ہیں، اسی لئے شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ جو علم سُنّت سے بے بہرہ ہیں یہ خیال رکھتے ہیں کرتے کا گریبان سینہ پر رکھنا بدعت ہے یہ قول قطعا بے بنیاد اور بالکل باطل ہے۔

سفید کپڑے کی فضیلت

(۳۰) وَعَنْ سَمُرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَسُوا الثِّيَابَ الْبِيْضَ فَاِنَّهَا اَطْهَرُ وَاَطْيَبُ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ۔ (رواہ احمد والترمذی والنسائی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا سفید کپڑے پہنا کرو کیوں کہ سفید کپڑے بہت پاک اور زیادہ پاکیزہ و خوش تر ہوتے ہیں اسی طرح اپنے مردوں کو کفن بھی سفید کپڑوں کا دو۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: سفید کپڑے کو بہت پاک تو اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ سفید کپڑا چونکہ جلد میلا ہو جاتا ہے اس لئے وہ بار بار اور بہت زیادہ دھویا جاتا ہے، اس کے برخلاف رنگین کپڑا چونکہ میل خور ہوتا ہے اس لئے وہ کافی عرصہ کے بعد ہی دھویا جاتا ہے! اور "زیادہ پاکیزہ" اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ وہ دوسرے رنگوں میں مخلوط نہیں ہوتا، اسی طرح سفید کپڑے کو خوشتر اس سبب سے کہا گیا ہے کہ سلیم الطبع لوگ سفید ہی کپڑے کی طرف زیادہ راغب ہوتے ہیں۔ البتہ ضرورت کی صورت اس سے خارج ہے۔ جیسے بعض صوفیاء نیلا اور یا کسی اور رنگ کے کپڑے کو اس ضرورت کی بناء پر اختیار کرتے ہیں کہ وہ سفید کپڑے کو بار بار دھوئے رہنے پر قادر نہیں ہوتے۔

جہاں تک کفن کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ کفن میں سفید ہی کپڑا دینا افضل ہے کیوں کہ اس وقت مردہ گویا فرشتوں کی مجلس میں حاضر ہوتا ہے جیسے کہ سفید کپڑا پہننا اس شخص کے لئے افضل ہے جو مجلسوں اور محفلوں میں جانا چاہے، مثلاً جمعہ یا جماعت کے لئے مسجد میں، اور علماء و اولیاء اللہ کی ملاقات کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہو لیکن بعض حضرات نے کہا ہے کہ عید میں وہ کپڑا پہننا افضل ہے جو زیادہ قیمتی ہو تا کہ خدا کی عطا کی ہوئی نعمت کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہو سکے چنانچہ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ عیدین اور جمعہ میں سرخ دھاریوں والی چادر اوڑھتے تھے۔

پگڑی کے شملہ کا مسئلہ

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اعْتَمَّ سَدَلَ عِمَامَتَهٗ بَيْنَ كَتِفَيْهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب عمامہ باندھتے تو اس کا شملہ دونوں مونڈھوں کے درمیان ڈالتے۔ ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ عَمَّمَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَدَلَهَا بَيْنَ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِيْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ کو عمامہ بندھوایا تو اس کا شملہ میرے آگے اور میرے پیچھے (دونوں طرف) لٹکایا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یعنی آپ ﷺ پگڑی کے دونوں سروں کا شملہ چھوڑ کر ایک کو سینہ پر اور دوسرے کو پیٹھ پر لٹکایا۔

واضح رہے کہ عمامہ باندھنا سنت ہے اور اس کی فضیلت میں، بہت زیادہ حدیثیں منقول ہیں، بلکہ ایک روایت میں جو اگرچہ ضعیف ہے یہاں تک منقول ہے کہ عمامہ باندھ کر پڑھی جانے والی دو رکعتیں بغیر عمامہ کے پڑھی جانے والی ستر رکعتوں سے افضل ہیں۔

نیز یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ عمامہ میں شملہ چھوڑنا افضل ہے لیکن دائمی طور پر نہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ کبھی تو شملہ چھوڑتے تھے اور کبھی نہیں چھوڑتے تھے، اسی طرح بعض دفعہ آپ ﷺ کے عمامہ کا شملہ آپ ﷺ کی

گردن سے نیچے تک لٹکا ہوتا تھا اور بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ عمامہ کا ایک سرا عمامہ ہی میں اڑس دیتے تھے اور دوسرا چھوڑ دیتے تھے نیز آپ ﷺ کے عمامہ کا شملہ اکثر اوقات میں پیٹھ پر پڑا ہوتا تھا اور کبھی کبھی دائیں طرف بھی لٹکا لیتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ عمامہ کے دونوں سروں کا شملہ چھوڑ کر دونوں کو دونوں مونڈھوں کے درمیان یعنی ایک کو سینہ پر اور دوسرے کو پیٹھ پر لٹکا لیتے تھے لیکن بائیں طرف لٹکانا چونکہ ثابت نہیں ہے اس لئے یہ بدعت ہے اور کنز میں لکھا ہے کہ شملہ کو مونڈھوں کے درمیان چھوڑنا مستحب ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے شملہ کی لمبائی کم سے کم ایک بالشت اور زیادہ سے زیادہ ہاتھ بھر ہونی چاہئے اس سے زائد لمبا شملہ چھوڑنا بدعت ہے اور اس حکم کی خلاف ورزی ہے جس کے ذریعہ اسبال و اسرف سے منع کیا گیا ہے چنانچہ مقررہ حد سے زائد لمبائی اگر غرور و تکبر کے طور پر ہوگی تو وہ حرام شمار ہوگی ورنہ مکروہ اور خلاف سنت! نیز محدثین نے یہ لکھا ہے کہ شملہ چھوڑنے کو صرف نماز کے وقت کے ساتھ مختص کرنا بھی سُنت کے خلاف ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ شملہ چھوڑنا فقہی اعتبار سے مستحب ہے جس کا تعلق سنت زائدہ سے ہے سنت ہدی سے نہیں اس لئے اس (شملہ چھوڑنے) کے ترک میں کوئی گناہ یا برائی نہیں ہے اگرچہ اس کو اختیار کرنے میں ثواب و فضیلت ہے، جن حضرات نے شملہ چھوڑنے کو سنت مؤکدہ کہا ہے ان کا یہ قول تحقیق و روایت کے خلاف ہے۔

ٹوپی پر عمامہ باندھنا مسلمانوں کی امتیازی علامت ہے

(۴۳) وَعَنْ رُكَانَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَرْقُ مَابَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُشْرِكِيْنَ الْعَمَائِمُ عَلَى الْقَلَانِسِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَاِسْنَادُهُ لَيْسَ بِالْقَائِمِ۔

"اور حضرت رکانہؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہمارے اور مشرکوں کے درمیان (ایک) فرق یہ (بھی) ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی اسناد درست نہیں۔

تشریح: اس حدیث کو ابوداؤدؒ نے بھی روایت کیا ہے لیکن انہوں نے سکوت کیا ہے یعنی انہوں نے یہ نہیں کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد درست نہیں، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اس حدیث کی اسناد اصل کے اعتبار سے درست ہو یا دونوں (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) کے نقل کرنے کی وجہ سے اس کو "درستی" حاصل ہو گئی ہو۔

بہر حال حدیث کی عبارت کے دو معنی محتمل ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ "ہم (مسلمان) تو ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں جب کہ مشرک لوگ بغیر ٹوپیوں کے (یعنی ننگے سر پر) عمامہ باندھتے ہیں۔" اور دوسرے یہ کہ۔ "ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں جب کہ مشرک لوگ عمامہ باندھتے ہی نہیں صرف ٹوپی پہنتے ہیں۔" شارحین نے لکھا ہے کہ ان دونوں معنوں میں سے پہلے ہی معنی مراد ہیں کیونکہ اس زمانہ کے مشرکین کا عمامہ باندھنا تو تحقیق کے ساتھ معلوم ہے لیکن ان کا صرف ٹوپی پہننا ثابت نہیں ہے (اگرچہ ملا علی قاریؒ نے خدریؒ سے نقل کیا ہے کہ دوسرے معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں نیز انہوں نے کہا ہے کہ بعض علماء کے قول کے مطابق سُنت یہ ہے کہ ٹوپی اور عمامہ استعمال کیا جائے صرف ٹوپی پہننا مشرکین کی علامت ہے۔)

سونا اور ریشم عورتوں کے لئے حلال اور مردوں کے لئے حرام ہے

(۴۴) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِيْرُ لِلْاِنَاثِ مِنْ اُمَّتِيْ وَحُرِّمَ عَلٰى ذُكُوْرِهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ میری اُمت کی عورتوں کے لئے سونا اور ریشم حلال کیا گیا ہے اور اُمت کے مردوں پر حرام کیا گیا ہے (ترمذیؒ، نسائیؒ) اور ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: "مرد" کے لفظ میں بچے (لڑکے) بھی داخل ہیں لیکن بچے چونکہ مکلف نہیں ہیں اس لئے ان کے حق میں ان چیزوں کی حرمت کا تعلق پہنانے والوں سے ہوگا کہ اگر کوئی بچہ ریشم یا سونے، کا زیور پہنے گا تو اس کا گناہ اس کے پہنانے والے پر ہوگا۔ نیز "سونے سے مراد سونے کے زیورات" ہیں ورنہ سونے چاندی کے برتن کا استعمال جس طرح مردوں کے لئے حرام ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی حرام ہے، اسی طرح چاندی کے زیورات کا حلال ہونا بھی صرف عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے علاوہ اس مقدار کے جو مردوں کے لئے بھی حلال ہے جیسے انگوٹھی وغیرہ۔

نیا کپڑا پہنتے وقت کی دعا

(۳۵) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اُسْتَجَدَّ ثَوْبًا سَمَّاہُ بِاِسْمِہٖ عِمَامَۃً اَوْقَمِیْصًا اَوْرِدَآءً ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا کَسَوْتَنِیْہِ اَسْأَلُکَ خَیْرَہٗ وَخَیْرَ مَاصُنِعَ لَہٗ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّہٖ وَشَرِّ مَاصُنِعَ لَہٗ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کوئی نیا کپڑا پہنتے تو اس کا جو نام ہوتا یعنی پگڑی یا کرتا اور یا چادر، وہ نام لیتے اور پھر فرماتے۔ "اے اللہ تیرے ہی لئے تعریف ہے کہ تو نے مجھ کو یہ کپڑا پہنایا، اے اللہ میں تجھ سے اس کپڑے کی بھلائی کا طلب گار ہوں (کہ یہ کپڑا میرے بدن پر عافیت سے رہے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچے) اور تجھ سے اس چیز کی بھلائی چاہتا ہوں جس کے لئے یہ کپڑا بنایا گیا ہے (یعنی یہ کہ میں یہ کپڑا پہن کر تیری اطاعت کروں) اور میں اس کپڑے کی برائی اور اس چیز کی برائی کی جس کے لئے یہ کپڑا بنایا گیا ہے تیری پناہ چاہتا ہوں (یعنی یہ کہ میں کپڑا پہن کر کوئی گناہ نہ کروں)۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "نیا کپڑا پہننے" کے بارے میں ابن حبانؒ خطیبؒ اور بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ جب کوئی نیا کپڑا پہننے کا ارادہ کرتے تو اس کو جمعہ کے دن زیب تن فرماتے۔

"اس کا جو نام ہوتا الخ" یعنی آپ ﷺ اس کپڑے کا نام لیتے خواہ کپڑا عمامہ ہوتا یا کرتا یا چادر اور یا کوئی اور لباس، چنانچہ مذکورہ جملہ میں لفظ "ثوب" سے عمومیت مراد ہے اور خاص طور پر جن کپڑوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض تمثیل کے طور پر ہیں۔

"وہ نام لیتے" یعنی اگر مثلاً آپ ﷺ کرتا پہنتے تو اس طرح فرماتے کہ رزقنی اللہ۔ یا۔ اعطانی اللہ۔ یا۔ کسانی اللہ ھذا القمیص اور پھر اس کے بعد مذکورہ دعا پڑھتے۔

(۳۶) وَعَنْ مُعَاذِبْنِ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَکَلَ طَعَامًا ثُمَّ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ ھٰذَا الطَّعَامَ وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ غُفِرَ لَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَزَادَ اَبُوْدَاؤدَ وَمَنْ لَبِسَ ثَوْبًا فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ ھٰذَا وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ غُفِرَ لَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ وَمَاتَأَخَّرَ۔

"اور حضرت معاذ ابن انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص کھانا کھائے اور پھر یہ کہے یعنی یہ دعا پڑھے۔" تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ کو یہ کھانا کھلایا اور کھانا بغیر میرے کسی حیلہ اور بغیر میری کسی قوت (کے اثر کے) مجھ تک پہنچایا" تو اس کے تمام پہلے (صغیرہ) گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔" (ترمذیؒ) اور ابوداؤدؒ نے اپنی روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ جو شخص کپڑا پہنے اور پھر یہ کہے۔ "تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ کو یہ کپڑا پہنایا اور یہ کپڑا بغیر میرے کسی حیلہ اور بغیر میری کسی قوت (کے اثر کے) مجھ تک پہنچایا۔" تو اس کے تمام اگلے پچھلے (صغیرہ) گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔"

پرانے کپڑے کو ضائع مت کرو

(۳۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَائِشَةُ اِنْ اَرَدْتِ اللُّحُوْقَ بِيْ فَلْيَكْفِكِ مِنَ الدُّنْيَا كَزَادِ الرَّاكِبِ وَاِيَّاكِ وَمُجَالَسَةَ الْاَغْنِيَاءِ وَلَا تَسْتَخْلِقِيْ ثَوْبًا حَتّٰى تُرَقِّعِيْهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ صَالِحِ بْنِ حَسَّانٍ وَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ اِسْمَاعِيْلَ صَالِحُ بْنُ حَسَّانٍ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا۔ "عائشہؓ! اگر تم (دنیا وآخرت دونوں جگہ مجھ سے (کامل) اتصال ووابستگی چاہتی ہو تو دنیا کی صرف اتنی ہی چیزوں پر اکتفا کرو جو سوار کے زادراہ کے برابر ہو، اور دولت مندوں کی ہم نشینی اختیار کرنے سے اجتناب کرو، نیز کپڑے کو اس وقت تک پرانا سمجھ کر نہ پھینکو جب تک کہ تم اس کو پیوند (لگا کر پہننے) کے قابل سمجھو۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور یہ حدیث ہم تک صالح ابن حسان کی روایت کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے نہیں پہنچی ہے جب کہ محمد بن اسماعیل (یعنی امام بخاریؒ) نے کہا ہے صالح ابن حسان منکر الحدیث ہیں (یعنی ان کی روایت منکر ہے)۔"

تشریح: "جو سوار کے زادراہ کے برابر ہو۔" اس ارشاد گرامی ﷺ کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ دنیا کی صرف اتنی ہی چیزوں پر قناعت کرے جو اس کی زندگی اور مقصد حیات کے لئے ضروری ہوں۔ اس جملہ میں "سوار" کی تخصیص شاید اس لئے ہے کہ وہ اپنا راستہ تیز گامی سے طے کرتا ہے اور منزل پر جلد پہنچتا ہے جس کی وجہ سے اس کو تھوڑا سا بھی زادراہ کافی ہو جاتا ہے اس کے برخلاف پیادہ کو چونکہ سفر میں دیر لگتی ہے اس لئے اس کو زادراہ بھی زیادہ لینا پڑتا ہے

دولت مندوں کی ہمنشینی سے بچنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ دنیادار دولت مندوں کی صحبت ومجالست، دنیا اور دنیا کی لذات کے تئیں محبت وخواہشات میں زیادتی اور لہو ولعب میں مشغولیت کا باعث بنتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ الآیہ ایک روایت میں منقول ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "مردوں کی ہمنشینی سے اجتناب کرو۔" عرض کیا گیا کہ "یارسول اللہ ﷺ! وہ کون لوگ ہیں (جن کو مردہ فرمایا جارہا ہے، اور جن کی ہمنشینی سے بچنے کی تلقین فرمائی جارہی ہے۔)" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "(دنیادار) دولت مند۔"

"جب تک کہ تم اس کو پیوند کے قابل سمجھو۔" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کپڑا پرانا و بوسیدہ ہو جائے یا وہ پھٹ جائے تو اس سے بے اعتنائی نہ برتو اور اس کو ضائع نہ کرو بلکہ اس کو ٹھیک ٹھاک کر کے اور اس میں پیوند لگا کر کم سے کم ایک بار اور استعمال کرلو۔ اس ارشاد کے ذریعہ گویا اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ اگر اپنے پاس پھٹے پرانے کپڑے ہوں تو (زہد وقناعت کا تقاضا یہ ہے کہ سرپوشی کے لئے انہی پر اکتفا کیا جائے، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی خلافت کے زمانہ میں (جب کہ ان کو دنیا کے ایک عظیم ترین حکمران کی حیثیت حاصل تھی) ایک دن اسی حالت میں خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ انہوں نے جو تہبند باندھ رکھا تھا اس میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

(۳۸) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اِيَاسِ بْنِ ثَعْلَبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اَنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِيْمَانِ اَنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِيْمَانِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ ابن ایاس ابن ثعلبہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کیا تم سن نہیں رہے ہو، کیا تم سن نہیں رہے (یعنی اے لوگو! کان لگا کر سنو!) کپڑے کی بوسیدگی و کہنگی (یعنی لباس کی سادگی) کو اختیار کرنا اور دنیا کی زیب وزینت کو ترک کرنا، حسن ایمان کی علامت ہے، کپڑے کی بوسیدگی و کہنگی کو اختیار کرنا اور دنیا کی زیب وزینت کو ترک کرنا حسن ایمان کی علامت ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ لباس کے معاملہ میں زیادہ تکلّف واہتمام سے کام لینا، عورتوں کی طرح اپنے آپ کو سنوارنا، اور ہر وقت زیب

وزینت کا خیال رکھنا مسلمان مرد کے شایان شان نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے اچھے کپڑے پہننے کی استطاعت عطا کی ہے تو بیشک اپنے لباس میں شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے عمدگی و نفاست کا لحاظ رکھنا اور جائز طریقے سے اچھے کپڑے پہننا کوئی معیوب نہیں ہے، لیکن کبھی کبھی پرانا کپڑا بھی پیوند لگا کر پہن لینا بہتر ہے۔ حاصل یہ کہ لباس میں تواضع وانکسار اختیار کرنا اور دنیاوی زیب وزینت سے بچنا اہل ایمان کی اچھی عادتوں میں سے ہے اور حسن ایمان کی علامت ہے کیونکہ آخرت اور آخرت کی زینتوں پر ایمان لانا ہی اس زہد وقناعت کا باعث ہوتا ہے۔

اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اعلیٰ لباس پہننا اخروی ذلت کا باعث ہے

(۳۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ فِي الدُّنْيَا اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص دنیا میں شہرت کا کپڑا پہنے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا کپڑا پہنائے گا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی عزت طلبی اور اپنی بڑائی کے اظہار کی غرض سے اعلیٰ ونفیس لباس پہنے یعنی اس کا مقصد یہ ہو کہ لوگ میرے جسم پر اعلیٰ لباس دیکھ کر میری عزت کریں اور مجھے شہرت وبڑائی ملے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ذلیل وحقیر کپڑا پہنائے گا، یعنی اس کو اس کپڑے کے ذریعہ ذلیل وبے عزت کرے گا اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے دنیا میں ایسا لباس پہنے گا جس سے تواضع اور بے نفسی ظاہر ہوتی ہو (یعنی جس کو دنیادار لوگ ذلیل وحقیر لباس سمجھتے ہوں اس کو اللہ تعالیٰ عقبیٰ میں عزت وعظمت کا لباس پہنائے گا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ شہرت کے کپڑے سے مراد وہ حرام کپڑے ہیں کہ جن کا پہننا مباح نہیں ہے بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ کپڑا مراد ہے جو فقراء ومساکین کو ذلیل وخوار رکھنے اور ان کی دل شکستگی کی غرض سے ازراہ غرور وتکبر پہنے، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کپڑا مراد ہے جو ازراہ تمسخر ومذاق یعنی لوگوں کو ہنسانے کے لئے پہنے، یا وہ کپڑا مراد ہے جو اپنے زہد وپارسائی کے اظہار کے لئے پہنے اسی طرح بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں دراصل "اعمال" کو کپڑے سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی مراد یہ ہے کہ جو شخص ازراہ ریا یعنی محض دکھانے سنانے کے لئے اچھے اعمال کرے تاکہ ان کی وجہ سے دنیا والوں کی نظر میں اس کو شہرت وعزت حاصل ہو تو قیامت کے دن اس کے حشر یہ ہوگا! بہرحال حدیث کے سیاق کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلاشک کہی جاسکتی ہے کہ وہی مراد ومطلب زیادہ صحیح ہے جس کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔

تشبہ بقوم کا ذکر

(۴۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا اس کا شمار اسی قوم میں ہوگا۔"

(احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص جس قوم وجماعت کی مشابہت اختیار کرے گا اس کو اسی قوم وجماعت جیسی خیر ومعصیت ملے گی مثلاً اگر کوئی شخص اپنے لباس واطوار وغیرہ کے ذریعہ کسی غیر مسلم قوم یا فساق وفجار کی مشابہت اختیار کرے گا تو اس کے نامہ اعمال میں وہی گناہ لکھے جائیں گے جو اس غیر مسلم قوم کے لوگوں یا فساق وفجار کو ملتا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے آپ کو علماء ومشائخ اور اولیا اللہ کے

نمونے پر ڈھالے گا کہ انہی جیسا لباس پہنے گا، انہی جیسے اطوار اختیار کرے گا اور انہی جیسے اعمال کرے گا تو وہ بھلائی و سعادت کے اعتبار سے انہی کے زمرہ میں شمار ہوگا۔ اس ارشاد گرامی کے الفاظ بہت جامع و ہمہ گیر ہیں جن کے دائرے میں بہت سی باتیں اور بہت سی چیزیں آجاتی ہیں یعنی مشابہت کا مفہوم عمومیت کا حامل ہے کہ مشابہت خواہ اخلاق و اطوار میں ہو، یا افعال و کردار میں ہو، اور خواہ لباس و طرز رہائش میں ہو اور یا کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے اور بولنے چالنے میں ہو سب کا یہی حکم ہے۔

ترک زیب و زینت آخرت میں بڑائی ملنے کا ذریعہ ہے

(۴۱) وَعَنْ سُوَيْدِبْنِ وَهْبٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَبْنَاءِ اَصْحٰبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ وَهُوَيَقْدِرُ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ تَوَاضُعًا كَسَاهُ اللّٰهُ حُلَّةَ الْكَرَامَةِ وَمَنْ تَزَوَّجَ لِلّٰهِ تَوَّجَهُ اللّٰهُ تَاجَ الْمُلْكِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ مِنْهُ عَنْ مُعَاذِبْنِ اَنَسٍ حَدِيْثَ اللِّبَاسِ۔

"اور حضرت سوید ابن وہب، نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی کے بیٹے سے، اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص زیب و زینت کے لباس کو پہننا چھوڑ دے باوجودیکہ وہ اس کے پہننے کی استطاعت و حیثیت رکھتا ہو۔ اور ایک روایت میں تواضعا کا لفظ بھی آیا ہے یعنی جو شخص زہد و تواضع اور کسر نفسی کے سبب زیب و زینت کا لباس پہننا چھوڑ دے اس کو اللہ تعالیٰ عزت و عظمت کا جوڑا پہنائے گا یعنی اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا لباس عطا کرے گا جو اس کی رفعت و عظمت کا باعث ہوگا، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت دونوں جگہ عزت و عظمت عطا کرے گا جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص فروتنی اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو بلند مرتبہ بناتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نکاح کرے اس کو اللہ تعالیٰ بادشاہت کا تاج عطا فرمائے۔ (ابوداؤدؒ) اور ترمذیؒ نے اس روایت کا صرف وہ حصہ جس میں لباس کا ذکر ہے حضرت معاذ ابن انسؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اعلیٰ و نفیس کپڑے اور زینت و آرائش کا لباس پہننے کی حیثیت رکھتا ہو لیکن اس کے باوجود یا تو اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے، یا آخرت میں بلند مرتبہ پانے کی تمنا میں اور یا دنیا کی زینت و آرائش کے بے وقعت و حقیر جان کر اعلیٰ لباس پہننا چھوڑ دے تو اس کو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں عزت و عظمت کی دولت سے نوازے گا۔

"اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نکاح کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جو نہ تو کفو اور عزت میں اس کے برابر اور نہ دولت و ثروت میں اس کی برابری رکھتی ہو اور اس شخص نے اس عورت سے محض اس لئے نکاح کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا خوشنودی چاہتا تھا یا وہ اپنے نفس کو بدکاریوں کے، فتنہ سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اور اس کا مقصد دین کی محافظت اور طلب و بقا نسل تھا۔

"اس کو اللہ تعالیٰ بادشاہت کا تاج عطا فرمائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل پر اس کو جنت میں بادشاہی عزت و عظمت کا تاج پہنائے گا یا یہ جملہ "عزت و توقیر" سے کنایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت میں عزت و توقیر عطا فرمائے گا۔

روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو معاذ ابن انسؓ سے نقل کیا ہو اور صرف وہ حصہ نقل کیا ہے جس میں لباس کا ذکر ہے، حدیث کا دوسرا جز کہ جس میں نکاح کا ذکر ہے انہوں نے نقل نہیں کیا۔

حق تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا اظہار ایک مطلوب عمل ہے

(۴۲) وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّرٰى اَثَرُ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے بندے پر دیکھا جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو مادی نعمت عطا کرے تو چاہئے کہ وہ اس کو ظاہر کرے مثلاً وہ اپنی حیثیت کے مطابق اور مبالغہ واسراف کی حد تک جائے بغیر اچھے کپڑے پہنے، لیکن اس کو خوش پوشاکی کسی غرور و تکبر اور اتراہٹ کے جذبہ سے نہیں ہونی چاہئے بلکہ شکر گزاری کی نیت سے ہونی چاہئے تاکہ فقراء محتاج، زکوۃ صدقات لینے کے لئے اس کی طرف رجوع کریں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کو چھپانا اچھا نہیں ہے بلکہ کفران نعمت کا موجب ہے اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو روحانی نعمت جیسے علم و فضل کی دولت اور بزرگی و شخصیت عطا فرمائے تو اس کو چاہئے کہ وہ لوگوں کے سامنے اس نعمت کا اظہار کرے تاکہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ اوپر کی حدیث میں تو ترک زینت کی طرف راغب کیا گیا ہے۔ اور اس حدیث میں خوش پوشاکی کے ذریعہ گویا زیب و زینت اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے اس صورت میں ان دونوں حدیثوں کے درمیان جو ظاہری تضاد محسوس ہوتا ہے، اس کے دفعیہ کے لئے کیا توجیہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اوپر کی حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ خوش پوشاکی کی حیثیت واستطاعت نہ ہو، چنانچہ اس صورت میں "ترک زینت کی طرف راغب کیا گیا ہے تاکہ اگر کسی شخص کو کسی موقع پر خوش پوشاکی کی ضرورت بھی لاحق ہو اور وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس مقصد کی تکمیل کے لئے غیر موزوں تکلیف و اہتمام کر کے اور ناروا زحمت برداشت کر کے اچھے کپڑے حاصل کرنے کی سعی نہ کرے، بلکہ صبر واستقامت کی راہ اختیار کر کے "ترک زینت" ہی پر عامل رہے اس کے برخلاف جو شخص عمدہ پوشاک پہننے اور لباس کی نفاست و لطافت کو اختیار کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور وہ اس کے باوجود "ترک زینت" ہی کو اپنا معمول کی بنا پر پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑے پر قناعت کئے رہے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کیوں کہ اس کی یہ عادت اصل میں بخل و خست پر محمول ہوگی۔

جسم و لباس کی درستگی اور صفائی ستھرائی پسندیدہ چیز ہے

(۴۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِدًا فَرَاٰى رَجُلًا شَعِثًا قَدْ تَفَرَّقَ شَعْرُهٗ فَقَالَ مَا كَانَ يَجِدُ هٰذَا مَا يُسَكِّنُ بِهٖ رَاسَهٗ وَرَاٰى رَجُلًا عَلَيْهِ ثِيَابٌ وَسِخَةٌ فَقَالَ مَا كَانَ يَجِدُ هٰذَا مَا يَغْسِلُ بِهٖ ثَوْبَهٗ۔ (رواہ احمد والنسائی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ ملاقات کی غرض سے ہمارے پاس تشریف لائے تو وہاں آپ ﷺ نے ایک پراگندہ بال شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اس شخص کو وہ چیز یعنی کنگھی وغیرہ میسر نہیں ہے جس کے ذریعہ یہ اپنے بالوں کو درست کر سکے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے بدن پر میلے کچیلے کپڑے تھے تو فرمایا کہ کیا اس شخص کو وہ چیز یعنی صابون یا پانی میسر نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑوں کو دھو ڈالے!۔" (احمدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جسم کی درستی و نفاست اور لباس کی صفائی و ستھرائی آنحضرت ﷺ کے نزدیک پسندیدہ تھی اور اس کا برعکس ناپسندیدہ و مکروہ کیونکہ یہ چیزیں تہذیب و شائستگی کی علامت بھی ہیں اور اسلام کی روح پاکیزگی کے عین مطابق بھی۔ لہٰذا اس ارشاد گرامی البذاذة من الایمان (یعنی لباس کی سادگی اور ترک زینت حسن ایمان کی علامت ہے) کی مراد چونکہ موٹے چھوٹے کپڑے پر قناعت کرنا ہے اس لئے یہ بات نہ تو مذکورہ بالا روایت کے منافی ہے اور نہ اس نظافت و پاکیزگی کے خلاف ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّهَا مِنَ الدِّيْنِ (یعنی وہ نظافت و پاکیزگی) دین کا ایک جزء ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے مال و دولت عطا کی ہے تو اس کو اپنی پوشاک سے ظاہر کرو

(۴۴) وَعَنْ اَبِي الْاَحْوَصِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيَّ ثَوْبٌ دُوْنٌ فَقَالَ لِيْ اَلَكَ مَالٌ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ مِنْ اَيِّ الْمَالِ قُلْتُ مِنْ كُلِّ الْمَالِ قَدْ اَعْطَانِيَ اللّٰهُ مِنَ الْاِبِلِ وَالْبَقَرِ وَالْغَنَمِ وَالْخَيْلِ وَالرَّقِيْقِ قَالَ فَاِذَا

اَتَاكَ اللّٰهُ مَالاً فَلْيُرَ اَثَرُ نِعْمَةِ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَكَرَامَتِهٖ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِىُّ وَفِىْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ۔

"اور حضرت ابوالاحوص اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں ایک دن رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوا کہ میرے بدن پر خراب وخستہ کپڑے تھے آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر مجھ سے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس مال ہے؟ میں نے عرض کیا ہر قسم کا مال ہے اللہ تعالیٰ، نے مجھے اونٹ گائیں اور بکریاں بھی عطا کی ہیں اور گھوڑا اور غلام بھی دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنا زیادہ مال دیا ہے تو اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمت کا اثر ظاہر ہو اور تمہیں اللہ نے جس عزت و عظمت سے نوازا ہے وہ عیاں ہو۔ (نسائی) اور شرح السنۃ نے اس روایت کو مصابیح کی روایت سے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے عبادت تو دونوں کی مختلف ہے لیکن دونوں کا مضمون ایک ہی ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنا کچھ دیا ہے اور تم اچھا لباس پہن سکتے ہو تو پھر تم اچھے کپڑے زیب تن کرو تاکہ لوگ جانیں کہ تم مال دار ہو اللہ کی نعمت کا اظہار کرنے کے لئے خوش پوشاکی اچھے، صاف ستھرے اور نئے کپڑے پہننے سے حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ وہ کپڑے اپنی حیثیت واستطاعت کے مطابق ہوں اور یہ کہ وہ تو اتنے باریک اور مہین ہوں جس کی ممانعت منقول ہے اور نہ اتنے زیادہ نفیس وعمدہ ہوں جس سے بیجا شان وشوکت کا اظہار ہو اسی طرح وہ کپڑے اوپر تلے یعنی ایک لباس کے اوپر دوسرا لباس نہ پہنا گیا ہو۔ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ لباس کے تئیں دونوں شہرتوں سے منع فرماتے تھے یعنی باریک کپڑے سے بھی اور موٹے کپڑے سے بھی اور سخت کپڑے سے بھی اور لمبے کپڑے سے بھی اور چھوٹے کپڑے سے بھی، الاّیہ کہ وہ کپڑا درمیانی درجہ کا ہو۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ کپڑے کی کہنگی یعنی کپڑے کا پرانا ہونا اور اس میں پیوند لگا ہوا ہونا ایک پسندیدہ محمود چیز ہے اور افعال ایمان میں سے ہے بشرطیکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے دنیا میں زہد وفقر اور تواضع وانکسار اختیار کرنے کے مخلصانہ جذبہ سے ہو، اور اگر حیثیت واستطاعت کے باوجود یہ (یعنی کپڑے کا پرانا وخستہ وپیوند لگا ہوا ہونا) بخل وخست کی بنا پر ہو گا تو اس کو قبیح ومذموم کہیں گے۔

مردوں کے لئے سرخ کپڑا پہننا حرام ہے

(۴۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ مَرَّ رَجُلٌ وَعَلَيْهِ ثَوْبَانِ اَحْمَرَانِ فَسَلَّمَ عَلَى النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص دو سرخ کپڑے پہنے ہوئے گزرا اور نبی کریم ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ حدیث صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مرد کو سرخ کپڑا پہننا حرام ہے نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جو شخص کسی ممنوع چیز کا مرتکب ہو اور وہ سلام کرے تو وہ سلام کا جواب دیئے جانے اور تکریم وتوقیر کئے جانے کا مستحق نہیں ہے! جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے ریشمی کپڑے پر بیٹھنا بھی صاحبینؒ اور تینوں اماموں کے نزدیک مکروہ ہے لیکن حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔

خوشبو کا مسئلہ

(۴۶) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ نَبِىَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا اَرْكَبُ الْاُرْجُوَانَ وَلَا اَلْبَسُ الْمُعَصْفَرَ وَلَا اَلْبَسُ الْقَمِيْصَ الْمُكَفَّفَ بِالْحَرِيْرِ وَقَالَ اَلَا وَطِيْبُ الرِّجَالِ رِيْحٌ لَا لَوْنَ لَهٗ وَطِيْبُ النِّسَاءِ لَوْنٌ لَا رِيْحَ لَهٗ۔ (ابوداؤد)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ میں ارغوانی یعنی سرخ رنگ کے ازین پوش پر سوار نہیں ہوتا نہ میں کسم کا رنگا ہوا کپڑا پہنتا ہوں اور نہ میں ایسا پیرہن (کرتا وغیرہ) پہنتا ہوں جس پر ریشمی سنجاف (یعنی ریشمی گوٹ وبیل وغیرہ) لگی ہوئی ہو۔ اور پھر فرمایا یاد رکھو! مرد جو خوشبو لگائیں وہ ایسی ہونی چاہئے جس میں مہک تو ہو رنگ نہ ہو جیسے گلاب اور عطر وغیرہ تاکہ رنگ دار خوشبو لگانے سے کپڑے رنگین نہ ہو جائیں، اور عورتیں جو خوشبو لگائیں وہ ایسی ہونی چاہئے جس میں رنگ تو ہو مہک نہ ہو جیسے زعفران و مہندی وغیرہ تاکہ ان کی مہک باہر نکل کر مردوں کے لئے فتنہ و ابتلاء کا سبب نہ بن جائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "اُرْجُوَان" (الف وجیم کے پیش اور راء کے سکون کے ساتھ) کے معنی ہیں سرخ رنگ کی ریشمی زین پوش مطلب یہ ہے کہ میں سواری کے کسی ایسے جانور پر نہیں بیٹھتا جس کی زین (پالان) کے اوپر سرخ ریشمی کپڑا پڑا ہو اور نہایہ میں یہ لکھا ہے کہ ارجوان اصل میں ارغوان کا معرب ہے اور ارغوان اس درخت کو کہتے ہیں جس کا پھول سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور جو رنگ اس پھول کے رنگ کے مشابہ ہوتا ہے جیسے نارنجی اس کو بھی ارجوان کہتے ہیں۔ اور قاموس میں یہ لکھا ہے کہ ارجوان سرخ رنگ کو کہتے ہیں، بہرحال ملا علی قاریؒ کے مطابق حدیث میں ارجوان سے مراد سرخ رنگ کا کپڑا ہے خواہ وہ ریشمی اور ہو یا غیر ریشمی اور گویا یہ ارشاد گرامی اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس حکم کو زیادہ سے زیادہ تاکید کے ساتھ واضح کر رہا ہے کہ مردوں کو سرخ رنگ کا لباس پہننے سے اجتناب کرنا چاہئے، کیونکہ اگرچہ سوار ہونے پر پہننے کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ جب سرخ رنگ کے زین پوش پر سوار ہونے سے اجتناب کرتے تھے تو سرخ رنگ کا کپڑا پہننے سے تو آپ ﷺ بطریق اولیٰ اجتناب کرتے ہوں گے۔

اور نہ میں ایسا پیرہن پہنتا ہوں......... کا مطلب یہ ہے کہ میں ایسا کرتا یا جبہ وغیرہ نہیں پہنتا جس میں ریشمی سنجاف چار انگشت سے زیادہ ہو یا یہ کہ یہ ارشاد گرامی تقویٰ اور احتیاط پر محمول ہے۔

"جس میں رنگ تو ہو مہک نہ ہو۔" کا مطب یہ ہے کہ عورت کو اپنے گھر سے باہر نکلتے وقت ایسی کوئی چیز استعمال کرنی درست نہیں ہے جس میں مہک اور خوشبو ہو ہاں...... گھر کے اندر رہتے ہوئے اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ حدیث میں خوشبو کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا ظاہری اسلوب بیان "خبر" کا ہے لیکن معنی میں امر یعنی حکم کے ہے جس کا مطلب یہ ہے جیسا کہ ترجمہ میں بھی واضح کیا گیا ہے کہ مرد جو خوشبو استعمال کریں اس میں رنگ کی آمیزش نہ ہونی چاہئے، اس کے برخلاف عورت جو خوشبو استعمال کرے اس میں مہک نہ ہونی چاہئے، اسی طرح شمائل ترمذی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ مردوں کی خوشبو ایسی چیز ہونی چاہئے جس سے مہک تو نکلتی ہو لیکن اس کا رنگ ظاہر نہ ہو اور عورتوں کی خوشبو ایسی چیز ہونی چاہئے جس کا رنگ تو ظاہر ہو لیکن اس سے مہک نہ نکلتی ہو۔ اس روایت کا مطلب بھی وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عورت گھر سے باہر نکلتے وقت کوئی ایسی چیز استعمال نہ کرے جس کی مہک پھیلتی ہو کیونکہ اگر یہ مطلب نہیں لیا جائے تو عبارت کا مفہوم اس لئے غیر واضح ہو جائے گا کہ کوئی بھی "خوشبو" بغیر مہک کے نہیں ہو سکتی اس صورت میں اس کی طرف "مہک" کی نسبت غیر ضروری اور بے فائدہ ہوگی اور اگر یہ کہا جائے کہ کچھ خوشبوئیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں بالکل مہک نہیں ہوتی اور عورتوں کے لئے ایسی ہی خوشبوؤں کا استعمال جائز کیا گیا ہے تو یہ بات بالکل غیر حقیقی اور غیر صحیح ہوگی۔

دس باتوں کی ممانعت

(۴۷) وَعَنْ اَبِیْ رَیْحَانَۃَ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ عَشْرٍ عَنِ الْوَشْرِ وَالْوَشْمِ وَالنَّتْفِ وَعَنْ مُکَامَعَۃِ الرَّجُلِ الرَّجُلَ بِغَیْرِ شِعَارٍ وَمُکَامَعَۃِ الْمَرْاَۃِ الْمَرْاَۃَ بِغَیْرِ شِعَارٍ وَاَنْ یَجْعَلَ الرَّجُلُ فِیْ اَسْفَلِ ثِیَابِہٖ حَرِیْرًا مِثْلَ الْاَعَاجِمِ اَوْ یَجْعَلَ عَلٰی مَنْکِبَیْہِ حَرِیْرًا مِثْلَ الْاَعَاجِمِ وَعَنِ النُّھْبٰی وَعَنْ رُکُوْبِ النُّمُوْرِ وَلُبُوْسِ الْخَاتَمِ اِلَّا لِذِیْ سُلْطَانٍ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوریحانہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے دس باتوں سے منع فرمایا ہے دانتوں کو تیز کرنے سے، جسم کے کسی حصہ کو گودنے سے، بال اکھاڑنے سے، مرد کو مرد کے ساتھ سونے سے اگر درمیان میں کپڑا حائل نہ ہو، اور آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ مرد اپنے کپڑے کے نیچے ریشم (کا استر) لگائے جیسا کہ عجمی لوگ لگاتے ہیں یا عجمی لوگوں کی طرح مونڈھوں پر ریشمی کپڑا لگائے اور آپ ﷺ نے کسی کا مال لوٹنے سے اور چیتے کی زین پر سونے سے منع فرمایا نیز آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص مہر والی انگوٹھی پہنے الا یہ کہ وہ صاحب حکومت ہو۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: عرب میں یہ دستور تھا کہ بوڑھی عورتیں، جوان عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اپنے دانت کے کناروں کو تیز اور باریک کیا کرتی تھیں لہٰذا آپ ﷺ نے اس نے منع فرمایا۔ اسی طرح ایک رواج یہ بھی تھا کہ عورتیں اپنے جسم کے بعض حصوں کو سوئی سے گود کر اس میں نیل یا سرمہ بھر دیتی تھیں (جیسا کہ ہمارے یہاں بھی بعض غیر مسلم میں یہ دستور ہے کہ جسم کے کسی حصہ خاص طور سے ہاتھ پر نام وغیرہ گودتے ہیں) آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا۔ بال اکھاڑنے سے منع فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ آرائش و زینت کی خاطر داڑھی اور سر کے سفید بال چننا ممنوع ہے یا یہ کہ عورتوں کا اپنے چہرہ یعنی پیشانی کے بال چننا ممنوع ہے۔ ان چیزوں کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اول تو ان سے اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تغیر کرنا لازم آتا ہے دوسرے یہ چیزیں آرائش و زینت کے لئے بے جا اور برے قسم کے تکلفات کا مرتکب ہونے کا باعث ہیں اگرچہ زیب و زینت اختیار کرنا عورتوں کے لئے جائز ہے مگر اس طرح کے مذموم تکلفات ان کے لئے بھی ممنوع ہیں۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "بال اکھاڑنے" سے مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ و مصیبت کے وقت شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے سر اور داڑھی کے بال نوچنا ممنوع ہے۔

"مرد کا مرد کے ساتھ سونے...... الخ" کا مطلب حدیث کے ظاہری مفہوم کے مطابق تو یہی ہے کہ دو مرد ایک کپڑے (یعنی ایک چادر و لحاف وغیرہ میں) اس طرح سوئیں کہ دونوں بالکل ننگے ہوں، یا ان کے صرف ستر ڈھکے ہوئے ہوں تو یہ بالکل ممنوع ہے یا یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس ممانعت کا تعلق صرف اس صورت سے ہو جب کہ دونوں کے ستر بھی ڈھکے ہوئے نہ ہوں، یہی دونوں احتمال عورتوں کے بارے میں بھی ہیں! اگر وہ عورتوں کا باہم اس طرح سونا کسی فتنہ و شرانگیزی کا خوف رکھتا ہو تو اس صورت میں بالکل صاف بات یہ ہے کہ یہ قطعاً ممنوع ہوگا اور اگر کسی فتنہ و شرانگیزی کا خوف نہ ہو تب بھی یہ صورت تہذیب و شائستگی اور ادب و اخلاق کے منافی اور بے حیائی و بے شرمی کی غماز تو بہر حال ہو ہی گی۔

مرد اپنے کپڑے کے نیچے ریشم کا استر لگائے کا مطلب یہ ہے کہ ریشم کا کپڑا پہننا مرد کے لئے قطعاً حرام ہے خواہ وہ کپڑا ایسے لباس کی صورت میں کیوں نہ ہو کہ اس کے اوپر کا حصہ سوتی اور اس کا استر ریشمی ہو یا اس کے اوپر کا حصہ تو ریشمی ہو اور اس کا استر سوتی ہو چنانچہ صحیح قول یہی ہے۔

"مونڈھوں پر ریشمی کپڑا لگانے" کا مطلب یہ ہے کہ کرتے یا جبہ وغیرہ کے مونڈھوں پر بطور سنجاف (بیل) ریشمی کپڑا لگانا یا ریشم کا کام کرنا ایسی صورت میں جائز ہے جب کہ اس کی مقدار چار انگشت تک ہو، چار انگشت سے زائد کی صورت میں ممنوع ہوگا، نیز ہو سکتا ہے کہ اس جملہ سے یہ مراد ہو کہ کاندھوں پر دوپٹے کی طرح ازراہ تکبر و اتراہٹ ریشمی کپڑا ڈالنا ممنوع ہے۔

چیتے کی کھال کی زین پر سوار ہونے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس میں متکبرین کی مشابہت ہے۔ بعض مشائخ نے کہا ہے کہ چوپایوں اور درندوں کی کھال پر بیٹھنے سے ان چوپایوں و درندوں کی خاصیتیں جیسے وحشت و درندگی وغیرہ سرایت کر جاتی ہیں۔

"الا یہ کہ وہ صاحب حکومت ہو" یعنی جیسے بادشاہ، قاضی اور حاکم وغیرہ۔ حاصل یہ کہ مہر والی انگوٹھی کو بلا ضرورت کے محض زینت کی خاطر پہننا مکروہ تنزیہی ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے بایں دلیل کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے خلفاء کے زمانہ میں صحابہؓ مہر والی انگوٹھی پہنا کرتے تھے اور کوئی اس کو خلاف نہیں کہتا تھا۔

مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی اور ریشمی کپڑا حرام ہے

(۴۸) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهَانِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ خَاتَمِ الذَّهَبِ وَعَنْ لُبْسِ الْقَسِّيِّ وَالْمَيَاثِرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِي رِوَايَةٍ لِاَبِي دَاؤُدَ قَالَ نَهٰى عَنْ مَيَاثِرِ الْاُرْجُوَانِ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو سونے کی انگوٹھی اور قسی کے پہننے سے اور میاثر استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ) اور ابوداؤد کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت علیؓ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ارغوانی یعنی سرخ میاثر استعمال کرنے سے منع فرمایا۔"

تشریح: مردوں کو سونے کی انگوٹھی پہننا چاروں اماموں کے نزدیک حرام ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بعض صحابہؓ جیسے حضرت طلحہؓ حضرت سعدؓ اور حضرت صہیبؓ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے سونے کی انگوٹھی پہنی تھی تو اس کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب کہ یہ حرمت نافذ نہیں ہوئی تھی۔

"قسی" اصل میں اس کپڑے کو کہا جاتا تھا جو مصر کے ایک شہر "قس" میں تیار ہوتا تھا۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "قسی" ایک خاص قسم کے کپڑے کو کہا جاتا تھا جس میں ریشمی دھاریاں ہوتی تھیں، اس صورت میں اس ممانعت کا تعلق احتیاط و تقوی کی بناء پر نہی تنزیہی سے ہوگا۔ اور حضرت ابن مالکؒ نے کہا ہے کہ مذکورہ ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ وہ کپڑا یا تو پوری طرح کا ریشم کا ہو یا اس کے بانے میں ریشم ہو اس صورت میں یہ ممانعت نہی تحریمی کے طور پر ہوگی اور طیبیؒ نے یہ کہا ہے کہ "قسی" جس کپڑے کو کہتے تھے وہ کتان کا ہوتا تھا جس میں ریشم بھی مخلوط ہوتا تھا۔

"میاثر" مثیر کی جمع ہے جو "سرخ رنگ کے زین پوش" کو کہتے ہیں اور وہ عام طور پر ریشمی ہوتا تھا چنانچہ اس ممانعت کا تعلق بھی اس صورت سے ہوگا جب کہ وہ ریشمی ہو، تاہم یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس ممانعت کا تعلق اس کے سوتی ہونے کی صورت سے بھی ہو اس صورت میں یہ ممانعت اسکے بیجا قسم کی شان و شوکت اور اتراہٹ و تکبر میں مبتلا لوگوں کی مشابہت کے مظہر ہونے کی وجہ سے نہی تنزیہی کے طور پر ہوگی۔

خز اور چیتے کی کھال کے زین پوش پر سوار ہونے کی ممانعت

(۴۹) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَرْكَبُوا الْخَزَّ وَلَا النِّمَارَ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تم لوگ خز اور چیتے کی کھال کے زین پوش پر سوار نہ ہوا کرو۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "خز" پچھلے زمانہ میں اس کپڑے کو کہتے تھے جو اون اور ریشم ملا کر بنا جاتا تھا اور ایک طرح کے خالص ریشمی کپڑے کو بھی خز کہتے ہیں، چنانچہ اگر "خز" سے وہ کپڑا مراد ہو جس میں اون اور ریشم دونوں ہوتے تھے تو ان عجمیوں کی مشابہت کی بنیاد پر جو از راہ تکبر خز کو زین پر ڈالتے تھے یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہوگی کیونکہ اس خز کا پہننا مباح ہے، چنانچہ صحابہؓ اور تابعینؒ اس کو پہنا کرتے تھے۔ اور اگر خز سے مراد خالص ریشمی کپڑا ہو تب یہ ممانعت نہی تحریمی یعنی حرمت کے طور پر ہوگی۔ واضح رہے کہ ایک دوسری روایت میں جو آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے کہ آخر زمانہ میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو خز اور حریر (ریشمی لباس) کو حلال جانیں گے تو اس میں "خز" سے وہی خالص ریشمی کپڑا مراد ہے۔ چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ زمانہ نبوت میں اس کپڑے (یعنی وہ خز جو خالص ریشم کا ہوتا ہے کا وجود نہیں تھا اس صورت میں یہ ارشاد گرامی آپ ﷺ کے معجزہ پر محمول ہوگا کہ آپ ﷺ نے ایک ایسے کپڑے کے بارے میں آگاہ کیا جو بہت بعد

کے زمانہ میں وجود پزیر ہونے والا تھا۔

سرخ زین پوش کی ممانعت

⑩ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنِ الْمِیْثَرَةِ الْحَمْرَاءِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت براء ابن عازبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سرخ زین پوش سے منع فرمایا ہے۔" (شرح السنۃ)

آنحضرت ﷺ کے بالوں کی سفیدی

⑪ وَعَنْ اَبِیْ رِمْثَةَ التَّیْمِیِّ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْهِ ثَوْبَانِ اَخْضَرَانِ وَلَهٗ شَعْرٌ قَدْ عَلَاهُ الشَّیْبُ وَشَیْبُهٗ اَحْمَرُ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ، وَفِیْ رِوَایَةٍ لِاَبِیْ دَاؤدَ وَهُوَ ذُوْ وَفْرَةٍ وَبِهَا رَدْعٌ مِنْ حِنَّاءٍ۔

"اور حضرت ابورمثہ تیمیؓ کہتے ہیں کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کے بدن پر دو سبز کپڑے تھے یعنی آپ ﷺ نے جو دو کپڑے پہن رکھے تھے وہ یا تو خالص سبز رنگ کے تھے یا ان میں سبز رنگ کی دھاریاں تھیں اور آنحضرت ﷺ کے سر اور داڑھی کے تھوڑے ہی بالوں پر بڑھاپے (یعنی سفیدی) کا غلبہ تھا، نیز آپ کا بڑھاپا سرخ تھا۔ (ترمذیؒ) اور ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ وفرہ والے تھے اور ان (بالوں) میں مہندی کا رنگ تھا۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کے سفید بالوں کی مقدار کے بارے میں مختلف روایتیں منقول ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے سر اور داڑھی کے سفید بالوں کو گنا تو وہ چودہ سے زیادہ نہیں تھے۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر بڑھاپے کا اثر تقریباً بیس سفید بالوں سے زیادہ نہیں تھا، اس طرح ایک روایت میں سترہ کی تعداد آئی ہے۔

"وفرہ" اصل میں سر کے ان بالوں کو کہتے ہیں جو کانوں کی لو تک ہوں لہٰذا آنحضرت ﷺ وفرہ والے تھے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے سر کے بال کان کی لو تک تھے۔

آپ ﷺ کا بڑھاپا سرخ تھا کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے جو چند بال ان پر آپ ﷺ مہدی کا خضاب کئے ہوئے تھے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ سرخ بڑھاپے سے مراد یہ ہے کہ وہ چند بال بھی بالکل سفید نہیں تھے بلکہ مائل بہ سرخی تھے جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب بال سفید ہونے لگتے ہیں تو وہ پہلے بھورے ہوتے ہیں اور پھر سفید ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک آنحضرت ﷺ کے خضاب کرنے کا تعلق ہے تو اس بارے میں محدثین اور فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خضاب کیا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اکثر محدثین یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے خضاب نہیں کیا ہے اور نہ آپؐ کا بڑھاپا سفید بالوں کی اس حد تک پہنچا تھا کہ آپ ﷺ کو خضاب کرنے کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے پھر آپ ﷺ کے جو چند بال سفید تھے ان کی بھی صورت یہ تھی کہ اگر آپ ﷺ سر کو تیل لگاتے تو ان بالوں کی سفیدی ظاہر نہیں ہوتی تھی اور جب سر بغیر تیل کے ہوتا تو وہ سفید بال ظاہر رہتے! اس کے برخلاف فقہاء اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ خضاب لگاتے تھے اس کی تفصیل فقہی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ محدثین اس حدیث کے بارے میں جو اوپر نقل ہوئی ہے یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جو چند بال سفید تھے آپ ﷺ صرف انہی پر خضاب کرتے تھے، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ ان بالوں پر بھی قصداً خضاب نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ آنحضرت ﷺ اپنے بالوں کو دھونے اور ان کو صاف کرنے کے لئے کبھی کبھی سر میں مہندی ڈال لیا کرتے تھے اسی کی وجہ سے وہ سفید بال رنگین ہو جاتے تھے۔ ایک روایت میں جو یہ منقول ہے کہ حضرت انسؓ کے پاس آنحضرت ﷺ کا جو موئے مبارک تھا وہ (دیکھنے والوں کو) ایسا نظر آتا تھا جیسے اس پر مہدی

کا خضاب کیا گیا ہو تو اس کے بارے میں محدثین یہ کہتے ہیں کہ بیشک اس بال پر خضاب کا اثر تھا لیکن وہ خضاب آنحضرت ﷺ نے نہیں کیا تھا بلکہ اس کی حقیقت یہ تھی کہ حضرت انسؓ چونکہ ادب و تعظیم و تبرک کے طور پر اس بال کو خوشبوؤں میں ڈال کر رکھتے تھے اس لئے وہ ان خوشبوؤں کے رنگ کے اثر سے خضاب کے مشابہ نظر آتا تھا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود حضرت انسؓ نے اس بال کی حفاظت و مضبوطی کے لئے اس پر خضاب کر دیا ہو۔ اسی طرح بعض روایت میں جو یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی سرخ خضاب کرتے تھے اور کبھی زرد، تو اس کی حقیقت بھی یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنی ریش مبارک کو صفائی و ستھرائی کے لئے مہدی کے ساتھ دھوتے تھے اور کبھی زعفران کے ساتھ چنانچہ ریش مبارک کے بال جو بذات خود سیاہ تھے اس طرح دھوئے جانے کی وجہ سے رنگین ہو جاتے تھے۔

قطری چادر کا ذکر

(۵۲) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاكِيًا فَخَرَجَ يَتَوَكَّأُ عَلٰى أُسَامَةَ وَعَلَيْهِ ثَوْبُ قِطْرٍ قَدْ تَوَشَّحَ بِهٖ فَصَلّٰى بِهِمْ۔ (رواه فی شرح السنة)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی بیماری کے زمانہ میں اس حالت میں باہر (مسجد میں) تشریف لائے کہ اسامہؓ پر سہارا دیئے ہوئے تھے اور بدن مبارک پر قطر کا کپڑا تھا جس کو آپ ﷺ نے بدھی کی طرح لپیٹ رکھا تھا اور پھر آپ ﷺ نے صحابہؓ کو نماز پڑھائی۔" (شرح السنة)

تشریح: "قطر" ایک قسم کی چادر کو کہتے ہیں جس میں سرخ رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں اور اس کا کپڑا کچھ کھرا کھرا ہوتا ہے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جس کپڑے کا ذکر کیا گیا ہے وہ "قطر" کا تھا جو بحرین کے علاقہ میں ایک بستی کا نام ہے اسی مناسبت سے اس کپڑے کو "قطری" کہا گیا ہے۔ حضرت انسؓ نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے یہ اس وقت کا ہے جب آپ ﷺ مرض الموت میں مبتلا تھے چنانچہ حضرت ﷺ کی آخری نماز تھی جو آپ ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ مسجد نبوی میں ادا کی روایت میں منقول ہے کہ اس وقت حضرت ابوبکرؓ صحابہؓ کو نماز پڑھانا شروع کر چکے تھے کہ آنحضرت ﷺ مرض اور نقاہت کی وجہ سے حضرت اسامہؓ کا سہارا لئے ہوئے حجرہ مبارک سے نکل کر مسجد میں تشریف لائے اور حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ گئے اور نماز پڑھائی، چنانچہ اس واقعہ کی پوری تفصیل کتاب الصلوۃ کے باب الامامت میں گزر چکی ہے۔

ایک یہودی کی شقاوت کا ذکر

(۵۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَوْبَانِ قِطْرِيَّانِ غَلِيْظَانِ وَكَانَ اِذَا قَعَدَ فَعَرِقَ ثَقُلَا عَلَيْهِ فَقَدِمَ بَزٌّ مِنَ الشَّامِ لِفُلَانٍ الْيَهُوْدِيِّ فَقُلْتُ لَوْ بَعَثْتَ اِلَيْهِ فَاشْتَرَيْتَ مِنْهُ ثَوْبَيْنِ اِلَى الْمَيْسَرَةِ فَاَرْسَلَ اِلَيْهِ فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُ مَا تُرِيْدُ اِنَّمَا تُرِيْدُ اَنْ تَذْهَبَ بِمَالِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَبَ قَدْ عَلِمَ اَنِّيْ مِنْ اَتْقَاهُمْ وَآدَاهُمْ لِلْاَمَانَةِ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک زمانہ میں نبی کریم ﷺ کے جسم مبارک پر جو "دو کپڑے تھے وہ قطر کے تھے" اور بہت زیادہ موٹے تھے چنانچہ جب آپ ﷺ زیادہ دیر تک بیٹھتے اور پسینہ آتا تو وہ کپڑے آپ ﷺ کے بدن پر بھاری ہو جاتے جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو تکلیف اٹھانی پڑتی آخر کار ایک دن جب کہ فلاں یہودی کے ہاں جس کا نام یہاں ذکر نہیں کیا گیا ہے شام سے کپڑا آیا ہوا تھا تو میں نے عرض کیا کہ اگر آپ ﷺ کسی شخص کو اس یہودی کے پاس بھیج دیتے جو اس سے بوعدۂ فراغت یعنی اس وعدہ پر کہ جب کہیں سے کچھ آجائے گا تو قیمت ادا کر دی جائے گی دو کپڑے خرید لیتا تو اچھا ہوتا تا کہ آپ ﷺ اس تکلیف سے بچ جائیں جو ان کپڑوں کی وجہ سے

اٹھانا پڑ رہی ہے آنحضرت ﷺ نے میرے اس مشورہ کو قبول فرمالیا اور کسی شخص کو مذکورہ وعدہ پر کپڑا خریدنے کے لئے اس یہودی کے پاس بھیج دیا اس شخص نے یہودی کے پاس پہنچ کر جب کپڑا مانگا تو اس نے کہا کہ تمہارا جو ارادہ ہے اس کو میں جانتا ہوں تم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے کہ اس وقت تو وعدہ پر میرا کپڑا لے جاؤ اور پھر بعد میں قیمت ادا کرنے سے انکار کر دو بظاہر ان الفاظ کا مخاطب وہ شخص تھا، لیکن حقیقت میں اس کا خطاب آنحضرت ﷺ سے تھا، پھر اس شخص نے واپس آکر جب آنحضرت ﷺ سے یہودی کا قول نقل کیا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس یہودی نے جھوٹ بولا ہے، اور وہ خود بھی جانتا ہے کہ اس نے بالکل جھوٹ بات اپنی زبان سے نکالی ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ (تورات کے ذریعہ) یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ متقی و پرہیز گار ہوں اور ان سے زیادہ اچھی طرح امانت ادا کرنے والا ہوں۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے موٹا کپڑا پہنا لیکن جب اس کپڑے کی وجہ سے آپ ﷺ کو تکلیف ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنی راحت اور آسودگی کی خاطر دوسرے کپڑے قرض خریدنے کا ارادہ فرمایا اسی طرح اس حدیث سے اس یہودی کی شقاوت بھی ظاہر ہوئی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے تئیں کس قدر بغض و نفرت کا شکار تھا۔

مرد کو کسم کا رنگا ہوا کپڑا پہننا ممنوع ہے

(۵۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ رَاٰنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيَّ ثَوْبٌ مَصْبُوْغٌ بِعُصْفُرٍ مُوَرَّدًا فَقَالَ مَاهٰذَا فَعَرَفْتُ مَاكَرِهَ فَانْطَلَقْتُ فَاَحْرَقْتُهٗ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاصَنَعْتَ بِثَوْبِكَ قُلْتُ اَحْرَقْتُهٗ قَالَ اَفَلَا كَسَوْتَهٗ بَعْضَ اَهْلِكَ فَاِنَّهٗ لَابَاْسَ بِهٖ لِلنِّسَاءِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو ابن عاصؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے مجھ کو کسم کا رنگا ہوا گلابی رنگ کا کپڑا پہنے ہونے دیکھا تو فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ میں اس ارشاد گرامی سے سمجھ گیا کہ آپ ﷺ نے میرے اس کپڑے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے چنانچہ میں فوراً گیا اور اپنے اس کپڑے کو جلا ڈالا، پھر جب میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو) آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم نے اپنے اس کپڑے کا کیا کیا؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے اس کو جلا ڈالا، آپ ﷺ نے فرمایا تم نے اس کپڑے کو اپنی کسی عورت کو کیوں نہیں پہنا دیا کیونکہ عورتوں کے لئے اس قسم کے کپڑے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ)

سرخ دھاری دار چادر کا ذکر

(۵۵) وَعَنْ هِلَالِ بْنِ عَامِرٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِنًى يَخْطُبُ عَلٰى بَغْلَةٍ وَعَلَيْهِ بُرْدٌ اَحْمَرُ وَعَلِيٌّ اَمَامَهٗ يُعَبِّرُ عَنْهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت بلال ابن عامر اپنے والد سے نقل کرتے ہیں، کہ انہوں نے کہا، میں نے رسول کریم ﷺ کو منیٰ میں خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے دیکھا اس وقت آپ ﷺ خچر پر سوار تھے اور جسم مبارک پر سرخ (ادھاریوں کی) چادر تھی، نیز حضرت علیؓ آپ ﷺ کے سامنے کھڑے تھے جو آپ ﷺ کے الفاظ لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: چونکہ اس موقع پر لوگوں کا بہت زیادہ ہجوم تھا اور آنحضرت ﷺ کی آواز مبارک مجمع میں دور والوں تک نہیں پہنچ رہی تھی اس لئے حضرت علیؓ آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے الفاظ بلند آواز میں دوہرا کر لوگوں کو سمجھاتے جاتے تھے۔

سیاہ چادر کا ذکر

(۵۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صُنِعَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُرْدَةٌ سَوْدَاءُ فَلَبِسَهَا فَلَمَّا عَرِقَ فِيْهَا وَجَدَ رِيْحَ

الصُّوْفِ فَقَذَفَهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے لئے سیاہ چادر تیار کی گئی جس کو آپ ﷺ نے استعمال فرمایا لیکن جب اس کی وجہ سے پسینہ آیا اور اس میں سے اون کی بو نکلنے لگی تو آپ ﷺ نے الطافت طبع کی ناگواری کی بنا پر اس چادر کو پھینک دیا!۔" (ابوداؤد)

آنحضرت ﷺ کے گوٹ مار کر بیٹھنے کا ذکر

(۵۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُحْتَبٍ بِشَمْلَةٍ قَدْ وَقَعَ هُدْبُهَا عَلٰی قَدَمَیْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ ﷺ ایک چادر کے ذریعہ گوٹ مارے ہوئے بیٹھے تھے اور اس چادر کے کنارے آپ ﷺ کے قدموں پر پڑے ہوئے تھے!۔" (ابوداؤد)

تشریح: گوٹ مار کر بیٹھنا اس نشست کو کہتے ہیں جس میں کولھے زمین پر ٹیک کو دونوں گھٹنے کھڑے کر لیتے ہیں اور سہارے کے لئے دونوں ہاتھ یا کوئی کپڑا گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر لیتے ہیں۔

عورتیں باریک کپڑا کس طرح پہنیں

(۵۸) وَعَنْ دِحْیَةَ بْنِ خَلِیْفَةَ قَالَ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِقَبَاطِیَّ فَاَعْطَانِیْ مِنْهَا قُبْطِیَّةً فَقَالَ اصْدَعْهَا صَدْعَیْنِ فَاقْطَعْ اَحَدَهُمَا قَمِیْصًا وَاَعْطِ الْاٰخَرَ اِمْرَاَتَكَ تَخْتَمِرُ بِهٖ فَلَمَّا اَدْبَرَ قَالَ وَاْمُرْ اِمْرَاَتَكَ اَنْ تَجْعَلَ تَحْتَهٗ ثَوْبًا لَا یَصِفُهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت دحیہ ابن خلیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کے پاس قبطی کپڑے آئے تو آپ ﷺ نے اس میں سے ایک قبطی کپڑا مجھ کو عطا کیا اور فرمایا کہ اس کو پھاڑ کو دو ٹکڑے کر لینا، ان میں سے ایک کا کرتہ بنا لینا اور دوسرا اپنی عورت کو دے دینا وہ اس کا دوپٹہ بنا لے گی۔ پھر جب دحیہؓ یعنی میں واپس ہونے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اور اپنی عورت کو ہدایت کر دینا کہ اس قبطی کپڑے کے نیچے ایک اور کپڑا لگا لے تاکہ اس کپڑے کے باریک ہونے کی وجہ سے اس کے بال اور جسم نظر نہ آئے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "قباطی" اصل میں "قبطیہ" کی جمع ہے، قبطیہ ایک خاص قسم کے کپڑے کو کہتے ہیں جو سفید اور مہین ہوتا تھا اور مصر میں بنا کرتا تھا، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر عورت کوئی ایسا کپڑا پہننا چاہے جس کے نیچے بدن جھلکتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ خالی وہی کپڑا نہ پہنے بلکہ کپڑے کے نیچے کوئی اور کپڑا لگا لے تاکہ اس کا بدن نہ جھلکے۔

دوپٹہ کا سر پر ایک ہی پیچ ڈالنا کافی ہے

(۵۹) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَیْهَا وَهِیَ تَخْتَمِرُ فَقَالَ لَیَّةً لَا لَیَّتَیْنِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت اُم سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو وہ اس وقت دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ دوپٹہ کا ایک ہی پیچ سر پر ڈال لیتیں دوسرے پیچ کی ضرورت نہیں تھی۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ تھا کہ دوپٹہ کا سر پر اور گلے کے نیچے ایک ہی پھیر ڈالا کرو دو پھیر نہ دو تاکہ اسراف لازم نہ آئے اور مردوں کے عمامہ کی مشابہت بھی نہ ہو اور یہ بھی محتمل ہے بلکہ یہی زیادہ صحیح ہے کہ یہاں پیچ سے مراد سر پر کپڑا لپیٹنا ہو، جیسا کہ پچھلے زمانہ کی عرب عورتوں کا دستور تھا کہ وہ اپنے سر کو عصابہ (عورتوں کے سر پر باندھنے کا ایک خاص قسم کا رومال) کی طرح کپڑے لپیٹے رہا کرتی تھیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے واضح فرمایا کہ دوپٹہ کا بس ایک پیچ کافی ہے، دوپٹہ کو سر پر زیادہ نہ لپیٹو تاکہ اسراف کی صورت بھی پیدا نہ ہو اور

مردوں کی پگڑی کی مشابہت بھی لازم نہ آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ مردوں جیسا لباس پہنیں اور ان کی مشابہت اختیار کریں جس طرح کہ مردوں کیلئے عورتوں جیسا لباس پہننا اور عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ازار کا نصف ساق تک ہونا پسندیدہ ہے

(۶۰) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَرَرْتُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَفِیْ اِزَارِیْ اُسْتِرْخَاءٌ فَقَالَ یَا عَبْدَاللّٰہِ اُرْفَعْ اِزَارَكَ فَرَفَعْتُہٗ ثُمَّ قَالَ زِدْ فَزِدْتُ فَمَازِلْتُ اَتَحَرَّاھَا بَعْدُ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ اِلٰی اَیْنَ قَالَ اِلٰی اَنْصَافِ السَّاقَیْنِ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کے قریب سے گزرا، اس وقت میرا تہبند لٹکا ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عبداللہ! اپنا تہبند اونچا کرو۔ میں نے تھوڑا سا اونچا کر لیا، آپ ﷺ نے فرمایا اور اونچا کرو۔ میں نے اور اونچا کر لیا پھر حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ اس حکم کے بعد میں برابر عمل (یعنی تہبند کو اونچا کرتے رہنے) کی طرف متوجہ رہتا ہوں، بعض لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ ﷺ اپنے تہبند کو کتنا اونچا رکھتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ "آدھی پنڈلیوں تک۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اتحراھا" کی ضمیر اصل میں فعلۃ جو محذوف ہے کی طرف راجع ہے چنانچہ ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے لیکن بظاہر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ضمیر رفعۃ اخیرہ کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ میں ہمیشہ اس بات کی طرف متوجہ رہتا ہوں کہ میرا تہبند آنحضرت ﷺ کی منشاء کے مطابق اونچا ہے۔ بہرحال مطلب دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

ٹخنوں سے نیچے ازار کے لٹکنے کی حرمت کی اصل تکبر و غرور ہے

(۶۱) وَعَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ جَرَّ ثَوْبَہٗ خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰہُ اِلَیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِزَارِیْ یَسْتَرْخِیْ اِلَّا اَنْ اَتَعَاھَدَہٗ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّكَ لَسْتَ مِمَّنْ یَفْعَلُہٗ خُیَلَاءَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ازراہ تکبر اپنا تہبند یا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹکائے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت کی نظر نہیں اٹھائے گا یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا، کہ یارسول اللہ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے کہ میرے قصد و ارادہ کے بغیر میرا تہبند لٹک جاتا ہے اور ٹخنوں تک یا ٹخنوں سے نیچے پہنچ جاتا ہے الایہ کہ میں ہمہ وقت اس کا دھیان رکھوں یعنی اگر میں ہر وقت اس طرف متوجہ رہوں تو یقیناً کسی بھی وقت میرا تہبند نیچے نہیں لٹک سکتا لیکن بعض شرعی یا طبعی رکاوٹوں کی وجہ سے اس کی طرف ہر وقت دھیان رکھنا ممکن نہیں ہے تو ایسی صورت میں میرے لئے کیا حکم ہے؟ رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں جو ازراہ تکبر اپنا تہبند یا پاجامہ لٹکاتے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تہبند یا پاجامہ کا بغیر قصد و ارادہ کے لٹکنا شرعی طور پر نقصان دہ نہیں ہے خاص طور سے اس شخص کے حق میں جو غرور و تکبر سے دور رہتا ہے لیکن افضل یہی ہے کہ بہر صورت متابعت ہی کو اختیار کیا جائے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تہبند و پاجامہ کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کی حرمت کی اصل تکبر ہے۔

اگر تہبند آگے سے لٹکا ہوا ہو لیکن پیچھے سے اٹھا ہوا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں

(۶۲) وَعَنْ عِکْرِمَۃَ قَالَ رَاَیْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ یَاْتَزِرُ فَیَضَعُ حَاشِیَۃَ اِزَارِہٖ مِنْ مُقَدَّمِہٖ عَلٰی ظَھْرِ قَدَمِہٖ وَیَرْفَعُ مِنْ مُؤَخَّرِہٖ

قُلْتُ لِمَ تَأْتَزِرُ هٰذِهِ الْإِزْرَةَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتَزِرُهَا۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کو اس طرح تہبند باندھے ہوئے دیکھا کہ وہ اس تہبند کے آگے کا کنارہ تو اپنے پیروں کے اوپر تک رکھتے اور اس کے پیچھے کا کنارہ ٹخنوں سے اونچا رکھتے تھے، میں نے یہ دیکھ کر حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ آپ بھی کبھی اس طرح تہبند کیوں باندھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ بھی کبھی کبھی اس طرح تہبند باندھا کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ تہبند و پاجامہ آگے کی طرف تو لٹکا رہے لیکن پیچھے کی طرف سے ٹخنوں سے اوپر اٹھا رہے تو عدم اسبال یعنی ٹخنوں سے نیچے نہ لٹکانے کے حکم کی تعمیل کے لئے کافی ہے۔

عمامہ باندھنے کا حکم

(۶۳) وَعَنْ عُبَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِالْعَمَائِمِ فَإِنَّهَا سِيمَاءُ الْمَلَائِكَةِ وَارْخُوْهَا خَلْفَ ظُهُوْرِكُمْ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عبادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم عمامہ پگڑی باندھنا ضروری سمجھو کیونکہ عمامے فرشتوں کی علامت ہیں (بایں طور کہ بدر کی جنگ کے موقعہ پر جو فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لئے نازل ہوئے تھے وہ عمامہ باندھے ہوئے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ الٰافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ) اور عمامہ کے شملہ کو اپنی پشت پر چھوڑ دو کیونکہ ملائکہ بھی اسی ہیئت سے آئے تھے۔" (بیہقی فی شعب الایمان)

بدن کا باریک کپڑے کے نیچے جھلکنا بدن کے برہنہ ہونے کے برابر ہے

(۶۴) وَعَنْ عَائِشَةَ عَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِیْ بَكْرٍ دَخَلَتْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهَا ثِيَابٌ رِقَاقٌ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَقَالَ يَا اَسْمَاءُ اِنَّ الْمَرْاَةَ اِذَا بَلَغَتِ الْمَحِيْضَ لَنْ يَّصْلُحَ اَنْ يُّرٰى مِنْهَا اِلَّا هٰذَا وَهٰذَا وَاَشَارَ اِلٰى وَجْهِهٖ وَكَفَّيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن اسماء بنت ابوبکرؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں اس حالت میں آئیں کہ ان کے بدن پر باریک کپڑے تھے، آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا کہ اسماءؓ! عورت جب ایام حیض کو پہنچ جائے یعنی (جب وہ بالغ ہو جائے) تو یہ ہرگز درست نہیں ہے کہ اس کے جسم کا کوئی عضو دیکھا جائے علاوہ اس کے اور اس کے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنے چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عورت کے لئے شرعی پردہ کی حد یہی ہے کہ وہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ باقی اعضاء کو ڈھانکے لیکن شرم و حجاب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس حالت میں بھی گھر سے باہر نکل کر مردوں کے سامنے نہ آئے کہ اس کا پورا بدن علاوہ چہرے اور ہاتھوں کے چھپا ہوا ہو بلکہ اگر باہر نکلنا ضروری ہو تو چہرے اور ہاتھوں کو بھی چھپائے رکھے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر عورت نے کوئی ایسا باریک کپڑا پہن رکھا ہو جس کے نیچے اس کا بدن جھلک رہا ہو تو وہ برہنہ کے حکم میں ہوگی۔

نیا کپڑا پہنو تو خدا کی حمد و ثنا کرو

(۶۵) وَعَنْ اَبِیْ مَطَرٍ قَالَ اِنَّ عَلِيًّا اشْتَرٰى ثَوْبًا بِثَلَاثَةِ دَرَاهِمَ فَلَمَّا لَبِسَهٗ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنِیْ مِنَ الرِّيَاشِ مَا

اَتَجَمَّلُ بِهٖ فِي النَّاسِ وَاُدَوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابو مطرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت علیؓ نے ایک کپڑا تین درہم کے عوض خریدا اور جب اس کو پہنا تو کہا تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں جس نے مجھ کو زینت والے اسباب میں سے وہ چیز عطا کی جس کے ذریعہ ہم لوگوں کے سامنے اپنی آرائش بھی کرتے ہیں اور ستر بھی چھپاتے ہیں پھر حضرت علیؓ نے کہا کہ اسی طرح میں نے رسول کریم ﷺ کو بھی کپڑے پہننے کے بعد یہ حمد وثنا کرتے ہوئے سنا ہے۔"

(احمدؒ)

(۶۶) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ لَبِسَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ثَوْبًا جَدِيْدًا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ مَا اُوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ وَاَتَجَمَّلُ بِهٖ فِيْ حَيَاتِيْ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ لَبِسَ ثَوْبًا جَدِيْدًا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ مَا اُوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ وَاَتَجَمَّلُ بِهٖ فِيْ حَيَاتِيْ ثُمَّ عَمَدَ اِلَى الثَّوْبِ الَّذِيْ اَخْلَقَ فَتَصَدَّقَ بِهٖ كَانَ فِيْ كَنَفِ اللّٰهِ وَفِيْ حِفْظِ اللّٰهِ وَفِيْ سَتْرِ اللّٰهِ حَيًّا وَمَيِّتًا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر ابن خطابؓ نے نیا کپڑا پہنا تو یہ کہا۔ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے وہ کپڑا پہننے کو دیا جس کے ذریعہ میں اپنا ستر بھی چھپاتا ہوں اور اپنی زندگی میں لوگوں کے سامنے اپنی آرائش بھی کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص نیا کپڑا پہننے کے بعد یوں کہے، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے وہ کپڑا پہننے کو دیا جس کے ذریعہ میں اپنا ستر بھی چھپاتا ہوں اور اپنی زندگی میں لوگوں کے سامنے اپنی آرائش بھی کرتا ہوں۔ اور پھر اس کپڑے کو جو پرانا ہو گیا ہے یعنی جو (کپڑا اس نے اپنے جسم سے اتارا ہے) کسی کو اللہ واسطے دے دے تو وہ اپنے جیتے جی اور مرنے کے بعد (یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) اللہ کی پناہ میں رہے گا اللہ کی محافظت میں رہے گا اور اللہ کے عفو ومغفرت کے پردے میں رہے گا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔)

عورتوں کے لئے باریک کپڑے کی ممانعت

(۶۷) وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ اَبِيْ عَلْقَمَةَ عَنْ اُمِّهٖ قَالَتْ دَخَلَتْ حَفْصَةُ بِنْتُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَلٰى عَائِشَةَ وَعَلَيْهَا خِمَارٌ رَقِيْقٌ فَشَقَّتْهُ عَائِشَةُ وَكَسَتْهَا خِمَارًا كَثِيْفًا۔ (رواہ مالکؒ)

"اور حضرت علقمہ ابن ابو علقمہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن حضرت عبدالرحمٰن ابن ابوبکرؓ کی صاحبزادی حفصہ، حضرت عائشہ کے پاس اس حالت میں آئیں، کہ انہوں نے باریک اوڑھنی اوڑھ رکھی تھی۔ حضرت عائشہ نے وہ باریک اوڑھنی پھاڑ ڈالی اور ان کو ایک موٹی اوڑھنی اڑھا دی۔" (مالکؒ)

تشریح: حفصہ، حضرت عائشہؓ کی بھتیجی تھیں حضرت عائشہؓ نے جب ان کو باریک دوپٹہ اوڑھے ہوئے دیکھا تو خفا ہوئیں اور ان کو سبق دینے کے لئے ان کے اس باریک دوپٹے کے دو ٹکڑے کر ڈالے اور پھر اس کے بدلے ان کے سر پر ایک موٹا دوپٹہ ڈال دیا۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں حضرت عائشہؓ کا فقر وزہد

(۶۸) وَعَنْ عَبْدِ الْوَاحِدِ بْنِ اَيْمَنَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ وَعَلَيْهَا دِرْعٌ قِطْرِيٌّ ثَمَنُ خَمْسَةِ دَرَاهِمَ فَقَالَتْ اِرْفَعْ بَصَرَكَ اِلٰى جَارِيَتِيْ اُنْظُرْ اِلَيْهَا فَاِنَّهَا تُزْهٰى اَنْ تَلْبَسَهٗ فِي الْبَيْتِ وَقَدْ كَانَ لِيْ مِنْهَا دِرْعٌ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا كَانَتِ امْرَاَةٌ تُقَيَّنُ بِالْمَدِيْنَةِ اِلَّا اَرْسَلَتْ اِلَيَّ تَسْتَعِيْرُهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبدالواحد ابن ایمن اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ایک دن میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو

اس وقت ان کے جسم پر (مصر کے بنے ہوئے) قطری کپڑے کا کرتا تھا جس کی قیمت پانچ درہم تھی، حضرت عائشہؓ نے دوران گفتگو، مجھ سے فرمایا کہ ذرا میری اس لونڈی کو تو دیکھو یہ کس قدر غرور کرتی ہے یہ گھر میں بھی اس کپڑے کو پہننے پر تیار نہیں ہوتی (چہ جائیکہ اس کو پہن کر باہر نکلے) حالانکہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں میرے پاس اس طرح کے (یعنی قطری کپڑے) کا ایک کرتا تھا اور مدینہ میں جو بھی عورت (اپنی شادی میں یا کسی اور کی شادی کے وقت) اپنی آرائش کرنا چاہتی وہ کسی کو میرے پاس بھیج کر وہی کرتا عاریتاً منگواتی۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں حضرت عائشہؓ نے یہاں یہ واضح کیا ہے کہ اس تھوڑے سے عرصہ میں ذہنوں میں کیسی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے کہ جس کپڑے کے کرتے کو کل تک عورتیں اپنی آرائش کے لئے ضروری سمجھتی تھیں وہی کرتا اب وہ اپنے گھر میں بھی پہننا پسند نہیں کرتی ہیں وہیں انہوں نے گویا آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اپنے فقر و تنگی اور زہد کو بھی بیان کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ اور ریشمی قبا

(۶۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ لَبِسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا قَبَاءَ دِيْبَاجٍ اُهْدِيَ لَهُ ثُمَّ اَوْشَكَ اَنْ نَزَعَهُ فَاَرْسَلَ بِهِ اِلٰى عُمَرَ فَقِيْلَ قَدْ اَوْشَكَ مَا انْتَزَعْتَهُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ نَهَانِيْ عَنْهُ جِبْرِيْلُ فَجَآءَ عُمَرُ يَبْكِيْ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَرِهْتَ اَمْرًا وَاَعْطَيْتَنِيْهِ فَمَالِيْ فَقَالَ اِنِّيْ لَمْ اُعْطِكَهُ تَلْبَسُهُ اِنَّمَا اَعْطَيْتُكَهُ تَبِيْعُهُ فَبَاعَهُ بِاَلْفَيْ دِرْهَمٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک ریشمی قبا پہنی جو آپ ﷺ کو ہدیہ کے طور پر دی گئی تھی۔ لیکن فوراً ہی اس قبا کو جسم مبارک سے اتار کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیا صحابیؓ نے (یہ دیکھ کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ نے اس قباء کو اتنی جلد کیوں اتار ڈالا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھ کو جبرئیل علیہ السلام نے اس کے پہننے سے منع کر دیا تھا (اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے وہ قبا ریشمی کپڑے کی حرمت نازل ہونے سے پہلے پہنی تھی) پھر جب حضرت عمرؓ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ روتے ہوئے حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! جس چیز کو آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے (یعنی اس ریشمی قبا کے پہننے کو) اس کو مجھے مرحمت فرما دیا ہے (تاکہ میں اس کو پہن لوں) اس صورت میں میرا کیا حال ہوگا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں نے وہ قبا تمہیں اس لئے نہیں دی ہے کہ تم اس کو پہنو، بلکہ اس لئے دی ہے کہ تم اس کو بیچ ڈالو، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس قبا کو دو ہزار درہم کے عوض بیچ دیا۔" (مسلمؒ)

جس کپڑے کے تانے میں ریشم ہو وہ مردوں کے لئے حلال ہے

(۷۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّمَا نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الثَّوْبِ الْمُصْمَتِ مِنَ الْحَرِيْرِ فَاَمَّا الْعَلَمُ وَسَدَى الثَّوْبِ فَلَا بَأْسَ بِهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس کپڑے کو پہننے سے منع فرمایا ہے جو خالص ریشم کا ہو، البتہ ریشم کی گوٹ یا بیل (جو چار انگشت سے زائد نہ ہو) اور وہ کپڑا جس کے تانے میں ریشم ہو اس کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: جس کپڑے میں تانا اور بانا دونوں ریشم کا ہو اس کا مردوں کو پہننا حرام ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک جنگ میں اس کو پہننا مباح ہے اور جس کپڑے کا تانا ریشم کا ہو اور بانا، سوت وغیرہ کا ہو تو اس کا پہننا بالاتفاق جائز ہے اور اس کا برعکس ناجائز ہے مگر جنگ میں جائز ہے۔ گویا صاحبینؒ کے نزدیک تو جنگ میں وہ کپڑا بھی پہننا مباح ہے جو خالص ریشم کا ہو، اور وہ کپڑا بھی جس کے بانے میں ریشم ہو۔ لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جنگ میں صرف وہ کپڑا پہننا مباح ہے جس کا بانا ریشم کا ہو اور تانا سوت وغیرہ کا اور جس کپڑے کا تانا ریشم کا ہو اور بانا کسی اور چیز کا وہ ہر حالت میں مباح ہے۔

اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت کو ظاہر کرنا پسندیدہ ہے

(۷۱) وَعَنْ اَبِیْ رَجَاءٍ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا عِمْرَانُ بْنُ حُصَیْنٍ وَ عَلَیْهِ مُطَرَّفٌ مِنْ خَزٍّ وَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ نِعْمَةً فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ اَنْ یُّرٰی اَثَرُ نِعْمَتِهٖ عَلٰی عَبْدِهٖ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابورجاءؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمران ابن حصینؓ (گھر سے) نکل کر ہمارے پاس آئے تو اس وقت ان کے بدن پر خز کا مطرف (شال) تھا۔ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنی نعمت سے سرفراز فرمائے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے پر اس کی نعمت کا اثر دیکھا جائے۔" (احمدؒ)

تشریح: "مطرف" ایک خاص طرح کا چادر نما کپڑا ہوتا تھا، جس کے دونوں طرف کنارے بنے ہوتے تھے اور قاموس میں لکھا ہے کہ مطرف، جو مکرم کے وزن پر ہے خز کی دھاری دار چادر شال کو کہتے ہیں اس صورت میں "مطرف من خز" اس کپڑے کو کہتے تھے جو ریشم اور اون دونوں سے بنا جاتا تھا۔ اس کا پہننا مباح ہے۔ چنانچہ یہاں "خز" سے یہی مراد ہے۔

مباحات میں سے جو چاہو کھاؤ پہنو لیکن اسراف اور تکبر سے دامن بچاؤ

(۷۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُلْ مَاشِئْتَ وَالْبَسْ مَاشِئْتَ مَا اَخْطَاَتْكَ اثْنَتَانِ سَرَفٌ وَ مَخِيْلَةٌ۔ (رواہ البخاری فی ترجمۃ باب)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا جائز و مباح چیزوں میں سے جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو تاوقتیکہ دو چیزیں یعنی اسراف اور تکبر تم میں سرایت نہ کریں۔" (بخاری فی ترجمۃ باب)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کھانے کی ہر مباح چیز کو کھانا اور پہننے کی ہر مباح چیز کو پہننا درست ہے، لیکن کھانے اور پہننے میں وہ توسع مکروہ ہے جو اسراف اور تکبر کے طور پر ہو جس توسع میں اسراف اور تکبر نہ ہو وہ مباح ہے۔

(۷۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَ تَصَدَّقُوْا وَالْبَسُوْا مَالَمْ يُخَالِطْ اِسْرَافٌ وَلَا مَخِيْلَةٌ۔ (رواہ احمد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول کریم ﷺ نے فرمایا (اپنی حاجت و ضرورت کے بقدر) کھاؤ اور پیو اور جو چیز تمہاری حاجت اور ضرورت سے زائد ہو اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو (نیز پہننے کی مباح چیزوں میں سے جو چاہو) پہنو جب تک کہ اس میں اسراف اور تکبر نہ ہو۔" (احمدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

سفید کپڑے کی فضیلت

(۷۴) وَعَنْ اَبِى الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحْسَنَ مَازُرْتُمُ اللّٰهَ فِىْ قُبُوْرِكُمْ وَ مَسَاجِدِكُمُ الْبَيَاضُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ بہترین کپڑا کہ جس کو پہن کر تم اپنی قبروں اور اپنی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرو، سفید کپڑا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مسجد، اللہ کا گھر ہے۔ جو شخص عبادت کے لئے مسجد میں گیا وہ گویا اللہ سے ملاقات کے لئے گیا لہٰذا وہاں سفید کپڑا پہن کر جانا بہتر ہے۔ اسی طرح بندہ مرنے کے بعد گویا اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرتا ہے۔ لہٰذا مردہ کو سفید کفن دینا بہتر ہے۔

بَابُ الْخَاتَمِ
انگوٹھی پہننے کا بیان
اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مردوں کو سونے کی انگوٹھی پہننا حرام اور چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اتَّخَذَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمًا مِنْ ذَهَبٍ، وَفِيْ رِوَايَةٍ وَجَعَلَهُ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى ثُمَّ اَلْقَاهُ ثُمَّ اتَّخَذَ خَاتَمًا مِنْ وَرَقٍ نُقِشَ فِيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَقَالَ لَا يَنْقُشَنَّ اَحَدٌ عَلٰى نَقْشِ خَاتَمِيْ هٰذَا وَكَانَ اِذَا لَبِسَهٗ جَعَلَ فَصَّهٗ مِمَّا يَلِيْ بَطْنَ كَفِّهٖ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی بنوائی۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ انگوٹھی کو اپنے داہنے ہاتھ میں پہنا۔ اور پھر اس کو پھینک دیا، پھر آپ ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں "محمد رسول اللہ" کے الفاظ کندہ کرائے اور فرمایا کہ کوئی شخص میری اس مہر کی مانند الفاظ (اپنی انگوٹھی میں) کندہ نہ کرائے نیز آنحضرت ﷺ جب انگوٹھی پہنتے تو اس کا نگینہ ہتھیلی کی جانب رکھتے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے سونے کی انگوٹھی اس وقت بنوائی تھی جب کہ مردوں کے لئے سونا حرام نہیں ہوا تھا چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ مردوں کے لئے سونا پہننا حرام قرار دے دیا تو آپ ﷺ نے وہ انگوٹھی پھینک دی۔

امام محمدؒ نے اپنی کتاب مؤطا میں کہا ہے کہ مردوں کے لئے جس طرح سونے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں ہے اسی طرح ان کے لئے لوہے اور کانسی وغیرہ کی انگوٹھی بھی جائز نہیں ہے لہٰذا مرد کو چاندی کے علاوہ اور کسی چیز کی انگوٹھی نہیں چاہئے۔ عورتوں کے لئے سونے کی انگوٹھی اور دوسرے زیورات پہننا جائز ہے بلکہ علماء نے یہ لکھا ہے کہ عورتوں کو چاندی کی انگوٹھی پہننا مکروہ ہے، کیونکہ چاندی کی انگوٹھی مرد پہنتے ہیں اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنا مکروہ ہے، لہٰذا اگر کوئی عورت چاندی کی انگوٹھی پہننا ہی چاہے تو وہ اس کے رنگ کو کسی ملمع وغیرہ کے ذریعہ تبدیل کردے۔ نیز ہدایہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس بارے میں انگوٹھی کے حلقہ کا اعتبار ہے نہ کہ اس کے نگینہ کا۔

"کوئی شخص میری مہر کے مانند الفاظ کندہ نہ کرائے" اصل بات یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ یہ دیکھا کرتے تھے کہ مسلمان میری اتباع کے کس قدر حریص اور شیدائی ہیں وہ میرے ہر عمل کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے کوئی بعید نہیں کہ لوگ میری اس مہر کے الفاظ اپنی انگوٹھیوں میں بھی کندہ کرنے لگیں، لہٰذا آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا، نیز اس ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آنحضرت ﷺ کی اس مہر اور اس میں کندہ الفاظ کی ایک قانونی حیثیت بھی تھی کہ آپ ﷺ جو خطوط وغیرہ دنیا کے بادشاہوں اور سربراہان مملکت کے نام بھیجا کرتے تھے ان پر یہی مہر ثبت فرماتے تھے اس صورت میں اگر دوسرے لوگ بھی اپنی انگوٹھیوں میں اسی طرح کی مہر کندہ کراتے تو نہ صرف یہ کہ مہر رسالت کی مخصوص حیثیت ان بادشاہوں کی نظر میں مشتبہ ہو جاتی بلکہ ایک عجیب طرح کی خرابی بھی واقع ہو جاتی۔

قاضی خاںؒ نے کہا ہے کہ چاندی کی انگوٹھی پہننا اس شخص کے حق میں مباح ہے جس کے لئے مہر رکھنا ایک ضرورت کے درجہ کی چیز ہو جیسے قاضی وغیرہ اور جو شخص مہر رکھنے کا ضرورت مند نہ ہو اس کے حق میں افضل یہی ہے کہ چاندی کی انگوٹھی کا بھی استعمال نہ کرے، نیز جو شخص انگوٹھی پہنے اس کے لئے مناسب یہ کہ وہ انگوٹھی کو بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنے اور اس کا نگینہ ہتھیلی کی طرف رکھے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انگوٹھی کس ہاتھ میں پہنی جائے تو سیوطیؒ کہتے ہیں کہ احادیث تو دائیں ہاتھ میں پہننے کے بارے میں بھی منقول ہیں اور بائیں ہاتھ میں پہننے کے بارے میں بھی، لیکن عمل ان ہی احادیث پر ہے جن میں بائیں ہاتھ میں پہننے کا ذکر ہے اور جو احادیث دائیں ہاتھ کے متعلق ہیں ان کو منسوخ قرار دیا گیا ہے چنانچہ عدیؒ وغیرہ نے حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلے تو دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے لیکن پھر بائیں ہاتھ میں پہننے لگے۔ سفر السعادہ کے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ اس بارے میں مختلف احادیث منقول ہیں، بعض روایتوں میں تو نقل کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے اور بعض روایتوں میں بائیں ہاتھ میں پہننا نقل کیا گیا ہے یہ سب روایتیں صحیح ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کبھی تو آپ ﷺ دائیں ہاتھ میں پہنتے ہوں گے اور کبھی بائیں ہاتھ میں۔ امام نوویؒ یہ لکھتے ہیں کہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انگوٹھی کا دائیں ہاتھ میں بھی پہننا جائز ہے اور بائیں ہاتھ میں بھی لیکن شوافع کے نزدیک دائیں ہاتھ میں پہننا بہتر ہے کیونکہ دایاں ہاتھ بائیں کی بہ نسبت شرف وفضیلت رکھتا ہے اس لئے وہی ہاتھ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کی زینت وآرائش اور توقیر ہو۔

④ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لُبْسِ الْقَسِيِّ وَالْمُعَصْفَرِ وَعَنْ تَخَتُّمِ الذَّهَبِ وَعَنْ قِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ فِي الرُّكُوْعِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (مردوں کو) قسی کپڑے کسم کے رنگے ہوئے کپڑے اور سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا، نیز آپ ﷺ نے رکوع میں قرآن پڑھنے سے منع فرمایا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "قسی" ایک خاص قسم کے ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں جو مصر کے ایک شہر قس میں تیار ہوتا تھا۔

"رکوع میں قرآن پڑھنے کی ممانعت" کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ رکوع میں یا سجدے میں تسبیح کے بجائے قرآن پڑھا جائے، دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص قیام کی حالت میں اضطراب وبے اطمینانی کا رویہ اختیار کرے اور قراءت کو پورا کئے بغیر اس طرح رکوع میں چلا جائے کہ اس قرآت کا کچھ حصہ رکوع میں واقع ہو۔

سونے کی انگوٹھی پہننے والے مرد کے بارے میں وعید

③ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى خَاتَمًا مِنْ ذَهَبٍ فِيْ يَدِ رَجُلٍ فَنَزَعَهٗ فَطَرَحَهٗ فَقَالَ يَعْمِدُ اَحَدُكُمْ اِلٰى جَمْرَةٍ مِنْ نَارٍ فَيَجْعَلُهَا فِيْ يَدِهٖ فَقِيْلَ لِلرَّجُلِ بَعْدَ مَاذَهَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذْ خَاتَمَكَ انْتَفِعْ بِهٖ قَالَ لَا وَاللّٰهِ لَا اٰخُذُهٗ اَبَدًا وَقَدْ طَرَحَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ سے اس انگوٹھی کو اتار کو پھینک دیا اور پھر فرمایا کہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوزخ کی آگ کے انگارے کو حاصل کرے اور اس کو اپنے ہاتھ میں پہن لے، یعنی جو شخص اپنے ہاتھوں میں سونے کی کوئی چیز پہنے گا اس کا ہاتھ دوزخ کی آگ میں جلایا جائے گا اس صورت میں کسی مرد کا سونے کی انگوٹھی پہننا گویا اپنے ہاتھ میں دوزخ کی آگ کا انگارہ پہننا ہے، پھر جب رسول کریم ﷺ وہاں سے تشریف لے گئے تو اس شخص سے کہا گیا کہ تم اپنی اس انگوٹھی کو اٹھا لو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ، یعنی چاہے تو اس کو فروخت کر ڈالو اور چاہے کسی عورت کو دے دو لیکن اس شخص نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم میں اس کو کبھی نہیں اٹھاؤں گا جب کہ اس کو رسول کریم ﷺ نے پھینک دیا ہے!۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص قدرت رکھتا ہو وہ اگر کسی خلاف شرع چیز کو دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بگاڑ دے اور مٹا دے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے اِذَا رَاٰى اَحَدُ مِّنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ یعنی جب تم میں سے کوئی شخص کسی خلاف شرع چیز

کو دیکھے تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بگاڑ ڈالے۔

مہر نبوی ﷺ

④ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَرَادَ اَنْ یَّکْتُبَ اِلٰی کِسْرٰی وَ قَیْصَرَ وَالنَّجَاشِیِّ فَقِیْلَ اِنَّهُمْ لَا یَقْبَلُوْنَ کِتَابًا اِلَّا بِخَاتَمٍ فَصَاغَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمًا حَلْقَةً فِضَّةً نُقِشَ فِیْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِیْ رِوَایَةٍ لِلْبُخَارِیِّ کَانَ نَقْشُ الْخَاتَمِ ثَلَاثَةَ اَسْطُرٍ مُحَمَّدٌ سَطْرٌ وَرَسُوْلٌ سَطْرٌ وَاللّٰهِ سَطْرٌ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ واپس آکر، کسریٰ (فارس کے بادشاہ) قیصر (روم کے بادشاہ) اور نجاشی (حبشہ کے بادشاہ) کو (اسلام کی دعوت دینے کے لئے) خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو عرض کیا گیا کہ (مروج قاعدہ کے مطابق) یہ (بادشاہ) اسی خط کو قبول کرتے ہیں یعنی مستند سمجھتے ہیں جس پر مہر لگی ہوئی ہو، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے چاندی کے حلقہ والی انگوٹھی بنوائی جس میں محمد رسول اللہ کندہ کر دیا گیا۔ (مسلمؒ) اور بخاری کی ایک روایت میں یوں منقول ہے کہ اس انگوٹھی میں جو الفاظ کندہ کرائے گے تھے وہ تین سطروں میں تھے اس طرح کہ ایک سطر میں (جو سب سے نیچی تھی) محمد کا لفظ تھا ایک سطر میں (جو بیچ میں تھی) رسول کا لفظ تھا اور ایک سطر میں (جو سب سے اوپر تھی) اللہ (کا لفظ) تھا۔

تشریح: یہاں انگوٹھی کے ضمن میں صرف اس کے حلقہ کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے اس کے نگینہ کے بارے میں ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ انگلی میں خلقہ ہی پہنا جاتا ہے اور وہی محل استبعاد بھی ہے اس لئے بیان جواز کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا تاہم دوسری احادیث میں نگینہ کا بھی ذکر ہے چنانچہ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ بھی چاندی ہی کا تھا اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس کا نگینہ حبشی یعنی عقیق کا تھا، چنانچہ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

مہر نبوی ﷺ میں جو الفاظ کندہ تھے ان کی ہیئت امام نوویؒ نے وہی بیان کی ہے جو اوپر ذکر کی گئی، یعنی اوپر کی سطر میں "اللہ" بیچ کی سطر میں "رسول" اور نیچے کی سطر میں "محمد" کا لفظ تھا، گویا اس مہر کی یہ صورت تھی محمد رسول اللہ ﷺ اور بعض حضرات نے اس مہر کی یہ صورت بیان کی ہے محمد رسول اللہ واللہ اعلم۔

آنحضرت ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی انگوٹھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ میں رہا کرتی تھی ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھ میں اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں آئی، لیکن حضرت عثمانؓ کے خلافت کے آخری دور میں وہ انگوٹھی ایک دن معیقیب کے ہاتھ سے جو حضرت عثمانؓ کے خادم تھے اریس کنویں میں گر پڑی اور پھر اس کو بہت زیادہ تلاش کیا گیا مگر نہیں ملی!

علماء لکھتے ہیں کہ وہ فتنہ و فساد اور اختلاف و انتشار جو حضرت عثمانؓ کے آخری دور خلافت میں اور پھر ان کے بعد اسلامی مملکت میں پیدا ہوا اس کا باعث اس مبارک انگوٹھی کا گم ہونا تھا کیونکہ اس انگوٹھی میں حق تعالیٰ نے ایسی برکت عطا فرمائی تھی جو حکومت و مملکت کے انتظام و انصرام کا ایک مؤثر ذریعہ تھی جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہر والی انگوٹھی کی خاصیت تھی۔

آنحضرت ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ

⑤ وَعَنْهُ اَنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ خَاتَمُهٗ مِنْ فِضَّةٍ وَکَانَ فَصُّهٗ مِنْهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی اور اس کا نگینہ بھی چاندی ہی کا تھا۔" (بخاریؒ)

⑥ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَبِسَ خَاتَمَ فِضَّةٍ فِیْ یَمِیْنِهٖ فِیْهِ فَصٌّ حَبَشِیٌّ کَانَ یَجْعَلُ فَصَّهٗ مِمَّا یَلِیْ

كَفِّهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ ہی سے (یہ بھی) روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ میں پہنی جس کا نگینہ حبشی تھا۔ نیز آنحضرت ﷺ انگوٹھی نگینہ کا ہتھیلی کی جانب رکھتے یعنی آپ ﷺ اپنی انگوٹھی کو اس طرح پہنتے تھے کہ اس کا نگینہ والا حلقہ ہتھیلی کی طرف رہتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح : "حبشی" سے مراد "عقیق" ہے اور عقیق کو حبشہ کی طرف منسوب کر کے حبشی اس لئے کہا گیا ہے کہ عقیق کی کان حبشہ اور یمن میں تھی، یا وہ نگینہ عقیق کی بجائے کسی اور قسم کا ہوگا اور وہ قسم حبشہ ہی میں پائی جاتی تھی اس لئے اس کو حبشی کہا گیا، یا وہ نگینہ سیاہ رنگ کا تھا جیسا کہ حبشیوں کا رنگ ہوتا ہے اس مناسبت سے اس کو حبشی کہا گیا، اور یا یہ کہ اس نگینہ کو کسی حبشی شخص نے بنایا ہوگا اس لئے اس کو "حبشی" سے تعبیر کیا گیا، اس صورت میں یہ روایت اس روایت کے منافی نہیں ہوگی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ بھی چاندی کا تھا البتہ اگر پہلے معنی مراد لئے جائیں یعنی یہ کہ وہ نگینہ عقیق کا تھا اور چونکہ عقیق کی کان حبشہ میں تھی اس لئے اس کو "حبشی" کہا گیا ہے تو اس صورت میں دونوں روایتیں تعدد پر محمول ہوں گی یعنی یہ کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کی ایک انگوٹھی کا نگینہ چاندی ہی کا تھا اور دوسری انگوٹھی کا نگینہ حبشی یعنی عقیق کا تھا۔

(۷) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ خَاتَمُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلَى الْخِنْصَرِ مِنْ يَدِهِ الْيُسْرٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی (اس انگلی) میں تھی! حضرت انسؓ نے یہ کہہ کر بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کی طرف اشارہ کیا۔" (مسلمؒ)

انگوٹھی کس انگلی میں پہنی جائے

(۸) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَتَخَتَّمَ فِيْ اِصْبَعِيْ هٰذِهٖ اَوْ هٰذِهٖ قَالَ فَاَوْمَأَ اِلَى الْوُسْطٰى وَالَّتِيْ تَلِيْهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے اس سے منع فرمایا کہ میں اپنی اس انگلی میں یا اس انگلی میں انگوٹھی پہنوں۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے (یہ کہہ کر) درمیانی انگلی اور اس کے قریب والی انگلی یعنی شہادت کی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔" (مسلمؒ)

تشریح : درمیانی اور شہادت کی انگلی کے بارے میں تو اس حدیث سے واضح ہوا اور انگوٹھے نیز چھوٹی انگلی کے قریب والی انگلی میں انگوٹھی پہننا نہ تو آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے اور نہ صحابہؓ و تابعینؒ ہی سے منقول ہے اس سے معلوم ہوا کہ انگوٹھی کو چھوٹی انگلی ہی میں پہننا مستحب ہے۔ چنانچہ شوافع اور حنفیہ کا رجحان اسی طرف ہے تاہم یہ بات مردوں کے حق میں ہے، جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے تو ان کے لئے سب انگلیوں میں پہننا جائز ہے۔ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ مردوں کو درمیانی اور شہادت کی انگلی میں انگوٹھی پہننا مکروہ تنزیہی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آنحضرت ﷺ انگوٹھی دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں میں پہنتے تھے

(۹) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَتَّمُ فِيْ يَمِيْنِهٖ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ

وَالنَّسَائِی عَنْ عَلِیٍّ۔

"حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی کو اپنے دائیں ہاتھ میں پہنا کرتے تھے۔ (ابن ماجہؒ) ابوداؤد اور نسائیؒ نے اس روایت کو حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے۔"

⑩ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَتَّمُ فِي يَسَارِهِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی کو اپنے بائیں ہاتھ میں پہنا کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

ریشمی کپڑا اور سونا مردوں کے لئے حرام ہے

⑪ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخَذَ حَرِيْرًا فَجَعَلَهُ فِي يَمِيْنِهِ وَاَخَذَ ذَهَبًا فَجَعَلَهُ فِي شِمَالِهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُوْرِ اُمَّتِي۔ (رواه احمد وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے ریشمی کپڑا لیا اور اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا اسی طرح سونا لیا اور اس کو اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا اور پھر فرمایا کہ میری اُمّت کے مردوں کے لئے یہ دونوں چیزیں حرام ہیں۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

⑫ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ رُكُوْبِ النُّمُوْرِ وَعَنْ لُبْسِ الذَّهَبِ اِلَّا مُقَطَّعًا۔

(رواه ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے چیتے کی کھال کی زین پر سوار ہونے سے منع فرمایا اسی طرح آپ ﷺ نے (مردوں کو) سونا پہننے سے منع فرمایا الا یہ کہ وہ بہت قلیل مقدار میں ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ سے قلیل مقدار میں سونے کی جو اباحت ثابت ہوتی ہے وہ بھی منسوخ قرار پاچکی ہے ویسے بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان الفاظ سے بظاہر جو جواز ثابت ہوتا ہے وہ حنفیہؒ کے نزدیک اس پر محمول ہے کہ مثلاً کسی چیز پر سونے کا ملمع کیا جائے یا نگینہ وغیرہ میں سونے کی کیل لگائی جائے اور یا کپڑے پر دھاریوں اور بیل کے طور پر سنہرا کام کیا جائے تو یہ حنفیہؒ کے نزدیک مردوں کے لئے بھی جائز ہیں۔

پیتل اور لوہے کی انگوٹھی پہننے کی ممانعت

⑬ وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِرَجُلٍ عَلَيْهِ خَاتَمٌ مِنْ شَبَهٍ مَالِيْ اَجِدُ مِنْكَ رِيْحَ الْاَصْنَامِ فَطَرَحَهُ ثُمَّ جَاءَ وَعَلَيْهِ خَاتَمٌ مِنْ حَدِيْدٍ فَقَالَ مَالِيْ اَرٰى عَلَيْكَ حِلْيَةَ اَهْلِ النَّارِ فَطَرَحَهُ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ اَتَّخِذُهُ قَالَ مِنْ وَرِقٍ وَلَا تُتِمَّهُ مِثْقَالًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ مُحْيِ السُّنَّةِ وَقَدْ صَحَّ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ فِي الصَّدَاقِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِرَجُلٍ۔ اِلْتَمِسْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيْدٍ۔

"اور حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے ایک شخص سے جو پیتل کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھا فرمایا کہ مجھے کیا ہوا ہے کہ میں تم میں بتوں کی بو پاتا ہوں یعنی آپ ﷺ نے اس شخص کے سامنے یہ بات بطور تعریض فرمائی۔ کیونکہ عام طور پر پیتل ہی کے بت بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کی یہ ناگواری دیکھ کر اس انگوٹھی کو اتار کر پھینک دیا، پھر (جب دوبارہ) وہ شخص آیا تو لوہے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھا، آنحضرت ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ مجھے کیا ہوا ہے کہ میں تم پر دوزخیوں کا زیور دیکھ رہا ہوں یعنی آپ ﷺ نے یہ بات بھی بطور تعریض اس بناء پر فرمائی کہ کفار میں سے کچھ لوگ دنیا میں لوہے کی چیز پہنتے ہیں یا اس ارشاد میں اس طرف اشارہ تھا کہ کافروں کو دوزخ میں جو طوق و سلاسل پہنائے جائیں گے وہ لوہے کے ہوں گے، اس لئے لوہے کی انگوٹھی پہننا دوزخیوں کی

مشابہت اختیار کرنا ہے چنانچہ اس شخص نے اس انگوٹھی کو (بھی) اتار کر پھینک دیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر میں کس چیز کی انگوٹھی بناؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا چاندی کی اور وہ چاندی بھی پوری مثقال نہ ہو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

محی السنۃؒ فرماتے ہیں کہ عورت کے مہر کے بارے میں حضرت سہل ابن سعدؓ کی صحیح روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا جو نکاح کرنے کا متمنی تھا کہ بیوی کے مہر کے لئے از قسم مال کوئی چیز تلاش کرو اگرچہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔

تشریح: "پوری ایک مثقال نہ ہو" یہ ممانعت اصل میں احتیاط و تقویٰ اور اولویت کیلئے ہے، یعنی اولیٰ یہ ہے کہ انگوٹھی ایک مثقال (۴ ۱/۲ ماشہ) سے کم چاندی کی ہو ورنہ جہاں تک جواز کا تعلق ہے تو پورے ایک مثقال کی بھی جائز ہے) اور یہ الویت بھی اس بنا پر ہے کہ سونا اور چاندی اصل کے اعتبار سے "غیر پسندیدہ" ہیں لہٰذا ان کا استعمال بس اسی قدر ہونا چاہئے جو ضرورت کے مطابق ہو اس لئے دو یا اس سے زائد انگوٹھیاں پہننا مکروہ ہے تاہم متعدد انگوٹھیاں بنانا مکروہ نہیں ہے، بشرطیکہ ان کو ایک ساتھ نہ پہنا جائے بلکہ نوبت بنوبت پہنا جائے۔

فتاویٰ قاضی خاں میں لکھا ہے کہ لوہے اور پیتل کی انگوٹھی وغیرہ پہننا مکروہ ہے اور مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے۔

محی السنۃؒ نے عورت کے مہر کے بارے میں حضرت سہلؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس سے ان کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے جو یہ فرمایا کہ بیوی کو مہر میں دینے کے لئے مال مہیا کرو اگرچہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو تو اس سے معلوم ہوا کہ اوپر روایت میں لوہے کی انگوٹھی پہننے کی جو ممانعت ثابت ہوتی ہے وہ تحریم کے لئے نہیں ہے کیونکہ اگر حقیقت میں لوہے کی انگوٹھی پہننا حرام ہوتا تو آپ ﷺ نکاح کے متمنی شخص کو لوہے کی انگوٹھی مہیا کرنے کے لئے کیوں فرماتے۔

مہر کے مال کے بارے میں مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد دراصل عورت کے مہر میں مال خرچ کرنے کی اہمیت و ضرورت کو زیادہ سے زیادہ تاکید کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ مہر کے طور پر کوئی نہ کوئی مال ضرور مقرر کیا جائے خواہ وہ ادنیٰ ترین چیز ہی کیوں نہ ہو۔ اس ارشاد سے یہ بھی واضح ہوا کہ لوہے کی انگوٹھی پہننے کو اگرچہ ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن وہ انگوٹھی مال متقوم مالیت کے دائرے سے باہر نہیں ہے تاہم یہ بھی احتمال ہے کہ لوہے کی انگوٹھی پہننے کی اس ممانعت کے نفاذ و بیان کا زمانہ حضرت سہلؓ کی مذکورہ روایت کے بعد کا ہو، کیوں کہ یہ ثابت ہے کہ حضرت سہلؓ کی روایت استقراء سنن اور استحکام شرائع سے پہلے کی ہے اور حضرت بریدہؓ کی یہ روایت اس کے بعد کی ہے لہٰذا حضرت سہلؓ کی روایت منسوخ قرار پائے گی، نیز حضرت سہلؓ کی روایت باب المہر کی پہلی فصل میں گزر چکی ہے۔

وہ دس چیزیں جن کو آنحضرت برا سمجھتے تھے

⑮ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُ عَشْرَ خِلَالٍ الصُّفْرَةَ يَعْنِي الْخَلُوْقَ وَتَغْيِيْرَ الشَّيْبِ وَجَرَّ الْإِزَارِ وَالتَّخَتُّمَ بِالذَّهَبِ وَالتَّبَرُّجَ بِالزِّيْنَةِ لِغَيْرِ مَحِلِّهَا وَالضَّرْبَ بِالْكِعَابِ وَالرُّقٰى اِلَّا بِالْمُعَوِّذَاتِ وَعَقْدَ التَّمَائِمِ وَعَزْلَ الْمَاءِ لِغَيْرِ مَحِلِّهٖ وَفَسَادَ الصَّبِيِّ غَيْرَ مُحَرِّمِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دس چیزوں کو برا سمجھتے تھے ایک تو زردی یعنی خلوق کے استعمال کو، دوسرے بڑھاپا تبدیل کرنے کو، تیسرے (ٹخنوں سے نیچے) تہبند (یا پاجامہ کو لٹکا کر) کھینچتے ہوئے چلنے کو، چوتھے (مردوں کے لئے) سونے کی انگوٹھی پہننے کو، پانچویں عورت کا بے محل زینت ظاہر کرنے کو، چھویں نرد (چوسر) کھیلنے کو، ساتویں بجز معوذات کے جھاڑ پھونک کرنے کو، آٹھویں کوڑیوں اور منکوں کے باندھنے کو نویں بے موقع عزل یعنی عورت کی شرم گاہ سے باہر منی گرانے کو اور دسویں بچے کے خراب کرنے کو، اگرچہ آپ ﷺ اس کو حرام نہیں فرماتے تھے۔" (ابوداؤد، نسائیؒ)

تشریح: "خلوق" ایک قسم کی خوشبو کو کہتے ہیں جو زعفران وغیرہ سے بنائی جاتی ہے، خلوق استعمال کرنے کی یہ ممانعت صرف مردوں

کے لئے ہے عورتوں کو اس کا لگانا درست ہے اگرچہ ایسی احادیث بھی منقول ہیں جن سے مردوں کے لئے بھی خلوق کے استعمال کی اباحت ثابت ہوتی ہے لیکن ایسی احادیث زیادہ منقول ہیں جن سے ممانعت ثابت ہوتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اباحت کی حدیثیں منسوخ ہیں۔ مردوں کے لئے خلوق کا استعمال اس لئے ممنوع ہے کہ وہ خاص طور پر عورتوں کی خوشبو ہے۔

بڑھاپے کو تبدیل کرنا خواہ سفید بالوں کو چننے کی صورت میں ہو یا سیاہ خصاب لگانے کے ذریعہ ہو، یہ بہر صورت ممنوع ہے البتہ مہندی کا خصاب مستثنیٰ ہے کیوں کہ اس کے جواز میں احادیث کے منقول ہونے کی بنا پر وہ بالاتفاق درست ہے، سفید بالوں کو اکھاڑنے اور چننے کے بارے میں حنفیہ کا مختار قول حرمت و کراہت کا ہے۔

والتبرج بالزینۃ لغیر محلھا میں لفظ محل حاء کے زیر کے ساتھ ہے جو "موضع حل" کے معنی میں ہے یعنی وہ جگہ جہاں عورت کو اپنا بناؤ سنگار ظاہر کرنا حلال ہے اور وہ جگہ اس کا شوہر اور اس کے محارم جیسے باپ اور بھائی وغیرہ ہیں، گویا مطلب یہ ہے کہ عورت کو اپنے خاوند اور اپنے محارم کے علاوہ دوسرے مردوں کے سامنے اپنا بناؤ سنگار ظاہر کرنا درست نہیں ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِھِنَّ اَوْ اٰبَآئِھِنَّ الآیۃ۔ بعض حضرات نے "محلھا" میں لفظ "محل" حاء کے زبر کے ساتھ بھی کہا ہے جو "حلول" سے ہے۔

"کعاب" کعب کی جمع ہے اور چوسر کی گوٹوں اور مہروں (پانسوں) کے معنی میں ہے جن کو قرعہ کی مانند پھینک پھینک کر چوسر کھیلا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ کھیل ممنوع ہے، چنانچہ اہل علم صحابہؓ کی اکثریت کے نزدیک یہ کھیل حرام تھا، حنفیہ شطرنج کھیلنے کو بھی مکروہ تحریمی کہتے ہیں۔

"رقی" رقیہ کی جمع ہے جس کے معنی منتر پڑھ کر پھونکنے کے ہیں اور "معوذات" سے مراد قرآن کی وہ آیتیں ہیں جو استعاذہ کے معنی پر مشتمل ہیں، خواہ وہ یہ دونوں سورتیں ہوں یا ان کے علاوہ دوسری آیات۔ حاصل یہ کہ قرآن کریم کی آیات، احادیث میں منقول دعاؤں اور اسماء الٰہی کے ذریعہ جھاڑ پھونک جائز ہے ان کے علاوہ کے ذریعہ حرام ہے، خاص طور پر ایسے الفاظ کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جن کے معنی معلوم نہ ہوں نہ صرف حرام ہے، بلکہ کفر کی حد میں داخل ہو جانے کے خوف کا بھی محتمل ہے۔

"تمائم" تمیمہ کی جمع ہے اس کے معنی ان منکوں (دانوں) اور ہڈیوں کے ہیں جن کو جوڑ کر عرب نظر نہ لگنے کے لئے بچوں کے گلے میں لٹکاتے تھے یہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا خاص طریقہ تھا لیکن اسلام نے اس کی ممانعت فرمادی۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "تمائم" سے مراد وہ گنڈے اور منتر ہیں جن کی نوعیت مشرکانہ ہوتی ہے اور جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھے، لیکن وہ تعویذات وغیرہ جن میں آیات قرآنی، منقول دعائیں اور اسماء الٰہی لکھے ہوتے ہیں گلے میں لٹکانا جائز ہیں جیسا کہ حصن حصین میں منقول حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

"بے موقع عزل" کا مطلب یہ ہے کہ حمل ٹھہر جانے کے خوف سے عزل کرنا اس صورت میں جائز ہے جب کہ عورت (بیوی) کی رضامندی حاصل ہو اگر اس کی رضامندی کے بغیر عزل کیا جائے گا تو وہ ایسا عزل ہو گا جو بے موقع کہلائے گا۔ جس کی ممانعت اس حدیث میں مذکور ہے، البتہ اگر عورت آزاد نہ ہو بلکہ لونڈی ہو تو وہ (لونڈی) چونکہ محل عزل ہے اس لئے اس کی رضامندی کے بغیر عزل کرنا جائز ہے۔

"بچے کو خراب کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے ساتھ صحبت کی جائے جس کی گود میں دودھ پینے والا بچہ ہو، اور اس صحبت کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو جائے، چونکہ اس حمل کی وجہ سے اس کا دودھ خراب ہو جاتا ہے اور وہ دودھ بچے کو نقصان پہنچاتا ہے کہ اس کو ضعف وغیرہ لاحق ہو جاتا ہے اس لئے دودھ پلانے والی عورت کے ساتھ صحبت کرنا گویا بچے کو نقصان پہنچانا ہے۔ دودھ والی عورت کے ساتھ صحبت کرنے کو "غیل" کہتے ہیں اور اس کا ذکر باب المباشرت میں گزر چکا ہے۔

"اگرچہ آپ ﷺ اس کو حرام نہیں فرماتے تھے" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ آپ ﷺ دودھ پلانے کے زمانہ میں عورت کے ساتھ صحبت کرنے اور بچے کو نقصان پہنچانے کو ناپسند فرماتے تھے لیکن اس کو حرام قرار نہیں دیتے تھے کیونکہ منکوحہ عورت کے ساتھ جماع کرنا حلال ہے اور محض حمل کے احتمال سے کہ جس سے بچے کو مذکورہ نقصان پہنچنے کا تعلق ہے وہ عورت حرام نہیں ہوتی۔

عورت کو بجنے والا زیور پہننا ممنوع ہے

⑮ وَعَنِ ابْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّ مَوْلَاةً لَهُمْ ذَهَبَتْ بِابْنَةِ الزُّبَيْرِ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَفِىْ رِجْلِهَا اَجْرَاسٌ فَقَطَعَهَا عُمَرُ وَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَعَ كُلِّ جَرَسٍ شَيْطَانٌ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ ان کی آزاد کی ہوئی لونڈی حضرت زبیرؓ کی بچی کے پیروں میں گھنگرو تھے، حضرت عمرؓ نے ان گھنگروؤں کو کاٹ ڈالا اور فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر (جرس بجنے والی چیز) کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ شیطان کا مزمار (باجہ) ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے الجرس مذامیر الشیطان لہٰذا ہر جرس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ہر بجنے والی چیز کی طرف لوگوں کو مائل کرتا ہے اور ان کی نظر میں اس کی آواز کو زیادہ سے زیادہ دلکش بناتا ہے۔

⑯ وَعَنْ بُنَانَةَ مَوْلَاةِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ حَيَّانَ الْاَنْصَارِيِّ كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ اِذْ دُخِلَتْ عَلَيْهَا بِجَارِيَةٍ وَعَلَيْهَا جَلَاجِلُ يُصَوِّتْنَ فَقَالَتْ لَا تُدْخِلْنَهَا عَلَيَّ اِلَّا اَنْ تُقَطِّعْنَ جَلَاجِلَهَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ جَرَسٌ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن حیان انصاریؓ کی آزاد کی ہوئی لونڈی بنانہؓ سے روایت ہے کہ وہ (ایک دن) حضرت عائشہؓ کے ہاں تھیں کہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ایک چھوٹی لڑکی لائی گئی جو گھنگرو پہنے ہوئے تھی اور وہ بج رہے تھے، حضرت عائشہؓ نے (اس لڑکی کو لانے والی عورت سے) فرمایا کہ اس لڑکی کو میرے پاس اس وقت تک نہ لایا جائے جب تک کہ ان گھنگروؤں کا کاٹ کر پھینک نہ دیا جائے، کیوں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس گھر میں (رحمت کے) فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں باجے کی قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

کسی مجبوری کے تحت سونے کے استعمال کی اجازت

⑰ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ طَرَفَةَ اَنَّ جَدَّهُ عَرْفَجَةَ بْنَ اَسْعَدَ قُطِعَ اَنْفُهُ يَوْمَ الْكُلَابِ فَاتَّخَذَ اَنْفًا مِنْ وَرِقٍ فَاَنْتَنَ عَلَيْهِ فَاَمَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَتَّخِذَ اَنْفًا مِنْ ذَهَبٍ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن طرفہ سے روایت ہے کہ ان کے دادا حضرت عرفجہ ابن سعدؓ کی ناک کلاب کی لڑائی میں کاٹ ڈالی گئی تھی، انہوں نے چاندی کی ناک بنوائی لیکن اس میں بدبو پیدا ہوگئی، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان کو سونے کی ناک بنوانے کا حکم دیا۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "کلاب" ایک جگہ کا نام ہے وہاں لڑائی ہوئی جس میں حضرت عرفجہؓ بھی شریک تھے اسی لڑائی کے دوران ان کی ناک کٹ گئی تھی جس کی وجہ سے ان کو چاندی کی ناک بنوا کر چہرے پر لگانی پڑی، لیکن اس میں بدبو پیدا ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے اس کو سونے کی ناک بنوانے کی اجازت عطا فرمائی۔ اس حدیث کی بناء پر علماء نے سونے کی ناک بنوانے کو اور اسی طرح دانتوں میں چاندی کا تار باندھنے کو

مباح قرار دیا ہے، لیکن حضرت امام محمدؒ نے دانتوں میں سونے کا تار باندھنے کو بھی جائز کہا ہے۔

سونے کے زیوارت پہننے والی عورت کے بارے میں وعید

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّحَلِّقَ حَبِیْبَهٗ حَلْقَةً مِنْ نَارٍ فَلْیُحَلِّقْهُ حَلْقَةً مِنْ ذَهَبٍ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّطَوِّقَ حَبِیْبَهٗ طَوْقًا مِنْ نَارٍ فَلْیُطَوِّقْهُ طَوْقًا مِنْ ذَهَبٍ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّسَوِّرَ حَبِیْبَهٗ سِوَارًا مِنْ نَارٍ فَلْیُسَوِّرْهُ سِوَارًا مِنْ ذَهَبٍ وَلٰكِنْ عَلَیْكُمْ بِالْفِضَّةِ فَالْعَبُوْا بِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے عزیز یعنی بیوی یا اولاد وغیرہ کو (ان کے کان یا ناک میں) آگ کا حلقہ پہنانا پسند کرتا ہو تو وہ اس کو سونے کا حلقہ ضرور پہنائے (یعنی سونے کا بالا وغیرہ پہنانے کی سزا یہ ہے کہ اس کو آگ کا بالا وغیرہ پہنایا جائے گا) جو شخص اپنے عزیز کی گردن میں آگ کا طوق ڈالنا پسند کرتا ہو تو وہ اس کو سونے کا گلوبند ضرور پہنائے اور جو شخص اپنے عزیز کو آگ کا کنگن پہنانا پسند کرتا ہو وہ اس کو سونے کا کنگن ضرور پہنائے، لیکن چاندی کے استعمال کی تمہیں اجازت ہے کہ تم اس کو اپنے استعمال و تصرف میں لاسکتے ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ "فَالْعَبُوْا بِهَا" کا اصل ترجمہ تو یہ ہے کہ تم چاندی سے کھیلو، یعنی چاندی کے زیورات بنوا کر اپنی عورتوں کو پہناؤ، اس کی انگوٹھی بنوا کر خود پہنو، اور اگر اپنے ہتھیار جیسے تلوار وغیرہ کی زینت و آرائش چاہو تو اس مقصد کے لئے بھی چاندی استعمال کر سکتے ہو، لیکن حدیث کے ان الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دنیا کی زیب و زینت اور دنیا کے زیورات لہو و لعب میں داخل ہیں اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے مباح ہوں، یا اس طرف اشارہ ہے کہ زیور دار عورت کے ساتھ تفریح و دل چسپی لینا گویا اس کے زیور کے ساتھ کھیلنا ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ کسی چیز کے ساتھ کھیلنا اس میں خواہش و مرضی کے مطابق تصرف کرنے کے مرادف ہے، لہٰذا ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی عورتوں کے زیور کے اقسام میں سے جس قسم کا زیور چاہو اس میں چاندی کا استعمال کرو، لیکن مردوں کو صرف انگوٹھی، تلواروں اور جنگ کے دوسرے ہتھیاروں کی زینت و آرائش کے لئے چاندی کا استعمال کرنا جائز ہے۔

(۱۹) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ یَزِیْدَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَیُّمَا امْرَاَةٍ تَقَلَّدَتْ قِلَادَةً مِنْ ذَهَبٍ قُلِّدَتْ فِیْ عُنُقِهَا مِثْلُهَا مِنَ النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَاَیُّمَا امْرَاَةٍ جَعَلَتْ فِیْ اُذُنِهَا خُرْصًا مِنْ ذَهَبٍ جَعَلَ اللّٰهُ فِیْ اُذُنِهَا مِثْلَهٗ مِنَ النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو عورت سونے کا ہار پہنے قیامت کے دن اس کی گردن میں اسی طرح کا آگ کا ہار پہنایا جائے گا، اور جو عورت اپنے کان میں سونے کا بالا یا بالی پہنے گی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے کان میں اسی طرح کا آگ کا بالا یا بالی ڈالے گا۔" (ابوداؤدؒ)

(۲۰) وَعَنْ اُخْتٍ لِحُذَیْفَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ اَمَا لَكُنَّ فِی الْفِضَّةِ مَا تُحَلَّیْنَ بِهٖ اَمَا اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْكُنَّ امْرَاَةٌ تَحَلّٰی ذَهَبًا تُظْهِرُهٗ اِلَّا عُذِّبَتْ بِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت حذیفہؓ کی بہن سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے عورتوں کی جماعت! کیا تمہارے لئے چاندی میں وہ بات نہیں ہے کہ تم اس کا زیور بناؤ (یعنی تمہارے لئے چاندی کا زیور بنوانا کافی ہے) یاد رکھو! تم میں سے جو بھی عورت سونے کا زیور بنوائے گی اور پھر اس زیور کی (بے جا اور بے موقع) نمائش کرتی پھرے گی تو اس کو اس کے اس عمل کی بنا پر عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اوپر جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عورتوں کو بھی خالص سونا پہننا منع ہے اور جو عورت سونے کے زیورات پہنے گی وہ حدیث میں مذکورہ وعید کا مورد ہوگی نیز یہ کہ عورتوں کو محض چاندی کا زیور پہننا مباح ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کے لئے دونوں مباح ہیں وہ سونے کے زیورات بھی پہن سکتی ہیں اور چاندی کے بھی۔ لہٰذا علماء نے ان احادیث کی مختلف تاویلیں بیان کی ہیں، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ پہلے تو یہی حکم تھا کہ سونا پہننا عورتوں کے لئے بھی مباح نہیں لیکن بعد میں اس روایت کے ذریعہ اس حکم کو منسوخ قرار دیا گیا جس کو حضرت علیؓ نے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حریر یعنی خالص ریشم اور سونا میری اُمّت کے مردوں کے لئے حرام ہے پس اس ارشاد سے ثابت ہوا کہ عورتوں کو سونا اور خالص ریشم پہننا مباح ہے۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ مذکورہ احادیث میں جو وعید بیان کی گئی ہے اس کا تعلق اس عورت سے ہے جو زکوٰۃ ادا کئے بغیر سونے کے زیورات پہنے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ وعید اس عورت کے حق میں ہے جو زیورات پہن کر اجنبی مردوں کو دکھلائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اگر جنّت میں زیور اور ریشم پہننا چاہتے ہو تو دنیا میں ان چیزوں سے اجتناب کرو

(۲۱) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَمْنَعُ اَهْلَ الْحِلْيَةِ وَالْحَرِيْرِ وَيَقُوْلُ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ حِلْيَةَ الْجَنَّةِ وَحَرِيْرَهَا فَلَا تَلْبَسُوْهَا فِي الدُّنْيَا۔ (رواه النسائی)

"حضرت عقبہ ابن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ زیور والوں اور ریشم والوں کو منع فرماتے تھے (یعنی ان چیزوں کے پہننے کی ممانعت بیان کرتے تھے) اور فرماتے تھے کہ اگر تم جنّت کے زیور اور جنّت کے ریشم کی خواہش رکھتے ہو کہ جنّت میں تمہیں یہ چیزیں ملیں تو دنیا میں ان چیزوں کو نہ پہنو۔" (نسائیؒ)

آنحضرت ﷺ کی سونے کی انگوٹھی

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّخَذَ خَاتَمًا فَلَبِسَهٗ قَالَ شَغَلَنِيْ هٰذَا عَنْكُمْ مُنْذُ الْيَوْمِ اِلَيْهِ نَظْرَةٌ وَاِلَيْكُمْ نَظْرَةٌ ثُمَّ اَلْقَاهُ۔ (رواه النسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک انگوٹھی بنوائی اور اس کو پہنا پھر آپ ﷺ نے (حاضرین کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ آج کے دن اس انگوٹھی نے مجھ کو تمہاری طرف سے مشغول رکھا (یعنی میں تمہاری طرف متوجہ نہ رہ سکا) کیونکہ کبھی تو اس انگوٹھی کی طرف دیکھتا ہوں اور کبھی تمہاری طرف دیکھتا ہوں۔ اور (یہ کہہ کر) آپ ﷺ نے اس انگوٹھی کو اتار پھینکا۔" (نسائیؒ)

تشریح: بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث میں جس انگوٹھی کا ذکر کیا گیا ہے وہ سونے کی تھی۔

بچوں کو بھی سونا پہنانا منع ہے

(۲۳) وَعَنْ مَالِكٍ قَالَ اَنَا اَكْرَهُ اَنْ يَلْبَسَ الْغِلْمَانُ شَيْئًا مِنَ الذَّهَبِ لِاَنَّهٗ بَلَغَنِيْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ التَّخَتُّمِ بِالذَّهَبِ فَاَنَا اَكْرَهُهٗ لِلرِّجَالِ الْكَبِيْرِ مِنْهُمْ وَالصَّغِيْرِ۔ (رواه فی الموطا)

"اور حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں اس کو برا سمجھتا ہوں کہ لڑکوں کو سونے کی کوئی چیز پہنائی جائے کیونکہ مجھ تک روایت پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی بھی استعمال کرنے سے منع فرمایا (اور جب انگوٹھی جیسی چیز بھی ممنوع ہے تو اور چیزیں بطریق اولیٰ ممنوع ہوں گی) لہٰذا میں مردوں کے لئے (سونا پہننا) برا سمجھتا ہوں خواہ وہ بڑے ہوں یا بچے ہوں!۔" (موطا)

تشریح: پس جس طرح مردوں کو سونے کی کوئی چیز خود پہننا یا لڑکوں کو پہنانا ممنوع ہے اسی طرح چاندی کی چیزیں بھی ممنوع ہیں علاوہ انگوٹھی کے نیز ریشم کا کپڑا بھی سونے چاندی کے حکم میں ہے۔

بَابُ النِّعَالِ

پاپوش کا بیان

"نعال"، نعل کی جمع ہے اور "نعل" اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ پیروں کو زمین سے بچایا جائے، جس چیز کے ذریعہ پیروں کی حفاظت کی جاتی ہے یعنی پاپوش اس کی ہیئت وقسم ہر دور میں اور ہر قوم وفرقہ کے لوگوں میں مختلف رہی ہے، خواہ وہ جوتے کی صورت میں ہو یا چپل وکھڑاؤں وغیرہ کی شکل میں ہو۔ اس باب کی اصل مراد آنحضرت ﷺ کے پاپوشوں کی ہیئت وصفات بیان کرنا ہے جو اس دور میں اہل عرب کے درمیان رائج تھیں، چونکہ اس زمانہ میں رائج پاپوش بھی مختلف اقسام کے ہوتے تھے اس لئے باب کے عنوان میں جمع کا صیغہ، نعال، استعمال کیا گیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی پاپوش مبارک

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِیْ لَیْسَ فِیْهَا شَعْرٌ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو جو پاپوش مبارک پہنے ہوئے دیکھا ہے اس میں بال نہیں تھے!۔" (بخاریؒ)

② وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ نَعْلَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَهَا قِبَالَانِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی پاپوش مبارک میں دو تسمے تھے۔" (البخاریؒ)

تشریح: "قبال" پاپوش کے تسمے کو کہتے ہیں جو انگلیوں کے بیچ میں ہوتا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی پاپوش مبارک میں دو تسمے تھے ایک انگوٹھے اور اس کے برابر والی انگلی کے درمیان رہتا تھا اور دوسرا تسمہ بیچ کی انگلی اور اس کے برابر والی انگلی جس کو عربی میں بنصر کہتے ہیں کے درمیان ہوتا تھا۔ اس پاپوش کو اس زمانے میں اہل عرب چپل کے طور پر استعمال کرتے تھے جس کو ہمارے یہاں عام طور پر گھر میں یا مسجد وغیرہ تک جانے کے لئے پہن لیا جاتا ہے۔

جوتے کی اہمیت

③ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ غَزْوَةٍ غَزَاهَا یَقُوْلُ اسْتَكْثِرُوْا مِنَ النِّعَالِ فَاِنَّ الرَّجُلَ لَا یَزَالُ رَاكِبًا مَا انْتَعَلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک غزوے کے موقع پر کہ جس میں جنگ ہوئی (یعنی کسی جہاد کے لئے روانگی کے وقت) نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بہت سی جوتیاں لے لو، کیونکہ آدمی جب تک جوتیاں پہنے ہوئے ہوتا ہے سوار کی مانند رہتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: جو شخص جوتا پہنے ہوئے ہوتا ہے وہ یقیناً ننگے پیر چلنے والوں کی بہ نسبت زیادہ تیز چلتا ہے اور اس کے پیر بھی تکلیف اور نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے جوتا پہننے والے شخص کو سوار کی مانند کہا گیا ہے، اس ارشاد گرامی میں گویا اس بات

کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ اسباب سفر میں سے وہ چیزیں دوران سفر ضرور ساتھ رکھنی چاہئیں جن کی ضرورت پڑتی ہو۔

پہلے دایاں پیر جوتے میں ڈالو اور پہلے بائیں پیر کا جوتا اتارو

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْتَعَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيُمْنٰى وَاِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشِّمَالِ لِتَكُنِ الْيُمْنٰى اَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ وَاٰخِرَهُمَا تُنْزَعُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص جوتا پہنے تو اس کو چاہئے کہ دائیں پیر سے ابتدا کرے یعنی پہلے دایاں پیر جوتے میں ڈالے اور جب جوتا اتارے تو چاہئے کہ بائیں پیر سے ابتداء کرے یعنی پہلے بایاں پیر جوتے سے نکالے، حاصل یہ کہ دائیں پیر کو پہنتے وقت تو مقدم رکھنا چاہئے اور اتارتے وقت مؤخر رکھنا چاہئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مذکورہ مسئلہ میں اصل ضابطہ یہ ہے کہ جو عمل فضیلت و شان رکھتا ہو اس میں دائیں سے ابتداء کرنا مستحب ہے اور جو عمل ایسا نہ ہو اس میں بائیں سے ابتداء ہونی چاہئے، چنانچہ جوتا پہننا چونکہ مسجد میں جانے اور دوسرے اعمال خیر کا ذریعہ اور وسیلہ ہے اس لئے جوتا پہنتے وقت دائیں پیر سے ابتداء کرنا مستحب ہے اس ضابطہ کی روشنی میں یہ بھی مستحب ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دائیں پیر رکھنا چاہئے اور مسجد سے نکلتے وقت پہلے بایاں پیر نکالنا چاہئے اس کے برخلاف بیت الخلاء جاتے وقت پہلے بایاں پیر اندر رکھنا چاہئے اور وہاں سے نکلتے وقت پہلے دایاں پیر نکالنا چاہئے۔ یہ تو ضابطہ کی بات تھی اس کے علاوہ اس حقیقت پر بھی نظر رہنی چاہئے کہ بائیں پیر کے مقابلہ میں دائیں پیر کو فضیلت اور برتری کا درجہ حاصل ہے لہٰذا اس کی تکریم کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور اس کی تکریم یہی ہے کہ جب جوتا پہنا جائے تو پہلے دایاں پیر جوتے میں ڈالا جائے اور جب جوتا اتارا جائے تو پہلے بائیں پیر کا جوتا نکالا جائے تاکہ دایاں پیر بائیں پیر کی بہ نسبت جوتے میں زیادہ دیر تک رہے یہ گویا دائیں پیر کے اعزاز و احترام کا ذریعہ ہے اسی پر مسجد وغیرہ میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ایک پیر میں جوتا اور ایک پیر ننگا نہ ہونا چاہئے

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَمْشِيْ اَحَدُكُمْ فِیْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ لِيُحْفِهِمَا جَمِيْعًا اَوْ لِيُنْعِلْهُمَا جَمِيْعًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایک پیر میں جوتا پہن کر نہ چلے، یہ ضروری ہے کہ یا تو دونوں پیر ننگے ہوں یا دونوں پیروں میں جوتے ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جوتا پہنے تو دونوں پیروں میں پہنے اور اگر نہ پہنے تو دونوں پیروں میں نہ پہنے ایک پاؤں میں جوتا پہننا اور دوسرے پاؤں کو ننگا رکھنا مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ اول تو یہ طریقہ تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے، دوسرے پیروں کے اونچے نیچے پڑنے اور گر جانے کا سبب بن سکتا ہے خاص طور پر اس صورت میں جب کہ جوتا اونچا اور زمین غیر ہموار ہو۔ علماء نے اس کے ساتھ ایک ہاتھ آستین سے باہر رکھنے کو بھی شامل کیا ہے یعنی اگر کوئی شخص کرتے وغیرہ کی ایک آستین میں تو ہاتھ ڈال لے لیکن دوسری آستین کو خالی چھوڑ کر کندھے پر ڈال لے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اسی طرح ایک پاؤں میں جوتا پہننا اور دوسرے پاؤں میں محض موزہ پہن لینا بھی یہی حکم رکھتا ہے۔

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْقَطَعَ شِسْعُ نَعْلِهٖ فَلَا يَمْشِیْ فِیْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ حَتّٰى يُصْلِحَ شِسْعَهٗ وَلَا يَمْشِیْ فِیْ خُفٍّ وَاحِدٍ وَلَا يَاْكُلْ بِشِمَالِهٖ وَلَا يَحْتَبِیْ بِالثَّوْبِ الْوَاحِدِ وَلَا يَلْتَحِفَ الصَّمَّآءَ۔

(رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی شخص کی جوتی یعنی چپل وغیرہ کا تسمہ ٹوٹ جائے تو ایک ہی جوتے میں نہ چلے بلکہ اس جوتی کا تسمہ درست کرلے اسی طرح ایک کپڑے میں گوٹ مارے (جب کہ اس کپڑے کا کوئی حصہ اس کے ستر کو چھپائے ہوئے نہ ہو) اور نہ کسی کپڑے کو بدن پر اس طرح لپیٹ لے کہ ہاتھ بھی اندر رہیں (اور ہاتھ نکالتے وقت ستر کھل جائے)۔" (مسلم)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آنحضرت ﷺ کی پاپوش مبارک کے تسمے

⑦ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ لِنَعْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِبَالَانِ مُثَنًّى شِرَاكُهُمَا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی پاپوش مبارک میں دو تسمے تھے جن میں پیروں کی انگلیاں رہتی تھیں اور ان دونوں میں ہر تسمہ دوہرا تھا تاکہ تسمے کی مضبوطی بھی قائم رہے اور پاؤں میں دھنستے بھی نہیں۔" (ترمذیؒ)

کھڑے ہو کر جوتا پہننے کی ممانعت

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّنْتَعِلَ الرَّجُلُ قَائِمًا رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر جوتا پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ وابن ماجہؒ) نے اس روایت کو ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح : یہ ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ کھڑے ہو کر جوتا پہننے میں مشقت اٹھانا پڑتی ہو، یعنی ایسا جوتا ہو جس کو پہننے اور اس کا تسمہ باندھنے میں ہاتھ لگانا پڑتا ہو، ویسے مطلق جوتے کے بارے میں یہ ممانعت نہیں ہے۔

کیا آنحضرت ﷺ ایک پاؤں میں جوتا پہن کر چلتے پھرتے تھے

⑨ وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ رُبَّمَا مَشَى النَّبِيُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِنَّمَا مَشَتْ بِنَعْلٍ وَاحِدَةٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا اَصَحُّ۔

"اور حضرت قاسم ابن محمدؒ، حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا نبی کریم ﷺ بعض وقت ایک پاپوش پہن کر چلتے تھے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عائشہؓ ایک پاپوش پہن کر چلیں۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے یہ روایت اسناد کے اعتبار سے یا مفہوم و معنی کے اعتبار سے نہایت صحیح ہے۔"

تشریح : جن احادیث میں ایک پاؤں میں جوتا پہن کر چلنے کی ممانعت منقول ہے یہ حدیث ان کے بالکل متضاد ہے، چنانچہ علماء نے اس حدیث کے صحیح ہونے میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس صورت میں آنحضرت ﷺ کا یہ عمل نادر کے درجہ میں ہوگا۔ اور یہ کہ اس کا تعلق گھر کے اندر سے ہوگا نہ کہ باہر سے یعنی آپ ﷺ گھر کے اندر کسی موقع پر ایک جوتا پہن کر چلے ہوں گے اور وہ بھی کسی ضرورت و مجبوری کی بنا پر، یا بیان جواز کی خاطر تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ایک پیر میں جوتا پہن کر چلنا بالکل حرام نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز اُمت کے حق میں مکروہ تنزیہی ہے اس کا شارع علیہ السلام کے عمل میں آنا اس چیز کے اصل جواز کو ظاہر کرنے کے لئے ہوتا ہے، اس اعتبار سے وہ چیز گویا شارع کے حق میں مکروہ ہوتی ہی نہیں بلکہ کسی چیز کے جواز کو بیان کرنا شارع پر واجب ہے اس نکتہ کو صاحب مواہب لدنیہ نے آنحضرت ﷺ کے کھڑے ہو کر پانی پینے کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

جوتے اتار کر بیٹھو

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مِنَ السُّنَّةِ اِذَا جَلَسَ الرَّجُلُ اَنْ يَخْلَعَ نَعْلَيْهِ فَيَضَعَهُمَا بِجَنْبِهٖ۔ (رواہ ابو داؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ بات سُنّت سے ثابت ہے کہ جب کوئی شخص بیٹھے تو اپنے جوتے اتارے اور ان کو اپنے پہلو میں رکھ لے ا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جوتے سمیت نہ بیٹھے بلکہ ان کو اتار کر بیٹھے کہ یہ آداب مجلس کا تقاضہ بھی ہے اور تہذیب و شائستگی کی علامت بھی، نیز جوتوں کو اپنے بائیں پہلو کی طرف رکھے تاکہ دائیں پہلو کی تکریم برقرار رہے، سامنے کی طرف بھی نہ رکھے، تاکہ اگر مسجد وغیرہ میں بیٹھا ہوا ہے تو قبلہ کی تعظیم کے خلاف نہ ہو، اور چوری ہو جانے کے خوف سے پیچھے کی طرف بھی نہ رکھے۔

آنحضرت ﷺ کے لئے نجاشی کی طرف سے پائتابوں کا ہدیہ

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّجَاشِيَّ اَهْدٰى اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُفَّيْنِ اَسْوَدَيْنِ سَاذَجَيْنِ فَلَبِسَهُمَا رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ عَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ ثُمَّ تَوَضَّاَ وَمَسَحَ عَلَيْهِمَا۔

"اور حضرت ابن بریدہؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نجاشی (حبش کے بادشاہ) نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دو سیاہ موزے (یعنی کالے چمڑے کے پائتابے) بطور ہدیہ بھیجے جو سادہ یعنی غیر منقش تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کو بحالت طہارت پہنا۔ (ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے اس روایت کو ابوہریرہؓ اور انھوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے یعنی ترمذی کی روایت میں عن ابن بریدة کے بجائے عن ابی بریرة ہے اور ان کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے کہ پھر آنحضرت ﷺ نے وضو کیا اور ان موزوں پر مسح کیا۔"

تشریح: وہ موزے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے یہ تحقیق و تفتیش نہیں کی کہ یہ موزے جس چمڑے کے ہیں آیا وہ دباغت دیا گیا تھا یا نہیں اور یہ کہ چمڑہ مردار کا ہے یا ذبح کئے ہوئے جانور کا، ان باتوں کو پوچھے بغیر آپ ﷺ نے وہ موزے پہن لئے، گویا آپ ﷺ نے ان موزوں کی ظاہری صورت حال کا اعتبار کیا کہ ظاہر میں ان پر کسی نجاست وغیرہ کے آثار نہیں تھے اس لئے ان کو پاک سمجھا اس سے کورے کپڑوں، بوریوں، چٹائیوں، قالین، دریوں اور شطرنجی اور دوسرے فرش و فروش کا یہ حکم معلوم ہوا کہ اگر ان پر ظاہر میں کوئی نجاست وغیرہ محسوس نہ ہو تو وہ پاک سمجھے جائیں گے۔

بَابُ التَّرَجُّلِ

کنگھی کرنے کا بیان

"ترجل" عربی زبان میں کنگھی کرنے کو کہتے ہیں، خواہ اس کا تعلق سر میں کنگھی کرنے کا ہو یا داڑھی میں لیکن عام طور پر "ترجل" کا استعمال سر میں کنگھی کرنے کے معنی میں ہوتا ہے اور داڑھی میں کنگھی کرنے کو "تسریح" کے لفظ سے بیان کرتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حائضہ کا بدن ناپاک نہیں ہوتا

(۱) عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ كُنْتُ اُرَجِّلُ رَاْسَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا حَائِضٌ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اپنے ایام حیض میں بھی رسول کریم ﷺ کے سر مبارک میں کنگھی کیا کرتی تھی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حائضہ کا بدن ناپاک نہیں ہوتا، اور یہ کہ اس (حائضہ) کے ساتھ اختلاط جائز ہے۔

وہ چیزیں جو "فطرت" ہیں

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْفِطْرَةُ اَخْمَسُ اَلْخِتَانُ وَالْاِسْتِحْدَادُ وَقَصُّ الشَّارِبِ وَتَقْلِیْمُ الْاَظْفَارِ وَنَتْفُ الْاِبْطِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا پانچ چیزیں فطرت میں (داخل) ہیں ایک تو ختنہ کرانا دوسرے (زیر ناف بالوں کو صاف کرنے کے لئے لوہے) یعنی استرے، وغیرہ کا استعمال کرنا، تیسرے لبوں کے بال ترشوانا چوتھے ناخون کٹوانا اور پانچویں بغل کے بال صاف کرانا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "فطرت" کا مطلب یہ ہے کہ یہ پانچ چیزیں تمام انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین کی شریعت میں مسنون رہی ہیں۔ واضح رہے کہ فطرت سے متعلق حدیث کتاب کے ابتدائی حصے میں باب السواک میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں دس چیزوں کو فطرت میں شمار کرایا گیا تھا اور یہاں پانچ چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ تو وہاں حصر مقصود تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ جو چیزیں تمام انبیاء کرام کی سُنّت ہونے کی وجہ سے فطرت کا درجہ رکھتی ہیں ان میں سے دس چیزیں یہ ہیں (جن کو باب السواک میں بیان کیا گیا ہے) اور پھر ان دس چیزوں میں سے پانچ چیزیں علیحدہ کر کے یہاں بیان کی گئی ہیں۔

اپنے کو اہل شرک سے ممتاز رکھو

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَالِفُوا الْمُشْرِكِیْنَ اَوْفِرُوا اللُّحٰی وَاَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَنْهِكُوا الشَّوَارِبَ وَاَعْفُوا اللُّحٰی۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل شرک کے خلاف کرو یعنی وہ چونکہ داڑھیاں پست کراتے ہیں اور مونچھیں بڑھاتے ہیں اس لئے ہم بایں طور ان سے اپنے آپ کو ممتاز رکھو کہ تم داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں ہلکی کراؤ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ تم مونچھیں نہایت ہلکی کراؤ اور داڑھیاں چھوڑ دو۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

زائد بالوں کو صاف کرنے کی مدت

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ وُقِّتَ لَنَا فِیْ قَصِّ الشَّارِبِ وَتَقْلِیْمِ الْاَظْفَارِ وَنَتْفِ الْاِبْطِ وَحَلْقِ الْعَانَةِ اَنْ لَا نَتْرُكَ اَكْثَرَ مِنْ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مونچھیں ترشوانے، ناخون کٹوانے، بغل کے بال صاف کرانے اور زیر ناف بال مونڈنے کے بارے میں ہمارے لئے جو مدت متعیّن کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کو چالیس دن سے زیادہ نہ چھوڑیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابو عمرؓ سے منقول ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ناخون اور لبوں کے بال، ہر جمعہ کو ترشواتے تھے، زیر ناف بال بیس دن میں صاف کرتے تھے، اور بغل کے بال چالیس دن میں صاف کراتے تھے۔ قنیہ میں لکھا ہے کہ افضل یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک بار ناخون ترشوا کر، لبوں کے بال ہلکے کرا کر اور جسم کے زائد بال صاف کر کے غسل کے ذریعہ اپنے بدن کو صاف ستھرا کیا جائے اگر ہر ہفتہ یہ ممکن نہ ہو تو ہر پندرھویں دن اس پر عمل کیا جائے، یہاں تک کہ چالیس دن سے زائد کا عرصہ گزر

جائے تو یہ "بلاعذر ترک" کہلائے گا گویا ان چیزوں کے لئے ایک ہفتہ تو افضل مدت ہے پندرہ روزہ مدت اوسط درجہ پر مشتمل ہے اور آخری مدت چالیس دن ہے چالیس دن سے زیادہ گذارنے والا بلاعذر ترک کرنے والا شمار ہوگا، جس پر حنفیہ کے نزدیک وہ وعید کا مستحق ہوگا۔

مظہر کہتے ہیں کہ ابو عمر اور عبداللہ الاغر سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کو جانے سے پہلے لبوں کے بال اور ناخون کترتے تھے، اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ بغل کے بال اور ناف کے نیچے کے بال چالیس دن میں اور بعض حضرات کی روایت کے مطابق ایک مہینہ میں صاف کرتے تھے، ایک مہینہ والی روایت ایک معتدل قول ہے۔

خضاب کرنے کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی لَا یَصْبِغُوْنَ فَخَالِفُوْهُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "یہودی اور عیسائی خضاب نہیں لگاتے لہٰذا تم ان کے خلاف کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تم لوگ خضاب لگا کر یہودیوں اور عیسائیوں کی مخالفت کو ظاہر کرو۔ واضح رہے کہ "خضاب" سے مراد وہ خضاب ہے جو سیاہ نہ ہو کیونکہ سیاہ خضاب لگانا ممنوع ہے، اس کی تفصیلی بحث آگے آئے گی، جہاں تک صحابہؓ وغیرہ کا تعلق ہے تو وہ مہندی کا سرخ خضاب کرتے تھے اور کبھی کبھی زرد خضاب بھی کر لیا کرتے تھے چنانچہ مہندی کا خضاب لگانے کے بارے میں متعدد احادیث منقول ہیں اور علماء نے لکھا ہے کہ مہندی کا خضاب مؤمن ہونے کی ایک علامت ہے، تمام علماء کے نزدیک مہندی کا خضاب لگانا جائز ہے، بلکہ بعض فقہاء نے مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے اس کو مستحب بھی کہا ہے اور اس کے فضائل میں وہ احادیث بھی نقل کرتے ہیں اگرچہ ان احادیث کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

مجمع البحار میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں خضاب کرنے کا حکم ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جن کے بال کھچڑی یعنی کچھ سیاہ اور کچھ سفید ہوں، بلکہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کے بال بالکل سفید ہو گئے ہوں اور سیاہ بالوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہ گیا ہو، جیسا کہ حضرت ابوقحافہؓ کے بال تھے جن کے متعلق اگلی حدیث میں ذکر آرہا ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ خضاب کے مسئلہ میں علماء کے اقوال مختلف ہیں اور اس اختلاف کی بنیاد احوال کے مختلف ہونے پر ہے۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس حکم کا تعلق اس مسلم شہر و علاقہ کے لوگوں سے ہے جہاں خضاب لگانے کا عام دستور ہو کہ اگر کوئی شخص اپنے شہر کے لوگوں کے تعامل و عادت سے اپنے آپ کو الگ رکھے گا تو غیر مناسب شہرت کا حامل ہوگا جو مکروہ ہے اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے بالوں کی سفیدی اس کے باوقار و پاکیزہ بڑھاپے کی علامت اس کے چہرے مہرے کی نورانیت اور خوشنمائی کا سبب ہو بلکہ، خضاب کرنے سے اس کی شخصیت کا وقار بھیکا پڑ جاتا ہو تو اس کے حق میں خضاب نہ کرنا ہی زیادہ بہتر اور زیادہ مناسب ہے اس کے برخلاف جس شخص کے بالوں کی سفیدی اس کے بدنما اور بے وقت بڑھاپے کی غماز ہو جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کی دل کشی مجروح ہوتی ہو تو اس کو اپنا یہ عیب چھپانا اور خضاب لگانا زیادہ بہتر و مناسب ہے۔

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اُتِیَ بِاَبِیْ قُحَافَةَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّةَ وَرَاْسُهٗ وَلِحْیَتُهٗ کَالثَّغَامَةِ بَیَاضًا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَیِّرُوْا هٰذَا بِشَیْءٍ وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ کے والد) ابوقحافہؓ کو فتح مکہ کے دن لایا گیا اور اسی دن انہوں نے اسلام قبول کیا ان کے سر اور داڑھی کے بال گویا ثغامہ تھے یعنی بالکل سفید تھے نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ان بالوں کی سفیدی کو کسی چیز کے ذریعہ بدل

ڈالو لیکن سیاہ رنگ سے اجتناب کرنا، یعنی سیاہ خضاب استعمال نہ کرنا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ثغامہ" ایک قسم کی گھاس کو کہتے ہیں جس کے شگوفے اور پھل سفید ہوتے ہیں اس گھاس کو فارسی میں ورمغہ کہا جاتا ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سیاہ خضاب مکروہ حرام ہے اور مطالب المؤمنین میں علماء کا یہ قول لکھا ہے کہ اگر کوئی غازی و مجاہد دشمنان دین کی نظر میں اپنی ہیبت قائم کرنے کے لئے سیاہ خضاب کرے تو جائز ہے اور جو شخص اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے زینت و آرائش کی خاطر اور عورت کی نظر میں دل کش بننے کے لئے سیاہ خضاب کرے تو یہ اکثر علماء کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں جو کچھ منقول ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مہندی اور وسمہ (نیل کے پتے) کا خضاب کرتے تھے اور اسی خضاب کی وجہ سے ان کے بالوں کا رنگ سیاہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ سرخ مائل بہ سیاہی ہوتا تھا، اسی طرح اس سلسلے میں بعض دوسرے صحابہؓ کے متعلق جو روایات نقل کی جاتی ہیں وہ بھی اسی پر محمول ہیں۔

حاصل یہ کہ مہندی کا خضاب بالاتفاق جائز ہے اور سیاہ خضاب میں حرمت و کراہت ہے بلکہ اس کے بارے میں بڑی سخت وعید بیان کی گئی ہے، جیسا کہ دوسری فصل میں بیان ہوگا۔

سر کے بالوں میں فرق و سدل دونوں جائز ہیں

(۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ مُوَافَقَةَ اَهْلِ الْكِتَابِ فِيْمَا لَمْ يُؤْمَرْ فِيْهِ وَكَانَ اَهْلُ الْكِتَابِ يَسْدُلُوْنَ اَشْعَارَهُمْ وَكَانَ الْمُشْرِكُوْنَ يَفْرُقُوْنَ رُءُ سَهُمْ فَسَدَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاصِيَتَهٗ ثُمَّ فَرَقَ بَعْدُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہیں ملتا تھا اس میں آپ ﷺ اہل کتاب کی موافقت کو پسند فرماتے تھے، چنانچہ اہل کتاب اپنے (سر کے) بالوں کو یوں ہی چھوڑے رکھتے تھے (یعنی وہ مانگ نہیں نکالتے تھے بلکہ اپنے بالوں کو یونہی پڑے رہنے دیتے تھے) جب کہ مشرکین اپنے سروں میں مانگ نکالتے اس لئے نبی کریم ﷺ (اہل کتاب کے طریقے کے مطابق) اپنی پیشانی کے بال یوں ہی چھوڑے رکھتے تھے لیکن بعد میں مانگ نکالنے لگے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "سدل" کے معنی ہیں سر کے بالوں کو چاروں طرف یونہی چھوڑے اور لٹکائے رکھنا اور مانگ نکالنے کے لئے دونوں طرف کے بالوں کو اکٹھا نہ کرنا اور فرق کا مطلب ہے سر کے آدھے بالوں کو ایک طرف اور آدھے بالوں کو دوسری طرف اکٹھا کر لینا۔ نیز قاموس میں لکھا ہے کہ "فرق" بالوں کے درمیان پیدا کی جانے والی راہ یعنی مانگ کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا، نبی کریم ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو ابتداء میں اہل کتاب کی موافقت میں پیشانی کے بالوں کو سدل کرتے تھے، یعنی یوں ہی بے ترتیب چھوڑے رکھتے، کیونکہ اہل کتاب کا طریقہ سدل ہی کا تھا۔ واضح رہے کہ "سدل" کا مطلب اگرچہ بالوں کے سر کے چاروں طرف یونہی رکھنا ہے اور اس میں پیشانی کے بالوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے، لیکن سدل اور فرق کے درمیان امتیاز چونکہ پیشانی کے اوپر کے بالوں ہی سے ظاہر ہوتا ہے اس سبب سے خاص طور سے پیشانی کے بالوں کو ذکر کیا گیا ہے اگرچہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ یہاں "سدل" سے مراد محض پیشانی کے بالوں کو چھوڑے رکھنا ہے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ شروع میں تو آنحضرت ﷺ کا معمول سدل ہی کا تھا لیکن بعد میں فرق یعنی مانگ نکالنا آخری عمل پایا، لہٰذا اس بنا پر بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ سدل یعنی بالوں کو یوں ہی چھوڑے رکھنا منسوخ ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر فرق کو اختیار کرنا حکم الٰہی (وحی) کے سبب تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو یہ اجازت تھی کہ جس معاملہ میں ابھی کوئی شرعی حکم نازل نہیں ہوا ہے اس میں اہل کتاب کے دستور کے مطابق عمل کیا جا سکتا ہے، چنانچہ جب بالوں کے بارے میں آپ ﷺ کو بذریعہ وحی

فرق یعنی مانگ نکالنے کا حکم دیا گیا تو یہ اس بات کی علامت قرار پایا کہ بالوں کے سلسلے میں عارضی طور پر اہل کتاب کے دستور کے مطابق عمل کرنے کی جو اجازت تھی وہ منسوخ ہوئی اس سے خود بخود یہ واضح ہوگیا کہ فرق کا حکم آخری وحتمی ہے اس لئے اس بارے میں اہل کتاب کی مخالفت یعنی سدل کو ترک کرنا بھی حتمی ہی طور پر ہونا چاہئے۔

اس حدیث سے بعض حضرات نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعت ہمارے لئے قابل اتباع ہے جب تک کہ ہمیں اس کے برخلاف عمل کرنے کا حکم نہ دیا جائے، لیکن یہ اتباع انہیں چیزوں میں ہوگا جن کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ جوں کے توں وہی احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے پچھلی شریعت میں نازل کئے تھے۔

روایت کے ان الفاظ "یحب موافقتھم" (آپ ﷺ اہل کتاب کی موافقت کو پسند فرماتے تھے) سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان معاملات میں بھی اہل کتاب کی موافقت کرنے کو آنحضرت ﷺ کے محض اختیار پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ اگر آپ ﷺ پسند کریں تو اہل کتاب کے مطابق عمل کریں اور اگر پسند نہ کریں تو عمل نہ کریں اگر یہ (یعنی موافقت کرنے کا حکم) اسی درجہ کا ہوتا، جس درجہ کا کوئی شرعی حکم ہوتا ہے تو اس میں آنحضرت ﷺ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا، بلکہ ایک واجب اور لازم امر ہوتا۔

بعض احادیث میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ اگر آپ ﷺ کے بال بے ترتیب اور بکھرے ہوئے ہوتے تو ان کو اکٹھا کر کے مانگ نکال لیتے تھے ورنہ ان کی حالت پر چھوڑے رکھتے تھے۔ گویا عام حالات میں (جب کہ بال بکھرے ہوئے نہ ہوتے) آپ ﷺ سدل یا دونوں میں سے کسی کا بھی اہتمام و تکلف نہیں فرماتے تھے بلکہ ان بالوں کو ان کی حالت پر رہنے دیتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ سدل اور فرق دونوں جائز ہیں لیکن فرق افضل ہے۔

"قزع" کی ممانعت

⑧ وَعَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى عَنِ الْقَزَعِ قِيْلَ لِنَافِعٍ مَاالْقَزَعُ قَالَ يُحْلَقُ بَعْضُ رَاسِ الصَّبِيِّ وَيُتْرَكُ الْبَعْضُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَالْحَقَ بَعْضُهُمُ التَّفْسِيْرَ بِالْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت نافعؒ، حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو "قزع" سے منع فرماتے ہوئے سنا، حضرت نافعؒ سے پوچھا گیا کہ قزع کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا (قزع اس کو کہتے ہیں کہ) لڑکے کے سر کے بعض حصہ کو مونڈا جائے، اور بعض حصے کو چھوڑ دیا جائے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور بعض راویوں نے وضاحت کو حدیث کے ساتھ جوڑا ہے، یعنی ان راوی کے مطابق، قزع کے یہ معنی آنحضرت ﷺ ہی نے بیان فرمائے۔"

تشریح: نوویؒ کہتے ہیں کہ قزع کے معنی مطلق (کسی کے بھی) سر کے کچھ حصے کو مونڈنا (اور کچھ حصے کو بغیر مونڈے چھوڑ دینا ہیں)۔ اور یہی معنی زیادہ صحیح ہیں، کیوں کہ حدیث کے راوی نے بھی یہی معنی بیان کئے ہیں اور یہ حدیث کے ظاہری مفہوم کے مخالف بھی نہیں ہیں، لہٰذا اسی معنی پر اعتماد کرنا واجب ہے! جہاں تک "لڑکے" کی تخصیص کا ذکر ہے تو یہ محض عام رواج وعادت کی بنا پر ہے ورنہ قزع جس طرح لڑکے کے حق میں مکروہ ہے، اس طرح بڑوں کے حق میں بھی مکروہ ہے، اسی لئے فقہی روایات میں یہ مسئلہ کسی قید و استثناء کے بغیر بیان کیا جاتا ہے، اور قزع میں کراہت اہل کفر کی مشابہت اور بدہیئتی سے بچانے کے لئے ہے۔

راوی نے "قزع" کا جو مطلب بیان کیا ہے اور جس کو نوویؒ نے زیادہ صحیح کہا ہے اس میں چوٹی (جیسا کہ غیر مسلم اپنے سر چھوڑتے ہیں) (زلف اور بالوں کی) وہ تراش خراش شامل ہے جو مسنون طرز کے خلاف ہو۔

⑨ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى صَبِيًّا قَدْ حُلِقَ بَعْضُ رَاسِهٖ وَتُرِكَ بَعْضُهٗ فَنَهَاهُمْ عَنْ ذٰلِكَ وَقَالَ احْلِقُوْا كُلَّهٗ اَوِ اتْرُكُوْا كُلَّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے ایک ایسے لڑکے کو دیکھا جس کے سر کا کچھ حصہ مونڈا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے لڑکے کی پرورش کرنے والوں کو اس سے منع فرمایا اور فرمایا کہ پورے سر کو مونڈو یا پورے سر کو چھوڑ دو!" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ حج و عمرہ کے علاوہ بھی سر منڈانا جائز ہے۔ ویسے مسئلہ یہ ہے کہ مرد کو اختیار ہے کہ وہ چاہے سر منڈائے اور چاہے سر پر بال رکھے لیکن افضل یہ کہ سوائے حج اور عمرہ کے سر نہ منڈائے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ کرامؓ کا معمول تھا اور کتاب کے ابتدائی حصہ میں باب الجنایت کے دوران اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

مخنث پر آنحضرت ﷺ کی لعنت

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَعَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُخَنَّثِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَقَالَ اَخْرِجُوْهُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مخنث مردوں پر لعنت فرمائی ہے، اور ان عورتوں پر بھی لعنت فرمائی جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مخنثوں کو اپنے گھروں سے نکال باہر کرو۔" (بخاریؒ)

تشریح: مُخَنَّث یا مُخَنِّث (زیادہ صحیح مُخَنَّث ہی ہے) کی اصل "خنث" ہے جس کے لغوی معنی نرمی اور شکستگی کے ہیں۔ مخنث اس مرد کو کہتے ہیں جو عورتوں کا سا لباس پہنے، عورتوں کی طرح ہاتھ پیروں کو مہندی کے ذریعہ رنگین کرے، بات چیت میں عورتوں کا لب ولہجہ اختیار کرے، اور اسی طرح جملہ حرکات و سکنات میں عورتوں کا انداز اپنائے، ایسے مرد کو ہماری بول چال میں ہجڑہ یا زنانہ بھی کہا جاتا ہے۔ مخنث دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو خلقی کہ ان کے اعضاء جسم اور انداز میں خلقی اور جبلی طور پر عورتوں کی سی نرمی و لچک ہوتی ہے، گویا ان میں قدرتی طور پر عورتوں کے اوصاف و عادات ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض مرد اگرچہ اپنے اعضاء جسم اور خلقت و جبلت کے اعتبار سے مکمل مرد ہوتے ہیں مگر جان بوجھ کر اپنے کو عورت بنانا چاہتے ہیں چنانچہ وہ بات چیت کے انداز اور رہن سہن کے طور طریقوں میں عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے فوطے اور عضو تناسل کٹوا کر، نامرد بھی بن جاتے ہیں، مخنثوں کی اسی قسم کے حق میں لعنت و مذمت فرمائی گئی ہے، اس کے برخلاف پہلی قسم اس لعنت سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ تو معذوری کی شکل ہے اس میں اپنے قصد و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اسی طرح ان عورتوں پر بھی لعنت فرمائی گئی ہے جو اپنے آپ کو وضع قطع، رہن سہن اور لباس وغیرہ میں مردوں کے مشابہ بناتی ہیں۔

شرعۃ الاسلام کی شرح میں لکھا ہے کہ مہندی لگانا عورتوں کے لئے تو مسنون ہے اور مردوں کے لئے بلاعذر لگانا مکروہ ہے، کیونکہ اس میں عورتوں کی مشابہت لازم آتی ہے۔ اس قول سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عورتوں کے لئے مہندی سے بالکل عاری رہنا مکروہ ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی مردوں کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے۔

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَآءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَآءِ بِالرِّجَالِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو مرد عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور جو عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔" (بخاریؒ)

انسانی بال سے نفع اٹھانا حرام ہے

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو عورت اپنے بالوں میں کسی دوسری عورت کے بالوں کا جوڑ لگائے (خواہ خود لگائے اور خواہ کسی دوسرے سے لگوائے) اور جو عورت کسی دوسری عورت کے بالوں میں اپنے بالوں کا جوڑ لگائے اور جو عورت گودے اور جو عورت گدوائے ان سب پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "بالوں کا جوڑ لگائے یا لگوائے" سے مراد یہ ہے کہ بالوں کے حسن و درازی کے لئے کوئی عورت کسی دوسری عورت کے بالوں کا چوٹا لے کر اپنی چوٹی میں شامل کرے، یا اپنے بالوں کا چوٹا لے کر کسی دوسری عورت کی چوٹی میں شامل کر دے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "احادیث سے یہ بات صراحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ بلا کسی استثناء وقید کے بالوں کا جوڑ لگانا حرام ہے،" چنانچہ ظاہر و مختار مسئلہ بھی یہی ہے، لیکن ہمارے (شافعی) علماء نے اس مسئلہ میں یہ تفصیل بیان کی ہے کہ انسان کے بالوں کا جوڑ لگانا تو بلا اختلاف حرام ہے کیوں کہ انسان کو جو بزرگی و شرف حاصل ہے، اس کی بناء پر اس کے بالوں اور اس کے دیگر اجزاء جسم سے فائدہ اٹھانا حرام ہے، اور اگر انسان کے علاوہ کسی جانور کے پاک بال ہوں تو ان کی چوٹی میں شامل کرنے کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر عورت کا خاوند یا مالک نہ ہو (یعنی جو عورت آزاد ہو اور مطلقہ یا بیوہ یا کنواری ہو) تو اس کے لئے اپنی چوٹی میں ان بالوں کو شامل کرنا بھی حرام ہے اور اگر عورت خاوند یا مالک والی ہو تو اس کے حق میں تین صورتیں ہیں جن میں سب سے زیادہ صحیح صورت یہ ہے کہ وہ خاوند یا مالک کی اجازت کے بعد ان بالوں کو اپنی چوٹی میں شامل کرے تو جائز ہے۔

مالکؒ، طبریؒ اور اکثر علماء یہ کہتے ہیں کہ عورت کے لئے اپنی چوٹی میں کوئی بھی چیز شامل کرنا ممنوع ہے خواہ وہ بال ہوں، خواہ کالے صوف (اون) ہوں، خواہ دھجیاں ہوں اور خواہ ان کے علاوہ کوئی اور شے ہو، ان حضرات نے اس مسئلہ میں احادیث سے استدلال کیا ہے، جب کہ فقیہ لیثؒ کا قول یہ ہے کہ مذکورہ ممانعت کا تعلق صرف بالوں سے ہے، لہٰذا چوٹی میں بالوں کے علاوہ دوسری چیزیں جیسے صوف وغیرہ شامل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ نیز بالوں کو ایسی ڈوری وغیرہ سے باندھنا کہ جو بالوں کی مشابہت نہ رکھے بلا کراہت جائز ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں یہ لکھا ہے کہ سر کے بالوں میں (یعنی چوٹی میں) انسان کے بال شامل کرنا حرام ہے لیکن صوف یعنی اون کو شامل کرنا جائز ہے۔

"گودنے" کا مطلب یہ ہے کہ جسم کے کسی حصہ کی جلد پر سوئیاں یا اسی طرح کی کوئی چیز چبھوئی جائے یہاں تک کہ خون بہنے لگے پھر اس میں سرمہ یا نیل بھر دیا جائے۔ یہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم ہے اور آج کل بعض غیر مسلم قوموں میں اس کا رواج ہے، شریعت اسلامی نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے، نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ چیز گودنے والے اور گدوانے والے دونوں کے لئے حرام ہے، اور جسم کے جس حصہ پر گودا جاتا ہے وہ حصہ بھی نجس ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر کسی مسلمان نے ناسمجھی سے گدوا لیا ہے اور کسی علاج و معالجہ کے ذریعہ اس کا ازالہ ممکن ہو تو اس کا نشان مٹوا دینا واجب ہے اور اگر کسی حرج و تنگی کے بغیر اس کا ازالہ ممکن نہ ہو، نیز اس بات کا خوف ہو کہ اس کو زائل کرنے کی صورت میں جسم کا وہ حصہ تلف یا بیکار ہو جائے گا یا پوری طرح کام نہیں کرے گا یا اس ظاہری عضو میں بہت بڑا عیب پیدا ہو جائے گا تو اس صورت میں اس کا ازالہ واجب نہیں، تاہم خدا سے معافی مانگنا اور توبہ و استغفار کرنا چاہئے تاکہ اس پر سے گناہ کا بار ہٹ جائے، اور اگر مذکورہ چیزوں میں سے کسی چیز کا خوف نہ ہو تو پھر اس کا ازالہ ہی لازم ہوگا اور اس میں تاخیر کرنے سے گنہ گار ہوگا۔

اللہ کی تخلیق میں تغیر کرنے والا اللہ کی لعنت کا مورد ہے

(۱۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ فَجَاءَتْهُ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ اِنَّهٗ بَلَغَنِیْ اَنَّكَ لَعَنْتَ كَيْتَ وَكَيْتَ فَقَالَ مَالِیْ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ هُوَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ مَابَيْنَ اللَّوْحَيْنِ فَمَا وَجَدْتُ فِيْهِ مَاتَقُوْلُ قَالَ لَئِنْ كُنْتِ قَرَأْتِيْهِ لَقَدْ وَجَدْتِيْهِ اَمَا قَرَأْتِ مَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا قَالَتْ بَلٰى قَالَ فَاِنَّهُ قَدْ نَهٰى عَنْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ گودنے والی اور گدوانے والی عورتیں، منہ پر سے بال نچوانے والی عورتیں، افزائش حسن کے لئے دانتوں کو سوہان (ریتی) سے رتوانے والی عورتیں ان سب پر کہ جو اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں میں تغیر کرتی ہیں اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔ (جب ابن مسعودؓ کی یہ روایت عورتوں تک پہنچی) تو ایک عورت حضرت ابن مسعودؓ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ آپ اس طرح (کی عورتوں پر) لعنت بھیجتے ہیں؟ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ میرے لئے کیا رکاوٹ ہے کہ میں اس پر لعنت نہ بھیجوں جس پر رسول کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، اور جس کو کتاب اللہ میں ملعون قرار دیا گیا ہے عورت نے کہا کہ میں نے بھی اس چیز کو پڑھا ہے جو دو دفتیوں کے درمیان ہے (یعنی میں نے بھی پورا قرآن کریم پڑھا ہے) لیکن اس میں مجھے یہ بات جو آپ کہتے ہیں، (صریح الفاظ میں) کہیں نہیں ملی ہے؟ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ "اگر تم قرآن کریم کو غور و فکر کے ساتھ اور سمجھ کر پڑھتیں تو اس میں تمہیں یقیناً اس کا حکم ملتا، کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی ہے ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا (یعنی رسول کریم (ﷺ) تمہیں جو کچھ دیں اس کو قبول کرو اور اس پر عمل کرو، اور جس چیز سے تمہیں منع کریں اس سے باز رہو) اس عورت نے کہا کہ ہاں یہ آیت تو میں نے پڑھی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ "پس یہ وہ چیز ہے جس سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عورتوں کو اپنے چہرے کے بال چنوانا مکروہ ہے، لیکن اگر کسی عورت کو چہرے پر داڑھی یا مونچھ نکل آئے تو اس کو صاف کرنا جائز بلکہ مستحب ہے۔ حدیث میں صرف چنوانے والی کا ذکر ہے۔ چننے والی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ جس کو نامصہ کہتے ہیں جب کہ اس مسئلہ سے متعلق جو روایت دوسری فصل میں آئے گی اس میں نامصہ کا ذکر ہے۔

اہل عرب کے نزدیک عورتوں کے دانتوں میں ایک دوسرے دانت کے درمیان کشادگی و فرق کا ہونا پسندیدہ سمجھا جاتا تھا اور عام طور پر چھوٹی عمر کی عورتوں کے دانت اسی طرح کے ہوتے ہیں، چنانچہ عرب میں یہ دستور تھا کہ عورتیں جب بوڑھی ہو جاتی تھیں اور ان کے دانت بڑھ جاتے تھے جس کی وجہ سے ان کے دانتوں کے درمیان یہ کشادگی باقی نہیں رہتی تھی، تو وہ باقاعدہ اپنے دانتوں پر سوہان اور ریتی وغیرہ چلا کر کے دانتوں کے درمیان کشادگی پیدا کرتی تھیں اور اس کی بنیاد ان کا یہ جذبہ ہوتا تھا کہ جوان و کمسن نظر آئیں اور حسن و دلکشی ظاہر ہو، چنانچہ اسلامی شریعت نے اس طریقہ کو بھی ممنوع قرار دیا۔

لفظ المغیرات تمام مذکورہ عورتوں کی صفت ہے جس کو ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے، یعنی جن عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ سب اس طرح کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز جیسی بنادی ہے، اس میں وہ اپنی خواہش کے مطابق ترمیم کرتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مصلحت و مرضی کے خلاف ہے۔ اسی طرح لفظ "خلق اللّٰہ" مغیرات کا مفعول ہے اور یہ پورا جملہ تعلیل کے درجہ میں ہے جو وجوب لعنت کی علت و وجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مثلہ اور داڑھی منڈانا وغیرہ میں جو حرمت (ممانعت) ہے اس کی علت و وجہ بھی یہی چیز یعنی اللہ کی تخلیق میں تغیر کرنا ہے۔ لیکن اس سے یہ ضروری قرار نہیں پاتا کہ ہر تغیر حرام ہو کیونکہ یہ علت کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ حرمت کی اصل علت تو شرع کی طرف سے منع کیا جانا ہے اور اس ممانعت میں جو حکمت پوشیدہ ہے وہ یہ چیز ہے جس کو ظاہری علت کا درجہ دیا جاتا ہے، لہٰذا حاصل یہ نکلا کہ شارع (علیہ السلام) نے جن تغیرات کو مباح قرار دیا ہے ان میں اباحت رہے گی اور جن تغیرات کو حرام قرار دیا ہے ان میں حرمت جاری ہوگی۔

مذکورہ عورت نے حضرت ابن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ ان

عورتوں کو اپنی طرف سے ملعون قرار دیتے ہیں یا اس بات کی اطلاع دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں ان عورتوں کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں ان عورتوں پر لعنت کا کوئی صریح ذکر نہیں ہے اور یہ مسئلہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ملعون قرار نہیں دیا ہے اس پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے؟ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے اس عورت کو بڑے اچھے انداز میں بات سمجھائی اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے مسئلہ کو ثابت کیا تو اس کو اطمینان ہو گیا کیونکہ اس کو حدیث کے بارے میں کوئی شبہ تھا ہی نہیں محض اس حکم کے قرآن میں بالفاظ صریح نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ذہن میں اشکال پیدا ہوا تھا اور وہ بھی رفع ہو گیا۔

روایت کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن امور کی ممانعت بیان فرمائیں ان سے باز رہا جائے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بھی اور دوسری احادیث کے ذریعہ بھی مذکورہ بالا چیزوں سے منع فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان چیزوں کی ممانعت گویا قرآن میں مذکور ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ عورتوں پر آنحضرت ﷺ کا لعنت فرمانا ایسا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کو ملعون قرار دیا ہو لہٰذا اس پر عمل کیا جانا واجب ہے۔

نظر بد ایک حقیقت ہے

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَيْنُ حَقٌّ وَنَهٰى عَنِ الْوَشْمِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "نظر لگنا برحق ہے" نیز آپ ﷺ نے گودنے سے منع فرمایا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نظر بد ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اثر ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ سحر کی طرح یہ (نظر بد) بھی انسان وغیرہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔

سر کے بالوں کو گوند وغیرہ سے جمانے کا ذکر

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُلَبِّدًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو ملبد دیکھا ہے!۔" (بخاریؒ)

تشریح: "مُلَبِّد" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے سر کے بالوں کو گوند سے جما دیا تھا کہ جوئیں نہ پڑیں اور گرد وغبار سے حفاظت رہے۔ ایسا عام طور پر مذکورہ مقصد کے لئے احرام کی حالت میں کیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کو اس طرح یا تو احرام کی حالت میں دیکھا ہو گا یا کسی دوسرے سفر کے دوران دیکھا ہو گا۔

مردانہ کپڑے اور جسم کو زعفران سے رنگنے کی ممانعت

⑯ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَتَزَعْفَرَ الرَّجُلُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی مرد اپنے بدن یا کپڑوں پر زعفران ملے!۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: یہ ممانعت اسلئے ہے کہ کپڑے یا بدن پر زعفران ملنا عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ رہی یہ بات کہ بعض صحابہؓ کے بارے میں جو یہ منقول ہے کہ انہوں نے خلوق کا استعمال کیا جو زعفران سے بنائی جانے والی ایک خوشبو ہے تو وہ اس ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہے۔

رنگ دار خوشبو کا مسئلہ

⑰ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اُطَيِّبُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَطْيَبِ مَا نَجِدُ حَتّٰى اَجِدُ وَبِيْصَ الطِّيْبِ فِيْ رَاْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھے جو بہترین خوشبو میسر آتی وہ میں نبی کریم ﷺ کو لگاتی، یہاں تک کہ اس خوشبو کی چمک مجھ کو آپ ﷺ کے سر اور داڑھی میں نظر آتی!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے بارے میں اس حدیث کے پیش نظر اشکال واقع ہوتا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مرد کے لئے اس خوشبو (عطر وغیرہ) کا استعمال جائز ہے جس کا رنگ ظاہر نہ ہوتا ہو جب کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جو خوشبو لگائی جاتی تھی اس کا رنگ ظاہر ہوتا تھا کیونکہ اگر اس کی خوشبو کا رنگ ظاہر نہ ہوتا تو اس کی چمک آنحضرت ﷺ کے سر اور داڑھی میں کیسے نظر آتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں مرد کو رنگ دار خوشبو استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد وہ رنگ ہے جس کے ظاہر ہونے سے زینت و زیبائش کا انداز نمایاں ہوتا ہو، جیسے سرخ اور زرد رنگ اور جو رنگ ایسا نہ ہو جیسے مشک و عنبر وغیرہ کا رنگ تو وہ جائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صندل اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا بھی رنگ جائز ہے۔

خوشبو کی دھونی لینے کا ذکر

(۱۸) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا اسْتَجْمَرَ بِأَلُوَّةٍ غَيْرَ مُطَرَّاةٍ وَبِكَافُورٍ يَطْرَحُهُ مَعَ الْأَلُوَّةِ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا كَانَ يَسْتَجْمِرُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ جب خوشبو کی دھونی لیتے تو (کبھی تو صرف) اگر کی دھونی لیتے جس میں مشک وغیرہ مخلوط نہ ہوتا اور (کبھی) کافور کی دھونی لیتے کہ اس کو اگر کے ساتھ یعنی دونوں کو ملا کر آگ میں ڈالتے، نیز حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ رسول کریمؐ بھی اسی طرح دھونی لیتے تھے کہ کبھی تو صرف اگر کی دھونی لیتے اور کبھی کافور اور اگر دونوں مخلوط کر کے اس کی دھونی لیتے۔" (مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

لبیں ترشوانی قدیم سُنّت ہے

(۱۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُصُّ أَوْ يَأْخُذُ مِنْ شَارِبِهٖ وَكَانَ إِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ الرَّحْمٰنِ (صَلَوٰتُ الرَّحْمٰنِ عَلَيْهِ) يَفْعَلُهُ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی لبوں کو کترتے۔ یا لیتے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جو خدا کے دوست تھے وہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، یعنی وہ بھی اپنی لبیں ترشواتے تھے!۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مونچھیں بالکل ہلکی کرانا ایک ایسی قدیم سُنّت ہے جو حضرت ابراہیم کا بھی معمول تھا اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کا بھی، چنانچہ پیچھے لفظ "فطرۃ" کی وضاحت میں اس کا ذکر گزر چکا ہے، رہی یہ بات کہ جب یہ (یعنی مونچھیں ہلکی کرانا) دوسرے انبیاء کرام کی بھی سنت ہے تو اس موقعہ پر صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیوں کیا گیا؟ تو اس تخصیص کی وجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مخصوص عظمت و جلالت کا اظہار ہے، یا یہ کہ اس سُنّت کی ابتداء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے ہوئی ہے، جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے جو تیسری فصل میں نقل ہوگی۔

مونچھیں ہلکی نہ کرانے والے کے بارے میں وعید

(۲۰) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَمْ يَأْخُذْ مِنْ شَارِبِهٖ فَلَيْسَ مِنَّا۔

(رواہ احمد والترمذی والنسائی)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص لبوں کو نہ کتروائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"
(احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: "وہ ہم میں سے نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری سُنّت اور ہمارے طریقے پر عمل پیرا نہیں ہے۔ اور ملا علی قاریؒ کے مطابق اس جملہ کے زیادہ صحیح معنی یہ ہیں کہ ایسا شخص ہماری سُنّت اور ہمارے طریق کو ماننے والوں میں کامل ترین نہیں ہے، یا اس جملہ کے ذریعہ اس سُنّت کو ترک کرنے والے کی تہدید مقصود ہے، یا ایسے شخص کو اس بات سے ڈرایا گیا ہے کہ اس سُنّت کا تارک ہوتے ہوئے مرنا گویا امت مسلمہ کے خلاف طریقے پر مرنا ہے۔

داڑھی کو برابر کرنے کا ذکر

(۲۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْخُذُ مِنْ لِحْيَتِهٖ مِنْ عَرْضِهَا وَطُوْلِهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی ریش مبارک کو عرض وطول میں یعنی نیچے سے بھی اور دائیں بائیں جانب سے بھی کترتے تھے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی داڑھی کو ادھر ادھر سے بڑھے ہوئے بال کترواکر برابر درست کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کا یہ عمل داڑھی کو "چھوڑنے اور بڑھانے" کے منافی نہیں ہے جس کا حکم دوسری احادیث میں منقول ہے کیونکہ اصل ممانعت کا تعلق منڈانے یا اتنی چھوٹی کرانے سے ہے جو غیر مسلم لوگوں کا شعار ہے ورنہ تو داڑھی کو برابر اور درست رکھنے کے لئے ادھر ادھر سے بڑھے ہوئے بالوں کو کترنا ممنوع نہیں ہے، جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ داڑھی کے طول وعرض میں سے ان بالوں کو ترشتے تھے جو ادھر ادھر بڑھے ہوتے تھے اسی لئے ابن ملکؒ نے کہا ہے کہ داڑھی کے بالوں کو برابر کرنا سُنّت ہے۔ اور احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ زیادہ بڑھانے کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ کچھ حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی داڑھی کو مٹھی میں پکڑ کر داڑھی کے اس حصے کو کتروائے جو مٹھی سے نیچے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، یہ قول حضرت ابن عمرؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت کا ہے، اور شعبیؒ اور ابن سیرینؒ نے اس کو اچھا سمجھا ہے، جب کہ حسنؒ قتادہ اور ان کے متبعین نے اس چیز کو (یعنی داڑھی کے اس حصے کو کترنے کو جو مٹھی سے نکلی ہوئی ہو) اچھا نہیں سمجھا ہے ان حضرات نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد اعفو اللحی (داڑھیوں کی چھوڑ دو) کے پیش نظر اسی چیز کو بہتر جانا ہے کہ مٹھی سے بڑھی ہوئی داڑھی کو بھی چھوڑے رکھا جائے۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

مرد کو خلوق کے استعمال کی ممانعت

(۲۲) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ مُرَّةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى عَلَيْهِ خَلُوْقًا فَقَالَ اَلَكَ امْرَاَةٌ قَالَ لَا قَالَ فَاغْسِلْهُ ثُمَّ اغْسِلْهُ ثُمَّ اغْسِلْهُ ثُمَّ لَا تَعُدْ۔ (رواہ الترمذی و النسائی)

"اور حضرت یعلی ابن مرہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے ان (یعلیؓ) کے کپڑوں پر (زعفران سے مرکب خوشبو) خلوق لگی ہوئی دیکھی تو فرمایا کہ کیا تم بیوی والے ہو؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر اس کو دھوڈالو، پھر دھوؤ اور پھر دھوؤ اور پھر آئندہ کبھی اس کو استعمال نہ کرنا۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: "کیا تم بیوی والے ہو" آپ ﷺ کے اس سوال کا مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ اگر بیوی ہے اور اس نے خلوق استعمال کی ہے اور

پھر اس کے بدن یا کپڑے سے اس کا اثر تمہارے بدن یا کپڑے پر پہنچا ہے تو اس صورت میں تم معذور ہو، اور اگر خود تم نے خلوق کا استعمال کیا ہے تو پھر معذور نہیں سمجھے جاؤ گے کیونکہ مرد کو خلوق کا استعمال جائز نہیں ہے، اس صورت میں تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ تم اپنے بدن یا کپڑے کو دھو کر اس کا اثر زائل کرو۔ اس سے واضح ہوا کہ اس سوال کا مقصد یہ ظاہر کرنا نہیں تھا کہ اگر تمہاری بیوی ہے اور تم نے بیوی کی خاطر استعمال کیا ہے تو تم "معذور" کے حکم میں ہو، جیسا کہ حدیث کے ظاہر مفہوم سے گمان ہوتا ہے۔

"اس کو دھو ڈالو" اس جملہ کے ذریعہ آپ ﷺ نے تین بار دھونے کا حکم دیا، اور تین بار دھونے کا حکم دینا مبالغہ و تاکید کے طور پر تھا، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے تین بار دھونے کا حکم اس لئے فرمایا کہ اس کا رنگ کم از کم تین مرتبہ دھوئے بغیر نہیں چھوٹتا۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَایَقْبَلُ اللّٰہُ صَلَاۃَ رَجُلٍ فِیْ جَسَدِہٖ شَیْءٌ مِنْ خَلُوْقٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں کرتا، جس کے بدن پر تھوڑی سی بھی خلوق لگی ہوئی ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: سیدؒ کہتے ہیں کہ "نماز قبول نہ کرنے" سے مراد عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے کی وجہ سے اس ثواب کا نہ ملنا ہے جو نماز کامل پر ملتا ہے۔ اور ابن ملکؒ نے کہا ہے کہ یہ ارشاد گرامی خلوق استعمال کرنے کے خلاف زجر و تہدید کے طور پر ہے۔

(۲۴) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ یَاسِرٍ قَالَ قَدِمْتُ عَلٰی اَھْلِیْ مِنْ سَفَرٍ وَقَدْ تَشَقَّقَتْ یَدَایَ فَخَلَّقُوْنِیْ بِزَعْفَرَانٍ فَغَدَوْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَلَّمْتُ عَلَیْہِ فَلَمْ یَرُدَّ عَلَیَّ وَقَالَ اذْھَبْ فَاغْسِلْ ھٰذَا عَنْکَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمار ابن یاسرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں سفر سے واپسی میں اپنے گھر والوں کے پاس اس حال میں پہنچا کہ میرے دونوں ہاتھ پھٹے ہوئے تھے، چنانچہ میرے گھر والوں نے (علاج کے طور پر) میرے ہاتھوں پر اس خوشبو کا لیپ کیا جس میں زعفران مخلوط تھی، پھر جب میں صبح کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ جاؤ اور اس خوشبو کو اپنے بدن پر سے دھو ڈالو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے علم میں وہ عذر نہیں آیا ہو گا جس کی بناء پر حضرت عمارؓ نے اس خوشبو کا استعمال کیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے سلام کا جواب نہ دے کر اپنی خفگی کا اظہار فرمایا، یا یہ کہ آنحضرت ﷺ کو عمارؓ کا اپنے ہاتھوں پر خوشبو لگائے ہوئے باہر نکلنا پسند نہیں آیا۔

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ طِیْبُ الرِّجَالِ مَاظَھَرَ رِیْحُہٗ وَخَفِیَ لَوْنُہٗ وَطِیْبُ النِّسَاءِ مَاظَھَرَ لَوْنُہٗ وَخَفِیَ رِیْحُہٗ۔ (رواہ الترمذی و النسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مردانہ خوشبو وہ ہے جس کی بو تو ظاہر ہو لیکن اس کا رنگ ظاہر نہ ہو (جیسے مشک و عنبر اور عطر وغیرہ) اور زنانہ خوشبو وہ ہے جس کا رنگ تو ظاہر ہو لیکن اس کی بو نہ پھیلے جیسے مہندی اور زعفران وغیرہ۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا "رنگ" سے مراد وہ رنگ ہے جو زینت و رعنائی کا غماز ہو۔ جیسے سرخ و زرد رنگ علماء نے لکھا ہے کہ "زنانہ خوشبو" کی جو وضاحت کی گئی ہے وہ اس عورت کے حق میں ہے جو گھر سے باہر نکلے، جو عورت گھر کے اندر رہو، یا اپنے خاوند کے پاس ہو تو اس کے لئے ہر طرح کی خوشبو استعمال کرنا جائز ہے۔

آنحضرت ﷺ کے استعمال کی خوشبو

(۲۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُكَّةٌ يَتَطَيَّبُ مِنْهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سکہ تھی (ایک مرکب خوشبو کا نام) آپ ﷺ اس میں سے خوشبو لگاتے تھے۔"

(ابوداؤدؒ)

آنحضرت ﷺ کثرت سے سر میں تیل لگاتے تھے

(۲۷) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ دَهْنَ رَاسِهٖ وَتَسْرِيْحَ لِحْيَتِهٖ وَيُكْثِرُ الْقِنَاعَ كَاَنَّ ثَوْبَهٗ ثَوْبُ زَيَّاتٍ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے سر مبارک پر کثرت سے تیل استعمال کرتے تھے، کثرت سے داڑھی میں کنگھی کرتے تھے اور اکثر سر مبارک پر ایک کپڑا رکھتے تھے جو ایسا نظر آتا جیسے تیلی کا کپڑا ہو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "کثرت سے کنگھی کرتے تھے" یہ بات اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے روزانہ کنگھی سے منع فرمایا ہے، کیوں کہ اول تو یہ ممانعت، نہی تحریمی کے طور پر نہیں ہے بلکہ نہی تنزیہی کے طور پر ہے، دوسرے "کثرت سے کنگھی کرنے" سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ روزانہ کنگھی کرتے تھے کیوں کہ "کثرت" کا اطلاق اس چیز پر بھی ہوتا ہے کہ کسی کام کو اس ضرورت کے وقت انجام دیا جائے، گویا جس عمل کی جس وقت ضرورت ہو اس وقت اس کو کرنا بھی "کثرت" کے حکم میں شامل ہوتا ہے، جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو داڑھی میں کنگھی کرنا سُنّت ہے لیکن جو لوگ ہر وضو کے بعد کنگھی کرتے ہیں اس کی سُنّت صحیحہ میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔

"قناع" سے مراد وہ کپڑا ہے جو آپ بالوں کو تیل لگانے کے بعد سر پر اس مقصد سے ڈال لیا کرتے تھے کہ عمامہ میلا اور چکنا نہ ہو، چنانچہ وہ کپڑا تیل لگنے کی وجہ سے چونکہ بہت تیل آلود ہو جاتا تھا اس لئے اس کو تیلی کے کپڑے سے تشبیہ دی گئی ہے ورنہ یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ وہ کپڑا بہت گندا رہتا تھا یا آپ کے سارے کپڑے تیلی کے کپڑوں کی طرح رہتے تھے، کیونکہ یہ مراد اس نظافت و پاکیزگی اور صفائی و ستھرائی سے بہت بعید ہے جو آنحضرت ﷺ کے مزاج کا جز تھی، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سفید کپڑے کو بہت پسند فرماتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے گیسوئے مبارک

(۲۸) وَعَنْ اُمِّ هَانِئٍ قَالَتْ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْنَا بِمَكَّةَ قَدْمَةً وَلَهٗ اَرْبَعُ غَدَائِرَ۔

(رواہ احمد و ابوداؤد والترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت اُمّ ہانیؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ (فتح مکہ کے دن) رسول کریم ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے تو اس وقت آنحضرت ﷺ کے چار گیسو گندھے ہوئے تھے (یعنی دو دائیں طرف تھے اور دو بائیں طرف۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پورے سر کے بالوں کو چار حصوں میں بٹ لیا تھا۔ گویا "گیسو" سے بالوں کی وہ مخصوص وضع مراد نہیں ہے جس کو ہماری زبان میں "زلف" کہا جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی مانگ کا ذکر

(۲۹) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِذَا فَرَقْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاْسَهٗ صَدَعْتُ فَرْقَهٗ عَنْ يَافُوْخِهٖ وَاَرْسَلْتُ

نَاصِيَتَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں جب رسول کریم ﷺ کے سر مبارک کے بالوں میں مانگ نکالتی تو تالو پر سے بالوں کے دو حصے کر کے مانگ چیرتی اور آپ ﷺ کی پیشانی کے بل دونوں آنکھوں کے درمیان چھوڑتی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "یافوخ" سر کے درمیانی حصے کو کہتے ہیں جہاں تالو ہوتا ہے، یہ دماغ کے عین اوپر کی سطح ہوتی ہے اور بچپن میں اس جگہ پھڑکن رہتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے گویا آنحضرت ﷺ کی مانگ کی صورت بیان کی ہے کہ اس کا ایک سرا تو تالو کے نزدیک ہوتا ہے، اور دوسرا سرا دونوں آنکھوں کے درمیان کی جگہ کے بالمقابل پیشانی کے نزدیک ہوتا تھا۔

روایت کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں مانگ کا رخ پیشانی کے اس کنارے پر رکھتی جو دونوں آنکھوں کی عین درمیانی سمت میں ہے اس طرح کہ پیشانی کے آدھے بال مانگ کی دائیں طرف ہوتے اور آدھے بال مانگ کی بائیں طرف۔ طیبیؒ نے حدیث کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔

روزانہ کنگھی کرنے کی ممانعت

(۳۰) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ التَّرَجُّلِ اِلَّا غِبًّا۔

(رواه الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مغفلؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کنگھی کرنے سے منع فرمایا الا یہ کہ ایک روز ناغہ دے کر کنگھی کی جائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: قاضیؒ کہتے ہیں کہ "غب" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام ایک دن کیا جائے اور ایک دن ترک کیا جائے، لہٰذا حدیث کا یہ مطلب ہوا کہ کنگھی ہر روز نہ کی جائے بلکہ ایک دن کا ناغہ کر کے کی جائے، لیکن یہ ممانعت محض نہی تنزیہی کے طور پر ہے اور اس سے ضرورت و بے ضرورت ہر روز کنگھی کرنے کا اہتمام کرنے اور اس کو بطور عادت اختیار کر لینے کی ممانعت مراد ہے کیونکہ یہ زینت و آرائش میں مبالغہ اور بے جا تکلف و اہتمام کرنے کی صورت ہے۔

واضح رہے کو لفظ "غب" جب ملاقات کے سیاق میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ملاقات کی جائے اور جب یہ لفظ بخار کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس سے ایک دن کا ناغہ دے کر یعنی تیسرے دن کا بخار مفہوم ہوتا ہے، اسی طرح مریض کی عیادت کرنے اور گوشت کھانے کے سیاق میں بھی اس سے مراد ایک دن کا ناغہ ہوتا ہے۔

ہر روز کنگھی کرنے کی ممانعت میں سر کے بالوں اور داڑھی دونوں میں کنگھی کرنا شامل ہے، لہٰذا جو لوگ ہر وضو کے بعد کنگھی کرتے ہیں اس کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح احیاء العلوم میں جو یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر روز دو مرتبہ داڑھی میں کنگھی کرتے تھے تو اس حدیث کا بھی کوئی ثبوت نہیں پایا گیا ہے اور احیاء العلوم میں امام غزالیؒ کے علاوہ اور کسی نے بھی اس حدیث کو نقل نہیں کیا ہے، بلکہ شیخ ولی الدین العراقیؒ کے قول کے مطابق امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس حدیث کے علاوہ بھی بعض ایسی احادیث نقل کی ہیں جن کی کوئی اصل ثابت نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ روزانہ کنگھی کرنے کی ممانعت صرف مرد کے لئے ہے یا مرد عورت دونوں کے لئے؟ تو بظاہر یہ بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ ممانعت صرف مردوں کے حق میں ہے کیونکہ عورتوں کے لئے زینت و آرائش کرنا مکروہ نہیں ہے، تاہم بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس ممانعت کا تعلق مرد و عورت دونوں سے ہے لیکن وہ حضرات بھی یہ کہتے ہیں کہ عورتوں کے حق میں یہ ممانعت ہلکے درجے کی ہے کیونکہ ان کے لئے زینت و آرائش کا دائرہ مردوں کی بہ نسبت بہت وسیع ہے۔

زیادہ عیش و آرام کی زندگی اختیار کرنا میانہ روی کے خلاف ہے

(۳۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِفُضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ مَالِيْ اَرَاكَ شَعِثًا قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْهَانَا عَنْ كَثِيْرٍ مِنَ الْاِرْفَاهِ قَالَ مَالِيْ لَا اَرٰى عَلَيْكَ حِذَاءً قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَاْمُرُنَا اَنْ نَحْتَفِيَ اَحْيَانًا۔

(رواہ ابوداؤد)

"حضرت عبداللہ ابن بریدہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت فضالہ ابن عبیدہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ میں آپ کو پراگندہ بال (یعنی آپ کے بال بغیر کنگھی کئے ہوئے) دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ عیش و آرام کی زیادہ چیزیں اختیار کرنے سے ہمیں منع فرمایا کرتے تھے (اور کنگھی و تیل کا زیادہ استعمال بھی اسی میں شامل ہے) اس شخص نے پھر یہ پوچھا کہ کیا بات ہے کہ میں آپ کے پیروں میں جوتیاں نہیں دیکھ رہا ہوں! انہوں نے جواب دیا کہ رسول کریم ﷺ ہمیں یہ حکم دیتے تھے کہ ہم کبھی کبھی ننگے پیر بھی پھرا کریں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: عیش و آرام کی زیادہ چیزیں اختیار کرنے سے اجتناب کرنے اور کبھی کبھی ننگے پیر پھرنے کا حکم دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح سے ایک تو مزاج و طبیعت میں تواضع و انکسار پیدا ہوتا ہے دوسری طرف اس ریاضت و مشقت کے ذریعہ نفس پر قابو حاصل ہوتا ہے اور اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ حالات و معیشت کی سختی و تنگی کے وقت وہ ریاضت و مشقت کام آتی ہے اور سختی و تنگی کو انگیز کرنے کی ہمت و توانائی عطا کرتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آنحضرت ﷺ بالوں میں تیل بھی لگاتے تھے اور کنگھی بھی کرتے تھے بلکہ اس کو اچھا سمجھتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی حکم و ترغیب کے ذریعہ اس پر عمل کراتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ بعض حاملین زہد و ریاضت کو اس کے خلاف بھی رکھتے تھے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے سامنے ان چیزوں کو ترک کرتا تو آپ ﷺ اس کو ٹوکتے نہیں تھے بلکہ ان چیزوں کو ترک کرنے کا حکم بھی فرماتے تھے! اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس سلسلے میں اصل کراہت جس بات میں ہے وہ یہ ہے کہ عیش و راحت اور خوشحالی و آسودگی میں حد اعتدال سے تجاوز کیا جائے، یہاں تک کہ نفس تن آسانی کا خوگر ہو جائے اور تیل لگانے و کنگھی کرنے اور زینت و آرائش میں ایسا انہماک ظاہر کرے جو دین بیزار اور عیش و عشرت کے دلدادگان کا شیوہ ہے لہٰذا جب یہ حکم دیا جاتا ہے کہ زیب و زینت کے ذرائع اختیار نہ کرو اور اپنے رہن سہن میں سادگی و انکساری اور بے تکلفی بلکہ زہد و ریاضت کو اختیار کرو تو اس سے یہ مراد مطلق نہیں ہوتی کہ میلے کچیلے رہ کر پاکیزگی و نظافت کو ترک کر دو، اور اپنے کو اول جلول بنا کر تہذیب و شائستگی اور خوش ہیئتی کا مذاق اڑاؤ۔ بلکہ اس حکم کی مراد یہ ہوتی ہے کہ بہر صورت اعتدال اور میانہ روی کو ملحوظ رکھو! کسی بھی شرعی حکم کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ رہن سہن کا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو تہذیب و شائستگی کے خلاف اور نفاست و پاکیزگی کے منافی ہو کیونکہ انسان کو مہذب و شائستہ بنانا اسلام کا ایک مقصد اور تہذیب و پاکیزگی، دین کا ایک جزو ہے جیسا آگے آنے والی حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

بالوں کو اچھی طرح رکھنے کا حکم

(۳۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَ لَهٗ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص سر پر بال رکھے ہوئے ہو اس کو چاہئے کہ اپنے بالوں کو اچھی طرح رکھے یعنی اس کو دھویا کرے ان میں تیل لگایا کرے، کنگھا کیا کرے اور اول جلول شخص کی طرح ان کو بکھرا ہوا نہ رہنے دے، کیونکہ نفاست و صفائی اور خوش ہیئتی ایک پسندیدہ محبوب چیز ہے۔" (ابوداؤدؒ)

(۳۳) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحْسَنَ مَاغُیِّرَبِہِ الشَّیْبُ الْحِنَّاءُ وَالْکَتَمُ۔
(رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جن چیزوں کے ذریعہ بڑھاپے یعنی بالوں کی سفیدی کو تبدیل کیا جاسکتا ہے ان میں سب سے بہتر چیز مہندی اور وسمہ ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "کتم" اور بعض حضرات کے قول کے مطابق کُتْمٌ ایک گھاس کا نام ہے جو وسمہ کے ساتھ ملا کر بالوں پر خضاب کرنے کے کام میں لائی جاتی ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ کتم اصل میں وسمہ ہی کو کہتے ہیں۔

بہر حال حدیث کے مفہوم کے بارے میں یہ سوال ہوتا ہے کہ آیا یہ مراد ہے کہ مہندی اور وسمہ دونوں کو ملا کر خضاب کیا جائے، یا مراد ہے کہ صرف مہندی یا صرف وسمہ کا خضاب کیا جائے؟ چنانچہ نہایہ کے قول کے مطابق بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں صرف کتم، یا صرف مہندی کا خضاب کرنا مراد ہے کیونکہ اگر کتم کو مہندی کے ساتھ ملایا جائے تو اس سے خضاب، سیاہ ہو جاتا ہے اور صحیح روایات میں سیاہ خضاب کی ممانعت مذکور ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ یہ جملہ اصل میں۔ "بالحناء او الکتم" ہے (یعنی حرف واؤ کے بجائے او ہے) جس کا مطلب یہ ہے کہ خضاب کرنے والے کو اختیار ہے کہ چاہے مہندی کا خضاب کرے اور چاہے کتم کا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت متعدد طرق واسانید سے منقول ہے اور سب نے بالحناء والکتم ہی نقل کیا ہے اگرچہ اس سے مذکورہ مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ حرف "و" مفہوم کے اعتبار سے حرف او کے معنی میں ہو سکتا ہے۔ بعض حواشی میں یہ لکھا ہے کہ صرف مہندی کا خضاب سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور صرف کتم کا خضاب سبز رنگ کا ہوتا ہے۔

بعض حضرات کے قول سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ خالص کتم کا خضاب سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور اگر کتم کو مہندی کے ساتھ ملا کر خضاب کیا جائے تو سرخ مائل بہ سیاہی رنگت پیدا ہو جاتی ہے، اس صورت میں اگر یہ کہا جائے کہ حدیث میں کتم اور مہندی دونوں کا مرکب خضاب مراد ہے تو کوئی اشکال پیدا نہیں ہوگا، چنانچہ آگے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت آرہی ہے (نمبر ۳۶) اس سے یہ بات بصراحت معلوم ہوتی ہے۔

ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کتم اور مہندی کے مرکب خضاب کی مختلف نوعیت ہوتی ہے اگر کتم کا جزء غالب ہو یا کتم اور مہندی دونوں برابر ہوں تو خضاب سیاہ ہوتا ہے اور اگر مہندی کا حصہ غالب ہو تو خضاب سرخ ہوتا ہے۔

سیاہ خضاب کرنے والے کے بارے میں وعید

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَکُوْنُ قَوْمٌ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ یَخْضِبُوْنَ بِھٰذَا السَّوَادِ کَحَوَاصِلِ الْحَمَامِ لَا یَجِدُوْنَ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ آخر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو کبوتر کے پوٹے کی مانند اس سیاہی کے ذریعہ خضاب کریں گے، یعنی جو خضاب استعمال کریں گے وہ ایسا ہی سیاہ ہوگا جیسے بعض کبوتروں کے پوٹے سیاہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جنت کی بو بھی نہیں پائیں گے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "اس سیاہی" سے مراد خالص سیاہی ہے اس صورت میں وہ سیاہی مستثنیٰ ہوگی جو مائل بہ سرخی ہو، جیسے کتم اور مہندی کے خضاب کا رنگ ہوتا ہے۔ جنت کی بو نہیں پائیں گے۔" یہ دراصل سیاہ خضاب کرنے والے کے حق میں زجر و تہدید کو زیادہ شدت کے ساتھ بیان کرنا ہے، یا یہ ارشاد گرامی ﷺ اس شخص پر محمول ہے جو سیاہ خضاب کا نہ صرف استعمال کرے بلکہ اس کو جائز بھی سمجھے! بعض حواشی میں یہ لکھا ہے کہ ایسے لوگ اگرچہ جنت میں داخل ہوں گے لیکن اس کی بو یعنی اس کے کیف و سرور سے محظوظ و بہرہ مند نہیں ہوں گے،

اور بعض حضرات کے قول کے مطابق اس سے یہ مراد ہے کہ موقف میں جنت سے جو فرحت بخش مہک آئے گی اور جس سے مسلمان محفوظ و مسرور ہوں گے اس سے مذکورہ لوگ محروم رہیں گے۔ بہر حال حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سیاہ خضاب حرام ہے۔"

زرد خضاب کرنا جائز ہے

۳۵ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَلْبَسُ النِّعَالَ السِّبْتِیَّۃَ وَیُصَفِّرُ لِحْیَتَہٗ بِالْوَرْسِ وَالزَّعْفَرَانِ وَکَانَ ابْنُ عُمَرَ یَفْعَلُ ذٰلِکَ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دباغت دیئے ہوئے اور بغیر بال کے چمڑے کی پاپوش پہنتے تھے اور اپنی ریش مبارک پر ورس (ایک گھاس جو یمن کے علاقہ میں ہوتی تھی) اور زعفران کے ذریعہ زرد رنگ چڑھاتے تھے نیز حضرت ابن عمرؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے (یعنی مذکورہ پاپوش پہنتے اور مذکورہ خضاب استعمال کرتے)۔" (نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی ریش مبارک پر خضاب کرتے تھے جب کہ کتاب اللباس میں حضرت انسؓ کی جو روایت گزری ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی خضاب کا استعمال کیا چنانچہ ان دونوں روایتوں کے درمیان مطابقت کی جو صورت ہے وہ اسی جگہ (حضرت انسؓ کی روایت کے ضمن میں) بیان کی جا چکی ہے۔

۳۶ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ قَدْ خَضَبَ بِالْحِنَّاءِ فَقَالَ مَا اَحْسَنَ ھٰذَا قَالَ فَمَرَّ اٰخَرُ وَقَدْ خَضَبَ بِالْحِنَّاءِ وَالْکَتَمِ فَقَالَ ھٰذَا اَحْسَنُ مِنْ ھٰذَا ثُمَّ مَرَّ اٰخَرُ قَدْ خَضَبَ بِالصُّفْرَۃِ فَقَالَ ھٰذَا اَحْسَنُ مِنْ ھٰذَا کُلِّہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کے سامنے سے ایک شخص گزرا جس نے مہندی کا خضاب لگا رکھا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا "یہ اس کا خضاب، کتنا اچھا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر ایک شخص گزرا جس نے مہندی اور وسمہ کا خضاب لگا رکھا تھا جو خالص سیاہ نہیں تھا آپ ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ خضاب پہلے سے بھی بہت اچھا ہے اس کے بعد ایک اور شخص گزرا جس نے زرد خضاب لگایا تھا آپ ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ ان سب سے زیادہ اچھا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

خضاب کرنے کا حکم

۳۷ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غَیِّرُوا الشَّیْبَ وَلَا تَشَبَّھُوْا بِالْیَھُوْدِ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاہُ النَّسَائِیُّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَالزُّبَیْرِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بڑھاپے (یعنی بالوں کی سفیدی) کو خضاب کے ذریعہ بدل ڈالو اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو جو خضاب نہیں کرتے (ترمذیؒ) اور نسائی نے اس روایت کو ابن عمرؓ اور زبیرؓ (بعض نسخوں میں ابن زبیرؓ ہے) سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: احتمال ہے کہ حدیث میں مذکورہ حکم خاص طور پر ان لوگوں کے لئے ہو جو برسرِ جہاد ہوں تاکہ اس کے ذریعہ دشمنوں پر مسلمانوں کی طاقت کا اظہار ہو اور وہ (دشمن) خوف میں مبتلا ہوں۔

بالوں کی سفیدی نورانیت کی غماز ہوتی ہے

۳۸ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَنْتِفُوا الشَّیْبَ فَاِنَّہٗ نُوْرٌ

الْمُسْلِمِ مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِي الْإِسْلَامِ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بِهَا حَسَنَةً وَكَفَّرَ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً وَرَفَعَهُ بِهَا دَرَجَةً۔ (ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سفید بالوں کو نہ چنو کیونکہ بڑھاپا (یعنی بالوں کا سفید ہونا) مسلمانوں کے لئے نورانیت کا سبب ہے، جو شخص حالت اسلام میں بڑھاپے کی طرف قدم بڑھاتا ہے یعنی جب کسی مسلمان کا ایک بال سفید ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور اس کی ایک خطا کو محو کر دیتا ہے اور اس کا ایک درجہ بلند کر دیتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بڑھاپے کی نورانیت کا سبب اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ بڑھاپا اصل میں وقار کا مظہر ہے، جیسا کہ تیسری فصل میں آنے والی ایک روایت سے واضح ہوگا کہ بنی آدم میں سب سے پہلے جس شخص پر سفید بالوں کی صورت بڑھاپا آیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے چنانچہ جب انہوں نے پہلے پہل اپنی داڑھی میں سفید بال کی صورت میں بڑھاپا دیکھا تو بارگاہ کبریائی میں عرض کیا کہ میرے پروردگارا یہ کیا ہے؟ جواب آیا کہ یہ وقار ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ خداوندا! میرے وقار کو زیادہ کر۔"

وقار، دراصل ایک ایسا وصف ہے جو انسان کو گناہ فسق اور بے حیائی کی باتوں سے روکتا ہے اور توبہ وطاعات کی طرف مائل کرتا ہے، اس اعتبار سے یہ وصف انسان میں اس نور کو پیدا کرتا ہے جو میدان حشر میں ظلمت وتاریکیوں کو چیرتا ہوا آگے آگے چلے گا، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے۔ "يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ" لہٰذا اس توجیہ کی روشنی میں بڑھاپے کے نور سے قیامت کے دن کا نور مراد ہے چنانچہ ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے، اور اگر نورانیت سے شکل وصورت کی خوشنمائی ودلکشی اور باطن کی صفائی ونیک سیرتی مراد ہو جو اس دنیا میں بوڑھوں کو حاصل ہوتی ہے تو یہ بھی بعید از حقیقت نہیں ہوگا،

اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ سفید بالوں کو چننا مکروہ ہے۔

(۳۹) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مُرَّةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِي الْإِسْلَامِ كَانَتْ لَهُ نُوْرًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

"اور حضرت کعب ابن مرہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص اسلام کی حالت میں بوڑھا ہوتا ہے اس کا بڑھاپا قیامت کے دن نور کی صورت میں ظاہر ہوگا۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس موقعہ پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب بڑھاپا (یعنی بالوں کا سفید ہونا) دنیا وآخرت دونوں جگہ نورانیت کا سبب ہے تو خضاب کے ذریعہ اس کو ظاہر نہ ہونے دینا اور اس کو تبدیل کرنا شریعت نے جائز کیوں قرار دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خضاب کی مشروعیت بھی دراصل ایک دینی مصلحت کے سبب سے ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعہ دشمنوں کے سامنے قوت وہیبت کا اظہار ہوتا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو ضعیف وناتواں جان کر دلیر نہ ہوں۔ اس صورت میں پھر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ مصلحت کی خاطر خضاب کرنا مشروع ہے تو اسی مصلحت کے لئے بالوں کو جڑ سے اکھاڑنا پڑتا ہے جو اول تو تکلیف کا باعث ہے، دوسرے بدہیئتی اور بدنمائی کا سبب بھی بنتا ہے جب کہ خضاب کا لگانا خوش ہیئتی میں اضافہ کرتا ہے، لہٰذا خضاب کرنے اور بالوں کو چننے میں بڑا فرق ہے۔

آنحضرت ﷺ کے سر مبارک کے بال

(۴۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَغْتَسِلُ اَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ كَانَ لَهُ شَعْرٌ فَوْقَ الْجُمَّةِ وَدُوْنَ الْوَفْرَةِ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اور رسول کریم ﷺ ایک ہی برتن سے نہایا کرتے تھے، یعنی پانی سے بھرا ہوا ایک ہی برتن ہم دونوں کے درمیان رکھا رہتا تھا اور آنحضرت ﷺ کے سر کے بال جمہ کے اوپر اور وفرہ کے نیچے ہوتے تھے۔" (نسائیؒ)

تشریح: سر کے بالوں کو عربی میں تین ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک تو جُمَّہ، دوسرے وَفرۃ اور تیسرے لِمَّۃ۔ چنانچہ اگر کسی شخص کے سر پر اتنے لمبے بال ہوں جو کانوں تک پہنچ جائیں تو ان بالوں کو جمہ کہتے ہیں اور اگر کان کے لوؤں تک بال ہوں تو ان کو وفرہ کہتے ہیں اور جو بال کان کی لو اور کاندھے کے بین بین ہوتے ہیں یعنی کان کی لو سے تو نیچے ہوں لیکن کاندھوں سے اوپر ہوں تو ان کو لمہ کہتے ہیں، لہٰذا حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کے بال کاندھوں سے اوپر اور کان کی لو سے نیچے تھے جن کو لمہ کہتے ہیں۔ ویسے بعض مواقع پر جمہ مطلق بالوں کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شمائل ترمذی میں یہ منقول ہے کہ وَكَانَتْ جمة تضرب شحمة اذنيه۔

مردوں کے بالوں کی زیادہ لمبائی ناپسندیدہ

(۴۱) وَعَنِ ابْنِ الْحَنْظَلِيَّةِ رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ الرَّجُلُ خُرَيْمٌ الْاَسَدِيُّ لَوْلَا طُوْلُ جُمَّتِهِ وَاِسْبَالُ اِزَارِهِ فَبَلَغَ ذٰلِكَ خُرَيْمًا فَاَخَذَ شَفْرَةً فَقَطَعَ مَا جُمَّتَهُ اِلٰى اُذُنَيْهِ وَرَفَعَ اِزَارَهُ اِلٰى اَنْصَافِ سَاقَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن حنظلہؓ جو نبی کریم ﷺ کے اصحاب میں سے ایک شخص ہیں، روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خریم اسدی اچھا آدمی ہے اگر اس کے بال لمبے نہ ہوں اور اس کا تہ بند لٹکتا ہوا نہ ہو۔" جب خریمؓ کو آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا علم ہوا تو انہوں نے ایک استرا لے کر اپنے بالوں کو کانوں کی لوؤں تک کاٹ ڈالا اور اپنے تہبند کو آدھی پنڈلیوں تک کر لیا!۔" (ابوداؤدؒ)

(۴۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَتْ لِيْ ذُؤَابَةٌ فَقَالَتْ لِيْ اُمِّيْ لَا اَجُزُّهَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمُدُّهَا وَيَاْخُذُهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت انس فرماتے ہیں میرے سر پر لمبے بال تھے میری والدہ کاٹنے سے منع کرتی تھیں کیونکہ آپ ﷺ ان بالوں کو پکڑتے تھے (لہٰذا میں برکت حاصل کرنے کے لئے ان بالوں کو یونہی چھوڑوں گی۔" (ابوداؤدؒ)

اگر بالوں کی صفائی ستھرائی میں کوئی امر مانع ہو تو سر کو منڈا دینا چاہیے

(۴۳) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمْهَلَ اٰلَ جَعْفَرٍ ثَلَاثًا ثُمَّ اَتَاهُمْ فَقَالَ لَا تَبْكُوْا عَلٰى اَخِيْ بَعْدَ الْيَوْمِ ثُمَّ قَالَ ادْعُوْا لِيْ بَنِيْ اَخِيْ فَجِيْئَ بِنَا كَاَنَّا اَفْرَاخٌ فَقَالَ ادْعُوْا لِيَ الْحَلَّاقَ فَاَمَرَهُ فَحَلَقَ رُءُوْسَنَا۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جعفر کی اولاد کو تین دن کی مہلت دی یعنی جب حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت کی خبر آئی تو آپ ﷺ نے ان کے گھر والوں کو تین دن تک رونے دھونے اور سوگ کرنے کی اجازت دی اور اس عرصہ میں آپ ﷺ ان کے ہاں تشریف نہیں لائے، پھر آپ ﷺ (ان لوگوں کو تسلی و دلاسہ دینے کے لئے) ان کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ "بس، آج کے بعد میرے بھائی (جعفرؓ) پر مت رونا۔" پھر فرمایا کہ میرے بھتیجوں (یعنی عبداللہؓ، عونؓ اور محمدؓ) کو (جو جعفرؓ کے لڑکے ہیں) میرے پاس لے کر آؤ۔" چنانچہ ہم سب آپ ﷺ کی خدمت میں لائے گئے اور اس وقت ہم چوزوں کی طرح یعنی بہت کمسن تھے اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ نائی کو بلا کر میرے پاس لاؤ"۔ (جب نائی آگیا تو) آپ ﷺ نے اس کو (ہمارے بال) مونڈنے کا حکم دیا اور اس نے ہمارے سروں کو مونڈا!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت جعفرؓ، ابوطالب کے بیٹے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے حقیقی بھائی تھے۔ اس اعتبار سے وہ آنحضرت ﷺ کے

چچازاد بھائی ہوئے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نوحہ اور جزع فزع کے بغیر میت پر رونا، غمگین و افسردہ ہونا اور رنج والم کا اظہار کرنا تین دن تک جائز ہے، تین دن کے بعد نہ تو رونا دھونا اور سوگ کرنا جائز ہے اور نہ تعزیت کرنا روا ہے۔

حج و عمرہ سے فراغت کے بعد تو سر کو منڈانا افضل ہے لیکن اس کے علاوہ بال رکھنا ہی افضل ہے لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ نے حضرت جعفرؓ کے لڑکوں کے سر مونڈنے کا حکم اس لئے دیا کہ ان کی ماں یعنی اسماء بنت عمیسؓ شوہر کی دائمی جدائی کے سخت ترین صدمہ سے دوچار تھیں، ان کو اپنی اس مصیبت سے اتنی فرصت کہاں ملتی کہ وہ بچوں کے سر کے بالوں کی صفائی ستھرائی اور تیل کنگھے کا خیال رکھتیں اس صورت میں ان کے سروں میں جوئیں وغیرہ پڑ جانے کا خدشہ تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کے بالوں کو منڈوا دینا ہی بہتر سمجھا۔

عورت کی ختنہ کا ذکر

(۴۴) وَعَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ الْاَنْصَارِيَّةِ اَنَّ امْرَاَةً كَانَتْ تَخْتِنُ بِالْمَدِيْنَةِ فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَنْهِكِيْ فَاِنَّ ذٰلِكَ اَحْظٰى لِلْمَرْاَةِ وَاَحَبُّ اِلَى الْبَعْلِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ هٰذَا الْحَدِيْثُ ضَعِيْفٌ وَرَاوِيْهِ مَجْهُوْلٌ۔

"اور حضرت اُمّ عطیہ انصاریؓ کہتی ہیں کہ مدینہ میں ایک عورت تھی جو (عورتوں کی) ختنہ کیا کرتی تھی (جیسا کہ اس زمانہ میں عورتوں کی ختنہ کا بھی رواج تھا) نبی کریم ﷺ نے (ایک دن) اس عورت سے فرمایا کہ "تنہ کو" زیادہ مت کاٹا کرو (بلکہ تھوڑا سا اوپر سے کاٹ دیا کرو) کیونکہ یہ (یعنی زیادہ نہ کاٹنا) عورت کے لئے بھی بہت لذت بخش ہوتا ہے اور مرد کو بھی بہت پسندیدہ ہوتا ہے (یعنی اگر اس کو زیادہ کاٹ دیا جائے تو جماع میں نہ عورت کو لذت ملتی ہے اور نہ مرد کو) ابوداؤدؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کے راوی مجہول ہیں۔"

تشریح: وراویہ مجہول (اور اس کے راوی مجہول ہیں) میں جس طرح یہ احتمال ہے کہ یہاں جنس راوی مراد ہے یعنی اس حدیث کے سب راوی مجہول ہیں، اسی طرح یہ بھی احتمال ہے کہ اس جملہ سے اصل میں یہ مراد ہے کہ کوئی ایک راوی مجہول ہے جیسا کہ ایک دوسرے صحیح نسخے میں منقول ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے وفی روایۃ مجہول بہرحال اس روایت کو طبرانیؒ نے صحیح سند کے ساتھ اور حاکم نے اپنی مستدرک میں ضحاک ابن قیسؓ سے نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں احفضنی ولا تنھکی فانہ انضر للزوجۃ واحظی عند الزوج۔

عورتوں کا سر کے بالوں پر مہندی کا خضاب کرنا ناپسندیدہ

(۴۵) وَعَنْ كَرِيْمَةَ بِنْتِ هَمَّامٍ اَنَّ امْرَاَةً سَاَلَتْ عَائِشَةَ عَنْ خِضَابِ الْحِنَّاءِ فَقَالَتْ لَا بَاْسَ وَلٰكِنِّيْ اَكْرَهُهُ كَانَ حَبِيْبِيْ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) يَكْرَهُ رِيْحَهُ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت کریمہ بنت ہمام سے روایت ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے (سر کے بالوں پر) مہندی کا خضاب کرنے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا اگرچہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن میں اس کو اچھا نہیں سمجھتی کیونکہ میرے محبوب (یعنی آنحضرت ﷺ) اس کی بو کو پسند نہیں فرماتے تھے!۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ عورتوں کے سر کے بالوں پر مہندی کا خضاب کرنے کو ناپسند فرماتے تھے کیوں کہ اگر آپ کے نزدیک عورتوں کے لئے مطلق مہندی کا استعمال ناپسندیدہ ہوتا تو آپ ﷺ ہندہؓ کو محض اس لئے بیعت کرنے سے انکار کیوں فرماتے کہ ان کے ہاتھ مہندی سے عاری تھے جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے واضح ہوگا۔

عورتوں کو ہاتھوں پر مہندی لگانا مستحب ہے

(۴۶) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ هِنْداً بِنْتَ عُتْبَةَ قَالَتْ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ بَايِعْنِيْ فَقَالَ لَا اُبَايِعُكِ حَتّٰى تُغَيِّرِيْ كَفَّيْكِ فَكَاَنَّهُمَا كَفَّا سَبُعٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ عتبہ کی بیٹی ہندہؓ نے (جب) یہ کہا اے اللہ کے نبی (ﷺ)! مجھ کو بیعت کر لیجئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تک کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں کو (مہندی لگا کر ان کی رنگت کو) متغیر نہ کر لوگی میں تم سے (زبانی) بیعت نہیں لوں گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ہندہؓ عتبہ کی بیٹی، ابوسفیانؓ کی بیوی اور معاویہؓ کی ماں تھیں، انہوں نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث بالا میں جس بیعت کا ذکر کیا گیا ہے وہ فتح مکہ کے دن کے علاوہ کسی اور دن کا واقعہ ہے۔ حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ عورتوں کو اپنے ہاتھوں پر مہندی لگانا مستحب ہے اور اس کو ترک کرنا مکروہ ہے اور یہ کراہت مردوں کی مشابہت اختیار کرنے کی وجہ سے ہے۔

(۴۷) وَعَنْهَا قَالَتْ اَوْمَتِ امْرَاَةٌ مِنْ وَرَاءِ سِتْرٍ بِيَدِهَا كِتَابٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَبَضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ فَقَالَ مَا اَدْرِيْ اَيَدُ رَجُلٍ اَمْ يَدُ امْرَاَةٍ قَالَتْ بَلْ يَدُ امْرَاَةٍ قَالَ لَوْ كُنْتِ امْرَاَةً لَغَيَّرْتِ اَظْفَارَكِ يَعْنِيْ بِالْحِنَّاءِ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن ایک عورت نے پردہ کے پیچھے سے اپنے ہاتھ کے ذریعہ اشارہ کیا جس میں ایک پرچہ تھا جو کسی شخص نے رسول کریم ﷺ کو بھیجا تھا (یعنی اس عورت نے پردہ کے پیچھے سے اپنا ہاتھ نکال کر وہ پرچہ آنحضرت ﷺ کو دینا چاہا) لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا (یعنی وہ پرچہ نہیں لیا) اور فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ہاتھ مرد کا ہے یا عورت کا؟ اس عورت نے عرض کیا کہ "یہ ہاتھ عورت کا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم عورت ہوتیں (یعنی تمہیں عورتوں کا طور طریقہ ملحوظ رکھنا آتا) تو اپنے ناخن کی رنگت کو مہندی کے ذریعہ ضرور تبدیل کرتیں۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: یہ حدیث عورتوں کے ہاتھوں پر مہندی لگانے کے استحباب کو اور رہن سہن کے طور طریقوں نیز آداب معاشرت کی تلقین کو پُر زور انداز میں واضح کرتی ہے۔

کسی مرض و عذر کی وجہ سے گودنا اور گدوانا جائز ہے

(۴۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لُعِنَتِ الْوَاصِلَةُ وَالْمُسْتَوْصِلَةُ وَالنَّامِصَةُ وَالْمُتَنَمِّصَةُ وَالْوَاشِمَةُ وَالْمُسْتَوْشِمَةُ مِنْ غَيْرِ دَاءٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "ملانے والی یعنی اپنے بالوں میں انسانی بالوں کا جوڑا لگانے اور لگوانے والی اور بالوں کو چننے والی اور چنوانے والی، نیز بغیر کسی مرض کے گودنے اور گدوانے والی، یہ سب عورتیں ملعون قرار دی گئی ہیں!" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث میں مذکورہ الفاظ کی وضاحت پہلی فصل میں گزر چکی ہے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اگر گودنے کی کوئی ضرورت اور حاجت ہو تو اس صورت میں گودنا اور گدوانا جائز ہے اگرچہ اس کے نشان باقی رہیں۔

مردانہ لباس پہننے والی عورت اور زنانہ لباس پہننے والے مرد پر آنحضرت ﷺ کی لعنت

(۴۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَ يَلْبَسُ لِبْسَةَ الْمَرْاَةِ وَالْمَرْاَةَ تَلْبَسُ لِبْسَةَ الرَّجُلِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو زنانہ لباس پہنے، اسی طرح اس عورت پر بھی لعنت فرمائی ہے جو مردانہ لباس پہنے۔" (ابوداؤد)

(۵۰) وَعَنْ اَبِیْ مُلَیْکَةَ قَالَ قِیْلَ لِعَائِشَةَ اِنَّ امْرَاَةً تَلْبَسُ النَّعْلَ قَالَتْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَةَ مِنَ النِّسَآءِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوملیکہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کو بتایا گیا کہ ایک عورت مردانہ جوتے پہنتی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ نے اس عورت پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: وہ مشابہت مذموم ہے جو لباس، وضع قطع، بول چال اور رہن سہن میں اختیار کی جائے، اور جو عورت علم و عقل، اور حکمت و دانائی میں مردوں کی مشابہت اختیار کرے تو وہ مذموم نہیں ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کانت عائشة رجلة الرای (یعنی عائشہ کی عقل مردوں کی عقل کی طرح تھی)۔

اپنے اہل بیت کا راحت و آرام کی زندگی اختیار کرنا آنحضرت ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ

(۵۱) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَافَرَ کَانَ اٰخِرُ عَهْدِهٖ بِاِنْسَانٍ مِنْ اَهْلِهٖ فَاطِمَةَ وَاَوَّلُ مَنْ یَدْخُلُ عَلَیْهَا فَاطِمَةَ فَقَدِمَ مِنْ غَزَاةٍ وَقَدْ عَلَّقَتْ مِسْحًا اَوْسِتْرًا عَلٰی بَابِهَا وَحَلَّتِ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ قُلْبَیْنِ مِنْ فِضَّةٍ فَقَدِمَ فَلَمْ یَدْخُلْ فَظَنَّتْ اَنَّ مَامَنَعَهٗ اَنْ یَّدْخُلَ مَارَاٰی فَهَتَکَتِ السِّتْرَ وَفَکَّتِ الْقُلْبَیْنِ عَنِ الصَّبِیَّیْنِ وَقَطَعَتْهُ مِنْهُمَا فَانْطَلَقَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَبْکِیَانِ فَاَخَذَهٗ مِنْهُمَا فَقَالَ یَاثَوْبَانُ اذْهَبْ بِهٰذَا اِلٰی اٰلِ فُلَانٍ اَنَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلِیْ اَکْرَهُ اَنْ یَّاْکُلُوْا طَیِّبَاتِهِمْ فِیْ حَیَاتِهِمُ الدُّنْیَا یَاثَوْبَانُ اشْتَرِ لِفَاطِمَةَ قِلَادَةً مِنْ عَصَبٍ وَسِوَارَیْنِ مِنْ عَاجٍ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب سفر پر روانہ ہوتے تو اپنے اہل وعیال کے لوگوں میں سب سے آخری وقت حضرت فاطمہؓ کو عطا کرتے اور جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے ہاں جاتے یعنی سفر کے لئے روانگی کے وقت آپ ﷺ پہلے دیگر اہل بیت سے الوداعی ملاقات فرماتے پھر ان سب سے فارغ ہو کر اور سب کو رخصت کر کے آخر میں حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لے جاتے ان سے جو کچھ کہنا سننا ہوتا کہتے سنتے اور جو کوئی وصیت ونصیحت کرنی ہوتی وہ کرتے اور ان کو خدا حافظ کہہ کے روانہ ہو جاتے، اور پھر جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے ہاں تشریف لے جاتے اور سب سے پہلے ان سے ملاقات کرتے چنانچہ (ایک مرتبہ) آنحضرت ﷺ ایک جہاد کے سفر سے واپس آئے تو اس وقت حضرت فاطمہؓ نے اپنے مکان کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹکا رکھا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے وہ پردہ آرائش کی خاطر لٹکایا تھا) کیونکہ اگر پردہ کی ضرورت کی خاطر لٹکایا ہوا ہوتا تو آنحضرت ﷺ کو کوئی ناگواری نہیں ہوتی) نیز انہوں نے (اپنے دونوں صاحبزادوں) حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو چاندی کے دو کڑے پہنا رکھے تھے (یعنی ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک کڑا یا دو دو کڑے پہنا رکھے تھے) جب آنحضرت ﷺ اپنے معمول کا مطابق سفر سے واپسی میں سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کی ملاقات کے لئے ان کے گھر، تشریف لائے اور یہ چیزیں دیکھیں تو آپ ﷺ ان کے گھر میں داخل نہیں ہوئے، حضرت فاطمہؓ سمجھ گئیں کہ جس چیز نے آنحضرت ﷺ کو میرے گھر میں داخل ہونے سے روکا وہ یہ ہے جو آپ ﷺ نے دیکھا ہے (یعنی دروازہ پر پردہ لٹکنا اور حسنؓ و حسینؓ کے ہاتھوں میں کڑے کا ہونا چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے (فوڑا) پردہ کو پھاڑ ڈالا اور دونوں صاحبزادوں کے ہاتھ سے دونوں کڑوں کو اتار لیا اور ان کو توڑ ڈالا پھر دونوں صاحبزادے ان ٹوٹے ہوئے کڑوں کو لے کر) روتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں گئے، آپ ﷺ نے اپنے رشتہ داروں میں

سے کسی شخص کا نام لے کر فرمایا کہ اس کے گھر والوں کو دے آؤ کیونکہ وہ محتاج وضرورت مند تھے، چونکہ یہ دونوں بچے میرے اہل بیت میں سے ہیں اس لئے میں اس کو اچھا نہیں سمجھتا کہ یہ دنیاوی زندگی میں بہترین غذا کھائیں (یعنی میرے نزدیک یہ پسندیدہ) نہیں ہے کہ میرے یہ بچے بہترین غذاؤں اور نفیس پوشاک واسباب سے لذت وفائدہ اٹھائیں یا آپ ﷺ نے "بہترین غذا" سے عیش وآرام کی زندگی اختیار کرنا اور دنیا کی لذتیں حاصل کرنا مراد لیا۔ نیز آپ ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ گویا یہ واضح فرمایا کہ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں اس چیز کو اختیار کرتا ہوں کہ وہ اس دنیا میں فقر وزہد اور سختی ومشقت کی زندگی اپنائیں تاکہ آخرت میں ان کے درجات بلند ہوں اور ان کا شمار ان لوگوں میں نہ ہو جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيٰوتِكُمُ الدُّنْيَا لیکن اس کے ساتھ ہی آنحضرت ﷺ چشم تصور سے اپنی لخت جگر فاطمہؓ کی شکستہ دلی کو بھی دیکھ رہے تھے اس لئے ان کے تئیں شفقت ومحبت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ ثوبانؓ! فاطمہؓ کے لئے عصب کا ایک ہار اور دونوں بچوں کے لئے ہاتھی دانت کے دو کڑے خرید لینا تاکہ فاطمہؓ کی بھی دلجوئی ہو جائے اور بچوں کی اشک شوئی ہو جائے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

سرمہ لگانے کا حکم

(۵۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اكْتَحِلُوْا بِالْاِثْمِدِ فَاِنَّهٗ يَجْلُو الْبَصَرَ وَيُنْبِتُ الشَّعْرَ وَزَعَمَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهٗ مُكْحُلَةٌ يَكْتَحِلُ بِهَا كُلَّ لَيْلَةٍ ثَلَاثَةً فِيْ هٰذِهٖ وَثَلَاثَةً فِيْ هٰذِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اصفہانی سرمہ (برابر) لگایا کرو، کیونکہ وہ سرمہ بینائی کو روشن کرتا ہے اور بالوں یعنی پلکوں کو اگاتا ہے جو آنکھوں کی زیبائی وحفاظت کی ضامن ہوتی ہیں) حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک لمبی سرمہ دانی تھی، جس سے آپ ﷺ روزانہ رات میں تین بار اس آنکھ میں اور تین بار اس آنکھ میں سرمہ لگاتے تھے (یعنی مسلسل تین سلائی دائیں آنکھ میں اور تین سلائی بائیں آنکھ میں لگاتے تھے)۔" (ترمذیؒ)

تشریح: بعض حضرات یہ کہتے ہیں "اثمد" مطلق سرمہ کو کہا جاتا ہے، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ "اثمد" ایک مخصوص قسم کے سرمہ کو کہا جاتا ہے، اور بعض حضرات کے قول کے مطابق وہ مخصوص قسم اصفہانی سرمہ ہے جو آنکھ سے بہنے والے پانی کو روکتا ہے، آنکھ کے اندر اگر زخم پیدا ہو جاتے ہیں یا سوزش ہوتی ہے تو اس کو دفع کرتا ہے اور آنکھ کی رگوں کو جو روشنی کا ذریعہ ہیں طاقت دیتا ہے خاص طور پر بڑی عمر والوں اور بچوں کے حق میں زیادہ فائدہ مند رہتا ہے۔

ایک روایت میں بالاثمد کے بجائے بالاثمد المروح کے الفاظ ہیں یعنی وہ سرمہ جس میں خالص مشک مخلوط ہو۔

"روزانہ رات میں" سے ہر روز رات میں سونے سے پہلے "مراد" ہے جیسا کہ ایک روایت میں وعند النوم کے الفاظ منقول بھی ہیں۔ رات میں سونے سے پہلے سرمہ لگانے میں حکمت ومصلحت یہ ہے کہ سرمہ کے اجزاء آنکھوں میں زیادہ عرصہ تک رہتے ہیں اور اس کے اثرات آنکھ کے اندرونی پردوں اور جھلیوں تک اچھی طرح سرایت کرتے ہیں۔

بہترین دوائیں کون سی ہیں

(۵۳) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْتَحِلُ قَبْلَ اَنْ يَنَامَ بِالْاِثْمِدِ ثَلَاثًا فِيْ كُلِّ عَيْنٍ قَالَ وَقَالَ اِنَّ خَيْرَ مَا تَدَاوَيْتُمْ بِهِ اللَّدُوْدُ وَالسَّعُوْطُ وَالْحِجَامَةُ وَالْمَشِيُّ وَخَيْرَ مَا اكْتَحَلْتُمْ بِهِ الْاِثْمِدُ فَاِنَّهٗ يَجْلُو الْبَصَرَ وَيُنْبِتُ الشَّعْرَ وَاِنَّ خَيْرَ مَا تَحْتَجِمُوْنَ فِيْهِ يَوْمُ سَبْعَ عَشْرَةَ وَيَوْمُ تِسْعَ عَشْرَةَ وَيَوْمُ اِحْدٰى وَعِشْرِيْنَ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ عُرِجَ بِهٖ مَا مَرَّ عَلٰى مَلَاءٍ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ اِلَّا قَالُوْا عَلَيْكَ بِالْحِجَامَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (رات میں) سونے سے پہلے ہر آنکھ میں اصفہانی سرمہ کی تین تین سلائیاں لگایا کرتے تھے! نیز حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم علاج کے لئے جن چیزوں کو اختیار کرتے ہو ان میں بہترین چیزیں چار ہیں ایک تو لدود، دوسرے سعوط، تیسرے حجامۃ اور چوتھے مشی! آنکھوں کے لگانے کی چیزوں میں بہترین چیز اصفہانی سرمہ ہے جو بینائی کو روشن کرتا ہے اور پلکوں کے بالوں کو جماتا ہے، نیز بھری ہوئی سینگی کھنچوانے کے لئے (چاند کی) سترھویں، انیسویں اور اکیسویں (تاریخ) بہترین دن ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ بھی بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو فرشتوں کی کوئی بھی ایسی جماعت نہیں تھی جس کے پاس سے آپ ﷺ گزرے ہوں اور اس نے یہ نہ کہا ہو کہ بھری ہوئی سینگی کھنچوانا آپ ﷺ کے لئے ضروری ہے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "لدود" اس کو کہتے ہیں جو مریض کے منہ میں باچھ کی طرف سے ٹپکائی جائے! سعوط اس دوا کو کہتے ہیں جو ناک میں ٹپکائی جائے! حجامہ بھری ہوئی سینگی کھنچوانے کو کہتے ہیں! اور مشی اسہال کی دواء کو کہتے ہیں، یہ لفظ مشی بمعنی چلنے سے مشتق ہے، چونکہ دست آور دوا کے استعمال سے بیت الخلاء جانے کے لئے بار بار چلنا پڑتا ہے اس مناسبت سے اس دوا کو مشی کہا جاتا ہے۔

چوں کو مہینہ کی ابتداء سے وسط مہینہ تک خون، بلکہ تمام رطوبات میں بڑھوتری، غلبہ اور جوش رہتا ہے، ادھر مہینہ کی آخری تاریخوں میں ان چیزوں کا عمل سست کمزور اور سرد ہو جاتا ہے اس اعتبار سے گویا مہینہ کے وسط ایام اور خاص طور پر مذکورہ تاریخیں انسانی جسم کے لئے معتدل ہوتی ہیں، لہٰذا ان دنوں میں سینگی کھنچوانا زیادہ سود مند ہوتا ہے حجامۃ کے بارے میں تفصیلی باتیں انشاء اللہ کتاب الطب والرقی میں نقل کی جائیں گی۔

حمام میں جانے کا ذکر

﴿۵۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى الرِّجَالَ وَالنِّسَاءَ عَنْ دُخُولِ الْحَمَّامَاتِ ثُمَّ رَخَّصَ لِلرِّجَالِ اَنْ يَّدْخُلُوْا بِالْمَيَازِرِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مردوں اور عورتوں کو حمام میں جانے سے منع فرمادیا تھا، پھر بعد میں آپ ﷺ نے مردوں کو اس صورت میں جانے کی اجازت دے دی تھی جب کہ ان کے جسم پر تہبند ہو!" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "حمام" سے مراد وہ غسل خانے ہیں جو عوامی ضرورت کے لئے بازاروں میں بنائے جاتے ہیں اور جہاں ہر کس و ناکس نہانے کی غرض سے آتا جاتا ہے، بلکہ پہلے زمانوں میں تو اس قسم کے حمام ہوتے تھے، جہاں علیحدہ علیحدہ نہانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا بلکہ کئی کئی آدمی ایک ہی جگہ ساتھ ساتھ غسل کرتے تھے ظاہر ہے کہ اس صورت میں ستر پوشی ممکن نہیں ہوسکتی تھی اس لئے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حمام میں جانے سے منع کر دیا البتہ بعد میں مردوں کو اس شرط کے ساتھ جانے کی اجازت دی کہ وہ بغیر تہبند کے جو گھٹنوں تک ہونا ضروری ہے وہاں غسل نہ کریں۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (تہبند کی شرط کے ساتھ بھی) عورتوں کو حمام میں جانے کی اجازت اس لئے نہیں دی کہ ان کے اعضاء ستر کے حکم میں داخل ہیں کہ ان کے لئے جسم کا کوئی حصہ بھی کھولنا جائز نہیں ہے تاہم واقعی ضرورت و مجبوری کی صورت میں عورتوں کے لئے بھی اجازت ہے مثلاً شدید سردی کے موسم میں حیض و نفاس سے فراغت کے بعد، یا ناپاک ہونے کی صورت میں نہانے کی ضرورت ہو یا کسی علاج کے سلسلے میں گرم پانی سے نہانا ضروری ہو اور گرم پانی کا حمام کے علاوہ اور کہیں انتظام نہ ہو نیز ٹھنڈے پانی سے نہانا ضرر و نقصان کا باعث ہو تو اس صورت میں عورت کو بھی حمام جانے کی مخصوص اجازت ہوگی۔

یہاں یہ خلجان پیدا ہوسکتا ہے کہ اس وضاحت سے وہ وجہ ظاہر نہیں ہوئی جس سے یہ واضح ہوتا کہ اس ممانعت میں مردوں اور

عورتوں کے درمیان فرق کیوں کیا گیا ہے کیونکہ عورت کی موجودگی میں عورت کے لئے بلافرق وہی حکم ہے جو مرد کی موجودگی میں مرد کے لئے ہے کہ جس طرح مرد کو کسی مرد کے سامنے اپنے جسم کو کھولنا جائز ہے۔ علاوہ اس حصہ جسم کے جو شرعی طور پر عورت کے لئے ستر کے حکم میں ہے اس اعتبار سے قیاس کا تقاضا تو یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی یہ اجازت ہونی چاہئے کہ وہ زنانہ حمام میں جا سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اپنے جسم کے اس حصے کو ضرور چھپائے رہیں جن کو عورت کے سامنے بھی کھولنا جائز نہیں ہے؟ اس خلجان کو اس توجیہ کے ذریعہ رفع کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو مذکورہ شرط کے ساتھ حمام میں جانے کی اجازت اس لئے نہیں دی ہوگی کہ عام طور پر عورتیں اپنی ہم جنسوں کے سامنے اپنی ستر پوشی کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھتیں۔ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو عورتوں کے سامنے حتیٰ کہ اجنبی عورتوں تک کے سامنے اپنے ستر کی عریانیت کو معیوب نہیں سمجھتیں، چہ جائیکہ اپنی اقارب جیسے ماں یا بیٹی یا بہن وغیرہ کے سامنے ستر کھولنے کو کوئی برائی سمجھیں یہاں تک کہ گھر میں بھی غسل وغیرہ کے مواقع پر عورتیں ایک دوسرے کے سامنے اپنے ستر کو چھپانے کا خیال نہیں رکھتیں چہ جائیکہ حمام میں کہ جہاں ویسے بھی ایک دوسرے کے سامنے ستر پوشی بڑی مشکل سے قائم رکھنی پڑتی ہے بلکہ اکثر عورتیں تو کوئی کپڑا وغیرہ لپیٹنے تک روادار نہیں ہوتیں، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے نور نبوت کے ذریعہ عورتوں کی اس حالت کا ادراک کر لیا اور ان کے لئے اس راستہ ہی کو بند کر دیا۔

(۵۵) وَعَنْ اَبِی الْمَلِیْحِ قَالَ قَدِمَ عَلٰی عَائِشَةَ نِسْوَةٌ مِنْ اَهْلِ حِمْصَ فَقَالَتْ مِنْ اَیْنَ اَنْتُنَّ قُلْنَ مِنَ الشَّامِ قَالَتْ فَلَعَلَّکُنَّ مِنَ الْکُوْرَةِ الَّتِیْ تَدْخُلُ نِسَآئُهَا الْحَمَّامَاتِ قُلْنَ بَلٰی قَالَتْ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تَخْلَعُ امْرَاَةٌ ثِیَابَهَا فِیْ غَیْرِ بَیْتِ زَوْجِهَا اِلَّا هَتَکَتِ السِّتْرَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ رَبِّهَا، وَفِیْ رِوَایَةٍ فِیْ غَیْرِ بَیْتِهَا اِلَّا هَتَکَتْ سِتْرَهَا فِیْمَا بَیْنَهَا وَبَیْنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابو ملیح کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں (ملک شام کے شہر) حمص کی کچھ عورتیں آئیں، حضرت عائشہؓ نے ان سے پوچھا تم کہاں کی رہنے والی ہو؟ انہوں نے کہا کہ ملک شام کی، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ شاید تم اس علاقہ کی رہنے والی ہو جہاں کی عورتیں حمام میں جاتی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! تب حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو بھی عورت اپنے خاوند کے گھر کے علاوہ کہیں اور کپڑے اتارتی ہے تو (گویا) وہ اس پردہ کو چاک کر دیتی ہے جو اس کے اور اللہ عزوجل کے درمیان ہے۔ یعنی اس روایت میں فِیْ بیت غیر زوجها کی بجائے فِیْ بیتها کے الفاظ ہیں۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ نے گویا مذکورہ حدیث عورتوں کے حمام میں جانے کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کی، جس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ پردہ میں رہے اور اس بات سے اپنے آپ کو بچائے کہ کوئی اجنبی اس کو دیکھے، یہاں تک کہ اس کے لئے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے خاوند کی موجودگی کے علاوہ خلوت (تنہائی) میں بھی اپنا ستر کھولے، لہٰذا جب وہ بلاضرورت شرعی حمام میں گئی اور وہاں اس نے اجنبی نظروں کا لحاظ کئے بغیر اپنے اعضاء و جسم کو عریاں کر دیا تو اس نے گویا اس پردہ کو چاک کر دیا جس میں اپنے جسم کو چھپانے کا حکم اس کو اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لباس کو اس لئے نازل کیا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنے ستر کو چھپایا جائے گو وہ لباس اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کا ذریعہ ہے، لہٰذا جس عورت نے اللہ تعالیٰ کے اس منشاء و حکم کو پورا نہیں کیا اور اپنے ستر کو عریاں کیا تو گویا اس نے اس پردہ کو پھاڑ ڈالا جو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔

(۵۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَتُفْتَحُ لَکُمْ اَرْضُ الْعَجَمِ وَسَتَجِدُوْنَ فِیْهَا بُیُوْتًا یُقَالُ لَهَا الْحَمَّامَاتُ فَلَا یَدْخُلَنَّهَا الرِّجَالُ اِلَّا بِالْاُزُرِ وَامْنَعُوْهَا النِّسَاءَ اِلَّا مَرِیْضَةً اَوْ نُفَسَاءَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ عنقریب تمہیں عجم کی سرزمین پر فتح حاصل ہوگی جہاں تمہیں

ایسے گھر ملیں گے جن کو حمام کہا جائے گا، لہٰذا (خبردار) ان میں داخل ہونے سے بالکل منع کر دینا الا یہ کہ کوئی عورت بیمار ہو یا نفاس کی حالت میں ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مردوں کو تو حمام میں جانے کی اس شرط کے ساتھ اجازت بھی ہے کہ وہ تہبند باندھے رکھیں، لیکن عورتوں کو مطلقاً اجازت نہیں ہے خواہ وہ تہبند باندھے ہوئے ہوں یا بغیر تہبند کے ہوں، کیونکہ عورت کا پورا جسم سر سے پاؤں تک ستر ہے جب کہ مرد کا پورا جسم ستر نہیں ہے بلکہ صرف ناف سے زانوں تک کا حصہ چھپانا اس کے لئے ضروری ہے اس لئے تہبند باندھنے سے ان کی ستر پوشی ہو جاتی ہے تاہم اگر کوئی عورت بیمار ہو اور کسی علاج کے سلسلے میں اس کے لئے گرم پانی سے نہانا ضروری ہو، یا کوئی عورت ولادت سے فارغ ہوئی تو غسل کے لئے یا اسی طرح کے کسی اور شرعی عذر کی بنا پر اس کے لئے زنانہ حمام میں داخل ہونا جائز ہو گا خواہ وہ وہاں تہبند جیسی کوئی چیز لپیٹ کر غسل کرے یا بالکل عریاں حالت میں، بغیر عذر حمام میں داخل ہونا عورتوں کے لئے جائز نہیں ہے۔

(۵۷) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَدْخُلِ الْحَمَّامَ بِغَيْرِ اِزَارٍ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يُدْخِلْ حَلِيْلَتَهُ الْحَمَّامَ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَجْلِسْ عَلٰى مَائِدَةٍ تُدَارُ عَلَيْهَا الْخَمْرُ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنی عورت کو حمام میں داخل نہ ہونے دے" اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اس دسترخوان پر نہ بیٹھے جس پر شراب کا دور چلتا ہو۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: "اپنی عورت کو حمام میں داخل نہ ہونے دے" کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی کو حمام میں جانے کی اجازت نہ دے، اس حکم میں ماں، بیٹی اور بہن وغیرہ ایسی عورتیں بھی شامل ہیں جو اس (مرد) کے قابو و اختیار میں ہوں، نیز مرد کے لئے یہ مکروہ ہے کہ وہ حمام میں جانے کی اجرت دینے کے لئے اپنی بیوی وغیرہ کو روپیہ پیسہ دے کیونکہ اس صورت میں وہ ایک مکروہ عمل کا مددگار بنے گا۔

فقہ کی بعض کتابوں میں آنحضرت ﷺ کا حمام میں جانا نقل کیا گیا ہے لیکن محدثین کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے اور اس بارے میں حدیث منقول ہے اس کو موضوع یعنی من گھڑت قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ بات درجہ صحت پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی بھی حمام میں نہیں گئے ہیں بلکہ آپ ﷺ نے حمام کی صورت بھی کبھی نہیں دیکھی! رہی اس حمام کی بات جو مکہ معظمہ میں حمام النبی ﷺ کے نام سے مشہور ہے تو ہو سکتا ہے کہ جس جگہ آنحضرت ﷺ نے کبھی غسل کیا ہو گا اس کو حمام کی صورت دے دی گئی ہو اور پھر اس کو حمام النبی ﷺ کہا جانے لگا ہو، نیز ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ جگہ "حمام النبی ﷺ" اس مناسبت سے زبان زد خاص و عام ہو گئی ہو کہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش مبارک کی جگہ اسی مقام کے اطراف و جوانب میں واقع ہے تاہم احادیث میں "حمام" کا ذکر ضرور موجود ہے جیسا کہ مذکورہ روایات سے ظاہر ہوا۔

"اس دسترخوان پر نہ بیٹھے" کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ ہرگز نہ جائے جہاں شراب کا دور چلتا ہو اور شرابی لوگ وہاں مے نوشی کرتے ہوں۔ لہٰذا وہاں جانے والا مسلمان اگر شراب نوشی میں شامل نہ بھی ہو تو اس صورت میں اس پر یہ تو واجب ہو ہی گا کہ وہ وہاں شراب پینے والوں کو اس برے فعل سے روکے لیکن وہاں پہنچ جانے کے باوجود اگر اس نے نہ تو ان لوگوں کو شراب پینے سے روکا، نہ ان سے بے اعتنائی کا برتاؤ کیا اور نہ ان کے خلاف اپنی نفرت و غصہ کا اظہار کیا تو یقیناً اس کا شمار کامل مؤمنین میں نہیں ہو گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ نے سر مبارک پر کبھی خضاب نہیں کیا

۵۸ عَنْ ثَابِتٍ قَالَ سُئِلَ اَنَسٌ عَنْ خِضَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْشِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتٍ کُنَّ فِیْ رَاْسِہٖ فَعَلْتُ قَالَ وَلَمْ یَخْتَضِبْ وَزَادَ فِیْ رِوَایَۃٍ وَقَدِ اخْتَضَبَ اَبُوْبَکْرٍ بِالْحِنَّاءِ وَالْکَتَمِ وَاخْتَضَبَ عُمَرُ بِالْحِنَّاءِ بَحْتًا۔

(متفق علیہ)

"حضرت ثابتؒ سے روایت ہے کہ حضرت انس ابن مالکؓ سے نبی کریم ﷺ کے خضاب کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر میں آنحضرت ﷺ کے سر مبارک میں سفید بالوں کی تعداد شمار کرنا چاہتا تو (یقیناً) شمار کر لیتا (یعنی آپ ﷺ کے سر مبارک میں چند ہی بال سفید تھے) اس صورت میں آپ ﷺ کو خضاب کرنے کی کیا ضرورت تھی چنانچہ آپ ﷺ نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ ایک روایت میں حضرت انسؓ نے یا حضرت انسؓ سے ثابتؒ نے یہ عبارت مزید نقل کی کہ حضرت ابوبکرؓ نے مہندی اور وسمہ کا خضاب استعمال کیا اور حضرت عمرؓ نے صرف مہندی کا خضاب استعمال کیا۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

تشریح: آپ ﷺ نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سر مبارک میں کبھی بھی خضاب کا استعمال نہیں کیا اس صورت میں یہ روایت پیچھے نقل کی گئی اس روایت کے منافی نہیں ہوگی جس میں ریش مبارک پر خضاب کرنے کا ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ آگے بھی حضرت ابن عمرؓ کی روایت آرہی ہے۔ نیز مہندی اور وسمہ دونوں کے مخلوط اور صرف مہندی کے خضاب کے سلسلے میں جو بحث کی جاتی ہے وہ بھی پیچھے گزر چکی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے خضاب کرنے کا ذکر

۵۹ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّہٗ کَانَ یُصَفِّرُ لِحْیَتَہٗ بِالصُّفْرَۃِ حَتّٰی یَمْتَلِیَٔ ثِیَابُہٗ مِنَ الصُّفْرَۃِ فَقِیْلَ لَہٗ لِمَ تَصْبَغُ بِالصُّفْرَۃِ قَالَ اِنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَصْبَغُ بِھَا وَلَمْ یَکُنْ شَیْءٌ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْھَا وَقَدْ کَانَ یَصْبَغُ بِھَا ثِیَابَہٗ کُلَّھَا حَتّٰی عِمَامَتَہٗ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنی داڑھی پر زرد خضاب کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے کپڑے بھی زرد آلود ہو جاتے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ زرد خضاب کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کو (اپنی ریش مبارک پر) زرد خضاب کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور آپ ﷺ کے نزدیک داڑھی پر خضاب کرنے کے لئے زرد رنگ سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں تھی، نیز آنحضرت ﷺ اپنے تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ کو بھی رنگ دیتے تھے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "زرد خضاب" سے مراد ورس کے ذریعہ خضاب کرنا ہے جو ایک گھاس ہوتی ہے اور زعفران کے مشابہ ہوتی ہے۔ بسا اوقات ورس کے ساتھ زعفران کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یصبغ بھا سے ابن عمرؓ کی مراد یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی ریش مبارک پر زرد خضاب کرتے تھے جیسا کہ ترجمہ کے دوران قوسین میں اس کو واضح کیا گیا ہے، بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ بالوں کو رنگنا مراد ہے، اور بعض حضرات کے قول کے مطابق کپڑوں کو رنگنا مراد ہے، نیز سیوطیؒ نے کہا ہے کہ یہی قول اشبہ یعنی صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ کا بالوں کا رنگنا منقول نہیں ہے لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ جب یہ بات درجہ صحت کو پہنچ چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسم کے رنگے ہوئے اور زعفرانی

کپڑے پہننے سے منع کیا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مذکورہ جملہ کو کپڑوں کے زرد رنگنے پر محمول کیا جائے لہٰذا زیادہ صحیح بات وہی ہے جو صاحب نہایہ نے نقل کی ہے کہ مختار قول یہ ہے کہ کبھی تو آپ ﷺ نے بالوں کو رنگا اور اکثر نہیں رنگا لہٰذا راویوں میں سے ہر ایک نے اسی چیز کو بیان کیا جس کو اس نے دیکھا ہے اس اعتبار سے ہر راوی اپنے بیان میں سچا ہے۔

"تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ کو زرد رنگ دیتے تھے" اس سے یہ قطعا مراد نہیں ہے کہ آپ ﷺ خاص طور کپڑوں کو زرد رنگتے تھے اور پھر اس کو پہنتے تھے، کیونکہ زرد رنگ کے کپڑے پہننے کی ممانعت منقول ہے بلکہ عبارت کا مقصد، محض یہ واضح کرنا ہے کہ آنحضرت ﷺ جو زرد خضاب لگاتے تھے اس کے اثر سے آپ ﷺ کے کپڑے بھی زرد ہو جاتے تھے۔

(۶۰) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَوْهَبٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى اُمِّ سَلَمَةَ فَاَخْرَجَتْ اِلَيْنَا شَعْرًا مِنْ شَعْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَخْضُوْبًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عثمان ابن عبداللہ ابن موہب کہتے ہیں کہ ایک دن میں اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے ہمیں نبی کریم ﷺ کا ایک موئے مبارک نکال کر دکھایا جو رنگین تھا!" (بخاریؒ)

تشریح: میرکؒ کہتے ہیں کہ ابن ماجہؒ اور احمدؒ نے اپنی روایت میں "رنگین" کے ساتھ مہندی اور وسمہ کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں یعنی وہ موئے مبارک مہندی اور وسمہ کے مخلوط رنگ سے رنگین تھا۔ بخاریؒ کی جو روایت نقل کی گئی ہے اسی طرح کی ایک روایت ترمذیؒ نے بھی شمائل میں حضرت انسؓ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے (یعنی انسؓ نے) بیان کیا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کا ایسا موئے مبارک دیکھا جو رنگین تھا، لیکن حضرت انسؓ ہی کی یہ روایت بھی گزر چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ خضاب نہیں کرتے تھے، تو ہو سکتا ہے کہ جس روایت میں انہوں نے آنحضرت ﷺ کے خضاب کرنے کی نفی کی ہے اس سے ان کی مراد یہ ہو کہ آپ ﷺ اکثر خضاب نہیں کرتے تھے اور جس روایت سے خضاب کا اثبات ہوتا ہے وہ اقل احوال پر محمول ہو یعنی کبھی کبھار آپ ﷺ نے خضاب کیا ہوگا نیز یہ کہنا بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک روایت تو حقیقت پر مبنی ہے اور دوسری مجاز پر محمول ہے یعنی حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی خضاب نہیں کیا، لیکن کسی موقع پر آپ ﷺ نے درد سر کے دفعیہ کے لئے اپنے سر مبارک پر مہندی لگائی ہوگی اس کے رنگ کا اثر آپ ﷺ کے بالوں پر بھی آ گیا ہوگا یا یہ کہ وہ موئے مبارک جو حضرت انسؓ نے دیکھا تھا خوشبوؤں میں بسا کر رکھا جاتا ہوگا اور ان خوشبوؤں کے اثر سے وہ ایسا نظر آیا ہوگا جیسے خضاب کیا ہو، اس اعتبار سے حضرت انسؓ نے اس موئے مبارک کو رنگین کہا۔ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ خضاب کی نفی کو اس پر محمول کیا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے سفید بالوں کو چھپانے کے لئے اپنے سر مبارک پر کبھی خضاب نہیں کیا اور جس روایت سے خضاب کا اثبات ہوتا ہے اس کو اس پر محمول کیا جائے کہ آپ ﷺ نے اپنی ریش مبارک کے ان چند بالوں پر خضاب کیا تھا جو سفید ہو گئے تھے، اور بخاریؒ کی جس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت اُم سلمہؓ کے پاس آنحضرت ﷺ کی ریش مبارک کا ایک بال تھا جس پر مہندی اور وسمہ کے خضاب کا اثر تھا تو اس پر شمائل میں منقول حضرت ابوہریرہؓ کی اس مطلق روایت کو محمول کیا جائے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت ﷺ خضاب کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔

آنحضرت ﷺ کے حکم سے ایک مخنث کو شہر بدر کرنے کا ذکر

(۶۱) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمُخَنَّثٍ قَدْ خَضَبَ يَدَيْهِ وَ رِجْلَيْهِ بِالْحِنَّاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَابَالُ هٰذَا قَالُوْا يَتَشَبَّهُ بِالنِّسَاءِ فَاَمَرَ بِهٖ فَنُفِيَ اِلَى النَّقِيْعِ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا نَقْتُلُهٗ فَقَالَ اِنِّيْ نُهِيْتُ عَنْ قَتْلِ الْمُصَلِّيْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک مخنث کو لایا گیا جس نے (عورتوں کی طرح) اپنے ہاتھ پر مہندی لگا رکھی تھی رسول کریم ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ اس کو کیا ہوا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ شخص (اپنے رہن سہن، بول چال اور طور طریقوں میں) عورتوں کی مشابہت کرتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو (شہر سے) باہر نکال دینے کا حکم دیا اور اس کو (مدینہ کے ایک جگہ) نقیع میں بھیج دیا گیا، پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ!" کیا ہم اس کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیں، یعنی چونکہ یہ فسق و فساد اور برائی کی گند پھیلا رہا ہے اس لئے اگر آپ ﷺ حکم دیں تو اس کو قتل کر دیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھ کو نماز پڑھنے والوں کے قتل سے منع کیا گیا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے "نماز" کے ذریعہ بطور کنایہ اس کے اسلام کو ذکر کیا گویا آپ ﷺ نے واضح کیا کہ چونکہ وہ شخص بہرحال مسلمان ہے اس لئے اس کے قتل کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے! نماز بول کر اسلام مراد لینے کی بنیاد یہ بھی ہے کہ حقیقت میں نماز ایک ایسا عمل ہے جو اسلام کے اظہار کا ذریعہ ہے اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو گویا وہ ظاہر کرتا ہے کہ میرا اسلام سے تعلق نہیں ہے اسی لئے اس قول "اگر کوئی مسلمان نماز نہ پڑھے تو اس کو قتل کر دیا جائے" کو بعض علماء نے اس کے ظاہری مفہوم ہی پر محمول کیا ہے۔

مرد کے لئے رنگدار خوشبو کا استعمال ممنوع ہے

(۶۲) وَعَنِ الْوَلِيْدِ بْنِ عُقْبَةَ قَالَ لَمَّا فَتَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَّةَ جَعَلَ اَهْلُ مَكَّةَ يَاْتُوْنَهٗ بِصِبْيَانِهِمْ فَيَدْعُوْلَهُمْ بِالْبَرَكَةِ وَيَمْسَحُ رُؤُوْسَهُمْ فَجِئَ بِيْ اِلَيْهِ وَاَنَا مُخَلَّقٌ فَلَمْ يَمَسَّنِيْ مِنْ اَجْلِ الْخَلُوْقِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ولید ابن عقبہؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کو مکہ پر فتح حاصل ہوئی (اور آپ ﷺ مکہ شہر میں رونق افروز ہوئے) تو مکہ والوں نے اپنے بچوں کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لانا شروع کیا، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان بچوں کے لئے برکت کی دعا کرتے اور (پیار و شفقت سے) ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے اس موقع پر مجھے بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا لیکن چونکہ میرے بدن پر (زعفران وغیرہ کی بنی ہوئی خوشبو) خلوق لگی ہوئی تھی اس لئے آپ ﷺ نے مجھ کو خلوق آلودہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ نہیں لگایا۔" (ابوداؤد)

تشریح: خلوق چونکہ عورتوں کی مخصوص خوشبو ہے اس لئے اگر کوئی مرد اس خوشبو کو لگائے تو عورتوں کی مشابہت لازم آتی ہے لہٰذا مرد کے لئے خلوق کا استعمال ممنوع ہے۔

بالوں کی دیکھ بھال کرنے کا ذکر

(۶۳) وَعَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ اَنَّهٗ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِيْ جُمَّةً اَفَاُرَجِّلُهَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ وَاَكْرِمْهَا قَالَ فَكَانَ اَبُوْقَتَادَةَ رُبَّمَا دَهَنَهَا فِي الْيَوْمِ مَرَّتَيْنِ مِنْ اَجْلِ قَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ وَاَكْرِمْهَا۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میرے (سر کے بال) منڈھوں تک ہیں، کیا ان میں کنگھا کیا کروں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہاں! اور ان کی تکریم بھی کیا کرو یعنی ان میں تیل وغیرہ لگا کر ان کی دیکھ بھال کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے اس ارشاد "ہاں اور ان کی تکریم کیا کرو" کی تعمیل میں حضرت ابوقتادہؓ اکثر دن بھر میں دو مرتبہ اپنے بالوں میں تیل لگایا کرتے تھے۔" (مالک)

تشریح: بالوں میں تیل لگانے اور کنگھی کرنے کو کثرت کے ساتھ اختیار کرنا، اس صورت میں غیر پسندیدہ اور نامحمود ہے جب کہ اس کا

مقصد محض زینت وآرائش ہو اور اس میں بے جا انہماک و اہتمام سے کام لیا جائے، لیکن حضرت ابوقتادہؓ کے بارے میں جو نقل کیا گیا ہے اس کی نوعیت بالکل جداگانہ تھی کہ ان کا یہ عمل یعنی بالوں میں اکثر تیل لگانا اور کنگھی کرنا محض آنحضرت ﷺ کے حکم کی بجا آوری اور منشاء نبوی ﷺ کی تعمیل کی خاطر تھا جو یقیناً پسندیدہ و محمود کہلائے گا جیسا کہ حضرت انسؓ کی والدہ کے بارے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے انسؓ کے گیسو محض اس لئے نہیں کاٹے کہ ان کو آنحضرت ﷺ کھینچا اور پکڑا کرتے تھے۔

غیر مسلم قوموں کی وضع قطع کے بال رکھنے ممنوع ہیں

﴿۶۴﴾ وَعَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ حَسَّانٍ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰى اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ فَحَدَّثَتْنِىْ اُخْتِىَ الْمُغِيْرَةُ قَالَتْ وَاَنْتَ يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ وَلَكَ قَرْنَانِ اَوْ قُصَّتَانِ فَمَسَحَ رَاْسَكَ وَبَرَّكَ عَلَيْكَ وَقَالَ احْلِقُوْا هٰذَيْنِ اَوْ قُصُّوْهُمَا فَاِنَّ هٰذَا زِيُّ الْيَهُوْدِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حجاج ابن حسان کہتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ یعنی میں اور میرے گھر کے کچھ افراد) حضرت انسؓ ابن مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے اس دن کے واقعہ کو مجھ سے میری بہن نے بیان کیا جن کا نام مغیرہ ہے، یعنی اس وقت میں بچہ تھا اور مجھے اس دن حضرت انسؓ کی خدمت میں حاضر ہونا تو یاد ہے لیکن اس حاضری کی کیفیت اور وہاں جو احوال پیش آئے ان کی تفصیل مجھے یاد نہیں ہے چنانچہ میری بہن نے (مجھے بتایا کہ) تم ان دنوں میں بچے تھے اور تمہارے سر پر دو گندھے ہوئے گیسو۔ یا دو گچھے تھے۔ حضرت انسؓ نے تمہارے سر پر ہاتھ پھیرا اور تمہارے حق میں برکت کی دعا کی نیز فرمایا کہ ان دونوں کو منڈوا ڈالو یا کاٹ ڈالو کیونکہ یہ یہودیوں کی وضع ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "یا دو گچھے تھے" یہاں راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے کہ حضرت حجاجؒ نے اس موقع پر لفظ "قرنان" کہا تھا یا "قصتان"، قصتان اصل میں قصہ کا تثنیہ ہے جس کے معنی سر کے بالوں کے ہیں جو آگے کی جانب (پیشانی) پر پڑے رہتے ہیں۔

عورت کو اپنا سر منڈانا حرام ہے

﴿۶۵﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تَحْلِقَ الْمَرْاَةُ رَاْسَهَا۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی عورت اپنا سر منڈائے۔" (نسائی)

تشریح: عورت کے حق میں سر کے بالوں کی وہی اہمیت ہے جو مرد کے حق میں داڑھی کی ہے لہٰذا جس طرح مرد کو داڑھی منڈانا حرام ہے اسی طرح عورت کو سر منڈانا حرام ہے۔

سر اور داڑھی کے بالوں کا بکھرا ہوا ہونا غیر مہذب ہونے کی علامت ہے

﴿۶۶﴾ وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ ثَائِرُ الرَّاْسِ وَاللِّحْيَةِ فَاَشَارَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ كَاَنَّهٗ يَاْمُرُهٗ بِاِصْلَاحِ شَعْرِهٖ وَلِحْيَتِهٖ فَفَعَلَ ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَيْسَ هٰذَا خَيْرًا مِنْ اَنْ يَاْتِىَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ ثَائِرُ الرَّاْسِ كَاَنَّهٗ شَيْطَانٌ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت عطاء ابن یسارؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں تشریف فرما تھے کہ ایک ایسا شخص آیا جس کے سر کے اور داڑھی کے بال پراگندہ (یعنی بکھرے اور الجھے ہوئے) تھے رسول اللہ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) اس (کے سر اور داڑھی) کی طرف (اپنے دست مبارک سے اس انداز میں) اشارہ کیا جیسے آپ ﷺ اس کو یہ حکم دے رہے ہوں کہ وہ اپنے سر کے بالوں اور داڑھی کو سنوارے، چنانچہ اس شخص نے اپنے سر اور داڑھی کے بالوں کو سنوارا اور پھر واپس آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں آئے کہ اس کے سر کے بال پراگندہ ہوں اور وہ ایسا دکھائی دے جیسے کوئی شیطان (جن) ہو

(یعنی اس نے اپنی شکل و صورت ایسی بنا رکھی ہو جیسے کوئی جن اپنے بال بکھیرے ہوئے اور بدہیئت شکل و صورت میں ہوتا ہے)۔" (مالکؒ)

گھر کے صحن کو صاف ستھرا رکھو

(۶۷) وَعَنِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ سَمِعَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ يُحِبُّ الطَّيِّبَ نَظِيْفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ كَرِيْمٌ يُحِبُّ الْكَرَمَ جَوَادٌ يُحِبُّ الْجُوْدَ فَنَظِّفُوْا اُرَاهُ قَالَ اَفْنِيَتَكُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ قَالَ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِمُهَاجِرِيْنَ مِسْمَارٍ فَقَالَ حَدَّثَنِيْهِ عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَهٗ اِلَّا اَنَّهٗ قَالَ نَظِّفُوْا اَفْنِيَتَكُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن مسیب (تابعیؒ) سے روایت ہے کہ ان کو یہ فرماتے ہوئے سنا گیا کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے پاکی پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ نہایت ستھرا ہے ستھرائی کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ کرم کرنے والا ہے کرم کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہایت سخی اور عطا کرنے والا ہے، سخاوت و عطا کو پسند کرتا ہے، لہٰذا تم صاف ستھرا رکھو۔ (حضرت ابن مسیب سے روایت کرنے والے) راوی کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ ابن مسیب نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنے صحنوں کو (یعنی انھوں نے فنظفوا کے بعد افنیتکم کا لفظ بھی کہا تھا گویا اس جگہ پورا جملہ یہ ہے کہ تم اپنے صحنوں کو صاف ستھرا رکھو) اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو (جو اپنے گھروں کے صحن و آنگن کو کوڑے کرکٹ سے ناپاک و گندہ رکھتے ہیں)۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن مسیبؒ کا یہ قول حضرت مہاجر ابن مسمار تابعی کے سامنے ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت عامر ابن سعد (تابعیؒ) نے اور انھوں نے اپنے والد حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ (صحابیؓ) سے اور انھوں نے نبی کریم ﷺ سے اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔ لیکن مہاجرؒ نے جو حدیث نقل کی اس میں انھوں نے یہ نقل کیا کہ تم اپنے گھروں کے صحن کو صاف ستھرا رکھو۔ یعنی ان کی روایت میں افنیتکم کا لفظ صریحاً مذکور ہے جب کہ ابن مسیب کی روایت میں یہ لفظ گمان کے درجہ میں نقل کیا گیا ہے۔"

تشریح: "اللہ تعالیٰ پاک ہے" یعنی وہ ہر عیب، ہر نقصان، ہر برائی اور ہر اس چیز سے پاک و منزہ ہے جو شان الوہیت اور شان ربوبیت کے منافی ہو۔ "یحب الطیب" میں لفظ طیب طاء کے زیر کے ساتھ ہے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خوش کرداری و خوش کلامی محبوب و پسندیدہ ہے، یا اللہ تعالیٰ کے نزدیک خوشبو ایک پسندیدہ چیز ہے اور چونکہ اس ساری چیزوں کی بنیاد پاکی و پاکیزگی ہے لہٰذا جو بندہ ان چیزوں کو اختیار و استعمال کر کے اپنے اندر پاکی و پاکیزگی پیدا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے اور اس کے عمل سے خوش ہوتا ہے، ایک نسخہ میں یہ لفظ طاء کے زبر اور یاء مشددہ کے زیر کے ساتھ یعنی طَيِّبٌ لکھا ہوا ہے اس صورت میں اس سے مراد وہ شخص ہو گا جو طیبات یعنی عقائد و خیالات کی اچھائی، اقوال اور زبان و بیان کی پاکیزگی، اور اعمال و اخلاق کی بلندی و نیک خوئی کے اوصاف کا حامل ہو۔ نظافۃ جس کا ترجمہ "ستھرائی" کیا گیا ہے، کے معنی ظاہر و باطن کی صفائی و پاکی کے ہیں۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ "گھروں کے صحن کو صاف ستھرا رکھنے" کا حکم اصل میں کرم اور جود اختیار کرنے کا کنایہ ہے، یعنی اس حکم سے اصل مقصد یہ تلقین کرنا ہے کہ اپنے اندر عطاء و بخشش اور سخاوت و مہمان نوازی کے اوصاف پیدا کرو، اور ظاہر ہے کہ گھر کی صفائی ستھرائی اس وصف کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ جس گھر کا صحن و آنگن صاف ستھرا رہتا ہے اور مکان کے در و دیوار سے صفائی و سلیقہ شعاری ہویدا ہوتی ہے اس گھر میں لوگوں کو اور مہمانوں کے آنے اور ٹھہرنے کی ترغیب ملتی ہے۔

مونچھیں ترشوانے کی سنّت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاری ہوئی

(۶۸) وَعَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّهٗ سَمِعَ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُوْلُ كَانَ اِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ الرَّحْمٰنِ اَوَّلَ النَّاسِ ضَيَّفَ الضَّيْفَ وَاَوَّلَ النَّاسِ اخْتَتَنَ وَاَوَّلَ النَّاسِ قَصَّ شَارِبَهٗ وَاَوَّلَ النَّاسِ رَاَى الشَّيْبَ فَقَالَ يَارَبِّ مَا هٰذَا قَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَقَارٌ يَا اِبْرَاهِيْمُ قَالَ رَبِّ زِدْنِيْ وَقَارًا۔ (رواہ مالک)

"اور یحییٰ ابن سعیدؒ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت سعید ابن مسیبؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو رحمٰن (اللہ) کے دوست تھے سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے مہمان کی مہمانداری کی یعنی مہمان کی پذیرائی و مہمانداری کی ابتداء انھوں ہی نے کی وہ سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے ختنہ کیا، وہ سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے اپنی مونچھیں کتریں، اور وہ سب سے پہلے انسان ہیں جھنوں نے بڑھاپا یعنی سفید بال دیکھا، چنانچہ انھوں نے (جب سب سے پہلے اپنے بالوں میں سفیدی کو دیکھا تو) عرض کیا کہ "میرے پرودگار" ! یہ کیا ہے؟ پروردگار کا جواب آیا کہ "ابراہیم (علیہ السلام)" یہ وقار ہے یعنی یہ اس بڑھاپے کی علامت ہے جو علم و دانش میں اضافہ کا باعث اور عزو وقار کا ذریعہ ہے اور اس کی وجہ سے انسان لہو ولعب کی مشغولیت اور گناہوں کے ارتکاب سے باز رہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ پروردگار! یہ تو تیری بہت بڑی نعمت ہے لہذا "میرے وقار میں اضافہ فرما۔" (مالکؒ)

تشریح: سیوطیؒ نے موطا کے حاشیہ میں ایسی اور چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی ابتداء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی ہے، جو یہ ہیں، ناخن کاٹنا، مانگ نکالنی، استرا استعال کرنا، پائجامہ پہننا، مہندی اور وسمہ کا خضاب لگانا، منبر پر خطبہ پڑھنا، خدا کی راہ میں جہاد کرنا، میدان جنگ میں لشکر کو میمنہ، میسرہ، مقدمہ اور قلب کی ترتیب کے ساتھ صف آراء کرنا، لوگوں کے ساتھ معانقہ کرنا اور ثرید تیار کرنا۔

بَابُ التَّصَاوِيْرِ
تصاویر کا بیان

"تصاویر" تصویر کی جمع ہے، جس کے معنی صورت بنانے کے ہیں، یہاں تصاویر سے مراد جاندار کی تصویریں ہیں جو پردوں وغیرہ پر کڑھی یا بنی ہوئی ہوں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ
تصویر بنانے اور رکھنے کا مسئلہ

(۱) عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُ الْمَلٰئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِيْرُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر ہو اور نہ اس گھر میں داخل ہوتے ہیں جس میں کتا ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ یہاں وہ تصویر اور کتا مراد ہے جن کا گھر میں رکھنا حرام نہیں ہے، جیسے وہ کتا جو شکار یا کھیت کھلیان اور مویشیوں وغیرہ کی حفاظت کے لئے پالا گیا ہو یا ایسی تصویریں جو بچھونوں وغیرہ پر ہوں اور ان کی تحقیر و پامالی کی جاتی ہو، چنانچہ گھر میں ایسے کتے یا ایسی تصویروں کی موجودگی فرشتوں کے داخل ہونے میں رکاوٹ نہیں بنتی، لیکن یہ مسئلہ محض ان تصویروں کے رکھنے یا استعمال کا ہے کیونکہ تصویر بنانا تو ہر صورت میں حرام ہے خواہ بچھونے پر ہو خواہ درہم سکوں اور نوٹوں پر ہوں۔ اور خواہ کسی اور چیز پر بنائی جائے، جاندار کی تصویر و مورت بنانے والا ایک سخت حرام عمل کا ارتکاب کرتا ہے اور گناہ کبیرہ میں مبتلا ہوتا ہے البتہ غیر جاندار چیزوں جیسے درخت، پہاڑ اور عمارت وغیرہ کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ حکم عمومی نوعیت کا ہے یعنی کسی گھر میں مطلق تصویر اور کتے کی موجودگی ملائکہ کے داخل ہونے میں رکاوٹ بنتی ہے، اگرچہ کتا اور تصویریں اسی نوعیت کی کیوں نہ ہوں جن کا گھر میں رکھنا حرام نہیں ہے۔

"فرشتوں" سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بندوں کے اعمال لکھنے اور ان کی حفاظت پر مامور نہیں ہوتے کیونکہ جو فرشتے اعمال لکھنے اور حفاظت کرنے پر معمور ہوتے ہیں وہ کسی بھی حال میں انسان سے جدا نہیں ہوتے۔

غیر ضروری کتوں کو مار ڈالا جائے

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُونَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْبَحَ يَوْمًا وَاجِمًا وَقَالَ اِنَّ جِبْرَئِيْلَ كَانَ وَعَدَنِيْ اَنْ يَلْقَانِي اللَّيْلَةَ فَلَمْ يَلْقَنِيْ اَمَا وَاللّٰهِ مَا اَخْلَفَنِيْ ثُمَّ وَقَعَ فِيْ نَفْسِهٖ جِرْوُ كَلْبٍ تَحْتَ فُسْطَاطٍ لَهٗ فَاَمَرَ بِهٖ فَاُخْرِجَ ثُمَّ اَخَذَ بِيَدِهٖ مَاءً فَنَضَحَ مَكَانَهٗ فَلَمَّا اَمْسٰى لَقِيَهٗ جِبْرَئِيْلُ فَقَالَ لَقَدْ كُنْتَ وَعَدْتَنِيْ اَنْ تَلْقَانِي الْبَارِحَةَ قَالَ اَجَلْ وَلٰكِنَّا لَا نَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا صُوْرَةٌ فَاَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَئِذٍ فَاَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ حَتّٰى اِنَّهٗ يَاْمُرُ بِقَتْلِ كَلْبِ الْحَائِطِ الصَّغِيْرِ وَيَتْرُكُ كَلْبَ الْحَائِطِ الْكَبِيْرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن صبح کے وقت رسول کریم ﷺ بہت اداس و غمگین نظر آئے اور اس اداسی غمگینی کا سبب بیان کرتے ہوئے میمونہؓ سے یا کسی اور زوجہ مطہرہؓ سے یا اپنے دل میں اور یا اظہار تعجب و حیرت کے طور پر خود اپنے سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "حضرت جبرئیل نے آج کی رات میرے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن وہ میرے پاس نہیں آئے۔ خدا کی قسم! (اس سے پہلے) ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ انہوں نے وعدہ خلافی کی ہو"۔ پھر (اچانک) آپ ﷺ کے ذہن میں کتے کے اس پلہ کا خیال آیا جو آپ ﷺ کے خیمے (یعنی کسی تخت یا ٹاٹ وغیرہ) کے نیچے پڑا تھا، چنانچہ آپ ﷺ سمجھ گئے کہ حضرت جبرئیل اسی پلہ کی وجہ سے میرے پاس نہیں آئے اور آپ ﷺ نے اس پلے کو نکال دینے کا حکم دیا، جب وہ پلہ وہاں سے نکال دیا گیا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں میں پانی لے کر اس جگہ چھڑکا جہاں وہ پلہ بیٹھا ہوا تھا، پھر جب شام ہوئی تو حضرت جبرئیل آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ "آپ (علیہ السلام) نے تو گذشتہ شب میں مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا؟" حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں! لیکن ہم اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔ اس کے بعد دوسرے دن صبح کو رسول کریم ﷺ نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ چھوٹے باغات کے کتوں کو بھی مار ڈالنے کا حکم دے دیا اور بڑے بڑے باغات کے کتوں کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ (کیونکہ ان باغات کی حفاظت کے لئے کتوں کا رکھنا ضروری تھا)۔" (مسلم)

آنحضرت ﷺ تصویر دار چیزوں کو ضائع کر دیتے تھے

③ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ يَتْرُكُ فِيْ بَيْتِهٖ شَيْئًا فِيْهِ تَصَالِيْبُ اِلَّا نَقَضَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے گھر میں ایسی کوئی چیز نہ چھوڑتے تھے جس پر تصویر ہو اور آپ ﷺ اس کو توڑ ڈالتے ہوں!۔" (بخاریؒ)

تشریح: "تصالیب" اصل میں تو تصلیب کی جمع ہے جس کے معنی صلیب (سولی) کی تصویر بنانا ہیں اور جن کو عیسائی برکت کے لئے اپنے پاس رکھتے ہیں اور اس کی پرستش تک کرتے ہیں ان کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے سولی پر چڑھا دیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر کے اٹھا لیا، چنانچہ اس سولی کی تصویر ان کے نزدیک ایک مقدس مذہبی علامت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں حدیث میں "تصالیب" سے مطلق جاندار کی تصاویر مراد ہیں۔

تصویر بنانے والوں کو آخرت میں عذاب بھگتنا پڑے گا

④ وَعَنْهَا اَنَّهَا اشْتَرَتْ نُمْرُقَةً فِيْهَا تَصَاوِيْرُ فَلَمَّا رَاٰهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ عَلَى الْبَابِ فَلَمْ يَدْخُلْ

فَعَرَفْتُ فِیْ وَجْھِهِ الْكَرَاهِيَةَ قَالَتْ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) اَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ وَاِلٰى رَسُوْلِهٖ مَاذَا اَذْنَبْتُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَابَالُ هٰذِهِ النُّمْرُقَةِ قَالَتْ قُلْتُ اِشْتَرَيْتُهَالَكَ لِتَقْعُدَ عَلَيْهَا وَتَوَسَّدَهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَصْحَابَ هٰذِهِ الصُّوَرِ يُعَذَّبُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيُقَالُ لَهُمْ اَحْيُوْامَا خَلَقْتُمْ وَقَالَ اِنَّ الْبَيْتَ الَّذِیْ فِيْهِ الصُّوْرَةُ لَاتَدْخُلُهُ الْمَلَائِكَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ ایسا تکیہ خرید لیا جس پر تصویریں تھیں، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں داخل ہوتے وقت جب اس تکیہ کو دیکھا تو دروازے پر رک گئے اور حجرہ میں داخل نہیں ہوئے، حضرت عائشہؓ اس تصویر دار تکیہ کی وجہ سے آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر ناگواری کے اثرات کو بھانپ گئیں! حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) میں نافرمانی چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کے طرف متوجہ ہوتی ہوں، میں نے ایسا کونسا گناہ کیا ہے کہ آپ میرے حجرے میں داخل نہیں ہو رہے ہیں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یہ تکیہ کیسا ہے اور تم اس کو کہاں سے لائی ہو؟ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے جواب دیا۔ میں نے اس تکیہ کو آپ (ﷺ) کے لئے خریدا ہے کہ آپ (ﷺ) جس وقت چاہیں اس کا سہارا لے کر بیٹھیں اور جس وقت چاہیں اس کو سوتے وقت سر کے نیچے رکھیں۔ رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ یاد رکھو تصویر بنانے والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ جو تصویریں تم نے بنائی ہیں ان میں جان ڈالو اور ان کو زندہ کرو۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس گھر میں تصویر ہوتی ہے اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے اسی طرح انبیاء علیہم السلام و اولیاءؒ کے لئے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ تصویر والے گھر میں داخل ہوں؟۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

آرائشی پردے لٹکانا ناپسندیدہ

⑤ وَعَنْهَا اَنَّهَا كَانَتْ قَدِ اتَّخَذَتْ عَلٰى سَهْوَةٍ لَهَا سِتْرًا فِيْهِ تَمَاثِيْلُ فَهَتَكَهُ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاتَّخَذَتْ مِنْهُ نُمْرُقَتَيْنِ فَكَانَتَا فِی الْبَيْتِ يَجْلِسُ عَلَيْهِمَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شہ نشین پر ایک ایسا پردہ ڈال دیا جس پر تصویریں تھیں، رسول کریم ﷺ نے اس پردہ کو دیکھا تو اس کو پھاڑ دیا، حضرت عائشہؓ نے (اس پھٹے ہوئے پردہ کا یہ مصرف نکالا کہ) اس کے دو تکئے بنا دیئے چنانچہ وہ دونوں تکئے گھر میں رکھے رہتے تھے اور ان پر تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: بظاہر یہ حدیث اس حدیث کے منافی ہے جو اس سے پہلے گزری ہے کیونکہ پہلی حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تکیہ پر بنی ہوئی تصویریں گھر میں ملائکہ کو داخل ہونے سے روکتی ہیں، اگرچہ ایسی تصویروں کا گھر میں رہنے دینا حرام نہ ہو، اس صورت میں وہ دونوں تکیے جن پر تصویریں تھیں حضرت عائشہؓ کے گھر میں کیسے رکھے ہوئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان تکیوں پر جو تصویریں تھیں وہ کسی جاندار کی نہیں تھیں جن کا بنانا اور رکھنا حرام ہے اور آپ ﷺ نے جو اس پردہ کو پھاڑ ڈالا تھا تو اس کی وجہ بھی اس پردے پر تصویروں کی موجودگی نہیں تھی بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ درودیوار پر بلاضرورت پردے لٹکانا منشاء خداوندی کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ پتھر اور مٹی کو کپڑے پہنائے جائیں جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے معلوم ہوگا اور اگر بالفرض وہ تصویریں کسی جاندار ہی کی تھیں تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ جب تکیہ بنانے کے لئے اس پردہ کی کانٹ چھانٹ ہوئی تو اس پر جو تصویریں تھیں ان کے سر کٹ گئے تھے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "ھتک" (کہ جس کا ترجمہ پھاڑ ڈالنا کیا گیا ہے) کے معنی ان تصویروں کو کاٹنا اور مٹا دینا ہیں جو اس پردہ پر تھیں۔

⑥ وَعَنْهَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ غَزَاةٍ فَاَخَذْتُ نَمَطًا فَسَتَرْتُهُ عَلَى الْبَابِ فَلَمَّا قَدِمَ فَرَأَى النَّمَطَ

فَجَذَبَهُ حَتّٰى هَتَكَهُ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَاْمُرْنَا اَنْ نَكْسُوَ الْحِجَارَةَ وَالطِّيْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ جہاد کے لئے سفر میں تشریف لے گئے تو میں نے آپ ﷺ کے جانے کے بعد ایک کپڑا حاصل کیا اور اس کا پردہ دروازہ پر لٹکایا جب آنحضرت ﷺ سفر جہاد سے واپس تشریف لائے اور وہ پردہ پڑا ہوا دیکھا تو اس کو کھینچ کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم نہیں دیا ہے کہ ہم مٹی اور پتھر کو کپڑے پہنائیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "نمط" ایک عمدہ قسم کے فرش یا بچھونے کو کہتے ہیں جس کے کنارے باریک اور ملائم تانے کے ہوتے ہیں اس کو ہودج پر بھی ڈالتے ہیں اور اس کا پردہ بھی بناتے ہیں، احتمال ہے کہ یہ لفظ نمط، نمد کا معرب ہے۔ حضرت عائشہؓ نے غالباً اس کپڑے کو دروازے پر آرائش کی خاطر لٹکایا ہوگا ورنہ اگر پردے کے مقصد سے دروازے پر ڈالتیں تو اس پر عتاب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس کپڑے پر گھوڑے کی تصویریں تھیں اس لئے آپ ﷺ نے اس کو ضائع کر دیا، اور گویا ان تصویروں کو مٹا ڈالا، لیکن یہ قول حدیث کے سیاق کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ حدیث کا ربط مضمون یہ واضح کرتا ہے کہ آپ ﷺ کا اس کپڑے کو پھاڑنا اور گویا اس کو دروازے پر لٹکانے سے منع کرنا تصویر کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ در و دیوار کو کپڑے سے ڈھانپنے کی کراہت کی بنا پر تھا جیسا کہ آپ ﷺ کے ارشاد سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

یحییٰؒ کہتے ہیں کہ در و دیوار کو کپڑے سے ڈھانپنے کی ممانعت نہی تنزیہی طور پر ہے کیونکہ اس چیز کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہ ہونا ممانعت پر دلالت نہیں کرتا، رہی یہ بات کہ پھر آنحضرت ﷺ نے اس پردے پر اس قدر ناگواری کا اظہار کیوں کیا کہ اس کو پھاڑ بھی ڈالا تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ یہ چیز آپ ﷺ کے نزدیک اہل بیت کی شان اور ان کے ورع و تقویٰ کے خلاف تھی، تاہم یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ گھر کی دیواروں وغیرہ کو کپڑے سے ڈھانپنے سے منع کیا جائے نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اگر کوئی بری چیز دیکھی جائے تو اس کو اپنے ہاتھ سے خراب و برباد کر دیا جائے اور اس کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا جائے۔

تصویر بنانے والے کے بارے میں وعید

⑦ وَعَنْهَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الَّذِيْنَ يُضَاهِئُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب لوگوں سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی مشابہت اختیار کرتے ہیں؟۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مشابہت اختیار کرتے ہیں" یعنی صورت بنانا اللہ کا کام ہے لہٰذا جو شخص تصویر بناتا ہے وہ گویا اپنے فعل کو اللہ تعالیٰ کے فعل کے ساتھ مشابہ کرتا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تصویر بنانے والا گویا اس چیز (تصویر) کو بناتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے مشابہ ہوتی ہے۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اگر مصور کا فعل تصویر سازی اسی نظرئے (عقیدے) کے تحت ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فعل صورت گری کی مماثلت کرنے والا ہے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور اس صورت میں اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کو اس کے اس قبیح کفر کی بنا پر دوسرے کافروں کی بہ نسبت زیادہ سخت عذاب بھگتنا ہوگا اور اگر وہ ایسا عقیدہ نہ رکھتا ہو تو پھر اس کے حق میں یہ حدیث تہدید پر محمول ہوگی۔

⑧ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِيْ فَلْيَخْلُقُوْا ذَرَّةً اَوْ لِيَخْلُقُوْا حَبَّةً اَوْ شَعِيْرَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو میرے پیدا کرنے کی طرح پیدا کرے یعنی جس طرح میں صورت بناتا ہوں اسی طرح وہ بھی صورت بناتا ہے اگرچہ حقیقت میں وہ اس

مادہ سے صورت نہیں بنا تا جس مادہ سے خدا کی بنائی ہوئی صورتیں ہیں تاہم وہ کوئی صورت بناتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ یہ صورت میری بنائی ہوئی ہے اگر تصویر و مورت بنانے والے واقعہ تخلیق کا دعوی کرتے ہیں تو ذرا وہ ایک چیونٹی تو بنائیں یا ایک دانہ تو پیدا کریں یا ایک جو تو پیدا کر کے دکھائیں؟۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

⑨ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَاللّٰهِ الْمُصَوِّرُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "خدا کے ہاں سخت ترین عذاب کا مستوجب، مصور ہے!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو سخت ترین عذاب میں مبتلا کرے گا ان میں مصور بھی ہوگا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو بتوں کی مورتیاں اس لئے بناتا ہے کہ ان کی پوجا کی جائے اور چونکہ ایسا شخص یقیناً کافر ہوگا اس لئے اگر اس کو سخت ترین عذاب میں مبتلا کیا جائے تو کچھ بعید نہیں۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی مشابہت کی نیت سے تصویر بنائے وہ بھی کافر ہے اور سخت ترین کا مستوجب۔ اور جو شخص اس نیت کے بغیر تصویر سازی کرے وہ کافر نہیں ہوگا بلکہ فاسق کہلائے گا اور اس کا وہی حکم ہوگا جو مرتکب معاصی کا ہے اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حدیث میں جس مصور کے بارے میں وعید بیان کی گئی ہے اس سے جاندار کی تصور بنانے والا مراد ہے نہ کہ درختوں اور عمارات وغیرہ کی تصویر بنانے والا اسی لئے عام طور پر مصور کا اطلاق جاندار کی تصویر بنانے والے پر ہوتا ہے اور جماوات و نباتات وغیرہ کی تصویر بنانے والے کو نقاش کہتے ہیں! مجاہدؒ نے پھل دار درختوں کی تصویر بنانے کو بھی مکروہ کہا ہے دوسرے محققین کے نزدیک غیر جاندار کی تصویر بنانا کراہت سے خالی نہیں اور لہو ولعب نیز بے مقصد ولایعنی چیزوں میں داخل ہے۔

⑩ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ يُجْعَلُ لَهٗ بِكُلِّ صُوْرَةٍ صَوَّرَهَا نَفْسٌ فَيُعَذِّبُهٗ فِيْ جَهَنَّمَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَاِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَاصْنَعِ الشَّجَرَ وَمَالَا رُوْحَ فِيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "ہر مصور دوزخ میں ڈالا جائے گیا اور اس کی بنائی ہوئی ہر تصویر کے بدلے ایک شخص پیدا کیا جائے گا جو تصویر بنانے والے کو دوزخ میں عذاب دیتا رہے گا" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر تمہیں تصویر بنانے کی ضرورت ہی ہو تو درختوں یا کسی غیر ذی روح کی تصویر بنالو۔" (بخاریؒ، و مسلمؒ)

تشریح: یوں تو ہر طرح کی تصویر اور مورت بنانا ناجائز ہے تاہم اکثر علماء نے لڑکیوں کے لئے گڑیوں کو مستثنیٰ رکھا ہے یعنی ان کے نزدیک لڑکیوں کے حق میں گڑیاں بنانا مباح ہے لیکن امام مالکؒ نے مردوں کو ان کا خریدنا مکروہ قرار دیا ہے اور بعض علماء نے مذکورہ اباحت کو منسوخ قرار دیا ہے۔

⑪ وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَحَلَّمَ بِحُلْمٍ لَمْ يَرَهٗ كُلِّفَ اَنْ يَعْقِدَ بَيْنَ شَعِيْرَتَيْنِ وَلَنْ يَفْعَلَ وَمَنِ اسْتَمَعَ اِلٰى حَدِيْثِ قَوْمٍ وَهُمْ لَهٗ كَارِهُوْنَ اَوْيَفِرُّوْنَ مِنْهُ صُبَّ فِيْ اُذُنَيْهِ الْاٰنُكُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً عُذِّبَ وَكُلِّفَ اَنْ يَنْفُخَ فِيْهَا وَلَيْسَ بِنَافِخٍ۔ (رواہ البخاریؒ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص ایسا خواب دیکھنے کا دعوی کرے جو کہ اس نے نہیں دیکھا ہے یعنی جھوٹا خواب بیان کرے تو اس کو قیامت کے دن دو جو میں گرہ لگانے پر مجبور کیا جائے گا، جس کو وہ ہرگز نہیں کر سکے گا، اور جو شخص کچھ لوگوں کی بات چیت کی طرف اپنا کان لگائے جب کہ وہ لوگ اس شخص کے سننے کو پسند نہ کریں اور اس سے فرار اختیار

کریں تو قیامت کے دن اس شخص کے کان میں سیسہ ڈالا جائے گا اور جو شخص تصویر بنائے گا اس کو آخرت میں عذاب دیا جائے گا اور اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس تصویر میں روح پھونکے حالانکہ وہ ہرگز روح نہیں پھونک سکے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "جس کو وہ ہرگز نہیں کر سکے گا" کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ وہ جو کے دو دانوں کو آپس میں جوڑ کر ایک کردے اور جب وہ ایسا نہیں سکے گا تو اس کو پھر عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور اسی طرح اس کو عذاب دیا جاتا رہے گا۔ جھوٹا خواب بیان کرنے اور جو کے دو دانوں کو آپس میں جوڑنے کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ جس طرح اس شخص نے خواب کی بے بنیاد اور جھوٹی باتوں کو جوڑا اسی طرح اس سے کہا جائے گا کہ اب ذرا جو کے دو دانوں کو جوڑ کر دکھلا۔؟ واضح رہے کہ جھوٹا خواب بیان کرنا بھی اگرچہ جھوٹ کی ایک قسم ہے لیکن اس جھوٹا خواب بیان کرنے پر مطلق جھوٹ بولنے کی بہ نسبت زیادہ سخت عذاب اس لئے دیا جائے گا کہ اصل میں خواب کا تعلق عالم غیب سے ہے اور سچا خواب اجزاء نبوت میں سے ایک جزو ہے اور ایک طرح سے وحی کے درجہ کا حکم رکھتا ہے لہٰذا جس شخص نے جھوٹا خواب بیان کیا اس نے گویا حق تعالیٰ پر جھوٹ باندھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا جھوٹ کی سب سے سخت قسم ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں مذکورہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو جھوٹے خواب کے ذریعہ نبوت یا ولایت کا دعوے کرے، مثلاً وہ یوں کہے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو نبی بنایا ہے یا ولی بنایا ہے اور مجھ کو خبر دی ہے کہ فلاں شخص کی مغفرت ہوگئی ہے یا فلاں شخص ملعون ہے وغیرہ وغیرہ، یا یوں بیان کرے کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو خواب میں فلاں حکم دیا ہے حالاں کہ حقیقت میں اس نے خواب کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔

"اس شخص کے کان میں سیسہ ڈالا جائے گا" یہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو ان لوگوں کی باتیں چغل خوری اور فتنہ و فساد پھیلانے کی غرض سے سنے، اس کے برخلاف اگر وہ ان لوگوں کی باتیں اس غرض سے سنے کہ اگر وہ (لوگ) اس بات چیت کے ذریعہ کسی فتنہ و فساد پھیلانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں تو ان کو اس سے روکے یا ان کی شر انگیزیوں سے اپنے آپ کو یا دوسرے کو محفوظ رکھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

نردشیر کھیلنے کی مذمت

⑫ وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَعِبَ بِالنَّرْدِشِيْرِ فَكَاَنَّمَا صَبَغَ يَدَهُ فِيْ لَحْمِ خِنْزِيْرٍ وَدَمِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے نردشیر کے ذریعہ کھیلا اس نے گویا سور کے گوشت اور خون میں اپنا ہاتھ ڈبویا۔" (رواہ مسلمؒ)

تشریح: "نردشیر" چوسر کی قسم سے ایک کھیل ہے جس کو فارس (ایران) کے ایک بادشاہ شاپور ابن اردشیر ابن بابک نے ایجاد کیا تھا چونکہ سور کا گوشت اور لہو نہ صرف یہ کہ نجس ہوتا ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ نفرت بھی ہوتی ہے اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا تاکہ لوگ اس کھیل سے نہایت بیزاری برتیں۔ واضح رہے کہ مطلق نرد کے ذریعہ کھیلنا تمام علماء کے نزدیک حرام ہے خواہ وہ چوسر کی صورت میں ہو تختہ نرد کی صورت میں اور یا کسی اور طرح کا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

بچھونے پر تصویروں کا ہونا مکروہ نہیں

⑬ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَانِيْ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ اَتَيْتُكَ الْبَارِحَةَ فَلَمْ

يَمْنَعُنِىْ اَنْ اَكُوْنَ دَخَلْتُ اِلاَّ اَنَّهٗ كَانَ عَلَى الْبَابِ تَمَاثِيْلُ وَكَانَ فِى الْبَيْتِ قِرَامُ سِتْرٍ فِيْهِ تَمَاثِيْلُ وَكَانَ فِى الْبَيْتِ كَلْبٌ فَمُرْ بِرَاسِ التِّمْثَالِ الَّذِىْ عَلٰى بَابِ الْبَيْتِ فَيُقْطَعُ فَيَصِيْرُ كَهَيْئَةِ الشَّجَرَةِ وَمُرْ بِالسِّتْرِ فَلْيُقْطَعْ فَلْيُجْعَلْ وِسَادَتَيْنِ مَنْبُوْذَتَيْنِ تُوْطَانِ وَمُرْ بِالْكَلْبِ فَلْيُخْرَجْ فَفَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے فرمایا میرے پاس حضرت جبرئیل آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میں گذشتہ شب آپ (ﷺ) کے پاس آیا تھا لیکن مجھ کو گھر میں آنے سے جس چیز نے روکا وہ یہ تھی کہ دروازے کے پردے پر تصویریں تھیں باایں طور کہ گھر میں جو رنگین منقش کپڑا تھا اس کا پردہ بنایا گیا تھا اور اس پر وہ تصویریں بنی ہوئی تھیں نیز گھر میں کتا بھی موجود تھا لہٰذا آپ (ﷺ) ان تصویروں کے سر کاٹے جانے کا حکم دیجئے، جو دروازے (کے پردے) پر ہیں اور ان تصویروں کے سر اس طرح کاٹ دیئے جائیں کہ ان کی ہیئت وشکل بدل جائے اور وہ درخت کی شکل کے ہو جائیں اور پھر اس پردہ کو کاٹ کر ان کے دو تکیے بنانے کا حکم دیجئے جو سہارا لے کر بیٹھنے اور تکیہ لگا کر سونے کے کام میں آنے کے لئے گھر میں فرش پر پڑے رہیں اور روندے جاتے رہیں۔ نیز کتے کو بھی گھر سے نکال باہر کرنے کا حکم دیجئے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ایسا ہی کیا (جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بتایا تھا)۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: فتاویٰ قاضی خاں میں لکھا ہے کہ اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ ہے کہ مصلے کے آگے یا سر کے اوپر یا دائیں طرف یا بائیں طرف کوئی تصویر موجود ہو یا نمازی کے کپڑے پر تصویر بنی ہو، البتہ بچھونے پر تصویر کے ہونے کے بارے میں دو قول ہیں ان میں سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ بچھونے یا فرش پر تصویر کا ہونا مکروہ نہیں ہے بشرطیکہ اگر اس بچھونے یا فرش پر نماز پڑھی جائے تو اس جگہ سجدہ نہ کیا جائے جہاں کوئی تصویر ہو۔ واضح رہے کہ یہ مسئلہ اس صورت کا ہے جب کہ تصویریں بڑی ہوں اور دیکھنے والوں کو بغیر کسی تکلّف کے نظر آئیں اور اگر تصویریں چھوٹی ہوں یا ان کے سر کٹے اور مٹے ہوئے ہوں تو ان میں کوئی مضائقہ نہیں۔

قیامت کے دن مصور وغیرہ پر مسلّط کیا جانے والا خاص عذاب

⑭ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ عُنُقٌ مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَهَا عَيْنَانِ تُبْصِرَانِ وَاُذُنَانِ تَسْمَعَانِ وَلِسَانٌ يَنْطِقُ يَقُوْلُ اِنِّىْ وُكِّلْتُ بِثَلٰثَةٍ بِكُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ وَكُلِّ مَنْ دَعَا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَبِالْمُصَوِّرِيْنَ۔

(رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن دوزخ میں سے ایک گردن نکلے گی یعنی آگ کا ایک شرارہ لمبی گردن کی صورت میں نکلے گا اس گردن میں دیکھنے والی دو آنکھیں ہوں گی، سننے والے دو کان ہوں گے اور بولنے والی زبان ہوگی۔ وہ گردن کہے گی کہ میں تین طرح کے لوگوں پر مسلّط کی گئی ہوں یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بات پر متعین کیا ہے کہ میں ان تین طرح کے لوگوں کو دوزخ میں کھینچ کر لے جاؤں اور لوگوں کے سامنے ان کو ذلیل ورسوا کر کے عذاب میں مبتلا کروں ان میں سے ایک طرح کے تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کے ساتھ تکبر وعناد کا برتاؤ کیا (یعنی دنیا میں ان پر حق ظاہر ہوا مگر انہوں نے حق کو قبول نہیں کیا) دوسری طرح کے لوگوں میں ہر وہ شخص شامل ہے جس نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارا ہے، اور تیسری طرح کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے تصویر سازی کی ہے۔" (ترمذیؒ)

شراب، جوا اور کوبہ حرام ہے

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى حَرَّمَ الْخَمْرَ وَالْمَيْسِرَ وَالْكُوْبَةَ وَقَالَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ قِيْلَ الْكُوْبَةُ الطَّبْلُ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابن عباسؓ، رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شراب، جوا اور کوبہ بجانے کو لسان نبوت کے ذریعہ حرام قرار دیا ہے نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ "کوبہ" طبل کو کہتے ہیں۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "کوبہ" کے معنی میں علماء کے تین قول ہیں ایک تو نرد، دوسرے بربط اور تیسرے طبل جیسا کہ مصنف نے حدیث کے کسی راوی سے نقل کیا ہے، ڈھولکی اور ڈھولک وغیرہ کی طرح طبل بھی ایک خاص قسم کا دورخا باجا ہوتا ہے، حدیث میں وہ طبل مراد ہے جو محض لہو ولعب کے لئے ہو نہ کہ غازیان اسلام کا طبل۔

⑯ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَالْكُوْبَةِ وَ الْغُبَیْرَاءِ وَالْغُبَیْرَاءُ شَرَابٌ تَعْمَلُهُ الْحَبْشَةُ مِنَ الذُّرَةِ وَیُقَالُ لَهَا السُّكُرْكَةُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شراب، جوئے، کوبہ اور غبیرائے سے منع کیا ہے اور غبیرا ایک قسم کی شراب ہوتی ہے جس کو حبشہ کے لوگ جوار سے بناتے ہیں اور اس کو سکرک کہتے ہیں!۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "غبیرا" کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ یا تو حضرت ابن عمرؓ ہی سے منقول ہے یا کسی دوسرے راوی کی بیان کی ہوئی ہے۔

نرد سے کھیلنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنا ہے

⑰ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَعِبَ بِالنَّرْدِ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔

(رواہ احمد و ابوداؤد)

"اور حضرت ابوموسیٰ شعریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے نرد سے کھیلا درحقیقت اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: نرد سے کھیلنا اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کے مرادف اس لئے ہے کہ یہ کھیل اگر بازی لگا کر کھیلا جائے، تو حقیقۃً جوا ہے اور اگر بغیر بازی لگائے کھیلا جائے تب بھی صورۃً جوا ہی ہوگا اور یہ پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ مطلق نرد سے کھیلنا حرام ہے۔

کبوتر بازی حرام ہے

⑱ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَاٰی رَجُلًا یَتْبَعُ حَمَامَةً فَقَالَ شَیْطَانٌ یَتْبَعُ شَیْطَانَةً۔

(رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجۃ والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو کبوتروں کے پیچھے پڑا ہوا تھا یعنی ان کے ساتھ لہو ولعب کرنے اور ان کو اڑانے میں مشغول تھا آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شیطان ہے اور شیطان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

(احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: اس شخص کو شیطان اس لئے فرمایا کہ وہ حق سے بعد اختیار کئے ہوئے تھا اور لایعنی و بے مقصد کام میں مشغول تھا اور ان کبوتروں کو اس بنا پر شیطان فرمایا کہ انہوں نے اس شخص کو بازی اور لہو ولعب میں مشغول کر کے ذکر الٰہی اور دین و دنیا کے دوسرے کاموں سے باز رکھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کبوتر بازی حرام ہے اور نوویؒ نے لکھا ہے کہ انڈے بچے حاصل کرنے کے لئے دل کو بہلانے کی خاطر اور نامہ بری کے مقصد سے کبوتروں کو پالنا بلا کراہت جائز ہے، لیکن ان کو اڑانا مکروہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

تصویر کشی کا پیشہ ناجائز ہے

⑲ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِى الْحَسَنِ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ اِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ اِنِّى رَجُلٌ اِنَّمَا مَعِيْشَتِىْ مِنْ صَنْعَةِ يَدِىْ وَاِنِّىْ اَصْنَعُ هٰذِهِ التَّصَاوِيْرَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَا اُحَدِّثُكَ اِلَّا مَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً فَاِنَّ اللّٰهَ مُعَذِّبُهُ حَتّٰى يَنْفُخَ فِيْهِ الرُّوْحَ وَلَيْسَ بِنَافِخٍ فِيْهَا اَبَدًا فَرَبَا الرَّجُلُ رَبْوَةً شَدِيْدَةً وَاصْفَرَّ وَجْهُهُ فَقَالَ وَيْحَكَ اِنْ اَبَيْتَ اِلَّا اَنْ تَصْنَعَ فَعَلَيْكَ بِهٰذَا الشَّجَرِ وَكُلِّ شَيْءٍ لَيْسَ فِيْهِ رُوْحٌ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سعید ابن ابوالحسن تابعیؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ناگہاں ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا ابن عباسؓ میری معاشی زندگی کا انحصار میرے ہاتھوں کی محنت مزدوری پر ہے جن کے ذریعہ میں یہ تصویریں بناتا ہوں (اب سوال یہ ہے کہ میں کیا کروں کیونکہ شریعت نے اس پیشہ کو حرام قرار دیا ہے اور کوئی دوسرا پیشہ مجھے آتا نہیں کہ جس کے ذریعہ اپنی روزی کا انتظام کروں تو کیا اس مجبوری کے تحت میرے لئے یہ پیشہ جائز ہے یا نہیں؟) حضرت ابن عباسؓ نے جب یہ دیکھا کہ تصویر کشی کے کام سے اس شخص کا تعلق سخت نوعیت کا ہے اور شاید میرے منع کرنے سے باز نہ آئے تو انہوں نے اس کے سامنے آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کی، چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے اس بات کے علاوہ اور کوئی بات بیان نہیں کروں گا جس کو میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا ہے (تو تم توجہ سے سنو کہ) میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص تصویر سازی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں مبتلا رکھے گا یہاں تک کہ وہ اس تصویر میں روح پھونک دے درآنحالیکہ وہ اس تصویر میں ہرگز روح نہیں پھونک سکے گا۔ اس شخص نے (یہ وعید سن کر) بڑا گہرا سانس لیا اور اس کا چہرہ خوف کی وجہ سے پیلا پڑ گیا، حضرت ابن عباسؓ نے (اس کی یہ حالت دیکھی تو) فرمایا کہ تم پر افسوس ہے اگر تم اس تصویر کشی کے پیشہ کے علاوہ دوسرے پیشوں (کو قبول کرنے سے) انکار کرتے ہو (کیونکہ تم کوئی اور پیشہ جانتے ہی نہیں) تو ایسا کرو کہ ان درختوں کی اور ان چیزوں کی تصویریں بنانے لگو جو بے جان ہیں۔" (بخاریؒ)

کنیسہ کا ذکر

⑳ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا اشْتَكَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَكَرَ بَعْضُ نِسَائِهِ كَنِيْسَةً يُقَالُ لَهَا مَارِيَةُ وَكَانَتْ اُمُّ سَلَمَةَ وَاُمُّ حَبِيْبَةَ اَتَتْ اَرْضَ الْحَبَشَةِ فَذَكَرَتَا مِنْ حُسْنِهَا وَتَصَاوِيْرَ فِيْهَا فَرَفَعَ رَاْسَهُ فَقَالَ اُولٰئِكَ اِذَا مَاتَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ اُولٰئِكَ شِرَارُ خَلْقِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ بیمار ہوئے تو آپ ﷺ کی ازواجؓ میں سے بعض نے ایک کنیسہ کا ذکر کیا جس کو ماریہ کہا جاتا تھا (کنیسہ یہود ونصاریٰ کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں، جو کنشیت کا معرب ہے اسی کے بارے میں حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی بیماری میں آپ ﷺ کے پاس بیٹھی ہوئی ازواج مطہراتؓ آپ ﷺ کی دلبستگی کے لئے باتوں میں مشغول تھیں کہ بعض ازواج مطہراتؓ یعنی اُم سلمہؓ اور اُم حبیبہؓ نے کنیسہ کا ذکر کیا جس کو انہوں نے ملک حبشہ میں دیکھا تھا اور آپ ﷺ کی وہ ازواج مطہراتؓ یعنی اُم سلمہؓ اور اُم حبیبہؓ حبشہ جا چکی تھیں جہاں کے لوگ عیسائیت کے پیروکار تھے) چنانچہ ان دونوں نے کنیسہ کی خوبصورتی اور اس میں بنی ہوئی تصویروں کا ذکر کیا، آنحضرت ﷺ نے یہ تذکرہ سن کر اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا کہ وہ لوگ (یعنی حبشہ والے یا نصاریٰ ایسا کرتے ہیں کہ) جب ان میں سے کوئی نیک وصالح آدمی مرجاتا ہے تو وہ اس کی قبر پر عبادت گاہ بنا لیتے ہیں (جس کو کنیسہ کہا جاتا ہے) اور اس کنیسہ میں (اپنے نیک وصالح لوگوں کی) یہ تصاویر بناتے ہیں وہ لوگ (حقیقت میں) خدا کی بدترین مخلوق ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قبروں پر عبادت گاہ بنانے اور ان قبروں کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے کی وجہ سے وہ خدا کی بدترین مخلوق میں شمار کئے جاتے ہیں۔

سب سے سخت عذاب کن لوگوں پر ہوگا

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنْ قَتَلَ نَبِيًّا اَوْ قَتَلَهٗ نَبِيٌّ اَوْ قَتَلَ اَحَدَ وَالِدَيْهِ وَالْمُصَوِّرُوْنَ وَعَالِمٌ لَمْ يَنْتَفِعْ بِعِلْمِهٖ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" قیامت کے دن سخت ترین عذاب اس شخص پر ہوگا جو نبی کو قتل کرے" یا جہاد میں اس کو نبی قتل کرے یا جو والدین میں سے کسی ایک کو قتل کرے اور جو شخص تصویر بنائے، یا جو عالم اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھائے یعنی اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرے ان پر بھی سخت ترین عذاب ہوگا۔"

تشریح: جس شخص کو میدان جہاد میں کسی نبی نے قتل کیا ہوگا اس کا سخت ترین عذاب میں مبتلا ہونا ایک اور روایت سے بھی ثابت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اشتد غضب اللّٰه علی رجل تقتله رسول اللّٰه فی سبیل اللّٰه یعنی اللہ کا سخت ترین غضب (عذاب) اس شخص پر ہوگا جس کو اللہ کے رسول نے خدا کی راہ یعنی جہاد میں قتل کیا ہوگا! کیونکہ اللہ کے رسول کا مقتول اصل میں وہی شخص ہوگا جو اللہ کے رسول کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوگا۔ جہاد کی قید کے ذریعہ گویا اس قتل کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے جو حد اور قصاص کے طور پر ہو۔

شطرنج کی مذمت

(۲۲) وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ الشِّطْرَنْجُ هُوَ مَيْسِرُ الْاَعَاجِمِ۔

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ "شطرنج عجمی لوگوں یعنی غیر مسلم قوموں کا جوا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم قوموں کے لوگ شطرنج کے ذریعہ حقیقۃً جوا کھیلتے ہیں یا شطرنج کھیلنا صورۃً ان کے جوئے کی مشابہت رکھتا ہے اور ان کی ہر طرح کی مشابہت اختیار کرنا ممنوع ہے۔

(۲۳) وَعَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ اَبَا مُوْسَى الْاَشْعَرِيَّ قَالَ لَا يَلْعَبُ بِالشِّطْرَنْجِ اِلَّا خَاطِئٌ۔

"اور حضرت ابن شہابؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا۔ شطرنج صرف وہ شخص کھیلتا ہے جو خطا کار ہو۔"

(۲۴) وَعَنْهُ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنْ لَعِبِ الشِّطْرَنْجِ فَقَالَ هِيَ مِنَ الْبَاطِلِ وَلَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْبَاطِلَ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الْاَرْبَعَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن شہابؓ سے روایت ہے کہ ان سے شطرنج کھیلنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ کھیل ایک باطل شئے ہے اور اللہ تعالیٰ باطل کو پسند نہیں کرتا۔ مذکورہ بالا چاروں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: ہدایہ میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی "جس شخص نے شطرنج یا نردشیر کھیلا اس نے گویا سور کے خون میں اپنا ہاتھ ڈبویا"۔ کی بنیاد پر نردشیر اور شطرنج کھیلنا مکروہ تحریمی ہے۔ جامع صغیر میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ شطرنج کھیلنے والا ملعون ہے اور جس شخص نے دلچسپی ورغبت کے ساتھ شطرنج کی طرف دیکھا گویا اس نے سور کا گوشت کھایا۔ اور بعض کتابوں میں جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ امام شافعیؒ نے شطرنج کے کھیل کو کچھ شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے تو نصاب الاحتساب میں امام اغزالیؒ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک بھی یہ کھیل مکروہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ شافعیؒ پہلے اس کے جواز کے قائل رہے ہوں گے لیکن پھر انہوں نے اس قول سے رجوع کر لیا، درمختار وغیرہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اس طرح کے سب کھیل مکروہ ہیں۔

کتے اور بلی کا فرق

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَاْتِیْ دَارَ قَوْمٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَدُوْنَهُمْ دَارٌ فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَیْهِمْ فَقَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ تَاْتِیْ دَارَ فُلَانٍ وَلَاتَاْتِیْ دَارَنَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِاَنَّ فِیْ دَارِکُمْ کَلْبًا قَالُوْا اِنَّ فِیْ دَارِهِمْ سِنَّوْرًا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ السِّنَّوْرُ سَبُعٌ۔ (رواہ الدار قطنی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ انصار میں سے بعض لوگوں کے گھر تشریف لے جایا کرتے تھے، حالانکہ ان کے پڑوس میں اور لوگوں کے بھی گھر تھے (لیکن آپ ﷺ ان کے یہاں نہیں جاتے تھے) ان لوگوں پر یہ بات بڑی گراں گزرتی تھی (کہ ہمارے پڑوس میں دوسرے لوگوں کے گھر تشریف لاتے ہیں لیکن ہمارے یہاں نہیں آتے چنانچہ ان لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ (ﷺ) فلاں کے گھر تو تشریف لاتے ہیں لیکن ہمارے گھر تشریف نہیں لاتے (ہم نے کیا قصور کیا ہے، کہ ہمارا گھر آپ (ﷺ) کی تشریف آوری کی سعادت سے محروم ہے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہارے گھر اس لئے نہیں آتا تمہارے گھروں میں کتے پلے ہوئے ہیں انہوں نے عرض کیا کہ ان کے گھروں میں بلی پلی ہوئی ہے (اور جس طرح کتا درندہ ہے اسی طرح بلی بھی درندہ ہے پھر دونوں کے درمیان یہ فرق کیسا ہے؟) نبی کریم ﷺ نے فرمایا بلی درندہ ہے۔" (دار قطنیؒ)

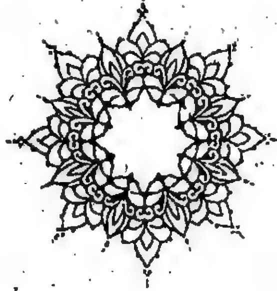

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كِتَابُ الطِّبِّ وَالرُّقٰى
طب اور جھاڑ پھونک کا بیان

"طب" عام طور پر طاء کے زیر کے ساتھ مستعمل ہے، لیکن سیوطیؒ کہتے ہیں کہ یہ لفظ طاء کے زبر، زیر اور پیش تینوں کے ساتھ منقول ہے، اس کے معنی ہیں "علاج کرنا، دوا کرنا"، بعض مواقع پر اس لفظ کو طاء کے زیر کے ساتھ "سحر" کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے، اسی اعتبار سے "مطبوب" اس شخص کو کہتے ہیں جس پر سحر (جادو) کیا گیا ہو۔

طب کا تعلق جسم (ظاہر) سے بھی ہوتا ہے اور نفس (باطن) سے بھی، چنانچہ حفظان صحت اور دفع مرض کے ذریعہ بدن کے علاج معالجہ کو جسمانی طب کہتے ہیں، اور باطنی ہلاکت و تباہی تک پہنچانے والے افکار و اعمال اور بری عادات و اطوار کے ترک و ازالہ کے ذریعہ نفس کا علاج کرنے کو طب نفسانی کہتے ہیں۔ جس طرح طب کی دو قسمیں ہیں، اسی طرح دوا کی بھی دو قسمیں ہیں ایک تو جسمانی اور طبعی، خواہ وہ مفردات کی شکل میں ہو یا مرکبات کی شکل میں (جیسا کہ ظاہری دوائیں ہوتی ہیں) اور دوسری قسم روحانی و لسانی ہے۔ جو قرآن کریم اور قرآن کریم کے حکم میں شامل دوسری چیزوں کی صورت میں ہے۔ نبی کریم ﷺ اپنی اُمت کے لوگوں کے علاج و اصلاح کے لئے ظاہری و طبعی دواؤں کو بھی اختیار فرماتے تھے۔ اور باطنی و روحانی معالجہ کو بھی۔

"رقی" اصل میں "رقیہ" کی جمع ہے جس کے معنی افسون کے ہیں ہماری زبان میں اس کو منتر اور روزمرہ کی بول چال میں جھاڑ پھونک بھی کہا جاتا ہے، علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآنی آیات، منقول دعاؤں اور اسماء الٰہی کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جائز ہے، ان کے علاوہ ایسے منتروں کے ذریعہ بھی جائز ہے جن کے الفاظ و کلمات کے معنی معلوم ہوں۔ اور وہ دین و شریعت کے مخالف نہ ہوں، جن منتروں کے الفاظ و کلمات ایسے ہوں کہ ان کے معنی معلوم نہ ہوں یا ان کے الفاظ و کلمات دین و شریعت کی تعلیمات و احکام کے برخلاف ہوں ان کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح وہ اہل عزائم و تکسیر جو علم نجوم و رمل کی مدد لے کر عملیات کرتے ہیں اور حفظ ساعات و تعیین اوقات جیسی چیزوں کو اختیار کرتے ہیں ان کا یہ طریقہ بھی اہل دیانت و تقویٰ کے نزدیک مکروہ و حرام ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کا علاج پیدا کیا ہے

(1) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی دَاءً اِلَّا اَنْزَلَ لَهٗ شِفَاءً (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری نہیں اتاری ہے اور پیدا نہیں کی ہے جس کے لئے

شفا نازل نہ کی ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کے ساتھ اس کا علاج بھی پیدا کیا ہے، تاکہ اگر وہ مرض لاحق ہو تو اس علاج کے ذریعہ شفا بخشے۔" (بخاریؒ)

دوا صرف ایک ظاہری ذریعہ ہے حقیقی شفا دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے

② وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ فَإِذَا أُصِيبَ دَوَاءُ الدَّوَاءِ بَرَءَ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہر بیماری کی دوا ہے، لہٰذا جب وہ بیماری کے موافق ہو جاتی ہے تو بیمار خدا کے حکم یعنی اس کی مشیت وارادہ سے اچھا ہو جاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "خدا کے حکم" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے تاکہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ مرض سے شفایابی کا اصل تعلق دوا سے ہے اور مریض کو صحت بخشنے میں علاج و معالجہ، حقیقی اور مستقل بالذات مؤثر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں شفایابی تو محض اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ پر موقوف ہے، دوا اور علاج و معالجہ محض ایک ظاہری ذریعہ اور وسیلہ ہے، کسی بھی مرض پر کوئی دوا اسی وقت اثر انداز ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، چنانچہ روایت حمیدی میں اس کی تفصیل یوں منقول ہے کہ ایسا کوئی بھی مرض نہیں ہے جس کا علاج نہ ہو، چنانچہ جب کوئی شخص بیمار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے جس کے ساتھ ایک پردہ ہوتا ہے وہ فرشتہ اس پردہ کو بیمار کے مرض اور دوا کے درمیان حائل کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیمار جو بھی دوا استعمال کرتا ہے وہ مرض کو نہیں لگتی اور شفا حاصل نہیں ہوتی یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہوتی ہے کہ بیمار اچھا ہو جائے تو وہ فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ مرض اور دوا کے درمیان سے پردہ اٹھا دیا جائے اس کے بعد بیمار جب دوا پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس دوا کے ذریعہ اس کو شفا دیدیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی مرض لاحق ہو جائے تو اس کا علاج کرنا اور دوا مستحب ہے، چنانچہ صحابہ کرامؓ اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔ نیز اس سے ان حضرات کے نظریہ کی بھی تردید ہوتی ہے جو علاج معالجہ اور دوا کی افادیت وضرورت سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر چیز کی طرح مرض بھی قضا وقدر کے زیر اثر ہے اس لئے کسی بیمار کا علاج کرنا لاحاصل ہے۔ جمہور علماء جو علاج و معالجہ کے قائل ہیں کی دلیل مذکورہ احادیث ہیں اور انکا اعتقاد یہ ہے کہ بیشک امراض کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، لیکن امراض کے ازالہ کے ذرائع پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جس طرح مرض و بیماری قضا وقدر کے تابع ہے اسی طرح علاج معالجہ کرنا بھی تقدیر الٰہی ہی سے ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسا کہ ہر انسان کی موت کا وقت بالکل اٹل ہے جس کی موت جس صورت میں لکھی جا چکی ہے۔ اسی صورت میں آکر رہے گی۔ لیکن اس کے باوجود اپنی حفاظت وسلامتی کے ذرائع اختیار کرنا اور اپنی جان کو کسی حادثہ یا دشمن کے حملہ سے محفوظ رہنے کی دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یا میدان جنگ میں دشمنان دین کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ حاصل یہ کہ جان وصحت کی حفاظت وسلامتی کے لئے دوا وغیرہ جیسے اسباب ذرائع اختیار کرنا نہ تو حکم خداوندی کے خلاف ہے اور نہ توکل کے منافی ہے جیسا کہ کھانے کے ذریعہ بھوک کو دفع کرنا توکل کے منافی نہیں ہے چنانچہ رسول کریم ﷺ سے بڑھ کر توکل کرنے والا کون انسان ہو سکتا ہے کہ آپ سید المتوکلین تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ علاج بھی کرتے تھے اور بیماری کو دور کرنے کے ذرائع اختیار فرماتے تھے۔

تین چیزوں میں شفا ہے

③ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشِّفَاءُ فِي ثَلٰثٍ فِي شَرْطَةِ مِحْجَمٍ اَوْ شَرْبَةِ عَسَلٍ اَوْ كَيَّةٍ بِنَارٍ وَاَنَا اَنْهٰى اُمَّتِي عَنِ الْكَيِّ۔ (رواہ البخاریؒ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا شفا تین چیزوں میں ہے پچھنے والی سینگی لگانے میں، یا شہد پینے میں خواہ خالص شہد پیا جائے یا پانی وغیرہ میں ملا کر پیا جائے اور آگ سے داغنے میں۔ لیکن میں اپنی اُمت کو داغنے سے منع کرتا ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مِحجَم۔ میم کے زیر اور جیم کے زبر کے ساتھ۔ سینگی کو کہتے ہیں، لیکن یہاں اس لفظ سے مراد نشتر یا استرا ہے جس سے پچھنے دیئے جاتے ہیں۔ شَرْطَۃٌ شین کے زبر کے ساتھ، پچھنے لگاؤ کے لئے کو پچھنے کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ رگ سے خون نکالا جاتا ہے لہٰذا فِیْ شَرْطَۃمعجم کا ترجمہ یہ ہوگا کہ نشتر یا استرے کے ذریعہ پچھنے لگانے میں (شفا ہے)۔

سفر السعادۃ کے مصنف کے مطابق علماء کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تمام ہی مادی (جسمانی) امراض کے علاج معالجہ کی طرف راہنمائی و اشارہ ہے کیونکہ مادی امراض یا تو دموی ہوتے ہیں یا صفراوی، یا بلغمی ہوتے ہیں، یا سوداوی، چنانچہ اگر کوئی مرض دموی یعنی فساد خون کی بنا پر ہوتا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس کو جسم سے باہر نکال دیا جائے۔ جس کی صورت پچھنے لگوانا ہے اور باقی تینوں صورتوں میں مرض کا بہترین علاج اسہال ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے شہد کے ذریعہ مسہلات کی طرف متوجہ کیا کہ اسہال کے لئے شہد ایک بہترین اور معتدل دوا کا کام دیتا ہے نیز آگ سے داغنے کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا کہ اگر مرض کی نوعیت ایسی ہو کہ طبیب و معالج اس کے علاج سے عاجز ہو جائیں تو پھر آگ سے داغا جائے کیونکہ یہ جب کوئی مغلظ باغی ہو جاتی ہے اور اس کا مادہ منقطع نہیں ہوتا تو اس کے انقطاع کا واحد ذریعہ اس کو داغ دینا ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اخر الدو الکی یعنی آخری دوا داغنا ہے۔

رہی یہ بات کہ داغنا جب ایک علاج ہے تو آپ ﷺ نے اس کی ممانعت کیوں فرمائی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب داغنے کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ مادہ مرض کا باعث ہے اس کے دفیعہ کے لئے داغنا یقینی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں یہ مشہور تھا کہ اخز الدو الکی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اسلامی عقیدے کے سراسر خلاف ہے کیونکہ کوئی بھی علاج خواہ وہ کتنا ہی مجرب کیوں نہ ہو یقین کا درجہ نہیں رکھ سکتا، صرف ظاہری سبب اور ذریعہ ہی سمجھا جا سکتا ہے یقینی شفا تو صرف حق تعالیٰ کے حکم پر موقوف ہے لہٰذا آپ ﷺ نے اس فاسد عقیدے کی تردید اور لوگوں کو شرک خفی میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لئے اس کی ممانعت فرمائی اور یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے ورنہ اگر کوئی شخص داغنے کو مرض کے دفیعہ کا ایک ظاہری سبب و ذریعہ سمجھتے ہوئے اس کو بطور علاج اختیار کرنے اور اللہ تعالیٰ سے شفا کی امید رکھے جائز ہے۔ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ داغنے کی ممانعت کا تعلق خطرہ اور تردد کی صورت سے ہے یعنی اگر ایسی صورت ہو کہ داغنے سے فائدے کے جزم کی بجائے نقصان اور ہلاکت جان کا خوف اور خطرہ ہو تو پھر داغنا نہ چاہئے۔ اس مسئلہ میں بعض شارحین حدیث نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ داغنے کے سلسلہ میں مختلف احادیث منقول ہیں بعض احادیث تو اس کے جواز پر دلالت کرتی ہیں اور بعض نہی کو ثابت کرتی ہیں، جیسے مذکورہ بالا احادیث اور دوسری احادیث اسی طرح بعض احادیث میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ میں داغنے کو پسند نہیں کرتا۔ اور بعض احادیث میں داغنے کو اختیار نہ کرنے پر مدح و تعریف کی گئی ہے اس طرح ان احادیث کے باہمی تعارض و تضاد کو دور کرنے اور ان میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے علماء نے یہ لکھا ہے کہ جن احادیث میں آپ ﷺ کا یہ فعل منقول ہے کہ آپ ﷺ نے داغا تو یہ اصولی طور پر داغنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے اور جن احادیث میں آپ ﷺ کا یہ فعل منقول ہے کہ آپ ﷺ نے داغا تو یہ اصولی طور پر داغنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے اور جن احادیث سے آپ ﷺ کی عدم پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے وہ اس جواز کے منافی نہیں ہے، کیونکہ عدم پسندیدگی عدم جواز پر دلالت نہیں کرتا، چنانچہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کو آپ ﷺ تو پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن دوسروں کے لئے اس کی ممانعت بھی نہیں فرماتے تھے، اسی طرح جن احادیث میں داغنے کو اختیار نہ کرنے پر مدح و تعریف منقول ہے وہ بھی عدم جواز پر دلالت نہیں کرتیں کیونکہ مدح و تعریف کا مقصد صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ داغنے کو اختیار نہ کرنا محض اولی اور افضل ہے نہ کہ ضروری ہے البتہ جن احادیث میں داغنے کی ممانعت صراحت کے ساتھ منقول ہے تو وہ ممانعت دراصل اس صورت پر محمول ہے جب کہ داغنے کو اختیار کرنا یا تو سبب مرض کے بغیر ہو یا مرض کے دفیعہ

کے لئے اس کی واقعی حاجت نہ ہو، بلکہ وہ مرض دوسرے علاج معالجہ سے دفع ہو سکتا ہے، نیز جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ ممانعت اس بات پر بھی محمول ہے کہ یہ ممانعت داغنے دراصل داغنے کے بارے میں مذکورہ بالا فاسد عقیدے اور شرک خفی میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لئے ہے اور اگر اس طرح کا فاسد عقیدہ نہ رکھا جائے تو یہ ممانعت نہیں ہوگی، بعض حضرات کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا بعض صحابہؓ کے بارے میں داغنے کا حکم دینا (جیسا کہ آگے آرہا ہے) اس بنا پر تھا کہ ان صحابہؓ کے زخم بہت خراب ہو گئے تھے اور بعض عضو کے کٹ جانے کی وجہ سے اخراج خون میں کمی نہیں ہو رہی تھی، نیز آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ داغنے کے صحت یقینی ہے حاصل یہ کہ کسی عضو کو داغنا یا جلانا مکروہ ہے ہاں اگر کوئی واقعی ضرورت پیش آجائے اور طبیب حاذق یہ کہے کہ اس مرض کا آخری علاج داغنا ہی ہے تو پھر داغنا جائز ہوگا۔

داغنے کا ذکر

④ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ رُمِيَ أُبَيٌّ يَوْمَ الْأَحْزَابِ عَلَى أَكْحَلِهِ فَكَوَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ غزوہ احزاب (کہ جس کو غزوہ خندق بھی کہتے ہیں) کے دن حضرت ابی کی رگ ہفت اندام پر تیر آکر لگا (جس سے خون جاری ہو گیا) تو رسول کریم ﷺ نے ان کو داغ دیا، یعنی آپ ﷺ نے زخم کے منہ کو داغنے کا حکم فرمایا یا خود اپنے دست مبارک سے داغا تاکہ خون بند ہو جائے۔" (مسلمؒ)

⑤ وَعَنْهُ قَالَ رُمِيَ سَعْدُ بْنُ مَعَاذٍ فِيْ أَكْحَلِهِ فَحَسَمَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ بِمِشْقَصٍ ثُمَّ وَرِمَتْ فَحَسَمَهُ الثَّانِيَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ حضرت سعد ابن معاذؓ کی رگ ہفت اندام پر تیر آکر لگا (جس سے خون جاری ہو گیا) چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے تیر کے پیکان کے ذریعہ (زخم کو) داغ دیا، پھر جب ان کے ہاتھ پر ورم آگیا تو آپ ﷺ نے دوبارہ داغا۔" (مسلمؒ)

⑥ وَعَنْهُ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ طَبِيْبًا فَقَطَعَ مِنْهُ عِرْقًا ثُمَّ كَوَاهُ عَلَيْهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ابی ابن کعبؓ کے پاس ایک طبیب بھیجا طبیب نے ان کی ایک رگ کو کاٹ ڈالا اور اس (زخم) پر داغ دیا۔" (مسلمؒ)

کلونجی کی خاصیت

⑦ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِي الْحَبَّةِ السَّوْدَاءِ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ إِلَّا السَّامَ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ السَّامُ الْمَوْتُ وَالْحَبَّةُ السَّوْدَاءُ الشُّوْنِيْزُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سیاہ دانہ سام کے وقت کے علاوہ ہر بیماری کے لئے شفا ہے۔ ابن شہابؒ نے بیان کیا کہ سام سے موت مراد ہے اور سیاہ دانہ سے کلونجی مراد ہے۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ اگرچہ حدیث کے مفہوم میں عمومیت ہے کہ کلونجی کو ہر بیماری کی دوا فرمایا گیا ہے لیکن یہ کلونج خاص طور پر انہی امراض میں فائدہ مند ہے۔ جو رطوبت اور بلغم میں پیدا ہوتے ہیں کیونکہ کلونجی ماء یابس وخشک وگرم ہوتی ہے اس لئے یہ ان امراض کو دفع کرتی ہے جو اس کی ضد ہیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم عمومیت پر ہی محمول ہے یعنی کلونجی ہر بیماری میں فائدہ مند ہے بایں طور کہ اگر اس کو کسی بھی دوا میں خاص مقدار وترکیب کے ساتھ شامل کیا جائے تو اس کے صحت بخش اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ کرمانیؒ نے کہا ہے کہ حدیث کا مفہوم عام ہے کیونکہ حدیث میں استثناء صرف موت کا کیا گیا ہے۔

سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اکابر و مشائخ کی ایک جماعت کا معمول تھا کہ وہ اپنے تمام امراض میں کلونجی کو بطور دوا استعمال کرتے تھے، اور ان کے حسن اعتقاد کی برکت سے ان کے امراض دور ہو جایا کرتے تھے۔

شہد کی شفا بخش تاثیر

⑧ وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اَخِی اسْتَطْلَقَ بَطْنُہٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِسْقِہٖ عَسَلاً فَسَقَاہُ ثُمَّ جَآءَ فَقَالَ سَقَیْتُہٗ فَلَمْ یَزِدْہُ اِلاَّ اِسْتِطْلاَقًا فَقَالَ لَہٗ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ جَآءَ الرَّابِعَۃَ فَقَالَ اِسْقِہٖ عَسَلاً فَقَالَ لَقَدْ سَقَیْتُہٗ فَلَمْ یَزِدْہُ اِلاَّ اسْتِطْلاَقًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَدَقَ اللّٰہُ وَکَذَبَ بَطْنُ اَخِیْکَ فَسَقَاہُ فَبَرَأَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میرے بھائی کا پیٹ چل رہا ہے یعنی اس کو دست پر دست آ رہے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو شہد پلا دو، اس شخص نے (جا کر) اپنے بھائی کو شہد پلایا (کچھ دیر کے بعد) پھر آیا اور کہنے لگا کہ میں نے شہد پلا دیا تھا، لیکن شہد نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا کہ اس کے پیٹ چلنے میں اور زیادتی کر دی ہے (یعنی شہد پلانے کے بعد سے دستوں میں پہلے سے بھی زیادتی ہو گئی ہے) آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو تین مرتبہ یہی حکم دیا (یعنی آپ ﷺ ہر بار یہی فرماتے کہ اس کو شہد پلا دو، اور وہ شخص شہد پلاتا رہا، پھر آ کر کہتا کہ میں نے شہد پلا دیا مگر دستوں میں پہلے سے بھی زیادتی ہو گئی ہے) یہاں تک کہ وہ جب چوتھی مرتبہ آیا (اور کہنے لگا کہ اس کے دستوں میں زیادتی ہو گئی ہے) تو آنحضرت ﷺ نے پھر یہی فرمایا کہ اس کو شہد پلا دو، اس نے عرض کیا کہ میں نے شہد پلا دیا ہے، مگر شہد نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا ہے کہ اس کے پیٹ چلنے میں اور زیادتی کر دی ہے، تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تو سچ فرمایا ہے مگر تمہارے بھائی کا پیٹ ہی جھوٹا ہے۔" آخر کار اس شخص نے اپنے بھائی کو پھر شہد (خالص یا پانی میں ملا کر پلایا) تو وہ اچھا ہو گیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کسی بیماری کی صورت میں شہد استعمال کرنے کا ایک خاص طریقہ حضرت علیؓ سے یوں منقول ہے کہ جب کوئی شخص بیمار ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی بیوی سے کہے کہ وہ اپنے مہر میں سے کچھ مال دے اور پھر اس مال کے ذریعہ شہد خریدے اور شہد کو بارش کے پانی میں ملا کر پی لے انشاء اللہ بابرکت شفا پائے گا۔

"اللہ تعالیٰ نے تو سچ فرمایا ہے" ان الفاظ کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اس آیت کریمہ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شہد میں لوگوں کے لئے شفا ہے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ بتا دیا تھا کہ اگر وہ مریض شہد پیئے گا تو اس کے پیٹ کو آرام ہو جائے گا اور دست بند ہو جائیں گے اسی بات کو آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ بیان کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا ہے کہ شہد پینے سے اس کو فائدہ ہو گا اور اللہ کی بتائی ہوئی بات غیر صحیح نہیں ہو سکتی لہٰذا مریض کو شہد پلائے جاؤ اس کو یقیناً فائدہ ہو گا۔

پھر آپ نے "تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے" کے ذریعہ گویا صحت یابی میں تاخیر ہونے کی علت بیان فرمائی کہ تمہارے بھائی کے پیٹ میں کوئی سخت مادہ جمع ہو رہا ہے اس کی وجہ سے شہد کی دی ہوئی مقدار کارگر نہیں ہو رہی ہے جب تک وہ مادہ باہر نہیں آ جائے گا تب تک اسے آرام نہیں آئے گا یا یہ کہ پیٹ خطا کر رہا ہے، یعنی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا ہے اور ابھی شفا کو قبول، نہیں کر رہا ہے جب وہ ٹھیک کام کرنے لگے گا اور شفا قبول کرے گا تو دست بند ہو جائیں ہے۔ واضح رہے کہ اہل عرب اپنے کلام میں اکثر لفظ کذب یعنی جھوٹ کو خطا کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ جب انہیں کہنا ہوتا ہے کہ فلاں شخص کے کان نے خطاء کی یعنی اس نے جو بات سنی ہے اس کی حقیقت کو نہیں پہنچا ہے تو وہ یوں کہتے ہیں۔ کذب سمعہ یعنی اس کے کان نے جھوٹ کہا۔

طب نبوی ﷺ اور مروج طب میں فرق اور اس کی وجہ

اس موقع پر یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ اگرچہ علماء نے حتیٰ الامکان طب نبوی ﷺ اور مروجہ طب میں مطابقت وموافقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں فرق ضرور موجود ہے اسی لئے صاحب سفر السعادۃ نے لکھا ہے کہ طب نبوی (ظاہری طور پر) طباء کے قواعد و اصول کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتی کیونکہ طب نبوی ﷺ کا مصدر وحی الٰہی، قلب نبوت اور کمال عقل ہے، ظاہر ہے کہ جو طب وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہو یا جو علاج معالجہ قلب نبوت اور کمال عقل کا بتایا ہوا اس کا کامیاب ہونا اور اس کے ذریعے شفا پانا درجہ یقین کا حامل ہے اس کے برخلاف اطباء وحکماء کی جو طب ہے اور ان کے اصول و قواعد کے مطابق جو علاج معالجہ ہوتا ہے اس کا کلیۃً کامیاب اور افادیت بخش ہونا یقینی درجہ کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس میں غلطی و خطا ہونے کا بھی گمان ہے کیونکہ اس طب کی بنیاد انسانی ذہن و تجربہ پر ہے اس اعتبار سے یہ طب اس طب نبوی ﷺ کے برابر ہو ہی نہیں سکتی جس کی بنیاد وحی الٰہی، قلب نبوت اور کمال عقل ہے۔

طب نبوی اور مروجہ طب کے درمیان یہی فرق ہے جو بعض مواقع پر کچھ لوگوں کو شک شبہ اور الجھن میں ڈال دیتا ہے چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کسی مرض کا ایسا علاج تجویز فرمایا ہے جو فن طب کے اصول و قواعد کے خلاف ہے تو وہ مختلف قسم کے اعتراض کرتے ہیں حالانکہ انہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ جس طب کے اصول و قواعد کی بات کرتے ہیں وہ چونکہ انسان کے اپنے ذہن اور اپنی عقل و تدبیر کی پیداوار ہے اس لئے اس میں غلطی و خطا کا ہونا اور حقیقت حال تک نہ پہنچنا عین ممکن ہے جب کہ طب نبوی کا مصدر وحی الٰہی اور قلب نبوت ہے جس میں کسی خطا کا امکان ہی نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ نے کسی مرض کا جو بھی علاج تجویز فرمایا ہے اس کے بارے میں تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا ناقص علم اور ذہن اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ علاج مرض کے مطابق نہ ہو مثال کے طور پر یہاں حدیث میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق بعض اطباء سخت حیرانی اور الجھن میں مبتلا ہوئے ہیں کیونکہ شہد اپنے خواص کے اعتبار سے سہل اور پیٹ جاری کرنے والا ہے، لہٰذا دستوں کے روکنے کے لئے شہد پلانے کا حکم نبوی ﷺ بظاہر اطباء کے اصول و قواعد کے بالکل خلاف ہے بناء بریں وہ اطباء کہتے ہیں کہ ہر مرتبہ شہد پلانے کے بعد دستوں میں زیادتی کا ہونا اسی وجہ سے تھا کہ شہد اسہال پیدا کرتا ہے؟ اس بارے میں ایک بات تو یہی کہی جاسکتی ہے کہ یہ ایک بالکل مخصوص نوعیت کا معاملہ تھا جس میں دوا کی تاثیر سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت اور آپ ﷺ کے اعجاز سے وہی شہد اس کے حق میں شفایابی کا ذریعہ بن گیا اور وہ اچھا ہو گیا، یہ بات اگرچہ حسن اعتقاد کے نقطہ نظر سے ایک اچھی تعبیر و ترجمانی ہے جو اہل ایمان کو مطمئن کر سکتی ہے اور پھر وہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ محض اس واقعہ پر قیاس کر کے طب نبوی ﷺ کو مروج طب کے اصول و قواعد کے متضاد قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن اس کے علاوہ اگر فنی نقطہ نظر سے بھی آنحضرت ﷺ کے تجویز کردہ اس علاج پر پوری تحقیق اور گہری نظر کے ساتھ غور کیا جائے تو واضح ہو گا کہ آنحضرت ﷺ کا مریض کو شہد پلانے کا حکم دینا اطباء کے اصول و قواعد کے خلاف نہیں تھا۔ کیونکہ دستوں کا آنا جس طرح بدہضمی کی وجہ سے ہوتا ہے اسی طرح وہ فاسد مادہ بھی دست جاری ہونے کا سبب بنتا ہے جو جمع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جو دست معدے میں جمع ہونے والے فاسد مادہ کی وجہ سے آتے ہیں ان کو بند کرنا اور اس مادے کو باہر نکالنا ضروری ہوتا ہے اور اس کا بہترین علاج شہد ہے۔ خصوصاً شہد کو گرم پانی میں ملا کر پلانا بہت مفید ہے کہ وہ مادہ کو دفع بھی کرتا ہے اور خارج بھی کر دیتا ہے پس وہ شخص جو بدہضمی کا شکار تھا اور اس کے معدے میں فاسد مادہ بھی جمع ہو گیا تھا اس کے لئے بہترین علاج یہی تھا کہ شہد پلا کر اس کے معدے میں جمع ہو جانے والا فاسد مادہ نکالا جائے چنانچہ آپ ﷺ اس کو شہد پلانے کا حکم دیتے رہے یہاں تک کہ جب اس کا معدہ فاسد مادے سے بالکل صاف ہو گیا تو وہ اچھا ہو گیا، اس سلسلے میں یہ بات بطور خاص ذہن میں رکھنے کی ہے کہ علاج معالجہ میں حسن اعتقاد اور معالج کی تشخیص و تجویز پر مکمل اعتبار و بھروسہ بنیادی چیز ہے، چنانچہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی

شخص اپنے معالج کے بارے میں کسی بھی قسم کے شک وشبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس سے حسن اعتقاد نہیں ہوتا تو اس کا مزاج معالج کے اس علاج کو قبول نہیں کرتا اور شفایابی سے محروم رہتا ہے خواہ وہ معالج کتنے ہی اونچے درجے کا کیوں نہ ہو اس کے برخلاف اگر وہ شخص پورے یقین و اعتقاد کے ساتھ کوئی انتہائی معمولی درجہ کا بھی علاج کرتا ہے تو وہ علاج اس کے لئے فائدہ مند ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص طب نبوی ﷺ کے ذریعہ اپنا علاج کرے جس کی کامیابی یقینی ہے اور اس کو اس علاج سے فائدہ نہ ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اس کے ایمان میں کھوٹ ہے اور اس کو یقین و اعتقاد کی نعمت حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے کسی مرض کا علاج طب نبوی ﷺ کے ذریعہ کرنے کا خواہش مند ہو تو اس کو اپنا یقین کامل اور اپنا اعتقاد مضبوط کرنا چاہئے اور پھر صدق نیت و اخلاص عمل کے ساتھ اس علاج کو اختیار کرنا چاہئے۔ اگر اس نے طب نبوی ﷺ کی اس بنیادی ضرورت کو پورا کر لیا تو اس کو یقیناً فائدہ ہوگا، اس حقیقت کو بالکل اسی طرح سمجھنا چاہئے۔ جیسا کہ قرآن کریم، امراض باطنی وروحانی اور فساد قلب و ذہن کے لئے شفاء کامل کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا جو شخص قرآن کریم کو اخلاص و خلوص کے جذبہ سے سیکھتا ہے اور پڑھتا ہے اس کی تعلیمات پر یقین و اعتقاد کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ اس کے قلب وروح کو یقیناً جلاو شفا حاصل ہوتی ہے، اس کے برخلاف جو شخص عدم اخلاص و قبول اور بے یقینی و بے اعتمادی کے ساتھ قرآن کریم کو سیکھتا پڑھتا ہے تو اس کے باطن میں اور زیادی برائی اور اس کے قلوب میں اور زیادہ فساد پیدا ہوتا ہے۔ اسی بناء پر بعض حضرات نے حدیث کے الفاظ کذب بطن اخیک (تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے) کو مریض کے عدم صدق نیت اور عدم خلوص اعتقاد پر بھی محمول کیا ہے یعنی ان حضرات کے نزدیک، آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ گویا یہ واضح کیا کہ تمہارے بھائی نے چونکہ شہد کو یقین و اعتقاد اور اخلاص و قبول کے ساتھ نہیں پیا ہے، اسلئے فائدہ ہونے کے بجائے اس مرض میں زیادتی ہو گئی ہے۔

قسط کے فوائد

⑨ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَمْثَلَ مَاتَدَاوَيْتُمْ بِهِ الْحِجَامَةُ وَالْقُسْطُ الْبَحْرِيُّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جن چیزوں کو تم دوا علاج کے طور پر اختیار کرتے ہو ان میں بہترین چیز سینگی کھچوانا اور بحری قسط کا استعمال کرنا ہے۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

تشریح: "قسط" ایک جڑ کا نام ہے جس کو "کوٹ" بھی کہتے ہیں اور دوا کے کام میں آتی ہے اطباء نے اس کے بہت فوائد لکھے ہیں مثلاً نفاس والی عورتیں اس کی دھونی لیں تو رکا ہوا فاسد خون جیسے حیض اور پیشاب جاری ہو جاتا ہے۔ یہ مسموم جراثیم کو دور کرتی ہے۔ دماغ کو قوت بخشتی ہے اعضاء رئیسہ باہ اور جگر کو طاقت وربتاتی ہے اور قوت مردمی میں تحریک پیدا کردیتی ہے۔ ریاح کو تحلیل کرتی ہے، دماغی بیماریوں جیسے فالج، لقوہ، اور رعشہ کے لئے مفید ہے۔ پیٹ کر کیڑے باہر نکالتی ہے۔ چوتھے دن کے بخار کے لئے بھی فائدہ مند ہے اس کا لیپ کرنے سے چھائیاں اور چھیپ جاتی رہتی ہے، زکام کی حالت میں اس کی دھونی لینا ایک بہترین علاج ہے اس کی دھونی سے سحر و وبا کے اثرات بھی جاتے رہتے ہیں غرضکہ طب کی کتابوں میں اس کے بہت زیادہ فوائد لکھے ہیں اسی لئے اس کو "سب سے بہتر دوا" فرمایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ "قسط" دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو قسط بحری جس کا رنگ سفید ہوتا ہے اور دوسری کو قسط ہندی کہا جاتا ہے جس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ دونوں کی خاصیت گرم و خشک ہے لیکن بحری قسط ہندی قسط سے بہتر ہوتی ہے کیونکہ اس میں گرمی کم ہوتی ہے۔

بچوں کے حلق کی مخصوص بیماری "عذرہ" کا علاج

⑩ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُعَذِّبُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالْغَمْزِ مِنَ الْعُذْرَةِ وَعَلَيْكُمْ بِالْقُسْطِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم اپنے بچوں کے حلق کی بیماری کو ہاتھ یا کپڑے سے ان کو اذیت نہ پہنچاؤ بلکہ تمہیں قسط کا استعمال کرنا چاہئے۔" (بخاریؒ، و مسلمؒ)

تشریح: "عذرہ" ایک بیماری ہے جو شیر خوار بچے کو ہو جایا کرتی ہے اس کا سبب خون کا ہیجان ہوتا ہے عام طور پر مائیں یا دائیاں اس کو دفع کرنے کے لئے بچے کے حلق میں انگلی ڈال کر ان کو دباتی ہیں جن میں سے سیاہ خون نکلتا ہے اور بچے کو بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس طریقہ علاج سے منع فرمایا اور دفعیہ مرض کے لئے قسط کو بطور دوا تجویز فرمایا اس مرض میں قسط کو استعمال کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس کو پانی میں حل کر کے ناک میں ٹپکایا جائے جس کو "سعوط" کہتے ہیں یہ محلول ناک کے ذریعہ عذرہ پر پہنچ کر اس کو دور کر دے گا۔ واضح رہے کہ عذرہ کے علاج کے لئے قسط کی تجویز بعض اطباء کے نزدیک حیرانی کا باعث ہے کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق قسط چونکہ گرم ہے اور عذرہ بھی گرمی کی وجہ سے ہوتا ہے خاص طور پر حجاز میں کہ جہاں کی آب و ہوا گرم ہے اس لئے اس بیماری کو قسط سے کیونکر فائدہ ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عذرہ کا مادہ اصل میں وہ خون ہوتا ہے جس پر بلغم کا غلبہ ہوتا ہے گویا عذرہ خون اور بلغم دونوں سے مل کر بنتا ہے لیکن بلغم زیادہ ہوتا ہے اور خون کم لہٰذا بلغم کی رطوبت کو قسط کی گرمی جذب کر لیتی ہے! بسا اوقات دوا کا فائدہ بالخاصیت بھی ہوتا ہے اس اعتبار سے عذرہ میں قسط کا استعمال باعث حیرت نہیں ہونا چاہئے، علاوہ ازیں ایک جواب یہ بھی ہے کہ عذرہ کا علاج قسط کے ذریعہ کرنا اعجاز نبوی ﷺ کا ایک کرشمہ ہے جس میں عقل کی کوئی دخل نہیں ہے۔

ذات الجنب کا علاج

(۱۱) وَعَنْ اُمِّ قَيْسٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مَا تَدْغَرْنَ اَوْلَادَكُنَّ بِهٰذَا الْعِلَاقِ عَلَيْكُنَّ بِهٰذَا الْعُوْدِ الْهِنْدِيِّ فَاِنَّ فِيْهِ سَبْعَةَ اَشْفِيَةٍ مِنْهَا ذَاتُ الْجَنْبِ يُسْعَطُ مِنَ الْعُذْرَةِ وَيُلَدُّ مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ قیسؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم اپنے بچوں کے حلق کا علاج اس طرح دبا کر کیوں کرتی ہو بلکہ تمہیں ان کا علاج عود ہندی یعنی کوٹ کے ذریعہ کرنا چاہئے کیونکہ عود ہندی میں سات بیماریوں کی شفا ہے جن میں ایک ذات الجنب ہے۔ عذرہ کی صورت میں توسط کیا جائے (یعنی عذرہ بیماری کو دور کرنے کے لئے عود ہندی کو پانی میں گھول کر ناک میں ٹپکایا جائے) اور ذات الجنب کی صورت میں لدود کیا جائے یعنی ذات الجنب کی بیماری کو دور کرنے کے لئے عود ہندی کو پانی میں گھول کر باچھ کی طرف سے منہ میں ٹپکایا جائے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: "تَدْغَرْنَ" دغر کا مطلب ہے عذرہ بیماری میں حلق کو انگلی کے ذریعہ دبانا، جیسا کہ جب بچوں کو حلق کی بیماری ہوتی ہے تو عورتیں ان کے حلق میں انگلی ڈال کر ورم کو دباتی ہیں اور کوے کو اوپر اٹھا دیتی ہیں، چنانچہ اس بارے میں اس سے پہلے کی حدیث میں بھی گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے اس تکلیف دہ طریقہ علاج سے منع فرمایا ہے، اور یہاں بھی آپ ﷺ نے بطریق انکار فرمایا کہ تم اپنے بچوں کے حلق کو انگلی سے کیوں دباتی ہو، یعنی اس طریقہ علاج سے اجتناب کرو۔ اعلق کے معنی بھی وہی ہیں جو دغر کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ بعض روایت میں علاق کے بجائے اعلاق مذکور ہے، لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہی روایت اولی اور اصوب ہے، ویسے اعلاق کے بھی وہی معنی ہیں جو علق کے ہیں، حاصل یہ کہ عورتوں کو آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ عذرہ کی بیماری میں انگلی کے ذریعہ حلق کو دبانے کا طریقہ علاج اختیار کیا جائے۔ بلکہ عود ہندی کے ذریعہ اس کا علاج کیا جائے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو پانی میں گھول کر بچے کی ناک میں ٹپکایا جائے۔

حدیث میں "عود ہندی" کا ذکر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ پچھلی حدیث میں قسط بحری سے مراد یہی عود ہندی ہے تاہم یہ بھی احتمال ہے کہ "قسط" ہندی کو عود ہندی فرمایا گیا ہو۔ جیسا کہ بعض حضرات نے اس کی وضاحت "عود ہندی" کی ہے اور یہ بات پہلے بتائی جا چکی

ہے کہ فائدہ مند تو دونوں ہیں لیکن "قسط بحری" زیادہ فائدہ مند ہے۔

"ذات الجنب" ایک بیماری ہے اس کی صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ سینے میں ورم ہو جاتا ہے اور یہ اگرچہ عضلات میں پیدا ہوتا ہے مگر پھر باطن سے ظاہر میں آجاتا ہے اور یہ صورت خطرناک ہے اور اس کا شمار مہلک امراض میں ہوتا ہے.......... ذات الجنب کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ریاح غلیظہ کے رک جانے کی وجہ سے پہلو میں ایک درد ہوتا ہے یہاں حدیث میں جس ذات الجنب کا ذکر ہے اس سے مراد یہی دوسری صورت ہے کیونکہ "عود ہندی" ریاحی امراض کی دوا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی میں سات بیماریوں کا ذکر فرمایا لیکن نام صرف دو بیماریوں کا لیا، باقی پانچ کے بارے میں سکوت فرمایا، کیونکہ اس موقع پر ان پانچوں کی وضاحت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پانچ بیماریاں ایسی ہوں گی جو عرب میں مشہور رہی ہوں گی اور ان کے بارے میں لوگ خود جانتے ہوں گے اور چونکہ ان دونوں بیماریوں کے بارے میں لوگوں کا علم محدود ہوگا اس لئے آپ ﷺ نے صرف دو بیماریوں کا نام لیا، لیکن حدیث میں "سات بیماریوں" کے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ قسط بس انہی سات بیماریوں کے کام میں آنے والی دوا ہے سات سے زیادہ کسی اور بیماری کے لئے فائدہ مند نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دوا کا فائدہ بہت وسیع ہے اور بہت سی بیماریوں میں استعمال کی جاتی ہے جن میں سے کچھ بیماریاں وہ ہیں جن کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سات بیماریوں کے لئے یہ بہت فائدہ مند ہوگی اس لئے اس کو یہاں ذکر کیا گیا، علاوہ ازیں بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ "سات" سے مراد مخصوص عدد نہیں ہے بلکہ کثرت مراد ہے چنانچہ اہل عرب کے کلام میں بسا اوقات سات کا اطلاق کثرت پر ہوتا ہے۔

بخار کا علاج اور پانی

⑫ وَعَنْ عَائِشَةَ وَرَافِعِ ابْنِ خَدِيجٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْحُمَّى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَابْرِدُوْهَا بِالْمَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن خدیجؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا بخار جہنم کی بھاپ ہے لہٰذا تم اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: بعض حضرات نے کہا ہے کہ ارشاد گرامی کا مقصد بخار کی حرارت کو دوزخ کی آگ سے مشابہت دینا ہے یعنی بخار دوزخ کی آگ کی تپش کا نمونہ ہے، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ حقیقی معنی پر محمول ہیں جیسا کہ باب مواقیت میں یہ روایت گزری ہے کہ موسم گرما کی تپش و حرارت اصل میں دوزخ کی بھاپ کا اثر ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ بخار کی حرارت و جلن بھی دوزخ کی بھاپ کا اثر ہو۔ اس حدیث کے اصل مخاطب اہل حجاز ہیں کیونکہ مکہ اور مدینہ کے رہنے والے کو عام طور پر سورج کی شدید تمازت، گرم آب و ہوا اور دھوپ میں ان کی محنت مشقت کرنے اور ان کے مزاج کی تیزی و گرمی کی وجہ سے بخار ہو جایا کرتا تھا، چنانچہ جو بخار آفتاب کی حرارت و تمازت، کوئی گرم دوا وغیرہ کھانے دھوپ و تپش میں زیادہ چلنے پھرنے اور حرکت کرنے اور آب و ہوا کے دباؤ کی وجہ سے ہو اس کا بہترین علاج پانی ہے کہ ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگایا جائے یا یا ٹھنڈا پانی اپنے بدن پر بہایا جائے، یا بخار کو پانی سے ٹھنڈا کیا جائے کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس طرح کے بخار میں ٹھنڈی دوائیں پانی میں مخلوط کر کے استعمال کی جائیں اور بعض حضرات کے مطابق اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ جس شخص کو بخار ہو وہ پیاسوں کو اللہ واسطے ٹھنڈا پانی پلائے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے بخار کو دور کر دے گا۔

جھاڑ پھونک کے ذریعہ علاج کرنے کی اجازت

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَخَّصَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الرُّقْيَةِ مِنَ الْعَيْنِ وَالْحُمَةِ وَالنَّمْلَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جھاڑ پھونک کے ذریعہ نظر بد، ڈنک اور نملہ کا علاج کرنے کی اجازت دی ہے۔"
(مسلم)

تشریح: "افسوں" سے مراد وہ جھاڑ پھونک ہے، جس میں حصول شفا کے لئے منقول دعائیں اور قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں "نظر بد" ایک حقیقت ہے جس کو بعض حضرات نے "زہر" سے تعبیر کیا ہے ان حضرات کا کہنا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بچھو کے ڈنک اور سانپ کے منہ میں زہر رکھا ہے اسی طرح بعض آدمیوں کی آنکھوں میں بھی زہر رکھا ہے کہ ان کی نظر جس چیز کو بھی لگ جاتی ہے خواہ وہ انسان ہو یا مال و اسباب، زمین جائیداد ہو یا کھیتی و باغات اور جانور ہو، اس کو کھا جاتی ہے۔ چنانچہ نظر بد کے دفعیہ کے لئے دعا و تعویز اور جھاڑ پھونک نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ آنحضرت ﷺ نے اس مقصد کے لئے مختلف دعائیں بھی تعلیم فرمائی ہیں جو دعاؤں کے باب میں گزر چکی ہیں۔

"ڈنک" سے مراد زہریلہ ڈنک ہے جیسے بچھو کا ڈنک، سانپ کا ڈسنا بھی اسی کے حکم میں ہے اگر کسی شخص کو بچھو ڈنک مار دے یا سانپ ڈس لے تو اس کا زہر اتارنے کا بہترین ذریعہ جھاڑ پھونک ہے۔

"نملہ" اصل میں چیونٹی کو کہتے ہیں لیکن یہاں وہ پھوڑا مراد ہے جو آدمی کے پہلو میں ہو جایا کرتا ہے، کبھی یہ پھوڑا چھوٹی چھوٹی پھنسیوں کی صورت میں بھی ہوتا ہے جو پسلی کے اوپر نکل آتی ہیں، نملہ پھوڑے میں آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں اور غالباً اسی مناسبت سے اس پھوڑے کو نملہ کہا گیا ہے اور اگر نملہ چھوٹی چھوٹی پھنسیوں کی صورت میں ہو تو اس میں وجہ مشابہت یہ ہوگی کہ وہ پھنسیاں چیونٹیوں کی طرح پھیلی اور بکھری ہوتی ہیں۔

واضح رہے کہ جھاڑ پھونک کے ذریعہ ہر مرض کا علاج کرنا جائز ہے، اس صورت میں خاص طور پر ان تین چیزوں کا ذکر محض اس لئے کیا گیا ہے کہ دوسرے امراض کی بہ نسبت ان تینوں میں جھاڑ پھونک کا اثر زیادہ اچھا ہوتا ہے اسی طرح جس روایت میں بطور حصر یہ فرمایا گیا ہے کہ جھاڑ پھونک صرف ان تین چیزوں میں جائز ہے۔ اس کی تاویل بھی یہی ہوگی، علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب جن الفاظ و کلمات کے ذریعہ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے ان سے اجتناب کی خاطر آنحضرت ﷺ نے ابتداء اسلام میں مسلمانوں کو جھاڑ پھونک کرنے سے منع فرما دیا تھا پھر جب ان تینوں چیزوں میں جھاڑ پھونک کی اہمیت اور لوگوں کو اس سے حاصل ہونے والے فائدے کی بنا پر آپ ﷺ نے ان تین چیزوں میں منتر پڑھ کر پھونکنے کی اجازت دیدی بشرطیکہ اس منتر میں مشرکانہ الفاظ و کلمات استعمال نہ ہوں یہاں تک کہ بعد میں اس اجازت کو عام کر دیا گیا کہ کسی بھی مرض میں منقول دعاؤں اور قرآنی آیات کے ذریعہ جھاڑ پھونک کی جا سکتی ہے۔

⑭ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَمَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَسْتَرْقِیَ مِنَ الْعَیْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ہم نظر بد کا اثر دور کرنے کے لئے جھاڑ پھونک کرائیں۔" (بخاری و مسلم)

⑮ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَاٰی فِیْ بَیْتِهَا جَارِیَةً فِیْ وَجْهِهَا سَفْعَةٌ تَعْنِیْ صُفْرَةً فَقَالَ اسْتَرْقُوْا لَهَا فَاِنَّ بِهَا النَّظْرَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ سلمہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے ان کے گھر میں ایک لڑکی کو دیکھا جس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر منتر پڑھواؤ۔ یعنی اس کی جھاڑ پھونک کراؤ۔ کیونکہ اس کو نظر لگی ہے۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: حدیث کے ظاہری مفہوم سے تو عمومیت ظاہر ہوتی ہے کہ اس لڑکی کو نظر لگ گئی تھی خواہ کسی انسان کی نظر لگی ہو یا کسی جن کی لیکن شارحین نے وضاحت کی ہے کہ اس لڑکی پر کسی جن کی نظر بد کا اثر تھا۔ جنات کی نظر برچھے کی نوک سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔

⑯ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الرُّقٰی فَجَآءَ اٰلُ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهٗ

كَانَتْ عِنْدَنَا رُقْيَةٌ نَرْقِي بِهَا مِنَ الْعَقْرَبِ وَاَنْتَ نَهَيْتَ عَنِ الرُّقٰى فَعَرَضُوْهَا عَلَيْهِ فَقَالَ مَا اَرٰى بِهَا بَاْسًا مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يَنْفَعَ اَخَاهُ فَلْيَنْفَعْهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منتر پڑھنے اور پھونکنے سے منع فرمادیا تو عمرو ابن حزم کے خاندان کے لوگ (جو منتروں کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرتے تھے) حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے پاس ایک منتر ہے جس کو ہم بچھو کے کاٹے پر پڑھا کرتے تھے اب آپ نے منتروں سے منع فرمادیا ہے اس کے بعد انہوں نے منتر کو پڑھ کر آنحضرت ﷺ کو سنایا (تاکہ آپ ﷺ اس منتر کو درست یا غلط ہونے کا فیصلہ فرمائیں) آنحضرت ﷺ نے (منتر کو سن کر) فرمایا کہ میں اس منتر میں کوئی حرج نہیں دیکھتا تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکے تو وہ ضرور نفع پہنچائے خواہ جھاڑ پھونک کے ذریعہ اور خواہ کسی اور طرح سے بشرطیکہ اس میں کوئی خلاف شرع بات نہ ہو۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

⑰ وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكِ نِ الْاَشْجَعِي قَالَ كُنَّا نَرْقِيْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ تَرٰى فِيْ ذٰلِكَ فَقَالَ اعْرِضُوْا عَلَيَّ رُقَاكُمْ لَا بَاْسَ بِالرُّقٰى مَالَمْ يَكُنْ فِيْهِ شِرْكٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عوف ابن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں کہ ہم زمانہ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کے ذریعہ منتر پڑھا کرتے تھے پھر (جب اسلام کا زمانہ آیا تو) ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) ان منتروں کے بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم ان منتروں کو پڑھ کر مجھ کو سناؤ، جب تک ان میں شرک نہ ہو، میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جب تک ان میں شرک نہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ جس منتر و افسوں میں جن و شیاطین کے اسماء اور ان سے استعانت نہ ہو اور ان کے مفہوم و معنی ایسے نہ ہوں جن سے کفر لازم آتا ہو تو ان کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ ایسے الفاظ و کلمات پر مشتمل منتر و افسوں کے ذریعہ جھاڑ پھونک جائز نہیں ہے۔ جن کے مفہوم و معانی معلوم نہ ہوں البتہ بعض ایسے منتر جن کے الفاظ و کلمات صحیح روایت میں شارع سے منقول ہیں اور ان کے مفہوم و معانی معلوم نہیں ہیں ان کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جائز ہے۔

واضح رہے کہ جس طرح شیطان ازل ہی سے انسانی عداوت میں مبتلا ہے اسی طرح جنات بھی بالطبع انسان کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے جنات و شیاطین آپس میں ایک دوسرے کے دوست و رفیق ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی انسان پر جنات کا سایہ و اثر ہوتا ہے اور اس سایہ و اثر کو دور کرنے کے لئے ایسے منتر و افسوں پڑھے جاتے ہیں جن میں شیاطین کے نام اور ان سے استعانت ہوتی ہے تو جنات اس منتر و افسوں کو قبول کر کے اس انسان کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح بعض اوقات مار گزیدہ (سانپ کا ڈسا ہوا) شخص اصل میں جنات کے زیر اثر ہوتا ہے، بایں طور پر کہ کوئی شریر جن سانپ کی صورت اختیار کر کے کسی انسان کو ڈس لیتا ہے لیکن لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس کو درحقیقت سانپ نے کاٹ کھایا ہے۔ جب ایسے شخص پر منتر پڑھے جاتے ہیں جن میں شیاطین کے نام ہوتے ہیں تو وہ زہر جو حقیقت میں جن کا اثر ہوتا ہے اس شخص کے بدن سے زائل ہو جاتا ہے اس طرح گویا جنات و شیاطین دونوں انسان کی گمراہی کا ذریعہ بنتے ہیں، چنانچہ علماء اُمت کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ کتاب اللہ اور اسماء و صفات الٰہی کے بغیر افسوں و منتر پڑھنا اور جھاڑ پھونک کرنا جائز نہیں ہے، سب سے زیادہ مہتم بالشان "خود قرآن مجید" ہے کہ اس کا ہر ہر فقرہ اور ہر ہر لفظ کائنات انسانی کے لئے تاثیر و شفا اور خیر و برکت کا خزانہ ہے اور جن کا فائدہ یقینی ہے اور پھر اس میں بھی بعض سورتیں اور آیتیں جھاڑ پھونک کے لئے زیادہ فضیلت رکھتی ہیں جیسے سورہ فاتحہ، معوذتین آیت الکرسی اور وہ آیات کریمہ جو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کے مفہوم پر مشتمل ہیں، اسی طرح وہ دعائیں اور عملیات بھی افضل ہیں جو احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ سے منقول و ثابت ہیں۔

سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ حدیث شریف میں منقول ہے کہ جب کوئی شخص اپنے کسی ایسے مال و اسباب وغیرہ یا بچے پر

نظر ڈالے جو اس کو اچھا لگتا ہو تو چاہئے کہ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه کہے (تاکہ اس مال یا بچے کو نظر نہ لگے) اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک بہت ہی خوبصورت بچے کو دیکھا تو فرمایا کہ اس کی تھوڑی کے گڑھے میں ذرا سی سیاہی لگا دو، تاکہ اس کو نظر نہ لگے۔

آیات شفا

حضرت شیخ ابوالقاسم قشیریؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا، ایک مرتبہ میرا بچہ سخت بیمار ہوا یہاں تک کہ ہم سب اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے اسی دوران میں نے رسول کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور آپ ﷺ سے اپنے بچے کی بیماری کے بارے میں عرض کیا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم آیات شفا سے بے خبر کیوں ہو؟ پھر جب میں بیدار ہوا اور قرآن کریم سے آیات شفا کی تلاش شروع کی یہاں تک کہ میں نے قرآن میں چھ جگہوں پر آیات شفا پائیں جو یہ ہیں۔

1. وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ۔
2. وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔
3. يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔
4. وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔
5. وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔
6. قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ۔

چنانچہ میں نے ان آیات کو لکھا اور پانی میں دھو کر بچے کو پلا دیا جس سے وہ اتنی جلدی اچھا ہو گیا کہ جیسے ان کے پیروں کا بند کھول دیا گیا ہے۔ قاضی بیضاویؒ نے بھی اپنی تفسیر میں ان آیات شفا کی طرف اشارہ کیا ہے، اسی طرح سعد حلبیؒ نے تفسیر بیضاوی کے حاشیہ میں ان آیات شفا کا تعین کرتے ہوئے ابوالقاسم قشیریؒ کی مذکورہ بالا حکایات کو نقل کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھنے، ان آیات کو پڑھ کر مریض پر دم کرنے اور ان کو چینی کے برتن پر لکھ کر اور اس کو دھو کر مریض کو پلانے کا ذکر کیا ہے۔

نیز حضرت شیخ تاج الدین سبکیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے بہت سے مشائخ کو دیکھا کہ وہ بیماریوں سے شفا حاصل کرنے کے لئے ان آیات کو لکھا کرتے تھے۔ رہی یہ بات کہ حصول شفا کے لئے ان آیات کے صرف مذکورہ بالا اجزاء کو لکھا جائے یا پوری آیتیں لکھی جائیں تو اس سلسلہ میں نقل کرنے والوں نے اکابر و مشائخ کا جو عمل دیکھا ہے وہ صرف ان ہی مذکورہ اجزاء کو لکھا جانا ہے۔

نظر بد کا لگنا ایک حقیقت ہے

(۱۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْعَيْنُ حَقٌّ فَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدَرَ سَبَقَتْهُ الْعَيْنُ وَاِذَا اسْتُغْسِلْتُمْ فَاغْسِلُوْا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا نظر بد حق ہے یعنی نظر لگنا ایک حقیقت ہے اگر تقدیر پر سبقت لے جانے والی کوئی چیز ہوتی تو وہ نظر ہی ہوتی اور جب تم سے دھوئے کا مطالبہ کیا جائے تو تم دھو دو۔" (مسلم)

تشریح: "نظر حق ہے" کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والے کی نظر میں کسی چیز کا کھب جانا اور اچھا لگنا خواہ وہ چیز جاندار یعنی انسان و حیوان ہو، یا غیر جاندار جیسے مال و اسباب ہو اور پھر اس چیز پر دیکھنے والے کی نظر کا اثر انداز ہو جانا ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جو تقدیر الٰہی سے متعلق ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے سحر و جادو کی طرح بعضوں کی نظر میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جس چیز کو لگ جاتی ہے اس کی ہلاکت و تباہی اور

نقصان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اگر تقدیر الٰہی پر سبقت لے جانے والی کوئی چیز ہوتی کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا مرکز اور مصدر ومنبع، تقدیر الٰہی ہے کہ بڑی سے بڑی طاقت کا اثر ونفوذ بھی تقدیر الٰہی سے پابستہ ہے اور چھوٹے سے چھوٹے تک کی حرکت وسکون بھی تقدیر الٰہی کے بغیر ممکن نہیں، گویا کوئی چیز بھی تقدیر کے دائرہ سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اگر بالفرض کوئی چیز ایسی طاقت رکھ سکتی کہ وہ تقدیر کے دائرہ کو توڑ کر نکل جائے تو وہ نظر بد ہوتی کہ وہ تقدیر کو بھی پلٹ دیتی اور اس پر غالب آجاتی۔ گویا یہ بات اشیاء میں تاثیر نظر کی شدت اور اس کے سرعت نفوذ کو زیادہ سے زیادہ کے ساتھ بیان کرنے کے لئے فرمائی گئی ہے۔

اور جب تم سے دھونے کا مطالبہ کیا جائے۔" اس وقت عرب میں یہ دستور تھا کہ جس شخص کی نظر لگتی تھی اس کے ہاتھ پاؤں اور زیر ناف حصے کو دھو کر وہ پانی اس شخص پر ڈالتے تھے جس کو نظر لگتی تھی اور اس چیز کو شفا کا ذریعہ سمجھتے تھے اس کا سب سے ادنیٰ فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اس ذریعہ سے مریض کا وہم دور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس کی اجازت دی اور فرمایا کہ اگر تمہاری نظر کسی کو لگ جائے اور تم سے تمہارے اعضاء دھو کر مریض پر ڈالنے کا مطالبہ کیا جائے تو اس کو منظور کر لو اعضاء جسم کو اس مقصد کے لئے دھونے کا طریقہ دوسری فصل کے اخیر میں ذکر ہوگا"۔

واضح رہے کہ جمہور علماء اہل حق کا مسلک تو یہی ہے کہ جاندار خواہ وہ انسان ہو یا حیوان اور اموال میں جائیداد وغیرہ میں نظر کی تاثیر یعنی نظر لگنے سے نقصان پہنچنا ثابت ہے جب کہ بعض لوگ جیسے معتزلہ وغیرہ اس کے منکر ہیں جیسا کہ وہ اموال وغیرہ میں دوا اور صدقہ و خیرات کی تاثیر کے قائل نہیں ہیں ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جس چیز کا وقوع پذیر ہونا مقدر میں لکھ دیا گیا ہو اس میں کسی اور چیز کا دخل نہیں ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ تقدیر کے لکھے کو کوئی چیز متغیر نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ تقدیر عالم اسباب کے ساتھ کوئی تضاد ومنافات نہیں رکھتی، چنانچہ نظر کی تاثیر اور سببیت اس بناء پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اس طرح کی خاصیت رکھ دی ہے کہ وہ ہلاکت ونقصان کا سبب بن جائے علاوہ ازیں علماء اہل حق کے مسلک کی دلیل یہ ارشاد گرامی ﷺ "العین الحق" ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ نظر کی تاثیر برحق ہے تو اس کا اعتقاد رکھنا واجب اور ضروری ہے۔ رہی بات یہ کہ نظر لگنے کی کیفیت وصورت کیا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے نظر زدہ کو نقصان وضرر کیسے پہنچتا ہے تو اس سلسلے میں علماء نے مفصل بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ اس سلسلے میں بعض ایسے لوگوں نے جن کی نظر عام طور پر کسی نہ کسی کو لگتی رہتی ہے بیان کیا کہ جب ہمیں کوئی چیز اچھی لگتی ہے اور ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری آنکھوں سے حرارت نکل رہی ہو۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ نظر لگانے والے کی آنکھ سے ایک خاص قسم کی حرارت سمیہ نکلتی ہے جو ہوا میں مخلوط ہو جاتی ہے اور وہ ہوا پھر نظر زدہ تک پہنچتی ہے تو اس کے نقصان وہلاکت کا باعث بن جاتی ہے جیسا کہ بعض قدیم محققین کے مطابق اس سانپ کی زہر کی کیفیت ہوتی ہے جو محض اپنی نظر کے ذریعہ زہر کو منتقل کرتا ہے کہ اس کی نظر جس پر بھی پڑ جاتی ہے اس تک اس کا اثر پہنچ جاتا ہے اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے حاصل یہ کہ دکھائی نہ دینے والی کوئی شئے نظر لگانے والے کی نظر سے تیر کی طرح روانہ ہوتی ہے اور اگر کوئی ایسی چیز درمیان میں نہ ہو جو اس شے کو روک دے تو وہ نظر زدہ تک پہنچتی ہے اور اس کو نقصان وہلاکت میں ڈال دیتی ہے اور اگر روکنے والی کوئی چیز درمیان میں ہوتی ہے جیسے حرز وتعویذ اور دوا وغیرہ تو وہ شئے نظر زدہ تک نہیں پہنچتی اور اس میں اثر ونفوذ نہیں کرتی بلکہ اگر وہ حرز وتعویز قوی ومضبوط قسم کا ہوتا ہے تو وہ شئے نظر لگانے والے ہی کی طرف پلٹ آتی ہے جیسا کہ اگر مقابل کے پاس سخت ومضبوط سپر ہوتا ہے تو تیر مارنے والے کا تیر سپر سے ٹکرا کر الٹا مارنے والے کو آکر لگتا ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے جس طرح بعض لوگوں کی نظر میں مذکورہ خاصیت وتاثیر پیدا کی ہے اسی طرح نفوس کاملہ یعنی اہل اللہ اور کاملین کو بھی اس نظر بد کے دفعیہ کی قوت اور اس میں تصرف کی طاقت عطا فرما دی ہے تا کہ وہ عوام کو دعا وتعویز کے ذریعہ نظر بد کے اثرات سے محفوظ رکھنے میں مدد دیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حق تعالیٰ نے ہر مرض کا علاج پیدا کیا ہے

⑲ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) اَفَنَتَدَاوٰى قَالَ نَعَمْ يَا عِبَادَ اللّٰهِ تَدَاوَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهٗ شِفَاءً غَيْرَ دَاءٍ وَاحِدٍ الْهَرَمُ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"حضرت اسامہؓ ابن شریک کہتے ہیں کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم بیماری میں دوا وعلاج کریں؟ آپ نے فرمایا ہاں اے اللہ کے بندو دوا وعلاج کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری پیدا نہیں کی ہے جس کی شفا نہ رکھی ہو، علاوہ ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اے اللہ کے بندو آنحضرت ﷺ نے صحابہ ؓ کو ان الفاظ کے مخاطب کر کے گویا اس طرف اشارہ کیا ہے کہ علاج معالجہ کرنا اور بیماری کو دور کرنے کے ذرائع اختیار کرنا عبودیت و توکل کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ محض علاج پر ہی اعتماد بھروسہ نہ کیا جائے بلکہ دوا علاج کو شفا کا صرف ایک ضروری سبب وذریعہ سمجھو اور شافی حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کو جانا جائے۔

مریض کو زبردستی نہ کھلاؤ پلاؤ

⑳ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتُكْرِهُوْا مَرْضٰكُمْ عَلَى الطَّعَامِ فَاِنَّ اللّٰهَ يُطْعِمُهُمْ وَيَسْقِيْهِمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے مریضوں کو زبردستی نہ کھلاؤ کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کھلاتا پلاتا ہے۔" ترمذی، ابن ماجہ اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر مریض کسی چیز کے کھانے پینے پر راضی نہ ہو تو اس کو وہ چیز زبردستی نہ کھلاؤ پلاؤ اور وہ چیز خواہ از قسم طعام ہو یا از قسم دوا۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے جو جسم انسان کو طاقت بخشتی ہے اور اصل میں اس کی مدد کھانے پینے جیسی چیزوں کے فائدے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے گویا کسی بھی جاندار کا زندہ رہنا اور اس کو قوت و طاقت کا حاصل ہونا کھانے پینے پر منحصر نہیں ہے بلکہ قدرت الٰہی پر موقوف ہے۔ لہٰذا نفس کے کسی چیز میں مبتلا و مشغول ہونے کی وجہ سے اگر طبیعت کھانے پینے پر آمادہ نہ ہو تو کھانے پینے کے معاملہ میں زبردستی نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ طبیعت و خواہش کے علی الرغم کھانا پینا فائدہ مند ہونے کی بجائے نقصان دہ ہو جاتا ہے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جسم وجان کی بقا کے لئے نظام قدرت و عادت انسانی کے تحت کوئی نہ کوئی ظاہری سبب ذریعہ ہونا چاہئے تو اس مقصد کے لئے وہ رطوبت بدن کافی ہوتی ہے جس کو فقدان غذا کی صورت میں حرارت عزیزی تحلیل کر کے بقاء جسم وجان کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔

سرخ بادہ کا علاج

㉑ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَوٰى اَسْعَدَ بْنَ زُرَارَةَ مِنَ الشَّوْكَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سعدؓ ابن زرارہ کے جسم پر سرخ بادہ (کی بیماری کے علاج) کے لئے داغ دیا۔ اور اس

روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "داغ دیا" یعنی آپ ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے داغا یا کسی کو داغنے کا حکم دیا۔ یہ بات واضح نہیں ہو سکی ہے کہ مذکورہ بیماری کے علاج کے لئے حضرت سعدؓ کے جسم کے کس حصے پر داغ دیا گیا تھا۔

ذات الجنب کا علاج

(۲۲) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَتَدَاوٰى مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ بِالْقُسْطِ الْبَحْرِيِّ وَالزَّيْتِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں ہدایت فرمائی کہ ہم ذات الجنب کی بیماری میں قسط بحری اور زیتون کے تیل کے ذریعہ علاج کریں۔" (ترمذیؒ)

(۲۳) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْعَتُ الزَّيْتَ وَالْوَرْسَ مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ذات الجنب کے علاج کے لئے زیتون کے تیل اور ورس کی تعریف کیا کرتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "ورس" ایک قسم کی گھاس کو کہتے ہیں جس کا رنگ زرد مائل بہ سرخ، ہوتا ہے اور اس کے ریشے زعفران کی مانند ہوتے ہیں۔ اور زعفران ہی کی طرح یہ گھاس بھی رنگنے کے کام میں آتی ہے ویسے اطباء نے مختلف بیماریوں کے لئے اس کے بہت فوائد بیان کئے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات الجنب کے علاج کے لئے ان دونوں چیزوں کا استعمال بطریق لدود یعنی منہ میں ٹپکانے کے ذریعہ ہو گا۔"

ثناء بہترین دوا ہے

(۲۴) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَهَا بِمَا تَسْتَمْشِيْنَ قَالَتْ بِالشُّبْرُمِ قَالَ حَارٌّ جَارٌّ قَالَتْ ثُمَّ اسْتَمْشَيْتُ بِالسَّنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ شَيْئًا كَانَ فِيْهِ الشِّفَآءُ مِنَ الْمَوْتِ لَكَانَ فِي السَّنَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم کس چیز سے جلاب (مسہل) لیتی ہو، انہوں نے کہا شبرم سے آپ ﷺ نے فرمایا۔ شبرم تو گرم ہے گرم۔ اسماء کہتی ہیں کہ پھر میں نے ثناء سے جلاب لیا اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر کسی چیز میں موت سے شفا ہوتی، یعنی موت کا علاج کسی دوا میں ہوتا تو وہ ثناء ہوتی۔ (ترمذی، ابن ماجہ) اور ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: "شبرم" ایک گھاس ہے جو دست آور ہے، بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "شبرم" سے اس گھاس کے دانے مراد ہیں جو مسور کے برابر ہوتے ہیں اور اسہال کے لئے ان دانوں کو پانی میں جوش دے کر اس کو پیا جاتا ہے دونوں لفظ "حار" حار کے زبر اور راہ کی تشدید کے ساتھ ہیں، جیسا کہ مشکوۃ کے اکثر صحیح نسخوں اور اصل کتاب یعنی ترمذی و ابن ماجہؒ میں نقل کیا گیا ہے، لیکن بعض حضرات نے دوسرے لفظ کو جیم کے ساتھ یعنی (جار) کو پہلے لفظ (حار) کا "تابع" "مہمل" قرار دیا ہے، جیسا کہ جب کسی لفظ کو زیادہ اہمیت وتاکید کے ساتھ بیان کرنا ہوتا ہے تو اس اصل لفظ کے بعد اس کے مناسب وہم وزن کوئی دوسرا مہمل لفظ بول دیتے ہیں۔ جیسے پادر وادر اور پانی وانی وغیرہ، بہرصورت آنحضرت ﷺ نے اس جملہ کے ذریعہ گویا یہ واضح فرمایا کہ شبرم نہایت گرم ہے اور دست لانے کے لئے اس کو استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ اطباء لکھتے ہیں کہ شبرم حار درجہ چار ہے اور چونکہ اس کا استعمال بہت زیادہ دست لاتا ہے اس لئے

اس میں احتیاط شرط ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کے ذریعہ سناء کی فضیلت و تعریف کو بطور مبالغہ بیان فرمایا گیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ سناء اور خاص طور پر سناء مکی (جو زیادہ بہتر ہے) بڑی عجیب و غریب دوا ہے جس کے فوائد مشہور ہیں اور اطباء اس کو اکثر امراض میں شفا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ضرر و نقصان کا خوف نہیں ہوتا یہ باعتدال ہے اور حار درجہ ایک ہے، صفرا، سودا اور بلغم کے اسہال و تنقیہ کے لئے بہترین چیز ہے اور جرم قلب کو بہت زیادہ طاقت و قوت بخشتی ہے، نیز اس کی جملہ خاصیتوں میں سے ایک بڑی خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ اسواس سوداوی کے لئے فائدہ مند ہے۔

حرام چیزوں کے ذریعہ علاج معالجہ نہ کرو

(۲۵) وَعَنْ اَبِی دَرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ الدَّآءَ وَالدَّوَآءَ وَجَعَلَ لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءً فَتَدَاوَوْا وَلَا تَدَاوَوْا بِحَرَامٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابو دردا کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بیماری بھی اتاری ہے اور دوا بھی، اور ہر بیماری کے لئے دوا بھی، اور ہر بیماری کے لئے دوا مقرر کی ہے لہٰذا تم دوا سے بیماری کا علاج کرو، لیکن حرام چیز سے دوا علاج نہ کرو۔" (ابوداؤد)

تشریح: "حرام چیز سے مراد وہ شراب، خنزیر اور ان جیسی وہ چیزیں ہیں جن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔" علاج معالجہ کے طور پر مطلق کسی بھی حرام چیز اور خاص طور پر شراب کو اختیار کرنے کی حرمت و کراہت کے سلسلے میں متعدد احادیث منقول ہیں۔ جن سے حرام چیزوں کے ذریعہ علاج معالجہ کرنے کی ممانعت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں کا استعمال قطعاً لاحاصل رہے گا۔ کیونکہ ان کے ذریعہ حصول شفا ممکن نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری شفا ان چیزوں میں نہیں رکھی جن کو تمہارے لئے حرام قرار دیا گیا ہے، اسی طرح منقول ہے کہ ایک صحابیؓ حضرت طارق جعفیؓ نے نبی کریم ﷺ سے شراب بنانے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور جب انہوں نے کہا کہ میں دوا کے طور پر شراب استعمال کرنے کے لئے بناتا ہوں تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا، شراب دوا نہیں ہے بلکہ وہ درد و مرض ہے نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ من تداوی بالخمر فلا شفا اللّٰہ ۔یعنی جو شخص شراب کے ذریعہ علاج معالجہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو شفا نہیں دے گا۔ تاہم بعض فقہی روایت میں یہ اجازت دی گئی ہے کہ اگر کسی مرض کے بارے میں قابل اعتماد اور حاذق اطباء معالجین کا اس پر اتفاق ہو کہ اس کا علاج شراب کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے تو اس مرض میں شراب کے بطور دوا استعمال کرنا جائز ہے، لیکن یہ بات بجائے خود تقریباً ناممکن ہوگی کیونکہ اول تو قابل اعتماد اور حاذق اطباء کا پایا جانا اور دوسرے ان اطباء کا اس بات پر اتفاق کر لینا کہ اس مرض کا علاج صرف شراب پر منحصر ہے کچھ آسان نہیں ہے۔

جس دوا کو طبیعت قبول نہ کرے وہ زیادہ کارگر نہیں ہوتی

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الدَّوَآءِ الْخَبِیْثِ۔

(رواہ احمد والبوداؤد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خبیث دوا سے منع فرمایا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایسی دوا استعمال کرنے سے منع فرمایا جو نجس و ناپاک یا حرام ہو یا "خبیث" سے وہ دوا مراد ہے جو بدمزہ اور بدبودار ہو کہ جس کے استعمال سے طبیعت نفرت کرتی ہے، چنانچہ ایسی دوا بھی بہتر نہیں سمجھی جاتی کیونکہ جس دوا کو طبیعت قبول نہیں کرتی اس کی افادیت کم ہو جاتی ہے اس اعتبار سے حدیث میں مذکورہ نفرت کا تعلق نہی تنزیہی سے ہوگا۔

سر اور پاؤں کے درد کا علاج

(۲۷) وَعَنْ سَلْمٰی خَادِمَةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَتْ مَاکَانَ اَحَدٌ یَشْتَکِیْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَجَعًا فِیْ رَاْسِہٖ اِلَّا قَالَ احْتَجِمْ وَلَا وَجَعًا فِیْ رِجْلَیْہِ اِلَّا قَالَ اخْتَضِبْھُمَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سلمیٰؓ جو نبی کریم ﷺ کی خادمہ تھیں کہتی ہیں کہ جب ہم میں سے کوئی شخص نبی کریم ﷺ سے سر کی (ایسی) بیماری کی شکایت کرتا (جس کا تعلق خون کی زیادتی و دباؤ سے ہوتا) تو آپ ﷺ فرماتے کھجری ہوئی سینگی کھچواؤ، اور جو شخص پاؤں کے درد کی شکایت کرتا یعنی ایسا درد جو گرمی حرارت کی بنا پر ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے کہ پیروں پر مہندی لگالو!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ویسے تو یہ حدیث مطلق ہے کہ اس کے حکم میں مرد عورت، دونوں شامل ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ مرد صرف تلووں پر مہندی لگا لینے پر اکتفا کرے۔ اور ناخونوں پر لگانے سے اجتناب کرے تاکہ عورتوں کی مشابہت سے حتیٰ الامکان احتراز ہونا چاہئے۔"

زخم کا علاج

(۲۸) وَعَنْھَا قَالَتْ مَاکَانَ یَکُوْنُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَرْحَةٌ وَلَا نَکْبَةٌ اِلَّا اَمَرَنِیْ اَنْ اَضَعَ عَلَیْھَا الْحِنَّاءَ۔ (رواہ ترمذی)

"اور حضرت سلمیٰؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے جسم کے کسی حصہ پر) جب بھی کوئی زخم آجاتا (خواہ وہ تلوار، چھری، یا اور کسی ایسی چیز کے کٹ جانے کی صورت میں ہوتا) یا پتھر اور کانٹے سے آپ ﷺ زخمی ہوجاتے تو مجھ کو حکم دیتے کہ میں اس زخم پر مہندی (کی چھٹس) رکھ دوں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مہندی کی تاثیر چونکہ سرد ہے اور جلدی امراض کو نافع ہے اس لئے اس کی برودت زخم کی گرمی اور سوزش کو ختم کر دیتی ہے۔

سینگی کھنچوانے کا ذکر

(۲۹) وَعَنْ اَبِیْ کَبْشَةَ الْاَنْمَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَحْتَجِمُ عَلٰی ھَامَتِہٖ وَبَیْنَ کَتِفَیْہِ وَھُوَ یَقُوْلُ مَنْ اَھْرَاقَ مِنْ ھٰذِہِ الدِّمَآءِ فَلَا یَضُرُّہٗ اَنْ لَّا یَتَدَاوٰی بِشَیْءٍ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت کبشہ انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے سر مبارک پر اور اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان بھری ہوئی سینگیاں کھنچواتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ان خونوں میں سے کچھ نکال دیا کرے اور پھر وہ کسی بیماری کا علاج نہ کرے تو اس کو کوئی نقصان وضرر نہیں پہنچے گا۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: احتمال ہے آپ ﷺ کبھی تو سر مبارک پر سینگی کھنچواتے ہوں گے اور کبھی دونوں مونڈھوں کے درمیان۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایک ساتھ دونوں جگہ سینگی کھنچواتے ہوں۔

ان خونوں میں سے کچھ نکال دیا کرے۔ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "خون" سے مراد مذکورہ دونوں عضو کا خون ہے لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ مطلق فاسد خون مراد ہو، یعنی جسم کے جس حصہ میں بھی فاسد خون جمع ہوگیا ہو اس کو نکلوا دینا چاہئے۔

(۳۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ احْتَجَمَ عَلٰی وَرِکِہٖ مِنْ وَثْأٍ کَانَ بِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے کولہے پر بھری ہوئی سینگی کھنچوائی کیونکہ آپ ﷺ کے پائے مبارک پر موچ آگئی تھی!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "وَثَاءٌ" واؤ کے زبر اور ثاء کے جزم کے ساتھ، اس درد اور چوٹ کو کہتے ہیں جو کسی عضو کو اس ہڈی ٹوٹے بغیر پہنچے جس کو ہماری زبان میں "موچ" کہا جاتا ہے۔

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ حَدَّثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لَيْلَةٍ اُسْرِيَ بِهٖ اَنَّهٗ لَمْ يَمُرَّ عَلٰى مَلَاءٍ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِلَّا اَمَرُوْهُ مُرْ اُمَّتَكَ بِالْحِجَامَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے شب معراج کے واقعات بتاتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ آپ ﷺ ملائکہ کی جس جماعت کے پاس سے گزرے اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا کہ آپ اپنی امت کو پچھنے لگوانے کا حکم دیں۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: پچھنے کی یہ اہمیت و فضیلت اس بنا پر ہے کہ فساد خون کی وجہ سے بہت زیادہ امراض پیدا ہوتے ہیں جن کو امراض دموی کہتے ہیں، امراض دموی کا سب سے بڑا علاج خون نکلوانا ہے، نیز خون نکلوانے کے دوسرے طریقوں کی بہ نسبت پچھنے کو زیادہ پسند اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ وہ خون کو نواحی جلد سے خارج کرتا ہے چنانچہ تمام اطباء اس کے قائل ہیں کہ گرم آب و ہوا میں رہنے والوں کو فصد کے مقابلہ پر پچھنے لگوانا زیادہ مفید رہتا ہے کیونکہ ان لوگوں کا خون رقیق اور پختہ ہوتا ہے جو سطح بدن پر آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس خون کو پچھنے ہی کے ذریعہ سے نکالا جاسکتا ہے۔ نہ کہ فصد کے ذریعہ۔

"امت" سے مراد اہل عرب ہیں جو آنحضرت کے زمانہ میں موجود تھے یا "امت" سے آنحضرت ﷺ کی قوم و وطن کے لوگ مراد ہوسکتے ہیں، نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "یہاں" "امت" کا عام مفہوم مراد ہے یعنی آنحضرت ﷺ کی پوری امت میں سے ہر وہ شخص مراد ہے جس کو خون نکلوانے کی ضرورت لاحق ہو۔

مینڈک کی دوا بنانے کی ممانعت

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عُثْمَانَ اَنَّ طَبِيْبًا سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ضِفْدَعٍ يَجْعَلُهَا فِيْ دَوَاءٍ فَنَهَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عثمانؓ سے روایت ہے کہ ایک طبیب نے نبی کریم ﷺ سے مینڈک کو دوا میں شامل کرنے کے بارے میں پوچھا کہ یہ درست ہے یا نہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے اس کو مینڈک کے مارنے سے منع فرمایا!" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "مینڈک کے مارنے سے منع فرمایا" کا مطلب یہ ہے کہ مینڈک کو مار ڈالنے اور پھر اس کو دوا میں شامل کرنے سے منع فرمایا اس وضاحت سے سوال و جواب کے درمیان مطابقت ہو جاتی ہے اس بات کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو جامع میں منقول ہے کہ نهى عن القتل الصفدع للدواء یعنی آنحضرت ﷺ نے دوا بنانے کے لئے مینڈک مارنے سے منع فرمایا۔"

قاضیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا مینڈک کے مارنے سے منع کرنا شاید اس بنا پر تھا کہ آپ ﷺ نے مینڈک کی دوا بنانے کو مناسب نہیں سمجھا اور یہ مناسب نہ سمجھنا یا تو مینڈک کے "نجس و حرام ہونے کی وجہ سے تھا کہ نجس و حرام چیزوں کے ذریعہ علاج کرنا جائز نہیں ہے یا اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ مینڈک سے طبیعت کراہت و تنفر محسوس کرتی ہے اور جس چیز سے طبیعت نفرت کرے اس کو دوا کے طور پر استعمال کرنا لاحاصل ہے اور یہ کہ طبیب نے مینڈک میں جو فوائد سمجھے ہوں گے اس کے مقابلہ پر آنحضرت ﷺ نے اس کی مضرت زیادہ دیکھی ہوگی اس لئے آپ نے اس کی دوا بنانے کو مناسب نہیں سمجھا۔

آنحضرت ﷺ کے پچھنے لگوانے کا ذکر

(۳۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْتَجِمُ فِي الْاَخْدَعَيْنِ وَالْكَاهِلِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَزَادَ

التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَکَانَ یَحْتَجِمُ لِسَبْعَ عَشْرَۃَ وَتِسْعَ عَشْرَۃَ وَاِحْدٰی وَعِشْرِیْنَ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ گردن کی دونوں رگوں میں مونڈھوں کے درمیان بھری ہوئی سینگی کھنچواتے تھے (ابوداؤدؒ) ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے یہ عبارت بھی نقل کی ہے کہ اور آنحضرت ﷺ سترھویں انیسوی، اور اکیسویں تاریخ کو سینگی کھنچواتے تھے۔"

پچھنے لگوانے کے دن

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَسْتَحِب الحِجَامَۃَ لِسَبْعِ عَشْرَۃَ وَتِسْعَ عَشْرَۃَ وَاِحْدٰی وَعِشْرِیْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سترھویں، انیسویں اور اکیسویں تاریخ کو سینگی کھنچوانا ناپسند فرماتے تھے۔" (شرح السنۃ)

(۳۵) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ احْتَجَمَ لِسَبْعَ عَشْرَۃَ وَتِسْعَ عَشْرَۃَ وَاِحْدٰی وَعِشْرِیْنَ کَانَ شِفَآءً مِنْ کُلِّ دَآءٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص سترھویں، انیسویں، اور اکیسویں تاریخ کو سینگی کھنچوائے گا اس کو ہر بیماری سے شفا ہوتی ہے؟" (ابوداؤدؒ)

(۳۶) وَعَنْ کَبْشَۃَ بِنْتِ اَبِی بَکْرَۃَ اَنَّ اَبَاهَا کَانَ یَنْهٰی اَهْلَہٗ عَنِ الْحِجَامَۃِ یَوْمَ الثُّلٰثَاءِ وَیَزْعَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ یَوْمَ الثُّلٰثَاءِ یَوْمُ الدَّمِ وَفِیْہِ سَاعَۃٌ لَا یَرْقَأُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت کبشہؓ بنت ابی بکرہ سے روایت ہے کہ ان کے باپ اپنے گھر والوں کو منگل کے دن سینگی لگوانے سے منع کرتے تھے اور رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے تھے کہ منگل کا دن خون کے غلبہ کا دن ہے اور اس دن ایسی گھڑی آتی ہے خون بند نہیں ہوتا (لہٰذا اس دن خون نکلوانے کی صورت میں یہ ہوسکتا ہے کہ وہی گھڑی پڑجائے اور خون رکنے کا نام نہ لے جس سے ہلاکت بھی واقع ہوسکتی ہے)۔" (ابوداؤدؒ)

(۳۷) وَعَنِ الزُّهْرِیِّ مُرْسَلاً عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَجَمَ یَوْمَ الْاَرْبِعَاءِ اَوْ یَوْمَ السَّبْتِ فَاَصَابَہٗ وَضح فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَہٗ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ وَقَدْ اُسْنِدَ وَلَا یَصِحُّ۔

"اور حضرت زہری تابعیؒ نبی کریم ﷺ سے بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، جو شخص ہفتہ کے دن یا بدھ کے دن سینگی کھنچوائے اور پھر اس کو کوڑھ کی بیماری لگ جائے تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے (ابوداؤدؒ، احمدؒ) اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ حدیث (ایک روایت میں) مسند بیان کی گئی ہے، (یعنی وہ روایت راویوں کے اعتبار سے متصل ہے اور وہ اسناد صحیح نہیں ہے)۔"

تشریح: اگرچہ اس دوسری روایت مسند کو صحیح نہیں کہا گیا ہے لیکن اس کے ذریعہ اس مرسل حدیث کو تقویت وتائید حاصل ہوتی ہے اور ویسے بھی مرسل حدیث حنفیہ اور دیگر اصحاب جرح تعدیل کے نزدیک حجت (یعنی قابل عمل ہوتی ہے۔

(۳۸) وَعَنْہُ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَجَمَ اَوِ اطَّلٰی یَوْمَ السَّبْتِ اَوِ الْاَرْبِعَاءِ فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَہٗ فِی الْوَضَحِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت زہریؒ بطریق ارسال کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص ہفتہ یا بدھ کے دن بھری ہوئی سینگی کھنچوائے یا (اپنے بدن کے کسی عضو پر) لیپ کرے تو وہ کوڑھ مبتلا ہوجانے کی صورت میں اپنے آپ کو ملامت کرے۔" (شرح السنۃ)

ٹوٹکہ کی ممانعت

(۳۹) وَعَنْ زَیْنَبَ امْرَاَۃِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰہِ رَاٰی فِیْ عُنُقِیْ خَیْطًا فَقَالَ مَا هٰذَا فَقُلْتُ خَیْطٌ رُقِیَ لِیْ فِیْہِ قَالَتْ

فَاَخَذَهٗ فَقَطَعَهٗ ثُمَّ قَالَ اَنْتُمْ اٰلَ عَبْدِ اللّٰهِ لَاَغْنِيَآءُ عَنِ الشِّرْكِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ فَقُلْتُ لِمَ تَقُوْلُ هٰكَذَا لَقَدْ كَانَتْ عَيْنِيْ تَقْذِفُ وَكُنْتُ اَخْتَلِفُ اِلٰى فُلَانِ الْيَهُوْدِيِّ فَاِذَا رَقَاهَا سَكَنَتْ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ اِنَّمَا ذٰلِكَ عَمَلُ الشَّيْطَانِ كَانَ يَنْخَسُهَا بِيَدِهٖ فَاِذَا رُقِيَ كَفَّ عَنْهَا اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكِ اَنْ تَقُوْلِيْ كَمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَذْهِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَاشِفَاءَ اِلَّاشِفَاؤُكَ شِفَآءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی بیوی زینبؓ کہتی ہیں کہ ایک دن حضرت عبداللہ نے میری گردن میں تاگا پڑا ہوا دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ تاگا ہے جس پر میرے لئے منتر پڑھا گیا ہے (یعنی جو کچھ منتروں کے ذریعہ اس تاگے کا گنڈہ بنوا کر میں نے اپنے گلے میں ڈال لیا ہے)۔ زینبؓ کہتی ہیں کہ حضرت عبداللہ نے (یہ سن کر) اس تاگے کو (میری گردن سے) نکال لیا اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور پھر کہا کہ اے عبداللہؓ کے گھر والو، تم شرک سے بے پرواہ ہو، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بلاشبہ منتر منکے، اور ٹوٹکے شرک ہیں۔ میں نے کہا آپ یہ بات کس طرح کہہ رہے ہیں (یعنی آپ گویا منتر سے اجتناب کرنے اور توکل کو اختیار کرنے کی تلقین کر رہے ہیں جب کہ مجھ کو منتر سے بہت فائدہ ہوا ہے)۔ چنانچہ میری آنکھ (درد کے سبب) نکلی پڑی تھی اور میں فلاں یہودی کے ہاں آیا جایا کرتی تھی اس یہودی نے جب منتر پڑھ کر آنکھ کو دم کیا تو آنکھ کو آرام مل گیا۔ حضرت عبداللہ نے کہا کہ (یہ تمہاری نادانی و غفلت ہے) اور وہ درد اس کا اچھا ہو جانا منتر کے سبب سے نہیں تھا بلکہ (حقیقت میں) وہ شیطان کا کام تھا، شیطان تمہاری آنکھ کو کونچتا تھا (جس سے تمہیں درد محسوس ہوتا تھا) پھر جب منتر پڑھا گیا تو (چونکہ وہ ایک شیطان کا کام تھا اس لئے) شیطان نے کونچنا چھوڑ دیا۔ تمہارے لئے وہ دعا بالکل کافی تھی جو رسول کریم ﷺ پڑھا کرتے تھے کہ۔ اَذْهِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَاشِفَاءَ اِلَّاشِفَاؤُكَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا (یعنی اے لوگوں کے پروردگار! تو ہماری بیماری کو کھو دے اور شفا عطا فرما (کیونکہ) تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا کے علاوہ شفا نہیں ہے، ایسی شفا جو بیماری کو باقی نہ چھوڑے!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "تم شرک سے بے پرواہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان و اسلام کی دولت دے کر کفر شرک سے دور کر دیا ہے، لہٰذا تمہیں اس چیز کی حاجت نہیں ہے کہ تم اپنی بیماریوں اور مضرتوں کو ختم کرنے کے لئے ایسے افعال و ذرائع اختیار کرو جو شرک میں مبتلا کر دیتے ہیں اور شرک کو متضمن ہیں۔ حضرت عبداللہ نے یہ بات اس بناء پر فرمائی کہ اس زمانہ میں جھاڑ پھونک اور تعویز گنڈے کے لئے جو منتر و افسوں کئے جاتے تھے وہ مشرکانہ مضامین پر مشتمل ہوتے تھے۔ ملا علی قاریؒ نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ یہاں شرک سے مراد یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ یہ عمل یعنی جھاڑ پھونک وغیرہ بیماری و مضرت کو دفع کرنے کا ایک قوی سبب ہے اور خود اس میں تاثیری طاقت ہے اس صورت میں یہ شرک خفی ہوگا اور یہ اعتقاد ہو کہ یہ چیز بذات خود مؤثر حقیقی ہے تو یہ شرک جلی کہلائے گا۔

جس منتر کو شرک کہا گیا ہے اس سے وہ منتر اور جھاڑ پھونک مراد ہے جس میں بتوں، دیویوں، اور شیاطین کے نام لئے گئے ہوں جو کفریہ کلمات اور ایسی چیزوں پر مشتمل ہو جس کو شریعت نے جائز قرار نہ دیا ہو، نیز اس حکم میں ایسے منتر و افسوں بھی داخل ہیں جن کے معنی معلوم نہ ہوں۔

"تمائم" تمیمہ کی جمع ہے، اور تمیمہ ان تعویذ کو کہتے ہیں جو گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔ یہاں وہ تعویز مراد ہے جس میں اسماء الٰہی، قرآنی آیات اور منقول دعائیں نہ ہوں! اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ تمیمہ منکے کو کہتے ہیں یعنی عرب میں عورتیں چتکبرے مہروں کو جوڑ کر بچوں کے گلے میں ڈال دیتی تھیں اور یہ عقیدہ رکھتی تھیں اس کی وجہ سے بچوں کو نظر نہیں لگتی، اسی کو تمیمہ کہتے ہیں۔

"تِوَلَة" ایک قسم کے ٹوٹکے کو کہتے ہیں جو مرد و عورت کے درمیان محبت قائم کرنے کے لئے دھاگے یا کاغذ تعویذ کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

"بلاشبہ منتر منکے" اور ٹوٹکے شرک ہیں۔ کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب عملیات اور کام وہ ہیں جو اہل شرک کرتے ہیں اور یہ چیزیں

شرک خفی یا شرک جلی کے ضمن میں آتی ہیں جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔

"بلکہ شیطان کا کام تھا"۔ یعنی تمہاری آنکھ میں جو درد تھا۔ وہ حقیقۃً درد نہیں تھا۔ بلکہ شیطان کی ان ایذا رسانیوں میں سے ایک ایذا رسانی تھی جس میں وہ انسان کو مبتلا کرتا رہتا ہے۔

"نشرہ" شیطان کا کام ہے

(۴۰) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النُّشْرَةِ فَقَالَ هُوَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے نشرہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ وہ شیطانی کام ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "نُشْرَہ" ایک قسم کا سفلی عمل ہے جو آسیب کے دفعیہ کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ نشرہ ایک رقیہ یعنی منتر ہے جس کے ذریعہ مجنون و مریض کا علاج کیا جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ نشرہ کے لفظی معنی منتر یا تعویز کے ہیں، لہٰذا جس نشرہ کو شیطان کا کام فرمایا گیا ہے اس سے مراد وہ منتر ہوگا جو اسماء الٰہی، قرآن اور منقول دعاؤں پر مشتمل نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ زمانہ جاہلیت کے ان عملیات میں سے ایک عمل تھا جو بتوں اور شیاطین کے اسماء اور ان سے اعانت پر مشتمل ہوتے تھے، یا اس منتر کے الفاظ عبرانی زبان کے ہوں گے کہ جن کے معنی معلوم نہ ہوں گے۔

لاپرواہ لوگوں کے کام

(۴۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا اُبَالِیْ مَا اَتَيْتُ اِنْ اَنَا شَرِبْتُ تِرْيَاقًا اَوْ تَعَلَّقْتُ تَمِيْمَةً اَوْ قُلْتُ الشِّعْرَ مِنْ قِبَلِ نَفْسِیْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں ہر عمل سے لاپرواہ ہوں اگر میں تریاق پیوں یا گلے میں منکا ڈالوں اور یا میں اپنے دل سے اور اپنے قصد و ارادہ سے شعر لکھوں (یعنی اشعار بناؤں)۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر ان چیزوں میں سے کوئی بھی چیز مجھ سے سرزد ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میرا شمار ان لوگوں میں سے ہو جو ہر عمل سے لاپرواہ ہوتے ہیں یعنی وہ کسی بھی کام کو کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ آیا ان کو یہ کام کرنا چاہئے یا نہیں، نتیجۃً وہ نامشروع افعال و حرکات سے پرہیز نہیں کرتے۔ گویا اس ارشاد گرامی سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ان چیزوں کو اختیار کرنا اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے۔ جو نامناسب چیزوں اور غیر مشروع اعمال کو اختیار کرنے کے غیر پابند اور لاپرواہ ہوتے ہیں۔

مذکورہ چیزوں کے استعمال کو آنحضرت ﷺ نے اس لئے مذموم سمجھا کہ تریاق میں تو سانپ کا گوشت اور شراب پڑتی تھی اور یہ چیزیں حرام ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جس تریاق کے اجزاء ترکیبی حرام چیزوں پر مشتمل نہ ہوں اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اگرچہ بعض حضرات نے حدیث کے مطلق مفہوم پر عمل کرنے کے پیش نظر اس کے ترک کو بھی اولیٰ قرار دیا ہے، اسی طرح تمیمہ یعنی منکے اور گنڈے سے وہ چیزیں مراد ہیں جن کو زمانہ جاہلیت کے لوگ جھاڑ پھونک اور عملیات کے ضمن میں استعمال کرتے تھے، لہٰذا ایسے تعویز اور گنڈے وغیرہ جو اسماء الٰہی اور آیات قرآنی وغیرہ پر مشتمل ہوں وہ حکم سے خارج ہیں۔ بلکہ ان کا مستحب ہونا ثابت ہے اور ان کی برکت سے حصول مقصد کی ایک امید کی جا سکتی ہے جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کے نزدیک اس کا مذموم ہونا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِیْ لَهٗ کی بناء پر تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ خود کوئی شعر نہیں کہتے تھے بلکہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو شعر گوئی سے پاک و منزہ رکھا تھا، اسی لئے آپ ﷺ شعر کہنے پر قادر ہی نہیں تھے۔ اور یہ بات ہے کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے بے ساختہ اور بلا قصد و ارادہ جو موزوں و مقفیٰ جملے ادا ہوتے تھے اور آپ ﷺ کا کلام جس فصاحت و بلاغت سے بھرپور ہوتا تھا وہ بذات

خود وصف شعر گوئی سے کہیں اعلیٰ معیار کی چیز ہوتی تھی، مگر ظاہر ہے کہ یہ چیز نہ تو شعر کہنے کے زمرے میں آتی ہے اور نہ یہ مذموم ہے اور ویسے بھی اہل فن و اصطلاح اس پر بے ساختہ اپنے کلام میں دوسروں کے اشعار استعمال کرنے کے باوصف آپ ﷺ کا خود شعر کہنے پر قادر نہ ہونا آپ ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے حق میں اشعار اور شعر گوئی کی حیثیت دوسرے اصناف سخن و کلام کی طرح ہے کہ اچھے مضامین کو اشعار کا جامہ پہنانا اور صالح و پاکیزہ خیالات کو شعر گوئی کے ذریعہ ظاہر کرنا اچھا ہے اور برے مضامین اور گندے خیالات پر مشتمل شعر گوئی کرنا برا ہے تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ اس صورت میں بھی اپنے باطن کو شعر گوئی ہی کی طرف متوجہ کر لینا، اسی میں عمر کو ضائع کرنا اور اس میں اتنا زیادہ انہماک و تفکر اختیار کرنا کہ ان دینی امور میں رکاوٹ اور نقصان پیدا ہو جو ضروری اور واجب ہیں یقیناً مذموم ہوگا۔

ابن ملکؒ نے اس حدیث کی وضاحت میں کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ شعر کہنا، تریاق پینا اور گلے میں تعویذ و گنڈے لٹکانا میرے لئے حرام ہے البتہ اُمت کے حق میں نہ تو شعر گوئی حرام ہے اور نہ گلے میں تعویذ و گنڈے لٹکانا حرام ہے، بشرطیکہ اس شعر گوئی کے ذریعہ کسی مسلمان کی ہجو نہ کی گئی اور نہ وہ اشعار جھوٹ اور بری باتوں پر مشتمل ہوں اور نہ ہی وہ تعویذ و گنڈے غیر مشروع عملیات سے متعلق ہوں اسی طرح اُمت کے حق میں وہ تریاق بھی حرام نہیں ہے جس میں کوئی حرام چیز جیسے سانپ کا گوشت وغیرہ شامل نہ ہو۔

جھاڑ پھونک وغیرہ توکل کے منافی

(۴۲) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اكْتَوٰى اَوِ اسْتَرْقٰى فَقَدْ بَرِئَ مِنَ التَّوَكُّلِ۔

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے داغ دلوایا، یا منتر پڑھوایا تو وہ توکل سے بری ہوا۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی مرض کے لئے جسم کے کسی حصّہ پر داغ لینا یا کسی ضرورت و حاجب کی صورت میں جھاڑ پھونک اور تعویز گنڈے کرانا، اگرچہ مباح ہے لیکن توکل اور اعتماد علی اللہ کا جو مرتبہ و مقام ہے وہ اس سے بلند و بالا ہے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنِيْنَ لہٰذا اسباب و ذرائع کے اختیار کرنے میں زیادہ انہماک و رغبت گویا رب الارباب سے غافل ہو جانے کی دلیل ہے اسی لئے امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کہیں جانے کے لئے اپنے مکان کے دروازوں کو دو تالوں سے مقفل کرنے یا ایک تالا ڈالے اور پھر اپنے پڑوسی سے بھی مکان کی حفاظت و نگرانی کے لئے کہے تو وہ توکل کے دائرے سے نکل گیا۔

(۴۳) وَعَنْ عِيْسَى ابْنِ حَمْزَةَ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُلَيْمٍ وَبِهٖ حُمْرَةٌ فَقُلْتُ اَلَا تُعَلِّقُ تَمِيْمَةً فَقَالَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِلَ اِلَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عیسیٰ ابن حمزہؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت عبداللہ بن عکیم کے پاس گیا تو دیکھا کہ ان کا بدن سرخی کی بیماری میں مبتلا تھا میں نے کہا کہ آپ تعویز کیوں نہیں باندھ لیتے؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کام سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے جو شخص کوئی چیز لٹکاتا ہے یا (باندھتا ہے) تو اسی چیز کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: طیبیؒ کے قول کے مطابق بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے تعویذ باندھنے سے خدا کی پناہ چاہی تھی کیونکہ وہ مقام توکل و رضا پر فائز تھے اور انہوں نے تعویز باندھنے کو مرتبہ توکل کے منافی سمجھا۔ اگرچہ دوسروں کے لئے یہ جائز ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تعویز باندھتا ہے یا گنڈا ڈالتا ہے اور جھاڑ پھونک وغیرہ جیسے عملیات کا سہارا

لیتا ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یہ چیزیں فائدہ مند ہیں اور ضرر کو دفع کرتی ہیں تو اس کو اس حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور انہی چیزوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے یعنی اس کو حق تعالیٰ کی مدد اعانت سے محروم کر دیا جاتا ہے اور وہ شفا نہیں پاتا کیونکہ ذات حق تعالیٰ کے علاوہ نہ کوئی چیز فائدہ دیتی ہے اور نہ نقصان پہنچاتی ہے۔ گویا اس ارشاد گرامی ﷺ کا مقصد تفویض و توکل کی طرف راغب کرنا ہے۔

جھاڑ پھونک کے اثر کا ذکر

(۴۴) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا رُقْيَةَ اِلَّا مِنْ عَيْنٍ اَوْحُمَةٍ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ بُرَيْدَةَ۔

"اور حضرت عمران ابن حصین ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ منتر یعنی جھاڑ پھونک کا اثر تو بس نظر یا زہردار جانور (جیسے بچھو وغیرہ کے) ڈنگ ہی پر ہوتا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد) اور ابن ماجہ ؒ نے اس روایت کو حضرت بریدہ ؓ سے نقل کیا ہے۔"

(۴۵) وَعَنْ اَنَسٍ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا رُقْيَةَ اِلَّا مِنْ عَيْنٍ اَوْحُمَةٍ اَوْدَمٍ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت انس ؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا منتر تو بس نظر یا زہریلے ڈنک اور خون پر اثر کرتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس سے پہلی حدیث میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے گویا اس حدیث میں "خون" کا لفظ مزید نقل کیا گیا ہے۔ علماء نے خون سے نکسیر کا خون مراد لیا ہے اور اگر لفظ خون کو اس کے عمومی مفہوم پر محمول کیا جائے یعنی یوں کہا جائے کہ خون سے وہ تمام امراض مراد ہیں جو خون کے سبب سے لاحق ہوتے ہیں کہ خواہ ان کا تعلق، خون کی روانی، دباؤ اور غلبہ سے ہو، اور خواہ فساد خون سے تو یہ بھی صحیح ہوگا۔

"ابوداؤد" کی ایک روایت میں۔ اِلَّا فِي عَيْنٍ کے بجائے اِلَّا فِي نَفْسٍ کے الفاظ منقول ہیں، لیکن علماء نے کہا ہے کہ "نفس سے مراد" عین یعنی نظر ہی ہے اسی طرح اَوْدَمٍ کے بجائے اَوْلَدْغَةٍ کے الفاظ منقول ہیں۔ جن کے معنی دانتوں سے کاٹنے کے ہیں، جیسا کہ سانپ اور اس طرح کے دوسرے جانور دانتوں کے ذریعہ ڈستے ہیں اور کاٹتے ہیں۔

واضح رہے کہ جھاڑ پھونک اور عملیات کے ذریعہ علاج معالجہ کرنا درد سر دانتوں کے درد جیسی تقریباً ہر بیماری کے لئے فائدہ مند ہے جس کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے، نیز بخاریؒ و مسلمؒ کی روایت میں منقول ہے کہ جب آنحضرت ﷺ بیمار تھے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ دَآءٍ يُؤْذِيْكَ۔ لہٰذا مذکورہ بالا حدیثوں میں جھاڑ پھونک کے اثر کو محض تین چیزوں میں منحصر کرنا دراصل مبالغہ کے طور پر ہے اور مراد یہ ہے کہ دوسری چیزوں کی بہ نسبت ان تین چیزوں میں جھاڑ پھونک زیادہ فائدہ مند اور بہتر ہے۔ جیسا کہ عام طور پر لوگ انہی چیزوں میں عملیات کا سہارا زیادہ لیتے ہیں۔

تیز نظر کا ذکر

(۴۶) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ وُلْدَ جَعْفَرٍ تَسْرِعُ اِلَيْهِمُ الْعَيْنُ اَفَاَسْتَرْقِيْ لَهُمْ قَالَ نَعَمْ فَاِنَّهٗ لَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدْرَ لَسَبَقَتْهُ الْعَيْنُ۔ (رواه احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت اسماء بنت عمیس سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! جعفر طیار ؓ کی اولاد (چونکہ خوبصورت و خوب سیرت ہے اس لئے ان) کو نظر بہت جلدی لگتی ہے تو کیا ان کے لئے منتر پڑھوائیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہاں کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت لے جاسکتی تو وہ نظر ہوتی (یعنی نظر کا اثر یقیناً ایک سخت ترین چیز ہے۔ لہٰذا اس کے دفعیہ کے لئے جھاڑ پھونک کرانا جائز ہے۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: عطاءؒ نے لکھا ہے کہ جس طرح بعض نظر بسبب حسد اور خبث طبع کے نقصان و ضرر پہنچاتی ہے اسی طرح اس کے مقابلہ میں عارفین اور اہل اللہ کی نظر اکسیر کی مانند فائدہ مند ہوتی ہے کہ ان کی ایک نگاہ ہدایت کافر کو مؤمن فاسق کو صالح اور جاہل کو عالم بنادیتی ہے۔

نملہ کا منتر

(۴۷) وَعَنِ الشِّفَاءِ بِنْتِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَتْ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا عِنْدَ حَفْصَةَ فَقَالَ اَلَا تُعَلِّمِيْنَ هٰذِهٖ رُقْيَةَ النَّمْلَةِ كَمَا عَلَّمْتِيْهَا الْكِتَابَةَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت شفاء بنت عبداللہؓ کہتی ہیں (ایک دن) میں اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس بیٹھی تھی کہ رسول کریم ﷺ اندر تشریف لائے اور مجھ کو (دیکھ کر) فرمایا کہ کیا تم ان کو (یعنی حفصہؓ کو) نملہ کا منتر نہیں سکھا دیتیں جس طرح کہ تم نے ان کو لکھنا سکھایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: شفاء۔ عبداللہ ابن شمس کی بیٹی اور قریشی عدوی ہیں ان کا اصلی نام لیلی تھا اور شفاء لقب تھا جو اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام پر غالب آگیا، انہوں نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اونچے درجہ کی عاقلہ فاضلہ عورتوں میں سے تھیں، نبی کریم ﷺ دوپہر کو قیلولہ کے لئے ان کے یہاں تشریف لے جاتے اور وہاں آرام فرماتے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کے لئے بستر اور لنگی کا انتظام کر رکھا تھا تاکہ آرام کے وقت یہ دونوں چیزیں آپ ﷺ کی خدمت میں آئیں۔

"نملہ" کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان پھنسیوں کو نملہ کہتے ہیں جو پسلیوں پر نکلتی ہیں اور بہت تکلیف پہنچاتی ہیں، جو شخص ان پھنسیوں میں مبتلا ہوتا ہے، اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ان پھنسیوں کی جگہ چیونٹیاں رینگ رہی ہوں اور غالباً اسی مناسبت سے ان پھنسیوں کو نملہ چیونٹی کہا جاتا ہے۔ حضرت شفاءؓ مکہ میں اس نملہ کے دفعیہ کے لئے ایک منتر پڑھ کر جھاڑ پھونک کرتی تھیں، جب انہوں نے اسلام قبول کیا اور آنحضرت ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے اور یہ بھی وہاں پہنچیں تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) میں اپنے زمانہ جاہلیت میں نملہ کے دفعیہ کے لئے ایک منتر پڑھا کرتی تھیں، اب چاہتی ہوں کہ وہ منتر پڑھ کر آپ ﷺ کو سناؤں تاکہ آپ ﷺ اس کے بارے میں حکم دیں کہ اس منتر کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس منتر کو سن کر اس کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنے کی اجازت دیدی اور پھر فرمایا کہ یہ منتر حفصہؓ کو بھی سکھا دو۔

"رقیہ نملہ" سے مراد وہ چند کلمات ہیں جو عرب کی عورتوں میں مشہور تھے، جن کو وہ رقیہ نملہ کہتی تھیں ورنہ نملہ کا جو حقیقی منتر تھا وہ تو دراصل خرافات کا مجموعہ تھا جس کو پڑھنے سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمادیا تھا ظاہر ہے کہ آپ ﷺ اس منتر کے سکھانے کا حکم کیوں فرماتے، وہ مشہور کلمات جن کو عرب کی عورتیں رقیہ نملہ کہتی تھیں یہ ہیں۔ العروس تنتعل و تختضب و تکتحل و کل شیء تفتعل غیر انہا و لا تعصی الرجل یعنی دلہن کو چاہئے کہ مانگ چوٹی اور زیب و زینت کرے، ہاتھ پاؤں رنگے، سرمہ لگائے ہر بات کرے مگر مرد کی نافرمانی نہ کرے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا شفاءؓ سے یہ فرمانا کہ حفصہؓ کو نملہ کا منتر سکھا دو حقیقت میں تعریض کے طور پر تھا اور اس کا ایک خاص پس منظر تھا اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت حفصہؓ کو ایک راز کی بات سنائی تھی، لیکن حفصہؓ نے اس کو فاش کر دیا اس کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ تحریم میں بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے شفاء سے مذکورہ ارشاد فرما کر گویا حضرت حفصہؓ کو نصیحت کی اور ان کو متنبہ کیا کہ تم نے میرے بتائے ہوئے راز کو ظاہر کر کے شوہر کی نافرمانی کی ہے جو نہ صرف تمہارے مقام و مرتبہ کے منافی بات ہے بلکہ وفاشعار عورت کی اس خصوصیت کے بھی منافی ہے۔ کہ وہ شوہر کی نافرمانی کرنا گوارا نہیں ہوتی۔

ایک حدیث میں عورتوں کو لکھنا سکھانے کی ممانعت منقول ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ لا تعلم الکتابة اس کے برخلاف،

اس حدیث میں اس کا جواز ثابت ہوتا ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس وقت سے ہو جب کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ممانعت ارشاد نہیں فرمائی تھی گویا ممانعت والی حدیث بعد کی ہے اور یہاں جو حدیث نقل کی گئی ہے وہ پہلے کی ہے۔ بعض حضرات اس بارے میں کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہراتؓ کی ایک خاص حیثیت تھی اس بنا پر بعض احکام و فضائل میں بھی ان کو مخصوص رکھا گیا ہے لہٰذا ممانعت کا تعلق اور تمام عورتوں سے ہے کہ ان کا اس فتنہ و برائی میں مبتلا ہو جانا عین ممکن ہے۔ جو مذکورہ ممانعت کی بنیاد ہے۔ جب کہ ازواج مطہرات کے بارے میں اس طرح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے ان کو لکھنا سیکھنے کی اجازت تھی۔

خطابیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورتوں کو لکھنا سکھانا مکروہ ہے اور ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ یہ احتمال ہے کہ اس وقت یعنی زمانہ رسالت میں عورتوں کو لکھنا سکھانا جائز ہو، لیکن فتنہ و فساد میں مبتلا ہو جانے کے خوف کے سبب سے بعد کی عورتوں کے لئے جائز نہ ہو بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ لکھنا سکھانے کا مذکورہ حکم صرف حضرت حفصہؓ کے لئے تھا، دوسری عورتوں کے لئے نہیں۔

نظر لگنے کا ایک واقعہ

⑱ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ رَاٰى عَامِرُ بْنُ رَبِيْعَةَ سَهْلَ بْنَ حُنَيْفٍ يَغْتَسِلُ فَقَالَ وَاللّٰهِ مَارَاَيْتُ كَالْيَوْمِ وَلَا جِلْدَ مُخْبَاَةٍ قَالَ فَلُبِطَ سَهْلٌ فَاُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ لَهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ لَكَ فِيْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ وَاللّٰهِ مَا يَرْفَعُ رَاْسَهٗ فَقَالَ هَلْ تَتَّهِمُوْنَ لَهٗ اَحَدًا فَقَالُوْا نَتَّهِمُ عَامِرَ بْنَ رَبِيْعَةَ قَالَ فَدَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامِرًا فَتَغَلَّظَ عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَامَ يَقْتُلُ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ اَلَّا بَرَّكْتَ اِغْتَسِلْ لَهٗ فَغَسَلَ لَهٗ عَامِرٌ وَجْهَهٗ وَيَدَيْهِ وَمِرْفَقَيْهِ وَرُكْبَتَيْهِ وَاَطْرَافَ رِجْلَيْهِ وَدَاخِلَةَ اِزَارِهٖ فِيْ قَدَحٍ ثُمَّ صُبَّ عَلَيْهِ فَرَاحَ مَعَ النَّاسِ لَيْسَ لَهٗ بَاْسٌ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَاهُ مَالِكٌ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ قَالَ اِنَّ الْعَيْنَ حَقٌّ تَوَضَّاْ لَهٗ فَتَوَضَّاَ لَهٗ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ ابن سہل ابن حنیف کہتے ہیں کہ (ایک دن) عامر ابن ربیعہؓ نے (میرے والد) سہل ابن حنیفؓ کو نہاتے ہوئے دیکھا۔ تو کہنے لگا کہ خدا کی قسم (سہل کے جسم اور ان کے رنگ و روپ کے کیا کہنے) میں نے تو آج کے دن کی طرح (کوئی خوبصورت بدن کبھی) نہیں دیکھا۔ اور پردہ نشین (خوبصورت عورت) کی بھی کھال (سہلؓ کی کھال جیسی نازک و خوش رنگ) نہیں دیکھی۔ ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ (عامرؓ کا) یہ کہنا تھا کہ ایسا محسوس ہوا (جیسے) سہلؓ کو گرا دیا گیا (یعنی ان کو عامرؓ کی ایسی نظر لگی کہ وہ فوراً غش کھا کر گر پڑے) چنانچہ ان کو اٹھا کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا اور عرض کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) سہلؓ کے علاج کے لئے کیا تجویز کرتے ہیں! خدا کی قسم، یہ تو اپنا سر بھی اٹھانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ آنحضرت ﷺ نے سہلؓ کی حالت دیکھ کر فرمایا کہ کیا کسی شخص کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ اس نے ان کو نظر لگائی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ (جی ہاں) عامر ابن ربیعہؓ کے بارے میں ہمارا گمان ہے کہ انہوں نے نظر لگائی ہے راویؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (یہ سنکر) عامر کو بلایا اور ان کو سخت سست کہا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں مار ڈالنے کے درپے ہوتا ہے، تم نے سہلؓ کو برکت کی دعا کیوں نہیں دی (یعنی اگر تمہاری نظر میں سہل کا بدن اور رنگ و روپ بھا گیا تھا تو تم نے یہ الفاظ کیوں نہ کہے۔ بَارَكَ اللّٰهُ عَلَيْكَ تاکہ ان پر تمہاری نظر کا اثر نہ ہوتا)، پھر آپ ﷺ نے عامرؓ کو حکم دیا کہ (تم سہل کے لئے اپنے اعضاء کو) دھوؤ اور اس پانی کو اس پر ڈال دو۔ چنانچہ عامرؓ نے ایک برتن میں اپنا منہ، ہاتھ، کہنیاں، گھٹنے، دونوں پاؤں کی انگلیوں کے پورے اور زیر ناف جسم (یعنی ستر اور کولھوں) کو دھویا اور پھر وہ پانی جس سے عامرؓ نے یہ تمام اعضاء دھوئے تھے سہلؓ پر ڈالا گیا اس کا اثر یہ ہوا کہ سہل فوراً اچھے ہو گئے اور اٹھ کر لوگوں کے ساتھ اس طرح چل پڑے۔ جیسے ان کو کچھ ہوا ہی نہیں تھا! (شرح السنۃ، مؤطا امام مالکؒ) اور امام مالکؒ کی ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ٹوکنے والے سے فرمایا کہ "نظر بد حق" ہے تم

نظر زدہ کے لئے وضو کرو چنانچہ اس نے نظر زدہ کے لئے وضو کیا۔"

تشریح: نوویؒ کہتے ہیں کہ علماء کے نزدیک نظر زدہ کے لئے نظر لگانے والے کے وضو کی صورت یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ تحقیق ہو کہ اس نے نظر لگائی ہے کہ اس کے سامنے کسی برتن یعنی پیالہ وغیرہ میں پانی لایا جائے اس برتن کو زمین پر نہ رکھا جائے۔ پھر نظر لگانے والا اس برتن میں سے ایک چلو پانی لے کر کلی کرے اور اس کلی کو اسی برتن میں ڈالے پھر اس میں سے پانی لے کر اپنا منہ دھوئے پھر بائیں ہاتھ میں پانی لے کو دائیں کہنی اور دائیں ہاتھ میں پانی لے کر بائیں کہنی دھوئے اور ہتھیلی و کہنی کے درمیان جو جگہ ہے اس کو نہ دھوئے، پھر داہنا پیر اور پھر اس کے بعد بایاں پیر دھوئے پھر اسی طرح پہلے داہنا گھٹنا اور بعد میں بایاں گھٹنا دھوئے اور پھر آخر میں تہبند کے اندر زیر ناف جسم کو دھوئے اور ان سب اعضاء کو اسی برتن میں دھویا جائے ان سب کو دھونے کے بعد اس پانی کو نظر زدہ کے اوپر اس کی پشت کی طرف سے سر پر ڈال کر بہا دے۔ واضح رہے کہ اس طرح کا علاج اسرار و حکم سے تعلق رکھتا ہے۔ جو عقل و سمجھ کی رسائی سے باہر کی چیز ہے۔ لہٰذا اس بارے میں عقلی بحث کرنا لاحاصل ہے۔

مارزیؒ نے کہا ہے کہ مذکورہ اعضاء جسم کو دھونے کا حکم وجوب کے طور پر ہے، لہٰذا نظر لگانے والے کو اس بات پر طاقت کے ذریعہ مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ نظر زدہ کے لئے مذکورہ وضو کرے، نیز انہوں نے کہا ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنا انسانیت سے بعید ہے خاص طور سے اس صورت میں جب کہ نظر زدہ کے ہلاک ہو جانے کا خوف ہو۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص نظر لگانے کے بارے میں مشہور و معروف ہو جائے تو اس سے اجتناب کرنا اور اس کے سامنے آنے میں احتیاط کرنا لازم ہے اور امام سربراہ حکومت کے لئے مناسب ہے کہ وہ ایسے شخص کو لوگوں میں آنے جانے اور بیٹھنے اٹھنے سے روک دے اور اس پر یہ پابندی عائد کر دے کہ وہ اپنے گھر میں ہی رہا کرے، گھر سے باہر نہ نکلا کرے اور اگر وہ شخص محتاج و فقیر ہو کہ اپنی گزر بسر کرنے کے لئے لوگوں کے پاس آنے جانے پر مجبور ہو تو بیت المال سرکاری خزانے سے اس کے لئے بقدر کفایت وظیفہ مقرر کر دے تاکہ وہ گزر اوقات کر سکے۔ حاصل یہ کہ ایسے شخص کا ضرر جذامی کے ضرر سے بھی سخت و شدید ہے لہٰذا اس بارے میں احتیاط لازم ہے امام نوویؒ نے اس قول کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے بالکل صحیح اور ناقابل تردید ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق علماء میں سے کسی کا بھی کوئی اختلافی قول ہمارے علم میں نہیں ہے۔

پناہ مانگنے کا ذکر

(۴۹) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَتَعَوَّذُ مِنَ الْجَآنِّ وَعَیْنِ الْاِنْسَانِ حَتّٰی نَزَلَتِ الْمُعَوِّذَتَانِ فَلَمَّا نَزَلَتْ اَخَذَ بِھِمَا وَتَرَکَ مَاسِوَاھُمَا۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جنات سے اور انسان کا نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ معوذات یعنی سورہ قل اعوذ برب الناس اور سورہ قل اعوذ برب الفلق نازل ہوئیں جب یہ سورتیں نازل ہوئیں تو آپ ان سورتوں کے ذریعہ دعا مانگنے لگے۔ اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں سے پناہ مانگنی چھوڑ دی۔ (ترمذیؒ ابن ماجہؒ) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

(۵۰) وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ رُءِیَ فِیْکُمُ الْمُغَرِّبُوْنَ قُلْتُ وَمَا الْمُغَرِّبُوْنَ قَالَ الَّذِیْنَ یَشْتَرِکُوْنَ فِیْھِمُ الْجِنُّ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَذُکِرَ حَدِیْثُ ابْنِ عَبَّاسٍ خَیْرُ مَاتَدَاوَیْتُمْ فِی بَابِ التَّرَجُّلِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تمہارے اندر (یعنی انسانوں میں) مغربون دکھائی دیتے

ہیں؟ میں نے عرض کیا مغربون کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا...... "مغربون وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ جنات یعنی شیاطین شریک ہوتے ہیں؟ (ابوداؤدؒ) اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت خیر ما تداویتم الخ باب الترجل میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے جماع کرتے وقت خدا کا ذکر نہ کرے یعنی یہ دعا نہ پڑھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا تو اس پر شیطان اثر انداز ہوتا ہے۔ بایں طور کہ شیطان اس کے جسم سے اپنا جسم اور اس کے ستر سے اپنا ستر ملا لیتا ہے اور اسکے ساتھ عورت سے جماع کرتا ہے اس طرح شیطان اس شخص کے نطفہ اور اس کے ہونے والی اولاد میں شریک ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا ہے کہ وَشَارِکْھُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ اس سے معلوم ہوا کہ "مغربون" کے معنی ہیں وہ لوگ جو جماع کے وقت ذکر خداوندی سے روگردانی کرتے ہیں اور اپنے نفس کو ذکر حق سے دور کر دیتے ہیں۔ یا وہ جماع کے وقت ذکر خداوندی سے غفلت اختیار کر کے اور گویا وظیفہ زوجیت میں شیطان کو اپنا شریک بنا کر اپنی پیدا ہونے والی اولاد کو اپنی جنس سے دور کر دیتے ہیں اور اپنی نسل اور اپنے نسب میں گویا اجنبی خون کو شامل کرتے ہیں لہٰذا جماع کا وقت چونکہ سرشاری و غفلت کا وقت ہوتا ہے اس لئے اس موقع پر احتیاط و ہوشیاری اختیار کر کے ذکر خداوندی یعنی مذکورہ دعا پڑھنے سے چوکنا نہ چاہئے تاکہ اس بلاء و فتنہ سے محفوظ رہے۔ واضح رہے کہ آج کل کے ابناء روزگار (افراد انسانی میں) جو عام بے راہ روی، فتنہ و فساد اور مختلف قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں ان کا سبب اس حدیث کی روشنی میں بالکل ظاہر ہے کہ لوگوں نے عام طور پر مذکورہ ہدایت کو فراموش کر کے ذکر خداوندی کو ترک کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ پیدا ہونے والی نسل پوری طرح شیطانی اثرات لئے ہوئے دنیا میں آتی ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں، شیطان کی شرکت کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ان لوگوں کو زنا کی طرف راغب کرتا ہے اور ان کی نظر میں بدکاری کو اچھے سے اچھے روپ میں پیش کرتا ہے جس کی بنا پر وہ اس برائی میں مبتلا ہو کر نالائق اور غیر صالح اولاد کی پیدائش کا ذریعہ بنتے ہیں یا یہ شیطان ان لوگوں کی عورتوں و بیویوں کو زنا کی طرف مائل کرتا ہے اور ان کو غیر مردوں کے ساتھ ملوث کراتا ہے اور اس کے نتیجہ میں نالائق اولاد پیدا ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

معدے کی مثال

(۵۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمَعِدَۃُ حَوْضُ الْبَدَنِ وَالْعُرُوْقُ اِلَیْھَا وَارِدَۃٌ فَاِذَا صَحَّتِ الْمَعِدَۃُ صَدَرَ الْعُرُوْقُ بِالصِّحَّۃِ وَاِذَا فَسَدَتِ الْمَعِدَۃُ صَدَرَتِ الْعُرُوْقُ بِالسَّقَمِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (آدمی کا) معدہ بدن کا حوض ہے اور پیٹ کی رگیں (جو اعضاء جسم سے پیوستہ ہیں) معدہ کی طرف (پانی پینے والے کی طرح) آتی ہیں جب معدہ درست ہوتا ہے تو یہ رگیں معدہ سے صحت بخش رطوبات کے ساتھ اعضاء جسم کی طرف جاتی ہیں (جس سے بدن کو صحت و طاقت حاصل ہوتی ہے) اور جب معدہ خراب ہوتا ہے تو یہ رگیں فاسد رطوبات کے ساتھ اعضاء کی طرف جاتی ہیں (جس سے بدن کو بیماری اور ضعف لاحق ہو جاتا ہے)۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انسان کے بدن اور اس کے معدہ کے درمیان وہی نسبت ہے جو پانی کے تالاب وغیرہ اور درخت کے درمیان ہے کہ جس طرح کسی تالاب کے کنارے یا پانی میں کھڑا ہوا درخت اپنے رگ و ریشہ کے ذریعہ پانی سے حیات بخش رطوبات حاصل کرتا ہے اسی طرح جسم انسانی مختلف رگوں کے ذریعہ اپنے معدہ سے صحت و طاقت کی رطوبات حاصل کرتا ہے چنانچہ اگر پانی صاف و شیریں ہوتا ہے تو وہ درخت کی تازگی اور نشو و نما کا سبب بنتا ہے اور اگر پانی گدلا اور کھارا ہوتا ہے تو وہ درخت کی پژمردگی و خشکی کا باعث بن جاتا ہے۔

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کو طب نبوی پر محمول کیا جائے اس صورت میں مذکورہ بالا ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہوگا کہ انسان کے اقوال و افعال، کردار و عادات اور اخلاق و اطوار اس کی غذا و خوراک کے مطابق ہوتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے پیٹ میں حرام غذا داخل ہوتی ہے تو اس کے اعضاء جسم سے حرام افعال و اقوال صادر ہوتے ہیں اسی طرح اگر کسی شخص کے پیٹ میں کھانے پینے کی فضول و غیر مناسب چیزیں جاتی ہیں تو اس کے جسم کے ہر چھوٹے بڑے عضو سے فضول و غیر مناسب افعال وغیرہ صادر ہوتے ہیں اس کے برخلاف جس شخص کے پیٹ میں حلال و پاک غذائیں جاتی ہیں اس کے اعضاء و جسم سے صالح و پاکیزہ افعال وغیرہ صادر ہوتے ہیں گویا انسان کی غذا اس کے افعال کا تخم ہے اور افعال بمنزلہ روئیدگی کے ہیں اور اس کے پیٹ میں جس طرح کی غذا جائے گی اس کے اعضاء سے اسی طرح کے افعال ظاہر ہوں گے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ اناء یترشح بمافیه یعنی ہر برتن سے وہی چیز ٹپکتی اور نکلتی ہے جو اس کے اندر ہوتی ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ من نبت لحمه من سحت فالنار اولی به۔

بعض محدثین نے اس حدیث کے بارے میں کلام کیا ہے اور بعض حضرات نے تو اس کو موضوع من گھڑت قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ "لا اصل لہ" (یعنی اس حدیث کو کوئی اصل نہیں ہے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کے بارے میں یہ کہنا کہ باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے غیر صحیح بات ہے کیونکہ تعدد طرق کے سبب اور طبرانیؒ و بیہقی کی روایت کی بنا پر اس کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور اس بناء پر اس حدیث کو بلاشک و شبہ حسن یا ضعیف کہا جا سکتا ہے۔

بچھو کے کاٹے کا علاج

(۵۲) وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ بَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَیْلَةٍ یُصَلِّیْ فَوَضَعَ یَدَهٗ عَلَی الْاَرْضِ فَلَدَغَتْهُ عَقْرَبٌ فَنَاوَلَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِنَعْلِهٖ فَقَتَلَهَا فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْعَقْرَبَ مَا تَدَعُ مُصَلِّیًا وَلَا غَیْرَهٗ اَوْ نَبِیًّا وَغَیْرَهٗ ثُمَّ دَعَا بِمِلْحٍ وَمَآءٍ فَجَعَلَهٗ فِیْ اِنَاءٍ ثُمَّ جَعَلَ یَصُبُّهٗ عَلٰی اِصْبَعِهٖ حَیْثُ لَدَغَتْهُ وَیَمْسَحُهَا وَیُعَوِّذُهَا بِالْمُعَوِّذَتَیْنِ رَوَاهُمَا الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہی کہ ایک روز رات میں رسول کریم ﷺ نے نماز پڑھتے ہوئے اپنا ہاتھ زمین پر رکھا تھا کہ اس (ہاتھ) کی انگلی میں بچھو نے کاٹ لیا، آپ ﷺ نے اپنی پاپوش مبارک کے ذریعہ اس بچھو کو مار ڈالا اور جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ بچھو پر خدا کی لعنت ہو، نہ نمازی کو چھوڑتا ہے نہ غیر نمازی کو یا یہ فرمایا کہ، نبی کو چھوڑتا ہے نہ غیر نبی کو اس کے بعد آپ ﷺ نے نمک اور پانی منگوایا اور دونوں کو ایک برتن میں گھول دیا اور پھر آپ ﷺ اس چیز کو (جو برتن میں تھی یعنی پانی اور نمک) کو انگلی کے اس حصے پر ڈالتے جاتے تھے جہاں بچھو نے کاٹا تھا اور انگلی کو ملتے جاتے تھے۔ نیز قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھتے جاتے تھے۔ ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

آنحضرت ﷺ کے موئے مبارک کی برکت

(۵۳) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَوْهَبٍ قَالَ اَرْسَلَنِیْ اَهْلِیْ اِلٰی اُمِّ سَلَمَةَ بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ وَکَانَ اِذَا اَصَابَ الْاِنْسَانَ عَیْنٌ اَوْ شَیْءٌ بَعَثَ اِلَیْهَا مِخْضَبَةً فَاَخْرَجَتْ مِنْ شَعْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَکَانَتْ تُمْسِکُهٗ فِیْ جُلْجُلٍ مِنْ فِضَّةٍ فَخَضْخَضَتْهُ لَهٗ فَشَرِبَ مِنْهُ قَالَ فَاطَّلَعْتُ فِی الْجُلْجُلِ فَرَاَیْتُ شَعَرَاتٍ حُمْرًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عثمان ابن عبداللہ ابن موہب کہتے ہیں کہ ایک دن میرے گھر والوں نے مجھ کو پانی کا ایک پیالہ دے کر اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ کے پاس بھیجا۔ معمول یہ تھا کہ جب کسی کو نظر لگتی یا اور کوئی بیماری ہوتی تو اُمّ سلمہؓ کے پاس ایک پیالہ بھیجا جاتا اور اُمّ سلمہؓ

رسول پاک ﷺ کا موئے مبارک نکالتیں جس کو وہ چاندی کی ایک نلکی میں رکھتی تھیں اور اس موئے مبارک کو پانی میں ڈال کر ہلاتیں اور پھر مریض اس پانی کو پی لیتا جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کو شفا عطا فرما دیتا راوی کہتے ہیں کہ میں نے چاندی کی اس نلکی میں جھانک کر دیکھا تو مجھ کو آنحضرت ﷺ کے کئی سرخ بال نظر آئے!۔" (بخاری)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس موقع پر چاندی کا استعمال موئے مبارک کی تعظیم و توقیر کے پیش نظر تھا، جیسا کہ کعبہ مکرمہ پر ریشمی کپڑے کا پردہ ڈالا جاتا ہے۔ جہاں تک ان بالوں کی سرخی کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ موئے مبارک خلقی طور پر سرخ ہی تھے۔ یا تھے تو بھورے مگر دیکھنے میں سرخ معلوم ہوتے تھے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان پر مہندی کا خضاب ہو گا جس کی وجہ سے وہ سرخ تھے۔ یا چونکہ ان کو خوشبوؤں میں رکھا جاتا تھا اس لئے ان خوشبوؤں کی وجہ سے ان کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ اور وہ سرخ نظر آنے لگتے تھے۔

کھنبی کے خواص

۵۴ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ نَاسًا مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْكَمْاَةُ جُدَرِیُّ الْاَرْضِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْكَمْاَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَآءُ هَا شِفَآءٌ لِّلْعَیْنِ وَالْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهِیَ شِفَآءٌ مِّنَ السَّمِّ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ فَاَخَذْتُ ثَلٰثَةَ اَكْمُؤٍ اَوْخَمْسًا اَوْسَبْعًا فَعَصَرْتُهُنَّ فَجَعَلْتُ مَاءَهُنَّ فِیْ قَارُوْرَةٍ وَكَحَلْتُ بِهٖ جَارِیَةً لِّیْ عَمْشَاءَ فَبَرَأَتْ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے کئی حضرات نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کھنبی زمین کی چیچک ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (نہیں) بلکہ کھنبی من کی قسم سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے اور عجوہ (جو کھجور کی سب سے نفیس اور عمدہ قسم ہے) جنت کی کھجور ہے اور اس میں زہر سے شفا کی خاصیت ہے حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سنکر) میں نے تین یا پانچ یا سات کھنبیاں لیں اور ان کو نچوڑ لیا (یعنی کوٹ کر ان کا عرق نکال لیا)، اور اس پانی (عرق) کو ایک شیشی میں بھر کر رکھ لیا پھر میں نے اس پانی کو اپنی ایک چندھی لونڈی کی آنکھوں میں ڈالنے لگا تو وہ اچھی ہو گئی۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔"

تشریح: "کھنبی زمین کی چیچک ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح چیچک کے دانے دراصل جسم میں پیدا ہو جانے والے ناقص، فضلات ہوتے ہیں جو جلد میں سے باہر نکل آتے ہیں، اسی طرح یہ کھنبی بھی زمین کا فضلہ ہے۔ جو زمین سے باہر نکل آتی ہے۔ صحابہؓ نے یہ بات گویا کھنبی کی مذمت کے طور پر کہی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے خیال کو رد کرنے کے لئے کھنبی کی فضیلت و تعریف اور اس کی منفعت بیان فرمائی کہ کھنبی من کی قسم سے ہے یعنی یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو اس نے اپنے بندوں کو بطور احسان عطا فرمائی ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے نہ زمین کو کھودنے بونے کی مشقت کرنا پڑتی ہے اور نہ پانی دینے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے بلکہ یہ خود بخود زمین کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور بہت سے لوگوں کے کھانے اور پیٹ بھرنے کی ضرورت پوری کرتی ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آپ نے اس جملہ کے ذریعہ کھنبی کو اس من کے ساتھ مشابہت دی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اتری تھی، اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر ان کی محنت و مشقت کے بغیر من اترتی تھی اسی طرح یہ کھنبی بھی تخم ریزی کی محنت و مشقت کے بغیر زمین سے نکلتی ہے یہ قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ ایک روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ الکمأة من المن والمن من الجنة یعنی کھنبی من کی قسم سے ہے اور من جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

"اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے" کے بارے میں نوویؒ لکھتے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک محض کھنبی کا پانی آنکھ کو شفا بخشتا ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس کا پانی اس صورت میں شفا دیتا ہے جب کہ اس میں آنکھ کے امراض کے مطابق دوسری دوائیں بھی ملائی

جائیں، نیز بعضوں کے نزدیک یہ تفصیل ہے کہ اگر آنکھ کو گرمی سے ٹھنڈک پہنچانا مقصود ہو (یعنی آنکھ گرمی کی وجہ سے دکھتی ہو) تو صرف اس کا پانی ہی مفید ہے ورنہ دوسری صورتوں میں اس کے پانی کو دوسری دواؤں میں ملا کر آنکھ میں ڈالنا مفید ہوگا۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہر صورت میں کہ آنکھ خواہ گرمی کی وجہ سے دکھتی ہو یا کسی اور وجہ سے، محض اس کا پانی شفا بخش ہے، چنانچہ بعض مشائخ کے بارے میں منقول ہے کہ اس کی بینائی بالکل جاتی رہی تھی اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی ﷺ پر مکمل اعتقاد رکھتے ہوئے اور اس کو متبرک جانتے ہوئے اپنی آنکھوں میں محض کھنبی کا پانی ڈالنا شروع کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حسن اعتقاد اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کی برکت کی بناء پر ان کی آنکھوں کو شفائے کامل عطا فرمائی۔

شہد کی فضیلت

(۵۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَعِقَ الْعَسَلَ ثَلٰثَ غَدَوَاتٍ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ لَمْ يُصِبْهُ عَظِيْمٌ مِنَ الْبَلَاءِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص ہر مہینے میں تین دن صبح کے وقت شہد چاٹ لیا کرے تو وہ کسی بڑی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوتا۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ شہد کی برکت وخاصیت سے بڑی مصیبت وبلا تک دفع ہو جاتی ہے خواہ وہ کسی سخت بیماری کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں چہ جائیکہ کوئی چھوٹی مصیبت وبلا ہو۔

سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ روزانہ ایک پیالہ میں شہد کو پانی میں ملا کر گھونٹ گھونٹ نوش فرماتے تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ شہد کو پانی میں ملا کر پینے سے حفظان صحت وہ نعمت حاصل ہوتی ہے جس کی معرفت کی راہ عارفین ہی جان سکتے ہیں چنانچہ شہد کے جو بیشمار فوائد وخواص ہیں ان کی بناء پر ارباب طب وتحقیق کا یہ فیصلہ ہے کہ شہد بلاشبہ ایک ایسی نعمت الٰہی ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا، جالینوس کا کہنا ہے کہ خالص طور پر بیماریوں کے لئے شہد سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ اطباء لکھتے ہیں کہ نہار منہ شہد کو پینا یا چاٹنا بلغم کو چھانٹتا ہے۔ معدے کو صاف کرتا ہے لزوجت اور فضلات کو دور کرتا ہے، معدے کو اعتدال کے ساتھ گرمی پہنچاتا ہے اور سدوں کو کھولتا ہے، علاوہ ازیں یہ جلندر، استرخاء اور ہر قسم کے ریاح کو زائل کرتا ہے، پیشاب، حیض، اور دودھ کو جاری کرتا ہے مثانہ وگردہ کی پتھری کو توڑتا ہے اور ہر رطوبت ردیہ کو دفع کرتا ہے۔

(۵۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِالشِّفَائَيْنِ الْعَسَلَ وَالْقُرْاٰنَ رَوَاهُمَا ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ الصَّحِيْحُ اَنَّ الْاَخِيْرَ مَوْقُوْفٌ عَلَى ابْنِ مَسْعُوْدٍ۔

"اور حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ شفاء دینے والی دونوں چیزوں کو اپنے اوپر لازم کر لو، ایک تو شہد دوسرے قرآن۔ ان دونوں روایتوں کو ابن ماجہؒ اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے، نیز بیہقیؒ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ دوسری حدیث (یعنی علیکم بالشفائین) مرفوع (آنحضرت ﷺ کا ارشاد) نہیں ہے بلکہ ابن مسعودؓ پر موقوف ہے یعنی ان کا اپنا قول ہے۔"

تشریح: شہد کی یہ فضیلت اس لئے ہے کہ اس میں شفا کا ہونا قرآن کریم سے ثابت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔ یعنی اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے اور خود قرآن مجید بھی کائنات انسانی کے لئے شفاء ورحمت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا هُدًى وَّشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (یعنی یہ قرآن دلوں کی بیماریوں کے لئے ہدایت اور شفا ہے۔) لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ شہد تو محض ظاہری جسمانی بیماریوں کے لئے شفا ہے جب کہ قرآن کریم ظاہر وباطن یعنی جسم وروح دونوں کی بیماریوں کے لئے شفا ہے اسی لئے قرآن کریم کے حق میں هُدًى وَّشِفَآءٌ فرمایا گیا ہے۔

بلا ضرورت سر پر پچھنے لگوانا قوت حافظہ کے لئے نقصان دہ ہے

(۵۷) وَعَنْ اَبِی کَبْشَةَ الْاَنْمَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ احْتَجَمَ عَلٰی ھَامَتِہٖ مِنَ الشَّاةِ الْمَسْمُوْمَةِ قَالَ مَعْمَرٌ فَاحْتَجَمْتُ اَنَا مِنْ غَیْرِ سَمٍّ کَذٰلِکَ فِیْ یَا فُوْخِیْ فَذَھَبَ حُسْنُ الْحِفْظِ عَنِّیْ حَتّٰی کُنْتُ اُلَقَّنُ فَاتِحَةَ الْکِتَابِ فِی الصَّلٰوةِ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابوکبشہ انماریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس بیماری کے سبب کہ جو بکری کا زہر آلود گوشت کھالینے کی وجہ سے لاحق ہوگئی تھی اپنے سر پر سینگی کھنچوائی۔ (حدیث کے ایک راوی) معمرؒ کا بیان ہے کہ میں نے کوئی زہر آلود چیز کھائے بغیر اسی طرح اپنے سر پر سینگی کھنچوائی، تو میں اپنے حافظہ کی خوبی سے محروم ہوگیا۔ یہاں تک کہ مجھ کو نماز میں الحمد سیکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی!۔" (رزینؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ کسی علت و سبب کے بغیر کہ جو سر میں سے خون نکلوانے کو ضروری قرار دے، سر پر سینگی کھنچوانا اور خون نکلوانا قوت حافظہ کو نقصان پہنچانے کا باعث ہے۔

سینگی کھنچوانے کے دن

(۵۸) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ قَالَ ابْنُ عُمَرَ یَا نَافِعُ یَنْبَغُ بِیَ الدَّمُ فَأْتِنِیْ بِحَجَّامٍ وَاجْعَلْہُ شَابًّا وَلَا تَجْعَلْہُ شَیْخًا وَلَا صَبِیًّا قَالَ وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْحِجَامَةُ عَلَی الرِّیْقِ اَمْثَلُ وَھِیَ تَزِیْدُ فِی الْعَقْلِ وَ تَزِیْدُ فِی الْحِفْظِ وَ تَزِیْدُ الْحَافِظَ حِفْظًا فَمَنْ کَانَ مُحْتَجِمًا فَیَوْمَ الْخَمِیْسِ عَلَی اسْمِ اللّٰہِ وَاجْتَنِبُوا الْحِجَامَةَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَیَوْمَ السَّبْتِ وَیَوْمَ الْاَحَدِ فَاحْتَجِمُوْا یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَیَوْمَ الثُّلَثَاءِ وَاجْتَنِبُوا الْحِجَامَةَ یَوْمَ الْاَرْبِعَاءِ فَاِنَّہٗ یَوْمُ الَّذِیْ اُصِیْبَ بِہٖ اَیُّوْبُ فِی الْبَلَاءِ وَمَا یَبْدُوْ اجُذَامٌ وَّلَا بَرَصٌ اِلَّا فِیْ یَوْمِ الْاَرْبِعَاءِ اَوْ لَیْلَةِ الْاَرْبِعَاءِ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت نافعؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ نافع میرے جسم میں خون جوش کھا رہا ہے۔ ذرا تم سینگی کھینچنے والے کو بلالاؤ، لیکن جوان آدمی کو لانا، کسی بوڑھے یا بچے کو مت پکڑ لانا (کیونکہ طاقت ور آدمی زیادہ اچھی طرح سینگی کھینچے گا)۔ نافعؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ بھری ہوئی سینگی نہار منہ کھنچوانا زیادہ بہتر ہے اس سے عقل میں زیادتی ہوتی ہے (جس شخص کے حافظہ نہیں ہوتا) اس کا حافظہ تیز ہوتا ہے اور جس شخص کے حافظہ تیز ہوتا ہے اس کے حافظہ میں زیادتی ہوتی ہے، لہٰذا جو شخص سینگیاں کھنچوانا چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جمعرات کے دن سینگی کھنچوائے اور جمعہ، ہفتہ اور اتوار کو سینگی کھنچوانے سے اجتناب کرو، پھر پیر اور منگل کے دن کھنچوائے اور بدھ کے دن سینگی کھنچوانے سے اجتناب کرو، کیونکہ بدھ کا دن وہ دن ہے جس میں حضرت ایوب علیہ السلام مبتلائے بلاء ہوئے اور جذام یا کوڑھ کی بیماریاں بدھ کے دن یا بدھ کی رات میں ظاہر ہوتی ہیں۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "جس میں حضرت ایوب علیہ السلام مبتلائے بلا ہوئے" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا بلاء میں مبتلا رہنا اسی سبب سے تھا کہ انہوں نے بدھ کے دن سینگی کھنچوائی تھی اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مفسرین نے اس کے مبتلائے بلاء ہونے کے اور بھی اسباب بیان کئے ہیں۔ تو ہوسکتا ہے کہ ان اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ دوسری فصل میں حضرت کبشہؓ بنت ابی بکرہ کی جو روایت گزری ہے تو اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ منگل کے دن سینگی کھنچوانا مناسب نہیں ہے جب کہ یہاں اس کے برخلاف بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان دونوں روایتوں کے درمیان اس تضاد کو اس قول کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت کبشہؓ کی روایت کو صحیح مان لیا جائے تو یہاں نقل کی گئی روایت میں "منگل" سے مراد وہ منگل ہوگا۔ جو چاند کی سترھویں تاریخ کو واقع ہوتا ہو جیسا کہ آگے آنے والی روایت سے واضح ہوتا ہے۔

روایت کے آخری الفاظ کے ذریعہ جو حصر بیان کیا گیا ہے کہ جذام اور کوڑھ کی بیماریاں صرف بدھ کے دن یا بدھ کی رات میں پیدا ہوتی ہیں تو یہ حصر اکثر کے اعتبار سے اور ازراہ مبالغہ ہے۔

(۵۹) وَعَنْ مَعْقَلِ ابْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحِجَامَةُ يَوْمَ الثُّلٰثَآءِ لِسَبْعِ عَشْرَةَ مِنَ الشَّهْرِ دَوَاءٌ لِدَاءِ السَّنَةِ رَوَاهُ حَرْبُ ابْنُ اِسْمَاعِيْلَ الْكِرْمَانِيُّ صَاحِبُ اَحْمَدَ وَلَيْسَ اِسْنَادُهُ بِذَالِكَ هٰكَذَا فِي الْمُنْتَقٰى وَرَوٰى رَزِيْنٌ نَحْوَهُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

"اور حضرت معقل ابن یسار ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ منگل کے دن سترھویں تاریخ کو سینگی کھنچوانا سال بھر کی بیماریوں کا علاج ہے اس روایت کو حرب ابن اسماعیل کرمانی ؒ نے نقل کیا ہے جو امام احمد بن حنبل ؒ کے مصاحب ہیں اور روایت کی اسناد ایسی قوی نہیں ہے کہ اس پر اعتماد کیا جاسکے (ابن جارود ؒ کی کتاب) منتقی میں بھی اسی طرح منقول ہے، نیز اسی طرح کی روایت رزین ؒ نے بھی حضرت ابوہریرہ ؓ سے نقل کی ہے۔"

تشریح: منگل کے دن سینگی کھنچوانے کے سلسلے میں چوں کہ مختلف روایتیں منقول ہیں اس لئے زیادہ بہتر اور مناسب یہی ہے کہ منگل کے دن سینگی کھنچوانے سے اجتناب کیا جائے۔ تاوقتیکہ کوئی شدید ضرورت پیش آئے۔

سحر کے احکام

اس باب میں منتروافسوں اور جھاڑ پھونک وغیرہ کے متعلق احکام و مسائل بیان ہوئے ہیں اب جب کہ باب ختم ہو رہا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مناسبت سے سحر وجادو کے احکام و اقسام کے سلسلے میں کچھ تفصیل بیان کر دی جائے اس مقصد کے لئے خاص طور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ؒ کے منقولات کو منتخب کیا گیا ہے جو انہوں نے آیت کریمہ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِيْنُ کے تحت سحر کے اقسام و احکام کی وضاحت میں بیان کئے ہیں ان معقولات و فرمودات کا ترجمہ و خلاصہ اور اس کی روشنی میں چند دوسری باتیں نقل کی جاتی ہیں۔

جاننا چاہئے کہ سحر کے حکم کی مختلف صورتیں ہیں اگر سحر کرنے والے نے کوئی ایسا قول و فعل اختیار کیا جو کفر کا موجب ہو جیسے بتوں، دیوی، دیوتاؤں اور ارواح خبیثہ کا نام ایسی تعظیم وصفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو جو صرف رب العزت ہی کے شایان شان ہے مثلاً ان بتوں وغیرہ کے لئے عموم علم، قدرت و تصرف اور غیب دانی و مشکل کشائی وغیرہ ثابت کی گئی ہو، یا غیر اللہ کے لئے ذبح کیا گیا ہو، یا غیر اللہ کے لئے سجدہ کیا گیا ہو وغیرہ وغیرہ تو ایسا سحر بلاشبہ کفر ہوگا اور اس سحر کو کرنے والا مرتد قرار پائے گا اسی طرح جس شخص نے اپنے کسی مطلب کے حصول کے لئے اس طرح کا سحر دیدہ دانستہ کرایا ہوگا تو وہ بھی کافر ہو جائے گا اور اس پر ارتداد کے احکام نافذ ہوں گے، اگر وہ مرد ہے تو پہلے اس کو تین دن کی مہلت دینی چاہئے اگر تین دن کے بعد اس نے صحیح توبہ نہ کی تو اس کو مار ڈالا جائے اور اس کی لاش کو پھینک دیا جائے نہ مسلمان میت کی طرح اس کی تجہیز و تکفین کی جائے نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے اور نہ فاتحہ و درود وصدقات کے ذریعہ ایصال ثواب کیا جائے، اور اگر وہ عورت ہے تو حضرت امام شافعی ؒ کے مسلک کے مطابق اس کو بھی مردوں کی طرح تین دن کی مہلت کے بعد قتل کر دیا جائے، اور، جب کہ حضرت امام اعظم ؒ کے نزدیک عورت کو ہمیشہ کے لئے قید میں ڈال دیا جائے جب تک کہ وہ توبہ نصوح نہ کرے۔

اور اگر سحر میں کوئی ایسا قول و فعل نہ ہو جو ارتداد و کفر کا موجب ہوتا ہے، لیکن سحر کرنے والا اس بات کا دعوی کرے کہ میں اپنے اس جادو کے زور سے وہ کام کر سکتا ہوں جو خدا کرتا ہے۔ مثلاً میں انسان کو جانور کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہوں یا لکڑی کو پتھر اور پتھر کو لکڑی بنا سکتا ہوں یا ایسے کام کر سکتا ہوں جو پیغمبر کر سکتے ہیں اور ان معجزات کی طرح میں بھی معجزہ دکھا سکتا ہوں مثلاً میں ہوا میں اڑ سکتا

ہوں یا ایک مہینے کی مسافت ایک لمحے میں طے کر سکتا ہوں تو اس کو بھی اس دعوے کی وجہ سے مرتد کافر قرار دیا جا سکتا ہے نہ کہ نفس سحر کے سبب۔ اگر وہ یوں کہے کہ میرے عملیات میں ایک خاصیت ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے عمل جادو کے ذریعہ کسی جاندار کو جان سے مار سکتا ہوں، یا کسی تندرست کو بیمار اور بیمار کو تندرست کر سکتا ہوں یا میں لوگوں کے خیالات تک کو اچھا یا برا بنا سکتا ہوں تو اس کا یہ سحر جھوٹ بولنے اور فسق اختیار کرنے کے حکم میں ہوگا اور وہ (سحر کرنے والا) فاسق و کاذب قرار پائے گا اور اگر وہ اپنے اس عمل (سحر) کے ذریعہ کسی بے گناہ کو ہلاک کر ڈالے تو اس کو قزاق اور قاتل کی طرح سزائے موت دے کر مار ڈالا جائے کیونکہ وہ اپنے اس عمل کے ذریعہ فتنہ وفساد پھیلانے اور بے گناہوں کو ہلاکت میں ڈالنے کا مجرم قرار پائے گا۔ اس بارے میں ساحر اور ساحرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

ایک روایت میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ سے یہ منقول ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ سحر کرتا ہے اور اقرار و تنبیہ کے ذریعہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس کو مار ڈالنا چاہئے۔ اس سے توبہ کا مطالبہ کرنے یا مہلت دینے کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ کہے کہ میں سحر کو ترک کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں تو اس کی بات کو قبول نہ کرنا چاہئے۔ ہاں اگر وہ یوں کہے کہ میں پہلے تو بیشک سحر کرتا تھا مگر ایک مدت سے اپنے اس فعل سے باز آگیا ہوں تو اس کے اس قول کو قبول کر لیا جائے اور اس کو معاف کر دیا جائے۔

حضرت امام شافعی یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے سحر کیا اور اس کے سحر کی وجہ سے سحر زدہ مر گیا تو ساحر سے جواب طلب کرنا چاہئے اگر وہ اقرار کرے کہ میں نے اس شخص پر سحر کیا تھا اور میرا سحر اکثر اوقات جان لے لیتا ہے تو اس پر قصاص واجب ہوگا اور اگر یہ کہے کہ میں نے اس شخص پر سحر کیا تھا اور میرا سحر کبھی جان لے لیتا ہے اور کبھی جان نہیں لیتا تو یہ قتل شبہ عمد کے حکم میں ہوگا اور اس پر شبہ عمد کے احکام نافذ ہوں گے اور اگر وہ یوں کہے کہ سحر تو میں نے کسی دوسرے شخص کے لئے کیا تھا لیکن اتفاق سے اس شخص کا نام وہی تھا جو اس شخص کا تھا یا اس کا گزر اس جگہ پر ہو گیا جہاں اس دوسرے شخص کے لئے سحر کیا گیا تھا اور اس وجہ سے اس کا اثر اس شخص پر ہو گیا اور یہ ہلاک ہو گیا تو یہ قتل خطاء کے حکم میں ہوگا اور اس (ساحر) پر قتل خطاء کے احکام نافذ ہوں گے۔

اس موقع پر ایک اشکال واقع ہوتا ہے، جو اکثر ذہنوں میں خلجان پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ خرق عادت افعال کہ جو محض قدرت الٰہی سے صادر ہوتے ہیں اکثر اولیاء اللہ کے ذریعہ ظہور میں آتے ہیں جیسے تقلیب اعیان یا تبدیلی صورت یا اسی طرح کے وہ افعال جو پیغمبروں کے معجزات کے مشابہ ہوتے ہیں جیسے مردہ کو زندہ کر دینا یا دور دراز کے سفر کو ایک لحہ میں طے کر لینا، علاوہ ازیں اولیاء اللہ سے اسی طرح کی اور بہت سی چیزوں کا صادر ہونا ثابت ہے جن کو ان اولیاء اللہ کے مستند سوانح نگاروں نے ان کے مناقب و کرامات کے ضمن میں لکھا ہے۔ لہٰذا اگر افعال الٰہی کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا کفر ہے تو ان اولیاء اللہ سے صادر ہونے والے خرق عادت افعال کی صورت میں بھی کفر لازم آنا چاہئے اور اگر یہ کہا جائے کہ اولیاء اللہ سے جو خرق عادت فعل صادر ہوتا ہے وہ حقیقت میں ان کا فعل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ ہی کی قدرت اور اس کے حکم سے صادر ہوتا ہے اور اولیاء اللہ اس فعل کے صادر ہونے کا ایک ظاہری سبب و ذریعہ بنتے ہیں اس لئے ان پر کفر کا اطلاق نہیں ہوتا تو پھر ساحروں کے حق میں کفر کا حکم کیوں کیا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی ان افعال کے صادر ہونے کا ظاہری سبب و ذریعہ ہی تو ہوتے ہیں نہ کہ حقیقی فاعل بلکہ علاوہ ازیں دعا تعویذ کرنے والے اور عاملین کہ جو اپنے عملیات اور دعاؤں کے ذریعہ ساحروں کی طرح کتنے ہی محیر العقول کارنامہ انجام دیتے ہیں اور اس طرح وہ بھی گویا پوری طرح ساحروں کے مشابہ ہوتے ہیں تو ان کے افعال پر بھی کفر کا طلاق کیوں نہیں ہوتا اور ان کے اور ساحروں کے درمیان فرق کیوں کیا جاتا ہے۔؟ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ خرق عادت افعال خواہ وہ معجزات کے مشابہ ہوتے ہیں اور خواہ کسی اور طرح کے ہوں سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اسی کے ارادہ و حکم سے اور اسی کے پیدا کرنے سے صادر و ظاہر ہوتے ہیں اس اعتبار سے اولیاء اللہ سے جو چیزیں (کرامت کی صورت میں) صادر ہوتی ہیں وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کے حکم و ارادہ سے ظہور میں آتی ہیں اور جو چیزیں ساحروں سے صادر ہوتی ہیں وہ بھی

اللہ تعالیٰ کے حکم وارادہ ہی سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن ان دونوں صورتوں میں جو فرق ہے اور جس فرق کی وجہ سے کفر اور عدم کفر کا حکم لگتا ہے وہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ یا دعا تعویذ کرنے والے اور عاملین ان افعال کی نسبت غیر اللہ کی طرف نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت یا اس کے اسماء پاک کے خواص کی طرف کرتے ہیں اسی لئے ان پر کفروشرک کا اطلاق نہیں ہوتا، جب کہ ساحران افعال کو غیر اللہ، یعنی ارواح خبیثہ، دیوی دیوتاؤں، بتوں کے نام اور منتروں کے خواص کی طرف کرتے ہیں اسی لئے وہ ان افعال کو اپنے قبضہ وقابو اور اپنے زیر حکم جانتے ہیں اور ان افعال کے عوض اجرت لیتے ہیں، بھینٹ چاہتے ہیں، ان دیوی دیوتاؤں اور بتوں کے نام پر نذر کرنے اور قربانی دینے کا مطالبہ کرتے ہیں اور ظاہر ہے یہ چیزیں شرک وکفر کو لازم کرتی ہیں، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کو بچہ عطا ہونا، رزق میں وسعت وفراخی ملنا اور مریض کا شفایاب ہونا وغیرہ امور اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں اور اسی کے حکم وارادہ کے تحت ہیں لیکن گمراہ لوگ ان کی نسبت ارواح خبیثہ، دیوی، دیوتاؤں اور پیروں فقیروں وغیرہ کی طرف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں دیوی دیوتا سے بچہ مانگا تھا تو اس نے ہمیں بچہ دیا ہم نے فلاں کی روح کے نام پر بھینٹ چڑھائی تھی تو اس نے ہمیں رزق میں وسعت دی اور ہم نے فلاں بزرگ وفقیر سے درخواست کی تھی اور اس مقصد کے لئے ان کے مزار پر نذرانے چڑھائے تھے تو انہوں نے ہمیں شفا دی۔ گویا ان کے نزدیک ان چیزوں کا دینے والا اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ غیر اللہ ہوتا ہے، لہٰذا ایسے لوگ کافر ہو جاتے ہیں اس کے برخلاف خدا کو ماننے والے اور اس کے احکام پر عمل کرنے والے لوگ اگر ان چیزوں کے لئے جائز ذرائع واسباب، جیسے دعا، تعویذ، جھاڑ پھونک یا علاج معالجہ کا سہارا لیتے ہیں اور ان کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے تو ان امور کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمیں جو چیز ملی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملی ہے البتہ اس کے حصول میں اسماء الٰہی دعاؤں اور تعویز گنڈے کی تاثیر یا دوا کے خواص ایک ظاہری سبب وذریعہ کا درجہ رکھتے ہیں اس بناء پر ان کے ایمان میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔

سحر کی تعریف وحقیقت

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سحر کی تعریف وحقیقت کیا ہے اور یہ کہ سحر کی کونسی قسم موجب کفر ہے کونسی موجب فسق ہے اور کونسی قسم مباح ہے یعنی شریعت میں جائز ہے؟ اس کی تفصیل اگرچہ بہت طویل ہے لیکن اجمالی طور پر اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ سحر کی حقیقت و تعریف یہ ہے دعاؤں اور اسماء الٰہی، کے عملیات وغیرہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد طاقت حاصل کرنے کے بجائے خفیہ اسباب کی مزاولت (یعنی مخفی طاقتوں کی پرستش وجبہہ سائی اور ان کی تسخیر) کے ذریعہ خوارق عادات اور افعال عجیبیہ پر قدرت حاصل کرنا اور ان خوارق عادات اور افعال عجیبیہ کی نسبت قادر مطلق پروردگار عالم کی طرف کرنے کے بجائے غیر اللہ یعنی ان مخفی طاقتوں یا اپنی ذات کی طرف کرنا۔ اور چونکہ عالم میں اسباب خفیہ کئی طرح کے ہیں اس لئے سحر کی قسمیں بھی متعدد ہیں جن کو منضبط طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ خفیہ سبب یا تو روحانیت کی تاثیر ہے، یا جسمانیت کی تاثیر پھر روحانیت یا تو کلیہ مطلق ہیں جیسے کواکب وافلاک یا عناصر کی روحانیت، یا وہ روحانیات جزیہ خاصہ ہیں جیسے امراض اور جن وشیاطین کی روحانیات اور وہ ارواح جو جسم انسانی سے نکل کر جاتی ہیں اور جن کو مسخر کر کے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جہاں تک جسمانیات کا تعلق ہے تو وہ جسمانیات یا تو ترکیب اور اجتماع کیفیات کے سبب سے تاثیر کرتے ہیں جس سے عجیب وغریب باتیں ظہور میں آتی ہیں یا خواص کے سبب سے تاثیر کرتے ہیں یعنی ان کی صورت نوعیہ کسی ترکیب اور اجتماع کیفیات کے توسط کے بغیر خود بخود تاثیر کرتی ہے جس طرح کہ مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔

رہی یہ بات کہ ان روحانیات یعنی ان پوشیدہ ومخفی طاقتوں سے مناسبت کیونکر حاصل ہوتی ہے اور ان کی تاثیر کو کس طرح مائل کیا جاتا ہے تو اس کے مختلف طریقے ہیں، بعض لوگ چند مخصوص شرائط کے ساتھ ان روحانیت کا نام جپتے ہیں، اور حصول مقصد کے لئے ان سے ملتجی ہوتے ہیں بعض لوگ ان کی تصویر بنا کر اس کے سامنے نذر بھینٹ چڑھاتے ہیں اور وہ کام کرتے ہیں جو ان کو مرغوب ہو سکتے ہیں، یا مخصوص طریقہ اور مخصوص شرائط کے ساتھ کچھ حروف والفاظ بلالحاظ ترکیب پڑھتے ہیں جن کے ذریعہ وہ ارواح میں سے کسی روح

کی بڑائی کی طرف یا ایسے عجیب وغریب فعل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جو اس سے کبھی سرزد ہوا تھا اور جس کی وجہ سے عام وخاص اس کی مدح وثناء میں رطب اللسان ہوئے تھے۔ غرضیکہ سحر کرنے کے مختلف عملیات اور مختلف صورتیں ہیں اور ان عملیات اور صورتوں کے نتیجہ میں سحر کی متعدد اور کثیر قسمیں سامنے آتی ہیں، لیکن جو قسمیں زیادہ مشہور ہیں وہ چند ہیں اور ان میں کی پہلی قسم جو سب سے بڑی قسم سمجھی جاتی ہے کلدانیوں اور بابل کا سحر ہے اور اسی کو باطل کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے اس سحر کے علم کی اصل ہاروت وماروت سے چلی ہے کہا جاتا ہے کہ بابل کے لوگ ہاروت وماروت سے اس سحر کا علم اور طریقہ سیکھتے تھے اور پھر اس کے ذریعہ اپنے مقصد حاصل کیا کرتے تھے، نیز انہوں نے اس میں مختلف تحقیق وتجربے کئے تھے اور اس کے علم کو بہت زیادہ وسیع وہمہ گیر بنایا، اسی طرح کلدانیین، جو بابل میں سکونت رکھتے تھے اس علم کے حصول کے لئے مختلف محنت وجستجو میں لگے رہتے تھے اور اس کے ذریعہ نت نئی چیزیں پیدا کرتے تھے۔

تاریخ کی معتبر کتابوں میں لکھا ہے کہ بابل کے حکماء اور اس فن کے ماہرین نے نمرود کے زمانہ میں اپنے شہر بابل میں کہ جو نمرود کا دار السلطنت تھا اس سحر کے ذریعہ ایسے چھ ہوشربا اور محیر العقول طلسمات بنا رکھے تھے۔ جن کی حقیقت وکیفیت جاننے سے انسان کی عقل و ذہانت عاجز رہتی تھی۔

اول یہ کہ انہوں نے تانبے کی ایک بطخ بنا رکھی تھی جو شہر میں ناپسندیدہ اور مضر افراد کے داخل ہونے کی خبر دیتی تھی، چنانچہ اگر کسی دوسرے ملک سے کوئی جاسوس یا دشمن یا کوئی چور وغیرہ شہر میں داخل ہوتا تو اس بطخ میں سے مخصوص آواز نکلنے لگتی تھی، شہر کے تمام لوگ اس آواز کو سن کر اس کا مقصد جان لیتے تھے۔ اور اس طرح وہ اس جاسوس اور چور کو پکڑ لیتے تھے۔

دوسرے یہ کہ انہوں نے ایک نقارہ بنا رکھا تھا جس کا مصرف یہ تھا کہ شہر میں جس شخص کو کوئی چیز گم ہو جاتی تو وہ اس نقارہ پر چوٹ مارتا، جس کے نتیجے میں اس میں سے یہ آواز نکلتی کہ تمہاری فلاں چیز فلاں جگہ ہے، چنانچہ تلاش کرنے کے بعد وہ اسی جگہ سے ملتی۔

تیسرے یہ کہ انہوں نے گم شدہ لوگوں کو دریافت کرنے کے لئے ایک آئینہ بنا رکھا تھا۔ جب شہر میں کسی کے گھر کا کوئی فرد غائب ہو جاتا تو وہ اس آئینے کے پاس آتا اور اس میں اپنے گمشدہ فرد کا حال دیکھ لیتا وہ گمشدہ خواہ کسی شہر میں ہوتا، خواہ جنگل میں اور خواہ کسی کشتی وغیرہ پر سفر کرتے ہوئے ہو یا کسی پہاڑ پر، اسی طرح خواہ وہ بیمار ہوتا یا تندرست، خواہ مفلس وقلاش ہوتا یا مال دار اور خواہ زخمی ہوتا یا مقتول، غرضکہ وہ جس جگہ اور جس حالت میں ہوتا اسی جگہ اور اسی حالت کے ساتھ اس آئینہ میں نمودار ہو جاتا۔

چوتھا طلسم یہ تھا کہ انہوں نے ایک حوض بنایا تھا جس کے کنارے وہ سال بھر میں ایک دن جشن مناتے تھے، چنانچہ شہر کے تمام سردار اور معززین اپنی پسند کے مشروب لے کر اس حوض کے کنارے جمع ہوتے اور جو شخص اپنے ساتھ جو مشروب لاتا اس کو اس حوض میں ڈال دیتا، پھر جب ساقی کا فرض انجام دینے والے لوگ اس کے کنارے کھڑے ہو کر لوگوں کو پلانا شروع کرتے اور اس حوض میں سے نکال نکال کر دیتے تو ہر شخص اس کو وہی پسندیدہ مشروب ملتا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

پانچواں طلسم یہ تھا کہ انہوں نے لوگوں کے لڑائی جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے ایک تالاب بنایا تھا اگر دو آدمیوں کا آپس میں کوئی تنازعہ ہوتا اور یہ ثابت ہونا ہوتا کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ تو دونوں فریق اس تالاب کے کنارے آتے اور پھر اس میں اتر جاتے، چنانچہ جو شخص حق پر ہوتا اس تالاب کا پانی اس کے ناف کے نیچے رہتا اور وہ غرق نہ ہوتا اور جو شخص حق پر نہ ہوتا پانی اس کے سر سے اوپر چلا جاتا اور اس کو ڈبو دیتا ہاں اگر وہ فریق مخالف کے حق کو مان لیتا اور اپنے جھوٹے دعوے کو ترک کر دیتا تو پھر غرقابی سے نجات پاتا۔

اور چھٹا طلسم یہ تھا کہ انہوں نے نمرود کے محل کے میدان میں ایک درخت لگا رکھا تھا۔ جس کے سایہ میں درباری بیٹھتے تھے لوگوں کی تعداد جس قدر بڑھتی رہتی اسی قدر اس کا سایہ بھی بڑھتا رہتا تھا یہاں تک کہ اگر تعداد ایک لاکھ تک پہنچ جاتی تو سایہ بھی اسی اعتبار سے زیادہ ہو جاتا تھا مگر جب اس عدد سے ایک آدمی بھی زیادہ ہو جاتا تو پھر سایہ بالکل ختم ہو جاتا تھا اور تمام لوگ دھوپ میں بیٹھے رہ جاتے

تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس بارے میں بابل کے لوگ ہی شغف و دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا بادشاہ نمرود بھی بہت زیادہ غلو رکھتا تھا اور اس علم کی پوری طرح سرپرستی کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سحر کی یہ قسم سب سے زیادہ سخت اور مشکل ہے لیکن اگر کوئی شخص سخت ترین ریاض و محنت اور مسلسل جدوجہد کے بعد اس کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور اس فن کو جان لیتا ہے تو پھر اس کی اتنی زبردست طاقت و قدرت حاصل ہوجاتی ہے۔ کہ وہ انسانی عادت کے مخالف امور کو ظاہر کرنے اور انسانی عادات کے موافق امور کو روک دینے پر قادر ہوجاتا ہے۔

جیسے وہ ان امراض کا علاج بھی کرسکتا ہے جس کے معالجہ سے دنیا بھر کے طبیب عاجز ہوگئے ہوں مثلاً برص اور جذام وغیرہ کیونکہ ایسا شخص روحانیات یعنی طاقتوں (جیسے جن و شیاطین) کے ذریعہ تدبیر و عمل کرتا ہے، جب کہ طبیب جسمانیت (دواؤں) کے ذریعہ تدبیر کرتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اجسام و ارواح کے ساری حقیقتیں منکشف کردیں اور انہوں نے ہر جسم اور ہر روح کو قادر مطلق کے دست قدرت کے تحت مجبور و بیکس دیکھا تو سب سے منہ پھیر کر ذات واحد حقیقی کی طرف متوجہ ہوگئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۃ انعام میں فرمایا۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تا وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یعنی ہم نے ایسے ہی طور پر ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں تاکہ وہ عارف ہوجائیں اور کامل یقین کرنے والوں سے ہوجائیں، پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھاگئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا اور کہا کہ یہی میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہوگیا تو انہوں نے کہا کہ میں غروب ہوجانے والوں سے محبت نہیں رکھتا، پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا کہ یہی میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہوگیا تو انہوں نے کہا کہ اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا رہے تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہوجاؤں۔ جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا کہ یہی میرا رب ہے یہ تو سب سے بڑا ہے سو جب وہ غروب ہوگیا تو انہوں نے کہا کہ اے قوم! بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ میں اپنا رخ اس ذات کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔

واضح رہے کہ اوپر سحر کی جو قسم ذکر کی گئی ہے وہ خالص کفر اور شرک محض ہے کیونکہ اس سحر کے علم کا حصول جن، پندرہ شرائط کی پابندی پر موقوف ہے ان میں سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ارواح کو عالم الغیب اور احوال قلب پر مطلع مانا جائے۔ اور ان کے تئیں عجز و جہل کا گمان ہرگز نہ کیا جائے ورنہ وہ ارواح اس کا کہنا بالکل نہیں مانیں گی اور اس کے مقصد تک نہیں پہنچائیں گی۔

کواکب و سیارات کی روحانیات یعنی ان کی قوتوں سے استمداد کرنے اور ان کی تاثیر کو متوجہ کرنے کے لئے جو طریقہ بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے روحانیات قمر کی تاثیر کو ان الفاظ کے ورد کے ذریعہ متوجہ کرتے ہیں۔ ایها الملک الکریم و السید الرحیم مرسل الرحمة و منزل النعمة اور عطارد کی تاثیر کو متوجہ اور اپنے زیر اثر کے لئے ان الفاظ کا ورد کیا جاتا ہے۔ کل ما حصل لی من السحر فهو منک و کل ما یندفع من الشر منی فهو منک دیگر کواکب و سیارات سے استمداد کرنے اور ان کی تاثیر کو متوجہ کرنے کے لئے جن الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہوگا ان کو بھی انہی پر قیاس کیا جاسکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح کا عقیدہ رکھنا جو ان الفاظ سے آشکار ہوتے ہیں اور اس طرح کے الفاظ زبان سے نکالنا عقیدہ توحید، تعلیمات اسلامی اور ملت حنفی کے سراسر منافی ہے۔

سحر کی دوسری قسم وہ ہے جس میں جنات و شیاطین کو مسخر کیا جاتا ہے اور ان سے امداد و اعانت طلب کرکے مقصد حاصل کیا جاتا ہے یہ قسم سہل الحصول بھی ہے اور کثیر ارواج بھی ہے، جنات و شیاطین کی اس تسخیر میں جن چیزوں کا اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے ان میں بعض مخصوص الفاظ و اعمال کے ذریعہ ان سے تعلق پیدا کرنے کے علاوہ ان کی جبیہ سائی کرنا ان کے نام پر نذریں چڑھانا، بھینٹ دینا، ان کی پسندیدہ خوشبو وغیرہ ان کے آنے کی جگہوں پر رکھنا اور بسانا، جس جگہ ان کے آنے کا تصور ہو وہاں ہاتھ جوڑ کر بیٹھنا اور ان کو اپنے سامنے

موجود جانتے ہوئے رونا گڑگڑانا، منت خوشامد کرنا اور ان سے حاجت براری کی التجا کرنا وغیرہ وغیرہ خاص عمل ہیں اور ان سب چیزوں سے صریح کفر لازم آتا ہے۔

سحر کی تیسری قسم وہ ہے جس میں ان انسانی ارواح کو مسخر کیا جاتا ہے جو جسم چھوڑ چکی ہوتی ہیں، اس قسم کو اختیار کرنے کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کسی ایسے مرے ہوئے انسان کا پتہ لگایا جائے جو قوی الجثہ اور قوی القلب رہا ہو، پھر بعض مخصوص عملیات اور مخصوص الفاظ کے ورد کے ذریعہ کہ جو بڑے بڑے جنات و شیاطین کے ذکر اور ان کی بہت زیادہ تعظیم و توقیر کے مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں ان ارواح کو اپنی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان الفاظ و عملیات کے زور سے اور نذرانے و بھینٹ چڑھانے کے ذریعہ اس روح کو اس طرح اپنے قابو و اختیار میں کرلیا جاتا ہے کہ غلام و نوکر کی طرح اس کو جو کام کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اس کو وہ انجام دیتی ہے یہ عمل بھی کفر کو لازم کرتا ہے یا کفر کے قریب پہنچادیتا ہے۔ نیز اغلب یہ ہے کہ اس طرح کی ارواح کہ جوان سفلی و شہوانی عملیات کے ذریعہ متوجہ ہوتی ہیں۔ دراصل ان انسانوں کی ارواح ہوتی ہیں۔ جو کفر و شرک و فسق و خبث کی حالت میں مرجاتے ہیں لہٰذا اس عمل سحر میں خباثت کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔

سحر کی چوتھی قسم وہ ہے جس میں بعض جنات کی ارواح کے ذریعہ کسی شخص کے خیالات و تصورات میں خلل ڈالتے اور اس کے ذہن کو فاسد کردیتے ہیں کہ اس کو حقیقت کے خلاف کچھ کا کچھ نظر آنے لگتا ہے یا وہ اپنی ہی صورت ہائلہ متخیلہ سے ڈرنے لگتا ہے اور یا غیر واقعی چیزوں کو واقعی سمجھنے لگتا ہے، سحر کی اس قسم کو نظر بندی یا خیال بندی کہتے ہیں اور بعض مفسرین نے آیت کریمہ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ کے تحت کہا ہے کہ فرعون کے ساحروں کا سحر اسی قسم کا تھا جس سے حضرت موسی علیہ السلام کو واسطہ پڑا تھا، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں وہ سب لکڑیاں اور رسیاں سانپ بن کر نظر آنے لگی تھیں جو فرعون کے جادوگروں نے ان کو ڈرانے کے لئے ان کے سامنے ڈال دی تھیں، اس طرح کا سحر اگر نبی ﷺ کے لئے اس کے مقابلہ پر ہوگا کہ اس کی نبوت کی دلیل و شہادت کو ختم کردیا جائے یا کسی ولی یا بزرگ کی حیثیت کو مجروح کرنے کے لئے اس کے مقابلہ پر پیش کیا جائے، تو حرام اور گناہ کبیرہ کے حکم میں ہوگا اور اگر اس کی نظر بندی کا مقصد کسی شخص کو دھوکا و فریب میں مبتلا کرنا یا کسی شخص کی عزت و آبرو یا اس کے مال میں خیانت کرنا ہو تو گناہ کبیرہ کے حکم میں ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ سحر کی یہ قسم اگرچہ بنفسہ کفر نہیں ہے لیکن کسی شخص کے خیالات و تصورات پر اثر انداز ہونے کے لئے یا یوں کہا جائے کہ اس نظر بندی یا شعبدہ بازی کو کامیاب کرنے کے لئے چونکہ جنات کی ارواح سے استمداد کرنا یا جنات کے ارواح کو جپنا ضروری ہوتا ہے اس لئے کفر لازم آتا ہے، بشرطیکہ اس استمداد اور اسماء کو جپنے میں ان جنات کی اتنی زیادہ تعظیم و توقیر کا اظہار کیا جائے جو عقیدہ توحید کے منافی ہو۔

سحر کی پانچویں قسم وہ ہے جس میں انسان خود اپنے دھیان اور حواس خمسہ کی قوتوں کو دماغ میں مجتمع کرتے ہوئے کمال یکسوئی پیدا کرکے ایک ایسی قوت و قدرت حاصل کرلیتا ہے اس کے ذریعہ وہ اس خیال کو جو اس کی قوت متخیلہ میں ہوتا ہے (اور جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے) مشکل کرکے سامنے لے آتا ہے، جسمانی طول، عرض عمق کی حدود و قیود سے آزادی حاصل کرتے ہوئے مسمریزم کی طاقت سے شعبدے دکھلاتا ہے اور نظر یک سے دو متصل چیزوں کو منفصل کردکھاتا ہے۔ اور دو علیحدہ علیحدہ چیزوں کو ملاکر دکھلادیتا ہے۔ سحر کی اس قسم کا اب نام و نشان بھی موجود نہیں ہے، لیکن پچھلے زمانہ میں ہندوستان کی بعض قدیم اقوام میں یہ قسم بہت رائج تھی اس قسم کے حصول کے لئے جہاں اور بھی بہت شرائط ہیں، انہیں میں دو سب سے زیادہ اہم اور ضروری شرط کھانے پینے میں بالکل کمی اور لوگوں سے گوشہ نشینی اختیار کرلینا ہے اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر اس کے ذریعہ کسی مباح چیز کا حصول مقصود ہو، جیسے دو زناکاروں کے درمیان جدائی ڈالنا یا کسی ظالم کو مارڈالنا تو سحر کی یہ قسم جائز ہوگی اور اگر کسی ممنوع چیز کا حصول مقصود ہو جیسے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنا یا کسی معصوم انسان کو ہلاک کردینا تو پھر یہ قسم بھی حرام ہوگی۔

سحر کی چھٹی قسم وہ ہے جس میں دواؤں یا اشیاء کے مخفی خواص معلوم کر کے ان کے ذریعہ عجیب و غریب کرشمے دکھائے جاتے ہیں اور چونکہ عام لوگ اس مخفی خواص سے قطعاً لاعلم ہوتے ہیں اس لئے اکثر دنیا اور پیرو فقیر اور جوگی اپنی حیلہ سازیوں سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں لوگوں پر اپنی "کرامت" ظاہر کرنے کے لئے اپنی انگلیوں کو روشن کر دوں تو اس کا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ تھوڑا سا نورہ کابلی سرکہ میں بھگو کر اس میں تھوڑا سا کف دریا ملا دیا جائے اور پھر انگلی پر اس کا لیپ کیا جائے اور جس جگہ لیپ کیا جائے وہاں رال ٹپکا دی جائے اب لوگوں کی کسی ایسی مجلس میں کہ جہاں شمع یا چراغ جلتا ہو اس انگلی کو چراغ کے سامنے کر دیا وہ انگلی روشن ہو جائے گی اور جلے گی نہیں۔

سحر کی ساتویں قسم وہ ہے جس میں ایجاد کئے گئے عجیب و غریب آلات کی مدد سے بعض چیزوں کو ترکیب دے کر حیرت انگیز امور انجام دیئے جائیں! ان آلات کو ایجاد کرنا عام طور پر مختلف علوم و فنون میں تعمق اور تحقیق و جستجو پر منحصر ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ فرعون کے ساحروں کی جادوگری نظر بندی اور شعبدہ بازی کے ساتھ اس طرح کی جنی مہارت کا بھی پرتو تھی، آج کل کی سائنسی ایجادات کو بھی اس قسم میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

سحر کی آٹھویں قسم وہ ہے جس میں ہاتھ کی صفائی کے ذریعہ مختلف شعبدے دکھلا کر لوگوں کو متحیر کیا جاتا ہے سحر کی اس قسم میں ہاتھ کا سرعت کے ساتھ چند مخصوص پوشیدہ حرکات اور تبدیل امثال کر دینا ہے "خفیہ سبب" ہوتا ہے۔

سحر کی یہ تینوں آخری قسمیں نہ تو کفر ہیں اور نہ حرام، ہاں اگر ان کو کسی حرام چیز کے حصول یا کسی حرام کام کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے تو اس بنا پر ان پر حرمت کا حکم ثابت ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ سحر کی جو آٹھ قسمیں بیان کی گئی ہیں یہ صرف لفظی اعتبار سے ہیں، کیونکہ عربی زبان میں سحر یعنی جادو ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو محیر العقول ہو اور جس کا سبب و ذریعہ نظروں سے پوشیدہ ہو اگر سحر یا جادو کے اصطلاحی و حرفی مفہوم اور اس کی مشہور تعریف و حقیقت کا اعتبار کیا جائے تو اصولی طور پر سحر کی تین ہی قسمیں ہونی چاہئیں ایک تو وہ سحر جس میں کواکب و سیارات کی قوتوں سے استمداد کر کے ہوشربا کرشمے اور محیر العقول طلسمات ظاہر کئے جائیں۔ دوسرا وہ سحر جس میں جنات و شیاطین اور مردہ انسانوں کی ارواح کو مسخر کر کے حاجت روائی کی جائے۔ اور تیسرا وہ سحر جس میں اپنے دھیان اور خواس خمسہ کی قوتوں کو دماغ میں مجتمع کرتے ہوئے نظر بندی اور شعبدہ بازی کا کمال حاصل کیا جائے۔

سحر کا بدل کیا ہے؟

اس بات کو بھی جاننا ضروری ہے کہ اس اُمت کے اذکیاء و عارفین نے سحر کی مذکورہ بالا قسموں میں سے اکثر کی اصطلاح کر کے اور اس کی بنیاد سے کفر و شرک کی غلاظتوں کو دور کر کے ان کو عملیات کی صورت میں پیش کیا ہے جس سے مختلف قسم کے روحانی اور جسمانی فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں، چنانچہ سحر کی پہلی قسم کی اصلاح دعوت علوی ہے یہ وہ عمل ہے جس میں ملائکہ علویہ کو اسماء الٰہی اور آیات قرآنی کی استعانت سے مسخر کیا جاتا ہے، دوسری قسم کی اصلاح عزائم اور دعوت سفلی ہے، اس عمل میں زمین کے موکلات اور جنات کو مسخر کیا جاتا ہے لیکن اس تسخیر میں بھی نہ کفر و شرک کی آمیزش ہوتی ہے اور غیر اللہ کی تعظیم و توقیر، بلکہ ان جنات و شیاطین کو حکم و استیلاء کے ذریعہ مسخر کیا جاتا ہے، تیسری قسم کی اصلاح وہ عملیات ہیں جن کے ذریعہ صلحاء اور اولیاء اللہ کی ارواح طیبہ سے ربط و تعلق پیدا کیا جاتا ہے اور عام طور اویسی مشرب بزرگ ان عملیات کو اختیار کر کے اپنے اور مخلوق خدا کے مقاصد و حوائج میں فائدہ حاصل کرتے ہیں ان عملیات کی بنیاد، طہارت و پاکیزگی، تلاوت قرآن اوراد و وظائف اور ان ارواح کو صدقات و خیرات کا ثواب پہنچانے پر ہوتی ہے پانچویں قسم کی اصلاح عقد ہمت ہے جو اونچے درجے کے مشائخ اور صوفیاء کرام حل مشکلات کے لئے اختیار کرتے ہیں جس میں دنیاوی امور سے کامل بے خبری پیدا کر کے اور اپنے دھیان و اپنے خیالات کو یکسو کر کے اسماء الٰہی میں سے کسی اسم پاک کے غور فکر میں استغراق کا درجہ حاصل کیا

جاتا ہے اور چھٹی قسم کی اصلاح وہ عملیات ہیں جن میں آیات قرآنی اور اسماء الٰہی کے خواص میں تعمق و جستجو کر کے ان کو مخصوص ترکیب و شرائط کے ساتھ یا ان کے اعداد کی صورت میں نقش و تعویذات لکھے جاتے ہیں، یا دعاؤں کے ذریعہ جھاڑ پھونک کی جاتی ہے جیسا کہ نقش و تعویذات اور اوراد و عملیات کی کتابوں میں اس کی تفصیل لکھی ہوتی ہے۔

حاصل یہ کہ سحر میں جو برائی ہے وہ محض اس وجہ سے کہ اس کی بنیاد کفر و شرک، نیز کواکب و سیارات، جنات و شیاطین اور ارواح خبیثہ کی تاثیر کے اعتقاد پر ہوتی ہے اور اس سے فائدہ حاصل کرنا اس پر موقوف ہوتا ہے کہ غیر اللہ سے رو و اعانت کی التجا کی جائے، ان کو حاجت روا مانا جائے اور اسباب و ذرائع پر اس طرح اعتماد کیا جائے کہ سبب یعنی حق تعالیٰ کی قدرت سے بالکل صرف نظر کر لیا جائے اور جب برائی کی یہ وجہ بالکل دور ہو جائے تو پھر اصل حرمت و حلت کا مدار غرض و مقاصد پر ہوگا کہ اگر کوئی نیک و مباح مقصد پیش نظر ہے تو سحر و عملیات کی طاقت سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، اور اگر غرض و مقصد کسی بری چیز اور ناجائز امور سے متعلق ہو تو اس صورت میں بھی "سحر" کی طاقت سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہوگا۔

جو علم نفع پہنچانے والا نہ ہو اس سے احتراز کرنا ہی دانشمندی ہے

مولانا شاہ عبد العزیزؒ آیت کریمہ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ الآیۃ کے اس ٹکڑے وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہودی ان دونوں طرح کے سحر سیکھنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے۔ جو انتہائی مذموم و قبیح ہیں بلکہ وہ اپنے اوقات اور اپنی صلاحیتوں کو دوسرے ایسے علوم کے حصول میں بھی صرف کرتے تھے جو علم شریعت اور وحی الٰہی سے دور کر دینے کا ذریعہ اور موجب بنتے ہیں، چنانچہ وہ اس طرح کے علوم سیکھتے تھے جو ان کے لئے نقصان دہ ہوتے تھے گو دوسروں کو نقصان نہ پہنچاتے ہوں اور ان سے خود ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ گو اوروں کو فائدہ پہنچتا ہو، لہٰذا عقلمندی، سمجھداری کا تقاضہ یہی ہے کہ انسان ہر اس علم و فن سے احتراز کرے جو نفع بخش ہونے کی بجائے کسی طرح کا نقصان پہنچانے والا ہو۔ مگر واضح رہے کہ کسی شخص کے حق میں کسی علم کا مذموم و معیوب ہونا ان تینوں جہتوں میں سے کسی ایک جہت کے سبب سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ اس علم سے خود اپنے کو یا دوسروں کو نقصان پہنچنے کا خوف ہو، جیسے سحر و طلسمات کا علم نجوم کا علم بھی اسی میں شامل ہے کیونکہ اس کے ذریعہ اکثر لوگ عقیدہ کی گمراہی میں مبتلا ہو کر اپنا اخروی نقصان کرتے ہیں، چنانچہ جب وہ زمین اور کواکب سیارات کا باہم ربط دیکھتے ہیں اور علم نجوم ان کو بتاتا ہے کہ کرہ ارضی پر رونما ہونے والے تغیرات و واقعات اجرام فلکی کی حرکت و سکون اور سیارگان کی چال کے زیر اثر ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ عالم میں جو بھی حادثہ و تغیر وقوع پذیر ہوا ہو وہ فلاں ستارے فلاں برج اور فلاں درجے کی تاثیر کے سبب سے ہے۔ اس طرح وہ اپنے مقاصد کے حصول کی امید یا مقاصد کے فوت ہو جانے کے خوف کو ستاروں اور ان کے بروج و منازل سے وابستہ کرتے ہیں۔ یعنی وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر فلاں ستارہ فلاں برج اور فلاں منزل میں ہوگا تو ہمارا فلاں مطلب حاصل ہوگا اور اگر فلاں ستارہ فلاں برج و منتری میں داخل ہوگا تو ہمارا فلاں مطلب حاصل نہیں ہوگا گویا ان کی توجہ ذات حق جل مجدہ کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ جو نفع و نقصان کا حقیقی مالک ہے اور ان کے دل پر ایسا پردہ پڑ جاتا ہے جو ان کو نظر الی اللہ سے روک دیتا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ علم اگرچہ بذات خود نقصان پہنچانے والا نہ ہو، لیکن اس کو حاصل کرنے کا دعویدار اس کے حقائق و نکات اور اس کے باریک و مخفی گوشوں تک اپنی عدم صلاحیت اور عدم استعداد کی وجہ سے نہ پہنچ سکتا ہو، ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو علم کے حقائق و دقائق تک رسائی ہی نہ حاصل کر سکا ہو اس علم کا فاضل و ماہر تو ہونے سے رہا، البتہ جہل مرکب میں ضرور مبتلا ہو جائے گا، اسی لئے بے صلاحیت لوگوں کا اسرار و رموز الٰہیہ احکام شرعیہ کے بارے میں بحث و تمحیص کرنا، اکثر و بیشتر فلسفیانہ علوم میں جان کھپانا، قضا و قدر اور صبر و اختیار کے مسئلے میں تحقیق و جستجو کرنا مسئلہ توحید وجودی و شہودی کی راہ پر لگنا، اور بعض صحابہؓ کے درمیان آپسی نزاعات و خصومات کی جو صورتیں پیدا ہو گئی تھیں ان کو علم و تحقیق کے نام پر اچھالنا یا ان کی کھوج کرید کرنا وغیرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کو مذکورہ بالا علم کے زمرہ میں

شمار کیا جاتا ہے، اسی طرح شعرو شاعری کے فن کو بھی کچھ اچھا علم نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ شعرو شاعری کی بنیاد زیادہ تر حسن و عشق کے مضامین اور غیر پاکیزہ خیالات و تصورات پر ہوئی ہے اور یہ چیز عوام کے حق میں کہ جن کے دل و دماغ نفسانی خواہشات اور جنسی جذبات سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں زہر جیسی تاثیر رکھتی ہے اور تمام امور میں تخیل پردازی و مبالغہ آرائی کا ملکہ پیدا کرتی ہے۔

اور تیسرے یہ کہ شریعت سے متعلق علوم محمودہ میں بے جا فکر اور تعمق کیا جائے اور اس میں افراط و تفریط سے کام لیا جائے، جیسے عقائد و توحید کے علوم میں فلسفیانہ موشگافیاں اور دیگر شرعی علوم و قواعد میں عقل و منطق کی غیر موزوں اور غیر ضروری نکتہ آفرینیاں کی جائیں، اور فقہی احکام و مسائل میں کھوج کرید کر کے بے اصل حیلوں اور نادر روایات و اقوال کو بیان کیا جائے اسی طرح سلوک و ریاضت کے علم میں ایسے اصول و قواعد اور اعمال و اشغال داخل کرنا جوگیوں وغیرہ کا طریقہ ہے۔ یادعوت اسماء الٰہی اور دوسرے عملیات دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک میں سحر و طلسمات کے اصول و قواعد کو شامل کرنا، یا انبیاء علیہم السلام کے قصص و حالات میں یہود و روافض جیسے معاندین حق کے بیان کردہ جھوٹے قصے اور روایات کو سننا ان کو بیان کرنا کہ جن سے عقائد وغیرہ بھی اسی حکم میں شامل ہیں۔

غرضیکہ علم کی یہ جو قسمیں بیان کی گئی ہیں ان کے متوقع فوائد لوگوں کو نہیں پہنچتے، بلکہ ان کے حق میں نقصان دہ ہوتے ہیں، یہودی عام طور پر انہی جیسے لاحاصل، بے مقصد اور غیر نفع بخش علوم میں مشغول و مصروف رہتے تھے اور اصل علوم محمودہ سے اعراض کرتے تھے۔

بَابُ الفَالِ وَالطِّيَرَةِ

فال اور طیرہ کا بیان

"فال" اصل میں تو مطلق شگون کو کہتے ہیں، لیکن عام طور پر اس لفظ کا استعمال نیک شگون یا اچھی خال کے معنی میں ہوتا ہے۔ نیک شگون یا اچھی خال کا مطلب ہے کسی اچھی بات کو سننا یا کسی اچھی چیز کو دیکھنا جس سے اپنی مراد حاصل ہونے کی توقع پیدا ہو، مثلاً کوئی شخص بیمار ہو اور اس بات کے تردد اندیشہ میں ہو کہ صحت پاؤں گا یا نہیں اور اس حالت میں وہ سنے کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ یَاسَالِمُ یا کوئی شخص میدان جنگ رہا تھا کہ ایک شخص سے ملاقات ہو گئی۔ جس کا نام ظفر خاں یا فتح علی تھا، اور یا مثلاً کوئی شخص کسی چیز کا طالب ہو یا اس کی کوئی چیز گم ہو گئی ہو اور وہ اس کو تلاش کر رہا ہو اور اسی اثناء میں اس کے کان میں یا واجد کی آواز آئے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ کبھی لفظ "فال" برائی کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز کا واقع ہونا بری فال ہے۔ یا زبان سے بری بات نکالنا بدفالی ہے۔

"طیرۃ" نظیر (یعنی بدفالی لینا) کا مصدر ہے جیسا کہ "خیرہ" تخیر کا مصدر ہے ان دونوں لفظوں کے سوا پر مطلق فال یعنی شگون کے معنی میں بھی ہوتا ہے جو وہ فال اچھی ہو یا بری۔

تطیر کی اصل اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب عام طور پر اس طرح شگون لیتے تھے کہ جب وہ کوئی کام کرتے یا کسی سفر پر جانے کا ارادہ کرتے تو کسی پرندے یا ہرن کو چھچھکار دیتے اگر وہ داہنی سمت میں اڑ جاتا یا دائیں طرف کو بھاگتا تو اس کو مبارک جانتے اور نیک فال لیتے اور پھر اس کام کو شروع کرتے یا سفر پر روانہ ہوتے، اور اگر وہ پرندہ یا ہرن بائیں سمت میں اڑتا یا بائیں طرف کو بھاگتا تو اس کو نجس جانتے اور اس کام سے باز رہتے۔

واضح رہے کہ شکار کے اس جانور کو سنوح یا سانح کہتے ہیں جو سامنے سے نمودار ہو کر بائیں طرف سے دائیں طرف کو جا رہا ہو، اور شکار کا جو جانور دائیں طرف سے بائیں طرف کو جا رہا ہو اس کو بروح یا بارح کہتے ہیں عرب کے لوگ سنوح کو مبارک اور بروح کو منحوس سمجھتے تھے چنانچہ بعض مواقع پر "سوانح" اور "بوارح" اور ان کے ذریعہ شگون لینے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے یہی معنی ہیں۔

یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ نیک فال لینا محمود و مستحسن بلکہ مستحب ہے جب کہ تطیر یعنی بری فال لینا مذموم و ممنوع ہے چنانچہ نبی

کریم ﷺ کثرت کے ساتھ اور خاص طور پر لوگوں کے ناموں اور جگہوں کے ذریعہ اچھی فال لیتے تھے ان دونوں میں فرق و امتیاز اس بنا پر ہے کہ نیک فال میں اول اول تو اطمینان اور خوشی حاصل ہوتی ہے دوسرے اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے اچھائی و بھلائی کی امید آوری ہوتی ہے، نیز دل میں اچھائی اور بھلائی ہی کا خیال آتا ہے اور یہ امید آوری اور یہ خیال ہر حالت میں بندے کے لئے بہتر ہے گو اس کی مراد پوری نہ ہو، اور بدفالی اس لئے ممنوع و مذموم ہے کہ اس میں خواہ مخواہ رنج اور تردد پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے قطع امید ہوتی ہے اور ناامیدی و نامرادی کا احساس اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں شرعاً مذموم و ممنوع بھی ہیں اور عقل و دانش کے منافی بھی ہیں جب کہ بہر صورت ہو گا وہی جو اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے۔

بہر حال اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جو فال و طیرہ سے متعلق اور جن کی تحقیق اوپر بیان کی گئی نیز مؤلف مشکوۃ نے اس باب میں وہ احادیث نقل کی ہیں، جن میں عدویٰ، ہامہ، اور ان جیسی دوسری اور چیزوں کا ذکر ہے اور یہ سب بھی تطیر یعنی بدفالی کے مفہوم کی حامل اور اسی کے حکم میں داخل ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بدشگونی لینا منع ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَاطِیَرَةَ خَیْرُهَا الْفَالُ قَالُوْا وَمَا الْفَالُ قَالَ الْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ یَسْمَعُهَا اَحَدُكُمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "بدشگونی بے حقیقت ہے اس سے بہتر تو اچھی فال ہے۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ اور فال کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ اچھا کلمہ جس کو تم میں سے کوئی شخص سنے اور اس سے اپنی مراد پانے کی توقع پیدا کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "بدشگونی بے حقیقت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ حصول منفعت یا دفع مضرت میں بدفالی لینے کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اور نہ شریعت نے اس کو سبب اعتبار قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس کا کوئی اعتقاد و اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ چونکہ ہو گا وہی جو قادر مطلق (اللہ تعالیٰ) کی مرضی ہو گی اس لئے بدفالی لے کر اپنے آپ کو خواہ مخواہ خوف و اندیشہ اور ناامیدی میں کیوں مبتلا کیا جائے۔ طیرہ یعنی بدفالی کی نفی کرنے اور اس کی ممانعت کو ظاہر کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فال کی تعریف کی اور یہ فرمایا کہ طیرہ کی بہترین صورت اچھی فال ہے۔ گویا حدیث میں "طیرہ" مطلق فال لینے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے لیکن اس موقع پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حدیث کی عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھی فال لینا بہتر ہے۔ اور بدفالی لینا بھی کسی نہ کسی درجہ میں اچھی چیز ہے حالانکہ حقیقت میں بدفالی اچھی چیز نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت میں لفظ خیر اصل میں بہ کے مفہوم میں ہے نہ کہ بہتر کے معنی میں جیسا کہ یہ جملہ ہے۔ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی۔ وَاَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَیْر ایک جواب یہ بھی ہے کہ یہ ارشاد گرامی ﷺ دراصل اہل عرب کے گمان و اعتقاد پر مبنی ہے کہ وہ بدفالی کو بھی پسندیدہ چیز سمجھتے تھے یا یہ کہ اس عبارت کی بنیاد یہ ہے کہ اگر طیرہ کا اچھا ہونا بالفرض ممکن بھی ہوتا تو فال اس سے بہتر چیز ہوتی۔

"وہ اچھا کلمہ......" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو کوئی ایسا جملہ سنائی دے جس سے اس کے دل میں اپنے مطلوب و مقصود کے حاصل ہو جانے کی امید پیدا ہو جائے اور وہ اس لفظ یا جملے کو اپنے حق میں گویا اچھی پیشگوئی سمجھے جیسے کوئی شخص اپنی کسی گمشدہ چیز کو تلاش کر رہا ہو کہ وہ یہ آواز سنے یا واجد یا کوئی شخص راستہ بھول گیا ہو اور اس کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہا ہو کہ اس کے کان میں کسی طرف سے یہ آواز آئے۔ یا راشدا۔

چند بے اصل باتیں اور ان کا بطلان

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاعَدْوٰى وَلَاطِيَرَةَ وَلَاهَامَةَ وَلَاصَفَرَ وَفِرَّمِنَ الْمَجْزُوْمِ كَمَاتَفِرُّمِنَ الْاَسَدِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگنا بدشگونی ہامہ، اور صفر یہ سب چیزیں بے حقیقت ہیں (البتہ) تم جذامی سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ خیال کہ ایک شخص کی بیماری دوسرے کو لگ جاتی ہے، زمانہ جاہلیت کی یادگار ہے، چنانچہ اہل عرب کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص بیمار کے پہلو میں بیٹھ جائے یا اس کے ساتھ کھائے پئے تو وہ بیماری اس میں بھی سرایت کر جائے گی۔ علماء لکھتے ہیں کہ عام طور پر اطباء کے نزدیک سات بیماریاں ایسی ہیں جو ایک سے دوسرے کو لگتی ہیں ① جذام ② خارش ③ چیچک ④ آبلے جو بدن پر پڑ جاتے ہیں ⑤ گندہ دہنی ⑥ رمد ⑦ وبائی امراض۔

لہٰذا شارع علیہ السلام نے اس اعتقاد خیال کو رد کرتے ہوئے واضح کیا کہ مرض کا ایک سے دوسرے میں سرایت کرنا اور اڑ کر لگنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق نظام قدرت اور قادر مطلق کی مشیت سے ہے کہ جس طرح پہلا شخص بیمار ہوا ہے اسی طرح دوسرا شخص بھی اس بیماری میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ جب تمام امراض کے ہی بارے میں چھوت کے اعتقاد و نظریہ کی تردید کی گئی ہے تو پھر جذامی سے بھاگنے کا حکم کیوں دیا گیا اور اس طرح خود اس حدیث کے مفہوم میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب انشاء اللہ فصل کے آخر میں نقل کیا جائے گا۔

بدشگونی کے بارے میں تو اوپر بیان کیا جا چکا ہے! "ھاما" کے اصل معنی سر کے ہیں، لیکن یہاں اس لفظ سے ایک خاص جانور مراد ہے جو عربوں کے گمان کے مطابق میت کے استخوان سے پیدا ہو کر اڑتا ہے، زمانہ جاہلیت میں اہل عرب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے تو اس مقتول کے سر سے ایک جانور جس کو "ہامہ" کہتے ہیں باہر نکلتا ہے اور ہر وقت یہ فریاد کرتا رہتا ہے کہ مجھے پانی دو، پانی دو، یا وہ قاتل سے انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب قاتل (خود اپنی موت سے یا کسی کے قتل کر دینے سے) مر جاتا ہے تو وہ جانور اڑ کر غائب ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ یہ کہا کرتے تھے خود مقتول کی روح اس جانور کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور فریاد کرتی ہے تاکہ قاتل سے بدلہ لے سکے جب اس کو قاتل سے بدلہ مل جاتا ہے تو اڑ کر غائب ہو جاتا ہے۔ شارع علیہ السلام نے اس اعتقاد کو بھی باطل قرار دیا اور فرمایا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ "ہامہ" سے مراد الو ہے کہ جب وہ کسی گھر پر بیٹھ جاتا ہے تو وہ گھر ویران ہو جاتا ہے۔ یا اس گھر کا کوئی فرد مر جاتا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اس عقیدہ کو بالکل مہمل قرار دیا اور واضح رہے فرمایا کہ تطیر یعنی پرندہ کے ذریعہ بدفالی لینے کے حکم میں ہے جو ایک ممنوع چیز ہے۔

"صفر" کی وضاحت میں متعدد اقوال بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس سے تیرہ تیزی کا مہینہ مراد ہے جو محرم کے بعد آتا ہے اور جس کو صفر کہتے ہیں، چوں کہ کمزور عقیدہ لوگ اس مہینہ کو منحوس سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس مہینے میں آفات وبلاء اور حوادث و مصائب کا نزول ہوتا ہے اس لئے اس ارشاد کے ذریعہ اس عقیدے کو باطل و بے اصل قرار دیا گیا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اہل عرب یہ کہا کرتے تھے کہ ہر انسان کے پیٹ میں ایک سانپ ہوتا ہے۔ جس کو "صفر" کہا جاتا ہے ان کے گمان کے مطابق جب پیٹ خالی ہوتا ہے اور بھوک لگتی ہے تو وہ سانپ کاٹتا ہے اور تکلیف پہنچاتا ہے ان کا کہنا تھا کہ بھوک کے

وقت پیٹ میں جو ایک قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ اسی سانپ کے سبب سے ہوتی ہے اور اس کے اثرات ایک دوسرے میں سرایت کرتے ہیں۔ نوویؒ نے شرح مسلم میں یہ لکھا ہے کہ بعض لوگوں کے گمان کے مطابق "صفر" ان کیڑوں کو کہتے ہیں جو پیٹ میں ہوتے ہیں اور بھوک کے وقت کاٹتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے سبب سے آدمی زرد رنگ کا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔ یہ سب بے اصل باتیں ہیں جن کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔

کسی بیماری کا متعدی ہونا بے حقیقت بات ہے

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا عَدْوٰى وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ فَقَالَ اَعْرَابِيٌّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَمَابَالُ الْاِبِلِ تَكُوْنُ فِي الرَّمْلِ لَكَاَنَّهَا الظِّبَآءُ فَيُخَالِطُهَا الْبَعِيْرُ الْاَجْرَبُ فَيُجْرِبُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنْ اَعْدَى الْاَوَّلَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کسی بیماری کا ایک سے دوسرے کو اڑ کر لگنا، ہامہ، اور صفر، ان سب کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ (ایک دیہاتی نے کہ جو اپنے ناقص مشاہدے و تجربہ کی بنا پر خارش کو متعدی بیماری سمجھتا تھا) آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سن کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! تو پھر ان اونٹوں کے بارے میں کہا جائے گا (جو اپنی تندرستی اور اپنی جلد کھال کی صفائی ستھرائی کے اعتبار سے) ہرن کی مانند ریگستان میں دوڑے پھرتے ہیں، لیکن جب کوئی خارشی اونٹ ان میں مل جاتا ہے تو وہ دوسروں کو بھی خارش زدہ بنا دیتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (اچھا تو یہ بتاؤ) پہلے اونٹ کو کس نے خارش زدہ بنایا؟ یعنی خارش پیدا ہونے کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی سے اڑ کر لگے لہٰذا جس طرح ان تندرست اونٹوں میں آملنے والے خارش زدہ اونٹ میں خارش کا پیدا ہونا بتقدیر الٰہی ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے اونٹوں کا خارش زدہ ہو جانا بھی حکم الٰہی کے تحت اور نظام قدرت کے مطابق ہوتا ہے۔" (مسلمؒ)

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا عَدْوٰى وَلَا هَامَةَ وَلَا نَوْءَ وَلَا صَفَرَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ایک دوسرے کو بیماری لگنا۔ ہامہ، نوء اور صفر کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "نوء" کا مطلب ہے کہ ایک ستارہ کا غروب ہونا اور دوسرے کا طلوع ہونا۔ اہل عرب کے خیال میں بارش کا ہونا یا نہ ہونا ستاروں کے اسی طلوع و غروب کے زیر اثر ہے جیسا کہ علم نجوم پر اعتقاد رکھنے والے لوگ کہا کرتے ہیں کہ بارش کا تعلق نچھتروں سے ہے کہ فلاں فلاں نچھتر اگر فلاں فلاں تاریخ میں پڑ جائیں اور ان تاریخوں میں بارش ہو جائے تو آگے چل کر برسات کے مہینوں میں فلاں فلاں تاریخوں میں بارش ہوگی۔

نہل میں لکھا ہے کہ "نوء" کی جمع انواء ہے جس کے معنی قمر کے ہیں منازل یعنی نچھتروں کے ہیں اور وہ منازل اٹھائیس ہیں قرآن کریم کی آیت کریمہ "وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ" میں ان ہی منازل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، چنانچہ اہل عرب نزول باراں کو انہی منازل کی طرف منسوب کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ جب چاند ان سے فلاں فلاں منازل میں آتا ہے تو بارش یقیناً ہوتی ہے گویا ان کے نزدیک چاند کا ان منازل میں آنا بارش ہونے کے لئے علت اور مؤثر حقیقی کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ شارع علیہ السلام نے اس عقیدے کو باطل قرار دیا اور واضح کیا کہ بارش کا ہونا محض حکم الٰہی پر منحصر ہے نہ کہ کسی سبب اور علت سے متعلق ہے لیکن واضح رہے کہ اس نفی و ابطال کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ تاثیر علت کا اعتقاد ہو ہاں اگر منازل میں چاند کے آنے کو نزول باراں کا ایک ظاہری سبب سمجھا جائے۔ یعنی یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس وقت بارش برساتا ہے جب کہ چاند اپنی اپنی فلاں منزل میں آتا ہے اور وہ وقت علت کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ محض ایک ظاہری سبب کا درجہ رکھتا ہے کہ حق تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اس وقت سے پہلے یا اس کے بعد بھی بارش برسائے اور اگر چاہے تو اس

وقت بھی نہ برسائے تو یہ عقیدہ نہ کفر کے دائرے میں آئے گا اور نہ اس کو باطل کہا جائے گا۔ اگرچہ امام نوویؒ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ بھی کفر کا سبب ہے کیونکہ نزول باراں کو چاند اور اس کے منازل سے کسی بھی طرح متعلق کرنا اول تو اہل کفر کا شعار ہے، دوسرے مذکورہ صورت (اگرچہ علیت کے عقیدہ کو ظاہر نہیں کرتی مگر موہم علیت تو یقیناً ہے، اس بارے میں زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ حدیث مذکورہ ممانعت مطلق (بلا استثناء) ہے کہ اس کا تعلق علیت کے عقیدے سے بھی ہے اور اس صورت سے بھی ہے جس میں چاند اور اس کی منازل کو محض ایک ظاہری سبب سمجھا جائے، کیونکہ اول تو اس ارشاد کا مقصود عقیدے کی گمراہی وفساد کا سدباب ہے دوسری ایسی کوئی حدیث منقول نہیں ہے جس سے اس کا جواز کسی بھی صورت میں ثابت ہو۔ حاصل یہ کہ جب بارش ہو، اس طرح نہیں کہنا چاہئے کہ فلاں نچھتر سے بارش ہوئی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بارش ہوئی ہے۔

غول کا ذکر

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَاعَدْوٰى وَلَا صَفَرَ وَلَا غُوْلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ "ایک سے دوسرے کو بیماری کا لگنا، صفر اور غول کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "غول" جس کی جمع غیلان ہے جنات وشیاطین کی ایک قسم وجنس ہے، اہل عرب کا خیال تھا کہ جنگلات میں غول مختلف صورتوں اور شکلوں میں لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں اور ان کو راستہ بھلادیتے ہیں اور ہلاک کرڈالتے ہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس خیال کو باطل قرار دیا اور فرمایا کہ غول کوئی چیز نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ارشاد گرامی ﷺ میں غول کے وجود کی نفی مراد نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان (غول) کا مختلف صورتوں میں ظاہر ہونا اور لوگوں کو گمراہ وہلاک کردینا ایک بے حقیقت بات ہے یعنی ان کو اتنی قدرت وطاقت حاصل ہی نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر مسافروں کو راستہ بھلادیں اور ان کو ہلاک کرڈالیں۔

جذامی کا ذکر

⑥ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيْدِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ فِيْ وَفْدِ ثَقِيْفٍ رَجُلٌ مَجْذُوْمٌ فَاَرْسَلَ اِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا قَدْ بَايَعْنَاكَ فَارْجِعْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو ابن شرید اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ قبیلہ ثقیف کے لوگوں کا جو وفد (دربار رسالت میں) آیا تھا اس میں ایک جذامی تھا (جب اس جذامی نے بیعت کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا) تو نبی کریم ﷺ نے اس کے پاس ایک آدمی کو بھیج کر کہلا دیا کہ ہم نے (تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے بغیر) تم سے (زبانی) بیعت لے لی ہے، لہٰذا تم لوٹ جاؤ (گویا آپ ﷺ نے اس کو سامنے نہیں بلایا تاکہ حاضرین مجلس کو کراہت محسوس نہ ہو)۔" (مسلمؒ)

تشریح: جذامی سے ملنے جلنے میں اجتناب واحتراز کے بارے میں ایک تو یہ حدیث ہے، دوسری حدیث وہ ہے جو پیچھے گزری ہے اور جس میں فرمایا گیا کہ جذامی سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو ان دونوں حدیثوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جذامی کی صحبت ومجالست سے اجتناب وپرہیز کرنا چاہئے، جب کہ وہ احادیث ان کے برعکس ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ کسی بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں بالکل متضاد ہیں، اس تضاد کو دور کرنے کے لئے اور ان احادیث کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے علماء کے متعدد اقوال منقول ہیں، حضرت شیخ ابن حجر عسقلانیؒ نے شرح نخبہ میں لکھا ہے کہ احادیث کے اس باہمی

تضاد کو دور کرنے کے لئے سب سے بہتر قول یہ ہے کہ جن احادیث میں عدویٰ یعنی چھوت کی نفی کی گئی ہے ان کا حکم اپنے عموم و اطلاق کے ساتھ قائم و باقی ہے اور ان لوگوں کی مخالطت و مجالست جو جذام جیسے امراض میں مبتلا ہوں ان کی بیماری لگنے کا سبب ہرگز نہیں ہوتا اور جہاں تک احادیث کا تعلق ہے جو جذامی سے اجتناب و پرہیز کو ظاہر کرتی ہیں تو ان کا مقصد محض اوہام و وساوس کا سد باب ہے کہ کوئی شخص شرک کے گرداب میں نہ پھنس جائے۔ اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر کسی شخص نے جذامی کے ساتھ مخالطت و مجالست اختیار کی، یعنی ان کے بیٹھا اٹھا اور اس کے ساتھ ملنا جلنا جاری رکھا، اور پھر اسی دوران اللہ کا یہ حکم ہوا کہ وہ شخص بھی جذام میں مبتلا ہو گیا تو بعید نہیں کہ وہ اس وہم و اعتقاد میں مبتلا ہو جائے کہ میں اسی جذامی کی مخالطت و مجالست ہی کی وجہ سے اس مرض میں گرفتار ہوا ہوں لہٰذا آپ ﷺ نے لوگوں کو اس وہم و اعتقاد سے بچانے کے لئے کہ جو کفر و شرک کی حد تک پہنچاتا ہے، جذامی سے اجتناب و پرہیز کرنے کا حکم دیا، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود اپنی ذات کو حکم سے مستثنیٰ رکھا کیونکہ آپ توکل و اعتقاد علی اللہ کے مرتبہ اعلیٰ پر فائز تھے اس کی بنا پر مذکورہ وہم و گمان میں آپ ﷺ کے مبتلا ہونے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ ایک دن آپ ﷺ ایک جذامی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لائے اور پھر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، حاصل یہ ہے کہ جذامی سے اجتناب و پرہیز کرنے کا حکم اس شخص کے لئے ہے جو اپنے اندر صدق و یقین کی طاقت نہ رکھے اور اس بات کا خوف ہو کہ اگر وہ کسی جذامی کی مخالطت و مجالست کے دوران خود اس مرض میں مبتلا ہو گیا تو اس وہم و اعتقاد کا شکار ہو کر شرک خفی کے گرداب میں پھنس جائے گا۔

کرمانیؒ نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے کہ بیماری کے چھوت کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو جذام کی بیماری اس سے مستثنیٰ ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں کہ جذام میں ایک خاص قسم کی بدبو ہوتی ہے اگر کوئی شخص کسی جذامی کے ساتھ مخالطت و مجالست اور ہم خوری و ہم بستری میں زیادتی اختیار کرے تو وہ بو اس کو متاثر کرتی ہے اور بیمار کر دیتی ہے۔ جیسا کہ اگر کوئی شخص ایسا کھانا کھالے یا ایسی بو میں پھنس جائے جو اس کے مزاج و طبیعت کے موافق نہ ہو یا اس کا مضر ہونا ظاہر ہو تو اس شخص سے متاثر ہوتا ہے اور مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اگرچہ یہ چیزیں محض ایک ظاہری ذریعہ و سبب بنتی ہے حقیقت میں وہ بیماری اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے لاحق ہوتی ہے اس اعتبار سے جذامی سے پرہیز طبی نقطہ نظر اور حصول حفظان صحت کی رو سے ہو گا نہ کہ اس کو چھوت سمجھنے کی وجہ سے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آنحضرت ﷺ نیک فال لیتے تھے

(۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَفَاءَلُ وَلَا يَتَطَيَّرُ وَكَانَ يُحِبُّ الْاِسْمَ الْحَسَنَ۔

(رواه فی شرح السنة)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (اچھی فال لیتے تھے اور شگون بد نہیں لیتے تھے، نیز آپ ﷺ اچھے ناموں کے ذریعہ فال لینے کو) پسند فرماتے تھے۔" (شرح السنة)

شگون بد لینا شیطانی کام ہے

(۸) وَعَنْ قَطَنِ بْنِ قَبِيْصَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْعِيَافَةُ وَالطَّرْقُ وَالطِّيَرَةُ مِنَ الْجِبْتِ۔

(رواه ابوداؤد)

"اور حضرت قطن ابن قبیصہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں۔ کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ عیافہ، طرق، اور شگون بد لینا یہ سب چیزیں جبت میں سے ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "عِیَافَۃ" تطیر یعنی پرندوں کے ذریعہ فال لینے کی ایک صورت ہے جس میں پرندے کو خاص طور پر اڑا کر یا اس کے خود بخود اڑنے، اور اس کی آواز کے ذریعہ نیک فالی یا بد فالی لی جاتی ہے پہلے زمانہ کے عربوں میں اس کا بہت زیادہ رواج تھا اور عیافت دانی ایک باقاعدہ فن سمجھا جاتا تھا اس میں عام طور پر پرندوں کے نام کا اعتبار کیا جاتا ہے، مثلاً عقاب کے ذریعہ عقوبت، غراب کوے کے ذریعہ غربت اور ہدہد کے ذریعہ ہدایت کی فال لی جاتی تھی۔ طیرہ اور عیافہ میں فرق یہ ہے کہ طیرہ کے مفہوم میں عمومیت ہے کہ خواہ کسی پرندے کے ذریعہ شگون بد لیا جائے یا کسی اور جانور کے ذریعے، جبکہ عیافہ کا استعمال خاص طور پر کسی پرندے کی آواز کے ذریعہ نیک یا بد فالی لینے کے مفہوم میں ہوتا ہے۔ نہایہ میں لکھا ہے کہ "عیافہ" کے معنی ہیں ڈلے مار کر یا ہشکا کر کسی پرندے کو اڑانا اور اس کے نام، اس کی آواز اور اس کے اڑنے و گزرنے کے ذریعہ فال لینا۔

"طرق" (کنکریاں) مارنے کو کہتے ہیں، فال لینے کی یہ بھی ایک صورت تھی، چنانچہ پہلے زمانہ میں خاص طور پر عرب عورتیں فال لیتے وقت کنکریاں مارتی تھیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ریت پر خطوط اور لکیریں کھینچنے کو طرق کہتے ہیں جیسا کہ رمل جاننے والے ریت پر مختلف طرح کے ہندسے اور خطوط وغیرہ کھینچتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ غیب کی باتیں دریافت کرنے کا دعوی کرتے ہیں۔

"جبت" سحر و کہانت کے معنی میں ہے، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جبت کے معنی ہیں ہر وہ چیز جس میں بھلائی نہ ہو۔ یا وہ چیز جو اللہ کے سوا پوجی جائے، یعنی شرک، اور بعض حضرات کے نزدیک "جبت" شیطان کے کام کو کہتے ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں یعنی شگون بد لینا، پرندوں کی آواز کے گزرنے کے ذریعہ اور کنکریاں مار کر فال لینا، یا رمل و زائچہ وغیرہ کھینچ کر آئندہ کے حالات بتلانا، سحر و کہانت کے حکم میں داخل ہیں، یہ سب شرک کے کام ہیں اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ سب چیزیں شیطان کے کام ہیں۔

بد شگونی شرک ہے

⑨ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الطِّیَرَۃُ شِرْکٌ قَالَہٗ ثَلٰثًا وَمَامِنَّا اِلَّا وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُذْھِبُہٗ بِالتَّوَکُّلِ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ اِسْمٰعِیْلَ یَقُوْلُ کَانَ سُلَیْمَانُ بْنُ حَرْبٍ یَقُوْلُ فِیْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ وَمَامِنَّا اِلَّا وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُذْھِبُہٗ بِالتَّوَکُّلِ ھٰذَا عِنْدِیْ قَوْلُ ابْنِ مَسْعُوْدٍ۔ (ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "شگون بد لینا شرک ہے آپ ﷺ نے (زیادہ سے زیادہ) اہمیت ظاہر کرنے کے لئے) یہ بات تین مرتبہ فرمائی تاکہ لوگ اس سے اجتناب کریں اور ہم میں سے جو بھی شخص ایسا ہوتا ہے (کہ جس کے دل میں کبھی بد شگونی کے ذریعہ تردد و خلجان پیدا ہو جاتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کو اس پر بھروسہ و اعتماد کرنے سے روک دیتا ہے یعنی یہ ایمان کا تقاضہ ہے کہ کسی کام و سفر کے قصد و ارادہ کے وقت کوئی ایسی چیز ظاہر ہو جائے جس سے بتقاضائے بشریت دل و دماغ میں کوئی وہم اور تردد پیدا ہو تو اس وہم و تردد پر قطعا بھروسہ و اعتماد نہ کیا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکل و یقین رکھتے ہوئے اس کام کو کیا جائے یا اس سفر پر چلا جائے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

اور ترمذیؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام بخاریؒ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ میرے استاد و شیخ حضرت سلمان ابن حرب" اس حدیث کے بارے میں فرماتے تھے کہ حدیث کی یہ عبارت وَمَامِنَّا اِلَّا وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُذْھِبُہٗ بِالتَّوَکُّلِ میرے نزدیک حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے (نہ کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے)۔

تشریح: "شگون بد لینا شرک ہے"۔ کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز مشرکین کے طور طریقوں اور ان کی عادات میں سے ہے اور شرک خفی کی موجب ہے۔ ہاں اگر جزما یہ اعتقاد رکھا جائے کہ یونہی ہوگا تو وہ شگون بلاشک و شبہ کفر کے حکم میں ہوگا۔

آنحضرت ﷺ نے جذامی کے ساتھ کھانا کھایا

⑩ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخَذَ بِيَدِ مَجْذُوْمٍ فَوَضَعَهَا مَعَهُ فِي الْقَصْعَةِ وَقَالَ كُلْ ثِقَةً بِاللّٰهِ وَتَوَكُّلًا عَلَيْهِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک جذامی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو کھانے کے پیالہ میں اپنے ساتھ شریک کیا اور فرمایا کہ کھاؤ، میرا اللہ پر اعتماد و بھروسہ ہے اور میں اسی کی ذات پر توکل کرتا ہوں۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ توکل و یقین کا مرتبہ حاصل ہو جانے کے بعد جذامی سے بھاگنا اور اس کو اپنے سے الگ رکھنا ضروری نہیں ہے۔

بدشگونی کوئی چیز نہیں ہے

⑪ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا هَامَةَ وَلَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ وَاِنْ تَكُنِ الطِّيَرَةُ فِيْ شَيْءٍ فَفِي الدَّارِ وَالْفَرَسِ وَالْمَرْاَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سعد ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا نہ ہامہ کوئی چیز ہے نہ ایک سے دوسرے کو بیماری کا لگنا کوئی حقیقت رکھتا ہے اور نہ شگون بد میں کوئی حقیقت ہے، اگر کسی چیز میں شگون بد ہوتا تو گھر میں، گھوڑے اور عورت میں ہوتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: طیرہ یعنی بدشگونی اور نحوست کے سلسلے میں مختلف احادیث منقول ہیں، جن احادیث سے طیرہ کے اثرات کی نفی اور اس کا اعتبار کرنے یا اس پر اعتقاد رکھنے کی نہی و ممانعت ثابت ہوتی ہے وہ زیادہ ہیں، بعض احادیث سے عورت، گھوڑے اور گھر میں طیرہ کا ثبوت یقینی الفاظ کے ذریعہ مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ بخاریؒ و مسلم کی روایت ہے۔ اِنَّمَا الشُّؤْمُ فِيْ ثَلٰثٍ اَلْفَرَسِ وَالْمَرْاَةِ وَالدَّارِ یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ تین چیزوں میں نحوست ہے، گھر، گھوڑے اور عورت میں ایک روایت میں وہ تین چیزیں زمین، خادم اور گھوڑا بیان کی گئی ہیں۔ بعض احادیث سے ان تین چیزوں میں طیرہ کا ثبوت الفاظ شرط کے ساتھ مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ اوپر نقل کی گئی حدیث یا اسی طرح کی دوسری حدیث کے الفاظ ہیں کہ اگر بدشگونی اور نحوست کوئی چیز ہوتی تو ان چیزوں میں پائی جاتی، بعض احادیث سے دوسری تمام چیزوں کی طرح ان تین چیزوں میں بھی نحوست کے پائے جانے کا انکار مفہوم ہوتا ہے، جیسا کہ ابن ابی ملیکہ کی روایت ہے جس کو انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے اور بعض احادیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ان چیزوں میں نحوست کے پائے جانے کا اعتقاد زمانہ جاہلیت کے بے سروپا اعتقادات و خیالات سے ہے۔ غرضکہ اس بارے میں مختلف مفہوم کی روایتیں منقول ہیں لہٰذا ان سب کے درمیان وجہ مطابقت اور ان سب کا حاصل مقصد یہ ہے کہ تطیر یعنی شگون بد لینا اور کسی چیز کو منحوس سمجھنا بالکل بے اصل بات ہے اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ کچھ چیزوں میں نحوست ہوتی ہے تو جو چیزیں ایسی ہیں جو اپنی بعض حیثیتوں اور مآل کار کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ ان میں نحوست کا ہونا گمان کیا جا سکتا ہے اور ان کو نحوست کا موقع و محل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بات ایسی ہی ہے جیسا کہ اس روایت میں فرمایا گیا ہے۔ لو کان شی سابق القدر لسبقۃ العین یعنی اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت لے جانے والی ہو تو وہ نظر بد ہوتی۔

قاضیؒ نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے وہ کہتے ہیں کہ حدیث میں پہلے تو طیرہ کا انکار کرنا اور اس کے بعد یہ شرطیہ جملہ (کہ اگر کسی چیز میں شگون بد ہوتا تو گھر میں گھوڑے میں ایک عورت میں ہوتا) لانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ تطیر یعنی بدشگونی کی نحوست کا انکار اس مفہوم میں ہے کہ اگر نحوست کا کوئی وجود و ثبوت ہوتا تو ان تین چیزوں میں ہوتا کیونکہ یہی تین چیزیں نحوست کا موقع و محل ہو سکتی ہیں، لیکن جب ان چیزوں میں بھی نحوست کا کوئی وجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نحوست سرے سے کوئی وجود نہیں رکھتی۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر ان چیزوں میں "نحوست" کا کوئی وجود مفہوم ہوتا ہے تو اس معنی میں کہ اگر عورت زبان دراز، بے

حیا اور بدکار ہو یا اس کی کوکھ سے بچہ جنم نہ لیتا ہو یا اپنے شوہر کی نافرمانی کرتی ہو اور یا مکروہ صورت و بدشکل ہو تو اس اعتبار سے اس کو منحوس کہا جاتا ہے گھر میں نحوست کا ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ گھر تنگ و تاریک ہو اس کا پڑوس برے ہمسایوں پر مشتمل ہو اور اس کی آب وہوا ناموافق ہو، اسی طرح گھوڑے میں نحوست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گھوڑا سرکش و شریر ہو، کھانے میں تو تیز ہو لیکن چلنے میں مٹھا ہو، خصوصیات کے اعتبار سے کم تر ہو لیکن قیمت کے اعتبار سے گراں ہو اور مالک کی ضرورت و مصالح کو پورا نہ کرتا ہو، گھوڑے ہی پر خادم کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نحوست سے شرعی و طبعی کراہت و ناپسندیدگی مراد ہے اس اعتبار سے شوم و تطیر کی نفی تو عموم و حقیقت پر محمول ہوگی یعنی حقیقت تو یہی ہے کہ کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے۔ جس میں نحوست کا کوئی وجود ہو لیکن جن احادیث سے بعض چیزوں میں نحوست کا ہونا مفہوم ہوتا ہے ان میں نحوست سے مراد ان چیزوں کا طبعی طور پر یا کسی شرعی قباحت کی بنا پر ناپسندیدہ ہونا ہے۔

آنحضرت ﷺ نیک فال لینے کے لئے اچھے ناموں کا سننا پسند فرماتے تھے

(۱۲) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُعْجِبُہٗ اِذَا خَرَجَ لِحَاجَۃٍ اَنْ یَّسْمَعَ یَا رَاشِدُ یَا نَجِیْحُ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کام کے لئے باہر نکلتے تو آپ ﷺ کو یہ اچھا معلوم ہوتا کہ کسی کی زبان سے یہ سنیں اے راشد اے نجیح یعنی کسی کام کے لئے جاتے وقت اس طرح کے نام والفاظ سننا نیک فال ہے۔" (ترمذیؒ)

(۱۳) وَعَنْ بُرَیْدَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یَتَطَیَّرُ مِنْ شَیْءٍ فَاِذَا بَعَثَ عَامِلًا سَاَلَ عَنْ اِسْمِہٖ فَاِذَا اَعْجَبَہٗ اسْمُہٗ فَرِحَ بِہٖ وَرُؤِیَ بِشْرُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ وَاِنْ کَرِہَ اسْمَہٗ رُؤِیَ کَرَاہِیَۃُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ وَاِذَا دَخَلَ قَرْیَۃً سَاَلَ عَنْ اِسْمِہَا فَاِذَا اَعْجَبَہٗ اِسْمُہَا فَرِحَ بِہٖ وَرُؤِیَ بِشْرُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ وَاِنْ کَرِہَ اسْمَہَا رُؤِیَ کَرَاہِیَۃُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی چیز سے شگون بد نہ لیتے تھے اور جب آپ ﷺ کسی عامل (کارکن کو کہیں) روانہ کرنے لگتے تو اس کا نام دریافت فرماتے، اگر اس کا نام اچھا معلوم ہوتا تو آپ ﷺ اس سے خوش ہوتے اور آپ ﷺ کی خوشی آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہوتی اور اگر اس کا نام برا معلوم ہوتا تو اس سے آپ ﷺ کی ناگواری آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہوتی (یہاں تک کہ آپ ﷺ اس کے نام کو کسی اچھے نام سے بدل دیتے) اسی طرح جب آپ ﷺ کسی بستی میں داخل ہوتے تو اس بستی کا نام پوچھتے اگر آپ ﷺ کو اس کا نام اچھا معلوم ہوتا تو اس سے خوش ہوتے اور آپ ﷺ کی خوشی آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہوتی اور اگر اس کا نام برا معلوم ہوتا تو آپ ﷺ کی ناگواری آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہوتی!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: کسی برے نام کو سن کر ناگواری ہونا تطیر (یعنی شگون بد لینا) نہیں ہے تطیر تو اس صورت میں ہوتا جب آپ ﷺ برے نام کو سن کر اپنے کام یا اپنے سفر کو ترک کر دیتے جیسا کہ شگون بد لینے کی صورت میں ہوتا ہے تاہم کسی شخص یا آبادی کا برا اور بھدا نام سن کر آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ناگواری کے اثرات نمایاں ہوتے تھے کیونکہ طبیعت کا اچھائی و برائی سے متاثر ہونا اور اس کے نتیجے میں خوشی یا ناخوشی کا ظاہر ہونا تفاؤل و تطیر سے قطع نظر ایک فطری بات ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد یا اپنے خادم کے لئے اچھے نام کو اختیار کرنا سنت ہے۔ کیونکہ بسا اوقات برے نام تقدیر کے موافق ہو جاتے ہیں اور اس کے نتائج دوررس اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کا نام خسار رکھے تو ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر خود وہ شخص یا اس کا وہ بیٹا تقدیر الٰہی کے تحت خسارہ میں مبتلا ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اس کا خسارہ مبتلا ہونا نام کی وجہ سے ہے اور بات یہاں تک پہنچے کہ

لوگ اس کو منحوس جاننے لگیں اور اس کی صحبت وہم نشینی تک سے احتراز کرنے لگیں۔

مکان میں بے برکتی کا ذکر

(۱۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّا کُنَّا فِیْ دَارٍ کَثُرَ فِیْھَا عَدَدُنَا وَاَمْوَالُنَا فَتَحَوَّلْنَا اِلٰی دَارٍ قَلَّ فِیْھَا عَدَدُنَا وَاَمْوَالُنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَرُوْھَا ذَمِیْمَۃً۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن بارگاہ رسالت میں ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول کریم (ﷺ) پہلے ہم ایک مکان میں رہا کرتے تھے جس میں ہمارے افراد کی تعداد بھی زیادہ تھی اور ہمارے پاس مال بھی بہت تھا، پھر ہم ایک دوسرے مکان میں منتقل ہوگئے تو اس میں ہمارے آدمیوں کی تعداد بھی کم ہوگئی اور ہمارا مال بھی تھوڑا رہ گیا۔ رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ اس مکان کو چھوڑ دو جو برا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا اس مکان کو چھوڑ دینے کا حکم اس مکان کو منحوس سمجھنے کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ اس مکان کی آب وہوا اور اس کی سکونت چونکہ مکینوں کو راس نہیں آئی اس لیے آپ ﷺ نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ اس مکان کو چھوڑ دیں۔

خطابیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو مکان چھوڑ دینے کا حکم اس مصلحت کے پیش نظر دیا کہ ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ سارے نقصان اور ساری جڑ مکان ہے اگر ہم اس مکان میں نہ رہتے تو نہ ہمارے آدمیوں میں کمی آتی اور نہ ہمارے مال و اسباب کا نقصان ہوتا، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کو مکان چھوڑ دینے کا حکم دینا ہی بہتر سمجھا۔ تاکہ ان کے اس غلط خیال اور واہمہ کی جڑ ہی کٹ جائے اور یہ شرک خفی کے گرداب میں نہ پھنسیں۔

خراب آب وہوا کو چھوڑ دینے کا حکم

(۱۵) وَعَنْ یَحْیَی بْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ بُحَیْرٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ مَنْ سَمِعَ فَرْوَۃَ بْنَ مُسَیْكٍ یَقُوْلُ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ عِنْدَنَا اَرْضٌ یُقَالُ لَھَا اَبْیَنُ وَھِیَ اَرْضُ رِیْفِنَا وَمِیْرَتِنَا وَاِنَّ وَبَآءَھَا شَدِیْدٌ فَقَالَ دَعْھَا عَنْكَ فَاِنَّ مِنَ الْقَرَفِ التَّلَفَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت یحیی ابن عبداللہ ابن بحیر کہتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص نے بیان کیا کہ جس نے حضرت فروہؓ ابن مسیک سے یہ روایت سنی کہ انہوں نے یعنی فروہ نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ہمارے پاس ایک زمین ہے جس کو ابین کہا جاتا ہے اور وہ ہماری زراعت اور غلے کی زمین ہے یعنی وہ غلہ منڈی ہے، جہاں تجارت کے لئے دوسری جگہوں سے غلہ لاکر جمع کیا جاتا ہے اور دوسرے شہروں میں بھیجا جاتا ہے لیکن اس زمین کی وبا سخت ہے یعنی وہاں وبائی امراض زیادہ رہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے یہ سنکر فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو (یعنی وہاں رہنا اور آنا جانا ترک کردو کیونکہ وہ طاعون زدہ آبادی کے حکم میں ہے) اور وبا (بیماری) کا قرب ہلاکت اور اتلاف کا باعث ہوتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس زمین کو چھوڑنے کا حکم عدویٰ یعنی چھوت کے نقطہ نظر سے نہیں تھا بلکہ اصول طب اور حفظان صحت کے پیش نظر تھا کیونکہ وہاں کی آب وہوا غیر موافق تھی اور یہ ظاہر ہے کہ آب وہوا کا اچھا و صاف اور موافق ہونا حفظان صحت کی بنیاد اور جسم و بدن کی تندرستی و سلامتی کے لئے ضروری اسباب میں سے ہے اس کے برعکس آب وہوا کا خراب و ناموافق ہونا صحت و تندرستی کے لئے انتہائی مضر اور بیماری وہلاکت کا سبب ہوتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ وبا کی جگہ سے بھاگ جانا چاہئے وہ شاید اسی حدیث کے مضمون سے استدلال کرتے ہیں، ان حضرات کے مطابق اس شخص نے آنحضرت ﷺ سے وبا کی شکایت کی کہ اس زمین میں وبائیں پھیلتی ہیں لہٰذا

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس زمین کو چھوڑ دو اور وہاں سے نکل جاؤ۔ کیونکہ وبائی امراض کی قربت و مخالطت ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔
حالانکہ حقیقت میں اس حدیث سے مذکورہ استدلال قطعاً غیر موزوں ہے کیونکہ یہ حدیث اس صورت سے متعلق نہیں ہے کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی تھی اور آپ ﷺ نے وہاں سے بھاگ جانے کو جائز رکھا بلکہ اس شخص کی شکایت کا تعلق دراصل اس بات سے تھا کہ وہ زمین ایسی ہے۔ جہاں وبائیں پھیلتی رہتی ہیں۔ گویا اس شخص نے اس زمین کو منحوس و مکروہ جانا، چنانچہ اس کے باطنی احوال کی کمزوری کی بنا پر اس کو یہ اجازت دینا ہی بہتر سمجھا گیا کہ وہ اس زمین کو چھوڑ دے اور وہاں آنا جانا ترک کر دے تاکہ وہ ان وباؤں کو اس زمین کی نحوست سمجھ کر بے بنیاد عقیدے کا شکار نہ ہو جائے اور شرک خفی کے گرداب میں نہ پھنس جائے۔
ویسے وبا کی جگہ کے مسئلہ میں علماء کے مختلف اقوال و مباحث ہیں مگر جس صورت کو علماء نے زیادہ بہتر قرار دیا ہے اور جس پر عمل کیا جانا چاہئے وہ یہ ہے کہ پیش از وقوع تو احتراز و اجتناب کیا جائے اور بعد از وقوع صبر و رضا کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اگر کسی شہر و آبادی میں کوئی وبائی مرض پھیل جائے تو وہاں پہلے سے موجود لوگوں کو اس شہر و آبادی سے بھاگنا ناروا ہے بلکہ وہاں رہتے ہوئے توبہ استغفار کیا جائے اور اس وبا کے دفعیہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا و تضرع کیا جائے جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے، چنانچہ بخاری و مسلم وغیرہما میں وہ احادیث موجود ہیں جن میں وبا زدہ آبادی سے نکلنے اور وبا سے ڈر کر بھاگنے کی ممانعت نیز ایسے مواقع پر صبر و ثبات کی راہ اختیار کرنے کی ترغیب و تعریف منقول ہے۔
واضح رہے کہ وبا سے بھاگنے کو جائز قرار دینے والے حضرات کا اس حدیث سے استدلال کرنا یوں بھی غیر مناسب ہے کہ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے جب کہ جو احادیث بھاگنے کی ممانعت کو ثابت کرتی ہیں ان کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا لہٰذا یہ حدیث بخاری و مسلم کی احادیث کے معارض نہیں ہو سکتی علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ علماء و محققین کے مطابق فروہؓ ابن مسیک کوئی کثیر الروایت صحابی نہیں ہیں بلکہ ان سے ایک دو ہی حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور وہ بھی ایک ایسے راوی نے روایت کی ہیں جو بالکل مجہول غیر معروف ہیں یہاں تک کہ ان کا نام تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ بلکہ خود یحییٰ ابن عبداللہ ابن بحیر کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ کوئی ثقہ راوی ہیں بھی یا نہیں؟
حاصل یہ کہ وبا سے ڈر کر بھاگنا بلاشک وشبہ ممنوع اور معصیت ہے اور اگر کوئی اس اعتقاد کے ساتھ بھاگے کہ یہاں موجود رہا اور صبر و ثبات کی راہ اختیار کی تو یقیناً وبا کا شکار ہو کر مر جاؤں گا اور اگر یہاں سے نکل بھاگا تو بچ جاؤں گا تو ایسا شخص نہ صرف بھاگنے کی معصیت ہی کا مرتکب ہوگا بلکہ اس فاسد اعتقاد کی بنا پر کافر ہو جائے گا اس اعتقاد کے بغیر بھاگنے والا معاصی ہوگا۔ وبا سے ڈر کر بھاگنے کو، زلزلہ آجانے یا آگ لگ جانے کی صورت میں گھر سے نکل بھاگنے پر قیاس کرنا بھی ایک مہمل بات ہے کیونکہ اول تو یہ قیاس نص کے خلاف ہے، دوسرے زلزلہ آجانے، گھر کے گر پڑنے اور مکان میں آگ لگ جانے کی صورت میں گھر میں موجود رہنا یقینی طور پر ہلاکت و تباہی کا موجب ہے۔ جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے اس کے برخلاف وباء سے نہ بھاگنے کی صورت میں مر جانا یقینی نہیں ہوتا بلکہ مشکوک و موہوم ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بد شگونی کو سد راہ نہ بناؤ

(۱۶) عَنْ عُرْوَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ ذُكِرَتِ الطِّيَرَةُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَحْسَنُهَا الْفَالُ وَلَا تَرُدُّ مُسْلِمًا فَاِذَا رَاٰى اَحَدُكُمْ مَا يَكْرَهُ فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ لَا يَاْتِىْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ مُرْسَلًا۔

"حضرت عروہ بن عامرؒ تابعی کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کے سامنے بدشگونی کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی بہترین صورت اچھی فال ہے اور یاد رکھو کسی مسلمان کو شگون بد (اس کے مقصد وارادہ سے) باز نہ رکھے (یعنی مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرے اور پھر کسی چیز کو بدشگونی سمجھ کر اس کام سے باز رہے) اور جب تم میں سے کوئی شخص ایسی چیز کو دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے یعنی ایسی چیز جس کے ذریعہ شگون بد لیا جاتا ہے اور جو دل ودماغ میں وہم وخلجان پیدا کرتی ہے تو چاہئے کہ یہ دعا پڑھے اَللّٰھُمَّ لَایَاتِیْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَایَدْفَعُ السَّیِّئَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ اے اللہ! اچھائیوں اور برائیوں کا لانے والا صرف تو ہے اور صرف تو ہی برائیوں اور خرابیوں کو دور کرنے والا ہے اور برائی سے منہ موڑنے اور نیکی کی طرف آنے کی توفیق وطاقت اللہ ہی کی طرف سے ہے۔" اس روایت کو ابوداؤد نے بطریق روایت نقل کیا ہے۔

بَابُ الْکِہَانَۃِ

کہانت کا بیان

صراح میں لکھا ہے کہ "کہانت" فال گوئی کو کہتے ہیں اور اس (فال گوئی) کے پیشہ وہنر کو "کہانت" کہا جاتا ہے اسی طرح فال گو "کاہن" کہتے ہیں"، طیبیؒ کہتے ہیں کہ کاہن اس شخص کو کہتے ہیں جو آئندہ پیش آنے والے واقعات وحوادث کی خبر دے اور علم غیب و معرفت اسرار کا دعوی کرے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب میں کہانت کا بڑا رواج تھا، اہل عرب کاہنوں کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتماد وبھروسہ کرتے تھے ان میں سے بعض کاہن یہ دعوی کرتے تھے کہ جو جنات آسمان پر جاتے ہیں وہ وہاں کی باتیں ہم سے بتادیتے ہیں یہ بات روایت سے بھی ثابت ہے کہ بعثت نبوی ﷺ سے پہلے شیاطین چوری چھپے آسمان پر جاتے وہاں دنیا میں آئندہ پیش آنے والے واقعات جن کا تذکرہ فرشتوں میں ہوتا یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو جو احکام دیئے جاتے وہ شیاطین ان کو ادھر ادھر چھپ کر سن لیتے تھے اور پھر زمین پر آکر ان میں اپنی من پسند باتوں کا اضافہ کرکے اور جھوٹ ملا کر اپنے متبعین کو بتادیتے وہ لوگ ان سب باتوں کو صحیح مان کر تسلیم کرتے اور ان کے ذریعہ اہل عرب پر اپنی غیب دانی کا سکہ جماتے، لیکن آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد جب شیاطین کو آسمان پر جانے سے روک دیا گیا اور یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ تو کہانت کا کام بھی تمام ہوگیا۔

کہانت ہی کی طرح کی ایک چیز عرافت بھی تھی کچھ لوگ بعض مخصوص چیزوں اور کچھ علامات ومقدمات کے ذریعہ پوشیدہ چیزوں کی خبر دیتے تھے، جیسے رمل جاننے والوں کی طرح وہ بھی یہ بتادیتے تھے کہ چوری کا مال کہاں موجود ہے۔ یا گمشدہ شخص کس جگہ ہے وغیرہ وغیرہ ایسے لوگوں کو عراف کہا جاتا تھا، بعض مواقع پر کاہن کا اطلاق عراف اور منجم پر بھی ہوتا ہے علماء لکھتے ہیں کہ کہانت، عرافت اور رمل ونجوم کا علم حرام ہے کہ ان کا سیکھنا اور ان پر عمل کرنا شریعت نے قطعا روا نہیں رکھا ہے اسی لئے ان علوم کے ذریعہ کمایا ہوا مال بھی حرام ہوتا ہے، لینے والا اور دینے والا دونوں گنہ گار ہوتے ہیں جو لوگ دنیاوی طور پر یا دینی طور پر مخلوق خدا کی دیکھ بھال اور ان کی ہدایت وراہنمائی پر مامور ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کو ان چیزوں میں پڑنے سے روکیں اور جو لوگ ان میں مبتلا ہیں ان کو تادیب وتنبیہ کریں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کہانت ورمل ناجائز ہے

① عَنْ مُعَاوِیَۃَ بْنِ الْحَکَمِ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمُوْرًا کُنَّا نَصْنَعُھَا فِی الْجَاھِلِیَّۃِ کُنَّا نَاْتِی الْکُھَّانَ قَالَ فَلَا تَاْتُوا الْکُھَّانَ قَالَ قُلْتُ کُنَّا نَتَطَیَّرُ قَالَ ذٰلِکَ شَیْءٌ یَجِدُہٗ اَحَدُکُمْ فِیْ نَفْسِہٖ فَلَا یَصُدَّنَّکُمْ قَالَ قُلْتُ وَمِنَّا

رِجَالٌ يَخُطُّونَ خَطًّا قَالَ كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ فَذَالِكَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت معاویہ ابن حکمؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ایسی کتنی ہی چیزیں ہیں جن کو ہم زمانہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ہم کاہنوں کے پاس جاتے تھے (اور ان سے غیب کی باتیں پوچھا کرتے تھے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب تم کاہنوں کے پاس نہ جایا کرو۔ حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا ایک چیز یہ بھی ہے کہ ہم شگون بدلیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو تم میں سے کوئی اپنے دل میں محسوس کر سکتا ہے لیکن یہ (یعنی دل میں اس طرح کا خیال آنا) تم کو کسی کام سے نہ روکے (یعنی اگر تم میں سے کوئی شخص بتقاضائے بشریت شگون بد کا خیال بھی لائے تو اس سے متاثر ہو کر اپنے قصد وارادہ سے باز نہ رہے کیونکہ بدشگونی وہم محض سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی) حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔ ایک چیز یہ بھی ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ لکیریں اور خطوط کھینچتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ انبیاء میں سے ایک نبی گزرے ہیں جو (اللہ تعالیٰ کے حکم سے یا اپنے علم لدنی کے ذریعہ) لکیریں اور خطوط کھینچا کرتے تھے لہٰذا جس شخص کا خط ان کے موافق ہو وہ مباح ہوگا (ورنہ ناجائز)۔" (مسلم)

تشریح: حدیث میں جن نبی کا ذکر کیا گیا ہے ان سے حضرت دانیال علیہ السلام یا بعض حضرات کے قول کے مطابق حضرت ادریس علیہ السلام مراد ہیں۔ حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ لکیریں اور خطوط کھینچنے کا علم کہ جس کو رمل کہا جاتا ہے اصل میں ان نبی سے چلا تھا جو اب اپنے حقیقی اصول وقواعد کے اعتبار سے معدوم ہو چکا ہے، اگر اب بھی کوئی شخص اس علم کو انہی خصوصیات وشرائط کے ساتھ جانتا ہو جو ان نبی علیہ السلام نے وضع فرمائے تھے اور اس کا لکیریں اور خطوط کھینچنا بالکل اسی طرح ہو جس طرح وہ نبی کھینچتے تھے تو اس صورت میں اس علم سے فائدہ اٹھانا مباح ہوگا، لیکن یہ بات چونکہ متحقق ہے کہ یہ علم اپنے اصل کے اعتبار سے دنیا سے اٹھ گیا ہے اور کوئی شخص یہ جاننے پر قادر نہیں ہے کہ وہ نبی کس طرح لکیریں اور خطوط کھینچا کرتے تھے اس لئے اب اس علم کو سیکھنا اور اس پر عمل کرنا حرام وممنوع ہوا اس کی وضاحت باب مالا یجوز من العمل فی الصلوۃ میں بھی گزر چکی ہے۔

کہانت کوئی حقیقت نہیں ہے

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَأَلَ أُنَاسٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْكُهَّانِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّهُمْ لَيْسُوا بِشَيْءٍ قَالُوا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَإِنَّهُمْ يُحَدِّثُوْنَ أَحْيَانًا بِالشَّيْءِ يَكُوْنُ حَقًّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ الْكَلِمَةُ مِنَ الْحَقِّ يَخْطَفُهَا الْجِنِّيُّ فَيَقُرُّهَا فِي أُذُنِ وَلِيِّهِ قَرَّ الدَّجَاجَةِ فَيَخْلِطُوْنَ فِيْهَا أَكْثَرَ مِنْ مِائَةِ كَذِبَةٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے کاہنوں کے بارے میں پوچھا (کہ ان کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟) تو رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ کچھ نہیں ہیں یعنی وہ جن باتوں کا دعوی کرتے ہیں وہ بے بنیاد ہوتی ہیں اس لئے ان کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتماد بھروسہ مت کرو۔" لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! بعض دفعہ وہ ایسی بات بتاتے ہیں یا ایسی خبر دیتے ہیں۔ جو سچ ہوتی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ بات حق ہوتی ہے جس کو جن (یعنی شیطان) اچک لیتا ہے اور اپنے دوست (کاہن) کے کان میں اس طرح ڈال دیتا ہے۔ جس طرح مرغ کوئی دوسرے مرغ کو دانہ لینے کے لئے بلاتا ہے پھر وہ کاہن اس بات میں سو سے زیادہ جھوٹی باتیں ملا دیتے ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "وہ بات حق ہوتی ہے جس کو جن اچک لیتا ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ کاہنوں کی جو بعض باتیں یا بعض چیزیں صحیح ثابت ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب ذات حق جل مجدہ سے کوئی حکم بذریعہ وحی فرشتوں تک آتا ہے یا لوح محفوظ کی کوئی بات فرشتوں پر منکشف ہوتی ہے تو کسی طرح سے جنات وشیاطین ان فرشتوں سے اس بات یا حکم کو سن لیتے ہیں اور اس کو ان لوگوں کے کان میں پھونک دیتے ہیں

جو ان جنات اور شیاطین کے پیروکار ہوتے ہیں (یعنی وہ کاہن) اور پھر وہ کاہن اس ایک بات میں سینکڑوں جھوٹی باتیں ملا کر لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے لفظ "یقرھافی اذن ولیہ قر الدجاجۃ"۔ کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ جس طرح مرغ اپنی مرغی سے جفتی کے وقت اس طرح منی ڈالتا ہے کہ کسی آدمی کو معلوم نہیں ہوتا اسی طرح وہ جن اس آسمانی بات کو اپنے پیروکار کے کان میں اس طور سے ڈالتا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔

③ وَعَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الْمَلٰۤئِكَةَ تَنْزِلُ فِي الْعَنَانِ وَهُوَ السَّحَابُ فَتَذْكُرُ الْاَمْرَ قُضِيَ فِي السَّمَآءِ فَتَسْتَرِقُ الشَّيَاطِيْنُ السَّمْعَ فَتَسْمَعُهُ فَتُوْحِيْهِ اِلَى الْكُهَّانِ فَيَكْذِبُوْنَ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "فرشتوں کی کوئی جماعت جب عنان یعنی ابر میں اترتی ہے اور (آپس میں) ان باتوں اور ان امور کا تذکرہ کرتی ہے جو آسمان میں خدا کے ہاں مقدر ہوئے ہیں اور دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے ہیں جب وہ کوئی بات سن لیتے ہیں تو اس کو کاہنوں کے پاس پہنچا دیتے ہیں اور وہ کاہن شیاطین سے سنی ہوئی اس بات میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا لیتے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کاہن جو باتیں بیان کرتے ہیں ان میں وہ بات بھی ہوتی ہے جو ان کو شیاطین کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے اور وہ شیاطین اس بات کو فرشتوں سے چوری چھپے سن لیتے ہیں اور چونکہ وہ بات بہرصورت وقوع پذیر ہوتی ہے اس طرح کاہنوں کی بعض باتیں حقیقت و واقعہ کے مطابق ہو جاتی ہیں لیکن یہ چیز بہرحال ملحوظ رکھنے کی ہے کہ وہ کاہن چونکہ اس بات میں اپنی طرف سے سینکڑوں جھوٹی باتیں بھی ملا دیتے ہیں اور ان کی بتائی ہوئی باتوں اور چیزوں پر جھوٹ غالب رہتا ہے اس لئے شریعت نے ان کاہنوں سے استفادہ کرنے اور ان کی باتوں پر دھیان دینے سے سرے سے روک دیا اور فرمایا ان کی باتیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔

نجومیوں اور کاہنوں کے پاس جانے والے کے بارے میں وعید

④ وَعَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَتٰى عَرَّافًا فَسَاَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلٰوةُ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حفصہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص کاہن یا نجومی کے پاس جائے اور اس سے کچھ پوچھے یعنی غیب کی باتیں دریافت کرے) تو اس کی چالیس دن رات کی نمازیں قبول نہیں کی جاتی۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ چیز گویا ایسے شخص کے حق میں سخت نقصان دہ اور انتہائی بدبختی کی علامت ہے کہ اس کی نماز جو عبادات میں سب سے افضل اور بزرگ ترین عمل ہے، نامقبول ہو جائے یا یہ مراد ہے کہ اس شخص کی جب نماز ہی قبول نہیں ہوتی تو دوسرے اعمال بطریق اولی قبول نہیں ہوں گے، نیز نماز قبول نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ان نمازوں کا ثواب نہیں ملتا اگرچہ اس کے ذمہ سے فرض ادا ہو جاتا ہے اور اس پر ان نمازوں کی قضا واجب نہیں ہوتی۔

حدیث میں اگرچہ اربعین لیلۃ کے الفاظ ہیں یعنی صرف رات کا ذکر کیا گیا ہے مگر حقیقت میں رات اور دن دونوں مراد ہیں کیونکہ اہل عرب کے کلام کا یہ بھی اسلوب ہے کہ الفاظ میں تو ذکر صرف دن یا صرف رات کا ہوتا ہے۔ مگر مراد رات اور دن دونوں ہوتے ہیں۔

ستاروں کو بارش ہونے کا سبب قرار دینا کفر ہے

⑤ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِنِ الْجُهَنِيِّ قَالَ صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى اَثَرِ

سَمَآءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوْا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ قَالَ اَصْبَحَ مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ فَاَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ وَاَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِيْ مُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت زید ابن خالد جہنیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مقام حدیبیہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی جب کہ رات میں بارش ہو چکی تھی، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم جانتے ہو تمہارے پروردگار نے اس وقت کیا فرمایا ہے (یعنی آپ ﷺ نے ارشاد کیا کہ ابھی مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میرے بندوں نے آج اس حال میں صبح کی کہ بعض تو مجھ پر ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا، چنانچہ جس شخص نے یہ کہا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی ہے تو وہ مجھ پر ایمان لایا اور ستاروں کے ساتھ کفر کیا (یعنی ستاروں کے اثر کا منکر ہیں) اور جس شخص نے کہا کہ فلاں ستارے کے طلوع ہونے اور فلاں ستارے کے غروب ہونے کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی ہے تو اس نے میرے ساتھ کفر کیا اور ستاروں پر ایمان لایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ بارش ہونے میں ستاروں کی تاثیر کا دخل ہوتا ہے یعنی ستارے ہی بارش برساتے ہیں یا ستارے ہی ایسے اثرات مرتب کرتے ہیں جن سے پانی برستا ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا عقیدہ ہوتا ہے تو ایسا شخص کافر ہو جائے گا۔ ہاں اگر اعتقاد کی نوعیت یہ ہو کہ بارش اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے اور اس کے فضل و کرم سے ہوتی ہے۔ اور ستاروں کا طلوع و غروب اور نچھتر وغیرہ بارش کی ایک علامت ہے۔ اور ان چیزوں کی بنیاد پر بارش ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے تو یہ کفر نہیں، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس طرح کا خیال و عقیدہ رکھنا بھی مکروہ تنزیہی ہے۔

⑥ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ بَرَكَةٍ اِلَّا اَصْبَحَ فَرِيْقٌ مِنَ النَّاسِ بِهَا كَافِرِيْنَ يُنْزِلُ اللّٰهُ الْغَيْثَ فَيَقُوْلُوْنَ بِكَوْكَبِ كَذَا وَكَذَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب بھی اللہ تعالیٰ آسمان سے کوئی برکت نازل کرتا ہے تو انسانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت اس کے ذریعہ کفر میں مبتلا ہو جاتی ہے یعنی کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اس برکت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی بجائے دوسرے ذرائع و اسباب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے تو بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ فلاں ستارے کے اثر سے بارش ہوئی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگرچہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "برکت" سے مراد بارش ہے اور یہ عبارت وینزل الغیث (اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے الخ) ماقبل عبارت اور لفظ برکت کی توضیح ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "برکت" سے عام یعنی ہر طرح کی برکت مراد ہو اور وینزل الغیث الخ کے ذریعہ نزول برکت کی ایک مثال اور اس کی ایک خاص صورت کو بیان کرنا مقصود ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

علم نجوم حاصل کرنا گویا سحر کا علم حاصل کرنا ہے

⑦ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اقْتَبَسَ عِلْمًا مِنَ النُّجُوْمِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ زَادَ مَا زَادَ۔ (رواہ احمد و ابوداود و ابن ماجۃ)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص علم نجوم کا ایک حصہ سیکھتا ہے تو گویا، وہ علم سحر کا ایک حصہ سیکھتا ہے

اس طرح وہ اتنا ہی زیادہ سحر کا علم سیکھتا ہے جتنا زیادہ نجوم کا علم سیکھتا ہے۔" (ابوداؤد، احمد، ابن ماجہ)

تشریح: علم نجوم کو سحر سے تشبیہ دی گئی ہے کہ نجوم کا علم سیکھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی نے جادو ٹوٹکے کا علم سیکھ لیا اور اس مشابہت کی وجہ سے علم نجوم کی برائی کو ظاہر کرنا ہے اس اعتبار سے علم نجوم پر عمل کرنے والا گویا جادوگروں اور کاہنوں میں کا ایک فرد ہے جو خلاف شریعت امور کو اختیار کرتے ہیں اور غیب کی باتیں بتانے کا دعوی کرتے ہیں۔

کاہنوں کی بتائی ہوئی باتوں کو سچ جاننے والے کے بارے میں وعید

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَتٰى كَاهِنًا وَصَدَّقَهٗ بِمَا یَقُوْلُ اَوْاَتٰى امْرَاَتَهٗ حَائِضًا اَوْاَتٰى امْرَاَتَهٗ فِیْ دُبُرِهَا فَقَدْبَرِئَ مِمَّا اُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ۔ (رواہ احمد والبوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص کاہن کے پاس جائے اور اس کی بتائی ہوئی باتوں کو سچا جانے، یا جو شخص کاہن کے پاس جائے اور اس کی بتائی ہوئی باتوں کو سچا جانے، یا جو شخص حیض کی حالت میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہو، یا جو شخص اپنی بیوی کے پیچھے کی طرف بد فعلی کرے تو وہ اس چیز (یعنی قرآن و سنت و شریعت) سے بیزار ہوا جو، محمد (ﷺ) پر نازل ہوئی ہے۔" (احمدؒ والبوداؤدؒ)

تشریح: "بیزار ہوا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ کافر ہو گیا، لیکن یہ اس صورت پر محمول ہے جب کہ وہ اس کو حلال جانے، حلال نہ جاننے کی صورت میں یہ ارشاد گرامی ﷺ ان چیزوں کی سخت ترین برائی کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنے اور ان سخت برائیوں کے اختیار کرنے والے کو شدت کے ساتھ متنبہ کرنے اور ڈرانے پر محمول ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

نجومی اور کاہن غیب کی باتیں کس طرح بتاتے ہیں؟

⑨ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا قَضَى اللّٰهُ الْاَمْرَ فِی السَّمَآءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِاَجْنِحَتِهَا خِضْعَانًا لِقَوْلِهٖ كَاَنَّهٗ سِلْسِلَةٌ عَلٰى صَفْوَانٍ فَاِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْ قَالَ الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ فَیَسْمَعُهَا مُسْتَرِقُو السَّمْعِ وَمُسْتَرِقُوا السَّمْعِ هٰكَذَا بَعْضُهٗ فَوْقَ بَعْضٍ وَوَصَفَ سُفْیَانُ بِكَفِّهٖ فَحَرَّفَهَا وَبَدَّدَ بَیْنَ اَصَابِعِهٖ فَیَسْمَعُ الْكَلِمَةَ فَیُلْقِیْهَا اِلٰى مَنْ تَحْتَهٗ ثُمَّ یُلْقِیْهَا الْاٰخَرُ اِلٰى مَنْ تَحْتَهٗ حَتّٰى یُلْقِیْهَا عَلٰى لِسَانِ السَّاحِرِ اَوِ الْكَاهِنِ فَرُبَّمَا اَدْرَكَ الشِّهَابُ قَبْلَ اَنْ یُلْقِیَهَا وَرُبَّمَا اَلْقَاهَا قَبْلَ اَنْ یُدْرِكَهٗ فَیَكْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ فَیُقَالُ اَلَیْسَ قَدْ قَالَ لَنَا یَوْمَ كَذَا وَكَذَا كَذَا وَكَذَا فَیُصَدَّقُ بِتِلْكَ الْكَلِمَةِ الَّتِیْ سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس وقت اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی چیز کا حکم جاری کرتا ہے۔ تو فرشتے اللہ کے فرمان سن کر خوف و عاجزی سے اپنے بازو کو پھڑپھڑانے لگتے ہیں (یعنی فرشتے حکم الٰہی کی ہیبت و عظمت سے مارے ڈر کے پرندوں کی طرح اپنے چھکے پھیلا دیتے ہیں اور لرزنے کانپنے لگتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کے فرمان یعنی اس کے کلام کی آواز (گویا) اس زنجیر کی آواز کی مانند ہوتی ہے جس کو صاف، پتھر پر کھینچا جائے پھر جب فرشتوں کے دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو وہ (نیچے رہنے والے) تمام فرشتے مقرب فرشتوں سے دریافت کرتے ہیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم جاری فرمایا ہے، مقرب فرشتے وہ حکم بتاتے ہیں جو پروردگار نے جاری کیا ہے (یا مقرب فرشتے دریافت کرنے والے فرشتوں سے کہتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پروردگار نے فرمایا ہے) حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات بلند قدر اور بلند مرتبہ ہے۔ چنانچہ ان باتوں کو (جو فرشتوں کے درمیان ہوتی ہیں) چوری چھپے سننے والے (یعنی جنات و شیاطین) سن لیتے ہیں اور وہ چوری چھپے سننے والوں کی ہیئت کو اپنے ہاتھ (کی انگلیوں) کے ذریعہ بیان کیا چنانچہ انہوں نے ہاتھ کو ٹیڑھا کر کے انگلیوں کے درمیان فرق کیا (یعنی

حضرت سفیان نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے اوپر تلے ہونے کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ وہ جنات وشیاطین آسمان سے زمین تک اس طرح سلسلہ وار اور اوپر تلے کھڑے رہتے ہیں) اور اوپر والا جن فرشتوں کی بات کو چوری چھپے سن کر اپنے نیچے والے جن کو پہنچا دیتا ہے اور وہ اپنے نیچے والے جن کو پہنچاتا ہے یہاں تک کہ آخری جن (جو سب سے نیچے ہوتا ہے) اس بات کو ساحر یا کاہن کی زبان تک پہنچاتا ہے ادھر (ان جنات وشیاطین کو مارنے اور بھگانے کے لئے آسمان سے شعلے پھینکے جاتے ہیں تو) کبھی تو یہ شعلے ساحر یا کاہن تک وہ بات پہنچانے سے پہلے ہی چوری چھپے سننے والے (جن کو) آپکڑتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ جن اس شعلے کے پہنچنے سے پہلے ساحر یا کاہن تک وہ بات پہنچا دیتا ہے اور جب اس ساحر یا کاہن تک وہ بات پہنچا دیتا ہے اور جب اس ساحر یا کاہن تک وہ بات پہنچ جاتی ہیں تو وہ اس میں سو جھوٹی باتیں شامل کر لیتا ہے (اور لوگوں کے سامنے ان جھوٹی باتوں کے درمیان وہ بات بھی بیان کرتا ہے جو اس تک جنات وشیاطین کے ذریعہ پہنچتی ہے)۔ چنانچہ جب کوئی شخص اس کاہن کو (اس کی بتائی ہوئی باتوں میں سے جھوٹی باتوں کے ذریعہ) جھٹلاتا ہے (یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے جو فلاں فلاں بات کہی تھی وہ جھوٹی ثابت ہوئی) تو (ان گمراہ لوگوں کی طرف سے جو کاہن کی باتوں کو سچا جانتے ہیں جھٹلانے والے کے سامنے) یہ کہا جاتا ہے کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے اور کیا تم نہیں جانتے کہ اس کاہن نے فلاں فلاں دن ہم سے فلاں بات کہی تھی اور اس طرح اس کاہن کی سچائی کی تصدیق اس بات سے کی جاتی ہے جو اس تک (جنات کے ذریعہ) آسمان سے پہنچتی تھی۔" (بخاری)

تشریح: حدیث میں وہ صورت بیان کی گئی ہے جو کاہنوں تک غیب کی باتیں پہنچنے کا سبب بنتی ہے اس کے ساتھ حدیث کے آخر میں اس گمراہی کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب کاہن کی بتائی ہوئی اکثر باتیں جھوٹ ثابت ہوتی ہیں اور لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں تو وہ لوگ جو کاہن کی سچائی کا اعتقاد رکھتے ہیں اور باطن کی گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں اس کاہن کی ساری جھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف اس بات کا حوالہ دے کر اس کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو جنات وشیاطین فرشتوں سے چوری چھپے سن کر کاہن تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور جو واقعہ کے مطابق ہوتی ہے یہی صورت نجومیوں کے بارے میں بھی ہوتی ہے کہ جب سینکڑوں باتیں بتاتے ہیں اور اس میں کوئی بات اتفاق سے صحیح ثابت ہو جاتی ہے تو وہ دنیادار لوگ جن کے باطن میں گمراہی وکجی ہوتی ہے اس ایک بات کی بنیاد پر ان نجومیوں کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

آگے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت آرہی ہے جس میں صراحت کے ساتھ کاہن کو ساحر فرمایا گیا ہے اس اعتبار سے اس حدیث کے ان الفاظ علی لسان الساحر او الکاھن۔ میں ساحر سے مراد کاہن ہے اس صورت میں حرف او راوی کے شک کے اظہار کے لئے ہوگا (یعنی یہ کہا جائے گا کہ راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے کہ یہاں ساحر کا لفظ فرمایا گیا ہے یا کاہن کا) اور اگر یہ بات پیش نظر ہو کہ ساحر چونکہ غیب کی باتیں نہیں بتایا کرتا اور اس اعتبار سے یہاں ساحر کا لفظ اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہو سکتا تو یہ کہا جائے گا کہ "ساحر" سے مراد نجومی ہے جیسا کہ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے المنجم ساحر یعنی نجومی ساحر ہے اس صورت میں الساحر والکاھن میں حرف او تنویع کے لئے ہوگا۔

رہی یہ بات کہ چوری چھپے آسمان میں داخل ہونے اور فرشتوں کی باتیں سننے والے جن وشیطان کو بھگانے کے لئے جب شعلے پھینکے جاتے ہیں اور وہ شعلے اس جن یا شیطان کو پکڑتے ہیں تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ چنانچہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ جن یا شیطان ان شعلوں کی زد میں آکر جل بھن جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں جب کہ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ وہ جل بھن کر ختم نہیں ہوتے بلکہ شعلوں سے تکلیف وایذا پا کر زندہ واپس آجاتے ہیں۔

شہاب ثاقب کی حقیقت

⑩ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَخْبَرَنِی رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْاَنْصَارِ اَنَّھُمْ بَیْنَاھُمْ جُلُوْسٌ

لَیْلَۃً مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رُمِیَ بِنَجْمٍ وَاسْتَنَارَ فَقَالَ لَھُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَاکُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ اِذَا رُمِیَ بِمِثْلِ ھٰذَا قَالُو اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ کُنَّا نَقُوْلُ وُلِدَ اللَّیْلَۃَ رَجُلٌ عَظِیْمٌ وَمَاتَ رَجُلٌ عَظِیْمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِنَّھَا لَا یُرْمٰی بِھَا لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَیٰوتِہٖ وَلٰکِنْ رَبُّنَا تَبَارَکَ اسْمُہٗ اِذَا قَضٰی اَمْرًا سَبَّحَ حَمَلَۃُ الْعَرْشِ ثُمَّ سَبَّحَ اَھْلُ السَّمَآءِ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ حَتّٰی یَبْلُغَ التَّسْبِیْحُ اَھْلَ ھٰذِہِ السَّمَآءِ الدُّنْیَا ثُمَّ قَالَ الَّذِیْنَ یَلُوْنَ حَمَلَۃَ الْعَرْشِ لِحَمَلَۃِ الْعَرْشِ مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ فَیُخْبِرُوْنَھُمْ مَاقَالَ فَیَسْتَخْبِرُ بَعْضُ اَھْلِ السَّمٰوٰتِ بَعْضًا حَتّٰی یَبْلُغَ ھٰذِہِ السَّمَآءِ الدُّنْیَا فَیَخْطَفُ الْجِنُّ السَّمْعَ فَیَقْذِفُوْنَ اِلٰی اَوْلِیَآءِھِمْ وَیَرْمُوْنَ فَمَا جَآءُوْبِہٖ عَلٰی وَجْھِہٖ فَھُوَ حَقٌّ وَلٰکِنَّھُمْ یَقْرِفُوْنَ فِیْہِ وَیَزِیْدُوْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے انصاری صحابہؓ میں سے ایک صحابیؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک دن رات کے وقت کچھ صحابہؓ رسول کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ستارہ ٹوٹا اور اس کی تیز روشنی پھیل گئی یہ دیکھ کر رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم زمانہ جاہلیت میں اس طرح ستارہ ٹوٹنے کو کیا کہتے تھے؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ حقیقت حال کو اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں ہم تو یہ کہا کرتے تھے کہ آج کی رات کوئی بڑا آدمی پیدا کیا گیا ہے (اور کبھی یہ کہتے کہ) آج کی رات کوئی بڑا آدمی مر گیا ہے (یعنی ہم اس طرح ستارہ ٹوٹنے کو کسی بڑے اور اہم واقعے کی علامت سمجھا کرتے تھے) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ستارہ نہ تو کسی کی موت سے ٹوٹتا ہے اور نہ کسی کے پیدا ہونے سے بلکہ، حقیقت حال یہ ہے کہ ہمارا رب جس کا نام بابرکت ہے جب کوئی حکم جاری فرماتا ہے تو عرش الٰہی کو اٹھانے والے فرشتے تسبیح (یعنی سبحان اللہ، سبحان اللہ کا ورد کرنے لگتے ہیں) پھر ان کی تسبیح کی آواز سن کر آسمان کے فرشتے تسبیح کرنے لگتے ہیں، جو عرش اٹھانے والے فرشتوں کے قریب ہے یہاں تک کہ اس تسبیح کی آواز ایک دوسرے آسمان سے ہوتی ہوئی آسمان دنیا پر رہنے والے فرشتوں تک پہنچ جاتی ہے، پھر وہ فرشتے جو عرش الٰہی کو اٹھانے والے فرشتوں سے قریب رہتے ہیں، عرش کو اٹھانے والے فرشتوں سے پوچھتے ہیں تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟ وہ فرشتے ان کو وہ بات بتاتے ہیں جو پروردگار نے فرمائی ہے، پھر اس بات کو ان سے دوسرے فرشتے دریافت کرتے اور ان سے اور فرشتے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ آسمان دنیا پر رہنے والوں تک پہنچ جاتا ہے، پھر اس سنی ہوئی بات کو جنات اچک لیتے ہیں یعنی وہ کان لگائے ایسی باتوں کے منتظر رہتے ہیں اور جب وہ چوری چھپے کوئی بات سن لیتے ہیں تو اس کو وہاں سے لے اڑتے ہیں۔ اور اپنے دوستوں یعنی کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں، چنانچہ ان جنات کو مارنے کے لئے ستارے پھینکے جاتے ہیں (لہٰذا ان ستاروں کے پھینکے جانے کا سبب یہ ہے نہ کہ وہ جس کا تم اعتقاد رکھتے ہو، یعنی کسی کی موت یا پیدائش وغیرہ) اس طرح کاہن اگر اس بات کو جو آسمان سے سنی گئی ہے۔ اور جنات کے ذریعہ اس تک پہنچی ہے جوں کی توں (یعنی اس میں کوئی تصرف اور کمی بیشی کے بغیر) بیان کریں تو وہ یقیناً صحیح ثابت ہوگی، (لیکن وہ کاہن ایسا نہیں کرتے بلکہ) اس میں جھوٹی باتیں شامل کر دیتے ہیں اور ایک بات کی بہت سی باتیں بنا لیتے ہیں۔" (مسلمؒ)

ستارے کس لئے پیدا کئے گئے؟

(۱۱) وَعَنْ قَتَادَۃَ قَالَ خَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی ھٰذِہِ النُّجُوْمَ لِثَلٰثٍ جَعَلَھَا زِیْنَۃً لِلسَّمَآءِ وَرُجُوْمًا لِلشَّیٰطِیْنِ وَعَلَامَاتٍ یُھْتَدٰی بِھَا فَمَنْ تَاَوَّلَ فِیْھَا لِغَیْرِ ذٰلِکَ اَخْطَاءَ وَاَضَاعَ نَصِیْبَہٗ وَتَکَلَّفَ مَالَا یَعْلَمُ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ تَعْلِیْقًا وَفِیْ رِوَایَۃِ رَزِیْنٍ وَتَکَلَّفَ مَالَا یَعْنِیْہِ وَمَالَا عِلْمَ لَہٗ بِہٖ وَمَا عَجَزَ عَنْ عِلْمِہِ الْاَنْبِیَآءُ وَالْمَلٰئِکَۃُ وَعَنِ الرَّبِیْعِ مِثْلُہٗ وَزَادَ وَاللّٰہِ مَاجَعَلَ اللّٰہُ فِیْ نَجْمٍ حَیٰوۃَ اَحَدٍ وَلَا رِزْقَہٗ وَلَا مَوْتَہٗ وَاِنَّمَا یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَیَتَعَلَّلُوْنَ بِالنُّجُوْمِ۔

"اور حضرت قتادہؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو تین باتوں کے لئے پیدا کیا ہے ایک تو یہ کہ ان کو آسمانوں کی زینت بنایا ہے اور

دوسرے شیاطین وجنات کو مارنے کے لئے اور تیسرے علامات کے لئے کہ لوگ ان کے ذریعہ جنگل و دریا میں اپنا راستہ پاسکیں، لہٰذا جس شخص نے ان ستاروں میں ان تین باتوں کے سوا اور کوئی غرض بیان کی تو اس نے خطا کی، اپنا حصہ ضائع کیا اور پھر اس چیز میں تکلف کیا جس کو وہ نہیں جانتا (یعنی آسمان کی چیزوں کے بارے میں جو حقوق ہیں ان کا علم قرآن وسُنّت کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے حاصل ہونا ممکن نہیں اور جب قرآن وسُنّت میں ستاروں کی غرض ان تین باتوں کے علاوہ اور کوئی بیان نہیں کی گئی ہے تو مذکورہ باتوں کے علاوہ کوئی اور غرض بیان کرنا ایسی بات کا بیان کرنا ہے جس کا معلوم ہونا متصور ہی نہیں ہے!۔ اس روایت کو بخاریؒ نے بغیر سند کے نقل کیا ہے اور رزین کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس نے اس چیز کا تکلف کیا جو اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی اور اس چیز میں تکلف کیا (یعنی اس چیز کو جاننے کا دعویٰ کیا) جس کا اس کو علم نہیں ہے اور اس چیز میں تکلف کیا جس کے علم سے انبیاء اور فرشتے عاجز رہے ہیں۔ ربیع نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ قسم ہے خدا کی! اللہ تعالیٰ نے ستارے میں نہ تو کسی کی زندگی (یعنی پیدائش) مقرر کی ہے نہ کسی کا رزق یعنی مال وجاہ وغیرہ اور نہ کسی کی موت! اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کاہن اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹی افتراء پردازی کرتے ہیں اور ستاروں کے طلوع وغروب ہونے کو کسی واقعہ وحادثہ کی علت قرار دیتے ہیں!۔"

تشریح: "اپنا حصہ ضائع کیا" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اس طرح لایعنی باتوں اور بیکار امور میں مبتلا کیا کہ جن کا کوئی فائدہ نہ دنیا میں حاصل ہوتا ہے اور نہ آخرت میں حاصل ہونے والا ہے۔ اس طرح اس نے گویا اپنی عمر عزیز کا قیمتی حصہ گنوایا۔

نجومی، ساحر ہے

⑫ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اقْتَبَسَ بَابًا مِنْ عِلْمِ النُّجُوْمِ لِغَيْرِ مَاذَكَرَ اللّٰهُ فَقَدِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ الْمُنَجِّمُ كَاهِنٌ وَالْكَاهِنُ سَاحِرٌ وَالسَّاحِرُ كَافِرٌ۔ (رواه رزين)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے علم نجوم کا کوئی حصہ سیکھا اور سیکھنے کی غرض ان تین چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز سے متعلق ہو کہ جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر فرمائی ہیں۔ (اور جن کا بیان حدیث میں گزرا) تو اس نے بلاشبہ علم سحر کا ایک حصہ سیکھا (جب کہ علم سحر ایک برا علم ہے کیونکہ اس کی بعض قسم فسق میں داخل ہے۔ اور بعض قسم موجب کفر ہے) اور (یاد رکھو) منجم (علم نجوم کا جاننے والا) کاہن کے حکم میں ہوتا ہے (کیونکہ کاہن کی طرح منجم بھی بعض علامات کے ذریعہ غیب کی خبر دیتا ہے) اور کاہن، ساحر کے حکم میں ہے (کیوں کہ کاہن بھی بری باتوں کا ارتکاب کرتا اور لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے) اور جو شخص ساحر کرے اور اس کے جائز ہونے کا اعتقاد رکھے وہ کافر ہو جاتا ہے (اسی طرح منجم اور کاہن بھی اپنی بد اعتقادی کی بنا پر کافر ہو جاتے ہیں)۔" (رزینؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ نجوم کہانت اور سحر، یہ سب چیزیں ایک ہی جنس سے ہیں کہ ان سب کا ایک ہی حکم ہے اور یہ سب کافروں اور بے دین لوگوں کے کام ہیں۔

منازل قمر کو نزول باراں میں مؤثر حقیقی جاننا کفر ہے

⑬ وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْاَمْسَكَ اللّٰهُ الْقَطْرَ عَنْ عِبَادِهٖ خَمْسَ سِنِيْنَ ثُمَّ اَرْسَلَهٗ لَاَصْبَحَتْ طَائِفَةٌ مِنَ النَّاسِ كَافِرِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سُقِيْنَا بِنَوْءِ الْمِجْدَحِ۔ (رواه النسائی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ مثلاً پانچ برس تک اپنے بندوں کو بارش سے محروم رکھے اور پھر بارش برسائے تو لوگوں کی ایک جماعت جو نجوم پر اعتقاد رکھتی ہے اس صورت میں بھی کفر کرتی ہوئی یہ کہے گی کہ مجدح یعنی قمر کی منزل کے سبب ہم پر بارش ہوئی ہے۔" (نسائیؒ)

تشریح: "مجدح" میم کے زیر جیم کے جزم اور دال کے زبر کے ساتھ اہل عرب کے نزدیک منازل قمر میں سے ایک منزل کا نام ہے زمانہ جاہلیت میں اہل عرب اس منزل کو بارش برسنے کا سبب قرار دیتے تھے۔ یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے، کہ ستاروں کے طلوع و غروب اور منازل قمر کو بارش برسنے کا حقیقی سبب سمجھنا کفر ہے۔

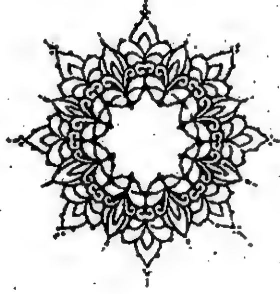

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الرؤیا

خواب کا بیان

"خواب" کے معنی ہیں وہ بات جو انسان نیند میں دیکھے "محققین" کہتے ہیں کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو محض خیال کہ دن بھر انسان کے دماغ اور ذہن پر جو باتیں چھائی رہتی ہیں، وہ خواب میں متشکل ہو کر نمودار ہو جاتی ہیں، دوسری طرح کا خواب وہ ہے جو شیطانی اثرات کا عکاس ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر ڈراؤنے خواب نظر آیا کرتے ہیں، اور تیسری طرح کا خواب وہ ہے جو منجانب اللہ بشارت اور بہتری کو ظاہر کرتا ہے، خواب کی یہی تیسری قسم "رویاء صالحہ" کہلاتی ہے اور اس کی حقیقت علماء اہل سُنّت کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سونے والے کے دل میں علوم معرفت اور ادراکات و احسان کا نور پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ وہ جاگنے والے کے دل کو علوم و معرفت اور دراکات و احساسات کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بلاشک وشبہ اس پر قادر ہے۔ کیوں کہ نہ تو بیداری قلب انسانی میں نور بصیرت کے پیدا ہونے کا ذریعہ ہے اور نہ نیند اس سے مانع۔

واضح رہے کہ سونے والا اپنے خواب میں جن باتوں کا ادراک و احساس کرتا ہے اور جن چیزوں کو اس کا نور بصیرت دیکھتا ہے وہ دراصل وقوع پذیر ہونے والی چیزوں کی علامت واشارہ ہوتا ہے اور یہی علامت و اشارہ تعبیر کی بنیاد بنتا ہے۔ کبھی یہ علامت و اشارہ اتنا غیر واضح ہوتا ہے کہ اس کو صرف عارفین و معبرین ہی سمجھ پاتے ہیں اور کبھی اتنا واضح ہوتا ہے کہ عام انسانی ذہن بھی اس کی مراد پالیتا ہے۔ جیسا کہ بادل کو دیکھ کر بارش کے وجود کی طرف ذہن خود بخود چلا جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مسلمان کا اچھا خواب حق ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ قَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَزَادَ مَالِكٌ بِرِوَایَةِ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ یَرَاهَا الرَّجُلُ الْمُسْلِمُ اَوْتُرٰی لَهٗ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا نبوت کے آثار میں سے اب کچھ باقی نہیں رہا ہے علاوہ مبشرات کے صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ مبشرات سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اچھے خواب۔" (بخاریؒ)

"اور امام مالکؒ نے اس روایت میں جس کو انہوں نے حضرت عطاء ابن یسارؒ سے نقل کیا ہے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں (وہ اچھے خواب) جن کو مسلمان آدمی (اپنے لئے) دیکھتا ہے یا اس کے بارے میں کوئی اور شخص دیکھے۔"

تشریح: "مبشرات" (میم کے پیش اور باء کے زبر کے ساتھ) بشارت سے مشتق ہے جس کے معنی خوش خبری کے ہیں اعرابی میں لفظ

"بشارت" کا استعمال عام طور پر خیر کے سیاق میں ہوتا ہے لیکن کبھی شر کے ساتھ بھی اس کو استعمال کر لیا جاتا ہے اسی طرح رویا کا اطلاق عام طور پر اچھے خواب پر ہوتا ہے اور برے خواب کو حلم کہتے ہیں لیکن یہ فرق و تخصیص شرعی نقطہ نظر سے ہے ویسے لغت کے اعتبار سے رؤیا مطلق خواب کو کہتے ہیں۔ چنانچہ یہاں حدیث میں بھی لفظ رویاء مطلق خواب کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ رویاء سے اچھا خواب مراد ہے تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ لفظ "صالحہ" کا ذکر محض لفظ رؤیا کی وضاحت و تشریح کے لئے ہے یا یہ کہ "صالحہ" اصل میں صادقہ کے معنی میں ہے کہ رؤیا صالحہ سے مراد وہ اچھا خواب ہے جو سچا یعنی واقع کے مطابق ہو۔ پہلے معنی میں یعنی لفظ صالحہ کو رؤیا کی وضاحت و تشریح قرار دینا زیادہ صحیح اور مبشرات کے معنی کے موافق ہے کیونکہ اچھے خواب کا مطلب اچھی خبر ہے اور بشارت بھی کلیۃً یا عام طور پر دل و دماغ کو خوش کرنے والی ہی ہوتی ہے اگرچہ طیبی کے قول کے مطابق بشارت میں صدق کا بھی اعتبار ہوتا ہے لیکن حدیث کا سیاق اس کا متقاضی ہے کہ دوسرے معنی صالحہ (بمعنی صادقہ) مراد لیا جائے کیونکہ حدیث میں خواب کو نبوت کا ایک جز کہا گیا ہے اور نبوت میں سچی خیر کا اعتبار ہے خواہ وہ خوش کرنے والی ہو یا ڈرانے والی ہو۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ لفظ مبشرات کا استعمال ازراہ تغلیب ہے یا یہ کہ "مبشرات" اپنے مطلق معنی یعنی "مخبرات" پر محمول ہے۔

اچھے خواب کی فضیلت

(۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اچھا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: ظاہر یہ ہے کہ یہاں رویاء صالحہ سے مراد صادقہ ہے یعنی وہ اچھا خواب جو سچا بھی ہو! اس موقع پر ایک اشکال واقع ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کا کوئی جزو حصہ اس چیز سے جدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ہوتا ہے اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ جب نبوت باقی نہیں رہی ہے تو نبوت کا جزو حصہ یعنی رویاء صالحہ کیوں کر باقی رہے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ کے معنی یہ ہیں کہ رویاء صالحہ علم نبوت کے اجزاء اور حصوں میں سے ایک جز، وحصہ ہے اور ظاہر ہے کہ علم نبوت باقی ہے اگرچہ نبوت باقی نہیں ہے گویا حدیث میں مذکورہ الفاظ کے ذریعہ رویاء صالحہ کی فضیلت و منقبت بیان فرمائی گئی ہے کہ اچھا خواب حقیقت میں نبوت کا پرتو ہے اگرچہ اس کو دیکھنے والا غیر نبی ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے نیک راہ وروش، حلم گرانباری، اور میانہ روی نبوت میں سے ہے۔ چھیالیس کے عدد کی تخصیص کے بارے میں اگرچہ علماء نے مختلف باتیں لکھی ہیں لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ نہ صرف اس کا بلکہ دوسری متعدد چیزوں جیسے نماز کی رکعات اور تسبیحات وغیرہ کے بارے میں اعداد مشروع و مذکور ہیں ان کی علت و حقیقت کا علم شارع علیہ السلام کو ہی ہے۔ ایک اور روایت میں چھیالیس کے بجائے چھبیس ایک روایت میں چھہتر اور ایک روایت میں چوبیس کا عدد مذکور ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کسی بھی روایت میں کسی خاص عدد سے تحدید مراد نہیں ہے بلکہ محض تکثیر مراد ہے۔

آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھنے کا ذکر

(۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ رَاٰنِيْ فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِيْ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَتِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے درحقیقت مجھ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بن سکتا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے گویا عالم بیداری میں میرا دیدار کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا

کہ اس شخص پر وہ احکام عائد ہوں جو واقعۃً آنحضرت ﷺ کے دیدار و صحبت کی صورت میں ہوتے ہیں۔ یعنی نہ تو ایسے شخص کو صحابی کہا جائے گا اور نہ اس چیز پر عمل کرنا اس کے لئے ضروری ہوگا جس کو اس نے اپنے خواب میں آنحضرت ﷺ سے سنا ہوگا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حدیث اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے فرمائی میرے زمانہ میں جو شخص مجھ کو خواب میں دیکھے گا اس کو اللہ تعالیٰ ہجرت کی توفیق عطا فرمائے گا۔ تاکہ وہ مجھ سے آکر ملے۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ آخرت میں میرا دیدار کرے گا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی ﷺ بمعنی اخبار کے ہے، مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس کو خبر دیدو کہ اس کا خواب حقیقی اور سچا ہے اضغاث احلام میں سے نہیں ہے کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ یعنی اس کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ کسی کے خواب میں آئے اور اس کے خیال میں یہ بات ڈالے کہ میں آنحضرت ﷺ ہوں اور اس طرح وہ آنحضرت پر یہ جھوٹ لگائے۔

بعض محققین نے لکھا ہے کہ شیطان حق تعالیٰ کی ذات کے بارے میں جھوٹ دکھا سکتا ہے، یعنی دیکھنے والے کو اس خیال و وسوسہ میں مبتلا کر سکتا ہے کہ یہ حق تعالیٰ کی صورت ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی صورت ہرگز نہیں بن سکتا۔ اور نہ آپ ﷺ کی ذات پر جھوٹ لگا سکتا ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ ہدایت و راستی کے مظہر ہیں۔ جب کہ شیطان لعین ضلالت و گمراہی کا مظہر ہے اور ہدایت و ضلالت کے درمیان پانی اور آگ کی نسبت ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس کے برخلاف حق تعالیٰ کی ذات الٰہی صفات ہدایت و اضلال اور صفات متضادہ کی جامع ہے، علاوہ ازیں صفت الوہیت ایسی صفت ہے۔ جس کا مخلوقات میں سے کسی کا دعوی کرنا صریح البطلان ہے اور محل اشتباہ نہیں ہے، جب کہ وصف نبوت اس درجہ کی صفت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص الوہیت کا دعوی کرے تو اس سے خرق عادات صادر ہو سکتا ہے، جب کہ اگر کوئی شخص نبوت کا دعوی کرے تو اس سے معجزہ کا ظاہر ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

④ وَعَنْ اَبِي قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَاٰنِي فَقَدْ رَأَى الْحَقَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس نے اپنے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے حق دیکھا یعنی اس کا خواب سچا ہے کہ اس نے مجھ کو ہی دیکھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: واضح رہے کہ اس مضمون کی احادیث، جو متعدد طرق و اسانید سے اور مختلف الفاظ میں منقول ہیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جس شخص نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا اس نے حقیقت میں آنحضرت ﷺ ہی کو دیکھا اس بارے میں دروغ خیال اور شیطانی اثرات کا قطعاً دخل نہیں ہوتا، چنانچہ علماء نے اس چیز کو آنحضرت ﷺ کے خصائص میں شمار کیا ہے اور اس کو اعجاز نبوی ﷺ قرار دیا ہے البتہ علماء کے ہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ ان احادیث کا تعلق آنحضرت ﷺ کو کس صورت و حلیہ میں دیکھنے سے ہے چنانچہ بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ ان احادیث کا تعلق اس شخص سے ہے جو اپنے خواب میں آنحضرت ﷺ کو اس مخصوص صورت و حلیہ میں دیکھے جس سے آپ ﷺ متصف تھے، پھر بعض حضرات نے اس بارے میں توسع کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ ﷺ کی اس صورت و شکل میں دیکھے جو پوری عمر آپ ﷺ سے متعلق رہی ہے۔ یعنی خواہ جوانی کی صورت و شکل میں دیکھے خواہ کہولت اور خواہ آخری عمر کی صورت میں دیکھے۔ اور بعض حضرات نے اس دائرے کو محدود کیا اور کہا ہے کہ آپ ﷺ کو اس شکل و صورت میں دیکھنے کا اعتبار ہے جو آپ ﷺ کی عمر کے آخری حصہ میں تھی اور جس پر آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے یہاں تک کہ ان حضرات نے ان سفید بالوں کو بھی دیکھنے کا اعتبار کیا ہے جو آپ ﷺ کے سر مبارک اور لحیہ مبارک میں تھے اور جو تعداد میں بیس تک بھی نہیں پہنچے تھے۔

منقول ہے کہ حضرت محمدؒ ابن سیرین جو تعبیر خواب کے فن میں امام تھے کے پاس جب کوئی شخص آکر بیان کرتا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے تو وہ کہتے تھے کہ بتاؤ تم نے آنحضرت ﷺ کو کس شکل و صورت اور کس حلیہ میں دیکھا ہے اگر وہ شخص آنحضرت ﷺ کا حلیہ بیان نہ کرتا جو آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا تو ابن سیرینؒ اس سے کہتے کہ بھاگ جاؤ تم نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں نہیں دیکھا ہے۔

اس بارے میں حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا اس نے بہر صورت آپ ﷺ کو دیکھا خواہ اس نے اس مخصوص صورت و حلیہ میں دیکھا ہو جو آپ ﷺ کے بارے میں منقول ہے یا کسی اور شکل و شباہت میں دیکھا ہو کیونکہ شکل و شباہت کا مختلف ہونا ذات کے مختلف ہونے کو ضروری قرار نہیں دیتا، علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ شکل و شباہت میں اختلاف و تفاوت کا تعلق خواب دیکھنے والے کے ایمان کے کمال و نقصان سے بھی ہو سکتا ہے یعنی جس شخص نے خواب میں آنحضرت ﷺ کو اچھی صورت و شکل میں دیکھا یہ اس کے ایمان کامل اور عقیدے کے صالح ہونے کی علامت قرار پائے گا اور جس شخص نے اس کے برخلاف دیکھا یہ اس کے ایمان کی کمزوری اور عقیدے کے فساد کی علامت قرار پائے گا، اسی طرح ایک شخص نے آپ ﷺ کو بوڑھا دیکھا، ایک شخص نے جوان دیکھا، ایک شخص نے رضامند دیکھا، ایک شخص نے خفگی کے عالم میں دیکھا، ایک شخص نے روتے ہوئے دیکھا، ایک شخص نے شاد و خوش دیکھا اور ایک شخص نے ناخوش دیکھا تو یہ ساری حالتیں خواب دیکھنے والے کے ایمانی احوال کے فرق و تفاوت پر مبنی ہوں گی، کہ جو شخص جس درجہ کے ایمان کا حامل ہوگا وہ آپ ﷺ کی اسی درجہ کی مثالی صورت میں دیکھے گا۔ اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھنا گویا اپنے احوال ایمانی کو پہچاننے کا ایک معیار ہے لہٰذا یہ چیز سالکین طریقت کے لئے ایک مفید ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے باطن کی حالت کو پہچان کر اس کی اصلاح کریں، اسی پر قیاس کرتے ہوئے بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص خواب میں آنحضرت ﷺ سے کوئی ارشاد سنے تو اس کا حدیث و سُنّت سے تقابل کرے اگر وہ ارشاد حدیث و سُنّت کے موافق ہو تو وہ یقیناً حق ہے اور اگر موافق نہ ہو، جانے کہ یہ میرے ذہن اور میرے سامعہ کا خلل ہے لہٰذا خواب میں آنحضرت ﷺ کی ذات کریمہ کو اور آپ ﷺ کے ارشاد کو دیکھنا اور سننا حق ہے، اگر صورت مبارک اور ارشادات مقدسہ میں کوئی تفاوت و مخالفت نظر آئے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ خواب دیکھنے والے کے نقص و کوتاہی کے اعتبار سے ہے۔

حضرت شیخ علی متقیؒ سے منقول ہے کہ ایک فقیر نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اس کو شراب پینے کے لئے فرما رہے ہیں، اس خواب کی وجہ سے اس کے ذہن میں سخت خلجان پیدا ہوا اس نے اس خلجان کو دور کرنے کے لئے علماء سے رجوع کیا اور ان سے پوچھا کہ اس خواب کی حقیقت کیا ہے ہر عالم نے اس کی مختلف تعبیر و تاویل بیان کی اسی دوران یہ مسئلہ حدیث کے ایک عالم حضرت شیخ محمد ابن عراقؒ کے سامنے آیا جو عالم باعمل اور نہایت متبع سُنّت تھے انہوں نے فرمایا کہ اصل بات یوں نہیں ہے جس طرح اس نے سنی ہے بلکہ اس کا ذہن و سامعہ، خلل اور انتشار کا شکار ہوا ہے۔ حقیقت میں آنحضرت ﷺ نے یوں فرمایا تھا کہ لا تشرب الخمر شراب ہرگز نہ پینا مگر اس نے اس جملہ کو یوں سنا اشرب الخمر (شراب پیو)۔

⑤ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَاٰنِىْ فِى الْمَنَامِ فَسَيَرَانِىْ فِى الْيَقْظَةِ وَلَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِىْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مجھ کو خواب میں دیکھا وہ جلد ہی مجھ کو بیداری کے عالم میں دیکھے گا اور شیطان میری صورت نہیں بن سکتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا تعلق آپ ﷺ کے زمانہ سے ہے کہ جو شخص خواب میں آپ کو دیکھتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ یہ توفیق عطا فرما دیتا ہے کہ وہ عالم بیداری میں آپ ﷺ کے دیدار سے مشرف ہوتا یعنی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اور اسلام قبول کرتا۔ یا اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ مجھ کو خواب میں دیکھنے والا شخص آخرت میں عالم بیداری میں مجھ کو دیکھے گا۔

اچھا خواب اور برا خواب

⑥ وَعَنْ اَبِىْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ

فَاِذَارَاٰی اَحَدُکُمْ مَایُحِبُّ فَلَا یُحَدِّثْ بِہٖ اِلَّا مَنْ یُحِبُّ وَاِذَارَاٰی مَایَکْرَہُ فَلْیَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّھَا وَمِنْ شَرِّ الشَّیْطَانِ وَلْیَتْفُلْ ثَلاثًا وَلَا یُحَدِّثْ بِھَا اَحَدًا فَاِنَّھَا لَنْ تَضُرَّہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہے لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جس سے وہ خوش ہو تو چاہئے کہ اس خواب کو صرف اس شخص کے سامنے بیان کرے جس کو وہ دوست و ہمدرد سمجھتا ہے (جیسے علماء و صلحاء اور اقرباء، نیز وہ اس خواب پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اسکی حمد و تعریف کرے، جیسا کہ بخاری و مسلم کی ایک اور ایک روایت میں منقول ہے) اور جب ایسا خواب دیکھے جس کو وہ پسند نہیں کرتا تو چاہئے کہ اس خواب کی برائی اور شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور شیطان کو دور کرنے کے قصد سے تین مرتبہ تھتکار دے نیز اس خواب کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے (خواہ دوست ہو یا دشمن) اس لئے وہ خواب اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "برا خواب شیطان کی طرف سے ہے" کا مطلب یہ ہے اگرچہ اچھے اور برے دونوں طرح کے خواب کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے اور دیکھنے والا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے دیکھتا ہے لیکن برا خواب شیطان اثرات کا عکاس ہوتا ہے اور چونکہ اس خواب سے انسان کو پریشانی ہوتی ہے اس لئے اس پر شیطان کو بہت خوشی ہوتی ہے، حاصل یہ کہ اچھا خواب تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو بشارت ہوتی ہے تاکہ وہ بندہ خوش ہو اور اس کا وہ خواب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے حسن سلوک اور امید آوری کا باعث اور شکر خداوندی کے اضافہ کا موجب بنے جب کہ غمگین اور پریشان کرنے والا جھوٹا خواب شیطانی اثرات کے تحت ہوتا ہے جس سے شیطان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان کو غمگین و پریشان کر کے ایسی راہ پر ڈال دے جس سے وہ بدگمانی اور ناامیدی اور تقرب الٰہی و تلاش حق کی راہ میں سست روی کا شکار ہو جائے۔

"وہ خواب اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا"۔ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کو مال کی حفاظت و برکت اور دفع بلیات کا سبب بنایا ہے اسی طرح اس نے مذکورہ چیزوں یعنی اللہ کی پناہ مانگنے، تین دفع تھتکارنے اور کسی کے سامنے بیان نہ کرنے کو برے خواب کے مضر اثرات سے سلامتی کا سبب قرار دیا ہے۔

برا خواب دیکھے تو کیا کرے

(۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَارَاٰی اَحَدُکُمُ الرُّؤْیَا یَکْرَھُھَا فَلْیَبْصُقْ عَنْ یَسَارِہٖ ثَلٰثًا وَیَسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ ثَلٰثًا وَلْیَتَحَوَّلْ عَنْ جَنْبِہِ الَّذِیْ کَانَ عَلَیْہِ۔ (رواہ مسلم)

اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہو تو اس کو چاہئے کہ بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور تین بار شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے اور اپنی کروٹ کو تبدیل کر دے جس پر وہ خواب دیکھنے کے وقت سویا ہوا تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "یہاں" "تھتکارنے" کے لئے لفظ "بصق" استعمال کیا گیا ہے۔ جب کہ پچھلی حدیث میں لفظ "تفل" مذکور ہے، مفہوم و مطلب کے اعتبار سے تو دونوں لفظ بظاہر یکساں ہیں لیکن دونوں میں ایک ہلکا سا فرق یہ ہے کہ "تفل" کے معنی ہیں منہ سے تھوک نکالنا جب کہ "بصق" کا مفہوم ہے منہ کے اندر سے (تھوک) نکالنا اس طرح کہ کچھ حلق سے بھی نکلے، منہ سے نکلے ہوئے تھوک کو "بصاق" کہتے ہیں اور "بزاق" بھی کہا جاتا ہے اس سے واضح ہوا کہ تھتکارنے کے سلسلے میں پہلا درجہ "بصق" ہے اس کے بعد "تفل" ہے، "تفل" کے بعد "نفث" ہے جس کے معنی ہیں لبوں کے تھوک کے ساتھ پھونکنا اور اس کے بعد "نفخ" ہے جو محض پھونک مارنے کو کہتے ہیں۔ مسلم کی ایک روایت میں فلیبصق کے بجائے فلینفث کا لفظ منقول ہے نیز اس حدیث میں بائیں طرف تھتکارنے کا حکم دیا

گیا ہے جب کہ پچھلی حدیث میں مطلق تھتکارنے کا حکم ہے اسی طرح اسی حدیث میں کروٹ تبدیل کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ خواب کے اثرات و کیفیات میں تغیر و تبدیلی کے لئے یہ چیزیں یعنی کروٹ پھیر لینا بہت تاثیر رکھتی ہے۔

چند خوابوں کی تعبیر

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اقْتَرَبَ الزَّمَانُ لَمْ یَكَدْ یَكْذِبُ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَاَرْبَعِیْنَ جُزْءً مِنَ النُّبُوَّةِ فَمَاكَانَ مِنَ النُّبُوَّةِ فَاِنَّهٗ لَایَكْذِبُ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ سِیْرِیْنَ وَاَنَا اَقُوْلُ الرُّؤْیَا ثَلَاثٌ حَدِیْثُ النَّفْسِ وَتَخْوِیْفُ الشَّیْطَانِ وَبُشْرٰی مِنَ اللّٰهِ فَمَنْ رَاٰی شَیْئًا یَكْرَهُهٗ فَلَایَقُصَّهٗ عَلٰی اَحَدٍ وَلْیَقُمْ فَلْیُصَلِّ قَالَ وَكَانَ یَكْرَهُ الْغُلَّ فِی النَّوْمِ وَیُعْجِبُهُمُ الْقَیْدُ وَیُقَالُ الْقَیْدُ ثُبَاتٌ فِی الدِّیْنِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ قَالَ الْبُخَارِیُّ رَوَاهُ قَتَادَةُ وَیُوْنُسُ وَهُشَیْمٌ وَاَبُوْهِلَالٍ عَنِ ابْنِ سِیْرِیْنَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَقَالَ یُوْنُسُ لَا اَحْسِبُهٗ اِلَّا عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الْقَیْدِ وَقَالَ مُسْلِمٌ لَا اَدْرِیْ هُوَفِی الْحَدِیْثِ اَمْ قَالَهُ ابْنُ سِیْرِیْنَ وَفِیْ رِوَایَةٍ نَحْوَهٗ وَاَدْرَاجَ فِی الْحَدِیْثِ قَوْلَهٗ وَاَكْرَهُ الْغُلَّ اِلٰی تَمَامِ الْكَلَامِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس وقت کہ زمانہ قریب ہو گا تو مؤمن کا خواب جھوٹا نہیں ہو گا اور مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے اور جو چیز نبوت کے اجزاء میں سے ہو وہ جھوٹی نہیں ہوا کرتی۔" حضرت محمد ابن سیرینؒ جو (ایک جلیل القدر تابعی اور فن تعبیر خواب کے امام ہیں) فرماتے ہیں کہ اور میں (آنحضرت ﷺ سے منقول احادیث کی روشنی میں یہ کہتا ہوں کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو نفس کا خیال، دوسرے شیطان کا ڈرانا اور تیسرے خدا کی طرف سے بشارت پس جو شخص کوئی برا خواب" (ڈراؤنا) دیکھے تو اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے اور (یہ کرے کہ خواب دیکھنے کے بعد) اٹھے اور (نفل) نماز پڑھ لے تاکہ نماز کی برکت و نورانیت کے سبب اس کے دل کو اطمینان نصیب ہو اور خواب کی برائی کا جو وہم و وسوسہ دل میں پیدا ہو گیا ہے وہ جاتا رہے گا) نیز ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خواب میں طوق کو دیکھنا اچھا نہیں سمجھتے تھے اور قید کو دیکھنا پسند فرماتے تھے چنانچہ کہا جاتا ہے (یعنی تعبیر خواب کے ماہر علماء کہتے ہیں) کہ قید کا مطلب دین پر ثابت قدم رہنا ہے یہ پوری روایت (جو آنحضرت ﷺ کے ارشاد اور ابن سیرینؒ کے قول پر مشتمل ہے) بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کی ہے لیکن روایت کے آخری جزو کے بارے میں دونوں کو تردد ہے چنانچہ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو یعنی پوری روایت کو یا صرف اسی جزو کو کہ جس میں قید کا ذکر ہے قتادہ، یونسؒ، ہشیمؒ، اور ابوہلالؒ نے محمد ابن سیرین سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے (ابتدائی جزو بطریق مرفوع اور آخری جزو بطریق موقوف) نقل کیا ہے اور یونس نے کہا ہے کہ میرا گمان ہے کہ حدیث کا وہ جزو جس میں ابن سیرین نے قید کا ذکر کیا ہے یعنی یہ الفاظ یعجبهم القيد و القيد ثبات في الدين) حضرت ابوہریرہؓ کا قول نہیں ہے بلکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے (گویا بخاری کے اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ ابن سرینؒ نے نقل کرنے والے ایک راوی یونسؒ کے مطابق روایت کا وہ جزو کہ جس میں طوق کا ذکر ہے، حضرت ابوہریرہؓ یا ابن سیرینؒ کا اپنا قول ہے، البتہ وہ جزو کہ جس میں قید کا ذکر ہے حضرت ابوہریرہؓ یا ابن سیرینؒ کا اپنا قول نہیں ہے بلکہ حدیث مرفوع یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے جس کو آنحضرت ﷺ سے ابوہریرہؓ نے اور ابوہریرہؓ سے محمد ابن سیرینؒ نے نقل کیا ہے") اور امام مسلمؒ نے جو (ابن سیرینؒ سے روایت نقل کر کے) یہ کہا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ (جزء کہ جس میں قید کے الفاظ ہیں)، آنحضرت ﷺ کی حدیث کے الفاظ ہیں یا ابن سیرینؒ کا اپنا قول ہے۔ مسلمؒ کی ایک اور روایت میں اسی طرح کے الفاظ ہیں نیز مسلمؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ یا محمد ابن سیرینؒ نے حدیث میں ادراج کیا ہے۔ بایں طور کہ انہوں نے کہا میں طوق کو دیکھنا اچھا سمجھتا ہوں...... الخ (گویا مسلم کے قول کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا پورا آخری جزو، جو طوق اور قید کے ذکر پر مشتمل ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں ہے۔ بلکہ حضرت ابوہریرہؓ یا محمد ابن سیرینؒ کا اپنا قول ہے نیز

بخاریؒ و مسلم کے ان اقوال کی روشنی میں قال و کان یکرہ کی ضمیروں کی حقیقت حال بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ ان ضمیروں کو کس کی طرف راجع ہونا چاہئے!۔"

تشریح: "جس وقت کہ زمانہ قریب ہوگا" کے تین معنی بیان کئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ زمانہ قریب ہونے سے مراد قرب قیامت کا آخری زمانہ ہے جیسا کہ ایک اور حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں قیامت کے قریب مؤمن کا خواب جھوٹا نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ زمانہ قریب ہونے سے مراد موت کے زمانہ سے قریب ہونا ہے یعنی جس مؤمن کی موت کا زمانہ قریب ہوتا ہے اس کا خواب جھوٹا نہیں ہوتا یہ معنی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنے بعض مشائخ سے نقل کئے ہیں، تیسرے یہ کہ اس سے مراد وہ ایام ہیں جن میں دن رات برابر ہوتے ہیں، چنانچہ جس زمانہ میں دن رات برابر ہوتے ہیں ان میں انسانی مزاج اعتدال پر ہوتا ہے اور ذہن و فکر کی صلاحتیں صحت و سلامت روی کے ساتھ کام کرتی ہیں ایسے دنوں میں دیکھا جانے والا خواب ذہنی و جسمانی خلل و انتشار سے محفوظ اور زیادہ سچا ہوتا ہے، چوتھے یہ کہ زمانہ قریب ہونے سے مراد وہ زمانہ ہے جب سال مہینہ کی طرح، مہینہ ہفتہ کی طرح، ہفتہ دن کی طرح اور دن ساعت کی طرح گزرنے لگے۔ علماء نے لکھا ہے کہ ایسا زمانہ حضرت امام مہدیؓ کے دور میں آئے گا کیونکہ اس وقت حضرت امام مہدیؓ کے عدل و انصاف اور رعایا پروری کی وجہ سے سب ہی لوگ آسودگی و مسرت اور بے فکری کے دن گزاریں گے اور ظاہر ہے کہ آسودگی و بے فکری کے دن بڑی سرعت کے ساتھ گزرتے معلوم ہوتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی طویل زمانہ کیوں نہ ہو اس کے برعکس عسرت و تنگی اور محنت مشقت کے دن اتنے بھاری معلوم ہوتے ہیں کہ خواہ وہ کتنا ہی مختصر عرصہ کیوں نہ ہو ایک ایک دن پہاڑ کی طرح گزرتا ہے۔ لہٰذا حضرت مہدیؓ کے زمانہ میں بھی خواب صحیح و درست ہوں گے کیوں کہ وہ راستی کا زمانہ ہوگا۔ ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ وہ شخص جتنا زیادہ راست باز ہوگا اس کا خواب اتنا ہی سچا ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی سے چونکہ مطلق خواب سچا ہونا اور اس کی توصیف و فضیلت واضح ہوتی تھی تو اس لئے خواب کی قسمیں بیان کرنے کے لئے حضرت محمد ابن سیرینؒ کا ایک قول نقل کیا گیا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ خواب کی ہر قسم نہ تو سچی ہوتی ہے اور نہ قابل تعبیر و لائق اعتبار، بلکہ خواب کی صرف وہی قسم قابل تعبیر و لائق اعتبار ہوتی ہے جس کو حق تعالیٰ کی طرف سے بشارت اور آئندہ پیش آنے والے واقعات و حادثات کی خبر و علامت قرار دیا جاتا ہے۔

ابن سیرینؒ نے خواب کی جو تین قسمیں بیان کی ہیں ان میں پہلی قسم نفس کا خیال ہے، یعنی انسان دن بھر جن امور میں مشغول رہتا ہے اور اس کے دل دماغ پر جو باتیں چھائی رہتی ہیں وہی رات میں بصورت خواب مشکل ہو کر نظر آتی ہیں مثلاً ایک شخص اپنے پیشہ و روزگار میں مصروف رہتا ہے اور اس کا ذہن و خیال انہیں باتوں کی فکر اور ادھیڑپن میں لگا رہتا ہے جو اس کے پیشہ و روزگار سے متعلق ہیں تو خواب میں اس کو وہی چیزیں نظر آتی ہیں، یا ایک شخص اپنے محبوب کے خیال میں مگن رہتا ہے اور اس کے ذہن پر ہر وقت اسی محبوب کا سایہ رہتا ہے تو اس کے خواب کی دنیا پر بھی وہی محبوب چھایا رہتا ہے غرضکہ عالم بیداری میں جس شخص کے ذہن و خیال پر جو چیز زیادہ چھائی رہتی ہے وہی اس کو خواب میں نظر آئے گی لہٰذا اس طرح کے خواب کا کوئی اعتبار نہیں۔

دوسری قسم ڈراؤنا خواب ہے، یہ خواب اصل میں شیطانی اثرات کا پرتو ہوتا ہے، شیطان چونکہ ازل سے بنی آدم کا دشمن ہے اور جس طرح وہ عالم بیداری میں انسان کو گمراہ کرنے اور پریشان کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح نیند کی حالت میں بھی وہ انسان کو چین نہیں لینے دیتا، چنانچہ وہ انسان کو خواب میں پریشان کرنے اور ڈرانے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے کبھی تو وہ کسی ڈراونی شکل و صورت میں نظر آتا ہے جیسے وہ دیکھتا ہے کہ میرا سر قلم ہو گیا وغیرہ وغیرہ اسی طرح خواب میں احتلام کا ہونا کہ موجب غسل ہوتا ہے اور بسا اوقات اس کی وجہ سے نماز فوت یا قضا ہو جاتی ہے اسی شیطانی اثرات کا کرشمہ ہوتا ہے، پہلی قسم کی طرح یہ قسم بھی بے اعتبار اور ناقابل تعبیر ہوتی ہے۔

خواب کی تیسری قسم وہ ہے جس کو منجانب اللہ بشارت کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کے خواب میں بشارت دیتا ہے اور اس کے قلب کے آئینہ میں بطور اشارات وعلامات ان چیزوں کو متشکل کر کے دکھاتا ہے۔ جو آئندہ وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہے۔ یا جن کا تعلق مؤمن کی روحانی و قلبی بالیدگی و طمانیت سے ہوتا ہے وہ بندہ خوش ہو اور طلب حق میں تروتازگی محسوس کرے، نیز حق تعالیٰ سے حسن اعتقاد اور امید آوری رکھے۔ خواب کی یہی وہ قسم ہے۔ جو لائق اعتبار اور قابل تعبیر ہے اور جس کی فضیلت و تعریف احادیث میں بیان کی گئی ہے۔

"تو اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے" کا مطلب یہ ہے کہ جب اس طرح کا خواب بے اعتبار ہے اور اس کو کوئی تعبیر نہیں تو اس کو کسی کے سامنے بیان کرنا عبث ولا حاصل ہے علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے کہ جب اس قسم کے خواب کو کسی کے سامنے بیان کرے گا اور سننے والا خواب کی ظاہری حالت کے پیش نظر اس کی خراب تعبیر دے گا۔ تو اس کی وجہ سے فاسد وہم میں مبتلا ہونا اور بدشگونی لینا لازم آئے گا، نیز دل و دماغ مختلف قسم کے اندیشوں اور وسوسوں سے پریشان ہو جائیں گے، مزید برآں خواب کے وقوع پذیر ہونے میں خواب کو ایک خاص تاثیر حاصل ہے کہ خواب کو سننے والا جو تعبیر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ویسا ہی وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔

"قال و کان یکرہ الغل الخ" میں لفظ قال اور کان کی ضمیروں کے بارے میں شارحین حدیث نے کئی احتمال لکھے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قال کی ضمیر محمد ابن سیرینؒ کی طرف سے راجع ہو جیسا کہ ماقبل کی عبارت قال محمدبن سیرین سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے اور اس بنا پر کان یکرہ کی ضمیریں آنحضرت ﷺ کی طرف راجع ہوں، اس صورت میں مذکورہ جملہ کے معنی وہی ہونگے جو ترجمہ میں بیان کئے گئے یعنی حضرت محمد ابن سیرینؒ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ اس کے گلے میں طوق ڈالا گیا ہے کیونکہ گلے میں طوق کا ڈالا جانا دوزخیوں کی صفت ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ اذالا غلال فی اعناقھم دوسرا احتمال یہ ہے کہ "قال" کی ضمیر تو ابن سیرینؒ کی طرف راجع ہو اور کان یکرہ کی ضمیریں حضرت ابوہریرہؓ کی طرف راجع ہوں اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ ابن سیرینؒ نے کہا ہے، حضرت ابوہریرہؓ اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ اس کے گلے میں طوق ڈالا گیا ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کا اس بات کو اچھا نہ سمجھنا یا تو اس پر تھا کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اسی طرح سنا ہو گا یا اپنے ان کے اجتہاد کی بنا پر تھا۔ اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ قال کی ضمیر تو اس راوی کی طرف راجع ہو جس نے اس حدیث کو حضرت ابن سیرینؒ سے نقل کیا ہے اور کان یکرہ کی ضمیریں حضرت ابن سیرینؒ کی طرف راجع ہوں اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ راوی نے کہا کہ حضرت ابن سیرینؒ خواب میں طوق کو دیکھنا اچھا نہیں سمجھتے تھے! بظاہر یہ تیسرا احتمال ایک طرح کی ترجیح رکھتا ہے کیوں کہ حضرت ابن سیرینؒ تعبیر خواب کے فن کے امام سمجھے جاتے ہیں اور ان سے اس طرح کے بہت سے اقوال منقول ہیں۔

اور قید کو دیکھنا پسند فرماتے تھے یعنی کوئی شخص خواب میں دیکھتا کہ اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اس کو قیدی بنا لیا گیا ہے تو اس خواب کو اچھا سمجھتے تھے، بخاریؒ نے اس جملہ میں جمع کا صیغہ یعنی لفظ یعجبھم نقل کیا ہے، لہٰذا ضمیروں کے سلسلے میں اوپر نقل کئے گئے احتمالات میں سے پہلے احتمال کی بنا پر یعجبھم کی ضمیر آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کی طرف راجع ہوگی دوسرے احتمال کی بنا پر حضرت ابوہریرہؓ اور ان کے تابعین کی طرف اور تیسرے احتمال کی بنا پر حضرت ابن سیرینؒ اور ان کے زمانہ کے تعبیر دینے والے علماء کی طرف راجع ہوگی۔ خواب میں اپنے کو قیدی دیکھنا اس لئے اچھا ہے کہ دراصل برے امور، گناہوں اور کمزوری و گمراہی سے باز رہنے اور دینی احکامات و طاعت پر ثابت قدم رہنے کی علامت ہے جیسا کہ روایت میں فرمایا گیا ہے ویقال القید ثبات فی الدین (کہا جاتا ہے کہ قید کا مطلب دین پر ثابت قدم رہنا ہے) لیکن واضح رہے کہ یہ تعبیر اہل دین و طاعت کی نسبت سے ہے یعنی جو شخص دینی زندگی کا حامل اور عبادات و طاعات پر عامل ہو گا اور وہ خواب میں اپنے کو قیدی دیکھے گا تو اس کے لئے مذکورہ تعبیر ہوگی اسی لئے تعبیر خواب کے ماہرین نے لکھا ہے کہ اگر کوئی بیمار یا قیدی، یا مسافر اور یا کوئی مصیبت زدہ شخص خواب میں دیکھے کہ میرے پیروں میں قید کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں تو

اس کے حق میں خواب کی یہ تعبیر ہوگی کہ وہ اپنے حال پر قائم رہے گا اسی طرح ایک ہی خواب کو دو مختلف حالت کے آدمی دیکھیں تو اس کی تعبیر ان کے حق میں ان کی حالت کے مطابق الگ الگ ہوگی، مثلاً اگر کوئی تاجر یہ خواب دیکھے کہ وہ اپنا سامان لے کر کشتی پر بیٹھا ہوا ہے اور ہوا کشتی کے موافق چل رہی ہے تو اس کے حق میں خواب نقصان وضرر سے سلامتی اور تجارت میں نفع کی علامت قرار پائے گا اور اگر یہی خواب کوئی سالک طریقت دیکھے تو اس کے حق میں یہ خواب شریعت کی اتباع اور مرتبہ حقیقت کو پہنچنے کی علامت قرار پائے گا۔

ڈراؤنا خواب شیطانی اثر ہے اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کرو

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ كَأَنَّ رَأْسِيْ قُطِعَ فَقَالَ فَضَحِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ اِذَالَعِبَ الشَّيْطَانُ بِاَحَدِكُمْ فِيْ مَنَامِهٖ فَلَايُحَدِّثْ بِهِ النَّاسَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گویا میرا سر کاٹ ڈالا گیا ہے۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ خواب سن کر ہنس دیئے اور فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کے خواب میں اس کے ساتھ شیطان تماشہ کرے تو وہ اس خواب کو لوگوں کے سامنے بیان نہ کرے۔" (مسلم)

تشریح: گویا آنحضرت ﷺ نے دیہاتی سے فرمایا کہ تمہارا یہ خواب اضغاث احلام میں سے ہے اور اس قسم سے ہے جس میں انسان کے ساتھ شیطان تماشہ کرتا ہے تاکہ اس کو پریشان و رنجور کرے ایسے خواب کو چھپانا چاہئے۔ نہ کہ لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ خواب اضغاث احلام میں سے ہے اور شیطانی اثرات کا عکاس ہے ورنہ اہل تعبیر کے نزدیک اس خواب کی تعبیر زوال نعمت، قوم برادری سے مفارقت اور اس جیسی دوسری چیزوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ایک خواب

⑩ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَيْتُ ذَاتَ لَيْلَةٍ فِيْمَا يَرَى النَّائِمُ كَأَنَّا فِيْ دَارِ عُقْبَةَ بْنِ رَافِعٍ فَاُتِيْنَا بِرُطَبٍ مِنْ رُطَبِ ابْنِ طَابٍ فَاَوَّلْتُ اَنَّ الرِّفْعَةَ لَنَا فِي الدُّنْيَا وَالْعَاقِبَةَ فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ دِيْنَنَا قَدْ طَابَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے ایک رات کو ان چیزوں میں کہ جن میں سونے والا دیکھتا ہے (یعنی خواب میں) دیکھا کہ گویا میں اور میرے صحابہؓ عقبہ ابن رافعؓ کے گھر بیٹھے ہوئے ہیں اور میرے سامنے تازہ کھجوریں لائی گئیں جن کو رطب ابن طاب کہا جاتا ہے، چنانچہ میں نے اس خواب کی یہ تعبیر لی کہ ہمارے لئے دنیا رفعت و سربلندی ہے۔ اور آخرت میں نیک عاقبت یعنی اچھی جزا کا انعام ہے اور یہ ہمارا دین اچھا ہے۔" (مسلم)

تشریح: مذکورہ تعبیر میں آپ ﷺ نے گویا ناموں کے الفاظ کو بنیاد بنایا بایں طور کہ رفعت کی تعبیر تو آپ ﷺ نے رافع سے لی........ عاقبت کی تعبیر عقبہ سے لی اور "طاب یعنی اچھا ہے" رطب ابن طاب سے لیا، چنانچہ یہ عادت شریفہ تھی کہ آپ ﷺ ناموں کے الفاظ کے ذریعہ بطریق تفاؤل وتاویل حصول مقصد کا مفہوم حاصل کرتے تھے۔ اور یہ بات محض تعبیر خواب کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ عالم بیداری اور روزمرہ کی زندگی میں بھی ان کے ذریعہ نیک فال لیتے تھے۔ جیسا کہ منقول ہے کہ جب آپ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک شخص بریدہ اسلمی کو چند سواروں کے ساتھ دیکھا جس کو قریش مکہ نے آپ ﷺ کو پکڑ کر مکہ واپس لانے پر معمور کیا تھا اور اس کے بطور انعام سو اونٹ مقرر کئے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس کو دیکھ کر پوچھا کہ تم کون ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ بریدہ، آنحضرت ﷺ نے یہ سنا (تو لفظ بریدہ سے نیک فال لیتے ہوئے) حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ قدبردا امرنا یعنی ہمارا معاملہ ٹھنڈا ہو گیا کہ (دشمن کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا)

ہجرت سے متعلق آنحضرت ﷺ کا خواب

⑪ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ رَاَیْتُ فِی الْمَنَامِ اَنِّی اُھَاجِرُ مِنْ مَکَّۃَ اِلٰی اَرْضٍ بِھَا نَخْلٌ فَذَھَبَ وَھْلِیْ اِلٰی اَنَّھَا الْیَمَامَۃُ اَوْھَجَرٌ فَاِذَاھِیَ الْمَدِیْنَۃُ یَثْرِبُ وَرَاَیْتُ فِیْ رُؤْیَایَ ھٰذِہٖ اَنِّیْ ھَزَزْتُ سَیْفًا فَانْقَطَعَ صَدْرُہٗ فَاِذَا ھُوَمَا اُصِیْبَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ اُحُدٍ ثُمَّ ھَزَزْتُہٗ اُخْرٰی فَعَادَ اَحْسَنَ مَاکَانَ فَاِذَا ھُوَ مَاجَاءَ اللّٰہُ بِہٖ مِنَ الْفَتْحِ وَاجْتِمَاعِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہجرت سے پہلے مکہ میں ایک دن میں نے یہ خواب دیکھا کہ میں مکہ سے ہجرت کر کے ایک ایسی زمین کی طرف جا رہا ہوں جس میں کھجوروں کے درخت ہیں، چنانچہ اس خواب کی تعبیر میں میرا یہ خیال ہوا کہ وہ شہر جہاں میں ہجرت کر کے جاؤں گا یمامہ ہو گا یا ہجر، لیکن حقیقت میں وہ مدینہ نکلا جس کا قدیم نام یثرب ہے، میں نے اپنے اس خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ میں نے اپنی تلوار کو ہلایا اور وہ اوپر سے ٹوٹ گئی، چنانچہ تلوار ٹوٹنے کی تعبیر جنگ احد کے ان پریشانیوں اور مصائب کی صورت میں ظاہر ہوئی جس سے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا کہ ابتداء میں مسلمانوں کو بظاہر شکست سے دوچار ہونا پڑا، آنحضرت ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے، کتنے ہی مسلمان شہید ہوئے اور کتنے زخمی ہو گئے پھر میں نے خواب ہی میں تلوار کو دوسری مرتبہ ہلایا تو وہ تلوار نہ صرف درست ہو گئی بلکہ پہلے سے بھی بہتر ہو گئی چنانچہ تلوار درست ہونے کی تعبیر جنگ احد ہی کے موقع پر یا فتح مکہ اور یا صلح حدیبیہ کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جانے والی فتح اور مسلمانوں کی اجتماعیت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جزیرہ نمائے عرب (نجد و حجاز) کا وہ علاقہ ہے جو جبل طویق کے جنوب مشرق میں پھیلا ہوا ہے اور اب نجد کے علاقے میں شامل ہے یمامہ کہا جاتا ہے یہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا اور اس میں کھجور کی بڑی پیداوار تھی موجود زمانہ میں "یمامہ" ایک چھوٹی سی بستی کی صورت میں سعودی عرب کے دار السلطنت ریاض اور الالم کے درمیان پایا جاتا ہے ہجر بھی یمامہ سے متصل مشرق میں ایک بستی تھی یہاں بھی کھجور بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں "مدینہ" کا نام یثرب تھا، جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے تو اس کا نام مدینہ، طابہ، اور طیبہ رکھا گیا، لیکن زیادہ مشہور مدینہ ہی ہوا! آنحضرت ﷺ نے اس شہر مقدس کو یثرب کہنے سے منع فرما دیا تھا، کیونکہ یثرب اصل میں ثرب بالتحریک سے مشتق ہے جس کے معنی فتنہ وفساد کے ہیں جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں یا بعض دوسری احادیث میں اس شہر کے لئے اس کا قدیم نام یثرب کیوں استعمال فرمایا تو اس کی وجہ تو یہ ہے کہ یہ احادیث مذکورہ ممانعت سے پہلے کی ہیں یا یہ ممانعت چونکہ نہی تنزیہی کے طور پر ہے اس لئے آپ ﷺ بیان جواز کی خاطر کبھی کبھی قدیم نام کو بھی استعمال فرما لیتے تھے اور یا یہ کہ ابتداء ہجرت میں چونکہ عام طور پر لوگ اس نئے نام سے واقف نہیں ہوتے تھے اس لئے آپ ﷺ نے اس کو اس سے واقف کرانے کے لئے اس کے شرعی نام مدینہ کے ساتھ قدیم نام یثرب کا بھی ذکر فرما دیا اور یہی آخری احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، نیز قرآن کریم میں جو فرمایا گیا ہے کہ یا یا اھل یثرب لا مقام لکم الخ یہ تو یہ منافقین کی زبانی فرمایا گیا ہے اس لئے اس کے بارے میں کوئی اشکال نہیں ہونا چاہئے۔

ایک خواب کی تعبیر

⑫ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَ اَنَا نَائِمٌ اُتِیْتُ بِخَزَائِنِ الْاَرْضِ فَوُضِعَ فِیْ کَفِّیْ سِوَارَانِ مِنْ ذَھَبٍ فَکَبُرَا عَلَیَّ فَاُوْحِیَ اِلَیَّ اَنْ اَنْفُخْھُمَا فَنَفَخْتُھُمَا فَذَھَبَا فَاَوَّلْتُھُمَا الْکَذَّابَیْنِ الَّذَیْنِ اَنَا بَیْنَھُمَا صَاحِبُ صَنْعَاءَ وَصَاحِبُ الْیَمَامَۃِ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ یُقَالُ اَحَدُھُمَا مُسَیْلَمَۃُ صَاحِبُ الْیَمَامَۃِ وَالْعَنْسِیُّ

صَاحِبُ صَنْعَآءَ لَمْ اَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَذَكَرَهَا صَاحِبُ الجَامِعِ عَنِ التِّرْمِذِيِّ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ایک دن) میں سو رہا تھا کہ (خواب) میں زمین کے خزانے میرے سامنے لائے گئے، پھر میرے ہاتھ پر سونے کے دو کڑے رکھے گئے جو مجھ پر گراں گزرے (یعنی مردوں کے لئے سونا حرام ہونے کی وجہ سے ان کڑوں کا میرے ہاتھوں میں ہونا مجھ کو ناگوار ہوا)، اس کے بعد مجھ پر وحی آئی (یعنی خواب ہی میں بطور الہام میرے دل میں اللہ نے یہ بات ڈالی) کہ ان کڑوں پر پھونک مارو چنانچہ میں نے پھونک ماری تو وہ کڑے اڑ گئے میں نے ان دونوں کڑوں سے ان دونوں جھوٹوں کے بارے میں تعبیر لی (باعتبار مسکن علاقہ کے) جن کے درمیان میں ہوں، یعنی ایک تو یمامہ والا، اور دوسرا صنعاء والا۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور ایک روایت میں جس کو (ترمذیؒ نے نقل کیا ہے) یوں ہے کہ (آپ ﷺ نے ان دونوں جھوٹوں کی وضاحت اس طرح فرمائی) کہ ان میں سے ایک کو تو مسیلمہ کہا جاتا ہے جو یمامہ کا رہنے والا ہے اور دوسرا عنسی ہے جو صنعاء کا رہنے والا ہے مصنف مشکوٰۃ کہتے ہیں کہ مجھے یہ روایت بخاریؒ و مسلم میں نہیں ملی ہے اور اس کو صاحب جامع الاصول نے ترمذیؒ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "زمین کے خزانے" یعنی زمین کے خزانے کی کنجیاں میرے سامنے لائی گئیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے سامنے حقیقت میں خزانے ہی لائے گئے تھے خزانوں کے ذریعہ گویا یہ بشارت دی گئی کہ آپ ﷺ کی اُمت کے لوگ اس روئے زمین پر اپنا تسلط قائم کریں گے اور دنیا کے خزانوں کے مالک قرار پائیں گے۔ نیز آپ ﷺ کی اُمت اور آپ ﷺ کی شریعت چار دانگ عالم میں پھیل جائے گی۔

"صنعاء" یمن کے ایک مشہور شہر کا نام ہے اس کے سردار کا نام اسود عنسی تھا جس نے آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات میں نبوت کا دعوی کیا تھا جب آپ ﷺ مرض وفات میں صاحب فراش تھے تو حضرت فیروز دیلمیؓ نے اسود عنسی کو قتل کیا، آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا فاز فیروز یعنی فیروز فائز المرام ہوئے، اسود عنسی کی طرح یمامہ کے رہنے والے مسیلمہ کذاب نے بھی نبوت کا دعوی کیا تھا اس کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت وحشیؓ نے قتل کیا تھا یہ وہی وحشیؓ ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے قبل غزوہ احد میں امیر حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔

کڑوں سے دونوں جھوٹوں کے بارے میں تعبیر لینے کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ کڑے اصل میں ہتھکڑی کی مشابہت رکھتے ہیں جس کو ہاتھوں میں ڈال کر قیدی بنایا جاتا ہے۔ اور ہتھکڑی ہاتھوں کو اس طرح باندھ دیتی ہے کہ وہ ہاتھ نہ کسی چیز کو پکڑ سکتے ہیں نہ کوئی کام کر سکتے ہیں اور نہ حرکت و تصرف کی قدرت رکھتے ہیں، چنانچہ وہ دونوں کذاب کہ جو نبوت کا دعوی کر کے آنحضرت ﷺ کے مقابلہ پر آئے تھے قیدیوں کے مشابہ ہوئے جن کے ہاتھ کی کڑی کڑوں کی صورت میں آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھی کہ آپ ﷺ نے ان دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑی میں ڈال کر پکڑ رکھا ہے اور چھوڑتے نہیں تاکہ وہ اپنی حرکت و عمل سے باز رہیں اور کوئی کام نہ کر سکیں۔ رہی یہ بات کہ اس تعبیر کے پیش نظر سونے ہی کے کڑے کیوں دکھائے گئے لوہے کے کڑے کیوں نہ دکھائے گئے جو ان کے زیادہ مناسب حال تھے تو اس میں بھی دراصل ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ سونے کے کڑے دکھا کر اشارہ کیا گیا کہ دونوں جھوٹے دنیاوی عزت و جاہ کے لالچ اور زیب و زینت کے انہماک میں کس قدر مبتلا ہیں اور یہ کہ ان کا مردود و مجرم ہونا کس قدر واضح اور ان کی نوعیت کتنی سنگین ہے۔

⑬ وَعَنْ اُمِّ الْعَلَاءِ الْاَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ رَاَيْتُ لِعُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ فِي النَّوْمِ عَيْنًا تَجْرِيْ فَقَصَصْتُهَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ذٰلِكَ عَمَلُهٗ يُجْرٰى لَهٗ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت اُمّ العلاء انصاریہؓ کہتی ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ عثمان ابن مظعونؓ کے لئے پانی کا ایک چشمہ جاری ہے جب میں نے یہ خواب نبی کریم ﷺ کے سامنے بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ان کے عمل کا ثواب ہے جو ان کے لئے جاری رکھا گیا ہے۔"

(بخاریؒ)

تشریح: حضرت عثمان ابن مظعونؓ ایک جلیل القدر اور قدیم الاسلام صحابی ہیں، مہاجرین میں بڑی فضیلت کے حامل تھے، میدان کارزار میں جان باز مجاہد کی حیثیت رکھتے تھے ان کی ایک بڑی فضیلت یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو مرابط یعنی میدان کارزار میں اسلامی لشکر و سرحد کا پاسبان مقرر کیا تھا۔ شریعت میں مرابط کے بہت زیادہ فضائل منقول ہیں ان میں سے ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ مرابط جب انتقال کر جاتا ہے تو اس کا عمل صالح قیامت تک بڑھتا رہتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ خواب کی یہ تعبیر بیان فرمائی کہ وہ چشمہ دراصل ان کا عمل صالح ہے اور جس طرح وہ چشمہ جاری ہے اسی طرح ان کے عمل صالح کا ثواب برابر جاری ہے جو قیامت تک ان کی طرف پہنچتا رہے گا۔

عالم برزخ کی سیر سے متعلق آنحضرت ﷺ کا ایک خواب

(۱۴) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ مَنْ رَاٰى مِنْكُمُ اللَّيْلَةَ رُؤْيَا قَالَ فَاِنْ رَاٰى اَحَدٌ قَصَّهَا فَيَقُوْلُ مَاشَاءَ اللّٰهُ فَسَاَلَنَا يَوْمًا فَقَالَ هَلْ رَاٰى مِنْكُمْ اَحَدٌ رُؤْيَا قُلْنَا لَا قَالَ لٰكِنِّي رَاَيْتُ اللَّيْلَةَ رَجُلَيْنِ اَتَيَانِي فَاَخَذَا بِيَدَيَّ فَاَخْرَجَانِيْ اِلٰى اَرْضٍ مُقَدَّسَةٍ فَاِذَا رَجُلٌ جَالِسٌ وَرَجُلٌ قَائِمٌ بِيَدِهٖ كَلُّوْبٌ مِنْ حَدِيْدٍ يُدْخِلُهٗ فِيْ شِدْقِهٖ فَيَشُقُّهٗ حَتّٰى يَبْلُغَ قَفَاهُ ثُمَّ يَفْعَلُ بِشِدْقِهِ الْاٰخَرِ مِثْلَ ذٰلِكَ وَيَلْتَئِمُ شِدْقُهٗ هٰذَا فَيَعُوْدُ فَيَصْنَعُ مِثْلَهٗ قُلْتُ مَاهٰذَا قَالَ انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا عَلٰى رَجُلٍ مُضْطَجِعٍ عَلٰى قَفَاهُ وَرَجُلٌ قَائِمٌ عَلٰى رَاْسِهٖ بِفِهْرٍ اَوْصَخْرَةٍ يَشْدَخُ بِهَا رَاْسَهٗ فَاِذَا ضَرَبَهٗ تَدَهْدَهَ الْحَجَرُ فَانْطَلَقَ اِلَيْهِ لِيَاْخُذَهٗ فَلَا يَرْجِعُ اِلٰى هٰذَا حَتّٰى يَلْتَئِمَ رَاْسُهٗ وَعَادَ رَاْسُهٗ كَمَا كَانَ فَعَادَ اِلَيْهِ فَضَرَبَهٗ فَقُلْتُ مَاهٰذَا قَالَا انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا اِلٰى ثَقْبٍ مِثْلِ التَّنُّوْرِ اَعْلَاهُ ضَيِّقٌ وَاَسْفَلُهٗ وَاسِعٌ تَتَوَقَّدُ تَحْتَهٗ نَارٌ فَاِذَا ارْتَفَعَتْ ارْتَفَعُوْا حَتّٰى كَادَاَنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا وَاِذَا خَمَدَتْ رَجَعُوْا فِيْهَا وَفِيْهَا رِجَالٌ وَنِسَاءٌ عُرَاةٌ فَقُلْتُ مَاهٰذَا قَالَ انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا عَلٰى نَهْرٍ مِنْ دَمٍ فِيْهِ رَجُلٌ قَائِمٌ عَلٰى وَسْطِ النَّهْرِ وَعَلٰى شَطِّ النَّهْرِ رَجُلٌ بَيْنَ يَدَيْهِ حِجَارَةٌ فَاَقْبَلَ الرَّجُلُ الَّذِيْ فِي النَّهْرِ فَاِذَا اَرَادَ اَنْ يَخْرُجَ رَمَى الرَّجُلُ بِحَجَرٍ فِيْ فِيْهِ فَرَدَّهٗ حَيْثُ كَانَ فَجَعَلَ كُلَّمَا جَاءَ لِيَخْرُجَ رَمٰى فِيْ فِيْهِ بِحَجَرٍ فَيَرْجِعُ كَمَا كَانَ فَقُلْتُ مَاهٰذَا قَالَا انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا حَتَّى انْتَهَيْنَا اِلٰى رَوْضَةٍ خَضْرَاءَ فِيْهَا شَجَرَةٌ عَظِيْمَةٌ وَفِيْ اَصْلِهَا شَيْخٌ وَصِبْيَانٌ وَاِذَا رَجُلٌ قَرِيْبٌ مِنَ الشَّجَرَةِ بَيْنَ يَدَيْهِ نَارٌ يُوْقِدُهَا فَصَعِدَا بِيَ الشَّجَرَةَ فَاَدْخَلَانِيْ دَارًا وَسْطَ الشَّجَرَةِ لَمْ اَرَقَطُّ اَحْسَنَ مِنْهَا فِيْهَا رِجَالٌ شُيُوْخٌ وَشَبَابٌ وَنِسَاءٌ وَصِبْيَانٌ ثُمَّ اَخْرَجَانِيْ مِنْهَا فَصَعِدَا بِيَ الشَّجَرَةَ فَاَدْخَلَانِيْ دَارًا هِيَ اَحْسَنُ وَاَفْضَلُ مِنْهَا فِيْهَا شُيُوْخٌ وَشَبَابٌ فَقُلْتُ لَهُمَا اِنَّكُمَا قَدْ طَوَّفْتُمَانِي اللَّيْلَةَ فَاَخْبِرَانِيْ عَمَّا رَاَيْتُ قَالَا نَعَمْ اَمَّا الرَّجُلُ الَّذِيْ رَاَيْتَهٗ يُشَقُّ شِدْقُهٗ فَكَذَّابٌ يُحَدِّثُ بِالْكِذْبَةِ فَتُحْمَلُ عَنْهُ حَتّٰى تَبْلُغَ الْاٰفَاقَ فَيُصْنَعُ بِهٖ مَاتَرٰى اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَالَّذِيْ رَاَيْتَهٗ يُشْدَخُ رَاْسُهٗ فَرَجُلٌ عَلَّمَهُ اللّٰهُ الْقُرْاٰنَ فَنَامَ عَنْهُ بِاللَّيْلِ وَلَمْ يَعْمَلْ بِمَافِيْهِ بِالنَّهَارِ يُفْعَلُ بِهٖ مَارَاَيْتَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَالَّذِيْ رَاَيْتَهٗ فِي الثَّقْبِ فَهُمُ الزُّنَاةُ وَالَّذِيْ رَاَيْتَهٗ فِي النَّهْرِ اٰكِلُ الرِّبَا وَالشَّيْخُ الَّذِيْ رَاَيْتَهٗ فِيْ اَصْلِ الشَّجَرَةِ اِبْرٰهِيْمُ وَالصِّبْيَانُ حَوْلَهٗ فَاَوْلَادُ النَّاسِ وَالَّذِيْ يُوْقِدُ النَّارَ مَالِكٌ خَازِنُ النَّارِ وَالدَّارُ الْاُوْلَى الَّتِيْ دَخَلْتَ دَارُ عَامَّةِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَمَّا هٰذِهِ الدَّارُ فَدَارُ الشُّهَدَاءِ وَاَنَا جِبْرَئِيْلُ وَهٰذَا مِيْكَائِيْلُ فَارْفَعْ رَاْسَكَ فَرَفَعْتُ رَاْسِيْ فَاِذَا فَوْقِيْ مِثْلُ السَّحَابِ وَفِيْ رِوَايَةٍ مِثْلُ الرَّبَابَةِ الْبَيْضَاءِ قَالَ ذَاكَ مَنْزِلُكَ قُلْتُ دَعَانِيْ اَدْخُلْ مَنْزِلِيْ قَالَ اِنَّهٗ بَقِيَ لَكَ عُمُرٌ لَمْ تَسْتَكْمِلْهُ فَلَوِ اسْتَكْمَلْتَهٗ اَتَيْتَ مَنْزِلَكَ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَذُكِرَ حَدِيْثُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فِيْ رُؤْيَا النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَدِيْنَةِ فِيْ بَابِ حَرَمِ الْمَدِيْنَةِ۔

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں، رسول کریم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب آپ ﷺ (صبح کی) نماز سے فارغ ہوتے تو اپنا چہرہ اقدس ہماری طرف متوجہ کرتے اور پوچھتے کہ آج کی رات تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟ حضرت سمرہؓ کہتے ہیں کہ اگر ہم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہوتا تو وہ اس کو بیان کرتا اور آپ اس کی وہ تعبیر فرما دیتے جو اللہ تعالیٰ الہام فرماتا۔ چنانچہ اپنے اپنے معمول کے مطابق ایک دن آنحضرت ﷺ نے ہم سے وہی سوال کیا اور فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی شخص نے خواب دیکھا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ نہیں آپ ﷺ نے فرمایا۔ لیکن میں نے آج کی رات خواب دیکھا ہے (اور وہ یہ) کہ دو شخص میرے پاس آئے اور میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر مجھے مقدس سرزمین، ملک شام کی طرف لے چلے، پس ایک جگہ پہنچ کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اور ایک شخص اپنے ہاتھ میں لوہے کا آنکڑا لئے کھڑا ہے، اور وہ پھر اس آنکڑے کو بیٹھے ہوئے شخص کے کلے میں ڈالتا ہے اور اس کو چیرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی گدی تک چیرتا چلا جاتا ہے، پھر وہ دوسرے کلے کے ساتھ اس طرح کرتا ہے (یعنی اس کو بھی گدی تک چیر دیتا ہے) جب وہ کلہ اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے تو پھر پہلے کی طرح وہی عمل کرتا ہے (یعنی وہ کلے کو چیرتا ہے اور جب وہ کلہ درست ہو جاتا ہے تو پھر چیرتا ہے غرضیکہ بار بار یہی عمل کرتا ہے اور یہ عمل جاری رہتا ہے) آنحضرت ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ میں نے (یہ دیکھ کر) ان دونوں آدمیوں سے پوچھا (جو مجھے اپنے ساتھ لائے تھے) یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان دونوں نے کہا کہ چلتے رہئے (یعنی یہ مت پوچھئے کہ کیا ہو رہا ہے بلکہ آگے چلئے ابھی بہت عجائبات دیکھنے ہیں اس کی تعبیر معلوم ہو جائے گی) چنانچہ ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ آئے جہاں ایک شخص چت پڑا ہوا تھا اور ایک شخص اس کے سر کے پاس اتنا بڑا پتھر لئے کھڑا تھا جس سے ہاتھ بھر جائے اور اس سے چت پڑے شخص کے سر کو کچلتا تھا، چنانچہ جب وہ پتھر کو (کھینچ کر) اس کے سر پر مارتا تو پتھر سر کو کچل کر لڑھکتا ہوا دور چلا جاتا (پھر وہ دوبارہ مارنے کی غرض سے) اس پتھر کو اٹھانے کے لئے جاتا اور جب لوٹ کر آتا تو اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس شخص کا سر درست ہو جاتا اور پھر وہ اس پر پتھر مارتا اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری تھا کہ اس کا سر درست ہوتا رہتا اور وہ اس پر پتھر مارتا رہتا میں نے (یہ دیکھ کر) پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ ان دونوں نے جواب دیا کہ چلے چلئے۔ چنانچہ ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک ایسے گڑھے پر پہنچے جو تنور کی مانند تھا کہ اس کے اوپر کا حصہ تنگ تھا اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے اندر آگ بھڑک رہی تھی جب آگ اوپر کی طرف بھڑکتی تو کچھ لوگ جو آگ کے اندر تھے (شعلوں کے ساتھ) اوپر آجاتے یہاں تک کہ اس گڑھے سے نکلنے کے قریب ہو جاتے اور جب شعلہ کا زور گھٹ جاتا تو وہ سب پھر اندر چلے جاتے میں نے دیکھا کہ اس آگ میں کئی مرد تھے اور کئی عورتیں تھیں اور سب ننگے تھے میں نے (یہ دیکھ کر) پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے تو ان دونوں نے کہا کہ چلے چلئے چنانچہ ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک ایسی نہر پر پہنچے جو (پانی کے بجائے) خون سے بھری ہوئی تھی۔ نہر کے بیچ میں ایک شخص کھڑا ہوا تھا اور ایک شخص اس کے کنارے پر تھا جس کے آگے پتھر رکھے ہوئے تھے جب وہ شخص جو نہر کے بیچ میں تھا (آگے کنارے پر) آیا اور چاہا کہ باہر نکل آئے تو اس شخص نے جو کنارے پر تھا اس کے منہ پر پتھر پھینک کر مارا جس سے وہ اپنی جگہ لوٹ گیا اور پھر اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا کہ نہر کے اندر کا آدمی جب باہر نکلنے کا ارادہ کرتا تھا تو کنارے والا آدمی اس کے منہ پر پتھر مارتا اور اس کو اسی جگہ واپس کر دیتا میں نے (یہ دیکھ کر) پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ تو ان دونوں نے کہا کہ چلے چلئے۔ چنانچہ ہم آگے چلے یہاں تک ایک سرسبز شاداب باغ کے پاس پہنچے، اس باغ میں ایک بڑا درخت تھا اور اس کی جڑ پر ایک بوڑھا اور کچھ لڑکے (بیٹھے) تھے پھر کیا دیکھتا ہوں کہ اس درخت کے پاس ایک اور شخص بھی ہے جس کے آگے آگ جل رہی ہے وہ اس کو جلا بھڑکا رہا تھا، پھر وہ دونوں آدمی مجھ کو لے کر درخت پر چڑھے اور مجھ کو ایک ایسے گھر میں داخل کیا جو درخت کے بالکل درمیان تھا (اور یہ گھر اتنا اچھا تھا کہ) میں نے کبھی بھی اس سے اچھا کوئی گھر نہیں دیکھا اس گھر میں کتنے ہی جوان بوڑھے، مرد تھے، کتنی ہی عورتیں اور کتنے ہی بچے تھے، اس کے بعد وہ دونوں مجھ کو اس گھر سے نکال کر درخت کے اور اوپر لے گئے اور مجھ کو ایک ایسے گھر میں داخل کیا جو پہلے گھر سے بھی بہت اچھا اور افضل تھا اس میں بھی بوڑھے اور جوان آدمی موجود تھے اب میں نے ان دونوں آدمیوں سے کہا کہ آج کی رات تم نے مجھ کو خوب گھمایا پھرایا لیکن میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی حقیقت سے تو مجھ کو آگاہ کرو؟ ان دونوں نے کہا کہ اچھا کہ ہم آپ ﷺ کو بتاتے ہیں (پھر

انہوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ) جس شخص کو آپ (ﷺ) نے دیکھا کہ اس کے کلے چیرے جا رہے تھے وہ ایسا شخص ہے جو جھوٹا ہے، جھوٹ بولتا ہے اور اس کی جھوٹی باتیں نقل و بیان کی جاتی ہیں، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلتی ہیں، جن سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں چنانچہ اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جا رہا ہے جو آپ (ﷺ) نے دیکھا اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور جس شخص کو آپ (ﷺ) نے دیکھا کہ اس کا سر کچلا جا رہا تھا وہ ایسا شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن سکھایا تھا یعنی اس کو قرآنی علوم سیکھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی لیکن وہ شخص اس (قرآن سے) بے نیاز ہو کر رات میں سوتا رہا اور دن میں قرآن کے مطابق عمل نہیں کیا، چنانچہ اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جا رہا ہے جو آپ (ﷺ) نے دیکھا اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور جن لوگوں کو آپ (ﷺ) نے تنور میں دیکھا ہے وہ زنا کار ہیں اور جس شخص کو آپ (ﷺ) نے نہر میں دیکھا وہ سود خور ہے (ان سب کو بھی اپنے کئے کی سزا مل رہی ہے اور قیامت تک یوں ہی ملتی رہے گی) اور جس بوڑھے شخص کو آپ (ﷺ) نے درخت کی جڑ کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے پاس جو بچے ہیں وہ آدمیوں کی اولاد ہیں اور جو شخص درخت سے کچھ فاصلہ پر آگ جلا رہا ہے وہ دوزخ کا داروغہ ہے اور درخت کے اوپر پہلا گھر جس میں آپ (ﷺ) داخل ہوئے تھے وہ (جنت میں عام) مؤمنوں کا مکان ہے اور یہ گھر (جو پہلے گھر سے اوپر واقع ہے) شہداء کا مکان ہے میں جبرئیل (علیہ السلام) ہوں اور یہ جو میرے ساتھ ہیں میکائیل (علیہ السلام) ہیں اور ذرا آپ (ﷺ) اوپر سر اٹھایئے (آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ) میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے اوپر (نہایت بلندی میں) ابر کی مانند کوئی چیز ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ تہ در تہ سفید ابر کی مانند کوئی چیز ہے ان دونوں نے کہا کہ یہ ابر کی مانند جو چیز آپ (ﷺ) دیکھ رہے ہیں دراصل جنت میں آپ (ﷺ) کا مکان ہے۔ میں نے کہا کہ تو پھر تم لوگ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اپنے مکان میں چلا جاؤں ان دونوں نے کہا کہ ابھی تو آپ کی عمر باقی ہے جس کو آپ (ﷺ) نے پورا نہیں کیا ہے جب آپ (ﷺ) اپنی عمر کو پورا کر لیں گے تو اپنے مکان میں چلے جائیں گے۔" (بخاریؒ)

اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی وہ روایت جو مدینہ میں نبی کریم ﷺ کے خواب دیکھنے سے متعلق ہے وہ حرم مدینہ کے باب میں نقل کی جا چکی ہے۔

تشریح: "رات میں سوتا رہا" یعنی اس شخص نے نہ تو رات میں قرآن کریم کی تلاوت کی اور نہ دن میں اس پر عمل کیا! یا تو قرآن پر عمل کرنے کا تعلق دن اور رات دونوں سے ہے اور رات میں اس کی تلاوت بھی اس پر عمل ہی کرنا ہے، لیکن چونکہ عبادت گزار بندے عام طور پر قرآن کریم کی تلاوت رات ہی کو کرتے ہیں اس لئے اس کو رات کے ساتھ مخصوص کیا گیا۔ اور چوں کہ زندگی کی زیادہ تر حرکت و عمل کا تعلق دن سے ہوتا ہے اور اس اعتبار سے قرآنی احکام یعنی اس کے امر و نواہی پر عمل کرنے کا تعلق زیادہ تر دن ہی سے ہوتا ہے اس لئے قرآن پر عمل کرنے کو ان کے ساتھ مخصوص کیا گیا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم نعمت عطا فرمائی کہ اس کو قرآن کا علم دیا لیکن اس نے اس نعمت کی قدر نہ کی بایں طور کہ رات کے وقت اس کی تلاوت سے غافل ہو کر سو رہا اور یہ چیز بسا اوقات قرآن کو بھول جانے کا سبب بنتی ہے۔ نیز اس نے قرآن کے اوامر و نواہی پر عمل بھی نہیں کیا باوجودیکہ قرآن نازل ہونے کا اصل مقصد یہی ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ جو شخص قرآن پر عمل کرتا ہے وہ گویا ہمیشہ قرآن کی تلاوت کرتا ہے اگرچہ وہ حقیقت میں تلاوت نہ کرے اور جو ہمیشہ تلاوت کرتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تو اس نے گویا قرآن کی کبھی تلاوت نہیں کی۔

یحییٰؒ کہتے ہیں کہ "سوتا رہا" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے قرآن کریم سے اعراض کیا اور بے نیازی اختیار کی لہٰذا جو شخص تلاوت کے بغیر اس طرح سوئے کہ اس میں اس کے اعراض کرنے اور بے نیازی برتنے کو قطعاً دخل نہ ہو بلکہ محض غفلت و کوتاہی یا کسی مجبوری کا دخل ہو تو ایسا شخص مذکورہ وعید سے مستثنیٰ ہوگا۔

"اور یہ گھر شہداء کا مکان ہے" کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ "شہداء" سے مراد مؤمنین خاص ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام،

اولیاءؒ، اور علماءؒ کیوں کہ منقول ہے کہ علماء کی سیاہی شہداء کے خونوں پر غالب ہوگی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی ﷺ سے یہ ہدایت واضح ہوتی ہے کہ امام کے لئے یہ مستحب ہے کہ نماز فجر میں سلام پھیرنے کے بعد مقیدیوں سے متوجہ ہو یہ بھی مستحب ہے کہ وہ امام مقتدیوں سے خواب دریافت کرے اور یہ بھی مستحب ہے کہ تعبیر بیان کرنے والا خواب کی تعبیر دن کے ابتدائی حصے میں بیان کردے تاکہ معاش روزگار میں مشغولیت کی وجہ سے ذہن منتشر نہ ہو اور دل جمی کے ساتھ تعبیر دے سکے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اپنا برا خواب کسی مرد دانا یا دوست کے علاوہ اور کسی کے سامنے بیان نہ کرو

⑮ عَنْ اَبِی رَزِیْنٍ الْعُقَیْلِی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَاَرْبَعِیْنَ جُزْءً مِنَ النُّبُوَّةِ وَهِیَ عَلٰی رِجْلِ طَائِرٍ مَالَمْ یُحَدِّثْ بِهَا فَاِذَا حَدَّثَ بِهَا وَقَعَتْ وَاَحْسِبُهٗ قَالَ لَا تُحَدِّثْ اِلَّا حَبِیْبًا اَوْ لَبِیْبًا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَفِی رِوَایَةِ اَبِی دَاؤُدَ قَالَ الرُّؤْیَا عَلٰی رِجْلِ طَائِرٍ مَالَمْ تُعَبَّرْ فَاِذَا عُبِّرَتْ وَقَعَتْ وَ اَحْسِبُهٗ قَالَ وَلَا تُقُصَّهَا اِلَّا عَلٰی وَادٍّ اَوْ ذِیْ رَأْیٍ۔

"حضرت ابورزین عقیلیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے اور خواب کو جب تک بیان نہ کیا جائے وہ پرندہ کے پاؤں پر ہوتا ہے اور جب اس کو کسی کے سامنے بیان کردیا جاتا ہے تو وہ واقع ہوجاتا ہے راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا دانا اور دوست کے علاوہ کسی اور کے سامنے خواب کو بیان نہ کرو۔ (ترمذیؒ) اور ابوداؤدؒ کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا خواب کی تعبیر جب تک بیان نہیں کی جاتی وہ پرندہ کے پاؤں پر ہوتا ہے اور جب اس کی تعبیر بیان کی دی جاتی ہے تو وہ تعبیر واقع ہوجاتی ہے اور میرا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا اور دوست و عقلمند کے علاوہ کسی اور کے سامنے خواب کو بیان نہ کرو۔"

تشریح: علی رجل طائر (وہ پرندہ کے پاؤں پر ہے) دراصل عربی کا ایک محاورہ ہے جو اہل عرب کسی ایسے معاملہ اور کسی ایسی چیز کے بارے میں استعمال کرتے ہیں جن کو قرار و ثبات نہ ہو، مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح پرندہ عام طور پر کسی ایک جگہ ٹھہرا نہیں رہتا، بلکہ اڑتا اور حرکت کرتا رہتا ہے اور جو چیز اس کے پیروں پر ہوتی ہے وہ بھی کسی ایک جگہ قرار نہیں پاتی بلکہ ادنیٰ سی حرکت سے گر پڑتی ہے اسی طرح یہ معاملہ اور یہ چیز بھی کسی ایک جگہ پر قائم و ثابت نہیں رہتی لہٰذا فرمایا گیا کہ خواب کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ جب تک اس کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جاتا اور اس کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے اس وقت تک وہ کوئی اعتبار نہیں رکھتا اور رواقع نہیں ہوتا، لیکن جب اس کو کسی کے سامنے بیان کردیا جاتا ہے اور جوں ہی اس کی تعبیر دی جاتی ہے وہ اسی تعبیر کے مطابق واقع ہوجاتا ہے، لہٰذا کسی کے سامنے اپنا خواب بیان نہ کرنا چاہئے لیکن واضح رہے کہ یہ حکم برے خواب کے بارے میں ہے کہ جس کے واقع ہونے سے انسان ڈرتا ہے اور نقصان وضرر کا واہمہ رکھتا ہے جیسا کہ دوسری احادیث میں اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

مرد دانا اور دوست کے سامنے خواب بیان کرنے کو اس لئے فرمایا گیا ہے کہ عقلمند و دانا اپنی عقل و حکمت کی بنا پر خواب کی اچھی ہی تعبیر دے گا اسی طرح جو شخص دوست و ہمدرد ہوگا وہ بھی خواب کو بھلائی پر ہی محمول کرے گا اور اچھی تعبیر دے گا جب کہ بے وقوف تو اپنی نادانی کی بنا پر اور دشمن اپنے بغض و عناد کے تحت خراب تعبیر دے گا۔

اس موقع پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب تمام ہی چیزوں کا وقوع پذیر ہونا قضاو قدر سے متعلق ہے تو خواب کا شرمندہ تعبیر نہ ہونا اس خواب کو ظاہر نہ کرنے پر کس طرح موقوف ہوسکتا ہے اور خواب کے وقوع پذیر ہونے میں تعبیر کا مؤثر ہونا کیونکر ہے؟ اس کا مختصر

ساجواب یہ ہے کہ یہ چیز بھی قضاو قدر کے مطابق ہے جیسا کہ دعا اور صدقہ وخیرات اور دوسرے اسباب وذرائع کا مسئلہ ہے۔

ورقہ ابن نوفل کے متعلق آنحضرت ﷺ کا خواب

(۱۶) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَرْقَةَ قَالَتْ لَهٗ خَدِيْجَةُ اِنَّهٗ كَانَ قَدْ صَدَّقَكَ وَلٰكِنْ مَاتَ قَبْلَ اَنْ تَظْهَرَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُرِيْتُهٗ فِى الْمَنَامِ وَعَلَيْهِ ثِيَابٌ بِيْضٌ وَلَوْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ لَكَانَ عَلَيْهِ لِبَاسٌ غَيْرُ ذٰلِكَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ سے ورقہ ابن نوفل کے بارے میں پوچھا گیا (کہ وہ مؤمن تھے یا نہیں؟) اور حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کے سامنے بیان کیا کہ وہ ورقہ بن نوفل آپ ﷺ کی تصدیق کرتے تھے لیکن آپ ﷺ کی نبوت ظاہر ہونے سے پہلے مرگئے تھے۔ تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو خواب میں ورقہ بن نوفل کو اس حالت میں دکھلایا گیا ہے کہ اس پر سفید کپڑے تھے اور وہ دوزخی ہوتے تو ان کے جسم پر اور طرح کے کپڑے ہوتے۔" (الترمذیؒ)

تشریح: ورقہ ابن نوفل ابن اسد ابن عبدالعزی۔ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے چچازاد بھائی تھے انہوں نے زمانہ جاہلیت میں عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کر کے اس میں کافی درک پیدا کیا تھا اور انجیل کو عربی زبان میں منتقل کیا تھا ان کے بارے میں ثابت ہے کہ بت پرستی سے سخت بیزار تھے اور اپنے طریقے پر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے، کافی معمر تھے اور عمر کے آخری حصے میں بینائی سے بالکل محروم ہوگئے تھے، جب آنحضرت ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ اور پہلے پہل آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو لے کر ان کے پاس گئیں انہوں نے آنحضرت ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی اور آپ ﷺ کو بشارت دی کہ آپ ﷺ وہی نبی آخر الزمان ﷺ ہیں جن کا تذکرہ آسمانی کتب میں کیا گیا ہے یہ واقعہ بہت مشہور ہے اور سیرت و تاریخ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔

مشہور کتاب اسد الغابہ کے مصنف نے ورقہ ابن نوفل کا تذکرہ صحابہؓ کے زمرے میں کیا ہے اور ان کے اسلام کے بارے میں علماء کے جو اختلافی اقوال ہیں ان کو ذکر کرتے ہوئے مذکورہ بالا حدیث کو بعینہ نقل کیا ہے! حضرت خدیجہؓ کی حیات میں حضرت عائشہؓ چونکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نہیں تھیں اس لئے انہوں نے اس روایت کو صحابہؓ سے بطریق سماع نقل کیا ہوگا۔

"اور حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کے سامنے بیان کیا الخ" یعنی جب آنحضرت ﷺ سے ورقہ ابن نوفل کے بارے میں سوال کیا گیا تو حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کے جواب دینے سے پہلے اپنے چچازاد بھائی کی حالت کو بیان کیا لیکن اسلوب کلام ایسا اختیار کیا کہ ورقہ ابن نوفل کی حقیقت بھی واضح ہو جائے اور مرتبہ نبوت کا ادب بھی ملحوظ رہے، چنانچہ انہوں نے یہ کہا کہ وہ آپ ﷺ کی تصدیق کرتے تھے یعنی انہوں نے آپ ﷺ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس فرشتہ کو آپ ﷺ نے دیکھا ہے وہ اللہ کی طرف سے انبیاء کے پاس وحی لانے والا ہی فرشتہ ہے جو آپ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی نازل ہوتا تھا اور آپ ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں اور اگر میں آپ ﷺ کے ظہور و غلبہ کے وقت زندہ رہا تو آپ ﷺ کی مدد کروں گا اور آپ ﷺ کو طاقت پہنچاؤں گا۔ گویا ایک طرف تو اس بات سے حضرت خدیجہؓ نے ان کے ایمان کو ثابت کرنا چاہا اور دوسری طرف انہوں نے یہ بھی کہا کہ لیکن وہ آپ ﷺ کی نبوت ظاہر ہونے سے پہلے مرگئے تھے اس سے انہوں نے ان کے ایمان کے بارے میں شک کو بھی ظاہر کر دیا اور پھر اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ مؤمن تھے لہٰذا یہ حدیث ورقہ ابن نوفل کے ایمان پر دلالت کرتی ہے اور ظاہر بھی ہے کہ جب انہوں نے آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد آپ ﷺ کی تصدیق کی تو پھر ان کے ایمان کے سلسلہ میں اختلاف کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر ان کا تصدیق کرنا نبوت سے پہلے ہوتا تو بے شک اختلاف کی

گنجائش تھی۔

آنحضرت ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کرنے سے متعلق ایک خواب

⑰ وَعَنِ ابْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ عَمِّهِ اَبِي خُزَيْمَةَ اَنَّهُ رَاٰى فِيْمَا يَرَى النَّائِمُ اَنَّهُ سَجَدَ عَلٰى جَبْهَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهُ فَاضْطَجَعَ لَهُ وَقَالَ صَدِّقْ رُؤْيَاكَ فَسَجَدَ عَلٰى جَبْهَتِهِ۔ رواه في شرح السنة وسنذكر حديث ابي بكرة كان ميزانا نزل في السماء في باب مناقب ابي بكر وعمر رضي الله عنهما۔

"اور حضرت خزیمہ ابن ثابت اپنے چچا حضرت ابوخزیمہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے اس حالت میں جس میں سونے والا دیکھتا ہے یعنی خواب میں دیکھا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کیا ہے، پھر انہوں نے یہ خواب آنحضرت ﷺ کے سامنے بیان کیا تو آپ ﷺ (وہ خواب سن کر) ابوخزیمہؓ کی خاطر لیٹ گئے (تاکہ وہ پیشانی اقدس پر سجدہ کرلیں) اور فرمایا کہ اپنے خواب کو سچا کرو یعنی اپنے خواب کے مطابق عمل کرو، چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کرلیا۔ (شرح السنۃ) اور حضرت ابوبکرؓ کی یہ روایت کَانَ مِيْزَانًا نَزَلَ مِنَ السَّمَآءِ کو مناقب ابوبکرؓ و عمرؓ کے باب نقل کیا جائے گا۔"

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر خواب کا تعلق طاعات و عبادات کی قسم سے ہو تو عالم بیداری میں اس خواب پر عمل کرنا مستحب ہے، مثلاً اگر کسی شخص نے یہ خواب دیکھا کہ روزہ رکھا ہے، یا نماز پڑھی ہے، یا صدقہ یا خیرات کیا ہے اور کسی بزرگ کی زیارت کی ہے وغیرہ وغیرہ تو اس خواب کے مطابق عالم بیداری میں نماز پڑھنا یا روزہ رکھنا یا صدقہ خیرات کرنا، یا اس بزرگ کی زیارت کرلینا مستحب ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عالم برزخ کے متعلق آنحضرت ﷺ کے خواب کے کچھ اور حصے

⑱ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا يُكْثِرُ اَنْ يَقُوْلَ لِاَصْحَابِهِ هَلْ رَاٰى اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنْ رُؤْيَا فَيَقُصُّ عَلَيْهِ مَنْ شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَقُصَّ وَ اِنَّهُ قَالَ لَنَا ذَاتَ غَدَاةٍ اِنَّهُ اَتَانِي اللَّيْلَةَ اٰتِيَانِ وَاِنَّهُمَا ابْتَعَثَانِيْ وَاِنَّهُمَا قَالَ لِيَ انْطَلِقْ وَاِنِّي انْطَلَقْتُ مَعَهُمَا۔ وَذَكَرَ مِثْلَ الْحَدِيْثِ الْمَذْكُوْرِ فِي الْفَصْلِ الْاَوَّلِ بِطُوْلِهِ وَفِيْهِ زِيَادَةٌ لَيْسَتْ فِي الْحَدِيْثِ الْمَذْكُوْرِ وَهِيَ قَوْلُهُ فَاَتَيْنَا عَلٰى رَوْضَةٍ مُعْتَمَّةٍ فِيْهَا مِنْ كُلِّ نَوْرِ الرَّبِيْعِ وَاِذَا بَيْنَ ظَهْرَيِ الرَّوْضَةِ رَجُلٌ طَوِيْلٌ لَا اَكَادُ اَرٰى رَاْسَهُ طُوْلًا فِي السَّمَاءِ فَاِذَا حَوْلَ الرَّجُلِ مِنْ اَكْثَرِ وِلْدَانٍ رَاَيْتُهُمْ قَطُّ قُلْتُ لَهُمَا مَا هٰذَا مَا هٰؤُلَاءِ قَالَ قَالَا لِي انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا فَانْتَهَيْنَا اِلٰى رَوْضَةٍ عَظِيْمَةٍ لَمْ اَرَ رَوْضَةً قَطُّ اَعْظَمَ مِنْهَا وَلَا اَحْسَنَ قَالَ قَالَا لِي ارْقَ فِيْهَا قَالَ فَارْتَقَيْنَا فِيْهَا فَانْتَهَيْنَا اِلٰى مَدِيْنَةٍ مَبْنِيَّةٍ بِلَبِنِ ذَهَبٍ وَلَبِنِ فِضَّةٍ فَاَتَيْنَا بَابَ الْمَدِيْنَةِ فَاسْتَفْتَحْنَا فَفُتِحَ لَنَا فَدَخَلْنَاهَا فَتَلَقَّانَا فِيْهَا رِجَالٌ شَطْرٌ مِّنْ خَلْقِهِمْ كَاَحْسَنِ مَا اَنْتَ رَاءٍ وَشَطْرٌ مِنْهُمْ كَاَقْبَحِ مَا اَنْتَ رَاءٍ قَالَ قَالَا لَهُمْ اذْهَبُوْا فَقَعُوْا فِي ذٰلِكَ النَّهْرِ قَالَ فَاِذَا نَهْرٌ مُعْتَرِضٌ يَجْرِيْ كَاَنَّ مَاءَهُ الْمَحْضُ فِي الْبَيَاضِ فَذَهَبُوْا فَوَقَعُوْا فِيْهِ ثُمَّ رَجَعُوْا اِلَيْنَا قَدْ ذَهَبَ ذٰلِكَ السُّوْءُ عَنْهُمْ فَسَارُوْا فِي اَحْسَنِ صُوْرَةٍ وَذَكَرَ فِي تَفْسِيْرِ هٰذِهِ الزِّيَادَةِ وَاَمَّا الرَّجُلُ الطَّوِيْلُ الَّذِيْ فِي الرَّوْضَةِ فَاِنَّهُ اِبْرَاهِيْمُ وَاَمَّا الْوِلْدَانُ الَّذِيْنَ حَوْلَهُ فَكُلُّ مَوْلُوْدٍ مَاتَ عَلَى الْفِطْرَةِ قَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْمُسْلِمِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاَوْلَادُ الْمُشْرِكِيْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَوْلَادُ الْمُشْرِكِيْنَ وَاَمَّا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَانُوْا شَطْرٌ مِنْهُمْ حَسَنٌ وَشَطْرٌ مِنْهُمْ قَبِيْحٌ فَاِنَّهُمْ قَوْمٌ قَدْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَاٰخَرَ سَيِّئًا تَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے صحابہؓ سے اکثر یہ پوچھا کرتے تھے کہ کیا تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ جس کو خواب دکھانا چاہتا اور وہ خواب دیکھتا تو وہ اپنا خواب آنحضرت ﷺ کے سامنے بیان کر دیتا۔ ایک دن آنحضرت ﷺ نے ہمارے سامنے بیان کیا کہ آج رات (میں نے خواب دیکھا کہ) دو شخص میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ کو اٹھا کر کہا ہمارے ساتھ چلئے، چنانچہ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے بعد حدیث کے راوی سمرہؓ نے وہی طویل حدیث بیان کی جو (اس خواب سے متعلق) پہلی فصل میں گزر چکی ہے لیکن اس حدیث میں پہلی فصل والی حدیث سے کچھ زیادہ باتیں ہیں اور وہ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، پس ہم ایک ایسے باغ میں پہنچے جہاں (درختوں کی کثرت اور ان میں سرسبزی و شادابی کی بہتات کی وجہ سے) اندھیرا پھیلا ہوا تھا باغ میں ہر طرف بہار ہی بہار تھی اور ہمہ اقسام کے شگوفے کھلے ہوئے تھے، پھر اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ باغ کے بیچوں بیچ ایک شخص کھڑے ہوئے ہیں وہ بہت لمبے تھے کہ ان کا سر بھی مجھے نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ ان کی لمبائی آسمان سے باتیں کر رہی تھی پھر مجھے یہ بھی نظر آیا کہ ان کے گرد بہت سے لڑکے تھے جن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ یہ لمبا شخص کون ہے اور یہ لڑکے کون ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے کہا کہ چلے چلئے چنانچہ ہم آگے چلے اور ایک بہت بڑے باغ کے پاس پہنچے جس سے بڑا اور جس سے اچھا کوئی اور باغ میں نے کبھی نہیں دیکھا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہاں پہنچ کر ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ باغ کے اندر چلئے یا اس کے درختوں پر چڑھئے چنانچہ ہم چڑھے اور ایک ایسے شہر کے قریب پہنچے جو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے پھر ہم اس شہر کے دروازے پر آئے اور اس کو کھلوایا اور جب وہ دروازہ ہمارے لئے کھول دیا گیا تو ہم اندر داخل ہوئے اور اس شہر میں ہم ایسے کتنے ہی لوگوں سے ملے جن میں سے ہر ایک کے بدن کا آدھا حصہ اس سے بھی بہتر تھا جس کو تم دیکھتے ہو اور آدھا حصہ اس سے بھی بدتر تھا اور آدھا حصہ انتہائی حسین و تندرست تھا اور آدھا حصہ انتہائی بھدا و خراب تھا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں نے (جو مجھ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے) ان سب نے کہا کہ جاؤ اس نہر میں غوطہ لگاؤ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں (کہ جب ان دونوں نے یہ بات کہی تو) میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں عرضا ایک نہر بہہ رہی ہے جس کا پانی خالص دودھ کی طرح سفید ہے، چنانچہ وہ لوگ نہر کے پاس گئے اور اس میں کود گئے، پھر جب وہ (غوطہ لگا کر) ہمارے پاس واپس آئے تو ان کے جسم کی خرابی و برائی دور ہو چکی تھی۔ اور ان کا پورا جسم بہترین شکل و صورت میں تبدیل ہو گیا تھا اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حدیث کے ان زیادہ الفاظ کی وضاحت میں فرمایا کہ وہ لمبے شخص جو باغ میں تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے گرد جو لڑکے تھے۔ وہ ایسے بچے تھے جو فطرت پر مرجاتے ہیں یعنی جو بچے چھوٹی عمر میں نابالغ مرجاتے ہیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس رہتے ہیں راویؒ یہ کہتے ہیں کہ بعض صحابہؓ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اور مشرکوں کے لڑکے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا مشرکوں کے نابالغ لڑکے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے پاس رہتے ہیں اور وہ لوگ جن کا آدھا جسم اچھا اور آدھا جسم برا تھا وہ ایسے لوگ تھے جن کے اعمال ملے جلے تھے کہ انہوں نے کچھ اچھے عمل کئے اور کچھ برے عمل، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا۔" (بخاریؒ)

جھوٹا خواب نہ بناؤ

⑲ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ اَفْرَى الْفِرٰى اَنْ يُرِيَ الرَّجُلُ عَيْنَيْهِ مَالَمْ تَرَيَا۔

(رواه البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بڑے بہتانوں میں سے ایک بڑا بہتان یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنی آنکھوں سے وہ چیز دکھلائے جو حقیقت میں آنکھوں نے نہیں دیکھی ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنکھوں پر یہ جھوٹ باندھا جائے کہ انہوں نے دیکھا ہے حالانکہ حقیقت میں انہوں نے کچھ نہیں دیکھا، گویا

مقصود جھوٹا خواب بنانے کی مذمت ظاہر کرنا ہے اور اس کو بڑا بہتان اس لئے فرمایا گیا ہے کہ خواب ایک طرح سے وحی کے قائم مقام ہے اور اس کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے پس جھوٹا خواب بنانا گویا حق تعالیٰ پر بہتان باندھنا ہے۔ ایک حدیث میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ خواب دکھانے کے لئے فرشتے کو بھیجتا ہے۔

کس وقت کا خواب زیادہ سچا ہوتا ہے؟

(۲۰) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَصْدَقُ الرُّؤْیَا بِالْاَسْحَارِ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا پچھلے پہر کا خواب زیادہ سچا ہوتا ہے۔"

(ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: پچھلا پہر عام طور پر دل و دماغ کے سکون کا وقت ہوتا ہے اس وقت نہ صرف یہ کہ خاطر جمعی حاصل رہتی ہے بلکہ وہ نزول ملائکہ، سعادت اور قبولیت دعا کا بھی وقت ہے۔ اس لئے اس وقت جو خواب دیکھا جاتا ہے وہ زیادہ سچا ہوتا ہے۔

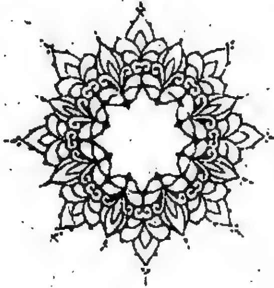

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الاداب

آداب کا بیان

"ادب" کے معنی ہیں وہ قول و فعل جس کو اچھا اور قابل تعریف کہا جائے! یا ادب کا مطلب یہ ہے کہ ہربات کو درستی و اچھائی کے ساتھ اچھے موقع پر کہا جائے اور ہر کام کو احتیاط اور دور اندیشی کے ساتھ انجام دیا جائے۔

بعض حضرات کے نزدیک مکارم اخلاق (عمدہ اخلاق) یعنی یقین، قناعت، صبر، شکر، علم، حسن خلق، سخاوت، غیرت، شجاعت اور مروت جیسے اوصاف کو اختیار کرنا اور ان پر عمل کرنے کو ادب کہتے ہیں۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ادب کا مطلب یہ ہے کہ نیکی، بھلائی کی راہ کو اختیار کیا جائے اور گناہ و برائی کے راستہ سے اجتناب کیا جائے۔

بعض حضرات کے نزدیک ادب کے معنی یہ ہیں کہ اپنے بڑے بزرگ کی عزت و توقیر کی جائے اور اپنے سے چھوٹے کے ساتھ شفقت و محبت اور نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔

"ادب" اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے چونکہ انسانی زندگی اور تہذیب و معاشرت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق احادیث نقل کی جائے گی۔

بَابُ السَّلَامِ

سلام کا بیان

"سلام" کے معنی ہیں، نقائص و عیوب سے برات و نجات پانا۔ "سلام" اللہ تعالیٰ کا ایک اسم پاک ہے جس کے معنی ہیں وہ ذات جو ہر عیب و آفت اور تغیر و فنا سے پاک اور محفوظ ہے۔

"سلام" اسلامی تہذیب و معاشرت کا ایک خاص رکن ہے، اس کے لئے جو الفاظ مقرر کئے گئے ہیں وہ السلام علیک ہے اس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تیرے حال سے واقف ہے۔ لہٰذا غفلت اختیار نہ کر، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسم پاک کا تجھ پر سایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نگہبانی میں ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ اللہ معک۔ یعنی اللہ تیرے ساتھ ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ تجھ پر سلامتی ہو یعنی تو مجھ سے سلامتی میں ہے اور مجھ کو بھی اپنے سے سلامتی میں رکھ، اس صورت میں سلام سلم سے مشتق ہو گا جس کے معنی مصالحت کے ہیں اور اس کلمہ کا مطلب یہ ہو گا کہ تو مجھ سے حفظ و امان میں رہ اور مجھ کو بھی حفظ و امان میں رکھ۔

منقول ہے کہ سلام کرنے کا طریقہ اسلام کے بالکل ابتدائی زمانہ میں مشروع ہوا تھا اور اس کا مقصد ایک ایسی علامت کو رائج کرنا تھا جس کے ذریعہ مسلمان اور کافر کے درمیان امتیاز کیا جاسکے تاکہ ایک مسلمان، دوسرے مسلمان سے تعرض نہ کرے گویا اس کلمہ کو اپنی زبان سے ادا کرنے والا اس بات کا اعلان کرتا تھا۔ کہ میں مسلمان ہوں اور پھر یہ طریقہ مستقل طور پر مشروع قرار پایا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کا سلام

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ طُوْلُهٗ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فَلَمَّا خَلَقَهٗ قَالَ اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلٰی اُولٰٓئِكَ النَّفَرِ وَهُمْ نَفَرٌ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ جُلُوْسٌ فَاسْتَمِعْ مَا یُحَیُّوْنَكَ فَاِنَّهَا تَحِیَّتُكَ وَتَحِیَّةُ ذُرِّیَّتِكَ فَذَهَبَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ فَقَالُوْا اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ قَالَ فَزَادُوْهُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ قَالَ فَكُلُّ مَنْ یَدْخُلِ الْجَنَّةَ عَلٰی صُوْرَةِ اٰدَمَ وَطُوْلُهٗ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فَلَمْ یَزَلِ الْخَلْقُ یَنْقُصُ بَعْدَهٗ حَتَّی الْاٰنَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا، ان کی لمبائی ساٹھ گز کی تھی، جب خدا نے ان کو بنایا تو ان سے فرمایا" جاؤ اور اس جماعت کو سلام کرو اور وہ جماعت فرشتوں کی تھی جو وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتی ہے وہ جو جواب دے گا وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا جواب ہے۔" چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام (اس حکم خداوندی کی تعمیل میں) فرشتوں کی اس جماعت کے پاس گئے اور کہا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ فرشتوں نے جواب دیا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ (یعنی تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (گویا) آدم علیہ السلام کے سلام کے جواب میں ورحمۃ اللہ کا لفظ فرشتوں نے زیادہ کیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ پس جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ آدم علیہ السلام کی صورت پر ہوگا بایں طور پر کہ اس کی لمبائی ساٹھ گز کی ہوگی۔ (یعنی جنت میں جانے والے حضرت آدم علیہ السلام کے قد کی مذکورہ بلندی اور ان کے حسن وجمال کے ساتھ وہاں داخل ہوں گے) پھر حضرت آدم علیہ السلام کے بعد لوگوں کی ساخت برابر کم ہوتی رہی یہاں تک کہ موجودہ مقدار کو پہنچی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا"۔ اس ارشاد گرامی کے معنی میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی احادیث صفات میں سے ہے جس کے حقیقی مفہوم ومطلب تک رسائی ممکن نہیں ہے اس لئے اس بارے میں کوئی تاویل وتوجیہہ کرنے کے بجائے سکوت ہی بہتر ہے جیسا کہ اس قسم کے ان اقوال وارشادات کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے جو متشابہات کہلاتے ہیں علماء سلف اسی قول کی طرف مائل ہیں جب کہ بعض دوسرے حضرات اس ارشاد گرامی کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں جن سے مشہور تاویل یہ ہے کہ فلاں معاملہ کی صورت مسئلہ یہ ہے یا صورت حال یوں ہے ظاہر ہے کہ جس طرح کسی مسئلہ یا حال کی کوئی ظاہری صورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ صورت کا لفظ استعمال کر کے حقیقت میں اس مسئلہ یا حال کی صفت وکیفیت مراد ہوتی ہے اس طرح یہاں اللہ کی صورت کا لفظ سے مراد اللہ کی صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صفت پر بنایا اور ان کو ان صفات کے ساتھ موصوف کیا جو صفات کریمہ باری تعالیٰ کا پرتو ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حی، عالم، قادر، مرید، متکلم، سمیع اور بصیر بنایا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "صورتہ" کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف، شرف وعظمت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ جیسا کہ روح اللہ اور بیت اللہ میں روح اور بیت کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس لطیف وجمیل صورت پر پیدا کیا جو اسرار ولطائف پر مشتمل ہے اور جس کو اس نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعہ اپنے پاس سے عطا کیا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "صورتہ" کی ضمیر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف راجع ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو انہی کی صورت پر بنایا، مطلب یہ ہے کہ وہ ابتداء آفرینش سے ہی شکل پر تھے، دوسرے انسانوں کی طرح ان کی تخلیق اس تدریجی طور پر نہیں ہوئی تھی کہ پہلے وہ نطفہ تھے، پھر مضغہ ہوئے پھر جنین، پھر طفل، پھر صبی اور پورے مرد ہوئے بلکہ وہ ابتداء ہی میں تمام اعضاء و جوارح، کامل شکل و صورت اور ساٹھ گز کے قد کے پورے انسان بنائے گئے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا سے مراد آدم علیہ السلام کی تخلیق و پیدائش کی حقیقت کو واضح کرنا ہے اور چونکہ دیگر صفات کے برخلاف قد کی لمبائی ایک غیر معروف چیز تھی اس لئے اس کو خاص طور پر ذکر کیا اسی طرح چونکہ لمبائی پر چوڑائی بھی قیاس کی جا سکتی ہے اور اجمالی طور پر اس کا تصور ذہن میں آسکتا ہے لہٰذا چوڑائی کو ذکر نہیں کیا۔

"ورحمۃ اللہ کا لفظ فرشتوں نے زیادہ کیا" اس کے ذریعہ سلام کے جواب کے سلسلے میں ایک تہذیب و شائستگی اور ادب و فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا، چنانچہ افضل طریقہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص السلام علیک کہے تو اس کے جواب میں وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا جائے اسی طرح اگر کوئی السلام علیک ورحمۃ اللہ کہے تو اس کے جواب میں وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا جائے، ایک روایت میں ورحمۃ اللہ کے بعد ومغفرۃ کا لفظ بھی منقول ہے حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کے جواب میں وعلیک السلام کے بجائے السلام علیک کہنا بھی درست ہے کیونکہ معنی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک افضل یہی ہے کہ جواب میں وعلیک السلام یا وعلیکم السلام ہی کہا جائے رہی یہ بات کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے سلام کے جواب میں وعلیک السلام کے بجائے السلام علیک کیوں کہا تو ہو سکتا ہے کہ ملائکہ نے بھی یہ چاہا ہو گا کہ سلام کرنے میں وہ خود ابتداء کریں، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ جب دو آدمی ملتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک سلام میں ابتداء کرنا چاہتا ہے تو دونوں ہی ایک دوسرے سے السلام علیک یا السلام علیکم کہتے ہیں، لیکن یہ بات واضح رہے کہ جواب کے درست و صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جواب سلام کے بعد واقع ہو نہ کہ دونوں ایک ساتھ واقع ہوں جیسا کہ، فاستمع مایحیونک (پھر سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں) سے واضح ہوتا ہے چنانچہ فاستمع میں حرف فا تعقیب کے لئے ہے، جو مذکورہ وضاحت کی دلیل ہے، عام طور پر لوگ اس مسئلہ سے بہت غافل ہیں اس لئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اگر دو شخص ملیں اور دونوں ایک ہی ساتھ السلام علیکم کہیں تو دونوں میں سے ہر ایک پر جواب دینا واجب ہو گا۔

حدیث کا آخری جملہ "تقدیم و تاخیر" پر دلالت کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ گز تھا ان کے بعد لوگوں کے قد بتدریج کوتاہ ہوتے گئے اور پھر جب جنت میں داخل ہوں گے تو سب کے قد دراز ہو جائیں گے جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد تھا۔

افضل اعمال

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتُقْرِئُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اہل اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھانا کھلانا اور ہر شناسا و ناشناسا کو سلام کرنا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اور دو اوصاف کی تخصیص، سائل کے حال کے مناسبت سے ہے، لہٰذا مختلف اوقات میں مختلف اعمال کو افضل فرمانا کہ کسی موقع پر کسی عمل کو افضل فرمایا اور کسی موقع پر کسی کو، سائل کے احوال کے اختلاف و تفاوت پر مبنی ہوتا تھا دریافت کرنے والا جس مزاج

واحوال کا آدمی ہوتا تھا اور اس کا رجحان جس نیک خصلت کی ضد کی طرف ہوتا اس کے سامنے اسی نیک خصلت کو افضل قرار دیا جاتا تھا، مثلاً کسی شخص نے پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ اور آپ ﷺ جانتے تھے کہ اس شخص کے مزاج میں بخل ہے تو اس سے فرماتے کہ کھانا کھلانا، سب سے بہتر عمل ہے، لہٰذا یہاں جس شخص نے سوال کیا تھا آپ ﷺ نے اس کے احوال کی مناسبت سے اس سے فرمایا کہ کھانا کھلانا اور ہر آشنا و نا آشنا کو سلام کرنا بہتر عمل ہے۔

لفظ "تقری" (تا کے پیش کے ساتھ) اقراء سے مشتق ہے اور اس کے معنی پڑھوانے کے ہیں یہ لفظ تاء کے زبر کے ساتھ منقول ہے جو "قراءت" سے مشتق ہے اور جس کے معنی پڑھنے کے ہیں اگرچہ مؤخر الذکر صورت میں مفہوم زیادہ، بہتر طور پر واضح نہیں ہوتا لہٰذا اس کی توجیہہ یہ کی جائے گی کہ سلام کرنے والا چونکہ مسلم علیہ (جس کو سلام کیا گیا ہے) کے جواب دینے کا باعث ہوتا ہے اس لئے گویا وہ اس کی زبان سے وہ کلمہ پڑھواتا ہے جس کا تعلق سلام اور اس کے جواب سے ہے۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ سلام کا تعلق، شناسائی کے حقوق سے نہیں ہے بلکہ یہ ان حقوق میں سے ہے جو اسلام نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے تئیں عائد کئے ہیں، اسی طرح مریض کی عیادت اور اس جیسے دوسرے امور بھی اسلامی حقوق و واجبات سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے واضح ہوگا۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے کیا حقوق ہیں؟

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْمُؤْمِنِ عَلَى الْمُؤْمِنِ سِتُّ خِصَالٍ يَعُوْدُهُ اِذَا مَرِضَ وَيَشْهَدُهُ اِذَا مَاتَ وَيُجِيْبُهُ اِذَا دَعَاهُ وَيُسَلِّمُ عَلَيْهِ اِذَا لَقِيَهُ وَيُشَمِّتُهُ اِذَا عَطَسَ وَيَنْصَحُ لَهُ اِذَا غَابَ اَوْ شَهِدَ لَمْ اَجِدْهُ فِی الصَّحِيْحَيْنِ وَلَا فِیْ كِتَابِ الْحُمَيْدِیِّ وَلٰكِنْ ذَكَرَهُ صَاحِبُ الْجَامِعِ بِرِوَايَةِ النَّسَائِی۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مسلمان پر مسلمان کے چھ حق ہیں (ایک تو یہ ہے کہ) جب (کوئی) مسلمان بیمار ہو تو دوسرا مسلمان اس کی عیادت کرے (دوسرے یہ کہ) جب کوئی مسلمان مرجائے تو (دوسرا مسلمان) اس کی نماز جنازہ میں شریک ہو (تیسرے یہ کہ) جب (کوئی مسلمان) کھانے پر بلائے تو (بلایا جانے والا مسلمان) اس کی دعوت کو قبول کرے (بشرطیکہ کوئی شرعی عذر مانع نہ ہو جیسے اس دعوت میں باجاگاجا وغیرہ ہو یا اس دعوت کا تعلق اظہار فخر وریاکاری سے ہو) (چوتھے یہ کہ) جب (کوئی مسلمان) ملے تو اس کو سلام کرے (پانچویں یہ کہ) جب (کوئی مسلمان) چھینکے اور الحمد للہ کہے تو اس کا جواب دے (یعنی یرحمک اللہ کہے اور اگر چھینکنے والا الحمد للہ نہ کہے تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہوگا) اور چھٹے یہ کہ (ایک مسلمان کی ہر حالت میں) خیر خواہی کرے خواہ وہ حاضر ہو یا غائب اور مشکوٰۃ کے مؤلف کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کو نہ تو صحیحین (بخاریؒ و مسلمؒ) میں پایا ہے اور نہ حمیدی کی کتاب میں، البتہ اس کو صاحب جامع الاصول نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "خیر خواہی کرے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ ہر حالت میں ایک دوسرے کے خیر خواہ و ہمدرد رہیں، جو مسلمان سامنے ہے اس کے ساتھ بھی خیر خواہی کی جائے اور جو نظروں سے دور ہے اس کے ساتھ بھی خیر خواہی کریں، یہ طرز عمل اختیار نہ کرنا چاہئے کہ جب کسی مسلمان کے سامنے آئیں تو اس کے ساتھ تملق یعنی خوشامد چاپلوسی کا رویہ اپنائیں اور جب وہ سامنے نہ ہو تو غیبت کریں یہ خالص منافقانہ رویہ ہے اور منافقوں کی خاصیت ہے۔

تعلق دوستی قائم کرنے کا بہترین ذریعہ سلام ہے

(۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم جب تک کہ ایمان نہ لاؤ جنت میں داخل نہیں ہو سکو گے اور تمہارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اللہ کی رضاء خوشنودی کے لئے آپس میں تعلق و دوستی قائم نہ کرو۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا اور... کیا میں تمہیں ایک ایسا ذریعہ نہ بتادوں جس کو تم اختیار کرو تو آپس میں دوستی کا تعلق قائم ہو جائے اور وہ ذریعہ یہ ہے کہ تم آپس میں سلام کا چلن عام کرو یعنی آشنا و نا آشنا سب کو سلام کرو۔" (مسلم)

تشریح: مشکوۃ کے ان صحیح و معتمد نسخوں میں کہ جو اونچے درجہ کے مشائخ کے سامنے پڑھے گئے ہیں لفظ ولا تؤمنوا نون کے حذف کے ساتھ ہے اور یہ حذف نون حتی تؤمنوا کے مجانست و مقارنت کی وجہ سے ہے تاہم بعض نسخوں میں یہ لفظ نون کے ساتھ یعنی ولا تؤمنون منقول ہے اور یہ نحوی قاعدہ کے مطابق ہے۔

کون کس کو سلام کرے؟

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِيْ وَالْمَاشِيْ عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص سواری پر ہو وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے آدمی زیادہ تعداد والے آدمیوں کو سلام کریں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جو شخص سواری پر ہو.....الخ" یہ حکم اصل میں تواضع و انکساری کی طرف راغب کرنے کے لئے ہے کیونکہ جو شخص سواری پر ہے اس کو گویا اللہ تعالیٰ نے پیدل چلنے والے پر برتری و فوقیت عطا فرمائی ہے، لہٰذا اس کو فروتنی ہی اختیار کرنی چاہئے، اسی طرح جو لوگ کم تعداد میں ہوں اور وہ ایسے لوگوں سے ملیں جو تعداد میں ان سے زیادہ ہوں تو ان کو بھی چاہئے کہ تواضع و انکساری کی بنا پر اور اکثریت کے احترام کے پیش نظر سلام کرنے میں ابتداء کریں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کچھ لوگوں سے ملے اور یہ چاہے کہ ان سب کو سلام کرنے کی بجائے ان میں سے چند کو سلام کرے تو یہ مکروہ ہے کیونکہ سلام کا اصل مقصد آپس میں موانست و الفت کو فروغ دینا ہے جب کہ بعض دوسرے مخصوص لوگوں کو سلام کرنا گویا باقی لوگوں کو وحشت و اجنبیت میں مبتلا کرنا ہے اور یہ چیز اکثر اوقات نفرت و عداوت کا بھی سبب بن جاتی ہے۔ لیکن بازار اور شارع عام کا حکم اس سے الگ ہے کہ اگر بازار میں یا شارع عام پر بہت سے لوگ آرہے ہوں تو وہاں بعض لوگوں کو سلام کر لینا کافی ہوگا۔ کیونکہ اگر کوئی شخص بازار میں شارع عام پر ملنے والے ہر شخص کو سلام کرنے لگے گا تو وہ اسی کام کا ہو کر رہ جائے گا اور اپنے امور کی انجام دہی سے باز رہے گا۔

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَلِّمُ الصَّغِيْرُ عَلَى الْكَبِيْرِ وَالْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا چھوٹا، بڑے کو گزرنے والا بیٹھنے ہوئے کو، اور کم تعداد والے زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں۔" (بخاریؒ)

تشریح: علماء نے یہ لکھا ہے کہ مذکورہ بالا حکم سر راہ ملاقات کے وقت کا ہے، مثلاً ایک شخص ادھر سے آرہا ہے دوسرا ادھر سے جا رہا ہو اور دونوں آپس میں ملیں تو اس صورت کے لئے یہ حکم ہے کہ ان دونوں میں جو شخص چھوٹا ہو وہ بڑے کو سلام کرے لیکن وارد ہونے یعنی کسی کے پاس یا مجلس میں جانے کی صورت میں سلام کی ابتداء وارد کو کرنی چاہئے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اور خواہ کم تعداد والے لوگ ہوں یا

زیادہ تعداد والے لوگ۔

آنحضرت ﷺ کی انکساری و شفقت

(۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی غِلْمَانٍ فَسَلَّمَ عَلَیْھِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کچھ لڑکوں کے پاس گزرے تو آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا یہ عمل مبارک کہ آپ ﷺ نے بچوں کو سلام کیا در حقیقت آپ ﷺ کے وصف تواضع، وانکساری اور دنیا والوں کے تئیں کمال شفقت و محبت کا مظہر ہے۔

غیر مسلم کو سلام کرنے کا مسئلہ

(۸) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتَبْدَؤُا الْیَھُوْدَ وَلَا النَّصَارٰی بِالسَّلَامِ وَاِذَا لَقِیْتُمْ اَحَدَھُمْ فِیْ طَرِیْقٍ فَاضْطَرُّوْہُ اِلٰی اَضْیَقِہٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یہودیوں اور عیسائیوں کو سلام کرنے میں ابتداء نہ کرو اور جب تم راستے میں ان میں سے کسی سے ملو تو ان کو تنگ ترین راستے پر چلے جانے پر مجبور کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سلام کرنے میں ابتداء نہ کرو۔ کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تم ان کو السلام علیکم نہ کہو۔ کیونکہ سلام میں پہل کرنا در حقیقت اسلامی تہذیب کا بخشا ہوا ایک اعزاز ہے جس کے مستحق وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو اسلامی تہذیب کے پیرو ہوں اور مسلمان ہیں، اس اعزاز کا استحقاق ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوسکتا جو دین کے دشمن اور خدا کے باغی ہیں اسی طرح ان باغیوں اور دشمنوں کے ساتھ سلام اور اس جیسی دوسری چیزوں کے ذریعہ الفت و محبت کے مراسم کو قائم کرنا بھی جائز نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

لَاتَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔

"آپ (ﷺ) ایسی کوئی قوم نہ پائیں گے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور ان لوگوں سے بھی دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔"

ہاں اگر وہ لوگ سلام میں خود پہل کریں اور السلام علیک یا السلام علیکم کہیں تو اس کے جواب میں صرف علیک یا علیکم کہہ دیا جائے، اور علماء نے لکھا ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ غیر مسلم کے جواب میں ھداک اللہ کہا جائے نیز بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی ضرورت و مجبوری کی بناء پر یہود و نصاریٰ کے ساتھ سلام میں پہل کرنی جائز ہے اور یہی حکم ان مسلمانوں کا بھی ہے جو بدعت اور فسق میں مبتلا ہوں۔

اسلامی سلطنت میں رہنے والے کسی مسلمان نے کسی اجنبی کو سلام کیا اور پھر معلوم ہوا کہ وہ ذمی ہے تو اس صورت میں مستحب یہ ہے کہ اپنے سلام کو واپس کرنے کا مطالبہ کرے یعنی یوں کہے کہ اسر جعت سلامی مین اپنے سلام کو واپس کرنے کا مطالبہ کرتا ہوں۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جو دین کے دشمن ہیں اور اپنے مکر و فریب کی طاقتوں کے ذریعہ خدا کے جھنڈے کو سرنگوں کرنا چاہتے ہیں اس سلوک کے مستحق ہیں کہ جب وہ راستہ میں ملیں تو ان پر اتنا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ یکسو ہو کر گزرنے پر مجبور ہو جائیں اور ان پر راستہ تنگ ہو جائے تاکہ اسلام کی عظمت و شوکت اور مسلمانوں کا دبدبہ ظاہر ہو۔ مشکوٰۃ کے بعض حواشی میں یہ مطلب لکھا ہے کہ ان کو یہ حکم دو کہ وہ ایک طرف ہو جائیں اور کنارے پر چلیں تاکہ راستے کا درمیانی حصہ مسلمانوں کی آمد و رفت کے لئے مخصوص رہے۔

یہودیوں کی شرارت

⑨ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمُ الْيَهُوْدُ فَإِنَّمَا يَقُوْلُ اَحَدُهُمُ السَّامُ عَلَيْكَ فَقُلْ وَعَلَيْكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب یہودی تمہیں سلام کرتے ہیں تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں، السام علیک (یعنی تمہیں موت آئے) لہٰذا تم ان کے جواب میں یہ کہو و علیک (یعنی تمہیں موت آئے)" (بخاریؒ ومسلمؒ)

⑩ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمْ اَهْلُ الْكِتَابِ فَقُوْلُوْا وَعَلَيْكُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب اہل کتاب یعنی یہود و نصاری تمہیں سلام کریں تو تم ان کے جواب میں کہو وعلیکم۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: پہلی روایت میں لفظ "فقل" اور "وعلیک" بصیغہ مفرد ہے اور اس روایت میں "فقولوا" اور "وعلیکم" بصیغہ جمع ہے اسی طرح اور روایتوں میں "وعلیک" اور "وعلیکم" واؤ کے ساتھ اور بغیر واؤ کے دونوں طرح منقول ہے مشکوۃ کے مؤلف نے یہاں جو روایت نقل کی ہے اس میں ان دونوں کو واؤ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ موطا کی روایت میں "علیک" بغیر واؤ کے مؤلف نے یہاں جو روایت نقل کی ہے اس میں ان دونوں کو واؤ کے ساتھ نقل کیا ہے موطا کی روایت میں "علیک" بغیر واؤ کے اور دار قطنی کی روایت میں "علیکم" بغیر واؤ کے منقول ہے اور علماء نے لکھا ہے کہ زیادہ صحیح اور مختار قول یہ ہے کہ مذکورہ لوگوں کے سلام کے جواب میں یہ لفظ بغیر واؤ کے یعنی "علیک" یا "علیکم" ہی کہا جائے تاکہ اس چیز میں مشارکت لازم نہ آئے جو ان کی زبان سے ادا ہوتی ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس لفظ کو واؤ کے ساتھ کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ جس چیز میں مشارکت لازم آئے گی وہ موت ہے اور موت سب کو آنے والی ہے اس صورت میں اس لفظ کا مطلب یہ ہوگا کہ (جس موت کو تم برا سمجھ کر گویا ہمیں اس کی بد دعا دے رہے ہو) اس میں ہم اور تم برابر ہیں کہ ہم سب ہی کو موت یعنی مرنا ہے۔ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ حرف واؤ یہاں مشارکت کے لئے نہیں ہے بلکہ استیناف کے لئے ہے، اس صورت میں یہ لفظ مفہوم کے اعتبار سے اس جملہ کا قائم مقام ہوگا کہ وعلیکم ماتستحقونہ من الذم (اور تجھ پر وہ برائی پڑے جس کا تو مستحق ہے) تاہم یہ بات واضح رہے کہ یہ لفظ احادیث میں چونکہ دونوں طرح منقول ہے کہ بعض روایتوں میں واؤ کے ساتھ ہے اور بعض روایتوں میں بغیر واؤ کے، اس لئے اس سلسلے میں درست بات یہ ہے کہ دونوں طرح کہنا جائز ہے۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اہل کتاب کے سلام کا جواب دیا جائے لیکن وعلیکم السلام نہ کہا جائے یعنی جواب دینے والا نہ تو "علیکم السلام" کہے اور نہ "علیک السلام" بلکہ صرف "وعلیکم" یا "علیک" کہے بلکہ "وعلیکم" بھی اس صورت میں کہے جب وہ ایک سے زائد ہوں اگر ایک ہی ہو تو "علیکم" نہ کہے، کیوں کہ اسطرح اس کی تعظیم و توقیر لازم آئے گی۔

آنحضرت ﷺ کا حلم

⑪ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اسْتَاذَنَ رَهْطٌ مِنَ الْيَهُوْدِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا السَّامُ عَلَيْكُمْ فَقُلْتُ بَلْ عَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ فَقَالَ يَاعَائِشَةُ إِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْاَمْرِ كُلِّهٖ قُلْتُ اَوَلَمْ تَسْمَعْ مَاقَالُوْا قَالَ قَدْ قُلْتُ وَعَلَيْكُمْ وَفِي رِوَايَةٍ عَلَيْكُمْ وَلَمْ يَذْكُرِ الْوَاوَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ اِنَّ الْيَهُوْدَ اَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا السَّامُ عَلَيْكَ قَالَ وَعَلَيْكُمْ فَقَالَتْ عَائِشَةُ السَّامُ عَلَيْكُمْ وَلَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْكُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَهْلًا يَاعَائِشَةُ عَلَيْكِ بِالرِّفْقِ وَاِيَّاكِ وَالْعُنْفَ وَالْفُحْشَ قَالَتْ اَوَلَمْ تَسْمَعْ مَاقَالُوْا اَوَلَمْ

تَسْمَعِيْ مَاقُلْتُ رَدَدْتُ عَلَيْهِمْ فَيُسْتَجَابُ لِي فِيْهِمْ وَلَا يُسْتَجَابُ لَهُمْ فِيَّ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ لَاتَكُوْنِي فَاحِشَةً فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفُحْشَ وَالتَّفَحُّشَ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن یہودیوں کی ایک جماعت نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی، چنانچہ ان کو اجازت دے دی گئی اور جب وہ آپ ﷺ کے پاس آئے تو کہا کہ بلکہ تمہیں موت آئے اور تم پر لعنت ہو آنحضرت ﷺ نے فرمایا عائشہؓ! اللہ تعالیٰ محبت ونرمی کرنے والا ہے اور ہر کام میں محبت ونرمی کو پسند کرتا ہے میں نے عرض کیا کیا آپ (ﷺ) نے سنا نہیں انہوں نے (سلام کے) بجائے کیا لفظ کہا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (بیشک میں نے سنا ہے) اور میں نے (ان کے جواب میں) کہا ہے کہ وَعَلَيْكُمْ اور ایک روایت میں یہ لفظ عَلَيْكُمْ ہے یعنی واؤ کا ذکر نہیں ہے (بخاریؒ ومسلمؒ)........اور بخاریؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا (ایک دن) کچھ یہودی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے السلام علیکم کہنے کے بجائے یہ کہا کہ السام علیکم، آنحضرت ﷺ نے (ان کے جواب میں) فرمایا کہ وعلیکم۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہودیوں کی یہ بد تمیزی مجھ سے برداشت نہیں ہوئی اور میں نے ان کے جواب میں کہا کہ تمہیں موت آئے، اور تم پر اللہ کی لعنت ہو، اور تم پر اللہ کا غضب ٹوٹے۔ آنحضرت ﷺ نے (جب میری زبان سے ایسے الفاظ سنے تو) فرمایا کہ عائشہؓ رک جاؤ! تمہیں نرمی اختیار کرنی چاہئے نیز سخت گوئی اور لچر باتوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ کیا آپ نے نہیں سنا کہ انہوں نے کیا لفظ کہا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اور کیا تم نے نہیں سنا کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے میں نے اس پر کیا جواب دیا ہے (تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ) ان کے حق میں میری دعا (یا بددعا) تو قبول ہوتی ہے لیکن میرے حق میں ان کی دعا (یا بددعا) قبول نہیں ہوتی اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا عائشہؓ تم لچر باتیں کرنے والی مت بنو، کیونکہ اللہ تعالیٰ لچر باتوں کو اور بہ تکلف لچر باتیں بنانے کو پسند نہیں کرتا۔"

مسلم اور غیر مسلم کی مخلوط مجلس میں سلام کرنے کا طریقہ

(۱۲) وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَجْلِسٍ فِيْهِ أَخْلَاطٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُشْرِكِيْنَ عَبَدَةِ الْأَوْثَانِ وَالْيَهُوْدِ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ ابن زید کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ ایک ایسی مجلس کے پاس سے گزرے جس میں مسلمان اور مشرکین باہم بیٹھے ہوئے تھے اور مشرکین میں بت پرست بھی تھے، اور یہودی بھی، چنانچہ آپ ﷺ نے (مسلمانوں کا ارادہ کر کے) مجلس والوں کو سلام کیا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی ایسی جماعت کے پاس سے گزرے یا کسی ایسی مجلس میں پہنچے جس میں مسلمان بھی ہوں اور غیر مسلم بھی، اور مسلمان خواہ ایک ہی ہو یا کئی ہوں تو مسنون یہ ہے کہ مسلمانوں، یا مسلمان کا قصد کر کے پوری جماعت کو سلام کرے، نیز علماء نے لکھا ہے کہ اس صورت میں چاہے تو السلام علیکم کہے اور نیت یہ رکھے کہ اس سلام کے اصل مخاطب مسلمان ہیں اور چاہے یوں کہے۔ السلام علی من اتبع الھدی نیز علماء یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر کسی مشرک وغیر مسلم کو خط لکھا جائے تو مسنون یہ ہے کہ مکتوب الیہ کو السلام علیکم لکھنے کی بجائے وہی الفاظ لکھے جو آنحضرت ﷺ نے ہرقل روم کے بادشاہ کو لکھے تھے، سلام علی من اتبع الھدی۔

راستہ کے حقوق

(۱۳) عَنْ أَبِي سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوْسَ بِالطُّرُقَاتِ فَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ

مَالَنَامِنْ مَجَالِسِنَا بُدٌّ نَتَحَدَّثُ فِيهَا قَالَ فَاِذَا اَبَيْتُمْ اِلَّا الْمَجْلِسَ فَاَعْطُوا الطَّرِيْقَ حَقَّهٗ قَالُوْا وَمَا حَقُّ الطَّرِيْقِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ غَضُّ الْبَصَرِ وَكَفُّ الْاَذٰى وَرَدُّ السَّلَامِ وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْىُ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدری نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم راستوں میں بیٹھنے سے اجتناب کرو۔ یہ سن کر بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ہمارے لئے راستوں میں بیٹھنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے، جہاں ہم باتیں کرتے ہیں (یعنی راستوں میں بیٹھنے سے اجتناب کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، ہمارے پاس چوں کہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ہم اپنی مجلس رکھا کریں اس لئے جب ہم چند لوگ کہیں مل جاتے ہیں تو وہیں راستہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے دینی و دنیاوی امور کے بارے میں باہمی رائے مشورہ اور مذاکرات کرتے ہیں، ایک دوسرے کی حالت دریافت کرتے ہیں اگر کوئی بیمار ہوتا ہے تو اس کے لئے علاج معالجہ تجویز کرتے ہیں، اگر آپس میں کوئی رنجش و عناد ہوتا ہے تو صلح وصفائی کرتے ہیں اور اپنے معاملات کو طے کرنے کی تدبیر پر غور کرتے ہیں) آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب (تم مجبوری کی بنا) پر بیٹھنے کے علاوہ دوسری صورت سے انکار کرتے ہو تو پھر راستہ کو اس کا حق ادا کرو (یعنی اگر ایسی صورت ہو کہ راستے میں بیٹھنے سے اجتناب کرنا تمہارے لئے ممکن نہ ہو اور تمہیں ایسی جگہ بیٹھنا پڑے جو راستہ پر واقع ہو تو راستے کا حق ادا کرو) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! راستہ کا کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ آنکھوں کا بند کرنا یعنی حرام چیزوں پر نظر ڈالنا، ایذاء رسانی سے باز رہنا یعنی تنگ راستہ کر دینے یا کسی اور طرح گزرنے والوں کو ایذاء نہ پہنچانا، سلام کا جواب دینا اور لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم کرنا اور بری باتوں سے روکنا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سلام کا جواب دینا یہاں سلام کرنے کا حکم دینے کے بجائے سلام کا جواب دینے کی ہدایت کرنا اس مسنون امر کے پیش نظر ہے کہ چلنے اور گزرنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

(۱۴) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ هٰذِهِ الْقِصَّةِ قَالَ وَاِرْشَادُ السَّبِيْلِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ عَقِيْبَ حَدِيْثِ الْخُدْرِىِّ هٰكَذَا۔۔۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے اس مضمون کے سلسلے میں (کہ جو اوپر کی حدیث میں ذکر کیا گیا) نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (یہ بھی) فرمایا کہ (جو شخص راستہ بھول جائے، یا جو شخص راستہ نہ جانتا ہو) اس کو راستہ بتانا (بھی ایک حق ہے) اس روایت کو ابوداؤدؒ نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت کے بعد اسی طرح نقل کیا ہے جیسا کہ صاحب مصابیح نے اور ان کی اتباع میں صاحب مشکوٰۃ نے یہاں نقل کیا ہے۔"

(۱۵) وَعَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ هٰذِهِ الْقِصَّةِ قَالَ وَتُغِيْثُوا الْمَلْهُوْفَ وَتَهْدُوا الضَّالَّ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ عَقِيْبَ حَدِيْثِ اَبِىْ هُرَيْرَةَ هٰكَذَا وَلَمْ اَجِدْهُمَا فِى الصَّحِيْحَيْنِ۔

"اور حضرت عمرؓ نبی کریم ﷺ سے اس مضمون کے سلسلے میں نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بھی یہ فرمایا کہ ایک حق یہ بھی ہے کہ مظلوم کی فریاد رسی کی جائے اور گم کردہ راہ کو راستہ بتایا جائے۔ اس روایت کو حضرت ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے بعد اسی طرح نقل کیا ہے اور میں نے ان دونوں حدیثوں کو صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں نہیں پایا۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

اسلامی معاشرہ کے چھ باہمی حقوق

(۱۶) عَنْ عَلِىٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ بِالْمَعْرُوْفِ يُسَلِّمُ عَلَيْهِ اِذَا لَقِيَهٗ

وَيُجِيْبُهٗ اِذَا دَعَاهُ وَيُشَمِّتُهٗ اِذَا عَطَسَ وَيَعُوْدُهٗ اِذَا مَرِضَ وَيَتَّبِعُ جَنَازَتَهٗ اِذَا مَاتَ وَيُحِبُّ لَهٗ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔

(رواہ الترمذی والدارمی)

"حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مسلمان پر مسلمان کے چھ حقوق ہیں جو حسن سلوک (اور خدا کی خوشنودی) سے متعلق ہیں، جب کوئی مسلمان ملے تو اس کو سلام کرنا، جب کوئی مسلمان کھانے (کے لئے یا کسی اور غرض سے بلائے) تو اس کو قبول کرنا جب کوئی مسلمان چھینکے تو اس پر یرحمک اللہ کہنا، جب کوئی مسلمان بیمار ہو تو اس کی عیادت کرنا، جب کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ جانا اور مسلمان کے لئے اس چیز کو پسند کرنا جس کو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

سلام کے ثواب میں اضافہ، باعث بننے والے الفاظ

⑰ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَجُلًا جَآءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَرَدَّ عَلَيْهِ ثُمَّ جَلَسَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ ثُمَّ جَآءَ اٰخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ فَقَالَ عِشْرُوْنَ ثُمَّ جَآءَ اٰخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ فَقَالَ ثَلٰثُوْنَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ایک شخص آیا اور کہا السلام علیکم آنحضرت ﷺ نے اس کے سلام کے جواب دیا، پھر وہ شخص بیٹھ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس شخص کے لئے دس نیکیاں لکھی گئی ہیں۔ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے سلام کا بھی جواب دیا اور جب وہ بیٹھ گیا تو فرمایا کہ اس کے لئے بیس نیکیاں لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد ایک اور شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آنحضرت نے اس کے سلام کا بھی جواب دیا اور جب وہ بیٹھ گیا تو فرمایا کہ اس کے لئے تیس نیکیاں لکھی گئی ہیں۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مذکورہ بالا ارشاد گرامی ﷺ کا تعلق سلام کرنے والے کے ساتھ ہے! اگر سلام کرنے والا السلام علیکم کہے اور جس کو سلام کیا گیا ہے وہ اس کے جواب میں ورحمۃ اللہ کے لفظ کا اضافہ کرے یعنی وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہے یا سلام کرنے والا السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے اور جواب دینے والا وبرکاتہ کے لفظ کا اضافہ کرے یعنی یوں کہے کہ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تو اضافہ ثواب کے سلسلے میں اس کا حکم بھی یہی ہوگا اور یہی حکم مغفرتہ کے اضافہ کا بھی ہے جیسا کہ آگے آنے والی حدیث میں مذکور ہے۔

⑱ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَعْنَاهُ وَزَادَ ثُمَّ اَتٰى اٰخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ وَمَغْفِرَتُهٗ فَقَالَ اَرْبَعُوْنَ وَقَالَ هٰكَذَا تَكُوْنُ الْفَضَائِلُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت معاذ ابن انسؓ نے بھی نبی کریم ﷺ سے اوپر کی حدیث کے ہم معنی روایت نقل کی ہے جس میں معاذؓ نے یہ الفاظ مزید نقل کئے ہیں۔ پھر ایک اور شخص یعنی چوتھا شخص آیا اور کہا کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ۔ آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اس کے لئے چالیس نیکیاں لکھی گئی ہیں۔ نیز یہ فرمایا کہ اسی طرح سے ثواب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یعنی سلام کرنے والا جس قدر الفاظ بڑھاتا جائے گا اسی قدر اس کے ثواب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ سلام کرنے کے سلسلے میں افضل یہ ہے کہ سلام کرنے والا یوں کہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، یعنی جمع کی ضمیر علیکم استعمال کی جائے اگرچہ جس کو سلام کیا جارہا ہے وہ ایک ہی شخص کیوں نہ ہو، اسی طرح جس شخص کو سلام کیا گیا ہے وہ جواب میں یوں کہے۔ وعلیکم السلام، یعنی وہ بھی جمع کی ضمیر استعمال کرے اور واؤ لگائے۔

واضح رہے کہ سلام کا ادنیٰ درجہ السلام علیکم کہنا ہے اور اگر السلام علیک کہا جائے تو بھی کافی ہوگا اور جواب میں ادنیٰ

درجہ و علیک السلام اور و علیکم السلام ہے اور اگر واؤ نہ لگایا جائے تو بھی کافی ہوگا۔ علماء کا اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اگر جواب میں صرف علیکم کہا جائے تو جواب پورا نہیں ہوگا اور اگر جواب میں و علیکم کہا جائے یعنی واؤ لگایا جائے تو اس صورت میں دونوں قول ہیں۔

سلام میں پہل کرنے کی فضیلت

⑲ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاللّٰہِ مَنْ بَدَأَ بِالسَّلَامِ۔

(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا لوگوں مین سے اللہ کے نزدیک تر وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔"

(احمدؒ وترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس فضیلت کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو راستہ میں ایک دوسرے سے ملیں کیوں کہ اس صورت میں سلام کرنے کے حق کے سلسلے میں وہ برابر کی حیثیت رکھیں گے لہذا ان میں سے جو شخص پہلے سے سلام کرے گا وہ مذکورہ فضیلت کا مستحق ہوگا اس کے برخلاف اگر یہ صورت ہو کہ ایک شخص تو کہیں بیٹھا ہوا ہو اور دوسرا شخص اس کے پاس آئے تو سلام کرنے کا حق اس دوسرے شخص پر ہوگا جو آیا ہے لہذا اگر وہ آنے والا سلام کرنے میں پہل کرے تو وہ فضیلت کا مخاطب نہیں ہوگا کیوں کہ اس نے سلام کرنے میں پہل کر کے درحقیقت اس حق کو ادا کیا ہے جو اس کے ذمہ تھا، ہاں اگر سلام کرنے میں وہ شخص پہل کرے جو بیٹھا ہوا تھا تو اس فضیلت کا وہ مستحق ہوگا۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کو اختیار کرنے سے مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے تئیں اخلاص و محبت کے جذبات کو فروغ دیتا ہے ایک تو ملاقات کے وقت سلام کرنے میں پہل کرنا دوسرے کسی مسلمان کو اس کے نام کے ذریعہ مخاطب کرنا اور پکارنا جس کو وہ پسند کرتا ہے تیسرے یہ کہ جب وہ مجلس میں آئے تو اس کو عزت و احترام کے ساتھ جگہ دینا۔

اجنبی عورت کو سلام کرنا جائز نہیں

⑳ وَعَنْ جَرِیْرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی نِسْوَۃٍ فَسَلَّمَ عَلَیْہِنَّ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ عورتوں کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا۔" (احمدؒ)

تشریح: یہ بات آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ﷺ کے ساتھ مخصوص تھی کیونکہ کسی فتنہ و شر میں آنحضرت ﷺ کے مبتلا ہونے کا کوئی خوف و خطر نہ تھا اس لئے آپ ﷺ کے لئے عورتوں کو بھی سلام کرنا روا تھا، لیکن آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان کے لئے یہ مکروہ ہے کہ وہ اجنبی عورت کو سلام کرے، ہاں اگر کوئی عورت اتنی عمر رسیدہ ہو کہ اس کے تئیں کسی فتنہ و شر میں مبتلا ہونے کا کوئی خوف نہ ہو اور نہ اس کو سلام کرنا دوسروں کی نظروں میں کسی بدگمانی کا سبب بن سکتا ہو تو اس کو سلام کرنا جائز ہوگا۔

جماعت میں سے کسی ایک کا سلام کرنا پوری جماعت کی طرف سے کافی ہے

㉑ وَعَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ قَالَ یُجْزِیُٔ عَنِ الْجَمَاعَۃِ اِذَا مَرُّوْا اَنْ یُّسَلِّمَ اَحَدُھُمْ وَیُجْزِیُٔ عَنِ الْجُلُوْسِ اَنْ یَّرُدَّ اَحَدُھُمْ۔ رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ مَرْفُوْعًا وَرَوٰی اَبُوْدَاؤُدَ وَقَالَ رَفَعَہُ الْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ وَھُوَ شَیْخُ اَبِیْ دَاؤُدَ۔

"اور حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا جب کچھ لوگ گزر رہے ہوں تو ان میں سے کسی ایک کا

سلام لینا ان سب کی طرف سے کافی ہوگا اسی طرح جو لوگ بیٹھے ہوئے ہوں ان میں سے کسی ایک کا جواب دینا ان سب کی طرف سے کافی ہوگا۔ اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں بطریق مرفوع نقل کیا ہے (یعنی بیہقیؒ کی روایت کے مطابق یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ﷺ ہے نہ کہ حضرت علیؓ کا قول ہے) اور ابوداؤد نے اس روایت کو (بطریق موقوف) نقل کیا ہے نیز انہوں نے (اپنی سند بیان کرنے کے بعد) کہا ہے کہ اس روایت کو حسن ابن علیؓ نے مرفوع بیان کیا ہے اور یہ حسن ابن علی (امام حسن ابن علی ابن ابی طالب نہیں ہیں بلکہ) وہ حسن ہیں جو ابوداؤد کے استاد و شیخ ہیں (حاصل یہ کہ اس روایت کو بیہقیؒ نے تو مرفوع نقل کیا ہے اور ابوداؤدؒ نے بھی حسن ابن علی کی سند سے مرفوع ہی نقل کیا ہے، لیکن دوسری اسند سے موقوف نقل کیا ہے)۔"

تشریح: "گزر رہے ہوں" اس حکم میں وہ صورت بھی داخل ہے جب کہ وہ (کچھ لوگ) کسی ایسی جگہ جائیں یا کسی ایسی جگہ رکیں جہاں پہلے سے کچھ لوگ بیٹھے ہوں، یا ایک ہی شخص ہو۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ سلام کرنے میں پہل کرنا سُنت کفایہ ہے اور سلام کا جواب دینا فرض کفایہ ہے جن لوگوں کو سلام میں پہل کرنی چاہئے، یا جن لوگوں کو سلام کا جواب دینا ہے اگر ان میں سے کوئی ایک شخص سلام کرے یا کوئی ایک شخص سلام کا جواب دیدے تو وہ سلام یا جواب میں ان سب لوگوں کی طرف سے کافی ہوگا اور سب بری الذمہ ہو جائیں گے اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا سلام کرنا یا ہر ایک کا جواب دینا افضل ہوگا۔

اشاروں کے ذریعہ سلام کرنا

(۲۲) وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا لَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ وَلَا بِالنَّصَارٰى فَاِنَّ تَسْلِيْمَ الْيَهُوْدِ الْاِشَارَةُ بِالْاَصَابِعِ وَتَسْلِيْمَ النَّصَارٰى الْاِشَارَةُ بِالْاَكُفِّ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ اِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ۔

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد حضرت شعیب سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ ابن عمروؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص ہمارے غیروں کے ساتھ مشابہت کرے گا یعنی ہماری امت کے لوگوں کے برعکس دوسرے مذاہب کے لوگوں کے طریقہ پر عمل کرے گا اور وہ ہم میں سے نہیں ہے، تم نہ یہودیوں کے ساتھ مشابہت کرو اور نہ عیسائیوں کے ساتھ، یہودیوں کا سلام کرنا انگلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے اور عیسائیوں کا سلام کرنا ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی اسناد ضعیف ہے۔"

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے کسی بھی فعل و طریقہ اور خاص طور پر سلام کرنے کے ان دونوں طریقوں کی مشابہت اختیار نہ کرنی چاہئے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اور عیسائی سلام کرنے یا سلام کرنے کا جواب دینے کے لئے اور یا دونوں کے لئے محض مذکورہ اشاروں ہی پر اکتفا کر لیتے تھے، سلام کا لفظ نہیں کہتے تھے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت میں سے انبیاء و اولیاء کی سُنت و طریقہ ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کو گویا مکاشفہ ہوا کہ میری اُمت کے کچھ لوگ بے راہ روی کا شکار ہو کر سلام کرنے کا وہ طریقہ اختیار کریں گے جو یہودیوں، عیسائیوں، اور دوسری غیر اقوام کا ہے جیسے انگلیوں یا ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنا ہاتھ جوڑ لینا، کمر یا سر کو جھکانا، اور صرف سلام کرنے پر اکتفا کر لینا وغیرہ وغیرہ لہٰذا آپ ﷺ نے پوری اُمت کو مخاطب کرتے ہوئے اس بارے میں تنبیہ بیان فرمائی اور یہ وعید بیان کی کہ جو شخص سلام کے ان رسوم و رواج کو اپنائے گا، جو اسلامی شریعت اور ہماری سُنت کے خلاف ہیں تو اس کو سمجھ لینا چاہئے، کہ اس کا شمار ہماری اُمت کے لوگوں میں نہیں ہوگا۔

واضح رہے کہ اس حدیث کی اسناد کو ترمذیؒ نے ضعیف کہا ہے لیکن یہ حدیث ایک دوسری سند سے بھی منقول ہے اور وہ ضعیف نہیں

ہے جس کو جامع صغیر میں نقل کیا گیا ہے۔

ہر ملاقات پر سلام کرو

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا لَقِیَ اَحَدُکُمْ اَخَاهُ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ فَاِنْ حَالَتْ بَیْنَهُمَا شَجَرَةٌ اَوْ جِدَارٌ اَوْ حَجَرٌ ثُمَّ لَقِیَهُ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص جب اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کرے تو چاہئے کہ پہلے اس کو سلام کرے اور اس کے بعد اگر دونوں کے درمیان کوئی درخت یا دیوار یا بڑا پتھر حائل ہوا اور پھر اس سے ملاقات ہو تو اس کو دوبارہ سلام کرے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اتنے معمولی وقفہ کی جدائی و مفارقت کے بعد بھی سلام کرنا مستحب ہے چہ جائیکہ زیادہ عرصہ کے بعد ملاقات ہو۔ گویا یہ حدیث سلام کے استحباب اور ہر موقع پر اس ادب کے ملحوظ رکھنے کو مبالغہ کے طور پر بیان کرتی ہے، واضح رہے کہ سلام کی اہمیت کے باوجود بعض صورتیں ایسی ہیں جو سلام کرنے سے مستثنیٰ ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص پیشاب کر رہا ہے یا پاخانہ میں ہو، یا جماع میں مصروف ہو یا اسی طرح کی کوئی حالت اور ہو تو اس وقت اس شخص کو سلام کرنا مکروہ ہے اور جواب دینا اس پر واجب نہیں ہوگا اسی طرح اگر کوئی شخص سو رہا ہو یا اونگھ رہا ہو، یا نماز پڑھ رہا ہو، یا اذان دے رہا ہو یا حمام میں ہو یا کھانا کھا رہا ہو اور نوالہ اس کے منہ میں ہو اور ان صورتوں میں اس کو کوئی سلام کرے تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہوگا نیز خطبہ کے وقت نہ تو سلام کرنا چاہئے اور نہ سلام کا جواب دینا چاہئے، جو شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہو اس کو بھی سلام نہ کیا جائے اگر کوئی سلام کرے تو تلاوت کرنے والے کو چاہئے کہ تلاوت روک کر سلام کا جواب دے اور پھر اعوذ پڑھ کر تلاوت شروع کر دے۔

اپنے گھر والوں کو بھی سلام کرو

(۲۴) وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلْتُمْ بَیْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَهْلِهٖ وَاِذَا خَرَجْتُمْ فَاَوْدِعُوْا اَهْلَهٗ بِسَلَامٍ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم گھر میں گھسو تو اپنے گھر والوں کو سلام کرو، اور جب گھر سے باہر نکلو تو اپنے گھر والوں کو سلام کے ذریعہ رخصت کرو۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: اگر گھر میں کوئی فرد نہ ہو تو مستحب یہ ہے کہ اس طرح کہے السلام علینا و عباد اللہ الصالحین تاکہ وہاں جو فرشتے ہوں ان کو سلام پہنچے۔

حدیث کے الفاظ فاودعوا اھلہ بسلام میں ایداع اصل میں تودیع کے معنی میں ہے جو وداع سے ہے جس کا مطلب یہ ہے گھر سے باہر جاتے وقت اپنے اہل و عیال کو سلام کے ذریعہ وداع کہو۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس رخصتی سلام کا جواب واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے کیوں کہ یہ سلام اصل میں دعا اور وداع ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ یہ فرماتے ہیں کہ لفظ اودعوا ایداع سے ہے باایں معنی کہ اپنے اہل و عیال کے پاس سلام کو ودیعت امانت رکھو۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تم نے رخصت ہوتے وقت اپنے اہل و عیال کو سلام کیا تو گویا تم نے سلام کی خیر و برکت کو اپنے اہل و عیال کے پاس امانت رکھا جس کو تم...... آخرت میں واپس لوگے، جیسا کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز کسی کے پاس امانت رکھتا ہے اور پھر اس کو واپس لے لیتا ہے۔ یحییٰ کے مطابق مطلب یہ ہے کہ تم سلام کو اپنے گھر والوں کی ودیعت امانت و سپردگی میں دے دو تاکہ لوٹ کر

ان کے پاس آؤ تو اپنی ودیعت امانت کو واپس لو جیسا کہ امانتیں واپس لی جاتی ہیں! یہ بات گویا اس امر کی نیک فال لینے کے مرادف ہے کہ گھر سے رخصت ہونے والا سلامتی کے ساتھ لوٹ کر آئیگا اور اسے دوبارہ سلام کرنے کا موقع نصیب ہوگا۔

(۲۵) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَابُنَیَّ اِذَا دَخَلْتَ عَلٰی اَھْلِکَ فَسَلِّمْ یَکُوْنُ بَرَکَۃً عَلَیْکَ وَعَلٰی اَھْلِ بَیْتِکَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ میرے بیٹے! جب تم اپنے گھر والوں سے ملو تو سلام کرو، وہ سلام تم پر اور تمہارے گھر والوں پر خیر و برکت کے نزول کا باعث ہوگا۔" (ترمذیؒ)

پہلے سلام پھر کلام

(۲۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلسَّلَامُ قَبْلَ الْکَلَامِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ مُّنْکَرٌ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سلام کلام سے پہلے ہے یعنی ملاقات کے وقت پہلے سلام کر ہئے، اور اس کے بعد بات چیت کرنی چاہئے، سلام کرنے سے پہلے بات چیت شروع کر دینا اچھا نہیں۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔"

زمانۂ جاہلیت کا سلام

(۲۷) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ قَالَ کُنَّا فِی الْجَاھِلِیَّۃِ نَقُوْلُ اَنْعَمَ اللّٰہُ بِکَ عَیْنًا وَاَنْعِمْ صَبَاحًا فَلَمَّا کَانَ الْاِسْلَامُ نُھِیْنَا عَنْ ذٰلِکَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں ملاقات کے وقت یہ کہا کرتے تھے انعم اللّٰہ بک علینا و انعم صباحا یعنی خدا تمہاری وجہ سے آنکھوں کو ٹھنڈا رکھے اور تم ہر صبح نعمتوں میں داخل ہو۔ پھر جب اسلام کا زمانہ آیا تو ہمیں یہ کہنے سے منع کر دیا گیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: پہلا لفظ "انعم" نعومۃ سے ماضی کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں نرمی، تازگی، اور شادمانی اس عبارت انعم اللّٰہ بک علینا کے دو مطلب ہوسکتے ہیں ایک تو یہ کہ "بک" میں حرف باسبب کے معنی میں ہے اور یہ جملہ اس مفہوم کا حامل ہے کہ خدا تمہاری وجہ سے تمہارے دوستوں اور عزیزوں کی آنکھوں کو تروتازہ اور روشن رکھے یہ گویا مخاطب کی خوش حالی سے کنایہ ہے کہ وہ خوش حال و شادمان رہے تاکہ اس کے دوست اس کی خوش حالی و شادمانی دیکھ کر خوش ہوں۔ دوسرے یہ کہ حرف بازائد ہے اور اس سے تاکید تعدیہ مراد ہے اس صورت میں یہ جملہ اس مفہوم کا حامل ہوگا۔ کہ خدا تمہیں اس چیز کو دیکھنے کا موقع دے کر خوش و خرم رکھے جس کو تم پسند کرتے ہو اور اس کی طلب رکھتے ہو۔

دوسرا لفظ "انعم" امر کا صیغہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری صبحیں تمہارے لئے تروتازگی و خوشحالی و مسرت کا باعث بنیں، یا یہ کہ صبح کے وقت تم تروتازہ اور خوش و خرم رہو۔ یہ بھی خوشی و فراغت کے ساتھ وقت گزارنے سے کنایہ ہے۔ اور صبح کے وقت کی تخصیص اس سبب سے ہے کہ دن کی ابتداء صبح سے ہوتی ہے اگر صبح کا وقت کسی حادثہ (مصیبت) کو اپنے ساتھ لاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب پورا دن بے چینی و بے اطمینانی اور سخت روی کے ساتھ گزرے گا خاص طور پر اس زمانہ میں غارت گری اور لوٹ مار کا جو معمول بنا ہوا تھا اس کی ابتداء عام طور سے صبح ہی کے وقت ہوتی تھی۔ لہٰذا اس دور میں جس شخص کی صبح خیر و عافیت اور امن کے ساتھ گزر جاتی تھی

اس کا پورا وقت اطمینان و چین کے ساتھ گزرتا تھا۔

غائبانہ سلام اور اس کا جواب

(۲۸) وَعَنْ غَالِبٍ قَالَ اِنَّا لَجُلُوسٌ بِبَابِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ اِذْجَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ عَنْ جَدِّیْ قَالَ بَعَثَنِیْ اَبِیْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ائْتِهِ فَاَقْرِئْهُ السَّلَامَ قَالَ فَاَتَيْتُهُ فَقُلْتُ اَبِیْ يُقْرِئُكَ السَّلَامَ فَقَالَ عَلَيْكَ وَعَلٰی اَبِيْكَ السَّلَامُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت غالب" کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم حضرت حسن بصری" کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور بیان کیا کہ مجھ سے میرے باپ نے اور ان سے ان کے باپ (یعنی میرے دادا) نے بیان کیا کہ مجھ کو میرے باپ نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجتے ہوئے کہا کہ تم آنحضرت ﷺ کے پاس جاؤ اور آپ ﷺ کو سلام عرض کرو میرے دادا نے بیان کیا کہ (اپنے باپ کے حکم پر) میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میرے باپ نے آپ ﷺ کو سلام عرض کیا ہے آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ تم پر اور تمہارے باپ پر سلامتی ہو۔" (ابوداؤد")

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کی طرف سے سلام پہنچائے تو مسنون یہ ہے کہ سلام پہنچانے والے پر بھی سلام بھیجا جائے اور جس کی طرف سے جس نے سلام پہنچایا ہے اس پر بھی یعنی جب کوئی شخص کسی کی طرف سے سلام پہنچائے تو جواب میں یوں کہا جائے علیک و علی فلان السلام یا و علیک و علیہ السلام چنانچہ نسائی کی روایت میں یہ الفاظ بعینہٖ منقول ہیں۔

خطوط میں سلام لکھنے کا طریقہ

(۲۹) وَعَنْ اَبِی الْعَلَاءِ الْحَضْرَمِیِّ اَنَّ الْعَلَاءَ الْحَضْرَمِیَّ كَانَ عَامِلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ اِذَا كَتَبَ اِلَيْهِ بَدَاءَ بِنَفْسِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوالعلاء حضرمی" کہتے ہیں کہ علاء حضرمی" رسول کریم ﷺ کی طرف سے عامل مقرر تھے، جب وہ آنحضرت ﷺ کو خط لکھتے تو اپنی طرف سے شروع کرتے۔" (ابوداؤد")

تشریح: ابوالعلاء" کا اصل نام یزید ابن عبد ہے۔ مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں اس روایت کے راوی کا نام ابوالعلاء ہی لکھا ہے یعنی یوں ہے عن ابی العلاء الحضرمی ان العلاء الحضرمی اور بعض نسخوں میں مصابیح کے بعض نسخوں کے مطابق ابن علاء لکھا ہے یعنی یوں ہے۔ عن ابن العلاء الحضرمی ان العلاء الحضرمی حضرمی اصل میں مشہور شہر حضرموت کی طرف نسبت ہے کیونکہ حضرت علاء" حضرموت کے رہنے والے تھے اور مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں آگے کی عبارت اَنَّ الْعَلَاءَ الْحَضْرَمِیَّ ہے لیکن ایک نسخہ میں ان العلاء ابن الحضرمی لکھا ہوا ہے۔

"تقریب میں" لکھا ہے کہ حضرت علاء" بنو امیہ کے حلیف تھے یہ ایک جلیل القدر اور بزرگ صحابی" ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ان کو بحرین کا عامل مقرر کیا تھا آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر" اور حضرت عمر" نے بھی اپنے دور خلافت میں ان کو وہاں کا عامل باقی رکھا اور اسی عہدے پر ان کا انتقال ہوا۔

"اپنی طرف سے شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خط کی ابتداء ان الفاظ سے کرتے من العلاء الحضرمی الی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السلام علیکم و رحمۃ اللہ (یعنی علاء حضرمی کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ) اس عبارت کے بعد خط کا مضمون ہوتا اور حضرت علاء حضرمی" خط لکھنے کا یہ طریقہ آنحضرت ﷺ کی اتباع میں اختیار کرتے تھے۔ کیوں کہ

آنحضرت ﷺ کے مکتوبات گرامی کی ابتداء اسی طرح ہوتی تھی۔ من محمد رسول اللہ الی فلاں اس عبارت کے بعد سلام کے الفاظ ہوتے تھے اگر مکتوب الیہ مسلمان ہوتا تو اس کا مخاطب خاص طور پر اسی کو بنایا جاتا یعنی سلام علیک جیسے الفاظ ہوتے اور اگر مکتوب الیہ مسلمان نہ ہوتا تو پھر علی العموم سلام کے الفاظ ہوتے یعنی یوں لکھتے سلام علی من اتبع الھدی (جو شخص راہ راست کی پیروی کرے اس پر سلامتی ہو) سلام کے بعد اصل مضمون ہوتا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ہرقل کو جو مکتوب ارسال کیا تھا وہ اسی ترتیب کے ساتھ لکھا گیا، نیز آنحضرت ﷺ نے معاذؓ کو ان کے بیٹے کی تعزیت میں جو خط بھیجا تھا اس کے ابتدائی الفاظ یوں تھے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، من محمد رسول اللہ الی معاذ بن جبل سلام علیک فانی احمد الیک اللہ الذی لا الٰہ الا ھو، اما بعد......الخ

یہ حدیث جو یہاں نقل کی گئی ہے بظاہر باب کے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن یہ حدیث چونکہ سلام کے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ بیان کیا گیا اس لئے یہ اس باب میں نقل کی گئی ہے اسی طرح آگے جو تین حدیثیں آرہی ہیں اور جن میں خط سے متعلق کچھ باتیں بیان کی گئی ہیں چونکہ ان کا تعلق بھی بایں، اعتبار سلام سے ہے کہ سلام جس طرح زبانی پیش کیا جاتا ہے اسی طرح وہ خط میں بھی لکھا جاتا ہے لہٰذا ان حدیثوں کو بھی اس باب میں نقل کیا گیا اور مشکوٰۃ کے مؤلف کا یہ محمول بھی ہے کہ وہ فصل کے آخر میں ان احادیث کو بھی نقل کرتے ہیں جو اگرچہ براہ راست باب سے تعلق نہیں رکھتیں، لیکن باب اور اس کے موضوع کے مناسب اور بالواسطہ طور پر تعلق رکھنے والی ضرور ہوتی ہے۔

خط لکھ کر اس پر مٹی چھڑکنے کی خاصیت

(۳۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَتَبَ اَحَدُکُمْ کِتَابًا فَلْیُتَرِّبْہُ فَاِنَّہٗ اَنْجَحُ لِلْحَاجَۃِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ حَدِیْثٌ مُّنْکَرٌ۔

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو خط لکھے تو چاہئے کہ وہ خط لکھنے کے بعد اس پر مٹی ڈال دے یا مٹی چھڑک کر جھاڑ دے کیونکہ یہ چیز حاجت براری کے لئے بہت کارآمد ہے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔"

تشریح: کاغذ وغیرہ پر لکھنے کے بعد مٹی چھڑکنا بڑا قدیم طریقہ ہے اور عام طور پر اس کا مقصد روشنائی کو خشک کرنا سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ حاجت براری کے لئے ایک مخصوص تاثیر رکھتا ہے اور یہ تاثیر بالخاصیت ہے کہ اس کا سبب شارع کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں ہے تاہم بعض عارفین نے پہلے معنی یعنی (مٹی ڈال دے) کی وضاحت میں لکھا ہے کہ ایسا کرنا دراصل اپنے لکھے ہوئے پر خاک ڈالنے کے مفہوم کے مترادف ہے بایں طور کہ اس فعل سے ظاہر کیا جاتا ہے کہ اپنے مقصد و حاجت کے لئے نہ تو اپنے اس مکتوب پر اعتبار ہے اور نہ مکتوب الیہ کو حقیقی حاجت روا کا درجہ دینا مقصود ہے، بلکہ حقیقی اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے کہ وہی مقصد کو پورا کرنے اور حاجت برلانے والا ہے لہٰذا یہ مکتوب محض اظہار حال کا ایک ظاہری ذریعہ ہے، حقیقی درخواست تو صرف اللہ تعالیٰ سے ہے۔

"یا مٹی چھڑک کر جھاڑ دے" یہ "فلیتربہ" کا دوسرا ترجمہ ہے اور یہ ترجمہ اس اعتبار سے ہے کہ "مٹی ڈالنے" کی صورت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مٹی کسی دوسرے کی ملکیت سے متعلق ہو اور اس طرح مالک کی اجازت کے بغیر اس کی چیز کو صرف کرنا لازم آئے جب کہ مٹی چھڑک کر جھاڑ دینے میں اس طرح کی کوئی بات لازم نہیں آتی، چنانچہ اس دوسرے ترجمہ کی تائید اور اس قصے سے بھی ہوتی ہے جس کو امام غزالیؒ نے منہاج العابدین میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے جو کسی کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر تھا ایک پرچہ لکھا، پھر جب اس نے یہ چاہا کہ مکان کی دیوار سے تھوڑی سی مٹی لے کر پرچہ پر ڈالے تو اس کو خیال ہوا کہ یہ مکان کرایہ کا ہے اور اس کی دیوار سے مٹی لے کر صرف کرنا غیر مناسب ہے، لیکن معاً دل میں دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چنانچہ اس نے مٹی لے کر پرچہ پر

ڈال دی اس کے بعد اس نے یہ غیبی ندا سنی کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ اس مٹی کو حلال جاننے والا جلد ہی اس چیز کو جان لے گا جو کل کے دن یعنی روز حشر طویل حساب کے سبب اس کو پیش آنے والی ہے۔

یہ حدیث راویوں کے اعتبار سے منکر ہے اس کے مضمون میں کوئی کلام نہیں ہے، چنانچہ طبرانیؒ نے اوسط میں بطریق مرفوع حضرت ابوداؤدؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اذا کتب احد کم الی انسان فلیبد ابنفسہ و اذا کتب فلیترب کتابہ فھو انجح یعنی جب تم میں سے کوئی شخص کسی آدمی کو خط لکھے تو چاہئے کہ اس کو اپنی طرف سے شروع کرے اور جب اس خط کو لکھ لے تو اس پر مٹی چھڑک دے کیوں کہ یہ چیز حاجت براری کے لئے بہت کارآمد ہے۔

لکھتے وقت قلم کو کان پر رکھنے کی خاصیت

(۳۱) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ يَدَيْهِ كَاتِبٌ فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ ضَعِ الْقَلَمَ عَلٰى أُذُنِكَ فَإِنَّهُ أَذْكَرُ لِلْمَالِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَفِيْ إِسْنَادِهٖ ضُعْفٌ۔

"اور حضرت زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں کہ میں (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کے سامنے ایک خط لکھنے والا بیٹھا ہوا تھا میں نے آپ ﷺ کو (لکھنے والے سے) یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قلم کو اپنے کان پر رکھ لو کیوں کہ یہ چیز مطلب کو بہت یاد دلاتی ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔"

تشریح: "یہ چیز مطلب کو بہت یاد دلاتی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنے سے ذہن کے دریچے کھل جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے مقصد اور مفہوم کو بیان کرنے کے لئے عبارت و الفاظ کی آمد ہونے لگتی ہے اور لکھنے والا جو کچھ لکھنا چاہتا ہے اس میں پوری طرح کامیاب رہتا ہے یہ چیز بھی بالخاصیت ہے یعنی ایسا کس طرح ہوتا ہے؟ اس کا علم شارع ہی کو ہے تاہم بعض علماء نے اس کی تاویل و توجیہہ بیان کی ہے! یحییٰؒ نے لکھا ہے، کہ قلم ایک طرح سے زبان کا حکم رکھتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے القلم احد اللسانین اور زبان، قلب و ذہن کی ترجمان ہوتی ہے لہٰذا قلم کو کان پر رکھنا گویا زبان کو کان پر جو کہ سننے کی جگہ ہے رکھنے کے مرادف ہے، تاکہ زبان، قلم قلب و ذہن کے قریب ہو جائے اور قلب و ذہن جو کچھ کہنے کا ارادہ کریں اور وہ مفہوم کو جس اعلیٰ عبارت و پیرایہ بیان اور جس عمدہ الفاظ و اسلوب میں ادا کرنے کا تقاضہ کریں ان کو کلام و بیان کی اسی مناسبت و موزونیت کے ساتھ بصورت تحریر بیان کرے۔

یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند ضعیف ہے کا مطلب یہ ہے کہ روایت متن یا سند کے اعتبار سے غریب ہے اور اپنے بعض راویوں کے ضعف کے سبب "ضعیف" ہے تاہم یہ بات اس روایت کے صحیح ہونے کے منافی نہیں ہے نیز اس کی تائید ابن عساکرؒ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو انہوں نے حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ اذا کتبت فضع قلمک علی اذنک فانہ اذکر لک اسی طرح جامع صغیر میں حضرت زید ابن ثابتؓ سے بطریق مرفوع ترمذیؒ کی یہ روایت منقول ہے کہ ضع القلم علی اذنک فانہ اذکر للملی۔

ضرورت کے تحت غیر مسلم قوموں کی زبان سیکھنا جائز ہے

(۳۲) وَعَنْهُ قَالَ أَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ أَتَعَلَّمَ السُّرْيَانِيَّةَ وَفِيْ رِوَايَةٍ أَنَّهُ أَمَرَنِيْ أَنْ أَتَعَلَّمَ كِتَابَ يَهُوْدَ وَقَالَ إِنِّيْ مَا اٰمَنُ يَهُوْدَ عَلٰى كِتَابٍ قَالَ فَمَا مَرَّ بِيْ نِصْفُ شَهْرٍ حَتّٰى تَعَلَّمْتُ فَكَانَ إِذَا كَتَبَ إِلٰى يَهُوْدَ كَتَبْتُ وَإِذَا كَتَبُوْا إِلَيْهِ قَرَأْتُ لَهٗ كِتَابَهُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو یہ حکم دیا کہ میں سریانی زبان کو سیکھوں اور ایک روایت میں یوں ہے

کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو حکم دیا کہ میں یہودیوں سے خط وکتابت کرنا سیکھ لوں، نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ خط وکتابت کے معاملہ میں مجھے یہودیوں پر اطمینان نہیں ہوتا۔ زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں (کہ آنحضرت ﷺ کے اس حکم کے بعد) آدھا مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ میں نے یہودیوں کی زبان اور ان سے خط وکتابت کرنا سیکھ لیا، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ یہودیوں کو کوئی مکتوب بھیجنا چاہتے تو اس کو میں ہی لکھتا، اور جب یہودی آپ ﷺ کے پاس کوئی مکتوب بھیجتے تو اس کو آپ ﷺ کی خدمت میں میں ہی پڑھتا۔" (ترمذی)

تشریح: "سریانی" دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک زبان ہے جس میں توریت نازل ہوئی تھی لیکن اکثر محققین کا قول یہ ہے کہ تورایت عبرانی زبان میں نازل ہوئی تھی اور سریانی و عبرانی دونوں ملتی جلتی زبانیں ہیں۔

مجھے یہودیوں پر اطمینان نہیں ہوتا" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کوئی مسلمان نہیں ہے جو یہودیوں کی زبان جانتا ہو اس لئے یہودیوں کے ساتھ خط وکتابت کے لئے مجھے کسی یہودی ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس صورت میں مجھے اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر یہودیوں کے نام اپنا کوئی خط کسی یہودی سے لکھواؤں تو وہ اس میں اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی نہ کردے، اسی طرح اگر یہودیوں کی طرف سے میرے پاس کوئی خط آئے اور میں اس کو کسی یہودی سے پڑھواؤں تو وہ اس میں اپنی طرف سے کم یا زیادہ کرکے نہ پڑھ دے اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے تحت غیر مسلم اقوام کی زبان سیکھنا جائز ہے بلاضرورت سیکھنا جائز نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں غیر مسلم کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا لازم آتا ہے اور یہ چیز ممنوع ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا من تشبہ بقوم فھو منھم جو شخص جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اسی قوم میں شمار ہوگا بلکہ یحییٰ نے بلاضرورت سیکھنے کو حرام لکھا ہے۔

ملاقات کے وقت بھی سلام کرو اور رخصت ہوتے وقت بھی

(۳۳) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا انْتَھٰی اَحَدُکُمْ اِلٰی مَجْلِسٍ فَلْیُسَلِّمْ فَاِنْ بَدَا لَہٗ اَنْ یَّجْلِسَ فَلْیَجْلِسْ ثُمَّ فَاِذَا قَامَ فَلْیُسَلِّمْ فَلَیْسَتِ الْاُوْلٰی بِاَحَقَّ مِنَ الْاٰخِرَۃِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص کسی مجلس میں پہنچے تو پہلے سلام کرے اور پھر اگر بیٹھنا چاہے تو بیٹھ جائے، نیز جب (مجلس سے چلنے کے لئے) کھڑا ہو تو اس وقت بھی سلام کرے کیونکہ پہلا سلام کرنا دوسرا سلام کرنے سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔" (ترمذی وابوداؤد)

تشریح: جب کھڑا ہو کا مطلب یہ ہے کہ مجلس میں بیٹھنے کے بعد جب وہاں سے واپس ہونے کے لئے کھڑا ہو اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہاں سے چلنے کا ارادہ کرے خواہ مجلس میں بیٹھا ہو یا نہ بیٹھا ہو! بہرحال حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رخصت ہوتے وقت بھی سلام کرنا سنت ہے جیسا کہ ملاقات کے وقت کا سلام سنت ہے اسی طرح ان دونوں ہی سلام کا جواب دینا واجب ہے لیکن بعض محققین نے لکھا ہے کہ رخصت ہوتے وقت کا سلام اور اس کا جواب مستحب ہے۔

راستہ پر بیٹھنے کا حق

(۳۴) وَعَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاخَیْرَ فِیْ جُلُوْسٍ فِی الطُّرُقَاتِ اِلَّا لِمَنْ ھَدَی السَّبِیْلَ وَرَدَّ التَّحِیَّۃَ وَغَضَّ الْبَصَرَ وَ اَعَانَ عَلَی الْحَمُوْلَۃِ رَوَاہُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ وَذُکِرَ حَدِیْثُ اَبِیْ جُرَیٍّ فِیْ بَابِ فَضْلِ الصَّدَقَۃِ۔ (شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ سے فرمایا۔ راستوں پر بیٹھنا کوئی اچھا کام نہیں ہے، ہاں جو (شخص راستہ بھولے ہوئے یا اندھے کو) راستہ بتلائے، سلام کا جواب دے، حرام چیزوں کو دیکھنے سے آنکھوں کو بند رکھے اور اس شخص کی مدد کرے جو بوجھ

لادے ہوئے ہو تو ایسے شخص کا راستہ پر بیٹھنا گوارا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "حمولہ" حاء کے پیش کے ساتھ ہے لیکن مشکوٰۃ کے ایک نسخہ میں یہ لفظ حاء کے زبر کے ساتھ منقول ہے شارحین نے لکھا ہے کہ حَمُولَۃ حاء کے زبر کے ساتھ اس جانور کو کہتے ہیں جس پر بوجھ لادا جاتا ہے اس شخص کی مدد کرے جو بوجھ لادے ہوئے ہو کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے باربرداری کے جانور کی پیٹھ پر لادنے کے لئے یا خود اپنے سر پر یا اپنی پیٹھ پر رکھنے کے لئے کوئی بوجھ اٹھانا چاہتا ہو۔ تو اس بوجھ کے اٹھانے سے اس کی مدد کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سلام کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے

(۳۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ وَنَفَخَ فِیْهِ الرُّوْحَ عَطَسَ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَحَمِدَ اللّٰهَ بِاِذْنِهٖ فَقَالَ لَهٗ رَبُّهٗ یَرْحَمُكَ اللّٰهُ یَا اٰدَمُ اذْهَبْ اِلٰی اُولٰئِكَ الْمَلَائِكَةِ اِلٰی مَلَاءٍ مِنْهُمْ جُلُوْسٍ فَقُلِ السَّلَامُ عَلَیْكُمْ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْكُمْ قَالُوْا عَلَیْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰی رَبِّهٖ فَقَالَ اِنَّ هٰذِهٖ تَحِیَّتُكَ وَتَحِیَّةُ بَنِیْكَ بَیْنَهُمْ فَقَالَ لَهُ اللّٰهُ وَیَدَاهُ مَقْبُوْضَتَانِ اخْتَرْ اَیَّتَهُمَا شِئْتَ فَقَالَ اخْتَرْتُ یَمِیْنَ رَبِّیْ وَكِلْتَا یَدَیْ رَبِّیْ یَمِیْنٌ مُبَارَكَةٌ ثُمَّ بَسَطَهَا فَاِذَا فِیْهَا اٰدَمُ وَذُرِّیَّتُهٗ فَقَالَ اَیْ رَبِّ مَا هٰؤُلَاءِ قَالَ هٰؤُلَاءِ ذُرِّیَّتُكَ فَاِذَا كُلُّ اِنْسَانٍ مَكْتُوْبٌ عُمْرُهٗ بَیْنَ عَیْنَیْهِ فَاِذَا فِیْهِمْ رَجُلٌ اَضْوَءُهُمْ اَوْ مِنْ اَضْوَءِهِمْ قَالَ یَارَبِّ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا ابْنُكَ دَاوٗدُ وَقَدْ كَتَبْتُ لَهٗ عُمْرَهٗ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً قَالَ یَا رَبِّ زِدْفِیْ عُمْرِهٖ قَالَ ذٰلِكَ الَّذِیْ كَتَبْتُ لَهٗ قَالَ اَیْ رَبِّ فَاِنِّیْ قَدْ جَعَلْتُ لَهٗ مِنْ عُمْرِیْ سِتِّیْنَ سَنَةً قَالَ اَنْتَ وَذَاكَ قَالَ ثُمَّ سَكَنَ الْجَنَّةَ مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ اُهْبِطَ مِنْهَا وَكَانَ اٰدَمُ یَعُدُّ لِنَفْسِهٖ فَاَتَاهُ مَلَكُ الْمَوْتِ قَالَ لَهٗ اٰدَمُ قَدْ عَجِلْتَ قَدْ كُتِبَ لِیْ اَلْفُ سَنَةٍ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنَّكَ جَعَلْتَ لِابْنِكَ دَاوٗدَ سِتِّیْنَ سَنَةً فَجَحَدَ فَجَحَدَتْ ذُرِّیَّتُهٗ وَنَسِیَ فَنَسِیَتْ ذُرِّیَّتُهٗ قَالَ فَمِنْ یَوْمَئِذٍ اُمِرَ بِالْكِتَابِ وَالشُّهُوْدِ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا اور ان کے جسم میں روح پھونکی تو ان کو چھینک آئی انہوں نے الحمد للہ کہا اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق و اجازت سے خدا کی حمد کی، اللہ تعالیٰ نے ان کی حمد کے جواب میں فرمایا یرحمک اللہ، یعنی تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہو۔ اور پھر فرمایا، آدم (علیہ السلام) فرشتوں کی اس جماعت کے پاس جاؤ جو وہاں بیٹھی ہوئی ہے اور کہو کہ السلام علیکم۔ (چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام ان فرشتوں کے پاس گئے اور ان کو سلام کیا) فرشتوں نے (جواب میں) کہا کہ علیک السلام ورحمۃ اللہ۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اپنے پروردگار کے پاس آئے (یعنی اس جگہ لوٹ کر آئے جہاں پروردگار نے ان سے کلام کیا تھا) اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا یہ (یعنی السلام علیکم ورحمۃ اللہ) تمہاری اور تمہاری اولاد کی دعا ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو دیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا، درآنحالیکہ اس کے دونوں ہاتھ بند تھے کہ ان دونوں ہاتھوں میں سے جس کو چاہو پسند کر لو۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ میں نے اپنے پروردگار کے داہنے ہاتھ کو پسند کر لیا۔ اور میرے پروردگار کے دونوں ہاتھ داہنے بابرکت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس ہاتھ کو کھولا تو حضرت آدم علیہ السلام نے کیا دیکھا کہ اس میں آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی اولاد کی صورتیں دیکھیں انہوں نے پوچھا کہ پروردگار! یہ کون ہیں؟ پروردگار نے فرمایا۔ یہ تمہاری اولاد ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ بھی دیکھا کہ ہر مسلمان کی عمر اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھی ہوئی ہے، پھر ان کی نظر ایک ایسے انسان پر پڑی جو سب سے زیادہ روشن تھا یا ان میں کے روشن ترین لوگوں میں سے ایک تھا حضرت آدم علیہ السلام نے اس انسان کو دیکھ کر پوچھا کہ میرے پروردگار! یہ کون ہے؟ پروردگار نے فرمایا یہ تمہارا بیٹا داؤد (علیہ السلام) ہے اور میں نے اس کی عمر چالیس سال لکھی ہے حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ پروردگار! اس

کی عمر کچھ اور بڑھا دے پروردگار نے فرمایا یہ وہ چیز ہے جس کو میں اس کے حق میں لکھ چکا ہوں حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ پروردگار (اگر اس کی عمر لکھی جا چکی ہے) تو میں اپنی عمر سے ساٹھ سال اس کو دیتا ہوں، پروردگار نے فرمایا تم جانو اور تمہارا کام جانے یعنی اس معاملہ میں تم مختار ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام جنت میں رہے جب تک کہ اللہ نے چاہا اور پھر ان کو (جنت سے) زمین پر اتار اگیا اور حضرت آدم علیہ السلام برابر اپنی عمر کے سالوں کو گنتے رہے (یہاں تک کہ ان کی عمر نو سو چالیس سال ہوئی تو) موت کا فرشتہ روح قبض کرنے کے لئے ان کے پاس آیا حضرت آدم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم نے جلدی کی میری عمر تو ایک ہزار سال کی مقرر کی گئی ہے، فرشتے نے کہا کہ یہ (صحیح ہے) لیکن آپ نے اپنی عمر کے ساٹھ سال اپنے بیٹے داؤد کو دیدیئے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے انکار کیا اور ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے نیز حضرت آدم علیہ السلام اس ممانعت کو بھول گئے تھے جو حق تعالیٰ کی طرف سے مشہور درخت کا پھل کھانے سے متعلق تھی اور ان کی اولاد بھی بھولی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس دن سے لکھنے اور گواہ بنانے کا حکم دیا گیا۔" (ترمذی)

تشریح: درآنحالیکہ اس کے دونوں ہاتھ بند تھے ان الفاظ سے اس ہیئت کذائی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے ہاتھوں میں کوئی چیز بند کر کے اس کو چھپالیتا ہے۔

"اور میرے پروردگار کے دونوں ہاتھ داہنے بابرکت ہیں" یہ جملہ یا تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا تھا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل کیا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے، بہر صورت حق تعالیٰ کی طرف ہاتھ اور داہنے ہاتھ کی نسبت کرنا متشابہات میں سے ہے۔ البتہ علماء نے ان الفاظ کے کئی معنی اور تاویلات بیان کی ہیں ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے "ید" ہاتھ کی صفت تو ثابت ہے لیکن ظاہری و جسمانی ہاتھ ثابت نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ عبارت جسمانی ہاتھ کی نفی کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کے لئے جسمانی ہاتھ ثابت نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ عبارت جسمانی ہاتھ کی نفی کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کے لئے جسمانی ہاتھ ثابت ہوتے تو یمین و شمال دایاں اور بایاں بھی ہوتا اور دونوں ہاتھ داہنے بابرکت ہیں سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہاں خیر و برکت کا وجود مراد ہے جو یدیمین داہنے ہاتھ اور لفظ یمین کے مادہ اشتقاق یمن معنی برکت کا تقاضہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح قوت اور گرفت میں مخلوقات کا بایاں ہاتھ کمزور اور ناقص ہوتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں کوئی کمزوری نہیں ہے بلکہ اس کے دونوں ہاتھ یکساں زور و قوت رکھتے ہیں، اس اعتبار سے اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہوئے، یہ بات اس طرح گویا سمجھانے کے لئے بیان کی گئی ہے ورنہ اس عبارت کی اصل مراد یہ بیان کرنا ہے کہ حق تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی طرح کی کوئی کمزوری اور نقص نہیں ہے اور اس کی تمام صفات کامل ہیں۔

اور تیسرے یہ کہ ان الفاظ کا مقصد حق تعالیٰ کے جود و کرم اور احسان و انعام کی صفت کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرنا ہے، چنانچہ اہل عرب جب کسی ایسے شخص کی توصیف کرنا چاہتے تو بہت زیادہ نفع پہنچانے والا ہوتا تو اس کے حق میں یہ کہتے کہ، کلتا یدیہ یمین یعنی اس شخص کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔

"جو سب سے زیادہ روشن تھا" اس عبارت سے ذہن میں ایک خلجان پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ اس سے تمام انبیاء پر حضرت داؤد علیہ السلام کی فضیلت لازم آتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس موقع پر حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک طرح کی امتیازی شکل و صورت میں ظاہر کیا تاکہ اس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام ان کے بارے میں سوال کریں؛ اور اس سوال پر وہ صورت حال مرتب ہو جو آگے پیش آئی، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کا حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی عمر میں سے ساٹھ سال دینا اور پھر ملک الموت کے آنے پر اس سے انکار کرنا اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے روشن ترین ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تمام صفات کمالیہ میں سب سے ترجیح رکھتے تھے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا مصلحت کے پیش نظر اس عالم میں حق

تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی شکل وصورت میں ایک طرح کی خاص نورانیت ودیعت فرمائی ہو اور بلکہ وہ اس عالم میں بھی اس نورانیت سے متصف رہے ہوں، چنانچہ پیغمبروں میں سے ہر ایک نبی علیہ السلام کسی نہ کسی خاص صفت سے موصوف رہا ہے اور اس صفت میں ان کو امتیازی حیثیت وخصوصیت حاصل رہی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ محض اس خاص صفت کی بنا پر اس نبی علیہ السلام کو دیگر تمام انبیاء پر فضیلت وفوقیت کا درجہ حاصل ہو۔

"میری عمر تو ایک ہزار سال مقرر کی گئی ہے۔" ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ بات بالکل صحیح کہی تھی کیونکہ واقعۃً حق تعالیٰ نے ان کی عمر ایک ہزار سال مقرر کی تھی البتہ اس بات کے ضمن میں ان کا مذکورہ انکار پوشیدہ تھا انہوں نے صریحًا یہ بات نہیں کہی کہ میں نے اپنی عمر سے داؤد علیہ السلام کو کچھ نہیں دیا ہے اور صریحًا انکار ممکن بھی نہیں تھا کیوں کہ انبیاء علیہم السلام کی زبان سے کوئی جھوٹ قصدا اور صریحا صادر نہیں ہوتا، لہٰذا کہا جائے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ انکار بطور تعریض تھا جیسا کہ اس طرح کی بعض صورتیں دیگر انبیاء سے بھی صادر ہوتی ہیں یا یہ کہا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مذکورہ انکار بطریق نسیان تھا یعنی انہیں یہ یاد نہیں رہا تھا کہ وہ اپنی عمر میں سے ساٹھ سال داؤد علیہ السلام کو دے چکے ہیں اس لئے انہوں نے ملک الموت کے سامنے اس کا انکار کر دیا۔

عورتوں کو سلام کرنا آنحضرت ﷺ کے لئے مخصوص طور پر جائز تھا

(۳۶) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ مَرَّ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نِسْوَةٍ فَسَلَّمَ عَلَيْنَا۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ ہم عورتوں کے پاس سے گزرے جب کہ ہم کچھ عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں تو آپ ﷺ نے ہمیں یعنی وہاں موجود تمام عورتوں کو سلام کیا۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: عورتوں کو سلام کرنے کی اجازت آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص تھی، کسی دوسرے مسلمان کے لئے جائز نہ تھی اور نہیں ہے کہ وہ اجنبی عورتوں کو سلام کرے جیسا کہ دوسری فصل کی حدیث کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔

سلام کی فضیلت

(۳۷) وَعَنِ الطُّفَيْلِ بْنِ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ اَنَّهُ كَانَ يَاْتِي ابْنَ عُمَرَ فَيَغْدُوْا مَعَهُ اِلَى السُّوْقِ قَالَ فَاِذَا غَدَوْنَا اِلَى السُّوْقِ لَمْ يَمُرَّ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عَلٰى سَقَّاطٍ وَلَا عَلٰى صَاحِبِ بَيْعَةٍ وَلَا مِسْكِيْنٍ وَلَا عَلٰى اَحَدٍ اِلَّا سَلَّمَ عَلَيْهِ قَالَ الطُّفَيْلُ فَجِئْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَوْمًا فَاسْتَتْبَعَنِيْ اِلَى السُّوْقِ فَقُلْتُ لَهُ وَمَا تَصْنَعُ فِي السُّوْقِ وَاَنْتَ لَا تَقِفُ عَلَى الْبَيْعِ وَلَا تَسْاَلُ عَنِ السِّلَعِ وَلَا تَسُوْمُ بِهَا وَلَا تَجْلِسُ فِيْ مَجَالِسِ السُّوْقِ فَاجْلِسْ بِنَا هٰهُنَا نَتَحَدَّثُ قَالَ فَقَالَ لِيْ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ يَا اَبَا بَطْنٍ قَالَ وَكَانَ الطُّفَيْلُ ذَا بَطْنٍ اِنَّمَا نَغْدُوْ مِنْ اَجْلِ السَّلَامِ نُسَلِّمُ عَلٰى مَنْ لَقِيْنَاهُ۔ (رواہ مالک والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت طفیل ابن ابی ابن کعب سے روایت ہے کہ وہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور پھر صبح کے وقت ان کے ساتھ بازار جایا کرتے تھے۔ حضرت طفیل کہتے ہیں کہ جب ہم صبح کے وقت بازار میں جاتے تو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ جس بساطی، جس بیچنے والے، جس مسکین اور جس کسی شخص کے پاس سے بھی گزرتے اس کو سلام کرتے۔ حضرت طفیل کہتے ہے کہ ایک دن (معمول کے مطابق) میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور وہ مجھ کو اپنے ہمراہ بازار لے جانے لگے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ بازار جا کر کیا کریں گے آپ نہ تو کسی خرید وفروخت کی جگہ ٹھہرتے ہیں اور نہ کسی بیچی جانے والی چیز کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ نہ تو مول تول اور کوئی سودا کرتے ہیں اور نہ بازار کی کسی مجلس میں شریک ہوتے ہیں (لہٰذا بازار جانے سے اچھا تو یہی ہے کہ) آپ ہمارے ساتھ یہیں

بیٹھتے تاکہ کچھ باتیں ہی کریں۔ حضرت طفیلؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ نے یہ سنکر مجھ سے کہا کہ اے بڑے پیٹ والے راوی کا بیان ہے کہ طفیلؒ کا پیٹ بڑا تھا کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم خرید و فروخت کرنے یا کسی اور غرض سے بازار جایا کرتے ہیں، نہیں بلکہ ہم صرف سلام کرنے کی غرض سے جاتے ہیں اور ہر اس شخص کو سلام کرتے ہیں جو ہم کو ملتا ہے اور اس طرح ہم بازار جا کر ثواب حاصل کرتے ہیں۔" (مالکؒ، بیہقیؒ)

سلام نہ کرنا بخل ہے

(۳۸) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتٰی رَجُلُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِفُلَانٍ فِیْ حَائِطِیْ عَذْقٌ وَاِنَّہٗ قَدْ اٰذَانِیْ مَکَانُ عَذْقِہٖ فَاَرْسَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ بِعْنِیْ عَذْقَکَ قَالَ لَا قَالَ فَھَبْ لِیْ قَالَ لَا قَالَ فَبِعْنِیْہِ بِعَذْقٍ فِی الْجَنَّۃِ فَقَالَ لَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا رَاَیْتُ الَّذِیْ ھُوَ اَبْخَلُ مِنْکَ اِلَّا الَّذِیْ یَبْخَلُ بِالسَّلَامِ۔

(رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے باغ میں فلاں شخص کا کھجور کا درخت ہے اور صورت حال یہ ہے کہ وہاں اس درخت کے ہونے سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے کیونکہ وہ شخص اپنے اس درخت کی وجہ سے وقت بے وقت میرے باغ میں آتا جاتا ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے کسی کو اس شخص کے پاس بھیجا تاکہ اس کو بلائے جب وہ آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنا کھجور کا درخت میرے ہاتھ فروخت کر دو، اس نے کہا کہ میں فروخت نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس درخت کو بیچنے میں تمہیں کوئی عار محسوس ہوتا ہے تو اس کو میرے نام ہبہ کر دو، اس نے کہا میں ہبہ بھی نہیں کرتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا اس درخت کو تم میرے ہاتھ کھجور کے ایسے درخت کے عوض فروخت کو دو جو تمہیں جنت میں ملے۔ اس نے کہا کہ میں اس طرح بھی فروخت کرتا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا۔ میں نے تم سے بڑا بخیل کسی شخص کو نہیں دیکھا علاوہ اس شخص کے جو سلام کرنے میں بخل کرتا ہے یعنی سلام کے معاملہ میں کوتاہی کرنے والا شخص تم سے بھی بڑا بخیل ہے کہ وہ اتنا ذرا سا کام کر کے بھی زیادہ ثواب حاصل نہیں کرنا چاہتا۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے جو کچھ فرمایا وہ بطریق شفارش تھا، حکم کے طور پر نہیں تھا، اگر آپ ﷺ حکم کے طور پر فرماتے تو وہ انکار کرنے کی ہرگز جرأت نہ کرتا کیونکہ وہ بہرحال مسلمان تھا اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ آنحضرت ﷺ کے کسی حکم سے برملا انکار کسی صورت میں نہیں کر سکتا تھا، ہاں اگر وہ مسلمان نہ ہوتا تو حکم نبوی ﷺ سے اس کا انکار کرنا کوئی تعجب خیز امر نہ ہوتا، لیکن آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ تم اس درخت کو جنّت کے کھجور کے درخت کے بدلے میرے ہاتھ فروخت کردو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یقیناً مسلمان تھا تاہم بخی طبع سے خالی نہیں تھا۔

سلام کرنے میں پہل کی فضیلت

(۳۹) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَادِیُٔ بِالسَّلَامِ بَرِیُٔ مِنَ الْکِبْرِ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔ (رواہ البیہقی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے پاک ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب کہیں آتے جاتے وہ شخص آپس میں ملیں اور دونوں کی حیثیت یکساں نوعیت کی ہو، جیسے دونوں پیدل ہوں، یا دونوں سواری پر ہوں تو ان میں سے جو شخص پہلے سلام کرے گا کہ وہ گویا یہ ظاہر کرے گا کہ خدا نے اس کو تکبر و غرور سے پاک رکھا

ہے۔

یہ بات بھی پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ سلام کرنا سُنت ہے اور سلام کا جواب دینا فرض ہے اگر کوئی شخص مجلس میں آئے اور وہاں سلام کرے تو مجلس والوں پر اس کے سلام کا جواب دینا فرض ہوگا۔

اور اگر وہ شخص اسی مجلس میں دوبارہ آئے اور پھر سلام کرے تو اب اس کے سلام کا جواب دینا ان پر فرض نہیں ہوگا البتہ مستحب ہوگا۔

سلام اور اس کا جواب، دونوں کے الفاظ بصیغہ جمع ہونے چاہئیں، اگرچہ مخاطب فرد واحد ہو، تاکہ ملائکہ جو ہر شخص کے ساتھ ہوتے ہیں، سلام میں مخاطب کے ساتھ وہ بھی شریک ہوں۔

ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک شخص سرخ کپڑے پہنے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص سلام کرتے وقت کسی نامشروع امر کا مرتکب ہو وہ سلام کے جواب کا مستحق نہیں ہوگا۔

بَابُ الْاِسْتِیْذَانِ
اجازت حاصل کرنے کا بیان

ادب وتہذیب کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہو، چنانچہ شریعت نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے گھر جائے تو پہلے دروازے پر کھڑے ہو کر گھر میں آنے کی اجازت طلب کرے، اگر صاحب خانہ گھر میں بلائے تو دروازے کے اندر قدم رکھے ورنہ وہیں سے واپس ہو جائے، اس حکم کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا۔ (الآیۃ)

"اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو، جب تک کہ گھر والوں سے اجازت حاصل نہ کر لو اور ان کو سلام نہ کر لو۔"

اس بارے میں مسنون طریقہ یہ ہے کہ دروازے پر کھڑے ہو کر اہل خانہ کو مخاطب کر کے یوں کہا جائے کہ "السلام علیکم" کیا میں اندر آسکتا ہوں؟

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دروازے پر کھڑے ہو کر تین مرتبہ سلام کرنے کے بعد بھی گھر میں سے جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ

① عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ اَتَانَا اَبُوْ مُوْسٰی قَالَ اِنَّ عُمَرَ اَرْسَلَ اِلَیَّ اَنْ اٰتِیَهٗ فَاَتَیْتُ بَابَهٗ فَسَلَّمْتُ ثَلَاثًا فَلَمْ یَرُدَّ عَلَیَّ فَرَجَعْتُ فَقَالَ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَاْتِیَنَا فَقُلْتُ اِنِّیْ اَتَیْتُ فَسَلَّمْتُ عَلٰی بَابِكَ ثَلَاثًا فَلَمْ تَرُدُّوْا عَلَیَّ فَرَجَعْتُ وَقَدْ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَاْذَنَ اَحَدُكُمْ ثَلٰثًا فَلَمْ یُؤْذَنْ لَهٗ فَلْیَرْجِعْ فَقَالَ عُمَرُ اَقِمْ عَلَیْهِ الْبَیِّنَةَ قَالَ اَبُوْ سَعِیْدٍ فَقُمْتُ مَعَهٗ فَذَهَبْتُ اِلٰی عُمَرَ فَشَهِدْتُّ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ حضرت عمرؓ نے میرے پاس ایک شخص کو بھیج کر مجھے بلا بھیجا تھا جب میں حسب طلب ان کے دروازے پر پہنچا اور اندر آنے کی اجازت طلب کرنے کے لئے تین مرتبہ سلام کیا تو مجھ کو سلام کا جواب نہیں ملا، چنانچہ میں واپس چلا آیا پھر بعد میں ملاقات ہوئی تو حضرت عمرؓ نے مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس آنے سے تمہیں کس چیز نے روکا تھا؟ میں نے کہا کہ میں (آپؓ کے پاس) آیا تھا اور آپؓ کے (دروازے پر کھڑے ہو کر) تین مرتبہ سلام کیا، لیکن آپ نے اس کا جواب نہیں دیا (اور نہ آپ کے کسی خادم ہی نے جواب دیا) لہٰذا میں واپس آ گیا کیوں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ جب تم میں سے کوئی شخص (کسی کے گھر جائے اور دروازے پر کھڑے ہو کر) تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اس کو اجازت نہ ملے تو چاہئے کہ واپس چلا آئے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس حدیث کے گواہ لاؤ (یعنی اس حدیث کے صحیح ہونے پر) گواہ پیش کرو کہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوموسیٰؓ کے ساتھ چلنے کے لئے کھڑا ہوا اور حضرت عمرؓ کے پاس جا کر گواہی دی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابوموسیٰؓ نے حضرت ابوسعید خدری کے سامنے مذکورہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یہ حدیث چونکہ آپ نے بھی آنحضرت ﷺ سے سنی ہے اس لئے میرے ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس چلئے اور ان کے سامنے گواہی دیجئے، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ ان کے ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور یہ گواہی دی کہ حضرت ابوموسیٰؓ نے جو حدیث بیان کی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

حضرت عمرؓ کا گواہ طلب کرنا محض احتیاط کے طور پر تھا کہ دوسرے لوگوں کو حدیث بیان کرنے کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے اور خاص طور پر وہ جھوٹے لوگ جو من گھڑت حدیثیں آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر کے بیان کرنا چاہیں ان کو اس بات کی جرأت نہ ہو سکے ورنہ متفقہ طور پر یہ بات ہے کہ خبر واحد مقبول ہے خاص طور پر اس صورت میں جب کہ راوی حضرت ابوموسیٰ اشعری جیسا صحابی ہو جو کبار صحابہ میں سے ہیں۔

دروازے پر کھڑے ہو کر تین بار سلام اس لئے کرنا چاہئے کہ ایک سلام تو تعرف کے لئے ہوگا، دوسرا سلام تأمل کے لئے اور تیسرا سلام اجازت کے لئے ہوگا، یعنی اہل خانہ پہلا سلام سن کر اس شخص کو پہچانیں گے کہ یہ کون شخص ہے اور دوسرا سلام سن کر وہ یہ سوچیں گے کہ آیا اس شخص کو اندر آنے کی اجازت دی جائے یا نہیں اور تیسرا سلام سننے کے بعد اندر آنے کی اجازت دیں گے۔

خاص اجازت

② وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْنُكَ عَلَيَّ اَنْ تَرْفَعَ الْحِجَابَ وَاَنْ تَسْتَمِعَ سِوَادِيْ حَتّٰى اَنْهَاكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میری طرف سے تمہیں یہ اجازت ہے کہ تم پردہ اٹھاؤ اور میری باتیں سنو تا آنکہ میں تمہیں منع نہ کر دوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے آستانۂ اقدس کے دروازے پر جو پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ بورئیے کے تھے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو آنحضرت ﷺ کے گھر کے اندر آنے کی مخصوص اجازت حاصل تھی اور وہ دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت حاصل کرنے کے پابند نہیں تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے فرما دیا تھا کہ میرے پاس تمہارے آنے کی اجازت کی علامت بس یہی ہے کہ تم پردہ، اٹھا کر دیکھو اگر میں سامنے موجود ہوں یا تمہیں یہ معلوم ہو کہ میں ہوں تو اندر چلے آؤ، خواہ میں مخصوص لوگوں سے خفیہ بات چیت ہی کیوں نہ کر رہا ہوں تمہیں اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں البتہ اگر کسی وقت میں تمہارا اندر آنا مناسب نہیں سمجھوں گا اس وقت تمہیں اندر آنے سے منع کر دوں گا اس سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے مرتبہ کا اندازہ

ہوتا ہے کہ انہیں نگاہ نبوت میں کس قدر محبوبیت حاصل تھی اور ان پر آنحضرت ﷺ کی کتنی زیادہ عنایت تھی آپ ﷺ نے ان کو اپنا اتنا مقرب قرار دیا تھا کہ وہ گویا گھر ہی کے ایک فرد ہوگئے تھے اور جب چاہتے گھر میں چلے آتے۔

لیکن واضح رہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی یہ مخصوص اجازت اس صورت سے متعلق تھی جب کہ حجرہ مبارکہ میں عورتوں کے آنے کا وقت نہیں رہتا تھا یا گھر میں عورتیں موجود نہیں ہوتی تھیں، خاص طور سے پردہ کی آیت نازل ہونے کے بعد تو یہ قید ضرور عائد ہوئی ہوگی۔

کسی دروازے پر پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع کرو تو نام بتاؤ

④ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ دَيْنٍ كَانَ عَلٰى اَبِيْ فَدَقَقْتُ الْبَابَ فَقَالَ مَنْ ذَا فَقُلْتُ اَنَا فَقَالَ اَنَا اَنَا كَاَنَّهٗ كَرِهَهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں ایک قرض کے معاملہ میں جو میرے باپ پر تھا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے دروازے کو کھٹکھٹایا، آپ ﷺ نے اندر سے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا کہ میں ہوں آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ میں ہوں، میں ہوں، گویا آپ ﷺ نے میرے اس طرح جواب دینے کو برا سمجھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قرض کا وہ معاملہ جس سلسلے میں حضرت جابرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، یہ تھا کہ ان کے والد حضرت عبداللہ انصاریؓ غزوہ احد میں شہید ہوگئے تھے اور اپنے ذمہ کچھ قرض چھوڑ گئے تھے، جب قرض خواہوں نے حضرت جابرؓ سے اس قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور ان کو تنگ کرنا شروع کر دیا تو وہ مدد چاہنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ اس قرض کی ادائیگی کا کوئی انتظام ہو اور قرض خواہوں سے نجات مل جائے اس وقت حضرت جابرؓ کی ملکیت میں تھوڑی سی کھجوروں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، لیکن اس موقع پر آنحضرت ﷺ کا معجزہ ظاہر ہوا کہ ان کھجوروں میں برکت ہوئی اور اتنی برکت ہوئی کہ حضرت جابرؓ نے ان کھجوروں سے پورا قرض ادا کر دیا اور اس کے بعد بھی وہ جوں کی توں باقی رہیں، ان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

"میں ہوں" کہنے کو آنحضرت ﷺ نے اس لئے برا سمجھا کہ اس جملہ کے ذریعہ ابہام کا ازالہ نہیں ہوتا اور صاحب خانہ پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، گویا یہ کہنے سے اس صورت میں صاحب خانہ کا یہ سوال کہ کون ہے جوں کا توں باقی رہتا ہے، لہٰذا حضرت جابرؓ کو چاہئے تھا کہ وہ نام لقب، یا کنیت بتاتے تاکہ یہ معلوم ہو جاتا کہ باہر دروازے پر کون شخص ہے اگرچہ بعض اوقات محض آواز پہچان لینے سے بھی شخصیت کی وضاحت ہو جاتی ہے، خاص خاص طور سے اس صورت میں جب کہ "میں ہوں" کہنے والا ایسا شخص ہو جس کے ساتھ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا یا اس سے راہ و رسم ہو، چنانچہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "میں ہوں" کی آواز سے حضرت جابرؓ کی آواز کو پہچان لیا ہوگا مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنی ناگواری کا اظہار حضرت جابرؓ کو اس ادب کی تعلیم کے طور پر کیا کہ کسی کے دروازے پر پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع دو صاف طرح سے اپنا نام بتاؤ محض یہ کہنے پر اکتفا نہ کرو کہ "میں ہوں"۔

یہ احتمال بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جابرؓ کے اس طرح کہنے کو اس لئے برا سمجھا کہ انہوں نے سلام کرنے کے ذریعہ اجازت حاصل کرنے کے طریقہ کو ترک کیا جو مسنون ہے۔

آنحضرت ﷺ کا "میں ہوں، میں ہوں" دوبار کہنا حضرت جابرؓ کے اس جواب کو قبول کرنے سے انکار کے طور پر تھا اور اس کا مفہوم گویا یوں تھا کہ میں ہوں میں ہوں کیا کہتے ہو، اپنا نام کیوں نہیں بتاتے؟

بلانے والے کے دروازے پر بھی رک کر اندر آنے کی اجازت مانگنی چاہئے

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ لَبَنًا فِيْ قَدَحٍ فَقَالَ اَبَا هِرٍّ الْحَقْ بِاَهْلِ

الصُّفَّةِ فَادْعُهُمْ اِلَیَّ فَاَتَیْتُهُمْ فَدَعَوْتُهُمْ فَاَقْبَلُوْا فَاسْتَاْذَنُوْا فَاَذِنَ لَهُمْ فَدَخَلُوْا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے رسول کریم ﷺ کے ساتھ (آپ ﷺ کے گھر میں) داخل ہوا تو آپ ﷺ نے گھر میں دودھ کا ایک پیالہ رکھا ہوا پایا آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ابوہریرہؓ! اہل صفہ کے پاس جاؤ اور ان کو میرے پاس بلالاؤ! چنانچہ میں ان کے پاس جاکر ان کو بلالایا جب وہ لوگ آئے تو دروازے پر رک کر اندر آنے کی اجازت چاہی آپ ﷺ نے ان کو اجازت دی تو وہ اندر آگئے!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ایک دوسری حدیث میں یہ بھی منقول ہے کہ اہل صفہ اندر آئے تو آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے دودھ کا وہ پیالہ پیش کیا اور آپ ﷺ کے معجزہ کے سبب سے ان سب نے اس پیالہ کے دودھ کو خوب سیر ہو کر پیا۔

واضح رہے کہ اہل صفہ ان صحابہؓ کی جماعت کو کہا جاتا تھا جو مدینہ میں نہ تو گھر بار رکھتی تھی اور نہ کوئی سلسلہ معاش، بلکہ اپنے فقرو افلاس کے ساتھ مسجد نبوی ﷺ کے باہر ایک چبوترہ پر جمع رہتی تھی اور ہمہ وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر رہ کر اکتساب فیض کرتی تھی ان صحابہؓ کا تعلق انصارؓ سے بھی تھا اور مہاجرینؓ سے بھی یوں تو مدینہ کے عام مسلمان اپنی حیثیت واستطاعت کے مطابق ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے رہتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ بذات خود اکثر و بیشتر ان سب کو اپنے پاس سے کھلاتے پلاتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کو بلانا، اجازت حاصل کرنے کو ساقط نہیں کرتا یعنی اگر کوئی شخص کسی کے بلانے پر اس کے گھر جائے تو اس کو بھی چاہئے کہ وہ دروازہ پر آکر پہلے اجازت طلب کرے اور پھر گھر اندر جائے الایہ کہ بلانے اور آنے میں زیادہ وقت کا فرق نہ ہو آگے...... حدیث آرہی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی شخص کو بلایا جائے اور وہ شخص اس کے ہمراہ آجائے جو بلانے گیا تھا تو اس کے ساتھ آنا ہی اس کے لئے اجازت ہے یعنی اس کو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ بظاہر یہ حدیث مذکورہ بالا حدیث سے مطابقت نہیں رکھتی اس لئے ان دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے علماء نے لکھا ہے کہ اصل مسئلہ یہی ہے کہ بلا کرلانے والے کے ساتھ آنے کی صورت میں اجازت ہے یعنی اس کو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ بظاہر یہ حدیث مذکورہ بالا حدیث سے مطابقت نہیں رکھتی اس لئے اس دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے علماء نے لکھا ہے کہ اصل مسئلہ یہی ہے کہ بلاکر لانے والے کے ساتھ آنے کی صورت میں اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ اہل صفہ نے اسی لئے اجازت چاہی تھی کہ وہ لوگ حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ ہی چلے آتے تو ان کو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی یا یہ کہ وہ لوگ حضرت ابوہریرہؓ کے ہی ساتھ آئے تھے اس صورت میں ان کو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت یا حاجت نہیں تھی لیکن چونکہ ان لوگوں پر ادب وحیا کا انتہائی غلبہ تھا اس لئے ان لوگوں نے اجازت حاصل کرنا ہی بہتر سمجھا یا ان لوگوں کو وہاں کوئی ایسی چیز محسوس ہوئی ہوگی جو اجازت حاصل کرنے کی مقتضی تھی یا یہ کہ ان لوگوں کو یہ حدیث ہی نہیں پہنچی ہوگی، اس لئے انہوں نے اجازت حاصل کی۔ واللہ اعلم

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اجازت طلب کئے بغیر کسی کے گھر میں نہ جاؤ

⑤ عَنْ کَلْدَةَ بْنِ حَنْبَلٍ اَنَّ صَفْوَانَ ابْنَ اُمَیَّةَ بَعَثَ بِلَبَنٍ اَوْجِدَایَةٍ وَضُغَابِیْسَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاَعْلَی الْوَادِیْ قَالَ فَدَخَلْتُ عَلَیْهِ وَلَمْ اُسَلِّمْ وَلَمْ اَسْتَاْذِنْ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِرْجِعْ فَقُلِ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ ءَاَدْخُلُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"حضرت کلدۃ ابن حنبلؓ کہتے ہیں کہ صفوان ابن امیہؓ نے میرے ہاتھ رسول کریم ﷺ کے لئے دودھ، ہرن کا بچہ اور ککڑی بھیجی اور اس وقت رسول کریم ﷺ مکہ کے بالائی کنارہ پر (جس کو معلی کہتے ہیں) قیام پذیر تھے، کلدہؓ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں یونہی چلا گیا تو میں نے (آپ ﷺ کی قیامگاہ میں داخل ہونے سے پہلے) سلام کیا اور نہ اندر آنے کی اجازت مانگی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مجھ فرمایا کہ واپس جاؤ (یعنی یہاں سے نکل کر دروازہ پر جاؤ) اور (وہاں کھڑے ہو کر) کہو کہ السلام علیکم، کیا میں اندر آسکتا ہوں۔"

(ترمذیؒ۔ ابوداؤدؒ)

بلاکر لانے والے کے ساتھ آنیکی صورت میں اجازت کی ضرورت نہیں

⑥ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ فَجَاءَ مَعَ الرَّسُوْلِ فَاِنَّ ذٰلِكَ لَهٗ اِذْنٌ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَّهٗ قَالَ رَسُوْلُ الرَّجُلِ اِلَى الرَّجُلِ اِذْنُهٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی شخص کو بلایا جائے اور وہ اسی کے ساتھ چلا آئے جو اس کو بلانے گیا ہے تو اس کے ساتھ آنا ہی اس کے لئے اجازت ہے۔ (ابوداؤد) اور ابوداؤد ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ کسی شخص کا کسی شخص کو بلانے کے لئے اس کے پاس آدمی بھیجنا ہی اس کی طرف سے اجازت ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا آدمی بھیج کر کسی کو اپنے گھر بلائے اور وہ بلا کر لانے والے ہی کے ساتھ چلا آئے تو اس صورت میں اس کو اس بات کی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے اجازت مانگے اور پھر گھر میں داخل ہو۔

آنحضرت ﷺ کسی کے گھر جاتے تو اجازت مانگنے کے لئے دروازے پر کس طرح کھڑے ہوتے

⑦ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتٰى بَابَ قَوْمٍ لَمْ يَسْتَقْبِلِ الْبَابَ مِنْ تِلْقَاءِ وَجْهِهٖ وَلٰكِنْ مِنْ رُكْنِهِ الْاَيْمَنِ اَوِ الْاَيْسَرِ فَيَقُوْلُ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَذٰلِكَ اَنَّ الدُّوْرَ لَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا سُتُوْرٌ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَنَسٍ قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ فِيْ بَابِ الضِّيَافَةِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کسی گھر جانے کے لئے اس کے دروازہ پر پہنچتے تو دروازہ کی طرف منہ کر کے کھڑے نہ ہوتے (تاکہ گھر والوں پر نظر نہ پڑ جائے) بلکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور پھر اجازت مانگنے کے لئے، فرماتے، السلام علیکم، السلام علیکم، اور دروازے کے سامنے کھڑے نہ ہونے کی وجہ یہ ہوا کرتی تھی کہ اس زمانہ میں دروازوں پر پردے نہ پڑے ہوئے تھے۔ (ابوداؤدؒ) اور انسؓ کی یہ روایت قال علیہ الصلوۃ والسلام السلام علیکم ورحمۃ اللہ باب الضیافۃ میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: ایک سے زائد بار سلام کرنے کی وجہ یہ تھی تاکہ صاحب خانہ اچھی طرح سن لے اور اجازت دے سکے واضح رہے کہ یہاں السلام علیکم جو دوبار ذکر کیا گیا ہے تو اس سے تعدد مراد ہے دوبار پر اقتصار مراد نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کسی کے دروازے پر کھڑے ہو کر تین بار سلام فرماتے تھے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

روایت کے آخری الفاظ، دروازے کے سامنے کھڑے نہ ہونے کی وجہ سے یہ سمجھا گیا ہے کہ اگر دروازے پر کواڑ ہوں یا اس پر پردے پڑے ہوئے ہوں تو اس صورت میں دروازے کے سامنے کھڑے ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اصل سنّت کی رعایت کے پیش نظر اولیٰ یہی ہے کہ اس صورت میں بھی دروازے کے سامنے سے ہٹ کر دائیں یا بائیں طرف کھڑا ہو، اور اس لئے بھی کہ بعض اوقات کواڑ یا پردہ کھولتے ہوئے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے شخص کی نظر اندر چلی جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اپنی ماں وغیرہ کے گھر میں بھی اجازت لے کر جاؤ

⑧ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَسْتَاذِنُ عَلٰى اُمِّي فَقَالَ نَعَمْ فَقَالَ رَجُلٌ اِنِّي مَعَهَا فِي الْبَيْتِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَاذِنْ عَلَيْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّي خَادِمُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَاذِنْ عَلَيْهَا اَتُحِبُّ اَنْ تَرَاهَا عُرْيَانَةً قَالَ لَا قَالَ فَاسْتَاذِنْ عَلَيْهَا۔ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلًا۔

"حضرت عطاء ابن یسارؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں اپنی ماں کے پاس جانے میں بھی اجازت طلب کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" (کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اس کے جسم کے اعضاء کھلے ہوئے ہوں جو بیٹے کو بھی دیکھنا جائز نہیں ہیں) اس شخص نے کہا کہ میں اس کے ساتھ ہی رہتا ہوں (یعنی میں اور میری ماں دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، اس صورت میں مجھے اجازت طلب کرنے کی کیا ضرورت ہے، گویا اس شخص نے گمان کیا کہ اجازت حاصل کرنا اسی شخص کے مشروع ہے جو بیگانہ ہو اور کبھی کبھار آتا جاتا ہو) رسول کریم ﷺ نے فرمایا (جب تم گھر میں داخل ہونا چاہو یا ایک ہی گھر میں وہ کسی علیحدہ جگہ کسی کمرے وغیرہ میں ہو اور) تم اس کے پاس جانا چاہو تو اجازت حاصل کر کے جاؤ اس نے کہا کہ میں اپنی ماں کا خادم ہوں (یعنی میں اپنی ماں کی دیکھ بھال اور خدمت کرنے کے لئے اس کے پاس بار بار آتا جاتا ہوں تو کیا شرعی قواعد کے مطابق دفع حرج کے لئے ہر بار اجازت طلب کرنے کی پابندی مجھ سے ہٹ سکتی ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا بہر صورت اجازت حاصل کر کے اس کے پاس جاؤ (اگرچہ اجازت کا حاصل کرنا، کھنکارنے پاؤں کی آہٹ اور بلند آواز سے بولنے کی ہی صورت میں کیوں نہ ہو) کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھو؟ یعنی تم اگر بغیر اجازت حاصل کئے اچانک اس کے پاس چلے جاؤ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس وقت وہ کسی وجہ سے برہنہ بیٹھی ہو اور تمہاری نظر اس پر پڑ جائے۔ اس شخص نے کہا کہ (ہرگز نہیں) آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر اجازت حاصل کر کے اس کے پاس جایا کرو اس روایت کو امام مالکؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس سلسلے میں ماں ہی کے حکم میں دیگر محارم بھی ہیں خواہ ان سے نسبی تعلق ہو یا دودھ کا اور خواہ سسرالی، حاصل یہ کہ جن عورتوں سے پردہ کرنا شرعی طور پر ضروری نہیں ہے اور جن کو محارم کہا جاتا ہے اگر ان کے پاس بھی جائے تو اجازت حاصل کئے بغیر نہ جانا چاہئے البتہ بیوی اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔

اجازت کا ایک طریقہ

⑨ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ لِي مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَدْخَلٌ بِاللَّيْلِ وَمَدْخَلٌ بِالنَّهَارِ فَكُنْتُ اِذَا دَخَلْتُ بِاللَّيْلِ تَنَحْنَحَ لِي۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے پاس رات کو بھی اور دن کو بھی آیا جایا کرتا تھا، چنانچہ جب میں رات کے وقت حاضر ہوتا تو آپ ﷺ مجھے اجازت دینے کے لئے کنکھار دیتے تھے۔" (نسائی)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ رات کے وقت اجازت دینے کی علامت کھنکارنا تھا، رہی یہ بات کہ دن کے وقت حاضری کی صورت میں کون سی علامت مقرر تھی تو احتمال ہے کہ اس صورت کے لئے امر بالعکس مراد ہو، یعنی حضرت علیؓ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رات کے وقت تو آنحضرت ﷺ کھنکارتے تھے جو میرے لئے اجازت کے مرادف ہوتا اور جب میں دن کے وقت حاضر ہوتا تو خود کھنکار کر اندر جاتا تھا۔

اس حدیث سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا کھنکارنا اجازت کی علامت تھا، لیکن ایک دوسری روایت میں حضرت علیؓ یہ فرماتے ہیں کہ جب میں رات کے وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ ﷺ کھنکار دیتے تو میں واپس ہو جاتا، اس لئے یہ واضح ہوتا ہے کہ کھنکارنا عدم اجازت کی علامت ہوتا ہے، لہذا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھنکارنا صرف اجازت ہی کی علامت نہیں ہوتا تھا بلکہ کوئی ایسا قرینہ ہوگا جس کے ذریعہ بعض اوقات تو کنکھارنا اجازت کی علامت سمجھا جاتا تھا اور بعض اوقات اس کو عدم اجازت کی علامت سمجھتے ہوں گے، لہذا وہ قرینہ جس صورت اجازت یا عدم اجازت کو ظاہر کرتا، حضرت علیؓ اسی پر عمل کرتے۔

سلام نہ کرنے والے کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دو

⑮ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَاذَنُوْا لِمَنْ لَمْ یَبْدَأْ بِالسَّلَامِ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص سلام سے پہل نہ کرے اس کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دو۔"
(بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے پاس آنا چاہے لیکن وہ سلام کے ذریعہ اندر آنے کی اجازت طلب نہ کرے یا تمہارے پاس پہنچ کر تمہیں سلام نہ کرے تو اس کو اپنے پاس آنے یا اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت نہ دو بلکہ اس سے کہو کہ وہ دروازے پر واپس جا کر پہلے سلام کرے اور پھر اجازت پانے پر اندر آئے۔

بَابُ الْمُصَافَحَةِ وَالْمُعَانَقَةِ

مصافحہ اور معانقہ کا بیان

"مصافحہ" کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ دست یکدیگر را گرفتن۔ دو آدمیوں کا باہم ایک دوسرے سے ہاتھ ملانا۔ معانقہ کے بارے میں یہ کہا گیا ہے دست در گردن یکدیگر در آوردن۔ یعنی دو آدمیوں کا باہم ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالنا یا دو آمیوں کا باہم ایک دوسرے کو سینے سے لگانا۔

مصافحہ اور معانقہ کے احکام

باہمی ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا سُنت ہے، نیز دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا چاہئے، محض ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا غیر مسنون ہے کسی خاص موقعہ یا کسی خاص تقریب کے وقت مصافحہ ضروری سمجھنا غیر شرعی بات ہے چنانچہ بعض مقامات پر جو یہ رواج ہے کہ کچھ لوگ عصر کی نماز یا جمعہ کے بعد ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور ہمارے علماء نے تصریح کی ہے کہ تخصیص وقت کے سبب اس طرح کا مصافحہ مکروہ ہے اور بدعت مذمومہ ہے ہاں اگر کوئی شخص مسجد میں آئے اور لوگ نماز میں مشغول ہوں یا نماز شروع کرنے والے ہوں اور وہ شخص نماز ہو جانے کے بعد ان لوگوں سے مصافحہ کرے تو یہ مصافحہ بلاشبہ مسنون مصافحہ ہے بشرطیکہ اس نے مصافحہ سے پہلے سلام بھی کیا ہو، تاہم یہ واضح رہے کہ اگرچہ کسی متعین اور مکروہ وقت میں مصافحہ کرنا مکروہ ہے لیکن اگر کوئی شخص اس وقت مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے تو اس کی طرف سے ہاتھ کھینچ لینا اور اس طرح بے اعتنائی برتنا مناسب نہیں ہوگا کیوں کہ اس کی وجہ سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھانے والے شخص کو دکھ پہنچے گا اور کسی مسلمان کو دکھ نہ پہنچانا آداب کی رعایت سے زیادہ اہم ہے۔

جوان عورت سے مصافحہ کرنا حرام ہے اور اس بوڑھی عورت سے مصافحہ کرنے سے کوئی مضائقہ نہیں ہے جس کی طرف جنسی جذبات مائل نہ ہو سکتے ہوں چنانچہ منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے دور خلافت میں ان بوڑھیوں سے مصافحہ کرتے تھے جن کا

دودھ انہوں نے پیا تھا، اسی طرح وہ بڈھا مرد جو جنسی جذبات کی فتنہ خیزیوں سے بے خوف ہو چکا ہو اس کو جوان عورت سے مصافحہ کرنا جائز ہے، عورت کی طرح خوش شکل امرد سے بھی مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے۔ واضح رہے کہ جس کو دیکھنا حرام ہے اس کو چھونا بھی حرام ہے، بلکہ چھونے کی حرمت، دیکھنے کی حرمت سے زیادہ سخت ہے جیسا کہ مطالب المؤمنین میں مذکور ہے۔

صلوٰۃ مسعودی میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص سلام کرے تو اپنا ہاتھ بھی دے یعنی مصافحہ کے لئے ہاتھ دینا سُنّت ہے لیکن مصافحہ کا یہ طریقہ ملحوظ رہے کہ ہتھیلی کو ہتھیلی پر رکھے محض انگلیوں کے سروں کو پکڑنے پر اکتفانہ کرے کیوں کہ محض انگلیوں کے سروں کو پکڑنا مصافحہ کا ایسا طریقہ ہے جس کو بدعت کہا گیا ہے۔

معانقہ یعنی ایک دوسرے کو سینے سے لگانا مشروع ہے خاص طور سے اس وقت جب کہ کوئی شخص سفر سے آیا ہو جیسا کہ حضرت جعفر ابن ابی طالب کی حدیث منقول ہے، لیکن اس کی اجازت اسی صورت میں ہے جب کہ اس کی وجہ سے کسی برائی میں مبتلا ہو جانے یا کسی شک و شبہ کے پیدا ہو جانے کا خوف نہ ہو۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے بارے میں منقول ہے کہ یہ دونوں حضرات معانقہ اور تقبیل یعنی ہاتھ کو منہ اور آنکھوں کے ذریعہ چومنے کی کراہت کے قائل ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ معانقہ کے بارے میں نہی (ممانعت) منقول ہے [illegible]نانچہ فصل اول میں حضرت انسؓ کی روایت سے یہ نہی ثابت ہوتی ہے یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ جن روایتوں سے معانقہ کی اجازت [illegible]ابت ہوتی ہے ان کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب کہ معانقہ کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا تھا۔ بہرحال اس سلسلے میں جو احادیث منقول ہیں اور جن کے درمیان بظاہر اختلاف نظر آتا ہے کہ بعض سے ممانعت کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ اور بعض معانقہ کا تعلق محبّت واکرام کے جذبہ سے ہو وہ بلاشک و شبہ جائز ہے بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ معانقہ کے بارے میں فقہاء کے درمیان جو اختلاف ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ جسم پر کپڑے نہ ہوں بدن پر قمیص و جبہ وغیرہ ہونے کی صورت میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ بالا اتفاق جائز ہے۔

تقبیل یعنی ہاتھ یا پیشانی وغیرہ چومنا بھی جائز ہے بلکہ بزرگان دین اور متبعین سُنّت علماء کے ہاتھ پر بوسہ دینے کو بعض حضرات نے مستحب کہا ہے۔ لیکن مصافحہ کے بعد خود اپنا ہاتھ چومنا کچھ اصل نہیں رکھتا بلکہ یہ جاہلوں کا طریقہ ہے اور مکروہ ہے۔

امرائے سلطنت اور علماء مشائخ کے سامنے زمین بوسی کرنا حرام ہے، زمین بوسی کرنے والا اور اس زمین بوسی پر راضی ہونے والا دونوں ہی گنہ گار ہوتے ہیں۔ فقیہ ابو جعفرؒ کہتے ہیں کہ سلطان و حاکم کے سامنے زمین بوسی اور سجدہ کرنے والا کافر ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کی زمین بوسی و سجدہ عبادت کی نیت سے ہو اور اگر تحیۃ سلام کے طور پر ہو تو کافر نہیں ہوتا لیکن آثم اور کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور بعض علماء کے قول کے مطابق کسی بھی طرح کی نیت نہ ہونے کی صورت میں بھی کافر ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اکثر علماء کے نزیک زمین بوسی کرنا، زمین پر ماتھا ٹیکنے یا رخسارہ رکھنے سے ہلکا فعل ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ کسی عالم یا سلطان و حاکم کے ہاتھ کو چومنا ان کے علم و انصاف کی بنا پر اور دین کے اعزاز واکرام کے جذبہ سے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اور اگر ان کے ہاتھ چومنے کا تعلق کسی دنیاوی غرض و منفعت سے ہو تو سخت مکروہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص کسی عالم یا کسی بزرگ سے اس کا پیر چومنے کی درخواست کرے تو اس کو ہرگز نہیں ماننا چاہئے بچوں کو بوسہ سے پیار کرنے کی اجازت ہے اگرچہ غیر کا بچہ ہو بلکہ وہاں طفل پر بوسہ دینا مسنون ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو بوسہ شرعی طور پر جائز ہے اس کی پانچ صورتیں ہیں ایک تو مودت و محبت کا بوسہ جیسے والدین کا اپنے بچے کے رخسار کو چومنا، دوسرے احترام و اکرام اور رحمت کا بوسہ، جیسے اولاد کا اپنے والدین کے سر پر بوسہ دینا، تیسرے جنسی جذبات کے تحت بوسہ دینا، جیسے شوہر کا بیوی کے چہرہ کا بوسہ لینا، چوتھے تحیۃ سلام کا بوسہ جیسے مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ہاتھ کو چومنا، اور پانچویں وہ بوسہ جو بہن اپنے بھائی کی پیشانی کا لیتی ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھ اور چہرہ کا بوسہ دینا مکروہ ہے،

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ چھوٹے بچے کا بوسہ لینا واجب ہے۔
امام نوویؒ نے یہ لکھا ہے کہ شوہر بیوی کے علاوہ کسی اور کا جنسی جذبات کے تحت بوسہ لینا بالاتفاق حرام ہے خواہ وہ باپ ہو یا کوئی دوسرا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مصافحہ مشروع ہے

① عَنْ قَتَادَةَ قَالَ قُلْتُ لِاَنَسٍ اَكَانَتِ الْمُصَافَحَةُ فِيْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ۔ (رواه البخاری)

"حضرت قتادہ تابعیؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ کیا رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ (باہمی ملاقات کے وقت سلام کے بعد) مصافحہ کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا ہاں!۔" (بخاریؒ)

بچے کو چومنا مستحب ہے

② وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَبَّلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ ابْنَ عَلِيٍّ وَعِنْدَهُ الْاَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ فَقَالَ الْاَقْرَعُ اِنَّ لِيْ عَشْرَةً مِنَ الْوَلَدِ مَا قَبَّلْتُ مِنْهُمْ اَحَدًا فَنَظَرَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ مَنْ لَّا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وسنذكر حَدِيْثَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَثَمَّ لُكَعُ فِيْ بَابِ مَنَاقِبِ اَهْلِ بَيْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَذُكِرَ حَدِيْثُ اُمِّ هَانِئٍ فِيْ بَابِ الْاَمَانِ۔ (بخاری ومسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے حسن ابن علیؓ کا بوسہ لیا تو ایک صحابی اقرع ابن حابسؓ نے جو اس وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہا کہ میرے دس بچے ہیں اور میں نے ان میں سے کسی کا کبھی بوسہ نہیں لیا۔ رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا یعنی جو شخص اپنی اولاد یا مخلوق خدا پر لطف و شفقت نہیں کرتا اس پر اللہ کی رحمت و شفقت نہیں ہوتی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت اَثَمَّ لُكَعُ کو ہم انشاء اللہ مناقب اہل بیت نبی ﷺ وعلیہم اجمعین کے باب میں نقل کریں گے اور حضرت اُمّ ہانیؓ کی روایت باب الامان میں نقل کی جا چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

مصافحہ کی فضیلت و برکت

③ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ اِلَّا غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ اَنْ يَتَفَرَّقَا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ دَاوُدَ قَالَ اِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ فَتَصَافَحَا وَحَمِدَا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَاهُ غُفِرَ لَهُمَا۔

"حضرت براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب دو مسلمان ملتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے خدا ان کو بخش دیتا ہے۔ (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور ابوداؤدؒ کی روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب دو مسلمان ملیں، ایک دوسرے سے مصافحہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی حمد کریں اور بخشش چاہیں تو ان دونوں کو

بخشدیا جاتا ہے۔"

تشریح: حکیم ترمذیؒ اور ابوالشیخؒ نے حضرت عمرؓ سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب دو مسلمان ملتے ہیں اور ان میں کا ایک اپنے دوسرے ساتھی کو سلام کرتا ہے تو ان میں سے وہ مسلمان اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے جو کشادہ پیشانی اور بشاشت کے ساتھ اپنے دوسرے ساتھی سے ملتا ہے اور پھر جب دونوں مصافحہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر سو رحمتیں نازل کرتا ہے نوے رحمتیں تو اس پر جس نے پہل کی اور دس رحمتیں اس پر جس سے مصافحہ کیا ہے۔

سلام کے وقت جھکنا ممنوع ہے

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ الرَّجُلُ مِنَّا يَلْقٰى اَخَاهُ اَوْ صَدِيْقَهٗ اَيَنْحَنِىْ لَهٗ قَالَ لَا قَالَ اَفَيَلْتَزِمُهٗ وَيُقَبِّلُهٗ قَالَ لَا قَالَ اَفَيَاْخُذُ بِيَدِهٖ وَيُصَافِحُهٗ قَالَ نَعَمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) ہم میں سے کوئی جب اپنے مسلمان بھائی یا اپنے دوست سے ملاقات کرے تو کیا وہ جھک جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اس شخص نے کہا کہ کیا اس سے گلے ملے اور اس کو بوسہ دے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اس نے کہا تو کیا اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے مصافحہ کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں"!۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کے وقت جھکنا، جیسا کہ کچھ لوگوں کا معمول ہے اور بعض جگہوں پر اس کا رواج ہے، خلاف سُنّت ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس کو اس بنا پر پسند نہیں فرمایا کہ یہ چیز رکوع کے حکم میں ہے اور رکوع اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

یحیٰی نے محی السنۃ سے نقل کیا ہے کہ سلام کے وقت پیٹھ جھکانا مکروہ ہے کیوں کہ اس کی ممانعت میں صحیح حدیث منقول ہے اور اگرچہ بعض اہل علم وصلاح نے اس کو اختیار کیا ہے لیکن ان کا فعل ہرگز قابل اعتبار واعتماد نہیں ہے

مطالب المؤمنین میں حضرت شیخ ابو منصور ماتریدیؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے سامنے زمین بوسی کرے یا اس کے آگے پیٹھ کو جھکائے تو اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگا البتہ گنہ گار ہوگا کیونکہ کسی کے آگے زمین بوسی کرنا یا جھکنا تعظیم کی خاطر ہوتا ہے نہ کہ عبادت کی نیت سے (اور اگر کوئی شخص عبادت کی نیت سے اس طرح کا فعل کرے گا تو وہ یقیناً کافر ہو جائے گا)۔

بعض مشائخ نے اس فعل جھکنے کی ممانعت کو بڑی شدت اور سختی کے ساتھ بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ کاد الانحناء ان یکون کفرا یعنی جھکنا، کفر کے نزدیک پہنچا دیتا ہے۔

جو حضرات معانقہ و تقبیل یعنی گلے لگانا اور ہاتھ وغیرہ چومنے کو مکروہ کہتے ہیں جیسا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمد سے منقول ہے، وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، تاہم جو حضرات ان چیزوں کی کراہت کے قائل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ معانقہ و تقبیل مکروہ ہے، جو تملق یعنی بیجا خوشامد اور تعظیم کے طور پر ہو، یا جس معانقہ و تقبیل سے کسی برائی میں مبتلا ہو جانے یا شک و شبہ کے پیدا ہو جانے کا خوف ہو ورنہ اس صورت میں گلے لگنا اور ہاتھ وغیرہ چومنا جائز ہے جب کسی کو رخصت کیا جائے یا کوئی سفر سے آئے یا کسی سے بہت دنوں کے بعد ملاقات نصیب ہوئی ہو اور یا بوجہ اللہ کسی کی محبّت کا غلبہ اس کا متقاضی ہو۔

سلام، مصافحہ سے پورا ہوتا ہے

⑤ وَعَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَمَامُ عِيَادَةِ الْمَرِيْضِ اَنْ يَّضَعَ اَحَدُكُمْ يَدَهٗ عَلٰى جَبْهَتِهٖ اَوْ عَلٰى يَدِهٖ فَيَسْاَلُهٗ كَيْفَ هُوَ وَتَمَامُ تَحِيَّاتِكُمْ بَيْنَكُمُ الْمُصَافَحَةُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَضَعَّفَهٗ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مریض کی پوری عیادت یہ ہے کہ تم میں سے کوئی اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر یا اس کے ہاتھ پر رکھے اور پھر پوچھے کہ اس کا کیا حال ہے اور تمہارا پورا اسلام کہ جو تم آپس میں کرتے ہو مصافحہ ہے یعنی جب تم سلام کرو تو مصافحہ بھی کرو تاکہ سلام پورا اور کامل ہو اس روایت کو احمدؒ و ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور اس کو ضعیف کہا ہے۔"

سفر سے آنے والے کے ساتھ معانقہ و تقبیل بلا کراہت جائز ہے

(۶) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَدِمَ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ الْمَدِيْنَةَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَيْتِيْ فَاَتَاهُ فَقَرَعَ الْبَابَ فَقَامَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرْيَانًا يَجُرُّ ثَوْبَهٗ وَاللّٰهِ مَارَاَيْتُهٗ عُرْيَانًا قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ فَاعْتَنَقَهٗ وَقَبَّلَهٗ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ زید ابن حارثہؓ جو مشہور صحابیؓ ہیں اور جن کو آنحضرت ﷺ نے بیٹا بنایا تھا، کسی غزوہ یا سفر سے لوٹ کر مدینہ پہنچے تو اس وقت رسول کریم ﷺ میرے گھر میں تشریف فرما تھے، زیدؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے میرے گھر آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، رسول کریم ﷺ برہنہ بدن اپنے کپڑے یعنی چادر کو کھینچتے ہوئے زیدؓ سے ملنے کے لئے باہر تشریف لے گئے (یعنی اس وقت آنحضرت ﷺ کے جسم مبارک پر تہبند کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں تھا اور آپ ﷺ اسی حالت میں دروازہ پر تشریف لے گئے) قسم ہے خدا کی میں نے اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی آپ ﷺ کو برہنہ نہیں دیکھا یعنی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے کسی کے استقبال کے وقت اس طرح اظہار شوق و تمنا کیا ہو اور اس سے ملنے کے لئے برہنہ بدن باہر تشریف لے گئے ہوں، بہر حال آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو گلے لگایا اور بوسہ دیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہ حدیث اور اسی طرح حضرت جعفر ابن ابو طالبؓ کی حدیث جو آگے آئے گی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ معانقہ و تقبیل یعنی گلے لگانا اور ہاتھ و پیشانی چومنا جائز ہے اور فقہاء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ سفر سے آنے والے کے ساتھ معانقہ و تقبیل بلا کراہت جائز ہے۔

معانقہ کا جواز

(۷) وَعَنْ اَيُّوْبَ بْنِ بُشَيْرٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ عَنَزَةَ اَنَّهٗ قَالَ قُلْتُ لِاَبِيْ ذَرٍّ هَلْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَافِحُكُمْ اِذَا لَقِيْتُمُوْهُ قَالَ مَا لَقِيْتُهٗ قَطُّ اِلَّا صَافَحَنِيْ وَبَعَثَ اِلَيَّ ذَاتَ يَوْمٍ وَلَمْ اَكُنْ فِيْ اَهْلِيْ فَلَمَّا جِئْتُ اُخْبِرْتُ فَاَتَيْتُهٗ وَهُوَ عَلٰى سَرِيْرٍ فَالْتَزَمَنِيْ فَكَانَتْ تِلْكَ اَجْوَدَ وَاَجْوَدَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ایوب ابن بشیر بنو عنزہ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابوذرؓ سے پوچھا جب آپ لوگ رسول کریم ﷺ سے ملاقات کیا کرتے تھے تو کیا آنحضرت ﷺ آپ لوگوں سے مصافحہ بھی کیا کرتے تھے؟ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میں نے جب آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی تو آنحضرت ﷺ نے مجھ سے مصافحہ کیا اور ایک دن کا واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے بلانے کے لئے میرے پاس ایک شخص کو بھیجا اس وقت میں اپنے گھر میں موجود نہیں تھا جب میں گھر آیا تو مجھے اس کی اطلاع دی گئی، چنانچہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ ﷺ اس وقت ایک تخت پر تشریف فرما تھے آپ ﷺ نے مجھ کو گلے لگایا اور یہ گلے لگانا (حصول لطف و سرور اور برکت کے اعتبار سے مصافحہ کی بہ نسبت) بہتر تھا کہیں زیادہ بہتر۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ سفر سے آنے کے علاوہ دوسری حالتوں میں بھی اظہار محبت و عنایت کے پیش نظر معانقہ کرنا ثابت ہے۔

بارگاہ نبوت ﷺ میں عکرمہؓ ابن ابوجہل کی حاضری کا راز

⑧ وَعَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ اَبِيْ جَهْلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ جِئْتُهُ مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمُهَاجِرِ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت عکرمہؓ ابن ابوجہل کہتے ہیں کہ (فتح مکہ کے بعد) اس دن جب کہ میں (اسلام قبول کرنے کے لئے) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے (مجھے دیکھ کر) فرمایا (اللہ اور رسول (ﷺ) کی طرف یا دار الحرب سے دار السلام کی طرف) ہجرت کرنے والے سوار کو خوش آمدید۔" (ترمذیؒ)

تشریح: سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں حضرت مصعب ابن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے عکرمہؓ ابن ابوجہل کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہوگئے اور چل کر ان کے پاس پہنچے اور پھر ان کو گلے سے لگایا اور فرمایا کہ مرحبا بالراکب المہاجر۔

حضرت عکرمہ اسلام قبول کرنے سے پہلے اپنے باپ ابوجہل کی طرح آنحضرت ﷺ سے سخت عداوت رکھتے تھے اور اسلام کے خلاف ہر معرکہ آرائی میں پیش پیش رہتے تھے ان کا خاص وصف شہ سواری تھا جس میں بڑے مشہور تھے اور بڑے جیالے سوار مانے جاتے تھے فتح مکہ کے دن جب اسلام دشمن عناصر کی طاقت آخری طور پر ٹوٹ کر چور چور ہوگئی اور اس خطہ مقدس پر خدا کے نام لیواؤں کا مکمل تسلط و غلبہ ہوگیا تو یہ عکرمہؓ بھی مکہ سے فرار ہو کر یمن پہنچ گئے، پھر ان کی بیوی اُم حکیم بنت حارث ان کے پاس یمن گئیں اور ان کو اپنے پاس نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائیں اور انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے اپنی گزشتہ تقصیرات پر ندامت کا اظہار کیا اور معافی و بخشش کے طلبگار ہوئے، آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا، اور پھر حسن اسلام کی ایسی دولت نصیب ہوئی کہ قابل رشک بن گئے یہاں تک کہ خدا کے دین کا جھنڈا سربلند رکھنے کے لئے اپنی جان تک قربان کردی اور جنگ یرموک میں شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔

واضح رہے کہ اس حدیث میں سفر سے آنے والے کو خوش آمدید کہنے کا ذکر ہے اور خوش آمدید کہنا مصافحہ سے ایک طرح کی مناسبت رکھتا ہے اس اعتبار سے اس حدیث کو یہاں مصافحہ کے باب میں نقل کیا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بوسہ دینے کا ذکر

⑨ وَعَنْ اُسَيْدِ بْنِ حُضَيْرٍ رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ قَالَ بَيْنَمَا هُوَ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ وَكَانَ فِيْهِ مِزَاحٌ بَيْنَا يُضْحِكُهُمْ فَطَعَنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَاصِرَتِهِ بِعُوْدٍ فَقَالَ اَصْبِرْنِيْ قَالَ اصْطَبِرْ قَالَ اِنَّ عَلَيْكَ قَمِيْصًا وَلَيْسَ عَلَيَّ قَمِيْصٌ فَرَفَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَمِيْصَهٗ فَاحْتَضَنَهٗ وَجَعَلَ يُقَبِّلُ كَشْحَهٗ قَالَ اِنَّمَا اَرَدْتُ هٰذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت اسید ابن حضیرؓ جو انصار میں سے تھے کے بارے میں راوی کہتے ہیں کہ ایک دن اس وقت جب کہ اسیدؓ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے اور ان کے مزاج میں جو خوش طبعی و ظرافت تھی اس کے تحت لوگوں کو ہنسا رہے تھے تو نبی کریم ﷺ نے ازراہ مذاق ان کے پہلو میں ایک لکڑی سے ٹھوکا دیا، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ مجھے اس ٹھوکا دینے کا بدلہ دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ لو! مجھ سے بدلہ لے لو، انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ کے جسم پر کپڑا ہے اور میرے جسم پر کپڑا نہیں تھا (اگر میں کپڑے کے اوپر سے ٹھوکا دوں گا تو بدلہ پورا نہیں ہوگا) نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر اپنا کرتہ اٹھا دیا اسیدؓ آپ ﷺ کے پہلو سے لپٹ گئے اور پہلو پر بوسہ دینا شروع کردیا اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! میں صرف یہی چاہتا تھا یعنی بدن مبارک پر بوسہ دینا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "رَجُلٍ" مصابیح میں جس طرح مذکورہ ہے یعنی لام کے زیر کے ساتھ وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ جس شخص کے مزاج میں خوش طبعی و ظرافت تھی اور جس نے آنحضرت ﷺ سے بدلہ کا مطالبہ کیا وہ خود اسیدؓ ہیں جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہوا، لیکن جامع الاصول میں یہ لفظ "رَجُلٌ" نہیں بلکہ رجلا منقول ہے، چنانچہ روایت کے الفاظ یوں ہیں عن اسید بن حضیر قال ان رجلا من الانصار کان فیہ مزاح فبینما ھو یحدث القوم یضحکم اذ طعنہ النبی (یعنی حضرت اسیدؓ سے روایت ہے کہ انصار میں سے ایک شخص تھے جن کے مزاج میں خوش طبعی و ظرافت تھی چنانچہ ایک موقع پر جب لوگوں سے باتیں کر رہے تھے اور ان کو ہنسا رہے تھے تو نبی کریم ﷺ نے ان کے پہلو میں لکڑی سے ٹھوکا دیا، اس سے یہ واضح ہوا کہ خوش طبعی و ظرافت سے ہنسانے والے اور آنحضرت ﷺ سے بدلہ لینے کا مطالبہ کرنے والے کوئی دوسرے صاحب تھے، خود حضرت اسیدؓ نہیں تھے حضرت اسیدؓ تو ان کے واقع کو نقل کرنے والے ہیں۔

چنانچہ طیبیؒ نے جامع الاصول ہی کی روایت کے پیش نظر متن حدیث کی روایت میں توجیہہ و تاویل کر کے اس بات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ صاحب واقعہ خود اسیدؓ نہیں ہیں بلکہ وہ محض اس واقعہ کے راوی ہیں اور انہوں نے کوشش اس بنا پر کی ہے کہ حضرت اسیدؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے ان کا تعلق اونچے درجہ کے صحابہؓ کے زمرہ سے تھا لہٰذا ان کی جلالت شان سے یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق خود ان کی ذات سے ہو، واللہ اعلم۔

آنحضرت ﷺ نے ان کو پہلو میں ایک لکڑی سے ٹھوکا دیا ان الفاظ کا محمول یہ ہے کہ وہ صاحب (خواہ اسیدؓ ہوں یا کوئی دوسرے صحابیؓ) مزاح و ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہے تھے اور اپنی باتوں سے لوگوں کو ہنسا رہے تھے اس لئے آنحضرت ﷺ نے بھی اس موقع پر خوش طبع فرمائی اور بطور مزاح ان کے پہلو میں لکڑی سے ٹھوکا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوش طبعی و ظرافت کی باتیں کرنا اور ان باتوں کو سننا مباح ہے بشرطیکہ ان کی وجہ سے کسی غیر شرعی اور ممنوع بات کا صدور نہ ہو۔

معانقہ اور بوسہ کا ذکر

(۱۵) وَعَنِ الشَّعْبِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَلَقّٰى جَعْفَرَ بْنَ اَبِي طَالِبٍ فَالْتَزَمَهُ وَقَبَّلَ مَابَيْنَ عَيْنَيْهِ۔ رَوَاهُ اَبُو دَاوُدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا وَفِي بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ وَفِي شَرْحِ السُّنَّةِ عَنِ الْبَيَاضِيِّ مُتَّصِلًا۔

"اور حضرت شعبیؒ تابعی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے ملے تو ان کو گلے سے لگا لیا اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اس روایت کو ابوداؤد اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے جب کہ مصابیح کے بعض نسخوں اور شرح السنۃ میں یہ روایت بیاضی سے بطریق اتصال نقل کی گئی ہے۔"

تشریح: یہ حضرت جعفرؓ کے حبشہ سے واپس آنے کے اسی واقعہ سے متعلق ہے جس کا ذکر آگے کی حدیث میں بھی آرہا ہے۔

"بیاضی" بیاضہ ابن عامر کی طرف منسوب ہے اور جامع الاصول میں لکھا ہے کہ جہاں مطلق بیاضی بغیر نام کے منقول ہوتا ہے وہاں حضرت عبداللہ ابن جابر انصاری صحابی مراد ہوتے ہیں۔

(۱۱) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ فِيْ قِصَّةِ رُجُوْعِهِ مِنْ اَرْضِ الْحَبْشَةِ قَالَ فَخَرَجْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا الْمَدِيْنَةَ فَتَلَقَّانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاعْتَنَقَنِيْ ثُمَّ قَالَ مَا اَدْرِيْ اَنَا بِفَتْحِ خَيْبَرَ اَفْرَحُ اَمْ بِقُدُوْمِ جَعْفَرٍ وَوَافَقَ ذٰلِكَ فَتْحَ خَيْبَرَ۔

(رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت جعفر ابن ابی طالبؓ سرزمین حبشہ سے واپسی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم حبشہ سے روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچ کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے ملاقات کی آپ ﷺ نے مجھ کو گلے لگایا اور فرمایا میں نہیں کہہ سکتا کہ میں خیبر کے فتح ہو جانے کی وجہ سے زیادہ خوش ہوں، یا جعفر کے واپس آنے کی وجہ سے اور اتفاق سے حضرت جعفرؓ اسی دن آئے تھے جس

دن خیبر فتح ہوا تھا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ کے شیخ و استاد حضرت سفیان ابن عیینہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک دن حضرت امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت امام مالکؒ نے ان سے مصافحہ کیا اور فرمایا کہ اگر معانقہ بدعت نہ ہوتا تو میں آپ سے معانقہ بھی کرتا۔ حضرت سفیانؒ نے کہا کہ معانقہ تو ان لوگوں نے کیا ہے جو مجھ سے اور آپ سے کہیں بہتر تھے، حبشہ سے حضرت جعفر کی واپسی کے وقت آنحضرت ﷺ ان سے گلے ملے ہیں اور ان کو بوسہ دیا ہے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ صحیح ہے لیکن وہ حضرت جعفر کے ساتھ مخصوص تھا۔ حضرت سفیانؒ نے جواب دیا کہ جی نہیں وہ معانقہ حضرت جعفرؓ کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ ایک عام مسئلہ کے طور پر تھا اور اگر ہمارا تعلق صلحاء کے زمرہ سے ہو تو ہم اور جعفرؓ (اس مسئلہ میں) ایک جیسی حیثیت رکھتے ہیں، نیز اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی مجلس میں یہ حدیث بیان کروں۔ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ ہاں! میں اجازت دیتا ہوں چنانچہ حضرت سفیانؒ نے حدیث کو اپنی سند کے ساتھ بیان کیا اور امام مالکؒ نے سکوت اختیار کی۔

پاؤں کو بوسہ دینا جائز نہیں ہے

۱۲ وَعَنْ زَارِعٍ وَكَانَ فِيْ وَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ قَالَ لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ فَجَعَلْنَا نَتَبَادَرُ مِنْ رَوَاحِلِنَا فَنُقَبِّلُ يَدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِجْلَهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت زارعؓ جو عبد القیس کے وفد میں شامل تھے، کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ پہنچے تو اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترنے لگے اور بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہوئے چنانچہ ہم نے رسول کریم ﷺ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے معلوم ہوتا ہے پیروں کو چومنا جائز ہے، لیکن فقہاء اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ اس حدیث کی تاویل کرتے ہیں کہ یا تو یہ آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے تھا کہ صرف آپ ﷺ کے پاؤں کو بوسہ دینا جائز تھا۔ یا ابتداءً یہ جائز تھا مگر پھر ممنوع قرار دیدیا گیا، یا وہ لوگ اس مسئلہ سے ناواقف تھے اور اس ناواقفی کی بناء پر سے انہوں نے آپ ﷺ کے پاؤں کے بوسہ دیا اور یا یہ کہ شوق ملاقات میں اضطراری طور پر ان سے یہ فعل صادر ہو گیا تھا۔

اولاد کو بوسہ دینا اظہار محبّت کا ذریعہ ہے

۱۳ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَارَأَيْتُ اَحَدًا كَانَ اَشْبَهَ سَمْتًا وَهَدْيًا وَدَلًّا وَفِيْ رِوَايَةٍ حَدِيْثًا وَكَلَامًا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فَاطِمَةَ كَانَتْ اِذَا دَخَلَتْ عَلَيْهِ قَامَ اِلَيْهَا فَاَخَذَ بِيَدِهَا فَقَبَّلَهَا وَاَجْلَسَهَا فِيْ مَجْلِسِهِ وَكَانَ اِذَا دَخَلَ عَلَيْهَا قَامَتْ اِلَيْهِ فَاَخَذَتْ بِيَدِهِ فَقَبَّلَتْهُ وَاَجْلَسَتْهُ فِيْ مَجْلِسِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے طور طریقہ، عادات و روش اور نیک خصلتی اور ایک روایت میں ہے کہ۔ بات چیت اور کلام میں رسول کریم ﷺ کی مشابہت فاطمہؓ سے زیادہ کسی اور شخص میں نہیں دیکھی (یعنی حضرت فاطمہؓ ان امور میں آنحضرت ﷺ سے بہت مشابہ تھیں۔ حضرت عائشہؓ حضرت فاطمہؓ کے بارے میں یہ بیان کرنے کے بعد اس محبّت و تعلق خاطر کو بیان کر رہی ہیں جو حضرت فاطمہؓ اور آنحضرت ﷺ کا ایک دوسرے سے تھا اور جس وجہ سے دونوں کے درمیان کمال مشابہت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں) کہ فاطمہؓ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آنحضرت ﷺ کھڑے ہو جاتے ان کی طرف متوجہ ہو جاتے پھر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے، ان کو بوسہ دیتے (یعنی ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی کو چومتے) اور پھر ان کو اپنے بیٹھنے کی جگہ پر بٹھاتے (یعنی جگہ ان کے بیٹھنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے اسی طرح آنحضرت ﷺ جب فاطمہؓ کے ہاں تشریف لے جاتے تو وہ آپ کو دیکھ کر

کھڑی ہو جاتیں آپ ﷺ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتیں، پھر آپ ﷺ کو بوسہ دیتیں (یعنی آپ ﷺ کے دست مبارک کو چومتیں، یا کسی اور جگہ بوسہ دیتیں) اور اپنی جگہ پر بٹھاتیں!۔" (ابوداؤدؒ)

⑭ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ اَبِیْ بَكْرٍ اَوَّلَ مَاقَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَاِذَا عَائِشَةُ ابْنَتُهُ مُضْطَجِعَةٌ قَدْاَصَابَهَا حُمّٰى فَاَتَاهَا اَبُوْبَكْرٍ فَقَالَ كَيْفَ اَنْتِ يَابُنَيَّةُ وَقَبَّلَ خَدَّهَا۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ میں (ایک مرتبہ) کسی غزوہ سے حضرت ابوبکرؓ کے مدینہ آتے ہی ان کے ساتھ (ان کے گھر گیا تو دیکھتا ہوں کہ ان کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہؓ لیٹی ہوئی ہیں اور بخار میں مبتلا ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کے پاس آئے اور پوچھا کہ میری بیٹی تمہاری طبیعت کیسی ہے اور انہوں نے (ازراہ شفقت و محبت یا بر عایت سنت) ان کے رخسار پر بوسہ دیا۔" (ابوداؤدؒ)

اولاد کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا

⑮ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِیَ بِصَبِیٍّ فَقَبَّلَهُ فَقَالَ اَمَا اِنَّهُمْ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ وَاِنَّهُمْ لَمِنْ رَيْحَانِ اللّٰهِ۔ (رواه فی شرح السنة)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بچہ لایا گیا آپ ﷺ نے اس کا بوسہ لیا اور فرمایا کہ جان لو یہ اولاد بخل کا باعث اور بزدلی کا سبب ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اولاد خدا کی عطا کردہ نعمت اور رزق بھی ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: اولاد کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اولاد ہی ہے جو انسان سے سب کچھ کراتی ہے ایک باپ اپنے بچوں کے لئے نہ صرف مختلف ذرائع و وسائل اختیار کر کے روپیہ پیسہ کماتا ہے اور مال و اسباب فراہم کرتا ہے بلکہ بچوں کا مستقبل اس کو اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ اس نے جو کچھ کمایا ہے اس کو پیسہ پیسہ جوڑ کر رکھے، یہاں تک کہ اولاد کی فکر اس کو بخیل بنا دیتی ہے کہ وہ اپنے روپے پیسے اور مال و اسباب کو نہ خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے نہ بھلائی و انسانی ہمدردی کے کام میں مدد دیتا ہے۔ اور پھر یہ کہ آل و اولاد کی محبت ہی ہوتی ہے جو انسان کو اس حد تک بزدل و نامرد بنا دیتی ہے کہ وہ اعلاء کلمۃ الحق اور دین و حق کی سربلندی کے اپنے فرض کو بھی فراموش کر دیتا ہے چنانچہ جہاد کرنے سے کتراتا ہے اور لڑائی میں جانے سے دل چراتا ہے" اس کو یہ خوف، شجاعت و بہادری دکھانے سے باز رکھتا ہے کہ اگر میں میدان جنگ میں مارا گیا یا مجھے پکڑ لیا گیا تو میرے بچے کا کیا حال ہو گا، ان کی دیکھ بھال اور پرورش کیسے ہو گی اور میرے بچے باپ کے سایہ سے محروم ہو کر کس کس طرح تکلیف و مشقت برداشت کریں گے۔

پہلے تو آنحضرت ﷺ نے گویا اولاد کے بارے میں اس طرح کی برائی بیان کی اور پھر بعد میں اولاد کی ایک خوبی اور اس کی تعریف بھی بیان فرمائی، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ یہ بچے ریحان ہیں! ریحان کے معنی روزی اور نعمت کے بھی ہیں اور ریحان ہر اس پودے اور گھاس کو بھی کہتے ہیں جو خوشبودار ہو، دونوں ہی صورتوں میں اولاد کی مدح (تعریف) ظاہر ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ بچے ماں باپ کے حق رزق کا درجہ رکھتے ہیں کہ اگر والدین کی گود اولاد سے خالی ہو تو ان کی مامتا اور ان کے جذبات اسی طرح مضطرب و پریشان رہتے ہیں جس طرح کوئی بھوکا روزی نہ ملنے کی صورت میں مضطرب رہتا ہے، اسی طرح بچے دراصل خدا کی طرف سے ماں باپ کو ایک عظیم نعمت کے طور پر عطا ہوتے ہیں، ایسی نعمت جو ان کی زندگی کا سہارا بھی ہوتی ہے اور ان کے گھر کا چراغ بھی۔

اور اگر "ریحان" سے خوشبودار پودا مراد لیا جائے تو بلاشک و شبہ بچے اپنے ماں باپ اور اہل خاندان کی نظر میں پھول کا درجہ رکھتے ہیں کہ جس طرح کوئی شخص خوشبودار پھول کو دیکھ کر سرور حاصل کرتا ہے اور سونگھ کر مشام جان کو معطر کرتا ہے اسی طرح بچوں کو دیکھ کر خوشی محسوس ہوتی ہے ان کو پیار کر کے، ان کو چوم کر اور ان کے ساتھ خوش طبعی کر کے سرور حاصل کیا جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

انسان اور اس کی اولاد

(۱۶) عَنْ يَعْلٰي قَالَ اِنَّ حَسَنًا وَ حُسَيْنًا اِسْتَبَقَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَضَمَّهُمَا اِلَيْهِ وَقَالَ اِنَّ الْوَلَدَ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ۔ (رواہ احمد)

"حضرت یعلیٰؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حسنؓ اور حسینؓ کہیں سے دوڑتے ہوئے رسول کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو گلے لگالیا اور فرمایا کہ بچے بخل کا سبب ہیں اور بزدلی کا باعث ہیں۔" (احمدؒ)

تشریح: علماءؒ نے لکھا ہے کہ یہاں مذکورہ الفاظ سے بچوں کے تئیں شفقت و محبت اور تعریف کا اظہار مقصود ہے جب کہ پچھلی حدیث میں ان الفاظ کے ذریعہ بچوں کی برائی اور کراہت کو ظاہر کیا گیا ہے۔

ہدیہ و مصافحہ کی فضیلت

(۱۷) وَعَنْ عَطَاءِ نِ الْخُرَاسَانِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَصَافَحُوْا يَذْهَبِ الْغِلُّ وَ تَهَادَوْا تَحَابُّوْا وَ تَذْهَبِ الشَّحْنَاءُ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلاً۔

"اور حضرت عطاء خراسانیؒ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ آپس میں ایک دوسرے سے مصافحہ کیا کرو کہ اس سے بغض و کینہ جاتا رہے گا اور آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ و تحفہ بھیجتے رہا کرو کہ اس سے محبت بڑھتی ہے اور دشمنی جاتی رہتی ہے امام مالکؒ نے اس روایت کو بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

(۱۸) وَعَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى اَرْبَعًا قَبْلَ الْهَاجِرَةِ فَكَاَنَّمَا صَلاَّهُنَّ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَالْمُسْلِمَانِ اِذَا تَصَافَحَا لَمْ يَبْقَ بَيْنَهُمَا ذَنْبٌ اِلاَّ سَقَطَ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت براء ابن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے دوپہرے سے پہلے چار رکعت نماز پڑھی اس نے گویا ان چار رکعتوں کو شب قدر میں پڑھا اور دو مسلمان جب آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے درمیان کوئی گناہ باقی نہیں رہتا بلکہ جھڑ جاتا ہے، اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ گناہوں سے مراد عام گناہ ہیں، لیکن طیبیؒ نے کہا ہے کہ گناہ سے مراد بغض و کینہ اور دشمنی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے حدیث میں بیان کیا گیا۔

بَابُ الْقِيَامِ

کھڑے ہونے کا بیان

"کھڑے ہونے" سے مراد ہے کسی کے لئے تعظیما کھڑے ہونا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ مجلس میں یا اپنے پاس آنے والے شخص کی تعظیم و توقیر کے لئے کھڑے ہو جانا مسنون ہے۔ ان حضرات نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی ﷺ سے استدلال کیا ہے کہ قوموا الی سیدکم جیسا کہ آگے حدیث میں آرہا ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مکروہ و بدعت ہے اور اس کی ممانعت ثابت ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس طرح عجمی کھڑے ہو جاتے ہیں اس طرح تم نہ اٹھو اور فرمایا کہ یہ عجمیوں کا دستور ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اہل فضل کی تعظیم کے لئے کھڑے ہونا جائز ہے

① عَنْ اَبِی سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ بَنُوْقُرَیْظَةَ عَلٰی حُکْمِ سَعْدٍ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَیْہِ وَکَانَ قَرِیْبًا مِنْہُ فَجَآءَ عَلٰی حِمَارٍ فَلَمَّا دَنَامِنَ الْمَسْجِدِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلْاَنْصَارِ قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَمَضَی الْحَدِیْثُ بِطُوْلِہٖ فِیْ بَابِ حُکْمِ الْاُسَرَآءِ۔

"حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ جب بنو قریظہ حضرت سعدؓ کے حکم وثالث بنانے پر اتر آئے تو رسول کریم ﷺ نے کسی شخص کو حضرت سعدؓ کے پاس بھیجا (تاکہ وہ ان کو بلا لائے اور وہ آکر بنو قریظہ کا مطالبہ طے کریں) اس وقت حضرت ابوسعدؓ آنحضرت ﷺ (کی قیام گاہ) کے قریب ہی فروکش تھے، چنانچہ وہ خر پر بیٹھ کر آئے اور جب مسجد کے قریب پہنچے تو رسول کریم ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا اے انصار تم اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔" (بخاریؒ ومسلمؒ) اور یہ حدیث پوری تفصیل کے ساتھ قیدیوں کے باب میں گزر چکی ہے۔

تشریح: "بنو قریظہ" مدینہ کے یہودیوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے، سن ۵ ھ میں غزوہ خندق کے دوران ان یہودیوں نے جو منافقانہ کردار کیا اور باوجودیکہ سابقہ معاہدہ کے تحت مدینہ کے اس دفاعی مورچہ پر ان یہودیوں کو بھی مسلمانوں کے شانہ بشانہ کفار عرب کی جارحیت کا مقابلہ کرنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے اپنی روایتی بدعہدی اور شرارت کا مظاہرہ کیا اور مختلف قسم کی سازشوں کے ذریعہ اس دفاعی مورچہ کو توڑنے کے لئے کفار عرب کے آلہ کار بن گئے انکی اسی بدعہدی اور سازشی کاروائیوں کی بناء پر آنحضرت ﷺ نے غزوہ خندق کی فتح سے فارغ ہوتے ہی ان بنو قریظہ کے ساتھ اعلان جنگ کر دیا اور ان سب یہودیوں کو ان کے قلعہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا، مسلمانوں کی طرف سے بنو قریظہ کے قلعہ کا محاصرہ ۲۵ دن تک جاری رہا آخر کار انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ ہمارا معاملہ حضرت سعد ابن معاذؓ کے سپرد کر دیا جائے جو قبیلہ اوس کے سردار تھے اور قبیلہ اوس بنو قریظہ کا حلیف تھا، ان یہودیوں نے کہا کہ حضرت سعد ابن معاذؓ کو پنچ اور حکم تسلیم کرتے ہیں، وہ ہمارے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے ہم اس کو بے چون وچرا مان لیں گے، یہودیوں کا خیال تھا کہ حضرت سعدؓ چونکہ ہمارے حلیف قبیلے کے سردار ہیں اور ان کے اور ہمارے درمیان تعلقات کی ایک خاص نوعیت ہے اس لئے حضرت سعدؓ یقیناً ہمارے ہی حق میں فیصلہ دیں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت سعدؓ کو بلا بھیجا کہ وہ آکر اس معاملہ میں اپنا فیصلہ دیں، حضرت سعدؓ اگرچہ اس وقت آنحضرت ﷺ کی قیامگاہ کے قریب ہی فروکش تھے لیکن چونکہ غزوہ خندق میں وہ بہت سخت مجروح ہو گئے تھے اور خاص طور پر رگ ہفت اندام پر ایک زخم پہنچا تھا۔ جس سے خون برابر جاری تھا اس لئے خچر پر بیٹھ کر بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہوئے اس وقت تک ان کے زخم سے خون جاری تھا لیکن یہ آنحضرت ﷺ کا اعجاز تھا کہ جب آپ نے ان کو بلوا بھیجا تو خون رک گیا، بہر حال حضرت معاذؓ آئے اور انہوں نے پورے معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اور ان کے جرم بدعہدی وغداری کی بنا پر انہی کی شریعت کے مطابق جو فیصلہ دیا اس کا اصل یہ تھا کہ ان کے لڑسکنے والے مرد قتل کر دیئے جائیں، عورتیں اور بچے غلام بنا لئے جائیں اور ان کے مال و اسباب کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس فیصلہ پر کسی حد تک عمل بھی ہوا۔

یہاں حدیث میں اسی وقت کے واقعہ کا ذکر ہے کہ جب حضرت سعدؓ آئے تو آنحضرت ﷺ نے انصار سے کہا کہ دیکھو تمہارے سردار آرہے ہیں کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ اکثر علماء اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب فضل وقابل تکریم شخص آئے تو اس کے اعزاز واحترام کے لئے کھڑے ہو جانا چاہئے، اس کے برخلاف بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ قوموا الی سیدکم سے آنحضرت ﷺ کی یہ مراد نہیں تھی کہ سعدؓ کی تعظیم وتکریم کے لئے کھڑے ہو جاؤ جیسا کہ کسی بڑے آدمی کے آجانے پر کھڑے ہونے کا رواج ہے اور جس کی ممانعت ثابت ہے اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ چیز عجمیوں کے رائج کردہ تکلفات میں سے ہے، نیز یہ عمل

آنحضرت ﷺ کے نزدیک آخر زمانہ حیات تک ناپسندیدہ رہا، یحییٰ کہتے ہیں کہ اگر اس ارشاد سے آنحضرت ﷺ کی مراد تعظیم وتکریم کے لئے کھڑے ہو جانے کا حکم دینا ہوتا تو آپ ﷺ اس موقع پر قوموا الی سیدکم نہ فرماتے بلکہ یہ فرماتے کہ قوموا لسیدکم لہٰذا ان علماء کے مطابق اس حکم سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ دیکھو تمہارے سردار سعدؓ آرہے ہیں، ان کی حالت اچھی نہیں ہے، جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس جاؤ اور سواری سے اترنے میں ان کی مدد کرو تاکہ اترتے وقت ان کو تکلیف نہ ہو اور زیادہ حرکت کی بنا پر زخم سے خون نہ بہنے لگے۔ ان علماء کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ جو روایت ہے کہ حضرت عکرمہؓ ابن ابی جہل جب بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہوئے تو آپ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ یا حضرت عدیؓ ابن حاتم کی جو یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ انہوں نے کہا میں جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا آپ ﷺ میرے لئے یا تو کھڑے ہو جاتے یا اپنی جگہ سے ہل جایا کرتے تھے تو ان روایتوں سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ محدثین نے ان روایتوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔

جو حضرات اہل فضل وکمال کے آنے پر کھڑے ہونے کو جائز قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر حضرت عکرمہؓ اور حضرت عدیؓ کے بارے میں مذکورہ بالا روایتیں ضعیف ہیں اور ان سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے تو پھر اس روایت کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو حضرت فاطمہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ جب آنحضرت ﷺ حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لاتے تو حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کے لئے کھڑی ہو جاتی تھیں اور جب حضرت فاطمہؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آنحضرت ﷺ ان کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ اگر اس روایت کی یہ تاویل کی جائے کہ ان کا کھڑا ہونا اظہار محبت واستقبال کے طور پر ہوتا نہ کہ تعظیم واجلال کے طور پر، تو یہ تاویل بعید از حقیقت سمجھے جانے سے خالی نہیں ہوگی علاوہ ازیں خود طیبیؒ نے محی السنۃ سے نقل کیا ہے کہ جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس حدیث کے پیش نظر اہل فضل وکمال جیسے علماء وصلحاء اور بزرگان دین کا اعزاز واکرام کرنا جائز ہے، علاوہ ازیں محی الدین نوویؒ نے یہ لکھا ہے کہ یہ کھڑا ہونا اہل فضل کے آنے کے وقت مستحب ہے اور نہ صرف یہ کہ اس سلسلے میں احادیث بھی منقول ہیں، بلکہ اس کی صریح ممانعت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

مطالب المؤمنین میں قنیہ کے حوالہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنے والے کی تعظیم کے طور پر بیٹھے ہوئے لوگوں کا قیام یعنی کھڑے ہو جانا مکروہ نہیں ہے اور یہ کہ قیام بنفسہ مکروہ نہیں ہے بلکہ قیام کی طلب وپسندیدگی مکروہ ہے چنانچہ وہ قیام ہرگز مکروہ نہیں ہوگا جو کسی ایسے شخص کے لئے کیا جائے جو نہ تو اپنے لئے قیام کی طلب رکھتا ہو اور نہ اس کو پسند کرتا ہو۔

قاضی عیاض مالکیؒ نے یہ لکھا ہے کہ کھڑے ہونے کی ممانعت کا تعلق اس شخص کے حق میں ہے جو بیٹھا ہوا ہو اور بیٹھے رہنے تک لوگ اس کے سامنے کھڑے رہیں جیسا کہ ایک حدیث میں منقول ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص نظر آئے جو علم وفضل اور بزرگی کا حامل ہو تو اس کی تعظیم وتوقیر کے طور پر کھڑے ہو جانا جائز ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ ایسے شخص کے آنے پر کھڑے ہونا جو نہ صرف یہ کہ اس اعزاز کا مستحق نہ ہو بلکہ اپنے آنے پر لوگوں کے کھڑے ہو جانے کی طلب وخواہش بھی رکھتا ہو، مکروہ ہے اور اسی طرح بیجا خوشامد وچاپلوسی کے طور پر کھڑے ہونا بھی مکروہ ہے، نیز دنیاداروں کے لئے کھڑے ہونا اور ان کی تعظیم کرنا بھی نہایت مکروہ ہے اور اس بارے میں سخت وعید منقول ہے۔

کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر وہاں بیٹھنا سخت برا ہے

(۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يُقِيْمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَجْلِسِهِ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيْهِ وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوْا وَتَوَسَّعُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ ہونا چاہئے کہ جو آدمی جس جگہ بیٹھ گیا ہو کوئی شخص

اس کو وہاں سے اٹھا کر خود اس جگہ بیٹھ جائے، البتہ بیٹھنے کی جگہ کو کشادہ رکھو اور آنے والے کو جگہ دو تاکہ اٹھانے کی حاجت نہ پڑے۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ولکن کے بعد لیقل کا لفظ مقدر ہے یعنی مفہوم کے اعتبار سے اصل عبارت یوں ہے کہ ولکن لیقل تفسحوا و توسعوا، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ (کوئی شخص کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر وہاں نہ بیٹھے) بلکہ اس سے یہ کہنا چاہئے کہ کشادگی کے ساتھ بیٹھو اور آنے والے کو جگہ دو

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں مذکورہ ممانعت نہی تحریمی کے طور پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ پہلے پہنچ کر بیٹھ جائے جو کسی کے لئے مخصوص نہیں ہے مثلاً جمعہ وغیرہ کے دن مسجد وغیرہ میں پہلے پہنچ جائے اور آگے کی صف میں بیٹھ جائے، یا اس کے علاوہ کسی اور مجلس وغیرہ میں پہلے پہنچ کر کسی عام جگہ پر بیٹھ جائے تو اس جگہ بیٹھنے کا سب سے بڑا حقدار وہی ہوگا، دوسرے کسی شخص کے لئے یہ حرام ہوگا کہ وہ اس (پہلے) شخص کو اس جگہ سے اٹھا کر وہاں خود بیٹھ جائے۔

اپنی جگہ سے کچھ دیر کے لئے اٹھ کر جانے والا اس جگہ پر اپنا حق برقرار رکھتا ہے

(۳) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَامَ مِنْ مَجْلِسِهٖ ثُمَّ رَجَعَ اِلَیْهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ۔
(رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر جائے اور پھر وہاں واپس آئے تو اس جگہ کا زیادہ حق دار وہی ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ وہ شخص اپنی جگہ سے اس ارادہ نیت کے ساتھ اٹھ کر گیا ہو کہ پھر جلدی اس جگہ واپس آئے گا مثلاً وہ وضو کے لئے اٹھ کر گیا ہو یا اس کو کوئی ایسی ضرورت پیش آگئی ہو جس کی بنا پر اس کو تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے اٹھ کر جانا ضروری ہو گیا ہو وہ وضو کر کے یا اس کام کو پورا کر کے جلد ہی واپس آگیا ہو تو اس جگہ کا زیادہ مستحق وہی شخص ہوگا، چنانچہ اس صورت میں اگر کوئی دوسرا شخص آکر اس جگہ بیٹھ گیا ہو تو اس کو اٹھانا درست ہوگا کیوں کہ وہ (پہلا) شخص اس جگہ بیٹھنے کے اپنے حق سے محروم نہیں ہوا ہے بایں طور کہ عارضی طور پر کسی ضرورت سے اٹھ کر جانے اور پھر جلد ہی اپنی جگہ پر واپس آجانے کی وجہ سے اس جگہ پر اس کا حق قرار رہے گا اس کی تائید آگے آنے والی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی جگہ تشریف رکھتے اور پھر وہاں سے اٹھ کر کہیں جانے کی ضرورت پیش آتی اور واپس آنے کا ارادہ ہوتا تو آپ ﷺ اپنی جگہ پر اپنی جوتیاں چھوڑ جاتے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جگہ چھوڑ کر مجلس سے اٹھا اور کسی ضرورت سے کہیں دور دراز یا طویل وقفہ کے لئے چلا گیا اور پھر واپس آیا تو اس صورت میں وہ اپنی سابقہ جگہ کا مستحق نہیں رہے گا اگرچہ اس جگہ پر وہ اپنی کوئی چیز ہی چھوڑ کر کیوں نہ گیا ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آنحضرت ﷺ اپنے لئے کھڑے ہونے کو پسند نہیں فرماتے تھے

(۴) عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمْ یَکُنْ شَخْصٌ اَحَبَّ اِلَیْهِمْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَکَانُوْا اِذَا رَاَوْهُ لَمْ یَقُوْمُوْا لِمَا یَعْلَمُوْنَ مِنْ کَرَاهِیَتِهٖ لِذٰلِكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کے نزدیک رسول کریم ﷺ سے زیادہ محبوب و عزیز کوئی اور شخص نہیں تھا، لیکن (اس محبت و تعلق کے باوجود) صحابہؓ جب آنحضرت ﷺ کو دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت ﷺ اس (کھڑے ہونے) کو پسند

نہیں فرماتے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ اپنی انکساری کے اظہار اور اہل تکبر کے طور طریقوں کی مخالفت کی بنا پر اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ جب آپ ﷺ مجلس میں تشریف لائیں تو صحابہؓ آپ ﷺ کو دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو جائیں بلکہ آپ ﷺ کھڑے ہونے، بیٹھنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے اور دیگر افعال و اخلاق میں ترک تکلفات پر قائم و عامل تھے جو اہل عرب کی عادت تھی اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا۔

انا و اتقیاء امتی براء من التکلف۔

"میں اور میری اُمت کے متقی لوگ، تکلف سے بیزار ہیں۔"

اور طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس چیز کو ناپسند کرنا کمال محبت، صفائی باطن، اور اتحاد قلوب کی بنا پر تھا کہ قلبی اتحاد اور تعلق کا کمال اس طرح کے تکلفات کا متقاضی نہیں ہوتا۔

حاصل یہ کہ تعظیماً کھڑے ہونا اور کھڑے نہ ہونا دونوں صورتوں کا تعلق وقت و حالات اور اشخاص و تعلقات کے تفاوت پر مبنی ہوتا ہے کہ بعض وقت اور بعض حالات میں آنے والے کے لئے احتراماً کھڑے ہو جانا مناسب ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں کھڑے نہ ہونا ہی مناسب ہوتا ہے خاص طور پر اس صورت میں جب کہ یہ معلوم ہو کہ آنے والا کھڑے ہونے کو پسند نہیں کرتا یا آپس کے تعلقات تکلفات کے محتاج نہیں ہیں، نیز کسی ایسے شخص کے لئے کھڑے ہونا جائز نہیں ہے جو کسی بھی طرح کی دینی فضیلت نہیں رکھتا بلکہ کوئی دنیاوی حیثیت رکھتا ہے۔

لوگوں کو اپنے سامنے کھڑا رکھنے والے کے بارے میں وعید

⑤ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے سامنے سیدھے کھڑے رہیں تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے بیٹھنے کی جگہ دوزخ میں تیار کرے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: تیار کرے یہ امر (حکم) خبر کے معنی میں ہے یعنی اس اسلوب بیان کے ذریعہ آپ ﷺ نے گویا یہ خبر دی ہے کہ جو شخص اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے باادب کھڑے رہیں تو اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے اپنے آپ کو دوزخ میں داخل ہونے کا مستوجب بنا لیا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو بطریق تکبر اور اپنی تعظیم کرانے کے لئے اپنے سامنے لوگوں کے کھڑے رہنے کو پسند کرتا ہو، ہاں اگر کوئی شخص اس طرح کی طلب و خواہش نہ رکھتا ہو بلکہ لوگ خود اپنی خوشی سے اس کی خدمت کے لئے یا طلب ثواب کی خاطر اور یا بطور تواضع و انکساری اس کے سامنے کھڑے رہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حاصل یہ کہ مکروہ و ممنوع یہ چیز ہے کہ اپنی تعظیم و احترام کرانے کے اور اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اپنے سامنے لوگوں کے کھڑے رہنے کو پسند کیا جائے اور اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر مکروہ و ممنوع نہیں ہوگا۔

بیہقیؒ نے شعب الایمان میں خطابیؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ (اس وعید کا تعلق اس شخص کی ذات سے ہے) جو بطریق تکبر و نخوت لوگوں کو یہ حکم دے کہ وہ اس کے سامنے کھڑے رہیں یا وہ لوگوں کے لئے ضروری قرار دیدے کہ وہ جب بھی اس کے سامنے آئیں کھڑے رہیں۔ نیز کہا ہے کہ حضرت سعدؓ کے بارے میں جو حدیث گزری ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ سردار و امیر، فاضل و

والی، اور عادل و منصف کے سامنے کسی شخص کا باادب کھڑے رہنا جیسا کہ کوئی شاگرد اپنے استاد کے سامنے کھڑا رہتا ہے، مستحب ہے نہ کہ مکروہ اور بیہقیؒ نے اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مذکورہ لوگوں کے کھڑے رہنا دراصل بھلائی حاصل کرنے اور تکریم و توقیر کے طور پر کھڑے ہو جانے کے مرادف ہے جیسا کہ (آنحضرت کے حکم پر) انصار حضرت سعدؓ کے لئے کھڑے ہوئے تھے یا حضرت طلحہ حضرت کعب ابن مالکؓ کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے، تاہم یہ ملحوظ رہے کہ جو شخص اس طرح کی حیثیت و فضیلت رکھتا اس کے سامنے احتراماً کھڑے ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اس کے لئے بھی قطعا مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے سامنے لوگوں کے کھڑے ہو جانے کی طلب رکھے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کھڑا نہ ہو تو وہ اس سے کینہ رکھے، یا اس کا شکوہ کرے اور یا اس سے ناراض ہو جائے۔

احتراماً کھڑے ہونے کی ممانعت

⑥ وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئًا عَلٰى عَصًا فَقُمْنَا لَهٗ فَقَالَ لَا تَقُوْمُوْا كَمَا يَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ يُعَظِّمُ بَعْضُهَا بَعْضًا۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت امامہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ عصاء مبارک پر سہارا دیئے ہوئے باہر تشریف لائے تو ہم آپ ﷺ کے احترام میں کھڑے ہو گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ اس طرح کھڑے نہ ہو جس طرح عجمی لوگ کھڑے ہوتے ہیں کہ ان میں بعض بعض کی تعظیم کرتے ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی یہ مراد تھی کہ یہ عجمی لوگوں کا دستور ہے کہ جب ان کا کوئی سردار یا بڑا آدمی ان کی مجلس میں آتا ہے تو محض اس کو دیکھتے ہی بڑبڑا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور پھر اس کے سامنے باادب دست بستہ کھڑے رہتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اس ارشاد "یعظم بعضھا بعضا" کے ذریعہ اسی طرف اشارہ فرمایا کہ ان میں کے چھوٹے اور کمتر لوگ اپنے بڑے اور اونچی حیثیت کے لوگوں کو محض دیکھ کر اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ کھڑے نہ ہوئے تو وہ بڑے لوگ ان سے ناراض ہو جائیں گے اور پھر تعظیما ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ اس توجیہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہاں حدیث میں اصل قیام کا ممنوع ہونا ثابت نہیں ہوتا جس کا جواز دیگر احادیث سے ثابت ہے بلکہ وہ قیام ممنوع ہے جو شان و شکوہ کے اظہار اور تکبر و نخوت کے طور پر ہو، زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تواضع و انکساری کی بنا پر صحابہؓ کو کھڑے ہونے سے منع فرمایا، جیسا کہ پہلے ایک حدیث میں گزر چکا ہے۔

دوسرے کی جگہ پر بیٹھنے کی ممانعت

⑦ وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِی الْحَسَنِ قَالَ جَآءَنَا اَبُوْبَكْرَةَ فِیْ شَهَادَةٍ فَقَامَ لَهٗ رَجُلٌ مِّنْ مَجْلِسِهٖ فَاَبٰى اَنْ يَجْلِسَ فِيْهِ وَقَالَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ ذَا وَنَهَى النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّمْسَحَ الرَّجُلُ يَدَهٗ بِثَوْبِ مَنْ لَّمْ يَكْسُهٗ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت سعید ابن ابوالحسنؒ جو ایک جلیل القدر اور ثقہ تابعی اور حضرت حسن بصری کے بھائی ہیں کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت ابوبکرؓ صحابی، ہمارے پاس (ایک ایسے مقدمہ میں) گواہی دینے کے لئے تشریف لائے (جس میں وہ گواہ تھے) ایک شخص اس کے احترام میں اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا (تا کہ وہ اس جگہ بیٹھ جائیں لیکن انہوں نے اس جگہ پر بیٹھنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے (یعنی آپ ﷺ نے اس جگہ پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے جہاں کوئی شخص پہلے سے بیٹھا ہوا ہو اور عارضی طور پر اس جگہ سے اٹھ گیا ہو) نیز آنحضرت ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا ہے کہ کوئی آدمی کسی ایسے شخص کے کپڑے سے اپنے ہاتھ پونچھے جس کو اس نے کپڑا نہیں پہنایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث میں مذکور دوسری ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کھانے وغیرہ میں ہاتھ بھر گئے ہوں تو ان ہاتھوں کو کسی اجنبی کر کپڑے سے نہ پونچھے بلکہ ایسے شخص کے کپڑے سے ہاتھ پونچھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جس کو اس نے کپڑے پہنائے اور دیئے ہوں، جیسے اپنی اولاد، یا غلام اور یا خادم وغیرہ اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس اجنبی کے کپڑے سے پونچھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے جو اس بات پر راضی ہو۔ اس پر حدیث کے پہلے جزو کے مسئلہ کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ معلوم ہو کہ کوئی شخص اس کے لئے اپنی جگہ سے بطیب خاطر اٹھا ہے تو اس کی جگہ بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ اس آیت تفسحوا فی المجالس سے مفہوم ہوتا ہے اور جیسا کہ اس پر حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ صدر الدابة احق بصاحبها الا اذا اذن۔ نیز اس طرح اور بہت سے منقولات ہیں جن سے یہ وضاحت مفہوم ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ جب وہ شخص حضرت ابوبکرؓ کے لئے اپنی مرضی سے جگہ چھوڑ کر اٹھا تھا تو حضرت ابوبکرؓ نے بیٹھنے سے کیوں انکار کر دیا؟ تو ان کے انکار کا سبب یہ تھا کہ ان کو اس شخص کی رضامندی کے بارے میں شک ہوا ہوگا اور انہوں نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ یہ شخص از خود بطیب خاطر اپنی جگہ سے نہیں اٹھا ہے بلکہ کسی اور شخص کے کہنے سے اٹھا ہے یا شرم حضوری میں اٹھا ہے اور یا یہ کہ اس شخص کی رضامندی جاننے کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے احتیاط و تقویٰ اسی میں دیکھا ہوگا کہ وہ اس کی جگہ پر نہ بیٹھیں یا انہوں نے ممانعت کی حدیث کو اطلاق پر محمول کیا ہوگا اور رضامندی کو بھی عدم ممانعت کا سبب نہیں سمجھتے ہوں گے۔

اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے لگو تو وہاں کوئی چیز رکھ دو

(۸) وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَآءِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ وَجَلَسْنَا حَوْلَهُ فَقَامَ فَاَرَادَ الرَّجُوْعَ نَزَعَ نَعْلَهُ اَوْ بَعْضَ مَا يَكُوْنُ عَلَيْهِ فَيَعْرِفُ ذٰلِكَ اَصْحَابُهُ فَيَثْبُتُوْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب تشریف رکھتے اور ہم آپ ﷺ کے گرد بیٹھتے اور پھر آپ ﷺ واپس آنے کے ارادہ سے گھر میں جانے کے لئے اٹھتے تو اپنی جگہ پر جوتیاں اتار کر رکھ جاتے اور ننگے پیر چلتے جاتے یا اپنے بدن پر کوئی چیز جیسے چادر وغیرہ اس جگہ چھوڑ جاتے اس سے آپ ﷺ کے صحابہؓ جان لیتے کہ آپ ﷺ مجلس میں پھر آئیں گے، چنانچہ وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: "آپ ﷺ کے گرد" سے مراد آپ ﷺ کے دائیں طرف، بائیں طرف اور سامنے بیٹھنا ہے، یعنی کچھ صحابہؓ آپ ﷺ کے داہنے ہاتھ کی طرف بیٹھتے کچھ بائیں ہاتھ کی طرف اور کچھ سامنے بیٹھ جاتے! یہ معنی اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ اگر گرد سے مراد چاروں اطراف لی جائیں تو یہ صحیح نہیں ہوگا کیونکہ حلقہ کے درمیان بیٹھنے کی ممانعت منقول ہے۔

دو آدمیوں کے درمیان گھس کر بیٹھنے کی ممانعت

(۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ يُفَرِّقَ بَيْنَ اثْنَيْنِ اِلَّا بِاِذْنِهِمَا۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ دو بیٹھے ہوئے آدمیوں کے درمیان ان کی اجازت کے بغیر جدائی ڈالے۔" (ترمذی۔ وابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر دو آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی تیسرے شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان گھس کر بیٹھ جائے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں آدمی آپس میں محبت و تعلق رکھتے ہوں، اور رازدارانہ طور پر ایک دوسرے سے کوئی بات چیت کرنا چاہتے ہوں، اگر کوئی تیسرا آدمی ان کے درمیان حائل ہو کر بیٹھے گا تو اس کا وہاں بیٹھنا ان پر شاق گزرے گا۔ علماء

نے یہ وضاحت کی ہے کہ اگر یہ معلوم ہو کہ یہ دونوں بیٹھے ہوئے آدمی آپس میں محبت و تعلق رکھتے ہیں تو ان کے درمیان نہ بیٹھے اور اگر یہ معلوم ہو کہ ان دونوں کے درمیان اتحاد و محبت کا علاقہ نہیں ہے تو اس صورت میں ان کے درمیان بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا اور اگر ان دونوں کے درمیان تعلق مبہم ہو یعنی یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ ان کے درمیان محبت کا علاقہ ہے یا نہیں، یا سرے سے یہ معلوم ہی نہ ہو تو اس صورت میں احتیاط کا تقاضہ یہ ہوگا کہ ان کے درمیان نہ بیٹھے۔

⑩ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَجْلِسْ بَيْنَ رَجُلَيْنِ اِلَّا بِاِذْنِهِمَا۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا پہلے سے بیٹھے ہوئے، دو آدمیوں کے درمیان نہ بیٹھو الا یہ کہ ان کی اجازت حاصل ہو۔" (ابوداؤدؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ جب مجلس سے اٹھتے تھے تو صحابہؓ کھڑے ہو جاتے تھے

⑪ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْلِسُ مَعَنَا فِي الْمَسْجِدِ يُحَدِّثُنَا فَاِذَا قَامَ قُمْنَا قِيَامًا حَتّٰى نَرَاهُ قَدْ دَخَلَ بَعْضَ بُيُوْتِ اَزْوَاجِهٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ مسجد میں ہمارے ساتھ بیٹھتے اور باتیں کیا کرتے تھے، پھر جب آپ مجلس سے اٹھتے تو ہم بھی کھڑے ہو جاتے تھے اور دیر تک کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ ہم دیکھتے کہ آپ ﷺ اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کے گھر میں تشریف لے گئے ہیں۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ جب مجلس سے اٹھتے تو اس وقت صحابہؓ کا کھڑا ہونا احتراما کھڑے ہو جانا کے طور پر نہیں ہوتا تھا بلکہ مجلس کے برخاست ہو جانے کی وجہ سے ہوتا تھا اور ظاہر بھی ہے کہ جب صحابہؓ آپ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت نہیں کھڑے ہوتے تھے تو جانے کے وقت کیوں کھڑے ہوتے تھے رہی یہ بات کہ اس وقت صحابہؓ دیر تک کیوں کھڑے رہتے تھے تو اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ آنحضرت ﷺ جب مجلس سے اٹھ کر جانے لگتے تو صحابہؓ اس انتظار میں رک جاتے تھے کہ شاید آپ ﷺ کسی کام کے لئے فرمائیں گے یا یہ امید ہوتی تھی کہ آپ ﷺ دوبارہ تشریف لائیں گے اور مجلس برقرار رہے گی، لیکن جب یہ امید ختم ہو جاتی تو صحابہؓ اپنی اپنی راہ پکڑتے۔

مجلس میں آنے والے شخص کے لئے جگہ نکالنا تہذیب کا تقاضہ ہے

⑫ وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ دَخَلَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ قَاعِدٌ فَتَزَحْزَحَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ فِي الْمَكَانِ سَعَةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلْمُسْلِمِ لَحَقًّا اِذَا رَاٰهُ اَخُوْهُ اَنْ يَتَزَحْزَحَ لَهٗ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت واثلہ ابن خطابؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا جب کہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے رسول کریم ﷺ نے اس شخص کو جگہ دینے کے لئے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ایک طرف کھسک گئے، اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! مکان میں بیٹھنے کی جگہ کافی فراخ و کشادہ ہے (میں کہیں بھی بیٹھ جاؤں گا آپ ﷺ نے میرے لئے اپنی جگہ سے حرکت کرنے اور کھسکنے کی زحمت گوارا کیوں فرمائی؟) نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ مسلمان کا حق ہے کہ جب اس کو اس کا مسلمان بھائی

مجلس میں یا اپنے پاس آتا دیکھے تو جگہ کی فراخی و تنگی سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کے لئے اپنی جگہ چھوڑ دے اور ایک طرف کو کھسک جائے یعنی آنے والے کے لئے اپنی جگہ سے حرکت کرنا اور کھسک جانا دراصل اس کا اکرام و اعزاز ہے اور ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی پر اس اکرام و اعزاز کا بجا طور پر حق رکھتا ہے ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

بَابُ الْجُلُوسِ وَالنَّوْمِ وَالْمَشْيِ

بیٹھنے، لیٹنے، سونے اور چلنے کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

گوٹ مار کر بیٹھنا جائز ہے

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِفِنَاءِ الْكَعْبَةِ مُحْتَبِيًا بِيَدَيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو خانہ کعبہ کے صحن میں اپنے ہاتھوں کے ذریعہ گوٹ مار کر بیٹھے ہوئے دیکھا"۔ (بخاریؒ)

تشریح: گوٹ مار کر بیٹھنا نشست کا ایک خاص طریقہ ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دونوں زانوں کھڑے کر لئے جاتے ہیں تلوے زمین پر رہتے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے پنڈلیوں پر حلقہ باندھ لیتے ہیں اور کولھے خواہ زمین پر ٹکے رہتے ہیں۔ خواہ اوپر اٹھے رہتے ہیں، بسا اوقات پنڈلیوں پر ہاتھوں کے ذریعہ حلقہ باندھنے کی بجائے ان پر کوئی کپڑا لپیٹ کر بیٹھنا بھی منقول ہے۔

بہر حال بیٹھنے کا یہ طریقہ اہل عرب میں بہت رائج تھا اور اکثر و بیشتر وہ لوگ اسی طرح بیٹھا کرتے تھے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس طرح بیٹھنا جائز بلکہ مستحب ہے۔

پیر پر پیر رکھ کر لیٹنے کا مسئلہ

② وَعَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيْمٍ عَنْ عَمِّهٖ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ مُسْتَلْقِيًا وَاضِعًا اِحْدٰى قَدَمَيْهِ عَلَى الْاُخْرٰى۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبادہ ابن تمیم تابعیؒ اپنے چچا حضرت عبداللہ ابن زید انصاری صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے ایک دن رسول کریم ﷺ کو مسجد میں اس طرح چت لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپ کا ایک قدم، دوسرے قدم پر رکھا ہوا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قدم کو قدم پر رکھ کر لیٹنے سے ستر نہیں کھلتا جب کہ اس طرح لیٹنا کہ پاؤں پر پاؤں رکھا ہوا ہو بسا اوقات ستر کھل جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس مطلب کے ذریعہ اس حدیث اور ان احادیث کے درمیان مطابقت پیدا ہو جاتی ہے جو آگے آرہی ہے اور جن سے واضح ہوتا ہے کہ پاؤں کو پاؤں پر رکھ کر لیٹنا ممنوع ہے اس مسئلہ کی مزید تفصیل آگے بیان ہوگی۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کا اس طرح لیٹنا کبھی کبھی ہوتا تھا اور وہ بھی یا تو بیان جواز کی خاطر، یا کچھ دیر آرام کر کے تکان کو دور کرنے کے لئے، ورنہ جہاں تک آنحضرت ﷺ کے معمول کا تعلق ہے، آپ کسی بھی ایسی جگہ کہ جہاں کچھ لوگ موجود ہوں، چار زانو، باوقار اور تواضع و انکسار کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔

③ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّرْفَعَ الرَّجُلُ اِحْدٰى رِجْلَيْهِ عَلَى الْاُخْرٰى وَهُوَ مُسْتَلْقٍ

عَلٰی ظَھْرِہٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص ایک پاؤں کھڑا کر کے دوسرا پاؤں اس پر رکھ لے درآنحالیکہ وہ چت ہوا ہو۔" (مسلمؒ)

④ وَعَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَایَسْتَلْقِیَنَّ اَحَدُکُمْ ثُمَّ یَضَعُ اِحْدٰی رِجْلَیْہِ عَلَی الْاُخْرٰی۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس طرح چت نہ لیٹے کہ ایک پاؤں کھڑا کر کے اس پر دوسرا پاؤں رکھ لے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت جابرؓ کی مذکورہ بالا دونوں حدیثیں، بظاہر عباد ابن تمیم کی روایت کے منافی، معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی منافات وتضاد نہیں ہے کیوں کہ پاؤں پر پاؤں رکھ کر چت لیٹنا دو طرح سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی ہوں اور ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی ہوئی ہو اس طریقہ پر لیٹنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں ستر کھل جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا عباد ابن تمیمؒ کی روایت میں جو یہ منقول ہے کہ آپ ایک قدم کو دوسرے قدم پر رکھ کر چت لیٹے ہوئے تھے تو اس سے یہی صورت مراد ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ چت لیٹ کر ایک ٹانگ کے گھٹنے کو کھڑا کر لیا جائے اور دوسری ٹانگ کے پیر کو اس کھڑے ہوئے گھٹنے پر رکھ لیا جائے یہ طریقہ ممنوع ہے، لیکن یہ ممانعت بھی اس صورت میں ہے جب کہ ستر کھل جانے کا اندیشہ ہو، مثلاً کسی شخص نے پاجامہ نہ پہن رکھا ہو بلکہ تہ بند باندھ رکھا ہو اور وہ تہ بند یا کرتے کا دامن اتنا چھوٹا ہو کہ اس طریقہ سے لیٹنے کی وجہ سے ستر کھل سکتا ہو! اگر ستر کھلنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پھر اس طریقہ سے لیٹنا بھی جائز ہو گا حاصل یہ نکلا کہ ممانعت اور جواز کا اصل مدار ستر کے کھلنے یا ستر کے نہ کھلنے پر ہے، چنانچہ علماء نے بھی یہی بیان کیا ہے۔

تکبر کی چال کا انجام

⑤ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَمَا رَجُلٌ یَتَبَخْتَرُ فِیْ بُرْدَیْنِ وَقَدْ اَعْجَبَتْہُ نَفْسُہٗ خُسِفَ بِہِ الْاَرْضُ فَھُوَ یَتَجَلْجَلُ فِیْھَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ایک شخص دو دھاری دار کپڑوں میں ملبوس اتراہٹ اور اکڑ کے ساتھ چل رہا تھا، نیز (وہ ان کپڑوں کو اتنا نفیس اور برتر سمجھ رہا تھا کہ اس کے نفس نے اس کو غرور و خود بینی میں مبتلا کر دیا تھا اس کا انجام یہ ہوا کہ زمین نے اس شخص کو نگل لیا چنانچہ وہ قیامت کے دن تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔"

تشریح: بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے وہ قارون تھا، جب کہ نوویؒ نے یہ لکھا ہے کہ یہ احتمال بھی ہے کہ وہ شخص کسی اُمت کا کوئی فرد ہو گا یا کسی پچھلی اُمت میں کا کوئی شخص ہو گا۔ بہرحال حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ تکبر و گھمنڈ اور اتراہٹ و اکڑ کے ساتھ چلنا برا ہے اور اس کا انجام نہایت برا۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

سب سے بہتر چال

واضح رہے کہ انسان کی چال اس کے مزاج و احوال اور عادات واطوار کی بڑی حد تک غماز ہوتی ہے، اسی طرح اس بات پر خاص زور دیا جاتا ہے کہ انسان کو اپنے چلنے کا انداز، ایسا نہ رکھنا چاہئے جس سے اس کی شخصیت میں کسی نقص و بے راہ روی اور اس کے طبعی احوال و کیفیات میں کسی کجی کا اظہار ہو۔ عام طور پر چال کی دس قسمیں بیان کی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر قسم کو عربی میں ایک مستقل لفظ کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے جن کا تفصیلی ذکر دوسری کتابوں میں موجود ہے جو قسم سب سے اچھی اور افضل سمجھی گئی ہے اس کو "ھون" کا نام دیا گیا ہے،

لغت کے اعتبار سے ہون کے معنی ہیں سکون وقرار، چنانچہ عربی کا یہ مشہور محاورہ ہے اِمْشِ عَلٰی هَوْنِكَ یعنی اپنی پرورش پر چلو۔ جس چال کو ہون کہا جاتا ہے وہ ایسی چال ہے جس میں حرکت تو پوری ہو لیکن قدم آہستہ آہستہ، قدرے سرعت کے ساتھ اٹھیں نہ تو خشک لکڑی کی مانند ایسی مری ہوئی چال جیسے مردہ دل اور افسر لوگ چلتے ہیں اور نہ تیزی اور بھاگ دوڑ کی چال جو جلد باز اور گھبراہٹ میں مبتلا لوگوں کے چلنے کا طریقہ ہے، چال کی یہ دنوں صورتیں ہی بری ہیں اور چلنے والے کی مردہ دلی یا بے عقلی کو ظاہر کرتی ہیں۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ہون کی تعریف کی ہے اور اس چال کو اپنے خاص بندوں کی صفت قرار دیا۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا۔

"اور رحمٰن (اللہ) کے خاص بندے وہ لوگ ہیں جو زمین پر نرمی آہستگی اور سکون ووقار کے ساتھ چلتے ہیں۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

تکیہ لگا کر بیٹھنا مستحب ہے

⑥ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئًا عَلٰى وِسَادَةٍ عَلٰى يَسَارِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت جابرؓ ابن سمرۃؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس طرح تکیہ لگائے بیٹھے ہوئے دیکھا کہ وہ تکیہ آپ ﷺ کے بائیں جانب رکھا ہوا تھا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تکیہ لگا کر بیٹھنا مستحب ہے اور یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ تکیہ کو پسند فرماتے تھے، نیز آپ ﷺ نے خوشبو کی طرح تکیہ کے بارے میں بھی یہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص تکیہ پیش کرے تو اس کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا جائے۔

گوٹ مار کر بیٹھنے کا ذکر

⑦ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ فِي الْمَسْجِدِ احْتَبٰى بِيَدَيْهِ۔

(رواہ رزین)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب مسجد میں بیٹھتے تو دونوں ران کھڑے کر لیتے اور پنڈلیوں پر دونوں ہاتھوں سے حلقہ باندھ لیتے۔" (رزینؒ)

آنحضرت ﷺ کی ایک منکسرانہ نشست

⑧ وَعَنْ قَيْلَةَ بِنْتِ مَخْرَمَةَ اَنَّهَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ وَهُوَ قَاعِدُ الْقُرْفُصَاءَ قَالَتْ فَلَمَّا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُتَخَشِّعَ اُرْعِدْتُ مِنَ الْفَرَقِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت قیلہ بنت مخرمہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو مسجد میں بہ ہیئت قرفصا بیٹھے ہوئے دیکھا۔ قیلہؓ کہتی ہیں کہ جب میں نے رسول کریم ﷺ کو اس طرح انتہائی فروتنی وانکساری، خشوع وخضوع اور استغراق وحضوری کے عالم میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو میں مارے ہیبت کے کانپ گئی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: قرفصاء قاف کے پیش، راء کے جزم اور فاء کے پیش اور زبر کے ساتھ کے معنی ہیں اکڑوں بیٹھنا اور ہاتھوں کو ٹانگوں کے گرد

باندھنا۔ چنانچہ اس نشست یعنی قرفصاء کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دونوں تانوؤں کو کھڑا کر کے سرینوں (کولھوں) پر بیٹھ جاتے ہیں، زانوؤں کو پیٹ سے لگا لیتے ہیں اور دونوں ہاتھوں کو پنڈلیوں پر باندھ لیتے ہیں۔ قرفصاء کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ دونوں زانوؤں کو زمین پر ٹیک کر رانوں کو پیٹ سے لگا لیتے ہیں اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں دونوں بغلوں میں داب لی جاتی ہیں اس طرح کہ دائیں ہتھیلی بائیں بغل میں اور بائیں ہتھیلی دائیں بغل میں رہتی ہے۔ بیٹھنے کا یہ خاص طریقہ عام طور پر عرب کے ان غیر متمدن لوگوں میں رائج تھا جو جنگلات میں بود و باش رکھتے تھے۔ نیز وہ مسکین و غریب لوگ بھی اسی طرح بیٹھتے ہیں جو تفکرات و خیالات اور غم و آلام میں مبتلا ہوتے ہیں، چونکہ یہ نشست انتہائی عجز و بے چارگی اور کمال انکسار و فروتنی کو ظاہر کرتی ہے اس لئے آنحضرت ﷺ اس ہیئت کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔

نماز فجر کے بعد آنحضرت ﷺ کی نشست

(۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى الْفَجْرَ تَرَبَّعَ فِيْ مَجْلِسِهٖ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ حَسْنَاءَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب فجر کی نماز پڑھ چکتے تو چار زانو بیٹھ جاتے اور سورج اچھی طرح روشن ہو جانے تک اسی طرح بیٹھے رہتے۔" (ابوداؤد)

آنحضرت کے لیٹنے کا طریقہ

(۱۰) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا عَرَّسَ بِلَيْلٍ اضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ وَإِذَا عَرَّسَ قُبَيْلَ الصُّبْحِ نَصَبَ ذِرَاعَهٗ وَوَضَعَ رَأْسَهٗ عَلٰى كَفِّهٖ۔ (شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب سفر کے دوران آرام کرنے اور سونے کے لئے کسی جگہ رات میں اترتے تو دائیں کروٹ لیٹتے تھے اور جب صبح کے قریب اترتے تو اس طرح لیٹتے کہ اپنا ایک ہاتھ کھڑا کر کے اس کی ہتھیلی پر سر مبارک رکھ لیتے۔"

(شرح السنۃ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا معمول مبارک یہ تھا کہ جب آپ ﷺ سفر میں ہوتے اور رات کا وقت کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے اور رات کا کچھ حصہ باقی رہتا تو داہنی کروٹ پر لیٹ کر آرام فرماتے جیسا کہ سفر میں داہنی کروٹ پر لیٹنے کی آپ ﷺ کی عادت تھی اور اگر ایسے وقت پڑاؤ ڈالتے کہ رات کا تقریباً پورا حصہ گزر چکا ہوتا اور صبح ہونے والی ہوتی تو اس صورت میں آپ ﷺ پوری طرح لیٹنے کی بجائے دست مبارک کو کھڑا کر لیتے اور اس کی ہتھیلی پر سر رکھ کر آرام فرما لیتے۔ ایسا اس وجہ سے کیا کرتے تھے تاکہ غفلت کی نیند نہ آجائے اور فجر کی نماز قضا نہ ہو جائے، اگرچہ داہنی کروٹ پر سونے کی صورت میں بھی غفلت کی نیند طاری نہیں ہوتی کیونکہ داہنی کروٹ پر لیٹنے سے لٹکا رہتا ہے اور اس کو قرار کم ملتا ہے، جب کہ بائیں کروٹ پر لیٹنے سے دل اپنے ٹھکانے پر ہوتا ہے اور آرام بھی پاتا ہے جس کی وجہ سے نیند بھی اطمینان و سکون کی آتی ہے یہی وجہ ہے کہ اطباء نہ صرف خود بلکہ دوسروں کو بھی بائیں کروٹ سونے کا مشورہ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بائیں کروٹ پر سونے سے دل چونکہ اپنی جگہ پر رہتا ہے اس لئے دل کے مطمئن و پر سکون ہونے کی وجہ سے نہ صرف آرام ملتا ہے اور چین کی نیند طاری ہوتی ہے بلکہ کھانا بھی خوب اچھی طرح ہضم ہوتا ہے کیوں کہ اس صورت میں جسم کے باہر کی حرارت بدن کے اندر رک جاتی ہے جو نظام ہضم کو بہتر اور معتدل بنانے کا سبب ہے، بعض روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ سفر کے دوران جب رات کے آخری حصے میں کہیں اترتے تو سر مبارک کے نیچے کوئی اینٹ رکھ لیتے اور جب صبح کے وقت کے قریب اترتے تو ہاتھ کھڑا کر کے اس کی ہتھیلی پر سر مبارک رکھ کر (کچھ دیر کے لئے) لیٹ رہتے۔

آنحضرت ﷺ جب لیٹتے تو سر مبارک کو مسجد کی طرف رکھتے

(۱۱) وَعَنْ بَعْضِ اٰلِ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَ كَانَ فِرَاشُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْوًا مِمَّا يُوْضَعُ فِيْ قَبْرِهٖ وَكَانَ الْمَسْجِدُ عِنْدَ رَاْسِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور اُم سلمہؓ کے ایک لڑکے کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا بچھونا (جس پر آپ ﷺ آرام فرماتے تھے) اس کپڑے کی مانند تھا جو آپ ﷺ کی قبر شریف میں رکھا گیا تھا اور مسجد آپ ﷺ کے سر مبارک کے قریب رہا کرتی تھی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جس بچھونے پر استراحت فرماتے تھے اس کی لمبائی چوڑائی اس کپڑے کے تقریباً برابر تھی جو آپ ﷺ کی قبر شریف میں رکھا گیا تھا اور اس کپڑے کو کچھ لوگوں نے دیکھ رکھا تھا کہ وہ ایک مختصر سا کپڑا تھا جو زیادہ لمبا چوڑا نہ تھا۔ بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا بچھونا اس کپڑے کی قسم سے تھا جو آپ ﷺ کی قبر مبارک میں رکھا گیا تھا اور جو کپڑا قبر مبارک میں رکھا گیا تھا وہ دراصل ایک سرخ چادر تھی جو بیماری کے دوران آنحضرت ﷺ کے نیچے رہتی تھی، آپ ﷺ کا وصال ہوا تو شقرانؓ نے (آنحضرت ﷺ کے غلام تھے) صحابہؓ کی رائے کے بغیر اس چادر کو قبر شریف میں آنحضرت ﷺ کے جسد مبارک کے نیچے رکھ دیا تھا ان کا کہنا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ آنحضرت ﷺ کا کپڑا آپ ﷺ کے بعد کوئی دوسرا شخص پہنے یا استعمال کرے، تاہم صحیح قول یہ ہے کہ صحابہؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے قبر تشریف بند کئے جانے سے پہلے اس چادر کو نکال لیا تھا۔ واضح رہے کہ حدیث میں اس جگہ لفظ یوضع، (مضارع کے صیغہ) کے بجائے "وضع" (ماضی کا صیغہ) ہونا چاہئے تھا لیکن راوی کا مقصد چونکہ حکایت بزمانۂ حال تھا اس لئے ماضی کے صیغہ کے بجائے مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

حدیث کے دوسرے جز۔ اور مسجد آپ ﷺ کے سر مبارک کے قریب رہا کرتی تھی کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ استراحت فرماتے تو اس زاویہ سے لیٹتے کہ سر مبارک مسجد کی طرف رہتا، کیونکہ آپ ﷺ کا حجرہ شریف، مسجد کے بائیں جانب تھا اور چونکہ آپ ﷺ روبقبلہ لیٹا کرتے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ اگر اس حجرہ شریف میں روبقبلہ لیٹا جائے تو مسجد سرہانے کی طرف رہے گی۔

مشکوۃ کے ایک نسخہ میں لفظ مسجد جیم کے زبر کے ساتھ ہے جس کے معنی مصلی کے ہیں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا استراحت کے وقت آپ ﷺ کے سرہانے رکھا رہتا تھا، تاکہ جب نماز پڑھنی ہو تو اس کو فوراً بچھا لیا جائے۔

پیٹ کے بل لیٹنا ناپسندیدہ ہے

(۱۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ رَاٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا مُضْطَجِعًا عَلٰى بَطْنِهٖ فَقَالَ اِنَّ هٰذِهٖ ضِجْعَةٌ لَا يُحِبُّهَا اللّٰهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو اوندھا یعنی پیٹ کے بل لیٹے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اس طرح سے لیٹنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ لیٹنے کی چار صورتیں ہیں، ایک تو چت لیٹنا، لیٹنے کا طریقہ اہل عبرت کا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں اور عجائبات قدرت کو دیکھ کر ایمان باللہ کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں وہ چت لیٹتے ہیں تاکہ وہ آسمان اور ستاروں کی طرف بنظر استشہاد دیکھتے رہیں اور خدا کی قدرت و حکمت کردگاری کی دلیل حاصل کریں دوسری صورت دائیں کروٹ پر لیٹنا ہے یہ اہل کبار رو کے لیٹنے کا طریقہ ہے جو لوگ خدا کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور شب بیداری کرنا چاہتے ہیں وہ دائیں کروٹ پر لیٹ کر سوتے ہیں تاکہ غفلت کی نیند طاری نہ ہو اور وقت پر اٹھ کر نماز و وظائف اور اپنے مولی کے ذکر میں مشغول ہو سکیں۔ تیسری صورت بائیں کروٹ پر لیٹنا ہے یہ

آرام وراحت کے طلبگاروں کے لیٹنے کا طریقہ ہے کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کھانا اچھی طرح ہضم ہو جائے، چین وسکون کی نیند سو سکیں اور جسم کو پوری طرح آرام وراحت ملے وہ بائیں کروٹ پر لیٹ کر سوتے ہیں اور چوتھی صورت اوندھا یعنی پیٹ کے بل لیٹنا ہے، یہ اہل غفلت اور نادان لوگوں کے لیٹنے کا طریقہ ہے کیونکہ اس طرح لیٹنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سینہ اور منہ جو برتر اعضاء ہیں اور اجزائے جسم میں سے سب سے افضل جزء ہیں ان کو بلا قصد وطاعت وسجدہ، خاک وذلت پر اوندھا ڈال دیا جائے جو ان اعضاء کے عزو شرف کے منافی ہے، نیز چونکہ اغلام کرانے والوں کی عادت ہے اس لئے اوندھا لیٹنا اتنی ذلیل ترین برائی کی مشابہت اختیار کرنا ہے جو خود انتہائی بری بات ہے۔

⑬ وَعَنْ يَعِيشَ بْنِ طِخْفَةَ بْنِ قَيْسٍ الْغِفَارِيِّ عَنْ اَبِيْهِ وَكَانَ مِنْ اَصْحَابِ الصُّفَّةِ قَالَ بَيْنَمَا اَنَا مُضْطَجِعٌ مِنَ السَّحَرِ عَلٰى بَطْنِى اِذَا رَجُلٌ يُحَرِّكُنِى بِرِجْلِهِ فَقَالَ اِنَّ هٰذِهِ ضِجْعَةٌ يُبْغِضُهَا اللّٰهُ فَنَظَرْتُ فَاِذَا هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت یعیش ابن طخفہ ابن قیس، غفاری اپنے والد ماجد (حضرت طخفہؓ) سے جو اصحابؓ صفہ میں سے تھے، نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے یعنی (حضرت طخفہؓ نے) بیان کیا کہ (ایک دن) میں سینہ کی درد کی وجہ سے پیٹ کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص مجھے اپنے پاؤں سے ہلا رہا ہے اور پھر میں نے سنا کہ وہ شخص کہہ رہا ہے لیٹنے کے اس طریقہ کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور پھر میں نے پلٹ کر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص رسول کریم ﷺ ہیں۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے علم میں حضرت طخفہؓ کا وہ عذر نہیں ہوگا جس کی وجہ سے وہ پیٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے اس لئے آپ نے مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کا عذر آپ ﷺ کے علم میں تھے تو پھر یہ تاویل کی جائے گی کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد احتیاط وتقویٰ کی بنا پر تھا اور یہ ظاہر کرنے کے لئے تھا کہ عام حالات میں بلا کسی عذر کے پیٹ کے بل لیٹنا سخت برا ہے اور اس طرف بھی اشارہ کرنا مقصود تھا کہ اگر سینہ کے درد کا دفاع ہی مقصود تھا تو اس صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پیروں کو پھیلائے بغیر ٹانگوں کی طرف جھک کر سینے کے دونوں رانوں کو دبا لیتے۔

بغیر دیوار کی چھت پر سونا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے

⑭ وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ شَيْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَاتَ عَلٰى ظَهْرِ بَيْتٍ لَيْسَ عَلَيْهِ حِجَابٌ وَفِىْ رِوَايَةٍ حِجَارٌ فَقَدْ بَرِءَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ۔ رَوَاهُ اَبُوْ دَاؤدَ وَفِىْ مَعَالِمِ السُّنَنِ لِلْخَطَّابِىِّ حِجًى۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت علیؓ ابن شیبان کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص رات میں گھر کی ایسی چھت پر سوئے جس پر پردہ نہ ہو اور روایت میں یوں ہے کہ جس کے گرد رکاوٹ والی کوئی چیز نہ ہو تو اس سے ذمہ جاتا رہا۔" (ابوداؤدؒ)

اور خطابی کی کتاب معالم السنن میں لفظ حجاب کے بجائے حجی کا لفظ ہے۔

تشریح: ایک ہی مضمون کی تین روایتوں میں تین الگ الگ لفظ ہیں ایک روایت میں "حجاب" کا لفظ ہے جس کے معنی پردہ کے ہیں اور اس سے مراد وہ دیوار ہے جو چھت کو بے پردگی سے محفوظ بھی رکھتی ہے اور اس کی وجہ سے اس چھت پر سے کسی کے گر پڑنے کا خدشہ بھی نہیں رہتا، دوسری روایت میں حجار کا لفظ ہے جو "حجر" (حاء کے زیر کے ساتھ) کی جمع ہے اور اس کے معنی اس چیز کے ہیں جو چھت کو اس طرح گھیر دے کہ کوئی گرنے نہ پائے خواہ وہ دیوار ہو یا جنگلہ وغیرہ اور تیسری روایت میں حجی کا لفظ ہے یہ لفظ حاء کے زیر کے ساتھ بھی ہے اور حاء کے زبر کے ساتھ بھی، دونوں ہی صورتوں میں یہ لفظ پردہ کے مفہوم میں ہے ویسے لغت کے اعتبار سے حجی حاء کے زیر کے ساتھ کے معنی ہیں عقل وزیر کی، لہٰذا کہا جائے گا کہ پردہ کو عقل کے ساتھ اس لئے مشابہت دی گئی ہے کہ جس طرح عقل انسان کو ناشائستہ اور

نقصان دہ امور سے روکتی ہے اسی طرح پردہ بھی انسان کو چھت پر سے گزرنے سے روکتا ہے اسی طرح (حجی حاء کے زبر کے ساتھ) کے معنی کنارہ اور گوشہ کے ہیں اور ظاہر ہے کہ چھت کا پردہ چھت کے کناروں پر کھڑی گئی دیوار وغیرہ ہی کی صورت میں ہوتا ہے اس اعتبار سے اس کو حجی کہا گیا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی نگہبانی و حفاظت کا ذمہ و عہد لیا ہے اور اس مقصد کے لئے اس نے محض اپنے فضل و کرم سے ملائکہ مقرر کئے ہیں اور ایسے اسباب و ذرائع پیدا فرمائے ہیں جن کو اختیار کر کے انسان اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسی چھت پر سوتا ہے جس کے گرد کوئی پردہ اور رکاوٹ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی جگہ سو رہا ہے جو عام طور پر ہلاکت و ضرر کا سبب بن سکتی ہے اور جب اس شخص نے خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہے تو اب قدرت کو کیا ضرورت ہے کہ اس کی حفاظت کرے لہٰذا اس کی محافظت کا خدائی ذمہ و عہد ساقط ہو گیا۔

⑮ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّنَامَ الرَّجُلُ عَلٰى سَطْحٍ لَيْسَ بِمَحْجُوْرٍ عَلَيْهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس کوٹھے پر سونے سے منع فرمایا ہے جس پر پردہ کی دیوار نہ ہو" (ترمذی)

حلقہ کے درمیان بیٹھنے والے پر لعنت

⑯ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ مَلْعُوْنٌ عَلٰى لِسَانِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَعَدَ وَسْطَ الْحَلْقَةِ۔ (رواہ الترمذی و ابوداود)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کی زبان مبارک کے ذریعہ اس شخص کو ملعون قرار دیا گیا ہے جو حلقہ کے درمیان بیٹھے۔" (ترمذیؒ و ابوداودؒ)

تشریح: اس حدیث کے محمول کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں ایک تو یہ کہ مثلاً کسی جگہ لوگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور بجائے اس کے کہ وہ جہاں جگہ دیکھتا وہیں بیٹھ جاتا لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا درمیان میں جا کر بیٹھ گیا چنانچہ ایسے شخص کو ملعون کہا گیا ہے، دوسرے یہ کہ کوئی شخص کچھ لوگوں کے حلقہ کے درمیان اس طرح بیٹھ گیا کہ ان میں سے بعضوں کے چہرے ایک دوسرے سے چھپ گئے اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کے چہرے نہ دیکھ سکنے سے اور اپنے درمیان خلل پڑ جانے کی وجہ سے اس شخص کو تکلیف و ضرر کا باعث محسوس کیا لہٰذا ایسا شخص مذکورہ حدیث کا محمول ہے اور تیسرے یہ کہ اس حدیث کا تعلق اس شخص سے ہے جو مسخرا پن کرنے کے لئے حلقہ کے بیچ میں جا کر بیٹھ جائے تا کہ لوگوں کو ہنسائے۔

مجلس ایسی جگہ منعقد کرنی چاہئے جو فراخ و کشادہ ہو

⑰ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ الْمَجَالِسِ اَوْسَعُهَا۔ (رواہ ابوداود)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بہترین مجلس وہ ہے جو کشادہ و فراخ جگہ میں منعقد کی جائے" (ابوداودؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مجلس وعظ و نصیحت منعقد کرنی ہو، یا کسی بھی مباح تقریب کے موقع پر کسی جگہ لوگوں کو جمع کرنا ہو تو اس مقصد کے لئے ایسی جگہ اختیار کرنی چاہئے جو کشادہ و فراخ ہو تا کہ لوگوں کو بیٹھنے میں تنگی نہ ہو اور وہ تکلیف میں مبتلا نہ ہوں۔

مجلس میں الگ الگ نہ بیٹھو

⑱ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ جَآءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهٗ جُلُوْسٌ فَقَالَ مَالِيْ اَرٰكُمْ عِزِيْنَ۔ (رواہ ابوداود)

"اور حضرت جابرؓ ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ گھر سے باہر نکل کر تشریف لائے جب کہ مسجد نبوی ﷺ میں آپ ﷺ کے صحابہؓ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ کیا بات ہے کہ میں تم لوگوں کو متفرق و منتشر بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "عزین" اصل میں عزۃ کی جمع ہے جس کے معنی لوگوں کے جماعت کے ہیں۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ صحابہؓ کی ایک جماعت اس طرف بیٹھی ہوئی ہے تو دوسری جماعت اس طرف کچھ لوگ اس کونے میں بیٹھے ہوئے ہیں تو کچھ لوگ اس کونے میں، تو چوں کہ الگ الگ گروہوں میں بیٹھنا اور علیحدہ علیحدہ مجلسیں قائم کرنا آپس میں وحشت و بیگانگی کو فروغ دینے اور ایک دوسرے سے علیحدگی و جدائی اختیار کرنے کا موجب ہوتا ہے اس لئے آپ ﷺ نے مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ کے ذریعہ اس طرح متفرق و منتشر طور بیٹھنے کو ناپسند فرمایا اور متحد و مجتمع ہو کر بیٹھنے کی طرف راغب کیا کیونکہ ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھنا در اصل باہمی یگانگت و اتحاد اور ایک دوسرے سے تعلق و موانست کی علامت ہے۔

حاصل یہ کہ اگر کسی جگہ مسلمان جمع ہوں تو ان کو چاہئے کہ وہ علیحدہ علیحدہ جماعتیں بنا کر نہ بیٹھیں بلکہ سب لوگ ایک جگہ حلقہ بنا کر یا صف بندی کے ساتھ بیٹھیں۔

اس طرح نہ لیٹو کہ جسم کا کچھ حصّہ دھوپ میں رہے اور کچھ سایہ میں

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا كَانَ اَحَدُكُمْ فِي الْفَيْءِ فَقَلَصَ عَنْهُ الظِّلُّ فَصَارَ بَعْضُهُ فِي الشَّمْسِ وَ بَعْضُهُ فِي الظِّلِّ فَلْيَقُمْ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ قَالَ اِذَا كَانَ اَحَدُكُمْ فِي الْفَيْءِ فَقَلَصَ عَنْهُ فَلْيَقُمْ فَاِنَّهُ مَجْلِسُ الشَّيْطٰنِ هٰكَذَا رَوَاهُ مَعْمَرٌ مَوْقُوْفًا

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص سایہ میں بیٹھا ہو اور پھر وہ سایہ ختم ہو رہا ہو بایں طور کہ اس سایہ کی جگہ دھوپ آجانے کی وجہ سے اس کے جسم کا کچھ حصّہ دھوپ میں اور کچھ حصّہ سایہ میں ہو تو اس کو چاہئے کہ وہاں سے اٹھ جائے اور ایسی جگہ جا کر بیٹھ جائے جو پوری طرح سایہ میں ہو یا پوری طرح دھوپ میں کیونکہ جب کوئی شخص ایسی جگہ بیٹھا یا لیٹا رہتا ہے کہ کچھ دھوپ میں ہو اور کچھ سایہ میں، تو اس کے جسم پر ایک ہی وقت میں دو متضاد چیزوں کے اثر انداز ہونے کی وجہ سے اس کا مزاج بھی فساد و اختلال کا شکار ہو جاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

اور شرح السنۃ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (یعنی حضرت ابوہریرہؓ نے) فرمایا تم میں سے جو شخص سایہ میں بیٹھا ہو اور پھر وہ سایہ ختم ہو رہا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ وہاں سے اٹھ جائے کیوں کہ ایسی جگہ کہ کچھ سایہ میں ہو اور کچھ دھوپ میں، شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے اسی طرح جیسا کہ شرح السنۃ میں ہے معمرؒ نے بھی اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ سے بطریق موقوف نقل کیا ہے۔

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ﷺ نہیں ہے لیکن واضح رہے کہ یہ موقوف حکم کے اعتبار سے مرفوع حدیث کے ہی درجہ میں ہے کیونکہ دین کی جوبات اجتہاد قیاس کے ذریعہ ثابت ہونے والی نہیں ہوتی اور اس کو کوئی صحابیؓ اپنے قول کے طور پر نقل کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس صحابیؓ نے وہ بات آنحضرت ﷺ سے ضرور سنی ہے ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی صحابیؓ دین کی کوئی ایسی بات نقل کرے جو اجتہاد و قیاس سے باہر ہو اور اس بات کو اس نے آنحضرت ﷺ سے نہ سنا ہو۔

شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے کے بارے میں بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عبارت اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے، یعنی واقعۃً ایسا ہوتا ہے کہ شیطان اس جگہ بیٹھتا ہے جس کا کچھ حصّہ دھوپ میں اور کچھ حصّہ سایہ میں ہوتا ہے اس اعتبار سے، یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کچھ سایہ اور کچھ دھوپ میں بیٹھنا شیطان کا کام ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ایسی جگہ کی نسبت شیطان کی طرف اس اعتبار سے کی گئی ہے

کہ شیطان جس شخص کو پریشان کرنا چاہتا ہے اس کو ایسی جگہ پر بیٹھنے یا لیٹنے کی طرف راغب کرتا ہے اور گویا اس جگہ پر کسی شخص کے بیٹھنے یا لیٹنے کا سبب شیطان بنتا ہے اور اس سے شیطان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص تکلیف و دکھ میں مبتلا ہو، لہٰذا معلوم ہوا کہ شیطان جس طرح انسان کے دین کا دشمن ہے اسی طرح اس کے بدن کا بھی بد خواہ ہے۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ کسی ایسی جگہ بھی بیٹھنا یا لیٹنا ممنوع و مکروہ ہے جو پوری طرح دھوپ میں ہو اگرچہ اس صورت میں ممانعت و کراہت کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ ایسی جگہ شیطان کی نشست گاہ ہوتی ہے بلکہ یہ اس لئے ممنوع و مکروہ ہوگا کہ پوری طرح دھوپ میں بیٹھنا گویا اپنے آپ کو تعب و مشقت اور تکلیف میں ڈالنا ہے ہاں اگر جاڑے کا موسم ہو تو پھر دھوپ میں بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

عورتوں کو راستے کے کنارے پر چلنے کا حکم

(۲۰) وَعَنْ اَبِی اُسَیْدِنِ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ وَھُوَ خَارِجٌ مِّنَ الْمَسْجِدِ فَاخْتَلَطَ الرِّجَالُ مَعَ النِّسَاءِ فِی الطَّرِیْقِ فَقَالَ لِلنِّسَاءِ اِسْتَاخِرْنَ فَاِنَّہٗ لَیْسَ لَکُنَّ اَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِیْقَ عَلَیْکُنَّ بِحَافَّاتِ الطَّرِیْقِ فَکَانَتِ الْمَرْ ءَۃُ تَلْصَقُ بِالْجِدَارِ حَتّٰی اَنَّ ثَوْبَھَا لَیَتَعَلَّقُ بِالْجِدَارِ۔ (رواہ ابوداؤد و البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابواسید انصاریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن، رسول کریم ﷺ کو اس وقت جب کہ آپ ﷺ مسجد سے نکل رہے تھے (لوگوں سے دینی ہدایات و احکام شرعی مسائل) بیان کرتے ہوئے سنا پھر راستہ میں مرد عورتوں سے مل گئے یعنی مرد اور عورتیں مخلوط ہو کر راستہ میں چلنے لگے، آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر عورتوں سے فرمایا کہ تم مردوں کے پیچھے چلو اور ان سے الگ رہو کیوں کہ تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم راستہ کے کنارے پر چلا کرو۔ چنانچہ عورتوں نے آنحضرت ﷺ کے اس حکم پر اس طرح عمل کیا کہ وہ راستہ چلتیں تو دیواروں سے لگ کر چلا کرتیں یہاں تک کہ بعض اوقات ان کا کپڑا دیوار سے اٹک جاتا تھا۔" (ابوداؤد، بیہقی)

عورتوں کے درمیان نہ چلو

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی اَنْ یَمْشِیَ یَعْنِی الرَّجُلُ بَیْنَ الْمَرْاَتَیْنِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا، یعنی مرد کو۔" (ابوداؤد)

تشریح: لفظ "یعنی" روای کا اپنا قول ہے جس سے الفاظ حدیث کی وضاحت مقصود ہے گویا راوی نے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "یمشی" کا فاعل الرَّجُلُ مراد لیا ہے حاصل یہ کہ لفظ الرَّجُلُ حدیث کے اصل متن کا جزء نہیں ہے بلکہ اس کو کسی راوی نے بطور وضاحت نقل کیا ہے اس طرح روایت کے درمیان یہ عبارت یعنی الرَّجُلُ گویا جملہ معترضہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے مرد کو عورتوں کے درمیان چلنے سے اس لئے منع فرمایا کہ مرد و عورت کا اختلاط نہ صرف یہ کہ مختلف قسم کی برائیوں کے فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو شرم و حیا اور سنجیدگی و متانت کے تقاضوں کے خلاف سمجھا گیا ہے۔

واضح رہے کہ جس طرح عورتوں کے درمیان چلنا منع ہے اسی طرح راستہ میں کسی عورت کے ساتھ بھی چلنا منع ہے بشرطیکہ اس کی وجہ سے کسی فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہو۔

مجلس میں جہاں جگہ دیکھو وہاں بیٹھ جاؤ

(۲۲) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ کُنَّا اِذَا اَتَیْنَا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَلَسَ اَحَدُنَا حَیْثُ یَنْتَھِیْ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَذُکِرَ حَدِیْثَا عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو فِیْ بَابِ الْقِیَامِ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَیْ عَلِیٍّ وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ فِیْ بَابِ اَسْمَآءِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَصِفَاتِہٖ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ہم حاضر ہوتے تو ہم میں سے جو شخص جہاں جگہ دیکھتا اور آخر میں جو جگہ خالی ہوتی وہاں بیٹھ جاتا۔ (ابوداؤدؒ) اور عبداللہ ابن عمروؓ کی دونوں حدیثیں یعنی ایک تو لا یحل للرجل اور دوسری جو اس کے بعد ہے وَلَا یجلس بین رجلین باب القیام میں نقل کی جا چکی ہے اور حضرت علیؓ و حضرت ابوہریرہؓ کی دونوں روایتوں کو ہم انشاء اللہ باب اسماء النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ و صفاته میں نقل کریں گے جن میں سے ایک تو کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مشی تکفا اور دوسری مَارَأَيْتُ شَيْئًا احسن من رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مجلس نبوی ﷺ میں ہر شخص مجلس نبوی ﷺ کے آداب وقار کو ملحوظ رکھتا تھا اور اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس کو دوسروں کی بہ نسبت نمایاں اور برتر مقام ملے، جہاں جگہ دیکھتا وہیں بیٹھ جاتا کیونکہ مجلس میں نمایاں اور برتر جگہ پر بیٹھنے کی خواہش اور اس کے لئے کوشش کرنا دراصل اس نفس کا تقاضہ ہوتا ہے جو ہر موقع پر اپنے آپ کو بلا ضرورت نمایاں کرنے اور برتر ثابت کرنے کا متلاشی رہتا ہے اور یہ ان لوگوں کی شان ہے جو جاہ پسند اور دنیاوی عزت اور بڑائی کے حریص ہوتے ہیں جب کہ صحابہؓ اس طرح کے جذبات سے بالکل عاری تھے نہ ان کو اس چیز کے حصول کی خواہش ہوتی تھی اور نہ کسی بھی موقع پر نشست برخاست کے سلسلہ میں خواہ مخواہ کے تکلفات و اہتمام کے عادی تھے ان کے مزاج میں جو سادگی و خاکساری اور بے تکلفی اور رواداری تھی اس کی بناء پر بھی اور آنحضرت ﷺ کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی وہ مجلس نبوی ﷺ میں جہاں جگہ دیکھتے بیٹھ جاتے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بیٹھنے کا ایک ممنوع طریقہ

(۲۳) عَنْ عَمْرِوبْنِ الشَّرِيْدِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ مَرَّبِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا جَالِسٌ هٰكَذَا وَقَدْ وَضَعْتُ يَدِىَ الْيُسْرٰى خَلْفَ ظَهْرِىْ وَاَتَّكَأْتُ عَلٰى اَلْيَةِ يَدِىْ فَقَالَ اَتَقْعُدُ قِعْدَةَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عمرو ابن شریدؒ تابعی اپنے والد ماجد (حضرت شرید ثقفی صحابیؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ایک دن رسول کریم ﷺ میرے پاس سے گزرے جب کہ میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ میرا بایاں ہاتھ تو میری پیٹھ کے پیچھے تھا اور انگوٹھے کی جڑ کے گوشت پر میں سہارا دیئے ہوئے تھا آپ ﷺ نے مجھ کو اس طرح بیٹھا ہوا دیکھ کر فرمایا کہ کیا تم اس ہیئت پر بیٹھے ہوئے ہو جس ہیئت پر وہ لوگ بیٹھتے ہیں جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے" سے مراد یہودی ہیں، یہاں یہودیوں کا صراحت کے ساتھ ذکر کرنے کے بجائے مغضوب علیہم کے ذریعہ ان کی طرف اشارہ کرنے کی ایک وجہ تو، اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ اس ہیئت پر بیٹھنا ان چیزوں میں سے ہے جن کو حق تعالیٰ دشمن رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ مسلمان چونکہ ایک ایسی اُمت کا فرد ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و نعمت فرمائی ہے اس لئے اس کو چاہئے کہ وہ ان لوگوں کی مشابہت اختیار نہ کرے جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا غضب نازل کیا ہے اور ان کو ملعون قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی سورۃ فاتحہ میں مغضوب علیہم کے ذریعہ جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے بھی یہی یہود مراد ہیں۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حدیث میں مغضوب علیہم کا لفظ اپنے وسیع و عام مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی اس سے تمام کافر اور وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے بیٹھنے چلنے اور دیگر افعال میں غرور و تکبر کا اظہار کرتے ہیں۔

پیٹ کے بل لیٹنا دوزخیوں کا طریقہ ہے۔

(۲۴) وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ مَرَّبِىَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا مُضْطَجِعٌ عَلٰى بَطْنِىْ فَرَكَضَنِىْ بِرِجْلِهٖ وَقَالَ يَا جُنْدُبُ

اِنَّمَاهِيَ ضِجْعَةُ اَهْلِ النَّارِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ میرے پاس سے گزرے جب کہ میں اپنے پیٹ کے بل یعنی اوندھا لیٹا ہوا تھا، آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر اپنے پاؤں سے مجھے ٹھوکا دیا اور فرمایا جندبؓ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس طرح لیٹنا دوزخیوں کا طریقہ ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: جندب حضرت ابوذرؓ کا اصل نام ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس موقع پر ان کو کنیت کے بجائے اصل نام سے مخاطب فرمایا۔ "اس طرح لیٹنا دوزخیوں کا طریقہ" کے بارے میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ کہ اس ارشاد گرامی سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اس دنیا میں کفار و فجار اسی طرح لیٹنے کی عادت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ اس طرف اشارہ فرمایا کہ کفار فجار دوزخ میں جس ہیئت پر بٹائے جائیں گے وہ یہی ہیئت ہوگی یعنی پیٹ کے بل......

بَابُ الْعُطَاسِ وَالتَّثَاؤُبِ
چھینکنے اور جمائی لینے کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جمائی کا آنا شیطانی اثر ہے

① عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعُطَاسَ وَيَكْرَهُ التَّثَاؤُبَ فَاِذَا عَطَسَ اَحَدُكُمْ وَحَمِدَ اللّٰهَ كَانَ حَقًّا عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ سَمِعَهُ اَنْ يَّقُوْلَ لَهُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ فَاَمَّا التَّثَاؤُبُ فَاِنَّمَا هُوَ مِنَ الشَّيْطَانِ فَاِذَا تَثَاءَبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَرُدَّهُ مَا اسْتَطَاعَ فَاِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا تَثَاءَبَ ضَحِكَ مِنْهُ الشَّيْطَانُ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ فَاِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا قَالَ هَا ضَحِكَ الشَّيْطَانُ مِنْهُ۔

"حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ چھینکنے کو تو پسند کرتا ہے لیکن جمائی کو ناپسند کرتا ہے لہٰذا تم میں سے جب کوئی شخص چھینکے اور اللہ کی تعریف کرے تو اس چھینک اور الحمد للہ کو سننے والے ہر مسلمان پر حق ہے کہ وہ چھینکنے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہے رہی جمائی کی بات تو جمائی کا آنا شیطانی اثر ہے لہٰذا تم میں سے جب کسی کو جمائی آئے تو چاہئے کہ وہ حتی الامکان اس جمائی کو روکے واضح رہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص جمائی لیتا ہے (یعنی منہ پھاڑتا ہے) تو اس پر شیطان ہنستا ہے۔ (بخاریؒ) اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ تو (چاہئے کہ حتی الامکان اس جمائی کو روکے) کیوں کہ جب تم میں سے کوئی شخص ہاء کہتا ہے یعنی جمائی لیتا ہے تو اس پر شیطان ہنستا ہے۔"

تشریح: "اللہ تعالیٰ چھینکنے کو پسند کرتا ہے" مطلب یہ ہے کہ چھینکنے کی وجہ سے چونکہ دماغ پر سے بوجھ ہٹ جاتا ہے اور فہم و ادراک کی قوت کا تزکیہ ہو جاتا ہے اور یہ چیز طاعت و حضوری قلب کا باعث و مددگار بنتی ہے اس لئے چھینکنا پسندیدہ ہے، اس کے برخلاف جمائی کا آنا طبیعت کے امتلاء نفس کے بھاری پن اور حواس کی کدورت کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ چیز غفلت و سستی اور بدفہمی نیز طاعت و عبادت میں عدم نشاط کا باعث بنتی ہے اس لئے جمائی کا آنا شیطان کی خوشی کا ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے جمائی کے آنے کو شیطانی اثر قرار دیا گیا ہے اور اس کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کا چھینکنے کو پسند کرنا اور جمائی کو ناپسند کرنا ان کے نتیجہ و ثمرہ کے

اعتبار سے ہے کہ چھینکنے کا نتیجہ عبادت وطاعت میں نشاط وتازگی کا پیدا ہونا ہے اور جمائی کا نتیجہ کسل وسستی کا پیدا ہو جاتا ہے۔

"اللہ کی تعریف کرے" یعنی جب چھینک آئے تو الحمد للہ کہے، اور اگر رب العالمین بھی بڑھا دے یعنی الحمد للہ رب العالمین کہے تو بہتر ہے جب کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ کہنا بہت ہی بہتر ہے نیز کتاب مصنف میں ابن ابی شیبہ نے حضرت علیؓ سے بطریق موقوف یہ نقل کیا ہے کہ جس شخص کو چھینک آئے اور وہ یوں کہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ عَلٰی کُلِّ حَالٍ تو وہ داڑھ اور کان کے درد میں کبھی مبتلا نہیں ہوگا۔ واضح رہے کہ علماء نے چھینک آنے پر الحمد للہ کہنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ چھینک دراصل دماغ کی صحت و صفائی اور مزاج طبیعت میں نشاط و توانائی کی علامت ہوتی ہے اور یہ چیز جسمانی صحت و تندرستی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور ظاہر ہے کہ حصول نعمت پر اللہ کی تعریف کرنا نہایت موزوں و مناسب چیز ہے۔

یرحمک اللہ کہنا فرض یا واجب؟

حدیث کی یہ عبارت، ہر مسلمان پر حق ہے کہ وہ چھینکنے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہے۔ بظاہر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ چھینکنے والا الحمد للہ کہے تو اس کو سننے والے ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ جواب میں یرحمک اللہ کہے لیکن اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، حنفی مسلک کے اعتبار سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ جواب میں یرحمک اللہ کہنا واجب علی الکفایہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چھینکنے والے کی حمد کو سننے والے ایک سے زائد لوگ ہوں تو وہاں موجود سب میں سے کسی ایک شخص کا یرحمک اللہ کہہ دینا سب کے ذمہ سے جواب کا وجوب ساقط کر دے گا۔ جب کہ ایک قول میں اس جواب کو مستحب کہا گیا ہے اس کے برخلاف سفر السعادۃ کے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ اس بارے میں منقول صحیح احادیث کا ظاہری مفہوم یہ واضح کرتا ہے کہ چھینکنے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا سننے والے ہر مسلمان پر فرض ہے اور وہاں موجود لوگوں میں سے کسی ایک کا جواب دے دینا اس فرض کو سب کے ذمہ سے ساقط نہیں کرتا، چنانچہ اکابر علماء کی ایک جماعت کا مسلک اسی قول کے مطابق ہے اشوافع کا مسلک یہ ہے کہ چھینکنے والے کا جواب دینا سنت علی الکفایہ ہے لیکن افضل یہی ہے کہ حاضرین میں سے ہر شخص جواب میں یرحمک اللہ کہے حضرت امام مالکؒ کے مسلک میں اختلافی اقوال ہیں کہ چھینکنے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا آیا واجب ہے یا سنت؟ لیکن اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ چھینکنے والا الحمد للہ کہے اور اس کو حاضرین سنیں، لہٰذا اگر چھینکنے والے نے الحمد للہ نہیں کہا تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہوگا اسی طرح اس نے الحمد للہ تو کہا لیکن اتنی آہستہ آواز سے کہا کہ کسی ایک نے بھی نہیں سنا تو اس صورت میں بھی جواب دینا یعنی یرحمک اللہ کہنا لازم نہیں ہوگا چنانچہ لفظ سَمِعَہٗ جو اس حدیث میں منقول ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے اور یہی حکم سلام اور تمام فرض کفایہ امور جیسے عیادت مریض و تجہیز میت اور نماز جنازہ وغیرہ کا بھی ہے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ چھینکنے والے کو چاہئے کہ وہ الحمد للہ، بلند آواز سے کہے تاکہ اہل مجلس سن لیں اور وہ جواب کا مستحق ہو۔

یرحمک اللہ کہنے والے کے جواب میں کیا کہا جائے

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا عَطَسَ اَحَدُكُمْ فَلْيَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلْيَقُلْ لَهٗ اَخُوْهُ اَوْ صَاحِبُهٗ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ وَاِذَا قَالَ لَهٗ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ فَلْيَقُلْ يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو چاہئے کہ وہ الحمد للہ کہے اور اس کے مسلمان بھائی۔ یا یہ فرمایا کہ اس کے دوست کو چاہئے کہ وہ اس (چھینکنے والے کے الحمد للہ کہنے) کے جواب میں یرحمک اللہ کہے اور جب اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہے تو چھینکنے والے کو چاہئے کہ یوں کہے یَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری ہدایت کرے اور تمہارے دل و تمہارے احوال درست کرے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ" میں مخاطب کے لئے جمع کا صیغہ یا تو باعتبار غالب کے ہے کہ عام طور پر چھینکنے والے کے پاس کئی آدمی ہوتے ہیں لہٰذا مذکورہ دعا میں ان سب کو شریک کرنا چاہئے، یا مخاطب کے لئے جمع کا صیغہ بطور تعظیم و تکریم کے ہے اور یا یہ کہ اس دعا میں مخاطب کے واسطے سے پوری امت مرحومہ کو شامل کرنا مراد، ہوتا ہے۔

جو چھینکنے والا الحمد للہ نہ کہے وہ جواب کا مستحق نہیں ہوتا

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ عَطَسَ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَشَمَّتَ اَحَدَھُمَا وَلَمْ یُشَمِّتِ الْاٰخَرَ فَقَالَ الرَّجُلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ شَمَّتَّ ھٰذَا وَلَمْ تُشَمِّتْنِیْ قَالَ اِنَّ ھٰذَا حَمِدَ اللّٰہَ وَلَمْ تَحْمَدِ اللّٰہَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے دو آدمیوں کو چھینک آئی آنحضرت ﷺ نے ان میں سے ایک آدمی کی چھینک کا جواب نہیں دیا جس آدمی کی چھینک کا جواب آپ نے نہیں دیا تھا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! (کیا وجہ ہے کہ) آپ نے اس آدمی کو تو جواب دیا لیکن مجھ کو جواب نہیں دیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس آدمی نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی تھی جب کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کی (لہٰذا تم جواب کے مستحق نہیں ہوئے)۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص چھینکنے کے بعد الحمد للّٰہ نہ کہے وہ اس بات کا مستحق نہیں ہوتا کہ اس کی چھینک کے جواب میں یرحمک اللّٰہ کہا جائے۔

حضرت مکحولؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت ابن عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کسی شخص نے مسجد کے کسی کونے میں چھینکا، حضرت ابن عمرؓ نے (اس چھینک کی آواز سنی تو) فرمایا کہ یرحمک اللّٰہ ان کنت حمدت اللّٰہ یعنی اگر تو نے اللہ کی حمد کی ہے تو تجھ پر اللہ اپنی رحمت نازل کرے۔

شعبیؒ کہتے ہیں کہ اگر تمہارے کان میں دیوار کے پیچھے سے کسی چھینکنے اور الحمد للّٰہ کہنے کی آواز آئے تو اس کو بھی جواب دو یعنی یرحمک اللّٰہ کہو۔

④ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا عَطَسَ اَحَدُکُمْ فَحَمِدَ اللّٰہَ فَشَمِّتُوْہُ وَاِنْ لَّمْ یَحْمَدِ اللّٰہَ فَلَا تُشَمِّتُوْہُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کوئی شخص چھینکے اور اللہ کی حمد کرے یعنی چھینک آنے پر الحمد للّٰہ کہے تو اس کو جواب یعنی یرحمک اللّٰہ کہو اور اگر وہ اللہ کی حمد نہ کرے تو اس کو جواب نہ دو۔" (مسلمؒ)

جس شخص کو لگاتار چھینک آتی رہے اس کے جواب کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ سَلَمَۃَ بْنِ الْاَکْوَعِ اَنَّہٗ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَطَسَ رَجُلٌ عِنْدَہٗ فَقَالَ لَہٗ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ ثُمَّ عَطَسَ اُخْرٰی فَقَالَ الرَّجُلُ مَزْکُوْمٌ۔ رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِلتِّرْمِذِیِّ اَنَّہٗ قَالَ لَہٗ فِی الثَّالِثَۃِ اَنَّہٗ مَزْکُوْمٌ۔

"اور حضرت سلمہؓ ابن اکوعؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن رسول کریم ﷺ کو اس شخص کی چھینک کا جواب دیتے سنا جو اس وقت آپ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا یرحمک اللّٰہ۔ پھر جب اس کو دوسری بار چھینک آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کو زکام ہو گیا ہے (مسلمؒ)۔ اور ترمذیؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کو تیسری مرتبہ چھینکنے پر یہ فرمایا کہ اس شخص کو زکام ہو گیا ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کو چوں کہ زکام ہو گیا ہے اس لئے یہ بار بار چھینکے گا اور

الحمد للہ کہے گا لہٰذا اس کے جواب میں بار بار یرحمک اللہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ واضح رہے کہ ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ کی ایک اور روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کو لگاتار چھینک آتی رہے اور وہ الحمد للہ کہتا رہے تو تین چھینکوں تک جواب دیا جائے، تیسری مرتبہ کے بعد اختیار ہوگا کہ چاہے جواب دے چاہے نہ دے۔

پس حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شخص کو لگاتار چھینک آتی رہے تو اس کے جواب میں تین چھینکوں تک یرحمک اللہ تو واجب یا سُنّت مؤکدہ ہوگا، تیسری مرتبہ کے بعد سکوت اور جواب کے درمیان اختیار ہوگا کہ چاہے تو تین مرتبہ کے بعد جواب نہ دے جو رخصت یعنی شریعت کی طرف سے آسانی ہے اور چاہے تین مرتبہ کے بعد بھی جواب دیتا رہے جو مستحب ہے گویا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ تین مرتبہ کے بعد جواب دینا کوئی ناجائز بات نہیں ہے لیکن واجب و سُنّت مؤکدہ بھی نہیں ہے۔

جب جمائی آئے تو منہ پر ہاتھ رکھ لو

(۶) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا تَثَاءَبَ اَحَدُکُمْ فَلْیُمْسِكْ بِیَدِهٖ عَلٰی فَمِهٖ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَدْخُلُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی شخص کو جمائی آئے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لے، کیونکہ شیطان اگر منہ کو کھلا ہوا پاتا ہے تو اس میں گھس جاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: منہ میں شیطان کے گھسنے سے مراد یا تو حقیقۃً گھسنا ہے یا یہ مراد ہے کہ جو شخص جمائی کے وقت اپنے منہ کو بند نہیں رکھتا، شیطان اس پر اثر انداز ہونے اور اس کو وساوس و اوہام میں مبتلا کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

چھینکتے وقت چہرہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہئے

(۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا عَطَسَ غَطّٰی وَجْهَهٗ بِیَدِهٖ اَوْ ثَوْبِهٖ وَغَضَّ بِهَا صَوْتَهٗ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب چھینکتے تو اپنے چہرہ مبارک کو اپنے ہاتھوں یا اپنے کسی کپڑے سے ڈھانک لیتے تھے اور اپنی چھینک کی آواز کو پست کر لیتے۔ اس روایت کو ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے، نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: چھینکتے وقت چہرے کو ڈھانک لینا اور بلند آواز سے نہ چھینکنا، یہ دونوں چیزیں تہذیب و شائستگی کی علامت بھی ہیں اور آداب شریعت کا تقاضہ بھی کیوں کہ ایک تو چھینک کے ذریعہ عام طور پر دماغ کا فضلہ و بلغم وغیرہ ناک یا منہ سے نکل پڑتا ہے دوسرے چھینکتے وقت چہرہ کی ہیئت بگڑ جاتی ہے اس لئے چہرے کو ڈھانک لینا چاہئے اسی طرح زیادہ زوردار آواز کے ساتھ چھینکنے کی صورت میں بسا اوقات لوگ چونک اٹھتے ہیں اور ویسے بھی زیادہ بلند آواز اور بے ساختہ آواز کے ساتھ چھینکنا طبیعت کی سلامتی اور شخصی وقار کے خلاف سمجھا جاتا ہے لہٰذا ہلکی آواز کے ساتھ چھینکنا حسن ادب سمجھا گیا ہے، علماء نے لکھا ہے کہ چھینکنے والے کے لئے مستحب ہے کہ اپنی چھینک کو پست آواز میں رکھے۔ اور الحمد للہ بلند آواز میں کہے تاکہ لوگ سن کر جواب دیں۔

یرحمک اللہ کہنے والے کے حق میں دعا

⑧ وَعَنْ اَبِی اَیُّوْبَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا عَطَسَ اَحَدُکُمْ فَلْیَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ وَلْیَقُلِ الَّذِیْ یَرُدُّ عَلَیْہِ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ وَلْیَقُلْ ھُوَ یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوایوبؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو چاہئے کہ وہ یوں کہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ یعنی ہر حال میں خدا کی تعریف ہے، اور جو شخص اس کا جواب دے اس کو یوں چاہئے۔ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ اور پھر اس کے جواب میں چھینکنے والے کو یوں کہنا چاہئے یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت بخشے اور تمہارے دل یا تمہارے احوال کو درست فرمائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

یہودیوں کی چھینک اور آنحضرت ﷺ کا جواب

⑨ وَعَنْ اَبِی مُوْسٰی قَالَ کَانَ الْیَھُوْدُ یَتَعَاطَسُوْنَ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَیَرْجُوْنَ اَنْ یَّقُوْلَ لَھُمْ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ فَیَقُوْلُ یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ یہودی جب نبی کریم ﷺ کے پاس ہوتے تو جان بوجھ کر چھینکتے اس امید میں کہ آپ ﷺ ان کے جواب میں یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہیں گے، لیکن آپ ﷺ ان کی چھینک کے جواب میں محض یہ فرماتے یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت بخشے اور تمہارے قلوب یا تمہارے احوال کی اصلاح فرمائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان کی چھینک کے جواب میں یرحمک نہ کہتے کیوں کہ اللہ کی رحمت صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے البتہ آپ ﷺ ان کے حسب حال ان کی ہدایت و اصلاح کی دعا فرماتے۔

چھینک کے وقت سلام

⑩ وَعَنْ ھِلَالِ بْنِ یَسَافٍ قَالَ کُنَّا مَعَ سَالِمِ بْنِ عُبَیْدٍ فَعَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ فَقَالَ لَہٗ سَالِمٌ وَعَلَیْکَ وَعَلٰی اُمِّکَ فَکَاَنَّ الرَّجُلَ وَجَدَ فِیْ نَفْسِہٖ فَقَالَ اَمَا اِنِّیْ لَمْ اَقُلْ اِلَّا مَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیْکَ وَعَلٰی اُمِّکَ اِذَا عَطَسَ اَحَدُکُمْ فَلْیَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَلْیَقُلْ لَہٗ مَنْ یَّرُدُّ عَلَیْہِ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ وَلْیَقُلْ یَغْفِرُ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ہلال ابن یسافؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ حضرت سالم ابن عبیدؓ کے ساتھ تھے کہ جماعت میں سے ایک شخص کو چھینک آئی اور اس نے الحمدللہ کے بجائے السلام علیکم کہا اس گمان کہ چھینک کے بعد الحمدللہ کی بجائے السلام علیکم کہنا بھی جائز ہے حضرت سالمؓ نے اس شخص کے جواب میں کہا کہ تم پر اور تمہاری ماں پر بھی سلام اس شخص نے گویا اپنے دل میں ان الفاظ (اور تمہاری ماں پر بھی سلام) کا برا مانا، حضرت سالمؓ نے (اس ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے) کہا کہ (اس ناگواری کی کیا بات ہے) تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے وہی الفاظ کہے ہیں جو نبی کریم ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمائے تھے جب کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کے سامنے چھینکا تھا اور اس نے الحمدللہ کہنے کی بجائے السلام علیکم کہا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ تم پر اور تمہاری ماں پر سلام۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو اس کو چاہئے کہ (الحمد للہ رب العالمین) کہے اور جواب دینے والے کو چاہئے کہ یرحمک اللہ کہے اور پھر چھینکنے والے کو (بطریق استحباب) چاہئے کہ یوں کہے یغفر اللہ لی ولکم یعنی اللہ تعالیٰ میری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ چھینک آنے پر الحمدللہ یا الحمدللہ رب العالمین کے الفاظ کہنے چاہیں اس موقع پر حاضرین کو سلام کرنا نہ کوئی معنی رکھتا ہے اور نہ اس کی کوئی اصل ہے۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ یرحمک اللہ کہنے والے کے جواب میں چھینکنے والے کو یغفر اللہ لی ولکم کے ساتھ یھدیکم اللہ ویصلح بالکم بھی کہنا اولیٰ و افضل ہے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر چھینکنے والا الحمدللہ کے بجائے کوئی اور لفظ کہے تو وہ چھینک کے جواب کا مستحق نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص کی چھینک کے جواب میں یرحمک اللہ نہیں فرمایا البتہ اس شخص نے چونکہ آپ ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا، رہی یہ بات کہ آپ ﷺ نے سلام کے جواب میں وعلی امک اور تمہاری ماں پر بھی سلام کے الفاظ کیوں فرمائے تو دراصل آپ ﷺ نے اس لفظ کے ذریعہ دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ایک تو یہ کہ اس موقع پر سلام کرنا بے محل و بے موقع ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سلام تو تمہیں کرنا چاہئے مگر کہے یوں کہ تم پر اور تمہاری ماں پر سلام۔ دوسری بات یہ کہ کسی بھی لفظ و کلام کا بے محل و بے موقع استعمال کرنا چاہئے اپنے آپ کو علم و تربیت اور مجلس کے آداب سے بے بہرہ ثابت کرنا ہے اور اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ میں اس شخص کی طرح ہوں جو کسی مردانا کی تربیت سے محروم اور محض ماں کی غیر موزوں تربیت کا حامل ہو اور جس کے دل و دماغ پر زنانہ ماحول اور زنانہ طور طریقوں کا اثر ہو۔ نیز علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان الفاظ کے ذریعہ گویا اس شخص کی نادانی کو ظاہر کیا گیا ہے جو اس میں ماں کے اوصاف کے سرایت کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اسی اعتبار سے وہ اپنی ماں کے حق میں آنحضرت ﷺ کی دعا کا محتاج تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ساتھ تمہاری ماں پر بھی سلامتی ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو عقل کی دولت سے نوازے اور نادانی کے فتنہ سے محفوظ رکھے۔

لگاتار تین بار سے زائد چھینکنے والے کو جواب دینا ضروری نہیں ہے

⑪ وَعَنْ عُبَيْدِبْنِ رِفَاعَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ شَمِّتِ الْعَاطِسَ ثَلَاثًا فَمَازَادَ فَإِنْ شِئْتَ فَشَمِّتْهُ وَإِنْ شِئْتَ فَلَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبید ابن رفاعہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا چھینکنے والے کی لگاتار تین چھینک تک جواب دیا جائے اور اگر کوئی شخص تین بار سے زائد چھینکے تو اس صورت میں اختیار ہے کہ چاہے اس کو جواب دیا جائے اور چاہے جواب نہ دیا جائے۔ اس روایت کو ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

⑫ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ شَمِّتْ اَخَاكَ ثَلٰثًا فَإِنْ زَادَ فَهُوَ زُكَامٌ رَوَاهُ اَبُوْ دَاؤدَ وَقَالَ لَا اَعْلَمُهُ اِلَّا اَنَّهُ رَفَعَ الْحَدِيْثَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ تم اپنے مسلمان بھائی کی چھینک کا تین بار تک جواب دو اگر وہ اس سے زائد بار چھینکے تو سمجھو کہ اس کو زکام ہو گیا ہے۔ اس روایت کو ابوداؤدؒ اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اس حدیث کو نبی کریم ﷺ تک پہنچایا ہے۔"

تشریح: امام ابوداؤدؒ کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کا اپنا قول نہیں ہے بلکہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جس کو ابوہریرہؓ نے نقل کیا ہے اور اگر اس روایت کو حدیث موقوف یعنی حضرت ابوہریرہؓ ہی کا قول کہا جائے تو بھی یہ روایت حدیث مرفوع یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کے حکم میں ہوگی کیوں کہ حضرت ابوہریرہؓ تین کے عدد کا تعین شارع علیہ السلام سے سنے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

چھینک آنے پر الحمد کے ساتھ صلوٰۃ و سلام کے الفاظ ملانا غیر مستحب ہے

⑬ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ رَجُلاً عَطَسَ اِلٰی جَنْبِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ابْنُ عُمَرَ وَاَنَا اَقُوْلُ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلَيْسَ هٰكَذَا عَلَّمَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَقُوْلَ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰی كُلِّ حَالٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت نافعؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کے برابر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے چھینکا اور پھر کہا الحمدللّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ۔ حضرت ابن عمرؓ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ میں بھی کہتا ہوں الحمدللّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ، لیکن یوں ہے نہیں (یعنی اس کا نہ تو حکم دیا گیا ہے اور نہ یہ مستحب اور آداب میں سے ہے کہ چھینک آنے پر الحمدللّٰہ کے ساتھ سلام کے الفاظ ملائیں جائیں۔ بلکہ اصل ادب اور حکم نبوی ﷺ کے اتباع کا تقاضہ یہی ہے کہ چھینک آنے پر ہم بلا کسی کمی وزیادتی کے وہی کہیں) جو رسول کریم ﷺ نے ہمیں سکھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم یوں کہیں الحمد للہ علی کل حال یعنی ہر حال میں خدا کی تعریف ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

بَابُ الضِّحْكِ

ہنسنے کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی ہنسی

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَارَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَجْمِعًا ضَاحِكًا حَتّٰی اَرٰی مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ اِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اتنا زیادہ ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ کا منہ کھل گیا ہو اور مجھے آپ ﷺ کے تالو یا حلق کا کوا یا مسوڑھا نظر آیا ہو بلکہ اکثر و بیشتر آپ ﷺ کا ہنسا مسکرانے کی حد تک رہتا تھا۔" (بخاریؒ)

② وَعَنْ جَرِيْرٍ قَالَ مَاحَجَبَنِيَ النَّبِيُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلَا رَاٰنِيْ اِلَّا تَبَسَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جریرؓ کہتے ہیں کہ جب سے میں مسلمان ہوا ہوں نبی کریم ﷺ نے کبھی مجھ کو منع نہیں کیا اور جب بھی آپ ﷺ مجھ کو دیکھتے مسکرا دیتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مجھ کو منع نہیں کیا" سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی مجھ کو اپنے پاس آنے سے روکا نہیں میں جس وقت چاہتا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا، چاہے کوئی خصوصی مجلس ہی کیوں نہ ہوتی بشرطیکہ مردانہ مجلس ہوتی! یا یہ مراد ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے آپ ﷺ سے کوئی چیز مانگی ہو اور آپ ﷺ نے اس کے دینے سے انکار کیا ہو میں نے آنحضرت ﷺ سے جب بھی مانگا اور جو کچھ بھی مانگا وہ مجھ عطا ہوا۔

صحابہؓ کی زبان سے زمانہ جاہلیت کی باتیں سن کر آنحضرت ﷺ کا مسکرانا

③ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُوْمُ مِنْ مُصَلَّاهُ الَّذِيْ يُصَلِّيْ فِيْهِ الصُّبْحَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ قَامَ وَكَانُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ فَيَأْخُذُوْنَ فِيْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ فَيَضْحَكُوْنَ وَيَتَبَسَّمُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلتِّرْمِذِيْ يَتَنَاشَدُوْنَ الشِّعْرَ۔

"اور حضرت جابرؓ ابن سمرۃؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ جس مصلے پر فجر کی نماز پڑھتے وہاں سے اس وقت تک نہیں اٹھتے تھے جب تک سورج اچھی طرح نہ نکل آتا جب سورج نکل آتا اور خاصا بلند ہوجاتا تو آپ ﷺ اشراق کی نماز پڑھنے یا گھر میں تشریف لے جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے، اس دوران صحابہؓ بطریق استہزاء مذمت زمانہ جاہلیت کی باتیں کرتے رہتے اور ہنسا کرتے ان کے ساتھ آنحضرت ﷺ بھی مسکراتے رہتے (مسلمؒ) اور ترمذیؒ کی روایات میں یوں ہے کہ اس دوران صحابہؓ اشعار پڑھنے سننے میں لگے رہتے۔"

تشریح: "اشعار" سے مراد وہ اشعار ہیں جو بیان توحید، منقبت رسالت اور ترغیب و ترہیب کے مضامین پر مشتمل ہوتے۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمانہ جاہلیت کی باتیں کرنا اور ان پر ہنسنا جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آنحضرت ﷺ بہت مسکراتے تھے

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَكْثَرَ تَبَسُّمًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواه الترمذی)

"حضرت عبداللہ ابن حارث ابن جزءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے زیادہ کسی اور شخص کو مسکراتے نہیں دیکھا" (ترمذیؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

صحابہؓ کے ہنسنے کا ذکر

⑤ وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ سُئِلَ ابْنُ عُمَرَ هَلْ كَانَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضْحَكُوْنَ قَالَ نَعَمْ وَالْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ أَعْظَمُ مِنَ الْجَبَلِ وَقَالَ بِلَالُ بْنُ سَعْدٍ أَدْرَكْتُهُمْ يَشْتَدُّوْنَ بَيْنَ الْأَغْرَاضِ وَيَضْحَكُ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ فَإِذَا كَانَ اللَّيْلُ كَانُوْا رُهْبَانًا۔ (رواه فی شرح السنة)

"حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ ہنسا کرتے تھے، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں! حالانکہ ان کے دلوں میں پہاڑ سے بھی بڑا ایمان تھا۔ اور حضرت بلال ابن سعد تابعیؒ کہتے ہیں کہ میں نے صحابہؓ کو اس حال میں پایا ہے کہ وہ دن میں تیر اندازی کی مشق کے وقت تیر کے نشانوں کے درمیان دوڑا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے مگر جب رات آتی تو وہ اللہ سے بہت زیادہ ڈرنے والے ہوجاتے۔" (شرح السنة)

تشریح: "حالانکہ ان کے دلوں میں پہاڑ سے بھی بڑا ایمان تھا" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب ہنسنے مسکرانے کا موقع ہوتا تو وہ ہنسا کرتے تھے لیکن اس طرح نہیں ہنستے تھے جیسے اہل غفلت اور دنیادار لوگ ہنستے ہیں کیوں کہ ایسی ہنسی جو حد سے بڑھی ہوئی ہو دل کو

غافل کر دیتی ہے اور نور ایمان میں خلل ڈالتی ہے چنانچہ صحابہ ہنسنے کی حالت میں بھی شرعی آداب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے اور اپنے ایمان کو کامل درجہ پر باقی رکھتے تھے۔

تو وہ اللہ سے بہت زیادہ ڈرنے والے ہو جاتے کا مطلب یہ ہے کہ جب رات آتی تو صحابہ دنیا کے سارے کام کاج اور آرام و راحت چھوڑ کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو جاتے اور خوف الٰہی کے غلبہ سے روتے گڑگڑاتے اور مناجات والتجا میں مصروف رہتے۔

بَابُ الْاَسَامِیْ

اسماء کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے ناموں کے احکام واضح ہوں گے اور یہ معلوم ہوگا کہ کس طرح کے نام رکھنے چاہئیں، کون سے نام اچھے ہیں اور کون سے نام برے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی کنیت پر اپنی کنیت مقرر نہ کرو

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی السُّوْقِ فَقَالَ رَجُلٌ یَا اَبَا الْقَاسِمِ فَالْتَفَتَ اِلَیْہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّمَا دَعَوْتُ ھٰذَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَمُّوْا بِاسْمِیْ وَلَا تَکْتَنُوْا بِکُنْیَتِیْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ بازار میں تھے ایک شخص نے کسی کو ابوالقاسم کہہ کر پکارا، آپ ﷺ نے پلٹ کر اس شخص کی طرف دیکھا اس نے عرض کیا کہ میں نے آپ ﷺ کو نہیں پکارا، تھا بلکہ اس شخص کو آواز دی تھی اور یہ کہہ کر ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو وہاں موجود تھا نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ تم میرے نام پر نام رکھ لو لیکن میری کنیت پر کنیت مقرر نہ کرو۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

② وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ سَمُّوْا بِاِسْمِیْ وَلَا تَکْتَنُوْا بِکُنْیَتِیْ فَاِنِّیْ اِنَّمَا جُعِلْتُ قَاسِمًا اَقْسِمُ بَیْنَکُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میرے نام پر نام رکھا کرو لیکن میری کنیت پر کنیت مقرر نہ کرو کیونکہ مجھ کو قاسم قرار دیا گیا ہے۔ اور میں تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کنیت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی ذات کی نسبت باپ یا بیٹے کی طرف کر کے اپنے کو مشہور و متعارف کرائے جیسے ابن فلاں یا ابوفلاں یعنی فلاں کا بیٹا فلاں کا باپ وغیرہ، یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کنیت اس نام کو کہتے ہیں جو باپ، بیٹا یا بیٹی، ماں کے تعلق سے بولا جائے۔

اور میں تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو جو علم اور حکمت دینی احکام و مسائل اور دنیاوی دولت جیسے مال غنیمت وغیرہ عطا کرتا ہے اس کو میں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔ بعض حضرات کے نزدیک "یہ تقسیم کرتا ہوں" سے مراد یہ ہے کہ میں خدا کے نیک بندوں کو جنت اور دوسری نعمتوں کی بشارت و خوش خبری دیتا ہوں۔ اور بدکار لوگوں کو دوزخ وغیرہ سے ڈراتا ہوں، لہٰذا یہ صفت چونکہ تمہارے اندر موجود نہیں ہے اور تم اس مقام پر فائز نہیں ہو اس لئے تم میری کنیت کو اختیار کرنے کے مجاز نہیں البتہ اپنا نام یا اپنی اولاد کا نام لفظ اور صورۃً میرے نام پر رکھ سکتے ہو۔ حاصل یہ کہ میں محض اس سبب سے ابوالقاسم نہیں ہوں کہ میرے بیٹے

کا نام قاسم ؑ ہے بلکہ مجھ میں قاسمیت کے معنی کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے بایں اعتبار کہ مجھ کو دینی و دنیاوی امور و دولت کا تقسیم کنندہ قرار دیا گیا ہے لہٰذا جب میں نہ تو ذات کے اعتبار سے اور نہ صفات کے اعتبار سے تم میں سے کسی بھی شخص کی مانند ہوں تو تم کو میری کنیت پر اپنی کنیت مقرر نہ کرنی چاہئے۔ واضح رہے کہ اس صورت میں ابو کے معنی باپ کے نہیں ہوں گے بلکہ اس وصف کے مالک ہوں گے جیسا کہ کسی شخص کو ابوالفضل کہا جائے درآنحالیکہ اس کے بیٹے کا نام فضل نہ ہو۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی کنیت پر مقرر کرنے کی ممانعت کا تعلق خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے تھا تاکہ تخاطب کے وقت ذات نبوی ﷺ اور دوسرے لوگوں کے درمیان اشتباہ کی صورت پیدا نہ ہو جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے یہی قول صحیح ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوتا ہے کہ محمد نام رکھنا تو جائز ہے لیکن۔ ابوالقاسم کنیت مقرر کرنا درست نہیں ہے خواہ یہ صورت ہو کہ جس شخص کا نام محمد ہو وہ ابوالقاسم کو اپنی کنیت قرار دینا چاہے اور خواہ یہ صورت ہو کہ نام کچھ اور ہو اور محض کنیت ابوالقاسم مقرر کرنا چاہے۔ حاصل یہ کہ کسی بھی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ابوالقاسم کو اپنی کنیت قرار دے خواہ اس کا نام محمد ہو یا کچھ اور ہو، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور اصحاب ظواہر کا یہی قول ہے اور وہ انہیں حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں دوسرا قول امام محمد شیبانیؒ کا ہے اور وہ یہ ہے کہ نام اور کنیت کو ایک ساتھ جمع کرنا درست نہیں ہے یعنی جس کا نام محمد ہو وہ اپنی کنیت ابوالقاسم نہ رکھے البتہ جس کا نام محمد نہ ہو اس کو صرف ابوالقاسم کہنا کہلانا جائز ہے ان کے نزدیک ان دونوں حدیثوں کا مطلب یہی ہے کہ کوئی شخص اپنی ذات کے لئے اس نام و کنیت کو ایک ساتھ اختیار نہ کرے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں کو جمع کرنا بھی جائز ہے یعنی جس شخص کا نام محمد ہو وہ بھی اپنی کنیت ابوالقاسم رکھ سکتا ہے اس قول کی نسبت حضرت امام مالکؒ کی طرف کی جاتی ہے ان کا کہنا ہے کہ جن احادیث میں اس کی ممانعت منقول ہے وہ منسوخ ہیں، چنانچہ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اس ممانعت کا تعلق آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک سے تھا آپ ﷺ کے بعد یہ جائز ہے اس جماعت کی دلیل حضرت علیؓ کی یہ حدیث ہے کہ جب انہوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ عرض کیا کہ اگر آپ ﷺ کے بعد میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوا تو میں اس کا نام اور کنیت آپ ﷺ کے نام و کنیت کی طرح رکھوں گا؟ تو آپ ﷺ نے ان کو اس کی اجازت عطا فرمائی، چنانچہ حضرت محمد بن الحنفیہؒ جو آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد پیدا ہوئے تھے، حضرت علیؓ نے ان کی کنیت ابوالقاسم رکھی۔ ایک اور جماعت کہ جس کا قول ناقابل اعتماد ہے یہ کہتی ہے کہ کسی شخص کو آنحضرت ﷺ کا نام رکھنا بھی جائز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تمام اقوال کی روشنی میں جو قول سب سے صحیح اور حنفی مسلک کے مطابق ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا نام رکھنا تو جائز بلکہ مستحب ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی کنیت پر اپنی کنیت رکھنا اگرچہ اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کے بعد سے ہو۔ ممنوع ہے اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یہ ممنوع تر تھا اسی طرح نام اور کنیت دونوں کو جمع کرنا بطریق اولی ممنوع ہوگا، جہاں تک حضرت علیؓ کے بارے میں مذکورہ بالا روایت کا تعلق ہے تو وہ ان کے ساتھ ایک مخصوص معاملہ تھا جیسا کہ حدیث کے سیاق سے واضح ہوتا ہے لہٰذا ان کے علاوہ کسی اور کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی کنیت پر اپنی کنیت رکھے اس کی تائید ابن عساکرؒ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو جمع الجوامع میں حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ایک دن اسی مسئلہ پر حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت طلحہؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ نے اپنے لڑکے کا آنحضرت ﷺ کے نام پر محمد رکھا ہے اور اس کی کنیت بھی آنحضرت ﷺ کی کنیت پر ابوالقاسم رکھی ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ نے کسی ایک شخص کے لئے ان دونوں کو جمع کرنے سے منع فرمایا ہے حضرت علیؓ نے قریشی صحابہؓ کو بلوایا ان سب نے حاضر ہو کر گواہی دی کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو مخصوص طور پر اس بات کی اجازت دیدی تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے بعد اپنے ہونے والے بچے کا نام و کنیت آپ ﷺ کے نام و کنیت پر رکھ لیں۔

عبداللہ اور عبدالرحمٰن سب سے بہتر نام ہیں

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَبَّ اَسْمَآءِ کُمْ اِلَی اللّٰہِ عَبْدُاللّٰہِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل کے نزدیک تمہارے ناموں میں سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ سے مراد ہے کہ یہ دونوں نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن انبیاء کے ناموں کے بعد سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں اس اعتبار سے کہا جائیگا کہ یہ دونوں نام اسم محمد سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہیں بلکہ پسندیدگی میں ان دونوں کا درجہ یا تو اسم محمد کے درجہ سے کم ہے یا برابر ہے۔

چند ممنوع نام

(۴) وَعَنْ سَمُرَۃَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتُسَمِّیَنَّ غُلَامَکَ یَسَارًا وَّلَا رَبَاحًا وَلَا نَجِیْحًا وَلَا اَفْلَحَ فَاِنَّکَ تَقُوْلُ اَثَمَّ ھُوَفَلَا یَکُوْنُ فَیَقُوْلُ لَا رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَہٗ قَالَ لَاتُسَمِّ غُلَامَکَ رَبَاحًا وَلَایَسَارًا وَلَا اَفْلَحَ وَلَا نَافِعًا۔

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اپنے غلام کا نام یسار، رباح، نجیح، اور افلح نہ رکھو کیوں کہ اگر کسی وقت تم نے کسی شخص سے پوچھا کہ کیا وہ (مثلاً) یسار یا رباح یہاں ہے اور (فرض کرو) وہ وہاں نہ ہوا تو جواب دینے والا کہے گا کہ وہ (یعنی یسار یا رباح) یہاں نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

اور مسلمؒ ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے غلام کا نام، رباح، یسار افلح، اور نافع نہ رکھو۔

تشریح: یسار، یسر سے ہے جس کے معنی فراخی اور تونگری کے ہیں۔ رباح، ربح سے ہے جس کے معنی فائدہ اور نفع کے ہیں، نجیح نجح سے ہے جس کے معنی فتحمندی یا مطلب یابی کے ہیں، اَفْلَحْ، فَلَاحْ سے ہے جس کے معنی کامیابی و نجات کے ہیں اور نافع نفع سے ہے جس کے معنی فائدہ کے ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے نام رکھنے ممنوع ہیں کیونکہ مثال کے طور پر اگر کسی شخص نے یسار نام رکھا اور کسی وقت گھر والوں سے پوچھا کہ یہاں یسار ہے؟ گھر والوں نے جواب دیا کہ گھر میں یسار نہیں ہے تو اگرچہ اس صورت میں متعین ذات مراد ہوگی مگر لفظ یسار کے حقیقی معنی کے اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ گھر میں فراخی و تونگری نہیں ہے اور اس طرح کہنا برائی کی بات ہے اس پر دوسرے مذکورہ بالا الفاظ کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

مسلمؒ کی دوسری روایت میں "نجیح" کے بجائے "نافع" کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ ممانعت کا تعلق محض انہی ناموں سے نہیں ہے بلکہ اور دوسرے نام بھی جو ان الفاظ کے معنی میں ہوں، یہی حکم رکھتے ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس طرح کے نام رکھنے مکروہ تنزیہی ہیں نہ کہ مکروہ تحریمی۔

(۵) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَرَادَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَنْھٰی اَنْ یُسَمّٰی بِیَعْلٰی وَبِبَرَکَۃَ وَبِاَفْلَحَ وَبِیَسَارٍ وَبِنَافِعٍ وَبِنَحْوِ ذٰلِکَ ثُمَّ رَاَیْتُہٗ سَکَتَ بَعْدُ عَنْھَا ثُمَّ قُبِضَ وَلَمْ یَنْہَ عَنْ ذٰلِکَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ یعلی، برکت، افلح، یسار، نافع اور اس طرح کے دوسرے نام رکھنے سے

لوگوں کو منع فرمادیں لیکن پھر میں نے دیکھا کہ اس ارادہ کے بعد آپ ﷺ نے سکوت فرمایا، یہاں تک کہ آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور ان ناموں کے رکھنے کو منع نہیں فرمایا۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا طرح کے نام رکھنے کی ممانعت نافذ نہیں ہوئی ہے جب کہ پچھلی حدیث ممانعت کے نفاذ پر واضح طور سے دلالت کرتی ہے اس تضاد کو دور کرنے کے لئے یحیی کہتے ہیں کہ گویا حضرت جابرؓ نے ممانعت کی علامتوں کو دیکھا اور وہ چیز سنی جو ممانعت کی طرف اشارہ کرتی ہے چونکہ انہوں نے ممانعت کا حکم صریح طور سے نہیں سنا تھا اس لئے اس مسئلہ کو انہوں نے مذکورہ اسلوب میں بیان کیا لیکن یہ ممانعت چونکہ حدیث صحیح سے ثابت ہوئی ہے اس لئے یہی کہا جائے گا کہ ممانعت ثابت ہے۔ علاوہ ازیں ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اس تضاد کو دور کرنے کے لئے ایک اور تاویل ہے وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کے ارادہ کا تعلق دراصل اس ممانعت کو نہی تحریمی کے طور پر نافذ کرنے سے تھا لیکن اس کے بعد آپ ﷺ نے امت کے حق میں آسانی و نرمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے سکوت فرمایا کیوں کہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ ناموں کا مسئلہ ایسا ہے جس کی طرف لوگ زیادہ توجہ نہیں دیں گے اور اچھے و برے ناموں میں فرق و امتیاز کرنے کے پابند نہیں ہوں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے امت کے لوگ دینی نقصان میں مبتلا ہوں گے! لہٰذا کہا جائے گا کہ جس روایت سے ممانعت کا عدم نفاذ ثابت ہوتا ہے اس کا تعلق نہی تحریمی سے ہے اور حقیقت میں مسئلہ بھی یہی ہے کہ مذکورہ طرح کے نام رکھنا مکروہ تنزیہی ہے مکروہ تحریمی نہیں ہے۔

شہنشاہ کا نام ولقب اختیار نہ کرو

(۶) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخْنَى الْاَسْمَآءِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ اللّٰهِ رَجُلٌ يُسَمّٰى مَلِكَ الْاَمْلَاكِ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِىُّ وَفِىْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ قَالَ اَغْيَظُ رَجُلٍ عَلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَخْبَثُ رَجُلٌ كَانَ يُسَمّٰى مَلِكَ الْاَمْلَاكِ لَامَلِكَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (بخاریؒ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین نام والا وہ شخص ہوگا جس کو شہنشاہ کا نام دیا جائے۔" (بخاریؒ)

اور مسلمؒ کی روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین اور سب سے بدتر وہ شخص ہوگا جس کو شہنشاہ کا نام دیا جائے یاد رکھو خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی بادشاہ نہیں ہے، چہ جائیکہ کسی کو شہنشاہ یعنی بادشاہوں کا بادشاہ کہا جائے اور صف شہنشاہیت ایک ایسا وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہے کہ اس وصف میں کسی مخلوق کے شریک ہونے کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ایسا نام نہ رکھو جس سے نفس کی تعریف ظاہر ہو

(۷) وَعَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ اَبِىْ سَلَمَةَ قَالَتْ سُمِّيْتُ بَرَّةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمُ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ سَمُّوْهَا زَيْنَبَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ کہتی ہیں کہ میرا نام برہ یعنی نیکوکار رکھا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے نفس کی تعریف نہ کرو تم میں جو شخص نیکوکار ہے اس کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اس بچی کا نام زینب رکھو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایسا نام نہ رکھنا چاہئے جس کے لفظی مفہوم سے نفس کی تعریف ظاہر ہو کیونکہ اس کی وجہ سے نفس

میں برائی پیدا ہو جاتی ہے۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ جُوَيْرِيَةُ اِسْمُهَا بَرَّةَ فَحَوَّلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْمَهَا جُوَيْرِيَةَ وَكَانَ يَكْرَهُ اَنْ يُّقَالَ خَرَجَ مِنْ عِنْدِ بَرَّةَ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ، حضرت جویریہؓ کا نام برہ تھا لیکن رسول کریم ﷺ نے ان کا یہ نام بدل کر جویریہؓ رکھ دیا کیونکہ آنحضرت ﷺ کو یہ پسند نہیں تھا کہ کوئی شخص یوں کہے کہ آپ ﷺ برہ کے پاس سے نکلے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "برہ کے معنی نیکوکار کے ہیں" لہٰذا آپ ﷺ نے اس لفظ کے اصل معنی کے اعتبار سے اس کو پسند نہیں کیا کہ جب برہ کے گھر سے نکلیں یوں کہا جائے کہ آپ ﷺ برہ یعنی نیکوکار کے پاس سے نکلے کیونکہ نیکوکار کے پاس سے نکلنا کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی۔ وَكَانَ يَكْرَهُ کے بارے میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اپنی مذکورہ ناپسندیدگی کے بارے میں خود آنحضرت ﷺ نے اپنے متعلق سے ان الفاظ کے ذریعہ خبر دی ہوگی۔

واضح رہے کہ اس حدیث میں برہ یا اس طرح کا کوئی اور نام رکھنے کی ممانعت کا سبب مذکورہ ناپسندیدگی کو قرار دیا گیا ہے جب کہ حضرت زینبؓ کے بارے میں اس ممانعت کا سبب تزکیہ نفس کی تعریف کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ اسباب کے درمیان کوئی مزاحمت نہیں ہوا کرتی ایک چیز کے دو مختلف سبب ہو سکتے ہیں، چنانچہ جن دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ دونوں مذکورہ ممانعت کا سبب بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں، علاوہ ازیں ہو سکتا ہے کہ زینب کے خاندان و قبیلہ کے لوگوں سے معلوم کرنے کے بعد یہ واضح ہوا ہوگا کہ انہوں نے زینبؓ کا نام برہ واقعۃً ان کے نفس کی تعریف اور مدح و ثنا کے قصد سے رکھا تھا جب کہ حضرت جویریہؓ کے حق میں اس ممانعت کا سبب۔ آنحضرت ﷺ برہ کے پاس سے نکلے کہے جانے کی ناپسندیدگی کو قرار دیا اور یہ بات تھی بھی کہ ازواج مطہرات کے پاس آنحضرت ﷺ کے جانے آنے کے بارے میں عام طور پر اسی طرح کہا جاتا تھا کہ آنحضرت ﷺ فلاں زوجہ مطہرہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں یا آنحضرت ﷺ فلاں زوجہ مطہرہ کے ہاں سے نکلے ہیں۔ نیز اس احتمال کو بھی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے کہ جس طرح یسار اور نجیح وغیرہ جیسے ناموں کی ممانعت کے سلسلے میں بدفالی کا اعتبار کیا گیا ہے اسی طرح برہ کے سلسلے میں بھی اس کا اعتبار ہو، اور جس طرح برہ کے سلسلے میں تزکیہ و کراہت کا اعتبار کیا گیا ہے، اسی طرح یسار اور نجیح وغیرہ کے سلسلہ میں بھی اس کا اعتبار ہو۔

برے نام کو بدل دینا مستحب ہے

⑨ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ بِنْتًا كَانَتْ لِعُمَرَ يُقَالُ لَهَا عَاصِيَةُ فَسَمَّاهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَمِيْلَةَ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی ایک بیٹی تھی جس کو عاصیہ بمعنی گنہ گار کہا جاتا تھا چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس کا نام جمیلہ رکھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کا دستور تھا کہ وہ اپنے بچوں کا نام عاصی یا عاصیہ رکھتے تھے اس کے لفظی معنی نافرمان سرکش، متکبر اور خدا اور اس کے دین کا مخالف ہیں چنانچہ زمانہ اسلام کے ظہور کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس طرح کے نام رکھنے کو ناپسند فرمایا اور جس کسی کا نام عاصی یا عاصیہ تھا اس کو بدل کر دوسرا نام رکھ دیا اس سے معلوم ہوا کہ برے ناموں کو بدل دینا مستحب ہے۔

⑩ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ اُتِيَ بِالْمُنْذِرِ بْنِ اَبِيْ اُسَيْدٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ وُلِدَ فَوَضَعَهُ عَلٰى فَخِذِهٖ فَقَالَ مَا اسْمُهُ قَالَ فُلَانٌ قَالَ لَا وَلٰكِنْ اِسْمُهُ الْمُنْذِرُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ منذر ابن ابی اسید جب پیدا ہوئے تو ان کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، آپ ﷺ نے ان کو اپنی ران مبارک پر رکھا اور پوچھا کہ اس کا کیا نام ہے؟ لانے والے نے بتایا کہ فلاں نام ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (یہ نام اچھا

نہیں ہے) بلکہ اس کا نام منذر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "فلاں نام ہے" یعنی ماں باپ یا خاندان والوں نے جو لکھا تھا لانے والے نے اس کو بیان کیا چونکہ راوی کو وہ نام معلوم نہیں تھا اس لئے انہوں نے اس طرح نقل کیا۔

"منذر" اصل میں انذار سے مشتق ہے جس کے معنی تبلیغ احکام اور عذاب خداوندی سے ڈرانے والے کے ہیں۔

اپنے غلام اور باندی کو میرا بندہ یا میری بندی نہ کہو

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَایَقُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ عَبْدِیْ وَاَمَتِیْ کُلُّکُمْ عَبِیْدُ اللّٰهِ وَکُلُّ نِسَآءِ کُمْ اِمَاءُ اللّٰهِ وَلٰکِنْ لِیَقُلْ غُلَامِیْ وَجَارِیَتِیْ وَفَتَایَ وَفَتَاتِیْ وَلَا یَقُلِ الْعَبْدُ رَبِّیْ وَلٰکِنْ لِیَقُلْ سَیِّدِیْ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِیَقُلْ سَیِّدِیْ وَمَوْلَایَ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَایَقُلِ الْعَبْدُ لِسَیِّدِهٖ مَوْلَایَ فَاِنَّ مَوْلٰکُمُ اللّٰهُ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام اور باندی کو "عبدی" میرا بندہ اور "امتی" میری لونڈی نہ کہے، تمہارے سب مرد اللہ کے بندے اور تمہاری سب عورتیں اللہ کی لونڈیاں ہیں، بلکہ یوں کہے کہ میرا غلام یعنی میرا لڑکا اور میری جاریہ یعنی میری لڑکی، یا میرا خادم اور میری خادمہ اسی طرح کوئی غلام اپنے مالک کو میرا رب نہ کہے بلکہ میرا سردار کہنا چاہئے۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ کوئی غلام اپنے مالک کو "میرا مولی" نہ کہے، کیونکہ تمہارا مولی تو صرف اللہ ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: جب غلام اور باندی رکھنے کا رواج تھا تو لوگ ان کو ایسے الفاظ کے ذریعہ یاد اور مخاطب کیا کرتے تھے جو اپنے معنی کے اعتبار سے بالکل غیر موزوں ہوتے تھے۔ مثلاً زمانہ جاہلیت میں اہل عرب جب اپنے غلام یا اپنی باندی کو مخاطب کرتے تو اس طرح کہتے، یاعبدی اے میرے بندے۔ اور۔ یا امتی، یعنی اے میری لونڈی ظاہر ہے کہ لفظ "عبد" ایک مخصوص مفہوم کا حامل ہے اور اسلامی عقیدے کے مطابق انسان اللہ تعالیٰ ہی کا عبد بندہ ہے اور ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے انسان کا بندہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ عبد یا بندہ عبادت کرنے والے کو کہتے ہیں اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے، کسی مخلوق کی نہیں! اس اعتبار سے اگر کوئی انسان، کسی دوسرے انسان کو اپنا عبد یعنی بندہ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر وہ یا تو حقیقت عبدیت میں شرک کا مرتکب ہو رہا ہے یا شرک کا مرتکب نہ سہی ارتکاب شرک کے گمان کا سبب بن رہا ہے لہٰذا آپ ﷺ نے اس لفظ کو استعمال کرنے سے منع فرمایا اسی طرح قاموس کے مطابق لفظ "امۃ" کے معنی مملوکہ کے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی انسان کی حقیقی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کو حال ہے یہ ممکن نہیں ہے ایک انسان دوسرے انسان کی ملکیت کا دعوی کرے لہٰذا آپ ﷺ نے اس لفظ کو بھی استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

جن الفاظ کے ذریعہ غلام و باندی کو یاد اور مخاطب کرنے کی اجازت دی گئی ہے ان میں سے غلام کے معنی لڑکے کے ہیں، جاریہ کے معنی لڑکی کے ہیں، فتی کے معنی جوان مرد اور فتاۃ کے معنی جوان عورت کے ہیں ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے استعمال میں نہ صرف یہ کہ مفہوم کے اعتبار سے کوئی غیر موزونیت نہیں ہے بلکہ ان الفاظ کے ذریعہ ایک طرح سے غلام و باندی کے تئیں شفقت و محبت اور یگانگت و رواداری کے جذبات کا بھی اظہار ہوتا ہے، رہی یہ بات کہ جب فتی اور فتاۃ جوان مرد اور جوان عورت کو کہتے ہیں تو ان الفاظ کا اطلاق ان غلام اور باندی پر کیسے ہو گا جو عمر رسیدہ اور بوڑھے ہوں تو اس بارے میں یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ غلام اور باندی، خواہ وہ کتنے ہی بوڑھے ہوں، عام طور پر ان کے آقا اور مالک ان کے ساتھ چھوٹوں اور جوانوں ہی کا سا معاملہ رکھتے تھے، اور ان کو بڑھاپے کا وہ لحاظ احترام نہیں کرتے تھے جو ان کی عمر کے دوسرے لوگوں یعنی آزاد بوڑھیوں کا ہوتا تھا، علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خدمت گاری اور کام کاج کے سلسلے میں چوں کہ بوڑھے غلام و باندی بھی جوانوں جیسی مستعدی اور چستی رکھتے تھے اس لئے ان کو بھی فتی اور فتاۃ کہا جاتا تھا۔ حاصل یہ کہ اس ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ واضح کرنا ہے کہ اگر اپنے غلام اور باندی کو ایسے الفاظ کے ذریعہ مخاطب کرنا ہی ہو جو ان کی حیثیت و رتبہ کو

واضح کر سکیں تو اس مقصد کے لئے عبد اور امتہ سے بہتر مذکورہ الفاظ ہیں، تاہم علماء نے یہ لکھا ہے کہ عبد اور امتہ کے الفاظ کے استعمال کی اس ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اپنے غرور و تکبر کے اظہار اور باندی کو حقیر و ذلیل جاننے کے طور پر ہو، ورنہ غلام و باندی پر لفظ عبد اور امتہ کا اطلاق خود قرآن و حدیث میں منقول ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اور ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ اس طرح بہت سی احادیث میں بھی غلام اور باندی کو، لفظ عبد اور امتہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جس طرح مالکوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے غلام و باندی کو ناشائستہ اور غیر موزوں الفاظ کے ذریعہ مخاطب نہ کریں، چنانچہ فرمایا گیا کہ کوئی غلام و باندی اپنے آقا کو ربی میرا رب نہ کہے کیوں کہ اگرچہ رب کے معنی تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں، اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے ایک آقا کو اپنے غلام و باندی کا تربیت و پرورش کرنے والا کہا جا سکتا ہے، لیکن ربوبیت علی الاطلاق ایک ایسی خاص صفت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہے، لہٰذا کسی انسان کو "رب" کہنا شرک کے گمان کا باعث ہے، لیکن واضح رہے کہ اس ممانعت کا تعلق بھی اس صورت سے ہے جب کہ اس لفظ کے استعمال کا مقصد اپنے مالک کی تعظیم ہو، ورنہ مالک پر لفظ رب کا اطلاق بھی قرآن کریم سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا گیا..... اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ غلام و باندی کو اپنے مالک کے تئیں جس لفظ کو استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

وہ "سید" ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مالک کو اپنے غلام باندی پر سیادت و فضیلت اور امارت و ریاست حاصل ہوتی ہے اس اعتبار سے غلام و باندی کا اپنے مالک کو، یاسیدی یعنی اے میرے سردار یا اے میرے آقا کہہ کر مخاطب کرنا موزوں و مناسب ہے۔

واضح رہے کہ ایک روایت میں تو غلام و باندی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مالک کو مولی کہیں لیکن دوسری روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کوئی غلام و باندی اپنے مالک کو مولی نہ کہے ان دونوں روایتوں کے درمیان پائے جانے والے ظاہری تضاد کو اس تاویل کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے کہ مولی کے کئی معنی آتے ہیں، جیسے متصرف و منتظم، ناصر اور معین وغیرہ چنانچہ غلام و باندی کو اپنے مالک کے تئیں "مولی" کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت و جواز کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ وہ اس کے معنی مراد نہ لیں جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں "ہاں" جس معنی کا اطلاق بندوں کی ذات پر بھی ہو سکتا ہے جیسے متصرف و منتظم تو ان معنی کو مراد لیتے ہوئے مالک کے لئے لفظ مولی کا استعمال کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ مولی کا اطلاق معتق اور معتق پر کیا جاتا ہے، جیسا کہ بخاریؒ کی روایت میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے مولی القوم من انفسهم یا طبری کی روایت میں ہے مولی الرجل اخوه اور مالک کو "مولی" کہنے کی ممانعت و عدم جواز کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اس کے وہ معنی مراد لئے جائیں جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے ناصر اور معین وغیرہ کیونکہ ان کے معنی کے اعتبار سے مولی کے حقیقی معنی صرف حق تعالیٰ ہے جیسا کہ یہ فرمایا گیا، نعم المولى ونعم النصير اس تاکی روشنی میں دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تضاد باقی نہیں رہا حاصل یہ کہ اس مسئلے میں وہی ضابطہ پیش نظر رہے گا جو پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اگر لفظ "مولی" کا استعمال غایت تعظیم کے طور پر ہو تو ممانعت کا حکم نافذ ہوگا ورنہ بصورت دیگر اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

انگور کو "کرم" کہنے کی ممانعت

⑭ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْلُوا الْكَرْمُ فَاِنَّ الْكَرْمَ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ لَا تَقُوْلُوا الْكَرْمَ وَلٰكِنْ قُوْلُوا الْعِنَبُ وَالْحَبَلَةُ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا (انگور کے درخت کو) کرم نہ کہو کیونکہ کرم مؤمن کا دل ہے (مسلم)، اور مسلمؒ ہی کی ایک حدیث میں حضرت وائل ابن حجرؓ سے یوں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا انگور کے درخت کو کرم نہ کہو بلکہ عنب اور حبلہ کہو۔"

تشریح: حبلہ۔ حاء اور باء کے زبر کے ساتھ، یا باء کے زبر اور باء کے جزم کے ساتھ، اصل میں انگور کے درخت یا ایک قول کے مطابق انگور کی جڑ یا شاخ کو کہتے ہیں، بعض مواقع پر مجازاً انگور کو بھی حبلہ کہا گیا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انگور کو عنب یا حبلہ کہو یا اس کے اور جو نام ہیں وہ لیا کرو۔ لیکن اس کو "کرم" نہ کہا جائے اس ممانعت کا ایک پس منظر ہے اور وہ یہ کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب انگور کو کرم کہا کرتے تھے کیونکہ انگور سے شراب بنتی ہے اور ان کا کہنا تھا کہ اس شراب کے پینے سے آدمی میں سخاوت و ہمت اور جود و کرم کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں چنانچہ جب شریعت نے شراب کو حرام کر دیا اور وہ ایک نجس و ناپاک چیز قرار پائی تو آنحضرت ﷺ نے انگور کو کرم کہنے سے منع فرمایا کیونکہ ایک ایسی چیز کو نذ کورہ نام کے ذریعہ کرم و خیر کے ساتھ متصف کرنا جو شراب جیسی ناپاک چیز کی جڑ ہے مناسب نہیں سمجھا گیا جب کہ انگور کو اتنے عمدہ نام سے یاد کرنے کا مطلب ایک حرام چیز کی تعریف و توصیف کا راستہ اختیار کرنا اور اس کی طرف سے دل و دماغ کو رغبت دلانا بھی ہو سکتا ہے، نیز آپ ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ "کرم" ایک ایسا اعلیٰ لفظ ہے جو اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے تمام بھلائیوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس اعتبار سے اس لفظ کا مصداق مؤمن اور اس کا قلب ہی ہو سکتا ہے نہ جو علم و تقویٰ کے نور کا مخزن اور اسرار معارف کا منبع ہے۔

زمانہ کو برا نہ کہو

⑬ وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُسَمُّوا عِنَبَ الْكَرْمَ وَلَا تَقُوْلُوْا يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ انگور کو کرم نہ کہو اور نہ یہ کہو کہ اے ناامیدی زمانہ کی کیونکہ بلاشبہ اللہ ہی کے اختیار میں زمانہ ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: زمانہ جاہلیت میں عام طور پر لوگوں کی عادت تھی کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی یا وہ کسی آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتے تو یوں کہتے۔ یا خیبۃ الدھر اور اس لفظ کے ذریعہ گویا وہ زمانہ کو برا کہتے تھے جیسا کہ اب بھی جاہلوں کی عادت ہے کہ وہ بات بات پر زمانہ کو برا کہتے ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو اس سے منع فرمایا کیونکہ زمانہ بذات خود کوئی چیز نہیں ہے، حالات میں الٹ پھیر اور زمانہ کے انقلابات مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں کہ جس بھلائی و برائی اور مصیبت و راحت کی نسبت زمانہ کی طرف کی جاتی ہے حقیقت میں وہ خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور وہی فاعل حقیقی ہے، پس زمانہ کو برا کہنا دراصل اللہ تعالیٰ کو برا کہنا ہے۔

⑭ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَسُبُّ اَحَدُكُمُ الدَّهْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں کوئی شخص زمانہ کو برا نہ کہے کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی زمانہ کو الٹ پھیر کرنے والا ہے۔" (مسلمؒ)

امتلاء نفس کو "خباثت نفس" سے تعبیر نہ کرو

⑮ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ خَبُثَتْ نَفْسِي وَلٰكِنْ لِيَقُلْ لَقِسَتْ نَفْسِي مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِي هُرَيْرَةَ يُؤْذِيْنِي ابْنُ اٰدَمَ فِي بَابِ الْاِيْمَانِ۔

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص (امتلاء کے وقت) یوں نہ کہے کہ میرا جی برا ہوا بلکہ لَقِسَتْ نَفْسِي کہے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت يُؤْذِيْنِي ابن ادم باب الایمان میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: خَبُثَتْ نفسی اور لقست نفسی یہ دونوں لفظ اگرمعنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں رکھتے بلکہ عربی میں ان دونوں کے معنی

ایک ہی ہیں یعنی جی متلانا اور طبیعت کا فاسد ہونا، لیکن آنحضرت ﷺ نے خبثت نفسی کہنے کو ناپسند فرمایا کیوں کہ لفظ "خبث" کی وجہ سے نہ صرف یہ جملہ قبیح ہو جاتا ہے بلکہ مؤمن کا لفظ خبث کو اپنے نفس کی طرف منسوب کرنا بھی لازم آتا ہے جو ایک مناسب بات نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ابوالحکم، کنیت کی ناپسندیدگی

(۱۶) عَنْ شُرَیْحِ بْنِ هَانِیءٍ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّهٗ لَمَّا وَفَدَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَعَ قَوْمِهٖ سَمِعَهُمْ یُکَنُّوْنَهٗ بِاَبِی الْحَکَمِ فَدَعَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَکَمُ وَاِلَیْهِ الْحُکْمُ فَلِمَ تُکْنٰی اَبَا الْحَکَمِ قَالَ اِنَّ قَوْمِیْ اِذَا اخْتَلَفُوْا فِیْ شَیْءٍ اَتَوْنِیْ فَحَکَمْتُ بَیْنَهُمْ فَرَضِیَ کِلَا الْفَرِیْقَیْنِ بِحُکْمِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحْسَنَ هٰذَا فَمَالَكَ مِنَ الْوَلَدِ قَالَ لِیْ شُرَیْحٌ وَمُسْلِمٌ وَعَبْدُاللّٰهِ قَالَ فَمَنْ اَکْبَرُهُمْ قَالَ قُلْتُ شُرَیْحٌ قَالَ فَاَنْتَ اَبُوْشُرَیْحٍ۔ (رواه ابوداؤد والنسائی)

"حضرت شریح ابن ہانیؒ اپنے والد حضرت ہانیؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جب وہ (حضرت ہانیؓ) اپنی قوم کے ساتھ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے سنا کہ ان کی قوم ان کو ابوالحکم کی کنیت کے ذریعہ یاد و مخاطب کرتی ہے، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ حکم تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور حکم اسی کی طرف سے ہے پھر تم نے اپنی کنیت ابوالحکم کیوں مقرر کی ہے؟ حضرت ہانیؓ نے عرض کیا کہ میری قوم مجھ کو ابوالحکم کی کنیت کے ذریعہ اس لئے پکارتی ہے کہ جب میری قوم کے لوگ کسی معاملہ میں اختلافات کا شکار ہوتے ہیں تو میرے پاس آتے ہیں اور میں ان کے معاملہ میں جو حکم فیصلہ کرتا ہوں دونوں فریق میرے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ یہ یعنی لوگوں کے تنازعات کو نمٹانا اور ان کے درمیان فیصلہ و حکم کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن یہ بتاؤ تمہارے کتنے بچے ہیں اور ان کے نام کیا ہیں انہوں نے کہا میرے تین بچے ہیں جن کے نام شریح مسلم اور عبداللہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ ان تینوں میں بڑا کون ہے؟ حضرت ہانیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا شریح! آنحضرت ﷺ نے فرمایا تو پھر آج سے تم ابوشریح ہو۔" (نسائیؒ)

تشریح: کنیت کبھی تو کسی وصف و صفت کی طرف نسبت کر کے مقرر کی جاتی ہے جیسے کوئی شخص اپنی کنیت ابوالفضل یا ابوالحکم اور ابوالخیر وغیرہ مقرر کرے، کبھی اولاد کی طرف نسبت کر کے مقرر کی جاتی ہے جیسے ابوسلمہ یا ابوشریح وغیرہ کبھی کنیت کا تعلق کسی ایسی خاص چیز کی طرف نسبت کرنے سے ہوتا ہے جس کے ساتھ انتہائی اختلاط اور ربط ہو، جیسے ابوہریرہؓ چنانچہ مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کا اصل نام عبداللہ تھا کہتے ہیں کہ ایک بلی ان کے پاس رہا کرتی تھی ایک دن وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس بلی کو اپنی آستین میں لئے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ بلی، آپ ﷺ نے فرمایا یَا اَبَاهُرَیْرَةَ بس اس دن سے ان کی کنیت ابوہریرہؓ مشہور ہو گئی اور کبھی کنیت محض علمیت کے لئے یعنی اصل نام کے طور پر ہوتی ہے، جیسے ابوبکرؓ اور ابوعمرؓ وغیرہ۔

"اور حکم اسی کی طرف سے ہے" سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ حقیقی حکم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ہر حکم و فیصلہ کی ابتداء و انتہا اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے کہ نہ صرف اس کے حکم و فیصلہ کو کوئی رد نہیں کر سکتا بلکہ اس کا حکم و فیصلہ حکمت و دانائی سے خالی نہیں ہوتا اس اعتبار سے یہ وصف چوں کہ حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے اور وہی اس صفت کا سزاوار ہے اس لئے کسی دوسرے کو مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ابوالحکم یعنی حکم و فیصلہ کا مالک کہے یا کہلائے کیوں کہ اس صورت میں اللہ کے اس وصف خاص میں غیر اللہ کے شریک ہونے کا گمان پیدا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ ابوت و ابنیت کے وہم کی وجہ سے اس کی ذات پر ابوالحکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔

"اجدع" شیطانی نام ہے

⑰ وَعَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ لَقِيْتُ عُمَرَ فَقَالَ مَنْ اَنْتَ قُلْتُ مَسْرُوْقُ بْنُ الْاَجْدَعِ قَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْاَجْدَعُ شَيْطَانٌ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت مسروقؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ جب میں حضرت عمرؓ سے ملا تو انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میں اجدع کا بیٹا مسروق ہوں۔ حضرت عمرؓ نے (میرے باپ کا نام اجدع سن کر) فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اجدع ایک شیطان کا نام ہے۔" (ابوداؤدؒ وابن ماجہؒ)

تشریح: "اجدع" اصل میں اس کو کہتے ہیں جس کے کان، ناک، ہونٹ، اور ہاتھ کٹے ہوئے ہوں اور کنایۃً اس نام کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے جس کی کسی بات میں کوئی وزن اور دلیل نہ ہو اسی مناسبت سے ایک شیطان کو اجدع کہا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا حضرت مسروقؒ کے بارے میں پوچھنا اور پھر آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد نقل کرنا گویا تفنن طبع کے طور پر تھا اور اس کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ اگر تمہارے والد حیات ہوں تو ان کا یہ نام بدل دو۔

اچھے نام رکھو

⑱ وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِاَسْمَائِكُمْ وَاَسْمَاءِ اٰبَائِكُمْ فَاَحْسِنُوْا اَسْمَائَكُمْ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن تم کو تمہارے اور تمہارے باپ کے ناموں سے پکارا جائے گا۔ لہٰذا تم اپنے اچھے نام رکھو۔" (احمدؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: "تم اچھے نام رکھو" اس ارشاد کے ذریعہ تمام بنی آدم کو خطاب کیا گیا ہے لہٰذا اس میں باپ بھی داخل ہیں اور ان کے لئے ہدایت ہے کہ وہ اپنے بچوں کا اچھا نام رکھیں۔

ایک روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا اور علماء نے لکھا ہے کہ ماؤں کے نام کے ساتھ پکارنے کی حکمت وعلت ایک تو یہ ہے کہ جو لوگ زنا کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہوں گے وہ اس صورت میں شرمندگی اور رسوائی سے بچ جائیں گے دوسرے حضرت عیسی علیہ السلام ابن مریم علیہ السلام کی رعایت حال مقصود ہوگی جو بے پدر تھے اور تیسرے حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے اس فضل وشرف کا اظہار مقصود ہوگا جو ان کو حضرت فاطمہؓ کے بیٹے ہونے کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کی طرف نسبت کے ذریعہ حاصل ہے۔ اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے تو کہا جائے گا کہ "تم کو تمہارے باپ کے ناموں سے پکارا جائے گا" میں باپ کو تغلیب پر حمل کیا جائے جیسا کہ ماں اور باپ دونوں کو ابوین کہا جاتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی موقع پر تو باپ کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا اور کسی موقع پر ماں کے نام کے ساتھ، یا بعض لوگوں کی نسبت ان کے باپ کی طرف کی جائے گی اور بعض لوگوں کی نسبت ان کی ماں کی طرف کی جائے گی اور یا یہ کہ بعض مقامات میں باپ کے نام کے ساتھ اور بعض مقامات میں ماں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔

آنحضرت ﷺ کے نام اور کنیت دونوں کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی ممانعت

⑲ وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى اَنْ يَّجْمَعَ اَحَدٌ بَيْنَ اِسْمِهٖ وَكُنْيَتِهٖ وَيُسَمِّيْ مُحَمَّدًا اَبَا

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص آپ ﷺ کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرے اور جس شخص کا نام محمد ہو اس کو ابوالقاسم (بھی) کہا جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مذکورہ ترجمہ اس صورت میں ہوگا جب کہ لفظ "محمد" مرفوع اور یسمی بصیغہ مجہول ہو جیسا کہ ترمذی اور شرح السنۃ اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں نقل کیا گیا ہے لیکن جامع الاصول اور مصابیح کے بعض نسخوں میں محمد کو نصب کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اس صورت میں یسمی صیغہ معروف کے ساتھ ہوگا اور ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ کوئی شخص اس آدمی کو ابوالقاسم کہے جس کا نام محمد ہو۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کا نام محمد ہو تو نہ خود اس کے لئے روا ہے کہ وہ اپنی کنیت ابوالقاسم مقرر کرے اور نہ کسی دوسرے شخص کے لئے مناسب ہے کہ وہ محمد نامی کو ابوالقاسم کہے اس مسئلہ کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

⑳ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا سَمَّيْتُمْ بِاسْمِيْ فَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِيْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ دَاوُدَ قَالَ مَنْ تَسَمّٰى بِاسْمِيْ فَلَا يَكْتَنِ بِكُنْيَتِيْ وَمَنْ تَكَنّٰى بِكُنْيَتِيْ فَلَا يَتَسَمَّ بِاسْمِيْ۔

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر تم میرے نام پر اپنا نام محمد رکھو تو میری کنیت پر کنیت (ابوالقاسم) مقرر نہ کرو۔ (ترمذیؒ، ابن ماجہ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ نیز ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میرے نام پر نام رکھے تو وہ میری کنیت پر کنیت نہ مقرر کرے اور جو شخص میری کنیت پر کنیت مقرر کرے تو میرے نام پر نام نہ رکھے۔"

تشریح: یہ حدیث بھی آنحضرت ﷺ کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی صریح ممانعت کو ظاہر کرتی ہے تاہم ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا یعنی صرف نام پر نام رکھنا یا صرف کنیت پر کنیت مقرر کرنا ممنوع نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کا نام اور کنیت ایک ساتھ اختیار کرنیکی ممانعت بطور تحریم نہیں ہے

㉑ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ امْرَاَةً قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ وَلَدْتُ غُلَامًا فَسَمَّيْتُهٗ مُحَمَّدًا وَكُنَّيْتُهٗ اَبَا الْقَاسِمِ فَذُكِرَ لِيْ اَنَّكَ تَكْرَهُ ذٰلِكَ فَقَالَ مَا الَّذِيْ اَحَلَّ اِسْمِيْ وَحَرَّمَ كُنْيَتِيْ اَوْمَا الَّذِيْ حَرَّمَ كُنْيَتِيْ وَاَحَلَّ بِاسْمِيْ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ مُحْيِ السُّنَّةِ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک عورت نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) میرے ایک لڑکا ہوا ہے اور میں نے اس کا نام محمد اور کنیت ابوالقاسم رکھی ہے لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ (ﷺ) اس کو پسند نہیں فرماتے یعنی بتانے والے نے مجھ کو یہ بتایا ہے کہ آپ (ﷺ) نے اپنا نام اور کنیت ایک ساتھ اختیار کئے جانے کو احرام قرار دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ایسی کیا چیز ہے جس نے میرے نام پر نام رکھنے کو تو حلال و جائز رکھا ہے اور میری کنیت پر کنیت مقرر کرنے کو حرام کیا ہے۔ یا یہ فرمایا کہ۔ ایسی کیا چیز ہے جس نے میری کنیت پر کنیت رکھنے کو تو حرام کیا ہے اور میرے نام پر نام رکھنے کو حلال رکھا ہے؟ (ابوداؤدؒ) اور محی السنۃ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کے سلسلے میں راوی نے (یہ فرمایا کہ) کے ذریعہ اپنے شک کو ظاہر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو پہلے نام کی حلت اور بعد میں کنیت کی حرمت کو ذکر کیا یا پہلے کنیت کی حرمت کو اور بعد میں نام کی حلت کو ذکر فرمایا۔ تاہم دونوں صورتوں میں معنی و مطلب ایک ہی ہیں، مفہوم و مقصد کے درمیان کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے! اصل بات یہ ہے کہ محدث جب کوئی حدیث بیان کرتا ہے

تو اس بات کی پوری احتیاط رکھتا ہے کہ اس نے حدیث کے الفاظ آنحضرت ﷺ سے جس طرح سنے ہیں یا جس طرح اس تک پہنچے ہیں اسی طرح بجنسہ ان کو نقل کرے چوں کہ اس موقع پر راوی کو الفاظ حدیث کے سلسلے میں شک ہوا اس لئے اس نے مذکورہ طرح سے بیان کیا۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی ممانعت بطریق تحریم یعنی حرام ہونے کے طور پر نہیں ہے بلکہ مکروہ تنزیہی کے طور پر ہے۔

(۲۲) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِيَّةِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِنْ وُلِدَلِي بَعْدَكَ وَلَدٌ اُسَمِّيْهِ بِاسْمِكَ وَاُكَنِّيْهِ بِكُنْيَتِكَ قَالَ نَعَمْ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت محمد ابن حنفیہؒ اپنے والد ماجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! مجھے بتائیے کہ اگر میں آپ (ﷺ) کے (وصال کے) بعد میرے یہاں (حضرت فاطمہؓ سے یا کسی اور بیوی سے) کوئی بچہ پیدا ہو تو کیا میں اس کا نام آپ (ﷺ) کے نام پر اور اس کی کنیت آپ (ﷺ) کی کنیت پر رکھ سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں!" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ حدیث بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی ممانعت کا تعلق آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے تھا اس کے بعد یہ جائز ہے اس مسئلہ پر علماء کے جو اختلافی اقوال ہیں پیچھے نقل کئے جا چکے ہیں۔

حضرت انسؓ کی کنیت

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَنَّانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَقْلَةٍ كُنْتُ اَجْتَنِيْهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَانَعْرِفُهٗ اِلَّامِنْ هٰذَا الْوَجْهِ وَفِي الْمَصَابِيْحِ صَحَّحَهٗ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے میری کنیت اس ساگ کے نام پر مقرر کی تھی جس کو میں اکھاڑتا تھا (یعنی آپ ﷺ نے ایک دن مجھ کو ایک ساگ کہ جس کو عربی میں حمزہ کہتے ہیں اکھاڑتے ہوئے دیکھا تو اس کی مناسبت سے میری کنیت ابو حمزہ رکھ دی) اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ہمارا علم یہ ہے کہ یہ حدیث اس سند کے علاوہ جو جامع الترمذیؒ میں نقل کی گئی ہے اور کسی سند کے ساتھ مذکور نہیں ہے (گویا یہ حدیث غریب ہے کہ ایک طریق اور ایک سند کے علاوہ اور کسی طریق و سند سے منقول نہیں ہے) لیکن صاحب مشکوٰۃ کہتے ہیں کہ مصابیح میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔"

جو نام اچھا نہ ہو اس کو بدل دو

(۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُغَيِّرُ الْاِسْمَ الْقَبِيْحَ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ برے نام کو بدل دیا کرتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مثلاً ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص کا نام اسود یعنی کالا تھا آنحضرت ﷺ نے اس کے نام کو بدل دیا اور فرمایا کہ آج سے اس کا نام ابیض (یعنی گورا) ہے۔

ایسے نام رکھنے کی ممانعت جو اسماء الٰہی میں سے ہیں

(۲۵) وَعَنْ بَشِيْرِ بْنِ مَيْمُوْنٍ عَنْ عَمِّهٖ اُسَامَةَ بْنِ اَخْدَرِيٍّ رَجُلًا يُقَالُ لَهٗ اَصْرَمُ كَانَ فِي النَّفَرِ الَّذِيْنَ اَتَوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اسْمُكَ قَالَ اَصْرَمُ قَالَ بَلْ اَنْتَ زُرْعَةُ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ

وَقَالَ وَغَيَّرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسم العَاصِ وَعَزِيْزٍ وَعَتَلَةَ وَشَيْطَانٍ وَالْحَكَمِ وَغُرَابٍ وَ حُبَابٍ وَ شَهَابٍ وَقَالَ تَرَكْتُ اَسَانِيْدَهَا لِلْاِخْتِصَارِ۔

"اور حضرت بشیر ابن میمونؒ (تابعی) اپنے چچا حضرت اسامہؓ ابن اخدری سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک جماعت حاضر ہوئی تو اس میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کو "اصرم" کہا جاتا تھا رسول کریم ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ مجھ کو اصرم کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (نہیں) بلکہ (آج سے) تمہارا نام زرعہ ہے۔ اس روایت کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے نیز انہوں نے بطریق تحلیق یہ بھی نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عاص، عزیز، عتلہ، شیطان، حکم، غراب، حباب اور شہاب ناموں کو بدل دیا تھا۔ ابوداؤدؒ کہتے ہیں کہ میں نے اختصار کے پیش نظر ان روایتوں کو کہ جس میں مذکورہ ناموں کو بدلنے کا ذکر ہے بغیر اسناد کے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "اصرم" صرم سے مشتق ہے جس کے معنی قطع و برید کرنا، ترک سلام و کلام کرنا اور درخت کاٹنا ہیں ان معنی کی مناسبت سے آپ ﷺ نے اصرم نام کو ناپسند فرمایا اور اس کے بجائے مذکورہ نام رکھ دیا یہ لفظ زراعت سے ما[illegible] اور اپنے معنی کے اعتبار سے جود وسخاوت اور خیر و برکت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آخر میں ابوداؤدؒ نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے جن ناموں کے بدلے جانے کا ذکر کیا ہے ان میں [illegible]ص، عاصی کا مخفف ہے یہ نام لفظی مفہوم کے اعتبار سے عصیان و سرکشی، عدم اطاعت اور نافرمانی پر دلالت کرتا ہے جب کہ مؤمن کی خصوصیت اطاعت و فرمانبرداری ہے اس لئے کسی مؤمن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ عاص یا عاصیہ نام رکھے۔

عزیز چونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم پاک ہے اس لئے عبدالعزیز نام رکھنا تو مناسب ہے لیکن صرف "عزیز" نام غیر موزوں ہے، علاوہ ازیں یہ لفظ غلبہ و قوت عزت اور زور آوری پر دلالت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان ہے جب کہ بندے کی شان ذلت و انکساری، خضوع اور فروتنی ہے اسی طرح حمید نام رکھنا بھی غیر مناسب ہے کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات میں سے ایک اسم ہے اور بطریق مبالغہ اس کی ایک صفت ہے اس اعتبار سے کسی شخص کا نام عبدالحمید موزوں ہے کریم وغیرہ کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

"عتلہ" نام کو بھی آپ ﷺ نے اس لئے ناپسند فرمایا کہ اس میں غلظت و شدت اور سختی کے معنی نکلتے ہیں جب کہ مؤمن کو نرم و ملائمت کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔

شیطان نام رکھنا نہ صرف اس ذات کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا ہے جو تمام برائیوں کی جڑ ہے بلکہ اس کے لفظی مفہوم کے اعتبار سے بھی نہایت غیر موزوں ہے کیونکہ لفظ شیطان یا تو "شیط" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں جل جانا ہلاک ہو جانا یا "شطن" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں خدا کی رحمت سے دور ہونا۔

"حکم" حاکم کا مبالغہ ہے اور حقیقی حاکم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ بس اسی کا حکم قابل نفاذ بھی ہے اور لائق اطاعت بھی اس اعتبار سے حکم نام بھی غیر موزوں ہے اور جب آنحضرت ﷺ نے ابوالحکم کی کنیت کو پسند نہیں فرمایا جیسا کہ پیچھے روایت گزری ہے تو حکم نام کا تغیر بطریق اولی مناسب ہے۔

غراب نام کی ناپسندیدگی کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ غراب کوے کو کہتے ہیں جو جانوروں میں پلید جانور ہے وہ مردار اور نجاست کھاتا ہے دوسرے یہ کہ اس کے معنی دوری کے ہیں۔

"حباب" نام اس اعتبار سے نہایت غیر موزوں ہے کہ یہ شیطان کا نام ہے اور سانپ کو بھی حباب کہتے ہیں۔

"شہاب" آگ کے اس شعلہ کو کہتے ہیں جو فرشتے شیطانوں پر مارتے ہیں اس مناسبت کے شہاب نام رکھنا بھی غیر پسندیدہ ہے البتہ اگر شہاب کی اضافت دین کی طرف کی جائے یعنی شہاب الدین نام رکھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہو گا۔

لفظ "زعموا" کی برائی

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِنِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ لِاَبِیْ عَبْدِاللّٰہِ اَوْقَالَ اَبُوْعَبْدِاللّٰہِ لِاَبِیْ مَسْعُوْدٍ مَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ زَعَمُوْا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ بِئْسَ مَطِیَّۃُ الرَّجُلِ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَقَالَ اِنَّ اَبَاعَبْدِاللّٰہِ حُذَیْفَۃُ۔

"اور حضرت ابوسعید انصاریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہؓ سے یا حضرت ابوعبداللہؓ نے حضرت ابومسعودؓ انصاری سے دریافت کیا کہ آپ نے رسول کریم ﷺ کو لفظ زعموا کے بارے میں کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ (یہ لفظ) مرد کی بری سواری ہے۔ ابوداؤدؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ابوعبداللہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی کنیت ہے جو اونچے درجہ کے صحابہؓ میں سے ہیں۔"

تشریح: "زعموا زاء ل" میں زعم سے مشتق، ہے "زُعم" یا "زِعم" زاء کے پیش اور زیر کے ساتھ کے معنی تقریباً وہی ہیں جو ظن وگمان کے ہوتے ہیں جیسا کہ نہایہ میں لکھا ہے، صراح میں یہ لکھا ہے کہ زعم کے معنی ہیں کہنا اور عام طور پر زعم کا اطلاق اس بات پر ہوتا ہے جو غیر صحیح اور قابل اعتماد ہو۔ اور قاموس میں لکھا ہے۔ "زَعْمٌ" یا "زِعْمٌ" کے معنی قول کے ہیں اور اس کا اطلاق اکثر بے بنیاد اور جھوٹی بات پر ہوتا ہے۔

لفظ زعموا کے بارے میں علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ لوگوں کا جو یہ محمول ہے کہ جب انہیں کسی بے بنیاد بات کو بیان کرتا ہوتا ہے تو وہ یوں کہتے یا لکھتے ہیں کہ لوگ یہ کہتے ہیں فلاں شخص کے متعلق یہ سنا گیا ہے۔ اور یا لوگ اس طرح کہہ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ اور جھٹلائے جانے کے خوف سے کسی شخص کا نام لے کر تو کہا نہیں جاتا کہ یہ بات فلاں نے کہی ہے یا فلاں شخص نے بیان کیا ہے بلکہ "لوگ کہتے ہیں یا بیان کیا جاتا ہے" کے پردہ میں بے تحاشہ جھوٹ بولا جاتا ہے اور بلا تحقیق و بے بنیاد باتوں کو پھیلایا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا دونوں صحابہؓ میں سے ایک صحابیؓ نے دوسرے صحابیؓ سے پوچھا کہ کچھ آدمی جو لفظ زعموا یعنی لوگ یہ کہتے ہیں کے ذریعہ بے بنیاد اور غیر تحقیقی باتیں نقل کرتے ہیں تو کیا آپ نے رسول کریم ﷺ سے اس لفظ کے بارے میں سنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس لفظ تحقیق میں اس لفظ کے استعمال اور اس کے مفہوم کے بارے میں کیا فرماتے تھے؟ دوسرے صحابیؓ نے جواب دیا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ لفظ بری سواری ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے اس لفظ کو سواری کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جس طرح کوئی شخص سواری پر بیٹھ کر اپنی منزل مقصود تک پہنچتا ہے اسی طرح جو آدمی یہ چاہتا ہے کہ کسی بے بنیاد اور غیر تحقیقی بات کو دوسروں کے سامنے نقل کرے اور پھیلائے تو وہ اپنی گفتگو اور اپنے قول کے شروع میں لفظ زعموا استعمال کرتا ہے اور اس لفظ کے ذریعہ اپنی غرض حاصل کرنا چاہتا ہے نیز آپ ﷺ نے بری سواری کے ذریعہ اس امر کی طرف اشارہ فرمایا کہ لفظ زعموا کوئی اچھا آغاز کلام نہیں ہے کیونکہ اس لفظ کو بنیاد بنا کر جو بات کہی یا نقل کی جاتی ہے جو کوئی سند اور ثبوت نہ رکھے بلکہ ایک حکایت کے درجہ میں ہو اور بر سبیل ظن وگمان زبان پر آئے۔ لہٰذا اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ نقل و بیان اور روایات و حکایات کے سلسلے میں پوری احتیاط ملحوظ رہنی چاہئے کیونکہ وہ باتیں جن کا تعلق محض ظن وگمان سے ہوتا ہے عام طور پر غلط فہمی اور جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ وزعموا مطیۃ الکذب لفظ زعموا جھوٹ کی سواری ہے۔

یا آنحضرت ﷺ کے مذکورہ ارشاد کا مقصد یہ ہدایت دینا ہے کہ کوئی شخص بلا تحقیق و یقین کسی کی طرف زعم وگمان یعنی دروغ گوئی کی نسبت نہ کرے ہاں اگر اس کو اس بات کا یقین ہو کہ فلاں شخص نے واقعۃً دروغ گوئی کی ہے۔ اور یہ کہ اس شخص کی دروغ گوئی کے نقصان و اثرات سے دوسروں کا بچانا ضروری ہے تاکہ کوئی دھوکا نہ کھا جائے تو اس مصلحت کے پیش نظر کسی کی طرف زعم وگمان کی نسبت

کرنا جائز ہو گا جیسا کہ محدثین وغیرہ کرتے ہیں۔

مشیت میں اللہ اور غیر اللہ کو برابر قرار نہ دو

(۲۷) وَعَنْ حُذَيْفَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَقُولُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ فُلَانٌ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شَاءَ فُلَانٌ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ مُنْقَطِعًا قَالَ لَاتَقُوْلُوْا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ وَقُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت حذیفہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا (لوگو) اس طرح نہ کہو کہ (وہی ہو گا) جو اللہ چاہئے اور فلاں شخص چاہے (کیونکہ) اس طرح کے کہنے کا مطلب، ارادہ و مشیت میں اللہ اور بندے کو برابر کا درجہ دینا ہے جب کہ کسی کام کا ہونا یا نہ ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت و مرضی پر منحصر ہوتا ہے البتہ ظاہری اسباب و وسائل کے پیش نظر انسان کی طرف ارادہ و مشیت کی نسبت کرنا ہی منظور ہو تو پھر یوں کہو کہ وہی ہو گا جو اللہ چاہے اور پھر فلاں چاہے یعنی اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کا مقدم ہونا اور بندے کی مشیت کا اس کے تابع ہونا مفہوم ہو گا جو صحیح ہے۔)" (احمد وابوداؤد)

اور ایک روایت میں جس کا سلسلہ سند متصل نہیں ہے بطریق انقطاع یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا یوں نہ کہو کہ وہی ہو گا جو اللہ چاہے اور محمد چاہیں، بلکہ اس طرح کہو کہ وہی ہو گا جو تنہا اللہ چاہے خواہ کوئی دوسرا چاہے یا نہ چاہے اس اعتبار سے اوپر کی روایت کہ جس میں ماشاء اللہ ثم شاء فلاں کہنے کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اس روایت کے درمیان تضاد واقع نہیں ہو گا اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔

کسی منافق کو سید نہ کہو

(۲۸) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَقُوْلُوْا لِلْمُنَافِقِ سَيِّدٌ فَاِنَّهُ اِنْ يَّكُ سَيِّدًا فَقَدْ اَسْخَطْتُمْ رَبَّكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حذیفہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی منافق کے سید نہ کہو یعنی سردار آقا نہ کہو کیوں کہ اگر وہ سید ہو اور تم نے اس کو سید کہا تو تم نے اپنے پروردگار کو ناراض کیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: عربی میں "سید" کے معنی ہیں سردار آقا۔ ظاہر ہے کہ کسی منافق کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا کہ اس کو کوئی مسلمان سردار آقا کہے بلکہ اگر کوئی منافق واقعۃً سردار ہو بایں طور کہ وہ اپنی قوم کا سربراہ ہو یا کچھ لوگوں کا حاکم ہو اور غلام و باندی اور دوسرے اسباب کا مالک ہو تو اس کے باوجود وہ اس قابل نہیں سمجھا جائے گا۔ کہ کوئی مسلمان اس کو سردار و آقا کہہ کر مخاطب کرے یا اس کو سید کہے اور اگر کوئی مسلمان اس کو سید و سردار و آقا کہے گا تو وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہو گا کیوں کہ یہ لفظ سید (یا سردار و آقا) تعظیم و احترام پر دلالت کرتا ہے اور وہ منافق، مسلمان کی طرف سے کسی بھی تعظیم و احترام کا مستحق نہیں ہے اور اگر صورت یہ ہو کہ وہ واقعۃً کسی بھی طرح کی سیادت و سرداری رکھتا ہی نہ ہو تو اس کو سید کہنا اور بھی برا ہو گا کیوں کہ اس کے باوجود اس کو سید کہنے والا نہ صرف مذکورہ حکم کی خلاف ورزی بلکہ جھوٹ اور نفاق کا بھی مرتکب ہو گا۔

ظاہر تو یہ ہے کہ اس بارے میں کافر، گم کردہ راہ ہدایت اور علی الاعلان گناہ کا ارتکاب کرنے والے مسلمان بھی منافق کے حکم میں داخل ہوں، لیکن حدیث میں خاص طور پر صرف منافق ہی کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ منافق چونکہ بہر حال ظاہری طور پر مسلمان ہوتا ہے اس لئے عام مسلمانوں کا اس کی تعریف و خوشامد میں مبتلا ہونا زیادہ قریبی احتمال رکھتا ہے لہٰذا صرف منافق کا ذکر کر کے اس بات کی ممانعت

فرمائی گئی کہ اس کو سید نہ کہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

برے نام کا برا اثر

(۲۹) عَنْ عَبْدِالْحَمِيْدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ شَيْبَةَ قَالَ جَلَسْتُ اِلٰى سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ فَحَدَّثَنِىْ اَنَّ جَدَّهُ حَزْنًا قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اسْمُكَ قَالَ اِسْمِىْ حَزْنٌ قَالَ بَلْ اَنْتَ سَهْلٌ قَالَ مَا اَنَا بِمُغَيِّرٍ اِسْمًا سَمَّانِيْهِ اَبِىْ قَالَ ابْنُ الْمُسَيِّبِ فَمَازَالَتْ فِيْنَا الْحُزُوْنَةُ بَعْدُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عبدالحمید ابن جبیر ابن شیبہؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت سعد ابن مسیبؒ کی خدمت میں حاضر تھا کہ انہوں نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی کہ میرے دادا جن کا نام حزن تھا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے انہوں نے کہا میرا نام حزنؓ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ حزن کوئی اچھا نام نہیں ہے بلکہ میں تمہارا نام سہل رکھتا ہوں میرے دادا نے کہا کہ میرے باپ نے میرا جو نام رکھا ہے اب میں اس کو بدل نہیں سکتا۔ حضرت سعیدؒ نے فرمایا کہ اس کے بعد سے اب تک ہمارے خاندان میں ہمیشہ سختی رہی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "حزن" سخت اور دشوار گزار زمین کو کہتے ہیں "سہل" حزن کی ضد ہے یعنی ملائم اور ہموار زمین جہاں آدمی کو آرام ملے۔

حضرت سعیدؒ کے دادا نے چوں کہ آنحضرت ﷺ کے رکھے ہوئے نام کو اختیار نہیں کیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس انکار کی نحوست سے ان کے خاندان پر حزنؓ کو مسلط کر دیا کہ ان کے گھر والے ہمیشہ سختی حالات کا شکار رہنے لگے اور برابر ایک نہ ایک مصیبت میں مبتلا ہوتے رہے۔

رہی یہ بات کہ حزنؓ کو آنحضرت ﷺ کی بات کا انکار کرنے کی جرات کیوں کر ہوئی تو اول اس کو شیطان کا وسوسہ کہا جا سکتا ہے جس میں وہ مبتلا ہو گئے دوسرے یہ کہ مذکورہ واقعہ ابتداء ہجرت کا ہے جب کہ وہ نئے نئے ہجرت کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اس وقت تک تعلیم و تربیت کے فقدان کی وجہ سے وہ صدق ایمان سلامتی طبع اور تہذیب و اخلاق سے مشرف نہ ہوئے تھے لہٰذا اس پر شیطان کا داؤ کارگر ہو گیا اور وہ آنحضرت ﷺ کے تجویز کردہ نام کو اختیار نہ کر سکے۔

اچھے نام

(۳۰) وَعَنْ اَبِىْ وَهْبِ الْجُشَمِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسَمَّوْا بِاَسْمَآءِ الْاَنْبِيَاءِ وَاَحَبُّ الْاَسْمَآءِ اِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ وَاَصْدَقُهَا حَارِثٌ وَهَمَّامٌ وَاَقْبَحُهَا حَرْبٌ وَمُرَّةُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابو وہب جشمیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ انبیاء کے ناموں پر اپنے نام رکھو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن (اور اسی طرح عبدالرحیم و عبدالکریم وغیرہ)، ہیں نیز زیادہ سچے نام، حارث اور ہمام ہیں اور سب سے برے نام حرب اور مرہ ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "انبیاء کے ناموں پر......" سے واضح ہوتا ہے کہ ملائکہ کے ناموں پر نام نہ رکھنے چاہئیں اسی طرح وہ نام بھی نہ رکھنے چاہئیں جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھے جیسے کلب، حمار، عبدشمس اور اسی طرح کے دوسرے نام۔

"حارث" کے معنی ہیں کسب و کمائی اور قصد و ارادہ کرنے والا۔ اسی طرح "ہمام، ہمؔ" سے نکلا ہے جس کے معنی قصد و ارادہ کے ہیں رہے کہ کوئی بھی شخص کسب و کمائی اور قصد و ارادہ کرنے سے خالی نہیں ہوتا اس لئے معنی و مفہوم اور واقعہ کے اعتبار سے ان ناموں کو

زیادہ سچا فرمایا گیا ہے۔
حرب اور مرہ کو سب سے برے نام اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ "حرب" لڑائی اور جنگ کو کہتے ہیں اور جنگ بڑی خراب چیز ہے جس میں کشت و خون اور خسارہ و بربادی ہے، اسی طرح مرہ تلخی کو کہتے ہیں جو طبیعت کو ناپسند ہوتی ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ابلیس کی کنیت ابو مرہ ہے اور اس وجہ سے مرہ قبیح نام ہے۔

بَابُ الْبَيَانِ وَالشِّعْرِ

بیان اور شعر کا بیان

"بیان" کے اصل معنی کھولنے، اچھی طرح ظاہر کرنے اور خوب واضح کرنے کے ہیں، یا یوں کہنا چاہئے کہ بیان اس فصیح گفتگو و تقریر وغیرہ کو کہتے ہیں جو مافی الضمیر کو نہایت وضاحت اور حسن و خوبی کے ساتھ ظاہر کرے۔ چنانچہ صراح میں بھی یہ لکھا ہے کہ بات کو کھول کر اور وضاحت کے ساتھ کہنے اور فصاحت کا نام "بیان" ہے اسی لئے کہا جاتا ہے فلان ابین من فلان (فلاں شخص، فلاں شخص سے زیادہ بیان کرنے والا ہے یعنی وہ اپنی بات کو فلاں شخص سے زیادہ فصاحت اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والا ہے)۔
"شعر" کے معنی دانائی اور زیرکی کے ہیں اور شاعر کے معنی ہیں دانا و زیرک، لیکن عام اصلاح میں شعر موزوں اور مقفّی (منظوم) کلام کو کہتے ہیں، جو بقصد و ارادہ موزوں و مقفّی کیا گیا ہو، اس اعتبار سے قرآن و حدیث میں جو مقفّی عبارتیں ہیں ان پر شعر کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیوں کہ ان عبارتوں کا مقفّی ہونا نہ تو قصد و ارادہ کے تحت ہے اور نہ مقصود بالذات ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بعض بیان سحر کی تاثیر رکھتے ہیں

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَدِمَ رُجُلَانِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَخَطَبَا فَعَجِبَ النَّاسُ لِبَيَانِهِمَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن مشرقی علاقے سے دو آدمی آئے اور آپس میں خوب فصاحت و بلاغت کے ساتھ گفتگو کرنے لگے لوگوں نے جب ان کی باتیں سنیں تو ان کی فصیح و بلیغ گفتگو پر بڑی حیرت اور تعجب کا اظہار کیا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا بلاشبہ بعض بیان سحر (کا اثر رکھتے) ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب مشرقی علاقے سے بنو تمیم کی ایک جماعت بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئی اس جماعت میں دو ایسے شخص بھی تھے جو فصاحت و بلاعت طرز تخاطب اور انداز گفتگو میں بڑی قابلیت اور مہارت رکھتے تھے اس میں سے ایک کا نام حصین ابن بدی اور لقب زبرقان تھا دوسرے کا نام عمرو ابن ہتم تھا ان دونوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے آپس میں گفتگو کی۔ زبرقان نے اپنے فضائل و اوصاف بیان کرنا شروع کئے اور اپنے فخریہ کارناموں کا بڑے زوردار الفاظ اور بڑی فصیح و بلیغ عبارت میں تعارف کرانے لگا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں نے فلاں فلاں کارنامے انجام دیئے ہیں اور میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں، یہاں تک کہ عمرو بھی اس بات کو جانتا ہے! عمرو نے یہ سنا تو اس نے بھی اتنے ہی پر شکوہ انداز اور اتنی ہی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس کی باتوں کا جواب دیا اور اپنے بیان میں اس کی طرح برائیاں ظاہر کیں کہ گویا زبرقان کے بیان کردہ سارے اوصاف و فضائل کو اچھی طرح جانتا ہے اور جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے اندر کی آواز نہیں ہے حقیقت میں اس کو میرے کمالات کا اعتراف ہے مگر حسد نے اس کو میرے خلاف بیان کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس

موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بعض بیان سحر کی تاثیر رکھتے ہیں کہ جس طرح سحر انسان کی حالت وکیفیت میں تغیر پیدا کر دیتا ہے اس طرح بعض بیان بھی اسی نوعیت کا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کے ذہن ودماغ میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی تاثیر دل کو پھیر دیتی ہے۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ بیان کی تعریف میں فرمایا یا اس کی مذمت میں؟ ان اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ صحیح بات یہ نکلتی ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ سے بیان کی تعریف ومذمت دونوں ظاہر ہوتی ہیں اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض بیان دلوں کو مائل ومنحرف کرنے اور اپنا جواب پیش کرنے سے معذور رکھتے ہیں سحر کی مانند تاثیر رکھتا ہے اور یہ محمود ومستحسن ہے بشرطیکہ اس بیان کا تعلق سچائی کو ظاہر کرنے اور سچائی کو ثابت کرنے سے ہو اور اگر اس کا تعلق باطل وفاسد امور سے ہو تو پھر وہی بیان مذموم ہوگا جیسا کہ ایک حدیث میں شعر کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ کہ الشعر ھو کلام فحسنه حسن وقبیحه قبیح یعنی شعر کلام ہی تو ہے (چنانچہ اچھے اور برے کلام کی طرح) اچھا شعر اچھا کہلائے گا اور برا شعر برا۔

بعض اشعار حکمت ودانائی کے حامل ہوتے ہیں

② وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابی ابن کعب ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بعض شعر حکمت (کا حامل) ہوتا ہے۔" (بخاری)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ سارے ہی اشعار برے نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے بعض اچھے اور فائدہ مند ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعہ حکمت ودانائی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

کلام میں مبالغہ آرائی کی ممانعت

③ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ قَالَهَا ثَلٰثًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعود ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کلام میں مبالغہ کرنے والے ہلاکت میں پڑ گئے، آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تحریر اور گفتگو وکلام میں بے جا تکلفات واہتمام کرنا، عبارت آرائی اور مبالغہ آمیزی کی پابندی اختیار کرنا اور لاحاصل وبے فائدہ باتوں کی آمیزش کرنا نہایت برا ہے جب کہ اس کا مقصد اظہار عظمت اور ریا، تصنع وبناوٹ، کسی کی بے جا خوشامد وچاپلوسی اور اس کو اپنی طرف مائل وراغب کرنا ہو۔

ایک مبنی بر حقیقت شعر

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ كَلِمَةُ لَبِيْدٍ اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہے لبید ؓ کا یہ کلام ہے کہ مت بھولو، اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے۔" (بخاری ؒ ومسلم ؒ)

تشریح: لبید ؓ عرب کے بہت مشہور شاعر تھے، عربی ادب میں ان کے کلام اور ان کی شاعری کو سند کا درجہ حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی ہدایت بھی بخشی اور ان کو قبولیت اسلام کے بعد صحابیت کا شرف حاصل ہوا، جس طرح زمانہ جاہلیت میں اپنے فن کی وجہ سے

قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اسی طرح زمانہ اسلام میں بہت معزز و مکرم رہے، بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بڑی طویل حیات پائی اور تقریباً ایک سو ستاون سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے جس کلام کی تعریف و توصیف فرمائی وہ پورا شعر یوں ہے۔

الا کل شئی ماخلا اللّٰہ باطل وکل نعیم لامحالۃ زائل

"(مت بھولو) اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے اور دنیا کی ہر لذت و راحت کو آخر کار فنا ہونا ہے۔"

یہ مشہور شعر بھی لبیدؓ کا ہی ہے۔

ولقد سئامت من الحیوۃ وطولھا وسوال ھذا لناس کیف لبید

"میں زندگی اور اس کی درازی سے بیزار ہو گیا ہوں اور لوگوں کے بار بار پوچھنے سے کہ لبید کیسا ہے۔"

علم و حکمت کے حامل اشعار سننا مسنون ہے

⑤ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيْدِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَدِفْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ هَلْ مَعَكَ مِنْ شِعْرِ اُمَيَّةَ بْنِ اَبِى الصَّلْتِ شَيْءٌ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ هِيْهِ فَاَنْشَدْتُهُ بَيْتًا فَقَالَ هِيْهِ ثُمَّ اَنْشَدْتُهُ بَيْتًا فَقَالَ هِيْهِ حَتّٰى اَنْشَدْتُهُ مِائَةَ بَيْتٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمروؓ ابن شریدؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ایک دن سفر کے دوران میں رسول کریم ﷺ کے پیچھے آپ ﷺ کی سواری پر بیٹھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کیا تمہیں امیہ ابن ابی الصلت کے کچھ اشعار یاد ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا اچھا تو سناؤ آپ ﷺ کو میں نے ایک شعر سنایا آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ! میں نے پھر ایک شعر سنایا آپ ﷺ اسی طرح مزید سنانے کی فرمائش کرتے رہے اور میں سناتا رہا یہاں تک کہ میں نے سو اشعار سنائے!" (مسلمؒ)

تشریح: امیہ ابن ابی الصلت بھی عرب کا ایک مشہور اور باکمال شاعر تھا اس کا تعلق قبیلہ ثقیف سے تھا بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے عہد جاہلیت میں اہل کتاب سے دین سیکھا تھا اور دینداری کی باتیں کرتا تھا، حشر و نشر اور قیامت کے دن پر بھی عقیدہ رکھتا تھا اور اس کے اشعار علم و حکمت اور پند و نصائح سے پر ہوتے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا تھا امن شعرہ و کفر قلبہ (یعنی اس کے اشعار سے ایمان جھلکتا ہے اگرچہ اس کا دل کفر میں مبتلا رہا) اس کا ایک خاص مشغلہ یہ تھا کہ آسمانی کتب کا علم رکھنے والوں کے پاس آنا جانا رکھتا اور ان سے ان بشارتوں اور پیشگوئیوں کے بارے میں دریافت کرتا رہتا جو آسمانی کتابوں پر نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت سے متعلق مذکورہ تھیں، اس کا گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں جن نبی ﷺ آخر الزمان ﷺ کی بعثت کی خبر دی ہے وہ میں ہوں، اور ایک نہ ایک دن مجھے نبوت کے خلعت فاخرہ سے نوازا جائے گا لیکن جب آسمانی کتب کے عالموں نے اس کو بتایا کہ وہ بنی قریش میں سے ہوں گے اور اس کو آنحضرت ﷺ کی صفات تفصیل سے معلوم ہوئیں تو وہ اپنے عقائد و نظریات سے ایک دم پھر گیا اور حسد و عناد کی راہ پر چل کر کہنے لگا کہ مجھے اس نبی ﷺ پر ہرگز ایمان نہ لانا چاہئے جس کا تعلق قبیلہ ثقیف سے نہ ہو۔

ابن جوزیؒ نے کتاب وفا میں یہ لکھا ہے کہ امیہ ابن ابی الصلت ابتداء میں تو نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کا انتظار بڑی شدت سے کرتا تھا اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کی جو علامتیں اور اوصاف سنتا تھا ان کی بنا پر یہ آرزو رکھتا تھا کہ کاش میں ان کا زمانہ پاؤں اور ان کی خدمت و مدد کروں مگر آنحضرت ﷺ کا جب نور نبوت آشکارا تو اپنی باتوں سے پھر گیا اور بغض و عناد اور سخاوت، وسختی کی راہ اختیار کر لی۔

بہر حال مذکورہ بالا حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ جو اشعار علم و حکمت اور پند و نصائح کی باتوں پر مشتمل ہوں ان کو سننا مسنون ہے اگرچہ

ان اشعار کو کہنے والا کوئی کافر و فاسق ہی کیوں نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کا ایک شعر

⑥ وَعَنْ جُنْدُبٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ فِيْ بَعْضِ الْمُشَاهِدِ وَقَدْ دَمِيَتْ اِصْبَعُهٗ فَقَالَ هَلْ اَنْتِ اِلَّا اَصْبَعٌ دَمِيْتِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَالَقِيْتِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جندبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک جنگ (غزوہ احد) میں شریک تھے کہ معرکہ آرائی کے دوران آپ ﷺ کی انگلی زخمی ہوگئی اور اس کی وجہ سے وہ خون آلود ہوگئی آپ ﷺ نے بطور استعارہ یا در حقیقت انگلی کو تسلی دینے کے لئے اس کو مخاطب کر کے یہ شعر فرمایا۔" (بخاریؒ)

هَلْ اَنْتِ اِلَّا اَصْبَعٌ دَمِيْتِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَالَقِيْتِ

"یعنی تو کیا ہے ایک انگلی ہے خون آلود ہوگئی اور پھر تجھ کو یہ جو کچھ ہوا ہے خدا کی راہ میں ہوا ہے۔"

تشریح: زخمی اور خون آلود انگلی کو مخاطب کر کے آپ ﷺ نے جو اشعار ارشاد فرمایا اس کا مطلب یہ تھا تو جسم کا کوئی بڑا حصہ نہیں ہے بدن کا کوئی سب سے اہم عضو نہیں ہے، ایک معمولی سی انگلی ہے، پھر تجھے جو تکلیف ہوئی ہے وہ سخت اور شدید ترین نہیں ہے کہ نہ تو کٹ کر گر پڑی ہے اور نہ ہلاکت میں مبتلا ہوئی ہے تجھ کو صرف زخم پہنچا ہے اور خون آلود ہوگئی ہے اگر تو نے اتنی سی تکلیف اٹھائی ہے اس کی وجہ سے بے تابی اور بے قراری کی کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ یہ تھوڑی سی تکلیف بھی ضائع جانے والی نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں اور اس کی رضاء میں چوں کہ تو نے تکلیف اٹھائی ہے اس لئے تجھ کو اس پر اجر ملے گا اس اعتبار سے یہ تکلیف بھی تیرے لئے خوشی و راحت کا ذریعہ ہونا چاہئے اس ارشاد کے ذریعہ گویا آپ ﷺ نے امت کے لوگوں کو تلقین فرمائی کہ اگر کسی مسلمان کو اللہ کی راہ میں کوئی تکلیف و ضرر پہنچے تو اس پر صبر کرنا چاہئے، بلکہ حقیقت میں اس کو شکر کا مقام سمجھنا چاہئے کہ اللہ کا عطا کیا ہوا جسم و بدن اسی کی راہ میں قربان کرنے اور تکلیف اٹھانے کی توفیق نصیب ہوئی جو ایک بہت بڑی سعادت ہے۔

اس حدیث کے سلسلے میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ ایک شعر ہے جب کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس شعر و شاعری کے وصف سے پاک ہے اور آپ ﷺ کی ذات سے کسی شعر کا صادر ہونا غیر ممکن ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے بارے میں فرمایا ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ (یعنی) اور ہم نے آپ (ﷺ) کو شعر کہنا سکھایا ہی نہیں، اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ شعر میں شاعر کا قصد و ارادہ بھی شرط ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ جس شخص نے کوئی کلام موزوں کیا ہے اس نے موزونیت کا قصد و ارادہ بھی کیا ہو جیسا کہ باب کے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے جب کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ﷺ بلاشبہ موزوں کلام ہے لیکن اس کی موزونیت آپ ﷺ کے کسی قصد و ارادہ کے تحت نہیں ہوئی، بلکہ بلا قصد و ارادہ اور بے ساختہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے صادر ہونے والا یہ کلام، شعر میں ڈھل گیا۔

بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ کلام اصل رجز کی قسم سے ہے اور رجز پر شعر کا اطلاق نہیں ہوتا! علاوہ ازیں یحییٰ نے یہ کہا ہے کہ جو شخص بطریق ندرت یعنی اتفاقاً کبھی کوئی شعر کہہ دے تو اس کو شاعر نہیں کہا جاتا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ۔ سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ شاعر نہیں ہیں۔

مشہور شاعر حسان کی فضیلت

⑦ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ قُرَيْظَةَ لِحَسَّانِ بْنِ ثَابِتٍ اُهْجُ الْمُشْرِكِيْنَ فَاِنَّ جِبْرِيْلَ

مَعَكَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لِحَسَّانٍ اَجِبْ عَنِّيْ اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قریظہ کے دن حضرت حسان ابن ثابتؓ سے فرمایا کہ تم مشرکین کی ہجو کرو، حضرت جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں۔ (یعنی مضامین کے القاء والہام کے سلسلے میں وہ تمہاری مدد کرتے ہیں! اور رسول کریم ﷺ جب کفار و مشرکین کی ہجو سنتے کہ وہ آپ ﷺ کی شان میں نازیبا باتیں کرتے ہیں اور آپ ﷺ کو برے الفاظ سے یاد کرتے ہیں تو حضرت حسانؓ سے فرمادیتے کہ تم میری طرف سے کفار کو جواب دو اور پھر یہ فرماتے اے اللہ جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ حسانؓ کی مدد کر اور ان کی زبان و بیان میں طاقت و قوت دے!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہودیوں کے ایک قبیلہ کا نام بنو قریظہ تھا جو مدینہ شہر کے ایک کنارے پر آباد تھا، جب ان یہودیوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر کے اور کفار عرب کے مددگار بن کر آنحضرت ﷺ اور تمام مسلمانوں کو سخت اذیت پہنچائی تو آنحضرت ﷺ نے غزوہ خندق کے بعد مسلمانوں کی معیت میں اس قبیلہ کا محاصرہ کر لیا جس کے نتیجہ میں ان کو اپنے کیفر کردار تک پہنچنا پڑا، چنانچہ اس موقع کو قریظہ کے دن سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت حسانؓ ابن ثابت ابن منذر مدینہ کے رہنے والے تھے اور جلیل القدر انصاری صحابیؓ ہیں، بڑے اونچے درجہ کے شاعر تھے شعراء اسلام میں ان کا شمار ہوتا ہے اور شاعر رسول کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں ان کی عمر ایک سو بیس سال ہوئی ہے۔ ساٹھ سال کی عمر تک کفر کی حالت میں رہے اور ساٹھ سال اسلام کی حالت میں گزارے۔

شعراء اسلام کو کفار قریش کی ہجو کرنے کا حکم

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اهْجُوْا قُرَيْشًا فَاِنَّهٗ اَشَدُّ عَلَيْهِمْ مِنْ رَشْقِ النَّبْلِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے شعراء سے فرمادیا تھا کہ کفار قریش کی ہجو کیا کرو کیوں کہ یہ ہجو ان پر تیر مارنے سے زیادہ سخت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ہجو" کے معنی ہیں اشعار کے ذریعہ برائی بیان کرنا! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کفار اور دشمنان دین کی ہجو کرنا جائز ہے لیکن اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اگر کفار مسلمانوں کی ہجو کریں، تب ان کی ہجو کی جائے اس سے پہلے ان کی ہجو کرنا روا نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں وہ مسلمانوں کی ہجو کریں گے اور اس طرح سے مسلمانوں کے خلاف ان کی ہجو کا سبب خود مسلمان بنیں گے اس مسئلہ کی بنیاد یہ آیت کریمہ ہے کہ۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔

"اے مسلمانو! ان لوگوں کو گالی نہ دو جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں یعنی کفار و مشرکین، نہیں وہ آگے بڑھ کر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے بغیر علم کے۔"

⑨ وَعَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لِحَسَّانٍ اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ لَا يَزَالُ يُؤَيِّدُكَ مَا نَافَحْتَ عَنِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَقَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ هَجَاهُمْ حَسَّانُ فَشَفٰى وَاشْتَفٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو حضرت حسان سے یہ فرماتے ہوا سنا کہ جب تک تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف کفار و مشرکین کی ہجو کا مقابلہ کرتے رہتے ہو حضرت جبرئیل برابر تمہاری مدد اعانت کرتے رہتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ

کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ حسانؓ نے کفار کی ہجو کی تو اس ہجو سے مسلمانوں کو شفا دی اور خود بھی شفا پائی، یعنی انہوں نے کفار کی ہجو کا جواب ہجو سے دے کر مسلمانوں کے لئے بھی تسلی و تشفی کا سامان بہم پہنچایا اور خود بھی سکون و طمانیت حاصل کی۔" (مسلمؒ)

غزوہ خندق میں عبداللہ بن رواحہؓ کا رجزیہ کلام آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک پر

⑩ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْقُلُ التُّرَابَ يَوْمَ الْخَنْدَقِ حَتّٰى اغْبَرَّ بَطْنُهُ يَقُوْلُ:

وَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

فَانْزِلَنْ سَكِيْنَةً عَلَيْنَا وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَيْنَا

اِنَّ الْاُوْلٰى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَةً اَبَيْنَا

يَرْفَعُ صَوْتَهُ بِهَا اَبَيْنَا اَبَيْنَا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت براءؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ خندق کھودے جانے کے دن خود بنفس نفیس مٹی اٹھا اٹھا کر پھینکتے تھے یعنی غزوہ احزاب کے موقع پر جب خندق کھودی جا رہی تھی تو سرکار دو عالم ﷺ بنفس نفیس سارے کام میں شریک تھے، صحابہؓ کے ساتھ آپ ﷺ بھی بڑے بڑے پتھر اٹھاتے اور مٹی اٹھا اٹھا کر پھینکتے جاتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کا شکم مبارک غبار آلود ہو گیا تھا اور اس موقع حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کا یہ رجزیہ کلام پڑھتے جاتے تھے۔

وَاللّٰهِ لَوْ لَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

"خدا کی قسم! اگر اللہ کی ہدایت نہ ہوتی تو ہم راہ راست نہیں پا سکتے تھے، نہ ہم صدقہ دے سکتے اور نہ نماز پڑھ سکتے تھے۔"

فَانْزِلَنْ سَكِيْنَةً عَلَيْنَا وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَيْنَا

"پس اے اللہ! ہم پر وقار اور اطمینان نازل فرما اور جب دشمنان دین سے ہماری مڈبھیڑ ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ۔"

اِنَّ الْاُوْلٰى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَةً اَبَيْنَا

"بلاشبہ ان کفار مکہ نے ہم پر اس لئے زیادتی کی ہے کہ جب وہ ہمیں فتنہ میں مبتلا کرنے یعنی کفر کی طرف واپس لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ہم انکار کر دیتے ہیں۔"

آنحضرت ﷺ ان اشعار کو بلند آواز سے پڑھتے تھے خصوصاً ابینا ابینا پر آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی؟ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یرفع بھا صوتہ میں بھا کی ضمیر لفظ "ابینا" کی طرف راجع ہے اور ابینا ابینا سے پہلے لفظ قائلا مقدر ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان اشعار کو پڑھتے تو آخر میں لفظ ابینا کو بار بار دہراتے اور اس وقت آواز کو زیادہ بلند کرتے اور اس سے مقصد اس لفظ کے مفہوم کو مؤکد کرنا، تلذذ و حظ حاصل کرنا اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں اور کافروں کے کانوں تک پہنچانا تھا۔

طیبیؒ نے یہ لکھا ہے کہ بھا کی ضمیر ان اشعار کی طرف راجع ہے اور ابینا ابینا اس جملہ میں حال واقع ہو رہا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ تمام اشعار کو با آواز بلند پڑھتے تھے اور لفظ ابینا پر پہنچ کر آواز خصوصیت سے بلند کر دیتے تھے۔

غزوہ خندق کے موقع پر رجز پڑھنے والے صحابہؓ کے حق میں آنحضرت ﷺ کی دعا

⑪ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَعَلَ الْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ يَحْفِرُوْنَ الْخَنْدَقَ وَيَنْقُلُوْنَ التُّرَابَ وَهُمْ يَقُوْلُوْنَ۔ نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا

مُحَمَّدًا عَلَى الجِهَادِ مَا بَقِينَا اَبَدًا يَقُوْلُ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُجِيْبُهُمْ اَللّٰهُمَّ لَاعَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ فَاغْفِرِ الْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب غزوہ احزاب کے موقع پر مہاجرینؓ اور انصارؓ نے خندق کھودنا اور مٹی کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کیا تو وہ اس دوران یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک جہاد کرتے رہنے کے لئے محمد ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔

اور رسول کریم ﷺ ان کے اس رجز کے جواب میں یہ دعا فرماتے جاتے تھے کہ اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے تو انصارؓ و مہاجرینؓ کو بخشدے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ گویا ان دعائیہ الفاظ کے ذریعہ صحابہؓ کو تسلی دیتے تھے کہ تمہیں اس موقع پر جو محنت و مشقت برداشت کرنا پڑ رہی ہے اور تم جن سخت حالات سے دوچار ہو ان پر صبر کرو اللہ تعالیٰ کا انعام تمہارے لئے مقدر ہے اور اس دنیا میں تمہیں راحت و سکون ملے یا نہ ملے لیکن آخرت کی زندگی میں تمہیں اپنی اس محنت و مشقت کے عوض بے شمار انعامات ملیں گے نیز اصل انعامات آخرت ہی کے ہیں یا یں طور کہ زندگی بس آخرت ہی کی زندگی ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جب کہ اس دنیا کی کیا راحت و کیا مصیبت سب کو آخر کار معدوم ہو جانا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔

ہروقت شعر و شاعری میں مستغرق رہنے اور برے شعر کی مذمت

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ يَمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَيْحًا يَرِيْهِ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يَمْتَلِئَ شِعْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یاد رکھو کسی شخص کا پیٹ کو پیپ سے بھرنا جو اس کے پیٹ کو خراب کر دے اس سے بہتر ہے کہ پیٹ کو مذموم اشعار سے بھرا جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ ایسی شاعری کی مذمت کی گئی ہے جو انسان کو ہر طرف سے غافل کر دے، چنانچہ جو شاعر ہروقت مضامین بندی اور تخلیق شعر میں مستغرق رہ کر فرائض و عبادت و تلاوت قرآن و ذکر خداوندی اور علوم شرعیہ سے غافل ہو جاتے ہیں ان کے اشعار برائی اور قابل نفرین ہونے کے اعتبار سے اس پیپ سے بھی بدتر ہیں جو زخم میں پڑ جاتی ہے خواہ وہ اشعار کسی بھی طرح کے ہوں، اور کیسے ہی اچھے مضامین پر مشتمل کیوں نہ ہوں۔

یا اس ارشاد گرامی ﷺ میں محض ان اشعار کی مذمت مراد ہے جو فحش و بے حیائی، کفر و فسق اور ناشائستہ و غیر صالح مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے برے اشعار کہے جاتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

شعری جہاد کی فضیلت

⑬ عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهٗ قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ اَنْزَلَ فِی الشِّعْرِ مَا اَنْزَلَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ يُجَاهِدُ بِسَيْفِهٖ وَلِسَانِهٖ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَكَاَنَّمَا تَرْمُوْنَهُمْ بِهٖ نَضْحَ النَّبْلِ۔ رَوَاهُ

فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ وَفِی الْاِسْتِیْعَابِ لِابْنِ عَبْدِالْبَرِّ اَنَّہٗ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَاذَا تَرٰی فِی الشِّعْرِ فَقَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ یُجَاھِدُ بِسَیْفِہٖ وَلِسَانِہٖ۔

"حضرت کعب ابن مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے شعر و شاعری کے حق میں جو حکم دیا ہے وہ آیت سے ظاہر ہے جو اس نے نازل فرمائی ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ان کی اس بات کے جواب میں فرمایا حقیقت یہ ہے کہ مؤمن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم کافروں کو اشعار کے ذریعہ اسی طرح زخم پہنچاتے ہو جس طرح تیروں کے ذریعہ۔" (شرح السنۃ)

اور ابن عبدالبرؒ کی کتاب استیعاب میں یوں ہے کہ حضرت کعبؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! شعر و شاعری کے متعلق آپ (ﷺ) کیا حکم فرماتے ہیں یہ کوئی اچھی چیز ہے یا بری؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا مؤمن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی۔

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ تین حضرات شعراءؓ اسلام میں ممتاز اور برتر حیثیت رکھتے تھے ان میں ایک تو حضرت حسان ابن ثابتؓ تھے دوسرے حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ اور تیسرے حضرت کعبؓ ابن مالک! علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ تینوں حضرات اپنا الگ الگ شعری انداز و رخ رکھتے ہیں حضرت کعبؓ کے اشعار خصوصیت سے ایسے مضامین پر مشتمل ہوتے تھے جو کفار و مشرکین کو جنگ و جہاد کے خوف میں مبتلا کرتے تھے اور ان کے دلوں پر رعب و ہیبت کے اثرات مرتب کرتے تھے، حضرت حسانؓ اپنے اشعار کے ذریعہ دشمنان دین، اور دشمنان رسول کے حسب و نسب پر طعن و تشنیع کے تیر چلاتے تھے اور حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کے اشعار کا رخ کفار مشرکین کی توبیخ و سرزنش کی طرف رہتا تھا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یہ آیت وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗنَ نازل فرمائی اور اس کے ذریعہ شعرو شاعری کی برائی اور اپنے احوال یعنی اپنے شاعر ہونے پر تاسف کے اظہار کے طور پر آنحضرت ﷺ کے سامنے مذکورہ جملہ ادا کیا لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنے جواب کے ذریعہ ان پر ظاہر فرمایا کہ شعر و شاعری بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ اس میں برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کو غیر شرعی باتوں اور نامناسب مضامین کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے اور چونکہ عام طور پر شعراء فکر و خیال کی گمراہی اور زبان کلام کی بے اعتدالیوں کا شکار ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت میں مذکورہ آیت نازل فرمائی ورنہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کوئی شخص اپنے اشعار کو حق و صداقت کے اظہار و باطل و ناحق کی تردید کا ذریعہ بنائے تو اس کی شعر و شاعری اس آیت کا محمول نہیں ہوگی بلکہ جو شعراء اپنے اشعار کے ذریعہ خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی خاطر کفار کا شعری مقابلہ کرتے ہیں اور ان کی ہجو کا جواب ہجو سے دے کر گویا دین اسلام کی تائید کرتے ہیں وہ دراصل جہاد کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں لہٰذا تمہیں اطمینان رکھنا چاہئے کہ نہ تمہارے اشعار اس آیت کی روشنی میں قابل مذمت ہیں اور نہ تم ان شعراء میں داخل ہو جن کی برائی ظاہر کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی گئی ہے کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے تم جیسے شعراء کو اپنے اس قول کے ذریعہ مذکورہ آیت کے حکم سے باہر رکھا ہے کہ۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا۔ (الایۃ)

کم گوئی ایمان کی نشانی ہے

⑭ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْحَیَآءُ وَالْعِیُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْبَذَاءُ وَالْبَیَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ۔ (ترمذیؒ)

"اور حضرت ابو امامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ شرم و حیا اور زبان کو قابو میں رکھنا ایمان کی دو شاخیں ہیں جب کہ فحش گوئی اور لاحاصل بکواس نفاق کی دو شاخیں ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: شرم وحیا کا ایمان کی شاخ ہونا ایک ظاہر و معروف بات ہے اور اس کا تفصیلی ذکر باب الایمان میں گزر چکا ہے۔

زبان کو قابو میں رکھنے کا ایمان کی شاخ ہونا اور فحش گوئی و لاحاصل بکواس کا نفاق کی شاخ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ مؤمن اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرم وحیاء انکساری و مسکینی اور سلامتی طبع کے جن اوصاف سے مزین ہوتا ہے وہ اپنے خدا کی عبادت، اپنے خدا کی مخلوق کی خدمت اور اپنے باطن کی اصلاح میں جس طرح مشغول و منہمک رہتا ہے اس کی بناء پر اس کو بے فائدہ تقریر بیان پر قدرت ہی حاصل نہیں ہوتی وہ اس بات پر قادر ہی نہیں ہوتا ہے کہ اپنے مفہوم و مدعا کو مبالغہ آرائی اور زبان کی تیزی و طراری کے ذریعہ ثابت و ظاہر کر سکے بلکہ وہ اس خوف سے کم گوئی کو اختیار کرتا ہے اور اپنی زبان کو قابو میں رکھتا ہے کہ مبادا زبان سے کوئی بڑی بات نکل جائے اور وہ فحش گوئی اور بدزبانی کا مرتکب قرار پاجائے اس کے برخلاف منافق کی شان ہی ہوتی ہے کہ وہ چرب زبانی یاوہ گوئی اور مبالغہ آمیزی کی راہ اختیار کرتا ہے اور نتیجہ کے طور پر وہ بے فائدہ تقریر و بیان، زبان درازی اور فحش گوئی پر قادر و دلیر ہو جاتا ہے۔

بے فائدہ بیان آرائی مکروہ ہے

⑮ وَعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ أَحَبَّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبَكُمْ مِنِّي يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنُكُمْ أَخْلَاقًا وَإِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي مَسَاوِيكُمْ أَخْلَاقًا الثَّرْثَارُوْنَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ الْمُتَفَيْهِقُوْنَ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَهُ عَنْ جَابِرٍ وَفِي رِوَايَةٍ قَالُوا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ فَمَا الْمُتَفَيْهِقُوْنَ قَالَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ۔

"اور حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن مجھ کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب اور میرے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو تم میں سے زیادہ خوش اخلاق ہیں اور میرے نزدیک تم میں سے سب سے برے اور مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ لوگ ہوں گے جو تم میں بداخلاق ہیں اور بداخلاق سے مراد وہ لوگ ہیں جو بہت (بنا بنا کر) باتیں کرتے ہیں بغیر احتیاط کے بک بک لگاتے ہیں اور متفیھقین، اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے بھی حضرت جابرؓ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ نیز ترمذیؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ صحابہؓ نے یہ ارشاد سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ثرثارون اور متشدقون کے معنی تو ہمیں معلوم ہیں متفیھقون سے کیا مراد ہے یعنی متفیھق کس کو کہتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تکبر کرنے والے۔"

تشریح: "فیھق" ضرورت سے زیادہ باتیں کرنا اور منہ پھیر کر کوئی بات کہنے کو کہتے ہیں جیسا کہ تکبر و غرور میں مبتلا لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جو وہ کسی سے بات چیت کرتے ہیں تو ان کے رویہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے مخاطب کو بہت حقیر و ذلیل سمجھ رہے ہوں اور یہ بھی گوارا نہیں ہو رہا ہے کہ اس کی طرف منہ اٹھا کر ہی بات کریں۔ بلکہ اس کی طرف سے چہرہ پھیر پھیر کر بات کرتے ہیں چنانچہ اسی معنوی لزوم کی وجہ سے "متفیھقین" کی وضاحت "متکبرین" کے ذریعہ کی گئی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بک بک لگانا، بے فائدہ و لاحاصل گفتگو کرنا، بنا بنا کر باتیں کرنا اور بیان آرائی و مبالغہ آمیزی کے ساتھ تقریریں کرنا مکروہ و مذموم ہے، لیکن حق کے تئیں لوگوں کے ذہن و فکر کو متأثر کرنے قلوب کو نرمانے اور عبادات و طاعات کی طرف متوجہ و راغب کرنے کے لئے وعظ و خطابت میں جو بیان آرائی و سیر کلامی اور طول بیانی کی جاتی ہے وہ مذموم و مکروہ نہیں ہے۔ لیکن اس صورت میں یہ بھی ضروری ہے کہ انداز بیان اور طرز کلام ایسا اختیار کیا جائے جو آسانی کے ساتھ لوگوں کو مقصد تک پہنچا دے اس کے برخلاف پیچیدہ و رقیق انداز مشکل لغات و الفاظ اور ایسی نکتہ سنجی و حکمت آفرینی اختیار کرنا جو عام ذہن و فہم سے بالاتر ہو اور جس کی وجہ سے ان پڑھ لوگ اس کے وعظ و تقریر سے کماحقہ فائدہ نہ اٹھا سکیں، مناسب و موزوں نہیں ہے۔

ایک پیش گوئی

⑯ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِی وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَخْرُجَ قَوْمٌ یَاکُلُوْنَ بِاَلْسِنَتِھِمْ کَمَاتَاکُلُ الْبَقَرَۃُ بِاَلْسِنَتِھَا۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ ایک ایسی جماعت پیدا نہیں ہو جائے گی جو اپنی زبانوں کے ذریعہ اس طرح کھائے گی جس طرح گائیں اپنی زبانوں سے کھاتی ہیں۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اپنی زبانوں کو کھانے پینے کا وسیلہ و ذریعہ بنائیں گے بایں طور کہ وہ خوشامد چاپلوسی کی خاطر لوگوں کی جھوٹی تعریفیں بیان کریں گے یا بغض و حسد کی بنا پر ان کی جھوٹی مذمت کریں گے اور اپنی تقریر و تحریر میں زبان دانی اور فصاحت و بلاغت کا جھوٹا مظاہرہ کریں گے تاکہ لوگوں کو اپنے دام فریب میں مبتلا کریں اور ان سے دنیا کا مال و زر حاصل کریں اور اپنی خواہشات کی تکمیل کرائیں۔

"جس طرح گائیں اپنی زبان کے ذریعہ کھاتی ہیں" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح گائیں اپنی زبان سے کھاتی ہیں اور چارہ چرتے وقت یہ تمیز نہیں کرتیں کہ وہ چارہ خشک ہے یا تر، شیریں ہے یا تلخ اور جائز ہے یا ناجائز، اسی طرح وہ لوگ بھی کہ جو اپنی زبانوں کو اپنے ناجائز مقاصد اور ناروا خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ و ذریعہ بنائیں گے، حق و باطل اور سچ و جھوٹ کے درمیان قطعاً کوئی تمیز نہیں کریں گے۔ اور نہ حلال و حرام کے درمیان کوئی فرق کریں گے۔

زبان دراز اور چکنی چپڑی باتیں کرنے والا خدا کا ناپسندیدہ ہے

⑰ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ یَبْغَضُ الْبَلِیْغَ مِنَ الرِّجَالِ الَّذِیْ یَتَخَلَّلُ بِلِسَانِہٖ کَمَا یَتَخَلَّلُ الْبَاقِرَۃُ بِلِسَانِھَا۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ شخص سخت ناپسندیدہ ہے جو کلام و بیان میں حد سے زیادہ فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرنے بایں طور کہ وہ اپنی زبان کو اس طرح لپیٹ لپیٹ کر باتین کرے جس طرح گائیں اپنے چارے کو لپیٹ لپیٹ کر جلدی جلدی اپنی زبان کے ذریعہ کھاتی ہیں۔ اس روایت کو ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے نیز ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ زبان درازی اور طاقت لسانی کوئی اچھی چیز نہیں ہے اپنی زبان اور اپنے کلام میں خواہ مخواہ کے لئے حد سے زیادہ فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرنا، حاشیہ آرائی اور مبالغہ آمیزی کے ساتھ اپنی بات کو پیش کرنا اور الفاظ کو چبا چبا کر اور زبان کو لپیٹ لپیٹ کر چکنی چپٹی باتیں کرنا احمق لوگوں کے نزدیک تو ایک وصف سمجھا جاتا ہے، لیکن جو دانشمند اور عاقل لوگ اس "وصف" کے پیچھے چھپی ہوئی برائی کو دیکھتے ہیں کہ عام طور پر اس طرح باتیں بنانے والے لوگ جھوٹے اور حیلہ باز ہوتے ہیں ان کے نزدیک اس وصف کا کوئی اعتبار نہیں اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے لہٰذا اچھا کلام وہی ہے جو ضرورت کے بقدر اور سیدھا سادا ہو نیز جس سے یہ واضح ہو کہ متکلم کے ظاہری الفاظ، اس کی باطنی کیفیات کے ہم آہنگ ہیں جو شریعت کا تقاضا بھی ہے۔

بے عمل واعظ و خطیب کے بارے میں وعید

⑱ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَرْتُ لَیْلَۃَ اُسْرِیَ بِیْ بِقَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَاھُھُمْ بِمَقَارِیْضَ مِنَ النَّارِ فَقُلْتُ یَاجِبْرَئِیْلُ مَنْ ھٰؤُلَاءِ قَالَ ھٰؤُلَاءِ خُطَبَآءُ اُمَّتِکَ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا

حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا معراج کی رات میں میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کی زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جا رہی تھیں، میں نے یہ دیکھ کر پوچھا کہ جبرئیل (علیہ السلام) یہ کون لوگ ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ یہ آپ (ﷺ) کی امت کے واعظ و خطیب ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں ان واعظوں اور خطیبوں کے لئے سخت تنبیہ وعید ہے جو دوسروں کو تو نیک کام کرنے کو کہتے ہیں لیکن خود نیک کام نہیں کرتے، تاہم واضح رہے کہ یہ حدیث ان واعظوں اور خطیبوں کی بے عملی کی مذمت کو ظاہر کرتی ہے نہ کہ اس ارشاد کا مقصد اس بات کی برائی کو بیان کرنا ہے کہ وہ نیک کام کے لئے کیوں کہتے ہیں اگرچہ وہ خود نیک کام نہیں کرتے اسی بنیاد پر علماء لکھتے ہیں کہ امر بالمعروف میں فعل شرط نہیں ہے یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ نیک کام کے لئے وہی شخص کہہ سکتا ہے جو خود بھی اس پر عمل کرے البتہ یہ بہتر ہے کہ امر بالمعروف کرنے والا اپنے کہے پر خود بھی عمل کرے۔ کیونکہ جس امر بالمعروف کی بنیاد محض قول پر ہوتی ہے عمل پر نہیں ہوتی ہے اس کا اثر نہیں ہوتا۔

چرب زبانی کے بارے میں وعید

⑲ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّمَ صَرْفَ الْکَلَامِ لِیَسْبِیَ بِہٖ قُلُوْبَ الرِّجَالِ اَوِ النَّاسِ لَمْ یَقْبَلِ اللّٰہُ مِنْہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا۔ (رواہ ابوداؤدؒ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اس مقصد کے لئے گھما پھرا کر بات کرنے کا سلیقہ سیکھے کہ وہ اس کے مردوں کے دلوں یا لوگوں کے دلوں پر قابو حاصل کر لے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ اس کی نفل عبادت قبول کرے گا اور نہ فرض۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: مذکورہ وعید کا تعلق اس شخص سے ہے جو چرب زبانی کرے، ضرورت سے زیادہ باتیں بنائے، اپنے مقصد کو اس طرح گھما پھرا کر بیان کرے کہ حقیقت ظاہر نہ ہو سکے اور یا اپنے کلام کو ضرورت سے زیادہ فصاحت و بلاغت نیز مبالغہ آرائی کے ساتھ آراستہ و مزین کرے اور ان چیزوں کا مقصد محض یہ ہو کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی باتوں سے اثر قبول کر کے اس کے مقصد کو پورا کریں۔

مختصر تقریر بہتر ہوتی ہے

⑳ وَعَنْ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ اَنَّہٗ قَالَ یَوْمًا وَقَامَ رَجُلٌ فَاَکْثَرَ الْقَوْلَ فَقَالَ عَمْرٌو لَوْ قَصَدَ فِیْ قَوْلِہٖ لَکَانَ خَیْرًا لَّہٗ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَقَدْ رَاَیْتُ اَوْ اُمِرْتُ اَنْ اَتَجَوَّزَ فِی الْقَوْلِ فَاِنَّ الْجَوَازَ ھُوَ خَیْرٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک دن انہوں نے اس وقت فرمایا جب کہ ایک شخص (وعظ کہنے یا خطبہ دینے کے لئے کھڑا ہوا اور اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار کی خاطر) بہت لمبی تقریر کی یہاں تک کہ سننے والے اکتا گئے چنانچہ اس وقت حضرت عمروؓ نے اس شخص سے فرمایا کہ اگر تم اپنی تقریر میں اعتدال و میانہ روی سے کام لیتے (یعنی مختصر تقریر کرتے) تو بے شک وہ (تقریر) سننے والوں کے حق میں بہت بہتر ہوتی، میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے سمجھ لیا ہے۔ یا یہ فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تقریر میں و گفتگو میں اختصار سے کام لوں، حقیقت یہ ہے کہ مختصر تقریر بہتر ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: روایت میں فقال عمرو کے الفاظ طول کلام کے سبب مکرر نقل کئے گئے ہیں کیونکہ ولو قصد.... الخ مقولہ ہے قال یومًا کا اور قام رجلٌ حال ہے اور ظاہر ہے کہ حال کی وجہ سے قول ومقولہ کے درمیان خاصا فرق ہوگیا اس لئے فقال عمرو دوبارہ کہہ کر گویا قول کا اعادہ کیا۔

بعض، علم جہالت ہوتے ہیں

(۲۱) وَعَنْ صَخْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا وَاِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلاً وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حُكْمًا وَاِنَّ مِنَ الْقَوْلِ عِيَالاً۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت صخر ابن عبداللہ ابن بریدۃؓ اپنے والد (حضرت عبداللہ) سے اور وہ صخرؓ کے دادا حضرت بریدۃؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بعض بیان جادو کی مانند ہوتے ہیں بعض علم جہالت ہوتے ہیں، بعض اشعار فائدہ مند یعنی حکمت ودانائی سے پر ہوتے ہیں اور بعض قول وکلام وبال جان ہوتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "بعض علم جہالت ہوتے ہیں" کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ کسی شخص نے ایسا علم حاصل کیا جو بذات خود نہ تو فائدہ مند ہو اور نہ اس کی طرف احتیاج وضرورت ہو، جیسے علم جعفر ورمل یا علم نجوم وفلاسفہ وغیرہ، اور اس بے فائدہ علم میں مشغولیت کی وجہ سے وہ ضروری علوم حاصل کرنے سے محروم رہا جن سے لوگوں کی احتیاج وضرورت وابستہ ہوتی ہے، جیسے قرآن وحدیث اور دین کے علوم، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ اس شخص نے جو بے فائدہ علم حاصل کیا اس علم نے دوسرے ضروری علوم سے اس کو محرومی وجاہل رکھا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ بعض علوم در حقیقت جہل کو لازم کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ بعض علم جہالت ہوتے ہیں۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ علم حاصل کرنے والا اپنے علم پر عمل پیرا نہ ہوا، اس اعتبار سے وہ شخص عالم ہونے کے باوجود جاہل قرار پائے گا کیوں کہ جو شخص علم رکھے اور عمل نہ کرے تو وہ گویا جاہل ہے۔

علاوہ ازیں اس ارشاد گرامی سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو شخص علم کا دعوی کرتا ہے اور اپنے گمان کے مطابق خود کو عالم سمجھا ہے مگر حقیقت میں وہ عالم نہیں ہے تو اس کا یہ علم جس کا اس نے دعوی کیا ہے علم نہیں ہے بلکہ سراسر جہالت ونادانی ہے۔

"بعض قول وکلام وبال جان ہوتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہی جس کی وجہ سے وہ خود کسی آفت میں مبتلا ہوگیا یا جس شخص نے اس بات کو سنا وہ کسی ملال ودل برداشتگی میں مبتلا ہوگیا، بایں طور کہ اگر وہ سننے والا جاہل تھا تو وہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور اگر عالم تھا تو اس کے لئے لاحاصل تھی یا وہ کوئی ایسی بات ہے جس کو سننے والا پسند نہیں کرتا اور اس بت کی وجہ سے اس کو رنج وملال ہوتا ہے تو ان صورتوں میں یہی کہا جائے گا کہ کہنے والے کا وہ قول وکلام وبال وملال کا ذریعہ بن گیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت حسانؓ کی فضیلت

(۲۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضَعُ لِحَسَّانٍ مِنْبَرًا فِي الْمَسْجِدِ يَقُوْمُ عَلَيْهِ قَائِمًا يُفَاخِرُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ يُنَافِحُ وَيَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُؤَيِّدُ حَسَّانَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ مَا نَافَحَ اَوْ فَاخَرَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاریؒ)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں مشہور شاعر اسلام حضرت حسانؓ کے لئے منبر رکھوا دیتے تھے جس پر

وہ کھڑے ہو کر اپنے اشعار سناتے اور ان اشعار میں رسول کریم ﷺ کی طرف سے اظہار فخر کرتے تھے۔ یا۔ یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے کفار کے دین مخالف اشعار اور ہجو کا مقابلہ کرتے تھے اور رسول کریم ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ حسان کی تائید کرتا ہے جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مقابلہ کرتے ہیں۔ یا یہ الفاظ ہیں کہ جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اظہار فخر کرتے ہیں۔" (بخاریؒ)

حدی کا جواز

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَادٍ يُقَالُ لَهُ اَنْجَشَةُ وَكَانَ حَسَنَ الصَّوْتِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُوَيْدَكَ يَا اَنْجَشَةُ لَا تَكْسِرِ الْقَوَارِيْرَ قَالَ قَتَادَةُ يَعْنِيْ ضَعَفَةَ النِّسَآءِ۔ (متفق علیہ)

"اور انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ایک حدی خواں تھے جن کا نام انجشہ تھا، وہ بہت خوش آواز تھے ایک سفر کے دوران نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ انجشہ اونٹوں کو آہستہ آہستہ ہانکو اور شیشوں کو نہ توڑو۔ حضرت قتادہؓ حدیث کے ایک راوی کہتے ہیں کہ شیشوں سے آنحضرت ﷺ کی مراد عورتیں تھیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "حدی" صراح کے مطابق اس بلند آواز گانے کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ اونٹوں کو ہانکا جاتا ہے، لغت کی بعض دوسری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ حدی، عرب شتربانوں کے نغمہ کو کہتے ہیں، چنانچہ عرب میں دستور ہے کہ شتربان اونٹ ہانکنے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کا اونٹ تھک گیا ہے یا اس کی چال سست ہوگئی ہے تو وہ بلند آواز اور خوش گوئی کے ساتھ گانے لگتا ہے اس گانے کی آواز گویا اونٹ میں چستی و گرمی پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ تیز رفتاری کے ساتھ چلنے لگتا ہے کتابوں میں لکھا ہے کہ حدی، جو گانے ہی کی ایک قسم ہے مباح ہے اور اس کے بارے میں علماء میں سے کسی کا کوئی اختلافی قول نہیں ہے۔

"قواریر" قارورہ کی جمع ہے جس کے معنی شیشہ کے ہیں! اس ارشاد گرامی وَلَا تَكْسِرِ الْقَوَارِيْرَ اور شیشوں کو نہ توڑو کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ عورتوں کے بدن میں جو فطری نزاکت و کمزوری ہوتی ہے اس کی بنا پر اونٹوں کا تیز چلنا اور ہچکولے لگنا ان کے سخت تعب و تکلیف کا موجب بن جاتا ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اپنے شتربان انجشہؓ کو حکم دیا کہ اونٹ کو اتنی تیزی کے ساتھ نہ بھگاؤ کہ اس پر سوار عورتیں ہچکولے کھانے لگیں اور اس کی وجہ سے ان کو تکلیف و پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ کے ذریعہ عورتوں کے دل کی کمزوری و نرمی کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا یعنی آنحضرت ﷺ نے انجشہؓ کو ہدایت کی اس طرح حدی خوانی نہ کرو جس سے عورتوں کے دل کمزور، متأثر ہو جائیں اور تمہارے گانے کی وجہ سے ان کے ذہن و دماغ اور جذبات میں ہلچل پیدا ہو جائے اور وہ کسی برے خیال میں مبتلا ہو جائیں کیونکہ گانے کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ طبیعت کو بھڑکاتا ہے اور جذبات میں ہلچل مچا دیتا ہے! اگرچہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس موقع پر یہ ارشاد فرمایا اس وقت اونٹ پر ازواج مطہراتؓ میں سے کوئی زوجہ مطہرہ سوار ہوں گی اور اس صورت میں مطلب غیر موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ مذکورہ احتمال یعنی گانے کی آواز سن کر جذبات میں ہلچل پیدا ہو جانا، ازواج مطہراتؓ کے حق میں نہایت کمزور ضعیف ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کسی برے خیال کا پیدا ہو جانا اور طبیعت و دل کا کسی وسوسے میں مبتلا ہو جانا ایک طبعی چیز ہے جو کسی انسان کے اختیار کی پابند نہیں ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس کو مناسب سمجھا کہ احتیاط کی راہ ظاہر فرما دیں کہ بہر صورت احتیاط کی راہ اختیار کرنا ہی بہتر اور اولیٰ ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا تعلق درحقیقت امت کے لوگوں کو تعلیم و تلقین سے ہے یعنی آپ ﷺ نے اس موقع پر مذکورہ ارشاد کے ذریعہ پوری امت کو ہدایت فرمائی کہ جب اونٹ پر عورتیں سوار ہوں تو ان کی موجودگی کو

ملحوظ رکھا جائے اور حدی خوانی میں احتیاط و مصلحت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔
اوپر جو دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ان میں سے دوسرے مطلب کو اکثر شارحین نے ترجیح دی ہے لیکن روایت کے الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ پہلا مطلب صحیح مانا جائے۔

شعر کی خوبی و برائی کا تعلق اس کے مضمون سے ہے

(۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ ذُكِرَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشِّعْرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ كَلَامٌ فَحَسَنُهُ حَسَنٌ وَقَبِيْحُهُ قَبِيْحٌ رَوَاهُ الدَّارَ قُطْنِيُّ وَرَوَى الشَّافِعِيُّ عَنْ عُرْوَةَ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کے سامنے شعر کا ذکر کیا گیا یعنی یہ دریافت کیا گیا شعر و شاعری کوئی اچھی چیز ہے یا بری؟ تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ شعر بھی ایک کلام ہے چنانچہ اچھا شعر اچھا کلام ہے اور برا شعر برا کلام ہے۔"

شعر و شاعری کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اور حدیث بھی اسی بات کو واضح کرتی ہے کہ شعر کہنا یا پڑھنا سننا بذات خود کوئی برائی نہیں رکھتا بلکہ اس کی اچھائی اور برائی کا دار و مدار شعر کے مضمون پر ہوتا ہے اگر شعر کا مضمون ایسا ہے جو شریعت کے حکم و منشاء اور دینی تقاضوں کے خلاف نہیں ہے تو اس شعر میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ ایسے مضمون کا حامل شعر کہا، اور سنا جائے جس سے دین کی بات پھیلتی اور ثابت ہوتی ہو یا جس سے خدا کی وحدانیت رسول ﷺ کی محبت و منقبت اور دین و خادمان دین کی عظمت ظاہر ہوتی ہو تو یقیناً ایسا شعر مستحسن و محمود بھی ہوگا اس کے برخلاف جس شعر کا مضمون شریعت کے حکم و منشاء کے خلاف ہو تو اس کو برا کہا جائے گا۔

شعر کی برائی

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ بَیْنَا نَحْنُ نَسِیْرُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ اِذَا عَرَضَ شَاعِرٌ یُنْشِدُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خُذُوا الشَّیْطَانَ اَوْ اَمْسِکُوا الشَّیْطَانَ لَاَنْ یَّمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَیْحًا خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّمْتَلِئَ شِعْرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ سفر کے دوران عرج میں تھے کہ اچانک ایک شاعر سامنے سے نمودار ہوا جو اشعار پڑھنے میں مشغول تھا، رسول کریم ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ اس شیطان کو پکڑ لو یا یہ فرمایا کہ اس شیطان کو جانے دو یعنی اس کو شعر پڑھنے سے روک دو، یاد رکھو! انسان کا اپنے پیٹ کو پیپ سے بھرنا اس میں اشعار بھرنے سے بہتر ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "عرج" مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان راستہ میں پڑنے والی ایک گھاٹی کا نام ہے جہاں ایک چھوٹی سی بستی بھی ہے اس راستے پر چلنے والے قافلے یہاں منزل کرتے تھے، آنحضرت ﷺ بھی سفر ہجرت اور حجۃ الوداع میں اس جگہ سے گزرے تھے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ حجۃ الوداع کے سفر کے دوران کا ہے۔

بہر حال جب آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ شعر پڑھنے میں بری طرح مشغول ہے یہاں تک کہ اس کو وہاں موجود مسلمانوں کی طرف بھی کوئی التفات نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے آنحضرت ﷺ اور تمام مسلمانوں سے صرف نظر کئے ہوئے بے محابا چلا جا رہا ہے اور اس کو شوق شعر و شاعری نے اس درجہ بےباک بنا دیا ہے کہ وہ انسانی اور اخلاقی تقاضوں اور آداب زندگی تک کو فراموش کر بیٹھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے رگ و پے میں صرف شعر و شاعری ہی سرایت کئے ہوئے ہے اور وہ پرلے درجے کا بے حیا و بے ادب بن گیا ہے تو آپ ﷺ نے اس کو شیطان فرمایا جس سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ یہ شخص رحمت الٰہی اور قرب خداوندی سے بعد اختیار کئے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے صورت حال کا صدور محض اس لئے ہوا کہ وہ اپنی شعر و شاعری کے غرور و نخوت میں مبتلا

تھا اس لئے آپ ﷺ نے شعر کی مذمت کی۔

راگ لگانا، نفاق کو پیدا کرتا ہے

(۲۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْغِنَاءُ یُنْبِتُ النِّفَاقَ فِی الْقَلْبِ کَمَا یُنْبِتُ الْمَاءُ الزَّرْعَ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ راگ و گانا دل میں نفاق کو اس طرح اگاتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ راگ و گانا انسانی قلب و روح کے لئے ایک آزار ہے کہ جس کا ثمرہ نفاق ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ راگ و گانا انسان میں نفاق و فساد باطن کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔

دیلمیؒ کی روایت میں حضرت انسؓ سے آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی یوں نقل کیا گیا ہے کہ۔

ان الغنا و اللھو ینبتان النفاق کما ینبت الماء العشب والذی نفس محمد بیدہ ان القران و الذکر ینبتان الایمان فی القلب کما ینبت الماء العشب۔

"حقیقت یہ ہے کہ راگ و گانا اور کھیل کود یہ دونوں نفاق کو اس طرح اگاتے ہیں جس طرح پانی سبزی کا اگاتا ہے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے قرآن اور ذکر الٰہی یہ دونوں قلب میں ایمان کو اس طرح اگاتے ہیں جس طرح پانی سبزی کو اگاتا ہے۔"

حاصل یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ راگ و گانے اور کھیل کود جیسی لاحاصل چیزوں سے اجتناب کرے بلکہ اپنے اوقات کو تلاوت قرآن اور ذکر الٰہی سے معمور رکھے کیوں کہ یہ چیزیں قلب و روح کو جلا بخشتی ہیں اور ایمان و اخلاق کو مضبوط تر بناتی ہیں۔

نوویؒ نے کتاب روضہ میں لکھا ہے کہ محض آواز کے ساتھ گانا مکروہ ہے اور اس کا سننا بھی مکروہ ہے نیز اجنبی عورت سے سننا سخت مکروہ ہے اور ساز جیسے عود و طنبور اور دیگر باجوں کے ساتھ گانا کہ شراب نوشوں کا خاص مشغلہ ہوتا ہے حرام ہے اور اس کا سننا بھی حرام ہے۔

باجے گاجے کی آواز آئے تو کانوں میں انگلیاں ڈال لو

(۲۷) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ کُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِیْ طَرِیْقٍ فَسَمِعَ مِزْمَارًا فَوَضَعَ اِصْبَعَیْہِ فِیْ اُذُنَیْہِ وَنَاءَ عَنِ الطَّرِیْقِ اِلَی الْجَانِبِ الْاٰخَرِ ثُمَّ قَالَ لِیْ بَعْدَ اَنْ بَعُدَ یَا نَافِعُ ھَلْ تَسْمَعُ شَیْئًا قُلْتُ لَا فَرَفَعَ اِصْبَعَیْہِ مِنْ اُذُنَیْہِ قَالَ کُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ صَوْتَ یَرَاعٍ فَصَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ قَالَ نَافِعٌ وَکُنْتُ اِذْ ذَاکَ صَغِیْرًا۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت نافعؒ تابعی کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ راستہ میں تھا یعنی ہم دونوں کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک جگہ حضرت ابن عمرؓ نے "نے" کی آواز سنی اور فورًا اپنی دونوں انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں نیز راستہ سے ہٹ کر دوسری طرف ہو لئے تاکہ اس آواز سے اپنے آپ کو بچا سکیں پھر اس راستہ سے ہٹنے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ نافع کیا تم بھی کچھ سن رہے ہو یعنی "نے" کی جو آواز آ رہی تھی وہ اب بھی جاری ہے یا بند ہو گئی ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں اب وہ آواز بند ہو گئی ہے انہوں نے اپنی دونوں انگلیاں کانوں سے نکال لیں اور پھر بیان کیا کہ ایک دن میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ ﷺ نے "نے" کی آواز سنی اور پھر آپ ﷺ نے بھی یہی کیا جو اس وقت میں نے کیا ہے! حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ اس وقت میں ایک چھوٹی عمر کا لڑکا تھا۔" (احمدؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت نافعؒ نے اس روایت کے آخر میں جو یہ واضح کیا کہ میں نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ اس وقت کا ہے جب میں بہت چھوٹا تھا اس سے ان کا مقصد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ اس وقت چونکہ میں چھوٹی عمر کا تھا اور شرعی طور پر مکلف نہیں تھا اس لئے

حضرت ابن عمرؓ نے اس آواز کو سننے سے مجھ کو منع نہیں کیا اگر میں شرعی طور پر مکلّف ہوتا تو وہ یقیناً مجھ کو یہ ہدایت کرتے کہ ان کی طرح میں بھی اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لوں لہٰذا کسی کو یہ وہم نہ ہونا چاہئے کہ اس آواز میں کراہت تنزیہی تھی اس لئے انہوں نے مجھے اس آواز سے سننے سے منع نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس آواز کو سننا مکروہ تحریمی تھا اور مجھے منع نہ کرنے کا تعلق میرے غیر مکلّف ہونے سے تھا۔

رہی یہ بات کہ جب حضرت ابن عمرؓ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں تھیں تو راستہ چھوڑ دینے کی کیا ضرورت تھی تو اس کا تعلق کمال تقویٰ اور ورع سے تھا یعنی حضرت ابن عمرؓ نے احتیاط و تقویٰ کا تقاضہ یہی سمجھا کہ اس راستہ سے ہی ہٹ جائیں ورنہ اگر اس راستے کو چھوڑ دینا بھی شرعی طور پر ضروری ہوتا تو حضرت ابن عمرؓ یقیناً حضرت نافعؒ کو بھی وہ راستہ چھوڑ دینے کا حکم دیتے۔

واضح رہے کہ گانے بجانے کا مسئلہ بہت تفصیل طلب ہے خلاصہ کے طور پر اتنا جان لینا کافی ہے کہ محدثین کی تحقیق کے مطابق ایسی کوئی حدیث منقول نہیں ہے جس سے گانے کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہو، مشائخ کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں اظہار ممانعت کے طور پر جو کچھ منقول ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ گانا ممنوع ہے جس کے ساز اور باجا بھی شامل ہو البتہ فقہاء نے اس مسئلہ میں بڑی شدت اختیار کی ہے جس کی تفصیل فقہی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے فتاویٰ قاضی خاں میں لکھا ہے کہ لہو و لعب کی چیزوں یعنی ساز اور باجوں کو سننا حرام اور سخت گناہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے۔

استماع الملاھی معصیة والجلوس علیھا فسق والتلذ ذبھا من الکفر

"باجوں کا سننا گناہ ہے اس پر بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لذت وحظ حاصل کرنا کفریات میں سے ہے۔"

ہاں اگر کسی شخص کے کان میں باجے کی آواز ناگہانی طور پر آجائے تو اس صورت میں کوئی گناہ نہیں، لیکن ان پر واجب ہوگا کہ وہ اس بات کی پوری کوشش کرے کہ وہ اس آواز کو سن نہ سکے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے باجے کی آواز سے بچنے کے لئے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لی تھیں۔

بَابُ حِفْظِ اللِّسَانِ وَالْغِيبَةِ وَالشَّتْمِ

زبان کی حفاظت، غیبت اور برا کہنے کا بیان

"غیبت" کے معنی ہیں پیٹھ پیچھے بدگوئی کرنا۔ یعنی کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کے متعلق ایسی باتیں کرنا کہ جس کو اگر وہ سنے تو ناپسند کرے۔

"شتم" کے معنی ہیں گالی دینا یعنی کسی کو کوئی فحش بات کہنا بدزبانی کرنا برا بھلا کہنا اور کسی کو ایسے الفاظ کے ذریعہ یاد و مخاطب کرنا جو شریعت و اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہوں۔

بہرحال اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے یہ واضح ہوگا کہ زبان کو ایسے الفاظ و کلام سے بچانا چاہئے جن کو زبان پر لانا شرعی، اخلاقی اور معاشرتی طور پر ناروا ہے خصوصاً غیبت، گالم گلوچ اور بدزبانی و بدکلامی! نیز ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان چیزوں میں شرعی طور پر کیا برائی ہے اور ان کا ارتکاب کرنے والا شریعت و اخلاق کی نظر میں کس کی نظم میں کس قدر ناپسندیدہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے کو آنحضرت ﷺ کی طرف سے جنت کی بشارت

① عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّضْمَنْ لِيْ مَابَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَابَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنْ

لَهُ الْجَنَّةَ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ اپنی اس چیز کی حفاظت کریگا جو اس کے دونوں کلوں کے درمیان ہے یعنی زبان اور دانت اور جو اس کے دونوں پاؤں کے درمیان ہے یعنی شرمگاہ تو میں اس کی جنت کی ضمانت لیتا ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: زبان کی حفاظت کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ اپنی زبان پر قابو حاصل کرے بایں طور کہ اس کو بے فائدہ الفاظ و کلام اور فحش گوئی و سخت کلامی سے محفوظ رکھے اور دانت کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو حرام چیزوں کے کھانے پینے میں ملوث نہ کرے اس طرح شرمگاہ کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ زنا جیسی برائی سے اجتناب کرے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص مجھ سے اس بات کا عہد کرے اور عمل کے ذریعہ اس عہد کو پورا کرے گا کہ وہ اپنی زبان کو فحش گوئی و بدکلامی سے محفوظ رکھے گا۔ اپنے منہ کو حرام و ناجائز کھانے پینے سے بچانے اور اپنی شرمگا کو حرام کاری سے محفوظ رکھنے پر پوری طرح عامل و کاربند رہے گا تو اس کے تئیں اس بات کا ضامن بنتا ہوں کہ وہ شروع ہی میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل کر دیا جائیگا اور وہاں کے درجات عالیہ کا مستحق قرار پائے گا۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کی دراصل حق تعالیٰ کی طرف سے ضمانت ہے کہ جس طرح وہ محض اپنے فضل سے بندوں کے رزق کا ضامن ہوا ہے اسی طرح اس نے پاکیزہ زندگی اختیار کرنے اور اعمال صالحہ پر جزاء دینے اور اپنے انعامات سے نوازنے کا بھی قوی وعدہ کیا ہے اور چونکہ آنحضرت ﷺ اس کے نائب ہیں اس کی طرف سے مذکورہ ضمانت لی ہے۔

زبان پر قابو رکھو

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ لَا يُلْقِیْ لَهَا بَالًا يَرْفَعُ اللّٰهُ بِمَا دَرَجَاتٍ وَاِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ لَا يُلْقِیْ لَهَا بَالًا يَهْوِیْ بِهَا فِیْ جَهَنَّمَ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ رِوَايَةٍ لَهُمَا يَهْوِیْ بِهَا فِی النَّارِ اَبْعَدَ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ جب بندہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نکالتا ہے جس میں حق تعالیٰ کی خوشنودی ہوتی ہے تو اگرچہ وہ بندہ اس بات کی اہمیت کو نہیں جانتا لیکن اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے اس کے درجات بلند کر دیتا ہے یعنی اگرچہ وہ بندہ اپنی اس بات کی قدر و اہمیت سے واقف نہیں ہوتا اور اس کو ایک نہایت سہل اور معمولی درجہ کی بات سمجھتا ہے مگر حق تعالیٰ کے نزدیک وہ بات بہت بلند پایہ اور بڑے مرتبہ کی ہوتی ہے اسی طرح جب بندہ کوئی ایسی بات زبان سے نکالتا ہے جو حق تعالیٰ کی ناخوشی کا ذریعہ بن جاتی ہے تو اگرچہ وہ بندہ اس بات کی اہمیت کو نہیں جانتا یعنی وہ اس بات کو بہت معمولی سمجھتا ہے اور اس کو زبان سے نکالنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا لیکن حقیقت میں وہ بات نتیجے کے اعتبار سے اتنی ہیبتناک ہوتی ہے کہ وہ بندہ اس کے سبب سے دوزخ میں گر پڑتا ہے۔ (بخاریؒ) اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ اس کے سبب سے دوزخ میں اتنی دور سے گرتا ہے جو مشرق و مغرب کے درمیانی فاصلہ سے بھی زیادہ ہے یعنی وہ جہاں سے دوزخ میں گرے گا وہ دوزخ جس جگہ جاکر گرے گا، ان دونوں کے درمیان اتنا طویل فاصلہ ہے جتنا مشرق و مغرب کے درمیان بھی نہیں ہے۔"

تشریح: اس ارشاد گرامی ﷺ کا حاصل اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ زبان پر ہر وقت قابو رکھو اور اس کے معاملہ کو کم اہم نہ سمجھو نیز اس حقیقت کو کسی بھی لمحہ نظر انداز نہ کرو کہ اگر زبان پر احتیاط کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور یہ چھوٹی سی چیز تمہارے قابو سے باہر ہو گئی تو پھر تمہاری خیر نہیں! چنانچہ اس حقیقت کو فرمایا گیا کہ بسا اوقات بندہ اپنی زبان سے کوئی بات نکالتا ہے اور اس کو اپنے نزدیک بہت معمولی درجہ کی

بات سمجھتا ہے مگر در حقیقت و نتیجہ کے اعتبار سے اس بات کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ اس کو یوں سمجھ کہ اگر وہ بات حق ہوتی ہے اور خدا کی خوشنودی کا ذریعہ بنتی تو وہی ذرا سی بات جنت میں اس کی بلندی کا سبب بن جاتی ہے اور اگر وہ بات کہیں ایسی ہوئی جو بری ہونے کی وجہ سے خدا کی ناراضگی کا سبب بن گئی ہو تو بندے کے نزدیک وہی معمولی بات اس کو دوزخ میں گرا دینے کا ذریعہ بن جائیگی۔

کسی مسلمان کے حق میں بدزبانی و سخت گوئی فسق ہے

③ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کو برا کہنا فسق ہے اور کسی مسلمان کا مار ڈالنا کفر ہے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کسی مسلمان کے قتل کرنے کو کفر کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی مسلمان اگر کسی مسلمان کو قتل کردے تو وہ کافر ہو جاتا ہے بلکہ ارشاد کا مقصد اس بات کو نہایت سختی و شدت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ کہ مسلمان کا ناحق خون بہانا انتہائی سنگین جرم ہے اور جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو قتل کرتا ہے وہ اپنے اسلام کے کامل ہونے کی نفی کرتا ہے گویا یہاں "کفر" سے مراد کمال اسلام کی نفی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے المسلم من سلم المسلمون یعنی کامل مسلمان وہی ہے جس سے مسلمان محفوظ و مامون رہیں اور اگر کفر سے اس کے حقیقی معنی مراد ہوں تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ وہ مسلمان یقیناً کافر ہو جائے گا جو کسی مسلمان کو اس لئے قتل کردے کہ وہ مسلمان ہو اور اس کے اسلام کے سبب سے اس قتل کرنے کو حلال و مباح جانے کیوں کہ کسی مسلمان کو محض اس کے اسلام کی وجہ سے قتل کرنا اور اس قتل کو حلال و مباح جاننا بلاشبہ کفر ہے۔

کسی مسلمان کو برا نہ کہو

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ قَالَ لِاَخِيْهِ كَافِرٌ فَقَدْ بَاءَ بِهَا اَحَدُهُمَا۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہا تو ان دونوں میں سے ایک پر کفر لوٹ گیا یعنی یا تو کہنے والا خود کافر ہو گیا یا وہ شخص کہ جس کو اس نے کافر کہا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے جو خود مسلمان ہے کسی دوسرے مسلمان کو کافر کہا تو اس کی دو ہی صورتیں ہوں گی ایک تو یہ کہ کہنے والے نے سچ کہا ہو، ظاہر ہے کہ اس صورت میں کلمہ کفر کا مستحق وہی شخص ہو گا جس کو کافر کہا گیا ہے اور جو حقیقۃً کافر ہے، دوسرے یہ کہ کہنے والے نے جھوٹ کہا ہو یعنی اس نے جس شخص کو کافر کہا ہے وہ حقیقت میں مسلمان ہے اور اس طرف کفر کی نسبت سراسر جھوٹ ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ کہنے والا خود کافر ہو گیا۔ تو اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے ایمان کو کفر سمجھا اور دین اسلام کو باطل جانا۔

اس حدیث کے سلسلے میں امام نوویؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کو بعض علماء نے مشکلات میں شمار کیا ہے کیونکہ اس ارشاد گرامی ﷺ کا جو بظاہر مفہوم ہے۔ اس کو حقیقی مراد قرار نہیں دیا جا سکتا بایں وجہ کہ اہل حق کا مسلک یہ ہے کہ کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ کرے جیسے قتل اور زنا وغیرہ اور خواہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو کافر کہنے کا ہی مرتکب کیوں نہ ہو بشرطیکہ وہ دین اسلام کے باطل ہونے کا عقیدہ نہ رکھے تو اس کی طرف کفر کی نسبت نہ کی جائے (جب کہ مذکورہ حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ثابت

کرتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کافر کہے اور حقیقت میں کافر نہ ہو تو کہنے والا خود کافر ہو جائے گا)۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس ارشاد گرامی ﷺ کی مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا محمول وہ شخص ہے جو نہ صرف یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کہے۔ بلکہ کسی مسلمان کی طرف کفر کی نسبت کرنے کو حلال و جائز بھی سمجھے اس صورت میں "باء بہا" کے معنی یہ ہونگے کہ کفر خود اس شخص کی طرف تکفیر کی معصیت لوٹتی ہے یعنی جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے گا تو اس کا یہ کہنا اس مسلمان کو تو کوئی نقصان پہنچائے گا نہیں البتہ مسلمان کو کافر کہنے کے گناہ میں خود مبتلا ہو گا اور تیسرے یہ کہ اس ارشاد گرامی ﷺ کا محمول خوارج ہیں جو مؤمنوں کو کافر کہتے ہیں لیکن یہ تیسری تاویل بہت ضعیف ہے کیونکہ اس تاویل کا مطلب یہ ہو گا کہ خوراج کو کافر قرار دیا جائے جب کہ اکثر علماء امت کے نزدیک زیادہ صحیح اور قابل قبول قول یہ ہے کہ خوارج فرقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ گمراہ بیشک ہیں جیسا کہ اہل بدعت، مگر ان کو کافر نہیں کہنا چاہئے۔ اگرچہ ملا علیؒ قاری نے وضاحت کی ہے کہ اس تاویل کو ان کے حق میں ضعیف نہیں کہا جائے گا۔ جو نہ صرف اہل سنت والجماعت بلکہ اکثر اونچے درجہ کے صحابہ کرامؓ تک کے بارے میں نعوذ باللہ کفر کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

کسی مسلمان کی طرف فسق کی نسبت نہ کرو

⑤ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْمِیْ رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفُسُوْقِ وَلَا يَرْمِيْهِ بِالْكُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَيْهِ اِنْ لَّمْ يَكُنْ صَاحِبُهٗ كَذٰلِكَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کوئی شخص کسی آدمی کو فاسق نہ کہے اور نہ اس پر کفر کی تہمت لگائے کیونکہ اگر وہ آدمی فسق یا کفر کا حامل نہیں ہے تو اس کا کہا ہوا اسی طرف لوٹ جائے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو نہ تو فاسق کہو اور نہ اس کی طرف کفر کی نسبت کرو۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے کسی ایسے مسلمان کو فاسق کہا جو حقیقت میں فاسق نہیں تو وہ کہنے والا خود فاسق ہو گا اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی ایسے شخص کو کافر کہا جو حقیقت میں کافر نہیں ہے بلکہ مؤمن ہے تو وہ کہنے والا خود کافر ہو جائے گا جیسا کہ پچھلی حدیث کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

کسی شخص کو دشمن خدا نہ کہو

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ دَعَا رَجُلًا بِالْكُفْرِ اَوْ قَالَ عَدُوُّ اللّٰهِ وَلَيْسَ كَذٰلِكَ اِلَّا حَارَ عَلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی کو کافر کہہ کر پکارے یا کسی کو خدا کا دشمن کہے اور وہ واقعۃً ایسا نہ ہو تو اس کا کہا ہوا خود اس پر لوٹ پڑتا ہے یعنی کہنے والا خود کافر یا خدا کا دشمن ہو جاتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

آپس کی گالم گلوچ کا سارا گناہ ابتداء کرنے والے پر ہوتا ہے

⑦ وَعَنْ اَنَسٍ وَاَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِیْ مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اگر دو شخص آپس میں گالم گلوچ کریں تو ان کی ساری گالم گلوچ کا گناہ اس شخص پر ہو گا جس نے پہل کی ہے جب تک کہ مظلوم تجاوز نہ کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر دو شخص آپس میں گالم گلوچ کرنے لگیں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگیں اور ایک دوسرے کے حق میں

بدکلامی وسخت گوئی کریں تو اس ساری گالم گلوچ اور برا بھلا کہنے کا گناہ ان دونوں میں سے اس شخص پر ہوگا جس نے گالم گلوچ کی ابتداء کی ہوگی یعنی اس کو اپنی گالم گلوچ کا گناہ تو ہوگا ہی دوسرے شخص کی گالم گلوچ کا گناہ بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا کیونکہ اس نے گالم گلوچ کی ابتداء کر کے گویا دوسرے شخص پر ظلم کیا ہے اور اس اعتبار سے وہ ظالم کہلائے گا اور دوسرا شخص مظلوم لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ وہ دوسرا شخص یعنی مظلوم جواب دینے میں زیادتی نہ کرے، اگر مظلوم حد سے تجاوز کر گیا بایں طور کہ اس کی گالم گلوچ ابتدا کرنے والے کی گالم گلوچ سے بڑھ گئی یا ابتداء کرنے والے نے جو ایذاء پہنچائی تھی اس کے جواب میں دوسرے شخص نے اس سے بھی زیادہ ایذا پہنچادی تو اس صورت میں ابتداء کرنے والے کی بہ نسبت اس پر زیادہ گناہ ہوگا بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ دوسرا شخص بھی اس تعدی اور زیادتی کی وجہ سے گنہ گار ہوگا۔

کسی پر لعن طعن کرنا نامناسب بات ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَنْبَغِیْ لِصِدِّيْقٍ يَكُوْنَ لَعَّانًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ صدیق کے لئے یہ جائز مناسب نہیں ہے کہ بہت زیادہ لعنت کرنے والا ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: "صدیق" مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ سچا۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جس کے قول وفعل کے درمیان کوئی تضاد نہ ہو بلکہ پوری یکسانیت ومطابقت ہو۔ صوفیاء کے ہاں صدیقیت ایک مقام ہے جس کا درجہ مقام نبوت کے بعد سب سے اعلیٰ ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت کریمہ فاولٰئک الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھدآء والصّٰلحین سے مفہوم ہوتا ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صدق وراستی کے وصف سے مزین ہو اور ایسے اونچے مقام پر پہنچ چکا ہو جو مقام نبوت کے بعد سب سے اعلیٰ ہے اور اس اعتبار سے اس کے مرتبہ کو مرتبہ نبوت سے سب سے قریبی نسبت حاصل ہے تو اس کی شان یہ نہیں ہونی چاہئے۔ کہ وہ دوسروں پر لعنت کرتا رہے اور نہ مقام صدیقیت کا مقتضاء ہو سکتا ہے کیونکہ کسی کو لعنت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو رحمت خداوندی اور بارگاہ الوہیت سے محروم اور بعید قرار دیدیا جائے جب کہ تمام انبیاء کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ وہ مخلوق خدا کو رحمت خداوندی سے بہرہ یاب کریں۔ اور جو بارگاہ الوہیت سے دور ہو چکے ہیں ان کو قریب تر لائیں۔ اسی وجہ اہل سُنّت والجماعت کا پسندیدہ شیوہ یہ ہے کہ لعن طعن کو ترک کیا جائے اور کسی بھی شخص کو لعنت نہ کی جائے اگرچہ وہ اس لعنت کا مستحق ہی کیوں نہ ہو کیونکہ جو شخص اپنے قول وفعل کے ذریعہ خدا کے نزدیک خود ملعون قرار دیا جا چکا ہے اس پر لعنت کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے لہٰذا کسی ایسے شخص پر لعنت کرنا اپنی زبان کو خواہ مخواہ آلودہ کرنا اس کی لعنت میں اپنا وقت صرف کرنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے اور یہ کہ اس پر لعن طعن کر کے گویا اپنی جماعت حقہ کے شیوہ ومعمول کے برخلاف عمل کرنا ہے البتہ اس کافر پر لعنت کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے جس کے بارے میں مخبر صادق کی خبر یا اپنا علم ویقین یہ ہو کہ وہ کفر ہی کی حالت میں مرا ہے۔

واضح رہے کہ لعنت کی دو قسمیں ہیں کہ ایک تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ شخص کو بھلائی سے بالکل محروم اور رحمت خداوندی سے کلیۃً دور قرار دینا نیز اس کو اللہ تعالیٰ کے فضل لامتناہی سے مطلق ناامید کر دینا، ایسی لعنت صرف کافروں کے لئے مخصوص ہے دوسری قسم کی لعنت کا مطلوب یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو رضائے حق اور قرب خداوندی کے مقام سے دور محروم قرار دیا جائے جو ترک اولیٰ واحوط کا مرتکب ہو چنانچہ بعض اعمال واوراد کو ترک کے سلسلے میں جو لعنت ملامت منقول ہے اور جو بعض صحابہؓ وغیرہ سے بھی نقل کی گئی ہے اس کا تعلق اسی دوسری قسم سے ہے۔

لفظ "لعان" مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ لعنت کرنے والا حدیث میں یہ لفظ صیغہ مبالغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ عام طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی اونچے سے اونچے درجہ کا مؤمن بھی تھوڑی بہت لعنت کرنے سے اجتناب کرتا ہو، چنانچہ ابن ملک" نے لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ میں اس لفظ کا بصیغہ مبالغہ ذکر ہونا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے لعنت کرنے کی جو برائی اس حدیث سے واضح ہوتی ہے کہ وہ اس شخص کے حق میں نہیں ہے جس سے کبھی کبھار یعنی ایک مرتبہ یا دو مرتبہ لعنت کا صدور ہو جائے۔

⑨ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللَّعَّانِیْنَ لَا یَکُوْنُوْنَ شُھَدَاءَ وَلَا شُفَعَاءَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو لوگ بہت زیادہ لعنت کیا کرتے ہیں وہ قیامت کے دن نہ گواہ بنائے جائیں گے اور نہ شفاعت کر سکیں گے۔" (مسلمؒ)

تشریح: قیامت کے دن امت محمدیہ کے لوگ پچھلی امتوں پر گواہ کی حیثیت سے پیش کئے جائیں گے چنانچہ وہ یہ گواہی دیں گے کہ ان کے رسولوں اور پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کے احکام ان تک پہنچائے تھے اور ان کو خدا کی طرف بلایا تھا مگر انہوں نے اپنے رسولوں اور پیغمبروں کی بات نہیں مانی اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں برگزیدہ امت بنایا تا کہ تم اور لوگوں پر گواہ ہو۔"

اسی گواہی کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایسے گواہ بننے کا اعزاز نہیں بخشا جائے گا جو دوسروں پر اتنی زیادہ لعنت کیا کرتے ہیں کہ لعنت کرنا گویا ان کی عادت بن جاتی ہے اسی طرح بہت زیادہ لعنت کرنے والے لوگ قیامت کے دن درجہ شفاعت سے بھی محروم کر دیئے جائیں گے یعنی اگر وہ چاہیں گے کہ دوسرے لوگوں کی شفاعت کریں تو وہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

کسی کی طرف اخروی ہلاکت کی نسبت نہ کرو

⑩ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَالَ الرَّجُلُ ھَلَكَ النَّاسُ فَھُوَ اَھْلَكُھُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ لوگ ہلاک ہوئے یعنی جہنم کی آگ کے مستوجب ہو گئے تو اس طرح کہنے والا سب سے زیادہ ہلاک ہونے والا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگر کوئی شخص کچھ لوگوں، کو ایسے عقائد و اعمال میں مبتلا دیکھے جو دین و شریعت کے خلاف ہوں تو ان کی اس حالت پر حسرت و افسوس کا ہونا اور غم خواری کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر بھی ہے اور اخوت اسلامی کا تقاضا بھی اب اگر وہ شخص اسی حسرت و افسوس اور غم خواری کے جذبات کے تحت ان لوگوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ لوگ تو ہلاک ہو گئے یعنی ان لوگوں نے ایسے عقائد و اعمال کو اختیار کر لیا ہے جو ان کو دوزخ کی آگ میں دھکیل کر رہیں گے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اس شخص کا یہ کہنا دراصل ان لوگوں کے تئیں ہمدردی و غم خواری کا مظہر ہو گا اور اس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ وہ شخص ان لوگوں کے برے احوال سے دل شکستہ ہے اور اس کا قلبی جذبہ یہ ہے کہ کاش وہ لوگ اس حالت میں مبتلا ہو کر اخروی ہلاکت و تباہی کے راستہ کو اختیار نہ کرتے اور جب وہ اس راہ پر پڑ گئے ہیں تو اے کاش اب بھی ان کو ہدایت نصیب ہو جائے اور وہ ابدی ہلاکت و تباہی کے خوف سے راہ راست پر لگ جائیں۔

لیکن اگر کوئی شخص ان جذبات ہمدردی و غم خواری کے برعکس محض عیب جوئی حقارت اور ان لوگوں کو رحمت خداوندی سے مایوس کرنے کے لئے اس طرح کے الفاظ زبان سے نکالے تو یہ سخت برا ہو گا اور اس طرح کہنے والا شخص خود سب سے زیادہ ہلاکت و تباہی میں

پڑے گا کیوں کہ اس کے ان الفاظ سے یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے نفس کی برائی اور اپنے اعمال کے غرور و تکبر میں مبتلا ہو گیا ہے دوسرے لوگوں کو چشم حقارت سے دیکھتا ہے اور ان کو حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید کرتا ہے یہ مطلب اس صورت میں ہو گا جب کہ لفظ اھلکم کاف کے پیش کے ساتھ یعنی بصیغہ تفضیل ہو اور اگر یہ لفظ کاف کے زبر کے ساتھ یعنی بصیغہ ماضی ہو جیسا کہ بعض روایتوں میں نقل کیا گیا ہے تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہو گا کہ اس طرح کہنے والا ان کو ہلاک و برباد کر دیتا ہے اور مطلب یہ ہو گا کہ جب کوئی شخص اپنے مشاہدہ کے مطابق بدعملیوں میں مبتلا لوگوں کے بارے میں اپنی زبان سے یہ الفاظ نکالتا ہے کہ وہ لوگ تو ہلاک و برباد ہو گئے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ رحمت خداوندی سے مایوس ہو کر ترک طاعت و عبادت اور ارتکاب معصیت و گناہ میں اور زیادہ مشغول و منہمک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کے الفاظ ان گنہ گاروں کو شکستہ دل، ناامید اور بے شوق بنا دیتے ہیں جو اپنی بدعملیوں کی وجہ سے گویا دنیا ہی میں خدا کے قہر و جلال میں گرفتار ہوئے ہیں اسی لئے شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ جو لوگ بدعملیوں کی راہ اختیار کئے ہوئے ہوں اور معصیت کے اندھیروں نے جن کو گھیر رکھا ہو انہیں نہایت نرمی و ملائمت اور شفقت و محبت کے ساتھ تذکیر و نصیحت کی جانی چاہئے اور ان پر سختی و تشدد کرنا ان کے حق میں سخت گوئی و ترش روئی سے پیش آنا ان کے بارے میں دل شکستگی اور مایوسی کے الفاظ اپنی زبان سے نکالنا اور ان پر سختی و تشدد کرنا ان کے حق میں سخت برا بن جاتا ہے اور وہ ضد و ہٹ دھرمی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے راہ راست پر آنے کے بجائے اور زیادہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں لہٰذا جو شخص ان کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتا ہے اور انہیں ہلاکت و بربادی کی خبر دیتا ہے وہ گویا انہیں ہلاکت و بربادی میں ڈالنے کا خود موجب بنتا ہے اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ گنہ گار لوگوں کو بھی مغفرت کی بشارت دینا چاہئے۔ ان کے قلب و ذہن کو دین و ایمان پر پختہ کرنا چاہئے۔ اور انہیں رحمت خداوندی کا امیدوار طلبگار بنانا چاہئے۔

منہ دیکھی بات کرنے والوں کی مذمت

⑪ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ذَاالْوَجْهَيْنِ الَّذِىْ يَاْتِىْ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قیامت کے دن سب سے بدتر شخص وہ ہو گا جو فتنہ انگیزی کی خاطر دو منہ رکھتا ہے یعنی منافق کی خاصیت و صفت رکھتا ہے کہ وہ ایک جماعت کے پاس آتا ہے تو کچھ کہتا ہے اور دوسری جماعت کے پاس آتا ہے تو کچھ کہتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی ﷺ میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید و تنبیہ ہے جو منافقوں کی طرح دو رویہ یعنی دو منہ والے ہوتے ہیں کہ ہر فریق کو خوش رکھنے کی خاطر کبھی صحیح اور حق بات نہیں کہتے بلکہ منہ دیکھی بات کرتے ہیں وہ جس جماعت اور جس فریق کے پاس اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنی زبان کھولتے ہیں زید کے پاس جاتے ہیں تو اس کی سی کہتے ہیں اور بکر کے پاس جاتے ہیں تو اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

چغل خور کے بارے میں وعید

⑫ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِىْ رِوَايَةٍ مُسْلِمٍ نَمَّامٌ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ چغل خور جنت میں داخل نہیں ہو گا (یعنی وہ نجات

پائے ہوئے لوگوں کے ساتھ ابتداء میں جنت میں داخل نہ ہوگا)۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں (قتات کے بجائے) نمام کا لفظ ہے۔"

تشریح: قتات اور نمام کے ایک ہی معنی ہیں یعنی چغل خور اس شخص کو کہتے ہیں جو لگائی بجھائی کرتا ہے اور ادھر کی بات ادھر اور ادھر کی بات ادھر کر کے لوگوں کے درمیان فتنہ و فساد کے بیج بوتا ہے۔

سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے کی تاکید

⑬ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِىْ اِلَى الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِىْ اِلَى الْجَنَّةِ وَمَايَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا وَاِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَاِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِىْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِىْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ الصِّدْقَ بِرٌّ وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِىْ اِلَى الْجَنَّةِ وَاِنَّ الْكَذِبَ فُجُوْرٌ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سچ بولنے کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ ہمیشہ اور پابندی کے ساتھ سچ بولنا، نیکو کاری کی طرف لیجاتا ہے یعنی سچ بولنے کی خاصیت یہ ہے کہ نیکی کرنے کی توفیق ہوتی ہے اور نیکو کاری نیکو کار کو جنت کے اعلیٰ درجات تک پہنچاتی ہے اور یاد رکھو! جو شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے اور ہمیشہ سچ بولنے کی سعی کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق، لکھا جاتا ہے! نیز تم اپنے آپ کو جھوٹ بولنے سے باز رکھو کیونکہ جھوٹ بولنا فسق و فجور کی طرف لے جاتا ہے یعنی جھوٹ بولنے کی خاصیت یہ ہے کہ برائیوں اور بد عملیوں کے ارتکاب کی طرف رغبت ہوتی ہے اور فسق و فجور فاسق و فاجر کو دوزخ کی آگ میں دھکیلتا ہے اور یاد رکھو! جو شخص بہت جھوٹ بولتا ہے اور زیادہ سے زیادہ جھوٹ بولنے کی سعی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب یعنی بڑا جھوٹا لکھا جاتا ہے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ سچ بولنا نیکی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور جھوٹ بولنا فسق و فجور ہے اور فسق و فجور، دوزخ کی آگ میں دھکیلتا ہے۔"

تشریح: "وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھا جاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کو وصف صدیقیت کا حامل اور مقام صدیقیت پر فائز قرار دیا جاتا ہے اور اس اونچے درجے کے وصف و مقام کے اجر و ثواب کا مستحق گردانا جاتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ملاء اعلیٰ کے پاس جس کتاب میں تمام بندوں کے اعمال لکھے ہوئے ہیں اس میں مذکورہ شخص کا نام صدیق لکھا جاتا ہے۔ اور یا یہ کہ دنیا میں لوگ ایسے شخص کو اپنی کتابوں اور قلم پاروں میں صدیق کے نام سے لکھتے اور یاد کرتے ہیں۔ اس صورت میں اس ارشاد کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں میں انتہائی معزز و مکرم ظاہر کیا جاتا ہے لوگوں کے دلوں پر اس شخص کا لقب صدیق القا کیا جاتا ہے اور ان کی زبانوں پر اس کے اس لقب و صفت کو جاری کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کو سچا و صادق سمجھتے ہیں اور اس کی سچائی و صداقت میں رطب اللسان رہتے ہیں، اس مفہوم کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا "جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال کئے اللہ تعالیٰ ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈالے گا"۔

"اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک کذاب لکھا جاتا ہے" کا مطلب بھی یا تو یہ ہے کہ جھوٹ بولنے والے شخص کے بارے میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور اس کے لئے وہ سزا مقرر کر دی جاتی ہے جو جھوٹوں کے لئے مخصوص ہے یا یہ کہ اس شخص کے بارے میں لوگوں کی نظروں اور دلوں میں یہ بات ظاہر و راسخ کر دی جاتی ہے کہ یہ شخص انتہائی ناقابل اعتبار ہے اس طرح گویا اس کو جھوٹا مشہور

کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے اور ہر شخص اس سے بغض و نفرت کرنے لگتا ہے۔

دروغ مصلحت آمیز جھوٹ کے زمرہ میں نہیں آتا

(۱۴) وَعَنْ أُمِّ كُلْثُوْمٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ وَيَقُوْلُ خَيْرًا أَوْ يَنْمِيْ خَيْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ام کلثوم کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص جھوٹا نہیں ہے، جو لوگوں کے درمیان صلح و صفائی کراتا ہے بھلائی کی بات کہتا ہے اور (ایک دوسرے سے) اچھی باتیں پہنچاتا ہے (اگرچہ وہ صلح و صفائی کرانے اور اس بات کے کہنے اور پہنچانے میں جھوٹ سے کام لے)۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی نزاع اور فتنہ و فساد کو ختم کرانے کے لئے اگر کوئی شخص ایسی بات کہے جو واقعہ کے اعتبار سے صحیح نہ ہو بلکہ جھوٹ ہو تو اس شخص کو جھوٹا نہیں کہیں گے اور اس پر جھوٹ کا گناہ نہیں ہوگا لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ بات ایسی ہو جو خیر و بھلائی ہی پر مشتمل ہو نہ کہ کسی برائی جیسے شرک و فسق وغیرہ کی حامل ہو مثلاً دو مسلمان زید اور بکر اگر آپس میں کوئی مخاصمت رکھتے ہوں یا ان دونوں کے درمیان کوئی فتنہ و فساد راہ پا گیا ہو، تو اس صورت میں اگر کوئی تیسرا شخص یہ چاہے کہ ان دونوں کی باہمی مخاصمت ختم ہو جائے اور ان کے درمیان صلح و صفائی ہو جائے اور اس مقصد کے لئے وہ دونوں میں سے ہر ایک کے پاس جا کر یوں کہے کہ اس دوسرے نے تمہیں سلام کہا ہے وہ تمہاری تعریف کر رہا تھا اور تمہارے بارے میں کہہ رہا تھا کہ میں اس کو اپنا دوست سمجھتا ہوں اور حقیقت میں نہ تو اس نے سلام کہا ہو نہ اس کی تعریف کی ہو اور نہ یہ کہا کہ میں اس کو دوست رکھتا ہوں۔

جھوٹی اور مبالغہ آمیز تعریف کرنے والے کی مذمت

(۱۵) وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْأَسْوَدِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا رَأَيْتُمُ الْمَدَّاحِيْنَ فَاحْثُوْا فِيْ وُجُوْهِهِمُ التُّرَابَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مقداد ابن اسود کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ میں خاک ڈال دو۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے منہ پر تمہاری تعریف کرے اور وہ تعریف خواہ زبانی ہو یا قصیدہ و نثر کی صورت میں ہو نیز اس تعریف کرنے سے اس کا مقصد تم سے کچھ مالی منفعت حاصل کرنا یا اپنا کوئی مطلب نکالنا ہو تو تم اس کے منہ پر مٹی ڈال دو یعنی اس کو محروم رکھو کہ نہ اس کو کچھ دو اور نہ اس کا مطلب پورا کر دو یا "منہ میں خاک ڈالنے" سے یہ مراد ہے کہ اس کو کچھ معمولی طور پر دے دو کہ کسی کو بہت تھوڑا سا اور حقارت کے ساتھ دینا اس کے منہ میں خاک ڈالنے کے مشابہ ہے اور یہ معمولی طور پر دینا بھی اس مصلحت کے پیش نظر ہو کہ مبادا کچھ بھی نہ ملنے کی صورت میں وہ ہجو کرنے لگے۔

بعض علماء نے اس ارشاد گرامی کو اس کے ظاہری مفہوم پر محمول کیا ہے چنانچہ اس حدیث کے راوی حضرت مقداد ہی کے بارے میں منقول ہے کہ ایک شخص امیر المؤمنین حضرت عثمان کے سامنے ان کی تعریف کرنے لگا تو انہوں نے ایک مٹھی خاک لے کر اس کے منہ پر ڈال دی علماء نے لکھا ہے کہ تعریف کرنے والوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے کا حکم دینا در اصل ان تعریف کرنے والوں کو سختی کے ساتھ متنبہ کرنا ہے کیوں کہ کسی کے منہ پر اس کی تعریف کرنے والا اپنے ممدوح کو مغرور متکبر بنا دیتا ہے۔

خطابی نے یہ لکھا کہ مداحین یعنی تعریف کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خوشامد و چاپلوسی اور بیجا تعریف و مدح کرنے کو

اپنی عادت بنالی ہو، چنانچہ ایسے لوگ تعریف ومدح کرنے میں نہ حق وباطل کی تمیز کرتے ہیں اور نہ مستحق وغیر مستحق کا لحاظ رکھتے ہیں نیز انہوں نے اس چیز کو حصول منفعت اور معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے کہ جس شخص سے انہیں کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے یا جس شخص سے مطلب براری کی امید ہوتی ہے وہ اس کے منہ پر نہایت مبالغہ آمیزی کے ساتھ اس کی تعریف ومدح کرتے ہیں لہٰذا جو شخص کسی دنیاوی غرض ولالچ کے بغیر کسی قابل تعریف آدمی کی واقعی مدح وتوصیف کرے یا کسی شخص کے کسی اچھے فعل اور پسندیدہ کام پر اس نقطہ نظر سے تعریف کریں کہ اس شخص کو مزید اچھے افعال اور بھلائی کے کام کرنے کا شوق پیدا ہو نیز دوسرے لوگوں کو بھی اس کی اتباع میں نیک اعمال اور بھلائی کے کام کرنے کی رغبت ہو تو ایسے شخص پر حدیث میں مذکورہ لفظ "مداح" کا اطلاق نہیں ہوگا یعنی اس کو قابل مذمت تعریف کرنے والا نہیں کہا جائے گا۔

⑯ وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ اَثْنٰی رَجُلٌ عَلٰی رَجُلٍ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ وَیْلَکَ قَطَعْتَ عُنُقَ اَخِیْکَ ثَلَاثًا مَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَادِحًا لَا مُحَالَۃَ فَلْیَقُلْ اَحْسَبُ فُلَانًا وَاللّٰہُ حَسِیْبُہٗ اِنْ کَانَ یُرٰی اَنَّہٗ کَذٰلِکَ وَلَا یُزَکّٰی عَلَی اللّٰہِ اَحَدًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک شخص نے ایک آدمی کی (مبالغہ آمیزی کے ساتھ) تعریف کرنی شروع کی (اور وہ شخص بھی کہ جس کی وہ تعریف کر رہا تھا وہاں موجود تھا) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تعریف کرنے والے سے فرمایا کہ افسوس ہے تم پر تم نے تو اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی آپ نے یہ الفاظ تین بار دہرائے اور پھر یہ فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی کی تعریف کرنا ضروری سمجھے تو اس کو چاہئے کہ مثلاً یوں کہے کہ فلاں شخص کے بارے یہ گمان رکھتا ہوں کہ وہ ایک نیک آدمی ہے جب کہ اس شخص کی حقیقی حالت سے اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے اور وہی ان کے اعمال کا حساب لینے والا ہے نیز اگر تعریف کرنے والا یہ گمان رکھتا ہے کہ اس نے جس شخص کی تعریف کی ہے وہ واقعۃً ایسا ہی ہے تو اس صورت میں بھی وہ خدا کی طرف سے کسی شخص پر جزم ویقین کے ساتھ حکم نہ لگائے۔"

(بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: کسی کی گردن کاٹنا، اگرچہ اس کو ذبح کرنے اور اس کی جسمانی ہلاکت کے ہم معنی ہے لیکن یہاں "گردن کاٹنے" سے مراد روحانی ہلاکت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی کی تعریف کرتا ہے تو وہ (ممدوح اپنی تعریف سنکر غرور وتکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے لہٰذا جس طرح کسی کی گردن کاٹ ڈالنا اس کو دنیاوی طور پر ہلاک کر دینے کے مرادف اسی طرح منہ پر کسی کی تعریف کرنا گویا اس کو دینی اور اخروی طور پر ہلاکت میں ڈال دینا ہے جب کہ یہ تعریف بسا اوقات دنیاوی طور پر بھی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے جیسے کوئی شخص اپنی تعریف بن کر اتنا زیادہ مغرور ہو جائے کہ کسی کا ناحق خون کر ڈالے اور پھر عدالت کی طرف سے سزائے موت کا مستوجب ہو کر خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

"اگر تم میں کوئی شخص کسی کی تعریف کرنا ضروری سمجھے"۔ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی شخص کے اندر کوئی ایسا وصف دیکھو کہ جس کی وجہ سے وہ قابل تعریف ہو، مثلاً کوئی شخص بہت زیادہ نیک وصالح ہو یا کوئی شخص بہت زیادہ خلیق ہو اور تم اس کی تعریف کرنا ہی چاہتے ہو تو اس صورت میں بھی یہ ضروری ہے کہ تم بس اپنے گمان کی حد تک اس کی تعریف کرو اس کے بارے میں جزم ویقین کے ساتھ فیصلہ نہ کرو بلکہ یوں کہو کہ میں فلاں شخص کو ایسا سمجھتا ہوں یا فلاں شخص کے بارے میں میرا یہ گمان ہے اس جملہ کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی شخص کا حقیقی حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جس شخص کو بظاہر نیک واچھا سمجھا جا رہا ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے باطنی احوال اس درجہ کے نہ ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہو، لہٰذا جو شخص قابل تعریف ہو اس کی تعریف میں احتیاط کی راہ اختیار کرنی چاہئے اس کے بارے بالکل آخری فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ کہ یہ شخص یقیناً اچھا و نیک اور خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے ہاں ان لوگوں کا معاملہ دوسرا ہے جن کو احادیث میں صراحت کے ساتھ قابل تعریف قرار دیا گیا ہے اور جن کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ خدا کے نزدیک یقیناً پسندیدہ ہیں جیسے عشرہ

مبشرہ وغیرہ ان لوگوں کے علاوہ اور کسی شخص کے بارے میں اس جزم و یقین کا اظہار نہ کیا جائے کہ فلاں شخص خدا کے نزدیک اچھا ہے۔

تعریف کی قسمیں

علماء نے کسی شخص کی تعریف کرنے کی تین قسمیں بیان کی ہیں ایک تو یہ کہ کسی کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے یہ قسم وہ ہے جس کی ممانعت منقول ہے دوسرے یہ کہ کسی کی غائبانہ تعریف کی جائے لیکن خواہش یہ ہو کہ اس کو اس تعریف کی خبر ہو جائے یہ قسم بھی ایسی ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور تیسرے یہ کہ کسی کی غائبانہ تعریف کی جائے اور اس کی مطلق پرواہ ہو کہ اس کو تعریف کی خبر پہنچے گی یا نہیں، نیز تعریف بھی ایسی کی جائے جس کا وہ واقعۃً مستحق ہے یہ قسم ایسی ہے جس کی اجازت دی گئی ہے اور کسی شخص کی اس طرح کی تعریف میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

غیبت کے معنی اور اس کی تفصیل

⑰ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ قِيْلَ اَفَرَاَيْتَ اِنْ كَانَ فِیْ اَخِیْ مَا اَقُوْلُ قَالَ اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَايَةٍ اِذَا قُلْتَ لِاَخِيْكَ مَا فِيْهِ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِذَا قُلْتَ مَا لَيْسَ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا۔ کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) زیادہ جانتے ہیں۔ آنحضرت نے فرمایا۔ غیبت یہ ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی کا ذکر اس طرح کرو کہ جس کو وہ (اگر سنے تو) ناپسند کرے۔ بعض صحابہؓ نے (یہ سن) کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! یہ بتائیے کہ اگر میرے اس بھائی میں کہ (جس کا میں نے برائی کے ساتھ ذکر کیا ہے) وہ عیب ہو جو میں نے بیان کیا ہے تو کیا جب بھی غیبت ہوگی یعنی میں نے ایک شخص کے بارے میں اس کے پیٹھ پیچھے یہ ذکر کیا کہ اس میں فلاں برائی ہے جب کہ اس میں واقعۃً وہ برائی ہے اور میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل سچ ہے اور ظاہر ہے کہ اگر وہ شخص اپنے بارے میں میرے اس طرح ذکر کرنے کو سنے تو یقیناً ناخوش ہوگا تو کیا میرا اس کی طرف کسی برائی کو منسوب کرنا جو درحقیقت اس میں ہے، غیبت کہلائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم نے اس کی جس برائی کا ذکر کیا ہے اگر وہ واقعی اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ برائی موجود نہیں ہے جس کو تم نے ذکر کیا ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا یعنی یہی تو غیبت ہے کہ تم کسی کا کوئی عیب اس کے پیٹھ پیچھے بالکل سچ بیان کرو اور اگر تم اس کے عیب کو بیان کرنے میں سچے نہیں ہو کہ تم نے اس کی طرف جس عیب کی نسبت کی ہے وہ اس میں موجود نہیں ہے تو یہ افتراء اور بہتان ہے جو بذات خود ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ (مسلمؒ) اور مسلمؒ ہی کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم اپنے کسی (مسلمان) بھائی کی وہ برائی بیان کی جو واقعی اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر تم نے اس کی طرف ایسی برائی کی نسبت کی جو اس میں موجود نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا!"

تشریح: غیبت یعنی پیٹھ پیچھے کسی کا کوئی عیب بیان کرنا نہ صرف ایک گناہ لوگوں میں زیادہ پھیلا ہوا ہے، ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو اس برائی سے بچے ہوئے ہیں ورنہ عام طور پر ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں غیبت کرتا نظر آتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس بات میں کچھ تفصیل بیان کر دی جائے۔

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے، غیبت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی ایسے شخص کے بارے میں جو موجود نہ ہو اس طرح کا ذکر کرے جس سے اس کا کوئی عیب ظاہر ہو اور وہ اس عیب کے ذکر کئے جانے کو ناپسند کرے اور اس عیب کا تعلق خواہ اس کے بدن سے ہو یا عقل سے خواہ اس کے دین سے ہو یا دنیا سے، خواہ اس کے اخلاق و افعال سے ہو یا نفس سے خواہ اس کے مال و اسباب سے، ہو یا اولاد سے خواہ اس کے ماں باپ سے، ہو یا بیوی خادم وغیرہ سے خواہ اس کے لباس وغیرہ سے ہو یا رفتار و گفتار سے، خواہ اس کی ہیئت کذائی سے یا

نشست و برخاست سے، خواہ اس کے حرکات و سکنات سے ہو یا عادات و اطوار سے، خواہ اس کی کشادہ روئی سے ہو یا ترش روئی سے اور خواہ اس کی تند خوئی و سخت گوئی سے ہو یا نرم خوئی اور خاموشی سے اور یا ان چیزوں کے علاوہ کسی بھی ایسی چیز سے ہو جو اس سے متعلق ہو سکتی ہے نیز اس عیب کے ساتھ اس کا ذکر کرنا خواہ الفاظ کے ذریعہ ہو یا اشارہ و کنایہ اور رمز کے ذریعہ اور اشارہ و کنایہ بھی خواہ لفظ و بیان کے ذریعہ ہو یا ہاتھ، آنکھ، ابرو اور سر وغیرہ کے ذریعہ۔

اس سلسلہ میں یہ قاعدہ کلیہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ اگر کسی شخص کا کوئی عیب اس کی عدم موجودگی میں بیان کیا جائے جو دوسروں کی نظروں میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی حیثیت و شخصیت کو گھٹاتا ہے تو یہ سخت غیبت ہے اور حرام ہے اور اگر کسی کے منہ پر اس کے کسی عیب کو اس طرح بیان کیا جائے جس سے اس کو ناگواری اور دل شکنی ہو تو یہ ایک طرح کی بے حیائی، سنگدلی اور ایذاء رسانی ہے کہ یہ اور بھی سخت گناہ ہے۔

غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس شخص کی غیبت کی گئی ہے غیبت کرنے والا اس سے معافی طلب کرے بشرطیکہ اس غیبت کی خبر اس تک پہنچی ہو اور اس سے معافی کی طلب کے وقت تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اجمالی طور پر اتنا کہنا کافی ہے کہ میں نے تمہاری غیبت کی ہے مجھے معاف کر دو اور اگر وہ غیبت اس تک نہ پہنچی ہو بایں طور کہ وہ مرگیا ہو یا کسی دور دراز جگہ پر ہو تو اس صورت میں استغفار کافی ہے یعنی اپنے اس گناہ پر خدا سے مغفرت و بخشش طلب کرے نیز احادیث میں یہ بھی منقول ہے کہ جس شخص کی غیبت کی گئی ہے اس کے حق میں استغفار کرنا غیبت کے کفارہ میں داخل ہے۔

غیبت کس صورت میں جائز ہے: علماء نے لکھا ہے کہ کسی کا عیب اس کے پیٹھ پیچھے بیان کرنا بعض صورتوں میں جائز ہے مثلاً کوئی شرعی صورت لاحق ہو، جیسے ظالم کا ظلم بیان کرنا، حدیث کے راویوں کا حال ظاہر کرنا، نکاح کے مشورہ کے وقت کسی کا نسب یا حال رویہ بیان کرنا، یا کوئی مسلمان کسی سے امانت و شرکت وغیرہ کا کوئی معاملہ کرنا چاہتا ہے تو اس مسلمان کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے اس شخص کا رویہ بیان کر دینا وغیرہ وغیرہ اسی طرح کوئی شخص ظاہری طور پر دیندارانہ زندگی کا حامل ہے یعنی نماز بھی پڑھتا ہے اور روزہ بھی رکھتا ہے۔ اور دیگر فرائض بھی پورے کرتا ہے مگر اس میں یہ عیب ہے کہ لوگوں کو اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے تکلیف و نقصان پہنچاتا ہے۔ تو لوگوں کے سامنے اس کے اس عیب کا ذکر کرنا غیبت نہیں کہلائے گا اور اگر اس شخص کے بارے میں ذمہ داران حکومت کو اطلاع دیدی جائے تاکہ وہ اس کو متنبہ کریں اور اس کی ایذاء رسانی سے لوگ محفوظ رہیں تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں! علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ بطریق اصلاح و اہتمام کسی شخص کے عیب کو ذکر کرنا کوئی مضائقہ نہیں رکھتا، ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ اس کے عیب کو ذکر کرنے کا مقصد اس شخص کی برائی بیان کرنا اور اس کو نقصان و تکلیف پہنچانا ہو اسی طرح کسی شخص کی کسی شہر والوں یا کسی بستی کے لوگوں کی غیبت نہیں کہیں گے جب تک کہ وہ متعین طور پر کسی جماعت کا نام لیکر اس کی غیب نہ کرے۔

فحش گو بدترین شخص ہے

(۱۸) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَجُلاً اِسْتَاْذَنَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ائْذَنُوْا لَهُ فَبِئْسَ اَخُو الْعَشِيْرَةِ فَلَمَّا جَلَسَ تَطَلَّقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ وَجْهِهٖ وَانْبَسَطَ اِلَيْهِ فَلَمَّا انْطَلَقَ الرَّجُلُ قَالَتْ عَائِشَةُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْتَ لَهُ كَذَا وَكَذَا ثُمَّ تَطَلَّقْتَ فِيْ وَجْهِهٖ وَانْبَسَطْتَ اِلَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَتٰى عَاهَدْتِنِيْ فَحَّاشًا اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنْ تَرَكَهُ النَّاسُ اِتِّقَاءَ شَرِّهٖ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِتِّقَاءَ فُحْشِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو آنے دو۔ وہ اپنی قوم کا برا آدمی ہے پھر وہ شخص جب آکر بیٹھا تو آپ ﷺ نے اس سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کی

اور مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرتے رہے جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ (ﷺ) نے تو اس شخص کے بارے میں ایسا ایسا کہا تھا (یعنی یہ فرمایا تھا کہ وہ شخص اپنی قوم کا برا آدمی ہے) مگر آپ (ﷺ) نے اس سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات فرمائی اور مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرتے رہے آپ ﷺ نے فرمایا تم نے مجھ کو فحش گو (لچر باتیں کرنے والا) کب پایا۔ (یاد رکھو) قیامت کے دن خدا کے نزدیک درجہ کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے بدتر شخص وہ ہوگا جس کو لوگ اس کی برائی کے ڈر سے چھوڑ دیں اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جس کی فحش گوئی سے (ڈر کر لوگ اس سے اجتناب کریں)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث میں جس شخص کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اس کا نام عیینہ ابن حصین تھا، یہ شخص اپنی سنگدلی بدخلقی اور سخت مزاجی کے اعتبار سے بہت ہی مشہور تھا اور اپنی قوم کا سردار بھی تھا اس کا شمار مولفۃ القلوب میں ہوتا تھا تاکہ اس کو اسلام پر قائم و ثابت قدم رکھا جاسکے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں اس کے دین و بیان میں نقصان واضمحلال کا اظہار ہونے لگا تھا مگر آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد دین و ایمان سے پوری طرح منحرف ہو کر مرتد ہوگیا اور حضرت ابوبکرؓ نے اس کو گرفتار کرلیا پھر اس نے دوبارہ ایمان قبول کیا اور اسلام کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا بہر حال حضرت عائشہؓ نے اسی شخص کے بارے میں ذکر کیا کہ اس نے اپنے ابتدائی زمانہ اسلام میں جب ایک دن ہمارے دروازے پر پہنچ کر بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضری کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اس کو آنے کی اجازت دیدی اور حاضرین مجلس سے فرمایا کہ یہ شخص اپنی قوم کا ایک برا شخص ہے اس نے اسی موقع پر آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنے اسلام کا اظہار کیا اگرچہ اس کا اسلام کامل اور اس کا ایمان راسخ نہیں تھا۔ اس سے واضح ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ علامات نبوت میں سے ایک علامت اور آپ کا ایک معجزہ تھا کہ آپ ﷺ نے مذکورہ ارشاد کے ذریعہ اس کے بارے میں آئندہ پیش آنے والے واقعات اور اس کے باطن کے حقیقی احوال سے لوگوں کو پہلے ہی مطلع کردیا اور آخر کار اس کی برائی و بدی بصورت ارتداد وغیرہ آشکارا ہوئی اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ آپ ﷺ نے اس کے حق میں مذمت کے جو الفاظ فرمائے یا یوں کہیے کہ اس کے جس عیب کو ظاہر فرمایا اس کا مقصد اس کے احوال کو منکشف کرنا تھا تاکہ لوگ اس کو جان لیں اور اس کی حقیقت حال سے باخبر رہ کر اس کے فریب اور اس کی وجہ سے کسی فتنہ و فساد میں مبتلا نہ ہو سکیں۔ لہٰذا اس کو غیبت نہیں کہا جائے گا۔

امام نوویؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے آنحضرت ﷺ سے کشادہ روئی اور خندہ پیشانی سے ملنا اور مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرنا اس کی تالیف قلب کی خاطر تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص کی مدارت کرنا جائز ہے جس کی فحش گوئی بدخلقی اور اس کے ضرر کا خوف ہو نیز اس سے یہ بھی ہوا کہ کسی فاسق کے عیب کو ظاہر کرنا یعنی اس کی غیبت کرنا جائز ہے اس موقع پر مدارات اور مداہنت کے درمیان فرق کو بھی سمجھ لینا چاہئے مدارات تو اس کو کہتے ہیں کہ کسی شخص کی دنیا یا دین اور یا دونوں کی اصلاح کے لئے اس پر دنیا کی چیز کو خرچ کیا جائے اور یہ مباح ہے بلکہ بسا اوقات اس کی حیثیت ایک اچھی چیز کی ہو جاتی ہے اس کے برخلاف مداہنت اس کو کہتے ہیں کہ کسی کی اصلاح و مدد کے لئے اس پر دین قربان کیا جائے، مداراب مدارات اور مداہنت کے درمیان اس فرق کو یاد رکھنا چاہئے کیوں کہ اکثر لوگ اس سے غافل ہیں اور اس فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

"تم نے مجھ کو فحش کب پایا" آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد دراصل حضرت عائشہؓ کے خیال کو صحیح کرنے کے لیے تھا جنہوں نے اپنے قول کے ذریعہ گویا اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ آپ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں مختلف رویہ اختیار فرمایا جب وہ آپ ﷺ کے سامنے نہیں تھا تو آپ ﷺ نے اس کی مذمت فرمائی اور جب وہ آپ کے سامنے آیا تو اس کے ساتھ ملاطفت و یگانگت کا برتاؤ کیا جب آپ ﷺ نے اس کی عدم موجودگی میں اس کو برا کہا تو اس کی موجودگی میں بھی اس کو برا کہتے اور اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے جو کسی برے آدمی کے ساتھ کیا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ کی بات کے جواب پر واضح فرمایا اگر میں اس کے سامنے بھی وہی بات کہتا جو اس کی عدم موجودگی میں کہی تھی اور ایک نازیبا اور لچر بات ہوتی جب کہ تم نے مجھے کبھی بھی لچر باتیں کرتے ہوئے نہیں

دیکھا ہو گا۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے جو ارشاد فرمایا اس کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ واضح فرمایا کہ میں نے اس شخص کے منہ پر اس کو اس لئے برا نہیں کہا کہ میں سخت گو قرار نہ پاسکوں اور میرا شمار ان لوگوں میں نہ ہونے لگے جن کی سخت اور کڑوی باتوں کی وجہ سے لوگ ان سے ملنا جلنا چھوڑ دینے کو کہتے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے الفاظ کے ذریعہ گویا ظاہر فرمایا کہ وہ شخص چونکہ بہت شریر اور بد باطن تھا لہٰذا میں نے اس کی بد باطنی کی وجہ سے اس سے اجتناب کیا اور اس کے منہ پر اس کو برا نہیں کہا اور حقیقت میں برا شخص وہی ہے جس کی برائی سے بچنے کے لئے لوگ اس سے اجتناب کریں اور اس کے عیوب سے بھی آگاہ نہ کریں۔

اپنے عیب کو ظاہر نہ کرو

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافًا اِلَّا الْمُجَاهِرُوْنَ وَاِنَّ مِنَ الْمَجَانَةِ اَنْ يَّعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ عَمَلًا ثُمَّ يُصْبِحُ وَقَدْ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَيَقُوْلُ يَافُلَانُ عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ كَذَا وَكَذَا وَقَدْ بَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَ اللّٰهِ عَنْهُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِیْ هُرَيْرَةَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فِیْ بَابِ ضِيَافَةِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میری امت پوری عافیت میں ہے علاوہ ان لوگوں کے جو اپنے عیوب اور گناہ کو ظاہر کرتے ہیں یعنی میری امتؐ کے وہ سارے گناہگار جو ایمان کی حالت میں مریں اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب میں مبتلا نہیں ہونگے البتہ وہ لوگ یقیناً سخت ترین عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے جو نہ صرف گناہ کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے گناہ کو دنیا والوں پر ظاہر بھی کرتے پھرتے ہیں، بلاشبہ یہ بات بڑی بے پروائی (بے حسی اور بے شرمی) کی ہے کہ کوئی شخص رات میں کوئی برا کام کرے اور پھر صبح ہونے پر جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس برے کام کو) چھپالیا تھا (یا اس کی بدعملی پر اسی رات میں اس کو عذاب میں مبتلا نہیں کیا یہاں تک کہ وہ دن ہونے تک ٹھیک ٹھاک رہا)۔ تو وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ اے فلاں شخص میں نے آج رات میں ایسا ایسا (یعنی فلاں برا کام) کیا ہے حالانکہ اس کے پروردگار نے تورات میں اس کے گناہ کی پردہ پوشی کی تھی اور اس نے صبح ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے پردہ کو چاک کر دیا۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت من کان یؤمن باللہ باب الضیافۃ میں نقل کی جاچکی ہے۔"

تشریح: حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب میں لفظ "معافًا" کے معنی "سلامت و محفوظ رہنا" لکھے ہیں گویا ان کے نزدیک كُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافًا اِلَّا الْمُجَاهِرُوْنَ کا ترجمہ یوں ہوگا کہ میری امت کے تمام لوگ غیبت سے محفوظ و مامون ہیں یعنی شریعت خداوندی میں کسی مسلمان کی غیبت کرنے کو روا نہیں رکھا گیا ہے علاوہ ان لوگوں کے جو گناہ و معصیت کے کھلم کھلا ارتکاب کرتے ہیں ایک دوسرے شارح حدیث طیبیؒ نے بھی یہی معنی لکھے ہیں لیکن ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ حدیث کا سیاق و سباق اور اس کا حقیقی مفہوم اس معنی پر دلالت نہیں کرتا چنانچہ ان کے نزدیک زیادہ مبنی بر حقیقت کے معنی وہی ہیں جو ترجمہ میں نقل کئے گئے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے حدیث کی وضاحت میں لکھا ہے کہ شریعت نے جس غیبت کو حرام قرار دیا ہے وہ اس شخص کی غیبت ہے جو پوشیدہ طور پر کوئی گناہ کرتا ہے اور اپنے عیب کو چھپاتا ہے لیکن جو لوگ کھلم کھلا اور ڈھٹائی کے ساتھ گناہ کرتے رہتے ہیں اور اپنے عیب کو خود ظاہر کرتے پھرتے ہیں کہ نہ تو خدا سے شرماتے ہیں اور نہ بندوں سے تو ان کی غیبت کرنا درست ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ فاسق معلن یعنی کھلم کھلا فسق و فجور کرنے والے کی غیبت کرنا جائز ہے نیز ظلم کرنے والے حاکم و سلطان اور مبتدع داعی کی اور داد خواہی و اظہار ظلم کے لئے غیبت کرنا بھی درست ہے اسی طرح اصلاح عیوب کی خاطر اور بقصد نصیحت کسی کی برائی کو بیان کرنا کسی کے گواہ و شاہد کے حالات کی چھان بین اور اس کے بارے میں صحیح اطلاعات بہم پہنچانے کی خاطر اس کے عیوب کو بیان کرنا اور اخبار و احادیث کے راویان کی حیثیت و شخصیت کو واضح کرنے کے لئے ان کے عیوب کو ظاہر کرنا غیبت میں داخل نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جھوٹ اور مخاصمت کو ترک کرنے والے اور اخلاق واطوار کو اچھا بنانے والے کا ذکر

(۲۰) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَهُوَ بَاطِلٌ بُنِیَ لَهٗ فِیْ رَبَضِ الْجَنَّةِ وَمَنْ تَرَكَ الْمِرَآءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِیَ لَهٗ فِیْ وَسَطِ الْجَنَّةِ وَمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهٗ بُنِیَ لَهٗ فِیْ اَعْلَاهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ وَكَذَا فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَفِی الْمَصَابِیْحِ قَالَ غَرِیْبٌ۔

"حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص جھوٹ بولنا چھوڑ دے اور وہ جھوٹ ناحق و ناروا ہو تو اس کے لئے جنت کے کنارے پر محل بنایا جاتا ہے اور جو شخص جھگڑے اور بحث و تکرار چھوڑ دے باوجودیکہ وہ حق پر ہو تو اس کے لئے جنت کی بلند جگہ پر محل بنایا جاتا ہے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اسی طرح کی روایت شرح السنۃ اور مصابیح میں منقول ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث میں ان تین طرح کے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کو جنت میں نمایاں مقامات پر رکھا جائے گا ایک طرح کے لوگ وہ ہیں جو جھوٹ بولنا بالکل ترک کر دیتے ہیں اس موقع پر "ناحق" کی قید لگائی گئی ہے یعنی ایسا جھوٹ جو بالکل ناروا اور ناجائز ہوتا ہے اس قید کی وجہ یہ ہے کہ بعض صورتوں میں جھوٹ بولنا جائز ہو جاتا ہے۔ جیسے جنگ کی حالت میں بشرطیکہ اس جھوٹ کی وجہ سے کسی طرح کی عہد شکنی نہ ہوئی ہو، یا لوگوں کے درمیان صلح و صفائی کی خاطر اور کسی مسلمان کا ایسا مال بچانے کے لئے جو ناروا طور پر اپنے مالک کے ہاتھ سے جا رہا ہو اور یا دو بیویاں رکھنے کی صورت میں یعنی اگر کسی شخص کے ہاں دو بیویاں ہوں تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی ہر ایک بیوی کا دل خوش رکھنے کے لئے ہر ایک سے یوں کہے کہ میں تمہیں زیادہ چاہتا ہوں اور بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک ہی بیوی ہونے کی صورت میں بھی اس وقت جھوٹ بولنا جائز ہوتا ہے جب وہ بیوی کا دل خوش کرنے کے لئے اس سے یوں کہے کہ میں تمہیں یہ دوں گا وہ دوں گا یہ بنا دوں گا وہ لا دوں گا۔

دوسری طرح کے وہ لوگ ہیں جو حق پر ہونے کے باوجود تواضع کسر نفسی اور شرافت نفس کی بنا پر مخاصمت و نزاع اور بحث و تکرار سے اپنا دامن بچاتے ہیں لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس مخاصمت و نزاع کا تعلق کسی دنیاوی معاملہ سے ہو اس میں سکوت و اجتناب کرنے سے دین میں کوئی خلل نہ پڑے، ہاں اگر کسی مخاصمت و نزاع کا تعلق کسی دینی معاملہ سے ہو تو اس سے اس وقت تک کنارہ کشی اختیار کرنا مناسب نہیں ہوگا جب تک وہ معاملہ نپٹ نہ جائے اور حق ظاہر نہ ہو جائے! حضرت امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی دینی معاملہ میں کوئی بحث و مناظرہ اس مقصد کے علاوہ اور کسی وجہ سے نہیں کیا کہ میں چاہتا تھا میں سچائی کو ثابت کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوں اور حق میرے مقابل کے ہاتھ پر ظاہر ہو۔

مذکورہ بالا سلسلے میں حضرت امام حجۃ الاسلامؒ نے لکھا ہے کہ مِرَاء یعنی جھگڑے اور بحث و تکرار کو اختیار کرنے کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کلام اور اس کی بات پر اعتراض وارد کرے، بایں طور کہ یا تو اس کے الفاظ میں خلل و نقصان کو ظاہر کرے یا اس کے مضمون و معنی میں غلطی نکالنے اور یا متکلم کے مقصد و مراد کو نادرست قرار دے۔ اس کے برخلاف ترک مراد یعنی جھگڑے اور بحث و تکرار سے اجتناب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کے کلام و قول پر کوئی اعتراض وارد نہ کرے لہٰذا انسان کو چاہئے کہ جب وہ کوئی کلام و بات سنے تو اگر وہ حق ہو تو اس کی تصدیق کرے اور اگر وہ باطل و بے بنیاد اور اس کا تعلق کسی دینی معاملہ سے نہ ہو تو اس سے سکوت اختیار کرلے۔

تیسری طرح کے وہ لوگ ہیں جو اپنے اخلاق اچھا بناتے ہیں! واضح رہے کہ حسن اخلاق یوں تو تمام ہی اچھے اوصاف و کمالات کو اختیار

کرنے کا نام ہے لیکن معاشرہ میں عام طور پر حسن اخلاق کا اطلاق، خندہ پیشانی، کشادہ روئی، نرم گوئی اور حسن معاشرت پر ہوتا ہے۔

جنت اور دوزخ لے جانے والی چیزیں

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَدْرُوْنَ مَا اَكْثَرُ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ تَقْوَى اللّٰهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ اَتَدْرُوْنَ مَا اَكْثَرُ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ الْاَجْوَفَانِ الفَمُ وَالْفَرْجُ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جانتے ہو، لوگوں کو عام طور پر کونسی چیز جنت میں داخل کرتی ہے؟ (یعنی کیا تمہیں معلوم ہے کہ جو چیزیں فائزین کے ساتھ لوگوں کے جنت میں داخل ہونے کا سبب ہیں ان میں سے کونسی چیز سب سے زیادہ سبب بنتی ہے؟) وہ تقویٰ یعنی اللہ سے ڈرنا اور حسن خلق ہے اور جانتے ہو، لوگوں کو عام طور پر کونسی چیز دوزخ میں لے جاتی ہے؟ دو کھوکھلی چیزیں ہیں یعنی منہ اور شرمگاہ۔" (ترمذیؒ ابن ماجہ)

تشریح: تقویٰ کا سب سے ادنی درجہ یہ ہے کہ شرک سے اجتناب کیا جائے اور سب سے اعلی درجہ یہ ہے کہ دل میں اللہ کے علاوہ اور کسی بات کا خیال بھی نہ آنے دیا جائے۔

"حسن خلق" سے مراد مخلوق خدا کے ساتھ خوش خلقی اختیار کرنا ہے جس کا سب سے ادنی درجہ یہ ہے کہ کسی مخلوق کو کوئی تکلیف وایذاء نہ پہنچائی جائے اور سب سے اعلی درجہ یہ ہے کہ انسان اس شخص کے ساتھ بھی بھلائی کرے جس نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ اس اعتبار سے حدیث کے پہلے جزء کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص میں تقویٰ اور حسن خلق یہ دونوں اوصاف پیدا ہو جائیں تو سمجھو کہ اس کی نجات کا دروازہ کھل گیا کیوں کہ تقویٰ یعنی پرہیزگاری سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور خوش خلقی سے مخلوق خدا کی خوشی ملتی ہے اور ظاہر ہے کہ جس انسان سے خدا بھی خوش ہو اور مخلوق خدا بھی تو اس کا بیڑا پار ہونے میں کیا شبہ رہ جائے گا۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لکھا ہے کہ خوش خلقی بھی تقویٰ میں داخل ہے لہٰذا حدیث میں تقویٰ کے بعد پھر خوش خلقی کا ذکر کرنا تخصیص بعد تعمیم کے طور پر ہے مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقویٰ سے تو ظاہری اعمال کا حسن مراد ہے اور حسن خلق سے باطنی احوال کا حسن۔

طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ "تقویٰ" کے ذریعہ تو اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ خالق (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ حسن معاملہ کرے بایں طور کہ ہر اس چیز سے اجتناب کرے جس سے اس نے منع کیا ہے اور ہر اس چیز پر عمل کرے جس کا حکم دیا ہے اور حسن خلق کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ حسن معاملہ کرے یعنی خوش خلقی اختیار کرے۔

حدیث کے دوسرے جز میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ منہ اور شرمگاہ گناہ کے دو بڑے سرچشمے ہیں جن سے پیدا ہونے والی برائیوں میں پڑ کر انسان دوزخ میں جا گرتا ہے چنانچہ منہ کہ اس میں زبان بھی داخل ہے گمراہی اور بدعملیوں کا بڑا ذریعہ ہے انسان جو بھی حرام چیز کھاتا اور پیتا ہے اسی منہ کے ذریعہ نگلتا اور وہ جو بھی ممنوع و ناجائز بے ہودہ و فحش اور لاطائل کلام و گفتگو کرتا ہے زبان ہی اس کا ذریعہ بنتی ہے اسی طرح شرمگاہ، خواہ عورت کی ہو یا مرد کی شیطان کا سب سے دل فریب جال ہے جس میں وہ لوگوں کو پھنسا کر دوزخ میں گرا دیتا ہے چنانچہ انسان اسی شرمگاہ کے سبب جنسی جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور نفسانی شہوت میں مبتلا ہو کر اپنے خالق کی نافرمانی کرتا ہے۔

کلمہ خیر اور کلمہ شر کی اہمیت

(۲۲) وَعَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الْخَيْرِ مَا يَعْلَمُ مَبْلَغَهَا يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهٗ بِهَا رِضْوَانَهٗ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الشَّرِّ مَا يَعْلَمُ مَبْلَغَهَا يَكْتُبُ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْهِ سَخَطَهٗ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ۔ رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوٰى مَالِكٌ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ نَحْوَهٗ۔

"اور حضرت بلال ابن حارث کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ انسان کوئی کلمہ خیر (بھلائی کی کوئی بات) اپنی زبان سے نکالتا ہے درآنحالیکہ وہ اس کی قدر و منزلت سے آگاہ نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اسی کلمہ خیر کے سبب سے اس کے حق میں اس دن تک کے لئے اپنی خوشنودی کو ثابت کر دیتا ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے، اسی طرح کوئی انسان کلمہ شر (یعنی کوئی بری بات) اپنی زبان سے نکالتا ہے درآنحالیکہ وہ اس کی اہمیت سے واقف نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ اس کلمہ شر کے سبب سے اس کے حق میں اس دن تک کے لئے اپنی خفگی ثابت کر دیتا ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے۔ (شرح السنۃ) اور امام مالکؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: "اپنی خوشنودی کو ثابت کر دیتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایسی باتوں کی توفیق دیتا ہے جو رضاء الٰہی کا موجب ہیں اس کو برزخ میں قبر کے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے اس کی قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس طرح سو رہو جیسے نوشہ سوتا ہے پھر وہ قیامت کے دن نیک بختی و سعادت کے ساتھ اٹھے گا کہ اس پر حق تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہوگا جنت میں داخل کیا جائے گا اور وہاں کی نعمتیں اس کا نصیب بنیں گی! اسی طرح جس شخص کے حق میں اللہ تعالیٰ اپنی خفگی قائم کر دے گا اس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔ لہٰذا حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اس دن تک کے لئے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے تو اس توقیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا یا اس کی خفگی بس اسی دن تک محدود رہے گی۔ اس کے بعد منقطع ہو جائے گی! اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے حق میں نازل فرمائی ہے کہ وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ظاہر ہے آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابلیس لعین، اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مورد صرف قیامت کے دن تک ہی ہے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ تک اللہ تعالیٰ کے لعنت میں گرفتار رہے گا اسی طرح حدیث میں مذکورہ لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی یا خفگی کا تعلق موت کے دن کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

سفیان ابن عیینہؒ کہتے ہیں کہ "کلمہ خیر" سے مراد ظالم سلطان و حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔ اس پر قیاس کر کے کہا جا سکتا ہے کہ "کلمہ شر" سے مراد کسی حاکم و سلطان کے سامنے کلمہ باطل یعنی بری بات کہنا ہے جو دین کو نقصان پہنچائے لیکن حدیث کا ظاہری مفہوم عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔

جھوٹے لطیفوں کے ذریعہ لوگوں کو ہنسانے والے کے بارے میں وعید

(۲۳) وَعَنْ بَهْزِبْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيْلٌ لِّمَنْ يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ وَيْلٌ لَّهٗ وَيْلٌ لَّهٗ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والدارمی)

"بہز ابن حکیمؒ اپنے والد (حکیم ابن معاویہ) سے اور وہ بہز کے دادا (حضرت معاویہ ابن عبدہؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "افسوس اس شخص پر جو بات کرے تو جھوٹ بولے تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ہنسائے، افسوس اس شخص پر افسوس اس شخص پر۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: "ویل" کے معنی ہیں عظیم ہلاکت اور ویل دوزخ کی ایک گہری وادی کا نام بھی ہے جس میں اگر پہاڑ ڈال دے جائیں تو گرمی سے گل جائیں اہل عرب کے کلام میں یہ لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کسی برائی اور ناپسندیدہ امر کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کے تئیں اظہار تاسف اور اس کو متنبہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا اپنے ارشاد کے آخر میں مذکورہ لفظ کو پھر استعمال کرنا اور مکرر استعمال کرنا گویا ایسے شخص کے حق میں زجر و وعید کو زیادہ شدت کے ساتھ بیان کرنا مقصود تھا جو بے بنیاد باتوں اور جھوٹے لطائف و قصص کے ذریعہ لوگوں کو ہنسائے۔

ویل لمن یحدث فیکذب میں لفظ یکذب (جھوٹ بولنے کی قید سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ہم جلیسوں اور یار دوستوں کو خوش کرنے اور ان کو ہنسانے کے لئے ایسی بات کرے یا ایسے لطیفے اور قصے سنائے جو سچے ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اگرچہ یہ ضروری ہے کہ اس کو اپنی عادت نہ بنائے اور نہ لطیفہ گوئی کو بطور پیشہ اختیار کرے کیونکہ خوش طبعی وبذلہ سنجی جو جھوٹ پر مبنی نہ ہو، باوجویکہ مشروع و مسنون ہے لیکن اس کو کبھی کبھار ہی اختیار کیا جائے نہ کہ ہمیشگی کے ساتھ اس طرح ہر وقت لوگوں کو ہنسانے اور مسخرا پن کرنے ہی میں نہ لگا رہے اور نہ اس پر زیادہ توجہ دے کیونکہ اس کا مآل کار نقصان و خسران کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ اگلی حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

مسخرے پن اور زبان کی لغزش سے بچو

۲۴ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَیَقُوْلُ الْكَلِمَةَ لَا یَقُوْلُهَا اِلَّا لِیُضْحِكَ بِهِ النَّاسَ یَهْوِیْ بِهَا اَبْعَدَ مِمَّا بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَیَزِلُّ عَنْ لِسَانِهٖ اَشَدَّ مِمَّا یَزِلُّ عَنْ قَدَمِهٖ۔ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" حقیقت یہ ہے کہ جب بندہ ایک بات کہتا اور صرف اس لئے کہتا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ہنسائے تو وہ اس بات کی وجہ سے (دوزخ میں) جا گرتا ہے اور اتنی دوری سے گرتا ہے جو زمین وآسمان کے درمیانی فاصلہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بندہ اپنے قدموں کے ذریعہ پھسلنے سے زیادہ اپنی زبان کے ذریعہ پھسلتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پاؤں کے پھسلنے سے منہ کے بل گر پڑے اور ضرر اٹھائے تو یہ اتنا سخت نہیں جتنا سخت وہ ضرر ہے جو زبان کے پھسلنے یعنی اس سے جھوٹ وغیرہ کے صادر ہونے کی وجہ سے اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ پاؤں کی لغزش بدن کو ضرر پہنچاتی ہے اور زبان کی لغزش دین وآخرت کے نقصان میں مبتلا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ جسمانی نقصان و ضرر دینی نقصان و ضرر سے ہلکا ہوتا ہے۔

ایک چپ لاکھ بلا ٹالتی ہے

۲۵ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَمَتَ نَجَا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص خاموش رہا اس نے نجات پائی۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، دارمیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ چپ رہ کر اور زبان کو بری باتوں سے محفوظ رکھ کر دنیا کی بھی بہت سی آفتوں سے نجات مل جاتی ہے اور دینی واخروی طور پر بھی بہت سی بلاؤں اور نقصان و خسران سے نجات حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ انسان عام طور پر جن بلاؤں اور آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے ان میں سے اکثر زبان ہی کے ذریعہ سے پہنچتی ہیں۔

کلام کی قسمیں: امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ انسان اپنی زبان سے جو بات نکالتا ہے اور جو کلام کرتا ہے اس کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو محض نقصان، دوسرے محض نفع، تیسرے وہ بات اور کلام جس میں نہ نفع ہوتا ہو اور نہ نقصان ہوتا ہو اور چوتھے وہ بات و کلام جس میں نفع بھی ہو اور نقصان بھی اس سے بھی خاموشی ہی اختیار کرنا چاہئے کیونکہ نقصان سے بچنا فائدہ حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہوتا ہے اور وہ کلام کہ جس میں نہ نفع ہو نہ نقصان تو ظاہر ہے کہ اس میں زبان کو مشغول کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے اور یہ چیز بھی خالص ٹوٹا ہی ہے دوسری

قسم یعنی وہ کلام کہ جس میں نفع ہی نفع ہو تو اگرچہ ایسی بات وکلام میں زبان کو مشغول کرنا برائی کی بات نہیں ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کہ اس میں بھی ابتلائے آفت کا خطرہ ضرور ہوتا ہے بایں طور کہ ایسے کلام میں بسا اوقات ریاء و تصنع، خوشنودی نفس اور فضول باتوں کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ اور اس صورت میں یہ تمیز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں لغزش ہو گئی ہے! حاصل یہ کہ ہر حالت اور ہر صورت میں خاموشی اختیار کرنا بہتر اور نجات کا ذریعہ ہے کیونکہ زبان کی آفتیں ان گنت ہیں اور ان سے بچنا سخت مشکل الا یہ کہ زبان کو بند ہی رکھا جائے کسی نے خوب کہا ہے۔

اللسان جسمہ صغیر و جرمہ کبیر و کثیر۔

"زبان کا جثہ تو چھوٹا ہے، مگر اس کے پاپ بڑے اور بہت ہیں۔"

دنیا و آخرت نجات کے ذریعے

(۲۶) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ لَقِيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ مَا النَّجَاةُ فَقَالَ اَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ وَابْكِ عَلٰى خَطِيْئَتِكَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ (مجھے بتائیے کہ دنیا اور آخرت میں) نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اپنی زبان کو قابو میں رکھو تمہارا گھر تمہاری کفایت کرے اور اپنے گناہوں پر روؤ۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: لفظ "املک" الف کے زبر اور لام کے زیر کے ساتھ ہے لیکن حضرت شیخ عبدالحقؒ نے الف کے زیر کو ترجیح دی ہے اس جملہ کے معنی ایک شارح نے یہ لکھے ہیں کہ اپنی زبان کو ایسی چیزوں اور باتوں سے صاف رکھو جن میں خیر و بھلائی نہیں ہے۔ لیکن اس جملہ کے زیادہ صحیح معنی یہ ہیں کہ اپنی زبان کو بند رکھو کہ گویا تم اپنے تئیں اپنے امور کی نگہداشت رکھتے ہو۔ یعنی اپنے دین کے معاملہ میں محتاط و پرہیزگار ہو اور اپنے حالات (کوائف پر متوجہ ہونا ظاہر ہے کہ جب تم اپنے معاملات میں محتاط پرہیزگار رہو گے اور اپنے احوال و کوائف پر متوجہ رہ کر اپنی برائیوں اور بھلائیوں پر نظر رکھو گے تو راہ نجات تمہارے سامنے ہوگی۔

"تمہارا گھر تمہیں کفایت کرے" کا مطلب یہ ہے کہ بری مجلسوں اور برے لوگوں کی صحبت سے بچنے کی خاطر یکسوئی اختیار کرو اپنے اپنے گھر سے اسی وقت باہر نکلو جب نکلنے کی ضرورت پیش آئے اور اس یکسوئی و گوشہ نشینی کی وجہ سے دل برداشتہ نہ ہو بلکہ اس کو غنیمت جانو کیونکہ یہ چیز بہت سے فتنہ وفساد اور برائیوں سے نجات پانے کا ذریعہ ہے اسی لئے کہا گیا ہے ھذا زمان السکوت و ملازمۃ البیوت والقناعۃ بالقوۃ الی ان تموت طیبیؒ کہتے ہیں کہ ویسعک بیتک میں حکم کا ظاہر مورد تو گھر ہے لیکن حقیقت میں اس حکم کا مورد مخاطب ہے، گویا اس ارشاد کے ذریعہ مخاطب کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے گھر میں یکسوئی اور گوشہ نشینی اختیار کر کے مولی کی عبادت میں مشغول رہو۔

"اپنے گناہوں پر روؤ۔" کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خطاؤں اور اپنی تقصیرات پر نادم و شرمسار ہو کر طلب مغفرت کے لیے خدا کے حضور رو و گڑگڑاؤ اور خشوع و خضوع اختیار کرو اور اگر رونا نہ آئے کم سے کم رونے کی صورت بنالو۔

تمام اعضاء جسم، زبان سے عاجزی کرتے ہیں

(۲۷) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ رَفَعَهٗ قَالَ اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ اٰدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ اتَّقِ اللّٰهَ فِيْنَا فَاِنَّا نَحْنُ بِكَ فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا وَاِنِ اعْوَجَجْتَ اعْوَجَجْنَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ" آنحضرت ﷺ سے بطریق مرفوع نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب ابن آدم صبح کرتا ہے تو سارے اعضاء چشم زبان کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے حق میں اللہ سے ڈر کیوں کہ ہمارا تعلق تجھ ہی سے ہے۔ اگر تو سیدھی رہے گی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہوگی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یوں تو سارے جسمانی نظام کا ظاہری و روحانی دارومدار دل پر ہے کہ اگر دل درست و صالح ہے تو تمام اعضاء جسم بھی درست وصالح رہتے ہیں اور اگر دل فاسد و ناکارہ ہو جائے تو سارے اعضاء بھی فاسد و ناکارہ ہو جاتے ہیں جب کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

ان فی الجسد مضغة ان صلحت صلح الجسد كله و اذا فسدت فسد الجسد كله۔

"جسم میں گوشت کا لوتھڑا ہے (جس کو دل کہا جاتا ہے) اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا۔"

اس حقیقت کے باوجود اس حدیث میں یہ ظاہر کرنا کہ گویا زبان ہی سارے اعضاء جسم کی سردار ہے اس اعتبار سے ہے کہ حقیقت میں "دل" ہی جسم کا بادشاہ ہے مگر دل کا ترجمان اور خلیفہ زبان ہی ہے۔ کہ دل جو کچھ سوچتا ہے زبان اس کو بیان کرتی ہے اور دیگر اعضاء جسم اس پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا جو حکم دل کا ہے وہی زبان کا ہے کہ جس طرح دل کے صالح و فاسد ہونے کا اثر سارے اعضاء جسم پر پڑتا ہے اس طرح زبان کا بناؤ بگاڑ بھی تمام اعضائے جسم کو بناتا اور بگاڑتا ہے۔

حسن اسلام کیا ہے

(۲۸) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَا يَعْنِيْهِ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَاَحْمَدُ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْهُمَا۔

"اور حضرت علیؓ ابن حسینؓ یعنی حضرت امام زین العابدینؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو بے فائدہ ہے۔" مالکؒ، احمدؒ) نیز اس روایت کو ابن ماجہؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے اور ترمذیؒ اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے دونوں یعنی حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت علی ابن الحسینؓ سے نقل کیا ہے)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے اسلام کے حسن و خوبی اور ایمان کے کامل ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ اس چیز سے اجتناب و پرہیز کرے جس کا اہتمام نہیں کیا جاتا جس کے ساتھ کوئی غرض متعلق نہیں ہوتی اور جس کی یہ شان نہیں ہوتی کہ کوئی شخص اس کا اہتمام کرے اور اس کے حصول میں مشغولیت اختیار کرے حاصل یہ کہ وہ چیز کوئی امر ضروری نہ ہو، چنانچہ جس چیز کا امر لایعنی کہا جاتا ہے اس کی تعریف و وضاحت یہی ہے اس کے برخلاف جو چیز امر ضروری کہلاتی ہے۔ اور کوئی شخص جس کا اہتمام کرتا ہے وہ ایسی چیز ہوتی ہے جس کے ساتھ دنیا میں ضروریات زندگی اور آخرت میں سلامتی و نجات وابستہ ہوتی ہے، مثلاً دنیا کی ضروریات زندگی میں سے ایک تو غذا ہے جو بھوک مٹاتی ہے، دوسرے پانی ہے جو پیاس کو رفع کرتا ہے، تیسرے کپڑا ہے جو ستر کو چھپاتا ہے، چوتھے بیوی ہے جو عفت و پاکدامنی پر قائم رکھتی ہے اور اسی طرح کی وہ چیزیں جو زندگی کی دوسری ضروریات کو پورا کریں نہ کہ وہ چیزیں جن سے محض نفس کی لذت حرص و ہوس کی بہرہ مندی اور دنیا کی محبت کا تعلق ہوتا ہے نیز ایسے افعال و اقوال، اور تمام حرکات و سکنات بھی نہیں جو فضول و بے فائدہ ہوں، اسی طرح وہ چیز کہ جس سے آخرت کی سلامتی و نجات متعلق ہوتی ہے ایمان و اسلام اور احسان کہ جس کی وضاحت ابتداء کتاب میں حدیث جبرئیل میں ذکر ہو چکی ہے۔ حاصل یہ کہ جو چیزیں دنیا و آخرت میں ضروری ہیں اور جن پر دینی و دنیوی زندگی کا انحصار و مدار ہوتا ہے اور جو مولیٰ کی رضا و خوشنودی کا سبب و ذریعہ بنتی ہے وہ تو لایعنی نہیں ہیں ان کے علاوہ باقی تمام چیزیں لایعنی ہیں خواہ ان چیزوں کا تعلق عمل سے ہو یا قول سے۔

حضرت امام غزالیؒ نے کہا ہے کہ لایعنی (بے فائدہ بات) کا آخری درجہ یہ ہے کہ تم کوئی ایسی بات اپنی زبان سے نکالو کہ جس کو اپنی زبان سے نہ نکالتے تو گنہ گار نہ ہوتے اور اس کی وجہ سے نہ تو تمہیں فوری طور پر کوئی نقصان پہنچتا اور نہ مآل کے اعتبار سے اس کی مثال یہ ہے کہ فرض کرو۔ تم کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہو، اب تم نے ان کے سامنے اپنے کسی سفر کے احوال بیان کئے اس بیان احوال کے دوران تم نے ہر اس چیز کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جو تم نے اپنے سفر کے دوران دیکھی تھی مثلاً پہاڑ عمارت وغیرہ یا جو کچھ واقعات و حادثات پیش آئے تھے ان کے بارے میں بتایا، پھر تم نے ان اچھے کھانوں، عمدہ لباس و پوشاک اور دوسری چیزوں کا بھی ذکر کیا جو تمہیں ملی تھیں یا جن کو تم نے دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ تم نے جو یہ ساری تفصیل بیان کی اور جن امور کا ذکر کیا وہ یقیناً ایسی چیزیں ہیں کہ اگر تم ان کو بیان نہ کرتے تو نہ گنہگار ہوتے اور نہ تمہیں کوئی نقصان و ضرر برداشت کرنا پڑتا جب کہ اس لمبی چوڑی تفصیل بیان کرنے کی صورت میں بہت ممکن ہے کہ کسی موقع پر تمہاری زبان نے لغزش کھائی ہو اور اس سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو جس سے تم گنہگار بن گئے ہو۔

کسی کی آخرت کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی حکم نہ لگاؤ

(۲۹) وَعَنْ انَسٍ قَالَ تَوفِّی رَجُلٌ مِنَ الصَّحَابَةِ فَقَالَ رَجُلٌ اَبْشِرْ بِالْجَنَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوَلَا تَدْرِیْ فَلَعَلَّهٗ تَکَلَّمَ فِیْمَا لَا یَعْنِیْهِ اَوْبَخِلَ بِمَا لَا یَنْقُصُهٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) صحابہؓ میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا تو ایک دوسرے شخص نے (مرحوم کی میت کو مخاطب کر کے) کہا کہ (آنحضرت ﷺ کی صحبت کی برکت سے) تمہیں جنت کی بشارت ہو۔ رسول کریم ﷺ نے (یہ بات سن کر اس شخص سے) فرمایا کہ تم یہ بات کس طرح کہہ رہے ہو جب کہ حقیقت حال کا تمہیں علم نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے کسی ایسے معاملہ میں اپنی زبان سے الفاظ نکالے ہوں جو اس کے لئے ضرر رساں نہ ہو یا کسی ایسی چیز میں بخل کیا ہو جس میں کمی نہ آئے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "کسی ایسے معاملہ میں اپنی زبان سے الفاظ نکالے ہوں۔" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بے فائدہ باتوں میں اپنا وقت ضائع کیا ہو اور ایسے امور میں خواہ مخواہ کے لئے اپنی زبان سے الفاظ نکالے ہوں جو اس کے لئے کسی طرح کا ضرر و نقصان پہنچانے کا سبب نہ ہوں۔

"کسی ایسی چیز میں بخل کیا ہو۔" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی ایسی چیز کو دینے میں بخل سے کام لیا ہو جو دیئے جانے کے باوجود کم نہیں ہوتی جیسے علم کی تعلیم یا مال زکوٰۃ کی ادائیگی کہ علم کو تقسیم کرنے یا زکوٰۃ ادا کرنے سے علم اور مال میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ ان میں زیادتی ہی ہوتی ہے۔

آنحضرت کے ارشاد کا ماحصل یہ تھا کہ تم نے اس شخص کے جنت میں جانے کے بارے میں اس طرح کا جزم و یقین کیوں ظاہر کیا ہے؟ جب کہ تمہیں اس کی زندگی کے سارے ظاہری باطنی گوشوں سے واقفیت اور اس کے احوال کی حقیقت کا علم نہیں ہے، بیشک اس شخص کی ظاہری زندگی بڑی پاکیزہ تھی اور اس کو صحابیت کی سعادت بھی حاصل ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی زبان سے کوئی لایعنی بات نکالی ہو یا بخل کیا ہو اور اس مواخذہ و حساب میں گرفتار ہو کر جنت میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہو۔

زبان کے فتنہ سے بچو

(۳۰) وَعَنْ سُفْیَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِیِّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا أَخْوَفُ مَا تَخَافُ عَلَیَّ قَالَ فَاَخَذَ بِلِسَانِ نَفْسِهٖ وَقَالَ هٰذَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَصَحَّحَهٗ۔

"اور حضرت سفیان ابن عبد اللہ ثقفیؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ میرے بارے میں جن چیزوں سے ڈرتے ہیں ان میں سب سے زیادہ خوفناک چیز کونسی ہے؟ حضرت سفیانؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) اپنی زبان

مبارک کو پکڑا اور فرمایا کہ یہ چیز یعنی تمہارے بارے میں مجھے سب سے زیادہ ڈر اس زبان سے لگتا ہے کہ گناہ کی اکثر باتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں، لہٰذا تم اس زبان کے فتنہ سے بچو۔" "ترمذیؒ" نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔"

جھوٹ بولنا حفاظت کرنے والے فرشتوں کو اپنے سے دور کر دیتا ہے

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيْلاً مِنْ نَتْنِ مَاجَآءَ بِهٖ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب کوئی بندہ جھوٹ بولتا ہے تو اس کی پیدا کی ہوئی چیز یعنی جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے (حفاظت کرنے والے) فرشتے اس سے کوس بھر دور چلے جاتے ہیں۔" (ترمذیؒ)

کسی کو اپنے جھوٹ کے دھوکے میں مبتلا کرنا بہت بڑی خیانت ہے

(۳۲) وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ اَسَدٍ نِ الْحَضْرَمِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ كَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاكَ حَدِيْثًا هُوَلَكَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ بِهٖ كَاذِبٌ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت سفیان ابن اسد حضرمیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے (مسلمان) بھائی سے کوئی بات کہو اور وہ تم کو اس بات میں سچا جانے جب کہ حقیقت میں تم نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یوں تو ہر حالت اور ہر موقع پر جھوٹ بولنا بہت برا ہے مگر اس صورت میں تو بہت ہی برا ہے کہ تم اپنے کسی مسلمان بھائی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤ بایں طور کہ وہ تو تمہیں سچ بولنے والا سمجھے مگر تم اس سے جھوٹ بولو۔

دورویہ کے بارے میں وعید

(۳۳) وَعَنْ عَمَّارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ ذَا وَجْهَيْنِ فِي الدُّنْيَا كَانَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لِسَانَانِ مِنْ نَارٍ۔ (رواه الدارمی)

"اور حضرت عمارؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص دنیا میں دورویہ ہو گا قیامت کے دن اس کے (منہ میں) آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔" (دارمیؒ)

تشریح: دورویہ اصل میں منافق صفت آدمی کو کہتے ہیں یعنی وہ شخص جو کسی کے حق مخلص نہ ہو، زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ رکھے جب کسی کے سامنے بات کرے تو اس طرح کرے کہ مخاطب یہ سمجھے کہ یہ میرا بڑا دوست و ہمدرد ہے مگر جب اس کے پیٹھ پیچھے بات کرے تو زبان سے ایسے الفاظ نکالے جو اس کے لئے تکلیف کا باعث ہوں۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ دورویہ اس شخص کو کہتے ہیں جو آپس میں مخاصمت رکھنے والے دو آدمیوں میں سے ہر ایک کی منہ دیکھی بات کرے ایک کے پاس جائے تو اس کی پسند کی باتیں کرے اور وہ یہ سمجھے کہ یہ میرا دوست ہے اسی طرح دوسرے کے پاس جائے تو اس کی سی کہے اور وہ سمجھے کہ یہ میرا دوست ہے غرضیکہ دونوں میں سے ہر ایک کے پاس اس کی محبت ظاہر کرے اور دوسرے کی برائی کرے اسی طرح دونوں ہی اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہیں۔ اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا دوست و ہمدرد اور مددگار ہے اور میرے مخالف کا دشمن و بدخواہ۔

کمال ایمان کے منافی چیزیں

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا

الْبَذِیِّ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَفِیْ اُخْرٰی لَهٗ وَلَا الْفَاحِشِ الْبَذِیِّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ (کامل) مؤمن نہ تو طعن کرنے والا ہوتا ہے نہ لعن کرنے والا نہ فحش گوئی کرنے والا ہوتا ہے، نہ زبان درازی کرنے والا (ترمذیؒ، بیہقیؒ) اور بیہقی کی روایت میں نہ فحش گوئی کرنے والا زبان دراز" کے الفاظ ہیں (یعنی اس روایت میں "بذی" کو "فاحش" کی صفت قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جو حد سے زیادہ فحش گوئی کرنے والا ہو نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

(۳۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ لَعَّانًا وَفِیْ رِوَایَةٍ لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یَکُوْنَ لَعَّانًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص (کامل) مؤمن نہیں ہوسکتا جو بہت زیادہ لعنت کرنے والا اور لعنت کرنے کا عادی ہو۔" ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ۔ "اور کسی مؤمن کے لئے یہ موزوں نہیں ہے کہ وہ بہت زیادہ لعنت کرنے والا ہو۔" (ترمذیؒ)

بددعا کرنے کی ممانعت

(۳۶) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلَاعَنُوْا بِلَعْنَةِ اللّٰهِ وَلَا بِغَضَبِ اللّٰهِ وَلَا بِجَهَنَّمَ وَفِیْ رِوَایَةٍ وَلَا بِالنَّارِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "آپس میں ایک دوسرے کے لیے نہ تو خدا کی لعنت کی بددعا کرو نہ خدا کے غضب کی اور نہ جہنم میں جانے کی بددعا کرو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یوں تو کسی صورت میں بھی کسی مسلمان کو اپنے کسی مسلمان بھائی کے حق میں بددعا نہ کرنی چاہئے کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن خدا کی لعنت وغیرہ جیسی چیزوں کی بددعا کرنا تو سخت برا اور گناہ کی بات ہے چنانچہ کسی کے حق میں اس طرح بددعا نہ کرنی چاہئے کہ تجھ پر خدا کی لعنت ہو یا تجھ پر خدا کا غضب ٹوٹے یا خدا کرے تو جہنم میں جائے اور یا خدا کرے تو دوزخ کی گھاٹی میں جلے وغیرہ وغیرہ۔

جو شخص لعنت کے قابل نہ ہو اس پر لعنت کرنا خود اپنے آپ کو مبتلائے لعنت کرنا ہے

(۳۷) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا لَعَنَ شَیْئًا صَعِدَتِ اللَّعْنَةُ اِلَی السَّمَآءِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُ السَّمَآءِ دُوْنَهَا ثُمَّ یَهْبِطُ اِلَی الْاَرْضِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُهَا دُوْنَهَا ثُمَّ تَاْخُذُ یَمِیْنًا وَّشِمَالًا فَاِذَا لَمْ تَجِدْ مَسَاغًا رَجَعَتْ اِلَی الَّذِیْ لُعِنَ فَاِنْ کَانَ لِذٰلِكَ اَهْلًا وَاِلَّا رَجَعَتْ اِلٰی قَآئِلِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ "جب کوئی بندہ کسی چیز یعنی کسی انسان یا غیر انسان پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان کی طرف جاتی ہے اور آسمان کے دروازے اس لعنت پر بند کر دئے جاتے ہیں پھر وہ لعنت دائیں بائیں طرف جانا چاہتی ہے (مگر ادھر سے بھی دھتکار دی جاتی ہے) چنانچہ جب وہ کسی طرف بھی راستہ نہیں پاتی تو اس چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس پر لعنت کی گئی ہے یہاں تک کہ اگر وہ چیز اس لعنت کی اہل و سزاوار ہوتی ہے تو اس پر واقع ہو جاتی ہے ورنہ اپنے کہنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ لعنت کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ کہ جس چیز کو لوگ بہت معمولی چیز سمجھتے ہیں۔ اور ہر کس و ناکس پر لعنت کرتے رہتے ہیں انجام کار خود ہی اس لعنت کا شکار ہو جاتے ہیں چنانچہ جب کوئی شخص کسی پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت ابتداء ہی سے اس پر متوجہ نہیں ہوتی۔ اور یہ چاہتی ہے کہ ادھر ادھر سے ہو کر باہر نکل جائے مگر جب کسی طرف کو راستہ نہیں پاتی تو آخر کار اس پر متوجہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اس لعنت کا سزاوار ہو اور اگر حقیقت کے اعتبار سے وہ اس لعنت کا سزاوار نہیں ہوتا تو پھر انجام یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ لوٹ کر اس شخص پر واقع ہو جاتی ہے جس نے وہ لعنت کی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جب تک یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں شخص لعنت کا واقعی مستوجب ہے اس پر لعنت نہ کی جائے اور ظاہر ہے کہ کسی شخص کا قابل لعنت ہونا شارع علیہ السلام کی طرف سے بتائے بغیر متعین نہیں ہو سکتا۔

(۳۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلاً نَازَعَتْهُ الرِّيحُ رِدَاءَهٗ فَلَعَنَهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلْعَنْهَا فَاِنَّهَا مَامُوْرَةٌ وَاِنَّهٗ مَنْ لَعَنَ شَيْئًا لَيْسَ لَهٗ بِاَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن کا واقعہ ہے کہ) ایک شخص کی چادر ہوا میں اڑ گئی تو اس نے ہوا پر لعنت کی چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ہوا پر لعنت نہ کرو کیونکہ وہ تو حکم کے تابع ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت کرے جو اس لعنت کے قابل نہ ہو تو وہ لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: "وہ تو حکم کے تابع ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ ہوا بذات خود کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ کسی طرح کا تصرف کرنے کے قابل ہے وہ تو چلنے پر منجانب اللہ مامور کی گئی ہے اور حق تعالیٰ نے اپنی حکمتوں اور مصالح کے تحت اس کو پیدا کیا اور چلایا ہے بس اس کا کام چلنا ہے اور وہ چلتی ہے اس صورت میں اگر اس کی وجہ سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس ہوا سے دل برداشتہ ہونا اور اس کو برا بھلا کہنا نہ صرف نہایت ناموزوں بات ہے بلکہ تقاضائے عبودیت اور استقامت کے منافی بھی ہے زمانہ کے حوادث و تغیرات اور انسان کے اپنے تابع ارادوں اور افعال کے بارے میں یہی حکم ہے کہ رنج و حادثہ کے وقت اپنے ظاہر و باطن دونوں میں قلب و زبان کو راضی و ساکت رکھے اور اگر کسی تکلیف و حادثہ کے وقت بتقاضائے بشریت اپنے اندر کوئی تغیر اور دل کو متاثر پائے تو لازم ہے کہ زبان کو قابو میں رکھے کہ اس سے شکوہ و شکایت اور اظہار رنج کا کوئی ایسا لفظ نہ نکل جائے جو مرتبہ عبودیت اور اسلامی تعلیمات و آداب کے خلاف ہو۔

اپنے بڑوں کے سامنے ایک دوسرے کی برائی نہ کرو۔

(۳۹) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُبَلِّغُنِيْ اَحَدٌ مِنْ اَصْحَابِيْ عَنْ اَحَدٍ شَيْئًا فَاِنِّيْ اُحِبُّ اَنْ اَخْرُجَ اِلَيْكُمْ وَاَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میرے صحابہؓ میں سے کوئی شخص کسی کے بارے میں مجھ تک کوئی (ایسی) بات نہ پہنچائے (جس سے اس کی برائی ظاہر ہوتی ہو یعنی میرے پاس آکر کسی کے بارے میں یہ نہ کہے کہ فلاں آدمی نے یہ برا کام کیا ہے۔ یا یہ بری بات کہی ہے اور یا وہ اس بری عادت میں مبتلا ہے۔) کیونکہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جب میں (گھر سے) نکل کر تمہارے پاس آؤں تو میرا سینہ صاف ہو (کہ میرے دل میں تم میں سے کسی کی طرف سے کوئی ناراضگی، غصہ اور بغض نہ ہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں امت کے لئے یہ تعلیم ہے کہ کوئی آدمی اپنے کسی بڑے مثلاً حاکم و سردار اور بزرگ و شیخ کے سامنے کسی شخص کی برائی بیان نہ کرے تاکہ بغض و عداوت اور ناراضگی و خفگی کی صورت پیدا نہ ہو۔

حدیث کے آخری جز کے مطلب یہ لکھا ہے کہ اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے گویا اپنی اس خواہش و آرزو کا اظہار فرمایا کہ آپ ﷺ اپنے صحابہؓ سے خوش و راضی رہتے ہوئے اہل دنیا سے رخصت ہوں۔

(۴۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا تَعْنِي قَصِيْرَةً فَقَالَ لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں (ایک دن مجھے کیا سوجھی کہ) میں نبی کریم ﷺ سے یہ کہہ بیٹھی کہ صفیہؓ کے تئیں بس آپ ﷺ کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ ایسی ایسی ہیں اس بات سے حضرت عائشہؓ کی مراد حضرت صفیہؓ کے قد کی کوتاہی کو ذکر کرنا تھا رسول کریم ﷺ نے (میری یہ بات سن کر ناگواری کے ساتھ فرمایا۔ کہ "تم نے اپنی زبان سے ایک ایسی بات نکالی ہے کہ اگر اس کو دریا میں ملایا جائے تو بلاشبہ یہ بات دریا پر غالب آجائے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت صفیہؓ بنت حُیّی بھی آنحضرت ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ تھیں ان کا قد کچھ چھوٹا تھا چنانچہ ایک دن حضرت عائشہؓ نے چاہا کہ آنحضرت کے سامنے حضرت صفیہ کے اس عیب کا ذکر کریں اور اس طرح انہوں نے مذکورہ الفاظ اپنی زبان سے ادا کئے ظاہر ہے کہ یہ غیبت تھی جس میں حضرت عائشہؓ مبتلا ہوئیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کی اس بات پر ناگواری کا اظہار فرمایا اور مذکورہ ارشاد گرامی کے ذریعہ گویا ان پر یہ واضح کیا کہ تم نے جو بات کہی ہے وہ کوئی معمولی درجہ کی نہیں ہے بلکہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے اس قدر ہیتناک ہے کہ اگر بالفرض اس کو کسی دریا میں ملادیا جائے تو دریا اس کے سامنے ہیچ ہو جائے اور یہ چند الفاظ اس دریا کی وسعت و عظمت کے باوجود اس پر غالب آجائیں اور اس کو متغیر کر دیں اور جب ان الفاظ کے مقابلہ پر دریا کا یہ حال ہے تو سوچو کہ تمہارے اعمال کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہو کہ کسی کے اس درجہ کے عیب کو بھی بقصد حقارت بیان کرنا کہ فلاں شخص کوتاہ قد ہے غیبت ہے۔

جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا لفظ کذا کذا کے ذریعہ حضرت صفیہؓ کے بعض عیوب یعنی ان کے قد کی کوتاہی کو کنایۃً بیان کرنا مقصود تھا، جب کہ ایک شارح نے کہا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے ان الفاظ کذا کذا کے ذریعہ دراصل اپنی بالشت کی طرف اشارہ کیا کہ حضرت صفیہؓ تو گویا بالشت بھر کی ہیں۔ نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لفظ کذا کو مکرر لانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا مقصد حضرت صفیہؓ کے اس عیب کو زبان اور اشارہ دونوں ذریعوں سے بیان کرنا تھا۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے پہلے تو اپنی زبان سے کہا ہو گا کہ صفیہ ٹھگنی ہیں اور پھر اپنی بالشت کا اشارہ کر کے اپنی بات کو مؤکد کیا کہ وہ بہت ہی ٹھگنی ہیں ملا علی قاریؒ نے اس طرح کی بات کی ہے۔

بدگوئی عیب دار بناتی ہے اور نرم گوئی، زینت بخشتی ہے

(۴۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا كَانَ الْفُحْشُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهُ وَمَا كَانَ الْحَيَاءُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس چیز میں بدگوئی اور سخت کلامی ہو اس کو عیب دار بنادیتی ہے اور جس چیز میں حیا و نرمی ہو اس کو زیب و زینت عطا کرتی ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی میں فحش یعنی بدگوئی و سخت کلامی اور اس کے مقابلہ پر حیاء یعنی نرم گوئی کی تاثیر و شان کو مبالغہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ اگر بالفرض فحش یا حیا کسی پتھر یا لکڑی میں پیدا ہو جائے تو اس کو عیب دار یا با زینت بنادے اس سے معلوم ہوا کہ بدگوئی و سخت کلامی شخصیت میں نقص و عیب پیدا کرنے کا ذریعہ ہے جب کہ نرم گوئی و خوش کلامی شخصیت میں وقار کو ظاہر کرتی ہے۔

عار دلانے والے کے بارے میں وعید

(۴۲) وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ عَنْ مُعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَيَّرَ اَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهُ يَعْنِيْ مِنْ ذَنْبٍ قَدْ تَابَ مِنْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ اِسْنَادُهُ بِمُتَّصِلٍ لِاَنَّ خَالِدًا لَمْ

يُدْرِكُ مُعَاذَبْنَ جَبَلٍ۔

"اور حضرت خالدؒ ابن معدان حضرت معاذؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ: "جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی کو کسی گناہ پر عار دلاتا ہے (یعنی اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور کوئی شخص اس کو شرم و غیرت دلاتا ہے اور سرزنش و ملامت کرتا ہے تو وہ عار دلانے والا مرنے سے پہلے خود بھی اس گناہ میں (کسی نہ کسی طرح ضرور) مبتلا ہوتا ہے آنحضرت ﷺ کی مراد اس گناہ سے تھی جس سے اس نے توبہ کر لی ہو۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ خالدؒ نے حضرت معاذؓ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔"

تشریح: کسی مسلمان کا بتقاضائے بشریت کسی گناہ میں مبتلا ہو جانا اور پھر شرم و نادم ہو کر اس گناہ سے توبہ کر لینا اس کی سلامتی طبع اور حسن ایمان کی علامت ہے اس صورت میں کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمان اس کے اس گناہ پر شرم و غیرت دلائے اور اس کو سرزنش و ملامت کرے ہاں اگر اس نے اس گناہ سے توبہ نہیں کی ہے اور اس گناہ میں مبتلا ہے تو پھر اس کو شرم و غیرت بھی دلائی جا سکتی ہے اور سرزنش و ملامت بھی کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کو شرم و غیرت دلانا اور سرزنش و ملامت کرنا بطریق تکبر و بقصد تحقیر نہ ہو بلکہ تنبیہ و نصیحت کے طور پر اور اس کو اس گناہ سے باز رکھنے کے قصد سے ہو۔

آنحضرت ﷺ کے مذکورہ ارشاد کی یہ وضاحت "آنحضرت کی مراد اس گناہ سے تھی الخ۔" حضرت امام احمد حنبلؒ سے منقول ہے اور یہ الفاظ اس روایت کے آخر میں نقل کئے جاتے ہیں۔

امام ترمذیؒ نے اس روایت کو اگرچہ غریب کہا ہے اور اس میں کلام کیا ہے لیکن عراقیؒ کہتے ہیں کہ اس روایت کو احمدؒ اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

کسی کو مصیبت میں دیکھ کر خوشی کا اظہار نہ کرو

(۴۳) وَعَنْ وَاثِلَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِاَخِيْكَ فَيَرْحَمَهُ اللّٰهُ وَيَبْتَلِيْكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت واثلہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اپنے مسلمان بھائی کی تکلیف پر اپنی خوشی مت ظاہر کرو۔ (یعنی اگر کسی ایسے مسلمان کو کسی دنیوی یا دینی مصیبت و آفت میں مبتلا دیکھو کہ جس سے تم عداوت رکھتے ہو تو اس کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کرو) کیوں کہ (ہو سکتا ہے کہ تمہاری بے جا خوشی سے ناراض ہو کر) اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت نازل کر دے (یعنی اس مصیبت و آفت سے نجات دیدے) اور تمہیں اس آفت و مصیبت میں مبتلا کر دے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

کسی کی نقل اتارنا حرام ہے

(۴۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اُحِبُّ اَنِّيْ حَكَيْتُ اَحَدًا وَاَنَّ لِيْ كَذَا وَكَذَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ میں کسی شخص کی نقل اتاروں اگرچہ میرے لئے ایسا اور ایسا ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی اگر کوئی مجھے بے حساب مال و زر اور کتنا ہی زیادہ روپیہ پیسہ بھی دے تو بھی میں کسی کی نقل اتارنا گوارا نہ کروں۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔"

تشریح: کسی کی نقل اتارنا خواہ قولی ہو یا فعلی، حرام اور غیبت محرمہ میں داخل ہے۔

خدا کی رحمت کو کسی کے لئے مخصوص و محدود نہ کرو

(۴۵) وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ جَآءَ اَعْرَابِیٌّ فَاَنَاخَ رَاحِلَتَهٗ ثُمَّ عَقَلَهَا ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَصَلّٰی خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سَلَّمَ اَتٰی رَاحِلَتَهٗ فَاَطْلَقَهَا ثُمَّ رَکِبَ ثُمَّ نَادٰی اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَمُحَمَّدًا وَلَا تُشْرِكْ فِیْ رَحْمَتِنَا اَحَدًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتَقُوْلُوْنَ هُوَ اَضَلُّ اَمْ بَعِیْرُهٗ اَلَمْ تَسْمَعُوْا اِلٰی مَا قَالَ قَالُوْا بَلٰی۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَذُکِرَ حَدِیْثُ اَبِیْ هُرَیْرَةَ کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا فِیْ بَابِ الْاِعْتِصَامِ فِی الْفَصْلِ الْاَوَّلِ۔

"اور حضرت جندبؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک دیہاتی شخص (اپنے اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ) آیا اور (مسجد نبی کے قریب پہنچ کر) اس نے اپنے اونٹ کو بٹھایا اور اس کے پاؤں کو باندھ کر مسجد میں داخل ہوا پھر اس نے رسول کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور سلام پھیرنے کے بعد (یعنی نماز سے فارغ ہو کر) اپنے اونٹ کے پاس آیا (اور اس کو کھول کر) اس پر سوار ہوا، اور پھر اس نے بآواز بلند اس طرح کہا کہ اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر اپنی رحمت نازل فرما اور ہماری رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کر رسول کریم ﷺ نے (اس کو اس طرح دعا مانگتے سنا تو صحابہؓ سے) فرمایا کہ۔ تم بتا سکتے ہو کہ یہ دیہاتی زیادہ جاہل ہے یا اس کا اونٹ کیا تم نے سنا نہیں اس نے کیا کہا ہے؟" صحابہؓ نے عرض کیا کہ جی ہاں! ہم نے سنا ہے (ابوداؤدؒ) اور حضرت ابوہریرہ کی روایت کفی بالمرء کذبا الخ باب الاعتصام میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: اس دیہاتی نے چونکہ اپنی دعا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو مخصوص و محدود کیا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے مذکورہ الفاظ کے ذریعہ گویا اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دعا میں اپنے مطلوب کو محدود و مخصوص نہ کرنا چاہئے۔ یعنی یہ دعا نہ مانگنی چاہئے کہ فلاں بات بس ہمارے ہی لئے ہو دوسرے کے لئے نہ ہو بلکہ اس میں تمام مؤمنین و مؤمنات کو داخل کرنا چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

فاسق کی تعریف و توصیف نہ کرو

(۴۶) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰی وَاهْتَزَّ لَهُ الْعَرْشُ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب فاسق کی مدح و تعریف کی جاتی ہے (یعنی کوئی شخص اس کے حق میں تعظیم و توقیر کے الفاظ استعمال کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ (مدح و تعریف کرنے والے پر) غصہ ہوتا ہے اور اس کی مدح و تعریف کی وجہ سے عرش کانپ اٹھتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "عرش کا کانپ اٹھنا" یا تو اپنے ظاہری مفہوم پر محمول ہے کہ جب کسی فاسق و فاجر کی تعریف کی جاتی ہے تو عرش الٰہی واقعۃً کانپنے لگتا ہے اور یا ان الفاظ کے ذریعہ اس بات کو بطور کنایہ بیان کرنا مقصود ہے کہ فاسق کی تعریف و توصیف ایک بہت ہی ہیبتناک بات اور انتہائی سنگین برائی ہے اور اس ہیبتناکی کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص کسی فاسق کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے تعریف کرنے والا گویا ان اوامر و افعال سے راضی اور خوش ہے جو اس فاسق کی زندگی میں پائے جاتے ہیں، بلکہ عجب نہیں کہ تعریف کرنے والا کفر کی حد میں داخل ہو جائے کیونکہ فاسق کی تعریف اس کو اس مقام تک لے جا سکتی ہے۔ جہاں وہ حرام کو حلال جاننے لگے اس سے معلوم ہوا کہ بے عمل اور دنیادار علماء گمراہ شعراء، اور ریاکار و پیشہ ور قراء کی مدح و تعریف کرنا بھی اس حکم میں داخل ہے نیز اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب فاسق کی مدح و تعریف کرنے کا یہ حال ہے تو ظالم اور کافر کی تعریف و توصیف میں

رطب اللسان ہونا کسی درجہ ہیبتناک برائی ہوگی، لہٰذا اس بارے میں احتیاط لازم ہے اور اس بلاء عظیم سے بچنا اشد ضروری ہے، نیز اس سے بچنا اس صورت میں ممکن ہے جب کہ ان لوگوں کی صحبت و ہم نشینی سے اجتناب کیا جائے۔

خیانت و جھوٹ، ایمان کی ضد میں

(۴۷) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مسلمان، جھوٹ اور خیانت کے سوا ہر طرح کی خصلت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ (احمدؒ) بیہقیؒ نے شعب الایمان میں اس روایت کو حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ کامل مؤمن میں یہ دو خصلتیں نہیں ہو سکتیں بلکہ اس کے اجزاء ترکیبی میں صدق وامانت کے اوصاف ہوتے ہیں جو تصدیق وایمان کا تقاضا ہیں یا اس ارشاد گرامی کی مراد مؤمن کی ذات میں ان دونوں خصلتوں کی نفی کرنا ہے یعنی یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مؤمن، جو ایمان کے بار امانت کا حامل ہے ان دو خصلتوں میں مبتلا نہیں ہو سکتا اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ دراصل ان دو خصلتوں کو اختیار کرنے سے منع فرمایا کہ کسی مسلمان کو یہ نہ چاہئے کہ ان دو، (خیانت اور جھوٹ) کو اپنے اندر راہ پانے دے کیونکہ یہ دونوں برائیاں در حقیقت ایمان و اسلام کی ضد میں۔

(۴۸) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ اَنَّهُ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا قَالَ نَعَمْ فَقِيْلَ لَهُ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ بَخِيْلًا قَالَ نَعَمْ فَقِيْلَ لَهُ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا قَالَ لَا۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَالْبَيْهَقِيُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت صفوان ابن سلیمؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا۔ کہ کیا مؤمن بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہو سکتا ہے۔" پھر آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہو سکتا ہے پھر جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مؤمن بہت جھوٹا ہو سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں اس روایت کو مالکؒ اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کوئی مؤمن کسی موقع پر بزدلی دکھا سکتا ہے اور کسی صورت میں بخیل بھی ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایمان کی صداقت و حقانیت کذب کے منافی ہے جو اپنی اصلی اور نفس الامر کے اعتبار سے باطل (ناحق) ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بھی اوپر کی حدیث کی تشریح میں ذکر کردہ تاویلات پر محمول ہے۔

حدیث میں کذاب مبالغہ کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرنا، اس امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اگر بتقاضائے بشریت کسی موقع پر مؤمن سے جھوٹ سرزد ہو جائے جیسا کہ بعض صورتوں میں دنیا کی کسی ناجائز غرض کے تحت نہیں بلکہ مصالح اور حکمت عملی کے پیش نظر جھوٹ بولنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ تو ایسی صورت مستثنیٰ ہے اس کو ایمان کے منافی نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت صفوانؒ کا کچھ ذکر خیر: اس موقع پر اس حدیث کے راوی حضرت صفوانؒ کا کچھ ذکر خیر کر دینا موزوں ہوگا یہ عظیم ہستی جن کا پورا نام صفوان ابن سلیم زہری ہے حضرت حمید ابن عبدالرحمٰن ابن عوف کے آزاد کردہ غلام ان کا شمار مدینہ کے مشہور و ثقہ اور جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے حضرت انس ابن مالکؓ وغیرہ سے روایت حدیث کرتے ہیں اللہ کے صالح اور برگزیدہ بندوں میں سے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس سال تک اپنے پہلو کو زمین سے نہیں لگایا یہاں تک کہ وقت مرگ بھی بیٹھے ہی رہے اور اسی حالت میں جان جاں آفریں کے سپرد کی لوگ کہتے تھے کہ عبادت الٰہی اور سجدہ کی کثرت کی وجہ سے ان کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا تھا۔ قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ باوجود احتیاج کے شاہی عطیات کے قبول نہیں کرتے تھے ان کے فضائل و مناقب بہت زیادہ ہیں۔ ۱۳۲ھ میں انتقال ہوا۔

شیطان کی فتنہ خیزی

(۴۹) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَةِ الرَّجُلِ فَيَاتِي الْقَوْمَ فَيُحَدِّثُهُمْ بِالْحَدِيْثِ مِنَ الْكِذْبِ فَيَتَفَرَّقُوْنَ فَيَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ سَمِعْتُ رَجُلًا اَعْرِفُ وَجْهَهٗ وَلَا اَدْرِيْ مَا اسْمُهٗ يُحَدِّثُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ (کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ) شیطان کسی آدمی کی صورت اختیار کر کے کسی جماعت کے پاس آتا ہے اور ان تک کوئی جھوٹی خبر پہنچا دیتا ہے پھر جب اس جماعت کے لوگ ادھر ادھر منتشر ہوتے ہیں تو ان میں سے کوئی شخص کہتا ہے کہ میں نے ایک شخص سے سنا ہے جس کی صورت تو میں پہنچانتا ہوں (کہ اگر اس کو دیکھوں تو بتا سکتا ہوں کہ یہ وہی شخص ہے) مگر اس کا نام نہیں جانتا، وہ یہ بات بیان کرتا تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "خبر" سے مراد یا تو آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے یا مطلق کوئی بھی جھوٹی خبر و اطلاع! حضرت ابن مسعودؓ کے قول کا مقصد یہ تنبیہ کرنا ہے کہ حدیث کی سماعت کے وقت پوری احتیاط اور چھان بین کر لینی چاہئے کہ جو حدیث سنائی یا نقل کی جا رہی ہے صحیح ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر کوئی بھی خبر یا کوئی بھی بات کسی سے سنے تو اس وقت تک دوسروں کے سامنے نقل نہ کرے جب تک کہ یہ تحقیق نہ کر لے کہ اس خبر اور بات بیان کرنے والا قابل اعتماد اور سچا ہے یا نہیں اور یہ کہ وہ خبر واقعہ کے مطابق اور صحیح ہے یا نہیں؟

مذکورہ بالا روایت اگرچہ بطریق مرفوع یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے طور پر نقل نہیں کی گئی ہے بلکہ بطریق موقوف ہے یعنی حضرت ابن مسعودؓ ایسی کوئی بات آنحضرت ﷺ سے سنے بغیر اس کو بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ روایت مرفوع حدیث ہی کے حکم میں ہے۔

برائی سکھانے سے چپ رہنا بہتر ہے

(۵۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حِطَّانَ قَالَ اَتَيْتُ اَبَاذَرٍّ فَوَجَدْتُهٗ فِي الْمَسْجِدِ مُحْتَبِيًا بِكِسَاءٍ اَسْوَدَ وَحْدَهٗ فَقُلْتُ يَا اَبَاذَرٍّ مَا هٰذِهِ الْوَحْدَةُ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيْسِ السَّوْءِ وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِّنَ الْوَحْدَةِ وَاِمْلَاءُ الْخَيْرِ خَيْرٌ مِّنَ السَّكُوْتِ وَالسَّكُوْتُ خَيْرٌ مِّنْ اِمْلَاءِ الشَّرِّ۔

"اور حضرت عمران ابن حطان (تابعی) کہتے ہیں۔ (ایک دن) میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو مسجد میں پایا، اس وقت وہ ایک کالی کملی لپیٹے ہوئے تنہا بیٹھے تھے میں نے عرض کیا کہ ابوذر! یہ تنہائی کیوں اختیار کر رکھی ہے؟ (یعنی صحابہؓ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر افادہ استفادہ کرنے کے بجائے اس طرح تنہا کیوں بیٹھے ہیں؟) حضرت ابوذرؓ نے جواب دیا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا برے ہم نشینوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہا بیٹھنا بہتر ہے اور تنہا بیٹھنے سے نیک ہم نشینوں کے ساتھ بیٹھنا بہتر ہے نیز چپ رہنے سے بھلائی کا سکھانا بہتر ہے اور برائی سکھانے سے چپ رہنا بہتر ہے (اور ظاہر ہے کہ جو چیز چپ رہنے میں مددگار بن سکتی ہے وہ گوشہ نشینی اور تنہائی ہے۔)"

تشریح: حضرت ابوذرؓ کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت چونکہ وہ خاص رفقا اور ہمنشین یہاں موجود نہیں ہیں جن کی نیکیوں، سلامتی طبع اور پاکیزہ صحبت کا جویا ہونا چاہئے۔ اور جن پر مجھے اعتماد بھروسہ ہو سکتا ہے اس لئے میں نے یہی بہتر سمجھا ہے کہ یہاں چپ چاپ اور تنہا بیٹھا رہوں، ہاں جب ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ بیٹھتا ہی ہوں۔

خاموشی اختیار کرنا، ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے

(۵۱) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَقَامُ الرَّجُلِ بِالصَّمْتِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ

سِتِّيْنَ سَنَةً۔

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا چپ رہنے کی وجہ سے آدمی کو جو درجہ حاصل ہوتا ہے وہ ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔"

تشریح: لفظ "مقام" میم کے زبر کے ساتھ ہے اور میم کے پیش کے ساتھ بھی منقول ہے مطلب یہ ہے کہ آدمی کا بری باتوں سے خاموشی اختیار کرنا اور اسی خاموشی پر مداومت و ہمیشگی کے ساتھ عمل پیرا اور ثابت قدم رہنا اس شخص کی ساٹھ سال کی عبادت سے بھی بہتر و افضل ہے جو کثرت کلام اور زبان کی بے احتیاطی میں مبتلا ہو اور اس کی وہ عبادت استقامت دین کی روح سے خالی ہو۔ طیبیؒ نے مقام کے معنی اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ لکھے ہیں۔ اور افضل ہونے کی یہ دلیل بیان کی ہے کہ عبادات میں بہت سی آفات بھی پیش آتی ہیں اور جو شخص خاموشی اختیار کر لیتا ہے وہ ان آفات سے محفوظ و سلامت رہتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ من کان صمت نجا یعنی جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے اس حدیث کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ چپ رہنے کی وجہ سے جو درجہ حاصل ہوتا ہے کبھی وہ خدا کے نزدیک ساٹھ سال کی عبادت سے بھی افضل اور فزوں تر قرار پاتا ہے کیونکہ وہ خاموشی کہ جس کے دوران اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اس کی قدرتوں اور کائنات و مخلوقات کے تئیں اس کی حکمت آفرینی دکار سازی میں غور فکر کو راہ ملے یا لطیفہ قلب کو ذکر خفی میں استغراق و انہماک دولت نصیب ہو اور روح و باطن کو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے نور سے روشنی حاصل کرنے کا موقع ملے تو یہ فکر و استغراق اگرچہ ایک ہی لمحہ و ساعت کے بقدر کیوں نہ ہو لیکن اعضاو جوارح کی اس عبادت و طاعت سے کہیں زیادہ بہتر و افضل ہے جو ذہن و فکر کے انتشار، بے حضوری قلب اور یاد الٰہی کے ساتھ غیر خاطر جمعی کے ساتھ عمل میں آئے اگرچہ وہ عبادت و طاعت سالہا سال کے بقدر رہی کیوں نہ ہو۔

حضرت ابوذرؓ کو آنحضرت ﷺ کی چند نصائح

۵۲ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَ الْحَدِیْثَ بِطُوْلِهٖ اِلٰی اَنْ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْصِنِیْ قَالَ اُوْصِیْکَ بِتَقْوَی اللّٰهِ فَاِنَّهٗ اَزْیَنُ لِاَمْرِکَ کُلِّهٖ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ عَلَیْکَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ وَ ذِکْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَاِنَّهٗ ذِکْرٌ لَکَ فِی السَّمَاءِ وَنُوْرٌ لَکَ فِی الْاَرْضِ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ عَلَیْکَ بِطُوْلِ الصَّمْتِ فَاِنَّهٗ مَطْرَدَةٌ لِلشَّیْطَانِ وَعَوْنٌ لَکَ عَلٰی اَمْرِ دِیْنِکَ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ اِیَّاکَ وَکَثْرَةَ الضِّحْکِ فَاِنَّهٗ یُمِیْتُ الْقَلْبَ وَیَذْهَبُ بِنُوْرِ الْوَجْهِ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ قُلِ الْحَقَّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ لَا تَخَفْ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ لِیَحْجُزْکَ عَنِ النَّاسِ مَا تَعْلَمُ مِنْ نَّفْسِکَ۔

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے بعد (خود ابوذرؓ نے یا ابوذر سے نقل کرنے والے راوی نے) طویل حدیث بیان کی (جو یہاں نقل نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے یہ آخری جملے نقل کئے گئے ہیں کہ) پھر ابوذرؓ نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھ کو کوئی نصیحت فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تم کو تقویٰ اللہ یعنی اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ تقویٰ تمہارے تمام (دینی و دنیاوی) امور و اعمال کو بہت زیادہ زینت و آراستگی بخشنے والا ہے میں نے عرض کیا کہ میرے سے کچھ اور (نصیحت) فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تلاوت قرآن اور ذکر اللہ کو اپنے لئے ضروری سمجھو، کیونکہ (تلاوت قرآن اور ذکر اللہ) تمہارے لئے آسمان میں ذکر کا موجب ہوگا اور زمین پر نور کا سبب ہوگا (یعنی جب تم تلاوت قرآن اور ذکر اللہ میں مشغولیت اختیار کرو گے تو اس کے سبب سے آسمانوں میں ملائکہ تمہارا ذکر خیر کریں گے بلکہ حق تعالیٰ بھی تمہیں یاد کریگا اور اس دنیا میں تمہارے معرفت و یقین اور

راہ ہدایت کا نور ظاہر ہوگا) میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمائیے! آپ ﷺ نے فرمایا طویل خاموشی کو اپنے اوپر لازم کرلو کیونکہ خاموشی شیطان کو دور بھگاتی ہے اور دینی امور میں تمہاری مددگار ہوتی ہے (یعنی خاموشی پر مداومت و ہمیشگی اختیار کرنے کی وجہ سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع نصیب علاوہ ازیں خاموشی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تم اپنے آپ کو شیطان کی فتنہ خیزیوں سے محفوظ رکھ سکو گے جو زبان کے راستہ سے عملی زندگی میں سرایت کرتا ہے اور دنیا و آخرت کے زبردست نقصان و خسران میں مبتلا کرلیتا ہے دوسرے یہ کہ خاموشی تمہاری دینی و اخروی بھلائی و سعادت کا ضامن بھی بنے گی کیوں کہ جب وہ تمہیں زبان کی آفتوں سے محفوظ و سلامت رکھ کر تمہارے دل کو خدا کی طرف متوجہ رکھے گی تو یہ چیز ذکر خفی کے سبب سے تمہارے حق میں علوم و معارف اور نورانیت قلب کے حصول کا موجب ہوگی۔) میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمائیے آپ ﷺ نے فرمایا بہت زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کردیتا ہے اور چہرے کی موزونیت کو کھودیتا ہے (یعنی بہت زیادہ ہنسنے ہنسانے کی وجہ سے چونکہ قلب پر غفلت و بے حسی کی تاریکی چھاجاتی ہے اور علم و معرفت کا وہ نور بجھ جاتا ہے جس پر دل کی حیات کا دارومدار ہے اس لئے بہت زیادہ ہنسنے والے کا دل گویا مردہ ہوجاتا ہے نیز جب دل غافل ہوجاتا ہے۔ اور قوائے باطن پر غفلت و بے حسی طاری ہوجاتی ہے تو طاعت و عبادت میں بھی کمی آجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ نور رخصت ہوجاتا ہے جو عبادت کی علامت کے طور پر مؤمن کے چہرے پر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ویسے بھی یہ بات یقینی ہے کہ دل کی مردنی چہرے کو بے نور بنادیتی ہے کیونکہ بدن کی تروتازگی اور نورانیت دراصل حسی اور معنوی حیات پر منحصر ہے) میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمائیے آپ ﷺ نے فرمایا سچی بات کہو اگرچہ وہ کڑوی ہو (یعنی حق کے اظہار میں کبھی نہ چوکو جو بات سچی ہو اس کو ضرور کہو۔ اگر اس کی وجہ سے لوگوں کو یا خود تمہارے نفس کو ناگوار محسوس ہو) میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمائیے آپ ﷺ نے فرمایا خدا کے دین اور خدا کو ظاہر کرنے اور اس کی تائید و تقویت میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا چاہئے کہ وہ چیز تمہیں لوگوں کے عیوب ظاہر کرنے سے روکے جس کو تم اپنے نفس کے بارے میں جانتے ہو یعنی جب تمہیں کسی کی عیب گوئی کا خیال آئے تو فوراً اپنے عیوب کی طرف دیکھو اور سوچو کہ خود میری ذات میں اتنے عیب ہیں تو میں دوسرے کی عیب گیری کیا کروں گو یا تم خود اپنے عیوب و نقائص کی طرف متوجہ رہو اور دوسروں کی عیب گوئی سے اجتناب کرو۔"

تشریح: ہر ایک کام اور ہر بھلی بات، جو محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے صادر و سرزد ہو ذکر اللہ میں داخل ہے اگر اس جملہ وَعَلَيْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ وَذِكْرِ اللّٰهِ یعنی سب ذکروں میں افضل لا الہ الا اللہ ہے تو کہا جائے گا کہ مذکورہ جملہ اس اسلوب بیان کا مظہر ہے کہ جس میں کوئی بات پہلے عمومی طور پر ذکر کی جاتی ہے اور پھر کسی ایسے جز کو خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے جو تمام اجزاء سے زیادہ شرف و فضیلت رکھتا ہو۔

"کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو۔" کے ذریعہ گویا یہ تلقین فرمائی گئی کہ خدا کے دین کو سربلند کرنے کا جو فریضہ تم پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس کی انجام دہی میں تمہیں دنیا والوں سے پوری طرح منہ موڑنا پڑے تو اس میں بھی کوئی ہچکچاہٹ نہ دکھاؤ۔ اور اس بات کو ضروری سمجھو کہ تمہیں دنیا والوں کی مذمت اور تعریف سے بالکل بے پرواہ ہو کر ہر حالت میں حق و صداقت پر اور خدا کی اطاعت پر ثابت قدم رہنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا یعنی اور دنیا والوں سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی رضا و خوشنودی کی طرف رجوع کرو۔

"جس کو تم اپنے نفس کے بارے میں جانتے ہو۔" کا مطلب یہ ہے کہ جب تم جانتے ہو کہ خود تمہارے اندر کیا عیوب ہیں اور تمہارا نفس کن برائیوں میں مبتلا ہے تو پھر تمہارے لئے یہ قطعاً مناسب نہیں ہوگا کہ تم دوسرے کے عیوب پر نظر رکھو اور دوسروں کی برائیوں پر

انگلی اٹھاؤ! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے نقطہ نظر سے تو بیشک کسی کو اس کی برائی پر ٹوک سکتے ہو اور اس کو راہ راست اختیار کرنے کی تلقین کر سکتے ہو بلکہ تم پر یہ ضروری بھی ہے کہ اگر تم کسی کو برائی میں مبتلا دیکھو تو اس کو اس برائی سے ہٹانے کی کوشش کرو۔ لیکن محض عیب جوئی اور تحقیر و تذلیل کے خیال سے کسی کی برائی پر انگلی نہ اٹھاؤ اور اس کی غیبت نہ کرو بلکہ اپنی برائیوں اور اپنے عیوب پر نظر رکھتے ہوئے خود اپنے کو سب سے زیادہ ناقص اور کمتر سمجھو کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

غافل اند ایں خلق از خود بے خبر لاجرم گویند عیب یکدگر

دیلمیؒ نے حضرت انسؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ:

طوبیٰ لمن شغله علیه عن عیوب الناس

"قابل مبارک باد ہے وہ شخص جس کو اس کا عیب لوگوں کی عیب گیری سے باز رکھے۔"

خاموشی اور خوش خلقی کی فضیلت

﴿۵۳﴾ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَبَاذَرٍّ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى خَصْلَتَيْنِ هُمَا اَخَفُّ عَلَى الظَّهْرِ وَاَثْقَلُ فِى الْمِيْزَانِ قَالَ قُلْتُ بَلٰى قَالَ طُوْلُ الصَّمْتِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ مَا عَمِلَ الْخَلَائِقُ بِمِثْلِهِمَا۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ابوذرؓ کیا میں تمہیں وہ دو خصلتیں نہ بتادوں جو مکلف انسان کی پشت پر یعنی اس کی زبان کے اوپر بہت ہلکی ہیں اعمال کے ترازو میں بہت بھاری ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے بیان کیا کہ میں نے سن کر عرض کیا کہ ہاں ضرور بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا معرفت الٰہیہ اور نظام قدرت میں غور و فکر کے لئے طویل خاموشی اور خوش خلقی قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، مخلوق کے لئے ان دونوں خصلتوں سے بہتر کوئی کام نہیں ہے۔"

تشریح: چپ رہنا اور خوش خلقی اختیار کرنا یہ دونوں خصلتیں اس اعتبار سے بہت آسان اور ہلکی ہیں کہ خاموش رہنے میں کوئی محنت و مشقت برداشت کرنا نہیں پڑتی بلکہ ایک طرح سے راحت ہی ملتی ہے کیونکہ زبان ہلانے اور الفاظ کو ترتیب دے کر جملے ادا کرنے میں ظاہر و باطن کی مشقت اٹھانا پڑتی ہے اسی پر خوش خلقی کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نرم خوئی اور خوش مزاجی اور خندہ روئی میں راحت و سکون اور آسانی و نرمی حاصل ہوتی ہے بخلاف سخت خوئی، تند مزاجی اور جدال و نزاع کے کہ ان میں سراسر محنت و مشقت ہے۔

لعنت کرنے کی برائی

﴿۵۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَبِىْ بَكْرٍ وَهُوَ يَلْعَنُ بَعْضَ رَقِيْقِهٖ فَالْتَفَتَ اِلَيْهِ فَقَالَ لَعَّانِيْنَ وَصِدِّيْقِيْنَ كَلَّا وَرَبِّ الْكَعْبَةِ فَاَعْتَقَ اَبُوْبَكْرٍ يَوْمَئِذٍ بَعْضَ رَقِيْقِهٖ ثُمَّ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا اَعُوْدُ۔ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الْخَمْسَةَ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس سے ...... گزر رہے تھے تو دیکھا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ اپنے کسی غلام پر لعنت کر رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور فرمایا کہ بھلا تم نے لعنت کرنے والے اور صدیقین کو بھی دیکھا ہے؟ (یعنی کیا تم نے کبھی کوئی ایسا شخص دیکھا کہ جس میں بیک وقت یہ دو صفتیں یعنی لعانیت اور صدیقیت پائی جاتی ہوں حاصل یہ کہ جو شخص صدیقیت کے مقام پر فائز ہو وہ لعنت کرنے والا نہیں ہو سکتا جیسا کہ یہ حدیث گزر چکی ہے کہ لا ینبغی لصدیق ان یکون لعانا یعنی صدیق کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ لعنت کرنے والا ہو) نہیں رب کعبہ کی قسم یہ دونوں باتیں کسی ایک شخص میں ہرگز جمع نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ ارشاد سن کر اپنی اس تقصیر کے کفارہ کے طور پر اس دن اپنے بعض غلاموں کو آزاد کیا اور پھر معذرت خواہی کے لئے نبی

کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں آئندہ کبھی ایسا کام نہیں کروں گا (یعنی کسی کو لعنت نہیں کروں گا) حضرت عمران بن حطان کی روایت سے لے کر اس حدیث تک کی ان پانچوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

زبان کی ہلاکت خیزی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خوف

۵۵ وَعَنْ اَسْلَمَ قَالَ اِنَّ عُمَرَ دَخَلَ يَوْمًا عَلٰى اَبِيْ بَكْرِنِ الصِّدِّيْقِ وَهُوَ يَجْبِذُ لِسَانَهُ فَقَالَ عُمَرُ مَهْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ فَقَالَ لَهُ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّ هٰذَا اَوْرَدَنِي الْمَوَارِدَ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت اسلمؒ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر فاروقؓ امیرالمؤمنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو (دیکھا کہ) حضرت ابوبکرؓ اپنی زبان کو کھینچ رہے ہیں (یعنی اپنی زبان کے تئیں اس قدر غیظ و غضب کا اظہار کر رہے تھے کہ اس کو انگلیوں سے پکڑ پکڑ کر کھینچ رہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کو نکال باہر پھینک دیں گے حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر کہا کہ ٹھہریئے، ایسا نہ کیجئے! اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ (یہ زبان اسی سزا کی مستوجب ہے کیونکہ) اس نے مجھے ہلاکت کی جگہوں میں ڈالا ہے" (مالک)

وہ چھ امور جو جنّت کے ضامن ہیں

۵۶ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اضْمَنُوْا لِيْ سِتًّا مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَضْمَنْ لَكُمُ الْجَنَّةَ اُصْدُقُوْا اِذَا حَدَّثْتُمْ وَاَوْفُوْا اِذَا وَعَدْتُمْ وَاَدُّوْا اِذَا اؤْتُمِنْتُمْ وَاحْفَظُوْا فُرُوْجَكُمْ وَغُضُّوْا اَبْصَارَكُمْ وَكُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ۔

"اور حضرت عبادہ ابن صامت روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم لوگ اپنے بارے میں مجھے چھ چیزوں کی ضمانت دو یعنی چھ باتوں پر عمل کرنے کا عہد کرلو تو میں نجات پائے ہوئے اور صالحین کے ساتھ تمہارے جنّت میں جانے کا ضامن بنتا ہوں ① جب بھی بولو سچ بولو ② وعدہ کرو تو پورا کرو۔ ③ تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو امانت کو ادا کرو۔ ④ اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو یعنی حرام کاری سے بچو۔ ⑤ اپنی نگاہ کو محفوظ رکھو یعنی اس چیز کی طرف نظر اٹھانے سے پرہیز کرو جس کو دیکھنا جائز نہیں۔ ⑥ اپنے ہاتھوں پر قابو رکھو یعنی اپنے ہاتھوں کو ناحق مارنے اور حرام و مکروہ چیزوں کو پکڑنے سے باز رکھو۔ یا یہ کو اپنے آپ کو ظلم و تعدی کرنے سے باز رکھو۔"

اچھے اور برے بندے کون ہیں؟

۵۷ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ وَاَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ اِذَا رُؤُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ وَشِرَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الْمَشَّاؤُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ الْمُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ الْاَحِبَّةِ الْبَاغُوْنَ الْبُرَاءَ الْعَنَتَ۔ رَوَاهُمَا اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن غنمؓ اور اسماءؓ بنت یزید، راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر خدا یاد آجائے اور اللہ کے بدترین بندے وہ ہیں جو لوگوں میں چغلی کھاتے پھرتے ہیں (جس سے ان کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا) کہ وہ دوستوں کے درمیان نفاق و جدائی ڈال دیں اور پاکیزہ لوگوں کے دامن پر فساد اور خرابی اور زناکاری کے چھینٹے ڈالیں یعنی خدا کے جو نیک بندے فتنہ و فساد، گناہ و معصیت اور کسی عیب سے پاک و منزہ ہوتے ہیں۔ ان پر فتنہ و فساد اور گناہ و معصیت جیسے زناکاری وغیرہ کا بہتان لگاتے ہیں اور اس طرح ان کو ہلاکت و مشقت اور دشواریوں میں مبتلا کرتے ہیں۔" (احمدؒ و بیہقیؒ)

تشریح: اس حدیث میں بہترین لوگوں کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ خدا کے وہ نیک و صالح اور عبادت گزار بندے جو اللہ رب العزت کے ساتھ اپنے کمال تعلق و اختصاص کی بنا پر ایسے درجے پر فائز ہو جاتے ہیں کہ ان کے احوال و کردار، عادات و اطوار اور حرکات و سکنات پر انوار و آثار الٰہی ہویدا ہو جاتے ہیں اور ان کے چہرے پر عبادت گزاری اور اتباع دین و شریعت کی وہ علامتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ جب ان کے

جمال پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ خدا یاد آجاتا ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ یہی وہ نیک بندے جو کامل عبودیت کے حامل اور کائنات انسانی کا خلاصہ اور انوار الٰہی کے مظہر ہیں۔

بعض حضرات نے خدا یاد آجانے کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ خدا کے ایسے نیک و صالح بندوں کو دیکھنا گویا ذکر الٰہی میں مشغول ہونا ہے جیسا کہ علماء نے لکھا ہے کہ عالم دین کے چہرے پر نظر ڈالنا، عبادت اور عین سعادت ہے اور اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ بسا اوقات کسی مرد صالح اور شیخ کامل کے چہرے پر نظر پڑتے ہی باطن میں ایسی نورانیت محسوس ہوتی ہے جس سے دل روشن ہو جاتا ہے! یہ بات حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ حضرت علیؓ کے بارے میں فرمایا گیا کہ النظر علی وجہ علیٍ عِبادَۃٌ یعنی علیؓ کے چہرہ پر نظر کرنا عبادت ہے۔ نیز منقول ہے کہ جب حضرت علیؓ گھر سے نکلتے تھے اور لوگوں کی نظر ان کے چہرہ پر نور پر پڑتی تھی تو یہ الفاظ ان کی زبان پر آجاتے لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مَا اَشْرَفَ هٰذَا الْفَتٰی، لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مَا اَكْرَمَ هٰذَا الْفَتٰی، لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مَا اَعْلَمَ هٰذَا الْفَتٰی، لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مَا اَشْجَعَ هٰذَا الْفَتٰی گویا حضرت علی کو دیکھنا کلمہ توحید کے ورد کا باعث بنتا تھا۔

غیبت مفسد روزہ ہے

(۵۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلَیْنِ صَلَّیَا صَلٰوةَ الظُّهْرِ اَوِ الْعَصْرِ وَكَانَ صَائِمَیْنِ فَلَمَّا قَضَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةَ قَالَ اَعِیْدُوْا وُضُوْءَ كُمَا وَصَلٰوتَكُمَا وَامْضِیَا فِیْ صَوْمِكُمَا وَاقْضِیَاهُ یَوْمًا اٰخَرَ قَالَ لِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اغْتَبْتُمْ فُلَانًا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) دو آدمیوں نے جو دوزہ دار تھے (نبی کریم ﷺ کے پیچھے) ظہر یا عصر کی نماز پڑھی جب نبی کریم ﷺ نماز پڑھ چکے تو ان دونوں سے فرمایا کہ تم دونوں دوبارہ وضو کرو اپنی اس نماز کو لوٹاؤ اور اپنے اس روزے کو پورا کرو اور اس کے بدلے میں احتیاطاً دوسرے دن روزہ رکھ لو۔ ان دونوں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ایسا کیوں؟ یعنی وضو، نماز اور روزے کو لوٹانا کس سبب سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس لئے کہ تم نے فلاں شخص کی غیبت کی ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیبت وضو اور روزے کو توڑ دیتی ہے لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث دراصل غیبت کی شدید مذمت اور غیبت کرنے والے کے حق میں سخت ترین زجر و تنبیہ کے طور پر ارشاد ہوئی ہے ورنہ حقیقت میں غیبت سے روزہ اور وضو ٹوٹتا نہیں تاہم غیبت کی وجہ سے وضو اور روزہ کا کمال و ثواب ضرور کھویا جاتا ہے لیکن حضرت سفیان ثوریؒ کے نزدیک غیبت، مفسد روزہ ہے۔ بہر حال حدیث سے یہ بات یقیناً واضح ہوتی ہے کہ غیبت کی قباحت و برائی بہت زیادہ ہے اور احتیاط و تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ اگر غیبت صادر ہو جائے تو وضو کی تجدید کرنی چاہئے بلکہ علماء نے بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص بہت زیادہ ہنسے یا کسی نے بہت زیادہ لغو باتیں کیں تو اس کے لئے مستحب ہوگا کہ وہ وضو کرلے تاکہ وہ ظلمت زائل ہو جائے جو بہت زیادہ ہنسنے یا بہت زیادہ لایعنی باتیں کرنے سے اس کے باطن پر طاری ہوگئی ہے نیز روزہ دار کو چاہئے کہ غیبت سے پوری طرح اجتناب کرے۔

غیبت زنا سے بدتر ہے

(۵۹) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَجَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْغِیْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَیْفَ الْغِیْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَزْنِیْ فَیَتُوْبُ فَیَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ فَیَتُوْبُ فَیَغْفِرُ اللّٰهُ لَهٗ وَاِنَّ صَاحِبَ الْغِیْبَةِ لَا یُغْفَرُ لَهٗ حَتّٰی یَغْفِرَ هَالَهٗ صَاحِبُهٗ وَفِیْ رِوَایَةِ اَنَسٍ قَالَ صَاحِبُ الزِّنَا یَتُوْبُ وَصَاحِبُ الْغِیْبَةِ لَیْسَ لَهٗ تَوْبَةٌ۔ رَوَی الْبَیْهَقِیُّ الْاَحَادِیْثَ الثَّلٰثَةَ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابو سعیدؓ اور حضرت جابرؓ دونوں بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بیان فرمایا غیبت کرنا زنا کرنے سے زیادہ سخت

برائی ہے۔ صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! غیبت زنا سے زیادہ سخت برائی کس طرح سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہ جب آدمی زنا کرتا ہے تو توبہ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ، توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے لیکن غیبت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا جب تک کہ اس کو وہ شخص معاف نہ کردے جس کی اس نے غیبت کی ہے یعنی زنا کاری چونکہ اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی ہے اس لئے وہ ان کی توبہ قبول کرلیتا ہے اور اس کو بخشدیتا ہے جبکہ غیبت کرنا حق العباد سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ غیبت کرنے والے کو اس وقت تک نہیں بخشتا جب تک وہ شخص اس کو معاف نہ کردے جس کی اس نے غیبت کی ہے اور حضرت انسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا زنا کرنے والا توبہ کرتا ہے اور غیبت کرنے والے کے لئے توبہ نہیں ہے (ان تینوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔")

تشریح: "اور غیبت کرنے والے کے لئے توبہ نہیں ہے" غالباً اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ جو شخص زنا میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کے دل پر خدا کا خوف طاری ہو جاتا ہے اور اس تصور سے لرزنے لگتا ہے۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مواخذہ کرلیا تو نجات کا راستہ نہیں ملے گا اس لئے وہ اپنے اس فعل شنیع پر نادم و شرمسار ہو کر توبہ کرتا ہے جب کہ غیبت اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے گناہ کی چیز ہے مگر غیبت کرنے والا اس کو ایک ہلکی چیز سمجھتا ہے کیونکہ جب کوئی برائی عام ہو جاتی ہے تو اس کی قباحت دل سے نکل جاتی ہے اور لوگ اس میں مبتلا ہو جانے کی برائی کو محسوس نہیں کرتے یا یہ بات بھی بعید از امکان نہیں ہو سکتی ہے کہ غیبت کرنے والا غیبت کو سرے سے کوئی برا فعل ہی نہ سمجھے بلکہ اس کو جائز و حلال جانے اور اس طرح وہ کفر کے بھنور میں پھنس جائے۔ اور یا اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ غیبت کرنے والا توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ بذات خود کارگر نہیں ہوتی بلکہ اس توبہ کا صحیح و مقبول ہونا اس شخص کی رضامندی اور اس کی طرف سے معاف کردیئے جانے پر موقوف ہوتا ہے جس کی اس نے غیبت کی ہے چنانچہ اوپر کی حدیث سے یہی واضح ہوتا ہے۔

غیبت کا کفارہ

(۶۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ كَفَّارَةِ الْغِيْبَةِ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لِمَنِ اغْتَبْتَهٗ تَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلَهٗ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ وَقَالَ فِيْ هٰذَا الْاِسْنَادِ ضُعْفٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تم اس شخص کی مغفرت و بخشش کی دعا مانگو جس کی تم نے غیبت کی ہے اور اس طرح دعا مانگو کہ اے اللہ ہم کو اور اس شخص کو کہ جس کی میں نے غیبت کی ہے بخش دے! اس روایت کو بیہقیؒ نے اپنی کتاب دعوات کبیر میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں ضعف ہے۔"

تشریح: دعاء مغفرت کے الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غیبت کرنے والا پہلے خواہ اپنے حق میں مغفرت کی دعا کرے اس میں نکتہ یہ ہے کہ استغفار کرنے والے کے بارے میں حق تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ اس کی دعاء مغفرت کو قبول کیا جائے گا لہٰذا غیبت کرنے والا جب پہلے خود اپنے حق میں استغفار کرے گا اور اس کے نتیجہ میں وہ اس معصیت سے پاک ہو جائے گا تو دوسرے کے حق میں بھی اس کی دعاء مغفرت قبول ہوگئی۔

"اغفر لنا" میں جمع متکلم کا صیغہ اس صورت کے اعتبار سے ہے جب کہ غیبت کا صدور بھی لوگوں سے ہوا ہو یعنی اگر غیبت کرنے والے کئی لوگ ہوں تو سب اس طرح دعا مانگیں اور اگر غیبت کرنے والا ایک شخص ہو تو پھر "اغفرلی" کے الفاظ استعمال ہونگے یا یہ مراد ہے کہ استغفار کرنے والا اپنی دعاء مغفرت میں تمام مسلمانوں کو شامل کرے اس صورت میں اس دعا کے معنی یہ ہونگے کہ اے اللہ ہم سب مسلمانوں کو اور خاص طور پر اس شخص کو کہ جس کی میں نے غیبت کی ہے بخش دے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت کی دعا کرنا اس صورت سے متعلق ہے جبکہ اس کی غیبت کی خبر اس شخص کو نہ پہنچی ہو جس کی غیبت

کی گئی ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ جس شخص کی غیبت کی گئی ہے اس کو معلوم ہو گیا کہ فلاں شخص نے میری یہ غیبت کی ہے تو غیبت کرنے والے کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اس شخص سے اپنے آپ کو معاف کرائے بایں طور کہ پہلے اس کو یہ بتائے کہ میں نے تمہاری غیبت میں اس طرح کہا ہے اور پھر اس سے اپنے آپ کو معاف کرائے اور اگر غیبت کرنے والا کسی مجبوری اور عذر کی بنا پر ایسا نہ کرسکے تو پھر یہ ارادہ رکھے کہ جب بھی ہو سکے گا۔ اس سے اپنے آپ کو معاف کراؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد جب بھی وہ اپنے آپ کو اس سے معاف کرالے گا اس ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔ اور اس غیبت کے سلسلہ میں اس پر کوئی حق و مواخذہ باقی نہیں رہ جائے گا، ہاں اگر وہ اپنے آپ کو معاف کرانے سے بالکل عاجز رہا۔ بایں سبب کہ جس شخص کی اس نے غیبت کی ہے۔ وہ مثلاً مر گیا ہے یا اتنی دور رہائش پذیر ہے کہ، اس سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں ہے تو اس صورت میں اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت و بخشش کا طلب گار ہو اور اس کے فضل و کرم سے یہ امید رکھے کہ وہ اس شخص کو اس کے تئیں راضی کر دے گا۔

فقیہ ابواللیثؒ نے کہا ہے کہ علماء نے غیبت کرنے والے کی توبہ کے بارے میں کلام کیا ہے کہ آیا اس کے لئے یہ جائز ہے یا نہیں؟ کہ اس نے جس شخص کی غیبت کی ہے اس سے معاف کرائے بغیر توبہ کرے چنانچہ بعض علماء نے اس کو جائز کہا ہے جب کہ ہمارے نزدیک اس کی صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اگر اس کی غیبت کی خبر اس شخص کو پہنچ گئی ہے کہ جس کی اس نے غیبت کی ہے تو اس کی توبہ بس یہی ہے کہ وہ اس سے معاف کرائے اور دوسرے یہ کہ اگر اس شخص کو اس غیبت کی خبر پہنچی ہے تو اس صورت میں وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت و بخشش کی دعا مانگے اور دل میں یہ عہد کر لے کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔

بیہقیؒ نے اس روایت کو گویا ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن اس کا ضعیف ہونا حدیث کے اصل مفہوم پر اثر انداز نہیں ہوتا کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث سے بھی استدلال کرنا کافی ہو جاتا ہے علاوہ ازیں جامع صغیر میں بھی اس طرح کی ایک حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے جو اس روایت کو تقویت پہنچاتی ہے اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ کفارة من الغيبة ان تستغفر له یعنی غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ اس شخص کے حق میں مغفرت کی دعا کی جائے جس کی غیبت کی گئی ہے۔

باب الوعد

وعدہ کا بیان

"وَعْدٌ" کے معنی ہیں قول و قرار کرنا، وعدہ کرنا یعنی کسی سے مثلاً یہ کہنا کہ تمہارا فلاں کام کر دوں گا یا تمہارے پاس آؤں گا اور یا تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا وغیرہ وغیرہ...... واضح رہے کہ لفظ وعد خیر اور شر دونوں سے متعلق جملوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس جملہ میں خیر اور شر کا لفظ مذکور ہو جیسے کہا جاتا ہے وعدته خیرا او وعدته شرا اور اگر خیر یا شر کا لفظ مذکور نہ ہو تو خیر میں وعد کا لفظ استعمال کیا جائے گا اور شر میں وعید اور ایعاد کا لفظ۔

ایفاء عہد اور وعدے کو پورا کرنا انسانیت کا مظہر اور اسلامی اخلاق و آداب کا ایک بنیادی تقاضا ہے اس کے برخلاف بدعہدی اور وعدہ خلافی ایک بہت بڑا عیب ہے جو شخص اپنا عہد پورا نہ کرے اور اپنا وعدہ وفا نہ کرے وہ اسلام اور معاشرہ دونوں کی نظر میں سخت ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے چنانچہ اس باب میں اسی موضوع سے متعلق احادیث نقل ہوں گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جو شخص اپنا وعدہ پورا کرنے سے پہلے مرجائے تو اس کا جانشین اس کا وعدہ پورا کرے

① عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَاءَ اَبَابَكْرٍ مَالٌ مِنْ قِبَلِ الْعَلَاءِ بْنِ الْحَضْرَمِيِّ فَقَالَ

اَبُوْبَکْرٍ مَنْ کَانَ لَهُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَيْنٌ اَوْ كَانَتْ لَهُ قِبَلَهُ عِدَةٌ فَلْيَأْتِنَا قَالَ جَابِرٌ فَقُلْتُ وَعَدَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُعْطِيَنِيْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا فَبَسَطَ يَدَيْهِ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ قَالَ جَابِرٌ فَحَثٰى لِيْ حَثْيَةً فَعَدَدْتُهَا فَاِذَا هِيَ خَمْسُ مِائَةٍ وَقَالَ خُذْ مِثْلَيْهَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس علاء بن حضرمیؓ کے ہاں سے مال آیا جن کو آنحضرت ﷺ نے بحرین کا عامل مقرر کیا تھا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ جس شخص کا آنحضرت ﷺ پر قرض ہو یا جس شخص سے آنحضرت ﷺ نے کچھ دینے کا وعدہ کیا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ ہمارے پاس آئے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے اتنا اور اتنا دینے کا مجھ سے وعدہ فرمایا تھا (یہ کہہ کر) حضرت جابرؓ نے اپنے دونوں ہاتھ تین مرتبہ کھولے یعنی حضرت جابرؓ نے اپنے ہاتھوں کو تین مرتبہ کھول کھول کر دکھایا اور واضح کیا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ مال آنے پر میں تمہیں دونوں ہاتھ بھر بھر کر دوں گا۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ پس حضرت ابوبکرؓ نے ایک بار اپنے دونوں (دونوں ہاتھ) بھر کر مجھ کو زر نقد عطا فرمایا میں نے اس کو شمار کیا تھا تو وہ تعداد میں پانچ سو تھے پھر انہوں نے فرمایا کہ اسی طرح دو مرتبہ اور لے لو یعنی ایک ہزار گن کر اور لے لو تا کہ کم و بیش نہ ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آنحضرت ﷺ کے وعدہ کا حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے ایفاء

(۲) وَعَنْ اَبِيْ جُحَيْفَةَ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْيَضَ قَدْ شَابَ وَكَانَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ يُشْبِهُهُ وَاَمَرَ لَنَا بِثَلٰثَةَ عَشَرَ قَلُوْصًا فَذَهَبْنَا نَقْبِضُهَا فَاَتَانَا مَوْتُهُ فَلَمْ يُعْطُوْنَا شَيْئًا فَلَمَّا قَامَ اَبُوْبَكْرٍ قَالَ مَنْ كَانَتْ لَهُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِدَةٌ فَلْيَجِئْ فَقُمْتُ اِلَيْهِ فَاَخْبَرْتُهُ فَاَمَرَ لَنَا بِهَا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوجحیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ ﷺ کا رنگ سرخی مائل سفید تھا اور آپ ﷺ پر بڑھاپا ظاہر ہو چکا تھا اگرچہ آپ ﷺ کے سر اور داڑھی کے بال سفید نہیں تھے اور حضرت حسن ابن علیؓ جسم کے اوپر کے حصہ کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ سے بہت مشابہ تھے آنحضرت ﷺ نے ہماری جماعت کو تیرہ جوان اونٹنیاں دیئے جانے کا حکم فرمایا تھا چنانچہ ہم ان اونٹنیوں کو لینے گئے تو اسی دوران ہمیں آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر ملی اور ہمیں کچھ بھی نہیں دیا گیا پھر جب حضرت ابوبکر صدیقؓ (خلیفہ اول قرار پائے اور خطبہ دینے کے لئے آ کھڑے ہوئے تو) فرمایا کہ جس شخص سے رسول کریم ﷺ نے کچھ دینے کا وعدہ فرمایا ہو اس کو چاہئے کہ وہ ہمارے پاس آئے۔ میں (حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ ارشاد سن کے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ان کو اس بارے میں بتایا کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں تیرہ اونٹنیاں دینے کا وعدہ فرمایا تھا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ہمیں تیرہ اونٹنیاں دینے کا حکم فرمایا۔" (ترمذیؒ)

ایفاء عہد کی عملی تعلیم

(۳) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِي الْحَمْسَاءِ قَالَ بَايَعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ يُبْعَثَ وَبَقِيَتْ لَهُ بَقِيَّةٌ فَوَعَدْتُهُ اَنْ اٰتِيَهُ بِهَا فِيْ مَكَانِهِ فَنَسِيْتُ فَذَكَرْتُ بَعْدَ ثَلٰثٍ فَاِذَا هُوَ فِيْ مَكَانِهِ فَقَالَ لَقَدْ شَقَقْتَ عَلَيَّ اَنَا هٰهُنَا مُنْذُ ثَلٰثٍ اَنْتَظِرُكَ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن ابو حسماءؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے نبی ہونے سے پہلے ایک مرتبہ میں نے آپ سے کسی چیز کو خریدا اور اس کے کچھ حصہ کی ادائیگی مجھ پر باقی رہ گئی اور میں نے وعدہ کیا کہ میں بقیہ قیمت لے کر اسی جگہ (جہاں آپ تشریف فرما تھے یا جہاں میں نے وہ چیز

خریدی تھی) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گا لیکن میں اس وعدہ کو بھول گیا اور پھر تیسرے دن یہ بات یاد آئی کہ میں نے آپ ﷺ سے کوئی وعدہ کیا تھا جبھی میں وہ بقیہ قیمت لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ اسی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں اور مجھے دیکھ کر فرمایا کو تم نے تو مجھ کو بڑی زحمت میں مبتلا کر دیا میں تین دن سے اسی جگہ بیٹھا ہوا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اتنے طویل انتظار کی اس مشقت و زحمت کو برداشت کرنا اپنی چیز کی بقیہ قیمت وصول کرنے کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ اس احساس کے تحت تھا کہ جب عبداللہؓ نے بقیہ قیمت لے کر یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا اور ان کے وعدے کے جواب میں گویا میری طرف سے بھی یہ وعدہ تھا کہ میں یہاں ہوں گا تو جب تک وہ یہاں نہ آئیں ایفاء وعدہ کی خاطر مجھے یہاں بیٹھ کر انتظار کرنا چاہئے اس اعتبار سے آپ ﷺ نے اپنے اس عمل کے ذریعہ اُمت کو یہ تعلیم دی کہ وعدہ کو بہر صورت پورا کرنا چاہئے خواہ اس کے لئے کتنی ہی زحمت کیوں نہ برداشت کرنا پڑے واضح رہے کہ دین اسلام سے پہلے بھی تمام ادیان میں وعدے کو پورا کرنے کا حکم تھا اور سارے رسول پیغمبر ایفاء وعدہ کی محافظت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح و تعریف میں یوں فرمایا ہے۔ وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى۔

ایفاء وعدہ کی نیت ہو اور وہ وعدہ پورا نہ ہو سکے تو گناہ نہیں ہوگا

④ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ اَخَاهُ وَمِنْ نِيَّتِهٖ اَنْ يَفِيَ لَهٗ فَلَمْ يَفِ وَلَمْ يَجِئْ لِلْمِيْعَادِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب کوئی آدمی اپنے کسی بھائی سے کوئی وعدہ کرے اور اس کے تئیں اس وعدہ کو پورا کرنے کا قصد رکھتا ہو مگر کسی عذر کے سبب اس وعدہ کو پورا نہ کر سکے اور وقت موعود پر نہ آئے تو گنہ گار نہیں ہوگا۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص وعدہ کو پورا کرنے کی نیت رکھنے کے باوجود اس وعدہ کو پورا نہ کر سکے تو وہ گنہ گار نہیں ہوتا اس سے یہ بات بھی سمجھی جاتی ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی وعدہ کیا اور نیت یہ رکھی کہ اس وعدہ کو پورا نہیں کروں گا تو وہ گنہ گار ہوگا خواہ اس وعدے کو پورا کرے یا پورا نہ کرے کیونکہ زبان سے وعدہ کرنا اور دل میں اس کے خلاف کرنے کا ارادہ رکھنا منافقین کی خصلت ہے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ بغیر کسی اور بلا کسی امر مانع کے وعدہ خلافی کرنا حرام ہے اور مذکورہ بالا ارشاد گرامی کی مراد بھی یہی ہے مجمع البحار میں لکھا ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ممنوع کام کا وعدہ کرے تو اس وعدہ کو پورا نہیں کرنا چاہئے۔

ایفاء وعدہ واجب ہے یا مستحب؟: آئمہ فقہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے یا مستحب؟ چنانچہ جمہور علماء بشمول حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعی کا قول یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا مستحب ہے اور پورا نہ کرنا سخت مکروہ ہے۔ البتہ گناہ نہیں اس کے برخلاف ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بھی اسی جماعت میں شامل ہیں۔

منقول ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا معمول تھا کہ جب کوئی وعدہ کرتے تو انشاء اللہ کہہ لیتے تھے اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ لفظ عسی فرماتے تھے۔

بچے سے بھی وعدہ کرو تو اس کو پورا کرو

⑤ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَامِرٍ قَالَ دَعَتْنِيْ اُمِّيْ يَوْمًا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ فِيْ بَيْتِنَا فَقَالَتْ هَا تَعَالَ

أُعْطِيْكَ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَرَدْتِ اَنْ تُعْطِيْهِ قَالَ اَرَدْتُ اَنْ اُعْطِيَهٗ تَمْرًا فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا اِنَّكِ لَوْلَمْ تُعْطِيْهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كَذْبَةٌ۔ (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عبداللہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میری والدہ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ لو آؤ! میں تمہیں (ایک چیز) دوں گی اس وقت رسول کریم ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے (جب میری والدہ نے مجھ سے کہا تو) رسول کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے اس کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کو ایک کھجور دینا چاہتی تھی رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) ان سے فرمایا کہ یاد رکھو اگر تم اس کو کچھ نہ دیتیں تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔" (ابوداؤدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: یہ واقعہ حضرت عبداللہ ابن عامرؓ کے بچپن کا ہے چنانچہ ان کی والدہ نے ان کو بلایا اور کوئی چیز دینے کا وعدہ کیا تو آنحضرت ﷺ یہ سمجھے کہ اپنے بچے کو محض بہلانے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کی جاتی ہیں اس کو اس کی مطلوبہ چیز یا کچھ اور دینے کا جھوٹ موٹ وعدہ کیا جاتا ہے یا اس کو ڈرانے دھمکانے کے لئے خوفناک چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور موقع پر ان باتوں کا حقیقی مفہوم مراد نہیں ہوتا لہٰذا آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کی والدہ کو اس بارے میں آگاہ کرنے کے لئے مذکورہ سوال کیا۔

کسی شرعی اور حقیقی عذر کی بناء پر وعدہ خلافی کرنا نامناسب نہیں

⑥ عَنْ زَيْدِ ابْنِ اَرْقَمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ وَعَدَ رَجُلًا فَلَمْ يَاْتِ اَحَدُهُمَا اِلٰى وَقْتِ الصَّلٰوةِ ذَهَبَ الَّذِيْ جَاۤءَ لِيُصَلِّيَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔ (رواہ رزین)

"حضرت زید ابن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی آدمی سے کہیں ملنے کا وعدہ کرے اور ان دونوں میں سے کوئی ایک نماز کے وقت تک وہاں نہ پہنچے اور وہ شخص نماز پڑھنے کے لئے چلا جائے جو وہاں آگیا تھا تو وہ گنہگار نہیں ہوگا۔" (رزینؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کی صورت وضاحت یہ ہے کہ مثلاً دو آدمیوں نے اپنے آپس میں ایک دوسرے سے یہ وعدہ کیا کہ ہم دونوں فلاں جگہ پہنچ کر ایک دوسرے سے ملیں گے اس وعدہ کے مطابق ان دونوں میں سے کوئی ایک مقررہ جگہ پر پہنچ کر دوسرے آدمی کی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اب مزید انتظار نہ کرے اور نماز کے لئے چلا جائے تو وہ وعدہ خلاف نہیں کہلائے گا اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا کیونکہ نماز کے لئے جانا ضرورت دین میں سے ہے ہاں اگر وہ نماز کا وقت آنے سے پہلے ہی وہاں سے اٹھ کر چلا جائے تو بیشک اس کو وعدہ خلاف کہا جائے گا اور وعدہ خلافی کی برائی اس کے ذمہ ہوگی اسی طرح اگر کوئی ضروری امر مانع پیش آئے جیسے کھانے پینے کا وقت ہو گیا ہو یا پیشاب و پاخانہ کی حاجت لاحق ہو گئی ہو یا اسی طرح کا کوئی اور حقیقی عذر پیش آگیا ہو تو اس صورت میں بھی مزید انتظار کئے بغیر پہلے جانا جائز ہوگا۔

بَابُ الْمِزَاحِ
خوش طبعی کا بیان

مِزَاحٌ میم کے زیر کے ساتھ مصدر ہے جس کے معنی ہیں خوش طبعی کرنا، ہنسی مذاق کرنا اور میم کے پیش کے ساتھ یعنی مُزَاحٌ اسم مصدر ہے جس کے معنی مطایبہ یعنی خوش طبعی و ظرافت کے ہیں۔

عربی میں لفظ مزاح کا اطلاق اس خوش طبعی اور ہنسی مذاق پر ہوتا ہے جس میں کسی کی دل شکنی اور ایذاء رسانی کا پہلو نہ ہو اس کے برخلاف جس خوش طبعی اور ہنسی مذاق کا تعلق دل شکنی اور ایذاء رسانی سے ہو اس کو سخریہ کہتے ہیں۔

ایک حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ لا تمار اخاک ولا تمازحہ یعنی اپنے مسلمان بھائی سے جھگڑا فساد نہ کرو، اور نہ اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرو تو علماء لکھتے ہیں کہ وہ مزاح وظرافت ممنوع ہے جس میں حد سے تجاوز کیا جائے اور اس کو عادت بنالیا جائے کیونکہ ہروقت مزاح وظرافت میں مبتلا رہنا اور اس میں حد سے تجاوز کرنا بہت زیادہ ہنسنے اور قہقہہ لگانے کا باعث ہوتا ہے، قلب وذہن کو قساوت اور بے حسی میں مبتلا کر دیتا ہے ذکر الہٰی سے غافل کر دیتا ہے مہمات دین میں غور وفکر اور پیش قدمی سے باز رکھتا ہے اور اکثر اوقات اس کا انجام ایذا رسانی اور آپس میں بغض وعناد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص ہروقت ہنسی مذاق کرتا رہتا ہے اس کی شخصیت بری طرح متاثر اور مجروح ہو جاتی ہے کہ نہ اس کا کوئی دبدبہ قائم رہتا ہے اور نہ اس کو عظمت اور اس کا وقار باقی رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو مزاح وظرافت، حد کے اندر اور کبھی کبھار ہو وہ نہ صرف مباح ہے بلکہ صحت مزاج اور وفور نشاط اور سلامت طبع کی علامت بھی ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ بھی مزاح وظرافت کو اختیار فرماتے تھے جس سے آپ ﷺ کا مقصد مخاطب کی دل بستگی وخوش وقتی اور آپس میں محبت وموانست کے جذبات کو مستحکم کرنا ہوتا تھا اور یہ چیز سنت مستحبہ ہے اور اگر اس موقع پر یہ اشکال واقع ہو کہ یہ بات کہ وہی مزاح وظرافت مباح ہے جو کبھی کبھار ہو۔ اس روایت کے مخالف ہے جس میں حضرت عبداللہ ابن حارث نے بیان کیا ہے کہ ما رایت احدا اکثر مزاحا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی میں نے رسول کریم ﷺ سے زیادہ مزاح کرنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا تو اس کا جواب مختصر طور پر یہ ہوگا کہ زیادہ مزاح وظرافت کرنے کی ممانعت اس وجہ سے ہے کہ اس سے نفس پر قابو نہیں رہتا اور ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے برابر کوئی اور شخص اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتا لہٰذا یہ چیز (زیادہ مزاح کرنا) ان امور میں سے ہے جو صرف آنحضرت ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں اور دوسروں کے لئے ان سے اجتناب ہی اولی ہے اس کی تائید ترمذی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو آگے آئے گی کہ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) ہمارے ساتھ مزاح فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں مزاح میں سچ کہتا ہوں۔ حاصل یہ کہ زیادہ مزاح کرنے کی ممانعت کا تعلق آنحضرت ﷺ کے سوا دوسرے لوگوں سے ہے ہاں اگر کوئی شخص حد پر قائم رہے نفس پر قابو رکھے اور راہ اعتدال سے منحرف نہ ہونے پر قادر ہو وہ بھی اس ممانعت سے مستثنیٰ ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی خوش طبعی

(۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُخَالِطُنَا حَتّٰى يَقُوْلَ لِاَخٍ لِيْ صَغِيْرٍ يَا اَبَا عُمَيْرٍ مَافَعَلَ النُّغَيْرُ ، وَكَانَ لَهٗ نُغَيْرٌ يَلْعَبُ بِهٖ فَمَاتَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انس کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہم سے اختلاط وخوش طبعی فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ میرے چھوٹے بھائی سے از راہ مذاق فرماتے ابو عمیر! نغیر کہاں گیا؟ حضرت انس کہتے ہیں میرے اس چھوٹے بھائی کے پاس ایک نغیر تھا جس سے وہ کھیلا کرتا تھا اور جو مر گیا تھا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حضرت انس نے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کیا ہے ان کا نام کبشہ تھا اور وہ ان کے اخیافی یعنی ماں شریک بھائی تھے ان کے باپ کا نام ابوطلحہ زید ابن سہیل انصاری تھا۔

"نُغَیْر" تصغیر ہے نُغَرْ کی جو ایک چھوٹے پرندے کا نام ہے اور چھوٹی چڑیا کی طرح ہوتا ہے اور اس کی چونچ سرخ ہوتی ہے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ وہ پرندہ چڑیا کی طرح سرخ سر والا ہوتا ہے نیز بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اہل مدینہ اس پرندے کو بلبل کہتے تھے ہو سکتا ہے کہ یہ وہی پرندہ ہو جس کو ہمارے ہاں لال کہتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی کبشہ اس پرندے کو لیکر آنحضرت ﷺ کے پاس آتے تھے جیسا کہ چھوٹے بچوں کو جب کوئی چڑیا وغیرہ مل جاتی ہے تو اس کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں۔ اور اس کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں پھر ایک دن اچانک وہ پرندہ مرگیا اس کے بعد جب وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ ﷺ ان کو ازراہ مذاق چھیڑتے اور پوچھتے کہ ارے ابو عمیر تمہارا نغیر کیا ہوا؟ گویا ان کو مخاطب کرتے وقت ظرافت کے ساتھ تفنن کلام کا اسلوب بھی اختیار فرماتے یعنی نغیر کی مناسبت سے اور اس لفظ کے قافیہ کے طور پر ان کو ابو عمیر کی کنیت کے ذریعہ مخاطب فرماتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچوں کو چڑیا وغیرہ سے دل بہلانا اور ان کے ساتھ کھیل کود کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کو تکلیف وایذاء نہ پہنچائیں نیز اس سے معلوم ہوا کہ کسی چھوٹے اور کمسن بچے کی کنیت مقرر کرنا جائز ہے اور یہ جھوٹ میں داخل نہیں ہے نیک فالی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

آنحضرت ﷺ کا ہنسی مذاق بھی جھوٹ پر مبنی نہیں ہوتا تھا

② عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ تُدَاعِبُنَا قَالَ اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! آپ ہم سے خوش طبعی فرماتے ہیں. آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ہاں لیکن اس خوش طبعی میں بھی میں سچی بات کہتا ہوں۔" (ترمذی)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو زیادہ ہنسی مذاق کرنے سے منع فرمایا تو اس کے بعد انہوں نے مذکورہ سوال کیا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کو جواب دیا کہ ہنسی مذاق کی ممانعت اس بنا پر ہے کہ اس میں عام طور پر جھوٹی باتوں اور غیر شرعی امور کا ارتکاب ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ تم میں سے کوئی بھی شخص اس پر قادر نہیں ہے کہ اس کا ہنسی مذاق جھوٹ اور لایعنی باتوں سے کلیۃً پاک ہو، کیونکہ تم کو معصوم نہیں بنایا گیا ہے لیکن حق تعالیٰ نے مجھ کو معصوم بنایا ہے اور مجھے اس بات پر قادر کیا ہے کہ میرے کسی بھی ہنسی مذاق کی بات میں جھوٹ کی آمیزش ہو وہ ناجائز ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی بھی ایسا مزاح نہیں فرماتے تھے جس میں جھوٹ اور لچریات کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو اور اگر ہنسی مذاق کی کوئی بات حقیقت کے اعتبار سے جھوٹ پر مبنی نہ ہو تو وہ جائز ہے لیکن اس کے باوجود ہنسی مذاق اور ظرافت کو عادت نہ بنالینا چاہئے کیوں کہ اس کی وجہ سے دبدبہ اور وقار ختم ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی ظرافت کا ایک واقعہ

③ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا اسْتَحْمَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ حَامِلُكَ عَلٰی وَلَدِ نَاقَةٍ فَقَالَ مَا اَصْنَعُ بِوَلَدِ النَّاقَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهَلْ تَلِدُ الْاِبِلَ اِلَّا النُّوْقُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے سواری کا ایک جانور مانگا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہاری سواری کے لئے اونٹنی کا بچہ دوں گا اس شخص نے (حیرت کے ساتھ) کہا یارسول اللہ (ﷺ)! میں اونٹنی کے بچہ کا کیا کروں گا؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اونٹ کو اونٹنی ہی تو جنتی ہے؟۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: اس شخص نے یہ سمجھا تھا کہ اونٹنی کے بچہ سے مراد وہ چھوٹا بچہ ہے جو سواری کے قابل نہیں ہوتا لیکن آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ سواری کے قابل جو اونٹ ہوتا ہے وہ بچہ تو اونٹنی ہی کا ہوتا ہے لہذا آنحضرت ﷺ نے اس شخص کی طلب پر مذکورہ ارشاد بطور خوش طبعی فرمایا اور پھر اس کی حیرت پر جو جواب دیا اس کے ذریعہ نہ صرف حقیقت مفہوم کو ادا کیا بلکہ اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اگر

تم تھوڑی سی عقل سے کام لیتے اور میری بات کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو اس حیرت میں نہ پڑتے اور حقیقی مفہوم کو خود سمجھ لیتے لہٰذا اس ارشاد میں نرمی ظرافت ہی نہیں ہے بلکہ اس امر کی طرف متوجہ کرنا بھی مقصود ہے کہ سننے والے کو چاہئے کہ وہ اس بات میں غور و تأمل کرے جو اس سے کہی گئی ہے اور بغیر سوچے سمجھے سوال و جواب نہ کرے بلکہ پہلے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے اور غور و فکر کے بعد آگے بڑھے۔

تعریف پر مشتمل خوش طبعی

④ وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ يَاذَا الْاُذُنَيْنِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا اے دو کانوں والے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے حضرت انسؓ کو دو کانوں والے کے ذریعہ جو مخاطب فرمایا تو اس میں خوش طبعی و ظرافت بھی تھی اور ان کے تئیں اس تعریف و توصیف کا اظہار بھی مقصود تھا کہ تم نہایت فہیم و ذکی ہو اور تم سے جو بات کہی جاتی ہے اس کو تم خوب اچھی طرح سنتے ہو۔

ایک بڑھیا کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خوش طبعی

⑤ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِامْرَاَةٍ عَجُوْزٍ اَنَّهٗ لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ فَقَالَتْ وَمَا لَهُنَّ وَكَانَتْ تَقْرَاُ الْقُرْاٰنَ فَقَالَ لَهَا اَمَا تَقْرَئِيْنَ الْقُرْاٰنَ اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔ رَوَاهُ رَزِيْنٌ وَفِي شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ۔

"اور انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن ایک بوڑھی عورت نے جب آپ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ میرے جنت میں جانے کی دعا فرمائیں تو اس سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہوگی وہ عورت قرآن پڑھی ہوئی تھی آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم نے قرآن میں یہ نہیں پڑھا ہے کہ اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ط یعنی ہم جنت کی عورتوں کو پیدا کریں گے جیسا کہ پیدا کیا جاتا ہے پس ہم ان کو کنواری بنادیں گے اس اعتبار سے یہ خوش طبعی مبنی بر حقیقت تھی اور آپ کا یہ فرمانا درست ہوا کہ یہ بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی کیونکہ واقعۃً کوئی عورت اپنے بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گی اس روایت کو رزین نے مذکورہ الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے اور بغوی نے اپنی دوسری کتاب شرح السنۃ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے جو مصابیح میں مذکور ہیں۔"

تشریح: مصابیح میں اس روایت کو جن الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے وہ یوں ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت سے فرمایا کہ بوڑھی عورتیں جنت میں داخل نہیں ہوں گی یہ سن کر وہ عورت واپس ہوئی اور روتی ہوئی چلی گئی آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس عورت کو جاکر بتادو عورتیں اپنے بڑھاپے کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہونگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔

خوش طبعی کا ایک واقعہ

⑥ وَعَنْهُ اَنَّ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ كَانَ اسْمُهٗ زَاهِرَ بْنَ حَرَامٍ وَكَانَ يُهْدِيْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْبَادِيَةِ فَيُجَهِّزُهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَخْرُجَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ زَاهِرًا بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْهُ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّهٗ وَكَانَ رَجُلًا دَمِيْمًا فَاَتَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا وَهُوَ يَبِيْعُ مَتَاعَهٗ فَاحْتَضَنَهٗ مِنْ خَلْفِهٖ وَهُوَ لَا يُبْصِرُهٗ فَقَالَ اَرْسِلْنِيْ مَنْ هٰذَا فَالْتَفَتَ فَعَرَفَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فَجَعَلَ لَا یَاْلُوْا مَا اَلْزَقَ ظَھْرَہٗ بِصَدْرِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ عَرَفَہٗ وَجَعَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ یَّشْتَرِی الْعَبْدَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِذًا وَاللّٰہِ تَجِدُنِیْ کَاسِدًا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لٰکِنْ عِنْدَ اللّٰہِ لَسْتَ بِکَاسِدٍ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ شہر سے باہر کا رہنے والا ایک شخص جس کا نام زاہر بن حرام ؓ تھا۔ نبی کریم ﷺ کے لئے بطور ہدیہ شہر کے باہر سے کچھ لایا کرتا تھا (یعنی ایسی چیزیں جو شہر سے باہر جنگل میں پیدا ہوتی ہیں، جیسے ساگ، سبزی، لکڑی اور پھول پھل وغیرہ) اور جب وہ مدینہ سے باہر (اپنی جائے سکونت کو) جانے لگتا تو رسول کریم ﷺ اس کے ساتھ شہر کا کچھ سامان کر دیا کرتے تھے نبی کریم ﷺ (اس کے بارے میں فرماتے) کہ زاہر ؓ ہمارا باہر کا گماشتہ ہے کہ وہ ہمارے لئے باہر کی چیزیں لاتا ہے اور ہم اس کے شہر کے گماشتہ ہیں کہ ہم اس کو شہر کی چیزیں دیتے ہیں نیز نبی کریم ﷺ زاہر ؓ سے بہت محبت و تعلق رکھتے تھے ویسے وہ ایک بد صورت شخص تھا ایک دن نبی کریم ﷺ (بازار میں) تشریف لے گئے تو (دیکھا کہ) وہ اپنا سودا سلف بیچ رہا ہے آپ ﷺ نے پیچھے سے اس کی اس طرح کولی بھرلی کہ وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہیں سکتا تھا (یعنی آپ ﷺ نے اس کی بے خبری میں اس کے پیچھے بیٹھ گئے اور اپنے ہاتھ اس کی دونوں بغلوں کے نیچے سے نکال کر اس کی آنکھیں چھپالیں تاکہ وہ پہچان نہ سکے) زاہر ؓ نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو یہ شخص کون ہے؟ پھر (اس نے کوشش کر کے) کن آنکھیوں سے دیکھا اور نبی کریم ﷺ کو پہچان گیا پھر تو وہ آپ ﷺ کو پہچاننے کے بعد اپنی پیٹھ کو نبی کریم ﷺ کے سینہ مبارک سے چمٹانے کی پوری کوشش کرنے لگا تاکہ زیادہ سے زیادہ برکت حاصل کرے زاہر نبی کریم ﷺ نے یہ آواز لگانی شروع کر دی کہ کون شخص ہے جو اس غلام کا خریدار ہے؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! خدا کی قسم آپ ﷺ مجھ کو ناکارہ پائیں گے (یعنی بالکل سستا اور بے کار مال) نبی کریم ﷺ نے فرمایا لیکن تم خدا کے نزدیک ناکارہ نہیں ہو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے زاہر کو از راہ مذاق غلام سے تعبیر کیا اور حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی جھوٹ بات نہیں تھی کیوں کہ وہ اللہ کا غلام بہر حال تھے ہی۔

کسی چیز کو بطور فروخت کرنے کے لئے بطور استفہام یہ کہنا کہ کون شخص ہے جو اس کو خریدتا ہے مفہوم کے اعتبار سے کبھی تو اس چیز کی پیش قیمت حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے مقابلہ آرائی پر اطلاق کیا جاتا ہے اور کبھی اس کا اطلاق استبدال پر آتا ہے، لہٰذا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد "کون شخص ہے جو اس غلام کا خریدار ہے" کا مطلب یہ تھا کہ اس بازار میں ایسا کوئی شخص ہے جو اس غلام کی قدر و قیمت اور اس کی حیثیت کا مقابلہ کرے؟ یعنی یہاں کوئی چیز اس کی حیثیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یا یہ کہ ایسا کوئی شخص ہے جو اس غلام کی قیمت لگا دے اور ایسی کوئی چیز مجھے دے سکے جس کے بدلے میں اس کو یہ غلام دے سکوں یعنی یہاں کا کوئی مال اس کا بدل نہیں ہو سکتا اور کوئی چیز اس کی قیمت نہیں بن سکتی! نیز یہ بھی ممکن ہے آپ ﷺ کا یہ ارشاد تجرید کے قبیل سے ہو جس سے گویا آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ کون شخص ہے جو اس غلام کو حاصل کرے یعنی ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو اس غلام کو حاصل کرنے اور اس کو اپنے پاس رکھنے کا اہل ہو۔

آنحضرت ﷺ کی صحابہ ؓ سے بے تکلفی

⑦ وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِکِ الْاَشْجَعِیِّ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ غَزْوَۃِ تَبُوْکَ وَھُوَ فِیْ قُبَّۃٍ مِنْ اَدَمٍ فَسَلَّمْتُ فَرَدَّ عَلَیَّ فَقَالَ ادْخُلْ فَقُلْتُ اَکُلِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ کُلُّکَ فَدَخَلْتُ قَالَ عُثْمَانُ بْنُ اَبِی الْعَاتِکَۃِ اِنَّمَا قَالَ اَدْخُلُ کُلِّیْ مِنْ صِغَرِ الْقُبَّۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عوف ابن مالک اشجعی ؓ کہتے ہیں کہ غزوہ تبوک کے دوران ایک دن میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ چمڑے کے خیمہ میں تشریف فرما تھے میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اندر آجاؤ میں

نے مزاح کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں سب کا سب اندر آجاؤں یعنی سارے جسم کو اندر لے آؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں سب بدن کو اندر لے آؤ چنانچہ میں خیمہ کے اندر داخل ہو گیا حضرت عثمانؓ ابن ابو عاتکہ (جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ حضرت عوفؓ نے یہ بات کہ کیا میں سب کا سب اندر آجاؤں اس مناسبت سے کہی تھی کہ خیمہ چھوٹا تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہؓ کے ساتھ اس طرح محبت و شفقت کا تعلق رکھتے تھے کہ صحابہؓ آپ ﷺ کے ساتھ بے تکلف ہو جاتے تھے اور اس بے تکلفی کے موقع پر آپ ﷺ سے ظریفانہ بات بھی کر لیتے تھے۔

(۸) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ اسْتَأْذَنَ اَبُوْبَكْرٍ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ صَوْتَ عَائِشَةَ عَالِيًا فَلَمَّا دَخَلَ تَنَاوَلَهَا لِيَلْطِمَهَا وَقَالَ لَا اَرَاكِ تَرْفَعِيْنَ صَوْتَكِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْجُزُهُ وَخَرَجَ اَبُوْبَكْرٍ مُغْضَبًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ خَرَجَ اَبُوْبَكْرٍ وَكَيْفَ رَاَيْتِنِيْ اَنْقَذْتُكِ مِنَ الرَّجُلِ قَالَتْ فَمَكَثَ اَبُوْبَكْرٍ اَيَّامًا ثُمَّ اسْتَأْذَنَ فَوَجَدَهُمَا قَدِ اصْطَلَحَا فَقَالَ لَهُمَا اَدْخِلَانِيْ فِيْ سِلْمِكُمَا كَمَا اَدْخَلْتُمَانِيْ فِيْ حَرْبِكُمَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ فَعَلْنَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے دروازے پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ سے گھر آنے کی اجازت طلب کی جبھی انہوں نے حضرت عائشہؓ کی آواز کو سنا جو ذرا زور سے بول رہی تھیں پھر جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے حضرت عائشہؓ کا ہاتھ پکڑا اور طمانچہ مارنے کا ارادہ کیا اور کہا کہ خبردار آئندہ میں تمہیں رسول کریم ﷺ کی آواز سے اونچی آواز میں بولتے ہوئے نہ دیکھوں ادھر نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو (حضرت عائشہؓ کو مارنے سے) روکنا شروع کیا اور پھر حضرت ابوبکرؓ غصہ کی حالت میں نکل کر چلے گئے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے چلے جانے کے بعد (حضرت عائشہؓ سے) فرمایا کہ تم نے دیکھا میں نے تمہیں اس آدمی یعنی ابوبکرؓ کے ہاتھ سے کس طرح بچالیا؟ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (اس کے بعد) حضرت ابوبکرؓ (مجھ سے خفگی کی بنا پر یا آنحضرت ﷺ سے شرمندگی کی وجہ سے) کئی دن تک آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نہیں آئے پھر ایک دن انہوں نے دروازے پر حاضر ہو کر اندر آنے کی اجازت مانگی اور اندر آئے تو دیکھا کہ دونوں (آنحضرت ﷺ اور عائشہؓ) صلح کی حالت میں ہیں انہوں نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تم دونوں مجھ کو اپنی صلح میں شریک کر لو جس طرح تم نے مجھ کو اپنی لڑائی میں شریک کیا تھا، آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا بے شک ہم نے ایسا ہی کیا بے شک ہم نے ایسا ہی کیا یعنی تمہیں اپنی صلح میں شریک کر لیا (گویا آپ ﷺ نے اپنی بات مؤکد کرنے کے لئے یہ جملہ دو مرتبہ فرمالیا)۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کا وہ جملہ بطور مزاح تھا جو آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا کہ دیکھا میں نے تمہیں اس شخص کے ہاتھ سے کس طرح نجات دلائی گویا آپ ﷺ نے "تمہارے باپ" کہنے کی بجائے "اس شخص" کہہ کر بقصد مزاح حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عائشہؓ کے حق میں اجنبی قرار دیا۔

ایسا مذاق نہ کرو جس سے ایذاء پہنچے

(۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم اپنے مسلمان بھائی سے جھگڑا نہ کرو، نہ اس سے ایسا مذاق کرو (جس سے اس کو تکلیف پہنچے) اور نہ ایسا وعدہ کرو۔ جس کو پورا نہ کر سکو۔ (حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لا تعدہ موعدا فتخلفہ کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ تم وعدہ نہ کرو جیسا کہ وعدہ کیا جاتا ہے تاکہ تم وعدہ خلافی نہ کرو یعنی اگر وعدہ کرو تو اس کو پورا کر دیا پھر سرے

سے وعدہ ہی نہ کرو اور وعدہ کا راستہ ہی بند کر دو تا کہ وعدہ خلافی کے وبال میں پڑنے کا تمہیں خوف ہی نہ رہے۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

بَابُ الْمُفَاخِرَةِ وَالْعَصَبِيَّةِ

مفاخرت اور عصبیت کا بیان

فَخْرٌ یا فَخَارَۃٌ کے معنی ہیں اترانا یعنی اپنے حسب و نسب یا اپنے خاندان و قبیلہ یا اپنی قوم و جماعت یا اپنے علم و اخلاق اور یا اپنی مالداری و ثروت وغیرہ پر نازاں ہونا اور فخر کرنا۔ تفاخر کے معنی ہیں کہ ایک دوسرے پر فخر کرنا مفاخرت کے معنی ہیں فخر میں ایک دوسرے کی برابری کرنا اور افتخار و تفخر کے معنی ایک کو دوسرے کے مقابلہ پر بڑھانا۔

مفاخرت یعنی اظہار فخر کرنا اور نازاں ہونا اگر حق کے معاملہ میں ہو، حق کی خاطر ہو کسی دینی مصلحت کے پیش نظر ہو اور دشمنان اسلام پر اپنی برتری، اپنی شان و شوکت اور اپنی قوت کے اظہار کے طور پر ہو تو جائز ہے چنانچہ اس طرح کی مفاخرت صحابہؓ اور سلف سے منقول ہے ور اگر مفاخرت کا تعلق ناحق معاملہ سے ہو اور نفسانیت کے تحت تکبر و غرور اور گھمنڈ کے طور پر ہو تو مذموم ہے اور عرف عام میں مفاخرت کا استعمال اکثر اسی معنی میں ہوتا ہے۔

عصبیت کے معنی ہیں عصبی یا متعصب ہونا یعنی اپنے مذہب یا اپنے خیال کی پچ کرنا اور اپنی قوم کی قوت و سختی کے اظہار کے لئے جدل و خصومت کرنا، چنانچہ عصبہ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی بات یا اپنی قوم کی حمایت کرے اور یا اپنی قوم و جماعت کی پچ کے لئے غصہ ہو تعصب بھی اگر حق کے معاملہ میں ہو اور ظلم و تعدی کے ساتھ نہ ہو تو مستحسن ہے اور اگر تعصب کا تعلق حق بات کو نہ ماننے، ظلم و تعدی اختیار کرنے اور اپنی قوت و شان و شوکت کے بیجا اظہار کی خاطر ہو تو مذموم ہے عام طور پر تعصب کا اطلاق اپنی بات و خیال اور اپنے مذہب قوم کے حق میں ناروا سختی اختیار کرنے اور دوسروں کے تئیں ظلم و تعدی کرنے پر ہوتا ہے جیسا کہ اس باب میں نقل کی جانے والی احادیث سے معلوم ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خاندانی و ذاتی شرافت کا حسن، علم دین سے ہے

① عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّ النَّاسِ اَكْرَمُ فَقَالَ اَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَنْ هٰذَا نَسْئَلُكَ قَالَ فَاَكْرَمُ النَّاسِ یُوْسُفُ نَبِیُّ اللّٰهِ بْنُ نَبِیِّ اللّٰهِ نَبِیِّ اللّٰهِ ابْنِ خَلِیْلِ اللّٰهِ قَالُوْا لَیْسَ عَنْ هٰذَا نَسْئَلُكَ قَالَ فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْاَلُوْنِیْ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ فَخِیَارُكُمْ فِی الْجَاهِلِیَّةِ خِیَارُكُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون شخص زیادہ معزز و مکرم ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار و متقی ہے۔ یعنی اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ خاندانی عظمت باپ دادا کی بڑائی اور اپنے فضائل و اچھی عادات سے قطع نظر ذاتی بزرگی و کرامت کیا چیز ہے تو جان لو کہ وہ تقویٰ ہے لہٰذا جو شخص لوگوں میں سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہے وہی سب سے زیادہ معزز و مکرم ہے خواہ وہ اپنے حسب و نسب، خاندانی عظمت و وجاہت اور اپنے اوصاف و خصائل کے اعتبار سے کمتر ہو یا برتر صحابہؓ نے عرض کیا آپ ﷺ سے ہمارے سوال کا مطلب یہ نہیں ہے

آنحضرت ﷺ نے فرمایا (اگر تم ذاتی بزرگی و کرامت کے بارے میں نہیں پوچھ رہے ہو بلکہ حسب و نسب کی بزرگی اور شرافت کے بارے میں پوچھ رہے ہو تو اس اعتبار سے) انسانوں میں سب سے زیادہ شریف و بزرگ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جو خدا کے نبی (حضرت یعقوب علیہ السلام) کے بیٹے، خدا کے نبی (حضرت اسحٰق علیہ السلام) کے پوتے اور خدا کے دوست (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کے پڑپوتے ہیں (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام میں کئی طرح کی شرافت و بزرگیاں جمع ہیں کہ خود بھی نبی ہیں اور ان تین پشتوں میں نبوت رہی ہے ان کے پردادا کو خلیل اللہ کا لقب ملا ہے کہ اللہ نے ان کو خالص دوست قرار دیا ہے پھر وہ علم و دانائی، حسن و جمال، عفو و کرم اخلاق و احسان، عدل و انصاف اور دینی و دنیاوی سرداری و حکمرانی کے اوصاف سے بھی متصف تھے لہٰذا اس اعتبار سے وہ انسانوں میں سب سے بزرگ و شریف انسان تھے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ سے ہمارے سوال کا یہ مطلب بھی نہیں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا تو کیا تم عربوں کی خاندانی شرافت اور ذات و حسب کی اعلیٰ خصوصیات کے اعتبار سے پوچھ رہے ہو؟ کہ اہل عرب جو اپنے اور باپ دادا کے کارناموں ذاتی بزرگی و عزت اور اس طرح کے اور دوسرے اوصاف کے ذریعہ ایک دوسرے کے سامنے اظہار فخر کرتے ہیں اور اپنی بزرگی و بڑائی کا دعویٰ کرتے ہیں نیز وہ اپنے میں ایک دوسرے کی عزت و شرافت کا معیار تقویٰ اور نسب کے بجائے مذکورہ اوصاف و خصوصیات کو قرار دیتے ہیں تو ان میں واقعۃً سب سے زیادہ معزز و مکرم کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں ہمارے سوال کا مطلب یہی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا (تو سنو) تم میں سے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں سب سے بہتر تھے وہی اسلام میں سب سے بہتر ہیں جبکہ وہ فقیہ ہوں (یعنی تم میں سے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنی خاندانی شرافت، شریف النفسی، بہادری و سرداری اور عمدہ اخلاق و عادات کے اعتبار سے سب سے پسندیدہ اور سب سے بہتر شمار کئے جاتے تھے اسلام کے زمانہ میں بھی وہی لوگ سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے بہتر ہیں بشرطیکہ وہ اسلامی احکام و شرائع کے سمجھنے والے اور دین کا علم حاصل کرنے والے ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے آخری جواب کا مطلب یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں جن لوگوں کی ذات اور شخصیت کی وجہ سے ان کو سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا وہ لوگ اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر زمانہ اسلام میں بھی معزز و مکرم قرار دیئے جائیں گے بشرطیکہ انہوں نے ایمان و اسلام قبول کر کے دین کا علم اور شریعت کے احکام و مسائل حاصل کئے ہوں فرق یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ان پر کفر کا سایہ معصیت کی تاریکی اور جہل کا غبار چھایا ہوا تھا اور خواہش نفس کے دام فریب میں مبتلا تھے اور اس اعتبار سے ان کی ذاتی شرافت و صفات کی کوئی حیثیت نہیں تھی مگر اب ایمان و اسلام کی پاکیزگی اور عبادات و علم دین کے نور نے ان کی ذات و شخصیت کو نکھار دیا ہے ان کی زندگی کو روشن کر دیا ہے اور ان کو حق کا تابعدار بنا دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ "معادن" سے مراد لوگوں کی اپنی ذات و شخصیات ہیں جو عمدہ صفات و اعلیٰ خصوصیات سے متصف ہوں جیسا کہ کتاب العلم میں یہ روایت نقل کی جا چکی ہے کہ الناس معادن کمعادن الذھب و الفضۃ الخ یعنی لوگوں کی بھی کانیں ہوتی ہیں جیسے سونے اور چاندی کی کانیں پس جو خاندان و افراد اپنی اعلیٰ خصوصیات کے اعتبار سے زمانہ جاہلیت میں سب سے بہتر شمار کئے جاتے تھے اسلام کے زمانہ میں بھی وہی سب سے بہتر ہیں بشرطیکہ وہ دین کا علم حاصل کریں۔

سب سے زیادہ مکرم کون ہے

④ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَرِيْمُ بْنُ الْكَرِيْمِ بْنِ الْكَرِيْمِ بْنِ الْكَرِيْمِ يُوْسُفُ بْنُ يَعْقُوْبَ بْنِ اِسْحٰقَ ابْنِ اِبْرَاهِيْمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ حضرت یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق علیہ السلام ابن ابراہیم علیہ السلام ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خاندانی شرافت و عظمت اور نسبی برتری کی جو خصوصیات حضرت یوسف علیہ السلام کو حاصل ہے وہ کسی اور کو

نہیں سب سے بڑا شرف ان کے علاوہ اور کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا کہ وہ خود نبی علیہ السلام تھے ان کے باپ نبی علیہ السلام تھے ان کے دادا نبی تھے اور ان کے پڑدادا نبی علیہ السلام تھے اس خصوصیت کے علاوہ ان کو حسن و جمال، عدل و انصاف، علم و دانائی اور ریاست و حکومت کے جو اوصاف حاصل تھے ان کے اعتبار سے ان کی ذاتی مکرمت کو شرافت کو سب سے برتر مقام حاصل ہے۔

کفار کے مقابلہ پر آنحضرت ﷺ کا اظہار فخر

(۳) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ فِي يَوْمِ حُنَيْنٍ كَانَ اَبُوْسُفْيَانَ بْنُ الْحَارِثِ اٰخِذًا بِعِنَانِ بَغْلَتِهٖ يَعْنِيْ بَغْلَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا غَشِيَهُ الْمُشْرِكُوْنَ نَزَلَ فَجَعَلَ يَقُوْلُ اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ قَالَ فَمَا رُوِيَ مِنَ النَّاسِ يَوْمَئِذٍ اَشَدُّ مِنْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ کہتے تھے کہ غزوہ حنین کے دن ان کے خچر یعنی رسول کریم ﷺ کے خچر کی باگ سفیان ابن حارثؓ نے پکڑ رکھی تھی جو حارث ابن عبدالمطلب کے لڑکے ہونے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی تھے اور عرب کے دلیر، جیالے جوانوں میں ایک بہادر مرد تھے چنانچہ جنگ کے دوران جب آنحضرت ﷺ کو مشرکوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تو آپ ﷺ (اپنے خچر پر سے) اتر پڑے اور یہ رجز فرمانا شروع کیا میں نبی ﷺ ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں اور میں عبدالمطلب کا سپوت ہوں۔ راوی کا بیان ہے کہ پس اس دن آنحضرت ﷺ سے زیادہ بہادر دلیر اور کسی کو نہیں دیکھا گیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی بے مثال شجاعت و جوانمردی پر دلالت کرتی ہے کہ ایک ایسے معرکہ میں جہاں ہوازن و غطفان کے قبائل سمیت عرب کے دوسرے بہت سے جنگجو قبائل برسرپیکار تھے اور انہوں نے اپنی بے پناہ خرابی قوت اور انفرادی طاقت کے ذریعہ اسلامی لشکر پر اتنا زبردست دھاوا بول دیا تھا کہ شکست کی صورت ظاہر ہونے لگی تھی تو آپ ﷺ بھی خچر پر سوار ہو کر مجاہدین اسلام کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے اور اپنے خچر کو ایڑ لگا لگا کر کفار کے لشکر پر حملہ کر رہے تھے۔ اور پھر جب ان دشمنان دین نے آپ ﷺ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور خچر کو آگے بڑھنے کا راستہ نہ مل سکا تو آپ ﷺ اس پر سے اتر پڑے اور پاپیادہ ہو کر بڑی دلیری اور جوان مردی کے ساتھ دشمن کے لشکر پر ضرب لگائی آخر اللہ تعالیٰ نے ان کو شکست سے دوچار کیا اور آنحضرت ﷺ کو فتح نصیب فرمائی۔

اگرچہ آنحضرت ﷺ نے حسب و نسب اور خاندانی وجاہت پر اظہار فخر کرنے اور نازاں ہونے سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ کا بطور رجز یہ فرمانا کہ میں عبدالمطلب کا سپوت ہوں اس طرح کا اظہار فخر نہیں ہے جو ممنوع ہے کیونکہ وہ فخر ممنوع ہے جو نہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق، بیجا اظہار نام و نمود، تعصب و ہٹ دھرمی اور نفس کے گھمنڈ کے طور پر ہو جبکہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ فخر دین کی طاقت اور شان و شوکت بڑھانے اور کفار کے مقابلہ پر اپنا رعب اور دبدبہ ظاہر کرنے کے لئے تھا اور اس طرح کا فخر جائز ہے علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت میں بعض اہل عرب جیسے کاہن اور اہل کتاب آنحضرت ﷺ کی نبوت ظاہر ہونے سے پہلے بعثت نبوی ﷺ کی خبر دیا کرتے تھے اور نبی آخر الزمان ﷺ کی جو نشانیاں اور علامتیں بتایا کرتے تھے ان میں سے ایک نشانی یہ بھی تھی۔ کہ وہ پیغمبر، عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہونگے۔

خیر البریہ کا مصداق

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ اِبْرَاهِيْمُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کو یوں مخاطب کیا اے وہ شخص جو ساری مخلوق میں بہتر ہے آپ ﷺ نے فرمایا وہ شخص جو ساری مخلوق میں بہتر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس موقع پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ تمام انبیاء کے سردار اور ساری مخلوق سے افضل و برتر ہیں تو خیر البریہ یعنی ساری مخلوق میں سب سے بہتر کا مصداق حضرت ابراہیم علیہ السلام کیونکر ہوئے اس کے تین جواب ہیں ایک تو یہ کہ حقیقت کے اعتبار سے تو ساری مخلوق میں سب سے بہتر آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ﷺ ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے ازراہ تواضع و انکسار اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے کہ وہ خلیل اللہ کے دوست اور آپ ﷺ کے جد اعلیٰ ہیں ان کو خیر البریہ کا مصداق قرار دیا جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کوئی شریف النفس اور خلیق انسان تعظیم و تکریم کا خود سب سے زیادہ اہل و مستحق ہونے کے باوجود بسا اوقات کسی دوسرے شخص کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے اور اس کی تعظیم کرتا ہے دوسرے یہ کہ مذکورہ روایت میں لسان نبوت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیر البریہ کا مصداق قرار دیا جانا اُس زمانہ کا واقعہ ہے جبکہ اس وقت تک یہ وحی نازل نہیں ہوئی تھی کہ آپ ﷺ تمام اولاد آدم علیہ السلام سے افضل اور ساری مخلوق میں سب سے بہتر ہیں اور تیسرے یہ کہ مذکورہ ارشاد گرامی کی مراد یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ میں ساری مخلوق سے بہتر و برتر تھے اور آپ ﷺ نے اس بات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کی خاطر مطلق الفاظ ارشاد فرماتے۔

آپ ﷺ کی منقبت و تعریف ایسے الفاظ کے ذریعہ نہ کرو جو مقام نبوت سے بالا ہوں

⑤ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم لوگ میری مدح و تعریف میں حد سے زیادہ تجاوز نہ کرو جس طرح کہ نصاریٰ نے ابن مریم علیہا السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں حد سے تجاوز کیا ہے (کہ ان کو بشریت سے چڑھا کر خدا کا بیٹا کہنے لگے ہیں) میں تو خدا کا بندہ ہوں لہٰذا تم مجھ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عبودیت اور بندگی کا جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے وہ آنحضرت ﷺ کی مخصوص صفت ہے کہ بندہ حقیقی آپ ﷺ کی ذات گرامی ﷺ ہے اور صفت عبودیت میں آپ ﷺ سب سے کامل و برتر ہیں لہٰذا آپ ﷺ کی مدح و تعریف کا کمال اور آپ ﷺ کی علو مرتبت کا بیان اسی صفت کو ظاہر کرنے میں ہے نہ کہ آپ ﷺ کی ذات گرامی ﷺ کی منقبت و تعریف ایسے الفاظ و پیرایہ بیان اور ان صفات کے ذریعہ کی جائے جس سے آپ ﷺ کا مقام عبودیت پیچھے رہ جائے اور وہ حد آجائے جہاں سے معبود کی صفات شروع ہو جاتی ہیں۔

اظہار فخر کی ممانعت

⑥ وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارِ الْمُجَاشِعِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَوْحٰى اِلَيَّ اَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ وَلَا يَبْغِيْ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عیاضؓ ابن حمار مجاشعی سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے حکم دیا ہے کہ عاجزی اور فروتنی اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی شخص کسی پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی شخص کسی پر ظلم و زیادتی کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا فخر جو غرور و تکبر اور گھمنڈ کے طور پر ہو حرام ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

باپ دادا کے متعلق شیخی بگھارنا اور خاندانی فخر کوئی چیز نہیں ہے

⑦ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیَنْتَھِیَنَّ اَقْوَامٌ یَفْتَخِرُوْنَ بِاٰبَائِھِمُ الَّذِیْنَ مَاتُوْا اِنَّمَاھُمْ فَحْمٌ مِنْ جَھَنَّمَ اَوْلَیَکُوْنُنَّ اَھْوَنَ عَلَی اللّٰہِ مِنَ الْجُعَلِ الَّذِیْ یُدَھْدِہُ الْخَرَاءَ بِاَنْفِہٖ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ عُبِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَفَخْرَھَا بِالْاٰبَاءِ اِنَّمَا ھُوَ مُؤْمِنٌ تَقِیٌّ اَوْ فَاجِرٌ شَقِیٌّ اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ اپنے ان باپ دادا پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو مر چکے ہیں اور جن کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ دوزخ کا کوئلہ بن گئے ہیں، ورنہ اگر فخر کرنے سے باز نہ آئے تو وہ خدا کے نزدیک گوہ (غلاظت) کے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل وخوار ہوں گے جو گوہ (غلاظت) کو اپنی ناک سے ہٹاتا ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے جاہلیت کی نخوت کو اور باپ دادا پر فخر کرنے کی عادت کو دور کر دیا ہے (یاد رکھو) آدمی (اب) یا تو مؤمن متقی ہے یا فاجر بدکار (یعنی اگر کوئی شخص ایمان و تقویٰ اور اعمال صالحہ کی دولت سے مالامال ہے تو وہ خود قابل تکریم اور معزز ہے اس صورت میں اس کو کیا ضرورت ہے کہ اپنے باپ دادا پر فخر کا اظہار کر کے اپنی حیثیت کو بڑھانے کی کوشش کرے اور اگر کوئی شخص فاجر وبدکار ہے تو وہ خدا کے نزدیک ذلیل وخوار ہے اس صورت میں اس کا کیا حق ہے کہ تکبر و گھمنڈ کرے) تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے" (اور مٹی چونکہ ایک بہت کمتر اور بے حیثیت چیز ہے لہٰذا مٹی سے ہٹائے گئے انسان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی عظمت وبڑائی کا دعویٰ کرے اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: وہ دوزخ کا کوئلہ بن گئے کا مطلب یہ ہے کہ اگر باپ دادا مشرک وکافر تھے تو وہ بالیقین دوزخ میں جائیں گے اور اگر وہ کافر و مشرک نہیں تھے تو ان کے بارے میں بھی یہ احتمال تو ہو ہی سکتا ہے کہ کسی وجہ سے ان کا خاتمہ بخیر نہ ہوا ہو اور وہ اس دنیا سے ایمان کے بغیر ہی رخصت ہو گئے ہوں اور وہ دوزخ میں ڈالے جائیں لہٰذا اس صورت میں ظاہر ہے کہ جو لوگ دوزخ کی آگ میں جل کر کوئلہ کی مانند سوختہ وسیاہ ہو جانے والے ہیں ان کے متعلق شیخیاں بگھارنا اور ان پر اظہار فخر کرنا بڑی نادانی کی بات ہے۔

حاصل یہ کہ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں فوت شدہ اپنے باپ دادا کے متعلق شیخیاں بگھاتے ہیں اور اپنے خاندان کی دنیاوی بڑائی پر فخرو گھمنڈ کا اظہار کرتے ہیں ان کو آنحضرت ﷺ نے غلاظت کے کیڑے سے تشبیہ دی ہے اور ان کے فوت شدہ باپ دادا کو غلاظت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اپنے باپ دادا پر ان کے فخر کرنے کو ایسا فعل قرار دیا ہے جیسا کہ غلاظت کا کیڑا اپنے جسم سے غلاظت کو خارج کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ محض اپنی بڑائی کو ظاہر کرنے　　اور لوگوں پر اپنی ناروا اہمیت کو جتانے کے لئے اپنے باپ دادا اور خاندان پر گھمنڈ کرنا اور اظہار فخر کرنا سخت معیوب اور انتہائی قابل نفرین فعل ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

دوش دیدم کہ ابلہے می گفت　　پدر من وزیر خاں بودست
باوجودیکہ نیست معلومم　　خود گر فتم کہ آنچناں بودست
ہیچ کس دیدہ کہ گہ خوردست　　کین بعہد قدیم نان بودست

آنحضرت ﷺ کا اپنے تئیں سردار کہلانے سے انکار

⑧ وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ الشِّخِّیْرِ قَالَ انْطَلَقْتُ فِیْ وَفْدِ بَنِیْ عَامِرٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا اَنْتَ سَیِّدُنَا فَقَالَ السَّیِّدُ اللّٰہُ فَقُلْنَا وَ اَفْضَلُنَا فَضْلًا وَ اَعْظَمُنَا طَوْلًا فَقَالَ قُوْلُوْا قَوْلَکُمْ اَوْ بَعْضَ قَوْلِکُمْ وَلَا

يَسْتَجْرِيَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مطرف ابن عبداللہ ابن شخیر کہتے ہیں کہ (میرے والد حضرت عبداللہؓ صحابی نے بیان کیا کہ) بنو عامر کا جو وفد رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اس میں میں بھی شریک تھا، چنانچہ (جب ہم آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو) ہم نے عرض کیا کہ آپ (ﷺ) ہمارے سردار ہیں آپ ﷺ نے فرمایا سردار تو خدا ہے ہم نے عرض کیا آپ (ﷺ) بھلائی و بہتری کے اعتبار سے ہم میں سب سے بہتر ہیں اور بخشش کے اعتبار سے ہم میں سب سے بزرگ و برتر ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اس طرح کہو، بلکہ اس سے بھی کم درجہ کے الفاظ استعمال کرو یعنی میری تعریف و مدح میں مبالغہ آرائی سے کام نہ لو اور ان صفات کو میری طرف منسوب نہ کرو جو صرف حق تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہیں تم نے آخر میں جو بات کہی ہے زیادہ سے زیادہ اسی حد تک میری تعریف کر سکتے ہو بلکہ میرے تئیں اس سے بھی ہلکے درجہ کی تعریف کرو تو زیادہ بہتر ہے اور دیکھو شیطان تم کو اپنا وکیل نہ بنائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "جَرِیّ" کے معنی وکیل کے ہیں جو اپنے موکل کا جاری مجری یعنی قائم مقام ہوتا ہے لہٰذا لایستجرینکم الشیطن کا مطلب یہ ہے کہ تم میری تعریف ایسے الفاظ کے ذریعہ اور ایسے انداز میں نہ کرو جس سے یہ معلوم ہو کہ شیطان لعین نے تمہیں اپنا وکیل و قائم مقام بنالیا ہے اور تم اس کی وکالت کے طور پر بلا تامل جو چاہتے ہو کہتے چلے جا رہے ہو چنانچہ وہ لوگ سخت گمراہی میں مبتلا ہیں۔ جو ذات رسالت ﷺ کی منقبت و تعریف میں حد سے تجاوز کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ گویا بندے کو خدا کا درجہ دیدیتے ہیں جیسے مروج مولود کے قصائد نقلیہ میں ایسے الفاظ و بیان اختیار کئے جاتے ہیں جن سے پروردگار کی شان میں بڑی بے ادبی ہوتی ہے۔

بعض روایت میں اس "یستجرینکم" میں یاء کی بجائے ہمزہ ہے اس صورت میں یہ لفظ جری کے بجائے جوأت سے ہوگا۔ اور معنے یہ ہوں گے کہ شیطان تم کو میری تعریف میں اس طرح اور بیباک نہ بنا دے کہ غلط سلط اور خلاف حقیقت جو کچھ کہنا چاہو بے جھجک کہنے لگو۔

"سردار تو بس خدا ہے" سے آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ وہ ذات کہ جو مخلوق کے تمام امور کی حقیقی مالک ہے اور وہ ذات کہ ہر ایک پر فرمانبروائی و حکمرانی کی سزاوار ہے اور جس کے دست قدرت میں تمام تر نظم و تصرف ہے صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے نہ کہ کوئی اور شخص۔

علماء نے لکھا ہے آنحضرت ﷺ کا اس جماعت کی طرف سے اپنے آپ ﷺ کو سردار کہے جانے کی ممانعت کرنا اس سبب سے نہیں تھا کہ ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے تئیں سرداری و سیادت کو ثابت کیا تھا کیونکہ آنحضرت ﷺ بلاشبہ تمام اولاد آدم علیہ السلام کے سردار ہیں، بلکہ آپ ﷺ کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ کو لفظ سید سردار کے ذریعہ اس انداز سے مخاطب کیا تھا جس طرح کسی قوم قبیلہ کے سردار رئیس کو مخاطب کیا جاتا ہے حالانکہ ان لوگوں کو چاہئے تھا کہ وہ آپ ﷺ کو لفظ نبی ﷺ یا رسول ﷺ کے ذریعہ مخاطب کرتے جو بشریت کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے۔

اصل فضیلت، تقویٰ ہے

⑨ وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَسَبُ الْمَالُ وَالْكَرَمُ التَّقْوٰى۔

(رواه الترمذی وابن ماجة)

"اور حضرت حسنؒ، حضرت سمرۃؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حسب مال داری ہے اور کرم پرہیزگاری کا نام ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "حَسَب" ان فضائل و خصائل کو کہتے ہیں کہ جو کسی انسان میں ہوتے ہیں چنانچہ صاحب حسب انسان اپنے اور اپنے باپ دادا

کے خصائل و فضائل کو شمار کرتا ہے اور ان کے ذریعہ اپنی حیثیت کو بڑھاتا ہے کرم صفات خیر کا نام ہے جس کا اطلاق تمام وجوہ خیر بھلائی اور شرف پر ہوتا ہے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے نزدیک اصل حسب و فضیلت مالداری ہے کہ جو شخص مالدار اور صاحب ثروت ہو تو وہی حسب والا اور فضیلت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور اس کی عزت کی جاتی ہے اگر کسی کے پاس مال و ثروت نہ ہو تو وہ سب کی نظروں میں کم تر و بے وقعت رہتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل فضیلت تقویٰ پرہیزگاری میں ہے کہ بغیر تقویٰ کے کوئی بھی فضیلت اعتبار نہیں رکھتی خدا کی نظر میں کریم یعنی بزرگ و شریف وہی شخص ہے جو پرہیزگار ہو جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقکم بیشک زیادہ عزت والا تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اپنے باپ دادا پر فخر کرنے والے کے بارے میں وعید

(۱۰) وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ تَعَزّٰی بِعَزَاءِ الْجَاھِلِیَّۃِ فَاَعِضُّوْہُ بِھَنِ اَبِیْہِ وَلَا تَکْنُوْا۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص زمانہ جاہلیت کی نسبت کے ساتھ اپنے کو منسوب کرلے تو اس کے باپ کے ہن کو کٹواؤ اور اس میں اشارہ کنایہ سے کام نہ لو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: ھَنٌ یا ھَنٌّ ہر اس قبیح اور بری چیز کو کہتے ہیں جو صاف صاف نام لے کر بیان نہیں کی جاتی اسی لئے اس لفظ کا اطلاق شرمگاہ پر بھی ہوتا ہے یعنی اگر کسی موقع پر شرمگاہ کا نام لینا ہو تو اس مقصد کے لئے ہن کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ دادا پر فخر کرے جو زمانہ جاہلیت میں گزرے ہیں تو اس کو صاف صاف باپ کی گالی دو اور اس کے باپ کی شرمگاہ کا ذکر کرتے ہوئے اشارہ کنایہ سے کام نہ لو بلکہ اس کا صریح نام لو یعنی اس سے مہذب گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں سیدھا صاف کہہ دو کہ اپنے باپ کی شرمگاہ...... اور اس ارشاد کا مطلب گویا باپ دادا اور خاندانی ثروت و وجاہت پر فخر کرنے والوں کے تئیں شاید نفرت کا اظہار اور ان کو سخت تنبیہ کرنا مقصود ہے تاکہ کوئی شخص اپنے باپ دادا کے تئیں فخر و مباہات میں مبتلا نہ ہو۔

بعض حضرات نے من تعزی بعزاء الجاھلیۃ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص زمانہ جاہلیت کی رسموں اور عادتوں کو اختیار کرے جیسے نوحہ اور بال نوچنے کپڑے پھاڑنے وغیرہ کے ذریعہ غمی منائے تو اس کو صاف صاف باپ کی گالی دو یا جو شخص زمانہ جاہلیت کی طرح لوگوں کو برا بھلا کہے، ان کو عار دلائے اور ان کے ساتھ گالم گلوچ کرے تو اس کے سامنے اس کے باپ کی برائیاں اشارہ کنایوں میں نہیں بلکہ صریح الفاظ میں بیان کرو یعنی یوں کہو کہ تمہارا باپ بتوں کو پوجتا تھا۔ فسق و فجور کی زندگی اختیار کئے ہوئے تھا اور زناکاری و شراب نوشی جیسی قبیح برائیوں میں مبتلا تھا اگر اس کے سامنے اس طرح کی بات کرو گے تو آئندہ کسی شخص کو برا بھلا کہنے، گالم گلوچ کرنے اور کسی کی آبروریزی کرنے کی وہ کبھی جرات نہیں کریگا۔

اپنے زمانہ جاہلیت کے کسی تعلق پر فخر نہ کرو

(۱۱) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ عُقْبَۃَ عَنْ اَبِیْ عُقْبَۃَ وَکَانَ مَوْلًی مِنْ اَھْلِ فَارِسٍ قَالَ شَھِدْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُحُدًا فَضَرَبْتُ رَجُلًا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ فَقُلْتُ خُذْھَا مِنِّیْ وَاَنَا الْغُلَامُ الْفَارِسِیُّ فَالْتَفَتَ اِلَیَّ فَقَالَ ھَلَّا قُلْتَ خُذْھَا مِنِّیْ وَاَنَا الْغُلَامُ الْاَنْصَارِیُّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمن ابن ابوعقبہؓ حضرت ابوعقبہ سے نقل کرتے ہیں جو (کسی انصاری) کے ایک فارس نژاد مولیٰ تھے انہوں نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ کے ہمراہ میں بھی غزوہ احد میں شریک تھا چنانچہ معرکہ آرائی کے دوران میں نے مشرکین میں سے ایک شخص کو

(تلوار یا نیزہ کھینچ کر) مارا اور کہا کہ ایک وار میری طرف سے بھی کھا میں ایک فارسی غلام یعنی فارس نژاد ہوں (جو دلیر اور بہت مار دینے والا ہے) رسول کریم ﷺ نے (میرا یہ جملہ سنا تو) تو میری طرف متوجہ ہوگئے اور فرمایا کہ تم نے اس طرح کیوں نہیں کہا کہ لے میری طرف سے بھی ایک وار کھا میں ایک انصاری غلام ہوں۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی تنبیہ کا مطلب یہ تھا کہ اس موقع پر اگر تم اپنی نسبت فارس کی طرف جو مذہباً مجوسی اور آتش پرست قوم ہے کرنے کی بجائے انصاری کی طرف کرتے جو بہت بہادر اور خدا کے دین اور رسول ﷺ کے حامی و مددگار ہیں تو زیادہ اچھا ہوتا اور اس وجہ سے بھی موزوں تھا کہ مولی القوم منھم (کسی قوم کے مولی کا شمار اسی قوم میں ہوتا ہے) کے بموجب تمہارا تعلق ہی سے ہے۔

"مولی" کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تو مولی عتاقہ یعنی وہ غلام جس کو اس کے مالک نے آزاد کر دیا ہو اور دوسرے یہ کہ وہ لوگ جن کا وطنی تعلق غیر عرب علاقوں اور ملکوں سے ہوتا تھا اور اسلام قبول کر لیتے تھے اور ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجاتے تھے وہ اپنے آپ کو مہاجرینؓ وانصارؓ کے اختیار میں رہتی تھی کہ ان کے سیاہ و سفید وہی مالک و متصرف ہوتے تھے ایسے لوگوں کو مولی موالات کہا جاتا تھا حضرت ابوعقبہ صحابیؓ جن کا اصل نام رشد تھا اسی طرح کے مولی تھے کہ وہ اصلاً فارس کے رہنے والے تھے اور جب انہوں نے اسلام قبول کیا اور اپنے ملک فارس سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئے تو کسی انصاریؓ کے زیر تربیت رہے اس حدیث کے راوی حضرت عبدالرحمٰن انہی ابوعقبہؓ کے صاحبزادے ہیں اور ان کا شمار ثقہ تابعین میں ہوتا ہے۔

اپنی قوم کی بیجا حمایت کرنے والے کی مذمت

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ نَصَرَ قَوْمَهٗ عَلٰى غَيْرِ الْحَقِّ فَهُوَ كَالْبَعِيْرِ الَّذِيْ رَدٰى فَهُوَ يُنْزَعُ بِذَنَبِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی قوم کی ناحق حمایت و مدد کرے وہ اس اونٹ کی مانند ہے جو کنویں میں گر پڑے اور پھر اس کی دم پکڑ کر اس کو کھینچا جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی اونٹ کنویں میں گر کر ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح وہ شخص کنویں میں گر کر روحانی طور پر تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور اس میں سے نکالے جانے کی کوئی سبیل نہیں پاتا جو کسی ناحق معاملہ میں یا کسی ایسے معاملہ میں کہ اس کا حق ہونا مشتبہ ہو اپنی قوم و جماعت کی حمایت و مدد کے ذریعہ اپنے آپ کو اونچا اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ قوم و جماعت کو تو ہلاک ہو جانے والے اونٹ کے مشابہ قرار دیا ہے کیونکہ جو طبقہ و گروہ حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتا ہے وہ گویا ہلاک ہو جانے والا شمار ہوتا ہے اور جو شخص اس قوم و جماعت کی حمایت کرتا ہے اس کو اس اونٹ کی دم کے ساتھ تشبیہ دی ہے چنانچہ جو اونٹ کنویں میں گر جائے اس کو اس کی دم پکڑ کر کھینچنا اس کو ہلاک ہونے سے نہیں بچا سکتا اسی طرح جو قوم و جماعت باطل ہونے کی وجہ سے ہلاکت کی کھائی میں گر پڑی ہے اس کو وہ حمایتی اور مددگار ہلاکت کی کھائی سے نجات نہیں دلا سکتا۔

عصبیت کس کو کہتے ہیں

(۱۳) وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْعَصَبِيَّةُ قَالَ اَنْ تُعِيْنَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْمِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت واثلہ ابن اسقعؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! عصبیت یعنی جاہلیت کیا چیز ہے؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا عصبیت

یہ ہے کہ تم ظلم پر اپنی قوم وجماعت کی حمایت کرو۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ حق کے معاملہ میں اپنی قوم وجماعت کی حمایت ورعایت کی جائے تو یہ اچھی چیز ہے جیسا کہ آنے والی حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

اپنی قوم وجماعت کے ظلم کے ختم کرنے کی کوشش کرو

⑭ وَعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكِ بْنِ جُعْشَمٍ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ خَيْرُكُمُ الْمُدَافِعُ عَنْ عَشِيْرَتِهِ مَالَمْ يَاْثَمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سراقہ ابن مالک ابن جعشمؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ہمارے سامنے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنی قوم جماعت کے لوگوں کے ظلم وزیادتی کا دفعیہ کرے جب تک کہ اس دفعیہ کی وجہ سے ظلم کے گناہ کا خود مرتکب نہ ہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: اگر یہ سوال پیدا ہو کہ جو شخص ظلم وزیادتی کا دفعیہ کر رہا ہے وہ خود ظلم کا مرتکب کس طرح ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ فرض کیجئے ایک شخص کو اس کے ظلم سے زبانی ہدایت وتنبیہ اور افہام وتفہیم کے ذریعہ روکا جا سکتا ہے لیکن کوئی شخص اس ظلم کے دفعیہ کے لئے اپنی زبان کو ذریعہ بنانے کی بجائے اپنے ہاتھوں کو ذریعہ بنانے لگے کہ ظلم کرنے والے کو مارنے لگے تو ظاہر ہے کہ یہ روا نہیں ہوگا یا اس ظلم کو روکنے کے لئے تھوڑا بہت مارنا کافی ہو سکتا ہو مگر کوئی شخص اس کو بہت زیادہ مارنے لگے یا جان ہی سے مار ڈالے تو اس کی اس کارروائی کو سراسر ناواجب کہا جائے گا۔ حاصل یہ کہ کسی ظالمانہ کارروائی کو روکنے کے لئے ایسا اقدام کرنا جو ضرورت سے زائد اور رواجبی حد متجاوز ہو تو ظلم کی وہ مدافعت خود ظلم وتعدی بن جائے گی۔

عصبیت کی مذمت

⑮ وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰى عَصَبِيَّةٍ وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِيَّةً وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جبیر ابن مطعمؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے (یعنی ہمارے اہل ملت یا ہمارے اہل طریقہ میں سے نہیں ہے) جو لوگوں کو عصبیت کی دعوت دے (یعنی لوگوں کو کسی ناحق معاملہ میں حمایت کرنے پر آمادہ کرے نہ وہ شخص ہم میں سے ہے جو عصبیت کے سبب جنگ کرے اسی طرح وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی حالت میں مر جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عصبیت میں مبتلا ہونا یعنی اس شخص وقوم کی حمایت کرنا جو باطل پر ہو ہر حالت میں مذموم وممنوع ہے بشرطیکہ اس عصبیت کا تعلق کسی دینی مصلحت سے نہ ہو بلکہ محض ظلم وتعدی کے طور پر ہو۔

محبت اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے

⑯ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حُبُّكَ الشَّیْءَ يُعْمِیْ وَيُصِمُّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوداؤدؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی چیز سے تمہارا محبت کرنا تم کو اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ محبت کا جنون انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے کہ وہ غلبہ محبت کی وجہ

سے اپنی محبوب چیز کے عیب کو نہ دیکھنے کی صلاحیت باقی رکھتا ہے اور نہ سننے کی اگر محبوب میں کوئی برائی دیکھتا بھی تو اس کو اچھی چیز سمجھتا ہے اور اگر اس سے کوئی بری بات سنتا بھی ہے تو اس کو اچھا جانتا ہے یا یہ مراد ہے کہ محبت انسان کو محبوب کے علاوہ ہر چیز سے اندھا اور بہرا کر دیتی ہے کہ وہ جمال یار کے سوا نہ کسی چیز پر نظر ڈالتا ہے اور نہ محبوب کے سوا بات سننا پسند ہے۔

اس باب میں اس حدیث کو نقل کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ارشاد گرامی اس شخص کے حق میں فرمایا گیا ہے جو کسی کی محبت سے مغلوب ہو باطل و ناروا امور میں اسی کی حمایت و مدد کرتا ہے کہ وہ حق کو نہ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے بلکہ محض محبت کی وجہ سے ناحق و باطل کا حامی و مددگار بن جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عصبیت کے معنی

⑰ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ كَثِيْرِ الشَّامِيِّ مِنْ اَهْلِ فِلَسْطِيْنَ عَنِ امْرَأَةٍ مِنْهُمْ يُقَالُ لَهَا فَسِيْلَةُ اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ اَبِيْ يَقُوْلُ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ اَنْ يُحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهٗ قَالَ لَا وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ اَنْ يَنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَهٗ عَلَى الظُّلْمِ۔ (رواہ احمد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبادۃ ابن کثیر شامیؒ جن کا تعلق فلسطین سے تھا اپنے ہی لوگوں میں کی ایک خاتون سے جن کا نام فسیلہ تھا۔ نقل کرتے ہیں کہ وہ خاتون بیان کرتی تھیں، میں نے اپنے والد کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا، یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا عصبیت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی قوم و جماعت کو عزیز رکھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، بلکہ عصبیت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص ظلم کے معاملہ میں اپنی قوم و جماعت کی حمایت و مدد کرے۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی "عصبیت" کے مفہوم پر بڑے سادہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ اپنی جماعت اور اپنی قوم کی جائز حمایت کرنا اور اس کے فطری و قانونی حقوق و مفادات کے حصول و تحفظ کے لئے اس طرح جدوجہد کرنا کہ دوسروں کے حقوق و مفادات پر کوئی زد نہ پڑے عصبیت کے معنی میں داخل نہیں ہے ہاں اگر اپنی جماعت و قوم کی اس طرح حمایت کی جائے جس سے دوسروں کے تئیں ظلم و تعدی کے جذبات ظاہر ہوتے ہوں۔ یا اپنی جماعت و قوم کی جدوجہد میں معاونت کرنا جو سراسر زیادتی اور انتہاپسندی پر مبنی ہو نیز اس جدوجہد کا کوئی قانونی جواز موجود نہ ہو تو اس کو عصبیت کہا جائے گا۔ اور شریعت کی نظر میں اس حمایت و معاونت کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔

اپنے نسب پر گھمنڈ نہ کرو

⑱ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْسَابُكُمْ هٰذِهٖ لَيْسَتْ بِمَسَبَّةٍ عَلٰى اَحَدٍ كُلُّكُمْ بَنُوْا اٰدَمَ طَفُّ الصَّاعِ بِالصَّاعِ لَمْ تَمْلَؤُهُ لَيْسَ لِاَحَدٍ عَلٰى اَحَدٍ فَضْلٌ اِلَّا بِدِيْنٍ وَتَقْوٰى كَفٰى بِالرَّجُلِ اَنْ يَكُوْنَ بَذِيًّا فَاحِشًا بَخِيْلًا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا نسب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے سبب تم کسی کو برا کہو اور عار دلاؤ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو جس طرح ایک صاع دوسرے صاع کے برابر ہوتا ہے کہ جس کو تم نے بھرا نہ ہو کسی کو کسی پر کوئی فضیلت و ترجیح نہیں ہے علاوہ دین اور تقویٰ کے آدمی کی برائی کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ زبان دراز، فحش گوئی اور لچر باتیں کرنے والا بخیل ہو۔ اس روایت کو احمد اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "صاع" سے مراد مپانہ یا پیمانہ ہے ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح ایک صاع یعنی مپانہ اپنے ہی جیسے دوسرے مپانہ کے بالکل برابر اہوتا ہے یا ان دونوں مپانوں میں جو چیزیں بھری ہوتی ہیں وہ یکساں اور برابر مقدار وزن کی حامل ہوتی ہیں کہ ان کو ایک دوسرے پر کوئی ترجیح حاصل نہیں ہوتی اسی طرح تمام انسان ایک باپ آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں اور کسی انسان کو دوسرے انسان پر محض نسب کے اعتبار سے کوئی فوقیت و برتری حاصل نہیں ہوتی۔

"تقویٰ" سے مراد شرک جلی و خفی سے بچنا اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے اجتناب و احتراز کرنا ہے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں رکھتا بلکہ انسانی جبلت اور نفسانی تقاضوں کے اختیار سے تمام انسان، نقصان و خسران کے مقام پر ہوتے ہیں البتہ جو انسان ایمان و اسلام کی دولت رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کمال تقویٰ و دین داری کے حامل ہوتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ آخرت کے نقصان سے محفوظ ہوتے ہیں بلکہ انسانیت کا اعلیٰ مظہر ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں پر فضیلت و برتری بھی رکھتے ہیں چنانچہ اسی حقیقت کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

"قسم ہے زمانہ کی، انسان بڑے خسارہ میں ہے علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔"

حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے طیبی ؒ کے حوالہ سے حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ "طف صاع" کے معنی ہیں وہ مپانہ جو پورا بھرا ہوا ہو۔ لہٰذا انسان کو طف صاع کے ساتھ تشبیہ دے کر گویا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ تم تمام انسانوں کے باپ چونکہ آدم علیہ السلام ہیں اور آدم علیہ السلام کو خاک سے پیدا کیا گیا ہے اس لئے تم سب اپنے اصل نسب کے اعتبار سے نقصان اور درجہ کمال تک نہ پہنچنے میں ایک دوسرے کے بالکل قریب اور برابر ہو کہ ہر انسان اپنی طبعی جبلت کی وجہ سے نقصان اور ٹوٹے میں مبتلا ہے ہاں وہ انسان اس نقصان اور ٹوٹے سے محفوظ ہیں جو ایمان و اسلام کے حامل اور تقویٰ و کمال دینداری کے مرتبہ پر فائز ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ صرف تقویٰ اور کامل دین داری ایک ایسا وصف ہے جو کسی انسان کو معزز و مکرم اور افضل و برتر قرار دے سکتا ہے جو شخص مؤمن اور متقی و پرہیزگار ہے اور دینداری کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے بس وہی انسان فضیلت کا حامل ہو سکتا ہے اور اس وصف کے علاوہ نہ نسب کی وجہ سے کوئی انسان برتر قرار پا سکتا ہے اور نہ محض خاندانی وجاہت و شوکت اور نسلی و قبائلی شرف و امتیاز کسی انسان کو دوسرے انسانوں پر فوقیت و برتری کا درجہ دے سکتا ہے۔

بَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ

بر و صلہ کا بیان

"بِرّ" باء کے زیر کے ساتھ کے معنی نیکی و احسان کے ہیں اور عام طور پر اس لفظ کا اطلاق اس نیکی و بھلائی پر ہوتا ہے جس کا تعلق ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے ساتھ اچھے برتاؤ سے ہوتا ہے اسی لئے لغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ بر کے معنی ہیں ماں باپ کی فرنبرداری و اطاعت کرنا۔ مذکورہ بالا عنوان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی مراد ہیں۔ واضح رہے کہ اس لفظ کی ضد "عقوق" ہے جس کے معنی ہیں ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور ان کے ساتھ سرکشی و ایذاء رسانی کا برتاؤ کرنا۔

"صلہ" کے لغوی معنی ملانا اور پیوند لگانے کے ہیں لیکن عام اصطلاح میں اس کے معنی ہیں اپنے اعزاء و اقارب کے ساتھ احسان اور اچھے سلوک کا معاملہ کرنا اور ان کو عطاء و بخشش اور اپنی مالی و اخلاقی مدد و اعانت کے ذریعہ فائدہ و راحت پہنچانا، چنانچہ عنوان میں اس لفظ کے یہی معنے مراد ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اولاد پر ماں کے حقوق

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ قَالَ اُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبُوْكَ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اَبَاكَ ثُمَّ اَدْنَاكَ اَدْنَاكَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! میری اچھی رفاقت یعنی میری طرف سے حسن سلوک و احسان اور خدمت گزاری کا سب سے زیادہ مستحق کون شخص ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری ماں اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری ماں اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری ماں اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا باپ، ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری ماں پھر تمہاری ماں پھر تمہاری ماں پھر تمہارا باپ پھر تمہارا وہ عزیز جو نزدیک کی قرابت رکھتا ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس دنیا کے معاشرہ کی اصلاح و فلاح دراصل باہمی حقوق کی نگہداشت تعلق و قرابت کی پاسداری ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور احسان و بھلائی کے برتاؤ اور اس حسن سلوک میں فرق مراتب کے احساس پر منحصر ہے شریعت اسلامی کا تقاضا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ جس تعلق و قربت کا رشتہ رکھتا ہے اور اس تعلق و قرابت میں جو فرق مراتب ہے ادائیگی حقوق اور حسن سلوک کے باہمی معاملات میں اس کا لحاظ ضروری ہے ظاہر ہے کہ قرابت کے اعتبار سے ماں کا رشتہ سب سے زیادہ گہرا اور اس کا تعلق سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے لہٰذا کسی شخص کے احسان و حسن سلوک اور خدمت گزاری کی سب سے زیادہ مستحق جو ذات ہو سکتی ہے وہ ماں ہے ماں کے بعد باپ ہے اور پھر دوسرے قرابتی اور رشتہ دار، لیکن ان قرابتی اور رشتہ داروں میں بھی تعلق و قرابت کے درجات و مراتب کی رعایت کی جائے گی کہ جو رشتہ دار، اپنے رشتہ کے اعتبار سے جتنا زیادہ نزدیک اور قریب ہو گا وہ اتنا ہی زیادہ مقدم رکھا جائے گا مذکورہ بالا حدیث میں اسی ضابطہ کو بیان فرمایا گیا ہے۔

بعض حضرات نے اس حدیث کے الفاظ سے ایک مسئلہ یہ اخذ کیا ہے کہ کسی شخص پر والدین کے ساتھ حسن سلوک اور بھلائی کرنے کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں ماں کا حصہ باپ سے تین گنا بڑھا ہوا ہے کیوں کہ وہ حمل کا بوجھ اٹھاتی ہے ولادت کی تکلیف و مشقت اور دودھ پلانے کی محنت برداشت کرتی ہے۔

فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اولاد پر ماں کا حق باپ کے حق سے بڑا ہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک و بھلائی اور اس کی خدمت و دیکھ بھال کرنا زیادہ واجب اور زیادہ ضروری ہے اور اگر ایسی صورت پیش آجائے جس میں بیک وقت دونوں کے حقوق کی ادائیگی دشوار ہو جائے مثلاً ماں باپ کے درمیان کسی وجہ سے ان بن ہو اور لڑکا اگر ماں کے حقوق کی رعایت کرتا ہے تو باپ ناراض ہوتا ہے اور اگر باپ کے حقوق کا لحاظ کرتا ہے تو ماں آزردہ ہوتی ہے تو ایسی صورت میں یہ درمیانی راہ نکالی جائے کہ تعظیم و احترام میں تو باپ کے حقوق کو فوقیت دے اور خدمت گزاری نیز مالی امداد و عطا میں ماں کے حق کو فوقیت دے۔

ماں باپ کے حقوق کی فہرست بہت طویل ہے بلکہ ان کے مرتبہ و درجہ کو دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اولاد اگر اپنی پوری زندگی بھی ان کے حقوق کی ادائیگی میں صرف کر دے تب بھی ان کے تئیں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تاہم شریعت نے کچھ چیزیں ایسی بیان کر دی ہیں۔ جو زیادہ اہمیت کی ہیں اور جن کا لحاظ بہر صورت ہونا چاہئے۔ مثلاً سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کی جائز خواہشات کی تکمیل اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کو لازم جانا جائے اور ان کی رضا و خوشنودی کو اپنے حق میں ایک بڑی سعادت سمجھی جائے، اپنی حیثیت و استطاعت کے ان کی ضروریات اور ان کے آرام و راحت میں اپنا مال و اسباب خرچ کیا جائے اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا

جائے جو ان کی شان کے مطابق ہو اولاد ان کے سامنے تواضع و انکساری اختیار کرے ان کے سامنے ملائمت و نرمی اور خوشامد و عاجزی کا رویہ اپنائے اور جہاں تک ہو سکے ان کی خدمت کرے تا آنکہ وہ راضی اور خوش ہوں، ان کی اطاعت و فرمانبرداری میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن اطاعت و فرمانبرداری ان ہی امور میں کی جانی چاہئے جو مباح ہوں ان کے ساتھ کوئی ایسا رویہ نہیں اپنانا چاہئے جس سے ان کی شان میں بے ادبی و گستاخی ظاہر ہوتی ہو اور نہ ان کے ساتھ تکبر و انانیت کے ساتھ پیش آنا چاہئے خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں بات چیت کے وقت اپنی آواز کو ان کی آواز سے اونچی نہ کرنا چاہئے۔ اور نہ ان کا نام لے کر ان کو یاد و مخاطب کرنا چاہئے کسی کام میں ان سے پہل نہ کرنا چاہئے اور نہ ان کے مقابلہ پر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اسی طرح اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کہ اگر والدین غیر شرعی امور کے مرتکب ہوں تو ان کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے وقت بھی ادب و احترام اور نرمی و ملائمت کی راہ اختیار کی جائے اور ایک دفعہ کہنے پر وہ باز نہ آئیں تو پھر سکوت اختیار کر لیا جائے اور ان کے حق میں دعا و استغفار کرتے رہنا چاہئے۔ یہ بات قرآن کریم کی اس آیت سے اخذ کی گئی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے اپنے باپ کے سامنے نصیحت و موعظت کا ذکر ہے۔

بوڑھے والدین کی خدمت نہ کرنے والے کے حق میں آنحضرت ﷺ کی بددعا

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَغِمَ اَنْفُهٗ رَغِمَ اَنْفُهٗ رَغِمَ اَنْفُهٗ قِيْلَ مَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَنْ اَدْرَكَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ اَحَدُهُمَا اَوْكِلَاهُمَا ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خاک آلود ہو ناک اس شخص کی خاک آلود ہو ناک اس شخص کی یعنی آپ ﷺ نے تین مرتبہ گویا یہ بددعا فرمائی کہ وہ شخص ذلیل و خوار ہو پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) وہ کون شخص ہے جس کے حق میں بددعا فرمائی جا رہی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ شخص جو اپنے والدین میں سے کسی ایک یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور پھر جنت میں داخل نہ ہو یعنی جس شخص کے ماں باپ یا دونوں میں سے کوئی ایک بڑھاپے کی حالت میں ہو اور وہ شخص ان کی خدمت کر کے ان کو راضی نہ کرے تو وہ انتہائی بدقسمت ہے کیونکہ خصوصیت سے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنا بڑے اجر کی بات ہے اور جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے۔" (مسلم)

مشرک ماں باپ کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنا چاہئے

(۳) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِىْ بَكْرٍ قَالَتْ قَدِمَتْ عَلَىَّ اُمِّىْ وَهِىَ مُشْرِكَةٌ فِىْ عَهْدِ قُرَيْشٍ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمِّىْ قَدِمَتْ عَلَىَّ وَهِىَ رَاغِبَةٌ اَفَاَصِلُهَا قَالَ نَعَمْ صِلِيْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کہتی ہیں کہ میری والدہ شرک کی حالت میں مکہ سے مدینہ آئیں جبکہ قریش کے ساتھ صلح کا زمانہ تھا یعنی مدینہ میں میری والدہ کے آنے کا یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جبکہ صلح حدیبیہ کی صورت میں آنحضرت ﷺ اور قریش مکہ کے درمیان جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو چکا تھا اور میری والدہ اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئی تھیں چنانچہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میری والدہ میرے پاس آئی ہیں اور وہ اسلام سے بیزار ہیں کیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔" (بخاری و مسلم)

صلہ رحم کی اہمیت

(۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اٰلَ اَبِىْ فُلَانٍ لَيْسُوْا لِىْ بِاَوْلِيَآءَ

اِنَّمَا وَلِیِّیَ اللّٰہُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنْ لَّھُمْ رَحِمٌ اُبُلُّھَا بِبَلَالِھَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ ابوفلاں کی اولاد میرے دوست نہیں ہیں میرا دوست یا تو خدا ہے یا نیک بخت مؤمنین البتہ ان لوگوں سے میری قرابت داری ہے جس کو میں تر چیزوں سے تر کرتا رہتا ہوں۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ابوفلاں کی اولاد" کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد میں صریح نام لیا تھا لیکن راوی نے اس ارشاد گرامی کو بیان کرتے وقت اس نام کو صریح ذکر نہیں کیا بلکہ لفظ "ابوفلاں" کے ذریعہ اشارۃً بیان کیا اور صریح ذکر نہ کرنے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ راوی نے جس موقع پر اس ارشاد گرامی کو بیان کیا اس وقت اس نام کو صراحۃً ذکر کرنے سے کسی فتنہ کے اٹھ کھڑے ہونے کا خوف ہوگا بخاریؒ و مسلمؒ کے اصل نسخوں میں بھی لفظ ابی کے بعد جگہ کو خالی چھوڑ دیا گیا ہے کسی نام کو صراحۃً نہیں کیا گیا ہے اور اس کی علت بھی وہی ہے رہی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد میں جس نام کو صراحۃً ذکر فرمایا تھا وہ کیا ہے؟ تو محققین نے کہا ہے کہ وہ ابولہب ہے اور بعض حضرات نے ابوسفیان یا حکم بن العاص بیان کیا ہے لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا جو مفہوم ہے اس کا تعلق کسی خاص فرد کی اولاد سے نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کی مراد عمومی طور پر اپنے قبیلہ و خاندان کے افراد ہیں جیسے اہل قریش یا بنو ہاشم اور یا آنحضرت ﷺ کے چچاؤں کی اولاد۔

"میرے دوست نہیں ہیں الخ" سے آنحضرت ﷺ کی مراد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ میری مالی امداد و معاونت اور ان کو دینا دلانا اس سبب سے نہیں ہے کہ میں ان کو زیادہ محبوب رکھتا ہوں اور مجھ کو ان سے کچھ زیادہ روحانی و باطنی تعلق ہے بلکہ چونکہ وہ میرے قرابتی ہیں اس لئے میں قرابت کا حق ادا کرنے کے لئے ان کی مالی امداد کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ جہاں تک باطنی و روحانی تعلق اور محبّت کا سوال ہے تو مجھ کو زیادہ تعلق اور زیادہ محبّت اس شخص سے ہے جو مؤمن صالح ہے خواہ وہ میرا قرابتی ہو یا غیر قرابتی چنانچہ میرا دوست خدا ہے یا نیک بخت مؤمنین میں نیک بخت سے جنس صلحاء یعنی تمام نیک بخت و صالح مسلمان مراد ہیں اگرچہ بعض حضرات نے حضرت ابوبکرؓ کو اور بعض حضرات نے حضرت علیؓ کو مراد قرار دیا ہے۔

"جس کو میں تر چیزوں سے تر کرتا رہتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ چونکہ میرے قرابتدار ہیں اس لئے میں ان کے ساتھ مدد تعاون کا سلوک کرتا ہوں اور ان کو مال وغیرہ دیتا رہتا ہوں تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کرسکیں دراصل تری اور نرمی چونکہ متفرق اجزاء اور اشیاء کو آپس میں جوڑنے اور ملانے کا ایک ذریعہ بنتی ہے اور اس کے برخلاف خشکی اور سختی چونکہ اشیاء کے باہمی افتراق و انتظار کا سبب بنتی ہے اس لئے اہل عرب اپنے کلام میں بطور استعارہ لفظ "بل" یعنی تری اور نرمی کو صلہ رحم، ناتا جوڑنے کے معنی میں اور "یبس" یعنی خشکی کو ناتا توڑنے اور ترک تعلق کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

والدین کو تکلیف پہنچانا حرام ہے

⑤ وَعَنِ الْمُغِیْرَۃِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّھَاتِ وَوَأْدَ الْبَنَاتِ وَمَنْعَ وَھَاتِ وَکَرِہَ لَکُمْ قِیْلَ وَقَالَ وَکَثْرَۃَ السُّؤَالِ وَاِضَاعَۃَ الْمَالِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم پر اس امر کو حرام قرار دیا ہے کہ ماں کی نافرمانی کر کے اس کا دل دکھایا جائے، لڑکیوں کو زندہ در گور کر دیا جائے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ فقر و محتاجگی اور عار کے خوف سے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے) اور بخیلی و گدائی اختیار کی جائے نیز قیل و قال سوال کی زیادتی اور مال ضائع کرنے کو تمہارے لئے مکروہ قرار دیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: خاص طور پر "ماں" کا ذکر کرنا اس سبب سے ہے کہ اولاد پر ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ ماں کا حق

باپ سے تین گنا ہے یا اس تخصیص کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ماں طبعی طور پر باپ سے زیادہ حساس اور کمزور دل ہوتی ہے باپ تو اولاد کی بڑی سے بڑی اذیت رسانی کو برداشت کر لیتا ہے لیکن ماں اپنی اولاد کی طرف سے ذرا سی بات میں رنجیدہ ہو جاتی ہے اگر اولاد اس کے حقوق کی ادائیگی اور اطاعت و فرمانبرداری کرنے میں معمولی سی بھی غفلت و کوتاہی کرتی ہے تو اس کا دل فوراً متاثر ہو جاتا ہے اور وہ سخت تکلیف محسوس کرتی ہے یہ اور بات ہے کہ اولاد کی تقصیر و کوتاہی سے جس قدر ماں درگزر کرتی ہے اتنا اور گزر باپ نہیں کرتا اور اس کا سبب بھی ماں کا کمزور دل ہونا ہے۔

"مَنۡع" یا "مَنَعَ" کے معنی روکنے اور محروم کرنے کے ہیں اور اس سے مراد بخل اور کنجوسی ہے۔

"هَاتِ" دراصل لفظ اٰتِ کے معنی میں ہے جو ایتاء کا صیغہ امر ہے اور جس کے معنی ہیں لاؤ دو! یہاں اس لفظ کو مانگنے اور سوال کرنے یعنی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے علماء نے لکھا ہے کہ منع و ھات سے مراد یہ ہے کہ اپنے مال پر دوسرے لوگوں کا جو حق واجب ہو تو اس کو ادا نہ کرے اور دوسروں کے مال میں سے وہ چیز لے جو اس کے لئے حلال نہیں ہے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نہ صرف مال میں منع وہات کو حرام قرار دیا گیا ہے بلکہ ہر طرح کے حقوق واجبہ کو ادا نہ کرانا حرام ہے ان کا تعلق خواہ مال و زر سے ہو یا افعال و احوال سے اور خواہ اقوال و گفتار سے ہو یا اخلاق و کردار سے اسی طرح کسی ایسی چیز کا مطالبہ کرنا اور مانگنا جو دوسروں پر کسی بھی طرح کے حق کے طور پر واجب نہ ہو اور دوسروں کو کسی ایسی چیز کی ادائیگی و انجام دہی کی محنت و کلفت میں مبتلا کرنا جو ان پر واجب نہیں ہے حرام ہے۔

قِيلَ وَقَالَ یہ ایک محاورہ ہے جو ہماری زبان میں بھی اسی طرح مستعمل ہے اس کا اطلاق عام طور پر بے فائدہ بحث و مباحثہ، ردوکد اور حجت و تکرار پر ہوتا ہے یہاں حدیث میں بھی قیل وقال کو مکروہ قرار دینے کا مطلب بے فائدہ باتیں کرنے اور بک بک لگانے سے منع کرنا ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ جب بے فکر لوگ کہیں آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ تو ادھر ادھر کی لایعنی باتوں میں لگ جاتے ہیں نہ کسی گفتگو کا کوئی بامقصد موضوع ہوتا ہے اور نہ کسی بات کا کوئی دینی و دنیاوی فائدہ ان کی بات چیت کا زیادہ تر موضوع غلط سلط واقعات کو نقل کرنا اور جھوٹے سچے اقوال کو بیان کرنا ہوتا ہے چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ فلاں شخص نے ایسا ایسا کہا ہے فلاں آدمی نے اس طرح کہا تو فلاں شخص نے یوں جواب دیا غرضیکہ اسی طرح کے بے سروپا اور لغو باتیں کر کے اور غپ شپ میں مشغول رہ کر وقت جیسی قابل قدر شے کو ضائع کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ قیل وقال کی ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ اس بحث و مباحثہ اور باہمی بات چیت کا مقصد کسی مسئلہ معاملہ کی تحقیق اور حصول معلومات نہ ہو ہاں اگر کسی معاملہ کی تحقیق حصول معلومات اور دوسرے نیک مقصد کے لئے باتوں میں مشغول رہا جائے اور لوگوں کے اقوال بیان کئے جائیں تو اس پر مذکورہ ممانعت کا اطلاق نہیں ہوگا بعض حضرات نے قیل وقال کی مراد بہت زیادہ باتیں کرنا لکھا ہے اور واضح کیا ہے کہ بہت زیادہ باتیں کرنا دل پر غفلت و مردنی طاری کرتا ہے بے حسی اور لاپرواہی میں مبتلا کرتا ہے اور وقت کو ضائع کرتا ہے۔

"کثرة السوال" یعنی سوال کی زیادتی کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دوسرے لوگوں کے احوال و معاملات کی بہت زیادہ پوچھا پاچھی اور تجسس معلومات کرنا دوسرے یہ کہ اپنے علم کی برتری کو ظاہر کرنے یا کسی کو امتحان و آزمائش میں مبتلا کرنے یا لاحاصل بحث و مناظرہ کی خاطر بہت زیادہ علمی سوالات کرنا اور کسی بات کو بہت زیادہ گھما پھرا کر پوچھنا اور تیسرے یہ کہ اس ممانعت کے مخاطب خاص طور پر صحابہؓ تھے جنہیں اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ دینی احکام و مسائل میں آنحضرت ﷺ سے زیادہ سوالات نہ کیا کریں اور نہ ادھر ادھر کے معاملات میں آپ ﷺ سے پوچھ پاچھ کیا کریں کیونکہ سوالات کی زیادتی و کثرت اور غیر ضروری پوچھا پاچھی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ کی طبیعت کو ناگواری ہوتی ہے بلکہ زیادہ پوچھنا احکام و مسائل میں شدت و سختی اور مزید پابندیوں کا سبب بھی بن سکتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ۔

"اِضَاعَةُ الْمَال" یعنی مال کو ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے مال اور اپنے روپے پیسے کو اسراف یعنی فضول خرچی میں بہایا جائے یا اس کو ایسی جگہ خرچ کیا جائے جس کا حق تعالیٰ کی طاعت وخوشنودی سے کوئی تعلق نہ ہو جیسے کوئی شخص اپنا سارا مال اور روپیہ پیسہ یا اس کا کچھ حصہ کسی دوسرے شخص کو دیدے مگر اس کے وہ عزیز و اقارب اور متعلقین محروم رہیں جو نہ صرف اپنے تعلق کی وجہ سے بلکہ اپنے احتیاج وضرورت کی بنا پر بھی اس کے مال اور روپیہ پیسہ پر اپنا حق رکھتے ہوں یا کوئی شخص اپنے مال و اسباب اور دولت کو پانی میں ڈال دے یا نذر آتش کر دے اور یا کسی ایسے فاسق کو دیدے جو اس کو گناہ و معصیت کے کاموں میں خرچ کرے۔

اضاعۃ مال کے مذکورہ بالا مسئلہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اپنے مال و دولت اور روپیہ پیسہ کو جہاں خرچ کرنا حرام یا مکروہ ہے وہاں اپنے مال اور روپیہ پیسہ کو صرف کرنا بلاشبہ اسراف اور ضائع کرنا کہلائے گا یہ دونوں صورتیں بالکل واضح ہیں اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں! اشتباہ اس جگہ ہے جہاں خرچ کرنا بظاہر تو مباح معلوم ہوتا ہو لیکن اگر اچھی طرح غور فکر کیا جائے تو اس خرچ کے نتیجہ سے برائیاں اور ظاہری باطنی خرابیاں نکلیں مثلاً بلا ضرورت دور دراز کے علاقوں میں مکانات بنانا، مکانات میں بے ضرورت تعمیر و ترمیم کر کے ان کو وسیع و عریض بنانا ان کی ناروا آرائش و زیبائش کی خاطر مال خرچ کرنا جہاں جس قدر خرچ کرنے کی ضرروت ہو اس سے زائد خرچ کرنا، محض نفس و طبیعت کے حظ اور مزہ و لذت حاصل کرنے کے لئے حد اعتدال سے زیادہ اور اچھے اچھے کھانے کھانا بڑائی جتانے اور اپنے کو برتر ثابت کرنے کی خاطر اعلیٰ پوشاک پہننا اور اپنی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لئے اونچے درجہ کی طرز معاشرت اختیار کرنا اور ان سب صورتوں میں فقراء و مساکین اور مفلس و قلاش لوگوں کی ضرورت و احتیاج سے صرف نظر کرنا اور ان کی خستہ حالی و محتاجگی کی قطعاً کوئی رعایت نہ کرنا جیسا کہ خالص دنیادار اور فضول خرچ کرنے والوں کا شیوہ ہے یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر اپنا مال اور روپیہ پیسہ خرچ کرنا اگرچہ شریعت کے ظاہری حکم کی روشنی میں حرام قرار نہ پائے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کے اخراجات قلب و طبیعت پر تنگی و سختی اور بے مروتی طاری ہونے کا سبب بنتے ہیں اس صورت حال سے سماج و معاشرہ میں غیر فطری عدم توازن و ناہمواری کی فضا بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے مختلف قسم کی برائیاں ظہور میں آتی ہیں۔

اسی طرح برتن باسنوں ہتھیاروں اور استعمال میں آنے والی دوسری چیزوں کو سونے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء سے مزین کرنا، خرید و فروخت کے معاملات میں اس طرح لاپرواہی برتنا کہ نہ تو مال کے ڈوبنے کا خوف ہو جیسے ادھار لین دین کی مدت کو ضرورت سے زائد بڑھانے اور نہ اپنے روپے پیسے کی حفاظت کا لحاظ ہو جیسے ایسی تجارت یا معاملہ میں اپنا روپیہ لگانا جس میں نقصان کا یقین ہو یا کسی چیز کو خواہ مخواہ بلا ضرورت گراں قیمت پر خریدنا اس طرح کی چیزیں بھی اسراف یعنی فضول خرچی اور اپنے مال کو ضائع کرنے کے حکم میں داخل ہیں۔

دوسروں کے ماں باپ کو برا کہہ کر اپنے ماں باپ کو برا نہ کہلواؤ

(۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَهَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ قَالَ نَعَمْ يَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ اَبَاهُ وَيَسُبُّ اُمَّهٗ فَيَسُبُّ اُمَّهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے ماں باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں کیوں نہیں (کبھی کبھار تو حقیقت میں بھی کوئی جاہل شخص اپنے ماں باپ کو گالی بک دیتا ہے اور یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ لوگ اپنے ماں باپ کو اگرچہ حقیقۃً خود گالی نہیں دیتے۔ مگر ان کو گالی دلوانے کا سبب ضرور بنتے ہیں اور وہ اس طرح کہ) اگر کوئی شخص کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ اپنے ماں باپ کو گالی دینا اور ان کو برا کہنا تو گناہ کبیرہ ہے ہی لیکن جو شخص کسی کے ماں باپ کو گالی دے کر اپنے ماں باپ کو گالی دلوانے اور ان کو برا کہلوانے کا سبب بنے وہ بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دیا جائے گا کیونکہ اگر وہ اس شخص کے ماں باپ کو گالی نہ دیتا تو وہ شخص بھی اس کے ماں باپ کو گالی نہ دیتا لہٰذا جب وہ اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا باعث بنا تو گویا اس نے خود گالی دی اور ماں کو گالی دینا عقوق یعنی والدین کی نافرمانی اور تمرد و سرکشی میں داخل ہے جو حرام ہے۔

گر مادر خویش دوست داری　　دشنام مده بمادر من

مذکورہ بالا حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ اگر کوئی شخص کسی فسق و معصیت کا سبب و ذریعہ بنے گا تو اس کا شمار بھی اس فسق و معصیت کے مرتکب کی حیثیت سے ہوگا اور درجہ کا گنہ گار بھی ہوگا۔

باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک و احسان کی اہمیت

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَبَرِّ الْبِرِّ صِلَةَ الرَّجُلِ اَهْلَ وُدِّ اَبِيْهِ بَعْدَ اَنْ يُّوَلِّيَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سب سے اعلیٰ نیکیوں میں سے ایک اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کے مرنے کے بعد یا اس کی غیر موجودگی میں اس کے دوستوں کے ساتھ احسان و سلوک کرے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کا باپ مر گیا ہو یا سفر پر گیا تو اس کے دوستوں کے ساتھ احسان و مروت کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک کا برتاؤ کرنا گویا اپنے باپ کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنا اور اس کا یہ معاملہ چونکہ اپنے باپ کی غیر موجودگی میں ہوگا اس لئے وہ بہترین اور اعلیٰ نیکی کرنے والا شمار ہوگا۔

حدیث شریف میں صرف باپ کے دوستوں کا ذکر کرنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ماں کی سکھی سہیلیوں کے ساتھ احسان و حسن سلوک بدرجہ اولیٰ ایک بہترین نیکی ہوگا۔

رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک فراخی رزق اور درازی عمر کا ذریعہ ہے

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَاَ لَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت و فراخی اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے یعنی اس کی عمر دراز ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "اَثَر" اصل میں پیروں کے اس نشان کو کہتے ہیں جو چلتے وقت زمین پر پڑتا ہے اور وہ نشان گویا زندگی کی علامت ہوتا ہے کہ جو شخص مر گیا اس کا نشان قدم زمین پر نہیں پڑا اس اعتبار سے عرب میں مدت عمر کو "اثر" کہا جانے لگا۔

حدیث کے اس جملہ اس کے رزق میں وسعت و فراخی اور اس کی موت میں تاخیر کی جانے کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی عقیدے رزق کا تعلق تقدیر سے ہے کہ جس شخص کے مقدر میں جس قدر رزق لکھ دیا گیا ہے اس کو اسی قدر ملے گا اس میں نہ کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی اسی طرح موت کا وقت بھی متعین ہے کہ جس کی موت کا جو وقت کاتب تقدیر نے لکھ دیا ہے اس وقت سے نہ ایک لمحہ پہلے موت آسکتی ہے اور نہ ایک لمحہ بعد جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔

"پھر جب وہ معیاد ختم ہوگی یعنی عمر پوری ہو جائے گی اس وقت نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے اور نہ آگے بڑھیں گے۔"

لہٰذا اس واضح عقیدے کی روشنی میں حدیث کے مذکورہ بالا جملے کے معنی کیا ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رزق میں وسعت و فراخی اور درازی عمر سے مراد رزق میں برکت کا محسوس ہونا، شب و روز کا خوشی و مسرت اور اطمینان و سکون کے ساتھ گزرنا عمر کے بیشتر لمحات کو طاعات و عبادات کی زیادہ سے زیادہ توفیق کا حاصل ہونا اور قلب کو نورانیت اور باطن کی صفائی و پاکیزگی کا نصیب ہونا ہے یا درازی عمر سے مراد دنیا جہان میں نام کو نیک بقا حاصل رہنا ہے اور یا یہ کہ درازی عمر سے اولاد صالح مراد ہے جو اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے حق میں دعاو مغفرت اور ایصال ثواب کرتی ہے اور اس کے نیک نام کو باقی رکھتی ہے اس لئے کہا گیا کہ بقائے اولاد مردہ کے لئے پیدائش ثانی ہے یعنی صاحب اولاد شخص مرنے کے بعد بھی اس اولاد کی صورت میں ایک طرح سے اپنا وجود باقی رکھتا ہے۔

اور اگر زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ رزق و عمر کے بارے میں مذکورہ بالا عقیدے اور حدیث کے مفہوم کے درمیان کوئی ایسا تضاد نہیں ہے جس کو دور کرنے کے لئے دقیق تاویلات اختیار کی جائیں کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرنے کو فراخی رزق اور درازی عمر کا سبب قرار دیا ہے جیسا کہ اس نے ہر چیز کے لئے کوئی نہ کوئی سبب ضرور پیدا کیا ہے چنانچہ وہ جس کے رزق میں وسعت، فراخی اور عمر میں درازی کرنا چاہتا ہے اس کو رشتہ داروں کے تئیں ادائے حقوق کی توفیق بخش دیتا ہے اور یہ بات ایسی نہیں ہے جس کو تقدیر الٰہی میں ترمیم و تغیر کا نام دیا جائے زیادہ سے زیادہ اس بات کو خلق کی نسبت سے محو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جیسے لوح محفوظ میں لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی عمر ساٹھ سال کی ہے لیکن اگر یہ شخص اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرے تو اس کی عمر میں چالیس سال کا اضافہ ہو جائے۔

اس مسئلہ میں بحث کی خاطر علمی اور تحقیقی طور پر بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن اصل بات صرف یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے جو بیان کر دیا ہے اور جس طرح فرمایا ہے بس اسی پر ایمان اور اعتقاد رکھا جائے نہ کہ بحث و مباحثہ کے ذریعہ شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں۔ چنانچہ سعادت کی نشانی میں ہے کہ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا فرما دیا ہے اسی کو اختیار کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے اور دور دراز کی بحثوں اور تحقیقی موشگافیوں میں الجھ کر اپنے ذہن و فکر کو بوجھل نہ بنایا جائے۔

صلۂ رحم کی اہمیت

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْهُ قَامَتِ الرَّحِمُ فَاَخَذَتْ بِحَقْوَیِ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ مَهْ قَالَتْ هٰذَا مَقَامُ الْعَآئِذِ بِكَ مِنَ الْقَطِیْعَةِ قَالَ اَلَا تَرْضَیْنِ اَنْ اَصِلَ مَنْ وَصَلَكِ وَ اَقْطَعَ مَنْ قَطَعَكِ قَالَتْ بَلٰی یَارَبِّ قَالَ فَذَاكِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو ان کی پیدائش سے پہلے ہی ان صورتوں کے ساتھ اپنے علم ازلی میں مقدر کر دیا جن پر وہ پیدا ہوں گی جب اس سے فارغ ہوا تو رحم یعنی رشتہ ناتا کھڑا ہوا اور پروردگار کی کمر تھام لی، پروردگار نے فرمایا کہہ کیا چاہتا ہے؟ رحم نے عرض کیا کہ یہ کاٹے جانے کے خوف سے تیری پناہ کے طلبگار کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے (یعنی کہ میں تیرے روبرو کھڑا ہوں اور تیرے دامن عزت و عظمت کی طرف دست سوال دراز کئے ہوں تجھ سے اس امر کی پناہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص مجھ کو کاٹ دے اور میرے دامن عزت و عظمت کی طرف دست سوال دراز کئے ہوں تجھ سے اس امر کی پناہ چاہتا ہوں۔ کہ کوئی شخص مجھ کو کاٹ دے اور میرے دامن کو جوڑنے کی بجائے اس کو تار تار کر دے) پروردگار نے فرمایا کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ جو شخص (رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک کے ذریعہ) تجھ کو قائم و برقرار رکھے اور اس کو میں بھی اپنے احسان و انعام اور اجر و بخشش کے ذریعہ قائم و برقرار رکھوں اور جو شخص رشتہ داری اور تعلق کے حقوق کی پامالی کے ذریعہ تجھ کو منقطع

کردے میں بھی (اپنے احسان و انعام کا تعلق) اس سے منقطع کرلوں؟ رحم نے عرض کیا کہ پروردگار! بیشک میں اس پر راضی ہوں پروردگار نے فرمایا اچھا تو یہ وعدہ تیرے لئے ثابت و برقرار ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جب اس سے فارغ ہوا" کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ مخلوقات کو پیدا کرچکا! اگرچہ ظاہری طور پر ان دونوں جملوں میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن اس میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ لغوی طور پر فراغت کا حقیقی مفہوم اپنے تحقق کے لئے پہلے اشتغال کا متقاضی ہوتا ہے یعنی فراغت کا مفہوم اس صورت پر صادق آتا ہے جب کسی کام میں مشغولیت رہی ہو اور اس کام کے علاوہ دیگر امور سے باز رکھتی ہے اس لئے کہا جائے گا کہ "جب اس سے فارغ ہوا" میں فراغت اپنے اس حقیقی مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے کیونکہ حق تعالیٰ اس سے پاک و منزہ ہے کہ اس کو ایک کام دوسرے کام سے باز رکھے جیسا کہ ایک دعائے ماثورہ میں یوں آیا ہے سبحان من لا یشغلہ شان عن شان۔

"حقو" دراصل اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ازار باندھتے ہیں۔ اور چونکہ ازار کو باندھنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دونوں کناروں کو ملا کر باندھا جاتا ہے اس اعتبار سے یہاں اس لفظ کا تثنیہ استعمال کرتے ہوئے بحقوی الرحمٰن فرمایا گیا یعنی وہ جگہ جہاں ازار کے دونوں کنارے باندھے جاتے ہیں، ویسے لفظ "حقو" کا اطلاق خود ازار باندھنے کی جگہ اور کمر جیسی چیزوں سے پاک و منزہ ہے اس لئے یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے۔ کہ یہ جملہ اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے بلکہ اہل عرب کے ایک مخصوص اور اپنے بیان کا مظہر ہے اور یہاں جس بات کو بیان کرنا مقصود تھا ان کو انہی کے طرز کلام کی مثالی صورت میں واضح کیا گیا ہے چنانچہ اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کی پناہ میں آنا چاہتا یا اس کی مدد کا خواہاں ہوتا جو اس کو سخت اضطراب و پریشانی میں ڈالنے والی ہوتی اور وہ پناہ یا مدد چاہنے کی اپنی ضروریات کو زیادہ اہمیت اور تاکید کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا تو جس کی پناہ یا مدد درکار ہوتی اس کے حقو ازار پر دونوں ہاتھ مارتا تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور یہ پوچھنے پر مجبور ہو کہ تیرا مقصد کیا ہے اور مجھ سے کیا چاہتا ہے چنانچہ رشتہ ناتے کا اپنے کاٹے جانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کے مفہوم کو بطور استعارہ مذکورہ عبارت کے ذریعہ بیان کیا گیا ورنہ لغوی طور پر یہاں نہ تو حقو کے حقیقی معنی مفہوم ہیں اور نہ اس کو پکڑنے کا وہی مفہوم ہے جو کسی انسان کو پکڑنے کا ہوتا ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا اہل عرب کے ہاں جب کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یداہ مبسوطتان یعنی اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں تو اس سے مراد اس کی نہایت سخاوت و فیاضی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے خواہ وہ واقعۃً ہاتھوں والا ہو یا خلقی طور پر سرے سے اس کے ہاتھ ہی نہ ہوں اور خواہ وہ ایسی ذات ہو جس کے لئے ہاتھوں کا وجود ہی محال ہو جیسے حق تعالیٰ کی ذات حاصل یہ کہ اس طرح کے طرز کلام اہل عرب میں محاورہ کے طور پر بہت مستعمل ہیں جن کے الفاظ اپنے حقیقی مفہوم کو ادا کرنے کے بجائے دوسرے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن کریم کا نزول اور احادیث نبوی ﷺ کا صدور اہل عرب ہی کے طرز کلام پر اور اسلوب بیان کے مطابق ہوا ہے اس لئے قرآن و حدیث کے ایسے مقام کہ جہاں اس طرح کے جملے آتے ہیں اور جن پر متشابہات کا اطلاق ہوتا ہے ان کی تاویل و وضاحت کے لئے یہ بات ایک بڑی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ویسے اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کہ رحم یعنی رشتہ و ناتا کوئی ذات و جسم تو ہے نہیں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو اور حق تعالیٰ سے پناہ کا طلبگار ہو، بلکہ حقیقت میں وہ ایک معنی ہے لہٰذا اس کے لئے۔ کھڑے ہونے اور پناہ چاہنے کے الفاظ استعمال کرنا بطور تشبیہ و تمثیل ہی ہوسکتا ہے جس سے اس بات کو واضح کرنا مراد ہے کہ رحم گویا ایک ہستی یا ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو کھڑا ہو اور حق تعالیٰ کی عزت و عظمت اور اس کی کبریائی کا دامن پکڑ کر پناہ کا طلبگار ہو۔

اسی طرح کی بات نووی نے بھی بیان کی ہے انہوں نے کہا ہے کہ رحم جس کو جوڑا جاتا ہے یا کاٹا جاتا ہے کوئی ذات یا جسم نہیں ہے بلکہ معانی میں سے ایک معنی ہے جو (کسی ذات جسم کی طرح) نہ کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ اس سے کلام و گفتگو کا صدور ہوتا ہے لہٰذا اس کے بارے میں مذکورہ ارشاد کی مراد دراصل رحم یعنی ناتے کی اہمیت کو ظاہر کرنا، ناتے کو جوڑنے والے کی فضیلت کو بیان کرنا اور ناتے کی مذمت کرنا ہے کیونکہ ناتے کو جوڑنا فی الجملہ واجب ہے اور اس کو توڑنا گناہ کبیرہ ہے اگرچہ صلہ رحم کے درجات متعین کردیئے گئے ہیں جن میں سے

بعض کو زیادہ اہمیت اور برتری حاصل ہے اور سب سے ادنی درجہ ترک مہاجرت یعنی میل ملاقات کو اختیار کرنا ہے کیونکہ صلہ رحم کا ایک ذریعہ کلام وملاقات بھی ہے اگرچہ وہ محض سلام کی حد تک ہو۔

واضح رہے کہ صلہ رحم کے ان درجات کے درمیان تفاوت و اختلاف کی بنیاد مواقع وحالات اور ضرورت وقدرت کے مختلف ہونے پر ہے چنانچہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں رشتہ داری کے تعلق کی رعایت اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کی زیادہ اہمیت و ضرورت ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں اس کی اہمیت وضرورت زیادہ نہیں رہتی علاوہ ازیں بعض مواقع پر رشتہ کا لحاظ اور نیک سلوک کرنے کی قدرت و استطاعت حاصل ہوتی ہے اور بعض مواقع پر قدرت و استطاعت کا فقدان ہوتا ہے اسی اعتبار سے صلہ رحم کا حکم بھی عائد ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں زیادہ اہم ہے اور بعض میں مستحب لہٰذا اگر کسی شخص نے ناتا جوڑنے کے حق کو جزوی طور پر ادا کیا اور اس کو پورے طور پر ادا نہیں کرسکا تو اس کو ناتا توڑنے والا نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر کسی شخص نے رشتہ داری کے حقوق میں سے کسی ایسے حق کو پورا کرنے میں کوتاہی کی جس کو پورا کرنے پر وہ قادر تھا نیز اس حق کو پورا کرنا اس کے لئے مناسب بھی تھا تو اس شخص کو ناتا جوڑنے والا کہا جائے گا۔

ناتا توڑنے والا اور رحمت خداوندی

(۱۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰهُ مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ رحم (کا لفظ) رحمٰن (کے لفظ) سے نکلا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (رحم یعنی رشتہ ناتے سے) فرمایا کہ جو شخص تجھ کو جوڑے گا یعنی تیرے حق کو ملحوظ رکھے گا میں بھی اس کو اپنی رحمت کے ساتھ جوڑ دوں گا اور جو شخص تجھ کو توڑے گا یعنی تیرے حق کا لحاظ نہیں کرے گا میں بھی اس کو توڑ دوں گا یعنی ایسے شخص کو اپنی رحمت سے محروم کروں گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: لفظ "رحم رحمٰن سے نکلا ہے" کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے رحم یعنی ناتے کو پیدا کیا اور اس کے نام کا لفظ یعنی رحم اپنے نام یعنی رحمٰن کے لفظ سے نکالا اور یہ احتمال بھی ہے کہ حدیث میں ان دونوں لفظ یعنی رحم اور رحمٰن کے معنی مراد ہوں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ رحم کی قرابت یعنی ذوالارحام جیسے ماں باپ اور بہن بھائی وغیرہ کہ جس کے حق کا لحاظ کرنا واجب ہے رحمٰن (یعنی اللہ تعالیٰ) کی رحمت کی ایک شاخ ہے۔

اور بعض شارحین نے لغت کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا کہ "شُجْنَة" اصل میں درخت کے ان ریشوں اور ٹہنیوں کو کہتے ہیں جو اپنی جڑ کے ساتھ پیوست ہوں لہٰذا حدیث میں اس لفظ کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ رحم رحمٰن سے نکلا ہے یا یوں کہا جائے کہ رحم کا لفظ رحمت سے مشتق ہے کہ جس طرح درخت کے ریشے اپنی جڑوں کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح گویا رحم، رحمٰن کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

اور بعض حضرات نے لفظ شُجْنَة کے بارے میں یہ کہا ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ لفظ رحم میں جو حروف ہیں وہ حق تعالیٰ کے اسم رحمٰن میں بھی موجود ہیں۔ اور چونکہ رحم اور رحمٰن کی اصل مادۂ اشتقاق ایک ہی ہے یعنی رحمۃ اس لئے رحم اور رحمٰن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ کسی درخت کی ٹہنیوں کو اس کی جڑ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اس طور پر حدیث کے معنی یہ ہونگے کہ رحم یعنی ناتا در اصل اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار میں سے ایک اثر ہے اور اس کے ساتھ مربوط ہے لہٰذا صلہ رحم کے حقوق یعنی ناتا داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ذمہ داری کو اپنے سے منقطع کرنے والا اپنے آپ کو رحمت خداوندی سے منقطع کرنے والا ہے اور ناتے کو جوڑنے والا یعنی ناتے داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ اپنے کو جوڑنے والا ہے جیسا

کہ خود حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

(۱۱) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِيْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِيْ قَطَعَهُ اللّٰهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا رحم یعنی ناتا عرش سے لٹکا ہوا ہے اور (بطریق دعا یا خبر دینے کے طور پر) کہتا ہے کہ جو شخص مجھ کو جوڑے گا اس کو اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت کے ساتھ) جوڑے گا اور جو شخص مجھ کو توڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی رحمت سے) جدا کرے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "عرش سے لٹکا ہوا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ عرشِ رحمٰن کا پایہ پکڑے ہوئے اپنے توڑے جانے سے بارگاہ کبریا کی پناہ کا طلبگار ہے اور اس نے اپنے حق میں اللہ تعالیٰ سے جو کچھ سنا ہے اس کے مطابق کو خبردار کر رہا ہے کہ اگر مجھ کو جوڑو گے یعنی ناتے داری کے میرے حقوق کو ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت کے ساتھ منسلک کریگا اور اگر تم مجھ کو توڑو گے یعنی میرے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔ یا تقول کا مطلب یہ ہے کہ ناتا یہ جو کچھ کہتا ہے وہ دعا کے طور پر ہے یعنی وہ عرش الٰہی کا پایہ تھامے ہوئے دعا کر رہا ہے کہ الٰہی جو شخص مجھ کو جوڑے اس کو تو اپنی رحمت کے ساتھ جوڑ دے اور جو شخص مجھ کو منقطع کرے اس کو تو اپنی رحمت سے منقطع کر دے۔

قطع رحم کرنے والا جنّت میں داخل نہیں ہو گا

(۱۲) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جبیر ابن مطعمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قطع رحم کرنے والا جنّت میں داخل نہیں ہو گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: نوویؒ نے ارشاد گرامی کی یہ مراد بیان کی ہے کہ جو شخص یہ جاننے کے باوجود کہ قطع رحم کرنا یعنی ناتے داری کا حق ادا نہ کرنا حرام ہے نہ صرف یہ کہ بغیر کسی سبب و عذر کے قطع رحم کرے اور بغیر کسی شبہ و وجہ کے قطع رحم کرنے کو حلال بھی جانے تو وہ جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا یا یہ مراد ہے کہ قطع رحم کرنے والا نجات یافتہ اور اولین لوگوں کے ساتھ جنّت میں داخل نہیں ہو گا۔

اقرباء کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا کامل ترین جذبہ

(۱۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِيْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کامل صلہ رحم کرنے والا وہ شخص نہیں ہے جو بدلہ چکائے بلکہ کامل صلہ رحم کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کی قرابت کو منقطع کیا جائے تو وہ اس قرابت کو قائم رکھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اس قرابت دار کے ساتھ بدلہ کے طور پر احسان اور نیک سلوک کرتا ہے جس نے اس کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کیا ہے تو اس کو حقیقی معنی میں صلہ رحمی نہیں کہیں گے بلکہ احسان چکانا کہیں گے ہاں اگر اس نے ایسے قرابتدار کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کیا جس نے خود اس کی قرابت کا کوئی لحاظ روا نہیں رکھا ہے اور کبھی اس کے ساتھ کوئی احسان اور نیک سلوک کیا تو اس کا احسان و نیک سلوک بے شک کامل صلہ رحم کہلائے گا اس سے معلوم ہوا کہ صلہ رحمی کا کامل ترین جذبہ وہ ہے جس کی بنیاد بدلہ چکانے پر نہ ہو بلکہ محض حق شناسی اور حق کی ادائیگی کے احساس پر ہو خواہ خود اس کا حق کسی نے ادا کیا ہو یا ادا نہ کیا ہو چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ جوان مرد وہی شخص ہے جو اپنا حق کسی سے طلب نہ کرے اور خود دوسروں کا حق ادا کرے۔

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِیْ قَرَابَةً اَصِلُهُمْ وَیَقْطَعُوْنِیْ وَاُحْسِنُ اِلَیْهِمْ وَیُسِیْئُوْنَ اِلَیَّ وَاَحْلُمُ عَنْهُمْ وَیَجْهَلُوْنَ عَلَیَّ فَقَالَ لَئِنْ کُنْتَ کَمَا قُلْتَ فَکَاَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ وَلَا یَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِیْرٌ عَلَیْهِمْ مَادُمْتَ عَلٰی ذَالِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) میرے کچھ قرابت دار ایسے ہیں کہ میں تو ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہوں لیکن وہ میرے ساتھ نیک سلوک نہیں کرتے ہیں، ان کے ساتھ احسان کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برائی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حلم و بردباری اور درگزر کا رویہ اختیار کرتا ہوں اور وہ مجھ سے جہالت کے ساتھ پیش آتے ہیں (یعنی مجھے برا بھلا کہتے ہیں اور مجھ پر غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں اس کی یہ باتیں سن کر) حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہ تم نے بیان کیا ہے تو گویا تم ان کو گرم راکھ پھکاتے ہو اور تمہارے ساتھ اللہ کی طرف سے ہمیشہ مدد و نصرت ہے جو ان کی ایذاء اور ان کے شر سے تمہاری محافظ ہے جب تک کہ تم اسی صفت پر قائم ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: "راکھ پھکانے" سے مراد یہ ہے کہ تمہارے وہ قرابت دار چونکہ تمہارے نیک سلوک کے قدردان نہیں ہیں اور تمہاری نیکی کا شکریہ ادا نہیں کرتے اس لئے تم ان کو جو کچھ دیتے ہو وہ ان کے حق میں حرام مال کا حکم رکھتا ہے اور تمہاری دی ہوئی چیزیں ان کے پیٹ میں آگ کی طرح ہیں! گویا آپ ﷺ نے ان قرابت داروں کے اس گناہ کو گرم راکھ کے ساتھ تشبیہ دی جو ان چیزوں کو کھانے کی وجہ سے ان کو لاحق ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے یہ مراد بیان کی ہے کہ تم ان کے برتاؤ کے علی الرغم، ان کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کر کے ان کو خود ان کے نفس کے سامنے ذلیل و رسوا کرتے ہو جیسا کہ کوئی شخص اگر گرم گرم راکھ منہ میں ڈالے اور اس کو پیٹ میں اتارے تو اس کا نفس اس کو لعنت ملامت کرتا ہے، بعض شارحین نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کے ساتھ تمہارا احسان گویا ان کے حق میں گرم راکھ ہے جو ان کو جلاتا اور ہلاک کرتا ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ تمہارا احسان ان کا منہ کالا کرتا ہے جیسا کہ گرم راکھ کسی کے چہرے کو جلا کر سیاہ کر دے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

والدین اور اقرباء کے ساتھ حسن سلوک درازی عمر کا سبب ہے

⑮ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَرُدُّ الْقَدَرَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا یَزِیْدُ فِی الْعُمْرِ اِلَّا الْبِرُّ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ یُصِیْبُهٗ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تقدیر الٰہی کو دعا کے علاوہ کوئی چیز نہیں بدلتی اور عمر کو دراز کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے علاوہ والدین اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک، اور (یاد رکھو) انسان کو جس سبب سے روزی سے محروم کیا جاتا ہے وہ صرف گناہ ہے جس کا وہ مرتکب ہوتا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "تقدیر" سے مراد تقدیر معلق ہے نہ کہ قضائے مبرم جو اٹل اور ناقابل ترمیم و تبدیل ہوتی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دعا کو جس تقدیر کے بدل دینے کا سبب گردانا ہے وہ تقدیر معلق ہے اور یہ بات بذات خود تقدیر الٰہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کیا ہے کہ اگر بندہ دعا کرے گا تو اس کی یہ مصیبت دور ہو جائے گی۔ چنانچہ عالم کے تمام اسباب و وسائل قضا و قدر الٰہی کے باوجود یہی حکم رکھتے ہیں جیسا کہ حصول شفا کے لئے علاج معالجہ اور دوائیں یا جنت و دوزخ میں جانے کے لئے بندوں کے اعمال وغیرہ وغیرہ۔

بعض حضرات نے یہ تاویل کی ہے کہ بندہ کا دعا و تدبیر میں برابر مشغول رہنا، تقدیر کے فیصلہ کو قبول کرنا آسان بنا دیتا ہے اور قسمت کے لکھے پر اس کا دل مطمئن و راضی ہو جاتا ہے یعنی جب بندہ اپنی کسی مشکل میں پھنس کر یا کسی تکلیف سے دوچار ہو کر دعا کرنے میں مشغول رہتا ہے اور پھر آخر کار دیکھتا ہے کہ اب کوئی دعا اور تدبیر کام نہیں کرے گی اور تقدیر کا لکھا اٹل ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا تو وہ قسمت کے آگے سپر ڈال دیتا ہے اور اپنی تقدیر پر راضی ہو جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تقدیر کا وہ فیصلہ اس کے لئے آسان و سبک ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر سے بوجھ ہٹ جاتا ہے اس کے برخلاف اگر اس کی تقدیر کا فیصلہ اس کے سامنے یکایک آنے اور ہونے والی بات ناگہاں اس پر نازل ہو جائے کہ نہ تو اس کو دعا میں مشغول ہونے کا موقع مل سکے اور نہ کسی تدبیر پر عمل کرنے کی مہلت مل سکے تو تقدیر کا وہی فیصلہ بڑا سخت اور مشکل ترین ہو جاتا ہے اس اعتبار سے فرمایا گیا کہ دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ یہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس ارشاد کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ دراصل دعا کی تاثیر کو اور دعا کی اہمیت و فضیلت کو بطور مبالغہ بیان فرمایا ہے اور مراد یہ ہے کہ قضاء و قدر کو کوئی چیز نہیں بدل سکتی، ہاں اگر کوئی چیز اس درجہ کی ہوتی کہ وہ تقدیر کو بدل دے تو وہ دعا ہوتی اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ یہ ارشاد گرامی اس حدیث کے مثل ہے جس میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت لے جانے والی ہوتی تو وہ نظر بد ہوتی۔

"درازی عمر" سے مراد عمر میں خیر و برکت کا ہونا اور زندگی کا اچھے کاموں فلاحی امور اور حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے راستہ پر گزرنا ہے جیسا پہلی فصل میں اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔

حدیث کے آخری جزء سے ایک اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ دنیا میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو اپنے فسق و فجور، خدائی احکام سے سرکشی و تمرد اور یہاں تک کہ اپنے کفر و شرک کے باوجود خدا کے نیک بندوں اور کامل مؤمنین کے مقابلہ پر زیادہ اچھا کھاتے ہیں اور زیادہ رزق کے مالک ہیں تو پھر اس بات کے معنی کیا ہوں گے کہ انسان اپنے گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کیا جاتا ہے چنانچہ اس کو دور کرنے کے لئے بعض حضرات نے یہ تاویل بیان کی ہے کہ حدیث میں رزق سے مراد آخرت کا رزق ہے یعنی ثواب اور اس میں کوئی شک نہیں کہ گناہ و معصیت کا ارتکاب اس رزق (آخرت کے اجر و ثواب) میں نقصان اور اس سے محرومی کا مطلب ان چیزوں سے محروم ہونا ہے جن کے بغیر مال و دولت کی فراوانی اور رزق کی وسعت کے باوجود انسان کو اندرونی طمانیت و خوشی اور قلبی و روحانی عظمت و بڑائی عطا نہیں ہوتی جیسے رضاء الٰہی کا حصول زندگی کا بے فکری اور سکون کے ساتھ گزرنا، قلب کا فراغ و اطمینان وقت کا یاد الٰہی اور اچھے کاموں میں صرف ہونا رزق کا طیب و پاکیزہ ہونا اور روح و باطن کا ہر قسم کی کدورت و ظلمت سے پاک و صاف ہونا، یہ وہ اوصاف ہیں جو انسانی زندگی کو حیوۃ طیبہ کا درجہ عطاء کرنے کی وجہ سے عطا ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔

"جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہے تو ہم اسے ضرور اچھی زندگی بسر کرائیں گے۔"

اس کے برخلاف اہل فسق و فجور، کہ جن کی زندگی شب و روز دنیا کی حرص و ہوس کی کدورتوں اور گناہ و معصیت کی ظلمت سے بھرے ہوتے ہیں ان کے وقت کا اکثر و بیشتر حصہ مال و دولت پیدا کرنے کی تعب و مشقت کی نذر ہوتا ہے ان کا قلب مال و زر کے نقصان و بربادی کے خوف سے ہر لحہ متفکر و پریشان رہتا ہے اور مختلف قسم کے خطرات اور اندیشے ان کی زندگی کو سکون و طمانیت سے محروم کر دیتے ہیں مزید برآں خدا کی عبادت و طاعت کی نورانیت اور اس کی رحمت سے محرومی ان کو ایسے اندھیروں میں ڈال دیتی ہے کہ وہ بظاہر بڑے خوشحال اور اسباب راحت و آسائش کے مالک ہونے کے باوجود ایک سخت اور مشکل زندگی گزارتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔

"جس نے میرے ذکر سے منہ موڑا اس کے لئے زندگی تنگ کر دی جائیگی۔"

اسی پر گنہ گار مؤمن کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ چاہے وہ ظاہری طور پر مال و دولت اور حشمت و تمول رکھتا ہو مگر روحانی و باطنی طور پر اس کی زندگی بھی کچھ کم سخت اور دشوار گزار نہیں ہوتی کم سے کم اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ اگر اس کے اندر ایمان کی روشنی پوری طرح موجود ہے تو ارتکاب گناہ و معصیت کا خوف اس کے قلب پر بہر حال چھایا رہتا ہے اور اس گناہ کی بد انجامی اور آخرت میں مبتلائے عذاب کا کھٹکا یقیناً اس کو وحشت زدہ رکھتا ہے اور خواہ اپنی دنیاوی زندگی میں کتنا ہی مطمئن نظر آئے مگر اس کو اپنے اندر اطمینان و سکون اور روحانی طمانیت و (بے فکری کی محرومی اور ضمیر کی لعنت ملامت سے دوچار رہنا پڑتا ہے حاصل یہ کہ رزق کا مطلب محض پیٹ بھرنے کے ساتھ انسان کے قلبی اطمینان و سکون، روحانی طمانیت و بشاشت اور اوقات زندگی کے بامقصد و کارآمد گزرنے سے بھی اور یہ چیزیں صرف انہی بندگان خدا کو نصیب ہوتی ہیں جو صالح عقائد اور پاکیزہ اعمال و کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ ارشاد گرامی کا تعلق صرف ان بعض مؤمنین سے ہے جو نفس کے فریب میں آکر گناہ و معصیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اپنے جن گناہگار بندوں پر حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ان کو گناہ و معصیت کے داغ دھبوں سے پاک و صاف کر کے اس دنیا سے اٹھائے تو ان کو فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیتا ہے اور ان کا وہ فقر و فاقہ گویا دنیا ہی میں ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے یا ان کو کسی ایسی مصیبت و پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے جس سے ان کو تنبیہ حاصل ہو جاتی ہے اور وہ توفیق الٰہی کی بنا پر اپنے گناہوں سے صدق دلی کے ساتھ توبہ کر لیتے ہیں اس کا حاصل یہ نکلا کہ جس مؤمن نے گناہ و معصیت کا ارتکاب کیا اور حق تعالیٰ کی طرف سے لطف خفی اس کے شامل حال رہا تو وہ فقر و فاقہ یا کسی مرض و تکلیف کے ذریعہ اس گناہ سے پاک و صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ اس کو اس بات کا بھی مستحق نہیں سمجھا جاتا کہ حق تعالیٰ کا لطف و کرم، فقر و فاقہ یا کسی آفت و مصیبت ہی کے ذریعہ اس کے گناہوں کو دھو دے تو پھر وہ اپنے حال پر آخر تک گناہوں میں گرفتار رہتا ہے اور اسی حالت میں دنیا سے چلا جاتا ہے اور آخر کار اس کو آخرت میں سزا بھگتنی پڑے گی۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

والدین کی خدمت کرنے کی فضیلت

(۱۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَسَمِعْتُ فِيْهَا قِرَاءَةً فَقُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالُوْا حَارِثَةُ ابْنُ النُّعْمَانِ كَذَالِكُمُ الْبِرُّ كَذَالِكُمُ الْبِرُّ وَكَانَ اَبَرَّ النَّاسِ بِاُمِّهٖ۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ نِمْتُ فَرَاَيْتُنِيْ فِي الْجَنَّةِ بَدَلَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میں جنت میں گیا تو میں نے وہاں قرآن پڑھنے کی آواز سنی میں نے (فرشتوں سے) پوچھا کہ یہ کون شخص ہے (جو قرآن کی تلاوت میں مشغول ہے) تو فرشتوں نے بتایا کہ یہ حارثہ بن نعمان ہیں۔ (صحابہؓ نے یہ بات سنی تو گویا ان کے دل میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی کہ حارثہؓ نے اپنے کس عمل کے سبب یہ فضیلت حاصل کی کہ آنحضرت ﷺ نے جنت میں ان کے قرآن پڑھنے کی آواز سنی چنانچہ آپ ﷺ نے حارثہؓ کی اس فضیلت کا سبب ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ) یہی وہ فضیلت و ثواب ہے جو والدین کے ساتھ نیکی کرنے پر حاصل ہوتا ہے یہی وہ فضیلت و ثواب ہے جو والدین کے ساتھ نیکی کرنے پر حاصل ہوتا ہے اور حارثہؓ ابن نعمان اپنی ماں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرنے والا تھا اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور بیہقیؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے (میں جنت میں گیا کے بجائے یہ) فرمایا کہ میں گیا تھا تو اسی حالت میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں جنت میں ہوں۔"

خدا کی خوشنودی کے طلبگار ہو تو والدین کو خوش رکھو

(۱۷) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رِضَى الرَّبِّ فِيْ رِضَى الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ

فِیْ سَخَطِ الْوَالِدِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا پروردگار کی رضامندی و خوشنودی ماں باپ کی رضامندی و خوشنودی میں ہے اور پروردگار کی ناخوشی و ناراضگی باپ کی ناخوشی و ناراضگی میں ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہی حکم ماں کا بھی ہے بلکہ ماں اس بات کی زیادہ مستحق ہے حاصل یہ کہ اگر تم اپنی خدمت و اطاعت اور اچھے سلوک کے ذریعہ ماں باپ کو خوش رکھو گے تو تمہارا پروردگار بھی تم سے خوش رہے گا اور اگر تم نافرمانی و سرکشی اور ایذاء رسانی کے ذریعہ ماں باپ کو ناخوش و ناراض رکھو گے تو تمہارا پروردگار بھی تم سے ناخوش و ناراض رہے گا۔

ماں باپ کی خوشنودی کو بیوی کی محبت پر ترجیح دینی چاہئے

(۱۸) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ اَنَّ رَجُلاً اَتَاهُ فَقَالَ اِنَّ لِیْ اِمْرَاَةً وَاُمِّیْ تَأْمُرُنِیْ بِطَلَاقِهَا فَقَالَ لَهُ اَبُو الدَّرْدَآءِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلْوَالِدُ اَوْسَطُ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَاِنْ شِئْتَ فَحَافِظْ عَلَى الْبَابِ اَوْضَيِّعْ۔

(رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ایک بیوی والا ہوں اور میری والدہ چاہتی ہیں کہ میں اس بیوی کو طلاق دے دوں حضرت ابودرداء نے اس سے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ والد جنّت کے بہترین دروازوں میں سے ہے (یعنی والد کی رضامندی و خوشنودی کو ہر حالت میں ملحوظ رکھنا جنّت میں داخل ہونے کا سبب ہے اس لئے جو شخص چاہتا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے لئے وہ دروازہ اختیار کرے جو بہترین دروازں میں سے ہے تو اس کو چاہئے کہ والد کی رضامندی و خوشنودی کو ہر حالت میں ملحوظ رکھے) پس تم کو اختیار ہے کہ چاہے اس دروازے کی محافظت کرو اور چاہے اس کو ضائع کر دو۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حضرت ابودرداء نے حدیث بیان کرنے کے بعد اپنے قول "پس تم کو اختیار ہے" کے ذریعہ اس شخص پر واضح کر دیا کہ اگر تم اپنی والدہ کی خواہش کے مطابق اپنی بیوی کو طلاق دیدو گے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم نے اس کی رضامندی و خوشنودی حاصل کر کے جنّت میں داخل ہونے کے لئے بہترین دروازہ اختیار کر لیا ہے ورنہ بصورت دیگر تم اس دروازے کو چھوڑ دینے والے سمجھے جاؤ گے۔

آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں اگرچہ والد کا ذکر ہے مگر ابودرداءؓ نے اس سے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ جب باپ کے حق میں اس طرح فرمایا گیا ہے تو ماں بدرجہ اولی اس ارشاد کا محمول قرار پائے گی یا یہ کہ لفظ "والد" سے صرف باپ مراد نہیں لیا گیا ہے بلکہ جنس یعنی پیدا کرنے والا مراد ہے اور یہ بات زیادہ موزوں و مناسب ہے کیونکہ پیدا کرنے والے کے مفہوم میں باپ اور ماں دونوں داخل ہیں۔

ماں اولاد کے نیک سلوک کی زیادہ مستحق ہے

(۱۹) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَبَرُّ قَالَ اُمَّكَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمَّكَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمَّكَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبَاكَ ثُمَّ الْاَقْرَبَ فَالْاَقْرَبَ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت بہز بن حکیمؒ اپنے والد سے اور وہ بہزؒ کے دادا (حضرت معاویہؓ ابن صدہ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں کس کے ساتھ بھلائی اور نیک سلوک کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ میں نے عرض کیا کہ پھر کس کے ساتھ؟ حضور ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ میں نے عرض کیا پھر کس کے ساتھ؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ۔ میں نے عرض کیا کہ پھر کس کے ساتھ؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے باپ کے ساتھ اور پھر اس کے ساتھ جو (ماں باپ کے بعد) تمہارا

قریب تر عزیز ہے (جیسے بھائی اور بہن) اور پھر اس کے ساتھ جو ان (بھائی بہن) کے بعد اوروں میں زیادہ قریبی عزیز ہے (جیسے چچا اور ماموں اور اسی ترتیب کے مطابق چچا اور ماموں کی اولاد وغیرہ)" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

ناتے داروں کے ساتھ بھلائی کرنے کی اہمیت

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَنَا اللّٰهُ وَاَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنِ اسْمِيْ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ بزرگ و برتر ارشاد فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں میں رحمٰن ہوں (یعنی صفت رحمت کے ساتھ متصف ہوں) میں نے رحم یعنی رشتے ناتے کو پیدا کیا ہے اور میں نے اس کے نام کا لفظ اپنے نام یعنی رحمٰن کے لفظ سے نکالا ہے لہٰذا جو شخص رحم کو جوڑے گا یعنی رشتہ ناتے کے حقوق ادا کرے گا تو میں بھی اس کو (اپنی رحمت کے ساتھ) جوڑوں گا اور جو شخص رحم کو توڑے گا یعنی رشتہ ناتے کے حقوق ادا نہیں کرے گا میں بھی اس کو (اپنی رحمت خاص سے) جدا کر دوں گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "میں اللہ ہوں" یعنی میں واجب الوجود ہوں کہ میری ذات پاک اپنے وجود اور اپنے حکم و فیصلہ کے نفاذ میں کسی کی محتاج نہیں ہے یہ جملہ دراصل آگے ارشاد ہونے والے کلام کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے بطور تمہید ہے اور اس تمہید میں پہلے اسم خاص کا ذکر کیا اور پھر اپنی صفت رحمٰن کو ذکر کیا جس کا لفظی مادہ اشتقاق وہی ہے جو رحم کا ہے۔

ناتا توڑنے والے خدا کی رحمت سے محروم رہتے ہیں

(۲۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِيْ اَوْفٰى قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ عَلٰى قَوْمٍ فِيْهِمْ قَاطِعُ رَحِمٍ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اس قوم پر رحمت نازل نہیں ہوتی جس میں ناتا توڑنے والا ہو۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "قوم" سے مراد پوری قوم نہیں ہے بلکہ محض وہ لوگ مراد ہیں جو ناتا توڑنے والے کی مدد و حمایت کریں یا اس کو اپنے ناتے داروں کے ساتھ بدسلوکی کے ذریعہ ناتا توڑنے سے منع نہ کریں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ رحمت سے باران رحمت مراد ہو یعنی جس قوم یا جس آبادی کے اندر ناتا توڑنے والا کوئی شخص ہوتا ہے تو ناتا توڑے جانے کی نحوست سے اس قوم یا آبادی کو بارش سے محروم رکھا جاتا ہے۔

بغاوت اور قطع رحم وہ گناہ ہیں جن کی وجہ سے دنیا میں عذاب ہوتا ہے

(۲۲) وَعَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ ذَنْبٍ اَحْرٰى اَنْ يُّعَجِّلَ اللّٰهُ لِصَاحِبِهِ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا مَعَ مَا يُدَّخَرُ لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْبَغْيِ وَقَطِيْعَةِ الرَّحِمِ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کوئی گناہ اس بات کے زیادہ لائق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ارتکاب کرنے والے کو دنیا میں بھی اس کی سزا دیدے اور (مرتکب) کو آخرت میں بھی دینے کے لئے (اس سزا) کو اٹھا رکھے ہاں دو گناہ بیشک اس بات کے لائق ہیں ایک تو امام وقت کے خلاف بغاوت کرنا اور دوسرے ناتا توڑنا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے ملک کے سربراہ اور قانونی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا اور ناتا توڑنا یعنی اپنے اعزا و اقرباء کے ساتھ بدسلوکی اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے اعراض کرنا بڑا سخت گناہ اور نہایت غمگین بات ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ ان دونوں گناہوں کے مرتکب کو محض آخرت ہی میں عذاب نہیں دیا جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینے میں جلدی کرے گا بایں طور کہ ان کو دنیا میں بھی اپنے ان گناہوں کی سزا بھگتنی پڑے گی گویا ایسے لوگ نہ دنیا میں چین پا سکتے ہیں اور نہ آخرت میں یہاں بھی سزا پائیں گے خواہ اس کی صورت کچھ ہی ہو اور وہاں بھی عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے کیونکہ یہ دونوں گناہ اس طرح کے ہین ان کے اثرات صرف دینی زندگی کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ دنیا میں بھی برے نتائج مرتب کرتے ہیں چنانچہ حکومت کے خلاف بغاوت برپا کرنے سے سارے ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا ہے پوری قوم سخت افراتفری اور مختلف مصائب و آلام میں مبتلا ہو جاتی ہے اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ قومی اور ملی توانائی ناگہانی انتشار و اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہے جس سے دشمن کو غالب آجانے کا موقع ملتا ہے اسی طرح ناتا توڑنے سے آپس میں نفرت و عداوت پیدا ہوتی ہے اور دلوں میں کدورت کو راہ مل جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اعزاء اور اقرباء جو باہم محبت و موانست کے ذریعہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر ایک پرسکون اور راست بخش ماحول پیدا کر سکتے ہیں اور آپس کے میل جول کے سبب بڑی سے بڑی مصیبت اور سخت سے سخت حالات کو انگیز کرنے کی طاقت فراہم کر سکتے ہیں وہ باہمی لڑائی جھگڑے اور افتراق و انتشار کی وجہ سے سخت جسمانی و روحانی اذیت ناکیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں لہٰذا ان گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کو دنیا میں زیادہ ڈھیل نہیں دی جاتی بلکہ خدا کی طرف سے ان کی سزا کا فیصلہ جلد صادر ہو جاتا ہے تاکہ وہ پہلے تو دنیا میں اپنے کئے کی سزا بھگت کر دوسروں کے لئے سامان عبرت بنیں اور پھر آخرت میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں۔

یہ بات واضح ہے کہ دنیا میں بھی سزا پانا اور آخرت میں بھی عذاب کا مستوجب ہونا محض ان دو گناہوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ کچھ اور گناہ بھی انہی طرح کے ہوں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں گناہ ان میں بدتر اور زیادہ ہیبت ناک ہیں۔

فائزین کے ساتھ جنّت میں داخل ہونے سے کون لوگ محروم رہیں گے

(۲۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَایَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنَّانٌ وَلَا عَاقٌّ وَلَا مُدْمِنُ خَمْرٍ۔ (رواہ النسائی والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں نہ تو وہ شخص داخل ہوگا جو کسی کے ساتھ بھلائی کر کے اس پر احسان رکھے نہ وہ شخص جو ماں باپ کی نافرمانی کرے اور نہ وہ شخص جو شراب نوشی کرے اور بغیر توبہ کے مرجائے۔" (نسائی، دارمیؒ)

تشریح: "مَنَّان" اصل میں مِنَّۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کو کچھ دیا جائے یا اس کے ساتھ کوئی نیکی کی جائے اور پھر اس پر اپنا احسان جتایا جائے یہ خصلت یعنی احسان کر کے اس کو جتانا نہایت بری بات ہے قرآن کریم میں ہے۔

لَاتُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی۔

"احسان رکھ کر اور ایذاء دے کر اپنی خیرات کو ضائع نہ کرو۔"

اور بعض حضرات نے لفظ "مَنَّان" کے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ من سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کاٹنا، لہٰذا منان کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ شخص جو ناتے کو کاٹے۔

"عاق" سے مراد وہ شخص ہے جو ماں باپ اور دوسرے اقرباء کو کسی شرعی وجہ کے بغیر ایذاء پہنچائے! یا عاق کا اطلاق خاص طور سے اس شخص پر ہوتا ہے جو ماں باپ کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو ستائے۔

جنّت میں داخل نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ ایسے لوگ خدا کے ان نیک اور صالح بندوں کے ساتھ جنّت میں داخل نہیں ہونگے جو

آخرت میں حساب کتاب کے دن فائز المرام اور نجات یافتہ قرار دیئے جائیں اور بلاکسی روک ٹوک کے شروع ہی میں جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے یا یہ مراد ہے کہ یہ لوگ عذاب کے بغیر جنت میں داخل نہیں ہونگے یعنی پہلے ان کو اپنے گناہ کی سزا بھگتنی ہوگی اس کے بعد جنت میں پہنچائے جائیں گے تاہم اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ان کے بغیر عذاب کے بھی جنت میں داخل کر دے گا کیونکہ اس کا وعدہ ہے کہ:

وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔

"اور اس کے علاوہ بھی جس کو وہ چاہے گا بخشدے گا۔"

اقرباء کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی برکت

(۲۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوْا مِنْ اَنْسَابِكُمْ مَاتَصِلُوْنَ بِهٖ اَرْحَامَكُمْ فَاِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةٌ فِي الْاَهْلِ مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ مَنْسَأَةٌ فِي الْاَثَرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم اپنے نسبوں میں اس قدر سیکھو کہ جس کے ذریعہ تم اپنے ناتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کو سکو کیونکہ ناتاداروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اقربا میں باہمی محبت و موانست کا سبب مال میں کثرت و برکت کا ذریعہ اور درازی عمر کا باعث بنتا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تم اپنے باپ، دادا، ماؤں، دادیوں، نانیوں، ان کی اولاد اور دیگر اعزاء و اقرباء کی پہچان رکھو ان کے ناموں سے باخبر ہو اور ان کے حالات سے واقفیت حاصل کرو تاکہ تم ذوی الارحام کو جان لو، جن کے ساتھ حسن سلوک کرنا تمہاری ذمہ داری ہے اور یہ جاننا تمہارے لئے ضروری اور فائدہ مند ہے۔

خالہ ماں کا درجہ رکھتی ہے

(۲۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِيْمًا فَهَلْ لِيْ مِنْ تَوْبَةٍ قَالَ هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ قَالَ لَا قَالَ وَهَلْ لَكَ مِنْ خَالَةٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَبِرَّهَا (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! مجھ سے ایک بڑا گناہ صادر ہو گیا ہے میری توبہ کے لئے کیا چیز ہے؟ یعنی کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس کو اختیار کر کے میں خدا کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرا سکوں اور اپنا وہ گناہ معاف کرا سکوں! حضور ﷺ نے فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں! حضور ﷺ نے فرمایا تو کیا تمہاری خالہ ہے؟ اس نے کہا کہ وہاں! حضور ﷺ نے فرمایا تم اس کے ساتھ نیک سلوک کرو یعنی اس کی خدمت و اطاعت کرو اور اس کی دیکھ بھال رکھو نیز اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق اس کی مالی امداد و اعانت کرتے رہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ناتے داروں کے ساتھ حسن سلوک، گناہوں کے کفارہ کا ذریعہ ہے اگرچہ وہ گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو تاہم یہ بھی ہو سکتا کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ بتایا گیا ہوگا کہ حسن سلوک کا کبیرہ گناہ کے کفارہ کا سبب بننا اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا حضور ﷺ نے اس سے فرمادیا کہ تم اپنی خالہ سے حسن سلوک کرو، تمہارا وہ گناہ بخشدیا جائے گا اور یا یہ کہ اس شخص سے جو گناہ صادر ہوا تھا وہ کبیرہ نہیں تھا بلکہ حقیقت میں صغیرہ گناہ تھا البتہ اس شخص نے اپنے مضبوط جذبہ ایمانی اور احتیاط و تقویٰ کی بنا پر اس گناہ کو ایک بڑا گناہ سمجھا! اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خالہ، ماں کا درجہ رکھتی ہے۔

والدین کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کی صورتیں

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ اُسَیْدِنِ السَّاعِدِیِّ قَالَ بَیْنَ نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذْجَاءَہٗ رَجُلٌ مِنْ بَنِیْ سَلِمَۃَ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ھَلْ بَقِیَ مِنْ بِرِّ اَبَوَیَّ شَیْءٌ اَبَرُّھُمَا بِہٖ بَعْدَ مَوْتِھِمَا قَالَ نَعَمْ اَلصَّلٰوۃُ عَلَیْھِمَا وَالْاِسْتِغْفَارُ لَھُمَا وَاِنْفَاذُ عَھْدِھِمَا مِنْ بَعْدِھِمَا وَصِلَۃُ الرَّحِمِ الَّتِیْ لَا تُوْصَلُ اِلَّا بِھِمَا وَاِکْرَامُ صَدِیْقِھِمَا۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابواسید ساعدی کہتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جو قبائل انصار میں سے ایک قبیلہ بنو سلمہ سے تعلق رکھتا تھا اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! میرے ماں باپ کے حسن سلوک کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے جس کو میں ان کی وفات کے بعد پورا کروں یعنی میں اپنے ماں باپ کی زندگی میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا تھا وہ مر چکے ہیں تو کیا ان کی وفات کے بعد بھی ان کے حق میں حسن سلوک کرنے کی کوئی صورت ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ہاں ان کے حق میں دعا کرنا (جس میں نماز جنازہ بھی شامل ہے) ان کے لئے استغفار کرنا ان کی موت کے بعد ان کی وصیت کو پورا کرنا ان کے ان ناتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا جن کے ساتھ حسن سلوک کرنا محض ان (ماں باپ) کے سبب سے ہے (یعنی ماں باپ کے وہ عزیز و اقارب کہ جن کے ساتھ محض اس وجہ سے حسن سلوک کیا جاتا ہے تاکہ ماں باپ کی خوشنودی حاصل ہو نہ کہ کسی اور غرض سے) اور ماں باپ کے دوستوں کی عزت و تعظیم کرنا (یہ وہ صورتیں ہیں جن کو اختیار کر کے ماں باپ کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے)۔" (ابوداؤد،ابن ماجہ)

دایہ حلیمہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا حسن سلوک

(۲۷) وَعَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقْسِمُ لَحْمًا بِالْجِعِرَّانَۃِ اِذْ اَقْبَلَتِ امْرَاَۃٌ حَتّٰی دَنَتْ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَبَسَطَ لَھَا رِدَاءَہٗ فَجَلَسَتْ عَلَیْہِ فَقُلْتُ مَنْ ھِیَ فَقَالُوْا ھِیَ اُمُّہُ الَّتِیْ اَرْضَعَتْہُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوطفیلؓ کہتے ہیں کہ جعرانہ میں، میں نے دیکھا کہ رسول کریم ﷺ گوشت تقسیم فرما رہے تھے کہ اچانک ایک خاتون آئیں جب وہ نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچیں تو آپ ﷺ نے ان کے لئے اپنی چادر مبارک بچھادی اور وہ اس پر بیٹھ گئیں میں نے ان کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا یہ حسن سلوک دیکھا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ خاتون کون ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ آنحضرت ﷺ کی وہ ماں ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث میں جن محترم خاتون کا ذکر کیا گیا ہے وہ دایہ حلیمہ ہیں جن کو آنحضرت ﷺ کی رضاعی ماں ہونے کا شرف حاصل ہے آنحضرت ﷺ کو دایہ حلیمہ کے علاوہ ایک اور خاتون نے بھی ابتداء میں کچھ دنوں تک دودھ پلایا تھا جن کا نام ثوبیہ ہے اور جو ابولہب کی باندی تھیں ان دونوں کے اسلام کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔

کسی مصیبت کے وقت اپنے نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا مانگنا مستحب ہے

(۲۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ بَیْنَمَا ثَلٰثَۃُ نَفَرٍ یَتَمَاشَوْنَ اَخَذَھُمُ الْمَطَرُ فَمَالُوْا اِلٰی غَارٍ فِی الْجَبَلِ فَانْحَطَّتْ عَلٰی فَمِ غَارِھِمْ صَخْرَۃٌ مِنَ الْجَبَلِ فَاَطْبَقَتْ عَلَیْھِمْ فَقَالَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ اُنْظُرُوْا اَعْمَالًا عَمِلْتُمُوْھَا لِلّٰہِ صَالِحَۃً فَادْعُوا اللّٰہَ بِھَا لَعَلَّہٗ یُفَرِّجُھَا فَقَالَ اَحَدُھُمْ اَللّٰھُمَّ اِنَّہٗ کَانَ لِیْ وَالِدَانِ شَیْخَانِ کَبِیْرَانِ وَلِیْ صِبْیَۃٌ صِغَارٌ اَرْعٰی عَلَیْھِمْ فَاِذَا رُحْتُ عَلَیْھِمْ فَحَلَبْتُ بَدَاْتُ بِوَالِدَیَّ اَسْقِیْھِمَا قَبْلَ وَلَدِیْ وَاِنَّہٗ قَدْ نَاٰی بِیَ الشَّجَرُ فَمَا اَتَیْتُ حَتّٰی اَمْسَیْتُ فَوَجَدْتُّھُمَا قَدْ نَامَا فَحَلَبْتُ کَمَا کُنْتُ اَحْلُبُ فَجِئْتُ بِالْحِلَابِ فَقُمْتُ عِنْدَ رُءُوْسِھِمَا اَکْرَہُ اَنْ

اَوْقِظَهُمَا وَاَكْرَهُ اَنْ اَبْدَأَ بِالصِّبْيَةِ قَبْلَهُمَا وَالصِّبْيَةُ يَتَضَاغَوْنَ عِنْدَ قَدَمَيَّ فَلَمْ يَزَلْ ذٰلِكَ دَأْبِيْ وَدَأْبُهُمْ حَتّٰى طَلَعَ الْفَجْرُ فَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ فَعَلْتُ ذَالِكَ ابْتِغَآءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ لَنَا فُرْجَةً نَرٰى مِنْهَا السَّمَآءَ فَفَرَجَ اللّٰهُ لَهُمْ حَتّٰى يَرَوْنَ السَّمَآءَ قَالَ الثَّانِيْ اَللّٰهُمَّ اِنَّهٗ كَانَتْ لِيْ بِنْتُ عَمٍّ اُحِبُّهَا كَاَشَدِّ مَا يُحِبُّ الرِّجَالُ النِّسَاءَ فَطَلَبْتُ اِلَيْهَا نَفْسَهَا فَاَبَتْ حَتّٰى اٰتِيَهَا بِمِائَةِ دِيْنَارٍ فَسَعَيْتُ حَتّٰى جَمَعْتُ مِائَةَ دِيْنَارٍ فَلَقِيْتُهَا بِهَا فَلَمَّا قَعَدْتُ بَيْنَ رِجْلَيْهَا قَالَتْ يَا عَبْدَاللّٰهِ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَفْتَحِ الْخَاتَمَ فَقُمْتُ عَنْهَا اَللّٰهُمَّ فَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ فَعَلْتُ ذَالِكَ ابْتِغَآءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ لَنَا مِنْهَا فَفَرَجَ لَهُمْ فُرْجَةً وَقَالَ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ كُنْتُ اسْتَاْجَرْتُ اَجِيْرًا بِفَرَقِ اَرُزٍّ فَلَمَّا قَضٰى عَمَلَهٗ قَالَ اَعْطِنِيْ حَقِّيْ فَعَرَضْتُ عَلَيْهِ حَقَّهٗ فَتَرَكَهٗ وَرَغِبَ عَنْهُ فَلَمْ اَزَلْ اَزْرَعُهٗ حَتّٰى جَمَعْتُ مِنْهُ بَقَرًا وَرَاعِيَهَا فَجَاءَنِيْ فَقَالَ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَظْلِمْنِيْ وَاَعْطِنِيْ حَقِّيْ فَقُلْتُ اذْهَبْ اِلٰى ذَالِكَ الْبَقَرِ وَرَاعِيْهَا فَقَالَ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَهْزَأْبِيْ فَقُلْتُ اِنِّيْ لَا اَهْزَأُبِكَ فَخُذْ ذٰلِكَ الْبَقَرَ وَرَاعِيَهَا فَاَخَذَهٗ فَانْطَلَقَ بِهَا فَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ فَعَلْتُ ذَالِكَ ابْتِغَآءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ لَنَا مَا بَقِيَ فَفَرَجَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی قوم کا یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ تین آدمی ایک ساتھ کہیں چلے جارہے تھے کہ (راستہ میں) سخت بارش نے ان کو آلیا وہ (اس بارش سے بچنے کے لئے) پہاڑ کے ایک غار میں گھس گئے اتنے میں پہاڑ سے ایک بڑا پتھر گر کر اس غار کے منہ پر آپڑا اور ان تینوں پر باہر نکلنے کا راستہ بند کر دیا وہ تینوں (اس صورت حال سے سخت پریشان ہوئے اور اس غار میں سے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آئی تو) آپس میں کہنے لگے کہ اب تم اپنے ان اعمال پر نظر ڈالو جو تم نے (کسی دنیاوی فائدہ کی تمنا اور جذبہ نام و نمود کے بغیر) محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے کئے ہوں اور ان اعمال کے وسیلہ سے خدا سے دعا مانگو شاید اللہ تعالیٰ ہماری نجات کے راستہ کو کھول دے چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا اے اللہ (تو خوب جانتا ہے کہ) میرے ماں باپ بہت بوڑھے تھے اور میرے کئی چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے اور میں بکریاں چرایا کرتا تھا تاکہ (ان کے دودھ کے ذریعہ) ان سب (ماں باپ اور بچوں کے پیٹ بھرنے) کا انتظام کر سکوں، چنانچہ جب میں شام کو اپنے گھر والوں کے پاس لوٹتا اور بکریوں کا دودھ نکالتا تو اپنے ماں باپ سے ابتدا کرتا اور ان کو اپنی اولاد سے پہلے دودھ پلاتا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ (چراگاہ کے) درخت مجھ کو دور لے گئے یعنی میں بکریوں کو چراتا چراتا بہت دور نکل گیا یہاں تک کہ شام ہوگئی اور میں گھر واپس نہ آسکا اور (جب رات گئے گھر پہنچا تو) اپنے ماں باپ کو سوتے ہوئے پایا پھر میں نے اپنے معمول کے مطابق دودھ دوہا اور دودھ سے بھرا ہوا برتن لے کر ماں باپ کے پاس پہنچا اور ان کے سرہانے کھڑا ہو گیا کیوں کہ میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان کو جگاؤں اور نہ ہی یہ گوارا ہوا کہ ان سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ پلاؤں جب کہ وہ بچے میرے پیروں کے پاس پڑے ہوئے مارے بھوک کے رو بلک رہے تھے میں اور وہ سب اپنے حال پر قائم رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی (یعنی پوری رات اسی حالت میں میں دودھ کا برتن لئے ماں باپ کے سرہانے کھڑا رہا وہ دونوں پڑے سوتے رہے اور میرے بچے بھوک سے بیتاب ہو کر روتے اور چیختے چلاتے رہے پس اے خدا! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام محض تیری رضا اور خوشنودی کی طلب میں کیا ہے تو (میں اپنے اس عمل کا واسطہ دیتے ہوئے تجھ سے التجا کرتا ہوں) کہ تو ہمارے لئے اس پتھر کو اتنا کھول دے کہ اس کشادگی کے ذریعہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرمائی اور اس پتھر کو اتنا سرکا دیا کہ ان کو آسمان نظر آنے لگا۔ دوسرے شخص نے اس طرح کہا کہ اے اللہ میرے چچا کی ایک بیٹی تھی میں اس کو اتنا ہی زیادہ چاہتا تھا جتنا زیادہ کوئی مرد کسی عورت کو چاہ سکتا ہے جب میں نے اس سے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دینے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے یہ کہہ کر میری خواہش کو ماننے سے انکار کر دیا کہ جب تک میں سو ۱۰۰ دینار اس کو پیش نہیں کر دیتا میری جنسی خواہش پوری نہیں ہوگی پھر (میں نے محنت مشقت کر کے سو ۱۰۰ دینار فراہم کئے اور) ان دیناروں کو لے کر اس کے پاس پہنچا (وہ اپنی شرط پوری ہو جانے پر میری خواہش کے لئے راضی ہوگئی) جب میں جنسی فعل کے لئے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھا تو وہ کہنے لگی کہ بندۂ خدا اللہ سے ڈر اور میری مہر امانت کو توڑنے سے باز رہ (یعنی اس نے مجھے خدا کا خوف دلاتے ہوئے التجا کی کہ میری آبرو کو نہ لوٹو اور حرام

طور پر ازالہ بکارت کر کے میرے پردہ ناموس کو جو کسی کی امانت ہے یوں تار تار نہ کرو)، میں یہ سنتے ہی خوف خدا سے کانپنے لگا اور اپنے نفس کی گمراہی پر شرمسار ہو کر اس کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا پس اے خدا! اگر تو جانتا ہے کہ میرا یہ عمل (یعنی قابو حاصل ہونے کے باوجود اس کو چھوڑ کر ہٹ جانا اور اپنے نفس کو کچل دینا) محض تیری رضا اور خوشنودی کی طلب میں تھا تو میں (اپنے اس عمل کے واسطہ سے) تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو اس پتھر کو ہٹا کر ہمارے لئے راستہ کھول دے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس شخص کی بھی دعا قبول فرمائی) اور اس پتھر کو تھوڑا سا اور سرکا دیا پھر تیسرے شخص نے اس طرح کہنا شروع کیا۔ اے اللہ! میں نے ایک مزدور کو ایک فرق چاول کے عوض مزدوری پر لگایا جب اس نے اپنا کام پورا کر لیا تو مطالبہ کیا لاؤ میری اجرت دو میں۔ نے اس کی اجرت اس کو پیش کر دی مگر وہ بے نیازی کے ساتھ اس کو چھوڑ کر چلا گیا پھر میں نے ان چاولوں کو اپنی زراعت میں لگا دیا اور کاشت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ انہی چاولوں کے ذریعہ میں نے (خاصی پونجی بنالی اور اس کے ساتھ میں) بیل اور ان بیلوں کے چرواہے جمع کر لئے پھر (ایک بڑے عرصہ کے بعد) وہ مزدور میرے پاس آیا اور کہنے لگا خدا سے ڈرو مجھ پر ظلم نہ کرو اور میرا حق (جو میں نے تمہارے پاس چھوڑ دیا تھا) مجھ کو واپس کر دو، میں نے کہا کہ (بیشک تمہارا حق مجھ پر واجب ہے) ان بیلوں اور ان کے چرواہوں کے پاس جاؤ (اور ان کو اپنے قبضہ میں کر لو، وہ سب تمہارا ہی حق ہے) اس نے (میری بات سن کر بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا اور) کہا کہ خدا سے ڈرو اور میرے ساتھ ٹھٹھول نہ کرو! میں نے کہا کہ (میری بات کو جھوٹ نہ سمجھو) میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں جا کر ان بیلوں اور ان کے چرواہوں کو لے لو اس کے بعد اس نے ان سب کو اپنے قبضہ میں کیا اور لے کر چلا گیا۔ پس اے خدا! اگر تو جانتا ہے کہ میرا وہ عمل محض تیری رضا اور خوشنودی کی طلب میں تھا تو میں (اپنے اس عمل کا واسطہ دے کر تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ) تو یہ پتھر جتنا باقی رہ گیا ہے اس کو بھی سرکا دے۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس شخص کی دعا بھی قبول فرمائی اور) غار کے منہ کا باقی حصہ بھی کھول دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جب کہ وہ بچے میرے پیروں کے پاس پڑے ہوئے .... الخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ جس قوم کے افراد سے متعلق ہے اس کی شریعت میں ماں باپ کا حق اولاد کے نفقہ وحق پر مقدم تھا جبھی تو اس شخص نے ماں باپ کو دودھ پلانے سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ پلانا گوارا نہیں کیا حالانکہ بھوک کی شدت سے رات بھر روتے تڑپتے رہے لیکن بعض حضرات کے قول کے مطابق ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے اپنے بچوں کو بقدر سد رمق تو دودھ پلا دیا تھا مگر وہ اتنی مقدار پر مطمئن نہیں ہوئے تھے اور مزید دودھ پینے کے لئے رو، چلا رہے تھے۔

"فرق" مدینہ میں رائج ایک پیمانہ کا نام تھا اس میں سولہ رطل یعنی تقریباً آٹھ سیر غلہ آتا تھا یہ پیمانہ عام طور پر غلہ وغیرہ کے لین دین میں ماپ تول کے کام آتا تھا۔

"بیلوں کے چرواہے" سے مراد وہ غلام ہیں جو کھیتی باڑی کے کام، چوپایوں کے دیکھ بھال اور ان کو چرانے پر مامور ہوتے تھے حدیث میں ان چاولوں کی کاشت سے حاصل ہونے والے مال کے طور پر صرف بیلوں اور چرواہوں کا ذکر اکثر واغلب کے اعتبار سے ہے کہ اس شخص نے ان چاولوں کو اپنی زراعت میں لگا کر بہت کچھ حاصل کیا یہاں تک کہ میرے پاس بہت زیادہ مال و اسباب جمع ہو گیا جیسے بیل اونٹ، گوسفند اور غلام وغیرہ۔

اس حدیث سے مختلف مسائل اخذ کئے جاتے ہیں چنانچہ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کسی سخت آفت و مصیبت کے وقت اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا مستحب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ان تینوں کی دعا قبول فرمانا اور آنحضرت ﷺ کا اس واقعہ کو مدح و تعریف اور ذکر فضیلت کے طور پر صحابہؓ کے سامنے بیان کرنا اس امر کی دلیل ہے اور اگر یہ مستحب نہ بھی ہو تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کو اپنے بال بچوں پر ترجیح دینا ان کو کسی تکلیف و مشقت میں

مبتلا کرنے سے اجتناب اور بہر صورت ان کے آرام و سکون کو مد نظر رکھنا بڑی فضیلت کی بات ہے۔
تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو شخص سو رہا ہو اور خاص طور پر وہ شخص جو قابل احترام و لائق تعظیم ہو تو اس کو نیند سے اٹھانا مکروہ ہے علاوہ اس صورت کے جب کہ اس نے نماز نہ پڑھی ہو اور فرض نماز کا وقت ختم ہو رہا ہو۔
چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ نیند کی راحت کھانا کھانے سے زیادہ لذت آمیز ہے کہ نیند کا مزہ بھوک کی حالت میں بھی غالب رہتا ہے۔
پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ عفت و پارسائی اور انسانی نفس کو حرام امور سے باز رکھنا خصوصا اس صورت میں جبکہ کسی طرح کی کوئی رکاوٹ بھی سامنے نہ ہو بڑی فضیلت کی بات ہے اور انسانی کردار کی پختگی و عظمت کی دلیل ہے چنانچہ نفس کی خواہش اور خاص طور جنسی خواہش کہ جو دوسری تمام خواہشات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ غالب اور سرکش ہوتی ہے انسان کو سخت ترین حالات سے دوچار کر دیتی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے تو عقل اور حرام و حلال کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت تک ختم ہو جاتی ہے لہٰذا جنسی خواہش کے اس قدر شدید غلبہ کی صورت میں جب کہ اس خواہش کی تکمیل کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو کسی مرد کا عین موقع پر نفس کو کچل ڈالنا اور حرام کاری سے باز رہنا ایک مثالی عظمت کردار کا مظہر ہے۔
چھٹی بات یہ معلوم ہوئی کہ غیر کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز ہوتا ہے بشرطیکہ بعد اس کی اجازت حاصل ہو جائے جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے کہ فضولی کا تصرف جائز ہو جاتا ہے اور یہ جواز مالک کی اجازت پر موقوف رہتا ہے کہ اگر مالک اجازت دیدیتا ہے تو وہ تصرف نافذ العمل قرار پا جاتا ہے۔
ساتویں بات یہ معلوم ہوئی کہ نیک عہد و اقرار، ادائیگی امانت اور خوش معاملگی نہ صرف بہتر چیز ہے بلکہ انسان کو قرب خداوندی سے ہمکنار کرنے اور آفات و مصائب سے نجات دلانے کا باعث ہے۔
آٹھویں بات یہ معلوم ہوئی کہ بندہ کا کسی آفت و بلا میں گرفتار ہو جانے پر دعا کرنا بہتر ہے کیونکہ وہ دعا قبول ہوتی ہے اور بندہ کو اس آفت و بلا سے نجات دلانے کا سبب بنتی ہے۔
اور نویں بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ کے نیک صالح بندوں کے ذریعہ ایسی چیزوں کا ظاہر ہونا جو عام انسانی عادت کے خلاف ہوں اور جن کو کرامات کہا جاتا ہے برحق ہے اور کرامات کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ اہلسنّت والجماعت کا مسلک ہے۔

جنّت ماں کے قدموں میں ہے

(۲۹) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ جَاهِمَةَ اَنَّ جَاهِمَةَ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَدْتُّ اَنْ اَغْزُوَ وَقَدْ جِئْتُ اَسْتَشِيْرُكَ فَقَالَ هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَالْزَمْهَا فَاِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلِهَا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔ (احمدؒ، نسائی، بیہقیؒ)

"اور حضرت معاویہ ابن جاہمہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت جاہمہؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں اور اس وقت اسی سلسلے میں آپ ﷺ سے مشورہ کرنے حاضر ہوا ہوں حضور نے فرمایا کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! حضور ﷺ نے فرمایا پھر تم انہی کی خدمت کو ضروری سمجھو کیونکہ جنّت ماں کے قدموں میں ہے۔" (احمدؒ، نسائی، بیہقیؒ)

تشریح: "جنّت ماں کے قدموں میں ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ تم جہاد میں جانے کے بجائے ماں کے قدموں میں پڑے رہ کر اس کی اطاعت و خدمت کرنا زیادہ ضروری سمجھو کیونکہ ماں کی اطاعت و خدمت جنت میں جانے کا ذریعہ ہے گویا اس جملہ کے ذریعہ بطور کنایہ اس تواضع و انکساری اور عاجزی و خاکساری کو بیان کرنا مقصود ہے جس کا حکم اولاد کو دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

وَخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ۔

"اور ان (والدین) کے سامنے شفقت سے عاجزی کے ساتھ جھکے رہو۔"

باپ کی خواہش کا احترام کرو

(۳۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتْ تَحْتِي امْرَأَةٌ أُحِبُّهَا وَكَانَ عُمَرُ يَكْرَهُهَا فَقَالَ لِيْ طَلِّقْهَا فَأَبَيْتُ فَأَتَى عُمَرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلِّقْهَا۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی جس سے میں بہت محبت کرتا تھا لیکن میرے والد محترم حضرت عمرؓ اس کو ناپسند کرتے تھے چنانچہ انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم اس عورت کو طلاق دیدو، میں نے انکار کر دیا پھر جب وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا تو حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اس عورت کو طلاق دے دو!۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا ابن عمرؓ سے یہ فرمانا کہ اس عورت کو اطلاق دیدو یا تو استحباب کے طور پر تھا یا اگر اس عورت کو طلاق دلوانے کا کوئی اور شرعی سبب بھی پایا جاتا تھا کہ اس بناء پر ابن عمرؓ کا اس صورت سے علیحدگی اختیار کرنا ہی ضروری ہو گیا تھا تو پھر کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد وجوب کے طور پر ہے۔

والدین کی اہمیت

(۳۱) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَقُّ الْوَالِدَيْنِ عَلٰى وَلَدِهِمَا قَالَ هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے ماں باپ تمہارے لئے جنت بھی اور...... دوزخ بھی۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اس ارشاد کے ذریعہ بڑے بلیغ انداز میں ماں باپ کی اہمیت اور ان کی عظمت شان کو ظاہر فرمایا گیا ہے کہ وہ تمہارے لئے جنت کی راہ بھی آسان کر سکتے ہیں اور تمہیں دوزخ کا مستوجب بھی بنا سکتے ہیں چنانچہ فرمایا گیا کہ اولاد پر ماں باپ کا حق یہ ہے کہ ان کی رضامندی اور خوشنودی کو بہر صورت ملحوظ رکھا جائے جو جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور ان کی نافرمانی سے اجتناب کیا جائے جو دوزخ میں جانے کا باعث۔ حاصل یہ کہ اگر اطاعت و خدمت کے ذریعہ ماں باپ کو راضی و خوش رکھو گے تو جنت میں جاؤ گے اور اگر نافرمانی و لاپرواہی کے ذریعہ ماں باپ کو ناخوش و ناراض رکھو گے تو دوزخ میں ڈالے جاؤ گے۔

ماں باپ کے حق میں استغفار وایصال ثواب کے ذریعہ ان کی ناراضگی کے وبال کو ٹالا جاسکتا ہے

(۳۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَمُوْتُ وَالِدَاهُ اَوْ اَحَدُهُمَا وَاِنَّهٗ لَهُمَا لَعَاقٌّ فَلَا يَزَالُ يَدْعُوْلَهُمَا وَيَسْتَغْفِرُ لَهُمَا حَتّٰى يَكْتُبَهُ اللّٰهُ بَارًّا۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کسی ایسے بندے کے ماں باپ مر جاتے ہیں یا ان دونوں میں سے کوئی ایک مرتا ہے جو ان کی نافرمانی کیا کرتا تھا اور پھر ان کی موت کے بعد وہ ان کے لئے برابر دعا و استغفار کرتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکوکار لکھ دیتا ہے۔"

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ والدین کے مرنے کے بعد اولاد کا ان کے حق میں برابر دعاء و استغفار اور ایصال ثواب کرتے رہنا

اس درجہ سود مند ہے کہ اگر وہ والدین اس اولاد سے ناراضگی و ناخوشی کی حالت میں بھی اس دنیا سے رخصت ہوئے ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی ناراضگی و ناخوشی کو ختم کر دے گا اور اس اولاد کا نام ان لوگوں میں شمار کرے گا جو اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرتے ہیں اور ان کی رضا و خوشنودی کے جویا رہتے ہیں۔

والدین کی اطاعت اور نافرمانی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طاعت و معصیت ہے

(۳۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصْبَحَ مُطِيْعًا لِلّٰهِ فِيْ وَالِدَيْهِ اَصْبَحَ لَهُ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ الْجَنَّةِ وَاِنْ كَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا وَمَنْ اَصْبَحَ عَاصِيًا لِلّٰهِ فِيْ وَالِدَيْهِ اَصْبَحَ لَهُ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ النَّارِ وَاِنْ كَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا قَالَ رَجُلٌ وَاِنْ ظَلَمَاهُ قَالَ وَاِنْ ظَلَمَاهُ وَاِنْ ظَلَمَاهُ وَاِنْ ظَلَمَاهُ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ ماں باپ کے حق میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والا ہے یعنی اس نے ماں باپ کے حقوق ادا کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کی ہے تو وہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے ہوتے ہیں اور اگر اس کے ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہو کہ جس کی اس نے اطاعت و فرمانبرداری کی ہے تو ایک دروازہ کھولا جاتا ہے اور جس شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ ماں باپ کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرنے والا ہے (یعنی اس نے ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی و تقصیر کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی ہے) تو وہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کے لئے دوزخ کے دو دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہو کہ جس کی اس نے نافرمانی کی ہے تو ایک دروازہ کھولا جاتا ہے۔ یہ ارشاد سن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم ہی کیوں نہ کریں، اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم ہی کیوں نہ کریں، اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم ہی کیوں نہ کریں۔"

تشریح: حدیث سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا اور ان کی نافرمانی کرنے سے اجتناب کرنا چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لئے ان کی اطاعت و فرمانبرداری یا ان کی نافرمانی در حقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری یا اس کی نافرمانی کرنا ہے۔

"اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم ہی کیوں نہ کریں۔" حضور ﷺ کا اس جملہ کو تین بار فرمانا ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کی اہمیت کو ظاہر کرنے اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کی تاکید کو زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ بیان کرنے کی بنا پر تھا تاہم واضح رہے کہ ظلم سے مراد وہ ظلم ہے جس کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہو نہ کہ دینی امور سے کیونکہ ماں باپ کی ایسی اطاعت و فرمانبرداری جائز نہیں ہے جس سے دین کی مخالفت اور شرعی احکام و مسائل کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

ماں باپ کو محبت و احترام کی نظر سے دیکھنے کی فضیلت

(۳۴) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ اِلٰى وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً قَالُوْا وَاِنْ نَظَرَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ قَالَ نَعَمْ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَاَطْيَبُ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والا جو بھی لڑکا اپنے باپ یا ماں کو محبت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر نظر کے بدلے ایک مقبول نفلی حج کا ثواب لکھتا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اگرچہ وہ دن بھر میں سو مرتبہ دیکھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! اللہ تعالیٰ بہت بڑا اور بہت پاکیزہ ہے یعنی تمہارے گمان میں جو یہ بات ہے کہ ہر نظر کے بدلے ایک مقبول نفلی حج کا ثواب کیونکر لکھا جا سکتا ہے تو یہ اجر و انعام اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی وسعت رحمت کی نسبت سے کچھ بھی بعید نہ ہے وہ اگر چاہے تو اس سے بھی بڑا اجر عطا کر سکتا ہے۔"

والدین کی نافرمانی کرنے والے کے بارے میں وعید

(۳۵) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّ الذُّنُوْبِ یَغْفِرُ اللّٰہُ مِنْھَا مَاشَآءَ اِلَّا عُقُوْقَ الْوَالِدَیْنِ فَاِنَّہٗ یُعَجِّلُ لِصَاحِبِہٖ فِی الْحَیٰوۃِ قَبْلَ الْمَمَاتِ۔

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا شرک کے علاوہ تمام گناہ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے جس قدر چاہتا ہے بخش دیتا ہے مگر نافرمانی کے گناہ کو نہیں بخشتا بلکہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی نافرمانی کرنے والے کو موت سے پہلے اس کی زندگی میں جلد ہی سزا دے دیتا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص ماں باپ کی نافرمانی کے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اسے اپنے اس گناہ کی سزا اپنی موت سے پہلے اسی دنیا میں بھگتنی پڑتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس دنیا کی زندگی کا تعلق ماں باپ سے ہو یعنی جو والدین اپنی اولاد کی طرف سے نافرمانی کا دکھ سہتے ہیں وہ اپنی زندگی ہی میں اس اولاد کو اپنے گناہ کی نافرمانی کی سزا بھگتتے دیکھ لیتے ہیں تاہم دونوں ہی صورتوں میں آخرت کا عذاب بدستور باقی رہتا ہے کہ نافرمان اولاد محض اسی دنیا میں سزا نہیں پائے گی بلکہ آخرت میں بھی عذاب کی مستوجب ہوگی۔

اس حدیث کے سلسلہ میں ایک احتمال اور بھی ہے وہ یہ کہ والدین کے حقوق کے مذکورہ بالا حکم میں تمام حقوق العباد شامل ہوں یعنی جس طرح ماں باپ کے حقوق ادا نہ کرنے والی اولاد اس گناہ کی سزا دنیا میں پاتی ہے اسی طرح ہر وہ شخص بھی اسی دنیا میں سزا یاب ہوتا ہے جو بندوں کے حقوق کو پامال کرتا ہے چنانچہ حکومت وقت کے خلاف بلا کسی شرعی وقانونی وجہ کے بغاوت کرنے والے اور ناحق ظلم کرنے والے کے بارے میں مذکورہ بالا طرح کی منقول وعید سے یہی ثابت ہوتا ہے حاصل یہ کہ مذکورہ بالا ارشاد گرامی کے ذریعہ والدین کے حقوق کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور ان کی نافرمانی کرنے کے گناہ کی شدت وسنگینی کو بڑے سخت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

بڑا بھائی باپ کی مانند ہے

(۳۶) وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَقُّ کَبِیْرِ الْاِخْوَۃِ عَلٰی صَغِیْرِھِمْ کَحَقِّ الْوَالِدِ عَلٰی وَلَدِہٖ۔ رَوَی الْبَیْھَقِیُّ الْاَحَادِیْثَ الْخَمْسَۃَ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت سعید بن العاصؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ چھوٹے بھائی پر بڑے بھائی کا وہی حق ہے جو بیٹے پر اس کے باپ کا ہوتا ہے یہ پانچوں روایتیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں۔"

بَابُ الشَّفْقَۃِ وَالرَّحْمَۃِ عَلَی الْخَلْقِ

مخلوق خداوندی پر شفقت ورحمت کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جو شخص، لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی

(۱) عَنْ جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت جریر ابن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا (یعنی اس کو اپنی خاص وکامل رحمت کا مستحق نہیں گردانتا) جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

بچوں کو پیار کرنے کی فضیلت

(۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَآءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَتُقَبِّلُوْنَ الصِّبْیَانَ فَمَا نُقَبِّلُھُمْ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوَ اَمْلِكُ لَكَ اَنْ نَزَعَ اللّٰہُ مِنْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی حاضر ہوا اور جب اس نے صحابہؓ کو دیکھا کہ وہ بچوں کو چومتے اور پیار کرتے ہیں تو کہنے لگا کہ کیا تم لوگ بچوں کو چومتے ہو؟ ہم تو بچوں کو نہیں چومتے، نبی کریم ﷺ نے اس کی یہ بات سن کر فرمایا۔ کیا میں اس بات پر قادر ہو سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں سے جس رحم و شفقت کو نکال لیا ہے اس کو روک دوں۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل کو رحمت و شفقت اور پیار محبّت سے خالی کر دیا ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ تمہارے دل میں رحمت و شفقت اور محبّت کا جذبہ پیدا کروں۔ یہ معنی اس صورت میں ہیں جب کہ لفظ اَنْ الف کے ساتھ ہو جیسا کہ اکثر راویوں نے نقل کیا ہے اور اگر الف کے زیر کے ساتھ یعنی اِنْ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ میں کیا کر سکتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل سے رحم کا جذبہ نکال دیا ہے تاہم دونوں صورتوں میں روایت کا مفہوم ایک ہی ہے تفاوت و فرق محض اعراب کی بنیاد پر ہے حدیث کا مقصد بے رحمی و بے مروتی اور سخت دلی کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا اور اس قسم کے لوگوں کو سختی کے ساتھ متنبہ کرنا ہے نیز اس ارشاد گرامی میں اس طرح بھی اشارہ ہے کہ دلوں میں رحم و شفقت کے جذبات کا ہونا اللہ تعالیٰ کا ایک بہترین عطیہ ہے اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اگر وہ کسی شخص کے دل سے رحم و شفقت اور محبّت و مروّت کے جذبات کو نکال دے تو یہ پھر کسی کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اس شخص کے دل کو ان جذبات کی دولت عطا کر دے۔

لڑکی، ماں باپ کے پیار و محبّت اور حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے

(۴) وَعَنْھَا قَالَتْ جَآءَ تْنِیْ اِمْرَاَۃٌ وَمَعَھَا ابْنَتَانِ لَھَا تَسْاَلُنِیْ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِیْ غَیْرَ تَمْرَۃٍ وَاحِدَۃٍ فَاَعْطَیْتُھَا اِیَّاھَا فَقَسَمَتْھَا بَیْنَ ابْنَتَیْھَا وَلَمْ تَاْکُلْ مِنْھَا ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ فَدَخَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَدَّثْتُہٗ فَقَالَ مَنِ ابْتُلِیَ مِنْ ھٰذِہِ الْبَنَاتِ بِشَیْءٍ فَاَحْسَنَ اِلَیْھِنَّ کُنَّ لَہٗ سِتْرًا مِنَ النَّارِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن میرے پاس ایک عورت آئی، اس کے ساتھ اس کی دو بچیاں بھی تھیں اس نے مجھ سے سوال کیا (یعنی مجھ سے کچھ مانگا) لیکن اس کو میرے پاس ایک کھجور کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں مل سکا (یعنی اس وقت میرے پاس صرف ایک کھجور کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا) چنانچہ میں نے اس کو وہی ایک کھجور دے دی اس نے اس کھجور کو آدھی آدھی اپنی دونوں بچیوں کو بانٹ دیا اور خود اس میں سے کچھ نہیں کھایا اور پھر وہ اٹھی اور باہر چلی گئی اتنے میں نبی کریم ﷺ گھر میں تشریف لائے میں نے آپ ﷺ سے اس عورت کا یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ان بچیوں میں سے کچھ یعنی ایک یا دو اور یا زیادہ لڑکیوں کی وجہ سے ابتلاء و آزمائش سے کیا جائے اور وہ ان بچیوں کے ساتھ احسان و سلوک کرے تو وہ بچیاں اور ان کے ساتھ کی گئی وہ نیکی اس کے لئے دوزخ کی آگ سے پردہ بنیں گی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یعنی وہ بچیاں اور ان کے ساتھ کی گئی نیکی اس شخص اور دوزخ کی آگ کے درمیان حائل ہونگی کہ وہ شخص اپنی ان بچیوں کی وجہ سے دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا اور بچیوں کے ساتھ حسن سلوک کی یہ فضیلت اس بنا پر ہے کہ لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیاں یا وہ اپنے ماں باپ کے پیار محبّت اور ان کے حسن سلوک و احسان کی مستحق ہوتی ہیں۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ ابتلاؤ آزمائش کا محمول محض لڑکیوں کا پیدا ہونا ہے یا کسی ایسی حالت میں مبتلاء ہونا ہے جو لڑکیوں کی وجہ سے کسی محنت و تکلیف اور پریشانی و عسرت کے سامنے آنے اور اس پر صبر و تحمل کرنے کی صورت میں پیش آئے چنانچہ پہلی صورت یعنی ابتلاؤ آزمائش کا تعلق لڑکیوں کی پیدائش سے ہونا زیادہ صحیح ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ جو لوگ اپنے ہاں لڑکیاں پیدا ہونے پر دل گرفتگی اور ناگواری میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں کہ لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی رحمت ہیں اور ان کی پرورش و دیکھ بھال اور ان کے ساتھ پیار و محبّت کا سلوک کرنا ایک بہت بڑی اخروی سعادت ہے اس بارے میں بھی علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ احسان و سلوک سے مراد وہ نان و نفقہ ہے جو باپ پر واجب ہوتا ہے یا اس واجب نان و نفقہ کے علاوہ مزید حسن سلوک کرنا مراد ہے۔ چنانچہ راجح قول یہ ہے کہ یہ دوسرے معنی زیادہ صحیح ہیں نیز واضح رہے کہ مذکورہ احسان و سلوک کی شرط یہ ہے کہ وہ شریعت کے موافق ہو۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ بچیوں کے ساتھ احسان و سلوک کرنے کا مذکورہ اجر اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جبکہ اس احسان و سلوک کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ بچیاں اپنی شادی بیاہ کی وجہ سے یا کسی اور صورت میں باپ کی کفالت اور اس کے احسان و سلوک سے بے نیاز ہو جائیں۔

بچیوں کی پرورش کرنے کی فضیلت

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَآءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَنَا وَهُوَ هٰكَذَا وَضَمَّ اَصَابِعَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص دو بیٹیوں کی پرورش اور دیکھ بھال کرے یہاں تک کہ وہ بلوغ کی حد تک پہنچ جائیں یا شادی بیاہ کے بعد اپنے خاوند کے پاس چلی جائیں تو وہ شخص قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ میں اور وہ اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہوں گے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ملا کر دکھایا۔" (مسلمؒ)

تشریح: آپ ﷺ نے اپنے اور اس شخص کے درمیان کمال قرب اور اتصال کو ظاہر کرنے کے لئے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر دکھایا کہ جس طرح تم ان دونوں انگلیوں کو ایک دوسرے سے ملی ہوئی دیکھ رہے ہو اسی طرح قیامت کے دن میں اور وہ شخص ایک دوسرے کے قریب ہوں گے اور محشر میں ہم دونوں ایک جگہ اور ایک ساتھ ہوں گے یا وہ میرے ساتھ جنّت میں داخل ہو گا۔

بیوہ اور مسکین کی خدمت کا ثواب

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّاعِيْ عَلَى الْاَرْمِلَةِ وَ الْمِسْكِيْنِ كَالسَّاعِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اَحْسِبُهٗ قَالَ كَالْقَائِمِ لَا يَفْتُرُ وَ كَالصَّائِمِ لَا يُفْطِرُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بیوہ عورت اور مسکین کی خبرگیری کرنے والا اس شخص کے مانند ہے جو خدا کی راہ میں سعی کرے یعنی جو شخص بیوہ عورت اور مسکین کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے اور ان کی ضروریات کو پورا کر کے ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے تو اس ثواب کے برابر ہے جو خدا کی راہ میں جہاد اور حج کرنے والے کو ملتا ہے اور میرا گمان ہے کہ انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ بیوہ عورت اور مسکین کی خبر گری کرنے والا اس شخص کے مانند ہے جو نماز و عبادت کے شب بیداری کرتا ہے اور اپنی شب بیداری میں نہ کوئی سستی کرتا ہے اور نہ کسی فتور اور نقصان کو گوارا کرتا ہے اور اس شخص کے مانند ہے جو (دن کو کبھی) افطار نہیں کرتا کہ جس کو صائم الدہر کہا جاتا ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: فقیر و محتاج بھی مسکین کے حکم میں داخل ہے بلکہ بعض حضرات کے نزدیک اس کو مسکین پر ترجیح حاصل ہے۔

"اور میرا گمان ہے کہ انہوں نے یہ بھی بیان" ان الفاظ کی نسبت حضرت عبداللہ ابن سلمہ قعنبیؒ کی طرف کی جاتی ہے جو بخاریؒ و مسلمؒ کے شیخ اور اس حدیث کے راوی ہیں جس کو انہوں نے حضرت امام مالکؒ سے روایت کیا ہے اس بات کی صراحت امام بخاریؒ نے کی ہے۔ بہرحال ان الفاظ کے ذریعہ حضرت عبداللہ ابن سلمہؒ کا مطلب یہ ہے کہ میرا گمان ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت امام مالکؒ نے یہ الفاظ کالقائم لا یفتر.... الخ نقل کئے تھے لیکن اگر بخاریؒ کی مذکورہ صراحت کے سامنے نہ ہو تو مصابیح اور مشکوٰۃ کے ظاہری الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ اور میرا گمان ہے کہ........ الخ حضرت ابوہریرہ کا ہے اور ابوہریرہؓ اس جملہ کے ذریعہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ میرے گمان کے مطابق پر آنحضرت ﷺ نے کالقائم لا....... الخ کے الفاظ بھی ارشاد فرمائے تھے یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابوہریرہ نے اپنے اس شک کو ظاہر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو کالساعی فِیْ سبیل اللّٰہ کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے یا کالقائم لا یفتر کے الفاظ، چنانچہ اس کی تائید جامع صغیر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو احمدؒ شیخینؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ سے نقل کیا گیا ہے اور جس کے الفاظ یوں ہیں کہ الساعی علی الارملة والمساکین کالمجاهد فی سبیل اللّٰہ او لقائم اللیل الصائم النهار۔

یتیم کی پرورش کرنے کی فضیلت

(۶) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ لَهٗ وَلِغَيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا کہ وہ یتیم خواہ اس کا ہو یا کسی اور کا جنت میں اس طرح ہوں گے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے ذریعہ اشارہ کیا اور دونوں کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: "وہ یتیم خواہ اس کا ہو یا کسی اور کا" کے ذریعہ اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ مطلق یتیم کی کفالت و پرورش کرنے کی فضیلت ہے وہ یتیم خواہ اس کا اپنا قرابتی ہو جیسے پوتا اور بھتیجا وغیرہ یا کوئی غیر قرابتی ہو۔ حضور ﷺ نے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے ذریعہ اشارہ کر کے واضح کیا کہ جنت میں میرے اور یتیم کی پرورش کرنے والے کے درمیان اتنا قریبی علاقہ ہوگا جتنا کہ ان دونوں انگلیوں کے درمیان ہے نیز آپ ﷺ نے ان دونوں انگلیوں کی کشادگی کے ذریعہ اس طرح بھی اشارہ فرمایا کہ مرتبہ نبوت جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے اس کے اور سخاوت و مروت کے مرتبہ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

تمام مسلمانوں کو ایک تن ہونا چاہئے

(۷) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى عُضْوًا تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى۔ (متفق علیه)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے مخاطب تو مؤمنوں کو آپس میں ایک دوسرے سے رحم کا معاملہ کرنے ایک دوسرے سے محبت و تعلق رکھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی و معاونت کا سلوک کرنے میں ایسا پائے گا جیسا کہ بدن کا حال ہے کہ جب بدن کا کوئی عضو دکھتا ہے تو بدن کے باقی اعضاء اس ایک عضو کی وجہ سے ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور بیداری و بخار کے تعب و درد میں سارا جسم شریک رہتا ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے مؤمن کی صفت اتحاد و یگانگت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی جذبہ و تعلق ایسا ہو سکتا ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کو رنگ و نسل کے بھید بھاؤ زبان و کلچر کے اختلاف و تفاوت اور ذات و قبائل اور علاقہ کی تفرقہ بازی سے نجات دلا کر ایک انسانی برادری اور اتحاد و یگانگت کی ایک لڑی میں پرو سکتا ہے تو وہ صرف ایمان و اسلام کا تعلق ہے چنانچہ اہل ایمان جہاں بھی ہوں جس رنگ و نسل سے بھی تعلق رکھتے ہوں اور ان کی زبان و معاشرت میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن انسان اور مؤمن ہونے کی حیثیت سے وہ ایک ہیں اور ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے درمیان کوئی انسانی اونچ نیچ نہیں ہے، کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے اور کسی برتری و کمتری کی نفرت و حقارت نہیں ہے وہ جس عقیدہ کے حامل اور جس نظریہ حیات کو ماننے والے ہیں اس کی روشنی میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تمام انسان ایک باپ کی اولاد ہیں تمام مسلمان ایک زنجیر کی کڑیاں ہیں، اگر وہ کڑیاں الگ الگ ہو جائیں تو زنجیر ٹوٹ کر رہ جائے گی، اسی طرح اگر مسلمان تفرقہ بازی کا شکار ہو جائیں اور رنگ و نسل زبان و کلچر اور ذات پات کے دائروں میں سمٹ جائیں تو ان کے ملی وجود اور ان کی اجتماعی طاقت کو انتشار و اضمحلال کا گھن لگ جائے گا۔ اور جب ان کی اجتماعی حیثیت مجروح ہو کر غیر مؤثر ہوگی تو ان کا شخصی و انفرادی وجود بھی نہ صرف بے معنی ہو جائے گا۔ بلکہ ہر شخص مختلف آفات و مصائب کا شکار ہوگا۔ اور چونکہ ملی وجود اور اجتماعی طاقت کا سرچشمہ افراد کا آپس میں محبت و موانست اور اشخاص کا باہمی ربط و تعلق ہے اس لئے ہر مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے اس طرح ربط و تعلق رکھتا ہے جس طرح دو حقیقی بھائی ہوتے ہیں کہ آپس میں سلام و دعا کرتے ہیں باہمی میل جول اور ملاقات کرتے ہیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔ باہمی معاملات و تعلقات کو محبت و مؤانست اور رحم دلی کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں ہدایا و تحائف کا تبادلہ کرتے ہیں ایک دوسرے کی مدد و اعانت کرتے رہتے ہیں۔ اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے حالات کی رعایت اور اس کے طور طریقوں کی پاسداری کرتا ہے چنانچہ جب شخصی اور انفرادی سطح پر یہ ربط و تعلق ایک دوسرے کو جوڑنے کا ذریعہ بن جاتا ہے تو سارے مسلمان ایک مضبوط اجتماعی حیثیت اور عظیم طاقت بن جاتے ہیں۔

اس حقیقت کو اس ارشاد گرامی میں ظاہر کیا گیا ہے اور تمام مسلمانوں کو ایک بدن کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جب بدن کا کوئی ایک عضو دکھتا تو سارا بدن اس دکھ سے متاثر ہوتا ہے اور محض ایک عضو میں تکلیف ہونے سے پورا جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ ایک تن بن جائیں اور پوری ملت اسلامیہ ایک جسم کی مانند ہو جائے کہ اگر کسی ایک بھی مسلمان کو کوئی گزند پہنچے یا وہ کسی آفت و مصیبت میں گرفتار ہو تو سارے مسلمان اس کے دکھ و رنج میں شریک ہوں اور سب مل کر اس کی تکلیف و مصیبت کو دور کرنے کی تدبیر کریں اسی مفہوم کو شیخ سعدیؒ نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یکدیگرند — کہ در آفرینش زیک گوہراند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضو ہا رانماند قرار

⑧ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُوْنَ كَرَجُلٍ وَاحِدٍ اِنِ اشْتَكٰى عَيْنُهُ اشْتَكٰى كُلُّهُ وَاِنِ اشْتَكٰى رَأْسُهُ اشْتَكٰى كُلُّهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (ایک خدا ایک رسول ﷺ اور ایک دین کو ماننے کی وجہ سے) سارے مسلمان ایک شخص (کے اعضاء و جسم کے) مانند ہیں کہ اگر اس کی آنکھ دکھتی ہے تو اس کا سارا جسم بے چین و مضطرب ہو جاتا ہے اور اس کا سر دکھتا ہے تو پورا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کی تکلیف کو سارے مسلمانوں کو محسوس کرنا چاہئے۔" (مسلمؒ)

سارے مسلمان ایک دوسرے کی مدد و اعانت کے ذریعہ ناقابل تسخیر طاقت بن سکتے ہیں

⑨ وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ

اَصَابِعِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ مسلمان، مسلمان کے لئے ایک مکان کے مانند ہے یعنی سارے مسلمان مضبوطی و طاقت حاصل کرنے کے اعتبار سے اس مکان کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط رکھتا ہے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: پہلے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اس مکان کے ساتھ تشبیہ دی جس کے سارے اجزاء اور تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر پورے مکان کو مضبوط و پختہ بناتے ہیں اور پھر اس حقیقت کو آپ ﷺ نے مثالی صورت میں اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر دکھلایا کہ اگر سارے مسلمان اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مربوط و متحد رہیں اور باہمی محبّت و موانست اور امداد و تعاون کی زنجیر میں منسلک رہیں تو پوری ملت اسلامیہ مضبوط و توانا اور ایک ناقابل تسخیر طاقت بن جائے گی لیکن واضح رہے کہ مسلمانوں کا وہی اتحاد اور وہی یک جہتی مطلوب و مستحسن ہے جس کی بنیاد حق و حلال کے معاملات پر ہو حرام و مکروہ اور گناہ کے موجب معاملات میں اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کے ساتھ مدد تعاون غیر مطلوب ہے۔

سفارش کرنا ایک مستحسن عمل ہے

⑩ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَانَ اِذَا اَتَاهُ السَّآئِلُ اَوْصَاحِبُ الْحَاجَةِ قَالَ اشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَيَقْضِى اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ رَسُوْلِهٖ مَاشَآءَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب آپ ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجتمند آتا تو صحابہؓ سے فرماتے کہ مجھ سے اس شخص کی سفارش کرو تاکہ تمہیں سفارش کا ثواب مل جائے اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کی زبان سے جو حکم چاہتا ہے جاری فرماتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کسی کی سفارش کرنا گویا اس کے ساتھ ہمدردی کرنا اور اس کی مدد کرنا ہے اس لئے حضور ﷺ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ تم لوگوں کی سفارش کرتے رہا کرو۔ خواہ تمہاری سفارش قبول کی جائے یا نہ کی جائے کیوں کہ کسی کا کام ہونا یا نہ ہونا تقدیر الٰہی اور حکم خداوندی کے مطابق ہے لہٰذا تم اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ شاید میری سفارش قبول نہ ہو، سفارش کرنے سے اجتناب نہ کرو اور اس کا ثواب ہاتھ سے نہ جانے دو۔

واضح رہے کہ سفارش کا حکم ان امور و معاملات سے متعلّق ہے جو کسی ناجائز و حرام مقصد پر مبنی نہ ہوں، نیز اگر کوئی شخص کسی ایسے معاملہ میں ماخوذ ہو جو حد یعنی شریعت کی طرف سے متعیّن شدہ سزا کو لازم کرتا ہو تو اس صورت میں اس وقت سفارش کرنا جائز نہیں ہوگا جب کہ وہ معاملہ امام وقت تک پہنچ چکا ہو، اگر وہ معاملہ امام تک نہ پہنچا ہو تو پھر سفارش کی جاسکتی ہے ہاں تعزیری معاملات میں بہر صورت سفارش کرنا جائز ہے۔ نیز یہ ساری تفصیل اس صورت سے متعلّق ہے جبکہ وہ شخص موذی و شریر نہ ہو، جس کی سفارش کرنا مقصود ہے موذی اور شریر شخص کی سفارش کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

ظالم کی مدد کس طرح کی جاسکتی ہے

⑪ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنْصُرُهٗ مَظْلُوْمًا فَكَيْفَ اَنْصُرُهٗ ظَالِمًا قَالَ تَمْنَعُهٗ مِنَ الظُّلْمِ فَذٰلِكَ نَصْرُكَ اِيَّاهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک صحابیؓ نے (یہ

ارشاد سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جو مسلمان مظلوم ہے اس کی مدد تو مجھے کرنی چاہئے۔ (اور میں جانتا ہوں کہ اس کی کس طرح مدد کی جاسکتی ہے)۔ لیکن میں اس مسلمان کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں جو ظلم کر رہا ہو؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ تم اس کو ظلم سے روکو اور یہی یعنی اس کو ظلم سے روکنا اس کے حق میں تمہاری مدد ہے کیوں کہ اس کو ظلم سے روکنا گویا اس کو اپنے نفس اور شیطان پر قابو پانے میں مدد دینا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تمام مسلمان ایک دوسرے کے دینی بھائی ہیں

⑫ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ اَخُ الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُہٗ وَلَا یُسْلِمُہٗ وَمَنْ کَانَ فِیْ حَاجَۃِ اَخِیْہِ کَانَ اللّٰہُ فِیْ حَاجَتِہٖ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ کُرْبَۃً فَرَّجَ اللّٰہُ عَنْہُ کُرْبَۃً مِنْ کُرُبَاتِ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا دینی بھائی ہے یعنی تمام مسلمان آپس میں دینی اخوت کا تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے شریعت کو وہی مقام حاصل ہے جو ماں کو حاصل ہوتا ہے اور شارع ﷺ تمام مسلمانوں کے دینی باپ ہیں لہٰذا اس دینی اخوت کا تقاضا ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان پر ظلم نہ کرے اور اس کو کسی ہلاکت میں مبتلا نہ کرے اور نہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو اس کے دشمن کے ہاتھوں میں چھوڑے بلکہ اس دشمن کے مقابلہ پر اس کی مدد و اعانت کرے اور (یاد رکھو) جو شخص کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی کی سعی و کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرتا ہے۔ جو شخص کسی مسلمان بھائی کے کسی غم کو دور کرتا ہے (خواہ وہ غم اور تکلیف زیادہ ہو یا کم) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن غموں میں سے ایک بڑے غم سے نجات دے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان بھائی کے بدن یا اس کے عیب کو ڈھانکتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب ڈھانکے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی کی ستر پوشی کرنے والے یا اس کے عیوب کو چھپانے والے شخص نے دنیا میں جو عیوب و گناہ کئے ہوں گے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے ان گناہ و عیوب کی پردہ پوشی کرے گا بایں طور کہ اہل موقف کے سامنے ظاہر نہیں کرے گا اس پر مواخذہ و محاسبہ نہیں کرے گا اور نامہ اعمال کی پیشی کے وقت ان کا ذکر پوشیدہ طور پر ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ جن مسلمانوں کے عیوب کی پردہ پوشی مستحسن و مستحب ہے وہ اس درجہ کے مسلمان ہیں جن کو اہل عزت و حیا کہا جاتا ہے یعنی وہ مسلمان جن کی ظاہری زندگی پاکیزہ اور آبرومندانہ سمجھی جاتی ہے اور جن کے عیوب پوشیدہ رہتے ہیں کہ اگر بتقاضائے بشریت ان سے کوئی گناہ و عیب سرزد ہو جاتا ہے تو وہ اس کو پردہ حیا میں چھپاتے ہیں۔ رہے وہ مسلمان جو حیا کا پردہ اٹھا دیتے ہیں جن کی ایذاء رسانی اور فتنہ پردازی آشکارا ہوتی ہے اور جو علی الاعلان گناہ و معصیت کا ارتکاب کرنے میں کوئی شرم اور جھجک محسوس نہیں کرتے ان کا معاملہ جداگانہ ہے کہ نہ صرف ان کو ان گناہ و عیوب پر ٹوکنا واجب، اور ان کو ارتکاب معصیت سے منع کرنا اور تنبیہ کرنا لازم ہے بلکہ اگر وہ روکنے اور تنبیہ کرنے کے باوجود اپنی برائیوں اور گناہ و ایذاء رسانی سے باز نہ آئیں تو ان کے بارے میں حاکم کے یہاں اطلاع دینی چاہئے تاکہ وہ ان کو ان کی ایذاء رسانیوں اور فتنہ پردازی سے باز رکھے اسی طرح راویان حدیث اور مورخین پر جرح و نقد، ارباب حکومت اور گواہوں کی تحقیق اور اہل ظلم کے حالات کا اظہار بھی نہ صرف جائز بلکہ واجب و لازم ہے کیوں کہ ان صورتوں میں دین و علم کی نگہبانی اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت مقصود ہوتی ہے اس لئے مذکورہ بالا لوگوں کے حالات و عیوب کو بیان کرنا اس اظہار عیب میں داخل نہیں ہے جس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

کسی مسلمان کو حقیر نہ سمجھو

⑬ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمُسْلِمُ اَخُ الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُہٗ وَلَا یَخْذُلُہٗ وَلَا یَحْقِرُہٗ

التَّقْوٰی هٰهُنَا وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلٰثَ مِرَارٍ بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ يَحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ كُلُّ الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا دینی بھائی ہے (لہٰذا) مسلمان، مسلمان پر ظلم نہ کرے اس کی مدد و اعانت کو ترک نہ کرے اور اس کو ذلیل و حقیر نہ سمجھے، پھر آپ ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین دفعہ اشارہ کر کے فرمایا کہ پرہیزگاری اس جگہ ہے نیز فرمایا کہ مسلمان کے لئے اتنی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو ذلیل و حقیر کرے یعنی کسی مسلمان بھائی کو ذلیل و حقیر کرنا بجائے خود اتنی بڑی برائی ہے کہ وہ کوئی اور گناہ نہ بھی کرے تو اسی ایک برائی کی وجہ سے مستوجب مواخذہ ہوگا۔ (اور یاد رکھو) مسلمان پر مسلمان کی ساری چیزیں حرام ہیں جیسے اس کا خون، اس کا مال، اور اس کی عزت و آبرو۔" (مسلم)

تشریح: "اس کو ذلیل و حقیر نہ سمجھے" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان بھائی کے عیب کو اچھال کر اور اس کی برائیوں کو لوگوں کے سامنے بیان کر کے ان کو رسوا اور بدنام نہ کرے اس کے ساتھ بدزبانی اور سخت کلامی نہ کرے۔ اور کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی غریب و محتاج ہو کتنا ہی ضعیف و ناتواں اور کتنا ہی نامراد و خستہ حال ہو اس کا مذاق نہ اڑائے کیوں کہ کسی کو کیا معلوم کہ جو مسلمان ظاہری طور پر نہایت خستہ حال اور ضعیف و محتاج ہے اللہ کے نزدیک اس کا مقام کیا ہے۔ اور انجام و مآل کے اعتبار سے وہ کس درجہ کا ہے۔ اس حقیقت کو کسی صورت میں فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ جو بھی شخص لا الہ الا اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اور خدا کے رسول ﷺ کا امتی ہے وہ عزت والا ہے اور قابل تکریم ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لہٰذا کسی مؤمن کی عزت ایمانی کو کسی حال میں مجروح نہ کرنا چاہئے اور خصوصا وہ مؤمن جن کے چہرے مہرے سے علم دین کی علامت اور عبادت خداوندی کا نور جھلکتا ہو ان کی تعظیم و توقیر کو بطریق اولیٰ ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے اکثر لوگ اور خصوصا وہ دنیا دار جو نفس کی ظلمت و غفلت میں مبتلا ہوتے ہیں عام طور پر فقراء و مساکین اور غریب و بے کس مسلمانوں کے وبال میں گرفتار رہتے ہیں کیونکہ وہ ان کو ذلیل و کمتر سمجھتے ہیں اور ان بے چاروں کے ساتھ انتہائی ترشی اور حقارت کا معاملہ کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر مؤمن کو ذلیل و حقیر کرنے کا عذاب اپنا سر لیتے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دنیا میں بھی عزت و اقبال مندی سے نوازتا ہے اور آخرت میں بھی نجات عطا کرے گا جو اس کے غریب و مسکین اور ضعیف و بے کس بندوں کے ساتھ محبت و احترام کا برتاؤ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ مسکین و غرباء کی محبت حاصل ہونے کی دعا مانگا کرتے تھے نیز آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ فقراء و مساکین کی ہم نشینی اختیار فرمائیں جیسا کہ سورہ کہف میں مذکور ہے۔

"پرہیزگاری اس جگہ ہے" کا مطلب یہ ہے کہ متقی یعنی وہ شخص جو شرک اور گناہوں سے اجتناب و پرہیز کرتا ہے اس کو کسی بھی صورت میں حقیر و کمتر سمجھنا جائز نہیں ہے یا یہ مراد ہے کہ تقویٰ کا مصدر و مخزن اصل میں سینہ یعنی دل ہے اور وہ ایک ایسی صفت ہے جو باطن کی ہدایت اور نورانیت سے پیدا ہوتی ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ ان الفاظ کا مقصد ماقبل جملہ کی تاکید و تقویت ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ جو چیز کسی انسان کو معزز و مکرم بناتی ہے وہ تقویٰ ہے اور جب تقویٰ کا تعلق باطن سے ہے اور اس کی جگہ دل ہے جو ایک پوشیدہ چیز ہے کہ جس کو انسان ظاہری نہیں دیکھ سکتا تو پھر کسی مسلمان کو کیونکر حقیر و ذلیل کہا جا سکتا ہے۔ درآنحالیکہ اس کی حقیقت معلوم نہیں ہے ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ تقویٰ کی جگہ دل کو قرار دیکر اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جس کے دل میں تقویٰ ہو وہ کسی مسلمان کو حقیر و ذلیل نہ کرے کیونکہ کوئی بھی متقی کسی مسلمان کو ذلیل کرنے والا نہیں ہو سکتا یہ مراد اگرچہ بعض علماء نے لکھی ہے لیکن پہلے معنی زیادہ صحیح اور زیادہ موزون ہیں۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی مسلمان ایسا کوئی کام نہ کرے اور نہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نکالے جس سے کسی مسلمان بھائی کی خوں ریزی ہو یا اس کا مال تلف و ضائع ہو اور یا اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچے۔

یہ حدیث اپنے الفاظ کے اختصار لیکن مفہوم و معنی کی وسعت کے اعتبار سے جوامع الکلم میں سے ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو خصوصی عطیہ ہے۔

جنتی اور دوزخی لوگوں کی قسمیں

⑭ وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلٰثَةٌ ذُوْ سُلْطَانٍ مُقْسِطٌ مُتَصَدِّقٌ مُوَفَّقٌ وَرَجُلٌ رَحِيْمٌ رَقِيْقُ الْقَلْبِ لِكُلِّ ذِيْ قُرْبٰى وَمُسْلِمٍ وَعَفِيْفٌ مُتَعَفِّفٌ ذُوْ عِيَالٍ وَاَهْلُ النَّارِ خَمْسَةٌ الضَّعِيْفُ الَّذِيْ لَا زَبْرَ لَهُ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْكُمْ تَبَعٌ لَا يَبْغُوْنَ اَهْلًا وَلَا مَالًا وَالْخَائِنُ الَّذِيْ لَا يَخْفٰى لَهُ طَمَعٌ وَاِنْ دَقَّ اِلَّا خَانَهُ وَرَجُلٌ لَا يُصْبِحُ وَلَا يُمْسِيْ اِلَّا وَهُوَ يُخَادِعُكَ عَنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ وَذَكَرَ الْبُخْلَ وَالْكِذْبَ وَالشِّنْظِيْرَ الْفَحَّاشَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عیاض ابن حمارؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنتی لوگوں کی تین قسمیں ہیں (یعنی جو اہل ایمان اس لائق ہیں کہ سابقین اور مقربین کے ساتھ جنت میں داخل ہوں وہ تین طرح کے ہیں) ایک تو وہ حاکم جو عدل و انصاف کرتا ہو اور لوگوں کے ساتھ احسان کرنے والا ہو اور جس کو نیکیوں اور بھلائیوں کی توفیق دی گئی، دوسرے وہ شخص (جو چھوٹوں اور بڑوں پر) مہربان، اور قرابتداروں اور مسلمانوں کے لئے رقیق القلب یعنی نرم دل ہو (یعنی وہ اپنے اور بیگانے ہر ایک کے ساتھ نرمی اور مروت اور مہربانی کا برتاؤ کرنے والا ہو)۔ اور تیسرے وہ شخص جو (غیر حلال چیزوں سے) بچنے والا (غیر اللہ کے آگے دست سوال دراز کرنے سے) پرہیز کرنے والا اور اہل وعیال کے بارے میں خدا پر توکل کرنے والا ہو (یعنی اہل وعیال کی محبت اور ان کے رزق کا خوف اس کو خدا پر توکل کرنے سے باز نہ رکھتا ہو، لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور حرام و ناجائز مال حاصل کرنے پر مجبور نہ کرتا ہو اور نہ وہ اپنے ان اہل وعیال کی وجہ سے علم وعمل میں مشغول ہونے سے غافل رہتا ہو) اور دوزخی لوگوں کی پانچ قسمیں ہیں۔ (یعنی جو لوگ اپنے افعال بد کے وبال میں پڑ کر مستوجب عذاب ہوتے ہیں وہ پانچ طرح کے ہیں! گویا یہاں ان افعال بد اور بری خصلتوں کی برائی بیان کرنا اور ان کی سختی و شدت کو ظاہر کرنا مقصود ہے جو دوزخ کے عذاب کا باعث ہیں جیسا کہ پہلے ان چیزوں کی تعریف و مدح ذکر کی گئی۔ جو جنت میں لے جانے والی ہیں) ایک تو کمزور عقل والا کہ اس کی عقل کی کمزوری اس کو ناشائستہ امور سے باز نہ رکھے (یعنی وہ شخص کہ جو اپنی عقل پر نفسانی خواہشات اور خود غرضی کے جذبات کے غالب آجانے کی وجہ سے ثبات و استقامت ترک کر دیتا ہے اور گناہوں اور بری باتوں سے باز رہنے پر قادر نہیں رہتا) وہ لوگ کہ جو تمہارے تابع اور تمہارے خادم ہیں ان کو نہ بیوی کی خواہش ہوتی ہے اور نہ مال کی پرواہ (یعنی جو لوگ تمہارے مال داروں اور مقتدروں کے آگے پیچھے پھرتے نظر آتے ہیں اور ان کی خدمت و اطاعت کا دم بھرتے رہتے ہیں ان کے مد نظر نہ تو کسی کی بھلائی و دوستی ہوتی ہے اور نہ ان کو واقعۃً خدمت و اطاعت سے کوئی غرض ہوتی ہے بلکہ وہ تو محض اپنی نفسانی خواہشات اور خود غرضی کے تابع ہوتے ہیں ان کا اصل مقصد اچھے اچھے کھانوں سے اپنا پیٹ بھرنا اچھے درجہ کا لباس اور دوسری چیزیں حاصل کرنا ہوتا ہے نہ تو انہیں بیوی کی پرواہ ہوتی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی جنسی خواہش جائز طور پر پوری کر سکیں اور نہ انہیں اس مال و زر کی طلب ہوتی ہے جو حلال ذرائع جائز وسائل اور محنت و مشقت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ بدکاریوں حرام خوریوں اجنبی عورتوں اور حرام و مشتبہ اسباب میں مگن اور خوش رہتے ہیں اور یہ چیز بھی انسانی عقل کی کمزوری اور ضمیر کی مردنی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ حلال و پاک چیزوں سے اعراض کرنا اور حرام و مشتبہ چیزوں کو مطلوب و مقصد قرار دینا نہ تو عقل کا تقاضا ہو سکتا ہے اور نہ ضمیر کے مطابق) دوسرے وہ شخص جو خائن و بددیانت ہے کہ اس کی طمع کسی پوشیدہ چیز کو بھی اس کے ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تاکہ وہ اس میں بددیانتی کر سکے خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی اور کمتر چیز کیوں نہ ہو (یعنی اس کی طمع و حرص اس کو کسی حال میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی یہاں تک کہ وہ چھپی ہوئی چیزوں کی بھی تلاش و جستجو میں لگا رہتا ہے اور جب وہ چیزیں اس کے ہاتھ لگ جاتی ہیں تو ان میں بھی بددیانتی کرتا ہے خواہ وہ چیزیں کتنی ہی بے وقعت اور کمتر کیوں نہ ہوں، نیز بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ خفا

چونکہ ظہور کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے لا یخفی لہ طمع کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خائن کہ وہ اس چیز میں بھی خیانت کرتا ہے جو اس کے سامنے نہیں ہوتی اور نہ وہ اس قابل ہوتی ہے کہ وہ اس کی طمع و حرص کر سکے)۔ اور تیسرے وہ شخص جو صبح و شام تمہیں تمہارے اہل و عیال میں دھوکہ دینے کے چکر میں رہتا ہے (یعنی جس شخص کو تم اپنے گھر والوں کی حفاظت اور اپنے مال و اسباب کی نگرانی سپرد کرتے ہو یا جو شخص از خود تمہارے ساتھ لگا رہتا ہے اور اپنی عفت و پاکدامنی کو تم پر ظاہر کر کے یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ تمہارے گھربار اور اہل خانہ کی حفاظت و نگرانی میں مصروف ہے لیکن حقیقت میں وہ ہر لمحہ تمہارے اہل خانہ اور تمہارے مال و اسباب پر بری نظر رکھتا ہے) نیز آنحضرت ﷺ نے بخیل اور جھوٹے اور بد خلق فحش گو کا ذکر کیا۔" (مسلم)

تشریح: "رجل رحیم رقیق القلب" میں رحیم سے مراد صفت فعلیہ اور رقیق سے مراد صفت قلبیہ ہے صفت فعلیہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ صفت اپنا خارجی وجود بھی رکھے اور دوسروں پر اس کے اثرات ظاہر ہوں جبکہ صفت قلبیہ کا تعلق محض اس صفت کے باطنی وجود سے ہوتا ہے خواہ علمی اور خارجی طور پر اس کا اظہار ہو یا نہ ہو۔

لفظ بخل اور کذب مصدر قائم مقام فاعل ہیں۔ وذکر البخل والکذب......الخ کے ذریعہ راوی نے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوزخیوں کی جو قسمیں بیان فرمائی تھیں ان میں بخیل اور کاذب کا بھی ذکر فرمایا اور پوری عبارت کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ ﷺ نے دوزخیوں کی مذکورہ قسمیں بیان فرمانے کے بعد فرمایا کہ دوزخیوں کی اور قسمیں بخیل و کاذب ہیں! رہی یہ بات کہ راوی نے ذکر البخیل والکاذب کہنے کے بجائے ذکر البخل والکذب کیوں کہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے جو ارشاد فرمایا تھا وہ بعینہ الفاظ میں راوی کو یاد نہیں رہا تھا البتہ صحیح طور پر یہ یاد تھا کہ آپ ﷺ نے باقی دو قسموں کے سلسلے میں جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے ان میں بخل اور کذب کا ذکر ضرور تھا خواہ آپ ﷺ نے والبخیل والکاذب ہی کے الفاظ فرمائے ہوں یا کچھ اور الفاظ فرمائے ہوں۔ اکثر روایتوں میں البخل اور الکذب کے درمیان واؤ کے بجائے او ہے یعنی البخل او الکذب اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ اس موقع پر راوی کو شک واقع ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو "البخل" کا لفظ ارشاد فرمایا تھا یا الکذب کا یعنی راوی گویا یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دوزخیوں کی تین قسمیں بیان کرنے کے بعد چوتھی قسم کے طور پر یا تو بخیل کو بیان کیا تھا یا کاذب کو اور زیادہ صحیح بات بھی یہی ہے کہ یہاں حرف او ہے جو راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے اور جن روایتوں میں واؤ ہے ان میں بھی واؤ حرف او کے معنی میں ہے نیز لفظ والشنظیر کو بھی مرفوع قرار دینا زیادہ صحیح ہو گا اور اس کا عطف رجل پر کیا جاتا ہے جبکہ بعض حضرات نے اس کو منصوب قرار دیا ہے۔

اپنے مسلمان بھائی کے لئے اسی چیز کو اچھا سمجھو جس کو اپنے لئے اچھا سمجھتے ہو

⑮ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کے لئے وہی چیز نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

"چیز" سے مراد دنیا و آخرت کی بھلائی ہے، چنانچہ ایک روایت میں من الخیر کا لفظ صریح طور پر منقول ہے! رہی یہ بات کہ دنیا و آخرت کی بھلائی کا تعلق کن چیزوں سے ہے تو آخرت کی بھلائی یہ ہے کہ نیک اعمال اور اچھے احوال کی سعادت نصیب ہو، خاتمہ بخیر ہو قبر کی

سختیوں قیامت کے دن کی باز پرسی اور دوزخ کے عذاب سے نجات حاصل ہو اپنے اعمال صالحہ کے سبب سے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنّت میں اعلیٰ درجات میں اور خدا اور خدا کے رسول کی خوشنودی حاصل ہو اسی طرح دنیا کی بھلائی یہ ہے کہ عزّت و آبرو اور نیک نامی و خوش حالی کی زندگی نصیب ہو مال و دولت اور اسباب راحت حاصل ہوں اچھے احوال و کردار کے حامل اہل خانہ اور صالح و فرمانبردار اولاد کی نعمت ملے اور یہ سب چیزیں آخرت کا وسیلہ بنیں جو مسلمان دنیا و آخرت کی ان نعمتوں اور بھلائیوں کو اپنے لئے چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ انہیں دنیاوی و اخروی نعمتوں اور بھلائیوں کو سارے مسلمانوں کے لئے چاہے کیونکہ یہی کمال ایمان بھی ہے اور دینی اخوت کا تقاضا بھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ جو مسلمان محض شیطان کے فریب، نفسانی حرص اور فساد باطن کی وجہ سے اپنے لئے دنیا کے مال وزر اور دنیا کی جاہ کے طلبگار و خواہشمند ہوتے ہیں اور اس مال و جاہ کا نتیجہ گناہ و معصیت فتنہ و فساد، ظلم وجور اور آخرت کے وبال و عذاب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ تو وہ اس مال و جاہ کی خواہش کسی دوسرے کے لئے کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو مال وزر اور جو جاہ و حشمت دین کے نقصان اور آخرت کے عذاب کا باعث ہو تو اس کو خیر و بھلائی کے زمرہ میں شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس طرح کے مال وزر اور جاہ و حشمت کو نہ تو اپنے لئے پسند کرے اور نہ کسی دوسرے مسلمان کے لئے تاہم اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ مال و دولت اور جاہ و حشمت بجائے خود برائی نہیں ہیں اور نہ یہ ہر حالت میں برائی تک پہنچانے کا سبب بنتے ہیں بلکہ ان کے تعلّق سے برائی یا بھلائی کا دارومدار خود انسان کے ذہن و مزاج اور اس کی طبعی خاصیت پر ہوتا ہے ایک شخص ایسا ہوتا ہے کہ وہ محض مال و دولت اور جاہ و حشمت کی وجہ سے نیکی و بھلائی کے بڑے سے بڑے درجہ پر پہنچ جاتا ہے اور جاہ و حشمت کا حصول ثواب آخرت اور قرب مولیٰ کا سبب بنتا ہو جیسے مال وزر کے ذریعہ حج کرنا اور فقراء و مساکین کی خبر گیری کرنا اور جاہ و حشمت کے ذریعہ عدل و انصاف قائم کرنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری کو پورا کرنا اس کے برخلاف اگر وہی مال و دولت اور جاہ و حشمت دوسرے شخص کے لئے دینی فائدے کے بجائے نقصان کا موجب بنتا ہو۔ جیسے اس مال و جاہ کے ذریعہ فسق و فجور کا ارتکاب فتنہ و فساد اور ظلم وجور کی گرم بازاری تو اول الذکر شخص کا اس مال و جاہ کو اپنے لئے پسند کرنا اور دوسرے شخص کے لئے پسند نہ کرنا درست ہوگا کیونکہ اس مال و جاہ کو اس کے حق میں خیر نہیں کہا جائے گا۔

ہمسایہ کو تکلیف نہ پہنچاؤ

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ قِیْلَ مَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قسم ہے خدا کی اس شخص کا ایمان کامل نہیں ہے، قسم ہے خدا کی اس شخص کا ایمان کامل نہیں ہے (جب آپ ﷺ نے بار بار الفاظ ارشاد فرمائے اور اس شخص کی وضاحت نہیں کی تو) صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! وہ شخص کون ہے جس کا ایمان کامل نہیں ہے اور جس کے بارے میں آپ (ﷺ) کا یہ ارشاد ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا وہ شخص جس کے پڑوسی اس کی برائیوں اور اس کے شر سے محفوظ و مامون نہ ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۱۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَّا یَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص نجات یافتہ اور سابقین کے ساتھ جنّت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ جس کے پڑوسی اس کی برائیوں اور شر سے محفوظ و مامون نہ ہوں۔" (مسلمؒ)

ہمسایہ سے اچھا سلوک اختیار کرنے کی اہمیت

(۱۸) وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا زَالَ جِبْرَئِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا حضرت جبرئیل علیہ السلام ہمیشہ مجھ کو ہمسایہ کے حق کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا کرتے تھے یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا کہ حضرت جبرئیل حکم الٰہی کے مطابق بذریعہ وحی عنقریب ہی پڑوسیوں کو ایک دوسرے کا وارث قرار دیں گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے ہمسایہ کے حقوق یعنی پڑوسیوں کے ساتھ احسان و نیک سلوک کرنے اس کے دکھ درد کو بانٹنے اور اس کو کسی قسم کی تکلیف و پریشانی میں مبتلا نہ کرنے کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ حضرت جبرئیل اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو جس تواتر اور پابندی کے ساتھ حکم دیتے تھے۔ اس سے آنحضرت ﷺ نے یہ خیال قائم کر لیا تھا کہ حضرت جبرئیل شاید کسی قریبی وقت میں یہ وحی لے کر نازل ہوں کہ پڑوسی آپس میں ایک دوسرے کے وارث قرار دیئے جاتے ہیں۔

تیسرے شخص کی موجودگی میں دو شخص آپس میں سرگوشی نہ کریں

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كُنْتُمْ ثَلٰثَةً فَلَا يَتَنَاجٰى اثْنَانِ دُوْنَ الْاٰخَرِ حَتّٰى تَخْتَلِطُوْا بِالنَّاسِ مِنْ اَجْلِ اَنْ يُحْزِنَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اگر تم تین آدمی یکجا ہو تو دو آدمی اس طرح سرگوشی نہ کریں کہ وہ تیسرا شخص نہ سن سکے یہاں تک کہ وہ بہت سے آدمیوں میں مل جائیں اور یہ (ممانعت) اس وجہ سے ہے کہ ان دونوں کا یہ فعل (یعنی آپس میں سرگوشی کرنا) اس (تیسرے آدمی) کو رنجیدہ کرے گا (یعنی جب وہ اپنے سامنے ان لوگوں کو سرگوشی کرتے دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ یہ دونوں شاید میری برائی کر رہے ہیں یا میرے خلاف کوئی مشورہ کر رہے ہیں۔)" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر تین آدمی ایک ساتھ مثلاً کہیں بیٹھے ہوئے ہیں تو ان میں سے کسی بھی دو آدمیوں کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ آپس میں اس طرح سرگوشی اور کانا پھوسی کرنے لگیں کہ ان میں کا تیسرا آدمی ان کی بات کو سننے نہ پائے، ہاں اگر کسی جگہ چار آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں اور ان میں سے دو آدمی آپس میں سرگوشی کرنے لگیں تو ان دونوں کی سرگوشی پر مذکورہ ممانعت کا اطلاق نہیں ہو گا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ تیسرے آدمی کی موجودگی میں دو آدمیوں کے آپس میں سرگوشی کرنے یا اسی طرح چوتھے آدمی کی موجودگی میں تین آدمیوں کے آپس میں سرگوشی کرنے کی مذکورہ بالا ممانعت نہی تحریمی کے طور پر ہے لہٰذا دو آدمی ہوں یا تین چار ہوں یا پورا مجمع ہو ان کے لئے یہ حرام ہے کہ وہ ایک آدمی کو چھوڑ کر باقی سب آپس میں سرگوشی اور کانا پھوسی کریں ہاں اگر اس ایک آدمی سے پوچھنے کے بعد اور اس کی اجازت کی صورت میں سرگوشی کریں تو کوئی مضائقہ نہیں، حضرت ابن عمرؓ حضرت امام مالکؒ، شوافع اور جمہور علماء کا یہی مسلک ہے اور اس حکم کا تعلق ہر موقع و ہر زمانہ سے ہے خواہ سفر ہو یا حضر ہو۔

خیر خواہی کی اہمیت و فضیلت

(۲۰) وَعَنْ تَمِيْمِ نِ الدَّارِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ ثَلٰثًا قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ دین نصیحت ہے (یعنی نصیحت اور خیر خواہی اعمال دین میں سے افضل

ترین عمل ہے یا نصیحت اور خیر خواہی دین کا ایک مہتم بالشان نصب العین ہے) حضور ﷺ نے یہ بات (کہ دین نصیحت ہے) تین بار فرمائی! ہم نے (یعنی صحابہؓ نے) پوچھا کہ یہ نصیحت اور خیر خواہی کس کے لئے ہے اور کسی کے حق میں کرنی چاہئے؟ حضور ﷺ نے فرمایا خدا کے لئے، خدا کی کتاب کے لئے، مسلمانوں کے اماموں (یعنی اسلامی حکومت کے سربراہوں اور علماء) کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: خدا کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات و صفات پر ایمان لائے اس کی واحدانیت و حاکمیت کا اعتقاد رکھے، اس کی صفات و کارسازی میں کسی غیر کو شریک کرنے سے اجتناب کرے اس کی عبادت اخلاص نیت کے ساتھ کرے اس کے اوامر و نواہی کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اس کی نعمتوں کا اقرار و اعتراف کرے اور اس کا شکر ادا کرے اس کے نیک اور فرمانبردار بندوں سے محبت رکھے اور بدکار و سرکش بندوں سے نفرت کرے۔

خدا کی کتاب کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا عقیدہ رکھے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر ہر حالت میں عمل کرے تجوید و ترتیل اور غور فکر کے ساتھ اس کی تلاوت کرے اور اس کی تعظیم و احترام میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔

خدا کے رسول ﷺ کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی سچے دل سے تصدیق کرلے کہ وہ رسول (ﷺ) اور اس کے پیغمبر ہیں ان کی نبوت پر ایمان لائے وہ اللہ کی طرف سے جو پیغام پہنچائیں اور جو احکام دین ان کو قبول کرے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے ان کو اپنی جان اپنی آل اولاد اپنے ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز و محبوب رکھے ان کے اہل بیت اور ان کے صحابہؓ سے محبت رکھے اور ان کی سُنّت پر عمل کرے۔

مسلمانوں کے اماموں کے حق میں خیر خواہی یہ ہے کہ جو شخص اسلامی حکومت کی سربراہی کر رہا ہو اس کے ساتھ وفاداری کو قائم رکھے، احکام و قوانین کی بیجا طور پر خلاف ورزی کر کے ان کے نظم حکومت میں خلل و ابتری پیدا نہ کرے اچھی باتوں میں ان کی پیروی کرے اور بری باتوں میں ان کی اطاعت سے اجتناب کرے اگر وہ اسلام اور اپنے عوام کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت و کوتاہی کا شکار ہوں تو ان کو مناسب اور جائز طریقوں سے متنبہ کرے اور ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہ کرے اگرچہ وہ کوئی ظلم ہی کیوں نہ کریں! علماء کو جو مسلمانوں کے علمی و دینی رہنما ہوتے ہیں ان کی عزت و احترام کرے، شرعی احکام اور دینی مسائل میں وہ قرآن و سُنّت کے مطابق جو کچھ کہیں اس کو قبول کرے اور اس پر عمل کرے ان کی اچھی باتوں اور ان کے نیک اعمال کی پیروی کرے۔

اور تمام مسلمانوں کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دینی و دنیاوی خیر و بھلائی کا طالب رہے ان کو دین کی تبلیغ کرے ان کو دنیا کے اس راستہ پر چلانے کی کوشش کرے اور ان کو کسی بھی طرح نقصان پہنچانے کی بجائے نفع پہنچانے کی سعی کرے۔

واضح رہے کہ یہ حدیث بھی "جوامع الکلم" میں سے ہے، اس کے مختصر الفاظ حقیقت میں دین و دنیا کی تمام بھلائیوں اور سعادتوں پر حاوی ہیں اور تمام علوم اولین و آخرین اس چھوٹی سی حدیث میں مندرج ہیں۔

(۲۱) وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جریر ابن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھوں گا زکوٰۃ ادا کروں گا اور ہر مسلمان کے حق میں خیر خواہی کروں گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ کی تمام تر عبادات و طاعت کا تعلق دو ہی چیزوں سے ہے ایک تو حقوق اللہ، دوسرے حقوق العباد، لہٰذا حضرت جریرؓ نے حقوق اللہ میں خاص طور پر ان عبادات کا ذکر کیا جو تمام بدنی اور مالی عبادتوں میں شہادت کے بعد سب سے اعلیٰ و افضل ہیں اور

ارکان اسلام میں سے اہم ترین رکن ہیں یعنی نماز اور زکوٰۃ جہاں تک روزہ اور حج کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ جس وقت حضرت جریرؓ نے بیعت کی ہو اس وقت تک یہ دونوں روزہ اور حج مسلمانوں پر فرض نہ قرار دیئے گئے ہوں! اسی طرح حقوق العباد سے متعلق اس چیز کو ذکر کیا جس کے دائرے میں بندوں کے تمام حقوق آجاتے ہیں یعنی خیر خواہی۔

انہی حضرت جریرؓ کا ایک واقعہ اس موقع کے نہایت مطابق ہے اور جس سے ان کی مذکورہ بالا بیعت کا ایک عملی نمونہ سامنے آتا ہے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جریرؓ نے ایک گھوڑا تین سو درہم کے عوض خرید کیا، انہوں نے بیچنے والے سے کہا کہ تمہارا یہ گھوڑا تو تین سو درہم سے زیادہ قیمت کا ہے کیا تم اس کی قیمت چار سو درہم لو گے؟ اس نے کہا ابن عبد اللہ! یہ تمہاری مرضی پر موقوف ہے! انہوں نے کہا کہ یہ گھوڑا تو چار سو درہم سے بھی زائد کا معلوم ہوتا ہے کیا تم اس کی قیمت پانچ سو درہم لینا پسند کرو گے؟ وہ اسی طرح اس کی قیمت سو سو درہم بڑھاتے گئے اور آخر کار انہوں نے اس گھوڑے کی قیمت میں آٹھ سو درہم ادا کیے جب لوگوں نے ان سے گھوڑے کی قیمت بڑھانے کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا اصل بات یہ ہے کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے یہ بیعت کی تھی کہ ہر مسلمان سے خیر خواہی کروں گا (چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ اس گھوڑے کا مالک وہ قیمت طلب نہیں کر رہا ہے جو حقیقت میں ہونی چاہئے تو میں نے اس کی خیر خواہی کے پیش نظر اس کو زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کی۔)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بدبخت کا دل رحم و شفقت کے جذبہ سے خالی ہوتا ہے

(۲۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا الْقَاسِمِ الصَّادِقَ الْمَصْدُوْقَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَاتُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِیٍّ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں ابوالقاسم ﷺ کو جو صادق و مصدوق ہیں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رحمت یعنی مخلوق خدا پر رحم و شفقت کرنے کے جذبہ کو کسی کے دل سے نہیں نکالا جاتا مگر بدبخت کے دل کو اس جذبہ سے خالی کر دیا جاتا ہے۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: "صادق" کے معنی ہیں وہ شخص اپنی باتوں میں سچا ہے اور مصدوق کے معنی ہیں وہ شخص جس کو لوگوں نے سچا تسلیم کر لیا ہے یا جس کے سچا ہونے کی خبر خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے یہ دونوں لقب آنحضرت ﷺ کی صفت ہیں چنانچہ آپ ﷺ نہ صرف یہ کہ سچے تھے۔ اور دنیا نے آپ ﷺ کو سچا تسلیم کیا بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سچا ہونے کی خبر دی کہ فرمایا و ماینطق عن الھوی۔

بدبخت سے مراد کافر ہے یا فاجر! اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کافر اپنے کفر یا فاسق اپنے فسق و فجور کی وجہ سے اپنے دل کو اتنا سخت بنالیتا ہے کہ اس کے اندر سے وہ انسانی جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان پر رحم و شفقت کرنے پر مائل کرتا ہے۔

تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا

(۲۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْكُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مخلوق خدا پر رحم و شفقت کرنے والوں پر رحمٰن کی رحمت نازل ہوتی ہے لہٰذا تم زمین والوں پر رحم و شفقت کرو تاکہ تم پر وہ رحم کرے جو آسمان میں ہے۔" (ابوداؤدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: "زمین والوں میں" سارے جاندار داخل ہیں خواہ وہ حیوان ہوں یا انسان اور انسان بھی خواہ نیک ہوں یا بد البتہ بد لوگوں پر رحم و شفقت کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان کو ان کی بدی اور برائی سے روکا جائے جیسا کہ اس حدیث کہ اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا

مظلوم کی تشریح میں بتایا گیا تھا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رکھا جائے یا یہ کہ زمین والوں پر رحم و شفقت کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں پر رحم و شفقت کرو جو اس کے مستحق ہوں۔

جو آسمان میں ہے سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کا کمال قدرت اور جس کی سلطنت آسمان میں ہے یا اس سے مراد ملائکہ ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم زمین پر رہنے والوں پر رحم و شفقت کرو تاکہ آسمانوں میں رہنے والے یعنی ملائکہ کا رحم تم پر ہو اور تمہارے حق میں ان کا رحم یہ ہے کہ وہ تمہارے دشمنوں اور ایذاء پہنچانے والی مخلوق جیسے جنات و شیاطین اور شریر انسانوں سے تمہاری حفاظت کریں اور بارگاہ کبریائی میں تمہارے لئے دعا و استغفار اور طلب رحمت کریں۔

جو شخص اپنے چھوٹوں پر شفقت اور اپنے بڑوں کا احترام نہ کرے وہ متبعین رسول میں نہیں ہے

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَیَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ وہ شخص ہماری اتباع کرنے والوں میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم و شفقت نہ کرے ہمارے بڑوں کا جو خواہ جوان ہوں یا بوڑھے احترام ملحوظ نہ رکھے، نیکی و بھلائی کا حکم نہ دے اور بدی و برائی سے منع نہ کرے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

اپنی تعظیم کرانا چاہتے ہو تو اپنے بڑوں کی تعظیم کرو

(۲۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَکْرَمَ شَابٌّ شَیْخًا مِنْ اَجْلِ سِنِّہٖ اِلَّا قَیَّضَ اللّٰہُ لَہٗ عِنْدَ سِنِّہٖ مَنْ یُکْرِمُہٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو بھی جوان کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کے سبب تعظیم و تکریم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے کے وقت کسی ایسے شخص کو متعین کر دیتا ہے جو اس کی تعظیم و خدمت کرتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ گویا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ جو شخص دوسروں کی تعظیم و خدمت کرتا ہے تو اس کی بھی تعظیم و خدمت کی جاتی ہے اور جو لوگ اپنے بزرگوں کی تعظیم و خدمت نہیں کرتے اور اپنے بڑے بوڑھوں کی تحقیر کرتے ہیں وہ اپنے بڑھاپے میں اپنے چھوٹوں کی طرف سے اسی تحقیر و تذلیل اور بے وقعتی سے دوچار ہوتے ہیں۔

اس ارشاد گرامی میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس جوان کی عمر دراز ہوتی ہے جو اپنے بڑے بوڑھوں کی تعظیم و خدمت کرتا ہے۔

منقول ہے کہ ایک بزرگ تھے جو مصر میں سکونت پذیر تھے اور ان کا ایک مرید تھا جو خراسان میں رہتا تھا ایک مرتبہ وہ مرید اپنے شیخ کے پاس کچھ دن رہنے کے لئے خراسان سے چل کر مصر پہنچا اور وہاں ایک طویل مدت تک شیخ کی خدمت میں رہا انہی دنوں کچھ دوسرے بزرگوں کی جماعت اس کے شیخ کی زیارت کے لئے آئی تو شیخ نے اس مرید سے اشارہ کیا کہ ان بزرگوں کی سواری کے جانور تھام لو وہ ان کے پاس سے چلا گیا اور ان جانوروں کی نگرانی کرنے لگا۔ مگر اس کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ میں جو اتنی دور دراز کا سفر طے کر کے شیخ کی خدمت میں آیا تھا یہ اس کا نتیجہ ہے! بہر حال جب وہ بزرگ ان شیخ کے پاس سے چلے گئے اور وہ مرید اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے کہا کہ عزیز من! اس وقت میں نے تمہیں ان بزرگوں کی سواری کے جانوروں کی دیکھ بھال پر جو متعین کیا تھا۔ تو اس کی وجہ نہ معلوم تمہارے دل میں کیا وسوسہ پیدا ہوا ہوگا لیکن اتنی بات یاد رکھو کہ تمہیں اس خدمت کا بہت بڑا اجر ملے گا اور عنقریب اللہ تعالیٰ تمہیں اس درجہ پر پہنچائے گا کہ تمہاری خدمت میں بڑے بڑے بزرگ اور اکابر آئیں گے اور پھر خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایسے لوگ

مقرر کئے جائیں گے جو ان آنے والوں کی خدمت کریں گے، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان شیخ نے جو کہا تھا وہ صحیح ثابت ہوا اور اس شخص کی ملاقات کے لئے آنے والے بڑے بڑے بزرگوں کی کثرت کی وجہ سے ہمیشہ اس کے دروازے پر خچر اور گھوڑوں کا ایک ہجوم رہا کرتا تھا۔

خود اس حدیث کے راوی حضرت انسؓ رسول خدا کی خدمت کے سلسلے میں دین و دنیا کے بڑے بڑے اجر و انعام سے نوازے گئے چنانچہ جب وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو اس وقت ان کی عمر صرف دس سال تھی اور جب تک آنحضرت ﷺ اس دنیا میں تشریف فرما رہے ان کی زندگی کا سارا وقت حضور ﷺ کی خدمت ہی میں صرف ہوتا رہا اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بڑی نعمت تو یہ عطا کی کہ ان کی حیات بہت طویل ہوئی اور وہ تقریباً ایک سو تین سال تک نہایت پاکیزہ اور اچھے احوال اور اطمینان و سکون کے ساتھ اس دنیا میں رہے اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت کی فراوانی سے بھی نوازا اور کثیر اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک سو لڑکے تھے۔

عالم حافظ اور عادل بادشاہ کی تعظیم ہے

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللّٰہِ اِکْرَامُ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ وَحَامِلِ الْقُرْاٰنِ غَیْرَ الْغَالِیْ فِیْہِ وَلَا الْجَافِیْ عَنْہُ وَاِکْرَامُ السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ۔ (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بوڑھے مسلمان کی عزت و توقیر کرنا، حامل قرآن یعنی حافظ و مفسر اور قرآن خوان کا احترام و اکرام کرنا جبکہ وہ قرآن میں زیادتی کرنے والا اور اس سے ہٹ جانے والا نہ ہو اور عادل بادشاہ کی تعظیم کرنی منجملہ خداوندی تعظیم کے ہے۔" (ابوداؤدؒ و بیہقیؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ مذکورہ لوگوں کی تعظیم و توقیر کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی شان میں بے ادبی گستاخی کرنا اور خدا کی تعظیم کے منافی عمل کرنا ہے۔

حامل قرآن — یعنی حافظ، مفسر اور قرآن خواں — کی تعظیم کو اس امر کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے کہ نہ تو غلو کرنے والا ہو اور نہ قرآن پڑھنے پڑھانے کو ترک کرنے والا ہو، بلکہ اعتدال و میانہ روی کو اختیار کرنے والا ہو جیسا کہ تمام عبادات میں آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ تھی چنانچہ غلو نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ریاکاروں کی طرح الفاظ کی تجوید اور حسن قرات و صوت میں حد سے تجاوز نہ کیا جائے تلاوت اس قدر تیز نہ کی جائے کہ نہ تو الفاظ صحیح طور پر ادا ہوں اور نہ معنی سمجھ میں آئیں قرآن کے الفاظ و حروف میں تحریف کے ذریعہ خیانت کا ارتکاب نہ کیا جائے اور نہ غلط سلط تاویلات اور فاسد عقائد و نظریات کے ذریعے اس کے معنی و مفہوم میں حذف و اضافہ اور ترمیم و تبدیلی کی جائے جیسا کہ اکثر اور فاسد ذہن و فکر کے حامل لوگوں کا شیوہ ہے اور نہ قرآن کے احکام و ہدایات کے بارے میں شکوک و شبہات اور وسوسے پیدا کئے جائیں اسی طرح قرآن سے نہ ہٹنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کو ترک نہ کیا جائے تجوید و قرآءت کے آداب و قواعد سے اعراض نہ کیا جائے اور قرآن نے جو احکام و ہدایات اور مسائل بیان کئے ہیں ان پر عمل کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔

بعض حضرات نے غالی (قرآن میں غلو کرنے والا) اس شخص کو قرار دیا ہے جو تعلیم و تدریس، تبلیغ و اصلاح، ذکر و فکر اور عبادات سے بالکل بے پرواہ ہو کر صرف تلاوت قرآن میں مشغول و مصروف رہے اسی طرح جافی (قرآن سے ہٹنے والا) اس شخص کو قرار دیا ہے جو تلاوت قرآن سے بالکل بے پرواہ اور گریزاں اور دوسری چیزوں میں مشغول رہے۔

"عادل بادشاہ" سے مراد وہ حاکم و سربراہ ہے جو حقیقی معنی میں عدل کا پیکر ہو اور اپنے عوام پر ظلم و جور کو گوارا نہ کرتا ہو اور اس کا کوئی فیصلہ اور کوئی عمل عدل و انصاف کے منافی نہ ہو اور یہ اعلیٰ درجہ ہے اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کا عدل اس کے ظلم پر غالب ہو، اس

کے ظلم پر غالب ہو اس کے برخلاف اگر اس کا ظلم اس کے عدل پر غالب ہو تو اس کو عادل نہیں کہیں گے اور ایسے بادشاہ حاکم سے دور رہنا ہی افضل ہو گا واضح رہے کہ اس دور کے اکثر حاکموں اور سربراہوں کے احوال ان کی حکومتی کاروائیاں اور ان کے نظم حکومت کے دیکھتے ہوئے ان کو ادنی درجہ کا عادل کہنا بھی بڑا مشکل ہے ان کی طرف سے اپنے عوام پر جو قوانین نافذ کئے جاتے ہیں اور جس طور پر ان کے کارندے عوام کے ساتھ سلوک کرتے ہیں ان کو اگر حقیقت کے آئینے میں دیکھا جائے تو عدل و انصاف سرنگوں اور ظلم و زیادتی کا غلبہ نظر آئے گا یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے یہاں تک کہدیا ہے کہ جو شخص موجودہ زمانہ میں کسی بادشاہ و حاکم کو "عادل" کہے گا وہ کفر کی حد میں داخل ہو جائے گا اگرچہ ہر بادشاہ حاکم کو کسی نہ کسی طرح کے عدل سے بالکل خالی نہیں کہا جا سکتا دراصل اس قول کی بنیاد ایک لطیف نکتہ پر ہے اور وہ یہ کہ کسی شخص کا عدل کرنا اور کسی شخص کا عادل ہونا ان دونوں کے درمیان فرق ہے اگر یہ کہا جائے کہ زید عدل کرتا ہے تو اس کے کہنے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہو گا کہ زید عادل ہے کیونکہ عدل کرنے کا اطلاق اس شخص پر بھی ہو سکتا ہے جو اگرچہ گاہے بگاہے عدل کرتا ہو جب کہ "عادل" کا اطلاق صرف اسی شخص پر ہوتا ہے جو صفت عدل کے ساتھ دوامی طور پر موصوف ہو اس کو مثال کے طور یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر اس طرح کہا جائے کہ زید نمازی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زید پابندی کے ساتھ ایک ایک وقت کی نماز پڑھتا ہے اور کبھی بھی اس کی کوئی نماز ترک یا قضا نہیں ہوتی جب کہ اگر یوں کہا جائے کہ زید نماز پڑھتا ہے تو اس کا مفہوم بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ زید بھی نماز پڑھتا ہے اگرچہ پابندی کے ساتھ نہیں بلکہ کبھی کبھی پڑھتا ہو۔ لہٰذا لفظ "عادل" اپنے جس وسیع اور اہم مفہوم کو ادا کرتا ہے اس کی بنیاد پر اس لفظ کا اطلاق نہ تو اس دور کے کسی بادشاہ و حاکم پر ہو سکتا ہے اور نہ اس دور کے کسی بھی بادشاہ و حاکم کو عادل کہنے کی اجازت ہے۔

مذکورہ بالا احادیث میں تین طرح کے لوگوں کی توقیر و تعظیم کرنے کے حکم کا ذکر ہے اور شرح السنہ میں حضرت طاؤس سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہ مسنون ہے کہ تم چار آدمیوں کی تعظیم و توقیر کرو ایک تو عالم کی، دوسرے بوڑھے شخص کی تیسرے سلطان و بادشاہ کی اور چوتھے باپ کی۔ ملا علی قاری نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ باپ کے حکم میں ماں بھی داخل ہے اور عالم سے مراد عالم باعمل ہے جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث میں باپ کا ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اول تو باپ کا معاملہ بالکل ظاہر ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ باپ کی تعظیم کرنی چاہئے دوسرے یہ کہ مستحق تعظیم قرار دینے کی زیادہ ضرورت انہی لوگوں کے حق میں ہے جو اجنبی ہوں اور جن سے کوئی قرابتی تعلق نہ ہو کیوں کہ قرابت کا تعلق بجائے خود ایک انسان کو دوسرے انسان کی تعظیم و توقیر کرنے پر مائل کرتا ہے لہٰذا اگر شخص کا باپ بوڑھا بھی ہو حامل قرآن یعنی حافظ و عالم باعمل بھی ہو اور سلطان و حاکم بھی ہو اور اس کا سلطان و حاکم ہونا خواہ اپنے ظاہری منصب کے اعتبار سے ہو یا باطنی و روحانی طور پر تو اس صورت میں اس شخص کو اپنے باپ کی بہت زیادہ تعظیم و توقیر کرنی چاہئے کیونکہ اس کی ذات میں وہ کئی خصوصیات جمع ہیں جو تعظیم و توقیر کو واجب کرتی ہیں۔

اس حدیث میں مذکورہ لوگوں کی تعظیم کو منجملہ تعظیم خداوندی قرار دیا گیا ہے جب کہ ایک روایت کے مطابق اس تعظیم و توقیر کو آنحضرت ﷺ نے خود اپنی بھی تعظیم و توقیر کے مترادف قرار دیا ہے چنانچہ خطیب نے اپنی جامع میں حضرت انس سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اِنَّ مِنْ اِجْلَالِیْ تَوْقِیْرُ الشَّیْخِ مِنْ اُمَّتِیْ یعنی اس بوڑھے شخص کی توقیر و تعظیم کرنا جو میری امت میں سے ہو، منجملہ میری توقیر و تعظیم کے ہے۔

یتیم کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْرُ بَیْتٍ فِی الْمُسْلِمِیْنَ بَیْتٌ فِیْهِ یَتِیْمٌ یُحْسَنُ اِلَیْهِ وَ شَرُّ بَیْتٍ فِی الْمُسْلِمِیْنَ بَیْتٌ فِیْهِ یَتِیْمٌ یُسَاءُ اِلَیْهِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: یتیم کے ساتھ برے سلوک کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر کے افراد اس کی ضروریات زندگی کی کفالت میں غفلت و کوتاہی برتیں اس کے ایسا برتاؤ کریں کہ جس سے اس کو اپنی کمتری و بے چارگی کا احساس ہو اور اس کو ناحق مارا پیٹا جائے اور تکلیف پہنچائی جائے ہاں اس کو تعلیم و تربیت کے طور پر مارنا یا کوئی اور سزا دینا برے سلوک میں شمار نہیں ہوگا بلکہ اس کو احسان و حسن سلوک ہی میں شمار کیا جائے گا۔

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَسَحَ رَأْسَ يَتِيْمٍ لَمْ يَمْسَحْهُ اِلَّا لِلّٰهِ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ شَعْرَةٍ تَمُرُّ عَلَيْهَا يَدُهٗ حَسَنَاتٌ وَمَنْ اَحْسَنَ اِلٰى يَتِيْمَةٍ اَوْيَتِيْمٍ عِنْدَهٗ كُنْتُ اَنَا وَهُوَفِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ وَقَرَنَ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی اور غرض و جذبہ کے تحت نہیں بلکہ) محض خدا کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کسی یتیم بچے (لڑکے یا لڑکی) کے سر پر (پیار و محبت اور شفقت کے ساتھ) ہاتھ پھیرے تو اس کے لئے یتیم کے سر پر اس بال کے عوض کہ جس پر اس کا ہاتھ لگا ہے، نیکیاں لکھی جاتی ہیں نیز جو شخص اس یتیم لڑکے یا یتیم لڑکی کے ساتھ جو اس کی پرورش و تربیت میں ہو اچھا سلوک کرے (اور وہ یتیم خواہ اپنا قرابتدار ہو یا بیگانہ) تو وہ شخص اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے اور یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملایا یعنی انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھایا کہ جس طرح یہ دونوں انگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں اسی طرح میں اور وہ شخص جنت میں ایک دوسرے کے قریب ہوں گے۔" اس روایت کو احمدؒ و ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: لفظ "تمر" اگر تاء کے زبر اور میم کے پیش کے ساتھ یعنی مونث کا صیغہ ہو تو اس کا ترجمہ وہی ہوگا جو اوپر نقل کیا گیا اور اگر یہ لفظ یاء کے پیش اور میم کے زیر کے ساتھ یعنی "یمر" بصیغہ مذکر ہو تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ (ہر اس بال کے عوض کہ) جس پر وہ شخص اپنا ہاتھ پھیرتا ہے مطلب کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے حسنات کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ نیکیاں کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مختلف درجہ کی ہوتی ہیں اور یہ فرق و اختلاف حسن نیت کے مدار پر مبنی ہوتا ہے۔

"اچھا سلوک کرے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ شفقت و مہربانی کا برتاؤ کرے اس کی تعلیم و تربیت پر توجہ دے جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو اس کا نکاح کرے۔ اور اگر اس کا مال وغیرہ اپنے پاس رکھا ہوا ہو تو اس کی محافظت کرے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے يَتِيْمَةٍ اَوْيَتِيْمٍ میں حرف اَوْ تنویع کے لئے ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حرف اَوْ شک کو ظاہر کرتا ہے یعنی اس موقع پر کسی راوی کو شک واقع ہوا ہے کہ یہاں آنحضرت ﷺ نے يَتِيْمَةٍ کا لفظ ارشاد فرمایا تھا یا يَتِيْمٍ کا۔

حدیث میں یتیم کی پرورش و تربیت کرنے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک اختیار کرنے والے کے بارے میں جن الفاظ کے ذریعہ تحسین فرمائی گئی ہے ان میں اس شخص کے لئے حسن خاتمہ کی بشارت ہے۔

بہن بیٹی کی پرورش کرنے کی فضیلت

(۲۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰوٰى يَتِيْمًا اِلٰى طَعَامِهٖ وَشَرَابِهٖ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ الْجَنَّةَ اَلْبَتَّةَ اِلَّا اَنْ يَعْمَلَ ذَنْبًا لَا يُغْفَرُ وَمَنْ عَالَ ثَلٰثَ بَنَاتٍ اَوْ مِثْلَهُنَّ مِنَ الْاَخَوَاتِ فَاَدَّبَهُنَّ وَرَحِمَهُنَّ حَتّٰى يُغْنِيَهُنَّ اللّٰهُ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ الْجَنَّةَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوِثْنَتَيْنِ قَالَ اَوِ ثْنَتَيْنِ حَتّٰى لَوْ قَالُوْا اَوْ وَاحِدَةً لَقَالَ وَاحِدَةً وَمَنْ

اَذْهَبَ اللّٰهُ بِكَرِيْمَتِهِ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا كَرِيْمَتَاهُ قَالَ عَيْنَاهُ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے کھانے پینے میں کسی یتیم کو شریک کرے تو اللہ تعالیٰ (اپنے وعدے کے مطابق) اس شخص کو بلاشک وشبہ جنت کا مستحق گردانتا ہے الایہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کرے جو بخشے جانے کے قابل نہ ہو اور جو شخص تین بیٹیوں یا ان ہی کی طرح تین بہنوں کی پرورش کرے اور پھر ان کی تربیت کرے اور ان کے ساتھ پیار وشفقت کا برتاؤ کرے یہاں تک کہ اللہ ان کو بے پرواہ بنادے (یعنی وہ بڑی ہو جائیں اور بیاہ دی جائیں) تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا مستحق گردانتا ہے" یہ سن کر ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ کیا دو بیٹیوں یا دو بہنوں کی پرورش کرنے پر بھی یہ اجر ملتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں دو پر بھی یہ اجر ملتا ہے" (راوی کہتے ہیں) اگر صحابہؓ ایک بیٹی یا ایک بہن کے بارے میں بھی سوال کرتے تو آپ ﷺ یہی جواب دیتے کہ ہاں ایک پر بھی یہی اجر ملتا ہے (پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ جس شخص کی دو پیاری چیزیں لے لے وہ بھی جنت کا مستحق گردانا جاتا ہے" پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) دو پیاری چیزوں سے کیا مراد ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی دونوں آنکھیں۔" (شرح السنۃ)

تشریح: جو گناہ بخشے جانے کے قابل نہ ہو اس سے مراد شرک اور حقوق العباد ہیں! گویا آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ شخص کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جو توبہ واستغفار وغیرہ کے بغیر بخشا نہیں جاتا تو اس کو جنت کا مستحق نہیں گردانا جائے گا۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے، کہ وہ تمام گناہ کہ جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حق سے ہے، بخشدیئے جاتے ہیں مگر شرک کے گناہ کو نہیں بخشا جاتا۔

"اگر صحابہؓ ایک بیٹی یا ایک بہن کے بارے میں سوال کرتے" یہ بات اس راجح ومختار مسلک کی روشنی میں تو بالکل واضح ہے جس میں اس امر کو تسلیم کیا گیا ہے کہ احکام شرعیہ کا نفاذ آنحضرت ﷺ کی صوابدید پر ہے کہ آپ ﷺ جس طرح چاہیں نافذ فرمائیں اور جس کو چاہیں مقید ومستثنیٰ قرار دیں، لیکن جو حضرات اس قول کو تسلیم نہیں کرتے وہ مذکورہ عبارت کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ کے مذکورہ جواب میں جوبات فرمائی وہ وحی الٰہی کی بنیاد پر تھی کہ سائلین نے اپنے سوال کے ذریعہ گویا اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ جو ثواب تین بیٹیوں یا تین بہنوں کی پرورش وتربیت کرنے پر ملتی ہے کاش وہی ثواب دو بیٹیوں یا دو بہنوں کی پرورش وتربیت کی صورت میں بھی ملے، چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی اس خواہش کے مطابق وحی نازل فرمائی اور حضور ﷺ نے اس کو بیان فرمایا، جیسا کہ اور بہت سی حدیثوں میں بھی اسی طرح کی صورت حال منقول ہے۔

بچوں کی صحیح تربیت وتادیب کی اہمیت

(۳۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ يُؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ اَنْ يَتَصَدَّقَ بِصَاعٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَنَاصِحُ الرَّاوِيْ لَيْسَ عِنْدَ اَصْحَابِ الْحَدِيْثِ بِالْقَوِيِّ۔

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بخدا انسان کا اپنے بیٹے کو ادب کی ایک بات سکھانا، ایک صاع غلہ خیرات کرنے سے بہتر ہے" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے راوی ناصحؒ محدثین کے نزدیک (حفظ وضبط کے اعتبار سے) قوی یعنی قابل اعتماد نہیں ہے۔"

تشریح: "ادب" سے شرعی تربیت وتادیب مراد ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کی بہت زیادہ اہمیت ہے لہٰذا یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صحیح تعلیم وتربیت سے بہرہ مند کریں اور صحیح تعلیم وتربیت وہی ہے جو دینی تعلیم، اسلامی اخلاق اور شرعی آداب وقواعد پر مشتمل ہو۔

ترمذیؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن واضح رہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کرنا جائز ہے جیسا کہ محدثین کا متفقہ فیصلہ ہے۔

(۳۱) وَعَنْ اَيُّوْبَ بْنِ مُوْسٰى عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَانَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهٗ مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا عِنْدِيْ حَدِيْثٌ مُرْسَلٌ۔

"اور حضرت ایوبؒ ابن موسی (اپنے والد حضرت موسیٰ) سے اور وہ ایوبؒ کے دادا (حضرت ابن سعیدؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی باپ اپنے بیٹے کو نیک ادب اور صحیح تربیت سے بہتر کوئی چیز نہیں دیتا۔" (ترمذیؒ، بیہقیؒ) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک یہ حدیث مرسل ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ایک باپ کی طرف سے اپنے بیٹے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ مفید ہو سکتی ہے وہ صحیح تعلیم و تربیت اور نیک تادیب ہے۔

اپنی اولاد کی پرورش میں مشغول رہنے والی بیوہ عورت کی فضیلت

(۳۲) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَامْرَاَةٌ سَفْعَاءُ الْخَدَّيْنِ كَهَاتَيْنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَوْمَاَيَزِيْدُ بْنُ زُرَيْعٍ اِلَى الْوُسْطٰى وَالسَّبَّابَةِ اِمْرَاَةٌ اٰمَتْ مِنْ زَوْجِهَا ذَاتُ مَنْصَبٍ وَجَمَالٍ حَبَسَتْ نَفْسَهَا عَلٰى يَتَامَاهَا حَتّٰى بَانُوْا اَوْ مَاتُوْا۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عوف ابن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں اور وہ عورت کہ جس کے رخسارے (اپنی اولاد کی پرورش و دیکھ بھال کی محنت و مشقت اور ترک زینت و آرائش کی وجہ سے) سیاہ پڑ گئے ہوں قیامت کے دن اس طرح ہوں گے اس حدیث کے راوی یزید ابن ذریعؒ نے یہ الفاظ بیان کرنے کے بعد انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا (کہ جس طرح یہ دونوں انگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں اسی طرح قیامت کے دن آپ ﷺ اور وہ بیوہ عورت قریب قریب ہوں گے) اور (سیاہ رخساروں والی عورت کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اس سے مراد) وہ عورت ہے جو اپنے شوہر کے مرجانے یا اس کے طلاق دیدینے کی وجہ سے بیوہ ہوگئی ہو اور وہ حسین و جمیل اور صاحب جاہ و عزت ہونے کے باوجود، محض، اپنے یتیم بچوں کی پرورش اور ان کی بھلائی کی خاطر (دوسرا نکاح کرنے سے) اپنے آپ کو باز رکھے یہاں تک کہ وہ بچے جدا ہو جائیں (یعنی بڑے اور بالغ ہو جانے کی وجہ سے اپنی ماں کے محتاج نہ رہیں یا موت ان کے درمیان جدائی ڈال دے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس عورت کا خاوند چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر گیا ہو یا جس عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی ہو اور اس عورت نے محض اپنے یتیم بچوں کی خاطر کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کیا ہو بلکہ اپنے حسن و جمال اور جاہ عزت کے باوجود اپنے جذبات کو کچل کر ازدواجی زندگی کی خوشیوں و مسرتوں سے دور رہی اور اپنے ان بچوں کی پرورش و دیکھ بھال میں اس وقت تک اپنی جان کھپاتی رہی جب تک کہ وہ اس کے ساتھ رہے یہاں تک کہ اس نے ان کی پرورش میں مشغول رہ کر اپنی زندگی کے جوان ایام کو قربان اور اپنے حسن و جمال کو برباد کر دیا۔ تو حضور ﷺ نے ایسی حوصلہ مند عورت کے بارے میں فرمایا کہ وہ قیامت کے دن میرے اس قدر قریب ہوگی جس قدر یہ دونوں انگلیاں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو عورتیں اپنے خاوند کی وفات یا طلاق کی وجہ سے بیوہ ہو گئی ہوں تو ان کو صبر و استقامت، عفت و پاکدامنی اور ترک زیب و زینت کو اختیار کرنا، اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر دوسرا نکاح نہ کرنا اور ان بچوں کی صحیح پرورش و تربیت میں مشغولیت رہنا بڑی فضیلت کا حامل ہے۔

دینے دلانے میں بیٹے کو بیٹی پر ترجیح نہ دو

(۳۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهٗ اُنْثٰى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ

وَلَدَهٗ عَلَيْهَا يَعْنِي الذُّكُوْرَ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کے کوئی بیٹی یا بہن ہو اور وہ اس کو نہ تو زندہ در گور کرے (جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ لوگ فقر کے خوف سے بچیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے) نہ اس کو ذلت و حقارت کے ساتھ رکھے اور نہ (دینے دلانے وغیرہ میں) اپنے ولد یعنی بیٹے کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اس کو (سابقین اور صلحاء کے ساتھ) جنت میں داخل کرے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: چونکہ "ولد" کا اطلاق بیٹے اور بیٹی دونوں پر ہوتا ہے اس لئے حضرت ابن عباسؓ نے ان الفاظ یعنی الذکور کے ذریعہ یہ وضاحت فرمائی کہ اس حدیث میں ولد سے آنحضرت ﷺ کی مراد بیٹا ہے۔

کسی شخص کو اپنے سامنے کسی مسلمان بھائی کی غیبت نہ کرنے دو

(۳۴) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اغْتِيْبَ عِنْدَهٗ اَخُوْهُ الْمُسْلِمُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى نَصْرِهٖ فَنَصَرَهٗ نَصَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَاِنْ لَّمْ يَنْصُرْهُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى نَصْرِهٖ اَدْرَكَهُ اللّٰهُ بِهٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت کی جائے اور وہ اس مسلمان بھائی کی مدد کرے بشرطیکہ وہ مدد کرنے پر قادر ہو تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی مدد کرے گا۔ اور اگر وہ مدد کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اس کی مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کا مواخذہ کرے گا۔" (شرح السنۃؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے سامنے اس کے کسی مسلمان بھائی کی غیبت کی جارہی ہو اور اس کے عیوب کو بیان کر کے اس کی حیثیت و عزت کو نقصان پہنچایا جارہا ہو تو اس کو چاہئے کہ اگر وہ اس پر قادر ہو تو اپنے اس مسلمان بھائی کی ذات و حیثیت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ اس طرح نہ صرف اپنے ایک مسلمان بھائی کی مدد ہوتی ہے بلکہ اپنے آپ کو دنیا و آخرت میں خدا کی مدد و نصرت کا مستحق بنایا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے سے گریز کرے تو اس کو جان لینا چاہئے کہ قدرت کا ہاتھ اس کا گریبان پکڑے گا اور اس کو دنیا و آخرت میں مواخذہ خداوندی سے دوچار ہونا ہوگا۔

(۳۵) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَّ عَنْ لَحْمِ اَخِيْهِ بِالْمَغِيْبَةِ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّعْتِقَهٗ مِنَ النَّارِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے پیٹھ پیچھے اس کا گوشت کھانے سے باز رکھے (یعنی اس کے سامنے اگر کوئی شخص کسی مسلمان بھائی کی برائی اور غیبت کر رہا ہو تو اس کو اس حرکت سے روکے) تو اس کا اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ اس کو دوزخ کی آگ سے آزاد کرے گا۔" (بیہقیؒ)

تشریح: غیبت کرنے کو بطور کنایہ گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی جو شخص کسی کی غیبت کرتا ہے تو گویا وہ اس کا گوشت کھاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں غیبت کی برائی ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے کہ۔

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا۔

"کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے۔"

غیبت کرنے کو گوشت کھانے کے ساتھ تشبیہ دینے کا سبب یہ ہے کہ غیبت کرنا دراصل اس کی آبروریزی کرنا ہے اور آبرو چونکہ جان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے لہٰذا جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کی غیبت کے ذریعہ آبروریزی کی اس نے گویا اس کو ہلاک کر دیا اور

اس کا گوشت کھالیا۔

بظاہر یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ لفظ بالمغیبۃ کا تعلق لفظ ذبّ سے ہے اور غیبت یعنی عدم موجودگی کے مفہوم میں ہے تاہم احتمال بھی ہے کہ بالمغیبۃ کا تعلق بلحم اخیہ سے ہو اور مفہوم کے اعتبار سے (غیبت یعنی عدم موجودگی کے بجائے) غیبت یعنی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے معنی میں ہو اس صورت میں عبارت گویا یوں ہوگی مَنْ ذَبَّ عن اکل لحم اخیہ بالمغیبۃ یعنی جو شخص کسی اپنے مسلمان بھائی کی غیبت کے ذریعہ اس کا گوشت کھانے سے باز رکھے...... الخ لیکن حدیث کا حاصل دونوں صورتوں میں ایک ہی رہے گا وہ یہ کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے کی غیبت کرنے سے باز رکھنے والے کی فضیلت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

"دوزخ کی آگ سے آزاد کرے۔" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اس شخص کو شروع ہی میں دوزخ کی آگ سے نجات یافتہ قرار دیدیا جائے گا یا یہ کہ اگر وہ شخص اپنے گناہوں کے سبب دوزخ میں داخل کیا جائے گا تو اس کو وہاں سے عذاب پورا کئے بغیر نکال لیا جائے گا۔

(۳۶) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَامِنْ مُسْلِمٍ یَرُدُّ مِنْ عِرْضِ اَخِیْہِ اِلَّا کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰہِ اَنْ یَرُدَّ عَنْہُ نَارَ جَھَنَّمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ثُمَّ تَلَا ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو مسلمان کسی کا اپنے بھائی مسلمان کی آبروریزی یعنی اس کی غیبت کرنے سے روکے اور اس کا دفعیہ کرے تو اللہ پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کو قیامت کے دن دوزخ کی آگ سے بچائے یا اس سے دوزخ کی آگ کو دور کرے۔ پھر حضور ﷺ نے (اپنے قول کان حقا کو ثابت کرنے کے لے) یہ آیت پڑھی وکان حقا علینا نصر المؤمنین یعنی (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) مؤمنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔" (شرح السنۃ)

(۳۷) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ اِمْرِءٍ مُسْلِمٍ یَخْذُلُ امْرَءً امُسْلِمًا فِیْ مَوْضِعٍ یُنْتَھَکُ فِیْہِ حُرْمَتُہٗ وَیُنْتَقَصُ فِیْہِ مِنْ عِرْضِہٖ اِلَّا خَذَلَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ مَوْطِنٍ یُحِبُّ فِیْہِ نُصْرَتَہٗ وَمَامِنْ اِمْرِءٍ مُسْلِمٍ یَنْصُرُ مُسْلِمًا فِیْ مَوْضِعٍ یُنْتَقَصُ فِیْہِ مِنْ عِرْضِہٖ وَیُنْتَھَکُ فِیْہِ مِنْ حُرْمَتِہٖ اِلَّا نَصَرَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ مَوْطِنٍ یُحِبُّ فِیْہِ نُصْرَتَہٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو مسلمان شخص اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد نہ کرے اور غیبت کرنے والے کو غیبت سے نہ روکے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی (دنیا و آخرت میں) اس موقع پر اس شخص کی مدد نہیں کریگا جہاں وہ خدا کی مدد کو پسند کرتا ہے اور جو مسلمان شخص اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو۔ اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس موقع پر اس شخص کی مدد کرے گا جہاں وہ خدا کی مدد کو پسند کرتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

کسی میں کوئی عیب دیکھو تو اس کو چھپاؤ

(۳۸) وَعَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ رَاٰی عَوْرَۃً فَسَتَرَھَا کَانَ کَمَنْ اَحْیٰی مَوْءُوْدَۃً۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَصَحَّحَہٗ۔

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مسلمان میں کوئی عیب دیکھے یا اس کی برائی کو جانے اور پھر اس کو چھپالے تو اس کا درجہ اس شخص کے درجہ کے برابر ہوگا جو زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کو بچالے۔" احمدؒ و ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔"

تشریح: کسی کا عیب چھپانے کو زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کو بچانے کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ جس شخص کی کوئی معیوب بات ظاہر ہو جاتی ہے تو مارے شرم کے گویا مردہ کے ہو جاتا ہے۔ اور یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش میں مرجاتا کہ میرا عیب ظاہر نہ ہوتا

اور مجھ کو اپنی یہ رسوائی دیکھنی نہ پڑتی لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کے عیب کو چھپاتا ہے تو گویا اس کی اس شرمندگی اور خجالت کو دفع کرتا ہے جو اس کے لئے موت کے برابر ہے، اس اعتبار سے کسی کے عیب کو چھپانا اس کو زندگی بخشنے کے مرادف ہوا جیسا کہ کسی زندہ لڑکی کو دفن کر دیا جائے اور پھر کوئی شخص اس کو عین اس وقت قبر سے نکال لے جب کہ وہ آخری سانس لے رہی ہو اور پھر زندگی پا جائے۔

ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے حق میں آئینہ ہے۔

(۳۹) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَدَكُمْ مِرْاٰةُ اَخِیْهِ فَاِنْ رَاٰی بِهٖ اَذًی فَلْیُمِطْ عَنْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَضَعَّفَهٗ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهٗ وَلِاَبِیْ دَاوٗدَ اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰةُ الْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنِ یَكُفُّ عَنْهُ ضَیْعَتَهٗ وَیَحُوْطُهٗ مِنْ وَّرَائِهٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے ہر شخص اپنے مسلمان کے حق میں آئینہ کی طرح ہے لہٰذا اگر تم اس میں کوئی برائی دیکھو تو اس سے اس برائی کو دور کر دو (یعنی جس مسلمان میں کوئی معیوب بات اور برائی دیکھو یا اس کو غلط راہ پر پاؤ تو اسے راہِ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کرو اور خواہ نرمی و شفقت کے ساتھ خواہ زجر و تنبیہ کے ذریعہ اور خواہ اس کو معتوب کر کے غرضیکہ اصلاح و نصیحت کے جو شرائط و قواعد ہیں، ان کے مطابق جس طرح بھی ہو سکے اس کو برائی سے باز رکھنے کی سعی کرو)" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے (یعنی ان کے نزدیک اس حدیث کو مذکورہ الفاظ میں روایت کرنا ضعف سے خالی نہیں ہے) اور ترمذیؒ کی ایک دوسری روایت نیز ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے جو اس سے اس چیز (برائی اور عیب، کو دور کرتا ہے جس میں اس کے لئے نقصان اور ہلاکت ہے اور اس کی عدم موجودگی میں بھی (اس کے حقوق و مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح آئینہ دیکھنے والا اس آئینہ میں اپنے خدوخال کو دیکھتا ہے اور اس میں جو عیب و خرابی ہوتی ہے اس سے آگاہ ہو جاتا ہے خواہ وہ عیب کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اسی طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے حق میں اتنا حساس اور بہی خواہ ہونا چاہئے کہ اگر کوئی مسلمان اپنے بھائی مسلمان میں کوئی عیب دیکھے اور اس کو کسی برائی میں مبتلا پائے تو اس کو فوراً آگاہ کر دے اور اس عیب و برائی کی مضرت و ہلاکت کو واضح کر دے اور یہ آگاہ و واضح کرنا پوشیدہ طور پر ہو، تاکہ اس کے اس عیب سے دوسرے لوگ مطلع نہ ہوں، اور وہ دنیا کی نظر میں ذلیل و رسواء نہ ہوں جیسا کہ آئینہ اپنے دیکھنے والے کو اس کے عیب سے اس طرح آگاہ کرتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کو معلوم نہیں ہوتا، نیز اس مسلمان کو بھی چاہئے کہ جب کوئی مسلمان اس کو اس کے کسی عیب سے آگاہ کرے تو وہ فوراً اس عیب پر مطلع ہو جائے۔ اور اپنی ذات کو اس کے داغ سے پاک و صاف کرے جیسا کہ کوئی شخص آئینہ میں اپنے چہرے پر کسی داغ و دھبہ کو دیکھ کر فوراً مطلع ہو جاتا ہے اور چہرے کی صفائی و زیبائش کی کوشش کرتا ہے! حاصل یہ نکلا کہ مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جو قلبی و روحانی تعلق ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے کسی بھائی مسلمان کو کسی برائی، کسی عیب اور کسی ناشائستہ حرکت میں مبتلا دیکھے تو اس احساس کے ساتھ کہ یہ میرا بھائی نقصان و تباہی کے راستہ پر لگ گیا ہے اور اس کا نقصان میرا نقصان ہے۔ اور اسی کی تباہی میری تباہی ہے اس کو اس عیب و برائی سے بچانے کی کوشش کرے کیونکہ یہ بہی خواہی اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی و تعاون ایمان و اسلام کا منشاء ہے اور اس ارشاد گرامی "ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے" کا تقاضا یہ ہے کہ ہمدردی ملت کی فلاح و بہبود اور دینی و دنیاوی کامرانیوں اور سعادتوں کا سرچشمہ ہے غالباً اسی بنا پر مولانا روم قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ صوفیا اس وقت تک خیر و بھلائی پر ہیں، جب تک وہ ایک دوسرے کے احوال کی اصلاح کی سعی و کوشش کرتے ہیں جب بھی وہ ایک دوسرے کی طرف سے بے پرواہ اور ایک دوسرے کا احوال سے اتفاق کر لیں گے ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔

حدیث کے آخری الفاظ ویحوط من ورآئہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایمانی اخوت کا مظہر ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عدم موجودگی میں بھی اس کی عزت و آبرو اور اس کی جان ومال کا تحفظ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے، چنانچہ کوئی مسلمان نہ صرف یہ کہ خود کسی مسلمان کی غیبت اور عیب جوئی نہیں کرتا کیونکہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی غیبت کرتا ہے تو وہ اس کو غیبت کرنے سے منع کرتا ہے اور اس کی طرف سے عیب جوئی پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے اس کی تردید و تنقیص کرتا ہے اور اس بات کا کوشاں رہتا ہے کہ اس کے سامنے کسی مسلمان بھائی کے جانی ومالی حقوق اور حیثیت عرفی کو نقصان نہ پہنچے۔

تم مسلمان کو عیب جو کے شر سے بچاؤ، اللہ تعالیٰ تمہیں دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔

(۴۰) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَمٰى مُؤْمِنًا مِنْ مُنَافِقٍ بَعَثَ اللّٰهُ مَلَكًا يَحْمِىْ لَحْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ وَمَنْ رَمٰى مُسْلِمًا بِشَيْءٍ يُرِيْدُ بِهٖ شَيْنَهٗ حَبَسَهُ اللّٰهُ عَلٰى جِسْرِ جَهَنَّمَ حَتّٰى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت معاذ ابن انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مسلمان کی (عزت و آبرو) کو منافق کے شر سے بچائے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ بھیجے گا۔ جو اس کو قیامت کے دن دوزخ کی آگ سے بچائے گا اور جو شخص کسی مسلمان پر ایسی چیز (یعنی کسی عیب و برائی) کی تہمت لگائے جس کے ذریعہ اس کا مقصد اس مسلمان کی ذات کو عیب دار کرنا (اور اس کی حیثیت عرفی کو نقصان پہنچانا) ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ کے پل پر قید کر دے گا یہاں تک کہ وہ اس تہمت لگانے کے وبال سے نکل جائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یہاں "منافق" سے مراد غیبت کرنے والا اور عیب جو شخص ہے اس کو "منافق" اس لئے فرمایا گیا ہے کہ غیبت کرنے والا کبھی بھی کسی شخص کے منہ پر اس کے منہ پر برائی نہیں کرتا بلکہ اگر وہ سامنے ہوتا ہے تو دل میں اس کی طرف سے برائی رکھنے کے باوجود اس کی خیر خواہی کا دم بھرتا ہے اور پیٹھ پیچھے اس پر عیب لگاتا ہے۔ غیبت کرنا اور عیب جوئی منافق کا کام ہے جس کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ۔

حدیث کے آخری الفاظ حَتّٰى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ شخص اپنی اتہام تراشی کا شکار بنانے والے شخص کو راضی نہ کر لے گا یا شفاعت کے ذریعہ اور یا گناہ کے بقدر عذاب بھگت لینے کے ذریعہ الزام تراشی کے گناہ سے صاف نہ ہو جائے گا اس وقت تک اس کی گلو خلاصی ممکن نہیں ہوگی۔

خیر خواہ دوست اور خیر خواہ پڑوسی کی فضیلت

(۴۱) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ الْاَصْحَابِ عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرُهُمْ لِصَاحِبِهٖ وَخَيْرُ الْجِيْرَانِ عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرُهُمْ لِجَارِهٖ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خدا کے نزدیک (ثواب و فضیلت کے اعتبار سے) دوستوں میں بہترین دوست وہ ہے جو اپنے دوستوں کا بہترین خیر خواہ ہو اور خدا کے نزدیک پڑوسیوں میں بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کا بہترین خیر خواہ ہو" (ترمذیؒ، دارمیؒ) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے دوستوں اور اپنے ہمسائیوں کے ساتھ بہت زیادہ احسان اور حسن سلوک کرتا ہے، اور ہر حالت میں ان کا خیر خواہ رہتا ہے تو وہ نہ صرف بہترین، دوست اور بہترین پڑوسی قرار پاتا ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بہت زیادہ ثواب بھی ملتا ہے۔

زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھو

(۴۲) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ لِيْ اَنْ اَعْلَمَ اِذَا اَحْسَنْتُ اَوْ اِذَا اَسَأْتُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتَ جِيْرَانَكَ يَقُوْلُوْنَ قَدْ اَحْسَنْتَ فَقَدْ اَحْسَنْتَ وَاِذَا سَمِعْتَهُمْ يَقُوْلُوْنَ قَدْ اَسَأْتَ فَقَدْ اَسَأْتَ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) میں اپنی نیکوکاری یا بدکاری کو کس طرح معلوم کر سکتا ہوں؟ یعنی اگر میں کوئی ایسا کام کروں جس کی شرعاً اچھائی برائی معلوم نہ ہو تو ایسا کونسا ذریعہ ہے جس سے میں یہ معلوم کر سکوں کہ وہ کام کر کے میں نیکوکار بنا ہوں یا بدکار؟ حضور ﷺ نے فرمایا" جب تم (اپنے کسی کام کے بارے میں) اپنے پڑوسیوں کو یہ کہتے سنو کہ تم نے اچھا کام کیا ہے تو تمہارا کام اچھا ہے اور جب تم پڑوسیوں کو یہ کہتے سنو کہ تم نے برا کیا ہے تو تمہارا وہ کام برا ہے۔ یعنی تمہارا نیکوکار یا بدکار ہونا تمہارے پڑوسیوں کی گواہی کے ذریعہ معلوم ہوگا۔" (ابن ماجہ)

تشریح: "جب تم اپنے پڑوسیوں کو یہ کہتے سنو" میں "پڑوسیوں" سے سارے پڑوسی مراد ہیں کیونکہ دو چار پڑوسی تو کسی غلط بات پر اتفاق کر سکتے ہیں لیکن عام طور پر سارے پڑوسیوں کا کسی ناروا فیصلے اور غلط بات پر متفق ہونا ممکن نہیں ہو سکتا۔ لیکن حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے صراحت بھی کی ہے کہ حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اس کے پڑوسی اہل حق، صاحب انصاف اور کسی کام کی اچھائی کو سمجھنے والے ہوں نیز وہ اس شخص سے نہ بہت زیادہ محبت و تعلق رکھتے ہوں اور نہ بہت زیادہ دشمنی و عداوت۔

یہ حدیث حضرت علیؓ کے اس عارفانہ قول کی تائید کرتی ہے السنۃ الخلق اقلام الحلق یعنی مخلوق خدا کی زبان حق تعالیٰ کا قلم ہے یا اسی مفہوم کو ہمارے یہاں اس محاورہ "زبانِ خلق نقارۂ خدا" کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے، کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

برا کہے جسے عالم اسے برا سمجھو ۔۔۔ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

مرتبہ کے مطابق سلوک کرو

(۴۳) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ہر ایک آدمی کو اس کے درجہ پر رکھو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی جو حیثیت عرفی اور جس کا جو متعین مرتبہ و درجہ ہے اس کے ساتھ اسی کے مطابق سلوک و تعظیم کرو۔ یہ نہیں کہ ہر ایک شخص کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کیا جائے کیوں کہ کوئی شخص شریف اور صاحب عزت ہوتا ہے اور کوئی شخص ذلیل و کمینہ، اگر دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ غیر موزوں ہوگا اس لئے تعظیم و تکریم میں ہر ایک کے ساتھ ایسا سلوک کرو۔ جو نہ تو تکلیف پہنچائے اور شکایت پیدا ہونے کا باعث ہو اور نہ درجہ و مرتبہ کے غیر مناسب۔ اس سے معلوم ہوا کہ خادم و مخدوم کے ساتھ برابری کا سلوک نہ کرنا چاہئے بلکہ دونوں سے ہر ایک کو اس کے درجہ پر رکھنا چاہئے۔ اور یہ بات قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ۔

احیاء العلوم میں منقول ہے کہ ایک دن حضرت عائشہؓ بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں کہ ایک فقیر ان کے سامنے راستے سے گزرا، انہوں نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس کو بھیج دیا۔ اس کے بعد ایک سوار ادھر سے گزرا تو انہوں نے اس کو کہلا بھیجا کہ کھانا حاضر ہے اگر خواہش ہو تو تشریف لا کر تناول فرمایئے! حاضرین میں سے ایک شخص نے ان کے اس مختلف برتاؤ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر آدمی کو اس کے درجہ پر رکھو چنانچہ وہ فقیر تو روٹی کے ایک ٹکڑے پر خوش ہو گیا، لیکن اگر

میں سوار کے ساتھ وہی برتاؤ کرتی جو فقیر کے ساتھ کیا تھا، تو وہ تکلیف محسوس کرتا اور اس کی حقارت لازم آتی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو علماء تفاضیل انبیاء اور تفضیل خلفاء وغیرہ کے قائل ہیں ان کا قول صحیح ہے اور یہ حدیث ان کے حق میں سرچشمۂ ہدایت ہے اگر کچھ لوگ امراء واغنیاء اور ارباب اقتدار کے تئیں اختیار کئے جانے والے اعزاز و اکرام کو اس حدیث کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کریں تو ان کی یہ کوشش گمراہی کے مترادف ہوگی کیونکہ علماء تو اہل علم وفضل کو ان کے علم وفضل کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت دیتے ہیں اور اس فضیلت دینے میں کسی کی حقارت وتوہین کا جذبہ ہرگز شامل نہیں ہوتا جب کہ دنیادار لوگ غریب و مسکین اور محتاج لوگوں کے ساتھ تو حقارت ونفرت کا برتاؤ کرتے ہیں چاہے کوئی غریب شخص علم وفضل کے بڑے سے بڑے درجہ کا حامل ہی کیوں نہ ہو اور امراء مقتدرین کی تعظیم وعزت کرتے ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی بڑے فاسق وفاجر کیوں نہ ہوں۔ اگر ایسے دنیادار لوگ اس حدیث سے استدلال کرنے لگیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرف تو وہ علماء ہیں، جنہیں اس حدیث سے استدلال و استنباط میں اللہ تعالیٰ نے سرفراز کیا اور دوسری طرف وہ بدنصیب دنیادار ہیں جن کو گمراہ کیا کُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ فَهُمْ کُلُّ فَرِيْقٍ مَذْهَبُهُمْ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِیْ بِهٖ كَثِيْرًا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سچ بولو، امانت ادا کرو، اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو

(۴۴) عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ قُرَادٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ يَوْمًا وَجَعَلَ اَصْحَابُهٗ يَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْئِهٖ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَايَحْمِلُكُمْ عَلٰى هٰذَا قَالُوْا حُبُّ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّحِبَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اَوْ يُحِبَّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَلْيَصْدُقْ حَدِيْثَهٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْيُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اِذَا ائْتُمِنَ وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهٗ۔

"حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی قرادؓ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے وضو کیا تو صحابہؓ سے حضور ﷺ کے وضو کے پانی کو اپنے جسم پر ملنا شروع کر دیا نبی کریم ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا کہ "تم یہ جو کچھ کر رہے ہو اس کا سبب کیا ہے؟" انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اس کا باعث ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسول اس سے محبت کریں تو اس کو چاہئے کہ جب بولے تو سچ بولے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس امانت کو ادا کرے اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھی ہمسائیگی کا ثبوت دے۔"

تشریح: "وضو کے پانی" سے مراد اکثر علماء کے نزدیک تو وہ پانی ہے جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچ گیا تھا، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو وضو کے وقت حضور ﷺ کے اعضاء مبارک سے جدا ہو کر گر رہا تھا۔

اویحبه اللّٰہ ورسولہ میں حرف اَوْ تنویع کے لئے ہے! واضح رہے کہ ایک درجہ تو بندہ کا اللہ ورسول ﷺ سے محبت رکھنا ہے اور دوسرا درجہ اللہ ورسول ﷺ کا بندہ سے محبت رکھنا ہے ظاہر ہے کہ دوسرا درجہ پہلے درجہ سے کہیں بالا ہے لیکن حقیقت میں دونوں درجے ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ بایں طور کہ ہر کوئی اپنے دوستدار کو دوست رکھتا ہے۔ یا یہ کہ حرف اَوْ دراصل لفظ بَلْ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ "جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھے بلکہ جو شخص پسند کرتا ہو کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس سے محبت کرے تو اس کو چاہئے کہ...... الخ" یہ قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حرف اَوْ راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے یہاں یا تو یہ فرمایا تھا کہ جو شخص اللہ کے رسول ﷺ سے محبت رکھنا چاہتا ہو۔ یا یہ فرمایا تھا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ اس سے محبت کرے۔

بہر حال حضور ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا دعوی ایسی باتوں کے ذریعہ کرنا کہ جو نفس پر چنداں شاق نہیں، کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس دعوے کے ثبوت کے لئے ضروری ہے۔ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جن چیزوں کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان کو اختیار کیا جائے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے اجتناب کیا جائے خصوصاً ان احکام پر زیادہ توجہ و مستعدی اور زیادہ پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے جن کا تعلق لوگوں کے حقوق اور باہمی معاملات سے ہو اور حقوق و معاملات بھی وہ کہ جن سے اکثر و بیشتر واسطہ رہتا ہے، جیسے سچ بولنا، امانت کو ادا کرنا اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک اور آداب ہمسائیگی کو لازم پکڑنا۔

احتمال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شاید ان صحابہؓ کو مذکورہ بالا چیزوں کے تعلق سے ادائے حقوق کی کسی تقصیر و کوتاہی میں مبتلا پایا ہوگا اس لئے خاص طور پر آپ ﷺ نے ان ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔

بھوکے پڑوسی سے صرف نظر کمال ایمان کے منافی ہے۔

(۴۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِيْ يَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "وہ شخص کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جو پیٹ بھر کر کھالے درآنحالیکہ اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو" دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: ظاہر ہے کہ وہ مسلمان کمال ایمان کے درجہ کو کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ جو خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بالکل بھوکا رہے کسی کامل مسلمان کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ اپنے پڑوسی میں فلاں شخص کو محتاجگی و افلاس اور شدت بھوک نے مضطرب و بے حال کر دیا ہے وہ اس کی خبر نہ لے اور اس کو اپنے کھانے میں شریک نہ کرے! "اس کے پہلو میں۔" اس جملہ کے ذریعہ گو اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ جو شخص اپنے پڑوسی کے حالات سے بے خبر و لاپرواہ ہو اس سے بڑا غافل اور لاپرواہ کون ہو سکتا ہے۔

اپنی بدزبانی کے ذریعہ ہمسائیوں کو ایذاء پہنچانے والی عورت کے بارے میں وعید

(۴۶) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ فُلَانَةَ تُذْكَرُ مِنْ كَثْرَةِ صَلَاتِهَا وَصِيَامِهَا وَصَدَقَتِهَا غَيْرَ اَنَّهَا تُؤْذِيْ جِيْرَانَهَا بِلِسَانِهَا قَالَ هِيَ فِي النَّارِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاِنَّ فُلَانَةَ تُذْكَرُ قِلَّةَ صِيَامِهَا وَصَدَقَتِهَا اَوْ صَلَاتِهَا وَاِنَّهَا تَصَدَّقُ بِالْاَثْوَارِ مِنَ الْاَقِطِ وَلَا تُؤْذِيْ بِلِسَانِهَا جِيْرَانَهَا قَالَ هِيَ فِي الْجَنَّةِ۔ (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن مجلس نبوی میں کسی شخص نے عرض کیا، کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! فلاں عورت کا زیادہ نماز، روزے اور کثرت صدقہ و خیرات کی وجہ سے بڑا چرچا ہے (یعنی لوگ کہتے ہیں کہ وہ عورت بہت زیادہ عبادت کرتی ہے اور کثرت سے صدقہ و خیرات کرتی رہتی ہے) لیکن وہ اپنی زبان کے ذریعہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ حضور ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ وہ دوزخ میں جائے گی۔ (یعنی وہ عورت چونکہ اپنی بدزبانی اور گالم گلوچ کے ذریعہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ اس لئے وہ دوزخ میں ڈالی جائے گی اور باوجودیکہ نماز روزہ اور صدقہ و خیرات افضل ترین عبادات ہیں لیکن اس کی یہ عبادتیں بھی اس کے گناہ کا کفارہ نہیں ہونگی اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! فلاں عورت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت کم روزے رکھتی ہے، بہت کم صدقہ و خیرات کرتی ہے اور بہت کم نماز پڑھتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا صدقہ و خیرات قروط کے چند ٹکڑوں سے آگے نہیں بڑھتا لیکن وہ اپنی

زبان کے ذریعہ اپنے ہمسائیوں کو تکلیف نہیں پہنچاتی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ عورت جنت جائے گی۔" (احمدؒ و بیہقیؒ)

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اصل میں دین کا مدار جس چیز پر ہے وہ اکتساب فرائض اور اجتناب معاصی ہے یعنی انسان کی اخروی فلاح و نجات محض اس بات پر منحصر ہے کہ وہ دینی فرائض و واجبات پر عمل کرے اور گناہ و معصیت سے پرہیز کرے اور گناہ و معصیت خواہ ترک فرائض و واجبات کی صورت میں ہوں یا بدعملیوں کی شکل میں! اس بات سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں کہ فضول یعنی نفلی عبادات و طاعات کو اختیار کیا جائے اور اصول یعنی واجبات کو ضائع کر دیا جائے۔ جیسا کہ اکثر علماء اور صلحاء اس کمزوری میں مبتلا ہیں چنانچہ علماء تو ان چیزوں کو ترک کرتے ہیں جن پر عمل کرنا واجب ہے اور صلحاء اس علم کو حاصل نہیں کرتے جس کو حاصل کرنا واجب ہے گویا دونوں طبقے ترک واجب کی معصیت کے مرتکب ہیں البتہ وہ مشائخ اور صوفیاء جو علم و عمل دونوں کے حامل ہوتے ہیں وہ واجبات پر عمل کرنے کو جو درجہ دیتے ہیں وہی درجہ ترک واجب کی معصیت سے اجتناب کو بھی دیتے ہیں بلکہ ایک طرح سے ان کے نزدیک اجتناب کی اہمیت مقدم ہے اور وہ حکمائے طب کے اس اصول کو اختیار کرتے ہیں کہ تحلیہ پر تخلیہ مقدم ہے لہٰذا جس طرح اطباء مریض کو پرہیز پہلے کراتے اور دواء بعد میں دیتے ہیں۔ اس طرح وہ مشائخ و صوفیاء بھی سالکین طریقیت کے لئے پہلی منزل توبہ قرار دیتے ہیں، اور حقیقت بھی ہے کہ جس طرح مریض مضر چیزوں سے پرہیز نہ کرے تو لاکھ دوائیں بھی اس کیلئے بے فائدہ ہیں اسی طرح کوئی مسلمان گناہ و معصیت سے اجتناب نہ کرے اور ترک واجبات سے دامن نہ بچائے تو لاکھ عبادات کرے اور نوافل و اوراد میں مشغول رہے اس کو خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ کلمۂ توحید میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے نفی ہے پھر اثبات اور یہ کہ صفات ثبوتیہ پر صفات سلبیہ مقدم ہیں کیونکہ صفات ثبوتیہ کا حصول تو لازم آتا ہے لیکن صفات ثبوتیہ سے صفات سلبیہ کا حصول لازم نہیں آتا۔

کون شخص بہتر ہے اور کون بدتر؟

(۴۷) وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَفَ عَلٰى نَاسٍ جُلُوْسٍ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِكُمْ مِنْ شَرِّكُمْ قَالَ فَسَكَتُوْا فَقَالَ ذٰلِكَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ رَجُلٌ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنَا بِخَيْرِنَا مِنْ شَرِّنَا فَقَالَ خَيْرُكُمْ مَنْ يُرْجٰى خَيْرُهُ وَيُؤْمَنُ شَرُّهُ وَشَرُّكُمْ مَنْ لَا يُرْجٰى خَيْرُهُ وَلَا يُؤْمَنُ شَرُّهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے بیٹھے ہوئے صحابہؓ کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا کیا میں تمہیں یہ بتاؤں کہ تم میں نیک ترین کون شخص ہے اور تمہارے بہترین آدمیوں کو تمہارے بدترین آدمیوں سے جدا کر کے دکھادوں؟ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ (یہ سن کر) خاموش رہے (کیونکہ انہیں خوف ہوا کہ اگر حضور ﷺ نے عام مفہوم اور عنوان کلی کے طور پر بتانے کے بجائے مشخص و متعین طور پر یعنی ایک ایک شخص کا نام لے کر بتادیا کہ فلاں نیک ہے اور فلاں بد تو اس سے بڑی ذلت اور رسوائی ہوگی یہاں تک کہ) جب حضور ﷺ نے مذکورہ ارشاد تین مرتبہ فرمایا، تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ ہاں! یا رسول اللہ (ﷺ) ہمیں بتادیجئے اور ہمارے نیک آدمیوں کو ہمارے بدآدمیوں سے ممیز و ممتاز فرمادیجئے! حضور ﷺ نے فرمایا (تو سنو) تم میں بہترین شخص وہ ہے جس سے لوگ بھلائی کی توقع کریں اور اس کے شر سے محفوظ و مامون ہوں۔ اور تم میں سے بدترین وہ ہے جس سے لوگ بھلائی کی توقع نہ کریں اور اس کے شر سے محفوظ و مامون نہ ہوں۔ (ترمذیؒ و بیہقیؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: بہترین اور بدترین شخص کی پہچان تو یہ ہے کہ جس کو حدیث میں فرمایا گیا، رہا وہ شخص کہ جس سے لوگ بھلائی کی امید تو رکھتے ہوں، لیکن اس کے شر سے محفوظ و مامون نہ ہوں۔ یا وہ شخص کہ جس کے شر سے تو لوگ محفوظ و مامون ہوں مگر اس سے کسی بھلائی کی توقع نہ رکھتے ہوں تو ایسا شخص بین بین ہوگا کہ اس کو نہ بہترین کہیں گے نہ بدترین۔

کامل مؤمن و مسلمان کون ہے؟

(۴۸) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَخْلَاقَكُمْ كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَرْزَاقَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُعْطِى الدُّنْيَا مَنْ يُّحِبُّ وَمَنْ لَّا يُحِبُّ وَلَا يُعْطِى الدِّيْنَ اِلَّا مَنْ اَحَبَّ فَمَنْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ الدِّيْنَ فَقَدْ اَحَبَّهٗ وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَا يُسْلِمُ عَبْدٌ حَتّٰى يُسْلِمَ قَلْبُهٗ وَلِسَانُهٗ وَلَا يُؤْمِنُ حَتّٰى يَاْمَنَ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان تمہارے اخلاق کو اسی طرح تقسیم فرمایا ہے جس طرح تمہارے رزق کو تمہارے درمیان تقسیم کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا تو اس شخص کو بھی دیتا ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے۔ (جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عثمانؓ وغیرہ) اور اس شخص کو بھی دیتا ہے جس کو دوست نہیں رکھتا (جیسے فرعون وغیرہ) لیکن دین یعنی اچھے اخلاق کی دولت صرف اسی شخص کو عطا کرتا ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے (حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ دنیاوی مال و دولت اور اقتدار تو ہر شخص کو عطا فرما سکتا ہے خواہ وہ اس کا دوست ہو یا نہ ہو لیکن اچھے اخلاق و احوال کی نعمت کا مستحق صرف وہی شخص ہے جو محبوب خداوندی ہو) لہٰذا اللہ تعالیٰ کا کسی شخص کو دین عطا فرمانا اس بات کی علامت ہے کہ اس کو اس نے دوست رکھا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا دل اور زبان مسلمان نہ ہو اور کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ و مامون نہ ہو۔"

تشریح: دل کا اسلام تو یہ ہے کہ اس کو باطل عقائد و نظریات سے پاک رکھا جائے اور زبان کا اسلام یہ ہے کہ اس کو لایعنی باتوں سے محفوظ رکھا جائے لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ دل اور زبان کے مسلمان ہونے سے مراد وہ تصدیق و اقرار ہے جس پر ایمان کی بنیاد ہے اور اس کے ذریعہ گویا اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ ظاہر و باطن کا ایک ہونا کمال ایمان و اسلام کی دلیل ہے اور چونکہ دل اور زبان ہی ایمان و اسلام کا مدار ہیں اس لئے خاص طور پر ان دونوں کا ذکر کیا گیا۔

باہمی الفت و محبت، اتحاد و یکجہتی کا ذریعہ ہے

(۴۹) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ مَاْلَفٌ وَلَا خَيْرَ فِيْمَنْ لَا يَاْلَفُ وَلَا يُؤْلَفُ۔ رَوَاهُمَا اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مسلمان، الفت و محبت کا مقام و مخزن ہے اور اس شخص میں بھلائی نہیں ہے جو الفت نہیں کرتا اور نہ اس سے الفت کی جاتی ہے یعنی جو شخص ایسا ہو کہ نہ تو وہ مسلمانوں سے الفت و محبت کرے اور نہ مسلمان اس سے محبت و الفت کریں تو وہ کسی کام کا نہیں ہے۔" ان دونوں روایتوں کو احمدؒ نے اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: لفظ مالف، مصدر میمی ہے اور فاعل و مفعول دونوں کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے گویا یہ لفظ مفہوم کے اعتبار سے یوں ہے یالف و یولف یعنی مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ الفت کرتا ہے اور دوسرے اس کے ساتھ الفت کرتے ہیں چنانچہ ایک روایت میں اسی طرح منقول ہے اور یہاں بھی حدیث کے آخری الفاظ اس بات کی تائید کرتے ہیں لیکن طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ یہ لفظ مالف مصدر بطریق مبالغہ ہو، جیسا کہ کہا جائے رجل عدل اس صورت میں معنی یہ ہونگے کہ مؤمن الفت کرنے والا ہے اور یا یہ کہ مالف اسم مکان ہے جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے اس صورت میں اس طرف اشارہ مقصود ہوگا کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت و موانست اور الفت و شفقت ہی کے ذریعہ اتحاد و یگانگت اور اتفاق و یکجہتی کی دولت حاصل کر سکتے ہیں اگر وہ باہمی الفت و محبت کی روح کو ختم کر دیں تو پھر ان میں تفرقہ پڑ جائے گا اور وہ انتشار کا شکار ہو جائیں گے، چنانچہ حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ كُنْتُمْ اَعْدَآءً

فالف بَیْنَ قُلُوْبِکُم الایۃ کے ذریعہ باہمی الفت وموانست کو مسلمانوں کے حق میں ایک زبردست نعمت قرار دیا ہے اور قرآن میں اس مضمون کو کئی جگہ بیان کیا ہے۔

مسلمانوں کی حاجت روائی کی فضیلت

(۵۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَضٰی لِاَحَدٍ مِنْ اُمَّتِیْ حَاجَۃً یُرِیْدُ اَنْ یَسُرَّہٗ بِھَا فَقَدْ سَرَّنِیْ وَمَنْ سَرَّنِیْ فَقَدْ سَرَّ اللّٰہَ وَمَنْ سَرَّ اللّٰہَ اَدْخَلَہُ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو آدمی میری اُمت میں سے کسی شخص کی کسی (دینی ودنیاوی) حاجت وضرورت کو پورا کرے اور اس سے اس کا مقصد اس کو خوش کرنا ہو تو اس نے مجھ کو خوش کیا (کیونکہ مسلمان کی خوشی ہوتی ہے) اور جس نے مجھ کو خوش کیا اس نے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا اس کو اللہ جنت میں داخل کرے گا۔"

تشریح: مسلمان کی حاجت روائی کی فضیلت کو جامع صغیر کی روایت میں جس کو خطیبؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے یوں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اپنے بھائی مسلمان کی کسی حاجت وضرورت کو پورا کیا تو اس کو حج وعمرہ کرنے والے شخص کے ثواب کی مانند ثواب ملتا ہے"۔

مسلمان کی فریادرسی کی فضیلت

(۵۱) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَغَاثَ مَلْھُوْفًا کَتَبَ اللّٰہُ لَہٗ ثَلٰثًا وَسَبْعِیْنَ مَغْفِرَۃً وَاحِدَۃً فِیْھَا صَلَاحُ اَمْرِہٖ کُلِّہٖ وَثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ لَہٗ دَرَجَاتٌ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص مظلوم کی فریادرسی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے بہتر بخششیں لکھ دیتا ہے اور ان میں سے ایک بخشش تو وہ ہے جو اس کے تمام (دنیاوی واخروی) امور کی اصلاح کی ضامن بن جاتی ہیں اور باقی بہتر بخششیں قیامت کے دن اس کے درجات کی بلندی کا سبب ہونگی۔"

تشریح: "عیال" کے معنی متعلقین کے ہیں اور کسی شخص کے متعلقین کا اطلاق ان افراد پر ہوتا ہے جن کی پرورش، جن کا کھانا پینا اور جن کی ضروریات زندگی کی تکمیل اس شخص کے ذمہ ہوتی ہے اور وہ ان کے اخراجات اپنے روپیہ پیسے سے پورا کرتا ہے لہٰذا اس معنی میں عیال کی نسبت غیر اللہ کی طرف تو مجازی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف حقیقی ہے کیونکہ رزاق مطلق حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسا کہ خلاق مطلق اسی کی ذات ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا۔

"زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔"

حقوق ہمسائیگی کی اہمیت

(۵۲) وَعَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوَّلُ خَصْمَیْنِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ جَارَانِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن سب سے پہلے دو جھگڑنے والے دو ہمسایہ ہوں گے۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اہل دوزخ کے بعد حقوق کی عدم ادائیگی سے متعلق جو معاملہ سب سے پہلے پیش ہوگا وہ ان دو ہمسایوں کا ہوگا۔ جنہیں آپس میں ایک دوسرے سے ایذا رسانی یا حقوق واجب الادا میں تقصیر وکوتاہی وغیرہ سے دو چار ہونا پڑا ہوگا۔ واضح

رہے کہ ایک روایت میں یوں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس محاسبہ کا سامنا کرنا پڑے گا وہ نماز سے متعلق ہوگا نیز ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ قیامت کے دن بندہ کے سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کا معاملہ ہوگا اور مذکورہ بالا روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جو معاملہ پیش ہوگا وہ ہمسائیوں کی مخاصمت کا معاملہ ہوگا۔ چونکہ ان روایتوں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ اس لئے علماء نے ان تمام روایتوں کے درمیان یہ تطبیق دی ہے۔ کہ حقوق اللہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے خون کے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔ کیونکہ کسی کا ناحق خون بہانا بہت بڑا گناہ ہے۔ رہی مذکورہ بالا حدیث تو لفظ خصمین کے ذریعہ یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حدیث دونوں فریق کے ایک دوسرے کے خلاف دعوی رکھنے کے ساتھ مقید ہے یعنی جو لوگ ایسے ہیں ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں تقصیر و کوتاہی کی ہے اور اس کی وجہ سے ہر ایک گنہگار ہوا ہے تو ایسے لوگوں میں سے جو دو آدمی سب سے پہلے اپنا معاملہ لے کر پیش ہونگے اور ایک دوسرے کے خلاف دعوی کریں گے وہ دو ہمسایہ ہوں گے اور ان کا فیصلہ کیا جائے گا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ادائیگی حقوق میں تقصیر و کوتاہی کا تعلق دونوں فریق سے نہ ہو بلکہ کسی ایک سے ہو تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ دونوں فریق پر خصمین کا اطلاق بطریق تغلیب اور مشاکلت کے ہے جیسا کہ قرآن کے یہ الفاظ وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا اس کی مثال ہے حاصل یہ کہ مذکورہ بالا روایتوں میں جن معاملات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ہر ایک میں اولیت اضافی ہے جس کی وجہ سے حقیقی طور پر کوئی باہمی تضاد لازم نہیں آتا۔

سنگدلی کا علاج

(۵۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلاً شَكٰى اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَسْوَةَ قَلْبِهٖ قَالَ امْسَحْ رَأْسَ الْيَتِيْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْكِيْنَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے (ایک دن) نبی کریم ﷺ سے ایک شخص نے اپنی سنگدلی کی شکایت کی اور (اس کا علاج پوچھا) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو۔" (احمدؒ)

بیوہ بیٹی کی کفالت کا اجر

(۵۵) وَعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَفْضَلِ الصَّدَقَةِ اِبْنَتُكَ مَرْدُوْدَةً اِلَيْكَ لَيْسَ لَهَا كَاسِبٌ غَيْرُكَ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت سراقہ ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کیا میں تمہیں بہترین صدقہ کے بارے میں بتاؤں؟ اور وہ صدقہ اپنی اس بیٹی کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے جو تمہارے پاس واپس بھیجدی گئی ہے اور جس کے لئے تمہارے علاوہ اور کوئی کمانے والا نہیں ہے یعنی اگر تمہاری بیٹی کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی ہو اور نہ تو اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ اس کے لئے گزر بسر کا سامان فراہم کر سکے بلکہ صرف تم ہی اس کے لئے واحد سہارا بن سکتے ہو اور وہ اسی لئے ناچار ہو کر تمہارے گھر آن پڑی ہو تو تمہاری طرف سے اس کی کفالت اور اس کے ساتھ حسن سلوک ایک بہترین صدقہ ہے۔" (ابن ماجہؒ)

بَابُ الْحُبِّ فِی اللّٰهِ وَمِنَ اللّٰهِ

اللہ کے ساتھ اور اللہ کے لئے محبت کرنے کا بیان

"اللہ کے ساتھ محبت" کے معنی یہ ہیں کہ معبود کے ساتھ عبودیت کا جو تعلق قائم کیا جائے اور پروردگار کی ذات سے جو محبت کی جائے

اس میں ریا و نمائش اور خواہشات نفسانی کی آمیزش نہ ہو بلکہ وہ محبت و تعلق محض اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہو۔
اللہ کے لئے محبت۔ کا مطلب یہ ہے کہ کسی بندے کے ساتھ تعلق و محبت کا جو رشتہ قائم کیا جائے وہ محض اللہ ہی کی خاطر ہو اور اللہ کی راہ میں کسی دنیاوی غرض و لالچ کی وجہ سے نہ ہو، یعنی اگر کسی بندے سے دلی محبت و دوستی کی جائے تو صرف اس لئے کی جائے کہ اس بندہ کے ساتھ محبت و دوستی رکھنے سے اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دنیا میں انسان کا باہمی اتحاد یا اختلاف روز ازل کے اتحاد، اختلاف کا مظہر ہے

① عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

"حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "روحیں (جسموں میں داخل کئے جانے سے پہلے) لشکر کی طرح (ایک جگہ) مجتمع تھیں (اور پھر ان کو الگ الگ کر کے ایک ایک جسم میں داخل کیا گیا) چنانچہ (جسموں میں داخل ہونے سے پہلے) جو روحیں ایک دوسرے کی صفات سے مناسبت و مشارکت رکھنے کی وجہ سے" آپس میں مانوس و متعارف تھیں، وہ (جسموں میں پہنچنے کے بعد اس دنیا میں بھی) ایک دوسرے کے ساتھ محبت و الفت رکھتی ہیں۔ اور جو روحیں ایک دوسرے سے انجان و نامانوس تھیں وہ (اس دنیا میں بھی) اختلاف رکھتی ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ دنیا میں اب تک جتنے اجسام پیدا ہو چکے ہیں یا قیامت تک جتنے پیدا ہونگے ان سب کی روحیں اپنے جسمانی وجود سے بھی بہت پہلے پیدا کی جا چکی ہیں، جو عالم ارواح میں جمع ہیں اور دنیا میں جب کسی روح کا جسم پیدا ہوتا ہے تو وہ روح اس جسم میں بھیجدی جاتی ہے۔ چنانچہ ابتداء خلقت میں اور روز ازل اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا عہد و اقرار کرنے کے لئے جب پوری کائنات انسانی کی روحوں کو چیونٹیوں کی صورت میں جمع کیا تو اس وقت وہاں جو روحیں آپس میں ایک دوسرے سے مانوس و متعارف ہوئیں، اور جن روحوں کے درمیان صفات کی مناسبت اور موانست و محبت پیدا ہوئی یا جو روحیں آپس میں نامانوس انجان رہیں اور جن روحوں کے درمیان اختلاف و تفرقہ رہا وہ دنیا میں اپنے اجسام میں آنے کے بعد بھی اسی مناسبت و محبت یا اختلاف و اجنبیت پر قائم رہتی ہیں، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے اس دنیا میں جو انسان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت و موانست اور ایک دوسرے کی صفات سے مناسبت و مشابہت رکھتے ہیں جیسے جو لوگ نیک اور اچھے ہوتے ہیں وہ نیک اور اچھے لوگوں سے محبت و تعلق رکھتے ہیں اور جو لوگ فاسق اور بدکار ہوتے ہیں، وہ فاسقوں اور بدکاروں سے محبت و تعلق رکھتے ہیں یا جو لوگ اس دنیا میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف و عناد اور اجنبیت رکھتے ہیں جیسے نیک لوگ برے لوگوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور برے لوگ نیک لوگوں سے اختلاف و عناد رکھتے ہیں تو وہ دراصل اپنی روحوں کے ازلی اتحاد موانست یا اختلاف و اجنبیت کا مظہر ہیں کہ روز ازل جن روحوں میں محبت و موانست تھی ان کے درمیان اس دنیا میں بھی محبت و موانست رہتی ہے اور جن روحوں میں وہاں اختلاف و عناد رہا وہ یہاں بھی اختلاف و عناد رکھتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ روحوں کے درمیان روز ازل جو تعارف و تعلق پیدا ہو گیا تھا اس کا ظہور اس دنیا میں الہام خداوندی کے سبب ہوتا ہے با ایں طور کہ جب وہ روحیں اس دنیا میں اپنے جسموں میں آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی وہاں (روز ازل) کی محبت کے سبب یہاں (دنیا) بھی ان کے دلوں میں تعلق و محبت ڈال دیتا ہے۔

جس بندے کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے اس کو زمین و آسمان والے بھی دوست رکھتے ہیں۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّہٗ قَالَ فَیُحِبُّہٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْہُ فَیُحِبُّہٗ اَھْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ یُوْضَعُ لَہُ الْقُبُوْلُ فِی الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَیَقُوْلُ اِنِّیْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْہُ قَالَ فَیُبْغِضُہٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِیْ اَھْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللّٰہَ یُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْہُ قَالَ فَیُبْغِضُوْنَہٗ ثُمَّ یُوْضَعُ لَہُ الْبَغْضَآءُ فِی الْاَرْضِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت رکھتا ہے (یعنی جب وہ اپنے بندوں میں کسی بندے کے تئیں اپنی خوشنودی و محبت کو ظاہر کرنے کا ارادہ کرتا ہے) تو جبرئیل کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت رکھتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو" آنحضرت نے فرمایا "جبرئیل علیہ السلام (یہ سن کر) اس بندے سے محبت رکھتے ہیں اور پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آسمان میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ۔ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت رکھتا ہے لہٰذا تم سب بھی اس سے محبت کرو۔ چنانچہ آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر اس بندے کے لئے زمین میں بھی قبولیت رکھی جاتی ہے (یعنی زمین والوں کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔ اور تمام جن وانس اس سے محبت کرتے لگتے ہیں) اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے نفرت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں، تم بھی اس سے نفرت کرو۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "جبرئیل (یہ سن کر) اس شخص سے نفرت کرتے ہیں اور پھر وہ آسمان میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے لہٰذا تم سب بھی اس سے نفرت کرو۔ چنانچہ آسمان والے بھی اس شخص سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک اس شخص کے لئے زمین میں بھی عداوت و نفرت رکھی جاتی ہے جس کی وجہ سے تمام جن وانس اس شخص سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔" (مسلم)

تشریح: اللہ تعالیٰ کا کسی بندے کو دوست و محبوب رکھنے کا مطلب دراصل اس بندے پر حق تعالیٰ کی طرف سے خیر و بھلائی اور ہدایت و فلاح کی بارش ہونا اور اس پر رحمت خداوندی کا نازل ہونا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی شخص سے نفرت کرنا گویا اس شخص کو عذاب میں مبتلا کرنے کے ارادۂ خداوندی کو ظاہر کرنا، اس سے حق، ہدایت کی توفیق کسی بندے کے حق میں ان کی محبت کو دو صورتوں پر محمول کیا جاسکتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ اس بندے کے حق میں استغفار کرتے ہیں۔ اس کی مدح و تعریف کرتے ہیں۔ اور اس کے لئے بارگاہ خداوندی میں دعا کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ "محبت" کے وہی ظاہری معنی مراد ہیں۔ جو عام طور پر مفہوم ہوتے ہیں یعنی ان کے دل اس بندے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور اس سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے ہیں۔

ملا علی قاری کہتے ہیں کہ دوسری صورت یعنی محبت کو اس کے اپنے ظاہری معنی پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے کیونکہ جب کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنا صحیح ہو تو مجازی معنی مراد لینا غیر موزوں ہے، علاوہ ازیں محبت کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنے کی صورت میں پہلے معنی (یعنی اس بندے کے حق میں جبرئیل اور فرشتوں کا دعا و استغفار اور مدح و تعریف کرنا ضمنی طور پر خود بخود متحقق ہو جاتے ہیں۔

خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر ایک دوسرے سے محبت رکھنے والوں کا قیامت کے دن اعزاز

(۳) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَیْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِیْ اَلْیَوْمَ اُظِلُّھُمْ فِیْ ظِلِّیْ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّیْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (سب لوگوں کے سامنے اپنے بعض بندوں کی عظمت و بزرگی کو ظاہر کرنے کے لئے) فرمائے گا "کہاں ہیں وہ لوگ جو میری بڑائی کے اظہار اور میری تعظیم کی خاطر آپس میں محبت و تعلق رکھتے تھے (یا کہاں ہیں وہ لوگ جو میری رضا و خوشنودی کی خاطر اور حصول ثواب کی غرض سے آپس میں محبت و تعلق رکھتے تھے) آج میں ان

لوگوں کو اپنے سایہ میں پناہ دوں گا اور آج کے دن میرے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ کے سایہ سے مراد یا تو عرش کا سایہ ہے، جیسا کہ بعض احادیث میں اس کا صراحۃً ذکر ہے اس صورت میں کہا جائے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سایہ کی وضاحت اس سایہ کی عظمت و تکریم کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ یا سایہ سے مراد حفاظت خداوندی اور رحمت الٰہی ہے جیسا کہ السلطان ظل اللّٰہ فی الارض (بادشاہ) دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے، فرمایا گیا ہے اور یا یہ کہ "سایہ" کے ذریعہ قیامت کے دن کی ان راحتوں اور نعمتوں کو تعبیر کیا گیا ہے جو ان لوگوں پر حق تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوں گی، چنانچہ عربی میں لفظ ظل یعنی سایہ، راحت و نعمت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ خوشی و راحت کے ساتھ گزرنے والی زندگی کو عیش ظلیل کہا جاتا ہے۔

حب فی اللہ کی فضیلت

④ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَجُلاً زَارَ اَخًا لَهُ فِيْ قَرْيَةٍ اُخْرٰى فَاَرْصَدَ اللّٰهُ لَهُ عَلٰى مَدْرَجَتِهِ مَلَكًا قَالَ اَيْنَ تُرِيْدُ قَالَ اُرِيْدُ اَخًا لِيْ فِيْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ قَالَ هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا قَالَ لَا غَيْرَ اَنِّيْ اَحْبَبْتُهُ فِي اللّٰهِ قَالَ فَاِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكَ بِاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَبَّكَ كَمَا اَحْبَبْتَهُ فِيْهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے مسلمان بھائی کی ملاقات کے لئے روانہ ہوا جو کہ دوسری آبادی میں رہتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ پر اس کے انتظار میں ایک فرشتہ کو بٹھا دیا (جب وہ شخص اس جگہ پہنچا تو) فرشتہ نے (اس کو روک کر) پوچھا کہ کہاں جانے کا ارادہ ہے، اس شخص نے کہا کہ میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی ملاقات کے لئے جا رہا ہوں، جو اس آبادی میں رہتا ہے فرشتہ نے پوچھا کہ کیا اس پر تمہارا کوئی حق نعمت ہے؟ جس کو حاصل کرنے کے لئے تم اس کے پاس جا رہے ہو (یعنی تم جس شخص کے پاس جا رہے ہو کیا وہ کوئی ایسا شخص ہے جس کو تم نے کوئی نعمت دی تھی اور اب اس کا بدلہ حاصل کرنے کے لئے اس کے یہاں جا رہے ہو؟) اس شخص نے کہا کہ نہیں! میں محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس سے محبت و تعلق رکھتا ہوں۔ فرشتہ نے کہا (تو پھر سنو!) مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تاکہ میں تمہیں یہ بشارت دوں، کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرتا ہے جیسا کہ تم محض اللہ تعالیٰ کی خاطر اس شخص سے محبت و تعلق رکھتے ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرنے کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ چیز (حب فی اللہ) محبت الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے نیز اس سے صالحین کی ملاقات کے لئے ان کے پاس جانے کی فضیلت بھی واضح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے نیک و محبوب بندوں کے پاس فرشتوں کو بھیجتا ہے جو ان سے ہم کلام ہوتے ہیں، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ چیز پچھلی امتوں کے ساتھ مخصوص تھی کیونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور انسانوں کے پاس فرشتوں کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔

علماء اور اولیاء اللہ کے ساتھ محبت رکھنے والے آخرت میں ان ہی کے ساتھ ہونگے

⑤ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ تَقُوْلُ فِيْ رَجُلٍ اَحَبَّ قَوْمًا وَلَمْ يَلْحَقْ بِهِمْ فَقَالَ الْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اس شخص کے بارے میں آپ (ﷺ) کیا فرماتے ہیں جو کسی جماعت یعنی علماء و صلحاء اور بزرگان دین سے محبت و عقیدت رکھتا ہو۔ لیکن ان کی محبت اس کو نہ ہوئی ہو یا وہ ان کے علم و عمل تک نہ پہنچا ہو؟ حضور ﷺ نے فرمایا ہے وہ شخص اسی کے ساتھ ہے جس کو وہ محبوب رکھتا

ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی عالم یا بزرگ کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتا ہے وہ آخرت میں اسی عالم و بزرگ کے ساتھ ہوگا۔ اور اگرچہ کامل محبت کہ جس کا اعتبار کیا جاسکتا ہے وہی ہے جو اتباع و موفقت اور علمی وعملی یگانگت تک پہنچادے لیکن محض مخلصانہ عقیدت و محبت بھی معیت (یکجائی کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس میں گویا ان لوگوں کے لئے بشارت ہے جو علماء و صلحا اور بزرگان دین سے عقیدت و محبت اور دوستی رکھتے ہیں کہ وہ لوگ انشاء اللہ قیامت کے دن انہی علماء و صلحاء اور بزرگان دین کے ساتھ اٹھیں گے اور آخرت میں ان کی رفاقت و معیت کی دولت پائیں گے، ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ حدیث کا ظاہری مفہوم عمومیت پر دلالت کرتا ہے یعنی اس ارشاد گرامی میں عمومی طور پر یہ نکتہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے۔ اس کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا۔ اور وہ شخص کہ جس کے ساتھ محبت ہے خواہ نیک و صالح ہو یا بدکار و فاسق، ملا علی قاریؒ کی اس بات کی تائید اس حدیث اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ سے ہوتی ہے جو آگے آئے گی اس صورت میں کہا جائے گا کہ جو لوگ علماء و صلحاء اور بزرگان دین کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتے ہیں ان کے لئے اس حدیث میں خاتمہ بخیر اور اخروی فلاح و سعادت کی بشارت ہے اور جو لوگ بدکار و فاسق اور خدا کے دشمنوں کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتے ہیں ان کے لئے اس حدیث میں سخت وعید و تنبیہ ہے۔

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَتَی السَّاعَۃُ قَالَ وَیْلَکَ وَمَا اَعْدَدْتَ لَھَا قَالَ مَا اَعْدَدْتُ لَھَا اِلَّا اَنِّیْ اُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ قَالَ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ قَالَ اَنَسٌ فَمَا رَاَیْتُ الْمُسْلِمِیْنَ فَرِحُوْا بِشَیْءٍ بَعْدَ الْاِسْلَامِ فَرَحَھُمْ بِھَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انس سے روایت ہے کہ (ایک دن) ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی تو حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم پر افسوس ہے! کیا تم نے قیامت کے لئے کوئی تیاری کر رکھی ہے؟۔" (بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آنحضرت ﷺ کو اس کا یہ سوال اچھا نہیں لگا اور آپ ﷺ کو گمان ہوا کہ اس شخص نے اچھا اعتقاد رکھتے ہوئے ازراہ خودی یہ سوال نہیں کیا ہے بلکہ قیامت کے آنے کو ایک دور دراز کی بات سمجھتے ہوئے لاپرواہی کے طور پر یہ سوال کر رہا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو جواب بھی اسی انداز میں دیا کہ یہ کیا پوچھتے ہو؟ کہ قیامت کب آئے گی، تم اپنا عقیدہ و عمل درست رکھو اور اچھے کام کرو، جب قیامت کے دن کو آنا ہوگا آجائے گا۔ لیکن جب) اس شخص نے عرض کیا کہ میں نے تو کوئی تیاری نہیں کی ہے البتہ میرے پاس ایک دولت ضرور ہے اور وہ یہ کہ) میں خدا اور خدا کے رسول (ﷺ) سے محبت رکھتا ہوں (تو آنحضرت ﷺ نے جانا کہ اس شخص کا مذکورہ سوال ایک مخلص و کامل مؤمن کے اعتقاد کا مظہر اور ازراہ خوف ہے کسی لاپرواہی کا غماز نہیں ہے، چنانچہ) آپ ﷺ نے فرمایا "تم دنیا و آخرت میں اسی کے ساتھ ہو، جس سے محبت رکھتے ہو۔" حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو اسلام کے بعد کسی اور چیز سے اتنا زیادہ خوش نہیں دیکھا جتنا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے خوش ہوئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس شخص نے "تیاری" کے زمرہ میں صرف خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت کو ذکر کیا اس کے علاوہ دوسری بدنی، و قلبی اور مالی عبادتوں کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ جن سے اس کی زندگی یقیناً خالی نہیں تھی۔ اس کی وجہ ایک تو اظہار عجز و انکساری اور اپنے مرتبۂ عبودیت کا اخفاء تھا جو ایک مخلص مؤمن کی شان ہے، دوسری وجہ یہ تھی کہ خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت ہی اصل چیز ہے اور تمام عبادتیں اسی محبت کی شاخیں اور اس کا لازمی اثر ہوتی ہیں۔ جس شخص کا قلب خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی محبت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ عبادت و طاعت خود بخود اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں صرف محبت کو ذکر کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ محبت بذات خود سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ بھی محبت کرتا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ اور ایک جگہ یوں فرمایا ہے۔ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ظاہر ہے

کہ جس بندے کو محبت الٰہی کی دولت حاصل ہو جائے اس کی دنیاوی و اخروی فلاح و نجات میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

"تم اسی کے ساتھ ہو جس سے تم محبت رکھتے ہو۔" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی ذات سے اس درجہ کا تعلق رکھتا ہے کہ اس کی محبت دوسری تمام چیزوں یہاں تک کہ اپنے مال، اپنے اہل و عیال اور اپنی جان تک کی محبت پر غالب آجاتی ہے۔ تو وہ اپنے محبوب کے ساتھ منسلک و ملحق ہو جاتا ہے اور اس کا شمار محبوب کے اپنے لوگوں میں ہونے لگتا ہے اور محبت صادقہ یا عشق حقیقی کی علامت یہ ہے کہ وہی کام کرے جس کا محبوب حکم کرے یا جو محبوب کی رضاء و خوشنودی کا باعث ہو اور ہر اس کام سے اجتناب و پرہیز کرے جو محبوب کے حکم و مرضی کے خلاف ہو۔ اور اس کے غیر کی مرضی و مراد کو پورا کرنے والا ہو۔ لہٰذا تم اگر اللہ کی محبت کا دعوی کرتے ہو تو اپنے عقیدہ و قول اور فعل و عمل سے اس دعوے کو ثابت کرتے رہو بایں طور کہ فرائض و واجبات کی بجا آوری کرو۔ حق تعالیٰ جن امور سے راضی و خوش ہوتا ہے ان کو ہمیشہ اختیار کرو۔ اور اس نے جن چیزوں سے منع کر دیا ہے ان کے قریب بھی مت جاؤ، اسی بات کو مشہور صوفی خاتون حضرت رابعہ بصریؒ نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے۔

تَعْصِی الْاِلٰهَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ ۔۔۔ هٰذَا لَعُمْرِی فِی الْقِيَاسِ بَدِيْعٌ

لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَ طَعْتَهٗ ۔۔۔ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعٌ

"تم خدا کی نافرمانی اختیار کئے ہوئے در آنحالیکہ تم اس کی محبت کا دم بھرتے ہو۔ اپنی جان کی قسم یہ چیز قیاس میں بھی نہیں آسکتی!.....اگر تمہاری محبت سچی ہوتی تو یقیناً تم اس کی اطاعت کرتے۔ (کیونکہ) محبت کرنے والا در حقیقت اپنے محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے......"

آنحضرت کا ارشاد سن کر مسلمانوں کا بہت زیادہ خوش ہونا اس بنا پر تھا کہ پہلے ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جنّت میں آنحضرت کی معیت محض آنحضرت کے ساتھ محبت اور آپ کی متابعت کی وجہ سے حاصل نہیں ہوگی بلکہ اس سعادت کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عبادت میں مشغول رہنا اور کثرت کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ اختیار کرنا ضروری ہے چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بات ارشاد فرمائی تو صحابہؓ کو بہت زیادہ خوشی ہوئی اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جس کو علامہ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک صحابیؓ حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ مجھ کو اپنی جان اپنے اہل خانہ اور اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہیں، میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں تو آپ کے تصور میں کھویا رہتا ہوں۔ جب آپ ﷺ کی یاد بہت ستاتی اور روے انورؐ کی زیارت کے بغیر چین نہیں ملتا تو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ اور آپ ﷺ کی زیارت سے تسکین حاصل کرتا ہوں جب مجھے اپنی موت کا خیال آجاتا ہے اور اس دنیا سے آپ ﷺ کے رخصت ہو جانے کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ آپ ﷺ جنّت میں جائیں گے تو جنّت کے سب سے اعلیٰ درجہ میں انبیاء کے ساتھ ہونگے اور اگر خدا نے مجھے بھی جنت میں داخل کیا تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں آپ ﷺ کی زیارت سے محروم رہوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے ان صحابیؓ کی یہ بات سنی لیکن کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ۔

"جس نے (ضروری احکام میں) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کی وہ (جنت میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا انعام نازل کیا ہے۔ یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیق شہداء اور صالحین۔"

رہی یہ بات کہ یہاں "معیت" سے کیا مراد ہے تو جاننا چاہئے۔ کہ "معیت" سے یہ مراد نہیں ہے کہ محبت کرنے والا اور محبوب دونوں کے درمیان ہونے والی ملاقات کی جو کیفیت ایک حدیث میں بیان کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ اعلیٰ درجہ والے ان لوگوں کے پاس آئیں گے جو نیچے کے درجات میں ہونگے اور پھر سب جنّت کے باغات میں یکجا ہونگے وہاں ایک دوسرے کی زیارت و ملاقات

ہوگی۔ اور درجہ عالیہ والے ان چیزوں کا ذکر کریں گے جو ان کو اللہ کی طرف سے بطور انعام حاصل ہوئی ہوں گی۔ اور حق تعالیٰ کے انعامات واکرامات پر اس کی حمد وثناء کریں گے پھر درجات سافلہ والے ان کی خاطر وتواضع کریں گے اور دوڑ دوڑ کر ہر وہ چیز لائیں گے۔ اور ان کو دیں گے جن کی وہ خواہش وطلب کریں غرضیکہ اسی طرح وہ سب جنت کے باغات میں اس طرح کی تقریب سے لطف اندوز اور مسرور ہوا کریں گے۔

واضح رہے کہ متابعت اور ضروری احکام کے مدارج مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا جس درجہ کے احکام ضروریہ میں اطاعت ہوگی اسی درجہ کی محبت بھی شمار ہوگی۔ اور جس درجہ کی محبت یا جس درجہ کا حسن معاملہ ہوگا اسی درجہ کی یہ معیت وملاقات بھی نصیب ہوگی۔

نیک اور بد ہمنشین کی مثال

⑦ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ وَالسَّوْءِ کَحَامِلِ الْمِسْكِ وَنَافِخِ الْکِیْرِ فَحَامِلُ الْمِسْكِ اِمَّا اَنْ یُّحْذِیَكَ وَاِمَّا اَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِیْحًا طَیِّبَةً وَنَافِخُ الْکِیْرِ اِمَّا اَنْ یُّحْرِقَ ثِیَابَكَ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِیْحًا خَبِیْثَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "نیک اور بد ہمنشین کی مثال مشک رکھنے والے اور دھونکنی دھونکنے والے کی سی ہے مشک رکھنے والا یا تو تمہیں مشک مفت دیدے گا یا تم اس سے خرید لوگے اور یا (اگر کسی بھی صورت میں اس کا مشک تمہارے ہاتھ نہیں لگتا تو کم (از کم اس کی خوشبو تو ضرور تمہیں حاصل ہوجائیگی (اس طرح نیک اور صالح ہمنشین سے کوئی فیض یا کوئی خاص نعمت نہ بھی ملے تو یہی کیا کم ہے کہ کچھ ساعتوں کے لئے اس کی صحبت میں سکون وطمانیت کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہوجائے) اور دھونکنی دھونکنے والا یا تو تمہارے کپڑوں کو جلادیگا یا تمہیں اس سے دماغ پاش بو یعنی دھواں ملے گا۔ (اسی طرح بدکار ہمنشین اول تو دین ودنیا دونوں کا نقصان پہنچاتا ہے وقت کو ضائع کرتا ہے اور حصول سعادت کی صلاحیت واستعداد کو مضمحل اور بےکار کردیتا ہے اور اگر یہ نہ بھی ہو تو اس کی صحبت میں کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ زندگی کے وہ قیمتی لمحات، دل ودماغ کی کبیدگی اور لاحاصل صحبت کی ناخوشگواری میں صرف ہوتے ہی ہیں۔"

(بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اچھے لوگوں کی محبت وہم نشینی اور برے لوگوں کی محبت وہم نشینی کے درمیان جو فرق ہے اس کو مذکورہ بالا نشین مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے اور جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے اس ارشاد گرامی کی مراد اس بات کی تاکید وتنبیہ ہے کہ اچھے لوگوں سے محبت وتعلق پیدا کرو۔ ان کی صحبت وہم نشینی کو اختیار کرو اور برے لوگوں کی محبت وموافقت اور ان کی صحبت وہم نشینی سے اجتناب کرو، نیز اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اچھے لوگوں یعنی علماء وصلحاء کی صحبت وہم نشینی دنیا وآخرت میں فائدہ حاصل کرنے کا سبب ہے اور برے لوگوں یعنی بدکار وفساق کی صحبت وہمنشینی دنیا وآخرت میں نقصان اٹھانے کا ذریعہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

خدا کی رضاء وخوشنودی کی خاطر باہمی میل ملاپ اور محبت رکھنے والوں کی فضیلت

⑧ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَجَبَتْ مَحَبَّتِیْ لِلْمُتَحَابِّیْنَ فِیَّ وَالْمُتَجَالِسِیْنَ فِیَّ وَالْمُتَزَاوِرِیْنَ فِیَّ وَالْمُتَبَاذِلِیْنَ فِیَّ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَفِیْ رِوَایَةِ التِّرْمِذِیِّ قَالَ یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِیْ جَلَالِیْ لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُّوْرٍ یَغْبِطُهُمُ النَّبِیُّوْنَ وَالشُّهَدَآءِ۔

"حضرت معاذ ابن جبلؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ میرا

محبت کرنا ایک طے شدہ امر ہے جو محض میری رضامندی وخوشنودی کی خاطر آپس میں میل محبت رکھتے ہیں محض میری رضا وخوشنودی کی خاطر اور میری حمد وثناء کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ محض میری رضا وخوشنودی کی خاطر ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور محض میری رضاء وخوشنودی کی خاطر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔" (مالک) ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ میری عظمت وجلال کے سبب آپس میں میل محبت رکھتے ہیں ان کے لئے (آخرت میں) نور کے منبر ہوں گے جن پر انبیاء وشہداء (بھی رشک کریں گے۔"

تشریح: "جن پر انبیاء وشہداء رشک کریں گے۔" اس جملہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کس طرح درست ہوسکتی ہے کیونکہ انبیاء علی الاطلاق تمام لوگوں سے افضل وبرتر ہیں اور شہداء راہ میں اپنی جان ومال قربان کر دینے کے سبب عظیم فضیلت رکھتے ہیں لہٰذا ان دونوں کا ایسے لوگوں کے اجرو انعام پر رشک کرنا کس طرح موزوں ہوسکتا ہے جس کا مذکورہ عمل (یعنی خدا کے لئے آپس میں میل محبت رکھنا) نہایت آسان اور سہل ہے علاوہ ازیں اس بات سے انبیاء اور شہداء کے مقابلہ پر مذکورہ لوگوں کا زیادہ افضل ہونا لازم آتا ہے کیونکہ رشک اسی کو ہوتا ہے جو مفضول ہو اور جس پر رشک کیا جاتا ہے وہ فاضل ہوتا ہے؟ اس کا جواب علماء نے اجرو انعام پر خوشی ومسرت کا اظہار کرنا ہے نہ کہ رشک کا حقیقی مفہوم مراد ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مذکورہ بالا جملہ دراصل فرض وتقدیر پر مبنی ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو رتبہ ومقام حاصل ہوگا اس کی اہمیت وفضیلت کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر بفرض محال انبیاء وشہداء کو کسی رتبہ ومقام پر رشک ہوتا تو ان لوگوں کے رتبہ ومقام پر ہوتا۔ اور تیسرا جواب جو اس طرح کے مواقع پر عام طور پر دیا جاتا ہے یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مفضول میں کوئی ایسی خاص صفت وفضیلت ہوتی ہے جو فاضل میں نہیں ہوتی اور باوجودیکہ فاضل اپنے اندر جو فضائل اور خوبیاں رکھتا ہے۔ ان کے مقابلہ پر مفضول کی اس صفت وفضیلت کی اہمیت نہیں ہوتی لیکن فاضل کی تمنا وخواہش ہوتی ہے کہ اس کو وہ صفت وخوبی حاصل ہوجائے جو مفضول میں ہے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ زید کے پاس ایک ہزار بہت خوب صورت غلام ہوں اور ان میں خوبصورتی کے علاوہ دوسری اور خوبیاں بھی اور اس کے مقابلہ پر بکر کے پاس صرف ایک غلام بچہ ہو جو بہت نیک اور ہونہار ہو، ظاہر ہے کہ زید اپنے غلاموں کی تعداد واہمیت کے اعتبار سے بکر کے مقابلہ پر کہیں زیادہ برتری وفضیلت رکھتا ہے اور اس کو اس بات کی بظاہر کوئی ضرورت ہی نہیں کہ وہ بکر کے غلام بچہ پر رشک کرے لیکن اس کے باوجود اس کی خواہش یہ ہو کہ بکر کے پاس جو غلام بچہ ہے اسی طرح کا ایک غلام بچہ مجھے بھی حاصل ہوجائے۔ اسی طرح انبیاء وشہداء بھی مذکورہ لوگوں کی فضیلت دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ کاش دوسری فضیلتوں کے ساتھ یہ فضیلت بھی ان کو حاصل ہوجاتی۔

(۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ عِبَادِي اللّٰهِ لَانَاسًا مَاهُمْ بِاَنْبِيَآءَ وَلَا شُهَدَآءَ يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَآءُ وَالشُّهَدَآءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللّٰهِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تُخْبِرُنَا مَنْ هُمْ قَالَ هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ عَلٰى غَيْرِ اَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ وَلَا اَمْوَالٍ يَتَعَاطَوْنَهَا فَوَاللّٰهِ اِنَّ وُجُوْهَهُمْ لَنُوْرٌ وَّاِنَّهُمْ لَعَلٰى نُوْرٍ لَا يَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ وَقَرَأَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْ اَبِي مَالِكٍ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ مَعَ زَوَائِدَ وَكَذَا فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خدا کے بندوں میں سے کتنے ہی لوگ (یعنی اولیاء اللہ) ایسے ہیں جو اگرچہ نبی اور شہید نہیں ہیں، لیکن قیامت کے دن خدا کے نزدیک ان کے مراتب ودرجات دیکھ کر انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کریں گے۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ہمیں بتایئے وہ کون لوگ ہونگے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ لوگ ہیں جو خدا کی روح یعنی قرآن کریم کے سبب آپس میں میل محبت رکھتے ہیں حالانکہ ان کے درمیان نہ کوئی رشتہ ناتا ہوتا ہے (جس کا تقاضا انہیں ایک دوسرے سے محبت کرنے پر مجبور

کرے) اور نہ مال و دوست کی لین دین کا معاملہ ہوتا ہے (حاصل یہ کہ ان کی باہمی محبت اور آپس کے اتحاد و میل ملاپ کی بنیاد کسی دنیاوی غرض و وسیلہ پر نہیں ہوتی۔ بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور تعلیمات قرآنی کی اتباع پر ہوتی ہے پس قسم ہے اللہ کی (قیامت کے دن) ان کے چہرے نورانی ہونگے یا وہ مجسم نور ہونگے اور وہ نور (کے منبروں) پر (یا نفس نور پر) متمکن و مستولی ہونگے وہ لوگ اس وقت بھی خوف زدہ نہیں ہونگے جب کہ دوسرے لوگ خوف میں مبتلا ہوں گے۔ اور وہ اس وقت بھی غمگین اور رنجیدہ نہیں ہوں گے۔ جب کہ دوسرے لوگ غمگین و رنجیدہ ہونگے پھر حضور ﷺ نے (ایسے لوگوں کو خدا کا دوست کرنے اور ان سے خوف و حزن کی نفی کرنے کے لئے بطور دلیل) یہ آیت تلاوت فرمائی اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ آگاہ ہو کہ خدا تعالیٰ کے دوستوں پر نہ تو خوف طاری ہوگا اور نہ وہ غمگین و رنجیدہ ہونگے۔ اس روایت کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور بغویؒ نے شرح السنۃ میں اس روایت کو بالفاظ مصابیح ابومالک سے روایت کیا ہے لیکن اس میں کچھ الفاظ کا اضافہ بھی ہے! اور اس طرح باضافہ الفاظ اس روایت کو بیہقیؒ نے بھی شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کریں گے" کے بارے میں پچھلی حدیث کی تشریح کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اور ایک خاص بات یہ ذہن میں رہنی چاہئے۔ کہ "انبیاء" سے وہ نبی اور پیغمبر مراد ہیں جو اپنی زندگی میں کسی عذر یا کسی اور سبب سے باہمی ملاقات کا موقع نہ پاسکے ہونگے۔ ورنہ تو جہاں تک نفس محبت و ہمنشینی کا تعلق ہے ایسا کوئی نبی اور پیغمبر نہیں گزرا ہے جو اللہ کی خاطر اپنی اُمت کے لوگوں سے محبت و تعلق نہ رکھتا ہو اور ہم نشینی سے محروم رہے ہوں گے۔

"رُوح" (را کے پیش کے ساتھ) اصل میں تو اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ جسم زندہ رہتا ہے یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس جوہر کو کہتے ہیں۔ جس کے سبب زندگی کو بقا حاصل ہوتی ہے اور یہاں "روح" سے مراد قرآن ہے چنانچہ قرآن کریم میں "رُوح" کے معنی "قرآن" کے بھی آئے ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا! اور اس اعتبار سے بھی "قرآن" کو "روح" کہنا نہایت موزوں ہے کہ جس طرح جسم و بدن کی زندگی کا مدار روح پر ہے اسی طرح قلب انسان کی حیات کا مدار قرآن پر ہے۔

قرآن کو باہمی میل و محبت کا سبب قرار دینا یا تو اس اعتبار سے ہے کہ قرآن یعنی دین اسلام انسانوں کو جوڑنے، ان میں اتحاد اور باہمی میل و محبت پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے یا اس اعتبار سے ہے کہ قرآن کریم کو نظام زندگی کا اساس قانون ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے باہمی محبت و موانست کی دولت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ قرآن کریم کی تعلیمات، محبت و موانست کا ذریعہ اور مؤمنین کو باہمی میل ملاپ اور اتحاد و یکجہتی اختیار کرنے کی ہدایت دینے والی ہیں۔

بعض حضرات نے "رُوْحُ اللّٰه" کی مراد قرآن کے بجائے خود محبت کو قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک "محبت پر" "روح" کا اطلاق اس سبب سے موزوں ہے کہ محبت بھی قلب انسان کی حیات و نشاط اور تازگی کا سبب ہے اسی لئے محبوب کو "جان من" کہا جاتا ہے۔

مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں یہ لفظ راء کے زبر کے ساتھ یعنی "رَوْحُ اللّٰه" منقول ہے جس کے معنی رحمت اور رزق کے ہیں، بہر حال مآل و ماحصل کے اعتبار سے معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنا۔

بالفاظ مصابیح یہ روایت جس طرح نقل کی ہے۔ وہ یوں ہے۔

عَنْ ابی المالک الاشعری اَنَّهٗ قَالَ کنت عند النبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اذ قال ان للّٰه عزوجل عبادا لیسوا بانبیاء وَلَا شهداء یغبطهم النبیون و الشهداء بقربهم و مقعدهم من اللّٰه یوم القیامة فَقَالَ حدثنا من هم فَقَالَ هم عباد اللّٰه من بلد ان شتی و قبائل شتی لَمْ یکن بینهم ارحام یتوا صلون وَلَا دنیا یتباذلون بها یتحابون بروح اللّٰه یجعل وجوههم نورا و یجعل لهم منابر من نور قدام عرش الرحمن۔

"حضرت ابومالک اشعریؓ کہتے ہیں (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل کے بعض

بندے ایسے ہیں جو اگرچہ انبیاء اور شہداء نہیں ہیں لیکن قیامت کے دن خدا کے نزدیک ان کا مرتبہ و مقام اور ان کی رفعت شان دیکھ کر انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کیا کریں گے۔" (یہ سن کر) ایک اعرابی نے عرض کیا کہ آپ ﷺ ہمیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہوں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ اللہ کے بندے ہیں جن کا تعلق مختلف شہروں اور مختلف قبائل سے ہوتا ہے۔ ان کے درمیان کوئی رشتہ ناتا بھی نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے تعلق و محبت قائم کرنے پر مجبور ہوں اور نہ وہ ایک دوسرے پر اپنا مال اور روپیہ پیسہ خرچ کرتے ہیں (جس سے ان کے درمیان تعلقات قائم ہو) مگر وہ محض خدا کی روح یعنی قرآن کریم کے سبب آپس میں میل محبت رکھتے ہیں (قیامت کے دن) ان کے چہرے نور کے ہوں گے۔ اور عرش الٰہی کے نیچے ان کیلئے نور کے منبر رکھے جائیں گے (جن پر وہ متمکن ہونگے)"

حب فی اللہ و بغض فی اللہ کی فضیلت

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاَبِیْ ذَرٍّ یَا اَبَاذَرٍّ اَیُّ عُرَی الْاِیْمَانِ اَوْثَقُ قَالَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ الْمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ۔ رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا کہ "ابوذر! (جانتے ہو) ایمان کی کونسی شاخ زیادہ مضبوط ہے حضرت ابوذرؓ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جاننے والے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا۔ "خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے آپس میں ایک دوسرے سے میل محبت رکھنا اور خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے کسی سے دوستی رکھنا اور خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے کسی سے بغض و نفرت رکھنا۔" (بیہقیؒ)

مسلمان بھائی کی عیادت کرنے اور ملاقات کے لئے اس کے ہاں جانے کا ثواب

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا عَادَ الْمُسْلِمُ اَخَاہُ اَوْزَارَہٗ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّاْتَ مِنَ الْجَنَّۃِ مَنْزِلًا۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کے لئے یا اس کی ملاقات کی خاطر اس کے ہاں جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ (بلا واسطہ یا فرشتوں کی زبانی، فرماتا ہے کہ۔ "(دنیا و آخرت میں) تیری زندگی خوش ہوئی، تیرا چلنا مبارک رہا (کہ تو چل کر یہاں تک آیا) ہر قدم پر تجھے ثواب ملا اور تجھ کو جنت میں ایک بڑی اور عالی مرتبہ جگہ حاصل ہوئی۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: دنیا میں زندگی کو خوشی و اطمینان ملنے کا تعلق جن چیزوں سے ہے وہ یہ ہیں کہ قناعت و توکل کی دولت نصیب ہو جائے رضائے الٰہی کی سعادت ملے، رزق میں برکت، قلب میں وسعت و حوصلہ، عادات و اطوار میں تہذیب و شائستگی اور علم و عمل کی توفیق حاصل ہو۔

واضح رہے کہ یہ تینوں لفظ طیب۔ طاب اور تبوات بطور خبر نقل ہوئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو حق تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ چیزوں کے حاصل ہو جانے کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تینوں لفظ دعائیہ جملہ کے طور پر منقول ہوں، اس صورت میں ان الفاظ کے معنی یہ ہوں گے کہ تیری زندگی کو خوشی و راحت نصیب ہو، تیرا راہ چلنا مبارک ثابت ہو اور تجھے جنت میں اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

جس شخص سے محبت و تعلق قائم کرو اس کو اپنی محبت اور تعلق سے باخبر رکھو

(۱۲) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیْکَرِبَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَحَبَّ الرَّجُلُ اَخَاہُ فَلْیُخْبِرْہُ اَنَّہٗ یُحِبُّہٗ۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت مقدام ابن معدیکربؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص اپنے کسی مسلمان بھائی سے دوستی و محبت رکھے تو چاہئے" کہ وہ اس مسلمان کو بتادے کہ وہ اس کو دوست و محبوب رکھتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ جب اس مسلمان کو یہ معلوم ہوگا کہ فلاں شخص مجھ سے دوستی اور محبت رکھتا ہے تو وہ بھی اس سے دوستی و محبت رکھے گا اور دوستی کے حقوق ادا کرے گا نیز اس کے حق میں دعا گو و خیر خواہ رہیگا۔

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَہٗ نَاسٌ فَقَالَ رَجُلٌ مِمَّنْ عِنْدَہٗ اِنِّیْ لَاُحِبُّ ھٰذَا اللّٰہِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْلَمْتَہٗ قَالَ لَا قَالَ قُمْ اِلَیْہِ فَاَعْلِمْہُ فَقَامَ اِلَیْہِ فَاَعْلَمَہٗ فَقَالَ اَحَبَّکَ الَّذِیْ اَحْبَبْتَنِیْ لَہٗ قَالَ ثُمَّ رَجَعَ فَسَأَلَہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَہٗ بِمَا قَالَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلَکَ مَا احْتَسَبْتَ۔ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَفِیْ رِوَایَۃِ التِّرْمِذِیِّ الْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ وَلَہٗ مَا اکْتَسَبَ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے سامنے سے ایک شخص گزرا جب کہ آپ ﷺ کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہ آدمی جو ابھی سامنے سے گزرا ہے اس سے محض خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے محبت کرتا ہوں نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ کیا تم نے اس کو بتادیا ہے کہ تم اس سے محبت رکھتے ہو؟ اس شخص نے کہا کہ نہیں! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تو اٹھو! اور اس کے پاس جاکر اس کو بتادو۔" چنانچہ وہ شخص (مجلس نبوی سے) اٹھ کر اس کے پاس گیا اور اس کو بتایا کہ میں تم سے محبت رکھتا ہوں! اس شخص نے (جواب میں بطور دعا) کہا کہ وہ ذات (یعنی اللہ تعالیٰ) تم سے محبت کرے جس کی رضا و خوشنودی کی خاطر تم مجھ سے محبت کرتے ہو! حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ پھر وہ شخص لوٹ کر آیا، تو نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ اس شخص نے جواب میں کیا کہا ہے؟ اس نے آنحضرت ﷺ کو اس کا وہ جواب بتایا جو اس نے دیا تھا حضور ﷺ نے فرمایا۔ "(آخرت میں) اس شخص کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت رکھتے ہو اور تم (محبت رکھنے بلکہ ہر عمل میں) اس چیز پر اجر و جزاء پاؤ گے جس کی اللہ تعالیٰ کے لئے نیت کروگے۔" (بیہقیؒ) اور ترمذیؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آدمی اس شخص کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے اور اس کو اس چیز پر اجر ملے گا جس کو وہ بہ نیت ثواب اختیار کرے گا۔"

تشریح: "احتساب" کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا اور حسبہ اس لفظ کا اسم ہے اور اصل میں یہ لفظ "حساب" سے نکلا ہے جس کے معنی گننے، شمار کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر کسی سے محبت کرنا ایسا فعل ہے جو اگر ثواب کی نیت سے ہو تو وہ حساب میں آتا ہے یعنی اس پر اجر مرتب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ محبت کرنے والے کو اس کی نیت کے مطابق ثواب عطا کرتا ہے۔

دشمنان دین اور بدکاروں کے ساتھ محبت و ہمنشینی نہ رکھو

⑭ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّہٗ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا یَاْکُلْ طَعَامَکَ اِلَّا تَقِیٌّ۔

(رواہ الترمذی والبوداؤد والدارمی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "مسلمان کے علاوہ اور کسی (کافر و مشرک) کو اپنا ہمنشین اور دوست نہ بناؤ۔ (یا یہ مراد ہے کہ نیکوکار مسلمان کے علاوہ کسی فاسق و بدکار سے دوستی مت کرو! اس مراد کا قرینہ وہ جملہ ہے جو آگے فرمایا کہ) تمہارا کھانا پرہیزگار و نیکوکار کے علاوہ اور کوئی نہ کھائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: ارشاد گرامی ﷺ کے آخری جملہ کا یہ مطلب بھی ہے کہ تمہیں چاہئے کہ تم اپنی روزی حلال و جائز وسائل و ذرائع سے حاصل کرو

تاکہ وہ نیک و پرہیزگار مسلمانوں کے کھانے کے قابل ہو اور یہ مطلب بھی ہے کہ تمہیں چاہئے کہ تم اپنا کھانا (دعوت کی صورت میں) صرف متقی وپرہیزگار مسلمانوں کو کھلاؤ تاکہ اس کھانے کے ذریعہ انہیں عبادت خداوندی اور نیک کام کرنے کی طاقت حاصل ہو. غیر متقی اور بدکار لوگوں کو اپنا کھانا نہ کھلاؤ کہ جس سے ان کو گناہ کرنے کی طاقت حاصل ہو۔

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو دشمنان دین اور بدکار لوگوں کے ساتھ صحبت وہم نیشنی اور ہم پیالہ وہم نوالہ ہونے سے اس لئے منع فرمایا ہے تاکہ ان سے الفت ومحبت قائم ہونے کا سبب پیدا نہ ہو اور ان کی صحبت وہم نشینی کی وجہ سے کفر وشرک اور بدکاری وبرائیوں کے جراثیم سرایت نہ کریں۔

علماء نے لکھا ہے کہ صرف متقی اور پرہیزگاروں کو کھانا کھلانے کے حکم کا تعلق محض دعوت طعام اور تقاریب سے ہے۔ ضرورتمندی واحتیاج کی صورت اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ کسی بھوکے اور محتاج کو کھانا کھلانے کے لئے کسی قسم کا امتیاز روا نہیں ہے! یہ بات اس آیت کریمہ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا سے بھی ثابت ہے کیونکہ اس آیت میں دوسرے ضرورتمندوں کے ساتھ جن اسیروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کافر تھے لہٰذا معلوم ہوا کہ رفع حاجت یعنی بھوک سے بچانے کے لئے کافر کو کھلانا جائز ہے۔

دوست بناتے وقت یہ دیکھ لو کہ کس کو دوست بنا رہے ہو

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَ قَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ وَقَالَ النَّوَوِیُّ اِسْنَادُهٗ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے (یعنی جو شخص کسی کو دلی دوست بناتا ہے تو عام طور پر اس کے عقائد ونظریات اور اس کے عادات واطوار کو قبول واختیار کرتا ہے) لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو دوست بنائے تو دیکھ لے کہ کس کو دوست بنا رہا ہے (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، بیہقیؒ) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور نوویؒ نے کہا ہے اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔"

تشریح: حدیث میں جس دوستی کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد دلی اور سچی دوستی ہے نہ کہ ظاہرداری اور خوش اخلاقی، کیونکہ ظاہرداری اور خوش اخلاقی کے تعلقات ضرورت کی بنا پر ہر ایک کے ساتھ استوار کئے جاسکتے ہیں البتہ دلی اور سچی دوستی صرف انہی لوگوں کے ساتھ کرنی چاہئے جن کے عقائد ونظریات صالح ہوں اور جن کے اعمال اور عادات واطوار پاکیزہ ہوں چنانچہ اس بارے میں قرآن کی ہدایت بھی یہی ہے کہ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچوں کے ساتھ رہو!۔"

حضرت امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ حریص کی ہم نشینی ومخالطت حرص کا ذریعہ بنتی ہے اور زاہد کی ہم نشینی ومخالطت دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے کیونکہ صحبت واختلاط کا اثر قبول کرنا اور اپنے ہمنشین ومصاحب کی مشابہت وپیروی اختیار کرنا انسانی طبیعت وجبلت کا خاصہ ہے۔

حدیث کے آخر میں مؤلف مشکوٰۃ جو طویل عبارت لائے ہیں اس کا مقصد ان لوگوں کے خیال کی تردید کرنا ہے جو اس حدیث کو موضوع کہتے ہیں۔

کسی سے بھائی چارہ قائم کرو تو اس کا اور اس کے ماں باپ و قبیلہ کا نام معلوم کرلو

⑯ وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ نُعَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اٰخَى الرَّجُلُ الرَّجُلَ فَلْيَسْئَلْهُ عَنِ اسْمِهٖ وَاسْمِ اَبِيْهِ وَمِمَّنْ هُوَ فَإِنَّهٗ أَوْصَلُ لِلْمَوَدَّةِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت یزید ابن نعامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔"..... جب کوئی شخص کسی سے بھائی چارہ قائم کرے تو چاہئے کہ وہ اس سے اس کا اور اس کے باپ کا نام دریافت کرلے اور پوچھ لے کہ وہ کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ یہ دریافت کرنا دوستی اور تعلق کو بہت زیادہ مضبوط بنانے کا ذریعہ ہوگا۔" (ترمذی)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

خدا کے لئے کسی سے محبت یا نفرت کرنے کی فضیلت

⑰ عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ اَيُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى قَالَ قَائِلٌ الصَّلٰوةُ وَالزَّكٰوةُ وَقَالَ قَائِلٌ الْجِهَادُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَرَوٰى اَبُوْدَاوٗدَ الْفَصْلَ الْاَخِيْرَ۔

"حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ (اپنے حجرۂ مبارک سے) نکل کر (مسجد نبوی میں) ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو، اللہ کے نزدیک بہت پیارا عمل کونسا ہے؟ کسی کہنے والے نے کہا کہ نماز یا زکوٰۃ اور ایک کہنے والے نے یہ کہا کہ جہاد! حضور ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت پیارا عمل خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر کسی سے محبت کرنا اور خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر کسی سے بغض و نفرت رکھنا ہے۔" (احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے اپنی روایت میں حدیث کا صرف آخری جزو یعنی اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ الخ نقل کیا ہے۔)

تشریح: لفظ وَالزَّكٰوةُ میں حرف واؤ معنی کے اعتبار سے اَوْ کی جگہ استعمال ہوا ہے، یا مفہوم کے اعتبار سے الصلوۃ کے بعد کی عبارت گویا یوں ہے وَقَالَ قَائِلُ الزَّكٰوةَ (اور کسی کہنے والے نے کہا کہ زکوٰۃ) حدیث میں آنحضرت ﷺ کے سوال، صحابہؓ کے جواب اور پھر آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا جواب اور پھر آنحضرت کے ارشاد کا جو اسلوب نقل کیا گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا درجہ نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے بھی بڑا ہے جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ نماز و زکوٰۃ اور جہاد، وہ اعمال ہیں جو بلاشک و شبہ تمام اعمال سے افضل و اعلیٰ ہیں، اس صورت میں یہاں جو اشکال واقع ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص حقیقی معنی میں کسی سے اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر محبت و تعلق رکھے گا وہ یقیناً انبیاء و علماء اور اولیاء اللہ سے سچی محبت و عقیدت رکھے گا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ یقیناً ان کی اتباع و پیروی بھی کریگا۔ بایں طور کہ نماز بھی پڑھے گا اور زکوٰۃ دیگا۔ اسی طرح جو شخص کسی سے اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر بغض و نفرت رکھے گا تو وہ یقیناً دشمنان دین سے دشمنی اور عداوت رکھے گا۔ اور جب وہ ان سے دشمنی و عداوت رکھے گا تو ظاہر ہے کہ وہ ان کی بیخ کنی، جہاد فی سبیل اللہ اور دین کی سربلندی کی سعی و کوشش کرے گا۔ لہٰذا حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کے ضمن میں ساری طاعتیں آجائیں گی خواہ وہ نماز و زکوٰۃ ہو یا جہاد وغیرہ ان میں سے کوئی بھی چیز اس عمل سے باہر نہیں رہے گی اس اعتبار سے حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ دین کی اصلی بنیاد اور اعمال و طاعات کا مدار حب فی اللہ اور بغض فی اللہ پر ہے جس شخص نے اس درجہ کو حاصل کرلیا اس کے لئے تمام عبادات و طاعات کو اختیار کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔

یا اس ارشاد گرامی ﷺ سے مراد یہ ہے کہ قلبی اعمال میں سب سے افضل عمل حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے اور بدنی اعمال میں سب سے افضل عمل نماز، روزہ، زکوٰۃ اور جہاد ہیں، اس صورت میں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوگا۔ اور یا یہ مراد ہے کہ شریعت نے جن امور کو

اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرنے کے بعد اور شریعت نے جن امور سے باز رکھا ہے ان سے اجتناب کرنے کے بعد (یعنی فرائض و واجبات کی تکمیل کے بعد) حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سب سے افضل عبادت ہے اور سب سے کامل طاعت ہے اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ

اجب الاعمال الی اللّٰہ بعد الفرائض ادخال السرور فی قلب المؤمن۔

"فرائض کے بعد جو عمل خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہے وہ کسی مؤمن کے دل کو خوشی و مسرت سے بھرنا ہے۔"

(۱۸) وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحَبَّ عَبْدٌ عَبْدًا لِلّٰهِ اِلَّا اَکْرَمَ رَبَّهٗ عَزَّوَجَلَّ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس بندے نے کسی بندے سے محض اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر محبت و دوستی رکھی تو اس نے در حقیقت اپنے پروردگار عزوجل کی تعظیم و تکریم کی۔" (احمدؒ)

بہتر لوگ کون ہیں؟

(۱۹) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ یَزِیْدَ اَنَّهَا سَمِعَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِخِیَارِکُمْ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ خِیَارُکُمُ الَّذِیْنَ اِذَا رُءُوْا ذُکِرَ اللّٰهُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں بہترین لوگ کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں! ضرور بتایئے حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جن کو دیکھ کر خدا یاد آجائے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: باب حفظ اللسان میں تیسری فصل میں یہ حدیث مع ترجمہ و شرح نقل کی جا چکی ہے۔

خدا کے لئے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت

(۲۰) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ عَبْدَیْنِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَاحِدٌ فِی الْمَشْرِقِ وَاٰخَرُ فِی الْمَغْرِبِ لَجَمَعَ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَقُوْلُ هٰذَا الَّذِیْ کُنْتَ تُحِبُّهٗ فِیَّ۔

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر دو بندے محض خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر آپس میں محبت رکھیں اور خواہ ان میں سے ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن یکجا کر دیگا (تاکہ وہ ایک دوسرے کی شفاعت کریں یا جنت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔) نیز اللہ تعالیٰ (فرشتے کی زبانی یا براہ راست خود ان میں سے ہر ایک سے فرمائے گا کہ یہ بندہ وہ ہے کہ جس سے تو میری خاطر محبت رکھتا تھا۔"

دنیا آخرت کی بھلائی حاصل کرنے کے ذرائع

(۲۱) وَعَنْ اَبِی رَزِیْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰی مِلَاكِ هٰذَا الْاَمْرِ الَّذِیْ تُصِیْبُ بِهٖ خَیْرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ عَلَیْكَ بِمَجَالِسِ اَهْلِ الذِّکْرِ وَاِذَا خَلَوْتَ فَحَرِّكْ لِسَانَكَ مَا اسْتَطَعْتَ بِذِکْرِ اللّٰهِ وَاَحِبَّ فِی اللّٰهِ وَاَبْغِضْ فِی اللّٰهِ یَا اَبَا رَزِیْنٍ هَلْ شَعَرْتَ اَنَّ الرَّجُلَ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَیْتِهٖ زَائِرًا اَخَاهُ شَیَّعَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ کُلُّهُمْ یُصَلُّوْنَ عَلَیْهِ وَیَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اِنَّهٗ وَصَلَ فِیْكَ فَصِلْهُ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تُعْمِلَ جَسَدَكَ فِیْ ذَالِكَ فَافْعَلْ۔

"اور حضرت ابورزینؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں تمہیں اس امر یعنی دین کی جڑ نہ بتادوں جس کے ذریعہ تم دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کر سکو؟ (تو سنو) ان چیزوں کو تم اپنے پر لازم کر لو اہل ذکر کی مجالس میں بیٹھا کرو (تاکہ تمہیں بھی ذکر اللہ کی توفیق و سعادت نصیب ہو) جب تنہا ہو تو جس قدر ممکن ہو ذکر اللہ کے ذریعہ اپنی زبان کو حرکت میں رکھو یعنی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر بھی ذکر اللہ کرو اور تنہائی میں بھی خدا کی یاد میں مشغول رہو (اگر تم کسی کو دوست رکھو تو محض اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے دوست رکھو اور جس کو دشمن رکھو تو محض اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے اس سے بغض رکھو یعنی کسی سے تمہاری دوستی اور دشمنی کا معیار تمہاری اپنی ذات کی خواہشات یا کوئی دنیاوی نفع نقصان نہ ہونا چاہئے بلکہ اللہ کی رضا و خوشنودی کو معیار بناؤ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسی شخص کو اپنا دلی دوست بناؤ جس کی دوستی سے خدا خوش ہوتا ہو اور اسی شخص سے دشمنی رکھو جس کی دشمنی سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو۔ اور اے ابورزینؓ کیا تمہیں معلوم ہے؟ کہ جب کوئی شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی زیارت و ملاقات کے ارادہ سے گھر سے نکلتا ہے (اور اس مسلمان کے ہاں جاتا ہے۔) تو ستر ہزار فرشتے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور وہ (سب فرشتے) اس کے لئے دعا استغفار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پرور دگار! اس شخص نے محض تیری رضا و خوشنودی کی خاطر (ایک مسلمان بھائی سے) ملاقات کی ہے تو اس کو اپنی رحمت و مغفرت کے ساتھ منسلک کر۔" پس (اے ابورزینؓ) اگر تمہارے لئے ان (مذکورہ) چیزوں میں اپنی جان کو لگانا (یعنی ان پر عمل کرنا) ممکن ہو تو ان چیزوں کو ضرور اختیار کرو۔"

خدا کے لئے محبت کرنے کا اجر

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ لَعُمُدًا مِنْ یَاقُوْتٍ عَلَیْهَا غُرَفٌ مِنْ زَبَرْجَدٍ لَهَا اَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ تُضِیْئُ کَمَا تَضِیْئُ الْکَوْکَبُ الدُّرِّیُّ فَقَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ یَسْکُنُهَا قَالَ الْمُتَحَابُّوْنَ فِی اللّٰهِ وَالْمُتَجَالِسُوْنَ فِی اللّٰهِ وَالْمُتَلَاقُوْنَ فِی اللّٰهِ۔ رَوَی الْبَیْهَقِیُّ الْاَحَادِیْثَ الثَّلَاثَةَ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ ﷺ فرمانے لگے "جنت میں یاقوت کے ستون ہیں جن پر زمرد کے بالا خانے بنے ہوئے ہیں ان کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور وہ بالا خانے اور ان کے دروازے اسی طرح روشن اور چمکتے ہیں جیسا کہ روشن ستارے چمکتے ہیں۔" صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! ان میں لوگ رہیں گے"؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ لوگ جو خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر آپس میں محبت رکھتے ہیں۔ خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر ایک دوسرے کی صحبت و ہم نشینی اختیار کرتے ہیں۔ اور خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر آپس میں ملاقات کرتے ہیں۔" (ان تینوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

بَابُ مَا یُنْهٰی عَنْهُ مِنَ التَّهَاجُرِ وَالتَّقَاطُعِ وَاتِّبَاعِ الْعَوْرَاتِ

ممنوع چیزوں یعنی ترک ملاقات، انقطاع تعلق اور عیب جوئی کا بیان

"تهاجر" کے معنی ہیں ترک کرنا، کاٹنا اور "تقاطع" کے معنی بھی یہ ہیں، اس اعتبار سے لفظ "تقاطع" معنوی طور پر لفظ تهاجر کی وضاحت اور اس کے بیان کے لئے ہے۔ اور ان دونوں لفظوں سے مراد ہے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ سلام و کلام اور ملنا جلنا چھوڑے رکھنا، صحبت و ہمنشینی کے تعلق کو منقطع رکھنا اور اسلامی بھائی چارہ کو نظر انداز کرنا چونکہ ان امور کی ممانعت

علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ بعض حالت میں اور بعض قیود کے ساتھ ان کو اختیار کرنا کوئی گناہ نہیں رکھتا اس لئے مذکورہ بالا عنوان میں یوں کہا گیا ماینھی عنہ من التھاجر و التقاطع۔

"عورات" عورت کی جمع ہے اور لغت میں عورت اس چیز کو کہتے ہیں جو شرم کی متقاضی ہو اور جس کے ظاہر ہونے کو کوئی شخص پسند نہ کرتا ہو بلکہ یہ چاہتا ہو کہ وہ چیز پوشیدہ رہے جیسا کہ کسی شخص میں کسی عیب اور نقصان کا ہونا۔ اس اعتبار سے اتباع عورت کا مطلب ہے کسی کی عیب جوئی کرنا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

تین دن سے زیادہ خفگی رکھنا جائز نہیں

(۱) وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَحِلُّ لِلرَّجُلِ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلٰثِ لَیَالٍ یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ ھٰذَا وَیُعْرِضُ ھٰذَا وَخَیْرُھُمَا الَّذِیْ یَبْدَاُ بِالسَّلَامِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ کسی شخص کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے ملنا جلنا چھوڑے رکھے اور صورت یہ ہو کہ (جب وہ کہیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں تو) یہ اپنا منہ ادھر کو پھیر لے اور وہ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لے (یعنی دونوں ہی ایک دوسرے سے سلام و کلام اور ملاقات سے احتراز کریں) اور ان دونوں میں بہتر شخص وہ ہے جو (خفگی کو دور کرنے کے لئے اور بحالی تعلقات کی خاطر) سلام میں پہل کرے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "تین دن سے زیادہ" کی قید کی بناء پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اگر کسی وجہ سے اظہار خفگی کی خاطر تین دن تک ملنا جلنا چھوڑے رکھا جائے تو یہ حرام نہیں ہے کیونکہ انسان کی طبیعت میں غیظ و غضب، غیرت و حمیت اور تندی و بے صبری کا جو مادہ ہے وہ بہرحال اپنا اثر ضرور ظاہر کرتا ہے اس لئے اس قدر مدت معاف کر دی گئی ہے تاکہ انسان کے ان جذبات کی بھی کچھ تسکین ہو جایا کرے اور اس تین دن کے عرصہ میں خفگی و ناراضگی اور بغض و نفرت کے جذبات بھی ختم ہو جائیں یا کم سے کم ہلکے پڑ جائیں اور صلح و صفائی ہو جائے۔

بہرحال حدیث کی مراد یہ ہے کہ اجتماعی طور پر ایک جگہ رہنے سہنے اور روزمرہ کے باہمی معاملات کی وجہ سے آپس میں نزاع ہو جایا کرتا ہے۔ اور ایک دوسرے سے کوئی شکایت پیدا ہو جانے کی وجہ سے خفگی و ناراضگی کی صورت پیش آجاتی ہے مثلاً ایک شخص نے کسی کی غیبت کر دی۔ اس کو برا بھلا کہہ دیا اور یا اس کو اس شخص سے خیر خواہی کی امید تھی مگر اس نے خیر خواہی نہیں کی۔ تو اس طرح کی صورتوں میں اگر آپس میں ناراضگی و خفگی ہو جائے اور ترک ملاقات کی نوبت آجائے تو اس خفگی اور ترک ملاقات کو تین دن سے زیادہ نہیں رہنے دینا چاہئے۔ ہاں اگر ترک موالات کسی دینی معاملہ کی وجہ سے ہو جیسے کوئی شخص خواہشات نفسانی کا غلام بن گیا ہو یا کوئی شخص بدعتی ہو تو اس سے ترک ملاقات اس وقت تک جائز ہے۔ جب تک کہ وہ توبہ کر کے راہ راست اختیار نہ کرے۔ اور حق کی طرف رجوع نہ کرے۔

سیوطیؒ نے موطا کے حاشیہ میں ابن عبدالبرؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی شخص کو یہ خوف ہو کہ اگر میں فلاں آدمی سے سلام کروں اور اس سے ملنا جلنا رکھوں تو اس کی وجہ سے مجھے دینی یا دنیاوی نقصان برداشت کرنا پڑے گا اور میرا قیمتی وقت لایعنی امور میں ضائع ہو گا کہ وہ اس شخص سے کنارہ کشی اختیار کرے اور اس سے دور رہنے کی کوشش کرے لیکن یہ کنارہ کشی اور دوری اختیار کرنا اچھے انداز میں ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ اس کی غیبت کی جائے۔ اس پر عیب لگائے جائیں اور اس کے تئیں کینہ و عداوت کو ظاہر کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے زمانہ کے ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن میں مسلمانوں کا دینی مصالح کے پیش نظر ایک دوسرے سے تین دن سے زیادہ بھی ترک ملاقات کئے رہنا ثابت ہے چنانچہ احیاء العلوم میں صحابہؓ وغیرہ کی ایک جماعت کے بارے میں منقول ہے

کہ ان میں سے بعض مرتے دم تک ترک ملاقات پر قائم رہے ان تین صحابہؓ کا واقعہ تو بہت مشہور ہے جو غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے اور آنحضرت ﷺ نے ان میں نفاق کی راہ پا جانے کے خدشہ سے ان کو تمام مسلمانوں سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے تمام صحابہؓ، ان تینوں کی ازواج اور ان کے عزیز و اقارب کو ان سے ترک ملاقات اور ترک سلام و کلام کا حکم دیا تھا، یہ حکم اور اس پر عمل پچاس ۵۰ دنوں تک جاری رہا، خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مہینہ تک اپنی ازواج مطہراتؓ سے ملنا جلنا چھوڑے رکھا تھا، حضرت عائشہؓ نے ایک مدت تک حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے ترک ملاقات اختیار رکھی اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے بیٹے حضرت بلالؒ سے ایک دینی معاملہ میں اس درجہ ناراض ہوئے کہ ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دی تھی۔ غرضیکہ ایسے بہت سے واقعات منقول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دینی معاملات میں خفگی و ناراضگی تین دن سے زیادہ بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ نیت صادق رکھی جائے اور اس میں کسی نفسانی خواہش اور دنیاوی غرض کا دخل نہ ہو۔

"جو سلام کے ذریعہ ابتداء کرے" کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے جو شخص خفگی و ناراضگی کو ختم کرنے کے لئے پہلے سلام کریگا۔ اس کا درجہ دوسرے کے مقابلہ پر بڑا ہوگا۔ نیز اس میں اسی طرف بھی اشارہ ہے کہ سلام میں پہل کرنا ترک ملاقات کے گناہ کو زائل کر دیتا ہے اور یہ کم سے کم ترک سلام کو تو ختم کر ہی دینا چاہئے۔ تاکہ اخوۃ اسلامی کا یہ بنیادی حق ضائع نہ ہونے پائے۔

ان باتوں سے ممانعت جن سے معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی فاسد ہوتی ہے

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَنَاجَشُوا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا وَفِیْ رِوَايَةٍ وَلَا تَنَافَسُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بدگمانی قائم کرنے سے اجتناب کرو۔ کیونکہ بدگمانی باتوں کا سب سے بدتر جھوٹ ہے (اپنے سے غیر متعلق امور اور بلا ضرورت دوسروں کے احوال کی) ٹوہ میں نہ رہو کسی کی جاسوسی نہ کرو کسی کے سودے نہ بگاڑو، آپس میں حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو اور سارے مسلمان خدا کے بندے اور ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہو۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپس میں حرص نہ کرو۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان کا معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بھاؤ سے براہ راست تعلق ہے ان باتوں سے اگر اجتناب کیا جائے تو معاشرہ میں پھیلنے والی بہت سی خرابیوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

بدگمانی کو باتوں کا سب سے بدتر جھوٹ فرمایا گیا ہے چنانچہ جب کوئی شخص کسی کے بارے میں بدگمانی کرتا ہے تو وہ یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ شخص ایسا ایسا ہے اور چونکہ وہ شخص حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا اس لئے اس فیصلہ کو جھوٹ ہی کہا جائے گا۔ واضح رہے کہ "باتوں" سے مراد وہ باتیں ہیں جو نفس پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں وہ شیطان کی طرف سے نفس میں ڈالی جاتی ہیں۔ اسی اعتبار سے بدگمانی کو "بدترین جھوٹ" کہا گیا ہے یا یہ کہ اس کو "بدترین جھوٹ" کا نام دینا گویا اس کی برائی کو زیادہ سے زیادہ کر کے بیان کرنا مقصود ہے! قرآن کریم میں یوں فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ چنانچہ ان الفاظ میں جس ظن کو گناہ قرار دیا گیا ہے اس سے بدگمانی مراد ہے اور جیسا کہ علماء نے وضاحت کی ہے جس سے بدگمانی کے بارے میں ممانعت منقول ہے۔ اس سے وہ بدگمانی مراد ہے جو ذہن میں بیٹھ جائے اور اس پر یقین کر لیا وہ بدگمانی مراد نہیں ہے جو محض خیال کے طور پر دل میں گزر جائے اور بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ "بدگمانی" گناہ گار اس وقت کرتی ہے جب کہ اس کا ذکر کیا جائے اور اس کو زبان پر لایا جائے۔ نیز بہر صورت اس بدگمانی کے موجب گناہ ہونے کی شرط یہ بھی ہے کہ اس بدگمانی

کو قائم کرنے کے لئے کوئی معقول وجہ اور دلیل نہ ہو یا اگر بدگمانی کی بھی معقول وجہ اور دلیل ہو تو بدگمانی نہ کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ اور دلیل ہو اور دونوں دلیلیں باہم متعارض ہوں، ہاں اگر اس بدگمانی کو درست ثابت کرنے کے لئے کوئی ایسا واضح قرینہ اور معقول دلیل ہو جس کو تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہو تو ایسی بدگمانی پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور نہ اس کو حقیقی معنی میں "بدگمانی" کہیں گے۔

تحسس اور تجسس (یعنی ٹو اور جاسوسی) بظاہر ایک ہی مفہوم کے حامل دو الفاظ ہیں لیکن علماء نے کئی وجوہ سے ان دونوں کے درمیان فرق ظاہر کیا ہے اس سلسلے میں مختلف اقوال منقول ہیں چنانچہ صاحب قاموس نے جیم کی فصل میں لکھا ہے کہ "تجسس" کے معنی ہیں خبروں کی تلاش میں رہنا جیسا کہ تجسس کے معنی ہیں اور "جاجوس" "وجس" اسی سے مشتق ہیں جن کے معنی ہیں ایسی پوشیدہ خبریں رکھنے والا جو اچھی نہ ہوں۔ پھر انہوں نے حاء کی فصل میں لکھا ہے کہ "حاسوس" کے وہی معنی ہیں جو جاسوس کے ہیں یا یہ کہ "حاسوس" خاص طور پر ایسی پوشیدہ خبریں رکھنے والے کو کہتے ہیں جو اچھی ہوں۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ "تجسس" کے معنی ہیں اچھی خبروں کو ہوشیاری اور نرمی کے ساتھ دریافت کرنا اور "تحسس" کے معنی ہیں ان خبروں کو قوت حاسہ کے ذریعہ دریافت کرنا جیسے کوئی شخص کسی بات کو چوری چھپے سنتا اور دیکھتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "تجسس" کے معنی ہیں کسی شخص کی برائیوں اور عیوب کی تفتیش کرنا اور "تحسس" کے معنی ہیں ان برائیوں اور عیوب کو سننا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "تجسس" کے معنی ہیں دوسروں کے لئے خبر کی ٹوہ میں رہنا اور "تحسس" کے معنی ہیں اپنے لئے کسی خبر کی ٹوہ لگانا! اور طیبیؒ نے یہ کہا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں "تجسس" مراد ہے خود اپنے طور پر یا کسی کی مدد سے دوسرے لوگوں کے عیوب اور ان کے پوشیدہ ذاتی احوال و معاملات کی ٹوہ لگانا اور "تحسس" کے معنی ہیں کسی کی مدد کے بغیر خود اپنے طور پر ٹوہ لگانا! بہر حال اگر حدیث کی مراد لوگوں کے ایسے احوال و معاملات کی لگانے اور ایسی خبروں کی تلاش میں رہنے سے منع کرنا ہے جن کا تعلق عیب و بڑائی اور کردار و احوال کی کمزوریوں سے ہو تو اس کی ممانعت بالکل ظاہر ہے اور اگر اچھی خبر کی تلاش میں رہنے اور اچھے احوال و معاملات کی ٹوہ میں رہنے سے بھی منع کرنا مراد ہے تو اس صورت میں اس ممانعت کی وجہ یہ بیان کی جائے گی کہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے بارے میں کوئی اچھی خبر پانے کے بعد اپنے اندر حسد کا جذبہ پیدا ہو جائے یا طمع و حرص جاگ اٹھے جو کوئی اچھی چیز نہیں ہے لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ کسی کی اچھی خبر کی ٹوہ میں بھی نہ رہا جائے۔

وَلَا تناجشوا اس میں اصل لفظ "نجش" ہے جس کے اصل معنی ہیں شکار کو برانگیختہ کرنا! بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ دوسروں کے مقابلہ پر اپنی عظمت و وقعت اور بڑائی کی طلب و خواہش کرنا اور بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں۔ کہ کسی کو دھوکا دینے کے لئے بکنے والی چیز کی چڑھا چڑھا کر تعریف کرنا یا مصنوعی خریدار بن کر بکنے والی چیز کی قیمت بڑھانا کہ تاکہ دوسرا شخص اس کے دیکھا دیکھی اس چیز کو اسی قیمت میں خرید لے یا کسی بکتی ہوئی چیز کی برائی کرنا تاکہ خریدار اس کو چھوڑ کر دوسری طرف ہو جائے، عام طور پر علماء نے حدیث میں اس لفظ کو اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی بھی طریقے سے سودے کو بگاڑنا! بعض حضرات نے اس لفظ کے اصل معنی رعایت سے حدیث میں وَلَا تناجشوا کے یہ معنی مراد لئے ہیں کہ کسی کو کسی کی برائی اور خصومت پر نہ اکساؤ۔

وَلَا تحاسدوا (آپس میں حسد نہ کرو) کا مطلب یہ ہے کہ کسی غیر ظالم کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر اس کے زوال کی آرزو نہ کرو یا یہ خواہش و آرزو نہ رکھو کہ وہ نعمت اس کے پاس سے ہٹ کر تمہارے پاس آجائے۔

وَلَا تباغضوا (ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اسباب کو پیدا کرنے سے احتراز کرو جو بغض و نفرت کو لازم کرتے ہیں! یہ وضاحت اس بناء پر ہے کہ جس طرح محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو خود بخود پیدا ہوتا ہے اسی طرح بغض و نفرت بھی پیدائشی ہیں کہ اس جذبہ کے پیدا ہونے یا نہ ہونے میں کسی شخص کا کوئی اختیار نہیں ہے البتہ انسان اپنے آپ کو ایسے اسباب سے محفوظ رکھنے پر یقیناً قادر ہو سکتا ہے جن سے باہمی بغض و نفرت پیدا ہو سکتی ہو بعض حضرات لا تباغضوا کے معنی بیان کئے ہیں۔ کہ شرعی احکام و مسائل میں خواہشات نفسانی کی بناء پر آپس میں اختلاف و انتشار پیدا نہ کرو اور خود ساختہ افکار و نظریات کو دین میں شامل نہ کرو۔ کیونکہ دین میں

بدعت اختیار کرنا اور راہ مستقیم سے گمراہ ہو ناوہ اسباب ہیں جو مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے سے بغض و نفرت پیدا کرتے ہیں لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث میں ایک دوسرے سے بغض رکھنے کی ممانعت کا اصل مقصد باہمی محبت و الفت کے حکم کو موکد کرتا ہے اور محبت و الفت کے اس حکم کا تعلق علی الاطلاق مسلمانوں کی پوری زندگی سے ہے البتہ جس محبت و الفت سے دین میں خلل پڑتا ہو اس صورت میں محبت کو جائز قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ دین کو نقصان پہنچانے والے شخص سے بغض و نفرت ہی رکھنا جائز ہو گا حاصل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرمی کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے محبت و اتحاد کی زنجیر میں منسلک رہیں جو ارشاد خداوندی کا بھی تقاضا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

"اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کی رسی کو اس طور پر کہ باہم سب متفق رہیں اور باہم نا اتفاقی مت کرو۔"

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محبت و الفت، اتحاد کی بنیاد ہے۔ اور بغض نفرت، افتراق و انتشار کا ذریعہ ہے لہٰذا فرمایا گیا کہ تم ایک دوسرے سے بغض و نفرت نہ رکھو۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ لا تباغضوا کے معنی یہ ہیں کہ تم مسلمانوں کے درمیان عداوت و دشمنی پیدا نہ کرو! اس صورت میں مذکورہ ممانعت کا تعلق گویا چغل خوری سے ہو گا۔ کیونکہ چغل خوری سے فساد کی بنیاد پڑتی ہے اور ایک دوسرے سے عداوت و دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔

وَلَا تدابروا کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرو! اور طیبیؒ نے کہا ہے کہ تدابر سے مراد تقاطع (ترک ملاقات) ہے اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ ایک دوسرے سے ملنا جلنا چھوڑو! اس معنی کو مذکورہ جملہ سے لفظی مناسبت باایں طور ہے کہ ترک ملاقات کرنے والوں میں سے ہر ایک دوسرے سے پیٹھ پھیر لیتا ہے اور اسلام کے بتائے ہوئے باہمی حقوق کی ادائیگی سے گریز کرتا ہے۔

وکونوا عباد اللّٰہ اخوانا کا مطلب یہ ہے کہ تم سب اللہ کے ایک بندے ہو اور عبودیت میں سب برابر ہو نیز تم سب اخوۃ کی ایک زنجیر سے منسلک ہو، لہٰذا تمہاری اس حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے درمیان حسد، بغض اور غیبت جیسی برائیوں کو حائل کرنے کے اپنے دلوں میں افتراق اور اپنی صفوں میں انتشار پیدا نہ کرو۔ بلکہ اپنے مرتبہ عبودیت پر اتحاد و یکجہتی کے ساتھ قائم رہو اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔

وَلَا تنافسوا (آپس میں حرص نہ کرو) میں لفظ تنافس لغوی طور پر تحاسد (ایک دوسرے سے حسد کرنے) کے معنی کے قریب ہے لیکن احتمال یہ رہے کہ تنافس کے معنی دنیا کی طرف میلان ور غبت رکھنا ہوں، اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ مجھے خدشہ ہے کہ تم پر دنیا کے دروازے کھول دیئے جائیں اور تنافس کرنے لگو۔ یعنی تم دنیا کی طرف راغب ہو جاؤ۔ اسی اعتبار سے ترجمہ میں (تنافس) کے معنی "آپس میں حرص کرنا" نقل کئے گئے ہیں۔

عداوت کی برائی

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُفْتَحُ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا رَجُلًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اَنْظِرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور پھر ہر اس بندے کی بخشش کی جاتی ہے جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو البتہ وہ شخص اس بخشش سے محروم رہتا ہے جو اپنے اور کسی

مسلمان بھائی کے درمیان عداوت رکھتا ہو اور فرشتوں سے کہا جاتا ہے ان دونوں کو جو آپس میں عداوت و دشمنی رکھتے ہیں مہلت دو تا آنکہ وہ آپس میں صلح و صفائی کر لیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ جنت کے طبقات و درجات یا اس کے بالا خانے ان دونوں میں کھول دیئے جاتے ہیں کیونکہ ان دونوں دنوں میں حق تعالیٰ کی رحمت کثرت سے نازل ہوتی ہے جو بندوں کی مغفرت کا باعث ہوتی ہے (ملا علی قاریؒ)

اور شیخ عبدالحقؒ نے یہ لکھا ہے کہ دروازوں کا کھلنا در اصل اس بات سے کنایہ ہے کہ ان دو دنوں میں بندوں کو بہت زیادہ مغفرت سے نوزا جاتا ہے ان کے گناہ و جرائم سے درگزر کیا جاتا ہے اور انہیں ثواب کی کثرت اور بلندی درجات کی سعادت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کیا جائے کیونکہ نصوص (یعنی قرآن و حدیث میں منقول احکام) کو ان کے ظاہری مفہوم پر عمل کرنا واجب ہے۔ تا وقتیکہ کوئی ایسی واضح دلیل موجود نہ ہو، جس سے اس سے ظاہری مفہوم کے بجائے کوئی دوسرا مطلب مراد لیا جا سکتا ہے۔

"تا آنکہ وہ آپس میں صلح و صفائی کر لیں" یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی مغفرت باہمی صلح و صفائی اور عداوت کے ختم ہو جانے پر موقوف رہتی ہے۔ خواہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے عداوت رکھتے ہوں۔ یا ان میں سے ایک عداوت رکھتا ہو اور دوسرا اس عداوت سے صاف ہو۔

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَضُ اَعْمَالُ النَّاسِ فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّؤْمِنٍ اِلَّا عَبْدًا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اتْرُكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَفِيْئَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" ہر ہفتہ میں دوبار پیر اور جمعرات کے دن پروردگار کے حضور لوگوں کے عمل پیش کئے جاتے ہیں چنانچہ ہر مؤمن بندہ کی مغفرت کی جاتی ہے علاوہ اس بندہ کے جو اپنے اور کسی مسلمان کے درمیان عداوت رکھتا ہو ان کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ ان دونوں کو مہلت دو تاکہ وہ رجوع کر لیں اور عداوت سے باز آجائیں۔" (مسلمؒ)

دروغ مصلحت آمیز

⑤ وَعَنْ اُمِّ كُلْثُوْمٍ بِنْتِ عُقْبَةَ بْنِ مُعَيْطٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ وَيَقُوْلُ خَيْرًا وَيَنْمِيْ خَيْرًا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ مُسْلِمٌ قَالَتْ وَلَمْ اَسْمَعْهُ تَعْنِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرَخِّصُ فِيْ شَيْءٍ مِّمَّا يَقُوْلُ النَّاسُ كَذِبٌ اِلَّا فِيْ ثَلٰثٍ الْحَرْبُ وَالْاِصْلَاحُ بَيْنَ النَّاسِ وَحَدِيْثُ الرَّجُلِ امْرَاَتَهٗ وَحَدِيْثُ الْمَرْاَةِ زَوْجَهَا وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ اَيِسَ فِيْ بَابِ الْوَسْوَسَةِ۔

"اور حضرت اُمّ کلثوم بنت عقبہ ابن ابو معیطؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا" وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو (اپنی جھوٹی باتوں کے ذریعہ) لوگوں کے درمیان اصلاح کرے یعنی باہمی عداوت رکھنے والوں کے درمیان صلح و صفائی کرائے (آپس میں دشمنی رکھنے والوں میں سے ہر ایک سے) بھلی بات کہے (جو صلح کا باعث بنے) اور (ہر ایک کی طرف سے دوسرے کو) بھلی بات پہنچائے۔" (بخاری ومسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ مزید نقل کئے گئے کہ حضرت اُمّ کلثوم نے کہا میں نے اس ذات گرامی یعنی نبی کریم ﷺ سے ایسی کوئی بات نہیں سنی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ آپ ﷺ نے ان میں سے کسی بات کی اجازت دی ہو جس کو لوگ جھوٹ کہتے ہیں (یعنی آپ ﷺ نے کسی معاملہ میں جھوٹ بولنے کی کبھی اجازت نہیں دی) علاوہ تین باتوں کے (کہ ان میں جھوٹ بولنے کی اجازت عطا فرمائی) ایک تو جنگ کی حالت میں، دوسرے لوگوں کے درمیان صلح و صفائی کرانے میں اور تیسرے اس وقت جبکہ شوہر اپنی بیوی سے باتیں کر رہا ہو

اور بیوی اپنے شوہر سے باتیں کر رہی ہو۔" اور حضرت جابرؓ کی یہ روایت اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ اَيِسَ الخ باب الوسوسہ میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: "بھلی بات پہنچائے"۔ یعنی صلح کرانے والا شخص دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کی طرف سے دوسرے فریق کو وہ بات پہنچائے جو حقیقت میں اس فریق نے نہ کہی ہو اور وہ بات اس طرح کی ہو جس سے دونوں کے درمیان صلح و دوستی کے جذبات پیدا کرنے میں مدد ملتی ہو مثلاً وہ دونوں فریق میں سے کسی کے پاس جائے اور اس سے یوں کہے کہ تم اس (دوسرے فریق) سے خواہ مخواہ کی عداوت رکھتے ہو، حالانکہ وہ تمہارا بڑا خیر خواہ ہے اور تمہارے حق میں اچھی بات کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کہتا اس نے تمہیں سلام کہا ہے اور تمہارے تئیں دوستی و خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

جنگ کی حالت میں جس جھوٹ بولنے کی اجازت ہے اس کا تعلق ایسی باتیں کہنے سے ہے جن سے مسلمانوں کی طاقت و قوت کا اظہار ہوتا ہو اپنے لشکر کے لوگوں کا حوصلہ بڑھتا ہو اور ان کے دل قوی ہوتے ہوں اور دشمن کے لشکر کا فریب کھا جانا ممکن ہو، اگرچہ وہ باتیں حقیقت کے بالکل خلاف ہی کیونکہ نہ ہوں، مثلاً یوں کہا جائے کہ ہمارے لشکر کی تعداد اتنی زیادہ ہے۔ کہ دشمن کا لشکر کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا اور ہمارے لشکر کی مدد کے لئے مزید کافی کمک آ رہی ہے، یا اپنے سامنے کھڑے ہوئے دشمن سے یوں کہا جائے۔ کہ دیکھ سنبھل فلاں شخص تجھے ختم کر دینے کے لئے تیرے پیچھے آپہنچا ہے اور پھر جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے اور اس کا دھیان سامنے سے ہٹ جائے تو موقع سے فائدہ اٹھا کر اس پر وار کر دیا جائے۔

میاں بیوی کی باتوں میں جھوٹ کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً میاں بیوی سے یا بیوی میاں سے اپنے اتنے زیادہ پیار و محبت کا اظہار کرے جو حقیقت کے خلاف ہو اور اس سے مقصد یہ ہو کہ آپس میں محبت و الفت زیادہ بڑھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

تین موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے

⑥ عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ الْكَذِبُ اِلَّا فِي ثَلٰثٍ كَذِبُ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ لِيُرْضِيَهَا وَالْكَذِبُ فِي الْحَرْبِ وَالْكَذِبُ لِيُصْلِحَ بَيْنَ النَّاسِ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے علاوہ تین موقعوں کے ایک تو شوہر کا اپنی بیوی سے جھوٹ بولنا جس سے وہ خوش ہو جائے دوسرے کفار سے جنگ کی حالت میں اور تیسرے اس مقصد کے جھوٹ بولنا تاکہ لوگوں کے درمیان صلح و صفائی ہو جائے۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں صرف شوہر کے جھوٹ بولنے کی اجازت کا ذکر ہے بیوی کے جھوٹ بولنے کا ذکر نہیں ہے جب کہ پچھلی حدیث میں دونوں کا ذکر ہے اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ راوی نے یہاں اختصار کی خاطر صرف شوہر کے بارے میں نقل کیا اور بیوی کے ذکر کو حذف کر دیا یہ کہ خود آنحضرت ﷺ نے اکثر و اغلب کا اعتبار کرتے ہوئے صرف شوہر ہی کا ذکر فرمایا کیونکہ عام طور پر عورتیں اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے زیادہ شکی اور بدگمان ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے ان کی تسلی اور ان کو خوش رکھنے کی شوہر کو زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

تین دن سے زیادہ خفگی نہ رکھو

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَكُوْنُ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ مُسْلِمًا فَوْقَ ثَلٰثَةٍ فَاِذَا لَقِيَهُ سَلَّمَ عَلَيْهِ ثَلٰثَ مِرَارٍ كُلُّ ذٰلِكَ لَا يَرُدُّ عَلَيْهِ فَقَدْ بَاءَ بِاِثْمِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ کسی

مسلمان بھائی سے ملنا جلنا چھوڑے رکھے جب وہ اس مسلمان سے کہیں ملے جو اس سے خفا ہے اور اسے تین مرتبہ سلام کرے اور وہ ایک مرتبہ بھی جواب نہ دے تو وہ (جواب نہ دینے والا) اس کے گناہ کا وبال لے کر وہاں سے لوٹے گا۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر وہ سلام کرنے والے کے سلام کا جواب نہیں دیگا تو ترک ملاقات کا گناہ اس کے سر پڑے گا یا تو وہ صرف اپنے گناہ میں مبتلا ہوگا یا سلام کرنے والے کا گناہ بھی اس پر ہوگا۔ حاصل یہ کہ سلام کرنے والا تو ترک ملاقات کے گناہ سے نکل آئے گا لیکن سلام کا جواب نہ دینے والے کی گردن پر بدستور رہے گا بلکہ سلام کا جواب نہ دینے کی وجہ سے سلام کرنے والے کا گناہ بھی اس پر ہوگا۔

ترک تعلق کی حالت میں مرجانے والے کے بارے میں وعید

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثٍ فَمَنْ هَجَرَ فَوْقَ ثَلٰثٍ فَمَاتَ دَخَلَ النَّارَ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک ملاقات کرے لہٰذا جو شخص تین دن سے خواہ ایک ساعت بھی زیادہ ملنا جلنا چھوڑے رکھے اور پھر وہ (اسی حالت میں توبہ کئے بغیر) مجائے تو آگ میں جائے گا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

ایک برس تک کسی مسلمان سے ملنا جلنا چھوڑے رکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔

⑨ وَعَنْ اَبِیْ خِرَاشٍ السُّلَمِیِّ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ هَجَرَ اَخَاهُ سَنَةً فَهُوَ كَسَفْكِ دَمِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوخراش سلمیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے (ناراضگی کے ساتھ) اپنے مسلمان بھائی سے ایک سال تک ملنا جلنا چھوڑے رکھا اس نے گویا اس کا خون کیا یعنی طویل ترک ملاقات کا گناہ اور ناحق قتل کرنے کا گناہ قریب قریب ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تین دن کے بعد ناراضگی ختم کردو

⑩ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّهْجُرَ مُؤْمِنًا فَوْقَ ثَلٰثٍ فَاِنْ مَرَّتْ بِهٖ ثَلٰثٌ فَلْیَلْقَهٗ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ فَاِنْ رَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ فَقَدِ اشْتَرَكَا فِی الْاَجْرِ وَاِنْ لَّمْ یَرُدَّ عَلَیْهِ فَقَدْ بَآءَ بِالْاِثْمِ وَ خَرَجَ الْمُسْلِمُ مِنَ الْهِجْرَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کسی مؤمن کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی مؤمن سے تین دن سے زیادہ ملنا جلنا چھوڑے رکھے لہٰذا جب (ناراضگی کو) تین دن گزر جائیں تو چاہئے کہ (جس سے ملنا جلنا چھوڑ رکھا ہے) اس سے ملے اور اس کو سلام کرے اگر اس نے سلام کا جواب دے دیا تو پھر وہ دونوں (ملنے والے) ثواب میں شریک ہونگے (کیونکہ پہلے کو تو سلام میں پہل اور ترک خفگی کی ابتداء کرنے کی وجہ سے ثواب ملے گا اور دوسرا سلام کا جواب دینے اور بحالی تعلقات کی پیش کش کو قبول کرنے کی وجہ سے ثواب کا حق دار ہوگا) اور اگر اس نے سلام کا جواب نہ دیا تو اس صورت میں وہ (سلام کا جواب نہ دینے والا) گناہ کے ساتھ لوٹے گا (یعنی اس پر ترک ملاقات اور سلام کا جواب نہ دینے کا گناہ ہوگا) اور سلام کرنے والا ترک ملاقات کے گناہ سے بری ہو جائے گا۔" (ابوداؤدؒ)

صلح کرانے کی فضیلت

(۱۱) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلاَ اُخْبِرُکُمْ بِاَفْضَلِ مِنْ دَرَجَۃِ الصِّیَامِ وَالصَّدَقَۃِ وَالصَّلٰوۃِ قَالَ قُلْنَا بَلٰی قَالَ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ ھِیَ الْحَالِقَۃُ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابودرداء کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" کیا میں تمہیں ایک ایسا عمل نہ بتادوں جس کے ثواب کا درجہ، روزے، صدقے اور نماز کے ثواب سے زیادہ ہے۔" ابودرداء کہتے ہیں کہ ہم نے یہ سن کر عرض کیا کہ ہاں (ضرور بتایئے) آپ ﷺ نے فرمایا۔" آپس میں دشمنی رکھنے والے) دو شخصوں کے درمیان صلح کرانا۔ (اس کے بعد فرمایا) کہ اور دو آدمیوں کے درمیان فساد و نفاق پیدا کرنا ایک ایسی خصلت ہے جو مونڈنے والی ہے، (یعنی اس خصلت کی وجہ سے مسلمانوں کے معاملات اور دین میں نقصان و خلل پیدا ہوتا ہے اس روایت کو ترمذیؒ ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے والصدقہ میں خرف واؤ جمع کے لئے ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ صلح صفائی کرانا ان سب عبادات سے افضل ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ حرف واؤ مفہوم کے اعتبار سے او کے معنی میں ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ صلح صفائی کرانا ان عبادتوں میں سے افضل ہے۔ حدیث کا جو مقصد ہے یعنی آپس میں دشمنی رکھنے والوں کے درمیان صلح کرانے کی ترغیب دلانا اس کے پیش نظر پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

ملا علی قاریؒ نے بعض حضرات کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ حدیث میں صلح کرانے کو جو روزہ، صدقہ اور نماز سے افضل کہا گیا ہے تو یہاں فرض روزہ یا فرض صدقہ یا فرض نماز مراد نہیں ہے بلکہ نوافل مراد ہیں۔" اس کے بعد ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ میرا کہنا یہ ہے کہ ویسے تو یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حقیقی مراد کیا ہے، لیکن اگر دو فریقوں کے درمیان پائی جانے والی دشمنی و عداوت کی نوعیت یہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں لوگوں کی خونریزی، مال و اسباب کی غارتگری اور عزت و ناموس کی بے حرمتی کا ہونا یقینی امر ہو تو قیاس کہتا ہے کہ ایسی عداوت و دشمنی کو ختم کرانا اور دونوں فریقوں کے درمیان صلح صفائی کرانا مذکورہ فرض عبادات سے بھی افضل ہو کیونکہ اول تو یہ عبادات ایسا عمل ہیں جو کسی وقت چھوٹ جائیں تو ان کی قضا ہو سکتی ہے جب کہ اس عداوت و دشمنی کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والی جانیں، تباہ و برباد ہونے والے مال و اسباب اور بے حرمت ہونے والی عزت و ناموس کی مکافات ممکن نہیں دوسرے یہ کہ ان عبادات کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور مذکورہ ہلاکت و تباہی کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بعض اعتبار سے .... پروردگار کے نزدیک حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد کی اہمیت ہے لہٰذا اس حقیقت کی بناء پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ جنس عمل کو ان عبادات پر جزوی فضیلت بہرحال حاصل ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے البشر خیر من الملک والرجل خیر من المراۃ یعنی انسان فرشتہ سے بہتر ہے اور مرد عورت سے بہتر ہے۔

"ذات البین" کے معنی ہیں وہ احوال جن میں لوگ باہمی طور پر مبتلا ہوں، جیسے بغض، عداوت اور جنگ و جدل وغیرہ اور "اصلاح" کے معنی ہیں ان احوال کو درست کرنا! اس اعتبار سے "اصلاح ذات البین" کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر کچھ لوگ آپس میں برے حالات کا شکار ہوں مثلاً وہ ایک دوسرے کے بغض و عناد میں مبتلا ہو کر اور آپس کے لڑائی جھگڑے میں پھنس کر اپنے آپ کو فتنہ و فساد میں ڈالے ہوئے ہوں، تو ان کے بغض و عناد کو باہمی محبت و الفت میں بدلا جائے۔ اور ان کو فتنہ و فساد سے نکال کر صلح و آشتی کی طرف لایا جائے اس کے برخلاف "فساد ذات البین" ہے (یعنی فساد و نفاق پیدا کرنا" جس کو لفظ "حالقہ" سے تعبیر کیا گیا ہے! "حالقہ" اصل میں "حلق" سے ہے جس کے معنی ہیں بال مونڈنا اور حالقہ بال مونڈنے والی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے مراد تباہ برباد کرنا اور جڑ سے اکھاڑنا ہے مطلب

یہ ہے کہ فساد ذات البین"، یعنی لوگوں کے درمیان افتراق وانتشار کے فتنہ کا بیج بونا ایک ایسی خصلت ہے جو دین کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اور ثواب کے حصول کو بالکل ختم کر دیتی ہے۔ جیسا کہ استرا بالوں کو جڑ سے صاف کر دیتا ہے، بہرحال اس ارشاد گرامی کا مقصد لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے اور فتنہ وفساد کو مٹانے کی ترغیب دلانا اور لوگوں میں افتراق وانتشار پیدا کرنے سے متنفر کرنا ہے۔

حسد اور بغض کی مذمت

⑫ وَعَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَبَّ اِلَيْكُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ۔ (رواه احمد والترمذی)

"اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم سے پہلے کی امتوں کی بیماری تمہارے اندر سرایت کر گئی ہے اور وہ بیماری حسد اور بغض ہے جو مونڈنے والی ہے اس سے میری مراد بالوں کو مونڈنا نہیں ہے بلکہ دین کو مونڈنا ہے (یعنی بغض یا حسد اتنی بری خصلت ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کا دین واخلاق تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ خصلت دین ودنیا دونوں کے لئے بڑی نقصان دہ ہے۔"

(احمد، ترمذیؒ)

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے

⑬ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "حسد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح لکڑیوں کو آگ کھا جاتی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ جس طرح آگ اور لکڑی کا معاملہ ہے کہ آگ لکڑی کو جلا کر اس کا وجود مٹا دیتی ہے۔ اسی طرح حسد وہ خصلت ہے جو انسان کو اپنی گرفت میں لے کر اس کی نیکیوں کو مٹا دیتا ہے۔

"معتزلہ" اس حدیث کو اپنے اس مسلک کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ کہ ارتکاب معصیت، عمل صالح کو باطل کر دیتا ہے اور برائیاں نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس کے اچھے اعمال محض اس گناہ کے ارتکاب سے ملیامیٹ ہو جاتے ہیں۔ اور برائی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ پچھلی نیکیوں کو ختم کر ڈالتی ہے۔ لیکن ہم سُنّت والجماعت اس بات کو غلط قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ برائیوں سے نیکیاں ختم نہیں ہوتیں البتہ نیکیوں کا خاصہ یہ ضرور ہے کہ وہ برائیوں کو مٹا دیتی ہیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں) جہاں تک اس حدیث سے معتزلہ کے استدلال کا سوال ہے تو اہل سُنّت والجماعت کی طرف سے کہا جاتا ہے اس ارشاد گرامی میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ حسد، نیکیوں کو کھا جاتا ہے تو اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ حسد نیکیوں کے حسن وکمال کو زائل کر دیتا ہے جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ الحسد یفسد الایمان کمایفسد الصبر العسل یعنی حسد ایمان میں فتور پیدا کر دیتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ حسد کا نیکیوں کو کھا جانے سے مراد یہ ہے کہ حسد، حاسد کو محسود کا مال تلف کرنے اس کی زندگی تباہ کرنے اور اس کی عزت وآبرو کو نقصان پہنچانے پر اکساتا ہے اگر حاسد ان چیزوں کو عملاً پورا نہیں کرتا تو وہ ان باتوں کا ارادہ ورجحان ضرور رکھتا ہے اور کچھ نہیں تو غیبت وغیرہ کے ذریعہ اس کی عزت وآبرو کو نقصان یقیناً پہنچاتا ہے، لہٰذا حسد کی سزا یہ ملے گی کہ قیامت کے دن حاسد کی نیکیاں محسود کو دیدی جائیں گی اور یہ محسود کے ان حقوق کا بدلہ ہوگا جو حاسد اپنی گردن پر لے کر اس دنیا سے جائے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا

ہے۔ کہ میری اُمت میں حقیقی مفلس شخص وہ ہے جو قیامت کے دن (اپنے نامۂ اعمال میں) نماز، روزہ، زکوٰۃ اور شب بیداری (کا ثواب) لئے ہوئے آئے گا لیکن اس کی حالت یہ ہوگی کہ اس نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر زنا کا بہتان لگایا ہوگا کسی کا مال کھایا ہوگا کسی کا خون کیا ہوگا اور کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔ لہٰذا اس کی تمام نیکیاں (جو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور شب بیداری جیسی صورتوں میں ہوں گی) ان لوگوں کو دیدی جائیں گی جن پر اس نے (گالی اور بہتان وغیرہ کے ذریعہ) زیادتی کی ہوگی لہٰذا مذکورہ بالا حدیث میں نیکیوں کے مٹائے جانے سے یہی مراد ہے یعنی قیامت کے دن اپنی نیکیوں سے محروم ہو جانا نہ کہ ان نیکیوں کو دیوان اعمال میں سے مٹا دینا اور ختم کر دینا مراد ہے۔ یہ مراد یوں بھی صحیح نہیں ہوگی کہ اگر کسی کی نیکیوں کو یہیں مٹا دیا جائے اور ان کو دیوان اعمال میں سے محو کر دیا جائے تو پھر وہ وہاں (قیامت کے دن) کن اعمال کے ساتھ آئے گا۔ درآنحالیکہ حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جس شخص نے دنیا میں جو اعمال کئے ہونگے۔ وہ قیامت کے دن انہی اعمال کے ساتھ میدان حشر میں حاضر ہوگا۔

ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ ہر بندہ اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق اپنی نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اور اس کے نامہ اعمال میں ثواب کی تعداد بڑھتی رہتی ہے، ظاہر ہے جو بندہ نیکیوں کی بجائے خطاؤں کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنے نامہ اعمال میں نیکیوں اور ثواب کے اضافہ سے محروم ہو جاتا ہے اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ حسد، حاسد کو اچھی بات سے مٹا کر گویا ان نیکیوں سے محروم رکھتا ہے۔ جو اس کو بُری خصلت سے اجتناب کی صورت میں حاصل ہوتیں۔

دو آدمیوں کے درمیان برائی ڈالنے کی مذمت

⑭ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِيَّاكُمْ وَسُوْءَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَاِنَّهَا الْحَالِقَةُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم اپنے آپ کو دو آدمیوں کے درمیان برائی ڈالنے کی خصلت سے بچاؤ کیوں کہ یہ خصلت مونڈنے والی یعنی دین کو تباہ کرنے والی ہے۔" (ترمذیؒ)

⑮ وَعَنْ اَبِيْ صِرْمَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ ضَارَّ ضَارَّ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوصرمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی (مسلمان کو بلاوجہ شرعی) کوئی ضرر و نقصان پہنچائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرر و نقصان پہنچائے گا یعنی اس کو برے عمل کی سزا دیگا اور جو شخص (کسی مسلمان کو) مشقت و تکلیف میں ڈالے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو مشقت و تکلیف میں مبتلا کریگا۔" (ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: لفظ "شاق" کے ایک معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ جو شخص کسی مسلمان سے عداوت و مخالفت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے عداوت و مخالفت رکھے گا۔ یعنی اس کو عذاب میں مبتلا کریگا۔

کسی مسلمان کو ضرر پہنچانے والے کے بارے میں وعید

⑯ وَعَنْ اَبِيْ بَكْرِنِ الصِّدِّيْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا اَوْ مَكَرَ بِهٖ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو ضرر پہنچائے یا اس کے ساتھ مکرو فریب کرے" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو خواہ ظاہری طور پر ضرر و نقصان پہنچائے اور خواہ پوشیدہ طور پر، اس کو بارگاہ رب العزت

کے قرب اور رحمت الٰہی سے دور قرار دیا گیا ہے۔

کسی مسلمان کو اذیت پہنچانے، عار دلانے اور اس کی عیب جوئی کرنے کی ممانعت

(۱۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمِنْبَرَ فَنَادٰى بِصَوْتٍ رَفِيْعٍ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ يُفْضِ الْاِيْمَانُ اِلٰى قَلْبِهٖ لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تُعَيِّرُوْهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ فَاِنَّهٗ مَنْ يَّتَّبِعْ عَوْرَةَ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ يَّتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِيْ جَوْفِ رَحْلِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو باآواز بلند اس طرح مخاطب فرمایا۔ "اے وہ لوگو! جو زبان سے تو اسلام لائے ہیں اور ان کے دل تک ایمان نہیں پہنچا ہے (تمہیں آگاہ کیا جاتا ہے) کہ تم (ان) مسلمانوں کو اذیت نہ دو (جو کامل مسلمان ہیں بایں طور کہ انہوں نے زبان سے بھی اسلام قبول کیا ہے اور ان کا دل بھی ایمان کے نور سے منور ہے) ان کو عار نہ دلاؤ اور ان کے عیب نہ ڈھونڈو۔ یاد رکھو! جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیب تلاش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا عیب ڈھونڈھے گا۔ اور جس کا عیب اللہ تعالیٰ ڈھونڈے اس کا رسوا کیا جانا یقینی ہے اگرچہ وہ (لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر اپنے گھر میں) چھپا ہوا کیوں نہ ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "جو زبان سے اسلام لائے ہیں" اس خطاب میں مؤمن اور منافق دونوں شامل ہیں اور اس کے آگے جو یہ فرمایا کہ۔ "جن کے دل تک ایمان نہیں پہنچا ہے یعنی ان کا دل اصل ایمان یا کمال ایمان کے نور سے منور نہیں ہوا ہے۔" تو اس کے ذریعہ خطاب میں فاسق کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ بات اس لئے بھی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ارشاد گرامی میں آگے یہ فرمایا گیا ہے۔ "جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیب تلاش کرتا ہے۔" تو اس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ حضور ﷺ کا خطاب تمام مسلمانوں سے تھا خواہ وہ کامل... مسلمان ہوں یا منافق اور یا فاسق! اگر خطاب صرف منافقین سے ہوتا تو چوں کہ مسلمان اور منافق کے درمیان اخوہ یعنی بھائی چارہ نہیں ہے اس لئے اس ارشاد گرامی میں "اپنے مسلمان بھائی" کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا! لہٰذا طیبیؒ کا اس قول کا اختیار کرنا کہ اس ارشاد گرامی کے مخاطب صرف منافقین ہیں اور صرف انہیں پر اس حدیث کا اطلاق ہوتا ہے ظاہر مفہوم کے خلاف ہے۔

"عار نہ دلاؤ۔" کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس کے اس گناہ پر طعن و تشنیع اور تنبیہ نہ کرو جو کبھی پہلے اس سے صادر ہوا ہو، خواہ اس گناہ سے اس کا توبہ کرنا تمہیں معلوم ہو یا معلوم نہ ہو، البتہ اگر کوئی شخص کسی گناہ کے ارتکاب کی حالت میں ہو یا وہ کوئی گناہ کر چکا ہو اور وہ گناہ اس کے توبہ کرنے سے پہلے علم میں آگیا ہو تو اس صورت میں اس کو اس گناہ پر طعن و تشنیع اور تنبیہ کرنا اس شخص پر واجب ہو گا جو اس پر قادر ہو اور اگر وہ گناہ قابل حد و تعزیر ہو تو اس پر حد اور تعزیر بھی جاری کرنا (قاضی و حاکم پر) واجب ہو گا، گویا اس صورت کا تعلق "عار دلانے" سے نہیں ہو گا بلکہ اس کا شمار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے زمرہ میں ہو گا۔

"نہ ان کے عیب ڈھونڈھو" یعنی تم کسی مسلمان کے جن عیوب کو نہیں جانتے ہو اس کی ٹوہ مت لگاؤ اور اس کے جو عیوب تمہارے علم میں آگئے ہیں ان کو دوسروں کے سامنے ظاہر نہ کرو۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان (جو فاسق نہ ہو) کے عیوب کی ٹوہ میں رہنے یا اس کے جو عیوب اپنے علم میں ہوں ان کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنے سے اجتناب کرنا واجب ہے۔ اور جو شخص ایسا کرے (یعنی کسی مسلمان کی عیب جوئی کرے یا کسی مسلمان کے عیوب کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا پھرے) اس سے خود بھی کنارہ کشی اختیار کرنا اور دوسروں کو بھی اس سے دور رکھنا واجب ہے۔

"اللہ تعالیٰ اس کے عیب ڈھونڈھے گا الخ۔" کا مقصد اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ جو شخص اس دنیا میں کسی مسلمان کی عیب جوئی کرتا ہے یا کسی مسلمان کے عیوب کو دوسروں کے سامنے بیان کر کے اس کی رسوائی کراتا ہے اس کو جان لینا چاہئے۔ کہ آخرت میں اس کے ساتھ بھی ایسا معاملہ ہو گا۔ بایں طور کہ اللہ تعالیٰ وہاں اس کے عیوب سے درگزر کرنے کے بجائے اس کی ایک ایک برائی پر نظر رکھے

گا۔ اور اس کے تمام عیوب کو مخلوق کے سامنے ظاہر کرے گا۔ تاکہ جس طرح اس نے اپنے ایک مسلمان بھائی کو دنیا میں رسواء کیا تھا اسی طرح آخرت میں وہ خود رسوا ہو اور ظاہر ہے کہ آخرت کی رسوائی دنیا کی رسوائی سے کہیں زیادہ ہوگی عطا نے لکھا ہے، کہ کسی کے عیوب کی ٹوہ لگانا خود سب سے بڑا عیب ہے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ عیب جوئی وہ خصلت ہے۔ جو دراصل بدگمانی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے جو شخص کسی مسلمان کے بارے میں بدگمانی قائم کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ٹوہ میں لگا رہے چنانچہ وہ ٹوہ میں رہتا ہے اور جب اس کے علم میں کوئی عیب آجاتا ہے تو پھر وہ اس کی پردہ دری کرتا ہے (لہذا چاہئے کہ اس بڑی خصلت کی جو جڑ ہے یعنی بدگمانی کرنا، اس سے اپنے آپ کو بچایا جائے تاکہ کسی مسلمان کی عیب جوئی اور اس کی پردہ دری کا وبال گردن پر نہ ہو۔) حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے ایک مسلمان کے کردار اس کی سماجی حیثیت اس کے شخصی وقار اور اس کی نجی زندگی کو معاشرہ میں ذلت و رسوائی سے بچانے پر بڑا زور دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس بات کا تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم کسی مسلمان کے کسی عیب کو جانو تو اس کو چھپاؤ نہ کہ اس کو اچھالتے پھرو، نیز کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ کسی مسلمان کے نجی حالات کی جستجو کرے اس کی کمزوری کو کھوج کھوج کر دوسروں کے سامنے لائے اور اس کے کردار کے ان گوشوں میں جھانکنے کی کوشش کرے جن کو وہ دنیا کی نظروں سے چھپانا چاہتا ہو، اس کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ شریعت نے کسی مسلمان کے عیوب کی پردہ پوشی کا جو حکم دیا ہے اس کی حد یہ ہے کہ اگر کسی کے پڑوس میں ایسا مکان ہو جہاں شغل مے نوشی ہوتا ہو اور راگ رنگ کی مجلسیں جمتی ہوں، تو اس شخص کو چاہئے کہ وہ خود اپنے مکان کا دروازہ بند کرے تاکہ اس کی نظر اس مکان میں ہونے والے غیر شرعی امور تک نہ جاسکے اس کے گھر کے لوگوں کی بدکاریاں اس کے علم میں نہ آسکیں نیز اس شخص کے مکان اور مذکورہ مکان کے درمیان جو دیوار حائل ہو اس سے کان لگا کر چوری چھپے اس آواز کو سننے کی کوشش نہ کرنی چاہئے جو اس مکان میں گانے بجانے اور راگ رنگ وغیرہ کے ذریعہ پیدا ہو رہی ہو۔ اور نہ یہ جائز ہے کہ اس برائی کو دیکھنے کے لئے اس شخص کے گھر میں گھسا جائے ہاں اگر اس مکان کے مکین اپنے افعال بد کو خود ظاہر کر رہے ہوں جیسے وہ اتنی بلند آواز میں گانا بجانا کر رہے ہوں کہ باہر تک آواز آرہی ہو یا شرابی لوگ آپس میں شرابیوں جیسا شور و شغب کر رہے ہوں اور ان کی آواز ان کے شغل مے نوشی بھی ان تک ظاہر کر رہی ہو تو یہ دوسری بات ہے اسی طرح اگر وہ شخص ان کی ٹوہ لینے کے مقصد کے بغیر یونہی اس گھر میں چلا جائے اور وہ لوگ شغل مے نوشی یا گانا بجانا موقوف کر کے شراب کے برتن اور گانے بجانے کی چیزیں اپنے دامن وغیرہ کے نیچے چھپالیں تو اس شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ ان کے دامن وغیرہ ہٹوا کر ان چیزوں کو دیکھنے کی کوشش کرے، اس طرح شراب کی بو کی ٹوہ میں منہ وغیرہ سونگھنا بھی جائز نہیں ہوگا۔ اور نہ یہ جائز ہوگا اپنے پڑوسیوں سے دریافت کرتا پھرے کہ اس کے مکان میں کیا کیا ہوتا ہے۔

آخر میں ایک بات یہ جان لینی چاہئے کہ حدیث کے الفاظ ولم یفض الایمان الی قلبہ (اور ان کے دل تک ایمان نہیں پہنچا ہے) میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب تک ایمان کا نور دل کو روشن نہیں کر دیتا اس وقت تک نہ اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور نہ اس کے حقوق ادا ہوتے ہیں اور یہ کہ قلب کے تمام روحانی امراض کا علاج اللہ کی معرفت اور اس کے حقوق کو ادا کرنے پر موقوف ہے چنانچہ جو شخص اللہ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے اور اس کے حقوق کو ادا کرتا ہے تو نہ وہ کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے اور نہ کسی کو نقصان و ضرر میں مبتلا کرتا ہے نہ کسی کو عار دلاتا ہے۔ اور نہ کسی کے احوال و کردار کی کمزوریوں اور اس کے عیوب کی تلاش و جستجو میں رہتا ہے۔

کسی مسلمان کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے کی مذمت

(۱۸) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِنْ اَرْبَى الرِّبٰو الْاِسْتِطَالَةَ فِيْ عِرْضِ الْمُسْلِمِ بِغَيْرِ حَقٍّ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت سعید ابن زید نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "سب سے بڑھ کر سود یہ ہے کہ کسی مسلمان کی عزت و آبرو کو ناحق بگاڑنے کے لئے زبان درازی کی جائے۔" (ابوداؤد، بیہقی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی شرعی مصلحت کے بغیر اور ناروا طور پر کسی مسلمان کے بارے میں اپنی زبان سے برے الفاظ نکالنا، اس کی غیبت کرنا، اس کے ساتھ تکبر کرنا اور اپنی بڑائی جتانے کے لئے اس کی حقارت و توہین کرنا اور اس طرح اس کی عزت و آبرو کے درپے ہونا ایک ایسی خصلت ہے جو حرام ہونے اور گناہ لازم کرنے کے اعتبار سے بہ نسبت اور سودوں کے سخت ترین سود ہے۔ واضح رہے کہ لغت میں "ربو" کے معنی ہیں زیادہ ہونا، بڑھنا، اور اصطلاح شریعت میں اس کا مفہوم ہے خرید و فروخت اور قرض میں واجب حق اور اصل رقم سے زیادہ لینا۔ لہٰذا کسی مسلمان کے بارے میں ایسا رویہ اختیار کرنا یا ایسے الفاظ اپنی زبان سے نکالنا جس کا اس مسلمان کے بارے میں اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا اور نہ اس کا تعلق کسی ایسے معاملہ سے ہو جس میں اس طرح کا رویہ اختیار کرنا یا اس طرح کے الفاظ کے استعمال کی شرعی طور پر اجازت ہو گویا اس چیز کی طرح ہے جو اپنے حق سے زیادہ اور نہایت ظلم کے ساتھ لی گئی ہو، اس اعتبار سے کسی کی آبروریزی کے لئے زبان درازی کو ربو کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور پھر اس کو اربی یعنی سب سے بڑا سود کہا گیا ہے کیونکہ کسی مسلمان کے نزدیک اس کی عزت و آبرو اس کے مال و زر سے زیادہ حیثیت و قیمت رکھتی ہے اور مال و زر کی بہ نسبت عزت و آبرو کا نقصان زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ سخت ہوتا ہے۔

شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ "ناحق" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ بعض صورتوں میں ایسا رویہ اختیار کرنا اور ایسی بات کہنا کہ جس سے عزت و آبرو مجروح ہوتی ہو، مباح قرار پاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص پر کسی شخص کا کوئی حق (جیسے قرض وغیرہ) ہو اور وہ اس حق کو ادا نہ کر رہا ہو تو صاحب حق کو اجازت ہے کہ وہ اس شخص کو "ظالم" جیسے سخت الفاظ کہہ سکتا ہے یا اس کو بدنام و بے عزت کر سکتا ہے یا کوئی شخص کسی کے حق میں گواہی دے رہا ہو تو اس پر جرح کرنا اور اس گواہ کے عیوب بیان کرنا درست ہے اسی قسم سے راویان حدیث پر جرح کرنا بھی ہے۔ یعنی محدثین کا حدیث کے راویوں کے عیوب ظاہر کرنا بھی درست ہے کیونکہ اس کا مقصد حدیث کی صحت کو محفوظ رکھنا اور دین کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح لوگوں کو نقصان و فساد سے بچانے کے لئے نکاح کا پیغام دینے والے کے صحیح احوال (یعنی اس کی برائیوں) کو ظاہر کرنا اور بدعتی و فاسق کی مذمت و بے عزتی کرنا بھی درست ہے۔

کسی کی ناحق آبروریزی کرنا اس کا گوشت کھانے کے مرادف ہے

(۱۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا عُرِجَ بِيْ رَبِّيْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ اَظْفَارٌ مِّنْ نُّحَاسٍ يَخْمِشُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ صُدُوْرَهُمْ فَقُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ وَيَقَعُوْنَ فِيْ اَعْرَاضِهِمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب اللہ تعالیٰ مجھے (معراج کی رات میں) اوپر لے گیا تو (عالم بالا میں) میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کے ناخون تانبے کے تھے اور وہ ان ناخونوں سے اپنے چہروں کو کھرچ رہے تھے (ان کی اس کی حالت کو دیکھ کر) میں نے پوچھا کہ جبرئیل علیہ السلام یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے (یعنی لوگوں کی غیبت کرتے ہیں) اور ان کی عزت و آبرو کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: حضرت جبرئیل علیہ السلام کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں۔ ان کے حق میں نازیبا (اور ناشائستہ الفاظ) اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ اور اس طرح ان لوگوں کی عزت و آبرو کو پامال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اپنے چہروں اور سینوں کو کھرونچنا، اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے بھائیوں کی آبروریزی کرکے اور اس آبروریزی پر خوش ہو کر ان بھائیوں کے

سینوں (یعنی دلوں) اور چہروں کو مجروح و مغموم کیا لہٰذا ان کی سزا یہی ہے کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سینوں اور چہروں کو بھی زخمی کریں۔

کسی شخص کی بے آبروئی کرنے والے کے بارے میں وعید

(۲۰) وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَكَلَ بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ اُكْلَةً فَاِنَّ اللّٰهَ يُطْعِمُهُ مِثْلَهَا مِنْ جَهَنَّمَ وَمَنْ كَسٰى ثَوْبًا بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَكْسُوْهُ مِثْلَهُ مِنْ جَهَنَّمَ وَمَنْ قَامَ بِرَجُلٍ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَقُوْمُ لَهُ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مستوردؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص کسی مسلمان کی غیبت (برائی کرنے یا اس پر زنا وغیرہ کی تہمت لگانے کے ذریعہ اس کی آبروریزی کر کے ایک لقمہ کھائے، تو اللہ تعالیٰ اس کو اس لقمہ کی مانند دوزخ کی آگ کھلائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی تحقیر و اہانت کے بدلہ میں کسی کو کپڑا پہنائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کپڑے کی مانند دوزخ کی آگ کا کپڑا پہنائے گا اور جو شخص کسی کو سنانے اور دکھانے کے لئے کھڑا کرے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے سنانے اور دکھانے کے لئے خود کھڑا ہوگا۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "اکلة" کے معنی ایک لقمہ کے ہیں اور ایک نسخہ میں یہ لفظ اکلة (الف کے زبر کے ساتھ) منقول ہے جس کے معنی ہیں ایک بار سیر ہو کر کھانا۔ کسی مسلمان کی آبروریزی کر کے ایک لقمہ یا ایک بار کھانے کا مطلب یہ ہے کسی شخص کی خوشنودی مزاج کے لئے اس کے سامنے کسی مسلمان کی برائی کرنا اور اس کے عوض کچھ کھانے پینے کا سامان پیدا کر لینا! مثلاً فرض کیجئے ایک شخص زید ہے جو کسی مسلمان سے عداوت رکھتا ہے۔ اور اس مسلمان کی برائی سن کر بہت خوش ہوتا ہے چنانچہ ایک اور شخص بکر اس کے اس مزاج کو جان کر اس کے پاس جاتا ہے اور ازراہ خوشامد و چاپلوسی اس کے سامنے اس مسلمان کو برا بھلا کہتا ہے یا اس کے عیوب کو بیان کرتا ہے اور زید اس کی اس حرکت سے خوش ہو کر اس کو روپیہ پیسہ یا کچھ کھانے پینے کے لئے دیدیتا ہے تو ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ کہ جو شخص کسی مسلمان کی آبروریزی کو اپنی کمائی اور روزی کا ذریعہ بناتا ہے تو آخرت میں اس کو اپنی اس روزی اور کمائی کے مثل دوزخ کی آگ کھانی پڑے گی۔

لفظ "کسی" بصیغہ معروف ہے اور اوپر ترجمہ میں اسی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ لیکن ایک نسخہ میں یہ لفظ بصیغہ مفعول ہے اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ جو شخص کسی مسلمان کی تحقیر و اہانت کرنے کے بدلے میں کپڑا پہنایا جائے۔ یہ معنی قبل کی عبارت کی زیادہ مطابق ہیں۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بصیغہ معروف ہونے کی صورت میں قبل کی عبارت من اکل برجل مسلم اکلہ دیکھتے ہوئے ترجمہ یوں ہوگا "اور جو شخص کسی مسلمان کی تحقیر و اہانت کرنے کے بدلہ میں اپنے آپ کو کپڑے پہنائے..... الخ"۔

ومن قام برجل مقام سمعة ورياء کے لفظ "برجل" میں حرف باء تعدیہ کے لئے اور "رجل" سے مراد خود وہی شخص ہو سکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی! مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نمود و نمائش کی خاطر خود اپنی زبان سے اپنی بڑائیاں بیان کرے۔ اور اپنی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو یا کسی دوسرے شخص کو اس بات پر مامور کرے کہ وہ لوگوں کی بڑائی جتانے کے لئے اور لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے اس کی تعریف و توصیف کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی برائیاں ظاہر کر کے لوگوں کے درمیان اس کی رسوائی و فضیحت کا سامان پیدا کرے گا۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ "برجل" میں حرف باء تعدیہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور سببیت کے لئے بھی! پس اگر تعدیہ کے لئے ہو تو یہ مطلب ہوگا کہ جو شخص کسی کو سمعہ ورياء (نمود و نمائش کے طور پر اس کی پرہیزگاری و دینداری کا ڈنکا پیٹتا پھرے اور اس کے

زہد وعبادات اور اس کی بزرگی کو جھوٹ شہرت دے اور اس سے مقصد یہ ہو کہ لوگ اس کے معتقد ہوں اور اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر اپنے جان ودل کے ذریعہ اس کی خدمت کیا کریں۔ اور اس کی آڑ میں اپنا جاہ ومال کا فائدہ ہو، جیسا کہ بعض بزرگان کے خدام کا شیوہ ہے کہ وہ ان کی شہرت کی آڑ میں اپنے لئے مختلف فوائد حاصل کرتے ہیں اور بقول شخصے "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" تو ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو رسوائی و فضیحت کی جگہ کھڑا کرے گا یعنی فرشتوں کو حکم دے گا کہ اس شخص کے بارے میں اعلان کرو کہ یہ جھوٹا ہے اس نے محض اپنے فائدہ اور ذاتی اغراض کے لئے ایک شخص کو ناروا طور پر شہرت دی اس کے بعد اس کو اس عذاب میں مبتلا کیا جائے گا جو جھوٹوں کے لئے ہو گا۔

اور اگر حرف باء سببیت کے لئے ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ اگر کوئی شخص کسی کی توجہ حاصل کرنے کے لئے خود اپنے آپ کو سمعہ وریاء کے مقام پر کھڑا کرے یعنی اپنے آپ کو بڑا زاہد و متقی اور نہایت صالح و پاکباز ظاہر کرے تاکہ کوئی صاحب جاہ اور مالدار شخص اس کا معتقد ہو اور وہ اس کے ذریعہ جاہ ومال کی اپنی خواہش وطلب کو پورا کرے تو ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ایسی جگہ کھڑا کرے گا جہاں لوگ اس کی رسوائی و فضیحت کو دیکھیں گے یعنی فرشتوں کو حکم دیا جائے گا۔ کہ یہ اعلان کرو کہ یہ شخص نہایت ریا کار تھا اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے اور اس کے ذریعہ جاہ ومال حاصل کرنے کے لئے خود کو زاہد و متقی ظاہر کرتا تھا اور پھر اس کے بعد اس عذاب میں مبتلا کیا جائے گا جو ریا کاروں کے لئے ہو گا۔

خدا کے ساتھ حسن ظن کی فضیلت

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اچھا گمان رکھنا، منجملہ بہترین عبادات کے ہے۔" (احمدؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ جن اعمال کو عبادت حسنہ کہا جاتا ہے ان میں سے ایک بہترین چیز اور بہترین عبادت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان رکھا جائے لہٰذا ضروری ہے کہ عبادتوں کو ترک نہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ جاہل عوام یہ گمان کرتے ہیں۔ کہ خدا کے ساتھ حسن ظن کا مطلب یہ ہے کہ اگر عبادتیں ترک ہوتی ہیں تو ہونے دو! البتہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد ہونا چاہئے کہ وہ کریم اور غفور الرحیم ہے جو تارک عبادت کو بھی یقیناً بخشدے گا۔ یہ گمان نہایت گمراہی کا سبب ہے اور شیطان کے فریب میں پھنس جانے کا نتیجہ ہے علماء نے لکھا ہے کہ جو شخص عبادتوں کو تو ترک کرے اور معبود کے ساتھ حسن ظن کا دعوی کرے وہ یقیناً مغرور و مردود ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ حدیث میں "اچھے گمان" کا تعلق خدا کے بجائے مسلمانوں کے بارے میں خیر و صلاح کا اعتقاد رکھنا منجملہ عبادات حسنہ کے ہے یا یہ (مسلمانوں کے بارے میں اچھا گمان رکھنا) ایک ایسی صفت ہے جو عبادتوں میں حسن و کمال پیدا کرتی ہے اور ثواب کا درجہ بڑھاتی ہے اس کا حاصل یہ نکلا کہ جو شخص عبادت گزار و نیکوکار ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے بارے میں ہمیشہ اچھا گمان اور نیک خیال رکھتا ہے اور بدگمانی رکھنے والا بدکار کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔

بد گماں باشد ہمیشہ زشت کار نامہ خود خواند اندر حق یار

ایک زوجۂ مطہرہ کی بدگوئی اور حضور ﷺ کی ناراضگی

(۲۲) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتِ اعْتَلَّ بَعِيْرٌ لِصَفِيَّةَ وَعِنْدَ زَيْنَبَ فَضْلُ ظَهْرٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِزَيْنَبَ اَعْطِيْهَا بَعِيْرًا فَقَالَتْ اَنَا اُعْطِيْ تِلْكَ الْيَهُوْدِيَّةَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَجَرَ هَاذَا الْحِجَّةِ وَالْمُحَرَّمَ وَبَعْضَ صَفَرٍ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَذُكِرَ حَدِيْثُ مُعَاذِبْنِ اَنَسٍ مَنْ حَمٰى مُؤْمِنًا فِيْ بَابِ الشَّفْقَةِ وَالرَّحْمَةِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہوگیا اس وقت زینبؓ کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ سواری تھی (یعنی ان کے پاس ایک اونٹ ضرورت سے زائد تھا) لہٰذا رسول کریم ﷺ نے زینبؓ سے فرمایا کہ تم اپنا وہ اونٹ (تمہاری ضرورت سے زیادہ ہے) صفیہؓ کو دے دو! زینبؓ نے جواب دیا کہ بھلا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں گی (یعنی انہوں نے صفیہ کو اپنا اونٹ دینے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ ان کے بارے میں نازیبا الفاظ بھی زبان سے نکالے) چنانچہ رسول کریم ﷺ ان سے سخت ناراض ہوگئے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ذی الحجہ اور محرم (کے پورے مہینے) اور ماہ صفر کے کچھ دنوں تک ان سے ملنا جلنا اور ان کے پاس جانا چھوڑے رکھا۔"
(ابوداؤدؒ) اور حضرت معاذ ابن انسؓ کی روایت من حمی مؤمنا الخ باب الشفقة و الرحمة میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: حضرت صفیہؓ ایک یہودی حیی ابن اخطب کا سلسلہ نسب چوں کہ اوپر جاکر حضرت ہارون علیہ السلام سے مل جاتا تھا اس لئے ان کو ایک پیغمبر یعنی حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونے کا نسبی شرف بھی حاصل تھا، حضرت صفیہؓ کی پہلی شادی ایک یہودی ابوالحقیق سے ہوئی تھی! جب جنگ خیبر میں ابوالحقیق مارا گیا اور صفیہ قیدی بنا کر بارگاہ رسالت میں لائی گئیں تو حضور ﷺ نے ان کو رہا کر دیا اور پھر ان سے عقد کر لیا آنحضرت ﷺ کی بعض ازواج مطہراتؓ ان کو پسند نہیں کرتی تھیں اور خود حضرت عائشہؓ بھی انہیں میں سے تھیں لیکن آنحضرت ﷺ کو دوسری ازواجؓ کی طرح ان سے بھی برابر کا تعلق تھا اور ان کی حمایت و رعایت کرتے تھے۔ ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کسی بات پر حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہودیہ کہہ دیا۔ اور کچھ سخت سُست بھی کہا انہوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی، حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم عائشہؓ سے کہو کہ تم ابوبکر کی بیٹی ہو، اور میں پیغمبرزادی ہوں۔

حضرت زینبؓ بھی آنحضرت ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں پہلے ان کا نام برہ تھا اور پہلی شادی عبداللہ ابن زمعہ سے ہوئی تھی جب یہ حضور ﷺ کے عقد میں آئیں تو آپ ﷺ نے ان کا نام زینبؓ رکھا۔

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کسی شخص کو اس کی گزشتہ زندگی کے تعلق سے طعنہ دینا یا اس کی حقارت کرنا نہایت نازیبا بات ہے، دوسری بات یہ کہ آنحضرت ﷺ حضرت زینبؓ کی بدگوئی پر ان سے سخت ناراض ہونا اور ایک طویل عرصہ تک ان سے ترک ملاقات اختیار کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ کسی شرعی مصلحت کے پیش نظر کسی مسلمان سے تین دن سے زائد بھی ترک ملاقات کی جا سکتی ہے، مثلاً اگر کوئی شخص کسی قبیح فعل کا مرتکب ہو تو اس کی تادیب و تنبیہ کی خاطر، نہ کہ کسی بغض و عداوت کے تحت اس سے تین دن سے زیادہ بھی ملنا جلنا چھوڑے رکھنا جائز ہے جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قسم کا بہرحال اعتبار کرو

(۲۳) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ رَجُلًا يَسْرِقُ فَقَالَ لَهٗ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ سَرَقْتَ قَالَ كَلَّا وَالَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَقَالَ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَكَذَّبْتُ نَفْسِیْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (ایک مرتبہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم علیہ السلام نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھ لیا! حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم علیہما السلام نے اس شخص سے کہا کہ تم نے چوری کی ہے؟ اس شخص نے کہا کہ ہرگز نہیں، اس ذات پاک کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے (میں نے چوری نہیں کی ہے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے (اس کو اس طرح قسم کھاتے ہوئے سنا تو) کہا کہ میں خدا پر ایمان لایا اور اپنے نفس کو جھوٹا قرار دیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "میں خدا پر ایمان لایا" یعنی تم نے اپنی قسم میں خدا کی واحدانیت کا جو ذکر کیا ہے میں اس پر اپنے ایمان و اعتقاد کا اقرار کرتا ہوں!

یہ جملہ مفہوم کے اعتبار سے یوں ہے کہ تم نے اللہ کی جو قسم کھائی ہے میں اس کا اعتبار کرتا ہوں اور اپنے نفس کو اس بات کے کہنے میں جھوٹا قرار دیتا ہوں کہ تم نے چوری کی ہے اگرچہ میرا یہ کہنا ظاہری حالات میں غمازی کی بنا پر تھا۔ یہ وضاحت اس احتمال کے پیش نظر ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے کہیں سے کوئی چیز اس کے مالک سے پوشیدہ طور پر اٹھائی ہوگی اس بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سمجھا کہ اس شخص نے چوری کی ہے لیکن اس نے اول تو خدا کی قسم کھا کر چوری سے انکار کیا دوسرے اس موقع پر ایسی کوئی شرط نہیں پائی گئی ہوگی جس کا چوری کے ثبوت کے لئے اور چوری کی سزا یعنی حد جاری کرنے کے لئے پایا جانا شرعی طور پر ضروری ہوتا ہے اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس شخص کی قسم کو تسلیم کر لیا اور اپنی بات کو غلط قرار دیا۔

حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے یہ مطلب لکھا ہے کہ میں تمہیں تمہاری قسم میں سچا مانتا ہوں اپنے اس گمان سے رجوع کرتا ہوں جو میں نے تمہارے بارے میں قائم کیا تھا اور مذکورہ بات کے کہنے میں اپنے نفس کو جھوٹا قرار دیتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر خدا کی قسم کھائے تو اگرچہ اس کی وہ بات حقیقت کے کتنی ہی خلاف معلوم ہوتی ہو لیکن چاہئے یہی کہ اپنے گمان اور اپنی معلومات کو غلط قرار دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم کے پیش نظر اس کی قسم کا اعتبار کیا جائے۔

حسد اور افلاس کی برائی

(۲۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا وَ کَادَ الْحَسَدُ اَنْ یَّغْلِبَ الْقَدَرَ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "فقر و افلاس قریب ہے کہ کفر کی حد تک پہنچا دے اور حسد، قریب ہے کہ تقدیر پر غالب آ جائے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ فقر و افلاس اور تنگدستی ایسی بری چیز ہے کہ بسا اوقات انسان اس سے مجبور ہو کر کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے، چنانچہ جو فقیر و مفلس، صبر و استقامت اور عزم و حوصلہ کی طاقت کھو کر قلبی افلاس بھی مبتلا ہو جاتا ہے وہ خدا کی ذات پر اعتماد و بھروسہ کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے وہ نہایت مایوسی کے عالم میں خدا کے نظام قدرت تک پر اعتراض کرنے لگتا ہے۔ یا تقدیر الٰہی کا شکوہ و گلا کر کے خدا کے حکم و فیصلہ پر ہر حالت میں راضی رہنے کے تقاضا کو پس پشت ڈال دیتا ہے یا خدا کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے غیر اللہ کے سامنے دست سوال دراز کرنے لگتا ہے اور ماسواء اللہ کو اپنا حاجت روا ماننے لگتا ہے۔ اور یا جب وہ دیکھتا ہے کہ اکثر کافر مالدار ہیں اور عیش و راحت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے برخلاف اکثر مسلمان افلاس و تنگدستی کی آزمائش میں مبتلا ہیں۔ تو وہ کفر کی طرف مائل ہونے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فقر و افلاس دراصل مسلمانوں کے لئے ایک آزمائش اور امتحان کا درجہ رکھتا ہے چنانچہ جو لوگ اس حقیقت کو جانتے ہیں اور مال و دولت اور دنیاوی زندگی کے اعتبار سے مفلس و قلاش ہونے کے باوجود اپنے دل کو غنی رکھتے ہیں اور تقدیر الٰہی پر صابر و شاکر رہ کر اس امتحان و آزمائش میں پورے اترتے ہیں۔ ان کے حق میں وہی فقر و افلاس ایمان کی پختگی اور ترقی درجات کا ضامن بن جاتا ہے لہٰذا جو مسلمان مال و دولت سے تہی دست اور فقر و افلاس میں مبتلا ہوں اور تمام تر انسانی تدابیر اور محنت و مشقت کے باوجود تنگی حالات سے نجات نہ پاتے ہوں ان کو چاہئے کہ وہ اپنی اس حالت کو خدا کی طرف سے امتحان و آزمائش سمجھیں اور یہ یقین کریں کہ یہ دنیا اور دنیا کی ساری کلفتیں اور پریشانیاں مرد مؤمن کے لئے ایک ایسا وقفہ حیات ہے۔ جس میں اگر صبر و استغناء اور اللہ کی ذات پر توکل و اعتماد کی دولت نصیب ہوگئی تو کبھی نہ کبھی دنیا میں بھی حالات تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اور آخرت کی فلاح و کامیابی تو یقیناً نصیب ہوگی اور یہاں کی ساری کلفتیں اور پریشانیاں وہاں کی بے پایاں نعمتوں اور لازوال آسائشوں میں تبدیل ہو جائیں گی! حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ۔

"یہ دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔"

اور جو مسلمان اس قید خانہ کی تکلیف و مصائب کو خندہ پیشانی کے ساتھ انگیز کرے ان کے لئے خدا نے آخرت کے بے پایاں انعامات کا وعدہ کیا ہے، قرآن کریم میں ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۝۔

"(اے مؤمن) تجھ کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے۔ (کیونکہ یہ) چند روزہ بہار ہے پھر ان کا ٹھکانہ (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہوگا اور وہ برا ہی آرام گاہ ہے۔ لیکن جو لوگ (ان میں سے) خدا سے ڈریں (اور مسلمان و مطیع ہو جاویں) ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔ یہ (ان کی) مہمانی ہوگی، اللہ کی طرف سے، اور جو چیزیں خدا کے پاس ہیں یہ نیک بندوں کے لئے بدرجہا بہتر ہیں۔"

منقول ہے کہ بعض صحابہؓ جب کفار و مشرکین کی تجارتی سرگرمیوں ان کے یہاں مال و دولت کی ریل پیل اور ان کو دنیا کی راحت و آسائش میں دیکھتے تو ان کی زبان پر یہ الفاظ آجاتے تھے کہ یہ لوگ جو خدا کے دشمن ہیں ان کا حال تو ہم بڑا اچھا دیکھتے ہیں لیکن ہم محنت و مشقت کی سختیوں اور افلاس و بھوک کی جانکاہیوں سے دم توڑتے نظر آرہے ہیں۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو بتایا گیا کہ دنیا کا یہ آرام و چین اور یہاں کی ساری آسائش و راحت چند روزہ ہے ان کو جلد ہی فنا ہونا ہے لیکن تمہیں آخرت کا جو آرام و چین اور وہاں کی جو آسائشیں اور راحت نصیب ہونے والی ہیں وہ لازوال ہیں جن کو کبھی فنا نہیں آئے گی، لہٰذا تم لوگ فنا ہونے والے چین و آرام اور چند روزہ راحت و آسائش کی تمنا نہ کرو۔ بلکہ ان نعمتوں کے امیدوار رہو جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔

جس طرح فقر و افلاس بسا اوقات کفر کی حد تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح بسا اوقات مال و دولت کی زیادتی بھی گمراہ کر دیتی ہے۔ دولتمندی کا نشہ انسان کو تمرد و سرکشی میں مبتلا کر دیتا ہے اور حد سے زیادہ راحت و آسائش کا فتنہ گناہ معصیت کے اندھیروں میں پھینک دیتا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے خواہ مالداری ہو یا افلاس ان دونوں کا معتدل طور پر رہنا انسانی زندگی کو گمراہی و ضلالت سے بچا سکتا ہے چنانچہ وہ فقر و افلاس جس کو انگیز کیا جا سکتا ہو مایوسی اور کفر کی حد تک پہنچنے سے روکے رکھتا ہے اور بقدر ضرورت مال و دولت کا ملنا سرمایہ داری کے نشہ سے محفوظ رکھتا ہے جس کی وجہ سے تمرد و سرکشی اور گناہ و معصیت کا خدشہ نہیں رہتا لہٰذا خیر الامور اوسطہا کا اصول ان دونوں پر بھی صادق آتا ہے۔

حدیث کے دوسرے جزو "اور حسد، قریب ہے کہ تقدیر الٰہی پر غالب آجائے" کا مطلب یہ ہے کہ بفرض محال کوئی چیز ایسی ہوتی جو تقدیر پر غالب آجانے اور اس کو بدل دینے کی طاقت رکھتی تو وہ حسد ہوتا اور بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حسد، حاسد کو اس گمراہ کن گمان تک لے جاتا ہے کہ وہ تقدیر الٰہی کو بھی بدل سکتا ہے۔

عذر خواہی کو قبول کرو

(۲۵) وَعَنْ جَابِرٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اعْتَذَرَ اِلٰى اَخِيْهِ فَلَمْ يَعْذِرْهُ اَوْلَمْ يَقْبَلْ عُذْرَهُ كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ خَطِيْئَةِ صَاحِبِ مَكْسٍ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ الْمَكَّاسُ الْعَشَّارُ۔

"اور حضرت جابرؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی سے (اپنے کسی قصور پر) عذر خواہی کرے اور وہ مسلمان شخص اس کو معذور نہ قرار دے (یعنی اس کے عذر کو ناقابل تسلیم قرار دیدے اور کہے کہ تمہیں کوئی عذر لاحق نہیں ہے بلکہ عذر خواہی کے نام پر جھوٹ بول رہے ہو) یا اس کے عذر کو قبول نہ کرے (یعنی یوں کہے کہ تم عذر تو رکھتے ہو مگر میں تمہارے

عذر کو قبول نہیں کرتا) تو وہ اسی درجہ کا گنہ گار ہوگا جس درجہ کا صاحب مکس گنہ گار ہوتا ہے ان دونوں حدیثوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ مکاس عشر لینے والے کو کہتے ہیں۔"

تشریح: "مکس" کے معنی ہیں محصول لینا، اسی اعتبار سے عشر لینے والے کو مکاس کہا جاتا ہے۔ اور عام طور پر صاحب مکس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے۔ جو از راہ ظلم و تعدی ناحق محصولات وصول کرے ناحق اور خلاف شرع محصولات لگانے اور وصول کرنے کا گناہ بہت سخت ہے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ صاحب مکس جنت میں نہیں جائے گا۔ عذر خواہی کو قبول نہ کرنے والے اور صاحب مکس کے درمیان مشابہت کی وجہ شاید یہ ہے کہ مذکورہ شخص کی طرح مکس بھی محصول دہندہ کے کسی عذر اور دلیل کو قبول نہیں کرتا، کوئی تاجر لاکھ کہے کہ مجھ پر اس قدر محصول عائد نہیں ہوتا یا میرے پاس مال تجارت کا نہیں ہے بلکہ امانت کا ہے اور یا یہ کہ میں قرضدار ہوں، یہ محصول ادا نہیں کر سکتا وغیرہ وغیرہ مگر وہ اس کی کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا اور اس سے زبردستی محصول وصول کر لیتا ہے۔

عذر خواہی کو قبول نہ کرنے کی مذمت اور اس کے گناہ کے بارے میں اور احادیث بھی منقول ہیں، چنانچہ طبرانیؒ نے اوسط میں حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

مَنِ اعْتَذَرَ اِلٰی اَخِیْہِ المسلم فلم یقبل عذرہ لَم یرد علی الحوض۔

"اگر کسی شخص نے اپنے کسی مسلمان بھائی سے عذر خواہی کی اور اس نے اس کے عذر کو قبول نہیں کیا تو اس کو حوض کوثر پر آنا نصیب نہیں ہوگا۔"

طبرانیؒ اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں برا شخص کون ہے؟ صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ ہاں! اگر آپ ﷺ بہتر سمجھیں تو ضرور بتائیں حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں برا شخص وہ ہے جو تنہا کسی منزل پر اترے اپنے غلام کو کوڑے مارے اور (محتاج و ضرور تمند وں کو) اپنی عطا و بخشش سے محروم رکھے۔" پھر فرمایا "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے بھی برا شخص کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں! اگر آپ (ﷺ) بہتر سمجھیں تو ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص کہ جو قصور (کرنے والے کے عذر) کو تسلیم نہ کرے، معذرت کو قبول نہ کرنے اور خطا کو معاف نہ کرے۔" پھر فرمایا۔ "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے بھی برا شخص کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں! اگر آپ (ﷺ) بہتر سمجھیں تو ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص کہ جس سے خیر و بھلائی کی توقع نہ ہو اور نہ اس کی فتنہ انگیزیوں سے امن ملتا ہو۔"

حاکمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "لوگوں کو عورتوں کے تئیں پاکدامن رکھو (یعنی تم دوسروں کی عورتوں پر بری نظر نہ رکھو تمہاری عورتیں دوسرے لوگوں سے اپنے دامن عفت کو محفوظ رکھیں گی) تم اپنے باپ سے اچھا سلوک کرو۔ تمہارے بیٹے تم سے اچھا سلوک کریں گے اور جس شخص کے پاس اس کا کوئی مسلمان بھائی (اپنے کسی قصور پر) عذر خواہ بن کر آئے تو چاہئے کہ اس کی عذر خواہی کو قبول کیا جائے خواہ اس کی عذر خواہی صحیح ہو یا غلط، اگر اس نے اپنے اس مسلمان بھائی کی عذر خواہی کو قبول نہیں کیا تو (وہ یاد رکھے کہ) اس کو حوض کوثر پر آنا نصیب نہیں ہوگا۔" (حاکمؒ نے اس روایت کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔

بَابُ الْحَذْرِ وَالتَّاَنِّیْ فِی الْاُمُوْرِ

معاملات میں احتراز اور توقف کرنے کا بیان

حذر حا اور ذال کے زبر اور راء کے جزم کے ساتھ) کے معنی ہیں بچنا، پرہیز کرنا، چوکنا رہنا۔ اور حذر حا کے زبر اور ذال کے زیر کے ساتھ) بیدار و مستعد مرد کو کہتے ہیں۔

تانی کے معنی ہیں کسی کام و معاملہ میں جلد بازی اختیار کرنے کے بجائے توقف و تاخیر کرنا اور اچھی طرح غور و فکر کر لینا" عنوان بالا کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ لوگوں کے شر زمانہ کی آفات اور ماحول و معاشرہ کے فتنہ و فساد سے اپنے آپ کو بچائے ان آفات و فتنہ و فساد کا تعلق خواہ دنیاوی نقصانات و مضرات سے ہو یا دینی و اخروی نقصان و تباہی سے اسی طرح چاہئے کہ وہ اپنے کام اور معاملات میں ہمیشہ ہوشیار اور چوکنا رہے، عجلت پسندی اور جلد بازی سے احتراز کرے حلم و وقار اختیار کرے اپنے ہر ارادہ و عمل پر اچھی طرح غور فکر کیا کرے اور ہر کام کے انجام و مآل پر بہر صورت نظر رکھے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ایک حکیمانہ اصول

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَیْنِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مؤمن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لدغ کے معنی ہیں ڈسنا، سانپ اور بچھو کا کاٹنا۔ جحر (پہلے جیم اور پر حاء) سوراخ اور بل کو کہتے ہیں جو سانپ اور بچھو وغیرہ کا مسکن ہوتا ہے۔

حدیث کا مقصد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ مؤمن دانا، جو حق و انصاف کا علمبردار اور دین کا حامی و محافظ ہوتا ہے اس کی شان یہ ہے کہ وہ کسی عہد شکن اور سرکش سے، جو دین کا دشمن ہے درگزر نہ کرے خدا کی راہ میں اور خدا کی خاطر اس کو اپنے غضب و انتقام کا نشانہ بنانے سے نہ چوکے، بار بار حلم و بردباری اور چشم پوشی کا رویہ اختیار نہ کرے اور اس کے دھوکہ و فریب میں نہ آئے واضح رہے کہ کسی دنیاوی معاملہ میں فریب کھا جانا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا مگر دین کے معاملہ میں ہرگز فریب نہ کھانا چاہئے۔

علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ ارشاد گرامی میں سے جس حکیمانہ اصول کی طرف اشارہ کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک عظیم الشان تعلیم ہے جس کی بنیاد دین کی رعایت و حمایت اور دشمنان دین کے شر و فساد کی بیخ کنی پر ہے۔

مذکورہ بالا ارشاد گرامی کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ زمانہ رسالت میں عرب کا ایک بڑا مشہور شاعر ابوغرہ تھا، اور اس کا تعلق کفار کے اس طبقہ سے تھا جو اسلام، ذات رسالت پناہ اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت اور سب و شتم کے پہاڑ تراشنے پر مامور تھا، چنانچہ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کی ہجو کیا کرتا تھا اور اپنی قوم کے شریر لوگوں کو مسلمانوں کی ایذاء و اہانت پر اکسایا کرتا تھا جب بدر کے میدان میں حق و باطل کے درمیان پہلی معرکہ آرائی ہوئی اور خدا نے اپنے مٹھی بھر بندوں کو دشمنان دین پر فتح عطا فرمائی اور مکہ کے بہت سارے کفار جس میں ان کے زعماء و اساطین بھی تھے۔ قیدی بنا کر مدینہ منورہ لئے گئے تو ان میں وہ بدبخت شاعر ابوغرہ بھی تھا اس نے بارگاہ رسالت میں اپنے پچھلے سیاہ کارناموں پر اظہار ندامت کیا اور عفو خواہی کے ساتھ یہ عہد و اقرار کیا کہ اب میں کبھی بھی ایسے افعال بد کے پاس نہیں پھٹکوں گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کو اس بدبخت پر رحم و کرم کرنے کا موقع مل گیا اور آپ ﷺ نے اس کے عہد و پیمان کی بنیاد پر اس کو رہا کر دیا۔ لیکن اس کی ازلی شقاوت و بدبختی نے اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور وہ اپنی قوم میں پہنچ کر پہلی روش پر چلنے لگا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دوبارہ، جنگ احد کے موقع پر، قیدی کی حیثیت سے بارگاہ رسالت میں پہنچا دیا۔ اس نے اس مرتبہ بھی وہی حربہ استعمال کیا اور اظہار ندامت و عفو خواہی کے ساتھ امان چاہنے لگا اور آئندہ اپنی ان حرکتوں سے باز رہنے کا عہد و پیمان کیا لیکن آنحضرت ﷺ نے اس کو معاف نہیں کیا اور اس کو جہنم رسید کر دینے کا حکم فرما دیا، چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ اس وقت جب بعض لوگوں نے اس کی سفارش کی اور حضور ﷺ سے درخواست کی کہ اس کو ایک مرتبہ اور معاف فرما دیا جائے تو حضور ﷺ نے فرمایا۔ "مؤمن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔"

حلم و بردباری اور توقف و آہستگی کی فضیلت

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاَشَجِّ عَبْدِالْقَیْسِ اِنَّ فِیْکَ لَخَصْلَتَیْنِ یُحِبُّھُمَا اللّٰہُ الْحِلْمُ وَالْاَنَاۃُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبیلہ عبدالقیس کے سردار اشج سے فرمایا کہ تمہارے اندر جو دو خوبیاں ہیں ان کو اللہ تعالیٰ بہت پسند کرتا ہے (خواہ وہ کسی شخص میں ہوں حلم و بردباری اور دوسرے توقف و آہستگی۔" (مسلم)

تشریح: عبدالقیس، ایک قبیلہ کا نام ہے۔ جب اس قبیلہ کے لوگ آنحضرت ﷺ کی زیارت وملاقات کے لئے مدینہ آئے اور مسجد نبوی کے سامنے پہنچے تو آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر فرط شوق سے اپنے اونٹوں سے کود پڑے بے تابانہ اور دیوانہ وار دوڑتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور آنحضرت ﷺ کے تئیں محبت وعقیدت اور شوق ملاقات کی بیقراری کا اظہار نہایت جذباتی طور پر کیا آنحضرت ﷺ نے ان کی اس بیقرار ومضطرب حالت کو دیکھا تو سکوت فرمایا اور ان سے کچھ نہیں کہا لیکن یہ لوگ جس عظیم المرتبت شخصیت اور اپنے سردار یعنی اشج کی زیر قیادت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور جن کا اصل نام منذرؓ تھا ان کی کیفیت بالکل دوسری تھی وہ پہلے اپنی قیامگاہ پر اترے وہاں انہوں نے اپنے تمام رفقاء کا سامان جمع کیا اور ساری چیزوں کو باندھ کر اطمینان کے ساتھ نہائے دھوئے، نہایت نفیس و پاکیزہ کپڑے زیب تن کئے اور پھر انتہائی وقار و تمکنت کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسجد نبوی میں آئے وہاں دو رکعت نماز ادا کی دعا مانگی اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو ان کی یہ وضع اور روش بہت پسند آئی، اور ان سے مذکورہ بالا الفاظ ارشاد فرمائے۔

ایک روایت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے ان میں ان دونوں خوبیوں کا ہونا بیان فرمایا، تو انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے اندر جو یہ دو خوبیاں ہیں ان کو میں نے ازراہ تکلف اختیار کیا ہے اور میری خود ساختہ ہیں یا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں خوبیوں کو میری فطرت میں پیدا کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ان دونوں خوبیوں کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مزاج و فطرت میں ودیعت فرمایا ہے۔" (یہ سن کر) انہوں نے کہا کہ۔ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر واحسان کہ اس نے مجھ کو ان دو خوبیوں کے ساتھ استوار کیا جن کو خدا اور اس کا رسول ﷺ پسند کرتا ہے یعنی اگر یہ دونوں خوبیاں میری خود ساختہ اور ازراہ تکلف اختیار کی ہوئی ہوتیں تو ان کے زائل ہو جانے یا ان میں نقصان پیدا ہو جانے کا خدشہ ہوتا مگر چونکہ فطری ہیں اور خدا کی عطا کی ہوئی ہیں اس لئے میں بجا طور پر امید رکھتا ہوں کہ یہ دونوں میرے اندر ہمیشہ رہیں گی اور باقی رہیں گی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آہستگی و بردباری کی فضیلت اور جلد بازی کی مذمت

(۳) عَنْ سَھْلِ بْنِ سَعْدِ السَّاعِدِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاَنَاۃُ مِنَ اللّٰہِ وَالْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ وَقَدْ تَکَلَّمَ بَعْضُ اَھْلِ الْحَدِیْثِ فِیْ عَبْدِالْمُھَیْمِنِ بْنِ عَبَّاسٍ الرَّاوِیْ مِنْ قِبَلِ حِفْظِہٖ۔

"حضرت سہل ابن ساعد ساعدیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "کسی کام میں آہستگی و بردباری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے (یعنی یہ خوبی الہام خداوندی کے ذریعہ کسی انسان کو حاصل ہوتی ہے) اور جلد بازی شیطان کی خصلت ہے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، نیز بعض محدثین نے (اس حدیث کے راوی) عبدالمہیمن ابن عباسؓ کی یادداشت کے بارے میں

کلام کیا ہے (یعنی انہوں نے کہا ہے کہ عبد المہیمن کا حافظہ زیادہ اچھا نہیں تھا اگرچہ ان کے عدل و ثقہ میں کوئی شبہ نہیں۔"

تشریح: اس حدیث کو بیہقیؒ نے بھی شعب الایمان میں بطریق مرفوع نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ کہ اَلتَّانِیْ مِنَ اللّٰہِ وَالْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ۔

اور جلد بازی شیطان کی خصلت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کسی دنیاوی کام میں غور و فکر نہ کرنا، اس کے انجام پر نظر رکھے بغیر اس کو شروع کر دینا اور جلد بازی کی روش اختیار کرنا ایک ایسی خصلت ہے جس کو شیطان وسوسوں اور واہمات کے ذریعہ انسان میں پیدا کرتا ہے جس سے اس کا مقصد اس کے کام کو خراب کرنا اور خود اس کو پریشانیوں میں مبتلا کرنا ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس سے وہ امور مستثنیٰ ہیں جن کی خیر و برکت میں کوئی شبہ یعنی اچھی چیزوں میں عجلت کرنا شیطان کی خصلت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ۔

ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ (جہاں تک عبادات و طاعات کا تعلق ہے تو جاننا چاہئے کہ) ایک تو کسی عبادت و طاعت کی طرف سرعت و جلد روی کو اختیار کرنا ہے۔ اور دوسرے اس عبادت و طاعت کو کرتے وقت جلد بازی کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے، چنانچہ اول الذکر ایک مطلوب و مستحسن چیز ہے اور ثانی الذکر ایک مذموم خصلت ہے اس بات کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک تو نماز کے لئے جلدی کرنا ہے اور ایک نماز میں جلدی کرنا ہے، نماز کے لے جلدی کرنا تو یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اس کو ادا کرنے میں تاخیر نہ کرے جلدی جلدی تیاری کرے اور نماز پڑھنے لگے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ اس "جلدی بازی" میں شامل نہیں ہے جس کی برائی بیان کی گئی ہے۔ بلکہ یہ ایک مستحسن و مطلوب فعل ہے۔ اور (نماز میں جلدی کرنا) یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے لگے تو اس نماز سے جلد از جلد فارغ ہو جانے کی خاطر اس کے ارکان و افعال کی ادائیگی میں عجلت کرنے لگے یہ چیز یعنی کسی نیک کام کو جلد بازی سے پورا کرنا مذموم ہے۔ لہٰذا ملا علی قاریؒ کے مذکورہ بالا الفاظ کا حاصل یہ نکلا کہ فرط شوق سے کسی اچھے کام کی طرف لپکنا اور اس کی انجام دہی کے لئے جلد سے جلد تیار ہونا ایک اچھی چیز ہے۔ اور اس اچھے کام کو جلد بازی کے ساتھ کرنا ایک بری چیز ہے۔

تجربہ سب سے بڑی دانائی ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا حَلِیْمَ اِلَّا ذُوْ عَثْرَۃٍ وَلَا حَکِیْمَ اِلَّا ذُوْ تَجْرِبَۃٍ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص کامل بردبار نہیں ہوتا جب تک اس کو لغزش نہ ہوئی ہو اور کوئی شخص کامل حکیم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو تجربہ حاصل نہ ہو" اس روایت کو احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ حلم و بردباری اور لحاظ و مروت کا جوہر اسی شخص میں ہوتا ہے جس نے دھوکا کھایا ہو لغزشوں اور خطاؤں سے دوچار ہوا ہو گناہ و معصیت کا مرتکب ہو چکا ہو اور اپنے معاملات میں خلل و نقصان برداشت کر چکا ہو، اور ہوشیار ہونے کے بعد ندامت و خجالت کا بار گراں کاندھوں پر اٹھائے پھرا ہو! ظاہر ہے کہ ایسا شخص چونکہ اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے کہ کسی کے دکھ درد اور نفع و نقصان کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ کسی کے عیوب کو چھپانے اور کسی کی خطاؤں سے درگزر کرنے کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کے تئیں حلیم و بردبار اور خیر خواہ ہوتا ہے لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے اور اگر کسی سے کوئی خطا و لغزش ہو جاتی ہے تو اس سے درگزر کرتا ہے۔

حکیم اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو دانا و عقلمند، راست بار اور استوار کار ہو، کیونکہ حکمت کے معنی ہیں ہر چیز کی حقیقت و

اصلیت کو جاننا! اور "تجربہ" کا مطلب ہے کاموں کی واقفیت حاصل ہونا اور کسی کام کو کرنے کا طریقہ جاننا لہٰذا فرمایا گیا کہ جس شخص کو اشیاء کی حقیقت و پہچان حاصل ہوئی ہر چیز کے نفع نقصان سے آگاہ ہوا، حالات کے اتار چڑھاؤ اور معاملات و افراد کی بھلائی برائی سے وقف ہوا اس کو "حکمت کی دولت مل گئی اور وہ "کامل حکیم" ہوا۔

اور اگر "حکیم" سے طبیب و معالج مراد لیا جائے تو بھی مطلب بالکل صاف ہے کہ کوئی شخص محض علم طب پڑھنے سے کامل طبیب و معالج نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے لئے تجربہ اور معالجہ کی مشق و مزادلت ضروری ہے۔

وہی کام کرو، جس کا انجام اچھا نظر آئے

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِيْ فَقَالَ خُذِالْاَ مْرَبِالتَّدْبِيْرِ فَاِنْ رَأَيْتَ فِيْ عَاقِبَتِهٖ خَيْرًا فَامْضِهٖ وَاِنْ خِفْتَ غَيًّا فَاَمْسِكْ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ حضرت (ﷺ) مجھ کو (کوئی ایسی) وصیت فرما دیجئے (جس پر میں اپنے کاموں اور معاملات میں عمل کروں اور جس کی وجہ سے میرا کوئی کام و عمل بگڑنے نہ پائے) حضور ﷺ نے فرمایا "تم جب بھی کسی کام کو (کرنے کا ارادہ) کرو تو تدبر اختیار کرو! (یعنی انجام) پر نظر ڈال لو اور اس کے تمام مصلح و مفاسد پر اچھی طرح غور و فکر کر لو) اور پھر اگر تمہیں اس کام کے انجام میں (دینی و دنیوی) خیر و بھلائی نظر آئے تو اس کو کرو اور اگر تمہیں اس کے انجام میں (کسی دینی یا دنیوی) گمراہی واخروی خوف محسوس ہو تو اس کو چھوڑ دو۔" (شرح السنۃ)

توقف و تاخیر نہ کرو

⑥ وَعَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ الْاَعْمَشُ لَا اَعْلَمُهٗ اِلَّا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ التُّؤَدَةُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ خَيْرٌ اِلَّا فِيْ عَمَلِ الْاٰخِرَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مصعب ابن سعدؒ نے اپنے والد (حضرت سعدؓ) سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے بارے میں (حدیث کے راوی) حضرت اعمش کہتے ہیں۔ کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس حدیث کو حضرت سعدؓ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے (اور وہ یوں ہے کہ) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "توقف و تاخیر ہر عمل میں بہتر ہے مگر آخرت کے عمل میں نہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں توقف و تاخیر نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کو فوراً کر لینا چاہیے۔ کیونکہ نیک کام میں تاخیر کا مطلب بہت سی آفات اور کوتاہیوں کا خطرہ مول لینا ہے علاوہ ازیں دنیاوی امور کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی دنیاوی کام کو کیا جائے تو ابتداء میں عام طور پر اس کے انجام کا حال معلوم نہیں ہوتا کہ آیا اس کام کا انجام یقینی طور پر اچھا ہوگا۔ جس کی وجہ سے اس کو فوراً کر لینا ضروری ہو یا اچھا نہیں ہوگا۔ کہ اس کے کرنے میں تاخیر کی جائے لہٰذا تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے دنیاوی معاملات میں توقف و تاخیر اختیار کرو اور کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے اچھی طرح غور و فکر کر لو، اس کے برخلاف دینی کاموں کا انجام چونکہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا علم نہ ہو اس لئے ان میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہوتی علاوہ ازیں قرآن کریم میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔

"نیکی و بھلائی کے کاموں میں سبقت و عجلت کرو اور مغفرت و بخشش کی طرف لپکو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔"

تشریح: امام غزالیؒ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ مؤمن کے لئے مناسب یہ ہے کہ جونہی اس کے دل میں خدا کے نام پر اپنا مال خرچ کرنے کا داعیہ پیدا ہو تو وہ اس نیک کام میں قطعاً توقف و تاخیر نہ کرے، کیونکہ جب کوئی شخص اللہ

کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا چاہتا ہے تو شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالنے لگتا ہے کہ اگر اپنا مال خرچ کیا تو کنگال ہو جاؤ گے اسی طرح وہ اس کو فقر وافلاس سے ڈراتا ہے اور صدقہ وخیرات کرنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا توقف وتاخیر کرنے کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ کہ وقت گزرنے کے ساتھ شیطان کا داؤ چل جائے اور اس نیکی سے ہاتھ دھونا پڑے۔

ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک دن بیت الخلاء میں تھے کہ انہوں نے وہیں سے اپنے شاگرد کو آواز دی اور کہا کہ میرے بدن کی قمیص اتار کر فلاں شخص کو دیدو، شاگرد نے یہ سن کر کہا کہ یہ بات آپ بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد بھی کہہ سکتے تھے اس قدر بے صبری کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ جیسے ہی میرے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ میں یہ قمیص فلاں ضرور تمند کو دیدوں تو میں نے ارادہ کر لیا کہ فوراً یہ نیک کام کرلوں۔ کیوں کہ میں اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کرسکتا نہ معلوم اس کا ارادہ کب بدل جائے اور میں اس نیکی سے محروم رہ جاؤں۔

نبوت سے تعلّق رکھنے والی صفات کا ذکر

(۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَرْجِس اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ السَّمْتُ الْحَسَنُ وَالتُّؤَدَۃُ وَالْاِقْتِصَادُ جُزْءٌ مِنْ اَرْبَعٍ وَعِشْرِیْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّۃِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن سرجسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "نیک راہ روش، کسی کام میں آہستگی اور غور و فکر کے لئے تاخیر کرنا، اور میانہ روی وہ خوبیاں ہیں جو نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "میانہ روی" کے معنی ہیں ہر کام اور ہر حالت میں درمیانی راہ اختیار کرنا اور افراط و تفریط (یعنی زیادتی اور کمی) سے اجتناب کرنا جیسے خرچ کرنے میں نہ تو اسراف کرنا اور نہ بخل کرنا بلکہ درمیانی طریقہ یعنی جود و سخاوت اختیار کرنا۔ یا ہمت و حوصلہ کے اظہار کے موقع پر نہ تو تہور دکھانا اور نہ بزدل بن جانا بلکہ درمیانی راہ شجاعت کو اختیار کرنا یا اعتقادی اور نظریاتی معاملات میں بھی میانہ روی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اسی عقیدہ پر اعتماد کیا جائے۔ اور وہی نظریہ اپنایا جائے جو دین و دیانت اور عقل و دانش کے اعتبار سے معتدل سمجھا جاتا ہے مثلاً ایک عقیدہ جبر کا ہے اور ایک قدر کا ہے یہ دونوں عقیدے افراط کے حامل ہیں۔ ان دونوں کے برخلاف درمیانی عقیدہ وہ ہے جو اہل سُنّت والجماعت کا ہے اسی طرح میانہ روی اختیار کرنے کے حکم کا تعلّق معیشت سے بھی ہے۔ اور اس کی درمیانی راہ یہ ہے کہ ضروریات زندگی پر نہ تو اتنا خرچ کیا جائے جو اسراف اور عیش و عشرت کی حد تک ہو اور نہ اس قدر کم خرچ کیا جائے جو تنگی و تکلیف میں مبتلا کردے بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال پیدا کیا جائے جیسا کہ خود ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة۔

"خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا معیشت کا آدھا سرمایہ ہے۔"

غرضیکہ انسانی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر فعل و عمل میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم ہے اور یہی چیز (یعنی ہر ایک امر میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرنا) وہ کمال ہے جو انسان کو اس کی مراد اور اس کے مقاصد تک پہنچاتا ہے کیونکہ بہت دوڑ کر چلنے والا گر پڑتا ہے اور سُست رفتاری سے چلنے والا بچھڑ جاتا ہے، صرف اعتدال کی چال چل کر ہی منزل پر پہنچا جاسکتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر راہِ اعتدال اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور بعض چیزوں کا نام لے کر ذکر فرمایا ہے جیسے ایک جگہ ارشاد ہے کہ واقصد فی مشیک (یعنی اپنی چال میں میانہ روی اپناؤ) اور ایک جگہ یوں فرمایا ہے کہ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَاتُسْرِفُوْا (یعنی کھاؤ اور پیو اور اسراف سے اجتناب کرو۔

بعض عارفینؒ نے کہا ہے کہ علم و عمل میں بھی میانہ روی کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی وجہ سے مختلف علمی و عملی آفات سے بچا جاسکتا ہے چنانچہ حصول علم میں اتنی ہی مشغولیت بہتر ہے جو عمل سے باز نہ رکھے، اور عمل میں اسی قدر انہماک روا ہے، جو حصول علم سے باز نہ

رکھے۔

"نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہیں" کے بارے میں شارحین نے لکھا ہے کہ یا تو یہ سب چیزیں مل کر ایک جزء کا درجہ رکھتی ہیں۔ یا ان میں سے ہر ایک چیز ایک جزء ہے اور اس جزء کا مطلب یہ ہے کہ یہ خوبیاں اور صفات ان خوبیوں اور صفات میں سے ایک ہیں جن سے انبیاء کرام علیہم السلام متصف و مزین ہوتے ہیں۔ رہی یہ بات کی اجزاء نبوت کے عدد کے تعین سے کیا مراد ہے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اس کی مراد صرف شارع ﷺ ہی بیان فرما سکتے تھے۔ جس کو بیان نہیں فرمایا گیا یوں بیان کرنے کو مختلف باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ مگر اس کی حقیقت تک چونکہ نور نبوت کے علاوہ کوئی بھی انسانی فہم و ادراک نہیں پہنچ سکتا اس لئے اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں کہنا چاہئے۔ اور اس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کے سپرد کر دینا چاہئے۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْھَدْیَ الصَّالِحَ وَالسَّمْتَ الصَّالِحَ وَالْاِقْتِصَادَ جُزْءٌ مِّنْ خَمْسٍ وَّعِشْرِیْنَ جُزْءً مِّنَ النُّبُوَّۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نیک سیرت، نیک راہ روش اور میانہ روی وہ خوبیاں ہیں جو نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزو ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

"ہدی صالح" اور "سمت صالح" کے درمیان فرق یہ ہے کہ "ہدی" کا تعلق انسان کے باطنی احوال سے ہے اسی لئے اس کا ترجمہ نیک سیرت کیا گیا ہے۔ جس کو نیک خوئی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور "سمت کا تعلق انسان کے ظاہری احوال و کردار سے ہے اس لئے اس کا ترجمہ "نیک راہ روش" کیا گیا ہے اس کو نیک چلنی بھی کہا جا سکتا ہے۔ راہ سلوک و طریقت میں ان دونوں کا وہی درجہ ہے جو شریعت میں ایمان و اسلام کا ہے اس اعتبار سے نیک خوئی اور نیک چلنی یہ دونوں خوبیاں ایک ساتھ جس مؤمن میں ہوں تو نور علی نور اور اس کے مرتبہ حقیقت کے کامل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

اس حدیث میں ان خوبیوں کو نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزو کہا گیا ہے جب کہ پچھلی حدیث میں چوبیس کا عدد منقول ہوا ہے، لہٰذا دونوں روایتوں میں یہ تفاوت و فرق یا تو کسی راوی کے وہم و خطا میں مبتلا ہو جانے کی بنا پر ہے یا اس میں بھی کوئی بھید ہے کہ حضور ﷺ نے کسی موقع پر تو چوبیس کا عدد ذکر فرمایا اور کسی موقع پر پچیس کا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے تو حضور ﷺ نے یہی فرمایا کہ یہ خوبیاں نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہیں اور پھر آپ ﷺ نے از راہ عنایت ان خوبیوں کا ایک درجہ اور بڑھا دیا اور یہ فرمایا کہ یہ خوبیاں نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء!یا یہ کہ پچھلی حدیث میں جن تین خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ مل کر چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء کا درجہ پاتی ہیں اور اس حدیث میں جن تین خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ مل کر پچیس اجزاء میں سے ایک جزء کا درجہ پاتی ہیں، اس صورت میں یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ یہ راوی کے وہم و خطا میں مبتلا ہو جانے کا نتیجہ ہے کہ اس سے ایک روایت میں چوبیس کا عدد نقل ہو اور ایک روایت میں پچیس کا۔

کسی کا راز امانت کی طرح ہے

⑨ وَعَنْ جَابِرِ ابْنِ عَبْدِاللّٰہِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِیْثَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَھِیَ اَمَانَۃٌ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ ابن عبداللہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جب کوئی شخص (کوئی) ایسی بات کہے (جس کا وہ اخفا چاہتا ہے) اور پھر وہ چلا جائے تو اس کی وہ بات امانت ہے"۔" (ترمذیؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس کی وہ بات، سننے والوں کے لئے ایک امانت کا حکم رکھتی ہے لہٰذا ان کو چاہئے۔ کہ وہ اس امانت میں خیانت

نہ کریں یعنی اس کو ظاہر نہ کریں۔

مشورہ چاہنے والے کو وہی مشورہ دو، جس میں اس کی بھلائی ہو

⑩ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاَبِی الْهَیْثَمِ بْنِ التَّیِّهَانِ هَلْ لَكَ خَادِمٌ قَالَ لَا فَقَالَ فَاِذَا اَتَانَا سَبْیٌ فَاْتِنَا فَاُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِرَاْسَیْنِ فَاَتَاهُ اَبُو الْهَیْثَمِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اخْتَرْ مِنْهُمَا فَقَالَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ اخْتَرْ لِیْ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ خُذْ هٰذَا فَاِنِّیْ رَاَیْتُهٗ یُصَلِّیْ وَاسْتَوْصِ بِهٖ مَعْرُوْفًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے (ایک صحابیؓ) حضرت ابوالہیثم ابن تیہانؓ سے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی خادم ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا! "جب ہمارے پاس کہیں سے غلام آئیں تو تم آجانا (میں تمہیں ایک غلام دیدونگا) چنانچہ (کچھ عرصہ کے بعد) جب نبی کریم ﷺ کے پاس دو غلام لائے گئے تو ابوالہیثمؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ یہ دو غلام ہیں ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے لئے پسند کر لو! ابوالہیثمؓ نے عرض کیا کہ یا نبی اللہ (ﷺ)! آپ ہی میرے لئے کوئی غلام پسند فرما دیجئے! حضور ﷺ نے فرمایا "جس شخص سے مشورہ لیا جائے اس کو امین ہونا چاہئے۔ (یعنی مشیر کو چاہئے کہ مشورہ چاہنے والے کی بھلائی و بہبودی کو بہر صورت ملحوظ رکھے اور وہی مشورہ دے جو اس کے حق میں بہتر ہو! گویا حضور ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ ابوالہیثمؓ پر واضح کیا کہ جب تم نے حق انتخاب میرے سپرد کر دیا ہے اور مجھ سے مشورہ چاہتے ہو تو میں تمہیں وہی غلام دوں گا جو تمہارے لئے بہتر و مناسب ہو اس کے بعد حضور ﷺ نے ان دونوں غلاموں میں سے ایک غلام کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ) اس غلام کو لے جاؤ کیونکہ میں نے اس کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے (یعنی یہ غلام چونکہ نمازی اور دین دار ہے اس لئے تمہارے حق میں بہت اچھا رہے گا) اور اس کے ساتھ اچھا سلوک اور بھلائی اختیار کرنے کی میری وصیت پر ہمیشہ عمل کرنا"۔ (ترمذی)

تشریح: ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ جب حضرت ابوالہیثمؓ اس غلام کو لے کر اپنے گھر آئے اور اہلیہ محترمہؓ سے فرمایا کہ سرکار ﷺ نے مجھ کو یہ غلام عطا کیا ہے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک اور بھلائی کرنے کی وصیت فرمائی ہے تو ان کی بیوی نے کہا کہ اس وصیت پر عمل پیرا ہونے کا حق شاید پوری طرح ادا نہ ہو سکے اس لئے اس کے ساتھ حسن سلوک یہی ہے کہ اس کو آزاد کر دو۔

وہ تین باتیں جو کسی کا راز بھی ہوں تو ان کو ظاہر کر دو

⑪ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ اِلَّا ثَلٰثَةَ مَجَالِسَ سَفْكُ دَمٍ حَرَامٍ اَوْفَرْجٌ حَرَامٌ اَوِاقْتِطَاعُ مَالٍ بِغَیْرِ حَقٍّ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَذُكِرَ حَدِیْثُ اَبِیْ سَعِیْدٍ اِنَّ اَعْظَمَ الْاَمَانَةِ فِیْ بَابِ الْمُبَاشَرَةِ فِی الْفَصْلِ الْاَوَّلِ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مجلسیں، امانت کے ساتھ وابستہ ہیں (یعنی اگر کسی مجلس میں کوئی ایسی بات سنی جائے جس کا افشاء کیا جانا مناسب نہ ہو تو امانت کی طرح اس بات کی حفاظت کرو یعنی نہ اس کو کہیں نقل کرو اور نہ کسی سے اس کی چغل خوری کرو) البتہ تین مجلسیں یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں کہیں کوئی بات کی جائے تو دوسرے تک ان کو پہنچا دینا ضروری ہے (خواہ کہنے والا ان باتوں کو کتنا ہی اہم راز کیوں نہ سمجھے، اور وہ تینوں یہ ہیں (۱) جس خون کو ناحق بہانا حرام ہے اس کو بہانے (یعنی کسی کو ناحق قتل کرنے کے مشورہ وارادہ کی بات)۔ (۲) حرام کاری یعنی زنا کرنے کے مشورہ وارادہ کی بات (۳) کسی کا مال ناحق چھیننے کے مشورہ وارادہ کی بات۔" (ابوداؤدؒ) اور حضرت ابوسعیدؓ کی روایت اِنَّ اَعْظَمَ الْاَمَانَةِ الخ باب المباشرۃ کی پہلی فصل میں ذکر کی جاچکی ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے یہ بات سنے کہ میں فلاں آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں یا فلاں عورت کے ساتھ بدکاری کروں گا یا فلاں شخص کا مال زور وزبردستی ہتھیاؤں گا تو اس طرح کی اس بات سننے والے کو چاہئے کہ وہ اس کو ایسا راز نہ سمجھے جس کو پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کو فوراً ظاہر کر دے یعنی اس بات سے متعلقہ لوگوں کو آگاہ کر دے تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں اور اپنے آپ کو بچائیں اسی طرح اس مجلس کی باتوں کا افشاء کرنا بھی جائز ہے جن میں دین وملت اور قوم کو نقصان پہنچانے پر گفتگو وتجویز ہوئی ہو! یہ مطلب حضرت شیخ عبدالحق نے لکھا ہے۔

اور ملا علی قاری نے اس حدیث کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں مطلب یہ ہے کہ ایک مؤمن کے لئے مناسب یہ ہے کہ اگر وہ کسی مجلس میں لوگوں کو کوئی برا کام کرتے دیکھے تو وہ ان کی اس بدعملی کا چرچا کرتا نہ پھرے البتہ تین مجلسیں ایسی ہیں کہ ان میں کی جانے والی برائیوں کا چرچا کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے ایک مجلس وہ ہے جس میں کسی کو ناحق قتل کیا جا رہا ہو، دوسری مجلس وہ ہے جس میں کسی عورت کی عصمت لوٹی جا رہی ہو اور تیسری مجلس وہ ہے جس میں کسی شخص کا مال ناحق ہتھیایا جا رہا ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عقل کی تعریف واہمیت

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ قَالَ لَهٗ قُمْ فَقَامَ ثُمَّ قَالَ لَهٗ اَدْبِرْ فَاَدْبَرَ ثُمَّ قَالَ اَقْبِلْ فَاَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ لَهُ اقْعُدْ فَقَعَدَ ثُمَّ قَالَ لَهٗ مَا خَلَقْتُ خَلْقًا هُوَ خَیْرٌ مِّنْكَ وَلَا اَفْضَلُ مِنْكَ وَلَا اَحْسَنُ مِنْكَ بِكَ اٰخُذُ وَبِكَ اُعْطِیْ وَبِكَ اُعْرَفُ وَبِكَ اُعَاتِبُ وَبِكَ الثَّوَابُ وَعَلَیْكَ الْعِقَابُ وَقَدْ تَكَلَّمَ فِیْهِ بَعْضُ الْعُلَمَآءِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا کہ کھڑی ہو جا! وہ کھڑی ہو گئی پھر اس سے فرمایا کہ پشت پھیر اس نے پشت پھیر لی، پھر اس سے فرمایا کہ میری طرف منہ کر، اس نے خدا کی طرف منہ کر لیا پھر اس سے فرمایا کہ بیٹھ جا! وہ بیٹھ گی اور پھر اس سے فرمایا کہ "میں نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو تجھ سے بہتر ہو، فضل و کمال میں تجھ سے بڑھی ہوئی ہو اور خوبیوں میں تجھ سے اچھی ہو میں تیرے ہی سبب سے (بندوں سے عبادت) لیتا ہوں (یعنی تیری رہنمائی کے ذریعہ بندے میری عبادت کرتے ہیں یا یہ کہ تیرے ہی سبب بندوں سے نعمتیں واپس لے لیتا ہوں، بایں طور کہ جو بندے تیرے بارے میں کوتاہی کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔ تو وہ میرے غضب میں مبتلا ہو کر میرے انعامات سے محروم ہو جاتے ہیں) میں تیرے ہی سبب سے (بندوں کو ثواب ودرجات) دیتا ہوں (یا یہ کہ میں جس بندے کو نعمت دیتا ہوں تیرے ہی واسطے دیتا ہوں کہ جس نے تیرے لئے محنت ومشقت اختیار کی اس کو اجر وانعام کا مستحق گردانتا ہوں) میں تیرے ہی سبب سے پہچانا جاتا ہوں میں تیرے ہی سبب غضبناک ہوتا ہوں میں تیرے ہی سبب سے ثواب دیتا ہوں اور تیرے ہی سبب سے عذاب دیتا ہوں (حاصل یہ کہ دنیا وآخرت میں انسان کا احکام خداوندی کا مکلف ومخاطب بننا، خدا کی رضا وخوشنودی اور اس کے غیظ وغضب کا مورد بننا اور ثواب وعذاب کا مستحق ومستوجب گردانا جانا، ان سب کا مدار عقل پر ہے) بعض علماء نے اس حدیث کے صحیح ہونے میں کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔"

تشریح: حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کو جسم کے ساتھ پیدا کیا تھا، جیسا کہ قیامت میں حساب کتاب کے بعد موت کو دنبہ کی صورت میں لایا جائے گا اور پھر اس کو جنت دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔

قیامت کے دن عقل کے مطابق جزاء ملے گی

⑬ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَكُوْنُ مِنْ اَهْلِ الصَّلٰوةِ وَالصَّوْمِ وَالزَّكٰوةِ

وَالْحجِّ وَالْعُمْرَةِ حَتّٰی ذَكَرَ سِهَامَ الْخَيْرِ كُلَّهَا وَمَا يُجْزٰى يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلَّا بِقَدْرِ عَقْلِهٖ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایک شخص جو نماز پڑھنے والوں میں سے ہو، روزہ رکھنے والوں میں سے ہو، زکوٰۃ دینے والوں میں سے ہو، حج اور عمرہ کرنے والوں میں سے ہو۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اسی طرح نیکی اور بھلائی سے متعلق ساری بڑی بڑی چیزوں کا ذکر کیا اور فرمایا کہ لیکن وہ قیامت کے دن اپنی عقل کے مطابق جزاء پائے گا"۔

تشریح: ان حدیثوں میں "عقل" سے مراد وہ اعلیٰ جوہر ہے جس کے ذریعہ انسان اشیاء و اسباب کی حقیقت کا ادراک کرتا ہے، دنیا و آخرت کی بھلائیوں اور برائیوں کو معلوم کرتا ہے نیکی اور بدی کے درمیان فرق و امتیاز کرتا ہے، نفس کی آفات اور گمراہیوں سے اجتناب کرتا ہے، نیک راہ و روش اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب و اتصال حاصل کرتا ہے۔ بعض عارفین کے کلام میں جس "عقل معاد" کا ذکر آتا ہے اس سے یہی عقل مراد ہے یہ اعلیٰ جوہر جس شخص میں جس نوعیت و مقدار کا ہوتا ہے اس کے اندر مذکورہ بالا اوصاف بھی اسی کے تناسب سے ہوتے ہیں اسی لئے فرمایا گیا ہے جس شخص میں جتنی عقل ہوگی اس کو قیامت کے دن اسی کے مطابق جزاء دی جائے گی کیونکہ خدا کی طرف سے جزاو انعام کا مدار محض عبادت و طاعت یا عبادات و طاعات کی مقدار پر نہیں ہوگا بلکہ عبادت کے حسن و کمال پر ہوگا اور ظاہر ہے کہ عبادات و طاعات میں حسن و کمال کیفیت و کمیت اسی عقل سے متعلق ہے۔

اسی موقع پر علماء اس بارے میں بحث و اختلاف کرتے ہیں کہ آیا علم افضل ہے یا عقل چنانچہ بعض حضرات علم کو افضل قرار دیتے ہیں اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ علم کی بہ نسبت عقل افضل ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ علم کا معنوی اطلاق بھی قوت تمیز و معرفت پر ہوتا ہے۔ جو عقل سے روشنی پاتی ہے تو اس صورت میں بحث اختلاف کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس اعتبار سے یہ بات البتہ کہی جاسکتی ہے کہ علم و عقل کو عمل و عبادت پر فضیلت حاصل ہے۔ چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ صاحب عقل عالم کی ایک رکعت نماز دوسرے لوگوں کی ایک ہزار رکعتوں سے افضل قرار پائے گی۔

تدبر کی فضیلت

⑭ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَاذَرٍّ لَا عَقْلَ كَالتَّدْبِيْرِ وَلَا وَرَعَ كَالْكَفِّ وَلَا حَسَبَ كَحُسْنِ الْخُلُقِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ یہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ابوذر (جان لو) عقل تدبیر کے برابر نہیں، ورع یعنی پرہیزگاری اجتناب و احتیاط کے برابر نہیں اور حسب و فضیلت خوش خلقی کے برابر نہیں ہے۔"

تشریح: "تدبیر" کے معنی ہیں ہر کام کے انجام پر نظر رکھ کر اس کے لئے سامان کرنا۔ لہٰذا "عقل تدبیر کے مانند نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی عقل، عقل تدبیر (وہ عقل کہ جس کے ساتھ تدبیر ہو) کے برابر نہیں ہوسکتی! گویا مذکورہ جملہ میں "عقل" سے مراد مطلق علم و ادراک ہے "تدبیر" سے مراد ہے عقل تدبیر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی کام کیا جائے پہلے اس کے انجام پر نظر رکھی جائے اور اس میں جو بھلائیاں و برائیاں ہوں ان کو پہچانا جائے۔

ورع کے معنی پرہیزگاری کے ہیں جس کو تقویٰ بھی کہا جاتا ہے اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک ورع اور تقویٰ کے درمیان بھی فرق ہے وہ کہتے ہیں کہ ورع کا درجہ تقویٰ کے درجہ سے بڑھا ہوا ہے بایں طور پر کہ تقویٰ کا مطلب ہے حرام چیزوں سے پرہیز کرنا اور تورع کا مطلب ہے ان چیزوں سے بھی پرہیز کرنا جو مکروہ یا مشتبہ ہوں لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ تقویٰ اور تورع دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور عام طور پر سب لوگ ان دونوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ حدیث میں جو دو لفظ ورع اور کف نقل کئے گئے اور ان میں سے ورع کا ترجمہ پرہیزگاری اور کف کا ترجمہ اجتناب و احتیاط کیا گیا ہے۔ تو کیا ان دونوں کے درمیان کچھ فرق

ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیونکہ ورع کے معنی ہیں باز رہنا اور "کف" کے معنی بھی باز رہنے کے ہیں اس صورت میں حدیث کے اس جملہ لا ورع کالکف پر اشکال واقع ہوتا ہے کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا "باز رہنا، باز رہنے کے برابر نہیں۔" اور ظاہر ہے کہ اس طرح اس جملہ کے کوئی معنی ہی نہیں ہوں گے چنانچہ طیبیؒ نے اس حدیث کی شرح میں اس اشکال کو ظاہر کیا ہے اور پھر اس کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں کف کے معنی مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے یا زبان کو لایعنی باتوں میں مشغول کرنے سے پرہیز کرنا ہے اور چونکہ دینی طور پر بھی اور سماجی و معاشرتی طور پر بھی ان دونوں چیزوں میں سے ہر ایک مفاسد اور اس کی برائیاں بہت زیادہ ہیں اس لئے ان کے مفاسد کو از راہ مبالغہ بیان کرنے کے لئے گویا یہ فرمایا کہ ورع یعنی حرام چیزوں سے باز رہنا اگرچہ ایک اعلیٰ وصف ہے علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ ورع و تقویٰ کے لغوی معنی اگرچہ باز رہنا اور پرہیز کرنا ہیں لیکن شرعی طور پر ان کے مفہوم میں امتثال اور اجتناب دونوں ایک ساتھ داخل ہیں اور اگر ان کا مفہوم صرف اجتناب یعنی پرہیز گاری ہی ہو تو احکام کی فرماں برداری ترک کرنے سے پرہیز کرنا بھی ان کے مفہوم میں داخل ہوتا لہٰذا بات وہی رہی کہ ورع اور تقویٰ کے مفہوم میں امتثال اور اجتناب دونوں داخل ہیں اور اس صورت میں بھی حاصل یہی نکلے گا کہ ورع اور تقویٰ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جو احکام دیئے گئے ہیں ان پر چلا جائے اور ان احکام پر خواہ امتثال کے طور پر ہو یا اجتناب کے طور پر۔ اس طرح جب یہ بات واضح ہوگئی کہ ورع کا تعلق دو چیزوں سے ہے یعنی جن امور کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کو اختیار کرنا اور جن امور سے منع کیا گیا ہے ان سے باز رہنا اور "کف" کا تعلق صرف ایک چیز یعنی ممنوعات سے باز رہنے سے ہے تو مذکورہ اشکال رفع ہوگیا۔ اس کے بعد یہ مسئلہ جان لینا چاہئے۔ جس سے حدیث کے مذکورہ جملہ کا مفہوم اور زیادہ صاف ہو جائے گا۔ کہ جانب اجتناب کی رعایت، جانب امتثال کی رعایت کی بہ نسبت زیادہ مقدم اور زیادہ ضروری ہے، یعنی شریعت نے جن چیزوں سے باز رہنے کا حکم دیا ہے ان سے باز رہنا زیادہ مقدم اور زیادہ ضروری ہے بہ نسبت اس بات کے کہ جن چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان کو اختیار کیا جائے اسی بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص جانب امتثال میں فرض و واجبات اور سنن موکدہ پر اکتفا کرے اور نوافل و مستحبات کو ترک کرے لیکن جانب اجتناب میں خوب اہتمام کرے یعنی تمام حرام مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرے تو وہ شخص منزل مقصود پالے گا یعنی معرفت و حقیقت اور قرب خداوندی کا درجہ حاصل کرے گا اس کے برخلاف اگر کوئی شخص جانب امتثال میں خوب اہتمام کرے یعنی فرائض و واجبات اور سنن موکدہ پر بھی عمل کرے۔ اور تمام نوافل و مستحبات کو بھی ادا کرے لیکن جانب اجتناب کی رعایت نہ کرے یعنی ممنوعات کا ارتکاب کرتا رہے۔ تو وہ شخص منزل مقصود کو نہیں پہنچے گا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بیمار ہو اور وہ پرہیز تو پوری طرح کرے لیکن دوا نہ کھائے تو وہ اچھا ہو جائے گا خواہ کتنی ہی دیر میں اچھا ہو، اس کے برخلاف اگر وہ دوائیں کھاتا رہے لیکن پرہیز بالکل نہ کرے تو وہ ہرگز شفا نہیں پائے گا۔ بلکہ روز بروز بیمار ہوتا چلا جائے گا۔

"حسب و فضیلت خوش خلقی کے برابر نہیں ہے" حسب اصل میں کہتے ہیں اپنے اور اپنے باپ دادا کے فضائل و مناقب کو گنوانا اور اپنے خاندانی فخریہ کارناموں کو بیان کرنا۔ لہٰذا اس جملہ میں اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ انسان کی ذاتی فضیلت و بزرگی اور انسانیت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ اس میں خوش خلقی ہو اگر کوئی شخص خوش خلقی کی صفت سے محروم ہے تو وہ لاکھ اپنے مناقب گنوائے اور لاکھ اپنے فخریہ کارناموں کا اظہار کرے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ اگر خوش خلقی میں "خلق" سے مراد تمام باطنی اوصاف ہوں تو ظاہر ہے کہ حسن اخلاق کو سب سے بہتر اور اصل فضیلت کہا جائے گا، اور اگر "خلق" سے مراد نرم خوئی و مہربانی اور مروت کے اوصاف ہوں جیسا کہ عام طور پر خوش خلقی انہی اوصاف کو کہا جاتا ہے تو اس صورت میں یہ فرمانا کہ حسب و فضیلت خوش خلقی کے برابر نہیں ہے خوش خلقی کی فضیلت کو از راہ مبالغہ بیان کرنے کے لئے ہوگا۔

اہل تصوف کے نزدیک خوش خلقی کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کی جاتی ہے کہ خندہ پیشانی کے ساتھ رہنا، لوگوں کو اپنی عطا و بخشش

سے بہرہ مند کرنا۔ اور خدا کی مخلوق کو ایذاء پہنچانے سے باز رہنا یہ وہ اوصاف ہیں جن پر حسن خلق کا اطلاق ہوتا ہے، یہ حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے اور ایک بڑے بزرگ یہ کہتے ہیں۔ کہ حسن خلق یہ ہے کہ خدا کی مخلوق کے ساتھ عداوت کو ترک کیا جائے اور راحت و تنگی، دونوں حالت میں لوگوں کو خوش رکھا جائے اور حضرت سہل تستریؒ کے قول کے مطابق حسن خلق کا سب سے کم تر درجہ یہ ہے کہ مخلوق کی طرف سے جو زیادتی و سختی پیش آئے اس کو برداشت کرے اور کسی سے انتقام نہ لے، ظالم کے حق میں بھی شفیق و مہربان رہے اور اس کی مغفرت کا خواہاں رہے۔

خرچ میں میانہ روی زندگی کا آدھا سرمایہ ہے

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاِقْتِصَادُ فِي النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ وَ التَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ وَحُسْنُ السُّوَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ۔ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الْاَرْبَعَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" اخراجات میں میانہ روی اختیار کرنا نصف معیشت ہے انسانوں سے دوستی نصف عقل ہے اور خوبی کے ساتھ سوال کرنا آدھا علم ہے۔" ان چاروں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اور اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی خرچ کرنے میں نہ تو اسراف کرنا اور نہ تنگی و سختی کرنا بلکہ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا زندگی کا آدھا سرمایہ ہے بایں طور کہ انسان کی معاشی زندگی کا دارومدار دو چیزوں پر ہے ایک تو آمدنی دوسرے خرچ اور ان دونوں کے درمیان توازن، خوشحالی کی علامت بھی ہے اور معیشت کے مستحکم ہونے کا ذریعہ بھی لہٰذا جس طرح آمدنی کے توازن کا بگڑنا، خوشحالی کے منافی اور معیشت کے عدم استحکام کا سبب ہے۔ اسی طرح اگر اخراجات کا توازن بگڑ جائے تو نہ صرف خوش حالی مفقود ہوگی۔ بلکہ معیشت کا سارا ڈھانچہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا مصارف میں اعتدال اور خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا معیشت کا نصف حصہ ہوا۔

حدیث کے دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ اچھے لوگوں کے ساتھ محبت ظاہر کرنا اور ان کی محبت کو اپنے معاملات واحوال میں خیر و برکت کا سرچشمہ جاننا اس عقل کا نصف حصہ ہے جو حسن معاشرت کی ضامن ہے۔ گویا پوری عقل مندی یہ ہے کہ انسان کوئی کسب و پیشہ اور سعی و محنت کر کے جائز روزی حاصل کرے اور اس کے ساتھ آپس میں محبت و مروت کے جذبات بھی کار فرما رکھے۔

حدیث کے تیسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ کسی علمی مسلہ میں خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح سوال کرنا آدھا علم ہے کیونکہ جو شخص سوال کرنے میں دانا اور سمجھدار ہوتا ہے اسی چیز کے بارے میں سوال کرتا ہے جو بہت زیادہ ضروری اور بہت کار آمد ہوتی ہے۔ اور چونکہ وہ اپنے علم میں اضافہ کا متمنی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ پوچھی جانے والی چیزوں کے درمیان تمیز کرنا جانتا ہے کہ کیا پوچھنا چاہئے۔ اور کس سے پوچھنا چاہئے اس لئے جب وہ اپنے سوال کا جواب پالیتا ہے تو حل طلب مسئلہ میں اس کا علم پورا ہو جاتا ہے اس اعتبار سے گویا علم کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک تو سوال اور دوسرے جواب۔

رہی یہ بات کہ اچھی طرح سوال کرنے کا مطلب ہے تو جاننا چاہئے۔ کہ "اچھے سوال" کا اطلاق اس سوال پر ہوتا ہے جس کے تمام پہلوؤں کی تحقیق و تنقیح کر لی گئی ہو۔ اور اس میں جتنے احتمالات پیدا ہو سکتے ہوں ان سب کی واقفیت ہو تاکہ شافی و کافی جواب پائے اور جواب میں کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پائے اس طرح کا سوال بذات خود علم کی ایک شق ہوگا اور اس پر یہ اشکال وارد نہیں ہوگا کہ جب سوال کرنا، جہل (ناواقفیت) اور تردد پر دلالت کرتا ہے تو سوال کرنے کو نصف علم کس طرح کہا گیا ہے تاہم مذکورہ اشکال کے پیش نظر ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ جو شخص خوب سوچ سمجھ کر اور صحیح انداز میں سوال کرتا ہے اس کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے۔ کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جو علمی ذوق کا حامل ہے اور علم میں اپنا کچھ حصہ ضرور رکھتا ہے اور اس بات کا خواہش مند ہے کہ اپنے ناقص علم کو پورا کرے لہٰذا اس

کے سوال کو نصف علم کہنا موزوں ہوگا۔ اس کے برخلاف جو شخص بغیر سوچے سمجھے اور خراب انداز میں سوال کرتا ہے وہ اپنے اس سوال کے ذریعہ اپنے نقصان عقل و کمال اور جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی مثال میں اس واقعہ کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام ابویوسفؒ نے اپنی علمی مجلس میں اپنے ایک شاگرد کو مسلسل خاموش بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس سے فرمایا کہ یہاں بیان کی جانے والی باتوں میں سے کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے یا کوئی مسئلہ تمہیں مشکل معلوم ہو رہا ہو تو اس کے بارے میں پوچھ لینا شرمانا نہیں، کیونکہ کسی حل طلب بات میں سوال کرنے سے شرمانا علم سے باز رکھتا ہے اس وقت حضرت امام یوسفؒ روزہ کی تعریف میں گفتگو فرما رہے تھے چنانچہ جب انہوں نے فرمایا کہ روزہ صبح سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب تک رہتا ہے تو اسی شاگرد نے سوال کیا کہ حضرت! اگر آفتاب غروب ہی نہ ہو تو پھر روزہ کب تک رہیگا؟ حضرت امام ابویوسفؒ نے (اس کا جاہلانہ سوال سنکر) فرمایا کہ چپ رہو! تمہارا چپ رہنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم بولو۔

حاصل یہ کہ سوال کی نوعیت اور سوال کرنے کا انداز سوال کرنے والے کی شخصیت و حالت پر بذات خود دلالت کرتا ہے اور اس کے سوال کی روشنی میں یہ اندازہ نکالنا مشکل نہیں ہوتا کہ یہ شخص بالکل ہی جاہل ہے یا علم سے کچھ سروکار رکھتا ہے جس شخص میں علم و عقل کی روشنی ہوگی اس کا سوال بھی عالمانہ اور عاقلانہ ہوگا اور جو شخص نرا جاہل ہوگا اس کی اور باتوں کی طرح اس کا سوال بھی جاہلانہ اور عامیانہ ہوگا جیسا کہ کسی نے کہا ہے جب جاہل بات کرتا ہے تو گدھے کی طرح معلوم ہوتا ہے اور جب چپ رہتا ہے تو دیوار کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

بَابُ الرِّفْقِ وَالْحَيَآءِ وَحُسْنِ الْخُلُقِ
نرمی، مہربانی، حیاء اور حسن خلق کا بیان

"رفق" عنف کی ضد ہے اور اس کے معنی ہیں نرمی و ملائمت اور فروتنی کا رویہ اختیار کرنا، اپنے ساتھیوں کے حق میں مہربان و نرم خو ہونا اور ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا اور ہر کام اطمینان و خوش اسلوبی کے ساتھ کرنا۔

"حیاء" سے مراد ہے شرمندہ اور محجوب ہونا اور حیاء دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو کسی انسان پر عیب و برائی کے خوف و ندامت کی وجہ سے طاری ہوتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بہترین حیاء وہی ہے جو نفس کو اس چیز میں مبتلا ہونے سے روکے جس کو شریعت نے بری قرار دیا ہے۔ حضرت جنیدؒ کا قول یہ ہے کہ حیاء اس کیفیت و حالت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حاصل ہونے اور ان نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنے کی وجہ سے وحشت و گھبراہٹ کے ساتھ دل میں پائی جائے اور حضرت رقاقؒ کا قول یہ ہے کہ حیاء اس کیفیت کا نام ہے جو آقا کے سامنے درخواست و طلب سے باز رکھتی ہے۔

"حسن خلق" یعنی خوش خلق یا اچھے اخلاق کا سب سے واضح مطلب یہ ہے کہ اس چیز کی اتباع و پیروی کی جائے جس کو خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے خدا کی طرف سے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا ہے یعنی شریعت، آداب طریقت اور احوال حقیقت و معرفت۔ چنانچہ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (اور بلاشبہ آپ ﷺ خلق عظیم کے مرتبہ پر فائز ہیں) تو آپ ﷺ کے وہ اخلاق کیا تھے؟ جن کو "خلق عظیم" سے تعبیر کیا گیا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جواب دیا کہ آپ ﷺ کا خلق قرآن کریم ہے۔ یعنی قرآن مجید میں اچھی خصلتیں اور اعلیٰ اوصاف بیان کئے گئے ہیں (خواہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی نافرمانی وغیرہ سے ہو یا مخلوق خدا کے ساتھ بدمعاملگی وغیرہ سے) آپ ﷺ ان سب سے اجتناب فرماتے تھے۔ (اور یہی چیز انسانی اخلاق و کردار کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے) رہی اتباع کے درجات کی بات تو ظاہر ہے کہ

"اتباع بقدر محبت وتوفیق متابعت کے حاصل ہوتی ہے یعنی جو شخص آنحضرت ﷺ کی محبت سے جتنا زیادہ سرشار ہوتا ہے اور اس کو اتباع کرنے کی جس قدر توفیق نصیب ہوتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ اور اسی قدر اتباع بھی کرتا ہے اور جس شخص کو آنحضرت ﷺ کی محبت کا جتنا کم حصہ حاصل ہوتا ہے اور اتباع کرنے کی جس قدر کم توفیق نصیب ہوتی ہے۔ وہ اتباع میں بھی اسی قدر پیچھے رہتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّل

نرمی ومہربانی کی فضیلت

① عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِىْ عَلَى الرِّفْقِ مَالَا يُعْطِىْ عَلَى الْعُنْفِ وَمَالَا يُعْطِىْ عَلٰى مَاسِوَاهُ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِىْ رِوَايَةٍ لَهُ قَالَ لِعَائِشَةَ عَلَيْكِ بِالرِّفْقِ وَاِيَّاكِ وَالْعُنْفَ وَالْفُحْشَ اِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِىْ شَىْءٍ اِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَىْءٍ اِلَّا شَانَهُ۔

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم ومہربان ہے اور نرمی ومہربانی کو پسند کرتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خود بھی نرم ومہربان ہے اور ان کو ایسے امور کا مکلف قرار نہیں دیتا جو ان کی قوت برداشت سے باہر ہوں اور جن کی وجہ سے وہ دشواریوں اور سختیوں میں مبتلا ہوں اور وہ بندوں کے تئیں بھی اس بات کو پسند کرتا ہے اور اس سے راضی وخوش ہوتا ہے کہ وہ آپس میں نرمی ومہربانی کریں اور ایک دوسرے کو سختیوں اور دشواریوں میں مبتلا نہ کریں) اس لئے وہ نرمی ومہربانی پر وہ چیز عطا فرماتا ہے جو درشتی وسختی پر عطا نہیں فرماتا اور نرمی ومہربانی پر جو چیز عطا کرتا ہے وہ نرمی ومہربانی کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز پر عطا نہیں فرماتا (مسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔" نرمی ومہربانی کو لازمی طور پر اختیار کرو اور سختی ودرشتی اور بے حیائی سے اپنے آپ کو بچاؤ! کیونکہ جس چیز میں نرمی ہوتی ہے اُس کو زینت بخشتی ہے اور جس چیز میں سے نکال لی جاتی ہے، وہ عیب دار ہو جاتی ہے۔

تشریح: "اللہ تعالیٰ نرم ومہربان ہے اور نرمی ومہربانی کو پسند کرتا ہے" کے ذریعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نرمی ومہربانی کو پسند کرنا، خود بندوں کے اس مفاد ومصالح کے پیش نظر ہے کہ آپس میں نرمی ومہربانی اور شفقت ومروت کے جذبات کو فروغ دینا ایک ایسی خوبی ہے جس کے ذریعہ معاشرہ کو مطمئن وپرسکون اور انسانی زندگی کو مختلف پریشانیوں اور بے چینیوں سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے چنانچہ جس معاشرہ کے افراد اپنے تمام امور میں ایک دوسرے سے نرم خوئی اور مہربانی ومروت کا برتاؤ کرتے ہیں ایک دوسرے کو سختیوں اور پریشانیوں میں مبتلا کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور باہمی معاملت کو سہولت وآسانی کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں اور ان امور ومعاملات کا تعلق خواہ حصول معاش (جیسے تجارت، ملازمت اور محنت مزدوری وغیرہ) سے ہو یا اس کے علاوہ معاشرتی زندگی کے کسی بھی پہلو سے ہو، تو اس معاشرہ کا ہر فرد اپنے آپ کو فلاح یاب وبامراد محسوس کرتا ہے اور پورے معاشرہ پر حق تعالیٰ کی طرف سے خیر وبرکت اور اس کی نعمتوں کا نزول ہوتا ہے چنانچہ ویعطی علی الرفق الخ (وہ نرمی ومہربانی پر وہ چیز عطا فرماتا ہے الخ) کے ذریعہ نہ صرف یہ ترغیب دلائی گئی کہ اپنے امور معاملات میں باہمی طور پر نرمی ومہربانی اختیار کرو تاکہ حصول مقصد کو پہنچ سکو بشارت بھی دی گئی ہے کہ جو لوگ سختی ودرشتی کے بجائے نرمی ومہربانی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ان کو حق تعالیٰ اجر وثواب عطا فرماتا ہے اور مقاصد میں کامیاب وکامران کرتا ہے۔

"اور نرمی ومہربانی پر جو چیز عطا کرتا ہے... الخ۔" یہ جملہ ماقبل عبارت کے مفہوم کو ایک دوسرے انداز میں کر رہا ہے یعنی پہلے تو نرمی ومہربانی کو سختی ودرشتی پر ترجیح دی گئی اور یہ فرمایا گیا۔ کہ اللہ کی طرف سے اجر وثواب اور حصول مقاصد کی جو نعمت نرمی ومہربانی اختیار کرنے پر ہوتی ہے وہ سختی ودرشتی اختیار کرنے کی صورت میں عطا نہیں ہوتی اور پھر آگے اس جملہ کے ذریعہ اس طرف اشارہ فرمایا کہ نرمی

ومہربانی اپنی ضد یعنی سختی ودرشتی ہی پر نہیں بلکہ حصولِ مقصد کے اور دوسرے اسباب ووسائل پر بھی ترجیح وفضیلت رکھتی ہے البتہ اس موقع پر یہ اشکال پیدا ہو کہ اگر وہ اسباب ووسائل از قسم نرمی ہوں تو ترجیح وفضیلت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور اگر از قسم سختی ودرشتی ہوں تو نرمی ومہربانی کا سختی ودرشتی پر فضیلت وترجیح رکھنا ماقبل عبارت سے واضح ہو ہی چکا تھا اس کے بعد اسی مفہوم کو دوبارہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ دونوں جملوں کی عبارت میں ظاہری طور پر تفاوت ہے مگر حقیقت میں یہ دوسرا جملہ ماقبل عبارت کو موکد کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اور دونوں جملوں کا مقصد اس بات کو زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے مقاصد جیسے حصولِ معاش وغیرہ کی طلب اور سعی، جدوجہد میں ایسا رویہ وانداز اختیار کرے جو نرم خوئی، مہربانی اور ایک دوسرے کے ساتھ لحاظ ومروت کا ہو کیوں کہ انسان کو اس کی مطلوب چیز دینے والا الحقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے۔ اور چونکہ نرمی ومہربانی اس کے نزدیک محبوب وپسندیدہ ہے اس لئے وہ نرمی ومہربانی کا رویہ اختیار کرنے والے کو زیادہ عطا کرے گا بہ نسبت اس شخص کے جو اپنے مقاصد کے حصول میں سختی ودرشتی اور عامیانہ انداز ورویہ اختیار کرتا ہے۔

جس شخص میں نرمی ومہربانی نہ ہو وہ نیکی سے محروم رہتا ہے

(۴) وَعَنْ جَرِيْرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ يُّحْرَمُ الرِّفْقُ يُحْرَمُ الْخَيْرَ۔ (رواہ مسلم)۔

"اور حضرت جریرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو نرمی ومہربانی سے محروم کیا جاتا ہے وہ گویا نیکی سے محروم کیا جاتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: جامع صغیر کی روایت میں خیر کے ساتھ کلہ کا لفظ بھی ہے لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص نرمی ومہربانی کی خوبیوں سے عاری ہوتا ہے وہ تمام بھلائیوں سے محروم قرار پاتا ہے۔ گویا اس ارشاد گرامی کا مقصد نرمی ومہربانی کے وصف کی فضیلت بیان کرنا اس عظیم وصف کو حاصل کرنے کی ترغیب دلانا، سختی ودرشتی کی مذمت کرنا اور یہ بات واضح کرنا ہے کہ نرمی ومہربانی تمام بھلائیوں کے حاصل ہونے کا سبب وذریعہ ہے۔

حیا کی فضیلت

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ وَهُوَ يَعِظُ اَخَاهُ فِي الْحَيَآءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُ فَاِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْاِيْمَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ ایک انصاری صحابیؓ کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا تو رسول کریم ﷺ نے اس سے فرمایا "کہ اس کو کچھ مت کہو، کیوں کہ حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔"

(بخاری ومسلم)

تشریح: وہ صحابیؓ اپنے بھائی کو زیادہ حیا کرنے سے منع کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جو شخص زیادہ حیا کرنے لگتا ہے وہ رزق اور علم حاصل کرنے سے باز رہتا ہے چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے ان کو اس طرح کہتے سنا تو ان کو منع کیا اور فرمایا تم اپنے اس بھائی کو حیا کرنے سے نہ روکو کیونکہ حیا بذات خود ایک بہت اعلیٰ وصف ہے اور ایمان کی ایک شاخ ہے۔

طیبیؒ نے کہا ہے کہ لفظ یعظ سے مراد "ینذر" ہے یعنی وہ صحابیؓ اپنے بھائی کو ڈرا دھمکا رہے تھے! امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ "وعظ" کے معنی ہیں کسی کو اس طرح تنبیہ کرنا کہ اس میں کچھ ڈرانا دھمکانا بھی ہو۔ خلیلؒ نے یہ بیان کیا ہے "وعظ" کہتے ہیں خیر وبھلائی کی اس طرح نصیحت کرنا کہ اس سے دل نرم ہو جائے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں حدیث میں "وعظ" عتاب کے معنی میں ہے

جیسا کہ ایک روایت میں (یعظ کے بجائے) یعاتب ہی کا لفظ منقول ہے۔

④ وَعَنْ عمران بن حصین قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْحَیَآءُ لَا یَأْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ وَفِیْ رِوَایَۃٍ اَلْحَیَاءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حیا نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی بات پیدا نہیں کرتی" ایک اور روایت میں یہ ہے کہ "حیاء کی تمام صورتیں بہتر ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہاں ایک اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ بسا اوقات حیا بعض حقوق کی ادائیگی جیسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مخل ہوتی ہے تو اس اعتبار سے حیا کی تمام صورتوں کو بہتر قرار دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جو حیاء اظہار حقیقت اور حق کی ادائیگی سے باز رکھے اس کو حیا کہا ہی نہیں جا سکتا بلکہ اس کو عجز اور بزدلی کہیں گے جو ایک طرح کی خرابی اور نقصان ہے اور اگر اس کو حیا کہا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ مجازاً کہا جا سکتا ہے کیونکہ شریعت کی نظر میں حقیقی حیا وہی ہے جو برائی کو ترک کرنے کا باعث بنے علاوہ ازیں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ حیا کے زیادہ صحیح معنی ہیں نفس کا برائی سے رک جانا خواہ وہ برائی طبعی ہو یا شرعی۔ اور شریعت میں جس حیا کو بہتر اور قابل تعریف قرار دیا گیا ہے اس کی صحیح پہچان یہ ہے کہ نفس اس چیز کو اختیار کرنے سے باز رہے جس کو شریعت نے برائی قرار دیا ہے اور خواہ وہ حرام ہو یا مکروہ اور یا ترکِ اولیٰ ہو لہٰذا مذکورہ بالا اشکال کا زیادہ واضح جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ الحیاء خیر کلہ حیا کی ان صورتوں کے ساتھ مخصوص ہے جو حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے مطابق ہوں۔

ایک بہت پرانی بات جو پچھلے انبیاء سے منقول چلی آ رہی ہے

⑤ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِمَّا اَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّۃِ الْاُوْلٰی اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "لوگوں نے پہلے انبیاء پر اترنے والے کلام میں سے جو بات پائی ہے وہ یہ کہ جب تو بے شرم ہو جائے تو جو جی چاہے کر۔" (بخاریؒ)

تشریح: ان مما ادرک الناس الخ کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بات پہلے انبیاء علیہم السلام پر اترنے والے کلام سے ماخوذ ہے اور جس کا حکم ابھی تک باقی ہے نہ اس کو منسوخ قرار دیا گیا ہے۔ اور نہ اس میں کوئی تغیر و تبدل ہوا ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ جملہ میں امر کا جو یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے کہ فاصنع الخ (یعنی جو جی چاہے کر) تو اس سے حکم دینا یا طلب مراد نہیں ہے بلکہ یہ امر بطور خبر کے ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ جو چیز بری باتوں سے باز رکھتی ہے۔ وہ حیا ہے اور جب کسی نے شرم و حیا کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا اور بے حیائی کو شیوہ بنا لیا تو پھر وہ جو چاہے گا کرے گا اور اسے کسی گناہ اور کسی برائی کو اختیار کرنے میں کوئی باک نہیں ہو گا۔ یا یہ کہ امر کا صیغہ تہدید و توبیخ کے طور پر ہے اور اس سے مقصد یہ آگاہی دینا ہے۔ کہ جب تم نے بے حیائی پر کمر باندھ ہی لی ہے تو جی چاہے کرتے پھرو! لیکن یاد رکھو کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ کہ جب تمہیں اپنے سارے کرتوتوں کی سزا بھگتنی پڑے! گویا یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ۔

نیکی اور گناہ کیا ہے؟

⑥ وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ فَقَالَ الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِثْمُ مَاحَاکَ فِیْ صَدْرِکَ وَکَرِھْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْہِ النَّاسُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نواس ابن سمعانؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھا (کہ نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "نیکی خوش خلقی کا نام ہے (یعنی نیکی کی عمدہ صورت خوش خلقی ہے) اور گناہ وہ (کام) ہے جو تمہارے دل میں تردد پیدا کردے اور تم اس بات کو پسند نہ کرو کہ لوگ تمہارے اس کام سے واقف ہو جائیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "تردد پیدا کردے" کا مطلب یہ کہ جب تم کوئی ایسا کام کرو جس پر تمہارے دل کو اطمینان نہ ہو بلکہ اس کی وجہ سے دل و دماغ میں ایک خلش پیدا ہو جائے تو سمجھو کہ تمہارا وہ کام بہتر نہیں ہے بلکہ گناہ کا باعث ہے لیکن واضح رہے کہ اس بات کا تعلق اس شخص سے ہے جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت کے لئے کھول دیا ہو اور اس کا دل نور تقویٰ سے روشن و آراستہ ہو علاوہ ازیں "کام" سے مراد وہ اعمال و افعال نہیں ہیں جن کی برائی کو شریعت نے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور جس کا گناہ ہونا کسی شک و شبہ سے بالاتر ہو بلکہ اس سے مراد کوئی ایسا فعل و عمل ہے جس کا ممنوع ہونا شارع علیہ السلام سے واضح طور پر منقول نہ ہو اور اس کے متعلق علماء کے اختلافی اقوال ہوں اور "تم اس بات کو پسند نہ کرو" یہ گویا گناہ کی دوسری پہچان بیان فرمائی گئی ہے لیکن اس کا تعلق بھی انہی لوگوں سے ہے جو اچھے احوال کے ہوں۔

اچھے اخلاق کی فضیلت

(۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تم میں سے وہ شخص مجھ کو بہت پیارا ہے، جو اچھے اخلاق کا حامل ہو۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تم میں سے وہ شخص میرے نزدیک بہت عزیز و محبوب ہے جو اچھے اطوار و عادات رکھتا ہو اور بہترین خصلتوں کا حامل ہو بایں طور کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرتا ہو اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں بھی تقصیر و کوتاہی نہ کرتا ہو۔

(۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نرمی کی فضیلت و اہمیت

(۹) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اُعْطِیَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ اُعْطِیَ حَظَّهٗ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَنْ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (رواه فی شرح السنۃ)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو نرمی میں سے حصہ دیا گیا اس کو گویا دنیا و آخرت کی بھلائیوں میں سے حصہ عطا ہوا اور جو شخص نرمی میں سے اپنے حصے سے محروم رہا وہ گویا دنیا و آخرت کی بھلائیوں میں سے اپنے حصہ سے محروم کیا گیا۔" (شرح السنۃ)

حیا ایمان کا جزء ہے

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِيْمَانِ وَالْاِيْمَانُ فِی الْجَنَّةِ وَالْبَذَاءُ مِنَ

اَلْجَفَآءِ وَالْجَفَاءُ فِي النَّارِ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "حیاء (یعنی برے کاموں سے حجاب رکھنا ایمان کا جز ہے اور ایمان یعنی مؤمن جنت میں جائے گا اور بے حیائی (کہ جس کی وجہ سے فحش باتوں اور بری باتوں کا ارتکاب ہوتا ہے) بدی کا جز ہے۔ اور بد، دوزخ کی آگ میں جائے گا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

خوش خلقی بہترین عطیہ خداوندی ہے

⑪ وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ مُزَيْنَةَ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا خَيْرُ مَا أُعْطِيَ الْإِنْسَانُ قَالَ الْخُلُقُ الْحَسَنُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ وَفِي شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْ أُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ۔

"اور قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے بیان کیا کہ صحابہؓ نے عرض کیا! یارسول اللہ (ﷺ)! جو چیزیں انسان کو عطا کی گئی ہیں ان میں سے بہترین چیز کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا "خوش خلقی" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور شرح السنۃ میں یہ روایت اسامہ ابن شریکؒ سے منقول ہے۔"

بد خلقی اور سخت کلامی کی مذمت

⑫ وَعَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ وَلَا الْجَعْظَرِيُّ قَالَ وَالْجَوَّاظُ الْغَلِيْظُ الْفَظُّ۔ رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ فِي سُنَنِهٖ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ وَصَاحِبُ جَامِعِ الْأُصُوْلِ فِيْهِ عَنْ حَارِثَةَ وَكَذَا فِي شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ وَلَفْظُهٗ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ الْجَعْظَرِيُّ يُقَالُ الْجَعْظَرِيُّ الْفَظُّ الْغَلِيْظُ وَفِي نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ عَنْ عِكْرَمَةَ بْنِ وَهْبٍ وَلَفْظُهٗ قَالَ وَالْجَوَّاظُ الَّذِيْ جَمَعَ وَمَنَعَ وَالْجَعْظَرِيُّ الْغَلِيْظُ الْفَظُّ۔

"اور حضرت حارثہ ابن وہبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں نہ تو سخت کلام داخل ہوگا اور نہ بد خلق اور راوی کہتے ہیں کہ جواظ کے معنی ہیں سخت کلام اور بد خلق۔ اس روایت کو ابوداودؒ نے اپنی سنن میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے نیز صاحب جامع الاصول نے بھی جامع الاصول میں اس روایت کو حارثہؓ ہی سے نقل کیا ہے اور اسی طرح یہ روایت شرح السنۃ میں حضرت حارثہؓ ہی سے ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے کہ "جنت میں جواظ جعظری داخل نہیں ہوگا۔" گویا ان الفاظ میں جعظری کو جواظ کی صفت قرار دیا گیا ہے) اور کہا گیا ہے۔ کہ جعظری کے معنی ہیں بد خلق اور سخت کلام (یعنی اس روایت کے مطابق جواظ اور جعظری کے ایک ہی معنی ہیں) اور مصابیح کے (بعض) نسخوں میں یہ روایت حضرت عکرمہ ابن وہبؓ سے منقول ہے) ان میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ راویؒ نے کہا ہے جواظ اس شخص کو کہتے ہیں جو مال و دولت جمع کرے لیکن سائل کو کچھ نہ دے اور جعظری اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت کلام اور بد خلق ہو"۔

تشریح: جیسا کہ اوپر کی عبارتوں سے واضح ہوا، بعض روایتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جواظ اور جعظری دونوں کے ایک معنی ہیں اور بعض روایتوں سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جواظ کے معنی متکبر کے ہیں اور جعظری کے معنی ہیں بد خلق لیکن ان سب روایتوں کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ معنی و مفہوم میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اور دونوں کے درمیان زیادہ فرق و تفاوت نہیں ہے۔

اور ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جواظ اور جعظری سے مراد وہ شخص ہے جو سخت دل اور بد خلق ہو (یعنی وہ شخص کہ جس کے باطنی احوال کی گمراہیوں اور عادات و اطوار کی خرابیوں نے اس کو شقی القلب بنا دیا ہو کہ نہ اس پر کسی وعظ و نصیحت کا اثر ہوتا ہو اور نہ اس کو خدا کا خوف برائیوں سے روکتا ہو۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا) اس کا قرینہ وہ روایت ہے جس کو خطیبؒ نے حضرت عائشہؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ (حضور نے فرمایا) ہر چیز کے لئے توبہ ہے مگر بد خلق

(یعنی بد چلن اور بد اطوار شخص) کے حق میں توبہ کارگر نہیں کیونکہ وہ ایک گناہ سے توبہ کرتا ہے تو اس سے بڑے دوسرے گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے (اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی بد چلنی اور بد اطواری اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔)

لا یدخل الجنة الجواظ ولا الجعظری میں لفظ جعظری سے پہلے لا زائد لانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو شخص ان دونوں بری خصلتوں میں سے کسی بھی ایک خصلت میں مبتلا ہوگا اس کو جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ شخص منافقین میں سے ہوگا تو اس کا جنت میں داخل نہ کیا جانا مطلق معنی پر محمول ہوگا اور اگر اس شخص کا تعلق مؤمنین سے ہو تو پھر کہا جائے گا۔ کہ اس کے حق میں ان الفاظ کہ "وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا" کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ ابتداء جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

خوش خلقی کی فضیلت اور فحش گوئی کی مذمت

⑬ وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَثْقَلَ شَيْءٍ يُوْضَعُ فِيْ مِيْزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ وَاِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيَّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ وَرَوٰى اَبُوْدَاوُدَ الْفَصْلَ الْاَوَّلَ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن مؤمن کی میزان اعمال میں رکھی جانے والی چیزوں میں بہت وزنی چیز حسن خلق ہے اور اللہ تعالیٰ فحش بکنے والے بے ہودہ گو سے سخت نفرت اور دشمنی رکھتا ہے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے نیز ابوداؤدؒ نے بھی اس روایت کا حصہ یعنی "خلق حسن" نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لفظ "بذی کا ترجمہ" "بے ہودہ گو" کیا لیکن ملا علی قاریؒ نے کسی شارح سے اس لفظ کے معنی "بد خلق" نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہی معنی موقع کے مناسب ہیں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حدیث میں پہلے جملے کے مقابلہ پر جو دوسرا جملہ لایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن میزان اعمال میں بد خلقی بہت بے وزن چیز ہوگی۔

خوش خلقی اختیار کرنے والے کا مرتبہ

⑭ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّيْلِ وَصَائِمِ النَّهَارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ "مؤمن (یعنی کامل مؤمن کہ جو عالم باعمل ہوتا ہے) خوش خلقی کے سبب وہ درجہ و مرتبہ حاصل کرتا ہے جو (عبادت و ذکر الٰہی کے لئے) شب بیداری کرنے والے اور ہمیشہ دن میں روزہ رکھنے والے کو ملتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت سہیلؒ فرماتے ہیں کہ خوش خلقی کا سب سے کم تر درجہ یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف کو برداشت کیا جائے انتقام لینے سے گریز کیا جائے اور یہ کہ نہ صرف ظالم کے ظلم سے درگزر کیا جائے بلکہ اس کے حق میں مغفرت و بخشش کی دعا کی جائے اور اس کے تئیں رحم و شفقت کو اختیار کیا جائے۔

لوگوں سے جو بھی معاملہ کرو، خوش خلقی کے ساتھ کرو

⑮ وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ مَاكُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ۔ (رواہ احمد والترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابودرداء کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا "اللہ سے ڈرو، تم جہاں کہیں بھی ہو اگر تم سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد نیک کام ضرور کرو تاکہ وہ نیکی اس برائی کو مٹا دے اور لوگوں سے خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرو۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: "اللہ سے ڈرو" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن امور کو تم پر واجب کیا ہے ان سب کی بجا آوری و فرمانبرداری کرو اور جن چیزوں سے منع کیا ہے یعنی تمام طرح کی برائیاں ان سے اجتناب و پرہیز کرو۔ کہ اسی کو "تقویٰ" کہا گیا ہے اور تقویٰ، دین کی بنیاد ہے جس کے ذریعہ ایقان و معرفت کے مراتب و درجات حاصل ہوتے ہیں، تقویٰ کا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ شرک سے بیزاری و پاکی اختیار کی جائے اور اس کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے۔ کہ ماسوای اللہ سے اعراض کیا جائے ان دونوں درجوں کے درمیان تقویٰ کے دوسرے مراتب ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر برتری حاصل ہے جیسے ممنوعات کو ترک کرنا ایک مرتبہ ہے اس سے برتر مرتبہ یہ ہے کہ مکروہات کو بھی ترک کیا جائے۔ اور اس سے بھی برتر مرتبہ یہ ہے کہ جو چیزیں مباح ہیں۔ ان میں سے بھی ان چیزوں کو ترک کیا جائے جو غیر ضروری اور بے فائدہ ہوں۔

"تم جہاں کہیں ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا خدا سے ڈرنا یعنی احکام خداوندی پر عمل کرنا کسی خاص وقت، کسی خاص جگہ اور کسی خاص حالت پر موقوف نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ تم خواہ سفر میں ہو یا حضر میں، خواہ نعمتوں سے بہرہ مندی کی حالت میں ہو یا آفات بلاؤں میں مبتلا ہو اور خواہ جلوت میں ہو یا خلوت میں، غرضیکہ تم کسی جگہ پر ہو اور کسی حالت میں ہو، اور اس وقت اس جگہ اور اس حالت سے متعلق جو بھی احکام خداوندی ہوں ان پر عمل پیرا ہوں کیونکہ خدا کے نزدیک تمہاری کوئی حالت پوشیدہ نہیں ہے اور وہ کسی بھی وقت تمہاری طرف سے غافل نہیں رہتا وہ جس طرح تمہاری ظاہری باتوں کو جانتا ہے اسی طرح تمہاری پوشیدہ باتیں بھی خوب جانتا ہے لہٰذا تمہارے لئے ضروری ہے کہ اس کے احکام کی بجا آوری اور اس کی معصیت سے اجتناب کے جو تقاضے اور جو آداب ہیں ان کو بہر صورت نگاہ میں رکھو! منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤدؒ طائی کسی قبر کے پاس سے گزر رہے تھے کہ خدا نے ان پر اس قبر کے اندر کے حالات منکشف کئے بایں طور کہ انہوں نے سنا قبر کے اندر سے ایک آواز باہر آ رہی ہے جس میں مردہ کہہ رہا ہے کہ پروردگار! کیا میں نے تیری نمازیں ادا نہیں کی ہیں۔ کیا میں نے تیری زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اور کیا میں نے یہ نہیں کیا ہے اور وہ نہیں کیا ہے؟ یعنی اس نے دنیا میں جب بھی نیک کام کئے تھے ان سب کو گنواتا رہا۔ (اس کی یہ بات سنکر) فرشتوں نے جواب دیا، ہاں اے دشمن خدا! بے شک تو نے یہ سب کام کئے ہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب تو خلوت میں ہوتا تھا اور اس وقت خدا کے خوف پر گناہوں کو ترجیح دیتا تھا اور تجھے اس بات کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا کہ اس حالت میں بھی تو خدا کی نگاہ میں ہے۔

"اگر تم سے برائی سرزد ہو جائے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ انسان بہرحال انسان ہے یہ ضروری ہے کہ اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور لغزشیں اس کے پائے استقامت پر اثر انداز نہ ہوں، لہٰذا اگر بتقاضائے بشریت تم سے کوئی گناہ صادر ہو جائے تو اس کے بعد فوراً نیک کام کر لو! تاکہ وہ نیکی اس گناہ و برائی کے اثرات کو مٹا دے! رہی یہ بات کہ نیک کام سے کیا مراد ہے؟ تو اس سے توبہ اور مطلق کوئی بھی مراد ہے یا یہ کہ وہ نیکی مراد ہے جو اس گناہ و برائی کو ضد ہو، چنانچہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ نیک کام کرنے کے ذریعہ برائیوں کے اثرات مٹانے سے کسی بھی لمحہ غافل نہ رہے اس سے جو بھی برائی صادر ہو اس کے بدلہ میں اسی کی جنس سے کوئی نیک کام ضرور کر لے، اگر شراب نوشی کا گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے بدلے میں حلال چیزیں خدا واسطے لوگوں کو پلائے اگر کسی وقت تکبر میں مبتلا ہو جائے تو تواضع اختیار کرے، اگر کسی جگہ گانا بجانا سننے کا اتفاق ہو جائے تو ان لوگوں کی ہم نشینی میں کچھ وقت گزارنا پڑا ہو جو گانے بجانے کی لغویت میں مبتلا ہوں تو اس کے بدلے میں قرآن پاک کی تلاوت سنے اور ذکر و نصیحت کی مجلس میں بیٹھے اور اسی طرح بخل کا تدارک، خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ کرے۔

جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "تاکہ وہ نیکی اس برائی کو مٹادے" تو مٹانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نیکی کے ذریعہ یا تو اس بندے کے دل پر سے برائی کے اثرات مٹادیتا ہے یا اعمال لکھنے والے فرشتوں کے رجسٹر میں سے اس برائی کو محو کردیتا ہے اور یہ مٹانا بھی اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ اس برائی کا تعلق کسی حقوق العباد سے ہوتا ہے بایں طور کہ کوئی شخص کسی کے حق کو تلف کرتا ہے یا کسی پر ظلم وزیادتی کرتا ہے تو اس حق تلفی یا ظلم کا تدارک اس طرح کیا جاتا ہے کہ حق تلفی کرنے والے یا ظلم کرنے والے کے نامہ اعمال میں جو نیکیاں ہوتی ہیں ان میں سے اس کے بقدر نیکیاں صاحب حق کو دیدی جاتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے دوسرے اجرو انعامات کے ذریعہ صاحب حق کو خوش کردے اور وہ اس شخص کو معاف کرنے پر راضی ہوجائے۔

منقول ہے کہ ایک بزرگ کا انتقال ہوگیا کچھ عرصہ بعد ایک دوسرے بزرگ نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنے احسان وانعام سے نوازا اور میری بخشش فرمادی لیکن حساب کتاب ضرور ہوا یہاں تک کہ اس دن کے بارے میں بھی مجھ سے مواخذہ ہوا جب کہ میں روزے سے تھا اور ایک دوست کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا جب افطار کا وقت ہوا تو میں نے گیہوں کی ایک بوری میں سے گیہوں کا ایک دانہ اٹھالایا اور اس کو توڑ کر کھانا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ یہ گیہوں میرا نہیں ہے چنانچہ میں نے وہ گیہوں فوراً اسی جگہ ڈال دیا جہاں سے اٹھایا تھا اور اب سے اس کا بھی حساب لیا گیا۔ یہاں تک کہ اس گیہوں کے توڑے جانے کے نقصان کے بقدر میری نیکیاں مجھ سے لی گئیں۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ نیکیاں صغیرہ گناہوں کا بھی کفارہ ہوتی ہیں اور کبائر میں بھی ان گناہوں کا کفارہ ہوجاتی ہیں جو پوشیدہ ہوں کیونکہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد لَنُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ بھی عموم پر دلالت کرتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث بھی مطلق اور عام ہے البتہ جو کبیرہ گناہ ظاہر ہوگئے اور حاکم وقاضی کے نزدیک ثابت ہوجائیں ان پر حد، یعنی شرعی سزا کا نفاذ ساقط نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ توبہ سے معاف ہوں گے۔

نرم مزاج ونرم خو شخص کی فضیلت

⑯ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ وَبِمَنْ تَحْرُمُ النَّارُ عَلَيْهِ عَلٰى كُلِّ هَيِّنٍ لَيِّنٍ قَرِيْبٍ سَهْلٍ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کیا میں بتاؤں کہ وہ شخص کون ہے جو آگ پر حرام ہوگا اور جس پر آگ حرام ہوگی؟ (تو سنو) دوزخ کی آگ ہر اس شخص پر حرام ہوگی جو نرم مزاج، نرم طبیعت، لوگوں سے نزدیک اور نرم خو ہو۔" اس روایت کو احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: سوال۔ کیا میں بتاؤں الخ میں ازراہ مبالغہ وتاکید دونوں صورتیں یعنی اس شخص کا آگ پر حرام ہونا اور آگ کا اس شخص پر حرام ہونا ذکر فرمائیں۔ اور چونکہ دونوں عبارتوں کا حاصل ایک ہی ہے یعنی اس شخص کا دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنا اس لئے جواب میں دوسری ہی صورت کے بیان پر اکتفاء فرمایا۔ اور ویسے بھی یہ بات عام بول چال کے زیادہ قریب ہے کیونکہ عام طور پر اس طرح کہا جاتا ہے کہ دوزخ کی آگ فلاں شخص پر حرام ہے۔

نیکوکار مؤمن کی تعریف

⑰ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ وَالْفَاجِرُ خَبٌّ لَئِيْمٌ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "نیکوکار مؤمن بڑا بھولا اور شریف ہوتا ہے جب کے

بدکار بڑا مکار و بخیل اور کمینہ ہوتا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: غِرٌّ کے معنی ہیں دھوکہ کھانے والا شخص اسی طرح صراح وغیرہ میں غر کے معنی ناآزمودہ یاناتجربہ کار نوجوان کے لکھے ہیں خب کے معنی ہیں وہ شخص جو دھوکہ دینے والا اور چالاک ہو۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نیکوکار شخص چونکہ طبعاً مطیع و فرمانبردار ہونے کی وجہ سے نرم مزاج، شریف النفس اور سادہ لوح ہوتا ہے اس لئے وہ ہر فریب کار شخص سے دھوکہ کھاجاتا ہے وہ نہ تو لوگوں کے مکروفریب سے آگاہ ہوتا ہے اور نہ مکروفریب کی باتوں اور چالوں کی چھان بین اور دھوکہ بازوں کے احوال کی تحقیق و جستجو کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ جاہل و نادان ہوتا ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کے مزاج کی نرمی و مروت حلم و کرم، عفو، درگزر کرنے کی عادت اور خوش خلقی ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے حدیث کا مطلب اس اسلوب میں بیان کیا ہے کہ نیکوکار شخص چونکہ سلیم القلب اور سادہ لوح ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لوگوں کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھتا ہے کسی کے اندر کیا بھرا ہوا ہے۔ اس کو وہ نہیں دیکھتا جس کے سینے میں کینہ ہوتا ہے اس کو پہچانتا نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص اس کے سامنے جو کچھ کہہ دیتا ہے اس کو مان لیتا ہے اور دھوکہ کھاجاتا ہے ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے آخرت کے معاملات اور نفس کی اصلاح کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور دنیا کے معاملات اس کی نظر میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لہٰذا وہ اپنے نفس کی اصلاح اور آخرت کے کاموں میں مشغول رہتا ہے اور دنیا کے کاموں پر زیادہ توجہ نہیں دیتا اس لئے اگرچہ وہ دنیاوی معاملات میں دھوکہ کھاجاتا ہے مگر آخرت کے معاملات میں ہوشیار اور عقل معاد میں کامل ہوتا ہے نیکوکار مؤمن کی اس حالت کو اگرچہ تعریف کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے مگر اس کے باوجود حضور ﷺ نے اپنے اس ارشاد لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین کے ذریعہ آگاہ بھی فرمایا ہے کہ مؤمن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ ہمیشہ غفلت اختیار کرے مسلسل دھوکہ کھاتا رہے، اور ہوشیاری کے طریقہ کو بالکل ترک کردے اور بات پہلے بھی بتائی جاچکی ہے کہ "لا یلدغ المؤمن الخ کے ذریعہ مؤمن کو جس ہوشیاری و بیدار مغزی کی تلقین کی گئی ہے اس کا تعلق دنیا و آخرت دونوں معاملات سے ہے اگرچہ بعض حضرات نے اس کو صرف اخروی معاملات کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔

نیکوکار کے برخلاف فاجر یعنی منافق وغیرہ کی خصلت یہ بیان فرمائی گئی ہے۔ چونکہ دھوکہ دہی اور مکاری اس کی فطرت ہی میں داخل ہوتی ہے، فتنہ و فساد پھیلانا ہی اس کا شیوہ ہوتا ہے اور اس کے نزدیک چشم پوشی ایک بے معنی چیز ہوتی ہے اس لئے وہ جلد دھوکا نہیں کھاتا الا یہ کہ کوئی شخص اس سے بھی بڑا مکار و عیار ہو اور وہ اس کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوجائے تاہم اگر وہ نادانستہ دھوکا کھا بھی جاتا ہے تو اس کو برداشت نہیں کرتا بلکہ انتقام لینے کی سعی کرتا ہے۔

(۱۸) وَعَنْ مَكْحُوْلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُؤْمِنُوْنَ هَيِّنُوْنَ لَيِّنُوْنَ كَالْجَمَلِ الْاَنِفِ اِنْ قِيْدَ انْقَادَوَ اِنْ اُنِيْخَ عَلٰى صَخْرَةٍ اسْتَنَاخَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ مُرْسَلاً۔

"اور حضرت مکحولؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایمان رکھنے والے لوگ بردبار، نرم خو اور فرمانبردار ہوتے ہیں اس اونٹ کی مانند جس کی ناک میں نکیل پڑی ہو کہ اگر اس کو کھینچا جائے تو کھنچا چلا آئے اور اگر پتھر پر بٹھایا جائے تو پتھر پر بیٹھ جائے" اس حدیث کو ترمذیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مؤمن طبعاً فرماں بردار ہوتا ہے وہ شریعت کا اتباع بلاچون وچرا کرتا ہے، خدا اور خدا کے رسول کے احکامات جس طرح ہوتے ہیں۔ انکو اسی طرح بجالاتا ہے ان میں اپنی طرف سے کوئی دخل اندازی نہیں کرتا اور ان احکام کی بجاآوری اور شریعت کی اتباع میں جو مشقت پیش آتی ہے اس کو برضاو رغبت برداشت کرتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس حدیث میں مسلمانوں کی اس خصوصیت کو بیان کرنا مقصود ہو جو وہ آپس میں ایک دوسرے کی اتباع

وفرمانبرداری اور ایک دوسرے کے ساتھ تواضع وانکساری اختیار کرنے اور غرور وتکبر سے اجتناب کرنے کی صورت میں رکھتے ہیں اور حقیقت میں یہ خصوصیت بھی احکام خداوندی کی اطاعت میں شامل ہے۔

لوگوں کے ساتھ رابطہ واختلاط عزلت وگوشہ نشینی سے افضل ہے

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْمُسْلِمُ الَّذِيْ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ اَفْضَلُ مِنَ الَّذِيْ لَا يُخَالِطُهُمْ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔"جو مسلمان لوگوں کے ساتھ ربط واختلاط رکھے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرے وہ (اجر وثواب کے اعتبار سے) افضل ہے اس شخص سے جو لوگوں سے ربط واختلاط نہ رکھے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے ساتھ ربط واختلاط اور میل جول رکھنا، عزلت وتنہائی اور گوشہ نشینی اختیار کرنے سے افضل ہے چنانچہ اکثر تابعینؒ اس پر عامل تھے اور یہ چیز امر بالمعروف ونہی عن المنکر، خیر وبھلائی کے پھیلانے، باہمی امداد وتعاون اور دین واسلام کی استعانت کے اعتبار سے بھی زیادہ کامل اور زیادہ افضل ہے۔ رہی یہ بات کہ عزلت وگوشہ نشینی کے بارے میں بھی احادیث منقول ہیں جس سے عزلت وگوشہ نشینی کا افضل وبہتر ہونا ثابت ہوتا ہے تو اس سلسلے میں اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس اختلاف کا تعلق زمان ومکان اور لوگوں کے احوال کے اختلاف سے ہے یعنی بعض موقعہ ومقام اور بعض لوگوں کے حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ربط واختلاط رکھا جائے۔ چنانچہ ایسی صورت میں لوگوں سے ملنا جلنا عزلت وگوشہ نشینی اور لوگوں سے الگ تھلگ رہنا ہی افضل وبہتر ہوتا ہے۔ تاہم اس بارے میں جس درمیانی راہ کو اختیار کرنے کی ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ ذہنی طور پر ضروری اور ناگزیر حالات کے علاوہ باقی اوقات میں عوام الناس سے الگ تھلگ رہا جائے اور جمعہ وان کے ساتھ اکٹھا ہونے پر اکتفا کیا جائے البتہ خواص یعنی صالحین وغیرہ کے ساتھ برابر ربط واختلاط رکھا جائے اور ان سے عزلت وگوشہ نشینی اختیار نہ کی جائے۔ لیکن عوام الناس سے عزلت وگوشہ نشینی اختیار کرنا اس صورت میں سود مند ہوگا جب کہ باعث عمل علم حاصل کیا جا چکا ہو اور زہد وتوکل کا وہ درجہ نصیب ہو گیا ہو جہاں پہنچ کر انسان مخلوق سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے اور کسی طرح کی طمع وخواہش نہیں رکھتا اسی لئے بعض عارفین نے کہا کہ عزلت وگوشہ نشینی بغیر علم کے ذلت ورسوائی ہے اور بغیر زہد وقناعت کے علّت وخرابی ہے! چنانچہ کامل صوفیاء جیسے نقشبندیہ، شاذلیہ اس طریقہ پر عامل تھے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ بھی رہتے تھے اور پھر ان سے ربط واختلاط بھی رکھتے تھے۔

غصہ پر قابو پانے کی فضیلت

(۲۰) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَّهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى اَنْ يُّنْفِذَهٗ دَعَاهُ اللّٰهُ عَلٰى رُؤُسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُخَيِّرَهٗ فِيْ اَيِّ الْحُوْرِ شَآءَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاوُدَ عَنْ سُوَيْدِ بْنِ وَهْبٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَبْنَآءِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ مَلَا اللّٰهُ قَلْبَهٗ اَمْنًا وَّاِيْمَانًا وَّذُكِرَ حَدِيْثُ سُوَيْدٍ مَنْ تَرَكَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ فِيْ كِتَابِ اللِّبَاسِ۔

"اور حضرت سہل بن معاذ، اپنے والد (حضرت معاذؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا"جو شخص اپنے غصہ کو پی جائے باوجودیکہ وہ اس غصہ پر عمل کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق کے روبرو بلائے گا اور اس کو یہ اختیار دے گا کہ وہ جس حور کو چاہے پسند کر لے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اور ابوداؤد کی ایک اور روایت میں کہ جو انہوں نے سوید بن

وہب سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے کسی صحابیؓ کے ایک صاحبزادے سے نقل کی ہے یہ الفاظ ہیں کہ حضور ﷺ نے (تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق کے روبرو بلائے گا الخ) کے بجائے اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے دل کو امن وامان سے معمور کرے (جو اپنے غصہ کو پی جائے) اور حضرت سویدؓ کی یہ روایت من ترک لبس ثوب جمال الخ کتاب اللباس میں نقل کی جا چکی ہے۔

تشریح : "اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق کے روبرو بلائے گا" کا مطلب یہ کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن ساری مخلوق کے درمیان اس شخص کو نیک شہرت دے گا، اس کی تعریف وتوصیف کرے گا اور اس پر فخر کا اظہار کرے گا، نیز اس کے بارے میں اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ شخص ہے جس کے اندر اتنی بڑی خوبی تھی۔

غصہ پر قابو پانے کی صفت کو اتنا اونچا مقام دینے کی وجہ یہ ہے کہ غصہ دراصل نفس امارہ کی ہیجانی کیفیت کا نام ہے اور جس نے اپنا غصہ پی لیا اس نے گویا اپنے نفس امارہ کو کچل ڈالا، اسی لئے غصہ پر قابو پانے والوں کی تعریف حق تعالیٰ نے بھی ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ اور جو شخص اپنے نفس کو اس کی خواہش سے باز رکھتا ہے اس کا آخری ٹھکانہ جنت اور اس کا انعام حور عین ہے۔ واضح رہے کہ جب اتنا عظیم اجر محض غصہ کو پی جانے پر حاصل ہوگا تو اس شخص کے مقام ومرتبہ کی بلندی کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جو محض غصہ کو پی جانے پر اکتفانہ کرے بلکہ اس کے ساتھ عفو واحسان کا برتاؤ بھی کرے، چنانچہ امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اصل احسان یہی ہے کہ تم اس شخص پر احسان کرو جو تمہارے ساتھ برائی کرے کیونکہ جس شخص نے تم پر احسان کیا ہے اگر تم اس پر احسان کرتے ہو تو وہ تمہارا احسان نہیں بلکہ بدلہ چکانا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حیا کی تعریف وفضیلت

(۲۱) عَنْ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَيَاءُ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلًا وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ اَنَسٍ وَابْنِ عَبَّاسٍ۔

"اور حضرت زید بن طلحہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر دین اور مذہب میں ایک خلق ہے (یعنی ہر مذہب والوں میں ایک ایسی صفت وخصلت ہوتی ہے جو ان کی تمام صفتوں پر غالب اور ان کی ساری خصلتوں سے اعلیٰ ہوتی ہے) اور اسلام کا وہ خلق حیا ہے۔" اس روایت کو مالکؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے (کیونکہ زید صحابی نہیں ہیں بلکہ تابعیؒ ہیں نیز ابن ماجہؒ اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے اس روایت کو حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔

تشریح : یہاں "حیاء" سے اس چیز میں شرم وحیا کرنا مراد ہے جس میں حیا کرنا مشروع ہے، چنانچہ جن چیزوں میں شرم وحیاء کرنے کی اجازت نہیں ہے جیسے تعلیم وتدریس، امر بالمعروف ونہی عن المنکر ادائیگی حق کا حکم دینا، خود حق کو ادا کرنا اور گواہی دینا وغیرہ وغیرہ، ان میں شرم وحیاء کرنے کی کوئی فضیلت نہیں ہے۔

حدیث کا زیادہ مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر دین کے لوگوں پر کوئی نہ کوئی وصف وخصلت غالب رہتی ہے چنانچہ اہل اسلام پر جس طبعی وصف وخصلت کو غالب قرار دیا گیا ہے وہ حیاء ہے اور باوجودیکہ حیا بھی ان اوصاف وخصائل میں سے ہے جو تمام ادیان ومذاہب کے لوگوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں لیکن اسی وصف وحیاء کو خاص طور پر اہل اسلام پر غالب کیا گیا ہے اور دوسرے مذہب کے لوگوں میں اس جوہر کو بہت کم رکھا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حیاء نہ صرف یہ کہ طبعی خاصیتوں اور خصلتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ رکھتی ہے بلکہ یہ وہ جوہر ہے جس سے انسانی اخلاق وکردار کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور چونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ بعثت لاتمم

مکارم الاخلاق (میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہوں) اس لئے اس جوہر کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے اخلاق واوصاف کو کمال کے درجہ پر پہنچایا گیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف حیا ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہم سے پہلے کی امتوں میں تمام ہی اخلاق وخصائل ناقص تھے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آپ ﷺ کی برکت سے ملت اسلامیہ میں تمام اخلاق وخصائل کو کامل و مکمل کیا گیا اسی لئے ملت اسلامیہ کی اس خاصیت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الآية (تم کو دنیا والوں کے لئے سب سے بہتر امت بنا کر پیدا کیا گیا ہے الخ۔

ابن ماجہؒ اور بیہقیؒ نے مذکورہ بالا روایت کو حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بطریق موقوفہ نقل نہیں کیا ہے جیسا کہ عبارت سے ظاہری اسلوب سے یہ گمان ہو سکتا ہے بلکہ بطریق مرفوع آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کے طور پر نقل کیا ہے۔ نیز مذکورہ عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں یعنی ابن ماجہؒ اور بیہقی میں سے ہر ایک نے ان دونوں صحابیؓ سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ مذکورہ عبارت میں ان دونوں کا ذکر علی الترتیب ہو یعنی ابن ماجہؒ نے اس روایت کو حضرت انسؓ سے اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے، لیکن جامع صغیر میں اس حدیث کو ابن ماجہؒ کے سلسلہ کے ساتھ بروایت حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ نقل کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح بیہقی نے بھی اس روایت کو ان دونوں صحابیؓ سے نقل کیا ہے۔

ایمان اور حیاء لازم ملزوم ہیں

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْحَيَاءَ وَالْاِيْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِيْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُهُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ فَاِذَا سُلِبَ اَحَدُهُمَا تَبِعَهُ الْاٰخَرُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "حیا اور ایمان کو ایک دوسرے کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے لہذا جب کسی کو ان دونوں میں سے کسی ایک سے محروم کیا جاتا ہے تو وہ دوسرے سے بھی محروم رکھا جاتا ہے یعنی جو شخص ایمان سے محروم رہتا ہے وہ حیاء سے محروم رکھا جاتا ہے اور جس میں حیا نہیں ہوتی اس میں ایمان بھی نہیں ہوتا اور ایک دوسری روایت جو حضرت ابن عباس سے منقول ہے یوں ہے کہ ان دونوں میں سے جب ایک کو دور کیا جاتا ہے تو دوسرا بھی جاتا رہتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: لفظ قُرَنَاءُ اصل میں قرین کی جمع ہے۔ اس اعتبار سے یہ لفظ ان لوگوں کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اقل جمع کا اطلاق دو پر بھی ہوتا ہے ویسے بعض نسخوں میں یہ لفظ ماضی مجہول کے صیغہ تثنیہ کے ساتھ منقول ہے۔

خوش خلقی کی اہمیت

(۲۳) وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ كَانَ اٰخِرُ مَا وَصَّانِيْ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ وَضَعْتُ رِجْلِيْ فِي الْغَرْزِ اَنْ قَالَ يَا مُعَاذُ اَحْسِنْ خُلُقَكَ لِلنَّاسِ۔ (رواه مالک)

"اور حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے جن باتوں کی نصیحت ووصیت فرمائی ان میں سب سے آخری وصیت جو آپ ﷺ نے اس وقت فرمائی جب کہ میں نے (گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے اپنا پاؤں رکاب میں رکھا تھا یہ تھی کہ "معاذؓ لوگوں کی تربیت وتعلیم کے لئے خوش خلقی اختیار کرنا۔" (مالکؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ حیات میں حضرت معاذؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ چنانچہ جب حضرت معاذؓ اپنا منصب سنبھالنے کے لئے یمن روانہ ہونے لگے تو حضور نے ان کو بہت سی نصیحتیں فرمائیں گھوڑے پر سوار کرایا اور رخصت کرنے کے لئے خود پا پیادہ کچھ دور تک ان کے ساتھ گئے اس وقت آنحضرت ﷺ نے ان سے یہ الفاظ بھی فرمائے تھے کہ معاذ! شاید تم پھر مجھے نہ دیکھ پاؤ

چنانچہ معاذؓ کو اس کے بعد سرکار رسالت پناہ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی، وہ یمن ہی میں تھے کہ آنحضرت ﷺ نے اس دنیا سے پردہ فرمالیا۔ بہرحال حضرت معاذؓ نے مذکورہ بالا روایت میں آنحضرت ﷺ کی جس وصیت کا ذکر کیا ہے وہ اسی موقع پر ان کے لئے آنحضرت ﷺ کی آخری نصیحت تھی۔

سیوطیؒ کہتے ہیں کہ یہاں "لوگوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو خوش خلقی اور نرمی و مہربانی کے مستحق ہوں ورنہ جہاں تک اہل کفر و فسق اور ظالموں کا تعلق ہے وہ اس دائرہ سے خارج ہیں اور ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے کا حکم ہے بلکہ سرکش لوگوں کے ساتھ اختیار کی جانے والی سختی و درشتی کو ظاہر کرنا ہی حسن خلق میں داخل ہے۔ کیونکہ نہ صرف ان کی تربیت و تہذیب اسی سختی و درشتی پر منحصر ہوتی ہے بلکہ ان کے ساتھ اختیار کئے جانے والے اس رویہ کے ساتھ دوسرے لوگوں کے حالات کی بہتری و سلامتی بھی وابستہ ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیوطیؒ کے نزدیک گویا حدیث میں حسن خوش خلقی سے مراد نرمی و مہربانی اور عفو و درگزر کا رویہ اختیار کرنا ہے۔

(۲۴) وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ۔ رَوَاهُ فِي الْمُوَطَّا وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

"اور حضرت مالکؒ سے منقول ہے کہ ان تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں یعنی اس دنیا میں میری بعثت کا ایک عظیم مقصد یہ ہے کہ انسانی اخلاق و اوصاف کو بیان کروں اور ان کو درجہ کمال تک پہنچادوں۔" (مؤطا امام مالک اور احمدؒ نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا ہے۔

اپنی بہترین صورت و سیرت پر آنحضرت ﷺ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے

(۲۵) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَظَرَ فِي الْمِرْاٰةِ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ حَسَّنَ خَلْقِيْ وَخُلُقِيْ وَزَانَ مِنِّيْ مَا شَانَ مِنْ غَيْرِيْ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت جعفر بن محمدؒ اپنے والد بزرگوار حضرت امام باقرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا۔ "رسول کریم ﷺ جب آئینہ دیکھتے تو فرماتے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں وہ اللہ کہ جس نے مجھ کو بہترین تخلیق سے نوازا میرے اخلاق و کردار کو اچھا بنایا اور مجھ میں ان چیزوں کو آراستہ کیا جو میرے عیب و نقصان کا باعث ہیں، اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں بطریق ارسال نقل کیا ہے"

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بعض آدمیوں کی جسمانی تخلیق میں کوئی عیب و نقصان ہوتا ہے کہ مثلاً کوئی شخص ایک ہاتھ سے یا ایک آنکھ وغیرہ سے محروم ہوتا ہے یا کسی شخص کی کوئی ٹانگ "ٹیڑھی ہوتی ہے یا کوئی اور عضو ناقص ہوتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ میں کوئی جسمانی عیب و نقصان نہیں رکھا بلکہ مجھ کو تمام نقصان و عیوب سے محفوظ اور صحیح و سلامت رکھا! ملا علی قاری کی وضاحت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقصان و عیب عام ہے کہ اس کا تعلق خواہ جسمانی تخلیق و پیدائش سے ہو یا اخلاق و کردار سے۔ بہرحال یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کسی بھی انسان کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کی سیرت و صورت بہت اعلیٰ اور بہت خوب تھی اور جیسا کہ طیبیؒ نے کہا ہے مذکورہ بالا حدیث گویا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد بعثت لاتمم حسن الاخلاق (میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں) کی وضاحت بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا اپنے حسن صورت و حسن سیرت پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرنا، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس حمد و شکر کی طرح ہے جس کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ..... (یعنی اور بلاشبہ ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو علم سے مالامال کیا اور ان دونوں نے کہا کہ تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے ہمیں اپنے مؤمن بندوں میں سے اکثر پر فضیلت عطا فرمائی۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آئینہ دیکھنا مستحب ہے اور اپنے حسن صورت و حسن سیرت پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنا بھی مستحب

ہے کیونکہ یہ دونوں نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہیں لہٰذا ان پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے! رہی یہ بات کہ ظاہری حسن وخوبصورتی ایک ایسی چیز ہے جس کو آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے لہٰذا آئینہ دیکھ کر اس پر شکر ادا کرنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اس کے ساتھ حسن سیرت یا حسن خلق کا ذکر سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ وہ ایک پوشیدہ چیز ہے جس کا آئینہ میں دیکھا جانا ممکن ہی نہیں ہے؟ اس کے جواب میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بے شک حسن سیرت کوئی نظر آنے والی چیز نہیں ہے لیکن انسان کا ظاہر بہرحال اس کے باطن کی غمازی کرتا ہے اور کسی دوسرے کے بارے میں بات چاہے صحیح نہ ہو لیکن رسول خدا پر یہ بات ضرور صادق آتی ہے کہ حسن صورت حسن سیرت کا ایک ایسا جلی عنوان ہوتا ہے جس کو دیکھ کر باطن کے احوال کا ادراک کیا جاسکتا ہے لہٰذا اس مناسبت سے حضور ﷺ نے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت کو بھی ذکر فرمایا اور اگر یہ سوال پیدا ہو کہ کیا آنحضرت ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی اتباع میں آئینہ دیکھ کر مذکورہ طرح سے حمد وثنا کریں یا اس طرح حمد وثنا کرنا صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا اور دوسرے لوگ وہ دعا پڑھنے پر اکتفا کریں جو آگے آنے والی حدیث میں نقل ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں حمد وثناء اور شکر کے جو الفاظ مذکور ہیں ان کو ہر مؤمن پڑھ سکتا ہے کیونکہ انسان اس اعتبار سے کہ وہ اچھی صورت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور وہ صاحب ایمان ہے بلا شک وشبہ خدا کی مخلوق کامال اور دین واخلاق کے اوصاف سے مزین ہوتا ہے تاہم بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حمد وثنا اور شکر کے مذکورہ الفاظ اپنی ذات کے تعلق سے فرمائے تھے اور ظاہر ہے کہ حسن صورت اور حسن سیرت کا وصف جو کمال ونہایت کے ساتھ حضور ﷺ کی ذات میں تھا وہ کسی دوسرے میں نہیں ہوسکتا اس لئے کسی دوسرے کے لئے ان الفاظ کو استعمال کرنا موزوں نہیں ہوگا چاہے اُمت کے بعض افراد کے اعتبار سے اس طرح کے الفاظ کے استعمال کو جائز نہ کہا جائے لیکن اُمت کے لئے بہتر یہی ہے کہ اسی دعا کو اختیار کیا جائے جو اگلی حدیث میں منقول ہے۔

حسن خلق کی دعا

(۲۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَاَحْسِنْ خُلُقِيْ (رواہ احمد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (یہ دعا) فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! تو نے میری جسمانی تخلیق کو اچھا کیا ہے لہٰذا میرے اخلاق کو بھی اچھا بنا۔" (احمدؒ)

تشریح: یہ دعا یا تو آپ ﷺ مطلق کسی بھی وقت فرماتے تھے یا آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر فرماتے تھے جیسا کہ جزریؒ نے حصن حصین میں صراحت بھی کی ہے اور پہلی حدیث کے مطابق یہی زیادہ موزوں ہے! نیز آنحضرت ﷺ کی یہ دعا تو اُمت کی تعلیم وتلقین کے لئے تھی تاکہ امت کے لوگ اپنے حق میں اسی طرح دعا مانگا کریں اور یا اس دعا کا تعلق خود آپ ﷺ کی ذات سے تھا اس صورت میں آپ ﷺ کی مراد گویا یہ طلب ودرخواست تھی کہ خدایا! اپنے دین کو کامل اور اپنی نعمتوں کو پورا کردے اس مراد کا قرینہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خلق کو اچھا اور مہذب کرنے کا ذریعہ قرآن کریم تھا جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا کہ آنحضرت ﷺ کا خلق قرآن تھا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کا اپنے اخلاق کا اچھا ہونے کی دعا کرنا درحقیقت قرآنؑ کو نازل کرنے اور اس کے نزول کو پورا کرنے کی طلب ودرخواست تھی۔

بہترین لوگ کون ہیں؟

(۲۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخِيَارِكُمْ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ خِيَارُكُمْ اَطْوَلُكُمْ اَعْمَارًا وَّاَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں بہترین لوگ کون ہیں! صحابہؓ نے

عرض کیا کہ ہاں ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو لمبی عمر والے ہیں اور جن کے اخلاق بہت اچھے ہیں۔"

(احمدؒ)

تشریح: ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے اخلاق و اطوار پاکیزہ اور اچھے ہوں گے اور ان کی عمر زیادہ ہوگی تو وہ نیکیاں اور ... تیں بہت کریں گے جس کے نتیجے میں ان کو فضائل و کمالات بھی زیادہ حاصل ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی عمر کا دراز ہونا اس کے حق میں بہت مبارک ہے اور حقیقت میں دراز عمر شخص وہی ہے جو نیک کاموں میں مشغول رہے۔

(۲۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا۔ (رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ایمان میں کامل ترین لوگ وہی ہیں جن کے اخلاق بہتر ہیں۔"

(ابوداؤد، دارمیؒ)

تین خاص باتیں

(۲۹) وَعَنْهُ اَنَّ رَجُلاً شَتَمَ اَبَا بَکْرٍ وَّالنَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ یَتَعَجَّبُ وَیَتَبَسَّمُ فَلَمَّا اَکْثَرَ رَدَّ عَلَیْہِ بَعْضَ قَوْلِہٖ فَغَضِبَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَامَ فَلَحِقَہٗ اَبُوْبَکْرٍ وَّقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ کَانَ یَشْتِمُنِیْ وَاَنْتَ جَالِسٌ فَلَمَّا رَدَدْتُّ عَلَیْہِ بَعْضَ قَوْلِہٖ غَضِبْتَ وَقُمْتَ قَالَ کَانَ مَعَکَ مَلَکٌ یَّرُدُّ عَلَیْہِ فَلَمَّا رَدَدْتَّ عَلَیْہِ وَقَعَ الشَّیْطَانُ ثُمَّ قَالَ یَا اَبَا بَکْرٍ ثَلٰثٌ کُلُّھُنَّ حَقٌّ مَامِنْ عَبْدٍ ظُلِمَ بِمَظْلَمَۃٍ فَیُغْضِیْ عَنْھَا لِلّٰہِ عَزَّوَجَلَّ اِلاَّ اَعَزَّ اللّٰہُ بِھَا نَصْرَہٗ وَمَا فَتَحَ رَجُلٌ بَابَ عَطِیَّۃٍ یُّرِیْدُ بِھَا صِلَۃً اِلاَّ زَادَ اللّٰہُ بِھَا کَثْرَۃً وَّمَا فَتَحَ رَجُلٌ بَابَ مَسْئَلَۃٍ یُّرِیْدُ بِھَا کَثْرَۃً اِلاَّ زَادَ اللّٰہُ بِھَا قِلَّۃً۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ (صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے حضرت ابوبکرؓ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، آنحضرت ﷺ (اس کی سخت سست باتوں کو سن کر) حیرت کرتے اور مسکراتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ شخص برا بھلا کہنے میں حد سے گزر گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس کی بعض باتوں کا جواب دیا (یعنی انہوں نے بھی اس شخص کو جواب میں کچھ برا بھلا کہا) اس پر نبی کریم ﷺ ناراض ہوگئے اور وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے حضرت ابوبکرؓ بھی آ گئے اور خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! جب وہ شخص مجھ کو برا بھلا کہہ رہا تھا تو آپ ﷺ وہاں بیٹھے رہے لیکن میں نے جب اس کی بعض باتوں کا جواب دیا (اور اسی کے الفاظ میں دوسرے انداز میں اس کو برا بھلا کہا تو آپ ﷺ ناراض ہوگئے اور وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے (اس میں آپ ﷺ کے نزدیک کیا حکمت تھی؟) حضور ﷺ نے فرمایا "(اصل بات یہ ہے کہ جب تک تم خاموش رہے تو) تمہارے ساتھ فرشتہ تھا جو (تمہاری طرف سے) اس کو جواب دے رہا تھا مگر جب تم نے خود جواب دیا (اور اس طرح نفس کی خواہش کا عمل دخل ہوگیا) تو شیطان درمیان میں کود پڑا پھر فرمایا "ابوبکرؓ! تین باتیں ہیں اور وہ سب حق ہیں ایک تو یہ کہ جو بندہ کسی کے ظلم کا شکار ہوتا ہے اور محض اللہ (کی رضا اور اس کے ثواب کی طلب) کے لئے (نہ کہ اپنے عجز کی وجہ سے یا دکھانے منانے کے لیے) اس ظالم سے چشم پوشی کرتا ہے (یعنی اس سے درگزر کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس (ظلم کے سبب یا اس کے وصف چشم پوشی کی) بناء پر (دنیا و آخرت) میں اپنی مدد کے ذریعہ اس بندہ کو مضبوط و قوی بناتا ہے دوسرے یہ کہ جو بھی بندہ اپنی عطاء و بخشش کا دروازہ کھولتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اپنے قرابت داروں اور مسکینوں کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کرے (یعنی ان کی مالی امداد و اعانت کرے) تو اللہ تعالیٰ اس کے عطا و بخشش کے سبب اس کے مال دولت میں (ظاہری باطنی خیر و برکت کی صورت میں) اضافہ کرتا ہے اور تیسرے یہ کہ جو شخص سوال و گدائی کا دروازہ کھولتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اپنی دولت کو بڑھائے (یعنی اس کا لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا حاجت و ضرورت کی بنا پر نہیں ہوتا محض اپنے مال و دولت میں اضافہ کی خاطر ہوتا ہے) تو اللہ اس کو گدائی کے سبب اس کے مال و دولت کو اور کم کر دیتا ہے (یعنی خواہ ظاہری طور پر اس کے مال و دولت کو

نقصان وبربادی سے دوچار کرتا ہے یا اس کی خیر وبرکت سے اس طرح محروم کردیتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے مال میں کمی ونقصان کو محسوس کرتا رہتا ہے۔" (احمد)

تشریح: "حیرت کرتے اور مسکراتے تھے۔ میں حیرت کا تعلق یا تو اس شخص کی بدزبانی اور اس میں شرم وحجاب کی کمی سے تھا یا حضرت ابوبکرؓ کے صبر وتحمل اور ان کے باوقار وبردبار رویہ سے تھا اور مسکرانے کا تعلق اس فرق سے تھا جو آپ ﷺ ان دونوں کے درمیان دیکھ رہے تھے علاوہ ازیں آپ ﷺ کی نظر ان دونوں کے حق میں مرتب ہونے والے نتیجہ پر بھی تھی کہ وہ شخص تو اپنی بدکلامی کے سبب عذاب کا مستوجب ہورہا تھا اور حضرت ابوبکرؓ پر ان کے صبر وتحمل اور بردباری وچشم پوشی کے سبب رحمت الٰہی نازل ہورہی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس کی بعض باتوں کا جواب دیا گویا انہوں نے اس موقع پر (جواب دے کر) رخصت واجازت پر عمل کیا جو ایک عام آدمی کیلئے موزوں ہے اور اس عزیمت کو ترک کیا جو خواص کے مرتبہ وشان کے عین مطابق ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جَزٰٓ ءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (برائی کا بدلہ اس برائی کے مطابق لیا جاسکتا ہے لیکن جو شخص درگزر کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے) چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اگرچہ اس شخص کی بعض باتوں کا بدلہ لے کر اور بعض باتوں پر صبر اختیار کرکے گویا دونوں پہلوؤں کی رعایت کی مگر نگاہ نبوت میں چونکہ ان کے لئے وہ مرتبہ کمال مطلوب تھا جو ان کی شان صدیقیت کے مطابق ہے اس لئے ان کا اس شخص کی بعض باتوں کا جواب دے کر جزوی بدلہ لینا بھی حضور ﷺ کو پسند نہیں آیا اور آپ ﷺ پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو ناراض ہوجانے والے شخص پر ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ اس مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تاکہ ایک طرف تو حضرت ابوبکرؓ کے رویہ پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہوجائے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل بھی ہوجائے کہ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ (یعنی جب وہ کوئی لغویات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں۔

"شیطان درمیان میں کود پڑا" یعنی حضور ﷺ نے گویا یہ واضح فرمایا کہ جب تم خود جواب دینے لگے تو پھر شیطان کو دخل دینے کو موقع مل گیا اور وہ فرشتہ جو تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا آسمان پر چلا گیا، اور تم یہ جانتے ہی ہو کہ جب کسی معاملہ میں شیطان کود پڑے تو کیا کچھ نہیں ہوجاتا وہ بے حیائی اور برائی پر اکسانے کے علاوہ اور کیا کرسکتا ہے چنانچہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں شیطان کا داؤ تم پر نہ چل جائے اور تم اپنے مخالف سے بدلہ لینے میں حد سے زیادہ بڑھ جاؤ اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ تم جو مظلوم تھے ظالم کی جگہ پر آجاؤ جب کہ چاہئے یہ کہ تم اللہ کے مظلوم بندے بنو ظالم بندے نہ ہو۔

نرمی ومہربانی کرنے کا اثر

(۳۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُرِيْدُ اللّٰهُ بِاَهْلِ بَيْتٍ رِفْقًا اِلَّا نَفَعَهُمْ وَلَا نَحْرِمُهُمْ اِيَّاهُ اِلَّا ضَرَّهُمْ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ جن گھر والوں کے لئے نرمی ومہربانی پسند کرتا ہے اس کے ذریعہ ان کو نفع پہنچاتا ہے اور جن گھر والوں کو نرمی ومہربانی سے محروم رکھتا ہے اس کے ذریعہ ان کو نقصان پہنچاتا ہے۔" (بیہقی)

بَابُ الْغَضَبِ وَالْكِبْرِ

غصہ اور تکبر کا بیان

"غضب" کے معنی ہیں غصہ ہونا! اور حقیقت میں غضب یا غصہ اس طبعی کیفیت وحالت کو کہتے ہیں جو طبیعت ومزاج کے خلاف

پیش آنے والی بات پر نفس کو برانگیختہ کرتی ہے، انتقام لینے پر اکساتی ہے اور ناپسندیدہ چیز میں مغضوب علیہ کی طرف میلان کرتی ہے تاکہ اس سے انتقام لے سکے اور طبیعت کیخلاف پیش آنے والی صورت حال کو دور کر سکے، اسی وجہ سے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور رگیں پھول جاتی ہیں اس طرح خوشی کی حالت میں بھی روح باہر کی طرف میلان کرتی ہے تاکہ اس چیز کے سامنے آجائے جو خوشی کا باعث بنی ہے۔ چنانچہ غصہ یا خوشی کی زیادتی کے وقت ہلاکت کا خوف اسی لئے ہوتا ہے کہ ایسے موقع پر روح پوری طرح بالکل نکل آنا چاہتی ہے۔ اس کے برخلاف غم یا خوف کی حالت میں روح اندر کی طرف چلی جاتی ہے جس کی وجہ سے چہرہ پر زردی چھا جاتی ہے اور جسم کو کمزوری لاحق ہو جاتی ہے، اس حالت میں بھی ہلاکت کا خوف ہوتا ہے کیونکہ روح پوری طرح اندر کی طرف چلی جاتی ہے اور مطلق سرد ہو جاتی ہے! اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف غضب و غصہ کی نسبت کرنا جیسا کہ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (جو شخص اللہ کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتا تو اللہ اس پر غصہ ہوتا ہے) مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے غصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بندے سے ناراض ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو کوئی بادشاہ غصہ کے وقت اپنی رعایا کے ساتھ کرتا ہے یعنی سزا دیتا ہے اور عذاب نازل کرتا ہے۔ غضب کی ضد حلم ہے اور حلم دراصل نفس و طبیعت کے اس سکون و استقلال کا نام ہے جو محبوب ترین چیز کے قریب پہنچ جانے اور مقصود و مراد کے بالکل سامنے ہونے کے وقت بھی انسان کو بے قرار نہیں ہونے دیتا جیسا کہ وفد عبدالقیس کے سردار حضرت منذرؓ کے بارے میں یہ روایت منقول ہے کہ جب وہ اپنا وفد لے کر مدینہ پہنچے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر اس اضطراب۔ بے قراری کا اظہار نہیں کیا جو انکی قوم کے دوسرے لوگوں نے ظاہر کیا تھا اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو حلم و وقار کی خوبیوں سے موصوف قرار دیا ہے۔

واضح رہے کہ غضب غصہ کوئی ایسی خصلت نہیں ہے جس کو بذات خود برا کہا جائے بلکہ اس میں برائی اس وقت آتی ہے جب اس کی وجہ سے راہ حق چھوٹ جائے اور احکام شریعت کی پابندی ترک ہو جائے چنانچہ جو غضب و غصہ حق کی خاطر ہو اور حق کی راہ میں ہو اس کو محمود و مستحسن کہا جائے گا یہی وجہ ہے کہ راہ طریقت و سلوک میں ریاضت و مجاہدہ کا مقصد مطلق غضب و غصہ کو ختم کر دینا نہیں ہوتا بلکہ اس کو قابو میں رکھنا اور حق کے تابع کرنا ہوتا ہے اور ویسے بھی قدرت نے غضب کو ایک ایسی قوت بنایا ہے جو جسمانی نظام کو برقرار رکھنے کا ذریعہ اور بقاء حیات کا سبب ہے کیونکہ یہ قوت غضبیہ ایسی ہوتی ہے جو مضرات و موذیات سے بچاتی ہے چنانچہ نباتات و جمادات کو نیست و نابود کرنے پر ہر کوئی اسی لئے قادر ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دونوں کو قوت غضبیہ سے محروم رکھا ہے اس کے برخلاف حکمت کاملہ خداوندی نے حیوانات میں نہ صرف یہ کہ قوت غضبیہ پیدا کی ہے بلکہ ان کے بعض جسمانی حصوں کو گویا ایسے آلات و ہتھیار کے طور پر بنایا جن سے وہ نقصان و ایذاء پہنچانے والوں سے اپنا دفاع کر سکیں، جیسے سینگ اور دانت وغیرہ اور انسان میں اگرچہ اس طرح کی چیزیں پیدا نہیں کی ہیں لیکن اس کو وہ عقل و تدبیر دکھا دی ہے جس کے ذریعہ وہ ضرورت و حالت کے مطابق ایسے آلات و ہتھیار بنا سکتا ہے جو اس کو نقصان و ایذا پہنچانے والے سے محفوظ رکھ سکتے ہوں۔

"کبر" کے اصل معنی تو بڑائی کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ کبر ہے جو عجب یعنی خود بینی و خود ستائی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے چنانچہ اپنے آپ کو اس طور پر بڑا سمجھنا اور بڑا ظاہر کرنا کہ جس کے سبب لوگوں پر اپنی فوقیت برتری جتانا مقصود ہو حق کو قبول کرنے اور حق کی فرمانبرداری سے انکار ہوتا ہو اور تمرد و سرکشی ظاہر ہوتی ہو تکبر اور استکبار کہلائے گا! واضح رہے کہ کبر اور تکبر اس صورت میں مذموم ہے جب کہ وہ واقع کے خلاف ہو، یعنی اگر کوئی شخص اپنی ذات میں ایسے اوصاف و فضائل اور کمالات کا دعوی کرے جن سے حقیقت میں وہ خالی ہو اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ان فضائل و کمالات سے متصف ظاہر کرتا ہو تو ایسا کرنا مذموم ہوگا اور اگر اس شخص کی ذات میں واقعۃً ایسے فضائل و کمالات ہوں جن کی بنا پر وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر و بلند اور بڑا سمجھتا اور ظاہر کرتا ہو تو یہ مذموم نہیں ہوگا۔ نیز یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ تکبر کے مقابلہ پر تواضع ہے جو کبر اور صغر کے درمیان توسط اور راہ استدلال ہے، چنانچہ کبر تو یہ ہے کہ

کوئی شخص ان اوصاف و فضائل سے بھی زیادہ کا دعوی کرے جو وہ اپنے اندر رکھتا ہے، اور صغر یہ ہے کہ اپنے اصل مقام سے بھی نیچے گر جائے اور وہ جس چیز کے دعوی کا حق رکھتا ہے اس کو بھی ترک کر دے ان دونوں کے درمیان تواضع ہے جو توسط اور اعتدال کا مقام ہے یعنی اپنے آپ کو نہ تو حد سے زیادہ بڑھایا جائے اور نہ حد سے نیچے گرایا جائے بلکہ بین بین رکھا جائے، کیونکہ ہر چیز اور ہر حالت کی طرح اس معاملہ میں بھی اصل کمال توسط اور اعتدال ہی ہے اگرچہ مشائخ اور صوفیاء قدس اللہ ارواحہم کا معمول یہ رہا ہے کہ جب وہ اپنے نفس میں تکبر کا غلبہ دیکھتے تھے تو اس کو زائل کرنے میں اتنا مبالغہ کرتے تھے کہ تواضع کے بجائے صغر کا مقام اختیار کرنیکی کوشش کرتے تاکہ نفس آخر الامر تواضع کے مقام پر رک جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

غصہ سے اجتناب کی تاکید

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِیْ قَالَ لاَ تَغْضَبْ فَرَدَّدَ ذٰلِكَ مِرَارًا قَالَ لاَ تَغْضَبْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرما دیجئے (تاکہ میں اس پر عمل کر کے دین و دنیا کی بھلائی حاصل کروں) آپ ﷺ نے فرمایا "غصہ مت کرو" اس شخص نے یہ بات (کہ آپ ﷺ مجھے کوئی نصیحت فرما دیجئے) کئی مرتبہ کہی اور آپ ﷺ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ غصہ مت کرو۔" (بخاری)

تشریح: چونکہ اس شخص میں غصہ کا مادہ زیادہ تھا اس لئے اس نے جتنی مرتبہ بھی یہ درخواست کی کہ مجھ کو کوئی نصیحت فرما دیجئے، آپ ﷺ نے یہی جواب دیا کہ غصہ مت کرو چنانچہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا کہ سوال کرنے والا جس حالت و کیفیت کا حامل ہوتا اس کو جواب اسی حالت و کیفیت کے مطابق ارشاد فرماتے، اور ہر ایک کے مرض کا علاج اس کے احوال کی مناسبت سے تجویز فرماتے، اسی لئے آپ ﷺ نے اس شخص کے حق میں، اجتناب کے حکم کو بار بار ظاہر کرنا ہی مناسب جانا۔

بعض محققین کہتے ہیں کہ غضب و غصہ کی کیفیت دراصل شیطانی وسوسوں سے پیدا ہوتی ہے جس کے سبب انسان ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی، اعتدال کی راہ سے گزر جاتا ہے اور شیطان کے جال میں پھنس جاتا ہے چنانچہ اس حالت میں وہ نہ صرف اس طرح اول فول بکنے لگتا ہے اور ایسے افعال و حرکات کا ارتکاب کرتا ہے جو شرعی طور پر بھی اور اخلاقی طور پر بھی نہایت برے اور ناز یبا ہوتے ہیں، بلکہ دل میں کینہ اور بغض بھی رکھتا ہے، اس کے علاوہ ایسی اور بہت سی چیزیں اس سے صادر ہوتی ہیں جو بد خلقی و بدخوئی کی نشانیاں ہیں، اور بسا اوقات تو غصہ کرنے والا اس درجہ مغلوب الغضب ہو جاتا ہے کہ اس سے کفر تک سرزد ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی یہ بات واضح ہوئی کہ غضب و غصہ چونکہ انسان کو دین و دنیا کے سخت ترین نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے اس لئے آپ ﷺ نے مذکورہ شخص کے بار بار عرض گزار ہونے کے باوجود بس ایک ہی نصیحت کی کہ غصہ مت کرو! اور ہر مرتبہ اسی کی تاکید فرماتے رہے، گویا آپ ﷺ نے اس کو یہ تعلیم ارشاد فرمائی کہ غصہ کا تعلق بد خلقی سے ہے اور بد خلقی محض ایک ہی برائی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے نہ معلوم کتنی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور کتنے نقصانات کرنا پڑتے ہیں۔ لہذا غصہ سے اجتناب و پرہیز کر کے خوش خلقی اختیار کرو جو دین و دنیا کی بھلائیوں اور دارین کی سعادتوں کی ضامن ہے۔

ایک بات یہ بھی جان لینی چاہئے کہ شریعت نے غصہ کا علاج بھی تجویز کیا ہے جو علم و عمل یا ظاہر و باطن کا مرکب ہے، چنانچہ اگر کوئی ایسی صورتحال پیش آجائے جو غصہ کا سبب ہو تو اس صورت میں علمی یا باطنی و قلبی علاج یہ ہے کہ دل میں یہ تصور کرے اور اس پر یقین رکھے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کے ارادہ و تقدیر کے بغیر نہیں ہوتا، جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، نفع و نقصان سب اسی

ے اختیار میں ہے، انسان تو ظاہر میں ایک آلہ ہے، لہٰذا جس شخص کی طرف سے کوئی نقصان یا تکلیف پہنچے اس پر غصہ ہونا ایسا ہے جیسے کوئی شخص چھری یا چاقو پر غصہ ہو کہ اس نے کیوں کاٹا علاوہ ازیں اپنے نفس کو سمجھائے کہ دیکھ اللہ تعالیٰ کس قدر قادر ہے اور اس کا غضب کتنا شدید ہے مگر اس کے باوجود وہ درگزر کرتا ہے بندے اس کی کس طرح مخالفت کرتے ہیں اور اس کے احکام سے کس طرح سرکشی اختیار کرتے ہیں لیکن وہ ان پر اپنا غضب نازل نہیں کرتا، پھر تو اتنا بڑا کہاں کا آیا کہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا دوسرا علاج جو عملی یا ظاہری ہے وہ یہ ہے کہ فوراً وضو کر ڈالے اور اعوذ پڑھنے لگے تاکہ پانی کی ٹھنڈک، غصہ کی حرارت کو فرو کر دے اور نفس دوسری طرف مشغول ہو جائے۔

طاقتور شخص

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "طاقتور اور پہلوان وہ شخص نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے بلکہ طاقتور اور پہلوان وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت (اپنے نفس کو پچھاڑ دے اور) اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اصل میں اگر کوئی چیز انسان کی سب سے بڑی دشمن اور اس کے مقابلہ میں سب سے زیادہ طاقتور ہے تو وہ خود اس کا نفس! اگر کوئی شخص بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑتا رہا اور اپنے طاقتور ترین دشمن کو بھی زیر کرتا رہا، مگر خود اپنے نفس پر غالب نہیں آسکا تو یہ کوئی کمال نہیں ہے، اصل کمال تو یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو زیر کرے جو اس کا اصل دشمن ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔

اعدی عدوک نفسک التی جنبیک۔

"تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔"

واضح رہے کہ بدن کی قوت ظاہری اور جسمانی ہے جو زوال پذیر اور فنا ہو جانے والی ہے اس کے برخلاف جو قوت نفس کو زیر کرتی ہے وہ دینی اور روحانی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ لہٰذا نفس کو مارنا، وصف اور کمال کی بات ہے جب کہ آدمی کو پچھاڑنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا ؎

مردے نہ بقوت بازو ست وزور کتف   بانفس اگر برآئی دانم کہ شاطرے

جنتی اور دوزخی لوگ

(۳) وَعَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ الْجَنَّةِ كُلُّ ضَعِيْفٍ مُتَضَعَّفٍ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ كُلُّ جَوَّاظٍ زَنِيْمٍ مُتَكَبِّرٍ۔

"اور حضرت حارث بن وہبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "کیا میں تمہیں جنتیوں کو بتلادوں؟ (یعنی کیا میں یہ کہوں کہ کون لوگ جنتی ہیں! تو سنو) ہر وہ ضعیف شخص (جنتی ہے) جس کو لوگ ضعیف و حقیر سمجھیں (اور اس کی کمزوری و شکستہ حالی کی وجہ سے اس کے ساتھ جبر و تکبر کا معاملہ کریں حالانکہ (حقیقت کے اعتبار سے وہ ضعیف و کمزور اللہ کے نزدیک اس قدر اونچا مرتبہ رکھتا ہے کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر کسی بات پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو سچا کر دے۔ اور کیا میں تمہیں وہ لوگ بتلادوں جو دوزخی ہیں؟ (تو سنو) ہر وہ شخص

(دوزخی ہے) جو جھوٹی اور لغو باتوں پر سخت گوئی کرنے والا جھگڑالو ہو مال جمع کرنے والا بخیل ہو اور تکبر کرنے والا ہو (بخاری ؒ اور مسلم ؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہر وہ شخص دوزخی ہے) جو مال کو جمع کرنے والا حرام زادہ اور تکبر کرنے والا ہو۔"

تشریح: حدیث میں ضعیف سے مراد وہ شخص ہے جو نہ تو گھمنڈی اور متکبر ہو اور نہ لوگوں پر جبر و زیادتی کرنے والا ہو۔ لفظ "متضعف" میں مشہور تو عین پر زبر ہی ہے اور ترجمہ میں اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، لیکن بعض حضرات نے عین کو زیر کے ساتھ پڑھا ہے، اس صورت میں اس لفظ کے معنی، متواضع، کمتر اور گمنام کے ہوں گے۔

"ہر ضعیف جنتی ہے۔" سے مراد یہ ہے کہ جنت میں جن لوگوں کی اکثریت ہوگی وہ یہی لوگ ہوں، اسی طرح دوسری قسم کے لوگ (یعنی جن کو دوزخی قرار دیا گیا ہے، سے بھی یہی مراد ہے کہ دوزخیوں کی اکثریت ان ہی لوگوں پر مشتمل ہوگی۔

علماء نے لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ کے معنی بیان کئے ہیں، ایک تو یہ کہ اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر اعتماد کر کے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کرتا ہے اور اس کے اعتماد کو پورا کرتا ہے یعنی اس کی قسم ٹوٹتی نہیں بلکہ پوری ہوتی ہے۔

ترجمہ میں اس معنی کو ملحوظ رکھا گیا ہے! دوسرے یہ کہ اگر وہ شخص اپنے پروردگار سے کسی چیز کا طلب گار ہوتا ہے اور اس کو قسم دے کر اپنی مراد پوری ہونے کی دعا کرتا ہے تو پروردگار اس کی قسم کی لاج رکھتا ہے اور اس کی مراد پوری کرتا ہے اور تیسرے یہ کہ اگر وہ شخص کسی کام کے بارے میں قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کام کو کرے گا یا اس کام کو نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو سچا کرتا ہے یعنی اس طرح کرتا ہے جو اسکی قسم کے مطابق ہوتا ہے۔

زَنِیم کے معنی کمینہ کے ہیں اور اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کسی ایسی قوم یا ایسے طبقہ کی طرف منسوب کر لے جس سے حقیقت میں وہ کوئی تعلق نہیں رکھتا اسی لئے "زنیم" کا ترجمہ "حرام زادہ" کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عتل اور زنیم کے الفاظ قرآن کریم میں بھی آئے ہیں اور مذکورہ بالا معنی ہی میں ان الفاظ کا مصداق ولید بن مغیرہ کو قرار دیا گیا ہے جو کفار مکہ میں سے نہایت بدطن اور اسلام و پیغمبر اسلام کا سخت ترین دشمن تھا۔

متکبر جنت میں داخل نہیں ہوگا

④ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ النَّارَ اَحَدٌ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِیْمَانٍ وَّلَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اَحَدٌ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ کِبْرٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعود ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "وہ شخص (ہمیشہ کے لیے) دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ برابر بھی ایمان ہوگا، اور وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ برابر بھی تکبر ہوگا۔" (مسلم)

تشریح: "ایمان" سے مراد اصل ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان کے ثمرات مراد ہیں جن کو فضائل و اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے خواہ ان کا تعلق ظاہر سے ہو یا باطن سے اور جو نور ایمان اور ظہور ایقان سے صادر ہوتے ہیں۔ جہاں تک اصلی ایمان کا تعلق ہے وہ چونکہ تصدیق قلبی کا نام ہے اسلیئے اس میں نہ تو زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی، اس اعتبار سے اس کو اجزاء میں منقسم بھی نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس کے شعبے اور شاخیں بہت ہیں جو اصل ایمان کی حقیقت و ماہیت سے خارج ہیں جیسے نماز روزہ اور زکوۃ اور اسی طرح اسلام کے دوسرے تمام ظاہری احکام یا جیسے تواضع اور ترحم اور اسی طرح وہ تمام چیزیں جو باطنی اوصاف و خصائل کا درجہ رکھتی ہیں، چنانچہ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے الایمان بضع وسبعون شعبة (ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں) ظاہر ہے کہ شاخوں اور اس کی اصل کے درمیان اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اس کے باوجود حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے کوئی بھی شاخ اپنی اصل کا مترادف نہیں ہو سکتی اس طرح اصل ایمان ایک الگ چیز ہے اور اسلام کے تمام ظاہری احکام و باطنی اخلاق و خصائل جداگانہ

حیثیت رکھتے ہیں جن کو اصل ایمان کی حقیقت و ماہیت میں شامل نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ آنحضرت کا یہ ارشاد الحیاء شعبة من الایمان (حیاء ایمان کی ایک شاخ ہے) مذکورہ بالا قول کی دلیل ہے کیونکہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حیاء ایمان کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔

حدیث کے دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک جنّت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کے نامہ اعمال میں تکبر کا گناہ موجود رہے گا ہاں جب وہ تکبر اور دوسری بری خصلتوں کی آلائش سے پاک وصاف ہو جائے گا تو اس وقت جنّت میں داخل کیا جائے گا، اور یہ پاکی وصفائی یا تو اس صورت میں حاصل ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں مبتلا کرے گا اور وہ عذاب اس آلائش کو دھودے گا یا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کو معاف کردے گا اور معافی اس آلائش کو زائل کردے گی۔ خطابیؒ نے لکھا ہے کہ حدیث کے اس جزء کی دو تاویلیں ہیں، ایک تو یہ کہ (کبر) سے کفر و شرک مراد ہے اور ظاہر ہے کہ کفر و شرک کے مرتکب پر جنّت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ بند رہیں گے دوسری تاویل یہ ہے کہ "کبر" سے مراد تو اس کے اپنے معنی ہی ہیں یعنی اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے برتر و بلند سمجھنا اور غرور گھمنڈ میں مبتلا ہونا البتہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ متکبر شخص اس وقت تک جنّت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ حق تعالیٰ کی رحمت اس پر متوجہ نہ ہو چنانچہ جب حق تعالیٰ اس کو جنّت میں داخل کرنا چاہے گا تو اس کے دل میں سے کبر کو نکال باہر کرے گا اور پھر اس کی کدورتوں سے پاک وصاف کر کے جنّت میں داخل کردیگا۔

تکبر کی حقیقت

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَّ نَعْلُهٗ حَسَنًا قَالَ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص جنّت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا (یہ سن کر) ایک شخص نے عرض کیا کہ کوئی آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس عمدہ ہو اور اس کے جوتے اچھے ہوں (اور وہ اپنی اس پسند وخواہش کے تحت اچھا لباس پہنتا ہے اور اچھے جوتے استعمال کرتا ہے تو کیا اس کو بھی تکبر کہیں گے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ جمیل یعنی اچھا اور آراستہ ہے اور جمال یعنی اچھائی و آراستگی کو پسند کرتا ہے، اور تکبر یہ ہے کہ حق بات کو ہٹ دھرمی کے ساتھ نہ مانا جائے اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھا جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ذرہ" سے یا تو چیونٹی مراد ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جیسی سو چیونٹیاں مل کر ایک جو کے وزن کے برابر ہوتی ہیں یا وہ ریزہ و غبار مراد ہے جو ہوا میں باریک باریک نظر آتا ہے اور روشنی کے وقت چمکتا ہے۔

"ایک شخص نے عرض کیا......" کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ "ایک شخص" سے کون صحابیؓ مراد ہیں، چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس وقت جن صحابیؓ نے مذکورہ بات عرض کی تھی وہ معاذ بن جبلؓ تھے۔ بعض حضرات نے عبداللہ بن عمروؓ بن العاص اور بعض حضرات نے ربیعہ بن عامرؓ کا نام ذکر کیا ہے۔

کوئی آدمی یہ پسند کرتا ہے الخ" ان صحابیؓ نے جو یہ سوال کیا تو اس کا ایک پس منظر تھا، وہ یہ دیکھا کرتے تھے کہ جو لوگ غرور و تکبر کرتے ہیں اور اپنے علاوہ ہر ایک کو ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں، ان کے جسم پر اعلیٰ اور نفیس لباس ہوتا ہے، ان کے پیروں میں نہایت اعلیٰ جوتیاں ہوتی ہیں اور ان کے کپڑے وغیرہ اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں چنانچہ جب انہوں نے آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد سنا تو ان کو گمان ہوا کہ کہیں یہ چیزیں تو تکبر کی نشانیاں نہیں ہیں اور اعلیٰ و نفیس لباس وغیرہ ہی سے تو تکبر پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا انہوں نے پوچھا کہ اگر کوئی

شخص محض اپنی ذاتی خواہش و پسند اور استطاعت کی بنا پر اچھے اچھے کپڑے پہنے اور عمدہ جوتے وغیرہ استعمال کرے اور اس کے خیال میں بھی یہ بات نہ ہو کہ وہ اپنے کپڑوں وغیرہ کے ذریعہ دوسروں پر اپنی امارت وبڑائی کا رعب ڈالے گا۔ لوگوں کو ذلیل و حقیر سمجھے گا اور اتراہٹ و گھمنڈ کرے گا اور اس شخص کی اس نیت کی علامت یہ ہو کہ وہ جس طرح لوگوں کے سامنے اچھے کپڑے وغیرہ استعمال کرنا پسند کرتا ہو اسی طرح تنہائی میں بھی ان چیزوں کو پسند کرتا ہو تو کیا ایسے شخص پر بھی تکبر کا اطلاق ہوگا؟ حضور ﷺ نے اپنے مذکورہ جواب کے ذریعہ واضح فرمایا کہ ایسے شخص پر تکبر کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ اس کا لباس عمدہ زیب تن کرنا اور اچھے جوتے پہننا اس کی تہذیب و شائستگی اور اس کی خوش ذوقی کی علامت ہوگا جس سے شریعت نے منع نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کبر کی حقیقت بیان فرمائی کہ جس کبر کو مذموم قرار دیا گیا ہے وہ دراصل اس کیفیت و حالت کا نام ہے جو انسان کو حق کے راستہ سے ہٹا دے یعنی توحید و عبادت خداوندی سے بے پرواہ بنا دے حق و صداقت سے سرکشی کرنے پر مائل کرے حقیقت تک پہنچنے سے روکے اور سچائی کو قبول کرنے سے باز رکھے اور مخلوق خدا کو ذلیل و حقیر سمجھنے پر مجبور کرے! بعض حضرات نے بطر الحق کے معنی "جمال حق کو باطل کرنا" لکھے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ جمیل ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات و صفات میں اور اپنے افعال و قدرت میں اوصاف کاملہ سے موصوف ہے، اور تمام ظاہری و باطنی حسن و جمال اسی کے جمال کا عکس ہیں اور جمال و جلال بس اسی کی ذات پاک کا خاصہ ہے بعض حضرات نے "جمیل" کے معنی "آراستہ کرنے والے اور جمال بخشنے والے" بیان کئے ہیں، بعضوں نے یہ کہا ہے کہ "جمیل" دراصل "جلیل" کے معنی میں ہے اس صورت میں "اللہ جمیل ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام تر نور و بہجت اور حسن و جمال کا مالک ہے۔ نیز بعض حضرات نے یہ معنی بھی بیان کئے ہیں کہ وہ اپنے بندوں کا اچھا کارساز ہے۔

وہ تین لوگ جو قیامت کے دن خدا کی توجہ سے محروم رہیں گے

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَفِیْ رِوَايَةٍ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ شَيْخٌ زَانٍ وَّمَلِكٌ كَذَّابٌ وَعَآئِلٌ مُّسْتَكْبِرٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تین شخص ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا (یعنی یا تو رضا و خوشنودی کا کلام نہیں کرے گا یا مطلق کوئی کلام نہیں کرے گا) اور نہ ان کی تعریف و ستائش کرے گا اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اور نہ ان کی طرف (رحمت و عنایت کی نظر سے) دیکھے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا! ایک تو زنا کار بڈھا، دوسرا جھوٹا بادشاہ اور تیسرا تکبر کرنے والا مفلس۔" (مسلم)

تشریح: "قیامت کے دن" سے میدان حشر کا وقت مراد ہے جب اللہ کے فضل و عدل، غضب و ناراضگی اور رضا کا ظہور ہوگا اور جنتیوں و دوزخیوں کے بارے میں فیصلے صادر کیے جائیں گے۔

وَلَا يُزَكِّيْهِمْ کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ترجمہ میں بیان کیے گئے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ میدان حشر میں اپنی تمام مخلوق کے سامنے اپنے مؤمن اور نیکوکار بندوں کی تعریف و ستائش کرے گا تو اس وقت ان تین طرح کے آدمیوں کو اس تعریف و ستائش سے خارج کر دیا جائے گا اور ایک معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان تینوں طرح کے آدمیوں کو اپنے عفو و درگزر کے ذریعہ گناہوں کی نجاست سے پاک و صاف نہیں کرے گا۔ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کے بارے میں دو احتمال ہیں، یا تو یہ جملہ دوسری روایت کا تتمہ ہے یا اس کا تعلق اصل حدیث سے ہے، اور یہ دوسرا احتمال زیادہ قوی اور قابل اعتماد ہے۔ حاصل یہ کہ مذکورہ باتیں دراصل اللہ تعالیٰ کے غضب و کبر اور اس کی ناراضگی سے کنایہ ہیں، چنانچہ جو کوئی کسی شخص سے ناراض و خفا ہوتا ہے تو وہ نہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے نہ اس سے کلام کرتا ہے اور نہ اس کی تعریف و ستائش کرتا ہے بلکہ اس کو سزا و تنگی میں مبتلا کرتا ہے۔

حدیث میں جن تین برائیوں کے مرتکبین کے بارے میں وعید بیان فرمائی گئی ہے وہ ہر حال میں مذموم اور مستوجب عذاب ہیں، خواہ ان برائیوں کا مرتکب کسی درجہ کا، کسی حیثیت کا اور کسی عمر کا آدمی ہو، لیکن یہاں ان برائیوں کے تعلق سے جن تین لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے اعتبار سے ان برائیوں کی سنگینی کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے، مثلاً زنا ایک بہت برا فعل ہے اور جب یہ فعل جوان کے حق میں بھی بہت بڑا گناہ ہے جو طبعی طور پر معذور بھی ہوتا ہے تو ایک بڈھے کے حق میں یہ فعل کہیں زیادہ برا ہوگا کیونکہ نہ تو وہ طبعی طور پر اس کی احتیاج رکھتا ہے اور نہ اس کی طبیعت پر جنسی خواہش اور قوت مردمی کا وہ غلبہ ہوتا ہے جو بسا اوقات عقل و شعور سے بیگانہ اور خوف خداوندی سے غافل کر دیتا ہے۔ لہٰذا جو بڈھا، زنا کا مرتکب ہوتا ہے وہ گویا اپنی نہایت بے حیائی اور خبث طبیعت پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح جھوٹ بولنا ہر شخص کے حق میں برا ہے لیکن بادشاہ کے حق میں بہت ہی برا ہے کیونکہ اس پر ملک کے انتظام، رعایا کے مصالح و مفاد کی رعایت اور مخلوق خدا کے معاملات کی نگہداشت کی ذمہ داری ہوتی ہے اس کا ایک ادنیٰ سا حکم پورے ملک کے نظم و نسق پر اثر انداز ہوتا ہے، اگر وہ جھوٹ کا مرتکب ہو تو اس کی اس برائی کی وجہ سے پورا ملک اور ملک کے تمام لوگ مختلف قسم کی برائیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں، علاوہ ازیں جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں وہ عام طور پر اس برائی کا ارتکاب اپنے کسی فائدہ کے حصول یا کسی نقصان کے دفعیہ کے لئے کرتے ہیں، جب کہ ایک بادشاہ و حاکم یہ مقصد بغیر جھوٹ بولے بھی حاصل کرنے پر قادر ہوتا ہے، لہٰذا اس کا جھوٹ بولنا نہ صرف بالکل بے فائدہ بلکہ نہایت مذموم ہوگا۔ اسی پر تکبر کو بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ جو چیزیں عام طور پر انسان کو غرور و تکبر میں مبتلا کر دیتی ہیں جیسے مال و دولت اور جاہ و اقتدار وغیرہ وہ اگر کسی شخص میں پائی جائیں اور وہ ان چیزوں کی وجہ سے تکبر کرے تو اگرچہ اس شخص کو بھی برا کہیں گے مگر اس کا تکبر کرنا ایک طرح سے سمجھ میں آنے والی بات ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی فقیر و مفلس تکبر کرے کہ جو نہ تو مال و دولت رکھتا ہے اور نہ جاہ و اقتدار وغیرہ کا مالک ہے تو اس کا یہ فعل نہایت ہی برا ہوگا اور اس کے بارے میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا کہ وہ خبث باطن اور طبیعت کی کمینگی میں مبتلا ہے۔

بعض حضرات نے عَآئِلٌ مُّسْتَكْبِرٌ میں لفظ عائل سے (مفلس کے بجائے) عیال دار مراد لیا ہے یعنی جو لوگ بال بچے دار ہوں اور اپنی خستہ حالی کی وجہ سے اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے پر قادر نہ ہوں لیکن اس کے باوجود ازراہ تکبر صدقہ و زکوٰۃ کا مال قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے ہوں، لوگوں کی تواضع و امداد کو ٹھکراتے ہوں اور اس طرح وہ اپنے اہل و عیال کی ضرورت کو پورا کرنے سے بے پرواہ ہو کر گویا ان کو تکلیف و ہلاکت میں مبتلا کرتے ہوں تو ایسے لوگ حدیث میں مذکورہ وعید کا مورد ہیں واضح رہے کہ خدا کی ذات پر توکل و اعتماد اور غیرت و خود داری کے تحت اپنی حالت کو چھپانا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے شرم و حیاء کرنا تو ایک الگ چیز ہے لیکن سخت احتیاج و اضطرار کے باوجود کبر و نخوت اختیار کرنا اور ازراہ تکبر لوگوں کا احسان قبول نہ کرنا ایک ایسا فعل ہے جس کو نہایت مذموم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

شَيْخٌ زَانٍ کے بارے میں بھی بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں "شیخ" سے مراد، محض شادی شدہ شخص بھی ہو سکتا ہے خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان جیسا کہ اس منسوخ التلاوت آیت اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالاً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ میں شیخ سے مراد شادی شدہ مرد ہے، چنانچہ ایسے شخص کے حق میں زنا کا زیادہ برا ہونا شرعاً بھی اور عرفاً بھی بالکل ظاہر بات ہے اسی لئے ایسے شخص کو سنگسار کرنا واجب ہے اسی طرح مَلِكٌ كَذَّابٌ کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں ملک (بادشاہ) سے مراد غنی و مالدار شخص بھی ہو سکتا ہے! چنانچہ کسی مفلس یا قلاش شخص کا جھوٹ بولنا تو ایک درجہ میں سمجھ میں آنے والی بات ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اپنی تنگ دستی و خستہ حالی کی وجہ سے بسا اوقات اپنی کسی سخت غرض اور شدید دنیاوی ضرورت کی وجہ سے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جب کہ غنی و مالدار شخص اپنے مال و زر کی وجہ سے ایسی کوئی احتیاج نہیں رکھتا اور وہ جھوٹ بولے بغیر بھی اپنی غرض پوری کر سکتا ہے لہٰذا جھوٹ بولنا اس کے حق میں زیادہ برا ہے "عائل مستکبر" کے بارے میں بھی ایک قول یہ ہے کہ یہاں "عائل" یعنی مفلس سے مراد وہ شخص ہے جو فقراء

و مساکین کے ساتھ تکبر کرے چنانچہ فقراء و مسکین کے ساتھ تکبر کرنا سخت برا ہے جب کہ مغرور مالداروں کے ساتھ تکبر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے! اس جملہ کے بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں "مفلس" سے مراد وہ شخص ہے جو کسب و کمائی اور محنت و مشقت کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے پر قادر ہو مگر اس کے باوجود وہ ازراہ رعونت و نخوت کوئی کسب و کمائی اور محنت مزدوری کرنے کو کسر شان سمجھتا ہو جیسا کہ آجکل عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اچھے خاصے اور ہٹے کٹے لوگ کوئی کام کاج کرنے اور محنت مزدوری اختیار کرنے میں اپنی ذلت سمجھتے ہیں خواہ ان کو اور ان کے متعلقین کو فاقوں کی اذیت ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑتی ہو یا ناروا طور پر دوسرے لوگوں کے کاندھوں کا بار ہی کیوں نہ بننا پڑتا ہو، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے لوگوں کا یہ طریقہ یقیناً تکبر کے ہم معنی ہے اور یہ تکبر مالداروں کے تکبر سے کہیں زیادہ برا ہے کیونکہ اس کی بنیاد رعونت و نخوت، بیجا شان دکھانے خواہ مخواہ کے لئے اپنے اور اپنے متعلقین کو تکلیف و ہلاکت میں مبتلا کرنے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور ناجائز طور سے مال حاصل کرنے پر ہے خصوصاً ایسی صورت میں اس تکبر کی برائی اور کہیں بڑھ جاتی ہے جبکہ ایسا کوئی شخص اپنے دست و بازو کے ذریعہ اپنا اور اپنے متعلقین کا رزق حاصل کرنے کے بجائے دین کا لبادہ اوڑھ لے اور اپنی وضع قطع دینداروں اور بزرگوں کی سی بنا کر اپاہج کی طرح بیٹھ جائے اور سادہ لوح مسلمانوں پر اپنی مصنوعی بزرگی کا سکہ جما کر ان کے کاندھوں کا بار بنا رہے۔

تکبر کرنا گویا شرک میں مبتلا ہونا ہے

(۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلْكِبْرِيَاۤءُ رِدَآئِىْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِىْ فَمَنْ نَازَعَنِىْ وَاحِدًا مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ النَّارَ - وَفِىْ رِوَايَةٍ قَذَفْتُهٗ فِى النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ذاتی بزرگی (گویا تمہارے اعتبار سے) میری چادر ہے اور صفاتی عظمت (گویا تمہارے اعتبار سے) میرا تہبند ہے پس جو ان دونوں میں سے کسی ایک میں میرے ساتھ جھگڑا کرے گا (یعنی جو تکبر کرے گا اور اس طرح وہ گویا میری ذات وصفات میں شرک کا ارتکاب کرے) تو میں اس کو (عذاب دینے والی) آگ میں داخل کروں گا اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "تو میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: میری چادر اور میرا تہبند جیسے الفاظ حق تعالیٰ نے مثال کے طور پر فرمائے ہیں اور اس مثال کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ یہ دونوں صفتیں یعنی کبریائی اور عظمت صرف میری ذات سے تعلق رکھتی ہیں جن میں کوئی بھی میرا ساجھی اور شریک نہیں ہو سکتا جیسے کسی کے لباس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا، چنانچہ حق تعالیٰ کی کچھ صفات تو ایسی ہیں جن میں کا کچھ حصہ بندوں کو بھی دیا گیا ہے اور بندے بطریق مجاز خود کو ان صفات کے ساتھ موصوف کر سکتے ہیں جیسے جود و کرم اور مہربانی وغیرہ لیکن کچھ صفات ایسی ہیں جو صرف حق تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہیں اور جن کے ساتھ کوئی بندہ اپنے آپ کو بطریق مجاز بھی موصوف نہیں کر سکتا اسی حقیقت کو مثال کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ جس طرح کوئی شخص ان کپڑوں کو نہیں پہن سکتا جو کسی دوسرے شخص کے جسم پر ہوں اسی طرح کبریائی اور حقیقی عظمت و بڑائی کا بھی کوئی بندہ دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ دونوں صفتیں صرف میری ذات کے لئے موزوں اور مخصوص ہیں۔

"کبریاء" اور "عظمۃ" یہ دونوں لفظ لغت میں ایک ہی معنی کے حامل ہیں یعنی بزرگی اور بڑا ہونا، لیکن حدیث کے ظاہری اسلوب سے ان دونوں کے درمیان فرق معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو چادر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور دوسرے کو تہبند کے ساتھ! لہٰذا اس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ کبریا تو صفت ذاتی ہے یعنی اللہ کی ذات کبیر و متکبر ہے خواہ دوسرا اس حقیقت کو جانے یا نہ جانے، اور "عظمت" کا لفظ حق تعالیٰ کی اس بڑائی کو بیان کرتا ہے جس کا ظہور اس کے غیر پر بھی ہوتا ہے کہ ساری مخلوق جانتی ہے کہ وہ ایسا بڑا ہے، پس یہ (عظمت) حق تعالیٰ کی صفت اضافی ہوئی اور ذاتی صفت سے اعلیٰ ہونا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا کبریائی کو

چادر کے ساتھ تشبیہ دی گئی کیونکہ چادر تہبند سے اعلی ہوتی ہے اور عظمت کو تہبند کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

تکبر نفس کا دھوکہ ہے

⑧ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَکْوَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَزَالُ الرَّجُلُ یَذْهَبُ بِنَفْسِهٖ حَتّٰی یُکْتَبَ فِی الْجَبَّارِیْنَ فَیُصِیْبُهٗ مَآ اَصَابَهُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت سلمہ بن اکوع کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص اپنے نفس کو برابر کھینچتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا نام) سرکشوں (یعنی ظالم اور متکبر لوگوں کی فہرست) میں لکھ دیا جاتا ہے اور پھر جو چیز دنیا و آخرت کی آفت و بلا) ان سرکشوں کو پہنچتی ہے وہی اس شخص کو بھی پہنچتی ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: لفظ "بنفسه" میں حرف باء اگر تعدیہ کے لئے ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنے نفس کو اوپر اٹھاتا ہے، خود کو بلند مرتبہ سمجھ کر لوگوں سے دور رکھتا ہے اور اپنے آپ کو ہر ایک کے مقابلہ پر بزرگ و برتر جانتا ہے اور اگر حرف باء مصاحبت کے لئے ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ کبر و غرور کی طرف بڑھتا ہے، اس کو عزت دیتا ہے اور اس کی تعظیم و توقیر کرتا ہے۔ جیسا کہ دوست، دوست کی تعظیم و توقیر کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ متکبر و مغرور ہو جاتا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے نفس کے دھوکے میں پڑ کر خود بینی و خود ستائی کا شکار ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو اپنے اصل مرتبہ و مقام سے اوپر اٹھا کر بڑے مرتبہ و مقام تک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، نفس اس کو جس طرح مصنوعی بڑائی کی طرف بہکاتا ہے وہ بہکتا رہتا ہے۔ جدھر لے جاتا ہے ادھر جاتا ہے اور نفس پر قابو پانے کے بجائے خود اس کے قابو میں ہو جاتا ہے، یہاں تک تکبر اور سرکشی میں پوری طرح مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے لئے دنیا و آخرت کا وہ عذاب مقدر ہو جاتا ہے جو سرکشوں کے لئے مخصوص ہے۔

تکبر کرنے والوں کا انجام

⑨ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یُحْشَرُ الْمُتَکَبِّرُوْنَ اَمْثَالَ الذَّرِّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْ صُوَرِ الرِّجَالِ یَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ یُسَاقُوْنَ اِلٰی سِجْنٍ فِیْ جَهَنَّمَ یُسَمّٰی بُوْلَسَ تَعْلُوْهُمْ نَارُ الْاَنْیَارِ یُسْقَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ اَهْلِ النَّارِ طِیْنَةِ الْخَبَالِ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے اور وہ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کو چھوٹی چیونٹیوں کی طرح مردوں کی صورت میں ایک جگہ جمع کیا جائے گا (یعنی ان کی شکل و صورت تو مردوں کی سی ہو گی لیکن جسم و جثہ چیونٹیوں کی مانند ہو گا) اور ہر طرف سے ذلت و خواری ان کو پوری طرح گھیرے گی، پھر ان کو جہنم کے ایک قید خانہ کی طرف کہ جس کا نام بولس ہے، ہانکا جائے گا، وہاں آگوں کی آگ ان پر چھا جائیگی (جیسے کسی ڈوبنے والے کے اوپر تک پانی چھا جاتا ہے) اور دوزخیوں کا نچوڑ (یعنی دوزخیوں کے بدن سے بہنے والا خون، پیپ اور کچ لہو ان کو پلایا جائیگا جس کا نام طینت الخبال ہے" (ترمذیؒ)

تشریح: "چھوٹی چیونٹیوں کی طرح" کے اصل مفہوم کے بارے میں علما کے اختلافی اقوال ہیں۔ چنانچہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ چیونٹیوں کی تشبیہ دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ تکبر کرنے والے لوگ قیامت کے دن میدان حشر میں نہایت ذلت و خواری کی حالت میں ہوں گے اور گویا وہ لوگوں کے پاؤں کے نیچے اس طرح پامال ہونگے جس طرح چیونٹیوں کو روندا جاتا ہے! ان حضرات کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ قیامت کے دن مخلوق کا اٹھنا اور ان کے اجسام کا دوبارہ بننا ان ہی اجزاء اصلی کے ساتھ ہو گا جو وہ دنیا میں رکھتے تھے جیسا

کہ یہ ثابت ہے کہ ہر شخص میدان حشر میں اپنے ہی اجزاء واعضاء کے ساتھ اٹھ کر آئے گا جن پر دنیا میں اس کا جسم مشتمل تھا، اور ظاہر ہے کہ چیونٹی کی صورت اور اس کا جثہ اس جسم وبدن کے اجزاء اصلی کے حامل نہیں ہو سکتا، اسی لئے حدیث فی الصور الرجال مردوں کی صورت میں) کے الفاظ بھی اس قول پر دلالت کرتا ہے بلکہ یغشاهم الذل کے الفاظ بھی اس کا قرینہ ہیں کہ "چیونٹیوں کی طرح" سے مراد ذلت وخواری ہی ہے نہ کہ یہ مراد ہے کہ ان کے جسم چیونٹیوں کی طرح ہوں گے۔ لیکن جیسا کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث اپنے ظاہری مفہوم پر محمول ہے، یعنی تکبر کرنے والے درحقیقت چیونٹیوں کے جسم کے ساتھ اٹھیں گے البتہ ان کی شکل وصورت مردوں جیسی ہوگی، اور یہ چیز قطعا بعید از قیاس نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو اس امر پر پوری قدرت حاصل ہے کہ وہ قیامت میں کسی کے ان اجزاء اصل کو جن کے ساتھ وہ اٹھے گا، ایک چیونٹی کے جثہ میں جمع کر دے اور اس کو چیونٹی کا جسم دے کر پوری مخلوق کے سامنے ذلیل وخوار کرے۔

حضرت ملا علی قاریؒ نے بھی اس بارے میں کئی اقوال نقل کیے ہیں اور پھر تورپشتیؒ کی طرف منسوب کر کے یہ بیان کیا ہے کہ ہم اس حدیث کے ظاہری معنی اس لئے مراد نہیں لیتے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب لوگ قیامت کے دن دوبارہ اٹھ کر میدان حشر میں آئیں تو ان کے جسم وبدن ان ہی اجزاء پر مشتمل ہوں گے جن پر دنیا میں ان کے جسم مشتمل تھے یہاں تک کہ ان کے عضو تناسل کی کھال کا وہ حصہ بھی لگا دیا جائے گا جو ختنہ کے وقت کاٹا جاتا ہے گویا سارے لوگ غیر مختون اٹھیں گے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان کے جسم کے سارے اجزاء یہاں تک کہ ناخن اور بال وغیرہ بھی ایک چیونٹی کے جثہ میں جمع ہو جائیں۔

آخر میں ملا علی قاریؒ نے تورپشتی کے مذکورہ قول کے مخالفین کے جواب بھی نقل کئے ہیں اور ان پر شک کا اظہار کرتے ہوئے اپنی تحقیق یہ لکھی ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں آئیں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں کی طرح تکبر کرنے والوں کے جسم کو بھی دوبارہ بنائے گا اور وہ بھی اپنے تمام اجزاء معدومہ کے ساتھ اپنے پورے جسم میں اٹھ کر آئیں گے تاکہ ہر ایک کی دوبارہ جسمانی تخلیق کی قدرت پوری طرح ثابت ہو جائے لیکن پھر ان لوگوں کو میدان حشر میں مذکورہ جسم وصورت میں تبدیل کر دے گا یعنی ان کے جسم چیونٹیوں کی طرح ہو جائیں گے اور ان کی صورت مردوں کی سی رہے گی، اور یہ تبدیلی جسم اس لئے ہوگی تاکہ ان کی ذلت واہانت پوری مخلوق کے سامنے ظاہر ہو جائے یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب مذکورہ لوگ حساب کتاب کی جگہ آئیں گے اور ان کے سامنے عذاب الٰہی کی نشانیاں ظاہر ہوں گی تو اس وقت وہ ہیبت ودہشت کے سبب اس قدر گھٹ جائیں گے کہ ان کے جسم چیونٹیوں کی طرح معلوم ہوں گے، اور اہل دوزخ کا اپنی اپنی حالتوں اور گناہوں کے اعتبار سے مختلف صورتوں جیسے کتے، سور، اور گدھے وغیرہ کی شکلوں میں تبدیل ہو جانا مختلف منقولات سے ثابت بھی ہے۔

لفظ "بولس" باکے زبر، واؤ کے جزم اور لام کے زبر کے ساتھ ہے، اور قاموس میں لکھا ہے کہ یہ لفظ با کے پیش اور لام کے زیر کے ساتھ ہے جو بلس سے مشتق ہے، اور جس کے معنی تحیر اور ناامیدی کے ہیں شیطان کا نام ابلیس بھی اسی سے مشتق ہے۔

"آگوں کی آگ میں" کی طرف آگ کی نسبت ایسی ہی ہے۔ جیسے آگ کی نسبت کسی ایسی چیز کی طرف کی جائے جس کو آگ جلا دیتی ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ آگ اس طرح کی ہوگی کہ وہ خود آگ کو لکڑی کی طرح جلائے گی۔

طینۃ الخبال میں لفظ خبال خاء کے زبر کے ساتھ ہے اور اس کے لغوی معنی فساد اور خرابی کے ہیں اور جیسا کہ حدیث سے واضح ہوتا ہے "طینۃ الخبال" ان دوزخ کے عصارہ کا نام ہے اور عصارہ (بمعنی شیرہ یا تلچھٹ) اس پیپ، خون اور کچ لہو کو کہتے ہیں جو دوزخیوں کے زخموں سے بہے گا۔

ناحق غصہ، شیطانی اثر ہے

⑮ وَعَنْ عَطِيَّةَ بْنِ عُرْوَةَ السَّعْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطٰنِ وَإِنَّ الشَّيْطٰنَ

خُلِقَ مِنَ النَّارِ وَاِنَّمَا يُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَاءِ فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عطیہ ابن عروہ سعدیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (ناحق) غصہ شیطانی اثر ہے (یعنی ناحق غصہ کرنا، شیاطین کے مشتعل کرنے اور اس کے فریب میں آجانے کا نتیجہ ہوتا ہے) اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے اس لئے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اس کو چاہئے کہ وضو کرلے۔" (ابوداؤد)

تشریح: ٹھنڈا پانی استعمال کرنے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے جیسا کہ عام تجربہ سے ثابت ہے۔ اور ٹھنڈے پانی کے استعمال کی بہترین صورت تو وضو کرلینا ہے لیکن ٹھنڈا پانی پینے کی بھی یہ خاصیت ہے اس حدیث میں تو صرف وضو کرنے کا ذکر ہے لیکن چاہئے یہ کہ جب غصہ آئے تو پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے (چنانچہ ایک حدیث میں یہ منقول ہے کہ اعوذ پڑھنے سے غصہ جاتا رہتا ہے) پھر جب دیکھے کہ غصہ ختم نہیں ہوا ہے تو اٹھ کر وضو کرے اور اللہ تعالیٰ کے لئے دو رکعت نماز پڑھے۔

غصہ کا ایک نفسیاتی علاج

(۱۱) وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ فَاِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَاِلَّا فَلْيَضْطَجِعْ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور اس وقت کھڑا ہو تو (فورا) بیٹھ جائے، اگر غصہ جاتا رہے تو خیر ورنہ پھر پہلو پر لیٹ جائے۔" (احمد، ترمذی)

تشریح: شرح السنہ میں لکھا ہے کہ غصہ کی حالت میں کھڑا رہنے کے بجائے بیٹھ جانے میں حکمت یہ ہے کہ عام طور غصہ کے وقت انسان بے قابو ہو جاتا ہے اور اگر وہ غصہ کے وقت کھڑا ہوا ہو تو اس بات کا زیادہ خوف رہتا ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت کر گزرے جس سے بعد میں پریشانی اور پشیمانی اٹھانی پڑے اور ظاہر ہے کہ بیٹھے ہوئے ہونے کی صورت میں کسی حرکت کا صادر ہونا اتنی سرعت اور آسانی کے ساتھ نہیں ہوتا جس قدر کہ کھڑے ہونے کی صورت میں ہوتا ہے اور لیٹے ہوئے ہونے کی صورت میں اتنی سرعت اور آسانی کے ساتھ نہیں ہوتا جس قدر بیٹھے ہوئے ہونے کی صورت میں ہوتا ہے لیکن اس بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ غصہ کے وقت اپنی حالت میں اس طرح تبدیلی کرلینا کہ جس سے جسم وذہن کو سکون وآرام ملے جیسے کھڑا ہو تو فوراً بیٹھ جائے یا بیٹھا ہوا ہو تو لیٹ جائے، غصہ اور اشتعال کے دفعیہ کے لئے بہترین تاثیر رکھتا ہے۔

برے بندے کون ہیں؟

(۱۲) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ تَخَيَّلَ وَاخْتَالَ وَنَسِيَ الْكَبِيْرَ الْمُتَعَالَ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ تَجَبَّرَ وَاعْتَدٰى وَنَسِيَ الْجَبَّارَ الْاَعْلٰى بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ سَهٰى وَلَهٰى وَنَسِيَ الْمَقَابِرَ وَالْبِلٰى بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ عَتَا وَطَغٰى وَنَسِيَ الْمُبْتَدَأَ وَالْمُنْتَهٰى بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ يَخْتِلُ الدُّنْيَا بِالدِّيْنِ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ يَخْتِلُ الدِّيْنَ بِالشُّبُهَاتِ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ طَمَعٌ يَقُوْدُهٗ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ هَوًى يُضِلُّهٗ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ رَغَبٌ يُذِلُّهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَا لَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِالْقَوِيِّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ اَيْضًا هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت اسماء بنت عمیس کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "برا بندہ ہے وہ بندہ جس نے اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر جانا اور تکبر کیا اور خداوند بزرگ وبرتر کو وہ بھول گیا (یعنی اس نے یہ فراموش کر دیا کہ بزرگی اور بلندی وبرتری صرف اللہ

تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے) یا یہ بھول گیا کہ اس نے دنیا میں احتیاط و تقوی کی راہ چھوڑ کر جس برے راستہ کو اختیار کیا ہے اس کی جواب دہی اس کو آخرت میں کرنی ہوگی اور وہاں خدا کا عذاب بھگتنا ہوگا) برا بندہ ہے وہ بندہ جس نے لوگوں پر جبر و جور کیا اور ظلم و فساد ریزی میں حد سے بڑھ گیا اور خداوند جبار و قہار کو بھول گیا جس کی قدرت و عزت سب سے بلند ہے! برا بندہ وہ بندہ ہے جو دین کے کاموں کو بھول گیا اور دنیا داری میں مشغول رہا اور اس نے مقبروں کو اور خاک میں مل جانے والے جسم کی کہنگی و بوسیدگی کو فراموش کر دیا! (یعنی اس نے بات سے کوئی عبرت نہیں پکڑی کہ اس دنیا کے کیسے کیسے لوگ ہزاروں مٹی کے نیچے دفن کر دیے گئے اور ان کے جسم کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن گئے) یا مقبروں کو بھولنا موت کو بھولنے سے کنایہ ہے یعنی اس نے یہ فراموش کر دیا کہ ایک دن موت کا پنجہ آدبوچے گا اور اس وقت سے پہلے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کے لئے کچھ تیاری کر لینی ہے) برا بندہ ہے وہ بندہ جس نے فتنہ و فساد برپا کیا اور حد سے متجاوز ہو گیا اور اپنی ابتدا و انتہاء کو بھول گیا (یعنی نہ تو اس کو یاد رہا کہ وہ کتنی حقیر چیز سے پیدا کیا گیا ہے اور ابتداء میں وہ کس قدر عاجز و ناتواں تھا اور نہ اس کو اپنا انجام یاد رہا کہ ابھی اس کو کیا کیا دیکھنا ہے اور آخر کار پیوند زمین ہو جانا ہے اور فتنہ و فساد برپا کرنے اور جور و جفا کی زندگی اختیار کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت اور مخلوق خدا کی خدمت و بھلائی میں مشغول رکھے)! برا بندہ ہے وہ بندہ جو دین کے ذریعہ دنیا حاصل کرے (یعنی دنیا کو حاصل کرنے کے لئے دین کو وسیلہ بنائے یا یہ معنی ہیں کہ صلحاء اور بزرگوں کی سی شکل و صورت اختیار کرکے اور دین کا لبادہ اوڑھ کر اہل دنیا کو فریب دے تاکہ وہ اس کے معتقد و مداح ہوں اور ان سے مال و جاہ حاصل کرے)! برا بندہ ہے وہ بندہ جس نے مخلوق سے طمع و امید قائم کی اور حرص و طمع اس کو دنیا داروں کے دروازہ پر کھینچے کھینچے پھرتی ہے اور جدھر چاہتی ہے لے جاتی ہے، اور برا بندہ ہے وہ بندہ جس کو دنیا کی طرف اس کی رغبت و خواہش حصول دنیا کی حرص اور کثرت مال و جاہ کی ہوس ذلیل و خوار کرتی ہے اور اس کے دین کی آبروریزی کرتی ہے" اس روایت کو ترمذی نے اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے نیز ترمذیؒ نے بھی کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: یہ حدیث محض ترمذی و بیہقی کی مذکورہ اسناد ہی سے منقول نہیں ہے، بلکہ اس کو طبرانیؒ نے بھی نقل کیا ہے اور ایک دوسرے موقع پر بیہقیؒ نے نعیم ابن ہماز سے نقل کیا ہے نیز اس کو حاکم نے بھی اپنی مستدرک میں نقل کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کثرت طرق ضعیف حدیث کو قوی کر دیتی ہے اور اس کو حسن لغیرہ کے درجہ پر پہنچا دیتی ہے جس سے روایت کا مقصود پورا ہو جاتا ہے جہاں تک ترمذیؒ کے اس قول کا تعلق ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، تو واضح رہے کہ اول تو غرابت صحت اور حسن کے منافی نہیں، دوسرے یہ کہ تمام محدثین کے نزدیک فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کیا جاتا ہے، لہٰذا واعظ و نصیحت کے موقع پر اس حدیث کو ذکر کرنا اور لوگوں کو اس سے سبق حاصل کرنے کی تلقین کرنا بطریق اولیٰ مناسب ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

غصہ کو ضبط کرو

⑬ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ أَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ جُرْعَةِ غَيْظٍ يَكْظِمُهَا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بندہ (کسی چیز کا ایسا کوئی گھونٹ نہیں پیتا جو خدا کے نزدیک غصہ کا گھونٹ پینے سے بہتر ہو جس کو وہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے پی جاتا ہے۔" (احمدؒ)

⑭ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ قَالَ الصَّبْرُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الْاِسَآءَةِ فَاِذَا فَعَلُوْا عَصَمَهُمُ اللّٰهُ وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ قَرِيْبٌ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيْقًا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (تم برائی بھلائی کے ذریعہ دفع کرنے کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ غصہ کے وقت صبر کرنا اور برائی کے وقت عفو و درگزر کرنا، اس ارشاد خداوندی کی مراد ہے! لہٰذا جب لوگ صبر و عفو کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو نفس اور مخلوقات کی آفتوں سے محفوظ رکھتا ہے اور ان کے دشمن اس طرح پست ہو جاتے ہیں جیسے وہ (دشمن نہ ہوں بلکہ) بہت قریبی دوست ہوں! اس روایت کو بخاری نے بطریق تعلیق نقل کیا ہے۔"

تشریح: روایت میں آیت کا جو ٹکڑا نقل کیا گیا ہے وہ اپنے سیاق و سباق کے ساتھ اس طرح ہے۔ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ

گویا آیت کی تعلیم یہ ہے کہ برائی کا بدلہ برائی نہیں ہے بلکہ برائی کا بدلہ نیکی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ برائی سے پیش آئے تم اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آو اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "برائی بھلائی کے ذریعہ دفع کرنے" سے مراد یہ ہے کہ جب غصہ آئے تو صبر و تحمل اختیار کرو اور اگر کسی سے کوئی برائی اور تکلیف پہنچے تو اس سے عفو و درگزر کا برتاؤ کرو۔

لفظ "قریب" دراصل لفظ حمیم کی تفسیر ہے جس سے قرابتی مراد ہے اور یہ جملہ مذکورہ آیت کے اس آخری جزو کی تفسیر ہے فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ یعنی پھر اچانک (تم دیکھو گے کہ) تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی قریبی دوست ہوتا ہے۔

غصہ ایمان کو خراب کر دیتا ہے

⑮ وَعَنْ بَهْزِبْنِ حَكِیْمٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغَضَبَ لَیُفْسِدُ الْاِیْمَانَ كَمَا یُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ۔

"اور حضرت بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ بہزؒ کے دادا (حضرت معاویہ ابن حیدۃ القشیریؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "غصہ ایمان کو خراب کر دیتا ہے جس طرح ایلواء شہد کو خراب کر دیتا ہے۔"

تشریح: "ایمان" سے یا تو کمال ایمان مراد ہے یا نور ایمان! اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بسا اوقات غصہ کی شدت اصل ایمان کو بھی ختم کر دیتی ہے، نعوذ باللّٰہ من ذٰلک۔

تواضع اختیار کرو

⑯ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ یَا اَیُّهَا النَّاسُ تَوَاضَعُوْا فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِیْ نَفْسِهٖ صَغِیْرٌ وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ عَظِیْمٌ وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ صَغِیْرٌ وَفِیْ نَفْسِهٖ كَبِیْرٌ حَتّٰى لَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِمْ مِنْ كَلْبٍ اَوْ خِنْزِیْرٍ۔

"اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر (خطبہ دیتے ہوئے فرمایا لوگو! تواضع اور فروتنی اختیار کرو کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو شخص اللہ تعالیٰ (کی رضا مندی و خوشنودی حاصل کرنے) کے لئے لوگوں کے ساتھ تواضع اور فروتنی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مرتبہ کو بلند کر دیتا ہے، چنانچہ وہ اپنی نظر میں تو حقیر ہوتا ہے (کیونکہ وہ اپنے نفس کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے) لیکن لوگوں کی نظر میں بلند مرتبہ ہوتا ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی تواضع و فروتنی کے سبب اس کو لوگوں کی نظر میں بلند مرتبہ کر دیتا ہے) اور جو شخص لوگوں کے ساتھ تکبر و غرور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مرتبہ کو گرا دیتا ہے چنانچہ وہ لوگوں کی نظر میں تو حقیر ہوتا ہے، لیکن اپنی نظر میں خود کو بلند مرتبہ سمجھتا ہے یہاں تک کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے یا سور سے بھی بدتر ہو جاتا

ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ متکبر و مغرور شخص اگرچہ خود کو بڑا اور عزت دار سمجھتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنی مصنوعی بڑائی اور عزت دکھاتا ہے لیکن وہ خدا کے نزدیک بھی ذلیل و حقیر ہوتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی نہایت کمتر و بے وقعت رہتا ہے، اس کے برخلاف جو شخص تواضع و فروتنی اختیار کرتا ہے وہ اگرچہ اپنی نظر میں خود کو حقیر سمجھتا ہے اور لوگوں کے سامنے بھی اپنے آپ کو کمتر و بے وقعت ظاہر کرتا ہے مگر خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی اس کی بڑی عزت و وقعت ہوتی ہے۔

انتقام لینے پر قادر ہونے کے باوجود عفو و درگزر کرنے کی فضیلت

⑰ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مُوْسَی بْنُ عِمْرَانَ عَلَیْهِ السَّلَامُ یَا رَبِّ مَنْ اَعَزُّ عِبَادِكَ عِنْدَكَ قَالَ مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "حضرت موسیٰ ابن عمران علیہ السلام نے عرض کیا، میرے پروردگار! تیرے بندوں میں سے کون بندہ تیرے نزدیک زیادہ عزیز ہے؟ پروردگار نے فرمایا۔ "وہ بندہ جو قادر ہونے کے باوجود عفو و درگزر کرے۔"

تشریح: یعنی اگر اس پر کسی شخص نے کوئی ظلم کیا اور اس کو رنج و تکلیف میں مبتلا کیا تو وہ اس سے انتقام لینے کی طاقت و قدرت رکھنے کے باوجود اس کو معاف کر دے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت پر چونکہ جلالی کیفیت غالب تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جواب کے ذریعہ گویا ان کو تلقین کی کہ وہ عفو و درگزر کا رویہ اختیار کیا کریں۔

جامع صغیر کی ایک روایت میں منقول ہے کہ جو شخص انتقام لینے کی طاقت و قدرت کے باوجود عفو و درگزر کرے تو اللہ تعالیٰ یوم عسرت یعنی قیامت کے دن اس کے ساتھ عفو و درگزر فرمائے گا۔

غصہ کو ضبط کرنے کا اجر

⑱ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ خَزَنَ لِسَانَهٗ سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ كَفَّ غَضَبَهٗ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمَنِ اعْتَذَرَ اِلَی اللّٰهِ قَبِلَ اللّٰهُ عُذْرَهٗ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اپنی زبان کو بلند رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو ڈھانک لیتا ہے (یعنی جو شخص لوگوں کے ان عیوب اور برائیوں کو چھپانے اور بیان کرنے سے باز رہتا ہے جو اس کے علم میں ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے عیوب و معاصی کو لوگوں کی نگاہوں سے یا اعمال لکھنے والے فرشتوں سے اور یادونوں سے چھپاتا ہے) جو شخص اپنے غصہ کو ضبط کرتا ہے (اور انتقام لینے سے باز رہتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اپنے عذاب سے بچائے گا، اور جو شخص (اپنے گناہ و تقصیر پر نادم ہو کر) اللہ تعالیٰ سے عفو خواہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عفو خواہی کو قبول کرتا ہے۔"

وہ تین چیزیں جو نجات کا ذریعہ ہیں اور وہ تین چیزیں جو اخروی ہلاکت کا باعث ہیں

⑲ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مُنْجِیَاتٌ وَّثَلٰثٌ مُهْلِكَاتٌ فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ فَتَقْوَی اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِی الرِّضٰی وَالسَّخَطِ وَالْقَصْدُ فِی الْغِنَا وَالْفَقْرِ وَاَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَهَوًی مُتَّبَعٌ وَّشُحٌّ مُّطَاعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَهِیَ اَشَدُّهُنَّ۔ رَوَی الْبَیْهَقِیُّ الْاَحَادِیْثَ الْخَمْسَةَ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں آخرت میں ہلاک

کرنے والی ہیں! جو چیزیں نجات دینے والی ہیں ان میں سے ایک تو ظاہر میں خدا سے ڈرنا ہے (یعنی جلوت وخلوت ہر حالت میں اور ہر حرکت وعمل کے وقت خدا کا خوف غالب ہو یا یہ کہ بندہ کا ظاہر بھی خوف خدا کے احساس کا مظہر ہو اور اس کا باطن بھی خوف خدا سے معمور ہو) دوسری چیز خوشی وناخوشی (ہر حالت) میں حق بات کہنا ہے، تیسری چیز دولت مندی وفقیری دونوں حالتوں کے درمیان میانہ روی اختیار کرنا ہے۔ اور جو تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں ان میں سے ایک تو خواہش نفس ہے جس کی پیروی کی جائے، دوسری چیز حرص وبخل ہے انسان جس کا غلام بن جائے، اور تیسری چیز مرد کا اپنے نفس پر گھمنڈ کرنا ہے (یعنی کسی شخص کا اپنے آپ کو نیک اور اچھا سمجھنا اور اپنے اوصاف کا خود مداح ہونا کہ جس سے کبر پیدا ہوتا ہے اور کبر سے غرور تکبر وجود میں آتا ہے، اور یہ تیسری چیز ان سب میں بدترین خصلت ہے۔" مذکورہ بالا پانچوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: خوشی وناخوشی میں حق بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت بیانی اور حق گوئی کو اپنی کسی مصلحت کسی مفاد اور اپنے کسی جذبۂ خوشی وناخوشی کا پابند نہیں بنانا چاہئے بلکہ اگر کسی سے راضی وخوش ہے تو اس کے سامنے بھی وہی بات کہے جو حق ہے اور اگر اس سے ناراض وناخوش ہو تو اس صورت میں بھی حق بات ہی کہے مثلاً اگر خود کو کسی ایسے شخص سے کوئی نفع وفائدہ پہنچتا ہے، دوسروں کے ساتھ جس کا ظلم اور جس کا فسق ظاہر و ثابت ہو تو اس کی ناحق تعریف وستائش اور خلاف واقعہ بات محض اس لئے بیان نہ کرے کہ ذاتی فائدہ حاصل ہونے کی وجہ سے اس سے خوش ہے، اسی طرح اگر کسی صالح وبزرگ شخصیت سے کسی معاملہ میں کوئی اختلاف اور ناراضگی کی صورت پیدا ہو جائے تو محض اپنی ذاتی ناراضگی کی وجہ سے اس کی برائی اور مذمت نہ کرے، حاصل یہ کہ خواہ کسی سے خوش ہو یا ناراض، دونوں صورتوں میں راہ استقامت پر گامزن رہے اور حق گوئی کے فریضہ کو کسی بھی حالت میں پس پشت نہ ڈالے۔

میانہ روی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خرچ واخراجات میں نہ تو اس قدر وسعت وفراخ دستی کا طور اپنائے کہ اس پر اسراف کا اطلاق ہونے لگے اور نہ اس قدر تنگی وسختی اختیار کرے کہ فقر وافلاس ظاہر ہونے لگے یا یہ مراد ہے کہ فقر وغنا کے درمیان اعتدال قائم کرے اور درمیانی راستہ کو اختیار کرے جیسا کہ علماء نے کہا ہے کہ حصول معاش کی جدوجہد میں اس حد پر اکتفا کرنا کہ جس سے ضروریات زندگی کی تکمیل اور بقاء حیات کا سامان فراہم ہو جاتا ہو غنا اور فقر دونوں سے افضل ہے۔

"خواہش نفس کہ جس کی پیروی کی جائے" کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس طرح کا تابع کر دینا کہ اس کی ہر خواہش پوری کرنے لگے، وہ جو کچھ کہے اور جس طرف لے جائے ادھر چل پڑے ایک ایسی خصلت ہے جو ہلاکت وتباہی میں ڈال دیتی ہے، اس کے برخلاف ایمان کا کامل ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ اپنے نفس کو فرمان حق اور شریعت مصطفوی ﷺ کا تابع بنا دیا جائے۔

بخل وحرص کا غلام بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بخل وحرص انسان کی طبیعت میں داخل ہے اور اس وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان بخل وحرص کے مادہ سے بالکل خالی ہو، لیکن اپنے آپ کو بخل وحرص کا اس طرح غلام بنا دیا کہ کسی بھی صورت میں ان چیزوں سے خود کو محفوظ رکھنا ممکن نہ ہو ایک ایسی خصلت ہے جو انسان کو اخروی تباہی وہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ہلاکت میں ڈالنے والی جن تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں از روئے گناہ اور نقصان سب سے بدتر خصلت عجب یعنی خود بینی وخود ستائی ہے جس کی وجہ سے انسان تکبر وغرور میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ خواہش نفس کی اتباع اور بخل وحرص کی غلامی) یہ دونوں برائیاں اس طرح کی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں گرفتار ہو تو ان کے پھندے سے اپنے آپ کو نکال لینا اور توبہ وانابت کی راہ اختیار کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا مگر خود بینی وخود ستائی ایک ایسا مرض ہے جو اگر لاحق ہو جاتا ہے تو کم ہی پیچھا چھوڑتا ہے اور انسان کو کبر ونحوست میں اس طرح مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کسی برے فعل کی اچھائی وبرائی کے احساس تک سے خالی ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کسی برے فعل پر نادم نہیں ہوتا اور توبہ وانابت کی راہ اس سے دور ہوتی چلی جاتی ہے، جیسا کہ بدعتی، بدعت کے پھندے میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا چنانچہ بدعتی سے کم ہی توبہ کی توفیق ہوتی ہے۔

بَابُ الظُّلْمِ
ظلم کا بیان

"ظُلْم" کے لغوی معنی ہیں "کسی چیز کو بے موقع اور بے محل رکھنا" یعنی جس چیز کی جو جگہ اور جو محل ہو اس کو وہاں کی بجائے دوسری جگہ اور دوسرے محل میں رکھنا! اور یہ مفہوم ہر اس چیز کو شامل ہے جو اپنی حد سے تجاوز کر جائے اور اس کو جس طرح واقع ہونا چاہئے اس کے بجائے زیادتی یا نقصان کے ساتھ بے جا اور بے وقت واقع ہو چنانچہ جس چیز کو عام اصطلاح میں جور و تعدی یا زور، زبردستی اور ستم کرنا کہتے ہیں اس کے بھی یہ معنی ہیں اور شریعت میں بھی ظلم وغیرہ کے یہ معنی مراد لئے جاتے ہیں، البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ موقع و محل سے شرعی موقع و محل مراد لیا جائے یعنی شرعی طور پر ظلم وغیرہ کا اطلاق اس چیز پر ہوگا جو اپنے شرعی محل سے بلاوجہ شرعی تجاوز کر جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ظالم قیامت کے دن اندھیروں میں بھٹکتا پھرے گا۔

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ظلم کرنا قیامت کے دن تاریکیوں کا باعث ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ظالم کو قیامت کے دن میدان حشر میں تاریکیاں اس طرح گھیرے ہوئے ہوں گی کہ وہ اس نور سے محروم رہے گا جو مؤمن کو نصیب ہوگا اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یوں فرمایا يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (یعنی قیامت کے دن مؤمنین کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں طرف دوڑتا ہوگا (جس کی روشنی میں وہ اپنی منزل پائیں گے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ظُلُمَاتٌ (تاریکیوں) سے آخرت کے وہ شدائد (تکالیف و مشکلات) اور عذاب مراد ہیں جن سے قیامت کے دن واسطہ پڑے گا اور جن میں اہل دوزخ مبتلا ہوں گے) چنانچہ قرآن کریم میں بھی بعض جگہ "ظلمات" کے معنی شدائد مراد لئے گئے ہیں جیسا کہ ایک آیت میں فرمایا گیا ہے قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (کہہ دیجئے کہ تمہیں جنگل اور دریا کی تکلیف و مشکلات سے کون نجات دیتا ہے۔

ظالم کی رسی دراز ہوتی ہے

② وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِيْ الظَّالِمَ حَتّٰى اِذَا اَخَذَهٗ لَمْ يُفْلِتْهُ ثُمَّ قَرَأَ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ الْاٰيَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بلاشبہ اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے (یعنی دنیا میں اس کی عمر دراز کرتا ہے تاکہ وہ اپنے ظلم کا پیمانہ لبریز کرے اور آخرت میں سخت عذاب میں گرفتار ہو) یہاں تک کہ جب اس کو پکڑے گا تو چھوڑے گا نہیں (اور وہ ظالم اس کے عذاب سے بچ کر نکل نہیں پائے گا) اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے (دلیل کے طور پر) یہ آیت پڑھی وَكَذٰلِكَ[1] اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ الاٰيَة (اور آیت کے آخری الفاظ یہ ہیں اِنَّ اَخْذَهٗ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

---

[1] وکذلک تا الیمٌ شدیدٌ کا ترجمہ یہ ہے "اور تمہارا پروردگار جب ظالم بستی والوں کو پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ اسی طرح کی ہوتی ہے بے شک اس کی پکڑ دکھ دینے والی اور سخت ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں گویا مظلوم لوگوں کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ اپنے اوپر کیے جانے والے ظلم و ستم پر صبر و استقامت اختیار کریں اور اس دن کا انتظار کریں جب قانون قدرت کے مضبوط ہاتھ ظالم کی گردن پر ہوں گے اور اس کو اپنے ظلم کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی، نیز اس ارشاد گرامی میں ظالموں کے لئے سخت وعید و تنبیہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اس مہلت پر مغرور نہ ہو جائیں بلکہ یقین کہ آخر الامر ان کو خدا کے سخت مواخدہ سے دوچار ہونا ہے اور اپنے ظلم کی سزا یقیناً بھگتنی ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ الآية (یعنی اور تم اللہ تعالیٰ کو اس چیز سے غافل مت سمجھو جس کو ظالم اختیار کرتے ہیں۔

قوم ثمود کے علاقہ سے گزرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی صحابہ کو تلقین

③ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا مَرَّ بِالْحِجْرِ قَالَ لَا تَدْخُلُوْا مَسَاكِنَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مَّآ اَصَابَهُمْ ثُمَّ قَنَّعَ رَأْسَهٗ وَاَسْرَعَ السَّيْرَ حَتّٰى اجْتَازَ الْوَادِيَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ جب مقام حجر سے گزرے تو (صحابہؓ سے) فرمایا کہ "تم ان لوگوں کے مکانات (کے کھنڈرات) میں نہ گھسنا جنہوں نے (کفر اختیار کر کے اور اپنی طرف بھیجے گئے اللہ کے پیغمبر علیہم السلام کو جھٹلا کر) خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے الا یہ کہ تم رونے والے ہو (یعنی اگر تم ان کھنڈرات کی صورت میں اس بد نصیب قوم کا المناک انجام دیکھ کر اور ان لوگوں کے سیاہ کارناموں کو یاد کر کے عبرت حاصل کرنا چاہو تو اس جگہ کو دیکھ سکتے ہو نیز تم اس جگہ سے غفلت ولاپرواہی کے ساتھ نہ گزرو) کہ مبادا تم پر بھی وہی مصیبت نازل ہو جائے جو ان پر نازل ہوئی تھی (کیونکہ ایسی جگہوں سے غفلت وبے پروائی کے ساتھ گزرنا اور عبرت نہ پکڑنا قساوت قلبی اور خوف خدا کے فقدان کی علامت ہے اور یہ چیز عذاب الٰہی کے ساتھ گزرنا اور عبرت نہ پکڑنا قساوت قلبی اور خوف خدا کے فقدان کی علامت ہے اور یہ چیز عذاب الٰہی کے نازل ہونے کا باعث بن سکتی ہے، یا یہ مراد ہے کہ تم یہاں خدا کا خوف کھاؤ اور عبرت پکڑو کہ مبادا تم سے بھی وہی اعمال صادر ہونے لگیں جو اس قوم کے لوگوں کا شیوہ تھے اور پھر تمہیں بھی سزا بھگتنی پڑے) اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے چادر سے اپنا سر ڈھانک لیا اور تیز تیز چل کر اس علاقہ سے گزر گئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حجر اس جگہ کا نام ہے جو مشہور پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کا مسکن تھی! حجاز کے شمالی علاقہ میں، جس کا نام مدین ہے) ایک تاریخی وادی ہے جس کا نام وادی القری ہے) اسی وادی میں تبوک سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر یہ جگہ واقع ہے) یہاں قوم ثمود کی بستیاں تھیں، اس قوم نے جب طغیانی و سرکشی میں حد سے تجاوز کیا اور اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے بنائے ہوئے راستہ پر چلنے کے بجائے ان کو جھٹلایا، ان کو سخت تکلیفیں پہنچائیں اور اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تو اس قوم پر عذاب الٰہی نازل ہوا، اور ان کی ساری بستیاں تباہ کر دی گئیں، ان بستیوں کے آثار و کھنڈرات اب بھی موجود ہیں اور زبان حال سے عبرت پذیر لوگوں کو قوموں کے عروج و زوال کی داستان سناتے ہیں! جب آنحضرت ﷺ غزوہ کے لئے تبوک جا رہے تھے یا غزوہ سے فارغ ہو کر وہاں سے واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں آپ ﷺ کا گزر اسی علاقہ سے ہوا، چنانچہ اس حدیث کا تعلق اسی وقت سے ہے۔

آنحضرت ﷺ کا اپنے سر پر چادر ڈال کر اس جگہ سے جلدی گزرنا جیسا کہ کسی جگہ سے کوئی خوفزدہ شخص جلد سے جلد گزر جاتا ہے، اس وجہ سے تھا تاکہ آپ کی نظر مبارک اس تباہ شدہ قوم کے مکانات کھنڈرات پر نہ پڑے۔ اور حقیقت میں آپ کا یہ عمل مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے تھا تاکہ وہ آنحضرت ﷺ کی پیروی کریں، چنانچہ آپ نے پہلے تو قول کے ذریعہ لوگوں کو اس امر کی طرف متوجہ کیا اور پھر ازراہ تاکید اپنے فعل کے ذریعہ بھی توجہ دلائی! یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا وہاں سے اس طرح گزرنا اس بناء پر تھا کہ خود آپ پر خوف خدا کا نہایت غلبہ رہتا تھا اور عذاب الٰہی کے آثار آپ ﷺ کو سب سے زیادہ لرزاں کر دیا کرتے تھے جیسا کہ ایک ارشاد میں فرمایا اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَاَخْشَاكُمْ (میں تم سب سے زیادہ خدا کا علم رکھتا ہوں اور سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔

ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس جگہ صحابہؓ کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ اس جگہ نہ تو کچھ کھائیں اور نہ وہاں کا پانی پئیں۔

بہر حال حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ خدا کے سرکش بندوں اور ظالموں کے مکانات اور ان کی جگہوں میں نہ تو رہائش اختیار کی جائے اور نہ ان کے علاقوں کو اپنا وطن بنایا جائے۔

قیامت کے دن مظلوم کو ظلم سے کس طرح بدلہ ملے گا

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهٗ مَظْلِمَةٌ لِاَخِیْهِ مِنْ عِرْضِهٖ اَوْشَیْءٌ فَلْیَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْیَوْمَ قَبْلَ اَنْ لَّا یَكُوْنَ دِیْنَارٌ وَّلَا دِرْهَمٌ اِنْ كَانَ لَهٗ عَمَلٌ صَالِحٌ اُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلِمَتِهٖ وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ لَهٗ حَسَنَاتٌ اُخِذَ مِنْ سَیِّئَاتِ صَاحِبِهٖ فَحُمِلَ عَلَیْهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کا کوئی حق رکھتا ہو، اور وہ حق خواہ (غیبت وبرائی کرنے اور روحانی وجسمانی ایذا رسانی وغیرہ کی صورت میں) آبروریزی کا ہو یا کسی اور چیز سے متعلق ہو (جیسے کوئی مالی مطالبہ یا ناحق خون وغیرہ) تو اس کو چاہئے کہ وہ اس حق کو آج ہی کے دن (یعنی اسی دنیا میں) معاف کرالے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے یعنی قیامت کا دن کہ جس میں) وہ نہ تو درہم رکھتا ہوگا نہ دینار (کہ جو اس حق کے بدلہ کے طور پر دے سکے) اگر (اس نے اپنے حق کو معاف کر دیا تو بہتر ہے ورنہ پھر) ظالم کے اعمال نامہ میں جو کچھ نیکیاں ہوں گی تو ان میں سے اس کے ظلم کے برابر یا واجب حق کے بقدر نیکیاں لے لی جائیں گی (اور مظلوم یا حق دار کو دیدی جائیں گی) اور اگر وہ کچھ بھی نیکیاں نہیں رکھتا ہوگا تو اس صورت میں اس مظلوم یا حق دار کے گناہوں میں سے (اس کے حق کے بقدر) گناہ لے کر ظالم پر لاد دیئے جائیں گے" (بخاریؒ)

تشریح: آخرت میں ظالم سے اس کے ظلم کا بدلہ اس طرح لیا جائے گا کہ اگر اس کے اعمال نامہ میں کچھ نیکیاں ہوں گی تو وہ مظلوم کو دیدی جائیں گی اور اگر وہ اپنے اعمال نامہ میں نیکیاں نہیں رکھتا ہوگا تو اس صورت میں مظلوم کے وہ گناہ جو اس نے دنیا میں کیے ہونگے اس ظالم پر لاد دیئے جائیں گے چنانچہ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتے ہی گا مزید برآں مظلوم کے گناہوں کے عذاب میں بھی مبتلا ہوگا اور مظلوم کو اس عذاب سے نجات دے دی جائے گی جس کا وہ ان گناہوں کی وجہ سے مستوجب ہوتا۔

حدیث کے یہ الفاظ کہ "وہ نہ درہم رکھتا ہوگا نہ دینار" اس طرف اشارہ کرتے ہیں جس شخص نے کسی پر کوئی ظلم وزیادتی حق تلفی کی ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ ہر حالت میں مظلوم یا حق دار سے اس ظلم یا حق کو ضرور معاف کرالے خواہ اس معافی کے عوض روپیہ پیسہ خرچ کرنا پڑے اور اس دنیا ہی میں معافی تلافی کا ہو جانا اس سے کہیں زیادہ بہتر اور آسان ہے کہ عدم معافی کی صورت میں اس کی نیکیاں لے لی یا اپنے گناہوں کا بوجھ اس پر ڈال دے۔

"اس کے ظلم یا واجب حق کے بقدر" کے بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ان نیکیوں اور گناہوں کی مقدار کا تعین علم الٰہی کے سپرد ہے، یعنی وہی بہتر جانتا ہے کہ ان نیکیوں اور گناہوں کا لینا دینا کس طرح اور کس اعتبار سے ہوگا تاہم ابن ملکؒ نے لکھا ہے کہ جن نیکیوں اور برائیوں کا لینا دینا ہوگا، ہوسکتا ہے کہ وہ اس موقع پر نفس اعمال ہوں گے جن کو جواہر کی مانند مجسم کر کے پیش کیا جائے گا) اور یہ احتمال بھی ہے کہ ایک دوسرے کو وہ نعمتیں یا عذاب ملیں جو ان نیکیوں یا برائیوں کی جزا وسزا کے طور پر حق تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں۔

حقیقی مفلس کون ہے

⑤ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ قَالُوا الْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ

فَقَالَ اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ يَّاتِیْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِصَلٰوةٍ وَّ صِيَامٍ وَّ زَكٰوةٍ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَكَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ يُّقْضٰى مَا عَلَيْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِى النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا۔ "تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ بعض صحابہؓ نے جواب دیا کہ ہم میں مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس نہ تو درہم و دینار (روپیہ پیسہ) ہو، اور نہ سامان و اسباب (یعنی انہوں نے اپنے جواب میں مفلس اس شخص کو بتایا جو مال وزر اور روپیہ وپیسہ سے تہی دست ہو جیسا کہ عام طور پر دنیا والے سمجھتے ہیں صحابہؓ کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ حضور ﷺ کی مراد دنیاوی طور پر مفلس شخص کے بارے میں پوچھا نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کے سوال کا تعلق اس شخص سے ہے جو آخرت کے اعتبار سے مفلس ہو) چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت مرحومہ میں مفلس شخص در حقیقت وہ ہے جو قیامت کے دن میدان حشر میں (دنیا سے) نماز، روزہ اور زکوٰۃ (اور دوسری مقبول عبادتیں لے کر آئے گا، مگر حال یہ ہوگا کہ اس نے کسی کو گالی دی تھی، کسی پر تہمت لگائی تھی کسی کو (ناحق) مارا پیٹا تھا (غرض کہ اس نے جہاں تمام مالی وبدنی عبادتیں کی تھیں وہیں ان برائیوں کا مرتکب بھی ہوا تھا چنانچہ اس کی نیکیوں میں سے (پہلے) کسی ایک مظلوم وصاحب حق کو (اس کے حق کے بقدر) نیکیاں دی جائیں گی (اس طرح اس نے دنیا میں جس کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا ہوگا اور جس جس کو ناحق ستایا ہوگا ان سب کو الگ الگ اپنے حق کے بقدر اس کی نیکیوں میں سے دیا جائے گا) یہاں تک کہ اگر اس کے ان گناہوں کا فیصلہ ہونے سے پہلے اس کی تمام نیکیاں ختم ہو جائیں گی (یعنی اگر اس کی تمام نیکیاں ان سب حق والوں کو دے دینے کے بعد بھی حقوق العباد کو تلف کرنے کی سزا پوری نہیں ہوگی) تو اس حقداروں اور مظلوموں کے گناہ (جو انہوں نے دنیا میں کیے ہوں گے) ان سے لے کر اس شخص پر ڈال دیے جائیں گے اور پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندوں کے حقوق کی پامالی کرنے والے کو آخرت میں نہ تو معافی ملے گی اور نہ اس کے حق میں شفاعت کام آئے گی، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کسی کے لئے چاہے گا تو وہ مدعی (صاحب حق) کو اس کے مطالبہ کے مطابق اپنی نعمتیں عطا فرما کر راضی کر دیگا۔ نوویؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ عام طور پر لوگ مفلس اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس مال و دولت اور روپیہ پیسہ نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں مفلس وہی شخص ہے جس کے بارے میں ذکر کیا گیا، چنانچہ دنیاوی مال و دولت سے تہی دست شخص کو حقیقی مفلس نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مال و دولت اور روپیہ پیسہ کا افلاس عارضی ہوتا ہے جو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات زندگی ہی میں وہ افلاس، مال و دولت کی فراوانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف حدیث میں جس افلاس کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی سے ہے اور اس افلاس میں مبتلا ہونے والا شخص پوری طرح ہلاک ہوگا۔

آخرت میں ہر حق تلفی کا بدلہ لیا جائے گا

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوْقَ اِلٰٓى اَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ اِتَّقُوا الظُّلْمَ فِىْ بَابِ الْاِنْفَاقِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن حق داروں کو ان کے حقوق ادا کیے جائیں گے، یہاں تک کہ بے سینگ بکری کا قصاص (بدلہ) سینگ دار بکری سے لیا جائے گا (مسلمؒ) اور حضرت جابرؓ کی روایت اتقو الظلم باب الانفاق میں ذکر کی جا چکی ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس دن (میدان حشر میں) اللہ تعالیٰ کا عدل و انصاف اس حد تک کار فرما ہوگا کہ آدمیوں کے حقوق کا بدلہ تو لیا ہی جائے گا لیکن حیوانات کہ جن کو انسان کی طرح مکلف قرار نہیں دیا گیا ہے ان سے بھی حق تلفی کا بدلہ لیا جائے گا۔ بعض علماء نے لکھا ہے

کہ یہ قصاص یعنی بدلہ (جس کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں ہے) اس طرح کا قصاص نہیں ہے جو مکلف سے لیا جاتا ہے بلکہ اس سے مقابلہ کا قصاص مراد ہے لیکن ملا علی قاری ؒ نے لکھا ہے کہ اس کو مقابلہ کا قصاص قرار دینا محل نظر ہے اور یہ کوئی صحیح بات نہیں ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ اس قصاص سے بھی وہی قصاص مراد ہے، جو مکلف سے لیا جاتا ہے مگر اس پر یہ اشکال واقع ہو گا کہ حیوان مکلف نہیں ہوتا لہٰذا اس سے قصاص کس طرح لیا جائے گا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اول تو اللہ تعالیٰ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے اس اعتبار سے وہ اپنی مرضی کا مالک اور اپنے ہر فعل پر قادر و مختار ہے لہٰذا وَلَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ یعنی وہ جو کچھ کرے گا اور جس طرح کرے گا اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا دوسرے یہ کہ یہاں بکری سے قصاص لئے جانے کا ذکر در حقیقت بندوں کو اس امر سے آگاہ کرنے کے لئے ہے کہ کسی کا کوئی حق ضائع نہیں ہو گا بلکہ جو بھی شخص جس شخص کا حق مارے گا اور اس کے ساتھ ظلم کرے گا اس سے اس حق تلفی اور ظلم کا بدلہ حق دار اور مظلوم کو ضرور دلایا جائے گا۔ یہ دوسری تاویل زیادہ اچھی اور زیادہ قابل فہم ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

برائی کا بدلہ برائی نہیں ہے

(۷) عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَکُوْنُوْا اِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا وَلٰکِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَکُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ اَسَآءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت حذیفہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم امعہ نہ ہو یعنی یہ نہ کہو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ ظلم کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ظلم کریں گے بلکہ تم اپنے آپ کو اس امر پر قائم رکھو کہ اگر لوگ بھلائی کریں تو تم بھی بھلائی کرو، اور اگر لوگ برائی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔ "اس روایت کو ترمذی ؒ نے نقل کیا"

تشریح: اِمَّعَةً اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی کوئی رائے اور عقل نہ رکھتا ہو اور بے سمجھے بوجھے دوسروں کی رائے اور دوسروں کے کہنے پر چلتا ہو۔ یہاں حدیث میں اس لفظ سے وہ شخص مراد ہے جو یہ کہے کہ لوگ جیسا سلوک میرے ساتھ کریں گے ویسا ہی سلوک میں بھی ان کے ساتھ کروں گا، اگر وہ میرے ساتھ بھلائی کریں گے تو میں بھی ان کے ساتھ بھلائی کروں گا اور اگر وہ میرے ساتھ برائی کریں گے تو میں بھی ان کے ساتھ برائی کروں گا، چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم ایسے آدمی مت بنو، کیونکہ یہ دین و دانش کے خلاف بات ہے بھلائی کا بدلہ بھلائی تو ہے ہی لیکن برائی کا بدلہ بھی بھلائی ہی کو قرار دو! جو شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کر کے گویا اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو کیونکہ انتقاماً بھی ظلم اور برائی کی راہ کو ترک کرنا احسان ہے! لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "اگر لوگ برائی کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو" سے یہ مراد ہو کہ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تو تم اس کے مقابلہ میں حد سے تجاوز نہ کرو بلکہ اعتدال کی حد میں رہتے ہوئے اس سے بدلہ لو، جیسا کہ مشروع ہے! یا برائی کرنے والوں سے بدلہ لینے ہی پر اپنے آپ کو پابند نہ بناؤ بلکہ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ بھی کرو! اور یا برائی کا بدلہ بھلائی کو قرار دے کہ برائی کرنے والے کے ساتھ احسان کرو۔ واضح رہے کہ ان تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت وہ ہے جس کو عام مسلمانوں کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے دوسری صورت کا تعلق ان مسلمانوں سے ہے جن کا شمار خواص میں ہوتا ہے اور تیسری صورت جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے، ان مسلمانوں سے متعلق ہے جن کو اخص الخواص کہا جاتا ہے۔

حضرت شیخ علی متقی ؒ نے ایک رسالہ میں بڑی عارفانہ بات کہی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کی محبت کو پہچاننے کا معیار یہ چار چیزیں ہیں:

(۱) جس شخص پر دنیا کی محبت غالب ہوتی ہے وہ لوگوں کو بلا وجہ ایذاء پہنچاتا ہے اور بغیر کسی پیش آمدہ معاملہ کے ان کے ساتھ برائی کرتا ہے۔

❷ جو شخص دنیا کی محبت میں اس درجہ مبتلا نہیں ہوتا وہ کسی کو ایذاء پہنچانے میں ابتداء نہیں کرتا، البتہ جب کوئی شخص اس کو ایذا پہنچاتا ہے تو وہ حد سے تجاوز کئے بغیر اس کو اسی قدر ایذاء پہنچاتا ہے جس کو شریعت نے بدلہ کے طور پر جائز رکھا ہے۔
❸ جس کی آخرت کی محبت قوی ہوتی ہے اور دنیا کی محبت ضعیف تو وہ اس شخص کے ساتھ عفوو درگزر کرتا ہے جو اس پر ظلم کرتا ہے۔
❹ جس شخص کی آخرت کی محبت بہت زیادہ قوی ہوتی ہے وہ ظلم کے مقابلہ پر احسان کرتا ہے۔ اور یہ وہ درجہ ہے جو صدیقین اور مقربین کو حاصل ہوتا ہے۔

لوگوں کو راضی وخوش رکھنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی وخوشنودی حاصل کرو

⑧ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ اَنَّهٗ كَتَبَ اِلٰى عَائِشَةَ اَنِ اكْتُبِىْ اِلَىَّ كِتَابًا تُوْصِيْنِىْ فِيْهِ وَلَا تُكْثِرِىْ فَكَتَبَتْ سَلَامٌ عَلَيْكَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّىْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ الْتَمَسَ رِضَى اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللّٰهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ وَكَلَهُ اللّٰهُ اِلَى النَّاسِ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت امیر معاویہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کو لکھا کہ آپ مجھ کو ایک نصیحت نامہ لکھ کر بھیج دیجئے (جس پر میں عمل پیرا ہو سکوں اور آپ کی وہ نصیحت میرے دینی ودنیاوی امور میں میرے لئے فلاح وسعادت کی باعث ہو) اور وہ نصیحت نامہ طویل نہ ہو (بلکہ مختصر اور جامع ہو، چنانچہ حضرت عائشہؓ نے یہ کلمات لکھ کر بھیج دیئے۔ تم پر سلامتی ہو! بعد ازاں میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے کہ جو شخص لوگوں کی خفگی وناراضگی سے بے پرواہ ہو اور لوگوں کی ناراضگی وناخوشی کا سبب بنے تو اللہ تعالیٰ لوگوں کی محبت کی طرف سے اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے (یعنی اگر کوئی شخص ایسا کام کرے جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی وخوشنودی کا باعث ہو اور لوگوں کی ناراضگی وناخوشی کا سبب بنے تو اللہ تعالیٰ اس کام کی وجہ سے اس سے خوش ہوتا ہے اور آخر الامر مخلوق کو بھی اس سے راضی و خوش کر دیتا ہے اور لوگوں کے شر وفساد سے اس کو محفوظ رکھتا ہے) اور جو شخص لوگوں کی رضامندی وخوشنودی کی مدنظر رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خفگی وناراضگی سے بے پرواہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے۔" اور سلامتی ہو تم پر۔ (ترمذی)

تشریح: "اس کو لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی خفگی وناراضگی سے بے پرواہ ہو کر لوگوں ہی کی رضامندی وخوشنودی کو ترجیح دیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اس کے امور کو لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے یہی نہیں کہ اس کے ان امور میں اس کی مدد نہیں کرتا اور دوسروں کے شر وفتنہ سے اس کو محفوظ نہیں رکھتا بلکہ لوگوں کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔ جو اس کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور اس پر ظلم وستم کرتے ہیں حاصل یہ کہ بندوں کے حق میں اصل چیز رضائے مولیٰ ہے، اگر خدا راضی و خوش ہے تو مخلوق خدا بھی راضی اور مطیع ہو جائے گی اور اگر رضائے مولیٰ پر نظر نہ ہو تو پھر نہ خدا راضی وخوش ہوتا ہے اور نہ مخلوق خدا راضی وخوش ہوتی ہے۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ خط کے شروع میں بھی سلام لکھا جائے اور آخر میں بھی چنانچہ شروع کا سلام تو ملاقات کے سلام کا درجہ رکھتا ہے اور آخر کا سلام رخصت کے سلام کا قائم مقام ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ایک آیت کے لفظ "ظلم" کی تشریح

⑨ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ شَقَّ ذٰلِكَ عَلٰى اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ ذَاكَ اِنَّمَا

هُوَا الشِّرْكُ اَلَمْ تَسْمَعُوْا قَوْلَ لُقْمَانَ لِابْنِهٖ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَيْسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّوْنَ اِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهٖ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ[1] ....الخ نازل ہوئی تو اس سے رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ کو بڑا بوجھ محسوس ہوا (کیونکہ انہوں نے یہ گمان کیا کہ "ظلم" سے مراد مطلق گناہ ہیں) چنانچہ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں ایسا کون شخص ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ بات نہیں ہے (یعنی ظلم سے وہ مراد نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو یعنی مطلق گناہ) بلکہ "ظلم" سے "شرک" مراد ہے! کیا تم نے لقمان کی وہ نصیحت نہیں سنی جو انہوں نے اپنے (مؤمن) بیٹے کو کی تھی (اور وہ یہ کہ) اے میرے بیٹے! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا (یعنی ایمان باللہ اور ان تمام چیزوں میں کہ جن پر ایمان لانا واجب ہے شرک کی آمیزش نہ کرنا) کیونکہ شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) ظلم سے وہ مراد نہیں ہے جس کا تم نے گمان کیا ہے بلکہ اس سے وہ مراد ہے جو لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے "ظلم" کو "گناہ" پر حمل کیا یعنی وہ سمجھے کہ اس آیت میں جن مؤمنین کو مامون اور ہدایت یافتہ قرار دیا گیا ہے ان سے وہی مؤمنین مراد ہیں جن کے اعمال، گناہ و معصیت کی آمیزش سے بالکل پاک وصاف ہوں، چنانچہ وہ اپنے گمان کے مطابق اس آیت کریمہ کے نزول سے بہت پریشان ہوئے اور حضور سے عرض کیا کہ اس آیت کی روشنی میں تو ہم میں سے شاید ہی کوئی مؤمن ہدایت یافتہ اور مومان قرار پائے کیونکہ ہم میں سے ایسا کون شخص ہے جس سے کبھی معصیت و گناہ صادر نہ ہوا ہو؟ تب رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے واضح فرمایا کہ اس آیت میں "ظلم" سے مراد "گناہ" نہیں ہے جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے بلکہ "شرک" مراد ہے۔

اگر اس موقع پر یہ اشکال واقع ہو کہ ایمان کے ساتھ شرک کا مخلوط ہونا کیونکر ممکن ہے کیونکہ ایمان شرک کی ضد ہے، البتہ ایمان کے ساتھ گناہ کا مخلوط ہونا سمجھ میں آنے والی بات ہے اور اسی وجہ سے صحابہؓ کا ذہن اس طرف گیا تھا کہ "ظلم" سے مراد گناہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ایمان کے ساتھ شرک کا مخلوط ہونا واقع کے اعتبار سے صحیح ہے، اس کی مثال مشرکین مکہ تھے، جو اگرچہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی بت پرستی بھی کرتے۔ واضح رہے کہ "شرک" کی دو قسمیں ہیں ایک تو شرک فی الربوبیۃ یعنی عبادت و تعظیم میں اور کو بھی خدا اقرار دینا، اس قسم کے مشرک دنیا میں کم ہیں، دوسرے شرک فی الالوھیۃ یعنی عبادت و تعظیم، اور اللہ کی صفات خاص جیسے خالقیت، رزاقیت اور حاجت براری وغیرہ میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا، اس قسم کے مشرک دنیا میں بہت سے نام کے مسلمان بھی اس شرک میں گرفتار ہیں)! چنانچہ حدیث میں جس شرک کو ظلم کا محمول قرار دیا گیا ہے اس سے وہ شرک مراد ہے جس کا تعلق دوسری قسم سے ہو! اس بات کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایمان کے ساتھ ظلم یعنی شرک کو ملانے سے یہ مراد ہو کہ زبان سے تو ایمان کا اقرار کیا جائے اور دل میں شرک کا اندھیرا ہو جیسے منافقین کا حال ہوتا ہے کہ وہ ظاہراً ایمان کے ساتھ باطنی شرک کم مخلوط رکھتے ہیں بایں طور کہ وہ زبان سے تو ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں مگر وہ دل سے ایمان کو قبول نہیں کرتے بلکہ ان کے اندر شرک اور اسلام دشمنی کے جذبات بھرے ہوئے ہیں۔

---

[1] لفظ بِظُلْمٍ کے بعد آیت کے باقی الفاظ یہ ہیں اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ اور سب کا ترجمہ یہ ہے "وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں ظلم کو شامل نہیں کیا (تو) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے امن ہے اور جو سیدھی راہ پانے والے ہیں۔"

ملا علی قاری ؒ نے اس حدیث کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (کیونکہ شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے) استیناف تعلیل ہے، جس کی مراد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ شرک ایسا گناہ ہے جو ایمان کو سرے سے ختم کر دیتا ہے، گویا ایمان اور شرک کسی بھی حال میں جمع نہیں ہو سکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ اس کے برخلاف اور تمام گناہ اس درجہ کے نہیں ہیں کہ وہ ایمان کے منافی ہوں، چنانچہ تمام اہل سُنّت والجماعت کا یہی مسلک ہے کہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو ایمان کو سرے سے ختم کر دے جب کہ معتزلہ، خوارج، اور دیگر اہل بدعت ہر گناہ کبیرہ کو ایمان کے منافی سمجھتے ہیں لہٰذا جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے پہلے یہ ہی سمجھا تھا کہ اس آیت میں جن لوگوں کو مؤمن وہدایت یافتہ قرار دیا گیا ہے ان سے وہی لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو گناہ سے ملوث نہیں کیا ہے کیونکہ شرک کا ایمان کے ساتھ مخلوط ہونا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان پر واضح فرمایا کہ بعض صورتوں میں ایمان کے ساتھ شرک کا ملنا ممکن ہے جیسے کوئی شخص اللہ پر ایمان لائے اور اس کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک کرے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت میں ایمان باللہ کا مفہوم اسی وقت پورا ہوتا ہے اس سے اس کے لغوی معنی مراد ہیں نہ کہ شرعی معنی کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے ایمان تمام صفات کمالیہ کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرنے اور اس کی ذات کو تمام نقصان و عیوب سے پاک قرار دینے پر مشتمل ہو، ورنہ (آیت میں لفظ ایمان کو اس کے لغوی معنی پر محمول قرار دینے کی صورت میں) یہ لازم آئے گا کہ حقیقت کے اعتبار سے تمام مشرکین و کفار ایمان رکھنے والے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ..... لیکن ظاہر ہے کہ شریعت میں اس طرح کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے اصل ایمان وہی ہے جو اللہ کی ذات کے اعتراف و اقرار کے ساتھ اس کی صفات خاص اور عبادت میں کسی کو شریک قرار نہ دینے پر مشتمل ہو) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کسی ایسے فعل و عمل کی بھی اجازت نہیں دی ہے جس سے ظاہرًا اور صورۃً ہی شرک کا ارتکاب ہوتا ہو جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ۔

آخرت کو دنیا پر قربان نہ کرو

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَبْدٌ اَذْهَبَ اٰخِرَتَهٗ بِدُنْيَا غَيْرِهٖ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن مرتبہ کے اعتبار سے بدترین آدمی وہ ہو گا دنیا کے سبب آخرت کو ضائع کر دے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یوں تو خود اپنی خاطر آخرت کے مفاد پر دنیا کے مفاد کو ترجیح دینا نہایت سنگین برائی ہے لیکن یہ برائی اس وقت کہیں زیادہ سخت اور بدتر ہو جاتی ہے جب کسی دوسرے کے لئے دنیا کو حاصل کرے اور اس کی وجہ سے لوگوں پر ظلم کر کے اپنی آخرت کو ضائع کر دے جیسا کہ بعض ناعاقبت اندیش اور مفاد پرست لوگ ظالموں اور بدکاروں کی مدد اعانت کرتے ہیں۔

شرک اور ظلم کی بخشش ممکن نہیں

(۱۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدَّوَاوِيْنُ ثَلٰثَةٌ دِيْوَانٌ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ الْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَدِيْوَانٌ لَا يَتْرُكُهُ اللّٰهُ ظُلْمُ الْعِبَادِ فِيْمَا بَيْنَهُمْ حَتّٰى يَقْتَصَّ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ وَدِيْوَانٌ لَا يَعْبَاُ اللّٰهُ بِهٖ ظُلْمُ الْعِبَادِ فِيْمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللّٰهِ فَذَاكَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ وَاِنْ شَاءَ تَجَاوَزَ عَنْهُ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دفتر (یعنی نامۂ اعمال تین طرح کے ہیں) ایک تو وہ نامۂ اعمال ہے جس کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا، اور وہ نامۂ اعمال وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کیا گیا ہو (یعنی کفر و شرک کا گناہ جس نامۂ اعمال میں ہو گا

اس کی بخشش ممکن نہیں ہوگی) چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا شرک کو نہیں بخشتا۔ دوسرا نامۂ اعمال وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ یوں ہی نہیں چھوڑ دے گا (بلکہ اس کے بارے میں ضرور حکم کرے گا) اور وہ نامہ اعمال وہ ہے جس میں بندوں کے آپس کے مظالم درج ہیں، چنانچہ وہ (اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق) ایک دوسرے سے بدلہ لیں گے (یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو ظالم سے اس کے ظلم کا بدلہ دلوائے گا یا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جس پر اپنا فضل کرنا چاہے گا اس کو صاحب حق کے مطالبہ سے بری کرادے گا بایں طور کہ وہ صاحب حق کو اپنے خزانہ رحمت سے اس کے حق کے بقدر یا اس سے زائد نعمتیں عطا فرما کر راضی کردیگا اور کہے گا کہ اب تم اس شخص کو معاف کردو جس نے تم پر ظلم کیا تھا یا تمہارا کوئی حق غصب کیا تھا، چنانچہ وہ راضی وخوش ہو کر اس شخص کو معاف کردیگا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں گویا اس کے حق کا بدلہ اور دنیا کی دیت کا قائم مقام ہو جائیں گی) اور تیسرا اعمال نامہ وہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ کو پرواہ نہیں ہوگی (یعنی اگر وہ چاہے تو اس اعمال نامہ کے مطابق سزا وعذاب کا فیصلہ صادر کرے اور اگر چاہے تو اس پر کوئی کاروائی نہ کرے) اور وہ اعمال نامہ وہ جس میں بندوں کا اللہ کے ساتھ ظلم کرنا یعنی ان کی طرف سے حقوق اللہ میں تقصیر وکوتاہی کا مرتکب ہونا درج ہے) چنانچہ یہ اعمال نامہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہوگا کہ چاہیں وہ بندے کو اس کے عمل کے مطابق سزا دے اور چاہے اس سے درگزر وعفو کا معاملہ کرے اور اس کو کوئی سزا نہ دے۔"

تشریح: اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ دنیا میں بندے جن برائیوں اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں ان میں سے جن کا تعلق حقوق العباد سے ہوگا جیسے کسی نے کسی پر ظلم کیا ہوگا، کسی کا حق مارا ہوگا، کسی کی عزت وآبرو کو نقصان پہنچایا ہوگا وغیرہ وغیرہ، تو آخرت میں ان گناہوں پر ہر حالت میں مواخذہ ہوگا اور اس مواخذہ سے کسی کو نجات نہیں ملے گی، اسی طرح جن برائیوں اور گناہوں کا تعلق حقوق اللہ سے ہوگا ان میں سے شرک کا گناہ بخشش ومعافی کے قابل نہیں ہوگا البتہ شرک کے علاوہ اور تمام گناہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہوں گے کہ چاہے وہ ان گناہوں پر عذاب دے اور چاہے اپنے فضل وکرم سے بخش دے۔

مظلوم کی بددعا سے بچو

⑫ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكَ وَدَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّمَا يَسْأَلُ اللّٰهَ حَقَّهٗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَايَمْنَعُ ذَاحَقٍّ حَقَّهٗ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اپنے آپ کو مظلوم کی بددعا سے بچاؤ (یعنی کسی پر ظلم نہ کرو کہ وہ تمہارے حق میں بددعا کرے) کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے صرف اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس کے حق سے باز نہیں رکھتا (یعنی ہر حق دار کو اس کا حق ضرور دیتا ہے۔"

ظالم کی مدد واعانت ایمان کے منافی ہے

⑬ وَعَنْ اَوْسِ بْنِ شُرَحْبِيْلَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ مَّشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيَهٗ هُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ۔

"اور حضرت اوس ابن شرحبیلؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جو شخص کسی ظالم کی تقویت وتائید کے لئے اس کے ساتھ چلے یعنی اس کی موافقت وحمایت کرے اور وہ یہ جانتا ہو کہ (جس شخص کی مدد تائید کر رہا ہے) وہ ایک ظالم انسان ہے تو وہ شخص اسلام سے خارج ہو جاتا ہے یعنی وہ کمال ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔"

ظلم کی نحوست

⑭ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ اِنَّ الظَّالِمَ لَا يَضُرُّ اِلَّا نَفْسَهٗ فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ بَلٰى وَاللّٰهِ حَتَّى الْحُبَارٰى

لَتَمُوْتُ فِیْ وَكْرِهَا هُزْلًا بِظُلْمِ الظَّالِمِ۔ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْأَحَادِيْثَ الْأَرْبَعَةَ فِیْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ظالم حقیقت میں اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتا ہے (دوسروں تک اس کے ظلم کے اثرات نہیں پہنچتے)" تو حضرت ابوہریرہؓ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "بیشک (ظالم اپنی ظالمانہ حرکتوں سے اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتا ہے، لیکن اس کی نحوست دوسروں کو بھی متاثر کرتی ہے) یہاں تک حباری اپنے گھونسلے میں ظالم کے ظلم کے سبب دبلا ہو کر مرجاتا ہے" چاروں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: حُباریٰ ایک پرندہ کا نام ہے جس کو اردو میں "سرخاب" کہتے ہیں! بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پرندہ اپنے دانہ پانی کی تلاش میں بہت دور دور تک جاتا ہے، عام طور پر اس کا گھونسلہ ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں سے پانی کی جگہ کئی کئی دن کی راہ کے فاصلہ پر ہوتی ہے، اور وہ اپنے گھونسلہ سے اتنے طویل فاصلہ پر جاتا ہے اور پانی پی کر اپنے گھونسلہ میں آتا ہے ایک محقق نے لکھا ہے کہ بعض مرتبہ دیکھا گیا کہ بصرہ میں سرخاب کے پیٹ میں سے حبہ الخضرار نامی جڑی برآمد ہوئی، جب کہ وہ جڑی صرف ایک علاقہ میں پائی جاتی ہے اور وہ علاقہ بصرہ سے کئی دن کی راہ کے فاصلہ پر واقع ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ ظالم کے اثرات دوسروں پر اس حد تک مرتب ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی نحوست سے بارش برسانا بند کر دیتا ہے اور پانی کی قلت سے کھانے پینے کی چیزیں نایاب ہو جاتی ہیں چنانچہ انسان و حیوان کھانا پانی نہ ملنے کی وجہ سے مرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ سرخاب جیسا جانور بھی اپنے گھونسلے ہی میں سوکھ سوکھ کر مرجاتا ہے جو اپنے چارے و پانی کے حصول میں دور دراز کے علاقوں تک کی رسائی رکھتا ہے! اس سے معلوم ہوا کہ سرخاب کا اپنے گھونسلے میں سوکھ سوکھ کر مرجانا قحط اور خشک سالی کی علامت ہے اور اس کے ظلم کی نحوست کے اثرات کو بیان کرنے کے لئے خاص طور پر سرخاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

جس شخص نے یہ کہا تھا کہ "ظالم حقیقت میں اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتا ہے" اس کی مراد یہ تھی کہ ظالم اگرچہ ظاہر میں مظلوم کو نقصان پہنچاتا ہے مگر حقیقت میں اس نقصان کا وہ خود ہی شکار ہوتا ہے کیونکہ مظلوم کا نقصان تو ایسا نقصان ہے جس پر اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے صبر کا پھل ملے گا اور ظالم سے اس ظلم کا بدلہ لے لیگا جب کہ ظالم کے حصہ میں آخر الامر خسران و تباہی کے علاوہ کچھ نہیں آئے گا چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے اس وقت پیش آنے والے کسی قرینہ کی بناء پر اس بات کو عمومیت کے ساتھ بیان کیا کہ ظالم اپنے ظلم کے نتیجہ میں خود تو نقصان و خسران میں مبتلا ہوتا ہے لیکن اس کے ظلم کی نحوست کسی نہ کسی صورت میں دوسرں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

اغلب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جو بات بیان فرمائی ہے وہ خود ان کا اپنا قول نہیں ہے بلکہ یہ مضمون کسی حدیث کا ہے جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہو گا یا یہ کہ ایک حدیث میں چونکہ یہ منقول ہے کہ بارش کا نہ ہونا ظلم کی نحوست کا اثر ہوتا ہے ظاہر ہے کہ بارش نہ ہونے سے حیوانات کو ضرور نقصان پہنچتا ہے اس لئے انہوں نے اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے مذکورہ بات فرمائی۔

بَابُ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ

امر بالمعروف کا بیان

"معروف" اصل میں "معرفت" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پہچاننا، حقیقت کو پالینا اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہ چیزیں جن کو شریعت کے ذریعہ پہچانا گیا ہے اور جن کو اختیار کرنے کا حکم شریعت نے دیا ہے۔ معروف کے مقابلہ پر منکر ہے یعنی وہ چیزیں جن کا شریعت سے کوئی واسطہ نہ ہو اور ان کو اختیار کرنے سے شریعت نے باز رکھا ہو۔

واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، تعلیمات اسلامی کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں لوگوں کو بھلائیوں کا حکم دینا، اور برائیوں سے روکنا! چنانچہ اس باب میں اسی مضمون سے متعلق احادیث نقل ہوں گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خلاف شرع امور کی سرکوبی کا حکم

① عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں سے جو شخص کسی خلاف شرع امر کو دیکھے (یعنی جس چیز کو شریعت کے خلاف جانے) تو اس کو چاہئے کہ اس چیز کو اپنے ہاتھوں سے بدل ڈالے (یعنی طاقت کے ذریعہ اس چیز کو نیست و نابود کر دے مثلاً باجوں گاجوں اور آلات لہو ولعب کو توڑ پھوڑ دے نشہ آور مشروبات کو ضائع کر دے اور ہڑپ کی ہوئی چیز کو اس کے مالک کے سپرد کرا دے وغیرہ وغیرہ) اور اگر وہ (خلاف شرع امر کے مرتکب کے زیادہ قوی ہونے کی وجہ سے) ہاتھوں کے ذریعہ اس امر کو انجام دینے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان کے ذریعہ اس امر کو انجام دے (یعنی خلاف شرع امور کے بارے میں وعید کی آیتیں اور احادیث سنائے، خدا کے عذاب سے ڈرائے، پند و نصیحت کرے اور اگر کوئی سیدھی طرح نہ مانے تو سخت سُست کہے) اور اگر زبان کے ذریعہ بھی اس امر کو انجام دینے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر دل کے ذریعہ اس امر کو انجام دے (یعنی اس کو دل سے برا جانے قلبی کڑھن رکھے اور اس عزم و ارادہ پر قائم رہے کہ جب بھی ہاتھ یا زبان کے ذریعہ اس امر کو انجام دینے کی طاقت حاصل ہوگی تو اپنی ذمہ داری کو ضرور پورا کرے گا، نیز اس خلاف شرع امر کے مرتکب کو بھی برا جانے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرے) اور یہ (آخری درجہ) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔" (مسلم)

تشریح: برائیوں کے پھیلنے سے روکنے اور ان کا قلع قمع کرنے کی جو ذمہ داری اہل ایمان پر عائد ہوتی ہے اس سے عہدہ برآ، ہونے کے تین درجے بیان کیے گئے ہیں پہلا درجہ یہ ہے کہ ہر برائی کا سر طاقت کے ذریعہ کچل دیا جائے بشرطیکہ اس طرح کی طاقت میسر ہو اور اگر یہ طاقت حاصل نہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس برائی کا فریضہ زبان کے ذریعہ ادا کیا جائے اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اگر زبان کے ذریعہ بھی کسی برائی کی مذمت کرنے اور اس کو ختم کرنے کی ہمت نہ ہو تو پھر دل سے اس فریضہ کو انجام دیا جائے۔ یعنی کسی خلاف شرع امر کو دیکھ کر اسے دل سے برا جانے اور اس کے مرتکب کے خلاف قلب میں عداوت و نفرت کے جذبات رکھے جائیں، اس درجہ کو ایمان کا سب سے کمزور درجہ قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب اہل ایمان اس درجہ کمزور ہو جائیں کہ وہ کسی برائی کو مٹانے کے لئے ہاتھ اور زبان کی طاقت سے محروم ہوں تو سمجھا جائے کہ یہ ایمان کے لئے سب سے کمزور زمانہ ہے کہ اگر اہل ایمان طاقتور ہوتے تو وہ کسی برائی کو اپنی قولی و فعلی طاقت کے ذریعہ مٹانے کے بجائے محض قلبی نفرت پر اکتفانہ کرتے۔ یا وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی برائی کو محض قلبی طور پر برا جاننے پر اکتفا کرتا ہے بلکہ ہاتھ اور زبان کے ذریعہ اس برائی کو مٹانے کی جدوجہد کرتا ہے، اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ بہترین جہاد، ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ (اور ان کو کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں ہوتا۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ حدیث میں پہلے حکم (یعنی برائی کو ہاتھ کے ذریعہ مٹانے) کا تعلق ان اہل ایمان سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے طاقت و اقتدار سے نوازا ہے یعنی بادشاہ و حاکم وغیرہ! چنانچہ طاقت و اقتدار رکھنے والے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حلقہ اثر و اقتدار میں سختی و شدت کے ساتھ برائیوں کی سرکوبی کریں اور برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں

دوسرے حکم (یعنی برائی کو زبانی مذمت اور تلقین و نصیحت کے ذریعہ ختم کرنے) کا تعلق علماء کی ذات سے ہے۔ یعنی یہ اہل علم اور واعظین کا فریضہ ہے کہ وہ جن برائیوں کو دیکھیں اپنے وعظ و نصیحت کے ذریعہ ان کی مذمت کریں اور عوام کو تلقین و نصیحت کے ذریعہ ان برائیوں سے روکیں اور تیسرے حکم (یعنی برائیوں اور ان کے مرتکبین کے خلاف دل میں نفرت کا جذبہ رکھنے) کا تعلق عام مسلمانوں سے ہے، چنانچہ عام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خلاف شرع امور کو دیکھ کر محض اعراض و بے اعتنائی کا رویہ اختیار نہ کریں بلکہ ان امور کو دل سے برا جانیں اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف قلبی نفرت رکھیں۔

بعض حضرات نے حدیث کے اس آخری جملہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ چیز یعنی کسی برائی کو دیکھ کر محض دل میں اس کو برا سمجھنے پر اکتفا کر لینا ایمان کے مراتب میں سب سے کمزور مرتبہ ہے کیونکہ اگر کوئی مسلمان ایسی چیز کو دیکھے کہ جس کا دینی نقطہ نظر سے برا ہونا قطعی طور پر ثابت و ظاہر ہو اور وہ اس چیز کو برا بھی نہ سمجھے بلکہ اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کرے اور اس کو اچھا جانے تو مسلمان نہیں رہے گا بلکہ کافر ہو جائے گا۔

اس موقع پر اس بات کو بھی جان لینا چاہیے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم بھلائیوں یا برائیوں کی حیثیت کے تابع ہوتا ہے یعنی اگر کوئی چیز اس درجہ کی ہے کہ اس کو اختیار کرنا واجب ہے تو اس کو اختیار کرنے کا حکم دینا (یعنی امر بالمعروف) بھی واجب ہوگا اور اگر وہ چیز مستحب ہوگی تو امر بالمعروف بھی مستحب ہوگا، اسی طرح اگر کوئی خلاف شرع چیز حرام کا درجہ رکھتی ہو اس سے روکنا یعنی نہی عن المنکر واجب ہوگا اور اگر وہ چیز مکروہ ہو تو اس صورت میں نہی عن المنکر بھی مستحب ہوگا۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کی وجہ سے کسی فتنہ و فساد کے پیدا ہو جانے کا خوف نہ ہو مثلاً اگر یہ ظاہر ہو کہ فلاں شخص کو کسی نیک کام کی تلقین کرنے کی وجہ سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا یا جو شخص کسی برے کام کا مرتکب ہے اگر اس کو اس برائی سے روکا گیا تو اس کے نتائج اور زیادہ فتنہ و فساد کی صورت میں نکلیں گے تو اس صورت میں اس فریضہ کی ادائیگی قطعا ضروری نہیں ہوگی۔ اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو قبول کیے جانے کا گمان بھی ہو، لہٰذا اگر یہ گمان ہو کہ جس شخص کو نیک کام کرنے کی تلقین کی جائے گی یا اس کو کسی برے کام سے روکا جائے گا تو وہ اس بات کو قبول نہیں کرے گا تو اس کو اس نیک کام کا حکم کرنا یا برے کام سے روکنا واجب نہیں ہوگا البتہ مستحسن ضرور رہے گا تاکہ شعار اسلام کا اظہار ہو جائے۔ امام نوویؒ نے اس کے خلاف نقل کیا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

حدیث کے الفاظ مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُّنْکَرًا میں لفظ من کے ذریعہ مذکورہ حکم کا مخاطب جن لوگوں کو قرار دیا گیا ہے ان میں ملت کا ہر فرد شامل ہے، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور خواہ آزاد ہو یا غلام یہاں تک کہ فاسق بھی اس امر کا ذمہ دار ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ امر بالمعروف کے لئے شرط نہیں ہے کہ جو شخص کسی نیکی کا حکم کرنے والا ہو وہ پہلے خود بھی اس نیکی پر عامل ہو اور بغیر اپنے عمل کے امر بالمعروف کا فریضہ انجام دینا اس کے لئے درست نہ ہو کیونکہ جس طرح خود اپنے نفس کو کسی نیکی پر عمل کرنے کی تلقین کرنا ایک واجب چیز ہے اسی طرح ایک واجب امر یہ ہے کہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کی جائے، لہٰذا اگر ان میں سے کوئی ایک واجب ترک ہوتا تو اس کی وجہ سے دوسرے واجب کو ترک کرنا قطعا جائز نہیں ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ جس واجب کا ترک ہوگا اس کا گناہ بہر صورت لازم آئے گا۔ لہٰذا قرآن کریم میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (یعنی تم اس چیز کو کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے) تو اس آیت کریمہ کا محمول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تسلیم کرنے کی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ اس آیت کی مراد ترک عمل سے روکنا اور اس پر زجر و تنبیہ ہے نہ کہ دوسروں کو بھلائی کی تلقین کرنے سے منع کرنا مراد ہے، اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں سمجھئے کہ جو شخص بھلائیوں کی تلقین کرتا ہے اور دوسروں سے نیک عمل اختیار کرنے کو

کہتا ہے لیکن وہ خود اس بھلائی اور نیک عمل کو اختیار نہیں کرتا تو یہ آیت کریمہ ایسے شخص کو متنبہ کرتی ہے کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ تم دوسروں کو بھلائی اور نیک عمل کرنے کی تلقین کرتے ہو لیکن یہ نہایت غیر موزوں بات ہے کہ تم خود اس بھلائی اور نیک عمل کو اختیار نہیں کرتے! لہٰذا آیت یہ بات قطعاً ثابت نہیں کرتی کہ جو شخص خود نیک عمل اختیار نہ کرے وہ دوسروں کو بھی نیک عمل اختیار کرنے کی تلقین نہیں کر سکتا، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نیکی کی تلقین کرنے والا اگر خود بھی نیکی کو اختیار کرے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو شخص خود عمل نہیں کرتا، اس کی تلقین و نصیحت دوسروں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی جو ترتیب ذکر کی گئی ہے وہ قرآن و سُنّت اور اجماع اُمّت کے ذریعہ واجب ہے اس بارہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ کچھ روافض کا اس سے اختلاف ہے جن کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لہٰذا جس شخص نے مذکورہ ترتیب کے مطابق اس فریضہ کو انجام دیا اور مخاطب نے اس کو قبول کر لیا تو سبحان اللہ، اور اگر قبول نہ کیا تو وہ شخص اپنی ذمہ داری سے بہر حال سبکدوش ہو جائے گا، اس کے بعد اب اس پر کوئی اور چیز واجب نہیں ہوگی! نیز علماء نے کہا ہے کہ اس امر (یعنی بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کی فرضیت بطریق کفایہ ہے اور جو شخص اس فریضہ کی ادائیگی کی طاقت و قوت رکھنے کے باوجود اس ذمہ داری کو بلا کسی عذر کے پورا نہ کرے تو وہ گناہ گار ہوتا ہے لیکن بعض صورتوں میں یہ امر فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی برائی کسی ایسی جگہ رونما ہو رہی ہو کہ ایک شخص کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا یا اس کے ازالہ کی قدرت اس کے علاوہ کوئی اور نہیں رکھتا جیسے اپنی بیوی یا بیٹی کسی برائی کا ارتکاب کرے تو اس برائی کو ختم کرنے کی ذمہ داری خاص طور سے اسی شخص پر عائد ہوگی۔

امام نوویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ عدم قبولیت کا گمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کو ساقط نہیں کرتا، لہٰذا اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ فلاں شخص کے سامنے بھلائی کی تلقین کرنا یا اس کو برے کام سے روکنا بے کار ہے کیونکہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قبول نہیں کرے گا تو اس صورت میں بھی اس پر واجب ہوگا کہ وہ اس شخص کو نیک کام کرنے کا حکم دے اور برائی کے راستہ سے روکے، اور اس بات کی قطعاً پرواہ نہ کرے کہ اس کی بات مانی جائے گی یا نہیں کیونکہ موعظت و نصیحت اول تو بذات خود بڑے فائدے رکھتی ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اور کبھی نہ کبھی ضرور اثر کرتی ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ دوسرے یہ کہ محض اس گمان کی بنا پر کہ مخاطب تلقین و نصیحت سے کوئی اثر نہیں لے گا اپنی ذمہ داری سے اعراض نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر بھلائیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کی جدوجہد میں مصروف رہنا چاہئے کہ لوگوں نے تو رسولوں تک کو جھٹلایا ہے اور پیغمبروں تک کی موعظت و نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے تو کیا ان رسولوں اور پیغمبروں نے حق بات پہنچانے کا فریضہ ترک کر دیا تھا! قرآن نے جو بات رسول و پیغمبر کے بارے میں فرمائی ہے وہ ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے یعنی وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (یعنی رسول کا کام بس یہ ہے کہ (خدا کے احکام) صاف صاف پہنچا دے (ان احکام کا ماننا یا نہ ماننا دوسروں کا کام ہے۔

واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ صرف حاکم اور مقتدر مسلمانوں ہی پر عائد نہیں ہوتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ اس امر کی انجام دہی کے لئے حاکم اپنی طرف سے احکام جاری کر دے، بلکہ اس کا حق عام لوگوں کو بھی پہنچتا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کو انجام دیں، بلکہ ایسے زمانہ میں جب کہ طاقت و اقتدار رکھنے والے مسلمان اس فریضہ سے بالکل لاپرواہی برتتے ہیں۔ خصوصیت سے عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں اور تمام مسلمانوں میں بھی زیادہ ذمہ داری علماء و مشائخ پر عائد ہوتی ہے، اسی طرح اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنا مخاطب صرف عام مسلمانوں ہی کو نہیں ماننا چاہئے بلکہ خواص جیسے حاکموں وغیرہ کو بھی مناسب انداز میں بھلائیوں کی تلقین کرنی چاہئے اور وہ جن برائیوں میں مبتلا ہوں ان سے ان کو روکنا چاہئے، چنانچہ پچھلے زمانوں کے بزرگ صرف

عوام الناس کو بھلائیوں کی تلقین نہیں کرتے تھے اور ان کو برائیوں سے روکنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ بادشاہوں حاکموں اور مقتدر مسلمانوں کے سامنے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسی شخص کو کرنا چاہئے جو یہ علم رکھتا ہو کہ وہ جس چیز کا حکم دے رہا ہے یا جس چیز سے روک رہا ہے شریعت کے اعتبار سے اس کی کیا حیثیت واہمیت ہے، چنانچہ جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جنکا فرض وواجب ہونا یا جن کا حرام ہونا اس طرح ظاہر ہے کہ تمام مسلمان ان کو جانتے ہیں، جیسے نماز اور روزہ وغیرہ یا زنا اور شراب وغیرہ، تو ان چیزوں کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عام مسلمان بھی شوق سے کر سکتے ہیں لیکن جو چیزیں کہ خواہ وہ قولی ہوں یا فعلی، ایسی ہیں کہ ان کے بارے میں عام مسلمانوں کو کوئی علم نہیں ہوتا جو اجتہاد سے تعلق رکھتی ہیں تو عوام کو ان طرح کی چیزوں میں سے صرف اسی چیز کو اختیار کرنے سے منع کرنا چاہئے جن کی ممانعت متفق علیہ ہو مختلف فیہ امور میں منع نہیں کرنا چاہیے خصوصا ان حضرات کے مسلک کے مطابق کہ جو یہ کہتے ہیں کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے۔

آخر میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری انجام دیں ان کو چاہئے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں خوش خلقی، نرمی اور تہذیب ومتانت کا رویہ اختیار کریں اور وہ اس امر کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کی خاطر انجام دیں نہ کہ کسی دنیاوی غرض ومقصد اور نفس کی خاطر، اس صورت میں مخاطب پر بات اثر بھی کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ ثواب بھی عطا فرماتا ہے اسی طرح جب کسی شخص کو کوئی نصیحت کرنی ہو تو لوگوں کی موجودگی میں نہ کی جائے بلکہ تنہائی میں اور پوشیدہ طور پر اس کو نصیحت کرنی چاہئے کیونکہ لوگوں کی موجودگی میں کسی کو نصیحت کرنا، نصیحت نہیں بلکہ فضیحت ہے۔

مداہنت کرنے والے کی مثال

(۲) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُدَاهِنِ فِيْ حُدُوْدِ اللّٰهِ وَالْوَاقِعِ فِيْهَا مَثَلُ قَوْمٍ اسْتَهَمُوْا سَفِيْنَةً فَصَارَ بَعْضُهُمْ فِيْ اَسْفَلِهَا وَصَارَ بَعْضُهُمْ فِيْ اَعْلَاهَا فَكَانَ الَّذِيْ فِيْ اَسْفَلِهَا يَمُرُّ بِالْمَاءِ عَلَى الَّذِيْنَ فِيْ اَعْلَاهَا فَتَاَذَّوْا بِهٖ فَاَخَذَ فَاْسًا فَجَعَلَ يَنْقُرُ اَسْفَلَ السَّفِيْنَةِ فَاَتَوْهُ فَقَالُوْا مَالَكَ قَالَ تَاَذَّيْتُمْ بِيْ وَلَا بُدَّلِيْ مِنَ الْمَاءِ فَاِنْ اَخَذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ اَنْجَوْهُ وَنَجَّوْا اَنْفُسَهُمْ وَاِنْ تَرَكُوْهُ اَهْلَكُوْهُ وَاَهْلَكُوْا اَنْفُسَهُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خدا کی مقرر کردہ حدود میں غفلت وسستی کرنے والے اور ان حدود میں گر پڑنے والے یعنی گناہ کا ارتکاب کرنے والے کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو قرعہ ڈال کر کشتی میں بیٹھے ہوں (جیسے کسی سواری میں ایک ساتھ سفر کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ قرعہ وغیرہ کی صورت میں ہر شخص کی جگہ متعین کر دی جاتی ہے اور جس شخص کی جو جگہ متعین ہوتی ہے وہ اسی جگہ پر بیٹھتا ہے) چنانچہ ان میں سے بعض لوگ کشتی کے نیچے کے حصے میں ہوں اور بعض لوگ اس کے اوپر کے حصے میں پھر جو لوگ کشتی کے نیچے کے حصے میں ہوں وہ جب پانی لینے کے لئے اوپر کے حصے میں آئیں تو اس حصے میں بیٹھے ہوئے لوگ اس شخص کے آنے جانے کی وجہ سے تکلیف محسوس کرنے لگیں (جو پانی لانے کے لئے اوپر جائے اور وہاں کے لوگوں کے درمیان سے گزرے) لہٰذا نیچے کے حصہ والوں میں سے ایک شخص (اوپر والوں کی تکلیف وناگواری کو دیکھ کر) یہ کرے کہ کلہاڑا لے کر کشتی کی سطح کو توڑنا شروع کر دے، اور پھر اوپر کے لوگ اس کے پاس آئیں اور کہیں کہ یہ تمہیں کیا ہوا ہے (یعنی تم یہ کیسا بے تکا کام کر رہے ہو کہ کشتی کی سطح کو توڑ رہے ہو اور تمام کشتی والوں کی زندگیوں کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو؟) اس پر وہ شخص یہ جواب دے کہ جب میں (پانی لینے کے لیے) اوپر جاتا ہوں اور تم لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوں تو تم تکلیف وناگواری محسوس کرتے ہو اور میں پانی حاصل کرنے پر مجبور ہوں (خواہ اس کے لئے مجھے کشتی کی سطح ہی کو کیوں نہ توڑ کر پانی کی جگہ نکالنی پڑے)! ایسی حالت میں (دو ہی صورتیں سامنے ہو سکتی ہیں) یا تو لوگ اس شخص کے ہاتھ کو روکیں (یعنی اس کو کشتی کی سطح نہ توڑنے دیں) تاکہ اس کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی (غرقابی اور ہلاکت سے) بچائیں یا اس کو اس کے حال پر

چھوڑ دیں (یعنی کشتی کی سطح توڑنے سے اس کو نہ روکیں) اور پھر اس کو بھی ہلاکت میں ڈالیں اور خود بھی ہلاک ہو جائیں۔" (بخاری)

تشریح: حدیث میں جو لفظ مُدْهِنْ ذکر کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں مداہنت کرنے والا اور مداہنت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص طاقت و قدرت رکھنے کے باوجود کسی خلاف شرع امر کو دیکھ کر اس کو مٹانے وختم کرنے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے باز رہے اور یہ باز رہنا خواہ شرم حضوری کی وجہ سے ہو یا دینی بے حمیتی کی بنا پر اور خواہ کسی کی جانب داری اور کسی غرض ولالچ کی وجہ سے ہو یا دین کی پرواہ نہ ہونے کی وجہ سے۔ واضح رہے کہ لغت میں، مداہنت اور مدارت کے ایک ہی معنی ہیں، لیکن شریعت میں مدارت کی اجازت ہے بلکہ بعض مواقع پر اس کو مستحسن قرار دیا گیا ہے جب کہ مداہنت کی صریح ممانعت ہے، چنانچہ شرعی نقطہ نظر سے مدارت اور مداہنت کے درمیان فرق یہ ہے کہ مدارت کی بنیاد، دین کی حفاظت مصالح وقت کی رعایت اور ظالموں کے ظلم کو دور کرنے پر ہوتی ہے اور مداہنت کی بنیاد اپنے نفس کے تحفظ اور اس کی خواہشات کی تکمیل، لوگوں سے منفعت ومفاد حاصل کرنے اور دین سے لاپرواہی پر ہوتی ہے۔

"خدا کی حدود میں غفلت وسستی کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی جو حد (سزائیں) مقرر کی ہیں (جیسے شرابی کو کوڑے مارنے وغیرہ) ان کو طاقت وقدرت کے باوجود قائم وجاری کرنے میں لاپرواہی وغفلت کرنا۔ یا اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں کو موجب حد قرار دیا ہے (جیسے زنا اور شراب نوشی وغیرہ) ان کے مرتکبین کو ان گناہوں سے روکنے میں غفلت کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دینے سے باز رہنا۔ پس حضور نے فرمایا کہ جس طرح کشتی میں سوار کوئی شخص کشتی کی سطح کو توڑنے لگے اور کشتی میں سوار دوسرے لوگ اس کو اس کی حرکت سے باز رکھیں تو کشتی ڈوبنے سے بچ جائے گی اور تمام مسافر محفوظ وسلامت رہیں گے اور اگر دوسرے مسافر اس شخص کو اس کے اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف وہی شخص بلکہ دوسرے تمام مسافر بھی اس شخص کی اس حرکت کی وجہ سے غرقاب وہلاک ہو جائیں گے اسی طرح اگر لوگ کسی فاسق وبدکار کو اس کے فسق وبدکاری سے روکیں اور برائیوں کے راستہ سے باز رکھیں تو وہ اس فاسق وبدکار کی نجات وفلاح کا بھی باعث بنیں گے اور خود کو بھی عذاب خداوندی سے محفوظ رکھ پائیں گے اور اگر لوگ اس فاسق وبدکار کو اس حالت پر چھوڑ دیں کہ وہ اسی طرح فسق وبدکاری میں مبتلا رہے تو پھر نہ صرف وہ فاسق وبدکار ہی تباہ وبرباد ہوگا بلکہ وہ لوگ اپنے آپ کو بھی ہلاکت وتباہی میں مبتلا کریں گے کیونکہ جب دنیا والوں کی بداعمالیوں اور بدکاریوں کی وجہ سے خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی تباہ کاریوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے سب ہی لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً یعنی تم لوگ اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچاؤ جو خاص طور پر ان ہی لوگوں کو مبتلا نہیں کرے گا جنہوں نے ظلم کیا ہے، بلکہ تمہاری مداہنت کی وجہ سے تمہیں بھی مبتلا کرے گا۔

"جو قرعہ ڈال کر کشتی میں بیٹھے ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے کشتی کو درجات میں تقسیم کر لیا ہو جن میں سے ایک درجہ تو کشتی کے اوپر کے حصہ میں واقع ہو اور دوسرا درجہ کشتی کے نیچے کے حصہ میں ہو اور ان دونوں درجات میں بیٹھنے کے لئے قرعہ اندازی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو کہ جس شخص کا نام قرعہ میں جس درجہ کے لئے نکلے وہ شخص اسی درجہ میں بیٹھے گا۔ واضح رہے کہ یہ قرعہ والی بات محض ایک قید اتفاقی کے طور پر ہے ورنہ عام طور سے کشتی میں بیٹھنے کا یہ طریقہ رائج نہیں ہے بلکہ نشست اور درجات کی تقسیم کشتی کے مالک و منتظم کی صوابدید پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ کرایہ وٹکٹ کی حیثیت اور ترتیب کے مطابق جس شخص کو جہاں چاہتا ہے جگہ دیتا ہے یا جس شخص کو جہاں جگہ مل جاتی ہے، وہاں بیٹھ جاتا ہے، ہاں اگر کشتی کسی ایک شخص کی ملکیت ہونے کے بجائے مشترکہ طور پر چند اشخاص کی یکساں طور پر ملکیت ہوتی ہے اور وہ اشخاص ایک ساتھ اس کشتی میں جانا چاہیں تو اس صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب اپنی اپنی نشست کے لئے قرعہ ڈال لیں، اور جس شخص کا نام جس درجہ اور جس جگہ کے لئے نکلے وہ وہاں بیٹھ جائے۔

فَكَانَ الَّذِيْ فِيْ اَسْفَلِهَا الخ میں لفظ اَلَّذِيْ استعمال کرنا ماسبق میں ذکر کیے گئے لفظ بعض کی مناسبت سے ہے اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اس حصے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں میں سے صرف ایک شخص بھی ایسا کرے (یعنی کشتی کی سطح کو توڑنے لگے) تو اس،

کے بارے میں بھی یہ ہی حکم ہوتا ہے۔

"وہ جب پانی لینے کے لئے اوپر کے حصہ میں آئیں" میں لفظ "پانی" سے مراد اکثر شارحین کے نزدیک وہی عام پانی ہے جو پینے وغیرہ کے استعمال میں آتا ہے، اور بعض شارحین کہتے ہیں کہ یہاں "پانی" سے مراد پیشاب پاخانہ ہے جو نیچے کے حصے میں کوئی شخص کسی برتن وغیرہ میں کرے اور پھر اس کو دریا میں ڈالنے کے لئے اوپر کے حصے میں آئے اور وہاں کے لوگوں کے درمیان سے گزرے، اس صورت میں اس شخص کی وجہ سے اوپر کے حصہ والوں کا تکلیف وناگواری محسوس کرنا زیادہ بدیہی بات ہوگی! بہرصورت حاصل یہی ہے کہ نیچے کے حصے والے پانی لانے کے لئے یا پیشاب پاخانہ پھینکنے کے لئے اوپر کے حصہ میں جائیں اور ان کی وجہ سے وہاں کے لوگ تکلیف واذیت محسوس کرنے لگیں اور پھر نیچے والوں میں سے کوئی شخص ان کی تکلیف وناگواری کو دیکھ کر کشتی کے نیچے کی سطح توڑنے لگے تاکہ اس جگہ سے پانی حاصل کرے یا غلاظت وغیرہ پھینک دیا کرے الخ۔

ایک شارحؒ نے حدیث کی تشریح میں یہ بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں غفلت وسستی کرنے والے کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو کشتی کے اوپر کے درجہ میں ہو اور حدود میں گر پڑنے والے یعنی گناہ ومعصیت میں مبتلا ہونے والے کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی جو کشتی کے نیچے کے درجہ میں ہو اور اس کے انہماک یعنی ان حدود (گناہوں) میں مشغول ومتفرق رہنے اور ان کو ترک نہ کرنے کو کشتی کے نیچے کی سطح کو توڑنے کے عمل کے ساتھ تشبیہ دی، اور گناہوں کے مرتکب کو ان گناہوں سے روکنے کو کشتی کی سطح توڑنے والے کا ہاتھ پکڑنے اور اس کو کشتی توڑنے سے منع کرنے سے تعبیر کیا، اور گناہوں سے روکنے ومنع کرنے کے فائدہ کو ان سب لوگوں کی فلاح ونجات سے تعبیر کیا جو پانی لینے کے لئے اوپر آنے والوں کو منع کریں یا جو پانی کے لئے اوپر جائیں اور ان کو اوپر آنے سے روکا جائے اور گناہوں سے منع نہ کرنے والوں کو ان لوگوں سے تعبیر کیا جو کشتی توڑنے والے کو اس کے حال پر چھوڑ دیں یعنی اس کو کشتی توڑنے سے باز رکھیں اور مدافعت کرنے والوں یعنی لوگوں کو گناہوں سے نہ روکنے والوں کے گناہ اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والے کے انجام کو اس امر سے تعبیر کیا کہ اگر کشتی کے اوپر والے کشتی کو توڑنے والے کو منع نہ کریں تو وہ اپنے آپ کو بھی اور کشتی توڑنے والے کو بھی ہلاکت وتباہی میں ڈال دیں گے! نیز اسلام کو گویا کشتی سے تعبیر فرمایا جو دونوں قسم کے لوگوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حدیث میں منع کرنے والوں کے طبقہ کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر فرمایا جس کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس شخص کی حسب قدرت پوری مدد کریں جو لوگوں کو گناہوں اور برائیوں سے باز رکھنے کا فریضہ انجام دے اور اسی طرح گناہ کرنے والے کا ذکر مفرد کے صیغہ کے ساتھ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ گناہ کے مرتکب اپنی حیثیت کے اعتبار سے ناقص ہیں خواہ وہ تعداد میں کتنے ہی ہوں۔

بے عمل واعظ وناصح کا انجام

(۳) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُجَآءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقٰى فِي النَّارِ فَتَنْدَلِقُ اَقْتَابُهُ فِي النَّارِ فَيَطْحَنُ فِيْهَا كَطَحْنِ الْحِمَارِ بِرَحَاهُ فَيَجْتَمِعُ اَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُوْنَ اَيْ فُلَانُ مَاشَانُكَ اَلَيْسَ كُنْتَ تَاْمُرُنَا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ قَالَ كُنْتُ اٰمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا اٰتِيْهِ وَاَنْهَاكُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاٰتِيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن (امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مقدمات کے فیصلہ کے وقت) ایک شخص کو لایا جائے گا جس کو مستوجب عذاب قرار دے کر آگ میں ڈال دیا جائے گا اور آگ میں پہنچتے ہی ان کی انتڑیاں فورًا باہر نکل پڑیں گی اور وہ انتڑیوں کو اس طرح پیسے گا جس طرح خراس کا گدھا اپنی چکی کے ذریعہ آٹے کو پیستا ہے (یعنی جس طرح چکی میں چلنے

والا گدھا اپنی چکی کے گرد چلتا رہتا ہے، اسی طرح وہ شخص اپنی ان انتڑیوں کے گرد چکر لگائے گا اور ان کو پیروں تلے روندتا رہے گا) چنانچہ (اس شخص کو اس حالت میں دیکھ کر) دوزخی (یعنی اس کے زمانہ کے فاسق وفاجر لوگ) اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ اے فلاں شخص! تمہارا یہ کیا حال ہے؟ تم تو ہمیں نیک کام کی تلقین و نصیحت کیا کرتے تھے اور برے کام سے منع کرتے تھے وہ شخص جواب دے گا کہ بے شک میں تمہیں نیک کام کی تلقین کیا کرتا تھا مگر خود اس نیک کام کو نہیں کرتا تھا اور تمہیں برے کام سے منع کرتا تھا مگر خود اس برے کام سے باز نہیں رہتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس شخص کو یہ سزا، عمل نہ کرنے کی وجہ سے ملے گی، نہ کہ اس وجہ سے ملے گی کہ وہ جب خود عمل نہیں کرتا تھا تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کیوں انجام دیتا تھا، چنانچہ اگر وہ اس فریضہ کو بھی ترک کرتا تو وہ مذکورہ عذاب سے بھی سخت عذاب کا مستوجب ہوتا کیونکہ اس صورت میں اس پر دو واجب کے ترک کا گناہ ہوتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ نہ انجام دینے پر عذاب خداوندی

(۴) عَنْ حُذَیْفَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَیُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ عِنْدِهٖ ثُمَّ لَتَدْعُنَّهٗ وَلَا یُسْتَجَابُ لَكُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت حذیفہؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم یقیناً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دو گے یا عنقریب اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل کرے گا پھر تم اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرو گے تو تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی۔" اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حضور کے ارشا کا مطلب یہ ہے کہ دونوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوگی یا تو تم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہو گے اور یا اگر تم اس فریضہ کی انجام دہی سے غافل رہے تو اللہ تعالیٰ مختلف طرح کی سختیوں اور مصائب کی صورت میں تم پر اپنا عذاب نازل کرے گا اور اس وقت تم ان سختیوں اور مصائب کے دفعیہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو گے تو تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسرے عذاب اور مصائب دعا کی برکت سے ٹلنے کا احتمال رکھتے ہیں لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک پر خدا کی طرف سے جو آفات وبلائیں نازل ہوتی ہیں وہ دعا کے ذریعہ بھی ٹلنے کا احتمال نہیں رکھتیں کیونکہ ان کے دفعہ کے لئے کی جانے والی دعا قبول نہیں ہوتی۔

بزارؒ نے اور طبرانیؒ نے کتاب اوسط میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ (حضور نے فرمایا۔ "دو باتوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے یعنی یا تو) تم یقیناً امر بالمعروف بھی کرو گے اور یقیناً نہی عن المنکر کا فریضہ بھی انجام دو گے، یا ان دونوں فریضوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں) یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر تمہارے برے لوگوں کو مسلّط کر دے گا اور پھر جو تمہارے نیک لوگ (ان برے لوگوں کے فتنہ وفساد اور ظلم وجور کے دفعیہ کے لیے) دعا کریں گے، مگر ان کی دعا، قبول نہیں کی جائے گی۔

گناہ کو گناہ سمجھو

(۵) وَعَنِ الْعُرْسِ ابْنِ عُمَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا عُمِلَتِ الْخَطِیْئَةُ فِی الْاَرْضِ مَنْ شَهِدَهَا فَكَرِهَهَا كَانَ كَمَنْ غَابَ عَنْهَا وَمَنْ غَابَ عَنْهَا فَرَضِیَهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عرس بن عمیرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جب زمین پر گناہ کیے جائیں تو جو شخص ان

گناہوں کو برا جانے، وہ اس شخص کی مانند ہے جو وہاں موجود نہ ہو (اور ان گناہوں کے وقوع کو نہ جانتا ہو) اور جو شخص وہاں موجود نہ ہو لیکن وہ ان گناہوں کے وقوع کو جانتا ہو) اور وہ ان گناہوں کو برا نہ جانے تو وہ اس شخص کی مانند ہوگا جو وہاں موجود ہو (اور ان گناہوں کو برا خیال نہ کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ گناہ کو ہر حال میں گناہ سمجھو، اور اس کو برا خیال کرو! اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے کسی گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہو تو اول اس کو ہاتھ اور زبان کے ذریعہ مٹانے اور ختم کرنے کی کوشش کرو اگر ان دونوں میں سے کسی کی بھی طاقت و قدرت نہیں رکھتے ہو تو پھر جو آخری درجہ ہے اس کو اختیار کرو یعنی اس گناہ کو برا خیال کرو اور دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ رکھو۔ اس صورت میں تمہارا شمار گویا ان لوگوں کے زمرہ میں ہوگا جو وہاں موجود ہی نہ ہوں، اور جن کی آنکھوں کے سامنے اس گناہ کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو! اس سے واضح ہوا کہ حقیقی موجودگی و غیر موجودگی کا تعلق دل سے ہے نہ کہ جسم و بدن سے، چنانچہ جس شخص نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والے گناہ کو برا خیال کیا اور دل میں بھی اس کے خلاف نفرت رکھی تو گویا حقیقت میں وہ اس جگہ موجود نہیں جہاں وہ گناہ کیا جا رہا ہے، اگرچہ ظاہری طور پر وہاں موجود ہے اور اگر کسی شخص نے گناہ کو گناہ نہیں سمجھا یعنی اس گناہ کو اور اس گناہ کے مرتکب کو دل میں برا خیال نہیں کیا تو گویا وہ حقیقت میں اس جگہ موجود ہے یہاں وہ گناہ کیا جا رہا ہے اگرچہ ظاہری طور پر وہاں موجود نہیں ہے۔

برائیوں کو مٹانے کی جدوجہد نہ کرنا عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے

﴿۶﴾ وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ نِ الصِّدِّیْقِ قَالَ یَاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّکُمْ تَقْرَءُوْنَ ھٰذِہِ الْاٰیَةَ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوْا مُنْکَرًا فَلَمْ یُغَیِّرُوْہُ یُوْشِكُ اَنْ یَّعُمَّھُمُ اللّٰہُ بِعِقَابِہٖ۔ رَوَاہُ ابْنُ مَاجَةَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَصَحَّحَہٗ وَفِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ دَاوُدَ اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ یَاْخُذُوْا عَلٰی یَدَیْہِ اَوْشَكَ اَنْ یَّعُمَّھُمُ اللّٰہُ بِعِقَابِہٖ وَفِیْ اُخْرٰی لَہٗ مَامِنْ قَوْمٍ یُّعْمَلُ فِیْھِمْ بِالْمَعَاصِیْ ثُمَّ یَقْدِرُوْنَ عَلٰی اَنْ یُّغَیِّرُوْا ثُمَّ لَا یُغَیِّرُوْنَ اِلَّا یُوْشِكُ اَنْ یَّعُمَّھُمُ اللّٰہُ بِعِقَابٍ وَفِیْ اُخْرٰی لَہٗ مَامِنْ قَوْمٍ یُّعْمَلُ فِیْھِمْ بِالْمَعَاصِیْ ھُمْ اَکْثَرُ مِمَّنْ یَّعْمَلُہٗ۔

"اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے فرمایا۔ "لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ " یعنی اے مؤمنو! تم اپنے نفسوں کو لازم پکڑ لو جو شخص گمراہ ہو گیا ہے وہ تم کو ضرر نہیں پہنچائے گا جب کہ تم ہدایت یافتہ ہو (لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ تم اس آیت کی تلاوت کرتے ہو اور اس کے معنی کو عموم و اطلاق پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں ہے۔ حالانکہ تمہارا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ کسی خلاف شرع امر کو دیکھیں اور اس کی اصلاح و سرکوبی کے لئے کوشش نہ کریں اور لوگوں کو اس سے باز نہ رکھیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے عذاب میں مبتلا کر دے۔" اس روایت کو ابن ماجہؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے! نیز ابوداؤدؒ کی روایت میں یوں ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) "جب لوگ کسی کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں (یعنی اس کو ظلم کرنے سے نہ روکیں) تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے عذاب کی گرفت میں لے لے۔" اور ابوداؤدؒ ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (حضور ﷺ نے فرمایا)۔ "جس قوم میں گناہ و معاصی کا ارتکاب ہونے لگے اور اس قوم کے لوگ ہاتھ اور زبان کے ذریعہ) ان کی اصلاح و سرکوبی کی قدرت رکھتے ہوں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی اصلاح و سرکوبی کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔" ابوداؤدؒ ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) جس قوم میں گناہ و معاصی کا ارتکاب ہونے لگے اور اس قوم میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جو گناہ و معاصی کا

ارتکاب نہیں کرتے (لیکن اس کے باوجود وہ اپنے میں کے گناہ گار لوگوں کو گناہوں سے باز نہ رکھیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے عذاب میں گرفتار کریگا۔"

تشریح : آخری روایت کے الفاظ کا حاصل یہ ہے کہ جب برے لوگوں کے مقابلہ میں اچھے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو اور وہ اچھے لوگ اپنی کثرت کے باوجود ان لوگوں پر قابو نہ پائیں اور ان کو گناہ و معاصی کے راستہ سے نہ روکیں تو وہ یقیناً عذاب اللہ کے مستوجب قرار پائیں گے کیونکہ ان کا اکثریت میں ہونا، برائیوں کو مٹانے پر قدرت رکھنے کے مترادف ہے۔ اور قدرت رکھنے کے باوجود برائیوں کی بیخ کنی کی جد و جہد اور سعی نہ کرنا ایک ایسی غفلت و تقصیر ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔

مذکورہ آیت کے بارے میں یہ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ یہ آیت اپنے حکم کے اعتبار سے عام و مطلق نہیں ہے بلکہ اس امر کے ساتھ مخصوص و مقید ہے کہ جو لوگ وعظ و نصیحت اور تنبیہ و تہدید کے باوجود برائی کا راستہ ترک نہ کریں، ان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی اثر نہ ہو اور وہ اپنے اختیار کیے ہوئے راستہ پر مطمئن و خوش ہوں، جیسا کہ قرب قیامت میں لوگوں کا یہی حال ہوگا تو ایسے لوگوں کے بارے میں مذکورہ آیت کہتی ہے کہ ایسے لوگوں کی برائیوں کا وبال ان بندگان خدا کو کوئی نقصان و ضرر نہیں پہنچا سکتا، جن کو خدا نے ہدایت یافتہ بنایا ہے اور جو برائیوں کے راستہ سے دور رہتے ہیں! اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ اس آیت کو لوگوں نے حضرت ابن مسعودؓ کے سامنے پڑھا (اور اس کا مطلب جاننا چاہا) تو انہوں نے فرمایا کہ تم جس زمانہ میں ہو وہ زمانہ اس آیت کا محمول نہیں ہے کیونکہ تمہارے زمانہ کے لوگ تو اچھی باتوں کو سنتے ہیں اور انکا اثر قبول کرتے ہیں، البتہ آخر میں ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب بندگان خدا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں گے تو لوگ ان کی باتوں کو نہیں سنیں گے، چنانچہ یہ آیت اس آنے والے زمانہ کے بارے میں آگاہ کر رہی ہے اسی طرح حضرت ابو ثعلبہؓ کی روایت جو آگے آ رہی ہے اس پر دلالت کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں "ہدایت یافتہ" سے مراد وہ مؤمن ہیں جو برے کاموں کی تردید و تغلیظ کریں اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔ اس مناسبت سے مذکورہ بالا حدیث کو اس آیت کی تفسیر کہا جا سکتا ہے! "ضرر" سے مراد عام عذاب ہے، نیز "انفسکم" سے مراد مسلمان ہیں "تم اپنے نفسوں کو لازم پکڑلو" کا مطلب یہ ہوگا کہ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کی اصلاح و ہدایت کرنے کی ذمہ داری کو پوری طرح انجام دیتے رہو اگر تم اس طور پر عامل رہو گے اور ایک دوسرے کو برائیوں سے روک کر ہدایت کا راستہ پکڑے رہو گے تو تمہیں کوئی گمراہی بہکا نہیں سکتی اور کسی کے گناہ کا وبال نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھو، اگر تم نے گناہوں اور برائیوں سے خود کی حفاظت کرلی اور اس طرح ہدایت یافتہ بن گئے، نیز کسی وجہ سے تم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے عاجز رہے تو پھر تمہیں ان لوگوں کی گمراہی کا وبال کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا جو خلاف شرع امور اور برائیوں کا ارتکاب کر کے گمراہ ہو گئے ہوں۔

(۷) وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُّغَيِّرُوْا عَلَيْهِ وَلَا يُغَيِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتُوْا۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

"اور حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ "جس قوم کا کوئی شخص گناہ و معاصی کا ارتکاب کرتا ہو اور اس قوم کے لوگ اس پر قدرت رکھتے ہوں کہ (ہاتھ یا زبان کے ذریعہ) اس گناہ کی اصلاح و سرکوبی کریں اور اس شخص پر قابو پائیں لیکن اس کے باوجود وہ اس کی اصلاح نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اپنی طرف سے عذاب نازل کرتا ہے قبل اس کے کہ وہ مریں۔"

(ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب اسی دنیا میں نازل ہوتا ہے۔ خواہ اس کی صورت کچھ ہی ہو! اس سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب پہنچتا ہے اور آخرت کا عذاب باقی رہتا ہے جو وہاں پہنچے گا، اس کے برخلاف اور گناہوں کے مرتکبین پر اس دنیا میں عذاب ہونا ضروری نہیں ہے۔

آخر زمانہ میں دین پر عمل کرنے کی فضیلت واہمیت

⑧ وَعَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ فَقَالَ اَمَا وَاللّٰهِ لَقَدْ سَاَلْتُ عَنْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ بَلِ ائْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ حَتّٰی اِذَا رَاَیْتَ شُحًّا مُّطَاعًا وَهَوًی مُّتَّبَعًا وَّدُنْیَا مُؤْثَرَةً وَّاِعْجَابَ كُلِّ ذِیْ رَاْیٍ بِرَاْیِهٖ وَرَاَیْتَ اَمْرًا لَا بُدَّ لَكَ مِنْهُ فَعَلَیْكَ نَفْسَكَ وَدَعْ اَمْرَ الْعَوَامِ فَاِنَّ وَرَآءَكُمْ اَیَّامَ الصَّبْرِ فَمَنْ صَبَرَ فِیْهِنَّ قَبَضَ عَلَی الْجَمْرِ لِلْعَامِلِ فِیْهِنَّ اَجْرُ خَمْسِیْنَ رَجُلًا یَّعْمَلُوْنَ مِثْلَ عَمَلِهٖ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَجْرُ خَمْسِیْنَ مِنْهُمْ قَالَ اَجْرُ خَمْسِیْنَ مِنْكُمْ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

"اور حضرت ابو ثعلبہؓ سے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا جان لو خدا کی قسم میں نے رسول کریم ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا (کہ کیا میں اس آیت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے باز رہوں؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (ہرگز نہیں) تم اس فریضہ کی ادائیگی سے باز نہ رہو) بلکہ نیکیوں کا حکم دیتے رہو یہاں تک کہ جب تم بخل کو دیکھو کہ لوگ اس کی اتباع کرنے لگے ہیں، جب تم خواہشات نفس کو دیکھو کہ لوگ اس کے غلام بن گئے ہیں، جب دنیا کو دیکھو کہ لوگ اس کے غلام بن گئے ہیں، جب دنیا کو دیکھو کہ لوگ اس کو آخرت پر ترجیح دینے لگے ہیں، جب تم دیکھو کہ ہر عقل مند اور کسی مسلک کا پیرو اپنی ہی عقل اور اپنے ہی مسلک کو سب سے اچھا اور پسندیدہ سمجھنے لگا ہے (کہ نہ تو وہ کتاب وسنت اور اجماع اُمّت اور قیاس کی طرف نظر کرتا ہے اور نہ علماء اور اہل حق کی طرف رجوع کرتا ہے بلکہ محض اپنے نفس ہی کو سب سے بڑا حاکم اور مفتی سمجھنے لگا ہے) اور جب تم کسی ایسی چیز کو دیکھو کہ جس کے علاوہ تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہ ہو تو (ان سب صورتوں میں) اپنے آپ کو لازم پکڑ لو (یعنی اپنی ذات کو گناہوں سے محفوظ رکھو) اور عوام کے معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھو (بلکہ ان سے گوشہ نشینی اختیار کرو) کیونکہ تمہارے سامنے آخر زمانہ میں ایسے دن آنے والے ہیں جن میں صبر کرنا ضروری ہوگا (اور ان ایام کی ابتداء خلفاء راشدین کے بعد ہی ہوگئی ہے اور تاحال ان کا سلسلہ جاری ہے) لہٰذا جس شخص نے ان دنوں میں صبر کر لیا (یعنی اس سخت زمانہ میں دین پر عمل پیرا رہنے کی کلفت ومشقت کو برداشت کر لیا) اس کی حالت یہ ہوگی کہ گویا اس نے اپنے ہاتھ میں انگارا لے لیا ہے اور ان دنوں میں جو شخص دین وشریعت کے احکام پر عمل کرے گا اس کو ان پچاس لوگوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا جو اس شخص جیسے عمل کریں (اور ان کا تعلق نہ ان سخت ایام سے ہو اور نہ ان کو دین پر عمل کرنے کے سلسلے میں وہ تکالیف ومصائب برداشت کرنا پڑے جو اس شخص کو برداشت کرنا پڑیں گے)۔" صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ان پچاس لوگوں کے عمل کا اعتبار ہوگا جو تمہارے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا تم میں سے پچاس آدمیوں کا اجر وثواب۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: ورایت امرا لابدلك (اور جب تم ایسی چیز دیکھو جس کے علاوہ چارۂ کار نہ ہو) کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ایسی برائی کا دور دورہ ہو کہ جس کی طرف خواہش نفس کا میلان ہوتا ہے اور لوگوں کے درمیان آنے اور ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے جبلت طبعی کی بناء پر بے اختیار اس برائی میں مبتلا ہو جانے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لینا لازم ہے تاکہ اس برائی کا ارتکاب نہ ہو! اور بعض حواشی میں یہ مطلب لکھا ہے لابدلک سے مراد اپنے عجز کے سبب نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے معذور رہنا ہے!

یعنی اگر تم کسی ایسی برائی کو دیکھو جس سے لوگوں کو روکنے اور منع کی طاقت تم نہ رکھتے ہو اور اس وجہ سے تم نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے سکوت و اعراض کرتے ہو تو اس صورت میں تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ تم ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لو جو اس برائی میں مبتلا ہیں۔ یہ معنی کتاب کے ان نسخوں کی روایت کے مطابق ہیں جن میں لابدلک (جس کے علاوہ تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہ ہو) کے بجائے لَايَدَلَكَ (بمعنی لا قدرة لكَ عليه یعنی جس سے روکنے اور منع کرنے کی طاقت وقدرت تمہیں حاصل نہ ہو) کے الفاظ ہیں! یا مذکورہ جملہ کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر تمہیں کوئی ایسا امر درپیش ہو جو تمہارے لئے نہایت ضروری ہو اور سخت اہمیت کا حامل ہو اور اس کی وجہ سے تم نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دے سکتے ہو بایں طور کہ اگر تم اپنی توجہ اور اپنے وقت کو اس فریضہ کی انجام دہی میں لگاتے ہو تو تمہارا وہ ضروری امر فوت ہو جاتا، ہو تو اس صورت میں تم ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لو، جو برائیوں میں مبتلا ہیں اور جن کو ان برائیوں سے روکنے سے تم معذور ہو۔

"اور عوام کے معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھو" کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کچھ لوگوں کو دیکھو کہ وہ گناہ کرتے ہیں اور برائیوں میں مبتلا ہیں مگر تم طاقت وقدرت نہ رکھنے کی وجہ سے ان لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے سے سکوت و عراض کرنا ضروری سمجھتے ہو تو اس صورت میں تمہیں چاہئے کہ بس اپنی ذات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے بجائے خود اپنے آپ کو گناہوں اور برائیوں سے محفوظ رکھنے اور نیک کاموں کو اختیار کرنے میں مشغول رہو، نیز لوگوں کے معاملات وحالات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو، وہ اگر چاہے تو اپنے فضل وکرم سے خود ہی ان کو راہ راست پر لے آئے گا ورنہ ان کو سخت سزا دے گا۔ اس حکم کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بس اسی قدر ذمہ دار قرار دیتا ہے، جتنی ذمہ داری اٹھانے کی وہ طاقت وقدرت رکھتا ہو۔

گویا اس نے اپنے ہاتھ میں انگارہ لے لیا ہے" یہ جملہ دراصل مشقت وکلفت برداشت کرنے سے کنایہ ہے یعنی اس زمانہ میں دین پر چلنا اور دنیا سے بے رغبتی رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہو گا بلکہ یہ کام اتنا سخت اور اس قدر مصائب اور کلفتوں سے بھرپور ہو گا کہ جیسے کوئی شخص اپنے ہاتھ پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ لے اور پھر اس کی تکلیف واذیت کو برداشت کرلے۔

حدیث کے آخری جزء سے مذکورہ صفت (یعنی دین پر عمل پیرا ہونے کی کلفت ومشقت برداشت کرنے اور اس پر صابر وشاکر رہنے) میں صحابہؓ پر آخر زمانہ کے دیندار لوگوں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جزوی فضیلت، کلی فضیلت کے منافی نہیں ہو سکتی، چنانچہ ابوعمرو بن عبدالبر نے، جو مشاہیر محدثین میں سے ہیں، اپنی کتاب استیعاب میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اس اُمت میں صحابہؓ کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو کسی صحابیؓ کے مرتبہ جیسی فضیلت رکھتا ہو بلکہ صحابیؓ سے زیادہ فضیلت کا حامل ہو! انہوں نے اپنے اس قول کی دلیل میں ان احادیث کو پیش کیا ہے جن سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے، لیکن علماء کا مختار قول اس کے خلاف ہے تاہم واضح رہے کہ یہ اختلاف اقوال بس ان صحابہؓ کی حد تک ہے جو آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر ایمان لائے اور واپس اپنے وطن چلے گئے، اس سے زیادہ محبت رسول ﷺ ان کو حاصل نہ رہی، ورنہ جہاں تک ان صحابہؓ کرام کی ذات کا تعلق ہے جنہیں آنحضرت ﷺ کی طویل صحبت ورفاقت کا شرف حاصل رہا ہے اور جو شب وروز آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے اور انہوں نے آثار وانوار صحبت جمع کیے ان کی ذات اس اختلاف اقوال سے ماوراء ہے کہ ان کے بارے میں کسی بھی عالم کا یہ قول نہیں ہے کہ اس اُمت کا کوئی بھی فرد ان صحابہؓ میں سے کسی کے رتبہ کے بقدر یا اس سے زائد فضیلت رکھ سکتا ہے، بلکہ ہم تو جمہور علماء کے قول کے مطابق بلا استثناء تمام ہی صحابہؓ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ شرف صحابیت کا مرتبہ ہر ایک صحابیؓ کو حاصل ہے خواہ وہ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر ایمان لا کر اپنے وطن چلے گئے ہوں اور خواہ تمام عمر آنحضرت ﷺ کی خدمت ورفاقت میں رہے ہوں، اور یہ شرف بذات خود اس درجہ کا ہے کہ ان کے علاوہ کوئی بھی فرد اس مرتبہ میں ان کا شریک نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس اُمت کا کوئی بڑے سے بڑا شخص

بھی بلا استثناء کسی بھی صحابیؓ کے مرتبہ جیسی فضیلت نہیں رکھ سکتا! قوت القلوب میں کیا خوب لکھا ہے کہ جمال مصطفی ﷺ پر پڑنے والی ایک ہی نظر سے وہ حقائق آشکارا ہو جاتے ہیں اور وہ مقام و مقصد حاصل ہو جاتا ہے جو دوسروں کو سالہا سال کے چلوں اور قرنہا قرن کی ریاضت و مجاہدہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضور کے ایک جامع خطبہ کا ذکر

⑨ وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَطِیْبًا بَعْدَ الْعَصْرِ فَلَمْ یَدَعْ شَیْئًا یَکُوْنُ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَۃِ اِلَّا ذَکَرَہٗ حَفِظَہٗ مَنْ حَفِظَہٗ وَنَسِیَہٗ مَنْ نَسِیَہٗ وَکَانَ فِیْمَا قَالَ اِنَّ الدُّنْیَا حُلْوَۃٌ خَضِرَۃٌ وَّاِنَّ اللّٰہَ مُسْتَخْلِفُکُمْ فِیْھَا فَنَاظِرٌ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ اَلَا فَاتَّقُوا الدُّنْیَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ وَذَکَرَ اَنَّ لِکُلِّ غَادِرٍ لِوَآءً یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ بِقَدْرِ غَدْرَتِہٖ فِی الدُّنْیَا وَلَا غَدْرَ اَکْبَرُ مِنْ غَدْرِ اَمِیْرِ الْعَآمَّۃِ یُغْرَزُ لِوَآءُہٗ عِنْدَ اِسْتِہٖ قَالَ وَلَا یَمْنَعَنَّ اَحَدًا مِّنْکُمْ ھَیْبَۃُ النَّاسِ اَنْ یَّقُوْلَ بِحَقٍّ اِذَا عَلِمَہٗ وَفِیْ رِوَایَۃٍ اِنْ رَاٰی مُنْکَرًا اَنْ یُّغَیِّرَہٗ فَبَکٰی اَبُوْ سَعِیْدٍ وَّقَالَ قَدْ رَاَیْنَاہُ فَمَنَعَتْنَا ھَیْبَۃُ النَّاسِ اَنْ نَّتَکَلَّمَ فِیْہِ ثُمَّ قَالَ اَلَا اِنَّ بَنِیْ اٰدَمَ خُلِقُوْا عَلٰی طَبَقَاتٍ شَتّٰی فَمِنْھُمْ مَّنْ یُّوْلَدُ مُؤْمِنًا وَّیَحْیٰی مُؤْمِنًا وَّیَمُوْتُ مُؤْمِنًا وَّمِنْھُمْ مَنْ یُّوْلَدُ کَافِرًا وَّیَحْیٰی کَافِرًا وَّیَمُوْتُ کَافِرًا وَمِنْھُمْ مَّنْ یُّوْلَدُ مُؤْمِنًا وَّیَحْیٰی مُؤْمِنًا وَّیَمُوْتُ کَافِرًا وَّمِنْھُمْ مَّنْ یُّوْلَدُ کَافِرًا وَّیَحْیٰی کَافِرًا وَّیَمُوْتُ مُؤْمِنًا قَالَ وَذَکَرَ الْغَضَبَ فَمِنْھُمْ مَّنْ یَّکُوْنُ سَرِیْعَ الْغَضَبِ سَرِیْعَ الْفَیْءِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی وَمِنْھُمْ مَنْ یَّکُوْنُ بَطِیْءَ الْغَضَبِ بَطِیْءَ الْفَیْءِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی وَخِیَارُکُمْ مَّنْ یَّکُوْنُ بَطِیْءَ الْغَضَبِ سَرِیْعَ الْفَیْءِ وَشِرَارُکُمْ مَنْ یَّکُوْنُ سَرِیْعَ الْغَضَبِ بَطِیْءَ الْفَیْءِ قَالَ اتَّقُوا الْغَضَبَ فَاِنَّہٗ جَمْرَۃٌ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ اَلَا تَرَوْنَ اِلَی انْتِفَاخِ اَوْدَاجِہٖ وَحُمْرَۃِ عَیْنَیْہِ فَمَنْ اَحَسَّ بِشَیْءٍ مِّنْ ذٰلِکَ فَلْیَضْطَجِعْ وَلْیَتَلَبَّدْ بِالْاَرْضِ قَالَ وَذَکَرَ الدَّیْنَ فَقَالَ مِنْکُمْ مَنْ یَّکُوْنُ حَسَنَ الْقَضَآءِ وَاِذَا کَانَ لَہٗ اَفْحَشَ فِی الطَّلَبِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّکُوْنُ سَیِّئَ الْقَضَآءِ وَاِنْ کَانَ لَہٗ اَجْمَلَ فِی الطَّلَبِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی وَخِیَارُکُمْ مَّنْ اِذَا کَانَ عَلَیْہِ الدَّیْنُ اَحْسَنَ الْقَضَآءَ وَاِنْ کَانَ لَہٗ اَجْمَلَ فِی الطَّلَبِ وَشِرَارُکُمْ مَّنْ اِذَا کَانَ عَلَیْہِ الدَّیْنُ اَسَآءَ الْقَضَآءِ وَاِنْ کَانَ لَہٗ اَفْحَشَ فِی الطَّلَبِ حَتّٰی اِذَا کَانَتِ الشَّمْسُ عَلٰی رُؤُسِ النَّخْلِ وَاَطْرَافِ الْحِیْطَانِ فَقَالَ اَمَا اِنَّہٗ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنْیَا فِیْمَا مَضٰی مِنْھَا اِلَّا کَمَا بَقِیَ مِنْ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْمَا مَضٰی مِنْہُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) عصر کے بعد رسول کریم ﷺ ہمارے سامنے کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، اس خطبہ میں آپ ﷺ نے (متعلقات دین میں سے) ایسی کوئی ضروری بات نہیں چھوڑی جو قیامت تک پیش آسکتی ہے، آپ ﷺ نے ان باتوں کو ذکر فرمایا، اور یاد رکھنے والے نے ان کو یاد رکھا اور بھولنے والا اس کو بھول گیا (یعنی وہ باتیں اتنی تفصیل اور ہمہ گیری کے ساتھ بیان ہوئیں کہ بعض لوگوں کو تو یاد رہیں اور بعض لوگوں کے حافظہ نے ان کو فراموش کر دیا) آپ ﷺ نے اس وقت جو کچھ فرمایا اس میں یہ بھی تھا کہ۔ "دنیا بڑی شیریں اور ہری بھری ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا وہ دیکھتا ہے کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو! پس خبردار! تم دنیا سے بچنا اور عورتوں سے دور رہنا۔" آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ۔ "قیامت کے دن ہر عہد شکن کے لئے ایک نشان (علامتی جھنڈا) کھڑا کیا جائے گا جو دنیا میں اس کی عہد شکنی کے بقدر ہو گا (یعنی جس شخص نے دنیا میں) جتنی زیادہ عہد شکنی کی ہو گی اس کا وہ نشان اسی قدر بلند و نمایاں ہو گا تاکہ میدان حشر میں اس کو عام طور پر پہچان لیا جائے کہ یہ عہد شکنی کا مرتکب ہے اور اس نے کتنی زیادہ عہد شکنی کی ہے اور اس طرح کا علامتی نشان ہر باعث حق و باطل کے لئے ہو گا تاکہ ایک کو دوسرے سے امتیاز کر کے پہچانا جا سکے جیسے اس دنیا میں امراء اور مقتدرین اپنے ساتھ کوئی علامتی نشان رکھتے ہیں" اور کوئی عہد شکنی امیر عامہ کی عہد شکنی سے زیادہ بڑی نہیں، چنانچہ اس کا

نشان اس کی مقعد کے قریب کھڑا کیا جائے گا (تاکہ اس کی زیادہ فضیحت ورسوائی ہو۔" حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ۔ "تم میں سے کسی کو بھی کوئی خوف وہیبت حق بات کہنے سے باز نہ رکھے، جب کہ وہ حق بات سے واقف ہو (یعنی کوئی شخص کلمہ الحق کہنے میں کسی کا کوئی خوف ولحاظ نہ کرے بلکہ اس کو برملا کہے) ہاں اس کی وجہ سے جان جانے کا خوف ہو تو معذوری ہے اگرچہ اس صورت میں بھی اس سے باز رہنا اولی ہوگا) اور ایک اور روایت میں اس جگہ وَلاَ یمنعن احدا منکم ھیبۃ النّاس ان یَقُوْلُ بحق کے بجائے) یہ ہے کہ "جب تم میں سے کوئی شخص کسی خلاف شرع امر کو دیکھے تو لوگوں کا کوئی خوف وہیبت اس کو خلاف شرع امر کی اصلاح وسرکوبی سے باز نہ رکھے۔" یہ بیان کر کے) حضرت ابوسعید خدریؓ رو پڑے اور کہنے لگے کہ ہم نے خلاف شرع امر کو (اپنی آنکھ سے) دیکھا اور لوگوں کے خوف سے ہم اس کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکے۔ (اس کے بعد حضرت ابوسعیدؓ نے بیان کیا کہ) حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا۔ "جان لو! آدم علیہ السلام کی اولاد کو مختلف جماعتوں اور متضاد اقسام و مراتب کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے چنانچہ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو مؤمن پیدا کیا جاتا ہے، جو (سن تمیز سے لے کر آخر عمر تک گویا ساری عمر) ایمان کی حالت میں زندہ رہتے ہیں اور ایمان ہی پر ان کا خاتمہ ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے، جو کفر ہی کی حالت میں (ساری عمر) زندہ رہتے ہیں اور کفر ہی پر ان کا خاتمہ ہوتا ہے! اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو مؤمن پیدا کیا جاتا ہے وہ ایمان ہی کی حالت میں (ساری عمر) رہتے ہیں لیکن ان کا خاتمہ کفر پر ہوتا ہے! اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے، وہ کفر ہی کی حالت میں (ساری عمر) گزارتے ہیں لیکن ان کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے۔" حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ (اس موقع پر) حضور ﷺ نے غضب وغصہ کی قسموں کو بھی ذکر کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "بعض آدمی بہت جلد غضب ناک ہو جاتے ہیں لیکن ان کا غضب وغصہ جلد ہی ختم بھی ہو جاتا ہے (یعنی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں ذرا سی بات پر جلد ہی غصہ آجاتا ہے لیکن ان کا غصہ جتنی تیزی کے ساتھ ہے اسی تیزی کے ساتھ فرو بھی ہو جاتا ہے) چنانچہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا بدل بن جاتا ہے (یعنی جلد غصہ آنا بری خصلت ہے اور غصہ کا جلد جاتے رہنا اچھی خصلت ہے، لہٰذا جس شخص میں یہ دونوں خصلتیں ہوں تو ان میں سے جو خصلت اچھی ہے وہ بری خصلت کی مکافات کر دیتی ہے، اس طرح اس بارے میں وہ شخص نہ تو مدح و تحسین کا مستحق ہوتا ہے اور نہ برائی کا مستوجب، بلکہ دونوں خصلتوں کا حامل ہونے کی وجہ سے بین بین رہتا ہے، بایں اعتبار اس کے متعلق نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگوں میں بہتر شخص ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگوں میں بدتر شخص ہے) اور بعض آدمی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور دیر سے جاتا ہے (ایسا شخص بھی ایک اچھی خصلت رکھتا ہے اور ایک بری خصلت کہ اگرچہ غصہ کا دیر میں آنا اچھا ہے لیکن اس کا دیر سے جانا برا ہے۔ چنانچہ ایسا شخص بھی بین بین ہوتا ہے کہ اس کو بہترین شخص کہا جاسکتا ہے اور نہ بدترین شخص، لہٰذا تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جن کو غصہ دیر سے آتا ہے اور جلد فرو ہو جاتا ہے جب کہ تم میں بدترین شخص وہ ہے جس کو جلد غصہ آئے اور دیر میں غصہ جائے۔" (اس کے بعد) حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم غصہ سے بچو (یعنی ایسا کام نہ کرو جس سے غصہ آئے یا یہ مطلب ہے کہ غصہ سے خدا کی پناہ مانگو اور اس کے درجہ اس خصلت سے بچو (کیونکہ وہ غصہ ابن آدم کے قلب پر ایک دہکتا ہوا انگارہ ہے (یعنی غصہ آگ کے انگارہ کی طرح حرارت غریزیہ اور حدت جبلیہ رکھتا ہے جو نفس کی انگیٹھی میں دبا ہوا ہے، اور جب خواہش نفس اس کو بھڑکاتی ہے تو اس کی حرارت اور تیزی قلب پر غالب آجاتی ہے اور عقل اپنا تصرف کرنے سے عاجز رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص اپنے غصہ کی آگ میں دوسروں کو تو جلاتا ہے لیکن خود کو بھی جلا ڈالتا ہے) کیا تم نہیں دیکھتے کہ (جب کوئی شخص غضب ناک ہوتا ہے تو) اس کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں (یعنی یہ چیزیں دراصل اسی غصہ کی حرارت غریزیہ اور انجارات غلیظہ کے اٹھنے کا اثر ہوتی ہیں، اس اس طرح غضب ناک شخص کا ظاہر گویا اس کے باطن کا غماز ہوتا ہے) لہٰذا جب کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ اب غصہ آیا ہی چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ فوراً پہلو پر لیٹ جائے اور زمین سے چمٹ جائے۔" اور

حضور ﷺ نے قرض کا بھی ذکر کیا (یعنی قرض قرضدار اور قرض خواہ کے احوال و اقسام کو بھی بیان کیا) چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم میں سے بعض آدمی ایسا ہوتا ہے کہ وہ (قرض کی) ادائیگی میں تو اچھا رہتا ہے لیکن اپنا قرض وصول کرنے میں سختی کرتا ہے (یعنی اگر اس پر کسی کا قرض ہوتا ہے تو اس کو ادا کرنے میں صفائی معاملہ اور خوبی کا ثبوت دیتا ہے، لیکن جب اس کا قرض کسی پر ہوتا ہے تو اس کو قرض دار سے وصول کرنے میں سختی کرتا ہے بایں طور کہ مطالبہ و تقاضا کے وقت اس قرض دار کا کوئی ادب و لحاظ نہیں کرتا اور سختی و بد کلامی کے ذریعہ اس کو ایذاء پہنچاتا ہے اس طرح اس میں قرض کو خوبی کے ساتھ ادا کرنے کی بھی خصلت ہوتی ہے اور اصولی قرض میں برائی اختیار کرنے کی بھی خصلت چنانچہ اس کی دونوں خصلتوں میں سے ہر ایک دوسری کا بدل ہو جاتی ہے، لہٰذا تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو کسی کا قرض ادا کرنے میں بھی اچھے ہوں اور کسی سے اپنا قرض وصول کرنے میں بھی اچھے ہوں اور تم میں بد ترین لوگ وہ ہیں جو کسی کا قرض ادا کرنے میں بھی برے ہوں اور کسی سے اپنا قرض وصول کرنے میں بھی برے ہوں۔" حضور ﷺ نے اپنے خطبہ میں یہ نصیحتیں فرمائیں) یہاں تک کہ جب سورج کا اثر صرف کھجوروں کی چوٹیوں اور دیواروں کے کناروں پر رہ گیا (یعنی جب دن آخر ہو گیا) تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا۔ "یاد رکھو! اس دنیا کا جو زمانہ گزر چکا ہے اس کی بہ نسبت اب صرف اتنا زمانہ باقی رہ گیا ہے جتنا کہ آج کے دن کے گزرے ہوئے حصہ کی بہ نسبت یہ آخری وقت! (یعنی جس طرح آج کے دن کا قریب قریب پورا حصہ گزر چکا ہے اب بہت قلیل عرصہ باقی رہ گیا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "یہ دنیا بڑی شیریں اور ہری بھری ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا اپنے متعلقات کے ساتھ بظاہر اس قدر لذت آمیز اور خوش نما ہے کہ محض ظاہری حالت پر ریجھنے والے لوگوں کو طبعی طور پر اس سے بہت مناسبت اور اس کی طرف میلان ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں میں اس کی حقیقت نہایت دلکش اور سرسبز و شاداب معلوم ہوتی ہے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اہل عرب کے نزدیک جو چیز نرم و نازک ہوتی ہے اور اپنی ناپائیداری کی وجہ سے زیادہ مدت نہیں ٹھہرتی بلکہ جلد جاتی رہتی ہے اس کو وہ لوگ خضروات یعنی سبزیوں اور ترکاریوں سے مشابہت دیتے ہوئے "خضراء" کہتے ہیں۔ بہر حال حدیث کے اس جملہ میں دراصل اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ دنیا مکر و تصنع اور ظاہری حسن و لذات سے بھری ہوئی ہے کہ لوگوں کو اپنے ظاہری ٹیپ ٹاپ رکھنے والے حسن و جمال پر فریفتہ کرتی ہے اور اپنی جھوٹی لذات و خواہشات کی طرف مائل کرتی ہے حالانکہ اس کی تمام تر دلکشی اور رنگینی اور خواہشات و لذات بہت جلد فناہ کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا میں خلیفہ بنایا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تمہیں جو مال و دولت حاصل ہے اس کے بارے میں تم اس حقیقت کو جان لو کہ اس مال و دولت کے تم حقیقی مالک نہیں ہو بلکہ حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور تم صرف اس کے خرچ و تصرف میں خلیفہ اور وکیل کی حیثیت رکھتے ہو۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان لوگوں کا خلیفہ قرار دیا ہے جو تم سے پہلے اس دنیا میں تھے اور ان کے اموال و جائداد کو تمہاری سپردگی میں دے دیا ہے، لہٰذا وہ یہ دیکھتا ہے کہ تم اپنے اموال و املاک کے بارے میں کیا طرز عمل اختیار کرتے ہو اور اس میں کس طرح تصرف کرتے ہو یا کہ تم گزرے ہوئے لوگوں کے احوال و انجام سے کس طرح عبرت پکڑتے ہو اور ان کے چھوڑے ہوئے اموال و جائداد میں کس طرح تصرف کرتے ہو۔

"تم دنیا سے بچو" کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے دنیا کی حقیقت جان لی کہ وہ فناہ ہو جانے والی چیز ہے اور اس کی کسی بھی شے کو کوئی استحکام و دوام نہیں ہے تو پھر اس کے پیچھے پڑنا نہایت نازیبا اور غیر دانش مندی کی بات ہے، لہٰذا تم دنیا کو اس قدر حاصل کرنے کی خواہش و کوشش نہ کرو جو ضرورت و حاجت سے زیادہ ہو اور ضرورت و حاجت بھی وہ کہ جس سے آبرومندانہ زندگی کی بقاء دین کی مدد اور آخرت میں نفع حاصل ہو۔ "اسی طرح عورتوں سے بچو" کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے حسن و جمال اور ناز و ادا کے مکر و فریب اور ان کی ناروا

محبت و شیفتگی کے جال سے اپنے آپ کو بچاؤ کہ مبادا یہ چیز مال و دولت جمع کرنے کی حرص اور دنیا کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے استغراق میں مبتلا کر دے جس کی وجہ سے تم علم و عمل کی رہ سے دور ہو جاؤ۔

"امیر عامہ" سے مراد متغلبی ہے یعنی وہ شخص جو مسلمانوں کے معاملات اور ان کے ملک و شہر پر غالب و حکمران ہو گیا ہو اور عام لوگوں نے ارباب حل و عقد یعنی علماء اور دانشوران زمانہ کی رائے و مشورہ کے بغیر اس شخص کو امیر و حاکم تسلیم کر لیا ہو اور اس کے حامی و مددگار ہوں۔

اور حضرت ابوسعیدؓ کا رونا اس احساس کی بنا پر تھا کہ ہم نے کلمہ حق کہنے کے سلسلہ میں اس مرتبہ کو ترک کر دیا جو اولیٰ ہے، اور وہ یہ کہ ہر حال میں حق بات کہی جائے خواہ اس کی پاداش میں جان ہی کیوں نہ دینی پڑے! ظاہر ہے کہ ان کا یہ احساس محض اس کے کمال ایمان اور دین کے تئیں شدت احتیاط پر مبنی تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس مرتبہ کو ترک کرنا اسلامی تعلیمات کے قطعاً خلاف نہیں تھا بلکہ ان احادیث پر عمل کرنے کی بناء پر تھا جن سے واضح ہوتا ہے کہ اہل ایمان کے ضعف و اضمحلال کے زمانہ میں اور عجز و بے بسی کی صورت میں کلمہ حق کہنے سے سکوت اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے جان و مال اور آبرو کی ہلاکت و نقصان کا خوف ہو! اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جب اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اکابر صحابہؓ کرام جیسے عظیم انسان کو جو دین کے بارے میں انتہائی سخت و مضبوط تھے اور جو یقین و معرفت کی دولت سے پوری طرح مالا مال تھے اگر وہ اس وصف و مرتبہ کے باوجود، اہل باطل جیسے یزید و حجاج سفاک وغیرہ کے خوف سے اظہار حق کی قدرت نہیں رکھتے تھے تو ہم جیسے مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو اہل ایمان کے انتہائی ضعف و اضمحلال کا زمانہ پائے ہوئے ہیں جن میں باعمل علماء اور ایمانی جرات و ایثار رکھنے والے راہبر کم ہیں جو ریا کار مشائخ و صوفیاء کی کثرت رکھتے ہیں اور جن پر اکثر ظالم امراء و حکماء مسلط ہیں! لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زمانہ صبر و تحمل، رضا بالقضاء اور سکوت و گوشہ نشینی اختیار کرنے اور بقدر بقاء زندگی معاشی ضروریات کے حصول پر قناعت کرنے کا ہے۔

"بعض وہ ہیں جن کو مؤمن پیدا کیا جاتا ہے" یعنی ان کی پیدائش مؤمن ماں باپ کے یہاں یا مسلم آبادی یا شہر میں ہوتی ہے اور اس اعتبار سے ان کو مؤمن کہا جاتا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے کی جاتی ہے کہ جب کوئی شخص پیدا ہوتا ہے تو سن تمیز کو پہنچنے سے قبل اس کی طرف ایمان کی نسبت نہیں کی جاتی، یہ اور بات ہے کہ علم الٰہی کے اعتبار سے یا اس سے آئندہ زمانہ کی حالت کے اعتبار سے اس کی طرف ایمان کی نسبت کر دی جائے۔ اسی طرح "بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو کافر ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں یا جن کی پیدائش کافروں کی آبادی اور ان کے شہر میں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے حدیث کا یہ جملہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرة کیونکہ اس ارشاد گرامی (کل مولود الخ) کی مراد، یہ بتانا ہے کہ جو بھی شخص اس دنیا میں آتا ہے وہ فطری طور پر ہدایت و راستی قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ کوئی ایسا مانع پیش نہ آئے جو اس کو گمراہی کے راستہ پر ڈال دے جیسا کہ خود اسی حدیث کے بعد کے الفاظ فابواہ یہودانہ الخ اس پر دلالت کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں لوگوں کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں وہ غالب و اکثریت کے اعتبار سے ہیں، ورنہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مؤمن پیدا ہوتے ہیں، کفر کی حالت پر زندگی گزرتے ہیں، لیکن ان کا خاتمہ ایمان ہی کی حالت پر ہوتا ہے، اسی طرح بعض وہ ہیں جو کافر پیدا ہوتے ہیں، ایمان کی حالت پر زندگی گزارتے ہیں، لیکن ان کا خاتمہ کفر کی حالت پر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں قسمیں اس لئے ذکر نہ فرمائی گئی ہوں کہ یہاں حقیقی مقصد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ ہدایت و گمراہی میں اصل اعتبار خاتمہ کی حالت کے ہے، اور یہ بات مذکورہ قسمیں بیان کرنے سے بھی اجمالی طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔

"پہلو پر لیٹ جائے اور زمین سے چمٹ جائے" غصہ آنے کے وقت اس حالت کو اختیار کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ حالت نفسیاتی طور پر غصہ کو فرو کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، کیونکہ غصہ کے وقت زمین سے لگ کر پہلو پر لیٹ جانا فوری طور پر یہ احساس پیدا کرتا

ہے کہ جب میری حقیقت بس اتنی ہے کہ میں مٹی سے پیدا ہوا اور آخر کار مٹی ہی میں مل جاؤں گا تو مجھ کو تکبر نہ کرنا چاہیے بلکہ تحمل اور انکساری کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔

گناہ کی زیادتی موجب ہلاکت ہے

(۱۰) وَعَنْ اَبِی الْبَخْتَرِیِّ عَنْ رَجُلٍ مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَنْ یَّهْلِكَ النَّاسُ حَتّٰی یُعْذِرُوْا مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوالبختری، نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ سے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "لوگ اس وقت تک ہرگز ہلاک و برباد نہیں ہوں گے جب تک کہ ان سے بہت زیادہ گناہ اور برائیاں صادر ہونے لگیں۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "یُعْذِرُوْا" یاء کے پیش، عین کے جزم اور ذال کے زیر کے ساتھ) "اعذار" سے مشتق ہے اور صراح میں لکھا ہے کہ "اعذار" کے معنی ہیں بہت گناہ گار اور باعیب ہونا۔ اس طرح قاموس میں لکھا ہے کہ اعذر فلان ای کثرت ذنوبہ وعیوبہ (یعنی جب اہل عرب یہ کہتے ہیں کہ "اعذر فلان" یعنی فلاں شخص نے اعذار کیا تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص سے بکثرت گناہ اور عیوب صادر ہوئے۔) مفہوم کے اعتبار سے حدیث کے اس جملہ میں اعذار کا لفظ گویا سلب عذر کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی جب کسی شخص کے گناہ اور عیوب بکثرت ہو جائیں تو پھر اس پر حق تعالیٰ کے عذاب کے نازل ہونے اور لوگوں کی طرف سے ان کو ان گناہ وعیوب سے روکنے اور منع کرنے میں کوئی عذر حائل نہیں رہ جاتا، لہٰذا اس شخص نے اپنے گناہوں اور عیوب کی کثرت کے سبب گویا اس عذر کو ختم کر دیا جو اس کو عذاب الٰہی سے محفوظ رکھتا۔

اعذار کا لفظ صاحب عذر یعنی عذر کرنے والے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور یہ معنی بھی حدیث کے مفہوم سے مطابقت رکھتے ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ لوگ اس وقت تک ہلاکت و بربادی میں مبتلا نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے اور اپنی برائیوں کے بارے میں دور دراز کی تاویلیں اور ناروا عذر و معذرت کرنے کا رویہ اختیار نہ کریں۔

بعض روایتوں میں یہ لفظ یعذروا (یاء کے زبر کے ساتھ) منقول ہے جس کا مادہ اشتقاق عذر (عین کے زبر کے ساتھ) ہے اور اس کے معنی ہیں معذور رکھنا! اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ لوگ اس وقت تک ہلاکت و تباہی میں مبتلا نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ لوگوں کو اس طرح معذور و مجبور نہ کر دیں کہ وہ ان کو کثرت گناہ اور برائیوں میں مبتلا دیکھ کر ان کو ان گناہوں اور برائیوں سے نہ روک سکیں اور نہ ان پر ملامت کر سکیں۔

بہر حال تینوں صورتوں میں حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دنیا کے مصائب و آفات اور ہلاکت و تباہی میں صرف اسی وقت مبتلا کرتا ہے جب کہ وہ گناہوں اور خلاف شرع امور کے ارتکاب میں منہمک ہو جاتے ہیں، احکام الٰہی کی نافرمانی کثرت سے کرنے لگتے ہیں، اور جب خدا کے نیک بندے ان کو گناہوں اور برائیوں سے روکتے ہیں تو ان کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے بلکہ نہایت بے حسی اور لاپرواہی کے ساتھ اپنی اختیار کی ہوئی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔

عام عذاب کب نازل ہوتا ہے

(۱۱) وَعَنْ عَدِیِّ بْنِ عَدِیِّ الْکِنْدِیِّ قَالَ حَدَّثَنَا مَوْلًی لَّنَا اَنَّهٗ سَمِعَ جَدِّیْ یَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَا یُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِعَمَلِ الْخَاصَّةِ حَتّٰی یَرَوُا الْمُنْکَرَ بَیْنَ ظَهْرَانَیْهِمْ وَهُمْ قَادِرُوْنَ عَلٰی اَنْ یُّنْکِرُوْهُ فَلَا یُنْکِرُوْا فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَذَّبَ اللّٰهُ الْعَامَّةَ وَالْخَاصَّةَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عدی بن عدی کندی کہتے ہیں کہ ہم سے ہمارے ایک آزاد کردہ غلام نے بیان کیا کہ اس نے میرے دادا (حضرت عمیرہؓ کندی) سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے بعض افراد کے اعمال بد کے سبب اس کے اکثر افراد کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا (یعنی اگر اس قوم کے کچھ افراد بد عملیوں اور احکام خداوندی کی نافرمانیوں میں مبتلا ہوں تو ان کی پاداش میں اور لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کیا جاتا) ہاں اگر اس قوم کے لوگ یہ دیکھیں کہ ان کے درمیان بعض افراد کی وجہ سے خلاف شرع امور کا ارتکاب ہو رہا ہے اور وہ ان خلاف شرع امور کی اصلاح و سرکوبی نہ کریں بشرطیکہ وہ اس اصلاح و سرکوبی کی قدرت رکھتے ہوں اور اس صورت حال (یعنی قدرت و طاقت رکھنے کے باوجود سکوت و مداہنت اختیار کرنے) میں قوم کے اکثر لوگ مبتلا ہو جائیں تو پھر اللہ تعالیٰ عام و خاص سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا حاصل یہ ہے کہ قوم کے ان بعض افراد کو تو ان کی بد عملیوں اور احکام خداوندی کی نافرمانیوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے اور باقی افراد کو اس لئے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قدرت و طاقت کے باوجود ان بعض افراد کو بد عملیوں سے باز کیوں نہیں رکھا اور برائیوں کو مٹانے کا فریضہ انجام کیوں نہیں دیا۔

برائیوں کے مٹانے کی پوری جدوجہد کرو

(۱۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْا اِسْرَآئِيْلَ فِي الْمَعَاصِيْ نَهَتْهُمْ عُلَمَآؤُهُمْ فَلَمْ يَنْتَهُوْا فَجَالَسُوْهُمْ فِيْ مَجَالِسِهِمْ وَاٰكَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ فَضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ فَلَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ قَالَ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مُتَّكِئًا فَقَالَ لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ حَتّٰى تَاطِرُوْهُمْ اَطْرًا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ قَالَ كَلَّا وَاللّٰهِ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَاْخُذُنَّ عَلٰى يَدَيِ الظَّالِمِ وَلَتَاطِرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا وَلَتَقْصُرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا اَوْلَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ۔

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل جب (زنا، ہفتہ کے دن شکار کرنے اور ان کے علاوہ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے ان کو روکا اور جب وہ باز نہ آئے (یعنی انہوں نے اپنے علماء کی بات نہیں مانی اور ممنوع چیزوں کو ترک نہیں کیا) تو ان کے وہ علماء بھی ان کی مجلسوں کے ہم نشین بن گئے اور ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو گئے (یعنی ان کے علماء نے پہلے تو ان بد عملی اور گناہ گار لوگوں کو بد عملی اور گناہ کی راہ اختیار کرنے سے منع کیا لیکن جب وہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے اور برائی کی راہ پر جمے رہے تو پھر وہ علماء بھی ان بد عمل اور گناہگار لوگوں کے ساتھ خلط ملط ہو گئے اور سکوت و مداہنت کی راہ پر لگ گئے) اللہ تعالیٰ نے ان سب کو خلط ملط کر دیا اور ان کے دلوں کو آپس میں ایک دوسرے کے دل کے ساتھ ملا دیا، پھر اللہ تعالیٰ ان (بنی اسرائیل کے گناہ گار لوگوں کے ساتھ مصاحب و مجالست رکھنے والوں اور ان کے تئیں مداہنت اختیار کرنے والوں) پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبان کے ذریعہ لعنت فرمائی اور یہ لعنت اس کے لئے کی گئی تھی کہ ان لوگوں نے گناہ کیے اور حد سے تجاوز کیا تھا (یعنی انہوں نے محض گناہ کرنے اور مداہنت اختیار کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حد سے تجاوز کر کے کفر تک پہنچ گئے تھے بایں طور کہ خلاف شرع امور کو حلال و جائز جاننے لگے، گناہوں سے رضامندی ظاہر کرنے لگے اور گناہ گاروں کو اچھا سمجھنے لگے تھے) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ جو اس وقت (اپنے پہلو یا پشت سے) تکیہ لگائے بیٹھے تھے مذکورہ بالا باتیں ارشاد فرمانے کے بعد) سیدھے بیٹھ گئے (یعنی آپ ﷺ نے تکیہ چھوڑ دیا اور اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی اہم بات فرمانے کا ارادہ ہو) چنانچہ فرمایا۔ "اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم اس وقت تک عذاب الٰہی سے نجات نہیں پاسکو گے جب تک کہ ظالموں کو ان کے ظلم سے اور فاسقوں

کو ان کے گناہوں سے نہیں روکو گے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) اور ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارا یہ گمان ہے کہ سکوت ومداہنت کے باوجود تمہیں عذاب الٰہی سے نجات مل جائے گی تو) ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ خدا کی قسم! تمہارے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حکم دو اور ان کو برائی کی راہ سے روکو، ظالم کا ہاتھ پکڑو، اس کو حق کی طرف مائل کرو اور اس کو حق وانصاف کی راہ پر قائم کرو! اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو پھر (جان لو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے (گناہگاروں اور ان سے سکوت ومداہنت کرنے والوں کے (دلوں کو بھی آپس میں ایک دوسرے کے دل کے ساتھ خلط ملط کر دے گا اور پھر تم پر لعنت فرمائے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر (ان کے گناہوں کی وجہ سے) لعنت فرمائی تھی۔"

تشریح: اس جملہ ضَرَبَ اللّٰہُ الخ کے معنی ملا علی قاریؒ اور "شیخ عبدالحق" نے وہی لکھے ہیں جو اوپر ترجمہ میں بیان کیے گئے ہیں، البتہ ملا علی قاریؒ نے ابن مالکؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ لفظ ببعض میں حرف باء سببیّت کے لئے ہے، اس صورت میں مذکورہ جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے گناہگاروں کی نحوست کے سبب سے ان لوگوں کے دل بھی سیاہ کر دیئے جنہوں نے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تھا لہٰذا وہ سب کے سب سخت دل ہو گئے حق وراستی کی راہ قبول واختیار کرنے کی استعداد وصلاحیت ان سب میں سے ختم ہو گئی اور ان میں کا ہر ایک شخص خیر ورحمت سے دور ہو گیا، اور یہ اس لئے ہوا کہ ان میں سے جن لوگوں نے گناہ اور برائی کی راہ اختیار کی تھی ان کو تو اپنے گناہوں کی سزا ملی، اور جنہوں نے گناہ نہیں کیے تھے ان کو اس لئے مبتلا کیا گیا کہ گناہگاروں کے ساتھ خلط ملط رکھا اور ان کے بارے میں سکوت ومداہنت کا رویہ اختیار کیا۔

بے عمل عالم و واعظ کے بارے میں وعید

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ رَاَیْتُ لَیْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ رِجَالًا تُقْرَضُ شِفَاھُھُمْ بِمَقَارِیْضَ مِنْ نَّارٍ قُلْتُ مَنْ ھٰؤُلَآءِ یَا جِبْرَئِیْلُ قَالَ ھٰؤُلَآءِ خُطَبَآءُ مِنْ اُمَّتِكَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَیَنْسَوْنَ اَنْفُسَھُمْ۔ رَوَاہُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ خُطَبَآءُ مِنْ اُمَّتِكَ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ وَیَقْرَءُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَلَا یَعْمَلُوْنَ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے معراج کی رات میں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کترے جارہے ہیں میں نے پوچھا کہ جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں! انہوں نے کہا کہ یہ آپ (ﷺ) کی اُمّت کے وہ علماء وواعظ اور مشائخ ہیں جو لوگوں کو تو نیکی کی تلقین کرتے تھے مگر خود اپنی ذات کو فراموش کر دیتے تھے، یعنی خود تو عمل نہیں کرتے تھے لیکن اوروں کو عمل کی تلقین ونصیحت کرتے تھے۔" اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ اور بیہقیؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت جبرئیل نے جواب دیا۔ "یہ لوگ آپ (ﷺ) کی امت کے وہ واعظ وخطیب ہیں جو اس چیز کو کہتے تھے جس کو خود نہیں کرتے تھے جو کتاب اللہ کو پڑھتے تھے لیکن اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔"

تشریح: یہ سزا بے عمل علماء وواعظین اور مشائخ کو ان کی بے عملی کی وجہ سے ملے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ، الآیة۔

"کیا تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور خود کو بھی بھول جاتے ہو۔"

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ویل للجاهل مرة وویل للعالم سبع مرات جاہل کے لئے ایک بار خرابی ہے اور (بے عمل) عالم کے لئے سات بار خرابی ہے اور

ایک حدیث مشہور میں یوں فرمایا گیا ہے۔

اشدا الناس عذابا یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ اللہ بعلم۔

"قیامت کے دن لوگوں میں سب سے سخت عذاب کا مستوجب وہ عالم ہوگا جس کو اللہ نے علم سے فائدہ نہیں پہنچایا ہوگا۔"

نعمت خداوندی میں خیانت کی سزا

⑭ وَعَنْ عَمَّارِبْنِ یَاسِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَتِ الْمَآئِدَۃُ مِنَ السَّمَآءِ خُبْزًا وَلَحْمًا وَّاُمِرُوْآ اَنْ لَّا یَخُوْنُوْا وَلَا یَدَّخِرُوْا لِغَدٍ فَخَانُوْا وَادَّخَرُوْا وَرَفَعُوْا لِغَدٍ فَمُسِخُوْا قِرَدَۃً وَّخَنَازِیْرَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمار بن یاسرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(حضرت عیسی علیہ السلام کی قوم پر) آسمان سے روٹی اور گوشت کا خوان اتارا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ نہ تو وہ اس میں خیانت کریں اور نہ آنے والے دن کے لئے ذخیرہ کریں (یعنی اس نعمت الٰہی کے بارے میں ان کو خاص طور پر دو حکم دیئے گئے) ایک تو یہ کہ کوئی شخص خیانت کا ارتکاب نہ کرے یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ خوان جس کے قبضہ میں آئے وہ خود تو اچھا اچھا کھالے یا دوسروں سے زیادہ کھالے اور دوسرے لوگوں کو خراب یا کم کھانے کو ملے اور دوسرا حکم یہ تھا کہ جو خوان اترے اس کو بچا کر دوسرے دن کے لئے نہ اٹھار کھیں! لیکن انہوں نے خیانت کا ارتکاب بھی کیا اور ذخیرہ بھی کیا کہ آنے والے دن کے لئے اٹھار کھا، چنانچہ ان کو بندر اور سور کی صورتوں میں تبدیل کر دیا گیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ بوڑھے تھے ان کو تو بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا اور جو لوگ جوان تھے ان کی صورتوں کو سوروں جیسی بنا دیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ظالم حکمرانوں کے زمانے میں نجات کی راہ

⑮ وَعَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّہٗ تُصِیْبُ اُمَّتِیْ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ مِنْ سُلْطَانِہِمْ شَدَآئِدُ لَا یَنْجُوْا مِنْہُ اِلَّا رَجُلٌ عَرَفَ دِیْنَ اللّٰہِ فَجَاھَدَ عَلَیْہِ بِلِسَانِہٖ وَیَدِہٖ وَقَلْبِہٖ فَذٰلِکَ الَّذِیْ سَبَقَتْ لَہُ السَّوَابِقُ وَرَجُلٌ عَرَفَ دِیْنَ اللّٰہِ فَصَدَّقَ بِہٖ وَرَجُلٌ عَرَفَ دِیْنَ اللّٰہِ فَسَکَتَ عَلَیْہِ فَاِنْ رَاٰی مَنْ یَّعْمَلُ الْخَیْرَ اَحَبَّہٗ عَلَیْہِ وَاِنْ رَاٰی مَنْ یَّعْمَلُ بِبَاطِلٍ اَبْغَضَہٗ عَلَیْہِ فَذٰلِکَ یَنْجُوْا عَلٰی اِبْطَانِہٖ کُلِّہٖ۔

"حضرت عمر ابن خطاب کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت کو آخری زمانہ میں اپنے حکمرانوں کی طرف سے (دینی یا دنیاوی) سختیاں اور بلائیں جھیلنا پڑیں گی اور اس وقت ان بلاؤں اور سختیوں سے نجات کی راہ پانے والا ایک شخص تو وہ ہوگا جو خدا کے دین کو سمجھے گا (یعنی اپنے اندر علم و عمل کو یکجا کرے گا، معرفت و یقین کی دولت کے ذریعہ خود بھی کمال کے درجہ کو پہنچے گا اور دوسروں کو بھی کامل کرے گا، اور اس طرح پہلے تو وہ خدا کے دین سے بہ تفصیل اصول و جزئیات اچھی طرح واقف و آگاہ ہوگا اور پھر اس علم کے مطابق اپنے نفس کو عمل کے سانچے میں ڈھالے گا اور صرف مشروع چیزوں کو اختیار کریگا جس کی وجہ سے اس کے اندر ظلم و ناانصافی کے خلاف سعی اور جدوجہد کرنے کا عزم و حوصلہ پیدا ہوگا) چنانچہ وہ شخص خدا کے دین کو سربلند کرنے کے لئے اپنی زبان اپنے ہاتھ اور اپنے دل کے ذریعہ جہاد کرے گا (یعنی بطریق وعظ و نصیحت زبان کے ذریعہ بھی ظلم و برائی کے خلاف جدوجہد کرے گا اور اگر اس کو طاقت و قوت میسر نہیں ہوگی تو مجبوراً دل میں اس ظلم و برائی کے خلاف نفرت و عداوت رکھنے پر اکتفا کرلے گا) پس یہ وہ شخص ہوگا جو کمال ایمان، ثواب اور دنیا و آخرت کی

سعادتوں تک پہلے پہنچے گا اور ایک شخص وہ ہوگا جو خدا کے دین کو سمجھے گا (مگر پہلے شخص سے ایک درجہ کم) چنانچہ وہ شخص دین کی تصدیق کرے گا اور اس کو اچھا جانے گا (یعنی وہ شخص ظلم و برائی کے خلاف صرف دل اور زبان کے ذریعہ جہاد کرے گا، ہاتھ کی قوت سے کام نہیں لے گا! یہ مطلب اس قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے بارہ میں تصدیق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ تصدیق کا تعلق دل سے ہوتا ہے جس کی ترجمانی زبان کرتی ہے) اور ایک شخص وہ ہوگا جو خدا کے دین کو (تھوڑا) بہت سمجھے گا چنانچہ وہ شخص سکوت اختیار کرے گا (اور صرف قلب کے ذریعہ جہاد کرے گا یعنی ظلم و برائی کو محض دل سے برا سمجھنے پر اکتفا کرے گا) چنانچہ اس شخص کی حالت یہ ہوگی کہ وہ جب کسی کو نیک کام کرتے دیکھے گا تو اس کو درست رکھے گا اور کسی کا غلط کام کرتے دیکھے گا تو اس سے نفرت کرے گا اور وہ شخص بھی پوشیدہ طور پر نیکی بھلائی کے تئیں محبت اور گناہ و برائی کے تئیں نفرت رکھنے کے سبب نجات پائے گا۔"

تشریح: اس ارشاد گرامی کے ذریعہ حضور ﷺ نے ایک طرف تو اس زمانہ کے بارے میں پیشگوئی فرمائی ہے جب اُمّت مرحومہ پر ظالم اور بدکار حکمرانوں اور ان سخت حالات سے نجات کی راہ کو بھی واضح فرمادیا گیا ہے اور وہ راہ ہے خدا کے دین کا علم حاصل کرنا یقین و معرفت اور عزم و استقامت اختیار کرنا، بھلائی کو پھیلانا اور برائی کو ختم کرنے کی جدوجہد کرنا! چنانچہ اس راہ کو اختیار کرنے والے لوگوں کو تین قسموں میں بیان فرمایا گیا ہے، پہلی قسم تو گویا ان لوگوں کی ہوئی جو خدا کے دین کو پوری طرح جانیں گے اور سمجھیں گے اور دین کے بارے میں نہایت سختی اور پختگی کا رویہ اختیار کریں گے، ایسے لوگ نہ صرف برائی کو دل سے برا جانیں گے اور زبان کے ذریعہ تلقین و نصیحت کا فریضہ انجام دیں گے بلکہ طاقت و قوت میسر ہونے پر ہاتھ کے ذریعہ بھی جہاد کریں گے اور ظلم و برائی کو مٹانے کے لئے کما حقہ جدوجہد کریں گے، دوسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو دین کو جاننے اور سمجھنے اور معرفت و یقین کے مرتبہ کے اعتبار سے پہلی قسم کے لوگوں سے کچھ کم تر ہوں گے ایسے لوگ بھلائی کو پھیلانے اور برائی کو ختم کرنے کے لئے محض زبان اور دل کو ذریعہ بنانے پر اکتفا کریں گے اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو دین کا علم بہت معمولی سا رکھیں گے اور برائیوں کے خلاف زبان کو بھی خاموش رکھیں گے اور خلاف شرع امور کو صرف دل میں برا سمجھنے پر اکتفا کریں گے بلکہ وہ قلبی نفرت و عداوت کے معاملہ میں بھی اس قدر سخت اور حساس نہیں ہوں گے جتنا ان کے ایمان کا تقاضا ہوگا، اسی لئے ان لوگوں کو ایک دوسری حدیث کے الفاظ ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ کے ذریعہ سب سے کمزور ایمان کا حامل بتایا گیا ہے۔ مذکورہ بالا تین قسمیں ان لوگوں کی ہیں جن کو عارف اور دیندار کہا جاسکتا ہے البتہ ان قسموں کے لوگ اپنے اپنے مرتبہ اور اپنی اپنی حیثیت کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت و برتری رکھتے ہیں اور ان کے درجات میں تفاوت ہے، چنانچہ قرآن کریم کی ایک آیت کی روشنی میں ان کے درجات کو اس طرح متعین کیا گیا ہے کہ پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے شخص کو "سابق" دوسری قسم سے تعلق رکھنے والے شخص کو "مقتصد" یعنی متوسط اور تیسری قسم سے تعلق رکھنے والے شخص کو "ظالم" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ آیت یہ ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ۔

"پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے (تمام دنیا کے) بندوں میں سے پسند فرمایا پھر بعضے تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے نیکیوں کے ساتھ آگے نکل جانے والے ہیں۔"

واضح رہے کہ تیسری قسم سے تعلق رکھنے والے شخص کو "ظالم" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ وہ دین کی زیادہ معرفت نہ رکھنے اور دین کے تئیں زیادہ محتاط و حساس نہ ہونے کی وجہ سے تقصیرات اور لغزشوں کا شکار ہو جاتا ہے اور اس طرح اپنی تقصیرات کے ذریعہ گویا اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے! نیز مذکورہ آیت کے ابتدائی الفاظ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان تینوں قسموں کے لوگ اگرچہ اپنے مراتب و درجات میں تفاوت رکھتے ہیں مگر ایک بات میں سب کے سب مشترک ہیں کہ ان سب کو بارگاہ رب العزت میں برگزیدہ بندہ قرار دیا گیا ہے۔

لفظ "سوابق" اصل میں سابقہ کی جمع ہے اور سابقہ اس خصلت کو کہتے ہیں جو اولیت اور امتیازی حیثیت رکھتی ہو، جیسا کہ کہا جاتا ہے

له سابقة فی هذا الامر یعنی اس کو اس معاملہ میں اولیت حاصل ہے، یا وہ شخص اس معاملہ میں لوگوں پر سبقت لے گیا ہے، لہٰذا حدیث کے اس جملہ و ذلک الذی سبقت له السوابق کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ شخص سابقین بالخیرات میں سے ہوگا بایں طور کہ وہ دین و دنیا کی سعادتوں، اجر و ثواب کی بشارتوں اور طاعات و عبادات کی توفیق کے حصول میں دوسرے لوگوں پر سبقت لے جائے گا۔ گویا اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَلسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں فرمایا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کمال و تکمیل کے مراتب، علم و عمل کے درجات اور تعلیم و تعلّم کی خصوصیات کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے اور اس اعتبار سے ان کے حق میں یہ بشارت ہے کہ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ یعنی یہ ہی لوگ بارگاہ خداوندی میں مقرب و مقبول ہیں۔

بروں کے ساتھ، اچھے بھی عذاب میں کیوں مبتلا کیے جاتے ہیں؟

(۱۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا فَقَالَ يَارَبِّ اِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ قَالَ فَقَالَ اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو جہاں کے حالات اس اس طرح کے ہیں، باشندوں سمیت الٹ دو! حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا "میرے پروردگار! اس شہر میں تیرا وہ فلاں بندہ بھی ہے جس نے ایک لحہ کے لئے بھی تیری نافرمانی نہیں کی ہے؟ آنحضرت فرماتے ہیں کہ (جب جبرئیل علیہ السلام نے یہ کہا تو) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس شہر کو سارے باشندوں پر بھی اور اس شخص پر بھی الٹ دو کیونکہ میری خوشنودی اور میرے دین کی محبت میں اس شخص کے چہرہ کا رنگ (شہر والوں کے گناہوں کو دیکھ) ایک ساعت کے لئے بھی نہیں بدلا۔"

تشریح: اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا حاصل تھا کہ بے شک میرے اس بندے نے کبھی بھی میری نافرمانی نہیں کی اور وہ ایک لحہ بھی برائی کی راہ پر نہ چلا مگر اس کا یہ جرم ہی کیا کم ہے کہ لوگ اس کے سامنے گناہ کرتے رہے اور وہ اطمینان کے ساتھ ان کو دیکھتا رہا برائی پھیلتی رہی اور لوگ خدا کی نافرمانی کرتے رہے مگر ان برائیوں اور نافرمانی کرنے والوں کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر کبھی بھی اس طرح کے آثار پیدا نہیں ہوئے جن سے یہ معلوم ہو کہ اس کے دل میں برائیوں اور برائیوں کے مرتکبین کے خلاف غیظ و غضب اور نفرت و عداوت کا کوئی جذبہ ہے، لہٰذا شہر کے اور باشندوں کے ساتھ وہ شخص بھی ہلاکت و بربادی کا مستوجب ہے۔ "ایک ساعت" کے الفاظ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگر وہ شخص اپنی پوری زندگی میں ایک مرتبہ بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے برائیوں اور برائیوں کا ارتقاب کرنے والوں کے خلاف غصہ و نفرت کا اظہار کر دیتا تو اس کی زندگی کے باقی حصے میں اس کی اس تقصیر سے درگزر کر دیا جاتا۔

تقصیر کی معذرت

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَسْاَلُ الْعَبْدَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيَقُوْلُ مَالَكَ اِذَا رَاَيْتَ الْمُنْكَرَ فَلَمْ تُنْكِرْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُلَقّٰى حُجَّتَهٗ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ خِفْتُ النَّاسَ وَرَجَوْتُكَ۔ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ بزرگ و برتر قیامت کے دن بندہ سے سوال کرتے ہوئے فرمائے گا کہ تجھ کو کیا ہوا تھا کہ جب تو نے کسی خلاف شرع کام کو دیکھا تو (زبان و ہاتھ کے ذریعہ) اس کی بیخ کنی کا فریضہ انجام نہیں دیا؟ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ (اگر اللہ تعالیٰ اس بندہ کو معاف کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو سوال کے ساتھ ہی) اس کو وہ تاویل و دلیل

سکھائی جائے گی (جس کے ذریعہ وہ اس فریضہ کو ترک کرنے کی معذرت کر سکے) چنانچہ وہ عرض کرے گا کہ۔ "میرے پروردگار! میں لوگوں کے ظلم وزیادتی سے ڈرتا تھا اور تیری طرف سے عفو ودرگزر اور مغفرت وبخشش کی امید رکھتا تھا۔" تینوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: اس بندہ کی طرف سے مذکورہ جواب میں گویا اپنی تقصیر کا اقرار، اپنے عجز کا اظہار اور رب کریم کے فضل وکرم پر اپنے یقین واعتماد کا بیان ہوگا۔ اور جیسا کہ بیہقی نے کہا ہے، یہ احتمال بھی ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس شخص سے ہو جو خلاف شرع امور کا ارتکاب کرنے والوں کے غلبہ ودبدبہ سے ڈرتا ہو اور ان کی طرف سے پہنچائے جانے والے کسی بھی طرح کے نقصان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی طاقت وقدرت نہ رکھتا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر لوگوں کے رعب داب کی وجہ سے کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دے سکے تو وہ مستوجب مواخذہ نہیں ہوگا اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے حق میں عفو ودرگزر کی امید رکھی جاسکتی ہے، لیکن اس صورت میں یہ اشکال یقیناً پیدا ہوگا کہ ایسا شخص شریعت کی نظر میں معذور ہے، لہٰذا قیامت کے دن نہ تو اس سے مواخذہ ہوگا اور نہ اس کو معذرت کے لئے کسی تاویل ودلیل کے سکھانے کی ضرورت ہوگی؟ اس اشکال کو دور کرنے کے لئے یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ اس حدیث کا تعلق دراصل اس شخص سے ہے جس نے کسی عذر ومانع کے بغیر مذکورہ فریضہ کی انجام دہی میں کچھ تقصیر کی ہوگی اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی اس جزوی تقصیر کو معاف کرنا چاہے گا تو اس کو مذکورہ تاویل ودلیل الہام کرے گا تاکہ وہ معذرت کر سکے۔

عمل خیر اور عمل بد قیامت کے دن متشکل ہو کر سامنے آئیں گے

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ اِنَّ الْمَعْرُوْفَ وَالْمُنْکَرَ خَلِیْقَتَانِ تُنْصَبَانِ لِلنَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فَاَمَّا الْمَعْرُوْفُ فَیُبَشِّرُ اَصْحَابَہٗ وَیُوْعِدُھُمُ الْخَیْرَ وَاَمَّا الْمُنْکَرُ فَیَقُوْلُ اِلَیْکُمْ اِلَیْکُمْ وَمَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَہٗ اِلَّا لُزُوْمًا۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے قیامت کے دن مشروع عمل اور غیر مشروع عمل کو (آدمیوں کی شکل وصورت میں) پیدا کیا جائے گا اور ان کو (ان) لوگوں کے سامنے کھڑا کیا جائے گا (جنہوں نے ان اعمال کو دنیا میں اختیار کیا ہوگا) چنانچہ مشروع عمل اپنے لوگوں کو خوشخبری سنائے گا اور انجام کی بھلائی کا وعدہ دے گا، جب کہ غیر مشروع عمل اپنے لوگوں سے) کہے گا کہ مجھ سے دور ہو جاؤ لیکن وہ لوگ اس سے جدا ہو جانیکی طاقت نہیں رکھیں گے بلکہ اس سے چمٹے رہیں گے۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان دنیا میں جو نیک اور اچھے اعمال کریگا وہ اس کے مرنے کے بعد قبر میں بھی اچھی وپاکیزہ اور عطر بیز صورتوں میں ظاہر ہوں گے اور قیامت کے دن بھی بہترین شکل وصورت اختیار کر کے اس شخص کے سامنے آئیں گے اور اس کو آخرت کی لازوال سعادتوں اور حسن انجام کی خوشخبری سنائیں گے، اس کے برخلاف اگر کوئی شخص برے اعمال اختیار کرے گا تو وہ اعمال قبر میں بھی خراب اور ڈراؤنی صورتوں میں آکر پریشان کریں گے اور قیامت کے دن بھی بری شکل وصورت کے ساتھ اس کے سامنے آئیں گے اور اس کو اس کے برے انجام سے ڈراتے ہوئے کہیں گے کہ ہمارے پاس سے دور ہٹ جا، مگر وہ شخص اس سے دور ہٹنے پر قادر نہیں ہوگا یعنی ان برے اعمال پر جو سزا ملنے والی ہوگی اس سے وہ شخص بھاگ نہیں پائے گا۔ لفظ "تنصبات" مجہول ہونے کی وجہ سے مونث کا صیغہ ہے لیکن مشکوۃ کے ایک نسخے میں یہ لفظ بہ صیغہ مذکر منقول ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے کیونکہ لفظ "خلیقہ" میں حرف تاء تانیث کے لئے نہیں ہے بلکہ اظہار (مبالغہ کے لئے ہے اور اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ یہ دونوں یعنی عمل خیر اور عمل بد مخلوقات میں سے ایک نوع ہیں جو قیامت کے دن لوگوں کے سامنے شکل وصورت اختیار کر کے ظاہر ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الرقاق

رقاق کا بیان

"رقاق" رقیق کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نرم، پتلا۔ یہاں سے کتاب کے جو ابواب شروع ہو رہے ہیں ان کو کتاب الرقاق سے اس لئے موسوم کیا گیا ہے کہ ان ابواب میں وہ احادیث منقول ہیں جو دل کو نرم کرتی ہیں، طبیعت میں رقت پیدا کرتی ہیں اور قوائے فکر و عمل کو اس طرح متاثر کرتی ہیں کہ دنیا سے زہد و بے اعتنائی اور آخرت سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دو قابل قدر نعمتیں

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دو نعمتیں ہیں کہ ان کے معاملہ میں بہت سے لوگ فریب اور ٹوٹا کھائے ہوئے ہیں (اور وہ دونوں نعمتیں) "تندرستی" اور "فراغت ہیں۔" (بخاری)

تشریح: مذکورہ نعمتوں میں سے ایک نعمت تو تندرستی ہے یعنی جسم و بدن کا امراض سے محفوظ رہنا، اور دوسری نعمت ہے اوقات کا غم روز گار کے مشاغل در مصروفیات اور تفکرات و تشویشات سے فارغ و خالی ہونا! چنانچہ دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی غفلت شعاری کی بنا پر ان دونوں نعمتوں کی قدر نہیں کر رہے اور ان کے معاملہ میں اپنے نفس سے فریب کھا کر ان کو مفت میں ہاتھ سے جانے دیتے ہیں جیسا کہ کوئی شخص خرید و فروخت کے معاملہ میں کسی کے فریب اور دھوکہ کا شکار ہو کر اپنے مال و متاع کو مفت میں گنوا دیتا ہے اور نقصان برداشت کرتا ہے۔

لہٰذا اس ارشاد گرامی میں ان لوگوں کے تئیں حسرت و افسوس کا اظہار ہے جو ان نعمتوں سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھاتے، بایں طور کہ نہ تو اپنی صحت و تندرستی کے زمانہ میں دین و دنیا کی بھلائی و فائدہ کے کام کرتے ہیں اور نہ فرصت کے اوقات کو غنیمت جان کر ان میں آخرت کے امور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ہاں جب ان کی صحت و تندرستی خراب ہو جاتی ہے دنیا بھر کے فکرات لاحق ہو جاتے ہیں اور غم روز گار کی گردش ان کے اوقات کو مختلف قسم کی مشغولیتوں اور تشویشوں میں جکڑ لیتی ہے اس وقت ان کو ان نعمتوں کی قدر ہوتی ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کیسے بیش قیمت مواقع گنوا دیئے اور اس قول اَلنِّعْمَةُ اِذَا فُقِدَتْ عُرِفَتْ (کہ نعمت کی قدر اس وقت ہوتی

ہے جب وہ جاتی رہتی ہے) کا مصداق بنتے ہیں

ملا علی قاریؒ نے حدیث کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان نعمتوں کی حقیقی قدر نہیں کرتے، بایں طور کہ وہ ان نعمتوں کے حاصل ہونے کے زمانہ میں ایسے کام نہیں کرتے جن کے آخرت میں وہ محتاج ہوں گے اور پھر وہاں نادم ہوں گے کہ ہم نے دنیا میں اپنی عمر کے بیش قیمت اوقات کو کس طرح ضائع کر دیا اور تندرستی و فراغت وقت کی جو نعمتیں ہمیں میسر تھیں ان کے جاتے رہنے سے پہلے ان کی قدر نہیں کی، حالانکہ اس وقت ان کی یہ ندامت ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ اور حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ آخرت میں اہل جنّت اگر کسی بات پر حسرت و افسوس کریں گے تو ان لمحات پر کریں گے جو انہوں نے دنیا میں اس طرح گزار دیئے ہوں گے کہ ان میں انہوں نے اللہ کو یاد نہیں کیا ہو گا۔

دنیا اور آخرت کی مثال

② وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ اَحَدُكُمْ اِصْبَعَهٗ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَا يَرْجِعُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مستورد ابن شداد کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "خدا کی قسم! آخرت (کے زمانہ اور وہاں کی نعمتوں) کے مقابلے میں دنیا (کے زمانہ اور اس کی نعمتوں) کی مثال ایسی ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی انگلی کو سمندر میں ڈبوئے اور پھر دیکھے کہ وہ انگلی کیا چیز لے کر واپس آئی ہے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی انگلی کو سمندر میں ڈبو کر باہر نکالے تو وہ دیکھے گا کہ اس کی انگلی سمندر میں سے محض تری یا صرف ایک آدھ قطرہ پانی کا لے کر واپس آئی ہے، پس سمجھنا چاہئے کہ آخرت کے زمانہ اور وہاں کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کا زمانہ اور دنیا کی تمام نعمتیں اسی قدر قلیل و کمتر ہیں جس قدر کہ سمندر کے مقابلہ میں اس کی انگلی کو لگا ہوا پانی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تمثیل بھی محض لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہے ورنہ متناہی کو غیر متناہی کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی، پانی کا وہ ایک قطرہ جو دریا سے باہر آیا ہے اپنی کمتری و بے وقعتی کے باوجود سمندر سے کچھ نہ کچھ نسبت ضرور رکھتا ہے مگر دنیا، آخرت سے اس قدر بھی نسبت نہیں رکھتی۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ نہ تو نہایت جلد فناہ ہو جانے والی دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں پر مغرور ہو اور نہ اس کی سختیوں اور پریشانیوں پر روئے پیٹے اور نہ شکوہ و شکایت کرے بلکہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم کے مطابق یہی کہے کہ:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشَ الْاٰخِرَةِ۔

"اے اللہ! اصل زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔"

نیز اس حقیقت کو ہر لمحہ مدنظر رکھے کہ یہ دنیا، مزرعة الاخرة (آخرت کی کھیتی ہے) اور یہاں کی زندگانی بس ایک ساعت کی ہے لہٰذا اس ایک ساعت کو گنوانے کی بجائے طالب الٰہی میں مصروف رکھنا ہی سب سے بڑی دانشوری ہے۔

دنیا ایک بے حیثیت چیز ہے

③ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِجَدْيٍ اَسَكَّ مَيِّتٍ قَالَ اَيُّكُمْ يُحِبُّ اَنَّ هٰذَا لَهٗ بِدِرْهَمٍ فَقَالُوْا مَا نُحِبُّ اَنَّهٗ لَنَا بِشَيْءٍ قَالَ فَوَاللّٰهِ لَلدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ بکری کے ایک ایسے مردہ بچہ کے پاس سے گزرے جس کے کان بہت چھوٹے تھے یا کٹے ہوئے تھے اور یا اس کے کان تھے ہی نہیں، چنانچہ آپ نے (اس کو دیکھ کر صحابہؓ سے) فرمایا کہ تم میں ایسا کوئی شخص ہے جو

اس (مردہ بچہ) کو ایک درہم کے عوض لینا پسند کرے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم تو اس کو کسی بھی چیز کے عوض لینا پسند نہیں کر سکتے! آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم! یہ دنیا (اپنی تمام لذتوں اور آسائشوں کے ساتھ) خدا کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ بے وقعت و کمتر ہے جیسا کہ تمہاری نظر میں یہ۔" (مسلم)

تشریح: حضور ﷺ نے بکری کے اس مردہ بچہ کی مثال کے ذریعہ درحقیقت اس طرف متوجہ فرمایا کہ یہ دنیا ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ انسان اس کی محبت و طلب میں آخرت کے نفع نقصان کو فراموش کر دے، بلکہ اصل چیز آخرت کی محبت و طلب ہے جہاں کی زندگی بھی لافانی ہے اور جس کی نعمتیں بھی لازوال ہیں، لہٰذا مقصودِ زندگی آخرت کی محبت و طلب ہونا چاہئے نہ کہ دنیا کی محبت و طلب، کیونکہ فرمایا گیا ہے۔

حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ

"دنیا کی محبت وچاہت ہر گناہ کی جڑ ہے۔"

تَرْكُ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ عِبَادَةٍ

"دنیا سے بے اعتنائی، ہر عبادت کی بنیاد ہے۔"

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی محبت میں گرفتار رہنے والا اپنے اعمال میں مخلص وپاکیزہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا ہر کام کسی فاسد غرض ولالچ کی آمیزش رکھتا ہے خواہ وہ کوئی دینی اور مذہبی کام ہی کیوں نہ کرے، اس کے برخلاف جو شخص دنیا سے بااعتنائی اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے اس کے ہر عمل میں اخلاص وپاکیزگی اور آخرت ہی کا مفاد ہوتا ہے، خواہ وہ کسی دنیاوی کام ہی میں کیوں نہ مشغول ہو! اسی لئے کسی عارف نے کہا ہے کہ جس نے دنیا کو اپنی پسندیدہ اور محبوب چیز بنالیا ہے اس کو تمام مشائخ اور مرشدین مل کر بھی راہ راست پر نہیں لگا سکتے اور جس نے دنیا سے بے اعتنائی کو اپنا شیوہ بنالیا اس کو دنیا بھر کے مفسد وبدکار لوگ بھی گمراہ نہیں کر سکتے۔

دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دنیا، مؤمن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔" (مسلم)

تشریح: "قید خانہ" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص قید خانہ میں بند ہو تو وہاں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے، اور طرح طرح کی مشقتیں جھیلتا ہے۔ اسی طرح مؤمن کے لئے یہ دنیا بھی گویا ایک قید خانہ ہے جہاں اس کو محنت و مشقت اور مصائب وشدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، منکرات اور منہیات (ممنوع اور خلاف شرع امور) سے اپنے آپ کو بچانا پڑتا ہے۔ نفس کی آزادی اور بے راہ روی کو ختم کرنا پڑتا ہے اور طاعات و عبادات کی مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ یا یہ کہ مؤمن اس دنیا کو ایک ایسی جگہ محسوس کرتا ہے جہاں تنگی و گھٹن ہوتی ہے اور جہاں بود وباش اختیار کرنے کو وہ پسند نہیں کرتا، چنانچہ وہ ہر وقت یہی خواہش رکھتا ہے کہ وہ اس تنگ وتاریک جہاں سے نکل جائے اور عالم ملکوت کی وسعتوں کو اپنی جولانگاہ بنائے! اور "دنیا کافر کے لئے جنت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کافر چونکہ اپنا مقصد زندگی دنیا کا حصول سمجھتا ہے اس لئے وہ اپنی تمام تر سعی وکوشش اور اپنی تمام تر جدوجہد دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں کو حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے اور پھر وہ دنیا کی لذات وشہوات میں اس طرح مشغول ومنہمک ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے یہ دنیا ایک عشرت کدہ بن جاتی ہے جہاں سے نکلنا اس کو گوارہ نہیں ہوتا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حدیث کی مراد یہ ہے کہ مؤمن کو آخرت میں جو اجر وثواب ملے گا اور اس کو وہاں کی جن نعمتوں اور

راحتوں سے نوازا جائے گا ان کی بہ نسبت یہ دنیا اس کے حق میں گویا قید خانہ ہے اور کافر کو آخرت میں جس دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا اس کے مقابلہ میں یہ دنیا اس کے حق میں گویا جنت ہے! اس کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن اس دنیا میں خواہ کتنے ہی ناز و نعم کے ساتھ رہے اور اس کو یہاں کی کتنی ہی آسائشیں اور راحتیں حاصل ہوں مگر وہ سب ہیچ ہیں کیوں کہ اس کو آخرت میں جو نعمتیں ملنے والی ہیں اور وہاں کی جو راحتیں اور آسائشیں اس کو حاصل ہوں گی وہ اس دنیا کی نعمتوں اور راحتوں و آسائشوں سے کہیں زیادہ بہتر اور کہیں زیادہ اعلیٰ ہوں گی، اسی طرح کافر اس دنیا میں خواہ کتنی ہی مصیبتیں اور آفتیں جھیلے اور کتنے ہی شدائد کا سامنا کرے۔ مگر آخرت میں اس کا حال اس دنیا کے حال سے بھی بدتر ہوگا۔ منقول ہے کہ ایک یہودی نے حضرت حسنؓ کو دیکھ کر ان سے کہا کہ آپ کے نانا جان (رسول کریم ﷺ) نے جو یہ فرمایا ہے کہ الدنیا سجن المؤمن و جنة الکافر تو ان کا یہ قول میرے اور آپ کے حال پر کس طرح صادق آتا ہے، کیونکہ تم تو گھوڑے پر سواری کرتے ہو، اور بڑی راحت و آسائش کے ساتھ زندگی گزارتے ہو، جب کہ میں بیماری میں مبتلا ہوں اور طرح طرح کی تکالیف اور فقر و فاقہ میں گرفتار رہتا ہوں؟ چنانچہ حضرت امامؓ نے اس کو جو جواب دیا وہ وہی تھا جو اوپر نقل کیا گیا۔

کافر کے اچھے کام کا اجر اس کو اسی دنیا میں دے دیا جاتا ہے

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مُؤْمِنًا حَسَنَةً يُعْطٰى بِهَا فِي الدُّنْيَا وَيُجْزٰى بِهَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَمَّا الْكَافِرُ فَيُطْعَمُ بِحَسَنَاتِ مَا عَمِلَ بِهَا لِلّٰهِ فِي الدُّنْيَا حَتّٰى اِذَا اَفْضٰى اِلَى الْاٰخِرَةِ لَمْ تَكُنْ لَهٗ حَسَنَةٌ يُجْزٰى بِهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ مؤمن کی نیکی کا اجر ضائع نہیں کرتا، کہ اس کی اس نیکی کے سبب اس کو دنیا میں بھلائیاں دی جاتی ہیں اور آخرت میں بھی اس کا اجر و ثواب دیا جائے گا۔ اور کافر خدا کی خوشنودی کے لئے جو اچھے کام کرتا ہے اس کو اس کے بدلہ میں اس دنیا میں کھلا پلا دیا جاتا ہے (یعنی وہ ان اچھے کاموں کی وجہ سے جس بھلائی کا مستحق ہوتا ہے وہ اس کو نعمتوں اور راحتوں کی صورت میں اس دنیا میں دے دی جاتی ہے) یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے نامۂ اعمال میں ایسی کوئی نیکی نہیں ہوگی کہ جس کی وجہ سے اس کو وہاں اجر و ثواب دیا جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ آخرت کی بھلائی اور وہاں کے اجر و ثواب کا دار و مدار دنیا میں محض اچھے کام کرنے پر نہیں ہے بلکہ ایمان و عقیدہ پر ہے چنانچہ وہ نیک کام جو خدا کی خوشنودی کے لئے کیے جاتے ہیں اور جن سے خدا یقیناً خوش ہوتا ہے، جب کوئی مؤمن کرتا ہے تو اس کو ان نیک کاموں کی وجہ سے دنیا میں بھی اچھا بدلہ ملتا ہے۔ بایں طور پر کہ اس کے کاروبار معیشت اور رزق میں وسعت و فراخی عطا کی جاتی ہے، اس کی زندگی کو چین و سکون اور خوش حالی و قلبی اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے اور پھر اس کو ہر طرح کی آفات و بلیات اور ناپسندیدہ عناصر سے محفوظ و مامون رکھا جاتا ہے، اور پھر جب وہ اس دنیا کی زندگی کو پورا کر کے آخرت میں پہنچے گا تو اس کو وہاں بھی ان نیک کاموں کا پورا پورا اجر و ثواب ملے گا۔ اس کے برخلاف جب کافر اچھے اعمال کرتا ہے جس سے خدا خوش ہوتا ہو جیسے فقیر و محتاج کو کھانا کھلانا اور اس کی مدد کرنا، یتیم اور بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرنا، اور اس طرح کے دوسرے فلاحی و رفاہی کام تو اس کے ان اچھے کاموں کا پورا بدلہ اس کو دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، جب کہ آخرت میں وہ ان اچھے کاموں کا کوئی اجر و ثواب پانے کے مستحق نہیں ہوگا۔

رہی یہ بات کہ جس طرح مؤمن کو دنیا میں اپنے اچھے کاموں کا بدلہ اچھا ملتا ہے اسی طرح کیا اس کو دنیا میں برے کاموں کی سزا بھی ملتی ہے؟ تو اس کا جواب اثبات میں ہوگا کہ حق تعالیٰ اپنے جس بندہ کو آخرت کے عذاب و شدائد سے بچانا چاہتا ہے اس کو اس کی برائیوں کی سزا اس دنیا میں دے دیتا ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں منقول ہے کہ مؤمن کو اس کے برے کاموں کا بدلہ دنیا میں مختلف قسم کے

مصائب و آلام اور تکالیف و پریشانیوں کی صورت میں دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ جب آخرت میں پہنچے گا تو اس کے نامۂ اعمال میں ایسی کوئی برائی نہیں ہوگی جس پر وہ عذاب کا مستوجب قرار پائے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو احمد اور ابن حبان نے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ من یعمل سوءً یجزبہ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! (اگر ایسا ہے کہ بندہ سے جو بھی برائی صادر ہوگی اس کی وجہ سے اس کو آخرت میں ضرور سزا دی جائے گی اور ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر بندے سے چھوٹی یا بڑی کوئی نہ کوئی برائی ضرور صادر ہوتی ہے) تو پھر نجات پانے والا کون شخص ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تمہیں بخشے، کیا تم غمگین نہیں ہوتے، کیا تم رنج و الم نہیں اٹھاتے، کیا تم بیمار نہیں ہوتے، اور کیا تمہیں کوئی آفت یا بلا نہیں پہنچتی؟" انہوں نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تو یاد رکھو) یہ چیز (یعنی تمہارا کسی تکلیف و مصیبت اور رنج والم میں مبتلا ہونا) دراصل تمہارے حق میں اس برائی کی سزا اور بدلہ ہے جو تم سے صادر ہو جاتی ہے۔"

جنّت اور دوزخ کے پردے

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهْوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ اِلَّا عِنْدَ مُسْلِمٍ حُفَّتْ بَدَلَ حُجِبَتْ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دوزخ کی آگ شہوتوں یعنی خواہشات ولذات سے ڈھانکی گئی ہے، اور جنّت سختیوں اور مشقتوں سے ڈھانکی گئی ہے" اس روایت کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے لیکن مسلم کی روایت میں "حجبت" (یعنی ڈھانکی گئی ہے کہ بجائے) "حفت" (یعنی گھیری گئی ہے) کا لفظ ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ وہ محنت و مشقت اور سختی و پریشانی پر جو طاعت و عبادت کی مداومت و پابندی اور نفسانی خواہشات ولذات سے اجتناب کی وجہ سے اٹھانا پڑتی ہے، گویا بہشت کا پردہ ہے، اور جو چیز پردے کے پیچھے ہوتی ہے اس تک پہنچنے کے لئے پہلے پردہ تک پہنچنا اور اس کو اٹھانا ضروری ہوتا ہے اس لئے اگر جنّت تک پہنچنا چاہتے ہو تو پہلے اس کے پردے کو اٹھاؤ یعنی احکام خداوندی کی اتباع اور نفس کی خواہشات سے اجتناب کی محنت اور سختی برداشت کرو، جب ان باتوں کو اختیار کرو گے تب کہیں جنّت تک رسائی ہوگی۔ اسی طرح نفس کی خواہشات ولذات گویا دوزخ کا پردہ ہیں۔ جو شخص اس پردہ کو ہٹائے گا یعنی نفس کی اتباع اور خواہش پرستی کا ارتکاب کرے گا وہ دوزخ تک پہنچ جائے گا۔

واضح رہے کہ حدیث میں "شہوات" کا جو لفظ استعمال فرمایا گیا ہے اس کا تعلق نفس کی ان خواہشات ولذات سے ہے جو حرام چیزوں جیسے شراب نوشی، زنا اور غیبت وغیرہ کا ارتکاب کراتی ہیں، ورنہ جہاں تک مباح خواہشات ولذات کا تعلق ہے وہ نہ تو دوزخ میں لے جانے کا باعث بنتی ہیں اور نہ جنّت میں داخل ہونے سے روکتی ہیں، اگرچہ نفس کی مباح خواہشات ولذات کا اتباع بھی بندہ کو قرب اور ولایت کے مقام سے دور کر دیتا ہے۔

حدیث کی مذکورہ بالا وضاحت سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ایک روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ العلم حجاب اللہ (یعنی علم اللہ تعالیٰ کا پردہ ہے) تو اس کے کیا معنی ہیں، چنانچہ اس جملہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ علم، گویا اللہ اور بندے کے درمیان پردہ ہے، جو شخص علم حاصل کرتا ہے وہ گویا اس پردہ کو اٹھا دیتا ہے اور جب وہ پردہ اٹھ جاتا ہے تو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔

مال وزر کا غلام بن جانے والے کی مذمت

(۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ وَعَبْدُ الْخَمِیْصَةِ اِنْ اُعْطِیَ رَضِیَ وَاِنْ لَمْ یُعْطَ سَخِطَ تَعِسَ وَانْتَكَسَ وَاِذَا شِیْكَ فَلَا انْتُقِشَ طُوْبٰى لِعَبْدٍ اٰخِذٍ بِعِنَانِ فَرَسِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَشْعَثَ

رَأْسُهُ مُغْبَرَّةٌ قَدَمَاهُ اِنْ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ وَاِنْ كَانَ فِي السَّاقَةِ كَانَ فِي السَّاقَةِ اِنِ اسْتَاذَنَ لَمْ يُؤْذَنْ لَهُ وَاِنْ شَفَعَ لَمْ يُشَفَّعْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ہلاک ہو وہ شخص جو دینار کا غلام ہو، درہم کا غلام ہو، اور چادر کا غلام ہو (یعنی اس شخص کے لئے آخرت میں ہلاکت و تباہی مقدر ہے جس نے مال و دولت کے حصول کو اپنا مقصد زندگی بنالیا ہو، دنیاوی عیش و تمول کو معبود جبار کی رضا و خوشنودی پر ترجیح دیتا ہو اور طلب مال و حصول زر کی راہ میں ناجائز و حرام وسائل و ذرائع اختیار کرنے سے باز نہ رہتا ہو اور پھر جو کچھ کماتا ہو اس کو از راہ بخل، جمع کر دیتا ہو کہ نہ اس مال کے حقوق کو ادا کرتا ہو نہ خدا کی راہ میں اور خدا کی خوشنودی کے لئے اس کو خرچ کرتا ہو، اور اس کے ساتھ ہی اپنی شان و شوکت اور بڑائی جتانے کے لئے لباس فاخرہ زیب تن کرتا ہو اور ناروا طور پر زیب و زینت میں مبتلا ہو اور ایسے شخص کی علامت یہ ہے کہ) جب اس کو (مال و دولت اور لباس فاخرہ) ملے تو خوش اور راضی ہو، اور اگر نہ ملے تو ناراض و ناخوش ہو (گویا اس کی طبیعت کا میلان ہمیشہ لوگوں کے مال و زر کی طرف رہتا ہو اور ہر وقت اس حرص میں مبتلا رہتا ہے کہ فلاں شخص سے فلاں چیز حاصل ہو جائے، چنانچہ اگر لوگ اس کی حرص و تمنا کو پورا کرتے ہیں تو وہ ان سے خوش رہتا ہے اور اگر ان کی طرف سے اس کی اس حرص و طمع کی تکمیل نہیں ہوتی تو ان سے ناخوش و ناراض ہو جاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس دینے یا نہ دینے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو، یعنی اگر اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کے مطابق اس کو مال و دولت اور سامان تعیش عطا کرتا ہے تو وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی خواہش و حرص کو پورا نہیں کرتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے تئیں اپنی ناراضگی ظاہر کرتا ہے) ایسے شخص کی اس مذموم خصلت کی وجہ سے گویا حضور ﷺ نے مکرر بد دعا فرمائی کہ ہلاک ہو ایسا شخص اور ذلیل و سرنگوں ہو! اور (دیکھو!) جب اس شخص کے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو کوئی اس کو نہ نکالے! (گویا تہدید و تنبیہ کے طور پر ایسے شخص کے حق میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا گیا کہ اگر ایسی مذموم خصلت رکھنے والا شخص کسی آفت و پریشانی میں مبتلا ہو جائے تو کوئی اس کی مدد و اعانت نہ کرے۔ دنیاداروں اور حرص و طمع کے غلام لوگوں کی اس بدحالی کو ذکر کرنے کے بعد حضور ﷺ نے چاہا کہ ان کے مقابلہ پر ان طالبان دین اور زاہدان دنیا کا بھی ذکر فرمائیں جو آخرت کی فلاح حاصل کرنے اور دین کو سربلند کرنے کے لئے محنت و مشقت اور جہاد کے ذریعہ اللہ کی راہ میں مشغول رہتے ہیں، دنیا سے بے نیازی برتتے ہیں، ظاہری زینت و آرائش سے دور رہتے ہیں اور اہل دنیا کے طور طریقوں سے اپنے کو الگ رکھتے ہیں اور اس وجہ سے ظاہر پرستوں کی نظر میں نہایت کمتر و حقیر معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا) سعادت و خوش بختی ہے اس بندے کے لئے جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑا ہے، اس کے سر کے بال پراگندہ اور قدم غبار آلود ہیں، اگر اس کو لشکر کی (اگلی صفوں کے آگے) نگہبانی پر معمور کیا جاتا ہے تو پوری طرح نگہبانی کرتا ہے (کہ کسی بھی وقت اپنی ذمہ داری کی انجام دہی سے نہ غافل رہتا ہے اور نہ سوتا ہے بلکہ ہر وقت پوری ہوشیاری و چستی کے ساتھ نگہبانی کرتا ہے) اور اگر اس کو لشکر کے پیچھے رکھا جاتا ہے تو لشکر کے پیچھے ہی رہتا ہے (یعنی وہ امیر لشکر اور مسلمانوں کی پوری تابعداری کرتا ہے کہ اس کو جس جگہ مامور کیا جاتا ہے وہیں اپنا فرض انجام دیتا ہے، اور اس سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس پر پوری طرح عمل کرتا ہے، تکبر اور ضد و اصرار نہیں کرتا) اور (خدا کے نزدیک اپنے اس مرتبہ و سعادت کے باوجود اپنے معاشرہ میں اس قدر سادگی، جاہ و مال اور شان و شوکت سے اس قدر بے نیازی اور اس قدر تواضع انکساری کے ساتھ رہتا ہے کہ دنیادار اس کو کوئی وقعت و اہمیت نہیں دیتے، یہاں تک کہ) اگر وہ لوگوں کی محفلوں میں شریک ہونا چاہتا ہے تو اس کو شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی، اور اگر کسی کی سفارش کرتا ہے تو اس کی سفارش قبول نہیں کی جاتی۔"

تشریح: "دینار و درہم کا غلام" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ مال و دولت کے سلسلہ میں جو چیز مذموم ہے وہ اس مال و دولت کی محبت اور دنیاداری میں مبتلا ہونا ہے، چنانچہ یہ خصلت (یعنی مال و دولت اور دنیا کی محبت میں گرفتار ہونا) انسان کو مال کا بندہ بنا دیتی ہے کہ اس کی ہر سعی اور جدوجہد کا محور، اس کی ہر تمنا و خواہش کا مرکز اور اس کے ہر فعل و عمل کی بنیاد صرف مال و زر ہوتا ہے اس سے واضح ہوا کہ مال

داری اور دولت مندی بذات خود کوئی مذموم چیز نہیں ہے، کسی شخص کے پاس خواہ کتنا ہی مال وزر ہو اور وہ کتنا بڑا دولت مند ہو، اگر وہ دولت کی محبّت میں گرفتار نہیں ہے تو اس کو برا نہیں کہیں گے۔

حدیث میں مال و دولت کے تعلّق سے "دینار اور درہم" ہی کا ذکر اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں (جن کو سونا چاندی یا روپیہ پیسہ بھی کہا جا سکتا ہے) زر نقد ہیں کہ لین دین اور خرید و فروخت میں انہی کا اعتبار ہوتا ہے، اور ان کے ذریعہ ہی تمام جائز و ناجائز مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے! اسی طرح اسباب معیشت میں صرف "چادر" کا ذکر اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ اصل میں "خمیصہ" اس خط دار چادر کو کہتے ہیں جو اس زمانہ میں لباس فاخرہ کا سب سے اعلیٰ مظہر سمجھی جاتی تھی اور اس کے استعمال سے عام طور پر تکبر و رعونت اور نمود و نمائش کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، نیز لوگ اس چادر کو اس قدر پسند کرتے تھے کہ اس کو اپنے سے جدا کرنا بھی ان کو گوارہ نہیں ہوتا تھا، لہٰذا اس زمانہ کے دنیا دار اس چادر کی خواہش و طلب اور اس کی محبّت میں اس قدر گرفتار ہوتے تھے کہ جیسے انہوں نے اس چادر کی غلامی اختیار کر لی ہو۔

نقش اور انتقاش کے معنی ہیں "پیر سے کانٹا نکالنا" لہٰذا و اذا شیک فلا انتقش کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مال و دولت اور روپیہ پیسہ کا غلام بن جائے کہ نہ تو وہ ناجائز اور حرام وسائل و ذرائع سے کمانا اور دولت جوڑنا ترک کرتا ہو اور نہ اپنے روپیہ پیسہ کو حقداروں پر اور خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون اور اس کی پشت پناہی سے گریز کریں۔ اور جب وہ کسی آفت میں پھنسے تو اس کی کوئی مدد نہ کریں! اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ پیر سے کانٹا نکالنا چونکہ مدد کرنے کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے لہٰذا اس سب سے ادنیٰ درجہ کی مدد سے بھی منع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر اس کو کوئی اس سے بھی بڑا حادثہ پیش آ جائے اور اس سے بھی زیادہ سخت حالات سے دوچار ہو تو اس کی مدد نہ کرنا بطریق اولیٰ جائز بلکہ مطلوب ہوگا۔

یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ حدیث کے لفظ "تعس" کا یہ ترجمہ کہ "ہلاک ہو وہ شخص الخ" اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کی مراد ایسے شخص کے حق میں بددعا کرنا ہے، چنانچہ مذکورہ ترجمہ اسی مراد کے پیش نظر اور شارحین کی اتباع کی بناء پر نقل کیا گیا ہے اور اگر یہ مراد لیا جائے تو حضور ﷺ نے اس لفظ کے ذریعہ اس شخص کے حق میں بددعا نہیں فرمائی بلکہ اس بدترین خصلت کی مذمت اور اس خصلت کو اختیار کرنے والوں کو دنیاوی اور اخروی ذلت و خواری اور ان کے برے انعام کو بطور خبر ظاہر فرمایا تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "ہلاک ہوا وہ شخص..... الخ۔" اور یہ مراد بھی حدیث کے مغائر نہیں ہوگی۔

مالداری بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِمَّا اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِنْ بَعْدِیْ مَا یُفْتَحُ عَلَیْکُمْ مِنْ زَھْرَۃِ الدُّنْیَا وَزِیْنَتِھَا فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوَیَاْتِی الْخَیْرُ بِالشَّرِّ فَسَکَتَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّہٗ یُنْزَلُ عَلَیْہِ قَالَ فَمَسَحَ عَنْہُ الرُّحَضَاءَ وَقَالَ اَیْنَ السَّائِلُ وَکَاَنَّہٗ حَمِدَہٗ فَقَالَ اِنَّہٗ لَا یَاْتِی الْخَیْرُ بِالشَّرِّ وَاِنَّ مِمَّا یُنْبِتُ الرَّبِیْعُ مَا یَقْتُلُ حَبَطًا اَوْیُلِمُّ اِلَّا اٰکِلَۃَ الْخَضِرِ اَکَلَتْ حَتّٰی امْتَدَّتْ خَاصِرَتَاھَا اسْتَقْبَلَتْ عَیْنَ الشَّمْسِ فَثَلَطَتْ وَبَالَتْ ثُمَّ عَادَتْ فَاَکَلَتْ وَاِنَّ ھٰذَا الْمَالَ خَضِرَۃٌ حُلْوَۃٌ فَمَنْ اَخَذَہٗ بِحَقِّہٖ وَوَضَعَہٗ فِیْ حَقِّہٖ فَنِعْمَ الْمَعُوْنَۃُ ھُوَ وَمَنْ اَخَذَہٗ بِغَیْرِ حَقِّہٖ کَانَ کَالَّذِیْ یَاْکُلُ وَلَا یَشْبَعُ وَیَکُوْنُ شَھِیْدًا عَلَیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ اور ان کے ذریعہ عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے) فرمایا۔ "اپنی وفات کے بعد تمہارے بارہ میں مجھے جن چیزوں کا خوف ہے (کہ تم ان میں مبتلا ہو جاؤ گے) ان میں سے ایک چیز دنیا کی تروتازگی اور زینت بھی ہے (جو ملکی فتوحات و اقتدار کی صورت میں) تم کو حاصل ہوگی۔" یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا

بھلائی اپنے ساتھ برائی بھی لائے گی؟ (یعنی ملکی فتوحات واقتدار کی وجہ سے ہم مسلمانوں کو جو مال غنیمت اور ساز وسامان حاصل ہوگا وہ تو ہمارے حق میں خدا کی نعمت ہوگی اور ویسے بھی جائز وسائل وذرائع سے حاصل ہونے والی دولت اور رزق وغیرہ کی وسعت وفراخی ایک اچھی چیز ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا کی عطا کی ہوئی نعمت اور ایک اچھی چیز ہمارے لئے برائی وفتنہ اور ترک طاعات کا سبب وذریعہ بن جائے؟) حضور ﷺ (یہ سن کر) خاموش رہے (اور انتظار کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے تو جواب دیں) یہاں تک کہ ہم کو خاموش کیا آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (تھوڑی دیر کے بعد) حضور ﷺ نے اپنے چہرۂ مبارک سے پسینہ پونچھا (جو نزول وحی کے وقت آتا تھا) اور پھر فرمایا کہ وہ شخص کہاں ہے جس نے سوال کیا تھا؟ گویا آپ ﷺ نے سائل کے سوال کی تحسین فرمائی (کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اس شخص نے جو سوال کیا ہے اور اب اس کا جو جواب دیا جائے گا اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا) اور اس کے بعد فرمایا۔ "حقیقت یہ ہے کہ بھلائی اپنے ساتھ برائی نہیں لاتی (یعنی جائز ذرائع سے مال ودولت کا حاصل ہونا اور رزق میں وسعت وفراخی اور خوشحالی کا نصیب ہونا بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے اور اس کی وجہ سے کوئی برائی پیش نہیں آتی، بلکہ اصل میں برائی کا پیش آنا ان عوارض کی وجہ سے ہوتا ہے جو دولتمندی اور خوشحالی کے وقت لاحق ہوجاتے ہیں جیسے بخل و اسراف اور حد اعتدال سے تجاوز کرنا اور اس کی مثال موسم بہار ہے جو زمین کے پیٹ سے گھاس وغیرہ اگاتا ہے وہ اپنی ذات کے اعتبار سے تو اچھا اور فائدہ مند ہوتا ہے، البتہ اس سے ضرور نقصان اس وقت پہنچتا ہے جب کوئی چوپایہ اس کو ضرورت سے زائد کھائے اور بسیار خوری کے سبب ضرور ہلاکت میں مبتلا ہوجائے، چنانچہ خود حضور ﷺ نے اس مثال کو یوں بیان فرمایا کہ) موسم بہار جو سبزہ اگاتا ہے (وہ حقیقت میں تو بھلائی وفائدہ کی چیز ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کوئی نقصان وبرائی لے کر زمین کے پیٹ سے نہیں اگتا مگر) وہ جانور کو اس کا پیٹ پھلا کر مار دیتا ہے یا (اگر وہ مرتا نہیں تو) مرنے کے قریب پہنچ جاتا ہے (یعنی جو جانور اس سبزہ کو کھانے میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے وہ اس سبزہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے فعل یعنی زیادہ کھانے کی وجہ سے ضرور ہلاکت میں مبتلا ہوجاتا ہے) یہ کہ کھانے والے جانور نے اس سبزہ کو اس طرح کھایا کہ (جب بسیار خوری کی وجہ سے) اس کی دونوں کوکھیں پھول گئیں تو وہ سورج کے سامنے بیٹھ گیا (جیسا کہ جانور کی عادت ہوتی ہے کہ جب بدہضمی کی وجہ سے اس کا پیٹ پھول جاتا ہے تو وہ دھوپ میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کا پیٹ گرمی پاکر نرم ہوجاتا ہے اور اس میں جو کچھ ہوتا ہے باہر نکل جاتا ہے، اور پھر (جب) پتلا گوبر اور پیشاب کرکے (اس نے اپنا پیٹ ہلکا کر لیا تو) چراگاہ کی طرف چلا گیا اور سبزہ چرنے لگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا یہ مال وزر بڑا سرسبز، تروتازہ اور نرم ودلکش ہے (کہ بظاہر آنکھوں کو بہت بھاتا ہے، طبیعت کو بہت اچھا لگتا ہے جس کی وجہ سے دل چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ حاصل ہو) لہٰذا جو شخص دنیا کے مال وزر کو حق کے ساتھ (یعنی بوقت ضرورت اور جائز وسائل وذرائع سے) حاصل کرے اور اس کو اس کے حق میں (یعنی اس کے اچھے مصارف میں کہ خواہ واجب ہو یا مستحب) خرچ کرے تو وہ مال وزر اس کے حق میں (دین کا) بہترین مددگار ثابت ہوتا ہے اور جو شخص اس مال وزر کو حق کے بغیر یعنی ناجائز طور پر حاصل کرے تو وہ اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو کھاتا رہتا ہے اور شکم سیر نہیں ہوتا اور وہ مال و زر قیامت کے دن اس کے بارے میں (اس کے اسراف اور اس کی حرص وطمع کا) گواہ ہوگا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بارے میں مجھے خدشہ ہے کہ جب تم دنیا کے ملکوں اور شہروں کو فتح کرکے اپنے تسلط واقتدار کا جھنڈا لہراؤ گے اور اس کے نتیجہ میں تمہیں مال ودولت کی فراوانی اور خوشحالی نصیب ہوگی تو یہ چیز تمہیں عبادت وطاعت اور نیک اعمال سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی، نفع پہنچانے والے علوم (یعنی دینی علوم وفنون) سے لاپرواہ بنا دے گی اور عجب وتکبر، گھمنڈ وغرور، شان وشوکت کا اظہار اور جاہ ومال سے محبت جیسی برائیاں تمہارے اندر پیدا ہوجائیں گی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم آخرت کی زندگی کی فکر کرنے اور موت کے لئے تیاری کرنے کے بجائے دنیاوی امور میں پھنس کر رہ جاؤ گے۔

پھر چراگاہ کی طرف چلا گیا اور سبزہ چرنے لگا" یعنی جب وہ جانور ضرورت سے زیادہ کھالیتا ہے اور بدہضمی میں مبتلا ہوجاتا ہے تو اپنے

طریقہ سے بدہضمی کا علاج کرتا ہے اور اپنے پیٹ کو صاف کر کے دوبارہ سبزہ چرنے لگتا ہے! یہ مثال اس شخص کی ہے جو انسانی خمیر میں شامل حرص وخواہشات کے غلبہ کی وجہ سے بعض وقت اعتدال کی راہ سے بھٹک کر حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور پھر ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے لیکن اپنے طرز عمل سے جلد ہی رجوع کر لیتا ہے اور مستقل طور سے بے اعتدالی وگناہ کی راہ پر قائم نہیں رہتا بلکہ آفتاب ہدایت کی روشنی اس کو راہ راست کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور ندامت وتوبہ کے ذریعہ اپنے نفس کو بے اعتدالی اور گناہ کی غلاظت سے پاک کر کے گویا اپنا علاج کر لیتا ہے۔ اس کے برخلاف پہلی قسم کی کہ جس کو "وہ جانور کو اس کا پیٹ پھلا کر مار دیتا ہے۔" کے ذریعہ بیان فرمایا، اس شخص کی حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نفس کی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے، گناہ ومعصیت پر قائم رہتا ہے اور اسی حالت میں مرجاتا ہے، یہاں تک کہ اس کو توبہ وانابت اور رجوع واستغفار کی توفیق بھی نصیب نہیں ہو پاتی۔ ان دونوں قسموں پر غور کرنے سے ایک اور قسم سامنے آتی ہے جس کا تعلق اس شخص سے ہے جو سرے سے بے اعتدالی اور گناہ کی راہ اختیار نہیں کرتا اور نفس کی خواہشات اور ناروا تمناؤں کا اسیر نہیں ہوتا بلکہ دنیا سے بے پرواہ ہوتا ہے اور اپنی تمامتر توجہ آخرت کے مفاد کی طرف مبذول رکھتا ہے، لہٰذا پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو اصطلاحی طور پر "ظالم" سے موسوم کیا جاتا ہے، دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو "مقتصد" یعنی میانہ رو کہا جاتا ہے اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو "سابق" یعنی بھلائیوں کو اختیار کرنے میں سبقت لے جانے والا کہا جاتا ہے۔ پس جو شخص "سابق" ہوتا ہے وہ سرے سے اپنے ہاتھوں کو گناہ سے آلودہ ہی نہیں کرتا، جو شخص "مقتصد" ہوتا ہے وہ اپنے ہاتھوں کو گناہ سے آلودہ تو کرتا ہے لیکن ان کو پھر دھو ڈالتا ہے، اور جو شخص "ظالم" ہوتا ہے وہ ہاتھ آلودہ ہی اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

مذکورہ مثال اور اس کی مطابقت کو بیان کرنے کے بعد حضور ﷺ نے "یہ مال وزر بڑا سرسبز تازہ اور نرم ودلکش ہے" سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ دنیا کے مال وزر، اس کے تئیں محبت اور اس کے مصارف کے تعلق سے انسانوں کے حالات وخیالات مختلف ہوتے ہیں کہ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو محض ضرورت وحاجت کے بقدر ہی مال واسباب کے حصول پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے بھی جائز ودرست وسائل وذرائع اختیار کرتے ہیں، نیز ان کے پاس جو مال واسباب اور روپیہ پیسہ ہوتا ہے اس کو وہ اچھے مصارف میں خرچ کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مال ودولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کی حرص وطمع کسی بھی حد پر قناعت نہیں کرتی، وہ نہ صرف یہ کہ ضرورت واحتیاج سے زائد مال وزر حاصل کرنے کی سعی وکوشش کرتے ہیں اور اس کو جوڑنے میں لگے رہتے ہیں بلکہ اس کے حصول میں جائز وناجائز کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتے، سخت سے سخت برائی کا ارتکاب کر کے اور حرام ذرائع کو اختیار کر کے دولت سمیٹتے رہتے ہیں، علاوہ ازیں ان کے پاس جو مال ودولت اور روپیہ پیسہ ہوتا ہے اس کو حقداروں پر اور ان مصارف میں خرچ نہیں کرتے جو خدا کی خوشنودی کا باعث ہوتے ہیں، اور مال ودولت کے تئیں ان کی یہ حرص وطمع ان کو اس شخص کی مانند بنا دیتی ہے جو کھاتا رہتا ہے مگر غلبہ حرص کی وجہ سے کبھی شکم سیر نہیں ہوتا یا ان کی حالت اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو استسقاء کا مریض ہوتا ہے کہ کسی وقت بھی سیراب نہیں ہوتا اور جتنا پانی پیتا ہے اسی قدر پیاس بھڑکتی ہے اور پیٹ پھولتا جاتا ہے۔

ایک عارف کی نظر میں دنیا کی مثال: بڑے پایہ کے بزرگ اور عارف باللہ حضرت خواجہ عبید اللہ نقشبندی کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "یہ دنیا سانپ کی مانند ہے، لہٰذا جو شخص اس کا منتر جانتا ہے اس کے لئے تو دنیا کو حاصل کرنا جائز ہے لیکن دوسروں کے لئے جائز نہیں" جب لوگوں نے یہ سنا تو عرض کیا کہ حضرت! اس کا منتر کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا "اس بات کا علم ہونا کہ اس (ادنیٰ کے مال ودولت) کو کہاں سے، اور کس طرح حاصل کر رہا ہے، اور کہاں خرچ کر رہا ہے"

دنیا کی طرف راغب ہونا تباہی وبربادی کی طرف راغب ہونا ہے

(۹) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَاللّٰهِ لَا الْفَقْرَ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ وَلٰكِنْ اَخْشٰى

عَلَیْکُمْ اَنْ تُبْسَطَ عَلَیْکُمُ الدُّنْیَا کَمَا بُسِطَتْ عَلٰی مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ فَتَنَا فَسُوْھَا کَمَا تَنَافَسُوْھَا وَتُھْلِکَکُمْ کَمَا اَھْلَکَتْھُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرو ابن عوفؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ خدا کی قسم مجھے تمہارے فقر و افلاس کا کوئی ڈر نہیں ہے (کیونکہ فقر و افلاس کی حالت میں دین کی سلامتی کا امکان غالب ہوتا ہے اور یہ چیز تمہارے حق میں زیادہ سود مند ہے) بلکہ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تم پر کشادہ کی جائے گی (اور تم، مالداروں کا طور طریقہ اختیار کر کے مختلف قسم کی آفتوں اور بلاؤں کے ذریعہ ہلاکت و تباہی میں مبتلا ہو جاؤ گے) جیسا کہ ان لوگوں پر دنیا کشادہ کی گئی تھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں (اور وہ مال و دولت کی بے حد رغبت و محبت رکھنے کی وجہ سے فقراء اور مساکین پر رحم نہیں کھاتے تھے اور ان کی مدد و اعانت سے گریز کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو تباہ و برباد کر دیا گیا) چنانچہ تم دنیا کی طرف رغبت کرو گے (یعنی دنیا کو اختیار کرو گے اور اس کی طرف نہایت رغبت رکھو گے کہ ایک دوسرے سے مال و دولت اور جاہ و حکومت حاصل کرنے کے لئے لڑائی جھگڑا شروع کر دو گے) جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں نے اس کی طرف رغبت کی تھی، اور پھر یہ دنیا تم کو اسی طرح تباہ و برباد کر دے گی جس طرح ان کو تباہ و برباد کر چکی ہے" (بخاری و مسلم)

تشریح: مال و دولت کی وہ فراخی و آسودگی جو دنیا کا گرویدہ بناتی ہے، حرص و طمع میں مبتلا کرتی ہے، جوڑنے سمیٹنے اور ذخیرہ اندوزی کا خوگر کرتی ہے چونکہ انسان کو اخلاقی و روحانی طور پر تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اخروی ہلاکت کا مستوجب بنا دیتی ہے اس لئے حضور ﷺ نے مسلمانوں کی دنیاوی خوشحالی و آسودگی اور مالداری سے اپنے خوف کا اظہار فرمایا! یا آپ ﷺ نے اس دنیاوی ترفع و آسودگی اور خوشحالی کے تئیں خوف کا اظہار فرمایا جو باہمی مخالفت و نزاع، سماجی استحصال و لوٹ کھسوٹ اور محض دنیاوی اقتدار کے لئے جنگ و جدل اور قتل و قتال کے نتیجہ میں حاصل ہو۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں "فقر" سے مراد ان تمام چیزوں سے تہی دست ہونا ہے جن کی ایک انسانی زندگی کو احتیاج ہوتی ہے اور جن پر ضروریات دین کی تکمیل اور بنیادی اسباب معیشت کا انحصار ہوتا ہے۔ اسی طرح غنا یعنی دنیاوی فراخی و آسودگی سے مراد دنیا کی چیزوں کا اس قدر حاصل ہونا ہے جو مقدار کفایت و ضرورت سے زائد ہوں، جس کی وجہ سے انسان حق تعالیٰ کی عبادت و اطاعت سے غافل ہو جاتا ہے اور تمرد و سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔

رزق کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی دعا

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا وَفِیْ رِوَایَۃٍ کَفَافًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی۔ "اے اللہ! تو آل محمد (ﷺ) کو بقدر قوت، رزق عطا فرما" اور ایک روایت میں (قوت کے بجائے) "کفاف" کا لفظ ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ملا علی قاری کے مطابق "آل" سے مراد آنحضرت ﷺ کی ذریت (اولاد) اور اہل بیت ہیں! یا اُمت کے وہ لوگ مراد ہیں جو آپ ﷺ کے سچے تابعدار اور محبوب ہوں۔ اور حضرت شیخ عبدالحقؒ نے یہ لکھا ہے کہ "آل" سے مراد آپ ﷺ کی اُمت کے تمام افراد اور متبعین مراد ہیں جیسا کہ لفظ "آل" کے اصل معنی یہی مراد لئے جاتے ہیں۔ اور اگر اہل و عیال ہی کو مراد لیا جائے تو بھی قیاس اور دلالت کو بنیاد بنا کر ان (اہل و عیال) کے علاوہ اُمت کے باقی افراد کو بھی اس دعا میں شامل قرار دیا جائے گا۔"

"قوت" کھانے پینے کی اس محدود مقدار کو کہتے ہیں جو زندگی کو باقی اور جسمانی توانائی کو برقرار رکھے! اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ کھانے پینے کی وہ محدود مقدار "قوت" کہلاتی ہے جو جان کو بچائے اور بطور رزق کافی ہو "کفاف" بنیادی ضروریات زندگی کی اس

مقدار کو کہتے ہیں جو کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے محفوظ و باز رکھے۔ نیز بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "قوت" اور کفاف" کے ایک ہی معنی ہیں اور زیادہ صحیح بات بھی یہی ہے کہ دوسری روایت کا لفظ "کفاف" دراصل پہلی روایت کے لفظ "قوت" کی وضاحت ہے اور اس لفظ کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اسباب معیشت اور ضروریات زندگی کی کم سے کم مقدار پر اکتفا کرنا اولی ہے! واضح رہے کہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کی اس دعا کو اپنے ان بندوں کے حق میں قبول فرمایا جنہیں اس نے اپنا پیارا اور برگزیدہ بنانا چاہا۔

اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ "کفاف" یعنی خوراک کی بقدر کفایت مقدار، کوئی متعین اور آخری نہیں، بلکہ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور اس فرق و اختلاف کا مدار اشخاص، زمانہ اور حالات کی عدم یکسانیت پر ہے، مثلاً ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو قلیل کھانے کی عادت رکھتا ہے بایں طور کہ وہ دو تین دن یا اس سے زائد بھوکا رہ سکتا ہے، ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو دن بھر میں دو تین بار کھانے کی عادت رکھتا ہے، کوئی شخص کم یا زیادہ اہل و عیال رکھتا ہے اور کوئی شخص سرے سے عیالدار ہی نہیں ہوتا، اسی طرح بعض حالات اور بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کھانے پینے کی تھوڑی سی مقدار بھی کافی ہو جاتی ہے جیسے قحط کا زمانہ، تنگدستی کی حالت اور ضعف و کمزوری یا مرض کا لاحق ہونا، اس کے برخلاف خوشحالی و آسودگی اور قوت و توانائی کی حالت میں کھانے پینے کی زیادہ خواہش ہوتی ہے غرضیکہ کفاف کی مقدار کو منضبط نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کا دار و مدار وقت و حالات و ضروریات پر ہوتا ہے کہ جو شخص جس حیثیت کا اور جس حالت میں ہوتا ہے اس کے حق میں کفاف کی مقدار اسی کے مطابق ہوتی ہے۔ البتہ مستحسن اور مطلوب یہ ہے کہ انسان کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات کو بس اسی مقدار تک محدود رکھنا چاہئے جو زندگی کی بقاء کے لئے ناگزیر اور جسمانی قوت توانائی کی برقراری کے لئے ضروری ہو کہ جس سے عبادات و طاعات پر قدرت حاصل رہے اور معمولات زندگی فوت نہ ہوں۔

اس حدیث میں گویا مسلمانوں کو اس امر پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ وہ حصول معاش کی جدوجہد کی ضروریات زندگی کی اس مقدار تک محدود رکھیں جو "کفاف" کہلاتی ہے اور ضرورت سے زیادہ اسباب معیشت مہیا کرنے کی محنت و مشقت برداشت نہ کریں نیز حد اعتدال سے تجاوز کر کے اور حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر اپنی روحانی و اخلاقی زندگی کو مضمحل نہ کریں۔

علماء نے لکھا ہے کہ "فقر اور غنا دونوں سے کفاف افضل ہے، اگرچہ بعض حالتوں میں غنا یعنی مال و دولت کی کثرت بھی ایک طرح کی فضیلت رکھتی ہے بشرطیکہ اس کثرت کی وجہ سے حاصل ہونے والی خوشحالی و آسودگی کسی بھی صورت میں دینی گمراہی، اخروی نقصان و خسران اور دنیا کی محبت و چاہ کا موجب نہ بنے بلکہ خیر و بھلائی اور عبادات و طاعات کی راہ زیادہ سے زیادہ اختیار کرنے میں مددگار ہو۔

فلاح و نجات پانے والا شخص

(۱۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَ رُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص فلاح و نجات کو پہنچ گیا جس نے اسلام قبول کیا (یا "اسلم" سے مراد یہ ہے کہ اس نے قضاء و قدر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کیا) اس کو (حلال و جائز ذرائع سے) بقدر کفاف رزق دیا گیا (یعنی اس کو بس اتنا رزق ملا جو اس کی ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو گیا اور وہ غیر اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانے کا ضرورتمند نہیں رہا) اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس چیز پر کہ جو اس کو دی گئی ہے قناعت بخشی (اور اس کو تقدیر پر راضی اور مطمئن کیا۔" (مسلم)

مال و دولت میں انسان کا اصل حصہ

(۱۲) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِىْ مَالِىْ وَاِنَّ مَالَهُ مِنْ مَالِهِ ثَلٰثٌ مَا اَكَلَ فَاَفْنٰى اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰى اَوْ اَعْطٰى فَاقْتَنٰى وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهُ لِلنَّاسِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بندہ کہتا رہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال (یعنی جو شخص مالدار اور دولت مند ہوتا ہے وہ اپنے مال و دولت پر بہت فخر کرتا ہے اور دوسرے پر یہ جتانے کی کوشش کرتا ہے کہ میرے پاس مال و دولت ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو اس مال و دولت میں سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ فی الجملہ تین چیزیں ہیں (اور ان تین چیزوں میں سے بھی صرف ایک چیز ایسی ہے جو اس کے لئے حقیقی نفع بخشش اور باقی رہنے والی ہے، جب کہ بقیہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق دنیا سے ہے اور جو فناہ ہو جانے والی ہے) ایک تو وہ چیز جس کو اس نے کھالیا اور ختم کر دیا، دوسری وہ چیز جس کو اس نے پہن لیا اور بوسیدہ کر دیا یعنی اتار کر پھینک دیا، اور تیسری وہ چیز جس کو اس نے خدا کی راہ میں دیا اور (آخرت کے لئے) ذخیرہ کر لیا، ان تینوں چیزوں کے سوا اور جو کچھ ہے (جیسے زمین، جائداد، مویشی، نوکر چاکر، روپیہ پیسہ اور دیگر قیمتی چیزیں وہ) سب ایسی ہیں جن کو وہ لوگوں کے لئے چھوڑ کر (اس دنیا سے) چلا جانے والا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ انسان محنت و مشقت کر کے دنیا کماتا ہے، مال و دولت حاصل کرتا ہے اور زمین و جائداد بناتا ہے، پھر اس مال و دولت اور زمین و جائداد پر فخر کرتا ہے، اپنے کو ایک بڑا آدمی ظاہر کرتا ہے اور لوگوں پر اپنی امارت و ثروت کا سکہ جمانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ اول تو اس مال و دولت اور زمین جائداد کا وبال بہت سخت ہے اور اس کی جواب دہی نہایت مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے پاس جو کچھ مال و دولت اور زمین جائداد ہے اس سے خود اس کی ذات کو بہت معمولی فائدہ پہنچتا ہے اور یہ چیزیں بہت کم عرصہ تک اس کا ساتھ دینے والی ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بڑے نفسیاتی طریقہ پر واضح فرمایا کہ مال و دولت میں انسان کا اصل حصہ اور اس کا فی الجملہ فائدہ بس اتنا ہوتا ہے کہ وہ کچھ چیزوں کو تو کھا کر ختم کر دیتا ہے۔ کچھ چیزوں کو پہن برت کر پرانا کر دیتا ہے اور اگر اسے توفیق ہوتی ہے تو کچھ چیزوں کو خدا کی راہ میں خرچ کر کے ان کو اپنے لئے ذخیرۂ آخرت بنالیتا ہے، باقی تمام مال و اسباب، ساری زمین جائداد اور سب روپیہ پیسہ وغیرہ دوسروں کے لئے چھوڑ کر دنیا سے چلا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں سے آخری صورت (یعنی اپنے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا) بے شک ایسی چیز ہے جو انسان کو اس کے مال و دولت سے سب سے بیش قیمت اور ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا نفع پہنچاتی ہے، اور اگر اس اصل نفع کے لئے مال و دولت کو حاصل کیا جائے اور اس کو جمع کیا جائے تو یہ یقیناً سمجھ میں آنے والی بات ہوگی ورنہ محض چند روزہ دنیاوی اور جزوی منافع کے لئے مال و دولت جمع کرنا اور اس کی وجہ سے اپنی بڑائی کا اظہار کرنا بے حقیقت بات ہوگی، چنانچہ اس ارشاد گرامی کے ان الفاظ او اعطی فاقتنی کے ذریعہ اس امر کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ مال و دولت کو جمع کرنا حقیقت میں یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ جو مال و دولت عطا کرے وہ اس کو خدا کی خوشنودی کے لئے فقراء و غرباء اور حاجتمندوں پر خرچ کرے تاکہ اس کا ثواب جمع ہوتا رہے اور پھر حاجت کے دن (روز حشر) کام آئے۔

مرنے کے بعد نہ اہل و عیال ساتھی ہوں گے اور نہ جاہ و مال

(۱۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلٰثَةٌ فَيَرْجِعُ اِثْنَانِ وَ يَبْقٰى مَعَهٗ وَاحِدٌ يَتْبَعُهٗ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ وَعَمَلُهٗ فَيَرْجِعُ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ وَيَبْقٰى عَمَلُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا میت کے ساتھ (قبر تک) تین چیزیں جاتی ہیں، ان میں سے دو چیزیں تو (اس کو اکیلا چھوڑ کر) واپس آجاتی ہیں اور ایک چیز اس کے ساتھ رہ جاتی ہے، چنانچہ اس کے متعلقین (جیسے اولاد، عزیز و اقارب، دوست و احباب اور جان پہچان کے لوگ) اور اس کے اموال (جیسے نوکر چاکر، پلنگ، جانور، گاڑی وغیرہ اور اسی طرح کے اسباب) اور اس کے اعمال اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ ان تینوں میں سے متعلقین اور مال تو (اس کو تنہا چھوڑ کر) واپس آجاتے ہیں اور اس کے اعمال اس کے ساتھ رہتے

ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اعمال" سے مراد وہ ثواب و عذاب ہے جو ہر اچھے برے عمل پر مرتب ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ انسان جب اس دنیا سے رخصت ہو کر آخرت کی پہلی منزل (قبر) میں پہنچتا ہے تو وہاں سے وہ مرحلہ شروع ہو جاتا ہے جہاں سے عزیز و اقارب، دوست، احباب، مال و دولت اور جاہ و حشم سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف وہ اعمال اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں جو اس نے دنیا میں کیے تھے۔ شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ القبر صندوق العمل یعنی قبر اعمال کا صندوق ہے۔

اپنے مال کو ذخیرۂ آخرت بناؤ

⑭ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّکُمْ مَالُ وَارِثِہٖ اَحَبُّ اِلَیْہِ مِنْ مَالِہٖ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَامِنَّا اَحَدٌ اِلَّا مَالُہٗ اَحَبُّ اِلَیْہِ مِنْ مَالِ وَارِثِہٖ قَالَ فَاِنَّ مَالَہٗ مَاقَدَّمَ وَمَالُ وَارِثِہٖ مَا اَخَّرَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ "تم میں وہ کون شخص ہے جو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال کو پسند کرتا ہو کہ اس کا مال اور روپیہ پیسہ خود اس کے لئے نہ ہو بلکہ اس کے وارثوں کے لئے ہو؟) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال کو پسند کرتا ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ (تو سنو) حقیقت میں اس کا مال وہ ہے جس کو اس نے (صدقہ و خیرات وغیرہ کے ثواب کی صورت میں) آگے بھیج دیا ہے، اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جس کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ واقعۃً اس بات کو زیادہ پسند کرتے ہیں کہ ان کے پاس جو مال و دولت ہے اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ انہی کو پہنچے تو چاہئے تو یہ کہ وہ اس مال و دولت کو یہاں دنیا میں جمع کرنے اور یہیں چھوڑ جانے کے بجائے آخرت میں کام آنے کے لئے آگے بھیجیں، جس کی صورت یہ ہے کہ اس کو صدقہ و خیرات اور نیک کاموں میں خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ ثواب کمائیں، لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ اپنے مال و دولت اور روپیہ پیسہ کو جوڑ جوڑ کر جمع کرتے ہیں، صدقہ و خیرات کرنے اور حقداروں کا حق دینے سے گریز کرتے اور بخل کرتے ہیں، اور اس طرح اس کو آگے بھیجنے کے بجائے ورثاء کے لئے یہیں دنیا میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مال و دولت کو اپنے لئے زیادہ پسند نہیں کرتے بلکہ اپنے ورثاء کے لئے زیادہ پسند کرتے ہیں تاہم واضح رہے کہ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس شخص کے پاس جو کچھ مال و دولت اور اثاثہ ہو وہ ان سب کو خدا کی راہ میں خرچ کر دے اور اپنے ورثاء کے لئے کچھ بھی چھوڑ کر نہ جائے، بلکہ اصل مقصد اس بات کی طرف راغب کرنا ہے کہ مال دار لوگ بخل و امساک کا طور نہ اپنائیں اور فقراء مساکین کی امداد و اعانت سے گریز نہ کریں بلکہ اپنے مال و دولت اور اپنے روپیہ پیسہ کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں ضرور خرچ کریں، چنانچہ اپنے مال و دولت کے کچھ حصے کو صدقہ و خیرات کرنے اور فقراء و مساکین اور نیک کاموں کے لئے وصیت کرنے کے بعد کہ جس کی زیادہ سے زیادہ مقدار تہائی حصہ ہے، باقی کو ورثاء کے لئے چھوڑنا افضل ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اپنے ورثاء کو تونگر چھوڑ کر جانا اس سے بہتر ہے کہ (اپنا سارا مال و زر خدا کی راہ میں خرچ کر کے دنیا سے رخصت ہو جائے اور) اس کے ورثاء اپنی ضروریات کے لئے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

مالدار کے حق میں اس کا اصل مال وہی ہے جو اس کے کام آئے

⑮ وَعَنْ مُطَرِّفٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَیَقْرَءُ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ قَالَ یَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِیْ مَالِیْ قَالَ وَھَلْ لَکَ یَا ابْنَ اٰدَمَ اِلَّا مَا اَکَلْتَ فَاَفْنَیْتَ اَوْلَبِسْتَ فَاَبْلَیْتَ اَوْ تَصَدَّقْتَ فَاَمْضَیْتَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مطرف" (تابعی) اپنے والد ماجد (حضرت عبداللہ ابن شخیر) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ الھکم التکاثر پڑھ رہے تھے (جس کے معنی یہ ہیں کہ اے لوگو تم آپس میں اپنی ثروت و امارت پر فخر و ناز کرنے کے سبب آخرت کے خوف سے بے پرواہ ہو گئے ہو) چنانچہ حضور ﷺ نے (تکاثر یعنی آپس میں ثروت و امارت پر فخر کرنے کی وضاحت میں) فرمایا ابن آدم میرا مال، میرا مال کہتا ہے (یعنی جس کے پاس زیادہ مال ہوتا ہے وہ لوگوں پر جتاتا رہتا ہے کہ میں اتنا بڑا مالدار ہوں، میرے پاس اتنی زیادہ دولت ہے) پھر آپ نے فرمایا کہ (لوگوں کا اپنے مال و متاع پر فخر کرنا بالکل بے حقیقت بات ہے، واقعہ یہ ہے کہ) اے ابن آدم! تجھے تیرے مال سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اور تو جتنا فائدہ اٹھاتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ تو کچھ چیزوں کو کھالیتا ہے اور اس کو ختم کر دیتا ہے، کچھ چیزوں کو پہنتا ہے اور ان کو بوسیدہ کر دیتا ہے اور کچھ چیزوں کو خدا کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے اور اس کو آخرت کے لئے ذخیرہ بنالیتا ہے۔" (مسلمؒ)

حقیقی دولت، دل کا غناء ہے

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اصل تونگری و دولت مندی یہ نہیں ہے کہ اپنے پاس بہت زیادہ مال و متاع ہو بلکہ حقیقی تونگری و دولتمندی جس چیز کا نام ہے وہ نفس یعنی دل کا تونگر و غنی ہونا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: دل کا غنی ہونا یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہو اس پر قناعت کرے، مال و دولت اور مالداروں سے بے نیازی و بے پروائی برتے اور بلند حوصلگی اور عالی ہمتی کا مالک ہو کہ نہ تو حرص و طمع میں مبتلا ہو اور نہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرے۔ چنانچہ جو شخص ایسا ہو کہ اس کا دل مال و دولت حاصل کرنے اور جوڑنے بٹورنے میں لگا رہے اور کثرت مال کی طلب و حرص میں مبتلا ہو تو وہ حقیقت میں فقیر و محتاج ہے، خواہ ظاہر میں کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو؛ اور جو شخص قوت و کفاف پر قانع و راضی ہو اور زیادہ طلبی و حرص سے دور رہے۔ وہ اصل میں تونگر و غنی ہے اگرچہ ظاہر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ اسی حقیقت کو شیخ سعدیؒ نے یوں بیان کیا ہے ۔

تو نگری بدل است نہ بمال   بزرگی بعقل است نہ بسال

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ غنی النفس (یعنی نفس کے غنی ہونے) سے مراد یہ ہے کہ وہ علمی کمالات حاصل ہوں جن کے بغیر انسان کی روحانی اخلاقی زندگی نہ تو محفوظ رہتی ہے اور نہ اس کو آسودگی و عظمت حاصل ہوتی ہے، گویا اصل خوش بختی و دولت اور تونگری کا مدار روحانی و عملی کمالات پر ہے نہ کہ مال و متاع کی کثرت پر، جیسا کہ کسی نے کہا ہے ۔

تو نگری نہ بمال است. نزد اہل کمال   کہ مال تالب گوراست بعد ازاں اعمال

اور بعض ارباب نے یوں کہا ہے ۔

رَضِيْنَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِيْنَا   لَنَا عِلْمٌ وَلِلْاَعْدَاءِ مَال

حق تعالیٰ نے ہماری قسمت میں جو کچھ لکھدیا ہے ہم اس پر راضی و مطمئن ہیں ہمارے لئے علم کی دولت ہے اور دشمنوں کے لئے دنیاوی مال ہے ۔

فَاِنَّ الْمَالَ يَفْنٰى عَنْ قَرِيْبٍ   وَاِنَّ الْعِلْمَ يَبْقٰى لَايَزَال

پس اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیاوی مال بہت جلد فنا ہونے والا ہے۔ جب کہ علم کی دولت یقیناً ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اور

یہ بات معلوم ہی ہے کہ دنیاوی مال و متاع ان لوگوں کی میراث ہے جو خدا کے نزدیک سخت مبغوض اور مردود ہیں، جیسے فرعون، قارون اور تمام کفار و فجار وغیرہ، جب کہ انبیاء، علماء اور اولیاء کی میراث علم و اخلاق کی دولت ہے، لہٰذا دنیادار شخص ظاہری مال و متاع حاصل کر کے راضی و مطمئن ہوتا ہے اور دیندار شخص علم کی دولت پا کر خوش اور مطمئن ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

پانچ بہترین باتوں کی نصیحت

⑰ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ یَّاْخُذُ عَنِّیْ هٰؤُلَآءِ الْكَلِمَاتِ فَیَعْمَلُ بِهِنَّ اَوْ یُعَلِّمُ مَنْ یَّعْمَلُ بِهِنَّ قُلْتُ اَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَخَذَ بِیَدِیْ فَعَدَّ خَمْسًا فَقَالَ اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ وَ ارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ اَغْنَی النَّاسِ وَاَحْسِنْ اِلٰی جَارِكَ تَكُنْ مُؤْمِنًا وَ اَحِبَّ لِلنَّاسِ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا وَلَا تُكْثِرِ الضَّحْكَ فَاِنَّ كَثْرَةَ الضَّحْكِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو مجھ سے پانچ باتوں کو سیکھے اور پھر ان پر عمل کرے یا اس شخص کو سکھائے جو ان پر عمل کرنے والا ہو۔ (حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ شخص میں ہوں۔ حضور ﷺ نے (یہ سن کر) میرا ہاتھ پکڑا اور وہ پانچ باتیں گنائیں، اور (اس طرح) بیان فرمایا کہ ① تم ان چیزوں سے بچو، جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اگر تم ان سے بچو گے تو تم لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بندہ ہو گے۔ ② تم اس چیز پر راضی و شاکر رہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں لکھ دیا ہے، اگر تم تقدیر الٰہی پر راضی و مطمئن رہو گے تو تمہارا شمار تونگر ترین لوگوں میں ہو گا، یعنی جب بندہ اپنے مقسوم پر راضی و مطمئن ہو جاتا ہے اور طمع و حرص سے پاک ہو کر زیادہ طلبی کی احتیاج میں رکھتا تو وہ مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا ہے اور تونگری کا اصل مفہوم بھی یہی ہے ③ تم اپنے ہمسایہ سے اچھا سلوک کرو (اگرچہ تمہارے ساتھ برا سلوک کرے) اگر تم ایسا کرو گے تو تم کامل مؤمن سمجھے جاؤ گے ④ تم (دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے متعلق) جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتے ہو اس کو دوسرے سب لوگوں کے لئے پسند کرو، اگر تم ایسا کرو گے تو تم کامل مسلمان سمجھے جاؤ گے ⑤ اور تم زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو، کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ (اور خدا کی یاد سے غافل) بنا دیتا ہے (اگر تم زیادہ ہنسنے سے اجتناب کرو گے تو تمہارا دل روحانی بالیدگی و تروتازگی اور نور سے بھرا رہے گا اور ذکر اللہ کے ذریعہ اس کو زندگی و طمانیت نصیب ہو گی)" اس روایت کو احمدؒ نے نقل کیا ہے اور (ترمذی نے) کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علم، بذات خود افضل و اشرف ہے کہ کسی شخص کا محض علم کا حاصل ہونا اس کی فضیلت کی دلیل ہے، ہاں اگر اس علم پر عمل پیرا ہونے کی دولت بھی نصیب ہو جائے تو اس سے بڑی کوئی سعادت ہی نہیں کہ علم کا اصل مقصود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی عالم اپنے علم پر خود تو عمل نہ کرے البتہ تعلیم و تلقین کے ذریعہ اس علم کی روشنی دوسرے تک پہنچائے اور سیدھی راہ دکھانے کا فریضہ انجام دے تو اس کو اس صورت میں بھی ثواب ملتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بے عمل عالم کا لوگوں کو نیکی و بھلائی کی تلقین کرنا اور برائی سے روکنا درست ہے۔

"محارم" کے مفہوم میں ہر طرح کی ممنوع چیزوں کو اختیار کرنا اور جن چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کو ترک کرنا شامل ہے لہٰذا تم "محارم" یعنی ان چیزوں سے بچو جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف ممنوع اور حرام چیزوں سے اجتناب کرو بلکہ شریعت نے جن چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان کو ترک کرنے سے بھی اجتناب کرو۔

محارم سے اجتناب کرنے والے کو سب سے زیادہ عبادت گزار بندہ اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ محارم سے اجتناب کرنا گویا ان

فرائض سے عہدہ برآ ہونا ہے جو حق تعالیٰ نے عائد کیے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ فرائض کو پورا کرنے سے افضل کوئی عبادت نہیں ہے، جب کہ عام لوگ فرائض کو ترک کرتے ہیں یا ان کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور کثرت نوافل میں مشغول رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ گویا اصول اور بنیاد کو تو ضائع کرتے ہیں اور فروعات و فضائل کو اختیار کرتے ہیں، مثلاً بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص پر روزوں کی قضا واجب ہوتی ہے مگر وہ اس قضا کو ادا کرنے کی طرف سے تو غافل رہتا ہے البتہ حصول علم اور فضل عبادات میں مشغول رہنے کو ترجیح دیتا ہے، یا ایک شخص پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یا لوگوں کے مالی حقوق اس کے ذمہ ہوتے ہیں مگر وہ زکوٰۃ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی طرف تو کوئی توجہ نہیں دیتا البتہ فقراء و مساکین پر خرچ کرنا اور مساجد و مدارس کی تعمیر و اعانت یا اسی طرح کے دوسرے نافلہ امور میں پورے ذوق و شوق کے ساتھ اپنا مال خرچ کرتا ہے۔

تقدیر الٰہی پر راضی و مطمئن ہونا اور اپنے مقسوم پر صابر و شاکر رہنا، بڑا اونچا مرتبہ ہے، جس شخص کو یہ مقام نصیب ہو جاتا ہے وہ حرص و طمع سے پاک رہتا ہے، زیادہ طلبی سے اپنا دامن بچاتا ہے اور قلبی استغنا و تونگری کی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارہ نہیں کرتا۔ منقول ہے کہ ایک شخص نے مشہور بزرگ حضرت سید ابوالحسن شاذلی سے کیمیا کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ (کیمیا) دو باتوں میں پوشیدہ ہے۔ ایک تو یہ کہ تم مخلوق کو نظر سے گرادو (یعنی غیر اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا بنانے کے قابل نہ سمجھو اور اللہ کے سوا کسی اور سے اپنی حاجت کو وابستہ نہ کرو) اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے بھی یہ امید وابستہ نہ کرو کہ وہ تمہیں اس چیز کے علاوہ کچھ اور بھی دے جو اس نے تمہاری قسمت میں لکھ دی ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "اے انسان، اس بات کو جان لے کہ جو چیز تیری قسمت میں لکھی جا چکی ہے وہ ہر حال میں تجھے ملے گی، خواہ تو طلب و سوال کی راہ اختیار کر یا اس راہ کو ترک کردے، اور جو چیز تیری قسمت میں نہیں لکھی ہے وہ تجھ کو کسی حالت میں نہیں ملے گی۔ خواہ تو اس کے طلب کی کتنی ہی حرص رکھے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کتنی ہی سعی و کوشش اور محنت و مشقت برداشت کرے، لہٰذا (تجھے جو کچھ مل جائے) اس پر شاکر و صابر رہ، ہر حالت میں جائز و حلال چیز کو حاصل کرنا ضروری سمجھ اور اپنے مقسوم پر راضی و مطمئن رہ تاکہ رب ذوالجلال تجھ سے راضی و خوش رہے۔

"تم جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ دین و دنیا کی بہتری و بھلائی کی جس چیز کو تم خاص طور پر اپنے لئے پسند کرتے ہو اس چیز کو دوسروں کے لئے بھی پسند کرو، یہاں تک کہ کافر کے لئے ایمان کو اور فاجر کے لئے توبہ و انابت کو پسند کرو۔"

دنیاوی تفکرات اور غم روزگار کی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ

⑱ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ ابْنَ آدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِىْ اَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى وَاَسُدَّ فَقْرَكَ وَاِنْ لَا تَفْعَلْ مَلَأْتُ يَدَكَ شُغْلًا وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ۔ (رواہ احمد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! میری عبادت کے لئے تو اپنے دل کو اچھی طرح مطمئن و فارغ کرلے، میں تیرے سینے کو استغناء سے بھردوں گا (یعنی تیرے دل کو علوم و معارف کی دولت سے مالا مال کردوں گا، جس کے سبب تو غیر اللہ سے بے نیاز و مستغنی ہو جائے گا) اور تیرے لئے فقر و افلاس کی راہ کو بند کردوں گا۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا (یعنی میں نے جو یہ حکم دیا ہے کہ دنیا سے بے پروائی اختیار کرکے اپنے رب کی عبادت کی طرف متوجہ رہ، کہ یہ چیز دنیا و آخرت دونوں جگہ فائدہ پہنچاتی ہے، اگر تو نے اس حکم سے اعراض کیا اور اپنے قوائے فکر و عمل کو میری عبادت میں مشغول رکھنے کے بجائے صرف دنیاوی امور اور اپنے نفس کی خواہشات کی تکمیل میں مشغول و منہمک رکھا) تو میں تیرے ہاتھوں (اور دیگر قوائے عمل کو) طرح طرح کے تفکرات اور مشاغل سے بھر دوں گا اور تیرے فقر و احتیاج کو دور نہیں کروں گا۔" (احمدؒ و ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ فقر و افلاس اور تفکرات و آلام کے بادل محض اس طور سے نہیں چھٹتے کہ اپنے تمام اوقات کو طلب معاش اور حصول مال کی جدوجہد اور محنت و مشقت میں صرف کرے اور ہر لمحہ دنیاوی امور و مشاغل میں سرگرداں رہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں تمام تر پریشانیاں اور سرگردانیاں اپنی جگہ باقی رہتی ہیں جب کہ عبادت خداوندی کے لئے اپنے قوائے فکر و عمل اور اوقات کو دنیاوی فکرات و مشاغل سے فارغ رکھنا کشائش حالات کا ضامن بھی ہے اور غیر اللہ سے استغناء و بے نیازی کے حصول کا باعث بھی، اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ہر وقت غم روزگار کی الجھنوں کو اپنے اوپر مسلط رکھنے اور طلب زر کی راہ میں ناروا محنت و مشقت کی صعوبتوں اور تفکرات میں پھنس کر اپنے آپ کو تعب و غم میں مبتلا رکھنے کی وجہ سے اس مقدار سے زائد تو کچھ حاصل ہونے سے رہا، جو ازل سے قسمت میں لکھ دی گئی ہے البتہ الٹا اثر یہ ضرور ہوگا کہ عبادت خداوندی کو ترک کرنے کے سبب قلبی استغناء کی دولت سے بھی محروم ہو جائے گا۔

ورع کی اہمیت

(۱۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ ذُكِرَ رَجُلٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعِبَادَةٍ وَاجْتِهَادٍ وَذُكِرَ اٰخَرُ بِرِعَةٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَعْدِلُ بِالرِّعَةِ يَعْنِي الْوَرْعَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے سامنے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا گیا جو کثرت کے ساتھ عبادت و طاعت میں مشغول رہتا ہے اور اس میں بہت زیادہ سعی و اہتمام کرتا ہے (اگرچہ وہ گناہوں سے بہت کم اجتناب کرتا ہے) اور ایک دوسرے شخص کے بارے میں ذکر کیا گیا جو پرہیزگاری کو اختیار کرتا ہے (چنانچہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ پہلا شخص افضل ہے یا دوسرا شخص؟) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ (پرہیزگاری کے بغیر) کثرت عبادت و طاعت اور اس میں سعی و اہتمام کرنے کو پرہیزگاری کے برابر نہ ٹھہراؤ (اگرچہ اس پرہیزگاری کے ساتھ عبادت و طاعت کی اس قدر کثرت اور سعی اور اہتمام شامل نہ ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یعنی "الورع" کے الفاظ اصل حدیث کا جزو نہیں ہیں بلکہ کسی راوی کا اپنا قول ہے جس نے ان الفاظ کے ذریعہ رعۃ کی وضاحت کی ہے کہ اس لفظ سے مراد ورع ہے۔ واضح رہے کہ ورع سے مراد تقویٰ ہے یعنی حرام چیزوں سے بچنا، اور جس کے مفہوم میں عبادات واجبہ کو ادا کرنا بھی شامل ہو سکتا ہے۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ "جو شخص عبادت و طاعات تو زیادہ کرے لیکن گناہوں سے اجتناب کے معاملہ میں کمزور ہو وہ اس شخص سے افضل نہیں ہو سکتا جو پرہیزگاری کو اختیار کیے ہوئے ہو، اگرچہ اس کے ہاں عبادت و طاعت کی کثرت اور اس میں زیادہ سعی و اہتمام نہ ہو۔

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو

(۲۰) وَعَنْ عَمْرِو ابْنِ مَيْمُوْنِ الْاَوْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِرَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُهُ اغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقْمِكَ وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيٰوتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت عمرو ابن میمون اودی (تابعیؒ) کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو (یعنی پانچ حالتیں ایسی ہیں کہ جب وہ موجود ہوں تو ان کو ان پانچ حالتوں سے غنیمت سمجھو جو زمانہ آئندہ میں پیش آنے والی ہیں (۱) بڑھاپے سے پہلے جوانی کو یعنی اپنے اس زمانہ کو غنیمت جانو اور اس سے پورا فائدہ اٹھاؤ جس میں تمہیں عبادت و طاعات کی انجام دہی اور خدا کے دین کو پھیلانے کی طاقت و ہمت میسر ہو۔ قبل اس کے کہ تمہارے جسمانی زوال کا زمانہ آجائے اور تم عبادت

وطاعت وغیرہ کی انجام دہی میں ضعف وکمزوری محسوس کرنے لگو ② بیماری سے پہلے صحت کو! یعنی ایمان کے بعد جو چیز سب سے بڑی نعمت ہے وہ صحت وتندرستی ہے، لہٰذا اپنی صحت وتندرستی کے زمانہ میں اگرچہ وہ بڑھاپے کے دور ہی میں کیوں نہ ہو، یعنی دینی ودنیاوی بھلائی وبہتری کے لئے جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو! ③ فقرو افلاس سے پہلے تونگری وخوشحالی کو (یعنی تمہیں جو مال ودولت نصیب ہے قبل اس کے کہ وہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے یا موت کا پنجہ تمہیں اس سے جدا کردے تم اس کو عبادت مالیہ اور صدقات وخیرات میں خرچ کرو اور اس دولتمندی وخوشحالی کو ایک ایسا غنیمت موقع سمجھو جس میں تم اپنی اخروی فلاح وسعادت کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہو! ④ مشاغل وتفکرات میں مبتلا ہونے سے پہلے وقت کی فراغت واطمینان کو۔ ⑤ موت سے پہلے زندگی کو!" اس روایت کو ترمذیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: "اغتنم" کا لفظ "اغتنام" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں غنیمت کا مال لینا! اور "غنیمت" اصل میں تو اس مال کو کہتے ہیں جو مسلمانوں نے لڑکر اور حملہ کر کے حربی کافروں سے حاصل کیا ہو، لیکن اس لفظ کا اطلاق اس چیز پر بھی ہوتا ہے جو کسی محنت ومشقت کے بغیر ہاتھ لگی ہو۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جوانی، صحت، دولت، فراغت وقت اور زندگی ایسی چیزیں ہیں جو ہمیشہ ساتھ نہیں دیتیں۔ جوانی کے بعد بڑھاپے، صحت کے بعد بیماری، دولت کے بعد محتاجگی، فراغت وقت کے بعد تفکرات ومشاغل اور زندگی کے بعد موت کا پیش آنا لازمی امر ہے، لہٰذا جب تک یہ چیزیں پیش نہ آئیں موقع غنیمت جانو اور اس میں اپنی دنیاوی واخروی بھلائی وبہتری کے لئے جو کچھ کر سکتے ہو اس سے غفلت اختیار نہ کرو۔

غنیمت کے موقعوں سے فائدہ نہ اٹھانا اپنے نقصان وخسران کا انتظار کرنا ہے

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا يَنْتَظِرُ اَحَدُكُمْ اِلَّا غِنًى مُطْغِيًا اَوْفَقْرًا مُنْسِيًا اَوْمَرَضًا مُفْسِدًا اَوْهَرَمًا مُفْنِدًا اَوْمَوْتًا مُجْهِزًا اَوِ الدَّجَّالَ فَالدَّجَّالُ شَرٌّ غَائِبٌ يُنْتَظَرُ اَوِ السَّاعَةَ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ۔

(رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں کوئی شخص تونگری کا انتظار کرتا رہتا ہے جو گنہگار کرنے والی اور امرونہی کی حدود سے متجاوز کرنے والی ہے یا فقرو افلاس کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ جو طاعت حق کو بھلا دینے والا ہے (یعنی فقرو افلاس میں مبتلا ہونے والا شخص بھوک وبرہنگی کے مصائب میں گرفتار ہو کر اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے چکر میں پھنس کر خدا کی عبادت وطاعت سے غافل ہو جاتا ہے، بیماری کا انتظار کرتا رہتا ہے جو (اپنی سختی وشدت کی وجہ سے) بدن کو (یا کمزوری یا سستی کے سبب دینی زندگی کو) تباہ کر دینے والی ہے، یا سخت بڑھاپے کا انتظار کرتا رہتا ہے جو بے عقل وبدحواس اور بیہودہ گو بنا دیتا ہے، یا موت کا انتظار کرتا ہے جو ناگہاں کام تمام کر دیتی ہے (کہ بعض وقت توبہ کرنے کا موقع بھی نہیں دیتی) یا دجال کا انتظار کیا جاتا ہے اور وہ آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا، یا وہ قیامت کا انتظار کرتا رہتا ہے جو حوادث، آفات میں سب سے زیادہ سخت وشدید ہے۔" (ترمذیؒ۔ نسائیؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو فرصت وفراغت اور کچھ کر لینے کا موقع نصیب ہوتا ہے وہ اس کو غنیمت نہیں جانتا اور اس طرح گویا وہ اس وقت کا منتظر رہتا ہے جب وہ موقع ہاتھ سے نکل جائے اور ایسی صورت حال پیش آجائے جو اس کو ان بھلائیوں اور سعادتوں سے محروم کر دے جن سے وہ بس اسی گزرے ہوئے زمانہ میں بہرہ مند ہو سکتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص فقرو افلاس میں مبتلا ہوتا ہے تو چاہئے تو یہ کہ وہ اس حالت کو اپنے لئے غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ مال ودولت کی وجہ سے جو خرابیاں اور برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان سے خدا نے بچا رکھا ہے اور اس وقت یہ موقع نصیب ہے کہ اپنی موجودہ حالت پر صبرو استقامت کی راہ اختیار کر کے خدا کا صابر بندہ

بن جاؤں، لیکن اس کے بجائے وہ اپنی حالت فقر کا شاکی ہو کر مال و متاع کا طلبگار ہوتا ہے اس کا نفس اس کو تونگری و مالداری کے پیچھے کھینچے کھینچے پھرتا ہے اور وہ گویا اس مال و دولت کی خواہش رکھتا ہے جس کا نشہ سرکشی میں مبتلا اور راہ راست سے دور کر دیتا ہے، اسی طرح جس شخص کو اللہ تعالیٰ مال و دولت سے نوازتا ہے وہ اپنی اس مالداری کی حالت میں ادائیگی شکر سے بے پرواہ ہوتا ہے اور اس مال و دولت کو بھلائیوں کے کاموں میں خرچ کرنے کے بجائے ادھر ادھر لٹا کر خدا کی اتنی بڑی نعمت کی بے قدری کرتا ہے اور اپنے اس طرز عمل سے گویا فقر و افلاس کی طرف جانا چاہتا ہے جو معاشی تفکرات و پریشانیوں میں مبتلا کر کے عبادات و طاعات سے غافل کر دیتا ہے۔ اسی پر حدیث کے دوسرے جملوں کے مطلب کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ الفاظ "انتظار کرتا رہتا ہے" دراصل ان لوگوں کے حق میں تنبیہ و سرزنش کے طور پر ہیں جو دین کے کاموں میں غفلت و سستی اور عبادات و طاعات میں تقصیر و کوتاہی کرتے ہیں، گویا ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت و طاعت اور اپنے دین کی خدمت کی راہ آخر کب اختیار کرو گے؟ اگر تم نے دین کی خدمت اور اپنے رب کی عبادت و طاعت اس وقت نہیں کی جب تمہیں قلت مشاغل و فراغت وقت اور جسمانی طاقت و توانائی کی صورت میں اس کا بہترین موقع نصیب ہے تو پھر اس وقت کس طرح کر پاؤ گے جب یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا؟ اور کثرت مشاغل اور ضعف بدن و خرابیٔ صحت کی وجہ سے تم اس پر پوری طرح قادر نہیں رہو گے؟ تو کیا تم فائدہ کا موقع چھوڑ کر ٹوٹے کے وقت کے منتظر ہو اور اپنے نقصان و خسران کی راہ دیکھ رہے ہو۔

دنیا کی مذمت

(۲۲) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اِنَّ الدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَّافِيْهَا اِلَّا ذِكْرُ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ۔ (رواه الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یاد رکھو، دنیا ملعون ہے (یعنی دنیا کو بارگاہ خداوندی سے دھتکار دیا گیا ہے کیونکہ یہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے دور رکھتی ہے) اور جو چیز دنیا کے اندر ہے وہ بھی ملعون ہے (یعنی دنیا کی جو چیزیں ذکر اللہ سے غافل رکھتی ہیں ان کو بھی راندۂ درگاہ قرار دے دیا گیا ہے) لہٰذا ذکر اللہ، خدا کی پسندیدہ چیزیں، عالم اور متعلم (وہ چیزیں ہیں جن کو بارگاہ رب العزت میں مقبول قرار دیا گیا ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مقصد، دنیا سے بے رغبت کرنا اور یہ تعلیم دینا ہے کہ دنیا کی جن چیزوں کو خدا نے ناپسند کیا ہے جیسے تمام حرام و ناجائز امور، ان سے اجتناب کرو کہ مبادا ان چیزوں کو اختیار کرنے کی وجہ سے تم بھی راندۂ درگاہ رب العزت قرار پا جاؤ گے، اور جو چیزیں خدا کے یہاں مقبول و پسندیدہ ہیں جیسے ذکر اللہ نیک کام اور تعلیم و تعلم وغیرہ ان کو اختیار کرو تاکہ تم بھی مقبول بارگاہ رب العزت قرار پاؤ خدا کی پسندیدہ چیزوں سے۔" عبادات و طاعات اور تمام وہ چیزیں مراد ہیں جو خدا کی خوشنودی کا باعث اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہیں! یا

ماوالاہ (جس کا ترجمہ "خدا کی پسندیدہ چیزیں" کیا گیا ہے) کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز جو ذکر اللہ کے قریب اور اس کے مشابہ ہو، جیسے انبیاء و اولیاء اور صلحاء کے حالات و فضائل کا ذکر اور اعمال صالحہ۔" یا یہ معنی ہیں کہ وہ چیز جو ذکر اللہ کے تابع اور اس کے لوازم و مقتضیات میں سے ہے جیسے احکام خداوندی (اوامر و نواہی) کی اتباع و فرمانبرداری۔ لہٰذا مَاوَالَاهُ کے پہلے معنی (جو ترجمہ میں نقل کیے گئے ہیں) مراد لینے کی صورت میں لفظ وَالَاهُ کا مادۂ اشتقاق وَلِی ہوگا جس کے معنی محبت اور دوستی کے ہیں، دوسرے معنی مراد لینے کی صورت میں یہ لفظ گویا "ولی" سے مشتق ہوگا جس کے معنی متابعت کے ہیں۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ اس ساری وضاحت کا تعلق اس امر کو تسلیم کرنے سے ہے کہ "ذکر اللہ" سے مراد اللہ تعالیٰ کے نام کا ورد ہے جیسا کہ عام طور پر ذکر اللہ کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے اور اگر "ذکر اللہ" سے مراد ہر وہ عمل خیر ہو جو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی، اس کا تقرب حاصل کرنے اور اس کی عبادت کی نیت سے کیا جائے تو اس معنی کے اعتبار سے تمام ہی عبادتیں

اور طاعتیں "ذکر اللہ" کے مفہوم میں داخل ہوں گی، اور پھر لفظ مَاوَالَاہُ سے وہ چیز مراد ہوں گی جو ذکر اللہ کے اسباب و ذرائع ہونے کی وجہ سے اس کا باعث اور معین و مددگار ہوتی ہے یہاں تک کہ بقدر کفاف کھانا پینا اور ضروریات زندگی کی دیگر چیزوں کا شمار بھی انہی اسباب میں ہوگا! اس صورت میں کہا جائے گا کہ بعد میں عالم اور متعلّم کا ذکر تخصیص بعد تعمیم کے طور پر ہے۔

دنیا کے بے وقعت ہونے کی دلیل

(۲۳) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَاسَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ دنیا اگر خدا کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت رکھتی تو اللہ تعالیٰ اس میں سے کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس دنیا کی کچھ بھی وقعت ہوتی تو اس دنیا کی کوئی ادنی ترین چیز بھی کافر کو نصیب نہ ہوتی، کیونکہ کافر، دشمن خدا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز کچھ بھی قدر و وقعت رکھتی ہے دینے والا وہ چیز اپنے کسی دشمن کو ہرگز نہیں دیتا، لہٰذا دنیا کے بے وقعت اور نہایت حقیر ہونے ہی کا سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دنیا کافروں کو دیتا ہے لیکن اپنے پیارے بندوں کو نہیں دیتا، جیسا کہ ایک حدیث میں اس طرف یوں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

مَازُوِيَتِ الدُّنْيَا عَنْ اَحَدٍ اِلَّا كَانَتْ خَيْرَةً لَّهٗ۔

"دنیا (کے مال و جاہ) کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جس کے لئے دنیا ہی بہتر ہوتی ہے۔"

نیز کفار و فجار جو دنیا میں زیادہ خوشحال و متمول نظر آتے ہیں تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ دنیا بڑی ذلیل چیز ہے جس کو وہ اپنے دوستوں (نیک بندوں) کے لئے اچھا نہیں سمجھتا، بلکہ اس کو کوڑے کرکٹ کی طرح ان لوگوں (کفار و فجار) کے سامنے ڈال دیتا ہے جس سے اس کو نفرت ہے، چنانچہ اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

لَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ۔

"اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ (قریب قریب) تمام لوگ ایک ہی طریقہ کے (یعنی کافر) ہو جائیں گے تو جو لوگ خدا کیساتھ کفر کرتے ہیں ہم ان کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے۔"

نیز قرآن کریم کی ان آیات وَمَاعِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ۔ اور وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔

کمانے میں اتنا منہمک نہ رہو کہ خدا سے غافل ہو جاؤ

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَتَّخِذُوا الضَّيْعَةَ فَتَرْغَبُوْا فِي الدُّنْيَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ضیعۃ کو (اس طرح) اختیار نہ کرو کہ وہ دنیا کی طرف رغبت کا سبب بن جائے۔" (ترمذیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: ضیعۃ سے مراد دنیاوی اسباب و سامان اور کمانے کے ذرائع ہیں جیسے صنعت و تجارت، زراعت، زمین جائداد، اور باغ و گاؤں وغیرہ! حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حصول معاش اور کمانے کے جو ذرائع خواہ وہ مذکورہ چیزیں ہوں یا ان کے علاوہ کچھ اور ہوں، ان میں اس

طرح کی مشغولیت اور انہماک اختیار کرنا ممنوع ہے جس سے انسان عبادت الٰہی اور آخرت کی طرف اچھی طرح متوجہ نہیں رہتا بلکہ زیادہ طلبی کی حرص میں مبتلا ہو کر ہر وقت دنیاوی دھندوں میں مشغول رہتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حدیث میں مذکورہ حکم اس شخص کے حق میں ہے جو حصول معاش کے دنیاوی اسباب و وسائل میں گرفتار ہو اور مسبب حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی طرف توجہ اور اس کی یاد سے بے پرواہ ہو اور حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی سے باز رہے، اگر ایسا نہ ہو تو پھر حصول معاش کے جائز اسباب و ذرائع کو اختیار کرنے اور حلال دنیاوی دھندوں میں مشغول ہونے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم کی اس آیت رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ کے جس طرح یہ معنی مراد لئے جاسکتے ہیں کہ قرآن نے ان الفاظ کے ذریعہ ان لوگوں کی تعریف و تحسین فرمائی ہے جو تجارت و بیع کی مشغولیت کو محض اس لئے اختیار نہیں کرتے کہ امور آخرت کی طرف ان کے متوجہ رہنے میں انہیں کوئی مانع پیش نہ آئے اسی طرح یہ معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں کہ اس آیت میں دراصل ان لوگوں کی تعریف و تحسین فرمائی گئی ہے جو اپنی تجارت وغیرہ میں مشغول رہنے کے باوجود امور آخرت سے غافل نہیں ہوتے بلکہ اپنی دنیا کے ساتھ اپنی آخرت کے صلاح و فلاح کی طرف بھی متوجہ رہتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ موخر الذکر معنی ہی زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں؟ جیسا کہ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ کے الفاظ کی مناسبت سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔

دنیا کی محبت، آخرت کے نقصان کا سبب ہے

(۲۵) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ دُنْيَاهُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِهٖ وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَهٗ اَضَرَّ بِدُنْيَاهُ فَاٰثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اپنی دنیا کو دوست رکھتا ہے (اس قدر دوست رکھنا کہ خدا کی محبت پر غالب آجائے) تو وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے (یعنی آخرت میں اپنے درجہ کو گھٹاتا ہے کیونکہ جب اس پر دنیا کی محبت غالب آجاتی ہے تو اس کا ظاہر و باطن ہمہ وقت دنیاوی امور میں مشغول و منہمک رہتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ امور آخرت اور طاعت الٰہی کے لئے فراغت و موقع سے محروم رہتا ہے) اور جو شخص اپنی آخرت کو درست رکھتا ہے وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچاتا ہے (کیونکہ وہ ہمہ وقت امور آخرت میں مشغول و منہمک رہنے کی وجہ سے دنیاوی امور کی طرف متوجہ نہیں رہتا) پس (جب تم نے یہ جان لیا کہ دنیا اور آخرت کی دوستی ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی تو) تمہیں چاہئے کہ جو چیز فنا ہوجانے والی ہے یعنی دنیا، اس پر اس چیز کو ترجیح دو جو باقی رہنے والی ہے یعنی آخرت۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

مال و زر کا غلام بن جانے والے پر حضور ﷺ کی لعنت

(۲۶) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لُعِنَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَلُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص دینار کا غلام اور درہم کا غلام بن جائے، وہ ملعون ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ جو شخص دینار کا غلام اور درہم کا غلام بن جائے اس پر لعنت ہو۔" (ترمذی)

تشریح: "لعن" کے معنی ہیں ہانک دینا، بھلائی سے محروم کردینا اور اللہ کی رحمت سے دور کردینا! حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مال و زر اور روپیہ پیسہ کی محبت میں اس طرح گرفتار ہوجائے کہ ان کی وجہ سے خدا کی عبادت و طاعت سے بعد اختیار کرلے تو وہ گویا مال و زر اور روپیہ پیسہ کا غلام ہے۔ اور ایسا شخص، تمام بھلائیوں سے محروم، رحمت خداوندی سے دور اور راندۂ درگاہ رب العزت قرار دیا جاتا

ہے۔

جاہ ومال کی حرص دین کے لئے نہایت نقصان دہ ہے

(۲۷) وَعَنْ کَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَاذِئْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلَا فِیْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَ لَهَامِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَی الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِیْنِهٖ۔ (رواہ الترمذی والداری)

"اور حضرت کعبؓ ابن مالک اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "دو بھوکے بھیڑیئے، جن کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے۔ اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا کہ انسان کی حرص، جو مال وجاہ کے تیئں ہو، اس کے دین کو نقصان پہنچاتی ہے۔" (ترمذیؒ، داریؒ)

تشریح: دین کو گویا بکری کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے، اور حرص کا مشابہ بھیڑیئے کو قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ اگر دو بھوکے بھیڑیوں کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے تو وہ بھی اس ریوڑ کو اس طرح تباہ نہیں کرتے جس طرح کہ ایک انسان کی حرص، اس کے دین کو خراب وتباہ کر دیتی ہے۔

حدیث کی سند مشکوٰۃ کے نسخوں میں اس طرح منقول ہے جیسا کہ اوپر نقل کی گی ہے یعنی عن کعب ابن مالک عن ابیہ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس روایت کو حضرت کعب ابن مالکؓ نے اپنے والد سے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے حالانکہ حقیقت میں یہ بات صحیح نہیں ہے اور بربناء سہو وخطا یہ سند اس طرح نقل ہوئی ہے کیونکہ حضرت کعب ابن مالکؓ کے والد کو اسلام کی سعادت نصیب ہی نہیں ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ ان کا آنحضرت ﷺ سے کسی حدیث کو نقل کرنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، لہٰذا یہ سند صحیح طور پر یوں ہے عن ابن کعب ابن مالک عن ابیہ یعنی ابن کعب اپنے والد حضرت کعب ابن مالک سے روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ جامع ترمذی میں یہ سند اسی طرح نقل کی گئی ہے اور مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں بھی اس طرح منقول ہے پس اس حدیث کے اصل راوی حضرت کعب ابن مالکؓ ہیں جو مشہور صحابی ہیں اور ان یعنی صحابہؓ میں سے ایک ہیں جو غزوہ تبوک میں شریک ہونے سے باز رہے تھے اور جن کا قصہ بہت مشہور ہے۔

ضرورت سے زیادہ تعمیر پر روپیہ خرچ کرنا لاحاصل چیز ہے

(۲۸) وَعَنْ خَبَّابٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اَنْفَقَ مُؤْمِنٌ مِنْ نَفَقَةٍ اِلَّا اُجِرَ فِیْهَا اِلَّا نَفَقَتَهٗ فِیْ هٰذَا التُّرَابِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت خبابؓ، رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "مسلمان (اپنی معیشت کے مصارف میں) جو کچھ خرچ اخراجات کرتا ہے اس کو اس کا ثواب دیا جاتا ہے علاوہ اس خرچ کے جو اس مٹی میں کرتا ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ مکان وغیرہ کی تعمیر میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس پر کوئی اجر وثواب نہیں ملتا! لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ وہ تعمیر، وحاجت سے زائد ہو، ورنہ اپنی حاجت کے بقدر گھر بنانا، ضروریات زندگی میں شامل ہے اور اس کی تعمیر پر صرف کیا جانے والا روپیہ پیسہ ضائع نہیں ہوجاتا، اسی طرح ہی خیر وبھلائی کے مکانات جیسے مساجد ومدارس اور ان جیسی دوسری عمارتوں کا معاملہ بھی مذکورہ حکم سے مستثنیٰ ہے کہ ان کا بنانا مستحب ومستحسن ہے۔

(۲۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ النَّفَقَةُ کُلُّهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِلَّا الْبِنَاءَ فَلَا خَیْرَ فِیْهِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(ضروریات زندگی کے) تمام مصارف اللہ کی راہ میں (خرچ کرنے کے برابر) ہیں (یعنی انسان اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات پر جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کو اس کا ثواب ملتا ہے بشرطیکہ تقرب الٰہی کی نیت سے خرچ کرے) البتہ (ضرورت وحاجت سے زائد) تعمیر پر خرچ کرنا کوئی نیکی اور ثواب نہیں رکھتا۔" اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: ضرورت سے زائد تعمیر پر خرچ کرنا اسراف ہے اور اللہ تعالیٰ اسراف کو پسند نہیں کرتا، اس کے برخلاف دیگر ضرورت پر بہ نیت تقرب الٰہی جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے۔ اس میں اسراف کا شائبہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ خرچ لوگوں کو کھلانے اور عطاو بخشش کی قسم سے ہوتا ہے۔ خواہ وہ مستحق ہوں یا غیر مستحق، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں یعنی کھلانے اور عطاء بخشش سے خوش ہوتا ہے۔

بلا ضرورت عمارت بنانے پر وعید

(۳۰) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا وَنَحْنُ مَعَهُ فَرَاٰى قُبَّةً مُشْرِفَةً فَقَالَ مَاهٰذِهٖ قَالَ اَصْحَابُهٗ هٰذِهٖ لِفُلَانٍ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ فَسَكَتَ وَحَمَلَهَا فِيْ نَفْسِهٖ حَتّٰى لَمَّا جَآءَ صَاحِبُهَا فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فِي النَّاسِ فَاَعْرَضَ عَنْهُ صَنَعَ ذٰلِكَ مِرَارًا حَتّٰى عَرَفَ الرَّجُلُ الْغَضَبَ فِيْهِ وَالْاِعْرَاضَ عَنْهُ فَشَكٰى ذٰلِكَ اِلٰى اَصْحَابِهٖ وَقَالَ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاُنْكِرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا خَرَجَ فَرَاٰى قُبَّتَكَ فَرَجَعَ الرَّجُلُ اِلٰى قُبَّتِهٖ فَهَدَمَهَا حَتّٰى سَوَّاهَا بِالْاَرْضِ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَمْ يَرَهَا قَالَ مَافَعَلَتِ الْقُبَّةُ، قَالُوْا شَكٰى اِلَيْنَا صَاحِبُهَا اِعْرَاضَكَ فَاَخْبَرْنَاهُ فَهَدَمَهَا فَقَالَ اَمَا اِنَّ كُلَّ بِنَآءٍ وَبَالٌ عَلٰى صَاحِبِهٖ اِلَّا مَالَا اِلَّا مَالَا يَعْنِيْ اِلَّا مَالَا بُدَّ مِنْهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول کریم ﷺ (کہیں جانے کے لئے) باہر نکلے۔ ہم صحابہؓ کی ایک جماعت بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھی، آپ ﷺ نے راستہ میں، ایک بلند قبہ کو دیکھا تو تحقیر ونفرت کے لہجہ میں فرمایا کہ یہ قبہ کیا ہے؟ (یعنی یہ ناپسندیدہ عمارت کس نے بنائی ہے؟) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ قبہ فلاں شخص نے بنایا ہے جو ایک انصاری ہے۔ آپ ﷺ (یہ سن کر) خاموش رہے اور (کچھ فرمایا تو نہیں لیکن) اس بات کو (ناگواری اور غصہ کے طور پر) اپنے دل میں رکھا یہاں تک کہ جب اس قبہ کا مالک آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے لوگوں کی موجودگی میں آپ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا (یعنی یا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب ہی نہیں دیا یا جواب تو دیا لیکن اس سے منہ پھیر لیا اور دوسرے لوگوں کو بھی تنبیہ ہو جائے) آنحضرت ﷺ نے ایسا کئی مرتبہ کیا (کہ وہ شخص آپ ﷺ کو سلام کرتا اور آپ ﷺ اس کا جواب نہ دیتے اور اس سے منہ پھیر لیتے تھے) آخرکار اس شخص نے آپ ﷺ کے چہرہ پر غصہ کے آثار محسوس کیے اور آپ ﷺ کے منہ پھیر لینے (سے آپ ﷺ کی نفرت) کو معلوم کر لیا چنانچہ اس شخص نے (ان) صحابہؓ سے (کہ جو حضور ﷺ کے خاص مصاحب اور ہم نشین تھے اس امر کا شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ بخدا، میں ایسا دیکھ رہا ہوں جیسے رسول کریم ﷺ مجھ سے ناآشنا ہوں (یعنی میں رسول کریم ﷺ کے چہرہ مبارک پر جس غضب وغصہ کے آثار دیکھ رہا ہوں وہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور مجھے اس کا سبب بھی معلوم نہیں کہ آپ ﷺ کیوں اتنا سخت ناراض ہیں؟) ان صحابہؓ نے اس کو بتایا کہ (ایک دن) حضور ﷺ ادھر (تمہاری طرف) تشریف لے گئے تھے اور (جب وہاں) تمہارے قبہ کو دیکھا (تو ناراض ہو گئے تھے)۔ اس شخص (نے یہ سنا تو فورا) اپنے قبہ کی طرف گیا اور اس کو ڈھادیا یہاں تک کہ زمین کے برابر کر دیا! (اس واقعہ کے بعد) ایک دن رسول کریم ﷺ پھر ادھر تشریف لے گئے اور قبہ کو وہاں نہیں دیکھا تو دریافت فرمایا کہ وہ قبہ کیا ہوا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ قبہ بنانے والے نے اپنے تئیں آپ ﷺ کی بے التفاتی اور ناراضگی کا ہم سے شکوہ کیا تھا (اور اس کا سبب دریافت کیا) تو ہم نے اس کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا (کہ حضور ﷺ تم سے اس لئے ناراض ہیں کہ تم نے اس قبہ کی صورت میں ایک ناپسندیدہ تعمیر کرائی ہے) چنانچہ اس شخص نے اس قبہ کو ڈھادیا

ہے تب آپ ﷺ نے (اس عمارت کی ناپسندیدگی اور اپنی ناراضگی کا سبب بیان کرنے کے لئے) فرمایا کہ۔ "یاد رکھو! یہ عمارت اپنے بنانے والے کے لئے آخرت میں وبال یعنی عذاب کا سبب بنے گی اِلَّا مَالاَ اِلَّا مَالاَ یعنی علاوہ اس چیز کے، کہ جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: "وبال" کے اصل معنی بوجھ، سختی اور مکروہ کے ہیں! حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو عمارت بنائی جاتی ہے وہ آخرت میں اپنے مالک کے لئے عذاب کا سبب بنتی ہے، لیکن واضح رہے کہ یہ حکم اس عمارت کے حق میں ہے جو ضرورت وحاجت سے زائد ہو، اظہار شان و شوکت اور محض عیش وعشرت کے لئے بنائی گئی ہو، ورنہ تو وہ عمارت جو اپنے اور اپنے متعلقین کی رہائشی ضروریات کے بقدر رہو یا جو عمارت خیر و بھلائی کے امور کے لئے ہو جیسے مساجد و مدارس اور خانقاہیں وغیرہ، وہ مذکورہ وعید سے مستثنیٰ ہیں، اسی طرح ہر وہ چیز کہ جو انسان کی جسمانی توانائی کو باقی رکھنے اور لباس و رہائش کے طور پر ضروریات زندگی کا درجہ رکھتی ہو، آخرت میں کسی وبال کا باعث نہیں بنے گی۔

بیہقی نے بھی حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ مسجد (اور خیر و بھلائی کے کام میں آنے والی دیگر عمارتوں کے علاوہ، ہر عمارت اپنے مالک پر قیامت کے دن وبال ہوگی! (اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ایسی عمارت کہ جو رہائشی ضروریات سے زائد اور اظہار شان وشوکت کے لئے ہو) اسی طرح طبرانیؒ نے حضرت واثلہؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ ہر عمارت وبال ہے علاوہ اس عمارت کے جو بس اس قدر ہو، اور یہ فرما کر اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کے ذریعہ اشارہ فرمایا (یعنی یہ اشارہ فرمایا کہ جو عمارت بہت مختصر اور محض رہائشی ضروریات کے بقدر رہو وہ وبال نہیں ہے) نیز ہر علم، قیامت کے دن وبال ہوگا، علاوہ اس علم کے جس پر عمل کیا جائے۔

کفایت و قناعت کی نصیحت

(۳۱) وَعَنْ اَبِیْ هَاشِمِ بْنِ عُتْبَةَ قَالَ عَهِدَ اِلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا یَكْفِیْكَ مِنْ جَمِیْعِ الْمَالِ خَادِمٌ وَمَرْكَبٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِیْ بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِیْحِ عَنْ اَبِیْ هَاشِمِ بْنِ عُتْبَدٍ بِالدَّالِ بَدَلَ التَّآءِ وَهُوَ تَصْحِیْفٌ۔

"اور حضرت ابوہاشم ابن عتبہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔ "دنیا کے تمام مال میں سے جو کچھ تمہارے لئے کافی ہے وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ تمہارے پاس ایک خادم ہو اور ایک سواری ہو جو خدا کی راہ میں کام (یعنی اگر تم دنیاوی چیزوں میں سے کچھ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو تو بس یہ دو چیزیں رکھو کہ سواری کے جانور کے ذریعہ جہاد، حج اور حصول علم کے لئے سفر کر سکو اور خادم اس سفر میں تمہاری خدمت کرے! دنیا کے اموال میں سے ان دو چیزوں سے زائد کچھ نہ رکھو بلکہ صرف کر ڈالو! حاصل یہ کہ اس ارشاد کا مقصود اس امر کی تلقین کرنا ہے کہ بقدر ضرورت مال واسباب پر اکتفاو قناعت کی جائے اور ان میں سے بھی ان چیزوں کو اختیار کیا جائے جو راہ آخرت کا توشہ ہیں۔" (اس روایت کو احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔"

اور مصابیح کے بعض نسخوں میں حدیث کی سند عن ابی ہاشم ابن عتبد منقول ہے یعنی عتبۃ میں تاء کی بجائے دال ہے اور یہ غلط ہے جو کسی راوی کے سہو کا نتیجہ ہے (گویا صحیح ہاشم ابن عتبۃ ہی ہے)۔

ضرویارت زندگی کی مقدار کفایت اور اس پر انسان کا حق

(۳۲) وَعَنْ عُثْمَانَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیْسَ لِابْنِ اٰدَمَ حَقٌّ فِیْ سِوٰی هٰذِهِ الْخِصَالِ بَیْتٌ یَسْكُنُهٗ وَثَوْبٌ یُوَارِیْ بِهٖ عَوْرَتَهٗ وَجِلْفُ الْخُبْزِ وَالْمَآءُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔" ابن آدم ان چیزوں کے علاوہ اور کسی چیز پر اپنا حق نہیں رکھتا، ایک تو گھر

کہ جس میں وہ رہائش اختیار کرے (یعنی ایسا گھر جو رہائشی ضروریات کے بقدر ہو کہ جو سردی گرمی سے محفوظ رکھ سکے) دوسرے کپڑا، کہ جس سے وہ اپنا ستر ڈھانکے، تیسرے بغیر سالن کے خشک روٹی (کہ جس سے وہ اپنی بھوک دفع کر سکے) اور چوتھے پانی کہ جس سے وہ اپنی پیاس بجھا سکے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "حق" سے مراد وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے واجب کی گئی ہے اور جس پر آخرت میں کوئی سوال و مواخذہ نہیں ہو گا، یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کی جن چیزوں کو ضروریات زندگی کے طور پر بنایا ہے ان کو انسان اسی قدر حاصل کرنے اور اس سے بہرہ مند ہونے کا حقدار و مجاز ہے جس قدر کہ اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو چنانچہ جو شخص ان چیزوں کو حلال وسائل ذرائع سے حاصل کرے گا اور بقدر ضرورت پر اکتفاء و قناعت کرے گا اس سے آخرت میں ان چیزوں کے بارے میں کوئی سوال و مواخذہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ بقدر ضرورت مذکورہ چیزیں ان لوازمات میں سے ہیں جن کے بغیر نفس انسانی کے لئے کوئی چارہ نہیں ہے، ہاں ان کے علاوہ دنیا کی اور جو چیزیں ہیں یا انہی چیزوں کی ضرورت سے زائد جو مقداریں ہیں وہ سب لوازمات زندگی میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ لذات نفس میں سے ہیں اور ان کے بارے میں آخرت میں یقیناً مواخذہ و مطالبہ کیا جائے گا۔

جِلْفٌ (جیم کے زیر اور لام کے جزم کے ساتھ) سے مراد ہے بغیر سالن کے خشک موٹی روٹی! ایک روایت میں یہ لفظ جَلْف (جیم کے زبر کے ساتھ) بھی منقول ہے جو جِلْفَةٌ کی جمع ہے اور جس کے معنی ہیں خشک روٹی کا ٹکڑا، کہ جس کے ذریعہ بھوک کو دفع کیا جائے۔

خدا اور لوگوں کی نظر میں محبوب بننے کا طریقہ

(۳۳) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ إِذَا أَنَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللّٰهُ وَأَحَبَّنِيَ النَّاسُ قَالَ ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيْمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے (بارگاہ رسالت میں) حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول (ﷺ) مجھ کو کوئی ایسا عمل بتا دیجئے کہ میں جب اس کو اختیار کروں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت رکھے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "دنیا سے زہد اختیار کرو (یعنی دنیا کی محبت میں گرفتار نہ ہو، اس کی فضولیات سے اعراض کرو اور امور آخرت کی طرف متوجہ رہو) اگر تم ایسا کرو گے تو گویا تم اس چیز سے نفرت کرنے والے ہوں گے جس سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے اور اس کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ تم سے محبت رکھے گا اور اس چیز کی طرف رغبت نہ کرو جو لوگوں کے پاس ہے (یعنی جاہ و دولت) لوگ تم سے محبت کریں گے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: کسی چیز کی طرف خواہش و میلان نہ رکھنے کو "زہد" کہتے ہیں، اور کامل و صادق زہد یہ ہے کہ دنیا کی لذات میسر ہونے کے باوجود ان سے بے رغبتی اختیار کی جائے! چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس شخص کے بارے میں "زہد" تصور ہی نہیں ہو سکتا جو نہ مال و دولت رکھتا ہو اور نہ جاہ و حشم کا مالک ہو، بلکہ حقیقت کے اعتبار سے "زاہد" وہی شخص ہے جو مال و دولت اور جاہ و حشم کا مالک ہونے کے باوجود ان کی لذات سے دور رہے! منقول ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت ابن مبارکؒ کو "یا زاہد" کہہ کر مخاطب کیا تو انہوں نے فرمایا کہ زاہد تو بس حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ تھے، جن کے دامن میں دنیا کھنچی آتی تھی مگر اس کے باوجود وہ دنیاوی لذات سے ترک تعلق رکھتے تھے اور ہمارے پاس کیا رکھا ہے کہ ہم زہد اختیار کریں گے! حاصل یہ کہ اصل میں "زہد" یہ ہے کہ لوازمات دنیا میں کھانے پینے اور پہننے کی فراوانی کے باوجود بقدر ضرورت پر قناعت کی جائے اور فضولیات کو ترک کیا جائے۔

دنیا کے عیش و آرام سے حضور ﷺ کی بے رغبتی

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلٰى حَصِيْرٍ فَقَامَ وَقَدْ أَثَّرَ فِيْ جَسَدِهٖ فَقَالَ ابْنُ

مَسْعُوْدٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَبْسُطَ لَکَ وَنَعْمَلَ فَقَالَ مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا وَمَا اَنَا وَالدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ بوریئے پر سوئے اور سو کر اٹھے تو آپ ﷺ کے جسم مبارک پر بوریئے کے نشان پڑے ہوئے تھے (یہ دیکھ کر) حضرت ابن مسعودؓ نے عرض کیا کہ یا رسول (ﷺ)، اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم آپ (ﷺ) کے لئے نرم بستر بچھادیں اور اچھے کپڑوں کا انتظام کردیں (تاکہ آپ ﷺ اس سخت بوریئے پر لیٹنے سے بے آرامی محسوس نہ کریں) حضور ﷺ نے فرمایا۔ "(عزیز) مجھ کو اس دنیا (کے عیش و آرام) سے اور اس دنیا کو مجھ سے کیا سروکار؟ میری اور دنیا کی مثال تو بس ایسی ہے جیسے کوئی سوار کسی درخت کے نیچے سایہ کی تلاش میں آئے اور وہاں (کچھ دیر تک سایہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے) اپنی سواری ہی پر کھڑا رہے اور پھر اس درخت کو وہیں چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف چل دے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح : مالی وللدنیا میں حرف ما، نفی کے لئے ہے اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو مجھے اس دنیا کے ساتھ کچھ الفت ہے اور نہ اس دنیا کو میرے ساتھ کوئی محبت والفت ہے کہ میں اس دنیا کے تیئں کوئی رغبت وچاہت رکھوں، اس کا عیش و آرام چاہوں اور اس کی بے آرامی سے بچنے کے لئے اس کی آرام دہ چیزوں جیسے نرم وگدیلے بستر اور نفیس واعلی کپڑوں وغیرہ کا مالک بنوں۔ ویسے اس حرف ما کو استفہامیہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے (جیسا کہ ترجمہ میں اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے) اور اس صورت میں جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھ کو اس دنیا سے کون سی الفت، محبت ہے یا اس دنیا کی طرف میری رغبت ومیلان سے یا میری طرف اس دنیا کی رغبت والفت سے مجھے کون سی نفع بخش چیز حاصل ہوگی؟ کیونکہ میں تو آخرت کا طلبگار ہوں اور دنیا اس آخرت کی سوکن اور ضد ہے۔

درخت کے سایہ سے فائدہ اٹھانے کے ضمن میں خاص طور پر سواری کا ذکر کرنا اس درخت کے نیچے اس کے ٹھہرنے کی مدت کے قلیل ہونے اور جلد ہی وہاں سے رخصت ہوجانے کی بناء پر ہے، یعنی یہ بات سب جانتے ہیں کہ کسی درخت کے سایہ سے فائدہ اٹھانے والا اگر کوئی سوار مسافر ہو، اور وہ اپنی سواری سے اترے بغیر اس درخت کے نیچے کھڑا ہے تو وہ وہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ بلکہ بہت قلیل عرصہ کے لئے اس سایہ میں کھڑا رہ کر آگے چل دیتا ہے۔ نیز سوار کی مثال بیان کرنے سے اس طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جس طرح کسی مسافر کی منزل مقصود جب دور ہوتی ہے تو وہ دوران سفر کسی راحت وآرام کی زیادہ پرواہ کیے بغیر زیادہ سے زیادہ راستہ طے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہاں وہاں زیادہ ٹھہر کر اپنا وقت برباد نہیں کرتا اسی طرح ہم بھی اس دنیا میں ایک مسافر کی طرح ہیں کہ ہماری منزل مقصود یعنی آخرت بہت دور ہے اور اس کا راستہ کٹھنائیوں سے بھرا ہوا ہے لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی راہ آخرت کو زیادہ سے زیادہ طے کرنے کی سعی واہتمام کریں اور کسی بھی ایسی چیز کی طرف ملتفت اور مائل نہ ہوں جو منزل مقصود کی طرف ہمارے سفر میں رکاوٹ بن سکے۔

قابل رشک زندگی

(۳۵) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَغْبَطُ اَوْلِیَائِیْ عِنْدِیْ لَمُؤْمِنٌ خَفِیْفُ الْحَاذِ ذُوْحَظٍّ مِنَ الصَّلٰوۃِ اَحْسَنَ عِبَادَۃِ رَبِّہٖ وَاَطَاعَہٗ فِی السِّرِّ وَکَانَ غَامِضًا فِی النَّاسِ لَا یُشَارُ اِلَیْہِ بِالْاَصَابِعِ وَکَانَ رِزْقُہٗ کَفَافًا فَصَبَرَ عَلٰی ذٰلِکَ ثُمَّ نَقَدَ بِیَدِہٖ فَقَالَ عُجِّلَتْ مَنِیَّتُہٗ قَلَّتْ بَوَاکِیْہِ قَلَّ تُرَاثُہٗ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابو امامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میرے نزدیک (یعنی میرے دین ومذہب کے اعتبار سے) میرے دوستوں (تمام مؤمنین) میں نہایت قابل رشک (یعنی اموال کے اعتبار سے سب سے اچھا اور مال ودولت کے اعتبار سے سب سے افضل) وہ مؤمن جو سبکسار ہے، نماز سے بہت زیادہ بہرہ مند ہوتا ہے اور اپنے رب کی سب ہی عبادتیں خوبی کے ساتھ کرتا ہے (اور جس

طرح ظاہر میں عبادت کرتا ہے اسی طرح مخفی طور پر (خلوت میں بھی) طاعت الٰہی میں مشغول رہتا ہے، لوگوں میں گمنام ہے کہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ نہیں کیا جاتا (یعنی اپنے علم وعمل کے سبب لوگوں میں مشہور ومعروف نہیں ہے بلکہ نہایت بے نفسی کے ساتھ گوشۂ گمنامی میں رہ کر علم وعمل کے ذریعہ دین وملت کی خدمت کرتا ہے) نیز اس کی روزی (یعنی ضروریات زندگی کا خرچ) بقدر کفایت ہے اور اسی پر صابر وقانع ہے۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے ذریعہ چٹکی بجائی اور فرمایا۔ "اس کی موت بس یوں (چٹکی بجاتے) اپنا کام جلد پورا کرلیتی ہے اور اس کی موت پر رونے والی عورتیں بھی کم ہوتی ہیں اور اس کا ترکہ بھی بہت مختصر (یعنی نہ ہونے کے برابر) ہوتا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "حاذ" کے معنی سواری کی پشت کے ہیں اور قاموس کے مطابق خفیف الحاذ کا مطلب قلیل المال و العیال خفیف الحاذ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو زیادہ اہل وعیال کو بوجھ اور مال ودولت کی گرانباری نہ رکھتا ہو۔ صراح میں یہ لکھا ہے کہ "خفیف الحاذ" کے معنی ہلکی پیٹھ کے ہیں یعنی وہ شخص جو زیادہ اہل وعیال اور مال ودولت کے جھمیلوں سے فارغ ہو بہرحال دونوں ہی صورتوں میں ایسا شخص چونکہ دنیاوی تفکرات ومشغولیات سے عاری ہوتا ہے اور فراغ قلب ووقت رکھتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت اور دین وملت کی خدمت میں اچھی طرح مشغول رہتا ہے اور از قسم علائق کوئی چیز اس کی راہ عبادت وخدمت میں رکاوٹ نہیں بنتی۔

"نماز سے بہت زیادہ بہرہ مند ہوتا ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضور قلب اور مناجات مع اللہ کے ساتھ نماز بہت زیادہ پڑھتا ہے اور اپنا زیادہ تر وقت عبادت خداوندی میں صرف کرتا ہے کیونکہ اہل وعیال اور دنیاوی جھمیلوں سے بہت کم تعلق رکھنے اور قلت مشغولیت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ نماز وعبادت ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے، بلکہ نماز وعبادت میں اس کو حضور قلب بھی بہت زیادہ حاصل ہوتا ہوتا ہے چنانچہ حقیقی درویش اور خدا رسیدہ لوگ دنیاوی علائق وتعلقات سے کنارہ کشی اس لئے اختیار کرتے ہیں تاکہ نماز وعبادت خداوندی میں زیادہ سے زیادہ حضور قلب حاصل کرسکیں۔

"لوگوں میں گمنام ہے" میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ عبادت وریاضت کے لئے لوگوں کے درمیان بود وباش ترک نہیں کرتا بلکہ ان کے درمیان رہ کر ہی عبادت وریاضت اور دین وعلم کی خدمت میں خاموشی کے ساتھ مشغول رہتا ہے اور اپنے آپ کو عام شہرت سے بچائے رکھتا ہے گویا اس جملہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اپنے کو عام شہرت سے بچانے کے لئے لوگوں کے درمیان سے چلا جاتا ہے اور سب سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا ہے کیونکہ عام لوگوں کے درمیان بود وباش ترک کردینا اور کنارہ کشی اختیار کرلینا بجائے خود موجب شہرت ہے! نیز اس جملہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ "لوگوں" سے مراد عوام الناس ہیں، چنانچہ خواص یعنی اولیاء وصلحاء کے درمیان اس کا متعارف ہونا کہ جن کا وہ ہمنشین رہتا ہے، اس کے مذکورہ مرتبہ کے منافی نہیں ہے۔ یہ بات بعد کے جملہ ولا یشاء الیہ الخ سے بھی مفہوم ہوتی ہے۔

لقد بیدہ، کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ آپ نے اپنے انگوٹھے کے پورے کو اپنی بیچ کی انگلی کے پورے پر مارا جس سے نکلی ہوئی آواز کو سنا گیا۔ اور حاصل یہ کہ جس طرح عام طور پر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ کسی بات پر اظہار حیرت وتعجب کے لئے یا کسی کام کی مدت کو کم سے کم بیان کرنے کے لئے چٹکی بجا کر کہتے ہیں کہ فلاں کام بس یوں چٹکی بجاتے ہوگیا اسی طرح حضور نے بھی مذکورہ مؤمن کا حال بیان فرمایا کہ وہ دنیا میں اپنی مذکورہ حالت وکیفیت کے ساتھ زندہ رہتا ہے کہ موت اس کے رشتہ جسم وجان کو چند دن کے بعد ختم کردیتی ہے اور وہ فتنہ وآشوب سے بھرے ہوئے اس عالم سے بہت جلد انتقال کرجاتا ہے اور یہاں کی آفات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات پا جاتا ہے۔ یا یہ مراد ہے ایسا مؤمن چونکہ اس دنیا سے بہت کم تعلق رکھتا ہے اور شوق آخرت اس پر غالب ہوتا ہے اس لئے وقت موعود آنے پر وہ نہایت آسانی اور سکون کے ساتھ بہت جلد اپنی جان، آفرین کے سپرد کردیتا ہے۔

دنیا سے آنحضرت ﷺ کی بے رغبتی

(۳۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّيْ لِيَجْعَلَ لِيْ بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا فَقُلْتُ لَا يَارَبِّ وَلٰكِنْ اَشْبَعُ يَوْمًا وَاَجُوْعُ يَوْمًا فَاِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ اِلَيْكَ وَذَكَرْتُكَ وَاِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَشَكَرْتُكَ۔

(رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میرے رب نے میرے سامنے اس امر کو ظاہر کیا کہ وہ میرے لئے مکہ کے سنگریزوں کو سونا بنادے، لیکن میں نے عرض کیا کہ میرے پروردگار! مجھ کو اس چیز کی قطعا خواہش نہیں ہے میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک روز بھوکا رہوں کہ جب میں بھوکا ہوں تو تیرے حضور گڑگڑاؤں، اپنی عاجزی بیان کروں اور تجھے یاد کروں اور جب میں شکم سیر ہوں تو تیری حمد و تعریف کروں اور تیرا شکر ادا کروں۔" (احمدؒ ترمذیؒ)

تشریح: آنحضور ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ کی مذکورہ پیش کش یا تو حسی و ظاہری طور پر تھی یا معنوی یعنی باطنی طور پر اور یہ دوسری مراد زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اس صورت میں آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں مجھ سے مشورہ فرمایا اور مجھے اختیار دیا کہ چاہے آپ ﷺ اس دنیا میں وسعت و فراخی اور یہاں کے مال و زر کی فراوانی کو پسند کریں اور چاہے دینا سے بے رغبتی اختیار کر کے توشۂ آخرت کی فکر میں لگے رہیے اور وہاں کے حساب و عذاب سے نجات کی راہ اختیار کر لیجئے! لہٰذا میں نے دنیا کو ٹھکرا دیا اور آخرت کو پسند کر لیا۔

"بطحاء" اور "ابطح" اس کشادہ نالہ کو کہتے ہیں جس سے پانی گزرتا ہے اور جس میں ریت اور سنگریزے جمع ہو جاتے ہیں۔ مکہ کے سنگریزوں کو سونا بنانے سے مراد یہ تھی کہ مکہ کے اطراف میں جو نالے اور پانی کے نکاس کے راستے ہیں ان سب کو سونے سے بھر دیا جائے یا یہ کہ ان نالوں میں جو سنگریزے ہیں ان کو سونے میں تبدیل کر دیا جائے۔ اور یہ دوسری مراد زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایک دوسری حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے کہ (اگر آپ ﷺ چاہیں تو اللہ تعالیٰ) مکہ کے پہاڑوں کو سونے میں تبدیل کر دے۔ حدیث کے آخری جملوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لئے دنیاوی وسعت و فراخی اور خوشحالی کی پیش کش کے باوجود میں نے دنیا کے مال و زر کو ٹھکرا دیا اور فقر کو اختیار کر لیا کہ اگر ایک روز شکم سیر ہوں تو دوسرے روز بھوکا رہوں اور اس طرح صبر اور شکر دونوں کی فضیلت پاؤں۔ اس ارشاد گرامی کے ذریعے حضور ﷺ نے گویا امت کو تعلیم و تلقین فرمائی کہ اگرچہ دولتمندی بھی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے لیکن اس کی آفات بھی بہت ہیں اور انسان دولتمندی کی حالت میں زیادہ گمراہ ہوتا ہے لہٰذا فقر و قناعت کو اختیار کرنا زیادہ موزوں ہے اس لئے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ غنا یعنی دولتمندی کے مقابلہ میں فقر، افضل ہے۔

دنیا کی اصل نعمتیں

(۳۷) وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ مِحْصَنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمْ اٰمِنًا فِيْ سِرْبِهٖ مُعَافًى فِيْ جَسَدِهٖ عِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبید اللہ ابن محصنؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں سے جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ وہ اپنی جان کی طرف سے بے خوف ہو (ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی اس کا بدن درست و باعافیت ہو اور اس کے پاس (حلال ذریعہ سے حاصل کیا ہوا) ایک دن کی بقدر ضرورت خوراک کا سامان ہو تو گویا اس کے لئے تو کم دنیا (کی نعمتیں) جمع کر دی گئی ہیں۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "وہ اپنی جان کی طرف سے بے خوف ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنے کسی دشمن کی طرف سے کسی نقصان وضرر کا خدشہ نہ ہو یا یہ کہ برے کاموں سے بچنے اور اپنی لغزشوں پر خدا سے توبہ کر لینے کی وجہ سے ان آفات سے بے خوف ہو، جو عذاب الٰہی کے طور پر نازل ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ لفظ "سرب" سین کے زیر اور راء کے جزم کے ساتھ (یعنی سرب) زیادہ مشہور ہے۔ جو نفس، راستہ، حال اور دل، ان سب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اگر یہاں حدیث میں اس لفظ سے ان سب چیزوں کو مراد لیا جائے تو یہ بھی منشاء حدیث کے مناسب ہوگا، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص اس حال میں صبح کو اٹھے کہ اس کو مذکورہ چیزوں کے بارے میں کسی نقصان وضرر کا کوئی خوف وخدشہ نہ ہو الخ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ لفظ سین اور راء دونوں کے زبر کے ساتھ (یعنی سرب) ہے جس کے معنی خانہ زیر زمین کے ہیں یعنی وہ بل وسوراخ جو وحشی جانوروں، جیسے چوہے وغیرہ کا مسکن ہوتے ہیں، اگر اس قول کو صحیح مان لیا جائے، یہ معنی بھی منشاء حدیث کے منافی نہیں ہوتے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ جو شخص اس حال میں صبح کو اٹھے کہ اس کے گھر کے بلوں اور سوراخوں میں رہنے والے چوہوں اور لومڑیوں وغیرہ کی طرف سے کہ جو آفات زمانہ میں سے ہیں اس کو کسی نقصان وضرر کا کوئی خوف وخدشہ نہ ہو.... الخ۔"

کھانا زیادہ سے زیادہ کتنا کھایا جائے

(۳۷) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامَلَأَ اٰدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِّنْ بَطْنٍ بِحَسْبِ ابْنِ اٰدَمَ اُكُلَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهٗ فَاِنْ كَانَ لَا مُحَالَةَ فَثُلُثٌ طَعَامٌ وَّثُلُثٌ شَرَابٌ وَّثُلُثٌ لِنَفَسِهٖ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت مقدام ابن معدیکرب کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "انسان (اگر اپنے پیٹ کو حد سے زیادہ بھر لے تو اس) نے پیٹ سے بدتر کوئی برتن نہیں بھرا (کیونکہ پیٹ کو زیادہ بھرنے سے جو برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا کوئی شمار نہیں، ابن آدم کے لئے بس چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پشت کی ہڈی کو سیدھا اور کھڑا رکھیں (تاکہ وہ اطاعت الٰہی کی بجا آوری اور بقدر ضرورت اپنی معاشی جدوجہد کو جاری رکھنے پر قادر رہ سکے، ہاں اگر ضروری ہو (یعنی کوئی پیٹ بھرنا ہی چاہتا ہو اور کھانے کی کم سے کم مقدار کفایت پر قناعت نہ کر سکتا ہو) تو اس کو چاہئے کہ پیٹ کے تین حصے کرے ایک حصہ کھانے کے لئے ہو ایک حصہ پانی کے لئے ہو اور ایک حصہ سانس (کی آمد ورفت) کے لئے (خالی چھوڑ دے تاکہ دم گھٹنے کی وجہ سے ہلاکت میں مبتلا نہ ہو جائے۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: جیسا کہ طیبی نے لکھا ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ واجب تو یہ ہے کہ کھانے کے معاملہ میں اس حد سے تجاوز نہ کیا جائے جو پیٹھ کو قائم رکھنے یعنی جسمانی توانائی کو برقرار رکھنے کے لئے کافی ہو اور یہ بھی اس لئے تاکہ خدا کے احکام بجالانے کی طاقت وقدرت حاصل رہے، ہاں اگر کوئی شخص اس حد کفایت پر قناعت نہ کر سکے اور وہ اس حد سے تجاوز کرے یعنی زیادہ مقدار میں کھانے کی خواہش رکھے تو وہ بھی بس اسی قدر زیادہ کھائے جو پیٹ کے تین حصوں میں سے ایک حصے کو بھر دے، باقی دو حصوں میں سے ایک حصہ پانی کے لئے اور ایک حصہ خالی رہنا چاہئے۔ اپنی خوراک کی مقدار میں اس آخری حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

واضح رہے کہ اس حدیث میں پہلے تو پیٹ کو ان معمولی برتنوں کی طرح ایک برتن قرار دیا گیا ہے جو گھر کی ضروریات میں کام آتے ہیں اور اس طرح یہ اشارہ فرمایا گیا کہ پیٹ ایک بے حیثیت چیز ہے، پھر یہ واضح فرمایا کہ برتنوں میں بھی (یہ پیٹ) گویا سب سے برا برتن ہے کیونکہ عام طور پر تمام برتن انہی کاموں میں استعمال کیے جاتے ہیں جن کے لئے ان کو بنایا گیا ہے، اس طرح پیٹ کا اصل موضوع یہ ہے کہ اس میں خوراک کی بس اتنی مقدار ڈالی جائے جو جسمانی توانائی کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہو اور اگر اس کو ضرورت سے زیادہ بھرا جائے تو نہ صرف اس کے مقصد سے تجاوز ہوگا بلکہ اس کی وجہ سے ایسی برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوں گی جو دین ودنیا دونوں کو نقصان

پہنچائیں گی، اس اعتبار سے پیٹ گویا سب سے برا برتن ہوا۔

بھوک کے دس فوائد: "بھوک" بظاہر بڑا بھیانک لفظ ہے اور آج کی دنیا کا نہایت سنگین مسئلہ ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اگر بھوک کا تعلق "قوت لایموت" تک کے فقدان سے ہو اور کوئی انسان نان جویں کی اس مقدار سے بھی محروم رہے جس کا بقاء زندگی کے لئے پیٹ میں پہنچنا ضروری ہے تو واقعۃً وہ "بھوک" انسان کے لئے پیغام اجل سے کم نہیں، لیکن اگر "بھوک" سے مراد کم کھانا، یا وقتاً فوقتاً فاقہ ہو، تو وہ بھوک بھی ہماری اس دنیا کے نقطہ نظر سے چاہے کتنا ہی سنگین مسئلہ ہو مگر حقیقت میں اس "بھوک" کے جو فوائد ہیں، طبی اور روحانی نقطہ نظر سے ہیں ان کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا! بعض حضرات نے ان فوائد کو بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ ایک اونچے درجہ کے اسلامی محقق اور عارف باللہ حضرت شیخ ابو حامدؒ نے لکھا ہے کہ "بھوک" میں دس فوائد پوشیدہ ہیں، اول یہ کہ قلب اور بصارت کی صفائی حاصل ہوتی ہے کیونکہ پیٹ کا بھرا ہوا ہونا طبیعت کو سست و کند، قلب کو بوجھل اور دماغ پر انجارات کا غلبہ کر دیتا ہے، دوسرے یہ کہ قلب میں رقت و نرمی اور پاکیزگی آتی ہے اور اس کی وجہ سے دل یاد الٰہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ طبیعت و مزاج میں انکسار پیدا ہوتا ہے اور اس تکبر و حرص اور عشرت پسندی کا خاتمہ ہوتا ہے جو طغیان و سرکشی کا مبداء ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کا نفس، جس قدر انکسار پسند بھوک کی حالت میں ہوتا ہے کہ اس قدر انکسار اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوتا، چوتھے یہ کہ عذاب الٰہی آفات و بلاء قدرت اور اہل بلاء فراموش نہیں ہوتے۔ چنانچہ جو لوگ ہر وقت اپنا پیٹ بھرا رکھتے ہیں وہ نہ تو بھوک کی اذیت کو محسوس کر سکتے ہیں اور نہ بھوکوں کو یاد کر سکتے ہیں! پانچویں یہ کہ نیند کا غلبہ کم ہوتا ہے اور بیداری کی کیفیت طاری رہتی ہے، کیونکہ جو شخص پیٹ کو کھانے سے بھر لیتا ہے وہ پانی بھی بہت پیتا ہے، زیادہ پانی پینا، نیند کی زیادتی کا سبب ہوتا ہے اور نیند کی زیادتی نہ صرف یہ کہ عبادت و طاعت، جیسے تہجد وغیرہ کو فوت کرتی ہے، طبیعت کو مکدر اور دل کو سخت بناتی ہے بلکہ زیادہ سونا، گویا عمر کو ضائع کرنا ہے، اور ظاہر ہے کہ عمر، بہت اعلیٰ جوہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے عطا نہیں کیا ہے کہ اس کو بیکار گنوایا جائے بلکہ اس کو انسان کے حق میں راس المال بنایا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنے دینی و دنیاوی معاملات کی صلاح و فلاح کے امور انجام دے۔ علاوہ ازیں "نیند" ایک طرح کی موت ہے، لہٰذا اپنے اوپر نیند کو غالب رکھنا گویا عمر کو چھوٹی کرنا ہے! چھٹے یہ کہ عبادت و طاعت کی پابندی و ہمیشگی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ جو شخص زیادہ کھاتا ہے اس کے اوقات کا زیادہ حصہ کھانے پینے کی مشغولیت میں صرف ہوتا ہے مثلاً اس کو کچھ وقت تو بازار سے سودا سلف لانے اور اشیاء خوراک کی فراہمی میں لگانا پڑتا ہے، کچھ وقت کھانے کی تیاری میں صرف ہوتا ہے، کھانا کھاتے وقت بھی کافی وقت دینا پڑتا ہے اور پھر کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے اور کھانے کے بعد منہ کی صفائی اور خلال کرنے اور بار بار پانی کے لئے پانی کی جگہ آنے جانے جیسے کاموں میں بھی کافی وقت صرف ہوتا ہے، غرضیکہ بہت ہی وقت کا خرچ ہے اور اگر ان اوقات کو کھانے پینے کی مشغولیات سے بچا کر عبادت و طاعت اور ذکر و مناجات میں لگائے تو کہیں زیادہ فائدہ حاصل کرے! مشہور عالم اور بزرگ حضرت علامہ تستری کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے حضرت علی جرجانیؒ کو ستو پھانکتے دیکھا تو عرض کیا کہ حضرت ایسی کون سی وجہ پیش آگئی جو آپ ستو پھانک رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ بھئی کیا پوچھتے ہو، میں نے ایک دن حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ایک چپاتی کھانے کے دوران اتنا وقت صرف ہوتا ہے جتنا کہ ستر تسبیحات پڑھنے میں (میں نے سوچا کہ اس طرح تو روٹیاں کھانے میں، بہت وقت لگتا ہے اور اس وقت کو بچا کر دوسرے مفید کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے) لہٰذا میں نے روٹیاں کھانی چھوڑ دیں اور چالیس برس سے ایک چپاتی بھی نہیں کھائی ہے بلکہ بھوک کی شدت کم کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً ستو پھانک لیا کرتا ہوں۔ ساتویں یہ کہ کم کھانے کی وجہ سے بدن کی صحت و تندرستی بحال رہتی ہے اور امراض کا دفیعہ ہوتا ہے کیونکہ اکثر امراض کا سبب کھانے کی زیادتی اور کھانے پینے میں بے اعتدالی ہوتی ہے، پھر زیادہ کھانے کی وجہ سے امراض صرف پیدا نہیں ہوتے بلکہ وہ عبادت سے باز رکھتے ہیں اور تشویش و فکر میں مبتلا کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت کا بڑا حصہ، حکیم ڈاکٹر کے پاس آنے جانے، علاج معالجہ کرنے، اور دواء وغیرہ کی فراہمی میں صرف ہوتا ہے اور سب چیز جو محنت

مشقت اور پریشانی برداشت کرنا پڑتی ہے وہ اس کے علاوہ ہوتی ہے، لہٰذا انسان اگر کم کھائے اور وقتاً فوقتاً فاقہ کرتا رہے تو ان پریشانیوں سے نجات مل جائے! آٹھویں یہ کہ حصول معاش کی جدوجہد اور روزی کمانے کی محنت مشقت زیادہ نہیں کرنا پڑتی، کیونکہ جو شخص کم کھانے کی عادت ڈال لیتا ہے اس کے لئے تھوڑی سی محنت مشقت سے حاصل کیا ہوا تھوڑا سامال و اسباب بھی کافی ہو جاتا ہے! نویں یہ کر ایثار و احسان اور صدقہ و خیرات کے داعیہ کو پورا کرنے پر آسانی سے قدرت حاصل ہوتی ہے، یعنی کم کھانے کی صورت میں جو کھانا اپنی خوراک سے بچ جاتا ہے اس کو غریب و مسکین اور فقیر و محتاج کو بطور صدقہ دینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا، اور ظاہر ہے کہ صدقہ و خیرات کرنے والا شخص قیامت کے دن اپنے اس صدقہ و خیرات کے سایہ میں رحمت خداوندی سے بہرہ مند ہو گا، نیز یہ حقیقت بھی سامنے آنی چاہئے کہ انسان جو کچھ خود کھاتا پیتا ہے اس کو تو وہ گویا بیت الخلاء میں جا کر جمع کر دیتا ہے اور جو کچھ فقیر و محتاج پر صدقہ و خیرات کرتا ہے اس کو اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر دیتا ہے کہ وہ وہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہتر جزاء پائے گا! اور دسواں یہ کہ جو بھوک کے مذکورہ بالا فائدوں میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ان خواہشات و جذبات کی بیخ کنی ہوتی ہے جو انسان کو ہر طرح کے گناہ پر ابھارتے ہیں، اور نفس امارہ پر غلبہ و قابو حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ کم کھانا ہر طرح کی نفسانی خواہش کو مارتا ہے اور شہوانی خواہشات کو مضمحل کر دیتا ہے اور یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ دین و دنیا کی تمام سعادتیں اور بھلائیاں اس امر میں پوشیدہ ہیں کہ انسان اپنے نفس کا مالک اور اس پر قابو یافتہ ہو اور ہر طرح کی شقاوت و بدبختی اس میں پوشیدہ ہے کہ انسان اپنے نفس کا غلام بن جائے اور خود پر اس کو قابو دے دے۔

لمبی ڈکار لینے کی ممانعت

(۳۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلًا یَتَجَشَّأُ فَقَالَ اَقْصِرْ مِنْ جُشَاءِكَ فَاِنَّ اَطْوَلَ النَّاسِ جُوْعًا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَطْوَلُهُمْ شِبَعًا فِی الدُّنْیَا۔ رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَی التِّرْمِذِیُّ نَحْوَهٗ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو ڈکارتے سنا تو اس سے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو (یعنی اتنا زیادہ نہ کھایا کرو کہ لمبی لمبی ڈکاریں آنے لگیں) اس لئے کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے بڑا بھوکا وہ ہوگا جو دنیا میں ان میں سب سے بڑے پیٹ والا ہو گا۔ یعنی جو شخص اس دنیا میں بہت زیادہ کھانے والا ہو گا اس کو قیامت کے دن بھی بہت زیادہ بھوک لگے گی۔ جس کی وجہ سے وہ نہایت پریشانی میں مبتلا ہو گا۔" "بغویؒ" نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: حدیث میں صحابیؓ کے ڈکارنے کا ذکر ہے ان کا نام وہب ابن عبداللہ تھا اور ان کا شمار چھوٹی عمر والے ان صحابہؓ میں ہوتا ہے جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بالغ نہیں ہوئے تھے! خود ان کا بیان ہے کہ ایک دن میں نے گوشت کا ثرید کھایا، اور ڈکاریں لیتا ہوا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اپنی ڈکاروں کو روکو۔ اور اس کے بعد وہی الفاظ ارشاد فرمائے جو اوپر نقل کیے گئے ہیں! مذکورہ ارشاد میں ڈکار لینے کی جو ممانعت فرمائی گئی ہے اس کا مقصد، جیسا کہ حدیث کے آخری جزو سے واضح ہوتا ہے، اتنا زیادہ کھانے سے منع کرنا ہے جس سے پیٹ ضرورت سے زیادہ بھر جائے۔ اور جو لمبی لمبی ڈکاریں لینے کا باعث بنتا ہے۔ منقول ہے کہ حضرت وہب ابن عبداللہ نے حضور ﷺ کی مذکورہ ممانعت کے بعد تا زندگی کبھی بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ اگر رات میں کھا لیتے تو دن میں نہیں کھاتے اور جب دن میں کھا لیتے تو رات میں نہیں کھاتے۔

مال و دولت ایک فتنہ ہے

(۴۰) وَعَنْ کَعْبِ بْنِ عِیَاضٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ لِکُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ اُمَّتِی الْمَالُ۔
(رواہ الترمذی)

"اور حضرت کعب ابن عیاض کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (حق تعالیٰ کی طرف سے) ہر اُمت کے لئے (کوئی نہ کوئی) فتنہ و آزمائش ہے (جس میں اس اُمت کے لوگوں کو مبتلا کر کے ان کو آزمایا جاتا ہے) چنانچہ میری اُمت کے لئے جو چیز فتنہ آزمائش ہے وہ مال و دولت ہے یعنی اللہ تعالیٰ میری اُمت کے لوگوں کو مال و دولت دے کر یہ آزمانا چاہتا ہے کہ وہ راہ مستقیم اور حد اعتدال پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔" (ترمذی)

جو مالدار صدقہ و خیرات کے ذریعہ آخرت کے لئے کچھ نہیں کرتے ان کے بارے میں وعید

(۴۱) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُجَاءُ بِابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كَاَنَّهٗ بَذَجٌ فَيُوْقَفُ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ لَهٗ اَعْطَيْتُكَ وَخَوَّلْتُكَ وَاَنْعَمْتُ عَلَيْكَ فَمَا صَنَعْتَ فَيَقُوْلُ رَبِّ جَمَعْتُهٗ وَثَمَّرْتُهٗ وَتَرَكْتُهٗ اَكْثَرَ مَا كَانَ فَارْجِعْنِيْ اٰتِكَ بِهٖ كُلِّهٖ فَيَقُوْلُ لَهٗ اَرِنِيْ مَا قَدَّمْتَ فَيَقُوْلُ رَبِّ جَمَعْتُهٗ وَثَمَّرْتُهٗ وَتَرَكْتُهٗ اَكْثَرَ مَا كَانَ فَارْجِعْنِيْ اٰتِكَ بِهٖ كُلِّهٖ فَاِذَا عَبْدٌ لَمْ يُقَدِّمْ خَيْرًا فَيُمْضٰى بِهٖ اِلَى النَّارِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَضَعَّفَهٗ۔

"اور حضرت انس نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن ابن آدم کو اس طرح حقارت و ذلت کے ساتھ) پیش کیا جائے گا گویا کہ وہ بکری کا بچہ ہے، پھر اس کو اللہ تعالیٰ کے روبرو کھڑا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ (فرشتہ کی وساطت سے یا خود براہ راست زبان قال یا زبان حال سے) اس سے فرمائے گا کہ میں نے (دنیا میں) تجھ کو (زندگانی، عمل و دانش، صحت و تندرستی اور امن و عافیت جیسی نعمت عطاء کی تھی (مال و دولت، حشم و خدم اور جاہ و عزت جیسی چیزوں کا مالک) بنایا تھا اور (اس سے بڑی) نعمت (یہ) عطا کی تھی (کہ اپنی کتاب نازل کی، اپنا رسول ﷺ بھیجا اور ہدایت و راستی کا نور پھیلایا) پس تو نے کیا کام کیا؟ یعنی کیا تو نے ان چیزوں کے حقوق ادا کیے اور ان سب نعمتوں کا شکر گزار رہا؟" ابن آدم عرض کرے گا۔ "میرے پروردگار! میں نے (تو بس یہ کیا کہ تجارت اور کاروبار کے ذریعہ) مال و دولت جمع کرنے اور اس کو بڑھانے میں لگا رہا اور (مرتے وقت) اس کو دنیا میں اس سے زیادہ چھوڑ کر آیا جتنا کہ (میری زندگی کے دنوں میں پہلے میرے پاس) تھا، اور اب آپ مجھے دنیا میں دوبارہ بھیج دیجئے تاکہ میں اس تمام مال و دولت کو (آپ کی راہ میں خرچ کروں اور اس کا ثواب) لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔" اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ (یہ تو ممکن نہیں کہ تمہیں دنیا میں دوبارہ بھیجا جائے اور تم جو مال و دولت دنیا میں چھوڑ کر چلے آئے تھے وہ بھی اب تمہارے لئے کارگر نہیں ہے، ہاں اگر) تم نے (اس مال و دولت میں سے کچھ حصہ بھی صدقہ و خیرات کیا ہو اور ثواب کی صورت میں) اس کو آگے (یہاں آخرت میں) بھیجا ہو تو مجھے اس کو دکھلاؤ۔" (لیکن اس نے چونکہ اس مال و دولت سے کچھ بھی حصہ آخرت کے کاموں میں خرچ نہیں کیا ہوگا اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر نہایت شرمندہ و خجل ہوگا اور جیسا کہ مجرموں کی عادت ہے کے جب اپنے جرم میں پکڑے جاتے ہیں اور اپنی صفائی میں کوئی معقول عذر بیان نہیں کر سکتے تو بار بار ایک ہی بات کو جو پہلے کہہ چکے ہوتے ہیں، دہراتے رہتے ہیں، وہ ابن آدم بھی ایک تو اس وجہ سے اور دوسرے اپنی اس بات کا جواب نہ پانے کی وجہ سے دوبارہ وہ عرض کرے گا کہ "میں تو بس مال و دولت کو جمع کرنے اور اس کو بڑھانے میں لگا رہا اور اس کو دنیا میں اس سے زیادہ چھوڑ کر آیا جتنا کہ پہلے تھا اور اب آپ مجھے دنیا میں دوبارہ بھیج دیجئے تاکہ میں اس تمام مال و دولت کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔"

اس طرح یہ ظاہر ہو جائے گا کہ (اس کو دنیا میں جو مذکورہ چیزیں دی گئی تھیں ان میں سے) اس نے کوئی بھی بھلائی آگے (آخرت میں) نہیں بھیجی ہے لہٰذا اس کو دوزخ میں پہنچائے جانے کا حکم دیا جائے گا۔" اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور اس (کی اسناد) کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (اگرچہ معنی کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح ہے)

تشریح: طیبی نے کہا ہے کہ اس حدیث میں ابن آدم کی جس حالت کو ذکر کیا گیا ہے کہ جس بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ چیزیں، اور

نعمتیں حاصل ہوں اور وہ ان کے ذریعہ آخرت کی بھلائی حاصل کرنے سے غافل رہے تو اس کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کو اس کا آقا بہت سامال واسباب اس مقصد کے لئے دے کہ وہ اس کے ذریعہ تجارت کر کے زیادہ سے زیادہ نفع کمائے مگر وہ (غلام) اپنے آقا کی مرضی اور اس کے حکم سے سرتابی کر کے اس سارے مال واسباب کو لٹا کر تلف وضائع کر دے یا ایسے کاروبار اور تجارت میں پھنسا دے جس کا حکم اس کو نہیں دیا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ وہ غلام نہ صرف نااہل سمجھا جائے گا بلکہ مستوجب سرزنش بھی قرار پائے گا، ٹھیک اسی طرح وہ بندہ بھی نہایت ٹوٹے میں رہے گا اور مستوجب عذاب قرار دیا جائے گا۔

ابو حامدؒ نے کہا ہے کہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگرچہ ہر بھلائی، ہر لذت اور ہر سعادت یہاں تک کہ ہر مطلوب. کو "نعمت" کہا جاتا ہے لیکن حقیقی نعمت بس "اخروی سعادت" ہے اس کے علاوہ، کسی بھی چیز کو "سعادت" کہنا غلط ہے. بلکہ کسی دنیاوی چیز پر مجازا بھی "سعادت" کا اطلاق کرنا یعنی اس کو "دینوی ساعدت" کہنا بھی صحیح نہیں ہے، ہاں جو دنیاوی چیزیں "اخروی سعادت" کے حصول کا سبب و ذریعہ ہوں اور اس کی راہ میں کسی ایک واسطہ یا کئی واسطوں کے ساتھ معاون ومددگار ہوں تو ان چیزوں کو "نعمت" کہنا صحیح ہو سکتا ہے اور یہ بھی اس وجہ سے کہ وہ چیز "حقیقی نعمت" تک پہنچا سکتی ہیں۔

ٹھنڈا پانی اور تندرستی، خدا کی بڑی نعمت ہے

(۴۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَایُسْاَلُ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مِنَ النَّعِیْمِ اَنْ یُّقَالَ لَهٗ اَلَمْ نُصِحَّ جِسْمَكَ وَنُرَوِّكَ مِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن سب سے پہلے بندے سے نعمتوں کے بارے میں جو سوال کیا جائے گا وہ یہ ہوگا کہ "کیا ہم نے تیرے بدن کو تندرستی نہیں عطا کی تھی اور تجھ کو ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا۔" (ترمذی)

تشریح: یوں تو ہر وہ چیز خدا کی نعمت ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑی نعمت تندرستی اور پانی ہے، اسی لئے قیامت کے دن سب سے پہلے انہی دونوں نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

ایک بڑے بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے اپنے مرید سے فرمایا۔ "پانی ٹھنڈا کر کے پیا کرو کیونکہ ٹھنڈا پانی، خدا کا شکر، دل کی گہرائیوں سے ادا کراتا ہے۔ نیز حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے والد ماجدؒ کے بارے میں خوب یاد ہے کہ وہ جب بھی ٹھنڈا پانی پیتے بیخود ہو جاتے، اور جب تھوڑی دیر تک اسی عالم بیخودی میں رہنے کے بعد اپنی حالت پر واپس آتے، تو فرماتے، سبحان اللہ! یہ ٹھنڈا پانی بھی کیا چیز ہے اور خدا نے اس کو کتنا بہترین جوہر بنایا ہے؟ اور اسی طرح کے عالم ذوق وتوحید سے متعلق کلمات ارشاد فرماتے! حاصل یہ کہ پانی بذات خود تو بہت بڑی نعمت ہے ہی، لیکن ٹھنڈا پانی جو کیف ولذات اور جو فوائد اپنے اندر رکھتا ہے ان کی وجہ سے اس نعمت کا درجہ کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ قدرت نے پانی کو چیز تو ایسی عزیز اور اہم بنایا کہ زندگی کا مدار ہی اس پر ہے لیکن عام اتنا کیا کہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس موقع پر ایک بڑی دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کسی طرح بھٹک کر کہیں اور جنگل میں پہنچ گیا، وہاں اس کو پیاس لگی مگر آس پاس پانی کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا، پیاس کے ساتھ اس کا اضطراب بڑھتا رہا یہاں تک کہ مرنے کے بالکل قریب پہنچ گیا تو اچانک اس کے سامنے ایک عارف یا کوئی فرشتہ نمودار ہوا اور بولا کہ اگر میں تمہیں پانی پلا دوں تو تم مجھے کیا دو گے؟ بادشاہ نے فوراً جواب دیا کہ اپنا آدھا ملک! اس غیبی انسان نے اس کو پانی پلا دیا، اس کے بعد اس کا پیشاب رک گیا۔ اس نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح پیشاب کر لے، مگر نامراد رہا۔ اور سخت پریشانی میں مبتلاء ہو گیا آخر کار پھر وہی غیبی انسان نمودار ہوا اور کہا کہ اگر میں تمہارے اس مرض کا علاج کر دوں اور تمہارا پیشاب کھل جائے تو مجھے کیا انعام دو گے؟ بادشاہ نے کہا کہ "باقی آدھا ملک بھی تمہیں ہی دے دوں گا۔ اس نے علاج کیا اور بادشاہ کا پیشاب کھل گیا۔ تب اسی غیبی انسان نے کہا کہ "بادشاہ

سلامت! آپ اپنا ملک خود سنبھالئے، مجھے اس کی حاجت نہیں ہے، لیکن اپنی سلطنت اور اپنے ملک کی حیثیت دیکھ لیجئے (کہ ذرا سے پانی اور پیشاب کے لئے آپ نے تمام ملک و سلطنت کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا، لہٰذا اتنی بے حیثیت چیز اور اس کی ظاہری چمک دمک پر کبھی گھمنڈ نہ کیجئے گا۔"

آخر میں ایک بات یہ ملحوظ رہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں تندرستی اور پانی دونوں نعمتوں کو ایک ساتھ ذکر کرنے میں گویا اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، کہ یہ دونوں اتنی عظیم الشان اور اہم نعمتیں ہیں کہ تمام ملک و سلطنت ایک طرف اور یہ دونوں نعمتیں ایک طرف۔

وہ پانچ نعمتیں جن کے بارے میں قیامت کے دن جوبداہی کرنا پڑے گی

(۴۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُسْأَلُ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمْرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن انسان کے پاؤں سرکنے نہیں پائیں گے اور اس کو بارگاہ رب ذوالجلال میں اس وقت تک کھڑا رکھیں گے جب تک کہ اس سے پانچوں باتوں کا جواب نہیں لے لیا جائے گا، چنانچہ اس سے پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں صرف کی، (بالخصوص یہ کہ) اس نے اپنی جوانی کو کس کام میں بوسیدہ کیا (یعنی جوانی گویا نیا لباس ہے جو رفتہ رفتہ پرانا ہوتا ہے) اس نے مال کیونکر کمایا (یعنی اس نے دنیا میں جو کچھ مال و دولت اور روپیہ پیسہ کمایا وہ حلال وسائل و ذرائع سے حاصل کیا یا حرام ذرائع سے؟) اس نے مال کو کہاں خرچ کیا (یعنی اپنے مال اور روپیہ پیسہ کو اچھے کاموں میں صرف کیا یا برے کاموں میں گنوایا) اور یہ کہ اس نے جو علم حاصل کیا تھا اس کے موافق عمل کیا یا نہیں؟" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حضرت ابودرداءؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دن انہوں نے حضرت عُوَیمِرؓ سے فرمایا کہ عویمر! (خیال کرو) قیامت کے دن تمہاری کیا کیفیت ہوگی جب تم سے سوال کیا جائے گا کہ آیا تم عالم تھے یا جاہل؟ اگر تم یہ جواب دو گے کہ میں عالم تھا تو پھر تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے جو کچھ علم حاصل کیا اس کے موافق کیا عمل کیا؟ اور اگر تم نے یہ جواب دیا کہ میں تو جاہل تھا، تو پوچھا جائے گا کہ تمہارے لئے جاہل رہنے کی کیا وجہ تھی اور تم نے علم کیوں حاصل نہیں کیا؟

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

برتری محض تقویٰ سے حاصل ہو سکتی ہے، رنگ و نسل سے نہیں

(۴۴) عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ اِنَّكَ لَسْتَ بِخَيْرٍ مِنْ اَحْمَرَ وَلَا اَسْوَدَ اِلَّا اَنْ تَفْضُلَهٗ بِتَقْوٰى۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا۔ (ابوذر!) تم نہ تو سرخ رنگ والے سے بہتر ہو اور نہ سیاہ رنگ والے سے الا یہ کہ تم ان دونوں میں سے کسی سے تقویٰ کے اعتبار سے افضل ہو۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انسانی فضیلت و برتری، ظاہری شکل و صورت اور رنگ و نسل پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کا مدار دینی اخلاقی کردار کی عظمت اور تقویٰ پر ہے! واضح رہے کہ حدیث میں صرف دو رنگوں سرخ اور سیاہ کا ذکر اس بناء پر کیا گیا ہے کہ زیادہ تر لوگ انہی دو

رنگ کے ہوتے ہیں، اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان دونوں رنگوں والوں سے مراد آقا اور غلام ہیں چنانچہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آقا گورے رنگ کا ہوتا ہے اور غلام کالے رنگ کا۔

طیبیؒ نے حدیث کی وضاحت میں کہا ہے کہ یہاں سرخ سے مراد اہل عجم اور سیاہ رنگ سے مراد اہل عرب ہیں۔ چنانچہ (اس زمانہ میں) اہل عرب، عجم والوں یعنی غیر عرب لوگوں کو، "احمر" (سرخ) کہا کرتے تھے، کیونکہ ان کے رنگ پر سرخی اور سفیدی غالب ہوتی تھی، اور اہل عرب کو "اسود" (سیاہ) کہا جاتا تھا کیونکہ ان کی رنگت پختہ ہوتی تھی اور اس پر سیاہی اور سبزی کا غلبہ ہوتا تھا۔

نیز حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لکھا ہے کہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی فضیلت و برتری کا تعلق تقویٰ اور عمل صالح سے ہے اور تقویٰ و عمل صالح کے بغیر کسی بھی وصف و خصوصیت کی طرف نسبت کوئی فضیلت نہیں رکھتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے) یہ بات ملحوظ رہے کہ "تقویٰ" اپنے مراتب و درجات کے اعتبار سے کئی اقسام پر مشتمل ہے، سب سے ادنیٰ قسم یا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہر حالت میں شرک جلی سے اجتناب کیا جائے۔ اوسط درجہ یہ ہے کہ ہر قسم کے گناہ ہر طرح کی برائی ہر طرح کے لہو و لعب اور شرک خفی سے اجتناب کیا جائے۔ اور سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ہر لمحہ خدا کے ساتھ تعلق و حضور رکھا جائے اور دل میں ماسوی اللہ کا خیال بھی نہ آنے دیا جائے۔

دنیا سے زہد و بے رغبتی کی فضیلت

(۴۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَازَهِدَ عَبْدٌ فِی الدُّنْیَا اِلَّا اَنْبَتَ اللّٰہُ الْحِكْمَةَ فِیْ قَلْبِهٖ وَاَنْطَقَ بِهَا لِسَانَهٗ وَبَصَّرَهٗ عَیْبَ الدُّنْیَا وَدَاءَهَا وَدَوَاءَهَا وَاَخْرَجَهٗ مِنْهَا سَالِمًا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ۔ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس بندہ نے دنیا میں (زائد از ضرورت و حاجت، دنیاوی مال و جاہ سے) زہد یعنی بے رغبتی اختیار کی، اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں حکمت یعنی معرفت و یقین کی دولت پیدا کی، اس کی زبان کو، اس (حکمت) کے ساتھ گویا کیا اور اس کو دنیا کے عیوب (جیسے کثرت غم و رنج، قلت غناء خست شرکاء، سرعت فنا اور ذکر الٰہی سے دل کی غفلت وغیرہ کو یقین کی آنکھوں سے) دیکھنے والا کیا، نیز اس دنیا کی بیماری (یعنی دنیاوی محبت کی علت و سبب) اور (علم و عمل، صبر و قناعت اور دنیا سے اجتناب و بے رغبتی اختیار کرنے اور تقدیر الٰہی پر راضی رہنے کی توفیق بخش کر) اس بیماری کا علاج بھی اس کو دکھایا اور (اس کے دنیا سے اعراض کرنے اور عقبیٰ کی طرف متوجہ رہنے کے سبب) حق تعالیٰ نے اس کو دنیا (کی آفات و بلیات) سے سلامتی کے ساتھ دار السلام میں پہنچا دیا۔" (بیہقی)

تشریح: "دار السلام" سے مراد "جنت" ہے اور اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ بکمال تمام حقیقی سلامتی بس دار آخرت اور جنت ہی میں حاصل ہوگی۔ منقول ہے کہ ایک عارف درویش سے لوگوں نے پوچھا کہ کہئے، آپ کا کیا حال ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ خدا نے چاہا تو سلامتی ہے بشرطیکہ جنت میں پہنچ جاؤں۔"

صلاح و فلاح کا انحصار خلوص ایمان پر ہے

(۴۶) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَخْلَصَ اللّٰہُ قَلْبَهٗ لِلْاِیْمَانِ وَجَعَلَ قَلْبَهٗ سَلِیْمًا وَلِسَانَهٗ صَادِقًا وَنَفْسَهٗ مُطْمَئِنَّةً وَخَلِیْقَتَهٗ مُسْتَقِیْمَةً وَجَعَلَ اُذُنَهٗ مُسْتَمِعَةً وَعَیْنَهٗ نَاظِرَةً فَاَمَّا الْاُذُنُ فَقَمْعٌ وَاَمَّا الْعَیْنُ فَمُقِرَّةٌ لِمَا یُوْعِی الْقَلْبُ وَقَدْ اَفْلَحَ مَنْ جُعِلَ قَلْبُهٗ وَاعِیًا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص فلاح یاب ہوا جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے (نفاق کی آمیزش سے پاک کر کے) ایمان کے لئے خالص و مخصوص کر دیا، (یعنی اس کو ایمان خالص عطا کیا) اس کے دل کو (بغض وحسد اور تمام برے کاموں وبرے احوال، جیسے دنیا کی محبت اور مولی اور عقبی سے بے پروائی وغیرہ سے) محفوظ وسالم رکھا! اس کی زبان کو راست گو بنایا، اس کے نفس کو (اللہ کے ذکر اور اس کی محبت کے ذریعہ مطمئن کیا (اور اس کو حق کا مطیع بنایا) اس کی خلقت وطبیعت کو (کجی وباطل کی طرف مائل اور افراط و تفریط میں مبتلا ہونے سے بچا کر) مستقیم اور سیدھا رکھا، اس کے کانوں کو (حق بات کا) سننے والا بنایا، اور اس کی آنکھوں کو (وحدانیت کے دلائل ومشاہدات اور پروردگار کے نظام قدرت وصنعت کا) دیکھنے والا بنایا، پس کان تو "قیف" ہیں اور آنکھ اس چیز کو قائم اور ثابت رکھنے والی ہے جس کو دل محفوظ کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شخص فلاح یاب ہوا جس کے دل کو خدا نے یا خود اس شخص نے اپنے دل کو (حق بات اور برحق چیزوں کا) محافظ بنایا۔" (احمدؒ۔ بیہقیؒ)

تشریح: "قمع" کے معنی قیف کے ہیں اور قیف ٹونٹی دار یا نلکی دار ظرف کی صورت میں اس آلہ کو کہتے ہیں جس کو بوتلوں وغیرہ کے منہ پر رکھ کر ان میں کوئی رقیق چیز جیسے تیل وغیرہ بھرتے ہیں۔ "پس کان تو قیف ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قیف کے ذریعہ کوئی رقیق چیز بوتلوں وغیرہ میں ڈالی جاتی ہے اسی طرح کان وہ ذریعہ ہے جو حق بات کو انسان کے قلب ودماغ میں اتارتا ہے بایں طور کہ کان اس بات کو سنتا ہے اور قلب ودماغ اس کو قبول کرتے ہیں۔

"اور آنکھ اس چیز کو قائم اور ثابت رکھنے والی ہے..... الخ۔" اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو آنکھیں دیکھتی ہیں، دل ان کا ظرف ہوتا ہے یا وہ چیزیں دل کو اپنا ظرف بناتی ہیں کہ وہ آنکھوں کے ذریعہ دل میں داخل ہوتی ہے! گویا جس طرح کان، حق بات کو دل تک پہنچاتا ہے اس طرح نظر آنے والے حقائق آنکھوں کی راہ سے دل میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے اندر قائم وثابت رہتے ہیں! حدیث کے آخری جزء میں گویا ان دونوں چیزوں کا نتیجہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جس شخص نے حق بات کو سن کر اور برحق چیزوں کو دیکھ کر انہیں اپنے دل میں اتار لیا اور ان کی محافظت کی یعنی بہر صورت حق پر عامل رہا تو وہ فلاح یاب قرار پائے گا۔

کفار وفجار کو دنیاوی مال ودولت کا ملنا گویا انہیں بتدریج عذاب تک پہنچانا ہے

(۴۷) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا رَأَيْتَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُعْطِي الْعَبْدَ مِنَ الدُّنْيَا عَلٰى مَعَاصِيهِ مَا يُحِبُّ فَإِنَّمَا هُوَ اسْتِدْرَاجٌ ثُمَّ تَلَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى إِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ رواه احمد۔

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اس کے گناہ ومعصیت میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کی محبوب ترین چیزیں (یعنی دنیاوی مال ودولت اور جاہ وحشمت وغیرہ) دیتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ (یعنی اس کو اس کی محبوب ترین چیزیں دینا) استدراج ہے۔

اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے (استشہاد کے طور پر) یہ آیت تلاوت فرمائی: فلمانسوا ماذکروا بہ فتحنا علیھم ابواب کل شیء حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذنھم بغتۃ فاذا ھم مبلسون

"جب کافر اس نصیحت کو بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی (یعنی اللہ تعالیٰ کا عہد، یا یہ کہ جب انہوں نے حق تعالیٰ کی نافرمانی کی) تو ہم نے ان پر (دنیا کی نعمتوں کی) ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر خوش ہوئے جو انہیں دی گئی تھیں (یعنی جاہ ومال، صحت وخوشحالی اور درازئ عمر اور دیگر نعمتیں) تو ہم نے ان کو (اپنے عذاب میں) پکڑ لیا اور وہ نہایت حیران وششدر رہ گئے۔" (احمد)

تشریح: لغت میں "استدراج" کے معنی ہیں درجہ بدرجہ سے جانا! جیسے کسی کو اوپر پہنچانے کے لئے زینہ کی ایک پیڑی پر چڑھا جائے پھر

دوسری پیڑی پر چڑھا جائے اور پھر تیسری پیڑی پر، اسی طرح یکے بعد دیگرے ایک ایک پیڑی پر چڑھاتے ہوئے اس کو آخر تک لے جایا جائے! اور بندہ کے حق میں اللہ تعالیٰ کا استدراج یہ ہے کہ جب کوئی انسان گناہ و معصیت میں مبتلا ہو تو اس کو دنیا کی خوش کن نعمت عطا کرے یا اس کی کوئی بات یا خواہش پوری کر دے، اور پھر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے تاکہ وہ انسان یہ گمان کرے کہ یہ میرے حق میں پروردگار کی طرف سے لطف و کرم ہے، چنانچہ اپنی کھال میں مست رہے کہ نہ تو اپنی بدعملیوں سے توبہ کرنے کی طرف متوجہ ہو اور نہ اپنے گناہ پر استغفار کرے اور پھر ایک دم عذاب خداوندی میں پکڑا جائے، پس یہ گویا حق تعالیٰ کی طرف سے اس بندہ کو بتدریج عذاب کی طرف لے جانا ہے جیسا کہ کسی کو درجہ بدرجہ چڑھا کر اوپر لے جایا جائے اور پھر اچانک اس کو وہاں سے نیچے پھینک دیا جائے۔

حاصل یہ کہ جس گناہ گار یا کافر کو دنیا کی ترقی یا بھلائی حاصل ہو جائے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ اس کو نواز رہے ہیں بلکہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس کی تمام تر دنیاوی ترقی و کامیابی دراصل اس کو بتدریج اس مرحلہ تک پہنچانا ہے جہاں اچانک عذاب خداوندی اس کو تباہ و برباد کر دے گا، خواہ وہ مرحلہ کتنے ہی طویل عرصہ کے بعد آئے۔

اہل زہد کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ قلیل مقدار میں بھی اپنے پاس دنیاوی مال رکھیں

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلاً مِنْ اَهْلِ الصُّفَّةِ تُوُفِّیَ وَتَرَكَ دِیْنَارًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَیَّةٌ قَالَ ثُمَّ تُوُفِّیَ اٰخَرُ فَتَرَكَ دِیْنَارَیْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَیَّتَانِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے ایک شخص نے وفات پائی اور ایک دینار کی صورت میں اپنا ترکہ چھوڑا رسول کریم ﷺ نے (جب اس دینار کو دیکھا تو) فرمایا کہ "یہ دینار (اس شخص کی پیشانی، پشت اور پہلو پر) ایک داغ ہے۔" حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ پھر (کچھ دنوں بعد) صفہ والوں میں سے ایک اور شخص نے وفات پائی اور اس نے اپنے ترکہ میں دو دینار چھوڑے، رسول کریم ﷺ نے (ان دیناروں کو دیکھ کر فرمایا۔ یہ دو دینار دو داغ ہیں۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: "صفہ والے" ان غریب اور گھربار نہ رکھنے والے صحابہؓ کی جماعت کو کہتے ہیں جو مستقل طور پر صفہ مسجد میں رہا کرتی تھی اور صفہ مسجد دراصل مسجد نبوی ﷺ سے متصل ایک مسقف (چھت دار) جگہ تھی اور بالکل شروع میں، جب کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا یہی جگہ "مسجد" کے طور پر استعمال ہوتی تھی، لیکن جب کچھ عرصہ بعد کعبۃ اللہ کو قبلہ قرار دیا گیا تو اس جگہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا اور اس کے برابر میں "مسجد نبوی ﷺ" بنائی گئی! صحابہؓ کی جو مقدس جماعت صفہ میں رہتی تھی وہ ستر اسی نفر پر مشتمل تھی۔ یہ تعداد مختلف اوقات میں کم و زیادہ بھی ہوتی رہتی تھی، ان صحابہؓ کا چونکہ نہ کوئی مکان تھا نہ ان کے پاس کچھ مال و اسباب تھا اور نہ کوئی کاروبار زندگی اور اہل و عیال رکھتے تھے اس لئے وہ کامل زہد اختیار کیے ہوئے تھے، اور خدا کی ذات پر توکل و اعتماد کے سہارے اس جگہ پڑے رہتے تھے اور ہمہ وقت ذکر و شغل، ریاضت و مجاہدہ اور تلاوت قرآن مجید میں مشغول اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث پاک کو یاد و محفوظ کرنے میں منہمک رہ کر ہمہ وقت انوار و برکات حاصل کرتے رہتے تھے، ان حضرت کو اضیاف اللہ (اللہ کے مہمان) کہا جاتا ہے! جو صحابہؓ استطاعت رکھتے تھے وہ ان کی خدمت کیا کرتے تھے، ان کی ضروریات زندگی کی فراہمی میں حتی الامکان سعی کرتے تھے، کچھ کو ان کی جگہ پر نہایت عزت و احترام کے ساتھ کھانے پینے کا سامان پہنچاتے، کچھ کو بطور مہمان اپنے گھر لے جاتے اور وہاں ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے اور ان میں سے کتنے ہی حضرات ایسے تھے جو آنحضرت ﷺ کی خصوصی عنایات و توجہ سے بہرہ مند ہوتے تھے اور سرکار رسالت پناہ ﷺ کے آستانہ پاک سے کھانا کھاتے تھے اور اسی وجہ سے کبھی کبھی آنحضرت ﷺ کے ایسے معجزات کے صادر ہونے کا باعث بھی بنتے تھے جس سے تھوڑا سا سامان خوراک حیرت انگیز طور پر سب کے لئے کافی ہو جاتا تھا، مثال کے طور پر، کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ دودھ کا صرف ایک پیالہ، جو ایک شخص کی بھی غذائی ضرورت کے لئے کافی ہو جانے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اعجاز نبوی ﷺ کے طفیل

ان سب حضرات کو شکم سیر کر دیتا تھا! آنحضرت ﷺ کو حکم خداوندی تھا کہ آپ ﷺ ان حضرات کے درمیان تشریف رکھا کریں۔ چنانچہ آپ ﷺ ان حضرات کو وقتاً فوقتاً اپنے حضور شرف یابی سے نوازتے رہتے تھے اور کسی وقت بھی انہیں اپنی بیچارگی اور لاچاری کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ آپ ﷺ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ (تم لوگ اپنے کو تنہا اور بے کس مت سمجھو) میں تم میں ہی سے ہوں۔ نیز ان کو یہ بشارت دیتے کہ آخرت میں تم میرے ساتھ رہوگے اور میرے ہمراہ جنت میں جاؤ گے! مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ بھی انہی (صفہ والے) صحابہ میں سے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

واضح رہے کہ صوفیاء کی جماعت کو (زہد و توکل اور دنیا سے ترک تعلق) اہل صفہ کے ساتھ مشابہت و مناسبت حاصل ہے اور اگرچہ لفظ "صوفیہ" کو "صفہ" سے مشتق قرار دینا اور یہ کہنا کہ مسلک زہد و توکل اختیار کرنے والے کو "صوفی" کہنا لفظ "صفہ" کی بنیاد پر ہے، ایک غیر حقیقی بات ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ معنوی طور پر صوفیاء کی نسبت اہل صفہ کی طرف کی جاسکتی ہے۔

اب اصل حدیث کی طرف آیئے! اہل صفہ میں سے وفات پانے والے حضرات کا اپنے پیچھے دینار چھوڑ جانا اور اس پر آنحضرت ﷺ کا وعید بیان فرمانا اس بنیاد پر تھا کہ اگرچہ حاجت و ضرورت کے تحت ایک دینار یا دو دینار جیسا معمولی سا دنیاوی مال بچا کر رکھنا اور جمع کرنا شرعی طور پر گناہ کا موجب نہیں ہے اور نہ یہ کوئی ایسی بات ہے جس کو غیر مناسب قرار دیا جاسکے بلکہ اگر کوئی شخص ادائے حقوق (مثلاً زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی) کے بعد پورا خزانہ بھی جمع کرلے اور دنیا بھر کا مال و اسباب اپنے پاس رکھے تو اس کو خلاف شرع نہیں کہیں گے الا یہ کہ کوئی شخص اس طرح مال و زر کا انبار لگائے اور جمع کرے کہ نہ تو اس کی زکوٰۃ ادا کرے اور نہ دوسرے مال حقوق کی ادائیگی کا لحاظ رکھے تو بے شک یہ ممنوع ہوگا، لیکن اس حقیقت کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اہل زہد اور تارکان دنیا جو سب کچھ چھوڑ کر، سب سے آنکھیں بند کر کے اور اہل فقر کی محبت کر کے باب توکل و فقر پر بیٹھتے ہیں ان کی شان جداگانہ ہے، ان کے پاس ضرورت سے زائد دنیاوی مال و اسباب کی حقیر سے حقیر مقدار کا بھی ہونا غیر موزوں ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ کا مذکورہ ارشاد گویا فقر و تجرد کے اس وعدے کے خلاف سخت تنبیہ و سرزنش کے طور پر ہے جو حقیقت حال سے مطابقت نہ رکھے۔ اور غالباً اسی وجہ سے راوی نے ان دونوں حضرات کے ذکر میں یہ نہیں کہا کہ "اصحاب میں سے ایک شخص نے وفات پائی۔" بلکہ یہ کہا کہ "اصحاب صفہ میں سے ایک شخص نے وفات پائی۔" گویا انہوں نے ان دونوں صحابیوں کی طرف "صفہ" کی نسبت خاص طور پر کی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اگر کوئی دوسرا صحابیؓ اپنے ترکہ میں ایک یا دو دینار چھوڑ کر وفات پاتا تو یہ کوئی اہم بات نہیں تھی لیکن یہ ان اصحاب صفہ میں سے دو شخصوں کا ذکر ہے جن کی شخصیات کا امتیاز ہی زہد و فقر تھا، لہٰذا ان اصحابہ صفہ کی صحبت و معیت میں رہنا اور خود کو ان کی امتیازی خصوصیت (یعنی زہد و فقر اور توکل) کا حامل قرار دینا، مطلق درہم و دینار جمع کرنے کے منافی ہے۔

ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کی وضاحت میں ایک دوسرے رخ سے بحث کی ہے، ان کے منقولات کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صحابہؓ کے بارے میں جو یہ وعید بیان فرمائی وہ اس امر کے پیش نظر تھی کہ وہ دونوں صحابہؓ دراصل ان خستہ حال و مسکین لوگوں (یعنی اصحاب صفہ) میں سے تھے جن کے فقر و فاقہ کی وجہ سے ان پر دوسرے لوگ اپنا مال خیرات کرتے تھے اور اللہ واسطے ان کو کھلاتے پلاتے تھے، اس طرح وہ دونوں حضرات یا تو ازروئے مال یا ازروئے حال بمنزلہ سائلین کے تھے اور جیسا کہ معلوم ہے، کسی بھی شخص کے لئے یہ قطعاً حلال نہیں ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دن کا بھی بقدر کفاف کھانے پینے کا سامان ہو تو وہ دست سوال دراز کرے، لہٰذا وہ دونوں حضرات اپنے پاس دینار ہونے کے باوجود ان چیزوں میں سے جو کچھ کھاتے پیتے تھے جو دوسرے لوگ صدقہ و خیرات کے طور پر ان کے پاس لاتے تھے، وہ گویا ان کے حق میں حرام تھا۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ جو شخص اپنے آپ کو فقراء و مساکین کی صورت میں ظاہر کرے، مثلاً پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور خستہ حالی کے ساتھ رہے یا صوفیا یا مشائخ کی وضع قطع اختیار کرے اور اس کے پاس از قسم نقد یا مثل نقود (یعنی سونا، چاندی، درہم و دینار یا نوٹ اور روپیہ پیسہ وغیرہ) کچھ ہو اور اس کے

باوجود لوگوں کے ہاتھ میں سے وہ چیز لے لے اور قبول کرلے جو کسی کو صدقہ وخیرات کے طور پر دینے کے لئے ہو اور پھر وہ اس چیز کو کھائے پئے یا اپنے مصرف میں لائے تو وہ چیز اس کے حق میں حرام ہوگی۔ اسی طرح وہ شخص اپنے آپ کو عالم یا صالح اور یا شریف ظاہر کرے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ایسا نہ ہو اور لوگ اس کو اس کے علم یا شرافت کی وجہ سے کچھ دیں تو ان کی دی ہوئی وہ چیز اس کے حق میں حرام ہوگی۔

منقول ہے کہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابواسحٰق "گازرونی" نے ایک دن فقراء کو ایک ایسے کھانے پر دیکھا جو مستحقین کے لئے تیار کیا گیا تھا، تو انہوں نے ان فقرا سے فرمایا۔ "تم لوگ حرام کھا رہے ہو؟ ان سب فقراء نے (یہ سن کر) کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اس کے بعد حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ "دیکھو یہ کھانا صرف ایسے لوگوں کے لئے ہے جن کے پاس از قسم دنیاوی مال کچھ بھی نہ ہو، لہٰذا تم سے جو شخص ایسا ہو وہ تو اس کھانے کو کھائے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہ کھائے" چنانچہ اس کھانے کو کچھ نے کھایا اور کچھ وہاں سے ہٹ گئے۔ (یہ دیکھ کر) حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ "سبحان اللہ! کھانا تو ایک ہی لیکن کچھ لوگوں کے لئے حلال ہے اور کچھ لوگوں کے لئے حرام" اس سے واضح ہوا کہ وہ اوقاف کہ جو محض فقراء کے لئے ہیں ان کی آمدنی اور ان کے وسائل کو کسی بھی ایسے شخص کا اپنے مصرف میں لانا مطلقاً حلال نہیں ہے جو شرعی طور پر غنی ہو! چنانچہ ان مکانات اور کمروں میں جو فقراء و مساکین کے لئے وقف ہیں ایسے لوگوں کا مفت رہائش اختیار کرنا حرام ہے جو فقیر و مسکین نہ ہوں جیسا کہ علامہ ابن حمامؒ نے صراحت کی ہے کہ غنی پر حرام ہے کہ وہ خانقاہوں کے وقف حجروں میں مفت رہائش اختیار کرے! لہٰذا اس قول کو قابل اعتبار نہیں سمجھنا چاہئے جس کا حاصل یہ ہے کہ حرمین شریفین کے اوقاف فقیر و غنی ہر ایک کے لئے ہیں کیونکہ اگر اس بات کو صحیح بھی مان لیا جائے (کہ واقعۃً وقف کرنے والوں نے ان اوقاف کو عام رکھا تھا) تو بھی ان اوقاف سے غنی کو فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک غنی کے حق میں کسی چیز کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے جب کہ وہ غیر محصور ہو۔

دنیاوی مال واسباب جمع کرنے سے گریز کرو

(۴۹) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ اَنَّهُ دَخَلَ عَلٰى خَالِهِ اَبِىْ هَاشِمِ بْنِ عُتْبَةَ يَعُوْدُهُ فَبَكٰى اَبُوْ هَاشِمٍ فَقَالَ مَا يُبْكِيْكَ يَا خَالُ اَوَجَعٌ يُشْئِزُكَ اَمْ حِرْصٌ عَلَى الدُّنْيَا قَالَ كَلَّا وَلٰكِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهِدَ اِلَيْنَا عَهْدًا لَمْ اٰخُذْ بِهٖ قَالَ وَمَا ذٰلِكَ قَالَ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ اِنَّمَا يَكْفِيْكَ مِنْ جَمْعِ الْمَالِ خَادِمٌ وَمَرْكَبٌ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاِنِّىْ اُرَانِىْ قَدْ جَمَعْتُ۔

(رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت معاویہ ابن سفیانؓ سے روایت ہے کہ وہ (ایک دن) اپنے ماموں حضرت ابوہاشم ابن عتبہؓ کے پاس ان کی عیادت کو گئے تو حضرت ابوہاشمؓ (ان کو دیکھ کر) رونے لگے، حضرت معاویہؓ نے پوچھا کہ ماموں جان! آپ کیوں روتے ہیں؟ کیا بیماری (کی شدت) نے آپ کو قلق و اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے یا دنیا کی حرص و تمنا نے؟" انہوں نے فرمایا (عزیز من! تم نے جو کچھ کہا ہے) ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ (قلق و اضطراب کا باعث یہ ہے کہ (رسول کریم ﷺ نے ہم (صحابہؓ) کو ایک وصیت کی تھی اور میں اس پر عمل کرنے سے قاصر رہا ہوں! معاویہؓ نے پوچھا کہ وہ وصیت کیا تھی؟ انہوں نے کہا، میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارے لئے دنیا کے مال میں سے بس اسقدر جمع کرنا کافی ہے کہ تمہارے پاس ایک خادم ہو اور خدا کی راہ میں لڑنے کے لئے ایک سواری ہو۔" اور میرا خیال ہے کہ میں نے (ان دونوں چیزوں سے کہیں زیادہ) مال واسباب اپنے پاس رکھا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: لفظ "اُرانی" مفہوم کے اعتبار سے اظن کے معنی میں ہے یعنی میں گمان کرتا ہوں۔" اور بعض نسخوں میں یہ لفظ ہمزہ کے زبر کے ساتھ (اَرانی) ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ میں دیکھتا ہوں۔ یا میں جانتا ہوں۔

آخرت کی دشوار گذار راہ سے آسانی کے ساتھ گزرنا چاہتے ہو تو مال و دولت جمع نہ کرو

⑤⓪ وَعَنْ اُمِّ الدَّرْدَاءِ قَالَتْ قُلْتُ لِاَبِی الدَّرْدَآءِ مَالَكَ لَا تَطْلُبُ كَمَا يَطْلُبُ فُلَانٌ فَقَالَ اِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اَمَامَكُمْ عَقَبَةً كَؤُوْدًا لَا يَجُوْزُهَا الْمُثْقِلُوْنَ فَاُحِبُّ اَنْ اَتَخَفَّفَ لِتِلْكَ الْعَقَبَةِ۔

"اور حضرت اُمّ درداءؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) میں نے (اپنے شوہر) حضرت ابو درداءؓ سے کہا) آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ (حضور ﷺ سے یا صحابہؓ سے) مال و اسباب اور منصب نہیں مانگتے جیسا کہ فلاں فلاں لوگ مانگتے ہیں؟ حضرت ابو درداءؓ نے (یہ سن کر) کہا کہ (میں کسی سے مال و دولت کی خواہش کرنے اور اس کو جمع کرنے سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ) میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے (یاد رکھو) تمہارے سامنے ایک دشوار گذار گھاٹی ہے، اس سے وہ لوگ (آسانی اور سہولت کے ساتھ) نہیں گزر سکتے جو گرانبار ہیں۔"
چنانچہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ (مال و دولت طلب کرنے سے گریز کر کے اور کم سے کم دنیاوی مال و اسباب پر صبر و قناعت کر کے) ہلکا رہوں تاکہ اس گھاٹی سے (آسانی و سہولت کے ساتھ) گزر سکوں۔"

تشریح: "دشوار گذار گھاٹی" سے مراد موت، قبر، حشر اور ان کے سلسلہ میں پیش آنے والی ہولناکیاں اور شدائد ہیں۔ اور "گرانبار" سے مراد وہ لوگ ہیں جو مال و دولت، منصب و جاہ اور دنیاوی ترفع و خوشحالی کا بوجھ اپنے کاندھوں پر رکھتے ہیں، حضور ﷺ کے ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن کی دنیاوی زندگی اور اس کی ابدی قرار گاہ (جنت) کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ ایک دشوار گذار گھاٹی سے گزرنے کے بعد ہی طے ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جس شخص کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دشوار گزار گھاٹی سے گزرنا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ کوئی بوجھ نہیں رکھتا اور زیادہ سے زیادہ ہلکا رہ کر ہی آسانی کے ساتھ اس گھاٹی سے گزر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر تم اپنی آخری منزل یعنی جنّت تک آسانی کے ساتھ پہنچنا چاہتے ہو تو خود کو دنیا کے مال و اسباب اور جاہ و حشم کی گرانباری سے ہلکا رکھو تاکہ تمہارے اور جنت کے درمیان جو دشوار گزار گھاٹی ہے اس کو طے کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے، اور اسی لئے کہا گیا ہے فَازَ الْمُخِفُّوْنَ وَهَلَكَ الْمُثْقِلُوْنَ یعنی سبک سر لوگ کامیاب ہوئے اور گرانبار لوگ ہلاکت میں پڑ گئے۔

دنیاداری سے اجتناب کرو

⑤① وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ مِنْ اَحَدٍ يَمْشِىْ عَلَى الْمَآءِ اِلَّا ابْتَلَّتْ قَدَمَاهُ قَالُوْا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كَذَالِكَ صَاحِبُ الدُّنْيَا لَا يَسْلَمُ مِنَ الذُّنُوْبِ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن، مجلس نبوی ﷺ میں موجود صحابہؓ سے) رسول کریم ﷺ نے پوچھا، کیا کوئی شخص پانی پر اس طرح چل سکتا ہے کہ اس کے پاؤں تر نہ ہوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ایسا تو ممکن نہیں! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "یہی حال دنیادار کا ہے کہ وہ گناہوں سے محفوظ و سلامت نہیں رہتا۔" (ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: جس شخص پر دنیا کی محبت غالب ہو، وہ تو کسی حالت میں بھی دنیاداری کے ساتھ گناہوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور جس شخص پر گو دنیا کی محبت غالب نہ ہو لیکن اس کا بھی مال و دولت اور دنیاوی امور میں مبتلا ہونا اس کے دامن کو عام طور پر گناہوں سے آلودہ ہونے سے محفوظ نہیں رکھتا۔

اس ارشاد گرامی کا حاصل دولتمندوں اور مالداروں کو سخت خوف دلانا اور زہد دنیا کی طرف راغب کرنا ہے نیز اس امر کو بھی واضح کرنا مقصود ہے کہ ہر حالت میں آخرت کے نفع و نقصان کو دنیا کے نفع و نقصان پر ترجیح دینا چاہئے دنیاوی مال و دولت کے حامل و طلب گار کے لئے یہی احساس کافی ہونا چاہئے کہ آخرت کا نقصان و خسران فقر کی بہ نسبت مالداری میں زیادہ پوشیدہ ہے اور فقر کی یہی فضیلت کیا کم ہے

کہ فقراء (جنہوں نے اپنے فقر و افلاس پر صبر و قناعت اختیار کیا ہوگا) جنت میں مالداروں سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو دنیوی امور سے اجتناب اور اخروی امور میں انہماک کا حکم

(۵۲) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اُوْحِىَ اِلَىَّ اَنْ اَجْمَعَ الْمَالَ وَاَكُوْنَ مِنَ التَّاجِرِيْنَ وَلٰكِنْ اُوْحِىَ اِلَىَّ اَنْ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ رَوَاهُ فِىْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَاَبُوْنُعَيْمٍ فِى الْحِلْيَةِ عَنْ اَبِىْ مُسْلِمٍ۔

"اور حضرت جبیر ابن نفیر (تابعیؒ) بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مجھ پر یہ وحی نازل نہیں ہوئی ہے کہ میں مال و دولت جمع کروں اور تاجر بنوں بلکہ مجھ پر یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ۔ " آپ ﷺ اپنے پروردگار کی حمد و تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجئے، اور سجدہ کرنے والوں (یعنی نمازیوں) میں سے بنیں۔ نیز اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہیے یہاں تک کہ آپ ﷺ (کی دنیاوی زندگی) کا آخری وقت آجائے۔" اس حدیث کو بغویؒ نے شرح السنہ میں اور ابو نعیم نے کتاب حلیہ میں ابو مسلمؒ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس ارشاد کے ذریعہ حضور ﷺ نے گویا یہ واضح فرمایا کہ مجھے تو اپنے رب کی طرف سے یہ حکم ہے کہ میں اپنے تمام اوقات کو تسبیح و تحمید اور عبادت، خصوصا نماز میں صرف کروں اور آخر عمر تک اسی طرح کے اخروی امور میں مشغول رہوں، بھلا مجھے اتنی فرصت کہاں کہ میں تجارتی معاملات اور خرید و فروخت نیز دیگر دنیاوی امور کی طرف توجہ دوں اور ان میں مشغولیت اختیار کروں۔

امور خیر کی نیت سے دنیا حاصل کرنے کی فضیلت

(۵۳) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلاَلاً اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ وَسَعْيًا عَلٰى اَهْلِهٖ وَتَعَطُّفًا عَلٰى جَارِهٖ لَقِىَ اللّٰهَ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَوَجْهُهٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَمَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلاَلاً مُكَاثِرًا مُفَاخِرًا مُرَائِيًا لَقِىَ اللّٰهَ تَعَالٰى وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَاَبُوْنُعَيْمٍ فِى الْحِلْيَةِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بچنے، اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے اور اپنے ہمسایہ کے ساتھ احسان کرنے کی خاطر جائز وسائل و ذرائع سے دنیا (کے مال و اسباب) کو حاصل کرے، وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ (کمال نور اور نہایت مسرت و سرور کی وجہ سے) چودہویں رات کے چاند کی مانند (روشن و منور ہوگا! اور جو شخص مال و دولت میں اضافہ کرنے (اپنی امارت و دولت مندی کے ذریعہ غرباء و فقراء پر) فخر کرنے، اور (محض اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لئے صدقہ و خیرات اور داد و دہش کی صورت میں) نام و نمود کے لئے (حرام وسائل و ذرائع تو الگ رہے) جائز وسائل و ذرائع سے (بھی) دنیا (کے مال و اسباب) کو حاصل کرے تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوگا۔" اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں ابو نعیمؒ نے کتاب حلیہ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: سوچنے اور عبرت حاصل کرنے کی بات ہے کہ جب زیادہ مال و دولت جمع کرنے کی حرص، ایک دوسرے پر اظہار فخر اور نام و نمود کے لئے دنیا کمانے اور سامان دنیا حاصل کرنے میں حلال ذرائع اختیار کرنے والے کا یہ حشر ہوگا تو ان لوگوں کا کتنا برا انجام ہوگا جو مذکورہ بالا غیر شرعی مقاصد کے لئے حرام وسائل و ذرائع سے مال و دولت حاصل کرتے ہیں؟ چنانچہ حضور ﷺ نے حدیث میں حرام مال کمانے والوں کا ذکر شاید اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے نہیں فرمایا کہ یہ کام کسی مسلمان کا تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اول تو وہ مذکورہ مفاسد کی خاطر دنیا کمائے اور پھر وسائل و ذرائع بھی حرام و ناجائز اختیار کرے، یا ایسے لوگوں کا ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ ان کا انجام بد حدیث کے انداز بیان اور طرز مضمون سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

خیر و شر کے خزانے اور ان کی کنجی

(۵۴) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ هٰذَا الْخَيْرَ خَزَآئِنُ لِتِلْكَ الْخَزَآئِنِ مَفَاتِيْحَ فَطُوْبٰى لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى مِفْتَاحًا لِلْخَيْرِ مِغْلَاقًا لِلشَّرِّ وَوَيْلٌ لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ مِفْتَاحًا لِلشَّرِّ مِغْلَاقًا لِلْخَيْرِ۔

(رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ خیر (یعنی مال و دولت کے انبار) خزانے ہیں اور ان خزانوں کے لئے کنجیاں ہیں (یعنی خدا اپنے جن نیک اور مخیر بندوں کو مال و دولت سے نوازتا ہے وہ گویا ان خدائی خزانوں کی کنجیاں ہوتے ہیں کہ ان کے مالی عطیات اور صدقہ و خیرات کے ذریعہ فقیر و مفلس اور ضرور تمند بندگان خدا فائدہ اٹھاتے ہیں) پس (دینوی کامیابی اور ترقی اور اخروی فلاح و سعادت کی) بشارت ہو اس بندہ کو کہ جس کو خدا نے خیر (یعنی نیکیوں و بھلائیوں اور مالی بخشش وعطاء) کے دروازے کھلنے اور برائی (یعنی بخل و خست اور ضرور تمندوں سے بے پروائی کے دروازے بند ہونے کا سبب و ذریعہ بنایا ہے اور (دین و دنیا کی) ہلاکت و تباہی ہے اس بندہ کے لئے جس کو خدا نے برائی کے دروازے کھلنے اور خیر کے دروازے بند ہونے کا سبب و ذریعہ بنایا ہے (یعنی جو مالدار اپنی دولت کو بڑھانے کے چکر میں رہتا ہے اور ضرور تمند بندگان خدا کی خبر گیری اور امور خیر میں خرچ کرنے کی اہمیت سے بے پرواہ رہ کر گویا بخل و خست میں مبتلا ہوتا ہے اس کے لئے تباہی ہی تباہی ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: مذکورہ بالا ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کی "اسعۃ اللمعات" سے ماخوذ ہے، جہاں تک ملا علی قاریؒ کا تعلق ہے تو انہوں نے حدیث کی وضاحت اس طور پر کی ہے کہ ھٰذَا الْخَیْرَ میں "خیر" جنس خیر (یعنی ہر طرح کی بھلائی) مراد ہے، خزائن سے مراد "خیر" کی انواع کثیرہ ہیں یعنی وہ بھلائیاں مختلف انواع رکھتی ہیں اور ان کو خدا کے بندوں کے درمیان اس طرح مخزون و مرکوز کیا گیا ہے جیسے خزانوں کو پوشیدہ رکھا جاتا ہے، لتلک الخزائن مفاتیح (ان خزانوں کے لئے کنجیاں ہیں) میں "کنجیوں" سے مراد خدا کے ان نیک بندوں کے ہاتھ (قوائے عمل ہیں) جو اس روئے زمین پر امور کائنات میں تصرف و تسلط کے لئے) خدا کے وکیل و نائب کی حیثیت رکھتے ہیں! مفتاحا للخیر (خیر کی کنجی) سے مراد، ان بندوں کا ان بھلائیوں اور نیکیوں کو اختیار کرنا اور پھیلانا ہے، خواہ وہ علم و عمل کو اختیار کرنے اور اپنے اور دوسروں کے اخلاق و احوال کو صالح بنانے کی صورت میں ہو یا اپنے مال و زر اور روپیہ پیسہ کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی شکل میں ہو! اور مفتاحا للشر (شر کی کنجی) سے مراد خیر و بھلائی کے راستہ کو مسدود کرنا اور بدی و برائی کے راستہ کو کھولنا ہے اور اس برائی کے راستہ کا کھلنا خواہ کفر و شرک، و تکبر و سرکشی اور بد عملی و فتنہ انگیزی کو اختیار کرنے کے ذریعہ ہو یا بخل و خست اور اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بد سلوکی اختیار کرنے کی صورت میں ہو۔

امام راغبؒ کہتے ہیں کہ "خیر" اس چیز کو کہتے ہیں جس کی طرف ہر انسان رغبت رکھتا ہے جیسے علم و عقل اور احسان و مہربانی وغیرہ اور اسی طرح ہر وہ چیز جو نفع پہنچاتی ہے! اور جو چیز "خیر" کی ضد اور اس کے برعکس ہوتی ہے اس کو "شر" کہتے ہیں۔ نیز خیر و شر اگرچہ ایک دوسرے کی ضد اور مخالف ہیں مگر کبھی کبھی ان دونوں میں اتحاد ذاتی اور فرق اعتباری بھی ہوتا ہے یعنی ایک ہی چیز دو اعتبار سے خیر اور شر دونوں کی حامل بن سکتی ہے کہ ایک شخص کے حق تو وہ خیر و بھلائی کا ذریعہ ہو اور دوسرے شخص کے حق میں وہی چیز شر اور برائی کا سبب بن جائے جیسے مال ہی کی مثال لے لیجئے، وہ ایک شخص مثلاً عمر کے حق میں تو خیر کا ذریعہ ہوتا ہے جب کہ عمر نے اس کو جائز طور پر حاصل کیا ہو اور جائز مصارف میں اس کو خرچ کرے اور وہی مال ایک دوسرے شخص مثلاً زید کے حق میں شر کا سبب بن سکتا ہے جب کہ زید اس مال پر ناجائز طور سے قبضہ و تصرف کرے۔

اسی طرح "علم" کی مثال بھی ہے کہ ایک ہی علم ایک ہی وقت میں بعض لوگوں کی نسبت سے خدا اور بندہ کے درمیان حجاب بن جاتا

ہے، اور ان لوگوں پر عذاب خداوندی کا سبب ہوتا ہے جب کہ وہ لوگ اس علم سے ہدایت وراستی حاصل کرنے کی بجائے ضلالت و گمراہی میں پھنس جائیں اور وہی علم دوسرے لوگوں کے حق میں خدا کی معرفت وقربت اور ایمان ویقین کا ذریعہ بنتا ہے جب کہ وہ لوگ اس علم سے ہدایت وراستی حاصل کریں اور اس کے صحیح تقاضوں پر عمل کریں! اسی پر اور عبادات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بعض عبادتیں، عجب وغرور کی باعث ہوتی ہیں جب کہ ان کو اختیار کرنے والا ریاء و نمائش اور نام ونمود کا راستہ اختیار کرے اور بعض عبادتیں، ایمانی وروحانی کیف وسرور اور نورانیت اور ذوق عبودیت کا باعث بنتی ہیں جب کہ ان کو اختیار کرنے والا اخلاص وللہیت کے جذبہ سے سرشار ہو! دنیاوی چیزوں مثلاً گھوڑے آلات حرب اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بارے میں بھی یہی بات ہے کہ کبھی تو یہ چیزیں دشمنان خدا کے ساتھ جہاد کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں اور اس طرح سے بندہ کو جنت میں لے جانے کا وسیلہ ہوتی ہے اور کبھی یہی چیزیں فتنہ وفساد پھیلانے یہاں تک کہ خدا کے نہایت نیک وبرگزیدہ بندوں (جیسے انبیاء واولیاء) کے قتل وخونریزی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور ان کی وجہ سے انسان دوزخ کے اسفل ترین درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔

ضرورت سے زیادہ عمارت بنانے کے بارے میں وعید

⑤⑤ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا لَمْ يُبَارَكْ لِلْعَبْدِ فِيْ مَالِهٖ جَعَلَهٗ فِي الْمَاءِ وَالطِّيْنِ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" جب کسی بندہ کے مال ودولت میں برکت عطا نہیں ہوتی (یعنی اس کو اپنا مال اور روپیہ پیسہ بھلائی کے امور اور عقبی کو سنوارنے والی چیزوں میں خرچ کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی) تو وہ اس مال کو پانی اور مٹی میں ملا دیتا ہے یعنی اپنی دولت ضرورت سے زائد عمارتیں بنانے اور ان کی زینت وآرائش میں خرچ کرتا ہے۔"

⑤⑥ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اتَّقُوا الْحَرَامَ فِي الْبُنْيَانِ فَاِنَّهٗ اَسَاسُ الْخَرَابِ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔" (لوگو!) تم عمارتوں میں حرام مال لگانے سے پرہیز کرو، کیونکہ عمارتوں میں حرام مال لگانا (دین یا اس عمارت کی خرابی کی بنیاد اور جڑ ہے۔" ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا۔"

تشریح: مذکورہ ارشاد گرامی سے یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر عمارتوں میں حلال مال لگایا جائے تو اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی اور بعض حضرات نے "عمارتوں میں حرام مال لگانے سے پرہیز کرو" کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ان حرام چیزوں کو اختیار کرنے سے اجتناب کرو جو عمارتیں بنانے کے سلسلہ میں پیش آتی ہیں! گویا اس اعتبار سے "چیز" وہی ضرورت سے زائد عمارت کا بنانا ہے۔

"فی البنیان" میں لفظ فی کے وہی معنی ہیں جو مثلاً اس جملہ کے ہیں کہ، اس زنجیر میں دو سیر لوہا ہے، ظاہر ہے کہ اس جملہ سے یہ مراد نہیں لیا جاتا کہ وہ زنجیر خالص دو سیر لوہا ہے۔

"خرابی" سے مراد دین کی خرابی اور آخرت کا نقصان ہے تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ خود عمارت کی خرابی مراد ہو یعنی عمارت کا بنانا، گویا اس کی خرابی وتباہی کی بنیاد رکھنا ہے کہ بہرصورت جو عمارت بنے گی وہ انجام کار تباہ وبرباد ہوگی جیسا کہ کہا جاتا ہے لدو للموت وابنوا للخراب یعنی پیدا کرو مرنے کے لئے اور عمارت بناؤ خراب ہونے کے لئے۔

بعض شارحین نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث کا یہ مطلب بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ عمارتوں میں حرام امور اور گناہوں کے ارتکاب سے اجتناب کرو، یعنی عمارتیں اس لئے نہ بناؤ کہ ان میں فسق وفجور کے لئے اٹھنا بیٹھنا رکھو۔ اوباش لوگوں کے ساتھ مجلس بازی کرو اور ان کو ناجائز کاموں کا اڈہ بناؤ کیونکہ جس عمارت میں فسق وفجور کی گرم بازاری رہتی ہے اور اوباش لوگوں کی مجلسیں جمتی ہیں وہ آخر کار تباہ وبرباد ہو جاتی ہے۔

ملا علی قاریؒ نے اس جملہ "کیونکہ عمارتوں میں حرام مال لگانا.....الخ" کے دونوں احتمال بیان کیے ہیں ایک تو یہ کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ (ضرورت سے زائد) تعمیر میں حلال مال لگانا جائز ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ حدیث مذکور جواز پر دلالت نہیں کرتی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ دوسرا احتمال باب کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

مال و دولت جمع کرنا بے عقلی ہے

(۵۷) وَعَنْ عَائِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهُ وَمَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهُ وَلَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عائشہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کے لئے (آخرت میں) مال نہیں ہے، نیز مال و دولت وہی جمع کرتا ہے جس کو عقل نہیں ہوتی۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا چونکہ فانی ہے اس لئے اس میں ٹھہرنا اور شادمانی کی زندگی اختیار کرنا ممکن نہیں ہے، لہٰذا جس شخص نے دنیا کو اپنا گھر سمجھا اور اس کے آرام و آسائش کو اصل شادمانی حیات جانا، وہ ایسا شخص ہے کہ گویا اس کے لئے کوئی اور گھر نہیں ہے! اسی طرح "اور مال اس شخص کا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو دنیا کا مال و اسباب حاصل ہو اور وہ اس کے مقصود اصلی یعنی بھلائیوں کے کام اور خدا کی رضا و خوشنودی کے امور میں خرچ نہ کرے، بلکہ دنیاوی لذات کے حصول اور نفسانی خواہشات کی تکمیل میں خرچ کرے۔ اس کا وہ مال گویا مالیت کے حکم سے خارج ہے کیونکہ اس نے اپنے مال کے اصلی مقصد سے انحراف کر کے اور اس کو غیر مقصود مصارف میں خرچ کر کے ضائع کر دیا۔ لہٰذا وہ اس شخص کی طرح ہوا جس کے پاس مال نہ ہو۔

مشکوٰۃ کے بعض حواشی میں یہ لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ دنیا کے گھر اور دنیا کے مال چونکہ بہت جلد فنا کے گھاٹ اتر جانے والی چیز ہے اور ان کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں ہے اس لئے ان کو "گھر" اور "مال" کہنا ہی نہیں چاہئے! یہ مراد بھی حقیقت کے اعتبار سے پہلی وضاحت ہی سے ماخوذ ہے۔

حدیث کی ایک مراد یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ جس شخص نے دنیا کے گھر کو اپنا اصلی گھر قرار دیا اور اس پر مطمئن ہو گیا، یا جس نے اس گمان کے ساتھ دنیوی مال و دولت کو جمع کیا کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب باقی رہنے والا اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا اور ایک جگہ یوں فرمایا ہے، يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ تو وہ شخص آخرت میں گھر پانے اور وہاں کے غنا (یعنی نعمتوں) سے نوازے جانے کا مستحق نہیں ہوگا۔

"مال و دولت وہی شخص جمع کرتا ہے.....الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص محض اس لئے مال و دولت جمع کرتا ہے کہ اس کو دنیا عزیز ہوتی ہے یا وہ اس مال و دولت کو ہمیشہ باقی رکھنے کی نیت رکھتا ہے اور یا محض دنیاوی لذات اور دنیاوی فائدوں کا حصول اس کے پیش نظر ہوتا ہے تو اس شخص کو عقل و دانش کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ حدیث کا اجمالی مفہوم یہ ہے کہ "یہ دنیا اس قابل نہیں ہے کہ اس کو "گھر" سمجھا جائے، ہاں جو شخص آخرت میں ملنے والے اپنے گھر سے محروم رہنا چاہتا ہے وہی اس دنیا کو اس قابل سمجھ سکتا ہے اسی طرح اس دنیا کی دولت کو وہی شخص "دولت" سمجھ سکتا ہے جو آخرت کی دولت سے محروم رہنا چاہتا ہے، اور حاصل یہ کہ اس ارشاد گرامی کا مقصد گویا یہ احساس دلانا ہے کہ جن لوگوں کے لئے آخرت میں دار القرار (قرار گاہ) اور وہاں کی بے بہا دولت مقدر ہے ان کی نظر میں یہ دنیا اتنی حقیر اور اسقدر بے وقعت ہے کہ اس کے "گھر" اور اس کے "مال و دولت" کو "گھر" اور "دولت" کہا ہی نہیں جا سکتا۔

شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے

(۵۸) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ خُطْبَتِهِ الْخَمْرُ جِمَاعُ الْاِثْمِ وَالنِّسَآءُ حَبَائِلُ الشَّيْطَانِ وَحُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ قَالَ وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ اَخِّرُوا النِّسَآءَ حَيْثُ اَخَّرَهُنَّ اللّٰهُ. رَوَاهُ رَزِيْنٌ وروى الْبَيْهَقِيُّ مِنْهُ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ.

"اور حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو ایک خطبہ کے دوران یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "یاد رکھو!) شراب پینا، گناہوں کو جمع کرنا ہے یعنی شراب چونکہ تمام برائیوں کی جڑ ہے اس لئے شراب پینے سے طرح طرح کے گناہ سرزد ہوتے ہیں) اور عورتیں شیطان کے جال ہیں اور دنیا کی محبت ہر گناہ کا سر ہے۔" حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "عورتوں کو موخر کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو موخر کیا ہے، یعنی قرآن مجید میں جہاں بھی عورتوں کا ذکر آیا ہے مردوں کے بعد آیا ہے، اسی طرح گواہی، جماعت اور فضیلت مرتبہ میں ان کو مردوں کے بعد رکھا گیا ہے، لہٰذا تم بھی ان چیزوں میں ان کو مقدم نہ کرو اور مردوں پر فضیلت نہ دو۔" رزین نے یہ پوری روایت نقل کی ہے اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت حسن بصریؒ سے بطریق ارسال روایت کا صرف یہ حصہ نقل کیا ہے کہ حب الدنیا رأس کل خطیئة۔"

تشریح: طبرانیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ الخمر الفواحش واکبر الکبائر من شربها وقع علی امه وخالته وعمته۔ "(حضور ﷺ نے فرمایا) شراب بےحیائیوں کی جڑ ہے اور بڑے گناہوں میں سے ایک بہت بڑا گناہ ہے، جس شخص نے شراب نوشی کی اس نے (گویا) اپنی ماں، اپنی خالہ اور اپنی پھوپھی کے ساتھ ہم بستری کی۔" کہتے ہیں کہ ایک شخص کو بت کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے کہا گیا تو اس نے انکار کر دیا، پھر اس سے ایک آدمی کو قتل کرنے کے لئے کہا گیا، تو اس نے اس کام سے بھی انکار کر دیا، پھر اس کو ایک عورت کے ساتھ زنا کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے اس سے بھی انکار کر دیا اور پھر جب اس سے شراب پینے کے لئے کہا گیا تو اس نے شراب پی لی پس اس شخص نے گویا شراب ہی نہیں پی، بلکہ اس نے ساری برائیوں کا ارتکاب کیا جن کی طرف اس کو بلایا گیا تھا، اور اس نے انکار کر دیا تھا۔

"دنیا کی محبت ہر گناہ کا سر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا کی محبت ہی ہے جو انسان کو طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا کرتی ہے اور وہ اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ممنوعات اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے! اس جملہ کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ ترک دنیا، ہر عبادت کا سر ہے، یعنی جو شخص دنیاوی لذات اور نفسانی خواہشات سے بے تعلق ہو جاتا ہے، وہ بس عبادت و اطاعت میں مشغول رہتا ہے اور ہر وقت خدا کی رضا و خوشنودی کو سامنے رکھتا ہے، چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ جس شخص نے دنیا کی محبت کو اختیار کر لیا اس کو تمام مرشدین و مصلحین بھی راہ راست پر نہیں لا سکتے اور جس شخص نے ترک دنیا کو پسند کر لیا اس کو تمام دنیا کے مفسد و گمراہ لوگ بھی راہ راست سے بھٹکا نہیں سکتے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ حدیث کے تینوں جملے نہایت جامع ہیں، یعنی ان کے دائرے میں اکثر گناہ آ جاتے ہیں کیونکہ ان تینوں چیزوں (یعنی شراب، عورت اور دنیا کی محبت) میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ بہت سارے گناہوں کی جڑ ہے۔

دو خوفناک چیزوں کا ذکر

(۵۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَتَخَوَّفُ عَلٰى اُمَّتِيْ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ فَاَمَّا الْهَوٰى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَاَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَيُنْسِي الْاٰخِرَةَ وَهٰذِهِ الدُّنْيَا مُرْتَحِلَةٌ ذَاهِبَةٌ وَهٰذِهِ الْاٰخِرَةُ مُرْتَحِلَةٌ قَادِمَةٌ وَلِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا بَنُوْنَ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تَكُوْنُوْا مِنْ بَنِي الدُّنْيَا فَافْعَلُوْا فَاِنَّكُمُ الْيَوْمَ فِيْ دَارِ الْعَمَلِ وَلَا حِسَابَ

وَاَنْتُمْ غَدًا فِیْ دَارِ الْاٰخِرَۃِ وَلَا عَمَلَ۔ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اپنی اُمت کے بارے میں جن دو چیزوں سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں، ان میں سے ایک تو خواہش نفس ہے، دوسرے (تاخیر عمل اور نیکیوں سے غفلت کے ذریعہ) درازی عمر کی آرزو ہے، پس نفس کی خواہش (جو حق کے مخالف اور باطل کے موافق ہوتی ہے) حق کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے روکتی ہے اور جہاں تک درازیٔ عمر کی آرزو کا تعلق ہے تو وہ آخرت کو بھلا دیتی ہے اور (یاد رکھو) یہ دنیا کوچ کر کے چلی جانے والی ہے اور آخرت کوچ کر کے آنے والی ہے (یعنی یہ دنیا لحہ بہ لحہ گزرتی چلی جارہی ہے اور آخرت لحہ بہ لحہ تمہاری طرف چلی آرہی ہے) نیزان دونوں (یعنی دنیا اور آخرت) میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں (یعنی کچھ لوگ تو وہ ہیں جو دنیا کے تابع و محکوم اور اس کی دوستی و چاہت رکھنے والے ہیں گویا وہ دنیا کے بیٹے ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں جو آخرت کے تابع و محکوم اور اس کے دوست و طلب گار ہیں گویا وہ آخرت کے بیٹے ہیں) لہٰذا اگر تم سے یہ ہو سکے کہ تم دنیا کے بیٹے نہ بنو تو ایسا ضرور کرو کہ (یعنی ایسے کام کرو اور ایسے راستے پر چلو کہ دنیا کا داؤ تم پر نہ چل سکے اور تم اس کی اتباع و فرمانبرداری اور اس کی محبت و چاہت کے دائرے سے نکل کی آخرت کے تابع و محکوم اور اس کے طلبگار بن جاؤ) کیونکہ تم آج دنیا میں ہو جو دار العمل (کام کرنے کی جگہ ہے) جہاں عمل کا حساب نہیں لیا جاتا (پس اس موقع کو غنیمت جانو اور اجل آنے سے پہلے عمل کر لو) جب کہ تم کل آخرت کے گھر میں جاؤ گے تو وہاں عمل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملے گا (بلکہ وہاں صرف محاسبہ ہوگا۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "دنیا کوچ کر کے چلی جانے والی ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا اپنے تمام سرو سامان کے ساتھ اس طرح فنا کی طرف جارہی ہے کہ اس میں رہنے والوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا جس طرح کشتی کے اندر بیٹھا ہوا شخص کشتی کو چلتے ہوئے محسوس نہیں کرتا! حدیث کا یہ جملہ اور مابعد کا جملہ دراصل دنیا کے نہایت جلد گزرنے اور فناء ہو جانے کے مفہوم کو واضح کرتا ہے کیونکہ اگر آخرت اپنی جگہ قائم ہوتی اور صرف دنیا اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے اس کی طرف چلتی تو بھی یہ پوری گزر ہی جاتی اور اپنی عمر تمام کر لیتی اگرچہ اس کے سفر کو کچھ وقفہ اور مل جاتا مگر جب صورت حال یہ ہے کہ ادھر سے تو آخرت چلی آرہی ہے اور ادھر سے دنیا اس کی طرف کو چلی جارہی ہے تو گویا وہ نقطہ کہ جہاں دنیا کا اختتام اور آخرت کی ابتداء ہونے والی ہے درمیان راہ ہی واقع ہو جائے گا اور مسافت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔

"جہاں عمل کا حساب نہیں لیا جاتا۔" یہ بات ظاہر کے اعتبار سے اور فاسق و فاجر کی نسبت سے فرمائی گئی ہے ورنہ تو ایک روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔ "اپنے نفسوں کا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تم سے حساب لیا جائے۔"

دنیا عمل کی جگہ ہے

(۶۵) وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ ارْتَحَلَتِ الدُّنْیَا مُدْبِرَۃً وَارْتَحَلَتِ الْاٰخِرَۃُ مُقْبِلَۃً وَلِکُلٍّ وَاحِدَۃٍ مِّنْھُمَا بَنُوْنَ فَکُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الْاٰخِرَۃِ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْیَوْمَ عَمَلٌ وَلَا حِسَابَ وَغَدًا حِسَابٌ وَلَا عَمَلَ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ فِیْ تَرْجَمَۃِ بَابٍ۔

"اور حضرت علیؓ سے (بطریق موقوف) روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "یہ دنیا ادھر سے کوچ کر کے منہ پھیرے ہوئے چلی جارہی ہے، اور آخرت ادھر سے کوچ کر کے ہماری طرف منہ کیے آرہی ہے (یعنی دنیا کا ہماری طرف سے منہ پھیر کر اپنی فنا کی طرف بڑھنا اور آخرت کا اپنی بقا کے ساتھ ہماری طرف متوجہ ہونا ظاہر ہو رہا ہے) اور ان دونوں (دنیا و آخرت) میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں، پس تم (نیک عمل اختیار کر کے اور آخرت کی طرف متوجہ ہو کر) آخرت کے بیٹے بنو اور (آخرت سے بے پروا اور دنیا کی طرف راغب و متوجہ ہو کر) دنیا کے بیٹوں میں سے نہ ہو، یاد رکھو! آج کا دن عمل کرنے کا ہے، حساب کا دن نہیں ہے (یعنی یہ دنیا دار العمل ہے دار الحساب نہیں، یہاں بس زیادہ سے زیادہ نیک عمل کیے جاؤ) اور کل (قیامت) کا دن، حساب کا دن ہوگا، عمل کرنے کا نہیں" اس روایت کو امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں نقل

کیا ہے۔

تشریح: "ترجمۃ الباب" سے مراد جامع بخاری کے ایک باب کا عنوان ہے، یعنی امام بخاریؒ نے اس روایت کو اپنی کتاب کے ایک باب کے عنوان میں بغیر اسناد کے حضرت علیؓ سے بطریق موقوف نقل کیا ہے، لیکن اس سے پہلے حضرت جابرؓ کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی اس روایت کی اصل مرفوع ہے، یعنی یہ حضور ﷺ ہی کا ارشاد ہے کیونکہ حضرت علیؓ نے جو مضمون نقل کیا ہے وہ وہی ہے جو حضرت جابرؓ کی روایت میں منقول ہے۔

دنیا غیر پائیدار متاع ہے

(۶۱) وَعَنْ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ يَوْمًا فَقَالَ فِيْ خُطْبَتِهِ اَلَا اِنَّ الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ يَاكُلُ مِنْهُ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ اَلَا وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ اَجَلٌ صَادِقٌ وَيَقْضِيْ فِيْهَا مَلِكٌ قَادِرٌ اَلَا وَاِنَّ الْخَيْرَ كُلَّهٗ بِحَذَافِيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ اَلَا وَاِنَّ الشَّرَّ كُلَّهٗ بِحَذَافِيْرِهٖ فِي النَّارِ اَلَا فَاعْمَلُوْا وَاَنْتُمْ مِنَ اللّٰهِ عَلٰى حَذَرٍ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مُعْرَضُوْنَ عَلٰى اَعْمَالِكُمْ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس خطبہ میں فرمایا۔ "لوگو!" خبردار ہو! دنیا ایک ناپائدار متاع ہے، اس میں سے نیک بھی کھاتا ہے اور بد بھی (یعنی اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہر شخص کو رزق دیتا ہے خواہ وہ مؤمن ہو یا کافر اور خواہ مطیع ہو یا فاسق جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا خبردار ہو! آخرت واقعی مدت ہے جو سچی یعنی متحقق و ثابت ہے اور اس (آخرت) میں، ہر قسم کی قدرت رکھنے والا بادشاہ (یعنی اللہ تعالیٰ) فیصلہ صادر فرمائے گا یعنی وہ ثواب و عذاب کے ذریعہ نیک و بد اور مؤمن و کفر کے درمیان فرق ظاہر کر دے گا) خبردار ہو! تمام بھلائیاں اور خوبیاں اپنے انواع و اقسام کے ساتھ جنت میں ہیں، خبردار ہو! تمام برائیاں اور خرابیاں اپنے انواع و اقسام کے ساتھ دوزخ میں ہیں، خبردار ہو! پس تم (نیک) عمل کرو درآنحالیکہ تم پر خدا کے حساب و عذاب کا خوف طاری ہو (یا یہ یعنی کہ نیک عمل کرو اور سارے میں خدا سے ڈرتے رہو، کہ تمہارے وہ نیک عمل قبول ہوتے ہیں یا نہیں) اور اس بات کو یاد رکھو کہ اپنے اعمال کے ساتھ (خدا کے سامنے) پیش ہونا ہے، پاس جو شخص ذرہ برابر بھی نیک کام کرتا ہے وہ (آخرت میں یا دنیا میں) اس کی جزاء پائے گا اور جو شخص ذرہ برابر بھی برا کام کرتا ہے وہ اس کی سزا پائے گا۔" (شافعیؒ)

تشریح: اِنَّكُمْ مُعْرَضُوْنَ عَلٰى اَعْمَالِكُمْ کا ترجمہ اگر یہ کیا جائے کہ تم اپنے اعمال کے سامنے کیے جاؤ گے۔ تو اس عبارت کے الٹے معنی مراد ہوں گے کہ (قیامت کے دن) تمہارے اعمال تمہارے سامنے حاضر کئے جائیں گے۔ ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم بارگاہ رب العزت میں اپنے اعمال کے مطابق پیش کیے جاؤ گے۔ لیکن زیادہ صحیح اور زیادہ واضح معنی کہ جو اوپر ترجمہ میں نقل کے گئے ہیں، یہی ہیں کہ تم اپنے اعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور اپنے ان اعمال کے مطابق جزاء یا سزا پاؤ گے، جیسا کہ جب کوئی لشکر میدان جنگ سے واپس آتا ہے تو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کی کاروائی کے ساتھ اپنے امیر کے سامنے پیش ہوتا ہے اور وہ امیر اس لشکر کے ہر فرد کے امور مفوضہ کی انجام دہی کو دیکھتا ہے اور اس کے مطابق ہر سپاہی کو انعام و سزا دیتا ہے۔

(۶۲) وَعَنْ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ يَاكُلُ مِنْهَا الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ وَعْدٌ صَادِقٌ يَحْكُمُ فِيْهَا مَلِكٌ عَادِلٌ قَادِرٌ يُحِقُّ فِيْهَا الْحَقَّ وَيُبْطِلُ الْبَاطِلَ كُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الْاٰخِرَةِ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْيَا فَاِنَّ كُلَّ اُمٍّ يَتْبَعُهَا وَلَدُهَا۔

"اور حضرت شدادؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "لوگو! بلاشبہ یہ دنیا ایک ناپائدار متاع ہے جس میں نیک و بد (یعنی مؤمن و کافر) دونوں کھاتے ہیں اور بلاشبہ آخرت ایک سچا اور یقینی طور پر پورا ہونے والا وعدہ ہے اس (آخرت) میں ہر طرح کی

قدرت رکھنے والا اور عدل وانصاف کرنے والا بادشاہ (اپنے حکم وفیصلہ کے ذریعہ) حق کو ثابت رکھے گا اور باطل کو مٹا دے گا (یعنی ثواب و عذاب کے ذریعہ اہل حق اور اہل باطل کو ایک دوسرے سے متمیز اور جدا کر دے گا) تم آخرت کے بیٹے بنو اور دنیا کے بیٹوں میں اپنا شمار نہ کراؤ، کیونکہ ہر ماں کا بیٹا اسی (ماں) کے تابع ہوتا ہے۔"

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دنیا کے بیٹے بنو گے یعنی دنیا کی طلب گاری و محبت میں منہمک و مستغرق رہو گے تو دوزخ میں جاؤ گے کیونکہ باطل دنیا کا ٹھکانا دوزخ ہے اور اگر تم آخرت کے بیٹے بنو گے یعنی طلب آخرت اور اخری امور کی انجام دہی میں منہمک و مستغرق رہو گے تو جنت میں جاؤ گے کیونکہ آخرت حقہ کی جگہ جنت ہے۔ یہ ملا علی قاریؒ کے منقولات کا مفہوم ہے، اور حضرت شیخ عبدالحقؒ نے حدیث کے اختتام پر یہ لکھا ہے کہ پس جو شخص آخرت کا بیٹا ہو گا وہ آخرت کی اتباع کرے گا اور اس کے مطابق عمل کرے گا اور جو شخص دنیا کا بیٹا ہو گا وہ دنیا کی پیروی کرے گا اور اسی کے لئے کام کرے گا۔

تھوڑا مال بہتر ہوتا ہے

(۶۳) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ اِلاَّ وَبِجَنْبَتَیْھَا مَلَکَانِ یُنَادِیَانِ یُسْمِعَانِ الْخَلَائِقَ غَیْرَ الثَّقَلَیْنِ یَاَیُّھَا النَّاسُ ھَلُمُّوْا اِلٰی رَبِّکُمْ مَاقَلَّ وَکَفٰی خَیْرٌ مِمَّا کَثُرَ وَاَلْھٰی۔ رَوَاھُمَا اَبُوْنُعَیْمٍ فِی الْحِلْیَۃِ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب بھی آفتاب طلوع ہوتا ہے اس کے دونوں طرف دو فرشتے ہوتے ہیں جو منادی کرتے ہیں اور جن وانس کے علاوہ اور ساری مخلوق کو سناتے ہیں (یعنی ان کی منادی کو جنات اور انس نہیں سنتے، باقی ساری مخلوق سنتی ہے اور وہ منادی یہ ہوتی ہے) کہ لوگو! اپنے پروردگار کی طرف آؤ (یعنی اپنے پروردگار کے احکام کی اتباع کرو یا یہ معنی ہیں کہ ہر طرف سے بے تعلقی اختیار کر کے اپنے رب کی طرف رجوع کرو، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً اور اس بات کو جان لو کہ جو مال قلیل ہو اور (دینی معاملات کی تکمیل یا زاد عقبی کے طور پر) کفایت کرے وہ اس مال سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو زیادہ ہو اور عبادت خداوندی سے باز اور اطمینان وسکون کی زندگی سے محروم رکھے۔" ان دونوں روایتوں کو ابونعیمؒ نے کتاب حلیہ میں نقل کیا ہے۔

تشریح: فرشتوں کی مذکورہ بالا منادی کا جنات وانسان کو نہ سنایا جانا شاید اس امر کی بناء پر ہے کہ وہ فریضہ کو غیب کی باتوں پر ایمان لانے اور عمل کرنے کے لئے جن وانس پر عائد کیا گیا ہے اس طرح سے بے اثر نہ ہو جائے، ہاں اس موقع پر یہ اشکال ضرور پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ منادی اور اس کا مضمون اصل میں تو انسان ہی کو متنبہ کرنے کے لئے ہے اور جب انسان اس کو سن ہی نہیں سکتا تو وہ متنبہ کیسے ہو گا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس آگاہی کا انحصار محض اپنے کان سے سننے ہی پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ وہ آگاہی سے باخبر اور مطلع ہو جائے، سو یہ بات مخبر صادق رسول کریم ﷺ کے خبر دے دینے اور اس آگاہی کے مضمون کو بیان کر دینے سے حاصل ہو جاتی ہے، لہٰذا مذکورہ بالا مضمون جب اس حدیث کے ذریعہ انسان تک پہنچ گیا تو وہ اس سے حقیقتاً باخبر اور مطلع ہو گیا! رہی یہ بات کہ اس تنبیہ میں صرف انسان ہی کو مخاطب کیوں بنایا گیا، جنات کو بھی خطاب کیوں نہیں کیا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں میں جو نوع، زیادہ مال و دولت کی نہایت حریص اور عقبی سے نہایت غافل ہے وہ نوع انسان ہی ہے، یہ صرف انسان ہے جو دنیا کے پیچھے اپنے خالق تک کو بھول جاتا ہے اور دنیا کا مال ومتاع اس کو ذکر رب اور عبادت الٰہی کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھتا ہے لہٰذا انسان کو خاص طور پر مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ عقبہ کے انجام کی طرف سے تمہاری یہ غفلت ولاپرواہی اور ذکر اللہ سے تمہارے اس اعراض کا سلسلہ کہاں تک جاری رہے گا؟ اپنی اخروی تباہی کے اس راستہ کو چھوڑ دو، اور آؤ، عبادت رب اور ذکر الٰہی کے ذریعہ اس راہ راست کو اپنا لو جو تمہیں آخرت کے حسن انجام تک لے جائے گی۔"

دنیاوی مال و متاع کے تئیں انسان کی حرص

(۶۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ یَبْلُغُ بِهٖ قَالَ اِذَا مَاتَ الْمَیِّتُ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ مَا قَدَّمَ وَقَالُوْا بَنُوْا آدَمَ مَاخَلَّفَ۔ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت منقول ہے جس کو وہ رسول کریم ﷺ تک پہنچاتے (یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں جس کو حدیث مرفوع کہتے ہیں) کہ انہوں نے کہا (حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ) "جب کوئی شخص مرتا ہے تو فرشتے تو یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے آخرت کے لئے (اعمال خیر کی صورت میں) کیا بھیجا ہے اور لوگ یعنی مرنے والے کے ورثاء اور دیگر متعلقین وغیرہ) یہ پوچھتے ہیں کہ اس نے (اپنے ترکہ میں) کیا چھوڑا ہے؟ (گویا فرشتوں کی نظر تو اعمال پر ہوتی ہے اور لوگوں کی نظر دنیاوی مال و متاع پر لگی رہتی ہے)" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

آخرت قریب ہے

(۶۵) وَعَنْ مَالِكٍ اَنَّ لُقْمَانَ قَالَ لِابْنِهٖ یَا بُنَیَّ اِنَّ النَّاسَ قَدْ تَطَاوَلَ عَلَیْهِمْ مَا یُوْعَدُوْنَ وَهُمْ اِلَی الْاٰخِرَةِ سِرَاعًا یَذْهَبُوْنَ وَاِنَّكَ قَدِ اسْتَدْبَرْتَ الدُّنْیَا مُنْذُ كُنْتَ وَاسْتَقْبَلْتَ الْاٰخِرَةَ وَاِنَّ دَارًا تَسِیْرُ اِلَیْهَا اَقْرَبُ اِلَیْكَ مِنْ دَارٍ تَخْرُجُ مِنْهَا۔

"اور حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ (مشہور حکیم) لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا، میرے بیٹے! جس بات (یعنی مردوں کا دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا، حساب اور ثواب و عذاب وغیرہ) کا لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا، اس کی مدت (از آدم تا ایں دم ان پر دراز ہوگئی حالانکہ لوگ آخرت کی طرف تیزی سے چلے جا رہے ہیں۔ اور میرے بیٹے! جس وقت تم پیدا ہوئے تھے اسی وقت سے تمہاری پیٹھ دنیا کی طرف اور تمہارا رخ آخرت کی طرف ہے (یعنی تم اپنی پیدائش کے دن سے گویا دنیا کو پیچھے چھوڑتے چلے آرہے ہو اور آخرت کی طرف بڑھتے جا رہے ہو) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جس گھر اور مقام کی طرف تم جا رہے ہو وہ تم سے اس گھر اور مقام کی بہ نسبت زیادہ قریب ہے جس کو تم چھوڑ کر جا رہے ہو۔" (رزینؒ)

تشریح: "اس کی مدت ان پر دراز ہوگئی" کا مطلب یہ ہے کہ قیامت آنے، امور آخرت اور اس جہان کی زندگی کے بارے میں جو خبر دی گئی ہے اور اس کا جو وعدہ کیا گیا ہے اس پر چونکہ ایک طویل مدت گزر گئی ہے اس لئے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وعدے کے پورے ہونے میں دیر ہوگئی ہے حالانکہ دیر کچھ نہیں ہوئی ہے بلکہ دنیا کا سفر جاری ہے اور لوگ ہر ساعت بلکہ ہر لمحہ اس یوم موعود اور آخرت کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کی خبر ان کو دی گئی ہے جیسا کہ کشتیوں کا کارواں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور بھری ہوئی کشتیوں میں بیٹھے ہوئے اہل کارواں راستہ گزرنے کا احساس نہیں کرتے! اسی بات کو اس جملہ، "اور جس وقت تم پیدا ہوئے تھے.....الخ" کے ذریعہ بیان کیا گیا۔ اس جملہ میں اگرچہ خاص طور پر بیٹے سے خطاب کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں اس سے مراد عام خطاب ہے کہ اس بات کا روئے سخن ہر انسان کی طرف ہے۔

روایت کے آخری جملہ سے اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی جگہ کو چھوڑ کر نکلتا ہے تو اس کا ہر قدم اس جگہ سے دور ہوتا جاتا ہے اور جس جگہ کی طرف اس کا رخ ہوتا ہے اس سے قریب تر ہوتا رہتا، لہٰذا جو بھی انسان اس دنیا میں آتا ہے وہ اپنی پیدائش کے دن سے آخرت کی طرف اپنا سفر شروع کر دیتا ہے اور دنیا کو پیچھے چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح گویا وہ ہر دن اور ہر لمحہ ایک ایسی مسافت کے درمیان ہے جس کو وہ قطع کرتا رہتا ہے اور اس کے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن ایسا آئے گا جب وہ مسافت پوری ہو جائے گی اور وہ جس جانب رواہ دواں ہے وہ وہاں پہنچ جائے گا! واضح رہے کہ حکیم لقمان کی اس نصیحت کا مقصد اس غفلت کا پردہ چاک کرنا ہے جس نے امور آخرت کی طرف سے بے پرواہ بنا رکھا ہے۔

بہتر انسان کون ہے؟

(۶۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ النَّاسِ اَفْضَلُ قَالَ کُلُّ مَخْمُوْمِ الْقَلْبِ صَدُوْقِ اللِّسَانِ قَالُوْا صَدُوْقُ اللِّسَانِ نَعْرِفُہٗ فَمَا مَخْمُوْمُ الْقَلْبِ قَالَ ھُوَ النقی التَّقِیُّ لَا اِثْمَ عَلَیْہِ وَلَا بَغْیَ وَلَا غِلَّ وَلَا حَسَدَ رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون آدمی بہتر ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہر وہ شخص جو مخموم دل اور زبان کا سچا ہو۔" (یہ سن کر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ زبان کے سچے کو تو ہم جانتے ہیں (کہ زبان کا سچا اس شخص کو کہتے ہیں جو کبھی جھوٹ نہ بولے) لیکن "مخموم دل" سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "مخمول دل وہ شخص ہے جس کا دل پاک وصاف ہو، پرہیزگار ہو، اس میں کوئی گناہ نہ ہو، اس نے کوئی ظلم نہ کیا ہو، حد سے تجاوز نہ کیا ہو، اور اس میں کدورت و کینہ اور حسد کا مادہ نہ ہو۔" (ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: لفظ "مخموم" اصل میں "خم" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں "جھاڑو دینا، کوڑے کرکٹ اور گندگی سے زمین و کنویں کو صاف کرنا۔" پس "مخموم دل سے" مراد وہ شخص ہے جس کا دل غیر اللہ کے غبار سے صاف ستھرا ہو اور برے اخلاق و احوال اور فاسد افکار و خیالات سے پاک ہو جس کو "سلیم القلب" کہا جاتا ہے، اور جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ! اسی مراد کو حضور ﷺ نے لفظ "نقی" اور "تقی" کے ذریعے واضح فرمایا، چنانچہ "نقی" کے معنی ہیں وہ شخص جس کا دل اور باطن غیر اللہ کی محبت سے پاک وصاف ہو! اور "تقی" کے معنی ہیں فاسد و بیہودہ افکار و خیالات، لغو عقائد اور برے اعمال و خیال سے بچنے والا۔

صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے جو "مخموم القلب" کے معنی دریافت کیے تو اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت دریافت کرنے والے صحابہؓ کے ذہن میں لفظ "مخموم" کے لغوی معنی محفوظ نہیں ہوں گے کیونکہ آنحضرت ﷺ کبھی کبھی ایسے نادر الفاظ ارشاد فرماتے تھے کہ صحابہؓ عربی زبان پر پوری دستگاہ رکھنے اور فصاحت بلاغت کے رموز سے آشنا ہونے کے باوجود ان کا فہم ان الفاظ کے معنی تک نہیں پہنچ پاتا تھا، چنانچہ وہ حضور ﷺ سے ایسے الفاظ کے بارے میں دریافت کر لیا کرتے تھے۔ یا یہ کہ صحابہؓ لفظ "مخموم" کے معنی تو جانتے تھے لیکن قلب کی طرف اس لفظ کی اضافت اور اس کی مراد و معنی کا تعین ان کے فہم سے باہر تھا، چنانچہ انہوں نے دریافت کیا اور حضور ﷺ نے اس کی وضاحت فرما دی۔ یہ احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

وہ چار باتیں جو دنیا کے نفع نقصان سے بے پرواہ بنا دیتی ہیں

(۶۷) وَعَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ اِذَا کُنَّ فِیْکَ فَلَا عَلَیْکَ مَافَاتَکَ الدُّنْیَا حِفْظُ اَمَانَۃٍ وَصِدْقُ حَدِیْثٍ وَحُسْنُ خَلِیْقَۃٍ وَعِفَّۃٌ فِیْ طُعْمَۃٍ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(لوگو!) چار چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ تم میں پائی جائیں تو دنیا کے فوت ہونے نہ ہونے کا تمہیں کوئی غم نہیں ہونا چاہئے، ایک تو امانت کی حفاظت کرنا (یعنی حقوق کی حفاظت و ادائیگی کرنا اور ان حقوق کا تعلق خواہ پروردگار سے ہو یا بندوں سے اور یا اپنے نفس سے) دوسرے سچی بات کہنا، تیسرے اخلاق کا اچھا ہونا اور چوتھے کھانے میں احتیاط و پرہیزگاری اختیار کرنا (یعنی حرام و ناجائز کھانے سے پرہیز کرنا اور زیادہ کھانے سے اجتناب کر کے بقدر حاجت و ضرورت پر اکتفا کرنا۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی ان چار چیزوں سے معمور ہو گئی تو گویا اس نے اخروی نعمتوں کی جڑ پکڑ لی، اس کے نفس نے

روحانی عروج و کمال کا درجہ پالیا، اس کا قلب و باطن منور ہو گیا اور ثواب آخرت اور بہشت کی لازوال نعمتوں کا ذریعہ اس کو حاصل ہو گیا، لہٰذا اس صورت میں اگر وہ دنیا بھر کی نعمتوں اور تمام مادی خواہشات و لذات سے محروم ہو جائے تو اس کو کوئی افسوس و غم نہیں ہونا چاہئے بلکہ ایک طرح سے اس کو اس محرومی پر مطمئن ہونا چاہئے کہ اگر دنیاوی نعمتیں اور لذتیں حاصل ہوتیں تو ان کی وجہ سے دینی معمولات اور عبادات و طاعات میں جمعیت خاطری اور حضور قلب، خلل و وحشت کا شکار ہوتے اور روحانی لطافت و نورانیت کا جمال مادی کثافت و ظلمت سے غبار آلود ہو جاتا۔

راست گفتاری و نیک کرداری کی اہمیت

(۶۸) وَعَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِي اَنَّهٗ قِيْلَ لِلُقْمَانَ الْحَكِيْمِ مَابَلَغَ بِكَ مَانَرٰى يَعْنِي الْفَضْلَ قَالَ صِدْقُ الْحَدِيْثِ وَاَدَآءُ الْاَمَانَةِ وَتَرْكُ مَالَا يَعْنِيْنِي۔ رَوَاهُ فِي الْمُوَطَّا۔

"اور حضرت امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ جب لقمان حکیم سے یہ پوچھا گیا کہ جس مرتبہ (یعنی فضیلت (کے جس مقام) پر ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں اس تک آپ کو کس چیز نے پہنچایا ہے؟ لقمان حکیم نے فرمایا۔ "سچ بولنے نے (کہ میں نے سچائی کا دامن، کبھی نہیں چھوڑا، خواہ میں نے خود کوئی بات کہی ہو یا کسی کی کوئی بات نقل کی ہو ہمیشہ سچ بولنے پر عامل رہا) ادائیگی امانت نے (یعنی خواہ کوئی مالی معاملہ رہا ہو یا فعلی، میں نے ہمیشہ دیانت داری کو ملحوظ رکھا ہے) اور جو چیزیں میرے لئے بے فائدہ اور غیر ضروری ہیں ان کو ترک کر دینے سے۔" (موطاؒ)

تشریح: اس روایت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصل حکمت و دانائی، راست گفتاری و نیک کرداری ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کے یہی وہ دو اعلیٰ جوہر ہیں جن کو اختیار کر کے لقمان حکیم اپنے عظیم مرتبہ تک پہنچ گئے۔

لقمان حکیم کون تھے؟: لقمان حکیم، جن کی حکمت و دانائی آج بھی ضرب المثل ہے اور جن کا نام عقل و دانش کے اس پیکر کے طور پر لیا جاتا ہے جس سے دنیا کے بڑے بڑے حکماء، بڑے بڑے مقننین اور بڑے بڑے فلاسفر فیضان حاصل کرتے ہیں، دراصل مشہور پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے اور بعض حضرات نے ان کو حضرت ایوب علیہ السلام کا خالہ زاد بھائی کہا ہے، علماء اسلام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ خود پیغمبر تھے یا نہیں؟ تاہم یہ بات متفقہ طور پر مسلم ہے کہ وہ ایک عظیم حکیم و فلاسفر تھے اور ولایت کے درجہ پر فائز تھے، نیز منقول ہے کہ انہوں نے تقریباً ایک ہزار پیغمبروں کی خدمت میں حاضر باشی اختیار کی تھی اور ان سب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، غالباً ان کی اس بے مثال حکمت و دانائی کا ایک بڑا راز یہ بھی ہے کہ ان کو اتنے زیادہ پیغمبروں سے فیضان حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا! حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ لقمان، نہ تو پیغمبر تھے اور نہ کوئی بادشاہ بلکہ وہ ایک سیاہ فام غلام تھے اور بکریاں چرایا کرتے تھے، حق تعالیٰ نے ان کو مقبول بارگاہ رب العزت بنایا، انہیں حکمت و دانائی، جوانمردی اور عقل و دانش سے نوازا، اور اپنی کتاب "قرآن کریم" میں ان کا ذکر فرمایا۔"

قیامت کے دن بندوں کے حق میں نیک اعمال کی شفاعت؟

(۶۹) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَجِيْءُ الْاَعْمَالُ فَتَجِيْءُ الصَّلٰوةُ فَتَقُوْلُ يَارَبِّ اَنَا الصَّلٰوةُ فَيَقُوْلُ اِنَّكِ عَلٰى خَيْرٍ فَتَجِيْءُ الصَّدَقَةُ فَتَقُوْلُ يَارَبِّ اَنَا الصَّدَقَةُ فَيَقُوْلُ اِنَّكِ عَلٰى خَيْرٍ ثُمَّ يَجِيْءُ الصِّيَامُ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ اَنَا الصِّيَامُ فَيَقُوْلُ اِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ ثُمَّ تَجِيْءُ الْاَعْمَالُ عَلٰى ذٰلِكَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ ثُمَّ يَجِيْءُ الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ اَنْتَ السَّلَامُ وَاَنَا الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ بِكَ الْيَوْمَ اٰخُذُ وَبِكَ اُعْطِي

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِهٖ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ (قیامت کے دن) اعمال (خداوند برتر وبزرگ کے حضور) آئیں گے۔ پس (سب سے پہلے) نماز پیش ہوگی اور عرض کرے گی کہ اے پروردگار! میں نماز ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "بے شک تو بھلائی ہے۔" پھر صدقہ یعنی زکوۃ پیش ہوگی اور عرض کرے گی کہ اے پروردگار! میں صدقہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "بے شک تو بھلائی ہے۔" اور پھر روزہ پیش ہوگا اور عرض کرے گا کہ اے پروردگار! اسی طرح (یکے بعد دیگرے) دوسرے اعمال (جیسے حج، جہاد اور طالب علم وغیرہ) پیش ہوں گے (اور ہر ایک عمل مذکورہ بالا الفاظ میں اپنا تعارف پیش کرے گا) اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو خیر پر ہے (گویا ہر نیک عمل اپنے تعارف کے ذریعہ بندوں کے حق میں جو شفاعت کرے گا اس کی قبولیت کو حق تعالیٰ موقوف رکھے گا اور ہر ایک کی درخواست کو نہایت ملائمت و نرمی اور مہربانی کے ساتھ ملتوی رکھے گا) پھر (سب سے آخر میں) اسلام پیش ہوگا اور عرض کرے گا کہ، اے پروردگار! تیرا نام سلام ہے (کہ تیری ذات تمام عیوب و آفات اور ہر طرح کے نقص سے سالم و پاک ہے، اور تو تمام بندوں کو ہر طرح کے خوف اور تمام سختیوں اور مصیبتوں سے سلامتی بخشنے والا ہے) اور میں اسلام ہوں (کہ تیرے حضور عجز و نیاز کرنے والا اور تیرے احکام کا مطیع و فرمانبردار ہوں، نیز میرے بارے میں تو نے خود فرمایا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "بے شک تو بھلائی پر ہے، آج کے دن میں تیرے ہی سبب مواخذہ کروں گا اور تیرے ہی وسیلہ سے عطا کروں گا (یعنی آج جزاو سزا کے دن میں تجھے ہی اصل اور طاعت و معصیت کے فیصلوں کا مدار قرار دیتا ہوں کہ جس نے تجھے اختیار نہیں کیا اور تیرے راستے پر نہیں چلا اس سے مواخذہ کروں گا اور اس کو عذاب میں مبتلا کروں گا اور جس نے تجھے اختیار کیا اور تیرے راستہ پر گامزن رہا اس کو جزاو ثواب دوں گا، لہٰذا تو جو کچھ چاہتا ہے ہمارے سامنے عرض کر، ہم تیری ہر سفارش و شفاعت قبول کریں گے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ یعنی جو شخص اسلام کے سوا کسی دین کو اختیار کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ٹوٹے میں رہنے والوں میں سے ہے۔"

تشریح: تَجِیْءُ الْاَعْمَالُ کا مطلب یہ کہ قیامت کے دن نیک اعمال بحضور رب ذوالجلال پیش ہوں گے اور دنیا میں جن لوگوں نے ان اعمال کو اختیار کیا ہوگا ان کے حق میں گواہی دیں گے اور ان کی شفاعت کریں گے، نیز جن لوگوں نے ان اعمال کو ترک کیا ہوگا ان کے خلاف احتجاج و شکایت کریں گے! رہی یہ بات کہ ان اعمال کے پیش ہونے کی کیا صورت ہوگی تو وہ ایک قوی احتمال یہ ہے کہ وہ اعمال اچھی صورتوں میں مشکل ہو کر پیش ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو نہایت پاکیزہ اور خوشنما صورتیں عطا فرمائے گا جیسا کہ بعض احادیث و آثار سے مفہوم ہوتا ہے اور یا یہ کہ حق تعالیٰ کی یہ قدرت پوری طرح ثابت ہے کہ وہ اعراض کو بالذات پیش کردے اور ان کو قوت گویائی عطا فرمائے۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے حدیث کی وضاحت میں یہ لکھا ہے کہ نماز کا یہ تعارف پیش کرنا کہ "میں نماز ہوں" دراصل اس مفہوم کا حامل ہے کہ اے پروردگار! مجھ کو تیری بارگاہ میں جو عظمت و مرتبہ حاصل ہے کہ تو نے مجھے اپنے دین کا ستون فرمایا ہے اور اپنے نزدیک مقام عزت و قرب سے نوازا ہے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اور بامید قبولیت تیری درگاہ لطف و کرم بندوں کے حق میں شفاعت کرنے حاضر ہوئی ہوں اور چونکہ تو نے یہ فرمایا ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ اس لئے جس طرح میں دنیا میں لوگوں کو فسق و فجور سے دور رکھنے والی تھی اسی طرح آج کے دن امیدوار ہوں کہ لوگوں کو تیرے عذاب سے دور رکھوں اور تیرے غضب سے بچاؤں۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ نماز سے فرمائے گا کہ۔ "بے شک تو بھلائی اور صلاح و فلاح کی حامل ہے۔" گویا اللہ تعالیٰ نماز کی شفاعت کو قبول نہیں فرمائے گا بلکہ اس کی درخواست شفاعت کو موقوف، ملتوی رکھے گا اور مذکورہ ارشاد کے ذریعہ اس توقف والتواء کو نہایت بلیغ و پاکیزہ انداز اور حسن کلام کے ذریعہ ظاہر کرے گا اور اس ارشاد کا مفہوم در حقیقت یہ ہوگا کہ اے نماز! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے تجھ کو بہت بڑے مرتبہ کا حامل قرار دیا ہے اور تجھ میں جو فضل و شرف رکھا ہے وہ ایک حقیقت ہے اور بجائے خود ہے، لیکن جہاں تک شفاعت کا

تعلق ہے تو یہ ایک دوسرا مرتبہ ہے جو تجھے حاصل نہیں ہے بلکہ یہ صفت و مرتبہ اس کو دیا گیا ہے جو تیری اور تیری ہم مثل عبادتوں کی بنیاد و مبنیٰ ہے اور تمام اچھی صفات کا مجموعہ یعنی دین اسلام۔

اس موقع پر ایک لطیف نکتہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ مقام شفاعت پر کھڑا ہونا (یعنی قیامت کے دن بارگاہ رب العزت میں بندوں کے حق میں شفاعت کرنا) صرف اس ذات کو سزاوار ہے جو جامع کمالات ہے جیسا کہ محمد مصطفےٰ ﷺ کی ذات پاک کہ آپ ﷺ تمام اسماء وصفات الٰہی کے مظہر ہیں، چنانچہ شفاعت کا حق صرف آپ ﷺ کی ذات کو حاصل ہوگا، آپ کے علاوہ کوئی اور پیغمبر شفاعت کا دروازہ کھلوانے پر قادر نہیں ہوگا اسی طرح اعمال میں بھی صرف وہی عمل شفاعت کرنے کا مجاز ہوگا جو تمام صفات و کمالات کا جامع ہے یعنی اسلام، جیسا کہ حدیث کے آخری جز سے واضح ہوتا ہے۔

صدقہ کا یہ تعارف پیش کرنا کہ "میں صدقہ ہوں" اس مفہوم کا حامل ہوگا کہ پروردگار! میں اپنی عزت و فضیلت کا سہارا لے کر تیری بارگاہ میں شفاعت کرنے حاضر ہوا ہوں جس سے تو نے اپنے لطف و کرم کے طفیل مجھے نوازا ہے اور میرے حق میں فرمایا ہے کہ الصدقة تطفی غضب الرب اسی طرح روزہ کے اس تعارف کا کہ "میں روزہ ہوں" یہ مفہوم ہوگا کہ پروردگار! میں وہ عبادت یعنی روزہ ہوں جو اس مخصوص صفت و حیثیت کا حامل ہے کہ تو نے اس کی وہ خاص جزا رکھی ہے جس کو تیرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا اور جس شخص نے اس کو اختیار کیا اور اس کے پورے حقوق کی رعایت ملحوظ رکھی اس کو تو نے بخشنے اور جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، لہٰذا میں اپنے اس فضیلت و خصوصیت کی بناء پر بامید قبولیت تیری بارگاہ میں درخواست شفاعت لے کر حاضر ہوا ہوں۔

"اسلام" اپنے تعارف کے سلسلے میں جو اسلوب و انداز اختیار کرے گا وہ مذکورہ بالا دیگر اعمال کے اسلوب تعارف سے مختلف ہوگا، چنانچہ اس کو چونکہ باب شفاعت واکرانے میں بہت دخل ہوگا اس لئے وہ اپنے تعارف اور اپنی درخواست کی ابتداء حق تعالیٰ شانہ کی حمد و تعریف اور اس کے تئیں اظہار تعظیم سے کرے گا جیسا کہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ جب مقام شفاعت پر کھڑے ہوں گے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف اور تعظیم و ثنا بیان کریں گے اس کے بعد درخواست شفاعت پیش کریں گے، لہٰذا اسلام حق تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر اس کو اس کے اسم مبارک سلام کے ذریعہ صدا دے گا اور اپنے آپ کو ایک مطیع و فرمانبردار ذات ظاہر کرے گا اور اس کے بعد درخواست شفاعت پیش کرے گا۔

ایک یہ احتمال بھی ہے کہ حدیث میں "اسلام" سے مراد دین اسلام نہ ہو بلکہ صفت رضاء تسلیم اور ترک اختیار مراد ہو جو خدا کے برگزیدہ اور مقرب بندوں کے اعلیٰ مراتب میں سے ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں "اسلام" کا ذکر اسی مفہوم میں کیا گیا ہے کہ فرمایا اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یعنی جب ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب نے فرمایا کہ تابعداری اختیار کرو تو انہوں نے کہا کہ میں رب العالمین کا تابعدار رہا)۔

دنیا کی طرف مائل کرنے والی چیزوں کو چھوڑ دو

(۷۵) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ لَنَا سِتْرٌ فِيْهِ تَمَاثِيْلُ طَيْرٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَآئِشَةُ حَوِّلِيْهِ فَاِنِّىْ اِذَا رَاَيْتُهٗ ذَكَرْتُ الدُّنْيَا۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہمارے ہاں (دروازے پر، یا بطور دیوارگیری) جو پردہ تھا اس پر پرندوں کی تصویریں بنی ہوتی تھیں چنانچہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عائشہؓ! اس پردہ کو بدل ڈالو، کیونکہ جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو دنیا یاد آجاتی ہے۔"

تشریح: حضور ﷺ نے اس پردے کو بدلنے کا حکم جس انداز سے دیا اور اس کی جو علت بیان فرمائی اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس پردے پر جو تصویریں تھیں وہ نمایاں نہیں تھیں بلکہ ان کے خطوط و نقوش اس قدر چھوٹے اور غیر واضح تھے کہ ان پر حقیقی معنی میں "تصویر"

کا اطلاق نہیں ہوتا تھا، یا یہ کہ تصویر دار پردہ کا یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ تصویر کی حرمت نازل ونافذ نہیں ہوئی تھی۔

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان اسباب واشیاء کو دیکھنا کہ جس کے ذریعہ دولتمند لوگ عیش وعشرت کی زندگی اختیار کرتے ہیں۔ فقراء کے قلب کی حلاوت وطمانیت پر اثر انداز ہوتا ہے، لہٰذا عیش وعشرت کی چیزوں اور دنیا کی طرف مائل کرنے والی اشیاء کو نہ صرف یہ کہ اختیار نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کی طرف نظر بھی نہیں اٹھانی چاہئے۔

چند انمول نصائح

(۷۱) وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِظْنِیْ وَاَوْجِزْ فَقَالَ اِذَا قُمْتَ فِیْ صَلَاتِکَ فَصَلِّ صَلٰوۃَ مُوَدِّعٍ وَلَا تَکَلَّمْ بِکَلَامٍ تَعْتَذِرُ مِنْہُ غَدًا وَاَجْمِعِ الْاِیَاسَ مِمَّا فِیْ اَیْدِی النَّاسِ۔

"اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا کہ (یارسول اللہ!) مجھ کو کوئی ایسی نصیحت فرمایئے مختصر اور جامع ہو! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اس شخص کی طرح نماز پڑھو جو (اللہ کے سوا ہر چیز یعنی مخلوق اور اپنے نفس کو) رخصت کرنے اور چھوڑنے والا ہے (حاصل یہ کہ جب نماز پڑھو تو دنیا بھر سے اپنی توجہ اور اپنا خیال پھیر کر کامل اخلاص اور پوری توجہ کے ساتھ رب العالمین کی طرف متوجہ رہو) نیز اپنی زبان سے ایسی کوئی بات نہ نکالو جس کے سبب تمہیں کل (قیامت کے دن، اللہ کے حضور) عذر خواہی کرنی پڑے (یا یہ کہ عذر خواہی کا مفہوم، عموم پر محمول ہے یعنی کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکال جس کے سبب تمہیں اپنے دوستوں، رفقاء و متعلقین اور تمام مسلمانوں کے سامنے پشیمان ہونا پڑے اور معذرت کرنے کی ضرورت پیش آئے) اور اس چیز سے ناامید ہو جانے کا پختہ ارادہ کرلو جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، (یعنی خدا نے تمہاری قسمت میں جتنا لکھ دیا ہے اور تمہیں جو کچھ دے دیا ہے اسی پر قناعت وکفایت کرو، اور لوگوں کے مال ومتاع سے اپنی امید وابستہ نہ کرو۔"

تشریح: "رخصت کرنے" کے ایک معنی تو وہ ہیں جو اوپر ترجمہ میں بیان کیے گئے ہیں اور ممکن ہے کہ "رخصت کرنے" سے مراد حیات کو رخصت کرنا ہو، یعنی تم اس طرح نماز پڑھو کہ گویا وہ تمہاری آخری نماز ہے اور وہ وقت تمہاری زندگی کا آخری وقت ہے! چنانچہ مشائخ کی وصیتوں اور نصائح میں یہ زریں ہدایت منقول ہے کہ طالب کو چاہئے کہ وہ اپنی ہر نماز میں یہ تصور کرے کہ بس یہ آخری نماز ہے! جب وہ اس تصور کے ساتھ نماز پڑھے گا تو یقیناً اس نماز کو کامل اخلاص، پورے ذوق وشوق، حضور قلب اور تعدیل ارکان کے ساتھ ادا کرے گا۔

حدیث کے آخری الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ دوسروں کے مال ومتاع اور دولت پر نظر رکھنا اور ان سے امیدیں وابستہ کرنا قلبی فقر وافلاس کی علامت ہے، چنانچہ قلب کا غنی ہونا اس پر منحصر ہے کہ لوگوں کے پاس جو کچھ مال ومتاع اور دولت ہے اس سے اپنی امید منقطع کرلی جائے۔

پرہیزگاری کی فضیلت

(۷۲) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ لَمَّا بَعَثَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَی الْیَمَنِ خَرَجَ مَعَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْصِیْہِ وَمُعَاذٌ رَاکِبٌ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَمْشِیْ تَحْتَ رَاحِلَتِہٖ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ یَا مُعَاذُ اِنَّکَ عَسٰی اَنْ لَّا تَلْقَانِیْ بَعْدَ عَامِیْ ھٰذَا وَلَعَلَّکَ اَنْ تَمُرَّ بِمَسْجِدِیْ ھٰذَا وَقَبْرِیْ فَبَکٰی مُعَاذٌ جَشْعًا لِفِرَاقِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَاَقْبَلَ بِوَجْھِہٖ نَحْوَ الْمَدِیْنَۃِ فَقَالَ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِیَ الْمُتَّقُوْنَ مَنْ کَانُوْا وَحَیْثُ کَانُوْا۔ رَوَی الْاَحَادِیْثَ الْاَرْبَعَۃَ اَحْمَدُ۔

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب رسول کریم ﷺ نے انہیں (قاضی یا عامل بنا کر) یمن روانہ فرمایا تو آپ ﷺ (الوداع کہنے کے لئے کچھ دور تک) ان کے ساتھ گئے اور اس دوران آپ ﷺ کو تلقین و نصیحت کرتے رہے، نیز اس وقت معاذؓ تو اپنی سواری پر سوار تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کی سواری کے ساتھ ساتھ (پیدل) چل رہے تھے! جب آپ ﷺ نصائح و ہدایت سے فارغ ہوئے تو فرمایا۔ "معاذؓ! میری عمر کے اس سال کے بعد شاید تم مجھ سے ملاقات نہیں کر سکو گے، اور ممکن ہے کہ تم (جب یمن سے واپس لوٹو گے تو مجھ سے ملاقات کرنے کے بجائے) میری اس مسجد اور میری قبر سے گزرو۔" معاذؓ (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ کی جدائی کے غم میں رونے لگے اور رسول کریم ﷺ نے معاذؓ کی طرف سے منہ پھیر کر مدینہ کی جانب اپنا رخ کر لیا، پھر فرمایا۔ "میرے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو پرہیز گار ہیں خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں (یعنی خواہ وہ کسی رنگ و نسل، کسی ملک و قوم اور کسی طبقہ و مرتبہ کے ہوں)" ان چاروں روایتوں کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: لفظ "ماقبل" گویا لفظ "التفت" کی وضاحت ہے! نیز معاذؓ کی طرف سے، حضور ﷺ کے منہ پھیرنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ آپ ﷺ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کو روتا ہوا دیکھیں، کیونکہ اس صورت میں آپ ﷺ کا دل بھی بھر آتا اور بعید نہیں تھا کہ آپ ﷺ بھی رونے لگتے جس سے آپ ﷺ کے قلب مبارک پر غم کا احساس شدید تر ہو جاتا! نیز اس طرح آپ ﷺ نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ میری اس بات سے تمہارا غمگین ہونا اور رونا بالکل بجا، لیکن میرا اس دنیا کو چھوڑنا اور آخرت کا سفر اختیار کرنا ایک یقینی بات ہے! چنانچہ ایک طرف تو آپ ﷺ نے اپنے مذکورہ فعل کے ذریعہ حضرت معاذؓ کو ڈھارس دی اور ان کو حادثہ فاجعہ کو قبول کرنے کے لئے تیار کیا اور دوسری طرف اپنے اشارہ کے ذریعہ ان کو آگاہ فرمایا کہ تم اس وقت مجھ سے اور مدینہ سے جدا ہو رہے ہو لیکن بعد میں تم مدینہ کو دیکھ لوگے البتہ مجھے دیکھنا تمہیں نصیب نہیں ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ انبیاء اور اتقیا کے درمیان حقیقی رفاقت و قرب کا کیف بس اسی جہاں میں حاصل ہوگا جو دار البقاء ہے وہاں جو شخص جس کا رفیق و ساتھی بن جائے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے! لہٰذا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو میری ہمیشہ کی رفاقت کا شرف مل جائے اور آخرت کی دائمی زندگی میں اس کو وہ مرتبہ نصیب ہو کہ جس کی وجہ سے اس کو میری شفاعت و قرب حاصل ہو تو اس کو چاہئے کہ تقویٰ و پرہیز گاری اختیار کرے، کیونکہ یہی وہ راہ ہے جس پر چل کر کوئی شخص میری قربت حاصل کر سکتا ہے۔

"خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں" جیسا کہ اوپر ترجمہ میں بھی وضاحت کی گئی، اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میرا پسندیدہ میرا نزدیک اور میرا عزیز بننا چاہتا ہے اس کو لازم ہے کہ وہ متقی بنے، قطع نظر اس بات کے کہ وہ کس قبیلہ و قوم کا ہے، کس رنگ و نسل کا ہے اور کس ملک میں سکونت پزیر ہے، ایک شخص مکہ اور مدینہ میں میرا ہم شہر اور میرے قبیلہ و خاندان کا ہونے کے باوجود میرے قریب نہیں ہو سکتا جب کہ وہ پرہیز گاری اختیار کیے ہوئے نہ ہو، اور ایک شخص مجھ سے بہت دور سکونت پذیر ہونے اور مجھ سے کوئی نسلی و قرابتی تعلق نہ رکھنے کے باوجود کہ وہ بصرہ میں ہو یا کوفہ میں، یمن میں ہو یا کسی اور دور دراز کے ملک میں، میرے، بہت قریب و نزدیک ہو سکتا ہے جب کہ وہ پرہیز گاری پر عامل ہو! اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک تو حضرت اویس قرنیؒ تھے کہ ان کو کبھی بھی حضور کی زیارت تک نصیب نہیں ہوئی اور یمن میں سکونت پذیر رہے مگر چونکہ وہ تقویٰ اور پرہیز گاری کے درجہ کمال پر پہنچے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے کتنا عظیم مرتبہ پایا اور حضور ﷺ سے دور رہنے کے باوجود بارگاہ رسالت میں کس قدر قربت و نزدیکی کے حامل ہوئے، اس کے برخلاف ایک وہ لوگ تھے جن کا شمار مکہ اور مدینہ کے معزز ترین اور اشرف لوگوں میں ہوتا تھا حضور ﷺ ہی کے شہر میں رہتے تھے اور حضور ﷺ ہی کے قبیلہ و خاندان کے تھے مگر چونکہ ترک تقویٰ اختیار کیے ہوئے تھے اس لئے بارگاہ رسالت میں مقام قرب سے محروم رہے بلکہ حضور ﷺ کو تکالیف ایذا پہنچانے کے سبب نہایت شقی اور بدبخت قرار پائے۔ پس حضور ﷺ نے مذکورہ ارشاد کے ذریعہ گویا حضرت معاذؓ کو تسلی دی کہ ہماری ظاہری جدائی کا غم نہ کھاؤ بلکہ تقویٰ کو اختیار کیے رہے اگر تم متقی رہے تو گو ظاہری اعتبار سے تم ہم سے

جدا ہو گے مگر معنوی طور پر ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا مذکورہ ارشاد حضرت معاذؓ کو اپنی رحلت کی پیشگی اطلاع دینے کے بعد گویا ان کے حق میں تسلی کے طور پر تھا اور ان کو اس طرف متوجہ کرنا مقصود تھا کہ جب تم اپنے فرائض منصبی کو پورا کر کے یمن سے مدینہ واپس آؤ اور مجھے اس دنیا میں موجود نہ پاؤ تو اس وقت یہاں ان لوگوں کی اقتداء واتباع کرنا جو اپنے تقویٰ وطہارت اور کمال دینداری کے سبب مجھ سے سب سے زیادہ نزدیک اور قریب ہیں۔ پھر طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد میں جن لوگوں کی اقتداء واتباع کرنے کا حکم دیا گیا ان سے گویا (بطور کنایہ) حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ذات گرامی مراد تھی جن کو آنحضرت ﷺ کے بعد خلیفہ اول قرار پانا تھا، اس بات کی تائید حضرت جبیر ابن مطعمؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا تعلق اسی طرح کے ایک واقعہ سے ہے جس میں حضور ﷺ نے اپنے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی طرف اشارہ فرمایا تھا، چنانچہ اس روایت میں منقول ہے کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئی اور آپ ﷺ سے کسی مسئلہ میں گفتگو کی۔ حضور ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم کسی اور وقت آنا (تو میں تفصیل کے ساتھ تمہیں سمجھا دوں گا) اس عورت نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر میں کسی ایسی وقت آئی کہ (خدانخواستہ) آپ ﷺ (اس دنیا میں) موجود نہ ہوئے تو میں کیا کروں گی؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "اگر تم ایسے وقت آئیں کہ میں (اس دنیا میں) نہیں رہا تو پھر تم ابوبکرؓ کے پاس چلی جانا۔" گویا حضور ﷺ نے اس طرف صریحا اشارہ فرمایا کہ میرے بعد ابوبکرؓ خلیفہ ہوں گے اور اس وقت مسلمانوں کے مقتداء وہی ہوں گے۔

بہرحال اس حدیث کا مقصد اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ اپنے تمام دینی ودنیاوی معاملات اور تمام ملکی وشرعی امر میں ہمہ وقت احتیاط وتقویٰ کو ملحوظ رکھنا چاہئے، نیز اس میں تمام اُمّت کے لئے یہ تسلی بھی پوشیدہ ہے کہ جن لوگوں کو حضور ﷺ کا زمانہ اور آپ ﷺ کی خدمت وصحبت کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے، خواہ وہ کتنے ہی زمانہ کے بعد پیدا ہوں گے اگر وہ تقویٰ اختیار کریں گے تو انہیں بارگاہ رسالت میں تقرب حاصل ہوگا، اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا هٰذِهِ النِّعْمَةَ۔

شرح صدر کی علامت

(۷۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ النُّوْرَ اِذَا دَخَلَ الصَّدْرَ انْفَسَخَ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ لِتِلْكَ مِنْ عَلَمٍ تُعْرَفُ بِهٖ قَالَ نَعَمْ التَّجَافِيْ مِنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْاِنَابَةُ اِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِهٖ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے آیت پڑھی فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کو ہدایت بخشنا چاہتا ہے (یعنی خاص ہدایت کہ جو اس کو مرتبۂ اختصاص تک پہنچا دے) تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے (بایں طور کہ اس کو شرائع اسلام اخلاص کے ساتھ قبول کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے) پھر حضور ﷺ نے (گویا آیت کی تفسیر میں) فرمایا۔ (جب ہدایت کا) نور سینہ میں داخل ہوتا ہے تو سینہ فراخ اور کشادہ ہو جاتا ہے۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا اس حالت وکیفیت کی کوئی علامت ہے جس سے اس کو پہچانا جا سکے؟ حضور نے فرمایا۔ "ہاں! اس کی نشانی ہے، دار الغرور (دنیا سے) دور رہنا، آخرت کی طرف کہ جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا جہان ہے، رجوع کرنا اور پوری طرح متوجہ رہنا اور مرنے سے پہلے مرنے کے لئے تیاری کرنا۔"

تشریح: "شرح صدر" یعنی سینہ کا کھل جانا وہ نعمت ہے جو ہدایت وراستی اور تمام دینی ودنیاوی امور میں بہتری وبھلائی کا ذریعہ ہے! یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں شخص شرح صدر کی حالت کو پہنچ گیا ہے؟ اس کو پہچاننے کے لئے تین علامتیں بیان فرمائی گی ہیں، ایک تو دار الغرور (دنیا) سے بعد یعنی زہد وقناعت اختیار کرنا کہ یہ جگہ مکر وفریب سے بھری ہوئی ہے اور شیطان اس کے ذریعہ لوگوں کو فریب دیتا ہے دوسرے دنیا کی طرف سے بے پرواہ ہو کر آخرت کی طرف ہمیشہ متوجہ رہنا اور ہر صورت میں اسی کی بہتری وبھلائی کو ملحوظ رکھنا اور تیسرے یہ کہ موت

آنے سے پہلے موت کے لئے تیاری کر لینا یعنی توبہ وانابت کے ذریعہ اپنی لغزشوں اور گناہوں سے اظہار بیزاری کرنا، عبادات اور اچھے کاموں میں سبقت کرنا اور اپنے اوقات کو طاعات الٰہی میں مشغول رکھنا! جس شخص میں یہ تینوں باتیں پائی جائیں تو جان لینا چاہئے کہ اس نے گویا تمام شرائع اسلام کو پورے یقین واخلاص کے ساتھ قبول کر لیا ہے اور وہ اس مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں احکام خداوندی کی بجاآوری مزاج وطبیعت پر گراں گزرنے کے بجائے روحانی وجسمانی کیف وسرور اور لذت بہم پہنچاتی ہے۔ واضح رہے کہ شرح صدر یعنی سینہ کی کشادگی سے مراد قلب میں قبول حق کی استعداد وصلاحیت کا پیدا ہو جانا ہے اور قلب مؤمن جو نور ہدایت سے پر ہو، وہ بذات خود بڑے عظیم مرتبہ کا حامل ہے یہاں تک کہ اس کو "عرش رب" سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لا یسعنی ارضی ولاسمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المؤمن یعنی نہ تو میری زمین میری گنجائش رکھتی ہے اور نہ میرا آسمان لیکن میرے مؤمن بندے کا قلب میری گنجائش رکھتا ہے۔

دنیا کو دار الغرور یعنی دھوکے کا گھر، کہا گیا ہے کیونکہ بلاشبہ یہ دنیا مکر وفریب میں مبتلا کرنے اور دھوکا دینے والی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی عہد شکن نہیں ہے! لوگ اس کی محبت میں مبتلا ہو کر کیا کچھ نہیں کرتے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کیسے کیسے پاپڑ نہیں بیلتے، لیکن آخر کار یہ کسی کی نہیں ہوتی اور ہر ایک کو دغا دیتی ہے! چنانچہ قرآن کریم میں آگاہ فرمایا گیا ہے کہ وَلَا یَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا یعنی دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں مبتلا نہ کر دے۔ جہاں تک اس دنیا کی حقیقت وماہیت کا تعلق ہے تو اس میں بھی کوئی شبہ کر سکتا ہے کہ یہ دنیا خرابی وفساد اور رنج ومحن کا گھر ہے، اگرچہ اس کی ظاہری حالت ایک نعمت کی طرح معلوم ہوتی ہے اور اس کی مثال سراب کی سی ہے کہ دھوپ میں چمکنے والے ریگستانی ریت کو پانی سمجھ کر پیاسا اس کی طرف لپکتا ہے مگر جب قریب پہنچتا ہے تو اس کو حقیقت نظر آتی ہے اور سمجھتا ہے کہ میں دھوکہ میں مبتلا ہو گیا، بالکل اسی طرح بادشاہ وامراء دولتمند اور دنیادار لوگ دنیا کی ظاہری چمک دمک کے دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جب حقیقت سامنے آتی ہے تو آنکھیں کھلتی ہیں مگر وقت گزر چکا ہوتا ہے اور حسرت وخسران کے سوا ان کے ہاتھ اور کچھ نہیں لگتا۔

"موت آنے سے پہلے" سے حیات مستعار کا وہ عرصہ مراد ہے جس میں انسان کچھ کر لینے کی صلاحیت وقوت رکھتا ہے یعنی صحت وتندرستی کا زمانہ اور آخر درجہ میں وہ زمانہ بھی مراد ہو سکتا ہے جب موت کے مقدمات ظاہر ہوں گے اور زندگی کے خاتمہ کے ظاہری اسباب پیدا ہو جائیں اور وہ مرض وبیماری کا زمانہ ہے لیکن عمر کا وہ حصّہ کہ جو انسان کو بالکل بیکار وناکارہ بنا کر رکھ دیتا ہے یعنی بہت بڑھاپا کہ اس زمانہ میں نہ علم ومعرفت حاصل کرنے کی طاقت رہتی ہے اور نہ عمل کرنے پر قدرت ہوتی ہے، اس وقت بے فائدہ حسرت وندامت کے سوا اور کچھ نہیں ملتا، لہٰذا دانائی اسی میں ہے کہ اس زمانہ سے پہلے سفر آخرت کے لئے زاد راہ تیار کر لیا جائے۔"

حکمت ودانائی کس کو عطا ہوتی ہے

(۷۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَاَبِیْ خَلاَّدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَاَیْتُمُ الْعَبْدَ یُعْطٰی زُهْدًا فِی الدُّنْیَا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ فَاِنَّهٗ یُلَقَّی الْحِکْمَةَ۔ رَوَاهُمَا الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوخلادؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ اس کو (دنیا سے) بے رغبتی اور (لغو وبیہودہ کلام سے اجتناب اور) کم گوئی عطا کی گئی ہے تو اس کی قربت وصحبت اختیار کرو کیونکہ اس کو حکمت ودانائی کی دولت دی گئی ہے۔" ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے (اور پہلی حدیث بہت سے طرق سے ثابت ہے۔"

تشریح: بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ زیادہ دانا مؤمن کون ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ مؤمن جو موت کو بہت یاد کرتا ہو اور موت کے بعد کی زندگی (یعنی آخرت) کے لئے بہت تیاری کرتا ہو۔

مذکورہ بالا حدیث میں لفظ "حکمت" نقل کیا گیا ہے اس سے مراد نیک کرداری اور راست گفتاری ہے۔ اور جس بندے کو اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرماتا ہے اس کی بڑی فضیلت منقول ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وَمَنْ يُّؤْتَى الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا یعنی جس شخص کو حکمت عطا کی گئی، گویا اس کو بہت زیادہ خیر و بھلائی دی گئی۔

بہرحال، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص دنیا سے بے اعتنائی اور بے رغبتی اختیار کیے ہوئے ہو اور کم گوئی کی صفت سے متصف ہو وہ ایک ایسا مخلص و کامل عالم ہے جس کو خدا نے نیک کرداری اور راست گفتاری کی دولت سے نواز دیا ہے اور وہ یقیناً مرشد و مقتدا بننے کا اہل ہے کہ وہ بندگان خدا کی تربیت و اصلاح اور رشد و ہدایت کی ذمہ داری کو پوری طرح انجام دے سکتا ہو، لہٰذا ہر ایک شخص پر واجب ہے کہ اس کی اطاعت و خدمت کرے، اسی کی صحبت و ہمنشینی اختیار کرے اور اس کے ساتھ ہمکلامی رکھے بعض عارفین نے بہت خوب کہا ہے کہ اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ اگر تم اس پر قادر نہ ہو سکو تو اس شخص کی صحبت و ہم نشینی اختیار کرو جو خدا کے ساتھ صحبت رکھتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ شخص وہی ہو سکتا ہے جس میں کردار و احوال اور اقوال و فعال کے صحیح اور قابل اعتماد ہونے کی وہ علامت پائی جائے جو انشراح صدر کی علامت کے طور پر پچھلی حدیث میں بیان کی جا چکی ہے، اور اس کی وہ حیثیت و شخصیت اس طرح ظاہر و ثابت ہو جائے کہ اس کی صحبت تمام دینی و دنیاوی معاملات پر بھلائی و بہتری کی صورت میں اثر انداز ہوتی ہو، وہ اپنے رفقاء اور معتقدین کو دنیاوی لذات سے کنارہ کش، تحصیل مال و جاہ سے بے رغبت اور مقدار حاجت و ضرورت سے زیادہ کی طلب و خواہش سے بے پرواہ بنا کر زاد عقبیٰ کی طرف پہنچاتا ہو۔ ایسا شخص نہ صرف عالم و عارف کہلاتا ہے بلکہ انبیاء کا حقیقی وارث و خلیفہ ہے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے عارف باللہ کی زیارت و خدمت اور اس کی صحبت و ہم نشینی کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز فرمائے (آمین ثم آمین)

بَابُ فَضْلِ الْفُقَرَاءِ وَمَا كَانَ مِنْ عَيْشِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فقراء کی فضیلت اور نبی کریم ﷺ کی معاشی زندگی کا بیان

"فقراء" فقیر کی جمع ہے جس کے معنی ہی مفلس، محتاج، غریب اور "فضیلت" سے مراد اجر و ثواب کی کثرت ہے! لہٰذا فقراء کی فضیلت کے بیان کا مطلب ان احادیث کو نقل کرنا ہے جن سے یہ واضح ہو گا کہ جو لوگ اپنی غربت و افلاس اور محتاجگی کی وجہ سے اپنی اور اپنے متعلقین کی معاشی زندگی کی سختیوں کو صبر و سکون کے ساتھ جھیلتے ہیں اور تمام مشکلات کا مقابلہ نہایت عزم و استقلال کے ساتھ کرتے ہوئے توکل و قناعت اختیار کرتے ہیں اور تقدیر الٰہی پر راضی و شاکر رہتے ہیں ان کو کتنا زیادہ اجر و ثواب ملتا ہے اور وہ آخرت میں کتنا بڑا درجہ پائیں گے۔

"حضور ﷺ کی معاشی زندگی" سے مراد آپ کے کھانے پینے، رہن سہن اور بسر اوقات کا وہ معیار اور طور طریقہ ہے جو غرباء اور فقراء کا ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ جس کو کفاف (بقدر ضرورت) کہا جا سکتا ہے! عنوان بالا میں "فقراء کی فضیلت" اور "حضور کی معاشی زندگی" کو ایک ساتھ ذکر کرنے اور دونوں سے متعلق احادیث و مضمون کو ایک باب میں نقل کرنے میں جو خاص حکمت ہے وہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اکثر انبیاء اولیاء کی طرح حضور ﷺ کا معیار زندگی اور بسر اوقات بھی غرباء و فقراء کی طرح تھا، یعنی سرکار دو عالم ﷺ خوشحال زندگی اختیار کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود اپنی زندگی اس طرح بسر کرتے تھے جس طرح کوئی غریب و مفلس شخص بسر کرتا ہے اور اپنے متعلقین کی کفالت اسی تنگی اور سخت کوشی و جانکاہی کے ساتھ کرتے تھے جو غریب و نادار لوگوں کا معمول ہے، چنانچہ غریب و نادار مؤمن کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لئے یہی بات بہت کافی ہے۔

واضح رہے کہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ صبر و رضا اختیار کرنے والا غریب و مفلس زیادہ فضیلت رکھتا ہے یا شکر گذار

غنی و خوشحال شخص؟ چنانچہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ شکر گذار غنی زیادہ فضیلت رکھتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ سے اکثر وہ چیزیں عمل میں آتی ہیں جو صدقہ و خیرات اور مالی انفاق و ایثار یعنی زکوٰۃ قربانی اور نیک کاموں میں خرچ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی زیادہ سے زیادہ قرب و نزدیکی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں نیز حدیث میں بھی اغنیاء کی تعریف میں یوں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (یعنی یہ مال و دولت اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے) اور اکثر حضرات یہ فرماتے ہیں کہ صبر کرنے والا غریب و مفلس زیادہ فضیلت رکھتا ہے جس کی ایک سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ خود حضور سرور کائنات ﷺ کا معیار زندگی اغنیاء کے مطابق نہیں تھا بلکہ غرباء اور مفلسوں کی طرح تھا نیز اس بات میں جو احادیث منقول ہوں گی وہ سب بھی ان حضرات کے قول کی دلیل ہیں! تاہم یہ بات ملحوظ رہے کہ اس اختلاف اقوال کا تعلق دراصل مطلق فقر اور غنا کی حقیقت و ماہیت سے ہے اور اس کا اعتبار بھی وجوہ کے مختلف ہونے پر ہے۔

چنانچہ ایک شخص کے حق میں کبھی تو غنا یعنی دولتمندی، خیر و بھلائی کا باعث بن سکتی ہے اور کبھی اس کا فقیر و مفلس ہونا ہی اس کے حق میں بہتر ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر مہربان ہوتا ہے تو اس کو وہی چیز دیتا ہے جو اس کے حق میں صلاح و فلاح کا ذریعہ ہوتی ہے۔ خواہ فقر ہو یا غنا، اور خواہ صحت ہو یا تندرستی! یہی حکم (کہ اختلاف وجوہ کی بناء پر ایک ہی چیز کبھی افضل ہو سکتی ہے اور کبھی مفضول) ان تمام صفات کا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حضرت شیخ المشائخ سید محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ صبر کرنے والا مفلس بہتر ہے یا شکر گزار دولتمند؟ تو انہوں نے فرمایا کہ شکر گذار فقیر دونوں سے بہتر ہے۔ انہوں نے اس جواب کے ذریعہ گویا فقر و افلاس کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمایا کہ فقر و افلاس درحقیقت ایک نعمت ہے کہ اس پر شکر گزار ہونا چاہئے، نہ کہ وہ کوئی مصیبت و بلا ہے جس پر صبر کیا جائے، شیخ عالم عارف ربانی اور ولی اللہ حضرت عبدالوہاب متقیؒ اپنے شیخ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے جب تک ہم سے فقر و افلاس کی فضیلت کا اقرار و اعتراف نہیں کرا لیا اس وقت تک ہمیں بیعت نہیں کیا، چنانچہ فرمایا کہ اس طرح کہو الفقر افضل من الغناء (فقر و افلاس، غنا سے بہتر ہے) جب ہم نے اس بات کو دہرایا تب انہوں نے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمیں مرید کیا۔

اس موقع پر اس بات کو بھی جان لینا چاہئے کہ اصلاح شریعت میں "فقیر" کا وہ مفہوم مراد نہیں ہوتا جو عام طور پر معروف ہے یعنی گداگر، بھکاری اور منگتا، بلکہ اس لفظ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کو عرف عام میں "غریب و مفلس کہا جاتا ہے اور جو مال و اسباب سے تہی دست ہوتا ہے! اسلام کی مذہبی کتابوں اور احکام و مسائل میں ایسے شخص کے لئے عام طور پر دو لفظ استعمال ہوتے ہیں ایک تو "فقیر" دوسرے "مسکین" چنانچہ بعض حضرات نے ان دونوں میں فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ "فقیر" کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو نصاب (یعنی اس قدر مال و اسباب) کا مالک نہ ہو جس کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ و فطرہ واجب ہوتا ہو، یا اس شخص کو "فقیر" کہا جاتا ہے جو بس ایک دن کی غذائی ضروریات کے بقدر مال و اسباب رکھتا ہو اور اس سے زائد اس کے پاس اور کچھ نہ ہو جب کہ "مسکین" اس شخص کو کہتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ نصاب کا مالک نہ ہو بلکہ اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو یہاں تک وہ ایک دن کی غذائی ضروریات کے بقدر بھی مال و اسباب نہ رکھتا ہو، اور بعض حضرات نے اس کے برعکس کہا ہے! بہر حال عنوان میں جو لفظ "فقراء" استعمال کیا گیا ہے اس سے فقیر اور مسکین دونوں مراد ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

افلاس اور خستہ حالی کی فضیلت

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بہت سے لوگ ایسے ہیں جو (بظاہر تو) پراگندہ بال اور غبار آلود (یعنی نہایت خستہ حال اور پریشان صورت) نظر آتے ہیں جن کو (ہاتھ یا زبان کے ذریعہ) دروازوں سے دھکیلا جاتا ہے لیکن (وہ خدا کے نزدیک اتنا اونچا درجہ رکھتے ہیں کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو یقیناً پورا کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جن کو دروازوں سے دھکیلا جاتا ہے" اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ واقعتاً دنیاداروں کے دروازوں پر جاتے ہیں اور ان کو وہاں سے دھکیلا جاتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ خدا کے لئے دنیا کی ظاہری زینت وعزت کی چیزوں سے دور رہتے ہیں، ان کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی ایسا کام کریں گے جس سے ذلت اٹھانا پڑے، بلکہ اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی روحانی عظمتوں کا راز ان کی شکستہ حالی میں پوشیدہ ہوتا ہے اور ان کا ظاہر، ان کے باطن کا اس حد تک سرپوش ہوتا ہے کہ اگر بالفرض وہ کسی کے گھر جانا چاہیں تو لوگوں کی نظر میں ان کی کوئی قدر و منزلت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو دروازہ ہی پر روک دیا جائے مکان میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ دروازوں سے دھکیلے جاسکتے ہیں تو ان کو مجلسوں اور محفلوں میں آنے سے بطریق اولی روکا جاسکتا ہے! اور اس میں حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ ان کی حقیقت لوگوں پر ظاہر ہو اور وہ ایسی حالت میں رہیں جس سے لوگ ان کی طرف مائل و ملتفت ہوں، تاکہ ان کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے کوئی انس و رغبت نہ ہو! پس حقیقت میں اللہ تعالیٰ ان پاک نفس بندوں کو دنیا داروں اور ظالموں کے دروازوں پر کھڑے رہنے اور ان کے حرام مال کے کھانے پینے سے محفوظ رکھتا ہے، جیسا کہ کوئی شخص اپنے مریض کو مضر آب و ہوا اور نقصان دہ غذاؤں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے! چنانچہ وہ لوگ اپنے مولی کے در کے علاوہ اور کسی دروازے پر حاضری نہیں دیتے اور اپنے کمال استغناء اور بے نیازی کی وجہ سے اپنے پروردگار کے علاوہ کسی دوسرے کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔

اور اگر وہ اللہ پر قسم کھائیں..... الخ کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اللہ پر اعتماد کر کے اور اس کی قسم کھا کر یہ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں کام کرے گا یا فلاں کام نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو سچا کرتا ہے بایں طور کہ ان کے کہنے کے مطابق اس کام کو کرتا ہے یا نہیں کرتا، جیسا کہ باب الدیت میں اس کے متعلق ایک روایت گزر چکی ہے! حاصل یہ کہ وہ لوگ اگرچہ اپنی ظاہری حالت کی وجہ دنیاداروں کی نظر میں کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتے مگر حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا مرتبہ اتنا بلند اور اس کی بارگاہ میں ان کی عزت و مقبولیت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کو سچا کرتا ہے اور ان کی قسم پوری کرتا ہے یعنی وہ بات پوری ہو کر رہتی ہے۔

ملت کے حقیقی خیر خواہ و پشت پناہ، غریب و ناتواں مسلمان ہیں

(۲) وَعَنْ مُصْعَبِ ابْنِ سَعْدٍ قَالَ رَاٰی سَعْدٌ اَنَّ لَهٗ فَضْلاً عَلٰی مَنْ دُوْنَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَاءِكُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مصعبؒ ابن سعد (تابعی) کہتے ہیں کہ (میرے والد) حضرت سعدؓ نے اپنے بارہ میں یہ گمان کیا کہ وہ اس شخص سے افضل ہیں جو ان سے کمتر ہے (یعنی ضعیف و ناتواں شخص یا فقیر و مفلس) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے (اس کا یہ گمان ختم کرنے اور دوسروں کو آگاہ کرنے کے لئے) فرمایا۔ "تمہیں (دشمنان دین کے مقابلہ پر) مدد و سہارا اور رزق کن لوگوں کی برکت سے ملتا ہے انہی کی برکت سے جو ضعیف و ناتواں اور غریب و نادار ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت سعدؓ بہت سے اوصاف اور خوبیوں کے مالک تھے، مثلاً شجاعت (دلاوری) جود و کرم، اور سخاوت، فیاضی جیسے اعلی اوصاف ان میں بدرجہ اتم تھے، چنانچہ ان کے ذہن میں یہ بات پیدا ہوئی کہ جو لوگ مجھ جیسی خصوصیات اور خوبیاں نہیں رکھتے ان کی بہ نسبت میں مسلمانوں کی زیادہ مدد و اعانت کرتا ہوں، اور اس اعتبار سے اسلام کے لئے میرا وجود زیادہ فائدہ مند ہے! ذہن کی یہ بات زبان

پر بھی آگئی ہوگی، لہٰذا حضور ﷺ نے ان کے اس گمان سے ان کو باز رکھا اور واضح فرمایا کہ تمہارا اس انداز سے سوچنا غیر مناسب بات ہے، تمہیں چاہئے کہ جو لوگ طاقت و قوت اور مال و دولت کے اعتبار سے تم سے کمتر ہیں ان کی عزت کرو، انہیں کمتر و حقیر نہ سمجھو اور ان کے تئیں تکبر و نخوت کا رویہ اختیار نہ کرو کیونکہ وہ لوگ بڑے شکستہ دل اور مسکین ہوتے ہیں، ان میں خلوص و سچائی کا جوہر ہوتا ہے، ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہوتی ہے، اور تم انہی کی دعاؤں کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتے ہو، خدا انہی کے طفیل تمہیں دشمنوں پر غالب کرتا ہے اور تمہارے رزق میں برکت عطا فرماتا ہے۔

غریب و نادار مسلمانوں کو جنّت کی بشارت

③ وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُمْتُ عَلٰى بَابِ الْجَنَّةِ فَكَانَ عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا الْمَسَاكِيْنَ وَاَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ غَيْرَ اَنَّ اَصْحَابَ النَّارِ قَدْ اُمِرَ بِهِمْ اِلَى النَّارِ وَقُمْتُ عَلٰى بَابِ النَّارِ فَاِذَا عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا النِّسَاءُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ فرمانے لگے کہ میں (معراج کی رات، یا خواب میں، یا حالت کشف میں) جنّت کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا (میں نے دیکھا کہ جو لوگ جنت میں داخل ہوئے ہیں ان میں زیادہ تعداد غریبوں کی ہے، اور مالداروں کو قیامت کے میدان میں روک رکھا گیا ہے۔ البتہ اصحاب نار یعنی کافروں کو دوزخ میں لے جانے کا حکم دے دیا گیا ہے، اور جب میں دوزخ کے دروازے پر کھڑا ہوا تو دیکھا کہ جو لوگ دوزخ میں ڈالے گئے ہیں ان میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "محبوسون" کے معنی ہیں، وہ لوگ جن کو جنت میں جانے سے روک دیا گیا ہے! حاصل یہ کہ مؤمنین میں سے جو لوگ اس فانی دنیا میں مالداری و تمول، اور جاہ و منصب کی وجہ سے عیش عشرت کی زندگی اختیار کیے ہوئے ہیں ان کو جنت میں جانے سے اس وقت تک کے لئے روکا رکھا جائے گا، جب تک ان سے اچھی طرح حساب نہیں لیا جائے گا، چنانچہ اس وقت وہ لوگ اس بات سے سخت رنج و غم محسوس کریں گے کہ انہیں دنیا میں مال و زر کی کثرت اور جاہ و منصب کی وسعت کیوں حاصل ہوئی، اور وہ اپنی خواہشات نفس کے مطابق دنیاوی لذات و عشرت سے کیوں بہرہ مند ہوئے! کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر ان سے ان دنیاوی امور کا ارتکاب ہوا ہو گا جن کو حرام قرار دیا گیا ہے تو وہ عذاب کے مستوجب ہوں گے اور اگر انہوں نے محض ان چیزوں کو اختیار کیا ہو گا جن کو حلال قرار دیا گیا ہے تب بھی انہیں حساب و کتاب کے مرحلہ سے بہر حال گزرنا پڑے گا، جب کہ فقراء و مفلس لوگ اس سے بری ہونگے کہ نہ تو ان سے حساب لیا جائے گا اور نہ انہیں جنت میں جانے سے روکا جائے گا بلکہ وہ مالداروں سے چالیس سال پہلے جنت میں چلے جائیں گے اور ان کا مالداروں سے پہلے جنت میں جانا گویا ان نعمتوں کے عوض میں ہو گا جن سے وہ دنیا سے محروم رہے ہوں گے۔

جنتیوں اور دوزخیوں کی اکثریت کن لوگوں پر مشتمل ہوگی

④ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِطَّلَعْتُ فِي الْجَنَّةِ فَرَاَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا الْفُقَرَاءَ وَاطَّلَعْتُ فِي النَّارِ فَرَاَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا النِّسَاءَ۔" (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے جنت میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثر تعداد غریبوں اور ناداروں لوگوں کی نظر آئی اور دوزخ میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

فقراء کی فضیلت

⑤ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِيْنَ يَسْبِقُوْنَ الْاَغْنِيَاءَ يَوْمَ

الْقِيٰمَةِ اِلَى الْجَنَّةِ بِاَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "فقراء، مہاجرین قیامت کے دن جنت میں اغنیاء (مال داروں) سے چالیس سال پہلے داخل ہوں گے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "چالیس سال" سے مراد وہ عرصہ ہے جو ہماری اس دنیا کے شب و روز کے اعتبار سے چالیس سال کے بقدر ہو نا! اور اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس حدیث کا تعلق خاص طور پر انہی فقراء سے ہے جو مہاجرین میں سے تھے۔ اس طرح "اغنیاء" سے مراد بھی اغنیائے مہاجرین ہیں! رہی یہ بات کہ یہاں فقراء اور اغنیاء کیساتھ۔ مہاجرین کی قید کیوں لگائی گئی ہے تو اس کی حقیقت دوسری فصل کی پہلی حدیث سے معلوم ہوگی! نیز جنت میں فقراء کے پہلے داخل ہونے کی وجہ ہوگی اغنیاء تو حساب کی طوالت کی وجہ سے میدان حشر میں رکے رہیں گے، جب کہ فقراء حساب کے بغیر جنت میں داخل ہو کر وہاں کی سعادتوں اور نعمتوں سے بہرہ مند ہونے لگیں گے۔

⑥ وَعَنْ سَهْلِ ابْنِ سَعْدٍ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِرَجُلٍ عِنْدَهٗ جَالِسٌ مَارَأْيُكَ فِيْ هٰذَا فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ اَشْرَافِ النَّاسِ هٰذَا وَاللّٰهِ حَرِيٌّ اِنْ خَطَبَ اَنْ يُّنْكَحَ وَاِنْ شَفَعَ اَنْ يُّشَفَّعَ قَالَ فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ مَرَّ رَجُلٌ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَارَأْيُكَ فِيْ هٰذَا فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا رَجُلٌ مِنْ فُقَرَآءِ الْمُسْلِمِيْنَ هٰذَا حَرِيٌّ اَنْ خَطَبَ اَنْ لَّا يُنْكَحَ وَاِنْ شَفَعَ اَنْ لَّا يُشَفَّعَ وَاِنْ قَالَ اَنْ لَّا يُسْمَعَ لِقَوْلِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ مِّلْاءِ الْاَرْضِ مِثْلُ هٰذَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کے سامنے سے ایک شخص گزرا تو آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ جو شخص گزرا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، یعنی یہ کوئی اچھا شخص ہے یا برا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ یہ شخص نہایت معزز اور شریف ترین لوگوں میں سے ہے، بخدا، اس شخص کی حیثیت یہ ہے کہ اگر کسی عورت سے نکاح کا پیغام بھیجے تو اس عورت سے اس کا نکاح ہو جائے، اور اگر (کسی حاکم و سردار سے کسی شخص کے بارے میں) کوئی سفارش کرے تو اس کی سفارش مان لی جائے! راوی حضرت سہلؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (یہ جواب سن کر) خاموش رہے، اتنے میں ایک دوسرا شخص سامنے سے گزرا تو آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) اپنے پاس بیٹھے ہوئے اسی شخص سے پوچھا کہ اچھا، اس شخص کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یارسول اللہ! یہ شخص نادار، قلاش مسلمانوں میں سے ہے، اس کی حیثیت تو یہ ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اس سے کوئی نکاح نہ کرے، اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ ہو، اور اگر کوئی بات کہے تو اس کی وہ بات سننے پر کوئی تیار نہ ہو (یعنی یہ شخص اپنے فقر و افلاس کی وجہ سے اتنی قدر و منزلت بھی نہیں رکھتا کہ کوئی شخص اس کی بات سننے پر آمادہ ہو جائے اور اس کی طرف التفات و توجہ کرے) رسول کریم ﷺ نے (یہ سنا تو) فرمایا۔ "(نادان!) یہ شخص (کہ جس کو تم نے حقارت کی نظر سے دیکھا ہے اور ایک بے حیثیت انسان سمجھا ہے) اس شخص جیسے لوگوں سے بھری زمین سے بھی کہیں بہتر ہے (جس کی تم نے تعریف کی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اس شخص جیسے لوگوں سے بھری زمین..... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمام روئے زمین اس شخص جیسے لوگوں سے بھر جائے جو پہلے یہاں سے گزرا تھا اور جس کی تعریف و توصیف میں تم رطب اللسان ہوئے تھے تو وہ ایک شخص کہ جو اپنے فقر و افلاس کی وجہ سے تمہاری نظر میں کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتا ہے، مرتبہ و فضیلت کے اعتبار سے اس تمام روئے زمین سے کہیں بہتر قرار پائے گا۔"

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضور ﷺ کے پاس جو صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور جن سے حضور ﷺ نے ان دونوں اشخاص کے بارے میں سوال کیا تھا وہ خود کوئی غنی اور مال دار شخص ہوں گے، لہٰذا ان کے ساتھ مذکورہ سوال و جواب گویا ان کے حق میں

یہ تنبیہ تھی کہ غریب ونادار مسلمانوں کو کبھی بنظر حقارت نہیں دیکھنا چاہئے کیونکہ خدا کے نزدیک ان کو جو فضیلت حاصل ہے وہ بڑے بڑے مالداروں کو بھی حاصل نہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضور ﷺ نے مالدار مسلمانوں کے مقابلہ پر غریب ونادار مسلمان کی اس درجہ فضیلت کیوں بیان فرمائی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر غریب ونادار مسلمان کا دل بہت صاف ہوتا ہے اور اس کے سبب وہ حق کو جلد قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی بہت زیادہ کرتا ہے، اس کے برخلاف غنی ومالدار لوگ عام طور پر بے حسی اور شقاوت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اندر سرکشی وبے نیازی اور تکبر کا وہ مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو انہیں قبول حق اور احکام خداوندی کی پیروی سے باز رکھتا ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اور اس حقیقت کا انداز علماء کے شاگردوں اور صلحاء ومشائخ کے مریدوں کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ غریب ونادار ہوتے ہیں وہ حق بات کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں اور جو لوگ صاحب ثروت ومالدار ہوتے ہیں وہ ہر بات میں حیل وحجت کرتے ہیں۔

حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ پہلے گزرنے والا شخص بھی مالدار مسلمانوں میں سے تھا نہ کہ کوئی کافر تھا کیونکہ مفاضلہ (یعنی آپس میں ایک دوسرے کی اخروی فضیلت کو ظاہر کرنے) کا تعلق کفار ومُسلمین کے مابین ہو ہی نہیں سکتا (یعنی کسی مسلمان اور کسی کافر کو ایک دوسرے کے مقابلہ پر رکھ کر یہ کہا ہی نہیں جاسکتا کہ اخروی اجر وثواب کے اعتبار سے ان میں سے کون شخص زیادہ افضل ہے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار میں سے کسی بھی شخص کی طرف سرے سے خیر (یعنی اخروی سعادت وبھلائی) کی نسبت کی ہی نہیں جاسکتی (اور ظاہر ہے کہ جس شخص میں "خیر" کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو سکتا ہو اس کی طرف اخروی فضیلت کی نسبت بھی کسی طرح نہیں کی جاسکتی چنانچہ بعض علماء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جس مسلمان نے اپنی زبان سے یوں کہا کہ اَلنَّصرانِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْیَھُوْدِیْ (یعنی عیسائی، یہودی سے افضل ہے) تو اس کے بارے میں خوف ہے کہ وہ دائرہ کفر میں داخل نہ ہو گیا ہو کیونکہ اس نے اس جملہ کے ذریعہ گویا ان لوگوں میں "خیر" کا وجود ثابت کیا جن میں سرے سے "خیر" کا وجود ہی نہیں ہو سکتا، تاہم اس پر کفر کا اطلاق، جزم کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ بعض موقعوں پر لفظ کے ذریعہ (اخروی سعادت وبھلائی کے بجائے) "حق کے زیادہ قریب" کا مفہوم بھی مراد لے لیا جاتا ہے (اور ہو سکتا ہے کہ مذکورہ جملہ ادا کرنے والے نے لفظ خیر کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہو)

اہل بیت نبوی ﷺ کے فقر کی مثال

(۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا شَبِعَ اٰلُ مُحَمَّدٍ مِنْ خُبْزِ الشَّعِیْرِ یَوْمَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ حَتّٰی قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ محمد ﷺ کے اہل بیت (یعنی ازواج مطہرات اور متعلقین) نے دو روز مسلسل جو کی روٹی سے پیٹ بھرا ہو (چہ جائیکہ گیہوں کی روٹی سے) یہاں تک کہ رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: دو روز مسلسل سے یہ واضح ہوا کہ حضور ﷺ اور آپ کے اہل بیت کا معمول یہی تھا کہ اگر ایک دن پیٹ بھر کر کھایا تو دوسرے دن بھوکے رہے، اور یہ اس وجہ سے تھا کہ حضور ﷺ نے خوشحالی وترفہ کی زندگی پر فقر وافلاس کی زندگی کو ترجیح دی تھی، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو دنیا بھر کے خزانوں کی پیش کش ہوئی اور حکم ہوا اگر آپ ﷺ کہیں تو مکہ کے پہاڑوں کو آپ ﷺ کے لئے سونے میں تبدیل کر دیا جائے تو حضور ﷺ نے دنیا بھر کے خزانوں اور سونے کے پہاڑوں کو تبدیل کرنے کے بجائے فقر اور تنگدستی ہی کو اختیار کیا اور فرمایا کہ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن پیٹ بھروں اور ایک دن بھوکا رہوں، تاکہ جس دن پیٹ بھروں اس دن خدا کا شکر ادا کروں اور جس دن بھوکا رہوں اس دن صبر کروں۔

مذکورہ بالا حدیث سے بعض لوگوں کے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں غنی و مالدار ہو گئے تھے، کیونکہ اگر حضور ﷺ اپنی آخر عمر میں واقعتاً غنی ہو گئے تھے تو پھر حضرت عائشہؓ کے اس کہنے کے کیا معنی ہوں گے کہ حضور ﷺ کے اہل بیت کا حضور ﷺ کی وفات تک یہی معمول رہا کہ انہوں نے کبھی مسلسل دو دن تک جو کی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا؟ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ جب آخری زمانۂ نبوی میں اسلام کو طاقت اور غلبہ ملا اور مجاہدین اسلام نے مختلف علاقوں کو فتح کیا تو اس صورت میں مال غنیمت کا مقررہ حصہ حضور ﷺ کو بھی ملا، اور تھوڑا بہت مال آپ ﷺ کے پاس آتا رہا، مگر روایات صحیحہ شاہد ہیں کہ حضور ﷺ نے اس مال کو بھی اپنے پاس کبھی نہیں رکھا، بلکہ جس طرح آتا اسی طرح اس کو اپنے پروردگار کی خوشنودی کی راہ میں خرچ کر دیتے اور خود ہمیشہ کی طرح خالی ہاتھ رہ جاتے، البتہ دل کا غنا اور بڑھ جاتا! حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی حالت یہ تھی کہ مسلسل کئی کئی راتیں بھوک میں گذار دیتے تھے، حضور ﷺ اور اہل بیت کو رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا اور (وقتاً فوقتاً کھانا میسر ہونے کی صورت میں بھی) آپ ﷺ کے دسترخوان پر عام طور سے جس چیز کی روٹی ہوتی تھی وہ جو تھا۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہمارے زمانہ کے غریب و نادار لوگوں اور فقراء میں سے کوئی بھی شخص اتنی سخت زندگی نہ تو گزارتا ہے اور نہ گذار سکتا ہے جتنی سخت زندگی حضور ﷺ گزراتے تھے، اور یہ شان اس ذات گرامی کی تھی جو نہ صرف افضل البشر بلکہ افضل الانبیاء ہے جس کے چشم و ابرو کے اشارے پر دنیا بھر کی نعمتیں اس کے قدموں میں آسکتی تھیں! پس حضور ﷺ کے اس طرز زندگی میں غریب و نادار مسلمانوں کے لئے بڑی تسلی و اطمینان کا سامان پوشید ہے۔

واضح رہے کہ حضور ﷺ کا اس قدر فقر و افلاس کی زندگی گذارنا اور بھوک کی صعوبت کو برداشت کرنا کوئی اضطرار و مجبوری کے درجہ کی چیز نہیں تھی بلکہ یہ اپنے قصد و اختیار کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ چونکہ دنیا کی لذات اور نعمتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، قوت لایموت پر قناعت کرتے اور اپنی اور اپنے اہل بیت کی ضروریات پر فقراء و مساکین اور دیگر ضرتمندوں کی ضروریات کو ترجیح دے کر ایثار نفس پر عمل پیرا تھے اس لئے آپ ﷺ اتنی سخت زندگی گذارا کرتے تھے۔

اتباع نبوی ﷺ کی اعلیٰ مثال

⑧ وَعَنْ سَعِيدِ نِ الْمَقْبُرِيِّ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهُ مَرَّبِقَوْمٍ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ شَاةٌ مُّصْلِيَّةٌ فَدَعُوْهُ فَاَبٰى اَنْ يَّاكُلَ وَقَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الدُّنْيَا وَلَمْ يَشْبَعْ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيْرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سعید مقبری (تابعیؒ) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) وہ (حضرت ابوہریرہؓ) کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے (جو ایک جگہ کھانے کے دسترخوان پر جمع تھے) اور ان کے سامنے بھنی ہوئی بھری بکری رکھی تھی، انہوں نے (کھانے کے لئے) حضرت ابوہریرہؓ کو بھی بلایا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور (اپنے نہ کھانے کے عذر میں) فرمایا کہ رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور کبھی آپ ﷺ نے جو کی روٹی سے بھی اپنا پیٹ نہیں بھرا لہٰذا یہ کیسے گوارا ہو سکتا ہے کہ میں بھنی بکری جیسی لذیذ غذا سے اپنا پیٹ بھروں جب کہ حضور ﷺ کو پیٹ بھر جو کی روٹی بھی میسر نہ ہوتی تھی۔" (بخاریؒ)

حضور ﷺ کی معاشی زندگی پر قرض کا سایہ

⑨ عَنْ اَنَسٍ اَنَّهُ مَشٰى اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخُبْزِ شَعِيْرٍ وَاِهَالَةٍ سَنِخَةٍ وَلَقَدْ رَهَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِرْعًا لَهُ بِالْمَدِيْنَةِ عِنْدَ يَهُوْدِيٍّ وَاَخَذَ مِنْهُ شَعِيْرًا لِاَهْلِهِ وَلَقَدْ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَا اَمْسٰى عِنْدَ اٰلِ مُحَمَّدٍ صَاعُ بُرٍّ وَّلَا صَاعُ حَبٍّ وَاِنَّ عِنْدَهُ لَتِسْعَ نِسْوَةٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جو کی روٹی اور ایسی چربی لے کر آئے جو زیادہ دن رکھی

رہنے کی وجہ سے بدبودار ہوگئی تھی۔ نیز (حضرت انسؓ ہی نے) بیان کیا کہ، نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) اپنی زرہ مدینہ میں ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر اس سے اپنے اہل بیت کے لئے کچھ جو لئے۔" حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے نے یہ بھی بیان کیا کہ میں نے حضرت انسؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ محمد ﷺ کے اہل بیت کی ایسی کوئی شام نہیں ہوتی تھی جس میں ان کے پاس ایک صاع گیہوں یا کوئی اور غلہ رہتا ہو جب کہ حضور ﷺ کے نو بیویاں تھیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: روایت کے آخری الفاظ کے ذریعہ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ حضور ﷺ نے اپنے اہل بیت کے لئے کسی رات میں آنے والے دن کے لئے کسی طرح کا غلہ رکھ چھوڑا ہو باوجودیکہ آپ کے نو بیویاں تھیں اور ان کی غذائی ضروریات کے لئے تھوڑا بہت غلہ ہر وقت آپ ﷺ کے یہاں رہنا چاہئے تھا۔

جہاں تک ایک یہودی سے حضور ﷺ کے قرض لینے کی بات ہے تو اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر آپ کسی مسلمان سے قرض لیتے تو مسلمان پر آپ ﷺ کا حال ظاہر ہوتا اور وہ آپ ﷺ کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے جب کہ آپ ﷺ اس بات کو ہرگز پسند نہیں فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کی ضروریات زندگی کا بار مسلمانوں کے کاندھوں پر پڑے اور وہ خواہ خوشی یا کسی گرانی کے ساتھ اور شرم حضوری میں آپ ﷺ کو کچھ دیں! لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ حضور ﷺ کا کسی مسلمان کی بجائے ایک یہودی سے قرض لینا دراصل اس بات سے انتہائی تنزہ اور کامل احتیاط کے پیش نظر تھا کہ حضور اپنی اُمّت کے لوگوں سے کسی "اجر و معاوضہ" کے طلب گار ہوں خواہ وہ (اجر و معاوضہ کے اعتبار سے نہ ہو بلکہ محض صورۃً ہو (جیسا کہ مثلاً قرض کی صورت، کہ اگر آپ ﷺ کسی مسلمان سے قرض لیتے تو اس پر اجر و معاوضہ کا اطلاق نہ ہوتا، مگر ممکن تھا کہ کسی نہ کسی درجہ میں نفع اٹھانے کی وجہ سے اس پر بھی صورتاً اجر و معاوضہ کا اطلاق ہو جاتا، اس لئے آپ ﷺ احتیاطاً اس کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کسی مسلمان سے قرض ہی کی صورت میں کوئی مالی فائدہ حاصل کریں) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ۔

حضور ﷺ کے اس کمال احتیاط کی ایک نظیر ہمارے امام، امام اعظم ابوحنیفہؒ کی زندگی میں بھی ملتی ہے، چنانچہ ان کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی دیوار کے سایہ سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے تھے جس پر ان کا کوئی قرض ہوتا تھا اور ان کی یہ احتیاط اس حدیث کے پیش نظر ہوتی تھی کل قرض جر منفعة فهو ربوا (یعنی جو بھی قرض کوئی منفعت کھینچ کر لائے وہ سود ہے۔

مذکورہ بالا حدیث کے ضمن میں ایک اشکال واضح ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بعض صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کی بقدر کفایت لازمی ضروریات کی بعض چیزیں ایک سال کے لئے اکٹھا بھروا کر رکھ دی تھیں، جب کہ یہاں جو حدیث نقل کی گئی ہے اس سے اس کے برعکس ثابت ہوتا ہے؟ اس کا جواب علماء یہ بیان کرتے ہیں کہ حقیقت تو یہی ہے کہ شروع میں بہت کافی عرصہ تک، جب کہ آپ ﷺ کی معاشی زندگی پر فقر کا زیادہ غلبہ تھا آپ ﷺ اس معمول پر قائم تھے کہ کبھی کسی چیز کا ایک دن کے لئے بھی ذخیرہ نہیں کیا، جس دن جو کچھ میسر ہو گیا وہ اس دن کی غذائی ضروریات میں کام آگیا، اگلے دن کے لئے قناعت و توکل کے علاوہ کچھ پاس نہیں رہا، ہاں بعد میں جب معاشی حالت کچھ بہتر ہوئی اور آمدنی میں کچھ وسعت ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کے لئے ایک سال کی غذائی ضروریات کے بقدر غلہ کہ جو حد کفایت سے متجاوز نہیں تھا، اکٹھا بھروا دیا تھا! بعض حضرات نے ان دونوں طرح کی روایتوں میں اس طور پر مطابقت پیدا کی ہے کہ آلِ مُحَمَّدْ میں لفظ آل زیادہ ہے جیسا کہ اہل عرب کے اسلوب کلام میں یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ (آل فلاں) بول کر اس کے لفظی معنی "فلاں کے اہل بیت" کے بجائے صرف اس فلاں کی ذات کو مراد لیتے ہیں مثلاً اگر وہ یہ کہتے ہیں لہ آل زید (یعنی زید کے گھر والوں) کے پاس چند روپے بھی نہیں ہیں تو اس جملہ سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ خاص طور پر زید کے پاس چند روپے بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ بات بعید از حقیقت نہیں ہو سکتی کہ کبھی کبھی دو دو روز مسلسل جو کی روٹی سے پیٹ نہ بھرنے یا اگلے دن کے لئے غلہ وغیرہ جمع نہ رکھنے کی بات خاص طور سے آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک سے تعلق رکھتی ہو یعنی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خود

آپ ﷺ نے مسلسل دو دن تک پیٹ بھر کر نہ کھایا ہو یا خاص اپنی ذات کے واسطے آنے والے ایک آدھ دن کے لئے رکھ چھوڑا ہو! ہاں اگر آپ ﷺ نے کبھی کبھار ایسا کیا ہو کہ اپنی ازواج مطہرات کے لئے کچھ دنوں یا ایک آدھ سال کی غذائی ضروریات کے بقدر غلہ وغیرہ بھروا کر رکھ دیا ہو تو یہ اس بات کے منافی نہیں ہے۔

دنیا کی طلب مؤمن کی شان نہیں

(۱۰) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا هُوَ مُضْطَجِعٌ عَلٰى رُمَالِ حَصِيْرٍ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ فِرَاشٌ وَقَدْ اَثَّرَ الرِّمَالُ بِجَنْبِهٖ مُتَّكِئًا عَلٰى وِسَادَةٍ مِنْ اَدَمٍ حَشْوُهَا لِيْفٌ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ادْعُ اللّٰہَ فَلْيُوَسِّعْ عَلٰى اُمَّتِكَ فَاِنَّ فَارِسَ وَالرُّوْمَ قَدْ وُسِّعَ عَلَيْهِمْ وَهُمْ لَا يَعْبُدُوْنَ اللّٰہَ فَقَالَ اَوَفِيْ هٰذَا اَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ اُولٰئِكَ قَوْمٌ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِيْ رِوَايَةٍ اَمَا تَرْضٰى اَنْ تَكُوْنَ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْاٰخِرَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور ﷺ کھجور کے پات کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے، آپ ﷺ کے بدن مبارک اور چٹائی کے درمیان کوئی بچھونا وغیرہ نہیں تھا جس کی وجہ سے حضور ﷺ کے پہلوئے مبارک پر چٹائی نے بدھیاں ڈال دی تھیں، نیز آپ ﷺ نے سر مبارک کے نیچے جو تکیہ رکھ رکھا تھا وہ چمڑے کا تھا اور اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، میں نے (سرکار دو عالم کو اس حالت میں دیکھ کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیوں نہیں فرماتے کہ وہ آپ ﷺ کی اُمت کو مالی وسعت و فراخی عطا فرمائے؟ فارس اور روم کے لوگوں کو کس قدر وسعت و فراخی عطا کی گئی ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی نہیں کرتے! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ابن خطاب! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، کیا تم ابھی تک اسی جگہ ہو (جہاں سے تم شروع میں چلے تھے اور اتنے عرصہ کے بعد بھی تمہارے انداز فکر اور سوچنے سمجھنے کا معیار اتنا آگے نہیں بڑھا جو تم حقیقت تک پہنچ سکو؟ یاد رکھو) یہ اہل فارس و روم (اور تمام کفار) وہ لوگ ہیں جن کو تمام نعمتیں اور خوبیاں بس ان کی دنیاوی زندگی ہی میں دے دی گئی ہیں (جب کہ ہمیشہ کی زندگی یعنی آخرت میں ان کو فقر و افلاس، ذلت و خواری اور خسران و نقصان کے سوا کچھ نہیں ملے گا)" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "کیا تم اس پر راضی و مطمئن نہیں ہو کہ ان (اہل فارس و روم اور دیگر کفار) کو دنیا ملے (جو فناہ ہو جانے والی ہے) اور ہمیں آخرت ملے (جو اپنی تمام تر نعمتوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے" یعنی وہی چٹائی سرکار دو عالم ﷺ کا بستر تھا جس کو چارپائی پر ڈال کر اس پر آپ لیٹے ہوئے تھے یا وہ چٹائی زمین پر بچھی ہوئی تھی اور آپ اسی کھری چٹائی پر استراحت فرما رہے تھے! اور بعض عبارتوں سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی جو چارپائی تھی وہی کھجور کی رسیوں سے بنی ہوئی تھی جیسا کہ چارپائیوں کو بان سے بنا جاتا ہے۔

"رمال" (راء کے پیش اور زبر دونوں کے ساتھ) اصل میں رمل کی جمع ہے اور مرمول (یعنی بنے ہوئے کے) معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ مخلوق کے معنی میں خُلقؑ استعمال ہوتا ہے۔

"لیف" (لام کے زیر اور راء کے جزم کے ساتھ) کھجور کی چھال کو کہتے ہیں! حاصل یہ کہ حضور ﷺ کا جو تکیہ مبارک تھا وہ چمڑے کا تھا اور اس میں روئی وغیرہ کے بجائے کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، چنانچہ جو لوگ غریب و نادار ہوتے ہیں، روئی وغیرہ کا تکیہ بنانا ان کی استطاعت سے باہر ہوتا ہے وہ کھجور کی چھال کو کوٹ کر نرم کر لیتے ہیں اور اس کو تکیہ میں بھر لیتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اُمت کے حق میں مالی وسعت اور رزق کی فراخی کی دعا کے لئے حضور ﷺ سے جو درخواست کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ فقر کو اختیار کر کے اتنی سخت زندگی گذار رہے ہیں اور اپنے آپ کو اس حال میں رکھے ہوئے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ اگر پوری اُمت بھی اسی فقر و افلاس میں مبتلا رہی اور اس کو معاشی زندگی کی غربت و دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تو

اس اُمت کے وہ لوگ جو مضبوط عقیدہ و مزاج کے نہیں ہوں گے، اتنی سخت زندگی کی تاب نہیں رکھ پائیں گے اور ناقابل برداشت دشواریوں میں مبتلا ہو جائیں گے لہٰذا انہوں نے ایسے لوگوں کے مناسب حال یہی جانا کہ انہیں مالی وسعت و فراخی عطا ہو جائے۔

لیکن طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا اصل مقصد خود حضور ﷺ کی ذات کے لئے مالی وسعت و فراخی کی خواہش کرنا تھا، مگر انہوں نے اس بات کو آنحضرت ﷺ کی شان عظمت کے مناسب نہیں سمجھا کہ براہ راست حضور ﷺ کے لئے اس ادنی اور ناپاک دنیا کی طلب کو ظاہر کریں، جیسا کہ ایک اور روایت میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ ﷺ ایک نہایت گرم اور تنگ و تاریک کوٹھری میں ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں انہوں نے کوٹھری کے کونوں میں نظر دوڑائی تو دیکھا کہ بس چمڑے کے دو چار ٹکڑے اور ایک دو باسن پڑے ہوئے ہیں، حضور ﷺ کی غربت و خستہ حالی کا یہ منظر دیکھ کر حضرت عمرؓ رونے لگے، حضور نے پوچھا کہ "ابن خطاب! کیوں رو رہے ہو؟" انہوں نے کہا یا رسول اللہ! حضور کی حالت دیکھ کر رو رہا ہوں کہ آپ ﷺ خدا کے رسول ہوتے ہوئے اس حالت میں پڑے ہوئے ہیں، اور قیصر و کسری (جو خدا کے نافرمان و سرکش بندے ہیں) کس قدر ناز و نعم اور عیش و راحت کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

اس کے بعد روایت کے وہی الفاظ ہیں جو اَوَفِي هٰذَا يَابْنَ الْخَطَّابِ سے آخر تک، اوپر حدیث میں نقل ہوئے ہیں! طیبیؒ کی یہ وضاحت بھی اگرچہ حقیقت کے بہت زیادہ قریب ہے لیکن خود حضرت عمرؓ کے الفاظ فَاِنَّ فَارِسَ وَرُوْمَ قَدْ وُسِّعَ عَلَيْهِمْ کے پیش نظر پہلی توضیح زیادہ مناسب ہے۔

اصحاب صفہ کی ناداری

⑪ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُ سَبْعِيْنَ مِنْ اَصْحَابِ الصُّفَّةِ مَامِنْهُمْ رَجُلٌ عَلَيْهِ رِدَاءٌ اِمَّا اِزَارٌ وَاِمَّا كِسَاءٌ قَدْ رَبَطُوْا فِيْ اَعْنَاقِهِمْ فَمِنْهَا مَايَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَيْنِ وَمِنْهَا مَايَبْلُغُ الْكَعْبَيْنِ فَيَجْمَعُهُ بِيَدِهٖ كَرَاهِيَةَ اَنْ تُرٰى عَوْرَتُهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر افراد کو دیکھا جن میں سے کوئی شخص ایسا نہیں تھا کہ اس کے پاس کوئی چادر ہو (جس کو وہ دوسرے کپڑے کے اوپر اوڑھ لے یا کاندھوں پر ڈال لے، گویا ان کو صرف ایک کپڑے کے علاوہ اور کوئی کپڑا میسر نہیں تھا اور وہ کپڑا (بھی) یا تو تہبند تھا یا کملی تھی، جس کو وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے (اور اس کے ذریعہ اپنے جسم و ستر کو ڈھانکتے تھے) ان تہبند اور کملیوں میں سے بعض ایسے تھے جو صرف آدھی پنڈلیوں تک آتے تھے اور بعض ایسے تھے جو دونوں ٹخنوں تک پہنچ جاتے تھے، چنانچہ جب کوئی شخص سجدہ میں جاتا (یا گھٹنے اٹھا کر بیٹھتا) تو وہ اس خوف سے کہ کہیں اس کا ستر نہ کھل جائے اپنے اس تہبند یا کملی کو ہاتھ سے پکڑے رہتا تھا۔" (بخاریؒ)

اپنی اقتصادی حالت کا موازنہ اس شخص سے کرو جو تم سے بھی کمتر درجہ کا ہے

⑫ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَظَرَ اَحَدُكُمْ اِلٰى مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ قَالَ اُنْظُرُوْا اِلٰى مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ فَهُوَ اَجْدَرُ اَنْ لَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں سے جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اس سے زیادہ مالدار اور اس سے زیادہ اچھی شکل و صورت کا ہو (اور اس کو دیکھ کر اپنی حالت پر رنج و حسرت ہو، خدا کا شکر ادا کرنے میں سستی و کوتاہی واقع ہوتی ہو اور اس آدمی کے تئیں رشک و حسد کے جذبات پیدا ہوتے ہوں) تو اس کو چاہئے کہ وہ اس آدمی پر نظر ڈالے جو اس سے کمتر درجہ کا ہے (تاکہ

اس کو دیکھ کر اپنی حالت پر خدا کا شکر ادا کرے اور نعمت عطا کرنے والے پروردگار سے خوش ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم اس شخص کو دیکھو جو مرتبہ میں تم سے کمتر ہے اس شخص کی طرف نہ دیکھو جو مرتبہ میں تم سے بڑا ہے، پس ایسا کرنا تمہارے لئے نہایت مناسب ہے تاکہ تم اس نعمت کو، جو خدا نے تمہیں دی ہے، حقیر نہ جانو۔"

تشریح: معاشرہ کے افراد کو دنیاوی مال و متاع اور جاہ و حشمت کے تئیں باہمی بغض و حسد، رشک و حسرت اور بددلی و مایوسی سے بچانے کے لئے حضور ﷺ نے بڑا نفسیاتی طریقہ تجویز فرمایا ہے! یہ انسان کی جبلت ہے کہ جب وہ کسی شخص کو اپنے سے زیادہ مالدار اور اپنے سے زیادہ اچھی حیثیت و حالت میں دیکھتا ہے تو یا اس کے اندر اس طرح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو اس کو بددل و مایوس، رنج خور و حسرت زدہ اور تقدیر الٰہی کا شاکی بنا دیتے ہیں یا پھر اس کے اندر حسد و جلن، اور ناروا مسابقت کا مادہ پیدا کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ جائز و ناجائز ہر طرح سے اپنے آپ کو اوپر لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح معاشرہ میں عجیب قسم کی "جنگ زرگری" اور نقصان دہ سماجی و معاشی دوڑ شروع ہو جاتی ہے! چنانچہ حضور ﷺ نے اس صورت حال سے بچنے کے لئے مذکورہ بالا ہدایت فرمائی جس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھے کہ جو اس سے زیادہ مالدار ہو، اس سے زیادہ اچھی شکل و صورت کا ہو، اس سے زیادہ جاہ و حشمت رکھتا ہو اور اس سے زیادہ اچھے لباس اور زیادہ اچھے مکان میں رہتا ہو، نیز وہ اس حقیقت سے بے خبر ہو کہ اس آدمی کو حاصل شدہ یہ تمام دنیاوی خوبیاں دراصل آخرت کے اعتبار سے اس کے حق میں وبال کا درجہ رکھتی ہیں کہ وہ انہی چیزوں کی وجہ سے آخرت میں مواخذہ و عذاب کا مستوجب ہو گا تو اس شخص کو چاہئے کہ وہ اس آدمی کی طرف نظر کرے جو مال و متال و شکل و صورت اور دنیاوی حیثیت و عزت کے اعتبار سے اس سے کمتر درجہ کا ہے، لیکن اپنے عقیدہ و خیال اور گفتار و کردار کے اعتبار سے آخرت میں درجۂ عالی کا مستحق ہے۔ اس حدیث کے بین السطور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معاشرہ میں اکثریت ایسے افراد کی ہوئی ہے جو اقتصادی و سماجی طور پر اعتدال کی حالت میں ہوتے ہیں یعنی کہ نہ تو زیادہ اونچے درجہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ بہت نیچے درجہ سے تعلق رکھتے ہیں (معروف اصطلاح میں ایسے لوگوں کو "درمیانہ طبقہ" کہا جاتا ہے) یہ اور بات ہے کہ وہ حالت اعتدال یکساں نوعیت نہ رکھتی ہو، بلکہ ایسا ہو کہ کوئی شخص کسی کی بہ نسبت معتدل حالت رکھتا ہو اور کوئی شخص کسی کی بہ نسبت! لہٰذا جس شخص نے اپنے سے برتر کی طرف دیکھ کر اپنے سے کمتر کی طرف نظر ڈالی وہ یقیناً اچھی حالت کا حامل ہو گا۔

اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بفرض محال کوئی شخص ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اپنے معاشرہ کے تمام ہی لوگوں پر فضیلت و برتری رکھتا ہو تو اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہو گا کہ وہ ان لوگوں کی طرف دیکھے جو اس سے کمتر درجہ کے حامل ہیں، کیونکہ اس صورت میں بعید نہیں کہ اس کے اندر عجب و غرور اور اظہار فخر کا مادہ پیدا ہو جائے لہٰذا اس پر واجب یہ ہو گا کہ وہ جس خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہے اور اپنی فضیلت و برتری کو اپنے بلند کردار کے ذریعہ تواضع و انکساری اور خدمت خلق کا ذریعہ بنا لے۔

نیز جو شخص ایسا ہو کہ کوئی دوسرا آدمی اس سے زیادہ مفلس و قلاش اور اس سے زیادہ غریب و نادار نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرے کہ اس نے مجھے دنیا کے وبال میں مبتلا نہیں کیا اور دنیا داری کے بکھیڑوں اور اس کے غم و فکر سے محفوظ رکھا! چنانچہ حضرت شبلیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ جب کسی دنیا دار کو دیکھتے تو (اس کے وبال کے خوف سے) بیساختہ ان کی زبان سے نکلتا۔ "اے اللہ! میں تجھ سے دنیا و آخرت میں عفو و عافیت کا طلب گار ہوں۔"

غربت و افلاس کی تنگی و سختی اور فقر و فاقہ کی صعوبتیں حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے، اس کا اندازہ اس حکایت سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دن ایک بہت بزرگ و ولی اور عارف باللہ اپنی مجلس میں حاضرین کو وعظ و نصیحت سے مستفید فرما رہے تھے کہ ایک نہایت مفلس و نادار شخص کھڑا ہوا اور شکوہ کرنے لگا کہ حضرت! میں نے اتنے طویل عرصہ سے نہ تو کسی کے سامنے اور نہ کسی سے

چھپ کر کچھ کھایا پیا ہے اور نہایت اخلاص اور کمال استقامت کے ساتھ شدت بھوک کی صعوبتوں کو برداشت کر رہا ہوں۔" ان بزرگ نے فرمایا۔ "ارے دشمن خدا! تو کتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے؟" تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ شدت بھوک کی صعوبت میں اپنے انہی بندوں کو مبتلا کرتا ہے جو اس کے رسول، نبی اور ولی ہوتے ہیں، اگر تو ایسے ہی بندگان خدا میں سے ہوتا تو اس پوشیدہ راز کو ہرگز ظاہر نہ کرتا اور خدا کی اس نعمت کو لوگوں سے چھپاتا۔"

ان ساری باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ مؤمن کو جب سلامتی طبع اور حسن استقلال کی دولت مل جاتی ہے اور اس کا دین ہر طرح کے نقصان و خلل سے محفوظ ہوتا ہے تو پھر وہ نہ مال و متاع کی پرواہ کرتا ہے اور نہ جاہ و حشمت سے محرومی اس کو ملول کرتی ہے نیز زمانہ حال یا مستقبل میں اس کو جن مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے وہ ان کو خدا کی طرف سے ایک ایسی نعمت سمجھ کر کہ جو اس کو آخرت کی سعادتوں اور کامیابیوں سے ہمکنار کرنے والی ہے، صبر و رضا اور شکر و اطمینان کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ منقول ہے کہ امام غزالی کے ایک مرید کو کسی نے مارا پیٹا اور قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا تو اس نے امام غزالی سے شکایت کی، انہوں نے فرمایا، عزیز من! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو بس اتنے ہی میں ٹل گئی ورنہ بلا تو کبھی اس سے زیادہ تکلیف دہ صورت میں نازل ہوتی ہے! کچھ دنوں کے بعد وہی مرید کچھ دوسرے لوگوں کے چکر میں پھنس گیا جنہوں نے اس کو ایک کنوئیں میں بند کر دیا، جب وہ کسی طرح سے نجات پاکر حضرت امام موصوف کی خدمت میں پہنچا اور ان سے اس حادثہ کی شکایت کی تو انہوں نے وہی جواب دیا جو پہلے دیا تھا، پھر اتفاق کی بات کہ کچھ عرصہ کے بعد ایک یہودی کے چنگل میں جا پھنسا، اس یہودی نے یہ سلوک کیا کہ اس کو ایک زنجیر میں باندھ کر اپنے پاس ڈال لیا اور ہر لمحہ کوئی نہ کوئی ایذاء اس کو پہنچاتا رہا! اس مرتبہ اس شخص کو نہایت تکلّف واذیت کا سامنہ کرنا پڑا اور بہت دل گرفتہ ہوا کہ کیا دنیا بھر کی مصیبتیں میرے ہی لئے رہ گئی ہیں۔ آخر کار جب اس یہودی سے بھی نجات پاکر امام غزالی کی خدمت میں پہنچا، اور جن مصائب سے دوچار ہوا تھا ان کی شکایت کی، تو حضرت امام موصوف نے پہلے کی طرح پھر صبر و شکر کی تلقین کی! اب بات چونکہ اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی لہذا نہایت بیقراری کے عالم میں کہنے لگا کہ حضرت! اب تک جن اذیتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہو چکا ہوں کیا ان سے بھی زیادہ سخت کوئی بلا باقی رہ گئی ہے؟ حضرت امام غزالی نے جواب دیا۔ "ہاں! اس سے بھی سخت بلا ہے اور وہ یہ کہ (خدانخواستہ) تمہاری گردن میں کفر کا طوق پڑ جائے۔" حاصل یہ کہ انسان کے لئے آفات اور بلاؤں کی کوئی حد نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کسی آفت و بلا میں مبتلا ہو تو صرف یہ کہ اس کو اس آفت و بلا کا صبر و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے بلکہ خدا کا شکر بھی ادا کرنا چاہئے کہ اس نے اس سے بھی سخت کسی آفت و مصیبت میں مبتلا نہیں کیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جنّت میں فقراء کا داخلہ اغنیاء سے پہلے ہوگا

(۱۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدْخُلُ الْفُقَرَآءُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْاَغْنِیَاءِ بِخَمْسِ مِائَةِ عَامٍ نِصْفُ یَوْمٍ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "فقراء جنت میں اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے جو آدھے دن کے برابر ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "آدھے دن" سے مراد قیامت کا آدھا دن ہے! مطلب یہ ہے کہ وہ پانچ سو سال قیامت کے آدھے دن کے برابر ہوں گے۔ اور قیامت کے دن کی مدت طوالت، دنیاوی شب و روز کے اعتبار سے ایک ہزار سال کے برابر ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم ہی میں ایک اور جگہ یہ فرمایا ہے کہ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ

خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ اور جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، تو جاننا چاہئے کہ پہلی آیت (کہ جس سے قیامت کے دن کا ایک ہزار سال کے برابر ہونا ثابت ہوتا ہے) عمومیت کی حامل ہے۔ جب کہ یہ دوسری آیت (کہ جس سے قیامت کے دن کا پچاس ہزار سال کے برابر ہونا ثابت ہوتا ہے) ایک خاص نوعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے! یعنی اصل بات تو یہی ہے کہ دنیاوی حساب کے اعتبار سے قیامت کا دن ایک ہزار سال کے برابر ہوگا اور اسی کو پہلی آیت کے ذریعہ واضح فرمایا گیا ہے. لیکن وہ قیامت کا دن چونکہ سختیوں اور شدت کا دن ہوگا اور جو شخص دنیا میں دین وہدایت سے جتنا دور ہوگا اس کو اس دن کی سختیاں اسی قدر زیادہ محسوس ہوں گی اس لئے کفار کے حق میں اس دن کی سختیاں اس قدر زیادہ ہوں گی کہ اپنی درازی وسختی کے اعتبار سے وہ دن ان کو پچاس ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا! یہ دوسری آیت یہی مفہوم بیان کرتی ہے کہ قیامت کا دن (اگرچہ ایک ہزار سال کے برابر ہوگا مگر سختیوں اور شدائد کی بنا پر) کفار کو وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا جیسا کہ مؤمنین اور نیک کاروں کے حق میں وہ دن گویا لپیٹ دیا جائے گا کہ ایک ہزار سال کے برابر اس دن کی طوالت ان کو ایک ساعت کے بقدر معلوم ہوگی! اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ "فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ ۝ فَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ ۝ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ۔

اس حدیث کے ضمن میں ایک اشکال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث بظاہر اس حدیث کے معارض ہے جو جنّت میں فقراء کے پہلے داخل ہونے کی مدت کو چالیس سال ظاہر کرتی ہے؟ لہٰذا شارحین نے ان دونوں حدیثوں میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے یہ بیان کیا ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ پچھلی حدیث میں "اغنیاء" سے مراد "اغنیاء مہاجرین" ہوں (جیسا کہ اس حدیث کی تشریح میں بھی اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے) اس صورت میں اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ فقراء ان اغنیاء سے کہ ان کا تعلق مہاجر صحابہ سے ہے چالیس سال پہلے جنّت میں داخل ہوں گے، جب کہ یہاں اس حدیث میں "اغنیاء" سے مراد وہ اغنیاء ہیں جو مہاجرین میں سے ہوں گے! اس وضاحت سے دونوں حدیثوں کے درمیان کوئی تعارض وتضاد باقی نہیں رہتا! لیکن جیسا کہ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کے درمیان مذکورہ تعارض کو ختم کرنے کے لئے یہ وضاحت زیادہ مناسب وموزوں ہے کہ دونوں عدد، یعنی چالیس اور پانچ سو سے مراد تحدید نہیں ہے بلکہ مطلقاً اس زمانی فرق کو بیان کرنا مقصود ہے جو جنّت میں داخل ہونے کے سلسلہ میں فقراء اور اغنیاء کے درمیان ہوگا، چنانچہ اس فرق کو ظاہر کرنے کے لئے کہ فقراء جنّت میں اغنیاء سے پہلے جائیں گے، ازراہ تفنن، کسی موقع پر تو "چالیس سال" فرمایا گیا ہے۔ اور کسی موقع پر "پانچ سو سال" کے الفاظ ذکر فرمائے گئے ہیں جب کہ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے! یا یہ کہ پہلے حضور ﷺ کو بذریعہ وحی یہی معلوم ہوا ہوگا کہ جنّت میں فقراء کے اغنیاء سے پہلے جانے کی مدت چالیس سال ہوگی، چنانچہ حضور ﷺ نے اس وحی کے مطابق چالیس سال کا ذکر فرمایا، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی برکت سے فقراء کے حال پر خصوصی فضل فرماتے ہوئے اور ان کی مزید تسلی کے لئے یہ خبر دی کہ فقراء کو جنّت میں اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے داخل کیا جائے گا، چنانچہ حضور ﷺ نے جب دوسری مرتبہ اس بات کا ذکر کیا تو اس میں پانچ سو سال کا ذکر فرمایا۔ یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کے مفہوم میں جو اختلاف نظر آتا ہے اس کا تعلق دراصل خود فقراء کی ذات وشخصیت کی غیر یکسانیت سے ہے یعنی ظاہر ہے کہ ہر غریب ونادار اور ہر فقیر مسلمان ایک ہی حالت نہیں رکھتا، بعض فقراء تو ایسے ہوتے ہیں جو صبر ورضا اور شکر کے درجۂ کمال پر ہوتے ہیں، اور بعض فقراء وہ ہیں جن میں صبر ورضا اور شکر کا مادہ کم ہوتا ہے لہٰذا "پانچ سو سال" والی حدیث کا تعلق اول الذکر فقراء سے اور "چالیس سال" والی حدیث کا تعلق موخر الذکر فقراء سے! یہ تاویل زیادہ مناسب اور موزوں بھی ہے اور اس کی تائید جامع الاصول کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے جس میں ان دونوں حدیثوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ جس حدیث میں "چالیس سال" کا ذکر ہے اس کی مراد یہ ہے کہ دنیاوی لذتوں اور نعمتوں کی خواہش رکھنے والا فقیر، حریص غنی سے چالیس سال پہلے جنّت میں داخل ہوگا اور جس حدیث میں "پانچ سو سال" ذکر ہے اس کی مراد یہ ہے کہ دنیاوی لذتوں و نعمتوں سے بالکل بے نیاز اور زاہد فقیر دنیادار غنی سے پانچ سو سال پہلے جنّت میں داخل ہوگا۔

مفلس و مسکین کی فضیلت

(۱۴) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ فَقَالَتْ عَآئِشَۃُ لِمَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِنَّھُمْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ قَبْلَ اَغْنِیَآءِ ھِمْ بِاَرْبَعِیْنَ خَرِیْفًا یَاعَآئِشَۃُ لَاتَرُدِّی الْمِسْکِیْنَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ یَاعَآئِشَۃُ اَحِبِّی الْمَسَاکِیْنَ وَقَرِّبِیْھِمْ فَاِنَّ اللّٰہَ یُقَرِّبُكِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اِلٰی قَوْلِہٖ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی۔ "اے اللہ! مجھ کو مسکین بنا کر زندہ رکھ، مسکینی ہی کی حالت میں مجھے موت دے اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر فرما۔" حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ کو یہ دعا فرماتے ہوئے سنا تو) کہنے لگیں کہ یارسول اللہ! آپ ایسی دعا کیوں کرتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "اس لئے کہ مساکین (اپنے دوسرے فضائل وخصوصیات اور حسن اخلاق و کردار کی وجہ سے آخرت کی سعادتوں اور نعمتوں سے تو بہرہ ور ہوں ہی گے لیکن اس سے قطع نظر ان کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ) دولتمندوں سے چالیس سال پہلے جنّت میں داخل ہوں گے! دیکھو عائشہؓ! کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے ناامید نہ جانے دینا (بلکہ ہر حالت میں اس کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنا) اگرچہ اس کو دینے کے لئے تمہارے پاس کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ عائشہؓ! (اپنے دل میں) مسکینوں کی محبت رکھو اور ان کو اپنی (مجلسوں اور محفلوں کی) قربت سے نوازو (یعنی ان کو حقیر و کمتر جان کر اپنے یہاں آنے جانے سے مت روکو) اگر تم ایسا کرو گی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی قربت سے نوازے گا (کیونکہ فقراء و مساکین کے ساتھ محبت ہمدردی کا برتاؤ کرنا اور ان کو اپنے قریب آنے دینا اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے)۔ ترمذیؒ، بیہقیؒ اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو حضرت ابوسعیدؓ سے صرف زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ تک نقل کیا ہے (یعنی ان کی روایت میں حضرت عائشہؓ کا سوال و جواب اور حدیث کے باقی جملے نہیں ہیں۔

تشریح: "مسکین" لفظ مسکنت سے نکلا ہے جس کے معنی تواضع کمزوری اور مفلسی کے ہیں! ویسے یہ لفظوں سکون اور سکینۃ سے بھی مشتق قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے معنی وقار، اطمینان اور تقدیر الٰہی کے اقرار و قبول کے ہیں اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ شرعی اصطلاح میں مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو یا جس کے پاس اتنا نہ ہو جو اس کے اہل و عیال کی ضروریات زندگی کو پورا کر سکے۔

مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں اُمّت کے لئے یہ تعلیم و تلقین ہے کہ فقراء و مساکین کی فضیلت کو پہچانا جائے، ان کے ساتھ محبّت و ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے اور ان کے ساتھ ہم نشینی و قربت اختیار کی جائے تاکہ ان کی برکت مسلمانوں کو پہنچے! نیز اس حدیث میں فقراء و مساکین کے لئے یہ بڑی تسلی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے حالات کی تنگی و سختی سے بددل و مایوس نہ ہوں بلکہ اپنے ان بلند درجات سے آگاہ ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس فانی دنیا کی زوال پذیر نعمتوں اور لذتوں سے محرومی کے عوض ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والے جہاں یعنی آخرت کی زندگی کے لئے عطا فرمادیئے ہیں۔

مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں اُمّت کے لئے یہ تعلیم و تلقین ہے کہ فقراء و مساکین کی فضیلت کو پہچانا جائے، ان کے ساتھ محبت و ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے اور ان کے ساتھ ہم نشینی و قربت اختیار کی جائے تاکہ ان کی برکت مسلمانوں کو پہنچے! نیز اس حدیث میں فقراء و مساکین کے لئے یہ بڑی تسلی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے حالات کی تنگی و سختی سے بددل و مایوس نہ ہوں بلکہ اپنے ان بلند درجات سے آگاہ ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس فانی دنیا کی زوال پذیر نعمتوں اور لذتوں سے محرومی کے عوض ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والے جہاں یعنی آخرت کی زندگی کے لئے عطا فرمادیئے ہیں۔

رہی یہ بات کہ حضور ﷺ کا اپنے حق میں "مسکین" بننے کی دعا کرنا کیا مفہوم رکھتا تھا، تو اس بارے میں یہ کہنا مناسب ہے کہ اس دعا سے حضور ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو بس اتنی روزی دے جو گزارہ کے بقدر ہو اور جس سے زندگی کا وجود باقی رہے، نیز

آپ کو دنیاوی مال و دولت اور اس کی نعمتوں ولذتوں میں مشغول نہ کرے، کیونکہ مال و دولت کی کثرت مقربین کے حق میں سخت وبال کا درجہ رکھتی ہے! "منقول ہے کہ ایک مسلمان بادشاہ کہیں جارہا تھا کہ راستہ میں اس کا گزر فقراء وصالحین کی ایک جماعت پر ہوا، ان لوگوں نے بادشاہ کے تئیں کسی التفات کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس کی طرف متوجہ ہوئے، بادشاہ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی، اس نے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے جواب میں جو بات کہی اس کو یہاں نقل کرنا مقصود ہے، انہوں نے کہا۔ "ہم وہ لوگ ہیں کہ جن کے ساتھ محبت، ترک دنیا کا سبب ہے اور جن کے ساتھ عداوت ترک عقبی کا سبب ہے۔" بادشاہ نے یہ جواب سنا تو ان سے دار و گیر کئے بغیر آگے بڑھ گیا اور کہنے لگا کہ ہم نہ تمہاری محبت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ تمہارے ساتھ عداوت رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا اپنے حق میں مذکورہ دعا فرمانا اور پھر حضرت عائشہؓ کے پوچھنے پر اس دعا کی یہ توجیہہ فرمانا کہ میرا مقصد وہ فضل و شرف حاصل کرنا ہے جو قیامت کے دن فقراء کو حاصل ہوگا وہ دولتمندوں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، یہ وہم پیدا کرتا ہے کہ فقراء بلا استثناء تمام دولتمندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے خواہ وہ (دولتمند) انبیاء ہی کیوں نہ ہوں! لیکن اس سلسلہ میں زیادہ قوی بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مذکورہ دعا اور اس کی توجیہہ میں مذکورہ ارشاد کا اصل مقصد ایک تو محض، فقراء و مساکین کے فضل و شرف کو ظاہر کرنا ہے، اور دوسرے اپنی اس طلب و خواہش کو ظاہر کرنا ہے کہ مجھے تمام انبیاء سے پہلے جنت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل ہو خواہ وہ انبیاء دولتمند ہوں یا فقراء! پس حضور ﷺ کا اپنے بارے میں فقر و فاقہ کی زندگی کی دعا کرنا فقراء غیر انبیاء سے پیچھے رہ جانے کے خوف سے نہیں بلکہ ان انبیاء سے پیچھے رہ جانے کے خوف کی بناء پر تھا جن کی زندگی فقر و فاقہ سے معمور تھی! اس وضاحت سے مذکورہ بالا وہم محل نظر ہو جاتا ہے۔

یا عائشة الا تردی المسکین الخ (عائشہؓ! کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے ناامید نہ جانے دینا الخ) کے ذریعہ حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو یہ نصیحت فرمائی کہ جو مسکین و فقیر تمہارے پاس اپنی حاجت لے کر آئے اس کو کمتر و حقیر نہ جانو اور اس کو بے مراد واپس نہ کرو، بلکہ اس کے ساتھ محبت و نرمی سے پیش آؤ، ان کی حالت پر رحم کھاؤ اور جو کچھ میسر ہو اس کے دامن مراد میں ڈال دو، خواہ وہ کتنی ہی کمتر چیز کیوں نہ ہو، اور اگر تمہارے پاس ایسی کوئی بھی چیز نہ ہو جس کے ذریعہ تم اس کا سوال پورا کر سکو تو اس صورت میں نہایت نرمی و بھلائی کے ساتھ معذرت کرو اور اس کو اچھے انداز میں واپس کرو۔

ابو الشیخؒ اور بیہقیؒ نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے نقل کیا ہے انہوں نے مشہور صحابی حضرت ابو سعیدؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "لوگو" تمہاری تنگدستی و ناداری تمہیں اس بات پر نہ اکسانے پائے کہ تم اپنی روزی ناجائز وسائل و ذرائع سے حاصل کرنے کی طلب رکھنے لگو، (یعنی اگر خدا نے تمہیں تنگدستی و ناداری میں مبتلا کیا ہے تو تم اپنی اس حالت پر صابر و شاکر رہ کر عزم و حوصلہ اور کردار کی پختگی کے ساتھ معاشی شدائد کا مقابلہ کرو، ایسا نہ ہو کہ روزی حاصل کرنے کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرو جو شرعی احکام کے خلاف اور انسانی اخلاق و کردار کی عظمت کے منافی ہیں) کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو اپنے بارے میں یہ دعا فرماتے سنا ہے کہ "اے اللہ! تو مجھے فقر و ناداری کی حالت میں موت دے، دولتمندی کی حالت میں موت نہ دے، اور میرا حشر مسکینوں کے زمرہ میں فرما۔" پس یقیناً سب سے بڑا بدبخت وہ شخص ہے جو دنیا کے فقر و افلاس کا بھی شکار ہو اور آخرت کے عذاب کا بھی مستوجب قرار پائے (یعنی جو شخص فقر و افلاس کی سختیوں سے گھبرا کر ناجائز طور پر اپنی روزی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اس سے بڑا بدنصیب اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فقر و افلاس کی وجہ سے دنیا کی نعمتوں سے بھی محروم رہا اور حصول معاش کی راہ میں حرام و ناجائز امور کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے آخرت کے عذاب کا بھی مستوجب قرار پایا۔

ملا علی قاریؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ۔ "میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر اس ارشاد گرامی کے علاوہ کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی حدیث اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھی کہ صبر کرنے والا فقیر و مسکین، شکر گذار دولت مند سے افضل ہے!

نیز ملا علی قاریؒ نے اس موقع پر ان دو حدیثوں کا بھی ذکر کیا ہے جو فقر و ناداری کے سلسلہ میں عوام میں بہت مشہور ہیں، ان میں سے ایک حدیث اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَبِہٖ اَفْتَخِرُ ہے ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ حفاظ حدیث جیسے علامہ عسقلانیؒ وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ یہ حدیث بالکل بے اصل ہے اور اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ دوسری حدیث کادا لفقران یکون کفرا ہے اس کے بارے میں محدثین نے وضاحت کی ہے کہ یہ حدیث اول تو یقینی طور پر ضعیف ہے دوسرے اگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کا محمول قلبی فقر و افلاس ہے جو جزع و فزع، شکوہ شکایت، قضا و قدر پر بے اطمینانی اور خدا کی بنائی ہوئی قسمت پر اعتراض کرنے کے باعث ہوتا ہے، ورنہ جہاں تک معاشی فقر و افلاس کا تعلق ہے تو وہ ایک ایسی چیز ہے جو اللہ کی طرف سے انہی بندوں کو نصیب ہوتی ہے جن کو وہ آخرت میں بلند درجات پر پہنچانا چاہتا ہے اس لئے ایک روایت میں فرمایا گیا ہے کہ الفقر شین عندالناس وزین عند اللہ یوم القیمۃ (دیلمی) یعنی فقر و افلاس لوگوں کی نظر میں تو ایک عیب و برائی ہے لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک زینت دینے والی چیز ہے۔

کمزور و نادار مسلمانوں کی برکت

⑮ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ابْغُوْنِیْ فِیْ ضُعَفَاءِ کُمْ فَاِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ اَوْ تُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَاءِ کُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابو درداءؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم لوگ مجھے اپنے کمزور لوگوں میں تلاش کرو کیونکہ تمہیں رزق کا دیا جانا۔ یا یہ فرمایا کہ تمہیں اپنے دشمن کے مقابلہ پر مدد کا ملنا انہی لوگوں کی برکت سے ہے جو تم میں کمزور ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "کمزور لوگوں" سے مراد فقراء و مساکین اور نادار لوگ ہیں اور ان میں تلاش کرنے کا مطلب، ان لوگوں کی مدد و اعانت اور خبر گیری کے ذریعہ ان کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنا ہے! یا "کمزور لوگوں" سے مراد "مظلوم" ہیں کہ اگرچہ وہ دولتمند ہی کیوں نہ ہوں اور مطلب ظلم کے پنجہ سے نکلنے میں ان کی ہر طرح مدد کرنا ہے۔ حاصل یہ کہ اس ارشاد گرامی کے ذریعہ حضور ﷺ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ میری رضامندی و خوشنودی کے طلب گار ہو تو اپنی مدد و اعانت اور حسن سلوک کے ذریعہ ان لوگوں کی خوشنودی حاصل کرو جو تم میں کمزور نادار ہیں۔

او تنصرون میں لفظ او تنویع کے لئے ہے، اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں اَوْ کے بجائے حرف واؤ ہے، تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں حرف اَوْ کے ذریعہ راوی کے شک کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حضور ﷺ نے یا تو لفظ ترزقون فرمایا تھا یا لفظ تنصرون چنانچہ اوپر ترجمہ میں اسی احتمال کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

"انہی لوگوں کی برکت سے ہے جو تم میں کمزور ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جو کمزور و نادار نظر آتے ہیں اور ہر طرح کی دنیاوی طاقت و حیثیت سے خالی معلوم ہوتے ہیں، ان کا وجود پوری کائنات کے لئے خیر و برکت کا باعث اور ان کے ساتھ احسان و حسن سلوک تمام لوگوں کی بھلائی و بہتری کا ضامن ہوتا ہے کیونکہ ان لوگوں میں وہ بڑے بڑے اقطاب و اوتاد بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ دنیاداروں کی نظر میں اپنی اصل حیثیت کے ساتھ متعارف نہیں ہوتے مگر حقیقت میں سارے عالم کا نظم کائنات انہی کی وجہ سے استوار ہوتا ہے بلکہ بعض حالات میں مختلف علاقوں اور آبادیوں کا نظم و انصرام روحانی طور پر خدا کی طرف سے ان کے سپرد ہوتا ہے ان لوگوں کا در و بست ان کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

ابن ملکؒ نے اس حدیث کی وضاحت میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ کے مذکورہ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ (اگر مجھ کو پانا چاہتے ہو تو) مجھے اپنے کمزور و نادار لوگوں میں تلاش کرو، بایں طور کہ تمہارے اوپر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں، ان کی محافظت کرو اور ان کی دل جوئی میں مشغول رہو کیونکہ میں ان کے ساتھ بعض اوقات تو جسمانی طور پر ہوتا ہوں دل و جان سے تمام اوقات میں ہوتا ہوں، لہٰذا جس

شخص نے ان کا احترام کیا اس نے گویا میرا اکرام و احترام کیا اور جس شخص نے ان کو (خواہ جسمانی خواہ روحانی طور پر) تکلیف (ایذاء پہنچائی) اس نے گویا مجھ کو تکلیف و ایذاء پہنچائی! اس کی تائید اس حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، من عادلی ولیا فقد بارزنی بالحرب (یعنی) جس شخص نے میرے ولی کے ساتھ عداوت و دشمنی اختیار کی وہ گویا مجھ سے لڑنے کے لئے میدان میں آیا۔

(۱۶) وَعَنْ اُمَيَّةَ ابْنِ خَالِدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَسِيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَانَ يَسْتَفْتِحُ بِصَعَالِيْكِ الْمُهَاجِرِيْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت امیہ ابن خالد ابن عبداللہ ابن اسید نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ (اللہ تعالیٰ سے کفار کے مقابلہ پر) فتح حاصل ہونے کے لئے درخواست کرتے تو فقراء مہاجرین کی برکت کے ذریعہ دعا مانگتے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "صعالیک" صعلوک کی جمع ہے، جیسا کہ عُصْفُور کی جمع عَصَافِير ہے، اور صعلوک کے معنی ہیں فقیر و مسکین اور کمزور و نادار۔

ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کا مطلب یہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ (کفار سے مقابلہ آرائی کے وقت) اللہ تعالیٰ سے فتح حاصل ہونے کی جو درخواست کرتے اس میں فقراء مہاجرین کا واسطہ اور ان کی دعاؤں کی برکت کا ذریع اختیار فرماتے۔" اس کے بعد انہوں نے ابن ملکؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ سے فقراء مہاجرین کا واسطہ اختیار کر کے فتح کی درخواست فرماتے بایں طور کہ آپ ﷺ اس طرح دعا فرمایا کرتے تھے، اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا عَلَى الْاَعْدَاءِ بِعِبَادِكَ الْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ۔ "یہ حدیث فقراء و نادار مسلمانوں کی اس عظمت و فضیلت کو ظاہر کرتی ہے جو سرکار دو عالم ﷺ نے ان کے لئے ثابت فرمائی، چنانچہ آپ نے یہ شرف صرف فقراء و مساکین کو عطا فرمایا کہ ان کی برکت کو واسطہ اور وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت کی درخواست کرتے تھے ع

شاہان چہ عجب گر بہ نوازند گدارا

کافروں کی خوشحالی پر رشک نہ کرو

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَغْبِطَنَّ فَاجِرًا بِنِعْمَةٍ فَاِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا هُوَ لَاقٍ بَعْدَ مَوْتِهٖ اِنَّ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ قَاتِلًا لَا يَمُوْتُ يَعْنِي النَّارَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کسی فاجر (یعنی کافر یا فاسق) کو دنیاوی نعمتوں "یعنی جاہ و حشمت اور دولت) سے مالا مال دیکھ کر اس پر رشک نہ کرو کیونکہ تم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد (قبر میں یا حشر میں) اس کو کیا کیا پیش آنے والا ہے (یعنی وہ یہاں تو بے شک دنیاوی نعمتوں سے مالا مال ہے لیکن اس کے برعکس آخرت میں طرح طرح کے عذاب اور سختیوں سے دوچار ہوگا) اور (یاد رکھو) فاجر کے لئے خدا کے یہاں ایک ایسا قاتل ہے جس کو موت اور فنا نہیں ہے۔" اور اس قاتل سے حضور ﷺ کی مراد "آگ" ہے۔"

(شرح السنۃ)

تشریح: "ایک ایسا قاتل ہے الخ" یعنی اللہ تعالیٰ نے کفار و فساق کے لئے ایک ایسی چیز تیار کر رکھی ہے جو ان کو سخت عذاب دے گی، ہلاک کرے گی اور طرح طرح کی اذیت ناکیوں میں مبتلا کرے گی، اور اس چیز کی شان یہ ہے کہ خود اس کو موت و فنا نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ موجود رہے گی۔

"یعنی النار" کے الفاظ ان راوی کے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور ان کا نام نامی حضرت عبداللہ ابن ابی مریم ہے، گویا انہوں نے ان الفاظ کے ذریعہ یہ وضاحت کی ہے کہ حضور ﷺ نے لفظ "قاتل" کے ذریعہ جس چیز کی

طرف اشارہ فرمایا ہے وہ دوزخ کی آگ ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کافر و فاسق کو دیکھ کر کہ جو زیادہ اولاد رکھتا ہے، یا زیادہ جاہ و حشمت کا مالک ہے یا مال و دولت کی فراوانی رکھتا ہے اور یا دوسری دنیاوی نعمتوں سے مالا مال ہے تو اس پر رشک نہ کیا جائے اور اس تمنا کو اپنے دل میں جگہ نہ دی جائے کہ کاش اسی طرح کی نعمتیں ہمیں بھی حاصل ہوں۔

دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے

(۱۸) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَسَنَتُہٗ وَاِذَا فَارَقَ الدُّنْیَا فَارَقَ السِّجْنَ وَالسَّنَۃَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ دنیا! مؤمن کے لئے قید خانہ اور قحط ہے! جب وہ مؤمن دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو (گویا) قید خانہ اور قحط سے نجات پاتا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: قید خانہ اور قحط کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن یہاں ہمیشہ طرح طرح کی تنگی و سختی کا شکار رہتا ہے اور معاشی پریشان حالیوں میں بسر اوقات کرتا ہے اور اگر کسی مؤمن کو یہاں کی خوشحالی میسر بھی ہو تو ان نعمتوں کی بہ نسبت کہ جو اس کو آخرت میں حاصل ہونے والی ہیں، یہ دنیا پھر بھی اس کے لئے قید خانہ اور قحط زدہ جگہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی! یا یہ مراد ہے کہ مخلص و عبادت گذار مؤمن چونکہ اپنے آپ کو ہمیشہ طاعات و عبادات کی مشقتوں اور ریاضت و مجاہدہ کی سختیوں میں مشغول رکھتا ہے۔ عیش و راحت کو اپنی زندگی میں راہ نہیں پانے دیتا اور ہر لمحہ اس راہ شوق پر گامزن رہتا ہے کہ اس محنت و مشقت بھری دنیا سے نجات پاکر دار البقاء کی راہ پکڑے۔ اس اعتبار سے یہ دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ اور قحط زدہ جگہ سے کم صبر آزما نہیں ہوتی، ایک روایت میں یوں فرمایا گیا لا یخلو المؤمن من قلة او علة او ذلة وقد یجتمع للمؤمن الکامل جمیع ذلک یعنی ایسا کوئی مؤمن نہیں جو، یا تو مال کی کمی، یا بیماری اور یا ذلت و خواری سے خالی ہو، اور بعض اوقات مؤمن کامل میں یہ سب چیزیں جمع ہو جاتی ہیں۔

جن کو خدا اپنا محبوب بنانا چاہتا ہے ان کو دنیاوی مال و دولت سے بچاتا ہے

(۱۹) عَنْ قَتَادَةَ بْنِ النُّعْمَانِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَحَبَّ اللّٰہُ عَبْدًا حَمَاہُ الدُّنْیَا کَمَا یَظَلُّ اَحَدُکُمْ یَحْمِیْ سَقِیْمَہُ الْمَآءَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت قتادہ ابن نعمانؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو اس کو دنیا سے بچاتا ہے، جس طرح کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے مریض کو پانی سے بچاتا ہے۔" (احمد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہارا کوئی عزیز و متعلق جب کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے جس میں پانی کا استعمال سخت نقصان پہنچاتا ہے جیسے استسقاء اور ضعف معدہ وغیرہ، اور تمہیں اس کی زندگی پیاری ہوتی ہے تو تم اس بات کی پوری کوشش کرتے ہو کہ وہ مریض، پانی کے استعمال سے دور رہے تاکہ صحتیابی سے جلد ہمکنار ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جس بندے کو اپنا محبوب بنانا اور اس کو آخرت کے بلند درجات پر پہنچانا چاہتا ہے اس کو دنیاوی مال و دولت، جاہ و منصب اور اس ہر چیز سے دور رکھتا ہے جو اس کے دین کو نقصان پہنچانے اور عقبیٰ میں اس کے درجات کو کم کرنے کا سبب بنے۔

اشرفؒ نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے اور لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو دنیاوی مال و جاہ اور یہاں کی کوئی ایسی چیز نہیں دیتا جو اس کی دینی و اخروی زندگی کی زینت و خوبی کو داغدار کر دے، تاکہ اس کا دل دنیا اور دنیا کی چیزوں کی محبت و خواہش کے مرض میں مبتلا نہ ہو۔

مال کی کمی، در حقیقت بڑی نعمت ہے

⑳ وَعَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اثْنَتَانِ يَكْرَهُهُمَا ابْنُ اٰدَمَ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَالْمَوْتُ خَيْرٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ مِنَ الْفِتْنَةِ وَيَكْرَهُ قِلَّةَ الْمَالِ وَقِلَّةُ الْمَالِ اَقَلُّ لِلْحِسَابِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دو چیزیں ایسی ہیں جن کو ابن آدم (انسان) ناپسند کرتا ہے (اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ دونوں چیزیں بہت اچھی ہیں چنانچہ انسان ایک تو موت کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ مؤمن کے لئے موت فتنہ سے بہتر ہے، دوسرے مال و دولت کی کمی کو ناپسند کرتا ہے، حالانکہ مال کی کمی حساب کی کمی کا موجب ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: "فتنہ" سے مراد ہے کفر و شرک، اور گناہوں میں گرفتار ہونا، ظالم و جابر لوگوں کا ایسے کام کرنے پر مجبور کرنا جو اسلامی عقائد و تعلیمات کے خلاف ہوں، اور ایسے حالات سے دوچار ہونا جن سے دین و آخرت کی زندگی مجروح ہوتی ہو! حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی اور زندہ رہنے کی تمنا تو اسی صورت میں خوب ہے جب کہ خدا اور خدا کے رسولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے طاعات و عبادات کی توفیق عمل حاصل رہے، راہ مستقیم پر ثابت قدم نصیب ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دنیا سے ایمان کی سلامتی کے ساتھ رخصت ہو! اگر یہ چیزیں حاصل نہ ہوں اور ایمان کی سلامتی نصیب نہ ہو تو پھر یہ زندگی کس کام کی؟ ظالم و جابر لوگوں کی طرف سے جبر و اکراہ کی صورت میں اگرچہ دل، ایمان، عقیدہ پر قائم رہے مگر زبان سے ایسی بات کا ادا ہونا کہ جو ایمان و عقیدہ کے مناسب و لائق نہیں ہے، یہ بھی ایک "فتنہ" ہی ہے! ہاں اگر فتنہ کا تعلق کسی اور طرح کے دنیاوی ابتلاء و مصائب، زندگی کی سختیوں اور نفس کی مشقت و شدائد سے ہو تو اسی صورت میں زندگی سے نفرت اور موت کی تمنا درست نہیں ہوگی کیونکہ ایسا فتنہ گناہوں کے کفارہ اور اخروی درجات کی بلندی و رفعت کا سبب ہوتا ہے۔

وَقِلَّةُ الْمَالِ اَقَلُّ لِلْحِسَابِ کا مطلب یہ ہے کہ دنیاوی مال و دولت کی کمی، عذاب سے بعید تر اور ہر مسلمان کے لئے بہتر ہے۔ لہٰذا جو مسلمان تنگدست و غریب ہو اس کو خوش ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مال و دولت کی فراوانی سے بچا کر گویا آخرت کے حساب و عذاب سے بچایا ہے! اور ظاہر ہے کہ اس دنیا میں غربت و ناداری کی وجہ سے جو سختیاں اور پریشانیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں وہ ان سختیوں اور ہولناکیوں سے کہیں کم اور آسان تر ہیں جو مال و دولت کی فراوانی کے وبال کی وجہ سے آخرت میں پیش آئیں گی۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اس موقع پر بڑی حکمت آمیز بات کہی ہے، انہوں نے ہر طالب حق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"عزیز من! یہ سب ایمان کی شاخیں ہیں، جو شخص شارع علیہ السلام کے ارشادات کے مطابق ایمان کو صحیح درست رکھتا ہے وہ یقیناً جانتا ہے کہ شارع نے جو کچھ فرمایا ہے وہ برحق اور عین صداقت ہے، اور اگر وہ شخص عقل سلیم اور صحیح تجربہ رکھتا ہو تو وہ اسی دنیا میں بھی جان لیتا ہے کہ مال و دولت کی فراوانی، اور اس مال و دولت کو حاصل کرنے اور جمع کرنے، نیز اس کے ساتھ تعلق و محبت رکھنے کے سلسلے میں جن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس قدر ذلت و خواری کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، اور جتنی زیادہ محنت اور مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے وہ سب فقر و افلاس کی سختیوں اور پریشانیوں سے کسی طرح کم نہیں! پس (دنیاوی طور پر محنت و مشقت اور ہر طرح کی ذلت و خواری سے بچنے ہی کا نہیں بلکہ) نفس کی پاکیزگی و صفائی (اور اخروی حساب و عذاب سے بچنے نیز درجات کی بلندی و رفعت) کا انحصار اس بات پر ہے کہ مال و دولت کی کثرت سے اپنا دامن بچایا جائے، اس سے قطع کر کے اور قدر کفایت پر قناعت کر کے عزت نفس اور اخلاق و کردار کی بلندی و استقامت کو اختیار کیا جائے۔

ذات رسالت ﷺ سے محبت کا دعویٰ رکھتے ہو تو فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کرو

㉑ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ اُحِبُّكَ فَقَالَ انْظُرْ مَا تَقُوْلُ

فَقَالَ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاُحِبُّکَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ قَالَ اِنْ کُنْتَ صَادِقًا فَاَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا لِلْفَقْرِ اَسْرَعُ اِلٰی مَنْ یُّحِبُّنِیْ مِنَ السَّیْلِ اِلٰی مُنْتَھَاہُ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ ﷺ سے (بہت زیادہ) محبّت رکھتا ہوں! حضور ﷺ نے یہ (سن کر) فرمایا کہ دیکھالو کیا کہہ رہے ہو؟ (یعنی اچھی طرح سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کیونکہ تم ایک بہت بڑی چیز کا دعوی کر رہے ہو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں اپنی بات پر پورا نہ اتر سکو) اس شخص نے عرض کیا کہ خدا کی قسم، میں، آپ ﷺ سے محبّت رکھتا ہوں۔ اور تین بار اس جملہ کو ادا کیا! حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم (میری محبت کے دعوے میں) سچے ہو تو پھر فقر کے لئے پاکھر تیار کر لو کیونکہ جو شخص مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کو فقر و افلاس، اس پانی کے بہاؤ سے بھی زیادہ جلد پہنچتا ہے جو اپنے منتہا کی طرف جاتا ہے۔" اس حدیث کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "تِجْفَاف" کے معنی ہیں "پاکھر" اور پاکھر اس آہنی جھول کو کہتے ہیں جو میدان جنگ میں ہاتھی گھوڑے پر ڈالی جاتی ہے تاکہ ان کا جسم زخمی ہونے سے بچا رہے جیسا کہ زرہ، سوار سپاہی کے جسم کو نیزہ و تلوار وغیرہ کے زخم سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہاں حدیث میں "پاکھر" کے ذریعہ "صبر و استقامت" کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جس طرح "پاکھر" ہاتھی گھوڑے کے جسم کو چھپاتا ہے۔ اس طرح صبر و استقامت اختیار کرنا، فقر و فاقہ کی زندگی کا سرپوش بنتا ہے! حاصل یہ کہ صبر و استقامت کی راہ پر بہر صورت گامزن رہو، خصوصا اس وقت جب کہ فقر و افلاس تمہاری زندگی کو گھیر لے تاکہ تمہیں مراتب و درجات کی بلندی و رفعت نصیب ہو۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص حضور ﷺ کی محبّت سے پوری طرح سرشار ہوتا ہے اس کو فقر و فاقہ کا جلد پہنچنا اور اس پر دنیاوی آفات و بلاؤں اور سختیوں کا کثرت سے نازل ہونا ایک یقینی امر ہے کیونکہ منقول ہے کہ دنیا میں جن لوگوں کو سب سے زیادہ آفات و شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ انبیاء ہیں ان کے بعد درجہ بدرجہ ان لوگوں کا نمبر آتا ہے جو عقیدہ و عمل کے اعتبار سے اعلی مرتبہ کے ہوتے ہیں۔ پس حضور ﷺ بھی انہی انبیاء میں سے تھے لہٰذا آپ ﷺ نے اس شخص پر واضح فرمایا کہ اگر واقعتا تم میری محبّت رکھو گے تو میرے تئیں تمہاری محبت جس درجہ کی ہوگی اسی درجہ کی دنیاوی سختیوں اور پریشانیوں کا تمہیں سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ یہ اصول ہے کہ المرء مع من احب (یعنی جو شخص جس کو دوست رکھتا ہے اسی جیسی حالت میں رہتا ہے۔)

حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے اس ارشاد "فقر کے لئے پاکھر تیار کر لو" کے ذریعہ بطور کنایہ اس امر کی تلقین فرمائی کہ فقر و فاقہ کے وقت "صبر" کی راہ پر چلنے کے لئے تیار رہو کیونکہ یہ صبر ہی ہے جو فقر و افلاس کی آفتوں اور صعوبتوں کو برداشت کرنے کی طاقت بہم پہنچاتا ہے، دینی و دنیاوی ہلاکت و تباہی سے محفوظ رکھتا ہے، جزع و فزع اور شکوہ شکایت کی راہ سے دور رکھتا ہے اور غضب خداوندی سے بچاتا ہے حضرت شیخ آگے فرماتے ہیں کہ "اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کئے بغیر اور حضور ﷺ کے طرز حیات پر عمل پیرا ہوئے بغیر آپ ﷺ کی محبّت کا دعوی بالکل نار وا اور جھوٹ ہے، کیونکہ حقیقت میں اسوۂ نبوی کی اتباع اور حضور ﷺ کی محبت دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور محبوب کی اتباع و پیروی کے بغیر محبت کا دعوی درست ہو ہی نہیں سکتا، ان المحب لمن یحب مطیع! تاہم واضح رہے کہ حب نبوی کا یہ سب سے اعلی مرتبہ ہے کہ کسی مسلمان کا حضور ﷺ کے اسوۂ حیات کی کامل اتباع کو اپنا شیوہ بنالینا اس بات کی علامت ہے کہ وہ حضور ﷺ کے تئیں دعوئ محبت میں بالکل سچا اور درجۂ کمال کا حامل ہے! اگرچہ "محبت" کی حقیقت و ماہیت یہ ہے کہ انسان کا کسی کی طرف اندر سے کھنچنا، اور اس کے دل کا اس (محبوب) کی خوبیوں، اس کی ذات و صفات کی تحسین اور اس کی شکل و صورت اور عادات و اطوار کی تعریف و توصیف سے معمور ہو جانا کہ وہ اپنے محبوب کو سب سے اچھا دیکھنے اور سب سے اچھا جاننے لگے! مگر جیسا کہ پہلے بتایا گیا تکمیل محبّت کا انحصار، محبوب کی کامل اتباع اور پیروی پر ہے، اگر باطنی تعلق و محبّت کے ساتھ عمل و اتباع کی دولت بھی نصیب ہو تو اصل اور کامل محبّت وہی کہلائے گی ورنہ

محض دل میں محبت کا ہونا اور زبان سے اس کا اعتراف اقرار بھی کرنا، مگر عمل و اتباع کی راہ میں غفلت و کوتاہی کا شکار ہونا، محبت کے ناقص ہونے کی دلیل ہے، جیسا کہ عمل کے بغیر ایمان، درجۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔

دعوت اسلام کی راہ میں حضور ﷺ کو پیش آنے والے فقر و فاقہ اور آفات و آلام کا ذکر

(۲۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَقَدْ اُخِفْتُ فِی اللّٰہِ وَمَا یُخَافُ اَحَدٌ وَلَقَدْ اُوْذِیْتُ فِی اللّٰہِ وَمَا یُؤْذٰی اَحَدٌ وَلَقَدْ اَتَتْ عَلَیَّ ثَلٰثُوْنَ مِنْ بَیْنِ لَیْلَۃٍ وَیَوْمٍ وَمَالِیْ وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ یَاکُلُہٗ ذُوْکَبِدٍ اِلَّا شَیْءٌ یُوَارِیْہِ اِبْطُ بِلَالٍ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ مَعْنٰی ھٰذَا الْحَدِیْثِ حِیْنَ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَارِبًا مِنْ مَکَّۃَ وَمَعَہٗ بِلَالٌ اِنَّمَا کَانَ مَعَ بِلَالٍ مِنَ الطَّعَامِ مَا یَحْمِلُ تَحْتَ اِبْطِہٖ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" خدا (کے دین کو ظاہر کرنے اور اس کی طرف لوگوں کو بلانے) کی راہ میں جس قدر مجھ کو خوف و دہشت میں مبتلا کیا گیا اس قدر کسی اور کو خوف و دہشت میں مبتلا نہیں کیا گیا، اور خدا (کے دین) کی راہ میں جتنی ایذاء رسانیوں سے میں دوچار ہوا ہوں اتنی ایذاء رسانیوں سے کوئی اور دوچار نہیں ہوا ہے (یعنی ابتداء میں جب میں نے اسلام کی دعوت پیش کی اور خدا کی وحدانیت اور اپنی رسالت کا اظہار و اعلان کیا تو اس وقت میں بالکل تنہا تھا، کوئی اور شخص میرے ساتھ نہیں تھا، چنانچہ اس راہ میں پیش آنے والے تمام تر مصائب و آلام اور ہر طرح کی دہشت انگیزی کو برداشت کرنے والا واحد شخص میں تھا) بلاشبہ مجھ پر متواتر تیس دن اور تیس راتیں ایسی گزری ہیں جن میں میرے اور بلالؓ کے لئے کھانے پینے کا ایسا کوئی سامان نہیں تھا جس کو کوئی جگر دار (یعنی حیوان) کھاتا ہے (یعنی ان دنوں میں ہم دونوں کے پاس کھانے کی ان چیزوں میں سے بھی کوئی چیز نہیں تھی جن کو جانور کھاتے ہیں، چہ جائیکہ آدمیوں کے کھانے پینے کی کوئی چیز ہوتی) علاوہ اس نہایت معمولی سی چیز کے جس کو بلالؓ اپنی بغل میں چھپائے رہتے تھے اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو انسان اپنی بغل میں دبالے اس کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے خاص طور پر اس صورت میں جب کہ باہر سے یہ نظر بھی نہ آئے کہ بغل میں کیا چیز ہے۔" "ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث میں حضور ﷺ نے جو صورت حال بیان فرمائی ہے اس کا تعلق اس وقت سے ہے جب حضور ﷺ مکہ سے نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ حضرت بلالؓ تھے، نیز حضرت بلالؓ کے پاس کھانے کی چیزوں میں سے صرف اتنا تھا جس کو وہ اپنی بغل میں دبائے رہتے تھے۔"

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں کی وضاحت طیبیؒ نے وہی کی ہے جو ترجمہ میں (بین القوسین) نقل کی گئی ہے، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "اس قدر کسی اور خوف و دہشت میں مبتلا نہیں کیا گیا۔ اور اتنی زیادہ ایذاء رسانیوں سے کوئی اور دوچار نہیں ہوا " سے حضور ﷺ کی مراد یہ تھی کہ خدا کا دین پہنچانے کی راہ میں جس قدر خوف و دہشت میں مجھے مبتلا کیا گیا ہے اور جس قدر اذیتیں اور تکلیفیں میں نے برداشت کی ہیں اس قدر خوف و دہشت میں کسی اور نبی اور رسول کو مبتلا نہیں کیا اور نہ اس قدر اذیتیں اور تکلیفیں کسی اور نبی اور رسول نے برداشت کی ہیں! اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ مِثْلَ مَا اُوْذِیْتُ (یعنی جتنی زیادہ ایذاء مجھے پہنچائی گئی ہے اتنی زیادہ کسی اور نبی کو نہیں پہنچائی گئی) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل خدا کے دین کی راہ میں ایذاء اور تکلیف کا پہنچانا ہر شخص کی ہمت و حیثیت اور مرتبہ کے مطابق ہوتا ہے، چونکہ سرکار دو عالم ﷺ کی ہمت و حیثیت سب سے زیادہ بلند تھی، آپ ﷺ کا مرتبہ سب سے اونچا تھا آپ ﷺ کی صداقت و حقانیت سب سے زیادہ واضح تھی، اور ایمان کو پھیلانے اور لوگوں کو راہ راست پر لانے کی تمنا و خواہش اور اس کے تئیں سعی و تڑپ سب سے زیادہ آپ ﷺ میں تھی اس لئے اس راہ میں سب سے زیادہ ایذاء رسانی اور مصائب کا سامنا بھی آپ ہی کو کرنا پڑا۔ وَلَقَدْ اَتَتْ عَلَیَّ الخ سے حضور ﷺ نے اپنے فقر و فاقہ کے انتہائی شدید و سخت دنوں کا ذکر جس انداز میں فرمایا اس سے ایک تو ان سخت مصائب و آلام کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا جن سے آپ ﷺ کو دعوت

سلام کی راہ میں دوچار ہونا پڑا اور ظاہر ہے کہ فقروفاقہ سے زیادہ سخت اور کوئی مشقت نہیں ہوسکتی، اور دوسرے اصل مقصد اُمت کے لوگوں کو تعلیم وتلقین تھا کہ خدا کے دین کی راہ میں اگر بڑی سے بڑی صعوبت بھی برداشت کرنا پڑے تو اس کو بطیب خاطر انگیز کیا جائے اور بہر صورت راہ استقامت پر گامزن رہا جائے۔

امام ترمذیؒ نے جو یہ کہا ہے کہ "اور اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ حضرت بلالؓ تھے۔" اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضور کی بیان فرمودہ صورت حال کا تعلق اس وقت سے نہیں جب کہ آپ ﷺ نے مکہ سے مدینہ کے لئے ہجرت فرمائی تھی کیونکہ اس وقت حضور ﷺ کے ساتھ حضرت بلالؓ نہیں تھے۔ بلکہ یہ واقعہ غالباً اس وقت کا ہے جب آپ ابتدائے اسلام میں مکہ سے طائف تشریف لے گئے تھے! چنانچہ نبوت کا دسواں سال تھا اور شوال کا مہینہ کہ آپ کے چچا ابو طالب کی وفات ہوگئی، اور پھر تین ہی دن بعد یا پانچ دن کے بعد اُم المؤمنین حضرت خدیجہؓ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں، یہ دونوں سانحے حضور ﷺ کے لئے نہایت سخت تھے اسی لئے آپ ﷺ نے اس سال کو عام الحزن یعنی "غم کا سال" فرمایا! قریش مکہ جو پہلے ہی آپ ﷺ کو طرح طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنا رہے تھے، اب ان دونوں، ہستیوں خصوصا ابو طالب کی وفات کے بعد ان کو اپنی جابرانہ کاروائیوں کا موقع مل گیا، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کے ایذا رسانی میں بڑی شدت پیدا کردی، ادھر جب آپ ﷺ کو اہل مکہ کے قبول اسلام سے مایوسی کی صورت پیدا ہونے لگی تو اسی سال یعنی ۱۰ نبوی، آخر ماہ شوال میں آپ حضرت زید ابن حارثہؓ کو ساتھ لے کر پیادہ پا مکہ سے طائف تشریف لے گئے، اور اہل طائف کو کلمۂ حق کی طرف دعوت دی، اور متواتر ایک ماہ تک ان کی تبلیغ وہدایت میں مصروف رہے، مگر انہوں نے آپ کی ایک بات نہیں سنی اور کسی ایک شخص کو بھی قبول حق کی توفیق نہیں ہوئی، بلکہ ظالموں نے اپنے بچوں اور اوباش لوگوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگادیا کہ جس قدر ہوسکے آپ ﷺ کو ایذاء پہنچائیں، چنانچہ ان بدبختوں نے آپ پر پتھر برسانے شروع کئے جس سے سردار دوعالم ﷺ کے قدم شریف زخمی ہوجاتے تھے اور اتنا خون بہتا تھا کہ آپ کے نعلین مبارک اس سے بھر جاتے تھے، جب آپ ﷺ پتھر کے زخموں سے چور ہو کر پڑتے تھے تو وہ لوگ آپ ﷺ کے دونوں بازو پکڑ کر کھڑا کردیتے تھے اور آپ ﷺ آگے چلتے تو پھر پتھراؤ شروع کردیتے تھے، اور خوش ہو ہو کر تالیاں بجاتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ حضرت زید ابن حارثہؓ جس طرف سے پتھر آتا ہوا دیکھتے اس طرف خود کھڑے ہو کر آنحضرت ﷺ کو بچاتے اور پتھر کو اپنے سر پر لیتے تھے یہاں تک کہ حضرت زیدؓ کا سر بھی پتھروں کے زخم سے چور چور ہوگیا۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا جو آپ ﷺ پر سایہ فگن ہوگیا اور پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایک اور فرشتے کے ساتھ حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ کے پروردگار نے آپ (ﷺ) کی قوم کی ساری باتیں سنیں اور آپ (ﷺ) کے ساتھ جو کچھ سلوک کیا ہے اس کو دیکھا، میرے ساتھ یہ وہ فرشتہ ہے جس کے سپرد پہاڑوں کی خدمت ہے، اللہ پاک کا اس کو حکم ہے کہ اگر آپ (ﷺ) فرمائیں تو طائف کے گرد کی دونوں پہاڑیاں باہم ٹکرادی جائیں۔ اور ان دونوں کے درمیان اہل طائف کو اس طرح دل دیا جائے جس طرح چکی کے دوپاٹوں میں دانہ دل جاتا ہے۔"

رحمت عالم ﷺ کسی انتقامی کاروائی کی اجازت دے دیتے، یہ کیسے ممکن تھا؟ چنانچہ آپ ﷺ نے اس امر کی اجازت نہیں دی اور بارگاہ رب العزت میں یوں گویا ہوئے، "ارحم الراحمین! تو نے مجھ کو سخت دل اور انتقام کا خوگر نہیں بنایا، میں لوگوں پر تیرے عذاب نازل کرانے نہیں آیا ہوں، مجھے اپنی قوم کے ہلاک وتباہ ہونے کا سبب نہ بنا، اگر یہ نیست ونابود ہوگئے تو اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا، ہاں اگر یہ زندہ رہے تو امید ہے کہ شاید ان کی نسلوں میں سے وہ لوگ پیدا ہوں جو تیری وحدانیت کے ساتھ پرستش کریں، اور تیرے دین کا جھنڈہ بلند کریں! پروردگار! یہ میرے مرتبہ سے ناواقف ہیں، ان کی آنکھوں پر جہل ونادانی کی پٹی بندی ہوئی ہے، اگر تو ان کو وہ بینائی عطا فرمادے جس سے یہ میری شان پیغمبری دیکھ لیں تو امید ہے کہ ایمان سے مشرف ہوجائیں۔"

بالآخر رحمت عالم ﷺ ایک ماہ بعد طائف سے اس طرح واپس ہوئے کہ فقروفاقہ کے تعب اور ایذار سانیوں کے زخم سے جسم نڈھال تھا اور آپ ﷺ کے ٹخنے شریف لہو لہان تھے، مگر زبان پر حرف بددعا کے بجائے دعائے ہدایت کے الفاظ تھے۔

سفر طائف کا یہ پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ و سیر کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، یہاں اس کا ذکر اجمالی طور پر کیا گیا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ روایت کے آخر میں اس طرف اشارہ ہے! رہی یہ بات کہ حدیث میں اس موقع پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ حضرت بلالؓ کا ہونا مذکور ہے، جب کہ مذکورہ بالا واقع میں حضرت زید ابن حارثہؓ کا ذکر ہے تو ان دونوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں کیونکہ اغلب ہے کہ حضرت بلالؓ اور حضرت زید ابن حارثہؓ دونوں ہی آپ ﷺ کے ساتھ رہے ہوں گے، تاہم تاریخ و سیر کی کتابوں میں اس موقعہ پر حضرت زید ابن حارثہؓ کا ہی ہونا ذکر کیا جاتا ہے۔

حضور ﷺ اور صحابہؓ کے فقر و افلاس کا حال

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ قَالَ شَكَوْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجُوْعَ فَرَفَعْنَا عَنْ بُطُوْنِنَا عَنْ حَجَرٍ حَجَرٍ فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَطْنِهٖ عَنْ حَجَرَيْنِ - رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول کریم ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا دکھایا، (یعنی ہم میں سے ہر شخص نے بھوک کی شدت سے بیتاب ہو کہ اپنے پیٹ پر ایک ایک پتھر باندھ رکھا تھا جس کو ہم نے اپنا پیٹ کھول کر حضور کو دکھایا) تب حضور ﷺ نے اپنا پیٹ کھولکر دکھایا تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: جب بھوک کی شدت ہوتی ہے اور پیٹ بالکل خالی ہوتا ہے تو اس صورت میں پیٹ پر پتھر باندھ لینا پیٹ و معدہ اور آنتوں کو اس حد تک تقویت پہنچا دیتا ہے کہ آدمی اپنا کام کاج کرنے، اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے پر تھوڑا بہت قادر ہو جاتا ہے، اور جب بھوک کی شدت اور زیادہ ہو جاتی ہے اور ایک پتھر سے بھی کام نہیں چلتا تو پھر دو پتھر باندھنے پڑتے ہیں، چنانچہ حضور ﷺ پر بھوک کی شدت زیادہ طاری تھی اور ویسے بھی آپ ﷺ زیادہ محنت و ریاضت کے عادی تھے اس لئے آپ نے اپنے شکم مبارک پر دو پتھر باندھ رکھے تھے۔

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ اَصَابَهُمْ جُوْعٌ فَاَعْطَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَمْرَةً تَمْرَةً۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب فقراء صحابہ کو بھوک کی شدت نے پریشان کیا تو رسول کریم ﷺ نے ان (میں سے ہر ایک) کو ایک کھجور عطا فرمائی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے حضرت ابوہریرہؓ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ان صحابہؓ پر فقر و افلاس اور کھانے پینے کی تنگی کا اتنا زیادہ غلبہ تھا کہ بسا اوقات انہیں ایک ایک کھجور پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

صابر و شاکر کون ہے؟

(۲۵) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا مَنْ نَظَرَ فِیْ دِيْنِهٖ اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاقْتَدٰی بِهٖ وَنَظَرَ فِیْ دُنْيَاهُ اِلٰی مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ فَحَمِدَ اللّٰهَ عَلٰی مَا فَضَّلَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا وَمَنْ نَظَرَ فِیْ دِيْنِهٖ اِلٰی مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ وَنَظَرَ فِیْ دُنْيَاهُ اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاَسِفَ عَلٰی مَا فَاتَهٗ مِنْهُ لَمْ يَكْتُبْهُ اللّٰهُ شَاكِرًا وَّلَا صَابِرًا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِیْ سَعِيْدٍ اَبْشِرُوْا يَا مَعْشَرَ صَعَالِيْكِ الْمُهَاجِرِيْنَ بِالنُّوْرِ التَّامِّ فِیْ بَابِ بَعْدَ فَضَائِلِ الْقُرْاٰنِ۔

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" دو خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں پائی جاتی ہیں اس کو اللہ تعالیٰ شاکر و صابر قرار دیتا ہے، ایک یہ کہ جب وہ شخص دینی معاملہ (یعنی اچھے اعمال وغیرہ) میں ایسے

آدمی کو دیکھے جو (علم و عمل، طاعات و عبادات، قناعت و استقامت اور ریاضت و مجاہدہ کے اعتبار سے) اس سے برتر ہو تو اس کی اقتدا کرے (یعنی اس میں دینی برتری و فضیلت سے اس طرح فیضان حاصل کرے کہ خود بھی علم و عمل کی راہ پر چلے، طاعات و عبادات کی محنت و مشقت اور برائیوں سے اجتناب پر صبر و استقامت اختیار کرے اور جو دینی و باطنی کمالات پہلے فوت ہو چکے ہیں ان پر تأسف کرے) اور دوسرے یہ کہ جب اپنی دنیا کے معاملہ میں اس آدمی کو دیکھے جو (مال و دولت اور جاہ و منصب کے اعتبار سے) اس سے کم تر ہو، تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور اس کا شکر ادا کرے کہ اس نے اس آدمی پر اس کو فضیلت و برتری بخشی ہے پس اللہ تعالیٰ اس شخص کو "صابر و شاکر" قرار دیتا ہے (یعنی شاکر تو اس لئے کہ اس نے دنیاوی اعتبار سے اپنے سے کمتر کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور "صابر" اس لئے کہ اس نے دینی اعتبار سے اپنے سے برتر شخص کو دیکھ کر اس سے رہنمائی اور فیضان حاصل کیا) اور جو شخص ایسا ہو کہ جب وہ کسی ایسے شخص کو دیکھے جو اس کے دینی (یعنی اعمال صالحہ وغیرہ) کے اعتبار سے اس سے کمتر درجہ کا ہو (تو اس کے تئیں عجب و غرور اور تکبر میں مبتلا ہو جائے) اور جب کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اس کی دنیا (یعنی جاہ و مال) کے اعتبار سے اس سے برتر ہو تو (اس کے تئیں رشک و حسد اور حرص و خواہش میں مبتلا ہو جائے اور) اس چیز (یعنی جاہ و مال) پر رنج و غم کرے جس سے وہ محروم ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ نہ "شاکر" قرار دیتا ہے اور نہ "صابر" (ترمذی)

اور حضرت ابو سعیدؓ کی روایت ابشروا یا معشر صعالیک، المہاجرین الخ اس باب میں نقل کی جا چکی ہے، جو فضائل قرآن کے باب کے بعد ہے۔

تشریح: موخر الذکر شخص کو نہ تو شاکر اور نہ صابر قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ جن دو خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی ایک صفت کو بھی اس نے اختیار نہیں کیا، بلکہ اس کے برخلاف اس نے خدا کی ناشکری کی اور زبان اور دل دونوں سے جزع و فزع اور شکوہ شکایت کا مرتکب ہوا۔

حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص کو صابر اور شاکر قرار دیتا ہے۔" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو کامل مؤمن بنا دیتا ہے۔ چنانچہ اس آیت اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ "صابر و شاکر" کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے جو کامل مؤمن ہو، نیز ایک حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے کہ ایمان کے دو نصف ہیں، اس کا ایک نصف "صبر" ہے اور ایک نصف "شکر" ہے گویا اپنے آپ کو برائیوں سے روکنا "صبر" سے تعبیر ہے اور اعضاء ظاہری کے ذریعہ طاعات کی بجا آوری "شکر" کے مفہوم میں ہے اور ظاہر ہے کہ جس بندے کی زندگی ان دونوں اجزاء تکمیل سے معمور ہو وہ "کامل مؤمن" ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

فقر پر صبر کرنے کی فضیلت

(۲۶) عَنْ اَبِیْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْحُبُلِیِّ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو وَسَأَلَهٗ رَجُلٌ قَالَ اَلَسْنَا مِنْ فُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ فَقَالَ لَهٗ عَبْدُاللّٰهِ اَلَكَ امْرَأَةٌ تَاْوِیْ اِلَيْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ اَلَكَ مَسْكَنٌ تَسْكُنُهٗ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاَنْتَ مِنَ الْاَغْنِيَاءِ قَالَ فَاِنَّ لِیْ خَادِمًا قَالَ فَاَنْتَ مِنَ الْمُلُوْكِ قَالَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ وَجَآءَ ثَلٰثَةُ نَفَرٍ اِلٰی عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَاَنَا عِنْدَهٗ فَقَالُوْا يَا اَبَا مُحَمَّدٍ اِنَّا وَاللّٰهِ مَا نَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ لَا نَفَقَةٍ وَلَا دَابَّةٍ وَلَا مَتَاعٍ فَقَالَ لَهُمْ مَا شِئْتُمْ اِنْ شِئْتُمْ رَجَعْتُمْ اِلَيْنَا فَاَعْطَيْنٰكُمْ مَا يَسَّرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِنْ شِئْتُمْ ذَكَرْنَا اَمْرَكُمْ لِلسُّلْطَانِ وَاِنْ شِئْتُمْ صَبَرْتُمْ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ فُقَرَآءَ الْمُهَاجِرِيْنَ يَسْبِقُوْنَ الْاَغْنِيَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلَی الْجَنَّةِ بِاَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا قَالُوْا فَاِنَّا نَصْبِرُ لَا نَسْاَلُ شَيْئًا۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابو عبدالرحمٰن جبلیؒ (جن کا اصل نام عبداللہ بن زید مصری ہے اور جن کا شمار ثقہ تابعین میں ہوتا ہے) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ کو فرماتے ہوئے سنا، جب کہ ایک شخص نے ان سے سوال کیا اور کہا کہ کیا ہم ان فقراء مہاجرین میں سے نہیں

ہیں جن کے بارہ میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ وہ دولتمندوں سے پہلے جنّت میں داخل ہوں گے؟) حضرت عبداللہ نے (یہ سن کر) اس شخص سے پوچھا کہ کیا تم بیوی والے ہو کہ جس کے پاس تمہیں سکون و قرار ملتا ہو؟" اس شخص نے کہا کہ ہاں! پھر حضرت عبداللہ نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس مکان ہے جس میں تم رہائش اختیار کرو؟ اس شخص نے کہا کہ ہاں مکان بھی ہے! حضرت عبداللہ نے فرمایا۔ تو پھر تم دولتمندوں میں سے ہو (یعنی تم ان مہاجرین کی حیثیت کے آدمی ہو جو فقر و افلاس میں مبتلا نہیں تھے، فقراء مہاجرین میں تمہارا شمار نہیں ہو سکتا کیونکہ ان فقراء کے پاس نہ بیوی تھی نہ گھربار تھا، یا اگر کسی کے پاس اس دونوں میں سے کوئی ایک چیز تھی تو دوسری چیز سے محروم تھا) اس شخص نے (جب یہ سنا کہ حضرت عبداللہ نے بیوی اور گھروالا ہونے کی وجہ سے اسے گویا دولتمند کہا ہے تو) کہا کہ میرے پاس ایک خادم بھی ہے (یعنی غلام یا لونڈی) حضرت عبداللہ نے فرمایا تب تو تم بادشاہوں میں سے ہو (یعنی اس صورت میں تو تمہارا شمار رئیسوں اور بادشاہوں میں ہونا چاہئے، تمہیں فقیر و مفلس کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔"

حضرت ابوعبدالرحمٰن (راوی) نے یہ بھی بیان کیا کہ (ایک دن) حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کے پاس تین آدمی آئے، اس وقت میں بھی ان کی خدمت میں حاضر تھا، ان تینوں نے کہا۔ "ابو محمد! بخدا ہم کسی چیز کی استطاعت نہیں رکھتے، نہ تو خرچ کرنے کی (کہ حج کو جا سکیں) نہ کسی جانور کی (کہ جہاد میں شریک ہو سکیں) اور نہ کسی دوسرے سامان کی (کہ جس کو فروخت کر کے اپنے ضروری مصارف پورا کر سکیں) حضرت عبداللہ نے (ان کی بات سن کر) فرمایا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اگر تمہاری (یہ) خواہش ہے کہ (میں تمہارے ساتھ معاونت کروں اور تمہیں اپنے پاس سے کچھ دوں) تو تم لوگ پھر کسی وقت آنا، میں تمہیں وہ چیز دوں گا جس کا خدا تمہارے لئے انتظام کر دے گا (کیونکہ تمہیں دینے کے لئے اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے) اور اگر تم چاہو تو میں تمہاری حالت بادشاہ (امیر معاویہؓ) سے بیان کر دوں (تمہیں اپنی عطاء سے فارغ البال کر دیں گے) اور (سب سے بہتر بات یہ ہے کہ) اگر تم (اہل کمال کا رتبہ حاصل کرنا) چاہو تو صبر کرو (یعنی اپنی اسی حالت فقر و افلاس پر استقامت اختیار کرو) کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ فقراء مہاجرین قیامت کے دن جنّت میں دولتمندوں سے چالیس سال پہلے جائیں گے۔" ان تینوں نے (یہ حدیث سنی تو) کہا کہ "بے شک ہم صبر و استقامت ہی کی راہ اختیار (کرنے کا عہد) کرتے ہیں، اب (ہم آپ سے) کچھ نہیں مانگتے (یا یہ کہ اب آئندہ ہم کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے۔" (مسلم)

فقراء مہاجرین کی فضیلت

(۲۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ بَيْنَا اَنَا قَاعِدٌ فِی الْمَسْجِدِ وَحَلْقَةٌ مِنْ فُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ قُعُوْدٌ اِذْ دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَعَدَ اِلَيْهِمْ فَقُمْتُ اِلَيْهِمْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُبَشَّرْ فُقَرَآءَ الْمُهَاجِرِيْنَ بِمَا يَسُرُّ وُجُوْهَهُمْ فَاِنَّهُمْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْاَغْنِيَآءِ بِاَرْبَعِيْنَ عَامًا قَالَ فَلَقَدْ رَاَيْتُ اَلْوَانَهُمْ اَسْفَرَتْ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو حَتّٰى تَمَنَّيْتُ اَنْ اَكُوْنَ مَعَهُمْ اَوْ مِنْهُمْ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو کہتے ہیں کہ ہم لوگ مسجد (نبوی ﷺ) میں بیٹھے ہوئے تھے اور فقراء مہاجرین کا حلقہ جما ہوا تھا کہ اچانک نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے اور فقراء کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور (حضور ﷺ کی اتباع میں) فقراء کے قریب پہنچ کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا (تاکہ آنحضرت ﷺ ان سے جو کچھ فرمائیں، ان ملفوظات کو میں بھی سن سکوں) چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "فقراء مہاجرین کو وہ بشارت" پہنچا دینی ضروری ہے جو ان کو مسرور و شادماں بنا دے، پس (وہ بشارت یہ ہے کہ) فقراء مہاجرین جنّت میں دولتمندوں سے چالیس سال پہلے داخل ہوں گے۔" حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ، بخدا میں نے دیکھا کہ (یہ بشارت سن کر) فقراء (کے چہروں) کا رنگ روشن و تاباں ہو گیا۔ پھر حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ یہ بشارت سن کر اور فقراء کے چہروں کی تابانی و شگفتگی) دیکھ کر میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ (کاش) میں بھی ان ہی جیسا ہوتا (یعنی اس دنیا میں مجھ پر بھی فقر و افلاس طاری ہوتا اور میں اس جماعت

فقراء میں شمار ہوتا) یا یہ کہ ان میں سے ہوتا (یعنی آخرت میں اس جماعت کے ساتھ اٹھتا اور انہی کے ساتھ میرا حشر ہوتا۔" (دارمیؒ)

تشریح: بِمَا یَسرُّوُ جُوْھَھُمْ میں لفظ "وجوہ" سے مراد یا توذات ہے یا جیسا کہ ترجمہ میں اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے یا یہ لفظ اپنے اصل معنی "چہرے" کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ (فقراء مہاجرین کو بشارت پہنچادینی ضروری ہے) جو ان کے دلوں کو خوش کردے اور اس خوشی کا اثر ان کے چہروں پر ظاہر و نمایاں ہو۔

اکون معھم او منھم میں حرف اَوْ تنویع کے لئے ہے اور اسی کے مطابق کا مطلب بھی بین القوسین بیان کر دیا گیا ہے یا یہ کہ یہ صرف راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عبداللہ نے یا تو ان اکون معھم فرمایا یا یہ کہ ان اکون منھم یعنی میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش) میں بھی فقراء مہاجرین میں سے ایک ہوتا۔

وہ باتیں جو خزانہ الٰہی میں سے ہیں

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اَمَرَنِیْ خَلِیْلِیْ بِسَبْعٍ اَمَرَنِیْ بِحُبِّ الْمَسَاکِیْنِ وَالدُّنُوِّ مِنْھُمْ وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَنْظُرَ اِلٰی مَنْ ھُوَ دُوْنِیْ وَلَا اَنْظُرَ اِلٰی مَنْ ھُوَ فَوْقِیْ وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَصِلَ الرَّحِمَ وَاِنْ اَدْبَرَتْ وَاَمَرَنِیْ اَنْ لَا اَسْئَلَ اَحَدًا شَیْئًا وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَقُوْلَ بِالْحَقِّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا وَاَمَرَنِیْ اَنْ لَا اَخَافَ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ وَاَمَرَنِیْ اَنْ اُکْثِرَ مِنْ قَوْلِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ فَاِنَّھُنَّ مِنْ کَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میرے خلیل (نبی کریم ﷺ) نے مجھ کو سات باتوں کا حکم دیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک حکم تو یہ دیا کہ میں فقراء و مساکین سے محبت کروں اور ان سے قربت رکھوں۔ دوسرا حکم یہ کہ میں اس شخص کی طرف دیکھوں جو (دنیاوی اعتبار سے) مجھ سے کمتر درجہ کا ہے اور اس شخص کی طرف نہ دیکھوں جو (جاہ و مال اور منصب میں مجھ سے بالاتر ہے، تیسرا حکم یہ دیا کہ میں کسی قرابتداروں سے ناتے داری کو قائم رکھوں اگرچہ کوئی (قرابت دار) ناتے داری کو منقطع کرے، چوتھا حکم یہ دیا کہ میں کسی شخص سے کوئی چیز نہ مانگوں، پانچواں حکم یہ دیا کہ میں (ہر حالت میں) حق بات کہوں اگرچہ وہ (سننے والے کو) تلخ اور غیر خوش آئند معلوم ہو، چھٹا حکم یہ دیا کہ میں خدا کے دین کے معاملہ میں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں ملامت کرنے والے کی کسی ملامت سے نہ ڈروں اور ساتواں حکم یہ دیا کہ میں کثرت کے ساتھ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد رکھوں (پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ) پس یہ ساتوں باتیں اور عادتیں اس خزانہ میں کی ہیں جو عرش الٰہی کے نیچے ہے (اور جس سے فیوض و برکات نازل ہوتے ہیں۔" (احمدؒ)

تشریح: فَاِنَّھُنَّ کی ضمیر حضرت شیخ عبدالحقؒ نے تو مذکورہ ساتوں باتوں کی طرف راجع کی ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہوا لیکن ملا علی قاریؒ نے اس ضمیر کا مرجع صرف آخری بات یعنی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ الفاظ (یعنی لاحول الخ) دراصل اس گنج معنوی کا ایک حصہ ہیں جو عرش الٰہی کے نیچے محفوظ رکھا گیا ہے اور گنج معنوی تک اس شخص کے علاوہ اور کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی جس کو خدا کی طرف سے حول و قوۃ یعنی قدرت و طاقت حاصل ہو۔ یا یہ معنی ہیں کہ یہ الفاظ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہیں۔ اس صورت میں "عرش الٰہی کے نیچے" کا مفہوم بھی بالکل واضح ہو گا کیونکہ عرش الٰہی، بالائے جنت ہے، نیز ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ "جن شارحین نے اِنَّھُنَّ کی ضمیر مذکورہ ساتوں باتوں کی طرف راجع کرتے ہوئے) یہ کہا ہے کہ "یہ ساتوں باتیں اور عادتیں اس خزانہ میں کی ہیں جو عرش الٰہی کے نیچے ہے۔" ایک ایسا قول ہے جو حقیقت سے بعید ہے کیونکہ اس قول کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے جب کہ (انہن) کی ضمیر کو صرف آخری بات یعنی لاحول الخ کی طرف راجع کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے) کہ صحاح ستہ اور دیگر مسند کتابوں میں کثیر طرق سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ رہی یہ بات کہ ان الفاظ کو جنت کا خزانہ کس اعتبار سے فرمایا گیا ہے تو اس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ بعض حضرات نے

یہ کہا ہے کہ ان الفاظ کو خزانہ اس لئے کہا گیا ہے کہ جس طرح خزانہ، عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح یہ الفاظ اپنی حقیقت و رفعت اور نفاست و پاکیزگی کے اعتبار سے لوگوں کی نظروں سے محفوظ ہیں۔ یا ان الفاظ کو اس لئے خزانہ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ جنت کے ذخائر میں سے ایک ذخیرہ ہیں۔ اور یا یہ کہ جو شخص ان الفاظ کا ورد رکھتا ہے اس کے لئے نہایت اعلیٰ مرتبہ کا اجر و ثواب جنت میں محفوظ کر دیا جاتا ہے، اس اعتبار سے یہ الفاظ گویا جنت کا ایک خزانہ ہیں۔ حضرت مسعودؓ ایک روایت میں بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے آنحضرت کے سامنے یہ کلمہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھا تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم ان الفاظ کا حقیقی مفہوم بھی جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جان سکتے ہیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا (ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ) "اللہ کی نافرمانی اور گناہوں سے پھرنا اور بچنا صرف اللہ تعالیٰ کی مدد پر منحصر ہے اور اللہ کی طاعت و عبادات پر قادر ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جانے والی قدرت و طاقت پر منحصر ہے۔

مشائخ شاذلیہ قدس اللہ اسرارہم نے طالبان حق اور رہروان طریقت و معرفت کو ان الفاظ "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" کے ورد کی بہت وصیت کی ہے اور فرمایا ہے کہ توفیق عمل کی راہ میں اس سے زیادہ معین و مددگار اور کوئی چیز نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کی مرغوب دنیاوی چیزیں

(۲۹) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهٗ مِنَ الدُّنْيَا ثَلٰثَةٌ اَلطَّعَامُ وَالنِّسَآءُ وَالطِّيْبُ فَاَصَابَ اثْنَتَيْنِ وَلَمْ يُصِبْ وَاحِدًا اَصَابَ النِّسَآءَ وَالطِّيْبَ وَلَمْ يُصِبِ الطَّعَامَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں رسول کریم ﷺ کی نظر میں نہایت پسندیدہ تھیں ایک تو کھانا (کہ جس کے ذریعہ جسم و بدن کو محفوظ و توانا رکھ کر دینی خدمات پر قدرت و طاقت حاصل کی جا سکے) دوسرے عورتیں (کہ جن کے ذریعہ نفس کو برے خیالات سے محفوظ رکھا جا سکے)، اور تیسرے خوشبو (کہ جس کے ذریعہ دماغ کو نشاط و تقویت حاصل ہو، کیونکہ حکماء کے قول کے مطابق عقل و فراست کا مخزن دماغ ہی ہے) چنانچہ ان تینوں چیزوں میں سے دو چیزیں تو حضور ﷺ کو (کثرت کے ساتھ) حاصل ہوئیں اور ایک چیز (زیادہ) حاصل نہیں ہوئی یعنی ایک تو عورتیں آپ کو زیادہ ملیں (بایں طور کہ آپ نے نو شادیاں کیں) اور دوسرے (خارجی طور پر) خوشبو آپ کو بہت ملی (باوجودیکہ آپ ﷺ کا پسینہ مبارک ہی تمام طرح کی خوشبو سے زیادہ معطر اور خوشگوار تھا، لیکن تیسری چیز کھانا، آپ ﷺ کو (زیادہ) نہیں ملا۔" (احمدؒ)

تشریح: "کھانے" پر نفی کا اطلاق بطور مبالغہ ہے، کہ آپ ﷺ کی غذائی ضروریات جس تنگی و قلت کے ساتھ پوری ہوتی تھیں اور جتنا کم کھانا آپ ﷺ کو نصیب ہوتا تھا اس کی بناء پر اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ کھانا، نہ ملنے ہی کے برابر تھا، چنانچہ پہلے یہ روایت گزر چکی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ تا وفات ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے مسلسل دو دن جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر کھائی ہو، اگرچہ کھانے کی یہ تنگی و قلت خود حضور ﷺ کی اختیار کردہ تھی کہ آپ ﷺ نے اپنے لئے تنگی معیشت اور فقر و غربت کی زندگی کو ترجیح دی تھی اور حق تعالیٰ نے اپنے حبیب کے لئے جو اس بات کو پسند کیا تو اس میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ تھیں۔

(۳۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُبِّبَ اِلَيَّ الطِّيْبُ وَالنِّسَآءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ ابْنُ الْجَوْزِيْ بَعْدَ قَوْلِهٖ حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خوشبو اور عورتیں میرے لئے پسندیدہ بنائی گئی ہیں اور میرا قلبی سکون و نشاط، نماز میں رکھا گیا ہے۔" (احمدؒ، نسائیؒ) اور ابن جوزیؒ نے اس ارشاد میں حبب الی کے بعد من الدنیا کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔"

تشریح: "میرا قلبی سکون و نشاط، نماز میں رکھا گیا ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو جو ذوق و لذت، استغراق و حضور اور راحت و سرور نماز

میں حاصل ہوتا ہے وہ کسی بھی وقت اور کسی بھی عبادت میں میسر نہیں ہوتا چنانچہ حضور ﷺ پر نماز کے تئیں اس لذت بیخودی اور اسی ذوق حضوری کے نشاط کا یہ اثر تھا کہ جونہی نماز کا وقت آتا، تو نہایت شوق کے عالم میں فرماتے ارحنا یا بلال! جلدی اٹھو اور اذان کہو، تاکہ میں نماز پڑھنے لگوں، اور دوسرے امور کی مشغولیت و فکرات سے دامن چھڑا کر مناجات حق میں مشغول ہو جاؤں۔

لفظ قُرَّۃٌ یا تو قَرَّ سے مشتق ہے جس کے معنی قرار و ثبات کے ہیں! اور چونکہ جب نگاہ کو محبوب کا دیدار نصیب ہو جاتا ہے تو نہ صرف نظر کو قرار مل جاتا ہے کہ نگاہیں پھر کسی دوسرے کو دیکھنے کی روادار نہیں ہوتیں، بلکہ دل و دماغ کو بھی راحت و اطمینان کی دولت مل جاتی ہے، جس طرح کہ محبوب کا دیدار نہ ہونے کی صورت میں نظریں پریشان اور دل بے قرار رہتا ہے، لہٰذا نگاہ و دل کے اسی قرار و سکون کو حضور ﷺ نے "قرۃ عنی" سے تعبیر فرمایا۔ یا کہ یہ لفظ قُرَّۃَ اصل میں قو سے مشتق ہے، جس کے معنی اس ٹھنڈک اور خنکی و لذت کے ہیں جو کسی عزیز ترین چیز اور محبوب کے دیدار و مشاہدہ کے سرور سے آنکھوں کو حاصل ہوتی ہے! چنانچہ جس طرح کسی دشمن اور قابل نفرت چیز کو دیکھ کر آنکھوں میں چنگاریاں سلگتی معلوم ہوتی ہیں اسی طرح اپنی کسی عزیز ترین چیز اور محبوب کو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے، اسی لئے بیٹے کو "قرۃ العین" کہا جاتا ہے۔

روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ابن جوزی نے اس حدیث کو جس طرح نقل کیا ہے اس میں شروع کا جملہ اس طرح ہے حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنیَا الطِّیبُ الخ (یعنی دنیا کی جن چیزوں کو میرے لئے پسندیدہ بنایا گیا ہے، ان میں سے ایک تو خوشبو ہے اور دوسری عورت ہے) تاہم یہ بات واضح رہے کہ حدیث کے وہ الفاظ کہ جن کو امام احمدؒ اور امام ترمذیؒ نے متفقہ طور پر نقل کیا ہے، زیادہ صحیح وہی ہیں جو اوپر متن میں نقل کئے گئے ہیں، چنانچہ طبرانیؒ نے اپنے تینوں معاجم میں، خطیب نے تاریخ بغداد میں، اور ابن عدی نے کامل میں بھی اس روایت کو انہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے، نیز حاکمؒ نے بھی اپنی مستدرک میں اسی طرح نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے البتہ ان کی روایت میں جُعِلَتْ کا لفظ نہیں ہے! ویسے نسائیؒ کی ایک روایت میں بھی من الدنیا کا لفظ ایک دوسری وجہ سے منقول ہے! ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض ناقلین حدیث کے ہاں اس روایت میں حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنیَا کے بعد "ثلث" کا جو ایک اور لفظ نقل کیا جاتا ہے، تو جیسا کہ سخاویؒ نے لکھا ہے کہ تحقیق و تفتیش کے باوجود یہ لفظ حدیث کی کسی کتاب میں اس روایت کے دوران نہیں ملتا، البتہ کتاب احیاء العلوم اور کشاف کی تفسیر سورۂ آل عمران میں یہ لفظ ضرور ملتا ہے! شیخ ابن حجرؒ اور شیخ ولی الدین عراقیؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ حدیث کی جس کتاب میں بھی یہ روایت ہے ثلث کا لفظ کہیں منقول نہیں ہے، لہٰذا یہ حدیث یہاں جن الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے اس کے مفہوم میں کوئی اشکال واقع نہیں ہوتا، اسی طرح ان دونوں لفظوں یعنی "من الدنیا" اور "ثلث" میں سے کوئی بھی ایک لفظ شامل روایت ہو تب بھی مفہوم بالکل واضح رہتا ہے، ہاں! اگر یہ دونوں لفظ ایک ساتھ شامل روایت ہوں تو اس صورت میں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ "نماز" پر "دنیاوی چیز" کا اطلاق کس طرح ہو سکتا ہے کیونکہ نماز دنیاوی امور میں سے نہیں ہے؟ لہٰذا جو ناقلین حدیث ان دونوں لفظوں کے ساتھ اس روایت کو بیان کرتے ہیں ان کی طرف سے اشکال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ "دنیا" سے حضور ﷺ کی مراد اس عالم کی حیات ہے، یعنی آپ ﷺ نے گویا یہ فرمایا کہ اس عالم میں تین چیزیں میری پسندیدہ ہیں جن میں سے، دو چیزیں تو طبعی اور دنیاوی امور سے تعلق رکھتی ہیں یعنی خوشبو اور عورت، اور تیسری چیز یعنی نماز کا تعلق دینی امور سے ہے۔

آخر میں ایک بات اور، حدیث میں "صلوٰۃ" کا لفظ تقریباً تمام علماء کے نزدیک "نماز" ہی پر محمول ہے، لیکن بعض حضرات کا قول یہ بھی ہے کہ اس حدیث میں "صلوٰۃ" کے لفظ سے نبی کریم ﷺ پر (درود و سلام، مراد ہے۔

راحت طلبی اور تن آسانی بندگان خاص کی شان کے منافی ہے

(۳۱) وَعَنْ مُعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَ بِهِ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ اِيَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ

لِيَسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب انہیں رسول کریم ﷺ نے (قاضی بنا کر) یمن بھیجا تو ان کو یہ نصیحت بھی فرمائی کہ "اپنے آپ کو راحت طلبی اور تن آسانی سے بچانا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بندگان خاص آرام و آسائش کی زندگی نہیں گذارتے۔" (احمدؒ)

تشریح: تنعم کا مفہوم ہے نفسانی خواہشات کی تکمیل میں زیادہ سے زیادہ اہتمام و انصرام کرنا، بہت زیادہ دنیاوی لذتوں اور نعمتوں کے درمیان رہنا اور کھانے پینے اور طبیعت و نفس کی مرغوبات کا حریص ہونا حاصل یہ کہ راحت طلبی و تن آسانی کی چیزوں میں پڑنا اور عیش و عشرت کی زندگی اختیار کرنا، کافر و فاجر، غافل و نادان اور جاہل لوگوں کا خاصہ ہے، بندگان خاص کو ایسی زندگی سے کیا سروکار! چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ۔

"آپ (ﷺ) ان (کافروں) کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ وہ (خوب) کھالیں اور چین اڑالیں، اور خیالی منصوبے (دنیا بھر کی آرزوئیں اور تمنائیں ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔"

اور فرمایا:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ۔

"اور جو لوگ کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جہنم ان لوگوں کا ٹھکانہ ہے۔ ایک جگہ یوں فرمایا گیا ہے وہ (کافر) لوگ اس سے قبل (دنیا میں) بڑی خوشحال اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔"

قناعت کی فضیلت

(۳۲) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَضِيَ مِنَ اللّٰهِ بِالْيَسِيْرِ مِنَ الرِّزْقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِالْقَلِيْلِ مِنَ الْعَمَلِ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص تھوڑے سے رزق پر اللہ سے راضی ہوتا ہے، (یعنی اپنی معاشی ضروریات کی قلیل مقدار پر قناعت کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس سے (طاعات و عبادات کے) تھوڑے سے عمل پر راضی ہو جاتا ہے۔"

اپنی معاشی تنگی و محتاجگی کو لوگوں پر ظاہر نہ کرنے والے کے حق میں وعدۂ خداوندی

(۳۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَاعَ اَوِ احْتَاجَ فَكَتَمَهُ النَّاسَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَنْ يَّرْزُقَهُ رِزْقَ سَنَةٍ مِنْ حَلَالٍ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص بھوکا ہو، یا (کسی چیز کا) محتاج ہو اور اپنی اس بھوک و محتاجگی کو لوگوں سے چھپائے (یعنی کھانے کی طلب میں کسی سے یہ نہ کہے کہ میں بھوکا ہوں اور نہ مدد چاہنے کے لئے کسی سے اپنی احتیاج و ضرورت کو بیان کرے) تو اللہ تعالیٰ کا یہ یقینی وعدہ ہے کہ وہ اس شخص کو حلال طریقہ پر ایک سال کا رزق پہنچائے گا۔" (ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "بھوک" سے مراد وہ بھوک ہے جس کو برداشت کرنا ممکن ہو، اور لوگوں سے اس کو چھپانا ناجائز نہ ہو، کیونکہ جو بھوک ناقابل برداشت حد تک پہنچائے اور اس کی وجہ سے ہلاکت کا خوف ہو تو ایسی بھوک کو چھپانا جائز نہیں ہے، اس لئے علماء نے تصریح کی ہے کہ

اگر کوئی شخص اس حالت میں بھوک کی وجہ سے مرا جائے کہ نہ تو اس نے کسی کے سامنے اپنی بھوک کا انحصار کر کے کھانے پینے کے لئے کچھ مانگا ہو اور نہ اس نے ایسی کوئی چیز ہی کھائی ہو جس سے زندگی بچائی جا سکتی تھی، اور بحالت مجبوری جس چیز کے کھانے کی اجازت شریعت نے دی ہے کہ خواہ وہ مردار ہی کیوں نہ ہو تو اس شخص کی موت گنہگار کی موت ہوگی۔

اللہ کے نزدیک کون مسلمان پسندیدہ ہے؟

(۳۴) وَعَنْ عِمْرَانَ ابْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِيَالِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ اس مسلمان کو محبوب رکھتا ہے جو مفلس، پارسا اور عیالدار ہو۔" (ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان عیالدار، مفلس ونادار ہونے کے باوجود اپنی اور اپنے اہل وعیال کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے حرام وناجائز اسباب وذرائع سے اجتناب کرتا ہو اور لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بھی پرہیز کرتا ہو وہ کامل مسلمان ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس کو محبوب رکھتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا کمال تقویٰ

(۳۵) وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ اَسْلَمَ قَالَ اسْتَسْقٰى يَوْمًا عُمَرُ فَجِيْءَ بِمَآءٍ قَدْ شِيْبَ بِعَسَلٍ فَقَالَ اِنَّهٗ لَطَيِّبٌ لٰكِنِّيْ اَسْمَعُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ نَعٰى عَلٰى قَوْمٍ شَهَوَاتِهِمْ فَقَالَ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَاَخَافُ اَنْ تَكُوْنَ حَسَنَاتُنَا عُجِّلَتْ لَنَا فَلَمْ يَشْرَبْهُ۔ (رواہ رزین)

"حضرت زید ابن اسلمؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے پینے کے لئے پانی مانگا تو ان کی خدمت میں جو پانی پیش کیا گیا اس میں شہد ملا ہوا تھا، حضرت عمرؓ نے (اس پانی کو دیکھ کر اور یہ جان کر کہ اس میں شہد ملا ہوا ہے) فرمایا۔ "یقیناً یہ پانی پاک وحلال اور نہایت خوشگوار ہے لیکن میں اس کو نہیں پیوں گا، کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں (قرآن سے) سنتا اور جانتا ہوں کہ اس نے ایک قوم کو خواہشات نفس کی اتباع کا ملزم گردانا اور (بطور سرزنش وتنبیہ) فرمایا۔ "کہ تم نے اس دنیاوی زندگی میں اپنی لذتوں اور نعمتوں کو پا لیا اور ان سے پورا پورا فائدہ حاصل کر لیا (اب آخرت میں تمہارے لئے کیا رہ گیا ہے۔" لہٰذا میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہماری) نیکیاں بھی ایسی نہ ہوں جن کا اجر وثواب (دنیاوی نعمتوں اور لذتوں کی صورت میں) جلد ہی اتنی دنیا میں) ہمیں دے دیا جائے (اور پھر آخرت میں محرومی کا منہ دیکھنا پڑے۔) چنانچہ حضرت عمرؓ نے شہد ملا ہوا وہ پانی نہیں پیا۔" (رزینؒ)

تشریح: حضرت عمرؓ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شہد ملا ہوا یہ پانی نہایت لذت آمیز اور بہت بڑی دنیاوی نعمت ہے جو نفس کو بھی نہایت مطلوب ہے، اگر میں اس پانی کو پیتا ہوں تو گویا بہت بڑی نعمت سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور لذت کام ودہن سے نفس کو خوش کرتا ہوں تو اس صورت میں مجھے خوف ہے کہیں یہ لذت ونعمت، ہمارے اعمال صالحہ کا وہ اجر وثواب نہ قرار پائے جو ہمیں بس دنیا ہی میں چکا دیا جائے اور آخرت کے لئے کچھ نہ رہ جائے جیسا کہ کافروں کے بارے میں ہے کہ ان کے نیک عمل کا بدلہ، دنیاوی نعمتوں اور لذتوں کی صورت میں ان کو اس دنیا میں مل جاتا ہے اور آخرت میں ان کو کچھ نصیب نہیں ہوگا۔

واضح رہے کہ حضرت عمرؓ نے اللہ تعالیٰ کا جو ارشاد نقل فرمایا ہے یعنی اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس طرح ایک آیت یہ بھی ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ (الآیۃ) یعنی جو شخص دنیا (کے نفع) کی

نیت رکھے گا، ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے، جس کے واسطے چاہیں گے جلدی (اسی دنیا میں) دے دیں گے۔ یہ دونوں آیتیں اگرچہ کفار کے حق میں ہیں لیکن اصل اعتبار تو الفاظ کی عمومیت کا ہے جس سے ہر شخص سبق حاصل کر سکتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا اعتبار ہونا چاہئے۔

ابتدائے اسلام میں صحابہؓ کا فقر و افلاس

(۳۶) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَاشَبِعْنَامِنْ تَمرٍ حَتّٰی فَتَحْنَا خَیْبَرَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم (صحابہؓ) نے اپنے فقر و افلاس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ کھجوروں سے، کبھی پیٹ نہیں بھرا، یہاں تک کہ ہم نے خیبر کو فتح کر لیا (جہاں کھجوریں بہت ہوتی تھیں) تب ہمیں پیٹ بھر کھانے کو کھجوریں ملیں۔" (بخاریؒ)

بَابُ الْاَمَلِ وَالْحِرْصِ

آرزو اور حرص کا بیان

اَمَل کے معنی ہیں امید رکھنا اور حرص کے معنی ہیں لالچ کرنا یا آرزو و ارادے کو دراز و وسیع کرنا! "حرص" کا تعلق نیک آرزوؤں اور اچھے ارادوں سے بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے، اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی ھُدٰھُمْ اور لفظ حرص کا اطلاق نفسانی خواہشات کی زیادتی اور دنیاوی چیزوں کے لالچ پر بھی ہوتا ہے جو ایک بری چیز ہے، چنانچہ قاموس میں لکھا ہے کہ بدترین حرص یہ ہے کہ تم اپنا حصّہ بھی حاصل کر لو اور غیر کے حصے کی بھی طمع رکھو! حاصل یہ کہ نیک امور جیسے حصول علم، خدا کے دین کی سربلندی اور اچھے اعمال، اس میں حریص ہونا یعنی آرزوؤں اور ارادوں کو دراز و وسیع کرنا، متفقہ طور پر علماء کے نزدیک بہت اچھی بات ہے، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا، طُوْبٰی لِمَنْ طَالَ عُمْرُہٗ وَحَسُنَ عَمَلُہٗ نیز آپ ﷺ نے اپنی عمر کے آخر میں اس آرزو اور ارادہ کا اظہار فرمایا تھا کہ اگر میں اگلے سال تک جیتا رہا تو (محرم کی) نویں تاریخ کو بھی روزہ ضرور رکھونگا اس کے برخلاف جس آرزو و ارادے کی درازی کا تعلق دنیاوی خواہشات نفس جیسے مال و دولت جمع کرنے اور جاہ و منصب کی طلب سے ہو تو وہ بہت بری بات ہے۔

جہاں تک عنوان کے پہلے لفظ "امل" کا تعلق ہے تو اس سے مراد دنیاوی امور (یعنی خوش حال زندگی اور محض دنیاوی بہبودی و ترقی وغیرہ) کی امیدوں، تمناؤں اور خیالی منصوبوں کی درازی و وسعت میں اس حد تک مبتلا ہو جانا ہے کہ موت کے لئے مستعد رہنے اور توشۂ آخرت تیار کرنے سے غافل ہو جائے۔ اور یہ شان صرف انہی لوگوں کی ہو سکتی ہے جو دین و آخرت سے غافل، خدا فراموش اور دنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنے والے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ذَرْھُمْ یَاکُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا وَیُلْھِھِمُ الْاَمَلُ۔ یعنی آپ (ﷺ) ان کافروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ (وہ خوب) کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منظوبے (یعنی دنیا بھر کی آرزوئیں اور تمنائیں) ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

انسان، اس کی موت اور اسکی آرزوؤں کی صورت مثال

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا مُرَبَّعًا وَخَطَّ خَطًّا فِی الْوَسْطِ خَارِجًا مِنْهُ وَخَطَّ خُطُطًا صِغَارًا اِلٰی هٰذَا الَّذِیْ فِی الْوَسْطِ مِنْ جَانِبِهِ الَّذِیْ هو فِی الْوَسْطِ فَقَالَ هٰذَا الْاِنْسَانُ وَهٰذَا اَجَلُهٗ مُحِیْطٌ

بِهٖ وَهٰذَا الَّذِیْ هُوَ خَارِجٌ اَمَلُهٗ وَهٰذِهِ الْخُطَطُ الصِّغَارُ الْاَعْرَاض فَاِنْ اَخْطَاهُ هٰذَا نَهَسَهٗ هٰذَا وَاِنْ اَخْطَاهُ هٰذَا نَهَسَهٗ هٰذَا۔ رواہ البخاری۔

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے ہمارے سمجھانے کے لئے چار خط کھینچ کر ایک مربع بنایا، پھر اس مربع کے درمیان ایک اور خط کھینچا جو مربع سے باہر نکلا ہوا تھا، اس کے بعد آپ ﷺ نے اس درمیانی خط کے اس حصہ کی طرف جو (مربع کے) خطوں کے درمیان تھا، چھوٹے چھوٹے کئی خطوط کھینچے اور پھر فرمایا)۔ "اس خاکہ کو اچھی طرح سمجھ لو! درمیانی خط کا یہ حصہ کہ مربع کے خطوں کے درمیان ہے، گویا انسان ہے، اور یہ خط (کہ جس نے چاروں طرف سے مربع بنا رکھا ہے) اس انسان کی موت ہے (یعنی مربع کے چاروں خطوط گویا اس کی موت کا وقت اور اس کی عمر کی آخری حد ہے جس نے چاروں طرف سے اس کو گھیر رکھا ہے) اور درمیانی خط کہ یہ حصہ کہ جو مربع سے باہر نکلا ہوا ہے، اس انسان کی (وہ) آرزو اور تمنّا ہے (جس کے بارے میں وہ یہ خیال رکھتا ہے کہ میں موت آنے سے پہلے اس کو حاصل کر لوں گا) حالانکہ وہ ایک بے بنیاد خیال میں مبتلا ہے کیونکہ اس کی آرزوؤں اور خواہشوں کا سلسلہ دراز ہوتا رہتا ہے جس سے اس کا دل و دماغ کبھی خالی نہیں رہتا جب کہ اس کی موت سے اس کی آرزوؤں کی تکمیل سے زیادہ قریب ہے) اور درمیانی خط کے اندرونی حصے پر جو یہ چھوٹے چھوٹے خطوط ہیں وہ عوارض (یعنی آفات و حادثات جیسے بھوک پیاس اور افلاس و بیماری وغیرہ) ہیں (کہ جو انسان پر ہر طرف سے مسلط رہتے ہیں اور اگر وہ عوارض اپنا کام کر جاتے ہیں تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے) پس اگر وہ (انسان) کسی ایک حادثہ و عارضہ سے بچ جاتا ہے تو دوسرا حادثہ و عارضہ گھیر لیتا ہے، اگر اس حادثہ و عارضہ سے بھی بچ نکلتا ہے تو پھر تیسرا حملہ کر دیتا ہے (غرضیکہ متعدد حوادث و عارضات اس کی تاک میں رہتے ہیں جن سے وہ یکے بعد دیگرے دوچار ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ موت آ کر اس کا کام تمام کر دیتی ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان دور دراز کی امیدیں اور آرزوئیں رکھتا ہے اور اس وہم میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کی وہ امیدیں اور آرزوئیں کبھی نہ کبھی پوری ہوں گی۔ حالانکہ حقیقت میں وہ ان امیدوں اور آرزوؤں سے بہت دور اور اپنی موت سے بہت قریب ہوتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی امیدوں اور آرزوؤں کی منزل تکمیل تک پہنچنے سے پہلے موت کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔

② وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ خَطَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُطُوطًا فَقَالَ هٰذَا الْاَمَلُ وَهٰذَا اَجَلُهٗ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ اِذْ جَآءَهُ الْخَطُّ الْاَقْرَبُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریمؐ نے کئی خطوط کھینچے (جیسا کہ پہلی حدیث میں گزرا کہ آپ نے چار خط کھینچ کر ایک مربع بنایا اور اس مربع کے درمیان ایک اور خط کھینچا جو مربع سے باہر نکلا ہوا تھا) پھر فرمایا کہ درمیانی خط کا یہ حصہ (جو مربع سے باہر نکلا ہوا ہے) انسان کی آرزو ہے، اور یہ خط (جس نے چاروں طرف سے ایک مربع بنا رکھا ہے) اس (انسان) کی موت ہے، پس انسان اسی حالت میں (یعنی امیدوں اور آرزوؤں کے پورا ہونے کی فکر میں) رہتا ہے کہ اچانک موت کا خط اس کو آدبوچتا ہے جو اس کے زیادہ قریب ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس انسان کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ وہ اس خط تک پہنچ جائے جہاں اس کی دنیائے آرزو بستی ہے اور جو اس سے بہت دور واقع ہے! لیکن ہوتا یہ ہے کہ ناگہاں موت اس کو آدبوچتی ہے اور وہ آرزو حاصل کئے بغیر اس جہاں سے چل کھڑا ہوتا ہے۔

بڑھاپے کی حرص

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَهْرَمُ ابْنُ اٰدَمَ وَيَشِبُّ مِنْهُ اثْنَانِ الْحِرْصُ عَلَی الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَی الْعُمُرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "انسان (خود تو بوڑھا ہو جاتا ہے مگر اس میں دو چیزیں جوان اور قوی ہو جاتی ہیں،

ایک تو مال (جمع کرنے) کی حرص اور اس کو خرچ نہ کرنے کی عادت اور دوسرے درازیٔ عمر کی آرزو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حقیقت ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے، اس کے مزاج و اطوار اور اس کی جبلت پر مذکورہ بالا دونوں خصلتوں کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ ان دونوں چیزوں کا زور بھی بڑھتا رہتا ہے اور بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا نفس (اگر علم و عمل اور ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ محفوظ و پاکیزہ نہ ہو جائے تو وہ) اپنی خواہشات اور اپنے جذبات کی گرفت میں رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ خواہشات و جذبات کی تکمیل، مال اور عمر کے بغیر نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ انسان جب بڑھاپے کی منزل میں پہنچ جاتا ہے تو اس میں ان نفسانی خواہشات و جذبات کا وجود تو جوں کا توں قائم رہتا ہے لیکن وہ قوت عقلیہ کو جو (قوت شہوانیہ) کے محرکات کو دفع نہیں کر سکتی! اسی اعتبار سے ان دونوں چیزوں کو "جوان اور قوی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَزَالُ قَلْبُ الْكَبِيْرِ شَابًّا فِيْ اثْنَيْنِ فِيْ حُبِّ الدُّنْيَا وَطُوْلِ الْاَمَلِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "بوڑھے کا دل ہمیشہ دو باتوں میں جوان (قوی) رہتا ہے، ایک تو دنیا کی محبت میں، اور دوسرے آرزو کی درازی میں۔" (اور یہ دونوں ہی باتیں مضر ہیں کیونکہ دنیا کی محبت موت کو عزیز نہیں رکھنے دیتی اور آرزوئے درازیٔ عمر، تاخیر عمل اور کوتاہی عمل کی مقتضی ہوتی ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

بوڑھا اگر توبہ و انابت نہیں کرتا تو اس کو عذر کا کوئی موقع نہیں

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْذَرَ اللّٰهُ اِلَى امْرِیٍٔ اَخَّرَ اَجَلَهٗ حَتّٰى بَلَّغَهٗ سِتِّيْنَ سَنَةً۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کے لئے عذر کا کوئی موقع نہیں چھوڑا (یعنی اس کا عذر دور کر دیا) جس کی موت کو اتنا مؤخر کیا کہ اس کو ساٹھ سال کی عمر تک پہنچا دیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اتنی لمبی عمر عطا کی اور اتنے طویل زمانہ تک اس کو مہلت دی اور اس نے اس کے باوجود توبہ و انابت کی راہ اختیار نہیں کی اور گناہوں سے باز نہیں آیا تو اب اس کے لئے عذر خواہی کا وہ کون سا موقع رہ گیا ہے جس کے سہارے وہ قیامت میں عفو و بخشش کی امید رکھتا ہے! اگر کوئی جوان گناہ و معصیت اور بے عملی کی راہ اختیار کئے ہوئے ہے تو وہ کہتا ہے کہ جب میں بڑھاپے کی منزل میں پہنچوں گا تو اپنی بدعملیوں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر لوں گا اور اپنی زندگی کے اس حصہ کو خدا کی رضا جوئی اور اس کی عبادت میں صرف کروں گا، لیکن جو شخص بڑھاپے کی منزل میں پہنچ چکا ہے اور توبہ و انابت اور عمل کرنے کا آخری موقع بھی اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو وہ اپنی بے عملی اور گناہوں پر کیا کہے گا؟ ہائے! کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو عمر کی آخری منزل میں بھی پہنچ کر اپنی بے عملیوں اور اپنے گناہوں پر نادم و شرمسار نہیں ہیں اور اس آخری مرحلہ پر بھی جب کہ موت ان کو آدبوچنے کے لئے بالکل تیار کھڑی ہے، انہیں اپنے رحیم و کریم پروردگار کا دامن عفو و رحمت پکڑ لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔

بعض حضرات کے قول کے مطابق اس ارشاد گرامی کے معنی یہ ہے کہ بوڑھے شخص پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ واجب ہے کہ وہ برابر پروردگار کی بارگاہ میں عذر خواہی اور توبہ و استغفار کرتا رہے اور اس میں قطعاً تقصیر و کوتاہی نہ کرے۔

انسان کی حرص و طمع کی درازی کا ذکر؟

⑥ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ

جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اگر (بالفرض والتقدیر) آدمی کے پاس مال و دولت سے بھرے ہوئے دو جنگل ہوں تب بھی وہ تیسرے جنگل کی تلاش میں رہے گا (یعنی اس کی حرص وطمع کی درازی کا یہ عالم ہے کہ کسی بھی حد پر پہنچ کر اس کو سیری حاصل نہیں ہوتی) اور آدمی کے پیٹ کو مٹی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی (یعنی جب تک وہ قبر میں جاکر نہیں لیٹ جاتا اس وقت تک اس کی حرص وطمع کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ تاہم یہ بات اکثر لوگوں کے اعتبار سے فرمائی ہے۔ ورنہ ایسے بندگان خدا بھی ہیں جن میں حرص وطمع کے ہونے کا تو کیا سوال اپنی ضرورت کے بقدر مال واسباب کی بھی انہیں پرواہ نہیں ہوتی) اور اللہ تعالیٰ بری حرص سے جس بندہ کی توبہ کو چاہتا ہے قبول کر لیتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کو قبول کرنا چونکہ پروردگار کی شان رحمت ہے اور ان گناہوں کا تعلق خواہ ظاہری بدعملیوں سے ہو یا باطنی برائیوں سے، اس لئے بڑی حرص میں مبتلا ہونے والا شخص اگر اخلاص و پختگی کے ساتھ اس برائی سے اپنے نفس کو باز رکھنے کا عہد کر لیتا ہے اور اپنے پروردگار سے توبہ واستغفار کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول کی جاتی ہے! یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو اس برائی سے پاک کرنا چاہتا ہے اس پر اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے بایں طور کہ اس کو اس بری خصلت کے ازالہ کی توفیق اور نفس کو پاکیزہ و مہذب بنانے کی باطنی طاقت عطا فرماتا ہے۔

اس حدیث میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ انسان کی جبلت میں بخل کا مادہ رکھا گیا ہے اور یہ بخل ہی ہے جو حرص وامل اور طمع ولالچ کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ انفاق و ایثار کے ذریعہ بخل کی سرکوبی کرتا رہے تاکہ حرص کو راہ پانے کا موقع نہ ملے۔

دنیا میں مسافر کی طرح رہو

⑦ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعْضِ جَسَدِيْ فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ اَهْلِ الْقُبُوْرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے میرے جسم کے ایک حصہ (یعنی دونوں مونڈھوں) کو پکڑ کر فرمایا۔ "تم دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ گیر ہو، اور تم اپنا شمار ان لوگوں میں کرو جو دنیا سے گزر گئے ہیں اور اپنی قبروں میں آسودۂ خواب ہیں (یعنی تم مردوں کی مشابہت اختیار کرو کہ جس طرح وہ دنیا کی تمام چیزوں سے منہ موڑ کر ایک گوشہ میں پڑے ہوئے ہیں اسی طرح تم بھی دنیاداری کے علائق سے اپنا دامن بنا کر نہایت سادگی اور یکسوئی کے ساتھ زندگی گزارو۔" (بخاریؒ)

تشریح: میرکؒ کہتے ہیں کہ اس روایت کا بخاری کی طرف منسوب ہونا محل نظر ہے کیونکہ یہاں جو الفاظ نقل کئے گئے وہ بعینہٖ ترمذیؒ کے روایت کردہ ہیں اور بخاریؒ نے اس حدیث کو جن الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے وہ اس سے مختلف ہیں۔

اَوْ عابر سبیل میں حرف اَوْ یا تو تنویع کے لئے ہے جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے، اور یا یہ کہ یہاں یہ حرف بل کے معنی میں استعمال فرمایا گیا ہے جو ترقی کے لئے آتا ہے، اس صورت میں پورے جملہ کا ترجمہ یوں ہوگا۔ "تم دنیا میں اس طرح رہو گویا تم مسافر ہو، بلکہ راہگیر ہو۔" اس طرح بات میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس ارشاد گرامی کا مقصد جس مفہوم کو بیان کرنا ہے وہ زیادہ پر تاثیر انداز میں واضح ہوتا ہے، کیونکہ مسافر تو پھر بھی کچھ دنوں کے لئے یا کچھ عرصہ کے لئے کہیں کہیں ٹھہر کر وہاں کی چیزوں میں کسی نہ کسی حد تک مشغول ہوتا ہے اور ان سے کچھ نہ کچھ تعلق اس کو ضرور رکھنا پڑتا ہے، لیکن جو شخص سرراہ گزر رہا ہوتا ہے وہ بس آگے کی طرف چلتا ہی رہتا ہے اس کو نہ تو اس راستے کی کسی چیز سے سروکار ہوتا ہے اور نہ ادھر ادھر کی مشغولیت میں اپنا وقت ضائع کر کے اپنے سفر میں رخنہ اندازی کو گوارا کرتا ہے۔

حدیث کے آخری جزء کی تشریح تھوڑی سی تفصیل کا تقاضہ کرتی ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں پہلے تو یہ جان لینا چاہئے کہ موت کی حقیقت کیا ہے؟ بدن سے روح کے تصرف کا منقطع ہو جانا، روح وبدن کے باہمی رشتہ کا ٹوٹ جانا، اور بدن کا روح کے آلہ کار کی حیثیت سے باہر ہو جانا موت کا مفہوم ہے! بدن کی موت سے روح معدوم ونابود نہیں ہو جاتی صرف اس کی وہ حیثیت وحالت بدل جاتی ہے جو بدن کے ساتھ تعلق رکھنے کی صورت میں اس کو حاصل ہوتی ہے مثلاً یہ کہ بدن کی موت کے ساتھ اس کی بصارت اس کی سماعت، اس کی گویائی اور اسی طرح ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء جسم کی وہ طاقتیں اس سے سلب کر لی جاتی ہیں جن کے ذریعہ وہ (روح) بدن پر اپنا تصرف ظاہر کرتی ہے، ایسے ہی اس کے تمام اہل وعیال، اقرباو آشنا، اور دوست وعزیز اس سے جدا کر دیئے جاتے ہیں، نیز دنیا کی وہ تمام چیزیں اس سے الگ کر دی جاتی ہیں، جن سے وہ اپنے بدن کے ساتھ تعلق رکھتی تھی جیسے گھربار، اسباب وسامان، زمین وجائداد، فوج وحشم، لونڈی وغلام اور گھوڑے ودیگر چوپائے اور دیگر ضروری وغیر ضروری چیزیں، پس مردوں میں اپنا شمار کرنا اور ان کی مشابہت اختیار کرنا گویا اس مفہوم کا حامل ہے کہ انسان جسمانی علائق سے حتی الامکان قطع تعلق اختیار کر لے، جس کی صورت یہ ہے کہ اعضائے جسم پر سے روح کا وہ تصرف ختم کر دے جس کے نتیجہ میں حرام ومکروہ امور کا ارتکاب ہوتا ہے اور اس میں یقین رکھے کہ دنیا کی جو بھی چیزیں میرے تصرف واختیار میں ہیں، ان سب کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے ان کی ملکیت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور اس بات کو اس کی علامت سمجھے کہ اگر ان چیزوں میں سے کوئی چیز اس کے پاس سے جاتی رہے تو کوئی غم نہ ہو، اور کوئی چیز اپنے پاس آئے تو خوش نہ ہو۔ اسی طرح اپنے اہل واولاد، عزیز واقارب اور دوستوں وغیرہ سے تعلق محبت کے وہ جذبات منقطع کر لے جن کی وجہ سے حرام ومکروہ چیزوں کا ارتکاب ہوتا ہے! پس جس شخص نے اپنے آپ کو اس وصف سے متصف کر لیا وہ دنیا سے بے تعلقی میں گویا مردوں کے مشابہ ہوگا، اور اس کا شمار آسودگان خاک کے حکم میں ہوگا! اس کے بعد اس شخص کی شان کی مناسب یہ بات ہوگی کہ وہ ان آداب وشرائط کو ملحوظ رکھے جن کے سبب اس کا مردوں کے مشابہ ہونا صحیح قرار پا سکے، مثلاً ایک تو یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے ہر مطلوب سے دست کنارہ کش ہو جائے جیسا کہ موت کی صورت میں، دوسرے یہ کہ زہد کو اختیار کرے، یعنی دنیا، کی محبت اور دنیا کی لذات وخواہشات سے کنارہ کش ہو جائے جیسا کہ موت کی صورت میں، تیسرے یہ کہ توکل کی راہ پر گامزن رہے یعنی دنیاوی اسباب ووسائل کی ناروا قید سے آزاد ہو جائے جیسا کہ موت کی صورت میں، چوتھے یہ کہ قناعت پر عامل رہے یعنی نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرے جیسا کہ موت کی صورت میں، پانچویں یہ کہ صرف اللہ کی طرف متوجہ رہے اور ماسوی اللہ کی طرف نظر نہ اٹھائے تاکہ اللہ عزوجل کے سوا کوئی مطلوب، کوئی محبوب اور کوئی مقصود نہ ہو جیسا کہ موت کی صورت میں، چھٹے یہ کہ صبر کی راہ اختیار کرے یعنی ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ نفس امارہ سے قطع تعلق کر لے جیسا کہ موت میں، ساتویں یہ کہ رضا کے راستہ پر چلے یعنی اپنے نفس کی خوشنودی کے جال سے نکل کر حق سبحانہٗ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے دائرے میں آجائے، احکام ازلیہ کو بلاچون وچرا تسلیم کرے اور اپنے تمام امور کو بغیر کسی اعتراض ومنازعت کے حق تعالیٰ کی تدبیر واختیار کے سپرد کر دے جیسا کہ موت کی صورت میں، آٹھویں یہ کہ ذکر سے غافل نہ رہے یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر میں اپنے دل اور اپنی زبان کو مشغول رکھے اور ماسوی اللہ کی یاد اور اس کے ذکر وخیال کی الجھن سے آزاد رہے جیسا کہ موت کی صورت میں، اور نویں یہ کہ مراقبہ کو اختیار کرے یعنی ہر طرح کی قوت وسطوت اور ہر مقتدر طاقت سے بے نیاز ہو کر اور اس کو چھوڑ کر بس احکم الحاکمین کی طاقت وقدرت کا دھیان رکھے اور اس کی طاقت اور قدرت کو اپنے تمام امور کا مالک ومتصرف جانے جیسا کہ موت کی صورت میں، پس یہ صفات وکیفیات پیدا ہو جائیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ مردوں کی مشابہت حاصل ہو گئی اور اہل قبور میں شمار کرانے کا حکم پورا ہو گیا، اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد وعد نفسک من اھل القبور کا یہی مفہوم ہے اور یہی معنی اس حدیث کے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے موتو اقبل ان تموتوا (موت آنے سے پہلے موت کو اختیار کر لو) چنانچہ ایک موت تو وہ ہے جو اچانک روح وبدن کے باہمی رشتہ کو یکسر منقطع کر دیتی ہے اور ایک موت وہ ہے جس کو انسان مذکورہ بالا صفات کی صورت میں اختیار کر کے اپنے نفس امارہ کو کچل ڈالتا ہے، اور

یہی موت "اختیاری موت" کہلاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

زیادہ توجہ، دنیاوی چیزوں کی اصلاح و درستی کے بجائے اپنی دینی و اخروی زندگی کی اصلاح کی طرف مبذول رکھو

(۸) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ مَرَّبِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا وَاُمِّیْ نُطَیِّنُ شَیْئًا فَقَالَ مَاھٰذَا یَاعَبْدَاللّٰہِ قُلْتُ شَیْئٌ نُصْلِحُہٗ قَالَ الْاَمْرُ اَسْرَعُ مِنْ ذٰلِکَ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں (ایک دن) میں اور میری والدہ گارے سے کسی چیز کو (یعنی اپنے مکان کی دیواروں یا چھت کو) لیپ پوت رہے تھے کہ رسول کریم ﷺ کا گزر ہماری طرف ہو گیا، آپ ﷺ نے (ہمیں اس حالت میں دیکھ کر) فرمایا کہ عبداللہ یہ کیا ہے؟ (یعنی یہ لیپ پوت کس وجہ سے ہو رہی ہے؟) میں نے عرض کیا کہ اس چیز (یعنی دیواروں یا چھت) کی درستی و مرمت کر رہے ہیں (یا اس کو اس لئے لیپ پوت رہے ہیں تاکہ اس میں پختگی آجائے) حضور ﷺ نے فرمایا "امر" یعنی اجل اس سے بھی زیادہ جلد آنے والی ہے۔ (احمدؒ وترمذیؒ)، اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ موت کا آنا اس مکان کی ٹوٹ پھوٹ اور خرابی سے کہیں پہلے متوقع ہے۔ تم لیپ پوت کے ذریعہ اس مکان کی مرمت و درستگی میں اس لئے مصروف ہو کہ کہیں اس کے در و دیوار اور چھت تمہاری زندگی ختم ہونے سے پہلے نہ گر پڑے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس مکان کے گر پڑنے اور اس کے خراب ہونے سے تم خود موت کی آغوش میں پہنچ سکتے ہو، پس تمہارے لئے اپنے عمل کی اصلاح کی طرف متوجہ رہنا، اس مکان کی مرمت و درستگی میں مشغول ہونے سے زیادہ بہتر ہے اور اس میں دل لگانا عبث ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کا اپنے مکان کو گارا مٹی لگانا اشد ضرورت کے تحت نہیں ہو گا بلکہ وہ زیادہ مضبوطی اور آرائش کے لئے اس کو لیپ پوت رہے ہوں گے۔

موت سے کسی لمحہ غافل نہ ہونا چاہئے

(۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُھْرِیْقُ الْمَآءَ فَیَتَیَمَّمُ بِالتُّرَابِ فَاَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ الْمَآءَ مِنْکَ قَرِیْبٌ یَقُوْلُ مَا یُدْرِیْنِیْ لَعَلِّیْ لَا اَبْلُغُہٗ۔ رَوَاہُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ وَابْنُ الْجَوْزِیِّ فِیْ کِتَابِ الْوَفَآءِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (کبھی ایسا ہوتا کہ) رسول کریم ﷺ پیشاب کرنے کے بعد (اور وضو کرنے سے پہلے) مٹی سے تیمّم کر لیتے، میں (یعنی ابن عباسؓ یہ دیکھ کر) عرض کرتا کہ یا رسول اللہ! پانی تو آپ (ﷺ) کے بہت قریب ہے؟ (یعنی جب پانی آپ (ﷺ) کی دسترس سے اتنا دور نہیں ہے کہ وضو کر سکتے ہیں تو پھر تیمّم کیوں کرتے ہیں؟) حضور ﷺ (میری اس بات کے جواب میں) فرماتے۔ مجھے کیا معلوم کہ میں اس پانی تک پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں؟" اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں اور ابن جوزیؒ نے کتاب الوفاء میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: یعنی مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میری عمر کتنی ہے، اور ہر لمحہ موت متوقع ہے، اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ پیشاب کرنے کے بعد مجھے اتنی مہلت بھی نہ ملے کہ پانی تک پہنچ کر وضو کر سکوں، لہٰذا فوری طور پر تیمّم کر لیتا ہوں تاکہ ایک طرح کی طہارت تو حاصل رہے۔

انسان کی موت اس کی آرزو سے زیادہ قریب ہے

(۱۰) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ھٰذَا ابْنُ اٰدَمَ وَھٰذَا اَجَلُہٗ وَوَضَعَ یَدَہٗ عِنْدَ قَفَاہُ ثُمَّ بَسَطَ فَقَالَ وَثَمَّ اَمَلُہٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ تو ابن آدم (انسان) ہے اور یہ اس کی موت ہے یہ فرما کر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف رکھا (یعنی پہلے تو ایک جگہ اشارہ کر کے بتایا کہ یہ انسان ہے اور پھر اس جگہ سے ذرا پیچھے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ اس کی موت ہے) اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو پھیلایا (اور دور اشارہ کر کے) فرمایا کہ اس جگہ انسان کی آرزو ہے (یعنی انسان کی موت اس کے بہت قریب ہے جب کہ اس کی آرزو اس سے بہت دور ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "یہ ابن آدم ہے" میں گویا حضور ﷺ نے مخاطبین کو ایک ظاہری اشارہ کے ذریعہ تصوراتی وجود کی طرف متوجہ کیا اور یہی اسلوب "یہ اس کی موت ہے" بھی اختیار فرمایا گیا۔ اس بات کو وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ پہلے تو حضور ﷺ نے اپنے سامنے کی جانب زمین کے گوشہ پر یا ہوا میں اپنے ہاتھ کے ذریعہ اشارہ کر کے بتایا کہ اس جگہ کو یہ تصور کرو کہ یہاں انسان ہے، پھر اپنے ہاتھ کو پیچھے ہٹایا اور جس جگہ پہلے اشارہ فرمایا تھا اس کے بالکل قریب عقب میں ہاتھ کو رکھ کر بتایا کہ اس جگہ کو وہ مقام تصور کرو جہاں انسان کی موت ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو بالشت اور انگلیوں کی کافی کشادگی کے ساتھ پھیلایا۔ یا بسط کے معنی یہ ہیں کہ، آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو اس جگہ سے کہ جہاں آپ ﷺ نے پہلے اشارہ فرمایا تھا، بہت آگے تک دراز کیا اور وہاں اشارہ کر کے بتایا کہ اس جگہ کو وہ مقام تصور کرو جہاں گویا انسان کی آرزو ہے اور اس طرح آپ ﷺ نے اس اسلوب بیان اور اشارہ کے ذریعہ گویا لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور متنبہ فرمایا کہ انسان کی موت اس کے بہت قریب کھڑی ہے جب کہ اس کی وہ آرزوئیں اور امیدیں کہ جن کے پیچھے وہ مارا مارا پھرتا ہے اس سے بہت دور واقع ہیں۔

کسی شاعر نے، اللہ اس پر اپنی رحمتیں نازل کرے، کیا خوب کہا ہے ؎

کل امری مصبح فی اھلہ　　والموت ادنی من شراک نعلہ

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غَرَزَ عُوْدًا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاٰخَرَ اِلٰی جَنْبِہٖ وَاٰخَرَ اَبْعَدَ..... فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ مَاھٰذَا قَالُوْا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ ھٰذَا الْاِنْسَانُ وَھٰذَا الْاَجَلُ اُرَاہُ قَالَ وَھٰذَا الْاَمَلُ فَیَتَعَاطَی الْاَمَلَ فَلَحِقَہُ الْاَجَلُ دُوْنَ الْاَمَلِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے سامنے ایک لکڑی (زمین میں) گاڑی، پھر ایک اور لکڑی (دونوں لکڑیوں سے یا دوسری لکڑی سے) کافی فاصلہ پر نصب فرمائی اور پھر فرمایا۔ "تم لوگ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یعنی ان لکڑیوں سے کیا مراد ہے اور یہ کس چیز کی مثالیں ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "(تو سنو) یہ (پہلی) لکڑی (گویا) انسان ہے، یہ (دوسری لکڑی (گویا) اس انسان کی موت ہے (جو انسان کے اتنے ہی قریب ہے جتنا کہ یہ دوسری لکڑی پہلی لکڑی کے قریب ہے) حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ فرمایا۔ "اور یہ (تیسری) لکڑی (کہ جس کو میں نے کافی فاصلہ پر گاڑا ہے گویا) اس (انسان) کی آرزو ہے (جو اس سے بہت دور ہے) پس انسان اپنی امید اور آرزو کی تکمیل کی جستجو میں رہتا ہے (اور اپنا وقت اس کوشش میں صرف کرتا رہتا ہے کہ اس آرزو کو حاصل کرلے مگر ہوتا یہ ہے) کہ اس کی موت، اس کی آرزو کے پورا ہونے سے پہلے ہی اس کو آدبوچتی ہے۔" (شرح السنۃ)

امت محمدی ﷺ کے لوگوں کی عمر

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عُمْرُ اُمَّتِیْ مِنْ سِتِّيْنَ سَنَةً اِلٰی سَبْعِيْنَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت (کے لوگوں) کی عمر ساٹھ سال سے ستر سال تک ہے۔" اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اُمت محمدیہ کے لوگوں کی عمر کا حصہ تناسب ساٹھ سال اور ستر سال کے درمیان رہے گا۔ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بات اکثر لوگوں کے اعتبار سے فرمائی ہے ورنہ تو اس اُمت میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی عمر ساٹھ سال تک بھی نہیں پہنچ پاتی، اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی عمر ستر سال سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے جیسا کہ آگے کی حدیث سے واضح ہوگا۔

⑬ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْمَارُ اُمَّتِیْ مَابَيْنَ السِّتِّيْنَ اِلَى السَّبْعِيْنَ وَاَقَلُّهُمْ مَنْ يَّجُوْزُ ذٰلِكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَذُكِرَ حَدِيْثُ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ الشِّخِّيْرِ فِیْ بَابِ عِبَادَةِ الْمَرِيْضِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت کے اکثر لوگوں کی عمر ساٹھ اور ستر سال کے درمیان رہے گی اور میری اُمت میں ایسے لوگوں کی تعداد کم ہی ہوگی جو اس (ستر سال) سے تجاوز کر جائیں (اور ان کی عمر سو یا سو سال سے بھی زائد ہو) (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور حضرت عبداللہ ابن شخیر کی روایت باب عیادۃ المریض میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: یوں تو ہر دور میں اُمت محمدی میں ایسے لوگوں کی بھی تھوڑی بہت تعداد رہی ہے جن کی عمر سو یا سو سال سے بھی زائد ہوتی ہے لیکن خود حضور ﷺ کے زمانے کے لوگوں یعنی صحابہ کرام میں بھی ایسے لوگوں کا وجود پایا جاتا ہے جنہوں نے کافی عمر پائی، مثلاً حضرت انسؓ ابن مالکؓ کی وفات ایک سو تین سال کی عمر میں ہوئی، اسماء بنت ابوبکرؓ نے سو سال کی عمر پائی، ان کی حالت تو یہ تھی کہ آخر عمر تک بھی ان کے دانت نہیں ٹوٹے تھے اور عقل و حواس ذرہ برابر مختل نہیں ہوئے تھے۔ ان دونوں سے زیادہ عمر حضرت حسان ابن ثابتؓ کی ہوئی، جنہوں نے ایک سو بیس سال کی عمر میں اس دنیا کو خیرباد کہا، ابتدائی ساٹھ سال تک تو کفر کی حالت میں رہے اور پھر ساٹھ سال تک ایمان و اسلام کی حالت میں بسر کئے، ان سے بھی طویل عمر حضرت سلمان فارسیؓ کی ہوئی، کہا جاتا ہے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو اس وقت ان کی عمر ڈھائی سو سال تھی، اگرچہ ایک روایت ساڑھے تین سو سال کی بھی ہے لیکن صحیح پہلا ہی قول ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بخل اور آرزو کی مذمت

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَوَّلُ صَلَاحِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْيَقِيْنُ وَالزُّهْدُ وَاَوَّلُ فَسَادِهَا الْبُخْلُ وَالْاَمَلُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس اُمت کی پہلی نیکی، یقین کرنا اور زہد اختیار کرنا ہے اور اس اُمت کا پہلا فساد، بخل اور دنیا میں باقی رہنے کی آرزو کو دراز کرنا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "یقین" سے مراد ہے اس بات پر کامل اعتقاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ رزاق ہے اور رزق پہنچانے کا متکفل و ضامن ہے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا یعنی روئے زمین پر ایسا کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں ہے جس کا رزق اللہ

کے ذمہ نہ ہو۔

"زہد اختیار کرنے" کا مطلب، دنیا کی محبت میں گرفتار ہونے سے بچنا اور دنیا کی نعمتوں ولذتوں سے بے اعتنائی ولاپرواہی برتنا ہے۔ حاصل یہ کہ دین وآخرت کی بھلائی وکامیابی کا مدار تقویٰ پر ہے جو زہد ویقین سے حاصل ہوتا ہے اور دین وآخرت کی خرابی کی جڑ، طمع ولالچ جو بخل اور درازئ عمر کی آرزو سے پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ جب حق تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل اعتقاد ویقین ہوتا ہے تو بخل کا مادہ فساد نہیں پھیلاتا کیونکہ بخل کا سبب وہ بے یقینی ہوتی ہے جو رزق پہنچنے کے تئیں انسان اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے یعنی اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرے پاس جو مال وزر ہے اگر میں نے اس کو انفاق وایثار کی صورت میں خرچ کر دیا تو پھر کل کہاں سے کھاؤں گا! اسی طرح جب زہد کی راہ اختیار کی جاتی ہے تو دنیا میں باقی رہنے کی تمنا اور آرزوؤں کی درازی ختم ہو جاتی ہے، اس لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اس اُمت کا پہلا فساد بخل اور آرزو ہے، کیونکہ یہ دونوں خصلتیں رزاقیت حق پر یقین اور زہد کی ضد ہیں۔

"یقین" کی تعریف: اس موقع پر یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ "یقین" کا اصل مفہوم کیا ہے؟ چنانچہ حضرت شیخ عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "حبل المتین فی تحصیل الیقین" میں لکھا ہے کہ "اعتقاد کا جزم کی حد تک پہنچ جانا اور دلیل وبرہان کے ذریعہ اتنا مضبوط ومستند ہو جانا کہ حق کو ثابت کر دے۔" حکماء ومتکلمین کی اصطلاح میں "یقین" کہلاتا ہے۔ لیکن صوفیہ کی اصطلاح میں اس مفہوم پر "یقین" کا اطلاق اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تصدیق دل پر اس حد تک غالب نہ ہو جائے کہ دل پر اس کے تصرف وحکمرانی کا سکہ چلنے لگے۔ یا اس دل کو صرف انہی چیزوں کی طرف مائل کرنے لگے جو شریعت کے مطابق ہوں اور ان چیزوں سے باز رہے جو شرعی احکام کے خلاف ہوں، مثلاً موت کا اعتقاد ہر شخص رکھتا ہے اور وہ اعتقاد نہ صرف جزم کی حد تک ہوتا ہے بلکہ دلیل وبرہان کے ذریعہ اتنا مضبوط ومستند ہوتا ہے کہ وہ موت کو ایک اٹل حقیقت بھی ثابت کرتا ہے، تو حکماء متکلمین کے نزدیک اس اعتقاد پر "یقین" کا اطلاق کیا جا سکتا ہے لیکن صوفیاء کے نزدیک وہ اعتقاد حقیقی معنی میں "یقین" نہیں کہلا سکتا اور اس اعتقاد کا حامل "صاحب یقین" شمار نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کے دل پر موت کی یاد غالب نہ ہو، اور موت کا احساس اس حد تک اس پر متصرف وحکمران نہ ہو کہ وہ طاعات کی مشغولیت اور گناہ کے ترک کے ذریعہ ہر وقت موت کے لئے تیار رہے۔

واضح رہے کہ چار امور ایسے ہیں جو "یقین" کا محل ہیں۔ یوں تو وہ تمام چیزیں یقین کی متقاضی ہیں جن کی خبر آنحضرت ﷺ نے دی ہے لیکن ان تمام چیزوں کی اصل اور بنیاد ہونے کی حیثیت سے وہ چار امور اس درجہ کے ہیں کہ ان پر ہر سالک کو یقین رکھنا بنیادی طور پر ضروری ہے، ایک تو توحید، یعنی یہ پختہ اعتقاد رکھنا کہ جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے حق تعالیٰ ہی کی قدرت سے واقع ہوتا ہے دوسرے توکل، یعنی اس بات پر کامل یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ رزق پہنچانے کے متکفل وضامن ہے، تیسرے جزاء وسزا کا اعتقاد، یعنی یہ یقین رکھنا کہ ہر عمل کی جزا وسزا مقرر ہے تمام اعمال پر ثواب وعذاب کا مرتب ہونا لازمی امر ہے اور چوتھے یہ یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام احوال وکیفیات اور تمام حرکات وسکنات سے پوری طرح باخبر اور مطلع ہے! پس توحید کے تئیں یقین کا فائدہ یہ ہوگا کہ مخلوقات کی طرف رغبت والتفات نہیں رکھے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق پہنچنے کے تئیں یقین رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ یا تو حصول رزق کی طلب وکوشش میں میانہ روی اختیار کرے گا، یا اگر افلاس وناداری کی صورت میں غذائی ضروریات پوری نہ ہوں گی تو کسی تاسف اور بددلی میں مبتلا نہیں ہوگا، اعمال کے جزا وسزا کے تئیں یقین رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ طاعات وعبادات کی مشغولیت اور خدا کی رضا وخوشنودی کے حصول میں زیادہ سے زیادہ سعی وکوشش کرے گا اور گناہ ومعصیت کی زندگی سے اجتناب کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے علیم وخبیر ہونے کے تئیں یقین رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اپنے ظاہر وباطن کی اصلاح کی طرح زیادہ سے زیادہ متوجہ رہے گا۔" یہ حضرت شیخ عبدالوہابؒ کے کلام کا خلاصہ تھا۔ اب آخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رزاقیت، رزق پہنچنے، اور اللہ تعالیٰ نے رزق دینے کا جو وعدہ کیا ہے اس پر کامل

توکل واعتماد رکھنا، تمام روحانی وباطنی اعلیٰ مراتب میں سے ایک بہت بڑا مرتبہ ہے نیز سالک راہ حق کو یہ مرتبہ اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں، اور تمام عبادات وطاعات میں قلبی فروغ واطمینان کا انحصار اس مرتبہ پر ہے۔ امام زمانہ، قطب وقت، حضرت الشیخ ابوالحسن شاذلیؒ نے بڑی عارفانہ بات کہی ہے کہ دو ہی چیزیں ایسی ہیں جو عام طور پر بندہ اور خدا کے درمیان پردہ کی طرح حائل ہو جاتی ہیں (یعنی ان دونوں چیزوں کی وجہ سے بندہ معرفت حق حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے) ایک تو رزق کا فکر، اور دوسرے مخلوق کا خوف، اور ان دونوں میں سے بھی زیادہ سخت پردہ رزق کا فکر ہے۔

امام اصمعیؒ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دیہاتی کے سامنے سورۂ وَالذّٰرِیٰتِ کی تلاوت شروع کی اور جب اس آیت پر پہنچا فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ تو اس دیہاتی نے (جو بڑے غور کے ساتھ میری تلاوت سن رہا تھا) ایک دم کہا کہ بس کیجئے! اور پھر وہ اپنی اونٹنی کی طرف متوجہ ہوا، اس نے اس اونٹنی کو نحر کیا اور اس کا گوشت کاٹ بنا کر ان تمام لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا جو اس کے آس پاس موجود تھے، اس کے بعد اس نے اپنی تلوار اور کمان اٹھائی اور ان کو بھی توڑ کر پھینک دیا، اور پھر بغیر کچھ کہے سنے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا، کافی عرصہ کے بعد میں ایک دن بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ اچانک اس دیہاتی سے ملاقات ہوگئی جو خود بھی طواف کر رہا تھا، میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا، اس کا بدن بالکل سوکھ گیا تھا اور رنگ زرد ہو گیا تھا، اس نے مجھ کو دیکھ کر سلام کیا اور کہنے لگا کہ وہی سورت پھر پڑھیے جو آپ نے اس دن پڑھی تھی، چنانچہ میں نے وہ سورت پڑھنی شروع کی اور جب اسی آیت یعنی وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ پر پہنچا تو اس نے ایک چیخ ماری اور کہا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا اس کے بعد اس نے کہا کہ کچھ اور؟ (یعنی اب آگے کی آیت پڑھیے) میں نے آگے کی آیت پڑھی، فَوَرَبِّ السَّمَآءِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ اس نے آیت سن کر پھر ایک چیخ ماری اور کہنے لگا، یا اللہ، پاک ہے تیری ذات! وہ کون بدبخت ہے جس نے اللہ کو اتنا غصہ دلایا کہ اس کو قسم کھانی پڑی؟ اس شخص کی بدبختی کا کیا ٹھکانا ہے کہ پروردگار نے جو کچھ فرمایا اور جو وعدہ کیا اس پر اس نے یقین نہیں کیا یہاں تک کہ پروردگار کو قسم کھا کر اس بات کا یقین دلانا پڑا؟ اس دیہاتی نے تین مرتبہ یہی جملے ادا کئے اور اس کے ساتھ ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

حقیقی زہد کیا ہے؟

⑮ وَعَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ قَالَ لَيْسَ الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا بِلُبْسِ الْغَلِيْظِ وَالْخَشِنِ وَاَكْلِ الْجَشِبِ اِنَّمَا الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا قِصَرُ الْاَمَلِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت سفیان ثوریؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "دنیا میں زہد اس کا نام نہیں ہے کہ موٹے چھوٹے اور سخت کپڑے پہن لئے جائیں اور روکھا سوکھا اور بدمزہ کھانا کھایا جائے بلکہ دنیا سے زہد اختیار کرنا حقیقت میں آرزوؤں اور امیدوں کی کمی کا نام ہے" (شرح السنۃ)

تشریح: "غلیظ" سے وہ کپڑا مراد ہوتا ہے جس کے سوت نہایت موٹے اور بھدے ہوں اور خشن سے مراد وہ کپڑا ہوتا ہے جو نہایت سخت اور کھردری بناوٹ کا ہو! جشب اس کھانے کو کہتے ہیں جو نہایت بدمزہ ہو، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ بغیر سالن کی روٹی کو "جشب" کہتے ہیں! آرزوؤں اور امیدوں کی کمی کا مطلب ہے دنیاوی چیزوں کے حصول کی خواہشات اور درازئ عمر کی تمنا کو ختم کر کے بلا تاخیر توبہ وانابت اور علم وعمل کی راہ اختیار کر لینا اور ہمہ وقت موت کے لئے تیار رہنا۔

حضرت سفیان ثوریؒ کے مذکورہ بالا عارفانہ قول کا مطلب یہ ہے کہ زہد، دنیا سے بے رغبتی بے اعتنائی کی اس کیفیت کا نام ہے جو انسانی قلب پر اس طرح طاری ہو کہ وہ (قلب) دنیا سے بیزار، اور آخرت کی طرف راغب ومتوجہ رہے! گویا زہد کا مدار اس بات پر نہیں ہے کہ انسان کا قالب یعنی جسم وبدن دنیا کی جائز ومباح چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے یا نہیں کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے اس (زہد) کے معاملہ میں یہ دونوں برابر ہوں یعنی ایک شخص جسمانی طور پر خوش پوشاک وخوش خوارک ہونے کے باوجود قلبی طور پر ہمہ وقت آخرت کی طرف

متوجہ و راغب رہ سکتا ہے اور ایک شخص جسمانی طور پر خوش پوشاکی و خوش خوراکی سے بیزار رہتے ہوئے بھی قلبی طور پر آخرت کی طرف زیادہ متوجہ و راغب نہیں رہ سکتا، اگرچہ لباس کی بے حیثیتی و سادگی اور کھانے کی بدمزگی، سلوک و طریقت کی راہ میں بندے کی استقامت واستواری پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ حاصل یہ کہ جو سالک جسمانی طور پر تو دنیا سے اجتناب کرے لیکن اس کے دل میں دنیا کی محبت جاگزیں ہو تو یہ چیز اس کے لئے نہایت مہلک اور تباہ کن ہے، اس کے برخلاف اگر وہ جسمانی طور پر تو دنیا کی جائز و مباح نعمتوں اور لذتوں سے فائدہ اٹھائے، مگر اس کا دل دنیا کی محبت سے خالی اور آخرت کی طرف متوجہ ہو تو یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہے۔

جاننا چاہئے کہ دل کی مثال کشتی کی سی ہے کہ اگر پانی کشتی کے اندر آجائے تو وہ نہ صرف کشتی بلکہ اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی ڈبو دیتا ہے، لیکن وہی پانی جب اسی کشتی کے باہر اور اس کے گرد رہتا ہے تو اس (کشتی) کو رواں کرتا ہے اور منزل تک پہنچاتا ہے! اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا ہے نعم المال الصالح للرجل الصالح اور اسی وجہ سے صوفیاء کی ایک جماعت کے بارے میں منقول ہے کہ وہ حضرات اسی طرح کا لباس پہنا کرتے تھے جیسا کہ عام طور پر رائج تھا بلکہ بعض نے تو امیروں اور رئیسوں جیسا لباس بھی پہنا ہے تاکہ ان کے باطنی احوال کا انکشاف نہ ہو۔

(۱۶) وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ الْحُسَيْنِ قَالَ سَمِعْتُ مَالِكًا وَسُئِلَ اَىُّ شَيْءٍ اَلزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا قَالَ طِيْبُ الْكَسْبِ وَقِصَرُ الْاَمَلِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت زید ابن حسین (جو حضرت امام مالک کے رفقاء اور مصاحبین میں سے تھے) کہتے ہیں میں نے حضرت امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا جب کہ ان سے پوچھا گیا کہ دنیا سے زہد اختیار کرنا کس چیز کا نام ہے؟ انہوں نے فرمایا۔ "حلال کمائی اور آرزوؤں کی کمی، کا نام زہد ہے۔" (بیہقی)

تشریح: "کسب" یہاں "مکسوب" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی کھانے پینے کی وہ چیزیں جو حلال و پاکیزہ ہوں! حاصل یہ کہ "زہد" اس چیز کا نام نہیں ہے کہ انسان ان چیزوں کو بھی کھانے پینے اور ان سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھانے سے پرہیز کرے جو اس کے حق میں حلال و پاکیزہ ہیں، کیونکہ اگر ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا "زہد" کے منافی اور غیر مستحسن ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں سے یہ نہ فرماتا کہ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اور نہ اہل ایمان کو یہ حکم دیا جاتا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ! بلکہ "زہد" یہ ہے کہ انسان کو جائز وسائل و ذرائع سے جو حلال پاکیزہ چیزیں حاصل ہوں ان سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھائے اور غیر حلال و غیر پاکیزہ چیزوں سے کلیۃً اجتناب کرے، اسی طرح ایک اور چیز، جس کا تعلق زہد سے ہے، یہ ہے کہ انسان آرزوؤں اور امیدوں کا اسیر بن کر کاہل و سست اور آخرت سے غافل نہ بن جائے بلکہ ہمہ وقت آخرت کی طرف متوجہ رہے اور زیادہ سے زیادہ اچھے عمل کرنے میں مشغول رہے تاکہ جس وقت بھی پیغام اجل آجائے، وہ اپنی جان، جاں آفرین کے سپرد کرنے پر اپنے کو بالکل تیار پائے، یہی وہ "زہد" جو شریعت کی نظر میں مطلوب ہے اور جو انسان کو عاقبت اندیش بناتا ہے اور آخرت کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔

اگر اس موقع پر ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ "زہد" سے حلال کمائی کا کیا تعلق؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ حضرت امام مالک نے اپنے اس قول کے ذریعہ اسی خیال کی تو تردید کی ہے "زہد" محض اس چیز کا نام ہے کہ دنیا سے بالکل بے تعلقی اور کنارہ کشی اختیار کرلی جائے، موٹا جھوٹا کپڑا پہنا جائے، اور روکھی سوکھی روٹی کھانے پر عمل پیرا رہا جائے! چنانچہ حضرت امام مالک نے اس بات کو بجا طور پر واضح فرمایا حقیقی زہد وہ نہیں ہے جس کو تم نے اپنے گمان میں جگہ دے رکھی ہے بلکہ زہد کی حقیقت یہ ہے کہ خدا تمہیں جائز ذریعوں سے جو کچھ حلال و پاکیزہ چیزیں عطا کرے ان کو کھاؤ پیو، ان سے فائدہ اٹھاؤ اور قدر ضرورت پر قناعت کرو نیز ضرورت سے زیادہ چیزوں کی امید و آرزو اور درازی عمر کی تمنا نہ رکھو، جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ "دنیا سے زہد اختیار کرنا اس چیز کا نام نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے لو اور اپنے مال و اسباب کو ضائع کر ڈالو، بلکہ زہد دراصل اس چیز کا نام ہے کہ جو چیز تمہارے ہاتھ میں ہے اس پر اس چیز سے زیادہ

اعتماد نہ کرو جو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

بَابُ اِسْتِحْبَابِ الْمَالِ وَالْعُمْرِ لِلطَّاعَةِ

خدا کی طاعت و عبادت کے لئے مال اور عمر سے محبّت رکھنے کا بیان

"استحباب" کے معنی ہیں، اچھا جاننا، پسند کرنا! "مال" کے معنی ہیں خواستہ، یعنی وہ چیز جس کی چاہ و خواہش رکھی جائے، اس کی جمع "اموال" ہے اور "مال" اصل میں "میل" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مائل ہونا، راغب ہونا! چنانچہ دھن دولت، اسباب و سامان اور جائداد وغیرہ کو "مال" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انسان ان چیزوں کی طرف طبعی طور پر رغبت و میلان رکھتا ہے! "عمر" کے معنی ہیں زندگی، زندہ رہنے کی مدت۔

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت کی خاطر، دین کی خدمت کے لئے اور اخروی فلاح و بہبود کے امور انجام دینے کی غرض سے مال و دولت کی خواہش و طلب اور درازی عمر کی آرزو رکھنا جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خدا کا پسندیدہ بندہ کون ہے؟

① عَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ ابْنِ عُمَرَ لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَيْنِ فِيْ بَابِ فَضَائِلِ الْقُرْاٰنِ۔

"حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، "یقیناً اللہ تعالیٰ اس بندے کو بہت پسند کرتا ہے جو متقی و غنی اور گوشہ نشین ہو۔" (مسلمؒ) اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت لاحسد الافی اثنین فضائل قرآن کے باب میں نقل کی جاچکی ہے۔"

تشریح: "متقی" اس شخص کو کہتے ہیں جو ممنوع چیزوں سے اجتناب کرے یا یہاں "متقی" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے مال و زر کو بڑے کاموں اور عیش و تفریح میں خرچ نہ کرے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ متقی سے مراد وہ شخص ہے جو حرام اور مشتبہ امور سے کلیۃً اجتناب کرے اور ان چیزوں سے بھی احتیاط و پرہیز کرے جن کا تعلق خواہشات نفس اور مباحات سے ہے! اور "غنی" سے مراد وہ شخص ہے جو مالدار و دولتمند ہو یا دل کا غنی ہو! لیکن اس حدیث کا یہاں اس باب میں نقل کرنا اس بات کو زیادہ ثابت کرتا ہے کہ "غنی" سے مراد وہی شخص ہے جو مال و دولت رکھتا ہو، اور یہ بات دل کے غنی ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ "غنا" کے باب میں وہی شخص اصل اور کامل ترین ہے جو ظاہری مال و دولت کے ساتھ دل کا غنا بھی رکھتا ہو اور جس کے ذریعہ ہاتھ کے غنا کا وہ تقاضا بھی پورا ہوتا ہے جو دنیا و آخرت میں مراتب و درجات کی بلندی کا باعث بنتا ہے اس صورت میں یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہاں "غنی" سے مراد اصل میں شکر گذار مالدار ہے! چنانچہ بعض حضرات نے اس حدیث سے یہی استدلال کیا ہے کہ شکر گذار مالدار، صبر اختیار کرنے والے فقیر و مفلس سے افضل ہے۔ اگرچہ یہ قول (کہ شاکر غنی، صابر فقیر سے افضل ہوتا ہے) اس قول کے خلاف ہے جس کو زیادہ صحیح اور قابل اعتماد قرار دیا گیا ہے (اور وہ یہ کہ صابر فقیر، شاکر غنی سے افضل ہوتا ہے) چنانچہ اس بارے میں تفصیلی بحث پیچھے گزر چکی ہے۔

"خفی" سے مراد یا تو گوشہ نشین ہے، یعنی وہ شخص جو سب سے ترک تعلق کے ذریعہ یکسوئی اور تنہائی اختیار کر کے اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہے، یا یہ کہ پوشیدہ طور پر خیر و بھلائی کرنے والا مراد ہے، یعنی وہ شخص کہ جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی و خوشنودی کے لئے نیک کاموں اور اپنے مال کو خرچ کرنے میں اس طرح رازداری اختیار کرے کہ کسی کو اس کا علم نہ ہو، اس صورت میں "خفی" کا

اطلاق مفلس و نادار شخص پر بھی ہو سکتا ہے، اور یہ دوسری مراد زیادہ واضح ہے ویسے یہ لفظ حائے مہملہ کے ساتھ یعنی "حفی" بھی روایت کیا گیا ہے جس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو حق کے معاملہ میں نرمی و مہربانی اور احسان کرے، لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ لفظ "خفی" ہے جس کی وضاحت پہلے کی گئی! واضح رہے کہ یہ حدیث ان لوگوں کی بھی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا، ان کے ساتھ میل جول اور ان کے درمیان رہن سہن رکھنے سے افضل ہے، لیکن جو حضرات، لوگوں کے ساتھ میل جول اور ان کے درمیان رہن کو ترک تعلق اور کنارہ کشی سے افضل قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ گوشہ نشینی کا افضل اور پسندیدہ ہونا اس صورت کے ساتھ خاص ہے جب کہ فتنوں کا زور ہو اور لوگوں کے ساتھ میل جول اور ان کے درمیان رہن سہن اختیار کرنے سے دین و آخرت کے معاملات پر برا اثر پڑتا ہو اور ایمان و عمل میں رخنہ اندازی ہوتی ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

درازیٔ عمر کی فضیلت حسن عمل پر منحصر ہے

(۲) عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَحَسُنَ عَمَلُہٗ قَالَ فَاَیُّ النَّاسِ شَرٌّ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَسَآءَ عَمَلُہٗ۔ (رواہ احمد والترمذی والدارمی)

"حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پوچھا، کہ یا رسول اللہ! کون سا آدمی بہتر ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص جس کی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں۔" پھر اس شخص نے پوچھا۔ "اور کون سا آدمی برا ہے؟" حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص جس کی عمر زیادہ ہو اور برے عمل ہوں۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: حدیث کے ظاہری اسلوب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ حکم اغلب کے اعتبار سے ہے یعنی اچھے یا برے عمل زیادہ ہوں گے تو وہ شخص یا برا قرار پائے گا اور اگر اچھے اور برے عمل دونوں برابر ہوں گے تو پھر وہ ایک وجہ سے تو اچھا کہلائے گا اور ایک وجہ سے برا، اگرچہ اس بات کا ثابت ہونا نادر ہے۔

اچھے اعمال کے ساتھ زیادتی عمر کی فضیلت

(۳) وَعَنْ عُبَیْدِ ابْنِ خَالِدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ آخٰی بَیْنَ رَجُلَیْنِ فَقُتِلَ اَحَدُھُمَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ مَاتَ الْاٰخَرُ بَعْدَہٗ بِجُمْعَۃٍ اَوْنَحْوِھَا فَصَلُّوْا عَلَیْہِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَاقُلْتُمْ قَالُوْا دَعَوْنَا اللّٰہَ اَنْ یَّغْفِرَ لَہٗ وَیَرْحَمَہٗ وَیُلْحِقَہٗ بِصَاحِبِہٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَیْنَ صَلٰوتُہٗ بَعْدَ صَلٰوتِہٖ وَعَمَلُہٗ بَعْدَ عَمَلِہٖ اَوْ قَالَ صِیَامُہٗ بَعْدَ صِیَامِہٖ لَمَا بَیْنَھُمَا اَبْعَدُ مِمَّا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبید ابن خالدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو شخصوں کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا تھا (یعنی ان دونوں کو جو صحابہؓ میں سے تھے، بھائی بھائی بنا دیا تھا) ان میں سے ایک شخص خدا کی راہ میں مارا گیا (یعنی جہاد میں شہید ہو گیا) اور اس کی شہادت کے ایک ہفتہ یا قریب ایک ہفتہ کے بعد دوسرا شخص بھی (صاحب فراش ہو کر) فوت ہو گیا۔ صحابہؓ نے اس شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور (جب وہ نماز جنازہ سے فارغ ہوئے تو) نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے مرحوم کی جو نماز جنازہ پڑھی ہے اس میں تم نے کیا پڑھا ہے اور کیا کہا ہے (یعنی تم نے نماز جنازہ میں مرحوم کے لئے کیا دعا کی ہے؟) صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ اس کے گناہ بخش دے، اس پر رحمت نازل کرے اور اس کو اس کے (شہید ہو جانے والے) ساتھی کے پاس (جنت کے اعلیٰ درجہ میں) پہنچا دے (جیسا کہ وہ دونوں اس دنیا میں اتفاق و اتحاد کے ساتھ اور یکجا رہتے تھے) نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا۔ "تو پھر اس کی وہ نماز کہاں گئی جو اس نے اپنے

ساتھی کی نماز کے بعد کے دنوں میں) پڑھی تھی، اور اس کے ان اعمال کا ثواب کہاں گیا جو اس نے اپنے ساتھی کے اعمال کے بعد (کے دنوں میں) کئے تھے۔ یا یہ فرمایا کہ "اس کے ان روزوں کا ثواب کہاں گیا جو اس نے اپنے اس ساتھی کے روزوں کے بعد (کے دنوں میں) رکھے تھے؟" (یعنی تم نے مرحوم کے حق میں جو یہ دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے اس بھائی و ساتھی کے پاس جنّت میں پہنچائے جو شہید ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے گمان میں اس شخص کا درجہ و مرتبہ اپنے اس شہید بھائی کے درجہ و مرتبہ سے کم ہے۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو پھر بتاؤ کہ اس مرحوم کی وہ نمازیں و روزے اور وہ دوسرے اچھے اعمال اور ان کا اجر و ثواب کہاں جائے گا جو اس نے اپنے بھائی کے انتقال کے بعد کے دنوں میں کئے ہیں، بلاشبہ جنّت کے اندر اور قرب الٰہی میں دو شخصوں کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ اس فاصلہ سے بھی زیادہ ہے جو زمین و آسمان کے درمیان ہے۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص اپنے ساتھی کی شہادت کے بعد جتنے زائد دنوں تک زندہ رہا اور ان دنوں میں اس نے جو عبادات و اعمال صالحہ کئے ان کی وجہ سے اس کا مرتبہ اپنے شہید بھائی و ساتھی کے مرتبہ سے بھی بلند ہو گیا ہے! اس موقعہ پر بجا طور پر یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ بعد میں وفات پانے والا مذکورہ شخص محض ان عبادات و اعمال کی وجہ سے کہ جو اس نے ایک ہفتہ کے دوران کئے تھے، اس شخص پر فضیلت کیسے پا سکتا ہے جو اس سے پہلے میدان جنگ میں شہید ہو گیا تھا اور جب کہ اس نے خدا کی راہ میں اور دین حق کی سربلندی کی خاطر شہادت کا درجہ پایا اور جام شہادت بھی اس نے اس زمانہ میں نوش کیا جب کہ رسول کریم ﷺ اس دنیا میں تشریف فرما تھے، اسلام اپنے ابتدائی زمانہ کے نہایت پر آشوب حالات سے گزر رہا تھا، اور دین کے مددگاروں کی کمی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس دوسرے شخص کو پہلے شخص (شہید) کے مقابلہ میں زیادہ افضل قرار دینا محض اس کے ان اعمال کی وجہ سے نہیں ہے جو اس نے اس ایک ہفتہ کے دوران کئے تھے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ وہ شخص بھی اسلامی لشکر ہی کا ایک فرد تھا اور خدا کی راہ میں مرابط کے فرائض انجام دیا کرتا تھا نیز میدان جنگ میں شہید ہونے کی صادق نیت رکھتا تھا، لہٰذا اس کی نیت کا یہ پھل اس کو ملا کہ اس کو گویا شہادت کا درجہ دیا گیا جس کی وجہ سے وہ اپنے ساتھی کا ہم مرتبہ ہو گیا اور پھر اس نے اس ساتھی کی شہادت کے بعد کے دنوں میں جو نیک اعمال کئے ان کی وجہ سے اس کا مرتبہ اور زیادہ بڑھ گیا۔

وہ چار آدمی جن کے حق میں دنیا بھلی یا بری ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ کَبْشَةَ الْاَنْمَارِیِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ثَلٰثٌ اُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ وَاُحَدِّثُكُمْ حَدِيْثًا فَاحْفَظُوْهُ فَاَمَّا الَّذِیْ اُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ فَاِنَّهٗ مَانَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ وَلَا ظُلِمَ عَبْدٌ مَظْلِمَةً صَبَرَ عَلَيْهَا اِلَّا زَادَهُ اللّٰهُ بِهَا عِزًّا وَلَا فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْئَلَةٍ اِلَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ وَاَمَّا الَّذِیْ اُحَدِّثُكُمْ فَاحْفَظُوْهُ فَقَالَ اِنَّمَا الدُّنْيَا لِاَرْبَعَةِ نَفَرٍ عَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَّعِلْمًا فَهُوَ يَتَّقِیْ فِيْهِ رَبَّهٗ وَيَصِلُ رَحِمَهٗ وَيَعْمَلُ لِلّٰهِ فِيْهِ بِحَقِّهٖ فَهٰذَا بِاَفْضَلِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ عِلْمًا وَّلَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ يَقُوْلُ لَوْاَنَّ لِیْ مَالًا لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَاَجْرُهُمَا سَوَآءٌ وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَّلَمْ يَرْزُقْهُ عِلْمًا فَهُوَ يَتَخَبَّطُ فِیْ مَالِهٖ بِغَيْرِ عِلْمٍ لَا يَتَّقِیْ فِيْهِ رَبَّهٗ وَلَا يَصِلُ فِيْهِ رَحِمَهٗ وَلَا يَعْمَلُ فِيْهِ بِحَقٍّ فَهٰذَا بِاَخْبَثِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٍ لَمْ يَرْزُقْهُ اللّٰهُ مَالًا وَّلَا عِلْمًا فَهُوَ يَقُوْلُ لَوْ اَنَّ لِیْ مَالًا لَعَمِلْتُ فِيْهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَهُوَ نِيَّتُهٗ وَوِزْرُهُمَا سَوَآءٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوکبشہ انماریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "تین باتیں ہیں جن کی حقانیت وصداقت پر میں قسم کھا سکتا ہوں، اور میں تم سے ایک بات کہتا ہوں (یعنی تمہارے سامنے اپنی ایک حدیث بیان کرتا ہوں) تم اس کو یاد رکھنا (اور اس پر عمل پیرا ہونا) پس وہ تین باتیں جن کی حقانیت وصداقت پر میں قسم کھا سکتا ہوں، یہ ہیں کہ بندہ کا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے

(صدقہ وخیرات) کی وجہ سے کم نہیں ہوتا (یعنی کسی بندہ کا اپنے مال کو خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے خرچ کرنا بظاہر تو اپنے مال کو کم کرنا اور گھٹانا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو کوئی نقصان اور گھاٹا نہیں ہوتا کیونکہ اس کا صدقہ وخیرات کرنا دنیاوی طور پر بھی اس کے مال و اسباب میں خیر و برکت کا موجب ہے اور آخرت میں بھی حصول ثواب کا ذریعہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز کثرت وزیادتی کے حکم میں ہوگی نہ کہ نقصان کے حکم میں۔

جس بندہ پر ظلم کیا جائے اور اس کا مال ناحق لے لیا جائے اور وہ بندہ اس ظلم وزیادتی پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتا ہے (یعنی اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا ہونا اگرچہ ظاہری طور پر اس کی ذلت کے مترادف ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ظلم وزیادتی پر صبر کرنے کی وجہ سے اللہ کے نزدیک اس بندہ کی عزت و مرتبہ بڑھ جاتا ہے جیسا کہ جو شخص ظلم کرتا ہے اس کے ظلم کی وجہ سے اللہ کے نزدیک اس کی ذلت بڑھ جاتی ہے، یا یہ مطلب ہے کہ ظلم وزیادتی کا شکار ہونے والا بندہ اگرچہ وقتی طور پر ذلت و کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر انجام کار اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کی عزت و مرتبہ کو بڑھا دیتا ہے جیسا کہ ظالم اگرچہ وقتی طور پر سربلند ہو جاتا ہے مگر آخر کار اپنے ظلم کی وجہ سے نہایت ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتا ہے اور دنیا والوں کی نظر میں بری طرح گر جاتا ہے اگرچہ وہ کتنی ہی طویل مدت کے بعد اس انجام بد کو کیوں نہ پہنچے، چنانچہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ قدرت کی کرشمہ سازی صورت حال کو اس طرح بدل دیتی ہے کہ ظالم ایک نہ ایک دن اپنی سربلندی کھو دیتا ہے اور کبھی زور آور ہونے کی وجہ سے جس شخص پر ظلم وزیادتی کیا کرتا تھا اپنے انجام کو پہنچ کر اسی مظلوم کا زیردست اور اس کے سامنے ذلیل و سرنگوں ہو جاتا ہے۔

اور جس بندہ نے اپنے نفس پر سوال کا دروازہ کھولا (یعنی ضرورت و حاجت کی وجہ سے نہیں بلکہ مال و دولت جمع کرنے اور خواہشات نفس کی تکمیل کے لئے لوگوں سے مانگنا شروع کر دے) اللہ تعالیٰ اس کے لئے فقر و افلاس کا دروازہ کھول دیتا ہے (یعنی اس کو طرح طرح کے احتیاج و افلاس میں مبتلا کر دیتا ہے یا اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اس کو بھی ختم کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نہایت خرابی میں پڑ جاتا ہے) اور رہی اس حدیث کی بات جس کو میں نے تمہیں سنانے کے لئے کہا تھا تو اب میں اس کو بیان کرتا ہوں (دھیان سے سنو اور) اس کو یاد رکھو، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دنیا بس چار آدمیوں کے لئے ہے (یعنی یہ دنیا اپنے مال و دولت کے احوال اور اپنی بھلائی برائی کے اعتبار سے چار طرح کے آدمیوں میں منحصر ہے) ایک تو وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و زر بھی عطا کیا اور علم کی دولت سے بھی نوازا (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے مال کو مصارف خیر میں خرچ کرنے کا طریقہ جانتا ہے اور اس کے اثرات و کیفیات سے بھی باخبر ہے) پس وہ بندہ اپنے مال و دولت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے (یعنی اس کو حرام و ناجائز اور ناپسندیدہ حق امور میں خرچ نہیں کرتا) اس کے ذریعہ اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرتا ہے اور اس مال و زر میں سے اس کے حق کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کرتا ہے (یعنی مال و دولت کے تئیں اللہ تعالیٰ نے جو حقوق متعین کئے وہ ان کو احکام خداوندی کی تکمیل کے لئے ادا کرتا ہے، مثلاً زکوٰۃ نکالتا ہے، صدقہ وخیرات کرتا ہے، مالی کفارات ادا کرتا ہے اور ضیافت ایمانداری میں خرچ کرتا ہے چنانچہ اس بندہ کا بہت بڑا اور کامل ترین مرتبہ ہے (یعنی وہ بندہ دنیا میں اچھے خصائل و احوال سے متصف قرار دیا جاتا ہے یا آخرت میں اعلیٰ مراتب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

دوسرا وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم تو عطا کیا (کہ جس کے ذریعہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مال کو کسی کام میں صرف کرنا خدا کی رضا و خوشنودی اور ہر طرح کے اجر و ثواب کا باعث ہے اور کس کام میں خرچ کرنا خدا کی ناراضگی اور ہر طرح کے خسران و عذاب کا سبب ہے) لیکن اس کو مال عنایت نہیں فرمایا پس وہ بندہ (اپنے علم کے سبب سچی نیت رکھتا ہے اور (حصول مال و دولت کی خواہش و آرزو رکھتے ہوئے) کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال اور روپیہ پیسہ ہوتا تو میں اس کے تئیں اچھے عمل کرتا جیسا کہ وہ فلاں شخص اپنے مال و زر کے بارے میں خدا سے ڈرتا ہے (یعنی جس طرح فلاں شخص کو خدا نے علم صادق کے ساتھ مال و دولت سے بھی سرفراز کیا ہے اور وہ اس مال کو خدا کی رضا و خوشنودی کی

خاطر اچھے کاموں میں خرچ کرے، (یعنی ادائیگی زکوٰۃ، اقرباء کے ساتھ حسن سلوک اور صدقہ وخیرات کے ذریعہ دنیا وآخرت کی سرخروئی حاصل کر رہا ہے، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس علم کے ساتھ مال ودولت بھی عطا فرماتا تو میں بھی اس شخص کی طرح اپنے مالک وزر کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سعادت حاصل کرتا) چنانچہ دونوں شخصوں کا ثواب برابر ہے (یعنی اگر پہلا شخص مالدار ہونے کی وجہ سے خدا کی راہ میں واقعتا اپنا مال خرچ کرتا ہے اور یہ دوسرا شخص مالدار نہ ہونے کی وجہ سے خدا کی راہ میں کچھ خرچ نہیں کرتا لیکن سچی نیت رکھنے کے سبب وہی اجر وثواب پاتا ہے جو پہلے شخص کو ملتا ہے) تیسرا بندہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہے لیکن علم نہیں دیا (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ خدا سے ڈرے اور اپنے مال کو حقوق کی ادائیگی میں خرچ کرے) پس وہ بندہ بے علم ہونے کی وجہ سے اپنے مال کے بارے میں بہک جاتا ہے (بایں طور کہ اول تو لالچ وحرص اور دنیا کی محبت کی وجہ سے بخل کرتا ہے کہ کسی بھی اچھے کام اور ادائیگی حقوق میں خرچ کرنے کا روادار نہیں ہوتا اور اگر کسی فلاحی، رفاہی کام یا کسی کی مدد واعانت میں کچھ خرچ بھی کرتا ہے تو مقصد محض نام ونمود اور اپنی بڑائی وثروت کا اظہار ہوتا ہے) وہ (اپنی بے عملی کے سبب) اس مال ودولت کے بارے میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا ہے (یعنی آمدنی کے ایسے وسائل وذرائع سے اجتناب واحتیاط نہیں کرتا جو حرام وناجائز اور مشتبہ ہوتے ہیں اور نہ ایسے امور میں اپنا مال خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے جو غیر شرعی اور ناپسندیدۂ حق ہیں) اور علم وتربیت کی کمی، نیز جذبۂ ترحم وہمدردی کے فقدان اور حرص وبخل کی کثرت کی وجہ سے) اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ مالی احسان وسلوک نہیں کرتا ہے اور نہ ان حقوق کی تعمیل کرتا ہے جو اس کے مال ودولت سے متعلق ہیں (یعنی نہ تو زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کے ذریعہ خدا کا حق ادا کرتا ہے اور نہ بندوں کے حقوق مطالبات کے ادائیگی کی پرواہ کرتا ہے، چنانچہ یہ بندہ بدترین مرتبہ کا ہے۔

اور چوتھا بندہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہ تو مال عطا کیا ہے اور نہ علم دیا ہے (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ خیر وشر کے درمیان تمیز کر سکے اور یہ پہچان کر سکے کہ میرے حق میں کون سی چیز بہتر ہے اور کون سی چیز بری) پس وہ بندہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال اور روپیہ پیسہ ہوتا تو میں بھی اس کو فلاں شخص کی طرح (برے کاموں میں) خرچ کرتا، چنانچہ یہ بندہ اپنی نیت کے سبب مغضوب ہے (یا یہ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے کہ پس یہ بندہ بری نیت رکھنے والا ہے) اور اس کا گناہ اس (تیسرے شخص) کے گناہ کے برابر ہے یعنی وہ تیسرا شخص اگرچہ اپنا مال برے کاموں میں خرچ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوتا ہے اور یہ (چوتھا) شخص مالدار نہ ہونے کی وجہ سے برے کاموں میں خرچ کرنے کا مرتکب نہیں ہوتا لیکن چونکہ برے کاموں میں خرچ کرنے کی نیت رکھتا ہے اس سبب سے اس کو بھی وہی گناہ ملتا ہے جو برے کاموں میں واقعتا خرچ کرنے والے کو ملتا ہے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: یہاں "نیت" کو "عزم" کے معنی پر محمول کرنا چاہئے، کیونکہ انسان گناہ کی محض خواہش ونیت پر نہیں بلکہ "عزم" پر ماخوذ ہوتا ہے اور اصطلاحی طور پر "عزم" اس کو کہتے ہیں کہ انسان کے دل میں کسی گناہ کے کرنے کا خیال وارادہ پیدا ہو اور وہ اس خیال وارادہ کو پورا کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑے لیکن خارجی طور پر کوئی ایسا مانع حائل ہو جس کی وجہ سے وہ اس گناہ کے کرنے اور اس تک پہنچنے پر قادر نہ ہو، کہ اگر وہ مانع باقی نہ رہے اور اس کو قدرت حاصل ہو جائے تو وہ بلا توقف اس گناہ کو کر ڈالے، مثلاً اگر کوئی شخص زنا کرنا چاہے اور وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل میں اس حد تک سعی وکوشش کرے گا کہ اگر کوئی خارجی چیز اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کرے تو وہ بے جھجک اور بلا توقف زنا میں مبتلا ہو جائے تو اس کی اس خواہش وارادہ کا اتنا پختہ (باعمی ہونا "عزم" کہلائے گا اور وہ اس عزم پر ماخوذ ہوگا اور اس کو خدا کی نظر میں گنہگار قرار دیا جائے گا کیونکہ "عزم" اگرچہ واقعۃً زنا نہیں ہے لیکن جس طرح زنا ایک گناہ ہے اسی طرح زنا کا عزم بھی ایک مستقل گناہ ہے! اس موقع پر زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس سلسلہ کی پوری بحث کو مختصر طور پر بیان کر دیا جائے، چنانچہ جاننا چاہئے کہ اول تو وسوسۂ شیطان ہے، یعنی بغیر کسی کسب وارادہ کے دل میں کسی گناہ کا خیال خود بخود آجائے اور گزر جائے، جمے نہیں، اس کو "ہاجس" کہا جاتا ہے اور ہاجس پر کوئی مواخذہ نہیں! لیکن اگر وہ خیال دل میں بیٹھ جائے اور طبیعت کے اندر جولانی وگردش کرنے لگے تو اس کو

"خاطر" کہتے ہیں، خاطر بھی اس اُمت کے حق میں مرفوع اور قابل معافی قرار دیا گیا ہے۔ اس پر کوئی مواخذہ نہیں اور یہ اس اُمت کے خصائص میں سے ہے! اس کے بعد "ہم" کا نمبر آتا ہے، "ہم" یہ ہے کہ گناہ کا وہ خیال دل میں اس طرح بیٹھ جائے کہ اس گناہ کے قصد وارادہ اور نیت کی صورت اختیار کر لے۔ حسنات (نیکیوں) میں تو "ہم" کا اعتبار کیا جاتا ہے کہ کسی نیکی کی محض نیت اور اس کا قصد وارادہ پوری نیکی کے مترادف قرار دیا جاتا ہے لیکن سیئات (گناہوں) کے معاملہ میں محض نیت اور ارادہ کا اعتبار نہیں ہوتا! اس کے بعد "عزم" ہے جس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یہ عزم قابل مواخذہ ہے۔

حدیث کے اس جملہ ویعمل للہ فیہ بحقہ میں فِیْهِ کی ضمیر حضرت شیخ عبدالحق نے تو مال کی طرف لوٹائی ہے (جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے) لیکن ملا علی قاری نے فِیْهِ کی ضمیر، مال کے بجائے، علم کی طرف لوٹائی ہے، اس صورت میں اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ "اور وہ شخص اس علم کے تعلق سے اور اس کے حق کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لئے کام کرتا ہے بایں طور کہ اس علم پر عمل کر کے اور حقوق اللہ وحقوق العباد ادا کر کے اس علم کا حق ادا کرتا ہے! تاہم ملا علی قاری نے ابن مالک کی طرف منسوب کر کے یہ قول بھی لکھا ہے کہ فِیْهِ کی ضمیر مال کی طرف راجع ہے! چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، نیز حضرت شیخ نے لفظ یتخبط کے یہ معنی لکھے ہیں کہ وہ شخص (کہ جس کو صرف مال عطا ہوتا ہے علم حاصل نہیں ہوتا) اپنی بے علمی اور بدعقلی کی وجہ سے اپنے مال ودولت کے معاملہ میں کوئی صحیح راہ اختیار نہیں کر پاتا، اور اچھے اور برے مصارف کے درمیان تمیز نہ کر پانے کی وجہ سے اس کو ادھر ادھر خرچ کرتا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا مال زیادہ تر ان کاموں میں خرچ ہوتا ہے جو غیر شرعی اور ناپسندیدہ حق ہوتے ہیں! چنانچہ مابعد کے الفاظ لا یتقی فیہ ربہ سے یہی بات واضح ہوتی ہے۔" لیکن ملا علی قاری نے اس جملہ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ۔ "وہ شخص مال ودولت کے حصول میں سخت بے اعتدالی کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ ہر وقت بس پیسہ کمانے اور دولت جمع کرنے کے چکر میں رہتا ہے اس کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا اور ہر حرکت وسکون کا واحد محور حصول زر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ اس مال ودولت کے تئیں طرح طرح کے احوال میں مبتلا ہوتا ہے کہ کبھی تو اس کو ادھر ادھر بے دریغ خرچ کرتا ہے اور کبھی اس طرح بخل وخست کرتا ہے کہ بنیادی ضروریات اور ادائیگی حقوق میں خرچ کرنے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔"

نیکی کی توفیق اور حسن خاتمہ

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی اِذَا اَرَادَ بِعَبْدٍ خَیْرًا اِسْتَعْمَلَهٗ فَقِیْلَ وَکَیْفَ یَسْتَعْمِلُهٗ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ یُوَفِّقُهٗ لِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ جب بندہ کی بھلائی (یعنی اس کے حسن انجام) کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے بھلائی کے کام کراتا ہے۔" پوچھا گیا کہ، یارسول اللہ، اس سے بھلائی کے کام اللہ تعالیٰ کس طرح کرتا ہے؟" فرمایا "موت سے پہلے اس کو نیک کام کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس بندہ پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہو جاتا ہے اس کو موت سے پہلے توبہ وانابت اور طاعت وعبادت کی توفیق خداوندی عطا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ حسن انجام اور خاتمہ بخیر کی سعادت پالیتا ہے۔

یہ حدیث گویا زندہ رہنے کی فضیلت واہمیت کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ زندگی ہی ہے جس میں انسان آخرت کی بھلائی وکامیابی کے لئے کچھ کما سکتا ہے۔

دانا شخص وہی ہے جو خواہشات نفس کو احکام الٰہی کے تابع کر دے

⑥ وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ

وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَ تَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عقلمند و بہادر شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو (اللہ تعالیٰ کے حکم و فیصلہ، تقدیر و قضا اور اس کی رضا خوشنودی کے تئیں) جھکادے اور (فرمان الٰہی کا) مطیع و فرمانبردار بنادے اور اس اجر و ثواب کے لئے (اچھے) عمل کرے جو موت کے بعد پائے گا۔ نیز احمق و نادان اور بزدل شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کا تابع بنادے (یعنی نفس جن حرام و مشتبہ چیزوں اور دنیاوی لذات و مرغوبات کا خواہشمند ہو، ان کو اختیار کرکے گویا اپنے آپ کو خواہش نفس کا اسیر بنادے) اور (گناہوں میں مبتلا ہونے، فرمان حق کے خلاف چلنے، عمل خیر اور توبہ و استغفار کی راہ اختیار نہ کرنے کے باوجود) اللہ تعالیٰ سے (اس بات کا متمنی اور آرزومند ہو (کہ وہ اس سے راضی ہو، اس کو بخش دے اور اس کو جنت میں داخل کرے۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: نوویؒ نے لکھا ہے کہ امام ترمذیؒ اور دیگر علماء و محدثین نے وضاحت کی ہے من دان نفسه دراصل حاسبها کے مفہوم میں ہے یعنی عقلمند و بہادر وہ شخص ہے جو اپنی دنیاوی زندگی میں اپنے قول و فعل اور اپنی حالت کا خود احتساب کرے، پس اگر وہ دیکھے کہ اس کے اعمال و احوال اور کردار و گفتار پر نیکیوں کا غلبہ ہے تو خدا کا شکر ادا کرے اور اگر اس کو برائیوں کا غلبہ معلوم ہو تو توبہ و انابت کے ذریعہ اپنی حالت سدھارنے کی طرف متوجہ ہو، برائیوں کا ازالہ کرے اور پچھلی زندگی میں جو عبادات و اعمال صالحہ فوت ہوگئے ہیں ان کا تدارک کرے قبل اس کے کہ آخرت کے سخت عذاب و مواخذہ میں گرفتار کیا جائے۔ چنانچہ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا یعنی اپنے نفس کا احساب کرو قبل اس کے کہ (آخرت میں) تمہارا محاسبہ کیا جائے! اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ لِغَدٍ یعنی نفس کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے کل (آخرت) کے لئے آگے کیا بھیجا ہے۔

حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ دانا مؤمن وہ ہے جو اپنے اندر اتنی طاقت و مضبوطی رکھے کہ اس کا نفس اپنی خواہشات کے فریب میں مبتلا نہ کرسکے، اور نادان مؤمن وہ ہے جو اس درجہ کمزور و ناتواں ہو کہ اس کا نفس اس کو اپنی خواہشات کا اسیر بنالے، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ گناہ و معصیت کی راہ کو ترک نہ کرنا، توبہ و استغفار اور عمل خیر کے ذریعہ اپنی زندگی کو پاکیزہ نہ بنانا اور خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف چلنا اور پھر امید یہ (رکھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دروزے کھول دے گا اور دین و دنیا کی فلاح و کامیابی سے نوازے گا نیز زبان سے یہ کہتے رہنا کہ میرا رب تو بڑا کریم و رحیم ہے، وہ مجھے بخش ہی دے گا اور جنت میں پہنچادے گا دراصل نفس کا ایک ایسا فریب ہے جس کے ذریعہ شیطان گمراہی سے نکلنے نہیں دینا چاہتا! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مَاغَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ اور فرمایا نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ایک موقع پر یوں واضح فرمایا کہ اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ اور فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰهِ۔ ان آیتوں کا حاصل یہی ہے کہ عمل تو نہ کرنا، برائی کے راستہ کو تو نہ چھوڑنا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہونا لاحاصل ہے امید ھار استہ بس یہی ہے کہ برائی کے راستہ کو چھوڑ دیا جائے، اعتقادی و عملی زندگی کو دینی و اخروی پاکیزگی و سلامتی کے سانچے میں ڈھال دیا جائے اور ہر عمل خیر کی راہ میں کوئی تقصیر و کوتاہی نہ کی جائے، اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار بھی رہے اور اس کے عذاب سے ڈرتا بھی رہے تو اس صورت میں رحمت خداوندی کا استحقاق نصیب ہوسکتا ہے۔

حضرت شیخ ابن عباد شاذلیؒ نے لکھا ہے کہ عارف باللہ علماء نے وضاحت کی ہے کہ خدا کی رحمت کے تئیں وہ جھوٹی امید کہ جس پر ناروا اعتماد کرکے انسان عمل و عبادت کی راہ ترک کردے اور وہ امید اس کو گناہ و معصیت کی زندگی کا بیباک راہرو بنادے، حقیقت میں امید نہیں ہے بلکہ نفس کا فریب آرزو اور شیطان کا دھوکا ہے۔

حضرت معروف کرخیؒ فرماتے ہیں۔ "عمل کے بغیر جنت کی طلب گناہوں میں سے ایک گناہ ہے (خدا ترسی و پاکیزگی عمل کا" ذریعہ و تعلق اختیار کئے بغیر شفاعت کی امید فریب کی ایک قسم ہے، اور اس ذات کی رحمت کا امیدوار ہونا کہ جس کی اطاعت و فرمانبرداری نہ

کرے بڑی جہالت و حماقت ہے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ "خدا کے بندو! ان باطل آرزوؤں اور جھوٹی امیدوں سے دور رہو جو حماقت کی وادی ہے اور جس میں لوگ گرے ہوئے ہیں، خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو محض اس کی آرزوؤں کے سہارے نہ دنیا میں کامیابی و کامرانی سے نوازا ہے اور نہ آخرت کی خیر و فلاح کا مستحق گردانا ہے۔

حضرت عمرو بن منصورؒ نے اپنے متعلقین میں سے ایک شخص کو لکھا تھا۔ "نادان! تم اپنی عمر کی درازی کے آرزومند ہو، اور اللہ تعالیٰ سے اس بات کے امیدوار ہو کہ وہ تمہاری بدعملیوں کے باوجود تمہیں اپنی رحمت سے نوازے؟ ہوش میں آؤ، یہ کیا ٹھنڈا لوہا کوٹنے کی سعی میں مصروف ہو؟۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

خدا ترس لوگوں کے لئے دولت بری چیز نہیں

⑦ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنَّا فِيْ مَجْلِسٍ فَطَلَعَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى رَاْسِهٖ اَثَرُ مَآءٍ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَرَاكَ طَيِّبَ النَّفْسِ قَالَ اَجَلْ قَالَ ثُمَّ خَاضَ الْقَوْمُ فِيْ ذِكْرِ الْغِنٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا بَاْسَ بِالْغِنٰى لِمَنِ اتَّقَى اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَالصِّحَّةُ لِمَنِ اتَّقٰى خَيْرٌ مِنَ الْغِنٰى وَطِيْبُ النَّفْسِ مِنَ النَّعِيْمِ۔ (رواہ احمد)

"نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص کہتے ہیں کہ ہم لوگ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول کریم ﷺ آکر ہمارے درمیان تشریف فرما ہوگئے، اس وقت آپ ﷺ کے سر مبارک پر (غسل کے) پانی کی تری تھی، ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس وقت ہم آپ ﷺ کو بہت خوش دل و شادماں دیکھ رہے ہیں (جس کے آثار چہرہ اقدس پر نمایاں ہیں۔)" حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں!" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد اہل مجلس دولتمندی کے ذکر میں مشغول ہوگئے (یعنی آپس میں یہ گفتگو کرنے لگے کہ مالداری و دولتمندی اچھی چیز ہے یا بری چیز!) رسول کریم ﷺ نے (ہماری یہ گفتگو سن کر فرمایا "اس شخص کا دولت مند ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور (جسم کی) صحت مندی، خدا سے ڈرنے والے (یعنی متقی و پرہیزگار) شخص کے لئے دولت مندی سے زیادہ بہتر ہے (اگرچہ وہ صحت مندی فقر و افلاس کے ساتھ کیوں نہ ہو) نیز شادمانی و خوش دلی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے (جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا واجب ہے اور اس کے بارے میں قیامت کے دن بندہ سے سوال ہوگا، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ۔" (احمدؒ)

مال و دولت مؤمن کی ڈھال ہے

⑧ وَعَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ قَالَ كَانَ الْمَالُ فِيْمَا مَضٰى يُكْرَهُ فَاَمَّا الْيَوْمَ فَهُوَ تُرْسُ الْمُؤْمِنِ وَقَالَ لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَا هٰؤُلَاءِ الْمُلُوْكُ وَقَالَ مَنْ كَانَ فِيْ يَدِهٖ مِنْ هٰذِهٖ شَيْءٌ فَلْيُصْلِحْهُ فَاِنَّهٗ زَمَانٌ اِنِ احْتَاجَ كَانَ اَوَّلَ مَنْ يَّبْذُلُ دِيْنَهٗ وَقَالَ الْحَلَالُ لَا يَحْتَمِلُ السَّرَفَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں مال کو برا سمجھا جاتا تھا (کیونکہ اس زمانہ کے لوگوں میں زہد و قناعت بہت زیادہ تھی، علاوہ ازیں اس وقت کے بادشاہوں اور حاکموں کی طرف سے اپنی رعایا کی بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کا خاص انتظام ہوتا تھا اور لوگ بلا کسی سعی و کوشش کے اور بغیر کسی الجھن و پریشانی کے گھر بیٹھے قوت لایموت حاصل کر لیتے تھے، نیز اس سلسلے میں ان بادشاہوں اور حاکموں کے کسی

تعالیٰ ور ویہ سے اپنے تئیں کوئی ذلت و خواری بھی محسوس نہیں کرتے تھے اس لئے روپیہ پیسہ کمانے اور مال و دولت حاصل کرنے کو برا سمجھا جاتا تھا، لیکن جہاں تک اس زمانہ کا تعلق ہے تو اب مال و دولت مسلمانوں کی ڈھال ہے (کیونکہ آج کل کے لوگوں میں زہد و قناعت کے جذبات مضمحل ہو گئے ہیں اور ضروریات زندگی کی احتیاج کا بہت زیادہ غلبہ ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں اب سلاطین و امراء اور حکومتوں کی طرف سے لوگوں کی کفالت کا کوئی نظم بھی باقی نہیں رہا ہے نتیجہ کے طور پر اگر کوئی شخص کسب و محنت کر کے مال حاصل نہ کرے تو اس کو اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے ان لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے جو مالی و اخلاقی مدد و اعانت سے زیادہ ذلیل و خوار کرتے ہیں پس اس صورت میں حلال مال مؤمن کے لئے بہت بڑی ڈھال ہے جس کے ذریعہ وہ نہ صرف حرام و مشتبہ معاملات میں پڑنے سے بچتا ہے بلکہ دنیادار امراء اور ظالموں کی مصاحبت و حاشیہ نشینی کی ذلت و خواری سے بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے! حضرت سفیانؒ نے یہ بھی فرمایا کہ "اگر (ہم لوگوں کے پاس) یہ درہم و دینار اور روپیہ پیسہ نہ ہوتا تو یہ (آج کل کے) سلاطین و امراء ہمیں ذلیل و پامال کر ڈالتے" نیز انہوں نے فرمایا "کسی شخص کے پاس اگر تھوڑا بہت بھی مال ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کی اصلاح کرے (یعنی اس تھوڑے سے مال کو یوں ہی ضائع نہ ہونے دے بلکہ تدبیر و ہنر مندی کے ساتھ اس کو کسی تجارت وغیرہ میں لگا کر بڑھانے کی سعی کرے یا یہ کہ اس کو بہت کفایت و قناعت کے ساتھ خرچ کرے تاکہ جلدی ختم نہ ہو جائے) کیونکہ ہمارا یہ زمانہ ایسا ہے کہ اس میں اگر کوئی محتاج و مفلس ہو گا تو (دنیا حاصل کرنے کی خاطر) اپنے دین کو اپنے ہاتھ سے گنوانے والا سب سے پہلے شخص وہی ہو گا" حضرت سفیانؒ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ "حلال مال، اسراف کا روادار نہیں ہوتا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: حضرت سفیانؒ کے آخری قول کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص محنت و مشقت برداشت کر کے اور جائز وسائل و ذرائع سے جو کچھ کماتا ہے وہ بڑا پاکیزہ مال ہوتا ہے، لہٰذا اس کو چاہئے کہ وہ اپنے اس حلال و پاکیزہ مال کو فضول خرچیوں میں ضائع نہ کرے بلکہ کفایت شعاری اور احتیاط کے ساتھ خرچ کرے، اور تھوڑا بہت پس انداز کرنے کی کوشش بھی کرے اور اس کی حفاظت کرے تاکہ وہ کسی فوری ضرورت کے وقت کسی کا محتاج نہ رہے اور قلبی اطمینان و استغناء کی وجہ سے اپنے دین کی سلامتی حاصل رہے۔ یا اس قول کے یہ معنی ہیں کہ محنت و مشقت اور جائز وسائل و ذرائع سے کمایا ہوا مال اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ اس کو فضول خرچیوں میں ضائع کیا جا سکے۔ بلکہ وہ بہت تھوڑا اور مختصر ہوتا ہے کہ جائز ضروریات زندگی کو بھی مشکل ہی سے پورا کر پاتا ہے۔

ساٹھ سال کی عمر، بڑی عمر ہے

(۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَادِيْ مُنَادٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَيْنَ اَبْنَآءُ السِّتِّيْنَ وَهُوَ الْعُمُرُ الَّذِيْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اعلان کرنے والا (فرشتہ) قیامت کے دن (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) یہ اعلان کرے گا کہ ساٹھ سال کی عمر والے لوگ کہاں ہیں (یعنی دنیا میں جن لوگوں نے ساٹھ سال کی عمر پائی، وہ اپنی عمر کا حساب دینے کے لئے اپنے آپ کو پیش کریں اور یہ عمر، وہ عمر ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: کیا ہم نے تم کو ایسی عمر نہیں دی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرے حالانکہ تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آیا۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ڈرانے والا" سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات یعنی قرآن مجید اور اس کے رسول ہیں، یا پھر اس سے مراد بڑھاپا اور موت ہیں، حاصل یہ کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اتنی طویل عمر عطا کی ہو اور آخرت کی طرف متوجہ ہونے کے اتنے زیادہ مواقع نصیب کئے ہوں وہ شخص اگر عقل و دانش سے کام لے کر اپنی آخرت کی بھلائی و کامیابی کے لئے کچھ نہ کر سکے اور عمر کا اتنا طویل عرصہ یوں ہی گنوا

کر اس دنیا سے چلا جائے تو اس سے زیادہ احمق و نادان اور اس سے زیادہ بدنصیب اور کون ہو سکتا ہے! لہٰذا ایسے شخص کو قیامت کے دن سخت جواب دہی کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہاں کوئی اور عذر خواہی اس کے کام نہیں آئے گی۔

حسن عمل کے ساتھ عمر کی زیادتی درجات کی بلندی کا باعث ہے

(۱۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ شَدَّادٍ قَالَ اِنَّ نَفَرًا مِنْ بَنِیْ عُذْرَةَ ثَلٰثَةً اَتَوُا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَسْلَمُوْا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ یَکْفِیْنِیْهِمْ قَالَ طَلْحَةُ اَنَا وَکَانُوْا عِنْدَهٗ فَبَعَثَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَعْثًا فَخَرَجَ فِیْهِ اَحَدُهُمْ فَاسْتُشْهِدَ ثُمَّ بَعَثَ بَعْثًا فَخَرَجَ فِیْهِ الْاٰخَرُ فَاسْتُشْهِدَ ثُمَّ مَاتَ الثَّالِثُ عَلٰی فِرَاشِهٖ قَالَ قَالَ طَلْحَةُ فَرَاَیْتُ هٰؤُلَاءِ الثَّلٰثَةَ فِی الْجَنَّةِ وَرَاَیْتُ الْمَیِّتَ عَلٰی فِرَاشِهٖ اَمَامَهُمْ وَالَّذِی اسْتُشْهِدَ اٰخِرًا یَلِیْهِ وَاَوَّلُهُمْ یَلِیْهِ فَدَخَلَنِیْ مِنْ ذٰلِكَ فَذَکَرْتُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذٰلِكَ فَقَالَ وَمَا اَنْکَرْتَ مِنْ ذٰلِكَ لَیْسَ اَحَدٌ اَفْضَلَ عِنْدَاللّٰهِ مِنْ مُّؤْمِنٍ یُعَمَّرُ فِی الْاِسْلَامِ لِتَسْبِیْحِهٖ وَتَکْبِیْرِهٖ وَتَهْلِیْلِهٖ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن شداد کہتے ہیں، بنی عذرہ کے قبیلہ کے کچھ لوگ کہ جن کی تعداد تین تھی، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا (اور پھر وہ لوگ حصول دین کی خاطر اور خدا کی راہ میں ریاضت و مجاہدہ کی نیت سے حضور ﷺ کے پاس ٹھہر گئے، ان کی مالی حالت چونکہ بہت خستہ تھی اور وہ ضروریات زندگی کی کفالت خود کرنے پر قادر نہیں تھے لہٰذا) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کون ہے جو ان لوگوں کی خبر گیری کے سلسلے میں مجھے بے فکر کر دے؟ (یعنی آپ ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص ایسا ہے جو ان لوگوں کی ضروریات زندگی کی کفالت اور ان کی خبر گیری و دلداری کی ذمہ داری برداشت کر سکے، تاکہ مجھے ان کا خبر گیراں بننے کی ضرورت نہ رہے اور میں ان کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں؟) حضرت طلحہؓ نے عرض کیا کہ میں اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں! چنانچہ وہ تینوں حضرت طلحہؓ کے پاس رہنے لگے! (کچھ دنوں کے بعد) جب نبی کریم ﷺ نے کسی طرح ایک لشکر بھیجا تو اس (لشکر) کے ساتھ ان تینوں میں سے بھی ایک شخص گیا اور میدان جنگ میں (دشمنوں سے لڑتا ہوا) شہید ہو گیا، اس کے بعد حضور ﷺ نے ایک اور لشکر بھیجا، اس کے ساتھ دوسرا شخص گیا اور وہ بھی شہید ہو گیا اور پھر تیسرا شخص اپنے بستر پر اللہ کو پیارا ہو گیا (اور یہ شخص اگرچہ میدان جنگ میں شہید ہونے کا موقع نہیں پا سکا لیکن مرابط ضرور تھا، اور میدان جنگ میں دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کی نیت بھی رکھتا تھا) راوی کہتے ہیں کہ حضرت طلحہؓ نے بیان کیا کہ (ان تینوں میں سے دو کی شہادت اور ایک کی قدرتی موت کے بعد ایک دن خواب میں) میں نے دیکھا کہ وہ تینوں جنت میں ہیں، نیز میں نے دیکھا کہ جو شخص اپنے بستر پر اللہ کو پیارا ہوا تھا وہ سب سے آگے ہے اور جو شخص دوسرے لشکر کے ساتھ جا کر شہید ہوا تھا، سب سے آخر میں ہے، چنانچہ (ان تینوں کو اس طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے دیکھ کر) میرے دل میں خلجان پیدا ہو گیا (کہ قاعدہ کے مطابق تو سب سے آگے اور نمایاں اس شخص کو ہونا چاہئے تھا جو پہلے خدا کی راہ میں شہید ہوا تھا، یا یہ کہ دونوں شہید ایک ساتھ برابر ہوتے کیونکہ دونوں شہید ہونے کی حیثیت سے یکساں مرتبہ کے مستحق تھے اور جو شخص اپنے بستر پر فوت ہوا تھا اس کو سب سے آخر میں ہونا چاہئے تھا، لیکن میں نے ان تینوں کو جس ترتیب کے ساتھ دیکھا وہ میرے لئے بڑی تعجب انگیز اور شک و شبہ میں مبتلا کرنے والی تھی) چنانچہ میں نے نبی کریم ﷺ سے اپنے اس خواب کا ذکر کیا! حضور ﷺ نے (وہ خواب اور اس پر میرا ردعمل سن کر) فرمایا۔ "تو پھر اس میں تمہارے شک و شبہ اور انکار کی باعث کون سی چیز ہے؟ (تم نے اپنے خواب میں ان تینوں کو جس ترتیب کے ساتھ دیکھا ہے وہ بالکل موزوں ہے) کیونکہ اللہ کے نزدیک اس مسلمان سے زیادہ افضل کوئی نہیں ہے جس نے اسلام کی حالت میں زیادہ عمر پائی اور اس کی وجہ سے اس کو خدا کی تسبیح و تکبیر اور تہلیل (اور دیگر تمام مالی و بدنی عبادتوں) کا زیادہ موقع ملا۔"

تشریح: ظاہر ہے کہ جس شخص نے بعد میں شہادت پائی اس کی عمر پہلے شہید ہونے والے کی عمر سے زائد ٹھہری، اور جب اس کی عمر زیادہ

ہوئی تو اس کے اچھے عمل بھی زیادہ ہوئے، لہٰذا پہلے شہید ہونے والے شخص سے اس کا افضل و برتر ہونا کسی شک و شبہ کا محل نہیں ہو سکتا، رہی اس شخص کی بات جو اپنے دونوں ساتھیوں کے بعد اپنے بستر پر فوت ہوا تو اس کی عمر گویا ان دونوں سے زائد ہوئی اور اسی اعتبار سے اس کے عمل بھی ان دونوں کے عمل سے زیادہ ہوئے، اس لئے وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے کہ جو اگرچہ میدان جنگ میں شہید ہوئے تھے زیادہ افضل قرار پایا، لیکن اس کے بارے میں وہی توجیہہ مدنظر رہنی چاہئے جو دوسری فصل میں حضرت عبید ابن خالدؓ کی روایت کی تشریح میں بیان کی جا چکی ہے جس کی طرف یہاں بھی ترجمہ کے دوران بین القوسین اشارہ کر دیا گیا ہے کہ وہ شخص گو شہادت نہیں پا سکا تھا مگر مرابط ہونے اور جہاد کرنے کی صادق نیت رکھنے کی وجہ سے شہیدی کے مرتبہ کا حامل قرار دیا گیا۔

عبادت گزار زندگی کی اہمیت

(۱۱) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِیْ عُمَیْرَةَ وَكَانَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ عَبْدًا لَوْ خَرَّ عَلٰی وَجْهِهٖ مِنْ يَّوْمِ وُلِدَ اِلٰی اَنْ يَّمُوْتَ هَرِمًا فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ لَحَقَّرَهٗ فِیْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَوَدَّ اَنَّهٗ رُدَّ اِلَی الدُّنْيَا كَيْمَا يَزْدَادَ مِنَ الْاَجْرِ وَالثَّوَابِ۔ رَوَاهُمَا اَحْمَدُ۔

"اور حضرت محمد ابن ابو عمیرہؓ جو رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی بندہ اپنی پیدائش کے وقت سے، بڑھاپے میں مرنے تک (اپنی پوری اور طویل زندگی کے دوران) صرف خدا کی طاعت و عبادت میں سرنگوں رہے تو وہ بھی اس (قیامت کے) دن (عمل کا ثواب دیکھ کر) اپنی اس تمام طاعت و عبادت کو بہت کم جانے گا اور یہ آرزو کرے گا کہ کاش اس کو دنیا میں پھر بھیج دیا جائے تا کہ اس کا اجر و ثواب زیادہ ہو جائے" (ان دونوں روایتوں کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے)۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عمر کا طویل ہونا خدا کی بہت بڑی نعمت ہے بشرطیکہ اس لمبی عمر کو یوں ہی ضائع نہ کر دیا جائے بلکہ اس کو خدا کی اطاعت و عبادت، دین کی خدمت اور اچھے کاموں میں صرف کیا جائے! لہٰذا عمر جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر اعمال صالحہ بھی زیادہ ہوں گے اور اعمال صالحہ جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب بھی حاصل ہوگا جو قیامت کے دن سب سے بڑا سرمایہ ہوگا۔

چنانچہ عبادت گزار زندگی کی اسی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی شخص اس دنیا میں پیدا ہوتے ہی، یا یہ کہ بالغ ہوتے ہی خدا کی طاعت و عبادت میں مصروف ہو جائے اور بڑھاپے کی عمر میں پہنچ کر وفات پانے کے وقت تک بس سجدہ و نماز ہی میں منہ کے بل پڑا رہے اور اس کی زندگی کا کوئی بھی لمحہ دنیاوی کام میں صرف نہ ہو تو وہ شخص بھی قیامت کے دن طاعت و عبادت اور اعمال صالحہ کے اجر و ثواب کی فضیلت و اہمیت دیکھ کر اپنی اس طویل عمر کی تمام طاعات و عبادات کو بہت کم جانے گا اور یہی آرزو کرے گا کہ کاش! مجھے طاعت و عبادت اور اچھے اعمال کرنے کا ارادہ اور موقع مل جائے اور مجھے دنیا میں واپس کر دیا جائے تا کہ میں وہاں زیادہ سے زیادہ عمل کر سکوں اور زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب لے کر یہاں آؤں۔

بَابُ التَّوَكُّلِ وَالصَّبْرِ

توکل اور صبر کا بیان

لغت میں وَكَلَ اُوْكُوْلُ کا لفظ آتا ہے جس کے معنی ہیں سونپ دینا، سپرد کر دینا، کسی پر بھروسہ کر کے کام چھوڑ دینا اس کا اسم وَكَالَتْ اور وِكَالَتْ ہے، اسی لفظ سے تَوَكُّلْ نکلا ہے جس کے معنی اپنے عجز و بیچارگی کو ظاہر کرنے اور دوسرے پر اعتماد و بھروسہ کرنے کے ہیں، اس کا اسم تُكْلَانْ ہے! اصطلاح شریعت میں توکل اس کو کہتے ہیں کہ بندہ اپنے معاملہ و کام کو خدا کے سپرد کر دے اپنی تدبیر و سعی کو ترک کر

دے اور اپنی ذاتی طاقت وقدرت سے بے پرواہ ہو کر تقدیر اور رضائے الٰہی پر کامل اعتماد کرے، یعنی اس بات پر یقین رکھے کہ اپنی تدبیرو سعی اور ذاتی طاقت وقدرت، خدا کی مشیت اور اس کے فیصلہ کو بدل نہیں سکتی، قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ جو لکھا ہی نہیں گیا وہ رونما نہیں ہو سکتا۔

یوں تو توکل کا تعلق تمام امور اور معاملات پر ہوتا ہے۔ لیکن اکثر اس کا استعمال رزق کے بارے میں ہوتا ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ توکل کا جو اصل مفہوم ہے وہ اس بات پر اعتماد و بھروسہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے رزق کا ضامن ہے۔ حصول معاش کے لئے جائز و حلال ظاہری وسائل و ذرائع کو ترک کرنا گو توکل کے صحیح ہونے کی شرط نہیں ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اصل اعتماد و بھروسہ ان وسائل و ذرائع پر نہ ہو۔ چنانچہ توکل کا تعلق اصل میں دل سے ہے اگر دل میں حق تعالیٰ کے ضامن ہونے کا یقین جاگزین ہو گیا تو توکل کا مفہوم پورا ہو جائے گا۔ گویا اعضاء عمل کو معطل کر دینا اور ہاتھ پاؤں ڈال کر اپاہج بن جانا توکل کے صحیح ہونے کے لئے لازم نہیں ہو گا اور نہ حصول معاش کے لئے ظاہری تدبیر دستی کرنا اس کے منافی ہو گا۔ رہی یہ بات کہ بعض زاہدان طریقت اور درویش صفت طالبان معرفت حصول معاش کے ظاہری اسباب و وسائل کو ترک کر دیتے ہیں تو ان کا وہ عمل محض ایک استثنائی حیثیت رکھتا ہے اور اس بات سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مقام توکل ثابت ہو جائے نفس زیادہ سے زیادہ ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے اور نظر امید اسباب و ذرائع سے منقطع ہو جائے، نیز اس امر پر کامل یقین حاصل ہو جائے کہ ظاہری اسباب و ذرائع رزق پہنچنے کے لئے شرط کا درجہ نہیں رکھتے۔

بعض حضرات نے توکل کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ بندہ کا حق اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر اعتماد و یقین کے سبب حصول معاش کے اسباب و ذرائع اور کسب و عمل کی پابندیوں سے مطلق آزاد ہو جانا! لیکن یہ توکل کا وہ مقام ہے جو ابتدائی حالت میں اختیار کیا جاتا ہے یا "آزاد" ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ بندہ ان اسباب و وسائل اور کسب و عمل کے ساتھ ہر طرح کا قلبی تعلق و اعتماد ختم کر دے یعنی اپنے دل میں یہ خیال بھی نہ پیدا ہونے دے کہ ظاہری اسباب و وسائل اور کسب و عمل، رزق پہنچنے کے لئے حقیقی مؤثر و مسبب ہیں، چنانچہ جو بندہ توکل کے آخری مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے اور اس مقام کا منتہی ہوتا ہے اس کا اسباب و وسائل اور کسب و عمل کو اختیار کرنا، اس کے حق میں توکل کے منافی نہیں ہوتا، اس کو خدا کی رزاقیت پر کامل یقین و اعتماد اس وقت بھی حاصل رہتا ہے جب وہ اپنی روزی کے لئے اسباب و وسائل اور کسب و عمل میں مشغول ہوتا ہے اور اس وقت بھی اس کے اس یقین و اعتماد میں ذرہ برابر بھی رخنہ نہیں پڑتا جب وہ ان چیزوں کو بالکل ترک کر دیتا ہے، مثلاً اگر وہ (منتہی) کھجور کا پودا لگائے اور خرق عادت کے طور پر (یعنی خلاف عادت) وہ پودا اسی لمحہ بار آور ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت صناعی پر اس کا یقین و اعتماد اس صورت میں، اور اس صورت میں کہ کھجور کا پودا وہ، عادت و محمول کے مطابق کئی سال کے بعد پھل لائے یکساں ہوتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے دنیاوی اسباب و وسائل کے ذریعہ اور ظاہری عوامل و مسببات کی تربیت کے ساتھ وجود پذیر ہوتی ہے تو اس صورت میں صانع کی کمال قدرت کا مشاہدہ زیادہ یقین و اعتماد اور زیادہ پر تاثیر انداز میں ہوتا ہے کیونکہ اسباب کے بغیر یعنی خرق عادت کے طور پر جو چیز سامنے آتی ہے اس میں محض وہی ایک فعل ہوتا ہے، جب کہ ظاہری اسباب و وسائل کے ذریعہ ظاہر ہونے والی چیز کتنے ہی مضبوط و مربوط افعال و حالات اور کتنے ہی محکم احکام و قوانین قدرت کا مظہر ہوتی ہے، علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی مد نظر رہنی چاہئے کہ اسباب و وسائل کو ترک کر دینا گویا، ان چیزوں کو معطل و بیکار بنا دینا ہے جن کو حق تعالیٰ نے انسان ہی کے لئے پیدا کیا ہے اور جن کو اختیار کرنا منشاء قدرت کے خلاف نہیں ہے۔

عنوان باب کا دوسرا جزء "صبر" ہے لغت میں "صبر" کے معنی ہیں رکنا، منع کرنا، نفس کو کسی چیز سے باز رکھنا، فارسی میں اس کو شکیبائی کہتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں صبر اس کو کہتے ہیں کہ نیکی اور برائی کے درمیان کشمکش کے وقت اپنے نفس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ نیکی کو اختیار کرے اور برائی سے باز رہے۔ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ فرماتے ہیں کہ صبر کا مفہوم ہے "ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ حظوظ نفس کے جال سے باہر آنا، اور نفس کو اس کی محبوب و مرغوب چیزوں سے باز رکھنے پر کاربند رہنا"۔

عوارف میں لکھا ہے کہ "صبر" کی جو اقسام ہیں ان میں سب سے اعلیٰ قسم وہ صبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے تئیں کیا جائے بایں طور کہ اس کی طرف متوجہ و انابت، صدق و اخلاص کے ساتھ ہو، اس کی ذات و صفات اور کمال قدرت میں استغراق و مراقبہ دوائی ہو، اور نفس کی تمام خواہشات و خیالات کو یکسر منقطع کر دیا جائے۔ نیز بیان کیا کہ۔ "صبر" فرض بھی ہے اور نفل بھی، فرض صبر تو وہی ہے جو فرائض کی ادائیگی اور حرام چیزوں کے ترک کرنے پر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور نفل صبر کی جو صورتیں ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں۔ ① فقرو افلاس اور شدائد و آلام پر صبر کرنا۔ ② کوئی صدمہ و تکلیف پہنچنے پر صبر کرنا۔ ③ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کو چھپانا۔ ④ شکوہ و شکایت سے اجتناب کرنا۔ ⑤ باطنی احوال و کرامات کو چھپانا۔ واضح رہے کہ فرض اور نفل دونوں طرح صبر کی بہت اقسام اور صورتیں ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ بہت ہیں جو صبر کی تمام ہی اقسام پر عامل و کاربند نہیں رہ سکتے جیسا کہ بیان کیا گیا، اگرچہ صبر کی بہت اقسام ہیں اور ان کا اطلاق بہت سی صورتوں پر ہوتا ہے مگر عام طور پر اس کا اطلاق خصوصیت سے مصائب و آفات اور ناگوار و ناپسندیدہ امور کو انگیز کرنے پر ہوتا ہے، جیسا کہ "شکر" ایک وسیع المفہوم لفظ ہے اور اپنے اطلاق کے اعتبار سے اس کی بہت سی قسمیں ہیں مگر خاص طور پر اس کا استعمال حصول نعمت و رزق کی صورت میں ہوتا ہے۔

توکل اور صبر کے بارے میں کچھ مفید باتیں

جاننا چاہئے کہ جو چیزیں انسان کے لئے عبادت خداوندی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں ان میں سب سے سخت رکاوٹ معاشی زندگی کے تفکرات یعنی کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی کی فراہمی کا فکر و خیال ہے، ظاہر ہے کہ انسان کا نفس اپنے وجود و بقاء کے لئے جن چیزوں کا محتاج ہے ان کی طرف اس کا رجحان اور مطالبہ ایک فطری تقاضا ہے، چنانچہ وہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ میں ہر چیز سے باز آیا، زہد و تقویٰ بھی اختیار کیا، دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھتا، لیکن ان چیزوں کا کیا علاج کروں جو میرے وجود و بقا کے لئے ضروری ہیں۔ جیسے کھانا پینا اور لباس وغیرہ! اور یہ بھی بالکل ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں یوں ہی حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے حصول کے لئے کسب و عمل، جہد و سعی اور لوگوں کے ساتھ ربط و ضبط اور میل جول اختیار کرنا ضروری ہے پس شریعت نفس کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے وہ سب سے یقینی راہ دکھاتی ہے جس کو توکل کہا جاتا ہے، کیونکہ توکل بذات خود وہ واحد قوی ذریعہ ہے جس پر اگر انسان صدق و اخلاص کے ساتھ عامل ہو جائے تو خدا کی طرف سے ضروریات زندگی کی تکمیل خود بخود ہونے لگتی ہے اور اس راہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے نہ صرف نفس کی تشویش رفع ہو جاتی ہے بلکہ کمال ایمان کا درجہ بھی نصیب ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف توکل کو ترک کر دینے والا نہایت سخت تفکرات و اوہام میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ اس کو سکون و اطمینان کے ساتھ طاعت و عبادات کا موقع نصیب ہوتا ہے اور نہ اس اطاعت و عبادت میں حلاوت و لذت نصیب ہوتی ہے، اور روزی کا فکر و غم اس کو اس طرح پراگندہ خاطر اور پریشان حال بنا دیتا ہے کہ وہ کوئی بھی نیک عمل یقینی قوت و حالت کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا، لہٰذا توکل کی راہ اختیار کرنا ہر شخص کے لئے لازمی امر ہے کہ اس کے بغیر وہ اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کی طاقت نہیں رکھ سکتا، جیسا کہ ایک طویل حدیث میں جو آگے آئے گی فرمایا گیا ہے کہ۔ جو شخص اس بات کو پسند کرے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ قوی ہو تو اس کو چاہئے کہ توکل کی راہ اختیار کرے۔" اور توکل کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے تمام امور کا وکیل اور اپنی بھلائی و بہتری کا ضامن جان کر بس اسی پر اعتماد و بھروسہ کرے اور جانے کہ اللہ تعالیٰ نے قسمت میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ہرگز معدوم نہیں ہوگا اور حکم الٰہی کسی بھی حالت میں ادل بدل نہیں سکتا، خواہ بندہ مانگے یا نہ مانگے، نیز اس بات پر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی روزی کا ضامن ہے، جب کہ اس نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی ضرور دے گا، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اور اس بات پر بھی قسم کھائی کہ۔ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ۔

پس غور کرنے کا مقام ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے وعدہ کی صداقت کے جزو ایمان ہونے کا اعتقاد

رکھتا ہے اگر وہ اس کے ضامن ہونے پر اعتماد نہ رکھے اور اس کے وعدہ پر باور نہ کرے تو اس کا ایمان کہاں رہے گا اور وہ کس طرح خدا کا بندہ کہلانے کا مستحق قرار پائے گا۔ ہر مؤمن کو چاہئے کہ وہ دنیا، دنیا کے مال و اسباب اور کسب و عمل کو محض حصول رزق کا ایک ظاہری وسیلہ و بہانہ اور سبب سمجھے، اس سے زیادہ اور کچھ نہ جانے، اور یہ یقین رکھے کہ حقیقی رزاق صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ اتنی بڑی قدرت کا مالک ہے کہ اس کے نزدیک ظاہری وسائل و اسباب کی چنداں اہمیت نہیں ہے وہ توکل و اعتماد کرنے والوں کو بے سبب و وسیلہ، اور بلا کسب و عمل بھی روزی پہنچاتا ہے، جیسا کہ فرمایا وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اسی طرح حصول معاش کے لئے وسائل و ذرائع کو اختیار کرنے اور کسب و عمل میں مشغول ہونے کو بھی خدا کی طرف سے مقرر کردہ نظام کائنات کا ایک سلسلہ اور رزق پہنچنے کا ایک ظاہری سبب جانے اس پر دل سے اعتماد و بھروسہ نہ کرے، اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اطمینان رکھے اور جانے کہ اگر کوئی کسب و عمل نہ کروں گا تو بھی اللہ تعالیٰ روزی پہنچائے گا، یہ توکل کا کم سے کم درجہ ہے جو ایمان کے لئے ضروری ہے اور عام مسلمانوں کا مرتبہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اس سے اعلیٰ درجہ تسلیم ہے، یعنی بندہ کا اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر دینا، خدا کے علم پر کفایت کرنا اور اپنے دل میں کسی بھی طرح کا کوئی رد و بدل نہ رکھنا یہ اولیاء اللہ کا مرتبہ ہے اور وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے۔

ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ حصول معاش کے لئے اسباب و ذرائع اختیار کرنا اور کسب و عمل میں مشغول ہونا توکل کے منافی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسباب و ذرائع اور کسب و عمل بھی نظام قدرت کا ایک حصہ ہے اور خدا کی طرف سے ایک حد تک انسان کو ان چیزوں کا مکلف بھی قرار دیا گیا ہے، البتہ جو چیز توکل کے منافی ہے۔ وہ بس یہ ہے کہ حصول معاش کے ظاہری، اسباب و ذرائع اور کسب و عمل پر دل سے اعتماد نہ کیا جائے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ رزق پہنچنے کا حقیقی سبب یہی چیزیں ہیں اگر انسان کوئی کسب و عمل نہ کرے اور محض خدا پر توکل کر کے بیٹھ جائے تو اس کو رزق پہنچ ہی نہیں سکتا، یہ عقیدہ و خیال ایمان کے منافی ہے اور اس کو شرک خفی کہا گیا ہے، لہٰذا جو شخص اسباب و ذرائع کو اختیار کرے اور کسب و عمل میں مشغول ہو لیکن اس کے دل کا اعتماد صرف خدا پر ہو تو وہ شخص بھی یقیناً متوکلین میں سے ہوگا، اگرچہ توکل کا اعلیٰ درجہ یہی ہے کہ بندہ اپنے ہاتھ پاؤں کو تمام اسباب و ذرائع سے دور رکھے اپنے تمام معاملات میں اللہ ہی پر اعتماد کرے اور اپنے تمام امور اسی کے سپرد کرے بشرطیکہ ہر حالت میں خواہ تنگی ہو یا فراخی، قوت ایمان کے سبب اللہ پر اس کا کامل اعتماد یکساں رہے، غیر اللہ سے امید منقطع رکھے اور اس راہ میں جو بھی رنج و مصیبت پیش آئے اس کو صبر و رضا کے ساتھ برداشت کر کے ریاضت و مجاہدہ اور عبادت میں مشغول ہو رہے اور جو شخص ان امور پر پوری طرح قادر نہ ہو سکے تو ان کے حق میں افضل یہی ہوگا کہ وہ دل سے خدا پر اعتماد رکھتے ہوئے ظاہری اسباب و ذرائع کو اختیار کرے اور کسب و عمل میں مشغول ہو۔ اسی طرح محض کسل و سستی اور عار کی وجہ سے یا بطور ریا ہاتھ پاؤں کو معطل کر دینا اور کسب و عمل سے باز رہنا قطعاً روا نہیں ہے کیونکہ اکثر انبیاء اور اولیاء کا یہی معمول رہا ہے کہ انہوں نے حصول معاش کے لئے ظاہری اسباب و ذرائع کو اختیار کیا اور کسب و عمل سے باز نہیں رہے کہ جو شخص کسب و عمل کی وجہ سے اپنی دینی زندگی میں کوئی نقصان اور اپنے باطنی احوال میں رخنہ پڑتا ہوا دیکھے تو اس کے لئے بہر صورت یہی ضروری ہوگا کہ وہ سب چیزوں سے تعلق منقطع کر کے بس ذکر و فکر اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے تاکہ واصل بحق ہو۔

متوکل کو ایسے کام و ذریعہ سے باز رہنا کہ جس کے بغیر کار برآری قطعاً ممکن نہ ہو اور سنت اللہ اسی کے مطابق جاری ہو، ہرگز روا نہیں ہے بلکہ حرام ہے، مثلاً کھانا ہاتھ کے ذریعہ کھایا جاتا ہے اور سنت اللہ اس کے مطابق جاری ہے کہ جو شخص، کوئی چیز کھانا چاہے اس کو ہاتھ سے اٹھا کر منہ میں ڈالے، اب اگر کوئی شخص متوکل یہ گمان کرے کہ اس چیز کو کھانے کے لئے ہاتھ کا ذریعہ اختیار کرنا توکل کے منافی ہے اور اس امید میں بیٹھا رہے کہ یہ چیز خود بخود (اٹھ کر منہ میں جائے گی تو کھاؤں گا، یہ توکل نہیں ہے بلکہ اس کو محض جنون و حماقت سے تعبیر کیا جائے گا، ایسے امور میں توکل کی کارفرمائی کی بس حد یہ ہے کہ یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانا اسی لئے پیدا کیا ہے کہ اس کو کھایا جائے، سب

کا خالق و رزاق بھی وہی ہے اور یہ ہاتھ اس (عمل) کھانے کا سبب وذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کیا ہے، بس ہاتھ کو کھانے کا ظاہری ذریعہ جان کر کھانے کے لئے استعمال کرے، لیکن دل سے اس پر اعتماد نہ کرے اور یہ جانے کہ جن لوگوں کے ہاتھ نہیں ہوتے ان کے کام بھی بہرحال سرانجام پاتے ہیں، جہاں تک کسی ایسے کام کا تعلق ہے کہ جس کی انجام دہی کا ذریعہ اگرچہ ہاتھ ہی ہے لیکن وہ ایسا قطعی ذریعہ نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام انجام ہی نہ پاسکتا ہو جیسے سفر کے دوران خرچ اور زاد راہ تھامنا وغیرہ، تو ایسی صورت میں ہاتھوں کو بطور ذریعہ استعمال کرنے سے باز رہنا روا ہو سکتا ہے کیونکہ ایسا ممکن اور کثیر الوقوع ہے کہ جو لوگ خرچ اور زاد راہ لے کر نہیں چلتے ان کا سفر بھی پورا ہو ہی جاتا ہے، تاہم واضح رہے کہ زاد راہ اور سفر خرچ لے کر چلنا توکل کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ جب کہ اصل اعتماد و بھروسہ خدا پر ہو نہ کہ اس زاد راہ اور سفر خرچ پر، بلکہ بقدر ضرورت سفر خرچ اور زاد راہ لے کر چلنا سُنّت ہے اور سلف کے معمولات سے بھی ثابت ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد بھروسہ کے سبب سفر خرچ اور زاد راہ وغیرہ نہ لینا تو متوکلین کے اعلیٰ درجات میں سے ہے۔

جو شخص عیالدار ہو اور اس کے اہل و عیال حالات کی تنگی پر صبر نہ کر سکتے ہوں، اور وہ اس بات کی اجازت نہ دیتے ہوں کہ وہ شخص توکل کے سبب کوئی کسب و عمل نہ کرے اور ذرائع سے اجتناب کرے۔

اپنے اہل و عیال کے لئے ایک سال تک کا اور اپنی ذات کے لئے چالیس روز تک کا بقدر ضرورت غذائی ضروریات کا سامان اکٹھا بھروا کر رکھ لینا توکل کے منافی نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص ازراہ توکل غذائی ضروریات کی چیزیں پہلے سے بھروا کر نہ رکھے اور سب کچھ ترک کر دے بشرطیکہ اللہ پر اس کا پورا اعتماد و اطمینان ہو تو یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے وہ اعلیٰ درجہ کا حامل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ حاصل کرنے کے لئے بڑی زبردست قوت اور ہمت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا جس شخص کو اتنی قوت و ہمت میسر نہ ہو اور اگر وہ غذائی ضروریات کا سامان اکٹھا بھروا کر نہ رکھنے کی صورت میں طاعت و عبادت میں اطمینان و سکون اور دل جمعی حاصل نہ کر سکتا ہو تو اس کے لئے یہی افضل ہوگا کہ وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی غذائی ضروریات کے لئے غلہ وغیرہ اکٹھا بھروا کر رکھ لے۔

رنج و پریشانی اور بیماری کا گلہ شکوہ نہ کرنا اور جو شخص طبیب و معالج نہ ہو اس کے سامنے بلاضرورت اپنے مرض کو ظاہر نہ کرنا توکل کے لئے شرط ہے۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ توکل اسی شخص کو راست آتا ہے جو توحید آشنا اور زہد صفت ہو! اس موقع پر توحید سے مراد یہ ہے کہ بندہ یہ جانے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہیں اور جانے کہ سب کا حقیقی محرک و عامل بس حق تعالیٰ ہے، اس کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں ہے جس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی جنبش نہ کر سکے، اور جہاں بھی جو کچھ بھی آتا جاتا ہے سب کا منبع و مصدر اسی ذات واحد کی مرضی و مشیت ہے، جس شخص کے دل پر یہ بات غالب آجائے گی اس کو بے اختیار توکل حاصل ہو جائے گا۔

یہ تو توکل کے بارے میں کچھ باتیں ہوئیں، اب "صبر" کے بارے میں جاننا چاہئے کہ صبر ایک ایسی راہ ہے جس کو اختیار کئے بغیر کسی مؤمن کے لئے کوئی چارہ نہیں ہے، کیونکہ ایمان کی سلامتی اور عبادت میں اطمینان و سکون کے ساتھ مشغولیت کا انحصار "صبر" ہی پر ہے! اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دنیا، اہل ایمان کے لئے آفات و مصائب اور رنج و آلام کے ایک گھرونده کے سوا اور کچھ نہیں، مؤمن کی زندگی کا وہ کون سا لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کو کسی نہ کسی طرح کی جسمانی اور روحانی اذیت و پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہو؟ لہٰذا اس صورت میں ہر مؤمن پر واجب ہے کہ وہ صبر کی راہ اختیار کرے تاکہ اس کا ایمان بھی سلامت رہے اور طاعت و عبادت میں بھی اطمینان و سکون کے ساتھ مشغول رہ سکے، کیونکہ دل گرفتگی رنج خوری جزع وفزع اور تاسف و حسرت کے عالم میں عبادت پورے کیف و نشاط کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتی، علاوہ ازیں صبر کرنے والے کو دنیا و آخرت کی بے شمار بھلائیاں اور سعادتیں عطا کرنے کا بھی وعدہ کیا گیا ہے، مثلاً دشمنوں، اور مخالفوں کے مقابلہ پر اور دیگر مہمات میں فتح و کامرانی نصیب ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ

لِلْمُتَّقِیْنَ دوسرے صبر کی وجہ سے بندہ اپنی مراد کو پہنچتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا تیسرے صبر و استقامت کی راہ پر چل کر لوگوں کی قیادت و امامت کا درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ فرمایا! وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا چوتھے صبر کرنے والا بندہ حق تعالیٰ کی طرف سے تعریف و توصیف سے نوازا جاتا ہے جیسا کہ فرمایا اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ پانچویں صابر بندوں کو بشارت دینے کا حکم فرمایا گیا ہے جیسا کہ فرمایا وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ چھٹے صبر کرنے والے بندوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے جیسا کہ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ساتویں جو بندے صبر کرتے ہیں وہ جنّت میں بلند تر درجات پائیں گے جیسا کہ فرمایا اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا آٹھویں، صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام کا اعزاز و شرف عطا ہوا ہے جیسا کہ فرمایا سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ اور نویں یہ کہ بندے صبر کرتے ہیں اور وہ بے حساب اور بے انتہا اجر و ثواب سے نوازے جائیں گے جیسا کہ فرمایا اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔

پس صبر اتنی بڑی فضیلت اور اتنا عظیم وصف ہے کہ اس پر کاربند رہنے کی ہر مؤمن کو کوشش کرنا چاہئے۔ اور اس کے حاصل کرنے کو نہایت اہم اور غنیمت جاننا چاہئے! اور "صبر" اصل میں یہ ہے کہ اپنے نفس کو جزع سے روکا جائے اور "جزع" اس کو کہتے ہیں کہ جب کوئی سخت حالت اور آفت و پریشانی پیش آئے تو اس پر اضطراب و گھبراہٹ کا اظہار کیا جائے اپنے عجز کا رونا رویا جائے۔

اور اس سختی و پریشانی سے بطریق قطع وحکم گلو خلاصی کا ارادہ کیا جائے! لہٰذا ان چیزوں کو ترک کرنا صبر کہلاتا ہے۔

صبر کا وصف حاصل کرنے کا نہایت مفید اور نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی ایسی صورت حال پیش آئے کہ جس کی وجہ سے نفس اضطراب و بے قراری میں مبتلا ہونے لگے۔ اور طبعی طور پر رنج و اذیت محسوس ہو تو یہ سوچنا چاہئے کہ جو کچھ قسمت میں لکھا ہوا ہے وہ ہر حال میں پورا ہو کر رہے گا، اس کی وجہ سے جزع و فزع کرنا اور رونا، دھونا، شکوہ و شکایت کرنا ایک قطعی لاحاصل چیز ہے کہ ان باتوں سے اس صورت حال میں کوئی تغیر و تبدل، کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی، علاوہ ازیں صبر کا جو ثواب تلف ہوتا ہے وہ مزید نقصان ہے۔

یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اپنی حیثیت و حالت کے اعتبار سے صبر کی چار قسمیں ہیں ایک تو صبر وہ ہے جو نفس کو طاعت و عبادت کی استقامت و پابندی کی محنت و مشقت برداشت کرنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، دوسرا وہ صبر ہے جو گناہوں سے اجتناب کرنے کی صورت میں اختیار کیا جائے، تیسرا وہ صبر ہے جو دنیا کی زائد از ضرورت چیزوں سے قطع تعلق کر لینے کی صورت میں اختیار کیا جائے اور چوتھا صبر وہ ہے جو کسی دینی و دنیاوی آفت و مصیبت اور سختی و پریشانی کو برداشت کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جو شخص صبر کی ان چاروں قسموں کو اختیار کرلے وہ طاعت و عبادت کی راہ پر سکون و استقامت کے ساتھ گامزن رہے گا، گناہوں سے محفوظ و مامون رہے گا، دنیا کی آفات و بلیات سے سلامتی اور آخرت کے عذاب سے نجات پائے گا، علاوہ ازیں، بہت زیادہ اجر و ثواب سے نوازا جائے گا، اور جو شخص مذکورہ بالا صورتوں میں صبر کو اختیار نہیں کرے گا اور جزع و فزع کی راہ پکڑے گا وہ تمام نعمتوں سے محروم رہے گا اور اول تو وہ دل جمعی اور اطمینان و سکون کے ساتھ عبادت نہیں کر سکے گا اور کچھ اگر کرے گا بھی تو بے صبری کے گناہ اس کو کالعدم کر دیں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

توکل اختیار کرنے والوں کی فضیلت

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِیْ سَبْعُوْنَ اَلْفًا بِغَیْرِ حِسَابٍ هُمُ الَّذِیْنَ لَا یَسْتَرْقُوْنَ وَلَا یَتَطَیَّرُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری اُمت میں سے ستر ہزار لوگ بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے جو منتر نہیں کراتے، شگون بد نہیں لیتے ہیں اور (اپنے تمام امور میں جن کا تعلق خواہ کسی چیز کو اختیار کرنے سے ہو یا اس کو چھوڑنے سے) صرف

اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ستر ہزار کی تعداد سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو مستقل بالذات بغیر حساب جنّت میں داخل ہوں گے اس تعداد میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو ان ستر ہزار لوگوں کے متبعین کی حیثیت سے ان کے ساتھ جنّت میں جائیں گے!! یہ وضاحت اس لئے کی گئی ہے تاکہ یہ روایت اس روایت کے منافی نہ رہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بے حساب جنّت میں جانے والے ان لوگوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ان کے ستر ستر ہزار متبعین بھی ہوں گے۔

"منتر نہیں کراتے" میں منتر سے مراد یا تو مطلق جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا وغیرہ ہے۔ یا اس سے وہ منتر اور ٹونا ٹوٹکا مراد ہے جو کلمات قرآنیہ، ادعیہ ماثورہ اور اسماء الٰہی کے بغیر ہوں۔ اسی طرح "شگون بد نہیں لیتے" سے مراد یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی طرح پرندوں کے اڑ جانے اور آواز وغیرہ سن کر ان سے شگون بد نہیں لیتے ہیں بلکہ یوں گویا ہوتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ لَا طَیْرَ اِلَّا طَیْرُكَ وَلَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُكَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُكَ اَللّٰھُمَّ لَا یَاْتِیْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا یَذْھَبُ بِالسَّیِّئَاتِ اِلَّا اَنْتَ۔

صاحب نہایہ نے کہا ہے کہ مذکورہ بالا اوصاف اولیائے کاملین کی خصوصیات میں سے ہیں کہ وہ پاک نفس لوگ دنیا کے اسباب و وسائل اور ان کے متعلقات سے بے اعتنائی برتتے ہیں اور دنیا سے تعلق رکھنے والے کسی بھی چیز کی طرف مائل و ملتفت نہیں ہوتے اور یہی درجہ ہے جو خواص کے لئے مخصوص ہے اور اس درجہ تک عوام کی رسائی نہیں ہوتی لیکن جہاں تک ان (عوام) کا تعلق ہے تو ان کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ حلال اسباب و ذرائع کو اختیار کریں اور دوا وغیرہ کے ذریعہ علاج معالجہ کرائیں، البتہ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ جو شخص کسی بیماری وغیرہ کی مصیبت میں مبتلا ہو اور وہ اس پر صبر کرے پھر دعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشائش و راحت کا منتظر و متمنی رہے تو یقیناً وہ شخص اولیاء و خواص میں سے شمار ہونے کا مستحق ہو گا اور جو شخص اس پر صبر کرنے پر قادر نہ ہو اور وہ اس بیماری و مصیبت سے گلو خلاصی پانے کے ظاہری اسباب و ذرائع اختیار کرنا چاہے تو اس کو اس بات کی اجازت دے دی جائے گی کہ وہ دعا تعویذ اور دوا وغیرہ کے ذریعہ اپنی اس بیماری و مصیبت کے دفعیہ کی سعی کرے۔

حاصل یہ کہ جو شخص اپنی طبعی حالت و کیفیات اور باطنی حیثیت کے اعتبار سے جس طرح کا ہو گا اس کے حق میں اسی کے مطابق فیصلہ ہو گا اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک موقعہ پر اپنا تمام مال و اسباب خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لئے حضور کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے ان کی اس پیش کش کو رد نہیں کیا کیونکہ آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے کہ ان میں یقین و صبر کا وصف بدرجہ کمال موجود ہے اس کے برخلاف جب ایک اور شخص نے کبوتر کے انڈے کے برابر سونا لا کر حضور ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کیا اور کہا کہ میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے یہ جو کچھ بھی ہے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے آپ کی نذر کرتا ہوں تو حضور ﷺ نے صرف یہ کہ اس سونے کو قبول نہیں فرمایا بلکہ اس پر سخت ناراض ہوئے یہاں تک کہ اس کو ایک دھپ بھی مارا۔ یہاں تک ملا علی قاریؒ کے منقولات کا ماحصل نقل کیا گیا۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حدیث میں "منتر" کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے زمانہ جاہلیت کے ٹونے ٹوٹکے اور مشرکانہ منتر مراد ہیں جن کا کتاب و سُنّت کی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اور جن کو حضور ﷺ نے قطعًا روا نہیں رکھا تھا کیونکہ ان منتروں کی ساخت اور ان کے الفاظ و معانی کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان کو اختیار کرنے والا شرک میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ بات کہ "منتر" سے زمانہ جاہلیت کے منتر مراد ہیں، حدیث کے الفاظ لا یتطیرون سے بھی واضح ہوتی ہے کہ تطیر یعنی بدفالی لینا، زمانہ جاہلیت کے اہل عرب کا خاص معمول تھا! پس جس طرح زمانہ جاہلیت کی دیگر مشرکانہ رسوم و عادات سے اجتناب ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اسی طرح تطیر یعنی بدفالی لینے سے بھی قطعی پرہیز کرنا نہایت لازم ہے۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کے بہت سے مسلمان بھی بربناء جہل و نادانی بدفالی لینے کی برائی میں مبتلا ہیں باوجودیکہ زمانہ جاہلیت کی ایک مشرکانہ عادت رہی

ہے اور اگر اس بات سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو اس سے اجتناب کی ایک بڑی معقول وجہ یہ بھی ہے کہ بدفالی نہ لینے والے کو بڑی فضیلت کا حامل قرار دیا گیا ہے بایں طور کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہوگا جو بغیر حساب جنت میں شامل کئے جائیں گے، نیز اس سے اجتناب ایک ایسا وصف بھی ہے جس کو توکل کے درجات میں سے شمار کیا جاسکتا ہے! اور اس سے بالاتر درجہ وہ ہے جو ہر طرح کے علاج معالجہ، جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے اور دیگر تدابیر کو کلیۃً ترک کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور جس کا مقصد حقیقی توکل کے مقام کو ثابت وظاہر کرنا ہوتا ہے، چنانچہ توکل کا متعارف مفہوم بھی یہی بیان کیا جاتا ہے اور اسی لئے صوفیہ نے "توکل" کی وضاحت یہی کی ہے کہ توکل کا مطلب ہے حق تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل اعتماد و بھروسہ پر کے سبب کسب وعمل اور اسباب و وسائل کو مطلق ترک کر دینا۔ یہ دوسرا یا اوسط درجہ ہے جو خواص کا مرتبہ مانا جاتا ہے اس مرتبہ کے لوگ اس اجر و فضیلت کے مستحق قرار پاتے ہیں جس کا ذکر حدیث میں ہے بلکہ مزید برآں ایک اور عظیم الشان سعادت کی بشارت دی گئی ہے کہ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ اس کے بعد تیسرا درجہ وہ ہے جو اس مقام کے منتہی اور مقربین بارگاہ الٰہی کے لئے مخصوص ہے اس درجہ کے لوگوں کی ظاہری نظر میں اسباب و ذرائع کلیۃً ساقط ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک ان کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں، وہ اگر اسباب و ذرائع کو کسی حد تک اختیار بھی کرتے ہیں تو محض اظہار عبودیت اور مشیت الٰہی کی فرمانبرداری کے طور پر، اور اس حیثیت سے ان کا اسباب و ذرائع کو اختیار کرنا ان کے حق میں عزیمت (الویت) کا حکم رکھتا ہے یہ مرتبہ اخص الخواص کا مرتبہ کہلاتا ہے اور وہ انبیاء و اولیاء ہیں کہ جو اپنی ذات کے اعتبار سے فانی اور خدا کے ساتھ باقی ہیں اور توکل کا یہی سب سے آخری مرتبہ بھی ہے اور اس کی اصل حقیقت بھی، نیز جو بندگان خاص اس مرتبہ تک پہنچ جاتے ہیں، ان کی فضیلت سب سے زیادہ اور ان کا اجر سب سے بڑا ہوتا ہے۔

مذکورہ مسئلے میں عالمگیری نے یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ کسی نقصان وضرر اور تکلیف کو دور کرنے والے اسباب و ذرائع تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ کہ جن کا موثر ہونا یقینی ہوتا ہے جیسا کہ پانی پیاس کو اور کھانا بھوک کو دور کرتا ہے دوسرے وہ اسباب جو ظنی ہوتے ہیں جیسے فصد کھلوانا، پچھنے لگوانا، مسہل لینا اور طب کے دوسرے قواعد و ضوابط کہ مثلاً گرمی سے پیدا ہونے والے امراض میں ٹھنڈی دواؤں کے ذریعہ اور ٹھنڈ سے پیدا ہونے والے امراض میں گرم دواؤں کے ذریعہ علاج معالجہ کرنا، اور یہ چیزیں طبی نقطۂ نظر سے ظاہری اسباب کا درجہ رکھتی ہیں اور تیسرے وہ اسباب کہ جو موہوم ذریعہ ہوتے ہیں جیسے جسم کو داغنا، دعاؤں کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا اور تعویذ گنڈا وغیرہ۔ پس جو اسباب و ذرائع یقینی درجہ رکھتے ہیں ان کو ترک کرنا نہ صرف یہ کہ توکل کے لئے شرط نہیں ہے بلکہ اس صورت میں شرعی نقطہ نظر سے بھی حرام ہے جب کہ ان کو ترک کرنے کی وجہ سے موت کے واقع ہو جانے کا خوف ہو، اس کے برخلاف جہاں تک ان اسباب و ذرائع کا تعلق ہے جو موہوم کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ترک کرنا ہی توکل کی شرط ہے کیونکہ رسول کریم ﷺ نے ایسے اسباب و ذرائع کو ترک کرنے والوں کو "متوکلین" کے زمرہ میں شمار فرمایا ہے، رہی ان اسباب و ذرائع کی بات جو ظنی ہیں اور جو اطباء و حکماء کے نزدیک ظاہری اسباب کا درجہ رکھتے ہیں تو ان کو اختیار کرنا یعنی طبی اصول و قواعد کے تحت علاج کرانا توکل کے منافی نہیں ہے۔ اس طرح ظنی اسباب، موہوم، اسباب، کی طرح تو توکل کے خلاف نہیں ہے اور ان کو ترک کرنا یقینی اسباب کو ترک کرنے کی طرح ممنوع نہیں ہے بلکہ بعض احوال میں اور بعض اشخاص کے حق میں ان کو ترک کرنا افضل ہو جاتا ہے۔ پس یہ ظنی اسباب گویا دو درجوں کے درمیان ایک معتدل درجہ ہے۔

② وَعَنْهُ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْاُمَمُ فَجَعَلَ يَمُرُّ النَّبِيُّ وَمَعَهُ الرَّجُلُ وَالنَّبِيُّ وَمَعَهُ الرَّجُلَانِ وَالنَّبِيُّ وَمَعَهُ الرَّهْطُ وَالنَّبِيُّ وَلَيْسَ مَعَهُ اَحَدٌ فَرَاَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْاُفُقَ فَرَجَوْتُ اَنْ يَكُوْنَ اُمَّتِيْ فَقِيْلَ لِيَ انْظُرْ فَرَاَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْاُفُقَ فَقِيْلَ لِيَ انْظُرْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا فَرَاَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْاُفُقَ فَقِيْلَ هٰؤُلَاءِ اُمَّتُكَ وَمَعَ هٰؤُلَاءِ سَبْعُوْنَ اَلْفًا قُدَّامَهُمْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا

يَكْتَوُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ فَقَامَ عُكَاشَةُ بْنُ مِحْصَنٍ فَقَالَ ادْعُ اللّٰهَ اَنْ يَجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ مِنْهُمْ ثُمَّ قَامَ رَجُلٌ اٰخَرُ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يَجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ قَالَ سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ (حالت کشف یا خواب میں) میرے سامنے امتوں کو (ان کے انبیاء کے ساتھ) پیش کیا گیا (یعنی ہر نبی کو اس کی اُمت کے ساتھ مجھے دکھایا گیا) پس (جب ان انبیاء نے اپنی امتوں کے ساتھ گزرنا) شروع کیا تو (میں نے دیکھا) کہ ایک نبی کے ساتھ صرف ایک ہی شخص تھا (یعنی دنیا میں اس کی پیروی کرنے والا اس ایک شخص کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوا) اور ایک نبی ایسا تھا کہ اس کے ساتھ دو شخص تھے، ایک اور نبی گزرا تو اس کی معیت میں پوری ایک جماعت تھی اور پھر ایک نبی ایسا بھی گزرا کہ اس کے ساتھ ایک بھی شخص نہیں تھا (یعنی دنیا میں اس کی پیروی کسی ایک شخص نے بھی نہیں کی) اس کے بعد میں نے (اپنے سامنے) ایک بہت بڑا انبوہ دیکھا جو آسمان کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا (اتنی بڑی امت دیکھ کر) میں نے امید باندھی کہ یہ میری اُمت ہوگی، لیکن مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ اور ان کی اُمت کے لوگ ہیں (کہ جو ان پر ایمان لائے تھے) پھر مجھ سے کہا گیا کہ ذرا آپ (ﷺ) نظر اٹھا کر تو دیکھئے، میں نے (جو نظر اٹھائی تو اپنے سامنے) دیکھا کہ ایک بڑا ہجوم بے پناہ ہے جو آسمان کے کناروں تک پھیلا ہوا ہے (میں اتنا بڑا انبوہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور خدا کا شکر ادا کیا) پھر مجھ سے کہا گیا کہ (آپ (ﷺ) اس انبوہ کو بس نہ سمجھئے، آپ (ﷺ) اس سے کہیں زیادہ لوگوں کو دیکھیں گے) ذرا ادھر ادھر یعنی دائیں بائیں بھی نظر گھما کر تو دیکھئے چنانچہ میں نے (دائیں بائیں نظر گھما کر) دیکھا تو (دونوں طرف) بے پناہ ہجوم تھا جو آسمان کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد (مجھ سے) کہا گیا کہ (آپ (ﷺ) کے سامنے اور دائیں بائیں آسمان کے کناروں تک جو انسانوں کا ایک بحر بیکراں نظر آتا ہے) یہ سب آپ (ﷺ) کی اُمت کے لوگ ہیں اور ان کے علاوہ (یعنی منجملہ ان لوگوں کے یا ان کے علاوہ مزید) ان کے آگے ستر ہزار لوگ ایسے ہیں جو جنّت میں بغیر حساب کے جائیں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ تو بدفالی لیتے ہیں، نہ منتر پڑھواتے ہیں اور نہ اپنے جسم کو دغواتے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔ یہ سن کر، ایک صحابی عکاشہ ابن محصن کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ (یارسول اللہ ﷺ) اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے ان لوگوں میں شامل فرمادے (جو خدا پر توکل کرتے ہیں اور بغیر حساب جنّت میں داخل ہوں گے) حضور نے دعا فرمائی "الٰہی عکاشہ" کو ان لوگوں میں شامل فرمادے" پھر ایک اور شخص کھڑا ہوا اور اس نے بھی عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے ان لوگوں میں شامل فرمادے آپ ﷺ نے فرمایا "اس دعا کے سلسلہ میں عکاشہؓ تم پر سبقت لے گئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "نبی" سے مراد "رسول" ہیں کہ جو خدا کا دین پہنچانے اور لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے اس دنیا میں مبعوث کئے گئے۔

جیسا کہ ترجمہ میں بین القوسین واضح کیا گیا، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "ستر ہزار" سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ کی اُمت میں سے ستر ہزار لوگ وہ ہیں جو ان لوگوں کے علاوہ ہیں، اور اس سے یہ معنی بھی لئے جاسکتے ہیں کہ ان ہی لوگوں میں ستر ہزار لوگ ایسے بھی ہیں جو بغیر حساب جنّت میں داخل ہوں گے! اس دوسرے معنی کی تائید بخاری کے روایت کردہ ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ هٰذِهٖ اُمَّتُكَ وَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ مِنْ هٰؤُلَاءِ سَبْعُوْنَ اَلْفًا یعنی یہ آپ کی اُمّت کے لوگ ہیں اور ان میں سے ستر ہزار لوگ وہ ہیں جو بغیر حساب جنّت میں داخل ہوں گے۔

"نہ اپنے جسم کو دغواتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بلاضرورت اپنے جسم کے کسی حصہ پر آگ کا داغ نہیں لیتے الا یہ کہ انہیں کوئی ایسی مجبوری پیش آجائے کہ دغوائے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو، تو یہ اور بات ہے، چنانچہ ضرورت و مجبوری کے تحت دغوانا بعض صحابہ سے بھی ثابت ہے ان میں سے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ بھی ہیں جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ لوگ مطلق نہیں دغواتے، خواہ انہیں اس کی کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ تقدیر و قضاء الٰہی پر راضی و مطمئن ہوتے ہیں، ان کا صرف خدا پر اعتماد و بھروسہ ہوتا ہے، وہ کسی آفت و مصیبت کو دفع کرنے کی تدبیر کرنے کی بجائے اس کی وجہ سے ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں اور اس

بات پر ان کو پورا یقین ہوتا ہے۔ کہ فائدہ اور نقصان پہنچانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے علاوہ ایسی کوئی ذات اور کوئی چیز نہیں ہے۔ جو حقیقی مؤثر ہو۔ پس وہ لوگ پاک نفس، گویا مرتبۂ مشہود پر فائز ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں ان کا اپنا وجود، عدم کے برابر ہوتا ہے اور نفس کی لذات وخواہشات کے اعتبار سے وہ فنا کا مقام اختیار کر لیتے ہیں۔

بعض شارحین نے یوں لکھا ہے کہ "نہ اپنے جسم کو دغواتے ہیں" کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ اول تو جسم کو دغوانے سے اجتناب کرتے ہیں لیکن اگر کسی مرض و تکلیف کی واقعی ضرورت و مجبوری کے تحت ان کو ایسا کرنا بھی پڑتا ہے تو ان کا فائدہ اور شفاء کا اعتقاد صرف اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے نہ کہ محض دغوانے پر۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جسم پر داغ لینا ان اسباب میں سے ہے جو وہمیہ ہیں، نیز احادیث میں اس کی ممانعت منقول ہے لیکن اگر کسی بیماری و تکلیف کے دفعیہ کے لئے کوئی حاذق معالج دغوانے کو ضروری قرار دے اور اس کا کارگر ہونا یقینی امر ہو تو اس کی اجازت بھی ہے۔

"نہ منتر پڑھواتے ہیں" میں منتر سے مراد، منتر و افسوں اور جادو ہے کہ جس کے الفاظ و معنی قرآن و احادیث صحیحہ کے مطابق نہ ہوں اور ان کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہو، اسی طرح "نہ بدفالی لیتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ کسی جانور، خواہ وہ پرندہ ہو اور خواہ چرند جیسے کتا اور بلی وغیرہ، ان کے اڑنے، ان کی آواز، اور ان کے راستہ وغیرہ کاٹنے سے وہ لوگ کوئی بدفالی نہیں لیتے۔

حاصل یہ ہے کہ جن لوگوں کے بارے میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ وہ بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے وہ دراصل وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان واعتقاد اور کردار وعمل کے لحاظ سے بہت پختہ و مضبوط ہیں کہ وہ کسی بھی ایسے عقیدہ اور ایسے عمل کو مطلقاً اختیار نہیں کرتے جو زمانۂ جاہلیت کے عقائد و اعمال سے مطابقت و مشابہت رکھتا ہے۔

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ مذکورہ لوگوں کے سلسلے میں "ستر ہزار" کی تعداد کا ذکر ہے تو کیا ازابتدا تا انتہا اس اُمت محمدیہ میں ایسے لوگوں کی تعداد صرف ستر ہزار ہی ہوگی؟ جب کہ یقیناً اس وصف کے لوگ مذکورہ تعداد سے کہیں زیادہ ایک ہی زمانہ میں پائے جاسکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ستر ہزار سے مراد کسی مخصوص عدد کو واضح نہیں کرنا ہے۔ بلکہ ستر ہزار کا عدد استعمال کرنے کا واحد مقصد ایسے لوگوں کی کثرت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

حدیث کے آخری جزء کے سلسلے میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوسرے شخص کی درخواست قبول کیوں نہیں کی اور اس کے حق میں دعا کیوں نہیں کی؟ اس کے جواب دئے جاسکتے ہیں مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو اس مجلس میں صرف ایک ہی شخص کے حق میں دعا کرنے کی اجازت دی گئی تھی اور چونکہ آپ عکاشہؓ کے حق میں دعا فرما چکے تھے اس لئے ان کے بعد کسی دوسرے شخص کے حق میں دعا کرنے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ یا یہ کہ وہ دوسرا شخص اپنی باطنی حیثیت و حالت کے اعتبار سے اس مرتبہ کا اہل اور اس منزلت کا مستحق نہیں تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس کے حق میں دعا نہیں فرمائی، لیکن اس کے بارے میں آپ ﷺ نے اس سے صراحت کے ساتھ یہ نہیں فرمایا کہ تم اس مرتبہ و منزلت کے اہل و مستحق نہیں ہو بلکہ اس کو ایک عام جواب دے دیا اور واضح فرمایا کہ عکاشہؓ کے حق میں دعا کرنے کا سبب ان کی طرف سے دعا کی عرض و التماس میں سبقت ہے! بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ شخص دراصل منافقین میں سے تھا اور ظاہر ہے کہ اس کی یہ حیثیت حضور ﷺ کے علم میں تھی اس لئے آپ ﷺ نے اس کے حق میں دعا نہیں فرمائی لیکن آپ نے ازراہ اخلاق و مروت اس سے یہ نہیں کہا بلکہ ایک مجمل جواب دے دیا۔ لیکن بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ عکاشہؓ کے حق میں دعا کرنا دراصل وحی خفی کے سبب تھا جس میں حضور کو مذکورہ دعا کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

یہ قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس موقع پر دعا کی درخواست کرنے والے دوسرے شخص حضرت سعد بن عبادہؓ تھے جو مشاہیر صحابہ میں سے ہیں۔

نیز یہ ارشاد گرامی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ نیکی کی راہ اختیار کرنے میں سبقت کرنی چاہئے اور اہل اللہ و بزرگان دین سے اپنے حق میں فلاح و سعادت کی دعا کی درخواست کی جانی چاہئے۔

مؤمن کی مخصوص شان

(۳) وَعَنْ صُهَيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت صہیبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مؤمن کی بھی عجیب شان ہے کہ اس کی ہر حالت اس کے لئے خیر و بھلائی کا باعث ہے اور یہ بات صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے کوئی اور اس کے وصف میں شریک نہیں ہے اور اس کو رزق و فراخی و وسعت، راحت، چین، صحت و تندرستی، نعمت ولذت اور طاعت و عبادت کی توفیق کی صورت میں خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے، بس یہ شکر اس کے لئے خیر و بھلائی کا باعث ہوتا ہے اور اگر اس کو (فقر و افلاس، مرض و تکلیف، رنج و الم اور آفات و حادثات کی صورت میں) مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے۔ پس یہ صبر بھی اس کے لئے خیر و بھلائی کا باعث ہوتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنی شب و روز کی زندگی میں یا تو ایسی حالت سے دوچار ہوتا ہے جو اس کو رنج و تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے یا وہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ جس سے وہ خوشی و مسرت محسوس کرتا ہے ان دونوں حالتوں سے کوئی شخص خالی نہیں ہوتا، پس مؤمن کے لئے رنج و تکلیف میں مبتلا کرنے والی حالت صبر کا تقاضہ کرتی ہے اور خوشی و مسرت دینے والی حالت شکر کا، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقام صبر و شکر، نہایت اعلیٰ ہیں اور بہت زیادہ اجر و ثواب کا باعث بنتے ہیں، اس طرح مؤمن گویا ہر حالت میں اعلیٰ مقام و مرتبہ اور بہت زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اوپر حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "اور یہ بات صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے" تو بظاہر مؤمن سے مراد "مؤمن کامل" ہے کیونکہ یہ کامل مؤمن کی ہی شان ہوتی ہے کہ وہ تنگی و سختی اور رنج و تکلیف کی حالت میں صبر کرتا ہے اور خوش حالی و مسرت کی صورت میں شکر گزار ہوتا ہے، اس کے برخلاف غیر کامل مؤمن کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر اس کو ترفہ و خوش حالی اور خوشی و مسرت کے اسباب میسر ہو جاتے ہیں تو وہ مغرور ہو جاتا ہے اور خلاف شرع باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور اگر تنگی و سختی اور رنج و تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو جزع و فزع، شکوہ شکایت اور کفران نعمت کرنے لگتا ہے۔ لہٰذا ہر مؤمن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جس حالت میں بھی ہو اس کے مطابق اپنی کیفیت کا جائزہ لے اور دیکھے کہ وہ اپنے فکر و خیال اور قول و فعل کے اعتبار سے اس حدیث کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اور پھر کامل مؤمن کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں۔

کچھ خاص ہدایتیں

(۴) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِىُّ خَيْرٌ وَاَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ وَفِىْ كُلٍّ خَيْرٌ اَحْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ وَاِنْ اَصَابَكَ شَىْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّىْ فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا وَلٰكِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَآءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قوی مسلمان"، ضعیف مسلمان سے بہتر اور خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ (یعنی جو مسلمان خدا کی ذات و صفات کے تئیں ایمان و اعتماد میں مضبوط ہوتا ہے اس پر پختگی کے ساتھ توکل و اعتماد رکھتا ہے ہر حالت میں نیکیاں و بھلائیاں اس کا مقصود ہوتی ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد و ایثار کرتا ہے۔ یا یہ کہ جو مسلمان لوگوں کی صحبت و ہم نشینی اور ان کی طرف سے پیش آنے والی ایذا و تکلیف پر صبر کرتا ہے، مخلوق خدا کی ہدایت کے لئے کوشش کرتا ہے اور تقریر و تحریر اور درس و تعلیم کے

ذریعہ خیر و بھلائی پھیلانے میں مصرف رہتا ہے وہ اس مسلمان سے کہیں زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک کہیں زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے جو ان صفات میں اس کا ہم پلہ نہیں ہوتا) اور ہر مسلمان (خواہ وہ قوی ہو یا ضعیف) اپنے اندر نیکی و بھلائی رکھتا ہے۔ (یعنی کوئی مسلمان نیک صفات سے خالی نہیں ہوتا ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے، کیونکہ تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا اصل سرچشمہ بنیادی ایمان ہے اور بنیادی ایمان ہر مسلمان میں ہوتا ہے) جو چیز تمہیں (دین و آخرت کے اعتبار سے) نفع پہنچانے والی ہو اس کی حرص رکھو، اللہ تعالیٰ سے (نیک عمل کرنے کی) مدد و توفیق طلب کرو اور اس (طلب مدد و توفیق سے عاجز نہ ہو (کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر پوری طرح قادر ہے کہ تمہیں اپنی طاعت و عبادت کی توفیق عطا فرمائے بشرطیکہ تم اس کی استعانت پر سیدھی طرح قائم رہو۔ اور بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تم اس چیز پر عمل کرنے سے عاجز نہ رہو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ اور ان کو ترک نہ کرو)۔ نیز اگر تمہیں (دین و دنیا) کی کوئی مصیبت و آفت پہنچے تو یوں نہ کہو "اگر میں اس طرح کرتا تو ایسا ہوتا (بلکہ زبان قال یا زبان حال سے) یہ کہو کہ "اللہ تعالیٰ نے یہی مقدر کیا تھا۔" لہٰذا جو کچھ بھی پیش آیا ہے قضاء و قدر الٰہی کے مطابق ہی پیش آیا ہے) اور اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔" اور یہ اس لئے کہ "اگر" کا لفظ (جب کسی چیز پر حسرت و پریشانی کے اظہار، تقدیر الٰہی کے ساتھ معارضہ و مقابلہ اور اپنی قوت و تدبیر پر اعتماد کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے تو) شیطان کے عمل دخل کا دروازہ کھول دیتا ہے (اور دل میں یہ غلط وسوسہ اور خیال سماجاتا ہے کہ ہر کام کا نتیجہ ہماری ہی تدبیر سے نکلتا ہے تقدیر الٰہی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ کہنا کہ میں اگر فلاں تدبیر کر لیتا اور یہ کام اس طرح کر لیتا تو میں فلاں نقصان اور مصیبت سے بچ جاتا۔" اس لئے ممنوع ہے کہ ایسا کہنا بالکل لاحاصل ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں، جو چیز جس طرح پیش آتی ہے وہ یوں ہی نہیں، بلکہ خدا کی مشیت اور اس کے حکم و فیصلہ کے مطابق پیش آتی ہے۔ جس کو تقدیر کا لکھا کہا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔ قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (کہہ دو کہ ہمیں صرف وہی پہنچے گا جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے) لہٰذا "لَوْ" یعنی "اگر" کا لفظ کہنا اسی صورت میں ممنوع ہے جب کہ اس کا استعمال کسی ایسے جملہ میں ہو جس کا مقصد تقدیر الٰہی کے ساتھ معارضہ و مقابلہ ہو اور یہ اعتقاد ہو کہ تقدیر کوئی چیز نہیں، ہر چیز کا وقوع پذیر ہونا اس کے ظاہری اور مادی اسباب و وسائل پر منحصر ہے اگر یہ مقصد اور یہ اعتقاد نہ ہو تو پھر اس کا استعمال ممنوع نہیں ہوگا جیسا کہ قرآن میں یوں وارد ہوا ہے۔ "لَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ۔

یا ایک حدیث میں (جو باب الحج میں نقل ہو چکی ہے) آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

لَوْ اَنِّیْ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ اگر مجھ کو پہلے یہ معلوم ہوتا جو بعد کو معلوم ہوا..... الخ اسی طرح اور بہت سی روایتوں میں بھی "لَوْ" کا لفظ منقول ہوا ہے! لہٰذا معلوم ہوا کہ "لَوْ" یعنی "اگر" کے لفظ کی ممانعت کا تعلق ایسی بات سے ہے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور جو تقدیر الٰہی کے معارض ثابت ہوتی ہے تاہم یہ واضح رہے کہ مذکورہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے نہ کہ نہی تحریمی کے طور پر! نیز اگر اس لفظ کا استعمال کسی ایسے جملہ میں ہو کہ جس کا مقصد کسی طاعت و عبادت کے فوت ہو جانے پر اظہار تاسف و حسرت سے ہو یا اس عبادت و طاعت سے اس معذوری و مجبوری کے اظہار و افسوس کے تئیں ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، اور مختلف احادیث میں جو یہ لفظ منقول ہوا ہے وہ اسی مفہوم پر محمول کیا جاتا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عبادت و طاعت کے فوت ہو جانے پر اظہار تاسف کرنا ثواب کا باعث بھی ہے اور اس کو ان چیزوں میں شمار کیا جانا ہی لائق ہے جو مستحب ہیں۔

چنانچہ امام رازیؒ نے اپنی کتاب مشیخت میں ابی عمرو سے نقل کیا ہے کہ جس شخص نے اپنی کسی دنیاوی چیز کے فوت و ضائع ہو جانے پر تأسف کیا تو وہ ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر دوزخ کے قریب ہو جاتا ہے اور جس شخص نے اپنے کسی دینی عمل اور کسی اخروی چیز کے فوت و ضائع ہو جانے پر تأسف کیا تو وہ ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر جنت کے قریب ہو جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اللہ پر پوری طرح توکل کرنے کی فضیلت

⑤ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَوْاَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْا خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

"حضرت عمر ابن خطابؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "حقیقت یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد کرو جیسا کہ توکل کا حق ہے تو یقیناً وہ تمہیں اسی طرح روزی دے گا جس طرح کہ پرندوں کو روزی دیتا ہے، وہ (پرندے) صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے (اپنے گھونسلوں میں واپس آتے ہیں۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: توکل کا حق یہ ہے کہ اول تو اس بات پر پورا یقین واعتقاد ہو کہ کسی بھی چیز کو وجود میں لانے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اور ہر موجودہ کو خواہ وہ جاندار یا غیر جاندار مخلوق ہو، یا رزق، کسی چیز کا ملنا ہو یا نہ ملنا ہو، ضرر ہو یا نفع ہو، غربت و افلاس ہو یا ثروت و مالداری ہو، مرض ہو یا صحت ہو، اور موت ہو یا حیات ہو، غرضکہ کوئی بھی چیز ہو، سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اور سب چیزیں اسی کی طرف سے ہیں، پھر اس امر کا پختہ اعتقاد ہو کہ رزق کا ضامن بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اور پھر اس یقین واعتقاد کے ساتھ حصول معاش کی سعی وجہد میں اچھے طور طریقوں سے، اور مناسب ومعقول صورت میں مشغول ہو، یعنی کسب وکمائی میں زیادہ تعب ومشقت برداشت نہ کرے، حرص ولالچ میں مبتلا نہ ہو، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے کی جدوجہد نہ کرے اور کمانے کی دھن میں غرق نہ ہو جائے کہ حلال و حرام کی تمیز بھی نہ کر سکے۔

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا گمان یہ ہو کہ "توکل" نام ہے کسب وعمل کے ترک کر دینے کا" اور ہاتھ پاؤں کو معطل کر دینے اور اپاہج بن کر) پڑے رہنے کا کہ جس طرح کسی کپڑے کو زمین پر ڈال دیا جائے تو، وہ، شخص نرا جاہل ہے! اور حضرت امام قشیریؒ کا قول یہ ہے کہ "توکل کا اصل مقام قلب ہے، اور حصول معاش کے لئے" حرکت وعمل ایک ظاہری فعل ہے جو توکل کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ اصل اعتماد (اپنے کسب وعمل کے بجائے) محض اللہ تعالیٰ پر ہو، اسی لئے حدیث میں پرندہ کے ساتھ تشبیہہ دی گئی ہے اور وہ اگرچہ اپنی روزی کی تلاش میں نکلتا ہے اور سارے جہاں میں مارا مارا پھرتا ہے لیکن اس کا اصل اعتماد اللہ تعالیٰ ہی پر ہوتا ہے، نہ کہ اپنی طلب اور جدوجہد اور اپنی تدبیر وقوت پر لہٰذا اس سے واضح ہوا کہ انسان کا حصول معاش کے لئے معقول اور مناسب طریقہ پر جدوجہد اور سعی کرنا اللہ تعالیٰ پر اعتماد وبھروسہ کرنے کے منافی نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ یعنی اور کوئی جانور اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی اس کو بھی اور تمہیں بھی رزق عطا کرتا ہے۔"

حاصل یہ کہ حدیث کا مفہوم اس امر سے آگاہ کرنا ہے کہ سعی وجدوجہد اور کسب وعمل حقیقت میں رزق پہنچانے والا نہیں ہے بلکہ رزق پہنچانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح حدیث کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ انسان کو اپنی روزی کمانے کے لئے حرکت وعمل سے باز رکھا جائے کیونکہ اللہ پر توکل واعتماد کا تعلق دل سے ہے جو اعضائے ظاہری کی حرکت وعمل کے مطلقاً منافی نہیں ہے، گو بسا اوقات اعضا وجوارح کی حرکت اور کسی کسب وعمل کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ رزق پہنچاتا ہے بلکہ توکل کی برکت تو یہاں تک ہوتی ہے کہ متوکل کو اپنا رزق لینے کے لئے حرکت بھی کرنا نہیں پڑتی بلکہ دوسرے حرکت کر کے اس تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق پہنچاتے ہیں جیسا کہ اس ارشاد ربانی کے عمومی مفہوم سے واضح ہوتا ہے۔ وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔

کہ جب کوے کے بچے انڈے سے باہر آتے ہیں تو بالکل سفید ہوتے ہیں اور کوا ان بچوں کو دیکھتا ہے تو وہ اسے بہت برے لگتے ہیں چنانچہ ان بچوں کو چھوڑ کر کوا چلا جاتا ہے، اور وہ تنہا پڑے رہ جاتے ہیں تب اللہ تعالیٰ ان کے پاس مکھی اور چیونٹیاں بھیجتا ہے جن کو وہ

بچے چن چن کر کھاتے ہیں، اور پرورش پاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو اپنا رنگ بدل دیتے ہیں اور بالکل سیاہ ہو جاتے ہیں، پھر جب کچھ عرصہ کے بعد کوا ان بچوں کے پاس آتا ہے اور ان کو سیاہ رنگ کا دیکھتا ہے تو ان کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور ان کی پرورش کرنے لگتا ہے اس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ بغیر حرکت وسعی کے بھی کسی طرح رزق پہنچاتا ہے، اس سلسلے میں کافی حکایتیں بیان کی جاتی ہیں لیکن یہ حکایت تو بہت ہی عجیب وغریب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح قبض کرنے والے فرشتے عزرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا کسی کی روح نکالتے وقت تجھے رحم بھی کبھی آیا ہے؟ عزرائیل علیہ السلام نے کہا کہ ہاں اے میرے پروردگار! ایک موقع پر تو مجھے بہت ہی رحم آیا تھا، اور وہ اس وقت کا قصہ ہے جب کہ ایک کشتی ٹوٹ گئی تھی اور اس کے لوگ پانی میں غرق ہو گئے تھے لیکن کچھ لوگ ڈوبنے سے بچ گئے تھے اور کشتی کے باقی ماندہ تختوں پر تیر رہے تھے، انہی میں ایک عورت تھی جو ایک تیرتے ہوئے تختے پر بیٹھی ہوئی اپنے شیرخوار بچے کو دودھ پلا رہی تھی، جبھی تیرا حکم ہوا کہ اس عورت کی روح قبض کر لی جائے چنانچہ میں نے اس عورت کی روح قبض کر لی، لیکن اس کے بچے پر بہت رحم آیا جو اس دریا میں ایک ٹوٹے ہوئے تختے پر تنہا رہ گیا تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہیں معلوم ہے اس بچے کا انجام کیا ہوا؟ میں نے اس تیرتے ہوئے تختے کو ایک جزیرہ کے کنارے لگ جانے کے حکم دیا جہاں اس نے بچہ کو ساحل پر ڈال دیا، پھر میں نے ایک شیرنی اس بچے کے پاس بھیجی جس نے اس کو اپنا دودھ پلا پلا کر پرورش کیا، جب وہ کچھ بڑا ہو گیا تو میں نے کچھ جنات متعین کر دیئے تاکہ وہ اس بچے کو آدمیوں کی بول چال اور رہن سہن کی تعلیم دیں، یہاں تک کہ وہ ایک مضبوط جوان ہو گیا اور پھر علم وفضل میں کمال حاصل کرتا ہوا علماء کی صف میں داخل ہو گیا، دولت وامارت سے بہرہ مند ہوا اور آخر کار سلطنت کے مرتبہ کو پہنچ کر تمام روئے زمین کا بادشاہ وحکمران بن گیا، تب وہ اپنی اصل حقیقت کو بھول گیا، روئے زمین پر چلنے والی اس کی مطلق العنانی اس کی انسانیت وعبودیت کی سب سے بڑی دشمن بن گئی اس نے عبودیت کے مرتبہ اور ربوبیت کے حقوق کو فراموش کر دیا اس کو یہ یاد نہ رہا کہ خدا تو وہ ذات ہے جس نے اس کو دریا کی لہروں سے زندہ بچا کر اپنی قدرت کے ذریعہ پرورش وتربیت کے مراحل سے گزارا، اور پھر اس مرتبہ تک پہنچایا کہ آج وہ تمام روئے زمین کا بادشاہ اور مطلق العنان حکمران بنا بیٹھا ہے، جانتے ہو وہ کون شخص تھا؟ وہ اس دنیا میں شداد کے نام سے مشہور ہوا ہے۔

بہرحال اہل ایمان کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بہت رحیم وکریم ہے، وہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے، جب وہ اپنے دشمنوں کو رزق دیتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کو بھول جائے جو اس کے دوست اور محبوب ہیں۔

حصول رزق کے بارے میں ایک خاص ہدایت

(٦) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ اِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّا قَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهٖ وَلَيْسَ شَيْءٌ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَاِنَّ الرُّوْحَ الْاَمِيْنَ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَاِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا اَلَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَعَاصِي اللّٰهِ فَاِنَّهٗ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ اِلَّا بِطَاعَتِهٖ۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ وَاِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ لوگو! کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تم کو جنت سے قریب کر دے اور دوزخ کی آگ سے دور کر دے علاوہ اس چیز کے جس (کو اختیار کرنے) کا حکم میں نے تمہیں دیا ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تم کو دوزخ کی آگ سے قریب کر دے اور جنت سے دور کر دے علاوہ اس چیز کے جس سے میں نے تمہیں منع کیا ہے، اور روح الامین۔ یا ایک روایت میں ہے کہ روح القدس (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے (یعنی میرے پاس وحی خفی لائے ہیں)۔ کہ بلاشبہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ اپنا رزق پورا نہیں کر لیتا (یعنی جو شخص بھی اس دنیا میں آتا ہے وہ اپنے اس رزق کو پائے بغیر دنیا

سے نہیں جاتا جو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے مقدر میں لکھ دیا جاتا ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے اس طرف یوں اشارہ فرمایا ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پس جب یہ معاملہ ہے کہ جو رزق مقدر ہو گیا ہے وہ ہر حال میں ملے گا تو) دیکھو، خدا کی نافرمانی سے ڈرتے رہو اور حصول معاش کی سعی و جدوجہد میں نیک روی اور اعتدال اختیار کرو (تا کہ تمہارا رزق تم تک جائز و حلال وسائل و ذرائع اور مشروع طور طریقوں سے پہنچے نیز کہیں ایسا نہ ہو کہ رزق پہنچنے میں تاخیر تمہیں اس بات پر اکسا دے کہ تم گناہوں کے ارتکاب کے ذریعہ رزق حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگو، حقیقت یہ ہے۔ کہ جو چیز خدا کے پاس ہے اس کو اس کی طاعت و خوشنودی ہی کے ذریعہ پایا جاسکتا ہے۔ اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے لیکن بیہقیؒ نے و ان روح القدس کے الفاظ نقل نہیں کئے ہیں۔"

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں کا مفہوم اس بات پر بصراحت دلالت کرتا ہے کہ وہ تمام باتیں جو انسانیت کو ابدی نفع پہنچانے والے امور اور نقصان کو دفع کرنے والے ذرائع سے روشناس کراتی ہیں صرف کتاب و سنت سے حاصل کی جاسکتی ہیں، جو باتیں اور جو چیزیں کتاب و سنت کی روشنی سے بے بہرہ ہوں وہ انسان کو صلاح و فلاح سے تو کیا ہمکنار کرسکتی ہیں ان میں اپنا وقت بھی صرف کرنا عمر کو بے فائدہ ضائع کرنا ہے۔

لفظ "روح" جان کے معنی میں آتا ہے اور اس سے "وحی" جبرئیل، اور عیسی علیہ السلام کے معنی بھی لئے جاتے ہیں، یہاں اس لفظ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ذات مراد ہے اور ان کی صفت "امین" کے ذریعہ بیان کرنا (یعنی ان کو روح الامین کہنا ان کی اس کمال دیانت داری کے سبب سے ہے جو خدا کے رسولوں تک علم و وحی پہنچانے میں ان کا وصف خاص ہے۔ اسی طرح روح القدس میں ان کی طرف قدس" (پاکی) کی نسبت ناموئی نجاست و کثافت سے ان کی کمال طہارت و پاکی کی بناء پر ہے۔

لفظ "اجملوا" اجمال سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں روزی کی تلاش میں اعتدال اختیار کرنا! مطلب یہ کہ تم حصول معاش کی خاطر کئے جانے والے کسب و عمل اور سعی و جدوجہد میں نیکی و میانہ روی اختیار کرو، طلب معاش میں ضرورت سے زیادہ مشقت و محنت کرنا غیر مناسب بات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں (تلاش رزق کا مکلف قرار نہیں دیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۞ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۞ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۞

"میں نے جنات اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں میں ان سے رزق کا بالکل طالب نہیں ہوں اور نہ یہ قطعا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلائیں، حقیقت یہ ہے کہ رزاق تو صرف اللہ تعالیٰ ہے (اور) وہ بڑی زبردست قوت کا مالک ہے۔"

ایک موقع پر پروردگار نے یوں فرمایا ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى۔

"اور اپنے گھر والوں کو نماز پڑھنے کا حکم کرو اور اس پر صابر و قائم رہو! ہم تم سے روزی کے خواستگار نہیں ہیں (یعنی ہم تمہیں اپنی اور دوسروں کی روزی پیدا کرنے کا مکلف قرار نہیں دیتے) بلکہ ہم تمہیں روزی دیتے ہیں (اور حسن انجام انہیں کے لئے ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔"

حاصل یہ ہے کہ لفظ "اجملو" کے ذریعہ جو حکم دیا گیا ہے اس کا مفہوم اگر وہ مراد لیا جائے جو اوپر مذکور ہوا تو پھر یہ حکم اباحت کے لئے ہوگا، اور اگر اس لفظ کے یہ معنی مراد لئے جائیں کہ۔ "تم اپنا رزق حلال و جائز، وسائل و ذرائع سے حاصل کرو، تو اس صورت میں یہ حکم وجوب کے لئے ہوگا، اس کی تائید بعد کی عبارت وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ الخ..... سے بھی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حصول معاش کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے اور رزق پہنچنے میں تاخیر محسوس کرو تو اس کی وجہ سے مضطرب و پراگندہ خاطر نہ ہو جاؤ اور ایسا ہرگز نہ

ہو کہ روزی حاصل کرنے کے لئے حرام و مکروہ ذرائع اختیار کرنے لگو، مثل چوری ڈکیتی پر اتر آؤ، کسی کا مال ہڑپ کو لو، امانت میں خیانت کے مرتکب ہو جاؤ اور کچھ نہ سہی تو اپنی سیادت و حیثیت اور اپنی عبادت و دیانت کا اظہار کر کے ان چیزوں کو حصول رزق کا واسطہ بنا لو، یا بیت المال جیسے مراکز سے اپنے حق اور اپنی حاجت سے زیادہ حاصل کرنے میں کوئی خرابی نہ سمجھو وغیرہ وغیرہ۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ رزق دیر سے کبھی نہیں پہنچتا جو کچھ پہنچے اور جس وقت پہنچے اصل رزق ہی ہے اور اسی طرح مقدر ہوتا ہے، پھر یہ کہ گناہ و معصیت کے ارتکاب سے رزق میں نہ تو وسعت ہوتی ہے اور نہ جلدی پہنچتا ہے، اسی قدر ملتا ہے اور اسی وقت پہنچتا ہے کہ مقدر میں جس قدر اور جس وقت پہنچنا لکھا جا چکا ہے، علاوہ ازیں مضطرب اور پراگندہ خاطر ہونے سے سوائے گناہ کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، اور جو رزق گناہ کے ساتھ پہنچے وہ حرام ہوتا ہے۔ لہٰذا حصول معاش کی راہ میں اضطراب و بے چینی، اور گناہ و معصیت کی راہ اختیار کرنا کسی بھی طرح فائدہ مند نہیں اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

طیبیؒ نے لکھا ہے کہ "اجملوا" کے ذریعہ جو حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مال کماؤ تو حسن و خوبی کے ساتھ کماؤ، یعنی کسی حال میں ایسا کوئی ذریعہ اور ایسا کوئی طریقہ اختیار نہ کرو جو شریعت کے خلاف ہو۔

لفظ اِسْتَبْطَأَ اصل میں ابطاء (تاخیر ہونے) کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور حرف "سین" اظہار مبالغہ کے لئے ہے جیسا کہ قرآن نے ان الفاظ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ میں "استعفف" دراصل "عف" (باز رہنے) کے معنی میں ہے۔

اصل زہد کیا ہے؟

⑦ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الزَّهَادَةُ فِی الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا بِاِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِی الدُّنْيَا اَنْ لَا تَكُوْنَ بِمَا فِیْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ بِمَا فِیْ يَدِ اللّٰهِ وَاَنْ تَكُوْنَ فِیْ ثَوَابِ الْمُصِيْبَةِ اِذَا اَنْتَ اُصِبْتَ بِهَا اَرْغَبَ فِيْهَا لَوْ اَنَّهَا اُبْقِيَتْ لَكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَعَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ الرَّاوِیْ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا دنیا سے زہد اختیار کرنا یہ نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو حرام کر لیا جائے اور مال و اسباب کو ضائع کر دیا جائے بلکہ دنیا سے زہد اختیار کرنا یہ ہے (یعنی اس دنیا کے تئیں کامل و معتبر زہد یہ ہے) کہ مال و دولت اور دیگر دنیاوی اسباب میں سے) جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے اس پر اس چیز سے زیادہ اعتماد و بھروسہ نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہے) نیز زہد یہ ہے کہ تم اس وقت کہ جب کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو طلب ثواب کی خاطر اس مصیبت کی طرف کہ جو اگر تمہارے لئے باقی رہے زیادہ رغبت رکھو۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی) عمرو ابن واقد، منکر الحدیث میں۔"

تشریح: حقیقی زہد کیا ہے اور زاہد کسے کہتے ہیں؟ اس بات کو حضور ﷺ نے وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے چنانچہ اس ارشاد گرامی کے مطابق دنیا سے زہد اختیار کرنا اس چیز کا نام ہرگز نہیں ہے کہ محض دنیا کی نعمتوں اور لذتوں اور طبعی خواہشوں کو ترک کر دیا جائے جب کہ ایسا کرنا گویا ان چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا ہے جن کو خدا نے حلال کیا ہے اور یہ بات نہ صرف یہ کہ حقیقی زہد و تقویٰ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ بذات خود ممنوع ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے علاوہ ازیں حضور ﷺ سے یہ ثابت ہی ہے کہ آپ ﷺ نے مرغوب و لذیذ چیزوں اور خدا کی اتاری ہوئی دنیاوی نعمتوں سے اجتناب نہیں کیا بلکہ جو چیز حاصل ہوئی اس سے فائدہ اٹھایا اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ سے زیادہ زہد و تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جو نام نہاد صوفی اور جاہل محض ترک

لذات کو زہد وتقویٰ کا کمال سمجھتے ہوئے عمدہ ولذیذ کھانوں اور پھل و میوہ جات وغیرہ سے اجتناب کرتے ہیں اچھے اور نئے لباس اور اسی طرح کی دوسری نعمتوں کو ترک کرتے ہیں اور اس چیز کو "زہد و تقویٰ" کا نام دیتے ہیں، وہ حقیقت میں یہ جانتے تک نہیں کہ زہد کس کو کہتے ہیں اور زاہد ہونے کا مطلب کیا ہے، اسی طرح زہد وتقویٰ یہ بھی نہیں ہے کہ خدا نے جو مال و دولت اور روپیہ پیسہ عطا کیا ہو اس کو یوں ہی ضائع کر دیا جائے یا اس کو غیر مصرف میں خرچ کر دیا جائے مثلاً یہ سوچ کر کہ میرے پاس جو مال و دولت ہے زہد وتقویٰ کی راہ میں رکاوٹ ہے اس کو لے جا کر دریا میں پھینک دے یا فقیرو، غنی، مستحق و غیر مستحق کی تمیز کے بغیر لوگوں میں بانٹ دے۔

حاصل یہ کہ نہ تو اس طرح کے ظاہری، زہد کا اعتبار ہے اور نہ یہ بات گوارا کرنے کے قابل ہے کہ دنیا کے ظاہری مال و اسباب سے اپنے ہاتھ کو بالکل خالی رکھے اور کوئی چیز کمانے اور اپنے پاس رکھنے کو تو زہد وتقویٰ کے خلاف جانے مگر معاشی ضرورت و احتیاج کے وقت دل غیر اللہ کی طرف متوجہ رکھے بلکہ اصل مدار و اعتبار قلب کے زہد پر ہے کہ دل ہر صورت میں صرف اللہ کی طرف متوجہ رہے اور اس میں دنیا اور دنیا کی کسی چیز کی کوئی محبت نہ ہو۔

"جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے" سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی مال و اسباب، تدبیر و ہنر، کسب و عمل اور مادی اسباب و وسائل ہیں! اسی طرح "جو اللہ کے ہاتھوں میں ہے" سے مراد یہ ہے کہ وہ چیز اس کے ظاہری و باطنی خزانوں میں ہے۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اصل اعتماد و بھروسہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر ہونا چاہئے۔ جو اس نے تمہیں رزق دینے اور تم تک اپنی نعمتیں پہنچانے کے بارے میں کیا ہے کہ وہ تمہیں اس طرح رزق دیتا ہے اور ایسی جگہ سے تم تک اپنی نعمتیں پہنچاتا ہے کہ تم اس کا گمان بھی نہیں کر سکتے! جو چیز تم اپنی سعی و تدبیر سے حاصل کرتے ہو اور جو مال وغیرہ تم اپنے کسب و عمل کے ذریعہ پیدا کرتے ہو اس کو یہ نہ سمجھو کہ واقعتاً اس چیز کے حاصل ہونے اور اس مال کے ملنے کے صرف تمہاری تدبیر و سعی اور تمہارے کسب و عمل کا دخل ہے بلکہ یہ یقین رکھو کہ تم تک جو کچھ بھی آیا ہے وہ سب دراصل خدا ہی کی طرف سے اس کے وعدہ رزق کے مطابق آیا ہے، اگر خدا تمہیں کچھ بھی نہ دینا چاہتا تو تم لاکھ تدبیر و سعی کرتے اور کتنی ہی محنت و مشقت سے کماتے تمہارے ہاتھ میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ آ سکتی تھی پھر اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے تھا کہ تم نے ظاہری اسباب و وسائل کے ذریعہ جو کچھ کمایا اور حاصل کیا ہے اور تمہارے کسب و عمل کے نتیجہ میں جو بھی چیز تمہارے پاس آئی ہے کہ خواہ وہ جاہ و منصب ہو یا مال و زر، خواہ وہ صنعتی و تجارتی کاروبار ہو یا زمین و جائیداد ہو، بالفرض محال علم کیمیا ہی کیوں نہ ہو، یہ سب چیزیں ان نعمتوں اور فائدوں سے زیادہ دیرپا ہرگز نہیں ہو سکتیں جو خدا کے خزانۂ قدرت میں موجود ہیں اور جو تمہیں ابھی نہیں ملی ہیں، کیونکہ تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب تلف و فنا ہو جانے والا ہے اس کے برخلاف جو چیزیں اور نعمتیں خدا کے خزانوں میں ہیں، وہ سب ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ۔

"تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے، سب فانی ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔"

حدیث کے آخری جزو، وَاَنْ تَكُوْنَ فِيْ ثواب المصيبة..... الخ کا مطلب یہ ہے کہ زہد یہ بھی ہے کہ تم دنیا کی راحت و چین اور آرام و آسائش کی طرف مائل و متوجہ نہ ہو اور دنیاوی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش و آرزو نہ رکھو بلکہ یہ جانو کہ دنیا کی نعمتیں اور لذتیں دراصل ان آفات اور بلاؤں میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہیں جو دینی اور اخروی، زندگی کو نقصان پہنچاتی ہیں! یہ اس لئے ضروری ہے تاکہ تمہارا دل دنیا کی طرف مائل نہ ہو اور تمہارا نفس دنیاوی چیزوں سے کوئی انس و تعلق نہ رکھے لہٰذا جب تم کسی دنیاوی مصیبت و آفت میں مبتلا ہو تو اس وقت مضطرب و پریشان حال اور شاکی ہونے کے بجائے اس مصیبت و آفت کو خوش آمدید کہو اور اس کے ذریعہ اجر و ثواب کے طلبگار بنو یہاں تک کہ اس وقت تمہارے دل میں اس مصیبت کی طرف اتنی زیادہ رغبت و اشتیاق ہو کہ جیسے وہ ابھی آئی نہیں ہے اور تم اس کے منتظر ہو۔

واضح رہے کہ ان الفاظ لو انہابقیت میں لفظ بقیت دراصل لم یصب کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس جملہ کا واضح مفہوم جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اجر و ثواب کی وجہ سے اس مصیبت کی طرف تمہاری رغبت، عدم مصیبت کی رغبت سے زیادہ ہونی چاہئے۔

بہرحال حضور ﷺ نے زہد کی مذکورہ دو صورتیں بیان کر کے یہ واضح فرمایا کہ کسی شخص میں ان دونوں صفات کا ہونا اس کے حق میں یہ کھلی ہوئی دلیل ہوگی کہ وہ زہد کے مقام پر فائز ہے دنیا اور دنیا کی چیزیں اس کی نظر میں کالعدم اور صرف آخرت اس کا مطلوب و مقصود ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ یوں تو بظاہر زہد کا مفہوم یہی ہے کہ دنیا سے بے رغبتی ہو، دنیاوی متاع و خواہشات جیسے مال و دولت اور جاہ و منصب وغیرہ کو ترک کیا جائے! لیکن حضور نے اشارہ فرمایا کہ زہد کا مرتبہ محض اس چیز سے کامل نہیں ہوتا تاوقتیکہ صبر و توکل کا مقام حاصل نہ ہو اور آخرت کی طرف رغبت و اشتیاق اس حد کو نہ پہنچ جائے کہ اس دنیا میں جو مصیبتیں اور بلائیں پہنچیں وہ آخرت کے اجر و ثواب کی تمنا میں محبوب و پسندیدہ بن جائیں اور ان کا پہنچنا، ان کے نہ پہنچنے سے زیادہ مرغوب ہو! اگر یہ مقام حاصل ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ زہد کی صفت پوری طرح پیدا ہو گئی ہے، ورنہ بصورت دیگر (محض مال و دولت کو ترک کرنا اور دنیاوی لذتوں اور نعمتوں سے اجتناب کرنا) گویا اپنے مال کو ضائع کرنا اور حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا ہے۔

تمام تر نفع و نقصان پہنچانے والا اللہ ہے

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ يَا غُلَامُ اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ وَاِذَا سَاَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰهَ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن (سفر کے دوران) میں رسول کریم ﷺ کی سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے (مجھے مخاطب کر کے) فرمایا! لڑکے! اللہ تعالیٰ کے تمام احکام (امر و نہی) کا خیال رکھو، اللہ تعالیٰ تمہارا خیال رکھے گا (اگر تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کرتے ہوئے ان چیزوں پر عمل کرو گے جن پر عمل کرنے کا اس نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے اجتناب کرو گے جن سے اجتناب کرنے کا اس نے حکم دیا، نیز تم ہر وقت اور ہر معاملہ میں اسی کی رضا و خوشنودی کے طالب رہو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ بھی تمہارا خیال رکھے گا بایں طور کہ تمہیں دنیا میں بھی ہر طرح کی آفات اور مصیبتوں سے بچائے گا اور آخرت میں بھی ہر عذاب و سختی سے محفوظ رکھے گا، جیسا کہ فرمایا گیا ہے و من کان للّٰہ کان اللّٰہ لہٗ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کا ہو جاتا ہے) اللہ تعالیٰ کے حق کا خیال رکھو گے تو تم اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ پاؤ گے (یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کو ہر لمحہ یاد رکھو گے، اس کے نظام قدرت میں غور و فکر کرو گے اور ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہو گے تو تم اس کی بے پایاں رحمتوں اور اس کے انعامات کو اپنے سامنے پاؤ گے) جب تم سوال کا ارادہ کرو تو صرف اللہ تعالیٰ کے آگے دست سوال دراز کرو، جب تم (دنیا و آخرت کے کسی بھی معاملہ میں) مدد چاہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ اور یہ جان لو کہ۔ اگر تمام مخلوق (کہ خواہ عوام ہوں یا خواص، انبیاء ہوں یا اولیاء اور ائمہ دین ہوں یا سلاطین دنیا) مل کر بھی تمہیں نفع پہنچانا چاہیں (یعنی اگر بفرض محال یہ ساری مخلوق اس بات پر اتفاق کر لے کہ وہ سب مل کر تمہیں کسی دنیاوی یا اخروی معاملہ میں کوئی فائدہ پہنچا دے تو ہرگز تمہیں نفع نہیں پہنچا سکے گی، علاوہ صرف اس چیز کے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے اور اگر دنیا کے تمام لوگ مل کر بھی تمہیں کسی طرح کا کوئی نقصان و ضرر پہنچانا چاہیں تو وہ ہرگز تمہیں کوئی نقصان و ضرر نہیں پہنچا سکیں گے علاوہ صرف اس چیز کے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا

ہے، قلم اٹھا کر رکھ دیئے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: "تو تم اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے پاؤ گے" کے معنی ایک یہ کہ جس کی طرف ترجمہ میں بھی بین القوسین اشارہ کیا گیا ہے، بعض حضرات کے مطابق یہ ہیں کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی یعنی اس کی عبادت و طاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری پر پابندی کے ساتھ عمل پیرا ہو گے تو تمہیں اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے گا اور تمہارے ساتھ معاملات میں مدد اور مشکل کشائی کرے گا اور تمہارے مقاصد و عزائم میں کامیابی عطا فرمائے گا (یا یہ کہ اس صورت میں تم اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی کو اپنے سامنے پاؤ گے کہ وہ تمہارے تمام معاملات میں تمہاری رعایت کرے گا اور طرح طرح سے تمہاری مدد و اعانت کرے گا۔

ایک مطلب، جو بہت اونچے مقام کا ضامن ہے، یہ ہے کہ جب تم حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی، اس کی اطاعت و عبادت کی پابندی اور اس کی رضا و خوشنودی کی طلب میں مشغول و مستغرق رہو گے تو اس وقت تمہاری نگاہ معرفت اس کو اپنے سامنے اس طرح پالے گی کہ گویا وہ تمہارے سامنے موجود ہے اور تم مقام احسان اور کمال ایمان کے درمیان اس کا مشاہدہ کر رہے ہو اور بالکل ایسا محسوس کرو گے، جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو بایں حیثیت کہ اللہ کے سوا ہر چیز تمہاری نظر کے سامنے سے بالکل معدوم اور فنا ہو جائے گی، پس اس طرح تمہیں مراقبہ کی اصل کیفیت بھی حاصل ہوگی اور مقام مشاہدہ بھی نصیب ہوگا۔

"صرف اللہ کے آگے سوال دست دراز کرو" کیونکہ عطاء و بخشش کے تمام خزانے اسی کے پاس اور اسی کے دست قدرت میں ہیں اور دنیا و آخرت کی ہر وہ نعمت و راحت جو بندہ کو پہنچتی ہے اور ہر وہ بلاو سزا جس سے بندہ محفوظ رہتا ہے محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پہنچتی ہے یا دفع ہوتی ہے، پھر اس کی رحمت، صرف رحمت ہے نہ کہ اس میں کسی غرض کی آمیزش ہے اور نہ کسی علت و سبب کا دخل، نیز وہ جواد مطلق اور ایسا غنی ہے کہ نہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی ہے اور نہ وہ کبھی محتاج ہوتا ہے لہٰذا صرف وہی ذات اس لائق ہے کہ اپنی ہر امید اس سے وابستہ کی جائے اس کے عذاب کے علاوہ اور کسی سے خوف نہ کھایا جائے، اپنی ہر مشکل میں اور ہر مہم میں صرف اسی کے حضور مدد کی التجا کی جائے اور تمام معالات میں صرف اسی پر اعتماد کیا جائے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے حکم دیا کہ جو کچھ بھی مانگنا ہو صرف خدا سے مانگو، اس کے علاوہ کسی اور کے آگے دست سوال دراز نہ کرو، کیونکہ کوئی اور، دینے یا نہ دینے اور نفع پہنچانے یا نقصان دور کرنے پر قادر ہی نہیں ہے، جو ذات خود اپنے کو نفع پہنچانے، یا اپنے نقصان کو دور کرنے اور اپنی موت و حیات کی مالک نہیں ہے وہ کسی دوسرے کو کیا نفع پہنچا سکتی ہے اور کیا نقصان سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اسی طرح مذکورہ حکم میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اپنی کسی بھی حالت میں اور کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلانے سے باز نہیں رہنا چاہئے کیونکہ ایک حدیث میں وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، اس پر اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوتا ہے، علاوہ ازیں اپنے خالق کے آگے پھیلانا درحقیقت اس کے حضور اپنی عاجزی و بے کسی اور محتاجگی کا اظہار کرنا ہے جو عبودیت کی شان ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اللّٰہ یغضب ان ترکت سؤالہ وابناء آدم حین یسأل یغضب

اللہ تعالیٰ تو اس وقت خفا ہوتا ہے جب تم اس سے سوال نہ کرو، اور آدم کے بیٹے اس وقت خفا ہوتے ہیں جب کہ کوئی ان سے سوال کرے۔

"اور اگر تمام مخلوق مل کر تمہیں نفع پہنچانا چاہے..... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ ہر نفع نقصان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانو اور ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہی نفع پہنچانے والا بھی ہے اور نقصان پہنچانے والا بھی، اور وہی دینے والا ہے اور وہی نہ دینے والا بھی! کسی ایک فرد بشر کا تو سوال ہی کیا ہے، اگر تمام روئے زمین کی ساری مخلوق مل کر بھی خدا کی مرضی و حکم کے خلاف کسی شخص کو کوئی نفع یا کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ اس شخص کو وہ نفع یا نقصان پہنچ جائے۔ الٰہیات کی بعض کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ۔ "قسم ہے اپنی عزت و جلال کی" یقیناً میں اس شخص سے انقطاع کر لیتا ہوں جو میرے علاوہ کسی اور سے اپنی امید وابستہ کرتا ہے اور لوگوں کی نظر میں اس کو ذلت کی پوشاک پہنا دیتا ہوں، یعنی لوگوں کے سامنے اس کو ذلیل و خوار کر دیتا ہوں، اس کو

اپنے قرب سے محروم کر دیتا ہوں اور اپنے وصل سے دور کر دیتا ہوں، پس یقینی بات یہ ہے کہ میں اس کو حیرانی و پریشانی اور تفکرات کے اندھیروں میں پھینک دیتا ہوں! کیا وہ شخص اپنی مشکلات اور پریشانیوں کے وقت میرے علاوہ کسی اور سے امید رکھتا ہے جب کہ پریشانیاں اور مشکلات میرے ہاتھ میں ہیں؟ میں الحی القیوم ہوں! وہ شخص فکر و پریشانی کے عالم میں دوسروں کے دروازوں کو کھٹکھٹاتا پھرتا ہے، جب کہ تمام دروازوں کی کنجیاں میرے ہاتھ میں ہیں اور دروازے بند ہیں؟ میرا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہوا ہے جو میری طرف آئے اور مجھ سے دعا مانگے۔

"قلم اٹھا کر رکھ دیئے ہیں" سے مراد یہ ہے کہ جو احکام صادر ہوتے تھے سب لکھے جا چکے ہیں! اسی طرح "اور صحیفے خشک ہو گئے" سے مراد یہ ہے کہ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اور جس کے حق میں جو کچھ پیش آنا ہے وہ سب تقدیر کی کتاب میں لکھا جا چکا ہے اور وہ کتاب خشک ہو چکی ہے کہ اب اس پر قلم نہیں چلے اور جو کچھ لکھ دیا گیا ہے اس کے بعد اب کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ حاصل یہ کہ اس دنیا میں جو بھی آتا ہے اور قیامت تک جو بھی آئے گا اس کی تقدیر و قسمت کے فیصلے لوح محفوظ میں لکھے جا چکے ہیں، اور اس کام سے فراغت بھی ہو چکی ہے کہ اب کسی کے حق میں کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ پس ہر شخص کی تقدیر و قسمت کے بہت پہلے لکھے جانے کو "قلم اٹھا کر رکھ دینے، اور صحیفوں کے خشک ہو جانے۔" سے تعبیر کیا ہے اور اس میں مشابہت کا پہلو یہ ہے کہ جس طرح کوئی کاتب جب کتاب کو مکمل لکھ کر فارغ ہو جاتا ہے تو قلم اٹھا کر رکھ دیتا ہے اور کتاب کو بند کر دیتا ہے اسی طرح کاتب تقدیر بہت پہلے ہی مخلوق کی تقدیریں لکھ کر فارغ ہو چکا ہے اور وہ صحیفہ کہ جس میں تقدیریں لکھی ہوئی ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لپیٹ دیا گیا ہے، اس میں اب کوئی تغیر و تبدل اور کوئی کمی بیشی ممکن نہیں ہے! اس کتاب کی ابتداء میں یہ حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا وہ قلم تھا پھر اس سے فرمایا کہ لکھو! قلم نے کہا کہ کیا لکھوں؟ فرمایا۔ "تقدیر لکھو" چنانچہ قلم نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو اب تک وقوع پذیر ہو چکا ہے اور جو قیامت تک وقوع پذیر ہوگا۔ "اگر یہاں یہ اشکال پیدا ہو کہ یہ روایت کہ (قلم اٹھا کر رکھ دیئے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے) قرآن کریم کی اس آیت یمحو اللہ مایشاء کے منافی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ محو و اثبات بھی دراصل انہی چیزوں میں سے ہے جو مقدر ہو چکی ہیں اور جن کو لکھنے کے بعد قلم رکھ دیئے گئے اور یہ صحیفے خشک ہو گئے کیونکہ قضا (یعنی وہ کلی احکام و فیصلے جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے صادر فرما دیئے تھے) کی دو قسمیں ہیں ایک تو قضائے مبرم (کہ جو اٹل ہے اور جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں) اور دوسرے قضائے معلق (کہ جو اٹل نہیں ہے اور جس میں تغیر و تبدل ممکن ہے) علاوہ ازیں اس محو و اثبات کا تعلق لوح محفوظ، اور اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے، یعنی یہ پہلے ہی سے لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے کہ فلاں چیز کو اس طرح مٹایا یا باقی رکھا جائے گا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے پس اسی مفہوم کو اللہ تعالیٰ کی محو و اثبات کی نسبت کر کے بیان کیا گیا ہے جو در حقیقت مقدر امور میں "نہ تغیر کہلائے گا نہ تبدل۔"

اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس اللہ کے پاس دو کتابیں ہیں، ایک تو لوح محفوظ ہے کہ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا اور دوسری کتاب وہ ہے جس میں فرشتے بندوں کے اعمال لکھتے ہیں اور محو و اثبات کا تعلق اسی کتاب سے ہے۔

بہر حال اس ارشاد گرامی میں یہ ترغیب ہے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل و اعتماد کرے رضائے مولی پر راضی رہے اور اپنی تدبیر و سعی اور ذاتی قوت و طاقت کو حقیقی مؤثر ہرگز نہ جانے کیونکہ پیش آنے والی کوئی بھی چیز کہ خواہ وہ سعادت و مسرت ہو یا شقاوت و کلفت، تنگی و سختی ہو یا فراخی و وسعت، خوشحالی ہو یا بد حالی، نفع ہو یا نقصان، اور موت ہو یا حیات، ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم و فیصلہ سے باہر اور اس قضا و قدر الٰہی کے مطابق نہ ہو جس کو کاتب تقدیر نے زمین و آسمان کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیا ہے اور جس چیز کا وقوع پذیر ہونا لکھا جا چکا ہے وہ ہر حالت میں اور ہر صورت میں وقوع پذیر ہو کر رہے گی اس کو نہ انسانی حرکت و سکون کا نظام روک سکتا ہے اور نہ تدبیر و سعی! پس خواہ خوشی کی حالت پیش آئے یا ضرر و تکلیف کی، بہر صورت شکر ادا کرنا لازم ہے نیز اس بات کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ بندہ اپنے دشمن و مخالف، اپنی تکلیف و مصیبت اور ضرر و نقصان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا اسی

صورت میں مستحق ہوتا ہے جب کہ وہ ان چیزوں کی وجہ سے پیش آنے والے رنج والم پر صبر کرے اور کسی بھی حالت میں اپنی تقدیر وحالت کا شکوہ نہ کرے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی کتاب "فتوح الغیب" میں بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ ہر مؤمن کے لئے لازم ہے کہ وہ اس حدیث کو اپنے دل کا آئینہ قرار دے اور اپنی تمام حرکات وسکنات میں اس کے مطابق عمل کرے، تاکہ دنیا وآخرت میں سالم ومحفوظ رہے اور دونوں جہان میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب عزت وسرفرازی سے نوازا جائے بعض روایات میں ان الفاظ تجدہ تجاھک کے بعد یہ عبارت بھی نقل کی گئی ہے۔

تَعْرِفِ اِلَی اللّٰہِ فِی الرَّخَاءِ یَعْرِفُکَ فِی الشَّدَائِدِ. فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰہِ بِالرِّضَاءِ فِی الْیَقِیْنِ فَافْعَلْ فَاِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَاِنَّ فِی الصَّبْرِ عَلٰی مَاتَکْرَہُ خَیْرًا کَثِیْرًا وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ وَالْفَرَجَ مَعَ الْکَرْبِ وَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا وَلَنْ یَغْلِبَ عُسْرٌ یُسْرَیْنِ۔

یعنی خوشحالی وشادمانی کی حالت میں نعمت شناسی اور طاعت حق کے ذریعہ) اللہ تعالیٰ کو پہچانو یعنی اس کی یاد سے غافل نہ ہو اور اس کی شکر گزاری کرتے رہو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کے بدلے میں یقیناً اللہ تعالیٰ بھی تمہیں تنگی وسختی کی حالت میں پہنچائے گا، یعنی وہ تمہیں اس تنگی وسختی سے نمٹنے کی طاقت وقوت، اس سے گلوخلاصی کا راستہ اور حاجت براری کی نعمت عطا فرمائے گا (پس اگر تم یقین کے مرتبہ پر رضا وخوشی کے ساتھ خدا کی خاطر کوئی کام کر سکتے ہو تو اس کام کو یقیناً کرو (کیونکہ بلاشبہ وہ بہت بڑا کام ہے) اور اگر تم کوئی ایسا کام نہ کر سکو (اور نعمت کی شکر گزاری کا حق پوری طرح ادا نہ کر سکو) (تو جانو کہ) آفات ومصائب اور طبیعت کے خلاف پیش آنے والے امور پر صبر کرنا بھی نیکی وبھلائی اور بہت فضیلت وثواب کا ضامن ہے (یعنی اصل چیز تو ہر حالت میں خواہ تنگی وسختی ہو، یا وسعت وخوشحالی اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی چیز پیش آتی ہے وہ یقیناً نعمت ہی ہوتی ہے اور خواہ ظاہر خواہ باطن کے اعتبار سے اس کے لطف کرم ہی کی ضامن ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص شکر گزاری کا حق پوری طرح ادا نہ کر سکے تو پیش آنے والی تنگی وسختی پر صبر کرنا چاہئے کیونکہ یہ بھی ایک بڑی فضیلت رکھتا ہے) اور جان لو کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ اطاعت حق اور ترک معصیت پر صابر اور ثابت قدم رہے اور وسعت وکشادگی دراصل رنج الم کے ساتھ ہے (یعنی ہر تنگی وسختی کے بعد وسعت وکشادگی آتی ہے، اور رنج وغم کے بعد راحت وشادمانی کا دروازہ کھلتا ہے) اور بے شک عسرت وسختی کے ساتھ خوش حالی وآسانی بھی ہے (یعنی جب کسی آدمی پر سختی وتنگی آتی ہے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ خوش حالی وآسانی بھی عطا فرماتا ہے) اور ایک سختی دو آسانیوں پر غالب نہیں ہو سکتی (یعنی اگر انسان کسی تنگی وسختی میں مبتلا ہو تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ اس کے عوض دو آسانیاں پائے گا، ایک تو اسی دنیا میں کہ اللہ تعالیٰ ہر سختی کے بعد آسانی پیدا کرتا ہے اور دوسری آسانی آخرت میں بصورت اجر وثواب حاصل ہوگی جیسا کہ مسلمانوں کی تاریخ سے ثابت ہے جب کہ وہ دنیا میں تنگی وسختی اور مصائب وآلام میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے صبر وعزیمت کے ساتھ ان سخت حالات کو برداشت کیا تو اس کے بعد ان کو پہلے تو اس دنیا میں قدرتی مدد ونصرت کے ذریعہ فتح وکامرانی اور عزت وحشمت اور ترفہ وخوشحالی کی نعمت ملی اور پھر انہیں آخرت میں وہاں جنت کی قیمتی راحتیں، بلند مراتب ودرجات، اور دیدار مولیٰ کی نعمت عظمیٰ حاصل ہوگی۔

انسان کی نیک بختی اور بدبختی

⑨ وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ سَعَادَۃِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاہُ بِمَا قَضَی اللّٰہُ لَہٗ وَمِنْ شِقَاوَۃِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْکُہٗ اسْتِخَارَۃَ اللّٰہِ وَمِنْ شِقَاوَۃِ ابْنِ اٰدَمَ سَخَطُہٗ بِمَا قَضَی اللّٰہُ لَہٗ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" ابن آدم (انسان) کی نیک بختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس پر راضی رہے اور ابن آدم کی بدبختی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی کو مانگنا چھوڑ دے، نیز ابن آدم کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کے مقدر میں لکھ دیا ہے وہ اس سے ناخوش و ناراض ہو

اس روایت کو احمدؒ و ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی شقاوت و بھلائی اور اس کی نیک بختی کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی مانگے اس کے آگے دست سوال دراز کرے اور اس کی بارگاہ کبریائی میں اپنی عرض و مناجات پیش کرے اور پھر اپنی تقدیر و قسمت پر بہر صورت راضی رہے اور یہ یقین رکھے کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا ہے، یا جو کچھ بھی پیش آنے والا ہے وہ سب خدا کے حکم و فیصلہ کے مطابق ہے جو اس نے میرے مقدر میں لکھ دیا ہے اور جو ہر اعتبار سے میرے لئے بہتر ہے۔ اگرچہ خدا سے خیرو بھلائی مانگنے کی بات انسان کی نیک بختی کے ضمن میں نقل نہیں کی گئی ہے، لیکن بعد کی عبارت کو، کہ جس میں انسان کی بدبختی کا ذکر کیا گیا ہے مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مراد یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی مانگنے سے اجتناب کرنے سے انسان کی بدبختی قرار دینا اس امر کو واضح کرتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ہر لمحہ اپنی بھلائی اور اپنی بہتری کے لئے خدا کی طرف متوجہ اور اس سے ہمیشہ خیر کا طلب گار رہے۔

نیز جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ابن آدم کو چاہئے کہ وہ ہر صورت میں قضاو قدر الٰہی پر راضی رہے۔ تو اس سے یہ وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ گناہ کے علاوہ اور خلاف شریعت امور کا ارتکاب ہو جانے کی صورت میں بھی اس کو قسمت کا لکھا سمجھ کر اس پر راضی و مطمئن ہو جانا چاہئے، لہٰذا آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی ہی کا طالب رہے تاکہ وہ پاک ذات اس کو صرف خیرو بھلائی کی راہ پر لے جائے اور اس کو صرف پسندیدہ امور اختیار کرنے کی توفیق عطا فرماتا رہے، اور برائی کی راہ اور خلاف شریعت امور سے اس کی حفاظت کرتا رہے۔

واضح رہے کہ ہر صورت میں اور ہر حالت میں قضاو قدر الٰہی پر راضی ہونا بہت بڑی بات ہے اور اس مقام کا نام "افخم" یعنی مرتبہ عظمیٰ ہے۔

یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قضاو قدر الٰہی پر راضی ہونے کو، کہ وہ اپنی تقدیر و قسمت کے خلاف ناراضگی و غضب ناکی کو ترک کرتا ہے، انسان کی سعادت و نیک بختی قرار دینا دو چیزوں کی وجہ سے ہے، ایک تو یہ کہ جو شخص قضائے الٰہی پر راضی رہتا ہے، اس کو سکون قلب، ذہنی فراغت و اطمینان، اور خاطر جمعی کی دولت نصیب ہو جاتی ہے اور یہ چیز ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے انسان اپنے معاملات و کاروبار اور خاص طور پر حق تعالیٰ کی اطاعت و عبادت میں نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ مشغول رہتا ہے، چنانچہ جو شخص تقدیر پر اعتقاد نہیں رکھتا یا قسمت کے لکھے پر راضی نہیں ہوتا وہ ذرا ذرا سی مصیبت اور حادثات پر متفکر اور پراگندہ خاطر رہتا ہے، اور یہ ادھیڑ بن اس کو اپنے مقاصد و معاملات اور طاعات و عبادات میں دل و دماغ کے سکون و اطمینان سے محروم رکھتی ہے کہ یہ مصیبت کیوں آگئی، فلاں حادثہ کیسے رونما ہو گیا اور یہ بات اس طرح کیوں نہ ہو گئی؟

دوسرے یہ کہ یہ چیز بندہ کو اس سبب سے اللہ تعالیٰ کے غضب و غصہ سے بچاتی ہے کہ وہ خدا کی لکھی تقدیر کے خلاف اپنی ناراضگی اور اپنے غصہ کا اظہار نہیں کرتا۔ اور تقدیر کے خلاف انسان کی ناراضگی و غصہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا ذکر کرے اور اس چیز کو اپنے حق میں بہتر قرار دے، جس کو اللہ نے اس کے مقدر میں نہیں لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز خدا نے اس کے مقدر میں لکھ دی ہے وہ یقینی طور پر اس چیز سے بہتر اور اولیٰ ہے جس کا اچھا اور برا ہونا سرے سے یقینی ہی نہیں ہے۔

استخارہ یعنی اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی طلب کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے تمام معاملات اور تمام امور میں اللہ تعالیٰ سے بہتری

اور اچھائی طلب کی جائے بلکہ یہ یقین واعتقاد رکھے کہ یہ انسان یہ جانتا ہی نہیں کہ اس کے حق میں کونسی چیز اچھی ہے اور کون چیز بری، یہ صرف خدا ہے جو اپنے بندوں کے حق میں اچھی اور بری چیز کو جانتا ہے، چنانچہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کو اپنے حق میں بہتر جانتا ہے مگر حقیقت میں وہ چیز اس کے حق میں بری ہوتی ہے، یا کسی کی چیز کو اپنے لئے برا سمجھتا ہے مگر حقیقت میں وہ چیز اس کے حق میں اچھی ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔

عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

"یہ بالکل بعید نہیں ہے کہ تم کسی چیز کو (اپنے حق میں) بری سمجھو مگر حقیقت میں) وہ تمہارے لئے اچھی ہو، اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ کسی چیز کو تم (اپنے حق میں) اچھی سمجھو مگر (حقیقت میں وہ تمہارے لئے بری ہو، یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے تم نہیں جانتے (کہ تمہارے حق میں کونسی چیز اچھی ہے اور کونسی چیز بری۔"

جب یہ یقین واعتقاد پختہ ہو جائے تو پھر اس یقین واعتقاد کے ذریعہ آگے کا درجہ اختیار کرے کہ اس دنیا میں اور ہماری زندگی میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے اور اس کے حکم وفیصلہ کے مطابق ہے اور جو بھی چیز اللہ کے حکم وفیصلہ کے مطابق ہوتی ہے وہ حقیقت اور انجام کے اعتبار سے خیر و بھلائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی اس لئے وارد ہوا ہے کہ۔

الخیر بیدیک والشر لیس الیک (اے رب) خیر و بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے اور برائی تیری طرف سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔"

اور پھر یہ مستحب ہے کہ اگر کوئی اہم دینی یا دنیوی معاملہ درپیش ہو تو اس کے متعلق ذی علم اصحاب رائے اور مخلصین سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد استخارہ کیا جائے یعنی کارساز حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف حضور قلب کے ساتھ متوجہ ہو کر خیر و بھلائی کی دعا مانگی جائے، استخارہ میں کم سے کم چیز یہ ہے کہ یوں دعا مانگی جائے۔

اَللّٰهُمَّ خِرْلِي وَاخْتَرْلِي فَلَا تَكِلْنِي اِلٰى اِخْتِيَارِي۔

"اے اللہ میرے حق میں بہتر فرما، اور جو چیز میرے لئے بہتر ہو رہی ہے اختیار فرما، پس مجھے میرے اختیار کے سپرد نہ فرما۔"

اور استخارہ کا کامل طریقہ یہ ہے کہ پہلے دو رکعت نماز پڑھے اور پھر استخارہ کی وہ دعا پڑھے جو بطور "مسنون دعا" مشہور ہے اور اسی کتاب کے گزشتہ صفحات میں نقل بھی کی جا چکی ہے۔

طبرانیؒ نے اوسط میں حضرت انسؓ سے یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ مَاخَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ وَلَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ۔

یعنی وہ شخص نامراد نہیں ہو سکتا جس نے استخارہ کیا، وہ شخص نادم و شرمندہ نہیں ہو سکتا جس نے مشورہ کیا اور وہ شخص محتاج نہیں ہو سکتا جس نے میانہ روی اختیار کی۔

بعض حکماء نے فرمایا کہ۔ جس شخص کو چار چیزیں حاصل ہو گئیں وہ چار چیزوں سے محروم نہیں ہو سکتا، جس شخص کو شکر گزاری کا مرتبہ حاصل ہو وہ (نعمتوں میں) اضافہ وزیادتی سے محروم نہیں رہے گا، جس شخص کو توبہ کی توفیق نصیب ہوگی وہ قبولیت سے محروم نہیں رہے گا جس شخص نے استخارہ کا راستہ اختیار کیا وہ بہتری و بھلائی سے محروم نہیں رہے گا، جس شخص نے مشورہ حاصل کیا وہ صحیح بات تک پہنچنے سے محروم نہیں رہے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

خدا پر کامل اعتماد کا اثر

(۱۵) عَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ غَزَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِبَلَ نَجْدٍ فَلَمَّا قَفَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَفَلَ مَعَهٗ

فَاَدْرَكَتْهُمُ الْقَائِلَةُ فِيْ وَادٍ كَثِيْرِ الْعِضَاهِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَفَرَّقَ النَّاسُ يَسْتَظِلُّوْنَ بِالشَّجَرِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحْتَ سَمُرَةٍ فَعَلَّقَ بِهَا سَيْفَهُ وَنِمْنَا نَوْمَةً فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوْنَا وَاِذَا عِنْدَهُ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ اِنَّ هٰذَا اخْتَرَطَ عَلَيَّ سَيْفِي وَاَنَا نَائِمٌ فَاسْتَيْقَظْتُ وَهُوَفِيْ يَدِهٖ صَلْتًا قَالَ مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي فَقُلْتُ اللّٰهُ ثَلٰثًا وَلَمْ يُعَاقِبْهُ وَجَلَسَ - مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ بَكْرِ الْاِسْمَاعِيْلِيِّ فِيْ صَحِيْحِهٖ فَقَالَ مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّيْ قَالَ اللّٰهُ فَسَقَطَ السَّيْفُ مِنْ يَدِهٖ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّيْفَ فَقَالَ مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي فَقَالَ كُنْ خَيْرَ اٰخِذٍ فَقَالَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ لَا وَلٰكِنِّيْ اُعَاهِدُكَ عَلٰى اَنْ لَّا اُقَاتِلَكَ وَلَا اَكُوْنَ مَعَ قَوْمٍ يُقَاتِلُوْنَكَ فَخَلّٰى سَبِيْلَهٗ فَاَتٰى اَصْحَابَهٗ فَقَالَ جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ هٰكَذَا فِيْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَفِي الرِّيَاضِ۔

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس جہاد میں شریک تھے جو نجد کی اطراف میں ہوا تھا اور جب رسول کریم ﷺ جہاد سے فارغ ہوئے اور واپس ہوئے تو جابرؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہی واپس ہوئے (اسی سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن) صحابہؓ دوپہر کے وقت ایک ایسے جنگل میں پہنچے جس میں کیکر کے درخت زیادہ تھے، چنانچہ رسول کریم ﷺ (صحابہؓ کے ساتھ) وہیں اتر پڑے اور تمام لوگ درختوں کے سایہ کی تلاش میں ادھر ادھر پھیل گئے (یعنی ہر شخص ایک ایک درخت کے نیچے چلا گیا اور اس کے سایہ میں کچھ دیر استراحت کی خاطر لیٹ گیا) رسول کریم ﷺ بھی کیکر کے ایک بڑے درخت کے نیچے فروکش ہوگئے اور اپنی تلوار کو اس درخت کی ٹہنی میں لٹکا دیا (حضرت جابرؓ کہتے ہیں) کہ ہم لوگ تھوڑی سی نیند لینے کی خاطر سو چکے تھے کہ اچانک ہم نے سنا کہ رسول کریم ﷺ ہمیں آواز دے رہے ہیں چنانچہ ہم لوگ (اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر) آپ ﷺ کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ لیٹے ہوئے ہیں اور وہیں آپ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی کافر موجود ہے، آنحضرت ﷺ نے (ہمارے جمع ہونے پر) فرمایا کہ یہ دیہاتی اس وقت جب کہ میں سو رہا تھا مجھ پر میری تلوار سوت کر کھڑا ہوگیا، اور جب میری آنکھ کھل گئی تو میں نے دیکھا کہ میری ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے، اس نے مجھ سے کہا کہ اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے فوراً جواب دیا کہ میرا خدا مجھے بچائے گا۔ حضور ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ کہی اور اس دیہاتی کو کوئی سزا نہیں دی، پھر آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ (بخاری،مسلم) اور اس روایت میں کہ جس کو ابوبکر اسماعیلیؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے یہ الفاظ ہیں کہ اس دیہاتی نے (آنحضرت ﷺ پر تلوار سوت کر) کہا کہ اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا "اللہ بچائے گا" (یہ سنتے ہی) دیہاتی کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی حضور ﷺ نے تلوار کو اٹھالیا، اور فرمایا کہ (اگر میں تمہیں قتل کرنا چاہوں تو بتاؤ کہ) اب تمہیں کون مجھ سے بچائے گا؟ دیہاتی نے جواب دیا آپ ﷺ تو بھلائی کے ساتھ گرفت کرنے والے ہیں (یعنی آپ ﷺ کی شان سے تو مجھے یہ امید ہے کہ میرے لئے انتقامی کاروائی نہیں کی جائے گی اور آپ ازراہ لطف و کرم مجھے معاف کردیں گے) حضور ﷺ نے فرمایا کہ اچھا اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ گویا آپ ﷺ نے اس سے یہ فرمایا کہ اگر تمہیں میرے اوپر اتنا زیادہ اعتماد ہے تو پھر یقیناً یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتے ہوگے کہ میری دعوت اسلام بالکل برحق اور مبنی بر صداقت ہے، اس صورت میں تو تمہیں چاہئے کہ کلمہ پڑھ لو اور مسلمان ہو جاؤ (دیہاتی نے کہا کہ مسلمان تو نہیں ہوسکتا البتہ آپ ﷺ سے یہ عہد ضرور کرتا ہوں کہ نہ میں خود آپ ﷺ سے لڑوں گا اور نہ ان لوگوں کا ساتھ دوں گا جو آپ ﷺ سے لڑیں گے۔ بہر حال آپ ﷺ نے اس دیہاتی کو چھوڑ دیا اور جب وہ دیہاتی اپنی قوم میں آیا تو کہنے لگا کہ میں تمہارے درمیان ایک ایسے شخص کے پاس سے آرہا ہوں، جو سب سے بہتر انسان ہے...... بخاری و مسلم کی مذکورہ بالا روایت انہی الفاظ کے اضافہ کے ساتھ کتاب حمیدی اور امام محی الدین نووی کی تصنیف "ریاض الصالحین" میں بھی منقول ہے۔"

تشریح: نجد لغت میں تو زمین کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو عام سطح سے بلند ہو، اور ویسے یہ جزیرۃ العرب کے ایک خاص علاقہ کا نام ہے

اور چونکہ یہ علاقہ ایک سطح مرتفع ہے اس لئے اس کو نجد کا نام دیا گیا ہے! زمانہ قدیم میں "نجد ایک بہت مختصر علاقہ پر مشتمل تھا مگر موجودہ جغرافیہ میں جزیرۃ العرب کے سارے وسطی علاقہ کو نجد کہا جاتا ہے، جس کا انتہائی طول تقریباً آٹھ سو میل.... اور انتہائی عرض تقریباً سودو سو میل ہے، یہ شمال میں بادیۃ الشام کے جنوبی سرے سے شروع ہو کر جنوب میں وادی الدواسر یا الربع انخالی تک اور عرضاً "احساء" سے حجاز تک پھیلا ہوا ہے۔

"عِضَاہ" اس میں "عضہ" کی جمع ہے اور جس کا اطلاق ہر اس درخت پر ہوتا ہے جو کانٹے دار ہو، اور مجمع البحار میں لکھا ہے کہ "عِضَاہ" کیکر کے درخت کو کہتے ہیں اور جو درخت عِضَاہ سے بڑا ہو اسے سَمُرہ کہا جاتا ہے۔"

تقویٰ و پرہیزگاری اور رزق

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّیْ لَاَ عْلَمُ اٰیَۃً لَوْ اَخَذَ النَّاسُ بِھَا لَکَفَتْھُمْ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بلاشبہ میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ (محض) اسی آیت پر عمل کریں تو ان کے حق میں وہی ایک آیت کافی ہو جائے (اور ان کو دیگر وظائف و اوراد کی ضرورت نہ رہے) وہ آیت یہ ہے وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (الآیۃ) یعنی جو شخص خدا سے ڈرے تو خدا اس کے لئے دنیا اور آخرت کے غموں سے نجات کا راستہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے (تعب و مشقت اور فکر و تردد کے بغیر) رزق دیتا ہے جہاں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔"

(ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: پوری آیت کہ جس کی طرف حضور ﷺ نے اشارہ فرمایا، یوں ہے۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا۔

"اور جو شخص خدا سے ڈرے تو خدا اس کے لئے نجات کا راستہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جہاں سے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص (اپنے امور و معاملات میں) خدا پر توکل و اعتماد کرے تو وہ دونوں جہاں میں اس کے لئے کافی ہے، بے شک اللہ تعالیٰ اپنی مراد کو پہنچنے والا ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے اندازہ مقرر کیا ہے۔"

پس وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ سے حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ تک میں تو اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے لئے دنیا و آخرت کے اس کے ان تمام امور و معاملات میں کافی ہو جاتا ہے جن سے وہ ڈرتا ہے اور جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوتے ہیں بایں طور کہ اس کو ایسی تمام چیزوں سے محفوظ و مامون رکھا جاتا ہے۔

اور وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ شخص اگر اللہ تعالیٰ پر اعتماد و بھروسہ کر کے (دنیا و آخرت کی نعمتوں کا طلبگار و متلاشی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے بایں طور کہ اس کو وہ نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ (بے شک اللہ تعالیٰ اپنی مراد کو پہنچنے والا ہے) سے مراد یہ ہے کہ وہ قادر مطلق اپنے احکام اور فیصلوں کو جاری اور نافذ کرنے والا ہے، یعنی اس کو ہر طرح کا حکم و فیصلہ جاری کرنے کے کلی اختیار بھی حاصل ہے اور وہ اپنے ہر حکم و فیصلہ کو نافذ کرنے کی پوری طاقت و قدرت بھی رکھتا ہے، کیونکہ جب یہ جان لیا گیا کہ از قسم رزق اور اس کے مانند ہر چیز تقدیر الٰہی اور توفیق خداوندی ہی سے تعلق رکھتی ہے کہ انسان جس چیز کی بھی خواہش و طلب رکھتا ہے وہ اس کے حکم و فیصلہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، تو اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ انسان قضا و قدر کے آگے سر تسلیم خم رکھے اور اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر توکل و اعتماد کرے۔

رزق دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اَقْرَأَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ اَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو یہ آیت سکھائی اِنِّيْ اَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ یعنی (اے انسان جان لے کہ) بلاشبہ میں ہی روزی دینے والا ہوں (اور) غالب طاقت والا ہوں۔" (ابوداؤدؒ ترمذیؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: اِنِّيْ اَنَا الرَّزَّاقُ قرأت شاذہ ہے، قرأت مشہورہ کے مطابق اس آیت کے الفاظ اصل میں یوں ہیں اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ (بلاشبہ خدا ہی رزق دینے والا ہے اور غالب طاقت والا ہے) حاصل یہ کہ جب رزق دینے والا اور غالب طاقت رکھنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے تو پھر لازم ہے کہ اس کی ذات کے علاوہ اور کسی پر قطعا بھروسہ نہ کیا جائے اور اپنے امور کا بہتر کارساز و وکیل، اس کے علاوہ اور کسی کو ہرگز نہ سمجھا جائے۔"

کسب و کمائی کو اصل رازق نہ سمجھو

(۱۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَخَوَانِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اَحَدُهُمَا يَاْتِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ يَحْتَرِفُ فَشَكَا الْمُحْتَرِفُ اَخَاهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهٖ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں دو بھائی تھے جن میں سے ایک تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں رہا کرتا تھا (کیونکہ اس کے اہل و عیال نہیں تھے، اور وہ حصول معاش کی ذمہ داریوں سے بے فکر ہو کر طاعت و عبادت اور دینی خدمات میں مشغول رہا کرتا تھا، اس وجہ سے اس کے اوقات کا اکثر حصہ "بارگاہ رسالت میں حاضر باشی کے ذریعہ حصول علم و معرفت میں صرف ہوتا تھا) اور دوسرا بھائی کوئی کام کرتا تھا (یعنی حصول معاش کے لئے کسی ہنر و پیشہ کے ذریعہ کماتا تھا اور دونوں بھائی ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے) چنانچہ کمانے والے بھائی نے اپنے دوسرے بھائی کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے شکایت کی (یعنی میرا بھائی نہ تو میرے کام کاج میں ہاتھ بٹاتا ہے اور نہ خود الگ سے کوئی کام کر کے کماتا ہے، اور اس طرح اس کے کھانے پینے کا خرچ مجھے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے) حضور ﷺ نے (اس کی یہ شکایت سن کر) فرمایا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں اسی کی برکت سے رزق دیا جاتا ہو۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح غریب ہے۔"

تشریح: حضور کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ تم یہی کیوں سمجھتے ہو کہ تمہیں جو رزق ملتا ہے وہ حقیقت میں تمہارے کمانے کی وجہ سے ملتا ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنے اس بھائی کے ساتھ جو ایثار کا معاملہ کرتے ہو، اور اس کی معاشی ضروریات کا بوجھ برداشت کر کے جس طرح اس کو فکر و غم سے دور رکھتے ہو اسی کی برکت کی وجہ سے تمہیں بھی رزق دیا جاتا ہو، پس اس صورت میں شکوہ و شکایت کرنے اور اس پر احسان رکھنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علم و عمل اور دینی خدمات کی طرف متوجہ رہنے اور زاد عقبیٰ کی تیاری کے لئے دنیاوی مشغولیات کو ترک کرنا جائز ہے۔ نیز یہ حدیث اس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ فقراء اور خاص طور پر اپنے ضرورت مند اور غریب اعزا و اقرباء کی خبرگیری کرنا اور ان کی معاشی ضروریات کی کفالت کرنا، رزق میں وسعت و برکت کا باعث ہے۔

توکل کی ہدایت

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ قَلْبَ ابْنِ اٰدَمَ بِكُلِّ وَادٍ شُعْبَةٌ فَمَنْ اَتْبَعَ قَلْبَهُ الشُّعَبَ كُلَّهَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ بِاَيِّ وَادٍ اَهْلَكَهُ وَمَنْ تَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ كَفَاهُ الشُّعَبَ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت عمرو ابن عاصؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بلاشبہ انسان کے دل کے لئے ہر جنگل میں ایک شاخ اور ایک گوشہ ہے۔ (یعنی انسان کے دل اور اس کی جبلت میں رزق کے اسباب وذرائع اور اس کے حصول کے تعلق سے طرح طرح کی فکریں اور غم ہیں) پس جس شخص نے اپنے دل کو ان شاخوں اور گوشوں کی طرف متوجہ رکھا (یعنی اس نے اپنے دل کو ان تفکرات اور غموں میں مشغول ومنہمک رکھا اور پراگندہ خاطری کا شکار ہوا) تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں کہ اس کو کس جنگل میں ہلاک کرے (یعنی جب وہ شخص خدا پر توکل واعتماد سے بے پرواہ ہوکر ساری توجہ اپنی ذاتی تدبیر وسعی اور تگ ودو میں مشغول رکھتا ہے تو پھر خدا کو کیا پرواہ کہ وہ کس طرح ہلاکت وتباہی میں مبتلا ہوتا ہے، اس دنیا سے کس مشغولیت میں رخصت ہوتا ہے اور کس حالت میں موت اس کو آدبوچتی ہے) اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد کیا (اور اپنے تمام امور اس کے سپرد کردئے) تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام کاموں کی درستی کے لئے کافی ہوجاتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی مدد ورحمت اس کو دل ودماغ کی پراگندگی وپریشانی، ضروریات کی تکمیل کے لئے ادھر ادھر بھٹکنے، اور گوناگوں جسمانی محنت ومشقت کے تعب وغم سے نجات دیتی ہے (ابن ماجہ)

خدا پر بھروسہ

⑮ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ، قَالَ رَبُّكُمْ عَزَّوَجَلَّ لَوْ اَنَّ عَبِيْدِيْ اَطَاعُوْنِيْ لَاَسْقَيْتُهُمُ الْمَطَرَ بِاللَّيْلِ وَاَطْلَعْتُ عَلَيْهِمُ الشَّمْسَ بِالنَّهَارِ وَلَمْ اُسْمِعْهُمْ صَوْتَ الرَّعْدِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بزرگ وبرتر تمہارا پروردگار فرماتا ہے کہ اگر میرے بندے میری فرمانبرداری کریں، (یعنی میرے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں، اور میری رضا وخوشنودی کے خلاف کوئی کام نہ کریں تو یقیناً میں ان پر رات میں تو بارش برساؤں (تاکہ وہ راحت وچین کی نیند سوئیں) اور دن کو ان پر دھوپ کی چادر پھیلاؤں (تاکہ وہ اپنے کام وکاج میں مشغول رہ سکیں (اور خواہ رات ہو خواہ دن) ان کو بادل گرجنے کی آواز نہ سناؤں (تاکہ نہ تو ان کو نیند اور ان کے آرام میں خلل پڑے اور نہ وہ ڈرنے اور گھبرانے کی وجہ سے اپنے کام کاج میں کسی رخنہ اور نقصان سے دوچار ہوں۔" (احمد)

صبر وتوکل سے متعلق ایک حیرت انگیز واقعہ

⑯ وَعَنْهُ قَالَ دَخَلَ رَجُلٌ عَلٰى اَهْلِهٖ فَلَمَّا رَاٰى مَا بِهِمْ مِنَ الْحَاجَةِ خَرَجَ اِلَى الْبَرِيَّةِ فَلَمَّا رَاَتِ امْرَاَتُهٗ قَامَتْ اِلَى الرَّحٰى فَوَضَعَتْهَا وَاِلَى التَّنُّوْرِ فَسَجَرَتْهُ ثُمَّ قَالَتْ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا فَنَظَرَتْ فَاِذَا الْجَفْنَةُ قَدِ امْتَلَاَتْ قَالَ وَذَهَبَتْ اِلَى التَّنُّوْرِ فَوَجَدَتْهُ مُمْتَلِئًا قَالَ فَرَجَعَ الزَّوْجُ قَالَ اَصَبْتُمْ بَعْدِيْ شَيْئًا قَالَتِ امْرَاَتُهٗ نَعَمْ مِنْ رَّبِّنَا وَقَامَ اِلَى الرَّحٰى فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَمَا اِنَّهٗ لَوْلَمْ يَرْفَعْهَا لَمْ تَزَلْ تَدُوْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص (کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دن، اپنے گھر والوں کے پاس آیا (یعنی کہیں باہر سے آکر گھر میں (داخل ہوا) تو اس نے گھر والوں پر محتاجگی اور فاقہ وفقر کے آثار دیکھے، وہ (یہ دیکھ کر اپنے خدا کے حضور اپنی حاجات پیش کرنے اور یکسوئی کے ساتھ اس کی بارگاہ میں عرض ومناجات کرنے کے لئے جنگل کی طرف چلا گیا، ادھر جب اس کی بیوی نے یہ دیکھا (کہ شوہر کے پاس کچھ نہیں ہے اور وہ شرم کی وجہ سے گھر سے باہر چلا گیا ہے) تو وہ اٹھی اور چکی کے پاس گئی، چکی کو اس نے اپنے آگے رکھا (یا اس نے چکی کے اوپر کا پاٹ

نیچے کے پاٹ پر رکھا، اور یا یہ معنی ہیں کہ اس نے اس امید میں چکی کو صاف کیا اور تیار کر کے رکھ دیا کہ شوہر باہر سے آئے گا تو کچھ لے کر آئے گا اس کو پیس کر روٹی پکالوں گی) پھر وہ تنور کے پاس گئی اور اس کو گرم کیا، اس کے بعد خدا سے یہ دعا کی۔ الٰہی! (ہم تیرے محتاج ہیں، تیرے غیر سے ہم نے اپنی امید منقطع کر لی ہے، تو خیر الرازقین ہے، اپنے پاس سے) ہمیں رزق عطا فرما۔" پھر جو اس نے نظر اٹھائی تو کیا دیکھتی ہے کہ چکی کا گرانڈ آٹے سے بھرا ہوا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد جب وہ آٹا (گوند کر) تنور کے پاس گئی (تاکہ اس میں روٹیاں لگائے۔ تو تنور کو روٹیوں سے بھرا ہوا پایا (یعنی خدا کی قدرت نے یہ کرشمہ دکھایا کہ خود بخود اس آٹے کی روٹیاں بن کر تنور میں جالگیں یا یہ کہ آٹا تو اپنی جگہ چکی کے گرانڈ میں رہا، اور تنور میں غیب سے روٹیاں نمودار ہو گئیں) راوی کہتے ہیں کہ کچھ دیر بعد جب خاوند (بارگاہ رب العزت میں عرض و مناجات اور دعا سے فارغ ہو کر) گھر آیا تو بیوی سے پوچھا کہ کیا میرے جانے کے بعد تمہیں (کہیں سے) کچھ (غلہ وغیرہ) مل گیا تھا (کہ تم نے یہ روٹیاں تیار کر رکھی ہیں؟ بیوی نے کہا کہ ہاں! یہ ہمیں خدا کی طرف سے ملا ہے (یعنی عام طریقہ کے مطابق کسی انسان نے ہمیں نہیں دیا ہے بلکہ یہ رزق محض غیب سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے) خاوند نے یہ سنا تو اس کو بہت تعجب ہوا اور وہ) اٹھ کی چکی کے پاس گیا (اور چکی کو اٹھایا تاکہ اس کا کرشمہ دیکھے) پھر جب اس واقعہ کا ذکر نبی کریم ﷺ کے سامنے کیا گیا تو آپ ﷺ نے (پورا قصہ سن کر) فرمایا "جان لو" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر وہ شخص اس چکی کو اٹھا نہ لیتا تو وہ چکی مسلسل قیامت کے دن تک گردش میں رہتی اور اس سے آٹا نکلتا رہتا۔" (احمد)

تشریح: مذکورہ واقعہ کی صورت میں خدا کی قدرت کا جو کرشمہ ظاہر ہوا، وہ درحقیقت فقر و فاقہ پر صبر اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد و توکل کرنے کا نتیجہ تھا! واضح رہے کہ یہ واقعہ کسی پچھلی امت کے کسی شخص کا نہیں ہے بلکہ اُمّت محمدی کے ایک فرد کا ہی ہے اور آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔

رزق انسان کی تلاش میں رہتا ہے

(۱۷) وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرِّزْقَ لَيَطْلُبُ الْعَبْدَ كَمَا يَطْلُبُهٗ اَجَلُهٗ۔ رَوَاهُ اَبُوْنَعِيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رزق بندے کی اس طرح تلاش کرتا ہے جس طرح انسان کو اس کی موت ڈھونڈتی ہے۔" اس روایت کو ابونعیم نے کتاب حلیہ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ رزق اور موت دونوں کا پہنچنا ضروری ہے کہ جس طرح کہ اس بات کی کوئی حاجت نہیں ہوتی کہ کوئی شخص اپنی موت کو ڈھونڈے اور اس کو پائے بلکہ خود موت اس کے پاس ہر صورت میں اور یقینی طور پر آتی ہے، اسی طرح رزق کا معاملہ ہے کہ اس کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ جو کچھ مقدر میں ہوتا ہے وہ ہر صورت میں لازمی طور پر پہنچتا ہے، خواہ اس کو ڈھونڈا جائے یا نہ ڈھونڈا جائے۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ڈھونڈنے کی صورت میں رزق نہیں ملتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حصول رزق کے لئے سعی و تلاش بھی تقدیر الٰہی اور نظام قدرت کے مطابق ہے البتہ جہاں تک قلبی اعتماد و بھروسہ کا تعلق ہے وہ صرف خدا کی ذات پر ہونا چاہئے نہ کہ سعی و تلاش پر! لہٰذا اس سلسلے میں صحیح راہ یہ ہے کہ اول انسان کو خدا پر توکل و اعتماد کرنا چاہئے اور یہ پختہ یقین رکھنا چاہئے کہ رزق کا ضامن اللہ تعالیٰ ہے۔ نیز اگر رزق ملنے میں کوئی رکاوٹ اور تاخیر ہو جائے تو اضطراب و بے چینی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے، پھر اس اعتقاد کے ساتھ اپنی ضرورت و حاجت اور ہمت و طاقت کے بقدر معتدل و مناسب طریقہ پر حصول معاش کی سعی و تلاش میں لگنا چاہئے کہ اصل رازق تو اللہ تعالیٰ ہے، لیکن یہ بھی طریقۂ عبودیت ہے کہ اپنا رزق حاصل کرنے کے لئے مناسب جدوجہد اور تلاش و سعی کی جائے۔

ملا علی قاری نے حدیث کے خاتمہ پر لکھا ہے کہ (یہی نہیں کہ جس طرح انسان کو اس کی موت کا پہنچنا یقینی ہے اسی طرح اس کے رزق کا بھی اس تک پہنچنا یقینی ہے) بلکہ انسان کو اس کا رزق اس کی موت سے بھی پہلے اور موت سے بھی جلدی پہنچتا ہے، کیونکہ جب کسی کی موت آتی ہے تو وہ اپنا رزق اس سے پہلے ہی پا چکا ہوتا ہے جس کو وہ اپنے مقدر میں لے کر اس دنیا میں آیا تھا، چنانچہ اگر غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے، نیز میرک ؒ نے منذری ؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کو ابن ماجہ ؒ نے اپنی صحیح میں اور بزار نے بھی روایت کیا ہے، اور طبرانی ؒ نے بھی بہتر سند کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اِنَّ الرِّزْقَ لَیَطْلُبُ الْعَبْدَ اَکْثَرَ مِمَّا یَطْلُبُهٗ اَجَلُهٗ اس سے بھی مذکورہ بالا بات کی تائید ہوتی ہے۔

ملا علی قاری ؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابو نعیم نے اپنی کتاب حلیہ میں بطریق مرفوع یہ بات بھی نقل کی ہے کہ لَوْ اَنَّ ابْنَ اٰدَمَ هَرَبَ مِنْ رِزْقِهٖ کَمَا یَهْرُبُ مِنَ الْمَوْتِ لَاَدْرَکَهٗ رِزْقُهٗ کَمَا یُدْرِکُهُ الْمَوْتُ (اگر انسان اپنے رزق سے بھی اس طرح بھاگے جس طرح وہ اپنی موت سے بھاگتا ہے تو یقیناً اس کا رزق بھی اس کو اسی طرح پالے جس طرح کہ اس کی موت اس کو پالیتی ہے۔

نبی کا لا مثال صبر

⑱ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُحْکِیْ نَبِیًّا مِنَ الْاَنْبِیَآءِ ضَرَبَهٗ قَوْمُهٗ فَاَدْمَوْهُ وَهُوَ یَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ وَیَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعود ؓ نے بیان کیا کہ "گویا میں اس وقت بھی رسول کریم ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک ایسے نبی کا قصہ بیان فرما رہے ہیں (اور اس کی صورت ہمیں بتا رہے ہیں) جن کو ان کی قوم نے مارا اور لہولہان کر دیا لیکن وہ نبی (بجائے اس کے کہ اپنی قوم کے تئیں بغض و نفرت میں مبتلا ہوتے، اور ان کے حق میں بددعا کرتے، بلکہ صبر و تحمل کا دامن پکڑے ہوئے) اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے۔ اے اللہ میری قوم کو بخش دے یہ لوگ میری حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔" (بخاری ؒ و مسلم)

تشریح: "گویا میں اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں" کے ذریعہ حضرت ابن مسعود ؓ نے یہ واضح فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ قصہ بیان فرمانا مجھے اچھی طرح یاد ہے اور اس وقت بھی اس وقت کا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔

"میری قوم کو بخش دے۔" یعنی ان لوگوں سے اس معنی میں درگزر فرما کہ انہوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور جو تکلیف پہنچائی ہے اس کی وجہ سے ان کو اس دنیا میں کسی عذاب میں مبتلا نہ کرنا اور ان کا نام و نشان نہ مٹا۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ کفار کی بخشش و مغفرت کی دعا اس معنی میں ہرگز جائز نہیں ہے کہ ان کا شرک و کفر معاف ہو جائے اور اگر وہ اپنے کفر و شرک کے ساتھ مر جائیں تو عذاب آخرت میں مبتلا نہ ہوں۔

"یہ لوگ میری حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔" یہ الفاظ گویا ان نبی علیہ السلام کے کمال صبر و حلم اور حسن اخلاق و کردار کا مظہر ہیں کہ جو لوگ، ان کو سخت ترین تکلیف پہنچا رہے ہیں، جنہوں نے ان کو لہولہان کر رکھا ہے، اور جو لوگ اپنے نبی کو اذیت پہنچا کر سب سے بڑا گناہ کر رہے ہیں، انہی لوگوں کی طرف سے وہ نبی خدا کی بارگاہ میں یہ عذر بیان فرما رہے ہیں کہ ان لوگوں نے جو کچھ بھی کیا ہے محض اس وجہ سے کیا ہے کہ اللہ و رسول کے بارے میں ان کے دل و دماغ پر جہل کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جہل و نادانی کی وجہ سے کیا جانے والا گناہ اس گناہ کی بہ نسبت ہلکا ہوتا ہے جو علم و دانائی کے باوجود صادر ہو، اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ: وَیْلٌ لِّلْجَاهِلِ مَرَّةً وَّوَیْلٌ لِّلْعَالِمِ سَبْعَ مَرَّاتٍ "جاہل کے لئے ایک رسوائی و خرابی ہے اور عالم کے لئے سات رسوائیاں و خرابیاں ہیں۔

شیخ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ میں یہ نہیں بتاسکتا کہ حدیث میں جن نبی علیہ السلام کا ذکر ہے وہ کون سے نبی علیہ السلام تھے اور ان کے ساتھ کیا قصہ پیش آیا تھا۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم کا یہ سلوک تھا کہ جب وہ ان لوگوں کو راہ ہدایت کی طرف بلاتے اور خدا کے حکم کی اتباع کی تلقین کرتے تو بدنصیب ان کو مارنے لگتے اور اس قدر مارتے کہ ان کا جسم لہولہان ہو جاتا، زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر پڑتے اور اسی حالت میں عرصہ تک زمین پر پڑے رہتے، پھر جب کچھ توانائی آتی تو اٹھ کھڑے ہوتے اور فریضۂ دعوت کی انجام دہی میں مشغول ہو جاتے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان نبی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد خود اپنی ذات مبارک تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے واقعہ کو اجمال وابہام کے طور پر بیان فرمایا۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے اور جنگ احد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفین کے حق میں جو دعا فرمائی اس کے یہی الفاظ منقول ہیں۔

بَابُ الرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ

ریا وسمعہ کا بیان

ریاء کی تعریف

"ریاء" رؤیت سے مشتق ہے اور "صراح" میں لکھا ہے کہ "ریاء" کے معنی ہیں اپنے آپ کو لوگوں کی نظر میں اچھا بنا کر پیش کرنا۔ اور عین العلم میں لکھا ہے کہ۔ ریاء کا مطلب یہ ہے اپنی عبادت ونیکی کا سکہ جمانا اور اس کے ذریعہ لوگوں کی نظر میں اپنی قدر ومنزلت چاہنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ "ریاء" کا تعلق خاص طور پر ان چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے جو عبادت ونیکی کے ظاہری عمل کہلاتے ہیں اور جو چیزیں کہ از قسم عبادت نہ ہوں جیسے کثرت مال ومتاع، علم وذہانت کی فراوانی، اشعار وغیرہ کا یاد رکھنا اور نشانہ بازی کی مہارت وغیرہ تو ان میں دکھاوے کے لئے کئے جانے والے کام کو ریاء نہیں کہا جاتا بلکہ وہ افتخار وتکبر (ناز وگھمنڈ) کی ایک قسم کہلاتا ہے اسی طرح (نیکی وعبادت کے) ظاہری اعمال میں بھی اگر کوئی کام اس صورت میں لوگوں کو دکھانے کے لئے کیا جائے جب کہ اس کا مقصد عزت وجاہ کی طلب نہ ہو، جیسا کہ بعض مشائخ اپنے مریدوں کو تلقین وتعلیم، لوگوں کے دلوں کو نیک اعمال کی طرف مائل کرنے اور ان کو اتباع وپیروی کی طرف راغب کرنے کے لئے بعض اعمال اس طرح کرتے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں تو یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے ریا نہیں کہلائے گا اگرچہ ظاہر میں ان کا وہ عمل ریاکاری معلوم ہو اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ رِيَاءُ الصِّدِّيقِيْنَ خَيْرٌ مِنْ اِخْلَاصِ الْمُرِيْدِيْنَ یعنی اونچے درجہ کے مشائخ اور بزرگوں کا ریا مریدین کے اخلاص (یعنی عدم ریاکاری) سے بہتر ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ریاء اصل میں اس چیز کا نام ہے کہ کسی شخص کی ذات میں واقعۃً کوئی صفت وکمال ہو اور وہ اپنے اس واقعی وصف وکمال پر لوگوں کے سامنے نمایاں کرے اور یہ خواہش رکھے کہ لوگ اس کے اس وصف وکمال کو جانیں تاکہ ان کی نظر میں قدر ومنزلت اور عزت ووقعت حاصل ہو۔ پس جو شخص کسی ایسے وصف وکمال کو اپنی طرف منسوب کر کے لوگوں پر ظاہر کرے کہ جو واقعۃً اس کی ذات میں نہیں ہے تو اس کو ریاء نہیں بلکہ خالص کذب اور منافقت کہا جائے گا، اسی پر قیاس کر کے یہ کہا گیا ہے کہ غیبت اس چیز کا نام ہے کہ کسی شخص کی پیٹھ پیچھے اس کا وہ عیب بیان کیا جائے جو واقعتاً اس کی ذات میں موجود ہو، اور اگر اس کی طرف منسوب کر کے کوئی ایسا عیب بیان کیا جائے جو حقیقت کے اعتبار سے اس کی ذات میں نہیں ہے، تو اس کو افتراء اور بہتان کہیں گے۔

ریاء کی قسمیں

ریاء کی مختلف اقسام اور صورتیں ہیں، اور ان اقسام میں سب سے زیادہ بری اور نہایت قابل نفرین وہ قسم ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی

عبادت کا قصد اور حصول ثواب کا ارادہ قطعاً نہ ہو بلکہ واحد مقصد لوگوں کو دکھانا اور ان کی نظر میں قدر و منزلت حاصل کرنا، جیسا کہ خالص ریا کار (بلکہ دھوکا باز) لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے کہ جب وہ لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں تو نماز پڑھتے ہیں اور مختلف قسم کے اوراد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں، لیکن جب تنہا ہوتے ہیں تو نہ نماز سے سروکار رکھتے ہیں اور نہ اوراد و وظائف سے، بلکہ ان بدنصیبوں کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نماز میں بغیر پاکی اور وضو کے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں! ریا کاری کی یہ قسم ارذل ترین اور اللہ تعالیٰ کے سخت غضب وقہر کے نازل ہونے کا باعث ہے اور اس صورت میں کیا جانے والا کوئی بھی عمل قطعی باطل ہوتا ہے، بلکہ بعض حضرات نے تو یہاں تک کہا ہے اگر وہ عمل فرض ہو تو اس کا کرنا فرض کے ادا ہو جانے کے حکم میں نہیں ہوگا بلکہ اس کی قضا واجب ہوگی! دوسری قسم وہ صورت ہے جس میں کسی نیک عمل کرنے میں دونوں چیزیں ہوں یعنی ارادہ ثواب بھی اور ریا کاری بھی (دکھانے کی نیت)، لیکن ریا کا پہلو غالب اور ارادہ ثواب کا پہلو ضعف ہو، بایں حیثیت کہ اگر اس عمل کو کرنے والا تنہائی میں ہوتا تو اس عمل کو نہ کرتا، اور اس کا قصد اس عمل کے صدور کا باعث نہ ہوتا اور اگر بالفرض اس عمل کا ثواب کوئی نہ ہوتا تو بھی محض ریا کاری کا جذبہ ہی اس عمل کو اختیار کرنے کا باعث بن جاتا، اس قسم کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی قسم کا ہے۔ تیسری قسم وہ صورت ہے جس میں کسی نیک عمل کو اختیار کرنے میں دونوں چیزیں یعنی ریا کاری کا جذبہ اور حصول ثواب کا ارادہ برابر ہوں، بایں حیثیت کہ اگر بالفرض وہ عمل ان دونوں چیزوں میں سے کسی بھی ایک چیز سے خالی ہوتا تو اس کو اختیار کرنے کا کوئی داعیہ پیدا نہ ہوتا بلکہ اس عمل کی طرف رغبت اسی صورت میں ہوتی جب کہ دونوں چیزیں ایک ساتھ پائی جاتی۔ اس قسم کے بارے میں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نفع، نقصان، دونوں برابر ہوں، لیکن احادیث و آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قسم بھی مذموم، اور اس صورت میں کیا جانے والا عمل بھی ناقابل قبول ہوتا ہے! اور چوتھی قسم وہ صورت ہے کہ جس میں کسی نیک عمل کو اختیار کرنے میں، ثواب کی نیت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ارادہ، راجح اور غالب ہو، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسم نہ تو محض باطل ہے اور نہ اس میں کوئی نقصان ہے، یا زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس صورت میں اختیار کیا جانے والا عمل نیت و ارادہ کے اعتبار سے ثواب اور عتاب دونوں کا یکساں طور پر باعث ہوتا ہے کہ ارادہ و نیت میں جس قدر اخلاص یا عدم اخلاص ہوگا اسی کے مطابق ثواب یا عتاب ہوگا، نیز اس صورت میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ قصد عمل میں ریا کاری کی جو آمیزش ہے، (جو اگرچہ ثواب کے ارادہ و نیت سے کمتر اور ضعیف ہے) وہ کب پیدا ہوئی ہے؟ اگر ریا کاری کی آمیزش ابتداء عمل میں ہوئی ہے تو یہ صورت زیادہ بری کہلائے گی، اور اگر عمل کے درمیان پیدا ہوئی ہے تو یہ صورت پہلی صورت سے کم برائی کی حامل ہوگی، اور اگر یہ عمل کرنے کے بعد آئی ہے، تو یہ صورت دوسری صورت سے بھی کم بری قرار دی جائے گی اور اس کی وجہ سے اختیار کیا جانے والا عمل باطل نہیں کہلائے گا۔

علاوہ ازیں ایک فرق یہ بھی ملحوظ رکھا جائے گا کہ ریا کاری کا وہ جذبہ اگر پختہ قصد و عزم کی صورت میں نمودار ہوا ہے تو اس میں زیادہ برائی ہوگی اور اگر محض ایک خیال کی صورت میں پیدا ہو اور اس خیال ہی کی حد تک محدود رہا، آگے کچھ نہ ہوا تو یہ صورت حال یقیناً زیادہ نقصان دہ نہیں کہلائے گی۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ "ریا" ایک ایسا جذبہ ہے جس سے پوری طرح خلاصی نہایت دشوار ہے اور ہر حالت میں حقیقی اخلاص کا پایا جانا بہت مشکل، اسی لئے علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ کسی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر خوش ہونا ریا کے پائے جانے کی علامت ہے، اسی طرح تنہائی میں کوئی عمل کرتے وقت بھی دل میں ریا کا خیال آ جائے تو وہ بھی "ریا" ہی کہلائے گا۔ خدا اس سے اپنی پناہ میں رکھے اور بہر صورت اخلاص عطا فرمائے کہ اس کی مدد و توفیق کے بغیر اس دولت کا ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔

علماء نے ایک خاص صورت وحالت اور بیان کی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کوئی نیک کام کرے اور کسی عبادت وطاعت میں مصروف ہو اور لوگ اس کو وہ نیک کام اور عبادت وطاعت کرتا ہوا دیکھ لیں تو اس کو چاہئے کہ اس وقت اپنے اندر اس وقت اس بات پر خوشی و مسرت کے جذبات پیدا کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور لطف وعنایت سے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی اور لوگوں کی نظر

میں باعزت بننے کا یہ سبب پیدا فرمایا کہ گناہوں اور عیوب کی تو پردہ پوشی فرمائی اور نیک اعمال و اخلاق کو آشکارا فرمایا اور ان جذبات مسرت کے ساتھ یہ نیت و قصد رکھے کہ اگر میرے نیک عمل کے اظہار سے دین و طاعات کا چرچہ ہوتا ہے تو لوگ دین کی طرف راغب ہوں گے اور ان کے اندر بھی نیک اعمال کو اختیار کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ "ریا" کے حکم میں داخل نہیں ہوگی، بلکہ اس کو محمود و مستحسن بھی کہا جائے گا جیسا کہ اس سلسلے میں وارد احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ مسئلہ بہت دقیق و پیچیدہ ہے اور اپنے اندر بہت تفصیل و مباحث رکھتا ہے، اگر اس کی تحقیق زیادہ وضاحت کے ساتھ جاننی ہو تو اہل اللہ اور عارفین کی کتابوں اور ان کے اقوال و ملفوظات سے راہنمائی حاصل کرنی چاہئے، خصوصا مشہور کتاب "احیاء العلوم" اس سلسلے میں زیادہ بہتر رہبری کر سکتی ہے۔

سمعہ کا مطلب

سُمْعَةَ (سین کے پیش اور میم کے جزم کے ساتھ) کے معنی ہیں "وہ کام جو لوگوں کے سنانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔" عام طور پر اس لفظ کا استعمال ریا کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "فلاں شخص نے یہ کام ریا و سمعہ یعنی دکھانے سنانے کے لئے کیا۔ گویا ریا کا تعلق تو حاسہ بصر (دکھانے) کے ساتھ ہوتا ہے اور سمعہ کا تعلق حاسہ سمع (سنانے) کے ساتھ۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خدا صورت اور مال کو نہیں دیکھتا، دل کو دیکھتا ہے

(۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مال و متاع کو نہیں دیکھتا (یعنی اس کی نظر رحمت و عنایت میں تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کا کوئی اعتبار نہیں ہے، کیونکہ اس کے نزدیک نہ تو اچھی یا بری صورت کی کوئی حیثیت ہے اور نہ مال و متاع کی کمی یا بیشی کی کوئی اہمیت ہے) بلکہ وہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے (یعنی اس کے ہاں تو بس اس چیز کو دیکھا جاتا ہے کہ تمہارے دل میں یقین و صدق، اور اخلاص وغیرہ، یا نفاق اور ریا و سمعہ وغیرہ، اسی طرح اس کے نزدیک اچھے اور برے اعمال کا اعتبار ہے جس کے مطابق وہ تمہیں جزاو سزا دیتا ہے۔" (مسلم)

غیر مخلصانہ عمل کی کوئی اہمیت نہیں

(۲) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْکِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَکَ فِیْہِ مَعِیَ غَیْرِیْ تَرَکْتُہٗ وَشِرْکَہٗ۔ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَاَنَا مِنْہُ بَرِیْءٌ ھُوَ لِلَّذِیْ عَمِلَہٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک کے تئیں تمام شرکاء سے نہایت زیادہ بے نیاز ہوں، یعنی دنیا کا دستور ہے کہ لوگ اپنے معاملات اور کاروبار میں ایک دوسرے کے اشتراک و تعاون کے محتاج ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے شریک بنتے ہیں، نیز وہ اس شرکت و تعاون پر راضی و مطمئن بھی ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے درمیان اس درجہ کی مفاہمت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک شریک متعلقہ معاملات و کاروبار میں اپنا پورا عمل دخل رکھتا ہے، لیکن میرا معاملہ بالکل جداگانہ ہے کہ میں علی الاطلاق خالق و حاکم ہوں، اپنے احکام و فیصلے اور اپنے نظام قدرت میں نہ تو مجھے کسی کے تعاون و اشتراک کی

حاجت وضرورت ہے اور نہ مجھے یہ گوارا ہے کہ میرے بندے کسی کو میرا شریک قرار دیں، اور میرے لئے کئے جانے والے کسی بھی عمل میں میرے علاوہ کسی اور کو مدنظر رکھیں۔ یہاں تک کہ میرے نزدیک ان کے صرف اسی عمل کا اعتبار ہے جو وہ خالص طور پر میرے لئے کریں۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ذکر شرکاء کے ضمن میں کرنا یعنی خود اپنے کو ایک "شریک" کے ذریعہ تعبیر کرنا محض ان بندوں کے اعتبار سے ہے جو اپنے جہل اور اپنی نادانی کی وجہ سے اس کی ذات وصفات اور اس کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرتے اور اس طرح وہ خدا کو بھی ایک "شریک" کا درجہ (دیتے ہیں "نعوذ باللہ۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اس بات سے اپنی بے نیازی اور ناخوشی کا اعلان فرمایا کہ کسی کو اس کا شریک قرار دیا جائے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ، جو شخص (میری طاعت وعبادت کے طور پر) کوئی ایسا عمل کرے کہ جس میں وہ میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک کرے تو میں اس شخص کو شرک کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہوں۔ اور ایک روایت میں ترکتہ وشرکہ کے بجائے) یہ الفاظ ہیں فانامنہ بری ھو للذی عملہ یعنی (جو شخص میری عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے) تو میں اس سے اپنی بے نیازی وبیزاری ظاہر کرتا ہوں، وہ شخص یا اس کا وہ عمل اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے وہ عمل کیا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خالص ریاکاری کے جذبہ سے کیا جانے والا عمل تو باطل ہو ہی جاتا ہے لیکن اس عمل کا بھی کوئی فوت ہو جاتا ہے جس میں ریا کی آمیزش اور اس کا دخل ہو جائے۔ لیکن علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم اس عمل کے بارے میں ہو گا جو ریا کی ان دو قسموں سے تعلق رکھے کہ یا تو اس عمل کو اختیار کرنے میں سرے سے ثواب کی نیت ہی نہ ہو یا ثواب کی نیت تو ہو مگر ریا کا قصد اس نیت پر غالب ہو اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث کا اصل مقصد خدا کے لئے کئے جانے والے کسی بھی عمل کو ریا کی آمیزش اور اس کے دخل سے پاک رکھنے کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا اور اس کے امر سے لاپرواہی اختیار کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ تنبیہ وسرزنش کرنا ہے۔

دکھانے سنانے کے لئے عمل کرنے والوں کے بارے میں وعید

(۳۳) وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنْ يُّرَائِي يُرَائِي اللّٰهُ بِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جندبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص لوگوں کو سنانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے کوئی عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا حال لوگوں کو سنائے گا (ذلیل ورسوا کرے گا) نیز جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے کوئی عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ریاکاری کی سزا دے گا (یعنی قیامت کے دن اس سے کہے گا کہ اپنا اجر وثواب اسی سے مانگو جس کے لئے تم نے وہ عمل کیا تھا۔"

(بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: بعض حضرات نے کہا ہے کہ، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کوئی نیک کام محض شہرت وناموری اور حصول عزت وجاہ کے لئے کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اس کے ان عیوب اور برے کاموں کو اپنی مخلوق کے سامنے ظاہر کر دے گا جن کو وہ چھپاتا ہے، اور لوگوں کی نظر میں اس کو ذلیل ورسوا کر دے گا، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی فاسد نیت اور بری غرض کو دنیا والوں پر آشکار کر دیتا ہے اور قیامت کے دن بھی اپنی مخلوق پر کھول دے گا کہ یہ شخص مخلص نہیں تھا، ریاکار تھا۔ اور بعض علماء نے یہ مراد بیان کی ہے کہ جو شخص اپنا کوئی عمل لوگوں کو سنائے گا یا وہ عمل لوگوں کو دکھائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے اس نیک عمل کا ثواب صرف اس کو سنا اور دکھا دے گا، دیگا نہیں، تاکہ وہ حسرت وافسوس زدہ رہے! یا یہ مراد ہے کہ جو شخص اپنا کوئی نیک عمل لوگوں کو سنائے گا، یا وہ عمل لوگوں کو دکھائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کے مطابق اس کا وہ عمل لوگوں کو سنا اور دکھا دے گا، اور گویا اس کے اس عمل کا یہی اجر وثواب ہو گا جو اس کو اسی دنیا میں مل جائے گا اور آخرت کے اجر وثواب سے قطعاً محروم رہے گا۔

کسی عمل خیر کی وجہ سے خود بخود مشہور ہو جانا ریا نہیں ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرَاَیْتَ الرَّجُلَ یَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَیْرِ وَیَحْمَدُہُ النَّاسُ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَیُحِبُّہُ النَّاسُ عَلَیْہِ قَالَ تِلْکَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ مجھے اس شخص کے بارے میں بتائیے جو کوئی نیک کام کرتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ اور ایک روایت میں (لوگ اس کی تعریف و توصیف کرتے ہیں کے بعد) یہ بھی ہے کہ۔ اور وہ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں! (ایسے شخص کا کیا حکم ہے اس کا اجر و ثواب کالعدم ہو جاتا ہے یا نہیں؟) حضور ﷺ نے (یہ سوال سن کر فرمایا کہ "لوگوں کا اس شخص کی تعریف و توصیف کرنا اور اس کو محبوب رکھنا در حقیقت اس کے حق میں مؤمن کے ذریعہ جلد ملنے والی بشارت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جلد ملنے والی بشارت" کا مطلب یہ ہے کہ ایک سعادت و بشارت تو وہ ہے جو باقی ہے اور آخرت میں ملے گی اور ایک سعادت و بشارت یہ ہے کہ جو جلد ہی یعنی اسی دنیا میں مل گئی ہے۔ حاصل یہ کہ اس شخص نے اپنے اس عمل خیر کا اصل ثواب آخرت میں پانے سے پہلے ایک اور اجر و ثواب اسی دنیا میں یہ پالیا کہ لوگوں نے اس کی تعریف و توصیف کی اور اس کو اپنا محبوب قلب و نظر بنالیا اور اس کے حق میں لوگوں کو یہ معاملہ گویا اس بات کی بشارت ہے کہ اس کا وہ عمل خیر مقبول ہو گیا اور وہ آخرت میں اجر و ثواب پائے گا۔

بہرحال حضور ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ یہ واضح فرمایا کہ اس شخص کا وہ عمل خیر کہ جس کی وجہ سے وہ دنیا والوں کی نظر میں قابل احترام اور محبوب بنا ہے "ریاء" نہیں کہلائے گا کیونکہ اس کو اس عزت و احترام اور محبت کے حاصل ہونے میں اس کے اپنے قصد و ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس عمل خیر کو اختیار کرنے میں اس کی نیت اور اس کا قصد و ارادہ، اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور ثواب آخرت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، یہ تو محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس شخص کو اس دنیا میں بھی مذکورہ سعادت کی صورت میں اجر و ثواب عطا فرمادیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

شرک و ریا کے بارے میں ایک وعید

⑤ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ بْنِ اَبِیْ فُضَالَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا جَمَعَ اللّٰہُ النَّاسَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ لِیَوْمٍ لَا رَیْبَ فِیْہِ نَادٰی مُنَادٍ مَنْ کَانَ اَشْرَکَ فِیْ عَمَلٍ عَمِلَہٗ لِلّٰہِ اَحَدًا فَلْیَطْلُبْ ثَوَابَہٗ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْکِ۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابوسعید ابن فضالہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہ جس کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، لوگوں کو (حساب اور جزا و سزا کے لئے) جمع فرمائے گا، تو ایک اعلان کرنے والا فرشتہ یہ اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں کہ جس کو اس نے خدا کے لئے کیا تھا، خدا کے سوا کسی اور کو شریک کیا ہو (یعنی جس شخص نے دنیا میں ریا کے طور پر کوئی نیک عمل کیا ہو) تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے اس عمل کا ثواب اسی غیر اللہ سے طلب کرے جس کو اس نے شریک کیا تھا کیونکہ خدا تعالیٰ شرک کے تئیں، تمام شریکوں سے نہایت زیادہ بے نیاز ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں لِیَوْمٍ میں حرف لام "جمع" سے متعلق ہے جس کے معنی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو اس دن کے لئے جمع کرے گا کہ جس کا پیش آنا یقینی امر ہے اور اس دن کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، اور یہ جمع کرنا اس کے لئے ہو گا کہ ہر ایک کو

اس چیز کے مطابق جزا و سزا دے جس کو اس نے دنیاوی زندگی میں اختیار کیا تھا۔ اس اعتبار سے یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مابعد کے الفاظ کی تمہید کے طور پر ہے، تاہم اس کو "جمع" کا ظرف بھی قرار دیا جاسکتا ہے، اور اس کی تائید اس روایت کے مطابق الفاظ سے ہوتی ہے جو استیعاب میں نقل کی گئی ہے کہ اِذَا کَانَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَجْمَعُ اللّٰهُ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ لِیَوْمٍ لَا رَیْبَ فِیْهِ۔ الخ اس صورت میں "لیوم" کے لفظ کو ایسا مظہر کیا جائے گا جو مضمر کی جگہ واقع ہوا ہے اور جو اس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے کہ جَمَعَ اللّٰهُ الْخَلْقَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ لِیَجْزِیَهُمْ فِیْهِ یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام مخلوق کو جمع فرمائے گا تاکہ اس دن سب کو جزا و سزا دے۔

ریاکاری کی مذمت

(۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمَّعَ النَّاسَ بِعَمَلِهٖ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ اَسَامِعَ خَلْقِهٖ وَحَقَّرَهٗ وَصَغَّرَهٗ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ جو شخص اپنے عمل کو لوگوں کے درمیان شہرت دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اس "ریا" کارانہ عمل کو اپنی مخلوق کے کانوں تک پہنچادے گا۔ (یعنی جو شخص کوئی نیک کام کر کے لوگوں کو یہ سنائے گا کہ اس نے یہ کام کیا ہے، اور اس کے ذریعہ اس کا مقصد شہرت و عزت حاصل کرنا ہوگا اللہ تعالیٰ اس کی اس ریاکاری کو ظاہر کردے گا اور لوگوں کے کانوں تک یہ بات پہنچادے گا کہ یہ شخص ریاکار اور غیر مخلص ہے نیز (قیامت کے دن) اس کو رسوا کرے گا اور (دنیا و آخرت میں) ذلت و خواری سے دوچار کرے گا۔" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

نیت کے اخلاص و عدم اخلاص کا اثر

(۷) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَتْ نِيَّتُهٗ طَلَبَ الْاٰخِرَةِ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ وَجَمَعَ لَهٗ شَمْلَهٗ وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ كَانَتْ نِيَّتُهٗ طَلَبَ الدُّنْيَا جَعَلَ اللّٰهُ الْفَقْرَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَشَتَّتَ عَلَيْهِ اَمْرَهٗ وَلَا يَاْتِيْهِ مِنْهَا اِلَّا مَا كُتِبَ لَهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالدَّارِمِيُّ عَنْ اَبَانٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص کی نیت محض آخرت کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی اور اس کی پریشانیوں کو جمع کر کے اطمینان خاطر بخشتا ہے نیز اس کے پاس دنیا آتی ہے لیکن اس کی نظر میں اس دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ یعنی کسی بھی علمی یا عملی کار خیر کو اختیار کرنے کے سلسلے میں جس شخص کی نیت اور اصل مقصد، محض رضائے مولی اور ثواب آخرت کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو قدر کفایت پر قانع و صابر بنا کر اور زیادہ طلبی کی محنت و مشقت کے کشت و رنج سے بچا کر قلبی غنا عطا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس بات سے بے نیاز اور مستغنی ہو جاتا ہے کہ ریاکاری کے ذریعہ لوگوں سے مال وجاہ اور عزت و منفعت حاصل کر کے آخرت کا نقصان و خسران مول لے۔ نیز اللہ تعالیٰ حصول معاش اور ضروریات زندگی کی تکمیل کے سلسلے میں ان کی پریشانیوں، الجھنوں، اور ذہنی انتشار و تفکرات کو سمیٹ کر خاطر جمعی میں تبدیل کر دیتا ہے، بایں طور کہ اس کو ایسی جگہوں اور ایسے ذرائع سے اسباب معیشت مہیا فرما دیتا ہے جن کے بارے میں اس کو معلوم بھی نہیں ہوتا، اور اس کے معاملات کو اس طرح استوار فرما دیتا ہے کہ اس کا وہم و گمان بھی اس کو نہیں ہوتا، اور پھر ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی نظر میں دنیا اور دنیا بھر کی نعمتیں اور لذتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، وہ دنیا سے دامن بچاتا ہے اور دنیا اس کے قدموں میں کھنچی چلی آتی ہے، اس کی ضروریات زندگی اور معیشت کے وہ اسباب جو اس کے لئے مقدر ہیں، بغیر کسی محنت و مشقت کے، بغیر کسی سعی و کوشش کے، اور بغیر کسی ذلت و خواری کے اس کو حاصل ہوتے رہتے ہیں)۔ اور جس شخص کی نیت اور اصل مقصد، دنیا کی طلب ہو (یعنی جس شخص پر دنیا اس حد تک سوار ہو جائے کہ وہ اعمال خیر کو بھی محض دنیا کے حصول کا واسطہ بنانا شروع کر دے) تو اللہ تعالیٰ اس کا فقر و احتیاج، اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے سامنے ہاتھ

پھیلانے کی ذلت وخواری میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنے فقر و افلاس اور محتاجگی کو نظر آنے والی چیز کی طرح اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے؟ اور اس کو ہر معاملہ میں پراگندہ خاطر اور ذہنی انتشار و تفکرات کا شکار بنادیتا ہے نیز دنیا بھی اس کو صرف اسی قدر ملتی ہے، جتنا کہ خدا نے اس کے لئے مقدر کر دیا ہے (ترمذیؒ) نیز احمدؒ اور دارمیؒ نے اس روایت کو ابانؒ سے اور انہوں نے زید ابن ثابتؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اعمال کے نتائج و آثار مرتب ہونے کا مدار نیت پر ہے، جس شخص کے پیش نظر صرف آخرت کا مفاد ہوتا ہے اور جو اپنے اعمال کے تئیں مخلص و صادق ہوتا ہے، وہ آخرت کی سعادتوں اور نعمتوں کا مستحق تو ہو ہی جاتا ہے، اس دنیا میں بھی اس کو اپنے تمام معاملات زندگی میں اطمینان و عافیت اور خاطر جمعی کی دولت حاصل رہتی ہے، نیز اس کو اس کا رزق نہایت آسانی اور آسودگی کے ساتھ پہنچتا ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص محض دنیا کی طلب و چاہ رکھتا ہے اور اپنے اعمال کو وسیلہ آخرت بنانے کے بجائے دنیاوی مال و زر اور دنیاوی نعمتوں کا وسیلہ و ذریعہ بناتا ہے اس کو آخرت میں تو اس کی سزا بھگتنی ہوگی، اس دنیا میں بھی اس پر اس برائی کا یہ وبال پڑتا ہے کہ وہ خاطر جمعی اور اطمینان و سکون کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے، ہر وقت طرح طرح کی پریشانیوں اور مختلف تفکرات کی وجہ سے حیران و سرگردان رہتا ہے، نیز اس کو وہ رزق تو ضرور ملتا ہے جو اس کے مقدر میں ہے، مگر اس کے حصول کے لئے بھی اس کو نہایت محنت و مشقت اور پریشانی و کشت برداشت کرنا پڑتی ہے۔

اخروی مقاصد کے لئے اپنے کسی نیک عمل کی شہرت پر خوش ہونا "ریا" نہیں ہے

(۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بينا اَنَا فِي بَيْتِي فِيْ مُصَلَّایَ اِذَا دَخَلَ عَلَیَّ رَجُلٌ فَاَعْجَبَنِی الْحَالُ الَّتِی رَاٰنِی عَلَيْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَكَ اللّٰهُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ لَكَ اَجْرَانِ اَجْرُ السِّرِّ وَ اَجْرُ الْعَلَانِيَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں اپنے گھر میں مصلے پر (نماز پڑھ رہا) تھا کہ اس وقت اچانک ایک شخص میرے پاس آیا، مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے نماز پڑھنے کی حالت میں دیکھا ہے (تو کیا اس وقت میرا خوش ہونا "ریا" میں شمار ہوا یا نہیں؟) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ابوہریرہؓ! تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو، تم دو ثواب کے مستحق ہوئے ایک تو پوشیدہ کا، اور دوسرا ظاہر ہونے کا۔" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ جو اس بات سے خوش ہوئے کہ اس شخص نے ان کو نماز کی حالت میں دیکھا، تو اس کا سبب حضرت ابوہریرہؓ کا یہ پاکیزہ جذبہ تھا کہ مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر اس میں بھی اس وقت کی نماز کے تعلق سے میری اتباع کا داعیہ پیدا ہوگا اور یہ شخص بھی اسی طرح نماز پڑھے گا جس طرح میں پڑھ رہا ہوں۔ یا ان کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ ان کی حالت نماز گویا ایک شخص کے سامنے نیکی کے راستہ کے اظہار و اعلان کا باعث بنی اور اس شخص کو اس وقت کی نماز کی طرف راغب کرنے کا ذریعہ بنی، اور جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ من سن سنه حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها انہیں بجا طور پر یہ خوش کن توقع ہوئی کہ جب یہ شخص نماز پڑھ لے گا تو اس کی نماز کا مجھے بھی ثواب ملے گا۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس موقع پر حضرت ابوہریرہؓ کا خوش ہونا اس طبعی خواہش کی تکمیل کے تئیں تھا جو شریعت کی نظر میں بھی پسندیدہ ہے، یعنی ہر انسان کی یہ طبعی خواہش ہوتی ہے کہ جب اس کو کوئی دیکھے تو وہ اچھی حالت میں ہو، کوئی بھی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ بری حالت میں دیکھا جائے اور ظاہر ہے کہ اس طبعی خواہش کی بنیاد ریا و سمعہ پر نہیں ہوتی بلکہ قلب سلیم کے تقاضہ اور پاکیزگی خیال پر ہوتی ہے، پس یہ بات اس ارشاد نبوی ﷺ کے عین مطابق ہے کہ من سرته حسنته و ساءته سيئته فهو مؤمن نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِه فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ لہٰذا مؤمن کی شان ہی یہ ہے کہ وہ نیک اعمال و احوال کی توفیق حاصل ہونے پر خوش ہوتا ہے جس طرح کہ غیر مؤمن بہت زیادہ دنیاوی مال و زر حاصل ہونے پر خوش ہوتا

ہے ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا خوش ہونا اس احساس شکر کے طور پر تھا کہ اس شخص کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان عبادت و توفیق کے ساتھ متعارف ہوا اور ایک نمازی کے طور پر جانا پہچانا گیا، ان لوگوں کے زمرہ میں شمار ہونے کا موقع نصیب ہوا، جو نماز جیسی اہم عبادت اور اسلام کے سب سے بڑے رکن کو قائم کرتے ہیں، اور ایک مسلمان اس بات کا گواہ بنا۔ یہ قول حدیث کے ان الفاظ، اجر السرو اجر العلانیة، کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔

ریاکار دین داروں کے بارے میں وعید

⑨ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ رِجَالٌ يَخْتِلُوْنَ الدُّنْيَا بِالدِّيْنِ يَلْبَسُوْنَ لِلنَّاسِ جُلُوْدَ الضَّانِ مِنَ اللِّيْنِ اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَ قُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الذِّيَابِ يَقُوْلُ اللّٰهُ اَبِيْ يَغْتَرُّوْنَ اَمْ عَلَيَّ يَجْتَرِءُوْنَ فَبِيْ حَلَفْتُ لَاَبْعَثَنَّ عَلٰى اُولٰئِكَ مِنْهُمْ فِتْنَةً تَدَعُ الْحَلِيْمَ فِيْهِمْ حَيْرَانَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(میں تمہیں بتاتا ہوں) آخر زمانہ میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو دین کے نام پر دنیا کے طلب گار ہوں گے (یعنی دینی و اخروی اعمال کے ذریعہ (دنیا کمائیں گے) از راہ تملق و چاپلوسی اور اظہار تواضع لوگوں (پر اثر ڈالنے) کے لئے دنبوں کی کھال کا لباس پہنیں گے (تاکہ لوگ انہیں عابد و زاہد، دنیاوی نعمتوں سے بے پرواہ اور آخرت کے طلبگار سمجھ کر ان کے مرید و معتقد ہوں) ان کی زبانیں تو شکر سے زیادہ شیریں ہوں گی لیکن ان کے دل بھیڑیوں کے دل کی طرح ہوں گے (یعنی ان کی باتیں تو بڑی خوشگوار من پسند اور نرمی و ملائمت سے بھرپور ہوں گی ان کی تقریر و گفتگو سن کر لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ ہمارے بڑے ہمدرد و بہی خواہ اور غم خوار دوست ہیں اور ان کے دل میں دین و ملت کا بہت درد ہے، لیکن حقیقت یہ ہوگی کہ اپنے ذاتی اغراض و منافع کے لئے دوستی و دشمنی کرنے اور اہل تقویٰ اور دین و ملت کے حقیقی خدمتگاروں کو نقصان و تکلیف پہنچانے، اور دیگر بہیمانہ و حیوانی خصلتوں میں ان کے دل بھیڑیے کے دل کی طرح سخت اور شقی ہوں گے) اللہ تعالیٰ (ایسے لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے) فرماتا ہے۔ کیا یہ لوگ میری طرف سے مہلت دیئے جانے اور میرے ڈھیل دیئے دینے کے سبب سے مغرور ہو گئے ہیں، اور فریب میں مبتلا ہیں (یعنی کیا یہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں ان کا معین و مددگار ہوں اور اس دنیا میں انہیں جو کامرانیاں اور کامیابیاں نصیب ہیں وہ ان پر میری رحمت کے نازل ہونے کی بنا پر ہیں؟ کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم اس قسم کے لوگوں کو اسی طرح ڈھیل دیا کرتے ہیں؟ یا اس جگہ "اغترا" سے مراد اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنا اور اپنے افعال بد سے توبہ نہ کرنا ہے اس صورت میں "یختروں" کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ لوگ میرے غضب اور میرے عذاب سے نہیں ڈرتے، اور کیا ان میں اتنی جرأت ہوگی ہے! کہ اعمال صالح کے ذریعہ اور دین کے نام پر لوگوں کو دھوکا دے کر گویا میری مخالفت پر کمربستہ ہیں؟) پس میں اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یقیناً ان لوگوں پر انہی میں سے فتنہ و بلا مسلط کر دوں گا (یعنی انہی لوگوں میں سے ایسے امراء و حکام اور ایسے افراد و گروہ متعین کر دوں گا جو ان کو آفات و مصائب اور طرح طرح کے نقصان و ضرر میں مبتلا کر دیں گے۔) اور وہ آفات و مصائب بڑے سے بڑے دانشور و عقلمند شخص کو بھی (ان آفات و مصائب کو دور کرنے، ان پر آشوب حالات سے "گلو خلاصی پانے اور ان کے سلسلے میں کسی مناسب و موزوں اقدام و کاروائی کرنے سے" عاجز و حیران کر دیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یَخْتِلُوْنَ (خاء کے جزم اور تاء کے زیر کے ساتھ) کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ان اعمال کے ذریعہ کہ جو آخرت کے لئے کئے جاتے ہیں، دنیا حاصل کریں گے۔ یا یہ کہ وہ لوگ دین کے بدلہ میں دنیا کمائیں گے، اور دینی و اخروی مفاد و مصالح پر دنیاوی اور مادی مفاد و منافع کو ترجیح دیں گے! اور زیادہ صحیح معنی یہ ہوں گے کہ۔ وہ لوگ دین کا لبادہ اوڑھ کر دنیا والوں کو دھوکا دیں گے، بایں طور کہ وہ دنیا کمانے کی خاطر اپنی ظاہری وضع قطع اور اپنے ظاہری اعمال و اخلاق کا ایسا دلفریب مظاہرہ کریں گے کہ دنیا والے ان کو سچا عابد زاہد اور دین

وملت کا مخلص ہی خواہ سمجھ کر ان کے ساتھ عقیدت و محبت رکھیں گے اور سادہ لوح مسلمان ان کے مرید و معتقد بن کر ان کر مراد پوری کریں گے۔ مثلاً وہ نماز، روزہ اور دیگر عبادات کے پابند نظر آئیں گے، اور اوراد و وظائف ذکر و شغل کی محفلیں سجائیں گے، اپنے ارد گرد زہد و تقویٰ کی دیواریں کھڑی کئے نظر آئیں گے، موٹے جھوٹے کپڑوں کا لباس پہنیں گے، دینداروں کی سی شکل و صورت بنائیں گے ان کی تحریر و تقریر، دین و آخرت کی تلقین و تعلیم موعظت و نصیحت کی باتوں، ملت کی بہی خواہی مسلمانوں کے مفاد اور باہمی ہمدردی و غمگساری سے پر نظر آئے گی، لیکن یہ تمام چیزیں صدق و اخلاص سے خالی ریا و سمعہ کے طور پر ہوں گی، جن کا واحد مقصد مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر دنیا سمیٹنا، اور صرف ذاتی منافع حاصل کرنا ہوگا۔

پس ایسے لوگوں کی اس ریاکارانہ زندگی کے خلاف یہ خدائی تنبیہ بیان فرمائی گئی کہ انہیں اس گھمنڈ میں ہرگز نہ رہنا چاہئے کہ ان کی یہ دھوکا کی ٹٹی ہمیشہ ہمیشہ رہے گی اور وہ اپنی اس ریاکارانہ زندگی کی سزا اسی دنیا میں نہیں بھگتیں گے؟ خدا قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں ان لوگوں کو ضرور مزا چکھاؤں گا، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ میرا غضب و قہر ان پر یقیناً نازل ہوگا، میں ان پر ایسے امراء و حکام مسلط کر دوں گا اور انہیں میں سے کچھ ایسے لوگ اور گروہ کھڑے کر دونگا، جو ان کی ناؤ کو آفات و مصائب، ذلت و خواری، اور تباہی و بربادی کے بھنور میں ڈال دیں گے، ان کی ریاکارانہ زندگی کا پردہ چاک کریں گے اور ان کو ایسے ایسے فتنوں میں مبتلا کریں گے کہ وہ نجات کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے، وہ اپنی اس خود ساختہ شان و شوکت، عزت و عظمت اور جاہ و منصب کو بچانے کے لئے جس قدر ہاتھ پاؤں ماریں گے اسی قدر ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی کے حلقے ان کے گرد تنگ ہوتے جائیں گے، اور بڑے بڑے دانشور، عقلمند لوگ بھی ان آفات و مصائب سے گلو خلاصی کا کوئی ذریعہ نہیں نکال پائیں گے۔

⑩ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ لَقَدْ خَلَقْتُ خَلْقًا اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ اَمَرُّ مِنَ الصَّبِرِ فَبِيْ حَلَفْتُ لَاُتِيْحَنَّهُمْ فِتْنَةً تَدَعُ الْحَلِيْمَ فِيْهِمْ حَيْرَانَ فَبِيْ يَغْتَرُّوْنَ اَمْ عَلَيَّ يَجْتَرِءُوْنَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جس کی زبان لشکر سے زیادہ شیریں ہے، اور جس کے دل ایلوے سے زیادہ تلخ ہیں، پس میں اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یقیناً ان پر ایسی بلائیں نازل کروں گا جو بڑے سے بڑے دانشور عقلمند شخص کو بھی حیران و عاجز بنا دیں گی، تو کیا وہ لوگ مجھے دھوکہ دیتے ہیں، یا مجھ پر جرأت و دلیری دکھاتے ہیں؟ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

میانہ روی کی فضیلت

⑪ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ شِرَّةً وَلِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةً فَاِنْ صَاحِبُهَا سَدَّدَ وَقَارَبَ فَارْجُوْهُ وَاِنْ اُشِيْرَ اِلَيْهِ بِالْاَصَابِعِ فَلَا تَعُدُّوْهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ہر چیز کے لئے حرص و زیادتی ہے اور پھر ہر حرص و زیادتی کے لئے سستی و کمی ہے۔ پس اگر عمل کرنے والے نے میانہ روی سے کام لیا اور اعتدال کے قریب رہا (اور اس نے افراط و تفریط سے اجتناب کیا) تو اس کے بارے میں امید رکھو (کہ وہ اپنی مراد پالے گا) اور اگر اس کی طرف سے انگلیوں سے اشارہ کیا گیا (یعنی اس نے طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف کی مشغولیت اور دنیاوی نعمتوں و لذتوں میں اجتناب میں اس لئے مبالغہ و کثرت کو اختیار کیا کہ لوگوں میں عابد و زاہد مشہور ہو، اور پھر وہ لوگوں میں عابد و زاہد مشہور بھی ہو گیا) تو تم اس کو (عابد و زاہد اور صالح) شمار نہ کرو (کیونکہ در حقیقت وہ ریاکاروں میں سے ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: شِرَّۃٌ کے معنی ہیں نشاط رغبت اور حرص میں مبتلا ہونا۔ یہاں حدیث میں اس لفظ سے مراد کسی چیز میں افراط اور کسی کام میں حد سے زیادہ انہماک ہے اور "فترہ" کے معنی ہیں سستی و کمزوری اور کمی۔ مطلب یہ ہے کہ جو عابد ابتداءً طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف وغیرہ میں حد سے زیادہ مشغول و منہمک رہتا ہے وہ بعد میں سُست و کمزور ہو جاتا ہے اور اس کی طاعت و عبادت وغیرہ کم ہو جاتی ہے۔ اس بات کو اصولی انداز میں زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کوئی انسان جب کسی چیز کو اختیار کرنا چاہتا ہے اور کوئی کام کرتا ہے تو شروع میں بہت زیادہ استغراق انہماک دکھاتا ہے اور اس قدر ذوق و شوق بلکہ حرص و لالچ میں مبتلا ہوتا ہے کہ اپنی بساط سے بڑھ کر محنت و مشقت اور اپنی طاقت و ہمت سے زیادہ مشغولیت اختیار کرتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں جلد ہی سُست و کمزور پڑ جاتا ہے اور اپنے مقصد کی راہ میں تھکن بے دلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ پس اگر کوئی عابد و زاہد اپنے اعمال و اشغال میں میانہ روی اختیار کرے۔ اور افراط و تفریط کی راہ سے بچ کر اعتدال کی راہ پر کہ جس کو صراط مستقیم کہا جاتا ہے گامزن رہے، تو اس کے بارے میں بجا طور پر امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جو کامل طور پر مراد پانے والے ہیں! لیکن اگر وہ افراط کی راہ پر چلا اور اس نے عبادت و طاعت اور دینی اعمال و اشغال میں اس حد تک غور کیا اور اپنی بے دینی زندگی کو اس طرح نمایاں کیا کہ وہ عابد و زاہد مشہور ہو گیا اور لوگ اس کی عبادت گذاری اور زہد و تقویٰ کی طرف اشارہ کرنے لگے تو اس کی طرف۔ کوئی التفات نہیں کرنا چاہئے، اور اس کو نیک و صالح نہ سمجھنا چاہئے۔

واضح رہے کہ لفظ فارجوہ (اس کے بارے میں امید رکھو) اور لفظ وَ لاَ تعدوہ (اس کو عابد و زاہد شمار نہ کرو) کے ذریعہ ان دونوں قسم کے لوگوں کی عافیت کی طرف ایک مبہم اشارہ مقصود ہے کیونکہ کسی شخص کے اخروی انجام کا حقیقی علم بس اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے اور اس کے بارے میں کوئی انسان آخری فیصلہ نہیں کر سکتا لہٰذا مذکورہ الفاظ کے ذریعہ یہ حدیث صرف یہ بتانا چاہتی ہے کہ جو شخص میانہ روی کا راستہ اختیار کرتا ہے، صحیح عمل کرتا ہے اور راہ راست سے بھٹکتا نہیں تو بظاہر اس کے بارے میں یہ امید رکھنی چاہئے کہ اس کی عاقبت سدھر گئی اور وہ نجات پا جائے گا اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا بلکہ افراط و تفریط کی راہ پر چل کر دنیاوی عزت و جاہ کا طلبگار ہوتا ہے اور گندم نما جو فروشی کا شیوہ اپنا کر فتنہ و فساد کے بیج بوتا ہے تو ظاہر میں اس کو فلاح یاب نہ سمجھو اور اس کا شمار مخلص دینداروں میں نہ کرو۔ رہی عاقبت کی بات تو وہاں کا انجام دونوں صورتوں میں غیر واضح ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ خاتمہ کس حالت میں ہو اور آخرت میں کیا معاملہ ہو گا ۔

حکم مستوری و مستی ہمہ بر خاتمہ است کس ندانست کہ آخر بچہ حالت گذرد

اگرچہ عاقبت کے بارے میں بھی امید ہی رکھنی چاہئے کہ رحمت باری نے جس جس شخص کو اطاعت و عبادت کی توفیق بخشی ہے اور راہ مستقیم پر گامزن کیا ہے اس کی عاقبت ضرور سنورے گی اور اس کا خاتمہ یقیناً ایمان و اخلاص پر ہو گا اس کی رحمت کاملہ کا دستور ہی ہے کہ نیکو کاروں کو بری راہ پر کم ہی لگایا جا سکتا ہے، جب کہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ بدکاروں کو بالآخر نیکی کی طرف کھینچ لیا جاتا ہے۔

شہرت یافتہ زندگی پر خطر ہے

(۱۲) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بِحَسْبِ امْرِیءٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ يُّشَارَ اِلَيْهِ بِالْاَصَابِعِ فِيْ دِيْنٍ اَوْدُنْيَا اِلَّا مَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ انسان کی برائی کے لئے اتنا کافی ہے کہ دین یا دنیا کے اعتبار سے اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جائے۔ الا یہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ ہی محفوظ رکھے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: دنیاوی اعتبار سے مشہور و معروف ہونا تو ظاہر ہے کہ آفتوں اور فتنوں میں مبتلا ہو جانے اور ایمانی امن و سلامتی کی راہ سے دور جا پڑنے کا سبب ہے ہی، لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے اعتبار سے مشہور و معروف ہوتا ہے تو وہ بھی خطرہ سے خالی نہیں، کیونکہ اس صورت میں اس کے ریاکار ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس شہرت کی وجہ سے اپنی قیادت و پیشوائی کی طلب و جاہ

میں، مبتلا ہو جائے یہ تمنا کرنے لگے کہ لوگ اس کو اپنا مشدا اور اپنی عقیدت واحترام کا مرکز بنالیں، اور اس طرح وہ شیطان کے بہکانے اور نفس امارہ کے اکسانے کی وجہ سے ان نفسانی خواہشات کی اتباع میں مبتلا ہو سکتا ہے جو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی ہیں! چنانچہ ایسے بندگان خدا کم ہی ہوتے ہیں جنہیں عوامی شہرت و ناموری حاصل ہوئی ہو اور وہ اس کے نتیجہ میں پیدا ہو جانے والی برائیوں سے محفوظ و مامون رہے، ہاں وہ بندگان خدا خاص کہ جنہیں اللہ تعالیٰ اپنا مقرب و محبوب بنالیتا ہے اور وہ صدیقیت کے مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں وہ تمام عالم کی شہرت و ناموری رکھنے کے باوجود اس کی برائیوں سے محفوظ رہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اس بلند ترین مرتبہ پر فائز ہی اس وقت ہوتے ہیں جب کہ ان کے ظاہر و باطن سے تمام برائیاں مٹ چکی ہوتی ہیں اور ان کا نفس پوری طرح پاکیزہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ مشائخ کرام کہتے ہیں کہ آخر مایخرج من رأس الصدیقین حب الجاہ۔

لہٰذا انسان کی بھلائی و بہتری اسی میں ہے اور ایمان و کردار کی سلامتی و حفاظت اسی صورت میں زیادہ ممکن ہے جب کہ وہ گوشہ نشینی و گمنامی اور یکسوئی کی زندگی کو شہرت کی زندگی پر ترجیح دے۔

"الا یہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ ہی محفوظ رکھے" حدیث کے اس جملہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شہرت و ناموری کا نقصان وہ اور برائی کا باعث ہونا اس شخص کے حق میں ہے جس کے ظاہر و باطن پر جاہ و اقتدار اور شہرت و ناموری کی طلب و خواہش کا سکہ رواں ہو، ورنہ تو بندگان خدا اس طلب و خواہش سے محفوظ و مامون اور اپنے ظاہر و باطن کے اعتبار سے مخلص و پاکباز ہوتے ہیں وہ اس بات سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ عوامی مقبولیت و شہرت اور جاہ و اقتدار بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہیں بلکہ خدا کی وہ نعمت ہیں جو وہ اپنے پاک نفس بندوں کو عطا فرماتا ہے جو ان چیزوں کے اہل و مستحق ہوتے ہیں اور جن کے حق میں وہ چیزیں فتنہ و برائی کا باعث بننے کی بجائے بلندئ درجات کا باعث بنتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے بندگان خاص کی نسبت سے یہ فرمایا ہے کہ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۔

منقول ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کی بے پناہ عوامی شہرت و مقبولیت دیکھ کر ایک شخص نے ان سے کہا کہ آپ تو لوگوں میں اس قدر مشہور و نمایاں ہو گئے ہیں! جب کہ آنحضرت ﷺ نے تو یہ فرمایا ہے کہ بحسب امری من الشر.....الخ؟ حضرت حسن بصریؒ نے جواب دیا کہ ارشاد گرامی ﷺ کا تعلق اس شخص سے ہے جو دین کے اعتبار سے بدعتی اور دنیا کے اعتبار سے فاسق ہو۔ (یعنی جو شخص دنیا میں مالداری و ثروت رکھتا ہے اور اس مالداری و ثروت کی وجہ سے مشہور معروف ہو، لیکن فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو اور دین کے اعتبار سے کتاب و سنت کی اتباع و پیروی کرتا ہو تو وہ شخص اس حکم میں داخل نہیں ہے۔ جو حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سمعہ کی مذمت

(۱۳) عَنْ اَبِى تَمِيمَةَ قَالَ شَهِدْتُ صَفْوَانَ وَاَصْحَابَهُ وَجُنْدُبٌ يُوصِيهِمْ فَقَالُوْا هَلْ سَمِعْتَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ شَاقَّ شَقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالُوْا اَوْصِنَا فَقَالَ اِنَّ اَوَّلَ مَا يُنْتِنُ مِنَ الْاِنْسَانِ بَطْنُهُ فَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ لَا يَاكُلَ اِلَّا طَيِّبًا فَلْيَفْعَلْ وَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ لَا يَحُوْلَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ مِلْءُ كَفٍّ مِنْ دَمٍ اَهْرَاقَهُ فَلْيَفْعَلْ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابی تمیمہؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں کی مجلس میں اس وقت حاضر ہوا کہ جب (مشہور اور جلیل القدر صحابی) حضرت جندبؓ (ابن عبداللہ ابن سفیان بجلی) حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں کو (ریاضت و مجاہدہ کی راہ مستقیم اختیار کرنے یا کثرت کے ساتھ عبادت کرنے یا طاعت میں میانہ روی اختیار کرنے اور ریا سمعہ وریا اور حصول شہرت کی طلب و خواہش سے احتراز و اجتناب کرنے کی) نصیحت فرما رہے تھے۔ پھر حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں نے ان سے کہا کہ کیا آپ نے رسول کریم ﷺ

سے کچھ سنا ہے؟ (یعنی اگر آپ نے حضور ﷺ کی کوئی حدیث سنی ہے تو اس کو ہمارے سامنے بیان فرمائیے اور ہمیں ارشاد نبوی ﷺ سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیجئے۔

حضرت جندبؓ نے یہ حدیث بیان کی میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ۔ "جو شخص سنائے گا (یعنی لوگوں کے سنانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے جو کوئی نیک کام کرے گا) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو رسوا کرے گا۔ اور جو شخص مشقت ڈالے گا (یعنی اپنی ہمت وطاقت سے بڑھ کر کوئی کام کرنے کی صورت میں اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرے گا۔ یا کسی دوسرے شخص مثلاً اپنے خادم یا نوکر چاکر وغیرہ کو کسی ایسے کام پر مامور کرکے، کہ جو اس کی ہمت وطاقت سے باہر ہو، ناقابل برداشت محنت ومشقت کی اذیت میں مبتلا کرے گا) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن مشقت میں ڈالے گا۔" (یہ سن کر) انہوں نے (یعنی صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے یا حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں نے حضرت جندبؓ سے کہا) کہ ہمیں (کچھ اور) نصیحت فرمائیے تو (حضور ﷺ نے یا حضرت جندبؓ نے) فرمایا۔ "انسان کی جو چیز سب سے پہلے گندی اور خراب ہوتی ہے وہ اس کا پیٹ ہے (یعنی جو چیز انسان کو سب سے پہلے زیادہ برائی میں مبتلا کرتی ہے سب سے پہلے دوزخ کی آگ کا مستوجب بناتی ہے اور آخرت میں سب سے پہلے دوزخ میں جانے اور عذاب بھگتنے کا باعث بنے گی وہ اس کا پیٹ ہے۔ پس جو شخص اس کی قدرت رکھتا ہو کہ اس چیز کے علاوہ اور کچھ اپنے پیٹ میں نہ پہنچائے جو حلال وجائز ہے تو بے شک اس کو ایسا ہی کرنا چاہئے اور جو شخص اس کی قدرت رکھتا ہو کہ اس کے اور جنت کے درمیان، ناحق بہایا جانے والا ایک چلو خون حائل ہو تو بے شک اس کو ایسا ہی کرنا چاہئے (کہ کسی کا ایک چلو بھی ناحق خون بہانے سے احتراز کرے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ ناحق خونریزی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا زیادہ ہونا تو کجا اگر ایک چلو کے بقدر بھی ہو تو جنت میں جانے سے روکنے والی ہے! پس یہ بات عقل ودانائی سے بعید تر ہے، کہ ایسے برے، اور قابل نفرین فعل کا ارتکاب کیا جائے جو انسانیت کے منافی نہیں ہے بلکہ جنت میں داخل ہونے جیسی عظیم واہم سعادت سے محروم رکھنے والا بھی ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "حضرت صفوان" سے مراد صفوان ابن سلیم زہری ہیں جو مدینہ کے ایک نہایت جلیل القدر تابعی تھے اور جن کی شخصیت، علم ومعرفت کردار وعمل، زہد وتقوی، اور عبادت وریاضت کا ایک مثالی نمونہ تھی! بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس برس تک اپنا پہلو زمین سے نہیں لگایا اور عبادت گزاری کا یہ عالم تھا کہ سجدوں کی کثرت سے ان کی پیشانی میں سوراخ ہوگیا تھا، ان کے حالات میں یہ لکھا ہے کہ وہ امراء وسلاطین کا کوئی بھی انعام واکرام قبول نہیں کرتے تھے۔ غرضیکہ ان کے بہت زیادہ فضائل ومناقب بیان کئے جاتے ہیں۔

ریاکاری شرک کے مرادف ہے

(۱۴) وَعَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ اَنَّهٗ خَرَجَ يَوْمًا اِلٰى مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ مُعَاذَبْنَ جَبَلٍ قَاعِدًا عِنْدَ قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَبْكِيْ قَالَ مَا يُبْكِيْكَ قَالَ يُبْكِيْنِيْ شَيْءٌ سَمِعْتُهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ يَسِيْرًا الرِّيَآءِ شِرْكٌ وَمَنْ عَادٰى لِلّٰهِ وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزَ اللّٰهَ بِالْمُحَارَبَةِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْاَبْرَارَ الْاَتْقِيَآءَ الْاَخْفِيَآءَ الَّذِيْنَ اِذَا غَابُوْا لَمْ يُتَفَقَّدُوْا وَاِنْ حَضَرُوْا لَمْ يُدْعَوْا وَلَمْ يُقَرَّبُوْا قُلُوْبُهُمْ مَصَابِيْحُ الْهُدٰى يَخْرُجُوْنَ مِنْ كُلِّ غَبْرَآءَ مُظْلِمَةٍ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور امیر المؤمنین حضرت عمر ابن الخطاب سے روایت ہے کہ وہ ایک دن رسول کریم ﷺ کی مسجد شریف (یعنی مسجد نبوی) میں تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھ کر روتا ہوا پایا، حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ کیوں رو رہے ہو؟ (کیا حضور ﷺ کی جدائی رلا رہی ہے یا کسی آفت ومصیبت کے پیش آجانے کی وجہ سے رو رہے ہو اور یا ان کے علاوہ

کسی اور سبب نے تمہیں رونے پر مجبور کر دیا ہے؟) حضرت معاذؓ نے جواب دیا۔ "مجھے ایک بات کی یاد نے رلا دیا ہے۔ جس کو میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا تھا میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ۔ "تھوڑا "ریا" (بھی) شرک ہے" (نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ)۔ جس شخص نے خدا کے دوست سے دشمنی اختیار کی (یعنی اولیاء اللہ کو اپنے کسی قول و فعل کے ساتھ ناحق تکلیف پہنچائی یا ان کو غصہ دلایا) تو اس نے گویا خدا سے مقابلہ کیا اور اس کے ساتھ جنگ کی (اور ظاہر ہے کہ جس شخص نے خدا کے ساتھ مقابلہ آرائی کی اس کی تباہی و بربادی اور ذلت و رسوائی میں کوئی شبہ نہیں) یقیناً اللہ تعالیٰ، نیکوکاروں، پرہیزگاروں اور مخفی حال لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی ظاہری حالت تو اتنی خستہ اور عام نگاہوں میں اس قدر ناقابل توجہ ہوتی ہے کہ) جب وہ نظروں سے غائب ہوں تو ان کو پوچھا نہ جائے، اور جب موجود ہوں تو انہیں (کسی دعوت و مجلس میں) بلایا نہ جائے۔ اور اگر وہ بلائے بھی جائیں تو پاس نہ بٹھائے جائیں۔" (لیکن باطنی و روحانی طور پر ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے، چنانچہ، ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں (جن کے نور سے راہ راست پائی جاتی ہے) اور یہ لوگ ہر تاریک زمین سے نکل کر آتے ہیں (اس روایت کو ابن ماجہؒ نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "تھوڑا ریا بھی شرک ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ریاکاری اگر معمولی درجہ کی بھی ہو تو وہ بھی ایک بڑا شرک ہے۔" یا یہ کہ تھوڑا ریا شرک کی قسموں میں سے ایک قسم ہے۔ اور یہ چیز انسانی جبلت میں اس طرح پوشیدہ طور پر گھر کئے ہوئے ہے کہ اچھے اچھے لوگ اور مضبوط و پختہ ایمان والے بھی اپنے اعمال میں اس کی دخل اندازی کو پہچان نہیں پاتے اور کم ہی لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں، لہٰذا حضرت معاذؓ نے اپنے رونے کا ایک سبب تو اسی چیز کو بتایا کہ مجھ پر یہ خوف طاری ہے کہ کہیں غیر معلوم طور سے میرے اعمال پر بھی اس برائی کا سایہ نہ ہو، دوسرا سبب انہوں نے اولیاء اللہ کی ایذاء رسانی بتایا، یعنی انہوں نے گویا یہ بیان کیا کہ اکثر اولیاء اللہ اپنی اصلی حیثیت اور حقیقت کے اعتبار سے عام نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں، اور اپنی ظاہری حالت میں وہ ایک بہت معمولی درجہ کے مسلمان نظر آتے ہیں، ان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کس بلند مقام پر فائز ہیں، اور خدا کی نظر میں ان کی کتنی بڑی حیثیت ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں (اللہ تعالیٰ فرماتا) ہے۔ اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیرھم اور ظاہر ہے کہ کوئی انسان اس بات سے خالی نہیں کہ وہ کسی مسلمان بھائی کے ساتھ کبھی بھی کوئی ایسی بدزبانی نہ کرے، جو گناہ کا باعث ہوتی ہے، لہٰذا حضرت معاذؓ نے بتایا کہ میں اس خوف سے رو رہا ہوں کہ مبادہ میں نے کسی مسلمان بھائی کے ساتھ قولاً یا فعلاً کوئی ایسا رویہ اختیار کیا ہو جو اس کے لئے اذیت کا باعث بن گیا ہو اور اس کی وجہ سے میں نے خدا کی ناراضگی مول لے لی ہو۔ گویا یہاں وَمَنْ عَادٰی لِلّٰہِ وَلِیًّا کے یہی معنی مراد لئے گئے ہیں۔

"نیکوکاروں" سے وہ لوگ مراد ہیں جو نیکی کرتے ہیں۔ اور نیکی کا مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طاعت کرنا اور اس کی مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک اور احسان کرنا۔ چنانچہ اسی لئے بعض عارفین نے یہ کہا ہے کہ دین کا مدار احکام خداوندی کو (اعتقادا اور عملاً) سب سے اہم اور قابل احترام جاننے اور مخلوق خداوندی کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آنے پر ہے۔

"پرہیزگاروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہر طرح کے شرک سے بچتے ہیں، خواہ وہ شرک جلی ہو یا خفی شرک ہو، اور ہر اس چیز سے اجتناب و پرہیز کرتے ہیں جس کو خدا اور خدا کے رسول ﷺ نے ممنوع و حرام قرار دیا ہے، یا جو شریعت کی نظر میں نہایت ناپسندیدہ اور نہایت نامناسب ہے۔

"مخفی لوگوں" سے خدا کے وہ پاک نفس بندے مراد ہیں جو ظاہری وجہ، وضع و قطع اور رہن سہن کے اعتبار سے نہایت خستہ حالت میں رہتے ہیں اور معاشرہ کے لوگ (دنیادار) ان کو بہت کمزور و حقیر جانتے ہیں، مگر اپنے کردار و اخلاق باطنی احوال اور روحانی عظمت کے اعتبار سے نہایت بلند و بالا درجہ پر فائز ہوتے ہیں۔ یا وہ اہل اللہ مراد ہیں، جو دنیاداروں کی نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں، اور ان کے درمیان رہن سہن نہیں رکھتے۔

"اِنَّ اللّٰہَ...... الخ" سے یہ جملہ استیناف ہے اور اس کے ذریعہ گویا "ولی" کی حقیقت بیان کرنا مقصود ہے چنانچہ پہلے تو نیکی، پرہیز

گاری اور اخفائے حال کی صفات کے ذریعہ اولیاء اللہ کی حقیقت بیان کی گئی اور پھر دنیا والوں کے تعلق سے ان اولیاء اللہ کے تین احوال بیان کئے گئے کہ جب وہ کہیں باہر چلے جاتے ہیں اور سفر میں ہوتے ہیں تو کسی تقریب و مجلس آرائی کے وقت ان کی تلاش و جستجو نہیں ہوتی اور ان کا کوئی انتظار نہیں کیا جاتا، جب وہ موجود ہوتے ہیں تو ان کو اس مجلس و تقریب میں بلایا نہیں جاتا، اور اگر وہ اس تقریب و مجلس میں جاتے ہیں تو ان کو اہل مجلس نہ صرف یہ کہ کوئی اہمیت و وقعت نہیں دیتے بلکہ اپنے قریب بیٹھنے بھی نہیں دیتے اور انہیں پیچھے کہیں، دور بٹھلا دیتے ہیں۔ یہ گویا اس روایت کی تفصیل ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ رب اشعث اغبر لا یعبا بہ لو اقسم علی اللہ لابرہ، یعنی بعض ایسے لوگ بھی ہیں (بظاہر) پراگندہ بال و غبار آلودہ (خستہ حال) ہوتے ہیں اور ان کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی (لیکن خدا کے نزدیک وہ اتنا بلند مرتبہ رکھتے ہیں کہ) اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کر کے قسم کھالیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو سچا اور پورا کرے۔

"ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں" یعنی وہ پاک نفس لوگ راہ ہدایت کے مشعل بردار ہیں کہ وہ رہبری و پیشوائی کی اہلیت رکھتے ہیں اور ان کی اتباع کرنا راہ ہدایت پانے کی ضمانت ہے، پس وہ اس بات کے پوری طرح مستحق ہیں کہ ان کا لحاظ رکھا جائے اور وہ اس لائق ہیں کہ ان سے راہ ہدایت و راستی کی روشنی حاصل کی جائے۔

"ہر تاریک زمین سے نکل کر آتے ہیں" کے ذریعہ ان لوگوں کی مفلسانہ طرز زندگی، ان کے مکانات کی تیرگی و تاریکی اور خراب حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی وہ لوگ اتنے مفلس و تہی دست ہوتے ہیں کہ اپنے گھر میں چراغ جلانے اور اپنے مکانات کو معمولی درجہ کا بھی قابل آسائش بنانے کے لئے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے۔

اس حدیث میں یہ تنبیہ پوشیدہ ہے کہ اگر کسی عالم و صالح اور متقی شخص کی ظاہری حالت خراب و خستہ ہو تو ان کی ظاہری خستہ حالی اور ان کے لباس وغیرہ کی کہنگی و بوسیدگی سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے اور ان کی تعظیم و توقیر اور ان کے ادب و احترام کو ترک کر دینے کی غلطی نہ کرنی چاہئے کیونکہ کسی کے ظاہر کو دیکھ کر کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہے یا نہیں ۔

خاکسار ان جہاں را بحقارت منگر ۔ توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

نیز یہ حدیث بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ محض فقر و افلاس، اور دنیاوی بے حیثیتی، کوئی فضیلت نہیں ہے جب تک کہ تقویٰ و پرہیزگاری اور باطن کی نورانیت حاصل نہ ہو۔

آخر میں ایک یہ بات بتا دینی ضروری ہے کہ "ولی" اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو متقی و پرہیزگار ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنْ اَوْلِيَآئُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے ولی وہی لوگ ہیں جو متقی و پرہیزگار ہوں) نیز شرح عقائد نسفی میں لکھا ہے کہ۔ "ولی وہ شخص ہے جو اپنی بساط بھر اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا عرفان رکھتا ہو، طاعات و عبادات کا پابند ہو، گناہوں سے اجتناب کرتا ہو اور نفسانی لذات و خواہشات میں منہمک رہنے سے اعراض کرتا ہو۔

صدق و اخلاص کی علامت

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ للّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا صَلّٰى فِى الْعَلَانِيَةِ فَاَحْسَنَ وَصَلّٰى فِى السِّرِّ فَاَحْسَنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذَا عَبْدِىْ حَقًّا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بندہ جب کھلے طور پر (سب کے سامنے) نماز پڑھتا ہے اور خوبی کے ساتھ پڑھتا ہے (یعنی نماز کی تمام شرائط و واجبات سنن اور مستحبات کو ملحوظ رکھ کر پڑھتا ہے اور اسی طرح دیگر عبادات و طاعات بھی پورے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرتا ہے) اور جب پوشیدہ طور پر (یعنی تنہائی میں) پڑھتا ہے (تو اس وقت بھی اسی خوبی کے ساتھ پڑھتا ہے (جس خوبی کے ساتھ کہ سب کے سامنے پڑھتا ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا یہ بندہ صدق و راستی کا حامل ہے (کہ اس کی طاعت و عبادت ریاکاری

سے پاک ہے۔" (ابن ماجہؒ)

ریا کار لوگوں کے بارے میں پیشگوئی

(۱۶) وَعَنْ مُعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَكُوْنُ فِیْ آخِرِ الزَّمَانِ اَقْوَامٌ اِخْوَانُ الْعَلَانِیَةِ اَعْدَاءُ السَّرِیْرَةِ فَقِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَیْفَ یَكُوْنُ ذٰلِكَ قَالَ ذٰلِكَ بِرَغْبَةِ بَعْضِهِمْ اِلٰی بَعْضٍ وَرَهْبَةِ بَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ۔

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "آخر زمانہ میں ایسی قومیں اور جماعتیں بھی پیدا ہوں گی جو ظاہر میں تو دوست ثابت ہوں گی مگر باطن میں دشمنی کریں گے۔"

عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ایسا کیونکر اور کس سبب سے ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ایسا اس وجہ سے ہوگا کہ ان میں سے بعض، بعض سے غرض و لالچ رکھیں گے، اور بعض، بعض سے خوف زدہ ہوں گے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آخر زمانہ میں مسلمانوں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہوگی جو اپنی دنیاوی اغراض اور ذاتی مفاد کی تکمیل کے لئے منافقت اور ریاکاری کو اختیار کریں گے اور صدق و اخلاص سے محروم رہیں گے نہ ان کی دوستی کا بھروسہ ہوگا، اور نہ ان کی دشمنی کا جس شخص و طبقہ سے ان کی کوئی غرض وابستہ ہوگی اس کی طرف رغبت و التفات رکھیں گے اور اس کے حق میں دوستی کا اظہار کریں گے۔ اگر کسی غرض و مفاد کا واسطہ درمیان میں نہیں ہوگا تو بیگانہ بن جائیں گے، بلکہ غرض و مفاد حاصل نہ ہونے کی صورت میں دشمنی و عداوت پر کمر بستہ ہو جائیں گے۔

اس سے واضح ہوا کہ شریعت کا جو یہ حکم ہے کہ مسلمان کی دوستی و دشمنی صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہونی چاہئے تو مذکورہ لوگ اس مرتبہ سے گرزے ہوئے ہوں گے، کیونکہ ان کی دوستی و دشمنی کا تعلق اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے بجائے ذاتی اغراض فاسدہ اور مذموم مقاصد سے ہوگا چنانچہ جب وہ اپنے اغراض اور اپنے مفاد کے تحت کسی فرد یا جماعت کی طرف رغبت و التفات رکھیں گے تو اس کے تئیں دوستی و الفت ظاہر کریں گے اور جب کسی وجہ سے کسی فرد یا جماعت کو ناپسند کریں گے تو ان کے خلاف بغض و عداوت ظاہر کریں گے۔

پس نہ تو لوگوں کے تئیں ان کی دوستی کا اعتبار ہوگا اور نہ ان کی عداوت کا، کیونکہ ان کی دوستی اور عداوت دونوں کی بنیاد، صدق و اخلاص، اور پاکیزہ اغراض و مقاصد کے بجائے، ذاتی اغراض و خواہشات، اور نفع و نقصان پر ہوگی۔

دکھلاوے کا نماز روزہ شرک ہے

(۱۷) وَعَنْ شَدَّادِ ابْنِ اَوْسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ۔ (رواهما احمد)

"اور حضرت شداد ابن اوسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ "جس شخص نے دکھلانے کے لئے نماز پڑھی، اس نے شرک کیا، جس شخص نے دکھلانے کو روزہ رکھا اس نے شرک کیا، اور جس شخص نے دکھلانے کو صدقہ خیرات کیا اس نے شرک کیا۔" دونوں روایتوں کو احمدؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حاصل یہ کہ ریاکاری کے تحت جو بھی نیک کام کیا جائے گا وہ شرک کے مرادف ہوگا اگرچہ اس کو شرک خفی کہا جائے گا، کیونکہ شرک جلی کا اطلاق علی الاعلان اور آشکارا طور پر بت پرستی کرنے پر ہوتا ہے رہی یہ بات کہ ریاکاری کو شرک خفی کس اعتبار سے کہا گیا ہے تو جاننا چاہئے کہ ریاکار جو نیک کام کرتا ہے وہ صدق و اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے نہیں کرتا بلکہ غیر اللہ کے لئے کرتا ہے اور جب اس نے کوئی نیک کام غیر اللہ کے لئے کیا تو گویا بت پرستی کی، اگرچہ وہ کھلی ہوئی بت پرستی نہیں ہے البتہ پوشیدہ طور پر بت پرستی کے مرادف ضرور

ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے۔ کل ماصدک عن اللہ فھو صنمک۔"

ملا علی قاری کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ریا کا دخل روزہ میں بھی ہو سکتا ہے! اس اعتبار سے یہ حدیث گویا ان حضرات کے خلاف ایک دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ریا کا تعلق روزہ سے نہیں ہو سکتا، اور اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ روزے کا مدار نیت پر ہے چنانچہ جس شخص کی نیت صحیح نہ ہو اس کے کھانے پینے سے رکنے کا کوئی اعتبار نہیں، اور ظاہر ہے کہ نیت میں ریا کاری یعنی دکھلاوے کا عمل دخل کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حقیقی معنی میں ریا، یعنی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی نیک کام اور کسی عبادت کا اس لئے قصد وارادہ کرتا ہے کہ اللہ کی رضا وخوشنودی حاصل کرے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی نیت میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ اس نیک کام اور عبادت کے ذریعہ اس کو شہرت حاصل ہو جائے، یا فلاں غرض پوری ہو جائے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی سے نہیں ہوتا، اور یہ الگ بات ہے کہ دونوں مقصد برابر ہوں یا ان میں سے ایک غالب ہو جیسا کہ ابتدائے باب میں تفصیل گزر چکی ہے پس معلوم ہوا کہ روزے میں بھی ریا کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔

(۱۸) وَعَنْهُ اَنَّهُ بَكٰى فَقِيْلَ لَهُ مَايُبْكِيْكَ قَالَ شَيْءٌ سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فَذَكَرْتُهُ فَاَبْكَانِيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَتَخَوَّفُ عَلٰى اُمَّتِي الشِّرْكَ وَالشَّهْوَةَ الْخَفِيَّةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُشْرِكُ اُمَّتُكَ مِنْ بَعْدِكَ قَالَ نَعَمْ اَمَا اِنَّهُمْ لَا يَعْبُدُوْنَ شَمْسًا وَلَا قَمَرًا وَلَا حَجَرًا وَلَا وَثَنًا وَلٰكِنْ يُرَاءُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ وَالشَّهْوَةُ الْخَفِيَّةُ اَنْ يُّصْبِحَ اَحَدُهُمْ صَائِمًا فَتَعْرِضُ لَهُ شَهْوَةٌ مِنْ شَهَوَاتِهِ فَيَتْرُكُ صَوْمَهُ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت شداد ابن اوس کے بارے میں منقول ہے کہ (ایک موقع پر وہ رونے لگے، پوچھا گیا کہ رونے کا سبب کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اس بات نے رلایا ہے جو میں نے رسول ﷺ سے سنی تھی، اس وقت مجھے وہ بات یاد آگئی تو میں رونے پر مجبور ہو گیا، اور وہ بات یہ ہے کہ آپ (ﷺ) فرمایا کرتے تھے۔ میں اپنی اُمت پر شرک (یعنی شرک خفی) اور چھپی خواہشات سے خوف کھاتا ہوں۔

حضرت شداد کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ کی اُمت آپ ﷺ کے بعد شرک میں مبتلا ہو جائے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں! یاد رکھو، میری اُمت کے لوگ سورج کو نہیں پوجیں گے، چاند کو نہیں پوجیں گے، پتھر کو نہیں پوجیں گے اور کھلم کھلا بت پرستی نہیں کریں گے (یعنی وہ شرک جلی میں تو نہیں مبتلا ہوں گے) لیکن لوگوں کو دکھلانے کے لئے نیک کام کریں گے۔ (اور یہ شرک خفی ہے جس میں وہ مبتلا ہوں گے) اور چھپی خواہش یہ ہے کہ (مثلاً تم میں سے کوئی شخص روزہ کی حالت میں صبح کرے، اور پھر اس پر نفسانی خواہشات میں سے کسی خواہش کا غلبہ ہو جائے (جیسے کھانے کی خواہش غالب ہو جائے! یا جنسی خواہش جاگ اٹھے) اور وہ (اس خواہش کے غلبہ کی وجہ سے کھانا کھا کر یا ہم بستری کر کے) اپنا روزہ توڑ ڈالے (جب کہ شرعی طور پر قابل اعتبار کسی ضرورت وحالت کے پیش آنے کے بغیر روزہ توڑنا حرام ہے)۔" (احمد، بیہقی)

تشریح: مذکورہ خواہش کو "چھپی خواہش" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ وہ روزہ کی نیت کے وقت گویا اس کے باطن میں پوشیدہ تھی، یعنی جب اس شخص نے روزہ کی نیت کی تھی اسی وقت اس نے اپنے نفس میں یہ خواہش چھپا رکھی تھی کہ اگر کوئی نفسانی تقاضا آیا تو روزہ توڑ دونگا۔

واضح رہے کہ طیبی نے تو "خواہش" سے مراد کھانے وغیرہ کو قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "چھپی ہوئی خواہش" سے مراد نفسانی خواہشات میں سے خاص طور پر وہ نادر الوجود خواہش ہے۔ جو ہر وقت پیدا نہ ہوتی ہو، بلکہ کسی خاص موقع پر اور کسی خاص وقت پیدا ہو جاتی ہو، اور جب وہ خواہش سر ابھارتی ہو تو اس وقت اس کو پورا کرنے کا داعیہ طبعی طور پر اس طرح غالب آجاتا ہو کہ اس کی راہ میں کسی شرعی حکم کی مخالفت کا خوف بھی رکاوٹ نہ بنتا ہو، جیسا کہ روزہ کی مثال بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا۔"

وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ۔" لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لئے روزہ توڑنے والا یہ لحاظ نہ رکھے کہ میرے اس فعل کی وجہ سے خدا کے حکم کی صریح نافرمانی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ از قسم عبادت وطاعت جو کام شروع کیا جاتا ہے وہ لازم ہو جاتا ہے اور اس کا پورا کرنا شرعا واجب ہوتا ہے۔

ریا کاری دجال کے فتنہ سے زیادہ خطرناک ہے

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَذَاکَرُ الْمَسِیْحَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِمَا ھُوَ اَخْوَفُ عَلَیْکُمْ عِنْدِیْ مِنَ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ فَقُلْنَا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الشِّرْکُ الْخَفِیُّ اَنْ یَّقُوْمَ الرَّجُلُ فَیُصَلِّیْ فَیَزِیْدُ صَلَاتَہٗ لِمَا یَرٰی مِنْ نَظَرِ رَجُلٍ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ آپس میں مسیح دجال کے فتنوں اور اس کے ابتلاء کا ذکر کر رہے تھے۔ کہ رسول کریم ﷺ آکر ہمارے درمیان تشریف فرما ہو گئے اور (پھر ہماری بات چیت سن کر) فرمانے لگے کہ کیا میں تمہیں اس چیز کے بارے میں نہ بتلاؤں جو میرے نزدیک (یعنی میری شریعت اور میرے طریق میں.... تمہارے حق میں مسیح دجال کے فتنہ سے بھی زیادہ خوفناک ہے (اور اس اعتبار سے اس کا لحاظ رکھنا اور اس سے اجتناب کرنا تمہارے لئے نہایت ضروری ہے) ہم نے عرض کیا کہ ہاں! یارسول اللہ! اس چیز کے بارے میں ہمیں ضرور بتایئے! آپ ﷺ نے فرمایا وہ چیز شرک خفی ہے (اور شرک خفی اس چیز کو کہتے ہیں کہ) مثلاً ایک آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور نماز پڑھتا ہے اور اس نماز کے تمام ارکان یا بعض ارکان) میں (کیفیت یا کمیت کے اعتبار سے) غلو اور زیادتی کرتا ہے، محض اس لئے کہ کوئی شخص اس کو نماز پڑھتے دیکھ رہا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "ریا کاری کی برائی کو دجال کے فتنہ سے زیادہ خوفناک اور پر خطر اس لئے فرمایا گیا ہے کہ دجال کے جھوٹے ہونے اور اس کی فتنہ انگیزیوں کو ظاہر کرنے کی نشانیاں اور علامتیں بہت ہیں اور بالکل کھلی ہوئی ہیں، جو صاحب صدق وایمان کی اس سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہوں گی۔"

جب کہ ریا کاری کا معاملہ نہایت پوشیدہ ہے اور جس کی برائی وفتنہ انگیزی میں ہر عمل میں، ہر وقت اور ہر طرح سے معلوم نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ اچھے اچھے لوگ بھی اس کے جال میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔"

ریا کاری شرک اصغر ہے

(۲۰) وَعَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِیْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمُ الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ قَالَ الرِّیَآءُ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَزَادَ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ یَقُوْلُ اللّٰہُ لَھُمْ یَوْمَ یُجَازِی الْعِبَادَ بِاَعْمَالِھِمْ اِذْھَبُوْا اِلَی الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تُرَاءُوْنَ فِی الدُّنْیَا فَانْظُرُوْا ھَلْ تَجِدُوْنَ عِنْدَھُمْ جَزَآءً اَوْ خَیْرًا۔

"اور حضرت محمود ابن لبیدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(مسلمانو) بہت زیادہ خوفناک چیز کہ جس سے میں تمہیں ڈراتا ہوں، شرک اصغر (چھوٹے درجہ کا شرک) ہے۔" صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ اور وہ شرک اصغر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ریا" اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ، اللہ تعالیٰ اس دن کہ جب وہ بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا۔ (یعنی قیامت کے دن) ریا کاروں سے فرمائے گا کہ تم ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھلانے کے لئے تم عمل کرتے تھے اور دیکھو کہ تمہیں ان کے پاس جزا۔ یا بھلائی ملتی ہے؟"

اخلاص عمل کا اثر

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ رَجُلاً عَمِلَ عَمَلاً فِیْ صَخْرَۃٍ لَا بَابَ لَھَا وَلَا کُوَّۃَ خَرَجَ عَمَلُہٗ اِلَی النَّاسِ کَائِنًا مَاکَانَ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اگر کوئی شخص کسی ایسے بڑے پتھر کے اندر بھی کوئی نیک کام کرے کہ جس میں نہ تو کوئی دروازہ ہو، اور نہ کوئی روشن دان، تو اس کا وہ عمل لوگوں میں مشہور ہو جائے گا" خواہ وہ عمل کسی طرح کا ہو۔"

تشریح: "صخرۃ" اصل میں تو بڑے پتھر کو کہتے ہیں لیکن یہاں اس لفظ سے غار مراد ہے! اور ہو سکتا ہے کہ اس لفظ سے اس کے اصل معنی یعنی بڑا پتھر ہی مراد ہو، اس صورت میں کہا جائے گا کہ مذکورہ مفہوم میں اس لفظ کا استعمال بطور مبالغہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی شخص پتھر کے اندر بھی گھس کر کوئی نیک کام کرے کہ جس میں نہ کوئی دروازہ ہوتا ہے اور نہ کوئی روشن دان، اور اس طرح اس پتھر کے اندر نہ تو داخل ہو کر اور نہ باہر سے جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے کہ اندر کون شخص کیا کام کر رہا ہے تو اس صورت میں بھی وہ شخص اپنے اس نیک کام کے ساتھ لوگوں میں مشہور ہو جاتا ہے۔

کُوَّۃٌ یا کَوَّۃٌ اس سوراخ کو کہتے ہیں جو دیوار و چھت میں ہوتا ہے! بعض حضرات نے اس لفظ کی یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر وہ سوراخ آرپار ہو تو اس کو کُوَّۃٌ (یعنی کاف کے پیش کے ساتھ) کہا جاتا ہے، اور اگر آرپار نہ ہو تو "کوۃ" (کاف کے زبر کے ساتھ) کہلائے گا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر یہ لفظ حرف تاء کے ساتھ یعنی کوہ ہو تو اس کے معنی اس سوراخ کے ہوں گے جو چھوٹا اور تنگ ہو، اور اگر حرف تاء کے بغیر یعنی "کو" ہو تو اس صورت میں اس کے معنی اس سوراخ کے ہوں گے جو بڑا اور کشادہ ہو! اس روایت میں یہ لفظ چونکہ حرف تا کے ساتھ ہے اس لئے یہاں اس کے معنی اس سوراخ کے ہوں گے جو چھوٹا اور آرپار ہو اور حدیث کے مفہوم کے اعتبار سے یہی معنی مناسب بھی ہیں۔

بہر حال، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اچھے کام خواہ کتنے ہی پوشیدہ طور پر اور کیسی ہی تنہائی میں کیوں نہ کئے جائیں، اور اس بات کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے کہ وہ (اچھے کام) لوگوں کے علم میں نہ آئیں مگر پھر بھی وہ لوگوں پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی مصلحت اگر خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ بندوں کے نیک عمل جو صدق و اخلاص کے ساتھ صادر ہوتے ہیں، لوگوں پر آشکارا ہوں، تاکہ ایک دوسرے کو اسی طرح نیک راہ اختیار کرنے کی ترغیب حاصل ہو تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ کوئی شخص اپنے نیک عمل کو ظاہر کرنے کے لئے ریاکاری کی حد تک پہنچ جائے اور اس کی قبولیت و ثواب سے خواہ مخواہ محروم رہے۔

یا حدیث کے یہ معنی ہیں کہ۔ مخلص بندہ کو چاہئے کہ وہ اپنے اچھے کاموں کو چھپائے اور اخلاص حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط و سعی کرے کیونکہ بندوں کے نیک عمل ایسی جگہوں سے بھی ظاہر ہو جاتے ہیں جہاں سے ظاہر ہو جانے کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی، اور جن کے آشکارا ہونے میں اس کے قصد و اختیار کو دخل بھی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ ہر پوشیدہ اچھی یا بری عادت کو آشکارا کر دیتا ہے

(۲۲) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَتْ لَہٗ سَرِیْرَۃٌ صَالِحَۃٌ اَوْ سَیِّئَۃٌ اَظْھَرَ اللّٰہُ مِنْھَا رِدَاءً یُعْرَفُ بِہٖ۔

"اور حضرت عثمان ابن عفانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص کے اندر کوئی اچھی یا بری عادت و خصلت چھپی ہوئی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس عادت و خصلت کو نمایاں کر دینے والی کوئی ایسی چیز پیدا کر دیتا ہے جس کے ذریعہ وہ شخص اس عادت و خصلت کے ساتھ شناخت کر لیا جاتا ہے۔"

نفاق کی برائی نہایت خوفناک ہے

(۲۳) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا اَخَافُ عَلٰى هٰذِهِ الْاُمَّةِ كُلَّ مُنَافِقٍ يَتَكَلَّمُ بِالْحِكْمَةِ وَيَعْمَلُ بِالْجَوْرِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الثَّلٰثَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عمر ابن الخطابؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "میں اس اُمّت (یعنی اُمّت محمدیہ ﷺ) کے بارے میں جس چیز سے ڈرتا ہوں وہ ہر منافق (یعنی ریاکار یا فاسق) کا شر ہے جو باتیں تو علم و حکم اور موعظمت و نصیحت کی کرتا ہے، لیکن کام ظلم و زیادتی اور ناراستی کے کرتا ہے۔" ان تینوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: یہ ان لوگوں کی خصلت بتائی گئی ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے باتیں تو بڑی اچھی اچھی کرتے ہیں مگر خود ان باتوں پر عمل کرتے نہیں اور اسی چیز کو نفاق کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی امت کے حق میں ایسے ہی لوگوں کے وجود اور اس بری خصلت سے ڈرتا ہوں کہ مبادا اس قسم کے لوگ میری اُمّت میں پیدا ہو جائیں گے اور یہ بری خصلت اس اُمّت محمدیہ کے درمیان راہ پاکر مسلمانوں کو فتنہ و فساد اور آلام و مصائب میں مبتلا کر دے۔

حسن نیت کی اہمیت

(۲۴) وَعَنِ الْمُهَاجِرِ بْنِ حَبِيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنِّيْ لَسْتُ كُلَّ كَلَامِ الْحَكِيْمِ اَتَقَبَّلُ وَلٰكِنِّيْ اَتَقَبَّلُ هَمَّهٗ وَهَوَاهُ فَاِنْ كَانَ هَمُّهٗ وَهَوَاهُ فِيْ طَاعَتِيْ جَعَلْتُ صَمْتَهٗ حَمْدًا لِيْ وَ وَقَارًا وَاِنْ لَمْ يَتَكَلَّمْ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت مہاجر ابن حبیبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں عقلمند و دانشور کی ہربات کو قبول نہیں کرتا (یعنی میرا دستور یہ نہیں ہے کہ عالم و فاضل اور عقلمند و دانا شخص جو بات بھی کہے اس کو قبول کرلوں) بلکہ میں اس کے قصد و ارادہ اور محبت و نیت کو قبول کرتا ہوں (یعنی یہ دیکھتا ہوں کہ اس نے جو بات کہی ہے وہ کس قصد و ارادہ اور کس نیت کے ساتھ کہی ہے۔) پس اگر اس کی نیت و محبت میری طاعت و فرمانبرداری کے تئیں ہوتی ہے تو میں اس کی خاموشی کو (بھی) اپنی حمد و ثنا اور اس کے حلم و وقار کے مرادف قرار دیتا ہوں اگرچہ وہ کوئی بات نہ کہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خدا کے نزدیک محض گفتار کے غازی کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ بات کہنے والا دانش و حکمت سے قطع نظر اپنی نیت میں کتنا مخلص ہے۔ اگر وہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کی نیت اور اپنے دل میں خدا کے احکام کی محبت و عظمت رکھتا ہے تو اس کی خاموشی بھی علم و وقار کا مایۂ افتخار اور خدا کے نزدیک مستحسن و محمود قرار پاتی ہے کہ اگر وہ زبان سے کچھ نہ کہے تو بھی وہ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ خدا کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہے۔ اور اگر اس کی نیت خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کی نہ ہو، اور اس کے دل میں احکام خداوندی کی عظمت و محبت کا فقدان ہو تو اس کی ہربات لغو اور ناقابل اعتناء قرار پاتی ہے، اگرچہ اس کے الفاظ و معنی علم و حکمت سے کتنے ہی پر کیوں نہ ہوں کیونکہ اس صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ ریاکاری میں مبتلا ہے اور جو بھی بات کہہ رہا ہے، اس کا مقصد لوگوں کو دکھانا سنانا، اور اس کے ذریعہ شہرت و ناموری حاصل کرنا ہے۔"

بَابُ الْبُكَاءِ وَالْخَوْفِ

رونے اور ڈرنے کا بیان

"بُكَاء" کے معنی ہیں رونا آنسو بہانا۔ اگر یہ لفظ مد کے بغیر، یعنی "بکا" ہو تو اس کا اطلاق کسی غم و حزن کی وجہ سے صرف آنسو بہنے پر

ہوتا ہے، اور اگر یہ لفظ مد کے ساتھ، یعنی بکآء ہو تو اس کا اطلاق آواز کے ساتھ رونے اور آنسو بہانے پر ہوتا ہے اور زیادہ مشہور مد کے ساتھ ہی ہے نیز ظاہر یہ ہے کہ عنوان بالا میں اس لفظ کا عام مفہوم مراد ہے یعنی رونا، خواہ خاموش آنسو بہانے کی صورت میں ہو یا بلند آواز کے ساتھ رونے کی صورت میں اسی سے تباکی کا لفظ نکلا ہے جس کے معنی ہیں رونے کی صورت بنانا، بہ تکلف رونا اور ان چیزوں کو کہ جن سے رونا آئے۔ مباد اور بیان کر کر کے زبردستی رونا! ابکاء بھی اسی لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کو رلانا۔

"خوف" کے معنی ہیں ڈرنا، دہشت کھانا۔ اسی لفظ سے اخافت اور تخویف ہے، جس کے معنی ہیں ڈرانا واضح رہے کہ "خوف" ایک خاص کیفیت و حالت کا نام ہے جو پیش آتی ہے۔

حاصل یہ کہ رونے اور ڈرنے سے مراد آخرت کے عذاب اور اللہ تعالیٰ کے عقاب و عتاب سے ڈرنا اور ان چیزوں کے خوف سے رونا گڑگڑانا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

زیادہ ہنسنا آخرت کی ہولناکیوں سے بے فکری کی علامت ہے

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ اَبُو الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا وَلَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ابوالقاسم (محمد) ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم اس چیز کو جان لو جس کو میں جانتا ہوں تو یقیناً تمہارا رونا زیادہ اور ہنسنا کم ہو جائے (یعنی قیامت کے احوال اور اس کی ہولناکیاں، مبدأ و معاد کی حقیقت گنہگاروں کے تئیں اللہ تعالیٰ کا عتاب و عذاب یوم حساب کی شدت پرسش اور باری تعالیٰ کی صفات قہریہ و جلالیہ کو، جو خوف و مصیبت کا باعث ہیں جس قدر میں جانتا ہوں اور پھر ان چیزوں کے تعلق سے تمہارے انجام کار کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے اور جس کی وجہ سے میرے دل پر ہر وقت غم و خوف طاری رہتا ہے اگر تم بھی ان سب چیزوں سے پوری طرح آگاہ ہو جاؤ تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خوف ہیبت کے مارے تم ہنسنا بھول جاؤ اور اپنا زیادہ وقت رونے اور غم کھانے میں صرف کرو، کیونکہ اس صورت میں تم رجا یعنی رحمت خداوندی کی امید کے مقابلہ پر عذاب خداوندی کے خوف کو زیادہ ترجیح دینے لگو گے)۔" (بخاری)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں اُمت کے لئے ایک تنبیہ تو یہ ہے کہ اپنے اوپر گریہ طاری رکھنا چاہئے اور ان چیزوں کی یاد تازہ رکھنی چاہئے جو رونے و ہلانے اور غم کھانے کا باعث ہوتی ہیں جیسے خوف خداوندی کا احساس اور عظمت و جلال حق کی حقیقت معلوم کرنا دوسری تنبیہ یہ ہے کہ جاہل و غافل لوگوں کی طرح بہت زیادہ ہنسنے اور راحت و چین اختیار کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو و مغفرت اور اس کی رحمت پر امید کی وجہ سے فی الجملہ راحت و چین اختیار کرنا ایک حد تک گنجائش رکھتا ہے۔

کسی کے اخروی انجام کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا

(۲) وَعَنْ اُمِّ عَلَاءِ الْاَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَا اَدْرِیْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا يُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ام العلاء انصاریہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ باوجودیکہ میں اللہ کا رسول ہوں لیکن خدا کی قسم یہ نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کی عاقبت کا معاملہ غیر معلوم ہے کوئی نہیں جانتا کہ کون شخص کیا عمل کرے گا اور اس

کا آخری انجام کیا ہوگا؟ تاہم واضح رہے کہ انبیاء اور رسولوں اور خصوصاً سید المرسلین ﷺ کی عاقبت کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کیونکہ ان حضرات کے بارے میں ایسی دلائل قطعیہ منقول ہیں جو واضح طور پر بتاتی ہیں کہ انبیاء خصوصاً حضور ﷺ کی عاقبت کا بخیر ہونا ایک یقینی امر ہے! لہٰذا حضور ﷺ کے اس ارشاد کہ میں یہ نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ کو اس مخصوص پس منظر میں رکھ کر دیکھنا چاہئے جس میں یہ حدیث حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی تھی اور وہ یہ کہ ایک صحابی حضرت عثمان ابن مظعونؓ جو اونچے درجہ کے مہاجر صحابہ میں سے تھے، ان کا مدینہ میں انتقال ہوا اور خاص بات یہ کہ مدینہ میں مہاجرین میں سے سب سے پہلے جن صحابی کا انتقال ہوا ہے وہ یہی تھے چنانچہ حضور ﷺ نے اپنی ذاتی نگرانی میں ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام فرمایا، ان کے جنازے کے ساتھ نہایت عزت و تکریم کا معاملہ کیا ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر اپنے سامنے بقیع میں ان کو سپرد خاک کرایا، اس موقع پر ایک خاتون، جو وہاں موجود تھیں اور حضرت عثمانؓ کے تئیں حضور ﷺ کی یہ محبت و عنایات دیکھ رہی تھیں کہنے لگیں "عثمان تمہیں جنت مبارک ہو کہ تمہاری عاقبت و انجام بخیر ہے" اس وقت حضور ﷺ نے ان خاتون کو سرزنش کی اور مذکورہ حدیث ارشاد فرمائی، لہٰذا اس حدیث کا مقصد دراصل حضور ﷺ کے سامنے ایک غیر موزوں بات زبان سے نکالنے کی جرأت و گستاخی پر بطریق مبالغہ سرزنش کرنا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ بات اس طرح بھی کہی جا سکتی ہے کہ حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا تو ان الفاظ سے آپ ﷺ کی مراد ان کے حقیقی معنی نہیں تھے، بلکہ آپ ﷺ نے ان الفاظ کے ذریعہ بطور کنایہ یہ فرمایا کہ کسی دوسرے شخص کی عاقبت کے بارے میں کوئی یقینی بات کہنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خود میرا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں اور میری عاقبت کا بخیر ہونا ایک یقینی امر ہے مگر چونکہ عاقبت کا معاملہ علم غیب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے میں ازراہ ادب اپنی عاقبت کے بارے میں بھی تصریح نہیں کر سکتا اور یہ نہیں بتا سکتا کہ آخرت میں میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

یا اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں لیکن کسی کی عاقبت اور انجام کار کے بارے میں تفصیل کے ساتھ مجھے بھی کچھ معلوم نہیں ہے کہ کون شخص دنیا میں کس انجام کو پہنچے گا اور آخرت میں کسی احوال سے دوچار ہوگا کیونکہ اس طرح کے احوال کا تعلق غیب سے ہے اور غیب کی تفصیلی باتیں عالم الغیب (اللہ تعالیٰ) کے سوا کسی کو معلوم نہیں، گو اجمالی طور پر اتنا ضرور معلوم ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی عاقبت بخیر ہے ملا علی قاری نے اسی احتمال کو صحیح لکھا ہے۔

ایک احتمال یہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہ مذکورہ ارشاد سے حضور ﷺ کی مراد یہ تھی کہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں اس دنیا سے کس طرح رخصت ہوں گا اور میری موت کن حالات میں واقع ہوگی، آیا اپنی موت سے مروں گا یا کوئی شخص مجھے قتل کر دے گا اسی طرح مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ جس طرح پچھلی امتوں پر خدا کا عذاب نازل ہوتا تھا اس طرح تم پر بھی کوئی ہلاکت خیز عذاب نازل ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس آیت کریمہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کے نازل ہونے سے قبل کا ہے، چنانچہ پہلے تو عاقبت کے بارے میں ابہام تھا کہ کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ مگر اس آیت کے نازل ہونے کے بعد یہ ابہام دور ہو گیا اور یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ کی عاقبت بخیر ہے۔

دوزخ کے بارے میں حضور ﷺ کا ایک مشاہدہ

(۴) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرِضَتْ عَلَيَّ النَّارُ فَرَاَيْتُ فِيْهَا امْرَاَةً مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ تُعَذَّبُ فِيْ هِرَّةٍ لَّهَا رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَاْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ حَتّٰى مَاتَتْ جُوْعًا وَرَاَيْتُ عَمْرَو ابْنَ عَامِرِ الْخُزَاعِيَّ يَجُرُّ قُصْبَهٗ فِي النَّارِ وَكَانَ اَوَّلَ مَنْ سَيَّبَ السَّوَائِبَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا معراج کی رات میں یا اور کسی موقعہ پر حالت خواب یا بیداری ہی میں میرے سامنے دوزخ کی آگ (دکھانے کے لئے) لائی گئی تو میں نے اس میں بنی اسرائیل کی ایک عورت کو (جلتے ہوئے) دیکھا (جو بنی اسرائیل کی اہل ایمان میں سے تھی) اس کو ایک بلی کے معاملہ میں عذاب دیا جارہا تھا جس کو اس نے باندھ چھوڑا تھا، نہ تو اس کو کچھ کھانے پینے کے لئے دیا کرتی تھی اور نہ اس کو کھولتی ہی تھی کہ وہ (چل کر) حشرات الارض (یعنی چوہوں وغیرہ) میں سے کچھ کھالے، اور آخر کار وہ بلی بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ نیز میں نے دوزخ میں عمرو ابن عامر خزاعی کو بھی دیکھا جو اپنی آنتوں کو دوزخ کی آگ میں کھینچ رہا تھا یہ وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے (اونٹنی چھوڑنے کی رسم نکالی تھی۔" (مسلمؒ)

تشریح: "سوائب" اصل میں "سائبۃ" کی جمع ہے اور سائبہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں نذر وغیرہ کے لئے چھوڑی جاتی تھی، چنانچہ اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی اونٹنی سارے بچے مادہ ہی مادہ جنتی، یا کوئی شخص دور دراز کے سفر سے واپس آتا، اور یا کوئی مریض صحت یاب ہوتا تو وہ اونٹنی کو آزاد چھوڑ دیتے تھے کہ نہ تو اس پر سوار ہوتے اور نہ اس کا دودھ دوہتے، وہ جہاں چاہتی چرتی پھرتی، کوئی شخص اس کو اپنے گھاس پانی وغیرہ سے روکتا نہیں تھا، وہ لوگ اس کام کو ایک عبادت اور اپنے بتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ جانتے تھے، اس رسم کو سب سے پہلے جس نے جاری کیا وہ عمرو ابن عامر خزاعی تھا۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے بت پوجنے کی رسم نکالی اور بت پرستی کو تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا وہ بھی یہی عمرو ابن عامر تھا۔ بعض روایتوں میں یہ نام عمرو ابن عامر کے بجائے عمرو ابن لحی بیان کیا گیا ہے اور بظاہر یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں عامر تو اس کے باپ کا نام تھا اور لحی اس کے دادا کا نام۔ تھا یا اس کے برعکس تھا کہ باپ کا نام تو "لحی" اور دادا کا نام "عامر" تھا چنانچہ کسی روایت میں باپ کی طرف نسبت کر کے اور کسی روایت میں دادا کی طرف نسبت کر کے اس کا ذکر کیا گیا۔

کرمانی نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ابھی سے دوزخ میں ڈالے جاچکے ہیں اور وہاں عذاب بھگت رہے ہیں۔ تاہم یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس ارشاد گرامی کا تعلق اس بات سے ہے کہ آنحضرت ﷺ پر دوزخ کا وہ احوال منکشف کیا گیا جو قیامت کے دن پیش آئے گا اور آپ کو اس کی صورت دکھائی گئی کہ قیامت کے دن مذکورہ عورت اور عمرو ابن عامر کو دوزخ میں اس طرح ڈالا جائے گا اور ان کو اس طرح عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

فسق وفجور کی کثرت پوری قوم کے لئے موجب ہلاکت ہے

④ وَعَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا يَوْمًا فَزِعًا يَقُوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ مِثْلُ هٰذِهٖ وَحَلَّقَ بِاِصْبَعَيْهِ الْاِبْهَامِ وَالَّتِيْ تَلِيْهَا قَالَتْ زَيْنَبُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ قَالَ نَعَمْ اِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت زینب بنت جحشؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ ان کے ہاں ایسی حالت میں تشریف لائے کہ جیسے بہت گھبرائے ہوئے ہیں! پھر فرمانے لگے کہ "اللہ کے سوا کوئی معبود عبادت کے لائق نہیں۔ افسوس صد افسوس عرب کے اس شر وفتنہ پر، جو اپنی ہلاکت آفرینی کے ساتھ قریب آپہنچا ہے۔ آج یاجوج ماجوج کی دیوار میں اس قدر سوراخ ہوگیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے انگوٹھے اور برابر والی انگلی کے ذریعہ حلقہ بنایا، حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا ہم اس صورت میں بھی ہلاک کر دیئے جائیں گے جب کہ ہمارے درمیان صالح و پاکباز لوگ موجود ہوں گے؟ کیا ہمارے درمیان خدا کے نیک بندوں کے وجود کی برکت ان فتنوں کے پھیلنے اور آفات وبلاؤں کے نازل ہونے میں رکاوٹ نہیں بنے گی؟ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! تمہارے درمیان علماء اور بزرگان دین کی موجودگی کے باوجود تمہیں ہلاکت و تباہی میں مبتلا کیا جائے گا جب کہ فسق وفجور کی کثرت ہوگی (یعنی جب معاشرہ میں برائیاں بہت

پھیل جائیں گی اور ہر طرف فسق وفجور کا دورہ ہوگا تو ان برائیوں اور فسق وفجور کے سبب نازل ہونے والے فتنہ والام اور آفات کو صلحاء اور بزرگوں کی موجودگی اور ان کی برکت بھی نہیں روک سکے گی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "شر" سے حضور ﷺ کی مراد اس فتنہ وفساد اور قتل وقتال کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا جس کی ابتداء مستقبل میں ہونے والی تھی اور جس کا شکار سب سے پہلے اہل عرب بننے والے تھے، چنانچہ قلب نبوت نے اہل اسلام کو افتراق و انتشار میں مبتلا کرنے والے جن واقعات کا بہت پہلے ادراک کر لیا تھا اور مذکورہ ارشاد کے ذریعہ گویا ان کے بارے میں پیش گوئی فرمادی تھی ان کی ابتداء خلیفہ ثالث حضرت عثمان ابن عفانؓ کے سانحہ شہادت سے ہوئی اور جن کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے، بعض حضرات نے یہ مراد بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ جب اہل عرب کو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سبب دشمنوں کے مقابلہ پر فتوح حاصل ہوں گی، دوسرے ملکوں پر غلبہ و اقتدار حاصل ہوگا اور مال و دولت کی ریل پیل ہوگی تو اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ لوگوں کے خلوص وللّٰہیت میں کمی آجائے گی، حکومت و اقتدار اور مال وزر سے رغبت و محبت پیدا ہو جائے گی، دنیا طلبی وجاہ پسندی اور خود غرضی کا عفریت باہمی مخالفت و مخاصمت اور افتراق و انتشار کے ذریعہ پوری ملت کو متاثر کر دے گا۔

"حلقہ بنایا" یعنی آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کے ذریعہ حلقہ بنا کر دکھایا کہ اس دیوار میں آج تک کبھی کوئی سوراخ نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج اس میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا ہے جتنا کہ ان دونوں انگلیوں کے ذریعہ بنایا گیا حلقہ ہے۔ واضح رہے کہ اس دیوار میں سوراخ کا ہو جانا قرب قیامت کی علامات میں سے ہے جس طرح کہ عرب اور اہل عرب میں فتنہ وفساد کا بیج پڑ جانا اور برائیوں کا پھیل جانا بھی قیامت کے قریب آجانے کی ایک دلیل ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یاجوج ماجوج کی دیوار میں سوراخ ہو جانے کی بات کہہ کر گویا اس علاقہ سے اٹھنے والے ایک عظیم فتنہ اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو پہنچنے والے سخت نقصان کی طرف اشارہ کیا، چنانچہ تاریخ کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جس فتنہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا وہ چنگیزیت کی صورت میں اسی علاقہ سے اٹھا اور جس نے بڑی بڑی اسلامی حکومتوں کو نقصان پہنچایا یہاں تک کہ ہلاکو خاں کی سربراہی میں تاتاری ترکوں کے سیلاب نے اسلامی خلافت کو بہا ڈالا، خلیفہ معتصم باللہ کو قتل کیا بغداد کو لوٹ کر تباہ وتاراج کیا اور لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا اور پوری ملت اسلامیہ کو بڑی بڑی جہادوں سے دوچار کیا۔

لفظ "خَبَث" خ اور ب کے زبر کے ساتھ فسق وفجور اور کفر وشرک کے معنی میں ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کے معنی بدکاری (زنا) کے ہیں! حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی جگہ آگ لگتی ہے بھڑک اٹھتی ہے تو پھر وہ ہر ایک چیز کو جلا ڈالتی ہے کیا خشک اور کیا تر، ہر ایک کو بھسم کر دیتی ہے، حلال اور حرام، پاک اور ناپاک جو بھی چیز اس شعلوں کی لپیٹ میں آتی ہے جل کر خاک ہو جاتی ہے، مؤمن اور کافر، موافق اور مخالف کسی کے درمیان فرق نہیں کرتی، جو شخص بھی اس کی زد میں آجاتا ہے راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے اسی طرح عذاب الٰہی کا معاملہ ہے کہ جب کسی ملک میں، کسی علاقہ میں اور روئے زمین کے کسی حصہ پر برائیوں کا دور دورہ ہو جاتا ہے، بدکاریاں عام ہو جاتی ہیں، فواحش کی کثرت ہو جاتی ہے اور فسق وفجور کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اس کے سبب وہاں کے لوگوں پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے تو پھر کسی کی کوئی تخصیص نہیں رہ جاتی! بدکار اور سرکش لوگ تو تباہ برباد ہوتے ہی ہیں نیکوکار وپاکباز لوگ بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ جب قیامت میں ساری مخلوق کو دوبارہ اٹھایا جائے گا تو اس وقت ہر شخص کے ساتھ اس کے عمل کے مطابق ہی سلوک ہوگا۔

ایک نسخے میں یہ لفظ خ کے پیش اور ب کے جزم کے ساتھ یعنی خُبث منقول ہے جس کے معنی فواحش اور فسوق کے ہیں! ویسے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔

خسف اور مسخ کا عذاب اس اُمت کے لوگوں پر بھی نازل ہو سکتا ہے

⑤ وَعَنْ اَبِیْ عَامِرٍ اَوْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيَكُوْنَنَّ مِنْ اُمَّتِیْ اَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّوْنَ الْخَزَّ وَالْحَرِيْرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ وَلَيَنْزِلَنَّ اَقْوَامٌ اِلٰى جَنْبِ عَلَمٍ يَرُوْحُ عَلَيْهِمْ بِسَارِحَةٍ لَهُمْ يَاْتِيْهِمْ رَجُلٌ لِحَاجَةٍ فَيَقُوْلُوْنَ ارْجِعْ اِلَيْنَا غَدًا فَيُبَيِّتُهُمُ اللّٰهُ وَيَضَعُ الْعَلَمَ وَيَمْسَخُ اٰخَرِيْنَ قِرَدَةً وَّخَنَازِيْرَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ الْحِرَ بِالْحَاءِ وَالرَّاءِ الْمُهْمَلَتَيْنِ وَهُوَ تَصْحِيْفٌ وَاِنَّمَا هُوَ بِالْخَاءِ وَالزَّاءِ الْمُعْجَمَتَيْنِ نَصَّ عَلَيْهِ الْحُمَيْدِیُّ وَابْنُ الْاَثِيْرِ فِیْ هٰذَا الْحَدِيْثِ وَفِیْ كِتَابِ الْحُمَيْدِیِّ عَنِ الْبُخَارِیِّ وَكَذَا فِیْ شَرْحِهِ الْخِطَابِیِّ تَرُوْحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَةٌ لَهُمْ يَاْتِيْهِمْ لِحَاجَةٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوعامرؓ یا حضرت ابومالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (یعنی ابوعامرؓ یا ابومالکؓ نے) بیان کیا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "میری اُمت میں کچھ ایسے گروہ اور طبقے بھی پیدا ہوں گے جو، ریشمی کپڑے کو اور شراب کو اور باجوں کو حلال و جائز کر دیں گے اور ان میں سے کچھ لوگ بلند پہاڑ کے پہلو میں قیام کریں گے" یعنی وہ اپنے قیام کرنے کی جگہ ایسے مقامات پر بنائیں گے جو بلند و ممتاز اور نمایاں ہوں گے اور ان کی یہ ممتاز و نمایاں حیثیت دیکھ کر غریب و محتاج لوگ اپنی حاجتیں اور ضرورتیں لے کر ان کے پاس آیا کریں گے رات کے وقت ان کے مویشی (جو چرنے کے لئے گئے ہوں گے) پیٹ بھرے ہوئے واپس آیا کریں گے اور ان مویشیوں کو ان کا چرانے والا دودھ سے بھرا ہوا لے کر آئے گا لیکن جب کوئی شخص (محتاج) اپنی ضرورت لے کر ان کے پاس آئے گا اور یہ خواہش کرے گا کہ ان مویشیوں کے دودھ میں سے کچھ حصہ اس کی غذائی ضرورت پورا کرنے کے لئے لے جائے) تو وہ اس کو یہ کہہ کر ٹال دیں گے کہ کل ہمارے پاس آنا، اور پھر رات ہی میں اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب اس طرح نازل کرے گا کہ ان میں سے بعض پر تو پہاڑ کی چوٹی الٹ دے گا (تاکہ وہ اس کے نیچے دب کر تباہ و ہلاک ہو جائیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور ان میں سے بعض کی صورتوں کو مسخ کر کے بندر اور سور بنا دے گا جو قیامت تک اسی شکل و صورت میں رہیں گے یا یہ کہ اس طرح کے بدکار لوگوں پر جو بھی عذاب نازل ہو گا وہ قیامت تک ان پر مسلط رہے گا۔" (بخاریؒ)

اور مصابیح کے بعض نسخوں میں "الخز" کے بجائے ح اور را کے ساتھ "الحر" ہے اور ح کے زیر اور را کے جزم کے ساتھ "الحر" کے معنی عورت کی شرمگاہ کے ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ وہ لوگ زنا و بدکاری کو حلال و جائز کر دیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کا حا اور را کے ساتھ یعنی "الحر" نقل ہونا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کتابت کی غلطی ہے جو کاتب سے واقع ہو گئی ہے اصل میں یہ لفظ "خز" (یعنی خ اور ز کے ساتھ) ہی ہے۔ حمیدی اور ابن اثیر نے اس حدیث کے سلسلہ میں اس معنی کی تصریح کی ہے۔ نیز حمیدی کی کتاب میں امام بخاری ہی سے جو یہ روایت نقل کی گئی ہے اور اسی طرح خطابی نے شرح بخاری میں جو روایت نقل کی ہے ان دونوں میں (یروح علیهم بسارحة) کے بجائے یوں ہے تَرُوْحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَةٌ لَهُمْ يَاْتِيْهِمْ لِحَاجَةٍ۔

تشریح: یا حضرت ابومالک اشعریؓ سے روایت ہے اس عبارت کے ذریعہ بخاری نے اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے یہ شک و تردد ظاہر کیا ہے کہ اس حدیث کو یا تو حضرت ابوعامر اشعری نے نقل کیا ہے جو حضرت ابوموسی اشعری کے چچا اور اکابر صحابہ میں سے ہیں یا اس روایت کو بیان کرنے والے حضرت ابومالک اشعری ہیں جن کو اشجعی بھی کہا جاتا ہے اور یہ بھی ایک مشہور صحابی ہیں! تاہم واضح رہے کہ کسی حدیث کے راوی کی حیثیت سے صحابہؓ کے بارے میں اس قسم کا شک و تردد اس حدیث میں طعن کا موجب نہیں ہوتا کیونکہ صحابہؓ سب ہی ثقہ اور عدل ہیں، لہٰذا وہ حدیث جس صحابی سے بھی منقول ہو گی صحیح ہو گی۔

"خز" (خ کے زبر اور ز کی تشدید کے ساتھ) اس خاص کپڑے کا نام ہے جو پہلے زمانے میں ریشم اور اون سے بنا جاتا تھا اس وقت یہ کپڑا

بہت مستعمل تھا یہاں تک کہ صحابہؓ اور تابعین بھی اس کو پہنتے اور استعمال کرتے تھے! لہٰذا علماء لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں خز کا ذکر کر کے مذکورہ کپڑے کے استعمال کی جو ممانعت ظاہر فرمائی گئی ہے وہ شاید اس بنا پر ہے کہ اس کپڑے کو پہننے سے اہل عجم (غیر دیندار اور عیش پرستوں) کی مشابہت پیدا ہوتی ہے علاوہ ازیں وہ کپڑا اپنی بناوٹ اور قیمت کے اعتبار سے ایک ایسا لباس تھا جس کو دولت مند، عیش پسند لوگ اور اہل اسراف استعمال کرتے تھے، دوسری بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ اس حدیث کا اصل محمول وہ "خز" ہے جو اگرچہ حضور ﷺ کے زمانہ میں رائج نہیں ہوا تھا مگر بعد میں اس کا رواج ہوا۔ جس میں صرف ریشم ہی ریشم ہوتا ہے اس اعتبار سے آپ ﷺ کا ارشاد بطور معجزہ، غیب (زمانہ مستقبل کی بات کی) خبر دینے کے طور پر ہوگا، اور اس مطلب کو تسلیم کرنے کی صورت میں "خز" پر "حریمہ" کا عطف تعمیم بعد تخصیص کے قبیل سے ہوگا۔

"معازف" کے معنی عود و طنبورہ وغیرہ جیسے باجوں کے ہیں اور یہ لفظ "عَزَف" یا "مِعْزَف" کی جمع ہے! ویسے "عزف" اور "عزیف" اصل میں جن کی آواز کو کہتے ہیں اور اس مخصوص آواز کو بھی کہتے ہیں جو رات کے وقت جنگل و بیابان میں سیٹیوں کے مشابہ سنائی دیتی ہے جس کو ہوا کی سرسراہٹ اور اس کی آواز سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اس اُمت میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو مختلف شکوک و شبہات پیدا کر کے دوراز کار تاویلیں کر کے اور لغو و مہمل نظائر و دلائل کے ذریعہ ان چیزوں کو حلال کرلیں گے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے مثال کے طور پر بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ مردوں کے لئے خالص ریشم کا کپڑا پہننا اور استعمال کرنا اس صورت میں حرام ہے جب کہ وہ بدن سے متصل ہو، یعنی اس کپڑے اور بدن کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو، اگر وہ ریشمی کپڑا ابرے کے طور پر استعمال کیا جائے کہ بدن سے لگا ہوا جو کپڑا ہو وہ تو سوتی ہو اور اس کے اوپر کا کپڑا ریشمی ہو تو اس کے استعمال کی گنجائش ہے، یہ بات الگ ہے کہ اس قول کی تحقیق کیا ہے اور یہ کس مراد کو واضح کرتا ہے لیکن اگر اس قول کو بنیاد بنا کر مردوں کے لئے مطلق ریشمی کپڑا پہننے اور استعمال کرنے کو جائز قرار دے لیا جائے اور لوگ بلا تکلف حریر و دیباج جیسے خالص ریشمی کپڑے پہننے لگیں تو یہ کھلی ہوئی گمراہی ہوگی، چنانچہ یہی ہوا ہے کہ جب امراء اور عوام خالص ریشمی کپڑے استعمال کرتے اور ان سے کہا جاتا کہ مردوں کے لئے حریر و دیباج پہننا حرام ہے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ اگر یہ حرام ہوتا تو فلاں عالم نے یہ بات کیوں کہی ہوتی اور فلاں فلاں بزرگ نے ریشمی کپڑا کیوں استعمال کیا ہوتا؟ اس طرح وہ لوگ ایک حرام چیز کو حلال جاننے اور سمجھنے کی نہایت سخت برائی اور گناہ میں مبتلا ہوئے۔ اسی طرح مزامیر کا معاملہ ہے کہ بعض علماء اور مشائخ کو سماع اور مزامیر سے تعلق رہا ہے جو اپنی جگہ پر ایک الگ بحث ہے اور اس کی تفصیل بہت طویل ہے اس بات سے قطع نظر کہ سماع و مزامیر سے ان کا تعلق کن حالات میں اور کن شرائط و پابندیوں کے ساتھ تھا، زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کے قول و فعل کو غلط طور پر بنیاد بنا کر لوگوں نے کس قدر گمراہیاں پھیلائی ہیں اور راگ رنگ، باجے گاجے کی شیطانی مجلسوں کو "محفل سماع" کے نام پر شریعت کی حرام کردہ چیزوں کو نہ صرف حلال جانتے بلکہ ان کو نعوذ باللہ حصول ثواب کا ذریعہ ماننے کی گمراہی کو عام کیا گیا۔

واضح رہے کہ ابن ابی الدنیا نے مذکورہ روایت کو آلات لہو یعنی مزامیر کی مذمت میں حضرت انسؓ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ "یکونن فِیْ ھذہ الامۃ خسف و قذف و مسخ و ذلک او اشربو الخمر و اتخذت القینات و ضربو ابالمعازف۔"

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جب لوگ ان چیزوں کو حلال جان کر ان کو اختیار کریں گے تو خسف و مسخ جیسے عذاب خداوندی میں گرفتار کئے جائیں گے۔

"نص علیہ الحمیدی الخ" اس عبارت کے ذریعے مؤلف مشکوٰۃ نے حمیدی اور ابن اثیر کے قول کو بطور دلیل اختیار کر کے اس امر کی تائید کی کہ لفظ "الحر" (ح اور ز کے ساتھ) واقعۃً کتابت کی غلطی ہے اور صحیح لفظ "الخز" (خ اور ز کے ساتھ) ہی ہے، لہٰذا کسی کا یہ گمان کرنا کہ یہ لفظ حؔ اور رؔ کے ساتھ صحیح ہے حقیقت کے خلاف ہے! تاہم مؤلف نے فِیْ ھٰذَا الحدیث کے الفاظ کے ذریعے اس

طرف اشارہ کر دیا ہے کہ یہ بحث صرف اس حدیث کے سلسلے میں ہے جو بخاریؒ سے یہاں نقل کی گئی ہے، ویسے "الحر" کا لفظ ایک دوسری روایت میں منقول ہے جس کو ابوداؤدؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے چنانچہ طیبیؒ نے اس حدیث کو اپنی شرح میں ذکر کیا ہے! لیکن بخاریؒ کے مشہور شارح علامہ ابن حجرؒ نے جو بات کہی ہے وہ مؤلف مشکوٰۃ کے مذکورہ قول کے منافی ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ بخاریؒ کی اکثر روایتوں میں یہ لفظ ح اور ر کے ساتھ یعنی "الحر" ہی ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ اپنی جگہ پر دونوں روایتیں صحیح ہیں۔

"تروح علیھم بسارحة" میں "سارحة" تروح کا فاعل ہے اور یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ پہلی روایت (جس کو مؤلف مشکوٰۃ نے یہاں نقل کیا ہے) کے لفظ "بسارحة" میں حرف ب زائد ہے چنانچہ ترجمے میں اسی کو محفوظ رکھا گیا ہے، اسی طرح ان دونوں کتابوں (کتاب حمیدی اور بخاری کی شرح خطابی) میں "یاتیھم لحاجة" منقول ہوا ہے، یعنی ان دونوں کتابوں کی نقل کردہ حدیث میں اس جملے میں "رجل" کا لفظ نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ ان دونوں نے بھی "رجل" کا لفظ نقل تو کیا ہے لیکن "لحاجة" کے بعد اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس اُمّت کے لوگوں کو بھی خسف اور مسخ کے عذاب میں گرفتار کیا جا سکتا ہے جیسا کہ گذشتہ امتوں کے لوگوں کی سرکشی اور بداعمالیوں کی وجہ سے ان کو اس عذاب میں مبتلا کیا گیا، لہٰذا وہ احادیث کہ جو اس بات کی نفی میں منقول ہیں اور جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امت محمدیہ پر اس طرح کے عذاب نازل نہیں ہوں گے وہ یا تو اس اُمّت کے ابتدائی زمانہ پر محمول ہیں اور آخری زمانہ ان کے دائرہ مفہوم سے باہر ہے اور یا اجتماعی طور سے پوری اُمّت کے خسف و مسخ پر محمول ہیں، نہ کہ انفرادی طور سے بعض کے بارے میں نفی پر۔

عذاب الٰہی کا نزول

⑥ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ عَذَابًا اَصَابَ الْعَذَابُ مَنْ كَانَ فِيْهِمْ ثُمَّ بُعِثُوْا عَلٰى اَعْمَالِهِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے تو وہ عذاب ہر اس شخص کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جو اس قوم میں ہوتا ہے اور پھر (آخرت میں) لوگوں کو ان کے اعمال کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب کسی قوم میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی و سرکشی، فسق و فجور، ظلم و عصیان، خدا کے دین اور خدا کے دین کو ماننے والوں کے ساتھ بغض و نفرت اور تمسخر و استہزاء اور وہ برائیاں حد سے زیادہ پھیل جاتی ہیں جو قہر خداوندی کو دعوت دیتی ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ تو وہ عذاب صالح و غیر صالح اور نیک و بد کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا بلکہ ہر اس شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جو اس قوم کے درمیان ہوتا ہے، اگرچہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے نیک و صالح بندوں کو اس عذاب سے محفوظ بھی رکھ لیتا ہے۔ لیکن تمام ہی لوگوں کا اس عذاب میں مبتلا ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اخروی انجام کے تعلق سے بھی وہ تمام لوگ ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہاں (آخرت میں) ہر شخص کے ساتھ اس کے اعمال ہی کے مطابق معاملہ ہوگا، جو شخص نیک و صالح رہا ہوگا اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا اور جو شخص بدکار و سرکش ہوگا وہ وہاں بھی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

اصل اعتبار خاتمہ کا ہے

⑦ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلٰى مَامَاتَ عَلَيْهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر بندہ کو اسی حال پر اٹھایا جائے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص جس حالت و حیثیت میں اس دنیا سے رخصت ہوگا اسی حالت میں قیامت کے دن اٹھے گا اور اس کا۔

اخروی انجام اسی کے مطابق ہوگا۔ اگر ایمان کی حالت میں مرا ہے تو ایمان ہی کی حالت میں اٹھے گا، اگر کفر کی حالت میں مرے گا تو کفر ہی کی حالت میں اٹھے گا، اگر طاعت و عبادت کی حالت میں مرا ہے تو طاعت و عبادت گذار بندے کی حیثیت میں اٹھے گا، اگر گناہ و معصیت کی حالت میں مرے گا تو نافرمان و گنہگار بندے کی حیثیت میں اٹھے گا، اسی طرح اگر خدا کے ذکر کی حالت میں مرے گا تو ذاکر بندے کی حیثیت میں اٹھے گا اور اگر ذکر خداوندی سے غفلت ولاپرواہی کی حالت میں مرے گا تو غافل ولاپرواہ بندے کے طور پر اٹھے گا۔ غرض یہ کہ قیامت کے دن اٹھنے اور آخرت میں فلاح یاب ہونے یا نامراد قرار دیئے جانے کا مدار خاتمہ پر ہے کہ کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا آخر کیسا گزرے اور اس کا خاتمہ کس حالت میں ہو جیسا کہ کسی نے کہا ہے ۔

حکم مستوری ومستی ہمہ بر خاتمہ است کس ندانست کہ آخر بچہ حالت گذرد

تاہم بعض عارفین نے کہا ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے تئیں حضوری واستغراق کا ملکہ حاصل کر لیتا ہے اور اس کے دل میں ذکر اللہ کا جوہر جگہ پالیتا ہے تو اگر موت کے وقت سختی وشدت کے سبب یا بیماری کے غلبہ اور بے تابی واضطراب کی وجہ سے اس کے اندر استحضار واستغراق کی کیفیت میں کوئی کمی وکوتاہی راہ پاجائے تو یہ چیز اس کے حق میں نقصان دہ نہیں ہوگی بلکہ جسم سے روح کی جدائی کے بعد اس کی وہ حالت وکیفیت لوٹ آئے گی۔ لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ ذکر خداوندی اور تعلق مع اللہ میں وہ ملکہ وکمال حاصل کیا جائے جو بہر صورت سرمایہ نجات ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

انسان کی نادانی وغفلت کی ایک مثال

⑧ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَارَاَيْتُ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَارِبُهَا وَلَامِثْلَ الْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (شدت وسختی اور ہولناکی کے اعتبار سے) میں نے دوزخ کی آگ کی مانند ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی کہ اس سے بھاگنے والا سوتا ہے اور (سرور وشادمانی کے اعتبار سے میں نے جنت کی مانند ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی کہ اس کا طلب کرنے والا سوتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی طاقتور دشمن کو اپنے لئے مضرت رساں اور ہلاکت میں مبتلا کرنے والا جانتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس دشمن کی طرف سے غافل نہیں رہتا اور اطمینان کی چادر تان کر سو نہیں جاتا بلکہ ہر وقت ہوشیار رہتا ہے اور جس قدر ممکن ہوتا ہے اس سے دور بھاگتا رہتا ہے! لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ دوزخ کی آگ، جو اپنی ہلاکت آفرینی، سختی وشدت اور ہولناکی کے اعتبار سے بڑے سے بڑے طاقتور دشمن سے بھی زیادہ ہلاکت ونقصان پہنچانے کے درپے ہے لوگ اس کی طرف سے غافل پڑے رہتے ہیں اور اس سے دور بھاگنے کی کوشش نہیں کرتے، اور اگر دور بھاگتے بھی ہیں تو عین بھاگنے کی حالت میں نیند وغفلت کا شکار ہو جاتے ہیں! واضح رہے کہ دوزخ کی آگ سے دور بھاگنا اور اس کی طرف سے غفلت کا شکار نہ ہونا یہ ہے کہ انسان خدا شناسی وخدا ترسی کا راستہ اختیار کرے، گناہ ومعصیت کو ترک کر دے اور طاعت وعبادت کو لازم کرے۔

اسی طرح دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پسندیدہ ومحبوب چیز کا طالب ہوتا ہے اور اس کو پوری طرح حاصل کرنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس چیز کی طلب وخواہش کی راہ میں کسی غفلت وسستی کا روادار نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہے اور وہ جتنی زیادہ سعی وکوشش کر سکتا ہے اس کے مطابق اس چیز کی طرف بھاگتا ہے اور اس کو پالینا چاہتا ہے، مگر کتنی عجیب بات ہے کہ جنت جو تمام

ترخوبیوں، راحتوں شادمانیوں اور سعادتوں کا مرکز و مجموعہ ہے اس کی طرف سے انسان کس قدر غافل ہے، اس کو پانے کی کوشش نہیں کرتا، اس کی طرف دوڑتا نہیں؟

واضح رہے کہ جنت کو پانا اور اس کی طرف دوڑنا یہ ہے کہ خدا اور خدا کے رسول کی رضا و خوشنودی کو ہر چیز پر مقدم رکھا جائے برائی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کیا جائے اور طاعت و عبادت میں غفلت و سستی نہ کی جائے۔

ایک نصیحت، ایک آرزو

(۹) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَالَا تَسْمَعُوْنَ اَطَّتِ السَّمَآءُ وَحُقَّ لَھَا اَنْ تَاَطَّ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَافِیْھَا مَوْضِعُ اَرْبَعِ اَصَابِعَ اِلَّا وَمَلَکٌ وَاضِعٌ جَبْھَتَہٗ سَاجِدًا لِلّٰہِ وَاللّٰہِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا وَّلَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَی الْفُرُشَاتِ وَلَخَرَجْتُمْ اِلَی الصُّعُدَاتِ تَجْاَرُوْنَ اِلَی اللّٰہِ قَالَ اَبُوْذَرٍّ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ شَجَرَۃً تُعْضَدُ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے اور جو کچھ میں سنتا ہوں تم نہیں سنتے (یعنی قیامت کی علامتیں، قدرت کی کرشمہ سازیوں کی نشانیاں اور اللہ تعالیٰ کی صفات قہریہ و جلالیہ جس طرح میرے سامنے ہیں اور میں ان کو دیکھتا ہوں اس طرح نہ تمہارے سامنے ہیں اور نہ تم انہیں دیکھتے ہو، نیز احوال آخرت کے اسرار و اخبار، قیامت کی ہولناکیوں اور دوزخ کے عذاب کی شدت و سختی کی باتوں کو جس طرح میں سنتا ہوں، تم نہیں سنتے) آسمان میں سے آواز نکلتی ہے، اور اس میں سے آواز کا نکلنا بجا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آسمان میں چار انگشت کے برابر بھی ایسی جگہ نہیں جہاں فرشتے خدا کے حضور اپنا سر سجدہ ریز کئے ہوئے نہ پڑے ہوں، خدا کی قسم اگر تم اس چیز کو جان لو جس کو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم بہت کم ہنسو اور زیادہ رونے لگو۔ اور بستروں پر اپنی عوتوں سے لذت حاصل کرنا چھوڑ دو، اور یقیناً تم خدا سے نالہ و فریاد کرتے ہوئے جنگلوں کی طرف نکل جاؤ (جیسا کہ رنج اٹھانے والوں اور غموں سے تنگ آجانے والوں کا شیوہ ہوتا ہے کہ وہ گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور صحرا صحرا جنگل جنگل گھومتے پھرتے ہیں تاکہ زمین کا بوجھ کم ہو اور دل کچھ ٹھکانے لگے)۔ "حضرت ابوذرؓ نے (یہ حدیث بیان کرکے ارادۂ حسرت و دردناکی) کہا کہ کاش! میں درخت ہوتا جس کو کاٹا جاتا!" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: لفظ "اطت" دراصل "اط" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں آواز نکالنا، پالان اور زین وغیرہ کا چرچرانا، اونٹ کا تعب کی وجہ سے بلبلانا! اس حدیث میں آسمان سے آواز نکلنے کی جوبات فرمائی گئی ہے اس کا مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ فرشتوں کی کثرت و ازدہام اور ان کے بوجھ کی وجہ سے آسمان میں سے آواز نکلتی ہے جیسا کہ سواری کا جانور سواری کے بوجھ کی وجہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکالتا ہے یا کسی تخت و پلنگ پر جب زیادہ لوگ بیٹھ جاتے ہیں تو وہ چرچرانے لگتا ہے! یا آسمان میں سے آواز نکلنے کا مطلب آسمان کا خدا کے خوف سے نالہ و فریاد کرنا ہے اور اس جملے کا مقصد یہ آگاہی ہے کہ جب آسمان ایک غیر ذی روح اور منجمد چیز ہوتے ہوئے اور مقدس ملائکہ کی قرار گاہ کی حیثیت رکھنے کے باوجود خوف الٰہی سے نالہ و فریاد کرتا ہے۔ تو انسان کہ جو جاندار ہے اور گناہ و معصیت کی آلودگی رکھتا ہے، وہ کہیں زیادہ اس لائق ہے کہ خوف الٰہی سے گریہ وزاری اور نالہ و فریاد کرے۔ یہ معنی حدیث کے اصل مقصد سے زیادہ قریب اور مناسب تر ہیں۔

"اپنا سر سجدہ ریز کئے ہوئے نہ پڑے ہوں" سے مراد فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی عبادت و تابعداری میں مشغول ہونا ہے! یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے تاکہ وہ بات بھی اس جملے کے دائرہ مفہوم میں آجائے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر فرشتہ خدا کی عبادت و تابعداری میں مشغول ہے کہ کچھ تو قیام کی حالت میں عبادت گذار ہیں، کچھ رکوع کی حالت میں ہیں اور کچھ سجدے میں پڑے ہوئے ہیں یا یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ حضور ﷺ نے آسمان میں سے کسی خاص آسمان کا ذکر فرمایا ہے اور اس آسمان میں جو فرشتے ہیں وہ سب کے سب سجدہ

کی ہی حالت میں پڑے ہوئے خدا کی عبادت کر رہے ہیں۔

"صُعُدَات" اصل میں "صُعُدٌ" کی جمع ہے اور "صُعُدٌ" جمع ہے صَعِیْدٌ کی، جیسے طُرُقَات جمع ہے طُرُقٌ کی اور طرق جمع ہے طریق کی! "صعید" کے لغوی معنی مٹی، راستہ اور زمین کے بلند حصے کے ہیں اور یہاں حدیث میں اس سے مراد جنگل ہے۔

"کاش! میں درخت ہوتا" یعنی انسان ہونے کی حیثیت سے گناہوں اور برائیوں سے بچنا بڑا مشکل ہے، شیطان ہر وقت پیچھے لگا رہتا ہے نہ جانے کب اس کا داؤ چل جائے گا اور گناہ و معصیت کا ارتکاب ہو جائے۔ جس کی وجہ سے خدا کی ناراضگی اور اس کا عذاب مول لینا پڑ جائے گا! لہٰذا حضرت ابوذرؓ نے یہ آرزو ظاہر کی کہ کاش میں انسان نہ ہوتا تاکہ کل قیامت کے دن گناہوں کی آلودگی کے ساتھ نہ اٹھتا۔ اور جس طرح ایک درخت کو کاٹ ڈالا جاتا ہے تو وہ سرے سے مٹ جاتا ہے، اسی طرح میں بھی ہوتا کہ مجھے کاٹ کر پھینک دیا جاتا اور میں آخرت میں ندامت و شرمندگی اور عذاب سے بچ جاتا۔ واضح رہے کہ اس طرح کی غمناک اور درد انگیز آرزوئیں دوسرے بڑے بڑے صحابہؓ سے بھی منقول ہیں، مثلاً ایک صحابیؓ نے کہا تھا کہ کاش، میں بکری ہوتا جس کو لوگ کاٹ کر کھا جاتے ہیں۔ دوسرے صحابیؓ نے کہا کاش! میں پرندہ ہوتا کہ وہ جہاں چاہتا ہے بیٹھ جاتا ہے اور جہاں چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ اس پر کوئی فکر اور کسی چیز کا دباؤ نہیں ہوتا یہ سب مقدس صحابہؓ وہ تھے جن کو حضور ﷺ نے ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی اور آخرت کے اعتبار سے ان کی عافیت کے بخیر ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن جب ان پاک نفس حضرات کے احساس اور فکر آخرت کا یہ حال تھا تو دوسروں کو کیا کہا جا سکتا ہے، اگرچہ مخبر صادق ﷺ کا وعدہ ہے کہ ہر مؤمن انشاء اللہ مغفرت و بخشش سے نوازا جائے گا اور اس کی عاقبت بخیر ہوگی لیکن بارگاہ بے نیازی کا خوف ہی کمر توڑے ڈالتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

کیا کیا نہ اپنے زہد واطاعت پہ ناز تھا   بس دم نکل گیا جو سنا بے نیاز ہے

حکیمانہ نصیحت

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَافَ اَدْلَجَ وَمَنْ اَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِیَةٌ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص (اس بات سے) ڈرتا ہے (کہ اس کا دشمن رات کے آخری حصے میں دھاوا بولنے والا ہے) تو وہ رات کے پہلے ہی حصے میں اپنے بچاؤ کا راستہ اختیار کر لیتا ہے (تاکہ دشمن کی غارت گری سے محفوظ رہ سکے) اور جو شخص رات کے پہلے حصے میں بھاگنا شروع کر دیتا ہے وہ منزل تک پہنچ جاتا ہے، جان لو خدا کا مال بہت قیمتی ہے (جو نہایت اونچی قیمت چکائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اور وہ اونچی قیمت اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی ہے) اور یاد رکھو، خدا کا مال جنت ہے۔" (ترمذی)

تشریح: "منزل" سے مراد مطلوب و مقصود کو حاصل کر لینا ہے! طیبیؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان الفاظ کے ذریعے گویا رہرو آخرت کی مثال بیان فرمائی ہے کہ شیطان اس کی تاک میں ہے نفس اور اس کی باطل آرزوئیں اس شیطان کی مددگار ہیں اور اس طرح وہ اس شخص کی مانند ہے جس کا طاقتور اور عیار دشمن اس پر دھاوا بولنے کے لئے تیار کھڑا ہو اور انتظار کر رہا ہو کہ رات کا پچھلا پہر آئے تو تاریکی اور سناٹے میں اس پر حملہ کر کے اس کو غارت و تباہ کر دے، پس اگر وہ رہرو آخرت ہوشیار ہو جائے، راہ ہدایت پر ابتداء ہی سے چلنا شروع کر دے اور اپنے اعمال میں نیت کا اخلاص پیدا کر لے تو وہ یقیناً شیطان سے اور اس کے مکر سے محفوظ رہے گا۔ ورنہ وہ اتنا عیار دشمن ہے کہ جہاں ذرا سی غفلت دیکھتا ہے اپنے مددگاروں کو لے کر فوراً دھاوا بول دیتا ہے اور ہلاکت میں ڈال دیتا ہے! اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس امر کی راہنمائی فرمائی کہ راہ آخرت پر چلنا نہایت دشوار، اور وہاں کی نعمتیں و سعادتیں حاصل کرنا سخت مشکل ہے، اس راستے میں ذرا سی غفلت و سستی بھی منزل کو دور سے دور کر دیتی ہے جب تک زیادہ سے زیادہ محنت و عمل اور سعی و کوشش نہیں کی

جاتی، وہ نعمتیں اور سعادتیں پوری طرح حاصل نہیں ہوسکتیں، چنانچہ آپ ﷺ نے "جان لو! خدا کا مال بہت قیمتی ہے" کے ذریعے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مال یعنی جنت کی اگر کوئی قیمت ہوسکتی ہے اور اگر اس کو کسی چیز کے بدلے میں حاصل کیا جاسکتا ہے تو وہ خدا پرستی وخدا ترسی اور نیک اعمال کا سرمایہ ہے، اگر خدا کی جنت حاصل کرنا چاہتے ہو تو نیکی کے راستے کو اختیار کرو، برائی کے نزدیک بھی نہ بھٹکو، اور زیادہ سے زیادہ اچھے کام کرو۔ اسی مفہوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان الفاظ کے ذریعے اشارہ فرمایا ہے۔

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا۔

"اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی ہزار درجے بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی ہزار درجے بہتر ہے۔"

اور فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔"

ذکر اللہ اور خوف خداوندی کی فضیلت

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ جَلَّ ذِكْرُهٗ اَخْرِجُوْا مِنَ النَّارِ مَنْ ذَكَرَنِيْ يَوْمًا اَوْخَافَنِيْ فِيْ مَقَامٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ كِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(قیامت کے دن) اللہ کہ جس کا ذکر بہت باعظمت ہے (دوزخ پر متعین فرشتوں سے) فرمائے گا کہ اس شخص کو دوزخ سے نکال لو جس نے ایک دن بھی (یعنی کسی ایک وقت بھی) مجھ کو یاد رکھا ہے، یا کسی موقع پر مجھ سے ڈرا ہے۔" (ترمذیؒ اور بیہقیؒ نے اس روایت کو کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے)

تشریح: "اس شخص" سے مراد وہ مؤمن ہے جو مرتے وقت تک اخلاص کے ساتھ ایمان پر قائم رہا تھا لیکن گناہوں اور بدعملی کی وجہ سے دوزخ میں ڈال دیا گیا تھا۔

"یا کسی موقع پر مجھ سے ڈرا ہے" یعنی اس کی دنیاوی زندگی میں کوئی ایسا موقع آیا ہو جب وہ کسی گناہ میں مبتلا ہونے سے محض میرے خوف کی وجہ سے باز رہا ہو! چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔

"اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت میں اس کا ٹھکانا ہوگا۔"

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ذکر اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے مراد وہ "ذکر" ہے جس میں زبان کے ساتھ دل بھی شریک ہو اور جس کو "اخلاص" کہتے ہیں، اخلاص کا مطلب ہے خلوص دل اور صدق نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور ماننا! ورنہ یوں تو کافر بھی زبان سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان کے اس ذکر کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا دل خدا کی وحدانیت اور صدق واخلاص سے قطعًا خالی ہوتا ہے اس بات کی تائید حضور ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ

مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهٖ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

"جس شخص نے خلوص دل کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں جائے گا۔"

واضح رہے کہ "خوف خداوندی" سے مراد وہ خوف ہے جس کی وجہ سے بندہ اپنے اعضاء جسم کو گناہوں سے باز اور طاعات و عبادات میں مشغول رکھے! ورنہ ایسے خوف کا کوئی اعتبار نہیں جو پیدا تو ہو مگر اس کی کار فرمائی اعضاء جسم پر ظاہر نہ ہو کہ نہ تو وہ گناہوں سے باز رکھے اور نہ طاعات و عبادات میں لگائے رکھے، بلکہ حقیقت میں اس کو "خوف خداوندی" نہیں کہا جاسکتا، اس کو تو "حدیث نفس" یعنی ایک ایسا وسوسہ اور ایک ایسی تحریک کہا جاسکتا ہے جو کسی ہولناک چیز کے اسباب و آثار دیکھنے کے وقت طبیعت پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ اسباب و آثار غائب ہو جاتے ہیں تو دل پھر غفلت میں پڑ جاتا ہے! مشہور بزرگ حضرت فضیلؒ نے بڑی حکیمانہ بات کہی ہے کہ "جب تم سے پوچھا جائے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہو؟ تو اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لینا چاہئے، کیونکہ اگر تم نے جواب میں کہا کہ نہیں، تو یقیناً کافر ہو جاؤ گے اور اگر کہا کہ ہاں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے! گویا حضرت فضیلؒ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اصل میں خدا کا خوف تو وہی ہے جو اعضاء جسم کو گناہوں میں ملوث ہونے سے قطعی باز رکھے۔

بہرحال اس حدیث میں یہ بشارت ہے کہ جس مسلمان نے ایک بار بھی ازراہ اخلاص خدا کو یاد کر لیا اور کسی ایک موقع پر بھی حقیقی معنی میں خدا کے عذاب کا خوف کھایا تو بالآخر وہ دوزخ کے عذاب سے نجات پائے گا بلکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو دوزخ میں داخل ہی نہ کرے اور ابتداء جنت میں بھیج دے، بے شک يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ اسی کی صفت اور شان ہے۔

ایک آیت کا مطلب

(۱۲) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَهُمُ الَّذِيْنَ يَشْرَبُوْنَ الْخَمْرَ وَيَسْرِقُوْنَ قَالَ لَا يَا ابْنَتَ الصِّدِّيْقِ وَلٰكِنَّهُمُ الَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَهُمْ يَخَافُوْنَ اَنْ لَّا يُقْبَلَ مِنْهُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا "وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ" (وہ لوگ کہ جو دیتے ہیں اور جو کچھ کر دیتے ہیں یعنی از قسم زکوۃ و صدقات، ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے دل لرزاں و ترساں ہیں یعنی ان پر یہ خوف طاری رہتا ہے کہ انہوں نے خدا کی راہ میں اور اس کے حکم کی اتباع میں جو کچھ خرچ کیا ہے وہ قبول بھی ہوگا یا نہیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا یہ انفاق و ایثار شرائط و آداب کے مطابق واقع نہ ہو اور ہم الٹے وبال میں پڑ جائیں۔ اسی آیت کے متعلق آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہؓ کا سوال یہ تھا) کہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا گنہگاروں ہی کا کام ہے) حضور ﷺ نے فرمایا "صدیق کی بیٹی! نہیں، یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اس کے باوجود وہ ڈرتے ہیں کہ ان کے اعمال کو (شائد) قبول نہ کیا جائے (اس کی دلیل آیت کے آخری الفاظ ہیں) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں (بایں طور کہ طاعات و عبادات کی طرف ان کی رغبت بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ سبقت کر کے ان چیزوں کو حاصل کرتے ہیں)۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث میں جو آیت ذکر کی گئی ہے وہ آخر تک اس طرح ہے "وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ۔

اس آیت کے متعلق حضرت عائشہؓ کا خیال یہ تھا کہ اس میں جن لوگوں کے ڈرنے کا ذکر کیا گیا ہے ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو شراب

پیتے ہیں، چوری کرتے ہیں اور دوسری برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انہی لوگوں کو ڈرنا چاہئے جو اس کی نافرمانی کرتے ہیں اور برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں! چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اس کے بارے میں حضور ﷺ سے دریافت کیا اور حضور ﷺ نے ان پر واضح فرمایا کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے بلکہ حقیقت میں یہ آیت ان لوگوں کے متعلق ہے جو طاعات و عبادات کرتے ہیں اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی دلیل خود آیت کے آخری الفاظ ہیں۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا آیت میں دو قرائتیں ہیں، مشہور قراءت میں کہ جو قراء سبعہ کی قراءت ہے، یُؤْتُوْنَ کا لفظ ہے، جو "اِیتَاءٌ" کا فعل مضارع ہے اسی طرح لفظ آتَوْا ہمزہ کے مد کے ساتھ ہے جو "ایتاء" کا فعل ماضی ہے اور اعطاء بمعنی عطاء یعنی دینے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ترجمے میں یہی معنی بیان کئے گئے ہیں اور دوسری قراءت میں کہ جو شاذہ ہے یہ لفظ یَاْتُوْنَ مَا اَتَوْا پڑھا گیا ہے جو ایتان سے مشتق ہے اور جس کے معنی کام کرنے کے ہیں، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "وہ لوگ کہ جو کرتے ہیں اور جو کچھ کہ کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے دل لرزاں و ترساں ہیں" چنانچہ حضرت عائشہؓ نے جو سوال کیا وہ اس دوسری قراءت کے زیادہ مناسب ہے، لیکن نہ صرف یہاں مشکوٰۃ، بلکہ اصل کتاب مصابیح میں بھی یہ لفظ پہلی قراءت ہی کے مطابق منقول ہے جب کہ زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ دوسری قراءت کے مطابق ہو! یہ توطیبیؒ کے منقولات کا خلاصہ تھا جس کو انہوں نے تفسیر زجاج اور کشاف سے نقل کیا ہے! ملا علی قاری نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر اس لفظ کو آنحضرت ﷺ کی طرف قراءت شاذہ ہی کے مطابق منسوب کیا جائے تو بھی مراد یہ ہوگی کہ وہ لوگ کہ جو از قسم طاعات و عبادات کوئی عمل کرتے ہیں گویا اس سے وہ مراد نہیں ہوگی جو حضرت عائشہؓ نے یہ سمجھی تھی کہ "وہ لوگ جو از قسم معصیت کوئی عمل کرتے ہیں" اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس لفظ سے عام عمل کہ خواہ وہ از قسم طاعت ہو یا از قسم معصیت، مراد ہے کیونکہ آیت کے آخری الفاظ اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ اس مراد کی تائید نہیں کرتے۔ حاصل یہ کہ حضور ﷺ کا ارشاد اَلَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَ الخ آیت کے الفاظ وَالَّذِيْنَ يَاْتُوْنَ مَا اَتَوْا کی واضح تفسیر و ترجمانی ہے۔ خواہ ان الفاظ کا تعلق دونوں قرأتوں میں سے کسی سے بھی ہو، زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک قراءت کے مطابق الفاظ میں ایک طرح کی تغلیب ہے، لہٰذا مشہور قراءت کے تعلق سے یہ آیت جس طرح کے عمل کرنے والوں کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ مالی عبادت ہے جب کہ قراءت شاذہ کے مطابق اس آیت کا تعلق بدنی عبادت سے ظاہر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک قول یہ بھی ہے کہ مشہور قراءت کے مطابق جو الفاظ ہیں ان کی تفسیر میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ کہ جو اپنے نفسوں میں سے وہ چیز دیتے ہیں جو طاعات و عبادات میں سے ہے (یعنی محنت و مشقت برداشت کر کے نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور دوسری بدنی عبادتیں کرتے ہیں) اور جو اپنے (مال) میں سے (خدا کی راہ میں) نکالتے ہیں۔ یعنی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور صدقہ و خیرات دیتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے دل لرزاں و ترساں ہیں۔ اس تفسیر و وضاحت سے دونوں طرح کی عبادتیں اس آیت کے مفہوم میں داخل ہو جائیں گی۔

ذکر اللہ کی نصیحت و تلقین

(۱۳) وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ قَامَ فَقَالَ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا اللّٰهَ اذْكُرُوا اللّٰهَ جَاءَتِ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ جَآءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيْهِ جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيْهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں کہ جب دو تہائی رات گزر جاتی تو نبی کریم ﷺ (تہجد کی نماز کے لئے) اٹھتے اور فرماتے۔ "لوگو اللہ کو (اس کی وحدانیت ذات اور اس کی تمام صفات کے ساتھ) یاد کرو، اللہ کو (یعنی اس کے عذاب و ثواب کو) یاد کرو (تاکہ تم اللہ کے تئیں خوف و امید کے درمیان رہو، اور ان لوگوں میں سے شمار کئے جاؤ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا زلزلہ آیا ہی چاہتا ہے (یعنی پہلا صور پھونکا ہی جانے والا ہے جس کے ساتھ ہی سب مر جائیں

گے) اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی آرہا ہے جو پیچھے آنے والا ہے (یعنی پہلے صور کے بعد دوسرا صور بھی بس پھونکا ہی جانے والا ہے جس کی آواز پر سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے اور اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے۔ غرض یہ کہ ان الفاظ سے حضور ﷺ کا مقصد قیامت کی یاد دلانا، اور آخرت کی طرف متوجہ کرنا ہے تاکہ یہ چیز طاعات و عبادات اور ذکر اللہ میں مشغول رکھنے کا باعث ہو) موت اپنے سے وابستہ تمام احوال کے ساتھ آیا ہی چاہتی ہے، موت اپنے سے وابستہ تمام احوال کے ساتھ آیا ہی چاہتی ہے (ان الفاظ کا مقصد بھی یہ تنبیہ کرتا ہے کہ غفلت چھوڑ کر ہوشیار ہو جاؤ، تمہاری موت تمہارے سر پر تیار کھڑی ہے اور ان تمام چیزوں کے ساتھ جو کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد واقع ہونے والی ہیں، آیا ہی چاہتی ہے۔" (ترمذی)

تشریح: "لوگو" کے ذریعے حضور ﷺ نے گویا ان لوگوں کو مخاطب فرمایا جو چین کی نیند سو رہے تھے اور تہجد کی نماز اور ذکر اللہ سے غافل تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کو بیدار کیا تاکہ وہ لوگ ذکر اللہ اور تہجد کی نماز میں مشغول ہوں۔ پس اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ آخر تہائی رات میں اٹھنا اور ذکر اللہ و نوافل میں مشغول ہونا مستحب مؤکدہ ہے! ایک نسخے میں اُذْكُرُوا اللّٰهَ کے الفاظ تین مرتبہ نقل کئے گئے ہیں، گویا تیسری مرتبہ کے ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، اس کی عطا کی ہوئی راحتوں اور اس کی طرف سے پیش آنے والے ضرر و آلام کو یاد کرو۔

جَاءَتِ الرَّاجِفَةُ (زلزلہ آیا ہی چاہتا ہے) میں قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ الخ نیز اس جملے میں جاءت ماضی کا صیغہ اس زلزلے کے آنے (یعنی صور پھونکے جانے) کے یقینی امر ہونے کی بنا پر استعمال کیا گیا ہے اور مفہوم وہی ہے جو ترجمے کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے یعنی وہ وقت بس آیا ہی چاہتا ہے، لہٰذا موقع کی غنیمت جانو اور طاعات و عبادات کی طرف سبقت کر کے ایسی تیاری کر لو کہ اس کے احوال آسانی کے ساتھ گزر جائیں۔ اس ارشاد گرامی میں ایک لطیف نکتہ بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ سونا، درحقیقت موت کا حکم رکھتا ہے جو پہلے صور پھونکے جانے کا اثر ہے اور بھاگنا دوسری مرتبہ صور پھونکے جانے کے حکم میں ہے، لہٰذا یہ دونوں چیزیں (یعنی سونا اور جاگنا، گویا قیامت کی علامت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور قیامت کی یاد دلانے کی باعث ہیں۔

موت اور قبر کو یاد رکھو

⑭ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِصَلٰوةٍ فَرَاَى النَّاسَ كَاَنَّهُمْ یَكْتَشِرُوْنَ قَالَ اَمَا اِنَّكُمْ لَوْ اَكْثَرْتُمْ ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ لَشَغَلَكُمْ عَمَّا اَرَى الْمَوْتِ فَاَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ فَاِنَّهٗ لَمْ یَاْتِ عَلَى الْقَبْرِ یَوْمٌ اِلَّا تَكَلَّمَ فَیَقُوْلُ اَنَا بَیْتُ الْغُرْبَةِ وَاَنَا بَیْتُ الْوَحْدَةِ وَاَنَا بَیْتُ التُّرَابِ وَاَنَا بَیْتُ الدُّوْدِ وَاِذَا دُفِنَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ قَالَ لَهُ الْقَبْرُ مَرْحَبًا وَّاَهْلًا اَمَا اِنْ كُنْتَ لَاَحَبَّ مَنْ یَمْشِیْ عَلٰى ظَهْرِیْ اِلَیَّ فَاِذَا وُلِّیْتُكَ الْیَوْمَ وَصِرْتَ اِلَیَّ فَسَتَرٰى صَنِیْعِیْ بِكَ قَالَ فَیَتَّسِعُ لَهٗ مَدَّ بَصَرِهٖ وَیُفْتَحُ لَهٗ بَابٌ اِلَى الْجَنَّةِ وَاِذَا دُفِنَ الْعَبْدُ الْفَاجِرُ اَوِ الْكَافِرُ قَالَ لَهُ الْقَبْرُ لَا مَرْحَبًا لَهٗ وَلَا اَهْلًا اَمَا اِنْ كُنْتَ لَاَبْغَضَ مَنْ یَمْشِیْ عَلٰى ظَهْرِیْ اِلَیَّ فَاِذْ وُلِّیْتُكَ الْیَوْمَ وَصِرْتَ اِلَیَّ فَسَتَرٰى صَنِیْعِیْ بِكَ قَالَ فَیَلْتَئِمُ عَلَیْهِ حَتّٰى تَخْتَلِفَ اَضْلَاعُهٗ قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاَصَابِعِهٖ فَاَدْخَلَ بَعْضَهَا فِیْ جَوْفِ بَعْضٍ قَالَ وَیُقَیَّضُ لَهٗ سَبْعُوْنَ تِنِّیْنًا لَوْ اَنَّ وَاحِدًا مِّنْهَا نَفَخَ فِی الْاَرْضِ مَا اَنْبَتَتْ شَیْئًا مَا بَقِیَتِ الدُّنْیَا فَیَنْهَسْنَهٗ وَیَخْدِشْنَهٗ حَتّٰى یُفْضٰى بِهٖ اِلَى الْحِسَابِ قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نماز کے لئے (مسجد شریف میں) تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ گویا لوگ (آپس میں کسی بات پر) ہنس رہے ہیں، آپ ﷺ نے (ان کو اس طرح ہنستے ہوئے دیکھ کر) فرمایا۔ "خبردار! (تم پر کونسی غفلت طاری

ہے کہ اس طرح بے فکری کے ساتھ ہنسنے میں مشغول ہو) بلاشبہ اگر تم لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز کا اکثر ذکر کرتے رہو تو وہ تم کو اس چیز (یعنی زیادہ ہنسنے اور غافل لوگوں کی طرح کے کلام و گفتگو) سے باز رکھے جس کو میں دیکھ رہا ہوں، اور وہ (یعنی لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز) موت ہے پس تم لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز یعنی موت کو بہت یاد کرو! حقیقت یہ ہے کہ قبر پر ایسا کوئی دن (یعنی ایسا کوئی وقت اور زمانہ نہیں گزرتا جس میں وہ (زبان قال یا زبان حال سے) یہ نہ کہتی ہو کہ "میں غربت کا گھر ہوں" (یعنی میں ایک ایسی دور دراز اور ویران و سنسان جگہ کی طرح ہوں جہاں جو بھی آجاتا ہے وہ اپنے عزیز و اقارب، اپنے متعلقین اور اپنے گھر والوں سے ناقابل عبور مسافت کی دوری پر جا پڑتا ہے۔ لہٰذا اے انسان! تجھ کو لازم ہے کہ تو دنیا میں اس طرح رہ جس طرح کوئی مسافر اپنے عزیز و اقارب اور گھر والوں سے دور مسافرت کی حالت میں ہوتا ہے) "میں تنہائی کا گھر ہوں" (یعنی ایک ایسا گھر ہوں جس میں تنہائی اور وحشت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، ہاں جو لوگ اللہ رب العزت کی وحدانیت کا نور لے کر آتے ہیں وہ بے شک تنہائی محسوس نہیں کرتے کیونکہ وہی نور ان کا رفیق و دم ساز بن جاتا ہے) "میں خاک کا گھر ہوں" (یعنی میں اس مٹی کا گھروندہ ہوں جو ہر جاندار کی اصل اور بنیاد ہے پس جس کی اصل اور جس کا مرجع مٹی ہو اس کی شان یہی ہے کہ وہ مسکین و خاک نشین رہے، تاکہ مٹی کے ساتھ اس کی مناسبت ہر وقت تازہ رہے) اور "میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں" (پھر حضور ﷺ نے فرمایا) جب کسی مؤمن بندے کو دفن کیا جاتا ہے تو (جس طرح کہ کوئی خوش اخلاق میزبان اپنے کسی عزیز مہمان کی آمد کے وقت کلمات ترحیب کے ذریعے اس کا استقبال کرتا ہے اسی طرح) قبر (بھی اس مؤمن بندہ کا استقبال کرتی ہے اور) اس سے کہتی ہے کہ خوش آمدید! تم ایک اچھی کشادہ، آرام کی جگہ اور اپنے ہی مکان میں آئے ہو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے زیادہ پیارے تھے، جو مجھ پر چلتے ہیں، پس آج جب کہ میں تم پر حاکم و قادر بنائی گئی ہوں اور تم میرے مجبور و مقہور ہوئے ہو تو تم عنقریب میرے اس نیک سلوک کو دیکھو گے۔ جو میں تمہارے ساتھ کروں گی یعنی میں تمہارے لئے کشادہ و فراخ ہو جاؤں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ اس کے بعد وہ قبر اس بندے کے کشادہ و فراخ ہو جاتی ہے اور وہ کشادگی و فراخی اس کو اپنی حد نظر تک معلوم ہوتی ہے اور پھر اس کے لئے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ (جس میں سے وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھتا رہتا ہے، اسی دروازے سے گزر کر اس تک ٹھنڈی اور مشکبار ہوائیں آتی ہیں اور وہ جنت کے مکانات، حوریں، نہریں، میوے اور درخت اور دوسری روح افزا نعمتیں دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہے) اور جب کوئی بندۂ فاسق یا کافر دفن کیا جاتا ہے تو (جس طرح کوئی شخص اپنے یہاں آئے ہوئے ناآشنا و غیر عزیز اور بن بلائے مہمان کے ساتھ بے رخی اور بے مروتی کا برتاؤ کرتا ہے اسی طرح (قبر (بھی اس کافر کو جھڑکتی ہے اور کہتی ہے کہ) نہ تو تیرا آنا مبارک اور نہ تو اچھی کشادہ آرام کی جگہ اور اپنے مکان میں آیا ہے! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تو میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے برا تھا، جو مجھ پر چلتے ہیں، پس آج جب کہ میں تجھ پر حاکم و قادر بنائی گئی ہوں اور تو میرا مجبور و مقہور ہوا ہے تو جلد ہی دیکھ لے گا کہ میں تیرے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اور پھر قبر اس کو دباتی ہے یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر ہو جاتی ہیں" ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے (ان پسلیوں کی صورت حال دکھانے کے لئے) اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا (اور بتایا کہ اس طرح قبر کے دبانے کی وجہ سے اس کافر کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں) اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس کافر پر ستر اژدھے مسلط کر دیئے جاتے ہیں (اور وہ ایسے اژدھے ہوتے ہیں کہ) اگر ان میں سے کوئی ایک اژدہا بھی زمین پر پھنکار مار دے تو وہ زمین، جب تک کہ دنیا باقی ہے سبزہ اگانے کے قابل نہ رہے، وہ اژدھے اس کافر کو کاٹتے اور نوچتے ہیں۔ (اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ اس بندہ کو (قیامت کے دن) حساب کے لئے نہ لے جایا جائے "حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا "اس میں کوئی شک نہیں کہ قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "لذت کو فنا کر دینے والی چیز کو بہت یاد کیا کرو" یہ در حقیقت غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کے لئے ایک بڑی اور موثر نصیحت ہے، اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ موت کو یاد کرنا غافل کے دل کو زندہ کرتا ہے، حضرت شیخ عارف باللہ مولانا نور الدین علی متقیؒ کے

بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک تھیلی نما چیز بنا کر اپنے پاس رکھے رہتے تھے جس پر "موت" کا لفظ لکھا ہوتا تھا، جب کوئی شخص ان کا مرید ہوتا تو وہ اس تھیلی کو اس مرید کی گردن میں لٹکا دیتے تھے تاکہ اس کے دل پر ہر وقت یہ احساس طاری رہے کہ موت بالکل قریب ہے، دور نہیں ہے! حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ گویا اس طریقہ سے سالکین طریقت کی تربیت فرماتے تھے اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی وقت غافل نہ ہوں اور بیداری کے ساتھ طاعت و عبادت اور ذکر اللہ میں لگے رہیں۔ اسی طرح ایک بہت نیک اور خداترس بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے اعیان سلطنت میں سے کسی ایک کو اس خدمت پر مامور رکھتے تھے کہ وہ ہر وقت ان کے پیچھے کھڑا رہے اور "الموت، الموت" کہتا رہے تاکہ دل کو خدا کی طرف سے غافل ہونے کا موقع ہی نہ ملے اور ہر طرح کی روحانی بیماری کا علاج ہوتا رہے۔

فَاِنَّہٗ لَمْ یَاتِ الخ کے ذریعے گویا حضور ﷺ نے اس حکم کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرنا چاہئے۔

"اور میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں" یعنی میں ایک ایسا مکان ہوں جس میں آنے والا انسان کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن جاتا ہے، پس اے انسان! تیرے لئے یہ بات کیسے مناسب ہو سکتی ہے کہ تو کھانے پینے کی چیزوں لذت اور عمدگی کا جویا ہو اور تیری خواہش و ارادہ ایک ایسے جسم کو اعلی قسم کے طعام و مشروبات کے ذریعے بنانے اور لذت پہنچانے میں منہمک ہو جس کو آخر کار فنا ہو جانا ہے اور حقیر کیڑے مکوڑے کی خوراک بننا ہے) ہاں جو چیز یہاں تیرے لئے فائدہ مند ہو سکتی ہے وہ صرف نیک عمل ہے، اگر اچھے اعمال کا سرمایہ لے کر میری آغوش میں آئے گا تو یقیناً تجھے فائدہ پہنچے گا! اسی وجہ سے قبر کو اعمال کا صندوق کہا گیا ہے! بعض حضرات نے حجر میں پیدا ہونے والے کیڑوں کے بارے میں یہ تحقیق بیان کی ہے کہ جب جسم میں سڑاند پیدا ہوتی ہے تو اس سڑاند اور بدبو سے کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور اس جسم کو کھا کھا کر زندہ رہتے ہیں، پھر جب وہاں ہڈیوں کے ڈھانچہ کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا تو وہ کیڑے آپس میں ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ آخر میں ایک کیڑا باقی رہ جاتا ہے اور پھر وہ بھی بھوک کی وجہ سے مر جاتا ہے! علماء نے لکھا ہے کہ قبروں میں کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے اور زمین کے کھانے سے انبیاء، شہداء اور اولیاء کے اجسام محفوظ رہتے ہیں، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَآءِ اور شہداء کے حق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ رہی بات ان علماء باعمل کی، جن کو اولیاء اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے تو جب شہداء کو یہ فضیلت حاصل ہے تو ان علماء کو بدرجہ اولیٰ حاصل ہوگی کیونکہ ان (کے قلم) کی سیاہی کی ایک بوند شہداء کے خون سے افضل ہے۔

"بندۂ فاسق" سے فسق و فجور میں اکمل ترین فرد، یعنی کافر مراد ہے۔ اس کا قرینہ مقابلہ کا لفظ "بندۂ مؤمن" ہے۔ نیز ایک قرینہ اس کے حق میں قبر کا یہ کہنا بھی ہے کہ "تو میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے برا تھا جو مجھ پر چلتے ہیں" اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں "فاسق" سے کافر مراد لیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا علاوہ ازیں یہ بات بھی مدنظر رہنی چاہئے کہ قرآن و حدیث کا اسلوب اور معمول بھی یہی ہے کہ برزخ و آخرت کے بارے میں جب کوئی حکم و فیصلہ بیان کیا جاتا ہے تو اس کے دو ہی فریق ہوتے ہیں، ایک تو مؤمن اور دوسرا کافر جہاں تک فاسق مؤمن کا تعلق ہے اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے اور یہ سکوت اختیار کرنا یا تو اس کی پردہ پوشی کے نقطہ نظر سے ہوتا ہے یا اس لئے کہ اس کو خوف و رجا کے درمیان رکھا جائے، نہ کہ اس کا مقصد اس کو دونوں مرتبوں (یعنی کفر و ایمان) کے درمیان ایک الگ تیسرے مرتبہ پر رکھنا ہے جیسا کہ معتزلہ نے غلط گمان کیا ہے۔

"اس کافر پر ستر اژدھے مسلط کر دیئے جاتے ہیں" میں "ستر" کا عدد یا تو تحدید کے لئے ہے کہ اس متعین تعداد میں اژدھے اس پر مسلط کئے جاتے ہیں، یا اس عدد سے "کثرت" مراد ہے۔ جس کا مقصد اس مفہوم کو ادا کرنا ہے کہ اس پر بہت زیادہ اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں۔ ایک دوسری روایت سے اس دوسرے احتمال کی تائید ہوتی ہے جو کہ قبر میں کافر پر عذاب کئے جانے کے سلسلے میں منقول ہے اور جس میں فرمایا گیا ہے کہ کافر پر اس کی قبر میں ایک کم سو اژدھے مسلط ہوں گے۔

آخرت کے خوف نے آپ ﷺ کو جلد بوڑھا کر دیا تھا

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ جحیفۃ قَالَ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَدْ شِبْتَ قَالَ شَیَّبَتْنِیْ سُوْرَۃُ ھُوْدٍ وَاَخَوَاتُھَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوجحیفہؓ کہتے ہیں کہ جب صحابہؓ نے یہ عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) آپ تو بوڑھے ہو گئے، یعنی بڑی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی آپ (ﷺ) پر بڑھاپے کے اثرات ظاہر ہو گئے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے مجھ کو بوڑھا کر دیا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یعنی سورۂ ہود اور ان جیسی سورتوں میں قیامت اور آخرت کے عذاب کا بہت زیادہ ذکر ہے۔ ان کے مضمون دیکھ دیکھ کر اپنی اُمّت کی طرف سے یہ غم مجھے کھائے جارہا ہے کہ نہ معلوم میری امت کے لوگوں کا کیا حشر ہوگا، یہی غم کھاتے کھاتے میرا یہ حال ہو گیا ہے۔

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَدْ شِبْتَ قَالَ شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدٌ وَالْوَاقِعَۃُ وَالْمُرْسَلٰتُ وَعَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ وَاِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَذُکِرَ حَدِیْثُ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ لَا یَلِجُ النَّارُ فِیْ کِتَابِ الْجِھَادِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت ابوبکرؓ کہنے لگے کہ یارسول اللہ! آپ (ﷺ) تو (بہت جلد) بوڑھے ہو گئے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں! سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، سورۂ مرسلات، عم یتساء لون اور اِذَا الشمس کورت (اور ان جیسی دوسری سورتوں) نے (کہ جن میں قیامت اور اس کے احوال کا ذکر ہے) مجھ کو (بڑی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی) بوڑھا کر دیا ہے۔" (ترمذیؒ)

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت لا یلج النّار الخ کتاب الجہاد میں نقل کی جا چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

صحابہؓ کا کمال احتیاط و تقویٰ

(۱۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّکُمْ لَتَعْمَلُوْنَ اَعْمَالاً ھِیَ اَدَقُّ فِیْ اَعْیُنِکُمْ مِنَ الشَّعْرِ کُنَّا نَعُدُّھَا عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمُوْبِقَاتِ یَعْنِی الْمُھْلِکَاتِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت انسؓ نے (اپنے زمانے کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے) فرمایا "تم ایسے کام کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بال سے بھی زیادہ باریک ہیں لیکن ہم ان کاموں کو رسول کریم ﷺ کے زمانے میں موبقات یعنی ہلاک کرنے والے کاموں میں شمار کرتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ایسے ایسے کام کرتے ہو اور ایسی ایسی چیزیں اختیار کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بہت معمولی درجہ کی اور بہت حقیر ہیں، زیادہ سے زیادہ تم ان کو مکروہات میں شمار کرتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کام اور وہ چیزیں بڑی نقصان دہ ہیں، اور بڑی تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں، چنانچہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں ہم لوگ ایسے کاموں کو بھی ان کاموں میں شمار کرتے تھے جو اخروی انجام کے اعتبار سے ہلاکت میں ڈالنے والے ہیں۔

صحابہؓ کا کمال احتیاط و تقویٰ

(۱۸) وَعَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا عَائِشَۃُ اِیَّاكِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ فَاِنَّ لَھَا مِنَ اللّٰہِ طَالِبًا۔ (رواہ ابن ماجۃ والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عائشہؓ! تم اپنے آپ کو ان گناہوں سے بھی دور رکھو جن کو بہت معمولی اور حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان گناہوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مطالبہ کرنے والا بھی ہے۔" (ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: "مطالبہ کرنے والا بھی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے گناہوں پر ایک طرح کا عذاب مقرر ہے جو ان گناہوں کے مرتکبین کو اپنی گرفت میں لیتا ہے پس گویا خود وہ عذاب اللہ تعالیٰ سے ایسے لوگوں کو اپنے حوالے کئے جانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور اللہ اس کے مطالبہ کو رد نہیں کرتا! اس اعتبار سے لفظ "طالبا" میں تنوین اظہار تعظیم کے لئے ہے اور جملے کے اعتبار سے طالبا عظیما کے مفہوم میں ہے لہٰذا یہ بات کسی کے لئے بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ اس امر سے غافل رہے جیسا کہ اکثر لوگ ایسے ایسے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کو کہ جو صغیرہ گناہ کے حکم میں ہوتے ہیں، بہت سہل جانتے ہیں اور ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ تو توبہ و استغفار کے ذریعے ان گناہوں کا تدارک کرتے ہیں اور نہ ان کی وجہ سے کسی خوف و ڈر میں مبتلا ہوتے ہیں نیز وہ اس بات سے بھی غافل رہتے ہیں کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے گناہ پر اصرار (یعنی اس کو بار بار کرنا اور اس سے اجتناب نہ کرنا صغیرہ گناہ نہیں رہتا، بلکہ گناہ کبیرہ کے حکم میں آجاتا ہے اور ویسے بھی ہر گناہ صغیرہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی نسبت سے کبیرہ ہی ہے جس کا تھوڑا سا حصہ بھی بہت بڑا بن جاتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ کبھی کبیرہ گناہ کو تو معاف کر دیتا ہے اور صغیرہ گناہ پر عذاب دیتا ہے جیسا کہ اس کے ارشاد وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ سے مفہوم و مستفاد ہوتا ہے! جہاں تک قرآن کی اس آیت کریمہ کا تعلق ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئٰتِكُمْ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے صغیرہ گناہوں کو تمہاری ان عبادتوں کے ذریعے دھو ڈالیں گے جو گناہ کو مٹا دیتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ سرے سے گناہ سے اجتناب کرو خواہ وہ صغیرہ گناہ ہو یا کبیرہ! گویا اس آیت میں شرط کا تعلق محض کبیرہ گناہوں سے بچنے سے نہیں ہے جیسا کہ معتزلہ نے گمان کیا ہے بلکہ اس شرط کا تعلق مطلق گناہ سے ہے۔

ایک اور روایت میں کہ جس کو احمدؒ اور طبرانیؒ نے نقل کیا ہے، یہ فرمایا گیا ہے کہ "تم اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی بچاؤ کیونکہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو کسی کھائی میں اترے اور وہاں انہوں نے ایک ایک لکڑی کر کے ایندھن جمع کیا اور پھر اپنی روٹی پکائی (اسی طرح صغیرہ گناہوں کا مرتکب چھوٹے چھوٹے گناہ کر کے اتنے وبال جمع کر لیتا ہے کہ آخر اس کے پاپ کی ناؤ بھر جاتی ہے اور وہ غرق ہو جاتا ہے) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ صغیرہ گناہ کرنے والے کو پکڑ لیتا ہے تو پھر اس کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰؓ سے کیا کہا

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ لِیْ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ هَلْ تَدْرِیْ مَاقَالَ اَبِیْ لِاَبِیْكَ قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَاِنَّ اَبِیْ قَالَ لِاَبِیْكَ یَا اَبَا مُوْسٰی هَلْ یَسُرُّكَ اَنَّ اِسْلَامَنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهِجْرَتَنَا مَعَهٗ وَجِهَادَنَا مَعَهٗ وَعَمَلَنَا كُلَّهٗ مَعَهٗ بَرَدَلَنَا وَاَنَّ كُلَّ عَمَلٍ عَمِلْنَا بَعْدَهٗ نَجَوْنَا مِنْهُ كِفَافًا رَاْسًا بِرَاْسٍ فَقَالَ اَبُوْكَ لِاَبِیْ لَا وَاللّٰهِ قَدْجَاهَدْنَا بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَصَلَّیْنَا وَصُمْنَا وَعَمِلْنَا خَیْرًا كَثِیْرًا وَاَسْلَمَ عَلٰی اَیْدِیْنَا بَشَرٌ كَثِیْرٌ وَّاِنَّا لَنَرْجُوْا ذَاكَ قَالَ اَبِیْ لٰكِنِّیْ اَنَا وَالَّذِیْ نَفْسُ عُمَرَ بِیَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنَّ ذٰلِكَ بَرَدَلَنَا وَاَنَّ كُلَّ شَیْءٍ عَمِلْنَا بَعْدَهٗ نَجَوْنَا مِنْهُ كِفَافًا رَاْسًا بِرَاْسٍ فَقُلْتُ اِنَّ اَبَاكَ وَاللّٰهِ كَانَ خَیْرًا مِّنْ اَبِیْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوبردہؓ ابن ابی موسیٰ اشعریؒ (جو اونچے درجے کے تابعین میں سے ہیں) کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت عبداللہ بن عمرؓ مجھ سے کہنے لگے کہ تمہیں معلوم ہے، میرے والد (حضرت عمر فاروقؓ) نے تمہارے والد (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) سے کیا کہا تھا؟ حضرت ابوبردہؓ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا۔ میرے والد نے تمہارے والد سے کہا تھا کہ ابوموسیٰ کیا یہ بات تمہارے لئے خوش کن ہے کہ ہمارا اسلام جو رسول کریم ﷺ کے ساتھ (یعنی آپ ﷺ کی بعثت سے ملا ہوا تھا) ہماری ہجرت جو آپ ﷺ کے ساتھ تھی، ہمارا جہاد جو آپ کے ساتھ تھا اور ہمارے سارے اعمال (یعنی نماز، روزے، زکوٰۃ، حج اور اس طرح کے

دوسرے عباداتی اعمال) جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے، وہ سب ہمارے لئے ثابت وبرقرار رہیں اور ہم نے جو اعمال رسول کریم ﷺ کے بعد کئے ہیں وہ اگر ہم سے برابر سرابر بھی چھوٹ جائیں تو ہماری نجات کے لئے کافی ہیں تمہارے والد نے (یہ سن کر) میرے والد سے کہا کہ نہیں، خدا کی قسم ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے رسول کریم ﷺ کے بعد جہاد کیا ہے، نمازیں پڑھیں ہیں، روزے رکھے ہیں اور دوسرے بہت نیک اعمال (جیسے صدقہ وخیرات وغیرہ) کئے ہیں اور بہت سے لوگ ہمارے ہاتھوں پر (یعنی ہماری وجہ سے) مسلمان ہوئے ہیں اور یقیناً ہم (مذکورہ چیزوں) کا اجر وثواب پانے کی امید رکھتے ہیں (جو ہمارے پہلے اعمال کے ثواب میں اضافہ ہی کریں گے) میرے والد (حضرت عمرؓ) نے کہا کہ (تمہاری بات صحیح ہے) لیکن میں تو قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں عمر کی جان ہے۔ اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ ہم نے جو اعمال رسول کریم ﷺ کے ساتھ کئے ہیں وہ ثابت وبرقرار رہیں اور جو اعمال ہم نے آپ ﷺ کے بعد کئے ہیں ان سے برابر سرابر چھوٹ جائیں۔ (حضرت ابوبردہؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر) میں نے حضرت ابن عمرؓ سے کہا کہ تمہارے والد، خدا کی قسم، میرے والد سے بہتر تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "برابر سرابر چھوٹ جائیں" ان الفاظ کے ذریعے حضرت عمرؓ نے اپنے اس احساس کا اظہار کیا کہ ہم نے حضور ﷺ کے بعد جو اعمال اختیار کئے جو نیک کام کئے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس زمرے میں رکھے گئے، آیا وہ قبول کئے گئے، یا ان کو ناقابل قبول قرار دے دیا گیا ہے، اس صورت میں ہماری یہ تمنا ہی بہتر ہے کہ ان اعمال کا نہ تو ہمیں کوئی نفع پہنچے نہ نقصان، نہ ان پر ثواب ملے اور نہ وہ عذاب کا موجب بنیں، گویا اگر وہ اعمال ہمارے لئے ثواب کا موجب نہیں بن سکتے تو خدا کرے وہ ہمارے حق میں عذاب کا سبب بھی نہ ہوں۔

طاعت ناقص ما، موجب غفراں نشود راضیم گر مدد علّت عصیاں نشود

چنانچہ ہم نے جو اعمال حضور ﷺ کے سایہ تربیت اور آپ ﷺ کی صحبت کی نورانیت کے سبب کئے ہیں اور بجا طور پر ان کی قبولیت کا گمان رکھتے ہیں، اگر وہی ثابت وبرقرار رہیں تو زہے سعادت، اور جو اعمال ہم نے حضور ﷺ کے بعد کئے ہیں اور وہ نقص وخرابی سے خالی نہیں تھے، اگر ان سے ہم برابر سرابر بھی چھوٹ جائیں تو یہی بہت غنیمت ہے۔ حضرت عمرؓ کے اس احساس کی بنیاد دراصل اس حقیقت پر تھی کہ اتباع کرنے والا علم وعمل کے تئیں اعتقاد واخلاص میں حجت وفساد کا خود ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے متبوع کی ذمہ داری کے تحت ہوتا ہے، جیسا کہ مقتدی کی نماز کا معاملہ ہے کہ اس کی نماز کا صحیح ادا ہونا امام کی نماز کے صحیح ادا ہونے پر انحصار رکھتا ہے کہ اگر امام کی نماز صحیح ادا نہیں ہوئی تو مقتدی کی نماز بھی صحیح ادا نہیں ہو سکتی، اسی طرح مقتدی کی نماز کا فاسد ہونا امام کی نماز کے فاسد ہونے پر انحصار رکھتا ہے لہٰذا جو اعمال حضور ﷺ کی صحبت اور آپ ﷺ کی راہنمائی میں ادا ہوئے ان کا صحت وخوبی کے ساتھ ادا ہونا اور درجہ کمال تک پہنچنا شک وشبہ سے بالاتر ہے، اسی طرح جو عباداتی اعمال حضور ﷺ کے بعد وقوع پذیر ہوئے ان کا نیتوں کے تغیر اور حالات کی خرابی سے متاثر ہونا بعید از امکان نہیں، چنانچہ اس بات کا اقرار تو خود صحابہؓ کے ہاں ان الفاظ میں ملتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ہم نے ابھی آپ ﷺ کی قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد اپنے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے اور ہنوز آپ ﷺ کو سپرد خاک کرنے میں مشغول ہی تھے کہ ہم نے اپنے دلوں میں ایک بڑا تغیر محسوس کیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ آفتاب نبوت کے غروب ہو جانے سے پوری کائنات پر جو اندھیرا پھیلا اس نے ان صحابہؓ کے قلوب کو بھی متاثر کیا اور انہیں محسوس ہوا کہ ہم زمانہ رسالت پناہ میں ایمان واخلاص اور یقین واعتقاد کے جس مقام پر تھے اب حضور ﷺ کے بعد اس مقام سے نیچے آ گئے۔ چنانچہ اگر حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا کہ حضور ﷺ کے بعد ہم نے جو عباداتی اعمال کئے، ان سے برابر سرابر بھی چھوٹ جانا ہمارے حق میں بڑا غنیمت ہے تو انہوں نے یقیناً بڑی عارفانہ بات فرمائی۔ واضح رہے کہ اس بات کا تعلق جب ان پاک نفوس سے ہے جو جلیل القدر صحابہؓ تھے اور جو اپنے ایمان واعتقاد اور عمل وکردار کے اعتبار سے پوری اُمت کے سب سے افضل فرد تھے تو ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے، اور ان کا کیا ٹھکانا ہو گا جو ان پاک نفسوں کے بھی بعد اس دنیا میں آئے اور ان کی طاعات وعبادات عجب وغرور اور ریا وغیرہ

سے بھری ہوئی ہیں؟ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک پر اپنا فضل وکرم اور رحمت خاص کا سایہ کرے یعنی بدکاروں کو اپنے نیک بندوں کے طفیل میں حسن عاقبت سے نوازدے! ویسے تو بعض عارفین نے یہاں تک کہا ہے کہ وہ گناہ و معصیت جو بندے میں ندامت وشرمندگی اور ذلت وخواری کا باعث ہو اس طاعت وعبادت سے بہتر ہے جو خود بینی وخود نمائی اور تکبر وغرور میں مبتلا کردے۔

روایت کے آخری جز یعنی حضرت ابوبردہ ؓ کے اس قول "تمہارے والد خدا کی قسم، میرے والد سے بہتر تھے" کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے والد اتنی عظیم القدر ہستی ہونے اور اتنے زیادہ اعمال وفضائل کے حامل ہونے کے باوجود خوف ودہشت کے اس مقام پر تھے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ میرے والد سے کہیں زیادہ بہتر ہوئے، اور ان کا مرتبہ کہیں زیادہ بلند ہوگا، یا یہ مراد ہے کہ اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے والد باوجود یہ کہ میرے والد سے برتر وافضل تھے لیکن وہ آخرت کے معاملے میں اس قدر خوف زدہ تھے؟ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کا معاملہ بہت نازک ہے۔

نو باتوں کا حکم

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ خَشْیَةِ اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَکَلِمَةُ الْعَدْلِ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضَا وَالْقَصْدِ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنَا وَاَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ وَاُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ وَاَعْفُوْ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ وَاَنْ یَّکُوْنَ صَمْتِیْ فِکْرًا وَنُطْقِیْ ذِکْرًا وَنَظْرِیْ عِبْرَةً وَاٰمُرَ بِالْعُرْفِ وَقِیْلَ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (رواہ رزین)

"حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (میرے رب نے مجھ کو نو باتوں کا حکم دیا ہے، ایک تو یہ کہ ظاہر وپوشیدہ ہر حالت میں اللہ سے ڈرا جائے (یعنی دل میں بھی خدا کا خوف سمایا ہوا ہو، اور ارتکاب معصیت سے اجتناب کی صورت میں اعضاء جسم پر بھی خوف خداوندی کا اثر ظاہر ہو، یا یہ کہ خواہ تنہائی ہو یا لوگوں کی موجودگی، ہر حالت میں وہی کام کرنا چاہئے جو خوف خداوندی کا مظہر ہو) دوسری بات یہ کہ سچ بولا جائے خواہ غصہ کی حالت ہو یا رضامندگی کی (یعنی بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ جب کسی سے راضی وخوش ہوتے ہیں تو اس کی تعریف کرتے ہیں، اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور اس کے عیوب کو چھپاتے ہیں اور جب کسی سے غصے وناراض ہوتے ہیں تو اس کی برائی کرتے ہیں اس کی ہر بات کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے عیوب کو اچھالتے ہیں، یہ بات مناسب نہیں ہے، بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ غصہ اور خوشی دونوں حالت میں اپنی زبان کو حد اعتدال پر رکھا جائے اور وہی بات کہی جائے جو حقیقت کے مطابق اور عین سچائی ہو)۔ تیسری بات یہ کہ فقر وغربت، اور ثروت ومالداری دونوں حالت میں میانہ روی اختیار کی جائے (یعنی خواہ فقر وغربت کی حالت ہو یا ثروت ومالداری کی، بہر صورت راہ اعتدال پر قائم رہا جائے کہ فقر وغربت کی حالت میں تو غصہ، تلخی اور جزع وفزع اختیار نہ کیا جائے اور ثروت ومالداری کی حالت میں تکبر وسرکشی اور اونچا اڑنے سے اجتناب کیا جائے یا یہ معنی ہیں کہ رزق اور ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں بس اسی مقدار میں طلب کرے جو اعتدال کی حد تک ہو، نہ تو فقر وافلاس کی حد تک تنگی وسختی برداشت کرے اور نہ عیش وعشرت کی زندگی اختیار کرے) چوتھی بات یہ کہ میں اس شخص سے قرابت داری کو قائم رکھوں جو مجھ سے قطع تعلق کرے (یعنی مجھے ایک حکم یہ بھی دیا گیا ہے کہ اگر میرا کوئی عزیز ورشتہ دار مجھ سے بدسلوکی کرے اور قرابت داری کا تعلق ختم کرے تو میں اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کروں اور اس کے ساتھ قرابت داری کو قائم رکھنے کی کوشش کروں، یہ بات آنحضرت ﷺ کے وصف علم وبردباری اور کمال تواضع ومروت کی آئینہ دار ہے) پانچویں بات یہ کہ میں اس شخص کو (بھی) اپنی عطاء وبخشش اور جود وسخاوت سے نوازوں جو مجھے (اپنے لین دین سے) محروم رکھے، چھٹی بات یہ کہ میں انتقام لینے کی طاقت وقوت رکھنے کے باوجود) اس شخص کو معاف کروں جو مجھ پر ظلم وزیادتی کرے، ساتویں بات یہ کہ میرا چپ رہنا عبادت کا ذریعہ ہو (یعنی جب میں خاموشی کی حالت میں ہوں اور کسی کے ساتھ بات چیت یا زبان کے ذریعے تبلیغ میں مشغول نہ ہوں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات اس کی قدرت کی کرشمہ سازیوں اور اس کے کلام کے معانی ومطالب میں غور وفکر اور استغراق وانہماک

رکھوں، آٹھویں یہ کہ میرا بولنا ذکر اللہ کا مظہر ہو (یعنی جب میری زبان جاری ہو اور میں بولوں تو اللہ کی بات کروں کہ اس کا تعلق خواہ تسبیح وتحمید، اور تکبیر وتوحید سے ہو یا تلاوت کلام اللہ، اور اس کے بندوں کو تعلیم وتلقین اور تذکیر ونصیحت سے) اور نویں بات یہ کہ میری نظر عبرت پذیری کے لئے ہو (یعنی جب میں خدا کی کسی مخلوق کی طرف دیکھوں تو میرا وہ دیکھنا عبرت حاصل کرنے کے لئے اور توجہ وہوشیاری کے ساتھ ہو، نہ کہ نادانی وغفلت کے ساتھ، نیز میرے پروردگار نے مجھے یہ بھی حکم دیا ہے کہ میں بندگان خدا کو نیکی کی تلقین وتبلیغ کروں) اور ایک روایت میں "بالمعروف" کا لفظ ہے۔" (رزین)

تشریح: آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ایک روایت میں "بالعرف" کے بجائے "بالمعروف" کا لفظ ہے اور دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی "اچھی بات"۔

رہی یہ بات کہ جب امر بالمعروف کا ذکر کیا گیا ہے تو نہی عن المنکر کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امر بالمعروف کا لفظ عام ہے جس کے دائرہ میں نہی عن المنکر کا مفہوم بھی آجاتا ہے، چنانچہ جب صرف امر بالمعروف کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد پورا مفہوم ہوتا ہے یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔

واضح رہے کہ حضور ﷺ نے امر بالمعروف کے حکم کا جو ذکر فرمایا ہے وہ مذکورہ باتوں کے حکم کے علاوہ ہے اور یہ حکم جامعیت کا حامل ہے کہ اس کے دائرہ مفہوم میں خالق ومخلوق سے متعلق تمام ہی اچھی باتیں اور طاعات آجاتی ہیں جن کو حضور ﷺ نے تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد پھر علیحدہ سے بطریق اجمال ذکر فرمایا۔

خوف الٰہی سے گریہ کی فضیلت

(۲۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَخْرُجُ مِنْ عَيْنَيْهِ دَمُوْعٌ وَاِنْ كَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ثُمَّ يُصِيْبُ شَيْئًا مِنْ حُرِّ وَجْهِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر وہ بندۂ مؤمن جس کی آنکھوں سے خدا کے خوف میں آنسو نکلیں اگرچہ وہ آنسو مکھی کے سر کے برابر (یعنی بہت معمولی مقدار میں) کیوں نہ ہوں اور پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے وجیہہ (خوبصورت) پر پہنچیں تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ کو حرام کردے گا۔" (ابن ماجہ)

بَابُ تَغَيُّرِ النَّاسِ

لوگوں میں تغیر وتبدل کا بیان

تغیر کے معنی ہیں بدل جانا۔ یعنی ایک حالت کو چھوڑ کر دوسری حالت اختیار کر لینا! یہاں "لوگوں میں تغیر وتبدل ہو جانے" سے مراد مسلمانوں کی اس حالت کا بدل جانا ہے جو حضور ﷺ کے زمانے میں تھی، چنانچہ حضور ﷺ کے زمانے میں اہل ایمان کی حالت یہ تھی کہ وہ دین کے راستہ پر سختی سے قائم تھے، احکام سُنّت کا احترام تھا حق کے پیرو تھے دنیا سے بے رغبت تھے، دنیا کی چمک دمک یعنی مال ودولت، حشم وخدم، اور جاہ ومنصب نے ان کے اندر حرص ولالچ، اور غرور وتکبر کے جراثیم پیدا نہیں کئے تھے شریعت کے پسندیدہ اعمال، اچھے خصائل واطوار، بلند کرداری اور حسن اخلاق ان کی عادت ثانیہ تھی حق کی راہ میں سینہ سپر رہتے تھے، دل کی نورانیت اور باطن کی صفائی وپاکیزگی کے جوہر سے متصف تھے۔

لیکن حضور ﷺ کے بعد جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا لوگوں کے ان حالات میں تبدیلی آتی گئی یہاں تک کہ آخر زمانے میں ان کے حالات۔

ومعاملات بالکل برعکس ہو جائیں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قحط الرجال

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا النَّاسُ كَالْاِبِلِ الْمِائَةِ لَا تَكَادُ تَجِدُ فِيْهَا رَاحِلَةً۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "آدمی اختلاف حالات اور تغیر صفات کے اعتبار سے) ان سو اونٹوں کے مانند ہے جن میں سے تم ایک ہی کو سواری کے قابل پاسکتے ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "راحلة" اس اونٹ کو کہتے ہیں جو تندرست و توانا ہوتا ہے اور سواری و بار برداری کے کام کے لئے بہت اچھا اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لفظ میں حرف ت اظہار مبالغہ کے لئے ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی تو بہت ہیں جیسے اونٹ بہت ہوتے ہیں، لیکن جس طرح اونٹوں میں سے سواری اور بار برداری کے قابل چند ہی اونٹ نکلتے ہیں اسی طرح کام کے آدمی کہ جو نبی ﷺ کی صحبت و دریافت کے قابل ہوں اور صحبت دریافت کا حق ادا کر سکیں اور ان کے نیک مقصد میں ان کے معین و مددگار ثابت ہو سکیں، بہت کم ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ کا زمانہ اس اعتبار سے سب سے بہتر زمانہ تھا کہ اس میں کام کے لوگ زیادہ تھے پھر بعد کے زمانہ میں اگرچہ پہلے زمانہ کی بہ نسبت ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی لیکن آنے والے زمانوں کے اعتبار سے وہ تعداد یقیناً زیادہ تھی اور پھر اس کے بعد کے زمانہ میں ایسے لوگوں کی تعداد اگرچہ دوسرے زمانے کی تعداد سے بھی کم تھی لیکن آنے والے زمانوں کے اعتبار سے یقیناً بہت زیادہ تھی۔

حدیث میں "سو" کا جو عدد ذکر فرمایا گیا ہے وہ تحدید و تعین کے لئے نہیں ہے بلکہ اظہار کثرت کے لئے ہے! حاصل یہ کہ لوگوں کے جنگل میں ایسی ہستی کا وجود کہ جس پر "مخلص عالم باعمل" کا اطلاق کیا جاسکے کیمیا کی طرح نایاب ہوتا ہے، اسی لئے ہر زمانہ کے ارباب حال یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ زمانہ "قحط الرجال" کا ہے۔ حضرت سہل تستریؒ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک دن جب مسجد میں لوگوں کو اس کثرت کے ساتھ دیکھا کہ مسجد اندر اور باہر سے بھری ہوئی تھی تو فرمایا کہ "کلمہ گو یقیناً بہت ہیں لیکن ان میں مخلص لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں کئی موقعوں پر بیان فرمایا ہے۔

اہل اسلام کے بارے میں ایک پیشگوئی

② وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُمْ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى قَالَ فَمَنْ؟ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یقیناً (آنے والے زمانوں میں) تم بالشت، بالشت کے برابر اور ہاتھ ہاتھ کے برابر ان لوگوں کے طور طریق کو اختیار کرو گے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ یعنی سوسمار کے بل میں بیٹھیں گے (جو بہت تنگ اور برا ہوتا ہے) تو تم اس میں بھی ان کی پیروی کرو گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) وہ لوگ کہ جو پہلے گزر چکے ہیں اور جن کے طور طریقوں کو ہم اختیار کریں گے کیا وہ یہود و نصاریٰ ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اگر وہ یہود نصاریٰ نہیں ہیں تو اور کون ہیں؟ یعنی تم سے پہلے گزرے ہوئے جن لوگوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ان سے مراد یہود و نصاریٰ ہی ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "سنن" سُنت کی جمع ہے جس کے معنی طور اور طریقے کے ہیں، خواہ نیک طریقہ ہو یا برا طریقہ، یہاں اس لفظ سے ان خواہش پرست اور دین کو مسخ کر دینے والے لوگوں کا طور طریقہ ہے جنہوں نے اپنے نبی اور پیغمبر کے گزر جانے کے بعد اپنی نفسانی خواہشات اور جھوٹی اغراض کے تحت اپنے دین تک کو بدل ڈالا اور ان کا نبی و پیغمبر ان کے پاس خدا کی جو کتاب چھوڑ کر گیا تھا اس میں انہوں نے تحریف کر ڈالی اور ان کے احکام و مسائل میں کانٹ چھانٹ کر دی۔ بعض نسخوں میں یہ لفظ سین کے زبر کے ساتھ ہے۔

"بالشت بالشت کے برابر اور ہاتھ ہاتھ کے برابر" کا مطلب ہے وبجمیع وجوہ ہر کام و معاملہ میں ان کی اتباع و پیروی کرنا اور ان کے تمام طور طریقوں کو اختیار کر لینا۔

دنیا میں بتدریج نیک لوگوں کی کمی ہوتی رہے گی

③ وَعَنْ مِرْدَاسٍ نِ الْاَسْلَمِیِّ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَذْھَبُوْنَ الصَّالِحُوْنَ الْاَوَّلُ وَالْاَوَّلُ وَیَبْقٰی حُفَالَۃٌ کَحُفَالَۃِ الشَّعِیْرِ اَوِ التَّمْرِ لَا یُبَالِیْھِمُ اللّٰہُ بَالَۃً۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مرداس اسلمیؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ نیک بخت و صالح لوگ یکے بعد دیگرے اس دنیا سے گزرتے رہیں گے اور بدکار و ناکارہ لوگ جو یا کھجور کی بھوسی کی طرح باقی رہ جائیں گے جن کی اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں ہوگی (یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے لوگوں کی کوئی قدر و منزلت نہیں اور ان کے وجود کا کوئی اعتبار نہیں)۔" (بخاریؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ایک پیشین گوئی جو صحیح ثابت ہوئی

④ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا مَشَتْ اُمَّتِیَ الْمُطَیْطَاءُ وَخَدَمَتْھُمْ اَبْنَاءُ الْمُلُوْكِ اَبْنَاءُ فَارِسَ وَالرُّوْمِ سَلَّطَ اللّٰہُ شِرَارَھَا عَلٰی خِیَارِھَا رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب میری اُمت کے لوگ تکبر کی چال چلنے لگیں گے اور بادشاہوں کے بیٹے کہ جو فارس و روم کے شہزادے ہوں گے، ان کی خدمت کریں گے (بایں طور کہ اللہ تعالیٰ اہل فارس و روم کے علاقوں اور شہروں کو مسلمانوں کے زیر نگیں کر دے گا اور وہ فتوحات حاصل کریں گے تو اس کے نتیجے میں ان علاقوں اور شہروں کے نہ صرف عام آدمی بلکہ بادشاہ و شہزادے بھی قیدی بنائے جائیں گے اور مسلمان ان سب کو بطور غلام اپنی خدمت پر مامور کریں گے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اُمت کے برے لوگوں کو بھلے لوگوں پر یعنی ظالموں کو مظلوموں پر) مسلط کر دے گا۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اس حدیث کے ذریعے ایک ایسی بات کی خبر دی جو آئندہ زمانہ میں وقوع پذیر ہونے والی تھی، اور آپ ﷺ نے بطور پیشگوئی جو بات فرمائی وہ "حرف بحرف" صحیح ثابت ہوئی، چنانچہ یہ بات اسلامی تاریخ کی ایک عین حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے فارس و روم کے علاقے فتح کر لئے وہاں کی بے شمار دولت مال غنیمت کے طور پر حاصل کی، ان علاقوں اور شہروں کے لوگوں کو قیدی بنایا اور بادشاہوں کی اولادوں تک کو غلام بنا کر ان سے خدمت و چاکری کرائی اور اس طرح سے ان کے اندر جب بڑائی کا احساس پیدا ہو گیا اور اخلاص کی جگہ جاہ و منصب اور مال و دولت کی محبت نے لے لی تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ان لوگوں کو مسلط کر دیا۔ جنہوں نے حضرت عثمان غنیؓ کو قتل کیا تھا، یہاں تک کی بنی ہاشم جو کل تک مسلمانوں کی قیادت و سیادت کے امین سمجھے جاتے تھے اور جن کی خلافت و حکمرانی تمام عالم اسلام پر قائم تھی ان پر بنو امیہ کو مسلط کر دیا اور

بنو امیہ نے جو کچھ کیا وہ اسلامی تاریخ کی ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس کو یہاں بیان نہ کرنا ہی مناسب ہے۔

مطیطاء کے معنی ہیں دونوں ہاتھ پھیلا کر اتراتے ہوئے (یعنی مغرورانہ چال) چلنا۔ اسی سے "مط" ہے جس کے معنی از راہ نخوت و تکبر ناک بھوں سکیڑنے اور ابرو چڑھانے کے ہیں! لغت کی مشہور کتابوں قاموس صحاح اور صراح نیز مشکوٰۃ کے صحیح نسخوں میں لفظ اسی طرح ہے لیکن "مجمع البحار" اور اس کتاب کے بعض حواشی میں لکھا ہے کہ یہ لفظ دوسرے ط کے بعد بھی ی کے ساتھ منقول ہے۔ جو محذوف ہے یعنی "مطیطا" کے بجائے "مطیطی" ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس لفظ میں دوسرے ط کے بعد بھی حرف ی ہے بلکہ ایک معنی میں ہی رائج بھی ہے۔

قیامت کب قائم ہوگی

⑤ وَعَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَقْتُلُوْا اِمَامَكُمْ وَتَجْتَلِدُوْا بِاَسْيَافِكُمْ وَيَرِثَ دُنْيَاكُمْ شِرَارُكُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم (مسلمان) اپنے (خلیفہ یا سلطان و حکمران) کو قتل کر دو گے، تمہاری تلواریں آپس ہی میں ایک دوسرے کی گردن اڑائیں گی اور یہاں تک کہ تمہاری دنیا کے وارث و والی، مکار لوگ ہو جائیں گے (یعنی سلطنت و حکمرانی ظالموں کے پاس پہنچ جائے گی اور مخلوق خدا کی زمام کار اور اقتدار کی باگ ذوڑ بدکاروں اور فاسقوں کے ہاتھ میں آجائے گی) تو اس وقت قیامت قائم ہو جائے گی۔" (ترمذیؒ)

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَكُوْنَ اَسْعَدَ النَّاسِ بِالدُّنْيَا لُكَعُ بْنُ لُكَعَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک کہ دنیا میں کثرت مال و زر اور اقتدار و حکمرانی کے اعتبار سے سب سے زیادہ نصیبہ ور وہ شخص نہ بن جائے گا جو احمق ہے اور احمق کا بیٹا ہے (یعنی جب دنیا میں بداصل، بدسیرت، اور بدکار لوگ سب سے زیادہ حکومت و اقتدار اور مال و دولت کے مالک بن جائیں گے تو سمجھو کہ قیامت بس آنے ہی والی ہے) اس روایت کو ترمذیؒ نے اور کتاب دلائل النبوۃ میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔"

عیش و راحت کی زندگی دینی و اخروی سعادتوں کی راہ میں رکاوٹ ہے

⑦ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبِ نِ الْقُرَظِيِّ قَالَ حَدَّثَنِيْ مَنْ سَمِعَ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ اِنَّا لَجُلُوْسٌ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ فَاطَّلَعَ عَلَيْنَا مُصْعَبُ ابْنُ عُمَيْرٍ مَا عَلَيْهِ اِلَّا بُرْدَةٌ لَهٗ مَرْقُوْعَةٌ بِفَرْوٍ فَلَمَّا رَاٰهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكٰى لِلَّذِيْ كَانَ فِيْهِ مِنَ النِّعْمَةِ وَالَّذِيْ هُوَ فِيْهِ الْيَوْمَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ بِكُمْ اِذَا غَدَا اَحَدُكُمْ فِيْ حُلَّةٍ وَرَاحَ فِيْ حُلَّةٍ وَوُضِعَتْ بَيْنَ يَدَيْهِ صَحْفَةٌ وَرُفِعَتْ اُخْرٰى وَسَتَرْتُمْ بُيُوْتَكُمْ كَمَا تُسْتَرُ الْكَعْبَةُ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مِّنَّا الْيَوْمَ نَتَفَرَّغُ لِلْعِبَادَةِ وَنُكْفَى الْمُؤْنَةَ قَالَ لَا اَنْتُمُ الْيَوْمَ خَيْرٌ مِّنْكُمْ يَوْمَئِذٍ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت محمد ابن کعب قرظیؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص نے یہ حدیث بیان کی جس نے حضرت علیؓ سے اس کو سنا تھا (چنانچہ اس شخص نے بیان کیا) کہ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "ایک دن ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے ساتھ مسجد میں (یعنی مسجد نبوی میں یا مسجد قبا میں) بیٹھے ہوئے تھے کہ مصعب ابن عمیرؓ بھی وہاں آگئے اس وقت ان کے بدن پر صرف ایک چادر تھی اور اس چادر میں بھی چمڑے کے پیوند لگے

ہوئے تھے، رسول کریم ﷺ نے ان کو دیکھا تو رو پڑے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب مصعبؓ کس قدر خوشحال اور آرام و راحت کی زندگی گذارتے تھے اور آج ان کی کیا ٹوٹی پھوٹی حالت ہے) پھر رسول کریم ﷺ نے (اظہار تعجب و حسرت کے طور پر فرمایا۔ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب کہ تم میں کوئی شخص صبح کو ایک جوڑا پہن کر نکلے گا اور پھر شام کو دوسرا جوڑا پہن کر نکلے گا، تمہارے سامنے کھانے کا ایک بڑا پیالہ رکھا جائے گا اور دوسرا اٹھایا جائے گا اور تم اپنے گھروں پر اس طرح پردہ ڈالو گے جس طرح کعبہ پر پردہ ڈالا جاتا ہے (یعنی حضور ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعے آنے والے زمانہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب تم پر خوشحالی و ترفہ کا دور آئے گا، اللہ تعالیٰ دنیا کے خزانوں کی کنجیاں تمہارے قدموں میں ڈال دے گا، تمہارے گھروں میں مال و اسباب کی فراوانی ہوگی تو تم دن میں کئی کئی مرتبہ جوڑے بدلو گے، صبح کا لباس الگ ہوگا، شام کا الگ، تمہارے دسترخوان انواع و اقسام کے کھانوں اور لذیذ و مرغوب اشیاء سے بھرے ہوں گے، تمہارے مکان راحت و آسائش اور آراستگی و زیبائش کی چیزوں سے پر رونق ہوں گے اور گویا تمہاری زندگی عیش و عشرت کا گہوارہ اور اسراف و تنعم کی آئینہ دار ہو جائے گی۔ تو بتاؤ اس وقت تمہارے دل کی کیا حالت ہوگی اور تم کیا محسوس کرو گے؟ بعض صحابہ ﷺ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ہم اس دن (جب کہ خوش حالی و ترفہ کی نعمت سے بہرہ مند ہوں گے) آج کے دن سے (جب کہ ہم فقر و افلاس کی گرفت میں ہیں) بہتر حال میں ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت ہم عبادت کے لئے (اپنی معاشی جدوجہد کی الجھنوں اور حصول رزق کے فکر سے) آزاد و فارغ ہوں گے اور ہمیں محنت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی (یعنی جب اس وقت ہمیں معاشی و اقتصادی طور پر خوش حالی حاصل ہوگی اور نوکر چاکر ہمارے سارے کام کاج کریں گے تو ہم ذہنی و جسمانی طور پر پوری طرح بے فکر و آزاد ہوں گے اور اس صورت میں طاعت و عبادت اور دینی خدمت میں پوری دل جمعی اور سکون کے ساتھ منہمک رہ سکیں گے) حضور ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا "ایسا نہیں ہے کہ اس وقت تم بہتر ہو گے) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اس دن کی بہ نسبت آج کے دن زیادہ بہتر ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں حضرت عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دن مصعب ابن عمیرؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت انہوں نے بکری کے چمڑے کا ایک تسمہ اپنی کمر کے گرد باندھ رکھا تھا، حضور ﷺ نے ان کو دیکھا تو (حاضرین مجلس سے) فرمایا کہ اس شخص کو دیکھو جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے منور کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس کے ماں باپ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ اس کو اچھے سے اچھا کھانا کھلاتے تھے، اچھے سے اچھا کپڑا پہناتے تھے، میں نے اس کے بدن پر ایک ایسا لباس دیکھا ہے جو دو سو درہم کے عوض خریدا گیا تھا، (یعنی یہ وہ شخص ہے جو اپنی پچھلی زندگی میں نہایت عیش و عشرت اور راحت و تنعم کی زندگی گذارتا تھا، لیکن خدا اور خدا کے رسول کی محبت نے اس کو ایسی حالت پر پہنچا دیا ہے۔ جس میں تم اس کو اب دیکھ رہے ہو! اللہ کی بے انتہا رحمتیں نازل ہوں اس جلیل القدر ہستی پر جس کا نام مصعب ابن عمیرؓ ہے، قریش الاصل ہیں بڑے اونچے درجے کے صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے، مکہ سے ہجرت کی، گھر بار چھوڑا، دنیا کی ساری نعمتوں اور راحتوں کو ٹھکرا دیا، اور حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ آگئے جیسا کہ خود حضور ﷺ نے شہادت دی ہے یہ اپنے اسلام سے پہلے کے زمانے میں مکہ کے بڑے مالداروں میں شمار ہوتے تھے نہایت خوش لباس و خوش طعام تھے، اچھے سے اچھا پہنتے اور اچھے سے اچھا کھاتے تھے۔ لیکن جب مسلمان ہو گئے تو سارے عیش و تنعم پر لات مار دی، خدا اور اس کے رسول کے عشق میں ایسے رنگ گئے کہ دنیا اور دنیا کی چیزوں سے نفرت کرنے لگے، زہد اختیار کر لیا، یہاں تک کہ غزوۂ احد کے موقع پر جام شہادت نوش کر کے واصل بحق ہو گئے، شہادت کے وقت ان کی عمر چالیس سال یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔

حدیث سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت مصعبؓ کو دیکھ کر حضور ﷺ کا رو پڑنا، ان کی خستہ حالی کے تئیں رحم و شفقت کے جذبات کے تحت تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو کبھی اپنی قوم کی آنکھوں کا تارا تھا، عیش و راحت کی زندگی گذارتا تھا اور اب اس حالت کو پہنچ گیا ہے کہ بدن پر صرف ایک پیوند لگی چادر لپیٹے اپنا وقت گذار رہا ہے۔ لیکن یہ بات اس واقعہ کے منافی معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر پیچھے بھی ایک روایت میں گزر چکا ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو کھردری چارپائی پر

لیٹے ہوئے دیکھا جس کے بان کے نشانات آپ ﷺ کے جسم مبارک پر پڑ گئے تھے تو اس وقت رو پڑے انہوں نے آنحضرت ﷺ کی مشقت بھری زندگی کے ساتھ فارس و روم کے بادشاہوں کی زندگی کا موازنہ کیا۔ جو خدا کے سرکش و نافرمان اور باغی بندے ہونے کے باوجود عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا تھا کہ تم ابھی تک سوچنے سمجھنے کے اس مقام سے نہیں بڑھے ہو، بندۂ خدا! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ ان (بادشاہان دنیا) کو بس دنیا کی نعمتیں ملیں اور ہمیں آخرت کی نعمتوں اور سعادتوں سے نوازا جائے؟ اولیٰ یہ ہے کہ حضرت مصعبؓ کو دیکھ کر حضور ﷺ کے رونے کو فرط مسرت سے رونے پر محمول کیا جائے کہ اپنی امت کے لوگوں کو دنیا سے زہد اختیار کر کے عقبیٰ کی طرف متوجہ دیکھ کر مارے خوشی کے آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اگر اس رونے کو غم و حسرت ہی پر محمول کیا جائے تو اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ آپ کا غم دراصل اس بات پر تھا کہ میری امت کے ان جیسے لوگوں کو ضروریات زندگی کی ایسی چیزیں بھی میسر نہیں ہیں جو دنیا ہی کے لئے ضروری نہیں ہیں بلکہ طاعت و عبادت میں معاون و مددگار بھی ہوتی ہیں جیسے بقدر ضرورت لباس وغیرہ! اس تاویل کی تائید حضور ﷺ کے ان الفاظ کیف بکم اذا غدا الخ اور انتم الیوم خیر منکم الخ سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ غریب و مفلس شخص کہ جو ضروریات زندگی کی بقدر کفایت چیزوں کا مالک ہو، غنی و مالدار شخص سے بہتر ہے، چنانچہ غنی و مالدار شخص حصول مال و زر کی جدوجہد میں زیادہ مشغولیت کی وجہ سے طاعت و عبادت کے لئے اتنا زیادہ قلبی و جسمانی فراغ و سکون نہیں رکھتا جس قدر کہ وہ غریب و مفلس شخص رکھتا ہے! اس اعتبار سے یہ حدیث درحقیقت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صبر و استقامت اختیار کرنے والا غریب و مفلس شخص شکر گذار مالدار سے زیادہ افضل ہوتا ہے۔ پس صحابہؓ جیسی ہستیوں کے تعلق سے کہ جو اُمت کے سب سے زیادہ مضبوط ایمان و عقیدہ اور کردار کے حامل تھے، مالداری کا یہ حال ہے تو غیر صحابہؓ کے تعلق سے اس کا کیا حال ہوگا، جو ان کی بہ نسبت ایمان و عقیدہ اور کردار و عمل میں کہیں زیادہ ضعیف ہیں۔ اس کی مؤید وہ حدیث بھی ہے جس کو دیلمیؒ نے فردوس میں حضرت ابن عمرؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) مَازُوِيَتِ الدُّنْيَا عَنْ اَحَدٍ اِلَّا كَانَتْ خَيْرَةً لَّهٗ بلکہ ملا علی قاریؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ایک خاص بات یہ کہی ہے کہ عَنْ اَحَدٍ (اس شخص) کا لفظ عام ہے کہ اس کے مفہوم میں مؤمن و غیر مؤمن سب شامل ہیں، لہٰذا دوزخ میں مالدار کافر کی بہ نسبت فقیر و مفلس کافر کا عذاب ہلکا ہوگا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ جب اس دار فانی میں فقر و افلاس نے کافر کو یہ فائدہ پہنچایا تو اس مؤمن کو دار التمرار (آخرت میں) کیسے فائدہ نہیں پہنچائے گا جو دنیا میں اپنے فقر و افلاس پر صابر رہا ہے۔

فسق و فجور کے دور میں دین پر قائم رہنے والے کی فضیلت

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْتِىْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ الصَّابِرُ فِيْهِمْ عَلٰى دِيْنِهٖ كَالْقَابِضِ عَلَى الْجَمْرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادُهٗ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس وقت لوگوں کے درمیان اپنے دین پر صبر کرنے والا (یعنی دنیا سے اپنا دامن بچا کر دینی احکام کی حفاظت و پیروی کرنے والا) اس شخص کی مانند ہوگا جس کے اپنی مٹھی میں انگارہ لے لیا ہو۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آخر زمانے میں جب برائی عام ہو جائے گی، فسق و فجور پھیل جائے گا، اور پورے معاشرہ میں بدکار لوگوں کا اس قدر غلبہ ہوگا کہ دین کی بات کرنے والے اور دینداروں کے مددگار معاون ڈھونڈھے نہیں ملیں گے، تو اس وقت دین کو اختیار کرنا اور ثابت قدمی کے ساتھ گامزن رہنا اتنا ہی دشوار اور سخت صبر آزما ہوگا جس قدر کہ کوئی شخص اپنی مٹھی میں انگارہ بند کر لے اور اس کی اذیت و تکلیف پر صبر و تحمل کرے۔

کب زندگی بہتر ہوتی ہے اور کب موت؟

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ اُمَرَآءُكُمْ خِيَارَكُمْ وَاَغْنِيَاؤُكُمْ سُمَحَاءُكُمْ وَاُمُوْرُكُمْ شُوْرٰى بَيْنَكُمْ فَظَهْرُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ بَطْنِهَا وَاِذَا كَانَ اُمَرَاءُكُمْ شِرَارُكُمْ وَاَغْنِيَاءُكُمْ بُخَلَاءُكُمْ وَاُمُوْرُكُمْ اِلٰى نِسَاءِكُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا۔ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تمہارے قائد وسردار وہ لوگ ہوں کہ جو تم میں کے بہترین لوگ ہیں، تمہارے دولت مند لوگ سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشوروں سے انجام پاتے ہوں (یعنی مسلمان ایک مرکز پر متحد و متفق ہوں اور اپنے تمام معاملات وامور ایک رائے ہو کر طے کرتے ہوں) تو اس وقت زمین کی پشت تمہارے لئے زمین کے پیٹ سے بہتر ہوگی (یعنی ایسے مبارک زمانہ میں زندگی موت سے بہتر ہوگی کیونکہ اس صورت میں تمہیں کتاب وسنت کے مطابق عمل کرنے اور دین کی راہ پر چلنے کی توفیق نصیب ہوگی، اور ظاہر ہے وہ لوگ نہایت خوش بخت ہیں جنہیں حسن عمل کے ساتھ طویل زندگی ملے اور جب تمہارے قائد وسردار وہ لوگ ہوں جو تم میں کے بدترین (یعنی فاسق وفاجر اور ظالم لوگ ہیں تمہارے دولت مند لوگ بخیل ہوں اور تمہارے معاملات کی باگ دوڑ عورتوں کے ہاتھ میں ہو، تو اس وقت زمین کا پیٹ تمہارے لئے زمین کی پشت سے بہتر ہوگا (یعنی ایسے زمانہ میں مرنا، جینے سے بہتر ہوگا)۔ اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرہ بہت بدنصیب ہوتا ہے جس میں لوگ اپنے معاملات عورتوں کے سپرد کردیتے ہیں، درآنحالیکہ عورتیں مردوں کی بہ نسبت عقل اور دین دونوں میں کمزور اور ناقص ہونے کی وجہ سے اس طرح کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتیں، اسی لئے فرمایا شاوروھن وخالفوھن یعنی عورتوں سے مشورہ (ضرور کرلو لیکن کرو ان کی رائے کے خلاف، اسی طرح وہ مرد بھی عورتوں ہی کے حکم میں ہیں جو انہی جیسے احوال رکھتے ہیں یعنی جن مردوں پر جاہ ومال کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے، جو یہ نہیں جانتے کہ کیا چیز دین کو نقصان پہنچاتی ہے، کون سا کام دین وشریعت کے خلاف ہے کسی بھی چیز اور کسی بھی معاملہ کا کیا انجام ہوسکتا ہے تو وہ بھی یقیناً عورتوں کی طرح عقل ودین دونوں کے اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں لہٰذا ایسے مردوں کو بھی اپنا مقتدا ورہنما بنانا اور اپنی زمام کار ان کو سونپ دینا پورے معاشرہ کو تباہی وخرابی سے دوچار کرنا ہے۔

حدیث کا ظاہری اسلوب یہ تقاضا کرتا ہے کہ جب پہلے جزء میں یہ فرمایا گیا ہے کہ تمہارے معاملات باہمی مشوروں سے طے پاتے ہوں تو دوسرے جز میں یوں فرمانا چاہئے تھا کہ تمہارے معاملات باہمی اختلاف رائے کا شکار ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس طرح فرمانے کی بجائے یہ فرمانا کہ تمہارے معاملات کی باگ دوڑ عورتوں کے ہاتھ میں ہو۔ گویا اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ آپس میں پیدا ہونے والے اختلاف اور تنازعات عام طور پر عورتوں کی اتباع کرنے اور ان کے کہے پر چلنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

دنیا سے محبّت اور موت کا خوف مسلمانوں کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب ہے

⑩ وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَعَى الْاَكَلَةُ اِلٰى قَصْعَتِهَا فَقَالَ قَائِلٌ وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ قَالَ بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ وَلٰكِنَّكُمْ غُثَآءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنُ قَالَ قَائِلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْوَهْنُ قَالَ حُبُّ الدُّنْيَا وَكِرَاهِيَةُ الْمَوْتِ۔ (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی دلائل النبوۃ)

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے جب کفر وضلالت سے بھرے ہوئے لوگوں

کا گروہ آپس میں ایک دوسرے کو تم سے لڑنے اور تمہاری شان وشوکت کو مٹانے کے لئے بلائے گا جیسا کہ کھانے کے دستر خوان پر جمع ہونے والے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کھانے کے قاب کی طرف متوجہ کرتے ہیں یعنی جس طرح کچھ لوگ جمع ہو کر کھانے کی محفل میں دستر خوان پر بیٹھتے ہیں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کی طرف کھانے کے برتن سرکاتے رہتے ہیں، اور اس میں جو چیز ہوتی ہے اس کو کھانے کے لئے کہتے رہتے ہیں، چنانچہ وہ سب بلا تکلّف اور بغیر کسی رکاوٹ کے ان برتنوں میں سے جو کچھ چاہتے ہیں لے لے کر کھاتے ہیں، اسی طرح کفر وضلالت کے حامل لوگ تمہارے مقابلے پر جمع ہو کر آپس میں ایک دوسرے کو اکسائیں گے، بھڑکائیں گے اور آخر کار وہ تمہیں ہلاک کریں گے، تمہاری جائیدادیں تباہ کریں گے، تمہارے مال واسباب لوٹیں گے اور تمہیں خانماں برباد کریں گے اس میں گویا (اس طرف اشارہ ہے کہ تم مسلمان ان دشمنان دین کے سامنے چارۂ تر کی طرح ہو جاؤ گے جس کا جی چاہے گا تمہیں نگل لے گا۔ کسی صحابیؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ (ان کا ہمارے خلاف جمع ہونا اور ہم پر غالب آجانا) کیا اس سبب سے ہو گا کہ اس وقت ہم کم تعداد میں ہوگے؟ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں ایسا اُس وجہ سے نہیں ہو گا کہ تم کم تعداد میں ہوں گے، بلکہ اس وقت تمہاری تعداد تو بہت ہو گی، لیکن تمہاری حیثیت پانی کے اس جھاگ کی سی ہو گی جو دریا یا نالوں کے کناروں پر پائے جاتے ہیں (یعنی تمہارے اندر جرأت وشجاعت اور قوت کا فقدان ہو گا) اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت اور تمہارا رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں ضعف وستی پیدا کر دے گا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے دلوں میں ضعف ستی پیدا ہو جانے کا سبب کیا ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "دنیا کی محبت اور موت سے بیزاری" (یعنی جب زندگی تمہارے لئے عزیز اور موت تمہارے لئے ناپسندیدہ ہو جائے گی تو تم دشمن کا مقابلہ کرنے اور بہادری کے جوہر دکھانے کے قابل نہیں رہ جاؤ گے) اس روایت کو ابوداؤدؒ نے اور بیہقیؒ نے کتاب دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

چند برائیاں اور ان کا وبال

(۱۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا ظَهَرَ الْغُلُوْلُ فِيْ قَوْمٍ اِلاَّ اَلْقَى اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ وَلاَ فَشَا الزِّنَا فِيْ قَوْمٍ اِلاَّ كَثُرَ فِيْهِمُ الْمَوْتُ وَلاَ نَقَصَ قَوْمٌ الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلاَّ قُطِعَ عَنْهُمُ الرِّزْقُ وَلاَ حَكَمَ قَوْمٌ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلاَّ فَشَا فِيْهِمُ الدَّمُ وَلاَ خَتَرَ قَوْمٌ بِالْعَهْدِ اِلاَّ سُلِّطَ عَلَيْهِمُ الْعَدُوُّ۔ (رواہ مالک)

"روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ جب کوئی قوم مال غنیمت میں خیانت کرنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دلوں میں دشمن کا رعب وخوف پیدا کر دیتا ہے، جس قوم میں زنا کاری پھیل جاتی ہے اس میں (کسی وبا مثلاً طاعون وغیرہ کے پھیلنے یا اہل علم ودانش کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کی صورت میں) اموات کی زیادتی ہو جاتی ہے، جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے (یعنی اس کا تجارت پیشہ طبقہ کم ناپنے کم تولنے اور کم گننے جیسے عیب میں مبتلا ہو جاتا ہے) تو اس کا رزق اٹھا لیا جاتا ہے (یعنی اسکے رزق میں برکت ختم کر دی جاتی ہے یا اس قوم کے مقدر سے حلال رزق اُٹھ جاتا ہے) جو قوم غیر منصفانہ اور ناحق احکام جاری کرنے لگتی ہے (یعنی جس قوم کے ارباب اقتدار) احکام وفیصلوں کے نافذ کرنے میں عدل وانصاف اور مساوات کو ملحوظ نہیں رکھتے یا جہل ونادانی کی وجہ سے غلط سلط فیصلے کرنے لگتے ہیں) تو ان کے درمیان خون ریزی پھیل جاتی ہے (یعنی اس قوم کے معاشرے میں ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسے عوامل پھیل جاتے ہیں جو عام فتنہ وفساد اور خونریزی کا باعث بنتے ہیں) اور جو قوم اپنے عہد وپیمان کو توڑ دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کے دشمن کو مسلط کر دیتا ہے۔"

(مالک)

باب فی ذکر الانذار و التحذیر
ڈرانے اور نصیحت کرنے کا بیان

مشکوٰۃ کے صحیح نسخوں اور اصل متون میں اوپر عنوان باب کی جگہ صرف باب کا لفظ لکھا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ باب گزشتہ باب کے لواحق اور متعلقات پر مشتمل ہے، لیکن ابن ملک ؒ نے یہاں باب کا مذکورہ بالا عنوان قائم کیا ہے، ہم نے اسی کو نقل کیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

چند احکام خداوندی

① عَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ الْمُجَاشِعِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَاتَ يَوْمٍ فِيْ خُطْبَتِهٖ اَلَا اِنَّ رَبِّيْ اَمَرَنِيْ اَنْ اُعَلِّمَكُمْ مَا جَهِلْتُمْ مِمَّا عَلَّمَنِيْ يَوْمِيْ هٰذَا كُلُّ مَالٍ نَحَلْتُهٗ عَبْدًا حَلَالٌ وَاِنِّيْ خَلَقْتُ عِبَادِيْ حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ وَاِنَّهُمْ اَتَتْهُمُ الشَّيٰطِيْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا اَحْلَلْتُ لَهُمْ وَاَمَرَتْهُمْ اَنْ يُّشْرِكُوْا بِيْ مَالَمْ اُنْزِلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَاِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ اِلٰى اَهْلِ الْاَرْضِ فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ اِلَّا بَقَايَا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَقَالَ اِنَّمَا بَعَثْتُكَ لِاَبْتَلِيَكَ وَاَبْتَلِيَ بِكَ وَاَنْزَلْتُ عَلَيْكَ كِتَابًا لَا يَغْسِلُهُ الْمَاءُ وَتَقْرَءُهٗ نَائِمًا وَيَقْظَانَ وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اُحَرِّقَ قُرَيْشًا فَقُلْتُ رَبِّ اِذًا يَثْلَغُوْا رَاْسِيْ فَيَدَعُوْهُ خُبْزَةً قَالَ اسْتَخْرِجْهُمْ كَمَا اَخْرَجُوْكَ وَاغْزُهُمْ نُغْزِكَ وَاَنْفِقْ فَسَنُنْفِقُ عَلَيْكَ وَابْعَثْ جَيْشًا نَبْعَثْ خَمْسَةً مِثْلَهٗ وَقَاتِلْ بِمَنْ اَطَاعَكَ مَنْ عَصَاكَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عیاض ابن حمار مجاشعی ؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے اپنے (جمعہ وغیرہ کے) خطبہ میں (یا کسی وعظ کے دوران فرمایا۔ (لوگو) سنو! میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں وہ باتیں بتادوں جو تم نہیں جانتے۔ (اس کے بعد آپ نے ان باتوں کے سلسلے میں اس طرح بیان فرمانا شروع کیا کہ) اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جو مال میں نے اپنے کسی بندہ کو دیا ہے وہ حلال ہے یعنی کسی شخص کو جو مال واسباب جائز ذرائع سے حاصل ہوا ہے۔ وہ اس کے حق میں حلال ہے، کوئی اس کو اپنی طرف سے حرام قرار نہیں دے سکتا جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں قاعدہ تھا کہ لوگ بعض صورتوں میں اونٹوں کو خواہ مخواہ اپنے پر حرام کر لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ میں نے تو اپنے سب بندوں کو باطل کے خلاف، حق کی طرف مائل پیدا کیا۔ لیکن یہ شیاطین تھے، جو ان (بندوں) کے پاس آئے اور ان کو ان کے دین سے پھیر کر گمراہی میں ڈال دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جن کو میں نے ان کے لئے حلال کیا تھا (یعنی شیاطین نے ان لوگوں کو اس طرح گمراہ کر دیا کہ انہوں نے اپنے اوپر حلال چیزوں کو حرام کر لیا، اور ان ہی شیاطین نے ان کو حکم دیا (یعنی ان کے دل میں یہ گمراہ کن وسوسہ ڈالا) کہ وہ اس چیز کو میرے ساتھ شریک کریں جس کے غالب ہونے کی کوئی دلیل نازل نہیں ہوئی (یعنی جو لوگ بتوں کو پوجتے ہیں اور اس طرح عبادت میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ ان کے پاس ان کے اس فعل کی کوئی معقول دلیل اور استحقاق نہیں ہے، یہ صرف شیاطین کے گمراہ کرنے کا اثر ہے کہ وہ ایسے ناروا کام میں مبتلا ہیں، اور یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین والوں پر نظر ڈالی (اور ان کو کفر شرک پر متفق اور ضلالت و گمراہی میں مستغرق پایا چنانچہ اللہ نے ان سب کو اپنا مبغوض و ناپسندیدہ قرار دے دیا خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے (یعنی جب دنیا کے سارے لوگ کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے اور محمد ﷺ کی بعثت تک سب کے سب گمراہی پر متفق و مجتمع تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے تو عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے سے انکار کیا اور عزیر علیہ السلام کی پوجا کرنے لگے، عیسیٰ ؑ کی قوم تین خداؤں کی قائل اور اس مشرکانہ عقیدہ کی حامل ہو گئی کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں وغیرہ وغیرہ تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اپنا مبغوض ترین بندہ قرار دے دیا)

علاوہ اہل کتاب کی اس جماعت کے (جو مشرک نہیں ہوئی بلکہ موسی علیہ السلام و عیسی علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہوئے اصل دین پر قائم و ثابت قدم رہی، اس جماعت کے لوگوں نے نہ تو اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کی اور نہ اپنے دین کے احکام میں اپنی مرضی کے مطابق کوئی تبدیلی کی یہاں تک کہ جب حضرت محمد ﷺ اس دنیا میں مبعوث ہوئے تو ان پر ایمان لائے اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو مبغوض قرار نہیں دیا) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے آپ کو (اے محمد ﷺ) پیغمبر بنا کر دنیا میں اس لئے بھیجا ہے تاکہ میں آپ کو آزماؤں (کہ آپ ﷺ اپنی قوم کی ایذا رسانی پر کس طرح صبر کرتے ہیں) اور آپ کے ساتھ آپ کی قوم کو بھی آزماؤں (کہ آیا وہ لوگ آپ ﷺ پر ایمان لاتے ہیں یا آپ کے ساتھ کفر اختیار کرتے ہیں) اور میں نے آپ پر ایک ایسی کتاب نازل کی جس کو پانی دھو اور مٹا نہیں سکتا (یعنی عام طور سے کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب کو پانی سے دھویا جائے تو مٹ جاتی ہے لیکن وہ کتاب جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے) یعنی قرآن کریم ایسی نہیں ہے کہ اس کو کوئی پانی دھو اور مٹا دے بلکہ وہ ہر قسم کی تحریف اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہے بایں طور کہ اس کو قیامت تک کے لئے دلوں میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے احکام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی و جاری رکھا گیا ہے) آپ اس کتاب کو سوتے جاگتے (ہر وقت) پڑھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کو یہ حکم دیا ہے کہ میں قریش کو جلا دوں (یعنی اہل قریش میں سے جو لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں اور کفر کی حالت پر قائم ہیں ان کو اس طرح تباہ و ہلاک کر دوں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے)" میں نے عرض کیا کہ میرے پروردگار قریش تو میرا سر کچل کر روٹی کی مانند (چوڑا) کر دیں گے (یعنی اہل اسلام کے مقابلہ پر ان کی طاقت اور تعداد بہت زیادہ ہے، میں ان سے کس طرح نمٹ سکوں گا اور کیسے ان پر غلبہ پاؤں گا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تم ان کو ان کے وطن سے نکال دو جس طرح کہ انہوں نے آپ ﷺ کو وطن بدر کیا تھا اور ان کے ساتھ جہاد کرو، ہم آپ کے جہاد کے سامان کا) انتظام کریں گے (یعنی آپ اور آپ کے رفقاء کو ایسی غیبی طاقت اور ہمت عطا کریں گے کہ اہل اسلام کی مٹھی بھر جماعت بھی ان کے لشکر جرار پر غالب آجائے گی) آپ اپنے لشکر والوں پر مال و اسباب خرچ کیجئے۔ اگر آپ کے پاس مال و اسباب نہیں ہو گا تو ہم دیں گے اور اس کا انتظام کریں گے، آپ ان کے خلاف اپنا لشکر بھیجئے ہم دشمن کے لشکر سے پانچ گنی زیادہ طاقت کے ساتھ آپ کی مدد کریں گے (چنانچہ جب بدر کی جنگ ہوئی اور مسلمان صرف تین سو کی تعداد میں کفر کے ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ معرکہ آرا ہوئے تو روایات میں آتا ہے کہ پانچ ہزار فرشتوں کا لشکر مسلمانوں کی مدد کے لئے آیا) اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے اور آپ کے اطاعت گذار ہیں ان کو ساتھ لے کر ان کے خلاف جنگ کیجئے جنہوں نے آپ کی نافرمانی اور آپ ﷺ سے سرکشی کی ہے اور کافر ہیں۔" (مسلم)

تشریح: "حق کی طرف مائل پیدا کیا" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کو ایسی استعداد و صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا جو قبول حق و قبول طاعت کی راہ میں ان کی مددگار ہوتی! اس ارشاد میں گویا اس "فطرت اسلام" کی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام (یعنی ہر بچہ قبول اسلام کی استعداد و صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے) لہٰذا اس جملہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ واقعۃً (بالفعل) مؤمن و مسلمان پیدا ہوئے تھے لیکن بعد میں شیطان کی گمراہی کی وجہ سے کافر ہو گئے۔ یا اس جملہ کے ذریعہ اس عہد کی طرف اشارہ ہے کہ جو میثاق کے دن تمام روحوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا لیا تھا اور سب نے یہ اقرار کیا تھا کہ بے شک ہم سب آپ کو اپنا رب مانتے ہیں عہد و اقرار میں ان لوگوں کی روحیں بھی شامل تھیں جو اس دنیا میں آنے کے بعد اور شیطان کے گمراہ کر دینے کی وجہ سے اپنے اس عہد و قرار سے مکر گئے اور مؤمن و مسلمان رہنے کی بجائے کفر و شرک اختیار کر لیا۔

"سوتے جاگتے پڑھتے ہیں۔ کا مطلب کہ ایسا ملکہ اور عبور حاصل ہو گیا ہے کہ قرآن ہر وقت آپ ﷺ کے ذہن میں مستحضر رہتا ہے اور اکثر حالات میں آپ ﷺ کا مقدس و پاک نفس اسی کی طرف متوجہ و ملتفت رہتا ہے، لہٰذا آپ ﷺ نہ تو اس سے جاگنے کی حالت میں غافل رہتے ہیں اور نہ سونے کی حالت میں! یہ ایک عام محاورہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص کسی خاص کام میں مہارت و ملکہ رکھتا ہے اور زیادہ تر اسی میں منہمک و مستغرق رہتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ سوتے جاگتے یہی کام کرتا ہے۔ حاصل یہ کہ قرآن سوتے وقت آپ کے دل

میں رہتا ہے! لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے قلب مبارک کی نسبت سے یہ تاویل قطعاً غیر ضروری ہے کیونکہ آپ ﷺ کا دل تو ہر وقت ہی بیدار رہتا تھا سونے کی حالت میں بھی صرف آنکھیں سوتی تھیں اور دل پر کوئی غفلت طاری نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا اس جملہ کا صاف مطلب یہ ہے کہ سوتے کی حالت بھی قرآن سے آپ کا تعلق منقطع نہیں ہوتا، فرق صرف اتنا ہے کہ جاگنے کی حالت میں تو آپ ﷺ کی زبان اور دل دونوں پر قرآن شریف رہتا ہے اور سونے کی حالت میں صرف قلب مبارک پر جاری رہتا ہے! قرآن کا اعجاز تو یہاں تک ثابت ہے کہ جو پاک نفس لوگ کلام اللہ سے بہت زیادہ اور نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں ان کی زبان سوتے کی حالت میں بھی تلاوت کرتی ہے جیسا کہ بہت سے بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ ان کو دیکھا گیا کہ وہ سو رہے ہیں لیکن زبان سے تلاوت جاری ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور عجیب واقعہ وہ ہے جو بعض کتابوں میں منقول ہے کہ ایک شخص اپنے شیخ و مرشد کے ساتھ ہر روز سحر کے وقت قرآن کی دس آیتوں کا دور کیا کرتا تھا، جب شیخ کی وفات ہوگی تو وہ شخص اپنی عادت کے مطابق سحر کے وقت اٹھا اور شیخ کی قبر پر حاضر ہوا اور وہاں دس آیتوں کی تلاوت کی، تلاوت سے فارغ ہو کر خاموش ہی ہوا تھا کہ اچانک قبر کے اندر سے اپنے شیخ کی آواز سنی کہ اپنی زندگی کے معمول کے مطابق انہوں نے دس آیتوں کی تلاوت کی اور اس کے بعد چھا گئی، پھر تو اس شخص نے یہ معمول بنا لیا کہ روز سحر کے وقت قبر پر پہنچ جاتا دس آیتوں کی تلاوت کرتا اور قبر کے اندر سے اپنے شیخ کی آتی ہوئی آواز میں دس آیتوں کی تلاوت سنتا اور چلا آتا یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا، ایک دن اس نے یہ واقع اپنے کسی دوست سے بھی بیان کر دیا اسی دن سے قبر کے اندر سے شیخ کی تلاوت کی آواز کا آنا بھی موقوف ہو گیا۔

قریش کو دعوت اسلام

④ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ فَصَعِدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّفَا فَجَعَلَ يُنَادِيْ يَابَنِيْ فِهْرٍ يَابَنِيْ عَدِيٍّ لِبُطُوْنِ قُرَيْشٍ حَتّٰى اجْتَمَعُوْا فَقَالَ اَرَاَيْتَكُمْ لَوْ اَخْبَرْتُكُمْ اَنَّ خَيْلاً بِالْوَادِيْ تُرِيْدُ اَنْ تُغِيْرَ عَلَيْكُمْ اَكُنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ قَالُوْا نَعَمْ مَاجَرَّبْنَا عَلَيْكَ اِلَّا صِدْقًا قَالَ فَاِنِّيْ نَذِيْرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ فَقَالَ اَبُوْلَهَبٍ تَبًّالَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا فَنَزَلَتْ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَنَادٰى يَا بَنِيْ عَبْدِمَنَافٍ اِنَّمَا مَثَلِيْ وَمَثَلُكُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ رَاَى الْعَدُوَّ فَانْطَلَقَ يَرْبَأُ اَهْلَهُ فَخَشِيَ اَنْ يَسْبِقُوْهُ فَجَعَلَ يَهْتِفُ يَا صَبَاحَاهُ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (یعنی اپنے قریب کے کعبہ والوں کو ڈرایئے) تو آپ کوہ صفا پر (جو خانہ کعبہ کے قریب ہے) تشریف لے گئے اور وہاں سے پکارنا شروع کیا۔ اے نبی عدی یعنی قریش کی تمام شاخوں کو (نام بنام) بلانا شروع کیا، چنانچہ جب (قریش کی تمام شاخوں کے) لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا "تم لوگ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ جنگل میں ایک لشکر آکر اترا ہے اور تمہیں تباہ و غارت کر دینا چاہتا ہے تو کیا تم مجھ کو سچا جانو گے ان سب نے (ایک زبان ہو کر) کہا۔ بیشک! کیونکہ ہمارا ہمیشہ کا تجربہ یہ ہے کہ تم نے جب بھی کوئی بات کہی ہے سچ کہی ہے تمہاری زبان سے ہم نے کبھی سوائے سچ کے کوئی بات نہیں سنی ہے" حضور نے فرمایا (اگر تم مجھے سچا سمجھتے ہو تو سنو کہ) میں خدا کی طرف سے تمہیں اس کے سخت ترین عذاب کے اترنے سے پہلے ڈرانے والا مامور ہوا ہوں (یعنی میں خدا کے رسول کی حیثیت سے تمہارے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتا ہوں، اس کو قبول کرو، اگر تم اس دعوت کو قبول نہیں کرو گے اور مجھ پر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر میں تمہیں یہ خبر دیتا ہوں کہ تم پر خدا کا نہایت سخت عذاب نازل ہو گا)۔ ابولہب (جو حضور ﷺ کا چچا تھا اور جس کا نام عبدالعزی تھا یہ بات سن کر) بولا۔ سارے دن تیری تباہی ہو، کیا اسی لئے تو نے ہمیں اکٹھا کیا تھا (کہ ہم اتنی خراب باتیں سنیں)؟ اس پر یہ سورت نازل ہوئی تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ یعنی ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ گستاخی کرنے کی وجہ سے تباہ برباد ہو گیا (بخاری و مسلم) اور

ایک روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ "آنحضرت ﷺ نے آواز دیکر (قریش کو جمع کیا اور فرمایا) اے عبد مناف کے بیٹو! میری اور تمہاری حالت کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے دشمن کا لشکر (اپنی قوم پر حملہ آور ہونے کے لئے آتے ہوئے) دیکھا تو وہ اپنی قوم کو (اس دشمن کے قتل وغارت گری سے بچانے کے لئے چلا (تاکہ کسی پہاڑی پر چڑھ کر بلند آواز کے ذریعہ قوم کے لوگوں کو دشمن کے خطرہ سے آگاہ کردے) لیکن اس خوف سے کہ کہیں دشمن کا لشکر اس سے پہلے ہی اس کی قوم تک نہ پہنچ جائے اس نے وہیں سے چلا چلا کر یہ کہنا شروع کردیا۔"

تشریح: "بطن" کے اصل معنی تو پیٹ کے ہیں لیکن یہ گروہ یا شاخ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جو قبیلہ سے نیچے کا درجہ ہے "بطن سے نیچے کا جو درجہ ہوتا ہے اس کو فخذ کہتے ہیں! گویا عرب میں نسب کے بالائی درجہ کو تو "قبیلہ" کہتے ہیں اس کے بعد کے درجہ کو "بطن" اور اس کے بعد کے درجہ کو "فخذ" کہا جاتا تھا چنانچہ قریش" قبیلہ کا نام ہے جس کے مورث اعلی کا نام "نضر ابن کنانہ" تھے نضر ابن کنانہ کے بعد جو شاخیں چلیں ان کو "بطون" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور پھر بطون کے بعد کی شاخوں کو "افخاذ" کہا جاتا ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں اس کا حاصل یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "قبیلہ" بمنزلہ جنس کے ہے" "بطن" بمنزلہ نوع کے، اور "فخذ" بمنزلہ فصل کے ہے۔

"وادی" (جنگل) سے مراد حجاز کا وہ خاص علاقہ ہے جو مکہ سے شمالی جانب تقریبا سولہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور جس کو وادی فاطمہ کہا جاتا ہے یہ ایک نخلستانی علاقہ ہے اور یہاں کی زمین شاداب) اور قابل کاشت ہے اس وادی کا ایک قدیم نام "مرالظہران" بھی ہے. مکہ اور مدینہ کے درمیان کا یہ پرانا راستہ اس طرف سے بھی گذرتا تھا۔

"ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں" میں ہاتھوں کے ٹوٹنے اور ہلاک ہونے سے مراد اس کی ذات کا ہلاک ہونا ہے، جیسا کہ قرآن نے ان الفاظ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی میں ذات کی ہلاکت کو ہاتھوں کی ہلاکت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس کے دونوں ہاتھوں سے مراد اس کے دونوں جہاں یعنی دنیا اور آخرت ہیں چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اس کے دونوں جہاں تباہ وبرباد ہوگئے، وہ نہ یہاں کا رہا نہ وہاں کا! اور بعض حضرات نے یہ تحقیق بھی بیان کی ہے کہ خاص طور پر اس کے ہاتھوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے حاضرین کو اسلام کی دعوت پیش کرتے ہوئے عذاب خداوندی سے ڈرایا تو ابولہب نے اس وقت صرف مذکورہ بات کہنے ہی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اس نے اپنے ہاتھوں سے پتھر اٹھا کر آنحضرت ﷺ کو مارنا بھی چاہا تھا۔

"عبد مناف" قریش کی ان دو شاخوں کے جد اعلی کا نام ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت سب سے مشہور اور مقتدر وغالب شاخیں تھیں۔ عبد مناف کے دو بیٹوں یعنی ہاشم اور عبد شمس سے جو شاخیں چلیں ان میں سے ایک یعنی ہاشم کی اولاد کو بنو ہاشم کہا جاتا ہے، اور یہی آنحضرت ﷺ کا خاندان ہے، اس خاندان کے ممتاز افراد میں حضور ﷺ کے علاوہ حضرت علیؓ اور حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ ہیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ سے جو سلسلہ نسب چلا وہ "علوی" اور "عباسی" کہلاتا ہے، عبد مناف کے دوسرے بیٹے عبد شمس تھے، ان کی شاخ ان کے بیٹے امیہ سے چلی اور ان کا خاندان بنو امیہ کے اہم اشخاص میں حضرت ابوسفیانؓ، مروان اور سیدنا عثمان غنیؓ ہیں۔

"صباحاہ" اصل میں ایک ایسا لفظ ہے جو اہل عرب میں کسی خطرناک اور دہشت آمیز چیز سے ڈرانے کے لئے بولا جاتا ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ لفظ صباح "(صبح کے وقت) سے مشتق ہے اور عام طور پر دشمن، چونکہ صبح کے وقت حملہ آور ہو کر غارتگری کرتا ہے اس لئے کسی حملہ کے خطرہ کے وقت چوکیدار اور محافظ لوگ اس لفظ کے ذریعہ چیختے چلاتے ہیں تاکہ لوگ حملہ کے خطرہ سے آگاہ ہو کر اپنی حفاظت ومقابلہ کے لئے تیار رہیں! لہذا اس لفظ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "لوگو! ہوشیار ہو جاؤ، قبل اس کے کہ دشمن تمہیں تباہ غارت کرنے کے لئے حملہ آور ہو اپنے بچاؤ کے لئے یہاں سے نکل جاؤ یا مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ چنانچہ حضور ﷺ نے اہل قریش کے سامنے مذکورہ

مثال بیان کر کے گویا یہ فرمایا کہ "میں بھی تمہیں ایک ایسے ہی عذاب کے خطرہ سے آگاہ کر رہا ہوں جو تمہیں تباہ و برباد کر دیگا لہٰذا قبل اس کے کہ وہ عذاب تم پر نازل ہو تم ایمان قبول کر کے اس عذاب سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ دَعَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قُرَیْشًا فَاجْتَمَعُوْا فَعَمَّ وَخَصَّ فَقَالَ یَا بَنِیْ كَعْبِ بْنِ لُؤَیٍّ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ یَا بَنِیْ مُرَّةَ بْنِ كَعْبٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ یَا بَنِیْ عَبْدِ شَمْسٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ یَا بَنِیْ عَبْدِ مَنَافٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ یَا بَنِیْ هَاشِمٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ یَا بَنِیْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ یَا فَاطِمَةُ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّیْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا غَیْرَ اَنَّ لَكُمْ رَحِمًا سَاَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِی الْمُتَّفَقِ عَلَیْهِ قَالَ یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ اِشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ لَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا یَا بَنِیْ عَبْدِ مَنَافٍ لَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا یَا عَبَّاسُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا اُغْنِیْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَیَا صَفِیَّةُ عَمَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَیَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ سَلِیْنِیْ مَا شِئْتِ مِنْ مَالِیْ لَا اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ..... (یعنی اپنے قریب کے کنبہ والوں کو ڈرایئے) تو نبی کریم ﷺ نے قریش کے لوگوں کو (آواز دیکر) بلایا جب وہ جمع ہو گئے تو آپ نے خطاب میں تعمیم بھی کی اور تخصیص بھی (یعنی ان کو ان کے دور کے جدا علی کے ناموں کے ذریعہ بھی مخاطب کیا خاص خاص لوگوں سے مخصوص خطاب بھی ہو جائے) چنانچہ آپ ﷺ نے ان سب کو (اس طرح) خطاب فرمایا اے کعب بن لوی کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ (یعنی ایمان قبول کرو اور نیک عمل کرو تاکہ دوزخ کی آگ سے نجات پاسکو) اے مرہ بن کعب کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اے عبد شمس کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اے عبد مناف کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اے ہاشم کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اور اے (میری لخت جگر) فاطمہ! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچا اس لئے میں تمہارے حق میں خدا کی طرف سے از قسم عذاب کسی چیز کا مالک نہیں ہوں (یعنی میں تم سے کسی کو بھی خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکتا) البتہ مجھ پر تمہاری قرابت کا حق ہے جس کو میں اس کی تری کے ساتھ تر کرتا ہوں (یعنی میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت ہے اور اس کا جو حق مجھ پر ہے۔ وہ بس اتنا ہی ہے کہ میں اس دنیا کے معاملات میں تمہاری دیکھ بھال رکھوں، تمہارے ساتھ اچھا سلوک کروں اور اگر تم احتیاج و ضرورت کی تپش محسوس کرو تو میں صلہ رحمی اور حسن سلوک واحسان کے چھینٹوں سے اس تپش کو ختم کرنے کی کوشش کروں) اس روایت کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ اور جس روایت کو بخاری و مسلم دونوں نے نقل کیا ہے ان میں یہ الفاظ ہیں کہ (حضور ﷺ نے فرمایا۔ اے قریش کے گروہ اپنے آپ کو خرید لو (یعنی مجھ پر ایمان لانے اور خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعہ کفران نعمت ترک کر کے اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) میں تم سے خدا کے عذاب میں سے کچھ بھی دور نہیں کر سکتا۔ اے (میرے چچا) عباس ابن عبد المطلب! میں آپ سے (بھی) خدا کے عذاب میں سے کچھ دور نہیں کر سکتا اور اے رسول اللہ کی پھوپھی صفیہ! میں آپ سے بھی) خدا کے عذاب میں سے کچھ دور نہیں کر سکتا۔ اور اے جان پدر) فاطمہ بنت محمد! میرے مال میں سے جو کچھ تو چاہے مانگ لے (میں دونگا) لیکن خدا کے کسی عذاب سے میں تجھ کو (بھی) نہیں بچا سکتا۔"

تشریح: "لوی" اصل میں تو لام کے پیش اور ہمزہ کے زیر کے ساتھ ہے لیکن کبھی ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے اور آخر میں تشدید کے ساتھ یا آتی ہے اس طرح سے یہ نام لوی پڑھا جاتا ہے۔ لوی قریش کے ایک جد اعلی کا نام ہے جو غالب ابن فہر کے بیٹے تھے اور یہ وہی فہر ہیں جن کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ قریش نضر ابن کنانہ کے بجائے انہیں کا لقب تھا اور اس اعتبار سے قریش کے سلسلہ نسب کی ابتدا گویا فہر ہی نام سے ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ قریش اصل میں لفظ "القرش" سے نکلا ہے جس کے معنی تجارت کے ہیں لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ قریش اصل میں "قرش" سے نکلا ہے جس کے معنی ایک بڑی خطرناک مچھلی کے ہیں اور جس کو "کلب البحر" بھی کہتے ہیں مچھلی

پانی کے اندر جانوروں کو اپنے دانت سے تلوار کی طرح کاٹ دیتی ہے۔ "مرۃ ابن کعب بھی قریش کی ایک شاخ کے جد اعلی کا نام ہے! اپنی شاخ کے سلسلہ نسب میں "عبد مناف" کا نام "عبد شمس" سے پہلے آتا ہے کیونکہ وہ عبد شمس کے باپ تھے لیکن یہاں روایت میں ان کا ذکر "عبد شمس" کے بعد کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کے جداعلی ہاشم کے باپ بھی عبد مناف ہی تھے۔

"اے ہاشم کے بیٹو! ان الفاظ کے ذریعہ گویا حضور ﷺ نے اپنے چچاؤں اور چچاؤں کے بیٹوں، ان سب کو مخاطب فرمایا حاصل یہ کہ حضور ﷺ نے قریش کی تمام شاخوں کو جمع فرما کر دعوت اسلام پیش کی اور ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا، اور یہ ڈرانا اس حد تک تھا کہ اپنی اولاد کو بھی اس میں شامل فرمالیا! چنانچہ جگر گوشہ رسول حضرت فاطمہؓ جو تمام عالم کی عورتوں کی سردار ہیں اور ان پر دوزخ کی آگ حرام ہے ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا۔

"کسی چیز کا مالک نہیں ہوں" کا مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں عذاب دینے کا ارادہ فرمالیا تو میں اس پر قادر نہیں ہوں کہ تم سے اس عذاب کو کوئی حصہ بھی دفع کر دوں، گویا حضور ﷺ کا یہ فرمانا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بنا پر تھا کہ قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ۔

"جس کو میں اس کی تری کے ساتھ تر کرتا ہوں" میں "تری" سے مراد قرابت داری کے تعلق کو قائم رکھنا اور ان قرابت داروں کے ساتھ احسان وحسن سلوک کرنا ہے۔ پس اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ میں اپنے قرابتداروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں، ان کے ساتھ امداد و تعاون کا معاملہ کرتا ہوں اور ان کو ظلم و نقصان سے بچاتا ہوں! نہایہ میں لکھا ہے کہ "بلال" اصل میں "بل" کی جمع ہے جس کے معنی تری کے ہیں اور اہل عرب اس قسم کے موقعوں پر تری کا اطلاق احسان اور حسن سلوک کرنے پر کرتے ہیں جیسا کہ "بیس" یعنی خشکی کا اطلاق قطع تعلق اور بد سلوکی کرنے پر کرتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اجزاء تری کے ذریعہ ایک دوسرے سے منسلک اور جڑے ہوئے ہوتے ہیں جب کہ خشکی کا پیدا ہو جانا ان اجزاء کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور جدا کر دیتا ہے تو انہوں نے بطور استعارہ تری کو وصل یعنی جوڑنے اور ملانے کے معنی میں اور خشکی کو منقطع کرنے اور توڑنے کے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔

آنحضرت ﷺ نے پورے قریش کو اور ان کے ساتھ اپنے خاندان والوں اور قریبی متعلقین کو جس انداز میں خدا کے عذاب سے ڈرایا وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں اور مقصد کی عظمت کے لحاظ سے نہایت ہی سخت اور بہت ہی پر زور تھا اور اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کے پیش نظر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ڈرانے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے سب کو جمع فرما کر ڈرا دیا ورنہ ان مخاطبین میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جن کی فضیلت اور جن کا جنت میں داخل ہونا بہت سی روایات سے ثابت ہے علاوہ ازیں جب اپنی اُمت کے دوسرے لوگوں کے حق میں آپ ﷺ کا شفاعت کرنا اور اس شفاعت کا قبول ہونا ایک یقینی امر ہے تو پھر خاص اقربا (جیسے حضرت عباسؓ، حضرت صفیہ، حضرت فاطمہ وغیرہ) کا معاملہ کہیں زیادہ خصوصی رحمت و شفاعت کا مستحق ہے لیکن جیسا کہ بتایا گیا ہے، یہ موقع بہر حال اس بات کا متقاضی تھا کہ خدا کے فریضہ کو زیادہ اہم انداز میں ادا کیا جائے اور چونکہ خدا کی بے نیازی کا خوف ہر صورت میں باقی رہتا ہے اس لئے حضور ﷺ نے سارے مخاطبین کے ساتھ ان اقربا خاص سے بھی یہ فرمایا کہ تم لوگوں کو بھی خدا کے عذاب سے بچانے پر قادر نہیں ہوں اس کے علاوہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ڈرانے کا یہ واقعہ پہلے کا ہے جب کہ ان خاص اقرباء کی فضیلت اور حضور ﷺ کی شفاعت کی بشارت بعد میں وارد ہوئی ہے۔

"میرے مال میں سے جو کچھ تو چاہے مانگ لے" اس جملہ کے بارے میں بعض حضرات کو سخت اشکال واقع ہوا ہے، ان کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اقتصادی زندگی جس تنگی و سختی اور فقر و افلاس سے بھری ہوئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے آپ کے پاس مال

کہاں تھا خصوصاً مکہ کے قیام کے دوران تو آپ بہت سخت مصائب آلام میں مبتلا تھے، ایسی صورت میں حضرت فاطمہؓ سے آپ کے اس فرمانے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ از قسم مال جو بھی چیز تم چاہو مجھ سے مانگ سکتی ہو اور میں تمہیں وہ چیز دوں گا؟ لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس اشکال کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی، اول تو اس وجہ سے کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى (یعنی اور ہم نے آپ کو محتاج و مفلس پایا تو غنی (مالدار کر دیا) چنانچہ مفسرین کہتے ہیں کہ غنی و مالدار کر دیا) سے حضرت خدیجہؓ کے مال و دولت کی طرف اشارہ ہے جو ان کے ساتھ نکاح کے بعد حضور ﷺ کے قبضہ تصرف میں آیا اور آپ جس طرح چاہتے تھے اس مال و دولت کو خرچ کرتے تھے، لہٰذا معلوم ہوا کہ اس وقت حضور ﷺ بالکل تہی دست نہیں تھے، دوسرے یہ کہ "مال" کا اطلاق تھوڑے مال اور زیادہ مال دونوں پر ہوتا ہے پس یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی کہ آپ کے پاس از قسم مال، مطلق کچھ بھی نہیں تھا، اور تیسرے یہ کہ مذکورہ جملہ کا ہونا اسی صورت میں کب ضروری ہے جب کہ آپ کے پاس اس وقت مال موجود رہا ہو، اس جملہ کے ذریعہ آپ کی مراد یہ بھی تو ہو سکتی تھی کہ اگر میرے پاس کچھ مال و اسباب آیا اور خدا نے مجھے کچھ دیا تو تم اس میں سے جو چاہنا مانگ لینا وہ میں تمہیں دے دوں گا لیکن جہاں تک آخرت کی نجات کا تعلق ہے اس کا میری ملکیت و قدرت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور میں یہ چیز تمہیں دینے پر قادر نہیں ہوں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اُمت محمدیہ کی فضیلت

(۴) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمَّتِیْ ھٰذِہٖ اُمَّۃٌ مَرْحُوْمَۃٌ لَیْسَ عَلَیْھَا عَذَابٌ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابُھَا فِی الدُّنْیَا اَلْفِتَنُ وَالزَّلَازِلُ وَالْقَتْلُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری یہ اُمت اُمت مرحومہ ہے (یعنی دوسری امتوں کی بہ نسبت میری اُمت کے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت زیادہ ہے کیونکہ ان کے نبی کی شان بھی رحمۃ للعالمین ہے) اس اُمت پر آخرت میں عذاب نہیں ہوگا اور دنیا میں اس کا عذاب، فتنے، زلزلے اور ناحق قتل ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "آخرت میں عذاب نہیں ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں دائمی عذاب یا سخت عذاب جو کفار و مشرکوں کے لئے ہے اس اُمت پر نہیں ہوگا بلکہ اس کا عذاب یہ ہے کہ جو لوگ برے اعمال کرتے ہیں اور دین و شریعت کے راستہ پر نہیں چلتے ان کو سزا کے طور پر اس دنیا میں مختلف فتنوں، آفتوں، امراض اور طرح طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا جاتا ہے! یہ بات اس آیت کریمہ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ کی مراد سے بھی واضح ہوتی ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے اور حدیث کے الفاظ عَذَابُھَا فِی الدُّنْیَا الخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے حدیث خاص طور سے ان مسلمانوں کے حق میں ہے جو کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے! اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث کا روئے سخن اس اُمت کی ایک مخصوص جماعت یعنی صحابہ کرام کی طرف ہو مظہرؒ نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث نہایت پیچیدہ مفہوم کی حامل ہے کیونکہ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اُمت کے کسی بھی فرد کو آخرت میں عذاب نہیں دیا جائے گا خواہ وہ گناہ کبیرہ کرے یا جو چاہے کرتا پھرے! اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی و توفیق کے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا سوائے اس سے کہ یہ تاویل کی جائے کہ یہاں اُمت سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام کی فرمانبرداری کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی بھی کامل پیروی کرے اور ان چیزوں سے پوری طرح پرہیز کرے جن کو اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

"دنیا میں اس کا عذاب..... کا مطلب یہ ہے کہ میری اُمت کے لوگ زمانہ کے جن حادثات سے دوچار ہوتے ہیں جیسے زلزلے آتے

ہیں اور جان و مال کو نقصان میں مبتلا کرتے ہیں، سیلاب آتے ہیں اور سخت تباہی پھیلاتے ہیں، لوٹ مار مچتی ہے اور مسلمانوں کے جان و مال کو نقصان پہنچتا ہے، یا اسی طرح کی دیگر آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، اور یہ سب چیزیں ان لوگوں کے گناہوں خطاؤں اور بد عملیوں کے کفارہ کا موجب بنتی ہیں اور آخرت میں ان کے درجات کی بلندی کا باعث ہوتی ہیں، اسی طرح جو کشت و خون اور قتل و قتال ان کے درمیان ہوتا ہے اگر اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ مسلمان کفار اور دین کے دوسرے دشمنوں جیسے بتدعین وغیرہ کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا قتل ہونا خود موجب شہادت ہوتا ہے یعنی ان مسلمانوں کو شہید کا درجہ ملتا ہے جو ایک بہت بڑی سعادت ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مسلمان خود آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں تو دیکھا جائے گا کہ ان کا باہمی قتل و قتال اور کشت و خون کس بنا پر ہے، اگر ایسا ہے کہ دونوں فریق کسی ایسے معاملہ میں بر سر جنگ ہو گئے ہیں جس کی حیثیت شرعی نقطہ نظر سے واضح نہیں ہے اور اشتباہ و تاویل کے سبب دونوں کا حق پر ہونا ثابت ہو سکتا ہے تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ دونوں فریق سلامتی پر ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی ظالم قرار نہیں دیا جائے گا، اور اگر ان کا باہم بر سر جنگ ہونا اور ایک دوسرے کا کشت و خون کرنا کسی ایسے معاملہ کی وجہ سے ہے جس کی حیثیت و حقیقت بالکل واضح ہے اور ایک فریق صریحاً ظلم و زیادتی پر ہے تو جو فریق مظلوم ہو گا اس کو ماجور قرار دیا جائے گا۔

بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ عذاب قبر اس اُمت مرحومہ و مغفورہ کے خصائص میں سے ہے، یعنی مسلمانوں کو قبر کے عذاب میں اس لئے مبتلا کیا جاتا ہے کہ ان کے نامہ اعمال میں گناہ و معصیت کی جو گندگی ہے اس کو عالم برزخ میں دھو دیا جائے اور وہ مسلمان عذاب قبر کی صورت میں اپنے گناہوں سے پاک و صاف ہو کر آخرت میں پہنچیں اور وہاں کے عذاب کا منہ نہ دیکھنے پائیں۔

مختلف زبانوں اور مختلف ادوار کے بارے میں پیش گوئی

⑤ وَعَنْ اَبِیْ عُبَیْدَةَ وَمَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ بَدَءَ نُبُوَّةً وَّرَحْمَةً ثُمَّ یَکُوْنُ خِلَافَةً وَّرَحْمَةً ثُمَّ مُلْکًا عَضُوْضًا ثُمَّ کَائِنٌ جَبْرِیَّةً وَعُتُوًّا وَفَسَادًا فِی الْاَرْضِ یَسْتَحِلُّوْنَ الْحَرِیْرَ وَالْفُرُوْجَ وَالْخُمُوْرَ یُرْزَقُوْنَ عَلٰی ذٰلِکَ وَیُنْصَرُوْنَ حَتّٰی یَلْقَوُا اللّٰہَ۔ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبیدہ بن جراحؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ (جو دونوں اونچے درجہ کے صحابہ میں سے ہیں) رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا یہ امر (یعنی دین اسلام) نبوت و رحمت کے ساتھ ظاہر ہوا (یعنی دین اسلام سب سے پہلے جس زمانہ میں ظاہر ہوا وہ زمانہ نزول وحی اور رحمت و نورانیت کا زمانہ ہے) پھر اس (دین اسلام) کا جو زمانہ آئے گے وہ خلافت و رحمت کا زمانہ ہو گا، پھر اس (دین اسلام) کا جو زمانہ آئے گا وہ کاٹ کھانے والی بادشاہت کا زمانہ ہو گا اور پھر اس (دین) کا جو زمانہ آئے گا وہ ظلم و جور، قہر و تکبر اور زمین پر فتنہ و فساد کا زمانہ ہو گا، اس وقت لوگ ریشمی کپڑوں کو جائز (جان کر استعمال) کریں گے، عورتوں کی شرمگاہوں کو اور شراب (کی تمام انواع و اقسام) کو حلال قرار دیں گے۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود ان کو رزق دیا جائے گا اور (کفار اور ان کے مخالفین کے مقابلہ پر) ان کی مدد کی جائے گی یہاں تک وہ (روز جزا) اللہ تعالیٰ سے جا ملیں گے (یعنی لوگ اگرچہ اتنی سخت بد عملیوں اور خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہوں گے اور اس اعتبار سے وہ عذاب خداوندی کے مستوجب اور ہلاکت و تباہی کے مستحق ہوں گے۔ مگر حق تعالیٰ کی اس رحمت کے سبب کہ جو اُمت مرحومہ کے لئے مخصوص ہے ان کو یہاں عذاب میں مبتلا نہیں کیا جائے گا! اور اس میں شاید حق تعالیٰ کی کوئی حکمت پوشیدہ ہو مثلاً یہ کہ ان سے مخلوق خداوندی کے نظم و نسق اور انتظام مملکت کا وہ کام لیا جانا مقصود ہو گا جس کی اہلیت و صلاحیت وہی رکھیں گے یا یہ کہ اگر وہ لوگ خود فاسق و بدکار ہوں گے لیکن ان کے ہاتھوں دین کی اصلاح و درستی کا کوئی کام انجام پانا مقدر ہو گا۔" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: لفظ "بَدَا" الف کے ساتھ ہے جس کے معنی ہیں "ظاہر ہوا" اور بعض نسخوں میں یہ لفظ ہمزہ کے ساتھ ہے جس کے معنی شروع ہونے" کے ہیں، اس صورت میں گویا ترجمہ یہ ہوگا کہ یہ امر یعنی دین اسلام) کا ابتدائی زمانہ وحی سے شروع ہوا اور ذات رسالت ﷺ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے وقت تک باقی رہا۔

اس ارشاد گرامی اسلامی تاریخ کے ان ادوار اور زمانوں کے بارے میں پیشگوئی فرمائی گئی ہے جس سے مسلمانوں کا کارواں گزرا یا گزرے گا۔ پہلا زمانہ تو وہ ہوگا جس میں دین اسلام کی ابتداء اور اس کا ظہور ہوا ہے اور جو نزول وحی کے وقت سے شروع ہو کر آنحضرت ﷺ کے آخر زندگی تک باقی رہا یہ زمانہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سراسر رحمت و نورانیت اور خیر و سعادت کا زمانہ تھا ذات رسالت ﷺ کی موجودگی کی وجہ سے دین میں کسی رخنہ اندازی، احکام شریعت میں کسی ابہام و تشکیک، مسلمانوں کی نظریاتی و عملی زندگی میں کسی گمراہی و ضلالت اور عام حالات میں کسی فتنہ و فساد کے پیدا ہونے کا کوئی خوف تک نہ تھا! حضور ﷺ کے بعد جو زمانہ آیا وہ خلافت کا زمانہ تھا، حضور ﷺ کی صحبت و رفاقت سے فیض اٹھائے ہوئے اور ذات رسالت پناہ کے تربیت یافتہ افراد میں سے سب سے زیادہ افضل، سب سے زیادہ باعظمت اور ایمان و عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل انسان حضور کے نائب و خلیفہ بنے، مسلمانوں کی زمام کار ان کے ہاتھوں میں آئی اور وہ دین و ملت کے معاملات کے والی و نگہبان بنے ان پاک نفس حضرات نے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر متمکن رہ کر جتنے دنوں تک مملکت و ملت کا نظم و نسق چلایا وہ پورا زمانہ گویا پھر ایک مرتبہ رحمت و نورانیت کا زمانہ رہا کہ خلفاء راشدین اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طور پر مسلمانوں پر سایہ فگن اور خیر و برکت کے نزول کا باعث بنے رہے اور ان کے زمانہ میں نیکیوں اور بھلائیوں کا دور دورہ رہا مسلمان اخلاص و ایثار اور عمل کردار کی پختگی کا نمونہ بنے رہے اور ان کے طفیل میں یہ زمین عام طور پر امن و سکون اور) اطمینان و عافیت کا گہوارہ رہی۔ وہ زمانہ کہ جس کو خلافت و رحمت کا زمانہ کہا گیا ہے، تیس سال کے شب و روز پر مشتمل تھا ان تیس سالوں میں سے ساڑھے انتیس سال تو چاروں خلفاء راشدین کے مجموعی زمانہ خلافت کے ہیں اور باقی چھ ماہ کا عرصہ وہ ہے جس میں حضرت حسنؓ مسند خلافت پر متمکن رہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضور ﷺ کے وصال کے بعد ربیع الاول ۱۱ھ میں خلیفہ رسول مقرر ہوئے اور جمادی الثانی ۱۳ھ میں ان کی وفات ہوئی! حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مرض الموت میں صاحب الرائے مسلمانوں کے مشورہ سے حضرت عمر فاروقؓ کو اپنا جانشین نامزد فرمادیا تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے جمادی الثانی ۱۳ھ میں خلافت کا منصب سنبھالا اور آخر ذی الحجہ ۲۳ھ تک اس منصب پر فائز رہے، ۲۷ ذی الحجہ کو ایک نصرانی غلام ابولؤلوء (اصل نام فیروز) نے آپ کو نماز فجر کی) امامت کی حالت میں خنجر سے حملہ کر کے سخت زخمی کر دیا تھا جس کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکے اور یکم محرم ۲۴ھ کو فوت ہو کر مدفون ہوئے! حضرت عمرؓ نے اپنے آخری دنوں میں پانچ جلیل القدر اور ممتاز صحابہ حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ، حضرت سعد ابن وقاصؓ، حضرت زبیر ابن عوامؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کو نامزد فرمادیا تھا کہ یہ حضرات آپس میں مشورہ کر کے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنالیں، چنانچہ ان حضرات نے کافی غور و خوض اور باہمی مشورہ کے بعد حضرت عثمان ابن عفانؓ کو اپنا امیر اور تیسرا خلیفہ منتخب کر لیا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت محرم ۲۴ھ سے شروع ہوئی اور ذی الحجہ ۳۰ھ تک رہی جب کہ اس ماہ کی ۱۸ تاریخ کو خلافت کے باغیوں اور بلوائیوں کی ایک بڑی جماعت نے آپ کو مکان میں محصور کر کے بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ایک ہفتہ بعد ۲۵ ذی الحجہ ۳۵ھ کو حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ پر مدینہ منورہ میں عام بیعت ہوئی اور اس طرح وہ چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے اور) اور رمضان ۴۰ھ کو ان کی خلافت کا دور ختم ہوا جب کہ عبدالرحمن ابن ملجم کے زخمی کر دینے کی وجہ سے ان کی وفات ہوئی۔ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کے بڑے صاحبزادے حضرت امام حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی خلافت قائم ہوئی، لیکن حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے آویزش جو سلسلہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں شروع ہوا تھا وہ ان کی وفات کے بعد اور زیادہ بڑھ گیا اور جب سیادت و امارت کے مسئلہ پر مسلمانوں میں افتراق و انتشار زیادہ بڑھنے لگا اور مخالف

فریقوں کے درمیان کشت وخون کا خطرہ زیادہ سنگین ہوگیا تو حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ انہوں نے ربیع الاول ۴۱ھ تک کا تیس سالہ دور وہ زمانہ ہے جس کو اس حدیث میں خلافت ورحمت کا زمانہ فرمایا گیا ہے اور اس زمانہ میں ان خلفاء راشدین نے آنحضرت ﷺ کے نائب وخلیفہ ہونے کی حیثیت سے اخلاص ودیانت، اور عدل وانصاف کے ساتھ اور حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنا کر دین اسلام کی خدمات انجام دیں، مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی قیادت و سیادت کی ذمہ داریوں کو حسن وخوبی کے سات نبھایا اور اسلام کی عظمت وشوکت کا جھنڈا بلند کیا۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس خلافت کی فضیلت اس حدیث میں بیان کی گئی ہے اور جو واقعتاً ذات رسالت ﷺ کی نیابت تھی اس میں امیر معاویہؓ کا کوئی حصّہ نہیں ہے کہ ان کا دور حکمرانی اس زمانہ سے الگ ہے۔ جس کو خلافت ورحمت کا زمانہ فرمایا گیا ہے۔

"عض" کے معنی کاٹنے کے ہیں اور "عضوض" (عین کے زبر کے ساتھ) اسی لفظ سے نکلا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے اور ایک روایت میں ملو کا عضوضار (عین کے پیش کے ساتھ) منقول ہے جو عض (عین کے زیر کے ساتھ) کی جمع ہے اور جس کے معنی خبیث، شریر، اور بد خلق کے ہیں مطلب یہ ہے کہ "خلافت ورحمت" کے زمانہ کے بعد جو دور آئے گا وہ ملوکیت (بادشاہت) کا دور ہوگا اور ایسے ایسے لوگ ملک کے بادشاہ حکمران اور مسلمانوں کے سردار و حاکم بن بیٹھیں گے جن کے دلوں میں نہ خدا خوف اور مواخذہ آخرت کا ڈر ہوگا اور نہ مخلوق خدا کے تئیں ہمدردی ومروت اور عدل وانصاف کا احساس ہوگا اس لئے وہ اپنے مالک اور اپنی قوم کے لوگوں پر ظلم وجبر کریں گے ان کو ناحق سزاؤں اور عقوبتوں میں مبتلا کریں گے اور ان کو طرح طرح سے ستائیں گے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ بات غالب واکثریت کے اعتبار سے کہی گئی ہے یعنی اکثر بادشاہ حکمراں ایسے ہوں گے، اور چونکہ شاذونادر پر حکم نہیں لگایا جاتا کہ اَلنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ اس لئے یہ اشکال پیدا نہیں ہوسکتا کہ حدیث میں خلافت راشدہ کے بعد کے حکمرانوں اور باشاہوں کے زمانہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، کیا اس کا اطلاق ان حکمرانوں کے رانوں پر بھی ہوتا ہے۔ جو عدل وانصاف، مذہب وملت کی خدمت گذاری اور خدا ترسی کے اوصاف سے پوری طرح آراستہ تھے؟ مثال کے طور پر حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا دور حکمرانی ہے، انہوں نے جس عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی کی اور ان کا دور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں جس طرح خیر وبھلائی کا باعث بنا اس کی بنیاد پر عمر ثانی کہا گیا ہے حاصل یہ کہ خلافت راشدہ کے بعد جن لوگوں نے مسلمانوں پر حکمرانی کی، اور جو لوگ بادشاہ بنے ان میں سے اکثر ایسے تھے جن کا دور حکمرانی مذہب وملت کے حق میں مفید ثابت ہوئے اور اپنے عوام کے لئے خیر وبرکت اور راحت واطمینان کا باعث بنے وہ استثنائی حکم رکھتے ہیں۔

"ظلم وجور، قہر وتکبر اور زمین پر فتنہ وفساد کا زمانہ ہوگا" مطلب یہ ہے کہ آخر میں جو زمانہ آئے گا وہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اور زیادہ سخت ہوگا، نااہل لوگ تخت حکومت پر بیٹھیں گے، ظلم اور زیادتی اور انتشار وبدامنی کا دور دورہ ہوگا، عام لوگوں کی جان ومال اور عزت آبرو غیر محفوظ ہوگی ہر طرف لوٹ مار، قتل وغارتگری کا بازار گرم ہوگا، اور انسانیت کو تباہ کرنے والی ہر طرح کی برائیاں روئے زمین پر پھیل جائیں گی۔ چنانچہ جیسا کہ ہم اپنے زمانہ میں دیکھ رہے ہیں یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہورہی ہے، کیونکہ حکومت واقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے جو آئین جہانبانی سے ناواقف ہیں، جنہوں نے ظلم وجور کو اپنا شعار بنا رکھا ہے اور مسلم ممالک جہاں مذہب وملت کے اصولوں کی فرمانبرداری ہونی چاہئے وہاں طاغوتی طاقتیں برسر حکومت ہیں ظالم وجابر لوگوں نے زور زبردستی اور مکروفریب کے ساتھ اقتدار کے ایوانوں پر قبضہ کر لیا ہے وہ نہ قیادت وسیادت کے اصول وشرائط کو پورا کرتے ہیں، نہ اپنے عوام کی دینی ودنیاوی بھلائی وبہتری سے انہیں کوئی تعلق ہے وہ اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے فتنہ وفساد کے بیج بوتے ہیں تباہ کن سازشیں کرتے ہیں، عوام پر نت نئے ظلم ڈھاتے ہیں جو بندگان خاص انہیں راہ راست دکھانا چاہتے ہیں ان کو طرح طرح کی صعوبتوں میں مبتلا کرتے ہیں، کلیدی عہدوں اور مناسب پر اہل ولائق افراد کی بجائے موقع پرست، خود غرض اور نا اہل لوگوں کو فائز کرتے ہیں، علماء وصلحاء اور اکابرین دین، جو ہر طرح

کی عزت احترام کے مستحق ہوتے ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی طرف کوئی توجہ والتفات نہیں کی جاتی بلکہ مختلف ذرائع اور اقدامات کے ذریعہ ان کی ہتک کی جاتی ہے۔ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی پاداش میں ان کو قید وبند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

اور یہ کہ تقریباً تمام ہی مسلم حکمرانوں نے دین کے دشمنوں کے خلاف تو جہاد کے فریضہ کو ترک کر دیا، البتہ اپنی حکمرانی کی خاطر اور ملک گیری کی ہوس میں خود مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اور اپنی تلواروں کو ان کے خوف سے رنگین کیا۔ اور اسی وجہ سے بعض علماء نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو شخص ان حکمرانوں اور بادشاہوں کو عادل کہے گا وہ کافر ہو جائے گا۔

غرضیکہ ان حکمرانوں اور بادشاہ کی وجہ سے روئے زمین پر فتنہ وفساد روز افزوں ہوتا گیا خود غرضی، موقع پرستی، بد انتظامی، اور عام بدامنی وانتشار کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، یہاں تک کہ تاریخ ایسے حکمرانوں کے سیاہ کارناموں سے شرمسار ہے جو مسلمان ہوتے ہوئے ان شہروں کو تاراج کرنے اور وہاں کے لوگوں کا قتل عام کا باعث بنے، جہاں بڑے بڑے اولیا، صلحاء اور مشائخ تھے، جہاں کمزور اور ضعیف لوگ بچے، اور عورتیں تھیں، اور جن کو قتل کرانے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں تھی، مزید ستم یہ کہ اس شہر کے لوگ ملت حنیفہ سے تعلق رکھتے تھے، اور اہل سُنت والجماعت میں شامل تھے۔ اور ان کا قتل عام کرنے والے مدعی سلطنت اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ ہم دین وشریعت کے حامی ومددگار ہیں، اور اہل علم وبزرگان دین کی تعظیم کرتے ہیں۔

علماء نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ اگر مسلمان دشمنان دین کے کسی ایسے قلعہ کو فتح کریں جس میں ہزاروں اہل حرب اور دشمنان دین پائے جائیں لیکن ان ہزاروں میں کوئی ایک مجہول الحال ذمی بھی موجود ہو تو محض اس ذمی کی وجہ سے مفتوح قلعہ میں قتل عام کرنا ہرگز درست نہیں ہوگا۔ مگر وہ حکمران اور بادشاہ حشر کے دن آخر کیا جواب دیں گے جنہوں نے محض اپنے اقتدار اور اپنی بادشاہت قائم کرنے کے لئے مسلمانوں تک کا قتل عام کرایا ہے اور ان کے شہروں وآبادیوں کو چشم وزدن میں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارے نالائق ونا اہل مسلم حکمرانوں ہی کی وجہ سے ایسے ایسے فتنہ وفساد رونما ہوئے اسلامی سلطنتوں میں اس قدر تباہیاں آئیں اور اتنا زیادہ کشت وخون ہوا کہ روئے زمین پناہ مانگنے لگی، یہاں تک کہ حرمین شریفین بھی ان فتنہ وفساد سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان مقدس شہروں میں اتنے تباہ کن اور بھیانک واقعات رونما ہوئے کہ قلم کو مجال بیان نہیں اور ان کی تفصیل کو ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور اپنے دین کا بہترین کارساز) اور اپنے نبی ﷺ اور اس کی اُمت کا حامی ومددگار ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آنے والا ہر سال، بلکہ ہر دن، اور بلکہ ہر لمحہ، پہلے کی بہ نسبت بد سے بدتر ہی گزر رہا ہے۔

شراب کے بارے میں ایک پیشگوئی

(۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اَوَّلَ مَايُكْفَأُ قَالَ زَيْدُ بْنُ يَحْيَى الرَّاوِيْ يَعْنِي الْاِسْلَامَ كَمَا يُكْفَأُ الْاِنَاءُ يَعْنِي الْخَمْرَ قِيْلَ فَكَيْفَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَقَدْ بَيَّنَ اللّٰهُ فِيْهَا مَابَيَّنَ قَالَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اِسْمِهَا فَيَسْتَحِلُّوْنَهَا۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ سب سے پہلے جس کام کو اوندھا کر دیا جائے گا۔ حدیث کے راوی حضرت زید ابن یحییٰؒ نے وضاحت کی کہ یعنی اسلام میں (سب سے پہلے جس کام کو اوندھا کر دیا جائے گا) جیسے برتن اوندھا دیا جاتا ہے وہ شراب ہوگی۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! یہ کیونکر ہوگا جب شراب کے متعلق اللہ کے وہ احکام بیان ہو چکے ہیں جو سب پر ظاہر بھی ہو گئے ہیں؟ یعنی جب شراب کی حرمت نازل ہو چکی ہے اور نہایت سختی کے ساتھ مسلمانوں کو اس چیز سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس حرمت اجتناب کا یہ حکم اتنا واضح، اتنا عام اور اس قدر تاکید کے ساتھ ہے کہ سب مسلمان اس سے واقف وآگاہ ہو گئے ہیں تو

پھر ایسا کس طرح ہوگا کہ اس کا حکم بدل دیا جائے گا اور وہ مسلمانوں کو اسلام کی مخالفت کی راہ پر لیجائے گی؟ حضور نے فرمایا۔ "لوگ حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ اس کو پینا شروع کر دیں گے اور طریقہ یہ اختیار کریں گے کہ) اس کا نام بدل دیں گے اور اس کو حلال قرار دے لیں گے۔" (دارمیؒ)

تشریح: "مَایُکْفَأُ" اصل میں لفظ "کفاء" کا صیغہ مجہول ہے، جس کے معنی ہیں برتن وغیرہ کو اوندھا دینا الٹ دینا تاکہ اس میں پانی وغیرہ جو بھی چیز ہو وہ گر جائے۔

"یعنی الْاِسْلَام" کے الفاظ حدیث کے ایک راوی زیدؒ نے بیان کئے ہیں اور ان میں بھی الاسلام سے پہلے "فی" کا لفظ تھا جو راوی سے ساقط ہو گیا ہے۔ کسی مجلس یا خطبہ میں حضور ﷺ شراب کا ذکر اور اس کا حکم بیان فرما رہے تھے کہ آپ ﷺ نے اس اثنا میں اول مایکفاء ارشاد فرمایا چنانچہ راوی نے اس ارشاد کو واضح کرنے کے لئے اس جملہ کی خبر، جو محذوف تھی، اپنے الفاظ الخمر کے ذریعہ بیان کی "پس"، "یعنی الخمر" کا لفظ بھی راوی کا ہے جو یہ مراد بیان کرتا ہے کہ اسلام میں جس چیز کو سب سے پہلے الٹ دیا جائے گا وہ شراب ہے۔ بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب آخر زمانہ میں مسلمانوں کی دینی زندگی میں بہت الٹ پھیر ہو جائے گا اور مذہب کے ساتھ ان کا تعلق کمزور ہو جائے گا تو اس وقت حرام و ناجائز چیزوں میں سے سب سے پہلے جس چیز کا کھلم کھلا ارتکاب ہوگا اور اسلام کے احکام میں سے سب سے پہلے جس حکم کو ساقط کر دیا جائے گا وہ شراب اور اس کا حکم ہے کہ لوگ نہ صرف شراب نوشی اختیار کریں گے بلکہ مختلف حیلوں بہانوں اور تاویلوں کے ذریعہ اس کو حلال و جائز قرار دینے کی سعی بھی کریں گے، مثلاً اس کا نام بدل کر کسی ایسے مشروب کے نام پر رکھ دیں گے جس کا پینا جائز ہے، جب کہ حقیقت میں وہ شراب ہوگی، یا اس کو کسی دوسرا اجزاء جیسے شہد اور چاول وغیرہ کے ساتھ بنائیں گے اور کہیں گے کہ اسلام میں جس چیز کو "خمر" یعنی شراب کہا گیا ہے اور جس کا پینا حرام ہے وہ انگور کا پانی ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور یہ مشروب چونکہ انگور سے نہیں بنایا گیا ہے اس لئے اس کو پینا حرام نہیں ہے، حالانکہ وہ نہیں جانیں گے کہ جو بھی چیز نشہ پیدا کرنے والی ہے وہ حرام ہے اور "خمر" کے حکم میں ہے۔

اور اس کو حلال قرار دے لیں گے۔" کی دو صورتیں ہوں گی، ایک تو یہ کہ وہ لوگ واقعتاً اس کو حلال جانیں گے، اس صورت میں وہ کافر ہو جائیں گے کیونکہ شریعت نے جس چیز کو وضاحت کے ساتھ حرام قرار دیا ہے اس کو حلال جاننا کفر ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس کو واقعتاً حلال قرار نہیں دیں گے بلکہ اس کو اسی طرح کھلم کھلا پئیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ گویا ہم حلال چیز پیتے ہیں، اس صورت میں ان پر کفر کا نہیں بلکہ فسق کا حکم لگے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مسلمانوں کے مختلف زمانوں کے بارے میں ایک پیشگوئی

(۷) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ۔ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًا فَيَكُوْنُ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَّكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ يَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَيَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ ثُمَّ سَكَتَ قَالَ حَبِيْبٌ فَلَمَّا قَامَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ كَتَبْتُ اِلَيْهِ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اُذَكِّرُهٗ اِيَّاهُ وَقُلْتُ اَرْجُوْا اَنْ تَكُوْنَ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بَعْدَ الْمُلْكِ الْعَاضِّ وَالْجَبْرِيَّةِ فَسُرَّبِهٖ وَاَعْجَبَهٗ يَعْنِيْ عُمَرَبْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"حضرت نعمان ابن بشیر حضرت حذیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے درمیان، نبوت کا

وجود اور اس کا نور اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ تعالیٰ (نبی کو اپنے پاس بلالینے کے ذریعہ) نبوت کو اٹھالے گا اس کے بعد نبوت کے طریقہ پر خلافت قائم ہوگی اور وہ اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ (یعنی تیس سال تک) پھر اللہ تعالیٰ خلافت کو بھی اٹھالے گا اس کے بعد کاٹ کھانے والی بادشاہت کی حکومت قائم ہوگی (یعنی ایسے لوگوں کی بادشاہت کا زمانہ آئے گا جو آپس میں ایک دوسرے کو اس طرح کاٹیں گے جس طرح کتے کاٹتے ہیں، اور وہ بادشاہت اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس بادشاہت کو بھی اس دنیا سے اٹھالیگا اس کے بعد قہر تکبر اور زور زبردستی والی بادشاہت کی حکومت قائم ہوگی اور وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس بادشاہت کو بھی اٹھالے گا، اس کے بعد پھر نبوت کے طریقہ پر (یعنی عدل وانصاف کو پورے طور پر جاری کرنے والی، خلافت قائم ہوگی (اور اس "خلافت" سے مراد حضرت عیسیٰ اور حضرت مہدی علیہما السلام کا زمانہ ہے) اتنا فرما کر آپ خاموش ہوگئے۔"

حضرت حبیب ابن سالم نے (جو اس حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی ہیں اور حضرت نعمان ابن بشیر کے آزاد کردہ غلام اور ان کے کاتب تھے، نیز ان سے حضرت قتادہؒ وغیرہ روایتیں نقل کرتے ہیں) بیان کیا کہ جب حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ مقرر ہوئے (اور انہوں نے نبوت کے طریقہ پر حکومت قائم کی) تو میں نے اس حدیث کی طرف ان کی توجہ مبذول کرنے کے لئے یہ حدیث لکھ کر ان کے پاس بھیجی اور اپنے اس احساس کا اظہار کیا کہ مجھ کو امید ہے کہ آپ وہی امیر المؤمنین یعنی خلیفہ، ہیں جس کا ذکر اس حدیث میں کاٹ کھانے والی بادشاہت اور قہر و تکبر اور زور و زبردستی والی بادشاہت کے بعد آیا ہے۔

وہ یعنی عمر ابن عبد العزیزؒ اس بات سے بہت خوش ہوئے اور اس تشریح نے ان کو بہت مسرور کیا (یعنی اس بات کی امید و آرزو نے ان کو بھی بہت خوش کیا کہ حدیث میں جس آخری خلافت کا ذکر کیا گیا ہے شاید اس کا اطلاق میرے زمانہ خلافت ہی پر ہو) اس روایت کو امام احمدؒ نے (اپنی مسند میں) اور بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔

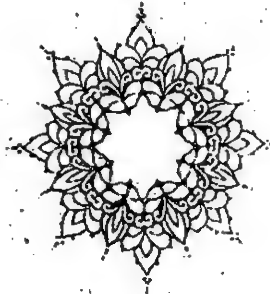

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الفتن

فتنوں کا بیان

"فِتَن" اصل میں فِتْنَةٌ کی جمع ہے جیسا کہ مِحَن مِحْنَةٌ کی جمع آتی ہے فتنہ کے مختلف معنی ہیں مثلاً آزمائش وامتحان، ابتلا، گناہ، فضیحت، عذاب، مال ودولت، اولاد، بیماری، جنون، محنت، عبرت، گمراہ کرنا وگمراہ ہونا، اور کسی چیز کو پسند کرنا اور اس پر فریفتہ ہونا نیز لوگوں کی رائے میں اختلاف پر بھی فتنہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مشکوٰۃ کا وہ حصہ جو یہاں سے شروع ہو کر آخر تک ہے اس کو مؤلف نے کتاب الفتن کا نام دیا ہے اور اس کے ضمن میں مختلف ابواب قائم کئے ہیں، بظاہر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، خصوصا، فضائل ومناقب کے ابواب کو کتاب الفتن میں شامل کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، اگر یہ کہا جائے کہ ان ابواب میں جن مقدس ہستیوں یعنی ذات رسالت پناہ ﷺ اور خلفائے راشدین و اکابر صحابہ کرام کے فضائل ومناقب بیان کئے گئے ہیں ہم ان کی عظمت وبرتری اور بزرگی کا اعتقاد رکھنے کے مکلف اور اس اعتقاد کو اپنے عمل سے ثابت کرنے کے امتحان وآزمائش میں مبتلا ہیں نیز ان کی ذات کے گرویدہ اور ان پر فریفتہ ہیں اور اس اعتبار کو ملحوظ رکھا جائے تو پوری کتاب میں جو کچھ منقول ومذکور ہے وہ سب اسی قبیل سے ہے اور اس صورت میں محض کتاب الفتن کی تخصیص لاحاصل ہوگی! بہر حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس موقع پر مؤلف مشکوٰہ کے ذہن میں کیا بات تھی اور انہوں نے کن وجوہ کی بنا پر یہاں سے کتاب کے آخر تک کے حصہ کو کتاب الفتن کا نام دیا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضور ﷺ نے قیامت تک ظاہر ہونے والے تمام فتنوں کے بارے میں پیشگوئی فرمادی تھی

(۱) عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقَامًا مَاتَرَكَ شَيْئًا يَكُوْنُ فِيْ مَقَامِهٖ ذٰلِكَ اِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ اِلَّا حَدَّثَ بِهٖ حَفِظَهٗ مَنْ حَفِظَهٗ وَنَسِيَهٗ مَنْ نَسِيَهٗ قَدْ عَلِمَهٗ اَصْحَابِيْ هٰؤُلَاءِ وَاِنَّهٗ لَيَكُوْنُ مِنْهُ الشَّيْءُ قَدْ نَسِيْتُهٗ فَاَرَاهُ فَاَذْكُرُهٗ كَمَا يَذْكُرُ الرَّجُلُ اِذَا غَابَ عَنْهُ ثُمَّ اِذَا رَاٰهُ عَرَفَهٗ۔ (متفق علیہ)

"حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے جیسا کہ (وعظ وخطبہ کے لئے) کھڑے ہوتے ہیں (چنانچہ آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور وعظ کہا جس کے دوران آپ ﷺ نے ان فتنوں سے آگاہ فرمایا جو ظاہر ہونے والے تھے) پس از قسم فتنہ جو چیزیں اس وقت (یعنی زمانہ نبوی) سے لے کر قیامت تک وقوع پذیر ہونے والی تھیں ان سب کو ذکر فرمایا اور ان میں سے کوئی چیز (بیان کرنے سے) نہیں چھوڑی ان باتوں کو یاد رکھنے والوں نے یاد رکھا اور جو بھولنے والے تھے وہ بھول گئے (یعنی آپ ﷺ نے جن

فتنوں کا ذکر فرمایا ان کو بعض لوگوں نے تو یاد رکھا اور بعض لوگوں نے فراموش کر دیا، حضرت حذیفہؓ نے یہ بھی فرمایا کہ) میرے یہ دوست (یعنی صحابہؓ جو اس وقت بقید حیات ہیں) اس واقعہ سے (کہ آپ ﷺ نے اس دن اپنے خطبہ میں قیامت تک ظاہر ہونے والے فتنوں کا ذکر فرمایا تھا) واقف ہیں (لیکن ان میں سے بعض حضرات حضور ﷺ کی بیان فرمودہ ان باتوں کو جانتے ہیں اور بعض حضرات کو وہ باتیں تفصیل کے ساتھ یاد نہیں رہی ہیں کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ نسیان کا طاری ہو جانا انسانی خواص میں سے ہے اور جیسا کہ بیان کیا گیا میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوں جو ان باتوں کو پوری طرح یاد نہیں رکھ سکے ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جن باتوں کی خبر دی تھی اور جن باتوں کو میں بھول گیا ہوں اگر ان میں سے کوئی بات پیش آجاتی ہے تو میں اس کو دیکھ کر اپنا حافظہ تازہ کر لیتا ہوں جس طرح کہ جب کسی غائب شخص کا چہرہ نظر آجاتا ہے تو وہ چہرہ دیکھ کر اس شخص کو پہچان لیا جاتا ہے (یعنی عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص بہت عرصہ تک غائب رہتا ہے تو اس کی شخصیت ذہن سے اوجھل ہو جاتی ہے اور لوگ اسے بھول جاتے ہیں لیکن جب بھی وہ ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کا چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے تو اس کی بھولی ہوئی شخصیت فوراً یاد آجاتی ہے اور وہ شخص کے ساتھ پہچان لیا جاتا ہے، اسی طرح میرا معاملہ بھی یہ ہے کہ اس دن حضور ﷺ نے جو باتیں پیش گوئی فرمائی تھیں وہ تفصیلی طور پر میرے ذہن میں نہیں رہی ہیں لیکن جب ان باتوں میں سے کوئی بات پیش آجاتی ہے اور حضور ﷺ نے جن چیزوں کی خبر دی تھی ان میں سے کوئی چیز وقوع پذیر ہوتی ہے تو اس کو دیکھ کر میں فوراً پہچان لیتا ہوں یہ وہی بات ہے جس کی خبر حضور ﷺ نے دی تھی۔" (بخاری ومسلم)

قلب انسانی پر فتنوں کی یلغار

(۲) وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ تُعْرَضُ الْفِتَنُ عَلَى الْقُلُوْبِ كَالْحَصِيْرِ عُوْدًا عُوْدًا۔ فَاَيُّ قَلْبٍ اُشْرِبَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ وَاَيُّ قَلْبٍ اَنْكَرَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ بَيْضَاءُ حَتّٰى يَصِيْرَ عَلٰى قَلْبَيْنِ اَبْيَضَ مِثْلُ الصَّفَا فَلَا تَضُرُّهُ فِتْنَةٌ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَالْاٰخَرُ اَسْوَدُ مُرْبَادًا كَالْكُوْزِ مُجَخِّيًا لَا يَعْرِفُ مَعْرُوْفًا وَلَا يُنْكِرُ مُنْكَرًا اِلَّا مَا اُشْرِبَ مِنْ هَوَاهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "لوگوں کے دلوں پر فتنے اس طرح ڈالے جائیں گے جس طرح چٹائی کے تنکے ہوتے ہیں (یعنی جس طرح چٹائی میں تنکے ایک کے پیچھے ایک لگائے جاتے ہیں اسی طرح سے دلوں پر ایک کے بعد ایک فتنے ڈالے جائیں گے) پس جو دل ان فتنوں کو قبول کریگا اس میں سیاہ نکتہ ڈال دیا جائے گا اور جو دل ان فتنوں کو قبول کرنے سے انکار کرے گا اس میں سفید نکتہ پیدا کر دیا جائے گا پس انسان (ان فتنوں کے پیش آنے اور ان کے دلوں پر ان فتنوں کی تاثیر وعدم تاثیر کے اعتبار سے) دو قسموں میں بٹ جائیں گے (یا یہ کہ انسان کے دل مذکورہ اعتبار کے مطابق دو قسم کے ہو جائیں گے) ایک تو سفید مثل سنگ مرمر کے (کہ جس پر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی واضح رہے کہ اس تشبیہ میں محض سفیدی مراد نہیں ہے بلکہ سختی اور قوت کا اعتبار بھی ملحوظ رکھا گیا ہے) چنانچہ اس طرح کے دل پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز اور مضرت رساں نہیں ہوگا جب تک کہ زمین وآسمان قائم وباقی ہیں (یعنی اس دل کی یہ کیفیت ہمیشہ باقی رہے گی) اور دوسرا راکھ کے رنگ جیسا سیاہ دل، اوندھے برتن کی مانند (کہ اس میں جو کچھ بھی ہو گر پڑے، مطلب یہ کہ اس طرح کا دل راکھ کی مانند سیاہ اور اوندھے برتن کی طرح ایمان ومعرفت کے نور سے خالی ہوگا) چنانچہ اس طرح کا دل نہ تو نیک واچھے اور مشروع کاموں کو پہچانے گا اور نہ برے کاموں کو برا جانے گا، وہ تو بس اس چیز سے مطلب رکھے گا جو از قسم خواہشات اس میں رچ بس گئی ہے اور جس کی محبت کا وہ اسیر بن چکا ہے۔ (یعنی وہ طبعی طور پر نفسانی خواہشات کا غلام ہوگا اور اچھی وبری کا امتیاز کئے بغیر ہر اس چیز کے پیچھے بھاگے گا جو اس کے نفس کو مرغوب ہوگی۔" (مسلم)

تشریح: "فتنوں" سے مراد بلاو آفات اور وہ چیزیں ہیں جو انسان کے ذہن وفکر اور قلب وجسم کو تعب وتکلیف اور رنج ونقصان میں مبتلا

کر لیتی ہیں لیکن بعض حضرات نے "فتنوں" کی مراد، فاسد و گمراہ نظریات، باطل افکار اور نفسانی شہوت و خواہشات کو قرار دیا ہے۔

لفظ "عودا" تین طرح سے نقل کیا گیا ہے، ایک روایت میں عین کے پیش اور دال مہملہ کے ساتھ ہے اور جیسا کہ دوسری روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ یہی زیادہ مشہور ہے! اس صورت میں حدیث کے اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ دلوں میں فتنے اس طرح ایک کے بعد ایک دو آئیں گے جیسا کہ چٹائی بنتے وقت تنکے ایک کے بعد ایک داخل کئے جاتے ہیں، اس تشبیہ سے مراد دلوں پر فتنوں کا اس طرح پیش آنا ہے جس طرح چٹائی بننے والے کے سامنے تنکے یکے بعد دیگرے پیش ہوتے رہتے ہیں! اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس تشبیہ سے یہ مراد ہے کہ وہ فتنے دل پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ دوسری روایات میں یہ لفظ عین کے زیر اور دال کے ساتھ (یعنی عوذا) ہے اس صورت میں یہ لفظ ان فتنوں سے خدا کی پناہ طلب کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ کسی گفتگو و کلام کے دوران کفر و معصیت کے ذکر کے بعد نعوذ باللہ یا معاذ اللہ کہا جاتا ہے۔ تیسری روایت میں یہ لفظ عین کے زیر اور دال مہملہ کے ساتھ (یعنی عودا) ہے اور اس سے مراد عود و تکرار ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ فتنے دل پر بار بار واقع ہوں گے۔ واضح رہے کہ پہلی روایت میں تو یہ لفظ منصوب اور مرفوع دونوں طرح نقل کیا گیا ہے اور دوسری و تیسری روایت میں صرف منصوب منقول ہے۔

"اشربھا" میں لفظ مشرب صیغہ مجہول کے ساتھ ہے! کہا جاتا ہے اُشْرِبَ فُلَانٌ حُبَّ فُلَانٍ یعنی فلاں شخص کے دل میں فلاں شخص کی محبت رچ گئی ہے، یا فلاں شخص کے دل میں فلاں شخص کی محبت کا فتنہ بیٹھ گیا ہے، یا فلاں شخص کے دل پر فلاں شخص کی محبت کا رنگ چڑھ گیا ہے جیسا کہ کسی کپڑے پر کوئی رنگ چڑھ جاتا ہے! چونکہ "شرب" کے اصل معنی پینے کے ہیں اس لئے کپڑے پر رنگ چڑھنے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ گویا وہ کپڑا اس رنگ کو پیتا ہے اور اس میں رنگ جاتا ہے پس۔ "جو دل ان فتنوں کو قبول کرلے گا" کا مطلب یہ ہے کہ جس میں کجی ہوگی اور جس کا میلان و رجحان برائی کی طرف ہوگا اس میں وہ فتنے رچ بس جائیں گے اور گویا وہ دل ان فتنوں کو اس طرح قبول کرلے گا جس طرح کوئی سفید کپڑا کسی بھی رنگ کو فوراً قبول کر لیتا ہے۔

"نکتہ" اصل میں داغ کو کہتے ہیں اور اس نشان کے معنی میں آتا ہے جو لکڑی وغیرہ کے کریدنے اور چھونے سے زمین پر پیدا ہو جاتا ہے! نیز "نکتہ" کا لفظ "نقطہ" کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور خاص طور سے اس نقطہ (دھبہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو مخالف رنگ کی چیز میں ہو جیسے سفید چیز میں سیاہ نقطہ اور سیاہ چیز میں سفید نقطہ۔

حتی تصیر علی قلبین میں لفظ "تصیر" حرف ت کے ساتھ بھی ہے اور حرف ی کے ساتھ بھی! اگر یہ لفظ ی کے ساتھ یعنی "یصیر" پڑھا جائے تو اس صورت میں اس کی ضمیر انسان کی طرف راجع ہوگی جیسا کہ سیاق کلام سے مفہوم ہوتا ہے اور اگر اس لفظ کو ت کے ساتھ تصیر پڑھا جائے تو اس کی ضمیر قلوب کی طرف راجع ہوگی جو صریحاً مذکور بھی ہے۔

"مرباد" م کے پیش اور ر کے جزم اور دال کی تشدید کے ساتھ، کے معنی خاکستر اور سیاہ رنگ کے ہیں "رُمد" کا لفظ بھی خاکستر رنگ کے معنی میں آتا ہے اور "ارمداد" کے معنی میں خاکستری رنگ کا ہونا۔

جب امانت دلوں سے نکل جائے گی

(۳) وَعَنْهُ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثَيْنِ رَأَيْتُ اَحَدَهُمَا وَاَنَا اَنْتَظِرُ الْاٰخَرَ حَدَّثَنَا اَنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِيْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ السُّنَّةِ وَحَدَّثَنَا عَنْ رَفْعِهَا قَالَ يَنَامُ الرَّجُلُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ الْاَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهٖ فَيَظَلُّ اَثَرُهَا مِثْلَ اَثَرِ الْوَكْتِ ثُمَّ يَنَامُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ فَيَبْقٰى اَثَرُهَا مِثْلَ اَثَرِ الْمَجْلِ كَجَمْرٍ دَحْرَجْتَهٗ عَلٰى رِجْلِكَ فَنَفِطَ فَتَرَاهُ مُنْتَبِرًا وَلَيْسَ فِيْهِ شَيْءٌ وَيُصْبِحُ النَّاسُ يَتَبَايَعُوْنَ وَلَا يَكَادُ اَحَدٌ يُؤَدِّى الْاَمَانَةَ فَيُقَالُ اِنَّ فِيْ بَنِيْ فُلَانٍ رَجُلًا اَمِيْنًا وَيُقَالُ لِلرَّجُلِ مَا اَعْقَلَهٗ وَمَا اَظْرَفَهٗ وَمَا اَجْلَدَهٗ وَمَا فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے ہم سے (امانت کے بارے میں اور فتنے کے زمانہ کے حوادث کے سلسلہ میں) دو حدیثیں (یعنی دو باتیں) بیان فرمائیں ان میں سے ایک کو تو دیکھ چکا ہوں اور دوسری کا منتظر ہوں (یعنی حضور نے پہلی بات جو یہ فرمائی تھی کہ امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں اتاری گئی ہے، اس کو گو میں نے دیکھ لیا ہے اور دوسری بات یعنی امانت کے اٹھ جانے کے مصداق کا منتظر ہوں) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا کہ۔ امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں اتاری گئی پھر انہوں نے (اس امانت کے نور سے) قرآن کو جانا اور پھر انہوں نے سُنّت کو جانا۔" اس کے بعد آپ نے امانت کے اٹھ جانے (یعنی ایمان کے ثمرات و برکات کے اٹھ جانے اور اس میں نقص آجانے) کی حدیث بیان کی، چنانچہ فرمایا۔ آدمی (حسب معمول) سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی (یعنی اس کے ایمان کے بعض ثمرات وانوار ناقص وکم ہو جائیں گے) پس امانت کا اثر یعنی نشان (جو ایمان کا ثمرہ ہے) وکت کے نشان کی طرح ہو جائے گا (حاصل یہ کہ ایمان کا نور دھندلا اور اس کا اثر وثمرہ ناقص ہو جائے گا) پھر جب وہ دوبارہ سوئے گا (اور زیادہ غفلت طاری ہوگی) تو اس کی امانت کا وہ حصہ بھی ناقص کر دیا جائے گا اور نکال لیا جائے گا جو باقی رہ گیا تھا پس (اس کے دل میں) ایک مجل یعنی آبلہ جیسا نشان رہ جائے گا جیسا کہ تم آگ کی چنگاری کو اپنے پاؤں پر ڈالدو اور اس سے آبلہ پڑ جائے جو بظاہر پھولا اور اٹھا ہوا ہوگا لیکن اس کے اندر (خراب اور گندے پانی کے علاوہ) کچھ نہیں ہوگا۔ پھر (اس صورت حال کے بعد) لوگ صبح کو اٹھیں گے تو حسب معمول آپس میں خرید و فروخت کریں گے اور ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جا امانت کو ادا کرے (یعنی شریعت کے حقوق ادا کرنے والا فرائض و واجبات کی تکمیل کرنے والا اور لوگوں کے حق میں کوئی خیانت وبد دیانتی نہ کرنے والا کہیں دور دور بھی نظر نہیں آئے گا) یہاں تک کہ (امانت و دیانت میں کمی آجانے کے سبب یہ کہا جائے گا کہ فلاں قبیلہ (یا فلاں شہر و آبادی) میں (لوگوں کی کثرت کے باوجود) بس ایک شخص ہے جو امانت دار یعنی کامل الایمان ہے۔ اور زبردست سیاسی مہارت وچالاکی اور دنیاوی شان وشوکت کا حامل ہوگا) یا کہا جائے گا کہ وہ (اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات میں) کس قدر عقلمند وہوشیار، کس قدر خوبصورت ودانا، خوشگوار اور زبان آور ہے اور کس قدر چست وچالاک ہے، حالانکہ اس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہوگا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "امانت" سے مراد یا تو اس کے مشہور معنی ہیں یعنی کسی کے حق میں یا کسی کی ملکیت میں خیانت نہ کرنا یا وہ تمام شرعی ذمہ داریاں مراد ہیں جو ہر شخص پر عائد کی گئی ہیں یعنی تمام اسلامی احکام وتعلیمات کو ماننا اور ان پر عمل کرنا اور "امانت" کے یہ وہ معنی ہیں جو قرآن کریم کی اس آیت اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں مذکور ہیں۔ تاہم ان دونوں معنی کی اصل اور بنیاد ایمان ہے اس لئے زیادہ وضاحت کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہاں "امانت" سے مراد "ایمان" ہے جیسا کہ خود حدیث کے آخری الفاظ و مافی قلبه مثقال حبة من خردل من ایمان سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حدیث کے اس جملہ و لا یکاد احد یو دی الامانة میں "امانت" کا جو لفظ ہے وہ بھی مذکورہ وضاحت پر مبنی! پس حضور ﷺ نے جو دو حدیثیں بیان فرمائیں ان میں سے پہلی حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت وفلاح کے لئے ایمان وامانت کو نازل فرمایا اور اس کا مورود کل قلب انسانی کو قرار دیا کہ پہلے ایمان کا نور اور جوہر انسان کے دل میں اترا اور راسخ ومستحکم ہوا جس نے کتاب ہدایت قرآن مجید اور سُنّت نبوی ﷺ پر عمل آوری کے راستہ کو منور کیا، چنانچہ انسان نے اسی نور ایمان کے سبب ان لافانی تعلیمات اور احکام ومسائل کو جانا اور سمجھا جو کتاب اللہ سے اخذ کئے گئے ہیں اور وہ احکام ومسائل خواہ فرض وواجب اور مسنون ومباح ہوں یا حرام ومکروہ، اور پھر اسی نور نے سُنّت نبی کی حقیقت وصداقت کو واشگاف کیا کہ زبان رسالت اور معمولات نبوی نے کتاب اللہ کی تعلیمات اور منشا حق کی جو وضاحت وتفسیر بیان فرمائی اس کو بلا چون وچرا قبول کر کے عمل کی راہ کو استوار کیا گیا۔ یہاں یہ بات واضح ہوئی کہ حق تعالیٰ کی طرف سے نور ہدایت کا پیدا کیا جانا اور اس کے ذریعہ انسانیت عامہ کو نوازنے اور فلاح پہنچانے کا ارادہ فرمانا کتاب اللہ کو نازل کرنے اور رسولوں کو مبعوث کرنے سے پہلے تھا، یعنی پہلے تو اللہ تعالیٰ نے نور ہدایت کو پیدا کیا اور یہ ارادہ فرمایا کہ اپنے بندوں کو اس نور ہدایت کے ذریعہ سعادت وبھلائی کے بلند مقام پر پہنچانا ہے۔ اس کے بعد اس

تے اپنی کتاب کو دنیا میں نازل فرمایا اور اپنے پیغمبر اور رسول مبعوث فرمائے ۔پس نسل انسانی سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عنایت وہدایت کا مورد و محل بننا نصیب ہوا اور جن میں اس نور ہدایت کو قبول کرنے کی توفیق و استعداد ودیعت ہوئی وہی خوش بخت کتاب وسُنت سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ایک نکتہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ جو یہ فرمایا گیا ہے کہ۔ پھر انہوں نے قرآن کو جانا اور پھر انہوں نے سُنت کو جانا۔ اس کے ذریعہ ایمان و امانت کے مرتبہ کی شان وحیثیت اور اس کی عظمت کو بیان کرنا بھی مقصود ہے کہ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے نور ہدایت (یعنی ایمان کو نازل فرمایا اور قلوب انسانی میں اس کو ودیعت وراسخ فرما دیا تھا مگر پھر کتاب اللہ کے نازل کرنے اور اپنے پیغمبر ورسول کے مبعوث کرنے کے ذریعہ بھی اس کو مؤکد و مؤید کیا۔ بہرحال یہ وہ پہلی حدیث ہے جو حضور ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمائی اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس کا مصداق اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا ہے باایں طور کہ حضور ﷺ کے زمانہ اور رفاقت حضوری میں صحابۂ کرام اس ارشاد گرامی کے عین مصداق تھے اور دوسری حدیث، کہ جس میں حضور ﷺ نے امانت کے کم ہو جانے اور اٹھ جانے کا ذکر فرمایا وہ حضور ﷺ کے مبارک زمانہ کے بعد کے لوگوں پر صادق آئی۔

"آدمی (حسب معمول) سوئے گا...... الخ" سے مراد یا تو حقیقۃً سونا ہے یا یہ جملہ اس کی غفلت و کوتاہی میں پڑ جانے سے کنایہ ہے! یعنی یاد الٰہی سے غافل آیات الٰہی سے بے خبر، قرآن مجید میں مدبر و تفکر سے بے پرواہ اور اتباع سُنت میں کوتاہ ہو جانا۔ یہ دوسری مراد زیادہ واضح ہے کیونکہ ماقبل جملہ ثُمَّ السنة (اور پھر انہوں نے سُنت کو جانا) کا مخالف مفہوم اسی مراد کا متقاضی ہے۔

"فیظل اثرہ مثل اثر الوکت" امانت کا اثر یعنی نشان وکت کے نشان کی طرح ہو جائے گا" پہلے یہ جاننا چاہئے کہ کسی چیز کا اثر وہ نشان کہلاتا ہے جو اس چیز کی علامت کے طور پر نمودار ہے اور اس چیز کا کچھ نہ کچھ حصہ اس کی صورت میں باقی رہے اور "وکت" عکسی چیز کے اس دھبہ کو کہتے ہیں جو اس چیز کے مخالف رنگ کی صورت میں نمودار ہو جائے جیسے کسی سفید چیز میں سیاہ نقطہ کا نمودار ہونا اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "وکت" اصل میں اس سفید نقطہ نما نشان کو کہتے ہیں جو آنکھ کی سیاہی میں پیدا ہو جائے۔ حدیث کے اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ دین و شریعت کی طرف سے غافل ہو جانے اور گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے دل میں (ایمان) کا نور کم ہو جائے گا اور وہ (غافل ہو جانے والا) جب اس صورت حال سے آگاہ ہوگا اور اپنے دل کی حالت و کیفیت میں غور و فکر کرے گا تو یہ محسوس کریگا کہ اس میں ایک نقطہ کی مقدار کے علاوہ نور امانت میں سے اور کچھ باقی نہیں رہا ہے! پھر جب وہ دوبارہ سو جائے گا۔" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب دین و شریعت سے غفلت کی نیند اور زیادہ طاری ہو جائے گی اور گناہوں کا ارتکاب زیادہ بڑھ جائے گا دل میں سے نور ایمان کا بقیہ حصہ بھی نکل جائے گا اور وہاں صرف مجل کے نشان کی طرح کی صورت میں رہ جائے گا واضح رہے کہ "مجل" کے معنی ہیں آبلہ پڑ جانا اور کام کرتے کرتے ہاتھ کی جو کھال سخت ہو جاتی ہے اور جس کو گھٹا بھی کہتے ہیں اس پر بھی مجل کا اطلاق ہوتا ہے۔ لہٰذا جس طرح انسان کے جسم کے کسی حصہ پر جو آبلہ پڑ جاتا ہے وہ اگرچہ اوپر سے ابھرا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے اندر خراب اور گندے پانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح جس شخص کے دل میں امانت کا وہ باقی اثر و نشان بھی نکال لیا جائے گا، تو اگرچہ وہ بظاہر بالکل صالح و کار آمد نظر آئے گا لیکن حقیقت میں اس کے اندر سعادت و بھلائی اور آخروی زندگی کو فائدہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ مذکورہ وضاحت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وکت اور مجل نور امانت کے اس حصہ کی تمثیل ہے جو دل میں باقی رہ جاتا ہے گویا ان دونوں چیزوں کی مثال کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس دور میں اسلام کے نام لیواؤں میں ایمان و دین کی اس کمزوری کے باوجود ان کے دل میں ایمان و امانت کا نور کسی نہ کسی حد تک ضرور باقی رہے گا خواہ وہ وکت اور مجل کے نشان کی طرح ہی کیوں نہ ہو لیکن اس وضاحت پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ مجل کا نشان وکت کے نشان سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ لہٰذا کلام کے اسلوب کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے مجل کے نشان کا ذکر کیا جاتا اور اس کے بعد وکت کے نشان کا ذکر ہوتا کیونکہ بعد کے درجہ کا نشان پہلے درجہ کے نشان سے کمتر اور ہلکا ہونا چاہئے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ "وکت" اگرچہ ایک بہت قلیل نشان ہوتا ہے مگر وہ "مجل" سے کمتر حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ "مجل ایک

خالی اور بالکل بیکار ہونے کی وجہ سے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ لیکن یہ جواب زیادہ مضبوط نہیں ہے۔

ایک شارح نے اس بحث پر ایک دوسرے انداز سے روشنی ڈالی ہے ان کے منقولات کے مطابق اس دوسری حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جن اہل ایمان کے قوائے فکر و عمل پر غفلت و بے حسی طاری ہو جائے گی اور گناہوں کے ارتکاب کی صورت میں دین شریعت کے ساتھ ان کا تعلق نہایت کمزور پڑ جائے گا ان کے دلوں سے "امانت" جاتی رہے گی چنانچہ جب اس کا ایک حصہ زائل ہو جائے گا تو ان کے دلوں میں سے اس کا نور بھی زائل ہو جائے گا اور اس کی جگہ "وکت" کی طرح ظلمت و تاریکی پیدا ہو جائے گی اور اس کی مثال ایسی جیسے کسی چیز میں اس کا مخالف رنگ نمودار ہو جائے (مثلاً سفید چیز میں سفید رنگ کا نمودار ہو جانا) اور جب دین و شریعت کے تئیں غفلت و کوتاہی اور بڑھ جائے گی اور گناہوں کا ارتکاب پہلے سے بھی زیادہ ہو جائے گا تو نور امانت کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اس میں سے کچھ اور زائل ہو جائے گا اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے جسم کے کسی حصہ پر مجل (یعنی آبلہ یا گٹھے کا نشان) اتنا گہرا اور اس قدر سخت ہوتا ہے کہ جلد زائل نہیں ہوتا، پس دوسری مرتبہ دل میں جو تاریکی پیدا ہو گی وہ پہلی مرتبہ پیدا ہونے والی تاریکی سے زیادہ پھیلی ہوئی اور گہری ہو گی۔ مذکورہ صورت حال کو اس مثال کے ذریعہ بیان فرمانے کے بعد پھر یہ فرمایا کہ قلب انسانی میں ایمان و امانت کے نور کا پیدا ہونا اور پھر نکل جانا یا دلوں میں اس نور کا جگہ پکڑنا اور پھر اس کے زائل ہو جانے کے بعد تاریکی کا آجانا ایسی تشبیہ رکھتا ہے جیسا کہ کوئی آگ کا انگارہ لے کر اس کو اپنے پیر پر ڈال لے اور انگارہ پیر کو جلا کر زائل ہو جائے اور پھر جلی ہوئی جگہ پر آبلہ پڑ جائے۔

ایک اور شارح نے یہ لکھا ہے کہ۔ اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں امانت کا نور پیدا کیا تا کہ وہ اس کی روشنی میں فلاح کے راستہ پر چلیں اور دین و شریعت کے پیرو کار بنیں، لیکن جب وہ لوگ اس نعمت سے بے پرواہ ہو جائیں گے، دین و شریعت کے تئیں غفلت و کوتاہی میں پڑ جائیں گے اور گناہوں کا ارتکاب کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر ان لوگوں سے یہ نعمت واپس لے لیگا، بایں طور کہ ان کے دل میں سے امانت نکل جائے گی، یہاں تک جب وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں گے تو محسوس کریں گے کہ ان کے قلب کی وہ حالت نہیں ہے جو امانت کی موجودگی میں پہلے تھی، البتہ ان کے دلوں میں اس امانت کا نشان باقی رہے گا جو کبھی وکت کی طرح ہو گا اور کبھی مجل کی طرح ہو گا۔ پس "مجل" اگرچہ مصدر ہے لیکن یہاں اس سے مراد نفس آبلہ ہے اور یہ (یعنی مجل) پہلے مرتبہ (یعنی وکت) سے کمتر درجہ ہے، کیونکہ "وکت" کے ذریعہ اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگرچہ امانت دل میں سے نکل جائے گی مگر نشان کی صورت میں اس کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی رہے گا۔

حدیث کے آخری الفاظ ــــ حالانکہ اس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہو گا، دونوں احتمال رکھتے ہیں یا تو اصل ایمان کی نفی مراد ہے، یعنی اس شخص کے سرے سے ایمان کا وجود ہی نہیں ہو گا، یا کمال ایمان کی نفی مراد ہے کہ ارشاد گرامی کے اس جزو کا حاصل یہ ہے کہ لوگ اس شخص کی عقل و دانائی کی زیادتی، اور چالاکی اور مہارت وغیرہ کی تعریف کریں گے اور اس کے تئیں تعجب تحسین کا اظہار کریں گے لیکن کسی ایسے شخص کی تعریف و توصیف نہیں کریں گے جس میں بہت زیادہ علم و فضل ہو گا اور جو عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز ایمان اور پاکیزگی فکر و عمل ہے، اگر کسی شخص میں ایمان و پاکیزگی کی دولت نہ ہو تو خواہ وہ دنیا بھر کی تمام نعمتوں، کامرانیوں اور خوبیوں کا حامل ہو اس کی کوئی حقیقت نہ ہو گی اگرچہ دنیا والے اس کی کتنی ہی تعریف و تحسین کریں اور اس کی ان خوبیوں و کامرانیوں کی وجہ سے اس کو کتنا ہی برتر و بہتر جانیں، لہٰذا تعریف و تحسین اسی شخص کے حق میں معتبر ہو گی جو ایمان و تقویٰ کا حامل ہو۔

جب فتنوں کا ظہور ہو تو گوشہ عافیت تلاش کرو

④ وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَيْرِ وَكُنْتُ اَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ اَنْ يُّدْرِكَنِيْ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا كُنَّا فِيْ جَاهِلِيَّةٍ وَشَرٍّ فَجَاءَ نَا اللّٰهُ بِهٰذَا الْخَيْرِ فَهَلْ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ قَالَ نَعَمْ قُلْتُ وَهَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الشَّرِّ مِنْ خَيْرٍ قَالَ نَعَمْ فِيْهِ دَخَنٌ قُلْتُ وَمَا دَخَنُهٗ قَالَ قَوْمٌ يَّسْتَنُّوْنَ بِغَيْرِ سُنَّتِيْ وَيَهْدُوْنَ بِغَيْرِ هَدْيِيْ

تَعْرِفُ مِنْهُمْ وَتُنْكِرُ قُلْتُ فَهَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ قَالَ نَعَمْ دُعَاةٌ عَلٰى اَبْوَابِ جَهَنَّمَ مَنْ اَجَابَهُمْ اِلَيْهَا قَذَفُوْهُ فِيْهَا قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صِفْهُمْ لَنَا قَالَ هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا وَيَتَكَلَّمُوْنَ بِاَلْسِنَتِنَا قُلْتُ فَمَا تَاْمُرُنِیْ اِنْ اَدْرَكَنِیْ ذٰلِكَ قَالَ تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِمَامَهُمْ قُلْتُ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ جَمَاعَةٌ وَلَا اِمَامٌ قَالَ فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا وَلَوْاَنْ تَعَضَّ بِاَصْلِ شَجَرَةٍ حَتّٰى يُدْرِكَكَ الْمَوْتُ وَاَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ قَالَ يَكُوْنُ بَعْدِیْ اَئِمَّةٌ لَا يَهْتَدُوْنَ بِهُدَایَ وَلَا يَسْتَنُّوْنَ بِسُنَّتِیْ وَسَيَقُوْمُ فِيْهِمْ رِجَالٌ قُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الشَّيَاطِيْنِ فِیْ جُثْمَانِ اِنْسٍ قَالَ حُذَيْفَةُ قُلْتُ كَيْفَ اَصْنَعُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ اَدْرَكْتُ ذٰلِكَ قَالَ تَسْمَعُ وَتُطِيْعُ الْاَمِيْرَ وَاِنْ ضُرِبَ ظَهْرُكَ وَاُخِذَ مَالُكَ فَاسْمَعْ وَاَطِعْ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ لوگ تو (اکثر) رسول کریم ﷺ سے خیر و نیکی اور بھلائی کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور میں آپ ﷺ سے شر و برائی کے بارے میں دریافت کیا کرتا تھا اس خوف کی وجہ سے کہ کہیں میں کس فتنہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ (یعنی دوسرے صحابہؓ تو عبادت و طاعت کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ نیک عمل اور اچھے کام کر سکیں، یا یہ کہ وہ لوگ آپ ﷺ سے اپنے رزق میں وسعت اور خوشحالی کی دعا کرتے تھے تاکہ انہیں اطمینان و فراغت حاصل ہو اور اپنی دنیا کو آخرت کی فلاح و کامیابی کا ذریعہ بنا سکیں لیکن ان کے برخلاف میرا معمول دوسرا تھا، میں حضور ﷺ سے گناہ اور برائیوں کے بارے میں پوچھا کرتا تھا کہ ان سے اجتناب کر سکوں یا یہ کہ ان فتنوں کے بارے میں پوچھتا تھا جو اس دنیا میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں اور جو نہ صرف اخروی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ ان کے برے اثرات دنیاوی خوشحالی اور رزق کی وسعت پر بھی پڑتے ہیں، اور پوچھنے کی بناء یہ خوف ہوتا تھا کہ کہیں میں ان فتنوں میں مبتلا نہ ہو جاؤں یا ان کے برے اثرات و اسباب مجھ تک نہ پہنچ جائیں چنانچہ اہل علم سے برائیوں کی واقفیت حاصل کر کے ان سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا ایک بہترین طریق ہے، اسی نے حکماء اور اطبا بلکہ بعض فضلاء نے اس طریق کو بطور اصول اختیار کیا ہے کہ ازالہ مرض کے سلسلہ میں پرہیز کو ملحوظ رکھنا، دوا استعمال کرنے سے زیادہ بہتر ہے نیز کلمہ توحید بھی اسی اصول کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے ماسوی اللہ کی نفی کی گئی ہے اس کے بعد الوہیت کو ثابت کیا گیا) حضرت حذیفہؓ نے بیان کیا کہ (اپنی مذکورہ عادت کے مطابق ایک دن) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ (اسلام) سے قبل جاہلیت اور برائی میں مبتلا تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے (آپ ﷺ کی بعثت کے صدقہ میں) ہمیں یہ ہدایت و بھلائی (یعنی اسلام کی روشنی عطا فرمائی) جس کی وجہ سے کفر ضلالت کے اندھیرے دور ہو گئے اور ہم گمراہیوں اور برائیوں کے جال سے باہر آ گئے) تو کیا اس ہدایت و بھلائی کے بعد کوئی اور برائی و بدی پیش آنے والی ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ہاں! (اس بھلائی کے بعد بھی برائی پیش آنے والی ہے)" میں نے عرض کیا۔ تو کیا اس برائی کے بعد پھر ہدایت و بھلائی کا ظہور ہو گا (کہ جس کی وجہ سے دین و شریعت کا پھر بول بالا ہو جائے)؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اس برائی کے بعد پھر بھلائی کا ظہور ہو گا لیکن اس برائی کے بعد جو بھلائی آئے گی اس میں کدورت ہو گی۔ میں نے عرض کیا کہ اس بھلائی کی کدورت کیا ہو گی؟ آپ نے فرمایا۔ "(میں نے کدورت کی جو بات کہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ) ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو میرے طریقہ اور میری روش کے خلاف طریقہ و روش اختیار کریں گے، لوگوں کو میرے بتائے ہوئے راستہ کے خلاف راستہ پر چلائیں گے۔ (اور میری سیرت اور میرے کردار کے خلاف سیرت و کردار اپنائیں گے) تم ان میں دین دار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی۔ میں نے عرض کیا کیا اس بھلائی کے بعد پھر کوئی برائی پیش آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! ایسے لوگ (پیدا) ہوں گے جو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر مخلوق کو (اپنی طرف) بلائیں گے) جو شخص ان کے بلاوے کو قبول کر کے دوزخ کی طرف جانا چاہے گا اس کو وہ دوزخ میں دھکیل دیں گے (یعنی جو شخص ان کے بہکاوے میں آ کر ان گمراہیوں میں مبتلا ہو گا جو دوزخ کے عذاب کا مستوجب بناتی ہیں تو وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا)"۔ میں نے عرض کیا کہ ان کے بارے میں وضاحت فرمائیے (کہ وہ کون لوگ ہوں گے، آیا وہ مسلمانوں ہی میں سے ہوں گے یا غیر مسلم ہوں گے؟) حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ ہماری قوم (یا ہمارے ابناء جنس اور ہماری ملت کے لوگوں میں سے ہوں گے اور ہماری زبان میں گفتگو کریں گے (یعنی وہ لوگ عربی زبان رکھنے والے ہونگے یا یہ مراد

ہے کہ ان کی گفتگو قرآن وحدیث کے حوالوں سے مزین اور پند ونصائح سے آراستہ ہوگی اور بظاہر ان کی زبان پر دین ومذہب کی باتیں ہوں گی مگر ان کے دل نیکی وبھلائی سے خالی ہوں گے) میں نے عرض کیا کہ تو پھر میرے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ (یعنی اگر میں ان لوگوں کا زمانہ پاؤں تو اس وقت مجھے کیا کرنا چاہئے؟) حضور ﷺ نے فرمایا۔ "کتاب وسُنّت پر عمل کرنے والے) مسلمانوں کی جماعت کو لازم جاننا اور ان کے امیر کی اطاعت کرنا (یعنی اہل سنت کے راستہ کو اختیار کرنا اور اہل سُنّت کا جو امام ومقتدا ہو اس کی اطاعت ورعایت ملحوظ رکھنا) میں نے عرض کیا کہ اور اگر مسلمانوں کی کوئی (مسلمہ) جماعت ہی نہ ہو؟ اور نہ ان کا کوئی (متفقہ) امیر ومقتدا ہو بلکہ مسلمان مختلف جماعتوں میں منقسم ہوں اور الگ الگ مقتداؤں کے پیچھے چلتے ہوں تو اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟) آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایسی صورت میں تمہیں ان سب فرقوں اور جماعتوں سے صرف نظر کرکے یکسوئی اختیار کرلینی چاہئے، اگرچہ اس یکسوئی کے لئے تمہیں کسی درخت کی جڑ میں پناہ کیوں نہ لینی پڑے (جنگلوں میں چھپنا کیوں نہ پڑے اور اس کی وجہ سے سخت سے سخت مصائب وشدائد برداشت کیوں نہ کرنا پڑے اور ان جنگلوں میں گھاس پھوس کھانے پر قناعت تک کی نوبت کیوں نہ آجائے) یہاں تک اسی یکسوئی کی حالت میں موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میرے بعد ایسے امام (یعنی امیر بادشاہ اور قائد رہنما) ہوں گے جو عقیدہ وفکر اور علم کے (اعتبار سے) میری سیدھی راہ پر نہیں چلیں گے اور کردار وعمل کے اعتبار سے) میری روش اور میرا طریقہ نہیں اپنائیں گے (یا یہ معنی ہیں کہ وہ کتاب وسُنّت پر عمل نہیں کریں گے) اور اس زمانہ میں ایسے بھی پیدا ہوں گے جو روپ اور بدن تو آدمیوں جیسا رکھیں گے لیکن ان کے دل شیطانوں کے سے ہوں گے (یعنی وہ لوگ فسق وگمراہی، شقاوت وسخت دلی، شکوک وشباہت پیدا کرنے، فریب دینے، عقل کے نکمے ہونے اور فاسد خواہشات رکھنے میں انسانیت کی ساری حدوں کو پار کر جائیں گے اور اس اعتبار سے ان کی شکل وصورت آدمیوں جیسی ہونے کے باوجود ان کی سیرت اور ان کی باطنی شیطان کی سی ہوگی۔" حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ (میں نے یہ سن کر) عرض کیا کہ۔ یارسول اللہ اگر میں اس زمانہ کو پاؤں تو کیا کروں؟ آپ نے فرمایا۔ "مسلمانوں کا امیر ومقتدا جو کچھ کہے اس کی سننا اور امیر کی اطاعت کرنا (بشرطیکہ اس اطاعت کا تعلق کسی معصیت سے نہ ہو) اگرچہ تمہاری پشت پر مارا جائے اور تمہارا مال چھین لیا جائے (تب بھی سننا اور طاعت کرنا)"۔

تشریح: لفظ "شَرّ" سے مراد فتنہ، ارکان اسلام میں سستی وکوتاہی واقع ہوجانا، برائی کا غلبہ پالینا اور بدعت کا پھیلنا ہے! اور "خیر" سے مراد اس کے برعکس معنی ہیں۔

"ہم لوگ جاہلیت اور برائی میں مبتلا تھے۔" کے ذریعہ حضرت حذیفہؓ نے بعثت نبوی سے قبل کے زمانہ کی طرف اشارہ کیا جب توحید کا آفتاب جہالت کے بادلوں میں چھپا ہوا تھا، نبوت ورسالت کی روشنی نمودار نہیں ہوتی تھی اور احکام خداوندی پر عمل آوری کا راستہ نظروں سے اوجھل تھا۔ "فی جاھلیۃ وشر" میں وشَرّ کا لفظ عطف تفسیری ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ جاہلیت کی وضاحت بیان کرنا مقصود ہے، یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس جملہ میں وشر کے بعد "تخصیص" کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

"دخن" جس کا ترجمہ "کدورت" کیا گیا ہے، دخان (دھواں) کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح فضا میں پھیلا ہوا دھواں صاف وشفاف چیزوں کو مکدر اور دھندلا بنا دیتا ہے اسی طرح اس وقت جو بھلائی سامنے آئے گی وہ بدی اور برائی کے گرد وغبار سے آلودہ ہوگی، بایں طور کہ لوگوں کے دلوں میں صفائی اور خلوص نہیں ہوگا جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھا، اور عقیدے صحیح اور اعمال صالح نہیں ہوں گے، امراء وسلاطین کا نظم مملکت اس عدل وانصاف پر مبنی نہیں ہوگا جو پہلے زمانہ میں پایا جاتا تھا مسلمانوں کے قائد ورہنما مخلص (بے غرض اور دین وملت کے سچے خادم نہیں ہوں گے، برائیوں کا ظہور ہوگا، بدعتیں پیدا ہوں گی بدکار لوگ نیکوکاروں کے ساتھ اہل بدعت، اہل سُنّت کے ساتھ خلط ملط رہیں گے۔

"تم ان میں دیندار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھلائی اور برائی دونوں کے ساتھ خلط ملط رکھنے کی وجہ سے متضاد اور مختلف (اعمال وکردار اور طور طریقوں کے حامل ہوں گے؟ ان کی زندگی میں منکر (یعنی بری باتوں کا چلن بھی ہوگا اور معروف (یعنی اچھے کاموں) کا عمل دخل بھی ہوگا۔ پس یہ جملہ بھی اسی مفہوم کو واضح کرتا ہے جو ماقبل کے جملوں نعم وفیہ دخن ویستنون بغیر سنتی سے مراد لیا گیا ہے۔

بعض حضرات نے وضاحت کی ہے کہ اس ارشاد گرامی میں اسلام وہدایت کی روشنی کے بعد پیش آنے والی جس پہلی برائی یا فتنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے وہ فتنہ وفساد مراد ہے جو حضرت عثمان غنیؓ کے سانحہ شہادت کے وقت رونما ہوا اور پھر پیش آنے والی دوسری بھلائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے مراد حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا زمانہ خلافت ہے، نیز منھم وتنکر یعنی تم ان میں دیندار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی۔" میں جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے وہ امراء وسلاطین مراد ہیں جو حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کے بعد حکمراں ہوئے، چنانچہ ان میں سے بعض ایسے حکمران گزرے جو اپنی ذاتی زندگی میں بھی اور اپنے نظام سلطنت میں بھی کتاب وسُنّت کی ہدایت کو رہنما بناتے تھے اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ یا یہ کہ ان میں سے بعض ایسے تھے جو کبھی تو اچھے کام کرتے تھے اور کبھی خواہشات نفسانی میں پڑ کر برے کام کرتے تھے، اس وقت ان کے سامنے آخرت کا مفاد اور دار آخرت کے لئے تیاری کا جذبہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کا اصل مفاد اپنی ذاتی اغراض کو پورا کرنا اور ہر صورت اپنے اقتدار اور اپنی حکمرانی کو باقی رکھنا ہوتا تھا اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ پہلی برائی سے مراد وہ فتنہ وفساد ہے جو حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کی صورت میں اور ان کے بعد رونما ہوا، اور دوسری بھلائی سے مراد وہ صلح صفائی ہے جو حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کے درمیان ہوئی اور دخن یعنی کدورت سے مراد وہ افسوسناک واقعات، حادثات ہیں جو حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں بعض امراء کے ذریعہ رونما ہوئے۔ جیسے عراق میں زیاد کا فتنہ وفساد۔

جو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر بلائیں گے" یعنی ان مفاد پرست خود غرض اور گمراہ افراد کا ایک گروہ ہوگا جو لوگوں کو طرح طرح کے فریب اور مختلف لالچ اور بہلاووں کے ذریعہ گمراہی کی طرف بلائیں گے اور ان کو ہدایت وراستی سے دور رکھے گا۔ پس حضور ﷺ نے گمراہی کی دعوت دینے والوں کی دعوت کو اور جن کو دعوت دی جائے گی ان کی طرف سے اس دعوت کو قبول کئے جانے کو ایک ایسا سبب قرار دیا ہے جس کے ذریعہ دعوت دینے والے، دعوت قبول کرنے والوں کو جہنم میں دھکیل دیں گے اس طرح وہ لوگ ان کی مکرو فریب دعوت کا شکار ہو کہ جہنم میں پہلے جائیں گے، نیز آپ ﷺ نے گویا مکرو فریب کی تمام اقسام اور تمام صورتوں کو جہنم کے دروازوں کا قائمقام قرار دیا ہے۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں جن افراد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف بلائیں گے، ان سے وہ جاہ پسند اور حکومت واقتدار کے طلبگار مراد ہیں جو ملک وقوم پر اپنا تسلط قائم کرنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے اپنے گروہ بنائیں گے اور عام لوگوں کو طرح طرح کے فریب دے کر اپنے گرد جمع کریں گے تاکہ ان کی اجتماعی طاقت کے ذریعہ ملی سیادت اور ملک وحکومت پر قبضہ کر سکیں، جیسا کہ خوارج اور روافض جیسے گمراہ فرقے اس ناپاک مقصد کے لئے پیدا ہوئے حالانکہ امارت وسیادت اور امانت وولایت کی کوئی بھی شرط وخصوصیت ان میں موجود نہیں پائی جائے گی۔ ایک بات یہ بھی قابل وضاحت ہے کہ جو یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی طرف بلائیں گے۔ تو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہونا، مآل کار کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے، یعنی گمراہی کی طرف ان لوگوں کے بلانے کا مآل کار چونکہ یہ ہوگا کہ جو لوگ ان کے بلانے پر ان کی طرف چلے جائیں گے وہ دوزخ کے عذاب کے مستوجب بنیں گے، اس لئے گمراہی کی طرف ان کے بلانے کو دوزخ کے دروزاوں پر کھڑے ہو کر بلانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس یہ ارشاد گرامی اسلوب کے اعتبار سے قرآن کریم کی اس آیت کی طرح ہے کہ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا۔

مسلم کی روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی ایسے ملک میں رہتے ہو جہاں مسلمانوں کا باقاعدہ نظم سلطنت قائم ہے اور

مسلمانوں کا امیر و امام موجود ہے گو وہاں کے سیاسی حالات میں تمہارے لئے کتنی ہی تنگی و سختی کیوں نہ ہو اور اس امیر و امام کی طرف سے تمہارے مال اور تمہاری جان کے تئیں ظلم ہی کیوں نہ ہوتا ہو یا تمہیں مارا پیٹا اور تمہارا مال و اسباب چھینا کیوں نہ جاتا ہو، تم اس امیر و امام کے خلاف علم بغاوت ہرگز بلند نہ کرنا اور فتنہ و فساد کے دروازے نہ کھولنا بلکہ صبر و تحمل کی راہ اختیار کئے رہنا، اور سخت سے سخت حالات میں بھی امام وقت سے بغاوت کر کے دین و ملت کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا سبب نہ بننا رہی یہ بات کہ اگر وہ امیر و امام مشروع امور کے ارتکاب کا حکم دے؟ تو اس صورت میں مسئلہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے ہاں اگر ان مشروع امور کے ارتکاب کے لئے کہا جائے (کہ حکم عدولی کی صورت میں بھی اولی کو اختیار کرنے کا جواز باقی رہتا ہے (یعنی حکم عدولی کی صورت میں جان جانے کا خوف ہو تو غیر مشروع امر کا ارتکاب کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص جان کی بازی لگا کر بھی غیر مشروع امر کے ارتکاب سے انکار کرے تو یہ سب سے اچھی بات ہوگی، اور اس سب سے اعلی درجہ کو اختیار کرنے کا جواز ہے)۔

آخر میں "فاسمع واطع" کے الفاظ جو دوبارہ ارشاد فرمائے گئے ہیں ان سے اس حکم کو مؤکد کرنا مقصود ہے کہ اپنے کو امام وقت کی اطاعت سے علیحدہ نہ کیا جائے اور سرکشی و بغاوت کے ذریعہ ملک و ملت میں انتشار و تفریق کا فتنہ نہ اٹھایا جائے۔

اس سے قبل کہ فتنوں کا ظہور ہو، اعمال صالحہ کے ذریعہ اپنی زندگی کو مستحکم کرلو

۵ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ فِتَنًا كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِیْ كَافِرًا اَوْ يُمْسِیْ مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا يَبِيْعُ دِيْنَهُ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اعمال صالحہ میں جلدی کرو قبل اس کے کہ وہ فتنے ظاہر ہو جائیں جو تاریک رات کے ٹکڑوں کی مانند ہوں گے (اور ان فتنوں کا اثر ہوگا کہ) آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر بن جائے گا اور شام کو مؤمن ہوگا تو صبح کو کفر کی حالت میں اٹھے گا، نیز اپنے دین و مذہب کو دنیا کی تھوڑی سی متاع کے عوض بیچ ڈالے گا۔" (مسلم)

تشریح: "اعمال صالحہ میں جلدی کرو" کی ہدایت کا حاصل یہ ہے کہ اس تغیر پذیر دنیا کو کسی ایک رخ پر قرار نہیں اور وقتی حالت کا بہاؤ ایک ہی سمت نہیں رہتا، اگر اب ایسے حالات ہیں جو عقیدہ و عمل کا رخ صحیح سمت رکھنے میں معاون بنتے ہیں تو بعد میں ایسے حالات بھی پیدا ہوسکتے ہیں جو فکر و نظریات اور عقیدہ و عمل کا سفر ٹھیک رخ پر جاری رکھتے ہیں زبردست رکاوٹ پیدا کردیں، اور ایسے میں کم ہی انسان ہوتے ہیں جن کے ذہن و فکر اور دل و دماغ ان حالات کی تاثیر سے محفوظ رہ پائیں اور جن کے اعمال صالحہ میں رکاوٹ نہ پیدا ہوتی ہو، پس جس شخص کو جو بھی موقع ملے اس میں اچھے کام اور نیک عمل کرنے میں جلدی کرنی چاہئے اور جس قدر بھی اعمال کئے جاسکتے ہوں کر لئے جائیں کیونکہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا وقت کیا فتنے لے کر آئے اور پھر اعمال صالحہ اختیار کرنے کا موقع بھی مل سکے یا نہیں۔

"فتنوں" کو اندھیری رات کے ٹکڑوں سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آنے والے فتنوں کے بارے میں کسی کو یہ معلوم نہیں ہوسکے گا کہ وہ کب اور کیوں نمودار ہوں گے اور ان سے چھٹکارے کی راہ کیا ہوگی، لہٰذا ان آنے والے فتنوں سے پہلے ہی اعمال صالحہ کے ذریعہ اپنی دینی زندگی کو مضبوط و مستحکم بنالو، آنے والے وقت کا انتظار نہ کرو کیونکہ اس وقت دین و شریعت کے تعلق سے سخت ترین آفات و مصائب میں اس طرح گم ہو کر رہ جاؤ گے کہ نیک کام کرنے کا موقع ہی نہ پاسکو گے۔ وہ وقت لوگوں کے ذہن و فکر اور اعمال و کردار پر کتنا برا اثر ڈالے گا اور وہ فتنے کس قدر سریع الاثر ہوں گے اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ مثلاً آدمی جب صبح کو اٹھے گا تو ایمان (یعنی اصل ایمان یا کمال ایمان) کے ساتھ متصف ہوگا لیکن شام ہوتے ہوتے کفر کے اندھیروں میں پہنچ جائے گا! رہی یہ بات کہ "کفر" سے کیا مراد ہے، تو ہوسکتا ہے کہ اصل کفر مراد ہو، یعنی وہ شخص واقعۃً کفر کے دائرہ میں داخل ہو جائے گا یا یہ مراد ہے کہ وہ کفران نعمت کرنے والا ہو جائے گا، یا وہ کافروں کی مشابہت اختیار کرلے گا اور یا یہ کہ وہ ایسے کام کرنے لگے گا جو صرف کافر ہی کرتے ہیں۔

اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ جملہ کے معنی یہ ہیں کہ۔ مثلاً ایک شخص جب صبح کو اٹھے گا تو اس چیز کو حلال جانتا ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، اور اس چیز کو حرام جانتا ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، لیکن شام ہوتے ہوتے اس کے ذہن و فکر اور اس کے عقیدے میں اس طرح انقلاب آجائے گا کہ وہ اس چیز کو حرام سمجھنے لگے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اور اس چیز کو حلال سمجھنے لگے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اسی پر جملہ کے دوسرے جزء یعنی۔ شام کو مؤمن ہوگا اور صبح کو کفر کی حالت میں اٹھے گا۔ کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے! اور حاصل یہ ہے کہ عام لوگ ان فتنوں کی وجہ سے دین وشریعت کے معاملات میں تذبذب وتردد کا شکار ہوجائیں گے اور نام نہاد دانشور وعالم اور دنیادار مقتداؤں کے پیچھے چلنے لگیں گے مظہرؒ نے کہا ہے کہ مذکورہ صورت حال کے کئی وجوہ واسباب اور مختلف مظاہر ہوں گے ایک تو یہ کہ مسلمانوں میں تفرقہ پڑجائے گا اور وہ مخالف گروہوں میں بٹ جائیں گے، پس ان کے درمیان محض عصبیت اور بغض وعناد کی وجہ سے خونریزی ہوگی اور دونوں گروہوں کے لوگ اپنے مخالفین کے جان ومال کو نقصان پہنچانے اور ایک دوسرے کی آبروریزی کرنے کو حلال وجائز جانیں گے، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے حاکم وامراء ظلم وجور کا شیوہ اپنالیں گے۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کا ناحق خون بہائیں گے، زور زبردستی ان کا مال لیں گے زنا کاری کریں گے، شراب پئیں گے اور دوسرے حرام امور کا ارتکاب کریں گے، لیکن ان کی ان صریح زیادتیوں اور بدکاریوں کے باوجود بعض لوگ یہ عقیدہ رکھیں گے اور دوسرے حرام امور کا ارتکاب کریں گے، لیکن ان بدعقیدگی کے اس فتنہ میں مبتلا کرنے والے وہ نام نہاد علماء ہوں گے جن کو "علماء سو" کہا جاتا ہے، ان کی طرف سے بے محابا ان امراء وحکام کے ان کاموں کے جواز کا فتویٰ دیا جائے گا جو وہ مسلمانوں کی خونریزی اور حرام امور کے ارتکاب کی صورت میں کریں گے، اور تیسرے یہ کہ عام مسلمانوں میں جہالت اور دین کی ناواقفیت کی وجہ سے جو برائیاں پھیل جائیں گی اور ان سے جن غیر شرعی امور کا صدور ہوگا جیسے خرید وفروخت کے معاملات اور دوسرے سماجی امور وتعلقات میں دین وشریعت کے احکام کی خلاف ورزی، ان کو حلال وجائز جانیں گے۔ اور حضرت شیخ عبدالحقؒ نے یہ لکھا ہے کہ مذکورہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوگی کہ لوگ اپنے اغراض ومنافع کی خاطر، دنیادار امراء وحکام اور اہل دولت وثروت سے میل جول رکھیں گے، ان سے حاجت روائی کی امید میں ان کے ہاں گھستے پھریں گے، ان کی حاشیہ نشینی اور مصاحبت کو بڑا اعزاز سمجھیں گے، پس اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ان کے تابع محض اور جی حضوری بن جائیں گے اور ان کے خلاف شریعت امور ومعاملات میں ان کی موافقت وتائید کرنے پر مجبور ہوں گے۔

"آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا آلخ" کے ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ۔ آدمی صبح کو اٹھے گا تو اپنے مسلمان بھائی کے خون اور مال وعزت کے حرام ہونے کا عقیدہ رکھنے کے سبب ایمان کی حالت میں ہوگا مگر شام ہوتے ہوتے اس کے اس عقیدے میں تبدیلی آجائے گی اور وہ اپنے مسلمان بھائی کے خون اور مال کو حلال سمجھنے لگے گا اور اس کے سبب وہ کافر قرار دیا جائے گا۔ یہ معنی اختیار کرنے کی صورت میں "فتنوں" سے مراد جنگ وقتال ہوگا! لیکن اس جملہ کے جو معنی پہلے بیان کئے گئے ہیں وہ حضور ﷺ کے ارشاد گرامی کے زیادہ مناسب ہیں۔

فتنوں کے ظہور کے وقت گوشۂ عافیت میں چھپ جاؤ

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَكُوْنُ فِتَنٌ اَلْقَاعِدُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْقَائِمِ وَالْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْمَاشِيْ وَالْمَاشِيْ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ السَّاعِيْ مَنْ تَشَرَّفَ لَهَا تَسْتَشْرِفْهُ فَمَنْ وَجَدَ مَلْجَأً اَوْ مَعَاذًا فَلْيَعُذْبِهٖ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ يَكُوْنُ فِتْنَةٌ اَلنَّائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَقْظَانِ وَالْيَقْظَانُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْقَائِمِ وَالْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ السَّاعِيْ مَنْ وَجَدَ مَلْجَأً اَوْ مَعَاذًا فَلْيَسْتَعِذْبِهٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب فتنے پیدا ہوں گے (یعنی جلد ہی ایک بڑا فتنہ سامنے آنے والا ہے یا

یہ کہ پے بہ پے یا تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بہت زیادہ فتنوں کا ظہور ہونے والا ہے) ان فتنوں میں بیٹھنے والا، کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا، اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا سعی کرنے والے (یعنی کسی سواری کے ذریعہ یا پاپیادہ دوڑنے والے اور جلدی چلنے والے) سے بہتر ہوگا اور جو شخص فتنوں کی طرف جھانکے گا فتنہ اس کو اپنی طرف کھینچ لے گا! پس جو شخص ان فتنوں سے نجات کی کوئی جگہ (یا اس سے بھاگنے کا کوئی راستہ) یا پناہ گاہ پائے (اور یا کوئی ایسا آدمی اس کو مل جائے جس کے دامن میں وہ ان فتنوں سے پناہ لے سکتا ہو) تو اس شخص کو چاہئے کہ اس کے ذریعہ پناہ حاصل کرلے (یعنی اگر ان فتنوں سے بھاگنے کا کوئی راستہ مل سکتا ہو تو فتنوں کی جگہ سے نکل بھاگے یا کوئی ایسی جگہ اس کو معلوم ہو کہ جہاں چھپ جانے کی وجہ سے ان فتنوں سے پناہ مل سکتی ہو تو وہاں جا کر چھپ جائے اور یا اگر کوئی آدمی اپنے سایہ عاطف میں پناہ دینے والا مل سکتا ہو تو پاس جا کر پناہ گزیں ہو جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ (جب) کوئی فتنہ ظاہر ہوگا تو اس فتنہ میں سونے والا شخص (جو اس فتنہ سے غافل اور بے خبر ہو اور اس کے بارے میں اطلاعات نہ سنتا ہو) جاگنے والے (یعنی اس فتنہ کو جاننے اور اس کی خبر رکھنے والے سے بہتر ہوگا، جاگنے والا شخص (کہ خواہ وہ لیٹا ہوا ہو یا بیٹھا ہوا) کھڑا رہنے والے سے بہتر ہوگا اور اس فتنہ میں کھڑا ہونے والا شخص اس فتنہ میں سعی و کوشش کرنے والے سے بہتر ہوگا (یہاں سعی کا لفظ مشی یعنی چلنے والے کے معنی میں ہے، اور کسی چیز کی طرف چلنا، گویا اس چیز کے حق میں سعی و کوشش کرنے کے مترادف ہوتا ہے، صراح میں لکھا ہے کہ سعی کے معنی ہیں دوڑنا، جلدی کرنا، اور کسی چیز کے حق میں محنت و عمل کرنا پس اس فتنہ میں سعی کرنے والے سے مراد اس فتنہ میں مدد تعاون دینا اور اس کے حق میں سعی و کوشش کرنا، ہے) لہٰذا جو شخص اس فتنہ سے بھاگنے کا راستہ یا اس سے پناہ کی جگہ پائے تو اس کو چاہئے کہ وہاں جا کر پناہ حاصل کرلے۔"

تشریح: فتنہ میں بیٹھنے والا، کھڑے ہونے والے سے اس لئے بہتر ہوگا کہ کسی چیز کے پاس کھڑے (رہنے والا شخص اس چیز سے زیادہ قربت اور مناسبت رکھتا ہے، کہ وہ اس چیز کو دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے جب کہ ادھر ادھر بیٹھا رہنے والا شخص اس چیز کو نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے لہٰذا فتنوں میں کھڑا رہنے والا شخص ان کو دیکھنے اور سننے کی وجہ سے کہ جن کو بیٹھا ہوا شخص نہیں دیکھے، سنے گا عذاب سے زیادہ قریب ہوگا! ہو سکتا ہے کہ اس جملہ میں "بیٹھنے والے شخص" سے مراد وہ شخص ہو جو اس زمانہ میں ظاہر ہونے والے فتنہ کا محرک نہ ہو بلکہ اس سے دور رہ کر اپنے مکان میں بیٹھا رہے اور باہر نہ نکلے "اور کھڑے ہونے والے" سے مراد وہ شخص ہو جس کے اندر اس فتنہ کے تعلق سے کوئی داعیہ اور تحریک تو ہو مگر فتنہ انگیزی میں متردد ہو۔

"جو شخص فتنوں کی طرف جھانکے گا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان فتنوں کی طرف متوجہ ہوگا اور ان کے نزدیک جائے گا تو اس کی وہ توجہ اور نزدیکی اس کے ان فتنوں میں مبتلا ہو جانے کا باعث ہوگی، لہٰذا ان فتنوں کی برائیوں سے بچنے اور ان کے جال سے خلاصی پانے کی صورت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگی کہ ان فتنوں سے جتنا زیادہ دور رہنا ممکن ہو اتنا ہی زیادہ دور رہا جائے۔

(۷) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتَنٌ اَلَا ثُمَّ تَکُوْنُ فِتَنٌ اَلَا ثُمَّ تَکُوْنُ فِتْنَۃٌ اَلْقَاعِدُ خَیْرٌ مِّنَ الْمَاشِیْ فِیْھَا وَالْمَاشِیْ فِیْھَا خَیْرٌ مِّنَ السَّاعِیْ اِلَیْھَا اَلَا فَاِذَا وَقَعَتْ فَمَنْ کَانَ لَہٗ اِبِلٌ فَلْیَلْحَقْ بِاِبِلِہٖ وَمَنْ کَانَ لَہٗ غَنَمٌ فَلْیَلْحَقْ بِغَنَمِہٖ وَمَنْ کَانَتْ لَہٗ اَرْضٌ فَلْیَلْحَقْ بِاَرْضِہٖ فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَاَیْتَ مَنْ لَّمْ تَکُنْ لَہٗ اِبِلٌ وَلَا غَنَمٌ وَلَا اَرْضٌ قَالَ یَعْمِدُ اِلٰی سَیْفِہٖ فَیَدُقُّ عَلٰی حَدِّہٖ بِحَجَرٍ ثُمَّ لِیَنْجُ اِنِ اسْتَطَاعَ النَّجَاءَ اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ ثَلٰثًا فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَاَیْتَ اِنْ اُکْرِھْتُ حَتّٰی یُنْطَلَقَ بِیْ اِلٰی اَحَدِ الصَّفَّیْنِ فَضَرَبَنِیْ رَجُلٌ بِسَیْفِہٖ اَوْ یَجِیْئُ سَھْمٌ فَیَقْتُلُنِیْ قَالَ یَبُوْءُ بِاِثْمِہٖ وَاِثْمِکَ وَیَکُوْنُ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عنقریب فتنوں کا ظہور ہوگا، یاد رکھو پھر فتنے پیدا ہوں گے اور یاد رکھو ان فتنوں میں سے ایک بہت بڑا فتنہ (یعنی مسلمانوں کی باہمی محاذ آرائی اور خونریزی کا حادثہ پیش آئے گا، اس فتنہ میں

بیٹھا ہوا شخص چلنے والے شخص سے بہتر ہو گا اور چلنے والا شخص اس فتنہ کی طرف دوڑنے والے شخص سے بہتر ہو گا۔ پس آگاہ رہو! جب وہ فتنہ پیش آئے تو جس شخص کے پاس (جنگل میں) اونٹ ہوں وہ اپنے اونٹوں کے پاس (جنگل میں) چلا جائے جس شخص کے بکریاں ہوں، وہ بکریوں کے پاس چلا جائے اور جس شخص کے پاس (اس فتنہ کی جگہ کہیں دور) کوئی زمین و مکان وغیرہ ہو وہ اپنی اس زمین پر یا اس مکان میں چلا جائے۔" (حاصل یہ کہ جس جگہ وہ فتنہ ظاہر ہو وہاں نہ ٹھہرے بلکہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے اور گوشۂ عافیت پکڑ لے یا اس فتنہ سے غیر متوجہ ہو کر اپنے کاروبار میں مشغول و منہمک ہو جائے) ایک شخص نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ۔ یا رسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر کسی شخص کے پاس نہ اونٹ اور بکریاں ہوں اور نہ (کسی دوسری جگہ) کوئی زمین و مکان وغیرہ ہو (کہ جہاں وہ جا کر گوشۂ عافیت اختیار کرے اور اس فتنہ کی جگہ سے دور رہ سکے تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟) حضور نے فرمایا۔ "اس کو چاہئے کہ وہ اپنی تلوار کی طرف متوجہ ہو اور اس کو پتھر پر مار کر توڑ ڈالے۔" (یعنی اس کے پاس جو بھی آلات حرب اور ہتھیار ہوں ان کو بے کار اور ناقابل استعمال بنا دے تاکہ اس کے دل میں جنگ و پیکار کا خیال ہی پیدا نہ ہو اور وہ مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کے اس فتنہ میں شریک ہی نہ ہو سکے! یہ حکم اس لئے ہے کہ جس لڑائی میں دونوں طرف سے مسلمان برسرپیکار ہوں اور ایک دوسرے کی خونریزی کر رہے ہوں، اس میں شریک نہیں ہونا چاہئے)۔ اور پھر اس شخص کو چاہئے کہ اگر وہ فتنہ کی جگہ سے بھاگ سکے تو جلد نکل بھاگے (تاکہ) وہ اس فتنہ کے اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اے اللہ! میں نے تیرے احکام تیرے بندوں کو پہنچا دیئے۔ یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین بار فرمائے! ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر مجھے مجبور کر کے (یعنی زور و زبردستی سے) لڑنے والے دونوں فریق میں سے کسی ایک فریق کی صف میں لے جایا جائے اور وہاں سے کسی شخص کی تلوار سے مارا جاؤں یا کسی کا تیر آکر مجھ کو لگے جو مجھے موت کی آغوش میں پہنچا دے (تو اس صورت میں قاتل اور مقتول کا کیا حکم ہو گا؟) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارا وہ قاتل اپنے اور تمہارے گناہ کے ساتھ لوٹے گا اور دوزخیوں میں شمار ہو گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: علماء اسلام کے ہاں یہ ایک طویل بحث ہے کہ اگر افتراق و انتشار کا کوئی فتنہ ابھر آئے اور کچھ مسلمان دو فریق میں تقسیم ہو کر آپس میں جنگ و جدال کرنے لگیں تو اس وقت باقی مسلمانوں کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟ اہل علم کی ایک جماعت کا یہ کہنا ہے کہ افتراق و انتشار اور مسلمانوں کی باہمی محاذ آرائی کی صورت میں کسی بھی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ قتل و قتال میں شریک ہو، بلکہ جب مسلمانوں کے دو فریق آپس میں جنگ و جدال کریں تو اس میں شامل ہونے سے احتراز کرنا اور دونوں فریق سے یکسوئی و غیر جانب داری اختیار کر کے گوشۂ عافیت پکڑنا واجب ہے۔ ان حضرات کی دلیل مذکورہ بالا ارشاد گرامی اور اس طرح کی دوسری احادیث ہیں، مشہور صحابی حضرت ابوبکرؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کا مسلک بھی یہی تھا! حضرت ابن عمرؓ کا قول یہ ہے کہ خونریزی کی ابتدا خود نہیں کرنی چاہئے لیکن اگر کوئی خونریزی کرے تو اس کا دفیعہ کرنا لازم ہے۔ جمہور صحابہؓ اور تابعین کا مسلک یہ ہے اگر مسلمانوں میں باہمی پھوٹ پڑ جائے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو کر قتل و قتال کرنے لگیں تو اس فریق کی حمایت کرنی چاہئے جو حق و انصاف پر ہو اور جو فریق ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار کئے ہوئے ہو یا مسلمانوں کے امام و سردار سے بغاوت کر کے ملی افتراق و انتشار کا سبب بن رہا ہو اس کے خلاف قتال کرنا چاہئے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے گا اور بغاوت و سرکشی کرنے والوں کی ہمت افزائی ہوگی! اس مسلک کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا الخ۔ چنانچہ آیت کریمہ اس امر کو واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ جب مسلمانوں کے دو فریق باہمی قتل و قتال اور خونریزی میں مبتلا ہوں تو ان کے درمیان صلح و صفائی کرانی چاہئے، اور دونوں فریق کو اس فتنہ و انتشار سے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن اگر ان دونوں میں سے کوئی فریق دوسرے فریق کے تئیں حد سے تجاوز کرے اور اس فتنہ کو جاری رکھنے اور بھڑکانے میں مصروف رہے تو پھر اس فریق کے خلاف (کہ جو حد سے متجاوز اور فتنہ کو بھڑکانے کا باعث بن رہا ہو) تلوار اٹھانی چاہئے اور اس کے ساتھ قتال کرنا چاہئے تاکہ وہ راہ حق پر آجائے۔

"اپنے اور تمہارے گناہ کے ساتھ لوٹے گا" کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں، ایک تو یہ کہ اس شخص پر دو گناہ ہوں گے، ایک گناہ تو اس کے اس عمل کا کہ اس نے حقیقت میں تمہیں مارا، اور دوسرا تمہارا گناہ بایں اعتبار کہ اگر بالفرض تم اس کو مارتے اور اس کا گناہ تمہیں ہوتا تو گویا وہ گناہ بھی اس کے سر ڈال دیا جائے گا۔ پس از راہ زجر و توبیخ اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ اس فتنہ میں کسی ایسے مسلمان کو قتل کرنے کا گناہ کہ جو اس جنگ سے بیزار ہو مگر مجبورًا اس میں شریک ہو گیا ہو الضاعف یعنی دو گناہوں کر سر پڑے گا۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس شخص پر دو گناہ ہوں گے، ایک گناہ تو اس بغض و عداوت کا کہ جو وہ مسلمانوں سے رکھتا تھا اور جس کے سبب تمہارا قتل ہوا، اور دوسرا گناہ تمہارے قتل کا جو اس سے سرزد ہوا۔

"اور وہ دوزخیوں میں شمار ہوگا" اس کے بعد دوسرا جملہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ۔ "اور تم جنتیوں میں سے ہوگے"، لیکن حضور ﷺ نے دوسرا جملہ ارشاد نہیں فرمایا کیونکہ مذکورہ پہلے جملہ سے یہ مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

(۸) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ اَنْ يَكُوْنَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتَّبِعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِيْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب (ایسا زمانہ آنے والا ہے جب کہ) ایک مسلمان کے لئے اس کا بہترین مال بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ پہاڑ پر بارش برسنے کی جگہ چلا جائے اور فتنوں سے بھاگ کر اپنا دامن بچالے۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث کا مطلب بھی یہ تلقین کرنا ہے کہ جب ایسے فتنے رونما ہوں جن سے مسلمانوں میں باہمی افتراق و انتشار اور جنگ و جدل کی وبا پھیل جائے اور ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں دین کو بچانا مشکل ہو تو اس وقت نجات کی راہ یہی ہوگی کہ گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا جائے اور جس قدر ممکن ہو سکے اپنے آپ کو دنیا والوں سے الگ تھلگ کر لے، چنانچہ فرمایا کہ ایسے میں سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ ایک مسلمان بس چند بکریوں کا مالک ہو اور وہ ان بکریوں کو لے کر کہیں دور جنگل میں یا پہاڑ پر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں کوئی چراگاہ اور پانی ملنے کا ذریعہ ہو، اور وہاں ان بکریوں کو چرا کر ان کے دودھ کی صورت میں بقدر بقاء حیات غذائی ضرورت پر قناعت کر کے اپنی زندگی کے دن گزارتا رہے، تاکہ نہ دنیا والوں کے ساتھ رہے اور نہ دین کو نقصان پہنچانے والے فتنوں میں مبتلا ہو۔

فتنوں کی پیش گوئی

(۹) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ اَشْرَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اُطُمٍ مِنْ اٰطَامِ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ هَلْ تَرَوْنَ مَا اَرٰى قَالُوْا لَا قَالَ فَاِنِّيْ لَاَرَى الْفِتَنَ تَقَعُ خِلَالَ بُيُوْتِكُمْ كَوَقْعِ الْمَطَرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ ابن زیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ مدینہ کے ایک بلند مکان کی چھت) پر چڑھے اور پھر (صحابہ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ "کیا تم اس چیز کو دیکھتے ہو جس کو میں دیکھ رہا ہوں"؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ نہیں! آپ نے فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ میں ان فتنوں کو دیکھ رہا ہوں جو تمہارے گھروں پر اس طرح برس رہے ہیں جس طرح مینہ برستا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "اُطُم" پہاڑ کی چوٹی قلعہ اور بلند مکان کو کہتے ہیں اور "اٰطام" اس کی جمع ہے! یہاں اطام سے مراد مدینہ کے گرد واقع وہ فلک بوس مکانات اور قلعے ہیں جن میں وہاں کے یہودی رہا کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ ایک دن انہی قلعوں میں سے ایک قلعہ کی چھت پر تشریف لے گئے اور پھر مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔

"میں ان فتنوں کو دیکھ رہا ہوں الخ" کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا اپنے نبی ﷺ کو اس وقت جب کہ وہ قلعہ کی چھت پر چڑھے، فتنوں کا قریب ہونا دکھایا تاکہ وہ ان فتنوں کے بارے میں آگاہ کر دیں اور لوگ یہ جان کر کہ ان فتنوں کا نازل ہونا مقدر ہو چکا ہے، ان سے بچنے کے طریقے اختیار کر لیں، اور اس بات کو آنحضرت ﷺ کے معجزات میں سے شمار کریں کہ آپ نے جو پیش گوئی فرمائی تھی وہ

بالکل صحیح ثابت ہوئی۔

ایک خاص پیش گوئی

⑩ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هَلَکَةُ اُمَّتِیْ عَلٰی یَدَیْ غِلْمَةٍ مِنْ قُرَیْشٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت کی ہلاکت قریش کے چند نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث میں "امت" سے مراد صحابہ کرام اور اہل بیت نبی ﷺ ہیں جو اُمت کے سب سے بہتر و افضل افراد تھے! اور لفظ "غِلْمَة" غلام کی جمع ہے جس کے معنی نوجوان کے ہیں اور صراح میں لکھا ہے کہ غلام کے معنی لڑکے کے ہیں! نیز واضح رہے کہ غلام کا لفظ اصل میں غلم اور اغتلام سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں شہوت کا جوش و غلبہ! بہرحال یہاں "غلمة" (نوجوانوں) سے مراد وہ چھوٹی عمر کے نوجوان ہیں، جو غیر سنجیدہ اور بیباک ہوتے ہیں، بڑوں، بزرگوں کا ادب و احترام نہیں کرتے اور اہل علم و دانش اور باوقار لوگوں کی عظمت کو ملحوظ نہیں رکھتے) پس آنحضرت نے اس ارشاد گرامی میں قریش کے جن نوجوانوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان سے، قریش سے نسلی تعلق رکھنے والے دین و ملت کے وہ بدخواہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے جاہ (سلطنت اور ذاتی اغراض حاصل کرنے کے لئے حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو شہید کیا اور ان کی ہلاکت کا باعث بنے یا جنہوں نے اس وقت ملت میں افتراق و انتشار اور ظلم و بغاوت کا فتنہ پیدا کیا! نیز مجمع البحار میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں ان لوگوں کو تعین و تشخص کے ساتھ جانتے تھے لیکن اس حدیث کو بیان کرتے وقت، فتنہ و شر انگیزی کے خوف سے ان لوگوں کے نام ظاہر نہیں فرماتے تھے اور وہ لوگ بنی امیہ کے عبداللہ ابن زیاد اور ان جیسے دوسرے نوجوان، حجاج ابن یوسف جو عبدالملک ابن مروان کا امیر الامراء بنا سلیمان ابن عبدالملک جیسے نوخیز اور ان کی اولاد میں سے دوسرے افراد تھے جنہوں نے اس حد تک فتنہ و فساد کا بازار گرم کیا کہ اہل بیت نبوی ﷺ کو بے پناہ مظالم کا شکار بننا اور جام شہادت نوش کرنا پڑا بڑے اونچے درجہ کے مہاجر اور انصار، صحابہؓ کرام کو بڑی مظلومیت کے ساتھ اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور ایسی ایسی خونریزیاں ہوئیں اور جان و مال کا اس قدر نقصان ہوا کہ زمین و آسمان کانپ گئے، چنانچہ ان لوگوں کے وہ سیاہ کارنامے تاریخ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

⑪ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَقَارَبُ الزَّمَانُ وَیُقْبَضُ الْعِلْمُ وَتَظْهَرُ الْفِتَنُ وَیُلْقَی الشُّحُّ وَیَکْثُرُ الْهَرْجُ قَالُوْا وَمَا الْهَرْجُ قَالَ الْقَتْلُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ (وہ وقت بھی آنے والا ہے جب) زمانے ایک دوسرے کے قریب ہوں گے، علم اٹھالیا جائے گا، فتنے پھوٹ پڑیں گے بخل ڈالا جائے گا اور ہرج زیادہ ہوگا۔ "صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "ہرج" کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا قتل۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "زمانے ایک دوسرے کے قریب ہوں گے۔" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اس وقت دنیا کا زمانہ اور آخرت کا زمانہ ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے، اس صورت میں قیامت کا قریب ہونا مراد ہوگا! یا اس جملہ سے مراد زمانہ والوں میں سے بعض کا بعض کے ساتھ برائی اور بدی کے تعلق سے قریب ہونا ہے۔ یعنی اس زمانہ میں جو برے اور بدکار لوگ ہوں گے وہ ایک دوسرے کے قریب و نزدیک آجائیں گے، یا یہ مطلب ہے کہ خود زمانہ کے اجزاء بدی و برائی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب اور مشابہ ہوں گے یعنی ایک زمانہ برائی اور بدی کا ماحول لئے ہوئے آئے گا اور اس کے بعد پھر دوسرا زمانہ بھی اسی طرح آئے گا، یا یہ مطلب ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں حکومتیں دیرپا نہیں ہوں گی اور مختلف انقلابات اور عوامل بہت مختصر مختصر عرصہ میں حکومتوں کو بدلتے رہیں گے! اور بعض

حضرات نے یہ مطلب بیان کیا کہ آخر میں جو زمانہ آئے گا اس میں لوگوں کی عمریں بہت چھوٹی چھوٹی ہوں گی، اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ دراصل گناہوں کے سبب زمانہ سے برکت کے ختم ہو جانے سے کنایہ ہو، یعنی آخر زمانہ میں جب کہ گناہوں کی کثرت ہو جائے گی، لوگ دین وشریعت کے تقاضوں اور خدا وآخرت کے خوف سے بے پرواہ ہو کر عیش وعشرت اور راحت وغفلت میں پڑ جائیں گے تو زمانہ میں سے برکت نکل جائے گی اور اس کے شب وروز کی گردش اتنی تیز اور دن ورات کی مدت اتنی مختصر محسوس ہونے لگے گی کہ سالوں پہلے گزرا ہوا کوئی واقعہ کل کی بات معلوم ہوگا اور ہر "وقت کی کمی" کا شکوہ سنج نظر آئے گا۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں وقت اس طرح جلدی گزرے گا کہ ایک سال ایک مہینے کے برابر اور ایک مہینہ ایک ہفتہ کے برابر اور ایک ہفتہ ایک دن کے برابر معلوم ہوگا۔

"علم اٹھالیا جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں مخلص، باعمل اور حقیقی علم کے حامل علماء اٹھالئے جائیں گے اور اس طرح حقیقی علم مفقود ہو جائے گا نیز مختلف علمی فتنوں کا اندھیرا اس طرح پھیل جائے گا کہ علماء سوء کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوگا، اور ہر طرف ایسا محسوس ہوگا جیسے علم کا چراغ گل ہو گیا ہے اور جہالت ونادانی کی تاریکی طاری ہو گئی ہے۔

"بخل ڈالا جائے گا" مطلب یہ ہے کہ آخر زمانہ میں لوگوں میں بخل کی خصلت نہایت پختہ ہو جائے گی اور یہ چیز (یعنی بخل کی برائی) ایک عام وبا کی طرح پھیل جائے گی، نیز لوگ اس بخل کے یہاں تک تابع ہو جائیں گے کہ صنعت وحرفت والے اپنی صنعتی اشیاء کو بنانے اور پیدا کرنے میں بخل وتنگی کرنے لگیں گے اور مال کی تجارت ولین دین کرنے والے لوگ اپنے مال کو چھپا کر بیٹھ جائیں گے یہاں تک کہ ضروری اشیاء کو بھی فراہم کرنے اور دینے سے انکار کرنے لگیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "بخل ڈالا جائے گا" سے لوگوں میں اصل بخل کا پایا جانا مراد نہیں ہے کیونکہ اصل بخل تو انسان کی جبلت میں پڑا ہوا ہے اور اس اعتبار سے یہ بات پہلے زمانہ کے لوگوں کے بارے میں بھی نہیں کی جاسکتی کہ ان میں سرے سے بخل کا وجود نہیں تھا! لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ نہیں کیا جاسکتا چونکہ اصل بخل انسان کی جبلت میں پڑا ہوا ہے اس لئے کوئی بھی شخص نہ پہلے زمانوں میں اس خصلت سے کلیۃً محفوظ رکھ سکتا ہے اور جیسا کہ اس آیت و من یوق شح نفسه فاولئک هم المفلحون سے واضح ہوتا ہے، ایسے پاک نفس انسان سے پہلے بھی گزرے ہیں اب بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی موجود رہیں گے، یہ اور بات ہے کہ زمانہ کے اثرات کی وجہ سے ایسے پاک نفسوں کی تعداد ہر آنے والے زمانہ میں پہلے زمانوں سے کم ہوتی جائے۔

"ہرج" کے معنی ہیں فتنہ اور خرابی میں پڑنا! اور جیسا کہ قاموس میں لکھا ہے، جب یہ کہا جاتا ہے کہ هرج النَّاسَ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ لوگ فتنے میں پڑ گئے اور قتل واختلاط یعنی خونریزی اور کاموں کے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے اچھے برے کی تمیز نہ کر سکنے کی آفت میں مبتلا ہو گئے! پس اس ارشاد گرامی "ہرج" سے مراد خاص طور پر وہ قتل وخونریزی ہے جو مسلمانوں کے باہمی افتراق وانتشار کے فتنہ کی صورت میں اور اچھے برے کاموں کی تمیز مفقود ہونے کی وجہ سے پھیل جائے۔

فتنوں کی شدت کی انتہا

(۱۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَاْتِيَ عَلَى النَّاسِ يَوْمٌ لَا يَدْرِي الْقَاتِلُ فِيْمَ قَتَلَ وَلَا الْمَقْتُوْلُ فِيْمَ قُتِلَ فَقِيْلَ كَيْفَ يَكُوْنُ ذٰلِكَ قَالَ الْهَرْجُ الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، (پوری دنیا اس وقت تک فنا نہیں ہوگی جب تک لوگوں پر ایسا دن (یعنی بدامنی وانتشار فتنہ وفساد کی شدت انتہا سے بھرا ہوا وہ دور) نہ آجائے جس میں نہ قاتل کو یہ معلوم ہوگا کہ اس نے مقتول) کو کیوں قتل کیا اور نہ مقتول (یا اس کے ورثاء ومتعلقین) کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کو کیوں قتل کیا گیا۔" پوچھا گیا کہ یہ کیونکر ہوگا (یعنی اس کی وجہ کیا ہوگی کہ قتل کا سبب نہ قاتل کو معلوم ہوگا نہ مقتول کو") آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہرج کے

سبب، نیز قاتل و مقتول دونوں دوزخ میں جائیں گے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے دل و دماغ سے فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری کی برائی کا احساس اس طرح ختم ہو جائے گا کہ نہ تو قاتل بتا سکے گا کہ اس نے مقتول کا خون کس مقصد سے بہایا ہے اور نہ مقتول اور اس کے ورثاء و متعلقین کو یہ معلوم ہو گا کہ اس کی جان کس دنیاوی غرض و مقصد کے تحت یا کس شرعی وجہ کی بناء پر ماری گئی ہے، ایسا اندھیرا پھیل جائے گا کہ بس شکوک و شبہات اور ذرا ذرا سے واہموں پر انسان کا قیمتی خون بے دریغ بہایا جانے لگے گا اس بات سے کوئی غرض نہیں ہو گی کہ کون شخص حق پر ہے اور کون باطل پر، بلا تشخیص و تمیز جو جس کو چاہے گا گھاٹ اتار دے گا۔ موجودہ زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ مذکورہ صورت حال کا ظہور نہیں ہو گیا ہے۔

"ہرج کے سبب سے" کا مطلب یہ ہے کہ اس اندھے قتل و غارت گری کا باعث جہالت و نادانی کی وہ تاریکی ہو گی جو پورے ماحول کو فتنہ و فساد اور بدامنی سے بھر دے گی، شرارت پسندوں اور بلوائیوں کا عروج ہو گا، اخلاقی و سرکاری قوانین کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ اچھے برے کاموں کی تمیز مٹ جائے گی، حق و باطل باہم خلط ملط ہو جائیں گے اور دل و دماغ سے انسانی خون کی حرمت کا احساس مٹ جائے گا۔

"دونوں دوزخ میں جائیں گے" سے یہ واضح ہوا کہ نیت کا فتور اس قدر عام ہو جائے گا کہ بظاہر مقتول اور مظلوم نظر آنے والا شخص بھی اپنے اندر ظلم و طغیان کا فتنہ چھپائے رہا ہو گا۔ اس کا مقتول و مظلوم ہونا اس وجہ سے نہیں ہو گا کہ وہ واقعۃً کسی ظالمانہ قتل کا شکار ہوا ہے بلکہ اس اعتبار سے ہو گا کہ وہ موقع پر چوک گیا اور خود وار کرنے سے پہلے دوسرے کے وار کرنے کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ مذکورہ جملے کا مطلب یہ ہے کہ قاتل تو دوزخ میں اس لئے جائے گا کہ وہ واقعۃً قتل عمد کا گناہگار ہوا ہے اور مقتول اس وجہ سے دوزخ میں جائے گا کہ وہ خود بھی اس (قاتل) کو قتل کرنا چاہتا تھا اور اس کو تباہ و ہلاک کرنے کی خواہش اور ارادہ رکھتا تھا، اور چونکہ آدمی کسی گناہ کا عزم رکھنے کی وجہ سے بھی ماخوذ ہوتا ہے اس لئے اس کو بھی دوزخ کا مستوجب قرار دیا جائے گا، لیکن واضح رہے کہ یہ حکم جہالت کے طاری ہونے اور حق و باطل کے درمیان تمیز مفقود ہونے کی صورت کا ہے، ہاں اگر اس مقتول کی مذکورہ نیت و ارادہ کا تعلق جہالت و نادانی اور عدم تمیز سے نہ ہو بلکہ اس بات سے ہو کہ وہ بسبب اشتباہ، خطاء اجتہادی میں پڑ گیا ہو تو اس پر مذکورہ حکم کا اطلاق نہیں ہو گا! اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ (مقتول) اپنے قاتل کے تئیں جو عداوت و نفرت رکھے ہوئے تھا اور اس کو قتل کے ساتھ مقتول بھی مستوجب عذاب ہو گا لیکن اگر وہ (مقتول) اس جہالت و نادانی کی بنا پر نہیں بلکہ وہ از روئے دین و دیانت اس شخص یعنی قاتل کو قتل کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ نیز اس عزم تک وہ دین و شریعت کے اپنے علم کی روشنی میں غور و فکر کرنے کے بعد اور نیت کے اخلاص کے ساتھ پہنچا تھا اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اس عزم تک اس کا پہنچنا غیر صحیح کیوں نہ ہو، اس کو محض اس عزم کی وجہ سے مستوجب عذاب قرار نہیں دیا جائے گا کیونکہ اجتہاد اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کی کوشش میں خطا کر جانے والا شخص عند اللہ ماخوذ قرآن میں دیا جاتا، واضح رہے کہ مذکورہ ارشاد گرامی اس مشہور اور صحیح مسلک کی دلیل ہے کہ جو شخص کسی گناہ کی نیت کرے اور اس نیت پر قائم رہے تو وہ گنہگار ہی کے حکم میں ہو گا، اگرچہ وہ اپنے اعضاء اور زبان سے عملی طور پر اس گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔

پر فتن ماحول میں دین پر قائم رہنے والے کی فضیلت

(۱۳) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِبَادَةُ فِي الْهَرْجِ كَهِجْرَةٍ إِلَيَّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت معقل ابن یسار کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "فتنے کے زمانہ میں (اور مسلمانوں کے باہمی محاذ آرائی اور قتل و قتال کے وقت پوری استقامت اور مداومت کے ساتھ دین پر قائم رہنے اور) عبادت و نیکی کرنے کا ثواب، میری طرف ہجرت کرنے کے ثواب

کی مانند ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ زمانہ نبوی میں فتح مکہ سے پہلے، دارالحرب سے ہجرت کر کے مدینہ آجانے اور آنحضرت ﷺ کی رفاقت وصحبت کا شرف رکھنے والے کو جو عظیم ثواب ملتا تھا اسی طرح کا عظیم ثواب اس شخص کو بھی ملے گا جو فتنہ وفساد کی جہالت وتاریکی سے اپنے کو محفوظ رکھ کر اور مسلمانوں کی باہمی محاذ آرائی سے اپنا دامن بچا کر مولیٰ کی عبادت میں مشغول اور اپنے دین پر قائم رہے۔

مظالم پر صبر کرو اور یہ جانو کہ آنے والا زمانہ موجودہ دور سے بھی بدتر ہوگا

(۱۴) وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَدِيٍّ اَتَيْنَا اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ فَشَكَوْنَا اِلَيْهِ مَانَلْقٰي مِنَ الْحَجَّاجِ فَقَالَ اصْبِرُوْا فَاِنَّهٗ لَايَاتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ اِلَّا الَّذِيْ بَعْدَهٗ اَشَرُّ مِنْهُ حَتّٰى تَلْقَوْا رَبَّكُمْ سَمِعْتُهٗ مِنْ نَّبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت زبیر ابن عدیؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ حضرت انس ابن مالکؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حجاج ابن یوسف کے مظالم اور ایذاء رسانیوں کی شکایت کی، انہوں نے فرمایا کہ صبر کرو اور ضبط وتحمل سے کام' کیونکہ آئندہ جو بھی زمانہ آئے گا وہ گزشتہ زمانے سے بدتر ہوگا (پس تمہیں کیا معلوم کہ آنے والے زمانے میں کیسے کیسے حکمراں وعمال ہوں جو شاید حجاج سے بھی زیادہ ظالم وجابر ثابت ہوں، اس لئے تم حجاج کے مظالم اور ایذاء رسانیوں پر صبر کرو، یہاں تک تم (روز آخرت) اپنے پروردگار سے ملاقات کرو (اور پھر تم دیکھنا کہ تمہارا پروردگار تمہارے ظالموں کو کس طرح عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ بات میں نے تمہارے پیغمبر ﷺ سے سنی ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ہر آنے والا زمانہ گزشتہ زمانہ سے بدتر ہوگا، تو اس پر اس صورت میں اشکال واقع ہوگا جب کہ "آنے والے زمانہ" سے مراد بلا استثناء ہر آنے والا زمانہ ہو، اور اشکال یہ واقع ہوگا کہ حجاج ابن یوسف کے زمانہ کے بعد حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا زمانہ آیا، یا بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدیؒ کا زمانہ آئے گا تو کیا ان زمانوں پر بھی مذکورہ بات کا اطلاق ہوگا اور بلا استثناء یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہر آنے والا زمانہ حجاج کے زمانہ سے بھی بدتر ہوگا، ہاں اگر یہ بات استثناء کے ساتھ فرمائی گئی ہے تو پھر اشکال پیدا ہوگا، چنانچہ شارحین حدیث نے وضاحت کی ہے کہ آنے والے زمانوں کے بدتر ہونے کی خبر دینا اکثر واغلب کے اعتبار سے ہے، یعنی آنے والے زمانوں میں اکثر وغالب زمانے ایسے ہی ہوں گے جو پچھلے زمانہ سے بدتر ماحول میں سے بھرئے ہوں گے، نیز آنے والے زمانہ سے مراد حجاج کے زمانہ سے زمانہ دجال تک کے زمانے ہیں جن میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدیؒ کے زمانے مستثنیٰ ہیں، علاوہ ازیں اس حدیث کا اصل مقصود اُمت کے لوگوں کو تسلی دینا، ظلم وجور پر صبر کرنے کی تلقین کرنا، آنے والے زمانوں کے بارے میں باخبر کرنا، اور اس بات کی طرف راغب کرنا ہے کہ اپنے زمانہ کو غنیمت جان کر زیادہ سے زیادہ آخروی فائدے حاصل کرنے میں مشغول رہو، کیا خبر کہ آنے والے زمانوں میں کسی کو اتنا بھی موقع مل سکے یا نہیں۔

بعض حضرات نے اس وضاحت کو زیادہ مناسب کہا ہے کہ آنے والے زمانوں کے بارے میں جہاں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ تو مستثنیٰ ہے، باقی تمام زمانے، کسی نہ کسی اعتبار سے، کسی نہ کسی جگہ کے حالات کے مطابق اور کسی نہ کسی معاملہ میں ازروئے علم وعمل اور استقامت واخلاص دین پہلے زمانے سے بدتر ہی حالت کے حامل رہے ہیں یا حامل رہیں گے اور آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک سے بعد ودوری کا تقاضا بھی ہے کہ زمانہ جوں جوں آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک سے دور ہوتا جاتا ہے، اسی اعتبار سے بدی اور خرابی بڑھتی جاتی ہے، اور اس کا سلسلہ ذات رسالت ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا چنانچہ صحابہؓ تک نے، اپنی صفائی باطن اور پاکیزگی ونفس کے باوجود، آنحضرت ﷺ کو تدفین کے بعد اپنے قلوب کی حالت وکیفیت میں تبدیلی محسوس کی تھی۔ پہلے کے بعض بزرگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ پہلے کسی وقت دل میں گناہ کا خیال پیدا ہو گیا اور

پھر وہ خیال جاتا رہا تو کہیں کافی مدت کے بعد جب وہی خیال پھر دوبارہ آیا تو اب آسانی کے ساتھ دفع ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد اس فرق کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ ظلمت، زمانہ نبوت کے نور سے اور زیادہ بعد زمانی ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے کیونکہ زمانہ نبوت کو گزرے جتنا زیادہ عرصہ ہوتا جاتا ہے برائی کی ظلمت اسی اعتبار سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حضور ﷺ نے قیامت تک پیدا ہونے والے اس اُمّت کے فتنہ پردازوں کے بارے میں خبر دے دی تھی

⑭ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ وَاللّٰهِ مَا اَدْرِيْ اَنَسِيَ اَصْحَابِيْ اَمْ تَنَاسَوْا وَاللّٰهِ مَاتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَائِدِ فِتْنَةٍ اِلٰى اَنْ تَنْقَضِيَ الدُّنْيَا يَبْلُغُ مَنْ مَعَهُ ثَلٰثَمِائَةٍ فَصَاعِدًا اِلَّا قَدْ سَمَّاهُ لَنَا بِاِسْمِهِ وَاِسْمِ اَبِيْهِ وَاِسْمِ قَبِيْلَتِهِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم کہ میرے یہ رفقاء (یعنی صحابہ کرامؓ) بھول گئے ہیں یا وہ بھولے تو نہیں ہیں مگر اپنی بعض مصلحتوں کی وجہ سے ایسا ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ بھول گئے ہیں، خدا کی قسم، رسول کریم ﷺ نے کسی بھی ایسے فتنہ پردازوں کو ذکر کرنے سے نہیں چھوڑا تھا جو دنیا کے ختم ہونے تک پیدا ہونے والا ہے اور جس کے تابعداروں کی تعداد تین سو تک یا تین سو سے زائد تک ہوگی، آپ ﷺ نے ہر فتنہ پرداز کا ذکر کرتے وقت ہمیں اس کا اور اس کے باپ کا اور اس کے قبیلے تک کا نام بتایا تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "فتنہ پرداز" سے مراد وہ شخص ہے جو فتنہ و فساد اور تباہی و خرابی کا باعث ہو، جیسے وہ عالم جو دین میں بدعت پیدا کرے دین کے نام پر مسلمانوں کو آپس میں لڑائے، اُمّت میں افتراق و انتشار پیدا کر کے اسلام کی شوکت کو مجروح کرے اور جیسے وہ ظالم بادشاہ و امیر جو مسلمانوں کے باہمی قتل و قتال کا باعث ہو۔

"تین سو" کے عدد کی قید بظاہر اس لئے لگائی گئی ہے کہ کم سے کم اتنی تعداد میں آدمیوں کا کسی فتنہ پرداز کے گرد جمع ہو جانا اس فتنہ پرداز کی فتنہ پردازیوں کو پھیلانے، فتنہ و فساد کی کاروائیوں کو اثر انداز ہو جانے اور دین و ملت کو نقصان پہنچ جانے کے لئے عام طور پر کافی ہو جاتا ہے، اگر کسی فتنہ پرداز کے تابعداروں کی تعداد اس سے کم ہوتی ہے تو گو وہ انفرادی اور جزوی طور پر فتنہ پردازی میں کامیاب ہو جائے مگر اجتماعی طور پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں ہوتا۔

گمراہ کرنے والے قائد

⑮ وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا اَخَافُ عَلٰى اُمَّتِي الْاَئِمَّةَ الْمُضِلِّيْنَ وَاِذَا وُضِعَ السَّيْفُ فِيْ اُمَّتِيْ لَمْ يُرْفَعْ عَنْهُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی اُمّت کے حق میں جن لوگوں سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ گمراہ کرنے والے امام ہیں، (یاد رکھو) جب میری اُمّت میں تلوار چل پڑے گی تو پھر قیامت تک نہیں رکے گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "ائمہ" اصل میں امام کی جمع ہے اور امام قوم و جماعت کے سردار، پیشوا اور اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں کو اپنے قول یا فعل یا عقیدے کی اتباع کی طرف بلائے! پس اس ارشاد کا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی حیثیت نیز ان کے دین کو سب سے

زیادہ نقصان پہنچانے والی اور تباہی کی طرف لے جانے والی جو چیز ہے وہ مسلمانوں کی قیادت و رہبری اور پیشوائی کرنے والے لوگوں کا گمراہ ہونا ہے کیونکہ انفرادی حیثیت میں کسی بھی شخص کے گمراہ ہونے کا نقصان اسی کی ذات تک محدود رہتا ہے لیکن قائد و پیشوا کی گمراہی کا نقصان و ضرر پوری قوم و جماعت کو متاثر کرتا ہے۔

"جب میری اُمت میں تلوار چل پڑے گی الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک دوسرے کے خلاف تلوار و طاقت آزمائی کی سیاست کی ابتداء ہو جائے گی اور باہمی مسائل و معاملات کو افہام و تفہیم اور دین و دیانت کی روشنی میں حل کرنے کی بجائے تشدد و خونریزی کے راستے کو اختیار کر لیا جائے گا تو پھر طاقت آزمائی اور تشدد و خونریزی کا وہ فتنہ قیامت تک ٹھنڈا نہیں ہوگا اور مسلمان کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہیں گے۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعے اُمت میں خونریزی کی ابتداء ہو جانے کے جس خوف کی طرف اشارہ فرمایا تھا اس کا مصداق امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ کے واقعہ شہادت کی صورت میں سامنے آیا، چنانچہ اسلام میں سب سے پہلے مسلمان نے مسلمان کے خلاف جو تلوار اٹھائی اور خون بہایا وہ حضرت عثمانؓ کی شہادت ہے! اور پھر ان کے سانحہ شہادت کے بعد مسلمانوں میں باہمی خونریزی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک باقی ہے جیسا کہ مخبر صادق ﷺ نے خبر دی ہے مسلمانوں کی بدقسمتی سے یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

خلافت راشدہ کی مدت کے بارے میں پیشگوئی

(۱۶) وَعَنْ سَفِينَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلْخِلَافَةُ ثَلٰثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا ثُمَّ يَقُوْلُ سَفِينَةُ اَمْسِكْ خِلَافَةَ اَبِيْ بَكْرٍ سَنَتَيْنِ وَخِلَافَةَ عُمَرَ عَشْرَةً وَعُثْمَانَ اِثْنَتَيْ عَشْرَةَ وَعَلِيٍّ سِتَّةً۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت سفینہؓ (جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے) کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "خلافت کا زمانہ تیس سال کا ہوگا، اس کے بعد وہ خلافت بادشاہت میں بدل جائے گی"۔ حضرت سفینہ نے (یہ حدیث بیان کرنے کے بعد راوی سے یا عام لوگوں کو خطاب کر کے) کہا کہ حساب کر کے دیکھو (حضور ﷺ نے جو تیس سال کی مدت بیان فرمائی ہے وہ اس طرح ہوتی ہے کہ) حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا زمانہ دو سال، حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ دس سال، حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ بارہ سال اور حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ چھ سال۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "خلافت" سے مراد خلافت حق ہے، یا وہ خلافت مراد ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ اور جس کی بنیاد قرآن و سُنت کی ہدایت اور رہنمائی اور دین و شریعت کے آئین حکمرانی کی اتباع پر ہو! چنانچہ اس خلافت کا صحیح مصداق حضور ﷺ کے بعد اول کی خلافت ہے جس کو "خلافت راشدہ" کہا جاتا ہے اور جس کی مدت تیس ہوئی ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اپنی شرح مشکوٰۃ میں اس روایت کو نقل کرتے ہوئے "مُلْكًا" کے بعد "عَضُوْضًا" کا لفظ بھی نقل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ خلافت کٹ کھنی بادشاہت میں بدل جائے گی، یعنی خلافت کا دور ختم ہو جانے کے بعد بادشاہت کا دور شروع ہو جائے گا اور بادشاہت بھی ایسی کہ لوگ اس کی سختیوں اور ظالمانہ کاروائیوں سے امن نہیں پائیں گے اور عدل و انصاف کا نظام اور دین پروری کا ماحول جیسا کہ ہونا چاہئے، جاری نہیں ہوگا، یہ اور بات ہے کہ اس دور کے حکمران گزرے ہوئے خلفاء کی جانشینی کا دعویٰ رکھنے کی وجہ سے اور مجازاً اس بادشاہت پر "خلافت" ہی کا اطلاق کریں اور اپنے کو خلیفہ کہلائیں اور گو ان کو امیر المؤمنین کہنا کوئی خلاف حقیقت بات بھی نہ ہو کیونکہ نظم مملکت اور ظاہری قانون کے مطابق وہ مسلمانوں کے امیر و حاکم بہرحال ہوں گے لیکن حقیقی خلافت کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بس تیس سال تک رہے گی، چنانچہ خلفاء راشدین کہ جن کا دور خلافت حقیقی خلافت کا واقعی مصداق تھا، تیس ہی سال پر مشتمل ہے۔

شرح عقائد میں اس حدیث کے تعلق سے ایک اشکال وارد کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ حضور ﷺ نے "خلافت" کا دور صرف تیس سال فرمایا ہے جب کہ خلفاء راشدین کے بعد کے زمانے میں خلفاء عباسیہ بلکہ بنو امیہ میں سے بھی بعض خلفاء جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت پر مسلمانوں کے تقریباً تمام ہی علماء اور اہل عمل وعقد کا اتفاق رہا ہے تو گویا ان کے دور خلافت کو "خلافت" نہیں کہا جاسکتا اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جس "خلافت" کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ خلافت کاملہ کہ جس میں دین وشریعت اور عدل وانصاف کے ذرا سی بھی آمیزش نہ ہو، تیس سال رہے گی، اس کے بعد کی خلافت کی شکل وصورت میں تبدیلی آجائے گی، ہاں کچھ دور ایسے بھی آئیں گے جس میں اس خلافت کے طرز کو اختیار کیا جائے گا ورنہ عام طور پر جو بھی خلافت قائم ہوگی وہ بس نام ہی کی خلافت ہوگی، اصل کے اعتبار سے بادشاہت ہوگی! واضح رہے کہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کا دور حکمرانی شروع ہوا جس کو انہوں نے اگرچہ "خلافت" ہی کا نام دیا مگر حقیقت میں وہ بادشاہت تھی، حضرت امیر معاویہؓ اس دور کے سب سے پہلے حکمران ہیں ان کا دور حکمرانی اگرچہ خلافت راشدہ کی طرح دین وملت کے حق میں حقیقی خلافت کا نمونہ نہیں رہا مگر ان کی خلافت وحکومت میں بادشاہت کی وہ تمام خرابیاں بھی نہیں تھیں جو ان کے جانشینوں کے دور حکومت میں پیدا ہوئیں نیز انہوں نے اپنے دور حکمرانی کو کسی نہ کسی حد تک خلافت راشدہ کے نہج پر رکھنے کی کوشش کی، لیکن ان کے بعد بنو امیہ کا اکثر دور حکمرانی مسلمانوں کی باہمی آویزش وخلفشار قتل وغارت گری، دین وشریعت کی صریح خلاف ورزی اور ظلم وناانصافی کی بہت زیادہ مثالوں سے بھرا ہوا تھا، اس دور کی ابتداء یزید ابن معاویہؓ سے ہوتی ہے، یزید کے بعد اس کا بیٹا، معاویہ ابن یزید حکمراں ہوا، اس کے بعد ولید ابن عبدالمالک، سلیمان ابن عبدالمالک، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ، یزید ابن عبدالمالک، ہشام ابن عبدالمالک، ولید ابن یزید ابن عبدالمالک، ابراہیم ابن ولید ابن عبدالملک اور مروان ابن محمد ابن مروان بالترتیب یکے بعد دیگرے خلیفہ وحکمراں ہوتے رہے مروان ابن محمد ابن مروان، بنو امیہ میں سے آخری حکمراں تھا، اس کے بعد خلافت بنو امیہ سے نکل کر بنو عباس میں پہنچ گئی۔

حدیث کے راوی حضرت سفینہؓ نے تیس سال کا جو حساب بیان کیا ہے وہ تخمیناً ہے اور اس بات پر مبنی ہے کہ انہوں نے کسور کو بیان نہیں کیا، چنانچہ صحیح روایات اور مستند تاریخی کتابوں میں خلافت راشدہ کی تیس سالہ مدت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا زمانہ دو سال چار ماہ، حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا زمانہ دس سال چھ ماہ، حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کا زمانہ چند روز کم بارہ سال اور حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت کا زمانہ چار سال نو ماہ رہا ہے۔ اس طرح چاروں خلفاء کی مجموعی مدت خلافت انتیس سال سات ماہ ہوتی ہے اور پانچ مہینے جو باقی رہے وہ حضرت امام حسنؓ کی خلافت کا زمانہ ہے، پس حضرت امام حسنؓ بھی خلفاء راشدین میں سے ہوئے۔

آنے والے زمانوں کے بارے میں پیشگوئی

⑰ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَيَكُوْنُ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ شَرٌّ كَمَا كَانَ قَبْلَهُ شَرٌّ قَالَ نَعَمْ قُلْتُ فَمَا الْعِصْمَةُ قَالَ السَّيْفُ قُلْتُ وَهَلْ بَعْدَ السَّيْفِ بَقِيَّةٌ قَالَ نَعَمْ تَكُوْنُ إِمَارَةٌ عَلٰى أَقْذَاءٍ وَهُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ قُلْتُ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ يَنْشَأُ دُعَاةُ الضَّلَالِ فَإِنْ كَانَ لِلّٰهِ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةٌ جَلَدَ ظَهْرَكَ وَأَخَذَ مَالَكَ فَأَطِعْهُ وَإِلَّا فَمُتْ وَأَنْتَ عَاضٌّ عَلٰى جِذْلِ شَجَرَةٍ قُلْتُ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ يَخْرُجُ الدَّجَّالُ بَعْدَ ذٰلِكَ مَعَهُ نَهْرٌ وَنَارٌ فَمَنْ وَقَعَ فِيْ نَهْرِهِ وَجَبَ أَجْرُهُ وَحُطَّ وِزْرُهُ وَمَنْ وَقَعَ فِيْ نَهْرِهِ وَجَبَ وِزْرُهُ وَحُطَّ أَجْرُهُ قَالَ قُلْتُ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ يُنْتَجُ الْمُهْرُ فَلَا يُرْكَبُ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ وَجَمَاعَةٌ عَلٰى أَقْذَاءٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ الْهُدْنَةُ عَلَى الدَّخَنِ مَا هِيَ قَالَ لَا تَرْجِعُ قُلُوْبُ أَقْوَامٍ عَلَى الَّذِيْ كَانَتْ عَلَيْهِ قُلْتُ هَلْ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ شَرٌّ قَالَ فِتْنَةٌ عَمْيَاءُ صَمَّاءُ عَلَيْهَا دُعَاةٌ عَلٰى أَبْوَابِ النَّارِ فَإِنْ مُتَّ يَا حُذَيْفَةُ وَأَنْتَ عَاضٌّ عَلٰى جِذْلٍ خَيْرٌ لَكَ مِنْ أَنْ تَتَّبِعَ أَحَدًا مِنْهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) کیا اس خیر کے بعد شر پیدا ہوگا جیسا کہ اب سے پہلے شر کا دور دورہ تھا (یعنی جس طرح آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کفر و شرک اور برائیوں کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور پھر آپ ﷺ کے نور نبوت نے بدی و برائی کی تاریکی کو ختم کر کے نیکی اور بھلائی کا اجالا پھیلایا، اسی طرح کیا خیر و بھلائی کے اس زمانے کے بعد شر و برائی کا زمانہ بھی آئے گا)۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! (اس کے بعد پھر بدی و برائی کا زمانہ بھی آئے گا)" میں نے عرض کیا کہ پھر اس وقت بچنے کی کیا سبیل ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا "تلوار! (یعنی اس فتنہ سے حفاظت، تلوار آزمائی کے ذریعے حاصل ہوگی یا یہ مراد ہے کہ اس فتنہ سے بچنے کا راستہ یہی ہوگا کہ تم اس فتنہ کو پیدا کرنے والے لوگوں کا سر تلوار سے اڑا دو) میں نے عرض کیا کہ پھر اس تلوار کے بعد اہل اسلام باقی رہیں گے (یعنی جب مسلمان بدی اور برائی کی طاقتوں کو ختم کرنے کے لئے تلوار اٹھائیں گے اور قتل و قتال کریں گے تو کیا اس کے بعد اس زمانے کے مسلمانوں میں اتنی طاقت و اجتماعیت باقی رہ جائے گی کہ وہ امانت و دیانت کے ساتھ اپنی سرداری و حاکمیت قائم کر لیں اور لوگ اس کی قیادت و امارت پر اتفاق کر لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! امارت یعنی حکومت و سلطنت تو قائم ہو جائے گی لیکن اس کی بنیاد فساد پر ہوگی اور صلح کی بنیاد کدورت پر ہوگی" میں نے عرض کیا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس کے بعد گمراہی کی طرف بلانے والے لوگ پیدا ہوں گے۔ اگر اس وقت زمین پر کوئی خلیفہ یعنی امیر و بادشاہ ہو تو خواہ وہ تیری پیٹھ پر مارے ہی کیوں نہ اور تیرا مال کیوں نہ لے لے (یعنی وہ امیر بادشاہ اگرچہ تمہیں ناحق ستائے تم پر ظلم و ستم ڈھائے اور تمہارا مال و اسباب چھین لے (لیکن تم اس کی اطاعت سے منہ نہ پھیرنا (تاوقتیکہ وہ تمہیں خدا اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف کوئی کام کرنے کو نہ کہے اور یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ دین و ملت میں افتراق و انتشار اور مملکت میں بدامنی و فساد پیدا نہ ہو) اور اگر کوئی خلیفہ یعنی امیر و بادشاہ نہ ہو تو تمہاری موت ایسی حالت میں آنی چاہئے کہ تم کسی درخت کی جڑ میں پناہ پکڑے ہوئے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اس کے بعد دنیا اور زیادہ فتنہ و انتشار اور برائیوں کی طرف بڑھتی رہے گی اور مسلمان بتدریج دینی و ملی طور پر اور دنیاوی اعتبار سے بھی زوال پذیر ہوتے رہیں گے، یہاں تک کہ حضرت مہدیؓ کے زمانہ میں) دجال کا ظہور ہوگا جس کے ساتھ پانی کی نہر ہوگی اور آگ (کی خندق) پس جو شخص اس کی آگ میں پڑے گا اس کا اجر ثابت و قائم ہوگا اور اس کے گناہ (جو اس نے پہلے کئے ہوں گے) دور ہو جائیں گے اور جو شخص اس کی نہر میں پڑے گا اس کا گناہ اس کے لئے بار دوش بنے گا اور اس کا اجر (جو اس نے اچھے عمل کر کے حاصل کئے ہوں گے) جاتا رہے گا۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "گھوڑے کا بچہ جنوایا جائے گا اور وہ سواری نہیں دینے پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔"

"اور ایک روایت میں (امارت تو قائم ہو جائے گی لیکن اس کی بنیاد فساد پر ہوگی الخ کے بجائے یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا (کدورت پر صلح ہوگی (یعنی اس وقت لوگ ظاہر میں تو صلح صفائی کا راستہ اختیار کریں گے لیکن ان کے باطن میں کدورت ہوگی) اور وہ (کسی معاہدہ و فیصلہ پر) دلوں کی ناخوشی اور بخشش کے ساتھ متفق و مجتمع ہوں گے"۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! "کدورت پر صلح" سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دل اس حالت پر نہیں ہوں گے جس پر پہلے تھے (یعنی جس طرح اسلام کے ابتدائی زمانے میں لوگوں کے دل بغض و کینہ سے صاف رہا کرتے تھے، وہ جو بات کہا کرتے یا جو معاملہ کرتے تھے اس میں صدق دلی شامل ہوتی تھی۔ اس طرح کے پاک و صاف دل اس وقت کے لوگوں کے نہیں ہوں گے کہ زبان سے کچھ کہیں گے، معاملہ کچھ کریں گے اور دل میں کچھ اور رکھیں گے۔ یا یہ مراد ہے کہ لوگوں میں باہمی صلح و صفائی ہو جانے کے باوجود ان کے دل اس طرح پاک و صاف نہیں ہوں گے جس طرح ایک دوسرے کے خلاف بغض و عناد میں مبتلا ہونے اور کدورت پیدا ہونے سے پہلے تھے"۔ میں نے عرض کیا کہ کیا اس بھلائی کے بعد کہ جو آپس کے نفاق و کدورت کے بعد مذکورہ باہمی مصالحت و مفاہمت کی صورت میں ظاہر ہوگی اور جو اگرچہ برائی کی آمیزش سے پوری طرح صاف نہیں ہوگی) کسی اور برائی کا ظہور ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" اس کے بعد پھر برائی کا ظہور ہوگا اور وہ ایک ایسے

بڑے فتنہ کی صورت میں ہوگا جو اندھا اور بہرا ہوگا (یعنی وہ فتنہ لوگوں کی عقل و خرد اور نیکی و بدی کی قوت تمیز پر اس طرح اثر انداز ہو جائے کہ وہ حق اور سچائی کو نہ دیکھیں گے اور نہ سنیں گے! گویا فتنہ کی طرف اندھے پن اور بہرے پن کی نسبت مجازاً ہے، اصل مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہو کر بدی اور برائی کی انتہائی حدوں تک پہنچ جائیں گے، اور اس کا نتیجہ، جیسا کہ آگے فرمایا جا رہا ہے، یہ ہوگا کہ) اس فتنہ کی طرف بلانے والے لوگ پیدا ہو جائیں گے (یعنی لوگ محض اس فتنہ میں مبتلا ہی نہیں ہوں گے بلکہ ایک ایسی جماعت بھی پیدا ہو جائے گی جو اس فتنہ کو ہوا دے گی اور دوسروں کے اس فتنہ میں مبتلا ہونے کا باعث بنے گی) اور اس جماعت کے لوگوں کا یہ عمل ایسا ظاہر کرے گا جیسے کہ وہ دوزخ پر کھڑے ہو کر مخلوق کو اس (دوزخ) کی طرف بلا رہے ہیں (چنانچہ بلانے والے اور ان کے بلاوے کو قبول کرنے والے، سب ہی دوزخ میں جائیں گے) پس اے حذیفہ! اس وقت تمہاری موت اگر اس حالت میں آئے کہ تم کسی درخت کی جڑ میں پناہ پکڑے ہوئے ہو تو یہ اس سے بہتر ہوگا کہ تم اہل فتنہ میں سے کسی کی اتباع و پیروی کرو"۔ (ابوداؤد)

تشریح: قتادہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جس فتنہ سے بچاؤ کا ذریعہ تلوار کو قرار دیا تھا اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جو حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں اسلام سے پھر گئے تھے اور اپنے ارتداد بغاوت کے ذریعہ ایک بڑے فتنہ کا باعث بننے والے تھے لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نہایت تدبر و ہوشیاری کے ساتھ ان کی سرکوبی کی اور طاقت کے ذریعے ان کو دبایا۔

اَقْذَاءٌ اصل میں قذی کی جمع ہے اور قَذَاۃٌ کی جس کے معنی اس کیچڑ، کوڑے اور تنکے کے ہیں جو آنکھ میں یا پانی و شربت وغیرہ میں پڑ جائے۔ پس حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت امارت و حکومت تو قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کا امیر و خلیفہ بھی ہوگا لیکن لوگ اخلاص و حسن نیت کے ساتھ اپنی اس امارت و حکومت کے تئیں وفاداری نہ رکھیں گے بلکہ ان کے دلوں میں بغض و عداوت، عدم وفاداری اور مخالفت و مخاصمت کے جذبات ہوں گے، جیسا کہ اگر کسی کی آنکھ میں کوئی ریزہ یا تنکا پڑ جائے تو گو وہ باہر سے اچھی بھلی معلوم ہوتی ہو مگر اس کے اندر سخت سوزش اور دکھن ہوتی ہے اسی طرح وہ لوگ گو ظاہر میں اپنی امارت و حکومت کے وفادار و بہی خواہ نظر آئیں گے مگر ان کے اندر غیر وفاداری اور مخالفت و عداوت بھری ہوگی، اور قاضیؒ نے اس کے دوسرے معنی بیان کئے ہیں اور وہ یہ کہ اس وقت مسلمانوں کی حکومت و امارت تو قائم ہوگی لیکن وہ امارت و حکومت، بعض بدعتوں اور دین مخالف کارروائیوں کے ذریعے اپنی حیثیت کو بگاڑے رکھے گی۔

"ھدنۃ" مصالحت کے مفہوم میں ہے اور اصل میں اس کے معنی سکون و آرام اور فراغت کے ہیں اور دخن دخان کے مفہوم میں ہے جس کے معنی ہیں "دھواں" اس جملے "ھدنۃ علی دخن" (صلح کی بنیاد کدورت پر ہوگی) کا مطلب بھی وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا کہ اس وقت باہم مخاصمت و مخالفت رکھنے والے فریقوں کے درمیان جو مصالحت ہوگی وہ فریب و نفاق اور بدنیتی کے ساتھ ہوگی کہ اس اعتبار سے یہ جملہ ماقبل کے جملہ کو مؤکدہ کرنے کے لئے ہے! اور شارحین حدیث نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا مصداق وہ مصالحت و مفاہمت ہے جو حضرت امام حسن اور حضرت امیر معاویہؓ کے سپرد کر دی تھی اور انہوں نے (یعنی امیر معاویہ۔ نے) اپنی امارت و سیادت کو مستحکم کر لیا تھا! اس سے معلوم ہوا کہ بعض حضرات خصوصاً مورخین نے جو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ امیر معاویہؓ، حضرت امام حسنؓ سے صلح و صفائی کر لینے کے بعد خلیفہ ہوئے تھے اس معنی میں صحیح نہیں ہے کہ امام حسنؓ واقعۃً حضرت امیر معاویہؓ کو خلافت کا اپنے سے زیادہ مستحق و اہل جانتے تھے اس لئے انہوں نے صلح کر کے ان کے حق میں خلافت سے دستبرداری دے دی تھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے سیاسی عناصر نے حضرت امام حسنؓ کے خلاف جس طرح کا ماحول بنا دیا تھا اور ان دونوں عظیم المرتبت شخصیتوں کی باہمی آویزش کی وجہ سے دین و ملت کو جو نقصان پہنچنے والا تھا، حضرت امام موصوف نے اس سے بچنے کے لئے بادل نخواستہ مصالحت کی اور اپنی خلافت و حکومت کو دین و ملت کے وسیع تر مفاد پر ترجیح دینے کے بجائے اس سے دستبرداری ہی کو بہتر سمجھا۔

"گمراہی کی طرف بلانے والے لوگ پیدا ہوں گے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے امراء اور ارباب حکومت میں سے ایسے لوگوں کی جماعت پیدا ہوگی جو لوگوں کو بدعت و گناہ کی طرف مائل کرے گی اور برائی کے راستے پر لگائے گی۔

"کسی درخت کی جڑ میں پناہ پکڑے ہوئے ہو" کے ذریعے اس امر کی تلقین کرنا مقصود ہے کہ ایسے نازک حالات اور اس طرح کے سخت دین مخالف ماحول میں تمہیں چاہئے کہ لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے کہیں گوشہ نشین ہو جاؤ اور اپنے آپ کو فتنہ و فساد سے بچا کر اپنی باقی زندگی کو کسی ایسی جگہ گذار دو جہاں تک اس فتنہ کے برے اثرات تم تک نہ پہنچ سکیں یہاں تک کہ اگر تمہیں ان نازک حالات اور اس پر فتن ماحول سے دور رہنے کے لئے کہیں دور جنگل میں جا کر کسی درخت کی جڑ میں پناہ لینی پڑے اور وہاں اتنی سخت اور صبر آزما زندگی گذارنی پڑے کہ گھاس پھوس اور لکڑی چبانے تک کی نوبت آجائے تو اس سے بھی دریغ نہ کرو۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ وَالاَّ فَمُتْ کا تعلق واطِعْهُ سے ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ اس امیر و بادشاہ کی طرف سے تمہارے حق میں کتنے ہی سخت حالات پیدا کر دیئے جائیں تم اس کی اطاعت و فرمانبرداری سے منہ نہ پھیرنا، کیونکہ اگر تم اس امیر و بادشاہ کی اطاعت نہیں کرو گے تو پھر تمہیں اور زیادہ شدید حالات میں اور کہیں زیادہ سخت اذیت کے ساتھ مرنا پڑے گا! نیز بعض نسخوں میں فمت کی بجائے قمت کا لفظ ہے جو لفظ قیام سے ماضی کا صیغہ ہے، اس صورت میں مطلب یوں ہو گا کہ اگر ایسا نہ ہو (یعنی تم اس امیر و بادشاہ کے ظلم و ستم کی وجہ سے اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے سے معذور ہو تو پھر) نکل کھڑے ہو اور کہیں دور جنگل میں جا کر کسی درخت کی جڑ میں پناہ لے لو (یعنی اس امیر و بادشاہ کے زیر حکومت علاقہ سے نکل جاؤ اور کہیں دوسری جگہ جا کر پناہ گزین ہو جاؤ)۔

"جس کے ساتھ پانی کی نہر ہو گی اور آگ کی خندق" کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ دونوں چیزیں حقیقی نہیں بلکہ محض خیالی ہوں گی اور ان کا تعلق سحر و طلسم سے ہو گا (یعنی بظاہر نظر تو ایسا آئے گا کہ وہ دجال اپنے ساتھ پانی کی نہر اور آگ کی خندق لئے پھر رہا ہے لیکن حقیقت ان کے علاوہ کچھ اور ہو گی، جیسا کہ شعبدہ باز نظر بندی کر کے کچھ کا کچھ دکھا دیتے ہیں۔ چنانچہ آگے کی عبارت فمن وقع فِي فارة میں دجال کی طرف آگ کی نسبت سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ دونوں چیزیں محض جادوئی اور طلسماتی ہوں گی۔ اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ پانی کی جو نہر ہو گی وہ نتیجہ و حقیقت کے اعتبار سے آگ ہو گی اور آگ کی خندق ہو گی وہ نتیجہ وحقیقت کے اعتبار سے پانی ثابت ہو گا۔ اور حضرت شیخ عبدالحق نے اس جملے کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات تو یہی ہے کہ یہ عبارت حقیقی معنی پر محمول ہے، یعنی اس کے ساتھ واقعۃً پانی کی نہر اور آگ کی خندق ہو گی، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ ان چیزوں سے مراد لطف و قہر اور وعدہ و وعید ہو، یعنی پانی کی نہر سے مراد تو یہ ہے کہ اس کے پاس اپنے متعلقین کے لئے زبردست ترغیبات و لالچ اور آسائش و راحت کے سامان ہوں گے اور آگ کی خندق سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین و منکرین کے لئے ڈرانے، دھمکانے اور مصیبت و اذیت میں مبتلا کرنے کے ذرائع رکھے گا، پس جو شخص اس کی آگ میں پڑے گا الخ۔ کا مطلب یہ ہے جو شخص دجال کی موافقت و تابعداری نہیں کرے گا وہ اس کو آگ میں ڈالے گا اور طرح طرح کی سختیوں اور آلام میں مبتلا کرے گا) اور جو شخص اس کی آگ میں پڑے گا وہ خدا کے دین پر ثابت قدم رہنے اور خدا کی رضاء کی خاطر ہر مصیبت پر صبر کرنے کی وجہ سے بڑے بڑے اجر پائے گا اور اس نے پہلے جو گناہ کئے ہوں گے وہ دھل جائیں گے، اسی طرح جو شخص دجال کی موافقت و تابعداری کرے گا اس کو وہ پانی میں ڈالے گا (یعنی اس کو طرح طرح کی آسائش اور راحت زیادہ سے زیادہ دنیاوی فائدے پہنچائے گا، چنانچہ جو شخص اس کے پانی میں جائے گا وہ دنیاوی آسائش و راحت اور یہاں کی زندگانی کی محبت کے سبب اس پر ایمان لانے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کی وجہ سے سخت وبال مول لے لے گا اور اس نے پہلے جو اچھے کام کئے ہوں گے ان سب کا اجر ضائع ہو جائے گا۔

"ثم ینتج المهر" الخ میں لفظ ینتج انتج کا صیغہ مجہول ہے نہ کہ یہ "انتاج" سے ہے اور "نتج" کے معنی ہیں حاملہ کی خبر گیری کرنا یہاں تک کہ وہ جنے! جب کہ انتاج کے معنی ہیں ولادت کا وقت آجانا! پس علماء نے لکھا ہے کہ یہاں "نتج" اصل میں تولید کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی لوگ اپنی گھوڑیوں کے ہاں بچہ ہونے کی تدابیر اختیار کریں گے اور بچہ جننے کے وقت گھوڑیوں کی دیکھ بھال اور خدمت کریں گے جیسا کہ دایہ کسی عورت کے ہاں ولادت کے وقت خدمت انجام دیتی ہے اور "مہر" کے معنی بچھڑے کے ہیں اور اگر

یہ لفظ "ۃ" کے ساتھ یعنی "مہرۃ" ہو تو اس کے معنی بچھڑی کے ہوتے ہیں! نیز "یُرْکَبُ" کے معنی ہیں سواری دینے کی عمر کو پہنچ جانا یا سواری کے قابل ہو جانا۔ بہرحال جو یہ فرمایا گیا ہے کہ لوگ اپنی گھوڑیوں سے بچے جنوانے کی تدابیر کریں گے تاکہ ان کو سواری کے کام میں لا سکیں لیکن جب ان کی گھوڑیاں بچے جنیں گی تو وہ بچے ابھی سواری کے قابل بھی نہیں ہونے پائیں گے کہ قیامت آجائے گی، تو اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کی طرف اشارہ کرنا ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت سے قیامت کے دن تک گھوڑوں کی سواری کا موقع ہی نہیں آئے گا اور یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اس زمانے میں کفار کا وجود ہی نہیں ہوگا کہ جن سے جنگ کرنے کے لئے گھوڑوں کی سواری کی ضرورت پیش آئے۔ (لیکن یہ مراد لینا اور مذکورہ تاویل کرنا اس زمانے میں تو صحیح تھا جب کہ گھوڑوں کی سواری صرف میدان جنگ تک محدود رہتی تھی اور گھوڑے کا اصل مصرف کفار کے مقابلے پر لڑنے کے لئے ان کو استعمال کرنا سمجھا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں یہ بات کچھ زیادہ وزن دار معلوم نہیں ہوتی) یا اس جملے کے ذریعے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ دجال کے ظاہر ہو جانے کے بعد سے قیامت آنے تک کا زمانہ طویل نہیں ہوگا، بہت مختصر ہوگا، گویا اس وقت سے قیامت آنے تک میں بس اتنا عرصہ رہ جائے گا ایک بچھڑے کے پیدا ہونے کے وقت سے اس سواری کے قابل ہونے تک کے درمیان لگتا ہے! یہ وضاحت نہ صرف یہ کہ زیادہ صاف اور قرین قیاس ہے بلکہ ان احادیث کے مفہوم کے مطابق بھی ہے جو اس سلسلے میں منقول ہیں۔

خلافت راشدہ کے بعد پیش آنے والے روح فرسا واقعات کے بارے میں پیشگوئی

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ کُنْتُ رَدِیْفًا خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمًا عَلٰی حِمَارٍ فَلَمَّا جَاوَزْنَا بُیُوْتَ الْمَدِیْنَۃِ قَالَ کَیْفَ بِکَ یَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا کَانَ بِالْمَدِیْنَۃِ جُوْعٌ تَقُوْمُ عَنْ فِرَاشِکَ وَلَا تَبْلُغُ مَسْجِدَکَ حَتّٰی یُجْھِدَکَ الْجُوْعُ قَالَ قُلْتُ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ تَعَفَّفْ یَا اَبَا ذَرٍّ قَالَ کَیْفَ بِکَ یَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا کَانَ بِالْمَدِیْنَۃِ مَوْتٌ یَبْلُغُ الْبَیْتُ الْعَبْدَ حَتّٰی اِنَّہٗ یُبَاعُ الْقَبْرُ بِالْعَبْدِ قَالَ قُلْتُ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ تَصَبَّرْ یَا اَبَا ذَرٍّ قَالَ کَیْفَ بِکَ یَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا کَانَ بِالْمَدِیْنَۃِ قَتْلٌ تَغْمُرُ الدِّمَاءُ اَحْجَارَ الزَّیْتِ قَالَ قُلْتُ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ تَاْتِیْ مَنْ اَنْتَ مِنْہُ قَالَ قُلْتُ وَاَلْبَسُ السِّلَاحَ قَالَ شَارَکْتَ الْقَوْمَ اِذًا قُلْتُ فَکَیْفَ اَصْنَعُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِنْ خَشِیْتَ اَنْ یَّبْھَرَکَ شُعَاعُ السَّیْفِ فَاَلْقِ نَاحِیَۃَ ثَوْبِکَ عَلٰی وَجْھِکَ لِیَبُوْءَ بِاِثْمِکَ وَاِثْمِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن (کسی سفر کے موقع پر) میں گدھے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا، گویا یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اور رفقاء کے ساتھ کس قدر تواضع و محبت اور حسن سلوک کا رویہ اختیار فرماتے تھے، نیز اس سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی اس خصوصیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر قریب کا مقام حاصل تھا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو نہایت توجہ و ہوشیاری کے ساتھ سنتے اور اچھی طرح یاد رکھتے تھے بہرحال، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب ہم مدینہ کے گھروں سے (یعنی آبادی سے باہر) نکل گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذر رضی اللہ عنہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب مدینہ میں بھوک کا دور دورہ ہوگا (یعنی خاص طور پر تمہیں اس قدر اسباب معیشت حاصل نہیں ہو سکیں گے کہ تم اپنا پیٹ بھی بھر سکو، یا یہ کہ اس وقت مدینہ میں قحط پھیل جائے گا اور تم لوگوں کو کھانے کے لئے کچھ نہیں ملے گا یہاں تک کہ تم اپنے بستر سے اٹھ کر اپنی مسجد تک پہنچنے میں بھی مشکل محسوس کرو گے اور بھوک کی شدت تمہیں سخت پریشانی اور اذیت میں مبتلا کر دے گی (یعنی بھوک کی وجہ سے تم پر اس قدر ضعف غالب ہو جائے گا کہ تم اپنے گھر سے نکل کر نماز پڑھنے کے لئے مسجد تک جانے میں بھی سخت مشکل اور دقت محسوس کرو گے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں (یعنی میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت کیا کروں گا، ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہدایت فرمائیے کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہئے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"ابوذرؓ پارسائی اختیار کرنا" یعنی اس بھوک پر صبر کرنا، ضبط و تحمل کے ساتھ اس سخت حالت کا مقابلہ کرنا، اپنے آپ کو حرام و مشتبہ مال سے محفوظ رکھنا، طمع ولالچ رکھنے اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے، اور مخلوق کے سامنے ذلت ورسوائی اختیار کرنے سے اجتناب کرنا) پھر آپ ﷺ نے فرمایا "ابوذرؓ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب قحط یا کسی وبا کے پھیل جانے کی وجہ سے) مدینہ میں موت کی گرم بازاری ہوگی اور مکان (یعنی قبر) کی قیمت غلام تک پہنچ جائے گی (یعنی کثرت اموات سے یہ حال ہوگا کہ لوگوں کو اپنے مردے دفن کرنے کے لئے قبر کی جگہ ملنی مشکل ہو جائے گی اور ایک قبر کی جگہ، غلام کی قیمت کے برابر پہنچ جائے گی۔ چنانچہ آگے جملے کے ذریعے اسی بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں فرمایا کہ یہاں تک کہ قبر کی جگہ، غلام کی قیمت کے برابر فروخت ہوگی۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں (آپ ﷺ ہی ہدایت فرمایئے کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہئے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "ابوذرؓ! صبر کا دامن ہرگز نہ چھوڑنا" اور پھر فرمایا ابوذرؓ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب مدینہ میں قتل عام ہوگا اور اس کا خون احجار الزیت کو ڈھانک لے گا؟ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں (آپ ﷺ ہی فرمایئے، مجھے اس وقت کیا کرنا چاہئے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس کے پاس چلے جانا، جس سے تم تعلق رکھتے ہو" میں نے عرض کیا کہ، تو کیا میں اس وقت ہتھیار باندھ لوں اور فتنہ پھیلانے والی جماعت کے خلاف برسرپیکار ہو جاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس طرح تو تم بھی جماعت کے شریک کار ہو جاؤ گے" میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) پھر مجھے اس وقت کیا کرنا چاہئے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تمہیں خوف ہو کہ تلوار کی چمک تم پر غالب آجائے گی (یعنی تم یہ دیکھو کہ کوئی شخص تمہیں مار ڈالنے کے لئے اپنی تلوار سے تم پر وار کرنا چاہتا ہے) تو اس وقت تم اپنے کپڑے کا کونہ اپنے منہ میں ڈال لینا۔ تاکہ وہ تمہارا گناہ (یعنی تمہارے قتل کا گناہ) اور اپنا گناہ لے کر واپس ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "تصبر" باب تفعل سے امر کا صیغہ ہے اور ایک نسخہ میں یہ لفظ مضارع کا صیغہ منقول ہے جو امر کے معنی میں ہے اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ تم اس آفت و بلا پر صبر کرنا جزع و فزع سے اجتناب کرنا، تقدیر الٰہی پر راضی و شاکر رہنا۔ اور مدینہ سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ "احجار الزیت" نواح مدینہ میں بجانب غرب ایک جگہ کا نام تھا، وہاں کی زمین نہایت پتھریلی تھی اور وہ پتھر بھی اس قدر سیاہ اور چمکدار تھے کہ جیسے کسی نے ان پر زیتون کا تیل مل دیا ہو، اسی مناسبت سے اس جگہ کو احجار الزیت کہا جاتا تھا! حضور ﷺ نے اس ارشاد گرامی "ابوذرؓ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب مدینہ میں قتل عام ہوگا الخ" کے ذریعے بطور پیشگوئی اس خونچکاں واقعہ کی طرف اشارہ کیا جو مسلمانوں کے قتل عام کی صورت میں مدینہ منورہ میں پیش آیا اور واقعہ حرہ کے نام سے مشہور ہوا، مستند کتابوں میں اس واقعہ کی جو تفصیل مذکور ہے وہ اتنی لرزہ خیز، اتنی دردناک اور اتنی بھیانک ہے کہ نہ تو اس کو بیان کرنے کا زبان و قلم کو یارا ہے اور نہ کوئی آسانی کے ساتھ اس کو پڑھنے اور سننے کی تاب لا سکتا ہے! تاہم اجمالی طور پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ جب بدبخت یزید ابن معاویہ کی فوج نے میدان کربلا میں حضرت امام حسینؓ کو نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا تو پورے عالم اسلام میں زبردست تہلکہ مچ گیا اور یزید کے خلاف عام مسلمانوں میں نہایت نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے ادھر اس کی بدکاریوں، بے اعتدالیوں اور بدمست زندگی کے واقعات نے اس کی طرف سے لوگوں کو پہلے ہی بدظن کر رکھا تھا چنانچہ اہل مدینہ نے متفقہ طور پر اس کی خلافت و حکومت سے بیزاری کا اظہار اور اس کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، جب یزید کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مسلم ابن عقبہ کی کمان میں ایک بہت بڑا لشکر اہل مدینہ کو کچلنے کے لئے روانہ کیا، چنانچہ مسلم نے مدینہ پہنچ کر مغربی حرہ (یعنی حرہ الوبرہ) کی جانب سے شہر پر دھاوا بول دیا، گو اہل مدینہ نے بڑی بہادری اور بے جگری کے ساتھ یزید کی فوج کا مقابلہ کیا لیکن اول تو تربیت یافتہ فوج اور دیگر وسائل و ذرائع کی کمی کی وجہ سے اور دوسرے مسلم ابن عقبہ جیسے ہوشیار و تجربہ کار کمانڈر کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے شکست کھا گئے پھر تو مسلم ابن عقبہ اور اس کی فوج نے شہر میں گھس کر قتل عام اور خونریزی کا بازار گرم کر دیا اور قتل عام و لوٹ مار کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا، ہزاروں مسلمان نہایت سفاکی اور بے دردی کے ساتھ قتل کر دیئے گئے جن میں صحابہ کرامؓ اور تابعین کی بھی بہت بڑی تعداد تھی، شہر مقدس اور مسجد نبوی ﷺ کی حرمت کو پامال کیا گیا اور

دیگر ناقابل بیان تباہیوں اور بربادیوں کا بازار گرم کیا گیا۔ صرف مدینہ ہی کی پامالی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بعد یزید کی وہ فوج مکہ کی طرف روانہ ہوئی جہاں کے لوگوں نے بہت پہلے سے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو خلیفہ تسلیم کر رکھا تھا، یزیدی لشکر نے مکہ مکرمہ میں بھی بے پناہ تباہی مچائی اور خانہ کعبہ تک کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ اسی سال یزید کی موت ہوئی۔

"تم اس کے پاس چلے جانا جس سے تعلق رکھتے ہو" کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت جو لوگ تمہارے دین ومسلک کے ہمنوا اور تمہارے خیالات واعمال کے موافق ہوں ان کے پاس چلے جانا! اور قاضیؒ نے اس جملے کی یہ مراد بیان کی ہے کہ تم اپنے اہل واقارب کے پاس چلے جانا اور یہ کہ اپنے گھر میں بیٹھ رہنا! اور طیبیؒ نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تم اپنے اس امام وامیر کی طرف رجوع کرنا جس کی تم اتباع وفرمانبرداری کرتے ہو۔ یہ مطلب زیادہ صحیح اور حضرت ابوذرؓ کے اس جملے "تو کیا میں ہتھیار باندھ لوں" کے زیادہ مناسب ہے۔

"اس طرح تم بھی جماعت کے شریک کار ہو جاؤ گے" کا مطلب، جو طیبی کے منقولات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے، یہ ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ فتنہ وفساد پھوٹ پڑا ہو اور قتل وخونریزی کا بازار گرم ہو مسلح اور ہتھیار بند ہونا گویا اس خونریزی میں شرکت کرنا اور فتنہ پردازی کے گناہ گاروں کی صف میں شامل ہونا ہے لہٰذا تم نہ ہتھیار باندھنا اور نہ کسی کے خلاف جنگ میں شریک ہونا بلکہ اپنے امام ومقتدا اور صلح جو وامن پسند لوگوں کے ساتھ رہنا یہاں تک کہ تم صلح جوئی اور امن پسندی کی راہ میں فلاح یاب ہو! لیکن اس وضاحت پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک طرف تو حضرت ابوذرؓ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے امام وامیر کے ساتھ رہیں جو یقیناً اس وقت اس قتل وقتال اور خونریزی میں ایک فریق کی حیثیت رکھے گا دوسری طرف یہ حکم دیا گیا کہ وہ قتل وقتال سے دور رہیں، تو یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کس طرح ممکن ہوں گی؟ اس کا جواب ابن ملکؒ نے اس طرح دینے کی کوشش کی ہے کہ شریعت کا حکم تو یہی ہے کہ اگر کوئی شخص ناحق اور ازراہ ظلم، خونریزی کا ارتکاب کرنا چاہے تو اس کا دفاع کرنا اور اس کی فساد انگیزی کو طاقت کے ذریعے ختم کرنے کی سعی کرنا واجب ہے لیکن حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ اس وقت، ہتھیار بند ہونا، گویا فتنہ پردازوں کی جماعت کا شریک کار ہونا ہے، تو اس کا اصل مقصد خونریزی کی برائی کو واضح کرنا اور اس کے تباہ کن اثرات کے خلاف آگاہ ومتنبہ کرنا ہے! تاہم اس سلسلے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر خونریزی وغارت گری کے لئے آنے والا دشمن اگر مسلمان ہو تو طاقت کے ذریعے اس کا دفاع کرنا اور اس سے لڑنا جائز ہے بشرطیکہ اس سے مقابلہ آرائی کی صورت میں فتنہ وفساد کے زیادہ بڑھ جانے کا خوف نہ ہو اور اگر وہ دشمن، کوئی غیر مسلم ہو تو پھر اس کا ہر ممکن ذریعے سے مقابلہ کرنا اور اس کے ساتھ ہر صورت میں لڑنا واجب ہے۔

"اپنے کپڑے کا کونہ اپنے منہ میں ڈال لینا" کا مطلب یہ ہے کہ اگر قتل وقتال کرنے والے لوگ تم پر حملہ بھی کریں تو تم ان سے نہ لڑو۔ بلکہ ان کے حملے کے وقت کسی بھی ذریعے سے اپنے آپ کو غافل اور غیر متعلق بنا لو تاکہ تمہیں اس حملے سے خوف محسوس نہ ہو۔ اس سے گویا اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ تم ان لوگوں سے اس حالت میں بھی نہ لڑنا اور ان کے خلاف تلوار نہ اٹھانا جب کہ وہ تم سے لڑنا اور تمہیں قتل کرنا چاہیں بلکہ تمہارے لئے فلاح کا راستہ یہی ہوگا کہ اس وقت مظلوم بن جانا اور اپنے آپ کو ان کے ہاتھوں شہید ہو جانے پر تیار کر لینا کیونکہ وہ لوگ بہرحال مسلمان ہوں گے اور مسلمان کے خلاف تلوار اٹھانا جائز نہیں ہے، اگر وہ تمہیں قتل کریں گے تو وہ ان کا عمل ہوگا اور خدا خود ان سے نبٹ لے گا! بعض شارحین نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کا اصل مقصد مسلمانوں کی باہمی خونریزی کی برائی اور اس سے بچنے کی فضیلت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ چاہے اپنی جان سے ہاتھ بھی دھونا پڑے مگر کسی مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھانا گوارہ نہ کرنا چاہئے ورنہ جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے، یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ فتنہ کا سر کچلنے کے لئے اور ناحق خونریزی پر آمادہ شخص کا دفاع کرنے کے لئے لڑنا جائز ہے اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا جب کہ حضرت ابوذرؓ کی وفات حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کے

آخری زمانے میں ۳۲ھ میں ہو چکی تھی، پس آنحضرت ﷺ پر یہ تو منکشف ہو گیا تھا کہ مدینے میں ایسا المناک واقعہ پیش آئے گا لیکن یہ منکشف نہیں ہوا تھا کہ یہ واقعہ کب پیش آئے گا، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کو اس کے متعلق باخبر کیا اور گویا یہ وصیت فرمائی کہ اگر وہ خونریزی تمہارے سامنے پیش آئے اور تمہاری زندگی اس وقت تک باقی رہے تو صبرو ثبات کی راہ اختیار کرنا اور اس خونریزی میں ہرگز شامل نہ ہونا جہاں تک بھوک کی حالت اور کثرت اموات کے واقعہ کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ مدینہ والوں کو ان دونوں باتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو اور حضرت ابوذرؓ کی زندگی ہی میں یہ دونوں پیشگوئیاں بھی پوری ہو گئی ہوں جیسا کہ عام الرماد میں پیش آنے والی صورت حال سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ قتل عام اور خونریزی کے فتنہ کی طرح یہ دونوں باتیں بھی حضرت ابوذرؓ کی وفات کے بعد ظاہر ہوئی ہیں۔

پُر فتن ماحول میں نجات کی راہ

⑲ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ کَیْفَ بِكَ اِذَا اُبْقِیْتَ فِیْ حُثَالَةٍ مِنَ النَّاسِ مَرِجَتْ عُهُوْدُهُمْ وَاَمَانٰتُهُمْ وَاخْتَلَفُوْا فَكَانُوْا هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَیْنَ اَصَابِعِهٖ قَالَ فَبِمَ تَاْمُرُنِیْ قَالَ عَلَیْكَ بِمَا تَعْرِفُ وَدَعْ مَاتُنْكِرُ وَعَلَیْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ وَاِیَّاكَ وَعَوَّامَّهُمْ وَفِیْ رِوَایَةٍ اِلْزَمْ بَیْتَكَ وَامْلِكْ عَلَیْكَ لِسَانَكَ وَخُذْ مَاتَعْرِفُ وَدَعْ مَاتُنْكِرُ وَعَلَیْكَ بِاَمْرِ خَاصَّةِ نَفْسِكَ وَدَعْ اَمْرَ الْعَامَّةِ۔ (رواہ الترمذی وصححہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "اس وقت تم کیا کرو گے جب تم اپنے آپ کو ناکارہ لوگوں کے زمانے میں پاؤ گے، جن کے عہد و پیمان اور جن کی امانتیں خلط ملط ہوں گی اور جو آپس میں اختلاف رکھیں گے، گویا وہ لوگ اس طرح کے ہو جائیں گے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کیا" حضرت عبداللہ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ آپ ﷺ مجھے ہدایت فرمایئے کہ اس وقت میں کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس وقت تم پر لازم ہو گا کہ اس چیز کو اختیار کرو اور اس پر عمل کرو جس کو تم (دین و دیانت کی روشنی میں) حق جانو اور اس چیز سے اجتناب و نفرت کرو جس کو تم ناحق اور برا جانو، نیز صرف اپنے کام اور اپنی بھلائی سے مطلب رکھو اور خود کو عوام الناس سے دور کر لو"۔ اور ایک روایت میں یوں منقول ہے کہ "اپنے گھر میں پڑے رہو (بلاضرورت باہر نکل کر ادھر ادھر نہ جاؤ) اپنی زبان کو قابو میں رکھو، جس چیز کو حق جانو اس کو اختیار کرو اور جس چیز کو برا جانو اس کو چھوڑ دو، صرف اپنے کام اور اپنی بھلائی سے مطلب رکھو اور عوام الناس کے معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھو"۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔"

تشریح: "حُثَالَة" کے معنی ہیں چاول اور جو وغیرہ کا چھلکا، جس کو بھوسی کہتے ہیں اسی طرح کسی بھی چیز کے ناکارہ اور بے فائدہ حصے کو بھی حثالہ کہا جاتا ہے، پس "حثالة من الناس" سے مراد وہ لوگ ہیں جو انسانی و اخلاقی قدروں کے اعتبار سے ادنیٰ درجے کے ہوں، جو انسانیت کا جوہر نہ رکھنے کے سبب نہایت پست ہوں اور جو دین و آخرت کے اعتبار سے بالکل ناکارہ اور بے فائدہ ہوں۔

"جن کے عہد و پیمان اور جن کی امانتیں خلط ملط ہوں گی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل بے اعتبار اور ناقابل اعتماد لوگ ہوں گے ان کے کسی عمل اور کسی قول کا کوئی بھروسہ نہیں ہو گا۔ ان کے کسی اقدام اور کسی معاملہ میں پختگی و استقلال نام کی کوئی چیز نہیں ہو گی، ان کے عہد و پیمان اور فیصلے لحہ بہ لحہ مختلف شکل و صورت میں بدلتے رہیں گے، دین و دیانت کے تقاضوں سے بے پرواہ ہوں گے اور امانتوں میں خیانت کریں گے۔

"اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کیا" یعنی آپ ﷺ نے یہ سمجھانے کے لئے کہ وہ آپس میں کس طرح ایک دوسرے کی ہلاکت کے درپے ہوں گے، اور ان کے باہمی اختلاف و نزاعات کی کیا صورت ہو گی، اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے

اندر داخل کر کے دکھایا اور بطور مثال واضح فرمایا کہ جس طرح ان دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہیں اسی طرح ان کی اخلاقی و سماجی حیثیت اس درجے الجھی ہوئی اور ان کے دینی معاملات و اعمال اس قدر خلط ملط ہوں گے کہ امین و خائن اور نیک و بد کے درمیان تمیز کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

واضح رہے کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کرنا جس طرح باہمی اختلاف و نزاع کو بطور تمثیل بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے اسی طرح کبھی دو چیزوں کے باہمی ربط و اتصال اور اتفاق و یگانگت کو ظاہر کرنے کے لئے بھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے دکھایا جاتا ہے جیسا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے بیان میں وہ حدیث گزری ہے جس میں حضور ﷺ نے مال غنیمت کے خمس کی تقسیم کے تعلق سے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے باہمی ربط و اتصال اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ قربت و یکجائی کو ظاہر کرنے کے لئے بطور تمثیل اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے دکھایا تھا! دونوں صورتوں پر اس تمثیلی عمل کا اطلاق معنوی طور پر بھی کوئی تضاد نہیں رکھتا بلکہ تشبیک کے جو اصل معنی ہیں، یعنی باہم مخلط ہونا، دو چیزوں کا ایک دوسرے میں داخل ہونا، وہ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔

"اپنی بھلائی سے مطلب رکھو اور خود کو عوام الناس سے دور کر لو" کا مطلب یہ ہے کہ پر فتن دور میں سب سے زیادہ ضرورت خود اپنے نفس کی اصلاح اور اپنے دین و کردار کی حفاظت کی ہوتی ہے، لہٰذا اس وقت تم بھی بس اپنے دین اور اپنی اخروی بھلائی کے کاموں کی تکمیل و حفاظت میں مشغول رہنا اور دوسرے لوگوں کی طرف سے کسی فکر و خیال میں نہ پڑنا۔ یہ حکم ایسے ماحول میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ پر عمل نہ کرنے کی ایک درجہ میں اجازت کے طور پر ہے جب کہ شریر و بدکار لوگوں کی کثرت اور ان کا غلبہ ہو اور صالح و نیک لوگوں کی طاقت بہت کم ہو۔

"اپنی زبان کو قابو میں رکھو" کا مطلب یہ ہے کہ جب پورے ماحول میں برائیوں کا دور دورہ ہو جاتا ہے اور شریر و بدکار لوگوں کے اثرات غالب ہوتے ہیں تو زبان سے اچھی بات نکالنا بھی ایک جرم بن جاتا ہے، لہٰذا تم اس وقت لوگوں کے احوال و معاملات کے بارے میں بالکل خاموشی اختیار کئے رکھنا، کسی کی برائی یا بھلائی میں اپنی زبان نہ کھولنا تا کہ تمہاری بات کا برا ماننے والے لوگ تمہیں تکلیف و ایذا نہ پہنچائیں۔

اس موقع پر ایک خاص بات یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ پر فتن دور کے سلسلے میں ایک حدیث تو یہ ہے اور ایک حدیث پیچھے گزری ہے جس کو حضرت حذیفہؓ نے نقل کیا ہے، ان دونوں میں ایک طرح سے تضاد نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ اس حدیث میں تو آنحضرت ﷺ نے گویا حضرت عبداللہ ابن عمرو کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ اس پر فتن ماحول میں بھی لوگوں کے درمیان بود و باش رکھنے سے پرہیز نہ کریں اور دنیا والوں سے مکمل یکسوئی علیحدگی اختیار نہ کریں، نیز ان کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ صرف اپنے نفس کے تزکیہ و اصلاح اور اپنی دینی زندگی کو سدھارنے سنوارنے لگے رہیں، عوام الناس کے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھیں اور ان کے حالات و اعمال کے تئیں کوئی فکر نہ کریں۔ اس کے برخلاف آپ ﷺ نے حضرت حذیفہؓ کو یہ حکم دیا کہ وہ ایسے ماحول میں بود و باش نہ رکھیں اور لوگوں سے مکمل علیحدگی و یکسوئی اختیار کر کے کسی ویرانہ و جنگل میں چلے جائیں دونوں حدیثوں کے اسی ظاہری تضاد کو دور کرنے کے لئے علماء نے لکھا ہے کہ ایک صورت حال کے لئے اس دو طرح کے حکم کا تعلق دراصل شخصی حالت کی رعایت و مصلحت کے اعتبار سے ہے، یعنی آپ ﷺ نے ان دونوں میں سے ہر ایک کو وہ حکم دیا جو اس کی حالت و حیثیت کے مطابق تھا، جس میں اس کی اصلاح پوشیدہ تھی اور جس پر عمل کر کے وہ نجات و فلاح کی راہ پا سکتا تھا جیسا کہ مرشد مصلح کا طرز اصلاح ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیرو اور مرید کے ذہن و مزاج اور اس کے طبعی و شخصی حیثیت و حالت کے مطابق ہی اس کو تلقین و ہدایت کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمروؓ جیسا کہ معلوم ہے نہایت اونچے درجے کے صحابی ہیں، ان کی زندگی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ

انتہائی عظمت وفضیلت کے حامل تھے، منقول ہے کہ وہ اپنی جوانی کے دنوں میں بھی اتنے عابد وزاہد تھے کہ افطار کئے بغیر مسلسل روزے رکھا کرتے تھے، رات بھر سوتے نہیں تھے بلکہ عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے، دنیاوی لذات وخواہشات سے اس قدر متنفر تھے کہ بیوی تک کی طرف کوئی رجحان نہیں رکھتے تھے! ایک دن ان کے والد محترم حضرت عمرو بن عاصؓ ان کو آنحضرت ﷺ کے پاس لے کر آئے اور ان کی اس عبادت وریاضت کا حال بیان کیا، آنحضرت ﷺ نے ان کو اتنی سخت ریاضت اور اتنی زیادہ عبادت سے منع کیا اور حکم فرمایا کہ بلا افطار تین دن سے زیادہ روزے نہ رکھا کرو اور پوری رات کے بس تہائی یا چھٹے حصے میں شب بیداری کیا کرو، نیز آپ ﷺ نے ان کو یہ بھی نصیحت کی کہ اپنے بزرگوار باپ کی مرضی ومنشاء کا ہمیشہ لحاظ رکھنا۔ چنانچہ حضور ﷺ کی اس وصیت ونصیحت کی بنا پر انہوں نے ملت میں تفرقہ وانتشار کے سخت ترین فتنے کے دور میں بھی اپنے والد بزرگوار سے علیحدگی وجدائی اختیار نہیں کی، جو حضرت امیر معاویہؓ کے مشیر اعلیٰ اور وزیر تھے، اور جیسا کہ حضور ﷺ نے ان کو حکم فرمایا تھا، وہ لوگوں کے معاملات وحالات سے بے پرواہ ہو کر اپنی ذات کی اصلاح اور اپنی استقامت کی طرف متوجہ رہتے، جب ان کے والد حضرت عمرو ان سے کہا کرتے کہ تم ہم میں سے ہونے کے باوجود ہم سے الگ الگ کیوں رہتے ہو، اور ہماری کاروائیوں میں کیوں شریک نہیں ہوتے؟ تو وہ جواب دیتے کہ "آپ لوگوں کے اچھے کاموں میں تو شریک ہوں لیکن ان کاموں میں خود کو شریک نہیں کر سکتا جو میرے نزدیک خدا اور اس کے رسول کی مرضی ومنشاء کے منافی وملی مفاد کے خلاف ہیں۔ نیز ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بڑے سے بڑے فتنے کے وقت بھی ان کے دل سے اہل بیت نبوی ﷺ کی عزت واحترام کا جذبہ کسی بھی طرح سے کم ہوا ہو، ان کا باطن ہمیشہ اہل بیت کی محبت وعظمت سے منور رہا۔

قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والے فتنوں کی پیشنگوئی

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ اِنَّ بَیْنَ یَدَیِ السَّاعَۃِ فِتَنًا کَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ یُصْبِحُ الرَّجُلُ فِیْھَا مُؤْمِنًا وَیُمْسِیْ کَافِرًا وَیُمْسِیْ مُؤْمِنًا وَیُصْبِحُ کَافِرًا اَلْقَاعِدُ فِیْھَا خَیْرٌ مِّنَ الْقَائِمِ وَالْمَاشِیْ فِیْھَا خَیْرٌ مِّنَ السَّاعِیْ فَکَسِّرُوْا فِیْھَا قِسِیَّکُمْ وَقَطِّعُوْا فِیْھَا اَوْتَارَکُمْ وَاضْرِبُوْا سُیُوْفَکُمْ بِالْحِجَارَۃِ فَاِنْ دُخِلَ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْکُمْ فَلْیَکُنْ کَخَیْرِ ابْنَیْ اٰدَمَ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَّہٗ ذُکِرَ اِلٰی قَوْلِہٖ خَیْرٌ مِّنَ السَّاعِیْ ثُمَّ قَالُوْا فَمَا تَاْمُرُنَا قَالَ کُوْنُوْا اَحْلَاسَ بُیُوْتِکُمْ وَفِیْ رِوَایَۃِ التِّرْمِذِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ فِی الْفِتْنَۃِ کَسِّرُوْا فِیْھَا قِسِیَّکُمْ وَقَطِّعُوْا فِیْھَا اَوْتَارَکُمْ وَالْزَمُوْا فِیْھَا اَجْوَافَ بُیُوْتِکُمْ وَکُوْنُوْا کَابْنِ اٰدَمَ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوموسیٰؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت آنے سے پہلے فتنے ظاہر ہوں گے جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کے مانند ہوں گے، ان فتنوں کے زمانے میں آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر ہو جائے گا، شام کو مؤمن ہو گا تو صبح کو کفر کی حالت میں اٹھے گا۔ (ان فتنوں کے وقت) بیٹھا ہوا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو گا اور چلنے والا شخص دوڑنے والے سے بہتر ہو گا! پس (جب تم ان فتنوں کا زمانہ پاؤ تو) اپنی کمانوں کو توڑ ڈالنا، کمانوں کے چلوں کو کاٹ ڈالنا اور اپنی تلواروں کو پتھر پر دے مارنا (یعنی ان کے دھار کو کند وبیکار کر دینا) اور جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو مارنے کے لئے آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ (حملہ آور کا مقابلہ کرنے اور اس سے لڑنے کی بجائے) آدم کے دو بیٹوں میں سے بہترین بیٹے کی مانند ہو جائے۔ (ابوداؤد) اور ابوداؤد کی ایک اور روایت میں خیر من الساعی (یعنی چلنے والا شخص دوڑنے والے سے بہتر ہو گا) کے الفاظ نقل کرنے کے بعد پھر یوں نقل کیا گیا ہے کہ صحابہؓ نے (یہ ارشاد گرامی سن کر) عرض کیا کہ تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ (یعنی ہمیں ہدایت دیجئے کہ اس وقت ہم کیا کریں اور ان فتنوں میں کس طرح زندگی گذاریں؟) آپ ﷺ نے فرمایا "تم اپنے گھروں کے ٹاٹ بن جانا" نیز ترمذیؒ کی روایت اس طرح ہے کہ حضور ﷺ نے فتنہ کے بارے میں یہ ہدایت فرمائی کہ "تم فتنوں کے زمانہ میں اپنی کمانوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے چلے کاٹ ڈالنا، نیز گھروں میں پڑے رہنے کو لازم

کرلینا (یعنی اشد ضرورت کے علاوہ باہر نہ نکلنا اور اپنا سارا وقت گھروں میں گذارنے کے ذریعے لوگوں سے یکسوئی اختیار کئے رہنا تاکہ ان فتنوں کے برے اثرات سے محفوظ رہو) اور تم آدم کے بیٹے (ہابیل) کی طرح (مظلوم) بننا گوارہ کرلینا (لیکن دفاع کی خاطر بھی کسی پر تلوار نہ اٹھانا)۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح غریب ہے۔"

تشریح: "جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کے مانند ہوں گے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی قتل وقتال اور خونریزی کی صورت میں وہ فتنے اتنے زیادہ ہیبتناک اور اس قدر شدید ہوں گے کہ دین وملت کا مستقبل تاریک تر نظر آنے لگے گا، اور اس وقت نیک وبد کے درمیان امتیاز کرنا اس طرح ناممکن ہو جائے گا جس طرح کہ اندھیری رات میں کسی کو شناخت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

"آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے عقائد ونظریات اقوال واحوال اور طور طریقوں میں ساعت بساعت تبدیلی ہوتی رہے گی، کبھی کسی نظریہ وعقیدہ کے حامل ہوں گے، کبھی کسی کے، ایک وقت میں کوئی عہد وپیمان کریں گے اور دوسرے وقت میں اس سے منحرف ہو جائیں گے، کبھی دیانت وامانت پر چلنے لگیں گے اور کبھی بددیانتی وخیانت پر اتر آئیں گے کبھی سنت پر عمل کرتے نظر آئیں گے اور کبھی بدعت کی راہ پر چلتے دکھائی دیں گے، کسی وقت ایمان ویقین کی دولت سے مالامال ہوں گے اور کسی وقت تشکیک واوہام اور کفر کے اندھیروں میں بھٹکنے لگیں گے، غرض یہ کہ ہر ساعت اور ہر لمحہ تبدیلی پیدا ہوتی نظر آئے گی اور اس امر کا یقین کرنا دشوار ہوگا کہ کسی شخص کی اصل کیفیت وحالت کیا ہے۔

"بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا الخ" کا اصل مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جو شخص ان فتنوں سے جتنا زیادہ دور ہوگا وہ اس شخص سے اتنا ہی زیادہ بہتر ہوگا جو ان فتنوں کے قریب ہوگا! اس جملے کی تفصیلی وضاحت پہلی فصل میں کی جا چکی ہے۔

"کمانوں کے چلوں کو کاٹ ڈالنا" یہ حکم گویا پہلے حکم یعنی "اپنی کمانوں کو توڑ ڈالنا" کو مؤکد کرنے اور مقصد کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اور پر زور انداز میں بیان کرنے کے لئے ہے، کیونکہ کمانوں کے ٹوٹ جانے کے بعد ان کے چلے اگر باقی بھی رہیں تو وہ (کمانیں) قطعی کارگر نہیں ہو سکتیں، لہٰذا کمانوں کے توڑ دینے کے حکم کے بعد ان کے چلوں کو کاٹ دینے کا حکم، محض زور بیان اور تاکید حکم کے لئے ہے۔

"آدم کے دو بیٹوں میں سے بہترین بیٹے کی مانند ہو جائے" کا مطلب یہ ہے اس طرح آدم کے ایک بیٹے ہابیل نے مظلومیت کی موت کو گوارا کر لیا تھا لیکن اس نے آدم کے دوسرے بیٹے (یعنی اپنے بھائی قابیل کے جملے کا جواب نہیں دیا اور سارا ظلم اور تمام زیادتی اسی کے سر ڈال دی تھی، اسی طرح فتنوں کے وقت کوئی شخص تم پر حملہ بھی کرے اور تمہیں قتل بھی کر دینا چاہے تو تم اس کا مقابلہ ہرگز نہ کرنا اور اس کے ہاتھوں مرجانے کو صبر وضبط کے ساتھ گوارا کر لینا، کیونکہ اگر تم اس کا مقابلہ کرو گے تو اس کی وجہ سے فتنہ میں اور زیادہ شدت پیدا ہو جائے گی اور خونریزی بڑھ جائے گی، پس اس وقت اپنے حملہ آور کا مقابلہ کئے بغیر شہید ہو جانا، مقابلہ کرنے اور خونریزی میں کسی بھی طرح سے شرکت کر کے اپنی جان کو بچالینے سے کہیں زیادہ بہتر ہوگا۔

"تم اپنے گھروں کے ٹاٹ بن جانا" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی اچھے فرش، جیسے قالین وغیرہ کے نیچے جو ٹاٹ بچھا ہوتا ہے وہ ہمیشہ اور ہر وقت اپنی جگہ پڑا رہتا ہے اسی طرح تم بھی اپنے گھروں میں پڑے رہا کرنا اور مکان کی چار دیواری سے باہر نکل کر ادھر ادھر نہ جانا تاکہ تم اس فتنے میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور اس کے اثرات تمہارے دین کو تباہ نہ کر دیں! حاصل یہ کہ فتنہ انگیزی کی جگہ سے دور رہنا، لوگوں کے معاملات وکاروبار سے بے تعلقی ویکسوئی اختیار کر لینا، اور گوشہ عافیت میں پڑے رہ کر اپنے دین کی حفاظت کرنا، اس وقت نجات کی بہترین راہ ہوگی جب کہ مسلمانوں کے باہمی قتل وقتال، افتراق وانتشار اور مناقشت ومنافقت کا فتنہ پھیل جائے۔

فتنوں کے وقت سب سے بہتر شخص کون ہوگا؟

(۲۱) وَعَنْ اُمِّ مَالِكٍ الْبَهْزِيَّةِ قَالَتْ ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِتْنَةً فَقَرَّبَهَا قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ خَيْرُ

النَّاسِ فِیْهَا قَالَ رَجُلٌ فِیْ مَاشِیَتِهٖ یُؤَدِّیْ حَقَّهَا وَیَعْبُدُ رَبَّهٗ وَرَجُلٌ اٰخِذٌ بِرَاسِ فَرَسِهٖ یُخِیْفُ الْعَدُوَّ وَیُخَوِّفُوْنَهٗ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت اُمّ مالک بہزیہ ؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن جب) رسول کریم ﷺ نے فتنہ کا ذکر فرمایا اور اس کو قریب تر کیا تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! اس فتنے کے زمانے میں سب سے بہتر کون شخص ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس زمانے میں سب سے بہتر شخص وہ ہو گا جو اپنے مویشیوں (کی دیکھ بھال اور ان کے گھاس چارے کے انتظام) میں (مصروف) رہے، ان کا حق ادا کرے (یعنی ان پر جو زکوۃ اور شرعی ٹیکس وغیرہ واجب ہو، اس کو ادا کرے) اور اپنے رب کی بندگی میں مشغول رہے! اور وہ شخص بھی سب سے بہتر ہو گا جو اپنے گھوڑے کا سر (یعنی اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار اس کی باگ) پکڑے (کھڑا) ہو اور دشمنان دین کو خوف زدہ کرتا ہو اور دشمن اس کو ڈراتے ہوں۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: بَهْزِیه (بؔ کے زبر اورہؔ کے جزم کے ساتھ) ابن امراء القیس کی طرف منسوب ہے، حضرت اُمّ مالک ؓ ایک صحابیہ ہیں اور حجازیہ کہلائی جاتی ہیں۔

"اور اس کو قریب تر کیا" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جب اس فتنہ کا ذکر فرمایا تو اس بات سے باخبر کیا کہ وہ فتنہ بالکل قریب ہے اور سامنے آنے والا ہے! اور طیبیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے اس فتنہ کو بہت تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا اور چونکہ یہ ایک عالم اسلوب ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے سامنے کسی چیز کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس کی خصوصیات و علامات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ واضح کرتا ہے تو گویا وہ اس چیز کو مخاطب کے ذہن، یا مشاہدہ کے قریب تر کر دیتا ہے، چنانچہ وہ (مخاطبہ اس چیز کو نہ صرف اپنے ذہن و خیال میں جاگزیں پاتا ہے بلکہ وہ خارج میں بھی ایسا محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ چیز اپنی شکل و صورت کے ساتھ اس کے بالکل قریب موجود ہے۔

"جو شخص اپنے مویشیوں میں رہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس فتنہ کے زمانے میں (جب کہ مسلمانوں کے باہمی قتل و قتال اور محاذ آرائی کا بازار گرم ہو جائے گا) فلاح یاب شخص وہی ہو گا جو فتنوں کی باتوں سے لاتعلق، اور دنیا والوں سے بیگانہ رہ کر اور گوشہ عافیت اختیار کر کے بس اپنے جائز کاروبار میں مشغول اور اپنے معاملات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو گا، اس پر اس کے کاروبار اور معاملات کے تئیں شریعت کے جو حقوق عائد ہوتے ہوں ان کو ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرے گا اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ اور اس کی عبادت میں منہمک رہے گا۔ یہ ارشاد گرامی گویا قرآن کریم کی ان آیات فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ۔ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا اور وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

"جو اپنے گھوڑے کا سر پکڑے ہو الخ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اس فتنہ و فساد میں الجھنے اور آپس میں ہی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے کے بجائے، اپنی طاقت و توانائی ان لوگوں کے خلاف استعمال کرنے کی طرف متوجہ ہو جو دین اسلام کے اصل دشمن و مخالف ہیں اور ان سے نبرد آزمائی میں لگ جائے یہ چیز نہ صرف یہ کہ دین و ملت کی اصل خدمت ہونے کی وجہ سے اجر و ثواب کا مستحق بنائے گی بلکہ اس فتنہ سے بچانے کا بہترین ذریعہ بھی ثابت ہو گی۔

فتنہ کا ذکر

(۲۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ تَسْتَنْظِفُ الْعَرَبَ قَتْلَاهَا فِى النَّارِ اللِّسَانُ فِيْهَا اَشَدُّ مِنْ وَقْعِ السَّيْفِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب ایک بڑا فتنہ ظاہر ہونے والا ہے جو پورے

عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا (اور اس کے بڑے اثرات ہر ایک تک پہنچیں گے) اس فتنہ میں قتل ہو جانے والے لوگ (بھی دوزخ میں جائیں گے، نیز اس فتنہ کے وقت زبان کھولنا (یعنی کسی کو برا بھلا کہنا اور عیب جوئی و نکتہ چینی کرنا) تلوار مارنے سے بھی زیادہ سخت مضر ہو گا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس فتنہ سے مراد باہمی قتل و قتال اور لوٹ مار کا وہ فتنہ ہے جو مختلف گروہ، حق و سچائی کو ثابت کرنے اور دین کا جھنڈا بلند کرنے اور حق و انصاف کی مدد کے لئے نہیں بلکہ محض جاہ اقتدار اور دولت و سلطنت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا ہوں گے اور آپس میں قتل و قتال اور لوٹ مار کا بازار گرم کریں گے جیسا کہ کسی ملک میں خانہ جنگی کے وقت ہوتا ہے کہ لوگ کسی پاک مقصد اور دینی فرض کے بغیر محض ذاتی اغراض و خواہشات اور دیگر غیر دینی اسباب و عوامل کے تحت اندھا دھند آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانے اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے لگتے ہیں۔

اس وضاحت سے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ اس فتنہ کے مقتولین بھی دوزخ میں کیوں جائیں گے، چنانچہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جو شخص خانہ جنگی میں مبتلا ہو کر لوٹ مار کی خاطر کسی سے لڑے اور اس لڑائی کے دوران مارا جائے تو وہ نہ شہید کہلاتا ہے اور نہ اس کی موت کوئی بامقصد موت کہلاتی ہے بلکہ وہ ایک ایسی موت کے ہاتھوں مرتا ہے جو دین و شریعت کے تقاضوں اور اسلامی احکام کے خلاف جنگ و جدل کی صورت میں آتی ہے لہٰذا جس طرح ناحق خون بہانے والا قاتل دوزخ میں جائے گا اسی طرح وہ مقتول بھی دوزخ کی آگ کا مستوجب ہو گا۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ صَمَّاءُ بُكْمَاءُ وَعُمْيَاءُ مَنْ اَشْرَفَ لَهَا اِسْتَشْرَفَتْ لَهٗ وَاِشْرَافُ اللِّسَانِ فِيْهَا كَوُقُوْعِ السَّيْفِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب گونگے، بہرے اور اندھے فتنے کا ظہور ہو گا، جو شخص اس فتنہ کو دیکھے گا اور اس کے قریب جائے گا، وہ فتنہ اس کو دیکھے گا اور اس کے قریب آجائے گا، نیز اس فتنہ کے وقت زبان درازی، تلوار مارنے کی مانند ہو گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: فتنہ کو گونگا اور بہرہ کہنا، لوگوں کے اعتبار سے ہے، یعنی وہ فتنہ اتنا سخت اور اس قدر ہیبت ناک ہو گا کہ عام لوگ اس وقت حیران و سراسیمہ ہو کر رہ جائیں گے، نہ کوئی فریادرس نظر آئے گا کہ جس سے کوئی شخص گلوخلاصی کی درخواست کر سکے اور نہ کسی کو نجات دلا سکے اور نہ کوئی ایسی راہ دکھائی دے گی جس کے ذریعے اس فتنہ سے نجات اور خلاصی پائی جا سکے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس فتنے کے وقت لوگ حق و باطل اور نیک و بد کے درمیان تمیز نہیں کریں گے۔ وعظ و نصیحت کو سننا اور اس پر عمل کرنا گوارہ نہیں کریں گے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی باتوں پر دھیان نہیں دیں گے، جو شخص ان کو نیک باتوں کی طرف بلائے گا اور زبان سے حق بات نکالے گا اس کو روحانی و جسمانی اذیتوں میں مبتلا کریں گے اور اس کے ساتھ نہایت تکلیف دہ اور پریشان کن سلوک کریں گے۔

"جو شخص اس فتنہ کو دیکھے گا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس فتنہ کی باتوں کی طرف متوجہ رہے گا اور ان لوگوں کی قربت و ہمنشینی اختیار کرے گا جو اس فتنہ کا باعث ہوں گے، تو اس شخص کا اس فتنہ سے محفوظ رہنا اور اس کے برے اثرات کے چنگل سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہو گا، اس کے برخلاف جو شخص اس فتنہ سے دور اور فتنہ پردازوں سے بے تعلق رہے گا وہ فلاح یاب ہو گا۔

"زبان درازی تلوار مارنے کی مانند ہو گی" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت چونکہ لوگوں میں تعصب و عداوت، ضد و ہٹ دھرمی اور حق کو قبول نہ کرنے پر اصرار بہت زیادہ ہو گا اس لئے وہ کسی کی زبان سے کوئی ایسی بات سننا بھی گوارا نہیں کریں گے جو ان کی مرضی و منشاء کے خلاف ہو گی۔ لہٰذا اس فتنہ میں زبان کھولنے والا گویا خون ریزی کو دعوت دے گا۔ اور یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ بعض وقت زبان سے نکلا ہوا لفظ اپنی تاثیر کے اعتبار سے تلوار کی دھار سے بھی زیادہ سخت وار کر جاتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے

جراحات السنان لها التئام ولا يلتام ماجرح اللسان

"نیزے کے پھل کا زخم مندمل ہو جاتا ہے، لیکن زبان کے گھاؤ کو کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔"

چند فتنوں کے بارے میں پیشن گوئی

(۲۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا قُعُوْدًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ الْفِتَنَ فَاَكْثَرَ فِيْ ذِكْرِهَا حَتّٰى ذَكَرَ فِتْنَةَ الْاَحْلَاسِ فَقَالَ قَائِلٌ وَمَا فِتْنَةُ الْاَحْلَاسِ قَالَ هِيَ هَرَبٌ وَحَرَبٌ ثُمَّ فِتْنَةُ السَّرَّاءِ دَخَنُهَا مِنْ تَحْتِ قَدَمَيْ رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ يَزْعَمُ اَنَّهُ مِنِّيْ وَلَيْسَ مِنِّيْ اِنَّمَا اَوْلِيَائِيَ الْمُتَّقُوْنَ ثُمَّ يَصْطَلِحُ النَّاسُ عَلٰى رَجُلٍ كَوَرِكٍ عَلٰى ضِلَعٍ ثُمَّ فِتْنَةُ الدُّهَيْمَاءِ لَا تَدَعُ اَحَدًا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا لَطَمَتْهُ لَطْمَةً فَاِذَا قِيْلَ انْقَضَتْ تَمَادَتْ يُصْبِحُ الرَّجُلُ فِيْهَا مُؤْمِنًا وَيُمْسِيْ كَافِرًا حَتّٰى يَصِيْرَ النَّاسُ اِلٰى فُسْطَاطَيْنِ فُسْطَاطِ اِيْمَانٍ لَا نِفَاقَ فِيْهِ وَفُسْطَاطِ نِفَاقٍ لَا اِيْمَانَ فِيْهِ فَاِذَا كَانَ ذٰلِكَ فَانْتَظِرُوا الدَّجَّالَ مِنْ يَوْمِهِ اَوْ مِنْ غَدِهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم نبی کریم ﷺ کی مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے۔ آپ ﷺ نے (آخر زمانہ میں ظاہر ہونے والے) فتنوں کا ذکر شروع فرمایا اور بہت سارے فتنوں کو بیان کیا، یہاں تک کہ فتنہ احلاس کا ذکر فرمایا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ احلاس کا فتنہ کیا ہے (یعنی اس فتنہ کی کیا نوعیت ہوگی اور وہ کس صورت حال میں ظاہر ہوگا؟) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "وہ بھاگنا، اور مال کا ناحق لینا ہے (یعنی اس فتنہ کی صورت یہ ہوگی کہ لوگ آپس میں سخت بغض وعداوت رکھنے اور باہمی نفرت و دشمنی کی وجہ سے ایک دوسرے سے بھاگیں گے، کوئی کسی کی صورت دیکھنے اور کسی کے ساتھ نباہ کرنے کا روادار نہیں ہوگا، ایک دوسرے کے مال کو زبردستی چھین لینے اور ایک دوسرے کا ہڑپ کر لینے کا بازار گرم ہوگا) اور پھر سراء کا فتنہ ہے، اس فتنہ کی تاریکی اور تباہی اس شخص کے قدموں کے نیچے سے نکلے گی (یعنی اس فتنہ کا بانی وہ شخص ہوگا) جو میرے اہل بیت میں سے ہوگا، اس شخص کا گمان تو یہ ہوگا کہ وہ (فعل و کردار کے اعتبار سے بھی) میرے اہل بیت میں سے ہے لیکن حقیقت یہ ہوگی کہ وہ) خواہ نسب کے اعتبار سے بھلے ہی میرے اہل بیت میں سے ہو مگر فعل و کردار کے اعتبار سے) میرے اپنوں میں سے (ہرگز) نہیں ہوگا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے دوست اور میرے اپنے تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو پرہیزگار ہوں۔ پھر اس فتنہ کے بعد لوگ ایسے شخص کی بیعت پر اتفاق کریں گے جو پسلی کے اوپر کولہے کی مانند ہوگا، پھر دہیماء کا فتنہ ظاہر ہوگا۔ اور وہ فتنہ اس امت میں سے کسی ایسے شخص کو نہیں چھوڑے گا جس پر اس کا طمانچہ، طمانچہ کے طور پر نہ لگے (یعنی وہ فتنہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہوگا کہ امت کے ہر شخص تک اس کے برے اثرات پہنچیں گے اور ہر مسلمان اس کے ضرر و نقصان میں مبتلا ہوگا) اور جب کہا جائے گا کہ یہ فتنہ ختم ہو گیا ہے تو اس کی مدت کچھ اور بڑھ جائے گی (یعنی لوگ یہ گمان کریں گے کہ فتنہ ختم ہو گیا ہے مگر حقیقت میں وہ ختم کی حد تک پہنچا ہوا نہیں ہوگا بلکہ کچھ اور طویل ہو گیا ہوگا، یہ اور بات ہے کہ کسی وقت اس کا اثر کچھ کم ہو جائے، جس سے لوگ اس کے ختم ہو جانے کا گمان کرنے لگیں لیکن بعد میں پھر بڑھ جائے گا) اس وقت آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر ہو جائے گا (یعنی اس فتنہ کے اثرات سے لوگوں کے دل و دماغ کی حالت و کیفیت میں اس قدر تیزی کے ساتھ تبدیلی پیدا ہوتی رہے گی کہ مثلاً ایک شخص صبح کو اٹھے گا تو اس کا ایمان و عقیدہ صحیح ہوگا اور اس پختہ اعتقاد کا حامل ہوگا کہ کسی مسلمان بھائی کا خون بہانا یا اس کی آبروریزی کرنا اور یا اس کے مال واسباب کو ہڑپ کرنا و نقصان پہنچانا مطلقاً حلال نہیں ہے مگر شام ہوتے ہوتے اس کے ایمان و عقیدہ میں تبدیلی آجائے گی اور وہ اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کرنے لگے گا کہ گویا اس کے نزدیک کسی مسلمان بھائی کا خون بہانا، اس کی آبروریزی کرنا اور اس کے مال و جائیداد کو ہڑپ کرنا و نقصان پہنچانا جائز و حلال ہے، اس طرح وہ جو صبح کے وقت مؤمن تھا شام کو اس عقیدے کی تبدیلی کی وجہ سے کافر ہو جائے گا، اور یہ صورت حال جاری رہے گی تاکہ لوگ خیموں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک خیمہ ایمان کا ہوگا کہ اس میں نفاق نہیں ہوگا اور ایک خیمہ

نفاق کا ہوگا کہ اس میں ایمان نہیں ہوگا! جب یہ بات ظہور میں آجائے تو پھر اس دن یا اس کے اگلے دن دجال کے ظاہر ہونے کے منتظر رہنا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "فتنہ احلاس" سے مراد یہ ہے کہ وہ فتنہ عرصہ دراز تک قائم رہے گا اور اس کے اثرات اُمت کے لوگوں کو بہت طویل عرصے تک مختلف آفات اور پریشانیوں میں مبتلا رکھیں گے۔ واضح رہے کہ احلاس اصل میں حلس کی جمع ہے اور حلس اس ٹاٹ کو کہتے ہیں جو کسی عمدہ فرش جیسے قالین وغیرہ کے نیچے زمین پر بچھا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اپنی جگہ پر پڑا رہتا ہے۔ یا حلس اس کملی کو کہتے ہیں جو پالان کے نیچے اونٹ کی پیٹھ پر ڈالی جاتی ہے! پس اس فتنہ کو فتنہ احلاس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کسی اچھے فرش کے نیچے کا ٹاٹ مستقل طور پر اپنی جگہ پڑا رہتا ہے وہاں سے اٹھایا نہیں جاتا، اسی طرح وہ فتنہ بھی لوگوں کو چھوڑنے والا نہیں، بلکہ برابر قائم رہے گا اور اس کے برے اثرات بہت دنوں تک لوگوں کو مبتلا رکھیں گے۔ یا یہ کہ اس فتنہ کو ظلمت وتاریکی اور برائی کے طور پر حلس سے تشبیہ دی گئی ہے اور یا یہ کہ اس فتنہ کو فتنہ احلاس فرما کر، اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح ٹاٹ ہمیشہ بچھا رہتا ہے اور اس کو اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں جاتا اسی طرح لوگوں کو بھی چاہئے کہ اس فتنہ کے دوران اپنے گھروں میں پڑے رہنے کو لازم کرلیں اور گوشہ نشینی اختیار کرلیں۔

لفظ فتنة السراء رفع کے ساتھ ہے اور اس اعتبار سے یہ لفظ "ھرب" پر عطف ہے، یعنی جب کسی نے آپ ﷺ سے یہ پوچھا کہ فتنہ احلاس کی نوعیت وصورت کیا ہوگی تو آپ ﷺ نے گویا یہ فرمایا کہ وہ فتنہ ہرب وحرب اور سراء کی صورت میں ہوگا ہرب اور حرب کے معنی تو اوپر ترجمے میں واضح کئے جا چکے ہیں، یعنی باہمی عداوت ودشمنی اور بغض ونفرت کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور بھاگنا اور کسی کا مال لوٹ لینا۔ اور سراء کے معنی یہ ہیں کہ وہ فتنہ اندر ہی اندر اسلام کی بیخ کنی کرے گا، یعنی کچھ لوگ ایسے پیدا ہو جائیں گے جو ظاہر میں اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی کا دعویٰ کریں گے مگر باطن میں اسلام اور مسلمانوں کی تباہی وبربادی چاہیں گے اور اپنی اس ناپاک خواہش کی تکمیل کے لئے طرح طرح کی سازشوں کے جال پھیلا کر مسلمانوں کو فتنہ وفساد میں مبتلا کریں گے! نہایہ میں لکھا ہے کہ سراء سے کنکریلا پتھریلا میدان مراد ہے، اس صورت میں فتنہ سراء سے واقعہ حرا کی طرف اشارہ مراد ہوگا جو یزید کی حکومت میں ہوا اور اس کی وجہ سے اہل مدینہ کا قتل عام ہوا، سینکڑوں صحابہ اور تابعین کو جام شہادت نوش کرنا پڑا اور حرم محترم کی سخت بربادی ہوئی! یہ معنی اس صورت میں ہوں گے جب کہ سراء کو پوشیدہ کے مفہوم میں لیا جائے! اگر یہ لفظ سرور وشادمانی کے مفہوم میں ہو تو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ وہ فتنہ ایسے حالات پیدا کردے گا جس میں عیش وعشرت کی چیزوں کی فراوانی ہو جائے گی، اور لوگ اسراف وتنعم کے ذریعے راحت وآرام اور سرور وشادمانی کی زندگی میں پڑکر خدا اور آخرت کے خوف سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ یا یہ کہ اس فتنہ کی وجہ سے چونکہ اسلام اور مسلمانوں کی شوکت کو دھچکا لگے گا اور ملت اسلامیہ بہت زیادہ نقصان وتباہی میں مبتلا ہو جائے گی لہٰذا یہ صورت حال اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے لئے خوشی وشادمانی کا باعث بنے گی۔ اور ایک نسخے میں "فتنہ السراء" کا لفظ نصب کے ساتھ ہے، اس صورت میں اس کا عطف فتنہ الاحلاس پر ہوگا اور معنی یہ ہوں گے کہ آپ نے فتنہ احلاس کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد فتنہ سراء کا ذکر کیا۔

"مگر وہ میرے اپنوں میں سے نہیں ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ خواہ وہ میرے اہل بیت میں سے ہونے کا کتنا ہی گمان رکھے اور اگرچہ نسب اور خاندان کے اعتبار سے وہ واقعۃً میرے اہل بیت میں سے کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنے طور طریقوں اور اپنے فعل وکردار کے لحاظ سے میرے اپنوں میں سے یقیناً نہیں ہوگا کیونکہ وہ میرے اپنوں میں سے ہوتا تو روئے زمین پر فتنہ وفساد کے ذریعے میری اُمت کو نقصان وضرر میں مبتلا نہیں کرتا۔ اس ارشاد گرامی کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (یقیناً وہ تمہارے اپنوں میں سے نہیں ہے) یا یہ کہ اس جملے کا یہ مطلب ہے کہ وہ شخص خواہ نسب کے اعتبار سے میرے خاندان سے کوئی تعلق کیوں نہ رکھے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ میرے محبوب اور دوستوں میں سے نہیں ہوگا کیونکہ میرا محبوب اور دوست صرف وہی مسلمان ہو سکتا ہے جو تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرے اور کبھی بھی ایسے قول وفعل کا ارتکاب نہ کرے جس سے اسلام اور مسلمانوں کو ذرہ برابر بھی نقصان پہنچ سکتا ہو۔

اس کی تائید حدیث کے اگلے جملے سے بھی ہوتی ہے۔

"جو پسلی کے اوپر کولہے کی مانند ہوگا" اس جملے کے ذریعے گویا اس شخص کو ذہنی و عملی کج روی اور غیر پائیداری کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح اگر کولہے کی ہڈی کو پسلی کی ہڈی پر چڑھا دیا جائے تو وہ کولہا اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا اور پسلی کی ہڈی کے ساتھ اس کا جوڑ نہیں بیٹھ سکتا اسی طرح اگرچہ لوگ اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کو اپنا امیر و حکمراں تسلیم کر لیں گے لیکن حقیقت میں وہ امارت و سرداری کے لائق نہیں ہوگا کیونکہ وہ علم و دانائی سے محروم ہوگا، آئین حکمرانی سے بے بہرہ ہوگا، قوت فیصلہ کی کمی اور رائے کی کمزوری میں مبتلا ہوگا، پس اس کا کوئی حکم اور کوئی فیصلہ، محل، موقع کے مطابق نہیں ہوگا اور جب یہ صورت حال ہوگی تو سلطنت و مملکت کا سارا نظام انتشار و بدامنی اور سستی و کمزوری کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

"پھر دہیما کا فتنہ ظاہر ہوگا" کے سلسلے میں پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جس طرح فتنۃ الاحلاس کے دونوں اعراب، یعنی رفع اور نصب ذکر کئے گئے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے مطابق معنی بیان کئے گئے تھے، اسی طرح فتنۃ الدھیما میں بھی فتنہ کے لفظ کے دونوں اعراب، یعنی رفع اور نصب میں دھیماء (دال کے پیش اور ہا کے زبر کے ساتھ) اصل میں لفظ دھماء کی تصغیر ہے جس کے معنی سیاہی اور تاریکی کے ہیں اور یہاں تصغیر کا اظہار مذمت و برائی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ حاصل یہ کہ فتنہ احلاس کے بعد جو فتنہ ظاہر ہوگا وہ اپنے اثرات کی ظلمت کی اور قتل و غارت گری کی شدت کے اعتبار سے ایک سیاہ اور تاریک شب کی مانند ہوگا، اور جس کی سیاہ رات کی تاریکی ہر شخص کو اندھیرے میں مبتلا کر دیتی ہے اس طرح اس فتنہ کی ظلمت ہر شخص کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوگی اور ہر ایک کے قوائے فکر و عمل پر تاریک سایہ بن کر چھا جائے گی۔

"تاآنکہ لوگ دو خیموں میں تقسیم ہو جائیں گے" کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ کے لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک گروہ تو خالص ایمان والوں کا ہوگا کہ جن میں کفر اور نفاق کا نام نہ ہوگا اور ایک گروہ خالص کفر والوں کا ہوگا اور ان میں ایمان و اخلاص کا نام نہ ہوگا۔ اور بعض حضرات نے یہاں فسطاط کا ترجمہ "خیمہ" کے بجائے "شہر" کیا ہے یعنی اس زمانے کے لوگ دو شہر یا دو ملکوں میں تقسیم ہو جائیں گے کہ ایک شہر یا ایک ملک میں صرف خالص مسلمان و اہل ایمان ہوں گے اور ایک شہر یا ملک میں خالص کافر ہوں گے! واضح رہے کہ "فسطاط" اصل میں تو خیمے کو کہتے ہیں لیکن "شہر" پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور حدیث میں اس لفظ کا استعمال گویا اس اسلوب کے طور پر ہے کہ ذکر تو محل (رہنے کی جگہ) کا ہو، لیکن مراد حال (یعنی رہنے والوں کی حالت و کیفیت) ہو پس "لوگ دو خیموں یا دو شہروں میں تقسیم ہو جائیں گے" کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا کے لوگ واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک طبقہ اہل ایمان کا ہوگا اور ایک طبقہ اہل کفر کا ہوگا، اور ان دونوں طبقوں کے لوگ خواہ دنیا کے کسی حصے اور شہر میں سکونت پذیر ہوں اس موقع پر ایک یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک خیمہ نفاق کا ہوگا کہ اس میں ایمان نہیں ہوگا۔ تو اس خیمہ (یا اس طبقہ) کے لوگوں میں سے ایمان کی نفی، یا تو اصل کے اعتبار سے ہے یعنی اس خیمہ کے لوگوں میں سرے سے ایمان نہیں ہوگا یا کمال ایمان کی نفی بھی مراد ہے یعنی اس خیمہ (یا اس طبقہ میں) ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ظاہر کے اعتبار سے ایمان رکھتے ہوں، مگر اہل نفاق کے سے اعمال اختیار کرنے، یعنی جھوٹ بولنے، خیانت کرنے اور عہد شکنی وغیرہ کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے مخلص اہل ایمان کے زمرے سے خارج ہوں گے۔

"دجال کے ظاہر ہونے کے منتظر رہنا" کا مطلب یہ ہے کہ جب فتنہ دہیما ظاہر ہو جائے تو سمجھنا کہ دجال کا ظہور ہوا ہی چاہتا ہے، چنانچہ اس فتنہ کے فوراً بعد دجال ظاہر ہوگا، اس وقت حضرت مہدیؓ دمشق میں ہوں گے، دجال دمشق کے شہر کو گھیر لے گا، پھر حضرت عیسی علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے اور دجال ان کے مقابلے پر اس طرح گھل جائے گا۔ جس طرح پانی میں نمک گھل جاتا ہے، حضرت عیسی علیہ السلام اس کو اپنے نیزے سے موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور اس کی موت سے ان کو بہت زیادہ خوشی حاصل ہوگی۔

طیبیؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ "فسطاط" شہر یا خیمے کو کہتے ہیں جس میں لوگ جمع ہوتے اور رہتے ہیں! نیز حدیث کے اس آخری جزو سے (کہ جس میں فسطاط کا ذکر ہے) یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ فتنہ آخر زمانے میں ظاہر ہو گا لیکن علماء نے پہلے ذکر کئے گئے فتنوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور کہا ہے کہ یہ فتنے کب ظاہر ہوں گے اور کون سے واقعات ان کا مصداق ہیں خصوصاً فتنہ سراء کے بارے میں تو مکمل سکوت اختیار کیا گیا ہے اور اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے کہ اہل بیت نبوی ﷺ میں سے وہ کون شخص ہے جس کو اس فتنہ کا بانی کہا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن زبیر کی شہادت کا سانحہ اور اس کی تفصیل

یہ بات تو طیبیؒ نے لکھی ہے لیکن بعد کے علماء میں سے حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس حدیث میں مذکورہ فتنوں کے مصداق کا تعین کیا ہے چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "فتنہ احلاس" کے ذریعے جس فتنہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا وہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جب کہ وہ یزید ابن معاویہ کی خلافت کے اعلان کے بعد اس کی بیعت سے گریز کر کے مع اہل و عیال مدینہ سے نکل گئے اور مکہ آ گئے تھے پھر جب ۶۲ھ میں یزید ابن معاویہ نے اپنے خلاف اہل مدینہ کی تحریک کو کچلنے کے لئے مسلم ابن عقبہ کی کمان میں شامیوں کی ایک بڑی فوج مدینہ کی طرف روانہ کی تو مسلم نے اس شہر مقدس میں پہنچ کر بڑی تباہی پھیلائی اور اہل مدینہ کا قتل عام کرایا" یہ واقعہ حرہ" کے نام سے مشہور ہے، مسلم نے شامیوں کی یہ فتح یاب فوج لے کر پھر مکہ کا رخ کیا، مسلم اگرچہ خود مکہ تک نہیں پہنچ سکا کیونکہ وہ راستے ہی میں مرگیا تھا، البتہ اس کی فوج حصین ابن نمیر کی سرکردگی میں مکہ پہنچ گئی اور اس نے ایک دن کی جنگ کے بعد مکہ کا محاصرہ کر لیا، حصین ابن نمیر نے کوہ ابن قبیس پر منجنیق نصب کر کے خانہ کعبہ پر سنگ باری کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اس محاصرے اور سنگ باری کے دوران، کہ جس کا سلسلہ ایک ماہ سے بھی زائد عرصے تک جاری رہا، اہل مکہ کو بڑی سخت تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، اتفاق کی بات کہ اسی اثناء میں دمشق میں یزید کا انتقال ہو گیا اور ابن نمیر نے اس خبر کو سن کر محاصرہ اٹھا لیا اور اپنی فوج کو لے کر دمشق کی طرف واپس روانہ ہو گیا، اس کے بعد حضرت عبداللہ ابن زبیر کی خلافت نہ صرف پورے حجاز میں قائم ہو گئی، بلکہ عراق اور مصر تک کے لوگوں نے ان کی خلافت کو تسلیم کر لیا یہاں تک کہ یزید ابن معاویہ کے جانشین معاویہ ابن یزید کی تقریباً دو ماہ کی مختصر خلافت کے بعد (جب کہ اس کا انتقال ہو گیا تھا) تو حضرت عبداللہ ابن زبیر پورے عالم اسلام کے خلیفہ تسلیم کر لئے گئے لیکن پھر چھ سات ماہ کے بعد مروان ابن حکم نے اپنی سازشوں اور کوششوں میں کامیاب ہو کر شام پر قبضہ جما لیا اور دمشق میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا، شام کے بعد مصر اور عراق بھی حضرت زبیرؓ کی خلافت سے نکل گئے اسی دوران مروان ابن حکم مرگیا اور اس کا بیٹا عبدالملک ابن مروان اس کا جانشین ہوا، عبدالملک نے زبردست جنگی طاقت کے ذریعے تقریباً تمام ہی علاقوں سے حضرت زبیرؓ کی خلافت کو ختم کر دیا اور آخر میں حجاج ابن یوسف کی کمان میں ایک لشکر جرار مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا اور ۷۲ھ کے ماہ رمضان میں حجاج نے شہر مکہ کا محاصرہ کر لیا اور کوہ ابوقبیس پر منجنیق لگا کر سنگ باری شروع کر دی، اور محاصرہ سنگ باری کا یہ سلسلہ ذی الحجہ تک جاری رہا، اس عرصے میں اہل مکہ کو بڑی زبردست مصیبت و پریشانی اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا حج کے دنوں میں کچھ عرصے کے لئے سنگ باری بند ہو گئی اور حج ختم ہوتے ہی یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا جس کا نشانہ براہ راست خانہ کعبہ تھا جہاں حضرت عبداللہ محصور تھے اور آخری مرحلے پر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے خانہ کعبہ سے نکل کر محض چند ساتھیوں کے ہمراہ شامیوں کے اس عظیم لشکر پر حملہ کیا اور بڑی بہادری کے ساتھ لڑتے رہے جب وہ چند ساتھی بھی ایک ایک کر کے کام آ گئے اور خود ان پر دشمنوں نے چاروں طرف سے پتھروں اور تیروں کی بارش شروع کر دی تو دنیا کا یہ عظیم الشان بہادر و متقی انسان داد شجاعت دیتا ہوا بڑی مظلومیت کے ساتھ جمادی الثانی ۷۳ھ کی ایک خوں آشام تاریخ میں اس طرح شہید ہوا کہ اس وقت میدان جنگ میں بہادری و شجاعت، زہد و عبادت اور بہت و شرافت کے علاوہ کوئی انسان ان کی مبارک لاش پر کف افسوس ملنے والا بھی موجود نہیں تھا۔ یہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی شہادت کا وہ واقعہ ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے

فتنہ احلاس کا مصداق قرار دیا ہے۔

فتنہ مختار کی تفصیل

"فتنہ سراء" کے بارے میں حضرت شاہ صاحب" کا کہنا یہ ہے کہ یہ فتنہ بھی مختار کے فتنہ وفساد کی صورت میں ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ مختار وہ شخص تھا جس نے پہلے تو مکرو فریب کے ذریعے پھر باقاعدہ جنگ کر کے اہل عراق پر تسلط حاصل کر لیا تھا اور اپنی اس کاروائی کے لئے حضرت محمد بن الحنفیہ کی اجازت اور اہل بیت نبوی ﷺ کی تائید ونصرت کا دعوی رکھتا تھا۔ اس کا واقعہ بھی تھوڑی سی تفصیل کا متقاضی ہے۔ اس شخص کا اصل نام مختار ابن عبیدہ ابن مسعود ثقفی تھا، کوفہ (عراق) میں رہتا تھا اور شیعان علی میں سے تھا حضرت امام حسینؓ نے اہل کوفہ کی دعوت پر جب کوفہ جانا طے کر لیا اور پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم ابن عقیل کو وہاں بھیجا تا کہ وہ پوشیدہ طور پر کوفہ میں کام کر کے لوگوں سے ان کے نام پر بیعت لیں تو مسلم ابن عقیل کوفہ پہنچ کر اسی مختار ابن عبیدہ کے مکان پر فروکش ہوئے تھے پھر اس سلسلے میں جو کچھ پیش آیا اور حادثہ کربلا واقع ہوا وہ سب بہت مشہور واقعات ہیں! کربلا میں شہادت حسین کے سانحہ کے بعد کوفہ میں ایک جماعت "توابین" کے نام سے معرض وجود میں آئی جس کا سردار سلیمان ابن صرد تھا یہ جماعت کوفہ کے ان لوگوں پر مشتمل تھی جو یہ کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کی بے وفائی کی وجہ سے حضرت امام حسینؓ کو کربلا میں جام شہادت نوش کرنا پڑا اور ہم اپنے اس جرم کا اعتراف کرتے ہوئے تائب ہوتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ اس جرم کی تلافی کے طور پر خون حسین کا انتقام لیں گے اور ہر اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے، جس نے قتل حسین میں ذرا بھی حصہ لیا ہے۔ مختار ابن عبیدہ چونکہ پہلے ہی سے اپنی مختلف سازشوں کے ذریعے عراق پر قبضہ جمانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس مقصد کے لئے قاتلان حسین کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکا کر انہیں اپنے گرد جمع کر رہا تھا، اس لئے اس نے توابین کی جماعت سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا اور جماعت کے لوگوں اور ان کے ہمنواؤں کو جمع کر کے کہا کہ تمہارا سردار سلمان تو ایک پست ہمت آدمی ہے، لڑنے سے جان چراتا ہے، لہٰذا امام مہدی محمد بن الحنفیہ نے جو حضرت امام حسینؓ کے بھائی ہیں مجھے اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے، تم لوگ میرے ہاتھ پر بیعت کر لو اور خون حسین کا بدلہ لینے کے لئے میرے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ، چنانچہ کوفہ کے وہ تمام لوگ جو شیعان حسین کہلاتے تھے، مختار کے ہاتھ پر بیعت ہونے لگے اس وقت عراق پر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی خلافت کا قبضہ تھا اور کوفہ میں ان کی طرف سے عبداللہ ابن یزید گورنر تھے انہیں جب مختار کی سرگرمیوں اور اس کے حقیقی ارادوں کا علم ہوا تو انہوں نے مختار کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا، لیکن توابین کی جماعت کا سردار سلیمان ابن صرو بہر حال اپنی جنگی تیاریوں میں پہلے ہی سے مصروف تھا، وہ سترہ ہزار مسلح افراد کا لشکر لے کر عبداللہ ابن زیاد کے خلاف جنگ کرنے چلا جو کربلا میں حضرت امام حسینؓ کو شہید کرنے والی کارروائیوں کا تمام تر ذمہ دار تھا اور مروان ابن حکم کی طرف سے موصل میں بحیثیت گورنر تعینات تھا، پھر عین الوردہ کے مقام پر عبداللہ ابن زیاد کی فوجوں سے اس کا مقابلہ ہوا اور کئی دن کی جنگ کے بعد خود سلیمان ابن صرو اور جماعت توابین کے تمام بڑے بڑے سردار مارے گئے فوج میں سے جو لوگ باقی بچے وہ وہاں سے بھاگ کر کوفہ واپس آ گئے، کوفہ میں مختار نے جیل سے (جہاں وہ قید تھا) ان لوگوں کو ہمدردی کا پیغام بھیجا اور تسلی دلائی کہ تم لوگ غم نہ کرو، اگر میں زندہ رہا تو خون حسین کے ساتھ تمہارے مقتولین کے خون کا بدلہ بھی ضرور لوں گا۔ اس کے بعد اس نے کسی ذریعے سے جیل کے اندر ہی سے ایک خط حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے نام مدینہ بھیجا جس میں یہ درخواست کی کہ عبداللہ ابن یزید گورنر کوفہ سے سفارش کر کے مجھے رہائی نصیب فرمائیں چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے گورنر کوفہ کو سفارشی خط لکھ دیا اور گورنر نے ان کی سفارش کی تکریم میں مختار کو اس شرط پر جیل سے رہا کر دیا کہ وہ کوفہ میں کوئی شورش نہیں پھیلائے گا اور اپنے گھر میں بیٹھا رہے گا۔ اس مکار نے جیل سے آنے کے بعد کوفہ والوں اور بالخصوص شیعان حسین پر یہ ظاہر کیا کہ یہ میری روحانی طاقت اور کرامت تھی جس نے جیل کے دروازے وا کرا دیئے اور میں باہر آ گیا، ادھر کسی وجہ سے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے عبداللہ ابن یزید کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر کے ان کی جگہ عبداللہ ابن مطیع کو مقرر کر دیا، مختار نے اس عزل ونصب کو بھی اپنی کرامت ظاہر کیا

اور پرانے حاکم کے کوفہ سے چلے جانے کے بعد تمام پابندیوں کو توڑ کر آزادانہ طور پر اپنی سازشی کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے مکرو فریب اور عیاریوں کے ذریعے کوفہ والوں پر اپنی روحانی بزرگی و کرامت کا کچھ ایسا سکہ جمایا کہ لوگ دھڑا دھڑ اس کے مرید ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جماعت حیرت انگیز طور پر ترقی کر گئی، کوتوال شہر نے اس کی جماعت کی ترقی اور اس کی سازشی تحریک سے گورنر کو مطلع کیا اور دارالامارۃ (گورنر ہاؤس) سے اس کے خلاف کاروائی کرنے کی تیاری بھی ہوئی مگر وقت گزر چکا تھا اور مختار نہایت عیاری کے ساتھ حکام کے ہاتھ لگنے سے بچ گیا اور روپوش ہو کر اپنی جماعت کو ایک باضابطہ فوج میں تبدیل کر دیا اور کوفہ پر قبضہ کرنے کے منصوبے کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ ادھر اس نے محمد بن الحنفیہ کو پوری طرح شیشے میں اتار ہی رکھا تھا چنانچہ جب مختار نے کوفہ کے بعض دوسرے بااثر حضرات کو قاتلان حسین کے خلاف بھڑکا کر اپنے ساتھ ملانا چاہا اور محمد بن الحنفیہ کی نیابت کا دعویٰ کیا اور ان لوگوں نے کچھ آدمیوں کو اس کے دعوی کی تصدیق کے لئے محمد بن الحنفیہ کے پاس بھیجا تو انہوں نے کہا کہ ہاں اختار کا خون حسین کا بدلہ لینے کی ہم نے اجازت دی ہے! اس تصدیق نے مختار کو بہت تقویت پہنچائی آخر کار ایک دن رات کے اندھیرے میں مختار نے اپنی جماعت کے مسلح افراد کے ساتھ خروج اختیار کیا اور کوفہ کے گلی کوچوں میں لڑائی چھڑ گئی، کافی سخت مقابلہ آرائی کے بعد سرکاری فوج کو شکست ہوئی اور عبداللہ ابن مطیع گورنر کوفہ کو دارالامارۃ میں محصور ہونا پڑا اور پھر تین دن کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح دارالامارۃ سے چھپ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے مختار نے سرکاری دفاتر اور بیت المال پر قبضہ کر لیا اور کوفہ کے لوگوں سے محمد بن الحنفیہ کے نام پر بیعت لینے لگا اور پورے شہر پر اس کا تسلط قائم ہو گیا، کچھ ہی دنوں کے بعد کوفہ کے لوگ مختار کے خلاف ہو گئے مگر مختار نے بڑی چالاکی کے ساتھ ان پر بھی قابو پا لیا اور پورے شہر میں اس طرح قتل عام کرایا کہ کوفہ کا کوئی بھی ایسا نہیں بچا جس میں سے ایک یا دو یا اس سے زائد آدمی قتل نہ کئے گئے ہوں، اس نے قاتلان حسین سے بھی انتقام لیا اور جس جس نے میدان کربلا میں کوئی حصہ لیا تھا ان میں سے ہر ایک کا سر تن سے جدا کرا دیا ایک طرف تو وہ کوفہ پر تسلط پانے کے بعد دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کی کاروائیوں میں مصروف رہا اور دوسری طرف حضرت علیؓ کی کرسی کھڑاگ کھڑا کر کے لوگوں کو اپنی غیر معمولی روحانی طاقتوں کا معتقد بنانے میں لگا رہا اور رفتہ رفتہ نبوت کے دعوؤں تک پہنچ گیا۔ جب حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو معلوم ہوا کہ مختار نہ صرف یہ کہ کوفہ میں لوگوں کا قتل عام کر رہا ہے اور اہل کوفہ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے اور دوسرے علاقوں کو بھی ہتھیانے کے منصوبے بنا رہا ہے، بلکہ یہ مشہور کرنے لگا ہے کہ میرے پاس جبرئیل امین آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتے ہیں اور میں بطور نبی مبعوث ہوا ہوں تو انہوں نے اس کے استیصال میں مزید تاخیر کرنا کسی طرح مناسب نہ سمجھا اور اپنے بھائی مصعب ابن زبیرؓ کو بصرہ کا گورنر مقرر کر کے مختار کے فتنہ کی سرکوبی کی مہم ان کے سپرد کی۔ چنانچہ حضرت مصعب اپنی فوج کو لے کر کوفہ کی طرف چلے، ادھر جب مختار کو اس فوج کشی کا علم ہوا تو وہ بھی اپنا لشکر لے کر کوفہ سے نکلا، دونوں فوجوں کا مدارا نامی گاؤں کے قریب مقابلہ ہوا اور خوب زور و شور کی لڑائی ہوئی آخر کار مختار شکست کھا کر کوفہ بھاگا اور دارالامارۃ میں قلعہ بند ہو گیا۔ حضرت مصعب ابن زبیرؓ نے کوفہ پہنچ کر دارالامارۃ کا محاصرہ کر لیا، مختار سامان رسد کی کمی سے مجبور ہو کر قلعہ کا دروازہ کھول کر باہر آیا اور آخری مرتبہ مقابلہ کیا لیکن جلد ہی موت کے گھاٹ اتر گیا اور اس طرح کوفہ کا یہ فتنہ ختم ہو گیا۔

مروان کا قصہ

حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کے بعد لوگ ایک ایسے شخص کی بیعت پر اتفاق کر لیں گے جو پسلی کی ہڈی کے اوپر کولہے کی مانند ہوگا۔ تو حضرت شاہ صاحب نے اس کا مصداق مروان ابن حکم کو قرار دیا ہے۔ مروان ابن حکم کی خلافت کا قصہ اگرچہ مختار کے فتنہ سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور جس وقت حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی فوج نے اس کو کوفہ میں قتل کر کے اس فتنہ کی سرکوبی کی اس وقت مروان ابن حکم کا انتقال ہو چکا تھا اور بنو امیہ کی خلافت کا جانشین عبدالملک ابن مروان مقرر ہو چکا تھا لیکن اگر اس لفظی تقدیم و تاخیر سے صرف نظر

کر کے نفس حقیقت کو دیکھا جائے تو حضرت شاہ صاحب کے بیان کردہ اس مصداق کو صحیح ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، یہ مروان ابن حکم ہی تھا جس نے معاویہ ابن یزید ابن معاویہ کے انتقال کے بعد پورے عالم اسلام پر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی قائم ہو جانے والی خلافت کو چیلنج کیا اور مختلف سازشوں کے ذریعے دمشق میں اپنی خلافت پر بیعت کرنے کے لئے لوگوں کو مجبور کر دیا، چنانچہ بنو امیہ کے علاوہ شام کے دیگر قبائل بنو کلب اور عنان وطے وغیرہ نے اس کی خلافت پر اتفاق کر لیا، اور پھر اسی وقت سے افتراق وانتشار اور فتنہ وفساد کا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا اور ملی طاقت کو اس طرح منتشر کر دیا کہ کافی عرصے تک مسلمان آپس میں برسرپیکار رہے اور جس قوت کو دشمنان دین کے خلاف استعمال ہونا چاہئے تھا وہ مختلف علاقوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کا خون بہانے کے لئے استعمال ہوتی رہی۔ مروان ابن حکم عیار وچالاک ہونے کے باوجود قوت فیصلہ، بصیرت وتدبر اور رائے ومزاج کے استقلال واستحکام جیسے وہ اوصاف نہیں رکھتا تھا جو ملی نظم ونسق اور مملکت کے سیاسی استحکام کے لئے اشد ضروری تھے، اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ جس زمانے میں معاویہ ابن یزید کی وفات کے بعد دمشق میں انتخاب خلیفہ کے متعلق اختلاف آراہ اور شام میں بنو امیہ کے حامی مددگار وطاقتور اور مقتدر قبائل بنو کلب اور بنو قیس کے درمیان رقابتیں آشکارا ہونے لگیں تو مروان نے یہ دیکھ کر کہ نہ صرف عراق بلکہ شام کا بھی ایک بڑا حصہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی خلافت کو تسلیم کر چکا ہے، ارادہ کیا تھا کہ دمشق سے روانہ ہو کر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی خدمت میں حاضر ہو اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کی خلافت کا وفادار ہو جائے بلکہ اس نے سفر کا سامان بھی درست کر لیا تھا، لیکن اس دوران عبداللہ ابن زیاد دمشق آ گیا جب اس کو مروان کے اس ارادے کا علم ہوا تو اس نے مروان کو باصرار اس ارادے سے باز رکھا اور اس بات پر ہموار کر لیا کہ وہ خلافت کے امیدوار کی حیثیت سے بیعت لینا شروع کر دے، چنانچہ مروان کی خلافت دراصل عبداللہ ابن زیاد کی کوششوں کا نتیجہ تھی اگر مروان میں مستقل مزاجی، رائے کی پختگی اور تدبر ودوراندیشی کا جوہر ہوتا تو وہ کسی قیمت پر ابن زیاد کی رائے نہ مانتا اور اپنے ارادے میں اٹل رہ کر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی خدمت میں چلا جاتا اور اس کی وجہ سے جو فتنے پیدا ہوئے اور پوری ملت کو جس نقصان وضرر میں مبتلا ہونا پڑا شاید اس کی نوبت نہ آتی۔

فتنہ دہیما کا مصداق

فتنہ دہیما کے بارے میں حضرت شاہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اس کے ذریعے حضور ﷺ نے ترکوں (تاتاریوں) کے اس قبضہ وتسلط کی پیشین گوئی فرمائی جس نے اسلامی شہروں کو تاراج کیا اور مسلمانوں کو سخت ترین تباہی وبربادی سے دوچار کیا، چنانچہ اس وقت جس جس نے ترکوں کی حمایت کی اور ان کے معاون بنے وہ منافقین کے زمرے میں شمار کئے گئے۔ یہ ساتویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے جب کہ خلافت عباسیہ کا آخری فرمانروا مستعصم باللہ بن مستنصر اللہ بغداد کے تخت خلافت پر متمکن تھا، یہ انتہائی کم ہمت، بے حوصلہ اور غیر مدبر خلیفہ تھا اس نے اپنا وزیر موید الدین علقمی کو بنا رکھا تھا جو نہایت متعصب اور بدباطن شیعہ تھا علقمی نے عہد وزارت پر فائز ہوتے ہی اپنی عیاریوں اور چالاکیوں سے خلیفہ کو عضو معطل بنا کر خود سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھا، اس کی شروع سے یہ خواہش تھی کہ کسی طرح عباسیوں کا نام ونشان ختم کر کے بغداد میں علویوں کی خلافت قائم ہو جائے اس خواہش کی تکمیل کے لئے اس نے ایک غیر ملکی طاقت یعنی تاتاریوں سے سازباز کر لی اور چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کو دعوت دی کہ تم اپنی فوج لے کر بغداد پر حملہ کر دو، میں نہایت آسانی کے ساتھ تمہیں بغداد کی خلافت اور اس کے زیر تسلط دوسرے علاقوں اور ممالک پر قبضہ کرا دوں گا، ہلاکو خاں کو شروع میں تو اس کی دعوت قبول کرنے میں تامل ہوا کیونکہ وہ اہل بغداد کی شجاعت وبہادری اور خلافت کی ہیبت سے مرعوب تھا لیکن جب علقمی نے مختلف حیلوں اور سازشوں کے ذریعے بغداد کی فوج کا بہت بڑا حصہ دور دراز کے علاقوں اور شہروں میں منتشر کرا دیا اور باقی ماندہ فوجیوں کے ذریعے شہر میں بعض اقدامات کرا کے لوٹ مار کا بازار گرم کرا دیا جس سے سخت ابتری اور انتشار پھیل گیا اور ہلاکو خاں کو معلوم ہو گیا کہ خلافت کی طاقت

بہت کمزور ہوگئی ہے اور خلیفہ کی فوج کسی بڑے حملے کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہی ہے تو ہلاکو خاں نے اس دعوت کو قبول کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کی، علقمی نے ایک چال اور اختیار کی اس نے بغداد کے شیعوں کی طرف سے ہلاکو خاں کو کثیر تعداد میں بغداد پر حملہ کرنے کی دعوت پر مشتمل خطوط روانہ کرا دیئے جن میں یہ لکھا گیا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے بطور پیشین گوئی ہمیں خبر دی تھی کہ فلاں سن میں فلاں تاتاری سردار بغداد و عراق پر قبضہ کرلے گا اور ہمارا یقین ہے کہ وہ فاتح سردار آپ ہی ہیں اس بات سے ہلاکو خاں کے ارادے کو اور تحریک ملی، ادھر خود ہلاکو خاں کے دربار میں ایک شیعہ نصیر الدین طوسی پہلے سے موجود تھا اور علقمی کی طرح وہ بھی عباسیوں کی خلافت ختم کرانے کے درپے تھے، اس نے بھی مختلف ترغیبات اور لالچ کے ذریعے ہلاکو خاں کے ارادے کو بہت تقویت پہنچائی۔

چنانچہ ہلاکو خاں نے پہلے تو ایک زبردست فوج ہراول دستے کے طور پر بغداد کی طرف روانہ کی جس کا مقابلہ خلیفہ کی کمزور فوج سے ہوا اور شروع میں اس فوج نے کچھ کامیابی بھی حاصل کی مگر انجام کار شکست سے دوچار ہوئی اور تاتاریوں کا ہراول دستہ کامیاب رہا، پھر ہلاکو خاں ایک بہت بڑی فوج لے کر بغداد کے اوپر چڑھ آیا اور شہر کا محاصرہ کرلیا، اہل شہر نے اس کا مقابلہ کیا اور پچاس روز تک تاتاریوں کو شہر میں گھسنے نہیں دیا۔ لیکن بغداد کے شیعوں نے صرف یہ کہ خفیہ طور پر ہلاکو خاں سے اپنے لئے امن و تحفظ کی ضمانت حاصل کرلی تھی بلکہ شہر کے حالات اور فوجی اطلاعات بھی ہلاکو خاں کو پہنچاتے رہے پھر علقمی نے ایک اور سازش کی، اس نے خلیفہ سے کہا کہ میں نے آپ کے لئے امن و تحفظ کی ضمانت حاصل کرلی ہے، آپ ہلاکو خاں کے پاس چلیں وہ آپ کے ساتھ اعزاز و تکریم سے پیش آئے گا اور مفاہمت کرکے آپ کو بغداد و عراق کا حکمراں باقی رکھے گا! خلیفہ علقمی کے بہکاوے میں آکر اپنے بیٹے کے ساتھ شہر سے نکل کر ہلاکو خاں کے لشکر میں پہنچا، ہلاکو خاں نے خلیفہ کو دیکھ کر کہا کہ آپ اپنے آراکین سلطنت اور شہر کے علماء و فقہاء کو بھی یہیں بلوا لیجئے، چنانچہ خلیفہ نے ان سب کو حکم بھیج کر وہاں بلوا لیا، جب سب لوگ آگئے تو ہلاکو خاں نے خلیفہ کے سامنے ہی ان سب کو ایک ایک کرکے قتل کروا دیا اس کے بعد ہلاکو خاں نے خلیفہ سے کہا کہ تم شہر میں پیغام بھیج دو کہ اہل شہر ہتھیار رکھ کر شہر سے باہر آجائیں، خلیفہ نے یہ پیغام بھی شہر میں بھیج دیا، اہل شہر باہر نکلے اور تاتاریوں نے ان کو قتل کرنا شروع کیا شہر کے تمام سوار پیادے اور شرفاء کھیرے ککڑی کی طرح کئی لاکھ کی تعداد میں کاٹ ڈالے گئے، شہر کی خندق ان کی لاشوں سے بھر گئی اور اس قدر خون بہا کہ اس کی کثرت سے دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہوگیا، تاتاری لوگ شہر میں گھس پڑے عورتیں اور بچے اپنے سروں پر قرآن شریف رکھ کر نکلے مگر تاتاریوں کی تلوار سے کوئی بھی نہ بچ سکا اور ان ظالموں نے بغداد اور اس کے مضافات میں چن چن کر لوگوں کو قتل کیا، شہر بغداد میں صرف چند شخص جو کنوئیں اور دوسری پوشیدہ جگہوں میں چھپے ہوئے رہ گئے، زندہ بچے، باقی کوئی متنفس زندہ نہیں چھوڑا گیا، اگلے دن یعنی ۹ صفر ۶۵۶ھ کو ہلاکو خاں، خلیفہ مستعصم کو ہمراہ لے کر بغداد میں داخل ہوا اور قصر خلافت میں پہنچ کر دربار کیا، خلیفہ سے تمام خزانوں کی کنجیاں لے لیں، جتنے دفینے تھے سب حاصل کئے، پھر خلیفہ کو نظر بند کردیا گیا اور بھوکا پیاسا رکھا گیا، اس کے بعد جب ہلاکو خاں نے خلیفہ مستعصم کے مستقبل کے بارے میں اپنے اراکین سے مشورہ کیا تو سب نے رائے دی کہ اس کو قتل کردینا چاہئے لیکن بدبخت علقمی اور طوسی نے کہا کہ نہیں تلوار کو اس کے خون سے آلودہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کو نمدے میں لپیٹ کر لاتوں سے کچلوانا چاہئے، چنانچہ یہ کام علقمی ہی کے سپرد ہوا اور اس نے اپنے آقا مستعصم باللہ کو نمدے میں لپیٹ کر اور ایک ستون سے باندھ کر اس قدر لاتیں لگوائیں کہ خلیفہ کا دم نکل گیا، پھر اس کی لاش کو زمین پر ڈال کر تاتاری سپاہیوں کے پیروں سے روندوا کر پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کرادیا اور خود دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا کہ میں علویوں کا انتقام لے رہا ہوں غرض یہ کہ بدنصیب خلیفہ کی لاش کو گور و کفن بھی نصیب نہیں ہوا اور اس طرح خاندان عباسیہ کی خلافت کا خاتمہ ہوگیا اس کے بعد ہلاکو خاں نے شاہی کتب خانہ کو بھی نہیں بخشا، جس میں بے شمار کتابوں کا ذخیرہ تھا، یہ تمام کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک دی گئیں جس سے دریا میں ایک بند سا بندھ گیا اور بتدریج پانی ان سب کو بہا لے گیا، دجلہ کا پانی جو بغداد و مضافات کے مقتولین کے خون سے سرخ ہو رہا تھا اب ان کتابوں کی روشنائی سے

سیاہ ہو گیا اور عرصہ تک سیاہ رہا۔ تمام شاہی محلات کو لوٹ کر مسمار کر دیا گیا! مورخین نے لکھا ہے کہ اس وقت ہلاکو خاں کی فوج کے ہاتھوں بغداد اور مضافات بغداد میں جو قتل عام ہوا اس کے نتیجے میں ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان مقتول ہوئے۔ غرض یہ کہ وہ ایسی عظیم الشان اور ہیبت ناک خونریزی اور بربادی تھی جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی اور اسلام پر ایک ایسی مصیبت آئی تھی کہ لوگوں نے اس کو قیامت صغریٰ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس سانحہ عظمیٰ کا سب سے زیادہ عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ علقمی نے جس علوی خلافت کے قیام اور اپنی حکمرانی کی خواہش کے تحت اتنی عظیم الشان تباہی و بربادی کے اسباب پیدا کئے اور پورے عالم اسلام کو زبردست نقصان پہنچنے کا باعث بنا، اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا، ہلاکو خاں نے کسی ہاشمی یا علوی کو خلیفہ و حکمراں بنانے کے بجائے اپنے آدمیوں کو عراق میں حاکم بنا دیا، علقمی نے بہت چالیس چلیں ہلاکو خاں کے آگے رویا گڑگڑایا اور لاکھ منت سماجت کی لیکن ہلاکو خاں نے اس کو اس طرح دھتکار دیا جس طرح کتے کو دھتکار دیتے ہیں کچھ دنوں تک تو علقمی غلاموں کی طرح تاتاریوں کے ساتھ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا پھرا، آخر اپنی منافقت وغداری کا عبرتناک حشر دیکھ کر ناکامی ومایوسی کے غم سے بہت جلد مر گیا اس سانحہ کے بعد بغداد دار الخلافہ بھی نہیں رہا اور خلیفہ مستعصم باللہ کے بعد تین سال کا ایسا عرصہ گزرا جس میں دنیا میں کوئی خلیفہ نہیں تھا۔

زمانہ نبوی کے بعد عرب میں ظہور پذیر ہونے والے فتنہ کی پیشین گوئی

(۲۵) وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ وَیْلٌ لِّلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ اَفْلَحَ مَنْ کَفَّ یَدَہٗ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "افسوس اور بدنصیبی عرب کی کہ برائی (کے فتنے کا ظاہر ہونا) قریب آگیا، اس فتنہ میں وہی شخص نجات یافتہ اور فلاح یاب رہے گا جس نے اپنا ہاتھ روکے رکھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعے عرب کے اس فتنہ کی طرف اشارہ فرمایا جو حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت میں پیش آیا اور جس نے مسلمانوں کے باہمی افتراق وانتشار، خروج وبغاوت اور بدامنی وخانہ جنگی کی صورت میں نہ صرف حضرت عثمان غنیؓ کو جام شہادت نوش کرنے پر مجبور کیا بلکہ اس کا سلسلہ بعد میں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی آویزش کی صورت میں بہت دنوں تک جاری رہا اور اسلام اور مسلمانوں کو کافی نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ لیکن ملا علی قاری کا کہنا یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا مصداق حضرت امام حسینؓ کے خلاف یزید ابن معاویہ کی وہ کارروائی ہے جس کے نتیجے میں امام عالی مقام کربلا کے میدان میں شہید ہوئے۔ معنی کے اعتبار سے یہ قول زیادہ صحیح اور حدیث کے قریب تر ہے کیونکہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا سانحہ ایک ایسا فتنہ تھا جس کی برائی میں عرب وعجم میں سے کسی کو بھی کوئی شک وشبہ نہیں۔

فتنہ وفساد سے دور رہنے والا شخص نیک بخت ہے

(۲۶) وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ السَّعِیْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ اِنَّ السَّعِیْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ اِنَّ السَّعِیْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ وَلَمَنِ ابْتُلِیَ فَصَبَرَ فَوَاھًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مقداد ابن اسودؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ یقیناً نیک بخت وہ شخص ہے جو فتنوں سے محفوظ رکھا گیا ہو۔ یقیناً نیک بخت وہ شخص ہے جو فتنوں سے محفوظ رکھا گیا ہو۔ (گویا آپ نے بات کی اہمیت کو زیادہ موثر اور تاکیدی انداز میں بیان کرنے کے لئے یہ جملہ تین بار ارشاد فرمایا) اور یقیناً نیک بخت وہ شخص بھی ہے جو فتنہ میں مبتلا کیا گیا لیکن اس نے صبر وضبط کا دامن پکڑے رکھا اور قابل افسوس وہ شخص ہے جو نہ فتنوں سے محفوظ رکھا گیا اور نہ اس نے صبر وضبط اختیار کیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "واھا" کے معنی ہیں افسوس، حسرت اور کبھی یہ لفظ عجب، یعنی خوشی ظاہر کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے! پس اگر یہاں یہ لفظ اظہار افسوس وحسرت کے معنی میں لیا جائے تو کہا جائے گا کہ "فواھا" کا لفظ ماقبل جملہ یعنی لمن ابتلی فصبر سے الگ ہے اور ایک ایسے جملے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جو اگرچہ لفظوں میں مذکور نہیں ہے لیکن اس کا مفہوم مراد لیا گیا ہے، اس صورت میں پوری عبارت گویا یوں ہوگی کہ یہ اور قابل افسوس وہ شخص ہے جو فتنوں سے محفوظ نہ رکھا گیا ہو اور (فتنوں میں مبتلا ہونے کی صورت میں) اس نے صبر وضبط اختیار نہ کیا ہو" اس طرح ماقبل جملہ لمن ابتلی فصبر میں لفظ لمن کے لام کو مفتوح قرار دیا جائے گا۔ اور اگر یہاں "واھا" کے معنی عجب یعنی خوشی کو ظاہر کرنا، مراد ہوں تو اس صورت میں "فواھا" کسی علیحدہ جملے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے نہیں ہوگا بلکہ ماقبل جملہ لمن ابتلی فصبر سے جڑا ہوا سمجھا جائے گا اور اس جملے کا ترجمہ یوں ہوگا کہ فتنوں سے محفوظ رہنا اور (اگر فتنے میں مبتلا ہو جائے تو) صبر وضبط اختیار کرنا کتنی اچھی اور خوش کرنے والی بات ہے؟ چنانچہ بعض محدثین نے جو یہاں لمن ابتلی فصبر میں "لمن" کے لام کو زیر کے ساتھ پڑھا اور لکھا ہے اور اس کو "فواھا" کے متعلق کہا ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں واھا کا لفظ عجب، یعنی اظہار خوشی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

چند پیشن گوئیاں

(۲۷) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَ السَّيْفُ فِيْ اُمَّتِيْ لَمْ يُرْفَعْ عَنْهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَلْحَقَ قَبَائِلُ مِنْ اُمَّتِيْ بِالْمُشْرِكِيْنَ وَحَتّٰى تَعْبُدَ قَبَائِلُ مِنْ اُمَّتِي الْاَوْثَانَ وَاَنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ كَذَّابُوْنَ ثَلٰثُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ نَبِيُّ اللّٰهِ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَلَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ۔ (رواه ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب میری اُمت میں (آپس میں) تلوار چل جائے گی تو پھر قیامت تک امت کے لوگوں کے قتل وقتال سے باز نہیں رہے گی! اور اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک میری اُمت کے بعض قبائل مشرکوں کے ساتھ نہ جاملیں گے، اور اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک میری اُمت کے بعض قبائل بتوں کو پوجنے لگیں گے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میری اُمت میں سے تیس جھوٹے (یعنی نبوت کا دعویٰ کرنے والے) ظاہر ہوں گے، ان میں سے ہر ایک یہ گمان کرے گا کہ وہ خدا کا نبی ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور میری اُمت میں سے ہمیشہ ایک جماعت حق پر ثابت قدم رہے گی (یعنی عملی طور پر بھی اور علمی طور پر بھی دین کے صحیح راستے پر چلنے والی ہوگی اور دشمنان دین پر غالب رہے گی) اس جماعت کا کوئی بھی مخالف وبد خواہ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا (کیونکہ اس جماعت کے لوگ دین پر ثابت قدم اور برحق ہونے کی وجہ سے خدا کی مدد ونصرت کے سایہ میں ہوں گے) تا آنکہ خدا کا حکم آئے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ کو بعض مسلمانوں کی وجہ سے میری اُمت میں باہمی محاذ آرائی آپس میں قتل وقتال کی سیاست کو عمل ودخل کا موقع مل گیا تو پھر مسلمانوں کی باہمی خونریزی اور ایک دوسرے کے خلاف تشدد وطاقت کے استعمال کا ایسا سلسلہ شروع ہو جائے گا جو قیامت تک ختم نہیں ہوگا اور ہمیشہ میری امت کے لوگ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں اپنی ہی صفوں کے خلاف لڑتے رہیں گے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ثابت ہوا اور حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے سے مسلمانوں کی جو باہمی محاذ آرائی شروع ہوئی تھی اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

"جب تک میری اُمت کے بعض قبائل مشرکوں کے ساتھ نہ جاملیں گے"۔ حضور ﷺ کی اس پیشین گوئی کا کچھ حصہ تو آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ہی سامنے آگیا تھا جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں عرب کے چند قبائل کچھ

شرپسندوں اور منافقین کے فریب میں آکر ارتداد میں مبتلا ہو گئے تھے اور کفر و شرک کی طاقتوں کے ساتھ مل گئے تھے، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فراست و دانش مندی اور قوت فیصلہ کی مضبوطی و اولوالعزمی نے ان مرتدین کا استیصال کر دیا تھا۔

"جب تک میری اُمت کے بعض قبائل بتوں کو پوجنے لگیں گے" میں بتوں کا پوجنا اگر حقیقی معنی میں مراد ہے تو کہا جائے گا کہ شاید آئندہ زمانے میں کوئی وقت ایسا بھی آئے جب مسلمانوں کے کچھ طبقے ایمان و اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود، واقعۃً بتوں کی پوجا کرنے لگیں۔ ویسے موجودہ زمانے میں بھی ایسے مسلمانوں کا وجود بہرحال پایا جاتا ہے جو قبر پرستی اور تعزیہ کی پرستش وغیرہ کی صورت میں اپنی پیشانیاں غیر اللہ کے آگے سجدہ ریز کرتے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اس جملے میں بتوں کو پوجنے والی بات اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے بلکہ اس سے مجازی اور معنوی صورت مراد ہے تو پھر اس کے محمول کی بہت صورتیں ہو سکتی ہیں جو ہر زمانے میں پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک صورت مال و دولت اور جاہ و اقتدار وغیرہ کے حصول کو اپنی زندگی کا اصل مقصد اور اپنی امیدوں اور آرزوؤں کی واحد آماجگاہ بنالینا ہے، اس صورت میں اس ارشاد گرامی کا ایک محمول وہ لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

تعس عبد الدینار و عبد الدرهم۔

"درہم و دینار (یعنی مال و دولت) کے غلام ہلاک ہوں۔"

لفظ "خاتم" ت کے زیر اور زبر دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ اور وانا خاتم النبیین کا جملہ نحوی قاعدہ کے اعتبار سے حال واقع ہوا ہے نیز لانبی بعدی کا جملہ اپنے پہلے جملہ یعنی انا خاتم النبیین کی تفسیر و وضاحت کے طور پر ہے۔

"تا آنکہ خدا کا حکم آئے" میں "خدا کے حکم" سے مراد قیامت ہے یا دین کا اس طرح تسلط و غلبہ پالینا مراد ہے کہ روئے زمین پر کفر کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔ نیز حتی یاتی الخ کا جملہ، لفظ لاتزال سے متعلق ہے۔

ایک پیشن گوئی

(۲۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَدُوْرُ رَحَى الْاِسْلَامِ لِخَمْسٍ وَّ ثَلٰثِيْنَ اَوْسِتٍّ ثَلٰثِيْنَ اَوْسَبْعٍ وَّ ثَلٰثِيْنَ فَاِنْ يُّهْلِكُوْا فَسَبِيْلُ مَنْ هَلَكَ وَاِنْ يَّقُمْ لَهُمْ دِيْنُهُمْ يَقُمْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ عَامًا قُلْتُ اَمِمَّا بَقِيَ اَوْ مِمَّا مَضٰى قَالَ مِمَّا مَضٰى۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعود نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اسلام کی چکی پینتیس برس یا چھتیس برس یا سینتیس برس تک گھومتی رہے گی پھر اگر لوگ ہلاک ہوں گے تو اس راستے پر چلنے کی وجہ سے ہلاک ہوں گے جس پر چل کر پہلے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں اور اگر ان کے دین کا نظام کامل و برقرار رہا تو ان کے دینی نظام کی تکمیل و برقراری کا وہ سلسلہ ستر برس تک رہے گا۔" (حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ) میں نے یہ (سن کر) پوچھا کہ یہ ستر برس بقیہ میں سے ہوں گے یا اس عرصے سمیت ہوں گے جو گزرا (یعنی آپ ﷺ نے دین کے نظام کی تکمیل و برقراری کے لئے جس ستر سال کے عرصے کا ذکر فرمایا ہے آیا اس سے ستر سال کا وہ عرصہ مراد ہے جس کی ابتداء ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ سال کا مذکورہ زمانہ گزرنے کے بعد ہوگی، یا وہ مذکورہ سال بھی اس ستر سال کے عرصے میں شامل ہیں اور اس کی ابتداء، اسلام کے ابتدائی زمانہ یا ہجرت کے وقت سے مراد لی گئی ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا (یہ مذکورہ سال بھی ان ستر سالوں میں شامل ہیں اور) ستر سال کا عرصہ اس عرصہ سمیت ہے جو (اسلام کے ابتدائی زمانہ یا ہجرت کے وقت سے اب تک) گزر چکا ہے"۔ (ابوداؤدؒ)

تشریح: "اسلام کی چکی گھومتی رہے گی" سے حضور ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ وہ زمانہ کہ جس میں دین کا نظام مستحکم و استوار رہے گا، احکام شریعت کی بھرپور حکمرانی ہوگی، مسلمانوں کے تمام دینی و دنیاوی معاملات قرآن و سنت کے مطابق خوش اسلوبی کے ساتھ چلتے رہیں گے اور دین و آخرت کی زندگی فتنہ و فساد سے محفوظ و مامون رہے گی، ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ سال پر مشتمل ہوگا اور اس زمانے کی ابتداء ہجرت کے سال

سے ہے کہ اسلام کے ملی وسیاسی ظہور اور ملکی فتوحات کا سلسلہ سال ہجرت ہی سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا سانحہ اسلام کی تاریخ کا وہ پہلا فتنہ ہے جس نے مسلمانوں کی دینی وملی زندگی کو سخت دھچکا لگایا اور اسلام کی سیاسی طاقت باہمی افتراق وانتشار کی وجہ سے بہت مضمحل ہوگئی، یہ فتنہ ۳۵ھ میں ظاہر ہوا، اس کے بعد ۳۶ھ میں جنگ جمل اور ۳۷ھ میں جنگ صفین کے فتنے پیش آئے، جس نے مسلمانوں کے دینی وملی نظام اور سیاسی استحکام کو ہلا کر رکھ دیا اور اس کے نہایت روح فرسا نتائج نکلے۔

واضح رہے کہ لخمس وثلثین اوست وثلثین او سبع وثلثین (۳۵ برس، یا ۳۶ برس یا ۳۷ برس) میں حرف او (بمعنی یا) تنویع کے لئے یا بل (بلکہ) کے معنی میں ہے۔

۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ کے تعین کے سلسلے میں ایک وضاحت تو وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی یعنی ابتداء تو سال ہجرت سے شمار کی جائے اور انتہا حضرت عثمانؓ کی شہادت اور پھر جنگ جمل وجنگ صفین کو قرار دیا جائے تو بالترتیب ۳۵ھ، ۳۶ھ، اور ۳۷ھ کے واقعات ہیں لیکن اس بارے میں ایک احتمال یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ کلام اس سال ارشاد فرمایا تھا جب کہ آپ ﷺ کی زندگی کے چند ہی سال باقی رہ گئے تھے اور اگر ان چند سالوں کو خلفاء اربعہ کی مدت خلافت کے ساتھ جوڑا جائے تو ان سب کی مجموعی مدت اتنے ہی سالوں پر مشتمل ہے جو حضور ﷺ نے اس ارشاد گرامی میں ظاہر فرمائی۔ گویا اس قول کے مطابق ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ سال کا ابتدائی سال تو اس کو قرار دیا جائے گا، جس میں حضور ﷺ نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی اور ان سالوں کا آخری سال حضرت علیؓ کی خلافت کے سال آخر کو قرار دیا جائے گا، لہٰذا دین کے نظام کے استقرار وتکمیل سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ ان مذکورہ سالوں میں دین پوری طرح محفوظ ومامون رہے گا کہ بدعت اور فکر وجمال کی لغزش تک کو دین میں راہ پانے کا موقع نہیں ملے گا اور ملک وملت کا کوئی بھی کام شارع کے حکم کے خلاف نہیں ہوگا تو پھر مذکورہ سالوں کے تعین کے سلسلے میں یہی وضاحت مناسب تر اور اولیٰ ہوگی اور اگر "دین کے استقرار وتکمیل" سے مراد لیا جائے کہ ملک وملت کے تمام انتظام فتنہ وفساد سے پاک ہوں گے، خلافت کا مسئلہ خوش اسلوبی اور اتفاق واتحاد کے ساتھ طے پاتا رہے گا اور مسلمانوں کے درمیان کوئی محاذ آرائی اور مخالفت وعناد کی صورت پیدا نہیں ہوگی تو پھر مذکورہ سالوں کے تعین میں وہ وضاحت مناسب تر ہوگی جو پہلے نقل کی گئی۔ ایک اور احتمال بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مذکورہ سالوں کی ابتداء اس وقت سے لگائی جب کہ آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تھا یعنی نبوت کا پہلا سال اس صورت میں ۳۵ برس کی مدت کا اختتام حضرت عمرؓ کی خلافت کے اختتام پر ہوگا یہ احتمال اس اعتبار سے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد دین وایمان کی سلامتی، سنت کی اتباع، جماعتی اتحاد واتفاق، مسلمانوں کی باہمی قلبی محبت ورواداری اور دین وملت کا اخلاقی وسیاسی استحکام جس زمانے میں بہت عمدہ اور نہایت خوبی کے ساتھ تھا وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہی کی خلافت کا زمانہ تھا، حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ایک دو سال کے بعد ہی جو صورت پیدا ہوگئی اور دین وملت کے نظم واستحکام کے منافی جو حادثات وواقعات ظاہر ہونے شروع ہوئے وہی ان فتنوں کا باعث بنے جنگی حشر سامانیوں نے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو نہایت مکدر کر کے رکھ دیا۔

"پھر اگر لوگ ہلاک ہوں گے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ سالوں میں دین وملت کے اخلاقی وسیاسی نظام میں استحکام واستقرار کے بعد اگر لوگ اپنے دینی وملی معاملات میں اختلاف وانتشار کا شکار ہو جائیں دین وآخرت کے امور میں سستی وکوتاہی کا شکار اور گناہ ومعصیت کا ارتکاب کرنے لگیں تو سمجھو کہ وہ اس خطرناک راستے پر پڑ گئے ہیں جس پر چل کر پچھلی امتوں کے لوگوں نے تباہی وبربادی اور ہلاکت مول لی تھی، چنانچہ پچھلی امتوں کے لوگ اسی لئے تباہ وبرباد اور ہلاک کر دیئے گئے تھے کہ انہوں نے کجروی اختیار کر لی تھی، حق سے دور ہٹ گئے تھے، شرعی احکام اور اپنے ملی معاملات میں اختلاف وانتشار کا شکار ہو گئے تھے، اپنے دین پر عمل کرنے اور اپنے پیغمبر کی تعلیمات کو ماننے میں سستی وکوتاہی اور لاپرواہی برتنے لگے تھے اور گناہ ومعصیت سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ واضح رہے کہ جو چیزیں

انسان کی ہلاکت وتباہی کا سبب بنتی ہیں اور جن کو اختیار کر کے کوئی شخص ہلاکت میں مبتلا ہوتا ہے یہاں ان ہی اسباب کو "ہلاکت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"اور اگر ان کے دین کا نظام کامل وبرقرار رہا..... الخ" کا مطلب یہ ہے اگر مسلمان پہلے کی طرح اپنے امیر وخلیفہ کی اطاعت وفرمانبرداری پر قائم رہے، احکام شریعت اور دینی نظام کو برقرار رکھنے اور ان کی اتباع کرنے پر عامل رہے اور ملی اتحاد واتفاق کے ذریعے اسلام کی شوکت کو بحال رکھنے میں مصروف رہے تو ان کے دو ملی اور سیاسی استحکام وبرقراری کا سلسلہ ستر برس تک جاری رہے گا! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ستر برس کی تحدید سے کیا مراد ہے؟ تو اس کا حقیقی مفہوم پوری وضاحت کے ساتھ سامنے نہیں ہے، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینی وملی نظام کے اخلاقی وسیاسی استحکام کے سلسلے میں جو بات پہلے ذکر کی جاچکی ہے کہ وہ (یعنی دینی وملی استحکام) ۳۵ یا ۳٦ یا ۳۷ سال تک قائم رہے گا تو اسی کے اعتبار سے یہ بات کہی گئی ہے کہ مسلمانوں کے ملی وملکی امور اور سیاسی وانتظامی معاملات آنے والے زمانہ کی بہ نسبت ان ستر سالوں میں زیادہ عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پاتے رہیں گے۔

بہر حال اس حدیث کی تشریح میں یوں تو شارحین نے بہت زیادہ بحث کی ہے اور لمبی چوڑی باتیں لکھی ہیں لیکن قابل اعتماد اعتبار مسلک وعقیدے کے مطابق نیز حدیث کے الفاظ کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے مختصر طور پر جو تشریح بیان کی جاسکتی تھی وہ یہاں نقل کر دی گئی ہے جو انشاء اللہ کافی ہوگی! لیکن اگر اسی اختصار کے ساتھ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی کے ان منقولات وفرمودات کو بھی بیان کر دیا جائے جو اس حدیث کی تشریح سے تعلق رکھتے ہیں تو حدیث کے فرمودات اور اس کے مصداق کی کچھ اور وضاحت ہو جائے گی! چنانچہ شاہ صاحب کے مطابق جو حدیث کا حاصل اور مصداق یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ گویا آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ زمانہ ہجرت کے بعد اسلام کی پیش قدمی اور مسلمانوں کے حالات میں جو مضبوطی واستحکام پیدا ہوا ہے وہ ۳۵، ۳٦ سالوں تک یوں ہی چلتا رہے گا اور تمام دینی وملی معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ طے پاتے رہیں گے، پھر اسلام کے دائرہ میں کچھ اضطراب واقع ہو جائے گا اور باہمی افتراق وانتشار کی وجہ سے مسلمانوں کے دینی وملی معاملات میں خرابی پیدا ہونی شروع ہو جائے گی، چنانچہ اس بگاڑ اور خرابی کی ابتداء ۳۵ھ سے ہوئی جب کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا، پھر ۳٦ھ میں مزید بگاڑ واقع ہوا جب کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان محاذ آرائی ہوئی اور جس کو جنگ جمل کہا جاتا ہے اور اس کے بعد ۳۷ھ میں حالات بالکل ہی قابو سے باہر ہو گئے اور اسلام ومسلمانوں کو سخت نقصان وتباہی سے دو چار ہونا پڑا۔ جب کہ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان بڑی خوف ناک جنگ، جنگ صفین کے نام سے ہوئی! اس کے بعد گویا حضور ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ مسلمانوں کے دینی اور ملی نظام میں اس خرابی کے واقع ہونے کے بعد اور باغیوں کے غالب آجانے اور خلیفہ برحق کی مغلوبیت کی وجہ سے اگر لوگ دینی وملی نظام کو تباہ کرنے والے ان اعمال واطوار کو اختیار کر کے ہلاک ہوں گے تو وہ اس راستے پر چلنے کی وجہ سے ہلاک ہوں گے جس پر پچھلی امتوں کے لوگوں نے چل کر اپنے آپ کو تباہ وبرباد کر لیا تھا، چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ایسا ہی ہوا کہ حضرت امام حسینؓ کو نہایت مجبوری اور ناگواری کے ساتھ اپنی خلافت سے دست کش ہونا پڑا اور جس طرح ان کو گویا مغلوب ہونا پڑا جس کے نتائج آگے چل کر باہمی افتراق وانتشار اور جاہ واقتدار کی خاطر ایک دوسرے کے خلاف قتل وقتال کی صورت میں رونما ہوئے اور اگر خلیفہ برحق کا اقتدار وتسلط قائم رہا اور باغیوں کو غالب آنے کا موقع نہ مل سکا تو مسلمانوں کا دینی وملی نظام آنے والے زمانوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ عمدگی کے ساتھ چلتا رہے گا اور یہ نظام ستر برس تک یوں ہی قائم رہے گا۔

شہادت عثمان رضی اللہ عنہ

حدیث کے تشریح میں تین ایسے واقعات کا ذکر آیا ہے جو اسلامی تاریخ میں نہایت روح فرسا نتائج کے ساتھ یاد کئے جاتے ہیں اور جن کی طرف حضور ﷺ نے گویا پہلے ہی اشارہ فرما دیا تھا، یہ تینوں واقعات ہیں، شہادت عثمانؓ، جنگ جمل، اور جنگ صفین، ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں واقعات پر مختصر انداز میں روشنی ڈالی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے واقعہ اور اس کے پس منظر کو بیان کیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ اسلام کے تیسرے خلیفہ اور حضرت عمر فاروقؓ کے بعد مسلمانوں کے امیر و حکمراں بنے تھے! حضرت عمرؓ کے دور خلافت تک مسلمانوں کے عام دینی وسیاسی اور ملکی و ملی معاملات ایک مستحکم خلافت کے تحت عمدگی و خوبی کے ساتھ چلتے رہے اور ان عوامل واسباب کو سر اٹھانے کا موقع نہیں ملا جو خلافت کے استحکام اور ملی نظم واتحاد کے خلاف کسی محاذ آرائی کا باعث بنتے، حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کا ابتدائی نصف حصہ بھی اسی نہج پر استوار رہا لیکن اس کے بعد کچھ ایسے اندرونی عوامل واسباب پیدا ہوگئے اور اس کے ساتھ بعض ایسی بیرونی سازشیں حرکت میں آگئیں جن سے حضرت عثمانؓ کی خلافت کا استحکام ڈانواں ڈول ہوگیا اور ملک وملت کے دینی وسیاسی معاملات پر حضرت عثمانؓ کی گرفت ڈھیلی پڑگئی! حضرت عثمانؓ کے جہاں بے شمار اوصاف ان کی زندگی میں مابہ الامتیاز حیثیت رکھتے وہاں ان میں ایک بڑا وصف علم و مروت، چشم پوشی و درگزر اور خاص طور پر اپنے عزیز واقارب کے ساتھ حسن سلوک کا جذبہ بھی تھا، انہوں نے اخلاص نیت کے ساتھ اپنے ان عزیز واقارب کو اونچے عہدوں اور مناصب پر فائز کیا جن کو وہ ان عہدوں کے لئے واقعۃً اور دیانۃً اہل اور مناسب جانتے تھے، نیز وہ چونکہ ذاتی طور پر بہت مالدار تھے اس لئے اپنے مال دولت کے ذریعے اپنے عزیزوں کی خبر گیری رکھتے تھے اور ان کی مالی معاونت فرمایا کرتے تھے ادھر مسلمانوں کے ذہنی و فکری حالات میں بھی زمانہ کے تغیرات اور وسیع تر ماحول میں عام خلط ملط کے اثرات سے کافی حد تک تبدیلی آگئی تھی، چنانچہ کچھ مسلمانوں میں اور خاص طور پر ان مسلمانوں میں جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے، اور جو قدیم قبائلی وعلاقائی عصبیت کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے، یہ شکوک پیدا ہونے شروع ہوگئے کہ امیر المؤمنین اپنی خلافت کے ذریعے اپنے قبیلے اور اپنے خاندان کے لوگوں ہی کو منفعت پہنچا رہے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کے لوگ ابھی بہت کم تھے اور عام لوگوں میں حضرت عثمانؓ کی طرف سے کوئی بدگمانی اور شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن عین اسی وقت عبداللہ ابن سبا نے اپنی مکرو سازش کا جال پھیلانے کا کام شروع کر دیا، عبداللہ ابن سبا شہر صنعاء کا رہنے والا ایک یہودی تھا اس نے حضرت عثمانؓ کی خلافت میں یہ دیکھ کر کہ مسلمان ہی دنیا کی سب سے فاتح قوم بن گئی ہے اور اس قوم کو بہت زیادہ مال و حشمت حاصل ہے، مدینہ میں آیا اور بظاہر مسلمان بن کر رہنے لگا، اس کا اصل مقصد محض دولت و حشمت کا حصول ہی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے ذہن میں مسلمانوں کی طاقت کمزور کرنے اور اسلام کی شوکت و حشمت کو ختم کرنے کی سازش بھی پنہاں رکھتا تھا، چنانچہ وہ مدینہ میں اپنی اس سازش کی تکمیل میں مصروف ہوگیا، وہاں جب کچھ کامیابی نہیں ہوئی تو بصرہ پہنچا۔

بصرہ میں اس نے مختلف مکرو فریب اور ترغیبات ولالچ کے ذریعے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا اور طرح طرح کی بدعقیدگیوں کا پرچار شروع کیا، جب بصرہ کے گورنر کو اس کے حالات اور اس کی اصل حقیقت کا علم ہوا اور انہوں نے بازپرس کی تو وہاں اپنے حامیوں کی ایک جماعت چھوڑ کر کوفہ آگیا جہاں پہلے ہی سے ایک جماعت حضرت عثمانؓ اور ان کے عامل کے خلاف تھی یہاں عبداللہ ابن سبا کو اپنی سازش پھیلانے کا زیادہ موقع ملا اس کو ایک طرف تو اسلام سے مخالفت تھی دوسری طرف وہ حضرت عثمان غنیؓ سے کوئی ذاتی عداوت وعناد بھی رکھتا تھا اور ان سے انتقام لینے کی خواہش رکھتا تھا کچھ دنوں کے بعد اس کو کوفہ بھی چھوڑنا پڑا اور پھر دمشق پہنچ گیا دمشق میں اس کی دال زیادہ نہ گلی اور جلد ہی اسے یہاں سے بھی شہر بدر ہونا پڑا، یہاں سے نکل کر وہ مصر پہنچا اور وہاں اس نے زیادہ ہوشیاری اور اطاعت کے ساتھ کام شروع کیا، اور ایک باقاعدہ خفیہ جماعت کی تنظیم کی چونکہ وہ اہل بیت کی محبت اور حضرت علیؓ کے ساتھ تعلق کا دعوی بھی کرتا تھا لہٰذا اس فریب آمیز دعوی کے ذریعے مصر میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی اور لوگوں نے اس کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا یہاں بیٹھ کر اس نے اسلامی سلطنت کے ان تمام علاقوں سے رابطہ قائم کیا، جہاں جہاں وہ گیا تھا اور اپنے کچھ حامیوں کی جماعت چھوڑ کر آیا تھا، اپنے ان حامیوں کے ذریعے ایک طرف تو اس نے مختلف علاقوں سے اہل مدینہ کے پاس یہ شکایتیں پہنچوائیں کہ عثمانؓ کے عامل

اور گورنر اپنے اپنے علاقوں کے لوگوں پر سخت ظلم و ستم کر رہے ہیں دوسری طرف اس نے عام مسلمانوں میں حضرت عثمانؓ کی خویش پروری اور ان کے عاملوں اور گورنروں کے ظلم و ستم کے فرضی واقعات کا پروپیگنڈہ کر کر کے خلافت عثمانؓ کے خلاف ناراضگی اور شورش پیدا کر دی، جب حضرت عثمانؓ کو اس شورش کا علم ہوا تو انہوں نے صورت حال کی طرف توجہ دی اور اپنے عاملین اور مشیروں کو جمع کر کے مشورہ کیا، کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ جو افراد یہ شورش پھیلانے کے ذمہ دار ہیں ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے اور مجرمین کے ساتھ کوئی رعایت روا نہ رکھی جائے لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنی مروت و بردباری کی وجہ سے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور یہ فرمایا کہ میں قرآن و حدیث کے حکم کے مطابق کسی شخص کو اس وقت تک قتل نہیں کر سکتا جب تک کہ علانیہ مرتد ہوتے نہ دیکھ لوں اور اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے غرض معمولی تدابیر کے علاوہ سازشیوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں ہوئی جس سے ان کے حوصلے اور بلند ہو گئے اور وہ نہایت زور و شور کے ساتھ اپنی تخریبی کارروائیوں میں مصروف رہے اور اکثر علاقوں خاص طور پر مصر میں شورش پسندوں کے گروہ کے گروہ تیار ہو گئے جن کو مدینہ پر دھاوا بولنے اور حضرت عثمانؓ کو قتل کر دینے کی تربیت دی جانے لگی۔

ادھر عبداللہ ابن سبا کے لوگ مختلف علاقوں کے گورنروں و عاملوں کے خلاف جو فرضی شکایتیں اہل مدینہ کے پاس بھیجتے تھے ان کو اہل مدینہ صحیح سمجھ کر حضرت عثمانؓ سے ان گورنروں اور عاملوں کی معزولی کا مطالبہ کرتے تھے، مگر حضرت عثمانؓ کو تفتیش و تحقیق سے چونکہ معلوم ہو جاتا تھا کہ تمام شکایتیں فرضی ہیں اس لئے وہ ان گورنروں اور عاملوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مدینہ میں حضرت عثمانؓ اور ان کی حکومت کے خلاف بدگمانیوں اور شکایتوں کی ایک فضا بن گئی اور جا بجا خلیفہ وقت کی نسبت سرگوشیاں ہونا شروع ہو گئیں بلکہ لوگوں کی زبان پر علانیہ شکایتیں آنے لگیں، یہ وہ زمانہ تھا جب عبداللہ ابن سبا کے ایجنٹ تمام ممالک اسلامیہ اور تمام بڑے شہروں اور قصبوں میں پہنچ چکے تھے اور ان کے حامیوں کے گروہ ہر جگہ پیدا ہو چکے تھے جب اس نے دیکھ لیا کہ اس کی سازش آخری مرحلوں میں پہنچ گئی ہے، تمام علاقوں میں خلافت عثمانؓ کے خلاف بدگمانیوں اور شکایتوں کا جال پھیلا دیا گیا ہے اور ہر جگہ میرے حامیوں کی خاصی تعداد جمع ہو گئی ہے تو اس نے ہر ہر علاقے سے اپنے مسلح آدمیوں کی بڑی تعداد، چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اور خفیہ طور پر مدینہ روانہ کی، اور پھر کچھ دنوں کے بعد مدینہ والوں نے دیکھا کہ باغیوں اور بلوائیوں کی ایک بڑی جماعت نعرہ تکبیر بلند کرتی ہوئی مدینہ میں داخل ہو گئی ہے۔ عبداللہ ابن سبا نے حضرت علیؓ کی محبت اور ان کو خلیفہ بنانے کا دعوی کر کے جن لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا تھا ان تک اس نے حضرت علیؓ کا ایک جعلی خط بھی گشت کرایا تھا جس میں گویا انہوں نے باغیوں کی حمایت کا اعلان کیا تھا، چنانچہ بلوائیوں نے مدینہ پہنچ کر حضرت علیؓ سے مدد کی درخواست کی تو انہوں نے اس کی کسی بھی طرح سے مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا، انہوں نے ان سے اس بات کا انکار کیا کہ میں نے تم لوگوں کی حمایت کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے کبھی بھی تم لوگوں کو خط نہیں لکھا۔ حضرت علیؓ نے بلوائیوں کو ان کی سازش سے دور رکھنے کی بہت کوشش کی، دوسرے صحابہؓ نے بھی معاملے کو سلجھانے کی سعی کی، حضرت عثمانؓ نے بلوائیوں کے مطالبے پر مصر کے گورنر کو معزول بھی کر دیا لیکن اصل تحریک کا مقصد ہی محض شورش و بغاوت پھیلانا تھا اس لئے بلوائیوں کے لیڈروں نے صورت حال کو معمول پر لانے اور شورش کو دبانے کی تمام تدابیر کو ناکام بنا دیا، حضرت عثمانؓ نے یہ رنگ اور مدینہ کے گلی کوچوں کو بلوائیوں سے پر دیکھ کر مختلف بلاد اسلامیہ کے گورنروں کو خط لکھ کر امداد طلب کی، اور ان بلاد سے سرکاری فوجیں بلوائیوں کی سرکوبی کے لئے مدینہ کی طرف روانہ بھی ہو گئیں لیکن بلوائیوں نے ان فوجوں کے آنے سے پیشتر ہی حضرت عثمانؓ کے مکان کو گھیر کر ان کا محاصرہ کر لیا، اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا نہایت ضروری ہے کہ اس صورت حال کو بگاڑنے میں بڑا دخل مروان ابن حکم کا تھا جو حضرت عثمانؓ کا چچازاد بھائی اور ان کا امیر منشی و وزیر تھا، اس نے حضرت عثمانؓ کی مروت و چشم پوشی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی بداطواریوں، جعل سازیوں اور عوام مخالف اقدامات کے ذریعے عام مسلمانوں اور خصوصاً اہل مدینہ کو بہت زیادہ برہم کر رکھا تھا، اہل مدینہ نے اس موقع پر فائدہ ضرور اٹھانا چاہا کہ مروان کے خلاف وہ بھی بلوائیوں کے شریک حال ہو گئے لیکن ان کا مطالبہ صرف مروان کو

اس کے عہدے سے معزول کر کے اہل مدینہ کے سپرد کر دینے کا تھا اور اگر حضرت عثمانؓ اہل مدینہ کا مطالبہ مان لیتے تو شاید بلوائیوں کو اپنے اصل مقصد میں زیادہ کامیابی نہ ہوتی کیونکہ پھر مدینہ کے لوگ بلوائیوں کی حمایت ترک کر کے پوری طاقت سے ان کا مقابلہ کرتے لیکن حضرت عثمانؓ کی مروت نے گوارہ نہ کیا کہ وہ مروان کو اہل مدینہ کے حوالے کر کے ان کے ہاتھوں اس کے قتل ہو جانے کا منظر دیکھیں بہر حال جب بلوائیوں نے زیادہ شورش برپا کی یہاں تک کہ ان کے مکان میں پانی جانے تک پر پابندی عائد کر دی اور جب حضرت علیؓ و دیگر جلیل القدر صحابہؓ کو یہ معلوم ہوا کہ اب بلوائی حضرت عثمانؓ کے مکان کا دروازہ توڑ کر ان کو قتل کر دینا چاہتے ہیں تو ان سب سے اپنے صاحبزادوں اور دوسرے متعدد آدمیوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر معمور کیا، اور ان لوگوں نے بڑی جوان مردی سے بلوائیوں کا مقابلہ کر کے حضرت عثمانؓ کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا اور دروازے پر جم کر کھڑے ہو گئے، کچھ حضرات نے ان کے مکانوں کی چھتوں پر پہرہ دینا شروع کیا بلوائیوں نے یہ سوچ کر کہ باہر سے سرکاری فوجوں کی آمد سے پہلے بہت جلد حضرت عثمانؓ کا کام کسی نہ کسی طرح تمام کر دینا چاہئے یہ چال چلی کہ خفیہ طور پر ایک پڑوسی کے مکان میں گھس گئے اور دیوار پھاند کر حضرت عثمانؓ کے مکان میں داخل ہو گئے اس وقت حضرت عثمانؓ کے جو محافظین تھے ان میں سے کچھ تو کوٹھے پر چڑھے ہوئے باغیوں کی کوشش اور نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے تھے، اور کچھ دروازے پر جمے ہوئے بلوائیوں کو اندر گھسنے سے روک رہے تھے، مکان کے اندر صرف عثمانؓ تھے اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہ، بلوائیوں نے گھستے ہی حضرت عثمانؓ پر تلوار چلائی جو قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف تھے، ان کی بیوی نے فوراً آگے بڑھ کر تلوار کو ہاتھ سے روکا، ان کی انگلیاں کٹ کر الگ جا پڑیں، پھر دوسرا وار ہوا جس سے حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے ایک بلوائی نے آگے بڑھ کر ٹھوکریں ماریں جس سے آپ کی پسلیاں ٹوٹ گئیں، پھر تمام بلوائیوں نے زبردست ریلے کے ذریعے مکان کے اندر دھاوا بول دیا، گھر کا سارا سامان لوٹ لیا اور بڑی وابتری مچائی، یہ المناک حادثہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ جمعہ کے روز ہوا تین روز تک حضرت عثمانؓ کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی، پورے شہر پر بلوائیوں کا تسلط تھا، آخر بعض حضرات نے کوشش کر کے تین دن کے بعد رات کے وقت ان کی نعش مبارک کو بغیر غسل کے دیئے ہوئے کپڑوں میں دفن کر دیا، نماز جنازہ حضرت جبیر ابن مطعمؓ نے پڑھائی اور حضرت عثمانؓ کی اس ہولناک اور مظلومانہ شہادت کے ذریعے ان کا دور خلافت ختم ہو گیا اور بد بخت یہودیوں کی ایک تباہ کن سازش کو کامیاب ہونے کا موقع مل گیا۔

جنگ جمل

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ میں قاتلین عثمانؓ اور بلوائیوں ہی کا دور دورہ تھا اس لئے سب سے پہلے انہوں نے اہل مدینہ کو ڈرا دھمکا کر انتخاب خلیفہ کے کام پر آمادہ کیا، عبداللہ ابن سبا نے چونکہ اپنی پوری سازش اور تحریک میں حضرت علیؓ کا نام اچھالا تھا اور ان ہی کی خلافت قائم کرنے کے نام پر لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا تھا اس لئے قدرتی طور پر بلوائیوں کی کثرت حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کرنے کی حامی تھی۔ اگرچہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پہلے ہی خلافت کے باغیوں سے اپنے تعلق کا انکار کیا تھا اور ان کی مدد کی درخواست کو ٹھکرا دیا تھا لیکن جب بلوائیوں نے ان سے اصرار کیا ادھر انہوں نے اہل مدینہ کی بھی کثرت آراء اپنے بارے میں دیکھی تو وہ خلافت کا بار سنبھالنے کے لئے تیار ہو گئے، تاہم جب لوگ بیعت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے صفائی سے کہہ دیا کہ جب تک اصحاب بدرؓ مجھ کو خلیفہ نہ تسلیم کر لیں میں بیعت نہیں لوں گا، یہ سن کر ان لوگوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا اصحابؓ بدر کو جمع کر کے حضرت علیؓ کی خدمت میں لائے اور اس طرح ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ خلیفہ بننے کے بعد حضرت علیؓ کو سب سے پہلے جس مطالبے کا سامنا کرنا پڑا وہ حضرت عثمانؓ کے قصاص کا تھا، انہوں نے حضرت عثمانؓ کی زوجہ محترمہ سے قاتلوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے صرف دو اشخاص کا حلیہ بتایا لیکن ان کا نام نہ بتا سکیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ بلا تشخص

و تعین اور ثبوت فراہم ہوئے بغیر قاتلین عثمانؓ کو سزا کیسے دے سکتے تھے۔ اس لئے قصاص کے مطالبہ کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوگئی، جب لوگوں نے بالخصوص حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے صرف حضرت علیؓ سے اس مطالبہ پر اصرار کیا تو حضرت علیؓ نے کہا کہ میں قاتلین عثمانؓ سے قصاص ضرور لوں گا اور حضرت عثمانؓ کے معاملے میں پورا پورا انصاف کروں گا لیکن ابھی تک بلوائیوں کا زور ہے اور ادھر خلافت کا زور پوری طرح مستحکم نہیں ہوا ہے اس لئے فی الحال میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا، اطمینان اور استحکام حاصل ہونے کے بعد سب سے پہلے اسی معاملے کی طرف توجہ کروں گا۔ بس اسی جگہ سے حضرت علیؓ کے خلاف بدگمانی کی فضا پیدا ہونا شروع ہوگئی، مسلمانوں بالخصوص بنو امیہ کے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کا بدلہ نہیں لیا جائے گا اور قاتلان عثمانؓ مزے اڑاتے پھریں گے، ادھر سبائیوں نے اس خوف سے کہ کہیں حضرت علیؓ قتل عثمانؓ کے بدلے میں ہمیں سزا نہ دینے لگیں، اپنی سازش میں لگ گئے اور کوشش کرنے لگے کہ خلافت کو استحکام نصیب نہ ہو اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی اور عداوت میں مبتلا ہو جائیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ حج کے لئے مکہ تشریف لے گئی تھیں وہاں سے مدینہ واپس آرہی تھیں کہ راستے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سانحہ سن کر پھر مکہ لوٹ آئیں ان کو حضرت علیؓ کی خلافت کی خبر بھی ملی ساتھ ہی انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ قاتلان عثمانؓ کو سزا دینے میں تامل کر رہے ہیں، چنانچہ وہ مکہ آئیں اور لوگوں کو ان کی اس طرح واپسی کا حال معلوم ہوا تو وہ آ آکر ان کی سواری کے گرد جمع ہو گئے انہوں نے مجمع کے روبرو تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ میں خود خون عثمان کا بدلہ لوں گی۔ بنو امیہ کے تمام لوگوں اور مکہ کے عثمانی گورنر نے ان کی حمایت کا اعلان کیا، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ مدینہ سے مکہ آئے تو وہ دونوں بھی حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہو گئے، کچھ عرصہ تیاریوں میں لگا اور پھر حضرت عائشہؓ اپنے تمام حامیوں کو لے کر بصرہ روانہ ہوئیں تاکہ وہاں سے فوجی امداد لے کر آگے کی کارروائی شروع کریں راستے میں کچھ لوگ ان سے جدا بھی ہو گئے، خود حضرت عائشہؓ نے ایک مقام پر یہ ارادہ کر لیا کہ اپنے ارادہ سے باز آکر واپس ہو جائیں مگر مسلمانوں کو باہم محاذ آرا کرنے پر سازشیوں کے جو لوگ متعین تھے انہوں نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ کارواں کو پھر آگے بڑھنا پڑا، بصرہ کے قریب پہنچ کر ام المؤمنین خیمہ زن ہو گئیں، گو امیر بصرہ نے ان کی مدد کرنے سے انکار کیا مگر عام لوگوں نے ان کی حمایت کی اور ان کے لشکر میں شامل ہو گئے، حضرت عائشہؓ اپنا وہ لشکر لے کر مقام امربد تک آپہنچیں، اس کے بعد امیر بصرہ بھی اپنا لشکر لے کر وہاں آ گیا اور دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو گئے، دونوں کے درمیان جنگ ہوئی اور گورنر بصرہ کی فوج شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی اور اُمّ المؤمنینؓ وغیرہ کا بصرہ پر قبضہ ہو گیا۔ حضرت علیؓ کو جب یہ صورت حال معلوم ہوئی تو وہ ایک بڑا لشکر لے کر بصرہ روانہ ہوئے ادھر بعض دور اندیش اور صاحب بصیرت حضرات کی طرف سے اُمّ المؤمنینؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش ہونے لگی چونکہ اُمّ المؤمنینؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے قلوب صاف تھے، اور دونوں ہی اس باہمی محاذ آرائی پر سخت دل گرفتہ تھے، اس لئے جب مصالحین نے دونوں کے دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں دور کرا کے باہمی صلح وصفائی کا میدان ہموار کر لیا اور مصالحت یقینی ہو گئی تو عین موقع پر عبداللہ ابن سبا جو اپنے ساتھیوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ حضرت علیؓ کے لشکر میں موجود تھا اپنی پرانی یہودی سازش کے تحت متحرک ہو گیا اور جس دن صلح نامہ پر دستخط ہونے والے تھے اس کی صبح سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے سپاہیوں نے اچانک ام المؤمنینؓ کے لشکر پر حملہ کر دیا اور اس طرح دونوں طرف کی فوجیں اس بدگمانی میں پڑ کر کہ فریق مخالفت نے مصالحت کی کوشش ٹھکرا کر جنگ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، باہم برسرپیکار ہو گئیں، اُمّ المؤمنینؓ نے اس موقع پر بھی جنگ رکوانے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے اونٹ پر ہودج پر بیٹھ کر میدان جنگ میں آئیں لیکن چونکہ دونوں طرف کے جذبات بھڑک اٹھے تھے اس لئے میدان جنگ میں ان کی بہ نفس نفیس آمد دونوں طرف سے جنگ کے شعلے کو بھڑکانے کا مزید سبب بن گئی جم کر لڑائی ہوئی اور جنگ کا سارا زور حضرت اُمّ المؤمنینؓ کے اونٹ کے ارد گرد رہا، اسی مناسبت سے اس جنگ کو جنگ جمل یعنی اونٹ کی لڑائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے! سازشیوں کی سازش لوگوں کو بھڑکاتی رہی اور مسلمانوں کی تلوار اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹنے میں مصروف رہی،

حضرت عائشہؓ نے آخری طور پر جنگ بند کرانے کی ایک اور کوشش کی لیکن عبداللہ ابن سبا کے لوگوں کی وجہ سے وہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ اُمّ المؤمنینؓ کا اونٹ لڑائی اور کشت وخون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے حضرت عائشہؓ کے کجاوہ پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی، اہل بصرہ پوری جان نثاری کے ساتھ ان تیروں کو اپنے اوپر لے رہے تھے اور اونٹ کے چاروں طرف لاشوں کے انبار لگ گئے، آخرش حضرت علیؓ کے لشکر والوں نے ایک زور کا دھاوا بولا اور ایک شخص نے موقع پا کر اونٹ کے پاؤں میں تلوار ماری اور چلا کر سینہ کے بل بیٹھ گیا اونٹ کے گرتے ہی اہل بصرہ منتشر ہو گئے اور جنگ ختم ہو گئی۔ اس جنگ میں حضرت عائشہؓ کی طرف سے لڑنے والوں کی تعداد تیس ہزار تھی جن میں سے نو ہزار آدمی میدان جنگ میں کام آئے۔ اس کے بعد اگلے دن حضرت علیؓ بصرہ میں داخل ہوئے تمام اہل شہر نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور بعد میں حضرت علیؓ نے اُمّ المؤمنینؓ کو پورے ادب واحترام کے ساتھ بصرہ سے روانہ فرمایا اور طرفین کے درمیان ہر طرح صلح وصفائی ہو گئی۔ یہ واقعہ ۳۶ھ کے وسط میں پیش آیا اور یہ یہودیوں کی گھناؤنی سازش کا دوسرا حملہ تھا جس سے اہل اسلام کو زبردست دھکا لگا اور مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

جنگ صفین

حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عثمان غنیؓ کی طرف سے ملک شام کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ ان کا حضرت عثمانؓ سے خاندانی اور قرابتی تعلق بھی تھا۔ جب حضرت علیؓ نے دوسرے ملکوں اور شہروں میں خلافت عثمانی کے مقررہ گورنروں اور عاملوں کو سبکدوش کر کے اپنے معتمد لوگوں کو ان کی جگہوں پر بھیجا تو حضرت امیر معاویہؓ کی معزولی کا فرمان بھی صادر ہوا اور ان کا عہدہ سنبھالنے کے لئے سہل ابن حنیف کو روانہ فرمایا لیکن سہل ابن حنیف کو راستے ہی سے واپس ہونا پڑا اور وہ حضرت امیر معاویہؓ سے شام کی گورنری کا عہدہ سنبھالنے میں ناکام رہے۔ اس طرح یہ بات سامنے آگئی کہ حضرت امیر معاویہؓ نے گویا حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا ہے اور وہ بنو امیہ کے معتمد ہونے کی حیثیت سے خون عثمانؓ کے قصاص کے مسئلہ پر نہایت مضبوطی سے حضرت علیؓ کے مخالف ہیں، اس موقع پر پھر یہودیوں نے سبائیوں کی صورت میں سازش کا جال پھیلایا اور حضرت علیؓ وامیر معاویہؓ کے درمیان خلیج کو وسیع تر کرنے میں مصروف ہو گئے، یہاں تک کہ حضرت علیؓ حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف ملک شام پر لشکر کشی کا ارادہ کرنے لگے، لیکن درمیان میں جنگ جمل کا واقعہ پیش آگیا، اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد حضرت علیؓ کے سامنے سب سے بڑا کام ملک شام کو قابو میں لانا اور امیر معاویہؓ سے بیعت لینے ہی کا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کوفہ کو اپنا دار الخلافہ بنایا اور اس مسئلے کی طرف متوجہ ہو گئے اور شام کی طرف لشکر کشی کا کام شروع ہو گیا، ادھر حضرت امیر معاویہؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھی مقابلے کے لئے تیار ہوئے، کوفہ سے حضرت علیؓ کا لشکر روانہ ہوا اور دریائے فرات کو عبور کر کے اس پار خیمہ زن ہوا، ادھر دمشق سے حضرت امیر معاویہؓ کا لشکر نکلا اور حضرت علیؓ کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے چل پڑا پہلے دونوں لشکروں کے مقدمۃ الجیش کے درمیان مقابلہ ہوا، اس کے بعد دونوں طرف کی پوری فوجیں میدان جنگ میں پہنچ کر ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئیں، حضرت علیؓ اپنی فوج کو کمان کر رہے تھے اور حضرت امیر معاویہؓ اپنے لشکر کے سپہ سالار تھے، پھر بعض حضرات نے مصالحت کی کوشش شروع کی لیکن سازشیوں کا جال چونکہ دونوں طرف پھیلا ہوا تھا اس لئے یہ کوشش ناکام ہو گئی اس کے بعد بمجبوراً لڑائی شروع ہو گئی، تقریباً ایک مہینے تک تو جنگ کا رخ بالکل انفرادی رہا اور باقاعدہ جنگ سے گریز کیا جاتا رہا۔ اس کے بعد ایک مہینے تک کے لئے یہ انفرادی لڑائی بھی معطل کر دی گئی اور اس عرصے میں مصالحت کی کوششیں پھر شروع ہو گئیں لیکن مصالحت کی یہ دوسری کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکی اور آخر کار یکم صفر ۳۷ھ سے جنگ کا آغاز ہو گیا، اور ایک ہفتے سے زائد تک بڑی خوفناک جنگ ہوتی رہی حضرت علیؓ کی فوج کا پلڑا ابھاری تھا، اور جنگ کے آخری دن وہ مرحلہ بھی آگیا تھا کہ حضرت امیر معاویہؓ کو پوری طرح شکست ہو جاتی لیکن عین موقع پر امیر معاویہؓ کے مشیر خاص حضرت عمرو بن العاصؓ کی حکمت عملی نے فوری جنگ بندی کرادی! اس

کے بعد فریقین نے یہ طے کر لیا کہ حکم کے ذریعے قرآن مجید کی روشنی میں صلح صفائی کر لی جائے۔
امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت علیؓ کی طرف سے ابوموسی اشعریؓ کو ثالث بنانے پر اتفاق ہو گیا۔ گو آگے چل کر بعض اسباب و عوامل کی بنا پر جس کی تفصیل بہت طویل ہے، یہ ثالثی کامیاب نہیں ہوئی اور حضرت علیؓ و امیر معاویہ کے درمیان اس آویزش و اختلاف کا سلسلہ ختم نہیں ہوا لیکن یہ بھیانک جنگ، جو جنگ صفین کے نام سے مشہور ہوئی، مزید تباہی و بربادی اور خونریزی پھیلائے بغیر بند ہو گئی۔ اس جنگ نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا اور اسلام کی شوکت کو زبردست دھکا لگا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس باہمی محاذ آرائی کے دوران مجموعی طور پر ستر ہزار کے قریب مسلمان میدان جنگ میں کام آئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ایک واقعہ ایک پیشین گوئی

(۲۹) عَنْ اَبِیْ وَاقِدٍ اللَّیْثِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَرَجَ اِلٰی غَزْوَۃِ حُنَیْنٍ مَرَّ بِشَجَرَۃٍ لِلْمُشْرِکِیْنَ کَانُوْا یُعَلِّقُوْنَ عَلَیْہَا اَسْلِحَتَہُمْ یُقَالُ لَہَا ذَاتُ اَنْوَاطٍ فَقَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اجْعَلْ لَنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ کَمَا لَہُمْ ذَاتُ اَنْوَاطٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰہِ ہٰذَا کَمَا قَالَ قَوْمُ مُوْسٰی اجْعَلْ لَنَا اِلٰہًا کَمَا لَہُمْ اٰلِہَۃٌ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَرْکَبُنَّ سُنَنَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوواقد لیثیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ (فتح مکہ کے بعد) جب غزوۂ حنین کے لئے روانہ ہوئے تو (راستہ میں) آپ ﷺ کا گزر مشرکوں کے ایک درخت پر ہوا جس پر وہ (مشرک) اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے، اور پوجا کے طور پر اس درخت کے گرد طواف کرتے اور تعظیماً اس کی طرف منہ کر کے بیٹھا کرتے تھے) اس درخت کا نام ذات انواط تھا۔ (آنحضرت ﷺ کے ہمراہیوں میں ایسے مسلمانوں کی بھی تعداد شامل تھی جو نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اسلامی احکام و شرائع اور دینی تعلیمات سے زیادہ واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے شرک بیزاری اور توحید میں کامل مرتبہ نہیں رکھتے تھے، انہی مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے اس درخت کو دیکھ کر) حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا درخت مقرر کر دیجئے جس پر ہم اپنے ہتھیار لٹکایا کریں اور اس کو ذات انواط کہا کریں جیسا کہ مشرکوں نے اس درخت کو اپنے لئے ذات انواط بنا رکھا ہے اور اس پر ہتھیار لٹکاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے (ان لوگوں کی یہ عجیب و غریب خواہش سن کر از راہ حیرت و تعجب) فرمایا کہ "سبحان اللہ (یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟) یہ بات تم ایسی کہہ رہے ہو جیسا کہ موسیٰ کی قوم (یہودیوں) نے (اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے) کہا تھا کہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا معبود (یعنی بت) بنا دیجئے جیسا کہ کافروں کے معبود ہیں) تاکہ جس طرح وہ کافر اپنے بتوں کو پوجتے ہیں اسی طرح ہم اپنے اس بت کو پوجا کریں۔ پھر حضور ﷺ نے بطور تنبیہ یہ فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم ان لوگوں کے راستے پر چلنا شروع کرو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "انواط" دراصل نوط کی جمع ہے جو مصدر ہے اور جس کے معنی لٹکانے کے ہیں، چونکہ اس درخت پر ہتھیار لٹکائے جاتے تھے اس لئے اس کا نام "ذات انواط" ہو گیا اور یہ نام اسی خاص درخت کا تھا۔

"جو تم سے پہلے گزرے ہیں" سے مراد گزشتہ امتوں کے لوگ یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ ہیں! حدیث کے اس آخری جملے کے ذریعے حضور ﷺ نے گویا ان لوگوں کے تئیں ناراضگی و بے اطمینانی کا اظہار فرمایا کہ اگر تم لوگ ایسی ہی بات کہتے اور کرتے رہے تو عجب نہیں کہ گمراہی اور حد سے بڑھ جانے کے اس راستہ پر جا پڑو جس کو پچھلی امتوں کے لوگوں نے اختیار کیا تھا اور خدا کے مبغوض بندے قرار

پائے تھے۔

چند فتنوں کا ذکر

(۳۰) وَعَنِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الْأُولٰى يَعْنِىْ مَقْتَلَ عُثْمَانَ فَلَمْ يَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ بَدْرٍ اَحَدٌ ثُمَّ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الثَّانِيَةُ يَعْنِى الْحَرَّةَ فَلَمْ يَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ الْحُدَيْبِيَةِ اَحَدٌ ثُمَّ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الثَّالِثَةُ فَلَمْ تَرْتَفِعْ وَبِالنَّاسِ طَبَاخٌ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن مسیبؒ سے (جو جلیل القدر تابعین میں سے تھے اور جنہوں نے چاروں خلفائے راشدین کا زمانہ پایا تھا) روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "جب پہلا فتنہ (کہ جس سے پہلے اسلام میں کوئی فتنہ ظاہر نہیں ہوا) واقع ہوا یعنی حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا تو غزوہ بدر میں شریک ہونے والے صحابہؓ میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا، پھر جب دوسرا فتنہ واقع ہوا یعنی حرہ کا واقعہ پیش آیا تو ان صحابہؓ میں سے کوئی باقی نہیں رہا جو صلح حدیبیہ (یعنی بیعت الرضوان) میں شریک ہوئے تھے پھر جب تیسرا فتنہ واقع ہوا تو اس کا خاتمہ اس حالت میں نہیں ہوا تھا کہ لوگوں میں قوت اور فربہی باقی رہی ہو۔" (بخاریؒ)

تشریح: "یعنی" کا لفظ اس روای کا ہے جس نے اس روایت کو حضرت ابن مسیب سے نقل کیا ہے، گویا اس راوی نے اس لفظ کے ذریعے وضاحت کی کہ حضرت ابن مسیب نے جس فتنہ کو ذکر کیا اس سے ان کی مراد کس فتنہ سے تھی"۔ فلم یبق الخ کے الفاظ ابن مسیب کے ہیں، جن سے مراد یہ ہے کہ اصحاب بدر اس وقت سے خدا کو پیارے ہونے لگے تھے جب کہ پہلا فتنہ، یعنی ۳۵ھ میں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا المناک سانحہ پیش آیا تھا اور پھر جب ۶۳ھ میں دوسرا فتنہ یعنی حرہ کی جنگ کا واقعہ پیش آیا تو اس وقت تک کوئی بھی بدری صحابی باقی نہیں رہا تھا! پس مذکورہ الفاظ کی مراد یہ نہیں ہے کہ اصحاب بدر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے فتنہ میں مارے گئے تھے۔ اسی وضاحت کو بعد کے جملے میں بھی ان الفاظ پر منطبق کرنا چاہئے اور حاصل یہ کہ غزوہ بدر میں شرکت کی برکت کے سبب اللہ تعالیٰ نے بدری صحابہؓ کو محفوظ رکھا اور انہوں نے فتنے کا دوبارہ منہ نہیں دیکھا! اصحاب بدر میں سب سے آخر میں جن صحابی کا انتقال ہوا ہے وہ حضرت سعد ابن ابووقاص ہیں جو واقعہ حرہ سے چند سال پہلے انتقال کر گئے تھے۔

"حرہ" مدینہ کے ایک نواحی علاقے کو کہا جاتا تھا جہاں کی زمین سخت پتھریلی اور سیاہ رنگ کی تھی، یزید ابن معاویہ کی طرف سے جو لشکر مدینہ والوں پر چڑھ کر آیا تھا، اس کی جنگی کاروائیوں کی ابتداء اسی جگہ سے ہوئی تھی! اس واقعہ کی تفصیل پچھلے صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔

"طباخ" کے معنی ہیں مضبوطی، قوت، موٹاپا۔ اور کبھی یہ لفظ اپنے برعکس معنی کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو طباخ نہیں ہے یعنی اس کو عقل نہیں ہے، اس میں خیر و بھلائی نہیں ہے۔ حدیث کے اس آخری جملے سے مراد یہ ہے کہ جب وہ فتنہ ظاہر ہوا تو اس وقت لوگوں میں یعنی تابعین میں کوئی صحابی باقی نہیں رہا تھا۔ بعض حواشی میں لکھا ہے کہ ابن مسیب نے جس تیسرے فتنہ کی طرف اشارہ کیا، اس سے ابن حمزہ خارجی کا فتنہ خروج مراد ہے جو مروان ابن محمد ابن مروان ابن الحکم کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ اور کرمانیؒ نے یہ لکھا ہے کہ اس تیسرے فتنہ سے مراد عبداللہ ابن زبیر اور اہل مکہ کے خلاف حجاج ابن یوسف کی وہ جنگ ہے جو عبدالملک ابن مروان کے زمانے میں ۷۴ھ میں ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں کعبہ اقدس کی بھی تخریب ہوئی تھی! لیکن یہ مراد اس صورت میں صحیح قرار نہیں پا سکتی جب کہ حدیث کے آخری جملے کے مطابق یہ کہا جائے کہ اس فتنے کے وقت دنیا میں کوئی صحابی موجود نہیں تھا کیونکہ حجاج ابن یوسف کی جنگ کے وقت تو صحابہؓ کی اچھی خاصی تعداد بقید حیات تھی، لہٰذا پہلی مراد ہی صحیح ہے۔

باب الملاحم
جنگ اور قتال کا بیان

مَلَاحِم، مَلْحَمَۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں معرکہ اور گھمسان کی جنگ کا موقع۔ اور اصل کے اعتبار سے یہ لفظ یا تو "لحم" سے نکلا ہے جو گوشت کے معنی میں آتا ہے، "لحمة" سے مشتق ہے جو کپڑے (یعنی بانے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے! اگر مادہ اشتقاق "لحم" کو قرار دیا جائے تو قتل وقتال یا موقع قتال کو "ملحمة" سے تعبیر کرنا اس سبب سے ہوگا کہ قتل وقتال یا میدان جنگ میں مقتولین کے گوشت اور لوتھڑوں ہی کی کثرت نظر آتی ہے اور اگر یہ مانا جائے کہ "ملحمه" کا لفظ "لحمه" سے نکلا ہے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ کسی بھی جنگ و معرکہ آرائی یا میدان جنگ میں چونکہ لوگ آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہوتے ہیں جس طرح کپڑے کا بانا اپنے تانے کے ساتھ گتھا ہوا ہوتا ہے اس لئے قتل وقتال اور موقع قتال کو "ملحمه" سے تعبیر کیا جاتا ہے! لیکن پہلی بات (یعنی "ملحمه" کا لحم سے مشتق ہونا) زیادہ مناسب اور موزوں ہے، نیز "ملحمه" کا لفظ لڑائی اور بڑے حادثے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور صراح میں لکھا ہے کہ "ملحمه" کے معنی ہیں فتنہ اور بڑی جنگ۔

واضح رہے کہ اس باب میں ان مخصوص لڑائیوں اور جنگوں کا ذکر ہوگا جن کا تعلق متعین طور پر کچھ خاص گروہوں کی باہمی محاذ آرائی اور خاص جگہوں اور شہروں سے ہے۔ اس لئے ان لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا ذکر کرنے کے لئے یہ الگ باب قائم کیا گیا ہے اور باب الفتن میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ باب الفتن میں باہمی قتل وقتال اور محاذ آرائی کا جو ذکر ہوا ہے وہ عمومی نوعیت کا ہے اور اجمال وابہام کے ساتھ ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کچھ وہ چیزیں جن کا قیامت آنے سے پہلے وقوع پذیر ہونا ضروری ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَقْتَتِلَ فِئَتَانِ عَظِیْمَتَانِ تَكُوْنُ بَیْنَهُمَا مَقْتَلَةٌ عَظِیْمَةٌ دَعْوَاهُمَا وَاحِدَةٌ وَحَتّٰى یُبْعَثَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ قَرِیْبٌ مِنْ ثَلٰثِیْنَ كُلُّهُمْ یَزْعَمُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَحَتّٰى یُقْبَضَ الْعِلْمُ وَیَكْثُرَ الزَّلَازِلُ وَیَتَقَارَبَ الزَّمَانُ وَیَظْهَرَ الْفِتَنُ وَیَكْثُرَ الْهَرْجُ هُوَ الْقَتْلُ وَحَتّٰى یَكْثُرَ فِیْكُمُ الْمَالُ فَیَفِیْضَ حَتّٰى یُهِمَّ رَبُّ الْمَالِ مَنْ یَّقْبَلُ صَدَقَتَهٗ وَحَتّٰى یَعْرِضَهٗ فَیَقُوْلُ الَّذِیْ یَعْرِضُهٗ عَلَیْهِ لَا اَرَبَ لِیْ بِهٖ وَحَتّٰى یَتَطَاوَلَ النَّاسُ فِی الْبُنْیَانِ وَحَتّٰى یَمُرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ الرَّجُلِ فَیَقُوْلُ یَالَیْتَنِیْ مَكَانَهٗ وَحَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا فَاِذَا طَلَعَتْ وَرَاٰهَا النَّاسُ اٰمَنُوْا اَجْمَعُوْنَ فَذٰلِكَ حِیْنَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِیْ اِیْمَانِهَا وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ نَشَرَ الرَّجُلَانِ ثَوْبَهُمَا بَیْنَهُمَا فَلَا یَتَبَایَعَانِهٖ وَلَا یَطْوِیَانِهٖ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدِ انْصَرَفَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ لِقْحَتِهٖ فَلَا یَطْعَمُهٗ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَهُوَ یَلِیْطُ حَوْضَهٗ فَلَا یَسْقِیْ فِیْهِ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ رَفَعَ اُكْلَتَهٗ اِلٰى فِیْهِ فَلَا یَطْعَمُهَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ دو بڑے گروہ آپس میں نہ لڑلیں گے، ان دونوں گروہوں کے درمیان زبردست قتل وقتال ہوگا۔ اور دونوں کا ایک ہی دعویٰ ہوگا (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک بڑے زبردست مکار، فریبی اور فسادی لوگ پیدا نہ ہو جائیں گے جو خدا اور رسول ﷺ پر جھوٹ بولیں گے، ان کی تعداد تیس کے قریب ہوگی اور ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ ہوگا کہ وہ خدا کا رسول ہے (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں

ہوگی) جب تک علم نہ اٹھالیا جائے گا (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک زلزلوں کی کثرت نہ ہو جائے گی، زمانہ قریب نہ ہو جائے گا، فتنوں کا ظہور نہیں ہونے لگے گا اور ہرج یعنی قتل وقتال اور لوٹ مار کے واقعات میں اضافہ نہ ہو جائے گا (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک کہ تمہارے پاس مال ودولت کی اتنی کثرت نہیں ہو جائے گی کہ مالدار شخص خیرات لینے والے کی وجہ سے قلق اور پریشانی میں مبتلا ہو جائے، یہاں تک کہ وہ مالدار، جس شخص (کو صدقہ وخیرات لینے والا سمجھ کر اس) کے سامنے صدقہ وخیرات کا مال پیش کرے گا، وہ (غنائے قلبی کے سبب یا خود مالدار ہونے کی وجہ سے) یہ کہے گا کہ مجھے تمہارے اس صدقہ خیرات کے مال) کی ضرورت وحاجت نہیں ہے! (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک کہ لوگ وسیع اور لمبی چوڑی عمارتوں کے بنانے پر فخر نہ کرنے لگیں گے اور جب تک کہ آدمی کسی قبر کے پاس سے گزرتا ہوا یہ نہ کہنے لگے گا کہ کاش! میں اس کی جگہ ہوتا (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع نہ ہوگا۔ چنانچہ جب آفتاب مغرب کی طرف سے نکلے گا اور لوگ اس کو دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے (اور آخرت کا امر ظاہر ہو جائے گا) پس یہ وقت وہ ہوگا جب کسی بھی ایسے شخص کو اس وقت اس کا ایمان لانا نفع نہ دے گا جس نے اس دن سے پہلے ایمان قبول نہیں کیا ہوگا اور نہ کسی شخص کو اس وقت اپنے ایمان کی حالت میں نیک کام کرنا فائدہ پہنچائے گا اگر اس نے اس دن سے پہلے نیک کام نہیں کیا ہوگا۔ اور اس میں شک نہیں کہ قیامت اس طرح قائم ہوگی (یعنی پہلا صور کہ جو قیامت کی ابتدا ہوگی، اس طرح اچانک پھونکا جائے گا) کہ دو شخصوں نے (اپنا کپڑا خرید وفروخت کے لئے) کھول رکھا ہوگا اور وہ نہ اس کی خرید وفروخت کر چکے ہوں گے اور نہ اس کو لپیٹ کر رکھ سکے ہوں گے کہ اسی حالت میں قیامت آجائے گی۔ اور بلاشبہ قیامت اس طرح قائم ہوگی کہ ایک شخص اپنی اونٹنی کے دودھ کے ساتھ واپس آیا ہوگا (یعنی اونٹنی کا دودھ لے کر اپنے گھر آیا ہوگا) اور اس دودھ کو پینے نہ پایا ہوگا کہ قیامت آجائے گی اور بلاشبہ قیامت اس طرح قائم ہوگی کہ ایک شخص اپنے حوض کو لیپتا اور پوتتا ہوگا (یعنی اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لئے کوئی کنڈ وغیرہ بناتا یا اس کو درست کرتا ہوگا) اور وہ اپنے جانوروں کو اس حوض سے پانی نہ پلانے پایا ہوگا کہ قیامت آجائے گی اور بلاشبہ قیامت اس طرح قائم ہوگی کہ ایک شخص نے منہ میں رکھنے کے لئے لقمہ اٹھایا ہوگا اور وہ اس لقمہ کو کھانے نہ پایا ہوگا کہ قیامت آجائے گی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "اور دونوں کا ایک ہی دعویٰ ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں لڑنے والے وہ دونوں گروہ دین اسلام کا دعویٰ رکھنے والے ہوں گے اور ان دونوں گروہوں سے تعلق رکھنے والا ہر شخص مسلمان ہوگا یا یہ کہ وہ دونوں گروہ جو مسلمان ہوں گے حق پر دعویٰ کریں گے اور ان میں سے ہر ایک یہ گمان وعقیدہ رکھے گا کہ دین ودیانت اور اصول کے اعتبار سے بالکل صحیح راستہ وہی اختیار کئے ہوئے ہے، علماء نے لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں جن دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے تابعدار ساتھی مراد ہیں۔ جیسا کہ حضرت علیؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ اخوا ننابغو اعلینا (یعنی وہ لوگ ہمارے بھائی ہیں جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کردی ہے) اسی طرح ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ اس زمانہ میں (جب کہ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف سرو آزما تھے) اور حضرت علیؓ کے لشکر کا ایک شخص حضرت امیر معاویہؓ کے ایک آدمی کو قیدی بنا کر حضرت علیؓ کی خدمت میں لایا، ایک دوسرے شخص نے اس قیدی کو دیکھ کر اس کی حالت پر تاسف کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ مسلمان پختہ اسلام کا حامل تھا! حضرت علیؓ نے یہ سنا تو ناگواری کے ساتھ فرمایا کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ شخص تو اب بھی مسلمان ہے! پس یہ حدیث خوارج کے قول کو باطل ثابت کرتی ہے جو کہتے ہیں کہ دونوں جماعتیں (یعنی حضرت علیؓ کے تابعدار بھی اور حضرت امیر معاویہؓ کے تابعدار بھی) کافر ہیں۔ اسی طرح اس حدیث کے ذریعے روافض کے اس قول کا باطل ہونا ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کے مخالف کافر ہیں۔

"ان کی تعداد تیس کے قریب ہوگی" اس طرح کی ایک حدیث گزشتہ باب میں گزری ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی تعداد تیس ہوگی

اور یہاں ان کی تعداد تیس کے قریب فرمائی گئی ہے؟ تو ہو سکتا ہے کہ پہلی حدیث میں آپ ﷺ نے متعین طور پر ذکر تو تیس کی تعداد کا فرمایا لیکن مراد یہی ہو کہ ان کی تعداد تیس کے قریب ہوگی یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیچھے جو حدیث گزری ہے وہ یہاں نقل کی جانے والی حدیث کے بعد کے زمانے کی ہے، گویا اس بارے میں پہلے آپ ﷺ کے پاس جو وحی آئی تھی اور اس سے بطریق اجمال وابہام جو بات آپ ﷺ کو معلوم ہوئی وہ آپ ﷺ نے بیان فرما دی کہ ان کی تعداد تیس کے قریب ہوگی لیکن پھر بعد میں دوسری وحی کے ذریعے اس تعداد کو مقید و متعین فرما دیا گیا، چنانچہ اس وحی کے آنے کے بعد آپ ﷺ نے جو حدیث ارشاد فرمائی اس میں فرمایا کہ ان کی تعداد تیس ہوگی۔ اسی طرح تیس کی تعداد والی یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہے جس کو طبرانی نے حضرت ابن عمروؓ سے نقل کیا ہے کہ لا تقوم الساعة حتی یخرج سبعون کذابا کیونکہ حضرت ابن عمروؓ کی روایت کا مقصد محض ان جھوٹوں کی کثرت کو ظاہر کرنا ہے، ان کی کسی خاص تعداد کا بیان نہیں! یا یہ کہ ستر میں سے تیس تو وہ ہوں گے جو نبوت کا دعویٰ کریں گے، اور باقی جھوٹے وہ ہوں گے جو نبوت کا دعویٰ نہیں کریں گے، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ستر کی جو تعداد ذکر فرمائی گئی ہے وہ تیس کے علاوہ ہو اور اس طرح سب کی مجموعی تعداد سو مراد ہو۔

"جب تک علم نہ اٹھالیا جائے گا" میں "علم" سے مراد وہ خاص علم ہے جو شریعت میں "نفع دینے والا علم" کہلاتا ہے اور وہ قرآن و حدیث اور ان کے متعلقات کا علم ہے، اور جس کو دین کا علم بھی کہا جا سکتا ہے، نیز "علم کے اٹھ جانے سے" مراد اہل سنت والجماعت کے علماء کا اس دنیا سے رخصت ہو جانا ہے! چنانچہ جب علم کے حامل اور علم پہنچانے والے ہی اس دنیا سے اٹھ جائیں گے تو گویا علم ہی اس دنیا سے اٹھ جائے گا، پس آخری زمانہ کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس وقت مخلص و باعمل اور حقیقی عالم تو رخصت ہو جائیں گے اور دنیا میں جاہل و بے علم اور بدعتی لوگوں کی کثرت ہو جائے گی، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایک عالم کی موت عالم کی موت ہے۔

"جب تک کہ زلزلوں کی کثرت نہ ہو جائے گی" میں زلزلوں سے مراد یا تو حسی یعنی واقعی زلزلے ہیں کہ زمین کا ہلنا اور بھونچال کا آنا کثرت سے ہو جائے گا یا یہاں "زلزلے" کے لغوی معنی مراد ہیں کہ طرح طرح کی آفتیں و بلائیں نازل ہوں گی اور نت نئے حادثات انسان، جان و مال کو نقصان پہنچانے لگیں گے۔

"جب تک کہ زمانہ قریب نہ ہو جائے گا" سے حضرت امام مہدیؓ کے مبارک زمانہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے چونکہ اس وقت تمام روئے زمین امن و امان اور خوشی و مسرت کا گہوارہ بن جائے گا اور لوگوں کی زندگی نہایت اطمینان و سکون اور سرور و شادمانی کے ساتھ گزرے گی اس لئے وقت کی رفتار تیز تر معلوم ہوگی اور زمانہ بہت مختصر معلوم ہونے لگے گا جیسا کہ عیش و راحت کا زمانہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، بہت مختصر معلوم ہوتا ہے اور مصیبت و سختی کا زمانہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، بہت طویل معلوم ہوتا ہے۔

"ویکثر الهرج وهو القتل" میں وهو القتل کے الفاظ کسی راوی کے ہیں جس کے ذریعے انہوں نے لفظ هرج کی وضاحت کی ہے کہ اس لفظ سے مراد قتل و قتال کا واقع ہونا ہے جو فتنے کے سبب وجود میں آئے گا۔

حتی یهم رب المال کے بارے میں کئی اقوال ہیں، ایک تو یہ کہ لفظ "یهم" کو حرف ی کے پیش اور ہ کے زیر کے ساتھ پڑھا جائے اور رب کو "یهم" کا مفعول ہونے کی بنا پر منصوب قرار دیا جائے، اس صورت میں "یهم" کا فاعل لفظ فقدان کو قرار دیں گے، من یقتل الصدقت کا مضاف محذوف ہے! یہ قول زیادہ مشہور ہے اور اس کے مطابق پوری عبارت کے معنی یہ ہوں گے کہ اس وقت جب کہ قیامت کا زمانہ قریب ہوگا) لوگوں کے پاس مال و دولت اور روپیہ پیسہ کی اس طرح فراوانی اور کثرت ہو جائے گی کہ صدقہ و خیرات کا مال لینے والے، صدقہ و خیرات کرنے والے کو ڈھونڈھے نہیں ملیں گے! یہاں تک کہ اس شخص کا ڈھونڈھنا سخت پریشانی اور قلق میں مبتلا کرے گا جو صدقہ و خیرات کے مال کو قبول کر لے یعنی مالدار شخص) کسی مفلس و فقیر شخص کو ڈھونڈھتا پھرے گا، تاکہ زکوٰۃ و صدقہ کا مال اسے دے سکے مگر پورے معاشرہ میں ضرورت مند و محتاج لوگوں کی کمی کے باعث مشکل ہی سے کوئی فقیر و مفلس اس کو مل پائے گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "یهم" کو لفظ "هم" (بمعنی قصد و ارادہ) سے مشتق قرار دے کر حرف ی کو زبر کے ساتھ اور ہ کو پیش کے

ساتھ پڑھا جائے، نیز "رب" کو مرفوع قرار دیا جائے اس صورت میں رب المال، یھم کا فاعل ہوگا اور من یقبل کا مفعول۔ اس طرح عبارت کے معنی یہ ہوں گے کہ (اس وقت جب کہ قیامت کا زمانہ قریب ہوگا تمہارے پاس مال و دولت کی بہت زیادتی ہو جائے گی) یہاں تک کہ ایک مالدار آدمی کسی ایسے شخص کی تلاش کا قصد کرے گا اور اس کو بہت ڈھونڈھے گا جو اس کے صدقہ و خیرات کا مال لے لے۔
اور تیسرا قول یہ ہے کہ لفظ "یھم" فعل متعدی ہے جس کے معنی غمگین کرنے کے آتے ہیں اس صورت میں حرف ی کو زبر کے ساتھ اور ہ کو پیش کے ساتھ پڑھا جائے اور رب کو منصوب قرار دیا جائے، اس طرح اس عبارت کے معنی یہ ہوں گے کہ کسی ایسے فقیر و مفلس کا پایا جانا کہ جو صدقہ و خیرات کا مال قبول کرے، مالدار شخص کو غمگین کرے گا۔

"جب تک کہ عمارتوں کے بنانے پر فخر نہ کرنے لگیں گے" یعنی لوگ محض رہائشی ضروریات کی تکمیل کے لئے یا کسی نیک مقصد کی خاطر لمبی چوڑی عمارتیں نہیں بنائیں گے بلکہ وہ فلک بوس اور محل نما عمارتیں محض اپنی شان و شوکت اور اپنی امارت کو ظاہر کرنے اور فخر و مباہات کی خاطر بنائیں گے جیسا کہ اس زمانہ میں ہو رہا ہے کہ مالدار اور رئیس لوگ بڑے بڑے مکانات بنانا فخر کی بات سمجھتے ہیں اور بڑی بڑی بلڈنگیں کھڑی کر کے اپنی جھوٹی شان و شوکت ظاہر کرتے ہیں! یہاں تک کہ وہ اس مقصد کے لئے عبادت گاہوں اور رفاہی عمارتوں اور قبرستانوں تک کو مسمار اور زمین دوز کرنے سے گریز نہیں کرتے اور ان کی جگہ پر اپنی عشرت گاہیں، سیر و تفریح کے مرکز اور رباغ باغیچے بناتے ہیں۔

"اور جب تک آدمی کسی قبر کے پاس سے گزرتا ہوا...... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ یا تو دینی معاملات میں غم و فکر کی کثرت کی وجہ سے یا آفات اور بلاؤں کی زیادتی کی وجہ سے، قبروں کو دیکھ کر احساس دل اور آخرت میں یقین رکھنے والے لوگ یہ کہنا شروع کر دیں گے کہ کاش ہم اس دنیا میں نہ ہوتے اور ان قبروں میں پڑے ہوتے تاکہ ہمیں ان آفات اور بلاؤں کو دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

"جب تک کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع نہ ہوگا" اس بات (کہ سورج مغرب کی طرف سے نکلے گا) کی وضاحت انشاء اللہ آگے باب العلامات بین یدی الساعۃ میں ذکر ہوگی، اس موقع پر تو صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ جس دن آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا اس دن سے توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، اس کے بعد سے کسی کی بھی توبہ قبول نہیں ہوگی جیسا کہ خود حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

"اس وقت اس کا ایمان لانا نفع نہ دے گا...... الخ" بعض حضرات نے اس عبارت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ آفتاب جب مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا تو اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا پس اس وقت یا اس کے بعد کسی شخص کا ایمان لانا کہ جو اس دن سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا اور کسی شخص کا نیکی کرنا کہ جس نے اس دن سے پہلے نیکی نہیں کی تھی، کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا واضح رہے کہ یہاں "نیکی" سے مراد توبہ ہے، یعنی جس طرح اس دن اس شخص کا ایمان لانا فائدہ مند نہیں ہوگا اس طرح اس دن اس کا گناہوں سے توبہ کرنا بھی فائدہ مند نہیں ہوگا! اس سے معلوم ہوا کہ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا میں لفظ اَوْ تنویع کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے گویا یہ فرمایا کہ اس دن نہ تو شرک سے توبہ کرنا کارآمد ہوگا اور نہ گناہوں سے توبہ کرنا کچھ فائدہ پہنچائے گا۔

"کہ دو شخصوں نے اپنا کپڑا کھول رکھا ہوگا" میں ان دونوں کی طرف کپڑے کی اضافت اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے ایک شخص (یعنی فروخت کرنے والا) تو اس کپڑے کا مالک ہی ہوگا اور جو دوسرا شخص (یعنی خریدار) ہوگا وہ چونکہ اس کپڑے کا طالب اور لینے والا ہوگا لہٰذا اس اعتبار سے کپڑے کی اضافت اس کی طرف بھی کر دی گئی ہے۔

حدیث کے آخری اجزاء کا ماحصل گویا یہ واضح کرنا ہے کہ قیامت اچانک آئے گی، تمام لوگ اپنے کاروبار میں مشغول و منہمک ہوں گے کہ یکایک قیامت کا پنجہ سب کو آدبوچے گا، کسی کو اتنی مہلت بھی نہیں ملے گی کہ اس نے کھانے کا جو لقمہ ہاتھ میں رکھ لیا ہے اس کو منہ ہی میں رکھ لے۔ واضح رہے کہ قیامت کے اچانک آنے سے مراد پہلے صور کا اچانک پھونکا جانا ہے، جس کی آواز سے سب لوگ مر جائیں گے، لیکن اس سے پہلے قیامت کی تمام علامتیں دیکھیں گے۔

بعض قوموں سے جنگ کی پیش گوئی

② وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوْا قَوْمًا نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ وَحَتّٰى تُقَاتِلُوْا التُّرْكَ صِغَارَ الْاَعْيُنِ حُمْرَ الْوُجُوْهِ ذُلْفَ الْاُنُوْفِ كَاَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تم اس قوم سے جنگ نہ کرلو گے جن کی پاپوشیں بالدار چمڑے کی ہوں گی اور جب تک تم ترکوں سے جنگ نہ کرلوگے جن کی آنکھیں چھوٹی، چہرے سرخ اور ناکیں بیٹھی ہوئی ہوں گی، گویا ان کے منہ چمڑے کی تہ بہ تہ ڈھال کی طرح ہوں گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ترکوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا سلسلہ نسب یافث بن نوح سے چلا جاتا تھا ان لوگوں کے مورث اعلیٰ کا نام ترک تھا اس سے پوری قوم کو ترک کہا جانے لگا۔ یہ وہی قوم ہے جس کو منگولین یا تاتاری بھی کہا جاتا ہے۔

"مَجَانٌّ" (میم کے زبر اور نون کے تشدید کے ساتھ) اصل میں "مِجن" (میم کے زیر کے ساتھ) کی جمع ہے جس کے معنی سپر، ڈھال کے ہیں اس قوم کے لوگوں کے منہ کو ڈھال کے ساتھ تشبیہ اس اعتبار سے دی گئی ہے کہ ان کے چہرے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، نیز ان کے چہرے چونکہ گولائی کے ساتھ پھیلے ہوئے اور گوشت سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے گویا ان کے چہرے کی گولائی اور گوشت سے بھرے ہوئے ہونے کو مطرقہ یعنی اس ڈھال کے ساتھ تشبیہ دی جو تہ دار چمڑے کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوْا خُوْزًا وَكِرْمَانَ مِنَ الْاَعَاجِمِ حُمْرَ الْوُجُوْهِ فُطْسَ الْاُنُوْفِ صِغَارَ الْاَعْيُنِ وُجُوْهُهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ عَنْ عَمْرِو ابْنِ تَغْلِبَ عِرَاضِ الْوُجُوْهِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ تم خوز اور کرمان کے لوگوں سے جو کہ اہل عجم میں سے ہیں، جنگ نہ کرلو گے، ان لوگوں کے چہرے سرخ، ناک بیٹھی ہوئی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہوں گی اور چہرے اس طرح کے ہوں گے جیسے تہ بہ تہ چمڑے کی ڈھال ہوتی ہے اور ان کی پاپوشیں بالدار چمڑے کی ہوں گی۔" (بخاریؒ)

"اور بخاری کی ایک اور روایت میں جو عمرو ابن تغلب سے منقول ہے (ان کے چہرے سرخ ہوں گے کے بجائے) یہ الفاظ ہیں کہ ان کے چہرے چوڑے چکلے ہوں گے۔"

تشریح: "خُوز" اس قوم کا نام ہے جو خوزستان میں رہتی ہے اور "کرمان" ایک مشہور شہر کا نام ہے جو فارس (ایران) میں واقع ہے۔

یہودیوں سے فیصلہ کن جنگ کی پیشین گوئی

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُوْنَ الْيَهُوْدَ فَيَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُوْنَ حَتّٰى يَخْتَبِئَ الْيَهُوْدِيُّ مِنْ وَّرَاءِ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ فَيَقُوْلُ الْحَجَرُ وَالشَّجَرُ يَا مُسْلِمُ يَا عَبْدَاللّٰهِ هٰذَا يَهُوْدِيٌّ خَلْفِيْ فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ اِلَّا الْغَرْقَدَ فَاِنَّهُ مِنْ شَجَرِ الْيَهُوْدِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ مسلمان، یہودیوں سے نہ لڑلیں گے چنانچہ (اس لڑائی میں) مسلمان یہودیوں کو بڑی مار ماریں گے (یعنی ان پر غالب آجائیں گے) یہاں تک کہ یہودی پتھر اور درخت کے پیچھے چھپتا پھرے گا اور وہ پتھر و درخت یہ کہے گا کہ اے مسلمان، اے خدا کے بندے! ادھر آ میرے پیچھے یہودی چھپا بیٹھا ہے اس کو مار ڈال۔ مگر غرقد (ایسا نہ کہے گا) کیونکہ وہ یہودیوں کا درخت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح : "غرقد" ایک درخت کا نام ہے جو خاردار جھاڑی کی صورت میں ہوتا ہے، مدینہ کا قبرستان "جنت البقیع" کا اصل نام بقیع الغرقد اسی لئے ہے کہ جس جگہ یہ قبرستان ہے پہلے وہ غرقد کی جھاڑیوں کا خطہ تھا۔ حاصل یہ کہ جب مسلمان، یہودیوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کریں گے اور ان پر غلبہ پالیں گے تو اس وقت ایک ایک یہودی درختوں اور پتھروں کے پیچھے چھپا پھرے گا تاکہ مسلمانوں کی مار سے بچ جائے مگر جس درخت یا پتھر کے پیچھے کوئی یہودی چھپا ہوا ہوگا وہ پکار کر مسلمانوں سے کہے گا کہ ادھر آکر دیکھو، میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے اس کا کام تمام کردو، البتہ اس وقت غرقد ایسا درخت ہوگا جو دوسرے درختوں کے برخلاف اپنے پیچھے چھپے ہوئے یہودی کو ظاہر نہیں کرے گا بلکہ اس کو پناہ دے گا اور مسلمانوں کو اس کا پتہ نہیں بتائے گا۔

رہی یہ بات کہ دوسرے درختوں کے برخلاف غرقد کا رویہ ایسا کیوں ہوگا تو ہو سکتا ہے کہ غرقد کو یہودیوں کے ساتھ کوئی خاص نسبت و تعلق ہو گا جس کی حقیقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں یہودیوں کے عبرت ناک حشر کی جو پیش گوئی فرمائی ہے، آخر زمانے میں دجال کے ظاہر ہونے کے بعد پوری ہوگی، اس وقت یہودی دجال کے تابع اور فرمانبردار ہونے کی حیثیت سے اور اس کی مدد کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے لیکن مسلمان اپنے خدا کی مدد کے ساتھ یہودیوں کے فتنہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیں گے۔

ایک قحطانی شخص کے بارے میں پیشین گوئی

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَخْرُجَ رَجُلٌ مِّنْ قَحْطَانَ يَسُوْقُ النَّاسَ بِعَصَاهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ قحطان میں سے ایک شخص پیدا نہ ہولے گا جو لوگوں کو اپنی لاٹھی سے ہانکے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح : قحطان اس قوم کو کہا جاتا ہے جو اس زمانہ میں یمن سے عمان تک کے علاقے میں آباد تھی، یہ قوم دراصل ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے اس شاخ کی نسل ہے جس کے مورث قحطان تھے۔ چنانچہ اس نسل کے لوگوں کو قحطان کہا جاتا ہے، یمن کے لوگ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

"جو لوگوں کو اپنی لاٹھی سے ہانکے گا" سے مراد اس شخص کا مکمل تسلط و اقتدار ہے کہ لوگ اس کی اطاعت و پیروی کریں گے۔ اس کو متفقہ طور پر اپنا سردار مانیں گے اور وہ شخص جابرانہ تسلط و تسخیر کے ذریعے ان لوگوں کو اس طرح اپنے قابو میں رکھے گا کہ کوئی بھی آدمی اس کی اطاعت سے انحراف کرنے کی ہمت نہیں کرے گا! اور ایک احتمال یہ ہے کہ یہاں "ہانکنے" سے مراد حقیقی طور پر ہانکنا ہو، یعنی وہ جن لوگوں پر غلبہ پالے گا ان کو اپنے عصاء کے ذریعے اس طرح ہانکتا پھرے گا، جس طرح کوئی گلہ بان اپنے جانوروں کو ہانکا کرتا ہے، نیز بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں حدیث میں جس قحطانی شخص کا ذکر کیا گیا ہے وہ شاید وہی شخص ہو جس کو اگلی حدیث میں جہجاہ کہہ کر ذکر کیا گیا ہے۔

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَذْهَبُ الْاَيَّامُ وَاللَّيَالِيْ حَتّٰى يَمْلِكَ رَجُلٌ يُّقَالُ لَهُ الْجَهْجَاهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ حَتّٰى يَمْلِكَ رَجُلٌ مِّنَ الْمَوَالِيْ يُقَالُ لَهُ الْجَهْجَاهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دن و رات اس وقت تک تمام نہیں ہوں گے (یعنی اس وقت تک زمانہ کا اختتام نہیں ہوگا اور قیامت نہیں آئے گا) جب تک کہ وہ شخص مالک نہ ہو جائے گا یعنی لوگوں پر اقتدار و تسلط نہ پالے گا جس کو جہجاہ کہا جائے گا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب تک موالی میں سے ایک شخص مالک نہ ہو جائے گا یعنی لوگوں پر اقتدار و تسلط نہ پالے گا جس کو جہجاہ

کہا جائے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "موالی" مولیٰ کی جمع ہے جس کے معنی "غلام" کے ہیں۔ لفظ "جهجاه" بعض نسخوں میں تو دو ہ کے ساتھ منقول ہے اور بعض نسخوں میں آخری ہ کے بغیر یعنی "جهجا" منقول ہے۔

کسریٰ کے خزانہ کے بارے میں پیشین گوئی

⑦ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَتَفْتَحَنَّ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ كَنْزَ اٰلِ كِسْرٰى الَّذِيْ فِي الْاَبْيَضِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "بلاشبہ مسلمانوں کی ایک جماعت آل کسریٰ کے خزانہ کو برآمد کرلے گی جو سفید محل میں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آل کسریٰ میں "آل" کا لفظ زائد ہے یا اس لفظ سے کسریٰ کے لواحقین، خاندان اور رعایا کے لوگ مراد ہیں! لفظ کسریٰ اصل میں "خسرو" کا معرب ہے اس زمانے میں فارس (ایران) کے بادشاہ کا لقب خسرو یا کسریٰ ہوتا تھا، جیسا کہ روم کے بادشاہ کو قیصر، چین کے بادشاہ کو خاقان، مصر کے بادشاہ کو فرعون، یمن کے بادشاہ کو قیل اور حبش کے بادشاہ کو نجاشی کہا جاتا تھا۔

"ابیض" ایک محل کا نام ہے جو مدائن میں واقع تھا اور جس کو اہل فارس سفید کوشک کہا کرتے تھے، اس شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے بعد اس محل کی جگہ ایک مسجد بنادی گئی تھی جو اب بھی ہے! نیز حضور ﷺ نے کسریٰ کے خزانہ کے برآمد ہونے کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی تھی وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں پوری ہوئی، اور فاتح مسلمانوں نے اس خزانے کو نکالا۔

فتح روم وفارس کی پیش گوئی

⑧ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا يَكُوْنُ كِسْرٰى بَعْدَهٗ وَقَيْصَرُ لَيَهْلِكَنَّ ثُمَّ لَا يَكُوْنُ قَيْصَرُ بَعْدَهٗ وَلَتُقْسَمَنَّ كُنُوْزُهُمَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَسَمَّى الْحَرْبَ خُدْعَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کسریٰ ہلاک ہوگیا، اس کسریٰ کے بعد اور کوئی کسریٰ نہیں ہوگا اور یقیناً قیصر (یعنی روم کا بادشاہ) بھی ہلاک ہوگا جس کے بعد کوئی اور قیصر نہیں ہوگا، نیز ان دونوں بادشاہوں کے خزانے خدا کی راہ میں تقسیم کئے جائیں گے۔ اور آنحضرت ﷺ نے جنگ کا نام دھوکہ اور فریب رکھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کسریٰ ہلاک ہوگیا" یہ جملہ خبریہ ہے، جس سے یہ مفہوم مراد ہے کہ عنقریب کسریٰ کا ملک تباہ و پامال ہوجائے گا۔"

اس بات کو ادا کرنے کے لئے ماضی کا صیغہ اس اعتبار سے استعمال فرمایا گیا کہ اس بات کا وقوع پذیر ہونا ایک یقینی امر تھا یا ماضی کا صیغہ استعمال فرمانا دعا اور نیک فالی کے طور پر تھا۔

"کوئی اور کسریٰ نہیں ہوگا" یعنی آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو کسریٰ تھا اس کے بارے میں آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ بس یہ آخری کسریٰ ہے، اس کے بعد کسی اور کو کسریٰ بننا نصیب نہیں ہوگا۔ واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات اس وقت فرمائی تھی جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے دعوت اسلام پر مشتمل اپنا جو مکتوب گرامی کسریٰ کو ایک قاصد کے ذریعے بھیجا تھا اس کو اس کسریٰ نے ازراہ نخوت پھاڑ کر ریزہ ریزہ کردیا۔

"وسمی الحرب خدعة" (اور آنحضرت ﷺ نے جنگ کا نام دھوکہ اور فریب رکھا) یہ جملہ قال رسول اللّٰہ الخ پر عطف ہے یعنی راوی نے حضور ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کرنے کے بعد یہ کہا کہ وسمی الحرب خدعة حاصل یہ کہ جب حضور ﷺ نے یہ

بشارت بیان فرمائی کہ مسلمانوں کو قیصر و کسریٰ کے ملکوں پر فتح حاصل ہو جائے گی اور وہ ان کے اموال و جائیداد اور خزانوں پر قبضہ و تسلط پالیں گے تو سب کے ذہن میں یہی بات آئی ہوگی کہ یہ چیزیں جنگ کے بغیر حاصل نہیں ہوں گی، اور جنگ ایسی چیز ہے جو زیادہ تر دھوکہ اور فریب کی محتاج ہوتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو آگاہ فرمایا کہ جنگ کے موقع پر اس وہم میں نہ پڑ جانا کہ جنگی دھوکہ اور فریب، عہد شکنی اور خیانت اور بد دیانتی کی قسم سے ہے، بلکہ اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا کہ دشمنوں کے ساتھ بر سر جنگ ہونے کی صورت میں حکمت عملی کے طور پر ایسے فریب اور حیلوں کو اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے جو جنگ کے جیتنے اور طاقت و مدد حاصل کرنے میں بڑا دخل رکھتے ہیں۔ مثلاً دشمن پر رعب ڈالنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے ذہن پر اپنی طاقت کی زیادتی اور اسلحہ جات کی برتری کا سکہ جمادیا جائے، اس مقصد کے لئے فرضی کارروائیوں اور جھوٹے سچے بیانات کا سہارا لیا جاسکتا ہے، یا میدان جنگ میں دشمن کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لئے میدان سے ہٹ جانا اور پیچھے لوٹ آنا تاکہ دشمن یہ سمجھے کہ مقابل لڑنے کی تاب نہ رکھنے کی وجہ سے میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور جب دشمن اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر غافل ہو جائے تو کسی طرف سے اچانک اس پر ٹوٹ پڑنا یہ اور اس طرح کی دوسری کارروائیاں ایسے حیلے ہیں جن کو جنگی حکمت عملی کے طور پر اختیار کرنے کی اجازت ہے لیکن واضح رہے کہ عہد شکنی کی کسی بھی حالت میں اجازت نہیں ہے، جو عہد و اقرار ہو جائے اس پر عمل کرنا بہر صورت ضروری ہے، کسی معاہدہ کو توڑنا ہرگز درست نہیں۔

لفظ "خدعة" اگرچہ خ کے پیش کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور زبر کے ساتھ بھی، اس طرح دال کے جزم اور پیش کے ساتھ بھی نقل کیا جاتا ہے اور زبر کے ساتھ بھی، لیکن یہ لفظ خ کے زبر اور دال کے جزم کے ساتھ زیادہ فصیح ہے۔

⑨ وَعَنْ نَافِعِ ابْنِ عُتْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَغْزُوْنَ جَزِيْرَةَ الْعَرَبِ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ فَارِسَ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ تَغْزُوْنَ الرُّوْمَ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ تَغْزُوْنَ الدَّجَّالَ فَيَفْتَحُهُ اللّٰهُ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت نافع ابن عتبہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم لوگ (میرے بعد) جزیرۃ العرب سے جنگ کرو گے اور اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے ہاتھوں فتح کرائے گا، پھر تم فارس کی مملکت سے جنگ کرو گے اور اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے ہاتھوں فتح کرائے گا، پھر تم روم کی مملکت سے جنگ کرو گے اور اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے ہاتھوں فتح کرائے گا اور پھر (آخری زمانہ میں) تم دجال سے جنگ کرو گے اور اللہ اس پر تمہیں فتح عطا فرمائے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: عالم عرب کا وہ خطہ جس کو "جزیرۃ العرب" سے تعبیر کیا جاتا ہے، قدیم جغرافیہ دانوں کے مطابق نجد حجاز (جس کے دو مقدس شہر مکہ اور مدینہ ہیں) یمامہ، یمن اور عروض پر مشتمل ہے اس خطہ کے جنوب میں بحر عرب، مشرق میں خلیج عربی اور خلیج عمان اور مغرب میں بحر احمر ہے، اس کے شمال میں دریائے فرات اس طرح بہتا ہے اس خطہ کے اس تنہا شمالی خشکی کے سرے کو بہت حد تک کاٹ دیتا ہے اور اس وجہ سے یہ خطہ گویا مجازاً "جزیرۃ العرب" کہلاتا ہے ورنہ اصل کے اعتبار سے یہ خطہ "جزیرہ نمائے عرب" سے موسوم کیا جاتا ہے، ویسے اہل عرب جزیرہ نما کو بھی توسعاً جزیرہ کہہ دیا کرتے ہیں۔

"جزیرۃ العرب سے جنگ کرو گے" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت میری زندگی میں جزیرۃ العرب کے جو علاقے اسلام کی روشنی سے محروم رہ گئے ہیں، میرے بعد ان کی تاریکی بھی ختم ہو جائے گی، کچھ علاقے تو تبلیغ و اشاعت اسلام کے ذریعے کفر کے اندھیرے سے نکل آئیں گے اور باقی علاقے کے لوگوں سے تم جنگ کرو گے اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے ذریعے فتح پاؤ گے اس طرح ہر چار طرف اسلام کا جھنڈا سربلند ہو جائے گا اور پورے جزیرۃ العرب میں کوئی ایک کافر بھی باقی نہیں بچے گا۔

"دجال سے جنگ کرو گے...... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ دجال جب ظاہر ہوگا تو اپنی طلسماتی طاقت اور مکر و فریب کے ذریعے بڑی اودھم مچائے گا اور کچھ ملکوں اور علاقوں پر قابو پالے گا لیکن جب تم اس کے مقابلے پر نکل کھڑے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اس کو مقہور و مغلوب کر دے گا اور جو ملک و علاقہ اس کے قبضے میں چلا گیا ہوگا وہ دوبارہ تمہارے تسلط و قبضہ میں آجائے گا، نیز وہ دجال حضرت

عیسی علیہ السلام کے ہاتھوں ہلاک ہو جائے گا جو مسلمانوں کی مدد کے لئے آسمان سے اتریں گے۔ واضح رہے کہ اس ارشاد میں حضور ﷺ کا خطاب تو صحابہؓ سے تھا مگر اصل روئے سخن اُمت کی طرف تھا۔

وہ چھ چیزیں جن کا قیامت سے پہلے وقوع پذیر ہونا ضروری ہے

(۱۵) وَعَنْ عَوْفِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ وَهُوَ فِيْ قُبَّةٍ مِنْ اَدَمٍ فَقَالَ اُعْدُدْ سِتًّا بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ مَوْتِيْ ثُمَّ فَتْحُ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ ثُمَّ مُوْتَانٌ يَاْخُذُ فِيْكُمْ كَقُعَاصِ الْغَنَمِ ثُمَّ اسْتِفَاضَةُ الْمَالِ حَتّٰى يُعْطَى الرَّجُلَ مِائَةَ دِيْنَارٍ فَيَظَلُّ سَاخِطًا ثُمَّ فِتْنَةٌ لَا يَبْقٰى بَيْتٌ مِنَ الْعَرَبِ اِلَّا دَخَلَتْهُ ثُمَّ هُدْنَةٌ تَكُوْنُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ بَنِي الْاَصْفَرِ فَيَغْدِرُوْنَ فَيَاْتُوْنَكُمْ تَحْتَ ثَمَانِيْنَ غَايَةً تَحْتَ كُلِّ غَايَةٍ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عوف ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے دوران (ایک دن) میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ چمڑے کے خیمے میں تشریف رکھتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا (تم قیامت آنے سے پہلے چھ چیزوں کو شمار کرو (یعنی ان چھ چیزوں کو قیامت کی علامتوں سے جانو کہ قیامت آنے سے پہلے یہ چھ چیزیں ضرور واقع ہوں گی) ایک تو میری موت (کہ جب تک میں تمہارے درمیان موجود ہوں قیامت نہیں آئے گی) دوسرے بیت المقدس کا فتح ہونا (یعنی جب تک بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں فتح نہیں ہو جائے گا قیامت نہیں آئے گی)، تیسرے عام وباء جو تم میں بکریوں کی بیماری کی طرح پھیلے گی، چوتھے لوگوں کے پاس مال و دولت کا اس قدر زیادہ ہونا کہ اگر ایک آدمی کو سو دینار بھی دیئے جائیں گے تو ان کو حقیر و کمتر جانے گا اور اس پر ناراض ہوگا (یعنی مال و دولت کی اس قدر ریل پیل ہوگی کہ کسی کی نظر میں بڑی سے بڑی رقم کو بھی کوئی اہمیت نہیں ہوگی) چنانچہ حضور ﷺ کی یہ پیش گوئی حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں پوری ہوئی جب کہ مسلمانوں میں مال و دولت کی زبردست ریل پیل ہوگئی تھی، پانچویں فتنے اور آپس کی مخاصمت و مخالفت کا اس طرح پھوٹ پڑنا کہ عرب کا کوئی گھرانا نہیں بچے گا جس میں اس فتنے کے برے اثرات نہ پہنچیں، (علماء نے لکھا ہے کہ اس پیش گوئی کا مصداق حضرت عثمانؓ کا سانحہ شہادت ہے یا فتنہ سے مراد ہر وہ فتنہ اور برائی ہے جس کا ظہور حضور ﷺ کے بعد ہوا) اور چھٹے صلح جو تمہارے اور رومیوں کے درمیان ہوگی، پھر رومی عہد شکنی کریں گے اور تمہارے مقابلے کے اسی نشانوں کے تحت آئیں گے جن میں سے ہر نشان کے ماتحت بارہ ہزار آدمی ہوں گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "بیت المقدس" میں مقدس کا لفظ میم کے زبر، قاف کے جزم اور دال کے زیر کے ساتھ، مَجْلِس کے وزن پر مَقْدِس ہے لیکن مشکوٰۃ کے ایک نسخے میں یہ لفظ میم کے پیش، قاف کے زبر اور دال کی تشدید کے ساتھ مُعَظَّم کے وزن پر مُقَدَّس منقول ہے۔

"قُعَاص" مویشیوں کی ایک بیماری کو کہتے ہیں جو عام طور سے مویشی کے سینے میں ہوتی ہے اور اس کو فوراً ہلاک کر دیتی ہے۔ حضور ﷺ نے یہاں جس عام وباء کی پیش گوئی فرمائی اور اس کو بکریوں کی بیماری یعنی قعاص سے تشبیہ دی، اس سے مراد طاعون کی وہ وبا ہے جو حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوئی اور اس کی وجہ سے صرف تین دن کے اندر ستر ہزار آدمی ہلاک ہوئے، اس وقت مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی عمواس میں تھی جو بیت المقدس کے قریب واقع ایک جگہ ہے، اسی مناسبت سے اس وباء کو طاعون عمواس کہا جاتا ہے، یہ پہلا طاعون تھا جو اسلام کے زمانہ میں پھوٹا اور اس کے سبب اتنا سخت جانی نقصان ہوا۔

"بنی الاصفر" رومیوں کو کہا جاتا تھا کیونکہ یہ لوگ جس نسل سے تعلق رکھتے تھے اس کے مورث اعلیٰ روم بن عیص بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کا رنگ زرد و مائل بسفیدی تھا، اور یہی جسمانی رنگت عام طور سے پوری قوم میں پائی جاتی تھی۔

"غایۃ" اس نشان یا جھنڈے کو کہتے ہیں جو فوجی سرداروں کے ساتھ ان کے دستوں اور لشکروں کی علامت کے طور پر ہوتا ہے اور بعض روایتوں میں یہ لفظ ی کے بجائے ب کے ساتھ یعنی "غابۃ" منقول ہے جس کے معنی جنگل اور درختوں کے جھنڈ کے ہیں اس

صورت میں کہا جائے گا کہ نشان اور جھنڈوں کی کثرت کی وجہ سے اس لشکر کو درختوں کے جھنڈ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور لشکر والوں کی تعداد ذکر کرنے کا مقصد لاؤ لشکر کی زیادتی بیان کرنا ہے۔

رومیوں سے جنگ اور دجال کے قتل کی پیش گوئی

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَنْزِلَ الرُّوْمُ بِالْاَعْمَاقِ اَوْ بِدَابِقٍ فَيَخْرُجُ اِلَيْهِمْ جَيْشٌ مِّنَ الْمَدِيْنَةِ مِنْ خِيَارِ اَهْلِ الْاَرْضِ يَوْمَئِذٍ فَاِذَا تَصَافُّوْا قَالَتِ الرُّوْمُ خَلُّوْا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الَّذِيْنَ سَبَوْا مِنَّا نُقَاتِلْهُمْ فَيَقُوْلُ الْمُسْلِمُوْنَ لَا وَاللّٰهِ لَانُخَلِّيْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ اِخْوَانِنَا فَيُقَاتِلُوْنَهُمْ فَيَنْهَزِمُ ثُلُثٌ لَايَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ اَبَدًا وَيُقْتَلُ ثُلُثُهُمْ اَفْضَلُ الشُّهَدَآءِ عِنْدَ اللّٰهِ وَيَفْتَتِحُ الثُّلُثُ لَايُفْتَنُوْنَ اَبَدًا فَيَفْتَتِحُوْنَ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ فَبَيْنَمَا هُمْ يَقْتَسِمُوْنَ الْغَنَائِمَ قَدْ عَلَّقُوْا سُيُوْفَهُمْ بِالزَّيْتُوْنِ اِذْ صَاحَ فِيْهِمُ الشَّيْطَانُ اِنَّ الْمَسِيْحَ قَدْ خَلَفَكُمْ فِیْ اَهْلِيْكُمْ فَيَخْرُجُوْنَ وَذٰلِكَ بَاطِلٌ فَاِذَا جَاؤُا الشَّامَ خَرَجَ فَبَيْنَا هُمْ يُعِدُّوْنَ لِلْقِتَالِ يُسَوُّوْنَ الصُّفُوْفَ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَيَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ فَاَمَّهُمْ فَاِذَا رَاٰهُ عَدُوُّ اللّٰهِ ذَابَ كَمَا يَذُوْبُ الْمِلْحُ فِی الْمَاءِ فَلَوْ تَرَكَهٗ لَانْذَابَ حَتّٰى يَهْلِكَ وَلٰكِنْ يَقْتُلُهُ اللّٰهُ بِيَدِهٖ فَيُرِيْهِمْ دَمَهٗ فِیْ حَرْبَتِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ رومی اعماق یا دابق میں آنہ دھمکیں گے اور پھر مدینہ والوں کا ایک لشکر ان کے مقابلے کے لئے نکلے گا جس میں اس دن یعنی اس وقت کے روئے زمین کے سب سے بہتر لوگ شامل ہوں گے، جب (لڑائی کے لئے) صف بندی ہوگی تو رومی یہ کہیں گے کہ ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان کہ جو ہمارے لوگوں کو قید کر کے لائے ہیں، جگہ خالی کر دو تاکہ ہم ان سے لڑیں (یعنی جن مسلمانوں نے اس سے پہلے ہمارے خلاف جہاد کیا اور ہمارے کچھ لوگوں کو قیدی بنا کر لے آئے ان مسلمانوں کو ہمارے مقابلہ پر لاؤ کیونکہ ہم تم سب مسلمانوں سے لڑنا نہیں چاہتے بلکہ بدلہ اتارنے کے لئے صرف ان ہی مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہیں۔ گویا رومی یہ بات اس لئے کہیں گے تاکہ مسلمان ان کی باتوں میں آکر اپنی اجتماعیت کھودیں اور باہمی تفریق کا شکار ہو جائیں) لیکن مسلمان ان کو جواب دیں گے کہ بخدا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، ہم تمہارے اور اپنے ان مسلمان بھائیوں کے درمیان جگہ خالی نہیں کر سکتے (یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ان مسلمان بھائیوں کو تو تمہارے مقابلہ پر لڑنے کے لئے آگے کر دیں اور خود ایک طرف ہو جائیں، اگر لڑیں گے تو ہم سب لڑیں گے اور ایک ساتھ لڑیں گے) چنانچہ سارے مسلمان رومیوں سے لڑنا شروع کر دیں گے اور (جب گھمسان کا رن پڑے گا) تو ان مسلمانوں میں سے ایک تہائی مسلمان پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوں گے، جن کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا، اور ایک تہائی مسلمان جام شہادت نوش کریں گے، جو یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین شہید قرار پائیں گے، اور باقی ایک تہائی مسلمان فتح یاب ہوں گے (یعنی اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مدد و نصرت کے ذریعے رومیوں کے مقابلے پر کامیابی عطا فرمائے گا اور ان کے ہاتھوں رومیوں کے شہروں کو فتح کرائے گا) ان مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کبھی فتنہ میں نہیں ڈالے گا۔

پھر مسلمان قسطنطنیہ کو فتح کر لیں گے (یعنی اس شہر کو کافروں کے قبضہ سے لے لیں گے) اور اس کے بعد اس وقت جب کہ وہ (مسلمان) مال غنیمت تقسیم کرنے میں مصروف ہوں گے اور اپنی تلواروں کو زیتون کے درختوں پر لٹکائے ہوئے ہوں گے اچانک شیطان ان کے درمیان یہ بات پھونک دے گا کہ (مسلمانو تم یہاں مصروف ہو جب کہ) تمہاری عدم موجودگی میں مسیح دجال تمہارے گھروں میں پہنچ گیا ہے۔ (اسلامی لشکر کے لوگ یہ سنتے ہی قسطنطنیہ سے) نکل کھڑے ہوں گے لیکن شیطان کی یہ خبر سراسر جھوٹی ثابت ہوگی، البتہ جب مسلمان شام پہنچیں گے تو پھر دجال ظاہر ہوگا) مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کریں گے اور صف بندی میں مشغول ہوں گے کہ نماز کا وقت آجائے گا (اور موذن تکبیر کہنے کے لئے کھڑا ہو چکا ہوگا) اتنے میں حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام (آسمان سے دمشق کی جامع مسجد کے منارے پر)

اتریں گے (پھر قدس آئیں گے) اور مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ پھر خدا کا وہ دشمن یعنی دجال (جو اس وقت مسلمانوں کو گھیرے ہوئے ہوگا) جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھے گا تو اس طرح گھلنا شروع ہو جائے گا جس طرح نمک پانی میں گھلنے لگتا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کو اس حالت میں چھوڑ دیں اور قتل نہ کریں تو وہ سارا گھل جائے اور (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کئے بغیر) خود مر جائے، لیکن اللہ تعالیٰ (کی مشیت و مرضی چونکہ یہ ہوگی کہ اس کی موت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں واقع ہو اس لئے) اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل کرائے گا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام (مسلمانوں کو یا کافروں کو اور یا سب کو) دجال کا خون اپنے نیزے کے ذریعے دکھائیں گے (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس نیزے سے دجال کو قتل کریں گے اور جو اس کے خون سے آلودہ ہوگا اس کو لوگوں کو دکھائیں گے کہ دیکھو میں نے اس دشمن خدا کا کام تمام کر دیا ہے)۔" (مسلم)

تشریح: "اَعْمَاق" اطراف مدینہ میں ایک جگہ کا نام تھا اسی طرح "وابق" مدینہ کے ایک بازار کا نام تھا! لیکن ایک قول جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس حدیث میں "مدینہ" سے مراد شہر حلب ہے جو ملک شام میں واقع ہے اور اعماق و وابق حلب و انطاکیہ کے درمیان دو مقامات کے نام ہیں۔ چنانچہ کتاب ازہار میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ "مدینہ" سے مدینۃ النبی (یعنی مدینہ منورہ) مراد لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جس زمانہ کے واقعہ کے بارے میں پیش گوئی فرمائی گئی ہے اس وقت مدینہ منورہ کسی طرح بھی تخریب کاری یا کسی اسلام دشمن حملہ سے بالکل محفوظ و مامون ہوگا بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ "مدینہ" سے مراد شہر دمشق ہے۔

"جن کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا" سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ان لوگوں کی موت کفر کی حالت میں ہوگی اور وہ کبھی بھی عذاب سے نجات نہیں پائیں گے۔

"ان مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کبھی فتنہ میں نہیں ڈالے گا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمان اپنے جس ایمانی استقلال و عزیمت اور اسلامی شجاعت و بہادری کا ثبوت دیں گے اس کا انعام ان کو یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو کبھی بھی کسی آفت و بلا میں نہیں ڈالے گا اور نہ جان و خون کی کسی آزمائش سے دوچار کرے گا! یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو کبھی بھی عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا! پس یہ اس بات کی بشارت ہے کہ ان لوگوں کا خاتمہ بخیر ہوگا۔

"قسطنطنیہ" کے بارے میں زیادہ مشہور اور صحیح قول یہ ہے کہ اصل میں یہ لفظ "قُسْطُنْطِيْنَة" ہے لیکن بعض حضرات نے "قُسْطُنْطِيْنِيَّة" کو زیادہ صحیح کہا ہے، چنانچہ مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح ہے اور بعض نسخوں میں یہ لفظ اس طرح منقول ہے کہ آخری حرف ی پر تشدید نہیں ہے، بہرحال اردو میں یہ لفظ "قسطنطنیہ" لکھا پڑھا جاتا ہے۔

قسطنطنیہ، تاریخ کا ایک مشہور شہر ہے جو اپنے زمانہ میں رومیوں کا دارالسلطنت تھا اور ان کے سب سے بڑے شہروں میں ایک بڑا شہر مانا جاتا تھا، یہ شہر قسطنطین بادشاہ کی طرف منسوب ہے جس نے اس کو ۳۳۰ء میں بسایا اور رومی سلطنت کا پایہ تخت قرار دیا تھا، اب اس شہر کو جو آبنائے فاسفورس کے کنارے واقع ہے استنبول کہا جاتا ہے اور ترکی کی مملکت میں شامل ہے! ترمذیؒ نے وضاحت کی ہے کہ یہ شہر صحابہؓ کے زمانہ میں فتح ہو گیا تھا اور تاریخی روایات کے مطابق، دوسری مرتبہ یہ شہر ۱۴۵۳ء میں عثمانی ترکوں کے ذریعے فتح ہوا اور اب تک اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہے! لیکن اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا، اور پھر آخری زمانہ میں جب کہ قیامت قریب ہوگی، مسلمان اس کو فتح کر لیں گے اور اسی زمانہ میں کانے دجال کا ظہور ہوگا۔

فَاِذَا جَاءَ الشَّامَ (جب مسلمان شام پہنچیں گے) میں "شام" سے مراد "قدس" ہے جس کو "بیت المقدس" کہا جاتا ہے چنانچہ بعض روایتوں میں اس کی تصریح بھی ہے اور اس وقت "بیت المقدس" ملک شام ہی کی حدود میں تھا، اب یہ فلسطین میں ہے جو ایک مستقل ملک ہے۔

"اور مسلمانوں کی امامت کریں گے" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت نماز تیار ہوگی، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام مسلمانوں کو نماز

پڑھائیں گے اور ان مسلمانوں میں حضرت امام مہدیؓ بھی ہوں گے! لیکن ایک روایت میں یہ ہے کہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام امامت کرنے کے لئے حضرت امام مہدیؓ کو آگے بڑھائیں گے اور ان سے فرمائیں گے کہ اس نماز کی اقامت چونکہ تمہاری امامت کے لئے کہی گئی ہے اس لئے تم ہی نماز پڑھاؤ اس بات سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقصود اس طرف اشارہ کرنا بھی ہوگا کہ اب مسلمانوں کے امیر و امام چونکہ تم ہو اس لئے مجھے بھی تمہاری اتباع کرنا چاہئے، نہ کہ تم میری اتباع کرو گے، میں مستقل طور پر امام و امیر بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ میرا آنا صرف تمہاری مدد و معاونت اور تمہاری تائید و توثیق کے لئے ہے۔ چنانچہ حضرت مہدیؓ اس نماز کی امامت فرمائیں گے لیکن اس کے بعد نماز کی امامت برابر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کریں گے۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے فَاَمَّهُمْ (اور مسلمانوں کی امامت کریں گے) تو یہ تغلیباً ارشاد فرمائے گئے ہیں، یعنی بعد میں چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی مسلمانوں کو نماز پڑھایا کریں گے، پس اس اعتبار سے اس وقت کی نماز کے بارے میں بھی فرمایا کہ وہ مسلمانوں کی امامت کریں گے یا یہ کہ "امامت کریں گے" کے مجازی معنی مراد ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت مسلمانوں کے امام (حضرت مہدیؓ) کو امامت کے لئے کہیں گے۔

(۱۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ السَّاعَةَ لَا تَقُوْمُ حَتّٰى لَا يُقْسَمَ مِيْرَاثٌ وَلَا يُفْرَحَ بِغَنِيْمَةٍ ثُمَّ قَالَ عَدُوٌّ يَجْمَعُوْنَ لِاَهْلِ الشَّامِ وَيَجْمَعُ لَهُمْ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ يَعْنِي الرُّوْمَ فَيَتَشَرَّطُ الْمُسْلِمُوْنَ شُرْطَةً لِلْمَوْتِ لَا تَرْجِعُ اِلَّا غَالِبَةً فَيَقْتَتِلُوْنَ حَتّٰى يَحْجُزَ بَيْنَهُمُ اللَّيْلُ فَيَفِيْءُ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ كُلٌّ غَيْرُ غَالِبٍ وَتَفْنَى الشُّرْطَةُ ثُمَّ يَتَشَرَّطُ الْمُسْلِمُوْنَ شُرْطَةً لِلْمَوْتِ لَا تَرْجِعُ اِلَّا غَالِبَةً فَيَقْتَتِلُوْنَ حَتّٰى يَحْجُزَ بَيْنَهُمُ اللَّيْلُ فَيَفِيْءُ هٰؤُلَاءِ كُلٌّ غَيْرُ غَالِبٍ وَتَفْنَى الشُّرْطَةُ ثُمَّ يَتَشَرَّطُ الْمُسْلِمُوْنَ شُرْطَةً لِلْمَوْتِ لَا تَرْجِعُ اِلَّا غَالِبَةً فَيَقْتَتِلُوْنَ حَتّٰى يُمْسُوْا فَيَفِيْءُ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ كُلٌّ غَيْرُ غَالِبٍ وَتَفْنَى الشُّرْطَةُ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الرَّابِعِ نَهَدَ اِلَيْهِمْ بَقِيَّةُ اَهْلِ الْاِسْلَامِ فَيَجْعَلُ اللّٰهُ الدَّبْرَةَ عَلَيْهِمْ فَيَقْتَتِلُوْنَ مَقْتَلَةً لَمْ يُرَ مِثْلُهَا حَتّٰى اِنَّ الطَّائِرَ لَيَمُرُّ بِجَنَبَاتِهِمْ فَلَا يُخَلِّفُهُمْ حَتّٰى يَخِرَّ مَيْتًا فَيَتَعَادُّ بَنُو الْاَبِ كَانُوْا مِائَةً فَلَا يَجِدُوْنَهُ بَقِيَ مِنْهُمْ اِلَّا الرَّجُلُ الْوَاحِدُ فَبِاَيِّ غَنِيْمَةٍ يُفْرَحُ اَوْ اَيُّ مِيْرَاثٍ يُقْسَمُ فَبَيْنَاهُمْ كَذٰلِكَ اِذْ سَمِعُوْا بِبَاْسٍ هُوَ اَكْبَرُ مِنْ ذٰلِكَ فَجَاءَهُمُ الصَّرِيْخُ اِنَّ الدَّجَّالَ قَدْ خَلَفَهُمْ فِيْ ذَرَارِيْهِمْ فَيَرْفُضُوْنَ مَا فِيْ اَيْدِيْهِمْ وَيُقْبِلُوْنَ فَيَبْعَثُوْنَ عَشَرَ فَوَارِسَ طَلِيْعَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ لَاَعْرِفُ اَسْمَاءَ هُمْ وَاَسْمَاءَ اٰبَائِهِمْ وَاَلْوَانَ خُيُوْلِهِمْ هُمْ خَيْرُ فَوَارِسَ اَوْ مِنْ خَيْرِ فَوَارِسَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ يَوْمَئِذٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ "یقیناً قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ میراث کا تقسیم ہونا موقوف نہ ہو جائے گا" یعنی یا تو کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کے کثرت سے مارے جانے کی وجہ سے میراث کی تقسیم بند ہو جائے گی کیونکہ اس وقت جو تھوڑے بہت مسلمان بچیں گے ان کو اتنا ہوش کہاں ہوگا کہ وہ اپنے مرنے والے مورثوں کے ترکہ کی تقسیم کی طرف دھیان دیں یا شرعی احکام پر عمل آوری میں کوتاہی کے سبب لوگ میراث تقسیم کرنا بند کر دیں گے اور یا یہ کہ مرنے والے لوگ اپنے ذمہ اتنے قرض اور مطالبات چھوڑ جائیں گے کہ ان کی ادائیگی کرنے کے بعد ترکہ میں سے اتنا بچے گا ہی نہیں کہ اس کی تقسیم کی نوبت آئے) اور (جب تک کہ مال غنیمت سے خوش ہونا نہ چھوڑیں گے (یعنی قیامت قائم ہونے سے پہلے ایک بات تو یہ ہوگی کہ میراث کی تقسیم نہ ہو پائے گی اور دوسری بات یہ ہوگی کہ مسلمان غنیمت کے مال سے خوش نہیں ہوا کریں گے، اور یہ خوش ہونا یا تو اس اعتبار سے ہوگا کہ مال غنیمت ملنا ہی بند ہو جائے گا اور جب مال ملے گا نہیں تو کوئی خوش کہاں سے ہوگا اور یا خوش نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ جو لوگ مال غنیمت کی حفاظت و تقسیم کے ذمہ دار ہوں گے وہ خیانت و بد دیانتی کا ارتکاب کرنے لگیں گے جس کی وجہ سے مال غنیمت ایماندار اور بادیانت لوگوں کے لئے کسی خوشی کا باعث نہیں ہوگا) پھر حضرت ابن مسعودؓ نے (ان دونوں) باتوں کی حقیقت کو واضح کرنے اور صورت واقعہ کو ظاہر کرنے کے لئے) بیان کیا کہ "دشمن یعنی کافر اہل شام سے لڑنے کے لئے فوج اور طاقت جمع کریں گے، ادھر مسلمان بھی ان کافروں سے مقابلہ کے لئے لشکر

اور طاقت جمع کریں گے۔ دشمن سے مراد رومی ہیں، چنانچہ مسلمان اپنے لشکر میں کچھ فوج منتخب کر کے آگے بھیجیں گے تاکہ وہ جنگ کرے اور مرجائے اور اگر واپس آئے تو فتح یاب اور غالب ہو کر آئے۔ پس دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں گے (اور جنگ شروع ہو جائے گی) یہاں تک کہ دونوں لشکروں کے درمیان رات حائل ہو جائے گی (اور جنگ کو روک دے گی) نیز دونوں فریق اپنے اپنے ٹھکانوں میں واپس آجائیں گے اور ان میں سے نہ کوئی غالب و فتح یاب ہو گا (اور نہ کوئی مغلوب و مفتوح) البتہ دونوں طرف کی فوج کے وہ چیدہ اور منتخب دستے جو لڑنے کے لئے آگے گئے ہوں گے فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے (یعنی دونوں طرف کے لشکروں نے اپنے جن چیدہ فوجیوں کو لڑنے کے لئے آگے بھیجا ہو گا وہ اس دن کی) جنگ میں کام آجائیں گے۔ اور باقی تمام فوجی اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آجائیں گے، اس طرح اس دن کی جنگ میں دونوں فریق برابر سرابر رہیں گے، نہ کوئی غالب ہو گا نہ کوئی مغلوب) پھر (دوسرے دن) مسلمان ایک دوسرے لشکر کو منتخب کر کے آگے بھیجیں گے تاکہ وہ جنگ کرے اور مرجائے اور واپس آئے تو فتح یاب ہو کر آئے، پس دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں گے یہاں تک کہ دونوں لشکروں کے درمیان رات حائل ہو جائے گی، اور دونوں طرف کی فوجیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آجائیں گی ان میں سے نہ کوئی غالب ہو گا (نہ کوئی مغلوب) دونوں طرف کی فوج کے وہ چیدہ دستے جو لڑنے کے لئے آگے گئے ہوں گے فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے، پھر (تیسرے دن) مسلمان ایک لشکر کو منتخب کر کے آگے بھیجیں گے تاکہ وہ جنگ کرے اور مرجائے اور اگر واپس آئے تو فتح یاب ہو کر آئے، پس دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں گے، یہاں تک کہ شام ہو جائے گی اور دونوں طرف کے فوجی اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آجائیں گے، ان میں سے نہ کوئی غالب ہو گا نہ کوئی مغلوب البتہ دونوں طرف کے وہ چیدہ دستے جو لڑنے کے لئے آگے گئے ہوں گے فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ اور پھر جب چوتھا دن ہو گا تو مسلمانوں کی باقی ماندہ فوج کفار سے جنگ کے لئے نکل کھڑی ہو گی اور اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں کفار کو شکست دلوائے گا۔ بہر حال (اس دن نہایت سخت اور خوفناک جنگ ہو گی اور) مسلمان جان توڑ کر لڑیں گے اور ایسا لڑیں گے کہ اس طرح کی لڑائی کبھی نہیں دیکھی گئی ہو گی، یہاں تک کہ اگر کوئی پرندہ لشکر والوں کے اوپر سے گزر جانا چاہے گا تو ان کو پیچھے نہیں چھوڑ پائے گا یعنی ان سے آگے نہیں گزر سکے گا کہ مر کر زمین پر گر پڑے گا (مطلب یہ کہ اس لڑائی میں اس کثرت سے لوگ مارے جائیں گے کہ پورا میدان جنگ لاشوں سے پٹا پڑا ہو گا اور اگر کوئی پرندہ ان لاشوں کے اوپر سے گزر کر جانا چاہے گا تو آگے نہیں جا پائے گا بلکہ لاشوں کے ناقابل برداشت بدبو کی وجہ سے مر کر گر پڑے گا یا یہ کہ وہ میدان جنگ اتنا وسیع اور طویل ہو گا کہ اگر کوئی پرندہ اس کے ایک سرے سے اڑ کر دوسرے سرے تک جانا چاہے گا تو نہیں جا پائے گا بلکہ اڑتے اڑتے تھک جائے گا اور مر کر گر پڑے گا) پھر جب ایک باپ کے بیٹے (یعنی کسی ایک خاندان یا کسی ایک سلسلے کے لوگ) کہ جن کی تعداد سو ہو گی اپنوں کو شمار کرنا شروع کریں گے تو ان میں سے صرف ایک ہی مل پائے گا (یعنی جنگ ختم ہونے کے بعد باقی ماندہ لشکر کے لوگ جانی نقصان کا جائزہ لینا شروع کریں گے، چنانچہ ہر شخص اپنے اقارب اور متعلقین کو شمار کرے گا تو اسے معلوم ہو گا کہ اگر اس کے اقارب اور متعلقین سو کی تعداد میں جنگ میں شریک ہوئے تھے تو ان سو لوگوں میں سے ایک ہی شخص زندہ بچا ہے باقی سب کام آگئے ہیں، حاصل یہ کہ اس جنگ میں جانی نقصان اس کثرت سے ہو گا کہ زندہ بچ رہنے والوں کا تناسب سو میں ایک ہو گا) پس ایسی صورت میں (جب کہ مرنے والوں کی تعداد اس قدر بڑی ہو گی) کون سامال غنیمت خوشی کا باعث ہو گا اور کونسی میراث تقسیم ہو گی؟ بہر حال مسلمان اسی حالت میں ہوں گے کہ اچانک ان کو ایک سخت لڑائی کی خبر معلوم ہو گی، جو پہلی لڑائی سے بھی زیادہ بڑی اور بھیانک ہو گی، پھر مسلمان یہ آواز سنیں گے (کہ جیسے کوئی اعلان کرنے والا اعلان کر رہا ہے کہ) ان کی عدم موجودگی میں ان کے اہل و عیال کے درمیان دجال پہنچ گیا ہے (یہ خبر سنتے ہی) وہ مسلمان اپنے ہاتھ کی چیزوں (یعنی مال غنیمت کی اشیاء کو کہ جو انہیں ملی ہوں گی) پھینک پھانک کر دجال کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور (پہلے) وہ اپنے دس سواروں کو آگے بھیجیں گے تاکہ دشمن کے بارے میں واقفیت بہم پہنچائیں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ مسلمان جن سواروں کو آگے بھیجیں گے یقیناً میں ان کے اور ان کے باپ کے نام بھی جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا

ہوں کہ ان کے گھوڑے کس رنگ کے ہوں گے نیز وہ بہترین سوار ہوں گے، یا یہ فرمایا کہ وہ اس زمانہ کے روئے زمین کے بہتر سواروں میں سے ہوں گے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "شُرْطَة" فوج کے اس جانباز دستہ کو کہتے ہیں جو لشکر کے بالکل آگے ہو اور اپنی جانیں تک قربان کر دینے کے عزم کے ساتھ میدان جنگ میں سب سے پہلے کود دے۔ "یتشرط" کا لفظ اسی سے مشتق ہے جو باب تفعل سے نکالا گیا ہے نیز یہ لفظ باب افتعال سے "یشترط" بھی نقل کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ جملہ لا ترجع الا غالبة اصل میں شرطه للموت کی صفت کاشفہ مبینہ موضحہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر اپنے جس جانباز دستہ کو آگے بھیجے گا اس کو یہ ہدایت ہوگی کہ وہ کسی بھی حالت میں دشمن کے مقابلے سے بھاگے نہیں بلکہ سخت سے سخت حالت میں بھی محاذ پر ڈٹا رہے، یہاں تک کہ دشمن کو فنا کے گھاٹ اتار کر سرخ رو لوٹے یا خود فنا کے گھاٹ اتر جائے۔

فیجعل اللہ الدبرۃ علیھم میں لفظ "دبر" ادبار کا اسم ہے بعض روایتوں میں یہ لفظ "دابر" بھی منقول ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ دونوں ہی سے مراد شکست اور ہزیمت ہے۔

"فَبِاَیِّ غَنِیمَةٍ" حرف ف تفریعیہ یا فصیحہ ہے اور طیبی نے لکھا ہے کہ یہ جملہ نحوی ترکیب کے اعتبار سے جزاء ہے شرط محذوف کی کہ پہلے تو مبہم طور پر فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ میراث کا تقسیم ہونا موقوف نہ ہو جائے گا اور مسلمان مال غنیمت سے خوش ہونا چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد جملہ کی وضاحت آگے کی عبارت عَدُوٌّ یَجْمَعُوْنَ الخ (دشمن یعنی کفار اہل اسلام سے لڑنے کے لئے فوج اور طاقت جمع کریں گے الخ) کے ذریعے کی، اور اس وضاحت کو مذکورہ صفت (یعنی بڑی بھیانک اور خوفناک جنگ ہونے اور اس میں اس قدر جانی نقصان ہونے) کے ساتھ مقید کیا کہ میراث اس لئے تقسیم نہیں ہوگی اور مسلمانوں کو مال غنیمت سے اس لئے خوشی نہیں ہوگی کہ جہاں اتنا زیادہ جانی نقصان ہوا اور اس قدر کثرت سے لوگ مارے گئے ہوں وہاں تقسیم کہاں اور خوشی کہاں؟

"طلیعه" کریمہ کے وزن پر ہے اور اس کے معنی اس شخص کے ہیں جس کو دشمن کی خبر لانے کے لئے آگے بھیجا جائے۔ چنانچہ ان دس سواروں سے مراد فوجی جاسوسوں کی وہ ٹکڑی ہے جس کو دشمن کے حالات، سازو سامان اور قوت و تعداد کی خبر لانے کے لئے دشمن کے ٹھکانوں کی طرف روانہ کیا جائے گا۔

حضور ﷺ کا یہ ارشاد "میں ان کے اور ان کے باپ کا نام جانتا ہوں الخ" اعجاز نبوت کی دلیل ہے، یعنی یہ آپ ﷺ کا معجزہ تھا کہ سیکڑوں سال بعد وقوع پذیر ہونے والے کسی واقعہ سے متعلق افراد کے نام اور ان کے باپ کے نام اور ان کے گھوڑوں کے رنگ تک کا علم حضور ﷺ کو تھا! نیز یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کی کلیات و جزئیات کو محیط ہے اور اس نے جس چیز کے بارے میں جس قدر مناسب جانا اس قدر علم اپنے رسول کو بھی عطا فرما دیا۔

کشت وخون کے بغیر ایک شہر کے فتح ہونے کی پیشگوئی

(۱۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَلْ سَمِعْتُمْ بِمَدِیْنَةٍ جَانِبٌ مِّنْهَا فِی الْبَرِّ وَجَانِبٌ مِّنْهَا فِی الْبَحْرِ قَالُوْا نَعَمْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَغْزُوَهَا سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنْ بَنِیْ اِسْحٰقَ فَاِذَا جَآءُوْهَا نَزَلُوْا فَلَمْ یُقَاتِلُوْا بِسِلَاحٍ وَلَمْ یَرْمُوْا بِسَهْمٍ قَالُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ فَیَسْقُطُ اَحَدُ جَانِبَیْهَا قَالَ ثَوْرُبْنُ یَزِیْدَ الرَّاوِیْ لَا اَعْلَمُهٗ اِلَّا قَالَ الَّذِیْ فِی الْبَحْرِ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ الثَّانِیَةَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ فَیَسْقُطُ جَانِبُهَا الْاٰخَرُ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ الثَّالِثَةَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ فَیُفَرَّجُ لَهُمْ فَیَدْخُلُوْنَهَا فَیَغْنَمُوْنَ فَبَیْنَاهُمْ یَقْتَسِمُوْنَ الْمَغَانِمَ اِذَا جَآءَهُمُ الصَّرِیْخُ فَقَالَ اِنَّ الدَّجَّالَ قَدْ خَرَجَ فَیَتْرُکُوْنَ کُلَّ شَیْءٍ وَیَرْجِعُوْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) پوچھا کہ کیا تم نے کسی ایسے شہر کے بارے میں سنا ہے جس کے ایک طرف تو سمندر ہے اور ایک طرف جنگل ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! (ہم نے اس شہر کا ذکر سنا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں سے ستر ہزار آدمی اس شہر کے لوگوں سے جنگ نہ کرلیں گے! چنانچہ حضرت اسحاق کی اولاد میں سے وہ لوگ (جب جنگ کے ارادے سے) اس شہر میں آئیں گے تو (اس شہر کے نواحی علاقہ میں) پڑاؤ ڈالیں گے (اور پورے شہر کا محاصرہ کرلیں گے) لیکن وہ لوگ شہر والوں سے ہتھیاروں کے ذریعے جنگ نہیں کریں گے اور نہ ان کی طرف تیر پھینکیں گے بلکہ لا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر کا نعرہ بلند کریں گے اور شہر کے دو طرف کی دیواروں میں سے ایک طرف کی دیوار گر پڑے گی" (اس موقع پر) حدیث کے راوی ثور ابن یزیدؒ نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہاں سمندر کی جانب والی دیوار کہا تھا (یعنی میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، البتہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہاں یہ روایت کیا تھا کہ اس نعرہ سے سمندر کی طرف والی دیوار گر پڑے گی)۔ (بہر حال اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ) پھر وہ لوگ دوسری مرتبہ لا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر کا نعرہ بلند کریں گے تو ان کے لئے شہر میں داخل ہونے کا راستہ کشادہ ہو جائے گا اور وہ شہر میں داخل ہو جائیں گے پھر وہ مال غنیمت جمع کریں گے (یعنی شہر میں جو کچھ ہوگا اس کو اپنے قبضے میں لے لیں گے) اور اس مال غنیمت کو آپس میں تقسیم کر رہے ہوں گے کہ اچانک (ان کے کانوں میں) یہ آواز آئے گی کہ کوئی کہہ رہا ہے، دجال نکل آیا ہے! (یہ آواز سنتے ہی، وہ لوگ سب کچھ (یعنی مال غنیمت وغیرہ کو) چھوڑ چھاڑ کر (دجال سے لڑنے کے لئے) لوٹ پڑیں۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد میں جس شہر کا ذکر فرمایا اس کے بارے میں ایک شارح کا کہنا یہ ہے کہ وہ شہر روم میں واقع ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر سے "قسطنطنیہ" مراد ہے جس کا مسلمانوں کے ذریعے فتح ہونا قیامت کی علامتوں میں سے (ایک علامت ہے! لیکن ایک احتمال یہ ہے کہ وہ شہر قسطنطنیہ کے علاوہ کوئی اور شہر ہوگا کیونکہ قسطنطنیہ کا فتح ہونا جنگ وجدال اور کشت وخون کے ذریعے ہوگا جب کہ مذکورہ شہر کی فتح کا ظاہری سبب صرف تہلیل و تکبیر کے نعرہ کو بتایا گیا ہے۔

"حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد" سے مراد جیسا کہ مظہرؒ نے وضاحت کی ہے، شام کے لوگ ہیں جن کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے صاحبزادے حضرت اسحاق علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے، اور وہ لوگ مسلمان ہوں گے اس سلسلہ میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ اس شہر کو فتح کرنے والے لوگوں میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد کے علاوہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے لوگ بھی ہوں گے جو حجاز (عرب) کے باشندے ہوں گے، یا ان کے علاوہ دوسرے مسلمان بھی شامل ہوں، اس صورت میں کہا جائے گا کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد کا ذکر اختصار کے پیش نظر اور دوسرے لوگوں پر ان کو فوقیت دینے کی بنا پر ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس شہر کو فتح کرنے والے لوگ صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں گے۔

"ہتھیاروں کے ذریعے جنگ نہیں کریں گے" کے بعد پھر یہ ارشاد کہ "اور نہ ان کی طرف تیر پھینکیں گے"، تعمیم کے بعد تخصیص کے طور پر ہے جس کا مقصد ہتھیاروں کے مطلق استعمال نہ ہونے کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

قرب قیامت کے وہ حوادث ووقائع جو یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوں گے

(۱۴) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمْرَانُ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ خَرَابُ يَثْرِبَ وَخَرَابُ يَثْرِبَ خُرُوْجُ الْمَلْحَمَةِ وَخُرُوْجُ الْمَلْحَمَةِ فَتْحُ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ وَفَتْحُ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ خُرُوْجُ الدَّجَّالِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت معاذ ابن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بیت المقدس کا پوری طرح آباد ہو جانا مدینہ منورہ کی خرابی کا باعث ہوگا،

اور مدینہ منورہ کی خرابی، فتنے اور سب سے بڑی جنگ کے وقوع پذیر ہونے کا سبب ہوگا اور اس سب سے بڑی جنگ کا وقوع پذیر ہونا قسطنطنیہ کے فتح ہونے کا باعث ہوگا اور قسطنطنیہ کا فتح ہونا دجال کے ظاہر ہونے کا سبب اور اس کی علامت ہوگا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بیت المقدس کی مکمل آبادکاری کو مدینہ منورہ کی تخریب کا سبب اس اعتبار سے قرار دیا گیا ہے کہ بیت المقدس اور اس کے علاقوں میں غیر مسلموں کا غلبہ ہو جائے گا اور وہ اس کے چپہ چپہ پر قابض و آباد ہو جائیں گے اور جب وہ دشمن خدا بیت المقدس پر چھا جائیں گے تو ان کی نظریں مدینہ منورہ پر پڑیں گی اور وہ اس پاک شہر کی تخریب کا منصوبہ بنائیں گے جس کی وجہ سے مدینہ کے سارے لوگ اپنے شہر سے نکل کر ان دشمنان دین سے جنگ کرنے میں مشغول ہوں گے۔

یہاں حدیث میں مدینہ منورہ کا ذکر اس کے قدیم نام "یثرب" کے ذریعے کیا گیا ہے! واضح رہے کہ لفظ "یثرب" اصل میں "ثرب" سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاکت کے ہیں، یا یہ کہ "یثرب" مدینہ کا ایک گاؤں تھا جس کو یثرب نامی شخص نے بسایا تھا، اسی کا نام سارے شہر کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمانے تک یہ شہر یثرب ہی کا کہلاتا تھا، ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے اس کا نام بدل دیا اور یہ شہر مدینہ الرسول (یعنی رسول اللہ ﷺ کا شہر کہا جانے لگا، یہ معنی "المدینة" سے بھی ادا ہوتے ہیں، لہٰذا عام طور پر "المدینة" کہا جاتا ہے! یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "مدینہ" کو "یثرب" کہنے سے منع فرمایا گیا ہے تو پھر اس حدیث میں خود حضور ﷺ نے "یثرب" نام کیوں استعمال فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں مدینہ کو یثرب فرمانا، یثرب کہنے کی ممانعت نافذ ہونے سے پہلے کی بات ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جن حوادث و وقائع کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب مذکورہ ترتیب کے مطابق یکے بعد دیگرے قیامت کے قریب واقع ہوں گے اور ان میں سے ہر ایک کا وقوع پذیر ہونا دوسرے کے وقوع پذیر ہونے کی علامت اور نشانی ہوگی اگرچہ اس کا وقوع پذیر ہونا مہلت اور تاخیر ہی سے کیوں نہ ہو۔

طیبیؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ سوال پیدا ہو کہ اس حدیث میں تو فتح قسطنطنیہ کو دجال کے ظاہر ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ پہلے جو حدیث گزری ہے اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان شیطان اچانک یہ اعلان کرے گا کہ تمہاری عدم موجودگی میں دجال تمہارے گھروں تک جا پہنچا ہے، اور جب مسلمان یہ اعلان سن کر دجال کی تلاش میں نکلیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک جھوٹا اعلان تھا۔ پس ان دونوں حدیثوں میں تضاد کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں حضور ﷺ کا مقصد محض قسطنطنیہ کی فتح کو دجال کے نکلنے کی علامت قرار دینا ہے، کہ جب قسطنطنیہ فتح ہو جائے تو سمجھنا کہ اب دجال کا خروج ہوگا، دجال کا خروج کس طرح ہوگا اور مسلمانوں کو اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوگا؟ پس حقیقت میں ان دونوں حدیثوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے! علاوہ ازیں شیطان کے اس جھوٹے اعلان کا تعلق دجال کے خروج سے کچھ نہیں ہوگا بلکہ وہ تو اس طرح کا جھوٹا اعلان صرف اس مقصد سے کرے گا، تاکہ مسلمانوں میں سراسیمگی اور بے اطمینانی پھیلا دی جائے اور وہ غنیمت کا مال تقسیم کرنے سے باز رہیں۔

جنگ عظیم، فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال کی پیشگوئی

⑮ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰى وَفَتْحُ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ وَخُرُوْجُ الدَّجَّالِ فِيْ سَبْعَةِ اَشْهُرٍ۔ (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جنگ عظیم کا واقع ہونا، قسطنطنیہ کا فتح ہونا اور دجال کا نکلنا، یہ سب سات ماہ کے اندر ہوگا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "جنگ عظیم" سے مراد، بعض حضرات کے نزدیک وہ جنگ ہے جس کے بارے میں پہلے فرمایا جا چکا ہے کہ لڑائی کے خاتمہ پر جب

لوگ اپنے عزیز و اقارب کے جانی نقصان کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ سو سے ایک زندہ بچا ہے اور باقی اموات کی آغوش میں چلے گئے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اس جنگ سے مراد اس شہر کی فتح ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اسمائے الٰہی کی برکت (یعنی تہلیل و تکبیر کے نعرہ کے ذریعے) فتح ہو جائے گا اور کشت و خون کی نوبت تک نہیں آئے گی جیسا کہ پیچھے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں گزرا۔

مذکورہ بالا تینوں چیزوں کے وقوع پذیر ہونے کے تعلق سے جو سات مہینے کی مدت ذکر فرمائی گئی ہے وہ ان دونوں شہروں اور فتنہ دجال کی طرف مسلمانوں کے متوجہ ہونے کے اعتبار سے فرمائی گئی ہے، ورنہ جہاں تک ان دونوں شہروں کے فتح ہونے کا اعتبار ہے تو مذکورہ جنگ عظیم اور فتح قسطنطنیہ کا وقوع پذیر ہونا یکے بعد دیگرے بغیر کسی تاخیر کے ہوگا اور ان دونوں کے بعد دجال کا خروج ہو جائے گا۔

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَ الْمَلْحَمَةِ وَفَتْحُ الْمَدِيْنَةِ سِتُّ سِنِيْنَ وَيَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِي السَّابِعَةِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ هٰذَا اَصَحُّ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جنگ عظیم اور مذکورہ شہر یعنی قسطنطنیہ کے فتح ہونے کی درمیانی مدت چھ سال ہوگی اور ساتویں سال دجال نکلے گا" اس روایت کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث زیادہ صحیح ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جنگ عظیم فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال، یہ تینوں واقعات سات سال کے اندر ہوں گے جب کہ پہلی حدیث میں اس مدت کو سات ماہ بیان کیا گیا ہے، اس اعتبار سے دونوں حدیثوں کے درمیان زبردست تضاد اور اختلاف ہے لہٰذا اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہئے کہ تعارض بالکل ثابت ہے کہ ایک حدیث میں وضاحت کے ساتھ سات ماہ کی مدت بیان کی گئی ہے اور ایک حدیث سال کی مدت، اور دونوں حدیثوں کے مفہوم میں مطابقت پیدا کرنا ممکن نہیں ہے، اس صورت میں اس کے علاوہ اور کوئی طریق نہیں کہ ان دونوں حدیثوں کی حیثیت کو سامنے رکھ کر اس حدیث کو راجح قرار دیا جائے جو زیادہ صحیح ہو، چنانچہ علماء اور محدثین نے لکھا ہے کہ پہلی حدیث میں کلام کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بعض راوی فن حدیث کی اصطلاح میں مجروح اور مطعون ہیں اور یہ دوسری حدیث بالکل صحیح ہے جیسا کہ خود امام ابوداؤدؒ نے وضاحت کی ہے، پس حاصل یہ نکلا کہ مذکورہ بالا تینوں واقعات کے وقوع پذیر ہونے کی درمیانی مدت، سات ماہ کے بجائے سات سال زیادہ صحیح ہے۔

(۱۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ يُوْشِكُ الْمُسْلِمُوْنَ اَنْ يُّحَاصَرُوْا اِلَى الْمَدِيْنَةِ حَتّٰى يَكُوْنَ اَبْعَدَ مَسَالِحِهِمْ سَلَاحٌ وَسَلَاحٌ قَرِيْبٌ مِّنْ خَيْبَرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ وہ وقت آنے والا ہے جب مسلمانوں کا مدینہ میں محاصرہ کیا جائے گا، یہاں تک کہ ان کا دور ترین مورچہ سلاح ہوگا، اور سلاح خیبر کے نزدیک ایک مقام کا نام ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "سلاح" سین کے زبر کے ساتھ ہے، لیکن اس بنا پر کہ یہ لفظ اسم موخر ہے اور اس کی خبر ابعد ہے، اس کو سین کے پیش کے ساتھ بھی نقل کیا جاسکتا ہے، علاوہ ازیں ایک نسخہ میں یہ لفظ دو زبر (تنوین) کے ساتھ اور ایک نسخہ میں حاء کے زبر کے ساتھ منقول ہے۔ بہر حال یہ ایک جگہ کا نام ہے جو خیبر کے پاس ہے اور خیبر مدینہ منورہ سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حدیث کا مطلب یا تو یہ ہے کہ جب آخر زمانہ میں مسلمانوں کی کمزوری اور انتشار کا وقت ہوگا تو دشمنان دین و اسلام کے حوصلے اتنے بڑھ جائیں گے کہ وہ مدینہ منورہ تک کا محاصرہ کرنے اور وہاں کے مسلمانوں کو گھیر لینے کی کوشش کریں گے اور ان کا اقتدار خیبر تک آجائے گا۔ یا یہ کہ اس وقت جب مسلمان دشمنوں کے تسلط و قبضہ سے نکلنے کے لئے اپنے اپنے ملکوں اور علاقوں سے بھاگ بھاگ کر مدینہ آئیں گے تو مدینہ اور سلاح کے درمیان جمع ہوں گے اور یا یہ کہ اس وقت اطراف عالم سے بھاگ کر آنے والے مسلمانوں میں سے کچھ تو وہ ہوں گے جو مدینہ منورہ میں آجائیں گے اور کچھ وہ ہوں گے جو اس مقدس شہر کی حفاظت و نگہبانی کی خاطر اس کے گرد مورچے بنائیں گے،

اور ان مورچوں پر ڈٹے رہیں گے، چنانچہ ان مورچوں میں سب سے دور جو مورچہ ہوگا وہ سلاح کے مقام پر ہوگا یہ معنی حدیث کے آخری الفاظ کی مناسبت سے زیادہ صحیح ہیں۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے بارے میں ایک پیشگوئی

⑱ وَعَنْ ذِی مِخْبَرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ سَتُصَالِحُوْنَ الرُّوْمَ صُلْحًا اٰمِنًا فَتَغْزُوْنَ اَنْتُمْ وَهُمْ عَدُوًّا مِّنْ وَّرَاءِ كُمْ فَتَنْصُرُوْنَ وَتَغْنِمُوْنَ وَتَسْلَمُوْنَ ثُمَّ تَرْجِعُوْنَ حَتّٰى تَنْزِلُوْا بِمَرْجٍ ذِیْ تَلُوْلٍ فَيَرْفَعُ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ النَّصْرَانِيَّةِ الصَّلِيْبَ فَيَقُوْلُ غَلَبَ الصَّلِيْبُ فَيَغْضَبُ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَيَدُقُّهٗ فَعِنْدَ ذٰلِكَ تَغْدِرُ الرُّوْمُ وَتَجْمَعُ لِلْمَلْحَمَةِ وَزَادَ بَعْضُهُمْ فَيَثُوْرُ الْمُسْلِمُوْنَ اِلٰى اَسْلِحَتِهِمْ فَيَقْتَتِلُوْنَ فَيُكْرِمُ اللّٰهُ تِلْكَ الْعِصَابَةَ بِالشَّهَادَةِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ذی مخبرؓ (جو آنحضرت ﷺ کے خادم اور نجاشی بادشاہ حبشہ کے بھتیجے تھے) کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "مسلمانو! وہ وقت آنے والا ہے جب تم رومیوں (یعنی عیسائیوں) سے ایک ایسی مصالحت کروگے جو باامن صلح ہوگی (یعنی طرفین میں سے کسی کو بھی مصالحت شکنی اور بد عہدی کا خوف نہ ہوگا) اور پھر (اس مصالحت اور معاہدہ کے تحت) تم اور رومی باہم مل کر اپنے علاوہ ایک اور دشمن کے خلاف جنگ کروگے چنانچہ (خدا کی طرف سے اس دشمن کے خلاف) تمہیں مدد و نصرت دی جائے گی، تم غنیمت کا مال حاصل کروگے اور تم سلامت رہوگے (یعنی تمہارا جانی ومالی نقصان نہیں ہوگا) اس کے بعد جب تم (اس دشمن کو شکست دے کر) واپس ہوگے تو تم اور وہ رومی ایک ایسی جگہ پڑاؤ ڈالوگے جو سرسبز وشاداب ہوگی اور جہاں ٹیلے ہوں گے، وہاں عیسائیوں (یعنی رومیوں) میں سے ایک شخص صلیب بلند کر کے کہے گا کہ صلیب کا غلبہ ہوا ہے (یعنی وہ عیسائی یہ دعویٰ کرے گا کہ اس جنگ میں صلیب کی برکت سے فتح حاصل ہوئی ہے) اس بات پر مسلمانوں میں سے ایک شخص غضب ناک ہو جائے گا (کیونکہ وہ اس بات کو مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ کے خلاف جانے گا کہ اس فتح و غلبہ کو خدا اور اس کے دین کے بجائے کسی اور چیز کی طرف منسوب کیا جائے) چنانچہ وہ مسلمان اس صلیب کو توڑ ڈالے گا اور اس وقت رومی نہ صرف عہد کو توڑ دیں گے اور مصالحت کو ختم کر دیں گے بلکہ (مسلمانوں کے خلاف) جنگ کے لئے اپنے لوگوں کو جمع کرلیں گے۔" بعض راویوں نے یہ الفاظ اور نقل کئے ہیں کہ "اس کے بعد مسلمان بھی اپنے ہتھیاروں کی طرف لپکیں گے (یعنی ان رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے) اور ان سے جنگ کریں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی اس جماعت کو شہادت کی فضیلت وعظمت عطا فرمائے گا۔" (ابوداؤدؒ)

حبشیوں کے بارے میں ایک ہدایت

⑲ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اتْرُكُوا الْحَبَشَةَ مَا تَرَكُوْكُمْ فَاِنَّهٗ لَا يَسْتَخْرِجُ كَنْزَ الْكَعْبَةِ اِلَّا ذُوالسُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم حبشیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو تاکہ وہ تم سے کچھ نہ کہیں اور تم سے تعرض نہ کریں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کعبہ کا خزانہ ایک حبشی ہی نکالے گا جس کی دونوں پنڈلیاں چھوٹی چھوٹی ہوں گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخر میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کا تعلق آخر زمانہ سے ہے جب کہ قیامت بالکل قریب ہوگی اس وقت اہل حبشہ کو غلبہ حاصل ہوگا اور ان کا بادشاہ اپنا لشکر لے کر مکہ پر چڑھ آئے گا اور کعبۃ اللہ کو ڈھا دے گا اور اس خزانہ کو نکال لے گا

جو خانہ کعبہ کے نیچے مدفون ہے، چنانچہ حدیث میں، کعبہ کے خزانہ کو نکالنے والے جس حبشی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے یا تو حبشہ کا بادشاہ مراد ہے، یا پھر پورا لشکر مراد ہے! نیز "خزانہ" سے مراد وہ پورا خزانہ ہے جو کعبہ اقدس کے نیچے مدفون ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ "خزانہ" سے مراد وہ مال اسباب ہے جو نذر کے طور پر وہاں آتا ہے اور خانہ کعبہ کا خادم اس کو جمع کرتا ہے۔

واضح رہے کہ یہاں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک حبشی خانہ کعبہ کا خزانہ نکال لے گا یا ایک اور روایت میں یوں فرمایا گیا ہے کہ ایک حبشی خانہ کعبہ کو تباہ و برباد کر دے گا، تو یہ بات قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَحَرَمًا اٰمِنًا (امن وامان والا احرام) کے خلاف اور معارض نہیں ہے کیونکہ حبشیوں کے ذریعے خانہ کعبہ کی تخریب و تباہی کا یہ واقعہ قیامت کے قریب پیش آئے گا جب کہ روئے زمین پر کوئی شخص اللہ اللہ کہنے والا نہیں رہے گا۔ اور اٰمِنًا کے معنی یہ ہیں کہ کعبۂ اقدس قیامت تک مامون و محفوظ رہے گا، لہٰذا جب روئے زمین پر اللہ اللہ کہنے والوں تک کا کوئی موجود نہ رہے گا اور جب قیامت ہی آجائے گی تو پھر اور کیا چیز باقی رہ جائے گی کہ کعبہ بھی باقی رہے۔ ویسے یہ بات بھی بجائے خود وزن دار ہے، لیکن بعض حضرات نے ایک اور وضاحت بیان کی ہے اور اس کو زیادہ صحیح کہا ہے، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو جو "امن والا حرم" قرار دیا ہے تو اس کے غالب احوال کے اعتبار سے قرار دیا ہے یعنی خانہ کعبہ کی اصل حقیقت تو یہی رہے گی کہ وہ "باامن حرم" کے طور پر ہمیشہ ہر قسم کی تخریب کاری اور پلیدگی سے محفوظ و مامون رہے گا، مگر کبھی کبھار ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا سخت حادثہ واقعہ پیش آجائے جس سے اس کی تخریب کاری ہو چنانچہ کعبہ کی تاریخ میں ایسے حادثات پہلے بھی پیش آچکے ہیں جنہوں نے اس کو نقصان پہنچایا جیسا کہ حضرت ابن زبیرؓ کے زمانے میں عبد الملک ابن مروان کی خلافت کی طرف سے اہل مکہ کے خلاف حجاج ابن یوسف کے حملے کے دوران خانہ کعبہ کی سخت تخریب ہوئی یا قرامطہ کا واقعہ پیش آیا کہ اس نے خانہ کعبہ کو نقصان پہنچایا، بس اگر زمانہ آئندہ میں بھی کعبہ اقدس کی تخریب کا پیش آنے والا کوئی واقعہ پیش آئے تو وہ واقعہ حَرَمًا اٰمِنًا کے خلاف نہیں ہوگا! یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ باامن حرم قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو حکم فرمایا کہ جو بھی شخص اس مقدس شہر اور حرم محترم میں آئے اس کو امن و عافیت عطا کرو اور یہاں کسی کے ساتھ بھی تعرض نہ کرو۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب زندیقوں کی جماعت قرامطہ کا سردار فساد و تباہی مچا چکا اور لوگوں کے قتل و غارت گری اور شہریوں کو لوٹ مار سے فارغ ہوا تو ایک دن کہنے لگا کہ اللہ کا یہ فرمان کہا گیا کہ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا (یعنی جو بھی شخص اس حرم محترم میں داخل ہوا اس کو امن و عافیت حاصل ہو گئی؟) اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو جواب دینے کی توفیق عطا فرمائی، اس نے کہا کہ قرآن کریم کے اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص کبھی بھی مکہ و اہل مکہ اور خانہ کعبہ کی تخریب اور نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ اس فرمان الٰہی کی مراد یہ حکم دینا ہے کہ جو شخص حرم محترم میں داخل ہو جائے اس کو امن و عافیت عطا کرو اور اس میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے ذریعے کسی کے ساتھ تعرض نہ کرو۔

(۲۵) وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ دَعُوا الْحَبَشَةَ مَا دَعُوْكُمْ وَاتْرُكُوا التُّرْكَ مَا تَرَكُوْكُمْ۔
(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے ایک شخص سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم حبشیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو جب تک کہ وہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑے رکھیں اور ترکوں کو بھی ان کے حال پر چھوڑ دو جب تک کہ وہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑے رکھیں۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: یہاں ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے تو یہ حکم دیا ہے کہ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (یعنی مشرکین سے قتال کرنا چاہئے وہ جہاں کہیں بھی ہوں) پس جب اس حکم میں عموم ہے تو حبشیوں اور ترکوں کے بارے میں حضور ﷺ نے یہ کیوں فرمایا ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یعنی ان پر حملہ نہ کرو اور ان کے ملکوں اور شہروں پر چڑھائی سے گریز کرو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حبشہ اور ترک کا معاملہ اس آیت کے عمومی حکم سے خارج اور مخصوص استثنائی نوعیت رکھتا تھا کیونکہ جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے یہ دونوں ملک اس

زمانے کی اسلامی طاقت کے مرکز سے بہت دور دراز فاصلے پر واقع تھے اور اسلامی چھاؤنیوں اور ان ملکوں کے درمیان دشت وبیابان کا ایک ایسا دشوار گذار سلسلہ حائل تھا جس کو عام حالات میں عبور کرنا ہر ایک کے لئے ممکن نہیں تھا، لہٰذا حضور ﷺ نے اس بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان دونوں ملکوں کے خلاف کوئی اقدامی کاروائی نہ کی جائے اور ان لوگوں سے اس وقت تک کوئی تعرض نہ کیا جائے جب تک کہ وہ خود تم سے چھیڑ نہ نکالیں، پس اگر وہ تمہارے خلاف جارحیت کا ارتکاب کریں اور اپنی فوج وطاقت جمع کر کے مسلمانوں کے شہروں اور اسلامی مراکز پر چڑھ آئیں تو اس صورت میں ان کے خلاف نبرد آزما ہو جانا اور ان کے ساتھ جنگ وقتال کرنا فرض ہوگا۔ یا ایک بات یہ بھی جا سکتی ہے کہ حضور ﷺ نے جو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اسلام کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے پاس اتنی طاقت اور اس قدر ذرائع نہیں تھے کہ وہ اتنے دور دراز علاقوں تک اسلام کی پیش رفت کو بڑھاتے، چنانچہ بعد میں جب مذکورہ آیت نازل ہوئی اور اسلام کو طاقت میسر ہو گئی تو حضور ﷺ کا یہ حکم منسوخ قرار پا گیا۔

ترکوں کے متعلق پیش گوئی

(۲۱) وَعَنْ بُرَيْدَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَدِيْثٍ يُقَاتِلُكُمْ قَوْمٌ صِغَارُ الْاَعْيُنِ يَعْنِي التُّرْكَ قَالَ تَسُوْقُوْنَهُمْ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ حَتّٰى تُلْحِقُوْهُمْ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ فَاَمَّا فِي السِّيَاقَةِ الْاُوْلٰى فَيَنْجُوْا مَنْ هَرَبَ مِنْهُمْ وَ اَمَّا فِي الثَّانِيَةِ فَيَنْجُوْا بَعْضٌ وَيُهْلِكُ بَعْضٌ وَاَمَّا فِي الثَّالِثَةِ فَيُصْطَلَمُوْنَ اَوْ كَمَا قَالَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت بریدہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ سے اس حدیث کے سلسلے میں جس کا شروع یہ ہے کہ "تم سے ایک چھوٹی آنکھوں والی قوم یعنی ترک قوم جنگ کرے گی" یہ بھی روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس قوم کے لوگوں کو تین بار دھکیل دو گے (یعنی تم ان پر غالب آؤ گے اور ان کو شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کرو گے) یہاں تک کہ تم ان کو جزیرۂ عرب (کی سرحد کے پار) تک دھکیل دو گے۔ جب تم ان کو پہلی مرتبہ شکست دے کر بھگاؤ گے تو بھاگ کھڑے ہونے والے لوگ اپنی جان بچالیں گے، جب دوسری مرتبہ شکست دے کر بھگاؤ گے تو ان میں سے کچھ تو اپنی جان بچا کر نکل جائیں گے اور کچھ موت کے گھاٹ اتر جائیں گے، لیکن جب تیسری مرتبہ شکست دے کر بھگاؤ گے تو اس وقت وہ جڑ سے ختم ہو جائیں گے یعنی یہ تیسری شکست ان کا بالکل خاتمہ کر دے گی۔ یا اس کے مانند فرمایا۔

(ابوداؤدؒ)

تشریح: "یعنی الترک" کے الفاظ راوی کے ہیں خواہ وہ صحابی یا تابعی! یعنی یا تو خود حضرت بریدہؓ نے یا ان سے روایت کرنے والے تابعی نے قوم صغار الاعین (چھوٹی آنکھوں والی قوم) کے بارے میں یعنی الترک کے ذریعے وضاحت کی اس قوم سے مراد ترک قوم ہے۔

"جزیرۃ العرب" جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، اس وقت کے جغرافیائی نقشہ کے مطابق حجاز، یمامہ اور یمن کے علاقوں کا نام تھا، اس علاقے کو "جزیرۃ العرب" اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ تقریباً چاروں طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے اس کے جنوب میں بحر عرب، مشرق میں خلیج عربی اور خلیج عمان، مغرب میں بحر احمر اور اس کے شمال میں دریائے فرات ہے۔

اَوْ كَمَا قَالَ (یا اس کے مانند فرمایا) یہ جملہ کسی حدیث کو بیان کرنے کے بعد اس صورت میں کہتے ہیں جب کہ حدیث بیان کرنے والا یہ گمان کرتا ہے کہ حدیث کے معنی تو پوری طرح یاد ہیں جس کو میں نے بیان کر دیا ہے، البتہ حدیث کے اصل الفاظ پوری طرح یاد نہیں ہیں۔ گویا یہ جملہ حدیث کے راوی کے کمال احتیاط پر دلالت کرتا ہے۔

بصرہ کے متعلق پیش گوئی

(۲۲) وَعَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَنْزِلُ اُنَاسٌ مِّنْ اُمَّتِيْ بِغَائِطٍ يُسَمُّوْنَهُ الْبَصْرَةَ عِنْدَ نَهْرٍ يُقَالُ لَهُ دَجْلَةُ يَكُوْنُ عَلَيْهِ جِسْرٌ يَكْثُرُ اَهْلُهَا وَيَكُوْنُ مِنْ اَمْصَارِ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِذَا كَانَ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ جَاءَ بَنُوْ

قَنْطُوْرَآءَ عِرَاضُ الْوُجُوْهِ صِغَارُ الْاَعْيُنِ حَتّٰى يَنْزِلُوْا عَلٰى شَطِّ النَّهْرِ فَيَتَفَرَّقُ اَهْلُهَا ثَلٰثَ فِرَقٍ فِرْقَةٌ يَاْخُذُوْنَ فِيْ اَذْنَابِ الْبَقَرِ وَالْبَرِيَّةِ وَهَلَكُوْا وَفِرْقَةٌ يَاْخُذُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ وَهَلَكُوْا وَفِرْقَةٌ يَجْعَلُوْنَ ذَرَارِيَّهُمْ خَلْفَ ظُهُوْرِهِمْ وَيُقَاتِلُوْنَهُمْ وَهُمْ شُهَدَآءَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت کے لوگ ایک پست زمین پر پہنچ کر قیام پذیر ہوں گے اور اس جگہ کا نام بصرہ رکھیں گے، وہ جگہ ایک نہر کے قریب ہوگی جس کو دجلہ کہا جاتا ہوگا، اس نہر پر پل ہوگا، بصرہ میں رہنے والوں کی آبادی بہت بڑھ جائے گی اور اس کا شمار مسلمانوں کے (بڑے) شہروں میں ہوگا اور پھر جب زمانہ آخر ہوگا تو قنطورا کی اولاد اس شہر کے لوگوں سے لڑنے کے لئے آئے گی، ان کے منہ چوڑے چکلے اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہوں گی، وہ لوگ نہر کے کنارے اپنا پڑاؤ ڈالیں گے اور (ان کو دیکھ کر) شہر کے لوگ تین حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے ایک حصہ تو بیلوں کی دموں اور جنگل میں پناہ حاصل کرے گا (یعنی یہ وہ لوگ ہوں گے جو حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے سے کترا کر اپنی کھیتی باڑی کے کاموں میں مشغول ہو جائیں گے اور بیل وغیرہ ڈھونڈنے کا بہانہ لے کر ادھر ادھر ہو جائیں گے تاکہ دشمن کے حملے سے اپنی جان بچا سکیں یا یہ کہ وہ لوگ اپنے اہل وعیال اور مال واسباب کو جمع کر کے جنگلوں میں چلے جائیں گے تاکہ حملہ اور دشمن کی نقصان رسانی سے محفوظ رہیں) حالانکہ وہ لوگ موت وتباہی کے گھاٹ اتر کر رہیں گے (یعنی وہ اپنی اس حیلہ سازی کے باوجود دشمن کی زد سے محفوظ نہیں رہ پائیں گے کیونکہ حملہ آور مشرک، دشمنی اور فتنہ وفساد کی جو آگ بھڑکائیں گے وہ اس طرح کے حیلوں بہانوں سے ٹھنڈی یا محدود نہیں ہوگی) اور دوسرا حصہ قنطورا کی اولاد سے اپنی جانوں کے لئے امان طلب کرے گا مگر ان لوگوں کو بھی موت اور تباہی کے گھاٹ اترنا پڑے گا اور تیسرا حصہ وہ ہوگا جو اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو پیچھے چھوڑ کر (یعنی اپنے اہل وعیال سے بے پرواہ ہو کر اور ان کی محبت سے اپنا دامن چھڑا کر حملہ آور کے مقابلے پر ڈٹ جائے گا یا یہ کہ وہ لوگ اپنے بال بچوں کو اپنے پیچھے لے کر محاذ پر جائیں گے اور وہاں) دشمنوں سے لڑیں گے اور ان میں سے اکثر مارے جائیں گے جو شہادت کے مرتبہ کو پہنچیں گے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "بصرہ" با کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ اور صاد کے جزم کے ساتھ ہے، نیز یہ لفظ صاد کے زبر اور زیر کے ساتھ بھی منقول ہے۔ "دجلہ" (دال کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ) اس علاقہ کا مشہور دریا ہے جس کے کنارے پر مشہور شہر بغداد واقع ہے۔

حلبی نے حاشیہ شفا میں لکھا ہے کہ بصرہ کی با، زبر، زیر اور پیش تینوں حرکتوں کے ساتھ ہے، نیز یہ وہ شہر ہے جس کو حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں عتبہ ابن غزوان نے آباد کیا تھا اور شہر میں کبھی بھی بت پرستی نہیں ہوئی۔

حدیث میں بصرہ سے مراد بغداد ہے

حدیث میں جس واقعہ کی پیش گوئی فرمائی گئی ہے اس میں صریحًا "بصرہ" کا ذکر ہوا ہے، لیکن علماء نے لکھا ہے کہ اس سے "بغداد" مراد ہے، اور بغداد مراد لینے کی دلیل یہ ہے کہ دریائے دجلہ کی گزرگاہ بصرہ نہیں بلکہ بغداد ہے اور اس دریا پر جس پل کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی بغداد ہی میں ہے [علاوہ ازیں بغداد کا شہر آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اس طرح کا شہر نہیں تھا جیسا کہ اب ہے بلکہ اس زمانہ میں اس جگہ منتشر طور پر کچھ قریئے اور دیہات تھے جو بصرہ کے مضافات میں سے شمار ہوتے تھے اور ان کی نسبت بصرہ ہی کی طرف جاتی تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا معجزہ کے طور پر، ان دیہاتی علاقوں کے ایک بڑے شہر میں تبدیل ہو جانے کی پیش خبری بیان فرمائی اور بصیغہ مستقبل یہ فرمایا کہ وہ اسلامی شہروں میں سے ایک بڑا شہر ہوگا اور کثیر آبادی پر مشتمل ہوگا یہ بات محض تاویل کے درجے کی نہیں بلکہ اس کی پشت پر تاریخی دلیل بھی ہے، چنانچہ تاریخ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ترکوں نے کبھی بصرہ پر حملہ کیا ہو اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کشت وخون، کی وہ صورت پیش آئی ہو جس کی طرف حضور ﷺ نے اس حدیث میں ارشاد فرمایا، البتہ بغداد پر ترکوں (تاتاریوں نے) ضرور حملہ کیا ہے جو آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے زمانہ کا واقعہ ہے جس کی کچھ تفصیل تاریخی کتابوں سے اخذ کر کے ہم نے مظاہر حق

جدید کی پچھلی قسط میں بھی بیان کی ہے، پس واضح ہوا کہ حدیث میں "بصرہ" کا ذکر محض اس سبب سے ہے کہ بغداد کی بہ نسبت "بصرہ" زیادہ قدیم شہر ہے اور وہ دیہات و مواضع کہ جہاں بغداد کی تعمیر ہوئی اور یہ عظیم شہر بنا "بصرہ" ہی کی طرف منسوب تھے اور یہ وہ "بصرہ" تھا جو بعد میں بھی بغداد کی شہر فصیل کے باہر ایک چھوٹی سی آبادی کی صورت میں تھا اور اس سمت شہر کے دروازہ کو اسی نام کی مناسبت سے باب البصرہ کہا جاتا تھا۔ لہٰذا حضور ﷺ نے "بغداد" کے ذکر کے لئے گویا اس شہر کے جزوی نام کے ذکر پر اکتفا فرمایا، یا یہ کہ یہاں اصل مراد تو "بغداد البصرہ" کا ذکر تھا مگر مضاف کو حذف کر کے صرف "بصرہ" کے ذکر پر اکتفا فرمایا گیا جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت کو واسئل القریۃ میں اللہ تعالیٰ نے صرف قریہ کا ذکر فرمایا ہے جب کہ اس سے مراد اہل قریہ ہیں۔

اس صورت میں حدیث کے ابتدائی جز کا حاصل یہ نکلا کہ میری اُمت میں سے کچھ لوگ دریائے دجلہ کے کنارے اپنا پڑاؤ ڈالیں گے اور اس جگہ کو اپنا مرکزی شہر بنائیں گے، یہاں تک کہ وہ چھوٹی سی جگہ ایک ایسے شہر میں تبدیل ہو جائے گی جس کا شمار مسلمانوں کے بڑے بڑے شہروں اور اسلامی مراکز میں ہوگا اور یہ وہ شہر ہے جس کو بغداد کہا جاتا ہے اس موقع پر یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ تاریخ میں بغداد کو جو عظمت و اہمیت اور مرکزیت حاصل ہوئی اور وہ جتنا عظیم شہر بنا اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے حضور ﷺ نے لفظ "امصار" استعمال فرمایا، اُمصار اَصل میں مصر کی جمع ہے اور بڑے شہر کو کہتے ہیں اس سے نیچے کی آبادیوں کو بالترتیب "مدینہ"، "بلدہ" اور "قریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

"قنطورا کی اولاد" سے مراد ترک قوم ہے۔ اس قوم کے وارث اعلیٰ کا نام قنطورا تھا، اس لئے پوری ترک قوم کو "قنطورا کی اولاد" سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

"اور دوسرا حصہ اپنی جانوں کے لئے امان طلب کرے گا" کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پیش گوئی کا مصداق خلیفہ مستعصم باللہ اور اس کے حوالی موالی تھے، جیسا کہ مظاہر حق جدید کی پچھلی قسط میں اس کی تفصیل بھی گزر چکی ہے، جب ہلاکو خاں (ترکوں یعنی تاتاریوں کے سردار) نے اپنی بے امان فوج کے ساتھ بغداد پر حملہ کیا تو خلیفہ مستعصم باللہ نے اپنے لواحقین اور درباریوں کے ساتھ ہلاکو خاں کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اور اہل شہر کی جانوں کی امان طلب کی، لیکن کسی کو بھی امان نہیں ملی اور خلیفہ سمیت سارے لوگ ہلاک و تباہ کر دیئے گئے اور ہلاکو خاں کے فوجیوں نے ایک ایک آدمی کو چن چن کر مار ڈالا۔

ایک شارح نے لکھا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہے کہ حضور ﷺ نے اس حدیث میں "بصرہ" کے ذکر سے "بغداد" مراد لیا تھا کیونکہ اس زمانہ میں موجودہ بغداد کا علاقہ "بصرہ" کے مضافاتی قریوں اور دیہات کی صورت میں تھا اور حضور ﷺ نے جزوی نام پر پورے نام کا اطلاق کرتے ہوئے گویا "بغداد البصرہ" کے ذکر کے بجائے صرف "بصرہ" کا ذکر فرمانا کافی جانا تو اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری ہو چکی ہے کہ حضور ﷺ کے فرمانے کے مطابق مسلمانوں نے دریائے دجلہ کے کنارے بغداد کا شہر بسایا، اس کو ترقی اور عظمت سے ہمکنار کیا، وہ مسلمانوں کا ایک مرکزی اور بہت بڑا شہر بنا، پھر ترکوں نے اس پر حملہ کیا اور اس حملہ کے نتیجے میں اہل شہر کا تقریباً پورا حصہ ان ترکوں کے ہاتھوں کشت و خون کی نذر ہو گیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث میں "بصرہ" سے مراد بغداد نہیں بلکہ بصرہ کا موجودہ شہر ہے، تو پھر یہ کہا جائے گا کہ حضور ﷺ کی مذکورہ پیش گوئی ابھی پوری نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی آنے والے زمانہ میں اس شہر کے مسلمانوں کو مذکورہ پیش گوئی کے مطابق کسی اسلام دشمن طاقت کے حملہ و جارحیت کا شکار ہونا پڑے، کیونکہ جہاں تک پچھلے زمانہ کا تعلق ہے، تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ بصرہ پر بھی کسی اسلام دشمن طاقت نے اس طرح کا حملہ کیا ہو اور وہاں کے مسلمانوں کو اس طرح کشت و خون کا سامنا کرنا پڑا ہو جس طرح کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

"ان میں سے اکثر مارے جائیں گے جو شہادت کے مرتبہ کو پہنچیں گے" یعنی اس شہر کے مسلمانوں کا تیسرا حصہ ان لوگوں پر مشتمل ہوگا جو غازی مجاہد فی سبیل اللہ ہوں گے اور اس سخت طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے نہایت جاں نثاری اور حوصلہ و استقامت کے ساتھ

میدان میں آجائیں گے اور قبل اس کے کہ دشمن اہل اسلام پر حاوی اور غالب ہو جائے، اس سے لڑ کر خدا کی راہ میں اپنی جان دے دیں گے، پس وہ لوگ شہید ہوں گے اور کامل شہادت کا مرتبہ پائیں گے، ان میں سے جو لوگ زندہ بچ جائیں گے ان کی تعداد بہت تھوڑی ہوگی اس موقع پر ایک اور شارح نے کہا ہے کہ یہ حدیث گرامی آنحضرت ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کیونکہ سب کچھ اس طرح واقع ہوا جس طرح کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بغداد پر ترکوں کے حملے کی جو پیش گوئی فرمائی تھی وہ ماہ صفر ۶۵۶ھ میں حرف بحرف پوری ہوئی، اس وقت تاتاری ترکوں نے ہلاکو خاں کی سربراہی میں بغداد کو جس طرح تاراج کیا، مسلمانوں کا جس کثرت اور بے دردی سے خون بہایا، شہر کے محلات و مکانات حتیٰ کہ کتب خانوں اور علمی مراکز کو جس طرح جلا کر راکھ کر دیا اور اس آگ کے شعلوں نے جس طرح پورے عالم اسلام کو متاثر اور کمزور کیا وہ ایک ایسا سانحہ ہے جس کی تفصیل بیان کرنے سے زبان و قلم قاصر ہیں۔

بصرہ کے متعلق ایک پیش گوئی

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَنَسُ اِنَّ النَّاسَ يُمَصِّرُوْنَ اَمْصَارًا وَاِنَّ مِصْرًا مِنْهَا يُقَالُ لَهُ الْبَصْرَةُ فَاِنْ اَنْتَ مَرَرْتَ بِهَا اَوْ دَخَلْتَهَا فَاِيَّاكَ وَسِبَاخَهَا وَكَلَاءَهَا وَنَخِيْلَهَا وَسُوْقَهَا وَبَابَ اُمَرَآئِهَا وَعَلَيْكَ بِضَوَاحِيْهَا فَاِنَّهُ يَكُوْنُ بِهَا خَسْفٌ وَقَذْفٌ وَرَجْفٌ وَقَوْمٌ يَبِيْتُوْنَ وَيُصْبِحُوْنَ قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ -

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے (ان کو مخاطب کر کے) فرمایا۔ "انسؓ! لوگ کچھ نئے شہر بسائیں گے اور ان شہروں میں ایک شہر کا نام "بصرہ" ہوگا پس اگر تم اس شہر کے پاس سے گزرو یا اس شہر میں جاؤ تو اس کے اس علاقے کے قریب بھی جانا جہاں کھاری زمین ہے، نہ ان جگہوں کے قریب جانا جن کو کلاء کہا جاتا ہے، اسی طرح وہاں کی کھجوروں، وہاں کے بازار، وہاں کے بادشاہوں اور سرداروں کے دروازوں سے بھی دور رہنا، صرف اس شہر کے کنارے کے حصے میں کہ جس کو ضواحی کہا جاتا ہے پڑے رہنا! کیونکہ (جن جگہوں پر جانے سے تمہیں منع کر رہا ہوں) وہاں، زمین میں دھنسا دیئے جانے، پتھر برسائے جانے اور سخت زلزلوں کا عذاب نازل ہوگا، نیز ان علاقوں میں ایک ایسی قوم ہوگی جس کے افراد (ایک دن) رات میں عیش و راحت کی نیند سوئیں گے، لیکن جب صبح اٹھیں گے تو ان کی صورتیں بندر اور سور جیسی ہوں گی۔"

تشریح: "سباخ" اصل میں "سبخه" کی جمع ہے، جس کے معنی اس زمین کے ہیں جو کھاری اور بنجر ہو کہا جاتا ہے کہ "سباخ" بصرہ کے اس علاقہ کا نام بھی ہے جہاں کی زمین کھاری اور بنجر ہے! اسی طرح "کلاء" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بھی بصرہ کے بعض مقامات کا نام ہے۔

"ضواحی" ضاحیه کی جمع ہے، جس کے معنی شہر کا کنارہ اور شہر کی نواحی بستیاں ہیں! ویسے "ضاحیة البصرہ" بصرہ کی ایک نواحی بستی کا نام بھی ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "ضواحی" سے مراد بصرہ پہاڑ ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت انسؓ کو بصرہ کے ضواحی میں پڑے رہنے کا جو حکم دیا وہ دراصل گوشہ نشینی اور کنارہ کشی اختیار کرنے کے حکم میں تھا۔

"ان کی صورتیں بندر اور سور جیسی ہوں گی" یعنی وہ قوم خدا کی نافرمانی اور سرکشی اور اپنی بداعتقادی اور عملی گمراہیوں کی وجہ سے اس عذاب میں مبتلا کی جائے گی کہ اس قوم کے جو لوگ جوان ہوں گے وہ بندر کی صورت کے اور جو لوگ بوڑھے ہوں گے وہ سور کی صورت کے ہو جائیں گے، پس اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسخ و خسف جیسے عذاب الٰہی اس اُمت میں بھی جائز الوقوع ہیں کیونکہ اگر اس طرح کے عذاب کا واقع ہونا سرے سے غیر ممکن ہوتا تو ان سے ڈرانے اور ان کے واقع ہونے کی جگہوں پر جانے سے روکنا، بالکل بے فائدہ ہوتا اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ احادیث میں اس طرح کے عذاب کی وعید فرقہ قدریہ کے بارے میں منقول ہے اور اسی بنا پر بعض شارحین نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ حدیث میں مذکورہ مقامات فرقہ قدریہ کے لوگوں کا مسکن ہوں گے کیونکہ اس اُمت سے جن لوگوں پر مسخ و خسف کا عذاب نازل ہوگا وہ دراصل تقدیر الٰہی کو جھٹلانے والے لوگ ہوں گے۔

لفظ "کَلاَّءَ" کاف کے زبر اور لام کی تشدید ومد کے ساتھ بھی منقول ہے، اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا، یہ بصرہ میں ایک مقام کا نام ہے اور ایک شارح نے کہا ہے کہ اس سے مراد بصرہ کے ساحلی علاقہ کی وہ جگہ ہے جہاں جہاز اور کشتیاں لنگر ڈالتی ہیں ! اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ کلاء سے مراد بصرہ کا وہ علاقہ ہے جہاں جانوروں کی چراگاہ ہے، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعض نسخوں میں یہ لفظ لام کی تشدید اور مد کے بغیر منقول ہے جس کے معنی گھاس اور سبزہ کے ہیں ایک شارح نے لکھا ہے کہ ان جگہوں پر مسخ وخسف کے عذاب کے نازل ہونے کی وجہ شاید وہاں کے لوگوں کی خباثت اور سرکشی ہوگی، اسی طرح وہاں کی کھجوروں سے دور رکھنے کا مقصد ان کھجوروں کے باغات میں جانے سے روکنا ہے کیونکہ شاید ان باغات کا ماحول اور وہاں کے اثرات دین وایمان اور عزت وآبرو کو نقصان پہنچانے کا خوف رکھتے ہوں، نیز وہاں کے بازار، دینی احکام سے غفلت ولاپرواہی یا لہو ولعب اور خرید وفروخت کے معاملات میں بے ایمانی اور وہاں کے امراء حکام کے دروازوں پر ظلم وناانصافی کے چلن کی وجہ سے ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا۔

واضح رہے کہ مشکوۃ کے اصل نسخے میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مشکوۃ کے مولف کو اس حدیث کے صحیح ماخذ کا علم نہیں ہوگا، لیکن جزری نے اس حدیث کے ماخذ کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے رواہ ابو داؤد ومن طریق لم یجزم بھا الراوی بل قال لا اعلم الاعن موسی ابن انس عن انس ابن مالک یعنی اس روایت کو ابوداؤدؒ نے ایک ایسی سند کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے ایک راوی کے بارے میں انہوں نے بے یقینی کا اظہار کیا ہے، بلکہ انہوں نے (اس راوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جو اس سند میں داخل ہے) کہا ہے کہ میں اس راوی کو نہیں جانتا، ہاں انہوں نے اس حدیث کا راوی موسی ابن انس کو ذکر کیا ہے جنہوں نے اس کو حضرت انس ابن مالکؓ سے نقل کیا ہے! پس حدیث کے ماخذ اور اس کے راوی کو اس طرح سے بیان کرنا ابہام اور اشتباہ پر دلالت کرتا ہے! موسی ابن مالک انصاریؒ بصرہ کے قاضی اور تابعین میں سے ہیں۔

بصرہ کے ایک گاؤں کی مسجد کی فضیلت

(۲۴) وَعَنْ صَالِحِ بْنِ دِرْهَمٍ يَقُوْلُ انْطَلَقْنَا حَاجِّيْنَ فَإِذَا رَجُلٌ فَقَالَ لَنَا إِلٰى جَنْبِكُمْ قَرْيَةٌ يُقَالُ لَهَا الْأُبُلَّةُ قُلْنَا نَعَمْ قَالَ مَنْ يَضْمَنُ لِيْ مِنْكُمْ اَنْ يُصَلِّيَ لِيْ فِيْ مَسْجِدِ الْعَشَّارِ رَكْعَتَيْنِ اَوْ اَرْبَعًا وَيَقُوْلُ هٰذِهٖ لِاَبِيْ هُرَيْرَةَ سَمِعْتُ خَلِيْلِيْ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَبْعَثُ مِنْ مَسْجِدِ الْعَشَّارِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ شُهَدَاءَ لَا يَقُوْمُ مَعَ شُهَدَاۗءِ بَدْرٍ غَيْرُهُمْ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ هٰذَا الْمَسْجِدُ مِمَّا يَلِي النَّهْرَ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ اَبِي الدَّرْدَاءِ اِنَّ فُسْطَاطَ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ بَابِ ذِكْرِ الْيَمَنِ وَالشَّامِ اِنْشَاۗءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت صالح ابن درہم تابعیؒ کہتے ہیں کہ ہم حج کے لئے (بصرہ سے مکہ) گئے تو وہاں (کسی جگہ) ایک شخص (یعنی حضرت ابوہریرہؓ) کو کھڑے دیکھا، انہوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا تمہارے شہر کے نواح میں ایک بستی ہے جس کو ابلہ کہا جاتا ہے؟ ہم نے کہا کہ ہاں ہے! انہوں نے کہا کہ تم میں سے کون شخص اس کا ذمہ لیتا ہے کہ وہ میری طرف سے مسجد عشار میں دو رکعت، بلکہ چار رکعت نماز پڑھے اور یہ کہے کہ اس نماز کا ثواب ابوہریرہ کو پہنچے میں نے اپنے یار صادق ابوالقاسم (محمد) ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ مسجد عشار سے قیامت کے دن شہداء کو اٹھائے گا اور بدر کے شہداء کے ساتھ ان شہداء کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا (قیامت کے دن بدر کے شہداء کے ساتھ جو شہداء اپنی اپنی قبر سے اٹھیں گے وہ اسی مسجد کے شہداء ہوں گے، یا یہ کہ قیامت کے دن مرتبہ کے اعتبار سے شہداء بدر کے ہمسر ان شہداء کے علاوہ اور کوئی شہید نہیں ہوگا۔ اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ مسجد بصرہ کے اس نواحی حصے میں ہے جو دریائے فرات کی طرف ہے اور حضرت ابودرداء کی حدیث ان فسطاط المسلمین الخ کو ہم انشاء اللہ تعالیٰ یمن وشام کے ذکر کے بیان میں نقل کریں گے۔"

تشریح: "اُبلّہ" ایک مشہور بستی کا نام ہے جو بصرہ کے قریب واقع ہے۔ "عشار" ایک مسجد کا نام ہے جو ابلہ میں ہے، حصول برکت وسعادت کی خاطر لوگ اس مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں۔

"مسجد عشار کے شہداء" کے بارے میں یہ وضاحت نہیں ہوتی کہ آیا ان شہداء کا تعلق کسی گذشتہ اُمت کے لوگوں سے ہے یا اسی اُمت کے لوگوں سے؟ بہرحال اس حدیث سے ان شہداء کی عظمت وفضیلت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ بدر کے شہیدوں کے ہم پلہ وہم رتبہ ہیں، پس معلوم ہوا کہ جب وہ مسجد اس قدر شرف وفضیلت رکھتی ہے تو اس میں نماز پڑھنا یقیناً بہت بڑی فضیلت اور بہت بڑے ثواب کی بات ہے۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فضیلت رکھنے والی جگہوں اور عمارتوں میں نماز پڑھنا اور عبادت کرنا بہت زیادہ فضیلت وسعادت کے حصول کا ذریعہ ہے، نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بدنی عبادت (جیسے نماز روزہ) کا ثواب کسی کو بخشنا جائز ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ اور وہ ثواب اس کو پہنچتا ہے، چنانچہ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے، ویسے مالی عبادت (جیسے صدقہ وخیرات وغیرہ کا ثواب بخشنا تو تمام ہی علماء کے نزدیک جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت عمرؓ فتنوں کا دروازہ کھلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے

(۲۵) عَنْ شَقِيْقٍ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ عُمَرَ فَقَالَ اَيُّكُمْ يَحْفَظُ حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْفِتْنَةِ فَقُلْتُ اَنَا اَحْفَظُ كَمَا قَالَ قَالَ هَاتِ اِنَّكَ لَجَرِيْئٌ وَكَيْفَ قَالَ قُلْتُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِيْ اَهْلِهٖ وَمَالِهٖ وَنَفْسِهٖ وَوَلَدِهٖ وَجَارِهٖ يُكَفِّرُهَا الصِّيَامُ وَالصَّلٰوةُ وَالصَّدَقَةُ وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ فَقَالَ عُمَرُ لَيْسَ هٰذَا اُرِيْدُ اِنَّمَا اُرِيْدُ الَّتِيْ تَمُوْجُ كَمَوْجِ الْبَحْرِ قَالَ قُلْتُ مَالَكَ وَلَهَا يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ بَيْنَكَ وَبَيْنَهَا بَابًا مُغْلَقًا قَالَ وَيُكْسَرُ الْبَابُ اَوْ يُفْتَحُ قَالَ قُلْتُ لَا بَلْ يُكْسَرُ قَالَ ذٰلِكَ اَحْرٰى اَنْ لَّا يُغْلَقَ اَبَدًا قَالَ فَقُلْنَا لِحُذَيْفَةَ هَلْ كَانَ عُمَرُ يَعْلَمُ مَنِ الْبَابُ قَالَ نَعَمْ كَمَا يَعْلَمُ اَنَّ دُوْنَ غَدٍ لَيْلَةً اِنِّيْ حَدَّثْتُهٗ حَدِيْثًا لَيْسَ بِالْاَغَالِيْطِ قَالَ نَهِبْنَا اَنْ نَسْاَلَ حُذَيْفَةَ مَنِ الْبَابُ فَقُلْنَا لِمَسْرُوْقٍ سَلْهُ فَسَاَلَهٗ فَقَالَ عُمَرُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت شقیق تابعیؒ، حضرت حذیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔ "ہم (ایک دن) حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر تھے کہ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ تم میں سے کسی شخص کو رسول کریم ﷺ کی وہ حدیث یاد ہے جو آپ ﷺ نے فتنہ کے سلسلے میں ارشاد فرمائی ہے، میں نے کہا کہ مجھے یاد ہے اور بالکل اس طرح یاد ہے جس طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے (یعنی میرے حافظہ میں وہ حدیث کسی کمی وبیشی کے بغیر حرف بہ حرف محفوظ ہے) حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ "اچھا، وہ حدیث بیان کرو، تم روایت حدیث میں بہت دلیر ہو، جو کچھ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے اس کو نقل کرو اور اس کی کیفیت بیان کرو۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے بیان کیا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "آدمی کا فتنہ (یعنی اس کی آزمائش اور ابتلا) اس کے اہل وعیال میں ہے، اس کے مال میں ہے، اس کے نفس میں ہے، اس کی اولاد میں ہے اور اس کے ہمسایہ میں ہے! اس کے اس فتنہ کو (اور اس فتنہ کے سبب وہ جو گناہ کرتا ہے، اس کو روزے، نماز، صدقہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دور کر دیتے ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے (یہ حدیث سن کر) فرمایا کہ میرا مدعا اس فتنے سے نہیں تھا، میں تو اس فتنہ کے بارے میں سننا چاہتا تھا جو سمندر کی موجوں کی طرح جوش مارے گا؟ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! بھلا آپ کو اس فتنہ سے کیا تعلق؟ آپ کے اور اس فتنہ کے درمیان تو ایک بند دروازہ حائل ہے۔ یعنی اس فتنہ کا آپ کو کیوں فکر ہے، اس کے برے اثرات آپ تک تو پہنچیں گے نہیں کیونکہ اس فتنہ کا ظہور آپ کی زندگی کے بعد ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ وہ دروازہ کہ جس سے فتنہ نکلے گا توڑا جائے گا (یعنی اس کو اس طرح توڑا جائے گا یا کھولا جائے

گا؟ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ "دروازہ کھولا نہیں جائے گا بلکہ توڑا جائے گا (یعنی اس کو اس طرح توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا جائے گا کہ پھر اس کا بند ہونا یا اس کا قابل مرمت ہونا ممکن نہیں ہوگا" حضرت عمرؓ نے (یہ سن کر) فرمایا "اس دروازے کے بارے میں (کہ جو کھولا نہیں جائے گا بلکہ توڑا جائے گا) زیادہ قرین حقیقت بات یہ ہے کہ وہ کبھی بند ہی نہ ہو" حدیث کے راوی حضرت شقیقؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ کیا حضرت عمرؓ اس سے واقف تھے کہ دروازہ سے مراد کون ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ ہاں! حضرت عمرؓ اس سے واقف تھے جیسا کہ وہ اس بات سے واقف تھے کہ کل کے دن سے پہلے رات آئے گی (یعنی جس طرح ہر شخص یقینی طور پر جانتا ہے کہ کل آنے والے دن سے پہلے رات کا آنا ضروری ہے اسی طرح حضرت عمرؓ یقینی علم رکھتے تھے کہ دروازہ سے مراد کون ہے) اور اس میں شک نہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے وہ حدیث بیان کی جس میں غلطیاں نہیں ہیں۔ حضرت شقیقؒ کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) ہمیں حضرت حذیفہؓ سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ دروازے سے مراد کون ہے، البتہ ہم نے حضرت مسروقؒ سے عرض کیا (جو وہاں موجود تھے) کہ آپ حضرت حذیفہؓ سے پوچھ لیجئے، چنانچہ انہوں نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا تو حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ دروازے سے مراد حضرت عمرؓ ہیں، یعنی حضرت عمرؓ کی ذات ایک ایسے دروازے کی طرح ہے جس نے اس اُمت اور اسلامی مملکت میں فتنہ و فساد کے در آنے کو روک رکھا ہے، ان کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "تم روایت حدیث میں بہت دلیر ہو" حضرت حذیفہؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ جملہ ان کے اظہار ناگواری کا بھی احتمال رکھتا ہے اور ان کے اظہار تحسین کا بھی یعنی ایک احتمال تو یہ ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے چونکہ اور صحابہؓ کی موجودگی میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں حضور ﷺ کی حدیث کو بعینہٖ یاد رکھتا ہوں اور اس بارے میں میرا حافظہ بہت قوی اور قابل اعتماد ہے اس لئے حضرت عمرؓ کو ان کی یہ بات ناگوار ہوئی، پس انہوں نے اس ناگواری کو ظاہر کرنے کے لئے فرمایا کہ تم بڑے عجیب قسم کے دلیر ہو؟ آخر تمہیں ایک ایسی بات کا دعویٰ کرنے کی جرأت کیسے ہوگئی جس کو نہ میں جانتا ہوں اور نہ یہاں موجود دوسرے صحابہؓ جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، اچھا اگر تمہیں اپنے حافظہ پر ایسا ہی ناز ہے تو سناؤ کہ حضور ﷺ نے کیا فرمایا تھا؟ یہ تو پہلا احتمال ہوا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس جملے کے ذریعے دراصل حضرت حذیفہؓ کی تحسین و تائید فرمائی، یعنی انہوں نے گویا یہ فرمایا کہ میں تمہارے دعوے کی تصدیق کرتا ہوں، کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم آنحضرت ﷺ سے اس اُمت میں پیدا ہونے والے فتنوں اور ظاہر ہونے والی برائیوں کے بارے میں بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ سوالات کیا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر حضور ﷺ سے پوچھتے رہتے تھے، لہٰذا تمہیں یقیناً فتنہ کے بارے میں حضور ﷺ کے ارشادات کا زیادہ علم ہوگا اور اس سلسلے کی حدیث پوری طرح یاد ہوگی، ہمیں وہ حدیث ضرور سناؤ کہ حضور ﷺ نے کیا فرمایا۔

"آدمی کا فتنہ اس کے اہل و عیال میں ہے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کا تعلق مختلف چیزوں جیسے اہل و عیال، اور مال و دولت وغیرہ سے قائم کیا، پھر اس کو ان چیزوں کے حقوق پہنچانے اور ان حقوق کو ادا کرنے کا ذمہ قرار دے کر ایک طرح کی آزمائش سے دوچار کیا ہے لیکن یہ انسان کی غفلت و نادانی ہے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتا اور جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں ان کی ادائیگی میں کوتاہی و تقصیر کرتا ہے، ان متعلقہ چیزوں کے سلسلے میں خدا نے اس کو جو حکم دیا ہے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے اور ان چیزوں کی وجہ سے نہ صرف گناہ اور ممنوع امور کے ارتکاب کا وبال اپنے سر لیتا ہے بلکہ خود کو تعب و رنج اور مشقت و ایذا میں گرفتار کرتا ہے لہٰذا اس صورت میں انسان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں جو کوتاہی اور گناہوں کا جو ارتکاب اس سے ہوتا ہے اس کے ازالہ اور کفارہ کے لئے اچھے کام جیسے نماز، روزہ اور صدقہ و خیرات وغیرہ کرتا رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ یعنی بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

"میرا مدعا اس فتنہ سے نہیں تھا" یعنی جب حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم میں سے کس شخص کو فتنہ کے سلسلے میں

آنحضرت ﷺ کی حدیث یاد ہے، تو ان کا یہ پوچھنا دو مفہوم کا احتمال رکھتا تھا، ایک یہ کہ فتنہ سے ان کی مراد وہ امتحان و آزمائش ہو جس میں انسان کو اولاد و مال وغیرہ کے تعلق سے مبتلا کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ الخ اور دوسرے یہ کہ فتنہ سے ان کی مراد باہمی قتل و قتال اور افتراق و انتشار ہو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے سوال کا تعلق اس دوسرے مفہوم سے تھا، یعنی انہوں نے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تھا جس میں حضور ﷺ نے باہمی قتل و قتال اور افتراق و انتشار کے فتنہ و فساد کا ذکر فرمایا تھا، لیکن حضرت حذیفہؓ نے یہ سمجھا کہ حضرت عمرؓ پہلے مفہوم سے متعلق حدیث کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اور اسی لئے انہوں نے اس کے مطابق حدیث بیان کی، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرے پوچھنے کا مدعا یہ فتنہ نہیں تھا، میری مراد اس فتنہ کے بارے میں حضور ﷺ کی حدیث سننا تھا جو باہمی قتل و قتال اور آپس میں ایک دوسرے کے خلاف جنگ و محاذ آرائی کی صورت میں اس اُمّت پر سیاہ بادل کی صورت میں چھا جائے گا اور اس کے برے اثرات تمام مسلمانوں کو سخت مصائب و پریشانی میں مبتلا کر دیں گے۔

"آپ کے اور اس فتنہ کے درمیان تو ایک بند دروازہ حائل ہے" بند دروازہ سے مراد حضرت عمرؓ کے وجود با مسعود کی طرف اشارہ کرنا تھا، جیسا کہ حدیث کے آخری الفاظ سے اس کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے، چنانچہ حضرت حذیفہؓ کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس فتنہ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں وہ ابھی دور ہے، کیونکہ جب تک اس اُمّت میں آپ کا وجود باقی ہے وہ فتنہ راہ نہیں پائے گا ہاں جب آپ اس دنیا سے اٹھ جائیں گے تو وہ فتنہ در آئے گا اور اُمّت میں راہ پا جائے گا۔

"وہ دروازہ توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا؟" یعنی آیا وہ دروازہ اتنا سخت اور مضبوط ہو گا کہ بغیر توڑے اس کو کھولا نہیں جا سکے گا یا اتنا کمزور اور ہلکا ہو گا کہ آسانی کے ساتھ اس کو کھول دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ کسی دروازہ کو توڑنے اور اس کو کھولنے میں فرق ہوتا ہے، ایک دروازہ تو وہ ہوتا ہے جس کو توڑے بغیر آمد و رفت کا راستہ بنانا ممکن نہیں ہوتا جب وہ دروازہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر اس کا بند ہونا ممکن نہیں ہوتا، اس کے برخلاف جو دروازہ صرف کھولا جاتا ہے اس کو بند کرنا ممکن ہوتا ہے، چنانچہ یہاں "بند دروازہ" تمثیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ تشبیہ دینا ہے کہ فرض کرو کہ دو گھر ہیں جن کے درمیان ایک دیوار حائل ہے اور اس دیوار میں ایک بند دروازہ ہے، اس دیوار کے ایک طرف کا گھر فتنہ و فساد کا مسکن ہے اور دوسری طرف کے گھر میں امن و عافیت کا رہن سہن ہے اور اس بند دروازہ کی وجہ سے فتنہ و فساد کو کوئی راہ نہیں ملتی کہ وہ امن و عافیت کے گھر میں در آئے اور اس گھر کے امن و سکون کو تہ و بالا کر دے پس حضرت عمرؓ کی حیات فتنوں کے روکے رکھنے والے بند دروازے کے مماثل اور ان کی موت، ان فتنوں کے دروازے کھل جانے کی مماثل ہوئی، اس طرح اس دروازے کے توڑے جانے کو ان کے قتل کے ساتھ اور اس دروازے کے کھولے جانے کو ان کی قدرتی موت کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔

قسطنطنیہ کا فتح ہونا، قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہو گا

(۲۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ فَتْحُ الْقُسْطُنْطِيْنِيَّةِ مَعَ قِيَامِ السَّاعَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "قسطنطنیہ کا فتح ہونا، قیامت کے قریب ہو گا" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تمت بالخیر

الحمد للہ کہ کتاب مظاہر حق جدید کی کتابت "کتاب الصید و الذبائح" سے شروع ہو کر "باب الملاحم" پر ختم ہو رہی ہے اور انشاء اللہ العزیز "باب اشراط الساعۃ" سے مظاہر حق جدید جلد پنجم کی کتابت شروع ہو گی۔

وصلی اللہ تعالٰی علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین

بَابُ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ

قیامت کی علامتوں کا بیان

شَرْط: (را کے جزم کے ساتھ) کے معنی ہیں۔ کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ وابستہ کرنا یا کسی چیز کا لازم کرنا جیسا کہ یوں کہا جائے اگر ایسا ہو تو ایسا ہوگا! اس کی جمع "شروط" آتی ہے اور "شرط" (را کے زبر کے ساتھ) کے معنی ہیں علامت، یعنی وہ چیز جو کسی وقوع پذیر ہونے والی چیز کو ظاہر کرے! اس کی جمع "اشراط" ہے پس یہاں "اشراط" سے مراد وہ نشانیاں اور علامتیں ہیں جو قیامت کے وقوع پذیر ہونے کو ظاہر کریں گی۔ ویسے لغت میں "شرط" کے معنی کسی چیز کا اول، مال کا زوال اور چھوٹا و کمتر مال" لکھے ہیں۔

"ساعۃ" شب و روز کے اجزاء میں سے کسی بھی ایک جز کو کہتے ہیں یہ لفظ "موجودہ وقت" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس قیامت یا قیامت کے آنے کو ساعت اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ جب اس کا وقت غیر معلوم ہے تو وہ کسی بھی وقت آسکتی ہے یہاں تک آنے والا ہر لمحہ یہ احتمال رکھتا ہے کہ اسی وقت قیامت نہ آجائے۔

علماء نے وضاحت کی ہے کہ اشراط ساعت یعنی قیامت کی علامتوں سے مراد وہ نسبتاً چھوٹی چیزیں ہیں جو قیامت آنے سے پہلے وقوع پذیر ہوں گی اور جن کو لوگ قیامت کی علامتیں تسلیم نہیں کریں گے مثلاً لونڈی کا اپنے مالک کو جننا، فلک بوس عمارتیں بنانا اور ان پر فخر کرنا، جہل و نادانی، زنا کاری اور شراب خوری کی کثرت، مردوں کی کمی اور عورتوں کی زیادتی، امانتوں میں خیانت و بد دیانتی، لڑائیوں اور فتنہ و فساد کی زیادتی اور اس طرح کی دوسری برائیاں کہ جن کا ذکر اس باب میں آئے گا۔ "اشراط" کی وضاحت اس معنی کے ساتھ اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ بڑی علامتیں کہ جو قیامت کے بالکل قریب ظاہر ہوں گی اور جن کا ذکر اگلے باب میں ہوگا، ان چھوٹی علامتوں کے علاوہ ہیں! رہی یہ بات کہ لوگ مذکورہ بالا چیزوں کو قیامت کی علامتیں تسلیم کرنے سے کیوں انکار کریں گے! تو اس کی وجہ اصل میں یہ ہوگی کہ اس طرح کی چیزیں اس دنیا میں ہمیشہ سے چلی آرہی ہیں، پس لوگ یہ سمجھتے رہیں گے کہ یہ چیزیں تو دنیا میں ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہیں، اب ان میں کیا خصوصیت پیدا ہوگئی ہے کہ ان کو قیامت کی علامتیں کہا جائے۔ واضح رہے کہ مذکورہ چیزوں کا محض وجود قیامت کی علامت نہیں ہے بلکہ ان چیزوں کا کثرت کے ساتھ وقوع پذیر ہونا اور ان برائیوں کا غیر معمولی طور پر پھیل جانا، قیامت کی علامت ہے! ایک بات اور بتا دینی ضروری ہے کہ اس باب میں حضرت امام مہدیؓ کے ظاہر ہونے کا بھی ذکر ہے، جب کہ ان کا ظاہر ہونا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور دجال کے پیدا ہونے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، لہٰذا اس بارے میں کوئی اشکال واقع نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس باب میں حضرت مہدیؓ کے ظاہر ہونے کا ذکر، لڑائیوں اور فتنوں کے ذکر کے ضمن میں ہوا ہے نہ کہ مستقل طور پر اس سلسلہ میں مزید وضاحت اگلے باب میں ہوگی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قیامت کی علامتیں

① عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يُّرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَكْثُرَ الْجَهْلُ وَيَكْثُرَ الزِّنَا وَيَكْثُرَ شُرْبُ الْخَمْرِ وَيَقِلَّ الرِّجَالُ وَيَكْثُرَ النِّسَاءُ حَتّٰى يَكُوْنَ لِخَمْسِيْنَ اِمْرَاَةً الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ وَفِیْ رِوَايَةٍ يَقِلَّ الْعِلْمُ وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "بلاشبہ قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ علم اٹھالیا

جائے گا (یعنی حقیقی عالم اس دنیا سے اٹھ جائیں گے یا یہ کہ علماء کی قدر و منزلت اٹھ جائے گی) جہالت کی زیادتی ہو جائے گی (یعنی ہر طرف جاہل و ناداں ہی نظر آنے لگیں گے جو اگرچہ علم و دانش کا دعویٰ کریں گے مگر حقیقت میں علم و دانش سے کوسوں دور ہوں گے) زنا کثرت سے ہونے لگے گا (کیونکہ لوگوں میں شرم و حیا اور اور غیرت کم ہو جائے گی) شراب بہت پی جائے گی (اور پھر شراب خوری کی زیادتی، آبادیوں اور لوگوں میں فتنہ و فساد پھیلنے کا باعث ہوگی) مردوں کی تعداد کم ہو جائے گی (جن کے دم سے عالم کا نظام استوار و مستحکم ہوتا ہے) عورتوں کی تعداد بڑھ جائے گی (کہ جن کے ذریعہ ضروری اور اہم امور سرانجام تو کیا پاتے البتہ ان کی وجہ سے تفکرات اور پریشانیوں اور مال و دولت حاصل کرنے کا غم ضرور برداشت کرنا پڑتا ہے) یہاں تک کہ پچاس عورتوں کی خبر گیری کرنے والا ایک مرد ہوگا (اس سے یہ مراد نہیں کہ ایک ایک مرد کی پچاس بیویاں ہوں گی بلکہ یہ مراد ہے کہ ایک ایک مرد پر پچاس پچاس عورتوں کی کفالت و خبر گیری کا بوجھ ہوگا جن میں مائیں، خالائیں، دادیاں، بہنیں، پھوپھیاں وغیرہ ہوں گی۔"

اور ایک روایت میں (یرفع العلم ویکثر الجھل) یعنی علم اٹھالیا جائے گا اور جہل کی زیادتی ہوگی، کے بجائے) یوں ہے کہ علم کم ہو جائے گا اور جہالت پھیل جائے گی۔

قیامت کی ایک خاص علامت

④ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ كَذَّابِيْنَ فَاحْذَرُوْهُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "قیامت آنے سے پہلے جھوٹوں کی پیدائش بڑھ جائے گی، لہٰذا ان سے بچتے رہنا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جھوٹوں" سے مراد یا تو وہ لوگ ہیں جو جھوٹی حدیثیں گھڑیں گے، یا وہ لوگ مراد ہیں جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کریں گے اور زیادہ تر وہ لوگ مراد ہیں جو بدعتیں رائج کریں گے، اپنے غلط سلط عقائد و خیالات اور اپنی جھوٹی اغراض و خواہشات کو صحیح اور جائز ثابت کرنے کے لئے ان کی نسبت صحابہؓ اور اگلے بزرگوں کی طرف کریں گے۔

ابن ملکؒ نے شرح مشارق میں لکھا ہے فاحذروھم کا جملہ صحیح مسلم میں مذکور نہیں ہے البتہ اس کے علاوہ دوسری روایتوں میں یہ جملہ یقیناً موجود ہے، بلکہ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ جملہ اصل حدیث یعنی حضور ﷺ کے ارشاد گرامی کا جزء نہیں ہے بلکہ حضرت جابرؓ کا اپنا قول ہے! نیز جامع میں یہ روایت بعینہ اس طرح منقول ہے جس طرح یہاں مشکوۃ میں نقل کی گئی ہے اور صاحب جامع نے کہا ہے کہ اس روایت کو امام احمدؒ اور امام مسلمؒ نے حضرت جابر ابن سمرہؓ سے نقل کیا ہے۔

③ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ اِذْ جَآءَ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ مَتَى السَّاعَةُ قَالَ اِذَا ضُيِّعَتِ الْاَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ قَالَ كَيْفَ اِضَاعَتُهَا قَالَ اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰى غَيْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ صحابہ سے (کسی سلسلہ میں) باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ایک دیہاتی (مجلس نبوی میں) آیا اور کہنے لگا کہ قیامت کب آئے گی؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب امانت، تلف کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرنے لگنا۔" دیہاتی نے پوچھا کہ امانت، کیونکر تلف کی جائے گی اور یہ نوبت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا۔ "جب حکومت و سلطنت کا کام نااہل لوگوں کے سپرد ہو جائے تو (سمجھنا کہ یہ امانت کا تلف ہو جانا ہے اور اس وقت) قیامت کا انتظار کرنا۔" (بخاریؒ)

تشریح: امانت سے مراد شریعت کی طرف سے عائد کی جانے والی ذمہ داریاں اور دین کے احکام ہیں جیسا کہ قرآن کریم کے ارشاد اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ میں امانت کا یہی مفہوم ہے یا "امانت" سے لوگوں کے حقوق اور ان کی امانتیں مراد ہیں۔ حاصل یہ کہ حضور ﷺ نے

اس دیہاتی کے پوچھنے پر یہ واضح فرمایا کہ قیامت کا متعین وقت عالم الغیوب کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا اور نہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو وہ ذریعہ بتایا ہے جس سے قیامت کا متعینہ وقت جانا جاسکے، ہاں اس نے ایسی علامتیں ضرور مقرر کی ہیں جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گی اور جو اس امر کی نشانیاں ہوں گی کہ اب قیامت قریب ہے چنانچہ ان علامتوں میں سے ایک علامت امانتوں کا ضائع کرنا ہے کہ لوگ امانتوں میں خیانت کرنے لگیں گے۔

"نا اہل" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے اندر حکومت وسیادت کی شرائط نہ رکھنے کی وجہ سے حکمراں بننے کا استحقاق نہ رکھتے ہوں گے، جیسے عورتیں، بچے جہلاء، فاسق وبدکار، بخیل اور نامرد وغیرہ، اسی طرح جو شخص قریش النسل نہ ہو وہ بھی اس باب میں "نا اہل" ہی کے زمرہ میں شمار ہوگا خواہ وہ سلاطین کی نسل سے کیوں نہ ہو، لیکن اس شرط کا تعلق خاص طور پر خلافت سے ہے! حدیث کے اس جزء کا حاصل یہ ہے کہ اگر دین ودنیا کے امور کا نظم وانتظام ایسے شخص کے ہاتھوں میں آجائے جو اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو یقیناً ان امور کا صحیح طور پر انجام پانا ممکن نہیں ہوگا اور طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے حقوق ضائع وپامال ہونے لگیں گے اور ہر شخص بے چین ومضطرب رہے گا۔

"وُسِّدَ" بصیغہ مجہول اور سین کی تشدید کے ساتھ یا تشدید کے بغیر۔ اصل میں "وسادۃ" سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی تکیہ کے ہیں، چنانچہ جس شخص کے سپرد کوئی کام کیا جاتا ہے تو گویا اس کام کے اعتبار سے اس شخص پر تکیہ کیا جاتا ہے۔

مال ودولت کی فراوانی قرب قیامت کی دلیل ہے

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَكْثُرَ الْمَالُ وَيَفِيْضَ حَتّٰى يُخْرِجَ الرَّجُلُ زَكَاةَ مَالِهِ فَلَا يَجِدُ اَحَدًا يَقْبَلُهَا مِنْهُ وَحَتّٰى تَعُوْدَ اَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوْجًا وَاَنْهَارًا رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ قَالَ تَبْلُغُ الْمَسَاكِنُ اِهَابَ اَوْيِهَابَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک مال ودولت کی فراوانی نہیں ہو جائے گی، اور فراوانی بھی اس طرح کی ہو جائے گی کہ ایک شخص اپنے مال کی زکوٰۃ نکالے گا لیکن وہ کوئی ایسا شخص نہیں پائے گا جو اس کے زکوٰۃ کا مال لے لے (کیونکہ مال ودولت کی فراوانی کسی شخص کو محتاج اور ضرور تمند نہیں چھوڑے گی اور کوئی آدمی اس طرح کے مال لینے پر تیار نہیں ہوگا اور قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی) جب تک کہ عرب کی سرزمین باغ وبہار اور نہر والی (یعنی بے حساب مال و دولت فراہم کرنے والی بن جائے۔ (مسلمؒ) اور مسلم ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ (قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ) عمارتوں اور آبادی کا سلسلہ اہاب یا یہاب تک نہ پہنچ جائے گا۔"

تشریح: "وَيَفِيْضَ" اصل میں عطف تفسیری ہے، یعنی مال ودولت کی وہ فراوانی اس طرح ہوگی کہ چاروں طرف پانی کی مانند بہتی پھرے گی اور لوگ اپنی ضرورت وحاجت سے کہیں زیادہ دولت کے مالک ہوں گے۔

اہاب اور یہاب (اور ایک نسخہ میں ی کے زبر کے ساتھ یعنی یہاب) یہ دونوں جگہ کے نام ہیں جو مدینہ کے نواح میں واقع ہیں! اہاب او یہاب میں حرف او تنویع کے لئے ہے دوسری روایت کے ان الفاظ کی مراد یہ واضح کرنا ہے کہ آخر زمانہ میں مدینہ میں اس قدر عمارتیں بنیں گی کہ ان کا سلسلہ شہر کے اردگرد نواحی علاقوں تک پہنچ جائے گا؟۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لکھا ہے کہ لفظ اہاب الف کے زبر کے ساتھ سحاب کے وزن پر ہے، اور یہ مدینہ سے چند کوس کے فاصلہ پر ایک موضع کا نام ہے نیز یہ لفظ الف کے زیر کے ساتھ بھی منقول ہے۔

حضرت امام مہدیؓ کے بارے میں پیشگوئی

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكُوْنُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ خَلِيْفَةٌ يَقْسِمُ الْمَالَ وَلَا يَعُدُّهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ يَكُوْنُ فِيْ اٰخِرِ اُمَّتِيْ خَلِيْفَةٌ اَحْثَی الْمَالَ حَثْيًا وَلَا يَعُدُّهٗ عَدًّا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "آخر زمانہ میں ایک خلیفہ (یعنی سلطان برحق) پیدا ہوگا جو ضرورت مندوں، مستحقین کو خوب مال تقسیم کرے گا اور اس کو شمار نہیں کرے گا۔ یعنی لوگوں میں بے حساب مال و دولت تقسیم کرے گا۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ میری اُمت کے آخری زمانہ میں ایک خلیفہ پیدا ہوگا جو لوگوں کو مٹھی یا چلو بھر کر (یعنی بہت زیادہ) مال و دولت دے گا اور اس کو شمار نہیں کرے گا جیسا کہ شمار کیا جاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "خلیفہ" سے مراد حضرت امام مہدیؓ ہیں جو آخر زمانہ میں ظاہر ہوں گے۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ان کے نظام حکومت کی مالی حالت بہت زیادہ اچھی ہوگی، فتوحات اور مال غنیمت وغیرہ کے ذریعہ ان کی آمدنی کا کوئی حساب نہیں ہوگا، لیکن وہ اس مال و دولت کو اپنی شان و شوکت بڑھانے اور اپنی زندگی کو پر عیش بنانے پر خرچ نہیں کریں گے یا جمع کر کے اپنے خزانوں میں بند کر کے نہیں رکھیں گے جیسا کہ ہمارے زمانہ کے حکمراں اور بادشاہوں کا دستور ہے، بلکہ وہ اس دولت کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ضروریات میں خرچ کریں گے اور اپنی طبعی سخاوت کی وجہ سے دونوں ہاتھ بھر بھر کر یہ دولت لوگوں میں تقسیم کریں گے۔

دریائے فرات سے خزانے نکلنے کی پیشگوئی

⑥ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ الْفُرَاتُ اَنْ يَّحْسُوَ عَنْ كَنْزٍ مِّنْ ذَهَبٍ فَمَنْ حَضَرَ فَلَا يَاْخُذْ مِنْهُ شَيْئًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جلد ہی وہ زمانہ آنے والا ہے جب دریائے فرات سونے کا خزانہ برآمد کرے گا (یعنی اس کا پانی خشک ہو جائے گا اور اس کے نیچے سے سونے کا خزانہ برآمد ہوگا) پس جو شخص اس وقت وہاں موجود ہو اس کو چاہئے کہ اس خزانہ میں سے کچھ نہ لے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس خزانہ میں سے کچھ لینے کی ممانعت اس بنا پر ہے کہ اس کی وجہ سے تنازعہ اور قتل و قتال کی صورت پیش آئے گی جیسا کہ اگلی حدیث میں وضاحت کی گئی ہے! اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس خزانہ میں سے کچھ بھی لینا اس لئے ممنوع ہے کہ خاص طور پر اس خزانہ میں سے کچھ حاصل کرنا آفات اور بلاؤں کے اثر کرنے کا موجب ہوگا اور ایک طرح سے یہ بات قدرت الٰہی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے! نیز بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس ممانعت کا سبب یہ ہے کہ وہ خزانہ مغضوب اور مکروہ مال کے حکم میں ہوگا جیسا کہ قارون کا خزانہ، لہٰذا اس خزانہ سے فائدہ حاصل کرنا حرام ہوگا۔

⑦ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی يَحْسُرَ الْفُرَاتُ عَنْ جَبَلٍ مِّنْ ذَهَبٍ يَقْتَتِلُ النَّاسُ عَلَيْهِ فَيُقْتَلُ مِنْ كُلِّ مِائَةٍ تِسْعَةٌ وَّتِسْعُوْنَ وَيَقُوْلُ كُلُّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ لَعَلِّيْ اَكُوْنُ اَنَا الَّذِيْ اَنْجُوْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ دریائے فرات سونے کا پہاڑ برآمد نہ کرے گا! لوگ اس کی وجہ سے (یعنی اس دولت کو حاصل کرنے اور اپنے قبضہ میں لینے کے لئے) جنگ اور قتل و قتال کریں گے، پس ان لوگوں میں سے ننانوے فیصد مارے جائیں گے، اور ہر شخص یہ کہے گا کہ شاید میں (زندہ بچ جاؤں اور) مقصد میں کامیاب

ہو جاؤں، یعنی ہر شخص اس توقع پر لڑے گا کہ شاید میں ہی کامیابی حاصل کر لوں اور اس دولت پر قبضہ جما لوں چنانچہ ننانوے فیصد لوگ اس توقع میں اپنی جان گنوا بیٹھیں گے۔" (مسلمؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی بات کو دو مختلف موقعوں پر مختلف الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے، لہٰذا دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ دریائے فرات کے نیچے سے سونے کا ایک عظیم خزانہ برآمد ہوگا جس کی مقدار پہاڑ کے برابر ہوگی۔ تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں حدیث میں پہاڑ کے برابر سونے کے جس خزانہ کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ اس خزانہ کے علاوہ ہوگا جس کا ذکر پہلی حدیث میں کیا گیا ہے اور "سونے کے پہاڑ" سے مراد سونے کی کان ہو۔

جب زمین کا سینہ اپنے خزانوں کو باہر اگل دیگا

⑧ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَقِيْءُ الْاَرْضُ اَفْلَاذَ كَبِدِهَا اَمْثَالَ الْاُسْطُوَانِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ فَيَجِيْءُ الْقَاتِلُ فَيَقُوْلُ فِيْ هٰذَا قَتَلْتُ وَيَجِيْءُ الْقَاطِعُ فَيَقُوْلُ فِيْ هٰذَا قَطَعْتُ رَحِمِيْ وَيَجِيْءُ السَّارِقُ فَيَقُوْلُ فِيْ هٰذَا قُطِعَتْ يَدِيْ ثُمَّ يَدَعُوْنَهُ فَلَا يَاْخُذُوْنَ مِنْهُ شَيْئًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" (قیامت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ) زمین اپنے جگر کے ٹکڑوں کو نکال کر باہر پھینک دے گی جو سونے چاندی کے ستونوں کے مانند ہوں گے۔ پس ایک شخص کہ جس نے محض مال حاصل کرنے کے لئے قتل کا ارتکاب کیا ہوگا آئے گا اور کہے گا کہ (کیا) اسی کے لئے میں نے لوگوں کو قتل کیا ہے، اور ایک شخص کہ جس نے ناطہ توڑا ہوگا (یعنی جس نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ احسان و سلوک نہیں کیا ہوگا) آئے گا اور کہے گا کہ (کیا) میں نے اسی مال کے لئے اپنے رشتہ داروں سے ناطہ توڑا ہے، اور پھر چور آئے گا اور کہے گا کہ (کیا) اسی مال کے لئے میرا ہاتھ کاٹا گیا ہے (یعنی ان سب کے کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مال و دولت ایسی چیز ہے جس کی محبت میں اور جس کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے ایسے ایسے گناہ کئے اور ایسی ایسی پریشانیوں سے دوچار ہوئے لیکن اب جب کہ یہ مال و دولت ہمارے سامنے اور ہمارے اختیار میں ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے اور ہمیں اس کی کوئی حاجت و ضرورت محسوس نہیں ہوتی) چنانچہ وہ سب لوگ اس مال و دولت کو یوں ہی چھوڑ دیں گے کہ کوئی بھی اس میں سے کچھ نہیں لے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "افلاذ" اصل میں "فَلْذَة" کی جمع ہے جس کے معنی کسی چیز کے اس ٹکڑے کے ہیں جس کو لمبائی میں کاٹا گیا ہو اور قاموس میں لکھا ہے کہ فِلذ (ف کے زیر کے ساتھ) کے معنی ہیں اونٹ کا جگر، جب کہ فِلذة (یعنی ۃ کے ساتھ، کے معنی ہیں جگر کا ٹکڑا، سونے یا چاندی کا ٹکڑا، اور گوشت کا ٹکڑا۔

واضح رہے کہ زمین کے جگر کے ٹکڑے سے مراد زمین کے نیچے چھپے ہوئے خزینے یعنی معدنیات ہیں اور معدنیات کو "جگر کے ٹکڑوں" سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے، زمین کا خلاصہ اور جوہر اصل میں معدنیات ہی ہیں جیسا کہ اونٹ کی سب سے اصل چیز اس کا جگر ہوتا ہے نیز معدنیات، زمین کی چیزوں میں سے سب سے زیادہ قابل اعتناء اور سب سے زیادہ پسندیدہ چیز ہے جیسا کہ پیٹ کے اندر کی چیزوں میں سے جگر ہی سب سے اعلیٰ چیز ہے۔

بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آخر زمانہ میں زمین کا سینہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے اندر چھپے ہوئے خزانوں کو باہر اگل دے گا ہر طرف معدنیات کا کام زور شور کے ساتھ جاری ہوگا اور ایک ایک ملک میں مختلف قسم کی مفید و کارآمد اور قیمتی چیزیں کانوں کے ذریعہ نکالی جائیں گی جس کے ذریعہ نسل انسانی مال و دولت کی فراوانی میں غرق ہو جائے گی۔

آخری زمانہ کے بارے میں ایک پیشگوئی

⑨ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَمُرَّ الرَّجُلُ عَلَى الْقَبْرِ فَيَتَمَرَّغُ عَلَيْهِ وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَكَانَ صَاحِبِ هٰذَا الْقَبْرِ وَلَيْسَ بِهِ الدِّيْنُ اِلَّا الْبَلَاءُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قسم ہے اس ذات کی) جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ دنیا اس وقت تک اختتام پذیر نہیں ہوگی جب تک کہ ایسا زمانہ نہیں آجائے گا کہ آدمی قبر کے پاس سے گزرے گا اور پھر لوٹ کر قبر پر آئے گا اور (حسرت سے) کہے گا کہ کاش! میں اس قبر والے کی جگہ ہوتا۔ اور یہ اس کا دین نہیں ہوگا بلکہ بلا ہوگی۔" (مسلمؒ)

تشریح: علماء نے حدیث کے آخری جملہ۔ "اور یہ اس کا دین نہیں ہوگا...... الخ۔" کے دو مطلب بیان کئے ہیں، ایک تو یہ کہ "دین" سے مراد عادت ہے اور ویسے "دین" عادت کے معنی میں آتا بھی ہے، لہٰذا مراد یہ ہے کہ وہ شخص جب قبر کے پاس سے گذرے گا اور پھر لوٹ کر قبر پر آئے گا اور اپنی مذکورہ خواہش و آرزو کا اظہار کرے گا تو اس کا وہ لوٹنا اور اس کا آرزو کا اظہار کرنا اس کی کسی عادت کے مطابق نہیں ہوگا بلکہ اس فتنہ وبلا کی وجہ سے ہوگا جس میں وہ گرفتار ہوگا! دوسرا مطلب یہ ہے کہ "دین" سے مراد اس کے مشہور معنی دین ومذہب ہیں اس صورت میں اس جملہ کی وضاحت یہ ہوگی کہ اس کا قبر پر لوٹ کر آنا اور وہاں کھڑے ہو کر مذکورہ خواہش و حسرت کا اظہار کرنا کسی ایسے فتنہ وبلا میں گرفتار ہونے کی وجہ سے نہیں ہوگا جو اس کے دین اور اس کے آخری معاملات کو نقصان پہنچانے یا تباہ کرنے کا سبب بنا ہو بلکہ کسی ایسی مصیبت وبلا میں گرفتاری کی وجہ سے ہوگا جس نے اس کی دنیا کو نقصان پہنچایا یا تباہ کیا ہوگا! ان دونوں وضاحتوں کے علاوہ ایک اور وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کا قبر پر لوٹ کر آنا اور مذکورہ حسرت کے اظہار کی صورت میں گویا موت کی آرزو کرنا ایک ایسے وقت کی بات ہوگی جب کسی فتنہ وبلا کے سبب اس کا دین جاتا رہا ہوگا اور اس وقت اس کے پاس اس فتنہ وبلاء کے مضر اثرات کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

ایک آگ کے بارے میں پیشگوئی

⑩ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَخْرُجَ نَارٌ مِّنْ اَرْضِ حِجَازٍ تُضِيْءُ اَعْنَاقَ الْاِبِلِ بِبُصْرٰى۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ حجاز سے ایک آگ نہ بھڑک لے گی جو بصریٰ کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن کردے گی۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: "بصریٰ" ملک شام کے ایک شہر کا نام ہے جو دمشق سے تین منزل کی مسافت کے فاصلہ پر واقع ہے اور "حجاز" جزیرۃ العرب کے اس علاقہ کو کہا جاتا ہے جس میں مکہ اور مدینہ بھی شامل ہیں! اس حدیث میں جس آگ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق تواتر کے ساتھ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ اس آگ کے نمودار ہونے کا حادثہ پیش آچکا ہے اور ان روایات سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ اس آگ کے زیر اثر آنے والا زیادہ تر حصہ مدینہ منورہ ہی کے علاقہ پر مشتمل تھا مگر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سرور کائنات ﷺ کی برکت سے مدینہ کے شہریوں کو اس آگ کی آفت وتباہ کاری سے محفوظ ومامون رکھا بیان کیا جاتا ہے کہ ۳ جمادی الثانی ۶۵۰ھ جمعہ کے دن وہ آگ نمودار ہوئی اور ۲۷ رجب ۶۵۰ھ بروز اتوار تک یعنی مسلسل بارہ دن تک ظاہر رہی! راویوں نے اس کی کیفیت یہ لکھی ہے کہ اچانک حجاز کی جانب سے وہ آگ نمودار ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگ کا ایک پورا شہر ہے جس میں قلع یا برج اور کنگورے جیسی چیزیں موجود ہیں اور انسانوں کا اژدہام اس شہر کو کھینچے چلا آرہا ہے، اس آگ کا سلسلہ جس پہاڑ تک پہنچتا اس کو شیشے اور موم کی طرح پگھلا کر رکھ دیتا تھا، اس

کے شعلوں میں بجلی کی کڑک جیسی آواز اور دریا کے تموج جیسا جوش تھا، اور یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر سے سرخ اور نیلے رنگ کے دریا نکل رہے ہوں، وہ آگ اس کیفیت کے ساتھ مدینہ منورہ تک پہنچی مگر عجیب تر بات یہ تھی کہ اس کے شعلوں کی طرف سے جو ہوا مدینہ تک آ رہی تھی وہ ٹھنڈی تھی! علماء نے لکھا ہے کہ اس آگ کی لپٹیں مدینہ کے تمام جنگلوں تک کو منور کیے ہوئے تھیں یہاں تک کہ حرم نبوی اور مدینہ کے تمام گھروں میں سورج کی طرح روشنی پھیل گئی تھی، لوگ رات کے وقت اسی کی روشنی میں اپنے سارے کام کاج کرتے تھے بلکہ ان دنوں میں اس پورے علاقہ پر سورج اور چاند کی روشنی معطل اور ماند ہو گئی تھی، مکہ معظمہ کے بعض لوگوں نے یہ شہادت دی کہ انہوں نے وہ روشنی یمامہ اور بصری تک دیکھی۔ اس آگ کی عجیب خصوصیات میں سے ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ پتھروں کو تو جلا کر کوئلہ کر دیتی تھی مگر درختوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جنگل میں ایک بہت بڑا پتھر پڑا تھا جس کا آدھا حصہ حرم مدینہ کی حدود میں تھا اور آدھا حصہ حدود حرم سے باہر تھا آگ نے پتھر کے اس آدھے حصہ کو جلا کر کوئلہ کر دیا جو حدود حرم سے باہر تھا لیکن جب اس آدھے حصہ تک پہنچی جو حدود حرم میں تھا تو ٹھنڈی پڑ گئی اور پتھر کا وہ آدھا حصہ بالکل محفوظ رہا! بہر حال اس عجیب و غریب ہیبتناک آگ نے اہل مدینہ پر بڑا خوف و ہراس طاری کر دیا، لوگوں نے رو رو کر خدا سے اس آتشی فتنہ کے دفعیہ کے لئے دعا کی اپنی عملی اور دینی کوتاہیوں کی طرف متوجہ ہوئے جس کے ذمہ جس کا جو حق تھا وہ اس کی ادائیگی میں لگ گیا صدقہ و خیرات اور غلاموں کو آزاد کرنا شروع کر دیا اور جمعہ کی رات میں تمام اہل مدینہ یہاں تک کہ عورتیں اور بچے حرم شریف میں جمع ہو گئے اور سب لوگ حجرۂ شریف (روضۂ اقدس) کے چاروں طرف ننگے سر بیٹھے روتے اور گڑگڑاتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے حفظ و امان کی دعائیں مانگتے رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آگ کا رخ شمال کی جانب پھیر دیا اور مدینہ منورہ کو اس سے محفوظ و مامون کر دیا علماء لکھتے ہیں کہ اس آگ کا نمودار ہونا قدرت الٰہی کی ایک عبرت انگیز نشانی تھی، اس سال تمام دنیا میں مختلف قسم کے عجیب و غریب حادثات و وقائع کا ظہور ہوا اور اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد مختلف علاقوں میں خون ریز جنگ اور قتل و قتال کی وہ مہیب آگ بھڑکی جس نے بغداد جیسے عظیم شہر کو تاراج کر دیا اور تاتاریوں کے فتنہ کی صورت میں عالم اسلام کو سخت نقصان سے دو چار کیا۔

قیامت کی پہلی علامت

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَّلُ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ نَارٌ تَحْشُرُ النَّاسَ مِنَ الْمَشْرِقِ اِلَى الْمَغْرِبِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کی علامتوں میں سے پہلی علامت وہ آگ ہو گی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو علامتیں قیامت کے بالکل قریب ظہور پذیر ہوں گی ان میں سب سے پہلی علامت وہ آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف ہانک کر لے جائے گی، ورنہ ظاہر ہے کہ اس آگ کو قیامت کی سب سے پہلی علامت کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ حضور ﷺ نے اس آگ کو بھی قیامت کی علامتوں میں سے شمار کیا ہے، جس کا ذکر اوپر کی حدیث میں گذرا اور جو روایت کے مطابق ۶۵۰ھ میں نمودار بھی ہو چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

زمانہ کی تیز رفتاری، قیامت کی علامتوں میں سے ہے

(۱۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَقَارَبَ الزَّمَانُ فَتَكُوْنَ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ

وَالشَّھْرُ کَالْجُمُعَةِ وَتَکُوْنُ الْجُمُعَةُ کَالْیَوْمِ وَیَکُوْنُ الْیَوْمُ کَالسَّاعَةِ وَتَکُوْنُ السَّاعَةُ کَالضَّرْمَةِ بِالنَّارِ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ زمانہ قریب نہ ہو جائے گا (یعنی زمانہ کی گردش تیز نہ ہو جائے گی اور دن و رات جلد جلد نہ گذرنے لگیں گے اور زمانہ کی تیز رفتاری اس کیفیت و حالت کے ساتھ ہوگی کہ) سال مہینہ کے برابر، مہینہ ہفتہ کے برابر ہو جائے گا، اور ایک گھنٹہ اتنا مختصر ہو جائے گا جیسے آگ کا شعلہ (گھاس کے تنکے پر) سلگ جاتا ہے (یعنی جھٹ سے جل کر بجھ جاتا ہے۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آخر زمانہ میں دنوں اور ساعتوں میں برکت کم ہو جائے گی، وقت اس قدر جلد اور تیزی کے ساتھ گزرتا معلوم ہوگا کہ اس کا فائدہ مند اور کار آمد ہونا معدوم ہو جائے گا یا یہ مراد ہے کہ اس زمانہ میں لوگ تفکرات اور پریشانیوں میں گھرے رہنے اور اپنے دل و دماغ پر بڑے بڑے فتنوں، نازل ہونے والے مصائب و آفات اور طرح طرح کی مشغولیتوں کا شدید تردد باور کھنے کی وجہ سے وقت کے گذرنے کا ادراک و احساس تک نہیں کر پائیں گے، اور انہیں یہ جاننا مشکل ہو جائے گا کہ کب دن گذر گیا اور کب رات ختم ہوگئی خطابی ؒ نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے زمانہ اور وقت کی جس تیز رفتاری کا ذکر فرمایا ہے اس کا ظہور حضرت عیسی علیہ السلام اور امام مہدی ؓ کے زمانہ میں ہوگا۔

بہ تبہ سے دار الخلافہ کی منتقلی ایک بری علامت ہے

⑬ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ حَوَالَةَ قَالَ بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِنَغْنَمَ عَلٰی اَقْدَامِنَا فَرَجَعْنَا فَلَمْ نَغْنَمْ شَیْئًا وَّعَرَفَ الْجُھْدَفِی وُجُوْھِنَا فَقَامَ فِیْنَا فَقَالَ اَللّٰھُمَّ لَاتَکِلْھُمْ اِلَیَّ فَاَضْعُفَ عَنْھُمْ وَلَا تَکِلْھُمْ اِلٰی اَنْفُسِھِمْ فَیَعْجِزُوْا عَنْھَا وَلَا تَکِلْھُمْ اِلَی النَّاسِ فَیَسْتَاْثِرُوْا عَلَیْھِمْ ثُمَّ وَضَعَ یَدَہٗ عَلٰی رَاْسِیْ ثُمَّ قَالَ یَا بْنَ حَوَالَةَ اِذَا رَاَیْتَ الْخِلَافَةَ قَدْ نَزَلَتِ الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ فَقَدْدَنَتِ الزَّلَازِلُ وَالْبَلَابِلُ وَالْاُمُوْرُ الْعِظَامُ وَالسَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنَ النَّاسِ مِنْ یَدِیْ ھٰذِہٖ اِلٰی رَاْسِكَ۔ (رواہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن حوالہ ؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے ہمیں جہاد کرنے کے لئے بھیجا تا کہ ہم مال غنیمت حاصل کر سکیں اور اس کے ذریعہ اپنی ضروریات پوری کریں) ہمارا وہ سفر پیدل تھا (یعنی چونکہ ہمارے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لئے ہمیں سفر جہاد میں پیدل ہی روانہ ہونا پڑا) اور (جب) ہم اس جہاد سے (باعافیت و سلامت) واپس ہوئے تو ہمارے ساتھ کچھ بھی مال غنیمت نہیں تھا (جس کا ہمیں غم و افسوس تھا) چنانچہ حضور علیہ السلام ہمارے چہروں پر اداسی اور مایوسی دیکھ کر۔ ہمیں تسلی دینے اور ہمارے حق میں دعا کرنے کے لئے) ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور (بطور دعا) فرمایا کہ۔ "پروردگار! ان لوگوں کو میرے سپرد فرما، ایسا نہ ہو کہ میں ان کی خبر گیری کی طاقت نہ رکھوں۔ ان کو خود ان کے سپرد فرما کیونکہ یہ اپنے امور کی انجام دہی سے عاجز ہوں گے، اور نہ ان کو دوسرے لوگوں کے سپرد فرما اور دوسروں کا محتاج بنا کیونکہ لوگ ان کی حاجتوں اور ضرورتوں پر اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو مقدم رکھیں گے۔" (حضرت عبداللہ ابن حوالہ ؓ کہتے ہیں کہ) اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سر پر رکھا اور فرمایا۔ "اے ابن حوالہ (جب تم دیکھو کہ خلافت ارض مقدس میں پہنچ گئی ہے (یعنی مسلمانوں کا دار الخلافہ مدینہ سے منتقل ہو کر ملک شام پہنچ گیا ہے) تو سمجھ لینا کہ زلزلے بلبلے، اور (وہ بڑے بڑے حادثے (کہ جن کا تعلق قیامت سے ہے) قریب آ پہنچے ہیں اور اس دن قیامت لوگوں سے اتنی قریب ہوگی جتنا میرا ہاتھ تمہارے سر سے قریب ہے۔"

تشریح: "تا کہ ہم مال غنیمت حاصل کر سکیں۔" بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن حوالہ ؓ اور ان کے ساتھیوں کی مالی حالت بہت سقیم ہوگی اور وہ لوگ سخت غریب اور افلاس کا شکار ہوں گے، لہٰذا اس جہاد کے لئے حضور ﷺ نے بطور خاص ان لوگوں کا

انتخاب فرمایا ہوگا تاکہ اس جہاد میں جو مال غنیمت حاصل ہو اس کے ذریعہ یہ لوگ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کر سکیں) غالباً اسی بنا پر غذا کا صریح ذکر نہیں فرمایا بلکہ مال غنیمت ہی کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔

"ان لوگوں کو میرے سپرد نہ فرما۔" کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ غربت و افلاس کا شکار ہیں اور میں نے ان کی اسی غربت و افلاس کی بنا پر ان کو جہاد میں بھیجا تھا تاکہ جہاد کا فریضہ بھی انجام پا جائے اور حاصل ہونے والے مال غنیمت کے ذریعہ ان کو اپنی ضرورت و احتیاج کو دور کرنے کا وسیلہ بھی فراہم ہو جائے، مگر ان کی قسمت کی بات کہ ان کو اس جہاد میں مال غنیمت ہی حاصل نہیں ہو سکا، پس اے خدا! اب تو ہی ان کی ضروریات کے تکفل کا کوئی اور وسیلہ پیدا فرما دے، ان کی ذمہ داری میرے اوپر نہ ڈال کیونکہ میں ان کی غمخواری اور ان کی خبر گیری کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا! واضح رہے کہ حضور ﷺ نے یہ بات اس حقیقت کے پیش نظر فرمائی کہ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی طاقت و قوت نہیں رکھتا اگر خدا کی طرف سے اس کو وسائل و ذرائع حاصل نہ ہوں تو وہ خود اپنی ذات کی خبر گیری سے عاجز و بے بس رہتا ہے چہ جائیکہ کسی دوسرے کی خبر گیری کا بوجھ اٹھا سکے اسی لئے ایک دعا میں حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں عرض رسا ہوئے اَللّٰھُمَّ لَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ یعنی اے اللہ! پلک جھپکنے کے برابر بھی مجھ کو خود میرے سپرد نہ فرما بلکہ میری حفاظت و ضمانت بس تو اپنے ہی ذمہ رکھ) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ (یعنی اے محمد کہدیجئے کہ اپنی ذات کے تئیں نہ میں نفع کا مالک ہوں اور نہ نقصان کا، علاوہ اس چیز کے جو اللہ کو (میرے حق میں) منظور ہو! اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے کمال عبدیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عاجز سمجھے اور یہ اعتراف و اظہار کرے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق اور اس کے حکم و فیصلہ کے بغیر کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی کسی چھوٹی سی چھوٹی ذمہ داری کو پورا کرنے کی طاقت و قدرت نہیں رکھتا، چنانچہ توحید کامل یہی وہ سبق ہے جو لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ میں مذکور ہے اور جس کو ہر بندہ اپنی زبان سے دہرانے اور اس پر یقین رکھنے کا پابند بنایا گیا ہے! ابن عدیؒ نے کتاب کامل میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت الیاس اور حضرت خضر علیہما السلام ہر سال کسی نہ کسی وقت ملتے ہیں، چنانچہ جب ان کے ملنے کا وقت آتا ہے تو ان میں سے ہر ایک، دوسرے کو تلاش کرتا ہے اور پھر ملاقات کے بعد دونوں ہی یہ کلمات کہتے ہوئے جدا ہوتے ہیں بِسْمِ اللّٰهِ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا یَسُوْقُ الْخَیْرَ اِلَّا اللّٰهُ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا یَصْرِفُ السُّوْءَ اِلَّا اللّٰهُ مَاشَاءَ اللّٰهُ مَا کَانَ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ!

چونکہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی جناب باری تعالیٰ میں سب سے زیادہ قرب رکھتی ہے اس لئے آپ ﷺ نے ان لوگوں کی ذمہ داری نہ سونپے جانے کی دعا سب سے پہلے اپنی ذات کے تئیں فرمائی اس کے بعد اس دعا میں دوسرے لوگوں کو بھی شامل فرمایا کہ جس طرح میں اپنی کمزوری اور عجز کی بنا پر شاید ان کی خبر گیری کی ذمہ داری کا انجام نہ دے سکوں اسی طرح دوسرے لوگ خود اپنی ذات کے نفع نقصان کو ترجیح دینے کے سبب ان کی خبر گیری نہیں کر سکیں گے، چنانچہ حقیقت بھی یہی ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا شکار ہوتے ہیں اور صرف اپنی ذات کے نفع نقصان سے مطلب رکھنے کی عادت میں گرفتار ہوتے ہیں وہ کسی دوسرے کی بڑی سے بڑی ضرورت و حاجت کو اپنی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت و حاجت پر بھی ترجیح نہیں دیتے اور اگر ان کے سپرد کوئی ذمہ داری ہوتی ہے تو وہ اس کی انجام دہی میں ہر مرحلہ پر اپنی ذات کے فائدے کو مقدم رکھتے ہیں! بہرحال حضور ﷺ کی پوری دعا کا حاصل یہ تھا کہ اے پروردگار! ان لوگوں کی ذمہ داری میرے سپرد نہ فرما کیونکہ میں ان کی کفالت و خبر گیری کی ذمہ داری انجام دینے کی طاقت و قدرت نہیں رکھتا اس لئے تو خود ان کی ذات کو ان کی کفالت کا ذمہ دار بنا کیونکہ اول یہ لوگ ذاتی وسائل و ذرائع نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی ذات کی کفالت کا بوجھ بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں، دوسرے ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ خواہشات نفس کی زیادتی اور بے راہ روی کا شکار ہو جائیں اور اپنی معاشی و سماجی زندگی کی خوش حالی کے لئے ایسے راستوں پر لگ جائیں جو ان کے دین و آخرت کے لئے نقصان و تباہی کا سبب بن جائے۔ اسی طرح اے پروردگار! ان کی ذمہ داری دوسرے لوگوں کے سپرد نہ فرما اور ان کو کسی کا محتاج نہ بنا کیونکہ وہ دوسرے، اپنی ذاتی اغراض اور اپنے خود کے

مفاد کو ان کے مفاد پر ترجیح دیں گے اور ان کی خبر گیری کا حق ادا نہیں کریں گے جس سے یہ اور زیادہ پریشان و تباہ ہو جائیں گے۔ پس اے خدا یہ تیرے بندے اور تیرے نام لیوا ہیں، تو ان کو اپنا ہی محتاج بنا اور ان کے ساتھ وہی معاملہ فرما جو آقا اپنے غلاموں کے ساتھ کرتا ہے۔

اس وضاحت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس دعا سے آنحضرت ﷺ کا اصل مقصد امت کو اس امر کی تعلیم و تلقین کرنا ہے کہ بندے کو چاہئے کہ وہ اپنا ہر کام اور اپنا ہر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے، یعنی اپنی تدبیر و سعی اور ظاہری وسائل و ذرائع پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے پروردگار کی مشیت و مرضی پر بھروسہ کرے، اسی کی ذات پر یقین و اعتماد رکھے، اس کے علاوہ کسی اور پر بھروسہ و اعتماد نہ رکھے، کسی دوسرے کی ذات سے امید وابستہ نہ کرے کیونکہ جو شخص صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتا ہے اور اسی کی ذات پر یقین و اعتماد رکھتا ہے اللہ تعالیٰ یقیناً اس کا کارساز بنتا ہے اور اس کے ہر کام و معاملہ کو، خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی، بہتر انجام اور کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، اللہ اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

"زلزلہ" کا مطلب زمین کا ہلنا، بھونچال آنا ہے، اسی لئے بلبلے سے مراد مختلف قسم کے غم و آلام اور تفکرات اور پریشانیاں ہیں، اور گویا یہ چیزیں قیامت کے اس سب سے بڑے زلزلے کے آنے کی علامت اور مقدمہ ہوں گی جس کے نتیجہ میں یہ پوری کائنات زیر و زبر ہو کر رہ جائے گی اور دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا اور جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں دی ہے اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا واضح رہے کہ مذکورہ باتیں بالکل آخر زمانہ میں واقع ہوں گی جب کہ بیت المقدس فتح ہو گا اور اس پر مسلمانوں کا کامل تسلط ہو جائے گا۔

مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی ہے لیکن جزری ؒ نے اس لفظ کے بعد اس عبارت کو شامل کیا ہے ابوداؤد واسنادہ حسن ورواہ الحاکم فی صحیحہ (یعنی اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور اس کی اسناد حسن ہے، نیز اس روایت کو حاکم نے بھی اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔

قیامت کی علامتیں

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اتُّخِذَ الْفَیْءُ دُوَلًا وَالْاَمَانَةُ مَغْنَمًا وَالزَّكٰوةُ مَغْرَمًا وَتُعُلِّمَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ وَ اَطَاعَ الرَّجُلُ امْرَاَتَهٗ وَعَقَّ اُمَّهٗ وَاَدْنٰى صَدِيْقَهٗ وَاَقْصٰى اَبَاهُ وَظَهَرَتِ الْاَصْوَاتُ فِی الْمَسَاجِدِ وَسَادَ الْقَبِيْلَةَ فَاسِقُهُمْ وَكَانَ زَعِيْمُ الْقَوْمِ اَرْذَلَهُمْ وَاُكْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهٖ وَظَهَرَتِ الْقَيْنَاتُ وَالْمَعَازِفُ وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ وَلَعَنَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا فَارْتَقِبُوْا عِنْدَ ذٰلِكَ رِيْحًا حَمْرَاءَ وَزَلْزَلَةً وَخَسْفًا وَمَسْخًا وَقَذْفًا وَاٰيَاتٍ تَتَابَعُ كَنِظَامٍ قُطِعَ سِلْكُهٗ فَتَتَابَعَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب مال غنیمت کو دولت قرار دیا جانے لگے، اور جب زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جانے لگے، اور جب علم کو دین کے علاوہ کسی اور غرض سے سکھایا جانے لگے، اور جب مرد بیوی کی اطاعت کرنے لگے اور جب ماں کی نافرمانی کی جانے لگے، اور جب دوستوں کو تو قریب اور باپ کو دور کیا جانے لگے اور جب مسجد میں شور و غل مچایا جانے لگے اور جب قوم وجماعت کی سرداری، اس قوم و جماعت کے فاسق شخص کرنے لگیں اور جب قوم وجماعت کے زعیم و سربراہ اس قوم وجماعت کے کمینہ اور رذیل شخص ہونے لگیں اور جب آدمی کی تعظیم اس کے شر اور فتنہ کے ڈر سے کی جانے لگے اور جب لوگوں میں گانے والیوں اور سازو باجوں کا دور دورہ ہو جائے اور جب شرابیں پی جانی لگیں اور جب اس اُمت کے پچھلے لوگ اگلے لوگوں کو برا کہنے لگیں اور ان پر لعنت بھیجنے لگیں تو اس وقت تم ان چیزوں کے جلدی ظاہر ہونے کا انتظار کرو سرخ یعنی تیز و تند اور شدید ترین طوفانی آندھی کا، زلزلہ کا، زمین میں دھنس جانے کا، صورتوں کے مسخ و تبدیل ہو جانے کا، اور پتھروں کے برسنے کا، نیز ان چیزوں کے علاوہ قیامت اور تمام نشانیوں اور علامتوں کا

انتظار کرو، جو اس طرح پے در پے وقوع پذیر ہوں گی جیسے (مثلاً موتیوں کی) لڑی کا دھاگہ ٹوٹ جائے اور اس کے دانے پے در پے گرنے لگیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں کچھ ان برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اگرچہ دنیا میں ہمیشہ موجود رہی ہیں اور کوئی بھی زمانہ ان برائیوں سے خالی نہیں رہا ہے، لیکن جب معاشرہ میں یہ برائیاں کثرت سے پھیل جائیں اور غیر معمولی طور پر ان کا دور دورہ ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ خدا کا سخت ترین عذاب خواہ وہ کسی شکل و صورت میں ہو، اس معاشرہ پر نازل ہونے والا ہے اور دنیا کے خاتمہ کا وقت قریب تر ہو گیا ہے۔

دَوَلْ اصل میں دَوْلَة یا دُوْلَة کی جمع ہے جس کے لغوی معنی انقلاب زمانہ کے ہیں اور ہر اس چیز کو بھی "دولت" کہتے ہیں جو کبھی کسی کے لئے ہو اور کبھی کسی کے لئے اسی وجہ سے اس لفظ کا مال وزر اور حلیہ و اقتدار پر ہوتا ہے! نیز بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ لفظ دُوْلَة (دال کے پیش کے ساتھ) تو اس چیز کا اسم ہے جو از قسم مال کسی شئے کو حاصل کرے یعنی مال غنیمت اور دال کے زبر کے ساتھ یعنی دَوْلَة کے معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پلٹنا یعنی سختی و پریشانی اور تنگدستی کی حالت کا ختم ہو جانا اور اطمینان و راحت اور خوشحالی کا آجانا بہرحال مال غنیمت کو دولت قرار دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کے ذریعہ دشمنوں سے جو مال حاصل ہوتا ہے اور جس کو "مال غنیمت" کہا جاتا ہے وہ شرعی طور پر تمام غازیوں اور مجاہدوں کا مشترک حق ہے اور اس مال کو ان تمام حقداروں پر، خواہ وہ کسی بھی حیثیت وحالت کے ہوں، تقسیم کرنا واجب ہے، لیکن اگر اسلامی لشکر و سلطنت کے اہل طاقت و ثروت اور اونچے عہدے دار اس مال غنیمت کو شرعی حکم کے مطابق تمام حقداروں کو تقسیم کرنے کے بجائے خود اپنے درمیان تقسیم کر کے بیٹھ جائیں اور محتاج و ضرورت مند اور چھوٹے لوگوں کو اس مال سے محروم رکھ کر اس کو صرف اپنے مصرف میں خرچ کرنے لگیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اس مال غنیمت کے تمام حقداروں کا مشترکہ حق نہیں سمجھتے بلکہ اپنی ذاتی دولت سمجھتے ہیں۔

"امانت کو مال غنیمت شمار کرنے" سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس امانتیں محفوظ کرائی جائیں وہ ان امانتوں میں خیانت کرنے لگیں اور امانت کے مال کو غنیمت کی طرح اپنا ذاتی حق سمجھنے لگیں جو دشمنوں سے حاصل ہوتا ہے۔

"زکوٰۃ کو تاوان سمجھنے" کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا لوگوں پر اس طرح شاق اور بھاری گذرنے لگے گا کہ گویا ان سے ان کا مال زبردستی چھینا جا رہا ہے اور جیسے کوئی شخص تاوان اور جرمانہ کرتے وقت سخت تنگی اور بوجھ محسوس کرتا ہے۔

علم کو دین کے علاوہ کسی اور غرض سے سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ علم سکھانے اور علم پھیلانے کا اصل مقصد دین و شریعت کی عمل اور اخلاق و کردار کی اصلاح و تہذیب انسانیت اور سماج کی فلاح و بہبود اور خدا اور رسول کا قرب و خوشنودی حاصل کرنا نہ ہو بلکہ اس کے ذریعہ دنیا کی عزت، مال و دولت، جاہ و منصب اور ایوان اقتدار میں تقرب حاصل کرنا مقصود ہو۔

"مرد کا بیوی کی اطاعت کرنا" یہ ہے کہ خاوند، زن مرید ہو جائے اور اس طرح بیوی کا حکم ماننے اور اس کی ہر ضرورت پوری کرنے لگے کہ اس کی وجہ سے خدا کے حکم و ہدایت کی صریح خلاف ورزی ہو۔

"ماں کی نافرمانی کرنے" سے مراد یہ ہے کہ ماں کی اطاعت و فرمانبرداری کا جو حق ہے اس سے لاپرواہ ہو جائے اور کسی شرعی وجہ کے بغیر اس کی نافرمانی کر کے اس کا دل دکھائے واضح رہے کہ یہاں صرف ماں کی تخصیص اس اعتبار سے ہے کہ اولاد کے لئے چونکہ باپ کی بہ نسبت ماں زیادہ مشقت اور تکلیف برداشت کرتی ہے اس لئے وہ اولاد پر باپ سے زیادہ حق رکھتی ہے۔

"دوستوں کو قریب اور باپ کو دور کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اپنا وقت باپ کی خدمت میں حاضر رہنے، اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور اس کی دیکھ بھال میں صرف کرنے کے بجائے دوستوں کے ساتھ مجلس بازی کرنے، ان کے ساتھ گپ شپ اور سیر و تفریح کرنے میں صرف کرے اور اپنے معمولات و حرکات سے ایسا ظاہر کرے کہ اس کو باپ سے زیادہ دوستوں کے ساتھ تعلق و موانست ہے۔

"مسجد میں شور و غل کرنے" سے مراد یہ ہے کہ مسجدوں میں زور زور سے باتیں کی جائیں، چیخ و پکار کے ذریعہ مسجد کے سکون میں

خلل ڈالا جائے اور اس کے ادب واحترام سے لاپرواہی برتی جائے! واضح رہے کہ بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ مسجد میں آواز کو بلند کرنا حرام ہے، خواہ اس کا تعلق ذکر اللہ ہی سے کیوں نہ ہو۔

"کسی قوم وجماعت کا سردار اس قوم کے فاسق کے ہونے۔" سے مراد یہ ہے کہ قیادت وسیادت اگر ایسے لوگوں کے سپرد ہونے لگے جو بدکردار، بدقماش اور بے ایمان ہو تو یہ بات پوری جماعت اور پوری قوم کے لئے تباہی کی علامت ہوگی! واضح رہے کہ قوم، جماعت کے حکم میں شہر اور گاؤں اور محلّہ بھی شامل ہیں! اسی طرح اگر کسی قوم وجماعت کے زعما ان لوگوں کو قرار دیا جانے لگے جو اپنی قوم وجماعت کے کمینہ، بے کردار اور رذیل ترین ہوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس قوم وجماعت کی تباہی کے دن آ گئے ہیں۔

"آدمی کی تعظیم، اس کے فتنہ وشر کے ڈر سے کی جانے" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی تعظیم واحترام کا معیار اس کی ذاتی فضیلت وعظمت نہ ہو بلکہ اس کی برائی اور اس کے شر کا خوف ہو۔ یعنی کسی شخص کی اس لئے تعظیم کی جائے کہ وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے یا ستانے کی طاقت رکھتا ہے، جیسے کسی فاسق وبدقماش شخص کو اقتدار وغلبہ حاصل ہو جائے اور لوگ اس کی عزت اور اس کی تعظیم کرنے پر مجبور ہوں۔

"گانے والیوں" سے مراد کنچنیاں، ڈومنیاں اور نائنیں وغیرہ ہیں! اور "قَيْنَاتٌ" قنة کی جمع ہے، جس کے اصل معنی گانے والی لونڈی کے ہیں، اسی طرح "باجوں" سے مراد ہر قسم کے ساز وباجے اور گانے بجانے کے آلات ہیں جن کو شرعی اصطلاح میں "مزامیر" کہا جاتا ہے جیسے ڈھولک، ہارمونیم، طبلہ، سارنگی اور شہنائی وغیرہ۔

"شرابوں" جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہاں شراب کی تمام انواع واقسام اور دیگر دوسری نشہ آور اشیاء بھی مراد ہیں۔

"جب اس اُمت کے پچھلے لوگ، اگلے لوگوں کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔" میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ برائی اسی اُمت کے ساتھ مخصوص ہے، گذشتہ امتوں کے لوگوں میں اس برائی کا چلن نہیں تھا۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے رافضی لوگ اس برائی میں مبتلا ہیں کہ وہ ان گذرے ہوئے اکابر یعنی صحابہؓ تک کے بارے میں زبان لعن وطعن دراز کرتے ہیں جن کے حق میں اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے۔

وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔

"جن لوگوں نے سبقت کی (یعنی سب سے) پہلے (ایمان لائے) مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی، خدا ان سب سے خوش ہے!۔"

اور ایک آیت میں یہ فرمایا کہ:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ۔

"(اے محمد ﷺ) جب مؤمن آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوا۔"

کس قدر بدنصیبی اور شقاوت کی بات ہے کہ جن بندگان خاص سے اللہ تعالیٰ راضی وخوش ہوا ان سے ناراضگی وناخوشی ظاہر کی جائے اور ان کے خلاف ہفوات بکے جائیں۔؟ ان بندگان خاص کے مناقب وفضائل سے قرآن وحدیث بھرے ہوئے ہیں، وہ پاک نفوس ایسی عظیم ہستیاں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے خدا کے دین کو قبول کیا، قبول ایمان میں سبقت حاصل کی، نہایت سخت اور صبر آزما حالت میں خدا کے نبی ﷺ کی مدد حمایت کی، اللہ کے دین کا پرچم سربلند کرنے کے لئے اپنی جانوں کی بازیاں لگائیں، جہاد کے ذریعہ اسلام کی شوکت بڑھائی، بڑے بڑے شہر اور ملک فتح کئے، کسی واسطہ کے بغیر سید الامام علیہ الصلوۃ والسلام سے دین کا علم حاصل کیا، شریعت کے احکام ومسائل سیکھے، دین کی بنیاد یعنی قرآن کریم کو سب سے زیادہ جانا اور سمجھا، اور مقدس، ہستیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قران کریم کے ذریعہ امت کے تمام لوگوں کو یہ تلقین فرمائی کہ ان کے حق میں یوں گویا ہوں۔

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔

"اے پروردگار! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش جنہوں نے قبول ایمان میں ہم پر سبقت حاصل کی ہے۔"

لیکن اس (رافضیوں) کے وہ لوگ کہ جو یا تو ایمان کی روشنی کھو چکے ہیں، یا دیوانے ہو گئے ہیں، ان مقدس، ہستیوں اور اُمّت کے سب سے افضل لوگوں کے بارے میں صرف زبان لعن وطعن دراز کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ محض اپنے گندے خیالات ونظریات اور سڑے ہوئے فہم کی وجہ سے یہ کہہ کر ان پاک نفسوں کی طرف کفر کی بھی نسبت کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ نے بلا استحقاق خلافت پر قبضہ کیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت کے اصل مستحق علیؓ تھے۔ خدا ان عقل کے اندھوں کو چشم بصیرت دے، آخر وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اس اُمّت کے اگلے پچھلے تمام لوگوں نے اس بات کو غلط اور باطل قرار دیا ہے، اور قرآن وسنت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت اول حضرت علیؓ کا حق تھا نیز صحابہؓ میں سے جن لوگوں نے حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں ان سے اختلاف کیا، انہوں نے نعوذ باللہ کسی بری غرض کے تحت حضرت علیؓ کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کا اختلاف ان کی اجتہادی رائے کے تحت تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خطاء اجتہادی میں مبتلا ہو گئے تھے، لیکن اس کی وجہ سے بھی ان پر لعن کرنا، اور ان کے حق میں گستاخانہ باتیں منہ سے نکالنا نہایت ناروا، بلکہ صریح زیادتی ہے، بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ان میں سے کسی نے بھی حضرت علیؓ کی مخالفت راہ حق سے بھٹک جانے کی وجہ سے کی اور وہ "فسق" کے مرتکب ہوئے تو بھی ان کو آخر کس بنا پر برا بھلا کہا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے انہوں نے مرنے سے پہلے اپنی غلط روی سے توبہ کر لی ہو یا اگر توبہ بھی نہ کی ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے یہ غالب امید رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی رحمت کے صدقہ میں اور ان کی گذشتہ خدمات کے بدلے میں ان کو مغفرت سے نواز دے گا چنانچہ ابن عساکرؒ نے حضرت علیؓ سے یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ (آنحضرت ﷺ نے فرمایا) میرے (بعض) صحابہؓ (اگر) ذلت یعنی لغزش کا شکار ہوں گے (تو) اللہ تعالیٰ ان کو میری صحبت اور میرے ساتھ تعلق رکھنے کی برکت سے بخش دے گا۔" اس بات کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہم لوگ اکثر و بیشتر صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے پروردگار کی رحمت اور آنحضرت ﷺ کی شفاعت کے امیدوار رہتے ہیں تو کیا وہ لوگ جو اُس اُمّت کے سب سے افضل اور سب سے بڑے لوگوں کے زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کے حق میں یہ نیک گمان رکھا جائے کہ اگر ان سے کوئی لغزش ہوئی بھی ہوگی تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے درجہ کی عظمت اور ان کے شرف صحابیت کی برکت سے ان سے درگذر فرمائے گا؟ مرتبہ صحابیت کے تقدس وشرف کو داغدار کرنے والے نادانو! سوچو کہ تم اپنی زبان کو کن مقدس ہستیوں کی شان میں گستاخی کر کے گندا کر رہے ہو، اور تمہارا یہ طرز عمل رحمۃ للعلمین ﷺ کو کس قدر تکلیف پہنچا رہا ہوگا!؟ کیا تم اس بات سے بے خبر ہو کہ نیک بخت وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے خود کے عیوب ان کو دوسروں کی عیب جوئی سے باز رکھیں؟ کیا تم اس فرمان رسالت ﷺ کی صداقت کے منکر ہو کہ اپنے مرے ہوئے لوگوں کو برائی کے ساتھ یاد نہ کرو۔" کیا رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے کہ جب تمہارے سامنے میرے صحابہؓ کا ذکر ہو تو اپنی زبان کو قابو میں رکھو؟ اگر تم ذرا بھی ایمان وعقل کا دعوی رکھتے ہو تو سنو کہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا ہے۔ "ابوبکرؓ عمرؓ کی محبت، ایمان کی ایک شاخ ہے اور ان دونوں سے بغض وعداوت رکھنا کفر کی علامت ہے) انصارؓ کی محبت ایمان کی ایک شاخ ہے اور ان سے بغض وعداوت، کفر ہے، اہل عرب کی محبت، ایمان کی ایک شاخ ہے اور ان سے **بغض وعداوت کفر ہے جس نے میرے صحابہ رضی کو برے الفاظ سے یاد کیا وہ اللہ کی لعنت کا مستوجب ہوا اور جس نے ان** کے بارے میں میرے حکم کی پاسداری کی، میں قیامت کے دن اس کی پاسداری کرونگا۔"! اے خدا بس تو ہی ان لوگوں کو عقل سلیم اور چشم بصیرت عطا کر کے راہ ہدایت دکھا سکتا ہے، جو جہالت ونادانی اور تعصب کی وجہ سے تیرے محبوب نبی ﷺ کے محبوب صحابہؓ اور ساتھیوں کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور ان کے حق میں زبان لعن وطعن دراز کر کے خود کو دوزخ کی آگ کا ایندھن بناتے ہیں۔

(۱۵) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَعَلَتْ اُمَّتِيْ خَمْسَ عَشْرَةَ خَصْلَةً حَلَّ بِهَا الْبَلَاءُ وَعَدَّ هٰذِهِ الْخِصَالَ وَلَمْ يَذْكُرْ تُعُلِّمَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ قَالَ وَبَرَّ صَدِيْقَهُ وَجَفَا اَبَاهُ وَقَالَ وَشُرِبَ الْخَمْرُ وَلُبِسَ الْحَرِيْرُ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب میری اُمّت ان پندرہ باتوں میں (کہ جن کا ذکر اوپر کی حدیث میں ہوا) مبتلا ہوگی تو اس پر (وہ) آفتیں اور بلائیں نازل ہوں گی (جو اوپر حدیث میں مذکور ہوئی ہیں) پھر آنحضرت ﷺ نے ان پندرہ باتوں کو شمار فرمایا (یعنی ان باتوں کی تفصیل بیان فرمائی جیسا کہ گذشتہ حدیث میں گذرا) لیکن حضرت علیؓ نے اس روایت میں یہ بات نقل نہیں کی کہ جب علم کو دین کے علاوہ کسی دوسری غرض سے سکھایا جانے لگے۔" (نیز ان دونوں حدیثوں کے الفاظ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ) حضرت علیؓ نے (اس جملہ ادنی صدیقہ کہ جب آدمی اپنے دوست کو تو اپنے قریب کرنے لگے الخ کے بجائے) یہ نقل کیا ہے کہ جب آدمی اپنے دوست کے ساتھ احسان و مروت اور اپنے باپ کے ساتھ جور و جفا کرنے لگے اور انہوں نے (جب شرابیں پی جانے لگیں" کے بجائے) جب شراب پی جانے لگے (یعنی "شراب" کو جمع کے صیغہ کے بجائے واحد کے صیغہ کے ساتھ) نقل کیا ہے اسی طرح (جب علم کو دین کے علاوہ کسی دوسری غرض سے سکھایا جانے لگے" کے بجائے جب ریشمی کپڑا پہنا جانے لگے۔" نقل کیا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: وعد هذه الخصال (پھر آنحضرت ﷺ نے ان پندرہ باتوں کو شمار فرمایا) کے الفاظ صاحب مصابیح کے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ ترمذیؒ نے دو قولی حدیثیں یکے بعد دیگرے نقل کی ہیں اور الگ الگ دونوں ہی حدیثوں میں ان پندرہ باتوں کو نقل کیا ہے صاحب مختصر نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی اس روایت میں ولبس الحریر (جب ریشمی کپڑا پہنا جانے لگے) کے الفاظ۔ "جب علم دین کے علاوہ کسی دوسری غرض سے سیکھا جانے لگے۔" کی جگہ نہیں ہیں، بلکہ۔ "جب اس اُمّت کے پچھلے لوگ اگلے لوگوں کو برا بھلا کہنے لگیں۔" کی جگہ منقول نہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرت علیؓ کی روایت میں۔ "جب اس اُمّت کے پچھلے لوگ الخ کے الفاظ مذکورہ مذکور ہیں لہٰذا صحیح یہی ہے کہ حضرت علیؓ نے ولبس الحریر کے الفاظ تعلم لغیر الدین کے بجائے نقل کئے ہیں۔ اس کے مطابق پندرہ باتوں کا ذکر دونوں روایتوں کے متعلق صحیح ہو جاتا ہے۔ لہٰذا طیبیؒ نے جو یہ کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے کہ۔ "مذکورہ پندرہ باتوں کا ذکر دونوں روایتوں کے متعلق صحیح ہو جاتا ہے۔ لہٰذا طیبیؒ نے جو یہ کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے کہ۔ "مذکورہ پندرہ باتوں کا ذکر دونوں روایتوں میں سے ہر ایک میں ہے، اور صاحب مختصر کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ پندرہ باتوں کا ذکر مجموعی طور پر دونوں روایتوں میں ہے۔ تاہم پہلی حدیث میں مذکورہ باتوں کی تعداد پندرہ نہیں بلکہ سولہ ہے۔

امام مہدیؑ کے بارے میں پیشگوئی

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَمْلِكَ الْعَرَبَ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ بَيْتِيْ يُوَاطِئُ اسْمُهٗ اِسْمِيْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهٗ قَالَ لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا يَوْمٌ لَطَوَّلَ اللّٰهُ تَعَالٰى ذٰلِكَ الْيَوْمَ حَتّٰى يَبْعَثَ اللّٰهُ فِيْهِ رَجُلًا مِّنِّيْ اَوْمِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ يُوَاطِئُ اسْمُهٗ اِسْمِيْ وَاسْمُ اَبِيْهِ اِسْمَ اَبِيْ يَمْلَاءُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دنیا اس وقت تک اختتام پذیر نہیں ہوگی جب تک کہ عرب پر ایک شخص قبضہ نہ کرلے گا جو میرے خاندان میں سے ہوگا اور اس کا نام میرے نام پر ہوگا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤد) اور ابوداؤد کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔" "اگر دنیا کے اختتام پذیر ہونے میں صرف ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس دن کو طویل و دراز کر دے گا، یہاں تک کہ پروردگار میری نسل میں سے یا یہ فرمایا کہ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کو بھیجے گا جس کا نام میرے نام پر اور جس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا اور وہ تمام روئے زمین کو (عرب کی سرزمین کو) عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح اس وقت سے پہلے تمام روئے زمین ظلم و جور سے بھری تھی۔"

تشریح: اس حدیث میں جس ذات گرامی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے حضرت امام مہدیؓ مراد ہیں چنانچہ ان کا اصل نام تو "محمد" ہوگا، اور لقب "مہدی" ہوگا، نیز آنحضرت ﷺ کی پشت سے تعلق رکھتے ہوں گے البتہ اس بارے میں اختلافی اقوال ہیں کہ آیا وہ حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے ہوں گے یا حضرت امام حسینؓ کی اولاد میں سے؟ لیکن بظاہر یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ وہ باپ کی جانب سے تو حسنی ہوں گے اور ماں کی جاب سے حسینی! حضور ﷺ کے مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ان کا تعلق صرف نسبی اور نسلی نہیں ہوگا بلکہ روحانی اور شرعی بھی ہوگا، یعنی ان کا طور طریقہ، اور ان کے عادات و معمولات حضور ﷺ کے طور طریقے اور آپ کے عادات و معمولات کے مطابق ہوں گے۔

واضح رہے کہ حدیث میں حضرت امام مہدیؓ کی طرف صرف عرب کی نسبت (کہ ان کا قبضہ عرب پر ہوگا) محض ان کی نسلی و وطنی عظمت اور شرف فضیلت کی بنا پر ہے، ورنہ دوسری احادیث میں آیا ہے کہ ان کا تسلط و قبضہ پوری دنیا پر ہوگا خواہ عرب علاقے ہوں یا غیر عرب لیکن یہ توجیہ زیادہ مناسب ہے کہ محض عرب کے ذکر پر اکتفا کرنا اس اعتبار سے ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان روحانی طور پر عرب ہی کے تابع ہیں، لہٰذا عرب پر ان کا تسلط و اقتدار بالواسطہ طور سے تمام دنیا کے مسلمانوں پر تسلط و اقتدار کے مترادف ہے۔" اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دنیا کا ہر مسلمان روحانی طور پر عربی ہے۔

اس موقع پر ایک خاص بات یہ بتادینی ضروری ہے کہ حضور ﷺ نے امام مہدیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو یہ فرمایا ہے کہ اس کا نام میرے نام پر اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا۔" تو اس بات سے شیعہ لوگوں کی اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ مہدی موعود قائم و منتظر ہیں اور وہ حسن عسکری کے بیٹے محمد ہیں۔

وہ تمام روئے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے زیر تسلط علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو پوری طرح عدل و انصاف سے نوازیں گے اور کسی بھی شخص کے ساتھ بے انصافی اور خلاف عدل کوئی سلوک نہیں ہوگا! جاننا چاہئے کہ "یقسط" اور عدل دونوں کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں جیسا کہ "ظلم" اور "جور" کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں چنانچہ صراح میں لکھا ہے کہ "قسط" کے معنی ہیں داد و انصاف اور "عدل" کے معنی ہیں داد یعنی انصاف اور داد و انصاف کرنا۔

اسی طرح "جور" کے معنی ہیں کسی کو ایسا حکم دینا جس سے اس پر ظلم و ستم ہو اور اصل کے اعتبار سے "جور" اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھا جائے۔ پس حدیث میں دونوں جگہوں پر ایک ہی معنی کے حامل دو لفظوں کا استعمال محض تاکید و تکرار کے لئے ہے یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے دونوں لفظوں کو دو الگ الگ معنی میں استعمال فرمایا ہے مثلاً قسط سے مراد انصاف چاہنے والوں کو انصاف دینا ہے اور "عدل" سے مراد حقوق میں برابری اور مساوات ملحوظ رکھنا ہے اسی طرح ظلم سے مراد انصاف چاہنے والوں کو انصاف ملنا ہے اور "جور" سے مراد حقوق میں عدم مساوات اور نا برابری ہے۔

حضرت امام مہدیؓ حضور ﷺ کی اولاد میں سے ہوں گے

(۱۷) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْمَهْدِيُّ مِنْ عِتْرَتِيْ مِنْ اَوْلَادِ فَاطِمَةَ۔

(رواه ابوداؤد)

"حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوسنا۔ "مہدیؓ میری عترت میں سے اور فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہوں گے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "عترت" کے معنی ہیں نسل جماعت اور قریبی رشتہ دار۔ چنانچہ کسی شخص کے ان قریبی رشتہ داروں کو جو پہلے گذر چکے ہوں یا آئندہ پیدا ہوں عترت سے تعبیر کیا جاتا ہے صراح میں بھی یہی لکھا ہے کہ "عترت" کسی شخص کے رشتہ دار اور لواحقین کو کہتے ہیں نہایہ میں

لکھا ہے کہ "عترت" کے معنی ہیں عزیز و رشتہ دار چنانچہ آنحضرت ﷺ کی "عترت سے مراد حضور ﷺ کے دادا عبد المطلب کی اولاد ہے جب کہ بعض حضرات نے "عترت" کا اطلاق حضور ﷺ کے نزدیکی اہل بیت پر کیا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ تمام قریش حضور ﷺ کی نسبت ہیں اور مشہور قول یہ ہے کہ "عترت" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو زکوٰۃ کا مال لینا حرام ہے یعنی اولاد ہاشم۔

بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضرت مہدیؓ کا نسلی تعلق آنحضرت ﷺ سے ہو گا اور وہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہوں گے۔

⑱ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَهْدِیُّ مِنِّیْ اَجْلَی الْجَبْهَةِ اَقْنَی الْاَنْف یَمْلَاُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا کَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا یَمْلِكُ سَبْعَ سِنِیْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مہدیؓ میری اولاد میں سے ہوں گے روشن و کشادہ پیشانی اور اونچی ناک والے، وہ روئے زمین کو انصاف و عدل سے بھر دیں گے، جس طرح کہ وہ ظلم و ستم سے بھری تھی وہ (یعنی مہدیؓ) سات برس تک روئے زمین پر برسر اقتدار اور قابض رہیں گے۔" (ابوداؤد)

تشریح : اس روایت میں "سبع سنین" کے بعد راوی نے او ثمان سنین اور تسع سنین (یا اٹھ برس یا نو برس) کے الفاظ بھی بیان کئے ہیں جو راوی کا اپنا قول ہے اور اس کے شک کو ظاہر کرتا ہے، لیکن یہاں ان الفاظ کو نقل کیا گیا، کیونکہ مصنف کتاب کو "سات برس" کے الفاظ پر یقین حاصل ہو گیا ہو گا جیسا کہ حضرت اُمّ سلمہؓ سے منقول ابوداؤد کی اس روایت سے "سات برس" ہی کے الفاظ کی تائید ہوتی ہے جو آگے آ رہی ہے، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "سات برس یا آٹھ برس یا نو برس" کے درمیان شک موجود تو ہو لیکن مصنف کتاب کے نزدیک زیادہ یقینی الفاظ "سات برس ہی ہوں گے، اس لئے انہوں نے شک کو ظاہر کرنے والے الفاظ کو نقل کرنے کے بجائے صرف یقینی الفاظ ہی کو نقل کرنے پر اکتفا کیا۔

حضرت امام مہدیؓ کی سخاوت

⑲ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ قِصَّةِ الْمَهْدِیِّ قَالَ فَیَجِیْءُ اِلَیْهِ الرَّجُلُ فَیَقُوْلُ یَا مَهْدِیُّ اَعْطِنِیْ اَعْطِنِیْ قَالَ فَیَحْثِیْ لَهٗ فِیْ ثَوْبِهٖ مَا اسْتَطَاعَ اَنْ یَّحْمِلَهٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے حضرت امام مہدیؓ کے واقعہ کے سلسلہ میں یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (ان کے عدل و انصاف کا ذکر کرنے کے بعد) یہ فرمایا کہ مہدیؓ (کے جود و سخاوت کی یہ حالت ہو گی کہ ان) کے پاس ایک شخص آئے گا اور کہے گا کہ مجھے کچھ عطا کیجئے، مجھے کچھ عطا کیجئے۔ چنانچہ مہدیؓ اس کو دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر اتنا دیں گے جتنا کہ وہ اپنے کپڑے میں بھر کر اٹھا سکے اور لے جا سکے۔" (ترمذیؒ)

تشریح : حضرت مہدیؓ سوال کرنے والے کی حرص کو دیکھ کر اس کو بے حساب روپیہ پیسہ اور مال و اسباب دیں گے تاکہ وہ آئندہ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے اور اپنے دل میں کوئی تنگی اور غم محسوس نہ کرے۔

امام مہدیؓ کے ظہور کی پیشگوئی

⑳ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَکُوْنُ اخْتِلَافٌ عِنْدَ مَوْتِ خَلِیْفَةٍ فَیَخْرُجُ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ هَارِبًا اِلٰی مَکَّةَ فَیَاْتِیْهِ نَاسٌ مِّنْ اَهْلِ مَکَّةَ فَیُخْرِجُوْنَهٗ وَهُوَ کَارِهٌ فَیُبَایِعُوْنَهٗ بَیْنَ الرُّکْنِ وَالْمَقَامِ وَیُبْعَثُ اِلَیْهِ

يُبْعَثُ مِنَ الشَّامِ فَيُخْسَفُ بِهِمُ الْبَيْدَآءَ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ فَإِذَا رَاَى النَّاسُ ذٰلِكَ اَتَاهُ اَبْدَالُ الشَّامِ وَعَصَائِبُ اَهْلِ الْعِرَاقِ فَيُبَايِعُوْنَهُ ثُمَّ يَنْشَأُ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ اَخْوَالُهُ كَلْبٌ فَيَبْعَثُ اِلَيْهِمْ بَعْثًا فَيَظْهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ وَذٰلِكَ بَعْثُ كَلْبٍ وَيَعْمَلُ فِى النَّاسِ بِسُنَّةِ نَبِيِّهِمْ وَيُلْقِى الْاِسْلَامُ بِجِرَانِهٖ فِى الْاَرْضِ فَيَلْبَثُ سَبْعَ سِنِيْنَ ثُمَّ يُتَوَفّٰى وَيُصَلِّىْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُوْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ (آخر زمانہ میں) جب خلیفہ (یعنی اس وقت کی حکومت کے سربراہ) کا انتقال ہوگا تو (دوسرے سربراہ کے انتخاب یا نامزدگی کے سوال پر اصحاب الرائے لوگوں کے درمیان) اختلاف و نزاع اٹھ کھڑا ہوگا، اسی دوران اہل مدینہ میں سے ایک شخص (مدینہ سے) نکل کر مکہ کی طرف بھاگ جائے گا، مکہ کے لوگ (جب اس شخص کے مرتبہ وحیثیت کو پہچانیں اور جانیں گے تو) اس کے پاس آئیں گے اور اس کو (گھر سے) باہر نکال کر لائیں گے (تاکہ اس کو اپنا سربراہ اور حاکم بنائیں) وہ شخص اگرچہ (فتنہ کے خوف سے) یہ منصب قبول کرنے کو پسند نہیں کرے گا مگر لوگ (منت سماجت کر کے اس کو تیار کریں گے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے، یہ بیعت (خانہ کعبہ میں) حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان عمل میں آئے گی، اس کے بعد اس کے مقابلہ پر شام (کے بادشاہ) کی طرف سے ایک لشکر بھیجا جائے گا لیکن وہ لشکر مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع مقام بیداء پر زمین میں دھنسا دیا جائے گا، اور پھر جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ (شام کا لشکر مکہ پہنچنے سے پہلے ہی زمین بوس کر دیا گیا ہے، تو ملک شام کے ابدال اور عراق کے عصائب اس شخص کی خدمت میں پہنچیں گے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے پھر قریش میں سے ایک شخص اٹھے گا جس کی ننہیال قبیلہ کلب میں ہوگی اور وہ بھی اس شخص کے اور اس کے تابعداروں کے خلاف ایک لشکر بھیجے گا (اور اپنی ننہیال یعنی قبیلہ کلب کی مدد حاصل کرے گا) لیکن اس شخص کا لشکر اسی قریشی کے لشکر پر غالب آجائے گا پھر وہ شخص لوگوں کے درمیان ان کے پیغمبر (محمد رسول اللہ ﷺ) کی روش اور ان کے طریقہ کے مطابق (ملک وملت کا) نظم ونسق چلائے گا اور مسلمانوں کا دین اپنی گردن زمین پر رکھدے گا وہ شخص سات سال تک قائم وبرقرار رہے گا، پھر جان بحق ہوجائے گا) اور مسلمان اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حدیث میں جس ہستی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے حضرت امام مہدیؓ کی ذات گرامی مراد ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ ابوداؤد نے اس روایت کو باب المہدی میں نقل کیا ہے۔

مدینہ سے مراد یا تو مدینہ طیبہ ہے، یا وہ شہر مراد ہے جہاں مذکورہ خلیفہ یا سربراہ حکومت کا انتقال ہوگا اور اس کے جانشین کے انتخاب پر لوگوں میں اختلاف و نزاع پیدا ہو جائے گا اس موقع پر حضرت امام مہدیؓ کا مکہ بھاگ جانا، مذکورہ اختلاف و نزاع کے فتنہ سے بچنے کے لئے ہوگا، اور مکہ چلے جانے کو ترجیح اس لئے دیں گے کہ وہ شہر مقدس نہ صرف یہ کہ ہر اس شخص کے لئے جائے امن ہے جو اس میں پناہ لینے کا طالب ہو بلکہ سکون وعافیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنے کی سب سے بہتر جگہ بھی ہے۔

بیداء اصل میں جنگل اور ہموار زمین کو کہتے ہیں اور مکان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن یہاں حدیث میں بیداء سے ایک مقام مراد ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔

شام کے لشکر سے مراد سفیانی کا لشکر ہے، نیز اس لشکر کا امام مہدیؓ کے خلاف محاذ آرائی کے لئے آنا در اصل سفیانی حکومت کا پیدا کردہ ایک فتنہ ہوگا جو حضرت امام مہدیؓ کے ظاہر ہونے کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے اس بارے میں تقریبًا تواتر کے ساتھ متعدد احادیث منقول ہیں ان میں سے ایک صحیح حدیث وہ ہے جس کو امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ۔ "وہ سفیانی (جو آخر زمانہ میں شام کے علاقوں پر قابض وحکمراں ہوگا) نسلی طور پر خالد ابن یزید ابن معاویہ ابن ابوسوی کی پشت سے تعلق رکھتا ہوگا، وہ بڑے سر اور چیچک زدہ چہرے والا ہوگا، اس کی آنکھ میں ایک سفید دھبہ ہوگا، دمشق کی طرف اس کا ظہور ہوگا اس کے تابعداروں کی جماعت زیادہ تر قبیلہ کلب سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہوگی، لوگوں کا خون بہانا اس کی خاص عادت ہوگی، یہاں تک کہ وہ

حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچوں کو ہلاک کر دیا کرے گا، وہ جب حضرت امام مہدیؓ کے ظہور کی خبر سنے گا تو ان سے جنگ کرنے کے لئے ایک لشکر بھیجے گا جو شکست کھا جائے گا، اس کے بعد وہ سفیانی بذات خود ایک لشکر لے کر حضرت امام مہدیؓ کے مقابلہ کے لئے چلے گا لیکن وہ مقام بیداء پر پہنچ کر اپنے تمام لشکر والوں کے ساتھ زمین میں دھنس جائے گا اور کوئی بھی شخص زندہ نہیں بچے گا، صرف ایک وہ شخص بچ جائیگا جو حضرت امام مہدیؓ کو سفیانی اور اس کے لشکر کے عبرتناک حشر کی خبر پہنچائے گا۔

"ابدال" اولیاء اللہ کے ایک گروہ کو کہتے ہیں جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کائنات کے نظام کو برقرار اور استوار رکھتا ہے دنیا میں کل ابدال کی تعداد ستر رہتی ہے، اس میں چالیس ابدال تو شام میں رہتے ہیں اور تیس ابدال باقی ملکوں میں ان اولیاء اللہ کو ابدال اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کی ادلی بدلی ہوتی رہتی ہے، یعنی جب ان میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کے بدلے میں کوئی دوسرا مقرر کر دیا جاتا ہے یا ان کو ابدال اس اعتبار سے کہتے ہیں کہ وہ ایسی مقدس، ہستیاں ہیں جو عبادت وریاضت کے ذریعہ اپنے اندر سے تمام بری عادتیں اور ناپسندیدہ خصلتیں ختم کر دیتے ہیں اور ان کے بدلے میں اچھی عادتیں اور اعلیٰ اخلاق پیدا کر لیتے ہیں! اس مقدس گروہ کے بارے میں احادیث میں ذکر آیا ہے گو سیوطیؒ نے سنن ابوداؤد کی شرح میں لکھا ہے کہ ابدال کا ذکر صحاح ستہ میں نہیں آیا ہے علاوہ ابوداؤد کی اس حدیث کے جو یہاں نقل ہوئی ہے، اس حدیث کو حاکم نے بھی نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے، تاہم سیوطی نے صحاح ستہ کے علاوہ دوسری مستند و معتبر کتابوں سے ایسی بہت سی احادیث کو جمع الجوامع میں نقل کیا ہے جن میں ابدال کا ذکر ہے، ان میں سے اکثر احادیث میں چالیس کا عدد مذکور ہے اور بعض میں تیس کا انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ابدال نے جو یہ اعلیٰ درجہ پایا ہے وہ بہت زیادہ نماز روزہ کرنے کی وجہ سے نہیں پایا ہے اور نہ ان عبادتوں کی وجہ سے ان کو تمام لوگوں سے ممتاز کیا گیا ہے بلکہ انہوں نے اتنا اعلیٰ درجہ سخاوت نفس، سلامتی دل اور مسلمانوں کی خیر خواہی رکھنے کی وجہ سے پایا ہے نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ علی! میری اُمت میں ایسے لوگوں کا وجود کہ جو ابدال کی صفت کے حامل ہوں، سرخ گندھک سے بھی زیادہ نادر ہے یعنی جس طرح سرخ گندھک بہت کمیاب چیز ہے اسی طرح دنیا میں ابدال بھی کم ہیں۔" ایک اور حدیث میں، جو حضرت معاذ بن جبلؓ سے منقول ہے، یہ فرمایا گیا ہے کہ جس شخص میں تین صفتیں یعنی رضا بالقضاء، ممنوعات سے کلی احتراز اور خدا کے دین کی خاطر غصہ کرنا، پائی جائیں اس کا شمار ابدال کی جماعت میں ہوتا ہے؟ نیز امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں نقل کیا ہے کہ جو شخص روزانہ تین مرتبہ یہ دعا پڑھنے کا التزام رکھے اس کے لئے ابدال کا درجہ لکھا جاسکتا ہے، دعا یوں ہے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِاُمَّۃِ مُحَمَّدٍ، اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ اُمَّۃَ مُحَمَّدٍ، اَللّٰھُمَّ تَجَاوَزْ عَنْ اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ۔

"اے اللہ! اُمت محمدی کی مغفرت فرما، اے اللہ اُمت محمدی پر رحم فرما، اے اللہ اُمت محمدی کے گناہوں سے درگذر فرما۔"

حاصل یہ کہ جو شخص اپنے اندر سے تمام انسانی واخلاقی برائیاں بدل ڈالے اپنے نفس کو پوری طرح پاکیزہ اور مہذب بنالے اور مخلوق خداوندی کا خیر خواہ ہو جائے، تو اس کا شمار ابدال کی جماعت میں ہوگا۔

"عصائب" بھی اولیاء اللہ کے ایک گروہ کا نام ہے جیسا کہ ابدال! حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ ابدال شام کے ملک میں رہتے ہیں، عصائب عراق کے ملک میں اور نجبا مصر کے ملک میں (ابدال اور عصائب کی طرح نجباء بھی اولیاء اللہ کی قسموں میں سے ایک قسم ہے) نیز بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "عصائب" ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اپنے معاشرہ میں سب سے زیادہ، عابد وزاہد اور نیک ہوں یہ وضاحت غالباً لغوی معنی کے اعتبار سے ہے، کیونکہ لغت میں "عصب القوم" "قوم کے نیک ترین لوگوں کو کہتے ہیں۔

قبیلہ کلب کی لشکر آرائی اور اس کی طرف سے قتل وقتال کا واقع ہونا آخر زمانہ میں ایک "فتنہ" کے طور پر ظاہر ہوگا اور یہ فتنہ بھی حضرت امام مہدیؓ کے ظہور کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔

"اور مسلمانوں کا دین اپنی گردن پر رکھ دے گا" کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام قائم اور پائیدار ہو جائے گا، شریعت کی فرمانروائی

پورے سکون واطمینان کے ساتھ جاری ہو جائے گی اور تمام مسلمان آسودگی واطمینان کے ساتھ زندگی گذاریں گے واضح رہے کہ "جران" اونٹ کی گردن کے اس اگلے حصّہ کو کہتے ہیں جو ذبح کی جگہ سے نحر کی جگہ تک ہوتا ہے، اونٹ جب چلتے چلتے ٹھہر جاتا ہے اور آرام لینے کے لئے بیٹھتا ہے تو اپنی گردن کے اس حصّہ کو زمین پر دراز کر دیتا ہے جس سے اس کو بہت راحت ملتی ہے پس یہاں دین کو اونٹ کی گردن سے تشبیہہ دینے کا مقصد اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ حضرت امام مہدیؓ کے زمانہ میں اسلام کو ثبات وقرار مل جائے گا کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی خلفشار نہیں ہو گا، باہمی مخالفت ومناقشت اور جنگ وجدال کا نام ونشان تک مٹ جائے گا، دین واسلام کی برتری، احکام سُنّت کی پابندی اور ملی نظام کی خوشحالی واستحکام کا دور دورہ ہو گا۔

مہدویت کا جھوٹا دعوی کرنے والوں کی تردید

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس بات کا دعوی کیا ہے کہ وہ مہدیؓ ہیں ان میں سے بعض لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے "مہدی" کے لغوی معنی "ہدایت کرنے والا، مراد لیتے ہوئے اپنے کو "مہدی" کہا یا کہلوایا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں کوئی تردیدی بات نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ اگر وہ واقعۃً ہدایت وراستی کی روشنی پھیلانے والے تھے اور ان کے ذریعہ مخلوق خدا دین وآخرت کی صحیح رہنمائی حاصل کرتی تھی تو لغوی طور پر ان کو "مہدی" کہا جا سکتا ہے لیکن وہ لوگ کہ جنہوں نے محض دنیا والوں کو فریب میں مبتلا کرنے اور اپنی شخصیت کو غلط طور پر لوگوں کا مرجع ومقتدا بنانے کے لئے خود کو "مہدی موعود" کہا یا کہلوایا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بالکل جھوٹے اور مکار تھے، چنانچہ ایسے لوگوں نے مکر وفریب کے جال پھیلا کر اور سادہ لوح مسلمانوں کو ورغلا کر اپنے تابعداروں کی جماعت تیار کی، اور بعضوں نے تو اوباش اور بدقماش افراد تک کو خرید کر اپنے گرد جمع کیا اور ان کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ اپنے "مہدی موعود" ہونے کا پروپیگنڈہ کرایا بلکہ بعض شہروں اور ملکوں میں فتنہ وفساد پھیلایا، لڑائی جھگڑا کرایا اور آخر کار ان کا انجام بہت برا ہوا کہ صحیح العقیدہ مسلمانوں نے ان کی بھرپور مدافعت کی اور انہیں تہ تیغ کر کے ان شہروں اور ملکوں کے لوگوں کو ان کے فتنہ وفساد سے نجات دلائی! خود ہمارے ہندوستان میں ایسے ہی گمراہ لوگوں کی ایک جماعت پیدا ہو چکی ہے جو اپنے کو "مہدویہ" کہلاتی تھی اس جماعت کے لوگ بہت جاہل اور پست خیال تھے ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ "مہدی موعود" ہمارے پیشوا کی صورت میں ظاہر ہوا پھر وفات پا گیا اور خراسان کے ایک شہر میں دفن کر دیا گیا! ان کی گمراہیوں میں سے ایک بڑی گمراہی، ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ جو شخص ہمارے نظریہ وخیال کا عقیدہ نہ رکھے اور ہماری بات سے متفق نہ ہو وہ کافر ہے۔ اسی بنا پر اس زمانہ میں مکہ کے چاروں مسلک کے علماء نے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا تھا کہ صاحب اقتدار مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان گمراہ لوگوں کو قتل کر دیں اسی طرح شیعہ حضرات کا یہ اعتقاد اور قول بھی بالکل فاسد ہے کہ "مہدی موعود" دراصل محمد ابن حسن عسکری ہیں جنؒ کا انتقال نہیں ہوا ہے بلکہ وہ نظروں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں، وہ امام زماں ہیں اور اپنے وقت پر ظاہر ہو کر اپنی امامت اور حاکمیت کا اعلان کریں گے اہل سُنّت والجماعت کے نزدیک یہ قول بھی سرے سے غلط اور باطل ہے، نیز اس کی تردید میں علم کلام کی کتابیں دلائل سے بھری ہوئی ہیں، علاوہ ازیں کتاب عروۃ الوثقی میں یہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ حضرت محمد ابن حسن عسکری کا انتقال ہو گیا تھا۔

(۲۱) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ ذَکَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلاَءً یُصِیْبُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ حَتّٰی لاَ یَجِدَ الرَّجُلُ مَلْجَاً یَلْجَاُ اِلَیْہِ مِنَ الظُّلْمِ فَیَبْعَثُ اللّٰہُ رَجُلاً مِّنْ عِتْرَتِیْ وَاَھْلِ بَیْتِیْ فَیَمْلَاءُ بِہِ الْاَرْضَ قِسْطًا وَّعَدْلاً کَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا یَرْضٰی عَنْہُ سَاکِنُ السَّمَآءِ وَسَاکِنُ الْاَرْضِ لاَ تَدَعُ السَّمَآءُ مِنْ قَطْرِھَا شَیْئًا اِلاَّ صَبَّتْہُ مِدْرَارًا وَلاَ تَدَعُ الْاَرْضُ مِنْ نَبَاتِھَا شَیْئًا اِلاَّ اَخْرَجَتْہُ حَتّٰی یَتَمَنَّی الْاَحْیَآءُ الْاَمْوَاتَ یَعِیْشُ فِیْ ذٰلِکَ سَبْعَ سِنِیْنَ اَوْ ثَمَانَ سِنِیْنَ اَوْ تِسْعَ سِنِیْنَ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (انسان کو سخت مصیبت اور پریشانیوں میں مبتلا کرنے والی) ایک بلا وآفت کا ذکر کیا جو اس اُمت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی یہاں تک کہ کسی شخص کو کوئی ایسی پناہ گاہ نہیں ملے گی جہاں وہ (اس آفت وبلا کی صورت میں رونما ہونے والے) ظلم وستم سے پناہ حاصل کر سکے پھر (جب ظلم وستم اور ناانصافی کا وہ (دور اپنی حد کو پار کر جائے گا تو) اللہ تعالیٰ میری اولاد اور میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کو (کہ جو عدل وانصاف اور علم ودانائی میں یکتا ہوگا اور جو "مہدی" کے لقب سے ملقب ہوگا، امامت کے منصب سے سرفراز کر کے اس دنیا میں) بھیجے گا، وہ شخص زمین کو اس طرح عدل وانصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وستم سے بھری ہوئی تھی، اس سے آسمان والے بھی خوش ہوں گے (یعنی فرشتے اور انبیاء (کی روحیں) اور (تمام) زمین کے رہنے والے بھی راضی ومطمئن ہوں گے (خواہ وہ کسی جنس اور نوع سے تعلق رکھتے ہوں، یہاں تک کہ جنگل کے جانور اور پانی کی مچھلیاں بھی) آسمان اپنے مینہ کے قطروں میں سے کچھ باقی رکھے بغیر کثرت سے (پانی) برسائے گا اور زمین اپنی روئیدگی میں سے کچھ باقی رہے بغیر سب کچھ اگادے گی یہاں تک کہ زندہ لوگ مردوں کی آرزو کرنے لگیں گے وہ شخص (یعنی مہدیؓ) اس خوشحال وکامرانی کے ساتھ سات برس یا آٹھ برس یا نو برس زندہ رہے گا۔"

تشریح: "آسمان اپنے مینہ کے قطروں میں سے.....الخ" کا حاصل یہ ہے کہ حضرت مہدیؓ کے زمانہ میں خیر وبرکت کا یہ حال ہوگا کہ بارش وقت اور ضرورت کے مطابق بھرپور طور سے ہوا کرے گی، زراعتی پیداوار اور زمین سے حاصل ہونے والی چیزیں نہایت فراوانی کے ساتھ پیدا ہوں گی اور اس طرح ہر طرف خوشحالی اور چین وراحت کا دور دورہ ہوگا اور لوگ نہایت پر مسرت اور شاد کام زندگی گذاریں گے۔

زندہ لوگ مردوں کی آرزو کرنے لگیں گے۔" کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگ اس قدر پر مسرت اور خوش حال زندگی گزاریں گے کہ مرے ہوئے لوگوں کے وجود اور حیات کی تمنا کرنے لگیں گے اور کہیں گے کہ کاش وہ لوگ ہمارے زمانہ میں ہوتے تو انہیں بھی اس پر مسرت اور خوشحال زندگی کے دن دیکھنا نصیب ہوتے! واضح رہے کہ بعض لوگوں نے لفظ "احیاء" کو الف کے زیر کے ساتھ یعنی مصدر پڑھا ہے جس کے معنی ہیں زندہ کرنا! اس صورت میں اس جملہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ خود مردے یہ آرزو کرنے لگیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دوبارہ زندگی بخش کر دنیا میں بھیجدے تاکہ وہ بھی مسرت وخوشحالی کا دور دیکھ لیں لیکن یہ بات اظہار مبالغہ کے لئے ایک ناممکن چیز کو ممکن فرض کرنے کے طور پر ہے بشرطیکہ احیاء یعنی الف کے زیر کے ساتھ) والی روایت ثابت ہو، ورنہ اس بات کی ایک احتمال سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں۔

"یا آٹھ یا نو برس۔" کے الفاظ یا تو راوی کے شک کو ظاہر کرنے کے لئے ہیں کہ یہ روایت نقل کرتے وقت راوی کو صحیح طور پر یاد نہیں تھا کہ حضور ﷺ نے یہاں سات سال کا عدد ذکر فرمایا تھا یا آٹھ کا یا نو کا یا یہ الفاظ خود حضور ﷺ کے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کو ارشاد فرماتے وقت تک آپ ﷺ کو بھی مبہم طور ہی پر معلوم تھا، جس کو آپ ﷺ نے سات یا آٹھ یا نو برس" کے ذریعہ بیان فرمایا لیکن پھر بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو تعین کے ساتھ سات سال کی مدت بتائی گئی، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے بعد احادیث میں صرف "سات سال" کا ذکر فرمایا ہے۔

"مشکوٰۃ" کے اصل نسخے میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی ہے، البتہ بعد میں یہ عبارت شامل کی گئی ہے الحاکم فی مستدرکہ و قال صحیح یعنی اس روایت کو حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

ایک پیشنگوئی

(۲۲) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ رَجُلٌ مِنْ وَرَاءِ النَّهْرِ يُقَالُ لَهُ الْحَارِثُ حَرَّاثٌ عَلٰى

مُقَدِّمَتِهٖ رَجُلٌ يُقَالُ لَهٗ مَنْصُوْرٌ يُوَطِّنُ اَوْيُمَكِّنُ لِاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا مَكَّنَتْ قُرَيْشٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَبَ عَلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ نَصْرُهٗ اَوْقَالَ اِجَابَتُهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ماوراء النہر (کے کسی شہر میں ایک (پاک باز و صالح) شخص ظاہر ہوگا جس کا نام حارث حراث ہوگا، اس کے لشکر کے اگلے حصہ پر ایک شخص ہوگا جس کا نام منصور ہوگا، وہ حارث، محمد ﷺ کی اولاد کو جگہ یا ٹھکانہ دے گا جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو قریش کے لوگوں نے ٹھکانا دیا تھا (پس) ہر مسلمان پر واجب ہوگا کہ اس شخص کی مدد و تائید کرے یا یہ فرمایا کہ (ہر مسلمان پر واجب ہوگا کہ) کہ اس شخص کو قبول کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "ماوراء النہر" کے معنی ہیں "وہ علاقے جو نہر کے پیچھے ہیں" اور اس سے مراد وہ خطہ ہوتا ہے جس میں بخارا اور سمرقند وغیرہ شہر واقع ہیں! حارث حراث میں "حارث" تو اصلی نام ہے اور حراث اس کی صفت ہے یعنی کھیتی کرنے والا۔

یوطن او یمکن (جگہ یا ٹھکانا دے گا) میں حرف او یا تو راوی کے شک کو ظاہر کرنے کے لئے ہے، یا "اور" کے معنی ہیں ہے اس صورت میں اس جملہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ شخص محمد ﷺ کی اولاد کو اپنی طرف سے مال و اسباب، ہتھیار، اسلحہ اور روپیہ پیسہ فراہم کرے گا، ان کی حکومت و خلافت کو پائیدار اور مستحکم بنائے گا، مختلف ذرائع اور طریقوں سے ان کو تقویت پہنچائے گا اور اپنے لشکر کے ذریعہ ان کی مدد کرے گا۔

"محمد ﷺ کی اولاد" سے مراد عمومی طور پر حضور ﷺ کی تمام ذریت اور آپ کے اہل بیت ہیں اور خصوصی طور پر حضرت امام مہدیؓ کی ذات مراد ہے یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "محمد کی اولاد" کا لفظ تو زائد ہے اور "محمد ﷺ" سے مراد حضرت امام مہدیؓ ہیں۔

"قریش کے لوگوں" سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے ایمان قبول کیا تھا اور تن من دھن سے حضور ﷺ کی مدد و اعانت کی تھی جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ وغیرہ تاہم رسول اللہ ﷺ کو ٹھکانا دینے والوں میں ابوطالب بھی شامل ہیں اگرچہ انہوں نے ایمان قبول نہیں کیا تھا" یا یہ فرمایا کہ اس شخص کو قبول کرو" کے الفاظ راوی کی طرف سے اس شک کے اظہار کے لئے ہیں حضور ﷺ نے اس موقع پر یا تو نصرہ کا لفظ ارشاد فرمایا تھا یا اجابتہ کا لفظ نیز اس حدیث کے سیاق سے اور اس سلسلہ میں منقول دوسری احادیث کے اسباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے جس شخص کے ظاہر ہونے کی پیشن گوئی فرمائی ہے وہ اپنی امامت و خلافت کے دعوے کے ساتھ ظاہر ہوگا یعنی اس کا ظہور سربراہ حکومت کی صورت میں ہوگا، اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری مسلمانوں پر واجب ہوگی اور منصور نامی شخص اس کی فوج کا کمانڈر ہوگا ویسے بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ حضور ﷺ نے "منصور" نام کے جس شخص کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس کا ظہور ہو چکا ہے، اور وہ مشہور عالم حضرت ابومنصور ماتریدی تھے، جن کا درجہ، حنفی فقہ کے اصول کے مدون کی حیثیت سے حنفیہ میں امام کا سمجھا جاتا ہے! اور ان کی ذات حنفی اصول فقہ کی مدار ہے۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُكَلِّمَ السِّبَاعُ الْاِنْسَ وَحَتّٰى تُكَلِّمَ الرَّجُلَ عَذَبَةُ سَوْطِهٖ وَشِرَاكُ نَعْلِهٖ وَيُخْبِرُهٗ فَخِذُهٗ بِمَا اَحْدَثَ اَهْلُهٗ بَعْدَهٗ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک درندے آدمیوں سے ہمکلام نہ ہونے لگیں گے اور جب تک آدمی کے کوڑے (چابک) کا پھندنا اور اس کے جوتے کا تسمہ اس سے باتیں نہ کرنے لگے گا، اور (یہی نہیں بلکہ) انسان کی ران اس کو یہ بتایا کرے گی کہ اس کے اہل و عیال نے اس کی عدم موجدگی میں کونسے نئے کام اور کیا نئی بات کی ہے۔" (ترمذیؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قیامت کی علامتیں کب سے ظاہر ہوں گی؟

(۴۴) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْاٰیَاتُ بَعْدَ الْمِائَتَیْنِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "نشانیاں دو سو برس کے بعد ظہور میں آئیں گی۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: حضور ﷺ کے فرمانے کا مطلب یہ تھا کہ جن چیزوں اور جن باتوں کو قیامت کی علامتیں اور نشانیاں قرار دیا گیا ہے، ان کا ظاہر ہونا اور پیش آنا پورے دو سو برس کے بعد سے شروع ہو جائے گا! رہی یہ بات کہ یہ دو سو برس کس وقت سے مراد تھے؟ ہجرت نبوی کے وقت سے، یا اسلام کی روشنی کے ظہور کے وقت سے اور یا وفات نبوی ﷺ کے وقت سے دو سو برس کی مدت مراد تھی اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ لفظ المائتین پر حرف لام عہد کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کی علامتیں دو سو برس کی اس مدت کے بعد ظاہر ہونا شروع ہوں گی جس کی ابتدا ہزار سال کے بعد سے ہوگی، مزید وضاحت کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ "دو سو برس" سے گویا بارہ سو برس مراد ہیں، اور یہ وہ زمانہ ہوگا جب قیامت کی چھوٹی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہوں گی اور بڑی نشانیاں جیسے حضرت مہدیؓ کے ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول، دجال کے نکلنے اور دوسری پے در پے علامتوں کے ظاہر ہونے یعنی سورج کے مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہونے، دابۃ الارض کے نکلنے اور یاجوج ماجوج کے ظاہر ہونے وغیرہ وغیرہ کا وقت قریب تر آ جائے گا اور اہل علم محسوس کرنے لگیں گے کہ دنیا اپنی عمر کی آخری حدوں کو پہنچ گئی ہے۔

ایک ہدایت

(۴۵) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَیْتُمُ الرَّایَاتِ السُّوْدَ قَدْ جَآءَتْ مِنْ قِبَلِ خُرَاسَانَ فَأْتُوْھَا فَاِنَّ فِیْھَا خَلِیْفَۃَ اللّٰہِ الْمَھْدِیُّ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ دَلَائِلِ النُّبُوَّۃِ۔

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم خراسان کی جانب سے سیاہ نشان آتے دیکھو تو اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ، کیونکہ اس میں خدا کا خلیفہ مہدیؓ ہوگا۔" اس روایت کو امام احمدؒ نے اور دلائل النبوۃ میں بیہقی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "سیاہ نشان" سے بظاہر مراد حارث اور منصور کا لشکر ہے جس کی طرف سے پیچھے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا تھا اور "متوجہ ہونے" سے مراد اس لشکر میں شامل ہونا اور آنے والوں کے امراء و حکام کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہے! "مہدی" سے مراد اس کے لغوی معنی ہیں یعنی وہ خلیفہ یا سربراہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہوگا بلکہ خدا کی طرف سے ہدایت پایا ہوا اور لوگوں کو ہدایت اور راستی کی راہ پر لگانے والا ہوگا، جس کی سربراہی کو قبول کرنا اور اس کی اطاعت کرنا واجب ہوگا۔ لہٰذا اس ارشاد گرامی میں "مہدی" سے نہ تو حضرت مہدیؓ مراد ہیں اور نہ اس سے اس بات کا تضاد لازم آتا ہے کہ مہدیؓ کا ظہور حرمین شریفین سے ہوگا۔

امام مہدیؓ، حضرت امام حسن کی اولاد میں سے ہونگے

(۴۶) وَعَنْ اَبِیْ اِسْحٰقَ قَالَ قَالَ عَلِیٌّ وَنَظَرَ اِلَی ابْنِہِ الْحَسَنِ وَقَالَ اِنَّ ابْنِیْ ھٰذَا سَیِّدٌ سَمَّاہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَسَیَخْرُجُ مِنْ صُلْبِہٖ رَجُلٌ یُسَمّٰی بِاسْمِ نَبِیِّکُمْ یُشْبِھُہٗ فِی الْخُلُقِ وَلَا یُشْبِھُہٗ فِی الْخَلْقِ ثُمَّ ذَکَرَ قِصَّۃً یَمْلَأُ الْاَرْضَ عَدْلًا رَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ وَلَمْ یَذْکُرِ الْقِصَّۃَ۔

"اور ابو اسحاقؒ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے صاحبزادے امام حسنؓ کی طرف دیکھ کر کہا کہ میرا بیٹا جیسا کہ

رسول کریم ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا، سردار ہے، عنقریب اس کی پشت سے ایک شخص پیدا ہوگا جس کا نام تمہارے نبی ﷺ کے نام پر (محمد) ہوگا، وہ باطنی سیرت یعنی اخلاق وعادات میں حضور ﷺ کے مشابہ ہوگا گو ظاہری شکل وصورت میں آپ کے مشابہ نہیں ہوگا اس کے بعد حضرت علیؓ نے وہ جملے بیان کئے جن میں فرمایا گیا ہے کہ وہ شخص زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیگا۔" اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے لیکن انہوں نے زمین کو عدل وانصاف سے بھر دینے والی بات نقل نہیں کی ہے!۔"

تشریح: جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا ہے" کہ ذریعہ حضرت علیؓ نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کی طرف اشارہ فرمایا ابنی هٰذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین یعنی میرا بیٹا سید (سردار) ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان مصالحت ومفاہمت کرائے گا۔

ظاہری شکل وصورت میں آپ ﷺ کے مشابہ نہیں ہوگا۔" یعنی حضرت مہدیؓ سب چیزوں میں اور ہر اعتبار سے حضور ﷺ کی ظاہری شکل وصوت کے مشابہ نہیں ہوں گے، ویسے بعض اعتبار سے ان کا حضور ﷺ کی ظاہری مشابہت رکھنا ثابت ہے جیسا کہ پیچھے بیان ہوا۔

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضرت امام مہدیؓ حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے ہونگے، اور حضرت امام حسینؓ کی طرف ان کی نسبت ماں کی طرف سے ہوگی! نیز اس سے شیعہ حضرات کے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے کہ امام مہدیؓ دراصل محمد ابن حسن عسکری ہیں جو اس دنیا میں موجود ہیں لیکن نظروں سے پوشیدہ ہوگئے ہیں اور اپنے وقت پر ظاہر ہوں گے شیعوں کا یہ قول اس لئے صحیح نہیں ہوسکتا کہ محمد ابن حسن عسکری، بالاتفاق حسینی ہیں وہ حضرت امام حسن کی اولاد میں سے نہیں ہیں اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علیؓ نے امام حسنؓ کی اولاد میں سے جس شخص کے پیدا ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، ہوسکتا ہے اس سے مراد امام مہدیؓ کے علاوہ کوئی اور شخص ہو تو یہ بات بھی خلاف حقیقت ہوگی، کیونکہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دینے والی بات اس کی تردید کرتی ہے، چنانچہ کسی بھی روایت میں حسنی یا حسینی سادات میں سے کسی بھی ایسے شخص کا ذکر نہیں ملتا ہے جس کی طرف زمین کو عدل وانصاف سے بھر دینے والی بات کی نسبت کی گئی ہو، سوائے اس کے کہ یہ صفت مہدیؓ موعود کے بارے میں نقل کی جاتی ہے۔

ٹڈیوں کا مکمل خاتمہ قیامت کی علامات میں سے ہے

(۲۷) وَعَنْ جَابِرِ ابْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ فَقَدَ الْجَرَادُ فِيْ سَنَةٍ مِنْ سِنِيْ عُمَرَ الَّتِيْ تُوُفِّيَ فِيْهَا فَاهْتَمَّ بِذٰلِكَ هَمًّا شَدِيْدًا فَبَعَثَ اِلَى الْيَمَنِ رَاكِبًا وَرَاكِبًا اِلَى الْعِرَاقِ وَرَاكِبًا اِلَى الشَّامِ يَسْئَلُ عَنِ الْجَرَادِ هَلْ اُرِيَ مِنْهُ شَيْئًا فَاَتَاهُ الرَّاكِبُ الَّذِيْ مِنْ قِبَلِ الْيَمَنِ بِقَبْضَةٍ فَنَثَرَهَا بَيْنَ يَدَيْهِ فَلَمَّا رَاٰهَا عُمَرُ كَبَّرَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَ اَلْفَ اُمَّةٍ سِتُّمِائَةٍ مِنْهَا فِي الْبَحْرِ وَاَرْبَعُ مِائَةٍ فِي الْبَرِّ فَاِنَّ اَوَّلَ هَلَاكِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الجراد فاذا هلك الجراد تتابعت الْاُمَمُ كَنِظَامِ السِّلْكِ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت جابر ابن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے جس سال وفات پائی ہے اس سال کا ذکر ہے کہ ٹڈیاں کم ہوگئیں، (یعنی خلافت عمر کے آخری سال مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں ٹڈی دل پیدا نہیں ہوا) حضرت عمرؓ (نے اس کو خاص طور سے محسوس کیا اور) ٹڈی دل نہ آنے سے سخت غمگین ہوگئے (کہ کہیں ٹڈیوں کا مکمل خاتمہ تو نہیں ہوگیا) پھر انہوں نے ایک سوار یمن کی طرف، ایک سوار عراق کی طرف اور ایک سوار شام کی طرف بھیجا تاکہ وہ پہنچ کر لوگوں سے دریافت کریں کہ آیا کسی شخص نے کہیں کچھ ٹڈیاں دیکھی ہیں یا نہیں؟ چنانچہ جس سوار کو یمن بھیجا گیا تھا وہ ایک مٹھی ٹڈیاں لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آیا، اور ان کے سامنے وہ ٹڈیاں ڈال دیں، حضرت عمرؓ نے ٹڈیاں دیکھیں تو (خوشی سے) اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور پھر فرمایا کہ (میں ٹڈیوں کے مکمل خاتمہ کے خوف سے اس لئے متفکر اور

پریشان ہوگیا تھا کہ) میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے خداوند بزرگ و برتر نے حیوانات کی ہزار قسمیں پیدا کی ہیں، ان میں چھ سو دریا میں ہیں (یعنی بحری حیوانات) اور چار سو جنگل میں (یعنی خشکی کے حیوانات) ہیں اور (جب قیامت آنے کو ہوگی تو) ان میں سب سے پہلے ٹڈیاں ہلاک ہونگی، چنانچہ جب ٹڈیاں ہلاک ہوں گی تو پھر حیوانات کی دوسری قسمیں بھی) اس طرح پے بہ پے ہلاک ہونا شروع ہو جائیں گی جس طرح موتیوں کی لڑی کھل جاتی ہے اور موتی پے در پے گر کر بکھرنے لگتے ہیں۔" (اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

بَابُ الْعَلَامَاتِ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ وَذِكْرُ الدَّجَّالِ

قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والی نشانیوں اور دجال کے ذکر کا بیان

اس باب میں بالکل آخر زمانہ کی ان نشانیوں اور علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو قیامت کے بالکل قریب ظاہر ہوں گی جیسا کہ پچھلے باب میں چھوٹی نشانیوں اور علامتوں کا ذکر تھا۔

چاہئے تو یہ تھا کہ حضرت امام مہدیؓ کے ظاہر ہونے کا ذکر بھی اسی باب میں ہوتا کیونکہ ان کے وجود کا تعلق حضرت عیسی علیہ السلام اور دجال کے ساتھ جڑا ہوا ہے لیکن چونکہ حضرت مہدیؓ کا ذکر پچھلے ابواب کی ان احادیث میں ہو چکا ہے جن میں ایسے فتنوں اور لڑائیوں کا ذکر تھا جو حضرت امام مہدیؓ کے ظاہر ہونے سے پہلے وقوع پذیر ہوں گی اور ان کے ظاہر ہونے کے بعد ختم ہو جائیں گی اس لئے اس باب میں ان کا ذکر نہیں ہوا۔

قیامت سے پہلے جن دس نشانیوں اور علامتوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور جن کو مولف کتاب نے یہاں نقل کیا ہے ان کے ظاہر اور واقع ہونے کی جو ترتیب احادیث و روایات میں منقول ہے ان میں باہم اختلاف ہے کہ کسی حدیث و روایت میں ان کو کسی اور ترتیب کے ساتھ نقل کیا ہے اور کسی حدیث و روایت میں کچھ اور ترتیب منقول ہے اور شارحین نے ان کے درمیان مطابقت اور موافقت پیدا کرنے کے لئے بہت کچھ لکھا ہے جس کا کچھ حصہ احادیث کی تشریح کے ضمن میں مذکور ہوگا تاہم یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ ان دس نشانیوں اور علامتوں میں سے سب سے بڑی نشانی اور علامت اور سخت ترین بلاء دجال کا ظاہر ہونا ہے جس کے سلسلے میں بہت زیادہ مشہور تر احادیث منقول ہیں۔

دجال اور مسیح کے معنی: "دجال" کا لفظ دجل سے نکلا ہے جس کے معنی خلط، مکر اور تلبیس کے ہیں، چنانچہ جب کوئی شخص صحیح بات کو غلط بات کے ساتھ خلط (گڈمڈ) کرتا ہے اور فریب دیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ دجل الحق بالباطل (اس نے حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کر دیا) ویسے "دجل" کے معنی کذب یعنی جھوٹ کے بھی آتے ہیں چنانچہ دجال کی ذات میں اس دونوں معنوں کا پایا جانا بالکل ظاہر بات ہے اس کے علاہ قاموس وغیرہ میں دجال کی اور بھی وجہ تسمیہ مذکورہ ہیں۔

"مسیح" ایک ایسا مشترک نام ہے جو حضرت عیسی علیہ السلام اور دجال دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جب یہ لفظ دجال کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس کو فقط دجال کے ساتھ مقید کر دیتے ہیں یعنی "مسیح دجال" کہتے ہیں اور جب حضرت عیسی علیہ السلام کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس لفظ کو مطلق استعمال کرتے ہیں یعنی صرف "مسیح" کہتے ہیں۔ حضرت عیسی علیہ السلام کو مسیح" اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ جس اندھے یا کوڑھی (اور یا کسی بھی بیمار) پر ہاتھ پھیر دیتے تھے وہ چنگا ہو جاتا تھا یا آپ علیہ السلام کا پاؤں چونکہ عام لوگوں کی طرح نہیں تھا بلکہ ہموار اور بے خم تلوے کا تھا اس لئے آپ علیہ السلام کو مسیح کہا جاتا ہے یا یہ کہ حضرت عیسی علیہ السلام ماں کے پیٹ سے بالکل ممسوح یعنی پونچھے پانچھے پیدا ہوئے تھے، پیدائش کے وقت بچے جس آلائش کے ساتھ ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہیں وہ ان

کے ساتھ نہیں تھی، بالکل صاف ستھرے ماں کے پیٹ سے باہر آئے تھے۔ اس اعتبار سے ان کو مسیح کہا جانے لگا بعض حضرات کے نزدیک "مسیح" کے معنی "صدیق" کے ہیں اس اعتبار سے آپ علیہ السلام کو مسیح کہا جانا بالکل ظاہر بات ہے! ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ آپ علیہ السلام زمین کے فاصلے بہت طے کرتے تھے لہٰذا مساحت کی مناسبت سے آپ کو مسیح کہا جانے لگا، دجال کو بھی مسیح کہنے کی ایک وجہ یہی ہے کہ وہ تقریباً ساری زمین کی سیر کرے گا اور تمام دنیا میں گھومتا پھرے گا، نیز اس ملعون کو مسیح کہنے کی کچھ اور وجوہ بھی ہیں ایک تو یہ کہ اس کی آنکھ غائب ہوگی اور ایک طرف کا چہرہ ممسوح ہوگا، دوسرے یہ کہ وہ ایک ایسی ذات ہوگی جس سے خیر و بھلائی کو الگ اور دور کر دیا گیا ہوگا جیسا کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی ذات سے بدی اور برائی کو الگ اور دور کر دیا گیا ہے پس حضرت عیسی علیہ السلام تو مسیح اللہ ہیں اور دجال ملعون مسیح الضلالت ہے بعض حضرات نے کہا ہے کہ دجال کے لئے مسیح کا لفظ ہے جس کے معنی بد شکل اور بد صورت کے ہیں اور حضرت عیسی کے لئے مسیح کا لفظ ہے تاہم بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ دجال کے لئے "مسخ" کا لفظ ہے تو یہ بات غلط ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قیامت آنے کی دس بڑی نشانیاں۔

① عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ اُسَيْدِ الْغِفَارِيِّ قَالَ اَطَّلَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْنَا وَنَحْنُ نَتَذَاكَرُ فَقَالَ مَا تَذْكُرُوْنَ قَالُوْا نَذْكُرُ السَّاعَةَ قَالَ اِنَّهَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰى تَرَوْ قَبْلَهَا عَشْرَ اٰيَاتٍ فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَالدَّآبَّةَ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا وَنُزُوْلَ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ وَيَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ وَثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَاٰخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ اِلٰى مَحْشَرِهِمْ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ نَارٌ تَخْرُجُ مِنْ قَعْرِ عَدْنٍ تَسُوْقُ النَّاسَ اِلَى الْمَحْشَرِ وَفِيْ رِوَايَةٍ فِي الْعَاشِرَةِ وَرِيْحٌ تُلْقِي النَّاسَ فِي الْبَحْرِ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت حذیفہ ابن اسید غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ آپس میں (قیامت کا) ذکر کر رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف آنکلے اور پوچھا کہ تم لوگ کس چیز کا ذکر کر رہے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے ہیں تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یقیناً قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیوں کو نہ دیکھ لوگے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان دس نشانیوں کو اس ترتیب سے) ذکر فرمایا ① دھواں ② دجال ③ دابۃ الارض ④ سورج کا مغرب کی طرف سے نکلنا ⑤ حضرت عیسی ابن مریم کا نازل ہونا ⑥ یاجوج وماجوج کا ظاہر ہونا اور (چھٹی، ساتویں اور آٹھویں نشانی کے طور پر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین خسوف کا (یعنی تین مقامات پر زمین کے دھنس جانے کا) ذکر فرمایا ایک تو مشرق کے علاقہ میں، دوسرے مغرب کے علاقہ میں اور تیسرے جزیرۂ عرب کے علاقہ اور دسویں نشانی، جو سب کے بعد ظاہر ہوگی، وہ آگ ہے جو یمن کی طرف سے نمودار ہوگی اور لوگوں کو گھیر ہانک کر زمین حشر کی طرف لے جائے گی اور ایک حدیث میں یوں ہے کہ وہ ایک ایسی آگ ہوگی جو (یمن کے مشہور شہر عدن کے آخری کنارے سے نمودار ہوگی اور لوگوں کو ہانک کر زمین حشر کی طرف لے جائے گی نیز ایک اور روایت میں دسویں نشانی کے طور پر یمن کی طرف سے یا عدن کے آخری کنارے سے آگ کے نمودار ہونے کے بجائے) ایک ایسی ہوا کا ذکر کیا گیا ہے جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔" (مسلم)

تشریح: حدیث میں قیامت کی جن دس بڑی نشانیوں اور علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں پہلی نشانی کے طور پر دھوئیں کا ذکر ہے، چنانچہ وہ ایک بڑا دھواں ہوگا جو ظاہر ہو کر مشرق سے مغرب تک تمام زمین پر چھا جائیگا اور مسلسل چالیس روز تک چھایا رہے گا اس کی وجہ سے تمام لوگ سخت پریشان ہو جائیں گے، مسلمان تو صرف دماغ و حواس کی کدورت اور زکام میں مبتلا ہوں گے مگر منافقین و کفار بیہوش ہو جائیں گے اور ان کے ہوش و حواس اس طرح مختل ہو جائیں گے کہ بعضوں کو کئی دن تک ہوش نہیں آئے گا واضح رہے کہ قرآن کریم میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ الخ تو حضرت حذیفہؓ اور ان کے تابعین کے قول کے مطابق اس آیت میں اسی

دھویں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن حضرت ابن مسعود اور ان کے تابعین کے نزدیک اس آیت میں دھویں سے مراد غلہ کا وہ قحط ہے جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں قریش مکہ پر نازل ہوا تھا اور جس کا حقیقی سبب رسول کریم ﷺ کی یہ بد دعا تھی کہ اے خدا! تو ان لوگوں پر (جو سرکشی اور اسلام دشمنی میں حد سے بڑھ گئے ہیں سات سال کا قحط نازل فرما جیسا کہ تو نے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصریوں پر نازل فرمایا تھا، چنانچہ اس بد دعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو سخت ترین غذائی قحط میں مبتلا کیا یہاں تک کہ وہ چمڑے، مردے اور دوسری الابلا چیزیں کھانے لگے تھے اس عرصہ میں انہیں فضا میں دھویں کی مانند ایک چیز نظر آتی تھی جس کو وہ اپنے اوپر منڈلاتے ہوئے دیکھا کرتے تھے جیسا کہ کوئی بھوکا ضعف و کمزوری کی شدت کے سبب اپنی آنکھوں کے آگے تاریکی محسوس کرتا ہے اور فضا میں بھری ہوئی ہوا اس کو دھویں کی شکل میں دکھائی دیتی ہے، ویسے بھی جب کسی علاقہ میں قحط سالی پھیل جاتی ہے تو بارش نہ ہونے کی وجہ سے پورے ماحول میں خشکی اور گرد و غبار کی جو کثرت ہو جاتی ہے وہ فضا کو اس طرح مکدر کر دیتی ہے کہ چاروں طرف دھویں کی صورت میں اندھیرا معلوم ہونے لگتا ہے۔

"دابۃ الارض" سے مراد ایک عجیب الخلقت اور نادر شکل کا جانور ہے جو مسجد حرام میں کوہ صفا و مروہ کے درمیان سے برآمد ہوگا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ان الفاظ واخرجنا لھم دابۃ من الارض کے ذریعہ کیا گیا ہے! علماء نے لکھا ہے کہ وہ جانور چوپایہ کی صورت میں ہوگا جس کی درازی ساٹھ گز کی ہوگی، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس عجیب الخلقت جانور کی شکل یہ ہوگی کہ چہرہ انسانوں کی طرح پاؤں اونٹ کی طرح گردن گھوڑے کی طرح دم چیل کی طرح سرین ہرن کی طرح سینگ بارہ سنگے کی طرح اور ہاتھ بندر کی طرح ہوں گے! نیز اس کے نمودار ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ کوہ صفا جو کعبہ کی مشرقی جانب واقع ہے، یکایک زلزلہ سے پھٹ جائیگا اور اس میں سے یہ جانور نکلے گا، اس کے ایک ہاتھ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہوگا اور دوسرے ہاتھ میں حضرت سلیمان کی انگشتری ہوگی تمام شہروں اور علاقوں میں اس تیزی کے ساتھ دورہ کریگا کہ کوئی فرد بشر اس کا پیچھا نہ کر سکے گا اور دوڑ میں اس کا مقابلہ کر کے اس سے چھٹکارا نہ پاسکے گا جہاں جہاں جائیگا ہر شخص پر نشان لگاتا جائیگا جو صاحب ایمان ہوگا اس کو حضرت موسیٰ کے عصاء سے چھوئے گا اور اس کی پیشانی پر "مؤمن" لکھ دے گا اور جو کافر ہوگا اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری سے سیاہ مہر لگا دے گا اور اس کے منہ پر کافر لکھ دے گا! بعض حضرات نے کہا ہے کہ دابۃ الارض تین مرتبہ نکلے گا ایک دفعہ تو حضرت امام مہدیؓ کے زمانہ میں پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اور پھر آخری دفعہ آفتاب کے مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے بعد۔

آفتاب کے مغرب کی طرف سے نکلنے کے سلسلے میں وضاحت آگے آنے والی ایک حدیث کی تشریح میں بیان ہوگی! آسمان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول حضرت امام مہدیؓ کے ظہور کے بعد ہوگا، چنانچہ آپ ایک دن شام کے وقت آسمان سے دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی سفید منارہ پر اتریں گے اور پھر دجال کو تلاش کر کے اس کو دروازہ لد پر قتل کریں گے "لد" شام میں ایک موضع کا نام ہے اور بعض حضرات نے اس کو فلسطین کے ایک موضع کا نام بتایا ہے واضح رہے کہ یہاں حدیث میں جن دس نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی ترتیب کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ان میں سے سب سے پہلے جس نشانی کا ظہور ہوگا وہ دھواں ہے، اس کے بعد دجال نکلے گا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے، پھر یاجوج ماجوج نکلیں گے، پھر دابۃ الارض نکلے گا، اور پھر آفتاب مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا یہ بات اس لئے کہی جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر اہل ایمان کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا کیونکہ سارے کفار مسلمان ہو جائیں گے اور ان کا ایمان مقبول ہوگا، اس کے برخلاف اگر یہ کہا جائے کہ مغرب کہ جانب سے آفتاب کا طلوع ہونا، دجال کے نکلنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے سے پہلے ہوگا تو ظاہر ہے کہ جو کفار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مسلمان ہوں گے ان کا ایمان مقبول قرار نہ پائے کیونکہ آفتاب مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جائیگا اور اس وقت کسی کافر کا ایمان قبول کرنا معتبر نہیں ہوگا جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایمان قبول کرنے والے تمام لوگوں کا

ایمان معتبر ہوگا اور وہ مسلمان مانے جائیں گے! پس حدیث میں مذکورہ نشانیوں کو جس ترتیب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے وہ ان نشانیوں کے وقوع پذیر ہونے کی اصل ترتیب نہیں ہے اور نہ یہاں اصل ترتیب کا ذکر کرنا مراد ہے بلکہ اصل مقصد ان نشانیوں کو ایک جگہ ذکر کرنا ہے سو بلالحاظ ترتیب ان کو ایک جگہ ذکر کر دیا گیا لہٰذا یہ اشکال وارد نہیں ہو سکتا کہ جب حضرت عیسی علیہ السلام کا نزول آفتاب کے مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے واقعہ سے پہلے ہوگا تو یہاں نزول آفتاب کے بعد کیوں ذکر کیا گیا۔

"یاجوج و ماجوج" دراصل دو قبیلوں کے نام ہیں جو یافث ابن نوح کی اولاد میں سے ہیں، یہ دونوں قبیلے بہت وحشی مگر طاقتور تھے ان کا خاص مشغلہ لوٹ مار اور زمین پر فتنہ و فساد پھیلانا تھا، یہ قبیلے جس گھاٹی میں رہا کرتے تھے اس کو ذوالقرنین نے ایک ایسی دیوار سے جس کی بلندی اس گھاٹی کے دونوں طرف کے پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچتی ہے اور موٹائی ۶۰ گز کی ہے، بند کرا دیا تھا تاکہ لوگ ان قبیلوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہ سکیں، جب قیامت آنے کو ہوگی اور یاجوج و ماجوج کے نکلنے کا وقت آئے گا تو دیوار ٹوٹ جائیگی۔

آپ ﷺ نے تین خسوف کا ذکر فرمایا" کے بارے میں ابن مالک نے کہا ہے کہ عذاب الٰہی کے طور پر زمین کا دھنس جانا مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں واقع ہو چکا ہے لیکن احتمال ہے کہ یہاں حدیث میں جن تین خسوف کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ پہلے واقع ہو چکنے والے خسوف کے علاوہ ہوں گے اور ان سے بھی زیادہ سخت ہوں گے۔

"اور لوگوں کو ہانک کر زمین حشر کی طرف لے جائیگی" میں زمین حشر سے مراد ملک شام کا وہ علاقہ ہے جہاں وہ آگ لوگوں کو لے جا کر چھوڑے گی بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس آگ کی ابتداء ملک شام سے ہوگی، یا یہ کہ ملک شام کو اس قدر وسیع و فراخ کر دیا جائیگا کہ پورے عالم کے لوگ اس میں جمع ہو جائیں گے، بہرحال حدیث کے اس جملہ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس آگ کا لوگوں کو ہانکنا، حشر کے بعد ہوگا۔ اگر زمین حشر سے مراد میدان حشر لیا جاتا تو یقیناً یہ مفہوم پیدا ہوتا اور اس پر اعتراض بھی واقع ہوتا، لیکن جب یہاں "میدان حشر" مراد ہی نہیں ہے تو پھر کوئی اعتراض بھی پیدا نہیں ہو سکتا! نیز ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ وہ آگ حجاز کی سرزمین سے نمودار ہوگی، جب کہ یہاں حدیث میں اس کا یمن کی جانب سے نمودار ہونا بیان کیا گیا ہے) لہٰذا قاضی عیاض نے یہ کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ قیامت کی نشانی کے طور پر جس آگ کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک نہیں بلکہ دو ہوں گی، اور وہ دونوں، لوگوں کو گھیر ہانک کر زمین حشر (یعنی ملک شام) کی طرف لے جائیں گی۔ یا یہ کہ وہ آگ تو ایک ہی ہوگی جو ابتداء میں یمن کی جانب سے نکلے گی لیکن اس کا ظہور حجاز کی سرزمین سے ہوگا۔ اس موقع پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں بخاری کی جو روایت ہے اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کی علامتوں میں سے سب سے پہلی علامت وہ آگ ہوگی جو لوگوں کو مشرق کی طرف سے گھیر ہانک کر مغرب کی طرف لے جائے گی جب کہ حقیقت میں وہ آگ سب سے آخری علامت ہوگی جیسا کہ یہاں حدیث میں مذکور ترتیب سے بھی واضح ہوتا ہے، پس اس تضاد کو اس تاویل کے ذریعہ دور کیا جائیگا کہ آگ کا سب سے آخری نشانی ہونا تو ان مذکورہ نشانیوں کے اعتبار سے ہے کہ یہاں حدیث میں جن نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سب سے آخری نشانی مذکورہ آگ ہوگی، اور بخاری کی روایت میں آگ کو جو سب سے پہلی نشانی قرار دیا گیا ہے تو وہ اس اعتبار سے کہ آگ، قیامت کی ان نشانیوں میں سے سب سے پہلی نشانی ہوگی جن کے بعد دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہے گی بلکہ ان نشانیوں کے وقوع پذیر ہونے کے ساتھ ہی صور پھونکا جائیگا، ان کے برخلاف یہاں حدیث میں جن نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ہر ایک نشانی کے بعد بھی دنیا کی چیزیں باقی رہیں گی۔

ایک ایسی ہوا کا ذکر کیا گیا ہے جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی" یہ روایت بظاہر اس روایت کے خلاف ہے جس میں آگ کا ذکر ہے پس ان دونوں روایتوں کے درمیان مطابقت و یکسانیت پیدا کرنے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ اس دوسری روایت میں لفظ ناس (لوگوں) سے مراد کفار ہیں، اور ان کو ہانکنے والی آگ ہوا کے سخت جھکڑ کے ساتھ ملی ہوئی ہوگی تاکہ ان کفار کو سمندر میں دھکیلنے کا عمل زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پورا ہو، نیز مذکورہ آگ جس کا پانی آگ کی صورت میں تبدیل ہو جائے گا، چنانچہ قرآن کریم کے ان الفاظ وَاِذَا الْبِحَار

سجرت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ تبدیل ہو جائے گا، چنانچہ قرآن کریم کے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اس کے برخلاف مومنین کے لئے جو آگ ہوگی وہ محض ان کو ڈرانے کے لئے ہوگی اور کوڑے کی طرح اس کا کام یہ ہوگا کہ انہیں ہانک کر زمین حشر اور موقف اعظم کی طرف لے جائے۔

قیامت کی وہ چھ نشانیاں جن کے ظاہر ہونے سے پہلے زیادہ سے زیادہ اعمال صالحہ اختیار کرلو"

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ سِتًّا الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَدَابَّةَ الْاَرْضِ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا وَاَمْرَ الْعَامَّةِ وَخُوَیْصَةَ اَحَدِکُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "چھ" چیزوں کی بناء پر تم اعمال صالحہ کی طرف پیش قدمی کرلو (اور وہ چھ چیزیں یہ ہیں) دھواں، دجال، دآبہ الارض، مغرب سے طلوع آفتاب، امر عامہ، (یعنی وہ فتنہ عام جو تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے) اور فتنہ خاص (کہ جو تم میں سے کسی کے ساتھ مخصوص ہو)۔" (مسلم)

تشریح: "چھ چیزوں کی بناء پر الخ کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کی ان چھ نشانیوں کے ظاہر ہونے اور ان کے آپہنچنے سے پہلے پہلے جس قدر زیادہ ہو سکے نیک کام کرلو کیونکہ ان چیزوں کے بعد یا تو نیک کام کرنا نہایت دشوار ہو جائے گا یا اگر کوئی نیک کام کیا بھی جائیگا تو اس کا اعتبار ہی نہیں ہوگا امر عامہ" سے مراد برائی اور دین سے بیزاری کا وہ ہمہ گیر فتنہ ہے جو اجتماعی طور پر تمام لوگوں کو گھیرے گا اور پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجائے اور فتنۂ خاص" سے مراد وہ مخصوص مسائل وآفات ہیں جو انفرادی طور پر کسی بھی شخص کو اس طرح پریشان حال اور پراگندہ خاطر کردیتے ہیں کہ وہ دین وآخرت کے معاملات کی طرف زیادہ توجہ دینے سے باز رہتا ہے جیسے اپنے یا اپنے اہل وعیال اور مال وجائیداد کے بارے میں مختلف قسم کی پریشانیاں اور مشغولیتیں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں امر عامہ سے مراد قیامت اور فتنہ خاص سے مراد موت ہو اس صورت میں کہا جائیگا کہ حدیث کا مقصد چونکہ لوگوں کو قیامت کی علامتوں سے ڈرانا اور چوکنا کرنا ہے اس لئے ان علامتوں کے ضمن میں خود قیامت اور قیامت صغری یعنی موت) کے آنے سے بھی ڈرایا گیا ہے۔

قیامت کی سب سے پہلی علامت

(۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اَوَّلَ الْاٰیَاتِ خُرُوْجًا طُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا وَخُرُوْجُ الدَّآبَّةِ عَلَی النَّاسِ ضُحًی وَاَیُّهُمَا مَا کَانَتْ قَبْلَ صَاحِبَتِهَا فَالْاُخْرٰی عَلٰی اَثَرِهَا قَرِیْبًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ظاہر ہونے کے اعتبار سے قیامت کی نشانیوں میں سب سے پہلی نشانی آفتاب کا مغرب کی طرف سے طلوع ہونا اور چاشت کے وقت لوگوں پر دابۃ الارض کا نکلنا اور ان سے اس کا بات کرنا ہے ان دونوں مذکورہ نشانیوں میں سے جو نشانی پہلے ظاہر ہوگی اس کے جلد ہی بعد دوسری ظاہر ہو جائے گی۔" (مسلم)

تشریح: طیبیؒ نے اس حدیث کی وضاحت میں کہا ہے کہ اگر یہاں اشکال پیدا ہو کہ آفتاب کا مغرب کی طرف سے نکلنا، قیامت کی سب سے پہلی نشانی نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے تو دھویں اور دجال کا ظہور ہو چکا ہو گا؟ تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ جن چیزوں کو قیامت کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے ان کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ نشانیاں ہیں جو قیامت کے وقت قریب آجانے کی علامت ہیں، اور دوسری نشانیاں ہیں جو قیام قیامت کے وجود اور اس کے آجانے پر دلالت کریں گی پس پہلی قسم کی نشانیوں سے سب سے پہلی نشانی تو آنحضرت ﷺ کی بعثت ہے اور پھر آخری کی باقی نشانیوں میں سے دھواں، دجال کا نکلنا اور اس طرح کی دوسری علامتیں ہیں دوسری قسم

کی نشانیوں میں سے آفتاب کا مغرب کی طرف سے نکلنا، زلزلہ اور اس آگ کا نمودار ہونا ہے جو لوگوں کو گھیرہانک کر محشر کی طرف لے جائے گی، چنانچہ مغرب کی طرف سے آفتاب کے طلوع ہونے کو سب سے پہلی نشانی اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ اسی نشانی سے دوسری قسم کی نشانیوں کی ابتداء ہوگی۔

وخروج الدابة علی النّاس میں لفظ خروج کا عطف طلوع الشمس پر ہے جو لفظ اول کی خبر ہے، اس صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ سب سے پہلی نشانی، ایک سے زائد ہو، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہوگا، لہٰذا ابن مالکؒ نے کہا ہے کہ خروج میں حرف واؤ شاید کہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اس صورت میں عبارت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ "قیامت کی نشانیوں میں سے سب سے پہلی نشانی آفتاب کا مغرب کی طرف سے طلوع ہونا یا چاشت کے وقت لوگوں پر دابۃ الارض کا نکلنا اور ان سے اس کا بات کرنا ہے" یہ وضاحت نہ صرف یہ کہ حدیث کہ آخری الفاظ ایھما ما کانت الخ کے مطابق ہے بلکہ اس کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یوں ہے کہ او خروج الدابة علی الناس۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں نشانیوں کے واقع ہونے کے درمیان جو وقفہ ہوگا وہ دوسری نشانیوں کے درمیانی وقفوں کی بہ نسبت بہت کم ہوگا، چنانچہ اگر مغرب کی طرف سے آفتاب کا طلوع ہونا پہلے ہوا تو دابۃ الارض کا نکلنا اس کے فوراً بعد ہوگا اور اگر پہلے دابۃ الارض نکلے گا تو مغرب کی طرف سے آفتاب کا طلوع ہونا اس کے فوراً بعد ہوگا! واضح رہے کہ ان دونوں علامتوں کی ترتیب اور تقدم و تاخر کے سلسلے میں تعیّن کے ساتھ وحی نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ اس بات کو مبہم چھوڑ دیا گیا تھا البتہ اتنا بتا دیا گیا تھا کہ یہ دونوں علامتیں اپنی نوعیت کی اور دوسری علامتوں سے پہلے ظاہر ہوں گی! نیز اس موقع پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ جس حدیث میں یہ منقول ہے کہ..... اِنَّ اَوَّلَهَا خُرُوْجُ الدَّجَّالِ (یعنی قیامت کی علامتوں میں سے سب سے پہلی علامت دجال کا نکلنا ہے) تو وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

قیامت کی وہ تین علامتیں جن کا ظاہر ہونا یقینی ہے

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ اِذَا خَرَجْنَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْ اِيْمَانِهَا خَيْرًا طُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا وَالدَّجَّالُ وَدَابَّةُ الْاَرْضِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تین باتیں جب ظہور میں آجائیں گی تو پھر کسی ایسے شخص کا ایمان لانا (اور کفر سے توبہ کرنا) کہ جس نے اس سے پہلے ایمان قبول نہیں کیا ہوگا، کوئی فائدہ نہیں دے گا اور نہ اس شخص کا اپنے ایمان کی حالت میں نیک عمل کرنا فائدہ مند ہوگا اگر اس نے اس سے پہلے وہ نیک عمل نہ کیا ہوگا (یعنی اس وقت گناہوں سے توبہ کرنا بھی معتبر نہ ہوگا) اور وہ تین باتیں یہ ہیں، آفتاب کا مغرب کی طرف سے طلوع ہونا، دجال اور دابۃ الارض کا نکلنا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ان نشانیوں کو دیکھ کر چونکہ قیامت کا آنا متعین ہو جائے گا، اور اس وقت اس دنیا کی پر فریب زندگی کا پردہ اس طرح چاک ہو جائیگا کہ آخرت کی زندگی اور وہاں کے احوال، نظر و مشاہدہ میں آجائیں گے اس لئے اس وقت کفر اور گناہوں سے توبہ کرنا اور ایمان قبول کرنا معتبر نہیں ہوگا کیونکہ ایمان تو وہی معتبر ہے جو غیب پر یقین کے ساتھ ہو۔

یہاں حدیث میں مغرب کی طرف سے آفتاب کے طلوع ہونے کو باقی دونوں سے پہلے ذکر کیا گیا ہے جب کہ وقوع پذیر ہونے کے اعتبار سے اس کا نمبر بعد میں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان کے قبول نہ ہونے کا اصل مدار اسی پر ہے یعنی توبہ اور ایمان کا قبول نہ ہونا اسی وقت ہوگا جب آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا، لہٰذا پہلے اس کو ذکر کیا گیا اور اس کے ساتھ دو اور نشانیوں یعنی دجال اور دابۃ الارض کے نکلنے کو بھی ملا دیا گیا۔

جب آفتاب کو مغرب کی طرف سے طلوع ہونے کا حکم ملے گا

⑤ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حِیْنَ غَرَبَتِ الشَّمْسُ اَتَدْرِیْ اَیْنَ تَذْهَبُ هٰذِهٖ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّهَا تَذْهَبُ حَتّٰی تَسْجُدَ تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَسْتَاْذِنُ فَلَا یُؤْذَنُ لَهَا وَیُقَالُ لَهَا ارْجِعِیْ مِنْ حَیْثُ جِئْتِ فَتَطْلُعُ مِنْ مَغْرِبِهَا فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا قَالَ مُسْتَقَرُّهَا تَحْتَ الْعَرْشِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) جب کہ آفتاب غروب ہو رہا تھا رسول کریم ﷺ (مجھ سے) فرمانے لگے، جانتے ہو یہ آفتاب کہاں جا رہا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا یہ آفتاب جاتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے پہنچ کر سجدہ کرتا ہے، پھر حضور رب العزت میں حاضری کی اجازت مانگتا ہے، اس کو اجازت عطا ہوتی ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ مشرق کی طرف لے جائے اور وہاں سے طلوع کرے اور (یاد رکھو) وہ وقت جلد ہی آنے والا ہے جب آفتاب (اپنے معمول کے مطابق) سجدہ کرے گا لیکن اس کا سجدہ قبول نہیں ہوگا، اور اجازت چاہے گا لیکن اس کو اجازت عطا نہیں ہوگی اور یہ حکم دیا جائے گا کہ جس طرف سے آیا ہے اسی طرف لوٹ جا چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے طلوع کرے گا، اور یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کہ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (یعنی آفتاب اپنے مستقر کی طرف چلا جاتا ہے نیز آنحضرت ﷺ نے (آفتاب کے "مستقر" کی وضاحت میں) فرمایا ہے کہ آفتاب کا مستقر یعنی اس کے ٹھہرنے کی جگہ عرش کے نیچے ہے۔" (بخاری)

تشریح: بعض علماء نے کہا ہے کہ اس حدیث میں فانها تذهب حتی تسجد تحت العرش کے الفاظ قرآن کریم کی اس آیت کے خلاف نہیں ہیں جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ حَتّٰی بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ کیونکہ اس آیت کی مراد در اصل حد نظر کو بیان کرنا ہے، جب کہ یہاں حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد عرش کے نیچے پہنچ کر سجدہ کرتا ہے۔

خطابیؒ نے یہ احتمال بیان کیا ہے کہ عرش کے نیچے پہنچ کر آفتاب کے سجدہ کرنے کی جو بات فرمائی گئی ہے اس کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آفتاب عرش کے نیچے پہنچ کر مستقر ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کے مستقر ہونے کی کیفیت و حقیقت کیا ہوتی ہے تو اس کا ادراک و اظہار انسانی علم کے احاطہ سے باہر ہے۔

لفظ تَسْتَاْذِنُ میں استیذان سے مراد "حضور حق میں حاضری کی اجازت چاہنا۔" لیا گیا ہے، لیکن اس لفظ کا زیادہ واضح مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ آفتاب عرش کے نیچے سجدہ ریز ہونے کے بعد اپنے معمول کے مطابق طلوع کرنے کی اجازت چاہتا ہو اور اس کو وہ اجازت عطا ہوتی ہے۔

آفتاب کا مستقر عرش کے نیچے ہے" کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد عرش کے نیچے جاتا ہے اور وہاں سجدہ کرتا ہے پھر وہ اجازت طلب کرتا ہے جس پر اس کو اجازت دی جاتی ہے واضح رہے کہ مذکورہ آیت والشمس تجری لمستقر لها کی تفسیر میں بیضاوی نے مستقر" کے کئی معنی بیان کیے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے "مستقر" کی اس وضاحت کو قطعاً ذکر نہیں کیا ہے جو بخاری و مسلم کی مذکورہ بالا حدیث میں بیان ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے اور جس سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ "مستقر" سے کیا مراد ہے۔

فتنہ دجال سے بڑا کوئی فتنہ نہیں

⑥ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَا بَیْنَ خَلْقِ اٰدَمَ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَةِ اَمْرٌ اَکْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آدم کی پیدائش سے لے کر قیامت کے دن تک (یعنی کائنات انسانی کے پورے زمانہ میں ابتلاء واختلال اور استدراج کے اعتبار سے) دجال کے فتنہ سے بڑا کوئی فتنہ نہیں۔" (مسلم)

۷ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِاَعْوَرَ وَاِنَّ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ اَعْوَرُ عَيْنِ الْيُمْنٰى كَاَنَّ عَيْنَهٗ عِنَبَةٌ طَافِيَةٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر مخفی نہیں ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے جب کہ مسیح دجال داہنی آنکھ سے کانا ہوگا۔ اور اس کی وہ آنکھ ایسی ہوگی جیسے وہ انگور کا ایک پھولا ہوا دانا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اللہ تعالیٰ تم پر مخفی نہیں ہے" یہ جملہ دراصل آگے کی عبارت "اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے الخ" کی تمہید کے طور پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کی بتائی ہوئی باتوں کی روشنی میں تم اللہ تعالیٰ کی حقیقت سے آگاہ ہو اور اس کی ذات کو تم نے اس کی صفات کاملہ کے ساتھ پہچان رکھا ہے، لہٰذا جب دجال کا ظہور ہو اور وہ اپنی شعبدہ بازیوں اور فریب کاریوں کے ذریعہ تمہیں تمہارے رب کے بارے میں گمراہ کرنا چاہے تو تم گمراہ نہ ہونا۔

اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے" کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی نقصان وعیب کی نفی کرنا مراد ہے نہ کہ اس کی ذات کے لئے کوئی جسمانی عضو کو صحیح وسالم ثابت کرنا مراد ہے گویا اصل مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی جنس سے نہیں ہے اور نہ اس کی آدمیوں جیسی آنکھ ہے چہ جائیکہ وہ کانا ہو۔

لفظ طافیة یہاں تویٔ کے ساتھ منقول ہے ویسے بعض روایتوں میں یہ لفظ ہمزہ کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے، اس کے لغوی معنی "بلند" کے ہیں لہٰذا عنبة طافیة کا مفہوم ہے انگور کا پھولا ہوا دانا واضح رہے کہ دجال کی آنکھ کے سلسلہ میں یہ روایت اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ انها لیست بناتئة ولا حجراء یعنی اس کی وہ آنکھ نہ ابھری ہوئی ہوگی اور نہ دھنسی ہوئی اور دونوں روایتوں کے درمیان منافات اس اعتبار سے نہیں ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں اس کی آنکھوں میں پائی جائیں، یعنی اس کی ایک آنکھ تو اس طرح کی کانی ہوگی جیسے انگور کا پھولا دانا اور دوسری آنکھ اس طرح کی ہوگی کہ نہ تو وہ ابھری ہوئی ہوگی اور نہ دھنسی ہوئی تورپشتی نے کہا ہے کہ وہ دجال کی جسمانی حالت خصوصاً آنکھ کے بارے میں جو احادیث منقول ہیں ان سب میں بہت زیادہ باہمی تضاد وتعارض ہے اور بسا اوقات ان کے درمیان مطابقت پیدا کرنا مشکل ہوجاتا ہے مثلاً یہاں جو حدیث نقل ہوئی ہے اس میں تو یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اس کی آنکھ طافیہ (بلند) ہوگی جیسا کہ انگور کا کوئی پھولا ہوا دانا ہوتا ہے، ایک حدیث میں یہ ہے کہ وہ جاحظ العین یعنی ابھری ہوئی آنکھ والا ہوگا اور ابھری ہوئی آنکھ بھی اس طرح کی ہوگی جیسے کوئی کوکب یعنی ستارا رکھا ہوا ہو اور ایک اور روایت میں، جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اس کی آنکھ نہ تو ابھری ہوئی ہوگی اور نہ دھنسی ہوئی ہوگی پس ان تمام روایات میں مطابقت کے لئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی آنکھ کی جو مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں ان کا تعلق دونوں آنکھوں کے ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہے یعنی ایک آنکھ اس طرح کی ہوگی اور ایک اس طرح کی اس کی تائید عبداللہؓ کی مذکورہ بالا روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں دجال کا دائیں آنکھ سے کانا ہونا نقل کیا گیا ہے اس سلسلہ میں جو روایت حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اس میں یہ ہے کہ وہ ممسوح العین (یعنی مٹی ہوئی آنکھ والا ہوگا) اور اس کی آنکھ پر موٹا ناخنہ ہوگا، نیز ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ بائیں آنکھ سے کانا ہوگا ان روایتوں کے درمیان مطابقت کرنے کے لئے بھی یہی کہا جائے گا کہ اس کی آنکھ کے عیب دار ہونے کی جو مختلف نوعیتیں بیان کی گئیں ہیں وہ الگ الگ دونوں آنکھوں کے اعتبار سے ہیں یعنی اس کی ایک آنکھ تو بالکل غائب ہوگی اور دوسری بھی عیب دار ہوگی۔ اس طرح سے اس کی دونوں آنکھوں پر "عور" کا اطلاق ہوسکتا ہے کیونکہ عور کے اصل معنی عیب کے ہیں لہٰذا اس کی دائیں آنکھ بھی عیب دار ہوگی اور بائیں آنکھ بھی۔

ہر نبی علیہ السلام نے اپنی اُمّت کو دجال سے ڈرایا ہے

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَامِنْ نَّبِیٍّ اِلَّا قَدْ اَنْذَرَ اُمَّتَہُ الْاَعْوَرَ الْکَذَّابَ اَلَا اِنَّہٗ اَعْوَرُ وَاِنَّ رَبَّکُمْ لَیْسَ بِاَعْوَرَ مَکْتُوْبٌ بَیْنَ عَیْنَیْہِ ک ف ر۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایسا کوئی نبی علیہ السلام نہیں گزرا جس نے اپنی اُمّت کو جھوٹے کانے (یعنی دجال سے نہ ڈرایا ہو آگاہ رہو، دجال کانا ہوگا اور تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے، نیز اس (دجال) کی دونوں آنکھوں کے درمیان ک ف ر (یعنی کفر کا لفظ) لکھا ہوا ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "ایسا کوئی نبی نہیں گزرا" الخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دجال کے ظاہر ہونے کا متعینہ وقت کسی پر بھی ظاہر نہیں فرمایا، بس اس قدر معلوم ہے کہ وہ قیامت سے پہلے ظاہر ہوگا اور چونکہ قیامت آنے کا تعیّن وقت کسی کو نہیں معلوم ہے اس لئے دجال کے ظاہر ہونے کا تعیّن وقت بھی کسی کو نہیں معلوم۔

ک ف ر سے کفر کا لفظ مراد ہے، چنانچہ مصابیح اور مشکوٰۃ کے نسخوں میں یہ تینوں حرف اسی طرح علیحدہ علیحدہ لکھے ہوئے ہیں اور اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ گویا دجال کے چہرے پر کفر کا لفظ اسی طرح لکھا ہوگا نیز اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ دجال دراصل تباہی وہلاکت یعنی کفر کی طرف بلانے والا اور کفر کے پھیلنے کا باعث ہوگا نہ کہ فلاح ونجات کی طرف بلانے والا ہوگا، اس سے بچنا اور اس کی اطاعت نہ کرنا واجب ہوگا درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اُمّت کے حق میں ایک بڑی نعمت ہے کہ دجال کی دونوں آنکھوں کے درمیان کفر کا لفظ نمایاں ہوگا جس سے ہر صاحب ایمان کو اس کے مکروفریب سے بچنے میں آسانی ہوگی۔

دجال کی جنّت اور دوزخ

⑨ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اُحَدِّثُکُمْ حَدِیْثًا عَنِ الدَّجَّالِ مَاحَدَّثَ بِہٖ نَبِیٌّ قَوْمَہٗ اِنَّہٗ اَعْوَرُ وَاِنَّہٗ یُجِیْءُ مَعَہٗ بِمِثْلِ الْجَنَّۃِ وَالنَّارِ فَالَّتِیْ یَقُوْلُ اِنَّھَا الْجَنَّۃُ ھِیَ النَّارُ وَاِنِّیْ اُنْذِرُکُمْ کَمَا اَنْذَرَ بِہٖ نُوْحٌ قَوْمَہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" آگاہ رہو میں تمہیں دجال کے بارے میں ایسی بات بتاتا ہوں جو کسی اور نبی علیہ السلام نے اپنی قوم کو نہیں بتائی ہے، (اور وہ بات یہ ہے کہ) دجال کانا ہوگا اور وہ اپنے ساتھ جنّت و دوزخ کی مانند دو چیزیں لائے، گا پس وہ جس چیز کو جنّت کہے گا حقیقت میں وہ آگ ہوگی لہٰذا میں تمہیں اس (دجال) سے ڈراتا ہوں جیسا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس سے ڈرایا تھا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دجال کے پاس چونکہ بڑی زبردست طلسماتی طاقت ہوگی اس لئے وہ اپنے ساتھ ایک بہت بڑا باغ اور آگ کا پھندا لئے پھرے گا جس کو وہ اپنی جنّت اور دوزخ سے تعبیر کرے گا یا جنّت سے مراد آسائش وراحت کے سامان یا اس کے الطاف و عنایات ہیں اور دوزخ سے مراد رنج وکلفت کی چیزیں اور اس کی ایذا رسانیاں ہیں۔

"حقیقت میں وہ آگ ہوگی۔" کی وضاحت ایک شارح نے یہ کی ہے کہ کسی شخص کا دجال کی اس جنّت میں داخل ہونا اور اس کو قبول کرنا درحقیقت عذاب خداوندی میں گرفتار ہونا اور دوزخ میں جانے کا راستہ اختیار کرنا ہے اسی پر قیاس کر کے دوسرا جزیوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ دجال جس چیز کو دوزخ کہے گا حقیقت میں وہ بہشت ہوگی، یعنی جو شخص اس کی اطاعت نہیں کرے گا اور اس کی وجہ سے وہ اس کو اپنی دوزخ میں ڈالے گا وہ شخص درحقیقت دجال کی تکذیب کرنے اور اس کے آگے جھکنے سے انکار کردینے کے سبب بہشت میں

داخل ہوگا! ایک وضاحت تو یہ ہے، لیکن زیادہ قریبی مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ دجال جس چیز کو اپنی جنت اور جس چیز کو اپنی دوزخ بتائے گا اور ان میں جن لوگوں کو داخل کرے گا وہ دونوں کے لئے بالکل برعکس ثابت ہوں گی اور ان کا فعل الٹا ہو جائیگا یعنی جن لوگوں کو تکلیف واذیت میں مبتلا کرنے کے لئے اپنی دوزخ میں ڈالے گا وہ ان کے لئے رنج و تکلیف کے بجائے اطمینان وراحت کی جگہ بن جائے گی اور جن لوگوں کو عیش وراحت دینے کے لئے اپنی جنت میں داخل کرے گا وہ اس کے لئے عیش وراحت کے بجائے رنج و تکلیف کی جگہ بن جائے گی اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے القبر روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النار (قبر یا تو جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے) یعنی قبر کا ماحول اور اس کا فعل بندوں کے اعتبار سے مختلف ہو جاتا ہے، جس بندے سے خدا خوش ہوتا ہے اس کے لئے اس کی قبر رنج و کلفت کی آلام گاہ ہو جاتی ہے اور اس کے قبیل سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ يانار كوني بردا وسلاما على ابراهيم (اے آگ تو ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی کا سبب بن جا) نیز یہی حال اس مکدر دنیا کا ہے جس کو "قید خانہ" کہا گیا ہے لیکن یہی قید خانہ اپنی تمام تر سختیوں اور تنگیوں کے باوجود ان عارفین اور اہل اللہ کے لئے "جنت" کا روپ اختیار کر لیتا ہے جو مقام رضا پر فائز ہوتے ہیں اور خدا کی خوشنودی کی خاطر یہاں کی ہر تنگی و سختی کو صبر و عزیمت اور خوش دلی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ولمن خاف مقام ربه جنتن۔ کہ ان مردان حق آگاہ کے لئے دو جنتیں ہیں، ایک تو یہی دنیا ان کے لئے جنت بن جاتی ہے اور ایک جنت انہیں عقبیٰ میں ملے گی اسی لئے عارفین کی نظر میں دنیا بالکل برعکس معلوم ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک دنیا کی نعمت وراحت در حقیقت نقمت یعنی عذاب ہوتی ہے اور یہاں کی نقمت حقیقت میں نعمت ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ حدیث کا اصل مقصد چونکہ لوگوں کو دجال کی فریب کاریوں سے ڈرانا ہے اس لئے اس موقع پر صرف پہلے جز، یعنی دجال کی جنت کی حقیقت کے ذکر پر اکتفا فرمایا گیا، اگرچہ بعض دوسری حدیثوں میں دوسرے جزء یعنی اس کی دوزخ کی حقیقت کو بھی صریح بیان فرمایا گیا ہے پس مفہوم کے اعتبار سے اس موقع پر پوری عبارت گویا یوں ہوگی کہ "پس وہ جس چیز کو جنت کہے گا حقیقت میں وہ آگ ہوگی اور جس چیز کو دوزخ کہے گا حقیقت میں وہ جنت ہوگی۔

دجال کے سلسلے میں پہلے عمومی طور پر ہر نبی علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد پھر آخر میں خاص طور پر حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کرنا اس حقیقت کی بناء پر ہے کہ مشاہیر انبیاء میں انہی کی ذات مقدم ہے۔

دجال جس شخص کو مصیبت میں ڈالے گا وہ در حقیقت راحت میں ہوگا

(۱۵) وَعَنْ حُذَيْفَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الدَّجَّالَ يَخْرُجُ وَاِنَّ مَعَهُ مَآءً وَنَارًا فَاَمَّا الَّذِيْ يَرَاهُ النَّاسُ مَآءً فَنَارٌ تُحْرِقُ وَاَمَّا الَّذِيْ يَرَاهُ النَّاسُ نَارًا فَمَآءٌ بَارِدٌ عَذْبٌ فَمَنْ اَدْرَكَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَلْيَقَعْ فِي الَّذِيْ يَرَاهُ نَارًا فَاِنَّهٗ مَآءٌ عَذْبٌ طَيِّبٌ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ مُسْلِمٌ وَاِنَّ الدَّجَّالَ مَمْسُوْحُ الْعَيْنِ عَلَيْهَا ظَفَرَةٌ غَلِيْظَةٌ مَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ كَافِرٌ يَقْرَءُهٗ كُلُّ مُؤْمِنٍ كَاتِبٍ وَغَيْرُ كَاتِبٍ۔

"اور حضرت حذیفہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا دجال اس حالت میں ظاہر ہوگا کہ اس کے ساتھ پانی ہوگا اور آگ ہوگی، تاہم لوگ جس چیز کو پانی سمجھیں گے وہ حقیقت میں جلانے والی ہوگی اور جس چیز کو لوگ آگ سمجھیں گے وہ حقیقت میں ٹھنڈا اور شیریں پانی ہوگا پس تم میں سے جو شخص اس کو (یعنی دجال کو یا اس کی فریب کاریوں کی مذکورہ چیزوں کو) پائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس چیز میں گرنا پسند کرے جس کو وہ آگ کی صورت میں دیکھے (یعنی دجال اس کی تکذیب سے ناراض ہو کر اس کو اپنی آگ میں ڈال دے گا) کیونکہ حقیقت میں وہ (آگ نہیں ہوگی بلکہ نہایت شیریں اور پسندیدہ پانی ہوگا۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم نے اپنی روایت میں یہ الفاظ مزید نقل کیے

ہیں کہ۔ "دجال ممسوح العین ہوگا (یعنی اس کی ایک آنکھ کی جگہ پیشانی کی طرح بالکل سپاٹ ہوگی کہ وہاں آنکھ کا کوئی نشان بھی نہیں ہوگا) اور اس پر (یعنی دوسری آنکھ پر) بھاری ناخنہ ہوگا گویا اس کی ایک آنکھ تو بالکل غائب ہی ہوگی اور دوسری آنکھ پر بھی گوشت یا کھال کا ایک موٹا ٹکڑا ہوگا، یا یہ معنی ہیں کہ اس غائب آنکھ پر ناخنہ ہوگا) اور اس کی آنکھوں کے درمیان کافر" کا لفظ لکھا ہوگا۔ اور اس لفظ کو ہر مؤمن پڑھے گا خواہ وہ لکھنا (اور پڑھنا) جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔"

تشریح: "اس کے ساتھ پانی ہوگا" میں "پانی" سے مراد اسباب عیش و راحت میں سے وہ چیز ہے جس کا بظاہر بہت قریبی تعلق پانی سے ہوگا اور جس کے ذریعہ وہ لوگوں کو اپنی اتباع کی طرف مائل کرے گا، اسی طرح "آگ" سے مراد وہ چیز ہے جو بظاہر اذیت و تکلیف میں مبتلا کرنے والی ہوگی ورنہ حقیقت کے اعتبار سے ان لوگوں کو کوئی تکلیف و اذیت نہیں پہنچائے گی جو اس (دجال) کو جھٹلائیں گے اور اس کی اتباع کرنے سے انکار کردیں گے۔

لوگ جس چیز کو پانی سمجھیں گے الخ کا مطلب یہ ہے کہ دجال جن چیزوں کو ان لوگوں کی نظر میں عیش و راحت کی چیزیں کر کے دکھائے گا یا جن چیزوں کو وہ اذیت و تکلیف پہنچانے والے اسباب ظاہر کرے گا وہ حقیقت کے اعتبار سے برعکس ہوں گی مثلاً جن کو اپنی اتباع کرنے کے صلہ میں اس پانی سے نوازے گا آخر الامر وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگ میں جلیں گے اسی طرح وہ جن لوگوں کو اپنی نافرمانی کی سزا کے طور پر آگ کے سپرد کرے گا اس آگ کو اللہ تعالیٰ ٹھنڈک اور راحت پہنچانے کے لئے، پانی کی تاثیر عطا کردے گا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ کو ٹھنڈا اور باعث راحت بنا دیا گیا تھا پس حاصل یہ نکلا کہ جو چیزیں دجال کے ذریعہ ظاہر ہوں گی اور فتنہ کا باعث بنیں گی ان کی حقیقت وہ نہیں ہوگی جو بظاہر نظر آئے گی بلکہ وہ طلسماتی اور خیالی چیزیں ہوں گی جیسا کہ طلسم جاننے والے اور شعبدہ باز اپنے کرتب دکھاتے ہیں لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا، یہ بھی احتمال ہے کہ اس کے ذریعہ ظاہر ہونے والی چیزیں حقیقی ہی ہوں گی مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے حکم سے ان کی تاثیر الٹی ہو جائے گی کہ پانی تو جلائے گا اور آگ ٹھنڈک پہنچائے گی۔

کیونکہ وہ نہایت شیریں اور پسندیدہ پانی ہوگا۔" یعنی بظاہر آگ نظر آنے والی چیز یا تو حقیقت کے اعتبار سے یا ماہیت بدل دیئے جانے کے اعتبار سے اور یا آخری مآل و انجام کے اعتبار سے، پانی ہوگا جو ٹھنڈک و راحت پہنچانے کا باعث بنے گا! واضح رہے کہ حدیث میں اس موقع پر اختصار سے کام لیا گیا ہے اور صرف ایک ہی جزء کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے، ورنہ حقیقت میں یہاں اس دوسرے جزء کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے کہ اور اس کو چاہئے کہ وہ اس کے پانی (یعنی اس کے اسباب عیش و راحت کی طرف مائل ہو کر اس (دجال) کی تصدیق و اتباع نہ کرے کیونکہ حقیقت میں وہ پانی نہیں ہوگا بلکہ ایک طرح کا عذاب و حجاب ہوگا۔

"دجال ممسوح العین ہوگا الخ" کے سلسلہ میں، جیسا کہ ترجمہ کے دوران وضاحت کردی گئی ہے، یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ناخنہ کا تعلق اسی آنکھ سے ہے جس کو ممسوح فرمایا گیا ہے حالانکہ یہ بات موزوں نہیں ہے کیونکہ) ممسوح العین کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس آنکھ کی جگہ سرے سے آنکھ اور بھویں نہ ہوں بلکہ وہ جگہ بالکل سپاٹ ہو پس جب وہ آنکھ ہی نہیں ہوگی تو اس پر ناخنہ ہونے کے کیا معنی لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ ناخنہ اس کی آنکھ پر ہوگا جو دوسری جانب ہوگی، ہاں اگر "ممسوح" سے مراد محض "عیب" لیا جائے تو اس صورت میں حدیث کے الفاظ اپنے ظاہری معنی پر محمول ہو سکتے ہیں۔

دجال کی پہچان

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدَّجَّالُ اَعْوَرُا الْعَيْنِ الْيُسْرٰى جُفَالُ الشَّعْرِ مَعَهٗ جَنَّتُهٗ وَنَارُهٗ فَنَارُهٗ جَنَّةٌ وَجَنَّتُهٗ نَارٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ دجال کی بائیں آنکھ کانی ہوگی، اس کے بہت کثرت سے بال ہوں گے اور اس

کے ساتھ اس کی جنت ہوگی اور اس کی آگ ہوگی، لیکن اس کی آگ حقیقت میں جنت ہوگی اور اس کی جنت حقیقت میں آگ ہوگی۔"
(مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ دجال کی بائیں آنکھ کانی ہوگی جب کہ اس سلسلے میں پہلے جو حدیث گذری ہے اس میں یہ ذکر ہے کہ وہ دائیں آنکھ سے کانا ہوگا اور اس کی ایک آنکھ بالکل غائب اور سپاٹ ہوگی۔ لہٰذا ان دونوں حدیثوں کے درمیان جو ظاہری تضاد ہے اس کو ختم کرنے کے لئے یہ کہا جائے گا کہ اس کی آنکھ بالکل غائب ہوگی اور دوسری جانب کی آنکھ عیب دار ہوگی، اس اعتبار سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کی ہر ایک آنکھ کو "اعور" کہا جائے کیونکہ "اعور" کے اصل معنی عیب کے ہیں بعض حضرات نے ان احادیث کے درمیان یہ کہہ کر مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ دجال کا اعور ہونا لوگوں کے فرق کی نسبت سے ہوگا یعنی کچھ لوگ تو اس کو بائیں آنکھ کا عیبی دیکھیں گے اور کچھ لوگ دائیں آنکھ کا عیب دار دیکھیں گے اور یہ اس لئے ہوگا تاکہ اس کا جھوٹا اور فریبی ہوجانا بالکل ظاہر ہوجائے کیونکہ جب تمام لوگوں کی نظر میں اس کی اصل حیثیت وحالت نہیں آئے گی بلکہ وہ آنکھوں کے اعتبار سے کبھی کسی طرح کا اور کبھی کسی طرح کا دکھائی دیگا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ جادوگر اور شعبدہ باز ہے اور اپنی کرتب بازیوں کے ذریعہ مختلف روپ اختیار کرتا رہتا ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں سے کسی ایک حدیث کے راوی کو سہو ہوگیا ہو کہ اس نے دائیں آنکھ کے بجائے بائیں آنکھ یا بائیں آنکھ کے بجائے دائیں آنکھ کا ذکر کردیا ہو۔

دجال کے طلسماتی کارناموں اور یاجوج وماجوج کا ذکر

⑫ وَعَنِ النَّوَاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اِنْ يَّخْرُجْ وَاَنَا فِيْكُمْ فَاَنَا حَجِيْجُهٗ دُوْنَكُمْ وَاِنْ يَّخْرُجْ وَلَسْتُ فِيْكُمْ فَامْرُءٌ حَجِيْجُ نَفْسِهٖ وَاللّٰهُ خَلِيْفَتِيْ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ اِنَّهٗ شَابٌّ قَطَطٌ عَيْنُهٗ طَافِيَةٌ كَاَنِّيْ اُشَبِّهُهٗ بِعَبْدِ الْعُزّٰى بْنِ قَطَنٍ فَمَنْ اَدْرَكَهٗ مِنْكُمْ فَلْيَقْرَأْ عَلَيْهِ فَوَاتِحَ سُوْرَةِ الْكَهْفِ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَلْيَقْرَأْ عَلَيْهِ بِفَوَاتِحِ سُوْرَةِ الْكَهْفِ فَاِنَّهَا جَوَارُكُمْ مِنْ فِتْنَتِهٖ اِنَّهٗ خَارِجٌ خَلَّةً بَيْنَ الشَّامِ وَالْعِرَاقِ فَعَاثَ يَمِيْنًا وَّعَاثَ شِمَالًا يَا عِبَادَ اللّٰهِ فَاثْبُتُوْا قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا لَبْثُهٗ فِي الْاَرْضِ قَالَ اَرْبَعُوْنَ يَوْمًا يَوْمٌ كَسَنَةٍ وَّيَوْمٌ كَشَهْرٍ وَّيَوْمٌ كَجُمُعَةٍ وَّسَائِرُ اَيَّامِهٖ كَاَيَّامِكُمْ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَسَنَةٍ اَيَكْفِيْنَا فِيْهِ صَلٰوةُ يَوْمٍ قَالَ لَا اُقْدُرُوْا لَهٗ قَدْرَهٗ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا اِسْرَاعُهٗ فِي الْاَرْضِ قَالَ كَالْغَيْثِ اِسْتَدْبَرَتْهُ الرِّيْحُ فَيَاْتِيْ عَلَى الْقَوْمِ فَيَدْعُوْهُمْ فَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ فَيَاْمُرُ السَّمَآءَ فَتُمْطِرُ وَالْاَرْضَ فَتُنْبِتُ فَتَرُوْحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَتُهُمْ اَطْوَلَ مَا كَانَتْ ذُرًى وَّاَسْبَغَهٗ ضُرُوْعًا وَّاَمَدَّهٗ خَوَاصِرَ ثُمَّ يَاْتِي الْقَوْمَ فَيَدْعُوْهُمْ فَيَرُدُّوْنَ عَلَيْهِ قَوْلَهٗ فَيَنْصَرِفُ عَنْهُمْ فَيُصْبِحُوْنَ مُمْحِلِيْنَ لَيْسَ بِاَيْدِيْهِمْ شَيْءٌ مِّنْ اَمْوَالِهِمْ وَيَمُرُّ بِالْخَرِبَةِ فَيَقُوْلُ لَهَا اَخْرِجِيْ كُنُوْزَكِ فَتَتْبَعُهٗ كُنُوْزُهَا كَيَعَاسِيْبِ النَّحْلِ ثُمَّ يَدْعُوْا رَجُلًا مُّمْتَلِئًا شَبَابًا فَيَضْرِبُهٗ بِالسَّيْفِ فَيَقْطَعُهٗ جَزْلَتَيْنِ رَمْيَةَ الْغَرَضِ ثُمَّ يَدْعُوْهُ فَيُقْبِلُ وَيَتَهَلَّلُ وَجْهُهٗ يَضْحَكُ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ اِذْ بَعَثَ اللّٰهُ الْمَسِيْحَ بْنَ مَرْيَمَ فَيَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَآءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ بَيْنَ مَهْرُوْدَتَيْنِ وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلٰى اَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ اِذَا طَاْطَاَ رَاْسَهٗ قَطَرَ وَاِذَا رَفَعَهٗ تَحَدَّرَ مِنْهُ مِثْلُ جُمَانٍ كَاللُّؤْلُؤِ فَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ مِنْ رِّيْحِ نَفَسِهٖ اِلَّا مَاتَ وَنَفَسُهٗ يَنْتَهِيْ حَيْثُ يَنْتَهِيْ طَرْفُهٗ فَيَطْلُبُهٗ حَتّٰى يُدْرِكَهٗ بِبَابِ لُدٍّ فَيَقْتُلُهٗ ثُمَّ يَاْتِيْ عِيْسٰى قَوْمٌ قَدْ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ فَيَمْسَحُ عَنْ وُّجُوْهِهِمْ وَيُحَدِّثُهُمْ بِدَرَجَاتِهِمْ فِي الْجَنَّةِ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ اِذْ اَوْحَى اللّٰهُ اِلٰى عِيْسٰى اَنِّيْ قَدْ اَخْرَجْتُ عِبَادًا لِّيْ لَا يَدَانِ لِاَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ فَحَرِّزْ عِبَادِيْ اِلَى الطُّوْرِ وَيَبْعَثُ اللّٰهُ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ فَيَمُرُّ اَوَائِلُهُمْ عَلٰى بُحَيْرَةِ طَبَرِيَّةَ فَيَشْرَبُوْنَ مَا فِيْهَا وَيَمُرُّ اٰخِرُهُمْ فَيَقُوْلُ لَقَدْ كَانَ بِهٰذِهٖ مَرَّةً مَآءٌ ثُمَّ يَسِيْرُوْنَ حَتّٰى يَنْتَهُوْا اِلٰى جَبَلِ الْخَمَرِ وَهُوَ جَبَلُ بَيْتِ

الْمَقْدِسِ فَيَقُوْلُوْنَ لَقَدْ قَتَلْنَا مَنْ فِي الْاَرْضِ هَلُمَّ فَلْنَقْتُلْ مَنْ فِي السَّمَآءِ فَيَرْمُوْنَ بِنُشَّابِهِمْ اِلَى السَّمَآءِ فَيَرُدُّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ نُشَّابَهُمْ مَخْضُوْبَةً دَمًا وَّيُحْصَرُ نَبِيُّ اللّٰهِ وَاَصْحَابُهُ حَتّٰى تَكُوْنَ رَاْسُ الثَّوْرِ لِاَحَدِهِمْ خَيْرًا مِّنْ مِائَةِ دِيْنَارٍ لِاَحَدِكُمُ الْيَوْمَ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى وَاَصْحَابُهُ فَيُرْسِلُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِيْ رِقَابِهِمْ فَيُصْبِحُوْنَ فَرْسٰى كَمَوْتِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ يُهْبَطُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى وَاَصْحَابُهُ اِلَى الْاَرْضِ فَلَا يَجِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرٍ اِلَّا مَلَاَهُ زَهَمُهُمْ وَنَتْنُهُمْ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى وَاَصْحَابُهُ اِلَى اللّٰهِ فَيُرْسِلُ اللّٰهُ طَيْرًا كَاَعْنَاقِ الْبُخْتِ فَتَحْمِلُهُمْ فَتَطْرَحُهُمْ حَيْثُ شَآءَ اللّٰهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ تَطْرَحُهُمْ بِالنَّهْبَلِ وَيَسْتَوْقِدُ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ قِسِيِّهِمْ وَنُشَّابِهِمْ وَجِعَابِهِمْ سَبْعَ سِنِيْنَ ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ مَطَرًا لَّا يَكُنُّ مِنْهُ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ فَيَغْسِلُ الْاَرْضَ حَتّٰى يَتْرُكَهَا كَالزَّلَفَةِ ثُمَّ يُقَالُ لِلْاَرْضِ اَنْبِتِيْ ثَمَرَتَكِ وَرُدِّيْ بَرَكَتَكِ فَيَوْمَئِذٍ تَاْكُلُ الْعِصَابَةُ مِنَ الرُّمَّانَةِ وَيَسْتَظِلُّوْنَ بِقِحْفِهَا وَيُبَارَكُ فِي الرِّسْلِ حَتّٰى اَنَّ اللِّقْحَةَ مِنَ الْاِبِلِ لَتَكْفِي الْفِئَامَ مِنَ النَّاسِ وَاللِّقْحَةَ مِنَ الْبَقَرِ لَتَكْفِي الْقَبِيْلَةَ مِنَ النَّاسِ وَاللِّقْحَةَ مِنَ الْغَنَمِ لَتَكْفِي الْفَخِذَ مِنَ النَّاسِ فَبَيْنَا هُمْ كَذٰلِكَ اِذْ بَعَثَ اللّٰهُ رِيْحًا طَيِّبَةً فَتَاْخُذُهُمْ تَحْتَ اٰبَاطِهِمْ فَتَقْبِضُ رُوْحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَّكُلِّ مُسْلِمٍ وَّيَبْقٰى شِرَارُ النَّاسِ يَتَهَارَجُوْنَ فِيْهَا تَهَارُجَ الْحُمُرِ فَعَلَيْهِمْ تَقُوْمُ السَّاعَةُ رَوَاهُ مُسْلِمٌ اِلَّا الرِّوَايَةَ الثَّانِيَةَ وَهِيَ قَوْلُهُ تَطْرَحُهُمْ بِالنَّهْبَلِ اِلٰى قَوْلِهِ سَبْعَ سِنِيْنَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت نواس ابن سمعانؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے دجال (کے نکلنے) اس کی فریب کاریوں اور اس کے فتنہ میں لوگوں کے مبتلا ہونے) کا ذکر کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا اگر دجال نکلے اور (بالفرض) میں تمہارے درمیان موجود ہوں تو میں اس سے تمہارے سامنے جھگڑوں اور دلیل کے ذریعہ اس پر غالب آؤں) اور اگر دجال اس وقت نکلا جب میں نہ ہوں گا تو پھر تم میں سے ہر شخص اپنی ذات کی طرف سے اس سے جھگڑنے والا ہو گا اور میرا وکیل وخلیفہ ہر مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ ہے دجال جوان ہو گا اس کے بال گھونگریالے ہوں گے اور اس کی آنکھ پھولی ہوئی ہو گی گویا میں اس کو قطن کے بیٹے عبدالعزی سے تشبیہ دے سکتا ہوں پس تم میں سے جو شخص اس کو پائے اس کو چاہئے کہ وہ اس کے سامنے سورۂ کہف کی ابتدائی آیتیں پڑھے" اور مسلم ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس کو چاہئے کہ وہ اس کے سامنے سورہ کہف کی ابتدائی آیتیں پڑھے کیونکہ وہ آیتیں تمہیں دجال کے فتنہ سے مامون و محفوظ رکھیں گی (جان لو) دجال اس راستہ سے نمودار ہو گا جو شام اور عراق کے درمیان واقع ہے اور دائیں بائیں فساد پھیلائے گا (پس) اے اللہ کے بندو! (اس وقت جب کہ دجال نکلے) تم (اپنے دین پر) ثابت قدم رہنا" راوی کہتے ہیں کہ) ہم نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ کتنے دنوں زمین پر رہے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا چالیس دن، (اور زمانہ کی طوالت کے اعتبار سے ان میں سے) ایک دن تو ایک سال کے برابر ہو گا اور ایک دن ایک مہینے کے برابر ہو گا اور ایک دن ایک ہفتہ کے برابر ہو گا اور باقی دن تمہارے دنوں کے مطابق (یعنی ہمیشہ کے دنوں کی طرح) ہوں گے" ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ان دنوں میں سے جو ایک دن ایک سال کے برابر ہو گا کیا اس روز ہماری ایک دن کی نماز کافی ہو گی؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ نماز پڑھنے کے لئے ایک دن کا حساب لگانا ہو گا۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ زمین پر کتنا زیادہ تیز چلے گا (یعنی اس کی تیز رفتاری کی کیا کیفیت ہو گی؟) آپ ﷺ نے فرمایا وہ اس مینہ یعنی ابر کی مانند تیز رفتار ہو گا جس کے پیچھے ہوا ہو! وہ ایک ایک قوم کے پاس پہنچے گا اور اس کو اپنی دعوت دے گا (یعنی اپنی اتباع کی طرف بلائے گا اور برائی کے راستہ پر لگائے گا) لوگ اس پر ایمان لے آئیں گے یعنی اس کے فریب میں آکر اس کی اتباع کرنے لگیں گے) پھر وہ (اپنے تابعداروں کو نوازنے کے لئے) ابر کو بارش برسانے کا حکم دیگا تو ابر بارش برسائے گا اور زمین کو سبزہ اگانے کا حکم دے گا تو زمین سبزہ اگائے گی۔ پھر جب شام کو اس قوم کے (وہ) مویشی آئیں گے جو چرنے کے لئے صبح کے وقت جنگل و بیابان گئے تھے تو ان کے کوہان بڑے بڑے ہو جائیں گے اور ان کی کوکھیں (خوب کھانے پینے کی وجہ سے) تن جائیں گی پھر اس کے بعد دجال ایک اور قوم کے پاس پہنچے گا اور اس کو اپنی دعوت دے گا (یعنی اپنی خدائی کی

طرف بلائے گا اور کہے گا کہ مجھے اپنا پروردگار تسلیم کرو) لیکن اس قوم کے لوگ اس کی دعوت کو رد کر دیں گے (یعنی وہ اس کی بات کو قبول نہیں کریں گے اور اس پر ایمان لانے سے انکار کر دیں گے، اور وہ ان کے پاس سے چلا جائیگا (یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اس قوم کی طرف سے پھیر دے گا) پھر اس قوم کے لوگ قحط وخشک سالی اور تباہ حالی کا شکار ہو جائیں گے یہاں تک کہ وہ مال واسباب سے بالکل خالی ہاتھ ہو جائیں گے، اس کے بعد دجال ایک ویرانہ پر سے گزرے گا اور اس کو حکم دے گا وہ اپنے خزانوں کو نکال دے چنانچہ وہ ویرانہ دجال کے حکم کے مطابق اپنے خزانوں کو اگل دے گا اور) وہ خزانے اس طرح اس کے پیچھے پیچھے ہولیں گے جس طرح شہد کی مکھیوں کے سردار ہوتے ہیں، پھر دجال ایک شخص کو جو جوانی سے بھرپور یعنی نہایت قوی وتوانا جوان ہوگا اپنی طرف بلائے گا اور (اس بات سے غصہ ہو کر کہ وہ اس کی الوہیت سے انکار کر دے گا، یا محض اپنی طاقت وقدرت ظاہر کرنے اور اپنے غیر معمولی کارناموں کی ابتداء کے لئے) اس پر تلوار کا ایسا ہاتھ مارے گا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے جیسا کہ تیر نشانے پر پھینکا جاتا ہے (یعنی اس کے جسم کے وہ دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے اس قدر فاصلہ پر جا کر گریں گے جتنا فاصلہ تیر چلانے والے اور اس کے نشانے کے درمیان ہوتا ہے اور بعض حضرات نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اس کی تلوار کا ہاتھ اس کے جسم پر اس طرح پہنچے گا جس طرح تیر اپنے نشانہ پر پہنچتا ہے) اس کے بعد دجال اس نوجوان (کے جسم کے ان ٹکڑوں) کو بلائے گا، چنانچہ وہ زندہ ہو کر دجال کی طرف متوجہ ہوگا اور اس وقت اس کا چہرہ نہایت بشاش، روشن اور کھلا ہوا ہوگا غرضیکہ دجال اسی طرح کی فریب کاریوں اور گمراہ کرنے والے کاموں میں مشغول ہوگا کہ اچانک اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم علیہ السلام کو نازل فرمائے گا جو دمشق کے شرقی جانب کے سفید منارہ پر سے اتریں گے، اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوں گے اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو دو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے (آسمان سے نازل ہونگے وہ جس وقت اپنا سر جھکائیں گے تو پسینہ ٹپکے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو ان کے سر سے چاندی کے دانوں کی مانند قطرے گریں گے جو موتیوں کی طرح ہوں گے، یہ ناممکن ہوگا کہ کسی کافر تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کی ہوا پہنچے اور وہ مر نہ جائیں (یعنی جو بھی کافران کے سانس کی ہوا پائے گا مر جائے گا) اور ان کے سانس کی ہوا ان کی حد نظر تک جائے گی پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے یہاں تک کہ وہ اس کو باب لد پر پائیں گے اور قتل کر ڈالیں گے، اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس وہ لوگ آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے دجال کے مکر وفریب اور فتنہ سے محفوظ رکھا ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے چہروں سے گرد وغبار صاف کریں گے اور ان کو ان درجات ومراتب کی بشارت دیں گے جو وہ جنت میں پائیں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی حال میں ہوں گے کہ اچانک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس یہ وحی آئے گی کہ میں نے اپنے بہت سے ایسے بندے پیدا کیے ہیں جن سے لڑنے کی قدرت وطاقت کوئی نہیں رکھتا۔ لہٰذا تم میرے بندوں کو جمع کر کے کوہ طور کی طرف لے جاؤ اور ان کی حفاظت کرو، پھر اللہ تعالیٰ یاجوج وماجوج کو ظاہر کرے گا جو ہر بلند زمین کو پھلانگتے ہوئے اتریں گے اور دوڑیں گے، (ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوگی کہ جب ان کی سب سے پہلی جماعت بحیرۂ طبریہ سے گزرے گی تو اس کا سارا پانی پی جائے گی، پھر جب اس جماعت کے بعد آنے والی جماعت وہاں سے گزرے گی تو بحیرۂ طبریہ کو خالی دیکھ کر) کہے گی کہ اس میں کبھی پانی تھا اس کے بعد یاجوج وماجوج آگے بڑھیں گے یہاں تک کہ جبل خمر تک پہنچ جائیں گے جو بیت المقدس کا ایک پہاڑ ہے (اور ظلم وقتل، غارت گری، اذیت رسانی اور لوگوں کو پکڑنے قید کرنے میں مشغول ہو جائیں گے اور پھر کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو ختم کر دیا ہے، چلو آسمان والوں کا خاتمہ کر دیں، چنانچہ وہ آسمان کی طرف اپنے تیر پھینکیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے لوٹا دے گا (تا کہ وہ اس بھرم میں رہیں کہ ہمارے تیر واقعۃً آسمان والوں کا کام تمام کر کے واپس آئے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل دے دی جائے گی، اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ تیر فضا میں پرندوں کو لگیں گے اور ان کے خون سے آلودہ ہو کر واپس آئیں گے، پس اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ دجال کا فتنہ زمین ہی تک محدود نہیں رہیں گا بلکہ زمین کے اوپر بھی پھیل جائے گا) اس عرصہ میں خدا کے نبی اور ان کے رفقاء یعنی حضرت عیسیٰ اور اس وقت کے مؤمن کوہ طور پر روکے رکھے جائیں گے، اور (ان پر اسباب معیشت کی تنگی وقلت اس درجہ کو پہنچ جائے گی کہ) اس

کے لئے بیل کا سر تمہارے آج کے سو دیناروں سے بہتر ہوگا (جب یہ حالت ہو جائے گی تو) اللہ کے نبی حضرت عیسی علیہ السلام اور ان کے ساتھی یاجوج ماجوج کی ہلاکت کے لئے دعاوزاری کریں گے، پس اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں میں نغف یعنی کیڑے پڑ جانے کی بیماری بھیجے گا جس کی صورت میں ان پر خدا کا قہر اس طرح نازل ہوگا کہ سب کے سب ایک ہی وقت میں موت کے گھاٹ اتر جائیں گے) اللہ کے نبی حضرت عیسی علیہ السلام اور ان کے ساتھی (اس بات سے آگاہ ہو کر) پہاڑ سے زمین پر آئیں گے اور انہیں زمین پر ایک بالشت کا ٹکڑا بھی ایسا نہیں ملے گا جو یاجوج ماجوج کی چربی اور بدبو سے خالی ہو (اس مصیبت کے دفعیہ کے لئے) حضرت عیسی علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تب اللہ تعالیٰ بختی اونٹ کی گردن جیسی لمبی لمبی گردنوں والے پرندوں کو بھیجے گا جو یاجوج ماجوج کی لاشوں کو اٹھا کر جہاں اللہ کی مرضی ہوگی وہاں پھینک دیں گے" اور مسلمان یاجوج ماجوج کی کمانوں، تیروں اور ترکشوں کو سات سال تک جلاتے رہیں گے، پھر اللہ تعالیٰ ایک زوردار بارش بھیجے گا جس سے کوئی بھی مکان خواہ وہ مٹی کا ہو یا پتھر کا اور خواہ صوف کا ہو، نہیں بچے گا وہ بارش زمین کو دھو کر آئینہ کی مانند صاف کر دے گی پھر زمین کو حکم دیا جائے گا کہ اپنے پھلوں "یعنی اپنی پیداوار کو نکال اور اپنی برکت کو واپس لا، چنانچہ (زمین کی پیداوار اس قدر بابرکت اور بافراط ہوگی کہ) دس سے لے کر چالیس آدمیوں تک کی پوری جماعت ایک انار کے پھل سے سیر ہو جائے گی اور اس انار کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے، نیز دودھ میں برکت دی جائے گی (یعنی اونٹ اور بکریوں کے تھنوں میں دودھ بہت ہوگا) یہاں تک کہ دودھ دینے والی ایک اونٹنی لوگوں کی ایک بڑی جماعت کے لئے کافی ہوگی، دودھ دینے والی ایک گائے لوگوں کے ایک قبیلہ کے لئے کافی ہوگی اور دودھ دینے والی ایک بکری آدمیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے لئے کافی ہوگی۔ بہرحال لوگ اسی طرح کی خوش حال اور امن وچین کی زندگی گزار رہے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک خوشبودار ہوا بھیجے گا جو ان کی بغل کے نیچے کے حصہ کو پکڑے گی (یعنی اس ہوا کی وجہ سے ان کی بغلوں میں ایک درد پیدا ہوگا) اور پھر وہ ہوا ہر مؤمن اور ہر مسلمان کی روح قبض کر لے گی اور صرف بدکار شریر لوگ دنیا میں باقی رہ جائیں گے جو آپس میں گدھوں کی طرح مختلط ہو جائیں گے اور ان ہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی۔

اس پوری روایت کو مسلم نے نقل کیا ہے علاوہ دوسری روایت کے ان الفاظ تطرحهم بالنهبل تاسبع سنين کے کہ اس کو ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: "تو میں اس سے تمہارے سامنے جھگڑوں۔" میں اس طرف اشارہ ہے کہ بالفرض اگر آنحضرت ﷺ کی حیات میں دجال کا ظہور ہوتا تو آنحضرت ﷺ دلیل وحجت کے ذریعہ اس پر غالب آنے کے لئے اپنی اُمت میں سے کسی معاون ومددگار کی مدد کے محتاج نہیں تھے! بہرحال مذکورہ بالا جملہ کی وضاحت کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ یہ بات خود حضور ﷺ کو معلوم تھی کہ دجال کا ظہور زمانۂ نبوی کے بعد ہوگا جیسا کہ دوسری احادیث اور دیگر دلائل وقرائن سے واضح ہے لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ کا مذکورہ جملہ ارشاد فرمانا دراصل دجال کے ظاہر ہونے کی حقیقت کو زیادہ یقین کے ساتھ بیان کرنے اور موکد کرنے، اس کے ظہور کے وقت کے مبہم ہونے کی طرف اشارہ کرنے اور جن لوگوں کا دجال سے سابقہ پڑنے والا ہے ان کو اس کے فتنہ سے چوکنا کرنے کے پیش نظر تھا۔

"تو پھر تم میں سے ہر شخص اپنی ذات کی طرف سے اس سے جھگڑنے والا" کا مطلب یہ ہے کہ دجال کے ظاہر ہونے کے وقت جو مسلمان اس دنیا میں ہوں گے ان میں سے ہر ایک کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کے شر سے بچنے کے لئے شرعی وقطعی اور عقلی دلائل کے ذریعہ اس سے بحث ومباحثہ کرے اور اس پر غالب آئے لیکن یہ بات فرض کر لینے کے بعد کہ دجال بحث ومباحثہ کو سننے اور دلائل کو تسلیم کرنے والا ہوگا ورنہ اس جملہ کے اصل معنی یہ ہوں گے کہ اس وقت ہر مؤمن کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ دجال کی تکذیب کرے، اس کی بات کو قبول کرنے اور اس کو تکلیف واذیت پہنچانے کی صورت اختیار کر کے اس کے شر سے اپنے کو بچائے۔

"میرا وکیل وخلیفہ ہر مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ ہے" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ میرے بعد اللہ تعالیٰ ہر مؤمن ومسلمان کا حافظ وناصر ہوگا اور دجال کے فتنہ سے بچنے میں مدد دے گا پس یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کامل یقین رکھنے والا مؤمن ہمیشہ مدد ونصرت

پاتا ہے اگرچہ ان کے درمیان نبی ﷺ وامام موجود نہ ہو، اس اعتبار سے حدیث فرقۂ امامیہ کے خلاف مضبوط دلیل ہے۔

"دجال جوان ہوگا۔" سے یہ ثابت ہوا کہ ابن صیاد پر دجال کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، ان الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ سفید بالوں کی صورت میں کسی شخص کو جو وقار حاصل ہوتا ہے اس سے دجال محروم ہوگا۔

"عبدالعزی ابن قطن" ایک یہودی کا نام تھا، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی مشرک تھا کیونکہ "عزی" ایک بت کا نام ہے۔ اس کی طرف عبد یعنی بندہ کی نسبت رکھنے والا مشرک ہی ہوسکتا ہے، اس کی تائید بعض حضرات کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ عبدالعزی قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص تھا جو زمانہ جاہلیت میں مرچکا تھا آنحضرت ﷺ نے دجال کو عبدالعزی کے ساتھ جو تشبیہ دی تو اس میں جزم کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ "گویا" کا لفظ اظہار شک کے مذکورہ تشبیہ کو تاکیدی انداز میں بیان کرنے کے لئے ہے، چنانچہ ملا علی قاریؒ نے بھی وضاحت کی ہے کہ کانی یعنی گویا کا لفظ اظہار شک کے لئے نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے یعنی عبدالعزی، اس کا تعارف آپ ﷺ کو عالم کشف یا خواب میں حاصل ہوا تھا اس لئے اس کے ساتھ دجال کو تشبیہ دیتے وقت آپ ﷺ نے کانی کا لفظ استعمال فرمایا جیسا کہ کسی خواب کو بیان کرنے کا یہی اسلوب معتبر ہے۔

سورۂ کہف کی ابتدائی آیتوں سے مراد شروع سے ان یقولون الا کذبا تک کی آیتیں ہیں آیتوں کو دجال کے سامنے پڑھنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ ان میں جو مضامین مذکور ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت، اس کی کتاب اور آیات بینات کے ثبوت اس کے رسول ﷺ کی صداقت، اور رسول کی اس اعجازی شان پر دلالت کرتے ہیں جس کی برکت سے دجال کے محیر العقول کارنامے ملیامیٹ ہوکر رہ جائیں گے اور اس کی اتباع کرنے والے ہلاکت وتباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں پائیں گے! طیبیؒ نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیتیں یہ خاصیت رکھتی ہیں کہ ان کا پڑھنے والا دجال کے فتنہ سے امن وحفاظت میں رہے گا جیسا کہ اصحاب کہف نے اپنے زمانے کی سب سے بڑی طاقت سے شر وفتنہ سے امان ونجات پائی تھی واضح رہے کہ بعض احادیث میں ان آیتوں کو رات میں سوتے وقت بھی پڑھنا منقول ہے! مسلم کی دوسری روایت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ فانھا جوار کم من فتنۃ (کیونکہ وہ آیتیں تمہیں دجال کے فتنہ سے محفوظ ومامون رکھیں گی) تو اکثر صحیح نسخوں میں "جوار" کا لفظ جیم کے زیر اور آخر میں رَ کے ساتھ ہے، جس کے معنی ہمسائیگی اور امان کے ہیں، لیکن بعض نسخوں میں یہ لفظ جیم کے زبر اور آخر میں زا کے ساتھ، یعنی "جواز" منقول ہے، جس کے معنی اس پروانہ راہ داری کے ہیں جس کی بنیاد پر کوئی شخص سفر کرتا ہے اور راستہ میں اس کو کوئی روک ٹوک نہیں کرتا پھر بعض شروح میں "جوار" کا جیم زبر اور پیش کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ جیم کے زیر کے ساتھ ہی فصیح ہے اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ حصن حصین میں سورہ کہف کے تعلق سے متعدد روایتیں منقول ہیں مثلاً ایک روایت میں یہ ہے کہ جس شخص نے سورۂ کہف پڑھ لی اس کو اس کے پاس سے لے کر مکہ مکرمہ تک کی نورانیت حاصل ہوتی ہے اور جس شخص نے اس سورۃ کی آخری دس آیتیں پڑھیں اور پھر اس کے زمانہ میں دجال نکل آئے تو دجال اس پر تسلط پانے میں ناکام رہے گا ایک اور روایت میں یہ ہے کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتیں یاد کرلیں وہ دجال سے محفوظ ہوگیا ایک روایت میں یوں فرمایا گیا ہے کہ جس شخص نے سورہ کہف کی ابتدائی تین آیتیں پڑھ لیں وہ دجال سے محفوظ ہوگیا ان آخری دونوں روایتوں میں دس آیتوں اور تین آیتوں کی صورت میں جو ظاہری تضاد ہے اس کو ختم کرنے کے لئے یوں تو بہت سے اقوال ہیں لیکن زیادہ واضح قول یہ ہے کہ سورۂ کہف کا کم سے کم حصہ کہ جس کا پڑھنا دجال کے شر سے محفوظ رکھے گا تین آیتیں ہیں اور ان تین آیتوں کو حفظ کرلینا اولیٰ ہے لہٰذا یہ بات زیادہ حصہ مثلاً دس آیتوں کے پڑھنے یا اس کو حفظ کرنے کے منافی نہیں ہے۔

"اور وہ دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔" سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ دجال جن شہروں اور علاقوں سے گزرے گا صرف انہی جگہوں پر فتنہ وفساد پھیلانے پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ وہ اپنے دائیں بائیں اور ادھر ادھر، جہاں خود نہیں جاسکے گا اپنے لشکر اور اپنے تابعداروں کی جماعت بھیجے گا، اس طرح اس کے فتنہ وشر سے کوئی مؤمن امن میں نہیں ہوگا اور ایسی کوئی جگہ باقی نہیں بچے گی

جہاں اس کا فتنہ نہ پہنچے۔

اے اللہ کے بندو، تم ثابت قدم رہنا۔" یہ خطاب ان مؤمنین سے ہے جو دجال کے زمانہ میں ہوں گے، یا آپ ﷺ نے یہ بات اپنے صحابہؓ سے فرمائی کہ اگر بالفرض تم دجال کا زمانہ پاؤ تو اس وقت دین پر مضبوطی سے قائم رہنا۔

"چالیس دن" کے سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ یہاں مسلم کی روایت میں تو دجال کی مدت قیام چالیس دن فرمائی گئی ہے جب کہ آگے آنے والی ایک حدیث میں یہ مدت چالیس سال بیان کی گئی ہے پس بغویؒ نے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ چالیس سال بیان کرنے والی حدیث صحت واستناد کے اعتبار سے اس درجہ کی نہیں ہے کہ اس کو مسلم کی اس روایت کے معارض قرار دیا جاسکے، اور اگر بالفرض اس کو اس درجہ کی صحیح حدیث بھی تسلیم کرلیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ ان دونوں حدیثوں میں جو الگ الگ دو مدتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک مدت تو وہ ہے جس میں دنیا والوں پر اس کا ظہور ہی نہیں ہوگا بلکہ اس دنیا میں اس کی موجودگی غیر معلوم ہوگی اور دوسری مخصوص مدت ہے جس کے دوران دنیا والوں پر ظاہر رہے گا اور انہیں تعین کے ساتھ اس کی موجودگی کا علم ہوگا۔

"نماز پڑھنے کے لئے ایک دن کا حساب لگانا ہوگا۔" کا مطلب یہ ہے کہ جب طلوع فجر کے بعد اتنا وقت گزر جائے جو عام دنوں کے اعتبار سے فجر اور ظہر کے درمیان ہوتا ہے تو اس وقت ظہر کی نماز پڑھی جائے اور جب ظہر کے بعد اتنا وقت گزر جائے جو عام دنوں میں ظہر اور عصر کے درمیان ہوتا ہے تو اس وقت عصر کی نماز پڑھی جائے اور جب عصر کے بعد اتنا وقت گزر جائے، جو عام دنوں میں عصر، مغرب کے درمیان ہوتا ہے تو اس وقت مغرب کی نماز پڑھی جائے۔ اسی حساب سے عشاء و فجر کی نماز پڑھی جائے۔ غرضیکہ پانچوں نمازیں اس انداز سے اور حساب سے پڑھی جائیں گی یہاں تک کہ وہ دن، ایک برس کے برابر ہوکر گزر جائے نیز یہی اندازہ اور حساب ان دنوں میں اختیار کیا جائے گا جو ایک مہینہ اور ایک ہفتہ کے برابر ہوں گے واضح رہے کہ مذکورہ دنوں کی طوالت کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ حقیقت میں اتنے ہی طویل ہوں گے اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ شب و روز کی گردش کو مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل کرسکتا ہے اس بارے میں بعض حضرات نے جو یہ کہا ہے کہ وہ دن حقیقت میں اس قدر طویل نہیں ہوں گے بلکہ ہجوم افکار اور کثرت آلام کی بنا پر اس قدر طویل معلوم ہوں گے تو یہ بات بالکل صحیح نہیں ہے اس کی سب سے بڑی دلیل صحابہؓ کا آنحضرت ﷺ سے مذکورہ سوال کرنا اور آنحضرت ﷺ کا انہیں یہ جواب دینا ہے کہ نماز پڑھنے کے لئے ایک دن کا حساب لگانا ہوگا نیز بعض حضرات جو یہ اشکال ظاہر کرتے ہیں کہ نماز تو وقتوں یعنی سورج کے طلوع وغروب وغیرہ کے اعتبار سے مقرر ہوتی ہے اور جب ان طلوع وغروب وغیرہ کا وقت ہی نہیں ہوگا تو نمازیں کس طرح پڑھی جائیں گی؟ تو یہ اشکال بالکل لغو ہے، حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز شارع کا حکم ہے جب شارع علیہ السلام نے اس مخصوص دن کے لئے مذکورہ حکم ارشاد فرمادیا ہے تو پھر کسی کو چون وچرا کی کیا گنجائش ہے تورپشتیؒ وغیرہ نے اس موقع پر مذکورہ اشکال کے اور جواب بھی لکھے ہیں، اہل علم مرقات میں دیکھ سکتے ہیں۔

"ان کے کوہان بڑے بڑے ہوجائیں گے۔" میں کوہان "ذری" کا ترجمہ ہے جو "ذروہ" کی جمع ہے، جس کے اصل معنی بلندی، بلند جگہ کے ہیں، اسی اعتبار سے اونٹ کے کوہان پر بھی ذروۃ کا اطلاق ہوتا ہے اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جو جانور چرنے کے لئے جنگل گئے ہوں گے وہ بہت فربہ ہوکر واپس آئیں گے۔

"پھر اس قوم کے لوگ قحط وخشک سالی اور تباہ حالی کا شکار ہوجائیں گے" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مؤمن چونکہ دجال کی بات کو قبول کرنے اور اس کی پیروی سے انکار کردیں گے اس لئے وہ دجال کی طرف سے طرح طرح کی سختیوں اور مصیبتوں میں مبتلا کیے جائیں گے لیکن وہ ان تمام سختیوں اور مصائب کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کریں گے اور اپنے دین وعقیدہ پر قائم رہیں گے، اور یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبی ﷺ کی برکت سے ان مؤمنوں کو اولیاء کاملین کی صفات وخصوصیات عطاء فرمادے گا۔

فتتبعہ کنوزھا کیعاسیب النحل (وہ خزانے اس طرح اس کے پیچھے پیچھے ہولیں گے جس طرح شہد کی مکھیوں کے سردار ہوتے ہیں "یعاسیب" اصل میں "یعسوب" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں شہد کی مکھیوں کا سردار، حاصل یہ کہ جس طرح "یعسوب" آگے

ہوتا ہے اور شہد کی مکھیاں اس کے ساتھ پیچھے پیچھے ہوتی ہیں اس طرح دجال کے ساتھ خزانے اس کے پیچھے پیچھے ہوں گے اور سردار کے تعلق کی مناسبت سے قوم و جماعت کے سربراہ کو بھی "یعسوب" کہا جاتا ہے، جیسا کہ دیلمیؒ نے حضرت علیؓ کے بارے میں یہ مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ علی یعسوب المؤمنین والمال یعسوب المنافقین یعنی علیؓ مؤمنوں کے سردار ہیں کہ تمام مؤمن ان کی اتباع کرتے ہیں اور ان کی امان و پناہ میں رہتے ہیں) اور مال منافقوں کا سردار ہے (کہ منافق مال و زر کے پیچھے رہتا ہے اور اس کی امان و پناہ میں رہنا چاہتا ہے) نیز حضرت ابوبکرؓ کی مدح میں بھی منقول ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کے مرثیہ میں فرمایا تھا کنت للدین یعسوب (یعنی اے ابوبکرؓ آپ تو دین کے رئیس اور سردار تھے۔

"جو دمشق کے مشرقی جانب کے سفید منارہ پر اتریں گے۔" اس روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دمشق میں اتریں گے، لیکن ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بیت المقدس میں، ایک روایت میں اردن میں اترنا منقول ہے اور ایک روایت میں ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع گاہ میں اترینگے واضح رہے کہ جس روایت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بیت المقدس میں اترنا منقول ہے وہ ابن ماجہؒ کی ہے اور اسی کو راجح قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ حقیقت میں یہ دوسری روایتوں کے منافی نہیں ہے اس وجہ سے کہ بیت المقدس، دمشق کے جانب مشرق میں واقع ہے، بیت المقدس مسلمانوں کا اجتماع گاہ بھی ہے اور بیت المقدس اردن ہی کا علاقہ ہے، صرف ایک چیز رہ جاتی ہے اور یہ کہ بیت المقدس میں سفید منارہ نہیں ہے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اترنے سے پہلے المقدس میں منارہ بھی بن سکتا ہے۔

بین مهزوذتین (اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوں گے) میں لفظ مهزودتین دال سے بھی منقول ہے اور ذال سے بھی اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ آسمان سے اترنے کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسم پر جو دو کپڑے ہوں گے وہ زعفران سے یا عصفر (زرد رنگ کی ایک گھاس) سے رنگے ہوئے ہوں گے۔

واذا رفعه تحدر منه مثل جمان اللؤلؤ۔ (اور جب سر اٹھائیں گے تو ان کے بالوں سے چاندی کے دانوں کی مانند قطرے گریں گے جو موتیوں کی طرح ہوں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ان سے ٹپکنے والے پسینہ کے قطرے اس قدر صاف اور سفید ہوں گے جیسا کہ موتیوں کی طرح چاندی کے دانے ہوتے ہیں۔ نہایہ میں لکھا ہیں کہ لفظ جمان عذاب کے وزن پر ہے اور اس کے معنی ہیں، چاندی کے بنے ہوئے بڑے بڑے موتی اس کا واحد جمانتہ ہے! طیبیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پسینہ کے قطروں کو پہلے تو بڑائی میں جمان کے ساتھ تشبیہ دی اور پھر صفائی اور خوشنمائی کے اعتبار سے جمان کو موتی کے ساتھ تشبیہ دی! اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ لفظ "جمان" میم کی تشدید کے ساتھ تو چھوٹے موتی کو کہتے ہیں اور جمان جیم کی تشدید کے بغیر، ان دانوں کے کہتے ہیں جو چاندی کے بنائے گئے ہوں، اور یہاں یہی دوسرے معنی مراد ہیں اور حاصل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنا سر جھکائیں گے تو ان کے سر کے بالوں میں نورانی قطرے ظاہر ہونگے اور جب سر اٹھائیں گے تو وہ قطرے ٹپک پڑیں گے یہ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شادابی و تازگی اور ان کے جمال و اطراوت سے کنایہ ہے۔

"یہ ناممکن ہوگا کہ کسی کافر تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کی ہوا پہنچے اور وہ مر نہ جائے" اس جملہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حکم میں خود دجال شامل کیوں نہیں ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دجال کو اس حکمت و مصلحت کے پیش نظر اس حکم سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہو اور وہ اس کے خون سے آلود اپنا نیزہ لوگوں کو دکھائیں تاکہ مؤمنین کے ذہن میں دجال کا ساحر و فریب کار ہونا ظاہر ہو اور اپنی آنکھوں سے اس کے فریب کا پردہ چاک ہوتے دیکھ لیں یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سانس کی ہوا سے کافروں کا مر جانا ان کی ایک ایسی کرامت ہوگی جو ان کے آسمان سے اترنے کے وقت یا اس کے کچھ بعد تک ظاہر رہے گی اور پھر جب وہ دجال کی طرف متوجہ ہوں گے تو یہ کرامت اٹھالی جائے گی، چنانچہ کسی کرامت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ

ہمیشہ اور ہر وقت ظاہر رہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ کرامت ان کے معمول کے مطابق ہر آنے والے سانس کی نہیں ہوگی بلکہ اس کا تعلق صرف اس مخصوص سانس سے ہوگا جس سے کسی کافر کو مارنا مقصود ہوگا سبحان اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اعجازی شان کے کیا کہنے، ایک وہ وقت تھا جب وہ اپنی پھونک سے مردہ کو زندہ کر دیتے تھے اور ایک وہ وقت ہوگا کہ ان کے سانس کی ہوا سے زندہ لوگ موت کے گھاٹ اتریں گے۔

لد (لام کے پیش اور دال کی تشدید کے ساتھ) شام کے ایک پہاڑ کا نام ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ لد بیت المقدس کے ایک گاؤں کا نام ہے اور بعض حضرات کے نزدیک وہ فلسطین کے ایک گاؤں کا نام ہے۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے چہروں سے گرد و غبار صاف کریں گے" ہوسکتا ہے کہ چہروں سے گرد و غبار کا صاف کرنا اپنے ظاہری معنی پر محمول ہو، کہ واقعۃً حضرت عیسیٰ علیہ السلام ازراہ لطف و کرم ان لوگوں کے چہروں سے گرد و غبار صاف کریں گے، یا اس جملہ کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے دلوں سے دجال کا خوف دور کریں گے اور ان کو راحت و اکرام کے اسباب فراہم کر کے ان کی تعب و کلفت کو ختم کریں گے۔

"بحیرۂ طبریہ" اضافت کے ساتھ ہے، اور لفظ "بحیرہ" اصل میں بحرۃ کی تصغیر ہے جس کے معنی اس جگہ کے ہیں جہاں پانی جمع ہوتا ہے جیسے سمندر یا بڑا دریا، چنانچہ بحیرہ کے معنی چھوٹے دریا یعنی جھیل کے ہیں، بحیرۂ طبریہ اس جھیل کو کہتے ہیں جو دس کوس لمبی ہے اور شام کے علاقہ طبریہ میں واقع ہے۔

"جبل خمر" ایک پہاڑ کا نام ہے خمر اصل میں گھنی جھاڑی کو کہتے ہیں یا اس زمین کو کہتے ہیں جو درختوں اور جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہو، چنانچہ اس پہاڑ پر درخت اور گھنی جھاڑیاں بہت ہیں اس لئے اس کو جبل خمر کا نام دیا گیا۔

"ان کے لئے بیل کا سر تمہارے آج کے سو دیناروں سے بہتر ہوگا" کے ذریعہ اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ لوگوں کو اشیاء کی قلت اور بے تحاشا گرانی اس طرح گھیر لے گی کہ معمولی چیز بڑی سے بڑی قیمت پر مشکل سے دستیاب ہوگی۔ مثلاً جانور کے تمام اعضاء میں سب سے سستا کلہ کا گوشت سمجھا جاتا ہے مگر اس وقت ان لوگوں کے نزدیک اسی کلہ کا گوشت ایک سو دینار میں بھی بہت غنیمت معلوم ہوگا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دوسرے اجزاء کے گوشت کی اہمیت ان کے نزدیک کیا ہوگی اور وہ کس قدر بیش قیمت ہوں گے۔

"وہ پرندے ان کی لاشوں کو "نہبل" میں ڈال دیں گے) یہ لفظ نون کے زبرؔ کے جزم اور بےؔ کے زبر کے ساتھ "نہبل" ہے، اور مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں اسی طرح منقول ہے، یہ دراصل ایک جگہ کا نام ہے جو بیت المقدس کے علاقہ میں واقع ہے، لیکن مجمع البحار میں کرمانیؒ سے منقول ہے کہ یہ لفظ میم کے ساتھ "منھل" ہے جس کے معنی زمین میں گہرے گڑھے کے ہیں! قاموس میں لام کے باب اور میم کی فصل میں لفظ "منھل" کے معنی پہاڑ سے گر پڑنے کے لکھے ہیں نیز کہا ہے کہ ترمذیؒ نے دجال سے متعلق حدیث میں فطرحھم بالنھبل (یعنی "نہبل" کا لفظ ذکر کیا ہے جب کہ زیادہ صحیح میم کے ساتھ "منھل" ہے۔

جس نے کوئی بھی مکان خواہ وہ مٹی کا ہو یا پتھر اور خواہ صوف کا ہو نہیں بچے گا۔" میں مٹی اور پتھر کے مکان سے شہری علاقے اور صوف (یعنی خیموں اور چھپر) کے مکان سے دیہاتی اور جنگلی علاقے مراد ہیں، حاصل یہ کہ وہ بارش ہر جگہ اور ہر علاقہ میں برسے گی، ایسی کوئی جگہ نہیں ہوگی جہاں اس بارش کا پانی نہ پہنچے اور کوئی دیوار و خیمہ وغیرہ اس پانی کو کسی بھی جگہ پہنچنے سے روک نہیں سکے گا! واضح رہے کہ لفظ "لا یکن" تیؔ کے زبر اور کاف کے پیش کے ساتھ کُنَّ سے بھی منقول ہے اور تیؔ کے پیش کاف کے زبر کے ساتھ "اکنان" سے بھی نقل کیا گیا ہے، ویسے دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی حفاظت و پوشیدگی۔

"اور اس انار کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے۔" کے بارے میں ایک شارح نے کہا ہے کہ "چھلکے" سے انار کے اوپر کا آدھا چھلکا مراد ہے اصل میں "قحف" اس گول ہڈی (یعنی کھوپڑی) کو کہتے ہیں جو دماغ کے اوپر ہوتی ہے، اور لکڑی کے پیالہ کو بھی "قحف"

کہتے ہیں لہٰذا اس مشابہت کی وجہ سے حدیث میں انار کے چھلکے کو "قحف" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"الفئام من النّاسِ" (لوگوں کی ایک بڑی جماعت) میں لفظ "فئام" دجال کے وزن پر ہمزہ کے ساتھ ہے، اور عام بول چال میں ہمزہ کو ئی سے بدل دیتے ہیں، بہر حال یہ لفظ "آدمیوں کی جماعت۔" کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے مراد لوگوں کی اتنی بڑی جماعت ہے جس پر "قبیلہ" سے زیادہ لوگوں کا اطلاق ہو، جیسا کہ "قبیلہ کا اطلاق، لوگوں کی اس جماعت پر ہوتا ہے جو "فخذ" سے زیادہ ہو اور "فخذ" یہاں فَ کے زبر اور خْ کے جزم کے ساتھ ہے، جس کے معنی صرف عزیز و اقربا کی جماعت کے ہیں، اور اس کا اطلاق لوگوں کی اس جماعت پر ہوتا ہے جو "بطن" سے کم ہو اور "بطن" کا اطلاق "قبیلہ، سے بھی کم جماعت پر ہوتا ہے! ویسے فخذ "خ" کے زیر کے ساتھ بلکہ خ کے جزم کے ساتھ بھی) کے معنی "ران" کے آتے ہیں۔

"اور پھر وہ ہوا ہر مؤمن ہر مسلمان کی روح قبض کرلے گی" میں ہوا کی طرف روح قبض کرنے کی نسبت مجازی ہے، حقیقت میں روح کو قبض کرنے کا کام ملک الموت (یعنی موت کے فرشتے) کا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ارواح قبض کرتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بیان ہو چکی ہے کہ مؤمن اور مسلم دونوں ایک ہی ہیں، جو مؤمن ہے وہ مسلمان ہے اور جو مسلمان ہے وہ مؤمن ہے، البتہ ان دونوں کے درمیان جو لطیف فرق علماء نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مؤمن تو تصدیق قلبی کے اعتبار سے کہتے ہیں جس کا تعلق باطن سے ہوتا ہے اور مسلمان ظاہری انقیاد و اطاعت کے اعتبار سے کہتے ہیں، لہٰذا یہاں ان دونوں کو الگ الگ بیان کرنے سے مراد تاکید بھی ہے اور تعمیم بھی اس حکم کے دائرے سے کوئی بھی باہر نہ رہے۔

"جو آپس میں گدھوں کی طرح مختلط ہو جائیں گے" کے بارے میں بعض شارحین نے کہا ہے کہ یہاں اختلاط سے مراد جماع کرنا یعنی وہ لوگ بے حیا اور بے لحاظ ہو کر علانیہ لوگوں کے سامنے جماع کریں گے جیسا کہ گدھے کرتے ہیں چنانچہ "هرج" کا لفظ جماع کے معنی میں بھی آتا ہے۔

"اور انہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی" کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی تو اس وقت اس دنیا میں صرف وہی بدکار و اشرار لوگ (یعنی کفار و فجار ہوں گے، ان کے برعکس اولیاء یعنی مؤمنین و صالحین نہ اس وقت اس دنیا میں موجود ہوں گے اور نہ ان پر قیامت قائم ہوگی چنانچہ آگے ایک حدیث آرہی ہے اس میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ روئے زمین پر اللہ اللہ کہنا بند نہ ہو جائے گا (یعنی قیامت اسی وقت آئے گی جب روئے زمین پر ایک بھی اللہ کا نام لیوا باقی نہیں رہے گا۔

دجال کے کارناموں کا ذکر

(۱۳) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَخْرُجُ الدَّجَّالُ فَیَتَوَجَّہُ قِبَلَہٗ رَجُلٌ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَیَلْقَاہُ الْمَسَالِحُ مَسَالِحُ الدَّجَّالِ فَیَقُوْلُوْنَ لَہٗ اَیْنَ تَعْمِدُ فَیَقُوْلُ اَعْمِدُ اِلٰی ھٰذَا الَّذِیْ خَرَجَ قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ لَہٗ اَوَمَا تُؤْمِنُ بِرَبِّنَا فَیَقُوْلُ مَا بِرَبِّنَا خَفَاءٌ فَیَقُوْلُوْنَ اقْتُلُوْہُ فَیَقُوْلُ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ اَلَیْسَ قَدْ نَھٰکُمْ رَبُّکُمْ اَنْ تَقْتُلُوْا اَحَدًا دُوْنَہٗ فَیَنْطَلِقُوْنَ بِہٖ اِلَی الدَّجَّالِ فَاِذَا رَاٰہُ الْمُؤْمِنُ قَالَ یَا اَیُّھَا النَّاسُ ھٰذَا الدَّجَّالُ الَّذِیْ ذَکَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ فَیَاْمُرُ الدَّجَّالُ بِہٖ فَیُشَجُّ فَیَقُوْلُ خُذُوْہُ وَشُجُّوْہُ فَیُوْسَعُ ظَھْرُہٗ وَبَطْنُہٗ ضَرْبًا قَالَ فَیَقُوْلُ اَوَمَا تُؤْمِنُ بِیْ قَالَ فَیَقُوْلُ اَنْتَ الْمَسِیْحُ الْکَذَّابُ قَالَ فَیُؤْمَرُ بِہٖ فَیُؤْشَرُ بِالْمِئْشَارِ مِنْ مَفْرِقِہٖ حَتّٰی یُفَرَّقَ بَیْنَ رِجْلَیْہِ قَالَ ثُمَّ یَمْشِی الدَّجَّالُ بَیْنَ الْقِطْعَتَیْنِ ثُمَّ یَقُوْلُ لَہٗ قُمْ فَیَسْتَوِیْ قَائِمًا ثُمَّ یَقُوْلُ لَہٗ اَتُؤْمِنُ بِیْ فَیَقُوْلُ مَا ازْدَدْتُ فِیْکَ اِلَّا بَصِیْرَۃً قَالَ ثُمَّ یَقُوْلُ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّہٗ لَا یَفْعَلُ بَعْدِیْ بِاَحَدٍ مِنَ النَّاسِ قَالَ فَیَاْخُذُہُ الدَّجَّالُ لِیَذْبَحَہٗ فَیُجْعَلُ مَا بَیْنَ رَقَبَتِہٖ اِلٰی تَرْقُوَتِہٖ نُحَاسًا فَلَا یَسْتَطِیْعُ اِلَیْہِ سَبِیْلًا قَالَ فَیَاْخُذُ بِیَدَیْہِ وَرِجْلَیْہِ فَیَقْذِفُ بِہٖ فَیَحْسَبُ النَّاسُ اِنَّمَا قَذَفَہٗ اِلَی النَّارِ وَاِنَّمَا اُلْقِیَ فِی الْجَنَّۃِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھٰذَا اَعْظَمُ النَّاسِ شَھَادَۃً عِنْدَ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا دجال نکلے گا تو مسلمانوں میں سے ایک شخص (اس کا شر رفع کرنے کے لئے)

اس کی طرف روانہ ہوگا (راستہ میں) اس شخص کو کچھ مسلح لوگ ملیں گے جو دجال کے محافظ ہوں گے، یہ لوگ اس مسلمان سے پوچھیں گے کہ کہاں جارہے ہو؟ وہ کہے گا کہ میں اس شخص کی طرف جارہا ہوں جو وہاں (فتنہ وفساد پھیلانے کے لئے) نکلا ہے یعنی دجال! آنحضرت ﷺ نے فرمایا (یہ سن کر) دجال کے محافظ اس سے کہیں گے کہ تو ہمارے رب (دجال) پر ایمان کیوں نہیں لے آتا وہ شخص جواب دے گا کہ ہمارے پروردگار کی صفات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں دجال کے آدمی (یہ سن کر آپس میں کہیں گے کہ اس شخص کو مار ڈالو (جو ہمارے رب پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہے) لیکن بعض لوگ آپس ہی میں پھر یہ کہیں گے کہ کیا ہمارے رب دجال نے اس سے منع نہیں کیا کہ ہم کسی کو اس کے حکم کے بغیر نہ ماریں آخر کار وہ لوگ اس مسلمان شخص کو دجال کے پاس لے جائیں گے) اور وہ علامات کے ذریعہ اس کو پہچان لے گا تو کہے گا کہ لوگو! جان لو، یہ وہی دجال ہے جس کا ذکر رسول کریم ﷺ نے (اپنی احادیث کے ذریعہ) فرمایا تھا (کہ فلاں فلاں علامتوں کے ساتھ آخر زمانے میں نکلے گا) آنحضرت نے فرمایا "دجال اس شخص کی بات سنتے ہی آگ بگولا ہو جائے گا اور اس کو چت لٹانے کا حکم دے گا (اور بعض حضرات نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ زمین پر پیٹ کے بل یعنی اوندھا لٹانے کا حکم دے گا جیسا کہ مجرم کو سزاءً مارنے کے لئے اوندھا لٹادیا جاتا ہے) چنانچہ اس شخص کو چت لٹادیا جائے، گا پھر دجال ازراہ تاکید و تشدید) کہے گا کہ اس کو پکڑو اور اس کا توڑ ڈالو چنانچہ اس شخص کی پیٹ پر اس قدر ضربیں لگائی جائیں گی اور مارا جائے گا کہ اس کی پیٹھ اور پیٹ پلپلا ہو جائے گا اور پھیل جائے گا آنحضرت نے فرمایا، اس کے بعد دجال کہے گا کہ کیا تو اب بھی مجھ پر ایمان نہیں لائے گا؟ وہ شخص کہے گا کہ (ہرگز نہیں) تو جھوٹا مسیح ہے پھر (دجال کی طرف سے اس شخص کو چیرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینے) کا حکم دیا جائے گا اور (اس حکم کے مطابق) اس کو آرے سے سر کی طرف سے چیرا جائے گا یہاں تک کہ اس کے دونوں پیروں کے درمیان سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں گے آنحضرت ﷺ نے فرمایا دجال (اپنے کارنامہ پر اتراتا ہوا، ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان ٹہلتا پھرے گا اور پھر کہے گا کہ کھڑا ہو جا، وہ مسلمان شخص (زندہ ہو کر) بالکل سیدھا کھڑا ہو جائے گا تب دجال کہے گا کہ اب تو مجھ پر ایمان لے آئے گا؟ وہ شخص جواب دیگا کہ (ہرگز نہیں) اب تو میرا یقین اور پختہ ہو گیا اور میری بصیرت اور زیادہ بڑھ گئی ہے (یعنی تو نے جس طرح مجھے پہلے تو قتل کیا اور پھر دوبارہ زندہ کر دیا اس سے مجھے کامل یقین ہو گیا ہے تو جھوٹا دجال ہی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "اس کے بعد وہ مسلمان شخص (وہاں موجود لوگوں کو مخاطب کر کے) کہے گا کہ لوگو! اچھی طرح جان لو) اس دجال نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے (یعنی پہلے قتل کرنا اور پھر دوبارہ زندہ کر دینا) اب کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا پھر دجال اس شخص کو پکڑ کر ذبح کرنا چاہے گا مگر ہنسلی کی ہڈی تک اس کی گردن کو تانبے کا بنا دیا جائے گا (یعنی اس کی پوری گردن تانبے کی طرح سخت اور ٹھوس ہو جائے گی تاکہ اس پر تلوار وغیرہ اثر انداز ہی نہ ہو سکے، شرح السنہ میں معمرؒ کا یہ قول ہے کہ مجھ تک جو روایت پہنچی ہے اس میں یوں ہے کہ اس شخص کی گردن پر تانبے کا تختہ رکھدیا جائے گا) جس کی وجہ سے وہ اس کو قتل نہیں کر سکے گا، اس کے بعد جھنجھلا کر) اس شخص کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر پکڑ کر اس کو اٹھائے گا اور (اپنی آگ میں) پھینک دیگا، لوگ تو یہی خیال کریں گے کہ اس کو آگ میں پھینکا گیا ہے لیکن حقیقت میں وہ جنت میں پھینکا گیا ہوگا (یہ بیان کرنے کے بعد) رسول کریم ﷺ نے فرمایا یہ شخص اللہ رب العلمین کے نزدیک شہادت کے اعتماد سے بہت بڑے درجہ کا حامل ہوگا۔" (مسلم)

تشریح: "مسلمانوں میں سے ایک شخص، کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے! اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں اور اس دنیا میں موجود ہیں، تاہم اس مسئلہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، چنانچہ فقہا، و محدثین کی اکثریت اور بعض صوفیا کا قول یہ ہے کہ وہ مر چکے ہیں، جب کہ صوفیاء کی اکثریت اور بعض فقہا کا کہنا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور نووی نے کہا ہے کہ یہی بات صحیح ہے۔

لفظ "مسالح" (میم کے زبر اور لام کے زیر کے ساتھ) اصل میں "مسلحة" کی جمع ہے جس کے لغوی معنی سرحد دیدبانی کی جگہ کے ہیں اور عرف عام میں اس کا اطلاق ان ہتھیار بند اور مسلح لوگوں پر ہوتا ہے جو اپنی سرحدوں اور آقاؤں کی حفاظت کرتے ہیں، چنانچہ یہاں

یہی معنی مراد ہیں۔

"ہمارے پروردگار کی صفات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے رب ہونے کی دلیلیں بالکل ظاہر اور واضح ہیں جیسے پیدا کرنا اور رزق دینا وغیرہ، نیز وہ تمام کمال کی صفات رکھتا ہے کہ ان میں کسی بھی طرح کے نقص اور عیب کا شمہ برابر شائبہ تک نہیں جب کہ دجال میں نقص و عیب کی چیزیں ہیں اور اس کا ناقص و عیب دار ہونا بالکل ظاہر ہے، لہٰذا جس ذات میں ربوبیت اور کمال کی واضح دلیلیں موجود ہوں اور اس کا شریک بندۂ ناقص کیسے ہو سکتا ہے اور اس اعتبار سے رب ہونا صرف اسی ذات پاک کو سزاوار ہے نہ کہ اس کے علاوہ کسی اور کو۔

فیشج فیقول خذوہ شجوہ فیوسع ظھرہ وبطنہ ضربا۔ (چنانچہ اس شخص کو چت لٹا دیا جائے گا الخ) میں لفظ "یوسع" واؤ کے جزم اور سین کے تخفیف کے سات) وسع سے ہے اور بعض نسخوں میں اس لفظ کو واؤ کے زبر اور سین کی تشدید کے ساتھ "توسیع" سے مشتق ہونا صحیح قرار دیا گیا ہے اسی طرح "یشج" کا لفظ "تشییج" سے مجہول کا صیغہ ہے جس کے اصل معنی کسی چیز کو چوڑا کرنے کے ہیں، اسی مناسبت سے اس کا ترجمہ "چت یا پیٹ کے بل لٹانا" کیا گیا ہے، نیز لفظ "شجوہ" (جیم کی تشدید کے ساتھ امر کا صیغہ ہے جس کے معنی سر کو زخمی کرنا ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم کی شرح میں کہا گیا ہے یہ قول زیادہ صحیح ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ جس طرح "یشج" کے لفظ "تشییج" سے مشتق کہا گیا ہے اس طرح "شجوہ" بھی اسی باب سے امر کا صیغہ ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ "یشج" اور "شجوہ" دونوں لفظ "شج" سے مشتق ہیں جو سر کے زخم" کے معنی میں ہے۔

"اس کے دونوں پیروں کے درمیان سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں گے" یعنی اس کو سر سے لے کر پیر تک چیر کر پورے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں گے! واضح رہے کہ لفظ "فیوشر" کے بارے میں احتمال ہے کہ ہمزہ کے ساتھ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ واؤ کے ساتھ ہو اسی طرح "میشار" کا لفظ ہمزہ کے ساتھ منقول ہے اور یٓ کے ساتھ بھی دونوں صورتوں میں اس کے معنی "آرہ" کے ہیں یعنی وہ آلہ جس کے ذریعہ کسی چیز کو چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے، ویسے "منشار" یعنی نون کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے! لفظ مفرق کے معنی ہیں سر کا وہ حصہ جو بیچوں بیچ ہو جس کو "مانگ" کہتے ہیں۔

"اب کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا" یہ گویا اس بات کی اطلاع ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اس (دجال) کو ڈھیل دینے کے لئے جو اتنی زبردست طاقت و قدرت عطا کر دی تھی کہ وہ جس کو چاہے مار دے اور پھر دوبارہ اس کو زندہ کر دے تو وہ طاقت و قدرت اس سے سلب کر لی گئی ہے لہٰذا اب کسی کو اس سے ڈرنے اور خوف زدہ رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"لیکن حقیقت میں وہ جنت میں پھینکا گیا ہوگا" میں "جنت" سے مراد یا تو دنیاوی و جسمانی راحت و سکون کی جگہ ہے جیسے کوئی باغیچہ و آرامگاہ وغیرہ، یا یہ مراد ہے کہ دجال اس شخص کو اس آگ میں پھینکے گا جو وہ اپنے ساتھ لئے پھرے گا لیکن وہ آگ اس شخص کے لئے ٹھنڈی ہو جائے گی اور سلامتی کا باعث بن جائے گی جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ ٹھنڈک و راحت پہنچانے کا ذریعہ بن گئی تھی، بہر صورت مطلب یہ ہے کہ دجال کے ہاتھوں اس شخص کی دوبارہ موت واقع نہیں ہوگی خواہ وہ کتنی ہی کوشش کرے۔

"یہ شخص اللہ رب العلمین کے نزدیک شہادت کے اعتبار سے بہت بڑے درجہ کا حامل ہوگا" میں اس شخص کو شہید اس کی اس پہلی موت کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے جو دجال کے ہاتھوں (آرہ سے چیرے جانے کی صورت میں) واقع ہوگی اگرچہ بعد میں وہ زندہ ہو جائے گا یا وہ اس اعتبار سے شہید ہوگا کہ دجال اس کو ذبح کرنے کا قصد کرے گا اگرچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "شہادت" حق تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہونا اور گواہی دینا مراد ہو۔

دجال کے خوف سے لوگ پہاڑوں پر بھاگ جائیں گے

(۱۴) وَعَنْ اُمِّ شَرِيْكٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَفِرَّنَّ النَّاسُ مِنَ الدَّجَّالِ حَتّٰى يَلْحَقُوْا بِالْجِبَالِ

قَالَتْ اُمُّ شَرِيْكٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَيْنَ الْعَرَبُ يَوْمَئِذٍ قَالَ هُمْ قَلِيْلٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اُمّ شریک کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "لوگ دجال (کے مکرو فریب اور فتنہ و فساد کے خوف) سے بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپیں گے" اُمّ شریک کہتی ہیں کہ میں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ ان ایام میں عرب کہاں ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا (ان دنوں) عرب بہت کم ہوں گے اور دجال سے جہاد و مقابلہ کرنے کی طاقت و قدرت نہیں رکھیں گے۔" (مسلم)

تشریح: فاین (کہاں ہوں گے) میں حرف فَ شرط محذوف کی جزا ہے، یعنی پورا جملہ گویا یوں ہے کہ جب لوگ دجال کے خوف سے بھاگتے اور چھپتے پھریں گے تو اس وقت اہل عرب کہاں ہوں گے، جن کا کام خدا کی راہ میں جہاد کرنا اور دین کو نقصان پہنچانے والے ہر فتنہ فساد کو دفع کرنا ہے۔

دجال کے تابعدار یہودی ہوں گے

⑮ وَعَنْ اَنَسٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَتْبَعُ الدَّجَّالَ مِنْ يَهُوْدِ اِصْفَهَانَ سَبْعُوْنَ اَلْفًا عَلَيْهِمُ الطَّيَالِسَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اصفہان کے ستر ہزار یہودی دجال کی اطاعت و پیروی اختیار کریں گے جن کے سروں پر طیلسائیں ہوں گی۔" (مسلمؒ)

تشریح: لفظ "یتبع" یؔ کے زبر، تؔ کے جزم اور بؔ کے زیر سے ساتھ ہے جس کے معنی ہمراہ ہونے کے ہیں۔ لیکن ایک شارح نے کہا ہے کہ یہ لفظ اتبّاع (ت کی تشدید کے ساتھ ہے جس کے معنی ہیں پیروی کرنا! اصفہان (الف کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ ایک مشہور شہر کا نام ہے جو ایران میں واقع ہے ایک روایت میں "ستر ہزار" کے بجائے نوے ہزار" کے الفاظ ہیں لیکن مشہور روایت کے مطابق زیادہ صحیح ستر ہزار ہی ہے! لفظ طیالسۃ اصل میں "طیلسان" کی جمع ہے جو عرب میں ایک مشہور کپڑے کا نام ہے اور یہ چادر کی صورت میں ہوتا ہے۔ عیاضؒ وغیرہ نے یہ نقل کیا ہے کہ طیلسان کا لفظ معرب ہے، یعنی اصل میں یہ لفظ "تالسان" تھا جس کو عربی میں "طیلسان" کر دیا گیا ہے واضح رہے کہ بعض علماء نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ طیلسان ایک ناپسندیدہ کپڑا ہے، ان حضرات نے حضرت انسؓ کی اس روایت کو بھی اپنے قول کی تائید میں پیش کیا ہے کہ انہوں نے کچھ لوگوں کو طیلسان اوڑھے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ لوگ خیبر کے یہودی جیسے معلوم ہوتے ہیں تاہم حقیقت یہ ہے کہ طیلسان میں کوئی برائی نہیں ہے اور اس کو استعمال کرنا کوئی قباحت نہیں رکھتا بلکہ سر کو چادر سے ڈھانکنے کے طور پر طیلسان کا استعمال مسنون بھی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ سے متعلق بہت سی حدیثیں منقول ہیں گو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں طیلسان صرف یہودیوں کے مخصوص لباس سے تعلق رکھتی ہو اور حضرت انسؓ اسی اعتبار سے اس کے استعمال کو پسندیدہ نظر سے نہ دیکھا ہو، یا انہوں نے اس سبب سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہو کہ ان لوگوں نے اس وقت جو طیلسان اوڑھ رکھی تھی اُن کا رنگ زرد تھا اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ طیلسان کے سلسلہ میں علماء کے درمیان جو اختلاف ہے وہ صرف اس کے چادر کے طور پر اس طرح اوڑھنے کے متعلق ہے کہ اس کا پلہ سر کے اوپر اوڑھا جائے اور اس کے کناروں کو کاندھے پر ڈال لیا جائے جس کو "تقنع" اور قناع بھی کہا جاتا ہے! بہر حال جو حضرات طیلسان کے استعمال کے خلاف ہیں ان کا کہنا ہے کہ طیلسان اوڑھنے کے بارے آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ سے جو کچھ منقول ہے اس کا تعلق خاص حالات اور ضرورت سے ہے، کہ حضور ﷺ اور صحابہؓ نے کسی خاص ضرورت کے تحت مثلاً کسی وقت دھوپ سے بچنے کے لئے طیلسان کو اپنے سر پر ڈال لیا ہو گا لیکن جمہور علماء نے طیلسان کے اوڑھنے اور استعمال کرنے کو بلا کراہت مطلق جائز قرار دیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ سر کو طیلسان سے ڈھانکو، کیونکہ چادر اوڑھنا اہل عرب کا پہناوا ہے اور "اقتناع" (یعنی طیلسان کو مذکورہ بالا طریقہ سے اوڑھنا) اہل ایمان کا پہناوا ہے

ایک اور حدیث میں یوں آیا ہے کہ طیلسان سے سر کو ڈھانکنا، دن میں نفقہ ہے اور رات میں زینت نیز ایک روایت میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ قناع کو بہت اختیار فرماتے تھے۔ اسی طرح صحابہؓ سے بھی "تقنع" کا اختیار کرنا منقول ہے اور اس بارے میں کافی آثار و اخبار ثابت ہیں۔

دجال مدینہ میں داخل نہیں ہو گا

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْتِی الدَّجَّالُ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْہِ اَنْ یَّدْخُلَ نِقَابَ الْمَدِیْنَۃِ فَیَنْزِلُ بَعْضَ السِّبَاخِ الَّتِیْ تَلِی الْمَدِیْنَۃَ فَیَخْرُجُ اِلَیْہِ رَجُلٌ وَّھُوَ خَیْرُ النَّاسِ اَوْمِنْ خِیَارِ النَّاسِ فَیَقُوْلُ اَشْھَدُ اَنَّکَ الدَّجَّالُ الَّذِیْ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَدِیْثَہٗ فَیَقُوْلُ الدَّجَّالُ اَرَاَیْتُمْ اِنْ قَتَلْتُ ھٰذَا ثُمَّ اَحْیَیْتُہٗ ھَلْ تَشُکُّوْنَ فِی الْاَمْرِ فَیَقُوْلُوْنَ لَا فَیَقْتُلُہٗ ثُمَّ یُحْیِیْہِ فَیَقُوْلُ وَاللّٰہِ مَاکُنْتُ فِیْکَ اَشَدَّ بَصِیْرَۃً مِنِّی الْیَوْمَ فَیُرِیْدُ الدَّجَّالُ اَنْ یَّقْتُلَہٗ فَلَا یُسَلَّطُ عَلَیْہِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "دجال (جب دنیا میں) آئے گا یعنی ظاہر ہو گا (تو مدینہ منورہ کی جانب بھی رخ کرے گا تا کہ اس شہر مقدس میں داخل ہو کر فتنہ و فساد پھیلائے) لیکن مدینہ کے راستوں میں اس کا داخل ہونا ممنوع ہو جائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ اس شہر کی حفاظت فرمائیں گے اور دجال اس میں داخل ہونے پر قادر نہیں ہو سکے گا) آخر وہ مدینہ کے قریب کی کھاری زمین میں ٹھہر جائے گا پھر اس کے پاس ایک شخص آئے گا (جو اس زمانہ کے) بہترین لوگوں میں سے ہو گا وہ شخص (دجال سے) کہے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہی، دجال ہے جس کی خبر ہمیں رسول کریم ﷺ نے اس کے احوال و علامات بیان کرنے کے ذریعہ دی ہے دجال (یہ سن کر اپنے اردگرد کے لوگوں سے) کہے گا کہ بتاؤ اگر میں اس شخص کو قتل کر کے دوبارہ زندہ کر دوں تو کیا پھر بھی تم میرے (خدا ہونے) کے بارے میں شک و شبہ کرو گے وہ لوگ جواب دیں گے کہ ہم کو پھر کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا! پس دجال اس شخص کو جان سے مار ڈالے گا اور پھر اس کو زندہ کر دے گا (اور وہی سوال کرے گا جو گزشتہ حدیث میں گزرا) تب وہ شخص کہے گا کہ خدا کی قسم تیرے بارے میں بصیرت اور میرا یقین اب پہلے سے بھی زیادہ پختہ ہے (یعنی پہلے تو صرف علم و خبر کی بنیاد پر تیرے دجال ہونے کا یقین تھا مگر اب اس تجربہ سے کہ تو نے مجھے پہلے جان سے مارا اور پھر زندہ کر دیا یہ یقین اور زیادہ بڑھ گیا ہے کہ تو جھوٹا دجال ہی ہے اور تیرا خدائی دعویٰ سراسر باطل ہے دجال (یہ سن کر) چاہے گا کہ اس شخص کو قتل کر دے مگر وہ اس پر قادر نہیں ہو سکے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: تو وہ لوگ جواب دیں گے کہ ہم کو پھر کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا۔" اس جملہ میں "لوگوں سے مراد اگر وہ لوگ ہیں جو دجال کے گرویدہ و تابعدار ہوں گے تو یہ جملہ بالکل واضح ہے اور اپنے اصل معنی ہی پر محمول ہے لیکن اگر "لوگوں" سے اہل ایمان کو بھی مراد لیا جائے تو پھر اس جملہ کی تاویل یہ ہوگی کہ ان لوگوں کا مذکورہ جواب دینا دراصل ازراہ خوف اور دفع الوقتی کی بناء پر ہو گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد بطریق توریہ اور کنایہ دجال کے جھوٹ اور فریب کاری شک و شبہ نہ کرنا ہو۔

مگر وہ اس پر قادر نہیں ہو سکے گا" میں اس بات کی دلیل ہے کہ دجال کو ڈھیل دینے کے لئے جو مافوق الفطرت طاقت و قدرت دی جائے گی وہ صرف شروع میں کچھ عرصہ کے لئے ہوگی، بعد میں اس سے وہ طاقت و قدرت سلب کر لی جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو اس پر قادر نہیں پائے گا کہ جو چاہے کر گزرے۔

(۱۷) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَاْتِی الْمَسِیْحُ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ ھِمَّتُہُ الْمَدِیْنَۃُ حَتّٰی یَنْزِلَ دُبُرَ اُحُدٍ ثُمَّ تَصْرِفُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَجْھَہٗ قِبَلَ الشَّامِ وَھُنَالِکَ یَھْلِکُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مسیح دجال مدینہ منورہ میں داخل ہونے کے ارادہ

سے مشرق کی طرف سے آئے گا یہاں تک کہ وہ احد پہاڑ کے پیچھے (جو مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے) آکر رکے گا، پھر (مذکورہ شخص کے واقعہ کے بعد) فرشتے اس کا منہ شام کے علاقہ کی طرف پھیر دیں گے تاکہ جہاں سے آیا ہے وہیں چلا جائے) اور وہ دجال وہاں (یعنی شام میں) ہلاک کر دیا جائے گا (جیسا کہ پیچھے گزرا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو شام کے ایک گاؤں باب لد میں قتل کریں گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "فرشتے اس کا منہ شام کے علاقہ کی طرف پھیر دیں گے" یہ بات دجال کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ایک بڑی دلیل بنے گی اور اس کے عجز و نقصان کی علامت ہوگی کہ وہ اپنی اتنی زبردست طاقت و قدرت کے دعوے کے باوجود اس شہر مقدس میں داخل ہونے پر قادر نہیں ہو سکے گا جس میں سید الوری آرام فرما ہیں اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ دجال جب مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو سکے گا تو حرم پاک مکہ مکرمہ میں بدرجہ اولی داخل نہیں ہو پائے گا۔"

⑱ وَعَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْمَدِيْنَةَ رُعْبُ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ لَهَا يَوْمَئِذٍ سَبْعَةُ اَبْوَابٍ عَلٰى كُلِّ بَابٍ مَلَكَانِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابو بکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اہل مدینہ دجال کے رعب و خوف سے محفوظ رہیں گے، اس دن جب کہ دجال مدینہ میں داخل ہونے کے ارادہ سے آئے گا) مدینہ کے سات دروازے ہونگے اور ہر دروازے پر دو فرشتے مامور ہوں گے (جو دجال کو مدینہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: سیوطیؒ نے کہا ہے کہ لوگوں میں جو یہ مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد حضرت جبرئیل کا روئے زمین پر آنا موقوف ہو گیا ہے تو یہ بالکل بے اصل بات ہے، اس غلط خیال کی تردید کے لئے وہ روایت کافی ہے جس کو طبرانیؒ نے نقل کیا ہے، کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر اس مؤمن کی موت کے وقت تشریف لاتے ہیں جو طہارت و پاکیزگی کی حالت میں ہوتا ہے ایک اور روایت ابو نعیمؒ نے نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جب دجال مدینہ کے قریب سے گزرے گا تو اس وقت اچانک اس کی مڈبھیڑ ایک بہت عظیم ہستی سے ہوگی، دجال پوچھے گا کہ تو کون ہے وہ ہستی جواب دے گی کہ میں جبرئیل (علیہ السلام) ہوں مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھیجا ہے تاکہ میں تجھے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم سے دور رکھوں۔"

دجال کا ذکر

⑲ وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ سَمِعْتُ مُنَادِيَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَادِي الصَّلٰوةُ جَامِعَةٌ فَخَرَجْتُ اِلَى الْمَسْجِدِ فَصَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهٗ جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَضْحَكُ فَقَالَ لِيَلْزَمْ كُلُّ اِنْسَانٍ مُصَلَّاهُ ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ لِمَ جَمَعْتُكُمْ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اِنِّيْ وَاللّٰهِ مَا جَمَعْتُكُمْ لِرَغْبَةٍ وَلَا لِرَهْبَةٍ وَلٰكِنْ جَمَعْتُكُمْ لِاَنَّ تَمِيْمًا الدَّارِيَّ كَانَ رَجُلًا نَصْرَانِيًّا فَجَآءَ وَاَسْلَمَ وَحَدَّثَنِيْ حَدِيْثًا وَافَقَ الَّذِيْ كُنْتُ اُحَدِّثُكُمْ بِهٖ عَنِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ حَدَّثَنِيْ اَنَّهٗ رَكِبَ فِيْ سَفِيْنَةٍ بَحْرِيَّةٍ مَعَ ثَلٰثِيْنَ رَجُلًا مِنْ لَخْمٍ وَّجُذَامٍ فَلَعِبَ بِهِمُ الْمَوْجُ شَهْرًا فِي الْبَحْرِ فَاَرْفَأُوْا اِلٰى جَزِيْرَةٍ حِيْنَ تَغْرُبُ الشَّمْسُ فَجَلَسُوْا فِيْ اَقْرُبِ السَّفِيْنَةِ فَدَخَلُوا الْجَزِيْرَةَ فَلَقِيَتْهُمْ دَآبَّةٌ اَهْلَبُ كَثِيْرُ الشَّعْرِ لَا يَدْرُوْنَ مَا قُبُلُهٗ مِنْ دُبُرِهٖ مِنْ كَثْرَةِ الشَّعْرِ قَالُوْا وَيْلَكِ مَا اَنْتِ قَالَتْ اَنَا الْجَسَّاسَةُ قَالُوْا وَمَا الْجَسَّاسَةُ قَالَتْ اَيُّهَا الْقَوْمُ انْطَلِقُوْا اِلٰى هٰذَا الرَّجُلِ فِي الدَّيْرِ فَاِنَّهٗ اِلٰى خَبَرِكُمْ بِالْاَشْوَاقِ قَالَ لَمَّا سَمَّتْ لَنَا رَجُلًا فَرِقْنَا مِنْهَا اَنْ تَكُوْنَ شَيْطَانَةً قَالَ فَانْطَلَقْنَا سِرَاعًا حَتّٰى دَخَلْنَا الدَّيْرَ فَاِذَا فِيْهِ اَعْظَمُ اِنْسَانٍ مَا رَاَيْنَاهُ قَطُّ خَلْقًا وَاَشَدُّهٗ وِثَاقًا مَجْمُوْعَةٌ يَدَاهُ اِلٰى عُنُقِهٖ مَا بَيْنَ رُكْبَتَيْهِ اِلٰى كَعْبَيْهِ بِالْحَدِيْدِ قُلْنَا وَيْلَكَ مَا اَنْتَ قَالَ قَدْ قَدَرْتُمْ عَلٰى خَبَرِيْ فَاَخْبِرُوْنِيْ

مَا اَنْتُمْ قَالُوْا نَحْنُ اُنَاسٌ مِّنَ الْعَرَبِ رَكِبْنَا فِيْ سَفِيْنَةٍ بَحْرِيَّةٍ فَلَعِبَ بِنَا الْبَحْرُ شَهْرًا فَدَخَلْنَا الْجَزِيْرَةَ فَلَقِيْنَا دَآبَّةً اَهْلَبَ فَقَالَتْ اَنَا الْجَسَّاسَةُ اِعْمِدُوْا اِلٰى هٰذَا فِي الدَّيْرِ فَاَقْبَلْنَا اِلَيْكَ سِرَاعًا وَفَزِعْنَا مِنْهَا وَلَمْ نَاْمَنْ اَنْ تَكُوْنَ شَيْطَانَةً فَقَالَ اَخْبِرُوْنِيْ عَنْ نَّخْلِ بَيْسَانَ قُلْنَا عَنْ اَيِّ شَاْنِهَا تَسْتَخْبِرُ قَالَ اَسْاَلُكُمْ عَنْ نَّخْلِهَا هَلْ تُثْمِرُ قُلْنَا نَعَمْ قَالَ اَمَا اِنَّهَا تُوْشِكُ اَنْ لَّا تُثْمِرَ قَالَ اَخْبِرُوْنِيْ عَنْ بُحَيْرَةِ الطَّبَرِيَّةِ قُلْنَا عَنْ اَيِّ شَاْنِهَا تَسْتَخْبِرُ؟ قَالَ هَلْ فِيْهَا مَآءٌ قُلْنَا هِيَ كَثِيْرَةُ الْمَآءِ قَالَ اَمَا اِنَّ مَآءَهَا يُوْشِكُ اَنْ يَّذْهَبَ قَالَ اَخْبِرُوْنِيْ عَنْ عَيْنِ زُغَرَ قُلْنَا عَنْ اَيِّ شَاْنِهَا تَسْتَخْبِرُ؟ قَالَ هَلْ فِي الْعَيْنِ مَآءٌ وَهَلْ يَزْرَعُ اَهْلُهَا بِمَآءِ الْعَيْنِ قُلْنَا نَعَمْ هِيَ كَثِيْرَةُ الْمَآءِ وَاَهْلُهَا يَزْرَعُوْنَ مِنْ مَّآئِهَا قَالَ اَخْبِرُوْنِيْ عَنْ نَّبِيِّ الْاُمِّيِّيْنَ مَا فَعَلَ قُلْنَا قَدْ خَرَجَ مِنْ مَّكَّةَ وَنَزَلَ يَثْرِبَ قَالَ اَقَاتَلَهُ الْعَرَبُ قُلْنَا نَعَمْ قَالَ كَيْفَ صَنَعَ بِهِمْ فَاَخْبَرْنَاهُ اَنَّهُ قَدْ ظَهَرَ عَلٰى مَنْ يَّلِيْهِ مِنَ الْعَرَبِ وَاَطَاعُوْهُ قَالَ اَمَا اِنَّ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّهُمْ اَنْ يُّطِيْعُوْهُ وَاِنِّيْ مُخْبِرُكُمْ عَنِّيْ اِنِّيْ اَنَا الْمَسِيْحُ الدَّجَّالُ وَاِنِّيْ يُوْشِكُ اَنْ يُّؤْذَنَ لِيْ فِي الْخُرُوْجِ فَاَخْرُجَ فَاَسِيْرَ فِي الْاَرْضِ فَلَا اَدَعَ قَرْيَةً اِلَّا هَبَطْتُّهَا فِيْ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً غَيْرَ مَكَّةَ وَطَيْبَةَ هُمَا مُحَرَّمَتَانِ عَلَيَّ كِلْتَاهُمَا كُلَّمَا اَرَدْتُّ اَنْ اَدْخُلَ وَاحِدًا مِّنْهُمَا اسْتَقْبَلَنِيْ مَلَكٌ بِيَدِهِ السَّيْفُ صَلْتًا يَصُدُّنِيْ عَنْهَا وَاِنَّ عَلٰى كُلِّ نَقْبٍ مِّنْهَا مَلٰٓئِكَةً يَحْرُسُوْنَهَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَطَعَنَ بِمِخْصَرَتِهِ فِي الْمِنْبَرِ هٰذِهِ طَيْبَةُ هٰذِهِ طَيْبَةُ يَعْنِي الْمَدِيْنَةَ اَلَا هَلْ كُنْتُ حَدَّثْتُكُمْ فَقَالَ النَّاسُ نَعَمْ اَلَا اِنَّهُ فِيْ بَحْرِ الشَّامِ اَوْ بَحْرِ الْيَمَنِ لَا بَلْ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ مَا هُوَ وَاَوْمَاَ بِيَدِهِ اِلَى الْمَشْرِقِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) میں نے رسول کریم ﷺ کے موذن کی یہ آواز الصلوۃ جامعۃ نماز جمع کرنے والی ہے) سن کر مسجد پہنچی اور پھر میں نے رسول کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہونے کے بعد منبر پر تشریف فرما ہوئے اس وقت (حسب عادت آپ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے جہاں نماز پڑھی ہے وہیں بیٹھا رہے یعنی کوئی شخص مسجد سے نکل کر ابھی جائے نہیں سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں، پھر فرمایا کہ کیا تم لوگ جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں جمع کیا ہے صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم میں نے تمہیں نہ تو کسی مرغوب چیز کے لئے جمع کیا ہے اور نہ کسی دہشت ناک چیز کے لئے یعنی تمہیں یہاں روکنے کا مقصد نہ تو تمہیں کوئی چیز دینا ہے اور نہ کسی دشمن وغیرہ سے ڈرانا ہے بلکہ میں نے تمہیں اس لئے جمع کیا ہے کہ تمیم داری، جو ایک نصرانی (عیسائی) شخص تھا، آیا اور مسلمان ہوا اور اس نے مجھ کو ایک ایسا واقعہ سنایا جو مسیح دجال کے بارے میں ان باتوں کے مطابق ہے جو میں تمہیں بتایا کرتا ہوں" چنانچہ میں نے مناسب جانا کہ تمیم داری کا وہ واقعہ تمہیں بھی سنا دوں تاکہ دجال کے بارے میں تمہارا یقین اور زیادہ پختہ ہو جائے اور میری بتائی ہوئی باتیں مشاہدہ کے قرین ہو جائیں تو سنو مجھ سے تمیم داری نے بیان کیا کہ وہ ایک (دن) قبیلہ جذام کے تیس آدمیوں کے ساتھ ایک بحری کشتی میں سوار ہو کر روانہ ہوا تو پانی کی موج ایک مہینہ تک کشتی کے سواروں سے کھیلا کی (یعنی کشتی سمندر کی ایک ایسی موج میں گھر گئی جو مسلسل ایک مہینہ تک اس کو ادھر ادھر لئے پھری اور اس نے سواروں کو منزل مقصود تک نہ پہنچنے دیا) یہاں تک کہ اس موج نے کشتی کو (ایک دن) غروب آفتاب کے وقت ایک جزیرہ کے قریب پہنچا دیا اور سارے سوار ان چھوٹی کشتیوں میں کہ جو بڑی کشتی کے ساتھ تھیں بیٹھ کر اس جزیرہ میں پہنچ گئے، وہاں انہیں ایک ایسا چوپایہ ملا جو بہت بالوں والا تھا اور ان کی کثرت کی وجہ سے لوگوں کو اس کا آگا پیچھا معلوم نہیں ہوتا تھا یعنی اس چوپایہ کے جسم پر اتنے زیادہ بال تھے کہ پورا جسم چھپ کر رہ گیا تھا اور لوگ نہیں پہچان سکتے تھے کہ اس کا اگلا حصہ کونسا ہے اور پچھلا کونسا) لوگوں نے (اس کو دیکھ کر بڑی حیرت سے) کہا کہ تجھ پر افسوس، تو کون ہے۔ اور کیا ہے؟ یعنی آخر تیری اصل وماہیت کیا ہے تو کوئی جن ہے یا انسان ہے؟) اس چوپایہ نے جواب دیا کہ میں جاسوس اور خبر رساں ہوں تم لوگ میرے ساتھ اس شخص کے پاس چلو جو دیر میں ہے کیونکہ اسے تمہاری خبریں سننے کا بہت شوق ہے تمیم داریؓ نے بیان کیا کہ جب اس چوپایہ نے ہم سے ایک شخص کا ذکر کیا (اور ہمیں اس کے پاس چلنے کو کہا) تو

ہمیں بڑا ڈر لگا کہ وہ شخص کہیں انسان کی شکل وصورت میں شیطان نہ ہو، بہرحال ہم تیزی کے ساتھ چل پڑے اور جب دیر میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک سب سے بڑے ڈیل ڈول والا اور نہایت خوفناک آدمی موجود ہے، اسی جیسی شکل وصورت کا آدمی ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ نہایت مضبوط اس طرح بندھا ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ گردن تک اور گھٹنوں کے درمیان سے ٹخنوں تک لوہے کی زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے ہم نے (اس کو دیکھ کر بڑی حیرت کے ساتھ) کہا کہ تجھ پر افسوس ہے، تو کون ہے اور کیا ہے؟ اس نے جواب میں کہا کہ جب تم نے مجھ کو پالیا اور معلوم کر ہی لیا ہے (اور یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہو تو اب میں تم سے اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپاؤں گا اور سب کچھ بتادوں گا لیکن پہلے) مجھے اپنے بارے میں بتاؤ (اور جو کچھ تم سے پوچھوں اس کا جواب دو) کہ تم کون ہو (اور کہاں سے آئے ہو؟) ہمارے لوگوں نے اسے بتایا کہ ہم عرب کے لوگ ہیں بحری کشتی میں سوار ہوئے تھے۔ (اور اپنی منزل مقصود کی طرف جارہے تھے) کہ سمندری طوفان نے ہمیں ایک مہینہ تک گھیرے رکھا (اور ہماری کشتی کو یہاں لا چھوڑا) ہم اس جزیرہ پر اتر گئے، یہاں ہمیں ایک بالوں والا چوپایہ ملا اور اس نے کہا کہ میں جاسوس ہوں تم لوگ اس شخص کے پاس جاؤ جو دیر یعنی بڑے محل میں موجود ہے چنانچہ ہم بڑی تیزی کے ساتھ تیرے پاس چلے آئے اس نے کہا کہ اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ بیسان میں کھجوروں کے جو درخت ہیں ان پر پھل آتے ہیں یا نہیں؟ ہم نے کہا کہ ہاں پھل آتے ہیں! اس نے کہا کہ جان لو جلد ہی وہ زمانہ آنے والا ہے جب بیسان کے کھجور کے درختوں پر پھل نہیں آئیں گے (گویا اس نے اس طرف اشارہ کیا کہ قیامت جلد ہی آنے والی ہے) اس نے کہا کہ اب مجھے بحیرۂ طبریہ کے بارے میں بتاؤ کہ آیا اس میں پانی ہے یا نہیں؟ ہم نے کہا کہ اس میں تو بہت پانی ہے اس نے کہا یقیناً عنقریب اس کا پانی ختم ہو جائے گا پھر اس نے پوچھا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ زغر کے چشمہ میں پانی ہے یا نہیں اور وہاں کے لوگ اس چشمہ کے پانی کے ذریعہ کھیتی باڑی کرتے ہیں؟ ہم نے کہا کہ ہاں اس چشمہ میں بہت پانی ہے اور وہاں کے لوگ اسی پانی سے کھیتی باڑی کرتے ہیں اس کے بعد اس نے کہا کہ اب مجھے اُمیون یعنی اہل عرب کے نبی (ﷺ) کے بارے میں بتاؤ اس نے کیا کیا؟ ہم نے کہا کہ انہوں نے مکہ کو چھوڑ دیا ہے اور اب یثرب (یعنی مدینہ) کو ہجرت کر گئے ہیں اس نے پوچھا کہ کیا عرب کے لوگ ان سے لڑے ہیں؟ ہم نے کہا کہ ہاں! پھر اس نے پوچھا کہ انہوں نے اہل عرب سے کیا معاملہ کیا؟ ہم نے اس کو بتایا کہ وہ نبی ﷺ ان عربوں پر غالب آگئے ہیں جو ان کے قریب ہیں اور انہوں نے ان کی اطاعت اختیار کر لی ہے اس نے کہا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کا ان کی اطاعت کرنا ہی ان کے لئے بہتر ہے اور اب میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں، میں درحقیقت مسیح یعنی دجال ہوں، وہ زمانہ جلد ہی آنے والا ہے جب مجھ کو نکلنے کی اجازت مل جائے گی، اس وقت میں نکلوں گا اور چالیس دنوں تک زمین پر پھروں گا یہاں تک کوئی آبادی ایسی نہیں چھوڑوں گا جس میں داخل نہیں ہوں گا، سوائے مکہ اور طیبہ یعنی مدینہ کے کیونکہ یہ دونوں شہر مجھ پر حرام قرار دیئے گئے ہیں یعنی ان دونوں شہروں میں میرا داخلہ ممنوع ہوگا (اور اس ممانعت کی صورت یہ ہوگی کہ) جب میں ان دونوں شہروں میں سے کسی شہر میں داخل ہونا چاہوں گا تو میرے سامنے ایک فرشتہ آجائے گا جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہوگی وہ فرشتہ مجھ کو اس شہر میں داخل ہونے سے روک دے گا، حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک شہر کے تمام راستوں پر فرشتے مامور ہیں جو اس شہر کی نگہبانی کرتے ہیں" راوی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (تمیم داری کا یہ پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد صحابہؓ پر اپنی یہ خوشی ظاہر کرنے کے لئے کہ دیکھو دجال کے بارے میں تمہیں جو کچھ بتایا کرتا تھا اس کی پوری پوری تصدیق وتائید اس واقعہ سے ہو جاتی ہے، نیز آپ ﷺ نے تمام شہروں پر مدینہ کی فضیلت وبڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے جوش میں) اپنا عصاء مبارک منبر پر مار کر (تین مرتبہ) یہ فرمایا کہ یہ ہے طیبہ، یہ ہے طیبہ یعنی مدینہ (پھر فرمایا) یاد رکھو، کیا میں تمہیں یہی بات نہیں بتایا کرتا تھا (جو دجال کے بارے میں اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے؟) صحابہؓ نے کہا کہ ہاں (آپ ﷺ ہمیں اسی طرح کی بات بتایا کرتے تھے اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "جان لو دجال شام کے سمندر میں ہے یا یمن کے سمندر میں، نہیں بلکہ وہ مشرق کی جانب سے نکلے گا، یہ فرما کر آپ ﷺ نے ہاتھ سے مشرق کی جانب اشارہ کیا۔" (مسلم)

تشریح: "الصلوۃ جامعۃ" کا جملہ لوگوں کو متوجہ کرنے اور نماز کے لئے بلانے کے واسطے ہے تاکہ لوگ یہ سن کر ایک جگہ پہنچ جائیں

اور جمع ہو جائیں جیسا کہ زمانہ نبوی ﷺ میں کسوف اور خسوف کی نماز کے لئے لوگوں کو جمع کرنے کے لئے اس جملہ کے ذریعہ پکارا جاتا تھا! "سفینۃ" کو بحریہ کی اضافت کے ساتھ ذکر کرنے کا مقصد اس بات سے احتراز کرنا ہے کہ ذہن خشکی کی کشتی یعنی اونٹ کی طرف منتقل نہ ہو کیونکہ اونٹ کو "سفینۃ البر" (خشکی کی کشتی) کہا جاتا ہے، ویسے بعض حضرات نے کہا ہے "سفینہ بریہ" سے مراد بڑی سمندری کشتی ہے جس کو "پانی کا جہاز" بھی کہا جاسکتا ہے۔

لفظ "اَقرُبْ" اصل میں قَارِبْ کی جمع ہے اور قارب اس ڈونگی یعنی چھوٹی کشتی کو کہتے ہیں جو بڑی سمندری کشتی (پانی کے جہاز) میں رکھی رہتی ہے اور ساحل پر آنے جانے اور ان کاموں میں استعمال ہوتی ہے جو بڑی کشتی یا جہاز کے ذریعہ انجام نہیں پا سکتے۔

اس عجیب الخلقت جانور نے اپنا نام جساسہ یعنی جاسوسی کرنے والا اس اعتبار سے بتایا کہ وہ دجال کو خبریں اور معلومات پہنچایا کرتا تھا، واضح رہے کہ قرآن شریف میں جس "دابۃ الارض" کا ذکر آیا ہے وہ یہی جانور ہے۔

"دَیر" اصل میں عیسائیوں کی عبادت گاہ یعنی "گرجا" کو کہتے ہیں ویسے لغت کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ "دَیر" راہبوں کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں، بہر حال یہاں حدیث میں "دَیر" سے مراد وہ بڑی عمارت ہے جس میں دجال تھا۔

"بیسان" ملک شام میں ایک بستی کا نام ہے یا یمامہ میں ایک جگہ کا نام ہے، لیکن مشرق الانور میں لکھا ہے کہ حدیث جسار میں (جو یہاں نقل ہوئی ہے) مذکور "بیسان" حجاز کے ایک شہر کا نام ہے اور دوسرا "بیسان" شام کے علاقہ میں واقع ہے۔

جیسا کہ پیچھے بھی ایک موقع پر بیان کیا جاچکا ہے "بحیرہ" اصل میں "بحر" کی تصغیر ہے یعنی چھوٹا سمندر، جس کو جھیل سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے اور "طبریہ" اردن کے ایک قصبہ کا نام ہے، فن حدیث کے مشہور امام طبرانی اس قصبہ کے رہنے والے تھے۔

"زغر" ایک شہر کا نام ہے جو ملک شام میں واقع ہے، اس علاقہ میں روئیدگی بہت کم ہوتی ہے۔

"مجھے امیوں یعنی اہل عرب کے نبی کے بارے میں بتاؤ" میں دجال نے حضور کی نسبت صرف اہل عرب کی طرف از راہ طنز کہ وہ خاص طور پر اہل عرب کے نبی ہیں یا یہ کہ یہ جملہ تعریضی پیرایہ بیان ہے یعنی اس جملہ کے ذریعہ اس ملعون دجال کے اس باطل خیال کی ترجمانی مقصود تھی کہ آپ ﷺ نادانوں اور جاہلوں کے نبی ہیں۔

ان لوگوں کا ان کی اطاعت کرنا ہی ان کے لئے" دجال کی زبان سے اس بات کا نکلنا گویا اس کی طرف سے حضور ﷺ کی عظمت وفضیلت کا اقرار تھا۔ گو یہ اقرار اضطراراً بھی تھا اور اس کے سبب سے بھی تھا کہ اس وقت کفر کے اظہار اور دین سے انکار کی کوئی غرض بھی اس کے سامنے نہیں تھی، لہٰذا اس نے اپنے کفر وعناد کو پوشیدہ رکھنا ہی مناسب سمجھا، یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس جملہ میں "بہتری" سے اس کی مراد دنیاوی بھلائی و بہتر اور امن و سلامتی ہو۔

لا بل من قبل المشرق ماھو (نہیں بلکہ وہ مشرق کی جانب سے نکلے گا) میں حرف ما، نفی کے لئے نہیں ہے بلکہ زائد ہے! اس جملہ کی وضاحت یہ ہے کہ قیامت آنے کا وقت چونکہ خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے اور تعیّن کے ساتھ نہیں بتایا کہ قیامت کب آئے گی بلکہ قیامت کی علامتوں اور نشانیوں کے ظاہر ہونے کے زمانوں اور اوقات کو بھی متعیّن نہیں فرمایا اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی متعیّن طور پر وہ جگہ نہیں بتائی جہاں دجال مقید ہے، صرف تردد وابہام کے طور پر مذکورہ تین مقامات کی طرف اشارہ فرمایا البتہ آخری مقام کو ظن غالب کے ذریعہ ظاہر فرمایا لیکن اس کو بھی متعیّن نہیں کیا سوائے اس کے کہ کسی خاص جگہ وعلاقہ کے تعیّن کے بغیر اس سمت کی طرف اشارہ فرما کر چھوڑ دیا۔ پس مذکورہ جملہ سے پہلے دو احتمال کی نفی اور تیسرے احتمال کا جو اثبات ہوتا ہے اس کے یہی معنی ہیں! ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلی دو جگہوں کا ذکر فرما کر پھر ان کی جو نفی فرمائی تو اس کا سبب یہ تھا کہ دجال کا قید خانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا ہوگا! اور تورپشتیؒ نے "بلکہ وہ مشرق کی جانب سے نکلے گا" کی وضاحت میں کہا ہے کہ احتمال ہے کہ یہ جملہ خبر دینے کے طور پر ہو، یعنی دجال مشرق کی جانب سے نکلے گا نیز اشرف نے کہا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ دجال کے

قید خانہ کی جگہ کے تعین میں شک رکھتے تھے، آپ ﷺ کے گمان میں تھا کہ وہ ان جگہوں میں سے کسی نہ کسی جگہ مقید ہے، چنانچہ جب آپ ﷺ نے اپنے اس شک کی بنا پر جب شام کے سمند اور یمن کے سمندر کا ذکر کیا تو اسی وقت وحی کے ذریعہ آپ ﷺ کو یقین کے ساتھ معلوم ہو گیا یا آپ ﷺ کو ظن غالب ہوا کہ اس کا قید خانہ مشرق کی سمت میں کسی جگہ واقع ہے، اس وجہ سے آپ ﷺ نے پہلی دونوں جگہوں کی نفی فرما دی اور ان سے اعراض کر کے تیسری جگہ یعنی جانب مشرق کا اثبات فرمایا۔

دجال کا حلیہ

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ رَاَیْتُنِی اللَّیْلَۃَ عِنْدَ الْکَعْبَۃِ فَرَاَیْتُ رَجُلًا اٰدَمَ کَاَحْسَنِ مَا اَنْتَ رَآءٍ مِنْ اُدْمِ الرِّجَالِ لَہٗ لِمَّۃٌ کَاَحْسَنِ مَا اَنْتَ رَآءٍ مِنَ اللِّمَمِ قَدْ رَجَّلَھَا فَھِیَ تَقْطُرُ مَآءً مُتَّکِئًا عَلٰی عَوَاتِقِ رَجُلَیْنِ یَطُوْفُ بِالْبَیْتِ فَسَاَلْتُ مَنْ ھٰذَا فَقَالُوْا ھٰذَا الْمَسِیْحُ بْنُ مَرْیَمَ قَالَ ثُمَّ اِذَا اَنَا بِرَجُلٍ جَعْدٍ قَطَطٍ اَعْوَرِ الْعَیْنِ الْیُمْنٰی کَاَنَّ عَیْنَہٗ عِنَبَۃٌ طَافِیَۃٌ کَاَشْبَہِ مَنْ رَاَیْتُ مِنَ النَّاسِ بِابْنِ قَطَنٍ وَّاضِعًا یَدَیْہِ عَلٰی مَنْکِبَیْ رَجُلَیْنِ یَطُوْفُ بِالْبَیْتِ فَسَاَلْتُ مَنْ ھٰذَا فَقَالُوْا ھٰذَا الْمَسِیْحُ الدَّجَّالُ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ فِی الدَّجَّالِ رَجُلٌ اَحْمَرُ جَسِیْمٌ جَعْدُ الرَّاْسِ اَعْوَرُ عَیْنِ الْیُمْنٰی اَقْرَبُ النَّاسِ بِہٖ شَبْھًا ابْنُ قَطَنٍ وَ ذُکِرَ حَدِیْثُ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَّغْرِبِھَا فِیْ بَابِ الْمَلَاحِمِ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ ابْنِ عُمَرَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی النَّاسِ فِیْ بَابِ قِصَّۃِ ابْنِ صَیَّادٍ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں نے آج کی رات اپنے آپ کو (خواب میں یا کشف کی حالت میں) کعبہ کے پاس دیکھا، وہاں مجھ کو ایک ایسا گندم گوں شخص نظر آیا جو کسی ایسے آدمی کی طرح تھا جس کو تم گندمی رنگ کا سب سے بہتر اور خوب صورت دیکھتے ہو، اس کے (سر پر) بہت بال تھے جو کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے اور بالوں کے اعتبار سے بھی وہ کسی ایسے شخص کے مشابہ تھا جس کو تم اس قسم کے بال رکھنے والوں میں سب سے خوبصورت دیکھتے ہو، اس کے بالوں میں کنگھی کی گئی تھی اور بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، وہ شخص دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا! میں نے (اس شخص کو دیکھ کر طواف کرنے والوں سے) پوچھا کہ یہ کون ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ مسیح ابن مریم ہیں! اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے فرمایا پھر اچانک میری نظر ہے ایک شخص گزرا جس کے بال گھونگریالے اور بہت کھڑے تھے، وہ داہنی آنکھ سے کانا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کی آنکھ انگور کا پھولا ہوا دانہ یا بے نور ہے، جن لوگوں کو میں نے دیکھا ہے ان میں سے وہ ابن قطن کے بہت مشابہ تھا، وہ شخص بھی دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا، میں نے اس کے بارے میں بھی پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو لوگوں نے جواب دیا کہ یہ مسیح دجال ہے" بخاری ومسلم) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضور ﷺ نے دجال کے بارے میں فرمایا کہ "وہ ایک ایسا شخص ہے جس کی آنکھیں سرخ ہیں، سر کے بال گھونگریالے ہیں، داہنی آنکھ سے کانا ہے، مشابہت کے اعتبار سے لوگوں میں ابن قطن اس کے بہت قریب ہے۔"

اور حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث لا تقوم الساعۃ حتی تطلع الشمس من غربھا الخ باب الملاحم میں نقل کی جا چکی ہے نیز حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی النَّاسِ... الخ کو انشاء اللہ ہم ابن صیاد کے قصہ کے باب میں نقل کریں گے۔

تشریح: "بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔" میں پانی سے مراد یا تو وہ پانی ہے جو نہانے کے بعد بالوں میں لگا رہتا ہے اور کنگھی کرنے کے بعد بالوں سے ٹپکنے لگتا ہے اور وہ پانی بھی مراد ہو سکتا ہے جس میں کنگھی کو بھگو کر بال سنوارتے ہیں، یا پانی کے قطرے ٹپکنے سے

مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انتہائی پاکیزگی و لطافت اور تروتازگی کو کنایۃ بیان کرنا ہے۔

"جیسے اس کی آنکھ انگور کا پھولا ہوا دانا ہے۔" کے بارے میں قاضی عیاضؒ نے یہ لکھا ہے کہ دجال کی داہنی آنکھ تو بالکل سلیٹ یعنی ہموار ہوگی (کہ اس جگہ آنکھ کا نام و نشان بھی نہیں ہوگا) اور بائیں آنکھ موجود تو ہوگی لیکن اس میں بھی پھولا ہوا ٹینٹ ہوگا۔

"ابن قطن" سے مراد عبد العزیٰ ابن قطن یہودی ہے جس کے بارے میں پیچھے بھی بیان ہو چکا ہے! لفظ "کاشبہ" میں کاف زائد ہے جو اظہار مبالغہ کے لئے استعمال ہوا ہے! دجال کو ابن قطن کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ شاید ابن قطن کا جسمانی حلیہ کچھ اس طرح کا رہا ہوگا جیسا کہ دجال کا ہوگا یا اس اعتبار سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اس کی آنکھ میں بھی ٹینٹ یعنی پھلی تھی۔

دجال جن دو آمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے طواف کرتا نظر آیا تھا بظاہر ان سے مراد وہ دو شخص ہیں جو اس (دجال) کے رفیق و مددگار ہوں گے جیسا کہ ان دو شخصوں سے مراد کہ جن کے کاندھے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہاتھ رکھے ہوئے طواف کرتے ہوئے نظر آئے تھے، وہ دو شخص ہیں جو حق کے راستہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معین و مددگار ہوں گے اور شاید وہ دونوں حضرات خضر علیہ السلام اور حضرت مہدیؓ ہوں! اس موقع پر اشکال واقع ہوتا ہے کہ دجال کافر ہے، اس کو طواف کی حالت میں دکھایا جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ مذکورہ واقعہ آنحضرت ﷺ کے مکاشفات میں سے ہے، جس کا تعلق خواب سے ہے اور اس کی تعبیر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اس خواب میں گویا یہ دکھایا گیا کہ ایک وہ دن آئے گا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دین اور مرکز دین کے اردگرد رہیں گے تاکہ دین کو قائم کریں اور فتنہ و فساد سے اس کی حفاظت کریں اور دجال بھی دین اور مرکز دین پر منڈلاتا پھرے گا تاکہ گھات لگا کر دین کو نقصان پہنچادے اور فتنہ و فساد پھیلانے میں کامیاب ہو جائے بعض حضرات نے ایک جواب یہ دیا ہے کہ مکہ مکرمہ پر اسلام کا غلبہ ہونے اور مشرکوں کو مسجد حرام کے قریب جانے کی مخالفت نافذ ہونے سے پہلے بہر حال کافر و مشرک بھی خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے، پس اگر دجال بھی طواف کرتا ہو تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے ایک یہ بات بھی ہے کہ حضور ﷺ کے اس مکاشفہ یا خواب سے، موجودات کی دنیا میں کسی کافر کا طواف کرنا ہرگز لازم نہیں آتا، جب کہ کفار اور مشرکین کے لئے خانہ کعبہ کے طواف کی ممانعت کا تعلق موجودات کی اس دنیا سے ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

دجال کا ذکر

(۲۱) عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ فِيْ حَدِيْثِ تَمِيْمِنِ الدَّارِيِّ قَالَتْ قَالَ فَاِذَا اَنَا بِامْرَءَةٍ تَجُرُّ شَعْرَهَا قَالَ مَا اَنْتِ قَالَتْ اَنَا الْجَسَّاسَةُ اِذْهَبْ اِلٰى ذٰلِكَ الْقَصْرِ فَاَتَيْتُهٗ فَاِذَا رَجُلٌ يَجُرُّ شَعْرَهٗ مُسَلْسَلٌ فِي الْاَغْلَالِ يَنْزُ فِيْمَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ فَقُلْتُ مَنْ اَنْتَ قَالَ اَنَا الدَّجَّالُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت فاطمہ بنت قیسؓ تمیم داریؓ کی حدیث کے سلسلہ میں بیان کرتی ہیں کہ تمیم داریؓ نے کہا کہ (جب میں جزیرہ میں داخل ہوا تو) اچانک میرا گزر ایک عورت پر ہوا جو اپنے بالوں کو گھسیٹتی تھی (یعنی اس کے بال بہت بڑے بڑے تھے جو زمین پر گھسٹتے رہتے تھے) تمیمؓ نے کہا (میں نے اس عورت کو دیکھ کر پوچھا کہ) تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں جاسوسی کرنے والی ہوں (اور دجال کو خبریں پہنچاتی ہوں) تو اس محل کی طرف چلا جا! تمیمؓ کا بیان ہے کہ میں اس محل میں آیا تو وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص ہے جو اپنے بالوں کو گھسیٹتا ہے۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور طوق پڑے ہوئے ہیں اور آسمان و زمین کے درمیان اچھلتا کودتا ہے میں نے پوچھا کہ تو کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں دجال ہوں۔" (ابوداؤد)

تشریح: روایت کے جزو کا حاصل یہ ہے کہ تمیم داریؓ کے مذکورہ واقعہ کے سلسلہ میں مسلمؒ نے جو حدیث حضرت فاطمہؓ سے نقل کی ہے

اور جو پیچھے گزری ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ جب تمیم داریؓ اور ان کے ساتھی اس جزیرہ میں داخل ہوئے تو فلقیتھم الدابۃ یعنی وہاں ان کو ایک چوپایہ ملا لیکن انہی فاطمہؓ کی جو روایت ابوداؤدؒ نے نقل کی ہے اس میں چوپایہ کے بجائے ایک عورت کے ملنے کا ذکر ہے پس ان دونوں روایتوں میں تو یا یہ تضاد ہوا کہ مسلمؒ کی روایت میں تو جساسہ کو دابہ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس کو عرف عام میں چوپایہ کہتے ہیں اور یہاں ابوداؤدؒ کی روایت میں "عورت" کہا گیا ہے؟ اس تضاد کو دور کرنے کے لئے کہی جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ شاید دجال کے دو جاسوس ہونگے، ایک دابہ اور دوسری، عورت، یا یہ کہ دابہ کے اصل لغوی معنی چلنے والے یعنی زمین پر چلنے والے کے ہیں، اس لفظ کا اطلاق جو صرف چوپایہ پر کیا جاتا ہے وہ عرف عام کے اعتبار سے ہے، قرآن مجید میں لفظ دابہ کا زیادہ استعمال اس کے اصل لغوی معنی ہی میں ہوا ہے، جیسے و مامن دابۃ فی الارض الاعلی اللّٰہ رزقھا (یعنی روئے زمین پر چلنے والا ایسا کوئی جاندار نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو پس اس معنی میں دابہ کا اطلاق عورت پر بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمؒ کی روایت میں "جو دابہ" کا لفظ ہے اس سے "عورت" مراد ہے، ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ جساسہ یعنی جاسوسی کرنے والی ہستی اصل میں شیطان تھا جو کبھی تو "دابہ" کی صورت میں ظاہر ہوا اور کبھی "عورت" کی صورت میں! یہ بات زیادہ قرین قیاس بھی ہے اور موزوں تر بھی کیونکہ جاسوسی کا جو اصل مقصد ہو سکتا ہے یعنی دنیا بھر کی خبریں جمع کرنا اور دجال تک پہنچانا اس کا انجام پانا کسی دابہ، یا عورت کی ذات سے بعید ہے، الا یہ کہ جاسوسی اور خبریں حاصل کرنے کا تعلق دنیا بھر سے نہ ہو بلکہ صرف ان جہازوں اور کشتیوں سے ہو جو اس جزیرے کے آس پاس سے گزرتے ہوں۔

ان دونوں روایتوں کے درمیان ایک اور تضاد بھی نظر آتا ہے، وہ یہ کہ مسلمؒ کی روایت میں سائل اور مخاطب کے طور پر شخص واحد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ذکر ہے، جب کہ ابوداؤدؒ کی روایت میں سوال و جواب شخص واحد یعنی صرف تمیم داریؓ کی ذات کے سات مختص رکھا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے، کہ سائل اور مخاطب پوری جماعت تھی لیکن اس جماعت میں چونکہ تمیم داریؓ بھی شامل تھے اس لئے سوال و جواب کی نسبت صرف ان کی طرف کرنا بھی درست ہے یا یہ کہ سوال و جواب کرنے والے صرف تمیم داریؓ ہی ہوں گے لیکن انہوں نے وہ سوال و جواب چونکہ پوری جماعت کے ترجمان کی حیثیت میں کیا ہوگا اس لئے اس سوال و جواب کی نسبت پوری جماعت کی طرف کرنا بھی درست ہے، چنانچہ عرف عام میں رائج ہے کہ جب کسی جماعت کا کوئی فرد کوئی کام کرتا ہے تو کبھی اس کی نسبت صرف اسی شخص کی طرف کی جاتی ہے اور کبھی پوری جماعت کی طرف مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں گروہ نے فلاں شخص کو مار ڈالا تو اگرچہ مارنے والا ایک ہی شخص ہوتا ہے مگر اس کی نسبت پورے گروہ کی طرف کی جاتی ہے۔

دجال کا حلیہ

(۲۲) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّىْ حَدَّثْتُكُمْ عَنِ الدَّجَّالِ حَتّٰى خَشِيْتُ اَنْ لَّا تَعْقِلُوْا اَنَّ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ قَصِيْرٌ اَفْحَجُ جَعْدٌ اَعْوَرُ مَطْمُوْسُ الْعَيْنِ لَيْسَتْ بِنَاتِئَةٍ وَّلَا حَجْرَاءَ فَاِنْ اُلْبِسَ عَلَيْكُمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِاَعْوَرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبادہؓ ابن صامت رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے تم لوگوں سے دجال کا حال اس اندیشہ سے (بار بار) بیان کیا ہے کہ کہیں تمہاری سمجھ میں نہ آئے، (تو اچھی طرح سمجھ لو کہ) دجال پستہ قد ہے، پھڈا ہے، اس کے بال مڑے ہوئے ہیں (ایک آنکھ سے) کانا ہے اور (دوسری) آنکھ سلپٹ یعنی بالکل مٹی ہوئی ہے، اس کی آنکھ نہ ابھری ہوئی ہے اور نہ اندر کو دھنسی ہوئی۔ اس کے بعد بھی اگر تم شبہ میں پڑ جاؤ (یعنی میں نے دجال کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ بھول جانے کے سبب اور اس کے مافوق الفطرت کے کارناموں کی وجہ سے اس کا دعوی الوہیت اگر تمہیں کسی درجہ میں شبہ میں مبتلا بھی کر دے تو) اتنی بات یاد رکھنا کہ تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح : "کہ کہیں تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔" کا مطلب یہ ہے کہ میں جو بار بار اور مختلف انداز میں دجال کا حال تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دجال کی حیثیت و حقیقت تمہارے ذہن میں اچھی طرح راسخ ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ جب دجال ظاہر ہو تو تم باتوں کو بھول جاؤ جو اس کے حق میں میں نے بتائی ہیں یا تمہارا دل و دماغ اس کی حقیقت سے نا آشنا رہے! اور طیبیؒ نے کہا ہے کہ انی حدثتکم عن الدجال حتّٰی خشیت الخ میں لفظ "حتّٰی" دراصل "حدثتکم" کی غایت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے دجال کے سلسلہ میں اتنی زیادہ اور اس قدر متفرق طور پر احادیث بیان کی ہیں کہ مجھے یہ خدشہ ہو گیا ہے کہ کہیں تم التباس کا شکار نہ ہو جاؤ اور تمہارا ذہن اس طرح نہ الجھ جائے کہ دجال کی حیثیت و حقیقت اور اس کے احوال کی تفصیل تمہارے فہم و ادراک کی گرفت سے باہر ہو جائے، پس تم پر لازم ہے کہ دجال کے احوال کو خوب اچھی طرح سمجھ لو اور اپنے آپ کو اس بارے میں شکوک و شبہات اور التباس سے بچاؤ۔

دجال پستہ قد ہے، یہ بات بظاہر اس روایت کے مخالف ہے جس میں دجال کو سب سے بڑے ڈیل ڈول والا بتایا گیا ہے لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ پستہ قد ہونا بڑے ڈیل ڈول والا ہونے کے منافی نہیں ہے، چنانچہ ہو سکتا ہے کہ دجال ٹھگنے قد کا بھی ہو اور چپٹیل بھاری جسم والا بھی، اور یہ بات اس کے اتنا بڑا فتنہ پرواز ہونے کے اعتبار سے اس کی فطرت اور اس کی حقیقت کے مطابق بھی ہے! اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے خروج کے وقت اس کو متغیر کر دے یعنی اس وقت تو وہ بہت بڑے ڈیل ڈول والا ہے لیکن جب اس کے ظاہر ہونے کا وقت آئے گا تو ٹھگنا ہو جائے گا۔

"پھڈا" "افحج" کا ترجمہ ہے، یعنی ایسا شخص یا جانور جس کے چلنے کا یہ غیر معمولی انداز ہو کہ پاؤں کے سرے یعنی پنجے تو زمین پر قریب قریب پڑیں مگر دونوں ایڑیاں، پھیلی ہوئی پنڈلیوں کے ساتھ ایک دوسرے سے دور پڑیں اور نہایہ میں یہ لکھا ہے کہ "افحج" کے معنی ہیں دونوں رانوں کے درمیان معمول سے زیادہ فاصلہ ہونا۔

"اس کی آنکھ نہ ابھری ہوئی ہے اور نہ اندر کو دھنسی ہوئی۔" یہ جملہ منفیہ موکدہ ہے جس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اس کی ایک آنکھ بالکل مٹی ہوئی ہوگی، پس یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اس کی دوسری آنکھ انگور کے دانہ کی طرح پھولی ہوئی ہوگی اس کی وضاحت پیچھے کی جا چکی ہے۔

"اتنی بات یاد رکھنا کہ تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے۔" یعنی ایک مسلمان و مؤمن کی حیثیت سے تمہارے اوپر صفات ربوبیت میں سے جس چیز کا سب سے پہلے پہچاننا واجب ہے وہ یہ ہے کہ وہ (تمہارا رب) حدوث و عیوب اور خصوصاً ظاہری نقائص سے بالکل پاک ہے پس اگر یہ بنیادی عقیدہ تمہارے دل و دماغ میں مستحضر رہے گا تو تم دجال کو کانا دیکھ کر فوراً سمجھ جاؤ گے کہ یہ عیب دار ذات ہرگز خدا نہیں ہو سکتی خواہ وہ اپنی خدائی کے اظہار کے لئے اور تمہیں شک و شبہ میں ڈالنے والے کتنے ہی مافوق الفطرت کارنامے کیوں نہ دکھائے۔

ایمان پر ثابت رہنے والوں کو دجال سے کوئی خوف نہیں ہو گا۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ عُبَیْدَةَ ابْنِ الْجَرَّاحِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّهٗ لَمْ یَكُنْ نَبِیٌّ بَعْدَ نُوْحٍ اِلَّا قَدْ اَنْذَرَ الدَّجَّالَ قَوْمَهٗ وَاِنِّیْ اُنْذِرُكُمُوْهُ فَوَصَفَهٗ لَنَا قَالَ لَعَلَّهٗ سَیُدْرِكُهٗ بَعْضُ مَنْ رَاٰنِیْ اَوْسَمِعَ كَلَامِیْ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَكَیْفَ قُلُوْبُنَا یَوْمَئِذٍ قَالَ مِثْلُهَا یَعْنِی الْیَوْمَ اَوْخَیْرٌ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عبیدہ بن الجراحؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا" حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کے بعد ایسا کوئی نبی نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو اور میں بھی (بار بار مختلف مواقع پر دجال کے احوال مکر و تلبیس اور اس کی

حقیقت و حیثیت کو بیان کرکے) تمہیں اس سے ڈراتا رہتا ہوں" اس کے بعد حضور ﷺ نے ہمارے سامنے دجال کے (کچھ) احوال بیان کیے اور پھر فرمایا "شاید ان لوگوں میں سے کہ جنہوں نے مجھے دیکھا ہے یا میرا کلام سنا ہے، کوئی شخص اس (کے زمانہ) کو پائے" صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس وقت ہمارے قلوب کی (یعنی اہل ایمان کے قلوب کی) کیا حالت ہوگی؟" فرمایا بالکل ایسی ہی جیسے آج کے دن ہے یا اس سے بھی بہتر۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا تھا! پس "نوح علیہ السلام کے بعد" سے مراد یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی ڈرایا اور ان کے بعد آنے والے تمام انبیاء نے بھی ڈرایا۔

"ان لوگوں میں سے کہ جنہوں نے مجھے دیکھا ہے الخ" یہ بات حضور ﷺ نے یہ فرض کرکے فرمائی کہ دجال کا ظہور اگر جلد ہی ہو جائے! اور بعض لوگوں نے اس جملہ کا مشار، الیہ حضرت خضر علیہ السلام کو قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ خضر علیہ السلام کے اس دنیا میں موجود ہونے کی دلیل ہے! یا "میرا کلام سنا ہے" اس کے حکم میں ہر وہ اہل ایمان آجاتا ہے جس تک دجال کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی احادیث پہنچیں، اگرچہ اس کا زمانہ آنحضرت کے زمانہ سے کتنے ہی بعد کیوں نہ ہو بہرحال اس پورے جملہ کا مطلب گویا یہ تھا کہ دجال کا وجود اور اس کا ظاہر ہونا یقینی امر ہے، البتہ اس وقت کا تعین کے ساتھ علم نہیں ہے کہ وہ کب ظاہر ہوگا، لہٰذا اگر ایسا ہو کہ میرے صحابہؓ میں سے کوئی اس کا زمانہ پائے تو فبہا ورنہ جو اہل ایمان بعد میں آئیں گے وہ دجال کا زمانہ پائیں گے ان تک چونکہ میری احادیث پہنچیں گی اور میں نے دجال کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کو وہ سنیں اور پڑھیں گے اس لئے ان کو چاہئے کہ وہ یقین پر قائم رہیں اور دجال کے مکر و فریب میں نہ آئیں۔

جیسے آج کے دن ہے یا اس سے بھی بہتر" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص (یعنی اہل ایمان) اپنے ایمان و عقیدہ پر ثابت و قائم رہے گا اس کا دل بھی اپنی جگہ مضبوط رہے گا کہ اس میں دجال کے خوف کا گزر تک نہیں ہوگا اور اس کے مکر و فریب سے کوئی خدشہ نہیں رہے گا، جس طرح کوئی اہل ایمان اس وقت دجال کا منکر و مخالف ہے اسی طرح اس وقت بھی منکر و مخالف ہوگا بلکہ اس کے احوال اور اس کے مکر و فریب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے سبب اس انکار و مخالفت میں کہیں زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

دجال خراسان سے نکلے گا

(۲۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ عَنْ اَبِیْ بَكْرِنِ الصِّدِّيْقِ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الدَّجَّالُ يَخْرُجُ مِنْ اَرْضٍ بِالْمَشْرِقِ يُقَالُ لَهَا خُرَاسَانَ يَتْبَعُهٗ اَقْوَامٌ كَاَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمرو ابن حریث، سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے ہم سے بیان کیا اور فرمایا کہ "دجال روئے زمین کے ایک ایسے حصّہ سے نکلے گا جو مشرق میں واقع ہے اور جس کو خراسان کہا جاتا ہے، اس کے ساتھ لوگوں کے کتنے ہی گروہ ہوں گے اور ان لوگوں کے چہرے تہہ بہ تہہ پھولی ہوئی ڈھال کی مانند ہوں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "خراسان" ایک مشہور شہر ہے جو ماوراء النہر کے علاقہ میں واقع ہے اور ایران کی مملکت میں شامل ہے اور ان لوگوں کے چہرے الخ کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے چہرے چوڑے چکلے اور رخسار ڈھال کی طرح ابھرے ہوئے ہوں گے لفظ مطرقۃ کی وضاحت کتاب الفتن میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے۔

دجال سے دور رہنے کی تاکید

(۲۵) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمِعَ بِالدَّجَّالِ فَلْيَنْأَ مِنْهُ فَوَاللّٰهِ اِنَّ

الرَّجُلَ لَيَاتِيهِ وَهُوَ يَحْسِبُ اَنَّهُ مُؤْمِنٌ فَيَتْبَعُهُ مِمَّا يُبْعَثُ بِهِ مِنَ الشُّبُهَاتِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص دجال کے نکلنے کی خبر سنے اس کو چاہئے کہ وہ اس سے دور رہے خدا کی قسم، آدمی دجال کے پاس آئے گا اور اس کا گمان تو یہ ہوگا کہ میں مؤمن ہوں لیکن وہ ان چیزوں کی وجہ سے شبہات میں پڑ کر کہ جو دجال کو دی گئی ہوں گی (جیسے سحر و شعبدہ بازی اور مردہ کو زندہ کر دینے کی قدرت وغیرہ اس کی اطاعت قبول کرے گا اور اس پر ایمان لے آئے گا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "اس کو چاہئے کہ اس سے دور رہے" کا حاصل یہ ہے کہ برائی کے قریب جانا خطرہ و خوف سے خالی نہیں ہوتا جب کہ اس سے دور رہنا بہتری و بھلائی کا ضامن ہوتا ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ لہٰذا جب دجال ظاہر ہو تو اس وقت جو بھی اہل ایمان ہو اس کو چاہئے کہ وہ دجال سے دور رہے۔

ظاہر ہونے کے بعد روئے زمین پر دجال کے ٹھہرنے کی مدت

(۲۶) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ بْنِ السَّكَنِ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْكُثُ الدَّجَّالُ فِي الْاَرْضِ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً اَلسَّنَةُ كَالشَّهْرِ وَالشَّهْرُ كَالْجُمُعَةِ وَالْجُمُعَةُ كَالْيَوْمِ وَالْيَوْمُ كَاضْطِرَامِ السَّعَفَةِ فِي النَّارِ۔ رواہ فی شرح السنۃ۔

"اور حضرت اسماء بنت یزید بن سکنؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا روئے زمین پر دجال چالیس سال تک رہے گا، (اس وقت) سال مہینہ کے برابر ہوگا، مہینہ ہفتہ کے برابر اور ہفتہ ایک دن کے برابر ہوگا اور ایک دن اتنی دیر کا ہوگا جتنی دیر میں کھجور کی خشک شاخ آگ میں جل جاتی ہے اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: پہلے ایک حدیث گزر چکی ہے جس میں روئے زمین پر دجال کے پھرنے کی مدت چالیس رات بتائی گئی ہے اور یہاں چالیس سال کی مدت بیان کی گئی ہے؟ پس ان دونوں حدیثوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے یہ کہا جائے گا کہ پہلی حدیث میں جس مدت کو بیان کیا گیا ہے اس سے وہ مخصوص مدت مراد ہے جس کے دوران وہ روئے زمین پر فتنہ و فساد پھیلائے گا اور لوگوں کو گمراہ کرے گا، اور یہاں جو مدت بیان کی گئی ہے اس سے وہ مطلق مدت مراد ہے جس میں وہ روئے زمین پر رہے گا۔

"سال مہینہ کے برابر ہوگا الخ" سے مراد وقت کی تیز رفتاری کو ظاہر کرنا ہے کہ اس وقت دن بہت جلد جلد گزریں گے رہی اس حدیث کی بات جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اس وقت ایک دن ایک سال کے برابر گزرے گا تو اس سے مراد تعلق و شدت کو بیان کرنا ہے کہ اس وقت فتنہ و فساد کی کثرت اور دینی و دنیاوی مصائب و آلام کی زیادتی کی وجہ سے ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے زمانہ کی رفتار دھیمی ہوگئی ہے اور دن پہاڑوں کی طرح کٹ رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ دن تیز رفتاری کے ساتھ گزریں گے۔

"اور ایک دن اتنی دیر کا ہوگا الخ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی سوکھی پتی کو آگ میں جلایا جائے تو وہ آگ بھک سے جل کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

دجال کی اطاعت کرنے والے

(۲۷) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتْبَعُ الدَّجَّالَ مِنْ اُمَّتِيْ سَبْعُوْنَ اَلْفًا عَلَيْهِمُ السِّيْجَانُ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میری اُمت میں سے ستر ہزار افراد کہ جن کے سروں پر سیجان پڑے ہوں گے دجال کی اطاعت اختیار کرلیں گے" (اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔)"

تشریح: سیجان اصل میں ساج کی جمع ہے جیسا کہ تاج کی جمع تیجان آتی ہے اور ساج بھی طیلسان کی طرح سبز یا سیاہ چادر کو کہتے ہیں۔

"میری امت" میں اُمّت سے مراد اُمّت اجابت یعنی ملت اسلامیہ بھی ہو سکتی ہے اور اُمّت دعوت یعنی غیر مسلموں کی قوم بھی ہو سکتی ہے لیکن زیادہ صحیح، آخری مراد یعنی غیر مسلموں کی قوم ہی ہے، جیسا کہ پیچھے کی ایک حدیث میں بیان ہو چکا ہے کہ دجال کے اطاعت کرنے والے ستر ہزار لوگ، اصفہان کے یہودی ہوں گے۔

دجال اور قحط سالی

(۲۸) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ بَيْتِىْ فَذَكَرَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اِنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ ثَلٰثَ سِنِيْنَ سَنَةٌ تُمْسِكُ السَّمَآءُ فِيْهَا ثُلُثَ قَطْرِهَا وَالْاَرْضُ ثُلُثَ نَبَاتِهَا وَالثَّانِيَةُ تُمْسِكُ السَّمَآءُ ثُلُثَيْ قَطْرِهَا وَالْاَرْضُ ثُلُثَيْ نَبَاتِهَا وَالثَّالِثَةُ تُمْسِكُ السَّمَآءُ قَطْرَهَا كُلَّهُ وَالْاَرْضُ نَبَاتَهَا كُلَّهُ وَلَا يَبْقٰى ذَاتُ ظِلْفٍ وَلَا ذَاتُ ضِرْسٍ مِّنَ الْبَهَآئِمِ اِلَّا هَلَكَ وَاِنَّ مِنْ اَشَدِّ فِتْنَتِهٖ اَنَّهٗ يَاْتِى الْاَعْرَابِىَّ فَيَقُوْلُ اَرَاَيْتَ اِنْ اَحْيَيْتُ لَكَ اِبِلَكَ اَلَسْتَ تَعْلَمُ اَنِّىْ رَبُّكَ فَيَقُوْلُ بَلٰى فَيُمَثِّلُ لَهُ الشَّيْطَانُ نَحْوَ اِبِلِهٖ كَاَحْسَنِ مَا يَكُوْنُ ضُرُوْعًا وَاَعْظَمِهٖ اَسْنِمَةً قَالَ وَيَاْتِى الرَّجُلَ قَدْمَاتَ اَخُوْهُ وَمَاتَ اَبُوْهُ فَيَقُوْلُ اَرَاَيْتَ اِنْ اَحْيَيْتُ لَكَ اَبَاكَ وَاَخَاكَ اَلَسْتَ تَعْلَمُ اَنِّىْ رَبُّكَ فَيَقُوْلُ بَلٰى فَيُمَثِّلُ لَهُ الشَّيَاطِيْنُ نَحْوَ اَبِيْهِ وَاَخِيْهِ قَالَتْ ثُمَّ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَاجَتِهٖ ثُمَّ رَجَعَ وَالْقَوْمُ فِىْ اهْتِمَامٍ وَّغَمٍّ مِّمَّا حَدَّثَهُمْ قَالَتْ فَاَخَذَ بِلَحْمَتَيِ الْبَابِ فَقَالَ مَهْيَمْ اَسْمَآءُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَقَدْ خَلَعْتَ اَفْئِدَتَنَا بِذِكْرِ الدَّجَّالِ قَالَ اِنْ يَّخْرُجْ وَاَنَا حَيٌّ فَاَنَا حَجِيْجُهٗ وَاِلَّا فَاِنَّ رَبِّىْ خَلِيْفَتِىْ عَلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاللّٰهِ اِنَّا لَنَعْجِنُ عَجِيْنَنَا فَمَا نَخْبِزُهٗ حَتّٰى نَجُوْعَ فَكَيْفَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَئِذٍ قَالَ يُجْزِئُهُمْ مَا يُجْزِئُ اَهْلَ السَّمَآءِ مِنَ التَّسْبِيْحِ وَالتَّقْدِيْسِ۔ (رواہ)

"اور حضرت اسماء بنت یزید ابن سکنؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا اور فرمایا۔" دجال کے ظاہر ہونے سے پہلے تین سال ایسے ہوں گے کہ (ان میں برکت جاتی رہے گی اور لوگوں کے معاشی حالات میں ابتری پیدا کرنے والے مختلف حالات رونما ہوں گے چنانچہ) پہلے سال تو آسمان تہائی بارش کو اور زمین تہائی پیداوار کو روک لے گی (یعنی اور سالوں کے معمول کے خلاف اس سال بارش ایک تہائی کم ہوگی اسی طرح زمین کی پیداوار میں بھی ایک تہائی کمی ہو جائے گی اگرچہ بارش کے پانی کے علاوہ دوسرے طریقوں سے زمین کی آبپاشی کی جائے گی) پھر دوسرے سال آسمان دو تہائی بارش کو اور زمین دو تہائی پیداوار کو روک لے گی اور پھر تیسرے سال آسمان تمام بارش کو اور زمین اپنی تمام پیداوار کو روک لے گی" یہاں تک کہ جس وقت دجال ظاہر ہوگا تو تمام روئے زمین پر قحط پھیل چکا ہوگا صرف انسان سخت ترین معاشی و غذائی بحران میں مبتلا ہونگے بلکہ مویشیوں اور چوپایوں میں بھی بھکری پھیل چکی ہوگی) چنانچہ نہ تو کوئی کھروالا جانور باقی رہے گا اور نہ وحشی جانوروں میں سے کوئی دانت والا بلکہ سب ہلاک ہو جائیں گے اور اس کے برعکس اس وقت خزینے اور دفینے دجال کے تسلط میں ہوں گے اور غذائی ضروریات کی تکمیل اور آسائش و خوشحالی کے دوسرے ذرائع اس کے پاس ہوں گے، اس طرح لوگوں میں اپنی خدائی کا سکہ جمانے اور گمراہی کا سخت ترین فتنہ پھیلانے کے لئے وہ ان چیزوں کو استعمال کرے گا) چنانچہ اس کا سخت ترین فتنہ یہ ہوگا کہ وہ علم و دانائی سے بے بہرہ ایک دیہاتی کے پاس آئے گا اور اس سے کہے گا کہ مجھے بتا، اگر میں تیرے ان اونٹوں کو زندہ کردوں (جو قحط کی وجہ سے مرگئے ہیں) تو کیا تو یہ تسلیم کرے گا کہ میں تیرا پروردگار ہوں" دیہاتی جواب دے گا کہ ہاں میں تجھے اپنا پروردگار مان لوں گا) تب دجال اس دیہاتی کے اونٹوں کی مانند شکل و صورت بنا کر لائے گا (یعنی اپنے تابعدار جنات اور شیاطین کو حکم دے گا کہ وہ اونٹوں کی شکل و صورت میں اس دیہاتی کے سامنے آجائیں، چنانچہ شیاطین اونٹ بن کر سامنے آجائیں گے) اور وہ اونٹ تھنوں کی درازی اور کوہانوں کی بلندی کے اعتبار سے اس کے اونٹوں سے بہتر معلوم ہوں گے" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

"(دجال کا اسی طرح کا ایک سخت ترین فتنہ یہ ہوگا کہ) پھر وہ ایک شخص کے پاس آئے گا جس کا باپ اور بھائی مر گئے ہوں گے۔ اور اس سے کہے گا کہ مجھے بتا، اگر میں تیرے (مرے ہوئے) بھائی اور باپ کو زندہ کردوں تو کیا تو تسلیم کرے گا کہ میں تیرا پروردگار ہوں؟ وہ شخص جواب دے گا کہ ہاں! (میں تجھے اپنا پروردگار مان لوں گا) تب دجال (شیاطین کو) اس شخص کے بھائی اور باپ کی شکل وصورت میں پیش کر دے گا۔" حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ یہ فرما کر کسی ضرورت سے باہر تشریف لے گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد مجلس میں تشریف لے آئے اس وقت حاضرین مجلس (دجال کے یہ حالات سن کر) فکر وغم کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے حضرت اسماء کہتی ہیں کہ یا رسول اللہ آپ ﷺ نے تو (دجال کا ذکر کرکے) ہمارے دل نکال لئے ہیں (یعنی اس کا یہ حال سن کر ہمارے دل سخت مرعوب زدہ ہو گئے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا اگر (دجال نکلے اور فرض کرو) میں زندہ رہوں تو دلائل وحجت سے اس کو رفع کردوں گا، اور اگر وہ اس وقت نکلا جب میں دنیا میں موجود نہ ہوں گا تو یقیناً میرا پروردگار ہر مؤمن کے لئے مراد وکیل وخلیفہ ہوگا (یعنی اس وقت اللہ تعالیٰ ہر صاحب ایمان کا حامی ومددگار ہوگا اور اس کے فتنہ وفساد سے محفوظ رکھے گا)" پھر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، بھوک کے وقت انسان کی بے صبری کا عالم تو یہ ہوتا ہے کہ ہم آٹا گوندھتے ہیں اور اس کی روٹی پکا کر فارغ بھی نہیں ہوتے کہ بھوک سے ہم بے چین ہو جاتے ہیں، تو (ایسی صورت میں اس وقت جب کہ قحط سالی پھیلی ہوئی ہوگی، غذائی اشیاء دجال کے تسلط میں ہوں گی اور کھانے پینے کی چیزیں صرف وہی شخص پا سکے گا جو دجال کی اتباع کرے گا) آخر مؤمنین کا کیا حال ہوگا (یعنی وہ اپنی بھوک پر کس طرح قابو پائیں گے اور انہیں صبر وقرار کس طرح ملے گا؟) حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ان کے لئے وہی چیز کافی ہوگی جو آسمان والوں یعنی فرشتوں کو کافی ہوتی ہے یعنی حق تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس۔"

تشریح: فاخذ بلحمتی الباب آنحضرت ﷺ نے دروازے کے دو جانب پکڑ لئے) میں لفظ "لحمة" مشکوٰۃ اور مصابیح کے تمام نسخوں میں ل کے زبر اور ح کے جزم کے ساتھ منقول ہے جو "جانب" کے معنی میں لیا گیا ہے لیکن صحاح وقاموس اور لغت کی دوسری کتابوں میں یہ لفظ اس معنی میں مذکور نہیں ہے چنانچہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ یہ اصل میں "ملجفتی الباب" ہے یعنی ح کی جگہ ج ہے اور م کی جگہ ف ہے، جس کے معنی دروازے کے بازو کے ہیں! لیکن بعض شارحین نے طیبیؒ کی اس بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ چونکہ مشکوٰۃ و مصابیح کے تمام ہی نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح منقول ہے جس طرح یہاں حدیث میں نقل کیا گیا ہے لہٰذہ لازم ہے کہ "بلحمتی الباب"، ہی کو صحیح مانا جائے اور اس معنی کے سلسلہ میں یہ تاویل کی جائے کہ چونکہ قاموس میں لحمہ کے معنی گوشت کا ٹکڑا لکھے ہیں اس لئے اس معنی میں سے صرف ٹکڑے کو اختیار کیا جائے اور کہا جائے کہ "بلحمتی الباب" میں "دونوں ٹکڑوں" سے مراد دروازے کے دونوں کواڑ ہیں اور دونوں کواڑ اس اعتبار سے "ٹکڑے" ہی کہے جا سکتے ہیں کہ وہ الگ الگ ہوتے ہیں، کہ کبھی تو (دروازہ بند ہونے کی صورت میں) مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور کبھی "دروازہ کھلنے کی صورت میں) ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں! یہ تاویل یقیناً اس بات سے زیادہ بہتر اور مناسب ہے کہ حدیث کے الفاظ میں کتابت کی غلطی یا روایت کے سہو کا احتمال نکالا جائے۔

"ان کے لئے وہی چیز کافی ہوگی الخ کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس قدر صبر واستقامت اور نفس پر قابو عطا فرما دے گا کہ وہ کھانے پینے کی احتیاج ہی محسوس نہیں کریں گے جیسا کہ فرشتے کھانے پینے کے محتاج نہیں ہوتے اور ان کی اصل غذا تسبیح ہوگی جیسا کہ فرشتوں کی غذا تسبیح وتقدیس ہے واضح رہے کہ بعض حضرات نے حضرت اسماءؓ کے ان الفاظ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ (ﷺ) نے تو ہمارے دل نکال لئے الخ" کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ دجال سے ہمارا تو واسطہ بھی نہیں پڑا ہے، اس کا صرف ذکر ہی سن کر ہمارا یہ عالم ہے کہ ہم روٹی پکانے کے لئے آٹا گوندھتے ہیں اور جونہی دجال کی ان باتوں کا خیال آجاتا ہے جو آپ ﷺ نے ذکر فرمائی ہیں اور جو ہمارا دل نکالنے لگتی ہیں تو خوف ودہشت اور فکر وصدمہ کی وجہ سے ہم روٹی پکانا چھوڑ دیتے ہیں اور بھوکے رہ جاتے ہیں، تو آخر ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اس زمانہ کے سخت ترین حالت سے دوچار ہوں گے اور جن کا واسطہ دجال سے پڑے گا" لیکن طیبیؒ نے اس معنی کو بعید قرار دیا ہے ویسے اگر یہ معنی مراد لئے جائیں تو اس صورت میں حضور ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تسبیح وتقدیس۔

کی برکت سے ان کو صبر و استقامت اور ان حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت و طاقت عطا فرمائے گا! نیز احتمال تو یہ ہے کہ حضرت اسماءؓ نے یہ بات اس مجلس کے بعد کسی وقت خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کی ہوگی ویسے "فَقُلْتُ" میں حرف ف بظاہر اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ انہوں نے یہ بات اسی مجلس میں دجال کا ذکر سن کر کہی تھی اور ان کے وہ الفاظ جن میں آٹا گوندھنے اور بھوک کا ذکر ہے، وہ انہوں نے زمانہ آئندہ کے اعتبار سے کہی۔

مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں رواہ کے بعد جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ لیکن پھر بعد میں کسی نے احمد و ابوداؤد و الطیالی کے الفاظ کا الحاق کیا ہے اور بعض حضرات نے اس طرح کہا ہے رواہ احمد عن عبدالرزاق عن معمر عن قتادۃ عن شھر بن حوشب عنھا وانفرد بہ عنھا

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اہل ایمان کو دجال سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں

(۲۹) عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ مَاسَأَلَ اَحَدٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الدَّجَّالِ اَكْثَرَ مِمَّا سَأَلْتُهُ وَ اِنَّهُ قَالَ لِيْ مَا يَضُرُّكَ قُلْتُ اِنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ مَعَهُ جَبَلَ خُبْزٍ وَّنَهَرَ مَآءٍ قَالَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کہتے ہیں کہ دجال کے بارے میں جس قدر میں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا ہے اتنا کسی اور نے نہیں پوچھا! چنانچہ (ایک دن) آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "دجال تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکے گا یعنی تمہارے اوپر چونکہ حق تعالیٰ کی عنایت وحمایت کا سایہ ہوگا اس لئے دجال تمہیں گمراہ نہیں کر سکے گا" میں نے عرض کیا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ روٹیوں کا پہاڑ (یعنی پہاڑ کے بقدر غذائی ضروریات کا ذخیرہ) ہوگا اور پانی کی نہر اس وقت جب کہ لوگ قحط سالی کا شکار ہوں گے اگر کوئی شخص بھوک و پیاس سے اضطرار کی حالت کو پہنچ جائے تو وہ کیا کرے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا دجال اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ ذلیل ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "اس سے زیادہ ذلیل ہے" کا مطلب یہ ہے کہ دجال اپنی طاقت وقوت کے جو مظاہر پیش کرے گا وہ سب بے حقیقت ہونگے کہ ان چیزوں کی حیثیت شعبدہ بازی، فریب کاری اور نظر بندی سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوگی وہ خدا کے نزدیک اس قدر ذلیل و بے حیثیت ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے اس کو اتنی زیادہ طاقت وقدرت عطا نہیں ہوسکتی اور وہ اس بات پر قادر ہی نہیں ہوسکتا کہ اپنے عقیدہ وعمل پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اہل ایمان کو گمراہ کر سکے لہٰذا اہل ایمان دجال کی اس مافوق الفطرت طاقت کو دیکھ کر، کہ جو صرف ظاہر میں طاقت نظر آئے گی اور حقیقت میں دھوکہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا! ہرگز خوفزدہ نہیں ہوں گے بلکہ وہ تو اس کی شعبدہ بازیوں اور اس کے محیر العقول کارناموں کو دیکھ کر اس کے دجل وفریب اور جھوٹ پر اپنے یقین کو اور زیادہ پختہ کریں گے۔

دجال کی سواری گدھا ہوگا

(۳۰) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَخْرُجُ الدَّجَّالُ عَلٰى حِمَارٍ اَقْمَرَ مَابَيْنَ اُذُنَيْهِ سَبْعُوْنَ بَاعًا رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ كِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا" دجال ایک سفید گدھے پر سوار ہو کر نکلے گا اور اس گدھے کے دونوں کانوں کے درمیان ستر باع چوڑا فاصلہ ہوگا" اس روایت کو بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "باع" دونوں ہاتھوں کے پھیلانے کی مقدار کو کہتے ہیں! حاصل یہ کہ دجال کی سواری کا وہ گدھا اتنا بڑا ہوگا کہ اس کے دونوں کانوں کے درمیان کا فاصلہ دونوں ہاتھوں کے ستر پھیلاؤ کے بقدر ہوگا۔

بَابُ قِصَّةِ ابْنِ صَيَّادٍ

ابن صیاد کے قصہ کا بیان

مشکوۃ کے اکثر قابل اعتماد نسخوں میں یہاں ابن صیاد ہی لکھا ہے، لیکن بعض نسخوں میں "ابن الصیاد" نقل کیا گیا ہے۔

ابن صیاد کی حقیقت: ابن صیاد کا اصل نام "صاف" تھا اور بعض حضرات نے "عبداللہ" کہا ہے وہ ایک یہودی تھا جو مدینہ کا باشندہ تھا یا اصل باشندہ تو کہیں اور کا تھا لیکن مدینہ آکر وہاں کے یہودیوں میں شامل ہو گیا تھا! ابن صیاد سحر و کہانت کا زبردست ماہر تھا اور اس وجہ سے اس کی شخصیت بڑی پر اسرار بن کر رہ گئی تھی اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اس کی حقیقت کو مختصر طور پر یوں ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک بڑا فتنہ تھا جس میں مسلمانوں کو مبتلا کر کے ان کا امتحان لیا گیا تھا اس کے حالات بڑے مختلف تھے اور اس بنا پر صحابہؓ کے درمیان بھی اس کی حیثیت کے تعین میں اختلاف تھا، چنانچہ کچھ صحابہؓ کا خیال یہ تھا ابن صیاد وہی دجال ہے جس کے بارے میں خبر دی گئی ہے کہ وہ دنیا میں ظاہر ہوگا اہل ایمان کو گمراہ کرے گا لیکن اکثر حضرات کا کہنا یہ تھا کہ ابن صیاد وہ بڑا دجال تو نہیں ہے لیکن ان چھوٹے دجالوں میں سے ایک ضرور ہے جو مختلف زمانوں میں پیدا ہوتے رہیں گے اور جن کا اصل مقصد فتنہ وفساد پھیلانا اور لوگوں کو گمراہ کرنا ہوگا! جیسا کہ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے کہ اس اُمت میں دجال پیدا ہوتے رہیں گے، جو خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے آخر الذکر حضرات کی دلیل یہ ہے کہ ابن صیاد اگرچہ پہلے کافر و کاہن تھا لیکن آخر میں مسلمان ہو گیا تھا، پھر اس نے حج بھی کیا مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہوا، اس کے اولاد بھی ہوئی اور وہ مدینہ و مکہ میں رہا کرتا تھا جب کہ دجال کافر ہوگا اور کفر ہی کی حالت میں مارا جائے گا اس کے اولاد نہیں ہوگی، اور مکہ و مدینہ میں اس کا داخلہ تک ممنوع ہوگا چہ جائیکہ وہ ان مقدس شہروں میں بود و باش اختیار کرے حضرت تمیم داریؓ کی اس حدیث کو بھی ان حضرات کی پوری دلیل قرار دیا جاسکتا ہے جو دجال کے سلسلہ میں پیچھے گزر چکی ہے! بہر حال ابن صیاد کی حیثیت و حقیقت مبہم تھی، اس کے بارے میں تعین و یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، خود آنحضرت ﷺ پر بھی اس بارے میں کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تھی اس لئے آپ ﷺ نے بھی اس کی اصل حیثیت پر سے پردہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کو مبہم رکھا جیسا کہ اس باب میں منقول احادیث سے معلوم ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ابن صیاد کے ساتھ ایک واقعہ

① عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ انْطَلَقَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ رَهْطٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ قِبَلَ ابْنِ صَيَّادٍ حَتّٰى وَجَدُوْهُ يَلْعَبُ مَعَ الصِّبْيَانِ فِيْ اُطُمِ بَنِيْ مَغَالَةَ وَقَدْ قَارَبَ ابْنُ صَيَّادٍ يَوْمَئِذٍ الْحُلُمَ فَلَمْ يَشْعُرْ حَتّٰى ضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ظَهْرَهٗ بِيَدِهٖ ثُمَّ قَالَ اَتَشْهَدُ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَنَظَرَ اِلَيْهِ فَقَالَ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ الْاُمِّيِّيْنَ ثُمَّ قَالَ ابْنُ صَيَّادٍ اَتَشْهَدُ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَرَصَّهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَبِرُسُلِهٖ ثُمَّ قَالَ لِابْنِ صَيَّادٍ مَاذَا تَرٰى قَالَ يَاْتِيْنِيْ صَادِقٌ وَكَاذِبٌ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُلِّطَ عَلَيْكَ الْاَمْرُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ خَبَأْتُ لَكَ خَبِيْئًا وَخَبَأَ لَهٗ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ فَقَالَ هُوَ الدُّخُّ فَقَالَ اخْسَأْ فَلَنْ تَعْدُوَ قَدْرَكَ قَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَاْذَنُ لِيْ فِيْهِ اَنْ اَضْرِبَ عُنُقَهٗ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ يَّكُنْ هُوَ لَا تُسَلَّطُ عَلَيْهِ وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ هُوَ فَلَا خَيْرَ لَكَ فِيْ قَتْلِهٖ قَالَ ابْنُ عُمَرَ انْطَلَقَ بَعْدَ ذٰلِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ الْاَنْصَارِيُّ يَؤُمَّانِ النَّخْلَ الَّتِيْ فِيْهَا ابْنُ صَيَّادٍ فَطَفِقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَّقِيْ

بِجُذُوْعِ النَّخْلِ وَهُوَ يَخْتِلُ اَنْ يَّسْمَعَ مِنِ ابْنِ صَيَّادٍ شَيْئًا قَبْلَ اَنْ يَّرَاهُ وَابْنُ صَيَّادٍ مُضْطَجِعٌ عَلٰى فِرَاشِهٖ فِيْ قَطِيْفَةٍ لَّهٗ فِيْهَا زَمْزَمَةٌ فَرَاَتْ اُمُّ ابْنِ صَيَّادٍ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَتَّقِيْ بِجُذُوْعِ النَّخْلِ فَقَالَتْ اَيْ صَافُ وَهُوَ اسْمُهٗ هٰذَا مُحَمَّدٌ فَتَنَاهٰى ابْنُ صَيَّادٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ تَرَكَتْهُ بَيَّنَ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي النَّاسِ فَاَثْنٰى عَلَى اللّٰهِ بِمَا هُوَ اَهْلُهٗ ثُمَّ ذَكَرَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اِنِّيْ اُنْذِرُكُمُوْهُ وَمَا مِنْ نَّبِيٍّ اِلَّا قَدْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ لَقَدْ اَنْذَرَ نُوْحٌ قَوْمَهٗ وَلٰكِنِّيْ سَاَقُوْلُ لَكُمْ فِيْهِ قَوْلًا لَمْ يَقُلْهُ نَبِيٌّ لِقَوْمِهٖ تَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ اَعْوَرُ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِاَعْوَرَ۔ (متفق علیہ)

”اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) حضرت عمرفاروقؓ ابن خطاب صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت میں شامل ہو کر رسول کریم ﷺ کے ساتھ ابن صیاد کے پاس گئے اور انہوں نے اس کو (یہودیوں کے ایک قبیلہ) بنو مغالہ کے محل میں بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوا پایا، وہ اس وقت سن بلوغ کے قریب ہو چکا تھا، ابن صیاد ان سب کی آمد سے بے خبر (اپنے کھیل میں مصروف) رہا یہاں تک کہ رسول کریم ﷺ نے اس کی پشت پر ہاتھ مارا اور (جب وہ متوجہ ہوا تو آپ ﷺ نے) اس سے سوال کیا کہ کیا تو اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ ابن صیاد نے (یہ سن کر بڑی غصیلی نظروں سے) آپ ﷺ کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم امیوں یعنی ناخواندہ لوگوں کے رسول ہو اور پھر اس نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں؟ آنحضرت ﷺ نے اس کو (پکڑ لیا) اور پھر خوب زور سے بھینچا اور فرمایا ”میں خدا پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا“ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ (اچھا یہ بتا) تو کیا دیکھتا ہے یعنی غیب کی چیزوں سے تجھ پر کیا منکشف ہوتا ہے؟ اس نے جواب دیا کبھی تو میرے پاس سچی خبر آتی ہے اور کبھی تو میرے پاس سچا فرشتہ آتا ہے اور کبھی جھوٹا شیطان رسول کریم ﷺ نے اس کا یہ جواب سن کر) فرمایا کہ تیرا معاملہ سب گڈمڈ ہو گیا“ پھر رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تیرے لئے اپنے دل میں ایک بات چھپائی ہے اور جو بات آپ ﷺ نے ابن صیاد کے لئے چھپائی تھی وہ یہ آیت یوم تاتی السمآء بدخان مبین ۞ تھی اس نے جواب دیا کہ وہ پوشیدہ بات (جو تمہارے دل میں ہے) ”دخ“ ہے آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا دور ہٹ! تو اپنی اوقات سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکے گا“ حضرت عمرفاروقؓ نے (یہ صورت حال دیکھ کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ (ﷺ) مجھے اجازت دیں تو میں اس کی گردن اڑا دوں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ابن صیاد اگر وہی دجال ہے (جس کے آخر زمانہ میں نکلنے کی اطلاع دی گئی ہے) تو پھر تم اس پر مسلط نہیں ہو سکو گے یعنی اس کو قتل کرنے پر قادر نہیں ہو سکو گے کیونکہ اس کو قتل کرنا تو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے مقدر ہے) اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو پھر اس کو قتل کرنے میں تمہارے لئے کوئی بھلائی نہیں) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد (ایک اور دن) رسول کریم ﷺ کھجور کے ان درختوں کے پاس تشریف لے گئے جہاں ابن صیاد تھا اس وقت آپ کے ساتھ حضرت ابی ابن کعب انصاریؓ بھی تھے، رسول کریم ﷺ (وہاں پہنچ کر) کھجور کی شاخوں کے پیچھے چھپنے لگے تاکہ ابن صیاد (اپنے قریب آپ ﷺ کی موجودگی سے) بے خبر رہے اور آپ ﷺ اس کے دیکھنے سے پہلے اس کی کچھ باتیں سن لیں اور اس طرح چھپ کر ابن صیاد کی باتوں کو سننے سے آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ خود آپ ﷺ بھی اور صحابہؓ بھی جان لیں کہ وہ آخر ہے کیا آیا کوئی کاہن ہے یا جادوگر یا کچھ اور؟ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص سے فتنہ پردازی کا خوف ہو اس کی حقیقت کو ظاہر کرنا اور لوگوں پر اس کے احوال منکشف کرنا جائز ہے) اس وقت ابن صیاد ایک چادر میں لپٹا ہوا لیٹا تھا اور اس چادر کے اندر سے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی (جس کا کوئی مفہوم سمجھ میں آتا تھا) اتنے میں ابن صیاد کی ماں نے نبی کریم ﷺ کو کھجور کی شاخوں میں چھپا ہوا دیکھ لیا اور کہا، ارے، صاف یہ ابن صیاد کا نام تھا (دیکھ) یہ محمد (ﷺ) کھڑے ہیں ابن صیاد نے (سن کر) گنگنانا ترک دیا (یعنی وہ بالکل خاموش ہو گیا اور جو ہلکی ہلکی سی آواز آ رہی تھی وہ بھی بند ہو گئی (یہ دیکھ کر) رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا۔ ”اگر ابن صیاد کی

ماں اس کو نہ ٹوکتی (اور میری موجودگی سے باخبر نہ کرتی) وہ اپنی حقیقت کو ظاہر کر دیتا (یعنی اس کی باتوں سے یہ معلوم ہو جاتا وہ کون ہے اور کیا ہے) حضرت عبداللہ (ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جب) رسول کریم ﷺ (خطبہ دینے کے لئے) لوگوں کے سامنے کھڑے ہوئے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جو اس کو سزاوار ہے، پھر دجال کا ذکر کیا (بایں احتمال کہ شاید ابن صیاد دجال ہو یا آپ ﷺ نے اس کی فتنہ پردازی اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس میں دجال کی بعض خصلتیں پائی جاتی تھیں دجال کا ذکر کرنا اور اس کے احوال سے آگاہ کرنا مناسب جانا) اور فرمایا میں تمہیں دجال سے ڈراتا ہوں، اور نوح کے بعد کوئی نبی علیہ السلام ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو اور (ان انبیاء سے پہلے) نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو اس سے ڈرایا ہے لیکن میں تم سے دجال کے بارے میں ایک ایسی بات اور ایک ایسی علامت بتاتا ہوں جو کسی اور نبی علیہ السلام نے اپنی قوم سے نہیں بتائی ہے، سو تم جان لو کہ دجال کانا ہوگا اور یقیناً اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "امیوں" سے اس کی مراد اہل عرب تھے، کیونکہ اس زمانہ میں اکثر اہل عرب پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے! اور اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں میں سے ایک طبقہ کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی رسالت کے منکر تو نہیں تھے لیکن آپ ﷺ کو صرف اہل عرب کا رسول مانتے تھے بہرحال یہ بات (یعنی ابن صیاد کا حضور ﷺ کی رسالت کی گواہی اس طرح دینا) اس کی ان لغو و باطل باتوں میں سے ایک تھی جو شیطان کاہنوں کو القا کیا کرتا ہے، ویسے منطقی طور پر بھی اس کے یہ الفاظ زبردست تضاد و تناقض کے حامل تھے کیونکہ نبی علیہ السلام ہر حال میں سچا ہوتا ہے خواہ وہ کسی ایک قوم و علاقہ میں مبعوث ہوا ہو یا پوری نوع انسانیت کے لئے) اور جب آنحضرت ﷺ نے اپنی نبوت عامہ کا اعلان کیا۔ اور تمام نوع انسان کو اپنی رسالت کی دعوت دی تو آپ ﷺ کی نبوت کو صرف اہل عرب کے ساتھ مخصوص کرنا سراسر باطل ٹھہرا" آنحضرت ﷺ نے اس کو خوب زور سے بھینچا" میں بھینچا" لفظ رص کا ترجمہ ہے جو ؔر کے زبر اور ص ؔ کے ساتھ ہے اور جس کے اصل معنی "دو چیزوں کو استوار کرنا اور آپس میں ایک دوسرے سے جوڑنا ملانا" ہے" اسی لئے مضبوط اور استوار بنیاد کو بنائے مرصوص کہا جاتا ہے حاصل یہ کہ حضور ﷺ نے ابن صیاد کو پکڑ کر اور اس کے اعضاء جسم کو ایک دوسرے سے ملا کر زور سے بھینچا اور نوویؒ نے یہ لکھا ہے کہ ہمارے علاقہ میں کتاب کے جو صحیح نسخے ہیں ان میں یہ لفظ فرفضہ، یعنی ف اور ض کے ساتھ ہے، جو رفض سے ہے اور جس کے معنی "چھوڑنے" کے ہیں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے اس کے سوال و جواب اور اس کی کٹ حجتی سے صرف نظر کر لیا۔

میں خدا پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا کا مطلب یہ تھا کہ میں یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور نبیوں پر ایمان لایا ہوں اور یہ بھی یقینی ہے کہ تو ان میں سے نہیں ہے) ہاں اگر بفرض محال تو بھی ان میں سے ہوتا تو میں تجھ پر بھی ایمان لاتا! لیکن یہ فرض کرنے والی بات اسی صورت میں جائز ہوگی جب یہ کہا جائے کہ حضور ﷺ نے یہ بات اپنے خاتم النبیین ہونے کے علم سے پہلے کہی تھی، اگر اس وقت آپ کا خاتم النبیین ہونا آپ ﷺ کے علم میں تھا تو یہ بفرض محال والی بات مراد نہیں لی جا سکتی اس مسئلہ کی نزاکت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص نبوت کا دعوی کرے اور کوئی اور شخص اس سے معجزہ کا مطالبہ کرنے کے باوجود اس کو اس لئے قتل نہیں کیا کہ اول تو وہ بہت چھوٹی عمر کا تھا اور چھوٹی عمر والوں کو قتل کرنا حضور ﷺ کے لئے ممنوع تھا، دوسرے یہ کہ یہودی ان دنوں ذمی تھے اور حضور ﷺ سے انہوں نے اس بات پر صلح کر رکھی تھی کہ ان کے حال پر رہنے دیا جائے گا، اور ظاہر ہے کہ ابن صیاد بھی یہودیوں ہی کا ایک فرد تھا ان کے خلیفوں میں سے تھا، اس لئے اس کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"کبھی تو میرے پاس سچی خبر آتی ہے اور کبھی جھوٹی خبر۔" کے بارے میں بعض شارحین نے کہا ہے کہ ابن صیاد سے حضور ﷺ کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ جو شخص تیرے پاس آتا ہے وہ تجھ سے کیا کہتا ہے اور اس کی کہی ہوئی باتیں تیرے لئے کیسی ثابت ہوئی ہیں؟ ابن صیاد نے مذکورہ جملہ کے ذریعہ اس سوال کا جو جواب دیا اس کا حاصل یہ تھا کہ ایک آنے والا مجھے کچھ باتیں بتاتا جاتا ہے، ان میں سے کوئی

بات سچی ہو جاتی ہے اور کوئی جھوٹی چنانچہ کاہنوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ شیطان ان پر جھوٹی سچی، ہر طرح کی خبریں القا کرتا ہے۔

"تیرا معاملہ سب گڈمڈ ہو گیا" مطلب یا تو یہ تھا کہ تیرے پاس چیزوں اور اطلاعات کا جو ذخیرہ ہے وہ سب بیکار اور لاحاصل ہے کیونکہ ان میں سے سچی باتیں بھی جھوٹ باتوں کے ساتھ مل کر کرنا قابل اعتبار ہو گئی ہیں یا یہ مطلب تھا کہ تیری حیثیت اور تیرے احوال کو نا قابل اعتماد بنا دیا گیا ہے کیونکہ تیرے پاس تو شیطان آتا ہے جو تجھے جھوٹی سچی خبریں سنا جاتا ہے اس بات کے ذریعہ گویا حضور ﷺ نے اس کے دعوئ رسالت کو جھوٹا قرار دیا کیونکہ کسی رسول کے پاس جھوٹی خبریں نہیں آیا کرتیں جب کہ اس نے خود اپنی زبان سے اس کا اقرار کیا، لہٰذا آپ ﷺ نے واضح کر دیا کہ تو صرف کاہن ہے اور کاہنوں کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔ تو رسول و نبی ہرگز نہیں ہو سکتا۔

"میں نے تیرے لئے دل میں ایک بات چھپائی ہے" یعنی تجھے اگر یہ دعوی ہے کہ تجھ پر خدائی راز تک منکشف ہو جاتے ہیں اور کوئی شخص آکر تجھے غیب کی باتیں بتا جاتا ہے تو ذرا یہ بتا کہ اس وقت میرے دل میں کیا ہے، میں نے تیرے تعلق سے ایک بات اپنے دل میں رکھی ہے؟ اس بات کے ذریعہ حضور ﷺ نے ابن صیاد کا امتحان لیا تا کہ صحابہ پر اس کی حقیقت واضح ہو جائے اور وہ جان لیں کہ یہ نرا کاہن ہے شیطان اس کے پاس آکر اس کو جھوٹی سچی باتیں سکھا جاتا ہے۔

"وہ پوشیدہ بات دخ ہے" د کے پیش اور زبر اور خ کی تشدید کے ساتھ دخ" کے معنی دھوئیں کے ہیں! ابن صیاد اس پوری آیت کو تو بتانے میں کامیاب نہیں ہو سکا جو آنحضرت ﷺ نے اپنے دل میں سوچ رکھی تھی، البتہ اس نے اس آیت کا ایک ناقص لفظ ضرور بتا دیا اس بات سے بھی اس کا کاہن ہونا ثابت ہو گیا کیونکہ کہانت میں یہی ہوتا ہے کہ شیطان کسی بات کا کوئی ایک ادھورا اور ناقص جز اڑا کر لے آتا ہے اور اس کو کاہنوں کے دل میں ڈال دیتا ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس وقت آہستہ سے صحابہؓ کو بتایا ہو کہ میں نے یہ آیت اپنے دل میں سوچی ہے اور شیطان نے بھی یہ بات سن لی ہو اور پھر اس نے ابن صیاد کو اس کا القا کر دیا ہو۔

"دور ہٹ تو اپنی اوقات سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکتا" "دور ہٹ" لفظ اخساء کا ترجمہ ہے جس کے ذریعہ اہانت و حقارت کا اظہار کیا جاتا ہے اور عام طور پر کتے اور سور کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے کہ کسی کتے اور سور کو ہانکنے اور لوگوں سے دور ہٹانے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ بہر حال جب ابن صیاد کی حقیقت واضح ہو گئی کہ اس کا حال وہی ہے جو کاہنوں کا ہوتا ہے کہ وہ شیطان کے القا کرنے کے سبب کچھ ادھوری باتیں معلوم کر لیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر اپنی غیب دانی کا دعوی کرنے لگتے ہیں تو حضور ﷺ نے اس سے فرمایا کہ جا بھاگ، تیری اوقات معلوم ہو گئی، تو بس کاہن ہی ہے اور کاہن ہی رہے گا اس سے آگے تو ہرگز نہیں بڑھ سکتا، اپنی حد میں رہنا اور آئندہ رسالت کا دعوی کرنے کی جرأت نہ کرنا کہ وہ میرا مقام ہے۔

"اس کو قتل کرنے میں تمہارے کوئی بھلائی نہیں ہے" کا مطلب یہ تھا کہ یہ چونکہ ذمی ہے اور ان یہودیوں میں سے ہے جو اہل ذمہ ہیں، علاوہ ازیں ایک نابالغ اور چھوٹی عمر کا بھی ہے اس لئے اس کو قتل کرنا کوئی فائدہ کی بات نہیں ہے چونکہ بعض قرائن ابن صیاد کے دجال ہونے پر دلالت کرتے تھے اس لئے آپ نے بطور شک یہ بات ارشاد فرمائی "کہ یہ اگر واقعی دجال ہے تو تم اس کو قتل کرنے پر قادر نہیں ہو سکو گے اور اگر یہ دجال نہیں ہے تو پھر اس کو قتل کرنے میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

اور یقیناً اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے" یعنی وہ دوسرے سے حاسہ بینائی ہی سے پاک و منزہ ہے چہ جائیکہ اس کی ذات میں کانے پن جیسا کوئی عیب ہو واضح رہے کہ حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ کسی نبی نے اپنی قوم کو یہ نہیں بتایا کہ دجال کانا ہے تو اس بارے میں یہ احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ کے علاوہ کسی اور نبی کو دجال کے احوال کا اتنا تفصیلی علم ہی نہیں تھا کہ دجال کانا ہو گا یا کیسا ہو گا؟ یا یہ کہ یہ علم تو ہر نبی کو ہو گا مگر کسی نے اپنی قوم کو یہ نہیں بتایا کہ دجال کانا ہو گا۔

ابن صیاد کاہن تھا

(۴) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ لَقِیَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرُ یَعْنِی ابْنَ صَیَّادٍ فِیْ بَعْضِ

طُرُقِ الْمَدِیْنَۃِ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتَشْھَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ فَقَالَ ھُوَ اَتَشْھَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ مَاذَا تَرٰی قَالَ اَرٰی عَرْشًا عَلَی الْمَآءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَرٰی عَرْشَ اِبْلِیْسَ عَلَی الْبَحْرِ قَالَ وَمَا تَرٰی قَالَ اَرٰی صَادِقَیْنِ وَکَاذِبًا اَوْکَاذِبَیْنِ وَصَادِقًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لُبِسَ عَلَیْہِ فَدَعُوْہُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروقؓ۔ ان سب کی ملاقات مدینہ کے ایک راستہ میں ابن صیاد سے ہوگئی، رسول کریم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ ابن صیاد نے جواب میں کہا کہ کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا۔ "میں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا (اس کے بعد آپ ﷺ نے پوچھا کہ اچھا یہ بتا) تو کیا چیز دیکھتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں ایک تخت کو پانی پر دیکھتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تو ابلیس کے تخت کو سمندر پر دیکھتا ہے! پھر فرمایا۔ "اس کے علاوہ اور کیا دیکھتا ہے؟ ابن صیاد نے کہا کہ دو سچوں کو دیکھتا ہوں (جو سچی خبریں لایا کرتے ہیں) اور ایک جھوٹے کو دیکھتا ہوں (جو جھوٹی خبریں لایا کرتا ہے) یا دو جھوٹوں کو دیکھتا ہوں اور ایک سچے کو اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے مخاطب ہو کر) فرمایا اس کے لئے صورت حال (یعنی کہانت) کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے، اس کو چھوڑ دو (یعنی یہ تو ٹھیک ٹھیک بات کرنے کے بھی قابل نہیں ہے کہ اس کا کوئی جواب دیا جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "تو ابلیس کے تخت کو سمندر پر دیکھتا ہے۔" کے ذریعہ حضور ﷺ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ ابلیس پانی کے اوپر اپنا تخت بچھا کر اس پر اپنا دربار قائم کرتا ہے اور وہیں سے اپنے چیلوں اور اپنے ساتھیوں کی ٹولیوں کو دنیا بھر میں فتنہ و فساد پھیلانے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے روانہ کرتا ہے اس کا ذکر کتاب کے شروع میں باب الوسوسہ میں گزر چکا ہے۔

یا دو جھوٹوں کو دیکھتا ہوں اور ایک سچے کو یہ یا تو راوی نے اپنا شک ظاہر کیا ہے کہ اس موقع پر روایت کے الفاظ اس طرح ہیں یا یہ کہ خود ابن صیاد ہی نے اس شک کے ساتھ بیان کیا ہو میں یا تو دو سچوں اور ایک جھوٹے کو دیکھتا ہوں یا دو جھوٹوں اور ایک سچے کو اور یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کا معاملہ جس طرح خلط و احتمالات میں گھرا ہوا تھا اور اس کے احوال جس طرح نظام و استقلال اور استقامت و یقین سے خالی تھے اس کا تقاضا ہی یہ تھا کہ اس کو کسی بھی صورت جزم و یقین حاصل نہ ہوا چنانچہ وہ کبھی اس طرح دیکھتا تھا اور کبھی اس طرح۔

جنت کے بارے میں آنحضرت سے ابن صیاد کا سوال

(۳) وَعَنْہُ اَنَّ ابْنَ صَیَّادٍ سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ تُرْبَۃِ الْجَنَّۃِ فَقَالَ دَرْمَکَۃٌ بَیْضَآءُ مِسْکٌ خَالِصٌ۔ (مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ابن صیاد نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ جنت کی مٹی کیسی ہے تو آپؐ نے فرمایا" وہ میدہ کی مانند سفید اور مشک خالص کی مانند خوشبودار ہے۔" (مسلمؒ)

دجال کے بارے میں ایک پیش گوئی

(۴) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ لَقِیَ ابْنُ عُمَرَ ابْنَ صَیَّادٍ فِیْ بَعْضِ طُرُقِ الْمَدِیْنَۃِ فَقَالَ لَہٗ قَوْلًا اَغْضَبَتْہُ فَانْتَفَخَ حَتّٰی مَلَأَ السِّکَّۃَ فَدَخَلَ ابْنُ عُمَرَ عَلٰی حَفْصَۃَ وَقَدْ بَلَغَھَا فَقَالَتْ لَہٗ رَحِمَکَ اللّٰہُ مَا اَرَدْتَّ مِنِ ابْنِ صَیَّادٍ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا یَخْرُجُ مِنْ غَضْبَۃٍ یَغْضَبُھَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نافع کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت ابن عمرؓ کی ملاقات مدینہ کے ایک راستہ میں ابن صیاد سے ہوگئی تو انہوں نے اس سے ایک ایسی بات کہدی جس سے وہ غضبناک ہوگیا اور جوش غضب سے اس کی رگیں پھول گئیں اس کے بعد جب ابن عمرؓ (اپنی بہن) اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ کے ہاں گئے، جن کو اس واقعہ کی خبر پہنچ چکی تھی، تو انہوں نے فرمایا۔ ابن عمرؓ! خدا تم پر اپنی رحمت نازل کرے، تم نے ابن صیاد سے کیا چاہا تھا (کہ اس کو اس قدر غضبناک کردیا) کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا۔ دجال کسی بات پر غضبناک ہو کر نکل پڑے گا۔" (مسلم)

تشریح: یعنی دجال کسی بات پر غصہ ہوگا اور وہ غصہ اس کو اتنا مشتعل کرے گا کہ وہ نکل پڑے گا اور یکدم نبوت یا خدائی کا دعوی کر بیٹھے گا پس اے ابن عمرؓ! تم ابن صیاد کو غضبناک و مشتعل نہ کرو اور اس سے کوئی بات نہ کرو تاکہ وہ خروج نہ کرے اور دنیا والے اس کی فتنہ پردازی سے محفوظ رہیں حضرت حفصہؓ نے ابن عمرؓ کو جو اس طرح منع کیا تو بظاہر اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے سوچا کہ شاید ابن صیاد ہی دجال ہو اور آنحضرت ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق کہیں ابن عمرؓ ہی اس کے خروج کا ظاہری سبب نہ بن جائیں، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت حفصہؓ اس کے دجال ہونے کا یقین ہی رکھتی ہوں۔

ابن صیاد کا دجال ہونے سے انکار

⑤ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ صَحِبْتُ ابْنَ صَیَّادٍ اِلٰی مَکَّةَ فَقَالَ لِیْ مَالَقِیْتُ مِنَ النَّاسِ یَزْعُمُوْنَ اَنِّی الدَّجَّالُ اَلَسْتَ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّہٗ لَا یُوْلَدُ لَہٗ وَقَدْ وُلِدَ لِیْ اَلَیْسَ قَدْ قَالَ ھُوَ کَافِرٌ وَّاَنَا مُسْلِمٌ اَوَلَیْسَ قَدْ قَالَ لَا یَدْخُلُ الْمَدِیْنَةَ وَلَا مَکَّةَ وَقَدْ اَقْبَلْتُ مِنَ الْمَدِیْنَةِ وَاَنَا اُرِیْدُ مَکَّةَ ثُمَّ قَالَ لِیْ فِیْ اٰخِرِ قَوْلِہٖ اَمَا وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَعْلَمُ مَوْلِدَہٗ وَمَکَانَہٗ وَاَیْنَ ھُوَ وَاَعْرِفُ اَبَاہُ وَاُمَّہٗ قَالَ فَلَبَّسَنِیْ قَالَ قُلْتُ لَہٗ تَبًّا لَّکَ سَائِرَ الْیَوْمِ قَالَ وَقِیْلَ لَہٗ اَیَسُرُّکَ اَنَّکَ ذَاکَ الرَّجُلُ قَالَ فَقَالَ لَوْ عُرِضَ عَلَیَّ مَا کَرِھْتُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میرا اور ابن صیاد کا مکہ کے سفر میں ساتھ ہوگیا، اس نے مجھ سے اپنی اس تکلیف کا حال بیان کیا جو لوگوں سے اس کو پہنچی تھی، وہ کہنے لگا کہ لوگ مجھ کو دجال سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں، (اور تم جانتے ہو کہ یہ بات خلاف حقیقت ہے) ابوسعیدؓ! کیا تم نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا کہ دجال کے اولاد نہیں ہوگی، جب کہ میرے اولاد ہے، کیا آنحضرت ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ دجال کافر ہوگا، جب کہ میں مسلمان ہوں، کیا یہ آپ کا ارشاد نہیں ہے کہ دجال مدینہ اور مکہ میں داخل نہیں ہوسکے گا، جب کہ میں مدینہ سے آرہا ہوں اور مکہ میں جارہا ہوں۔ ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ ابن صیاد نے آخری بات مجھ سے یہ کہی کہ یاد رکھو! خدا کی قسم میں دجال کی پیدائش کا وقت جانتا ہوں اور اس کا مکان جانتا ہوں (کہ وہ کہاں پیدا ہوگا اور یہ بھی جانتا ہوں وہ (اس وقت) کہاں ہے اور اس کے ماں باپ کو بھی جانتا ہوں ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ میں ابن صیاد کی یہ باتیں سن کر) شبہ میں پڑگیا میں نے کہا، تو ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ اس وقت موجود لوگوں میں سے) کسی نے ابن صیاد سے کہا کہ کیا تجھ کو یہ اچھا معلوم ہوگا کہ تو خود ہی دجال ہو ابن سعید کہتے ہیں کہ اس نے (یہ سن کر) جواب دیا کہ ہاں، اگر لوگوں کو گمراہ کرنے، فریب میں ڈالنے اور شعبدہ بازی وغیرہ کی وہ تمام چیزیں مجھے دیدی جائیں جو دجال میں ہیں تو میں برا نہ سمجھوں۔" (مسلم)

تشریح: "میں شبہ میں پڑگیا" کے ذریعہ ابوسعیدؓ نے گویا یہ بیان کیا کہ پہلے تو میں یہ یقین رکھتا تھا کہ ابن صیاد وہی دجال ہے لیکن اب اس نے جو اپنے دجال ہونے سے انکار کیا تو میں شک و شبہ میں پڑگیا کہ اس کو دجال سمجھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ اس نے پہلے تو دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ میں خود دجال نہیں ہوں لیکن اس نے آخر میں جو یہ کہا کہ میں دجال کا مولد و مسکن وغیرہ جانتا ہوں تو کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے یہ بات بطور تعرض کہی ہو اور ان آخری الفاظ سے مراد خود اس کی اپنی ذات ہو "تو میں برا نہ سمجھوں" کے ذریعہ ابن

صیاد نے گویا یہ اقرار کیا کہ ایسی صورت میں دجال بننا میں قبول کرلوں گا اور راضی ہو جاؤں گا پس یہ بات اس کے کفر کی واضح دلیل ہے۔

ابن صیاد کا ذکر

⑥ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَقِيْتُهُ وَقَدْ نَفَرَتْ عَيْنُهُ فَقُلْتُ مَتٰى فَعَلَتْ عَيْنُكَ مَآ اَرٰى قَالَ لَآ اَدْرِيْ قُلْتُ لَا تَدْرِيْ وَهِيَ فِيْ رَاْسِكَ قَالَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ خَلَقَهَا فِيْ عَصَاكَ قَالَ فَنَخَرَ كَاَشَدِّ نَخِيْرِ حِمَارٍ سَمِعْتُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن سر راہ) میری ملاقات ابن صیاد سے ہوگئی، اس وقت اس کی آنکھ سوجی ہوئی (ورم آلود تھی، میں نے پوچھا کہ تیری اس آنکھ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں (یعنی ورم) یہ کب سے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا کب سے ہے میں نے کہا "تجھ کو نہیں معلوم، حالانکہ آنکھ تیرے سر میں ہے" اس نے کہا کہ اگر خدا چاہے تو آنکھ کو تمہارے عصا میں پیدا کردے ابن عمر کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) ابن صیاد نے اپنی ناک سے گدھے کی اتنی سخت آواز کی مانند کہ جو میں نے سنی ہے) ایک آواز نکالی۔" (مسلم)

تشریح: "آنکھ کو تمہارے عصا میں پیدا کردے" اس جملہ سے ابن صیاد کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ جمادات (یعنی بے حس و حرکت اشیاء جیسے پتھر اور لکڑی وغیرہ) میں سے کسی چیز میں آنکھ لگادے اور پھر اس آنکھ میں درد پیدا ہو جائے تو اس چیز کو نہ آنکھ کا احساس ہوگا اور نہ آنکھ کے اس درد کا، تو اسی طرح یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایسے انسان کی آنکھ میں تکلیف کی کوئی علامت پیدا ہو جائے جو ہر وقت ذہنی (جسمانی طور پر مشغول و مستغرق رہتا ہو تو اس کو کثرت اشتغال اور ہجوم افکار کی وجہ سے اس درد و تکلیف کا احساس نہ ہوگا!۔

ابن صیاد، دجال ہے

⑦ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ رَاَيْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يَحْلِفُ بِاللّٰهِ اَنَّ ابْنَ صَيَّادِ الدَّجَّالُ قُلْتُ تَحْلِفُ بِاللّٰهِ قَالَ اِنِّيْ سَمِعْتُ عُمَرَ يَحْلِفُ عَلٰى ذٰلِكَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُنْكِرْهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت محمد ابن منکدر تابعیؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر ابن عبداللہؓ کو دیکھا وہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ ابن صیاد دجال ہے، میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اللہ کی قسم کھا رہے ہیں! (حالانکہ ابن صیاد کا دجال ہونا صرف ظنی ہے نہ کہ یقینی) انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت عمر فاروق کو سنا، وہ اس بات پر نبی کریم ﷺ کے سامنے قسم کھاتے تھے کہ ابن صیاد دجال ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے انکار نہیں فرمایا (اگر یہ بات یقینی نہ ہوتی تو یقیناً آنحضرت ﷺ حضرت عمرؓ کی اس بات کا انکار کرتے۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: ہوسکتا ہے کہ حضرت جابرؓ اور حضرت عمرؓ کا قسم کھانا اس بات پر ہو کہ ابن صیاد، ان دجالوں (یعنی جھوٹوں اور غریبوں میں سے ایک ہے جو وقتاً فوقتاً اس اُمت میں پیدا ہوتے رہیں گے اور اپنی نبوت کا دعویٰ کرکے لوگوں کو گمراہ کریں گے اور شکوک و شبہات میں مبتلا کریں گے گویا ان دونوں کی قسم کا تعلق اس بات سے نہیں تھا کہ ابن صیاد واقعۃً دجال ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ابن صیاد کے معاملہ کو مبہم رکھ کر گویا اس بات کی تردید فرمادی تھی کہ وہ یقینی طور پر دجال ہے! لیکن روایت کے الفاظ میں مطلق دجال کا ذکر ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک دجال معہود ہی مراد تھا، اس صورت میں ان دونوں کی قسم کو غلبہ ظن کے وقت قسم کھالینے کے جواز پر محمول کیا جائے گا، نیز آگے دوسری فصل میں حضرت ابن عمرؓ کی جو روایت آرہی ہے اس میں انہوں نے صراحۃً بیان کیا ہے کہ ابن صیاد، دجال معہود تھا، پس ہوسکتا ہے کہ ابن عمرؓ کا مسلک بھی یہی رہا ہو بہر حال یہ بات پہلے ہی بیان کی جاچکی ہے کہ ابن صیاد کے سلسلہ میں صحابہؓ کے درمیان اختلاف و اشتباہ تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ابن عمرؓ کے نزدیک ابن صیاد، مسیح دجال تھا

⑧ عَنْ نَافِعٍ قَالَ کَانَ ابْنُ عُمَرَ یَقُوْلُ وَاللّٰہِ مَا اَشُکُّ اَنَّ الْمَسِیْحَ الدَّجَّالَ ابْنُ صَیَّادٍ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ کِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ خدا کی قسم مجھ کو اس میں کوئی شک نہیں کہ مسیح دجال، ابن صیاد ہی ہے اس روایت کو ابوداؤد نے اور بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔"

ابن صیاد واقعہ حرہ کے دن غائب ہو گیا تھا

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ فَقَدْنَا ابْنَ صَیَّادٍ یَوْمَ الْحَرَّۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے واقعہ حرہ کے دن ابن صیاد کو غائب پایا تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: اگر الفاظ حدیث کے ظاہری معنی مراد ہوں تو مطلب یہ ہو گا کہ ابن صیاد حرہ کے واقعہ میں غائب ہو گیا تھا اور ایسا غائب ہوا کہ پھر کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں گیا اور اس کا کیا حشر ہوا اس صورت میں یہ روایت اس روایت کے منافی و متضاد ہو گی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ میں اس کا انتقال ہوا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی! اور اگر اس حدیث میں "غائب" سے مراد اس کا عام مفہوم ہو کہ جس میں "موت بھی شامل ہے تو پھر ان دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں رہے گا اس صورت میں حاصل یہ ہو گا کہ "غائب" ہو جانے سے مراد اس کا مر جانا ہے یعنی وہ واقعہ حرہ کے دن مدینہ میں مر گیا تھا۔

"واقعہ حرہ کے دن" سے مراد وہ دن ہے جب ابن معاویہؓ کی فوج نے اہل مدینہ پر یلغار کر دی تھی اور نہایت خونریز جنگ اور جان ومال کی زبردست تباہی مچا کر ان کو مغلوب کر لیا تھا۔

ابن صیاد اور دجال

⑩ وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَمْکُثُ اَبَوَا الدَّجَّالِ ثَلٰثِیْنَ عَامًا لَا یُوْلَدُ لَھُمَا وَلَدٌ ثُمَّ یُوْلَدُ لَھُمَا غُلَامٌ اَعْوَرُ اَضْرَسُ وَاَقَلُّہٗ مَنْفَعَۃً تَنَامُ عَیْنَاہُ وَلَا یَنَامُ قَلْبُہٗ ثُمَّ نَعَتَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَبَوَیْہِ فَقَالَ اَبُوْہُ طِوَالٌ ضَرْبُ اللَّحْمِ کَاَنَّ اَنْفَہٗ مِنْقَارٌ وَاُمُّہٗ اِمْرَاَۃٌ فِرْضَاخِیَّۃٌ طَوِیْلَۃُ الْیَدَیْنِ فَقَالَ اَبُوْبَکْرَۃَ فَسَمِعْنَا بِمَوْلُوْدٍ فِی الْیَھُوْدِ بِالْمَدِیْنَۃِ فَذَھَبْتُ اَنَا وَالزُّبَیْرُ بْنُ الْعَوَّامِ حَتّٰی دَخَلْنَا عَلٰی اَبَوَیْہِ فَاِذَا نَعْتُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْھِمَا فَقُلْنَا ھَلْ لَکُمَا وَلَدٌ فَقَالَا مَکَثْنَا ثَلٰثِیْنَ عَامًا لَا یُوْلَدُ لَنَا وَلَدٌ ثُمَّ وُلِدَ لَنَا غُلَامٌ اَعْوَرُ اَضْرَسُ وَاَقَلُّہٗ مَنْفَعَۃً تَنَامُ عَیْنَاہُ وَلَا یَنَامُ قَلْبُہٗ قَالَ فَخَرَجْنَا مِنْ عِنْدِھِمَا فَاِذَا ھُوَ مُنْجَدِلٌ فِی الشَّمْسِ فِیْ قَطِیْفَۃٍ وَّلَہٗ ھَمْھَمَۃٌ فَکَشَفَ عَنْ رَّاْسِہٖ فَقَالَ مَاقُلْتُمَا قُلْنَا وَھَلْ سَمِعْتَ مَا قُلْنَا قَالَ نَعَمْ تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا "دجال کے والدین تیس سال اس حالت میں گزاریں گے کہ ان کے کوئی لڑکا نہیں ہو گا، پھر ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہو گا جو بڑے دانتوں والا یعنی کچلیوں والا ہو گا۔ (بعض حضرات نے کہا ہے کہ "اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دانتوں سمیت پیدا ہو گا۔ وہ بہت کم فائدہ پہنچانے والا ہو گا (یعنی جس طرح اور لڑکے گھر کے کام کاج میں فائدہ پہنچاتے ہیں وہ کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا) اس کی دونوں آنکھیں سوئیں گی لیکن اس کا دل نہیں سوئے گا۔ اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے

ہمارے سامنے اس کے ماں باپ کا حال بیان کیا اور فرمایا۔ "اس کا باپ غیر معمولی لمبا اور کم گوشت والا یعنی دبلا ہوگا اس کی ناک مرغ جیسے جانور کی) چونچ کی طرح (لمبی اور پتلی) ہوگی اور اس کی ماں موٹی چوڑی اور لمبے ہاتھ والی ایک عورت ہوگی۔" ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے مدینہ کے یہودیوں میں ایک (عجیب و غریب) لڑکے کی موجودگی کے بارے میں سنا تو میں اور زبیر بن العوامؓ (اس کو دیکھنے چلے گئے) جب ہم اس لڑکے کے والدین کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل اسی طرح کے ہیں جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے ہم سے ان (والدین) کے بارے میں بیان کیا تھا، ہم نے ان دونوں سے پوچھا کہ کیا تمہارے کوئی لڑکا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہم نے تیس سال اس حالت میں گزارے کہ ہمارے کوئی لڑکا نہیں تھا، پھر ہمارے ہاں ایک کانا لڑکا پیدا ہوا جو بڑے دانتوں والا اور بہت کم فائدہ پہنچانے والا ہے، اس کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن اس کا دل نہیں سوتا۔ ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ ہم دونوں (ان کی یہ بات سن کر) وہاں سے چل دیئے اور پھر اچانک ہماری نظر اس لڑکے (یعنی ابن صیاد) پر پڑی جو دھوپ میں چادر اوڑھے پڑا تھا اور اس (کی چادر) میں سے گنگناہٹ کی سی ایک ایسی آواز آرہی تھی جو سمجھ میں نہیں آتی تھی (ہم نے وہاں کھڑے ہوکر آپس میں اس کے متعلق کوئی بات کہی ہوگی یا کچھ اور کہا ہوگا) اس نے سر سے چادر ہٹا کر ہم سے پوچھا کہ تم نے کیا کہا ہے؟ ہم نے (حیرت سے کہا) کہ (ہم تو سمجھے کہ تو سورہا ہے) کیا تو نے ہماری بات سن لی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں! میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: لیکن اس کا دل نہیں سوئے گا۔" کا مطلب یہ ہے کہ وساوس واوہام کی کثرت اور افکار فاسدہ کے مسلسل آتے رہنے کی وجہ سے سوتے وقت بھی وہ افکار فاسدہ اس سے منقطع نہیں ہوں گے بایں طور کہ شیطان اس کو القا کرتا رہے گا جیسا کہ افکار صالحہ کی کثرت اور وحی والہامات کے مسلسل آتے رہنے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کا دل مبارک، نیند کی حالت میں بھی نہیں سوتا تھا۔

کیا آنحضرت ﷺ بھی ابن صیاد کو دجال سمجھتے تھے؟

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ امْرَأَةً مِنَ الْيَهُوْدِ بِالْمَدِيْنَةِ وَلَدَتْ غُلَامًا مَمْسُوْحَةً عَيْنُهُ طَالِعَةً نَابُهُ فَاَشْفَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّكُوْنَ الدَّجَّالُ فَوَجَدَهُ تَحْتَ قَطِيْفَةٍ يُهَمْهِمُ فَاٰذَنَتْهُ اُمُّهُ فَقَالَتْ يَا عَبْدَاللّٰهِ هٰذَا اَبُو الْقَاسِمِ فَخَرَجَ مِنَ الْقَطِيْفَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالَهَا قَاتَلَهَا اللّٰهُ لَوْ تَرَكَتْهُ لَبَيَّنَ فَذَكَرَ مِثْلَ مَعْنٰى حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ ائْذَنْ لِّيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَقْتُلَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ يَّكُنْ هُوَ فَلَسْتَ صَاحِبَهُ اِنَّمَا صَاحِبُهُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَاِلَّمْ يَكُنْ هُوَ فَلَيْسَ لَكَ اَنْ تَقْتُلَ رَجُلًا مِّنْ اَهْلِ الْعَهْدِ فَلَمْ يَزَلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُشْفِقًا اَنَّهُ هُوَ الدَّجَّالُ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ مدینہ کی ایک یہودی عورت کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کی آنکھ (یعنی داہنی آنکھ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ بائیں آنکھ) مٹی ہوئی اور ہموار تھی، اور اس کی کچلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں رسول کریم ﷺ (کو جب اس طرح کے لڑکے کے بارے میں معلوم ہوا تو آپ ﷺ) ڈرے کہ کہیں یہ دجال نہ ہو (اور اُمت کے لوگوں کو فتنہ وفساد میں مبتلا کرے) پس (ایک دن آنحضرت ﷺ اس کو دیکھنے اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے تشریف لے گئے تو) آپ ﷺ نے اس کو ایک چادر کے نیچے لیٹا ہوا پایا، اس وقت وہ آہستہ آہستہ کچھ بول رہا تھا جس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تھا اس کی ماں نے کہا، عبداللہ یعنی ابن صیاد (دیکھو) یہ ابوالقاسم (محمد ﷺ) کھڑے ہوئے ہیں (ہوشیار ہو جاؤ اور ان سے بات کرو) وہ (یہ سنتے ہی) چادر سے باہر نکل آیا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس عورت کو کیا ہوا، خدا اس کو ہلاک کرے (کہ اس نے لڑکے کو میری آمد سے، خبردار اور ہوشیار کر دیا) اگر وہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی (اور میری آمد سے آگاہ نہ کرتی) تو یقیناً وہ اپنا حال ظاہر کر دیتا۔" اس کے بعد حضرت جابرؓ یا راوی نے حضرت عمرؓ کی (اس) حدیث کے مطابق بیان کیا (جو باب کے شروع میں نقل کی جا چکی ہے چنانچہ حضرت عمرؓ ابن خطاب نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ ﷺ اجازت

دیں تو میں اس کو قتل کر ڈالوں حضور ﷺ نے فرمایا۔ "اگر یہ (ابن صیاد) وہی دجال ہے تو اس کے قاتل تم نہیں ہو سکتے بلکہ اس کے قاتل عیسی ابن مریم ہوں گے (کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ کسی اور شخص کو اس کے قتل کی طاقت وقدرت ہی نہیں دی گئی ہے اور اگر یہ وہ دجال نہیں ہے تو تمہیں ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں جو اہل ذمہ میں سے ہے (یعنی ان غیر مسلموں میں سے ہے جن کے جان ومال کی حفاظت ہمارے ذمہ ہو چکی ہے اور جن کو "ذمی" کہا جاتا ہے) اس کے بعد رسول کریم ﷺ (اپنی اُمت کے تعلق سے برابر یہ خوف رکھتے تھے کہ ابن صیاد کہیں دجال نہ ہو" (اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: حدیث میں ابن صیاد کے تعلق سے جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس وقت کا ہے جب کہ وہ مسلمان نہیں ہوا تھا، اور عام طور پر لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کے خدشات رکھتے تھے اسی لئے حضرت عمرؓ نے اس کو قتل کر دینے کی اجازت چاہی تھی اگرچہ وہ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، مگر اسلام لانے کے بعد وہ اپنے فاسد خیالات سے پھرا نہیں تھا جیسا کہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں گزرا کہ اس نے مکہ کے سفر کے دوران یہ اقرار کیا تھا کہ اگر مجھے دجال بنا دیا جائے تو میں خوش ہوں گا اور ظاہر ہے کہ یہ کفر ہے اور اس کی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس درجہ کا مسلمان ہو گا۔

بعض محققین نے کہا ہے کہ ابن صیاد کے بارے میں جو احادیث وروایت منقول ہیں گو ان کے درمیان اختلاف وتضاد ہے اور اس کے متعلق علماء کا کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہے، لیکن اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے تعلق سے جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ ابن صیاد کے دجال ہونے کے خوف میں مبتلا رہتے، اس کی یہ توجیہ وتاویل ضروری ہے کہ جب تک آپ ﷺ کو مسیح دجال کے بارے میں پورے حقائق کا علم نہیں ہوا تھا، آپ ابن صیاد کو دجال سمجھتے تھے، لیکن جب تمیم داریؓ کے واقعہ سے اور وحی کے ذریعہ بھی آپ ﷺ کو یہ یقین حاصل ہو گیا کہ دجال کون ہو گا تو آپ ﷺ پر یہ بات واضح ہو گئی ابن صیاد وہ ذات یعنی دجال نہیں ہے جو سمجھا جاتا تھا اس کی تائید حضرت ابوسعید خدری کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں مکہ کے سفر کے دوران ابن صیاد اور ان کی ملاقات وگفتگو کا ذکر ہے رہی یہ بات کہ آنحضرت نے دجال کے والدین کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ ابن صیاد کے والدین پر صادق آیا تو اس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ ابن صیاد ہی دجال تھا کیونکہ دو الگ الگ اشخاص میں پائے جانے والے اوصاف وخصوصیات کا باہم مطابق ویکساں، ہو جانا ان دونوں شخصیتوں کے ایک ہونے کو لازم نہیں کرتا ایسے ہی حضرت عمرؓ وغیرہ کا قسم کھانا کہ ابن صیاد ہی دجال ہے اس پر آنحضرت ﷺ کی طرف سے کسی ممانعت کا نہ ہونا اس وقت کی بات ہے جب کہ دجال کے احوال تفصیل کے ساتھ علم میں نہیں آئے تھے، اور چونکہ دجال میں بعض باتیں ایسی ہوں گی جو خوف کا سبب بن سکتی ہیں اس لئے حضور ﷺ اس وقت اپنی اُمت کے بارے میں احتیاطاً ڈرتے تھے کہ کہیں ابن صیاد دجال نہ ہو اور میری اُمت کے لوگوں کو فتنہ وفساد میں نہ مبتلا کرے۔

بَابُ نُزُوْلِ عِیْسٰی عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ

حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والتسلیم کے نازل ہونے کا بیان

"حضرت عیسی علیہ السلام کے نازل ہونے" سے مراد ان کا آسمان سے زمین پر اترنا ہے، چنانچہ یہ بات صحیح احادیث کے ذریعہ باتحقیق ثابت ہے کہ قیامت کے قریب حضرت عیسی علیہ السلام آسمان سے اتر کر دنیا میں تشریف لائیں گے، محمد رسول اللہ ﷺ کے دین کا اتباع کریں گے اور اپنے تمام احکام وفرامین شریعت محمدی کے مطابق جاری ونافذ کریں گے جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام بعض ایسے احکام بھی جاری کریں گے جو شریعت محمدی میں نہیں ہوں گے جیسے جزیہ کو اٹھا دینا وغیرہ تو وہ بیان مدت کے قبیل سے ہے جیسا کہ نسخ کا مسئلہ ہے اور اس اعتبار سے اس زمانہ میں وہ احکام بھی شریعت محمدی ﷺ ہی کا ایک جزء ہوں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول کا ذکر

① عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَيُوْشِكَنَّ اَنْ يَّنْزِلَ فِيْكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيَفِيْضُ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهٗ اَحَدٌ حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْهُرَيْرَةَ فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ الْاٰيَةَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یقیناً عیسی ابن مریم (آسمان سے تمہارے درمیان اتریں گے جو ایک عادل حاکم ہوں گے، وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، سور کو مار ڈالیں گے (یعنی اس کو پالنا اور کھانا مطلق حرام و ممنوع اور اس کو مار ڈالنا مباح کر دیں گے) جزیہ کو اٹھا دیں گے (ان کے زمانہ میں) مال و دولت کی فراوانی ہوگی یہاں تک کہ کوئی اس کا خواہشمند نہ رہے گا۔ اور اس وقت ایک سجدہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہوگا" (اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد) حضرت ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ اگر تم اس بات میں کوئی شک وہ شبہ رکھتے ہو اور دلیل حاصل کرنا) چاہتے ہو تو یہ آیت پڑھو "وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ۔ یعنی کوئی اہل کتاب (خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی) ایسا باقی نہیں رہے گا جو عیسی علیہ السلام پر اس کی وفات سے پہلے ایمان نہ لے آئے گا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "صلیب" اصل میں دو مثلث لکڑیوں کا نام ہے جو جمع کی شکل میں ہوتی ہیں اور یہ شکل ایسا ظاہر کرتی ہے جیسے کسی شخص کو سولی پر لٹکا رکھا ہو۔ عیسائیوں کا عقیدہ چونکہ یہ ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا اور پھر خدا نے ان کو زندہ کر کے اپنے پاس آسمان پر بلا لیا اس لئے انہوں نے سولی کی اس شکل کو اپنا مذہبی نشان بنا لیا ہے اور یہ مذہبی نشان ان کی ہر چیز میں نمایاں رہتا ہے اور جس طرح اہل ہنود اپنے گلے میں زنار ڈالتے ہیں اسی طرح عیسائی بھی سولی کا یہ نشان اپنے گلے میں لٹکاتے ہیں، بعض تو اس نشان پر حضرت عیسی علیہ السلام کی تصویر تک بنوا لیتے ہیں تاکہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسی علیہ السلام کو سولی پر چڑھائے جانے کی یادگار مکمل صورت میں رہے لہٰذا "وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے" سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام، نصرانیت (یعنی عیسائی مذہب) کو باطل اور کالعدم قرار دیں گے اور شریعت محمدی ہی کو جاری و نافذ قرار دیں گے کہ ان کا ہر حکم و فیصلہ ملت حنفیہ کے مطابق ہوگا۔

جزیہ کو اٹھا دیں گے کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت اور اس کے شرعی دستور کی جو ایک شق یہ ہے کہ اس کی حدود مملکت میں اگر کوئی غیر مسلم رہنا چاہے تو وہ ایک مخصوص ٹیکس، جس کو جزیہ کہتے ہیں، ادا کر کے جان و مال کی حفاظت کے ساتھ رہ سکتا ہے، اور اس کو "ذمی" کہا جاتا ہے تو حضرت عیسی علیہ السلام جزیہ کی یہ شق ختم کر دیں گے اور یہ قانون نافذ کریں گے کہ ان کی مملکت اسلامی کا شہری صرف مسلمان ہو سکتا ہے، چنانچہ وہ حکم دیں گے کہ جتنے ذمی ہیں وہ سب مسلمان ہو جائیں، ان کی حکومت کسی سے بھی دین حق کے علاوہ اور کوئی چیز قبول نہیں کرے گی اور چونکہ اس وقت حضرت عیسی علیہ السلام کی برکت سے ہر شخص کا ذہن و فکر خیر کی طرف مائل ہوگا اس لئے تمام غیر مسلم ایمان لے آئیں گے پس اس جملہ کا حاصل بھی یہی ہے کہ وہ عیسائیت اور اس کے احکام و آثار کو بالکل مٹا دیں گے اور صرف اسلامی شریعت کو جاری و نافذ قرار دیں گے! اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام ذمیوں سے جزیہ اس لئے اٹھائیں گے کہ ان کے زمانہ میں مال و دولت کی فراوانی اور اہل حرص کی کمی کی وجہ سے ایسا کوئی محتاج و ضرورتمند نہیں رہے گا جو ان سے جزیہ کا مال لینے والا ہو، اس کی تائید آگے کی عبارت (ان کے زمانہ میں) مال و دولت کی فراوانی ہوگی الخ سے بھی ہوتی ہے۔

حتّٰی لا یقبلہ احد حتّٰی تکون السجدۃ الخ میں پہلا حتّٰی تو یفیض المال سے متعلق ہے اور دوسرا "حتّٰی" ان تمام مضامین سے متعلق ہے جو پہلے مذکور ہوئے ہیں یعنی صلیب توڑ ڈالنا وغیرہ! پس مطلب یہ ہے کہ دین اسلام اس طرح پھیل جائے گا اور اطاعت وعبادت کے ذریعہ آپس میں میل و محبت اس طرح پیدا ہو جائے گی کہ ایک سجدہ دنیا کی تمام متاع سے بہتر اور قیمتی سمجھا جائے گا! یوں تو ہر زمانہ میں اور ہر وقت ایک سجدہ، دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہوتا ہے، یہ صرف حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ کی خصوصیت نہیں ہے، لیکن یہ بات صرف اسی لئے کہی گئی ہے کہ اس زمانہ میں عبادت واطاعت دراصل انسان کی طبیعت کا جزاور نفس کا تقاضا بن جائے گی اور لوگ طبعی طور پر بھی ایک سجدہ کو دنیا کی تمام متاع سے زیادہ پسندیدہ اور بہت سمجھنے لگیں گے! تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ دوسرا "حتّٰی" بھی "یفیض" سے متعلق ہو، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس وقت مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہوگی اور ہر شخص اس طرح مستغنی وبے نیاز ہو جائے گا کہ کسی کو اس (مال و دولت) کی کوئی رغبت وخواہش ہی نہیں رہے گی، اور جب یہ صورت حال ہوگی تو مال کو خرچ کرنے کی فضیلت وپسندیدگی بھی جاتی رہے گی اور اصل ذوق ولگاؤ نماز سے باقی رہے گا کہ لوگ ایک سجدہ میں جو کیف و بھلائی محسوس کریں گے وہ دنیا کی کسی بھی چیز میں نہیں پائیں گے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے جس آیت کریمہ کا ذکر کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نازل ہونے کے بعد جب ایک ہی ملت اور ایک ہی دین کا دور دورہ ہو جائے گا اور تمام لوگوں کے درمیان سے دینی و مذہبی اختلاف و منافرت کا خاتمہ ہو جائے گا تو یہود و نصاری کا وہ اختلاف ونفرت بھی کالعدم ہو جائے گا جو وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے تئیں رکھتے ہیں۔ اور وہ (یہود و نصاری) بھی اس ایمان وعقیدے کے حامل ہو جائیں گے جو مسلمانوں کا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی ایک بندی مریم کے بیٹے ہیں واضح رہے کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاری سے مراد وہ یہود و نصاری ہیں جو ان کے زمانہ میں ہوں گے! اس آیت کی ایک تفسیر تو یہ ہے جو بیان کی گئی اور حضرت ابوہریرہؓ نے اسی اعتبار سے اس آیت کو حدیث کے مضمون کی دلیل قرار دیا ہے، دوسری جو تفسیر بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے ایسا کوئی شخص نہیں جو اپنے مرنے سے پہلے (نزع کی حالت میں) ایمان نہ لاتا ہو، لیکن اس وقت اس کا ایمان لانا کوئی اعتبار نہیں رکھتا اس تفسیر کی روشنی میں ایک احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ میں بِہٖ کی ضمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا اللہ سبحانہ تعالٰی کی طرف راجع ہو اگر آیت کی یہی تفسیر مراد لی جائے تو پھر حاصل یہ نکلے گا کہ ہر کافر مرنے سے پہلے (نزع کی حالت) اضطراری طور پر ایمان لاتا ہے لیکن اس وقت کا ایمان چونکہ کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا اس لئے چاہئے کہ وہ (کافر اس وقت سے پہلے ہی بقصد و اختیار ایمان قبول کرنے پر آمادہ ہو۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ کی برکتیں

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَنْزِلَنَّ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَادِلًا فَلَيَكْسِرَنَّ الصَّلِيْبَ وَلَيَقْتُلَنَّ الْخِنْزِيْرَ وَلَيَضَعَنَّ الْجِزْيَةَ وَلَيَتْرُكَنَّ الْقِلَاصَ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا وَلَتَذْهَبَنَّ الشَّحْنَآءُ وَالتَّبَاغُضُ وَالتَّحَاسُدُ وَلَيَدْعُوَنَّ اِلَى الْمَالِ فَلَا يَقْبَلُهٗ اَحَدٌ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِىْ رِوَايَةٍ لَّهُمَا قَالَ كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ وَاِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بخدا، حضرت عیسٰی ابن مریم (علیہ السلام) اس حالت میں نازل ہونگے کہ وہ ایک عادل حاکم ہونگے، صلیب کو توڑ دیں گے، سور کو مار ڈالیں گے، ذمیوں سے جزیہ کو اٹھا دیں گے، اور جوان اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا کہ ان سے سواری اور بار برداری کا کام نہیں لیا جائے گا اور یقیناً لوگوں کے دلوں سے کینہ، بغض اور حسد جاتا رہے گا (کیونکہ یہ سب برائیاں دنیا کی محبت ولالچ سے پیدا ہوتی ہیں، جب دنیا اور دنیا کی چیزوں کی طرف کوئی رغبت ہی نہیں رہ جائے گی تو یہ برائیاں کہاں سے پیدا ہونگی) اور یقیناً حضرت عیسٰی علیہ السلام لوگوں کو مال و دولت سے نوازنے کے لئے بلائیں گے لیکن (استغنا و بے نیازی کی وجہ سے

کوئی بھی مال و دولت لینے والا نہیں ہو گا۔" (مسلم) اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا (یعنی تم کتنا سکون وکیف محسوس کرو گے) جب عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم تمہارے درمیان اتریں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے (یعنی اہل قریش میں سے یا تمہاری ملت کا کوئی بھی فرد) ہو گا۔"

تشریح: "جوان اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت سواری اور بار برداری کے لئے ایسے آرام دہ اور تیز رفتار ذرائع مہیا ہوں گے اور ان کی اتنی کثرت ہوگی کہ نقل و حمل کے مقاصد کے لئے کسی کو اونٹنیوں جیسے جانوروں کی ضرورت نہیں ہوگی یا اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی کو یہ حکم نہیں دیں گے کہ وہ زکوٰۃ میں دینے کے لئے اپنی اونٹنیوں کو ان کے پاس لانے کی زحمت برداشت کرے کیونکہ اس زمانہ میں زکوٰۃ کا مال قبول کرنے والا کوئی نہیں ہو گا! اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ جملہ دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگ اپنی معاش و ضروریات سے اس قدر مستغنی و بے نیاز ہوں گے کہ اشیاء ضرورت اور مال و اسباب حاصل کرنے کے لئے تجارت اور زمین پر سفر وغیرہ کا سلسلہ تقریباً موقوف ہو جائے گا۔

"اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا الخ" کا مطلب علماء نے دو صورتوں میں بیان کیا ہے، ایک تو یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے بعد بھی تمہاری نماز کا امام تم ہی میں سے ایک فرد ہو گا اور وہ امام مہدیؓ ہیں اور خود عیسیٰ علیہ السلام ان کی اقتداء کریں گے۔ اور یہ بات اس اُمت محمدی کی تعظیم و تکریم کے پیش نظر ہوگی جیسا کہ آگے والی حدیث میں اسکی تصریح بھی ہے! لہٰذا اس زمانہ میں حاکم و خلیفہ اور خیر و بھلائی کی تعلیم و تلقین کرنے کے ذمہ دار تو حضرت عیسیٰ ہی ہوں گے لیکن نماز کی امامت کا شرف حضرت امام مہدیؓ کو حاصل رہے گا! لیکن بعض روایتوں میں یہ منقول ہے کہ جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے، حضرت امام مہدیؓ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی حالت میں ہوں گے اور چاہیں گے کہ امامت کے مصلے سے پیچھے ہٹ جائیں تاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امامت کریں، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت کی نماز کی امامت نہیں کریں گے بلکہ خود حضرت امام مہدی ہی کے پیچھے نماز پڑھیں گے، البتہ اس وقت کی نماز کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی امامت کیا کریں گے کیونکہ وہ بہر حال حضرت امام مہدیؓ سے افضل ہوں گے۔

دوسری صورت میں اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ "اور" تمہارا امام تم ہی میں سے ہو گا۔" "امام" سے مراد خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ مسلمانوں ہی کی شریعت کے مطابق حکم احکام جاری کیا کریں گے نہ کہ انجیل کی تعلیمات کے مطابق اور ان کا سارا نظام دین و دنیا، قرآن کریم اور احادیث رسول کے منہاج پر استوار اور ان کے تمام معاملات مسلمانوں کے دین و ملت کے مطابق ہوں گے جیسا کہ ایک روایت میں منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمہارے پروردگار کی کتاب (قرآن) اور تمہارے پیغمبر کی سُنّت کے مطابق تمہاری امامت کریں گے۔ اس اعتبار سے وہ مسلمانوں کی ملت کے ایک فرد ہوں گے، اور وہ جب مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ ان ہی میں کا ایک فرد ان کا امام ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا امامت سے انکار

(۳) وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِىْ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ قَالَ فَيَنْزِلُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَيَقُوْلُ اَمِيْرُهُمْ تَعَالَ صَلِّ لَنَا فَيَقُوْلُ لَا اِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اُمَرَآءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْاُمَّةَ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِىْ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت میں سے ہمیشہ کوئی جماعت حق کے واسطے لڑتی رہے گی اور (اپنے دشمنوں پر) غالب آئے گی، قیامت (کے قریب) تک یہ سلسلہ جاری رہے گا پھر آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جب حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام (آسمان سے اتریں گے، اور اس وقت مسلمان نماز کی حالت میں ہوں گے) تو اُمت کے امیر (یعنی امام مہدیؓ) عیسیٰ علیہ السلام

سے کہیں گے کہ آیئے ہمیں نماز پڑھایئے (کیونکہ امامت کا حق اسی شخص کو ہوتا ہے جو افضل ہو اور ظاہر ہے کہ آپ کامل رسول و نبی ہونے کی حیثیت سے اس وقت سب سے افضل ہیں) لیکن عیسیٰ علیہ السلام ان کو جواب دیں گے کہ میں امامت نہیں کروں گا (کیونکہ میری امامت کی وجہ سے یہ گمان ہوسکتا ہے کہ تمہارا دین منسوخ ہوگیا ہے) اور بلاشبہ تم میں سے بعض لوگ بعض پر امام و امیر ہیں بایں سبب کے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت محمدیہ کو بزرگ و برتر قرار دیا ہے (مسلمؒ) اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس میں دفن کئے جائیں گے

(۴) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَنْزِلُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ اِلَی الْاَرْضِ فَیَتَزَوَّجُ وَیُوْلَدُلَہٗ وَیَمْکُثُ خَمْسًا وَّ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً ثُمَّ یَمُوْتُ فَیُدْفَنُ مَعِیَ فِیْ قَبْرِیْ فَاَقُوْمُ اَنَا وَعِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ فِیْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ بَیْنَ اَبِیْ بَکْرٍ وَّعُمَرَ رَوَاہُ ابْنُ الْجَوْزِیِّ فِیْ کِتَابِ الْوَفَآءِ۔

"حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم زمین پر اتریں گے تو وہ نکاح کریں گے اور ان کے اولاد ہوگی، دنیا میں ان کی مدت قیام پینتالیس برس ہوگی، پھر ان کی وفات ہو جائے گی اور وہ میری قبر یعنی میرے مقبرہ میں میرے پاس دفن کیے جائیں گے، (چنانچہ قیامت کے دن) میں اور عیسیٰ علیہ السلام دونوں ایک مقبرہ سے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان اٹھیں گے" اس روایت کو ابن جوزیؒ نے کتب الوفا میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ان کی مدت قیام پینتالیس برس ہوگی۔" یہ بات بظاہر اس قول کے منافی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے ان کی عمر تینتیس سال تھی، اور پھر آسمان سے زمین پر اترنے کے بعد وہ سات سال دنیا میں رہیں گے اسی طرح دنیا میں ان کی کل مدت قیام چالیس سال ہوتی ہے؟ واضح رہے کہ آسمان سے اترنے کے بعد دنیا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رہنے کی مدت سات سال، مسلمؒ نے نقل کی ہے، لہٰذا ایک یہ بات توطے ہے کہ اوپر حدیث میں جو پینتالیس سال کی مدت نقل کی گئی ہے وہ دنیا میں ان کی مجموعی مدت قیام ہے کہ اس مدت میں ان کے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے کا عرصہ قیام بھی شامل ہے اور آسمان سے اترنے کے بعد کی بھی مدت قیام رہا چالیس اور پینتالیس کا فرق تو اس سلسلہ میں یا تو یہ کہا جائے کہ چالیس سال والے قول میں کسور یعنی پانچ کو حذف کر کے پوری مدت مراد لی گئی ہے یا یہ کہ اس روایت کو راجح قرار دیا جائے جو صحیح یعنی مسلم میں منقول ہے۔

"ابوبکر و عمرؓ کے درمیان اٹھیں گے " سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حدیث میں "قبر" سے مراد مقبرہ یعنی روضۂ مطہرہ ہے روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے اور وہ جگہ کسی کو بھی میسر "نہیں ہو سکی، چنانچہ حضرت امام حسن کا انتقال ہوا تو لوگوں نے چاہا کہ ان کی قبر اس خالی جگہ بنائی جائے اور حضرت عائشہؓ، جن کا وہ مکان تھا اس کے لئے راضی بھی ہوگئی تھیں مگر بنوامیہ کی شدید مخالفت کی وجہ سے حضرت حسنؓ کو روضۂ اقدس میں دفن نہیں کیا جاسکا، پھر اس جگہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی تدفین کے لئے بھی حضرت عائشہؓ راضی ہوگئی تھیں مگر ان کی قبر بھی وہاں نہیں بن سکی، یہاں تک کہ خود حضرت عائشہؓ سے بھی لوگوں نے کہا کہ آپ کا گھر ہے، ہم آپ کو اسی میں دفن کریں گے مگر انہوں نے کہا کہ میری مرضی یہ نہیں ہے، تم لوگ مجھے میری سوکنوں کے قریب جنت البقیع میں دفن کرنا اس سے معلوم ہوا کہ وہ خالی جگہ جو کسی کو نصیب نہیں ہوسکی تو اس کے پیچھے قدرت کی یہ حکمت و مصلحت کارفرما تھی کہ وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بنے گی۔

بَابُ قُرْبِ السَّاعَةِ وَاِنَّ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ

قرب قیامت اور اس بات کا بیان کہ جو شخص مرگیا اس پر قیامت قائم ہوگئی

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "قرب قیامت یعنی قیامت کا نزدیک آجانا" اس معنی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے بقاو وجود کی جو مدت متعین فرمائی ہے اس کا اکثر حصہ گزر چکا ہے اور اب جو حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بہت کم ہے۔

یہ جملہ وَاِنَّ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (جو شخص مرگیا اس پر قیامت قائم ہوگئی) دراصل ایک حدیث کے الفاظ ہیں جن کو مولف کتاب نے یہاں باب کا عنوان قرار دیا ہے اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مرجاتا ہے اس پر ان حالات اور ہولناک مراحل کا کچھ علامتی حصہ گزر جاتا ہے جو قیامت کے دن پیش آنے والے ہیں۔

"قیامت" کی قسمیں: تورپشتیؒ نے کہا ہے کہ قیامت تین طرح کی ہے، ایک قیامت کبری، کہ جب پوری کائنات کو زیروزبر کردیا جائے گا اور پھر تمام لوگوں کو جزا اور سزا کے لئے دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائے گا، دوسری قیامت وسطی یعنی ایک نسل کا اٹھ جانا اور اس کی جگہ دوسری نسل کا آجانا، جس کو "قران" کہتے ہیں گویا عہد کا اس طرح بدل جانا کہ ایک نسل کے تقریبًا ہم عمر لوگ وفات پاجائیں اور ان کے بعد کی نسل کے لوگ ان کی جگہ لے لیں، ایک طرح کی قیامت ہے اور تیسری "قیامت صغری" کہ وہ کسی آدمی کا مرجانا ہے اور یہاں یعنی وَاِنَّ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ میں) یہی آخری قسم مراد ہے لیکن "ساعة" کے بارے میں زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس سے مراد قیامت کبری" ہے خواہ اس کا تعلق پہلی قیامت (یعنی پہلا صور پھونکے جانے اور اس کائنات کے زیروزبر ہوجانے) سے ہو جیسا کہ ارشاد گرامی لا تقوم الساعة الا علی اشرار الناس سے ثابت ہے اور خواہ اس کا تعلق دوسری قیامت (یعنی دوسری مرتبہ صور پھونکے جانے اور تمام لوگوں کے دوبارہ زندہ ہوکر میدان حشر میں جمع ہونے وغیرہ) سے ہو جس کو "طامہ کبری" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے! آگے باب کی جو پہلی حدیث آرہی ہے اس کے الفاظ بعثت انا و الساعة کھاتین میں "ساعة" کا لفظ قیامت کے ان دونوں معنی کا احتمال رکھتا ہے، البتہ کچھ اور آگے حضرت عائشہؓ کی جو روایت آئے گی اس میں "ساعة" سے مراد "قیامت وسطی" ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قرب قیامت کا ذکر

① عَنْ شُعْبَةَؒ عَنْ قَتَادَةَؒ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ قَالَ شُعْبَةُ وَسَمِعْتُ قَتَادَةَ يَقُوْلُ فِىْ قَصَصِهٖ كَفَضْلِ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَلَا اَدْرِىْ اَذَكَرَهٗ عَنْ اَنَسٍ اَوْ قَالَهٗ قَتَادَةُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت شعبہؒ حضرت قتادہؒ سے اور وہ حضرت انسؓ سے روایت کرکے کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں اور قیامت، ان دو انگلیوں (یعنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی) کی مانند بھیجے گئے ہیں حضرت شعبہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت قتادہؒ سے سنا، انہوں نے (آنحضرت کی بعثت کو قیام قیامت کے ساتھ دو انگلیوں سے تشبیہ دینے کی مراد بیان کرتے ہوئے) اپنے وعظ میں کہا کہ جس طرح ان دونوں میں سے ایک انگلی دوسری انگلی سے بڑھی ہوئی ہے یعنی مذکورہ مشابہت سے حضور ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جس طرح بیچ کی انگلی شہادت کی انگلی سے کچھ بڑھی ہوئی ہے اسی طرح میری بعثت کا زمانہ قیامت کے وقت سے کچھ ہی آگے ہے کہ میں قیامت سے پہلے آیا ہوں اور قیامت میرے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہے) بہرحال (شعبہؒ کہتے ہیں کہ) مجھے نہیں معلوم، اور یہ مراد حضرت قتادہؒ نے خود بیان کی یا انہوں نے اس کو حضرت

انس ؓ سے سنا تھا (اور اگر یہ متعین بھی ہو جائے کہ قتادہ ؒ نے یہ مراد از خود بیان نہیں کی تھی بلکہ اس کو حضرت انس ؓ سے سنا تھا تو پھر یہ احتمال رہے گا کہ یہ مراد از خود حضرت انس ؓ نے بیان کی تھی یا آنحضرت ﷺ ہی نے اپنی یہ مراد بیان کی تھی اور اس کو حضرت انس ؓ نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا تھا ویسے حضرت متورد ؓ ابن شداد ؓ کی ایک روایت آ رہی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی یہ مراد خود آنحضرت ﷺ نے بیان فرمائی تھی۔" (بخاری و مسلم ؒ)

قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں

(۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَبْلَ اَنْ يَمُوْتَ شَهْرًا تَسْأَلُوْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ وَاِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَاُقْسِمُ بِاللّٰهِ مَا عَلَى الْاَرْضِ مِنْ نَفْسٍ مَنْفُوْسَةٍ يَاْتِيْ عَلَيْهَا مِائَةُ سَنَةٍ وَّهِيَ حَيَّةٌ يَوْمَئِذٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو وفات سے ایک مہینہ پہلے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم لوگ مجھ سے قیامت کا وقت پوچھا کرتے ہو (کہ پہلا صور کب پھونکا جائے گا اور دوسرا کب) تو حقیقت یہ ہے کہ اس کا متعینہ وقت صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اور میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس وقت روئے زمین پر ایسا کوئی شخص موجود نہیں ہے جس پر سو سال کا عرصہ گزرے اور وہ اس کے بعد بھی زندہ رہے۔" (مسلم)

تشریح: "اس کا متعینہ وقت صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے" کے ذریعہ حضور ﷺ نے یہ واضح فرمایا کہ تم لوگ قیامت کبریٰ کے آنے کا وقت مجھ سے کیا پوچھتے ہو، مجھے تو خود اس کا متعینہ وقت معلوم نہیں ہے کسی کو بھی اس سے باخبر نہیں کیا ہے، صرف وہی جانتا ہے کہ وہ قیامت کب آئے گی ہاں قیامت صغریٰ اور وسطیٰ کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ تمہیں بتائے دیتا ہوں اس کے بعد آپ ﷺ نے اسی کے بارے میں آگاہ فرمایا۔

"اس وقت روئے زمین پر ایسا کوئی شخص موجود نہیں ہے الخ" کے ذریعہ آپ ﷺ نے قیامت وسطیٰ" کی طرف اشارہ فرمایا کہ اس وقت میرے زمانہ میں جو لوگ موجود ہیں اور نسل ہمارے سامنے ہے اس کا خاتمہ سو برس کی مدت میں ہو جائے گا، اس مدت کے بعد ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا، اس نسل کے خاتمہ کے ساتھ گویا ایک عہد ختم ہو جائے گا اور ایک نئے عہد (قران) کی ابتداء ہوگی جو آنے والی نسل کا عہد ہوگا۔ پس پرانی نسل اور پرانے عہد کے خاتمہ اور اس کے بعد نئی نسل اور نئے عہد کی ابتداء کا نام قیامت وسطیٰ ہے اور اسی طرح ہر انسان کی موت اس کے اعتبار سے "قیامت صغریٰ" ہے! واضح رہے کہ حضور ﷺ نے اپنے عہد کی نسل کے خاتمہ کے ذریعہ طبقہ، صحابہ کی مدت حیات کی طرف اشارہ فرمایا کہ میرے صحابہ ؓ۔ جیسے حضرت انس ؓ اور سلمان وغیرہ سو برس سے بھی زائد تک حیات رہے! اور اگر یہ کہا جائے، جو زیادہ صحیح بھی ہے کہ حضور ﷺ نے جس سو سال کی مدت کا ذکر فرمایا اس کی ابتداء حضور کے اس ارشاد گرامی کے وقت سے مانی جانی چاہیے) جیسا کہ آگے آنے والی حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے، تو اس اعتبار سے "اکثر و غالب کی قید کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہے گی، چنانچہ بعض حضرات نے اپنی یہ تحقیق بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے وقت جتنے صحابہ حیات تھے یا اس زمانہ میں جو دوسرے اولیاء اللہ پیدا ہوئے وہ سب اس وقت سے ۱۰۰ سال پورے ہونے سے پہلے وفات پا گئے تھے۔

حضرت خضر اس دنیا میں زندہ ہیں یا نہیں: بعض اکابر علماء نے اس حدیث سے حضرت خضر علیہ السلام کی موت پر استدلال کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس ارشاد گرامی کے وقت روئے زمین پر جو لوگ موجود اور حیات تھے ان میں حضرت خضر علیہ السلام بھی تھے، لہٰذا مخبر صادق ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق یہ ضروری ہے کہ وہ دو سو سال کی اس مدت کے بعد اس دنیا میں زندہ نہ رہے ہوں اور وفات پا گئے ہوں۔ لیکن دوسرے علماء اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کا معاملہ بالکل خصوصی نوعیت کا ہے اور ان کی ذات مذکورہ اور ارشاد گرامی کے دائرہ سے باہر ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے تو اپنی اُمت کے بارے میں یہ خبر دی تھی کہ میری اُمت کے وہ

لوگ جو اس وقت موجود و حیات ہیں ۱۰۰ سو سال کے اندر اندر وفات پا جائیں گے، اور ظاہر ہے کہ حضرت خضر کا تعلق اس اُمت سے نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی نبی کسی دوسرے نبی کی اُمت میں سے نہیں ہوتا بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں "علی الارض" (روئے زمین پر) کی قید نے حضرت الیاس علیہ السلام کو مذکورہ مفہوم کے دائرے سے باہر کر دیا تھا کیونکہ یہ دونوں اس وقت روئے زمین پر نہیں تھے بلکہ پانی پر تھے۔

امام بغوی نے تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ انبیاء میں سے چار حضرات زندہ ہیں، اور ان میں سے دو یعنی حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام تو روئے زمین پر ہیں اور دو، یعنی حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام، آسمان پر ہیں! یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ مشائخ سے تواتر کے ساتھ بعض ایسے واقعات منقول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اس دنیا میں زندہ موجود ہیں اگرچہ بعض حضرات نے یہ تاویل کی ہے کہ "خضر" دراصل ایک منصب ہے جس پر ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی ہستی فائز رہتی ہے اور اس کے فرائض میں مخلوق خدا کو مدد فائدہ پہنچانا شامل ہوتا ہے لیکن اولیاء کاملین کے منقولات و حالات سے انہی خضر کا زندہ موجود ہونا ثابت ہوتا ہے جو بنی اسرائیل میں سے ایک نبی اور حضرت موسی علیہ السلام کے ساتھی و مصاحب تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشین گوئی

③ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَاْتِیْ مِائَةُ سَنَةٍ وَّعَلَی الْاَرْضِ نَفْسٌ مَّنْفُوْسَةٌ الْیَوْمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس وقت جو لوگ (یعنی صحابہؓ) حیات ہیں ان میں سے کوئی بھی شخص سو سال کے بعد روئے زمین پر زندہ موجود نہیں رہے گا۔" (مسلمؒ)

قیامت کے بارے میں ایک سوال اور اس کا جواب

④ وَعَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاَعْرَابِ یَاْتُوْنَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَیَسْاَلُوْنَہٗ عَنِ السَّاعَةِ فَکَانَ یَنْظُرُ اِلٰی اَصْغَرِھِمْ فَیَقُوْلُ اِنْ یَّعِشْ ھٰذَا لَا یُدْرِکُہُ الْھَرَمُ حَتّٰی تَقُوْمَ عَلَیْکُمْ سَاعَتُکُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ کچھ دیہاتی لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کرتے، اور یہ پوچھا کرتے تھے کہ قیامت کب آئے گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (یہ سوال سن کر) اس بچہ کی طرف دیکھتے جو ان پوچھنے والوں کے ساتھ ہوتا تھا اور پھر فرماتے کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو یہ بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے نہیں پائے گا کہ تم پر تمہاری قیامت ہو جائے گی۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: "اگر یہ بچہ زندہ رہا الخ" کا مطلب یہ تھا کہ اس بچہ کے بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے سے پہلے تم سب وفات پا جاؤ گے اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا مذکورہ مدت کے عرصہ کے بعد ایک نسل کے خاتمہ اور ایک قرن یعنی عہد کے اختتام پذیر ہو جانے کی طرف اشارہ فرمایا، اور یہ، ایک پوری نسل کا ختم ہو جانا اور ایک زمانہ کا اپنی مدت کو پہنچ کر اختتام پذیر ہو جانا) ایک طرح سے قیامت ہی ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو "ساعتکم" "تمہاری قیامت سے تعبیر فرمایا اس حدیث کے سلسلہ میں زیادہ واضح بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ پوچھنے والوں نے "قیامت کبری" کے بارے میں پوچھا اور چونکہ ان کا یہ سوال ایسا تھا جس کا صحیح جواب دینا ممکن ہی نہیں تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکیمانہ اسلوب میں مذکورہ جواب عنایت فرمایا۔

"ساعتکم" (تمہاری قیامت)" اس سے مراد بعض حضرات کے نزدیک قیامت صغری، یعنی پوچھنے والوں کا مرجانا" ہے اور بعض شارحین نے اس سے "قیامت وسطی" مراد لی ہے، جس کا مطلب ان جیسی عمر رکھنے والے سب لوگوں کا مرجانا ہے، اور یہ طے ہے کہ یہ

بات اکثر و غالب کے اقرار کے اعتبار سے فرمائی گئی تھی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

قرب قیامت کا ذکر

⑤ عَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ فِيْ نَفْسِ السَّاعَةِ فَسَبَقْتُهَا كَمَا سَبَقَتْ هٰذِهٖ هٰذِهٖ وَاَشَارَ بِاِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت مستورد ابن شدادؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "میں قیامت کی ابتداء میں بھیجا گیا ہوں (یعنی میری بعثت ایسے زمانہ میں ہوئی ہے جس میں قیامت کی علامت کا آغاز ہو گیا ہے اور میں قیامت سے بس اتنا ہی آگے آیا ہوں جس قدر کہ یہ (بیچ کی) انگلی اس (شہادت کی) انگلی سے آگے ہے یہ فرما کر آپ ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں، یعنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا۔" (ترمذی)

تشریح: "مطلب یہ کہ جس طرح بیچ کی انگلی، شہادت کی انگلی سے کچھ تھوڑی سی بڑھی ہوئی ہے، اسی طرح میری بعثت کا زمانہ قیامت آنے کے وقت سے کچھ ہی پہلے ہے، میں کچھ آگے آگیا ہوں، قیامت میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہے۔

دنیا میں اُمّت محمدیہ کے باقی رہنے کی مدت

⑥ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّیْ لَاَرْجُوْا اَنْ لَّا تَعْجِزَ اُمَّتِیْ عِنْدَ رَبِّهَا اَنْ يُّؤَخِّرَهُمْ نِصْفَ يَوْمٍ قِيْلَ لِسَعْدٍ وَكَمْ نِصْفُ يَوْمٍ قَالَ خَمْسُمِائَةِ سَنَةٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "یقیناً" میں امید رکھتا ہوں کہ میری اُمّت اپنے پروردگار کی نظر میں اتنی عاجز و بے حقیقت نہیں ہو جائے گی کہ اس کا پروردگار اس کو آدھے دن کی بھی مہلت عطا نہ کرے" حضرت سعد ابن ابی وقاص سے یہ پوچھا گیا کہ یہ "آدھا دن" کتنا ہوتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ پانچ سو سال۔" (ابوداؤد)

تشریح: "آدھے دن" کو پانچ سو سال" کے بقدر قرار دینا اس آیت کے پیش نظر ہے کہ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔ یعنی خدا کے نزدیک ایک دن اتنا ہوتا ہے جتنا کہ تمہارے (شب و روز کے) حساب سے ایک ہزار سال ہوتے ہیں پس جب وہ دن ہمارے شب و روز کی گردش کے حساب کے مطابق ایک ہزار سال کے برابر ہو تو آدھا دن یقیناً پانچ سو سال کے برابر ہو گا۔

بہر حال آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا مطلب کہ میری یہ اُمّت اللہ تعالیٰ کے نزدیک جس قدر قرب اور جتنا بلند مرتبہ رکھتی ہے وہ اس بات کا یقین رکھنے کے لئے کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اُمّت کو کم سے کم پانچ سو سال تک تو ضرور ہی امن و حفاظت میں رکھے گا اس کو ہلاک نہیں کرے گا اور دنیا میں اس کی بقاو قیام کی مدت کو اس سے کم نہیں کرے گا اس سے زیادہ چاہے جتنی کر دے پس اس ارشاد گرامی کے ذریعہ گویا آپ ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اب سے پانچ سو سال پہلے تو قیامت آئے گی اور اس اُمّت کا خاتمہ نہیں ہو گا، ہاں اس مدت کے بعد اللہ تعالیٰ جو چاہے گا کرے گا۔

اور بعض حضرات نے اس ارشاد گرامی کی مراد یہ بیان کی ہے اللہ تعالیٰ کم سے کم پانچ سو سال تک تو ضرور اس اُمّت کو شدائد و عقوبات سے محفوظ و مامون اور سلامت رکھے گا اور اس کو ایسی آفات میں مبتلا نہیں کرے گا جس سے پوری اُمّت ہلاک و ختم ہو جائے۔

اس موقع پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ حضرت شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی بعض کتابوں میں ثابت کیا ہے کہ دنیا میں اُمّت کی بقاو قیام آنحضرت ﷺ کے وصال سے ایک ہزار سال کے بعد پانچ سو سال سے آگے متجاوز نہیں ہو گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قرب قیامت کی مثال

⑦ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ هٰذِهِ الدُّنْيَا مَثَلُ ثَوْبٍ شُقَّ مِنْ اَوَّلِهٖ اِلٰى اٰخِرِهٖ فَبَقِى مُتَعَلِّقًا بِخَيْطٍ فِىْ اٰخِرِهٖ فَيُوْشِكُ ذٰلِكَ الْخَيْطُ اَنْ يَّنْقَطِعَ رَوَاهُ الْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس دنیا (کے فنا کے قریب پہنچ جانے اور قیامت کے نزدیک آجانے) کی مثال اس کپڑے کی سی ہے جس کو شروع سے آخر تک پھاڑ ڈالا گیا ہو اور اس کے ٹکڑے آخر میں صرف ایک دھاگے سے جڑے ہوئے لٹکے ہوں اور وہ دھاگا بھی ٹوٹ جانے کے قریب ہو پس دنیا بھی اپنی ٹوٹ پھوٹ اور خاتمہ کے اتنے ہی قریب پہنچ چکی ہے، اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

بَابُ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى شِرَارِ النَّاسِ

اس بات کا بیان کہ قیامت صرف برے لوگوں پر قائم ہوگی

اس باب میں جو احادیث منقول ہوں گی ان سے یہ واضح ہوگا کہ جب قیامت آنے کو ہوگی تو دنیا میں جتنے بھی نیک لوگ ہوں گے وہ سب مرجائیں گے، صرف بدکار باقی رہیں گے، اور پھر انہی پر قیامت قائم ہوگی، لہٰذا جب تک اس دنیا میں نیک لوگوں کا وجود رہے گا قیامت قائم نہیں ہوگی! جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عہد ختم ہوجانے کے بعد ایک خوشبودار ہوا چلے گی جس سے تمام مسلمان و مؤمنین مرجائیں گے اور دنیا میں صرف بدکار باقی رہ جائیں گے گدھوں کی طرح آپس میں اختلاط کریں گے، اور پھر انہی بدکاروں پر قیامت قائم ہوگی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جب تک روئے زمین پر ایک بھی اللہ کا نام لیوا موجود ہے قیامت نہیں آسکتی

① عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِى الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ وَفِىْ رِوَايَةٍ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ عَلٰى اَحَدٍ يَقُوْلُ اَللّٰهُ اَللّٰهُ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک روئے زمین پر اللہ اللہ کہنا موقوف نہ ہوجائے۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ فرمایا قیامت اس شخص پر قائم نہیں ہوگی جو اللہ اللہ کہتا ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی تو اس وقت روئے زمین میں ایسا کوئی شخص باقی نہیں ہوگا جو خدا کا نام لیوا اور اس کی پرستش کرنے والا ہو بلکہ سب کے سب کافر و بت پرست ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ اس کائنات کا وجود و بقا در حقیقت باعمل علماء و ذاکرین و صالحین اور نیکوکاروں کے وجود کی برکت سے ہے، جب ان کو اس دنیا سے اٹھا لیا جائے گا تو دنیا بھی باقی نہیں رہے گی۔

قیامت صرف برے لوگوں پر قائم ہوگی

② وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى شِرَارِ الْخَلْقِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت صرف بدکار لوگوں پر قائم ہوگی۔" (مسلم)

تشریح: "خلق یعنی مخلوق" سے مراد "انسان" ہیں، کیونکہ "شرار" یعنی بدکار" سے مراد گنہگار ہیں اور ظاہر ہے کہ گناہ و معصیت کا تعلق صرف انسان سے ہوتا ہے نہ کہ ساری مخلوق سے۔

اگر یہاں سوال پیدا ہو کہ اس حدیث اور اس حدیث کے درمیان کہ جو پیچھے گزر چکی ہے یعنی لا یزال طائفة من امتی حتی یقاتلون الحق ظاهرين الى يوم القيامة مطابقت کی کیا صورت ہے، کیونکہ اس حدیث سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ قیامت قائم ہونے سے پہلے ایک عرصہ ایسا بھی گزریگا جس میں اس روئے زمین پر کوئی خدا کا نام لیوا بھی موجود نہیں ہو گا بلکہ سارے لوگ خدا بیزار اور بدکار ہوں گے اور انہی پر قیامت قائم ہو جب کہ پہلی حدیث لا یزال بنا طائفة سے بظاہر یہ واضح ہوتا ہے کہ قیامت تک ہمیشہ اس روئے زمین پر خدا کے نام لیواؤں کی کوئی نہ کوئی جماعت ضرور موجود رہے گی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث "لا یزال طائفة الخ" کا تعلق تمام زمانوں سے ہے کہ روئے زمین پر جب تک اسلام کے حاملین کا وجود رہے گا، ان میں سے کوئی نہ کوئی جماعت ہمیشہ حق کی سربلندی کے لئے برسرپیکار رہے گی اس کے برخلاف یہاں نقل کی جانے والی حدیث (لا تقوم الساعة الخ کا تعلق صرف اس مخصوص زمانہ سے ہے جب قیامت آنے ہی والی ہوگی، اور اس دنیا سے خدا کے تمام نام لیواؤں کو اٹھالیا جائے گا۔

ایک پیشین گوئی

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَضْطَرِبَ اَلْيَاتُ نِسَآءِ دَوْسٍ حَوْلَ ذِی الْخَلَصَةِ وَذُوالْخَلَصَةِ طَاغِيَةُ دَوْسٍ الَّتِیْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ فِی الْجَاهِلِيَّةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک قبیلہ دوس کی عورتیں ذوالخلصہ کے گرد اپنے کولھے نہ مٹکانے لگیں گی۔" (اور حضرت ابوہریرہؓ یا کسی اور راوی نے ذوالخلصہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ) ذوالخلصہ قبیلہ دوس کے ایک بت کا نام ہے جس کو وہ زمانہ جاہلیت میں پوجتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "دوس" یمن کے ایک قبیلہ کا نام ہے، اور ذوالخلصہ "یمن میں ایک بت خانہ تھا جس کو کعبہ یمانیہ کہا جاتا تھا، اس بت خانہ میں ایک بت تھا جس کا نام "خلصہ" تھا، اسلام سے پہلے کے زمانہ میں یمن کے قبائل دوس خثعم اور بجیلہ اس بت کو پوجتے تھے جب اسلام کا زمانہ آیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت جریر ابن عبداللہ بجلیؓ کو یمن بھیج کر اس بت خانہ کو تباہ کرادیا تھا بہرحال حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آخر زمانہ میں پھر اس قبیلہ کے لوگ مرتد اور بت پرست ہو جائیں گے اور ان کی عورتیں اس بت خانہ کے گرد طواف کرتی پھریں گی۔

قیامت سے پہلے لات وعزیٰ کی پھر پرستش ہونے لگے گی

(۴) وَعَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَذْهَبُ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ حَتّٰى يُعْبَدَ اللَّاتُ وَالْعُزّٰى فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لَاَظُنُّ حِيْنَ اَنْزَلَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ اَنَّ ذٰلِكَ تَامًّا قَالَ اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ مِنْ ذٰلِكَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ رِيْحًا طَيِّبَةً فَتُوُفِّیْ كُلُّ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِيْمَانٍ فَيَبْقٰى مَنْ لَّا خَيْرَ فِيْهِ فَيَرْجِعُوْنَ اِلٰى دِيْنِ اٰبَآئِهِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ شب و روز کا سلسلہ اس وقت ختم نہیں ہو گا (یعنی یہ دنیا اس وقت تک فنا کے گھاٹ نہیں اترے گی اور قیامت نہیں آئے گی جب تک لات وعزیٰ کی پوجا نہ کی جانے لگے گی (حضرت عائشہؓ کہتی

ہیں کہ جب) میں نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سنا تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ تو (چونکہ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام مذاہب باطل میں مذہب اسلام سچا اور غالب ہے اور کم سے کم عرب میں بت پرستی کا رواج ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا، اس لئے یقین کی حد تک) میرا خیال تھا کہ بت پرستی کا خاتمہ ہونے والا ہے (اور یہ کہ آئندہ کبھی بت پرستی نہیں ہوگی، لیکن اب آپ ﷺ یہ خبر دے رہے ہیں؟) آپ ﷺ نے فرمایا درحقیقت ایسا ہی ہوگا (یعنی اسلام کی روشنی غالب رہے گی، اور کفر و شرک کا چراغ گل رہے گا مگر اس وقت تک کے لئے) جب تک کہ اللہ تعالیٰ چاہے گا (چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے اس بات کو یوں واضح فرمایا ہے کہ) پھر اللہ تعالیٰ ایک خوشبودار ہوا بھیجے گا جس کے ذریعہ ہر وہ شخص مرجائے گا جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہوگا اور (دنیا میں) صرف وہی شخص باقی بچے گا جس میں کوئی نیکی نہیں ہوگی (یعنی اس وقت روئے زمین پر ایسا کوئی شخص باقی نہیں بچے گا جس میں ایمان و اسلام ہو، جو قرآن پڑھنے والا، نماز روزہ، حج اور دوسرے ارکان اسلام ادا کرنے والا ہو، اور علم دین کا حامل ہو) پس تمام لوگ اپنے آباء و اجداد کے دین یعنی کفر و شرک کی طرف لوٹ جائیں گے۔" (مسلم)

تشریح: حاصل یہ کہ حکمت الٰہی کے تحت اخیر زمانہ میں ایمان و اسلام بالکل اٹھالیا جائے گا اور تمام روئے زمین پر صرف کفر و شرک بت پرستی اور بدکاری کا چلن رہ جائے گا تاکہ قیامت جو قہر و جلال الٰہی کے ظہور کا موقع و محل ہوگی، صرف بدکاروں پر قائم ہو نہ کہ نیکوکاروں پر۔

قیامت سے پہلے کیا ہوگا؟

⑤ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فَيَمْكُثُ اَرْبَعِيْنَ لَا اَدْرِیْ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا اَوْشَهْرًا اَوْ عَامًا فَيَبْعَثُ اللّٰهُ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ كَاَنَّهٗ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ فَيَطْلُبُهٗ فَيُهْلِكُهٗ ثُمَّ يَمْكُثُ فِی النَّاسِ سَبْعَ سِنِيْنَ لَيْسَ بَيْنَ اثْنَيْنِ عَدَاوَةٌ ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ رِيْحًا بَارِدَةً مِنْ قِبَلِ الشَّامِ فَلَا يَبْقٰى عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَحَدٌ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ خَيْرٍ اَوْ اِيْمَانٍ اِلَّا قَبَضَتْهُ حَتّٰى لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ دَخَلَ فِیْ كَبِدِ جَبَلٍ لَدَخَلَتْهُ عَلَيْهِ حَتّٰى تَقْبِضَهٗ قَالَ فَيَبْقٰى شِرَارُ النَّاسِ فِیْ خِفَّةِ الطَّيْرِ وَاَحْلَامِ السِّبَاعِ لَا يَعْرِفُوْنَ مَعْرُوْفًا وَلَا يُنْكِرُوْنَ مُنْكَرًا فَيَتَمَثَّلُ لَهُمُ الشَّيْطَانُ فَيَقُوْلُ اَلَا تَسْتَحْيُوْنَ فَيَقُوْلُوْنَ فَمَا تَاْمُرُنَا فَيَاْمُرُهُمْ بِعِبَادَةِ الْاَوْثَانِ وَهُمْ فِیْ ذٰلِكَ دَارٌّ رِزْقُهُمْ حَسَنٌ عَيْشُهُمْ ثُمَّ يُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَلَا يَسْمَعُهٗ اَحَدٌ اِلَّا اَصْغٰى لِيْتًا وَرَفَعَ لِيْتًا قَالَ فَاَوَّلُ مَنْ يَّسْمَعُهٗ رَجُلٌ يَّلُوْطُ حَوْضَ اِبِلِهٖ فَيَصْعَقُ وَيَصْعَقُ النَّاسُ ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ مَطَرًا كَاَنَّهُ الطَّلُّ فَيَنْبُتُ مِنْهُ اَجْسَادُ النَّاسِ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ثُمَّ يُقَالُ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ هَلُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ فَيُقَالُ اَخْرِجُوْا بَعْثَ النَّارِ فَيُقَالُ مِنْ كَمْ كَمْ فَيُقَالُ مِنْ كُلِّ اَلْفٍ تِسْعَ مِائَةٍ وَّتِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ قَالَ فَذٰلِكَ يَوْمٌ يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا وَذٰلِكَ يَوْمٌ يُّكْشَفُ عَنْ سَاقٍ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَّذُكِرَ حَدِيْثُ مُعَاوِيَةَ لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ فِیْ بَابِ التَّوْبَةِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "دجال نکلے گا اور چالیس تک رہے گا حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم، اس موقع پر چالیس سے آنحضرت ﷺ کی مراد کیا تھی، آیا چالیس دن یا چالیس مہینے اور یا چالیس سال پس اللہ تعالیٰ حضرت عیسی علیہ السلام کو بھیجے گا جو گویا عروہ ابن مسعودؓ کی شکل و صورت کے ہوں گے (یعنی حضرت عیسی علیہ السلام شکل و صورت میں عروہؓ ابن مسعود کے مشابہ ہوں گے) وہ دجال کو تلاش کریں گے اور اس کو مار ڈالیں گے، اس کے بعد حضرت عیسی علیہ السلام دنیا والوں میں سات سال تک رہیں گے اور اس عرصہ میں دو شخصوں کے درمیان بھی کوئی دشمنی و عداوت نہیں ہوگی، پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا بھیجے گا (جو اہل ایمان کو موت کی آغوش میں پہنچا دے گی چنانچہ اس وقت روئے زمین پر ایسا کوئی شخص باقی نہیں بچے گا جس کے

دل میں رائی برابر بھی نیکی یا ایمان میں سے کچھ ہوا اور وہ ہوا اس کی روح قبض نہ کرے یہاں تک کہ اگر تم میں سے کوئی شخص (بالفرض) پہاڑ کے اندر بھی چلا گیا ہوگا تو وہ ہوا پہاڑ میں داخل ہو کر اس شخص کا پیچھا کریگی اور اس کی روح قبض کر کے چھوڑے گی" آپ ﷺ نے فرمایا اس کے بعد (روئے زمین پر) صرف بدکار و شریر لوگ باقی رہ جائیں گے جو پرندوں کے مانند سبک رو اور تیز رفتار اور درندوں کی مانند مضبوط وسخت ہوں گے وہ نہ تو نیکی و بھلائی سے واقف ہوں گے اور نہ برائی و بدکاری سے اجتناب کریں گے، پھر شیطان (کسی معزز و قابل تکریم انسان کی شکل وصورت اختیار کر کے ان کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ (تم لوگ جس طرح فسق و فجور میں مبتلا ہو، اس پر) کیا تم کو شرم وحیا نہیں آتی ہے گویا یہ شیطان کا مکرو تلبیس ہوگا کہ وہ اس حیلے سے ان کو بت پرستی کی طرف لائے گا) وہ لوگ شیطان سے کہیں گے تم بتاؤ ہم کیا کریں (یعنی ہمارے بارے میں جو تمہارا مقصود ہے اس کو ظاہر کرو تا کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں) پس شیطان ان کو بت پوجنے کا حکم دیگا، یعنی شیطان ان کو اس فریب میں مبتلا کرے گا کہ تم لوگ وسیلہ اختیار کرنے کے طور پر بتوں کو پوجنے لگو تا کہ خدا تم سے راضی ہو۔ چنانچہ کفار یہی کہا کرتے تھے کہ ہم بتوں کو محض خدا کو خوش کرنے کے لئے پوجتے ہیں اور قرآن نے ان کی اس خام خیالی کی خبر ان الفاظ میں دی ہے مانعبد هم الالیقربونا الی اللّٰه زلفاویقولون هٰولاءشفعاؤناعند اللّٰه۔ بہرحال وہ لوگ شیطان کے کہنے کے مطابق بت پرستی کرنے لگیں گے اور ان کے اعمال واخلاق انتہائی پست ہو جائیں گے لیکن ان کے ان برے اعمال کے باوجود ان کے رزق میں فراوانی اور کثرت ہوگی اور وہ عیش وعشرت کی زندگی گزراتے ہوں گے پھر قیامت قائم کرنے کے لئے) صور پھونکا جائے گا اور جو بھی شخص اس کی آواز سنے گا وہ شخص اپنی گردن کو ایک جانب سے جھکائے گا اور دوسری جانب سے بلند کرے گا اس صور کی آواز کو سب سے پہلے سننے والا وہ شخص ہوگا جو اپنے اونٹ (کو پانی پلانے) کے حوض کو لیپ پوت رہا ہوگا اور وہ اسی حالت میں مرجائے گا۔ اور دوسرے تمام لوگ بھی اسی طرح اپنے اپنے کام میں مشغولیت کے دوران ہی مرجائیں گے (یعنی کسی کو بھی اتنی مہلت نہیں ملے گی کہ وہ جس کام میں مشغول ہے اس سے فارغ ہی ہو جائے) اس کے بعد اللہ تعالیٰ بارش بھیجے گا جو شبنم کی طرح ہوگی (یعنی ہلکی بارش جس کو پھوار بھی کہا جاسکتا ہے اور اس بارش کے ذریعہ لوگوں کے بدن اُگ آئیں گے (جو قبروں میں گل چکے ہوں گے) پھر چالیس برس کے بعد) دوسرا صور پھونکا جائے گا جس کو سن کر تمام لوگ (جو اپنی قبروں اور زمین کے نیچے سے زندہ ہو کر نکلیں گے) یکبارگی اٹھ کھڑے ہوں گے اور قیامت کے ہولناک منظر کو دیکھیں گے پھر ان سب سے کہا جائے گا کہ لوگو! اپنے پروردگار کی طرف آؤ اور فرشتوں کو حکم دیا جائے کہ ان سب کو روکے رکھو، ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا اور ان سے حساب لیا جائے گا پھر (پروردگار کی طرف سے) فرشتوں کی طرف سے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا جائے گا کہ کتنے لوگوں میں سے کتنے لوگوں کو الگ کیا جائے؟ یعنی جن لوگوں کو دوزخ میں بھیجا جانا ہے ان کا تناسب کیا ہے اور ان کو کتنے لوگوں میں سے کس مقدار کے حساب سے الگ کیا جائے فرشتوں سے کہا جائے گا ہر ہزار شخص میں سے نو سو ننانوے لوگوں کو دوزخ میں بھیجنے کے لئے الگ کر لو یہ کہہ کر آپ نے فرمایا یہ وہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور یہ وہ دن ہے جس میں امر عظیم کو ظاہر کیا جائے گا۔" (مسلم)

اور حضرت معاویہؓ کی روایت لا تنقطع الهجرة۔ توبہ کے باب میں نقل کی جاچکی ہے۔

تشریح: مجھے نہیں معلوم اسی موقع پر "چالیس" سے آنحضرت ﷺ کی کیا مراد تھی الخ) کے سلسلہ میں مختصر طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، دجال کے ٹھہرنے کی مدت بعض روایتوں میں چالیس سال اور بعض میں چالیس دن یا چالیس رات آئی ہے، اور اسی موقع پر یہ بھی وضاحت کی جاچکی ہے کہ ان روایتوں میں مطابقت کی صورت کیا ہے۔

"دو شخصوں کے درمیان بھی کوئی دشمنی وعداوت نہیں ہوگی" کے ذریعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس دنیا میں حضرت عیسی علیہ السلام کا وہ زمانہ باہمی انس ورواداری، اخوت ومحبت اور یگانگت ویک جہتی سے بھر پور ہوگا۔ اس وقت تمام لوگ ایمان واخلاق کی کامل صفات کے حامل ہوں گے، اور پورا معاشرہ اس طرح اعلی انسانی واخلاقی قدروں پر استوار ہوگا کہ کوئی کسی کا دشمن نہیں

ہو گا، کوئی کسی کے درپے آزار نہیں ہو گا۔ کسی کے دل میں کوئی بغض و کینہ اور حسد نہیں ہو گا بلکہ تمام لوگ ایک دوسرے کے دوست و رفیق اور ایک دوسرے کے ہمدرد اور بہی خواہ ہوں گے! واضح رہے کہ اس دنیا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ٹھہرنے کی مدت جو سات سال بیان کی گئی ہے وہ دجال کو قتل کرنے کے بعد اس دنیا میں ان کے ٹھہرنے کی مدت ہے ورنہ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس دنیا میں ان کی کل مدت حیات پینتالیس سال ہوگی۔

"جو پرندوں کی مانند سبک رو اور تیز رفتار الخ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ برائی و بدکاری کے کاموں اور جنسی خواہشات کی تکمیل میں اس طرح سبک رو اور تیز رفتار ہوں گے جیسے پرندے ہوتے ہیں، اور ظلم و تشدد کرنے، فتنہ و فساد پھیلانے اور لوگوں کے جان و مال کو ہلاک و برباد کرنے میں اس طرح شقی القلب اور سخت مزاج ہوں گے جس طرح درندے ہوتے ہیں! پس اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ علم و دانائی حلم و مروت اور دوسرے انسانی و اخلاقی اوصاف سے بالکل خالی ہوں گے بلکہ ان کے دل و دماغ اور مزاج و طبیعت پر ظلم و شقاوت، دست درازی، وحشت و درندگی اور ہلاکت خیزی کا غلبہ ہو گا۔

"وہ اپنی گردن کو ایک جانب سے جھکالے گا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اس صور کی آواز اتنی زیادہ خوفناک اور ڈراونی ہوگی کہ اس کی دہشت سے لوگوں کے دل پھٹ جائیں گے اور جسمانی قوت و ہمت معطل و بیکار ہو کر رہ جائے گی جس کا اثر گردن پر پڑے گا اور وہ ڈھلک جائے گی جیسا کہ خوف و دہشت کے وقت ہوتا ہے کہ سر اس طرح ایک طرف کو ڈھلک جاتا ہے کہ گردن کی ایک جانب تو جھک جاتی ہے اور اس کے مقابل کی دوسری جانب اوپر اٹھ جاتی ہے۔

"ہر ہزار شخص میں سے نو سو ننانوے لوگوں کو الخ" سے معلوم ہوا کہ ایک ہزار لوگوں میں سے صرف ایک شخص جنت میں جائے گا اور باقی سب دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ گویا جنت میں جانے والوں کا تناسب فی ہزار ایک شخص ہو گا! نیز زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "ہر ہزار شخص میں سے نو سو ننانوے لوگوں سے مراد کافر ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے چنانچہ آگے باب الحشر میں حضرت ابوسعید خدری کی ایک روایت آرہی ہے اس میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ دوزخیوں کی یہ جماعت یاجوج و ماجوج کے لوگوں پر مشتمل ہوگی۔

"یہ وہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا کردے گا یہ جملہ دراصل قیامت کے دن کی درازی و طوالت یا اس دن کی شدت و ہولناکی سے کنایہ ہے جیسا کہ مصائب و آلام اور غم و شدائد کے زمانہ میں بوڑھاپا بہت جلد آجاتا ہے۔ اسی طرح یہ وہ دن ہے جس میں امر عظیم کو ظاہر کیا جائے گا" بھی سخت ترین خوف و ہولناکی اور شدت و محبت سے کنایہ ہے واضح رہے کہ کشف ساق (جس کا ترجمہ امر عظیم کو ظاہر کیا جانا) کیا گیا ہے کے معنی اہل عرب میں یہی مشہور ہیں اور اس کی اصل یہ ہے کہ جب کسی شخص پر کوئی بہت سخت مشکل و پریشانی آتی ہے اور اس پریشانی سے نجات پانے کے لئے اس کو بہت زیادہ کوشش اور سعی کرنا ہوتی ہے تو وہ اپنی پنڈلی کے اوپر سے کرتہ کا دامن وغیرہ اٹھالیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی پنڈلی کھل جاتی ہے اس اعتبار سے "کشف ساق اہل عرب کا ایک محاورہ بنا ہوا ہے جو کسی کام کی اہمیت و نزاکت اور اس کام کے سلسلے میں پیش آنے والی صعوبتوں اور سختیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے! یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ یوم یکشف عن ساق۔ کے الفاظ قرآن کریم میں بھی آئے ہیں اور حدیث میں مذکورہ صورت میں قرآن کے انھی الفاظ کو پیش کیا گیا ہے، چنانچہ اس کی تفسیر کے سلسلہ میں بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن اکثر حضرات کے نزدیک اس کی زیادہ صحیح تاویل یہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی۔

بَابُ النَّفْخِ فِي الصُّوْرِ

صور پھونکے جانے کا بیان

"صور" اصل میں نرسنگا (سنگھ) اور قرنا کو کہتے ہیں جس میں پھونکنے سے ایک بلند آواز پیدا ہوتی ہے، اور یہاں وہ مخصوص نرسنگا

(سنکھ) مراد ہے جس کو حضرت اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے، حضرت اسرافیل کا یہ صور پھونکنا دو مرتبہ ہوگا، ایک بار تو اس وقت جب قیامت آنے کو ہوگی اور اس صور کی آواز سے تمام لوگ مرجائیں گے اور دوسری بار اس وقت جب تمام لوگوں کو میدان حشر میں جمع کرنے کے لئے دوبارہ زندہ کرنا مقصود ہوگا، چنانچہ اس صور کی آواز سے تمام لوگ زندہ
ہو کر میدان حشر میں جمع ہوں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دونوں نفخوں کے درمیان کتنا وقفہ ہوگا؟

① عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَابَیْنَ النَّفْخَتَیْنِ اَرْبَعُوْنَ قَالُوْا یَا اَبَاھُرَیْرَۃَ اَرْبَعُوْنَ یَوْمًا قَالَ اَبَیْتُ قَالُوْا اَرْبَعُوْنَ شَھْرًا قَالَ اَبَیْتُ قَالُوْا اَرْبَعُوْنَ سَنَۃً قَالَ اَبَیْتُ ثُمَّ یُنْزِلُ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیَنْبُتُوْنَ کَمَا یَنْبُتُ الْبَقْلُ قَالَ وَلَیْسَ مِنَ الْاِنْسَانِ شَیْءٌ لَّا یَبْلٰی اِلَّا عَظْمًا وَّاحِدًا وَّھُوَ عَجْبُ الذَّنَبِ وَمِنْہُ یُرَکَّبُ الْخَلْقُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِّمُسْلِمٍ کُلُّ ابْنِ اٰدَمَ یَاکُلُہُ التُّرَابُ اِلَّا عَجْبَ الذَّنَبِ مِنْہُ خُلِقَ وَفِیْہِ یُرَکَّبُ۔

”حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ”دونوں نفخوں (یعنی ایک مرتبہ مارنے کے لئے اور دوسری مرتبہ جلانے کے لئے دونوں مرتبہ پھونکے جانے والے صور کے درمیان کا وقفہ چالیس ہوگا لوگوں نے (یہ سن کر) پوچھا کہ ابوہریرہ! کیا (چالیس سے) چالیس دن مراد ہیں؟ ابوہریرہؓ نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم! پھر لوگوں نے پوچھا کہ کیا چالیس مہینے مراد ہیں؟ ابوہریرہؓ نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم ان لوگوں نے پھر پوچھا کہ کیا چالیس سال مراد ہیں؟ ابوہریرہؓ نے پھر یہی جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم اس کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے بیان حدیث کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ) اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا اور اس پانی سے لوگ (یعنی انسان اور تمام جاندار) اس طرح اگیں گے جیسے سبزہ اگتا ہے“ نیز آپ ﷺ نے فرمایا ”انسان کے جسم وبدن کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو پرانی اور بوسیدہ نہ ہوجاتی ہو (یعنی گل سڑکر ختم نہ ہوجاتی ہو) علاوہ ایک ہڈی کے جس کو عجب الذنب کہتے ہیں اور قیامت کے دن ہر جاندار کی اسی ہڈی سے اس کے تمام جسم کو مرکب کیا جائے گا۔“ (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حضرت ابوہریرہؓ کا یہ جواب دینا کہ مجھے نہیں معلوم، اس بنا پر تھا کہ یا تو انہوں نے آنحضرت سے اس حدیث کو اسی طرح مجملا سنا تھا یا سنا تو مفصل تھا مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ حضور ﷺ نے ”چالیس“ کے بعد کیا فرمایا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے مذکورہ جواب کے ذریعہ واضح کیا کہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ”چالیس“ سے حضور کی مراد چالیس دن تھے، یا چالیس مہینے اور یا چالیس سال بہر حال اس حدیث میں چالیس کا لفظ مجمل نقل ہوا ہے جب کہ ایک دوسری حدیث میں یہ لفظ تفصیل کے ساتھ ہے اور وہ چالیس برس ہے پس دونوں نفخوں کے درمیان جو وقفہ ہوگا وہ چالیس سال کے برابر ہوگا۔

”عَجْبُ الذَّنَبْ“ اس ہڈی کو کہتے ہیں جو ریڑھ کے نیچے دونوں کولھوں کے درمیان اس جگہ پر ہوتی ہے جہاں جانور کی دم کا جوڑ ہوتا ہے اور عام طور پر اس کو ریڑھ کی ہڈی سے تعبیر کیا جاتا ہے بعض روایتوں میں عجب الذنب میں ”عجب“ کے بجائے ”عجم“ کا لفظ ہے ویسے ”عجب اور ”عجم“ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اصل اور جڑ، نیز ذنب“ کے معنی دم کے ہیں، مذکورہ ہڈی چونکہ اس جگہ ہوتی ہے جہاں دم کا جوڑ ہوتا ہے اس لئے اس کا نام عجب الذنب یا عجم الذنب ہے حاصل یہ کہ ریڑھ کی ہڈی گویا انسان کا بیج ہے کہ اسی سے ابتدائی تخلیق ہوتی ہے اور قیامت کے دن دوبارہ اسی کے ذریعہ تمام اعضاء جسمانی کو از سر نو ترکیب دیا جائے گا بس مرنے کے بعد انسان یا کوئی بھی جاندار گل سڑکر نابود ہوجاتا ہے اور اس کے پورے جسم کی ہڈیوں کو مٹی کھا جاتی ہے مگر ریڑھ کی ہڈی نہ تو گلتی سڑتی ہے اور نہ اس کو مٹی کھاتی ہے واضح رہے کہ یہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہے جن کے بدن گل سڑجاتے ہیں پیغمبر لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کا سارا بدن محفوظ رہتا

ہے اور اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو کھانا حرام کیا ہے، یہی بات ان لوگوں کے حق میں کہی جاسکتی ہے جو اس بارے میں انبیاء کے حکم میں ہیں یعنی شہداء اور اولیاء اللہ، اور وہ موذن جو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اذان دیتے ہیں چنانچہ یہ سب لوگ اپنی قبروں میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ لوگ ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی کبریائی و جبروت کا اظہار

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْبِضُ اللّٰهُ الْاَرْضَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَطْوِي السَّمَآءَ بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَيْنَ مُلُوْكُ الْاَرْضِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زمین کو اپنے پنجہ میں لے لے گا اور آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا اور پھر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں (یعنی بادشاہت میرے علاوہ اور کسی کو سزاوار نہیں میں ہی شہنشاہ ہوں) کہاں ہیں وہ لوگ جو زمین پر اپنی بادشاہی کا دعوی کرتے تھے؟۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "زمین کو اپنے پنجہ میں لے لینے اور آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ میں لپیٹ لینے" سے مراد شاید اللہ تعالیٰ کا ان دونوں (زمین وآسمان) کو تبدیل کر دینا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ یا یہ کہ یہ الفاظ دراصل حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور جلال سے کنایہ ہیں اور اس طرف اشارہ کرنے کے لئے ہیں کہ وہ عظیم کارنامے اور افعال جن کے سامنے پوری کائنات انسانی کی عقلیں حیران ہیں اللہ رب العزت کی نظر میں بالکل حقیر، بے وقعت ہیں نیز پورے عالم کو آن واحد میں زیر وزبر کر دینا اور آسمان وزمین کو نیست ونابود کر دینا اس کی قدرت کے آگے بالکل آسان کام ہے اور چونکہ آسمان کو زمین کی بہ نسبت زیادہ شرف وعظمت حاصل ہے اس لئے اس کو دائیں ہاتھ کے ساتھ مخصوص کیا جو بائیں ہاتھ سے زیادہ شرف و فضیلت رکھتا ہے، پس پروردگار زمین کو مٹھی میں لے گا اور آسمانوں کو داہنے ہاتھ پر (جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے لپیٹ لے گا۔

(۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَطْوِي اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يَاْخُذُهُنَّ بِيَدِهِ الْيُمْنٰى ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَيْنَ الْجَبَّارُوْنَ اَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ ثُمَّ يَطْوِي الْاَرَضِيْنَ بِشِمَالِهٖ وَفِيْ رِوَايَةٍ يَاْخُذُهُنَّ بِيَدِهِ الْاُخْرٰى ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَيْنَ الْجَبَّارُوْنَ اَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آسمانوں کو لپیٹ لے گا اور پھر ان کو داہنے ہاتھ میں لے کر فرمائے گا کہ بادشاہ میں ہوں! کہاں ہیں ظلم وجبر کرنے والے، کہاں ہیں (اپنے جاہ وحشم پر تکبر کرنے والے؟ پھر زمینوں کو اپنے بائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ زمینوں کو اپنے دوسرے ہاتھ میں لے لے گا اور فرمائے گا۔ "بادشاہ میں ہوں کہاں ہیں بادشاہ یعنی وہ لوگ جو اپنے کو بادشاہ کہا کرتے تھے)؟ کہاں ہیں ظلم وجبر کرنے والے۔" (مسلمؒ)

قیامت کے دن کی کچھ باتیں یہودی عالم کی زبانی

(۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ جَآءَ حَبْرٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى اِصْبَعٍ وَّالْاَرَضِيْنَ عَلٰى اِصْبَعٍ وَّالْجِبَالَ وَالشَّجَرَ عَلٰى اِصْبَعٍ وَّالْمَآءَ وَالثَّرٰى عَلٰى اِصْبَعٍ وَّسَآئِرَ الْخَلْقِ عَلٰى اِصْبَعٍ ثُمَّ يَهُزُّهُنَّ فَيَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَنَا اللّٰهُ فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَجُّبًا مِّمَّا قَالَ الْحَبْرُ تَصْدِيْقًا لَّهٗ ثُمَّ قَرَأَ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہود کا ایک عالم حاضر ہوا اور کہنے لگا اے محمد ﷺ! قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آسمانوں کو ایک انگلی پر زمینوں کو ایک انگلی پر پہاڑوں اور درختوں کو ایک انگلی پر پانی اور پانی کے نیچے کی تر مٹی کو ایک انگلی پر اور باقی تمام مخلوقات کو انگلی پر رکھے گا اور انگلیوں کو ہلاتے ہوئے فرمائے گا، میں ہوں بادشاہ میں ہوں خدا (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ اس یہودی عالم کی زبانی ان باتوں پر اظہار تعجب کرتے ہوئے مسکرائے اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی وَمَاقَدَرُو اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ اور (افسوس ہے کہ) ان لوگوں نے (یعنی مشرکوں نے) خدائے تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ کی........ جیسی عظمت کرنا چاہئے تھی حالانکہ (اس کی وہ شان ہے کہ) ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹتے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں (اور کوئی دوسرا ایسا نہ ہے پس) وہ پاک و برتر ہے ان کے شرک سے (اس روایت کو بخاری نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "اللہ تعالیٰ آسمانوں کو ایک انگلی پر اور باقی تمام مخلوقات کو ایک انگلی پر رکھے گا اور ان انگلیوں کو ہلاتے ہوئے فرمائے گا" یہ سارے الفاظ بطور کنایہ و تمثیل ہیں اور حق تعالیٰ کی قدرت جلیلہ و عظمت کاملہ کے غلبہ و اظہار کی تصویر کشی کے لئے ہیں، نہ کہ انگلیوں اور انگلیوں کے ہلانے" کے حقیقی معنی ملحوظ و مقصود ہیں اس کی نظیر اہل عرب کا اسلوب بیان ہے کہ مثلاً وہ جب کسی شخص کو جود و سخاوت جیسے اوصاف کے ساتھ متصف کرنا چاہتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ "اس شخص کے دونوں ہاتھ فراخ و کشادہ ہیں اگرچہ وہ شخص اپنے دونوں ہاتھوں سے محروم ہی کیوں نہ ہو، کہ اس کے دونوں ہاتھ کسی حادثہ وغیرہ میں کٹ گئے ہوں یا پیدائشی طور پر بے ہاتھ والا ہو اسی طرح جب وہ کسی شخص کو سلطنت و حکومت کے وصف کے ساتھ ذکر کرنا چاہتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ "فلاں شخص تخت پر بیٹھا!" اگرچہ اس کے بیٹھنے کے لئے کبھی کوئی تخت یا کوئی بھی چیز نہ رہی ہو پس اگر اہل عرب کے ان محاورات اور اس اسلوب بیان پر نظر ہو تو پھر قرآن و حدیث کے ان متشابہات کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہو سکتی ہے جن میں خدا کی طرف ہاتھ، انگلی، پنڈلی اور تخت وغیرہ کی نسبت کی گئی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہاتھ سے یہ مراد ہے اور تخت سے یہ مراد ہے۔

اس یہودی عالم کی مذکورہ باتیں سن کر آنحضرت ﷺ کا اظہار تعجب کرنا اور مسکرانا اس کی تکذیب کے لئے نہیں تھا بلکہ اس کی تصدیق کے لئے اور اس کو راست گو ظاہر کرنے کے لئے تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے بعد میں مذکورہ بالا آیت کی تلاوت اسی لئے فرمائی تاکہ یہودی نے جو کچھ کہا ہے اس کی تفصیلی وضاحت ہو جائے۔

قیامت کے دن زمین و آسمان کی تبدیلی کے متعلق

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَوْلِهٖ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ فَاَيْنَ يَكُوْنُ النَّاسُ يَوْمَئِذٍ قَالَ عَلَى الصِّرَاطِ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے اس آیت يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ جس روز زمین بدل دی جائے گی اس زمین کو بدل دیا جائے گا اور ان کے علاوہ اور آسمان بھی (یعنی قیامت کے دن موجودہ زمین و آسمان کو بدل دیا جائے گا اور ان کے بجائے دوسرے زمین و آسمان پیدا کئے جائیں گے) کے بارے میں پوچھا کہ اس دن جب کہ زمین و آسمان کی تبدیلی واقع ہوگی) لوگ کہاں ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا "پل صراط پر۔" (مسلم)

تشریح: لفظ صراط کے اصل معنی "راستہ" کے ہیں اور یہاں حدیث میں "صراط" سے مراد "پل صراط" ہے یعنی وہ پل جس کے بارے میں شارع نے خبر دی ہے کہ وہ دوزخ کی پشت پر بنا ہوا ہے اور جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پل صراط کے بجائے کوئی بھی "صراط" مراد ہو۔

قیامت کے دن زمین کے تبدیل کیے جانے سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، جس میں سے ایک قول تو یہ ہے کہ قیامت کے دن زمین کو سفید روٹی میں تبدیل کر دیا جائے گا، چنانچہ اہل ایمان میدان حشر میں حساب سے فارغ ہونے کے وقت تک اپنے قدموں کے نیچے سے یہی روٹی توڑ توڑ کر کھاتے رہیں گے، اس قول کی تائید اسی حدیث سے بھی ہوتی ہے جو آگے آنے والے باب الحشر کی پہلی حدیث ہے، نیز آسمان کے تبدیل کیے جانے سے مراد یہ ہے کہ تارے ٹوٹ پھوٹ کر گر پڑیں گے اور چاند و سورج کو کہن کی صورت میں معطل و بیکار کر دیا جائے گا! اور طیبیؒ نے یہ کہا ہے کہ کسی بھی چیز کی تبدیلی دو صورتوں میں ہوتی ہے ایک تو ذات (یعنی اصل چیز) کی تبدیلی، جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ میں نے سونے کو چاندی میں تبدیل کر لیا ہے، یعنی سونا دیکر چاندی لے لی ہے اور دوسری صورت صفات کی تبدیلی ہے جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ میں نے چھلے کو انگوٹھی میں تبدیل کر لیا ہے یعنی چھلے کو پگھلا کر اس کی انگوٹھی بنوالی ہے۔ اس صورت میں ذات (یعنی اصل چیز مثلاً سونا یا چاندی، تو ایک ہی رہتی ہے البتہ اس کی حقیقت اور صورت بدل جاتی ہے۔ پس زمین و آسمان کے دوسری زمین اور دوسرے آسمان میں تبدیل کیے جانے والی بات ان دونوں صورتوں کا احتمال رکھتی ہے کہ اصل زمین و آسمان کی تبدیلی بھی مراد ہو سکتی ہے اور صفات یعنی ہیت و صورت کی تبدیلی بھی مراد ہو سکتی ہے، لیکن سلف کے زیادہ تر اقوال اس طرف ہیں کہ صفات کی تبدیلی مراد ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ زمین تو یہی زمین رہے گی البتہ اس کی صفات میں تغیر ہو جائے گا، اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد ہے کہ زمین کو اس طرح وسیع و کشادہ کر دیا جائے گا کہ اس میں کوئی نشیب و فراز باقی نہیں رہے گا تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ذات کی تبدیلی بالکل ناممکن ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اس زمین اور ان آسمانوں کی جگہ دوسری زمین اور دوسرے آسمان پیدا کر دے جیسا کہ بعض اقوال اس پر بھی دلالت کرتے ہیں، چنانچہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ ایک (نئی) زمین پیدا فرمائیں گے جو چاندی کی ہوگی اور جو آسمان پیدا فرمائیں گے وہ سونے کا ہوگا، اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی زمین پیدا فرمائیں گے جو سفید و پاکیزہ ہوگی اور اس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا، خود حدیث کے ظاہری اسلوب سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ "تبدیلی" سے ذات کا تغیر مراد ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کا سوال کرنا اور اس پر آنحضرت ﷺ کا جواب اس کی دلیل ہے۔

قیامت کے دن چاند و سورج بے نور ہو جائیں گے

⑥ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُكَوَّرَانِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن سورج اور چاند لپیٹ دیئے جائیں گے۔" (بخاریؒ)

حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں

⑦ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَیْفَ اَنْعَمُ وَصَاحِبُ الصُّوْرِ قَدِ الْتَقَمَهٗ وَاَصْغٰی سَمْعَهٗ وَحَتّٰی جَبْهَتَهٗ یَنْتَظِرُ مَتٰی یُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَقَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا تَاْمُرُنَا قَالَ قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "آرام و سکون سے کیسے بیٹھا رہوں جب کہ صور پھونکنے والا حضرت اسرافیل علیہ السلام) صور کو (پھونکنے کے لئے) منہ میں دبائے ہوئے ہیں، اپنا کان (بارگاہ حق جل مجدہ کی طرف) لگائے ہوئے ہیں کہ جب بھی حکم صادر ہو فوراً پھونک دیں) اور پیشانی جھکائے ہوئے (بالکل تیاری کی حالت میں) ہیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ کب صور پھونکنے کا حکم ملے" (یہ سن کر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ تو پھر آپ ﷺ ہمارے لئے کیا فرماتے ہیں؟ (یعنی آپ ﷺ ہمیں کیا تلقین فرماتے ہیں کہ ہم کسی بھی آفت اور سختی کے وقت کیا کریں) آپ ﷺ نے فرمایا (جب بھی کوئی آفت و مصیبت آئے تو بس حق تعالیٰ ہی کی طرف لو لگاؤ اسی کی بارگاہ

میں التجا کرو اور اس کے فضل و کرم پر بھروسہ واعتماد رکھو، نیز، یہ پڑھا کرو حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ اور ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔"

تشریح: "حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ" پڑھنا ایک ایسا عمل ہے جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ بڑی سے بڑی آفت ومصیبت اور سخت سے سخت مشکل کو دفع کر کے عافیت وسلامتی عطا فرماتا ہے، چنانچہ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی آگ میں ڈالا جانا تھا تو آپ کی زبان پر یہی بابرکت کلمہ تھا، اسی طرح ایک غزوہ (جہاد) کے موقع پر جب کچھ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ کہا کہ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ۔ یعنی دشمنوں نے آپ لوگوں کے مقابلہ کے لئے بڑا لاؤ لشکر جمع کر لیا ہے اور آپ (ﷺ) کو ان سے ڈرنا چاہئے تو آپ (ﷺ) نے یہی پڑھا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

صور کیا ہے؟

⑧ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الصُّوْرُ قَرْنٌ یُنْفَخُ فِیْہِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "صور ایک سینگ ہے جس کو پھونکا جائے گا۔" (ترمذی)

تشریح: "جس کو پھونکا جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ اس کو حضرت اسرافیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے دو مرتبہ پھونکیں گے ایک بار تو سب کو مارنے کے لئے اور دوسری بار سب کو جلانے کے لئے۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس سینگ یعنی صور کا وہ سرا جس کو حضرت اسرافیل علیہ السلام اپنے منہ میں لگائے پھونکنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں، گول ہے اور اس کی گولائی زمین اور آسمانوں کے برابر ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ناقور، راجفہ اور رادفہ کے معنی

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ الصُّوْرُ قَالَ وَالرَّاجِفَۃُ النَّفْخَۃُ الْاُوْلٰی وَالرَّادِفَۃُ الثَّانِیَۃُ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ فِیْ تَرْجَمَۃِ بَابٍ۔

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "نَاقُوْر" سے مراد صور ہے انہوں نے اس آیت یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ تَتْبَعُھَا الرَّادِفَۃُ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے) کہا کہ (راجفہ سے مراد پہلا صور پھونکا جانا اور رادفہ سے مراد دوسرا پھونکا جانا ہے (اس روایت کو بخاری نے ترجمۃ الباب میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: دونوں آیتیں مع ترجمہ اس طرح ہیں۔

① فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ ۝ فَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ ۝۔

"پھر جس وقت صور پھونکا جائے گا سو وہ وقت یعنی وہ دن کافروں پر ایک سخت دن ہوگا۔"

② یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ تَتْبَعُھَا الرَّادِفَۃُ ۝۔

"جس دن ہلا دینے والی چیز (زمین وپہاڑ اور تمام چیزوں کو) ہلا ڈالے گی جس کے بعد ایک پیچھے آنے والی آئے گی۔"

"راجف" اصل میں "رجف" سے نکلا ہے جس کے معنی ہلنے اور لرزنے کے ہیں اور "رادفۃ" کا لفظ ردف سے نکلا ہے جس کے معنی

ہیں کسی چیز کا کسی چیز کے پیچھے پیچھے پہنچنا۔

نفخ صور کے وقت جبرئیل علیہ السلام ومیکائیل علیہ السلام حضرت اسرافیل علیہ السلام کے دائیں بائیں ہونگے

⑩ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ ذَکَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَاحِبَ الصُّوْرِ وَ قَالَ عَنْ یَّمِیْنِہٖ جِبْرَئِیْلُ وَعَنْ یَّسَارِہٖ مِیْکَائِیْلُ

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے صور پھونکنے والے یعنی حضرت اسرافیل علیہ السلام کا ذکر کیا اور فرمایا کہ صور پھونکنے کے وقت) ان کے دائیں جانب حضرت جبرئیل علیہ السلام ہوں گے اور بائیں جانب حضرت میکائیل علیہ السلام۔"

دوبارہ زندہ کرنے کا ذکر

⑪ وَعَنْ اَبِیْ رَزِیْنِ الْعُقَیْلِیِّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ یُعِیْدُ اللّٰہُ الْخَلْقَ وَمَا اٰیَۃُ ذٰلِکَ فِیْ خَلْقِہٖ قَالَ اَمَامَرَرْتَ بِوَادِیْ قَوْمِکَ جَدْبًا ثُمَّ مَرَرْتَ بِہٖ یَھْتَزُّ خَضِرًا قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَتِلْکَ اٰیَۃُ اللّٰہِ فِیْ خَلْقِہٖ کَذٰلِکَ یُحْیِ اللّٰہُ الْمَوْتٰی۔ رواھما رزین۔

"اور حضرت ابورزین عقیلیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ خداوند تعالیٰ مخلوقات کو دوبارہ کس طرح زندہ کر کے اٹھائے گا (جب کہ ان کے جسم وبدن گل سڑ کر خاک ہو چکے ہوں گے) اور کیا اس کے لئے موجودہ مخلوقات میں (ایسی) کوئی نشانی ہے (جس کو دیکھ کر دوبارہ زندہ کئے جانے کے نظریہ پر استدلال کیا جا سکے؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم کبھی قحط اور خشک سالی کے زمانہ میں اپنی قوم کے جنگل اور کھیتوں کے درمیان سے گزرے ہو، وہاں سبزہ کا نام ونشان تک نظر نہیں آیا ہوگا (بلکہ ساری زمین بالکل بنجر اور خشک نظر آئی ہوگی) پھر جب تم (بارش کے بعد وہاں سے گزرے ہو گے تو تمہیں (پورے علاقہ میں) لہلہاتا ہوا سبزہ نظر آیا ہوگا میں نے عرض کیا کہ ہاں ایسا ہوتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا "پس مخلوقات میں قدرت الٰہی کی یہی نشانی ہے اور اللہ تعالیٰ مردوں کو اس طرح زندہ کرے گا ان دونوں روایتوں کو رزین نے نقل کیا ہے۔"

بَابُ الْحَشْرِ

حشر کا بیان

"حشر" کے اصل معنی ہیں جمع کرنا، اکٹھا کرنا، ہانکنا! چنانچہ قیامت کے دن کو یوم الحشر (حشر کا دن) اسی اعتبار سے کہتے ہیں کہ اس دن تمام مردے اپنی قبروں وغیرہ سے زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور سب کو اس جگہ پر جمع کیا جائے گا جس کو "محشر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ حشر دو ہوں گے، ایک تو مذکورہ بالا معنی میں قیامت آنے کے بعد اور دوسرے حشر کا تعلق قیامت سے پہلے علامات قیامت سے ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے کہ ایک آگ مشرق کی طرف سے نمودار ہوگی جو لوگوں کو گھیر کر زمین شام کی طرف لے جائے گی اور وہاں اکٹھا کر دے گی! یہاں عنوان باب میں "حشر" کے پہلے معنی مراد ہیں، اگرچہ اس باب میں بعض ایسی احادیث بھی نقل ہوں گی جو بظاہر دونوں معنی کا احتمال رکھتی ہیں، اسی لئے علماء کے ان کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں کہ بعض حضرات نے ان کو دونوں معنی پر محمول کیا ہے اور بعض نے ان کے خلاف کہا ہے اور زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ ان احادیث کا محمول پہلے ہی معنی ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حشر کا میدان

① عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى اَرْضٍ بَيْضَاءَ عَفْرَاءَ كَقُرْصَةِ النَّقِيِّ لَيْسَ فِيْهَا عَلَمٌ لِاَحَدٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کو ایسی سرخی مائل سفید زمین پر جمع کیا جائے گا جو (رنگ اور گولائی کے اعتبار سے" چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کے مانند ہوگی اور اس زمین پر کسی (کے مکان و عمارت وغیرہ) کا کوئی نشان نہیں ہوگا (بلکہ ہموار چٹیل میدان ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اہل جنّت کا پہلا کھانا

② وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَكُوْنُ الْاَرْضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خُبْزَةً وَّاحِدَةً يَتَكَفَّأُهَا الْجَبَّارُ بِيَدِهٖ كَمَا يَتَكَفَّأُ اَحَدُكُمْ خُبْزَتَهٗ فِي السَّفَرِ نُزُلًا لِاَهْلِ الْجَنَّةِ وَاَتٰى رَجُلٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ فَقَالَ بَارَكَ الرَّحْمٰنُ عَلَيْكَ يَا اَبَا الْقَاسِمِ اَلَا اُخْبِرُكَ بِنُزُلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قَالَ بَلٰى قَالَ تَكُوْنُ الْاَرْضُ خُبْزَةً وَّاحِدَةً كَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْنَا فَضَحِكَ حَتّٰى بَدَتْ نَوَاجِذُهٗ ثُمَّ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكَ بِاِدَامِهِمْ بَالَامُ وَالنُّوْنُ قَالُوْا وَمَا هٰذَا قَالَ ثَوْرٌ وَّنُوْنٌ يَاْكُلُ مِنْ زَائِدَةِ كَبِدِهِمَا سَبْعُوْنَ اَلْفًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن ساری زمین ایک روٹی ہوگی جس کو خداوند جبار اپنے ہاتھوں سے اس طرح الٹے پلٹے گا جس طرح تم میں سے کوئی شخص سفر کے دوران الٹ پلٹ کر کے (یعنی جلدی) روٹی پکاتا ہے اور یہ روٹی جنتیوں کی مہمانی ہوگی" آنحضرت ﷺ کے یہ فرمانے کے بعد ایک یہودی آیا اور کہنے لگا کہ اے ابوالقاسم! خدائے پاک مہربان آپ ﷺ پر برکت نازل کرے کیا میں آپ ﷺ کو بتاؤں کہ قیامت کے دن جنتیوں کی مہمانی کے طور پر پہلا کھانا کیا ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں بتاؤ! اس یہودی نے کہا کہ ساری زمین ایک روٹی ہوگی، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے (تعجب کے اظہار اور ہمیں یہ بتانے کے لئے کہ یہودی ٹھیک کہہ رہا ہے چاروں طرف دیکھا اور ہنس دیے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی کیچلیاں نظر آنے لگیں اس کے بعد اس یہودی نے کہا کہ کیا میں آپ ﷺ کو بتاؤں کہ جنتیوں کا سالن کیا ہوگا (جس سے وہ روٹی لگا کر کھائیں گے) وہ "بالام" اور "نون" ہے صحابہؓ ("بالام" کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے کیونکہ وہ عبرانی لفظ تھا اس لئے انہوں) نے کہا کہ یہ بالام کیا چیز ہوتی ہے کہا کہ (بالام کا مطلب) بیل ہے اور نون (کے بارے میں تم لوگ جانتے ہی ہو کہ مچھلی کو کہتے ہیں) اور ان دونوں یعنی بیل اور مچھلی کے گوشت کے اس ٹکڑے سے جو جگر کا زائد ہوتا ہے، ستر ہزار آدمی روٹی کھائیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اپنے ہاتھوں سے اس طرح الٹے پلٹے گا" کے ذریعہ اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح روٹی پکانے والا شخص روٹی گھڑنے اور اس کو گول (برابر اور باریک کرنے کے لئے اس کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر ہیرتا پھیرتا ہے پھر توے یا گرم بھوبل پر اس کو الٹ پٹ کر سینکتا ہے اسی طرح یہ زمین بھی الٹی پلٹی جائے گی اور اس کو روٹی بنا دیا جائے گا! واضح رہے کہ حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن یہ زمین روٹی ہو جائے گی اور جنّت میں جانے والوں کا کھانا بنے گی کہ وہ جنّت میں جانے کے وقت پہلے اس کو کھائیں گے پس حضرات نے حدیث کے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی ہی پر محمول کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بات حق تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں ہے وہ اس پر قادر ہے کہ اس زمین کو روٹی بنا دے اور اہل جنّت کو کھانے کے لئے دے! لہٰذا زیادہ صحیح یہی ہے کہ

حدیث کا یہی ظاہری مفہوم مراد لیا جائے اور اس بارے میں کسی شک وشبہ کو در آنے کا موقع نہ دیا جائے۔ ویسے کچھ حضرات نے حدیث کے ان مذکورہ الفاظ کو اس کے ظاہری معنی پر حمل نہ کر کے تاویل و توجیہ کا راستہ اختیار کیا ہے، لیکن ان کی ان تاویلات و توجیہات کو طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔

"آنحضرت ﷺ نے ہماری طرف دیکھا اور ہنس دیئے" اس یہودی عالم نے جو کچھ بیان کیا وہ توریت میں پڑھ کر بیان کیا تھا اور اس کی وہ باتیں گویا آنحضرت ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرتی تھیں علاوہ ازین وہ باتیں صحابہؓ کے یقین اور قوت ایمان میں اضافہ کا سبب بھی بنی تھیں اس لئے آنحضرت ﷺ ان پر اظہار اطمینان کے لئے ہنسے اور اس طرح ہنسے کہ آپ ﷺ کی کچلیاں ظاہر ہو گئیں۔

"ستر ہزار آدمی" سے مراد وہ بندگان خاص ہیں جو حساب و مواخذہ کے مراحل سے گزرے بغیر جنت میں جائیں گے اور جن کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح روشن و تابناک ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ "ستر ہزار" سے مخصوص عدد مراد نہ ہو بلکہ محض کثرت مبالغہ مراد ہو۔

"زائدہ کبد" (یعنی جگر کا زائد حصہ) اصل میں جگر ہی کے اس چھوٹے ٹکڑے کو کہتے ہیں جو اسی کے ساتھ ایک جانب ہوتا ہے اس حصہ کو بہت لذیذ اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔

ایک احتمال یہ ہے کہ صحابہؓ کے پوچھنے پر "بالام" کے جو معنی بیان کیے گئے وہ اس یہودی عالم نے نہیں بلکہ خود آنحضرت ﷺ نے بیان کیے ہوں، اور ہوا یہ ہو کہ جب صحابہؓ اس لفظ کے معنی نہ سمجھے اور انہوں نے اس بارے میں سوال کیا تو اس سے پہلے کہ یہودی عالم جواب دیتا آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی اس عبرانی لفظ کے معنی بتا دیے گئے اور آپ ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے بیان فرما دیئے۔

حشر کا ذکر

③ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰی ثَلٰثِ طَرَآئِقَ رَاغِبِیْنَ رَاهِبِیْنَ وَاثْنَانِ عَلٰی بَعِیْرٍ وَثَلٰثَةٌ عَلٰی بَعِیْرٍ وَّاَرْبَعَةٌ عَلٰی بَعِیْرٍ وَّعَشَرَةٌ عَلٰی بَعِیْرٍ وَتَحْشُرُ بَقِیَّتَهُمُ النَّارُ تَقِیْلُ مَعَهُمْ حَیْثُ قَالُوْا وَتَبِیْتُ مَعَهُمْ حَیْثُ بَاتُوْا وَتُصْبِحُ مَعَهُمْ حَیْثُ اَصْبَحُوْا وَتُمْسِیْ مَعَهُمْ حَیْثُ اَمْسَوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" حشر میں لوگوں کو تین قسموں میں جمع کیا جائے گا ایک قسم کے لوگ تو وہ ہوں گے جو بہشت کے خواہشمند ہیں، دوسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو دوزخ سے ڈرنے والے ہیں، اور ان دونوں قسموں میں سے جو لوگ سواری پر ہوں گے ان کی صورت یہ ہوگی کہ) دو ایک اونٹ پر سوار ہوں گے (یعنی جس شخص کا مرتبہ جتنا زیادہ بلند ہوگا وہ اتنے ہی کم آدمیوں کے ساتھ سواری پر ہوگا اور نہایت آرام و کشادگی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوگا اور جس کا مرتبہ جتنا ادنی ہوگا وہ اتنے ہی زیادہ آدمیوں کے ساتھ سواری پر ہوگا اور تنگی کے ساتھ بیٹھا ہوگا) اور تیسری قسم باقی تمام لوگوں پر مشتمل ہوگی جن کو آگ جمع کرے گی اور وہ آگ ہر وقت ان لوگوں کے ساتھ رہے گی اور کسی وقت بھی ان سے الگ نہیں ہوگی یہاں تک کہ، جہاں وہ لوگ قیلولہ کریں گے (یعنی استراحت کے لئے رکیں گے، آگ بھی وہیں قیلولہ کرے گی، جہاں وہ لوگ رات گزاریں گے وہیں ان کے ساتھ ہی رات گزارے گی، جہاں وہ لوگ صبح کریں گے وہیں آگ بھی ان کے ساتھ صبح کرے گی اور جہاں وہ لوگ شام کریں گے وہیں آگ بھی ان کے ساتھ شام کرے گی۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ملا علی قاریؒ کے مطابق "تین قسموں" میں سے ایک یعنی پہلی قسم کے لوگ تو سوار ہوں گے اور باقی دونوں قسموں کے لوگ پیدل اور منہ کے بل چلنے والے ہوں گے جیسا کہ آگے دوسری فصل میں آنے والی حدیث سے واضح ہوگا! لیکن بعض شارحین نے کہا ہے کہ پہلی دونوں قسموں کے لوگ سواریوں پر ہوں گے اور باقی تمام لوگ پیدل چلتے ہوئے آئیں گے، نیز انہوں نے کہا ہے کہ اونٹ

سواریوں کی مذکورہ تعدادوں کا ذکر دراصل ان دونوں قسموں کے لوگ کے فرقی مراتب کی تفصیل کو بطور کنایہ و تمثیل بیان کرنے کے لئے ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ عالی مرتبہ ہو گا وہ اتنی ہی زیادہ راحت و سہولت اور سرعت و سبقت کے ساتھ میدان حشر میں پہنچے گا۔

پہلی دونوں قسموں کا تعلق اہل ایمان سے ہے جن میں سے ایک تو وہ لوگ ہوں گے جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے امیدوار رہتے ہیں اور اس نے اپنے نیک بندوں کے لئے جنت اور وہاں کی نعمتوں کا جو وعدہ کیا ہے اس کا اشتیاق ان پر غالب رہتا ہے اور یہ وہ بندگان خاص ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو اس کے عذاب کے خوف میں رہتے ہیں اور دوزخ کی آگ کا ڈر ان پر غالب رہتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی امید و اشتیاق میں کی جانے والی طاعت و عبادت سے افضل ہے جو اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف سے کی جائے۔

"چار ایک اونٹ پر اور دس ایک اونٹ پر ہوں گے۔" چار اور دس کے درمیان کے دوسرے اعداد کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ ان کو ذکر کردہ اعداد پر قیاس کر کے مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے! اسی طرح "ایک اونٹ پر ایک آدمی کا سوار ہونا" ذکر نہیں کیا گیا ہے جب کہ یقینی طور پر محشر میں آنے والوں میں ایسے افراد بھی ہوں گے جو اپنے اپنے اونٹ پر تنہا ہوں گے اور ان کی سواری میں ان کا کوئی شریک نہیں ہو گا! تو اصل بات یہ ہے کہ وہ انبیاء اور رسولوں کا مرتبہ ہے اور یہاں انبیاء اور رسولوں کے حشر کا نہیں بلکہ "لوگوں" کے حشر کا ذکر کرنا مقصود ہے! ایک بات یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ایک ایک اونٹ پر دو اور دو سے زائد لوگوں کے سوار ہونے کی دونوں صورتیں محتمل ہو سکتی ہیں یا تو یہ ہو گا کہ ایک اونٹ جتنے لوگوں کی سواری کے لئے متعین ہو گا وہ سب لوگ اس پر ایک ساتھ بیٹھیں گے، اور یا یہ ہو گا کہ تناوب (باری متعین کرنے) کے طور پر بیٹھیں گے، کہ ہر شخص باری باری سے سوار ہوتا رہے گا۔

اب آخر میں یہ بات جان لیجئے کہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ یہاں حدیث میں لوگوں کو محشر میں جمع کیے جانے کا جو ذکر ہے اس کا تعلق کس وقت سے ہے؟ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ اس حشر کا ذکر ہے جو قیامت کے دن آخرت میں بڑا ہو گا اور ہر شخص کو دوبارہ زندہ کر کے محشر میں لایا جائے گا، جب کہ بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ یہ آخرت کے حشر کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ "حشر" مراد ہے جو قیامت کے قریب واقع ہو گا کہ لوگوں کو تمام علاقوں سے اکٹھا کر کے ملک شام کے علاقہ میں ایک جگہ کہ جس کو "محشر" ہی سے تعبیر کیا گیا ہے جمع کیا جائے گا، اور جس کو قیامت کی علامت میں سے کہا گیا ہے، ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ آخرت میں جو حشر ہو گا اس میں تمام لوگ پاپیادہ ہوں گے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ آخرت میں کئی حشر ہوں گے ایک تو قبر سے نکلتے وقت اور تمام لوگوں کے دوبارہ زندہ کئے جانے کے فوراً بعد، اور دوسرا حشر اس کے بعد ہو گا! اس میں بعضوں کو سواریاں ملیں گی اور بعض پیدل اور بعض منہ کے بل چل کر آئیں گے! بہر حال زیادہ صحیح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کا حشر مراد ہے۔

میدان حشر میں ہر شخص ننگے بدن، ننگے پاؤں اور غیر مختون آئے گا

④ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّكُمْ مَحْشُوْرُوْنَ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا ثُمَّ قَرَأَ كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ وَاَوَّلُ مَنْ يُّكْسٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِبْرَاهِيْمُ وَاِنَّ نَاسًا مِّنْ اَصْحَابِيْ يُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَاَقُوْلُ اُصَيْحَابِيْ اُصَيْحَابِيْ فَيَقُوْلُ اِنَّهُمْ لَنْ يَّزَالُوْا مُرْتَدِّيْنَ عَلٰى اَعْقَابِهِمْ مُذْ فَارَقْتَهُمْ فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ اِلٰى قَوْلِهِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباس نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "تمہیں (قیامت کے دن) اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ تم ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بے ختنہ ہو گے" اس کے بعد آپ ﷺ نے (بطور دلیل واستشہاد) یہ آیت پڑھی كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ

نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ یعنی، جس طرح ہم نے ان کو ابتداء پیدائش میں (ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بے ختنہ ماں کے پیٹ سے) پیدا کیا تھا اسی طرح ان کو دوبارہ (قیامت کے دن) پیدا کریں گے یعنی قبروں سے اٹھائیں گے یہ وعدہ (کہ ہم اِن کو دوبارہ پیدا کریں گے) ہم پر لازم ہے اور یقیناً ہم (نے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا) کرنے والے ہیں پھر آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن ان لوگوں میں سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں (پھر فرمایا) اور (اس وقت جب کہ لوگوں کو میدان حشر سے جنت اور دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا، میں دیکھوں گا کہ) میرے کچھ صحابہ کو پکڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف (یعنی دوزخ کی طرف) لے جایا جارہا ہے، میں یہ دیکھ کر بطریق حیرت واستعجاب اور ان کو نجات دلانے کے لئے) کہونگا کہ یہ میرے صحابی ہیں یہ میرے صحابی ہیں (ان کو کہاں لے جاتے ہو؟) خداوند تعالیٰ فرمائے گا۔ (بیشک یہ تمہارے صحابی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ) جب سے تم ان سے جدا ہوئے، یہ برابر دین سے برگشتہ اور پھرے رہے (اس لئے ان کو دوزخ میں بھیجا جارہا ہے) میں (یہ سن کر) وہی کہوں گا جو بندہ صالح یعنی حضرت عیسی علیہ السلام نے کہا تھا کہ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّادُمْتُ فِيهِمْ۔ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ تک یعنی جب تک میں ان کے درمیان رہا، میں ان کے احوال سے واقف رہا الخ۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "اور بے ختنہ ہوں گے" میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن جب مردے اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو ان کے جسم وبدن کے تمام اجزاء یک جا ہو کر مل جائیں گے اور پورا جسم اسی طرح کا ہو جائے گا جیسا کہ اس دنیا میں تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ ختنہ کی وہ کھال جو کاٹ کر پھینک دی جاتی ہے اور جو اس دنیا میں ضائع کر دیئے جانے کے قابل ہے جب وہ قیامت کے دن اپنی جگہ (یعنی ختنہ کے مقام پر) واپس آکر جسم کا حصہ بن جائے گی تو دوسرے اجزاء جیسے بال اور ناخن وغیرہ بطریق روئی پیدا ہوں گے اور اپنی اپنی جگہ لگ جائیں گے! پس یہ حقیقت نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ کے کمال علم اور کائنات کے ایک ایک جزو کل پر اس کے محیط ہونے کی دلیل ہے بلکہ اشیاء ممکنات کے تعلق سے اس کی قدرت کاملہ کی لامتناہی وسعتوں کی بھی علامت ہے۔

سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ فضیلت محض اس لئے حاصل ہوگی وہ ان لوگوں میں سب سے پہلے شخص ہیں جو فقراء اور ضرورت مندوں کو کپڑے پہناتے ہیں اور ان کی ستر پوشی کرتے ہیں یا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ سب سے پہلے شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے لباس کیا گیا تھا جب کہ انہیں نمرود کی آگ میں ڈالا گیا تھا بس ان کی یہ مخصوص نوعیت کی فضیلت ہمارے پیغمبر ﷺ پر ان کی افضلیت کو ثابت نہیں کرتی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنایا جانا ان کے اس اعزاز و اکرام کے طور پر ہو گا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے روحانی اور دینی باپ ہیں علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو اولیت حاصل ہوگی وہ حقیقی ہے یا اضافی؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ اولیت حقیقی نہیں ہے بلکہ اضافی ہے یعنی ان کو آنحضرت ﷺ کے علاوہ اور تمام لوگوں میں سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا! اس کی تائید اسی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جن کپڑوں میں دفن کیا گیا ہے آپ ﷺ قیامت کے دن انہیں کپڑوں میں اٹھ کر (میدان حشر میں) آئیں گے نیز جامع صغیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے ترمذی کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

انا اول من تنشق عنه الارض فاكسى حلة من حلل الجنة ثُمَّ اقوم عن يمين العرش لَيْسَ احد من الخلائق يقوم ذٰلِكَ المقام غيرى۔

"(قیامت کے دن) سب سے پہلے میں زمین سے پھٹ کر اٹھونگا اور جنت کا لباس پہنوں گا اور پھر عرش کے دائیں طرف کھڑا ہوں گا اور اس جگہ مخلوقات میں سے میرے علاوہ کسی اور کو کھڑا ہونا نصیب نہیں ہوگا۔"

"میں وہی کہوں گا جو بندہ صالح حضرت عیسی علیہ السلام نے کہا تھا الخ یعنی جس طرح حضرت عیسی علیہ السلام قیامت کے دن اپنی قوم کی گمراہی اور بدعقیدگی و بدعملی سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے، اور اپنی گمراہ قوم کے معاملہ کو حق تعالیٰ کے عدل و انصاف پر چھوڑ دیں گے اسی طرح میں بھی یہی کہوں گا کہ پروردگار! میری اُمت کے یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں میری موجودگی کے درمیان ایمان وعمل کی سیدھی راہ پر گامزن تھے اور میں ان کا نگہبان و ذمہ دار تھا۔ لیکن جب میں دنیا سے اٹھ گیا تو انہوں نے اپنے نفس اور شیطان کے فریب میں مبتلا ہو کر گمراہی کو اختیار کر لیا، اب ان کا معاملہ تیرے اوپر موقوف ہے، تیری عادل و منصف بارگاہ ان کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے وہ سراسر عادلانہ اور منصفانہ ہوگا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس بات کو واضح کرنے کے لئے حضرت عیسی علیہ السلام کے تعلق سے قرآن کریم کی جو آیت پڑھی وہ پوری یوں ہے وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ یعنی (قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ نصاریٰ کو سنانے اور ان کو شرمندہ کرنے کے لئے حضرت عیسی علیہ السلام سے فرمائے گا کہ کیا تم نے اپنی قوم کو عقیدہ تثلیث یعنی تین خدا ماننے کی تلقین و تبلیغ کی تھی تو حضرت عیسی علیہ السلام اپنی برأت کا اظہار کریں گے اور کہیں گے کہ میں نے تو ان کو صرف تیری بندگی کرنے کی تلقین و تبلیغ کی تھی اور) جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا ان پر مطلع رہا (اور ان کی نگہبانی کرتا رہا کہ یہ لوگ صحیح عقیدہ عمل کی روشنی سے دور نہ جا پڑیں) لیکن جب آپ نے مجھے (اس دنیا) سے اٹھالیا (اور ان کے اوپر سے میری نگہبانی ختم ہو گئی تو) پھر صرف آپ ان کے احوال پر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری واقفیت رکھتے ہیں اب اگر (ان کی بدعقیدگی و بدعملی کے لئے) آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو معاف فرما دیں تو بیشک زبردست حکمت والے ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں حدیث میں "صحابہ" سے مراد وہ صحابہ نہیں ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی آپ سے نسبت حاصل رہی اور جن کو حقیقت میں "صحابہ" کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے بارے میں یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان میں سے کوئی بھی صحابی مرتد نہیں ہوا اور نہ کسی نے عقیدہ وعمل کی کوئی ایسی گمراہی اختیار کی جس کی بنا پر انہیں دوزخی کہا جا سکے، لہٰذا "صحابہ" سے مراد وہ اجڈ دیہاتی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشرف باسلام ہو گئے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب اور اسود وغیرہ کے اتباع کرنے کے سبب مرتد ہو گئے تھے۔

میدان حشر میں سب لوگ ننگے ہوں گے

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ جَمِيْعًا يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ فَقَالَ يَا عَائِشَةُ الْاَمْرُ اَشَدُّ مِنْ اَنْ يَّنْظُرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن (میدان حشر میں) لوگوں کو ننگے پاؤں اور ننگے بدن جمع کیا جائے گا" (حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ) میں نے یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا مرد و عورت سب کا یہی حال ہوگا اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو عریاں دیکھیں گے؟ یعنی اس طرح تو عورتیں مردوں کو اور مرد عورتوں کو ننگا دیکھیں گے تو پھر سب کو عریاں حالت میں جمع کرنے میں کیا مصلحت و حکمت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عائشہؓ اس دن کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہولناک ہوگا کہ کوئی کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن میدان حشر میں گو تمام لوگ ننگے آئیں گے لیکن ہر شخص کی عریانیت ایک دوسرے کی نگاہ سے اوجھل ہوگی اور کوئی کسی کو ننگا نہیں دیکھے گا کیونکہ اس دن کا معاملہ ہی ایسا ہوگا کہ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں مستغرق ہوگا ہر طرف نامہ اعمال پھیلے ہونگے اور لوگ حساب و مواخذہ کے مراحل اور قیامت کی ہولناکیوں میں اس طرح گرفتار ہونگے کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوگی کہ کون

کس حال میں ہے اور کسی کو کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

دوزخی منہ کے بل چل کر میدان حشر میں آئیں گے

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً قَالَ يَانَبِيَّ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْشَرُ الْكَافِرُ عَلٰى وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ اَلَيْسَ الَّذِىْ اَمْشَاهُ عَلَى الرِّجْلَيْنِ فِى الدُّنْيَا قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يُّمْشِيَهٗ عَلٰى وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یانبی اللہ (ﷺ)، قیامت کے دن کافر منہ کے بل چل کر کس طرح میدان حشر میں آئیں گے یعنی کسی کے لئے منہ کے بل چلنا کیسے ممکن ہوگا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ جس ذات (یعنی اللہ تعالیٰ) نے اس (کافر) کو دنیا میں پاؤں کے بل چلایا وہی ذات اس کو قیامت کے دن منہ کے بل چلانے پر بھی قادر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا حشر

⑦ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَلْقٰى اِبْرَاهِيْمُ اَبَاهُ اٰذَرَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلٰى وَجْهِ اٰذَرَ قَتَرَةٌ وَّغَبَرَةٌ فَيَقُوْلُ لَهٗ اِبْرَاهِيْمُ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ لَا تَعْصِنِىْ فَيَقُوْلُ لَهٗ اَبُوْهُ فَالْيَوْمَ لَا اَعْصِيْكَ فَيَقُوْلُ اِبْرَاهِيْمُ يَارَبِّ اِنَّكَ وَعَدْتَنِىْ اَنْ لَّا تُخْزِيَنِىْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ فَاَىُّ خِزْيٍ اَخْزٰى مِنْ اَبِى الْاَبْعَدِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنِّىْ حَرَّمْتُ الْجَنَّةَ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ثُمَّ يُقَالُ لِاِبْرَاهِيْمَ اُنْظُرْ مَاتَحْتَ رِجْلَيْكَ فَيَنْظُرُ فَاِذَا هُوَ بِذِيْخٍ مُتَلَطِّخٍ فَيُؤْخَذُ بِقَوَائِمِهٖ فَيُلْقٰى فِى النَّارِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آذر سے اس حال میں ملیں گے کہ آذر کا چہرہ (غم وفکر کے سبب) سیاہ ہوگا اور غبار آلود ہوگا حضرت ابراہیم علیہ السلام (یہ دیکھ کر حسرت وافسوس کے ساتھ) کہیں گے کہ کیا (دنیا میں) تم سے یہ نہیں کہا کرتا تھا کہ (میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بتاتا اور تعلیم دیتا ہوں اس میں میری نافرمانی نہ کیا کر؟ ان کا باپ آذر ان سے کہے گا کہ میں آج کے دن تمہاری نافرمانی نہیں کرونگا (خدارا میری شفاعت کرو اور مجھے نجات دلاؤ) حضرت ابراہیم علیہ السلام (باپ کی یہ بات سن کر) عرض رسا ہوں گے کہ میرے پروردگار! تونے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس دن، جب لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا (میدان حشر میں) تو مجھ کو ذلیل ورسوا نہ کرے گا، پس میرے باپ کی رسوائی وذلت سے بڑی ذلت ورسوائی میرے لئے اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ تیری رحمت سے اسقدر دور ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ابراہیم علیہ السلام آج کے دن تمہارے باپ کے حق میں مغفرت ونجات کی تمہاری درخواست منظور نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ کافر ہے اور (حقیقت یہ ہے کہ میں نے جنت کو کافروں کے اوپر حرام کر دیا ہے" پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ نیچے دیکھو تمہارے پیروں میں کیا چیز ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام (یہ سن کر) اپنے پیروں کی طرف نگاہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ (ان کا باپ) آذر کفتار یعنی بجو کی شکل میں مٹی اور گوبر میں لتھڑا ہوا پڑا ہے پھر اس (آذر) کے پاؤں پکڑ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح : حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ آذر کی صورت کو بجو جیسے حقیر جانور کی شکل وصورت میں اس لئے بدل دیا جائے گا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل سے محبّت پدری جاتی رہے اور وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں یا اس لئے کہ ان کی سبکی نہ ہو کہ ان کا باپ دوزخ میں ڈالا گیا۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دنیا ہی میں اپنے باپ سے بیزار ہو گئے تھے اور اس سے اپنی برأت کا اظہار کر چکے تھے لیکن جب قیامت کے دن میدان حشر میں اس کو دیکھیں گے تو بے اختیار محبت پدری ان کے دامن گیر ہو جائے گی اور وہ اس کے لئے مغفرت ونجات کی خواہش کریں گے کہ شاید ان کی درخواست وشفاعت قبول ہو جائے۔ مگر جب ان کی درخواست وشفاعت قبول نہیں

ہوگی اور وہ اپنے باپ کو ایک حقیر شکل وصورت میں بدلا ہوا دیکھیں گے تو ناامید ہوجائیں گے اور اس سے ہمیشہ کے لئے اپنی برأت وبیزاری ظاہر کریں گے اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین نہیں تھا کہ ان کا باپ آذر کفر کی حالت میں مرا ہے، ان کا گمان تھا کہ ممکن ہے وہ پوشیدہ طور پر ایمان لے آیا ہو اور مجھے اس کی اطلاع نہ کی ہو اور شاید وہ قیامت کے دن اپنے اسی گمان کی بناء پر اس کے حق میں شفاعت کریں گے البتہ چونکہ ظاہری طور پر وہ کفر ہی کی حالت میں تھا اس لئے انہوں نے دنیا میں ظاہری احوال کا اعتبار کرتے ہوئے اس سے اپنی برأت وبیزاری کا اظہار کیا اور پھر جب قیامت میں اس کا کفر کی حالت میں مرنا یقین کے ساتھ معلوم ہوجائے گا تو اپنے باپ سے ان کی وہ بیزاری وبرأت (جو انہوں نے ظاہر کی تھی) ہمیشہ کے لئے ہوجائے گی۔

میدان حشر میں بہنے والا پسینہ

⑧ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْرَقُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يَذْهَبَ عَرَقُهُمْ فِي الْاَرْضِ سَبْعِيْنَ ذِرَاعًا وَيُلْجِمُهُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ اٰذَانَهُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن (میدان حشر میں جب حساب کتاب کی ابتداء ہوگی اور نامۂ اعمال کھلنے شروع ہوں گے تو) لوگوں کو پسینہ آئے گا اور وہ پسینہ اس قدر بہے گا کہ زمین کے اندر ستر گز تک چلا جائے گا اور ان کے لئے لگام بن جائے گا یہاں تک کہ ان کے کانوں تک پہنچ جائے گا یعنی وہ پسینہ ان کے دہنوں تک پہنچ کر لگام کی طرح ان کے منہ کو جکڑے گا کہ وہ بات چیت کرنے پر بھی قادر نہیں ہوسکیں گے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "لوگوں" سے سارے لوگ مراد ہیں ان میں جنات بھی شامل ہیں کہ ان کو بطریق ادنی پسینہ آئے گا اور بہے گا پس "جنات" کا ذکر نہ کرنا اکتفا کی قبیل سے ہے، نیز ظاہر یہ ہے کہ انبیاء اور اولیاء ان لوگوں سے مستثنیٰ ہوں گے واضح رہے کہ پسینہ کا اتنی شدت کے ساتھ آنا اور بہنا اس سبب سے ہوگا کہ وہ وقت سخت قسم کی ہولناکی کا ہوگا، نامہ، اعمال کھلنے پر حیا و خجالت اور ندامت وملامت کا غلبہ ہوگا، سورج کی تپش اور آگ کی لپک، بہت زیادہ ہوگی۔

یہ جو فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو اتنی کثرت سے پسینہ آئے گا کہ وہ ان کے لئے لگام بن جائے گا تو اس سلسلے میں زیادہ وضاحت آنے والی حدیث سے ہوگی جس سے معلوم ہوگا کہ پسینہ کی کثرت وشدت کے مختلف احوال ہوں گے جن سے لوگ اپنے اپنے مرتبہ اعمال کے اعتبار سے دوچار ہوں گے۔

میدان حشر میں سورج بہت قریب ہوگا

⑨ وَعَنِ الْمِقْدَادِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتّٰى تَكُوْنَ مِنْهُمْ كَمِقْدَارِ مِيْلٍ فَيَكُوْنُ النَّاسُ عَلٰى قَدْرِ اَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ فَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ اِلٰى كَعْبَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ اِلٰى حِقْوَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يُلْجِمُهُمُ الْعَرَقُ اِلْجَامًا وَاَشَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ اِلٰى فِيْهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مقداد کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "قیامت کے دن (میدان حشر میں) سورج کو مخلوق کے نزدیک کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ان سے ایک میل کے فاصلہ پر رہ جائے گا پس تمام لوگ اپنے اعمال کے بقدر پسینہ میں شرابور ہوں گے، چنانچہ ان میں سے بعض لوگ وہ ہوں گے جن کے ٹخنوں تک پسینہ ہوگا بعض لوگ وہ ہوں گے جن کے گھٹنوں تک پسینہ ہوگا، بعض لوگ وہ ہوں گے جو کمر تک پسینہ میں ڈوبے ہوں گے اور بعض لوگ وہ ہوں گے جن کے لئے ان کا پسینہ لگام بن جائے گا یعنی ان کے

دہانے تک پسینہ ہوگا بلکہ دہانے کے اندر تک پہنچ جائے گا یہ فرما کر رسول کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اپنے دہانہ، مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔" (مسلم)

تشریح: "میل" عربی میں کوس (یعنی ۱۷۶۰ گز کے فاصلہ) کو بھی کہتے ہیں اور سرمہ لگانے کی سلائی کو بھی کہا جاتا ہے، پس بعض حضرات نے تو ان سے ایک میل کے فاصلہ پر رہ جانے سے ایک کوس کے بقدر فاصلہ مراد لیا ہے اور بعض حضرات نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اس دن سورج سرمہ لگانے کی سلائی کے بقدر فاصلہ پر ہوگا! بہر حال اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ میدان حشر میں سورج لوگوں کے بہت نزدیک آجائے گا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اس دن لوگوں کو جو پسینہ آئے گا وہ ان کے اعمال کے مراتب کے بقدر ہوگا، چنانچہ سب سے کم پسینہ جن لوگوں کو ہوگا وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال بہت زیادہ اور اچھے ہوں گے، اور وہ لوگ صرف ٹخنوں تک پسینہ میں شرابور ہوں گے، اسی پر دوسروں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جس شخص کے نیک اعمال جتنے کم اور برے اعمال جتنے زیادہ ہوں گے وہ اتنا ہی زیادہ پسینہ میں غرق ہوگا۔

دو اشکال اور ان کا جواب: اس حدیث کے سلسلہ میں دو اشکال پیدا ہوسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس وقت سورج ہم سے کروڑوں میل کے فاصلہ پر ہونے کے باوجود اتنی زیادہ حرارت رکھتا ہے کہ اس کی براہ راست تمازت کسی انسان کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے، تو جب میدان حشر میں سورج صرف ایک میل کے فاصلہ پر رہ جائے گا تو اس کی حرارت و تمازت نہ صرف یہ کہ قابل برداشت کیسے ہوگی بلکہ اس کی زد میں آنے والے لوگ زندہ کیسے رہیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آخرت کے اجسام دنیا کے اجسام کی طرح نہیں ہوں گے اس لئے وہاں کے اجسام پر گزرنے والے احوال کو اس دنیا کے اجسام پر گزرنے والے احوال پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، علاوہ ازیں آخرت میں چونکہ موت نہیں ہوگی اس لئے وہاں لوگ سخت مشقت و تکلیف اٹھالیں گے دوسرا اشکال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جو پسینہ دریا کی موج کی طرح بعض لوگوں کے دہانوں تک پہنچ جائے گا تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ دوسرے لوگوں کے ٹخل تک پہنچ کر رک جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہر شخص کے پسینہ کو اس کے اعمال کے تناسب سے روکے رکھے گی کہ کسی کا پسینہ تو اس کے دہانوں تک پہنچ جائے گا اور کوئی اپنے پسینہ میں صرف ٹخنوں تک غرق رہے گا جیسا کہ اس کا مشاہدہ اس دنیا میں بھی ہوچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے دریائے نیل کی وہ موجیں جنہوں نے دوسروں کو غرقاب کر دیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لئے ساکن و جامد ہوگئی تھیں! علاوہ ازیں وہی بات یہاں بھی کہی جاسکتی ہے کہ آخرت کے معاملات بالکل جداگانہ نوعیت کے ہوں گے ان کو یہاں دنیا کے حالات و معاملات پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، وہاں کے تمام امور عادت اور دنیاوی نظام قدرت کے بالکل خلاف انوکھے طور پر ظاہر ہوں گے، کیا ایسا نہیں ہوتا کہ ایک قبر میں دو مردے ہوتے ہیں اور دونوں پر الگ الگ حالات طاری ہوتے ہیں کہ ان میں سے ایک تو عذاب میں مبتلا رہتا ہے اور دوسرا راحت و چین کے ساتھ ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے احوال سے بے خبر رہتے ہیں اور اس دنیا میں اس کی نظیر یہ ہے کہ دو شخص ایک طرح کی نیند سوتے ہیں اور وہ دونوں الگ الگ نوعیت کے خواب دیکھتے ہیں، ایک تو خواب دیکھ کر رنج و غم محسوس کرتا ہے اور دوسرا خواب دیکھ کر خوش ہوتا ہے اس کو بھی چھوڑیئے، کیا ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہی مکان میں دو آدمی رہتے ہیں، ان میں سے ایک تو صحت و شادمانی کی حالت میں ہوتا ہے اور دوسرا مرض و مصیبت میں مبتلا ہو کر رنج و تکلیف اٹھاتا ہے؟

اہل جنت کی سب سے بڑی تعداد اُمت محمدی پر مشتمل ہوگی

(۱۰) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی یَا اٰدَمُ فَیَقُوْلُ لَبَّیْکَ وَ سَعْدَیْکَ وَالْخَیْرُ کُلُّہٗ فِیْ یَدَیْکَ قَالَ اَخْرِجْ بَعْثَ النَّارِ قَالَ وَمَا بَعْثُ النَّارِ قَالَ مِنْ کُلِّ اَلْفٍ تِسْعَ مِائَۃٍ وَّتِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ فَعِنْدَہٗ

يَشِيبُ الصَّغِيْرُ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكْرٰى وَمَاهُمْ بِسُكْرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَاَيُّنَا ذٰلِكَ الْوَاحِدُ قَالَ اَبْشِرُوْا فَاِنَّ مِنْكُمْ رَجُلاً وَّمِنْ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ اَلْفٌ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اَرْجُوْا اَنْ تَكُوْنُوْا رُبُعَ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَكَبَّرْنَا فَقَالَ اَرْجُوْا اَنْ تَكُوْنُوْا ثُلُثَ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَكَبَّرْنَا فَقَالَ اَرْجُوْا اَنْ تَكُوْنُوْا نِصْفَ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَكَبَّرْنَا قَالَ مَآ اَنْتُمْ فِي النَّاسِ اِلَّا كَالشَّعْرَةِ السَّوْدَآءِ فِيْ جِلْدِ ثَوْرٍ اَبْيَضَ اَوْ كَشَعْرَةٍ بَيْضَآءَ فِيْ جِلْدِ ثَوْرٍ اَسْوَدَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "(قیامت کے دن میدان حشر میں) اللہ تعالیٰ آواز دے گا کہ اے آدم!" آدم جواب دیں گے کہ میں حاضر ہوں تیری تابعداری کے لئے تیار ہوں، ساری بھلائیاں تیرے ہی ہاتھوں میں ہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا "آگ والوں کے لشکر کو نکال لو یعنی ہمیں تمہاری اولاد میں سے جن لوگوں کو دوزخ میں بھیجنا منظور ہے ان کو علیحدہ کرلو۔" آدم عرض کریں گے کہ دوزخیوں کے لشکر کی تعداد (کا تناسب) کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے (یعنی دوزخوں کا تناسب یہ ہے کہ ہر ہزار میں سے ایک آدمی جنّت میں جائے گا اور باقی دوزخ میں ڈالے جائیں گے)! یہ حکم خداوندی سن کر چھوٹی عمر والا بوڑھا ہو جائے گا اور ہر حاملہ عورت اپنا حمل ضائع کردے گی۔ اور اس وقت) تم دیکھو گے کہ لوگ گویا نشہ میں مست ہیں حالانکہ وہ (شراب جیسے نشہ سے مست نہیں ہوں گے بلکہ عذاب الٰہی بہت سخت ہے (یعنی لوگوں کی وہ سرمستی و مدہوشی، عذاب خداوندی کے خوف و دہشت کی بناء پر ہوگی) صحابہؓ نے (جب یہ سنا کہ جنّت میں جانے والوں کا تناسب ہزار میں سے صرف ایک ہوگا تو انہوں نے خوف و حسرت سے) کہا کہ وہ ایک (جو ہزار میں سے نکل کر جنّت میں جائے گا) ہم میں کون ہوگا؟ آنحضرت ﷺ نے (ان کو سمجھانے اور تسلی دینے کے لئے) فرمایا اطمینان رکھو غم نہ کھاؤ (جنت میں جانے والا) ایک شخص تم میں سے ہوگا اور (دوزخ میں جانے والے ہزار شخص یاجوج و ماجوج میں سے ہوں گے پھر آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں امید رکھتا ہوں کہ (اے میری اُمّت کے لوگو) تم اہل جنّت کی مجموعی تعداد کا چوتھا حصّہ ہو گے ابوسعیدؓ کا بیان ہے کہ یہ سن کر مارے خوشی کے) ہم نے نعرہ تکبیر بلند کیا (کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، ہم اتنی بڑی تعداد میں جنّت کے مستحق ہوں گے) آنحضرت ﷺ نے پھر (اور بڑی بشارت دینے کے لئے) فرمایا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ تم اہل جنّت کی مجموعی تعداد کا تہائی حصّہ ہوگے، (یہ سن کر) ہم نے پھر نعرہ تکبیر بلند کیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں۔" (تم لوگوں یعنی اُمّت محمدی ﷺ کی یہ ایک عظیم فضیلت ہے کہ جنّت میں جانے والوں میں سب سے بڑی تعداد اسی اُمّت کی ہوگی جب کہ اس دنیا میں) لوگوں کے درمیان تمہاری تعداد اتنی کم ہے جیسا کہ سفید بیل کے جسم پر ایک سیاہ تل یا ایک کالے بیل کے جسم پر ایک سفید بال ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے ان الفاظ کے اعتبار سے یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ کی نقل کردہ اس حدیث کے مخالف ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ہر سو میں سے ننانوے لوگ دوزخی ہوں گے؟ پس کرمانیؒ نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ ان دونوں روایتوں میں کسی خاص عدد کا اعتبار نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اہل ایمان کی تعداد کے کم ہونے اور اہل کفر کی تعداد کے زیادہ ہونے کو بیان کرنا ہے! اور یہ احتمال بھی بیان کیا جاتا ہے "آگ والوں کے لشکر" سے مراد کافر ہوں اور "دوزخ میں جانے والوں" سے مراد گنہگار ہوں، پس یہاں، ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے کا جو تناسب بیان کیا گیا ہے وہ کافروں کے اعتبار سے ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں" ہر سو میں سے ننانوے جو تناسب ذکر کیا گیا ہے وہ گنہگاروں کے اعتبار سے ہے! اور ابن حجرؒ نے یہ لکھا ہے کہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوسعید کی روایت کردہ حدیث کے مفہوم کو تو حضرت آدم علیہ السلام کی تمام ذریت پر محمول کیا جائے (یعنی یہاں حدیث میں اہل دوزخ کے لئے ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے، کا جو تناسب ذکر کیا گیا ہے وہ ازاول تا آخر تمام انسانوں کے اعتبار سے ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں اہل دوزخ کے لئے "ہر سو میں سے ننانوے" کا جو تناسب ذکر کیا گیا ہے اس کو یاجوج و ماجوج کے علاوہ دوسرے لوگوں پر محمول کیا

جائے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ یاجوج وماجوج کا ذکر حضرت ابوسعیدؓ ہی کی روایت میں ہے نہ کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یا یہ کہ حضرت ابوسعید کی روایت کا تعلق تمام مخلوق سے ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کا تعلق صرف اُمت محمدی کے ساتھ مخصوص ہے! اور یا یہ کہ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت میں اہل دوزخ کے لشکر سے مراد تمام کفار اور تمام گنہگار ہیں جب کہ حضرت ابوہریرؓ کی روایت میں "اہل دوزخ کے لشکر" سے مراد صرف مسلمان گنہگار ہیں! بہر حال ان تاویلات اور توجیہات سے ان دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں رہتا۔

اور ہر حاملہ اپنا حمل ضائع کر دیگی" کے بارے میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ بات فرض کرنے کے طور پر بیان کی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بالفرض اس وقت کوئی چھوٹی عمر کا ہو تو وہ اس صورت حال کی ہیبت اور اس فیصلہ خداوندی کے صدمہ وخوف سے بوڑھا ہو جائے اسی طرح اس وقت اگر کوئی عورت حمل سے ہو تو مارے ہیبت کے اس کا پیٹ گر پڑے اور بعض حضرات نے یہ احتمال بیان کیا ہے کہ جو عورتیں حمل کی حالت میں مری ہوں گی وہ اپنے حمل کے ساتھ اٹھ کر میدان حشر میں آئیں گی اور اس وقت وہ حکم خداوندی سن کر مارے ہیبت کے ان کا حمل گر پڑے گا اسی طرح چھوٹی عمر والے اٹھ کر میدان حشر میں آئیں گے وہ مارے ہیبت کے بوڑھے ہو جائیں گے یہ اور بات ہے کہ وہ جنت میں جاتے وقت جوان ہو جائیں گے۔

اطمینان رکھو غم نہ کھاؤ الخ کے ذریعہ حضور ﷺ نے صحابہؓ سے خوف وخدشہ کو دور فرمایا کہ دراصل یاجوج وماجوج کی قوم کے لوگ اتنی کثرت میں ہوں گے کہ اگر تمہاری اور ان کی تعداد کا تناسب نکالا جائے تو وہ اس طرح ہوگا کہ ان میں سے تو ایک ہزار شخص اور تم میں سے صرف ایک شخص اور اس صورت حال میں بھی اہل جنت کی تعداد کچھ کم نہیں ہوگی بلکہ بہت ہوگی لہٰذا تمہیں اس خدشہ میں نہ پڑنا چاہئے کہ جنت میں جانے والوں کا تناسب دوزخ میں جانے والوں کے تناسب سے اس قدر کم ہوگا تو ہم میں سے بہت ہی کم لوگ جنت میں جائیں گے! تاہم اس بات سے یہ ضرور واضح ہو گیا کہ مجموعی طور پر دوزخ میں جانے والوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور جنت میں جانے والوں کی تعداد کم! لیکن اگر اہل جنت میں ملائکہ اور حوروں کو بھی شامل کر لیا جائے تو شاید اہل جنت کی تعداد، اہل دوزخ کی تعداد سے زیادہ بڑھ جائے گی اور اس صورت میں حدیث قدسی غلبت رحمتی علی غضبی (میری رحمت میرے غضب پر غالب ہوئی) کے معنی بھی صحیح ہوں گے۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہل جنت میں اُمت محمدی ﷺ کا جو تناسب بیان فرمایا اس کو بتدریج ذکر فرمایا یکبارگی ذکر نہیں کیا تاکہ صحابہؓ کے دل خوشی کے مارے پھٹ نہ جائیں، یا بتدریج ذکر اس بنا پر فرمایا کہ شاید اُمت محمدی کے لوگ کئی مراحل میں اسی تناسب کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے یعنی پہلے مرحلہ میں جو لوگ جنت میں جائیں گے وہ اہل جنت کی مجموعی تعداد کا تہائی حصہ بنے گا یہاں تک کہ جب سب لوگ جنت میں پہنچ جائیں گے تو پھر اُمت محمدی کے لوگ اہل جنت کی مجموعی تعداد کا آدھا حصہ ہوں گے اور یا یہ کہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ پر متعدد بار وحی نازل ہوئی اور مذکورہ تناسب کو اسی تدریج کے ساتھ بتایا گیا، چنانچہ جب بھی وحی نازل ہوتی اور اس میں جس تناسب کا ذکر ہوتا آپ ﷺ صحابہ کو بشارت دینے کے لئے اسی کو بیان فرما دیتے! بہر حال یہ احتمالات مذکورہ تناسب کو بتدریج ذکر کرنے کے سلسلہ میں ہیں، جو اصل بات ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُمت محمدی کے لوگ اہل جنت کی مجموعی تعداد کا نصف حصہ ہوں گے حالانکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جنت میں اُمت محمدی کی تعداد کا دو تہائی حصہ ہوگی، چنانچہ یہ ثابت ہے کہ اہل جنت کی ایک سو بیس ۱۲۰ صفیں ہوں گی، جن میں سے اسی صفیں آنحضرت ﷺ کی اُمت پر مشتمل ہوں گی اور چالیس صفیں باقی تمام اُمتیوں کی ہوں گی، پس ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب یہ حدیث (کہ جس سے اُمت محمدی ﷺ کا اہل جنت کی مجموعی تعداد کا نصف حصہ ہونا معلوم ہوتا ہے) ارشاد فرمائی تھی تو اس وقت تک آپ ﷺ کو یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ اُمت محمدی، اہل جنت کی کل تعداد کا دو تہائی حصہ ہوگی! اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے "نصف حصہ" والی بات ابتدائی مرحلہ میں جنت میں جانے والوں

کے تناسب کے اعتبار سے فرمائی ہو۔

ریاکاروں کے بارے میں وعید

⑪ وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَكْشِفُ رَبُّنَا عَنْ سَاقِهٖ فَيَسْجُدُ لَهٗ كُلُّ مُؤْمِنٍ وَّمُؤْمِنَةٍ وَّيَبْقٰى مَنْ كَانَ يَسْجُدُ فِي الدُّنْيَا رِيَآءً وَّسُمْعَةً فَيَذْهَبُ لِيَسْجُدَ فَيَعُوْدُ ظَهْرُهٗ طَبَقًا وَّاحِدًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ۔ "(قیامت کے دن) ہمارا پروردگار اپنی پنڈلی کھولے گا پس تمام مؤمن مرد و عورت اس کو سجدہ کریں گے، لیکن وہ شخص سجدہ نہیں کرے گا جو دنیا میں دکھانے اور سنانے کے لئے سجدہ کرتا تھا، (یعنی اس کا سجدہ اخلاص کی بنا پر نہیں بلکہ از راہ نفاق اور دنیاوی منفعت و شہرت حاصل کرنے کے لئے ہوتا تھا) گو وہ سجدہ کرنا چاہے گا مگر اس کی پشت (جھکنے اور اٹھنے کے وقت مڑنہ سکنے والی) ایک بے جوڑ ہڈی بن جائے گی جس کی وجہ سے وہ سجدہ کرنے پر قادر نہیں ہو سکے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے، کشف ساق یعنی پنڈلی کھولنا، دراصل عربی کا ایک محاورہ ہے جس کے ذریعہ غم و فکر اور کسی معاملہ کی شدت و سختی کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس کی ظاہری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایسے وقت میں صاحب معاملہ اپنا دامن یا اپنا پائجامہ و تہبند کا کنارہ پنڈلی پر سے اٹھا لیتا ہے پس "اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا" کی مراد یہ لی جائے کہ پروردگار اپنے بندوں کے سامنے ایسی صورت حال کو ظاہر کرے گا جس سے وہ سخت رنج و غم اور فکر و خدشہ میں پڑ جائیں گے ویسے بعض حضرات اس جملہ کی تاویل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ جس طرح اور بہت سے متشابہات ہیں اور ان کا حکم یہ ہے کہ ان کے حقیقی مراد و مفہوم کے پیچھے نہ پڑا جائے بلکہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ ان کا حقیقی مطلب خدا کے علم میں ہے اسی طرح "اللہ تعالیٰ کا اپنی پنڈلی کھولنا" بھی ایک ایسی بات ہے جس کی حقیقی مراد بس اللہ ہی کے علم میں ہے ہمیں اس کی جستجو میں نہیں پڑنا چاہئے راہ احتیاط یہی ہے۔

"پس تمام مؤمن مرد و عورت اس کو سجدہ کریں گے" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمام اہل ایمان صورت حال کی شدت و سختی سے بے تاب ہو کر بارگاہ حق میں سجدہ ریز ہو جائیں گے تاکہ اس قربت کے ذریعہ، اس وقت کی شدت و سختی سے نجات کے طلب گار ہوں نیز "مؤمن مرد و عورت" سے مراد مخلص مؤمن ہیں! اور بعض ضعیف روایتوں میں آیا ہے کہ ایک نور عظیم ظاہر ہوگا جس کو دیکھ کر لوگ سجدہ میں گر پڑیں گے۔

دنیا میں اترانے والوں کی قیامت کے دن حیثیت

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَاتِي الرَّجُلُ الْعَظِيْمُ السَّمِيْنُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يَزِنُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ وَقَالَ اقْرَءُوْا فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن (میدان حشر میں) جاہ و مال کے اعتبار سے) ایک بڑا اور خوب موٹا تازہ شخص آئے گا لیکن اللہ کے نزدیک وہ مچھر کے پر کے برابر بھی حیثیت اور کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتا ہوگا اور (اے مؤمنین) تم یہ آیت پڑھا کرو (تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ وہ دنیا دار جو اپنی دنیاوی حیثیت و وقعت پر نازاں اور مغرور ہیں اور اپنے کردار و عمل کو اچھا سمجھتے ہیں حقیقت کے اعتبار سے وہ بے حیثیت ہیں اور ان کے تمام اعمال و کردار ضائع و نابود ہو جانے والے ہیں اور وہ آیت یہ ہے کہ: فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا قیامت کے دن، ہم ان کو کوئی قدر و منزلت نہیں دیں گے۔ (اس روایت کو بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

دوسری فصل

قیامت کے دن زمین ہر شخص کے عمل کی گواہ بنے گی

⑬ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَآ اَخْبَارُهَا قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ اَخْبَارَهَا اَنْ تَشْهَدَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ وَّاَمَةٍ بِمَا عَمِلَ عَلٰى ظَهْرِهَا اَنْ تَقُوْلَ عَمِلَ عَلَيَّ كَذَا وَكَذَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا قَالَ فَهٰذِهٖ اَخْبَارُهَا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۔ (جس روز کہ زمین اپنی خبریں سنائے گی اور فرمایا کہ جانتے ہو (قیامت کے دن) زمین کی خبریں (جو وہ سنائے گی، کیا ہوں گی؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا زمین کی خبریں یہ ہوں گی کہ وہ (زمین) ہر بندے اور ہر لونڈی یعنی ہر مرد و عورت کے ہر اس عمل کی گواہی دے گی جو اس نے اس کی پشت پر کیا ہوگا (یعنی) وہ اس طرح کہے گی کہ میری پشت پر (فلاں مرد نے، فلاں عورت نے) فلاں فلاں دن یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے (یعنی فلاں شخص نے فلاں وقت فلاں نیک کام کیا ہے اور فلاں وقت فلاں برا کام کیا ہے" پھر آپ ﷺ نے فرمایا۔ "بس یہی (گواہی دینا) زمین کی خبریں ہیں" اس روایت کو احمدؒ ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔"

ہر مرنے والا پشیمان ہوتا ہے

⑭ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَمُوْتُ اِلَّا نَدِمَ قَالُوْا وَمَا نَدَامَتُهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنْ كَانَ مُحْسِنًا نَدِمَ اَنْ لَّا يَكُوْنَ ازْدَادَ وَاِنْ كَانَ مُسِيْئًا نَدِمَ اَنْ لَّا يَكُوْنَ نَزَعَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو مرے اور پشیمان نہ ہو (یعنی ہر مرنے والا بہر صورت پشیمان ہوتا ہے، پس قبل اس کے کہ موت آئے، اپنی زندگی کو غنیمت جانو اور مرنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ اچھے کام کرلو) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ندامت و پشیمانی کا سبب کیا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر وہ (مرنے والا) نیکوکار ہوتا ہے تو اس لئے پشیمان ہوتا ہے کہ اس نے زیادہ سے زیادہ نیکی کیوں نہیں کی، اور اگر وہ بدکار ہوتا ہے تو اس لئے پشیمان ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو برائی سے کیوں نہیں روکا۔" (ترمذیؒ)

میدان حشر میں لوگ تین طرح آئیں گے

⑮ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلٰثَةَ اَصْنَافٍ صِنْفًا مُشَاةً وَّصِنْفًا رُكْبَانًا وَّصِنْفًا عَلٰى وُجُوْهِهِمْ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَمْشُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ قَالَ اِنَّ الَّذِیْ اَمْشَاهُمْ عَلٰى اَقْدَامِهِمْ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يُّمْشِيَهُمْ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَمَا اِنَّهُمْ يَتَّقُوْنَ بِوُجُوْهِهِمْ كُلَّ حَدَبٍ وَّشَوْكٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن میدان حشر میں لوگوں کو تین طرح سے لایا جائے گا ایک قسم کے لوگ تو وہ ہوں گے جو پیدل چل کر آئیں گے، ایک قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو سواریوں پر آئیں گے اور ایک قسم کے لوگ وہ ہوں گے

جو منہ کے بل چلتے ہوئے آئیں گے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! (پاؤں کے بل چلنے کی عادت کے بالکل خلاف) لوگ منہ کے بل چل کر کس طرح آئیں گے؟ فرمایا۔ "حقیقت یہ ہے کہ جس ذات نے ان کو پاؤں کے بل چلایا ہے وہ ان کو منہ کے بل چلانے پر بھی قادر ہے اور جان لو کہ وہ لوگ منہ کے بل چلنے میں اپنے منہ کو بلندی اور کانٹوں سے بچائیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: پہلی قسم کے لوگ وہ اہل ایمان ہوں گے جن کے ذخیرہ اعمال میں نیک اور برے دونوں طرح کے عمل ہیں اور وہ خوف و رجاء کے درمیان تردد کی حالت میں رہتے ہوئے حق تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں دوسری قسم کے لوگ وہ کامل الایمان ہوں گے جو نیک اعمال میں سبقت و پیش قدمی اختیار کرتے ہیں، اور تیسری قسم اہل کفر و شرک پر مشتمل ہوگی۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں انسان اپنے پاؤں کے بل چلتا ہے تو وہ راستہ کی روکاٹوں اور ایذاء پہنچانے والی چیزوں سے ہاتھ اور پاؤں کے ذریعہ بچتا ہے اسی طرح وہ تیسری قسم کے لوگ) قیامت کے دن جب منہ کے بل چل کر آئیں گے تو ان کے منہ وہی فعل انجام دیں گے جو ہاتھ پاؤں انجام دیتے ہیں اور بغیر کسی فرق کے اپنے منہ کے ذریعہ راستہ نشیب و فراز، کانٹوں اور دوسری ایذاء پہنچانے والی چیزوں سے اپنا بچاؤ کریں گے اور اس دن ان کو منہ کے بل چلانا اس امر کا اعلان ہوگا کہ ان لوگوں نے چونکہ دنیا میں سجدۂ اطاعت نہیں کیا اور خدا کی فرمانبرداری میں اپنی گردن کو نہیں جھکایا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو منہ کے بل چلا کر ذلیل و خوار کیا ہے۔

اگر اسی دنیا میں قیامت کے دن کے احوال دیکھنا چاہتے ہو

⑯ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَاَنَّهٗ رَاْىُ عَيْنٍ فَلْيَقْرَأْ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص قیامت کے دن (کے احوال) کو اس طرح دیکھنا پسند کرتا ہو جیسے وہ (ظاہری) آنکھوں سے دیکھ رہا ہو تو اس کو چاہئے کہ سورہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ، سورہ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ اور سورہ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ پڑھے۔" (احمدؒ)

تشریح: ان سورتوں میں قیامت کے احوال کا تفصیلی ذکر ہے، پس پڑھنے والا اگر ان سورتوں کو حضور قلب کے ساتھ پڑھے اور ان کے معانی میں غور و فکر کرے تو یہ سورتیں قیامت کے احوال کو اس طرح مستحضر کر دیتی ہیں کہ گویا وہ احوال ظاہری آنکھوں کے سامنے پیش آ رہے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

لوگوں کو میدان حشر میں کس طرح لایا جائے گا

⑰ عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ اِنَّ الصَّادِقَ الْمَصْدُوْقَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَنِيْ اَنَّ النَّاسَ يُحْشَرُوْنَ ثَلٰثَةَ اَفْوَاجٍ فَوْجًا رَاكِبِيْنَ طَاعِمِيْنَ كَاسِيْنَ فَوْجًا يَسْحَبُهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ وَتَحْشُرُهُمُ النَّارُ وَفَوْجًا يَمْشُوْنَ وَيَسْعَوْنَ وَيُلْقِى اللّٰهُ الْاٰفَةَ عَلَى الظَّهْرِ فَلَا يَبْقٰى حَتّٰى اَنَّ الرَّجُلَ لَتَكُوْنُ لَهُ الْحَدِيْقَةُ يُعْطِيْهَا بِذَاتِ الْقَتَبِ لَا يَقْدِرُ عَلَيْهَا۔ (رواہ النسائی)

"حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ صادق و مصدوق ﷺ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ لوگوں کو تین گروہوں میں میدان حشر میں لایا جائے گا، ایک گروہ تو سواریوں پر ہوں گے اور زاد و راہ کی آسانیوں و سہولتوں کے ساتھ راحت و اطمینان سے آئیں گے، ایک گروہ وہ ہوگا جس کو فرشتے زمین پر منہ کے بل کھینچتے ہوئے لائیں گے اور ہانک کر دوزخ کی طرف لے جائیں گے، اور ایک گروہ وہ ہوگا جو دوڑتے ہوئے آئے گا (یعنی وہ

لوگ سہولت واطمینان کے ساتھ نہیں بلکہ بے اطمینانی اور پریشانی کے ساتھ چلتے ہوئے آئیں گے) اور اللہ تعالیٰ (سواری کے جانوروں کی) پیٹھ پر آفت وہلاکت مسلط کردے گا جس کی وجہ سے سواری کے جانور نایاب ہوجائیں گے یہاں تک کہ اگر کسی شخص کے پاس باغ ہوگا تو وہ باغ دیکر اس کے بدلہ میں ایک اونٹ لینا چاہے گا لیکن وہ (اس قدر اونچی قیمت ادا کرنے کے باوجود) اس اونٹ کو حاصل نہیں کرسکے گا۔" (نسائی)

تشریح: پہلا گروہ ان کامل مؤمنین پر مشتمل ہوگا۔ جنہوں نے اس دنیا میں نیکی وبھلائی کے کاموں میں سبقت اختیار کی ہوگی، دوسرا گروہ کفار ومشرکین پر مشتمل ہوگا اور تیسرا گروہ ان مسلمانوں پر مشتمل ہوگا جنہوں نے گناہ کئے ہوں گے۔

واضح رہے کہ حدیث کا سیاق اور اس حدیث کو اس باب میں ذکر کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں جس حشر کا ذکر کیا گیا ہے وہ "وہی حشر) ہے جو قیامت کے دن بپا ہوگا اور لوگ دوبارہ زندہ ہوکر محشر میں آئیں گے! لیکن حدیث کے آخری الفاظ "اور اللہ تعالیٰ پیٹھ پر آفت و ہلاکت تسلط کردے گا الخ" سے یہ بات صراحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ وہ حشر مراد نہیں ہے، جو قیامت کو بپا ہوگا، اسی طرح (کھانے پینے والوں) کے الفاظ بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں، چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے، کہ یہاں مذکورہ حشر سے قیامت کے دن کا حشر مراد نہیں ہے بلکہ وہ "حشر" مراد ہے جس کو قیامت کی علامت میں سے ذکر کیا گیا ہے، اس صورت میں کہا جائے گا کہ اس حدیث کو یہاں باب الحشر" میں نقل کرنا اس طراوی ہے اس کے برخلاف ملا علی قاریؒ نے تورپشتی کا قول نقل کرکے، جس میں انہوں نے آیات قرآنی اور احادیث سے استدلال کیا ہے، اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ وہی حشر ہے جو قیامت کے دن ہوگا، نیز انہوں نے لکھا ہے کہ خطابیؒ نے جو یہ کہا ہے کہ قیامت سے پہلے کا حشر مراد ہے، تو ان کا یہ قول خطاء پر محمول ہے، صحیح قول تورپشتی ہی کا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس حدیث میں "حشر" کی مراد کے تعین کے سلسلہ میں یہ جو ساری بحث اٹھ کھڑی ہوئی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے اس حدیث کو جس طرح روایت کیا ہے اس میں خلط ملط ہوگیا ہے لہٰذا بنیادی طور پر ضروری یہ ہے کہ اس خلط ملط کو دور کیا جائے اور وہ یوں کہ کہا جائے کہ اس حدیث میں دو مختلف حدیثوں کے الگ الگ اجزاء مل گئے ہیں جس سے مفہوم میں تضاد پیدا ہوگیا ہے اور یہ راوی کا تسامح ہے اس صورت میں کوئی خلجان واشکال باقی نہیں رہے گا۔

بَابُ الْحِسَابِ وَالْقِصَاصِ وَالْمِيزَانِ

حساب، قصاص اور میزان کا بیان

"حِسَاب" کے معنی ہیں گننا، شمار کرنا! اور یہاں مراد ہے قیامت کے دن بندوں کے اعمال وکردار کو گننا اور ان کا حساب کرنا! واضح رہے کہ حق تعالیٰ کی علیم وخبیر ذات کو سب کچھ معلوم ہے اور بندہ اس دنیا میں جو بھی عمل کرتا ہے وہ اس پر روشن وعیاں ہے لیکن قیامت کے دن بندوں کے اعمال وکردار کا حساب اس لئے ہوگا تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تمام مخلوق پر روشن ہوجائے کہ دنیا میں کس نے کیا کیا ہے اور کون کس درجہ کا آدمی ہے! پس قیامت کے دن کا یہ حساب قرآن مجید اور صحیح احادیث سے ثابت ہے اور اس کا عقیدہ رکھنا واجب ہے۔

"قِصَاص" کے معنی بدلہ ومکافات کے ہیں یعنی جس شخص نے جیسا کیا ہے اس کے ساتھ ویسا ہی کرنا! مثلاً اگر کسی شخص نے کسی شخص کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلہ میں اس کو بھی قتل کرنا اور اگر کسی شخص نے کسی شخص کو زخمی کیا ہے تو اس کے بدلہ میں اس کو بھی زخمی کرنا قصاص کہلاتا ہے قیامت کے دن، جان کا بدلہ جان، زخم اور تکلیف ہوگا اور دنیا میں جس نے جس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہوگا کہ خواہ اس کو آزردہ کیا ہو اور خواہ کوئی بھی جسمانی اور روحانی اذیت پہنچائی ہو اور وہ چیونٹی یا مکھی ہی کیوں نہ ہو، تو قیامت کے دن اس سے اس کا بدلہ لیا جائے گا اگرچہ وہ مکلف نہ ہو، چنانچہ تمام حیوانات کو بھی قیامت کے دن اسی لئے اٹھایا جائے گا تاکہ ان کو بھی ایک دوسرے کا

بدلہ دلوایا جاسکے مثلاً اگر کسی سینگ والی بکری نے کسی بے سینگ بکری کو مارا ہوگا تو اس دن اس کو قصاص یعنی بدلہ دینا ہوگا۔
"مِیْزَان" اس چیز سے تعبیر ہے جس کے ذریعہ بندوں کے اعمال کی مقدار و حیثیت جانی جاسکے اور جمہور علماء کا قول ہے کہ وہ چیز میزان یعنی ترازو ہی کی شکل میں ہوگی جس کے دو پلے ہوں گے اور ایک زبان ہوگی اور دونوں پلوں کے درمیان مشرق و مغرب جیسا فاصلہ ہوگا، اس میزان کے ذریعہ بندوں کے اعمال تولے جائیں گے، یعنی ایک پلے میں نیکیوں کے اعمال نامے اور دوسرے پلے میں برائیوں کے اعمال نامے رکھے جائیں گے، اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حسنات یعنی نیک اعمال کو اچھی صورتوں میں اور سیئات یعنی برے عمل کو بری صورتوں میں ڈھال دیا جائے گا اور ان دونوں کو تولا جائے گا لیکن بعض روایتوں میں پہلا قول ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں جو نصوص ہیں ان کا ظاہری مفہوم بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آسان حساب اور سخت حساب؟

① عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ اَحَدٌ يُحَاسَبُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلَّا هَلَكَ قُلْتُ اَوَ لَيْسَ يَقُوْلُ اللّٰهُ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا فَقَالَ اِنَّمَا ذٰلِكَ الْعَرْضُ وَلٰكِنْ مَنْ نُوْقِشَ فِي الْحِسَابِ يَهْلِكُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن جس سے حساب لیا جائے گا وہ تباہ ہو جائے گا (یعنی جو بھی شخص سخت حساب اور دار و گیر سے دو چار ہوگا اس کا بچ نکلنا ممکن نہیں ہوگا، نیز یہاں "تباہ ہونے" سے مراد عذاب میں (مبتلا ہونا ہے) حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (جب میں نے یہ آپ ﷺ کا ارشاد ایک کلیہ کے طور پر سنا تو میرے ذہن میں اشکال پیدا ہوا اور اسی اشکال کو دور کرنے کے لئے) میں نے عرض کیا کہ "کیا اللہ تعالیٰ نے اہل نجات کے حق میں یہ نہیں فرمایا کہ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا یعنی (جس شخص کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا) "پس قریب ہوگا کہ اس کا حساب آسان ہو" (اور جب حساب آسان ہوگا تو اس کے تباہ ہونے کے کیا معنی ہوں گے؟) آپ ﷺ نے (میرے اس اشکال کو دور کرنے کے لئے) فرمایا۔ "یہ آسان حساب صرف پیش کرنا اور بیان محض ہے، لیکن جس سے حساب میں مناقشہ کیا جائے گا (یعنی جس کو سخت باز پرس اور دار و گیر سے گزرنا پڑے گا) اور وہ یقیناً تباہ ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "آسان حساب صرف پیش کرنا اور بیان محض ہے" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ پس قریب ہوگا کہ اس کا حساب آسان ہو۔ "تو آسان حساب ہونے سے مراد ہے کہ اس کے اچھے اور برے اعمال اس کو بتلا دیے جائیں گے مثلاً اس سے کہا جائے گا کہ تو نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے، اور برے اعمال پر مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جس شخص کے حساب میں وار دگیر اور باز پرس کا دخل ہو جائے گا، اس سے ایک ایک چیز اور ہر چھوٹے بڑے عمل کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور اس پر محاسبہ و مواخذہ کی سخت کاروائی نافذ کی جائے گی تو اس شخص کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں ہوگا پس وہ تباہ ہو جائے گا، اور حقیقت میں حساب یہی ہے۔
اس بات کو ایک دوسرے نقطۂ نظر سے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اس کلیہ کو ظاہر کرتا ہے کہ جو بھی شخص حساب کے مرحلہ سے گزرے گا وہ یقیناً عذاب میں مبتلا ہوگا لیکن قرآن کی مذکورہ آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حساب کے مرحلہ سے گزرنے والوں میں سے بعض لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کیا جائے گا اس طرح سے گویا قرآن کی آیت اور حضور ﷺ کے مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے؟ لہٰذا اس ظاہری تضاد کو رفع کرنے کے لئے خود حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس آیت کریمہ میں "حساب" سے مراد صرف عرض ہے یعنی ان لوگوں کے سامنے (کہ جن کو نجات یافتہ قرار دینا مقصود ہوگا ان کے اعمال کی فہرست کھول کر رکھ دی جائے گی، چنانچہ انہوں نے جو برے اعمال کئے ہوں گے وہ ان کا اعتراف و اقرار

کریں گے اور حق تعالیٰ اپنا فضل و کرم ظاہر کرتے ہوئے ان کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرمائے گا، اس کے برخلاف حدیث میں "حساب" سے مراد واقعی محاسبہ و مواخذہ اور دار و گیر ہے جس کو "حساب میں مناقشہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس محاسبہ وار دگیر کی بنیاد اظہار عدل ہو گا۔

بزار وغیرہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جس شخص میں یہ تین اچھی باتیں ہوں گی اس سے اللہ تعالیٰ آسان حساب لے گا اور اس کو اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا (اور وہ تین اچھی باتیں یہ ہیں کہ تم اس شخص کو (اخلاقی جسمانی اور مالی مدد پہنچاؤ جو تمہیں اپنی مدد سے محروم رکھے، تم اس شخص کے ساتھ درگزر کا معاملہ کرو جو تمہارے اوپر ظلم کرے اور تم اس شخص کے ساتھ حسن سلوک کرو جو تمہارا مقاطعہ کرے۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بلا کسی واسطہ کے ہر شخص سے ہمکلام ہو گا

(۲) وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا سَيُكَلِّمُهُ رَبُّهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَرْجُمَانٌ وَّلَا حِجَابٌ يَحْجُبُهُ فَيَنْظُرُ اَيْمَنَ مِنْهُ فَلَا يَرٰى اِلَّا مَا قَدَّمَ مِنْ عَمَلِهِ وَيَنْظُرُ اَشْاَمَ مِنْهُ فَلَا يَرٰى اِلَّا مَا قَدَّمَ وَيَنْظُرُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلَا يَرٰى اِلَّا النَّارَ تِلْقَآءَ وَجْهِهٖ فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عدی ابن حاتمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن) تم میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہو گا جس سے اس کا پروردگار (کسی رابطہ کے بغیر) ہم کلام نہ ہو گا، اس وقت اس کے پروردگار کے درمیان نہ کوئی ترجمان ہو گا (کہ جو ہر ایک کو دوسرے کا مفہوم سمجھائے) اور نہ کوئی حجاب ہو گا (کہ جو بندے کو اس کے پروردگار سے چھپائے) جب بندہ اپنی داہنی طرف نظر ڈالے گا تو اس کو وہ چیز نظر آئے گی جو اس نے آگے بھیجی ہو گی (یعنی نیک اعمال جو ظاہری صورتوں میں نمایاں ہوں گے یا ان اعمال کی جزاء و انعامات) اور جب بائیں جانب دیکھے گا تو اس کو وہ چیز نظر آئے گی جو اس نے آگے بھیجی ہو گی یعنی برے اعمال اور جب وہ اپنے آگے دیکھے گا تو اس کو اپنے منہ کے سامنے آگ نظر آئے گی، پس (اے لوگو) تم آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے ہی سے کیوں نہ ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جب بندہ اپنی داہنی طرف نظر ڈالے گا الخ" یعنی یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی سخت صورت حال سے دوچار ہوتا ہے اور کسی مشکل میں پڑ جاتا ہے تو دائیں بائیں دیکھنے لگتا ہے، پس اس وقت چونکہ ہر بندے کے لئے ایک سخت ترین مرحلہ درپیش ہو گا اس لئے وہ دائیں بائیں دیکھے گا اور دائیں طرف اس کو وہ نیک اعمال نظر آئیں گے جو اس نے دنیا میں کئے ہوں گے اور بائیں طرف اس کے برے اعمال دکھائی دیں گے، اور سامنے کی طرف آگ نظر آئے گی، لہٰذا اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ وہ اس وقت اپنے نیک اعمال کی طرف دیکھ کر اطمینان و سکون حاصل کرے اور سامنے کی طرف نظر آنے والی آگ سے نجات پائے تو اس کو چاہئے کہ اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ نیک کام کرے اور برے اعمال سے اجتناب کر کے اپنے آپ کو اس آگ سے بچانے کی راہ نکالے۔

"اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے ہی سے کیوں نہ ہو" اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اپنے آپ کو دوزخ کی آگ میں جانے سے بچاؤ اور کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو اگرچہ وہ ظلم و زیادتی کھجور کے ایک ٹکڑے ہی کی صورت میں یا اس کے برابر کیوں نہ ہو! دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر دوزخ کی آگ سے بچنا چاہتے ہو تو ضرورت مندوں اور محتاج لوگوں کی مدد و اعانت اور خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرو اگرچہ تم صرف کھجور کا ایک ٹکڑا ہی خرچ کرنے کی استطاعت کیوں نہ رکھتے ہو، اس لئے خدا کی راہ میں خرچ کرنا یعنی صدقہ و خیرات تمہارے اور آگ کے درمیان پردہ بنے گا۔

قیامت کے دن مؤمن پر رحمت خداوندی

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُدْنِي الْمُؤْمِنَ فَيَضَعُ عَلَيْهِ كَنَفَهُ وَيَسْتُرُهُ فَيَقُوْلُ

اَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا اَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا فَيَقُوْلُ نَعَمْ اَیْ رَبِّ حَتّٰی قَرَّرَهُ بِذُنُوْبِهٖ وَرَاٰی فِیْ نَفْسِهٖ اَنَّهٗ قَدْ هَلَكَ قَالَ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِی الدُّنْيَا وَاَنَا اَغْفِرُ هَالَكَ الْيَوْمَ فَيُعْطٰی كِتَابَ حَسَنَاتِهٖ وَاَمَّا الْكُفَّارُ وَالْمُنَافِقُوْنَ فَيُنَادٰی بِهِمْ عَلٰی رُؤُسِ الْخَلَائِقِ هٰٓؤُلَاءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِيْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ مؤمن کو اپنے (فضل و کرم اور اپنی رحمت کے) قریب کرے گا اور (پھر) اس کو اپنی حفاظت اور اپنی عنایت کے سائے میں چھپائے گا تاکہ وہ اہل محشر پر اپنے گناہوں اور اپنی بداعمالیوں کے کھل جانے کی وجہ سے شرمندہ اور رسوانہ ہو) پھر اللہ تعالیٰ اس (مؤمن) سے پوچھے گا کہ کیا تو اس گناہ کو جانتا ہے، کیا تو اس گناہ کو جانتا ہے، یعنی کیا تجھے یاد اور اعتراف ہے کہ تو نے دنیا میں فلاں فلاں گناہ کیے تھے؟ وہ (مؤمن) عرض کرے گا کہ ہاں اے پروردگار (مجھے اپناوہ گناہ یاد ہے اور میں اپنی بدعملی کا اعتراف کرتا ہوں غرضکہ اللہ تعالیٰ اس (مؤمن) سے اس کے تمام گناہوں کا اعتراف واقرار کرائے گا اور وہ (مؤمن) اپنے دل میں کہتا ہوگا کہ (ان گناہوں کی پاداش میں) میں اب ہلاک ہوا، اب تباہ ہوا! لیکن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ "میں نے دنیا میں تیرے ان گناہوں اور ان عیوب کی پردہ پوشی کی اور آج بھی میں تیرے ان گناہوں کو بخش دوں گا" پس اس (مؤمن) کو اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ دے دیدیا جائے گا (اور برائیوں کا اعمالنامہ کالعدم کر دیا جائے گا) اور جہاں تک کافروں اور منافق لوگوں کا تعلق ہے تو ان کو تمام مخلوق کے سامنے طلب کیا جائے گا اور پکار کر کہا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے (کفر و شرک کے ذریعہ) اپنے رب پر بہتان باندھا تھا، جان لو ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مؤمن" کا لفظ یا تو بطور نکرہ ہے، کہ غیر متعین طور پر کسی بھی مؤمن کے بارے میں یہ بشارت دی گئی ہے، اور یہ بھی بعید نہیں ہے "مؤمن" سے جنس مؤمن مراد ہو یعنی تمام مؤمنوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کا یہی معاملہ فرمائے گا! اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ بشارت ان مؤمن بندوں کے حق میں ہے جو اس دنیا میں کسی کی غیبت نہیں کرتے، کسی پر عیب نہیں لگاتے کسی کو ذلیل و رسوا نہیں کرتے، کسی مسلمان کی فضیحت سے خوش نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور لوگوں میں کسی کی آبرو ریزی کا باعث نہیں بنتے! پس اللہ تعالیٰ ان کے اوصاف کی جزا کے طور پر قیامت کے دن ان کی پردہ پوشی فرمائے گا اور ان کو اپنی حفاظت و رحمت کے سایہ میں چھپائے گا۔

مسلمانوں کے دشمن ان کے لئے دوزخ سے نجات کا عوضانہ ہوں گے

④ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ دَفَعَ اللّٰهُ اِلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا فَيَقُوْلُ هٰذَا فِكَاكُكَ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب قیامت کا دن آئے گا (اور لوگوں کی ابدی نجات و عذاب کا فیصلہ سنایا جائے گا) تو اس وقت اللہ تعالیٰ ہر مسلمان (مرد اور عورت) کو ایک یہودی یا ایک نصرانی کے حوالہ کر دے گا اور فرمائے گا کہ یہ شخص دوزخ سے تیری چھڑائی ہے یعنی دوزخ کی آگ سے تیری نجات کا سبب ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: فَكَاكَ کے معنی ہیں گروی رکھی ہوئی چیز کو چھپانا! اور اسی سے "فکاک" (ف کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جس کے ذریعہ گروی رکھی ہوئی چیز کو چھڑایا جائے! پس "یہ شخص تیرا فکاک یعنی تیری چھڑائی ہے" کا مطلب یہ ہوا کہ گویا مسلمان دوزخ کی آگ میں گروی ہے، اور قیامت کے دن اس یہودی یا نصرانی کو اس (مسلمان) کے بدلہ میں آگ میں بھیج کر اس کو اس آگ سے چھڑایا جائے گا اب اس بات کی تاویل یوں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مکلف کے لئے، کہ خواہ کافر ہو یا مؤمن، جنت اور دوزخ میں ایک ایک جگہ مقرر کر رکھی ہے، لہٰذا جو شخص ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا اس کی وہ جگہ کہ جو دوزخ میں تھی اس شخص کی

جگہ کے ساتھ کہ جو جنّت میں ہے بدل دی جائے گی، اور جو شخص ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت نہیں ہوا اس کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا، پس اس اعتبار سے یہ کافر لوگ گویا دوزخ کی آگ سے مؤمنوں کی نجات کا سبب ہوں گے اس سے واضح ہوا کہ مذکورہ بالا جملہ کی یہ مراد قطعًا نہیں ہے کہ کافروں کو مؤمنوں کے گناہوں کے بدلہ میں دوزخ کے سپرد کیا جائے گا کیونکہ حق تعالیٰ نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی واضح رہے کہ "یہودی ونصاریٰ" کی تخصیص محض علامتی ہے یعنی یہاں اصلی مراد تو کافر ہیں اور یہود ونصاریٰ کا ذکر صرف اس بنا پر ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کی عداوت ودشمنی زیادہ مشہور ہے۔

قیامت کے دن اُمّت محمدی ﷺ حضرت نوح کی گواہ بنے گی

⑤ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُجَآءُ بِنُوْحٍ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَیُقَالُ لَهٗ هَلْ بَلَّغْتَ فَیَقُوْلُ نَعَمْ یَا رَبِّ فَتُسْئَلُ اُمَّتُهٗ هَلْ بَلَّغَکُمْ فَیَقُوْلُوْنَ مَاجَآءَ نَا مِنْ نَّذِیْرٍ فَیُقَالُ مَنْ شُهُوْدُكَ فَیَقُوْلُ مُحَمَّدٌ وَّاُمَّتُهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَیُجَآءُ بِکُمْ فَتَشْهَدُوْنَ اَنَّهٗ قَدْ بَلَّغَ ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ کَذٰلِكَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن (میدان حشر میں) حضرت نوح علیہ السلام کو لایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے (اپنی اُمت تک اللہ تعالیٰ کے احکام دین وہدایت) پہنچائے تھے؟ وہ عرض کریں گے کہ بیشک اے میرے پروردگار میں نے تیرے احکام دین وہدایت اپنی اُمت کے لوگوں تک پہنچائے تھے) پھر حضرت نوح علیہ السلام کی اُمت (کے ان لوگوں سے کہ جن تک حضرت نوح نے اللہ تعالیٰ کے احکام دین وہدایت پہنچائے تھے) پوچھا جائے گا کہ کیا (نوح علیہ السلام نے) تم تک ہمارے احکام پہنچائے تھے؟ وہ لوگ انکار کریں گے اور کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی بھی ڈرانے والا (خواہ وہ نوح ہوں یا اور کوئی نبی) نہیں آیا تھا اور پھر حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے گواہ کون ہیں؟ یعنی اگرچہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہوگا کہ نوح نے جو کچھ کہا ہے بالکل درست کہا ہے لیکن ان کی منکر اُمت کو قائل کرنے کے لئے حضرت نوح علیہ السلام سے ان کے اس دعوے پر گواہ طلب کرے گا کہ انہوں نے منصب تبلیغ ورسالت کی ذمہ داریوں کو پورا کیا تھا) چنانچہ حضرت نوح کہیں گے کہ میرے گواہ حضرت محمد ﷺ اور ان کی اُمت کے لوگ ہیں" اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ تب تمہیں پیش کیا جائے گا اور تم یہ گواہی دو گے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اُمت کو احکام خداوندی پہنچائے تھے پھر رسول کریم ﷺ نے (اس صورت واقعہ کی تصدیق وتثویب کے لئے) یہ آیت پڑھی (جس میں حق تعالیٰ امت محمد ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے) کہ۔"

وَ کَذٰلِكَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا۔

"اور اسی لئے ہم نے (اے مسلمانو) تمہیں نیک وعادل اور افضل اُمت بنایا ہے تاکہ تم ان لوگوں کے بارے میں (کہ جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور کفر وشرک پر قائم رہے ہیں) گواہی دو، اور تمہارے گواہ پیغمبر (ﷺ) ہوں گے۔"

اس روایت کو بخاریؒ نے نقل کیا ہے

تشریح: حضرت نوح علیہ السلام کا یہ کہنا کہ بیشک اے پروردگار! میں نے تیرے احکام اپنی اُمت کے لوگوں تک پہنچائے تھے، قرآن کریم کی اس آیت کے منافی نہیں ہے جس میں یوں ہے کہ۔

یوم یجمع اللہ الرسل فیقول ماذا اجبتم قالُوْا لا علم لنا انک انت علام الغیوب۔

"اس دن (میدان حشر میں) اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع کرے گا اور پھر ان سے پوچھے گا کہ تمہیں (تمہاری اُمت کی طرف سے تمہاری دعوت

وتبلیغ دین کا) کیا جواب ملا تو وہ کہیں گے کہ ہمیں علم نہیں، بلاشبہ پوشیدہ باتوں کو آپ ہی بہت زیادہ جاننے والے ہیں۔"

کیونکہ اس آیت کی مراد تو یہ کہ "اجابت" کا سوال ہوگا جس کے بارے میں وہ رسول اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے، جب کہ یہاں حدیث میں حضرت نوح علیہ السلام سے جس سوال کا ذکر ہے وہ "دعوت وتبلیغ" کے بارے میں ہوگا اور ظاہر ہے کہ "اجابت" اور "دعوت وتبلیغ" دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام یہ کہیں گے کہ میرے گواہ حضرت محمد ﷺ اور ان کی اُمت کے لوگ ہیں" یعنی اصل گواہ تو اُمت محمدی ﷺ کے لوگ ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے دعوے کی گواہی وہی دیں گے اور حضرت محمد ﷺ ان کے مزکی ہوں گے، اس صورت میں کہا جائے گا کہ اصل گواہ یعنی اُمت محمد ﷺ کے لوگوں سے پہلے مزکی یعنی آنحضرت کا ذکر کرنا آپ ﷺ کی تعظیم وتوقیر کے اظہار کے لئے ہوگا اور ویسے یہ بھی بعید نہیں کہ خود آنحضرت ﷺ بھی نوح علیہ السلام کی گواہی دیں کیونکہ وہ وقت اور جگہ ہی ایسی ہوگی جہاں زیادہ سے زیادہ مدد ونصرت پہنچانے کی ضرورت ہوگی رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ تب تمہیں پیش کیا جائے گا" ان الفاظ کا اسلوب بیان بتاتا ہے کہ اس وقت جب کہ دربار الٰہی میں لوگوں کی سب سے بڑی پیشی ہوگی، آنحضرت ﷺ حاضرو ناظر ہوں گے یعنی آپ ﷺ پوری کاروائی کے دوران موجود رہیں گے اور شاہد ہوں گے چنانچہ جب انبیاء اور رسولوں کی پیشی ہوگی تو سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو پیش کیا جائے گا اور پھر ان کے گواہوں یعنی اُمت محمدی علیہ السلام کے لوگوں کو لایا جائے گا۔

اور تم یہ گواہی دو گے کہ الخ" یعنی حضرت نوح علیہ السلام کے کہنے کے مطابق تم ان کی گواہی دو گے اور تمہارے نبی ﷺ تمہارے مزکی ہوں گے یا یہ کہ تم گواہی دو گے، اور تمہارے ساتھ نبی بھی گواہی دیں گے۔

اس آیت کریمہ وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا الایۃ میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمان قیامت کے دن گزشتہ امتوں کے بارے میں گواہی دیں گے اور ان (مسلمانوں) کی گواہی ان کے پیغمبر ﷺ دیں گے، تو ان گزشتہ لوگوں کے بارے میں مسلمانوں کی گواہی کی مثال تو یہی ہے کہ وہ (مسلمان) حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنی اُمت کے لوگوں تک خدا کے احکام پہنچائے تھے اور ان (مسلمانوں) کے بارے میں ان کے پیغمبر کی طرف سے گواہی کی صورت یہ ہوگی کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب قیامت کے دن گزشتہ انبیاء اور رسولوں کی امتیں انکار کرتے ہوئے کہیں گی کہ ہم تک کسی نبی نے کچھ نہیں پہنچایا اور ہمیں خدا کے احکام نہیں بتائے تو وہ رسول اور انبیاء اُمت محمدی کے لوگوں کو اپنا گواہ بنائیں گے اور جب مسلمان ان کی گواہی دیں گے تو ان سے پوچھا جائے گا کہ (تم لوگ تو ان امتوں کے بعد دنیا میں آئے تھے) تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء نے اپنی اُمت کے لوگوں کو خدا کے احکام پہنچائے تھے اور تم یہ گواہی کس بنا پر دے رہے ہو؟ تو وہ (مسلمان) جواب دیں گے کہ اس سلسلہ میں ہم نے کتاب اللہ کو ناطق پایا تھا (یعنی قرآن مجید نے ہمیں اس بارے میں بالکل سچی خبر دی تھی چنانچہ اسی کی بنا پر ہم یہ گواہی دے رہے ہیں! اس کے بعد ان رسولوں کی امتوں کے لوگ مسلمانوں کی صداقت وعدالت یعنی ان کے معتبر ہونے کی اور ان کی سچائی کے بارے میں جرح کریں گے تب آنحضرت ﷺ مسلمانوں کا سچا اور معتبر ہونا ثابت کریں گے اور گواہی دیں گے کہ یقیناً یہ لوگ قابل اعتماد اور اپنی بات میں سچے ہیں پس اپنی اُمت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے گواہی دینے کے یہی معنی ہیں اور اسی اعتبار سے آپ ﷺ کو اپنی امت کا گواہ کہا گیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے اپنی اُمت کو سچا اور گزشتہ امتوں کے بارے میں ان کی گواہی کو معتبر ثابت کیا تو گویا آپ نے بھی گواہی دی! اور اسی لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام یہ کہیں گے کہ میرے گواہ حضرت محمد ﷺ اور ان کی اُمت کے لوگ ہیں۔

قیامت کے دن جسم کے اعضاء شہادت دینگے

(۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَضَحِكَ فَقَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مِمَّا اَضْحَكُ قَالَ قُلْنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

قَالَ مِنْ مُّخَاطَبَةِ الْعَبْدِ رَبَّهٗ يَقُوْلُ يَارَبِّ اَلَمْ تُجِرْنِيْ مِنَ الظُّلْمِ قَالَ يَقُوْلُ بَلٰى قَالَ فَيَقُوْلُ فَاِنِّيْ لَا اُجِيْزُ عَلٰى نَفْسِيْ اِلَّا شَاهِدًا مِّنِّيْ قَالَ فَيَقُوْلُ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ شَهِيْدًا وَّبِالْكِرَامِ الْكَاتِبِيْنَ شُهُوْدًا قَالَ فَيُخْتَمُ عَلٰى فِيْهِ فَيُقَالُ لِاَرْكَانِهٖ اَنْطِقِيْ قَالَ فَتَنْطِقُ بِاَعْمَالِهٖ ثُمَّ يُخَلّٰى بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْكَلَامِ قَالَ فَيَقُوْلُ بُعْدًا لَّكُنَّ وَسُحْقًا فَعَنْكُنَّ كُنْتُ اُنَاضِلُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم رسول کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ یکایک ہنسنے لگے اور پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو میں کیوں، ہنس رہا ہوں؟ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "میں (قیامت کے دن) بندہ اور خدا کے درمیان منہ در منہ گفتگو ہونے کا خیال کر کے) ہنس رہا ہوں! (اس دن) بندہ کہے گا کہ اے پروردگار کیا تو نے مجھ کو ظلم سے پناہ نہیں دی ہے؟ (یعنی کیا تو نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ میں اپنے بندوں پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا (یہ سن کر) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہاں تجھ کو (میں نے پناہ دی ہے اور میں یقیناً بندوں پر ظلم نہیں کرتا) تب بندہ کہے گا کہ اگر تو نے مجھ کو ظلم سے پناہ دی ہے تو) میں اپنے متعلق اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا کہ میرے بارے میں گواہی دینے والا مجھ ہی میں سے ہو "آنحضرت ﷺ نے فرمایا (بندے کی یہ بات سن کر) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ "(مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے) آج کے دن تیرے بارے میں خود تیری ذات کی گواہی دیں گے" آنحضرت نے فرمایا" پھر بندے کے منہ پر مہر لگادی جائے گی (یعنی اس کی قوت گویائی کو معطل کر دیا جائے گا) اور اس کے بعد اس کے تمام اعضاء وجسم کو حکم دیا جائے گا کہ بولو، چنانچہ اس کے جسم کے اعضاء اس کے (ان) اعمال کو بیان کریں گے جو اس نے ان اعضاء کے ذریعہ کئے تھے پھر اس بندے اور اس کی گویائی کے درمیان سے (پردہ) اٹھادیا جائے گا (یعنی اس کے منہ کو جو مہر لگائی گئی تھی اس کو توڑ دیا جائے گا اور اس کی قوت گویائی بحال ہو جائے گی جس سے وہ پہلے کی طرح باتیں کرنے لگے گا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا" بندہ (یہ صورت حال دیکھ کر اپنے اعضاء جسم سے) کہے گا کہ دور ہو بد بختو اور ہلاک ہو، میں تو تمہاری ہی طرف سے اور تمہاری ہی نجات کے لئے لڑ جھگڑ رہا تھا۔" (مسلم)

تشریح: "میرے بارے میں گواہی دینے والا مجھ ہی میں سے ہو" یعنی مجھے یہ گوارہ نہیں ہے کہ میرے اعمال وکردار اور میری دنیاوی زندگی کے بارے میں گواہی دینے والا کوئی دوسرا ہو، میں تو صرف اس گواہ کو تسلیم کروں گا جو میری ذات کے اندر سے پیدا ہو گویا بندہ تو یہ خیال کرے گا کہ میری ذات کے اندر سے گواہی دینے والا کون ہو سکتا ہے کیونکہ کوئی ذات خود اپنے کو ضرر ونقصان پہنچانے کے لئے گواہی نہیں دیا کرتی، لیکن اس کو یہ خیال نہیں آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر بھی پوری طرح قادر ہے کہ وہ اس بندے کی ذات میں سے ایسا گواہ پیدا کر دے جو اس کے خلاف گواہی دے اور اس کو خدا کے حکم کے خلاف انکار کی مجال اور دم مارنے کی گنجائش نہ ہو! پس آنحضرت ﷺ کے ہنسنے کا سبب یہی تھا کہ حق تعالیٰ کے سامنے بندہ کا اس طرح کلام کرنا کہ خود اپنے جال میں پھنس جائے اس کی کس درجہ کی مضحکہ خیز حرکت ہوگی۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ کے منہ کو مہر لگانا ان اعضاء جسم کا اعمال کے بارے میں گواہی دینا جن کے ذریعہ بندے نے وہ عمل کیے ہوں گے، اور پھر اس بندے کا اپنی نادانی پر جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اپنے ان اعضاء جسم کو برا بھلا کہنا اور ان کو بد دعا دینا جیسے عجیب وغریب امور کا خیال کر کے آپ ﷺ ہنسے۔

خود بندے کی درخواست اور خواہش کے مطابق خود اسی کے اعضاء جسم کو اس کے بارے میں گواہ بنانے کے بعد پھر نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بھی گواہ بنانا مقصود سے زائد بات ہوگی۔ اور اس کا سبب یہ ہوگا کہ اعضاء جسم جو گواہی دیں گے اس کی تصدیق وتوثیق ہو جائے اور بندے کو یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ یہ اعضاء جسم درست گواہی نہیں دے رہے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ صرف فرشتوں کو گواہ بنائے گا تو یہ بات اس قرارداد کے خلاف ہوگی جو اس کے اور بندے کے درمیان طے پائی گی حاصل یہ کہ اصل گواہ تو بندے کے اعضاء جسم ہی ہوں گے جن کو خود بندے کی عرض وخواہش کے مطابق گواہ بنایا جائے گا اور ان اعضاء جسم کی گواہی ثابت کرنے کے لئے نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بطور زائد گواہ پیش کیا جائے گا، لہٰذا یہ اعتراض پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کی عرض

وخواہش کو مان کر اس کی ذات کے اندر سے، یعنی اسی کے اعضاء جسم کو گواہ بنائے گا تو فرشتوں کو گواہ بنانے کی کیا ضرورت ہوگی۔

دور ہٹو بد بختو اور ہلاک ہو الخ" یعنی جب وہ بندہ دیکھے گا کہ یہ میرے اعضاء جسم تو میرے ہی خلاف گواہی دے رہے ہیں، ادھر ان اعضاء جسم کا اس کے خلاف گواہ بننا خود اس کی درخواست وخواہش کے مطابق ہوگا، تو وہ اس صورتِ حال سے جھنجھلا جائے گا اور اپنے اعضاء جسم کو برا بھلا کہنے لگے گا کہ کمبختو، میں تمہاری ہی طرف سے لڑ جھگڑ رہا تھا تاکہ تمہیں اعمال بد کی سزا نہ بھگتنی پڑے، لیکن اپنے خلاف خود تم ہی گواہی دے رہے ہو اور اپنے آپ کو عذاب وہلاکت میں ڈال رہے ہو یا یہ کہ میں دنیا میں تمہاری ہی وجہ سے بندوں سے لڑتا جھگڑتا تھا، تمہیں نقصان وضرر سے بچانے کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچایا کرتا تھا، تمہاری راحت اور تمہارے کام کی وجہ سے فلاں فلاں پر عمل کیا کرتا تھا، ہر وقت تمہاری ہی حفاظت اور تمہاری ہی مدد میں لگا رہتا تھا، اور تمہیں ہی اپنا دوست وغم خوار مانتا تھا مگر آخر کو تم ہی میرے دشمن اور میرے بد خواہ نکلے اور مجھے عذاب خداوندی کے حوالہ کیے جانے کا سبب بنے! حدیث میں ان اعضاء جسم کا وہ جواب ذکر نہیں کیا گیا ہے جو وہ آخر میں بندے کی یہ بات سن کر دیں گے، لیکن قرآن کی ایک آیت میں ان کے اس جواب کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

وقالوا لجلودهم لم شهدتم علينا قالوا انطقنا الله الذى انطق كل شئ وهو خلقكم اول مرة واليه ترجعون۔

اور وہ اپنی جلدوں سے (یعنی اپنے اعضاء جسم سے) کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ تو وہ جلدیں کہیں گی کہ ہمیں اس اللہ نے بلایا ہے جس نے ہر ایک کو بلایا ہے، اور اس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

قیامت کے دن دیدار الٰہی

(۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ نَرٰى رَبَّنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قَالَ هَلْ تُضَآرُّوْنَ فِیْ رُؤْيَةِ الشَّمْسِ فِی الظَّهِيْرَةِ لَيْسَتْ فِیْ سَحَابَةٍ قَالُوْا لَا قَالَ فَهَلْ تُضَآرُّوْنَ فِیْ رُؤْيَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ لَيْسَ فِیْ سَحَابَةٍ قَالُوْا لَا قَالَ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا تُضَآرُّوْنَ فِیْ رُؤْيَةِ رَبِّكُمْ اِلَّا كَمَا تُضَآرُّوْنَ فِیْ رُؤْيَةِ اَحَدِهِمَا قَالَ فَيَلْقَى الْعَبْدَ فَيَقُوْلُ اَیْ فُلْ اَلَمْ اُكْرِمْكَ وَاُسَوِّدْكَ وَاُزَوِّجْكَ وَاُسَخِّرْ لَكَ الْخَيْلَ وَالْاِبِلَ وَاَذَرْكَ تَرْاَسُ وَتَرْبَعُ فَيَقُوْلُ بَلٰى قَالَ فَيَقُوْلُ اَفَظَنَنْتَ اَنَّكَ مُلَاقِیَّ فَيَقُوْلُ لَا فَيَقُوْلُ فَاِنِّیْ قَدْ اَنْسَاكَ كَمَا نَسِيْتَنِیْ ثُمَّ يَلْقَى الثَّانِیْ فَذَكَرَ مِثْلَهٗ ثُمَّ يَلْقَى الثَّالِثَ فَيَقُوْلُ لَهٗ مِثْلَ ذٰلِكَ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ اٰمَنْتُ بِكَ وَبِكِتَابِكَ وَبِرُسُلِكَ وَصَلَّيْتُ وَصُمْتُ وَتَصَدَّقْتُ وَيُثْنِیْ بِخَيْرٍ مَا اسْتَطَاعَ فَيَقُوْلُ هٰهُنَا اِذًا ثُمَّ يُقَالُ الْاٰنَ نَبْعَثُ شَاهِدًا عَلَيْكَ وَيَتَفَكَّرُ فِیْ نَفْسِهٖ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْهَدُ عَلَیَّ فَيُخْتَمُ عَلٰى فِيْهِ وَيُقَالُ لِفَخِذِهٖ انْطِقِیْ فَتَنْطِقُ فَخِذُهٗ وَلَحْمُهٗ وَعِظَامُهٗ بِعَمَلِهٖ وَذٰلِكَ لِيُعْذِرَ مِنْ نَّفْسِهٖ وَذٰلِكَ الْمُنَافِقُ وَذٰلِكَ الَّذِیْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِیْ هُرَيْرَةَ يَدْخُلُ مِنْ اُمَّتِیْ الْجَنَّةَ فِیْ بَابِ التَّوَكُّلِ بِرِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا قیامت کے دن (اپنی آنکھوں سے) اپنے خدا کا دیدار کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "کیا دوپہر کے وقت، جب کہ ابر نہ ہو، تم سورج کو دیکھنے میں کوئی شک رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں! آپ نے فرمایا "تو کیا چودھویں رات میں، جب کہ ابر نہ ہو تم چاند کو دیکھنے میں کوئی شک رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا۔ "پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے جس طرح تم سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتے اسی طرح (قیامت کے دن) اپنے پروردگار کو دیکھنے میں کوئی شک وشبہ نہیں کرو گے پھر آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جب بندے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ ایک بندے کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ اے بندے! کیا میں نے تجھے (جنس حیوان اور دیگر مخلوقات پر) فضیلت وشرف نہیں بخشا تھا، کیا میں نے تجھے تیری بیوی عطا نہیں کی تھی (جو میں نے تیری ہی جنس اور تیری ہی نوع سے پیدا

کی تھی اور پھر تیرے اور اس کے درمیان انس و محبت اور پیار کا رشتہ قائم کیا تھا) کیا میں نے تیرے لئے گھوڑے اور اونٹ (اور دیگر کارآمد جانوروں اور چیزوں) کو تیرا مطیع نہیں بنایا تھا۔ اور کیا میں نے تجھے یہ موقع نصیب نہیں کیا تھا کہ تو اپنی قوم کا سربراہ اور سردار ہو اور چوتھائی مال غنیمت حاصل کرے؟ (واضح رہے کہ یہ زمانہ جاہلیت میں بھی رواج تھا کہ کسی بھی قوم وقبیلہ کا سربراہ حاصل ہونے والے مال غنیمت میں سے اپنے لئے چوتھائی حصہ لیتا تھا اور باقی مال پوری قوم کے لئے چھوڑ دیتا تھا) وہ بندہ (یہ سن کر) عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! بیشک ایسا ہی ہوا تھا (یعنی تو نے اپنے جن انعامات کا ذکر فرمایا ہے وہ سب مجھے دنیا میں حاصل ہوئی تھیں)" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس کے بعد پروردگار فرمائے گا کہ کیا تجھے یہ بھی خیال تھا کہ (ایک دن) تو مجھ سے ملے گا؟ بندہ عرض کرے گا نہیں! (مجھے یہ خیال نہیں رہا تھا اور میں ایسی غفلت میں پڑ گیا تھا کہ اس بات کو بھول ہی گیا) پس پروردگار فرمائے گا کہ تو میں بھی تجھے فراموش کروں گا (یعنی آج میں بھی تجھے اپنی رحمت سے دور کر دوں گا) جیسا کہ تو نے دنیا میں میری اطاعت اور میری یاد کو فراموش کر دیا تھا" پھر پروردگار دوسرے بندے سے ملاقات اور خطاب فرمائے گا" اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ اور اس بندے کے درمیان اسی سوال وجواب کر ذکر کیا جو پہلے بندے کے سلسلے میں منقول ہوا پھر پروردگار تیسرے بندے سے ملاقات وخطاب فرمائے گا اور اس سے وہی فرمائے گا جو اس نے پہلے بندہ سے فرمایا تھا، اور وہ (تیسرا بندہ) یہ جواب دے گا کہ "میرے پروردگار! میں تجھ پر، تیری کتاب پر، اور تیرے پیغمبروں پر ایمان لایا تھا، میں نے نماز پڑھی، روزے رکھے اور صدقہ دیا (یعنی زکوٰۃ ادا کی)" اور اس طرح جس قدر ہو سکے گا وہ اپنی نیکیوں کے بارے میں تعریف وتوصیف بیان کرے گا۔ اللہ تعالیٰ (اس کی یہ تمام باتیں سن کر) فرمائے گا کہ تم یہیں ٹھیرو ہم ابھی تمہارے بارے میں گواہ پیدا کیے دیتے ہیں (یعنی تو نے اپنی نیکیوں کے بارے میں جو دعوی کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کوشش کی ہے کہ تو نے ہماری نعمتوں کی شکر گزاری میں اپنی دنیاوی زندگی کو اعمال خیر سے معمور کر رکھا تھا تو ذرا ٹھیر جا ہم گواہوں کے ذریعہ ابھی بتائے دیتے ہیں کہ تو اپنے دعوے میں کہاں تک سچا ہے) بندہ (یہ سن کر) اپنے دل میں سوچے گا کہ بھلا اس وقت میرے خلاف کون گواہی دے گا لیکن جبھی اس کے منہ کو مہر لگا دی جائے گی اور اس کی ران سے کہا جائے گا کہ بول، چنانچہ اس کی ران، اس کا گوشت اور ہڈی (یعنی ران کے سب حصے اس کے (ان) اعمال کے بارے میں (جو اس نے دنیا میں واقعۃً کئے ہونگے) بیان دیں گے اور یہ سب کچھ (یعنی مذکورہ سوال وجواب بندہ کے منہ کو مہر لگانا، اور اس کے اعضاء کے ذریعہ گواہی دلوانا) اس لئے ہوگا تاکہ بندہ کی بداعمالیاں ثابت ہو جائیں اور وہ کوئی عذر نہ کر سکے (یا یہ معنی ہیں کہ یہ سب کچھ اس لئے ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ خود صاحب عذر ہو یعنی اس بندے کو عذاب میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری اسی پر ڈال سکے) اور یہ تیسرا بندہ (جو اپنی نیکیوں کے بارے میں دعوی کرے گا لیکن خود اس کے اعضاء جسم اس کے دعوے کی تردید کریں گے) درحقیقت منافق ہوگا اور یہ وہ بندہ ہے جس سے حق تعالیٰ غصہ وناراض ہوگا۔" (مسلمؒ)

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت یدخل من امتی الجنۃ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے توکل کے باب میں ذکر کی جا چکی ہے۔

تشریح: "اسی طرح تم اپنے پروردگار کو دیکھنے میں کوئی شک وشبہ نہیں کرو گے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہیں سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا، کوئی دقت نہیں اٹھانا پڑتی، کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، اسی طرح تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کو بھی بلا تکلف دیکھو گے! واضح رہے کہ لفظ تضارون (جس کا آزاد ترجمہ "شک وشبہ کرنا" کیا گیا ہے) تؔ کے پیش اور رؔ کی تشدید کے ساتھ منقول ہے اور رؔ کی تشدید کے بغیر بھی نقل کیا گیا ہے" اور یہ لفظ رؔ کی تشدید کے ساتھ ہو تو اس کی اصل "مضارت" ہوگی جس کے معنی ضرر ونقصان کے ہیں اور اگر یہ لفظ رؔ کی تشدید کے بغیر ہو تو پھر اس کی اصل "ضیر" ہوگی اور اس کے معنی بھی ضرر ونقصان کے ہیں پس لفظی ترجمہ کے اعتبار سے لا تضارون کے معنی یہ ہوں گے کہ پروردگار کے دیدار کے وقت تم آپس میں لڑائی جھگڑے، دھکم پیل، مخالفت وموافقت اور تصدیق وتکذیب کے ذریعہ ایک دوسرے کو نقصان و تکلف نہیں پہنچاؤ گے کیونکہ اس کا دیدار اس طرح واضح وعام اور ہر ایک کے لئے عیاں ہوگا کہ ہر شخص بڑی آسانی اور اطمینان کے ساتھ اس کو دیکھے گا بعض حضرات نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اس کے

دیدار کے وقت تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے لئے پردہ اور رکاوٹ نہیں بنے گا اور مجمع البحار میں یہ لکھا ہے کہ تضارون کا لفظ مضارت سے ہے) اور مضارت کے معنی کسی کے دیدار کے وقت اجتماع وازدحام کا ہونا (اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے کو تکلیف وپریشانی اٹھنا)" مراد ہیں اسی طرح قاضی عیاض مالکی نے یہ کہا ہے کہ "مضارت" کے معنی مضایقت یعنی ایک دوسرے کو تنگ گیری میں مبتلا کرنا مراد ہیں اور یہ معنی اجتماع وازدحام کے قریب ہیں نیز انہوں نے کہا ہے کہ مضایقت یعنی آپس میں ایک دوسرے کو تنگ گیر ہونے کا اطلاق کسی ایسی چیز کو دیکھنے کے موقع پر ہوتا ہے جو بالکل مخصوص نوعیت اور خاص انداز سے کسی ایک محدود جگہ پر ہو۔ اور مجمع وہجوم کی وجہ سے ہر شخص آسانی کے ساتھ اس کے ساتھ اس کو نہ دیکھ سکتا ہو، پس اس صورت میں لا تضارون کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پروردگار کے دیدار کے وقت ایک دوسرے سے ملے اور جڑے ہوئے اور تنگ گیری میں مبتلا نہیں ہوں گے جیسا کہ محدود جگہ پر مجمع وہجوم کے وقت کسی چیز کو دیکھنے کی صورت میں ہوتا ہے بلکہ جس طرح تم سب اپنی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اطمینان وفراغت کے ساتھ سورج اور چاند کو دیکھتے ہو اسی طرح قیامت کے دن تم سب اپنی اپنی جگہ پر بہ فراغت اپنے پروردگار کا دیدار کرو گے۔

ایک روایت میں یہ لفظ تضارون کے بجائے تضامون ہے یعنی "ر" کی جگہ "م" ہے، پھر تضامون کا لفظ بھی دونوں طرح منقول ہے یعنی "ت" کے پیش اور "م" کی تشدید کے ساتھ بھی آیا ہے اور "م" کی تشدید کے بغیر بھی، تشدید کی صورت میں یہ لفظ "ضم" سے مشتق ہوگا اور بغیر تشدید کی صورت میں "ضیم" سے! "ضم" اجتماع وازدحام کے معنی میں ہے اور "ضیم" ظلم وزیادتی کرنے کے معنی ہیں! لیکن دونوں صورتوں میں مفہوم وہی ہوگا جو "تضارون) کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

"تو میں بھی تجھے فراموش کردوں گا الخ" کا حاصل یہ ہے کہ جب میں نے تجھ کو دنیا میں اپنے ان انعامات سے نوازا اور تجھ پر اتنے بڑے بڑے احسانات کیے تو تیرا فرض تھا کہ تو میری اطاعت وعبادت اور میرے احکام کی اتباع وپیروی کے ذریعہ میرا شکر ادا کرتا اور میرے دیدار کا امیدوار رہتا تاکہ میں تجھے اور زیادہ انعام وجزا دیتا اور دنیا کی طرح آج کے دن بھی تجھے سربلند وسرخ رو کرتا پس جب کہ تو نے دنیا میں میری ان نعمتوں اور میرے ان احسانات کے باوجود مجھے فراموش کردیا تھا اور میری طرف سے غافل ہوگیا تھا تو اب میں بھی احسان اور اچھا سلوک نہ کرکے تیرے ساتھ وہی معاملہ کروں گا جو کسی غافل اور احسان فراموش شخص کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس طرح میں تجھے اپنی رحمت سے دور کردوں گا واضح رہے کہ یہی مضمون اس آیت کریمہ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ایسا ہی (چاہئے تھا) تیرے پاس (دنیا میں) ہماری آیتیں آئیں تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج (یہاں قیامت کے دن ہم تجھ کو بھلادیں گے۔

"چنانچہ اس کی ران، اس کا گوشت اور اس کی ہڈی الخ" کے بارے میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں ہاتھ، پاؤں، زبان اور کھال کا بولنا اور بندے کے اعمال کے سلسلے میں گواہی دینا مذکور ہے، جب کہ یہاں "ران، گوشت اور ہڈی کے بولنے اور گواہی دینے کا ذکر ہے، تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کے اس جملہ کا اصل مقصد بھی یہی بیان کرنا ہے کہ بندے کے تمام اعضاء جسم بولیں گے اور اس کے اعمال کے بارے میں گواہی دیں گے جن میں ہاتھ اور پاؤں وغیرہ بھی شامل ہیں جیسا کہ پیچھے حضرت انسؓ کی روایت میں گزرا۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت الخ کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مصابیح نے یدخل من امتی الخ" کی حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہاں اس باب میں نقل کیا تھا لیکن صاحب مشکوٰۃ نے اس حدیث کو حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے اور اس باب کی بجائے باب التوکل میں ذکر کیا ہے لیکن واضح رہے کہ یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ سے ان الفاظ میں منقول ہے یدخل الجنۃ من امتی سبعون الفا بغیر حساب ھو الذین لا یسترقون ولا یتطیرون وعلی ربھم یتوکلون۔ پس صحیح بات تو یہ تھی کہ یہاں یدخل من امتی الجنۃ الخ" کے بجائے) یوں کہا جاتا کہ یدخل الجنۃ من امتی الخ!"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

امت محمدی ﷺ میں سے حساب کے بغیر جنت میں جانے والوں کی تعداد

⑧ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ وَعَدَنِیْ رَبِّیْ اَنْ یُّدْخِلَ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِیْ سَبْعِیْنَ اَلْفًا لَا حِسَابَ عَلَیْھِمْ وَلَا عَذَابَ مَعَ کُلِّ اَلْفٍ سَبْعُوْنَ اَلْفًا وَّثَلٰثُ حَثَیَاتٍ مِنْ حَثَیَاتِ رَبِّیْ۔

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ میری امت میں سے ستر ہزار لوگوں کو حساب اور عذاب کے بغیر جنت میں داخل کرے گا اور (ان ستر ہزار میں سے) ہر ہزار کے ساتھ مزید ستر ہزار اور میرے پروردگار کے چلوں میں سے تین چلو بھر کر لوگ جنت میں جائیں گے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "حساب وعذاب کے بغیر" سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو اس سخت حساب کے مرحلہ سے گزرنا نہیں پڑے گا جس میں بندہ پرسش ومواخذہ، داروگیر اور سخت پوچھ پاچھ سے دوچار ہونے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہر ہزار کے ساتھ مزید ستر ہزار الخ" کا مطلب یہ ہے کہ ستر ہزار لوگ تو حساب وعذاب کے مرحلہ سے گزرے بغیر جنت میں جائیں ہی گے لیکن ان میں سے بھی ہر ہزار کے ساتھ مزید ستر ہزار لوگ ہوں گے اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے تین چلو بھر کر اور لوگ ان کے ساتھ کر دے گا! اب رہی یہ بات کہ ستر ہزار سے کیا مراد ہے، تو ہو سکتا ہے کہ یہ خاص عدد ہی مراد ہو اور یا یہ کہ اس عدد سے "کثرت" مراد ہے نیز "تین چلووں" کے الفاظ بھی کثرت ومبالغہ سے کنایہ ہیں پس حاصل یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ میری اُمت کے اتنے زیادہ لوگوں کو، کہ جو شمار بھی نہیں کئے جا سکتے، حساب عذاب کے بغیر جنت میں داخل کرے گا۔

قیامت کے دن خدا کی عدالت میں لوگ تین مرتبہ پیش ہونگے

⑨ وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُعْرَضُ النَّاسُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ثَلٰثَ عَرَضَاتٍ فَاَمَّا عَرْضَتَانِ فَجِدَالٌ وَّمَعَاذِیْرُ وَاَمَّا الْعَرْضَةُ الثَّالِثَةُ فَعِنْدَ ذٰلِکَ تَطِیْرُ الصُّحُفُ فِی الْاَیْدِیْ فَاٰخِذٌ بِیَمِیْنِہٖ وَاٰخِذٌ بِشِمَالِہٖ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ لَا یَصِحُّ ھٰذَا الْحَدِیْثُ مِنْ قِبَلِ اَنَّ الْحَسَنَ لَمْ یَسْمَعْ مِنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ وَقَدْ رَوَاہُ بَعْضُھُمْ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی۔

"اور حضرت حسن بصری، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن لوگوں کو (اللہ تعالیٰ کے سامنے) تین مرتبہ پیش کیا جائے گا اور دو مرتبہ تو بحث وجرح اور عذر آرائی ہوگی اور جب تیسری مرتبہ پیش ہوں گے تو اس وقت (چونکہ حساب، کتاب اور پوچھ پاچھ کا مرحلہ نمٹ چکا ہوگا اس لئے) اعمال نامے اڑ اڑ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے پس ان میں سے کچھ لوگ (کہ جو اہل سعادت اور خوش نصیب ہوں گے اپنے دائیں ہاتھوں میں اعمال نامے لیں گے اور کچھ لوگ (کہ جو اہل شقاوت اور بدبخت ہوں گے) اپنے بائیں ہاتھوں میں اعمال نامے لیں گے اس روایت کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت اس اعتبار سے صحیح نہیں ہے کہ حضرت ابوہریرہ سے حضرت حسن بصریؒ کا سماع ثابت نہیں ہے نیز بعض محدثین نے اس روایت کو حضرت حسن بصری سے اور انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؒ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "دو مرتبہ تو بحث وجرح اور عذر آرائی ہوگی۔" کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگ پہلی مرتبہ پیش ہوں گے تو اس وقت وہ اپنے گناہ

ومعصیت اور اپنی بدعملیوں کا اقرار واعتراف نہیں کریں گے اور اپنے آپ کو مستوجب عذاب ہونے سے بچانے کی کوشش کریں گے، یعنی حق تعالیٰ کے سامنے بحث ومباحثہ کریں گے اور کہیں گے کہ ہم تک کسی بھی نبی نے آپ کے احکام نہیں پہنچائے اور نہ کسی نے ہمیں یہ بتایا کہ ہمارا کون سا عمل درست ہے اور کون سا عمل نادرست! اور جب ہم تک ہدایت پہنچی ہی نہیں اور ہمارے سامنے برائی اور بھلائی کے راستوں کو واضح ہی نہیں کیا گیا تو ہمارے خلاف بدعملیوں اور گناہوں کی فرد جرم کیوں عائد ہو؟ لیکن جب اللہ تعالیٰ مختلف دلائل اور گواہوں کے ذریعہ یہ ثابت فرمادے گا کہ ان تک ہدایت کا پیغام پہنچا تھا اور مختلف زمانوں میں اس کے پیغمبر اور رسول ان کے پاس خدا کے احکام پہنچاتے رہے تھے جن کو انہوں نے یا تو قبول نہیں کیا یا ان پر صحیح طرح سے عمل نہیں کیا تو دوسری مرتبہ کی پیشی کے وقت وہ اپنے گناہوں اور اپنی بدعملیوں کا اقرار واعتراف کریں گے اور پھر عذر آرائی کرنے لگیں گے مثلاً کوئی تو یوں کہے گا کہ میں نے ازراہ سہو وخطا گناہوں کا راستہ اختیار کر لیا تھا، کوئی یوں کہے گا کہ میں جہالت وغفلت کے اندھیروں میں کھو گیا تھا اور اس کی وجہ سے ہدایت کے راستہ پر نہیں چل سکا، اور کوئی یوں کہے گا کہ میں تیری رحمت کے امید پر کوتاہ عمل اور غفلت کا شکار ہو گیا تھا، غرض کہ ہر ایک اسی طرح کے عذر بیان کرے گا! اور پھر تیسری مرتبہ جب لوگوں کے تمام معاملات منقح ہو کر ان کے سامنے آجائیں گے اور ہر ایک کے عقیدہ وعمل کی چھان بین پوری ہو جائے گی تو پھر آخری فیصلہ ظاہر ہو جائے گا اور سب کے سامنے اہل ہدایت اور ضلالت کے درمیان فرق وامتیاز بالکل واضح ہو جائے گا جس کی صورت یہ ہوگی کہ جو لوگ جنت کی سعادت سے نوازے جانے والے ہوں گے ان کے نامہ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں پہنچ جائیں گے اور جن کو دوزخ میں ڈالا جانا ہوگا ان کے نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

اس حدیث کے بارے میں ترمذیؒ نے جو کچھ کہا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ حضرت ابوہریرہؓ سے حضرت حسن بصریؒ کا حدیث سننا ثابت نہیں ہے اس لئے حضرت ابوہریرہؓ سے ان کی اس روایت کی سند منقطع اور غیر متصل ہوئی جس کی بناء پر اس حدیث کو مذکورہ سند وروایت کے ساتھ صحیح نہیں کہا جا سکتا لیکن جزری نے تصحیح المصابیح میں کہا ہے کہ بخاریؒ نے اپنی صحیح (یعنی بخاری شریف) میں حضرت حسن بصریؒ کی ایسی تین حدیثیں نقل کی ہیں جن کو انہوں نے (یعنی حسن بصریؒ نے) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے، البتہ صحیح مسلمؒ میں حضرت حسنؒ کی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے جس کو انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہو بہرحال جزریؒ کی بات سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی اصل حدیث کی صحت پر اثر نہیں پڑتا کیونکہ بعض محدثین نے اس روایت کو حضرت حسنؒ سے اور انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؒ سے نقل کیا ہے، اور اس طریق سے اس روایت کی سند متصل ہوگی جس سے اصل حدیث کا صحیح ہونا ثابت ہو جاتا ہے! بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضرت حسن نے اس حدیث کو متعدد صحابہ جیسے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت انس ابن مالکؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے روایت کیا ہے۔

خدا کے نام کی برکت

⑮ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ سَیُخَلِّصُ رَجُلًا مِنْ اُمَّتِیْ عَلٰی رُؤُسِ الْخَلَآئِقِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَیَنْشُرُ عَلَیْہِ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ سِجِلًّا کُلُّ سِجِلٍّ مِّثْلُ مَدِّ الْبَصَرِ ثُمَّ یَقُوْلُ اَتُنْکِرُ مِنْ ھٰذَا شَیْئًا اَظَلَمَکَ کَتَبَتِیَ الْحَافِظُوْنَ فَیَقُوْلُ لَا یَارَبِّ فَیَقُوْلُ اَفَلَکَ عُذْرٌ قَالَ لَا یَارَبِّ فَیَقُوْلُ بَلٰی اِنَّ لَکَ عِنْدَنَا حَسَنَۃً وَاِنَّہٗ لَا ظُلْمَ عَلَیْکَ الْیَوْمَ فَتُخْرَجُ بِطَاقَۃٌ فِیْھَا اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ فَیَقُوْلُ اُحْضُرْ وَزْنَکَ فَیَقُوْلُ یَارَبِّ مَاھٰذِہِ الْبِطَاقَۃُ مَعَ ھٰذِہِ السِّجِلَّاتِ فَیَقُوْلُ اِنَّکَ لَا تُظْلَمُ قَالَ فَتُوْضَعُ السِّجِلَّاتُ فِیْ کَفَّۃٍ وَالْبِطَاقَۃُ فِیْ کَفَّۃٍ فَطَاشَتِ السِّجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَۃُ فَلَا یَثْقُلُ مَعَ اسْمِ اللّٰہِ شَیْءٌ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن (میدان حشر میں) اللہ تعالیٰ میری اُمت میں سے

ایک شخص کو تمام مخلوقات کے سامنے طلب کرے گا اور اس کے سامنے ننانوے رجسٹر کھول کر ڈال دے گا جن میں کا ہر رجسٹر حد نظر تک پھیلا ہوا نظر آئے گا) پھر اس شخص سے فرمائے گا کہ ان رجسٹروں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے کیا تو اس میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے (اور یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہے کہ ان رجسٹروں سے میرے جن برے اعمال کا پتہ چلتا ہے وہ میں نے نہیں کئے ہیں) اور کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میرے لکھنے والوں نے (یعنی نامہ اعمال لکھنے والے ان فرشتوں نے جو تیرے افعال واحوال کے نگہبان تھے) تیرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے وہ شخص عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! نہیں! (نہ تو میں ان رجسٹروں میں لکھے ہوئے اپنے اعمال سے انکار کر سکتا ہوں اور نہ یہ سمجھتا ہوں کہ نامہ لکھنے والے فرشتوں نے ان رجسٹروں میں غلط اندراجات کے ذریعہ میرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے) پھر پروردگار فرمائے گا کہ کیا تو کوئی عذر رکھتا ہے (یعنی تو نے دنیا میں جو برے اعمال کئے اور جو اس رجسٹرون میں لکھے ہوئے ہیں کیا تو ان کی معذرت میں کچھ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے سہواً یا جہلاً یا خطاءً اور یا کسی بھی فلاں وجہ سے برا کام کیا تھا؟) وہ بندہ عرض کرے گا کہ نہیں! میرے پروردگار! (میں کوئی عذر بیان نہیں کر سکتا) تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ "ہاں (ہمارے پاس ایک چیز ہے جو تیرے عذر کے قائم مقام ہے یعنی) ہمارے یہاں تیری ایک بہت بڑی) نیکی ہے (جو ہماری بارگاہ میں قبول کی جا چکی ہے اور جو تیرے تمام گناہوں کو مٹادے گی) اور یقیناً آج کے دن تجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوگا (یعنی نہ تو تیری اس نیکی کے ثواب کو گھٹایا جائے گا اور نہ تجھے عذاب دینے کے لئے تیرے گناہوں کو بڑھایا جائے گا) پھر ایک پرچہ نکالا جائے گا جس میں اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمدا عبدہ ورسولہ لکھا ہوگا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص سے فرمائے گا کہ جاو، اپنے اعمال (کے تولے جانے کی جگہ یا اعمال تولے جانے کے وقت اور یا اعمال تولے جانے کی چیز یعنی میزان) کے پاس پہنچ جا، (تاکہ جب تیری نیکی کا یہ چھوٹا سا پرچہ تیرے گناہوں سے بھرے ہوئے ننانوے رجسٹروں کے ساتھ تولا جائے تو تجھ پر ظاہر ہو جائے کہ ہمارا عدل وانصاف کس طرح ظاہر ہوتا ہے اور تجھ پر کسی ظلم وزیادتی کی بجائے ہمارے فضل واحسان کا سایہ کس طرح سایہ فگن ہوا ہے") وہ بندہ (حیرت واستعجاب کے ساتھ) عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! بھلا اس ایک چھوٹے سے پرچہ کو اتنے بڑے بڑے اور اتنے زیادہ رجسٹروں کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ (کہاں میری ایک نیکی کا یہ ایک چھوٹا سا پرچہ اور کہاں میرے تمام گناہوں پر مشتمل یہ دفتر کے دفتر؟ اس صورت میں اس پرچہ کو ان رجسٹروں کے مقابلہ میں تولنے کا کیا فائدہ؟) پروردگار فرمائے گا کہ "(تو جا کر دیکھ تو سہی) یقیناً تیرے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا! (یعنی اس پرچہ کو معمولی مت جان، یہ بہت عظیم القدر اور بہت بھاری ہے، اس کا تولا جانا ضروری ہے تاکہ تجھ پر ظلم نہ ہو جائے۔ اور ملا علی قاری نے "یقیناً تیرے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا" کا مطلب یہ لکھا ہے کہ اس ایک نیکی کا یہ پرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت عظیم القدر اور بہت بھاری ہے، کیونکہ اللہ کے نام کے مقابلہ پر کوئی بھی چیز بھاری نہیں ہے" اور اگر اس کے نام سے بھی بھاری کوئی چیز ہوگی تو تجھ پر ظلم ہو جائے گا یعنی پھر تو اپنے گناہوں کی پاداش میں مارا جائے گا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "پھر ان رجسٹروں کی پوٹ ترازو کے ایک پلے میں رکھی جائے گی اور اس پرچہ کو دوسرے پلے میں پس وہ رجسٹر ہلکے پڑ جائیں گے اور وہ پرچہ بھاری ہو جائے گا (یعنی ان رجسٹروں کا پلا اوپر اٹھ جائے گا اور اس پرچہ کا پلا نیچے جھک جائے گا) حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے زیادہ وزن دار کوئی چیز نہیں ہوگی کیونکہ اللہ کا نام سب سے بڑا اور سب سے بھاری ہے اگرچہ گناہوں کے بڑے سے بڑے پہاڑ جیسے رجسٹر کیوں نہ ہوں۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "سجل" (جس کا عام ترجمہ "رجسٹر" کیا گیا ہے) کے خاص معنی "وسیع وضخیم کتاب" کے ہیں اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ "سجل" اصل میں "طومار" کو کہتے ہیں یعنی کاغذات کا مٹھا جس کو لپیٹ کر اس میں لکھتے ہیں اور بعضوں نے یہ کہا ہے کہ۔ "سجل" فرشتے کا نام ہے جو بندوں کے اعمال لکھتا ہے۔ بہرحال یہاں حدیث میں "سجل" سے مراد وہ کتاب یا رجسٹر اور یا طومار ہے جس میں بندوں کے اعمال لکھے ہوں گے۔

پھر ایک پرچہ نکالا جائے گا جس میں اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمدا عبدہ ورسولہ لکھا ہوگا" کے بارے میں ایک احتمال تو

ہے کہ یہ کلمہ وہ ہوگا جو اس نے دنیا میں پہلی مرتبہ اپنی زبان سے ادا کیا ہوگا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس نے کسی اور مرتبہ یہ کلمہ پڑھا ہوگا جو حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہو گیا ہوگا اور یہی احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

قیامت کے دن کے تین ہولناک موقعے

(۱۱) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا ذَكَرَتِ النَّارَ فَبَكَتْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَايُبْكِيْكِ قَالَتْ ذَكَرْتُ النَّارَ فَبَكَيْتُ فَهَلْ تَذْكُرُوْنَ اَهْلِيْكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّافِي ثَلٰثَةِ مَوَاطِنَ فَلَا يَذْكُرُ اَحَدٌ اَحَدًا عِنْدَ الْمِيْزَانِ حَتّٰى يَعْلَمَ اَيَخِفُّ مِيْزَانُهٗ اَمْ يَثْقُلُ وَعِنْدَ الْكُتُبِ حَتّٰى يُقَالَ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ حَتّٰى يَعْلَمَ اَيْنَ يَقَعُ كِتَابُهٗ اَفِي يَمِيْنِهٖ اَمْ فِيْ شِمَالِهٖ مِنْ وَّرَآءِ ظَهْرِهٖ وَعِنْدَ الصِّرَاطِ اِذَا وُضِعَ بَيْنَ ظَهْرَيْ جَهَنَّمَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) وہ (یعنی حضرت عائشہ دوزخ کی آگ کا خیال کر کے رونے لگیں یعنی اچانک ان کے دل میں دوزخ کا خیال آگیا تو اس کی دہشت سے ان پر گریہ طاری ہو گیا رسول کریم ﷺ نے (ان کو اس طرح اچانک روتے دیکھا تو) پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟ انہوں نے کہا کہ مجھے دوزخ کی آگ کا خیال آگیا تھا، (اس کی دہشت اور خوف سے) رونے لگی ہوں) اور ہاں کیا آپ ﷺ قیامت کے دن اپنے اہل وعیال کو بھی یاد رکھیں گے؟ رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر فرمایا) کہ (ویسے تو اہل بیت ہی کیا، قیامت کے دن اپنی پوری اُمّت کا خیال وفکر ہوگا لیکن) صورت حال یہ ہے کہ اس دن تین موقعے ایسے ہوں گے کہ وہاں کسی کو کسی کا خیال نہیں ہوگا یعنی مخصوص طور پر کسی کا خیال نہیں ہوگا۔ البتہ شفاعت عظمیٰ عمومی طور پر تمام خلائق کے لئے ہوگی) ایک موقع تو وہ ہوگا جب (اعمال وکردار کو تولنے کے لئے میزان سامنے ہوگی تا آنکہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس کی میزان بھاری رہی یا ہلکی یعنی جب تک اعمال تل نہ لیں گے اور یہ پتہ نہ چل جائے گا کہ نیک اعمال کا پلا جھک گیا ہے یا اوپر کو اٹھ گیا ہے، تب تک ہر شخص اپنی اپنی فکر میں گرداں رہے گا دوسرا موقع وہ ہوگا جب اعمال نامے (ہاتھوں میں) حوالے کیے جائیں گے یہاں تک یہ نہ کہا جانے لگے کہ آؤ میرا اعمال نامہ پڑھو اور جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ پیٹھ کے پیچھے سے اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے، یا بائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے، (یعنی دوسرا ہولناک موقع وہ ہوگا جب ہر ایک کے بارے میں نجات یا عذاب کا فیصلہ ہونے کو ہوگا اور لوگوں کے اعمال نامے ان کی پیٹھ کے پیچھے سے ان کے ہاتھوں میں تھمادیئے جائیں گے چنانچہ جو شخص نجات یافتہ ہوگا اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں آئے گا اور جو شخص مستوجب عذاب گردانا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں ہوگا، اور اس طرح اس وقت جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ کس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں اور کس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دوبارہ ہے اور جس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں آئے گا وہ مارے خوشی کے یہ نہ کہہ اٹھے کہ آؤ میرا اعمال نامہ پڑھ لو، تب تک ہر شخص فکر وتردد میں رہے گا اور کسی کو کسی کا ہوش وخیال نہیں رہے گا) اور تیسرا موقع وہ ہوگا جب لوگ پل صراط (پر سے گزرنے) کے قریب ہوں گے اور وہ پل صراط جہنم کی پشت پر (یعنی اس کے دہانے پر) رکھا جائے گا (یہاں تک کہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس پر سے عافیت کے ساتھ گزر کر نجات پالی ہے یا جہنم میں گر پڑا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حضرت عائشہؓ کو آنحضرت کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے دن خاص طور پر تین موقعے ایسے ہوں گے جن کی دہشت وہولناکی سب کو اس طرح حیران دورماندہ اور وحشت زدہ بنادے گی کہ کسی کو کسی فرد کی خبر نہیں ہوگی اور نہ کوئی کسی کو یاد کرنے اور اس کا حال جاننے کی مہلت پائے گا، ہر شخص اپنی ہی فکر میں رہے گا اور اس کو ہر لحہ یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ نہ معلوم میرا کیا حشر ہو اور مجھے کس انجام سے دوچار ہونا پڑے۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جاچکا ہے اور یہاں ترجمہ کے دوران بھی واضح کردیا گیا ہے، جب ہر شخص کے فکر وعقیدہ اور اعمال وکردار کی چھان بین ہو چکے گی، میزان میں اعمال نامے تولے جاچکے ہوں گے، اور وہ بارگاہ خداوندی نے ہر شخص کی سعادت وشقاوت کا فیصلہ

ہو جائے تو سب کے اعمال نامے ان کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے، جن لوگوں کے اعمال نامے ان کے داہنے میں پہنچیں گے وہ نجات یافتہ ہوں گے اور جن لوگوں کے اعمال نامے ان کے بائیں میں پہنچیں گے وہ اہل عذاب ہوں گے! نیز لوگوں کے ہاتھوں میں ان کے اعمالناموں کے پہنچنے کی صورت یہ ہوگی کہ دائیں ہاتھ کو گردن میں ڈال کر پشت کی طرف سے نکالا جائے گا اور بائیں ہاتھ کو بغل کے نیچے سے نکال کر پشت کی طرف لے جایا جائے گا اور پھر پشت کی طرف سے ہاتھوں میں اعمال نامے دیدیے جائیں گے۔

"پل صراط" بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوگا، اس کو جہنم کی پشت پر یعنی اس کے دہانے پر قائم کیا جائے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے اوپر سے گزرنے کا حکم دیا جائے گا، اہل ایمان کہ جو نجات یافتہ ہوں گے، اپنے اعمال و مراتب کے اعتبار سے اس کے اوپر سے گزر جائیں گے اور جنت میں پہنچ جائیں گے، چند اہل کفر، جو مستوجب عذاب ہوں گے اس پر سے گر کر دوزخ میں جا پڑیں گے عافانا اللہ الکریم۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حساب کتاب کا خوف

(۱۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَ رَجُلٌ فَقَعَدَ بَيْنَ يَدَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ مَمْلُوْكِيْنَ يُكَذِّبُوْنَنِيْ وَيَخُوْنُوْنَنِيْ وَيَعْصُوْنَنِيْ وَاَشْتِمُهُمْ وَاَضْرِبُهُمْ فَكَيْفَ اَنَا مِنْهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ يُحْسَبُ مَا خَانُوْكَ وَعَصَوْكَ وَكَذَّبُوْكَ وَعِقَابُكَ اِيَّاهُمْ فَاِنْ كَانَ عِقَابُكَ اِيَّاهُمْ بِقَدْرِ ذُنُوْبِهِمْ كَانَ كِفَافًا لَّا لَكَ وَلَا عَلَيْكَ وَاِنْ كَانَ عِقَابُكَ اِيَّاهُمْ دُوْنَ ذَنْبِهِمْ كَانَ فَضْلًا لَّكَ وَاِنْ كَانَ عِقَابُكَ اِيَّاهُمْ فَوْقَ ذُنُوْبِهِمْ اُقْتُصَّ لَهُمْ مِنْكَ الْفَضْلُ فَتَنَحَّى الرَّجُلُ وَجَعَلَ يَهْتِفُ وَيَبْكِيْ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا تَقْرَأُ قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا اَجِدُ لِيْ وَلِهٰؤُلَاءِ شَيْئًا خَيْرًا مِّنْ مُّفَارَقَتِهِمْ اُشْهِدُكَ اَنَّهُمْ كُلُّهُمْ اَحْرَارٌ۔

(رواہ الترمذی)

"ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آکر بیٹھ گیا اور عرض کرنے لگا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس غلام ہیں جو مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں، میرے مال میں خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں، چنانچہ میں (از راہ تادیب و تنبیہ) ان کو برا بھلا کہتا ہوں اور ان کو مارتا ہوں تو ان کی وجہ سے قیامت کے دن (اللہ تعالیٰ کے ہاں) میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا (یعنی کیا مجھے ان کو برا بھلا کہنے ڈانٹنے ڈپٹنے اور مارنے پیٹنے کا حساب دینا ہوگا اور ان چیزوں کی وجہ سے میرا مواخذہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا) اور ہر شخص کے ایک ایک عمل اور ایک ایک چیز کی پوچھ تاچھ ہوگی) تو ان غلاموں نے تمہارے مال میں جو خیانت کی ہوگی، تمہاری جو نافرمانی کی ہوگی اور تمہارے ساتھ جو جھوٹ بولا ہوگا، ان سب کا حساب ہوگا، اسی طرح تم نے ان کو جو کچھ سزا دی ہوگی اس کا بھی حساب ہوگا، پس اگر تمہاری دی ہوئی سزا (رائج ضابطہ اخلاق و قانون اور عام عادت معمول کے مطابق) ان کے جرائم کے بقدر ثابت ہوئی تو تمہارا معاملہ برابر سرابر رہے گا کہ نہ تمہیں کوئی ثواب ملے گا اور نہ تم پر کوئی عذاب ہوگا، کیونکہ اس صورت میں کہا جائے گا کہ تم نے ان کے ساتھ حالات کے مطابق اور مباح معاملہ کیا ہے جس پر تم کسی مواخذہ و عذاب کے مستوجب نہیں ہوگے) اور تم نے ان کو سزا دی ہوگی وہ اگر ان کے جرائم سے کم ثابت ہوگی تو وہ تمہارا ازائد حق ہوگا (یعنی تمہارا ان کو ان کے جرائم سے کم سزا دینا ان پر تمہارے لئے ایک ایسے حق کو واجب کردے گا اگر تم چاہو گے تو اس کے عوض تمہیں انعام دیا جائے گا ورنہ نہیں) اور تمہاری دی ہوئی سزا ان کے جرائم سے زیادہ ہوگی تو پھر ان کے لئے تم سے اس زیادتی کا بدلہ لیا جائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ کرے گا کہ تم نے چونکہ

اپنے ان غلاموں کو ان کے جرائم سے زیادہ سزا دی تھی جس کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا لہٰذا اب تم اپنے ان غلاموں کو اس زیادتی کا بدلہ دو) وہ شخص (آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سن کر) الگ جا بیٹھا اور رونے چلانے لگا پھر رسول کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد کو مؤکد اور ثابت کرنے کے لئے) فرمایا کہ کیا تم (قرآن کریم میں) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں پڑھتے ہو کہ: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ "اور قیامت کے دن ہم عدل و انصاف کی میزان کھڑی کریں گے (جس کے ذریعہ سب کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن کیا جائے گا) پس کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا (یعنی جس کا بھی حق ہو گا وہ اس کو یقیناً دلوایا جائے گا اور اگر (کسی کا) عمل رائی کے دانہ کے برابر ہو گا تو (اس سے صرف نظر نہیں کی جائے گا بلکہ) ہم اس کو (بھی وہاں) حاضر کریں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں (یعنی ہمارے وزن اور حساب کے بعد حساب کتاب کی اور کسی مرافعہ کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ ہم سے بڑھ کر عدل و انصاف کرنے والا اور کوئی نہیں ہے اور اس وقت ہمارا فیصلہ بالکل آخری فیصلہ ہو گا جس پر کسی کو شک و شبہ کرنے کی ہم گنجائش ہی نہیں چھوڑیں گے)" اس شخص نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں اپنے اور ان غلاموں کے حق میں ان کی جدائی سے بہتر اور کوئی بات نہیں جانتا (یعنی اس صورت میں میرا خیال ہے کہ قیامت کے دن کے محاسبہ و مواخذہ سے بچنے اور وہاں کی جواب دہی سے محفوظ رہنے کی خاطر میرے اور میرے ان غلاموں، دونوں کے حق میں سب سے بہتر بات یہی ہے کہ وہ مجھ سے الگ ہو جائیں بایں طور کہ میں ان کو آزادی دے دوں) لہٰذا میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ وہ سب غلام آزاد ہیں۔" (ترمذی)

تشریح: "میرے پاس غلام ہیں" کے بارے میں احتمال ہے کہ اس شخص کے پاس غلام اور باندی، دونوں ہوں گے پس یہاں صرف "غلام کا ذکر تغلیباً ہے۔

كَانَ كَفَافًا (تو تمہارا معاملہ برابر سرابر رہے گا) اصل میں "کفاف" اس چیز کو کہتے ہیں جو ضرورت و حاجت کے بقدر رہو، پس اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ان غلاموں کو ان کے جرائم کے برابر سزا دی ہوگی تو تمہارا اور ان غلاموں کا معاملہ برابر سرابر رہے گا کہ قیامت کے دن نہ تو ان غلاموں پر تمہارا کوئی حق واجب ہو گا اور نہ تمہارے اوپر ان غلاموں کا کوئی حق آئے گا۔

كَانَ فَضْلًا لَكَ (تو وہ تمہارا زائد حق ہو گا) فضل اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جو واجب حق سے زیادہ ہو! پس اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا ان غلاموں کو ان جرائم سے کم سزا دینا قیامت کے دن تمہارے حق میں ایک ایسی خوبی بن جائے گا کہ اگر تم چاہو گے تو تمہیں اس کا اجر و انعام ملے گا لیکن واضح رہے کہ "اجر و انعام سے مراد حسن ثواب، قربت و نزدیکی اور درجہ و مرتبہ کی بلندی ہے نہ کہ نفس فعل کی جزاء کیونکہ بعض خوبی یا یوں کہہ لیجئے کہ بعض سچا عمل، اجر و ثواب کے حسن و اضافہ اور درجہ و مرتبہ کی بلندی کے اعتبار سے تو مفید ہوتا ہے مگر نفس فعل کے اعتبار سے کسی الگ اجر و ثواب کو واجب نہیں کرتا کہ وہ عمل اختیار کرنے والا خواہ طالب ہو یا نہ ہو" اس کو بہر صورت اجر و ثواب ملے، پس اس شخص کا اپنے غلاموں کو ان کے جرائم سے کم سزا دینا بھی اسی درجہ کی خوبی ہوگی کہ اگر وہ چاہے گا تو اس کی اس خوبی کو اس کے اجر و ثواب میں حسن و اضافہ اور اس کے مرتبہ و درجہ کی بلندی کا سبب بنا دیا جائے گا اور اگر وہ نہیں چاہے گا تو پھر اس کے نامہ اعمال میں اس خوبی کا کوئی الگ ثواب نہیں لکھا جائے گا۔

اس حدیث کے ذریعہ مالک و غلام اور آقا و خادم کے باہمی تعلق اور ان کے درمیان معاملات کی نزاکت کا اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو لوگ اپنے غلام، اپنے خادم اور اپنے نوکروں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتے ہیں، ان کو چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی معمولی خطاؤں پر جس طرح بڑی بڑی سزائیں دیتے ہیں اور ان کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو سخت جسمانی اور روحانی اذیت و تکلیف پہنچاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے حق میں کانٹے بوتے ہیں، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ وہ دن یقیناً آنے والا ہے جب احکم الحاکمین کی بارگاہ میں انہیں اپنے غلاموں، اپنے نوکر چاکر اور اپنے خادموں کے تعلق سے اپنے ایک ایک فعل و عمل، ایک ایک برتاؤ، اور ایک ایک

زیادتی کی جواب دہی کرنی پڑے گی اور سخت حساب و مواخذہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔

رہی ان صحابی کی بات جنہوں نے یہ حدیث سن کر، قرآن کی آیت سن کر، اپنے حق میں یہی بہتر جانا کہ وہ اتنا بڑا دنیاوی نقصان برداشت کر کے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیں، تو ان کا تقویٰ، ان کا کمال احتیاط، اور خوف خدا سے ان کے دل کا معمور ہونا پوری طرح ظاہر ہوتا ہے، اور یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کمال عبدیت یہی ہے کہ انسان اس چیز کے سائے سے بھی اجتناب کرے جو کسی بھی درجہ میں مولیٰ کی ناراضگی اور آخرت کے نقصان کا خدشہ و واہمہ رکھتی ہو۔

آسان حساب اور سخت حساب

⑬ وَعَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ بَعْضِ صَلَاتِهِ اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا قُلْتُ يَانَبِيَّ اللّٰهِ مَا الْحِسَابُ الْيَسِيْرُ قَالَ اَنْ يَّنْظُرَ فِيْ كِتَابِهٖ فَيَتَجَاوَزَ عَنْهُ اِنَّهٗ مَنْ نُّوْقِشَ الْحِسَابَ يَوْمَئِذٍ يَا عَائِشَةُ هَلَكَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو بعض نماز میں یہ دعا مانگتے سنا کہ اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا یا اللہ! میرے اعمال کا آسان حساب لیجیو! (حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ) میں نے (یہ سنا تو) عرض کیا کہ اے خدا کے نبی (ﷺ)! آسان حساب کا کیا مطلب ہے اور اس کی کیا صورت ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا" آسان حساب کی یہ صورت ہوگی کہ بندہ اپنے اعمال نامے کو دیکھ لے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرما دے گا اور عائشہؓ! حقیقت یہ کہ اس دن جس شخص کے حساب میں مناقشہ یعنی کرو کاوش کی گئی تو (بس سمجھ لو کہ) وہ برباد ہو گیا، یعنی وہ مستوجب عذاب ہونے سے بچ نہیں سکتا۔" (احمد)

تشریح: "بعض نماز" سے یا تو یہ مراد ہے کہ آپ نے یہ دعا بس نماز میں مانگی تھی، وہ فرض نمازوں میں سے کوئی نماز تھی، یا نوافل میں سے کوئی نفل نماز تھی اور یا یہ کہ آپ ﷺ نے یہ دعا نماز کے کسی ایک حصہ یعنی ابتداء قیام میں، یا رکوع میں، یا قومے میں، یا سجدے میں اور یا قعدے میں مانگی تھی۔

آنحضرت ﷺ کا مذکورہ دعا مانگنا یا تو اُمت کی تعلیم کے لئے تھا کہ مسلمانوں کے چاہئے کہ وہ خدا سے آسان حساب کی دعا مانگا کریں تاکہ وہ اصل حساب کی سختیوں اور مواخذہ کی ہولناکی و شدت سے بچ جائیں اور ان پر خدا کا فضل و احسان ہو جائے، یا آپ ﷺ نے یہ دعا لوگوں کو خواب غفلت سے ہوشیار کرنے کے لئے مانگی، کہ دیکھو چین و اطمینان کی چادر تان کر مت سو جاؤ، اس دن کا خیال کرو جب اپنے اعمال کے ساتھ خدائے جبار و قہار کی عدالت میں پیش ہونا ہے، اگر وہاں سخت مواخذہ میں گرفتار ہو گئے تو پھر عدل خداوندی کسی حال میں معاف نہیں کرے گا، عذاب میں مبتلا ہو کر رہو گے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ابھی سے اپنے اعمال کی دنیا کو سنوار لو، اتنا تو کر لو کہ کچھ منہ لے کر اس کی بارگاہ میں پیش ہو سکو اور اس کے فضل و احسان کے مستحق بن سکو! اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ پر خوف الٰہی کا غلبہ ہوا، احوال قیامت اور حساب کتاب کی ہولناکی کے خیال نے خشیت خداوندی اور خوف الٰہی سے دل و جان کو لرزاں کر دیا، اس لئے آپ ﷺ نے یہ دعا مانگی۔

"مناقشہ" کے معنی ہیں جانچ کر حساب لینا، کوڑی کوڑی کا جھگڑا کرنا پس "حساب میں مناقشہ کرنا" یہ ہے ایک ایک عمل اور ہر عمل کے ایک ایک جزو کی پوری پوری چھان بین ہو، ہر فعل کی اچھی طرح جانچ پڑتال ہو اور رتی رتی کا حساب لیا جائے ظاہر ہے کہ اصل حساب یہی ہے اور اس حساب میں کوئی بھی بندہ پورا نہیں اتر سکتا، جو بھی شخص اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے محروم رہا اور اس کو آسان حساب کے بجائے اس سخت حساب سے دوچار کیا گیا تو وہ عذاب میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"بندہ اپنے اعمال نامے کو دیکھ لے گا الخ" یعنی جو بندے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے سائے میں ہوں گے ان کے ساتھ حساب کی

صورت یہ ہوگی کہ ان کے سامنے ان کے اعمال نامے کھول کرڈالدیئے جائیں گے اور اس کو دکھادیا جائے گا کہ دیکھ تونے یہ فلاں فلاں گناہ کا ارتکاب کیا بندہ ندامت وشرمندگی کے ساتھ گناہوں کا اعتراف واقرار کرے گا۔ اور تب اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہوں سے درگزر فرمادے گا اور اس کو اپنی عنایت سے بخشش ومغفرت کا پروانہ عطافرمادے گا اور اگر لفظ ینظر کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کی جائے تو یہ بھی ہوسکتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اعمال نامے کو ایک نظر دیکھ لے گا اور پھر اس سے درگزر فرمادے گا۔

مؤمن پر قیامت کا دن آسان ہوگا

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّہٗ اَتٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَخْبِرْنِیْ مَنْ یُّقْوٰی عَلَی الْقِیَامِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ الَّذِیْ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ فَقَالَ یُخَفَّفُ عَلَی الْمُؤْمِنِ حَتّٰی یَکُوْنَ عَلَیْہِ کَالصَّلٰوۃِ الْمَکْتُوْبَۃِ۔

"اور حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ وہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ (یارسول اللہ) مجھے یہ تو بتائیے، قیامت کے دن کہ جس کے بارے میں خدائے بزرگ وبرتر یہ فرماتا ہے یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (جس دن کہ تمام لوگ ایک ایک جہان کے پروردگار کے سامنے کھڑے ہوں گے، کس شخص کو (حساب کے لئے) اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کی تاب ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت کا دن مؤمن کے لئے آسان کردیا جائے گا یہاں تک کہ وہ دن اس پر فرض نماز (کی ادائیگی کے وقت) کے بقدر رہ جائے گے۔"

تشریح: حضرت ابوسعید خدریؓ نے آنحضرت ﷺ سے سوال کرتے ہوئے قرآن کے جن الفاظ کا حوالہ دیا، وہ دراصل پارہ عم کی سورۃ تطفیف (وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ) کی ایک چھوٹی سی آیت ہے، اس سورۃ میں قیامت کے دن کے احوال اور اس دن اعمال کی جزاء وسزا دیئے جانے کا ذکر ہے اور چونکہ وہ دن خدا کے عدل وانصاف کے اظہار کا دن ہوگا اس مناسبت سے اس سورۃ میں خاص طور سے بعض ان اعمال پر وعید مذکور ہے جو حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں اور سماجی زندگی میں نہایت قابل نفرین سمجھتے ہیں جیسے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو ان الفاظ میں تہدید کی گئی ہے کہ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ کیا ان لوگوں کو (جوناپ تول میں کمی کرکے حقوق العباد کو نقصان پہنچاتے ہیں) اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کرکے اٹھائے جائیں گے جس دن کہ تمام لوگ ایک ایک جہان کے پروردگار کے سامنے کھڑے ہوں گے (پس اس دن سے ڈرنا چاہئے اور ہر اس برائی سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے بندوں کے حقوق پر اثر پڑتا ہو، جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو اور جس سے سماجی زندگی باہمی اطمینان واعتماد سے محروم ہوتی ہو، جیسے کم ناپنا اور کم تولنا) منقول ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے اس سورۃ کی تلاوت شروع کی اور جب اس آیت یوم یقوم الناس لرب العٰلمین پر پہنچے تو خوف وخشیت الٰہی سے بے حال ہوگئے اور ان پر گریہ طاری ہوگیا، اور پھر اس طرح روئے کہ اس کے بعد کی آیتوں کی تلاوت جاری رکھنے پر قادر نہیں ہوسکے۔

بہرحال حضرت ابوسعید خدریؓ کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ ایک تو قیامت کا دن خود اپنے اندر ہول ودہشت اور خوف وپریشانی کے صد ہزار عالم لئے ہوگا، اور اس پر اپنے اعمال کا کچا چٹھا لے کر خداوند ذوالجلال کی پرہیبت بارگاہ میں پیش ہونا ہوگا، اس کے عدل وانصاف کی ہیبت اور اس کے لئے اس کی عدالت میں، اس کی پرجلال بارگاہ میں کھڑا ہوسکے؟ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت عطا فرمائی کہ مسلمانوں کو بہرحال اطمینان رکھنا چاہئے کہ وہ دن اپنی تمام ہولناکیوں کے باوجود ان کے حق میں ایک آسان دن ہوگا وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل وکرم کے سائے میں رہیں گے، اس لئے قیامت کا وہ پورا دن بس اتنے عرصہ میں گزر جائے گا جتنے عرصہ میں کوئی

شخص فرض نماز پڑلیتا ہے پس اس سلسلے میں ایک بات تو یہ ذہن میں رہنی چاہئے کہ "مسلمان" سے مراد کامل مسلمان ہے، یعنی عقیدہ و فکر کے اعتبار سے پختہ و صالح، اعمال و کردار کے اعتبار سے پاکباز و متقی اور پروردگار کی اطاعت و عبادت میں کامل! اسی طرح "فرض نماز کے بقدر" سے مراد وہ عرصہ ہے جس میں فرض نماز کہ جس کی نہایت چار رکعتیں ہیں، ادا کی جاتی ہیں یا یہ کہ فرض نماز کا پورا وقت مراد ہے، یعنی جتنی دیر تک ایک فرض نماز ادا کرنے کا وقت رہتا ہے، اتنی دیر میں قیامت کا پورا دن گزر جائے گا ہی یہ بات کہ "مسلمانوں کے حق میں قیامت کے دن کا فرض نماز کی ادائیگی کے وقت کے بقدر ہونے" سے کیا یہ مراد ہے کہ ان کے حق میں قیامت کا دن واقعۃً اتنے مختصر سے عرصہ پر محیط ہوگا، یا یہ مراد ہے کہ وہ دن ہوگا تو بہت زیادہ لمبا و طویل لیکن مسلمانوں کو وہ اتنا بڑا دن بس ایسا محسوس ہوگا جیسے ایک فرض نماز کے وقت کے بقدر ہو کر گزر گیا ہو؟ تو اس سلسلہ میں یہی دوسرا پہلو مراد ہے یعنی وہ دن اپنی اتنی طوالت اور اتنی شدت و سختیوں کے باوجود مسلمانوں کے لئے اتنا ہلکا بنا دیا جائے گا کہ ان کو وہ پورا دن ایک فرض نماز کے مختصر ترین عرصہ کے بقدر گزرتا ہوا معلوم ہوگا جب کہ کافروں کے حق میں اس کے برعکس ہوگا، چنانچہ یہ تو اس دنیا میں بھی عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ وقت اور مقدار کے اعتبار سے شب و روز کی گردش ہر شخص کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن جو لوگ عیش و راحت اور خوشحالی کے ساتھ ہوتے ہیں ان کے لئے چوبیس گھنٹوں کے وہی دن و رات، لمحوں کے برابر گزرتے محسوس ہوتے ہیں جو مصائب و آلام اور پریشان حالی میں مبتلا لوگوں کے لئے سالوں کے برابر گزرتے معلوم ہوتے ہیں اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قیامت کے دن کا مسلمانوں کے حق میں آسان و ہلکا ہونا یکساں نوعیت نہیں رکھے گا بلکہ ہر مسلمان کے عقیدہ و عمل کے مراتب کے اعتبار سے الگ الگ نوعیت رکھے گا کہ جو شخص دنیا میں اپنے عقیدہ و عمل کے اعتبار سے زیادہ کامل رہا ہوگا وہ اس دن کو اور وہاں کے احوال کو اتنا ہی زیادہ آسان و ہلکا محسوس کرے گا اور دنیا میں جس شخص کا عقیدہ و عمل جتنا زیادہ کمزور رہا ہوگا وہ اس دن کو اتنا ہی کم آسان و ہلکا محسوس کرے گا یہاں تک کہ کفار کو وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا، چنانچہ قرآن کریم کے ان الفاظ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۞ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۞ وَنَرٰهُ قَرِيْبًا ۞۔

"فرشتے اور (اہل ایمان کی) روحیں اس کے پاس (عالم بالا میں چڑھ کر جاتی ہیں (اور وہ عذاب) ایسے دن میں ہوگا جس کی مقدار (دنیا کے) پچاس ہزار سال کے برابر) ہے تو آپ ﷺ (اہل کفر کی مخالفت پر) صبر کیجئے اور صبر بھی ایسا جس میں شکایت کا نام نہ ہو یہ لوگ (یعنی اہل کفر) اس دن کو (بدعقیدگی کی وجہ سے بعد از وقوع دیکھ رہے ہیں اور ہم اس کو (وقوع سے) قریب دیکھ رہے ہیں۔"

چنانچہ اس آیت میں "اس دن" سے مراد قیامت کا دن ہے جو اپنی درازی اور سختی کے اعتبار سے کفر کو اتنا لمبا معلوم ہوگا، اور جس طرح ایمان کے مراتب میں تفاوت ہونے کی وجہ سے وہ ان اہل ایمان میں سے کچھ کو بہت آسان اور ہلکا معلوم ہوگا اور کچھ کو کم آسان و ہلکا معلوم ہوگا، اسی اعتبار سے ایک آیت میں اس دن کو ایک ہزار سال کے برابر فرمایا گیا ہے، پس بعض کافروں کو ہزار سال کے برابر اور بعض کافروں کو پچاس ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا۔

نیز باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ ۞ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۞ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۞۔

"پھر جس وقت صور پھونکا جائے گا سو وہ وقت (یعنی وہ دن) کافروں پر ایک سخت دن ہوگا جس میں ذرا آسانی نہ ہوگی۔"

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اہل ایمان پر وہ دن بہت ہلکا اور آسان ہوگا اور وہ ہلکا و آسان ہونا ان کے ایمان و عمل کے اعتبار سے تفاوت رکھے گا۔

بہر حال اس حدیث میں مسلمانوں کے لئے واضح طور پر یہ ہدایت ہے کہ اگر وہ قیامت کے دن کو اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ آسان وہلکا اور جلد گزر جانے والا بنانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ وہ اپنے ایمان وعقیدہ کو زیادہ سے زیادہ پختہ بنائیں اور اپنی عملی زندگی کو زیادہ سے زیادہ طاعت وعبادت اور رضاء الٰہی کے کاموں سے مامور کریں۔

⑮ وَعَنْهُ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ مَاطُوْلُ هٰذَا الْيَوْمِ فَقَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّهٗ لَيُخَفَّفُ عَلَى الْمُؤْمِنِ حَتّٰى يَكُوْنَ اَهْوَنَ عَلَيْهِ مِنَ الصَّلٰوةِ الْمَكْتُوْبَةِ يُصَلِّيْهَا فِي الدُّنْيَا رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ كِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"اور حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے اس دن (قیامت کے دن) کے بارے میں پوچھا گیا جو پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا کہ اس کی درازی کیا ہوگی (یعنی جب وہ دن اتنا زیادہ لمبا ہوگا تو لوگوں کا کیا حال ہوگا، کیا وہ حساب کتاب اور اپنا فیصلہ سننے کے لئے اس دن کھڑے رہ سکیں گے؟) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ دن کامل مسلمان پر آسان اور ہلکا کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ دن اس (کامل مسلمان کے لئے اس فرض نماز (کے وقت) سے بھی زیادہ آسان اور ہلکا ہو جائے گا جس کو وہ دنیا میں پڑھتا تھا ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: یہ حدیث بھی پہلی حدیث کی طرح اہل ایمان کے حق میں بشارت ہے کہ اگر وہ ایمان کامل کے حامل ہیں اور ان کی دنیاوی زندگی اعمال صالحہ سے معمور ہے تو انہیں قیامت کے دن کی طوالت اور سختی سے مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں وہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں کے سائے میں ہوں گے اور وہ دن تمام درازی وسختی کے باوجود ان کے حق میں اس طرح گزر جائے گا جیسے انہوں نے کوئی فرض نماز پڑھ لی ہو۔

کمال ایمان رکھنے والے لوگ حساب کتاب کے بغیر جنت میں جائیں گے

⑯ وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ يَزِيْدٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُحْشَرُ النَّاسُ فِيْ صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ فَيَقُوْلُ اَيْنَ الَّذِيْنَ كَانَتْ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ فَيَقُوْمُوْنَ وَهُمْ قَلِيْلٌ فَيَدْ خُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ ثُمَّ يُؤْمَرُ لِسَآئِرِ النَّاسِ اِلَى الْحِسَابِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور اسماء بنت یزیدؓ (ابن سکن) رسول کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن لوگوں کو ایک فراخ وہموار میدان میں جمع کیا جائے گا، پھر ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو بستروں اور خواب گاہوں سے جدا رہتے تھے (یہ اعلان سن کر) اہل محشر میں سے بہت تھوڑے لوگ (جو اہل اسلام میں ہوں گے اٹھیں گے (یعنی مجمع سے نکل کر باہر آئیں گے) اور حساب کتاب کے (مرحلہ سے گزرے) بغیر جنت میں چلے جائیں گے، پھر باقی لوگوں سے حساب لینے کا حکم دیا جائے گا" (اس روایت کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: تتجافی جنوبهم عن المضاجع (جن کے پہلو بستروں اور خواب گاہوں سے جدا رہتے تھے) سے مراد یا تو وہ بندگان خدا ہیں جو رات میں اپنی پرسکون نیند کی راحت سے صرف نظر کر کے اور اپنے آرام دہ بستروں اور خواب گاہوں کو چھوڑ کر اپنے خالق کی بارگاہ میں حاضری دیتے ہیں اور نماز تہجد پڑھتے ہیں! اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شاید وہ لوگ مراد ہوں جو صلوۃ الاوابین پڑھتے ہیں! نیز یہ بھی احتمال ہے کہ ان سے وہ لوگ مراد ہوں جو عشا اور فجر کی نماز پڑھتے ہیں۔ بہر حال حدیث کے ان الفاظ سے قرآن کریم کی ان آیتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عبادت گزار اور پاکباز بندوں کو یوں متعارف کرایا ہے کہ: اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۞ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا

رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۞ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ بس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ (ایمان لانے اور خدا کے احکام ماننے سے) تکبر نہیں کرتے (جیسا کہ کافر لوگ تکبر کرتے ہیں اور از راہ نخوف خدا کا حکم ماننے سے انکار کرتے ہیں) نیز (رات کو ان کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں (خواہ عشاء فجر کی نماز یا تہجد کی نماز اور خواہ صلوۃ الاوابین پڑھنے کے لئے اور ان کے پہلو خواب گاہوں سے صرف علیحدہ ہی نہیں رہتے بلکہ وہ لوگ اپنے رب کو ثواب کی) امید اور (عذاب کے) خوف سے پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں، پس کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے، یہ ان کو ان کے نیک اعمال کا صلہ ملا ہے" پس ان آیات میں ان صفات اور خوبیوں کا ذکر ہے جو اہل ایمان کا خاصہ ہیں اور جن میں سے بعض صفات تو ایسی ہیں جن پر خود ایمان ہی موقوف ہے اور بعض صفات ایسی ہیں جن پر ایمان کا کامل ہونا موقوف ہے نیز مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان و عمل کا کمال رکھنے والے بندگان خاص قیامت کے دن حساب کتاب کے مرحلہ سے محفوظ رہیں گے ان پر کوئی سختی نہیں ہوگی ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا اور وہ اپنے رب کی بے پایاں عنایتوں اور رحمتوں کے سائے میں رہتے ہوئے حساب کتاب کے بغیر سیدھے جنت میں پہنچا دیے جائیں گے۔

"بہت تھوڑے لوگ" میں اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ اس دنیا میں اہل ایمان کی تعداد اہل کفر کی تعداد سے کم ہے اور برے لوگوں کے مقابلہ میں نیک لوگ کم ہوتے ہیں لہٰذا آخرت میں بھی اس دن ایسے لوگوں کی تعداد جو حساب کے بغیر جنت میں داخل کیے جانے کی سعادت کے سزاوار ہوں گے، نسبتاً کم نکلے گی پس یہ بات قرآن کریم سے بھی ثابت ہے کہ اہل حق اور نیکوکار لوگ ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اور اہل باطل و بدکار لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے جیسا کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ۔ مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں! اور ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا ہے۔

وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ۔ اور میرے بندوں میں (طاعت و عبادت کے ذریعہ میرا) شکر ادا کرنے والے کم ہی ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان اور اہل حق کا اقلیت میں ہونا اور اس اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ان کا مختلف قسم کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی مصائب و آلام میں مبتلا ہونا اور طرح طرح کے ظلم و جور سہنا ان کے لئے کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے وہ تنگ دل اور مایوسی کا شکار ہوں بلکہ حقیقت میں ان کے خدا کی طرف سے ان کے لئے ایک اعزاز اور ایک سعادت ہے اور آخر کار جس کا صلہ انہیں ابدی راحتوں اور نعمتوں کی صورت میں ملنے والا ہے خدا کے ان بندگان خاص یعنی ایمان و عمل کا کمال رکھنے والوں کو حساب کتاب کے بغیر جنت میں اس لئے داخل کیا جائے گا کہ انہوں نے دنیا میں ہدایت کے راستہ کو اختیار کیا، خدا اور اس کے رسول کے احکام کی فرمانبرداری کی، دین کی راہ پر استقامت و استقلال کے ساتھ چلے، خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے طاعت و عبادت کی مشقت برداشت کی، دنیا کی لذتوں اور راحتوں کو ترک کیا اور اس طرح انہوں نے "صبر" کا مقام اختیار کیا تو پھر ان کو خدا کے یہاں کی سعادتوں اور بے پایاں راحتوں کا مستحق ہونا ہی ہے، اور ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یوں بشارت دیتا ہے کہ قُلْ یٰعِبَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّکُمْ ط لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃٌ ط وَاَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ ط اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (اے محمد ﷺ) آپ ﷺ (مؤمنین کو میری طرف سے) کہیں کہ اے میرے ایمان والے بندو! تم اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو (یعنی طاعت پر دوام اور گناہوں سے پرہیز کرو) جو لوگ اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیک صلہ ہے اور اللہ کی زمین فراخ ہے (یعنی اگر تمہیں دین کی راہ میں اپنا وطن بھی چھوڑنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرو اور ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جاؤ) اور (ہم وعدہ کرتے ہیں کہ دین کی راہ میں) استقلال اختیار کرنے والوں (اور ہر طرح کی مشقت و تکلیف پر صبر کرنے والوں کو) ان کا صلہ بے حساب ملے گا۔

میزان اور پلصراط کے بارے میں کچھ باتیں: اہل سُنّت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن میدان حشر میں (ترازو) کھڑی کرے گا جس کے دو پلے اور ایک چوٹی ہوگی، اور اس ترازو کے ذریعہ بندوں کے نیک اور برے اعمال کو وزن کریگا معتزلہ، مرجیہ اور فارخیہ فرقے کے لوگوں کو "ترازو" کے وجود سے انکار ہے وہ کہتے ہیں کہ "ترازو" سے مراد "میزان عدل" ہے، اعمال کا تولنا اور وزن کرنا مراد نہیں ہے لیکن قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی رو سے یہ لوگ جھوٹے ہیں خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ط وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ ۝ اور وہاں ہم قیامت کے دن عدل کے لئے ترازو رکھیں گے (اور سب کے اعمال کا وزن کریں گے) پس کسی پر کسی بات کا ظلم نہ ہوگا اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کسی کی نیکی ہوگی تو اسے دی جائے گی (یعنی اس نیکی کو وہاں حاضر کر کے میزان عدل میں رکھا جائے گا) اور ہم ہی حساب کے لئے کافی ہیں ایک موقع پر یوں فرمایا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۔ (پھر اعمال کے وزن کے بعد) جس شخص (کے ایمان وعمل) کا پلہ بھاری ہوگا وہ ہمیشہ عیش وراحت میں رہے گا اور جس شخص (کے ایمان وعمل) کا پلہ ہلکا ہوگا وہ دوزخ میں جائے گا۔

پس عدل کی تعریف سب کی اور گرانی درست نہیں، بلکہ اظہار عدل کے لئے در حقیقت ترازو میں اعمال کو تولنا مراد ہے، اور علماء نے لکھا ہے کہ یہ ترازو اللہ تعالیٰ کے اپنے دست قدرت میں ہوگی کیونکہ بندوں کا حساب اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے! چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ترازو ہوگی، ایک گروہ کو اللہ تعالیٰ بلند کرے گا اور ایک کو پست کرے گا۔

بیان کیا گیا ہے کہ بندوں کی نیکیاں رائی کے دانہ اور چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کے برابر ہوں گی جو بہت خوبصورت ہونگی، انہیں نور کے پلے میں رکھا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ پلہ بھاری ہو جائے گا، برائیوں کی شکل بہت بھونڈی ہوگی اور انہیں ظلمت کے پلے میں رکھا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ پلہ ہلکا ہو جائے گا اعمال کے تلنے میں لوگوں کا حال تین طرح سے ہوگا بعض وہ ہوں گے جن کے نیک اعمال کا پلہ برے اعمال کے پلہ کی نسبت سے بھاری ہوگا، ایسے لوگ بہشت میں جائیں گے، دوسرا گروہ ان لوگون کا ہوگا جن کے نیک اعمال کی نسبت ان کے برے اعمال کا پلہ بھاری ہوگا ایسے لوگ دوزخ میں جائیں گے، تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہوگا جن کے نیک اعمال اور برے اعمال کے دونوں پلے برابر ہوں گے، ایسے لوگوں کو اعراف میں پہنچا دیا جائے گا اور پھر خواہ شفاعت کی وجہ سے سزا سے پہلے ہی خواہ سزا کے بعد ان کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

اہل سُنّت کے نزدیک، پل صراط پر ایمان لانا بھی واجب ہے، یہ وہ پل ہے جو دوزخ کی پیٹھ پر سے گزرتا ہے اور جو بال سے زیادہ باریک اور آگ سے زیادہ گرم اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، قیامت کے دن تمام مخلوق کو اس پل پر سے گزارا جائے گا، جو اہل جنت ہوں گے وہ اپنے ایمان وعمل کے مراتب کے مطابق آسانی یا پریشانی کے ساتھ پل پر سے گزر کر جنت میں چلے جائیں گے اور جو اہل دوزخ ہوں گے وہ اس پر سے گر کر دوزخ میں جا پڑیں گے اہل ایمان کو ان کے عمل کے مطابق نور عطا کیا جائے گا جس کی روشنی میں وہ اس پل کے راستہ کو طے کریں گے ان میں سے بعض سوار ہو کر اور دوڑتے کے برابر ہو جائیں گے بعض گھٹنوں کے بل اور بعض سرین کے بل رینگتے ہوئے جائیں گے پل صراط کی مسافت آخرت کے سالوں کے حساب سے تین ہزار سال ہے! ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دوزخ پر سات پل ہیں اور ہر پل کے درمیان ستر برس کی مسافت جتنا فاصلہ ہے اور ہر پل تلوار کی دھار جتنا تیز ہے اس کے اوپر سے گزرنے والے گروہوں میں سے پہلا گروہ آنکھ جھپکتے ہی گزر جائے گا دوسرا گروہ اس طرح گزرے گا جس طرح بجلی اچک لے جاتی ہے تیسرا گروہ تیز ہوا کہ طرح گزر جائے گا، چوتھا گروہ پرندوں کی سی تیزی کے ساتھ گزر جائے گا پانچواں گروہ گھوڑوں کی طرح دوڑ کر گزر جائے گا چھٹا گروہ دوڑتے ہوئے آدمیوں کی طرح سے عبور کرے گا اور ساتواں گروہ پیدل چلنے والے لوگوں کی طرح گزر جائے گا، ان سب کے بعد آخر میں ایک گروہ باقی

رہ جائے گا جب انہیں گزرنے کے لئے کہا جائے گا تو وہ اپنا پاؤں پل صراط پر رکھیں گے، مگر ان کے پاؤں لرزنے لگیں گے، چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل چلنے لگیں گے، اور دوزخ کی آگ کی چنگاریاں ان کے پاؤں اور پوست تک پہنچیں گی، تب یہ لوگ پیٹ کے بل گھسٹتے چلیں گے پھر ہاتھوں کے ذریعہ پل کے ساتھ لپٹ جائیں گے، آگ بھی ان سے لپٹ جائے گی، تب آگ سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ پیٹ کے بل گھسٹنے لگیں گے یہاں تک کہ دوزخ کو عبور کرلیں گے، عبور کرنے کے بعد پلٹ کر دوزخ کی طرف نگاہ دوڑائیں گے اور کہیں کے جس اللہ نے اس (دوزخ) سے ہمیں پار کردیا ہے وہ پاک ہے، بیشک اس نے اپنے لطف وکرم سے میرے حال پر مہربانی فرمائی ہے، آج تک ازاول تا آخر اس نے میرے سوا اور کسی پر فضل نہیں کیا، مجھے اپنے فضل سے پل صراط کے پنجہ سے رہائی دلائی۔

بَابُ الْحَوْضِ وَالشَّفَاعَةِ

حوض اور شفاعت کا بیان

حوض کے معنی: لغت میں "حوض" کے معنی ہیں "پانی جمع ہونا اور بہنا۔ اسی لئے جو گندا خون عورتوں کو ہر مہینہ آتا ہے۔ "حیض" کہلاتا ہے اور یہ لفظ بھی "حوض" ہی سے مشتق ہے! یہاں حوض سے وہ "حوض" (نہر) مراد ہے جو قیامت کے دن آنحضرت ﷺ کے لئے مخصوص ہوگا اور جس کی صفات وخصوصیات اس باب میں نقل ہونے والی احادیث سے معلوم ہوں گی۔

قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے لئے دو حوض ہوں گے۔ ایک حوض تو میدان محشر میں پل صراط سے پہلے عطا ہوگا اور دوسرا حوض جنّت میں ہوگا اور دونوں کا نام کوثر ہوگا۔ واضح رہے کہ عربی میں "کوثر" کے معنی ہیں خیر کثیر یعنی بیشمار بھلائیاں اور نعمتیں! پھر زیادہ صحیح یہ ہے کہ میدان حشر میں جو حوض عطا ہوگا وہ "میزان" کے مرحلہ سے پہلے ہی ہوگا پس لوگ اپنی قبروں سے پیاس کی حالت میں نکلیں گے اور پہلے حوض پر آئیں گے۔ اس کے بعد میزان (یعنی اعمال کے تولے جانے) کے کا مرحلہ پیش آئے گا۔ اسی طرح میدان حشر میں ہر پیغمبر کا اپنا الگ حوض ہوگا جس پر اس کی اُمّت آئے گی چنانچہ اس وقت تمام پیغمبر آپس میں فخر اظہار کریں گے کہ دیکھیں کس کے حوض پر زیادہ لوگ آتے ہیں ہمارے حضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں امید رکھتا ہوں کہ میرے حوض پر آنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

شفاعت کے معنی: "شفاعت کا مطلب ہے گناہوں کی معافی کی سفارش کرنا!" چنانچہ حضرت محمد ﷺ قیامت کے دن بارگاہ رب العزت میں گنہگار اور مجرم بندوں کے گناہوں اور جرموں کے معاف کئے جانے کی درخواست پیش کریں گے اس لئے عام طور پر "شفاعت" کا لفظ اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے!۔ ویسے "شفاعت" کا لفظ شفع سے نکلا ہے جس کے اصل معنی جوڑا (جفت) کرنے، کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ ملانے، کے ہیں وتر (بمعنی طاق) کے مقابلہ پر شفع (بمعنی جفت) کا جو لفظ آتا ہے وہ اس معنی کے اعتبار سے ہے۔ اسی طرح زمین یا مکان میں ہمسائیگی کی وجہ سے جو حق خرید حاصل ہوتا ہے اس کو بھی "شفعہ" اسی معنی کی مناسبت سے کہا جاتا ہے۔ پس "شفاعت" میں بھی یہ معنی اس اعتبار سے موجود ہیں کہ شفاعت کرنے والا جرم وگناہ کرنے والے کی معافی کی درخواست پیش کرکے گویا خود کو اس مجرم وگناہ گار) کے ساتھ ملاتا ہے۔

شفاعت کی قسمیں: جن لوگوں نے اس دنیا میں کبیرہ اور صغیرہ گناہ کیے ہوں گے ان کے حق میں آنحضرت ﷺ کی شفاعت کا قبول ہونا اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ واضح رہے کہ شفاعت کی مختلف نوعیتیں ہوں گی۔ اور وہ تمام نوعیتیں آنحضرت ﷺ کی ذات کے لئے ثابت ہیں چنانچہ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جو صرف آنحضرت ﷺ کی ذات سے مخصوص ہوں گی اور بعض ایسی ہیں جن میں دوسروں کے ساتھ مشارکت ہوگی لیکن شفاعت کا دروازہ چونکہ سب سے پہلے آپ ﷺ ہی کھولیں گے اس لئے حقیقت میں تمام شفاعتیں لوٹ

کر آپ ﷺ ہی کی طرف منسوب ہوں گی اور علی الاطلاق تمام شفاعتوں کے والی آپ ﷺ ہی ہیں۔

شفاعت کی سب سے پہلی قسم "شفاعت عظمیٰ" ہے اور یہ وہ شفاعت ہے جو تمام مخلوق کے حق میں ہوگی۔ اور یہ شفاعت کرنے کا شرف صرف ہمارے حضرت محمد ﷺ کو حاصل ہوگا۔ انبیاء کرام صلواۃ اللہ علیہم اجمعین میں سے بھی کسی کو اس شفاعت کی مجال وجرأت نہیں ہوگی اور اس شفاعت عظمیٰ" سے مراد ہے تمام میدان حشر کے لوگوں کو راحت دینے، وقوف کی طوالت وشدت کو ختم کرنے، حساب کتاب اور پروردگار کے آخری فیصلے کو ظاہر کرنے اور تمام لوگوں کو محشر کی ہولناکیوں، شدتوں اور سختیوں سے چھٹکارا دینے کی سفارش کرنا اس کی تفصیل احادیث سے معلوم ہوگی! شفاعت کی دوسری قسم وہ ہے جس کے ذریعہ ایک طبقہ کو حساب کتاب کے بغیر جنت میں پہنچانا مقصود ہوگا۔ آنحضرت کی ذات کے لئے اس شفاعت کا ثبوت بھی منقول ہے بلکہ بعض حضرات کے نزدیک یہ شفاعت بھی آنحضرت ﷺ ہی کی ذات کے لئے مخصوص ہے۔ شفاعت کی تیسری قسم وہ ہے جس کی مدد سے ان لوگوں کو جنت میں پہنچانا مقصود ہوگا جن کے نامہ اعمال میں ثواب اور گناہ مساوی طور پر ہوں گے۔ شفاعت کی چوتھی قسم وہ ہے جس کے ذریعہ ان لوگوں کو جنت میں پہنچانا مقصود ہوگا جو اپنے گناہ اور جرائم کی سزا بھگتنے کے لئے دوزخ کے مستوجب قرار پائیں گے۔ چنانچہ آنحضرت ان لوگوں کے حق میں شفاعت کریں گے اور ان کو جنت میں داخل کرائیں گے! شفاعت کی پانچویں قسم وہ ہے جس کے ذریعہ کچھ لوگوں کے درجات ومراتب اور ان کے اعزاز واکرام میں ترقی اور اضافہ کرنا مقصود ہوگا شفاعت کی چھٹی قسم وہ ہے جو ان گناہ گاروں کے حق میں ہوگی جنہیں دوزخ میں ڈالا جائے گا اور وہ اس شفاعت کے بعد وہاں سے نکال کر جنت میں پہنچائے جائیں گے، اس شفاعت کا حق مشترکہ ہوگا یعنی آنحضرت کے علاوہ دوسرے انبیاء، ملائکہ، علماء اور شہدا بھی اپنے اپنے طور پر اور اپنے اپنے لوگوں کے لئے یہ شفاعت کریں گے۔ شفاعت کی ساتویں قسم وہ ہے جس کے ذریعہ ان لوگوں کے عذاب میں تخفیف کرانا مقصود ہوگا جو ہمیشہ کے لئے عذاب دوزخ کے مستوجب قرار دیئے جا چکے ہوں گے۔ شفاعت کی نویں قسم وہ ہے جو صرف اہل مدینہ کے حق میں ہوگی اور شفاعت کی دسویں قسم وہ ہے جو امتیاز واختصاص کے طور پر صرف ان لوگوں کے حق میں کی جائے گی۔ جنہوں نے آنحضرت کے روضہ اقدس کی زیارت کا شرف حاصل کیا جائے گا۔

علماء نے کہا ہے کہ شفاعت کے متعدد مواقع ومحل ہوں گے، شفاعت کا سب سے پہلا موقع تو وہ ہوگا جب لوگوں کو درگاہ رب العزت میں پیش کرنے کے لئے میدان محشر میں لاکر کھڑا کر دیا جائے گا۔ اس وقت لوگ خوف وخجالت کے پسینے میں غرق ہوں گے، ہر ایک پر ہیبت ودہشت چھائی ہوگی ہر شخص مواخذہ وعذاب کے خوف سے کانپ رہا ہوگا اس وقت شفیع المذنبین ﷺ شفاعت کریں گے تاکہ لوگوں کو کچھ اطمینان وراحت مل جائے اور وہ بیٹھ کر دم لے سکیں پھر جب درگاہ رب العزت سے حکم ہوگا کہ ان سب کو لے جایا جائے اور حساب لیا جائے تو اس موقع پر بھی آپ ﷺ درخواست کریں گے کہ ان کو حساب سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور یوں ہی معاف فرما دیا جائے اور اگر سب کا حساب ضروری لیا جانا ہو تو سرسری حساب پر اکتفا کر لیا جائے، حساب میں سختی وشدت اور سخت بازپرس نہ کی جائے، کیونکہ جو بھی سخت حساب سے دوچار ہوگا، اس کا عذاب سے بچنا ممکن ہی نہیں ہوگا۔ پھر حساب کے بعد جو لوگ مستوجب عذاب قرار پائیں گے، ان کو دوزخ میں بھیجا جائے گا تو یہ موقع بھی شفاعت کا ہوگا تاآنکہ ان کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا تو آنحضرت ﷺ شفاعت کریں گے اور ان کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں پہنچوائیں گے۔ غرضیکہ ان ہولناک مواقع پر شروع سے لے کر آخر تک رسول مختار ﷺ کی شفاعت اور غفار وکریم پروردگار کی رحمت وعنایت سے عفو وکرم کی بہت کچھ امید رکھنی چاہئے۔ ویسے جو کچھ بھی فیصلہ صادر ہو۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حوض کوثر کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے موتیوں کے قبے ہونگے

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَآ اَنَا اَسِیْرُ فِی الْجَنَّۃِ اِذَا اَنَا بِنَھْرٍ حَافَتَاہُ قِبَابُ الدُّرِّ

الْمُجَوَّفِ قُلْتُ مَاهٰذَا يَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هٰذَا الْكَوْثَرُ الَّذِيْ اَعْطَاكَ رَبُّكَ فَاِذَا طِيْنُهٗ مِسْكٌ اَذْفَرُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "میں (معراج کی رات میں) جنّت کی سیر کررہا تھا کہ اچانک میرا گزر ایک نہر پر ہوا جس کے دونوں طرف موتیوں کے گنبد تھے میں نے پوچھا کہ جبرائیل یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ حوض کوثر ہے جو آپ ﷺ کو آپ کے پروردگار نے عطا کیا ہے۔ پھر جو میں نے دیکھا تو اس کی مٹی مثل مشک تیز خوشبودار تھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: "مجوف" کے معنی ہیں کھوکھلا! مجوف موتی کے گنبد سے مراد یہ ہے کہ حوض کوثر کے دونوں کناروں پر جو گنبد اور قبے ہیں وہ اینٹ پتھر اور چونے گارے جیسی چیزوں سے تعمیر شدہ نہیں ہیں بلکہ ہر گنبد دراصل ایک بہت بڑا موتی ہے جو اندر سے کھوکھلا ہے اور جس میں نشست ورہائش کی جملہ آسائشیں موجود ہیں "جو آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے پروردگار نے عطا کیا ہے۔" کے ذریعہ آیت کریم اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کی طرف اشارہ ہے جس کی تفسیر میں بہت سے مفسروں نے کہا ہے کہ اس آیت کریمہ میں "کوثر" سے مراد "خیر کثیر یعنی بیشمار بھلائیاں اور نعمتوں کی کثرت" ہے جو پروردگار نے آنحضرت ﷺ کو عطا فرمائی ہے، اس میں نبوت ورسالت، قرآن کریم اور علم وحکمت کی نعمتیں بھی شامل ہیں اور اُمت کی کثرت اور وہ تمام مراتب عالیہ بھی شامل ہیں جن میں ایک بہت بڑی نعمت آپ ﷺ کو آخرت میں مقام محمود، لوائے ممدود اور مذکورہ حوض کا عطا کیا جانے ہے۔ اس اعتبار سے اس بارہ میں کوئی منافات نہیں ہے کہ "کوثر" سے مراد "حوض کوثر" ہے یا "خیر کثیر" مراد ہونے کی صورت میں بشمول حوض کوثر، تمام ہی نعمتیں اور بھلائیاں اس میں شامل ہو جائیں گی اس طرح حضرت جبرائیل علیہ السلام کے مذکورہ جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو "کوثر" عطا کیا ہے اسی میں کی ایک چیز یہ "حوض کوثر" ہے! بعض مفسرین نے "کوثر" کی مراد "اولاد اور علماء امت" لکھا ہے، لیکن یہ قول بھی "خیر کثیر" کے قول کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں (یعنی اولاد اور علماء امت) بھی "خیر کثیر" ہی میں داخل ہیں۔

حوض کوثر کی فضیلت

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَوْضِيْ مَسِيْرَةُ شَهْرٍ وَزَوَايَاهُ سَوَآءٌ وَمَآءُهٗ اَبْيَضُ مِنَ اللَّبَنِ وَرِيْحُهٗ اَطْيَبُ مِنَ الْمِسْكِ وَكِيْزَانُهٗ كَنُجُوْمِ السَّمَآءِ مَنْ يَّشْرَبُ مِنْهَا فَلَا يَظْمَأُ اَبَدًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میرا حوض، یعنی حوض کوثر، ایک ماہ کی مسافت کے بقدر دراز ہے اور اس کے چاروں کنارے برابر ہیں (یعنی لمبائی چوڑائی میں وہ مربع ہے) اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، اور اس کی بو مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اور اس کے آب خورے (اپنی چمک دمک اور کثرت وزیادتی کے اعتبار سے آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں اور جو شخص اس کا پانی پی لے گا اس کو پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "اس کو پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔" اس سے معلوم ہوا کہ جنّت میں پانی یا کسی بھی مشروب کا پینا پیاس کی وجہ سے نہیں بلکہ حصول لذات کے لئے ہوگا جیسا کہ جنّت میں کوئی چیز کھانا، بھوک کی بنیاد پر نہیں بلکہ ازراہ تنعم ہوگا کیونکہ جنّت تو وہ نظام ہے جہاں کسی کو نہ بھوک لگے گی اور نہ پیاس، قرآن کریم میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا گیا ہے، وان لک ان لا تجوع فیھا ولا تعری وانک لا تظموأ فیھا ولا تضحی یعنی یہاں جنّت میں تو تمہارے لئے (یہ آرام) ہے کہ تم نہ کبھی بھوکے رہو گے اور نہ ننگے ہو گے، بلاشبہ تم نہ یہاں پیاسے ہو گے اور نہ دھوپ میں تپو گے۔

حوض کوثر کی درازی اور اس کی خصوصیات

(۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ حَوْضِيْ اَبْعَدُ مِنْ اَيْلَةَ مِنْ عَدْنٍ لَهُوَ اَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ

الثَّلْجِ وَاَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ بِاللَّبَنِ وَلَاٰنِيَتُهٗ اَكْثَرُ مِنْ عَدَدِ النُّجُوْمِ وَاِنِّیْ لَاَصُدُّ النَّاسَ عَنْهُ كَمَا يَصُدُّ الرَّجُلُ اِبِلَ النَّاسِ عَنْ حَوْضِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَعْرِفُنَا يَوْمَئِذٍ قَالَ نَعَمْ لَكُمْ سِيْمَآءُ لَيْسَتْ لِاَحَدٍ مِّنَ الْاُمَمِ تَرِدُوْنَ عَلَیَّ غُرًّا مُّحَجَّلِيْنَ مِنْ اَثَرِ الْوُضُوْءِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَايَةٍ لَهٗ عَنْ اَنَسٍ قَالَ تُرٰی فِيْهِ اَبَارِيْقُ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ كَعَدَدِ نُجُوْمِ السَّمَآءِ وَفِیْ اُخْرٰی لَهٗ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ سُئِلَ عَنْ شَرَابِهٖ فَقَالَ اَشَدُّ بَيَاضًا مِّنَ اللَّبَنِ وَاَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ يَغُتُّ فِيْهِ مِيْزَابَانِ يَمُدَّانِهٖ مِنَ الْجَنَّةِ اَحَدُهُمَا مِنْ ذَهَبٍ وَالْاٰخَرُ مِنْ وَرِقٍ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میرے حوض یعنی "حوض کوثر" کے دونوں سروں کے درمیان کا فاصلہ، اَيْلَهْ اور عدن کے درمیانی فاصلہ سے بھی زیادہ ہے اور بلاشبہ اس حوض کا پانی برف سے بھی زیادہ سفید اور شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے جس میں دودھ ملا ہوا ہو اور اس کے آبخورے آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں اور یقیناً میں دوسری امتوں کے لوگوں کو اس حوض پر آنے سے اس طرح روکوں گا اور بھگاؤں گا جس طرح کوئی شخص غیر لوگوں کے اونٹوں کو اپنے حوض پر آنے سے روکتا ہے (اور یہ روکنا اس وجہ سے ہوگا تاکہ اُمّت محمدی ﷺ کی اس فضلیت و خصوصیت میں دوسرے لوگ شریک نہ ہوں اور اس اُمّت کے لوگ دوسری امتوں کے لوگوں سے ممتاز و منفرد رہیں)" صحابہ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا (اس وقت) آپ ہمیں پہچان لیں گے؟ (یعنی تمام مخلوق کے اتنے زبردست ازدحام میں کیا آپ کے لئے ممکن ہوگا کہ اپنی اُمّت اور دوسری امتوں کے لوگوں کے درمیان امتیاز کر لیں اور وہ کونسی علامت ہوگی جس کو دیکھ کر آپ ﷺ اپنے امتیوں کو پہچان کر حوض کوثر پر آنے دیں گے اور غیر امتیوں کو وہاں آنے سے روکیں گے؟) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں میں تمہیں (بڑی آسانی کے ساتھ) پہچان لوں گا" دراصل تمہاری ایک خاص علامت ہوگی، جس سے دوسری اُمّت کے لوگ محروم ہوں گے، اور وہ علامت یہ ہوگی کہ جب تم میری طرف آؤ گے تو اس وقت تمہاری پیشانیاں اور تمہارے ہاتھ پاؤں، وضو کی نورانیت کے سبب روشن اور چمکدار ہوں گے۔" (مسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک اور روایت میں جو حضرت انسؓ سے منقول ہے، یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اس حوض میں سونے چاندی کے آبخورے ہوں گے جو (اپنی چمک دمک اور) تعداد کے اعتبار سے آسمان کے ستاروں کی طرح دکھائی دیں گے۔" اور مسلمؒ ہی کی ایک اور روایت میں حضرت ثوبانؓ سے یوں منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ سے اس حوض کے پانی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا "اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ اس حوض کو لبریز رکھنے کے لئے اس میں دو زوردار پرنالے گرتے ہیں جو جنّت (کی اس نہر) سے آتے ہیں (جس کا نام بھی کوثر ہے) ان میں کا ایک پرنالہ سونے کا ہے اور دوسرا چاندی کا۔"

تشریح: "اَيْلَهْ" ایک شہر کا نام ہے جو ملک شام کا ایک ساحلی علاقہ تھا اور آج کل "اسرائیل" کی حدود میں واقع اور اس کی ایک بندرگاہ ہے جس کا موجودہ نام ایلات ہے یہ شہر بحر احمر (جس کو بحیرہ قلزم اور انگریزی میں ریڈ سی کہتے ہیں) کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ اور عدن، بحر احمر کے جنوبی سرے پر واقع ایک مشہور جزیرہ نما کا نام ہے جو کبھی یمن کا ایک شہر اور اس کی بندرگاہ تھا حضور ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ ایلہ اور عدن کے درمیان جتنا فاصلہ ہے اتنا ہی فاصلہ میرے حوض کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا ہے! واضح رہے کہ اس سلسلہ میں جو روایات منقول ہیں ان میں حضور ﷺ نے اپنے حوض کے دونوں سروں کے درمیانی فاصلے کو ظاہر کرنے کے لئے متعدد شہروں اور علاقوں کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً اس حدیث میں مابین ایلہ اور عدن کا ذکر کیا ہے جب کہ آنے والی ایک حدیث میں مابین عدن اور عمان کا ذکر کیا ہے اسی طرح ایک اور حدیث میں مابین صنعاء اور مدینہ کا ذکر ہے، تو ان تمام حدیثوں میں مفہوم کی مطابقت و یکسانیت پیدا کرنے کے لئے یہ کہا جائے گا کہ مذکورہ شہروں کے درمیانی فاصلوں کے ذریعہ حوض کوثر کے دونوں سروں کے درمیانی فاصلہ اور اس کی درازی کو ظاہر فرمانا تحدید یعنی حد بندی کے طور پر نہیں ہے بلکہ تمثیلا اور تقریباً ہے۔ مطلب یہ کہ آپ ﷺ نے اس سلسلہ کی جو بھی حدیث ارشاد فرمائی اور جو اشخاص اس وقت آپ ﷺ کے مخاطب تھے ان کی سمجھ بوجھ اور ان کی ذاتی معلومات کا لحاظ

رکھتے ہوئے ان کے سامنے محض تمثیل کے طور پر بیان فرمایا کہ میرے حوض کے دونوں سروں کا درمیانی فاصلہ تقریباً اتنا ہے جتنا فلاں دو شہروں کا درمیانی فاصلہ ہے۔

مرتدین کو حوض کوثر سے دور رکھا جائے گا

④ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ مَنْ مَرَّ عَلَيَّ شَرِبَ وَمَنْ شَرِبَ لَمْ يَظْمَأْ اَبَدًا لَيَرِدَنَّ عَلَيَّ اَقْوَامٌ اَعْرِفُهُمْ وَيَعْرِفُوْنَنِي ثُمَّ يُحَالُ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَاَقُوْلُ اِنَّهُمْ مِنِّي فَيُقَالُ اِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ فَاَقُوْلُ سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں حوض کوثر پر تمہارا امیر سامان ہوں گا (یعنی وہاں تم سب سے پہلے پہنچ کر تمہارا استقبال کروں گا) جو شخص بھی میرے پاس سے گزرے گا وہ اس حوض کوثر کا پانی پیئے گا اور جو شخص بھی اس کا پانی پی لے گا وہ کبھی پیاسا نہیں رہے گا۔ وہاں میرے پاس (میری اُمت کے) کچھ ایسے لوگ بھی آئیں گے جنہیں میں پہچان لوں گا اور وہ مجھے پہچان لیں گے لیکن پھر میرے اور ان کے درمیان کوئی چیز حائل کر دی جائے گی (تاکہ وہ مجھ سے اور حوض کوثر سے دور رہیں۔) میں (یہ دیکھ کر) کہوں گا کہ یہ لوگ تو میرے اپنے ہیں!؟ (یعنی یہ لوگ میری اُمت کے افراد ہیں، یا یہ کہ یہ وہ لوگ ہیں جو میرے صحابی رہے ہیں، پھر ان کو میرے پاس آنے سے کیوں روکا جا رہا ہے!؟) اس کے جواب میں مجھے بتایا جائے گا کہ آپ (ﷺ) کو نہیں معلوم، انہوں نے آپ (ﷺ) کے بعد کیا کیا نئی باتیں پیدا کیں ہیں (یہ سن کر) میں کہوں گا کہ وہ لوگ دور ہوں مجھ سے دور خدا کی رحمت سے دور، جنہوں نے میری وفات کے بعد دین و سنت میں تبدیلی کی۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: حدیث میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ حوض کوثر کی طرف آئیں گے لیکن ان کو آنحضرت ﷺ اور حوض کوثر سے دور رکھا جائے گا، ان کے بارے میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ وہ کون لوگ ہوں گے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مراد ہیں جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مسلمان ہو گئے تھے اور جب تک آپ ﷺ اس دنیا میں رہے مسلمان ہی رہے، لیکن آپ ﷺ کی وفات کے بعد وہ مختلف گمراہ کن تحریکوں جیسے مسیلمہ کذاب کے جھوٹے دعویٰ نبوت وغیرہ کا شکار ہو کر اسلام سے پھر گئے اور مرتد ہو گئے تھے پس حدیث کا مضمون گزشتہ "باب الحشر" کی چوتھی حدیث، جو حضرت ابن عباس سے منقول ہے، کے مضمون کی طرح ہے جس میں حضور نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن میدان حشر میں جب میں اپنے کچھ لوگوں کو دوزخ کی طرف لیجاتے ہوئے دیکھوں گا تو کہوں گا کہ "یہ تو میرے صحابہؓ ہیں، یہ تو میرے صحابہؓ ہیں؟! لیکن پھر مجھے بتایا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو آپ ﷺ کے سامنے مسلمان تھے لیکن آپ ﷺ کے بعد اسلام سے پھر گئے تھے۔ لہٰذا اس حدیث کے ضمن میں جو تشریح و تاویل کی گئی ہے اس کو یہاں بھی پیش نظر رکھا جائے۔

ایک احتمال یہ ہو سکتا ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ لوگوں سے مراد اہل بدعت ہوں جو دین میں نئی نئی باتیں نکالتے ہیں لیکن یہ بات چونکہ ثابت ہے کہ اس امت کا کوئی بھی گناہ گار خواہ اس کا گناہ کتنا ہی بڑا ہو، حوض کوثر پر آنے اور اس کا پانی پینے سے روکا نہیں جائے گا، اس لئے یہ احتمال سرے سے رد ہو جاتا ہے ہاں اگر "بدعت" کا تعلق دین وملت میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرنے سے ہو جس سے اصول دین کی نفی ہوتی ہو اور نبوت و شریعت پر براہ راست اس طرح کی زد پڑتی ہو کہ اس پر کفر کا اطلاق ہو جائے تو اس درجہ کے اہل بدعت یقیناً "مرتد" ہی کہلائیں گے اور ان لوگوں کو اس حدیث کا محمول قرار دیا جا سکتا ہے۔

شفاعت سے تمام انبیاء کا انکار

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُحْبَسُ الْمُؤْمِنُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُهَمُّوْا بِذٰلِكَ فَيَقُوْلُوْنَ لَوِ اسْتَشْفَعْنَا اِلٰى رَبِّنَا فَيُرِيْحُنَا مِنْ مَّكَانِنَا فَيَاْتُوْنَ اٰدَمَ فَيَقُوْلُوْنَ اَنْتَ اٰدَمُ اَبُو النَّاسِ خَلَقَكَ اللّٰهُ بِيَدِهٖ وَاَسْكَنَكَ جَنَّتَهٗ وَ

اَسْجَدَ لَكَ مَلٰٓئِكَتَهٗ وَعَلَّمَكَ اَسْمَآءَ كُلِّ شَیْءٍ اِشْفَعْ لَنَا عِنْدَ رَبِّكَ حَتّٰی يُرِيْحَنَا مِنْ مَّكَانِنَا هٰذَا فَيَقُوْلُ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَيَذْكُرُ خَطِيْئَتَهُ الَّتِیْ اَصَابَ اَكْلَهٗ مِنَ الشَّجَرَةِ وَقَدْ نُهِیَ عَنْهَا وَلٰكِنِ ائْتُوْا نُوْحًا اَوَّلَ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ اِلٰی اَهْلِ الْاَرْضِ فَيَاْتُوْنَ نُوْحًا فَيَقُوْلُ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَيَذْكُرُ خَطِيْئَتَهُ الَّتِیْ اَصَابَ سُوَالَهٗ رَبَّهٗ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلٰكِنِ ائْتُوْا اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلَ الرَّحْمٰنِ قَالَ فَيَاْتُوْنَ اِبْرَاهِيْمَ فَيَقُوْلُ اِنِّیْ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَيَذْكُرُ ثَلٰثَ كَذِبَاتٍ كَذَبَهُنَّ وَلٰكِنِ ائْتُوْا مُوْسٰی عَبْدًا اٰتَاهُ اللّٰهُ التَّوْرَاةَ وَكَلَّمَهٗ وَقَرَّبَهٗ نَجِيًّا قَالَ فَيَاْتُوْنَ مُوْسٰی فَيَقُوْلُ اِنِّیْ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَيَذْكُرُ خَطِيْئَتَهُ الَّتِیْ اَصَابَ قَتْلَهُ النَّفْسَ وَلٰكِنِ ائْتُوْا عِيْسٰی عَبْدَاللّٰهِ وَرَسُوْلَهٗ وَرُوْحَ اللّٰهِ وَكَلِمَتَهٗ قَالَ فَيَاْتُوْنَ عِيْسٰی فَيَقُوْلُ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَلٰكِنِ ائْتُوْا مُحَمَّدًا عَبْدًا غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ قَالَ فَيَاْتُوْنِیْ فَاَسْتَاْذِنُ عَلٰی رَبِّیْ فِیْ دَارِهٖ فَيُؤْذَنُ لِیْ عَلَيْهِ فَاِذَا رَاَيْتُهٗ وَقَعْتُ سَاجِدًا فَيَدَعُنِیْ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَّدَعَنِیْ فَيَقُوْلُ اِرْفَعْ مُحَمَّدُ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَهْ قَالَ فَاَرْفَعُ رَاْسِیْ فَاُثْنِیْ عَلٰی رَبِّیْ بِثَنَآءٍ وَّتَحْمِيْدٍ يُعَلِّمُنِيْهِ ثُمَّ اَشْفَعُ فَيَحُدُّلِیْ حَدًّا فَاَخْرُجُ فَاُخْرِجُهُمْ مِنَ النَّارِ وَاُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ ثُمَّ اَعُوْدُ الثَّانِيَةَ فَاَسْتَاْذِنُ عَلٰی رَبِّیْ فِیْ دَارِهٖ فَيُؤْذَنُ لِیْ عَلَيْهِ فَاِذَا رَاَيْتُهٗ وَقَعْتُ سَاجِدًا فَيَدَعُنِیْ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَّدَعَنِیْ ثُمَّ يَقُوْلُ اِرْفَعْ مُحَمَّدُ وَقُلْ تُسْمَعْ وَشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَهْ قَالَ فَاَرْفَعُ رَاْسِیْ فَاُثْنِیْ عَلٰی رَبِّیْ بِثَنَآءٍ وَّتَحْمِيْدٍ يُعَلِّمُنِيْهِ ثُمَّ اَشْفَعُ فَيَحُدُّلِیْ حَدًّا فَاَخْرُجُ فَاُخْرِجُهُمْ مِنَ النَّارِ وَاُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ ثُمَّ اَعُوْدُ الثَّالِثَةَ فَاَسْتَاْذِنُ عَلٰی رَبِّیْ فِیْ دَارِهٖ فَيُؤْذَنُ لِیْ عَلَيْهِ فَاِذَا رَاَيْتُهٗ وَقَعْتُ سَاجِدًا فَيَدَعُنِیْ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَّدَعَنِیْ ثُمَّ يَقُوْلُ اِرْفَعْ مُحَمَّدُ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَهْ قَالَ فَاَرْفَعُ رَاْسِیْ فَاُثْنِیْ عَلٰی رَبِّیْ بِثَنَآءٍ وَّتَحْمِيْدٍ يُعَلِّمُنِيْهِ ثُمَّ اَشْفَعُ فَيَحُدُّلِیْ حَدًّا فَاَخْرُجُ فَاُخْرِجُهُمْ مِنَ النَّارِ وَاُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ حَتّٰی مَا يَبْقٰی فِی النَّارِ اِلَّا مَنْ قَدْ حَبَسَهُ الْقُرْاٰنُ اَیْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْخُلُوْدُ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ عَسٰی اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا قَالَ وَهٰذَا الْمَقَامُ الْمَحْمُوْدُ الَّذِیْ وَعَدَهٗ نَبِيُّكُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ قیامت کے دن (میدان حشر میں) مؤمنین کو روک دیا جائے گا (یعنی سب کو کسی ایک جگہ اس طرح محصور کر دیا جائے گا کہ کوئی شخص بھی کسی طرح کی نقل و حرکت نہیں کر سکے گا اور ہر شخص سکتے کی سی کیفیت میں ٹھہرا رہے گا) یہاں تک کہ سارے لوگ اس (محصور ہو جانے) کی وجہ سے سخت فکر و تردد میں پڑ جائیں گے، پھر وہ آپس میں تذکرہ کریں گے کہ کاش ہمیں کوئی ایسا شخص مل جاتا جو ہمارے پروردگار سے ہماری شفاعت کرتا اور ہمیں اس سختی و پریشانی سے چھٹکارا دلاتا اور پھر (کچھ لوگ سب کی نمائندگی کرتے ہوئے) حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور اسے کہیں گے کہ آپ آدم (علیہ السلام) ہیں، تمام لوگوں کے باپ، آپ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے (بلا کسی واسطہ وسیلہ کے) اپنے ہاتھ سے (یعنی اپنی قدرت کاملہ سے) پیدا کیا، آپ علیہ السلام کو جنت کی سکونت عطا فرمائی، اپنے فرشتوں سے (تحیہ کا) سجدہ آپ علیہ السلام کو کرایا، اور آپ علیہ السلام کو ہر چیز کے نام سکھائے: براہ کرم آپ علیہ السلام اپنے پروردگار سے (کہ جس نے آپ علیہ السلام کو اتنی زیادہ فضیلتیں اور اعزاز بخشے ہیں) ہماری سفارش کر دیجئے کہ وہ ہم کو اس (سخت ہولناک اور پریشان کن) جگہ سے نکال کر راحت و اطمینان بخشے حضرت آدم علیہ السلام (یہ سن کر کہیں گے) کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں (یعنی میں یہ مرتبہ (درجہ نہیں رکھتا کہ آج کے دن بارگاہ کبریائی میں شفاعت کرنے کا حوصلہ کروں) پھر حضرت آدم علیہ السلام اپنی اس لغزش کا ذکر کریں گے جو انہوں نے (گیہوں کا) درخت کھانے کی صورت میں کی تھی درآنحالیکہ ان کو اس درخت کے قریب جانے سے بھی منع کر دیا گیا تھا، (اس کے بعد وہ کہیں گے کہ) تم لوگوں کو نوح علیہ السلام کے پاس جانا چاہئے (وہ تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں) کیونکہ وہ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا والوں کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا تھا) وہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کے لئے درخواست کریں گے) حضرت نوح علیہ السلام جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں! اور وہ اپنی اس لغزش کا ذکر کریں گے جو انہوں نے بے جانے بوجھے اللہ تعالیٰ سے (اپنے بیٹے کو غرق ہونے سے بچالینے کی درخواست کرنے کی صورت میں کی تھی

(پھر وہ مشورہ دیں گے کہ) تم لوگوں کو ابراہیم علیہ السلام کے پاس" جو اللہ تعالیٰ کے خلیل (دوست ہیں، جانا چاہئے! آنحضرت ﷺ نے فرمایا وہ لوگ (یہ سن کر) ابراہیم خلیل اللہ کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے) حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں اور وہ دنیا میں تین مرتبہ اپنے جھوٹ بولنے کا ذکر کریں گے (پھر وہ مشورہ دیں گے کہ) تم لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ جو خدا کے ایسے بندے ہیں جن کو خدا نے (اپنی عظیم الشان کتاب) توریت عطا کی) اور بنی اسرائیل کے تمام انبیاء کو ان کا تابع بنایا، اور جن کو خدا نے براہ راست اپنی ہمکلامی کے شرف سے نوازا اور ان کو اپنا کمال قرب عطا فرما کر اپنا محرم اسرار بنایا۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا، وہ لوگ (یہ سن کر) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کے لئے درخواست کریں گے) موسیٰ علیہ السلام ان کو جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں! اور وہ اپنی اس لغزش کا ذکر کریں گے جو ایک قبطی کو قتل کرنے کی صورت میں سرزد ہو گئی تھی (یعنی انہوں نے طیش میں آکر ایک قبطی کو مکا مار دیا تھا جس سے اس کا کام تمام ہو گیا تھا۔ پھر وہ مشورہ دیں گے کہ تمہیں عیسیٰ کے پاس جانا چاہئے جو خدا کے بندے اور رسول علیہ السلام ہیں۔ وہ سراسر روحانی ہیں (کہ جسمانی مادہ کے بغیر محض خدا کی قدرت سے پیدا ہوئے تھے اور دوسروں کی جسمانی حیات کا سبب بنے تھے بایں طور کہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے) اور وہ اللہ کا کلمہ ہیں (کہ ایک کلمہ کن سے پیدا ہوئے تھے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا، وہ لوگ (یہ سن کر) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کے لئے کہیں گے) حضرت عیسیٰ جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں! البتہ تم لوگ محمد ﷺ کے پاس جاؤ جو خدا کے ایسے بندے ہیں جن کے اگلے پچھلے سارے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیئے ہیں (یقیناً وہی تم لوگوں کی شفاعت کریں گے۔) آنحضرت ﷺ نے فرمایا" تب لوگ (شفاعت کی درخواست لے کر) میرے پاس آئیں گے اور میں (ان کی شفاعت کے لئے تیار ہو جاؤں گا اور مقصد کی خاطر) درِ رب العزت پہنچ کر اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے اپنی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت مرحمت فرمائے گا! میں جب اس کے حضور میں پہنچ کر اس کو دیکھوں گا تو اس کی ہیبت و خوف کے مارے اور اس کی تعظیم کرنے کے لئے) سجدہ میں گر پڑوں گا اور اللہ تعالیٰ جتنا عرصہ مناسب سمجھے گا اتنے عرصہ کے لئے مجھے سجدہ پڑا رہنے دے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ محمد (ﷺ)! سر اٹھاؤ، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، تم (جس کے حق میں چاہو) شفاعت کرو، تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی اور جو چاہتے ہو مانگو، میں تمہیں دوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔" (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اس حمد و تعریف کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا اس کی حمد و ثنا بیان کروں گا، پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی، اس کے بعد میں (درگاہ رب العزت سے) باہر آؤں گا اور اس (متعینہ) جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا پھر (دوسری جماعتوں کے حق میں شفاعت کرنے کے لئے) میں دوبارہ درِ رب العزت پر حاضر ہو کر اس کی خدمت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا مجھے اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت عطا کی جائے گی اور جب میں اس کے حضور میں پہنچ کر اس کو دیکھوں گا تو سجدہ میں گر پڑوں گے اور اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا مجھے سجدہ میں پڑا رہنے دے گا، پھر فرمائے گا کہ محمد ﷺ اپنا سر اٹھاؤ، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، شفاعت کرو میں قبول کروں گا اور مانگو میں دوں گا۔" آنحضرت نے فرمایا۔" (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اس حمد و تعریف کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا اس کی حمد و ثنا بیان کروں گا پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی، اس کے بعد میں (درگاہ رب العزت سے) باہر آؤں گا اور اس متعینہ) جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا اور پھر میں تیسری مرتبہ بار درگاہ رب العزت پر حاضر ہو کر اس کی خدمت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا، مجھے اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت عطا کی جائے گی اور جب میں پروردگار کے حضور پہنچ کر اس کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا، اور اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا مجھے سجدہ میں پڑا رہنے دیگا۔ پھر فرمائے گا محمد (ﷺ) اپنا سر اٹھاؤ، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو، تمہاری بات سنی جائے گی شفاعت کرو میں قبول کروں گا اور مانگو میں دوں گا۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔" (یہ سن کر) میں اپنا سر

اٹھاؤں گا اور اس حمد و تعریف کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا اس کی حمد و ثنا بیان کروں گا پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔ اس کے بعد میں (درگاہ رب العزت سے) باہر آؤں گا اور اس (متعینہ) جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا، یہاں تک کہ دوزخ میں ان کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں رہ جائے گا جن کو قرآن نے روکا ہوگا (یعنی اس آخری شفاعت کے بعد دوزخ میں وہی لوگ باقی رہ جائیں گے جن کے بارے میں قرآن نے خبر دی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، چنانچہ حدیث کے اس جملہ کی وضاحت حضرت انسؓ کے نیچے کے راوی حضرت قتادہؓ جو جلیل القدر تابعی ہیں ان الفاظ میں کی ہے کہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ بس وہ لوگ دوزخ میں باقی رہ جائیں گے جو (قرآن کے حکم کے بموجب) ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب دوزخ کے مستوجب قرار پا چکے ہیں (اور وہ کفار ہیں) پھر آنحضرت نے (یا حضرت انسؓ یا حضرت قتادہؓ نے اس بات کو مستند کرنے کے لئے) قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ امید ہے کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو مقام محمود میں جگہ دے گا۔ اور پھر (آنحضرت ﷺ نے یا حضرت انسؓ نے یا حضرت قتادہؓ نے) فرمایا کہ (یہی وہ مقام محمود ہے، جس کا وعدہ خدا نے تمہارے نبی ﷺ سے کیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "وہ پہلے نبی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ...... الخ کے سلسلہ میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے تین نبی، حضرت آدم علیہ السلام، حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام دنیا میں آ چکے تھے۔ تو حضرت نوح علیہ السلام دنیا والوں کی طرف آنے والے پہلے نبی کیونکر ہوئے!؟ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ پہلے تینوں نبی جب دنیا میں آئے تو تمام روئے زمین صرف اہل کفر کی آماجگاہ نہیں تھی بلکہ اس دنیا میں اہل ایمان بھی موجود تھے اور گویا ان تینوں نبیوں کے مخاطب اہل ایمان اور اہل کفر دونوں تھے، ان کے برخلاف جب حضرت نوح علیہ السلام دنیا والوں میں آئے تو تمام روئے زمین پر صرف کافر ہی کافر تھے اہل ایمان کا وجود نہیں تھا، اس اعتبار سے حضرت نوح علیہ السلام دنیا میں آنے والے پہلے نبی ہیں جن کا واسطہ صرف کافروں سے تھا، اس اشکال کے کچھ اور جواب بھی علماء نے لکھے ہیں لیکن وہ زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔

اس مقام پر ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ جب تمام لوگ ابتدائی اور سب سے پہلے حضرت آدم کے پاس اور پھر یکے بعد دیگرے ایک ایک نبی کے پاس جائیں گے یہاں تک کہ آخر میں ہمارے حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر شفاعت کی درخواست کریں گے اور آپ ﷺ ان کی درخواست قبول کر لیں گے تو سوال یہ ہے کہ جب سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا کہ وہی ان لوگوں کے دلوں میں کسی شفاعت کرنے والے کے پاس جانے کا خیال ڈالے گا اور پہلا خیال حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں ہوگا کہ وہی ان لوگوں کے دلوں میں آنحضرت ﷺ کا خیال ڈال دے اور وہ ایک ایک نبی کے پاس جانے کے بجائے صرف آنحضرت ﷺ ہی کی خدمت میں پہنچ جائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طول عمل میں اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہوگی اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کا سب سے افضل و برتر ہونا تمام مخلوق کے سامنے ظاہر ہو جائے، اگر یہ ہو تو لوگ ابتدائی مرحلہ ہی میں آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ کر شفاعت کی درخواست کریں اور آپ ﷺ ان کی شفاعت کر دیں تو یہ احتمال باقی رہے گا کہ دوسرے بھی شفاعت کی جرأت رکھتے ہوں گے اور اگر کسی اور نبی سے بھی شفاعت کی درخواست کی جاتی تو وہ بھی شفاعت کر دیتا، لیکن جب وہ لوگ ایک ایک نبی کے پاس جا کر ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے اور ہر ایک شفاعت سے انکار کر دے گا اور پھر آخر میں آنحضرت ﷺ سے درخواست کی جائے گی جس کو آپ ﷺ قبول کر کے ان کا مقصد پورا کر دیں گے تو آنحضرت ﷺ کا سب سے عالی مرتبہ ہونا اور بارگاہ کبریائی میں کمال قرب رکھنا واضح طور پر ثابت ہو جائے گا اور ہر ایک پر یہ عیاں ہو جائے گا کہ آپ ﷺ کے مرتبہ و درجہ کا کوئی اور نہیں ہے۔ پس اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہمارے حضرت محمد ﷺ تمام مخلوق، حتیٰ کہ انسانوں فرشتوں اور تمام انبیاء تک پر فضیلت رکھتے ہیں کیونکہ شفاعت جو اتنا بڑا درجہ اور اتنا اہم کام ہے کہ کوئی بھی، خواہ وہ فرشتہ یا پیغمبر ہی کیوں نہ ہو اس کی جرأت

وحوصلہ نہیں کرے گا صرف آنحضرت ﷺ کریں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی جس لغزش کا ذکر کیا، اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نوح کو مسلسل جھٹلانے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی سزا میں دنیا والوں پر پانی کا عذاب نازل ہوا اور تمام روئے زمین پر ہلاکت خیز پانی ہی پانی پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت نوح علیہ السلام اپنے گھر والوں اور اپنے ماننے والوں کی ایک مختصر تعداد کو لے کر ایک کشتی میں بیٹھ گئے تاکہ وہ سب طوفانی سیلاب کی ہلاکت خیزی سے محفوظ رہیں، اس وقت انہوں نے اپنے بیٹے کو جو کافروں کے ساتھ تھا، بلایا اور کہا کہ تم کافروں کا ساتھ چھوڑ دو اب بھی ایمان لے آؤ اور میرے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ، مگر ان کا وہ بیٹا نہ مانا اور آخر کار دوسرے تمام لوگوں کے ساتھ وہ بھی غرق ہو گیا، اس موقع پر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے اس بیٹے کے حق میں غرقابی سے نجات کی دعا مانگی تھی اور بارگاہ رب العزت میں یوں عرض کیا تھا کہ۔

رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ۔

"میرے پروردگار! میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے، (اس کو نجات دے) بے شک آپ کا وعدہ بالکل سچا ہے اور آپ احکم الحاکمین ہیں۔"

اللہ تعالیٰ سے حضرت نوح علیہ السلام کی یہ درخواست چونکہ ایک ایسا امر تھا جس کو انہوں نے جانے بوجھے بغیر ظاہر کیا تھا اور اس بات کی تحقیق نہیں کر لی تھی کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی دعا مانگنی چاہئے یا نہیں، اس لئے ان پر بارگاہ خداوندی سے عتاب نازل ہوا کہ نوح ہم سے وہ چیز نہ مانگو جس کی حقیقت کا تمہیں علم نہیں ہے اور جس کے بارے میں تم نہیں جانتے کہ وہ چیز مانگی جانی چاہئے یا نہیں۔

"اور وہ دنیا میں تین مرتبہ جھوٹ بولنے کا ذکر کریں گے" حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی جن باتوں کو "جھوٹ" سے تعبیر کریں گے حقیقت میں ان پر "جھوٹ" کا اطلاق نہیں ہو سکتا، گو ظاہری حیثیت کے اعتبار سے وہ جھوٹ کی سی صورت رکھتی ہوں، لیکن انبیاء جس عالی مرتبہ کے ہوتے ہیں اور ان کا جو سب سے اونچا مقام ہوتا ہے اس کے پیش نظر ان کی اس طرح کی باتوں کو بھی جو ان کے مقام سے فروتر ہوں، بارگاہ رب العزت میں نظر انداز نہیں کیا جاتا اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین (بعض باتیں نیکوں کے حق میں تو نیکیاں ہوتی ہیں لیکن مقربین کے حق میں برائیاں ہوتی ہیں۔"

رہی یہ بات کہ وہ تین باتیں کیا تھیں جن کو حضرت ابراہیم علیہ السلام "جھوٹ" کے طور پر اپنی لغزش بتائیں گے، تو ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم اپنے کسی میلہ میں تماشہ دیکھنے آبادی سے باہر جانے لگی تو حضرت ابراہیم نے ارادہ کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا اور جب یہ سب لوگ چلے جائیں گے تو ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر ان کے بت توڑ دوں گا جن کو یہ پوجتے ہیں اور میری بار بار کی تلقین و تنبیہ کے باوجود بت پرستی سے باز نہیں آتے، چنانچہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگوں کو جانا ہو تو جاؤ میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا کیونکہ میں بیمار ہوں، ظاہر ہے کہ وہ دیکھنے میں جسمانی طور پر بیمار نہیں تھے، اور ان کا یہ کہنا کہ "میں بیمار ہوں" بظاہر جھوٹ سمجھا جا سکتا ہے، لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ان کی یہ بات "جھوٹ" میں شمار نہیں ہو سکتی کیونکہ جب انہوں نے یہ بات کہی تھی تو یہ مراد رکھ کر کہی تھی کہ تمہارے کفر و شرک اور تمہاری غلط حرکتوں نے میرے دل کو دکھی کر دیا ہے اور میں تمہارے غم میں اندرونی طور پر بیمار ہوں، دوسری بات یہ تھی کہ قوم کے لوگوں کے میلے میں چلے جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا اور جب ان لوگوں نے واپس آ کر دیکھا کہ آپ نے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ ان کا یہ جواب بھی اپنی ظاہری حیثیت میں ایک جھوٹ نظر آتا ہے، لیکن یہاں بھی وہی صورت حال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات اس مراد کے ساتھ کہی تھی کہ یہ جو بڑا بت ہے یہ تمہاری عبادات و تعظیم کے لئے ایک ممتاز و منفرد حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس کا وجود اس بات کا باعث بنا کہ میں دوسرے چھوٹے چھوٹے بتوں کو توڑ دوں یا اس بات سے حضرت ابراہیم کا اصل مقصد ان لوگوں کا مذاق اڑانا اور ان کو شرمندہ کرنا تھا کہ جس بت کو تم سب سے

بڑا مانتے ہو اور سب سے زیادہ اس کی عبادت کرتے ہو، اس کی لاچاری اور بے وقعتی کا یہ عالم ہے کہ اس کے ساتھی بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا گیا مگر وہ کسی بت کو بچا نہیں سکا ایسی صورت میں کیا یہ بت تمہاری پرستش کا مستحق ہوسکتا ہے!؟ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسا کہ ایک شخص تو بہت زیادہ خوشخط ہو اور اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص بہت زیادہ بدخط ہو، اور وہ بدخط شخص خوش خط شخص کی کسی لکھی ہوئی تحریر کو دیکھ کر کہے کہ کیا یہ تحریر تم نے لکھی ہے اور خوشخط شخص اس کے جواب میں کہے کہ جی نہیں، یہ تو تم نے لکھی ہے، ظاہر ہے کہ اس جواب کے ذریعہ وہ یہی واضح کرتا ہے کہ تم تو اتنی اچھی تحریر ہرگز نہیں لکھ سکتے، پھر یہاں میرے علاوہ اور کون لکھنے والا ہوسکتا ہے! تیسری بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنی بیوی یعنی حضرت سارہ کو ایک بدکار کافر کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے کہا تھا کہ یہ عورت میری بہن ہے یہ بات بھی بظاہر ''جھوٹ'' کے دائرہ میں آتی ہے، لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ایک مؤمن کی مؤمنہ بیوی بہرحال اس کی دینی بہن ہوتی ہے اور یہ بات کہنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مراد بھی یہی تھی کہ یہ عورت میری دینی بہن ہے، تو اس پر جھوٹ کا طلاق کیسے ہوسکتا ہے، ویسے یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چچازاد بہن بھی تھیں، اس اعتبار سے بھی ان کا سارہ کو بہن کہنا کوئی جھوٹ نہیں تھا۔

اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف آئیے، دوسرے انبیاء کے برخلاف حضرت عیسیٰ شفاعت کی درخواست لے کر آنے والوں کے سامنے اپنے کسی عذر کو بیان نہیں کریں گے اور نہ اپنی کسی لغزش کا ذکر کریں گے، اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ حضرت عیسیٰ اس وقت اپنا کوئی عذر بیان کرنے میں توقف شاید اسی لئے کریں گے کہ وہ اس تہمت کی وجہ سے جو عیسائیوں کی طرف سے ان کو اللہ کا بیٹا کہے جانے کی صورت میں ان پر تھوپی گئی ہے، اس درجہ شرمندہ و نادم ہوں گے کہ وہ اپنی خاموشی ہی کو زبان حال سے عذر بنالیں گے ویسے بعض روایتوں میں ان کے کچھ عذر نقل بھی کیے گئے ہیں، بہرحال اصل بات یہ ہے کہ شفاعت کا درجہ صرف ہمارے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوگا جو سید المرسلین اور امام النبیین ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے تمام انبیاء اور رسول صلوت اللہ علیہم اجمعین شفاعت کے مقام پر کھڑا ہونے اور بارگاہ رب العزت میں شفاعت کرنے سے عاجز و قاصر ہیں، ان کو یہ بلند و بالا مرتبہ عطا ہی نہیں ہوا ہے، لہٰذا شفاعت کی درخواست لے کر آنے والوں کے سامنے انہیں کوئی عذر بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، اور وہ سب یا ان میں سے کچھ انبیاء کوئی عذر بیان بھی کریں گے تو اس کا تعلق صرف ظاہری طور پر اپنی صوابدید سے ہوگا، اسی لئے دوسری حدیثوں میں یہ آیا ہے کہ سارے انبیاء کوئی عذر بیان کیے بغیر صرف یہی کہیں گے کہ ہم اس عظیم الشان امر کے اہل نہیں ہیں۔

''جن کے اگلے پچھلے سارے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیے ہیں۔'' اس جملہ کے سلسلہ میں واضح رہے کہ تمام ہی انبیاء معصوم عن الخطا یعنی گناہوں سے محفوظ ہیں چہ جائیکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بدرجہا اولی اس سے پاک و منزہ ہیں کہ کسی گناہ کی نسبت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو، پس یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ کہنا کہ ''ان کے سارے اگلے پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیئے ہیں۔'' کیا معنی رکھتا ہے؟ اس بارے میں علماء نے مختلف باتیں کہی ہیں اور اس جملہ کی متعدد تاویلیں منقول ہیں، لیکن زیادہ واضح تاویل یہ ہے کہ یہ جملہ دراصل بارگاہ رب العزت کی جانب سے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم اعزاز اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برتر فضیلت کے اظہار کا ذریعہ ہے قطع نظر اس امر کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اس کی بخشش کی جائے! اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جب کوئی امر مطلق اور بادشاہ اپنے کسی خاص مصاحب کو ہر حالت میں اپنا مطیع و فرمانبردار پرکھ لیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے تو اپنے دوسرے مصاحبوں اور رعایا کے لوگوں کے درمیان اس خاص مصاحب کی امتیازی اور مخصوص حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے یہ کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں معاف کیا خواہ تم نے کچھ ہی کیا ہو اور آئندہ تم جو کرو وہ بھی معاف، تم پر کوئی مواخذہ اور گرفت نہیں۔

''اور میں در رب العزت پر پہنچ کر اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا۔'' یہ جملہ حدیث کی اس عبارت۔''

کا آزاد ترجمہ ہے اگر اس عبارت کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ یوں ہو گا کہ پس میں اپنے پروردگار کے پاس اس کے مکان میں داخل ہونے کی اجازت طلب کروں گا۔" اس صورت میں کہا جائے گا کہ "اس کے مکان" سے مراد اس کی طرف سے عطا ہونے والے اجر و ثواب کی جگہ یعنی جنّت ہے۔" لیکن یہ مراد گنجلک ہے، زیادہ واضح تاویل وہ ہے جو تورپشتیؒ نے بیان کی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ "پروردگار کے پاس اس کے مکان میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنے" سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے یہ اجازت مانگیں گے کہ وہ آپ ﷺ کو اس مقام میں داخل ہونے کی اجازت عطا کرے جہاں کسی کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے جہاں پہنچ کر جو بھی عرض و دعا کی جائے، اس کا منظور و مقبول ہونا یقینی ہے اور جہاں پہنچ کر کھڑے ہونے والے اور پروردگار کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں ہے، اور یہ وہ مقام ہے جس کو مقام محمود" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی کو "مقام شفاع" بھی کہتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ پروردگار تو مکان و لامکان کی قید سے پاک ہے، اس کو جہاں بھی پکارا جائے اور جس جگہ بھی اس سے عرض و دعا کی جائے وہ وہیں موجود ہے اور وہیں سنتا اور دیکھتا ہے تو پھر اس کی کیا ضرورت ہوگی کہ آنحضرت ﷺ میدان حشر میں جس جگہ لوگوں کی شفاعت کی درخواست قبول کریں گے وہاں سے چل کر اس مقام خاص پر بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کریں گے اور پھر عرض و معروض کریں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مؤقف (یعنی میدان حشر کہ جہاں لوگ ٹھہرے ہوں گے) دراصل ایک ایسے ملکی نظام کی طرح ہو گا جو کسی باقاعدہ اور مہذب حکومت کے تحت ہو، جہاں ہر شخص کے مرتبہ و درجہ کے مطابق طریق کار اور نظم عمل کا اصول کارفرما ہو، چنانچہ اس وقت آنحضرت ﷺ "شافع" کی حیثیت رکھیں گے اور "شافع" کا یہ حق ہے کہ وہ اعزاز و اکرام کی جگہ آکر کھڑا ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کے دل میں یہ بات ڈالے گا کہ وہ اس جگہ سے چل کر کہ جو خوف و ہولناکی اور وحشت و گھبراہٹ سے گھری ہوگی، اس جگہ آئیں جو آپ ﷺ کے اعزاز و اکرام کا مقام ہے، تاکہ آپ وہاں اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ عرض و معروض کر سکیں۔

اور اس حمد و تعریف کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا........ الخ سے حضور نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اس وقت میں جن الفاظ، جس اسلوب اور جس انداز میں اللہ رب العزت کی تعریف و توصیف بیان کروں گا وہ کیا ہو گا۔ اس وقت اس کا علم مجھے بھی نہیں ہے وہ سب کچھ مجھے اسی وقت سکھایا اور بتایا جائے گا اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف اس موقع اور اس مقام کی مناسبت سے جس قدر وسعت و گہرائی رکھ سکتی ہے اس کا ادراک یہاں کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اسی اعتبار سے اس مقام کو "مقام حمد" اور مقام محمود کہتے ہیں۔ حدیث کے اس جزو سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جو شخص کسی سے سفارش کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ پہلے اس (سفارش قبول کرنے والے) کی تعریف و توصیف کرے تاکہ اس کا قرب اور اس کی توجہ حاصل کر سکے اور قبول سفارش سے نوازا جائے۔

"پھر میں شفاعت کروں گا" کے ضمن میں قاضیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی خوب خوب حمد ثنا کریں گے اور پھر اس حمد و ثناء کے بعد شفاعت کی اجازت پاکر امتی امتی کہنا شروع کریں گے۔

"اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سامنے یہ متعین فرما دے گا کہ ایسے ایسے گنہگاروں کی شفاعت کرو، مثلاً وہ فرمائے گا کہ اپنی اُمت کے ان لوگوں کی شفاعت کرو جو زنا کار تھے، یا جو بے نمازی تھے اور یا جو شراب نوش تھے، چنانچہ میں اسی تعین کے ساتھ شفاعت کروں گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے زانیوں کے حق میں تمہاری سفارش قبول کی، پھر فرمائے گا کہ میں نے بے نمازیوں کے حق میں تمہاری شفاعت قبول کی۔ اسی پر دوسرے طبقوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اور اس جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا اس موقع پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث کے شروع میں تو یہ مذکور ہے کہ شفاعت کی درخواست کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کو میدان حشر میں محصور کیا گیا ہو گا اور وہاں کی تنگی و سختی اور کرب و ہولناکی سے تنگ آکر آپ ﷺ کی سفارش چاہیں گے تاکہ آپ ﷺ انہیں اس جگہ کی پریشانیوں اور ہولناکیوں سے نجات دلائیں لیکن

یہاں حدیث کے اس جزو میں جب بارگاہ خداوندی میں حضور ﷺ کی شفاعت کرنے اور آپ ﷺ کی شفاعت قبول ہونے کا ذکر آیا، اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جنہیں دوزخ میں بھیجا جا چکا ہوگا؟! اس کے دو جواب ہیں، ایک تو یہ کہ شاید اہل ایمان کے دو طبقے ہونگے ایک طبقہ کو تو (جو اپنے گناہوں کے سبب سزا کا مستوجب ہوگا) میدان حشر میں محصور کیے بغیر دوزخ میں بھیج دیا جائے گا، اور یہی طبقہ آنحضرت ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرے گا، چنانچہ آپ ﷺ شفاعت کے ذریعہ اس طبقہ کو اس بدترین حالت سے کہ جس میں وہ گرفتار ہوگا نجات دلا کر جنت میں پہنچوائیں گے اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ اس طبقہ کے حق میں جماعت جماعت کر کے شفاعت فرمائیں گے جو دوزخ میں ڈالا جا چکا ہوگا، اور متعدد دفعوں میں ان کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کروائیں گے! اس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں یہاں صرف اسی ایک طبقہ کا ذکر فرمایا اور اختصار کلام کے طور پر دوسرے طبقہ کے ذکر کو حذف فرما دیا کیونکہ اس ایک طبقہ کو نجات دلانے کے ذکر سے دوسرے طبقہ کو نجات دلانا بطریق اولی مفہوم ہو جاتا ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں یہاں "نار" (یعنی آگ) کا لفظ منقول ہے جس کا ترجمہ "دوزخ" کیا گیا ہے" لیکن ہو سکتا ہے کہ "نار" یعنی آگ سے مراد "دوزخ" نہ ہو بلکہ وہ سخت حبس، تپش اور گرمی مراد ہو جو میدان حشر میں سورج کے بہت قریب آ جانے کی وجہ سے وہاں محسوس کی جائے گی اور "نکلوانے" سے مراد اس سخت تپش اور گرمی سے لوگوں کو چھٹکارا دلانا ہو، اس صورت میں حدیث کی اس عبارت فاخرجهم من النار وادخلهم الجنة کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں شفاعت قبول ہونے کے بعد درگاہ رب العزت سے باہر آؤں گا اور لوگوں کو سخت ترین تپش اور گرمی سے چھٹکارا دلا کر جنت تک پہنچواؤں گا یہ جواب اگرچہ ایک ایسی وضاحت ہے جس پر مجازی اسلوب کا اطلاق ہو سکتا ہے، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہی جواب حقیقت امر کے بہت قریب ہے اور حدیث کے اصل موضوع کے نہایت مناسب، کیونکہ اس ارشاد گرامی میں جس شفاعت کا ذکر ہو رہا ہے اس سے "شفاعت عظمی" مراد ہے جس کو آنحضرت کے ایک ارشاد ادم ومن دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ۔ کے بموجب مقام محمود اور لوائے ممدود سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس شفاعت عظمی کا اصل مقصد تمام مخلوق کو میدان حشر کی پریشانیوں اور ہولناکیوں سے چھٹکارا دلانا، جہاں وہ حساب کے انتظار میں کھڑے ہوں گے اور ان کا حساب جلد کرنا ہوگا، نیز یہی وہ شفاعت ہے جو صرف آنحضرت کے لئے مخصوص ہے، اس کے بعد پھر خود آنحضرت ﷺ، دوسرے انبیا، اولیاء علماء، صلحاء، شہدا اور فقراء کی طرف سے متعدد شفاعتیں ہوں گی جن کی تفصیل ابتدائے باب میں بیان ہو چکی ہے۔

"یہی وہ مقام محمود ہے۔۔۔۔۔۔۔ الخ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی اس آیت میں حضور کے لئے جس "مقام محمود" کا وعدہ کیا ہے وہ اسی "شفاعت عظمی" کا مقام ہے جو آپ ﷺ کے سوا کسی اور کو عطا نہیں ہوگا۔

واضح رہے کہ اس مقام کی صفت لفظ "محمود" کے ساتھ یا تو اس اعتبار سے ہے کہ اس مقام پر کھڑا ہونے والا اس کی تعریف کرے گا اور اس کو سراہے گا، یا اس اعتبار سے ہے کہ آنحضرت ﷺ اس مقام پر کھڑے ہو کر اللہ سبحانہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے اور یا اس اعتبار سے ہے کہ وہ مقام عطا ہونے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی تعریف وتوصیف تمام اولین وآخرین مخلوق کی زبان پر ہوگی۔

آنحضرت ﷺ کی شفاعت

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ مَاجَ النَّاسُ بَعْضُهُمْ فِيْ بَعْضٍ فَيَاْتُوْنَ اٰدَمَ فَيَقُوْلُوْنَ اشْفَعْ اِلٰى رَبِّكَ فَيَقُوْلُ لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِاِبْرَاهِيْمَ فَاِنَّهٗ خَلِيْلُ الرَّحْمٰنِ فَيَاْتُوْنَ اِبْرَاهِيْمَ فَيَقُوْلُ لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُوْسٰى فَاِنَّهٗ كَلِيْمُ اللّٰهِ فَيَاْتُوْنَ مُوْسٰى فَيَقُوْلُ لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِعِيْسٰى فَاِنَّهٗ رُوْحُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ فَيَاْتُوْنَ عِيْسٰى فَيَقُوْلُ لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُحَمَّدٍ فَيَاْتُوْنِيْ فَاَقُوْلُ اَنَا لَهَا فَاَسْتَاْذِنُ عَلٰى رَبِّيْ فَيُؤْذَنُ لِيْ وَيُلْهِمُنِيْ مَحَامِدَ اَحْمَدُهٗ بِهَا لَا تَحْضُرُنِيْ الْاٰنَ فَاَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَاَخِرُّ لَهٗ سَاجِدًا فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ

رَاْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَقُوْلُ يَا رَبِّ اُمَّتِيْ اُمَّتِيْ فَيُقَالُ انْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ شَعِيْرَةٍ مِّنْ اِيْمَانٍ فَانْطَلِقُ فَاَفْعَلُ ثُمَّ اَعُوْدُ فَاَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ اَخِرُّلَهٗ سَاجِدًا فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَاْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَقُوْلُ يَا رَبِّيْ اُمَّتِيْ اُمَّتِيْ فَيُقَالُ انْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ اَوْخَرْدَلَةٍ مِّنْ اِيْمَانٍ فَانْطَلِقُ فَاَفْعَلُ ثُمَّ اَعُوْدُ فَاَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ اَخِرُّلَهٗ سَاجِدً فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَاْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَقُوْلُ يَا رَبِّ اُمَّتِيْ اُمَّتِيْ فَيُقَالُ انْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ اَدْنٰى اَدْنٰى اَدْنٰى مِثْقَالَ حَبَّةِ خَرْدَلَةٍ مِّنْ اِيْمَانٍ فَاَخْرِجْهُ مِنَ النَّارِ فَانْطَلِقُ فَاَفْعَلُ ثُمَّ اَعُوْدُ الرَّابِعَةَ فَاَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ اَخِرُّ لَهٗ سَاجِدًا فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَاْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَقُوْلُ يَا رَبِّ ائْذَنْ لِيْ فِيْمَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ لَيْسَ ذٰلِكَ لَكَ وَلٰكِنْ وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ وَكِبْرِيَآئِيْ وَعَظْمَتِيْ لَاُخْرِجَنَّ مِنْهَا مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب قیامت کا دن ہو گا تو (میدان حشر میں) لوگ ایک دوسرے کے ساتھ عجب اضطراب و افراتفری کی حالت میں ہوں گے (یعنی وہاں کی سختی وتنگی اور ہولناکی سے بیتاب ہو کر ادھر ادھر بھاگے پھریں گے اور آپس میں صلاح ومشورہ کریں گے کہ اس ہولناکی سے چھٹکارے کی کیا راہ نکالی جائے) چنانچہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے کہ آپ علیہ السلام اپنے پروردگار سے شفاعت کر دیجئے (کہ وہ ہمارے حساب وکتاب کا حکم جاری فرمادے اور ہمیں اجرو ثواب یا عذاب دے کر ہمارا معاملہ ایک طرف کرے) حضرت آدم جواب دیں گے کہ میں شفاعت کا اہل نہیں ہوں، البتہ تم لوگ ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ اللہ کے دوست ہیں (اور تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں) وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی انہیں یہ جواب دیں گے کہ میں شفاعت کا اہل نہیں ہوں، البتہ تم لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ اللہ کے کلیم ہیں (اور تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں) وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی یہی جواب دیں گے کہ میں شفاعت کا اہل نہیں ہوں، البتہ تم لوگوں کو عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جانا چاہئے جو اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں (اور تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں) وہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی جواب دیں گے کہ میں شفاعت کا اہل نہیں ہوں اور تمہیں محمد (ﷺ) کے پاس جانا چاہئے (وہی تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں)۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تب لوگ میرے پاس آئیں گے (اور مجھ سے شفاعت کی درخواست کریں گے) میں ان سے کہوں گا کہ ہاں بے شک میں شفاعت کا اہل ہوں (کہ یہ کام میں ہی کر سکتا ہوں، کسی اور کے بس کا نہیں ہے پھر میں بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا، مجھے پیش ہونے کی اجازت عطا کی جائے گی اور (اس کے ساتھ ہی) اللہ تعالیٰ میرے دل میں اپنی حمد وثنا کے الفاظ ڈالے گا جس کے ذریعہ (اس وقت) میں اس کی حمد وثنا کروں گا اور وہ حمد وثنا، (کن الفاظ اور کس اسلوب میں ہوگی اس وقت مجھے معلوم نہیں ہے، بہر حال (جب میں اس کی بارگاہ میں پیش ہوں گا اور اس کو دیکھوں گا تو) سجدہ میں گر پڑوں گا اور اس کی وہی حمد وثنا بیان کروں گا، پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ محمد! اپنا سر اٹھاؤ، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو تمہاری بات سنی جائے گی، جو مانگنا چاہتے ہو مانگو میں دونگا، اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو میں قبول کروں گا۔ میں (سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد یا سجدہ ہی میں) عرض کروں گا کہ میرے پروردگار! میری اُمت کو بخش دیجئے، میری اُمت پر رحم فرمائیے (یا یہ مطلب ہے کہ میرے پروردگار میں اپنی اُمت کے بارے میں شفاعت کرتا ہوں) مجھ سے کہا جائے گا کہ جاؤ ہر اس شخص کو (دوزخ سے) نکال لو جس کے دل میں جو برابر بھی ایمان ہے، پس میں جاؤں گا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا، اس کے بعد میں پھر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور انہیں الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرتا ہوا سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھ سے کہا جائے گا محمد! اپنا سر اٹھاؤ جو کہنا چاہتے ہو کہو تمہاری بات سنی جائے گی جو مانگنا چاہتے ہو مانگو میں دوں گا اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو میں قبول کروں گا

میں عرض کروں گا میرے پروردگار! میری اُمت کو بخش دیجئے، میری اُمت پر رحم فرمائیے! مجھ سے کہا جائے گا کہ جاؤ اور ہر اس شخص کو دوزخ سے) نکال لو جس کے دل میں ذرے یا رائی کے برابر بھی ایمان ہے پس میں جاؤں گا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد پھر میں بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور انہی الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوا سجدہ میں گر پڑوں گا۔ پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ محمد! اپنا سر اٹھاؤ جو کہنا چاہتے ہو کہو تمہاری بات سنی جائے گی جو مانگنا چاہتے ہو مانگو میں دوں گا اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو میں قبول کروں گا میں عرض کروں گا کہ میرے پروردگار! میری اُمت کو بخش دیجئے، میری اُمت پر رحم فرمائیے مجھ سے کہا جائے گا کہ جاؤ اور ہر اس شخص کو (دوزخ سے) نکال لو جس کے دل میں رائی کے ادنی سے ادنی دانہ برابر بھی ایمان ہے۔ پس میں جاؤں گا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد پھر میں چوتھی مرتبہ بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور انہیں الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوا سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر مجھ سے پوچھا جائے گا کہ محمد! اپنا سر اٹھاؤ جو کہنا چاہتے ہو کہو تمہاری بات سنی جائے گی جو مانگنا چاہتے ہو مانگوں میں دوں گا اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو میں قبول کروں گا۔ میں عرض کروں گا میرے پروردگار (اب) مجھے اس شخص کی بھی شفاعت کی اجازت مرحمت فرما دیجئے جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو پروردگار فرمائے گا کہ نہیں، اس کام سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اپنے عزت و جلال اور اپنی ذاتی و صفاتی عظمت و بڑائی کی قسم، اس شخص کو میں خود دوزخ سے نکالوں گا جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو گا۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جس کے دل میں جو برابر بھی ایمان ہو۔" واضح رہے کہ اس طرح کے جملوں، یعنی "جس کے دل میں جو برابر یا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر اور یا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر اور یا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو کی توضیح و تاویل میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں اور یہ اختلاف اقوال پر مبنی ہے جو اصل ایمان کی بحث کے سلسلہ میں ان کے درمیان پایا جاتا ہے، یہ ایک لمبی چوڑی بحث ہے اور کتاب الایمان وغیرہ میں مختلف مواقع پر گزر بھی چکی ہے اس موقع پر صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ مذکورہ جملوں میں جس چیز کو جو یا رائی یا ذرہ کے برابر فرمایا گیا ہے اس سے حقیقی ایمان مراد نہیں ہے بلکہ از قسم خود خیر و بھلائی وہ چیز مراد ہے جو ایمان کے ثمرات و نتائج، ایقان کی روشنی اور عرفان کے نور سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس چیز پر حقیقت ایمان کا اطلاق اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اصل ایمان جو تصدیق قلبی (یعنی خاص دل سے ماننے) اور ایسے ہی اقرار لسانی (زبان سے سچا اقرار کرنے) کا نام ہے، ایک ایسا جوہر ہے جس کو اجزاء اور حصوں میں تقسیم ہی نہیں کہا جاسکتا اور نہ اس پر کمی و زیادتی کا اجراء ہو سکتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصل ایمان (یعنی نفس تصدیق قلبی اور یقین دلی، نہ تو گھٹتا بڑھتا ہے اور نہ اس کو کسی مقدار یا حصہ میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پس جو علماء یہ کہتے ہیں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے اور اس پر کمی و بیشی کا اطلاق ہو سکتا ہے اگر ان کے اس قول کو اچھے اور برے اعمال کے اعتبار سے ایمان کے ثمرات و درجات میں کمی و زیادتی پر محمول کیا جائے تو اس صورت میں معلوم ہو گا کہ مذکورہ مسئلہ سے متعلق علماء کے درمیان درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ ان کے اختلافی اقوال محض لفظی اختلاف اور صوری نزاع ہے۔

"جس کے دل میں رائی کے ادنی سے ادنی دانہ کے برابر بھی ایمان ہے۔" یہ دراصل حق تعالیٰ کی طرف سے انتہائی فضل و کرم کا اظہار ہو گا کہ اس شخص کو بھی دوزخ سے نکال لو جو ادنی سے ادنی درجہ کا مؤمن ہے۔

"جس نے لا الہ الا اللہ کہا۔" کا مطلب یہ ہے کہ میں ان لوگوں کی بھی شفاعت کرنا چاہتا ہوں جن کے نامۂ اعمال میں اس کلمہ طیبہ کے علاوہ اور کوئی بھی نیکی نہیں ہے اور ملا علی قاری کی وضاحت کے مطابق اگرچہ انہوں نے اپنے ایمان کی حالت میں یا ایمان لانے کے بعد اپنی پوری زندگی میں کلمہ طیبہ بھی صرف ایک ہی مرتبہ کیوں نہ زبان سے ادا کیا ہو! حاصل یہ کہ آنحضرت ﷺ آخری مرتبہ جن لوگوں کی شفاعت کریں گے وہ اس درجہ کے مؤمن ہوں کہ ان کا نامہ اعمال میں کوئی بھی نیکی اور کوئی بھی اچھا کام نہیں ہو گا سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کبھار اپنی زبان سے کلمہ طیبہ ادا کیا ہو گا بلکہ بعض تو ایسے بھی ہوں گے جن کی زبان پر پوری عمر

میں صرف ایک ہی مرتبہ یہ کلمہ آیا ہوگا اور ان کے بارے میں یہ شفاعت بھی آپ ﷺ اس امید پر کرنا چاہیں گے کہ زبان سے لا الہ الا اللہ کہنا بھی بہرحال ایک نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ کسی بھی نیکی خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی اور کتنے ہی کم درجہ کی کیوں نہ ہو، ضائع نہیں جانے دے گا بلکہ اول یا آخر اس کا اجر ضرور دے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے کہ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ (یعنی جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں جائے گا) طیبیؒ نے کہا ہے کہ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اس حدیث میں "جو اور رائی وغیرہ کی مقدار کے برابر" کے ذریعہ جس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے وہ اصل ایمان مراد نہیں ہے جس کو "تصدیق قلبی" سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ اس ایمان کے علاوہ کچھ اور مراد ہے اور وہ کچھ اور "از قسم نیکی و بھلائی وہ چیز ہے جو ایمان کے ثمرہ کے طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے۔

"نہیں اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے الخ کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کے نامۂ اعمال میں لا الہ الا اللہ کہنے کے علاوہ اور کوئی بھی نیکی، نہیں ہے اس کو دوزخ سے نکالنے کی شفاعت کا حق بھی گو آپ ﷺ کو حاصل ہے اور آپ ﷺ شوق سے ایسے شخص کی شفاعت بھی کیجئے، ہم اس کو قبول کریں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو دوزخ سے نکلوانا آپ ﷺ کے ذمہ نہیں ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ بے شک ہم اس شخص کو بھی دوزخ سے نکالیں گے مگر ایسا ہم آپ کی شفاعت کی وجہ سے نہیں کریں گے بلکہ اس وجہ سے کریں گے کہ اپنے فضل و کرم کو ظاہر کرنے کے لئے ہم خود اس کو دوزخ سے نکالنا پسند کرتے ہیں! اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس مؤمن کے دوزخ سے نکالے جانے کا معاملہ کہ جس نے اپنی پوری عمر میں کوئی بھی نیکی و بھلائی نہیں کی ہے، شفاعت کے دائرہ سے باہر ہوگا بلکہ وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے متعلق ہوگا۔ اس صورت میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ آگے حضرت ابوہریرہؓ کی جو روایت اسعد الناس الخ آرہی ہے پھر اس کا کیا مفہوم ہوگا اور مذکورہ مطلب مراد لینے کی صورت میں اس روایت اور اس حدیث کے درمیان تطبیق کیا ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہاں پہلا مطلب مراد لیا جائے تو ان دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تعارض ہی نہیں رہے گا کیونکہ مذکورہ شخص کو اللہ تعالیٰ بہرحال آنحضرت ﷺ کی شفاعت ہی کے سبب دوزخ سے نکالے گا اور اگر دوسرا مطلب مراد لیا جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ یہاں حدیث میں "جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا ہو" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے نبی پر ایمان تو لائے تھے لیکن کوئی بھی عمل خیر نہ رکھتے اور اپنی بدعملیوں کی بنا پر دوزخ کے مستوجب قرار دے دیئے گئے ہوں گے اور آگے آنے والی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آنحضرت ﷺ کے اُمت کے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنے نیک اعمال کو اپنے برے اعمال کے ساتھ اس طرح خلط ملط کیا ہوگا ان کی نیکیاں ہلکی اور برائیاں بھاری پڑ گئی ہوں گی اور وہ دوزخ کے مستوجب قرار دے دیئے گئے ہوں گے۔

نصیبہ والا شخص

⑦ وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِی یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِّنْ قَلْبِهٖ اَوْ نَفْسِهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن میری شفاعت کے لئے نصیبہ والا شخص وہ ہوگا، جس نے (دنیا میں) خلوص تہ دل سے، یا یہ فرمایا کہ خلوص تہ نفس سے لا الہ الا اللہ کہا ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: من قلبہ او من نفسہ میں حرف او کے ذریعہ راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہاں من قلبہ کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے یا من نفسہ کے، بہرحال دونوں کے معنی ایک ہی ہیں کیونکہ "نفس" سے مراد بھی "دل" ہی ہے نیز خالصا من قلبہ (خلوص تہ دل) ترکیب تاکیدی ہے، کیونکہ "خلوص" کی جگہ تہ دل یعنی دل کی گہرائی ہی ہے نہ کہ کچھ اور، اس اعتبار سے تہ دل کا دوسرا نام "خلوص" ہے، پس "خلوص تہ دل" کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "میں نے فلاں چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے یا میں نے فلاں بات

اپنے کان سے سنی ہے۔

حدیث میں اسعد کا لفظ "سعید" کے معنی میں ہے اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اہل توحید میں سے نہیں ہوگا وہ آنحضرت کی شفاعت سے فیض یاب نہیں ہوگا یا مَنْ قَالَ سے مراد وہ شخص ہے جس کے نامہ اعمال میں ایسا کوئی بھی عمل نہ ہو جس کے سبب وہ رحمت کا مستحق قرار پاسکے اور دوزخ کی آگ سے نجات پانے کا سزاوار ہوسکے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ شفاعت کا سب سے زیادہ ضرورت مند وہی شخص ہوگا اور شفاعت اسی کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے گی۔

حضور ﷺ کی شفاعت کا ذکر

⑧ وَعَنْهُ قَالَ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِلَحْمٍ فَرُفِعَ اِلَیْهِ الذِّرَاعُ وَکَانَتْ تُعْجِبُهٗ فَنَهَسَ مِنْهَا نَهْسَةً ثُمَّ قَالَ اَنَا سَیِّدُ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَتَدْنُو الشَّمْسُ فَیَبْلُغُ النَّاسَ مِنَ الْغَمِّ وَالْکَرْبِ مَالَا یُطِیْقُوْنَ فَیَقُوْلُ النَّاسُ اَلَا تَنْظُرُوْنَ مَنْ یَّشْفَعُ لَکُمْ اِلٰی رَبِّکُمْ فَیَاْتُوْنَ اٰدَمَ وَ ذَکَرَ حَدِیْثَ الشَّفَاعَةِ وَقَالَ فَاَنْطَلِقُ فَاٰتِیْ تَحْتَ الْعَرْشِ فَاَقَعُ سَاجِدًا لِرَبِّیْ ثُمَّ یَفْتَحُ اللّٰهُ عَلَیَّ مِنْ مَحَامِدِهٖ وَحُسْنِ الثَّنَآءِ عَلَیْهِ شَیْئًا لَمْ یَفْتَحْهُ اللّٰهُ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ ثُمَّ قَالَ یَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَاْسَكَ سَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَرْفَعُ رَاْسِیْ فَاَقُوْلُ اُمَّتِیْ یَارَبِّ اُمَّتِیْ یَا رَبِّ اُمَّتِیْ یَارَبِّ فَیُقَالُ یَا مُحَمَّدُ اَدْخِلْ مِنْ اُمَّتِكَ مَنْ لَّا حِسَابَ عَلَیْهِمْ مِنَ الْبَابِ الْاَیْمَنِ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ وَهُمْ شُرَکَآءُ النَّاسِ فِیْمَا سِوٰی ذٰلِكَ مِنَ الْاَبْوَابِ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ اِنَّ مَابَیْنَ الْمِصْرَاعَیْنِ مِنْ مَّصَارِیْعِ الْجَنَّةِ کَمَا بَیْنَ مَکَّةَ وَهَجَرَ۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں (پکا ہوا) گوشت لایا گیا اس میں سے دست کا گوشت آپ کو پیش کیا گیا جو آپ ﷺ کو بہت پسند اور مرغوب تھا، آپ ﷺ نے اس میں سے دانتوں سے نوچ نوچ کر کھایا، اور پھر فرمانے لگے کہ "میں قیامت کے دن، جب کہ لوگ دو جہان کے پروردگار کا فیصلہ سننے کے انتظار میں کھڑے ہوں گے، تمام لوگوں کا سردار ہوں گا، اس دن سورج (لوگوں کے سروں کے) بہت قریب ہوگا اور لوگوں کی حالت (مسلسل کھڑے رہنے، گرمی کی تپش و سختی اور وہاں کے ہولناک ماحول کے اثر سے) اس قدر کربناک اور غم وفکر سے بوجھل ہوگی کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں گے، یعنی صبر و استقامت پر قادر نہیں ہوں گے، اور نہایت حیرانی و پریشانی کے عالم میں) ایک دوسرے سے کہتے پھریں گے کہ آخر تم کسی ایسے شخص کی تلاش کیوں نہیں کرتے جو تمہارے پروردگار سے تمہاری سفارش کردے (اور وہ تمہیں اس کرب و اذیت کی حالت سے نجات عطا کردے) چنانچہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔" اس کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے یا خود آنحضرت ﷺ نے شفاعت کے سلسلے میں حدیث کے (وہی) اجزاء بیان کئے (جو پہلے ایک حدیث میں بیان ہوچکے ہیں، کہ لوگ یکے بعد دیگرے تمام انبیاء کے پاس جاکر شفاعت کی درخواست کریں گے اور وہ سب جواب دیں گے کہ ہم اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے اور پھر وہ لوگ شفاعت کی درخواست لے کر میرے پاس آئیں گے یہ ذکر کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "پس میں لوگوں کے پاس سے روانہ ہوں گا اور عرش کے نیچے آؤں گا اور وہاں (بارگاہ رب العزت میں) اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی حمد اور بہترین ثناء کے وہ الفاظ و اسلوب منکشف کردے گا جو مجھ سے پہلے اس نے کسی پر منکشف نہیں کیے ہوں گے (یعنی اس موقع کے لئے میرے دل میں اپنی حمد وثنا کے وہ الفاظ اور کورنش و آداب حضوری کے وہ طریقہ القاء فرمائے گا جو اس نے مجھ سے پہلے کسی اور کو القاء نہیں کیے ہوں گے بلکہ اس وقت سے پہلے مجھ کو بھی ان کا کوئی علم نہیں ہوگا، جیسا کہ پہلے ایک حدیث میں اس طرف اشارہ کیا جاچکا ہے، پھر پروردگار فرمائے گا کہ محمد! اپنا سر اٹھاؤ، جو چاہتے ہو مانگو میں دوں گا اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو تو کرو میں قبول کروں گا (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا کہ میرے پروردگار! میری امت کو بخش دیجئے،

تب کہا جائے گا کہ اے محمد! آپ (ﷺ) اپنی اُمت میں سے ان لوگوں کو جن سے حساب نہیں لیا جائے گا (اور جو حساب کے بغیر جنت کے مستحق ہیں) جنت کے دائیں طرف کے دروازہ سے جنت میں داخل کر دیجئے اور وہ لوگ اس دروازہ کے علاوہ دوسرے (اطراف کے، دروازوں کے استعمال کے حق میں بھی لوگوں کے ساتھ شریک ہیں اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا۔ "قسم ہے اس ذات کی جس کی دست قدرت میں میری جان ہے، جنت کے دروازوں میں سے ہر ایک دروازہ کے دونوں کواڑوں کے درمیان کا فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا کہ مکہ اور ہجر کے درمیان ہے" (بخاریؒ مسلمؒ)

تشریح: "میں قیامت کے دن تمام لوگوں کا سردار ہوں گا۔" میں "لوگوں" کا اطلاق پوری نوع انسانی پر ہے جس میں انبیاء بھی شامل ہیں! اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے انا سید ولد ادم یوم القیامۃ الخ یعنی قیامت کے دن میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا! اور یہ بات آپ ﷺ نے اس اعتبار سے ارشاد فرمائی کہ اس توقیر وعزت کی بنا پر کہ جو آپ ﷺ کو بارگاہ خداوندی میں سب سے زیادہ قرب و محبوبیت کی وجہ سے حاصل ہوگی، اس دن ہر ایک آپ ﷺ کی شفاعت کا محتاج ہوگا، جب سب لوگ نہایت مضطرب و پریشان ہوں گے تو آخر میں آپ ﷺ ہی کے پاس شفاعت کی درخواست لے کر آئیں گے اور صرف آپ ﷺ ہی ان کی شفاعت کا حوصلہ کریں گے۔

"عرش الٰہی کے نیچے آؤں گا" یہ جملہ پیچھے حضرت انسؓ سے نقل کی جانے والی اس حدیث کے خلاف ہے جس میں "اپنے پروردگار کے گھر میں آنے"، کے الفاظ ہیں، پس ان دونوں کے درمیان تطبیق یوں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا گھر جنت ہے اور جنت عرش الٰہی کے نیچے ہی ہے، لہٰذا دونوں حدیثوں کے الفاظ میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں ہے۔

"میرے پروردگار میری اُمت کو بخش دیجئے۔" ان الفاظ کو تین بار کہنا یا تو اپنی عرض کو زیادہ سے زیادہ اہم اور قابل توجہ بنا کر پیش کرنے کے لئے ہوگا جیسا کہ جب کوئی شخص اپنے حاکم و آقا سے کسی اہم مقصد کی بار آوری چاہتا ہے تو وہ اپنی عرض کو اس کے سامنے بار بار دہراتا ہے یا ان الفاظ کو بار بار دہرانے سے گناہ گاروں کے طبقوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوگا، جیسا کہ پیچھے گزرنے والی حدیث میں بیان ہوا کہ آپ ﷺ کی ایک دفع کی شفاعت کسی ایک طبقہ کے ساتھ مختص ہوگی اور پھر دوسری مرتبہ کی شفاعت کسی دوسرے طبقہ کے ساتھ، اور اس طرح متعدد دفعوں میں سب کی شفاعت پوری ہوگی۔

جنت کے دائیں طرف کے دروازے سے ...... الخ یعنی ان لوگوں کے اعزاز و تکریم کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے از راہ عنایت جنت کے دائیں طرف کا دروازہ انہی لوگوں کے لئے مخصوص ہوگا، ان کے علاوہ کسی اور کو اس دروازہ سے داخلہ کی اجازت نہیں ہوگی، اس دروازہ کے علاوہ باقی اور جو تمام دروازے ہوں گے وہ دوسرے سب لوگوں کے لئے مشترک ہوں گے اور مذکورہ لوگ بھی ان دروازوں کو استعمال کرنے کا حق رکھیں گے۔

ھَجَرَ ایک جگہ کا نام ہے جو جزیرہ نما عرب کے مشرقی ساحل پر (سعودی عرب کے) اس علاقہ میں واقعہ ہے جس کو اب "احساد" کہا جاتا ہے اور پہلے زمانہ میں "بحرین" اسی علاقہ کو کہتے تھے۔ بہرحال اس جملہ کا مقصود جنت کے دروازوں کی چوڑائی اور وسعت کو بیان کرنا ہے کہ جنت کے ہر دروازے کی چوڑائی اس فاصلہ کے بقدر ہے جو مکہ اور ہجر کے درمیان ہے، لیکن اس سے مراد تحدید و تعیین ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ تخمینا فرمایا گیا ہے تاکہ دروازے کی چوڑائی و وسعت کا اندازہ ہو جائے، جہاں تک حقیقت حال کا تعلق ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔

امانت اور قرابت داری کی اہمیت

⑨ وَعَنْ حُذَيْفَةَ ؓ فِيْ حَدِيْثِ الشَّفَاعَةِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَتُرْسَلُ الْاَمَانَةُ وَالرَّحِمُ فَتَقُوْمَانِ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حذیفہؓ نے رسول کریم ﷺ سے شفاعت کے سلسلہ کی (تفصیلی) حدیث نقل کرتے ہوئے بیان کیا کہ آپ ﷺ نے (پھر بعد میں یہ بھی) فرمایا کہ "امانت اور رحم یعنی قرابت داری کو بھیجا جائے گا اور وہ دونوں پل صراط کے دائیں بائیں جانب کھڑی ہو جائیں گی۔" (مسلمؒ)

تشریح: "امانت" یعنی لوگوں کے مال و اسباب اور حقوق کی حفاظت کرنا اور "رحم" یعنی ناتا کہ جس کو قرابت داری بھی کہتے ہیں، یہ دونوں باتیں چونکہ نہایت اہمیت اور بہت زیادہ فضیلت رکھتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کا اہتمام کرنا اور ان کی رعایت کو ملحوظ رکھنا بندوں پر لازم ہے۔ اس لئے قیامت کے دن ان کو صورت دے کر پل صراط کے دونوں طرف کھڑا کر دیا جائے گا تاکہ یہ امانت دار اور خیانت ناتا جوڑنے والے اور ناتا توڑنے والے کے حق میں گواہی دیں اور اس کے خلاف احتجاج کریں چنانچہ جس شخص نے اپنی دنیاوی زندگی میں امانت کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی اور قرابت داری کے تمام حقوق پوری طرح ادا کیے گئے ہوں گے، یہ دونوں اس کے حق میں مظاہرہ کریں گے اور اس کی نیکی پر زور و شور سے گواہی دیں گے اور جس شخص نے امانت کی ادائیگی میں کوتاہی اور بد دیانتی کی ہوگی اور قرابتداری کا حق ادا نہیں کیا ہوگا، یہ دونوں اس کے خلاف احتجاج کریں گے اور ان کی برائی کو زور و شور سے بیان کریں گے تاکہ دونوں طرح کے لوگوں کے درمیان امتیاز ہو جائے اور ہر شخص آسانی کے ساتھ پہچان لیا جائے کہ اس نے ان دونوں کے سلسلہ میں کیا عمل کیا تھا۔ پس اس حدیث میں اس امر کی ترغیب ہے کہ ان دونوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی بہرصورت ملحوظ رکھنے کا پورا پورا اہتمام رکھنا چاہئے۔

حضور ﷺ کی شفاعت قبول کرنے کا وعدہ خداوندی

⑩ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ وبْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَلَا قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالٰی فِی اِبْرَاهِیْمَ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَقَالَ عِیْسٰی اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ فَرَفَعَ یَدَیْهِ فَقَالَ اللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ وَبَکٰی فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی یَا جِبْرَئِیْلُ اذْهَبْ اِلٰی مُحَمَّدٍ وَّرَبُّكَ اَعْلَمُ فَاسْئَلْهُ مَا یُبْکِیْهِ فَاَتَاهُ جِبْرَئِیْلُ فَسَاَلَهٗ فَاَخْبَرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِمَا قَالَ فَقَالَ اللّٰهُ لِجِبْرَئِیْلَ اذْهَبْ اِلٰی مُحَمَّدٍ فَقُلْ اِنَّا سَنُرْضِیْكَ فِیْ اُمَّتِكَ وَلَا نَسُوْءُكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (اپنی مجلس میں لوگوں کے سامنے) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں (یہ بیان کرنے کے لئے کہ وہ قیامت کے دن اپنی امت کے متعلق بارگاہ رب ذوالجلال میں کیا عرض کریں گے) یہ آیت پڑھی، رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (اور آیت کا بقیہ حصہ یہ ہے وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ) اور پوری آیت کا ترجمہ یوں ہے کہ میرے پروردگار! یہ بت بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب بنے ہیں، پس ان لوگوں میں سے جنہوں نے میری اطاعت قبول کی ہے، یعنی توحید، اخلاص اور توکل کو اختیار کیا وہ میرے اپنے اور میرے تابعدار ہیں اور جنہوں نے میری نافرمانی کی ہے تو، تو معاف کرنے والا رحیم ہے) پھر آپ ﷺ نے (اسی سلسلہ میں) حضرت عیسیٰ کے تعلق سے یہ آیت پڑھی (جس میں یہ بیان ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنی اُمت کے حق میں پروردگار سے کیا عرض کریں گے) اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (اور آیت کا بقیہ حصہ یہ ہے وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ) اور پوری آیت کا ترجمہ یوں ہے "اگر تو ان کو عذاب میں مبتلا کرے تو بہر حال وہ تیرے ہی بندے ہیں" یعنی تو ان کا مطلق مالک ہے وہ تیرے حکم کے خلاف کر ہی کیا سکتے ہیں اور ان کو عذاب میں مبتلا کرنے سے تجھے کون روک سکتا ہے۔ "اگر تو ان کو بخش دے تو بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔" یعنی تجھ پر کوئی غالب نہیں ہے، تو جو چاہے حکم کر سکتا ہے، کوئی بھی تیرے حکم کو پس پشت ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا پھر یہ کہ تیری حکمت و دانائی میں بھی ذرہ برابر شبہ نہیں، تو ہر ایک کے بارے میں

وہی حکم کرتا ہے جس کا وہ مستحق و مستوجب ہوتا ہے اور ہر چیز کو وہی جگہ دیتا ہے جہاں کا وہ سزاوار ہے) اس کے بعد آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دُعا کی کہ پروردگار میری اُمت کو بخش دے، میری اُمت پر رحم فرما اور (یہ دعا کرتے ہوئے) آپ ﷺ رونے لگے۔ (فورًا) اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل کو حکم دیا کہ محمد (ﷺ) کے پاس جاؤ، اور حالانکہ اے جبرائیل تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے (اس کو کچھ مطلق دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے) مگر (محمد ﷺ کی دلجوئی اور پروردگار کی عنایت و توجہ کے اظہار کی خاطر) ان سے پوچھو کہ آپ ﷺ کیوں روتے ہیں (یہ حکم سنتے ہی) حضرت جبرائیل آنحضرت کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے رونے کا سبب پوچھا، آپ ﷺ نے اپنے الفاظ میں انہیں بتادیا (کہ اپنی اُمت کے بارے میں خوف خداوندی نے مجھ پر رقت طاری کردی ہے) پھر (حضرت جبرئیل علیہ السلام بارگاہ کبریائی میں واپس گئے اور صورت حال عرض کی اور تب) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محمدؐ کے پاس جاؤ اور کہو کہ (جب وقت آئے گا تو) ہم یقینًا آپ (ﷺ) کو آپ (ﷺ) کی اُمت کے بارے میں راضی و خوش کردینگے، اور آپ کو ہرگز رنجیدہ نہیں ہونے دیں گے۔" (مسلم)

تشریح: "(یہ دعا کرتے ہوئے) آپ ﷺ رونے لگے۔" یعنی آپ ﷺ نے اپنی اپنی اُمت کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شفاعت کو یاد کیا اور اس کا ذکر کیا تو پھر فورًا آپ ﷺ کو خود اپنی اُمت کا خیال آگیا، اور اس خوف سے آپ ﷺ پر رقت طاری ہوگئی کہ نامعلوم میری امت کے لوگوں کا کیا حشر ہوگا کہیں ان کو تو عذاب خداوندی میں مبتلا نہیں کیا جائے گا، چنانچہ آپ ﷺ نے بارگاہ خداوندی میں اپنی اُمت کی بخشش و مغفرت کی دعا فرمائی۔

"آپ ﷺ کو اپنی اُمت کے بارے میں راضی و خوش کردیں گے۔" اور آپ ﷺ راضی و خوش کس صورت میں ہوں گے، اس کے متعلق بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "میں اس وقت تک راضی و خوش نہیں ہونگا جب تک اللہ تعالیٰ میری اُمت کے ایک ایک فرد کو بخش نہیں دے گا۔" سبحان اللہ اس امت کے لئے اس سے بڑی سعادت کی بات اور کیا ہوسکتی ہے، ضرورت صرف یہ ہے کہ حقیقی معنی میں آپ ﷺ کا امتی بنا جائے آپ ﷺ کے ساتھ ایمان کے عقیدے کو ہر حالت میں درست رکھا جائے، مشکل جو ہے صرف یہی ہے اور کچھ نہیں ؎

خاک او باش بادشاہی کن آن او باش ہرچہ خواہی کن

اس حدیث سے کئی اہم باتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ آنحضرت ﷺ کو اپنی اُمت سے کس درجہ کا تعلق ہے اور آپ ﷺ اپنی اُمت پر کتنے زیادہ شفیق و مہربان ہیں، نیز آپ اپنی اُمت کے لوگوں کی صلاح و فلاح کی طرف کس طرح ہر وقت متوجہ رہتے تھے، دوسری اور سب سے بڑی بات اس اُمت مرحومہ کے لئے بشارت عظمیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے وعدہ فرمالیا ہے کہ ہم آپ (ﷺ) کو آپ ﷺ کی اُمت کے بارے میں راضی و خوش کردیں گے، اور تیسری بات آنحضرت ﷺ کا عظیم المرتبت ظاہر ہونا ہے۔

قیامت کے دن شفاعت وغیرہ سے متعلق کچھ اور باتیں

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ نَاسًا قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) ھَلْ نَرٰی رَبَّنَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَعَمْ ھَلْ تُضَارُّوْنَ فِیْ رُؤْیَۃِ الشَّمْسِ بِالظَّھِیْرَۃِ صَحْوًا لَّیْسَ مَعَھَا سَحَابٌ وَّھَلْ تُضَارُّوْنَ فِیْ رُؤْیَۃِ الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ صَحْوًا لَّیْسَ فِیْھَا سَحَابٌ قَالُوْا لَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ مَا تُضَارُّوْنَ فِیْ رُؤْیَۃِ اَحَدِھِمَا اِذَا کَانَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ لِیَتَّبِعْ کُلُّ اُمَّۃٍ مَا کَانَتْ تَعْبُدُ فَلَا یَبْقٰی اَحَدٌ کَانَ یَعْبُدُ غَیْرَ اللّٰہِ مِنَ الْاَصْنَامِ وَالْاَنْصَابِ اِلَّا یَتَسَاقَطُوْنَ فِی النَّارِ حَتّٰی اِذَا لَمْ یَبْقَ اِلَّا مَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ مِنْ بَرٍّ وَّفَاجِرٍ اَتَاھُمْ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ قَالَ فَمَاذَا تَنْظُرُوْنَ یَتَّبِعُ کُلُّ اُمَّۃٍ مَا کَانَتْ تَعْبُدُ قَالُوْا یَا رَبَّنَا فَارَقْنَا النَّاسَ فِی الدُّنْیَا اَفْقَرَ مَا کُنَّا اِلَیْھِمْ وَلَمْ نُصَاحِبْھُمْ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ فَیَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مَکَانُنَا حَتّٰی یَاتِیَنَا رَبُّنَا فَاِذَا جَآءَ رَبُّنَا عَرَفْنَاہُ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ سَعِیْدٍ فَیَقُوْلُ ھَلْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہٗ اٰیَۃٌ تَعْرِفُوْنَہٗ

فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ فَيُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ فَلَا يَبْقٰى مَنْ كَانَ يَسْجُدُ لِلّٰهِ تَعَالٰى مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِهٖ اِلَّا اَذِنَ اللّٰهُ لَهٗ بِالسُّجُوْدِ وَلَا يَبْقٰى مَنْ كَانَ يَسْجُدُ اتِّقَاءً وَّرِيَاءً اِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ ظَهْرَهٗ طَبَقًا وَاحِدَةً كُلَّمَا اَرَادَ اَنْ يَّسْجُدَ خَرَّ عَلٰى قَفَاهُ ثُمَّ يُضْرَبُ الْجِسْرُ عَلٰى جَهَنَّمَ وَتَحِلُّ الشَّفَاعَةُ وَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ فَيَمُرُّ الْمُؤْمِنُوْنَ كَطَرْفِ الْعَيْنِ وَكَالْبَرْقِ وَكَالرِّيْحِ وَكَالطَّيْرِ وَكَاَجَاوِيْدِ الْخَيْلِ وَالرِّكَابِ فَنَاجٍ مُسَلَّمٌ وَّمَخْدُوْشٌ مُّرْسَلٌ وَّمَكْدُوْشٌ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ حَتّٰى اِذَا خَلَصَ الْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النَّارِ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْكُمْ بِاَشَدَّ مُنَاشَدَةً فِي الْحَقِّ قَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لِلّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا كَانُوْا يَصُوْمُوْنَ مَعَنَا وَيُصَلُّوْنَ وَيَحُجُّوْنَ فَيُقَالُ لَهُمْ اَخْرِجُوْا مَنْ عَرَفْتُمْ فَتُحَرَّمُ صُوَرُهُمْ عَلَى النَّارِ فَيُخْرِجُوْنَ خَلْقًا كَثِيْرًا ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا مَا بَقِيَ فِيْهَا اَحَدٌ مِّمَّنْ اَمَرْتَنَا بِهٖ فَيَقُوْلُ ارْجِعُوْا فَمَنْ وَجَدْتُّمْ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ فَاَخْرِجُوْهُ فَيُخْرِجُوْنَ خَلْقًا كَثِيْرًا ثُمَّ يَقُوْلُ ارْجِعُوْا فَمَنْ وَجَدْتُّمْ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ نِصْفِ دِيْنَارٍ مِنْ خَيْرٍ فَاَخْرِجُوْهُ فَيُخْرِجُوْنَ خَلْقًا كَثِيْرًا ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا لَمْ نَذَرْ فِيْهَا خَيْرًا فَيَقُوْلُ اللّٰهُ شَفَعَتِ الْمَلٰئِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّوْنَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَلَمْ يَبْقَ اِلَّا اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِنَ النَّارِ فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَّمْ يَعْمَلُوْا خَيْرًا قَطُّ قَدْ عَادُوْا حُمَمًا فَيُلْقِيْهِمْ فِيْ نَهْرٍ فِيْ اَفْوَاهِ الْجَنَّةِ يُقَالُ لَهٗ نَهْرُ الْحَيٰوةِ فَيَخْرُجُوْنَ كَمَا تَخْرُجُ الْحِبَّةُ فِيْ حَمِيْلِ السَّيْلِ فَيَخْرُجُوْنَ كَاللُّؤْلُؤِ فِيْ رِقَابِهِمُ الْخَوَاتِمُ فَيَقُوْلُ اَهْلُ الْجَنَّةِ هٰؤُلَاءِ عُتَقَاءُ الرَّحْمٰنِ اَدْخَلَهُمُ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ عَمَلٍ عَمِلُوْهُ وَلَا خَيْرٍ قَدَّمُوْهُ فَيُقَالُ لَهُمْ لَكُمْ مَّا رَاَيْتُمْ وَمِثْلُهٗ مَعَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن مجلس نبوی ﷺ میں) کچھ لوگوں نے کہا کہ یارسول اللہ کہ کیا قیامت کے دن ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہاں دیکھو گے۔" (پھر آپ ﷺ نے دیدار الٰہی کے ثبوت کو واضح کرنے کے لئے لوگوں سے سوال کیا کہ) کیا تم لوگ دوپہر کے وقت جب کہ آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا بھی نہ ہو، سورج کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ و تکلیف محسوس کرتے ہو اور کیا تم لوگ شفاف چودھویں رات میں، جب کہ آسمان پر بادل کا کوئی ایک ٹکڑا بھی نہ ہو، چاند کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ و تکلیف محسوس کرتے ہو؟" لوگوں نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں یارسول اللہ! فرمایا "تو پھر قیامت کے دن تم اللہ تعالیٰ کو دیکھنے میں بھی کوئی رکاوٹ و تکلیف محسوس نہیں کرو گے، ہاں جیسا کہ تم ان دونوں (یعنی سورج و چاند) میں سے کسی کو دیکھنے میں رکاوٹ و تکلیف محسوس کرتے ہو۔ (اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا) جب قیامت کا دن برپا ہوگا (اور تمام مخلوق میدان محشر میں جمع ہوگی، تو ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ جو طبقہ (دنیا میں) جس چیز کی عبادت کرتا تھا وہ اسی کے پیچھے رہے، چنانچہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بجائے بتوں اور انصاب کو پوجتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہیں بچے گا اور سب کے سب دوزخ میں جاگریں گے۔ کیونکہ انصاب اور بت کہ جن کی پوجا ہوتی تھی، دوزخ میں پھینکے جائیں گے، لہٰذا ان کے ساتھ ان کی پوجا کرنے والے بھی دوزخ میں ڈالے جائیں گے) یہاں تک کہ جب ان لوگوں کے سوا کوئی موجود نہیں رہے گا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے وہ خواہ نیک ہوں یا بد، تو تمام جہانوں کا پروردگار ان کے پاس آئے گا اور فرمائے گا کہ تم کس کے منتظر ہو؟ ہر طبقہ اس چیز کے پیچھے پیچھے چلا جارہا ہے جس کی وہ عبادت کرتا تھا (تو تم پھر یہاں کیوں کھڑے ہو، تم بھی کیوں نہیں چلے جاتے وہ لوگ جواب دیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم نے دنیا میں ان لوگوں سے کہ جو دنیا میں غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے اور اب اپنے معبودوں کے پیچھے پیچھے دوزخ میں چلے جائیں گے) پوری طرح جدائی اختیار کر رکھی تھی حالانکہ ہم (اپنی دنیاوی ضرورتوں میں) ان لوگوں (کی مدد و اعانت) کے ضرورت مند تھے لیکن ہم نے کبھی ان کی صحبت و ہمنشینی کو گوارا نہیں کیا (اور نہ کبھی ان کی اتباع کی بلکہ ہمیشہ ان کے مدمقابل رہے اور صرف تیری رضا کی خاطر ان سے جنگ و جدال کرتے رہے، پس اب جب کہ ہم ان کے کسی طرح سے ضرورت مند بھی نہیں ہیں اور ان سب کی منزل بھی دوزخ ہے، تو ہم ان کے ساتھ کیسے چلے جاتے) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یہاں یوں نقل کیا گیا ہے کہ وہ لوگ (جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ یہ کہیں گے کہ ہم یہاں سے اس وقت تک نہیں

جائیں گے جب تک ہمارا پروردگار ہمارے پاس نہیں آئے گا یعنی جب تک وہ ہم پر اس طرح سے تجلی نہ فرمائے جس کے سبب ہم اس کو پہچان لیں کہ یہی ہمارا پروردگار ہے اور جب ہمارا پروردگار (اپنی تجلی وصفات کے اظہار کی صورت میں کہ جس کے سبب ہم اس کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں) ہمارے پاس آئے گا تو ہم اس کو (اچھی طرح) پہچان لیں گے اور حضرت ابوسعید خدری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان کوئی نشانی ہے جس کے ذریعے تم اس کو پہچان لوگے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں نشانی ہے تب اللہ کی پنڈلی کھولی جائے گی اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو سجدہ کی اجازت وتوفیق عطا فرمائے گا جو (دنیا میں کسی کو دکھانے سنانے اور کسی خوف اور لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اپنے نفس کے تقاضے یعنی اخلاص وعقیدت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا تھا اور ہر وہ شخص کہ (جو دنیا میں) کسی خوف سے یا لوگوں کو دکھانے سنانے کے لئے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا تھا اللہ تعالیٰ اس کی کمر کو ایک پورا تختہ بنا دے گا (یعنی اس کو پیٹھ وکمر کی ہڈیوں کے جوڑ بالکل ختم کر دیئے جائیں گے اور اس کی پوری پیٹھ ایک تختہ بن جائے گی تاکہ وہ جھک نہ سکے اور نہ سجدہ کر سکے) چنانچہ وہ سجدہ میں جانے کے لئے جھکنا چاہے گا تو چت گر پڑے گا پھر دوزخ کے اوپر (اس کے بیچوں بیچ) پلصراط کو رکھا جائے گا اور شفاعت کی اجازت عطا کی جائے گی، چنانچہ تمام انبیاء (اپنی اپنی امتوں کے حق میں طلب استقامت وسلامتی کے لئے) یہ دعا کریں گے کہ اے اللہ! ان کو (پلصراط کے اوپر سے) سلامتی سے گزار دے، ان کو دوزخ میں گرنے سے محفوظ رکھ۔ پس مسلمان لوگ (پلصراط کے اوپر سے اس طرح) گزریں گے کہ بعض تو پل جھپکتے گزر جائیں گے، بعض کوندے کی طرح نکل جائیں گے، بعض ہوا کے جھونکے کے مانند بعض پرندوں کی اڑان کے مانند، گزریں گے پس ان میں سے کچھ مسلمان تو وہ ہونگے جو دوزخ کی آگ سے بالکل سلامتی اور نجات پائے ہوں گے (یعنی پلصراط کے اوپر سے گزرنے کے وقت ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا) اور کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو زخم کھا کر نکلیں گے اور (دوزخ کی آگ سے) نجات پائیں گے، نیز کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو پارہ پارہ کیے جائیں گے اور دوزخ میں دھکیل دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ جب مؤمن دوزخ کی آگ سے نجات پالیں گے، تو قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی شخص ظاہر ثابت شدہ حق کے حصول میں اتنی شدید جدوجہد اور سختی نہیں کرتا جتنی شدید جدوجہد مؤمن قیامت کے دن اپنے ان بھائیوں کی نجات کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں کریں گے جو دوزخ میں ہوں گے۔ وہ مؤمن کہیں گے کہ "ہمارے پروردگار! یہ لوگ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ حج کرتے تھے (یعنی ان کی نماز ہماری نمازوں کی طرح ہوتی تھی اور ان کا حج ہمارے ہی حج کے طریقہ سے ہوتا تھا پس تو ان کو بھی دوزخ سے نجات دیدے") ان سے کہا جائے گا کہ جاؤ اور جن لوگوں کو تم (اپنی مذکورہ شہادت کی روشنی میں) پہچانتے ہو انہیں (دوزخ سے) نکال لو، پس دوزخ کی آگ پر ان کی صورتوں کو حرام کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ مؤمن بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے۔ پھر کہیں گا کہ ہمارے پروردگار! جن لوگوں کو تو نے (دوزخ) سے نکالنے کا حکم دیا تھا (یعنی اہل نماز، اہل زکوۃ اور اہل حج وغیرہ) ان میں سے اب دوزخ میں کوئی باقی نہیں رہا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اچھا پھر جاؤ اور ہر اس شخص کو بھی دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں تم دینار برابر بھی نیکی پاؤ پس وہ مؤمن (جائیں گے اور بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نکال لائیں گے اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا، اور اب ہر شخص کو دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں آدھے دینار برابر بھی نیکی پاؤ، پس وہ مؤمن جائیں گے اور بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نکال لائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ جاؤ اور اب اس شخص کو دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں تم از قسم نیکی ذرہ برابر بھی کوئی چیز پاؤ پس وہ مؤمن جائیں گے اور بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نکال لائیں گے اور کہیں گے کہ پروردگار! ہم نے دوزخ میں بھلائی کو باقی نہیں رہنے دیا ہے (یعنی دوزخ میں اب ایسا کوئی شخص باقی نہیں بچا ہے جس کے دل میں اصل ایمان کے علاوہ ادنی سے ادنی درجہ کی اور ذرہ برابر بھی بلکہ ذرہ سے بھی کمتر کوئی نیکی ہو خواہ اس نیکی کا تعلق اعمال سے ہو یا افعال قلب سے) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتوں نے شفاعت کر لی اور پیغمبروں نے بھی شفاعت کر لی) اور مؤمنوں نے بھی شفاعت کر لی) اور ان سب کی شفاعت کا تعلق ان لوگوں سے تھا جن کا نامہ اعمال میں کوئی نہ کوئی نیکی ضرور تھی خواہ وہ نیکی ذرہ کے برابر یا اس سے کمتر درجہ ہی کی کیوں نہ ہو اور اس طرح،

اب ایسی کوئی ذات باقی نہیں رہ گئی ہے (جو خود بھلائی پہنچانے یا بھلائی پہنچانے والے سے سفارش وشفاعت کے ذریعہ کسی کے ساتھ رحم ومروت اور عنایت وہمدردی کا معاملہ کرے لیکن ابھی ارحم الراحمین کی ذات باقی ہے (جس کی رحمت جس کا کرم اور جس کی عنایت ہر ایک پر سایہ فگن ہے اور اس کی رحمت وعنایت کے اثرات کے مقابلہ پر ہر ایک کی رحمت وعنایت ہیچ ہے اور (یہ فرماکر) اللہ تعالیٰ دوزخ میں سے اپنی مٹھی بھر کر (ان) لوگوں کو نکال لے گا جنہوں نے کبھی بھی کوئی (چھوٹی یا بڑی) نیکی کی ہی نہیں ہوگی، یہ لوگ دوزخ میں (جلتے رہنے کی وجہ سے) کوئلہ بن چکے ہوں گے، چنانچہ ان کو اس نہر میں ڈالے گا جو جنت کے دروازوں کے سامنے ہے اور جس کو "نہر حیات" کہا جائے گا، اور پھر یہ لوگ اس نہر سے اس طرح تروتازہ نکلیں گے جیسے دانہ سیلاب کے کوڑے کچرے میں اگتا ہے (یعنی جس طرح سیلابی کوڑے کچرے میں پڑا ہوا دانہ بہت جلد اگ آتا ہے اور خوب ہرا بھرا معلوم ہوتا ہے، اس طرح یہ لوگ بھی اس نہر میں غوطہ دلائے جانے کے بعد نہایت تیزی کے ساتھ بہتر جسمانی حالت میں واپس آجائیں گے اور خوب تروتازہ اور توانا معلوم ہوں گے) نیز یہ لوگ (اس نہر سے) موتی کی مانند پاک وشفاف باہر آئیں گے، ان کی گردنوں میں مہریں لٹکی ہوئی ہوں گی چنانچہ (جب اہل جنت ان لوگوں کو (ان کی امتیازی علامتوں کے ساتھ) دیکھیں گے تو کہیں گے کہ یہ وہ (خوش نصیب) لوگ ہیں جو خود خدائے رحمان کے آزاد کیے ہوئے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے (اپنے خاص فضل وکرم کے تحت، اس امر کے باوجود جنت میں داخل کیا ہے کہ انہوں نے (دنیا میں) کوئی نیک عمل کیا تھا اور نہ انہوں نے (کم سے کم افعال قلب ہی کی صورت میں، کوئی نیکی کر کے آگے بھیجی تھی اور پھر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) ان نو آزاد لوگوں سے کہا جائے گا کہ) بلکہ جنت میں تم جو کچھ دیکھ رہے ہو (یعنی تمہاری حد نظر تک تمہیں جو اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں نظر آرہی ہے) نہ صرف یہ بلکہ ان ہی جیسی اور بہت سی نعمتیں بھی، سب تمہارے لئے ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "ہاں دیکھو گے۔" سیوطیؒ نے اپنی تالیفات میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن موقف میں (یعنی میدان حشر میں کہ جہاں ساری مخلوق کھڑی ہوگی) مرد وعورت ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، جہاں تک کہ بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دفعہ کو تو دیدار منافقوں اور کافروں کو بھی حاصل ہوگا، لیکن پھر فوراً ہی ان کو محجوب کر دیا جائے گا تاکہ وہ ہمیشہ اس دیدار کی حسرت اور اپنی محرومی کے غم میں مبتلا رہیں، تاہم منافقوں اور کافروں کو دیدار حاصل ہونے کی یہ بات زیادہ واضح نہیں ہے، بلکہ اس میں کلام ہے کیونکہ قرآن کریم میں یہ آیا ہے کہ کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون (یعنی ہرگز نہیں، یقیناً کفار اس دن اپنے رب کے دیدار سے محروم ہوں گے) اور جہاں تک جنت میں حق تعالیٰ کے دیدار کا سوال ہے تو اس بارے میں سیوطیؒ نے کہا ہے کہ اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہاں حق تعالیٰ کا دیدار ہر اُمت کے نبیوں، رسولوں، صدیقوں اور اس اُمت محمدی کے افراد میں سے تمام مؤمن مردوں کو حاصل ہوا کرے گا، اُمت محمدی کی عورتوں کے سلسلے میں تین قول ہیں، ایک تو یہ کہ ان کو وہاں دیدار نصیب نہیں ہوگا، دوسرا یہ کہ ان کو بھی وہاں دیدار نصیب ہوا کرے گا مگر تمام دنوں میں نہیں بلکہ چند مخصوص دنوں مثلاً عید وغیرہ کے دنوں میں فرشتوں کے بارے میں بھی دو قول ہیں، ایک قول تو یہ ہے کہ وہ اپنے رب کو نہیں دیکھیں گے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ بھی اپنے رب کا دیدار کیا کریں گے، اسی طرح جنات کے بارے میں بھی اختلافی اقوال ہیں۔

"کیا تم لوگ دوپہر کے وقت....... الخ اس سوال کے ذریعہ آپ ﷺ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو چیز عام طور پر مشکل سے نظر آتی ہے اور لوگ اس کے دیدار کے تمنائی ہوتے ہیں، اس کو دیکھتے ہیں دھکا پیل اور مشقت وضرر کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن جس طرح آفتاب وماہتاب کو دیکھنے میں کسی قسم کی مشقت وضرر اور تکلیف ورکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیدار کے وقت کسی طرح کے دھکا پیل اور مشقت وضرر کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

"ہاں جیسا کہ تم ان دونوں میں سے کسی کو دیکھنے میں رکاوٹ وتکلیف محسوس کرتے ہو۔" یہ جملہ دراصل تعلق بالمحال کے طور پر پچھلے جملہ کو زیادہ سے زیادہ (زوردار) بنانے کے لئے ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر تم سورج وچاند کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ وتکلیف محسوس

کرتے ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ کو دیکھنے میں بھی رکاوٹ تکلیف محسوس کرو گے، لیکن جب یہ بات طے ہے کہ ان دونوں (سورج و چاند) میں سے کسی کو بھی دیکھنے میں کسی ادنی سے ادنی رکاوٹ و تکلیف کا سامنا کرنا نہیں پڑتا تو جان لو کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے میں کوئی ادنی سی رکاوٹ و تکلیف پیش نہیں آئے گی! ضمنی طور پر یہ بات ذکر کر دینا ضروری ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ یہاں جس دیدار الہٰی کے بارے میں ذکر ہے وہ اُس دیدار الہٰی کے علاوہ ہے جو جنت میں اہل ایمان کو بطور اعزاز و اجر نصیب ہو گا، یہ دیدار تو محض امتحان و آزمائش کے طور پر ہو گا تاکہ دنیا میں جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی، اور جن لوگوں نے غیر اللہ کو اپنا معبود بنایا، ان دونوں قسم کے لوگوں کے درمیان فرق و امتیاز ہو جائے اس سے معلوم ہوا کہ آخرت میں بھی بندوں کو امتحان آزمائش میں مبتلا کرنے کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ حساب و کتاب کے بعد ہر ایک کے حق میں آخری فیصلہ نہ ہو جائے گا کہ کون اجر و جزا کا سزاوار ہے اور کون عذاب کا مستوجب! پس آخرت اگرچہ دار جزا (بدلہ کا گھر) ہے لیکن کبھی کبھی وہاں امتحان و آزمائش کا مرحلہ بھی پیش آئے گا جس طرح کہ یہ دنیا اگرچہ "امتحان و آزمائش کا گھر" ہے لیکن یہاں کبھی کبھی اجر و بدلہ بھی مرتب ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ دراصل تمہاری شامت اعمال ہوتی ہے۔

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بجائے بتوں اور انصاب کو پوجتے تھے۔" میں انصاب دراصل "نصب" کی جمع ہے، اور نصب اس پتھر کو کہتے ہیں جو کسی خاص جگہ پر خاص اس مقصد کے لئے گاڑا اور نصب کیا جائے کہ اس کی پوجا ہو، اس کو ڈنڈوت کیا جائے اور اس کے سامنے قربت و نیکی (جیسے منت اور چڑھاوے) کی نیت سے جانور ذبح کیا جائے، پس ہر چیز کہ جو اس مقصد کے لئے نصب کی جائے اور اس کی پرستش و تعظیم کا عقیدہ رکھا جائے خواہ وہ پتھر ہو یا لکڑی اور یا کوئی دوسری چیز وہ "نصب" ہی کہلائے گی۔

"تو تمام جہانوں کا پروردگار ان کے پاس آئے گا۔" یعنی اپنے کمال اقرب کے ساتھ ان پر اپنی تجلی ڈالے گا یہ تو اس جملہ کی سیدھی سی تاویل ہے ویسے حقیقت یہ ہے کہ "آنا" پروردگار کی صفات میں سے ہے جس کو اس نے اپنے کلام پاک میں اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اور حدیث مقدسہ میں بھی اس کا اسی طرح (اس کی ذات کی طرف منسوب ہونا) ذکر ہے نیز ہم اس کی حقیقت و کیفیت جانے بغیر جوں کے توں اس پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اس بات کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی ذات پاک اس نقل و حرکت سے منزہ ہے جو "آنے" میں ہوتی ہے پس یہ بات متشابہات میں سے ہے اور ہم پر ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں زیادہ نہ الجھیں بلکہ حقیقت حال کا علم بس اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں، اس جملہ کی کچھ اور تاویلیں کی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ "آنے" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ آئے گا۔ یا یہ کہ ان لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کا حکم آئے گا جیسا کہ اگلے جملہ سے اشارۃً یہ بات مفہوم بھی ہوتی ہے۔

"تب اللہ تعالیٰ کی پنڈلی کھولی جائے گی۔" کے بارے میں بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "پنڈلی کے کھلنے" سے مراد خوف و دہشت اور گھبراہٹ و ہول کا جاتا رہنا ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "پنڈلی کھلنے) سے مراد ایک عظیم نور کا ظاہر ہونا ہے یا یہ کہ فرشتوں کی جماعت کا ظاہر ہونا مراد ہے لیکن سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس بارہ میں بھی توقف ہی کیا جائے اور اس جملہ کی کوئی تاویل کرنے کی بجائے اسکا حقیقی علم اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔

حدیث میں جہاں اللہ تعالیٰ کی پنڈلی کھلنے، لوگوں کو سجدہ کا حکم ملنے، اور پھر کچھ لوگوں کے سجدہ کرنے اور کچھ لوگوں کے سجدہ پر قادر نہ ہونے کے حکم ہے وہاں پر نووی نے اپنی شرح مسلم میں یہ لکھا ہے کہ حدیث کے اس جزو سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ آخرت میں منافقین بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گمان کوئی بنیاد نہیں رکھتا، کیونکہ حدیث کے مذکورہ الفاظ میں یہ صراحت نہیں ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے اس دیدار سے منافقین بھی مشرف ہوں گے، بلکہ اس موقع پر صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے کہ جن میں مخلص مؤمن بھی ہوں گے اور منافق بھی اپنا حجاب مٹا دے گا اور پھر امتحان و آزمائش کے لئے سب کو سجدہ کا حکم دے گا، پس جو شخص مخلص ہو گا سجدہ کرے گا اور جو شخص منافق ہو گا سجدہ نہیں کر سکے گا۔ اس بات سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ منافق بھی اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔

"پس مسلمان لوگ گزریں گے۔" یعنی اس پلصراط کے اوپر سے تمام مسلمان اس طرح گزریں گے کہ دنیا میں جو شخص عقیدہ وایمان عمل وکردار اور دین وشریعت پر استقامت کے اعتبار سے جس درجہ کا رہا ہوگا اس کے مطابق آسانی کے ساتھ یا دشواری کے ساتھ اس مرحلہ کو پار کرے گا جس کی طرف حدیث کے اگلے جملہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ پس وہ پلصراط گویا دین وشریعت کے صراط مستقیم کی طرح ہے جو معنوی طور پر تلوار کی دھار سے زیادہ باریک ہے اور جس پر چلنا دشوار ہے لیکن ساتھ ہی صراط مستقیم اس قدر روشن اور واضح ہے کہ جو صدق نیت اور اخلاص قلب کے ساتھ اس پر چلنا چاہے اس کے لئے کوئی دشواری نہیں ہے۔

"اور کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو زخم کھا کر نکلیں گے اور دوزخ کی آگ سے نجات پائیں گے۔" کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ جو مسلمان گناہگار ہوں گے وہ اس پلصراط پر سے گزرنے میں سخت دشواری اور تکلیف واذیت کا شکار ہونگے، مثلاً پلصراط کے دونوں طرف جو فولادی آنکڑے ہوں گے وہ ان کو زخمی کریں گے ان کا راستہ روکیں گے اور ان کے جسم کو چھیلیں گے لیکن وہ مسلمان زخمی ہو کر اور چل چلا کر کسی نہ کسی طرح پل کو پار کر ہی لیں گے اور جنت میں پہنچ جائیں گے، اس طرح وہ لوگ دوزخ میں نہیں گریں گے، بلکہ پلصراط کے اوپر ہی تکلیف اور مشقت اٹھا کر نجات پا جائیں گے۔ یہ مطلب ظاہر حدیث کے اسلوب کے زیادہ مطابق ہے اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ رکھا گیا ہے دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ پہلے تو پلصراط پر اس کے آنکڑوں زخمی ہوں گے سخت پریشانیوں سے دوچار ہوں گے اور پھر دوزخ میں گرا دیئے جائیں گے جہاں وہ اپنے گناہوں کے بقدر سزا پانے کے لئے ایک مدت تک رہیں گے اور پھر ان کو دوزخ کی آگ سے نجات دے کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔

"ومکدوش فی نار جھنم" (نیز کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو پارہ پارہ کیے جائیں گے اور دوزخ میں دھکیل دیئے جائیں گے۔" یہ ان گناہ گار مسلمانوں کا ذکر ہے جن کو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے بہر حال دوزخ کے سپرد کیا جائے گا، چنانچہ یہ لوگ نہ صرف پلصراط پر گزرتے وقت سخت زخمی، تباہ حال اور مصیبت زدہ ہوں گے بلکہ ان کو دوزخ میں بھی گرا دیا جائے گا تاکہ وہ وہاں اس وقت تک عذاب پاتے رہیں جب تک ان کا خدا چاہے مکدوش کا لفظ شین کے ساتھ منقول ہے ویسے یہ لفظ مکدوس یعنی سین کے ساتھ بھی مذکورہ معنی میں نقل ہوا ہے اور بعض روایتوں میں مکدوس منقول ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ان سب کو باندھ باندھ کر ہاتھوں اور پیروں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر دوزخ میں اس طرح اکٹھا پھینکا جائے گا کہ وہ ایک دوسرے پر جا کر گریں گے۔

"یہاں تک کہ جب مؤمن دوزخ کی آگ سے نجات پالیں گے......الخ" میں لفظ حتّٰی (یہاں تک کہ) اس مرحلہ کے ذکر کی غایت ہے جس میں تمام مؤمن پلصراط پر سے گزریں گے اور پھر ان میں سے کچھ لوگ تو پل کو پار کر جائیں گے اور کچھ لوگ دوزخ میں جا گریں گے لیکن طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ لفظ حتّٰی دراصل مکدوش فی نار جھنم (وہ لوگ جو پارہ پارہ ہو کر جہنم میں گر جائیں گے کی غایت ہے اس صورت میں پوری عبارت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ نیز کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو پارہ پارہ کئے جائیں گے اور دوزخ میں دھکیل دیئے جائیں گے اور پھر آخر کار ان کو بھی (اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد یا کسی کی شفاعت سے اور یا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے) دوزخ سے نجات مل جائے گی، پس قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے......الخ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گار مؤمن ہمیشہ کے لئے دوزخ کے عذاب میں مبتلا نہیں رہیں گے اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر کار دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیئے جائیں گے بلکہ وہ جنت میں پہنچنے کے بعد ان دوسرے مؤمنوں کی بھی شفاعت کریں گے اور بارگاہ رب العزت میں ان کو عذاب سے چھٹکارا دلانے کی سخت ترین جدوجہد کریں گے جو اپنے گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے اس وقت تک دوزخ سے چھٹکارا نہیں پا سکے ہوں گے جیسا کہ حضور ﷺ نے اپنے ارشاد "پس قسم ہے اس ذات کی......الخ" کے ذریعہ واضح فرمایا۔

"تم میں سے کوئی بھی شخص ظاہر و ثابت شدہ حق کے اصول میں......الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص پر تمہارا کوئی حق بالکل ظاہری دلائل وشواہد کے ذریعہ واجب ہوتا ہے اور تم اس حق کو پانے کا بہر صورت استحقاق رکھتے ہو تو اس شخص سے اپنا وہ حق حاصل

کرنے کے لئے تم جتنا شدید مطالبہ و تقاضا کرتے ہو اور اس کے حصول کی جدوجہد میں جس طرح سعی و کوشش کی آخری سے آخری حد تک چلے جاتے ہو، اس سے بھی زیادہ شدید تمہارا مطالبہ اس دن بارگاہ رب العزت میں اپنے ان مسلمان بھائیوں کی نجات کے لئے ہو گا جو دوزخ میں پڑے ہوں گے اور تم ان کو وہاں سے نکلوانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے عرض و معروض اور درخواست و شفاعت میں سعی و کوشش کی آخری سے آخری حد تک چلے جاؤ گے۔

"پس دوزخ کی آگ پر ان کی صورتوں کو حرام کر دیا جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ دوزخ کی آگ کو اس بات سے منع کر دیا جائے گا کہ وہ ان نا اہل ایمان کو اس طرح جلائے یا نقصان پہنچائے کہ ان کے چہرے مسخ ہو جائیں اور وہ پہچان میں نہ آسکیں۔ حاصل یہ کہ اس وقت تک جو اہل ایمان دوزخ میں ہوں گے ان کے چہرے نہ تو جلیں گے اور نہ سیاہ ہوں گے، لہٰذا ان کی شفاعت کرنے والے مؤمن اس علامت کے ذریعہ ان کو آسانی کے ساتھ پہچان لیں گے اور دوزخ سے نکلوالیں گے۔

"جس کے دل میں تم دینار کے برابر بھی نیکی پاؤ" یہاں اور اسی طرح آگے کے جملہ میں "نیکی" سے مراد وہ چیز ہے جو اصل ایمان سے زائد ہوگی، کیونکہ اصل ایمان کہ جس کو تصدیق کہتے ہیں ایک ایسا جوہر ہے جو اجزاء اور حصوں میں ناقابل تقسیم ہے اور اس پر کمی بیشی وغیرہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جس نیکی کو اجزا اور حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یا جس پر کمی بیشی کا اطلاق ہوتا ہے وہ اصل ایمان سے زائد اور ایمان کے نتیجہ و ثمرہ کے طور پر ایک الگ شے ہوتی ہے پس دل میں دینار برابر یا آدھے دینار برابر نیکی ہونے کا" مطلب یہ ہے کہ جن کے پاس معمولی درجہ کا بھی ایسا عمل صالح ہو کہ جس کے فعل کا تعلق دل سے ہے جیسے ذکر خفی (دل میں اللہ کو یاد کرنا) یا کسی غریب و مسکین پر شفقت کرنا یا خوف الٰہی اور نیت صادقہ وغیرہ تو ان کو دوزخ سے نکلوالو۔

جنہوں نے کبھی بھی کوئی نیکی کی ہی نہیں ہوگی، یہاں بھی (نیکی) سے مراد وہ چیز ہے جو اصل ایمان سے زیادہ ہو، پس یہ لوگ کہ جن کو ارحم الراحمین محض اپنی خصوصی رحمت کے تحت دوزخ سے نکالے گا اپنے پاس افعال قلب میں سے بھی کوئی چھوٹی یا بڑی نیکی نہیں رکھتے ہوں گے البتہ اصل ایمان (یعنی تصدیق) کے حامل ضرور ہوں گے اور ان لوگوں کی شفاعت کی اجازت کسی کو حاصل نہیں ہوگی۔

"ان کی گردنوں میں مہریں لٹکی ہوئی ہوں گی" میں "مہر" سے مراد سونے وغیرہ کا وہ زیور ہے جو گلے میں لٹکایا جاتا ہے، حاصل یہ کہ علامت کے طور پر ان کے گلوں میں کچھ مخصوص قسم کے ہار پڑے ہوں گے جن کے ذریعہ وہ دوسرے لوگوں سے ممتاز نظر آئیں گے۔

وہ لوگ جن کو دوزخ میں سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا

(۱۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَاَهْلُ النَّارِ النَّارَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِيْمَانٍ فَاَخْرِجُوْهُ فَيُخْرَجُوْنَ قَدِ امْتَحَشُوْا وَعَادُوْا حُمَمًا فَيُلْقَوْنَ فِيْ نَهْرِ الْحَيٰوةِ فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا يَنْبُتُ الْحَبَّةُ فِيْ حَمِيْلِ السَّيْلِ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَآءَ مُلْتَوِيَةً۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں پہنچا دیا جائے گا (اور ہر شخص اپنے اپنے عمل کے مطابق جنت یا دوزخ میں اپنی جگہ پہنچ جائے گا، تو اللہ تعالیٰ (انبیاء سے یا شفاعت کرنے والوں سے اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ فرشتوں سے) فرمائے گا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان (یعنی نیکی و بھلائی) ہو تو اس کو دوزخ سے نکال لو، چنانچہ ان لوگوں کو دوزخ سے باہر لایا جائے گا اور اس وقت ان کی یہ حالت ہوگی کہ وہ جل جلا کر کوئلہ کی طرح ہو گئے ہوں گے پھر ان کو نہر حیات میں ڈالا جائے گا اور وہ (اس نہر سے) اس طرح تروتازہ نکلیں گے جیسے سیلاب کے کوڑے کچرے میں گھاس کا دانہ اگتا ہے، کیا تم نے دیکھا نہیں وہ دانہ کس طرح لپٹا ہوا زرد نکلتا ہے (یعنی کتنا زیادہ تروتازہ اور کتنی جلدی باہر آتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو۔" اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ پچھلی حدیث میں جو یہ فرمایا گیا تھا کہ

"آخر میں ارحم الراحمین اپنی مٹھی بھر کر ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لے گا جنہوں نے کبھی بھی کوئی نیکی نہیں کی ہوگی۔" تو وہاں وہی لوگ مراد ہیں جن کا تعلق اہل ایمان سے ہوگا، یہ اور بات ہے کہ ان کے نامہ اعمال میں کوئی بھی نیکی یا بھلائی نہیں ہوگی۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس موقع پر حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ وہم ہوسکتا ہے کہ وہ کافر لوگ ہوں گے چنانچہ اس بات پر پوری اُمّت کا اجماع ہے کہ کوئی بھی کافر کسی بھی صورت میں دوزخ سے نہیں نکالا جائے گا۔

دوزخیوں کی نجات کا ذکر

⑬ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّاسَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ نَرٰی رَبَّنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَذَکَرَ مَعْنٰی حَدِیْثِ اَبِیْ سَعِیْدٍ غَیْرَ کَشْفِ السَّاقِ وَقَالَ یُضْرَبُ الصِّرَاطُ بَیْنَ ظَهْرَانَیْ جَهَنَّمَ فَاَکُوْنُ اَوَّلَ مَنْ یَّجُوْزُ مِنَ الرُّسُلِ بِاُمَّتِهٖ وَلَا یَتَکَلَّمُ یَوْمَئِذٍ اِلَّا الرُّسُلُ وَکَلَامُ الرُّسُلِ یَوْمَئِذٍ اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ وَفِیْ جَهَنَّمَ کَلَالِیْبُ مِثْلُ شَوْكِ السَّعْدَانِ لَا یَعْلَمُ قَدْرَ عِظَمِهَا اِلَّا اللّٰهُ تَخْطَفُ النَّاسَ بِاَعْمَالِهِمْ فَمِنْهُمْ مَنْ یُّوْبَقُ بِعَمَلِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ یُّخَرْدَلُ ثُمَّ یَنْجُوْا حَتّٰی اِذَا فَرَغَ اللّٰهُ مِنَ الْقَضَآءِ بَیْنَ عِبَادِهٖ وَاَرَادَ اَنْ یُّخْرِجَ مِنَ النَّارِ مَنْ اَرَادَ اَنْ یُّخْرِجَهٗ مِمَّنْ کَانَ یَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَمَرَ الْمَلٰئِکَةَ اَنْ یُّخْرِجُوْا مَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰهَ فَیُخْرِجُوْنَهُمْ وَیَعْرِفُوْنَهُمْ بِاٰثَارِ السُّجُوْدِ وَحَرَّمَ اللّٰهُ عَلَی النَّارِ اَنْ تَاْکُلَ اَثَرَ السُّجُوْدِ فَکُلُّ ابْنِ اٰدَمَ تَاْکُلُهُ النَّارُ اِلَّا اَثَرَ السُّجُوْدِ فَیُخْرَجُوْنَ مِنَ النَّارِ قَدِ امْتَحَشُوْا فَیُصَبُّ عَلَیْهِمْ مَآءُ الْحَیٰوةِ فَیَنْبُتُوْنَ کَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِیْ حَمِیْلِ السَّیْلِ وَیَبْقٰی رَجُلٌ بَیْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَهُوَ اٰخِرُ اَهْلِ النَّارِ دُخُوْلًا الْجَنَّةَ مُقْبِلٌ بِوَجْهِهٖ قِبَلَ النَّارِ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اصْرِفْ وَجْهِیْ عَنِ النَّارِ وَقَدْ قَشَبَنِیْ رِیْحُهَا وَاَحْرَقَنِیْ ذَکَاؤُهَا فَیَقُوْلُ هَلْ عَسَیْتَ اَنْ اَفْعَلَ ذٰلِكَ اَنْ تَسْئَلَ غَیْرَ ذٰلِكَ فَیَقُوْلُ لَا وَعِزَّتِكَ فَیُعْطِی اللّٰهَ مَا شَآءَ اللّٰهُ مِنْ عَهْدٍ وَّمِیْثَاقٍ فَیَصْرِفُ اللّٰهُ وَجْهَهٗ عَنِ النَّارِ فَاِذَآ اَقْبَلَ بِهٖ عَلَی الْجَنَّةِ وَرَاٰی بَهْجَتَهَا سَکَتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ یَّسْکُتَ ثُمَّ قَالَ یَا رَبِّ قَدِّمْنِیْ عِنْدَ بَابِ الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اَلَیْسَ قَدْ اَعْطَیْتَ الْعُهُوْدَ وَالْمِیْثَاقَ اَنْ لَّا تَسْاَلَ غَیْرَ الَّذِیْ کُنْتَ سَاَلْتَ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ لَا اَکُوْنُ اَشْقٰی خَلْقِكَ فَیَقُوْلُ فَمَا عَسَیْتَ اَنْ اُعْطِیْتَ ذٰلِكَ اَنْ تَسْاَلَ غَیْرَهٗ فَیَقُوْلُ لَا وَعِزَّتِكَ لَا اَسْئَلُكَ غَیْرَ ذٰلِكَ فَیُعْطِیْ رَبَّهٗ مَا شَآءَ مِنْ عَهْدٍ وَّمِیْثَاقٍ فَیُقَدِّمُهٗ اِلٰی بَابِ الْجَنَّةِ فَاِذَا بَلَغَ بَابَهَا فَرَاٰی ظَهْرَتَهَا وَمَا فِیْهَا مِنَ النَّضْرَةِ وَالسُّرُوْرِ فَسَکَتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ یَّسْکُتَ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اَدْخِلْنِی الْجَنَّةَ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی وَیْلَكَ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَا اَغْدَرَكَ اَلَیْسَ قَدْ اَعْطَیْتَ الْعُهُوْدَ وَالْمِیْثَاقَ اَنْ لَّا تَسْاَلَ غَیْرَ الَّذِیْ اُعْطِیْتَ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ لَا تَجْعَلْنِیْ اَشْقٰی خَلْقِكَ فَلَا یَزَالُ یَدْعُوْا حَتّٰی یَضْحَكَ اللّٰهُ مِنْهُ فَاِذَا ضَحِكَ اَذِنَ لَهٗ فِیْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ تَمَنَّ فَیَتَمَنّٰی حَتّٰی اِذَا انْقَطَعَ اُمْنِیَّتُهٗ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی تَمَنَّ مِنْ کَذَا وَکَذَا اَقْبَلَ یُذَکِّرُهٗ رَبُّهٗ حَتّٰی اِذَا انْتَهَتْ بِهِ الْاَمَانِیُّ قَالَ اللّٰهُ لَكَ ذٰلِكَ وَمِثْلُهٗ مَعَهٗ وَفِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی لَكَ ذٰلِكَ وَعَشَرَةُ اَمْثَالِهٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) لوگوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کیا قیامت کے دن ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟ اس کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے مضمون کے اعتبار سے وہی حدیث بیان کی جو پیچھے حضرت ابوسعیدؓ سے نقل کی گئی ہے (گو دونوں روایتوں میں الفاظ کا اختلاف ہے) ہاں حضرت ابوہریرہؓ نے "پنڈلی کھلنے" کا ذکر نہیں کیا، اور پھر کہا کہ (آنحضرت ﷺ نے فرمایا) جب دوزخ کے اوپر پلصراط کھڑا کیا جائے تو تمام رسولوں میں اس پل کے اوپر سے اپنی اُمّت کے ساتھ گزرنے والا سب سے پہلا رسول میں ہوں گا اور اس وقت (رسولوں کے علاوہ) کوئی بھی شخص زبان سے بات نکالنے کی جرأت نہیں کرے گا اور رسول بھی صرف اتنا کہیں گے کہ اے اللہ! سلامتی کے ساتھ رکھ نیز (اس پل کے دونوں طرف جہنم میں سعدان کے کانٹوں جیسے آنکڑے ہوں گے، ان آنکڑوں کی لمبائی اللہ تعالیٰ کے

علاوہ کوئی نہیں جانتا، وہ آنکڑے لوگوں کو ان کے برے اعمال کے سبب اچک لیں گے، پس ان لوگوں میں سے بعض تو وہ ہوں گے جو اپنے اعمال کی پاداش میں ہلاک ہوں گے (یعنی دوزخ میں جاگریں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا رہیں گے جیسے کافر) اور بعض وہ ہونگے جو (ان آنکڑوں کی گرفت کی وجہ سے پاش پاش ہوجائیں گے لیکن پھر نجات پاجائیں گے (یعنی آنکڑوں کے اچکنے کی وجہ سے ان کے جسم کا گوشت جگہ جگہ سے کٹ جائے گا اور پورا بدن بری طرح زخمی ہوجائے گا اور پھر وہ اسی حالت میں کسی نہ کسی طرح پل کو پار کرہی لیں گے یا اگر دوزخ میں جاگریں گے تو وہاں کچھ عرصہ تک اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر کار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات پاجائیں گے پس یہ گناہ گار و فاسق مسلمانوں کا حال بیان کیا گیا ہے) پھر جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فارغ ہوجائے گا (کہ اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے جو جنت کا مستحق ہوگا اس کو جنت میں بھیج دیا جائے گا اور جو دوزخ کا مستوجب ہوگا اس کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا) اور یہ ارادہ کرے گا کہ جن لوگوں نے لا الہ الا اللہ (محمد رسول اللہ) کی گواہی دی ہے ان میں سے جن کو وہ چاہے دوزخ سے نکال لے تو فرشتوں کو حکم دے گا ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو معبود مانتے تھے (اور اس کے علاوہ کسی اور کی معبودیت پر ایمان نہیں رکھتے تھے) چنانچہ فرشتے ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے اور ان کی پیشانیوں پر سجدہ کے نشانات کے ذریعہ ان کو شناخت کریں گے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ پر حرام کردیا ہے کہ وہ سجدوں کے نشان کو کھالے اس لئے دوزخ کی آگ ابن آدم (انسان) کے سارے جسم کو کھاجائے گی (یعنی جلاڈالے گی) مگر سجدوں کے نشان کو نہیں کھائے گی۔ بہرحال وہ لوگ دوزخ سے اس حالت میں باہر لائے جائیں گے کہ وہ آگ میں جل کر سیاہ ہوچکے ہوں گے، پس ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا اور وہ (اس پانی کے اثر سے) اس طرح تروتازہ ہوجائیں گے جس طرح سیلاب کے کوڑے کچرے میں پڑا ہوا دانہ (اک دم) اگ آتا ہے اور (اس وقت ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہوگا کہ) ایک شخص جو دوزخیوں میں سے جنت میں داخل ہونے والا آخری شخص ہوگا، جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا رکھا جائے گا اس کا منہ دوزخ کی طرف ہوگا، وہ عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! (بس اتنا کرم کردے کہ) میرا منہ دوزخ کی طرف سے پھیر دے، دوزخ کی آگ کی بدبو نے مجھے سخت اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے اور اس کے شعلوں کی تیزی و گرمی مجھے بھسم کیے دے رہی ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر میں ایسا کردوں (یعنی تیرا منہ دوزخ کی طرف سے پھیر دوں) تو ہوسکتا ہے کہ تو پھر کچھ اور بھی مانگنے لگے۔ وہ شخص عرض کرے گا کہ نہیں، تیری عزت کی قسم میں اور کچھ نہیں مانگوں گا پھر وہ کچھ اور عہد و پیمان کرے گا جو اللہ تعالیٰ چاہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کا منہ دوزخ کی طرف سے پھیر دے گا، مگر جب اس کا منہ (دوزخ کی طرف سے جنت کی طرف پھیر دے گا، اور وہ جنت کی زیبائش و آرائش اور تروتازگی دیکھے گا تو (پہلے تو) اس وقت تک خاموش (کھڑا دیکھتا) رہے گا جب تک خدا چاہے گا اور پھر عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! مجھے جنت کے دروازہ تک پہنچادے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو نے یہ عہد و پیمان نہیں کیا تھا کہ تو اپنی اس درخواست کے علاوہ (کہ میرا منہ دوزخ کی طرف سے پھیر دیجئے، کوئی درخواست پیش نہیں کرے گا وہ گڑگڑائے گا کہ میرے پروردگار! تو مجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بدنصیب نہ بنا (کہ تیری یہ ساری مخلوق تو جنت کے اندر ہے اور میں اتنا حرماں نصیب ہوں کہ جنت کے دروازہ تک نہ پہنچ سکوں، مگر جب وہ جنت کے دروازہ تک پہنچے گا اور جنت کی چمک دمک اور اس کے اندر کی چیزوں (جیسے عالیشان محلات، عیش و عشرت کے اسباب، حور و غلمان اور جنت میں رہنے والوں) کے ٹھاٹ باٹ دیکھے گا تو پہلے اس وقت تک خاموش (کھڑا دیکھتا) رہے گا، جب تک خدا چاہے گا، اور پھر عرض، کرے گا کہ میرے پروردگار! مجھے جنت کے اندر پہنچا دیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ابن آدم! افسوس تو کس قدر عہد شکن اور وعدہ فراموش ہے؟ کیا تو نے عہد و پیمان نہیں کیا تھا کہ تو اپنی اس درخواست کے علاوہ جو تیری خواہش کے مطابق منظور کرلی گئی تھی، کوئی اور درخواست پیش نہیں کرے گا۔ وہ عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! (بے شک میں نے عہد و پیمان کیا تھا لیکن جب میں نے تیری شان عفو اور تیری بیکراں رحمت کی طرف دیکھا اور اس بات پر غور کیا کہ خود تو نے اپنے کلام مجید میں فرمایا ہے لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ الخ تو مجھے معلوم ہوا کہ میں ان کافروں کی طرح نہیں ہوں جو تیری رحمت سے ناامید ہوگئے ہیں، میں تیرے کرم اور تیری وسعت رحمت سے ہر

لحہ امید رکھنے والا ہوں، پس تیرا دامن رحمت تھام کر عرض کرتا ہوں کہ) مجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بد نصیب نہ بنا غرضیکہ وہ اسی طرح گڑگڑاتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (اس کی گڑگڑاہٹ اور طلب صادق دیکھ کر) اس سے راضی ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ جب راضی ہو جائے گا تو اس کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دے گا، پھر فرمائے گا کہ تو اور جو کچھ آرزو اور خواہش رکھتا ہو تو اس کو ظاہر کر اور جو کچھ مانگنا چاہتا ہے مانگ لے چنانچہ وہ (دل کھول کر) اپنی آرزوئیں بیان کرے گا اور جب اپنی آخری سے آخری آرزو بھی پوری کرا لے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ (ارے نادان) فلاں فلاں چیز کی بھی خواہش کیوں نہیں ظاہر کرتا! گویا پروردگار اس کو یاد دلانا چاہے گا کہ تو نے فلاں فلاں چیز تو مانگی ہی نہیں، ان چیزوں کو بھی مانگ لے، میں آج تجھے ہر چیز عطا کروں گا یہاں تک کہ جب وہ آرزوئیں بھی پوری ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ نہ صرف یہ تمام چیزیں (جو تیری خواہش پر تجھے عطا ہوئی ہیں) تیرے لئے ہیں بلکہ (از راہ تفصیل) ان ہی جیسی مزید نعمتیں تجھے عطا کی جاتی ہیں اور حضرت ابوسعیدؓ کی روایت میں یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا "نہ صرف یہ تمام چیزیں تیرے لئے ہیں بلکہ ان کے ساتھ دس گنا اور نعمتیں تجھے عطا کی جاتی ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مگر سجدوں کے نشان کو نہیں کھا جائے گی۔" کے ضمن میں نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دوزخ کی آگ جسم کے ان اعضاء کو نہیں جلائے گی جن سے سجدہ کیا جاتا ہے اور وہ جسم کے سات حصے ہیں، یعنی پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں زانوں اور دونوں پاؤں، جب کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ "مگر سجدوں کے نشان کو نہیں کھائے گی۔" صرف پیشانی نہ جلایا جانا ہے لیکن علماء نے نوویؒ کے قول کو زیادہ پسند کیا ہے۔

"چنانچہ ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا۔" یہ بات بظاہر پچھلی حدیث کے مخالف ہے جس میں یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کو نہر حیات میں ڈالا جائے گا لیکن حقیقت میں ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو نہر حیات میں غوطہ دلوایا جائے گا اور کچھ لوگوں پر اس نہر کا پانی چھڑکنا ہی کافی قرار دیا جائے گا۔

"تیری عزت کی قسم میں کچھ نہیں مانگوں گا۔" اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص جب اپنی قسم اور اپنے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرے گا تو اس پر قسم و عہد توڑنے کا عتاب کیوں نہیں ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص کا حال ایک مجنون اور از خود رفتہ شخص کا سا ہوگا اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص "معذور" سمجھا جاتا ہے، یا یہ کہ یہ بات جس جگہ سے تعلق رکھتی ہے وہ ایک ایسی جگہ (یعنی آخرت) ہے جہاں کے کسی عمل کا کوئی شخص مکلف ہی نہیں ہوگا، پس اس سے مواخذہ کس بناء پر کیا جائے گا۔

جنت میں سب سے بعد میں جانے والے شخص کا ذکر

(۱۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اٰخِرُ مَنْ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ رَجُلٌ فَهُوَ يَمْشِىْ مَرَّةً وَيَكْبُوْ مَرَّةً وَتَسْفَعُهُ النَّارُ مَرَّةً فَاِذَا جَاوَزَهَا الْتَفَتَ اِلَيْهَا فَقَالَ تَبَارَكَ الَّذِىْ نَجَّانِىْ مِنْكِ لَقَدْ اَعْطَانِىَ اللّٰهُ شَيْئًا مَا اَعْطَاهُ اَحَدًا مِنَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ فَتُرْفَعُ لَهُ شَجَرَةٌ فَيَقُوْلُ اَىْ رَبِّ اَدْنِنِىْ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلِاَسْتَظِلَّ بِظِلِّهَا وَاَشْرَبَ مِنْ مَاءِهَا فَيَقُوْلُ اللّٰهُ يَا ابْنَ اٰدَمَ لَعَلِّىْ اِنْ اَعْطَيْتُكَهَا سَاَلْتَنِىْ غَيْرَهَا فَيَقُوْلُ لَا يَا رَبِّ وَيُعَاهِدُهُ اَنْ لَّا يَسْاَلَهُ غَيْرَهَا وَرَبُّهُ يَعْذِرُهُ لِاَنَّهُ يَرٰى مَالَا صَبْرَ لَهُ عَلَيْهِ فَيُدْنِيْهِ مِنْهَا فَيَسْتَظِلُّ بِظِلِّهَا وَيَشْرَبُ مِنْ مَّاۤئِهَا ثُمَّ تُرْفَعُ لَهُ شَجَرَةٌ هِىَ اَحْسَنُ مِنَ الْاُوْلٰى فَيَقُوْلُ اَىْ رَبِّ اَدْنِنِىْ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ لِاَشْرَبَ مِنْ مَّاۤءِهَا وَاَسْتَظِلَّ بِظِلِّهَا لَا اَسْاَلُكَ غَيْرَهَا فَيَقُوْلُ يَا ابْنَ اٰدَمَ اَلَمْ تُعَاهِدْنِىْ اَنْ لَّا تَسْاَلَنِىْ غَيْرَهَا فَيَقُوْلُ لَعَلِّىْ اِنْ اَدْنَيْتُكَ مِنْهَا تَسْاَلُنِىْ غَيْرَهَا فَيُعَاهِدُهٗۤ اَنْ لَّا يَسْاَلَهُ غَيْرَهَا وَرَبُّهُ يَعْذِرُهُ لِاَنَّهُ يَرٰى مَالَا صَبْرَ لَهُ عَلَيْهِ فَيُدْنِيْهِ مِنْهَا فَيَسْتَظِلُّ بِظِلِّهَا وَيَشْرَبُ مِنْ مَّاۤءِهَا ثُمَّ تُرْفَعُ لَهُ شَجَرَةٌ عِنْدَ بَابِ الْجَنَّةِ هِىَ اَحْسَنُ مِنَ الْاُوْلَيَيْنِ فَيَقُوْلُ اَىْ رَبِّ اَدْنِنِىْ مِنْ هٰذِهٖ فَلِاَسْتَظِلَّ بِظِلِّهَا وَاَشْرَبُ مِنْ مَّاۤءِهَا لَا اَسْاَلُكَ غَيْرَهَا فَيَقُوْلُ يَا ابْنَ

ادمَ اَلمْ تُعَاهِدْنِیْ اَنْ لَّا تَسْاَلَنِیْ غَیْرَھَا قَالَ بَلٰی یَا رَبِّ ھٰذِہٖ لَا اَسْاَلُكَ غَیْرَھَا وَرَبُّهٗ یَعْذِرُهٗ لِاَنَّهٗ یَرٰی مَالَا صَبْرَ لَهٗ عَلَیْهِ فَیُدْنِیْهِ مِنْهَا فَاِذَا اَدْنَاهُ مِنْهَا سَمِعَ اَصْوَاتَ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ اَیْ رَبِّ اَدْخِلْنِیْهَا فَیَقُوْلُ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَا یَصْرِیْنِیْ مِنْكَ اَیُرْضِیْكَ اَنْ اُعْطِیَكَ الدُّنْیَا وَمِثْلَهَا قَالَ اَیْ رَبِّ اَتَسْتَهْزِئُ مِنِّیْ وَ اَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ فَضَحِكَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ اَلَا تَسْاَلُوْنِیْ مِمَّ اَضْحَكُ فَقَالُوْا مِمَّ تَضْحَكُ فَقَالَ هٰكَذَا ضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا مِمَّ تَضْحَكُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مِنْ ضِحْكِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ حِیْنَ قَالَ اَتَسْتَهْزِئُ مِنِّیْ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ فَیَقُوْلُ اِنِّیْ لَا اَسْتَهْزِئُ مِنْكَ وَ لٰكِنِّیْ عَلٰی مَا اَشَاءُ قَدِیْرٌ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهٗ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ نَحْوَهٗ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ یَذْكُرْ فَیَقُوْلُ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَا یَصْرِیْنِیْ مِنْكَ اِلٰی اٰخِرِ الْحَدِیْثِ وَزَادَ فِیْهِ وَیُذَكِّرُهُ اللّٰهُ سَلْ كَذَا وَكَذَا حَتّٰی اِذَا انْقَطَعَتْ بِهِ الْاَمَانِیُّ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی هُوَ لَكَ وَعَشَرَةُ اَمْثَالِهٖ قَالَ ثُمَّ یَدْخُلُ بَیْتَهٗ فَتَدْخُلُ عَلَیْهِ زَوْجَتَاهُ مِنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ فَیَقُوْلَانِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَاكَ لَنَا وَاَحْیَانَا لَكَ قَالَ فَیَقُوْلُ مَا اُعْطِیَ اَحَدٌ مِثْلَ مَا اُعْطِیْتُ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جنت میں سب سے آخر میں داخل ہونے والا جو شخص ہوگا وہ جب (دوزخ سے باہر نکل کر) روانہ ہوگا تو ایک مرتبہ یعنی ایک قدم آگے چلے گا، اور دوسری مرتبہ (یعنی دوسرے قدم پر) منہ کے بل گر پڑے گا اور تیسری مرتبہ (یعنی تیسرے قدم پر) دوزخ کی آگ (کی گرمی اور تپش) اس کے جسم کو جھلس ڈالے گی (جس کی وجہ سے اس کے بعض اعضاء جسم جل جائیں گے اور اس کی جلد کا رنگ بدل جائے گا) پھر جب وہ (اسی طرح گرتا پڑتا اور جھلستا ہوا) دوزخ (کی گرمی و تپش کی زد) سے آگے گزر جائے گا تو مڑ کر (دوزخ کی طرف) دیکھے گا اور کہے گا کہ بزرگ و برتر ہے خدا کی ذات، جس نے مجھے تجھ سے چھٹکارا دلایا، خدا کی قسم میرے پروردگار نے مجھے وہ چیز عطا کی ہے جو اس نے اگلے پچھلے لوگوں میں سے کسی کو عطا نہیں کی، پھر اس کی نظر کے سامنے ایک درخت کھڑا کیا جائے گا (جس کے نیچے پانی کا چشمہ ہوگا) وہ (اس درخت اور چشمے کو دیکھ کر) عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! مجھے اس درخت کے قریب پہنچادے تاکہ میں اس کا سایہ حاصل کرسکوں اور اس کے چشمہ سے پانی پیوں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا ابن آدم! اگر میں تیری یہ آرزو پوری کردوں تو ہوسکتا ہے کہ تو مجھ سے کچھ اور مانگنے لگے! وہ عرض کرے گا کہ میرے پروردگار ایسا نہیں ہوگا، اس کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے اس بات کا عہد کرے گا کہ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگے گا! چونکہ وہ شخص ایک ایسی چیز دیکھے گا جو اس کو بے صبر کردے گی اس لئے اس کا پروردگار اس کو معذور جان کر اس سے درگزر کرے گا اور اس کو درخت کے پاس پہنچادے گا! وہ شخص اس درخت کے سایہ میں بیٹھے گا اور اس کے چشمے سے پانی پیئے گا پھر (اس کو اور زیادہ آگے بڑھنے کے لئے) اس کی نظر کے سامنے ایک درخت کھڑا کیا جائے گا جو پہلے درخت سے زیادہ اچھا ہوگا، وہ شخص (اس درخت کو دیکھ کر) کہے گا کہ میرے پروردگار مجھ کو اس درخت کے پاس پہنچا دیجئے تاکہ اس کا سایہ حاصل کرسکوں اور اس کے چشمے سے پانی پیوں، نیز میں اب اس درخت کے علاوہ تجھ سے کچھ اور نہیں مانگوں گا، حق تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ ابن آدم! کیا تو نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تو اس (پہلے) درخت کے علاوہ کچھ اور مجھ سے نہیں مانگے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا اگر میں تجھے اس درخت کے پاس بھی پہنچادوں تو ہوسکتا ہے کہ تو مجھ سے کچھ اور مانگنے لگے، پس اس کا پروردگار اس کو معذور جان کر اس سے درگزر کرے گا کیونکہ وہ ایک ایسی چیز دیکھے گا جو اس کو بے صبر کردیگی اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو اس درخت کے پاس پہنچادے گا، وہ شخص اس درخت کے سایہ میں بیٹھے گا اور اس کے چشمہ کا پانی پیئے گا اور (تیسرا) اور درخت اس کے سامنے کھڑا کیا جائے گا جو جنت کے دروازہ کے قریب اور پہلے دونوں درختوں سے زیادہ اچھا ہوگا، وہ شخص (اس درخت کو دیکھ کر) کہے گا کہ میرے پروردگار! مجھے اس درخت کے پاس پہنچا دیجئے تاکہ میں اس کا سایہ حاصل کرسکوں اور اس کے چشمے میں سے پانی پیوں، حق تعالیٰ اس سے فرمائے گا، ابن آدم! کیا تو نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ اس کے علاوہ کچھ اور مجھ سے نہیں مانگے گا۔ وہ عرض کرے گا کہ ہاں (میں نے بیشک عہد کیا تھا لیکن اب یہ میرا آخری سوال ہے) اس کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ پس اس کا پروردگار اس کو معذور جان کر اس سے درگزر کرے گا

کیونکہ وہ شخص ایک ایسی چیز دیکھے گا جو اس کو بے صبر کر دے گی اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو اس درخت کے پاس پہنچا دے گا۔ اور جب وہ اس درخت کے پاس پہنچ جائے گا اور اس کے کان میں وہ (دلچسپ اور مزے دار) باتیں آئیں گی جو جنتی لوگ اپنی بیویوں اور اپنے دوست واحباب سے کریں گے تو وہ شخص (بے اختیار ہو کر) عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! اب مجھے جنت میں بھی پہنچا دیجئے اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ ابن آدم! کیا کوئی ایسی چیز بھی ہے جو تجھ سے (یعنی تیرے بار بار خواہش و آرزو کرنے سے) میرا پیچھا چھڑا دے؟ کیا تو اس سے بھی خوش ہو گا یا نہیں کہ میں تجھے جنت میں دنیا بھر کی مسافت کے برابر اور اسی قدر مزید جگہ تجھے دے دوں؟ وہ شخص (انتہائی خوشی و مسرت کے عالم میں) کہے گا کہ پروردگار کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں، حالانکہ آپ تو تمام جہانوں کے پروردگار ہیں!؟ (حدیث کے یہ الفاظ بیان کرنے کے بعد) حضرت ابن مسعودؓ ہنسے، اور پھر حدیث سننے والوں سے) بولے کہ کیا تم یہ نہیں پوچھو گے کہ میں کیوں ہنسا؟ لوگوں نے پوچھا کہ ہاں بتائیے، آپ کیوں ہنسے تھے فرمایا اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی ہنسے تھے اور جب صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) ہنسے کیوں؟ تو آنحضرت نے فرمایا کہ میں اس وجہ سے ہنسا کہ جب وہ شخص کہے گا کہ پروردگار! کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں، حالانکہ آپ تمام جہانوں کے پروردگار ہیں؟ تو پھر پروردگار عالم اس پر ہنس پڑے گا! بہرحال اللہ تعالیٰ (اس شخص کی یہ بات سن کر) فرمائے گا کہ نہیں میں تجھ سے مذاق نہیں کر رہا ہوں، (اور خوب جانتا ہوں کہ تو اس عطاء و بخشش کا مستحق نہیں ہے) لیکن (یہ سب تجھ کو اس لئے دے رہا ہوں کہ) میں جو چاہوں کر سکتا ہوں (کہ ہر چیز کا مالک و مختار اور قادر مطلق میں ہی ہوں) اس روایت کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے! اور مسلمؒ ہی میں ایک اور روایت حضرت ابوسعید خدریؓ سے اسی طرح کے الفاظ میں منقول ہے، لیکن اس روایت میں فیقول یا ابن ادم مایصرینی منک سے آخر تک کے الفاظ تو نہیں ہیں البتہ یہ الفاظ اور نقل کیے گئے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ اس شخص کو یاد دلائے گا اور بتائے گا کہ فلاں فلاں چیز مانگ اور جب (وہ تمام چیزیں مانگ چکے گا اور) اس کی آرزوئیں تمام ہو لیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ نہ صرف یہ تمام چیزیں (جن کو تو نے خواہش و آرزو کی ہے) بلکہ ان کی دس گنی اور چیزیں بھی تجھے عطا کی جاتی ہیں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا! اس کے بعد وہ شخص جنت میں اپنے گھر میں داخل ہو گا، وہاں اس کے پاس حور عین میں سے اس کی دو بیویاں آئیں گی اور کہیں گی کہ تمام تعریف اللہ بزرگ و برتر کے لئے ہے جس نے (اس عالیشان محل میں کہ جہاں عیش و راحت جاودانی کے سوا نہ کوئی غم و فکر ہے اور نہ موت کا خوف، تمہیں ہمارے لئے اور ہمیں تمہارے لئے پیدا کیا۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا! وہ شخص (فرط خوشی سے) کہے گا کہ (یہاں سب سے زیادہ خوش نصیب میں ہی ہوں کیونکہ) جتنا مجھے عطا کیا گیا ہے اتنا کسی اور کو نہیں دیا گیا (یہ بات وہ اس بناء پر کہے گا کہ اسوقت تک اسے دوسروں کو حاصل ہونے والی نعمتوں کا علم ہی نہیں ہو گا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ یہاں سب سے زیادہ نوازا جانے والا بندہ بس میں ہی ہوں۔"

تشریح: "خدا کی قسم مجھے میرے پروردگار نے وہ چیز عطا کی ہے......الخ اس موقع پر اس شخص کا قسم کھانا اور یہ بات کہنا دراصل اس کے اندر بدرجہ غایت امنڈ آنے والی خوشی و مسرت کا غماز ہو گا، کیونکہ اس وقت وہ اسی چیز کو سب سے بڑی نعمت جانے گا کہ دوزخ کی آگ سے باہر آنے کا موقع مل گیا اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ دوزخ سے نکلنے کے وقت کسی اور کو اپنے ساتھ نہ دیکھے اور یہ نہ جانے کہ کتنی زیادہ مخلوق جنت کی نعمتوں اور وہاں کے عیش و راحت میں ہے، اس لئے وہ یہی سمجھے گا کہ اس وقت میرے پروردگار نے دوزخ سے باہر لانے کی صورت میں مجھے جو نعمت عطا کی ہے اتنی بڑی نعمت اس نے اگلے پچھلے لوگوں میں سے کسی کو عطا نہیں کی۔

اس شخص کے یہ کہنے پر کہ "پروردگار! کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں......الخ حق تعالیٰ کے ہنسنے سے مراد بندے سے اس کا بہت زیادہ خوش ہونا ہے اور اس بات کو بیان کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ کا ہنسنا اس عجب و سرور کی بنا پر تھا جو ایک گناہ گار بندے پر اللہ تعالیٰ کے کمال لطف و مہربانی کو دیکھ کر آپ ﷺ کے اندر پیدا ہوا تھا، رہی حضرت ابن مسعود کی بات تو وہ بیان حدیث کے وقت ان الفاظ پر پہنچ کر آنحضرت ﷺ کی اتباع میں اور خود اپنی بھی مسرت کے اظہار کے لئے ہنسے۔

"وہاں اس کے پاس حور عین میں سے اس کی دو بیویاں آئیں گی" "حور" اصل میں حوراء کی جمع ہے جس سے "گورے رنگ اور

حسین چہرے والی عورت" مراد ہوتی ہے اور "عین" اصل میں "عیناء" کی جمع ہے جو "بڑی اور کالی آنکھ" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

دوزخ سے جنت میں پہنچائے جانے والے لوگ جنت میں "جہنمی" کہلائیں گے

⑮ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیُصِیْبَنَّ اَقْوَامًا سَفْعٌ مِّنَ النَّارِ بِذُنُوْبٍ اَصَابُوْھَا عُقُوْبَۃً ثُمَّ یُدْخِلُھُمُ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ بِفَضْلِ رَحْمَتِہٖ فَیُقَالُ لَھُمُ الْجَھَنَّمِیُّوْنَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مسلمانوں کے کتنے ہی گروہ ایسے ہوں گے جنہیں ان کے ان گناہوں کی پاداش میں جو انہوں نے کیے ہونگے دوزخ کی آگ کے شعلے جھلس دیں گے اور ان کے حلیوں کو بدل دیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل وکرم اور رحمت کے تحت ان کو (دوزخ سے چھٹکارا دلا کر) جنت میں پہنچائے گا اور ان لوگوں کو "جہنمی" کہا جائے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "اور ان لوگوں کو جہنمی کہا جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں ان لوگوں کو اس اعتبار سے کہ وہ پہلے دوزخ میں گئے ہوں گے اور وہاں سے جنت میں آئے ہوں گے "جہنمی" کے نام سے تعبیر اور یاد کیا جائے گا لیکن اُن کو جنت میں جہنمی کا نام دینا ان کی تحقیر و تذلیل کے لئے نہیں ہوگا بلکہ ان لوگوں کو خوش کرنے اور نعمت یاد دلانے کے طور پر ہوگا تاکہ وہ لوگ شکر نعمت کریں اور وہ شکر نعمت انہیں دوزخ سے نجات ملنے اور جنت میں پہنچ جانے کی مسرت و شادمانی کا احساس دلاتا رہے۔

⑯ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَخْرُجُ اَقْوَامٌ مِّنَ النَّارِ بِشَفَاعَۃِ مُحَمَّدٍ فَیَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَیُسَمَّوْنَ الْجَھَنَّمِیِّیْنَ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃٍ یَخْرُجُ قَوْمٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مِنَ النَّارِ بِشَفَاعَتِیْ یُسَمَّوْنَ الْجَھَنَّمِیِّیْنَ۔

"اور حضرت عمران بن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بہت سے لوگوں کو محمد (ﷺ) کی شفاعت کے نتیجہ میں دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا اور ان کا نام "جہنمی" رکھا جائے گا۔" (بخاریؒ) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "میری اُمت میں کے بہت سے لوگ میری شفاعت کے نتیجہ میں دوزخ سے نکالے جائیں گے اور ان کا نام "جہنمی رکھا جائے گا۔"

⑰ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ لَاَعْلَمُ اٰخِرَ اَھْلِ النَّارِ خُرُوْجًا مِّنْھَا وَاٰخِرَ اَھْلِ الْجَنَّۃِ دُخُوْلًا رَجُلٌ یَّخْرُجُ مِنَ النَّارِ حَبْوًا فَیَقُوْلُ اللّٰہُ اذْھَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّۃَ فَیَاْتِیْھَا فَیُخَیَّلُ اِلَیْہِ اَنَّھَا مَلْاٰی فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ وَجَدْتُّھَا مَلْاٰی فَیَقُوْلُ اللّٰہُ اذْھَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّۃَ فَاِنَّ لَکَ مِثْلَ الدُّنْیَا وَعَشْرَۃَ اَمْثَالِھَا فَیَقُوْلُ اَتَسْخَرُ مِنِّیْ اَوْ تَضْحَکُ مِنِّیْ وَاَنْتَ الْمَلِکُ فَلَقَدْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ضَحِکَ حَتّٰی بَدَتْ نَوَاجِذُہٗ وَکَانَ یُقَالُ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَھْلِ الْجَنَّۃِ مَنْزِلَۃً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! میں یقیناً اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے آخر میں دوزخ سے نکالا جائے گا اور سب سے آخر میں جنت میں پہنچایا جائے گا یہ ایک شخص ہوگا جو گھٹنوں کے بل چل کر دوزخ سے باہر آئے گا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ جا اور جنت میں داخل ہو جا، وہ شخص جب وہاں (جنت کے اندر یا جنت کے دروازہ پر) پہنچے گا تو اس کو جنت اس حال میں دکھائی دے گی کہ گویا وہ بالکل بھر گئی ہے اور اس میں مزید کسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے) وہ شخص عرض کرے گا کہ میرے لئے کوئی جگہ نظر نہیں آرہی ہے؟) اللہ تعالیٰ فرمائے گا! تو جا اور جنت میں داخل ہو، وہاں تیرے لئے دنیا (کی مسافت) کے بقدر اور اس سے دس گنی مزید جگہ تیرے لئے (مخصوص کردی گئی) ہے! وہ شخص (انتہائی تحیر و استعجاب کے عالم میں) کہے گا کہ (پروردگار!) کیا آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں یا یہ کہے گا کہ آپ مجھ سے ہنسی کر رہے ہیں حالانکہ آپ تو (بادشاہوں کے بھی) بادشاہ ہیں!؟" حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول کریم ﷺ یہ بات فرما کر ہنسے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی کچلیاں نظر آنے

لگیں۔" اور کہا جاتا تھا کہ یہ شخص جنتیوں میں سب سے چھوٹے درجہ کا آدمی ہوگا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: ان الفاظ "اور کہا جاتا تھا" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص جنتیوں میں سب سے چھوٹے درجہ کا آدمی ہوگا کے الفاظ آنحضرت ﷺ کے نہیں ہیں بلکہ حضرت ابوسعیدؓ یا ان کے بعد کے کسی راوی کے ہیں پس اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صحابہؓ یا سلفؒ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد یہ کہا کرتے تھے کہ حدیث میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے اور جس کو جنت میں اتنی بڑی جگہ ملنے کا ذکر ہے وہ مرتبہ ودرجہ کے اعتبار سے تمام جنتیوں میں سب سے کمتر ہوگا۔

⑱ وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّی لَاَعْلَمُ اٰخِرَ اَھْلِ الْجَنَّۃِ دُخُوْلًا الْجَنَّۃَ وَاٰخِرَ اَھْلِ النَّارِ خُرُوْجًا مِّنْھَا رَجُلًا یُّؤْتٰی بِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فَیُقَالُ اَعْرِضُوْا عَلَیْہِ صِغَارَ ذُنُوْبِہٖ وَارْفَعُوْا عَنْہُ کِبَارَھَا فَتُعْرَضُ عَلَیْہِ صِغَارُ ذُنُوْبِہٖ فَیُقَالُ عَمِلْتَ یَوْمَ کَذَا وَکَذَا کَذَا وَکَذَا وَعَمِلْتَ یَوْمَ کَذَا وَکَذَا کَذَا وَکَذَا فَیَقُوْلُ نَعَمْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّنْکِرَ وَھُوَ مُشْفِقٌ مِّنْ کِبَارِ ذُنُوْبِہٖ اَنْ تُعْرَضَ عَلَیْہِ فَیُقَالُ لَہٗ فَاِنَّ لَکَ مَکَانَ کُلِّ سَیِّئَۃٍ حَسَنَۃً فَیَقُوْلُ رَبِّ قَدْ عَمِلْتُ اَشْیَاءَ لَا اَرَاھَا ھٰھُنَا وَلَقَدْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ضَحِکَ حَتّٰی بَدَتْ نَوَاجِذُہٗ۔ (رواہ مسلمؒ)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! میں یقیناً اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جنت میں داخل کیا جائے گا اور سب سے آخر میں دوزخ سے نکالا جائے گا، یہ ایک ایسا شخص ہوگا جس کو قیامت کے دن جب (پروردگار کے حضور میں) پیش کیا جائے گا تو (فرشتوں سے) کہا جائے گا کہ اس کے چھوٹے گناہوں پر مشتمل فرد جرم اس کے آگے کردو اور اس کے بڑے بڑے گناہوں کی فرد جرم) کو ابھی ہی اس پر ظاہر نہ کرو۔ چنانچہ اس کے چھوٹے چھوٹے گناہوں کی فرد جرم اس کے آگے کردی جائے گی اور پھر اس سے کہا جائے کہ (بتا) کیا تو نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں (برے کام کیے تھے اور فلاں فلاں دن طاعت کو ترک کیا تھا، وہ اقرار کرے گا کہ ہاں (میں نے فلاں فلاں دن اس اس طرح کیا تھا) وہ اپنے ان گناہوں سے انکار نہیں کر سکے گا کیونکہ وہ اپنے بڑے بڑے گناہوں کے خوف میں مبتلا ہوگا (اور سوچے گا، اگر کہیں ان کے بڑے گناہوں کی فرد جرم سامنے آگئی تو پھر بہت سی سخت پرسش ور مواخذہ سے دوچار ہونا پڑے گا پس اس سے کہا جائے گا کہ (جا ہم نے نہ صرف تجھے معاف کیا بلکہ ہماری خصوصی رحمت اور کمال فضل وکرم کے تحت تجھے ہر برائی کے بدلہ میں ایک نیکی عطا کی جاتی ہے وہ شخص کہے گا کہ میرے پروردگار! میں نے اور بھی بہت سے برے کام (یعنی بڑے گناہ) کیے تھے جو مجھے یہاں (فرد جرم میں) نظر ہی نہیں آرہے ہیں حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا، رسول کریم ﷺ یہ بیان کر کے ہنس پڑے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی کچلیاں نظر آنے لگیں۔" (مسلمؒ)

ایک دوزخ سے نکالے جانے والے شخص کا واقعہ

⑲ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَخْرُجُ مِنَ النَّارِ اَرْبَعَۃٌ فَیُعْرَضُوْنَ عَلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُؤْمَرُ بِھِمْ اِلَی النَّارِ فَیَلْتَفِتُ اَحَدُھُمْ فَیَقُوْلُ اَیْ رَبِّ لَقَدْ کُنْتُ اَرْجُوْ اِذْ اَخْرَجْتَنِیْ مِنْھَا اَنْ لَّا تُعِیْدَنِیْ فِیْھَا قَالَ فَیُنْجِیْہِ اللّٰہُ مِنْھَا۔ (رواہ مسلمؒ)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(آخر میں دوزخ سے جن لوگوں کو نکالا جائے گا ان میں سے) چار آدمی وہ ہوں گے جن کو جب دوزخ سے نکالا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کیا جائے گا تو ان کے بارے میں یہ حکم ہوگا کہ ان کو دوزخ میں بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد جب ان کو دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا تو ان میں سے ایک شخص مڑ کر دیکھے گا اور (بڑی حسرت کے ساتھ) کہے گا کہ میرے پروردگار! میں تو یہ امید رکھتا تھا کہ جب آپ مجھے دوزخ سے باہر بلوالیں گے تو دوبارہ مجھے نہیں بھیجیں گے!؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا! اللہ تعالیٰ (یہ بات سن کر) اس کو دوزخ سے نجات دے دے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: ان لوگوں کو دوزخ سے نکالنا، پھر دوبارہ دوزخ میں بھیجنے کا حکم دینا اور پھر نجات دے دینا دراصل ان کے امتحان وآزمائش اور

ان کو ممنون کرم کرنے کے لئے ہو گا! واضح رہے کہ آخر میں ان میں سے صرف ایک شخص کا حال بیان کیا گیا ہے اور باقی تینوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ایک شخص پر قیاس کر کے باقی سب کا حال خود بخود مفہوم ہو جاتا ہے کہ وہ سب بھی اسی طرح نجات پائیں گے۔ نیز یہاں "چار لوگوں" کا ذکر صرف تمثیل کے طور پر ہے اور اصل میں اس طرح کے لوگوں کی ایک پوری جماعت اور ایک بڑا طبقہ مراد ہے۔

اہل ایمان کو عذاب میں مبتلا کرنے کی اصل وجہ

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُخْلَصُ الْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النَّارِ فَیُحْبَسُوْنَ عَلٰی قَنْطَرَۃٍ بَیْنَ الْجَنَّۃِ وَالنَّارِ فَیُقْتَصُّ لِبَعْضِھِمْ مِنْ بَعْضٍ مَظَالِمُ کَانَتْ بَیْنَھُمْ فِی الدُّنْیَا حَتّٰی اِذَا ھُذِّبُوْا وَ نُقُّوْا اُذِنَ لَھُمْ فِیْ دُخُوْلِ الْجَنَّۃِ فَوَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَاَحَدُھُمْ اَھْدٰی بِمَنْزِلِہٖ فِی الْجَنَّۃِ مِنْہُ بِمَنْزِلِہٖ کَانَ لَہٗ فِی الدُّنْیَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! "جب اہل ایمان کو دوزخ سے چھٹکارا ملے گا تو ان کو (جنت میں پہنچانے سے پہلے) اس پل پر روک لیا جائے گا جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہو گا، اور پھر ان سے ایک دوسرے کو ان حقوق و مطالبات کا بدلہ دلوایا جائے گا جو دنیا میں وہ ایک دوسرے پر رکھتے تھے (یعنی جو بھی شخص دنیا میں اپنے ذمے کسی کا حق رکھتا ہو اور اس کو ادا کرنے سے پہلے مر گیا ہو گا تو اس موقع پر اس سے وہ حق، حقدار کو دلوایا جائے گا) یہاں تک کہ جب وہ لوگ (ہر طرح کے گناہ اور برائیوں کی آلائش سے) بالکل پاک وصاف ہو جائیں گے تو ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دیدی جائے گی۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے (جب وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو) (ان میں سے ہر شخص اپنے اس مکان کو، جو اس کے لئے جنت میں مخصوص ہو گا اپنے دنیا کے مکان سے زیادہ پہچاننے والا ہو گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "جب وہ لوگ بالکل پاک وصاف ہو جائیں گے........الخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ گار اہل ایمان کو دوزخ کے سپرد کرنا اور عذاب میں مبتلا کرنا، ان کو پاک وصاف کرنے کے لئے ہو گا تاکہ وہ پوری طرح کندن ہو کر جنت میں، کہ جو ان کے ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے، داخل ہوں، نہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے ان مؤمن بندوں کو کسی نفرت وعداوت اور قہر وغضب کے تحت دوزخ کی آگ میں جھونکے گا! اور اس کی یہی حکمت اس دنیا میں بھی کار فرما ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بیماریوں، حادثوں اور مختلف تکالیف ومصائب میں مبتلا کر کے ان کے گناہوں کو دھوتا رہتا ہے۔

اہل تحقیق نے کہا ہے کہ مختلف اوقات میں بندوں سے جو گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں ان میں بعض گناہ تو حق کی خاطر برداشت کی جانے والی مشقتوں اور مختلف مصائب وآفات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ڈھل جاتے ہیں، بعض گناہ وہ ہوتے ہیں جن کو سکرات الموت کی شدت وسختی پاک وصاف کر دیتی ہے، بعض گناہ وہ ہوتے ہیں جو عذاب قبر سے ختم ہو جاتے ہیں اور بعض گناہ وہ ہوتے ہیں جو دوزخ کی آگ کے علاوہ کسی اور چیز سے صاف نہیں ہوں گے جیسا کہ سونے اور چاندی کو بھٹی میں ڈال کر پگھلائے بغیر کندن نہیں کیا جا سکتا۔

"ان میں سے ہر شخص اپنے اس مکان کو........الخ سے قلب کی اس قوت ونورانیت اور ہدایت کی طرف اشارہ ہے جو گناہوں سے پاک وصاف ہونے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے، نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب ان لوگوں (یعنی اہل ایمان) نے دنیا میں نور توفیق اور نور قلب کی روشنی میں ایمان، عمل صالح اور تعلق مع اللہ کے راستہ کو پالیا تھا اور ہدایت یافتہ ہو گئے تھے تو آخرت میں بھی جنت کے اندر اپنی منزل اور اپنے مقام کا راستہ آسانی کے ساتھ پالیں گے۔

ہر بندہ کے لئے جنت ودوزخ میں جگہیں مخصوص ہیں

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ اَحَدٌ الْجَنَّۃَ اِلَّا اُرِیَ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ لَوْ

اَسَآءَ لِيَزْدَادَ شُكْرًا وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ اَحَدٌ اِلَّا اُرِیَ مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ لَوْ اَحْسَنَ لِيَكُوْنَ عَلَيْهِ حَسْرَةً۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! کوئی بھی شخص (کہ جنت کا مستحق قرار پاچکا ہوگا) اس وقت تک جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا جب تک اس کو دوزخ میں وہ جگہ نہ دکھادی جائے گی جو اس کا ٹھکانا ہوتا، اگر وہ برے کام کرتا (یعنی اس کو وہ جگہ دکھا کر بتایا جائے گا کہ اگر تم دنیا میں برے کام کرتے تو دوزخ میں اس جگہ تمہارا ٹھکانا ہوتا) اور یہ اس لئے ہوگا تاکہ وہ دنیا میں برے کام سے بچنے کی توفیق ملنے اور دوزخ میں جانے کے بجائے جنت میں داخل کیے جانے پر) زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرسکے اور کوئی بھی شخص (کہ جو عذاب دوزخ کا مستوجب قرار دیا جاچکا ہوگا) اس وقت تک دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا جب تک کہ اس کو جنت میں وہ جگہ نہ دکھادی جائے گی جو اس کے لئے مخصوص تھی اگر وہ نیک کام کرتا (یعنی اس کو وہ جگہ دکھا کر بتایا جائے گا کہ اگر تم دنیا میں برائی کے راستے پر نہ لگے رہتے اور نیک کام کرتے تو جنت میں تمہیں یہ مقام عطا ہوتا) اور یہ اس لئے ہوگا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ حسرت وندامت میں مبتلا ہو۔"

(بخاریؒ)

جب موت کو بھی موت کے سپرد کردیا جائے گا

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَارَ اَهْلُ الْجَنَّةِ اِلَى الْجَنَّةِ وَاَهْلُ النَّارِ اِلَى النَّارِ جِیْءَ بِالْمَوْتِ حَتّٰى يُجْعَلَ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ ثُمَّ يُذْبَحُ ثُمَّ يُنَادِیْ مُنَادٍ يَا اَهْلَ الْجَنَّةِ لَا مَوْتَ وَيَا اَهْلَ النَّارِ لَا مَوْتَ فَيَزْدَادُ اَهْلُ الْجَنَّةِ فَرَحًا اِلٰى فَرَحِهِمْ وَيَزْدَادُ اَهْلُ النَّارِ حُزْنًا اِلٰى حُزْنِهِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کہتے ہیں "جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں (اپنی اپنی جگہ) جالیں گے تو موت کو لایا جائے گا (اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ موت کو ایک دنبہ کی شکل میں لایا جائے گا) اور اس کو جنت ودوزخ کے درمیان ڈال کر ذبح کردیا جائے گا، پھر اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ اے جنتیو! (سن لو) اب موت کا کوئی وجود نہیں رہا (جو بھی شخص جہاں اور جس حالت میں ہے، اس پر کبھی موت کا سایہ نہیں پڑے گا، ہر ایک کو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی حاصل ہوگئی ہے) اور اے دوزخیو! (تم بھی سن لو) اب موت کا کوئی وجود نہیں رہا۔ (یہ اعلان سن کر) اہل جنت کی فرحت ومسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا اور اہل دوزخ رنج وغم کے دریا میں اور زیادہ ڈوب جائیں گے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حوض کوثر پر سب سے پہلے آنے والے فقراء مہاجرین ہوں گے

(۲۳) عَنْ ثَوْبَانَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حَوْضِیْ مِنْ عَدَنٍ اِلٰى عُمَّانَ الْبَلْقَاءِ مَآؤُهُ اَشَدُّ بَيَاضًا مِّنَ اللَّبَنِ وَاَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ وَاَكْوَابُهُ عَدَدُ نُجُوْمِ السَّمَآءِ مَنْ شَرِبَ مِنْهُ شَرْبَةً لَمْ يَظْمَأْ بَعْدَهَا اَبَدًا اَوَّلُ النَّاسِ وُرُوْدًا فُقَرَآءُ الْمُهَاجِرِيْنَ الشُّعْثُ رُؤُسًا الدُّنْسُ ثِيَابًا الَّذِيْنَ لَا يَنْكِحُوْنَ الْمُتَنَعِّمَاتِ وَلَا يُفْتَحُ لَهُمُ السُّدَدُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"حضرت ثوبانؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا! "میرے حوض (کوثر) کی لمبائی عدن اور عمان بلقاء کے درمیانی فاصلہ کے بقدر ہے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے، اس کے آب خورے (پانی پینے کے برتن) آسمان کے ستاروں سے زیادہ ہیں۔ جو شخص بھی ایک مرتبہ اس کا پانی پی لے گا پھر اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی، اس حوض پر پانی پینے کے لئے سب سے پہلے آنے والے لوگ فقراء مہاجرین ہوں گے، وہی فقراء مہاجرین جو (اس دنیا میں اپنے فقر وافلاس کی وجہ سے) پراگندہ

بال اور پریشان حال اور پھٹے پرانے کپڑوں میں نظر آتے ہیں جو خوشحال گھرانوں کی لڑکیوں سے (اگر اپنے نکاح کا پیغام بھیجیں تو ان سے) نکاح کے قابل نہیں سمجھے جاتے اور جن کے لئے (گھروں کے) دروازے نہیں کھولے جاتے۔" اس روایت کو احمدؒ، ترمذیؒ روایت کیا اور ابن ماجہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: جیسا کہ پہلے بھی اسی طرح کی ایک حدیث کی تشریح میں گزر چکا ہے، عدن ایک چھوٹے جزیرہ نما کا نام ہے جو پہلے یمن کا بندرگاہ تھا کچھ عرصہ پہلے تک اس جزیرہ پر انگریزوں کا قبضہ رہا ہے مگر اب خود مختار ریاست کی حیثیت رکھتا ہے، عدن بحر احمر کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ جہاں خلیج عدن، بحر احمر اور بحیرہ عرب (بحر ہند) کو ملاتی ہے۔ اسی طرح "عمان" بھی ایک شہر کا نام ہے جو بحر احمر کے شمالی سرے پر پہلے ملک شام کا ایک حصہ تھا اور اب ملک اردن کا دار السلطنت ہے۔ "بلقاء" اصل میں ایک قدیم شہر کا نام ہے جو کبھی ملک شام کے دار السلطنت "دمشق کے" قرب وجوار میں آباد تھا۔ اور "عمان" اسی شہر بلقاء سے متعلق ایک دیہاتی علاقہ تھا، اسی بناء پر حدیث میں عمان بلقاء فرمایا گیا ہے! حاصل یہ کہ آخرت میں مجھے جو حوض کوثر عطا ہو گا اس کی لمبائی کا فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا فاصلہ عمان بلقاء اور عدن کے درمیان ہے (موجودہ دور میں اس فاصلہ کو پورے بحر احمر کی لمبائی پر قیاس کیا جاتا ہے کہ حوض کوثر، بحر احمر جتنا لمبا ہو گا) اور یہ بات بھی پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ حوض کوثر کی وسعت بیان کرنے کے لئے مختلف حدیثوں میں مختلف شہروں اور علاقوں کے درمیانی فاصلہ کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً اس حدیث میں عدن اور عمان بلقاء کے درمیانی فاصلہ کا ذکر ہے، ایک حدیث میں یہ ہے کہ حوض کوثر کی لمبائی ایلہ (ایلات) اور صنعاء (یمن) کے درمانی فاصلہ کے بقدر ہو گی اور ایک حدیث میں دو مہینے کی مسافت کے بقدر فاصلہ کا ذکر ہے وغیرہ وغیرہ تو حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی حدیث میں حوض کوثر کی لمبائی و وسعت کو متعین طور پر حد بند کر کے بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ ان سب حدیثوں کا اصل مقصد صرف حوض کے طول و عرض کی وسعت و زیادیت کو ظاہر کرنا ہے، پس جس موقع پر جو مخاطب و سامع جن علاقوں و شہروں کے درمیانی فاصلوں اور جس مسافت کی سمجھ اور معلومات رکھتا تھا اسی کے مطابق تمثیل کے طور پر شہروں اور علاقوں اور مسافت کا ذکر فرمایا۔

اس حوض پر پانی پینے کے لئے سب سے پہلے آنے والے لوگ فقراء مہاجرین، ہوں گے۔" فقراء مہاجرین کو یہ شرف خصوصی اس لئے حاصل ہو گا کہ دنیا میں دین کی خاطر انہوں ہی نے سب سے زیادہ بھوک پیاس کی صعوبت برداشت کی ہے سب سے زیادہ پریشانی اور تباہ حالی کا شکار یہی لوگ ہوئے ہیں، اس لئے، آخرت میں سب سے پہلے انہی لوگوں کو حوض کوثر پر سیراب کیا جائے گا اور سب سے پہلے انہی کو وہاں خوش آمدید کہا جائے گا۔ اسی مفہوم کو ایک دوسری حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ:

اجوعکم فی الدنیا اشبعکم فی الاخرة۔

"تم میں سے جو لوگ دنیا میں سب سے زیادہ بھوکے رہتے ہیں وہی آخرت میں سب سے زیادہ شکم سیر ہوں گے۔"

نیز اللہ تعالیٰ جنت میں ایسے ہی لوگوں کو حکم دے گا۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ۔

"خوب مزے سے کھاؤ اور پیو، اس صورت حال کے صلہ میں جس سے تم گزشتہ ایام (یعنی دنیاوی زندگی) میں دوچار تھے۔"

واضح رہے کہ "مہاجرین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے اور آنحضرت ان کے قائد تھے، نیز انہی کے حکم میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے دین کی خاطر اپنے وطن اصلی سے ہجرت اختیار کر لی اور مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ جا کر بس گئے اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے راحت وچین اور خوشحالی کی زندگی پر فقر و افلاس کو اور شہرت و ناموری پر گم نامی و گوشہ گیری کو ترجیح دے کر اختیار کیا اور رضائے الٰہی کے لئے جاہ و مال کے حصول کی جدوجہد کو ترک کر کے علم و عمل کے حصول میں منہمک ہوئے۔

اور جن لوگوں کے لئے دروازے نہیں کھولے جاتے" یعنی اگر وہ لوگ بفرض محال کسی ضرورت کے تحت یا بلا ضرورت ہی کسی دنیادار کے دروازے پر جائیں تو ان کی ظاہری شکستہ حالی کی بنا پر وہ (دنیادار) ان کو اس قابل بھی نہ سمجھے کہ اپنے یہاں گھسنے دے اور اپنے پاس آنے دے یہ گویا اس بات سے کنایہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ظاہری حالت کی وجہ سے دنیاداروں کے یہاں کسی دعوت وضیافت میں بلائے جانے کے قابل نہیں سمجھے جاتے اور سماجی ومجلسی تعلقات میں ان کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جاتا۔

حوض کوثر پر آنے والے لوگوں کا کوئی شمار نہیں ہوگا

(۲۴) وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ اَرْقَمَ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَزَلْنَا مَنْزِلًا فَقَالَ مَا اَنْتُمْ جُزْءٌ مِّنْ مِّائَةِ اَلْفِ جُزْءٍ مِّمَّنْ يَّرِدُ عَلَيَّ الْحَوْضَ قِيْلَ كَمْ كُنْتُمْ يَوْمَئِذٍ قَالَ سَبْعَ مِائَةٍ اَوْ ثَمَانَ مِائَةٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت زید بن ارقمؓ کہتے ہیں کہ (ایک سفر میں) ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے ساتھ تھے کہ ایک جگہ ہمارا پڑاؤ ہوا، وہاں آنحضرت ﷺ نے (اس وقت موجود صحابہؓ سے) فرمایا کہ (آخرت میں) جو لوگ میرے پاس حوض کوثر پر آئیں گے ان کی تعداد کے اعتبار سے تم لاکھ جزوں میں سے ایک جزو بھی نہیں ہو۔" حضرت زید بن ارقمؓ سے سوال کیا گیا کہ اس موقع پر آپ لوگوں کی تعداد کیا تھی؟ انہوں نے کہا کہ سات سو یا آٹھ سو۔" (ابوداودؒ)

تشریح: اس سے تحدید وتعین مراد نہیں ہے بلکہ حوض کوثر پر آنے والے لوگوں کی کثرت وبہتات کو بیان کرنا مراد ہے، کہ وہاں پانی پینے کے لئے آنے والے لوگوں کی تعداد بے شمار ہوگی۔

ہر نبی ﷺ کو ایک حوض عطا ہوگا

(۲۵) وَعَنْ سُمَرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوْضًا وَاِنَّهُمْ لَيَتَبَاهُوْنَ اَيُّهُمْ اَكْثَرُ وَارِدَةً وَاِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَكْثَرَهُمْ وَارِدَةً رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (آخرت میں) ہر ایک نبی ﷺ کو حوض عطا ہوگا (اور ہر اُمت اپنے اپنے نبی ﷺ کے حوض پر آکر پانی پئیں گے، پس تمام انبیاء آپس میں اس پر فخر کریں گے کہ کس کے حوض پر زیادہ آدمی آتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ سب سے زیادہ آدمی میرے حوض پر آئیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ آنحضرت ﷺ کی اُمت کے لوگوں کی تعداد چونکہ دوسری تمام امتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی۔ اس لئے آپ ﷺ کے حوض پر پانی پینے کے لئے آنے والوں کی تعداد بھی سب سے زیادہ ہوگی! اور یہ بات بالکل یقینی ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، پس آپ کا یہ کہنا کہ "مجھے امید ہے" اور جس سے شک وتردد کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے) محض تواضع وانکساری کی بنا پر ہے۔

قیامت کے دن آنحضرت ﷺ کہاں کہاں ملیں گے

(۲۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ سَاَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّشْفَعَ لِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَقَالَ اَنَا فَاعِلٌ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَيْنَ اَطْلُبُكَ قَالَ اُطْلُبْنِيْ اَوَّلَ مَا تَطْلُبُنِيْ عَلَى الصِّرَاطِ قُلْتُ فَاِنْ لَّمْ اَلْقَكَ عَلَى الصِّرَاطِ قَالَ فَاطْلُبْنِيْ عِنْدَ الْمِيْزَانِ قُلْتُ فَاِنْ لَّمْ اَلْقَكَ عِنْدَ الْمِيْزَانِ قَالَ فَاطْلُبْنِيْ عِنْدَ الْحَوْضِ فَاِنِّيْ لَا اُخْطِئُ هٰذِهِ الثَّلٰثَ الْمَوَاطِنَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ قیامت کے دن (عام شفاعت کے علاوہ

خاص طور پر الگ سے بھی، میری شفاعت فرمائیں، آپ ﷺ نے فرمایا! اچھا میں شفاعت کردوں گا۔" میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) کو کہاں تلاش کروں اور آپ (ﷺ) مجھے کہاں ملیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا! "سب سے پہلے مجھے پلصراط پر تلاش کرنا" میں نے عرض کیا کہ اگر آپ (ﷺ) پلصراط پر نہ مل پائیں؟ فرمایا! تو پھر میزان کے پاس تلاش کرنا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ (ﷺ) میزان کے پاس بھی نہ ملیں؟ فرمایا! (اگر ان دونوں جگہ پر نہ مل پاؤں) تو پھر حوض پر مجھے تلاش کرنا میں ان تینوں جگہوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔" اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حضور ﷺ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ قیامت کے دن یہ تین موقعے اور یہ تین مقام ایسے ہوں گے جہاں لوگوں کو بہت زیادہ پریشانی اور ہولناکی سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہی وہ مقام ہوں گے جہاں پیش آنے والے حالات و معاملات، سفارش و شفاعت کے طلب گار ہوں گے، پس میں ان تینوں جگہوں پر باری باری موجود رہوں گا، کبھی یہاں کبھی وہاں اور اس طرح میں اس دن انہیں مقامات پر لوگوں کو دیکھ بھال رکھنے اور ان کے معاملات نمٹوانے میں مصروف رہوں گا۔

اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ یہ حدیث بظاہر حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کے خلاف ہے جو باب الحساب کی دوسری فصل میں گزری ہے اور جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ قیامت کے دن اپنے اہل و عیال کو یاد رکھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس دن ان تینوں موقعوں پر کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ والی حدیث "غائبین" پر محمول ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن ان تینوں موقعوں جو لوگ آپ ﷺ کے سامنے نہیں ہوں گے اور آپ ﷺ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کریں گے آپ ﷺ ازخود ان کو یاد نہیں کریں گے، اور یہ حضرت انسؓ والی حدیث "حاضرین" پر محمول ہے، یعنی آپ ﷺ کی اُمت میں جو لوگ ان موقعوں پر آپ ﷺ کی خدمت پر حاضر ہوں گے اور اپنی طرف متوجہ کریں گے تو آپ ﷺ ان کی طرف توجہ دیں گے اور ان کی خصوصی شفاعت فرمائیں گے۔ اور طیبیؒ نے ان دونوں حدیثوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ کو مذکورہ جواب اس لئے دیا کہ وہ آپ ﷺ کی زوجۂ مطہرہ تھیں، اور یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ مخصوص حضور ﷺ کی شفاعت اور خصوصی توجہ پر اعتماد و بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائے اور عمل و ریاضت کی طرف سے بے فکر ہو جائیں! چنانچہ آپ ﷺ اپنے اہل بیت اور قرابتداروں سے یہی فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو! میں تمہارے اخروی معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوں محض میرے اوپر اعتماد کر کے نہ بیٹھ جانا، آخرت میں تمہارا عمل ہی فائدہ پہنچائے گا، اس کے برخلاف آپ ﷺ نے حضرت انسؓ کو یہ جواب اس لئے دیا کہ وہ ناامید نہ ہو جائیں اور انہوں نے جس قلبی تعلق و اخلاص کی بنا پر یہ درخواست کی تھی اس کا تقاضہ یہی تھا کہ انہیں جواب بھی اس طرح کے محبت و تعلق کو ظاہر کرنے والا دیا جائے۔ بہرحال یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ وہ دن اپنی ہولناکی، شدت و سختی اور زحمت و مشقت کے اعتبار سے نہایت سخت ہوگا، اگرچہ آنحضرت ﷺ کو شفاعت کا مقام حاصل ہوگا اور آپ ﷺ کا شفاعت کرنا برحق ہے لیکن اس دن نجات پانے کے لئے اس دنیا میں عملی زندگی کو سوارنے اور درست کرنے کی ضرورت بھی مسلم ہے، محض حضور ﷺ کی شفاعت پر اعتماد کافی نہیں اور صرف اعمال پر اعتماد کر کے حضور ﷺ کی شفاعت سے بے نیازی کوئی معنی نہیں رکھتی، پس آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ کو جو الگ الگ جواب دیئے وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح تھے، اور ہر جواب میں مخاطب کے حال کی رعایت ملحوظ تھی۔

مقام محمود اور پروردگار کی کرسی کا ذکر

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قِيْلَ لَهُ مَا الْمَقَامُ الْمَحْمُوْدُ قَالَ ذٰلِكَ يَوْمٌ يَنْزِلُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى كُرْسِيِّهٖ فَيَاِطُّ كَمَا يَاِطُّ الرَّحْلُ الْجَدِيْدُ مِنْ تَضَايُقِهٖ وَهُوَ كَسَعَةِ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَيُجَآءُ بِكُمْ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا

فَيَكُوْنُ اَوَّلُ مَنْ يُّكْسٰى اِبْرَاهِيْمُ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اكْسُوْا خَلِيْلِيْ فَيُؤْتٰى بِرِيْطَتَيْنِ بَيْضَاوَيْنِ مِنْ رِيَاطِ الْجَنَّةِ ثُمَّ اُكْسٰى عَلٰى اِثْرِهٖ ثُمَّ اَقُوْمُ عَنْ يَمِيْنِ اللّٰهِ مَقَامًا يَغْبِطُنِي الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ۔ (رواه الدارمی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ مقام محمود اور اس کی اہمیت وخصوصیت) کیا ہے؟ جس کا اس آیت میں آپ ﷺ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا) تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس دن (کہ جب مجھے یہ مقام محمود عطا ہوگا) اللہ تعالیٰ اپنی کرسی پر نزول جلال فرمائے گا اور وہ کرسی چر چرائے گی جیسا کہ نئے چمڑے کی تنگ زین چر چراتی ہے اور اس کرسی کی کشادگی و وسعت اتنی ہے جتنی کہ زمین وآسمان کی درمیانی فضا، پھر تم سب کو برہنہ پاء ننگے بدن اور بے ختنہ (میدان حشر) میں لایا جائے گا اور اس دن سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ (فرشتوں کو) حکم دے گا کہ میرے دوست کو لباس پہناؤ، اور جنت کی چادروں میں سے ملائم کتان کی دو سفید چادریں لاکر حضرت ابراہیم کو پہنائی جائیں گی، ان کے بعد مجھ کو لباس پہنایا جائے گا اور پھر میں اللہ تعالیٰ کے دائیں جانب کھڑا ہوں گا اور (یہ اعزاز ملنے پر) اگلے پچھلے تمام لوگ مجھ پر رشک کریں۔" (داریؒ)

تشریح: اس حدیث میں "پروردگار کی کرسی" کی کشادگی و وسعت کو بیان کرنے کیلئے زمین وآسمان کی درمیانی فضا کی مثال دی گئی ہے جب کہ ایک حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ "(وسعت وکشادگی میں) اس کرسی کے مقابلہ پر ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کی مجموعی حیثیت بس اتنی ہی ہے جتنی کہ کسی بہت بڑے جنگل و بیابان میں پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے چھلے کی، اور اس کرسی کے مقابلہ پر عرش کی وہی حیثیت ہے جو اس چھلے کے مقابلہ پر پورے جنگل و بیابان کی!" پس اس حدیث میں کرسی کی جو وسعت وکشادگی بیان کی گئی ہے وہ بطریق تعین وتحدید نہیں ہے بلکہ عام لوگوں کے ذہن وفہم کے مطابق محض تمثیل کے طور پر ہے جیسا کہ جنت کی وسعت وکشاد کو محض تمثیل کے طور پر بیان کرنے کے لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ عرضها السموت والارض علاوہ ازیں اس وسعت وکشادگی" کو بیان کرنے کا ایک خاص مقصد بھی تھا وہ یہ کہ آپ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزول اجلال فرمانے کی وجہ سے کرسی اس طرح چر چرائے گی جس طرح نئے چمڑے کی تنگ زین سوار کے نیچے چر چراتی ہے تو اس سے یہ وہم ہوسکتا تھا کہ وہ کرسی تنگ اور چھوٹی ہونے کی وجہ سے چر چرائے گی، لہذا آپ ﷺ نے یہ واضح کرنا ضروری جانا کہ کرسی کے چر چرانے کی بات اور نئے چمڑے کی تنگ زین کی مشابہت سے یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ کرسی بھی چھوٹی اور تنگ ہوگی بلکہ وہ کرسی اتنی عظیم اور کشادہ ہے کہ اس کا ہلکا سا اندازہ کرنے کے لئے تم زمین وآسمان کی درمیانی فضا کا تصور کرلو بہرحال یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ حدیث کے الفاظ ان متشابہات میں سے ہیں جن کے حقیقی معنی و مراد تک انسانی علم وذہن کی رسائی تیقن کے ساتھ ممکن نہیں لہذا مفرداتِ عبادت جیسے کرسی پر حق تعالیٰ کے بیٹھنے، کرسی کے چر چرانے اور اس کرسی کے زمین آسمان کے درمیانی فاصلہ کے بقدر وسیع وکشادہ ہونے وغیرہ کی حقیقتِ معنی تک پہنچنے کی کوشش کئے بغیر صرف مفہوم حدیث کے خلاصہ کو اختیار کرنا چاہئے جو یہ ہے کہ اس حدیث کے ذریعہ قیامت کے دن حق تعالیٰ کی عظمت وکبریائی اس کے جاہ وجلال اور اس کی بادشاہت وحاکمیت کا اظہار کرنا مقصود ہے۔

"اس دن سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم ہوں گے" الحشر کی پہلی فصل کی ایک حدیث میں بھی گزر چکا ہے اور یہ بات بھی وہاں بتائی جاچکی ہے کہ اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، آنحضرت ﷺ پر فضیلت رکھتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنائے جانے کا شرف واعزاز بھی اسی وجہ سے حاصل ہوگا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے روحانی باپ ہیں اور آپ ﷺ کے دین اور آپ ﷺ کی ملت کا سلسلہ نسب انہی سے چلتا ہے! علاوہ ازیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حاصل ہونے والے اس شرف واعزاز کو زیادہ سے زیادہ آنحضرت ﷺ پر جزوی فضیلت ملنا ہی کہا جاسکتا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ جزوی فضیلت، کلی فضیلت کے منافی نہیں ہوتی جب کہ اس دن بھی آنحضرت ﷺ کا بالعموم

اور علی الاطلاق پوری نوع انسانی بشمول تمام پیغمبر و انبیاء سے افضل و برتر ہونا خود اسی حدیث کے آخری الفاظ ثُمَّ اقوم عن یمین اللّٰہ الخ سے ظاہر و ثابت ہے۔

"اس کے بعد مجھ کو لباس پہنایا جائے گا" یہ ارشاد بظاہر اس روایت کے منافی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ قیامت کے دن اپنی قبر سے لباس میں اٹھیں گے! لیکن اگر یہ وضاحت پیش نظر رہے تو پھر دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تضاد معلوم نہیں ہوگا کہ اگرچہ آنحضرت ﷺ اپنی قبر سے لباس میں اٹھیں گے لیکن میدان حشر میں آپ ﷺ کو تمام انبیاء کے ساتھ دوبارہ لباس پہنایا جائے گا اور یہ آپ ﷺ کے کامل و شرف واحترام کے اظہار کے لئے ہوگا۔

حدیث کو آخر تک دیکھنے کے بعد ایک بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے کیے جانے والے سوال اور آپ ﷺ کی طرف سے دیئے جانے والے جواب کے درمیان مطابقت و موزونیت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پوچھنے والوں نے مقام محمود کے بارے میں پوچھا تھا کہ اس کی نوعیت وصورت کیا ہوگی، آپ ﷺ نے اس کا جواب براہ راست نہیں دیا بلکہ پہلے اس دن کے پر ہیبت اور پُر حول ماحول کا ذکر کیا تاکہ لوگوں کے ذہن میں اس چیز کی بڑائی اور اہمیت راسخ ہو جائے جس کے بارے میں انہوں نے سوال کیا ہے بعد میں آپ ﷺ نے ان الفاظ ثُمَّ اقوم عن یمین اللّٰہ الخ (پھر میں اللہ تعالیٰ کے دائیں جانب کھڑا ہوں گا الخ) کے ذریعہ ان کے سوال کے جواب کی طرف اشارہ کیا گویا آنحضرت ﷺ نے بالواسطہ طور پر یہ جواب دیا کہ "مقام محمود" وہ جگہ ہے جہاں میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دائیں طرف کھڑا ہوں گا اور وہ سب سے بڑا شرف واعزاز ہوگا جو میرے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوگا، اور الاول تا آخر پوری کائنات مجھے عطا ہونے والے اس شرف واعزاز پر رشک کرے گی۔ پس یہ ارشاد گرامی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ ہمارے حضرت محمدؐ پوری کائنات حتیٰ کہ انبیاء رسول اور تمام مقربین پر فضیلت رکھتے ہیں۔

پلصراط پر اہل ایمان کی شناخت

(۲۸) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شِعَارُ الْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلَى الصِّرَاطِ رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن پلصراط پر سے گزرتے وقت اہل ایمان کی علامت، یہ الفاظ ہوں گے رب سلّم سلّم۔ (پروردگار بچائیو، پروردگار بچائیو)" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "شعار" (جس کا ترجمہ علامت کیا گیا ہے) دراصل اسی مخصوص اصطلاحی لفظ یا جملہ کو کہتے ہیں جو فوج والے آپس میں ایک دوسرے کو پہچاننے کے لئے، یا سفر کرنے والے دوران سفر ایک دوسرے کو شناخت کرنے کے لئے استعمال کریں، چنانچہ قیامت کے دن پلصراط پر گزرتے وقت اہل ایمان کی شناخت و پہچان کے لئے رب سلم رب سلم (پروردگار بچائیو) کے الفاظ ان کی زبان پر ہوں گے اور ہر امت کے لوگ جو اپنے پیغمبر اور رسول کے متبع اور تابعدار تھے، یہ الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھیں گے، تاہم زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس طرح کے شناختی الفاظ صرف مؤمنین کاملین کا "شعار" ہوں گے۔ یعنی باعمل علماء، شہدا، اور صالحین کہ جن کا انبیاء اور رسولوں کی اتباع کے صدقہ شفاعت کا مرتبہ حاصل ہوگا

ابن مردویہؒ نے حضرت عائشہ سے بطریق مرفوع یہ نقل کیا ہے کہ "قیامت کے دن جب لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا تو اس وقت اہل ایمان کا شعار لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ہوگا نیز شیرازیؒ نے حضرت عائشہؓ ہی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "قیامت کے دن اس دن کے ہولناک اندھیروں میں اہل ایمان کا شعار لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ہوگا۔

گناہ کبیرہ کی شفاعت صرف اسی اُمت کے لئے مخصوص ہوگی

(۱۹) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَآئِرِ مِنْ اُمَّتِیْ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنْ جَابِرٍ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا گناہ کبیرہ کرنے والوں کے حق میں میری شفاعت صرف میری اُمت کے لوگوں کے لئے مخصوص ہوگی (ترمذیؒ، ابوداؤد) اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ کہ کبیرہ گناہوں کی معافی کی میری شفاعت صرف میری اُمت کے لوگوں کے حق میں مخصوص ہوگی۔ دوسری امتوں کے لوگوں کے لئے نہیں ہوگی۔

طیبیؒ نے کہا ہے کہ یہاں جس شفاعت کا ذکر ہے اس سے وہ شفاعت مراد ہے عذاب سے نجات اور خلاصی دلانے کے لئے ہوگی، ورنہ وہ شفاعت جو درجات کی بلندی اور اعزاز و اکرامات میں اضافہ کے لئے ہوگی اتقیاء" اولیاء اور صلحاء کے حق میں بھی ثابت ہے۔

شفاعت کا ثبوت اور اس کی قسمیں: "شفاعت کے بارے میں جو اصولی باتیں ابتداء باب میں بھی گزر چکی ہیں۔ کچھ یہاں بھی نقل کر دینا موزوں معلوم ہوتا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک قیامت کے دن شفاعت و سفارش کا ہونا اس آیت سے ثابت ہے۔

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَہٗ قَوْلًا۔

"اس دن کسی کی سفارش کچھ فائدہ نہ دے گی مگر اس شخص کی جسے خدا اجازت دے اور اس کی بات کو پسند فرمائے۔"

نیز اس بارے میں اتنی زیادہ احادیث منقول ہیں کہ وہ سب مل کر حد تواتر کو پہنچتی ہیں اس لئے تمام سلف صالحین (صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین وغیرہ) اور تمام اہل سنت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے، ہاں خوارج اور معتزلہ کے بعض طبقے اس کے منکر ہیں اور وہ قیامت کے دن شفاعت کے قائل نہیں ہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ "شفاعت" کی پانچ قسمیں ہیں پہلی قسم وہ ہے جو صرف آنحضرت ﷺ کے واسطے مخصوص ہے، اس شفاعت کا حق و اذن کسی اور کو حاصل نہیں ہوگا، اور یہ شفاعت وہ ہوگی جس کا تعلق تمام لوگوں کو موقف (میدان حشر میں کھڑے رہنے، کی ہولناکیوں اور پریشانیوں سے چھٹکارا دلا کر حساب و کتاب جلد شروع کرانے سے ہوگا۔ دوسری قسم وہ ہے جو کچھ لوگوں کو حساب کے بغیر جنت میں داخل کر دینے کے لئے ہوگی اور اس شفاعت کا ثبوت بھی صرف ہمارے حضور ﷺ کے لئے منقول ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جو ان لوگوں کے لئے ہوگی جنہیں دوزخ کا مستوجب قرار دیا گیا۔ چنانچہ ان میں سے جن لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ چاہے گا ان کی شفاعت ہمارے حضرت کریں گے چوتھی قسم وہ ہے جو ان لوگوں کے لئے ہوگی جنہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں دوزخ میں ڈالا جا چکا ہوگا، پس ان لوگوں کی شفاعت کے سلسلے میں جو حدیثیں منقول ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ آنحضرت ﷺ، فرشتوں اور اپنے مسلمان بھائیوں کی جانب سے کی جانے والی شفاعت کے نتیجہ میں دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچائے جائیں گے اور پھر آخر میں خود اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت کے تحت ان لوگوں کو عذاب دوزخ سے نجات عطا فرمائے گا، جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہوگا، اور پانچویں قسم وہ ہے جس کا تعلق جنت میں اہل جنت کے درجات میں بلندی اور اعزاز و کرامات میں اضافہ سے ہوگا۔

رحمت عالم کی شان رحمت

(۳۰) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتَانِیْ اٰتٍ مِنْ عِنْدِ رَبِّیْ فَخَیَّرَنِیْ بَیْنَ اَنْ یُّدْخِلَ نِصْفَ اُمَّتِیَ الْجَنَّۃَ وَبَیْنَ الشَّفَاعَۃِ فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَۃَ وَھِیَ لِمَنْ مَّاتَ لَا یُشْرِکُ بِاللّٰہِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عوف بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے فرمایا! "(اللہ تعالیٰ کے پاس سے) ایک فرشتہ میرے پاس آیا اور اس نے (بارگاہ رب العزت کی جانب سے) مجھے ان دو باتوں میں سے ایک بات چن لینے کا اختیار دیا کہ یا تو میری آدھی اُمت جنت میں داخل ہو جائے یا (سب کے حق میں) شفاعت کا حق مجھے حاصل ہو۔ پس میں نے اپنی پوری اُمت کے حق میں، شفاعت کا حق حاصل ہونے کو چن لیا (تاکہ بلا استثناء سب ہی مؤمن و مسلمان اس سے فیضیاب ہوں اور کوئی بھی محروم نہ رہے) چنانچہ میری شفاعت (میری اُمت میں سے) ہر اس شخص کے لئے طے شدہ ہے جس نے اس حال میں اپنی جان آفرین کے سپرد کی ہو کہ اللہ کے شرک میں مبتلا نہیں تھا حاصل یہ کہ قیامت کے دن تمام اہل ایمان کو میری شفاعت نصیب ہونا یقینی ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

شفاعت کا ذکر

(۳۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی الْجَذْعَآءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِشَفَاعَةِ رَجُلٍ مِّنْ اُمَّتِیْ اَکْثَرُ مِنْ بَنِیْ تَمِیْمٍ۔ (رواه الترمذی والدارمی وابن ماجة)

"اور حضرت عبداللہ بن ابی جدعاءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا! میری اُمت کے ایک (بزرگ و صالح، شخص کی شفاعت سے بنی تمیم کے آدمیوں کی تعداد سے بھی زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔" (ترمذیؒ، دارمی، ابن ماجہؒ)

تشریح: "بنو تمیم" ایک بہت بڑے قبیلے کا نام تھا، جس کے افراد کثرت و زیادتی کے اعتبار سے بطور مثال پیش کیے جاتے تھے۔ حاصل یہ کہ جب اس اُمت کے ایک اچھے آدمی کی شفاعت کے نتیجہ میں اتنے زیادہ لوگ جنت میں داخل کیے جائیں گے تو اندازہ کرنا چاہئے کہ اس اُمت میں اچھے لوگوں کی کتنی زیادہ تعداد ہوگی اور ان میں سے ہر ایک شفاعت کرے گا، پس ان سب کی شفاعتوں کے نتیجہ میں اُمت محمدی کے لوگوں کی کتنی بڑی تعداد جنت میں داخل کی جائے گی۔

بعض حضرات نے "میری اُمت کے ایک شخص" کو متعین کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے حضرت عثمانؓ کی ذات مراد ہے، بعض نے حضرت اویس قرنیؒ کا نام لیا ہے اور کچھ نے کہا ہے کہ یہ تعین مشکل ہے اور کوئی بھی شخص مراد ہو سکتا ہے، اسی قول کو زین العرب نے حدیث کے مفہوم سے زیادہ قریب قرار دیا ہے۔

(۳۲) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْفِئَامِ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْقَبِیْلَةِ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْعُصْبَةِ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلرَّجُلِ حَتّٰی یَدْخُلُوا الْجَنَّةَ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: میری اُمت میں سے (جن لوگوں کو شفاعت کا حق و اذن حاصل ہوگا، جیسے علماء، شہدا اور صلحاء، ان میں سے) کوئی تو (اپنے متعلقین کی) کئی جماعتوں کی شفاعت کرے گا، کوئی ایک عصبہ (کے لوگوں کے برابر اپنے متعلقین) کی شفاعت کرے گا، اور کوئی اپنے متعلق) صرف ایک ہی آدمی کی سفارش کرے گا، غرضیکہ اسی طرح ہر ایک کی شفاعت کے نتیجہ میں ساری اُمت جنت میں داخل ہو جائے گی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "قبیلہ" ویسے تو بڑے خاندان، یا ایک باپ کی کئی پشتوں کے بیٹوں کو کہتے ہیں، لیکن عام طور پر اس لفظ کا اطلاق "بہت زیادہ لوگوں" پر ہوتا ہے اور عصبہ دس سے چالیس تک افراد کی ٹولی کو کہتے ہیں۔

حساب و کتاب کے بغیر جنت میں جانے والے

(۳۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَعَدَنِیْ اَنْ یُّدْخِلَ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِیْ اَرْبَعَ مِائَةِ اَلْفٍ بِلَا حِسَابٍ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ وَزِدْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَهٰکَذَا فَحَثَا بِکَفَّیْهِ وَ جَمَعَهُمَا فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ زِدْنَا یَا

رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ وَ ھٰکَذَا فَقَالَ عُمَرُ دَعْنَا یَا اَبَا بَکْرٍ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ وَّمَا عَلَیْکَ اَنْ یُّدْخِلَنَا اللّٰہُ کُلَّنَا الْجَنَّۃَ فَقَالَ عُمَرُ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ اِنْ شَاءَ اَنْ یُّدْخِلَ خَلْقَہُ الْجَنَّۃَ بِکَفٍّ وَّاحِدٍ فَعَلَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَدَقَ عُمَرُ۔

(رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "خدا عزوجل نے مجھ سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ میری اُمت میں سے چار لاکھ آدمیوں کو بلا حساب و کتاب (اور مواخذہ و عذاب میں مبتلا کیے بغیر) جنت میں داخل کرے گا۔" حضرت ابوبکرؓ نے (یہ ارشاد سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہماری اس تعداد میں اضافہ کر دیجئے (یعنی اللہ تعالیٰ سے اس تعداد میں اور اضافہ کرنے کی درخواست کیجئے، یا یہ کہ پروردگار نے آپ ﷺ سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے اس کو بڑھا کر بیان کیجئے) کیونکہ آپ ﷺ رحمت خداوندی پر اعتماد کر کے ہم سے جتنا زیادہ سے زیادہ بیان کر دیں گے اللہ تعالیٰ اس کو پورا فرمائے گا) آپ ﷺ نے فرمایا "اچھا، اتنا اور زیادہ" (یہ کہہ کر) آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں کو یکجا کر کے چلو بنایا حضرت ابوبکرؓ نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہماری اس تعداد و مقدار میں اور اضافہ کر دیجئے۔ آپ ﷺ نے پھر (چلو بنا کر) کہا کہ "اچھا اتنا اور زیادہ" حضرت عمرؓ بھی اس مجلس میں موجود تھے، انہوں نے محسوس کر کے کہ حضرت ابوبکرؓ (بس اب) ہمیں ہمارے حال پر رہنے دیجئے (یعنی اتنی رعایت نہ کرائیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے کرم عنایت ہی پر اعتماد کر کے بیٹھ جائیں اور عذاب خداوندی کے خوف سے اس طرح بے فکر ہو جائیں کہ عمل کرنا ہی ترک کر دیں، حضرت ابوبکرؓ نے (یہ سن کر) کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم سب کو (بغیر حساب و مواخذہ کے) جنت میں بھیج دے تو تمہارا کیا نقصان ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ اگر اللہ عزوجل اپنی ساری مخلوق کو جنت میں داخل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے (پھر بار بار اضافہ کی درخواست کرنے کی کیا ضرورت ہے) نبی کریم ﷺ نے (حضرت عمرؓ کی یہ بات سن کر) فرمایا کہ "عمرؓ نے بالکل سچ کہا۔" اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "(یہ کہہ کر) آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو یکجا کر کے چلو بنایا" یعنی ابوبکرؓ کی درخواست پر آنحضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چلو بنا کر گویا ان کے آگے کیا اور فرمایا کہ اتنے اور لوگوں کا اضافہ کرتا ہوں! اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ آپ ﷺ کا چلو بنانا اور یہ کہنا کہ "اچھا اتنا اور زیادہ" دراصل حق تعالیٰ کے فعل کی حکایت کے طور پر تھا، یعنی یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ میں نے بلا حساب جنت میں جانے والوں کی مذکورہ تعداد متعین طور پر بیان نہیں کی ہے بلکہ اس تعداد سے "کثرت" مراد ہے، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ اس طرح چلو بھر کر یعنی بیشمار اور بے تعداد لوگوں کو جنت میں داخل کرے گا اس لئے حدیث کے شارحین نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر چلو بنانے کی تمثیل اس حقیقت کے پیش نظر اختیار کی کہ دل کھول کر دینے والے کی شان یہی ہوتی ہے کہ جب اس سے زیادہ دینے کی درخواست کی جاتی ہے تو وہ تعداد و مقدار سے صرف نظر کر کے چلو بھر بھر کر بے حساب دیتا ہے۔ پس چلو بھر کر دینا" دراصل ایک تمثیل ہے جو زیادہ سے زیادہ دینے کی شان کو ظاہر کرتی ہے۔

اس حدیث میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے تعلق سے جو کچھ ذکر ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مذکورہ مسئلہ میں ان دونوں کے درمیان کوئی ذہنی و فکری اختلاف تھا، بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو کچھ کہا وہ اظہار عجز و بیچارگی، رحمت خداوندی کے تئیں بھرپور امیدواری اور نیازمندی اور درخواست گزاری کے قبیل سے تھا اور حضرت عمرؓ نے جو کچھ کہا وہ مصلحت و حکمت اور تسلیم و رضا کے قبیل سے تھا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے دونوں کی رعایت ملحوظ رکھی کہ پہلے تو حضرت ابوبکرؓ کی درخواست کو قابل اعتناء قرار دیا اور ان کو وہ جواب نہیں دیا جو حضرت عمرؓ کی تصدیق کر کے ان کو بھی مزید پسندیدگی عنایت فرما دی! اس بات کو ایک دوسرے نکتہ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی درخواست کا مثبت جواب دے کر گویا یہ ظاہر فرمایا کہ عمل کے راستہ پر لگنے اور دین و شریعت کی طرف متوجہ رہنے میں ایک بڑا دخل "بشارت کا بھی ہے، لہٰذا آپ ﷺ نے اس بشارت کو (کہ اللہ تعالیٰ ایک

بہت بڑی تعداد کو بلا حساب جنت میں داخل کرے گا) اور زیادہ وسعت عطا فرمائی، پھر آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کے قول کی تصدیق کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ........ عمرؓ نے جو بات کہی ہے وہ بشارت ہی ہے بلکہ پہلی بشارت سے بھی بڑی بشارت ہے۔ اس اعتبار سے دونوں کا مافی الضمیر ایک ہی تھا۔

گناہ گار لوگ کس طرح اپنی شفاعت کرائیں گے

(۳۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَفُّ اَهْلُ النَّارِ فَيَمُرُّ بِهِمُ الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ يَا فُلَانُ اَمَا تَعْرِفُنِيْ اَنَا الَّذِيْ سَقَيْتُكَ شَرْبَةً وَّقَالَ بَعْضُهُمْ اَنَا الَّذِيْ وَهَبْتُ لَكَ وُضُوْءً فَيَشْفَعُ لَهُ فَيُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! "اہل ایمان میں سے) جو لوگ (اپنے گناہوں کے سبب) دوزخی قرار دیئے جا چکے ہوں گے وہ اہل جنت یعنی علماء (اخیار اور صلحاء و ابرار کے راستوں میں) صف باندھ کر کھڑے رہتے ہیں) اور پھر جب ایک جنتی ان کے سامنے سے گزرے گا تو ان دوزخیوں میں سے ایک شخص (اس جنتی کا نام لے کر) کہے گا اے فلانے! کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟ میں وہ شخص ہوں جس نے ایک مرتبہ تمہیں پانی پلایا تھا انہیں میں سے کوئی شخص یہ کہے گا کہ میں وہی آدمی ہوں جس نے ایک مرتبہ تمہیں وضو کے لئے پانی دیا تھا وہ جنتی (یہ سن کر) اس کی شفاعت کرے گا اور اس کو جنت میں داخل کرائے گا۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ فاسق و گناہ گار اگر اس دنیا میں اہل دین اور ارباب طاعت و تقویٰ کی کوئی خدمت و امداد کریں گے تو اس کا بہتر ثمرہ عقبیٰ میں پائیں گے اور ان کی مدد و شفاعت سے جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

مظہرؒ نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ گویا اس امر کی ترغیب دی ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں اور خصوصاً بزرگ و نیک لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور مروت و احسان کا برتاؤ کرنا چاہئے اور جب بھی ان کی ہم نشینی و صحبت میسر ہو جائے اس کو اختیار کرنے کا موقع گنوانا نہ چاہئے کیونکہ ان کی صحبت اور محبت دنیا میں حصول زینت و پاکیزگی اور آخرت میں حصول نور کا باعث ہے۔

رحمت خداوندی کے دو مظاہر

(۳۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ رَجُلَيْنِ مِمَّنْ دَخَلَ النَّارَ اشْتَدَّ صِيَاحُهُمَا فَقَالَ الرَّبُّ تَعَالٰى اَخْرِجُوْهُمَا فَقَالَ لَهُمَا لِاَيِّ شَيْءٍ اشْتَدَّ صِيَاحُكُمَا قَالَا فَعَلْنَا ذٰلِكَ لِتَرْحَمَنَا قَالَ فَاِنَّ رَحْمَتِيْ لَكُمَا اَنْ تَنْطَلِقَا فَتُلْقِيَا اَنْفُسَكُمَا حَيْثُ كُنْتُمَا مِنَ النَّارِ فَيُلْقِيْ اَحَدُهُمَا نَفْسَهٗ فَيَجْعَلُهَا اللّٰهُ عَلَيْهِ بَرْدًا وَّسَلَامًا وَّيَقُوْمُ الْاٰخَرُ فَلَا يُلْقِيْ نَفْسَهٗ فَيَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ تَعَالٰى مَامَنَعَكَ اَنْ تُلْقِيَ نَفْسَكَ كَمَا اَلْقٰى صَاحِبُكَ فَيَقُوْلُ رَبِّ اِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ لَّا تُعِيْدَنِيْ فِيْهَا بَعْدَ مَا اَخْرَجْتَنِيْ مِنْهَا فَيَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ لَكَ رَجَاءُكَ فَيُدْخَلَانِ جَمِيْعًا الْجَنَّةَ بِرَحْمَةِ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! "(اہل ایمان میں سے) جو لوگ (اپنے گناہوں کی پاداش میں) دوزخ میں داخل ہوں گے ان میں سے دو آدمی بہت زیادہ شور مچائیں گے (یعنی رونا دھونا اور آہ و فریاد شروع کر دیں گے اور خوب چیخیں چلائیں گے) پروردگار (دوزخ کے فرشتوں کو) حکم دیگا کہ ان دونوں کو باہر نکالو اور جب وہ باہر آئیں گے تو) ان سے فرمائے گا کہ کیوں اس قدر چیخ چلا رہے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اس لئے چیخ چلا رہے تھے تاکہ آپ کی رحمت ہماری طرف متوجہ ہو جائے (اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپ اس شخص کو پسند کرتے ہیں جو آپ کے آگے روئے دھوئے اور آہ و فریاد کرے) اللہ تعالیٰ فرمائے گا تمہارے حق میں میری رحمت یہی ہے کہ تم واپس جاؤ اور دوزخ میں جہاں تھے وہیں پڑے رہو۔" ان میں سے ایک شخص تو (یہ سنتے ہی کامل اطاعت اور رضائے الٰہی کی طلب میں)

واپس ہو جائے گا اور خود کو دوزخ کی آگ میں ڈال دے گا اور اللہ تعالیٰ اس آگ کو اس کے لئے ٹھنڈا کر دے گا (کہ جیسا کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کو گل و گلزار بنا دیا تھا) اور دوسرا شخص (اپنے کو اس معاملہ میں بالکل بے بس پاتا ہوا اور اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر کامل یقین رکھتے ہوئے) وہیں کھڑا رہے گا اور خود کو آگ میں نہیں ڈالے گا! اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے خود کو آگ میں کیوں نہیں ڈالا جب کہ تیرا ساتھی (میرا حکم سنتے ہی چلا گیا اور) آگ میں کود پڑا؟ وہ عرض کرے گا کہ پروردگار میں تو اسی امید پر قائم ہوں کہ آپ نے جب مجھے دوزخ سے باہر بلوا لیا تو اب: دوبارہ وہاں نہیں بھیجیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا! تو نے جو امید قائم کی ہے وہ تیرے حق میں پوری کی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ دونوں شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت کے صدقہ میں ایک ساتھ جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "تمہارے حق میں میری رحمت یہی ہے کہ تم واپس جاؤ........ الخ کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ دوزخ میں واپس جا کر سپرد آگ ہونے کو رحمت پر کس اعتبار سے حمل کیا گیا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہو گا کہ یہ ارشاد اصل سبب کو سبب پر حمل کرنے کے اسلوب سے تعلق رکھتا ہے! وضاحت کے ساتھ اس بات کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کو دوزخ میں ان کے اس قصور کی پاداش میں داخل کیا جائے گا کہ انہوں نے اس بات کی اطاعت کے حکم کے ذریعہ کہ وہ دوزخ میں واپس جا کر اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر دیں اس امر پر تنبیہ کی جائے گی کہ رحمت خداوندی کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جو ہر حالت میں اس کے حکم کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔

"تو نے جو امید قائم کی ہے وہ تیرے حق میں پوری کی جاتی ہے۔" سے یہ ثابت ہوا کہ بندہ کا پروردگار پر امید باندھنا اس کے عطاء و کرم کے حصول میں بہت موثر ہے، خواہ وہ بندہ اپنے عجز و ناتوانی کے سبب اطاعت و فرمانبرداری کے دائرہ سے باہر ہی نکلا ہوا کیوں نہ ہو۔

پل صراط پر سے گزرنے کا حکم

(۳۶) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرِدُ النَّاسُ النَّارَ ثُمَّ يَصْدُرُوْنَ مِنْهَا بِاَعْمَالِهِمْ فَاَوَّلُهُمْ كَلَمْحِ الْبَرْقِ ثُمَّ كَالرِّيْحِ ثُمَّ كَحُضْرِ الْفَرَسِ ثُمَّ كَالرَّاكِبِ فِيْ رَحْلِهٖ ثُمَّ كَشَدِّ الرَّجُلِ ثُمَّ كَمَشْيِهٖ۔

(رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "لوگ یعنی اہل ایمان (پلصراط کے اوپر سے گزرنے کے وقت کہ جو دوزخ کے اوپر رکھا ہو گا آگ پر حاضر ہوں گے (یعنی اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے) اور پھر اپنے اپنے اعمال کے مطابق اس سے نجات پائیں گے (اور پل صراط کو آسانی کے ساتھ یا پریشانی سے عبور کر لیں گے) چنانچہ ان میں اول اور سب سے افضل لوگ وہ ہوں گے جو (پلصراط پر سے بجلی) کوندے کی طرح گزر جائیں گے۔ پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) ہوا کے جھونکے کی طرح، پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) گھوڑے کی دوڑ کی مانند، پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) اپنے اونٹ پر سوار کی مانند پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) آدمی کے دوڑنے کی مانند اور پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) آدمی کے (معمول کے مطابق) پیدل چلنے کی مانند (گزریں گے)"۔ اس روایت کو ترمذیؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حوض کوثر کی وسعت

(۳۷) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَمَامَكُمْ حَوْضِيْ مَابَيْنَ جَنْبَيْهِ كَمَابَيْنَ جَرْبَآءَ وَاَذْرُحَ قَالَ بَعْضُ الرُّوَاةِ هُمَا قَرْيَتَانِ بِالشَّامِ بَيْنَهُمَا مَسِيْرَةُ ثَلٰثِ لَيَالٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ فِيْهِ اَبَارِيْقُ كَنُجُوْمِ السَّمَآءِ مَنْ وَّرَدَهٗ فَشَرِبَ

مِنْهُ لَمْ يَظْمَأْ بَعْدَهَا اَبَدًا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "تمہارے آگے (قیامت کے دن) میرا حوض کوثر (ظاہر ہونے والا) ہے جس کے دونوں کناروں کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے جتنا جَرْبَا اور اَذْرُح کا درمیانی فاصلہ ہے۔" کسی راوی کا کہنا ہے کہ جَرْبَا اور اَذْرُح ملک شام میں دو بستیاں ہیں جن کے درمیان تین دن کی مسافت ہے۔ اور ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "(اس حوض) کے دونوں کناروں پر آب خورے رکھے ہوں گے جو (چمک دمک اور کثرت کے اعتبار سے) آسمان کے ستاروں کی مانند ہوں گے۔ جو شخص اس حوض پر آئے گا اور اس کا پانی پیئے گا وہ پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بعض محققینؒ نے لکھا ہے کہ ملک شام میں جَرْبَا ایک بستی کا نام ہے جو دراصل اَذْرُح کے بالکل قریب واقع ہے لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جَرْبَا اور اَذْرُح کے درمیان تین دن کی مسافت ہے! اس صورت میں چونکہ حدیث کا مفہوم گنجلک ہو جاتا ہے اس لئے محدثین نے یہ تحقیق کی ہے کہ اس حدیث کے کسی راوی کے وہم میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے وہ الفاظ نقل نہیں ہوئے جن سے حوض کوثر کی وسعت کو ظاہر کرنا مقصود تھا، چنانچہ دار قطنی کی روایت دیکھنے سے اس بات کی تائید ہوتی ہے جو یوں ہے۔

یعنی میری حوض کے دونوں کناروں کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے جتنا کہ مدینہ اور جوربا و اذرح کے درمیان فاصلہ ہے۔

شفاعت اور پلصراط کا ذکر

(۳۸) وَعَنْ حُذَيْفَةَ ؓ وَاَبِيْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى النَّاسَ فَيَقُوْمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى تُزْلَفَ لَهُمُ الْجَنَّةُ فَيَأْتُوْنَ اٰدَمَ فَيَقُوْلُوْنَ يَا اَبَانَا اسْتَفْتِحْ لَنَا الْجَنَّةَ فَيَقُوْلُ وَهَلْ اَخْرَجَكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا خَطِيْئَةُ اَبِيْكُمْ لَسْتُ بِصَاحِبِ ذٰلِكَ اِذْهَبُوْا اِلٰى ابْنِيْ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلِ اللّٰهِ قَالَ فَيَقُوْلُ اِبْرَاهِيْمُ لَسْتُ بِصَاحِبِ ذٰلِكَ اِنَّمَا كُنْتُ خَلِيْلًا مِنْ وَّرَآءَ وَرَآءَ اِعْمَدُوْا اِلٰى مُوْسَى الَّذِيْ كَلَّمَهُ اللّٰهُ تَكْلِيْمًا فَيَأْتُوْنَ مُوْسٰى فَيَقُوْلُ لَسْتُ بِصَاحِبِ ذٰلِكَ اِذْهَبُوْا اِلٰى عِيْسٰى كَلِمَةِ اللّٰهِ وَرُوْحِهٖ فَيَقُوْلُ عِيْسٰى لَسْتُ بِصَاحِبِ ذٰلِكَ فَيَأْتُوْنَ مُحَمَّدًا فَيَقُوْمُ فَيُؤْذَنُ لَهٗ وَتُرْسَلُ الْاَمَانَةُ وَالرَّحِمُ فَتَقُوْمَانِ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا۔ فَيَمُرُّ اَوَّلُكُمْ كَالْبَرْقِ قَالَ قُلْتُ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ اَيُّ شَيْءٍ كَمَرِّ الْبَرْقِ قَالَ اَلَمْ تَرَوْا اِلَى الْبَرْقِ كَيْفَ يَمُرُّ وَيَرْجِعُ فِيْ طَرْفِ عَيْنٍ ثُمَّ كَمَرِّ الرِّيْحِ ثُمَّ كَمَرِّ الطَّيْرِ وَشَدِّ الرِّجَالِ تَجْرِيْ بِهِمْ اَعْمَالُهُمْ وَنَبِيُّكُمْ قَائِمٌ عَلَى الصِّرَاطِ يَقُوْلُ رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ حَتّٰى تَعْجِزَ اَعْمَالُ الْعِبَادِ حَتّٰى يَجِيْءَ الرَّجُلُ فَلَا يَسْتَطِيْعُ السَّيْرَ اِلَّا زَحْفًا قَالَ وَفِيْ حَافَتَيِ الصِّرَاطِ كَلَالِيْبُ مُعَلَّقَةٌ مَاْمُوْرَةٌ تَاْخُذُ مَنْ اُمِرَتْ بِهٖ فَمَخْدُوْشٌ نَاجٍ وَمَكْدُوْسٌ فِي النَّارِ وَالَّذِيْ نَفْسُ اَبِيْ هُرَيْرَةَ بِيَدِهٖ اِنَّ قَعْرَ جَهَنَّمَ لَسَبْعِيْنَ خَرِيْفًا (رواہ مسلم)

"اور حضرت حذیفہؓ و حضرت ابوہریرہ دونوں نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن) بابرکت و بلند قدر پروردگار (میدان حشر میں) لوگوں کو جمع کرے گا اور پھر تمام مومن (حساب کتاب اور آخری فیصلہ کے انتظار میں) کھڑے ہوں گے کہ جنت کو ان کے قریب کر دیا جائے گا پس (ہر اُمت کے خاص خاص) مومن حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اے ہمارے باپ! ہمارے لئے جنت کو کھول دیجئے (تاکہ ہم اپنی اس ابدی آرام گاہ میں داخل ہو جائیں) حضرت آدم علیہ السلام ان کو جواب دیں گے کہ (کیا تم نہیں جانتے) تمہیں جنت سے تمہارے باپ ہی کے گناہ نے نکلوایا تھا (لہٰذا) اس کام (یعنی تمہارے حق میں شفاعت کرنے اور جنت کھلوانے) کا اہل میں نہیں ہوں، تم لوگ میرے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ جو اللہ کے دوست (اور اللہ کے رسولوں میں افضل اور ناتم الانبیاء کے جد اعلیٰ، ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا (لوگ یہ سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے ان سے وہی عرض کریں گے جو انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے عرض کیا تھا) حضرت ابراہیم بھی ان کو یہی جواب دیں گے کہ اس کام کا اہل میں نہیں

ہوں، میں خدا کا دوست آج سے پہلے پہلے ہی تھا، تم لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہم کلامی کے شرف سے نوازا ہے چنانچہ وہ لوگ حضرت موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور وہ بھی یہی جواب دیں گے کہ اس کام کا اہل میں نہیں ہوں، تم لوگ عیسیٰ کے پاس جاؤ جو خدا کا کلمہ اور اس کی روح ہیں! چنانچہ (وہ لوگ حضرت عیسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور) حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی جواب دیں گے کہ اس کام کا اہل میں نہیں ہوں آخر کار (اس وقت یہ بات واضح ہو جائے گی کہ شفاعت کا انحصار صرف خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے کیونکہ بارگاہ رب العزت میں سب سے زیادہ قرب وعزت انہی کو حاصل ہے اور تمام انبیاء ورسولوں میں سب سے زیادہ ممتاز ومشہور انہی کی ذات ہے، چنانچہ وہ لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئیں گے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم (عرش الٰہی کے دائیں جانب) کھڑے ہو کر تمام نوع انسانی کو میدان حشر کی سختیوں اور پریشانیوں سے راحت دلانے کی شفاعت کرنے کی اجازت طلب کریں گے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت عطا کی جائے گی (اور جیسا کہ پیچھے گزرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ رب العزت میں پیش ہو کر سجدہ میں گر پڑیں گے اور پھر حکم خداوندی پر سر اٹھائیں گے اور عرض ومعروض کریں گے) پھر جب حساب وکتاب کا مرحلہ گزر جائے گا اور تمام لوگ پل صراط کے اوپر سے گزرنے والے ہوں گے تو امانت اور رحم (ناتے) کو (صورت دے کر) لایا جائے گا اور یہ دونوں (اپنا حق اور انصاف مانگنے کے لئے) پلصراط کے دائیں بائیں دونوں طرف کھڑے ہو جائیں گے، پھر (پلصراط سے لوگوں کا گزرنا شروع ہو گا تو) ایک طبقہ جو تم میں سب سے افضل ہو گا اور سب سے پہلے گزرے گا بجلی کی طرح (نہایت سرعت سے) پل کو پار کر جائے گا۔" حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ (یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ!) آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر میرے ماں باپ فدا ہوں، بجلی کی طرح گزرنے کی صورت کیا ہو گی! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کیا تم نہیں دیکھتے کہ بجلی کی چمک کس طرح گزر جاتی ہے اور پل جھپکتے ہی واپس آجاتی ہے (مطلب یہ ہے) کہ وہ لوگ پلصراط پر سے بس اسی طرح گزر جائیں گے جیسے پلک جھپک گئی ہو) پھر (کچھ لوگ) پرندوں کی طرح اور (کچھ لوگ) مردوں کے دوڑنے (یا پیادہ چلنے والوں کی طرح) گزریں گے اور ان کو ان کے اعمال کی طاقت ونورانیت اور پاکیزگی آگے بڑھائے گی (یعنی جس کے اعمال جس درجہ کے ہوں گے اس کے گزرنے کی رفتار بھی اسی درجہ کی ہو گی) اور (اس وقت جب کہ مسلمان پلصراط کے اوپر سے گزر رہے ہوں گے) تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پلصراط پر کھڑے ہوئے یہ کہے جا رہے ہوں گے کہ۔

(یعنی پروردگار! ان کو سلامتی کے ساتھ گزار دے ان کو دوزخ میں گرنے سے محفوظ رکھ) اور پھر کچھ بندوں کے اعمال عاجز ہوں گے، یعنی جن بندوں کے اعمال ناقص وکمتر ہوں گے یا وہ ایسے اعمال نہ رکھتے ہوں گے جن کی بنا پر انہیں پل پار کرنے میں مدد ملے تو وہ لوگ پل پر سے گزرتے وقت سخت قسم کی پریشانیوں اور رکاوٹوں میں گھر جائیں گے) یہاں تک کہ ایک شخص (جو اپنے اعمال کی بہت زیادہ خرابی کی وجہ سے چلنے پر بالکل ہی قادر نہیں ہو گا) گھسٹتا ہوا اور کولہوں کے بل سرکتا ہوا آئے گا۔" اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اور پلصراط کے دونوں طرف آنکڑے لٹکے ہوں گے اور ان کو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) یہ حکم دیا گیا ہو گا کہ وہ ہر اس شخص کو گرفت میں لے لیں جو قابل گرفت قرار پا چکا ہے، چنانچہ وہ آنکڑے ایسے لوگوں کو پکڑ لیں گے اور پھر) ان میں سے کچھ لوگ تو ان آنکڑوں کی مصیبت جھیل کر اور زخمی ہو کر (دوزخ کی آگ سے) نجات پا جائیں گے اور کچھ لوگوں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں ابوہریرہؓ کی جان ہے دوزخ کا گہراؤ ستر برس کی مسافت کی راہ کے برابر ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جنت کو ان کے قریب کر دیا جائے گا۔" کے ذریعہ سورۂ تکویر کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝۔

"اور قیامت کے دن میدان حشر میں) جنت جب قریب لائی جائے گی تب ہر شخص معلوم کرے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان کو یہی جواب دیں گے کہ اس کام کا اہل میں نہیں ہوں........ الخ کے ضمن میں ایک شارحؒ نے لکھا

ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ بات اظہار تواضع وانکسار کے طور پر کہیں گے کہ اس بلند درجہ کا لائق میں نہیں ہوں گویا ان کا مطلب یہ ہوگا کہ پروردگار کی جانب سے مجھے جو بھی فضیلت و خصوصیت اور عزّت عطا ہوئی ہے وہ حضرت جبرائیل کے واسطہ سے مجھ تک پہنچی ہے، لہٰذا تمہیں موسیٰ علیہ السلام کے پاس جانا چاہئے کیونکہ ان کو عطا ہونے والی فضیلت و خصوصیت اور عزت یعنی پروردگار سے ہمکلامی کی سعادت بغیر کسی واسطہ کے براہ راست حاصل ہوئی ہے۔

وہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے" اس موقع پر یہ کہنے کے بجائے کہ وہ لوگ میرے پاس آئیں گے" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسم شریف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" میں حمد کے معنی ہیں اور اس کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دن "مقام محمود" پر کھڑے ہوں گے جو مقام شفاعت ہے۔

"ایک طبقہ جو تم میں سب سے پہلے گزرے گا......الخ" کے بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس طبقہ سے انبیاء کا طبقہ مراد ہے، تاہم یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس اُمت کے اولیاء و صلحاء کا طبقہ مراد ہو۔

دوزخ سے نکال کر جنّت میں پہنچائے جانے والے لوگ کس طرح جلد تر و تازہ اور توانا ہو جائیں گے

(۳۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ قَوْمٌ بِالشَّفَاعَةِ كَاَنَّهُمُ الثَّعَارِيْرُ قُلْنَا مَا الثَّعَارِيْرُ قَالَ اِنَّهُ الضَّغَابِيْسُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ لوگ جو شفاعت کی بناء پر دوزخ سے نکالے جائیں گے ان کی مثال ایسی ہوگی جیسے وہ "ثعاریر" ہیں۔" ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! "ثعاریر" سے کیا مراد ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ کھیرے ککڑیاں ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: کھیرے ککڑیاں "ضغابیس" کا ترجمہ کیا گیا ہے! مطلب یہ ہے کہ جب ان لوگوں کو دوزخ کی آگ سے باہر لایا جائے گا تو وہ جل کر کوئلہ ہو گئے ہوں گے، لیکن جب انہیں نہر حیات میں غوطہ دلایا جائے گا تو وہ اس طرح جھٹ پٹ تر و تازہ اور توانا ہو جائیں گے جس طرح کھیرے ککڑیاں یا اسی طرح کی دوسری سبزیوں کے درخت، بہت جلد بڑھتے اور ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔

کون کون لوگ شفاعت کریں گے؟

(۴۰) وَعَنْ عُثْمَانَ ابْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَشْفَعُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثَلٰثَةٌ اَلْاَنْبِيَآءُ ثُمَّ الْعُلَمَآءُ ثُمَّ الشُّهَدَآءُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عثمان ابن عفانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن تین طرح کے لوگ شفاعت کریں گے، اول انبیاء، پھر (باعمل) علماء اور پھر شہداء۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "اور پھر شہداء" میں جو عطف ہے اس سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ باعمل علماء، شہداء سے افضل ہیں، اس کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جس کو شیرازیؒ نے نقل کیا ہے۔

یوزن یوم القیامۃ مداد العلماء و دم الشھداء فترجح مداد العلماء علی دم الشھداء۔

"قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہداء کے خون کو تولا جائے گا تو شہداء کے خون پر علماء کی روشنائی بھاری پڑ جائے گی۔"

واضح رہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں شفاعت کرنے والے صرف تین طرح کے لوگوں کی تخصیص محض ان کی برتر فضیلت و بزرگی کی بنا

پر ہے ویسے مسلمانوں میں تمام ہی نیک لوگوں کو شفاعت کا حق حاصل ہوگا، جیسا کہ اس سلسلہ میں منقول متعدد مشہور احادیث سے ثابت ہے، خواہ اس شفاعت کا تعلق گناہوں کی مغفرت سے ہو یا مراتب و درجات کی بلندی سے نیز شفاعت سے انکار صریح بدعت و گمراہی ہے، جیسا کہ خوارج اور بعض معتزلہ نے اختیار کیا ہے۔

بَابُ صِفَةِ الْجَنَّةِ وَاَهْلِهَا

جنّت اور اہل جنّت کے حالات کا بیان

صراح میں لکھا ہے کہ "جنّت" کے معنی ہیں باغ بہشت "جنّت" اصل لغت میں "ڈھانپنے" کے معنی میں آتا ہے۔ اس مناسبت سے پہلے اس لفظ کا اطلاق "سایہ دار درختوں" پر ہوتا تھا جو اپنے نیچے کی چیز کو گویا اپنے سائے میں چھپائے اور ڈھانپتے رہتے ہیں، پھر اس لفظ کو "باغ کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا جو سایہ دار درختوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور پھر آخر میں یہ لفظ "ثواب و انعام ملنے کی جگہ یعنی بہشت" کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا، چنانچہ بہشت کو "جنّت" اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہاں گھنے ہوئے درخت اور باغات ہیں جو ہر چیز کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جنّت کا ذکر

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ رَاَتْ وَلَآ اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ وَاقْرَءُوْآ اِنْ شِئْتُمْ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! "میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کر رکھی ہے کہ (آج تک) نہ کسی آنکھ نے اس (جیسی کسی چیز) کو دیکھا ہے نہ کسی کان نے (اس جیسی خوبیوں کو) سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں (اس کی ماہیت کا تصور تک آیا ہے اگر تم اس بات کی تصدیق چاہو تو یہ آیت پڑھو: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (بخاریؒ و مسلمؒ) کوئی بھی شخص نہیں جانتا (جو بندے شب بیداری کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں) ان کے لئے کیا چیز چھپا کر رکھی گئی ہے جو آنکھ کی ٹھنڈک کا سبب ہے۔"

تشریح: "........ نہ کسی آنکھ نے الخ کے بارے میں بھی یہ احتمال ہے کہ اس چیز (یعنی جنّت) کے مظاہر شکل و صورت آوازیں اور خاطر داریاں مراد ہوں، مطلب یہ کہ وہاں جو اعلیٰ مناظر ہوں گے اور وہاں جو نظر افروز شکلیں اور صورتیں دکھائی دیں گی ان جیسے مناظر اور جیسی شکلیں اور صورتیں اس دنیا میں نہ دیکھی گئی ہیں اور نہ کبھی دیکھی جا سکتی ہیں، اسی طرح وہاں کی آوازوں میں جو مٹھاس، نغمگی اور دلکشی ہوگی، ایسی میٹھی، نغمہ ریز اور دلکش آوازیں اس دنیا میں آج تک نہ کسی کان نے سنی ہیں اور نہ کبھی سنی جا سکتی ہیں، اور ایسے ہی وہاں جو خاطر و مدارت ہوں گی، جو نعمتیں اور لذتیں حاصل ہوں گی، ان کا تصور بھی اس دنیا میں آج تک کسی انسان کے دل میں نہیں آیا ہوگا اور نہ کبھی اس کا کوئی تصور کیا جا سکتا ہے۔

آیت میں جس چیز کو آنکھ کی ٹھنڈک سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے فرحت و شادمانی، چین و راحت اور مقصود مراد پانا ہے! واضح رہے کہ (آنکھ کی ٹھنڈک) میں لفظ قرۃ دراصل قر سے نکلا ہے جس کے معنی ثبات و قرار کے ہیں۔ چنانچہ آنکھ جب اپنی محبوب چیز کو دیکھتی ہے تو قرار پا جاتی ہے اور اس طرح مطمئن ہو جاتی ہے کہ کسی اور طرف مائل نہیں ہوتی اس کے برخلاف جب آنکھ کسی غیر پسندیدہ اور ناگوار چیز کو دیکھتی

ہے اور اس کی محبوب شی سامنے نہیں ہوتی تو وہ پریشان اور کھوئی کھوئی سی رہتی ہے اور کسی ایک سمت قرار پانے کے بجائے ادھر ادھر بھٹکنا شروع کر دیتی ہے ایسے ہی فرحت و سرور اور راحت و اطمینان کی حالت میں آنکھوں کو عجیب طرح کا کیف و سکون اور آرام ملتا ہے جب کہ خوف و غم کی حالت میں وہ متحرک و مضطرب ہو جاتی ہیں۔

یا یہ کہ "قُرَّۃ" کے لفظ "قُرّ" سے مشق ہے جس کے معنی "ٹھنڈک اور خشکی" کے ہیں اس صورت میں کہا جائے گا کہ آنکھ کی ٹھنڈک سے مراد وہ مخصوص لذت و کیف ہے جو محبوب اور پسندیدہ چیز کو دیکھ کر اور اپنا مقصود و مطلوب پا کر آنکھ محسوس کرتی ہے، اس کے بر خلاف آنکھ جب کسی غیر پسندیدہ اور ناگوار چیز اور دشمن کو دیکھتی ہے اور مطلوب و مقصود کے انتظار میں ہوتی ہے تو گویا اس وقت وہ ایک خاص جلن اور سوزش محسوس کرتی ہے! اسی مناسبت سے "پیاری اولاد" کو قرۃ العین یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا جاتا ہے! نیز ایک حدیث میں جو یوں آیا ہے کہ جعلت قرۃ عینی فِی الصلوۃ (حضور ﷺ نے فرمایا: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے تو اس میں بھی لفظ قرۃ کے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں! جیسا کہ اپنے موقع پر اس حدیث کی تشریح میں ذکر ہو چکا ہے۔

جنّت کی فضیلت

(۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْضِعُ سَوْطٍ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو ہریرۃؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جنّت میں ایک کوڑے کے برابر بھی جگہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے سب سے بہتر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سفر کا قاعدہ ہوتا تھا کہ جب سوار کسی جگہ اترنا چاہتا تو اپنا کوڑا وہاں ڈال دیتا تاکہ دوسرا شخص وہاں نہ اترے اور وہ جگہ اس کے ٹھہرنے کے لئے مخصوص ہو جائے پس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جنّت کی اتنی تھوڑی سی جگہ اور وہاں کا چھوٹا سا مکان بھی کہ جہاں مسافر سفر میں ٹھہرتا ہے اس پوری دنیا اور یہاں کی تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی اور زیادہ اچھا ہے، کیونکہ جنّت اور جنّت کی تمام نعمتیں ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں جب کہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں۔

حوران جنّت کی تعریف

(۳) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَدْوَةٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا وَلَوْ اَنَّ امْرَاَةً مِّنَ النِّسَآءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ اِطَّلَعَتْ اِلَى الْاَرْضِ لَاَضَاءَتْ مَا بَيْنَهُمَا وَلَمَلَاَتْ مَا بَيْنَهُمَا رِيْحًا وَلَنَصِيْفُهَا عَلٰى رَاْسِهَا خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "صبح کو اور شام کو ایک بار خدا کی راہ میں نکلنا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے اور اگر جنتیوں میں سے کسی کی عورت (یعنی کوئی حور) زمین کی طرف جھانک لے تو مشرق و مغرب کے درمیان کو (یعنی دنیا کے اس کونے سے لے کر اس کونے تک کی تمام چیزوں کو) روشن و منور کر دے اور مشرق سے لے کر مغرب تک کی تمام فضاء کو خوشبو سے بھر دے، نیز اس کے سر کی ایک اوڑھنی اس دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "صبح اور شام کی تخصیص معمول کا لحاظ رکھتے ہوئے ہے کہ عام طور پر فوج و لشکر کی روانگی، میدان جنگ میں معرکہ آرائی اور حملہ وغیرہ کی ابتداء انہی اوقات میں ہوئی ہے۔ ورنہ یہاں مطلق مراد ہے خواہ وہ صبح و شام کا وقت ہو یا کوئی اور وقت "خدا کی راہ" سے مراد جہاد بھی ہے اور ہجرت بھی، اسی طرح حج، طلب علم اور ہر اس مقصد کے لئے گھر سے نکلنا اور سفر کرنا بھی مراد ہے جس کا مطمع نظر اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول اور بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اسی کے فرمان کی بجا آوری ہو، یہاں تک کہ اپنے اہل و عیال کا نفقہ پورا کرنے کے

لئے اور عبادت خداوندی اور احکام الٰہی کی بجا آوری میں دلجمعی واطمینان اور حضور قلب کے حصول کی غرض سے رزق حلال کی تلاش میں نکلنا اور سفر کرنا بھی خدا کی راہ میں نکلنے کا مفہوم رکھتا ہے! حاصل یہ کہ "اللہ کی راہ" میں گھربار چھوڑ کر مصروف عمل رہنے والے لوگوں کو جو فضیلت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگا دیا جائے کہ جو شخص محض ایک بار بھی اللہ کی راہ میں نکلتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کو جو اجر و ثواب ملتا ہے یا اس کو آخرت میں جو نعمتیں حاصل ہوں گی وہ اس دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہیں! نیز ذکر چونکہ راہ خدا میں نکلنے کی فضیلت کا تھا جس کا اجر اللہ کے ہاں جنّت ہے اس مناسبت سے جنّت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت (یعنی حور) کی کچھ خوبیاں بھی بیان فرمائی گئیں۔

لفظ بینھما کی ضمیریں مشرق و مغرب کی طرف لوٹائی گئی ہیں، لیکن یہ ضمیریں آسمان و زمین کی طرف یا جنّت اور زمین کی طرف بھی لوٹائی جاسکتی ہیں، ویسے زیادہ صحیح یہ ہے کہ جنّت اور زمین کی طرف راجع ہوں کیونکہ عبارت میں بھی یہی دونوں صریحاً مذکور ہیں۔

جنّت کے ایک درخت کا ذکر

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ شَجَرَةً یَّسِیْرُ الرَّاكِبُ فِیْ ظِلِّهَا مِائَةَ عَامٍ لَّا یَقْطَعُهَا وَلَقَابُ قَوْسِ اَحَدِكُمْ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌ مِّمَّا طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ اَوْ تَغْرُبُ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنّت میں ایک درخت ہے (جس کا نام طوبیٰ ہے) اگر کوئی سوار اس درخت کے سائے میں سو برس تک چلتا رہے تب بھی اس کی مسافت ختم نہ ہوگی، اور جنّت میں تمہارے کمان کی برابر جگہ ان تمام چیزوں سے بہتر و برتر ہے جن پر آفتاب طلوع یا غروب ہوتا ہے"۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جن پر آفتاب طلوع و غروب ہوتا ہے۔" سے مراد تمام دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں ہیں۔ "طلوع یا غروب" میں حرف "یا" یا تو راوی کے شک کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یا اظہار حیرت کے لئے ہے، یا "اور" کے معنی میں ہے اس طرح کی پہلے جو حدیث گزری ہے اس میں "ایک کوڑے کے برابر جگہ" کا ذکر ہے اور یہاں "ایک کمان کی برابر جگہ" کا ذکر کیا گیا ہے تو دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، اور یہاں بھی وہی وضاحت پیش نظر رہنی چاہئے جو پہلے بیان ہو چکی ہے، البتہ اس فرق کو سامنے رکھنا چاہئے کہ سفر کے دوران سوار تو اترنے کی جگہ اپنا کوڑا ڈال دیا کرتا تھا اور جو شخص پیدل ہوتا تھا وہ جس جگہ ٹھہرنا چاہتا وہاں اپنی کمان ڈال دیتا تھا تاکہ وہ جگہ اس کے ٹھہرنے کے لئے مخصوص ہو جائے۔

جنّت کا خیمہ

⑤ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلْمُؤْمِنِ فِی الْجَنَّةِ لَخَیْمَةً مِّنْ لُؤْلُؤَةٍ وَّاحِدَةٍ مُّجَوَّفَةٍ عَرْضُهَا وَفِیْ رِوَایَةٍ طُوْلُهَا سِتُّوْنَ مِیْلًا فِیْ كُلِّ زَاوِیَةٍ مِّنْهَا اَهْلٌ مَّا یَرَوْنَ الْاٰخَرِیْنَ یَطُوْفُ عَلَیْهِمُ الْمُؤْمِنُ وَجَنَّتَانِ مِنْ فِضَّةٍ اٰنِیَتُهُمَا وَمَا فِیْهِمَا وَجَنَّتَانِ مِنْ ذَهَبٍ اٰنِیَتُهُمَا وَمَا فِیْهِمَا وَمَا بَیْنَ الْقَوْمِ وَبَیْنَ اَنْ یَّنْظُرُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ اِلَّا رِدَاءُ الْكِبْرِیَاءِ عَلٰی وَجْهِهٖ فِیْ جَنَّتِ عَدْنٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "مومن کو جنّت میں جو خیمہ ملے گا وہ پورا ایک کھوکھلا موتی ہوگا جس کا عرض ایک اور روایت میں ہے کہ "جس کا طول ساٹھ کوس کی مسافت کے بقدر رہوگا، اس خیمہ کے ہر گوشہ میں اس (مومن) کے اہل خانہ ہوں گے اور ایک گوشہ کے آدمی دوسرے گوشہ کے آدمیوں کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ ان سب اہل خانہ کے پاس مومن آتا جاتا رہے گا۔ (مومن کے لئے) دو جنّتیں چاندی کی ہوں گی کہ ان جنّتوں کے برتن، باسن (مکانات و محلات اور خانہ داری کے دوسرے ضرور و آرائشی سامان تخت

کرسی میز پلنگ، جھاڑ، فانوس، یہاں تک درخت وغیرہ) سب چاندی کے ہوں اور دو جنتیں سونے کی ہوں گی کہ ان جنتوں کے برتن باسن اور ان میں ہر چیز سونے کی ہوگی، اور جنت العدن میں جنتیوں اور پروردگار کی طرف سے ان کے دیکھنے کے درمیان ذات باری تعالیٰ کی عظمت وبزرگی کے پردہ کے علاوہ اور کوئی چیز حائل نہیں ہوگی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ زیادہ صحیح اس روایت کے الفاظ ہیں جس میں اس خیمہ کا عرض ساٹھ کوس کی مسافت کے بقدر بیان کیا گیا ہے یا اس روایت کے الفاظ زیادہ صحیح ہیں جس میں خیمہ کے طول کو ساٹھ کوس کی مسافت کے بقدر بتایا گیا ہے، اصل مقصد اس خیمہ کی وسعت وکشادگی کو بیان کرنا ہے جو دونوں روایتوں سے حاصل ہو جاتا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس خیمہ کی چوڑائی ساٹھ کوس کے بقدر ہے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی لمبائی کتنی زیادہ ہوگی اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کی لمبائی ساٹھ کوس کی مسافت کے بقدر ہے تو اس پر قیاس کر کے اس کی چوڑائی کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

"اہل خانہ" سے مراد بیوی وغیرہ ہیں! اور ایک شارح نے لکھا ہے کہ "اہل" سے مراد بیویاں ہیں جو اس مومن کو وہاں ملیں گی اور جن سے وہ جنسی لذت حاصل کرے گا، چنانچہ "آتا جاتا رہے گا" کے الفاظ کے ذریعہ اسی بات کو کنایۃ بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ مومن اپنی ان بیویوں کے ساتھ جنسی اختلاط کرتا رہے گا۔

اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو جنتیں خالص چاندی کی اور دو جنتیں خالص سونے کی ہوں گی جب کہ ایک روایت میں جنت کی عمارتوں اور محلات کی تعریف میں بیان کیا گیا ہے کہ ان میں جو اینٹیں لگی ہوں گی ان کی ترتیب یہ ہوگی کہ ایک اینٹ تو سونے کی ہوگی اور ایک اینٹ چاندی کی۔ پس ان دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہوگی کہ پہلی روایت میں ان چیزوں کا ذکر ہے جو جنت کے اندر ہوں گی، جیسے برتن، باسن اور دیگر اشیاء چنانچہ ایک جنت میں تو تمام چیزیں سونے کی ہوں گی اور ایک جنت میں تمام چیزیں چاندی کی ہوں گی اور دوسری روایت میں جنت کی عمارتوں کی خوبی بیان کی گئی ہے کہ جنت کی ہر عمارت ومحل کی دیوار میں سونے اور چاندی کی اینٹیں ہوں گی۔

جنتوں کی تعداد اور ان کے نام: بیہقی نے کہا ہے کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جنتیں چار ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ رحمٰن میں فرمایا۔

وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔

"اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے (ہر وقت) ڈرتا ہو اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔"

اس کے بعد کی آیتوں میں ان دونوں جنتوں کی تعریف وتوصیف بیان فرمائی گئی ہے، اور پھر ارشاد ہوا۔

وَمِنۡ دُوۡنِهِمَا جَنَّتٰنِ۔

"اور ان دو جنتوں سے کم درجہ میں دو جنتیں اور ہیں۔"

پہلی دو جنتوں کی طرح آگے کی آیات میں ان دو جنتوں کی بھی تعریف وتوصیف بیان کی گئی ہے رہی حدیث کی بات تو اوپر حضرت موسیٰ کی روایت کے یہ الفاظ جنتان من فضة انیتھما و ما فیھما و جنتان من ذھب انیتھما و ما فیھما اس پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ جنتیں چار ہیں اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ جنتان من الذھب للسابقین و جنتان من فضة لاصحاب الیمین۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیت میں "جنتان" (دو جنتوں) کا جو لفظ ہے اس سے جنت کی دو قسمیں مراد ہوں یعنی ان جنتوں میں سے ایک سونے کی اور دوسری چاندی کی ہوگی۔ حاصل یہ نکلا کہ اصل میں چار جنتیں ہیں، دو سونے کی ہیں جو خاص مقربین کے لئے ہیں اور دو چاندی کی ہیں جو عام مومنین کے لئے ہیں، لیکن یہ بھی واضح رہے کہ "جنتان" گو تثنیہ کا صیغہ ہے مگر بعض موقعوں پر تثنیہ سے کثرت (یعنی دو سے زائد کی

تعداد بھی مراد ہوتی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ "جنتان" سے مراد چار چار جنتیں ہوں اور "کاملین" کو ان دو اصل جنتوں کے علاوہ دو دو جنتیں اور عطا ہوں جو سونے اور چاندی ہی کی ہوں گی اور وہ جنتیں زیبائش وخوشنمائی کے لئے ان کاملین کے محلات کے دائیں بائیں واقع ہوں گی، اس کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں جنّت کے تعلق سے آٹھ نام ذکر ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) جنّت العدن (۲) جنّت الفردوس (۳) جنّت الخلد (۴) جنّت النعیم (۵) جنّت الماوی (۶) دار السلام (۷) دار القرار (۸) دار المقامہ۔

"اور جنّت العدن میں جنتیوں اور پروردگار کی طرف ان کو دیکھنے .... الخ کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب جنتی لوگ جنّت میں پہنچ جائیں گے تو وہ جسمانی حجاب اور طبعی کدورتیں جو بندے اور پروردگار کے دیدار کے درمیان حائل ہوتی ہیں اٹھ جائیں گی مگر ذات مقدس کی کبریائی و عظمت اور ہیبت وجلال کا پردہ باقی رہے گا تاہم اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل وکرم سے اس پردہ کو بھی اٹھا دے گا یعنی نظروں کو تاب دیدار بخش دے گا اور جنتی لوگ اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

جنّت کے درجات

⑥ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْجَنَّۃِ مِائَۃُ دَرَجَۃٍ مَّا بَیْنَ کُلِّ دَرَجَتَیْنِ کَمَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَالْفِرْدَوْسُ اَعْلَاھَا دَرَجَۃً مِّنْھَا تُفَجَّرُ اَنْھَارُ الْجَنَّۃِ الْاَرْبَعَۃِ وَمِنْ فَوْقِھَا یَکُوْنُ الْعَرْشُ فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰہَ فَاسْئَلُوْہُ الْفِرْدَوْسَ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَلَمْ اَجِدْہُ فِی الصَّحِیْحَیْنِ وَلَا فِیْ کِتَابِ الْحُمَیْدِیِّ۔

"اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنّت میں سو درجے ہیں ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ زمین وآسمان کے درمیان ہے اور فردوس، صورۃً اور معنیً) وہ اپنے درجات (کی بلندی) کے اعتبار سے سب جنتوں سے اعلیٰ وبرتر ہے اور اسی فردوس سے بہشت کی چاروں نہریں نکلتی ہیں اور فردوس ہی کے اوپر عرش الٰہی ہے، پس جب تم خدا سے جنت مانگو تو جنت الفردوس مانگو (جو سب سے اعلیٰ وبرتر ہے)" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور مجھے یہ حدیث نہ تو صحیحین میں ملی ہے اور نہ کتاب حمیدی میں۔"

تشریح: "سو درجے" میں سو کا عدد تعیّن وتحدید کے لئے نہیں بلکہ "کثرت" کے اظہار کے لئے بھی ہو سکتا ہے اس کی تائید حضرت عائشہؓ کی اس مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو بیہقی نے نقل کیا ہے اور جس میں جنّت کے درجات کی تعداد قرآن کی آیتوں کے برابر بیان کی گئی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں عدد درج الجنت عدد ای القران فمن دخل الجنة من اھل القران فلیس فوقه درجة اور یہ بھی ممکن ہے کہ "سو" سے یہ خاص عدد ہی مراد ہو اور اس کے ذریعہ جنّت کے کثیر درجات میں صرف ان سو درجوں کو بیان کرنا مقصود ہو، جن میں سے ہر دو درجوں کا درمیانی فاصلہ مذکورہ فاصلہ سے کم یا زیادہ ہوگا دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ جنّت میں ایک درجہ وہ ہے جس تک اصحاب ہموم کے علاوہ اور کوئی نہیں پہنچے گا

"فردوس" جنّت کا نام ہے اور یہ نام قرآن کریم میں بایں طور مذکور ہے کہ:

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔

"یہی (پاک طینت پاک کردار) لوگ (جن کا پچھلی آیتوں میں ذکر ہوا) وارث بنیں گے (یعنی فردوس کی میراث حاصل کریں گے (اور) اس میں ہمیشہ رہیں گے "چار نہروں" سے مراد پانی، دودھ شہد اور شراب کی وہ نہریں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم کی ان آیات میں کیا گیا ہے۔"

فیھا انھار من ماء غیر اسن وانھار من لبن لم یتغیر طعمه وانھار من خمر لذة للشاربین وانھار من عسل مصفی۔

"جنّت میں بہت سی چیزیں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہ ہوگا اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا نہ ہوگا اور بہت

سی نہریں شراب کی ہیں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی اور بہت سی نہریں شہد کی ہیں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی اور بہت سی نہریں شہد کی ہیں جو بالکل صاف شفاف ہوگا۔"

"فردوس ہی کے اوپر عرش الٰہی ہے" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فردوس سب جنتوں سے افضل اور اوپر ہے کہ اس کے اوپر بس عرش الٰہی ہے۔

اسی لئے حضور ﷺ نے اُمت کو تلقین فرمائی کہ اللہ تعالیٰ سے جنّت مانگو تو جنّت الفردوس مانگو تاکہ سب سے اعلیٰ اور سب سے بہتر جنّت تمہیں حاصل ہو۔

روایت کے آخر میں مولف مشکوۃ کے ان الفاظ اور مجھے یہ حدیث نہ توصحیحین میں ملی ہے........الخ" کے ذریعہ دراصل صاحب مصابیح پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو فصل اول میں نقل کیا ہے جس میں صرف بخاریؒ و مسلمؒ کے متون میں ملی ہے اور نہ ان دونوں کتابوں کے مجموعہ کتاب حمیدی میں! لہٰذا اس حدیث کو فصل اول کے بجائے فصل دوم میں نقل کرنا چاہئے تھا۔ صاحب مصابیح پر مؤلف مشکوۃ کا اعتراض تو یہ ہے مگر بعض شارحین نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح بخاریؒ میں دو جگہ موجود ہے ایک تو کتاب الجہاد میں اور دوسری کان عرشه علی الماء کے باب میں اور صحیح مسلم میں بھی فضل جہاد فی سبیل اللہ کے باب میں موجود ہے۔

جنّت کے بازار کا ذکر

(۷) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَسُوْقًا يَاتُوْنَهَا كُلَّ جُمُعَةٍ فَتَهُبُّ رِيْحُ الشِّمَالِ فَتَحْثُوْا فِيْ وُجُوْهِهِمْ وَ ثِيَابِهِمْ فَيَزْدَادُوْنَ حُسْنًا وَّجَمَالاً فَيَرْجِعُوْنَ اِلٰى اَهْلِيْهِمْ وَقَدِ ازْدَادُوْا حُسْنًا وَّجَمَالاً فَيَقُوْلُ لَهُمْ اَهْلُوْهُمْ وَاللّٰهِ لَقَدِ ازْدَدْتُّمْ بَعْدَنَا حُسْنًا وَّجَمَالاً فَيَقُوْلُوْنَ وَاَنْتُمْ وَاللّٰهِ لَقَدِ ازْدَدْتُّمْ بَعْدَنَا حُسْنًا وَّجَمَالاً۔
(رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنّت میں ایک بازار ہے جس میں ہر جمعہ کو لوگ جمع ہوا کریں گے، اور وہاں شمالی ہوا چلے گی جو جنتیوں کے چہرے اور کپڑوں پر (طرح طرح کی خوشبوئیں اور مہک) ڈالے گی جس سے وہاں موجود جنتیوں کے حسن وجمال میں اضافہ ہو جائے گا، اور پھر جب وہ لوگ بہت زیادہ حسین وجمیل بن کر (اس بازار سے) اپنے گھر والوں کے پاس واپس آئیں گے تو وہ گھر والے ان سے کہیں گے کہ خدا کی قسم ہم سے الگ ہو کر تم نے اپنے حسن وجمال کو کتنا بڑھالیا ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ اور بخدا! ہمارے جانے کے بعد تم نے بھی تو اپنے حسن وجمال کو بڑھالیا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "بازار" سے مراد حسن وجمال کی افزائش کا مرکز ہے جہاں جنتی لوگ جمع ہوا کریں گے اور وہاں طرح طرح کی دلفریب، دیدہ زیب اور خوش جمال شکل وصورتیں موجود ہوا کریں گی اور ہر جنتی اپنی پسند وخواہش کے مطابق جو شکل وصورت چاہے گا اختیار کر لیا کرے گا۔

"ہر جمعہ" سے مراد ہر ہفتہ ہے یعنی ہفتہ میں ایک دن وہاں لوگ جمع ہوا کریں گے اور "ہفتہ" سے بھی حقیقی ہفتہ مراد نہیں ہے کیونکہ جنت میں نہ سورج ہوگا اور نہ دن رات کی گردش ہوگی، ہمیشہ یکساں وقت رہے گا لہٰذا ہفتہ سے "ایک ہفتہ کے بقدر وقت" کا عرصہ مراد ہے۔

"شمالی ہوا" سے مراد عام طور پر وہ ہوا ہوتی ہے جو اگر قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تو دائیں ہاتھ کی سمت سے آئے۔ اس کو اتری ہوا بھی کہا جاتا ہے لیکن یہاں حدیث میں اس جیسی ہوا مراد ہے جس کو عرب میں شمال یا شمْال کہا جاتا ہے۔ یہ ہوا چونکہ شمال سے چلتی ہے اور ٹھنڈے ملکوں اور بحر احمر سے ہوتی ہوئی آتی ہے اس لئے کافی ٹھنڈی ہوتی ہے اور "شمالی ہوا" کہلاتی ہے۔

جنتی لوگ اس تفریح گاہ سے لوٹنے پر اپنے گھر والوں کا حسن وجمال جو بڑھا ہوا پائیں گے تو اس کا سبب یہ ہوگا کہ وہ "شمالی ہوا" ان گھر والوں تک بھی پہنچے گی اور اس کی وجہ سے ان کا حسن وجمال بھی بڑھ جائے گا یا یہ کہ وہ جنتی لوگ جب اس تفریح گاہ سے اپنے بڑھے ہوئے حسن وجمال کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس آئیں گے تو ان کے حسن وجمال کا عکس ان کے گھر والوں پر پڑے گا جس سے وہ سب بھی پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ حسین وجمیل نظر آئیں گے۔

جنّت کی نعمتوں کا ذکر

⑧ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوَّلَ زُمْرَةٍ یَّدْ خُلُوْنَ الْجَنَّةَ عَلٰی صُوْرَةِ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ کَاَشَدِّ کَوْکَبٍ دُرِّیٍّ فِی السَّمَآءِ اِضَآءَةً قُلُوْبُهُمْ عَلٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ لَا اخْتِلَافَ بَیْنَهُمْ وَلَا تَبَاغُضَ لِکُلِّ امْرِءٍ مِّنْهُمْ زَوْجَتَانِ مِنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ یُرٰی مُخُّ سُوْقِهِنَّ مِنْ وَّرَآءِ الْعَظْمِ وَاللَّحْمِ مِنَ الْحُسْنِ یُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُکْرَةً وَّعَشِیًّا لَا یَسْقَمُوْنَ وَلَا یَبُوْلُوْنَ وَلَا یَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا یَتْفُلُوْنَ وَلَا یَمْتَخِطُوْنَ اٰنِیَتُهُمُ الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ وَاَمْشَاطُهُمُ الذَّهَبُ وَوُقُوْدُ مَجَامِرِهِمُ الْاَلُوَّةُ وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ عَلٰی خَلْقِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ عَلٰی صُوْرَةِ اَبِیْهِمْ اٰدَمَ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فِی السَّمَآءِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو لوگ جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے (یعنی انبیاء علیہم السلام) وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ومنور ہونگے اور ان کے بعد جو لوگ داخل ہوں گے (یعنی علماء، اولیاء شہداء اور صلحاء) وہ اس ستارے کی مانند روشن وچمکدار ہوں گے جو آسمان پر بہت تیز چمکتا ہے (اور چاند وسورج سے کم لیکن اور ستاروں سے زیادہ روشن ہوتا ہے) تمام جنتیوں کے دل ایک شخص کے دل کی مانند ہوں گے (یعنی ان کے درمیان اس طرح باہمی ربط واتفاق ہوگا کہ وہ سب ایک دل اور ایک جان ہوں گے) نہ تو ان میں کوئی باہمی اختلاف ہوگا اور نہ وہ ایک دوسرے سے کوئی بغض وعداوت رکھیں گے۔ ان میں سے ہر ایک شخص کے لئے حور عین میں سے دو دو بیویاں ہوں گی (جو اتنی زیادہ حسین وجمیل اور صاف شفاف ہوں گی کہ) ان کی پنڈلیوں کی ہڈی کا گودا ہڈی اور گوشت کے باہر سے نظر آئے گا۔ تمام جنتی صبح وشام (یعنی ہر وقت) اللہ تعالیٰ کو یاد کیا کریں گے وہ نہ تو بیمار ہوں گے، نہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ پھریں گے، نہ تھوکیں گے اور نہ (ینٹھ سکیں گے، ان کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے، ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی، ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن "اگر" ہوگا۔ ان کا پسینہ مشک کی طرح خوشبودار ہوگا اور سارے جنتی ایک شخص کی سی عادت وسیرت کے ہوں گے (یعنی سب کے سب یکساں طور پر خوش خلق وملنسار اور ایک دوسرے سے گہرا ربط وتعلق رکھنے والے ہوں گے) نیز وہ سب شکل وصورت میں باپ آدم کی طرح ہوں گے اور ساٹھ گز اونچا قد رکھتے ہوں گے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "حور" اصل میں حوراء، کی جمع ہے اور حوراء اس حسین، وجمیل عورت کو کہتے ہیں جس کی آنکھ کی سفیدی وسیاہی بہت زیادہ سفید وسیاہ ہو، عین عناء کی جمع ہے جس کے معنی "بڑی بڑی آنکھوں والی" ہے آگے دوسری فصل کے آخر میں ایک روایت آئے گی جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ سب سے ادنی درجہ کا جنتی وہ ہوگا۔ جس کے بہتر ۷۲ بیویاں ہوں گی، جب کہ یہاں دو بیویوں کا ذکر ہے؟ لہٰذا ان دونوں روایتوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے کہا جائے گا کہ یہاں حدیث میں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حور عین میں سے دو بیویاں ایسی ہوں گی جن کا حسن وجمال سب سے زیادہ ہوگا یہاں تک کہ ان کی پنڈلیوں کی ہڈیوں کا گودا باہر سے نظر آئے گا، ظاہر ہے کہ یہ بات اس کے منافی نہیں ہے کہ ہر جنتی کو اس نوعیت کی دو بیویوں کے علاوہ اور بہت سی بیویاں بھی ملیں۔

"ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن اگر، ہوگا۔" کا مطلب یہ ہے کہ یہاں دنیا میں تو انگیٹھیوں کا ایندھن کوئلہ وغیرہ ہوتا ہے اور یہاں خوشبو حاصل کرنے کے لئے اگر جلایا جاتا ہے لیکن جنت میں انگیٹھیوں کا ایندھن ہی اگر، ہوگا۔ واضح رہے کہ وُقُوْد (واؤ کے پیش کے ساتھ) کے

معنی ہیں وہ ایندھن (یعنی لکڑیاں وغیرہ) جس سے آگ جلائی جائے۔

مَجَامِرُ اصل میں مِجْمَرُ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جس میں آگ سلگانے کے لئے آگ رکھی جائے یعنی انگیٹھی یا عود سوز، یوں تو یہ لفظ میم کے زیر کے ساتھ ہے لیکن میم کے زبر کے ساتھ بھی منقول ہے۔ اُلُوَّۃ (الف کے زبر اور پیش کے ساتھ) اگر کی لکڑی کو کہتے ہیں جس کو دھونی دینے کے لئے جلایا یا سلگایا جاتا ہے۔

علی خلق رَجُلٍ میں لفظ "خلق" خ کے پیش کس ساتھ ہے اور ترجمہ میں اسی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اس صورت میں علی صورۃ ابیھم ایک علیحدہ جملہ ہوگا جس کا مقصد جنتیوں کی سیرت کو بیان کرنے کے بعد ان کی شکل وصورت کو بیان کرنا ہے۔ لیکن بعض روایتوں میں یہ لفظ خ کے زبر کے ساتھ منقول ہے۔ جس کا با مطلب ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ سب (جنتی لوگ) ایک شخص کی سی شکل وصورت رکھیں گے، حسن وخوبصورتی میں یکساں ہوں گے اور ایک ہی عمر والے ہوں گے۔ یعنی سب کے سب تیس تیس یا تینتیس تینتیس سال کی عمر کے نظر آئیں گے، اس صورت میں کہا جائے گا کہ علی صورت ابیھم کا جملہ اپنے پہلے جملہ علی خلق رَجُل واحد کی وضاحت وبیان کے لئے ہے یہ بات ذہن میں رہے کہ پیش والی روایت بھی صحیح ہے اور زبر والی روایت بھی۔

اہل جنت کو پیشاب وپاخانہ کی حاجت نہیں ہوگی

(۹) وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ يَاكُلُوْنَ فِيْهَا وَيَشْرَبُوْنَ وَ لَا يَتْفُلُوْنَ وَلَا يَبُوْلُوْنَ وَلَا يَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا يَمْتَخِطُوْنَ قَالُوْا فَمَابَالُ الطَّعَامِ قَالَ جُشَآءٌ وَّرَشْحٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ يُلْهَمُوْنَ التَّسْبِيْحَ وَالتَّحْمِيْدَ كَمَا تُلْهَمُوْنَ النَّفَسَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جنتی لوگ جنت میں (خوب) کھائیں پیئیں گے، لیکن نہ تو تھوکیں گے، نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ پھریں گے اور نہ ناک سنکیں گے۔" یہ سن کر بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ (جب جنتی لوگ پاخانہ نہیں پھریں گے، تو پھر کھانے کے فضلہ کا کیا ہوگا (اور اس کے اخراج کی کیا صورت ہوگی؟) آپ ﷺ نے فرمایا: "کھانے کا فضلہ ڈکار اور پسینہ ہو جائے گا جو مشک کی خوشبو کی مانند ہوگا اور جنتیوں کے دل میں تسبیح وتحمید یعنی سبحان اللہ الحمد للہ کا ورد اور ذکر الٰہی (اس طرح) ڈال دیا جائے گا (کہ وہ ان کی لازمی عادت ومعمول بن جائے گا) جیسے سانس جاری ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "کھانے کا فضلہ ڈکار اور پسینہ ہو جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ نظام قدرت نے جس طرح اسے دنیا میں کھانے کے فضلہ کا اخراج کے لئے پاخانہ کی صورت رکھی ہے اسی طرح جنّت میں جنتیوں کے کھانے کے فضلہ کے اخراج کے لئے ڈکار اور پسینہ کو ذریعہ بنا دیا جائے گا کہ تمام فضلہ ہوا اور پسینہ بن کر ڈکار کی صورت میں اور مسامات کے راستے نکل جایا کرے گا، اور ڈکار وپسینہ کی صورت یا تو اشخاص و اوقات کے اعتبار سے الگ الگ طور سے پیش آئے گی کہ بعض اوقات یا بعض اشخاص کا فضلہ تو ہوا بن کر ڈکار کی صورت میں نکل جائے گا اور بعض اوقات یا بعض اشخاص کا فضلہ پسینہ بن کر مسامات کے راستے خارج ہو جائے گا یا یہ کہ بعض کھانے کا فضلہ تو ڈکار بن کر خارج ہوگا، اور بعض کھانے کا فضلہ پسینہ بن کر نکلے گا لیکن اس سلسلے میں زیادہ بہتر اور موزوں یہ کہنا ہے کہ ڈکار تو کھانے کے فضلہ کے اخراج کا ذریعہ بنے گی اور پسینہ پانی کے فضلہ کے اخراج کا ذریعہ ہوگا۔

"جیسے سانس جاری ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سانس کی آمد ورفت کا سلسلہ کسی تکلف یا سعی کے بغیر از خود جاری رہتا ہے اسی طرح تسبیح تحمید اور ذکر الٰہی کے کلمات اہل جنت کی زبان پر رواں ہوں گے یا یہ مراد ہے کہ جس طرح معمول کے مطابق سانس کی آمد ورفت کی وجہ سے تمہیں کوئی دقت وپریشانی نہیں ہوتی اور تم کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتے اسی طرح جنتی لوگ تسبیح وتحلیل اور تحمید کی وجہ سے کوئی دقت وپریشانی اور بوجھ محسوس نہیں کریں گے اور یہ کہ جس طرح تمہیں سانس لینے سے کوئی چیز باز نہیں رکھتی اسی طرح ان

لوگوں کے تسبیح وتحلیل اور تحمید میں مشغول ہونے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنے گی۔

اہل جنّت کا دائمی عیش وشباب

⑩ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ یَّدْخُلِ الْجَنَّةَ یَنْعَمُ وَلَا یَبْاَسُ وَلَا یَبْلٰی ثِیَابُهٗ وَلَا یَفْنٰی شَبَابُهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو بھی شخص جنّت میں داخل ہوگا عیش وعشرت میں رہے گا نہ فکر وغم اس کے پاس پھٹکے گا نہ اس کے کپڑے میلے پرانے ہوں گے اور نہ اس کا شباب فناہ ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: جنّت اپنی تمام تر نعمتوں آسائشوں اور راحتوں کے ساتھ "دار القرار والثبات" ہے یعنی وہاں کسی بھی نعمت وراحت کو نہ زوال وفناہ ہے اور نہ وہاں کی پر آسائش زندگی میں کسی غم وفکر تغیر تبدل اور نقصان وخرابی کا خوف ہوگا۔

⑪ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَّاَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَا اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یُنَادِیْ مُنَادٍ اِنَّ لَكُمْ اَنْ تَصِحُّوْا فَلَا تَسْقَمُوْا اَبَدًا وَّاِنَّ لَكُمْ اَنْ تَحْیَوْا فَلَا تَمُوْتُوْا اَبَدًا وَّاِنَّ لَكُمْ اَنْ تَشِبُّوْا فَلَا تَهْرَمُوْا اَبَدًا وَّاَنَّ لَكُمْ اَنْ تَنْعَمُوْا فَلَا تَبْاَسُوْا اَبَدًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدری وحضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنّت میں ایک منادی کرنے والا یہ منادی کیا کرے گا (کہ اے جنتیو!) تم صحت وتندرستی کے ساتھ رہو تمہیں کبھی بھی کوئی بیماری لاحق نہیں ہوگی تم ہمیشہ ہمیشہ زندہ سلامت رہو موت کبھی تمہارے پاس بھی نہیں آئے گی، تم سدا جوان رہو بڑھاپا کبھی تمہارے پاس بھی نہیں پھٹکے گا اور تم عیش وعشرت کی زندگی گزارو کسی بھی طرح کے فکر وغم اور رنج والم کا تم تک گزر بھی نہیں ہوگا۔" (مسلمؒ)

جنّت کے بالاخانوں کے مکین

⑫ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ یَتَرَاءَوْنَ اَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْقِهِمْ كَمَا تَرَاءَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّیَّ الْغَابِرَ فِی الْاُفُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ اَوِ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَیْنَهُمْ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تِلْكَ مَنَازِلُ الْاَنْبِیَآءِ لَا یَبْلُغُهَا غَیْرُهُمْ قَالَ بَلٰی وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ رِجَالٌ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَصَدَّقُوا الْمُرْسَلِیْنَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جنتی اپنے اوپر کے بالاخانے والے لوگوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم لوگ اس روشن ستارے کو دیکھتے ہو جو آسمان کے مشرقی یا مغربی افق میں ہوتا ہے اور اس (بالاخانوں کی بلندی وخوشنمائی) کا تعلق فرق مراتب سے ہوگا جو اہل جنّت کے درمیان پایا جائے گا۔" صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! بالاخانے اوپر کے پر شکوہ محلات کیا انبیاء کے مکان ہوں گے جن تک انبیاء کے سوا کسی کی رسائی نہیں ہوگی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "کیوں نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، ان بلند وبالا محلات اور بالا خانوں تک ان لوگوں کی بھی رسائی ہوگی جو اللہ پر ایمان لائے اور رسولوں کی تصدیق کی۔" (مسلمؒ وبخاریؒ)

تشریح: لفظ غابر اصل میں غبور سے مشتق ہے جس کے معنی باقی رہنا، ٹھہرنا ہیں اور پھر یہاں وہ روشن ستارہ مراد ہے جو ڈوبنے کے قریب ہو، یا طلوع فجر کے بعد آسمان کے کنارے میں باقی رہ گیا ہو، ایک روایت میں غاير منقول ہے جو غور سے ہے اور جس کے معنی نشیب، پست جگہ کے ہیں، لیکن زیادہ صحیح اور مشہور پہلی ہی روایت ہے جس میں غابر منقول ہے۔

اور اس کا تعلق فرق مراتب سے ہوگا الخ کا مطلب یہ ہے کہ جنتیوں میں یہ فرق مراتب ہوگا کہ بعض اعلی مرتبہ کے ہوں گے، بعض

درمیانی مرتبہ کے اور بعض ادنی مرتبہ کے اور اسی کے اعتبار سے سب کو محلات و مکانات اور منازل و مراتب بھی اعلی، درمیانی اور ادنی عطا ہوں گے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ جنت میں منزلیں ہوں گی، اعلی منزل تو سابقین کے لئے درمیانی منزل مقصدین کے لئے اور نیچے کی منزل مختلطین کے لئے ہوگی۔

جو اللہ پر ایمان لائے اور رسولوں کی تصدیق کی" یعنی وہ اولیاء و اتقیاء جو ایمان باللہ اور اتباع رسول میں کامل ہیں اور جو اللہ تعالیٰ اور رسولوں کے احکام و اوامر کو ماننے والے اور ان کی طرف سے ممنوع قرار دی جانے والی چیزوں سے اجتناب کرنے والے ہیں اور جن کی تعریف قرآن کریم کی ان آیات:

وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا الایۃ۔

"اور رحمٰن (اللہ تعالیٰ) کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں الخ میں یہ بات فرمائی گئی ہے اور پھر ان کی مختلف اعلی صفات بیان کرنے کے بعد ان کے حق میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اُولٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا الاٰیۃ "ایسے لوگوں کو (جنت میں رہنے کے لئے) بالاخانے ملیں گے بوجہ ان کے ثابت قدم رہنے کے الخ۔"

چند جنتیوں کا ذکر

⑬ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَقْوَامٌ اَفْئِدَتُهُمْ مِثْلُ اَفْئِدَةِ الطَّيْرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنت میں ایسے لوگوں کی کتنی ہی جماعتیں داخل ہوں گی جن کے دل پرندوں کے مانند ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ جنت میں جانے والوں میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہوگی جو اس دنیا میں نرمی و مروت رحم و مہربانی، دل کی صفائی و سادگی اور حسد و بغض سے پاک و صاف ہونے کے اعتبار سے پرندوں جیسی خصلت رکھتے ہیں، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس حدیث میں ان لوگوں کا ذکر کرنا اور انہیں جنت کی بشارت دینا مقصود ہے جو اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں، اور ان کے دلوں پر آخرت کا خوف اور وہاں کے احوال کی ہیبت بہت زیادہ طاری رہتی ہے! ان کے قلوب کو پرندوں سے تشبیہ اس اعتبار سے دی گئی ہے کہ سب سے زیادہ ڈرنے والا جانور پرندہ ہی ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ توکل اختیار کرنے والے مراد ہیں، کیونکہ پرندے "توکل" کی خاص علامت سمجھے جاتے ہیں اس لئے توکل اختیار کرنے والے بندوں کے قلوب کو پرندوں سے تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے "اگر تم اللہ تعالیٰ پر توکل (یعنی کامل اعتماد) رکھو تو یقیناً وہ تمہیں رزق دے گا جیسا کہ وہ ان پرندوں کو رزق دیتا ہے جو صبح کو نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس آتے ہیں۔

حق تعالیٰ کی خوشنودی

⑭ وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ يَا اَهْلَ الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُوْنَ لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِىْ يَدَيْكَ فَيَقُوْلُ هَلْ رَضِيْتُمْ فَيَقُوْلُوْنَ وَمَالَنَا لَا نَرْضٰى يَارَبِّ وَقَدْ اَعْطَيْتَنَا مَالَمْ تُعْطِ اَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ فَيَقُوْلُ اَلَا اُعْطِيْكُمْ اَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ فَيَقُوْلُوْنَ يَارَبِّ وَاَىُّ شَىْءٍ اَفْضَلُ مِنْ ذٰلِكَ فَيَقُوْلُ اُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِىْ فَلَا اَسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهٗ اَبَدًا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جنتیوں کو (مخاطب کرنے کے لئے) آواز دے گا کہ

"اے جنتیو !" تمام جنتی (یہ آواز سن کر) جواب دیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم حاضر ہیں، تیری خدمت میں موجود ہیں، تمام تر بھلائی تیرے ہی قبضہ قدرت اور ارادے میں ہے (کہ جس کو چاہے عطا کرے)۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا (میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ) کیا تم (جنت کا انعام پاکر) مجھ سے راضی وخوش ہو؟" وہ عرض کریں گے کہ پروردگار! بھلا ہم آپ سے راضی وخوش کیوں نہیں ہوں گے، آپ نے تو ہمیں وہ بڑی سے بڑی نعمت اور سرفرازی عطا فرمائی ہے جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں کی اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا میں اس سے بھی بڑی اور اس سے بھی بہتر نعمت تمہیں عطا نہ کروں؟ وہ کہیں گے کہ پروردگار! اس سے بھی بڑی اور اس سے بھی بہتر نعمت اور کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "میں تمہیں اپنی رضا وخوشنودی عطا کروں گا اور پھر تم سے کبھی ناخوش نہ ہوں گا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مولی کریم کا اپنے بندے سے راضی وخوش ہو جانا تمام نعمتوں اور سعادتوں کے حاصل ہو جانے کی ضمانت ہے لہٰذا جب پروردگار اہل جنت کے تئیں اپنی رضا وخوشنودی کا اظہار فرمادے گا تو گویا انہیں تمام ہی نعمتیں اور سرفرازیاں حاصل ہو جائیں گی اور عظیم ترین نعمت دیدار الٰہی، بھی اسی کا ثمرہ ونتیجہ ہے۔

پہلے حق تعالیٰ جنتیوں سے پوچھیں گے کہ آیا تم مجھ سے خوش وراضی ہو؟ اور جب ان کی طرف سے اثبات میں جواب مل جائے گا تب حق تعالیٰ ان کے تئیں اپنی رضا وخوشنودی کا اظہار فرمائیں گے۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ بندے سے اللہ تعالیٰ کے راضی وخوش ہونے کی دلیل وعلامت یہ ہے کہ وہ بندہ اللہ تعالیٰ کو راضی وخوش پاتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا پروردگار بھی اس سے راضی وخوش ہے منقول ہے کہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپس میں یہ بحث وتمحیص اور غور وفکر کیا کرتے تھے کہ اس بات کو جاننے کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارا پروردگار ہم سے راضی وخوش ہے؟ آخر کار انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ خود ہم اپنے رب سے راضی وخوش ہیں تو ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ ہمارا رب بھی ہم سے راضی وخوش ہے۔

"اور پھر تم سے کبھی ناخوش نہ ہوگا۔" ظاہر ہے یہ اہل جنت کے حق میں سب سے بڑی سرفرازی کی بشارت ہوگی کہ ان کا پروردگار ہمیشہ ہمیشہ ان سے راضی وخوش رہے گا۔ اس سعادت ونعمت سے بڑی سعادت ونعمت اور کیا ہو سکتی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تھوڑی سی بھی رضا وخوشنودی پوری جنت اور جنت کی تمام نعمتوں اور سعادتوں سے بڑھ کر ہے چہ جائیکہ وہ رضا وخوشنودی مستقل طور پر اور ہمیشہ کے لئے حاصل ہو جائے، خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ورضوان من اللہ اکبر لہٰذا ہر صاحب ایمان کو یہی التجا کرنی چاہئے کہ اللھم ارض عنا وارضنا عنک (اے اللہ! ہم سے راضی ہو جایئے اور ہمیں اپنے سے راضی کیجئے۔

معمولی جنتی کا مرتبہ

⑮ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَدْنٰى مَقْعَدِ اَحَدِكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ تَمَنَّ فَيَتَمَنّٰى وَيَتَمَنّٰى فَيَقُوْلُ لَهٗ هَلْ تَمَنَّيْتَ فَيَقُوْلُ نَعَمْ فَيَقُوْلُ لَهٗ فَاِنَّ لَكَ مَا تَمَنَّيْتَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "تم میں جو شخص سب سے ادنیٰ درجہ اور کمتر مقام کا جنتی ہوگا اس کا یہ مرتبہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا جو آرزو رکھتے ہو بیان کرو اور جو کچھ چاہتے ہو مانگو۔" وہ اپنی آرزوئیں ظاہر کرے گا اور بار بار ظاہر کرے گا یعنی وہ جنتی بھی خواہش رکھے گا بیان کرنے لگے گا اور جس قدر بھی مانگ سکتا ہوگا مانگے گا) اللہ تعالیٰ (اس کی آرزوئیں اور خواہش سن کر) فرمائے گا کہ کیا تم اپنی آرزوئیں بیان کر چکے (اور اپنے دل میں جو کچھ خواہش رکھتے ہو سب ظاہر کر چکے!) وہ عرض کرے گا کہ ہاں (میں جو کچھ مانگ سکتا تھا مانگ چکا اور اپنی ایک ایک آرزو بیان کر دی)۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، "تم نے جو آرزوئیں بیان کیں اور جو کچھ مانگا نہ صرف وہ بلکہ اسی قدر مزید تمہیں عطا کیا گیا۔" (مسلمؒ)

وہ چار دریا جن کا سرچشمہ جنّت میں ہے

(۱۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيْحَانُ وَجَيْحَانُ وَالْفُرَاتُ وَالنِّيْلُ كُلٌّ مِنْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "سیحان، جیحان، فرات اور نیل، ان سب دریاؤں کا تعلق جنت کی نہروں اور چشموں سے ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: فرات اور نیل تو مشہور دریا ہیں ان کے تعیّن میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دریائے فرات، عراق میں اور دریائے نیل مصر میں بہتا ہے۔ لیکن سیحان اور جیحان کے تعیّن میں اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ سیحان شام کے دریا کا نام ہے اور جیحان بلخ کا دریا ہے اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ سیحان مدینہ کا دریا ہے، تاہم علماء نے یہ وضاحت کردی ہے کہ یہ جیحان و سیحان ان دو دریاؤں سے الگ ہیں جن کے نام جیحون اور سیحون ہیں اور جو ترک و بلخ (وسط ایشیا) کے دریا ہیں۔ طیبیؒ نے لکھا ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جیحان شام کا دریا ہے، جیسا کہ جوہری کا قول ہے، نیز علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دریائے جیحون خراسان کے علاقہ میں بہتا ہے اور سیحون سندھ کا دریا ہے۔ بہر حال تحقیقی بات یہ ہے کہ "جیحان اور سیحان شام کے دریا ہیں جو اس ملک کے قدیم شہر طرطوس اور مصیعہ کے قریب سے گزرتے ہیں اور بحر روم میں آکر گرتے ہیں۔

حدیث کی اس بات کہ ان چاروں دریاؤں کا تعلق جنت کی نہروں اور چشموں سے ہے، کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ زیادہ صحیح قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ حدیث کے یہ الفاظ اپنے ظاہری معنی پر محمول ہیں یعنی حقیقت میں ان چاروں نہروں کا مادہ جنّت میں ہے، چنانچہ مسلمؒ کی ایک روایت میں وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ دریائے نیل و فرات جنت سے نکلے ہیں اور بخاری کی روایت یہ ہے کہ سدرۃ المنتہی کی جڑ سے نکلے ہیں اور معالم التنزیل میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چاروں کا سرچشمہ پہاڑوں کو سونپ دیا ہے اور وہاں سے ان کو زمین پر جاری فرمایا ہے ایک قول یہ ہے کہ جنّت کی ان چار نہروں کو جو وہاں کی تمام نہروں کا سرچشمہ اور اصل ہیں دنیا کے ان چار دریاؤں کے نام کے ساتھ مشہور و نامزد کیا گیا ہے جو اور دریاؤں کی بہ نسبت بہت زیادہ اہمیت، بہت زیادہ شہرت اور پانی کے مٹھاس و دیگر فوائد کے اعتبار سے بہت خصوصی درجہ رکھتے ہیں اور اس کا مقصد اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ فوائد و منافع حاصل ہیں وہ سب جنّت کی نعمتوں اور وہاں کے فوائد و منافع کا نمونہ ہیں۔

ایک اور قول جس کو زیادہ واضح کہا جاسکتا ہے یہ ہے کہ "ان سب دریاؤں کا تعلق جنّت کی نہروں اور چشموں سے ہے" سے مراد یہ ہے کہ ان دریاؤں کا پانی اور پانیوں کی بہ نسبت زیادہ لطیف و شیریں اور اور زیادہ ٹھنڈا و خوشگوار ہے، نیز ان دریاؤں کے پانی سے اتنے زیادہ فوائد اور اتنی زیادہ خصوصیات ہیں کہ جیسے یہ دریا جنّت کی نہروں اور چشموں سے نکلے ہوں۔

دوزخ و جنّت کی وسعت

(۱۷) وَعَنْ عُتْبَةَ بْنِ غَزْوَانَ قَالَ ذُكِرَ لَنَا اَنَّ الْحَجَرَ يُلْقٰى فِيْ شَفَةِ جَهَنَّمَ فَيَهْوِىْ فِيْهَا سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا لَا يُدْرِكُ لَهَا قَعْرًا وَاللّٰهِ لَتُمْلَأَنَّ وَلَقَدْ ذُكِرَ لَنَا اَنَّ مَا بَيْنَ مِصْرَاعَيْنِ مِنْ مَصَارِيْعِ الْجَنَّةِ مَسِيْرَةُ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً وَلَيَاْتِيَنَّ عَلَيْهَا يَوْمٌ وَّهُوَ كَظِيْظٌ مِنَ الزِّحَامِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عتبہ بن غزوانؓ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا (یعنی آنحضرت ﷺ سے یہ روایت نقل کی گئی) کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) "اگر دوزخ کے (اوپری) کنارے سے کوئی پتھر گرایا جائے تو وہ ستر برس تک نیچے لڑھکتا چلا جائے گا اور دوزخ کی تہ تک نہیں پہنچے گا، خدا کی قسم دوزخ (اتنی گہری اور وسیع ہونے کے باوجود کافروں سے) پوری بھر جائے گی۔" اور (حضرت عتبہؓ کہتے ہیں کہ) ہمارے سامنے آنحضرت کا یہ ارشاد گرامی بھی ذکر کیا گیا کہ "جنت کے کسی بھی ایک دروازے کے دونوں بازوؤں کے درمیان چالیس برس کی مسافت کا

فاصلہ ہے اور ایک دن ایسا ہوگا کہ جنت اتنی وسعت وکشادگی کے باوجود) لوگوں سے بھری ہوئی ہوگی۔" (مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جنّت کی تعمیر کا ذکر

⑱ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مِمَّ خُلِقَ الْخَلْقُ قَالَ مِنَ الْمَآءِ قُلْنَا الْجَنَّةُ مَابِنَآءُهَا قَالَ لَبِنَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ وَّلَبِنَةٌ مِّنْ فِضَّةٍ وَّمِلَاطُهَا الْمِسْكُ الْاَذْفَرُ وَحَصْبَآؤُهَا اللُّؤْلُؤُ وَالْیَاقُوْتُ وَتُرْبَتُهَا الزَّعْفَرَانُ مَنْ یَّدْخُلُهَا یَنْعَمُ وَلَا یَبْاَسُ وَیَخْلُدُ وَلَا یَمُوْتُ وَلَا تَبْلٰی ثِیَابُهُمْ وَلَا یَفْنٰی شَبَابُهُمْ (رواہ احمد والترمذی والدارمی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مخلوق کو کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا پانی سے۔" پھر ہم نے پوچھا کہ جنت کس چیز سے بنی ہے یعنی اس کی عمارت پتھر یا اینٹ کی ہے یا مٹی اور یا لکڑی وغیرہ کی؟ فرمایا: "جنت کی (تعمیر اینٹوں کی ہے اور اینٹیں بھی اس طرح کی ہیں کہ) ایک اینٹ سونے کی ہے اور ایک اینٹ چاندی کی، اس کا گارا (یا وہ مصالحہ جس سے اینٹیں جوڑی جاتی ہیں، تیز خوشبودار خاص مشک کا ہے، اس کی کنکریاں (رنگ اور چمک دمک میں) موتی اور یاقوت کی طرح ہیں اور اس کی مٹی زعفران (کی طرح زرد اور خوشبودار) ہے، جو شخص اس (جنت میں) داخل ہوگا، عیش وعشرت میں رہے گا کبھی کوئی رنج وفکر نہیں دیکھے گا، ہمیشہ زندہ رہے گا مرے گا نہیں، نہ اس کا لباس پرانا اور بوسیدہ ہوگا اور نہ اس کی جوانی فنا ہوگی۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: شارحین نے حدیث کے پہلے جزء (یعنی یہ سوال کہ مخلوق کو کس چیز سے پیدا کیا گیا، اور آپ ﷺ کا یہ جواب کہ "پانی سے" کے ضمن میں لکھا ہے کہ حکماء کا اس بارے میں اختلاف رائے ہے کہ اجسام میں سے جو چیز سب سے پہلا عالم وجود میں آئی ہے وہ کیا ہے؟ اکثر کا کہنا یہ ہے کہ سب سے پہلے پانی کا جوہر وجود میں آیا، پھر اس جوہر کو کثیف منجمد کر کے زمین پیدا کی گئی اور اسی جوہر کو رقیق ولطیف کر کے آگ ہوا کو پیدا کیا گیا اور آگ کے دھویں سے آسمان وجود میں آیا۔

یہ بات توریت میں آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جوہر پیدا کیا اور پھر اس پر ہیبت وجلال کی نظر ڈالی تو اس کے اجزاء پگھل کر پانی بن گئے، اس پانی سے ایک بخار بلند ہوا اور دھوئیں کی طرح اوپر کو جا کر پھیل گیا جس سے آسمان وجود میں آیا، پھر پانی کے اوپر جھاگ ظاہر ہوا اور اس سے زمین پیدا ہوئی، اس کے بعد پہاڑ پیدا کر کے ان کو زمین کا لنگر بنایا گیا (یعنی پہلے زمین کو قرار نہیں تھا ہلتی ڈولتی تھی پھر پہاڑوں کے ذریعہ ان کو ساکن ومنجد کیا گیا۔

بعض شارحین نے یہ لکھا ہے کہ حدیث میں "پانی" سے مراد نطفہ (منی) ہے اگر اس مراد کو صحیح مانا جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ "مخلوق" سے مراد "حیوانات" ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وجعلنا من الماء کل شیء حی یعنی ہم نے ہر حیوان کو (خواہ انسان ہو یا غیر انسان) پانی سے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر یوں فرمایا گیا ہے واللّٰہ خلق کل دابة من ماء یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چلنے والے جاندار کو پانی سے پیدا فرمایا ہے رہی یہ بات کہ نطفہ مادہ "تخلیق کو" پانی" سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے تو اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے، پہلی بات یہ کہ وہ مادہ تخلیق پانی ہی کی صورت میں ہوتا ہے دوسرے یہ کہ ہر مخلوق (حیوانات) کی بہت بڑی ضرورت پانی ہی ہے اور ہر حیوان (خواہ انسان ہو یا غیر انسان) سب سے زیادہ فائدہ پانی ہی سے حاصل کرتا ہے۔

جنّت کے درخت

⑲ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا فِی الْجَنَّةِ شَجَرَةٌ اِلَّا وَسَاقُهَا مِنْ ذَهَبٍ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں جو بھی درخت ہے اس کا تنا سونے کا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: جنّت کے ہر ایک درخت کا تنا سونے کا ہے البتہ ان درختوں کی ٹہنیاں اور شاخیں مختلف قسموں کی ہیں۔ کسی کی سونے کی ہے، کسی کی چاندی کی، کوئی ٹہنی یاقوت وزمرد کی ہے یا موتی وغیرہ کی، اور ہر ٹہنی طرح طرح کے شگوفوں سے مرصع ومزین ہے اور اس پر قسم قسم کے میوے اور پھل لگے ہوئے ہیں نیز جنّت کے تمام درختوں کے نیچے نہریں رواں ہیں۔

جنّت کے درجات

(۲۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ مَّابَیْنَ کُلِّ دَرَجَتَیْنِ مِائَةُ عَامٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنّت میں سو درجے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان سو برس کی مسافت کا فاصلہ ہے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث میں "درجوں" سے مراد "بلند مراتب" ہیں جو اہل جنّت کو ان کے اعمال اور نیکیوں کے اعتبار سے ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے هم درجات عند الله (اہل جنّت اللہ کے نزدیک درجات ومراتب میں مختلف ہوں گے) یعنی ان کو اپنے اپنے اعمال کے مطابق الگ الگ مرتبہ ودرجہ ملے گا، جس جنتی کے اعمال جتنے زیادہ اچھے ہوں گے اس کو اتنے ہی زیادہ مراتب نصیب ہوں گے، جیسا کہ دوزخیوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے کفر وشرک کے اعتبار سے دوزخ کے نچلے حصوں میں ڈالے جائیں گے کہ جس دوزخی کے کفریہ اعمال وعقائد جتنے زیادہ خراب رہے ہوں گے اس کو دوزخ کے اتنے ہی نچلے حصوں میں پہنچایا جائے گا، اس کی طرف قرآن کریم کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے ان المنافقین فِی الدرک الاسفل من النار (یقیناً منافقین دوزخ کے نچلے حصوں میں پڑے ہوں گے۔

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ لَوْاَنَّ الْعَالَمِیْنَ اجْتَمَعُوْا فِیْ اِحْدٰهُنَّ لَوَسِعَتْهُمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنّت میں سو درجے ہیں کہ) اگر تمام عالم کے لوگ ان میں سے کسی بھی ایک درجہ میں جمع ہو جائیں تو وہ سب کے لئے کافی ہو گا۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

جنّت کے فرش

(۲۲) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ قَالَ ارْتِفَاعُهَا لَکَمَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ مَسِیْرَةُ خَمْسِ مِائَةِ سَنَةٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد و فرش مرفوعة (اور اونچے اونچے فرش اور بچھونے ہوں گے) کی تفسیر میں فرمایا کہ "ان بچھونوں کی بلندی اتنی ہو گی جتنی کہ آسمان اور زمین کے درمیان مسافت ہے یعنی پانچ سو برس کا راستہ۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جنّت کے درجوں میں جو فرش اور بچھونے ہوں گے وہ اتنے اونچے اونچے ہوں گے کہ بظاہر یہ نظر آئے گا کہ وہ آسمان جیسی بلندی تک چلے گئے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت میں جن اونچے اونچے فرش اور بچھونوں کا ذکر ہے وہ جنّت کے ان درجات میں بچھے ہوں گے جو زمین سے آسمان تک کی مسافت کے بقدر بلند ہوں گے اور جن کی اس بلندی کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ ان للجنة مائة درجة مابین کل درجتین کما بین السماء و الارض (جنّت میں سو درجے ہیں اور ان میں سے ہر دو

درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "فرش مرفوعة" میں لفظ "فرش" سے مراد حوران جنّت ہیں اور "مرفوعة" سے مراد ان حوران جنّت کا حسن و جمال میں دنیا کی عورتوں سے فائق و برتر ہونا ہے، لیکن ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جنّت میں مومن عورتیں حوروں سے بھی زیادہ حسین و جمیل ہوں گی اور ان کو حوروں پر فضیلت اس نماز روزے کے سبب حاصل ہوگی جو وہ دنیا میں کرتی تھیں۔

اہل جنّت کے چمکدار چہرے

(۲۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ زُمْرَةٍ يَّدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ضَوْءُ وُجُوْهِهِمْ عَلٰى مِثْلِ ضَوْءِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَالزُّمْرَةُ الثَّانِيَةُ عَلٰى مِثْلِ اَحْسَنِ كَوْكَبٍ دُرِّيٍّ فِى السَّمَآءِ لِكُلِّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ زَوْجَتَانِ عَلٰى كُلِّ زَوْجَةٍ سَبْعُوْنَ حُلَّةً يُّرٰى مُخُّ سَاقِهَا مِنْ وَّرَآءِهَا (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدری ﷺ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن جنت میں جو لوگ سب سے پہلے داخل ہوں گے (یعنی انبیاء علیہم السلام)، ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن و چمکدار ہوں گے، اور دوسری جماعت کے لوگ (جو انبیاء کے بعد جنّت میں داخل ہوں گے اور وہ اولیاء و صلحاء ہیں) ان کے چہرے آسمان کے اس ستارے کی طرح روشن و چمکدار ہوں گے جو سب سے زیادہ چمکتا ہے۔ نیز ان (جنتیوں) میں سے ہر شخص کے لئے دو بیویاں ہوں گی اور ہر بیوی کے جسم پر (لباس کے) ستر جوڑے ہوں گے (اور وہ دونوں بیویاں اتنی صاف و شفاف اور حسین و جمیل ہوں گی کہ) ان کی پنڈلیوں کے اندر کا گودا ستر جوڑوں کے اوپر سے نظر آتا ہوگا۔"

(ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں ہر جنتی کو دو بیویاں ملنے کا ذکر ہے جب کہ ایک حدیث میں یہ منقول ہے کہ اہل جنّت میں جو سب سے کمتر درجہ کا جنتی ہوگا اس کو بھی بہتر بیویاں اور اسی ہزار خادم ملیں گے پس ان دونوں میں مطابقت کے لئے علماء نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں جو دو بیویوں کا ذکر کرہے تو وہ اس خصوصیت کی حامل ہوں گی کہ ان کی پنڈلیوں کے اندر کا گودا ان کے لباس کے ستر جوڑوں کے اوپر سے بھی نظر آئے گا اور باقی بیویاں تو دنیا کی عورتوں میں سے ملیں گی اور ستر بیویاں حوران جنّت میں سے ملیں گی اور دونوں مل کر بہتر ہوں گی۔

جنتیوں کی مردانہ قوت کا ذکر

(۲۴) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُعْطَى الْمُؤْمِنُ فِى الْجَنَّةِ قُوَّةَ كَذَا وَكَذَا مِنَ الْجِمَاعِ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوَيُطِيْقُ ذٰلِكَ قَالَ يُعْطَى قُوَّةَ مِائَةٍ (رواہ الترمذیؒ)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں مومن کو جنسی اختلاط کی اتنی اتنی قوت عطا کی جائے گی عرض کیا گیا یا رسول اللہ! کیا ایک مرد اتنی عورتوں سے جنسی اختلاط (مباشرت) کی طاقت رکھے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا (جنت میں ایک مرد کو) سو مردوں کی قوت عطا کی جائے گی (اور جب اس کو اتنی زیادہ قوت مردانہ حاصل ہوگی تو پھر وہ کئی کئی عورتوں سے جنسی اختلاط کی طاقت کیوں نہیں رکھے گا۔" (ترمذیؒ)

جنّت کی اشیاء کا ذکر

(۲۵) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِىْ وَقَّاصٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ لَوْ اَنَّ مَا يُقِلُّ ظُفُرٌ مِّمَّا فِى الْجَنَّةِ بَدَا لَتَزَخْرَفَتْ لَهٗ مَا بَيْنَ خَوَافِقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَوْ اَنَّ رَجُلًا مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ اطَّلَعَ فَبَدَا اَسَاوِرُهٗ لَطَمَسَ ضَوْءُهٗ ضَوْءَ الشَّمْسِ كَمَا تَطْمِسُ الشَّمْسُ ضَوْءَ النُّجُوْمِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ

"اور حضرت سعد بن ابی وقاص نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جنت کی چیزوں (یعنی زینت و آرائش کی اشیاء) میں سے اگر ناخن کے برابر بھی کوئی چیز دنیا میں) آجائے تو آسمان و زمین کے اطراف و جوانب تک کی دنیا کی، ہر چیز رونق پا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر جنتیوں میں سے کوئی شخص دنیا کی طرف، جھانکے اور اس کے (ہاتھوں کے) کڑے نمایاں ہو جائیں تو ان کی چمک دمک سورج کی روشنی کو ماند کر دے جیسا کہ سورج ستاروں کی روشنی کو ماند کر دیتا ہے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

جنّت کے مردوں کا ذکر

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَهْلُ الْجَنَّةِ جُرْدٌ مُّرْدٌ كَحْلٰى لَا يَفْنٰى شَبَابُهُمْ وَلَا يُبْلٰى ثِيَابُهُمْ (رواه الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنتی بغیر بالوں کے امرد ہوں گے، ان کی آنکھیں سُرمگیں ہوں گی، ان کا شباب کبھی فناہ نہ ہوگا اور ان کے کپڑے کبھی پرانے نہوں گے۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: لفظ جرد اصل میں اجرد کی جمع ہے اور اجرد اس شخص کو کہتے ہیں جس کے بدن پر بال نہ ہوں، اسی طرح مرد، امرد کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں بے داڑھی کا جوان نیز لفظ کحلی (فعلی کے وزن پر) مکحول کے معنی میں ہے یعنی وہ شخص جس کی پلکوں کی جڑیں پیدائشی سیاہ ہوں اور ایسا نظر آتا ہو کہ اس نے آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا ہے۔

(۲۷) عَنْ مُعَاذِبْنِ جَبَلٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَدْخُلُ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ جُرْدًا مُرْدًا مُكَحَّلِيْنَ اَبْنَآءَ ثَلٰثِيْنَ اَوْ ثَلٰثٍ وَّثَلٰثِيْنَ سَنَةً (رواه الترمذی)

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جنتی جنت میں اس طرح داخل ہوں گے کہ ان کا بدن بالوں سے صاف ہوگا بے داڑھی کے جوان ہوں گے ان کی آنکھیں سرمگیں ہوں گی اور تیس یا تینتیس سال کی عمر کے لگیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: تیس یا تینتیس سال کی عمر مکمّل جوانی اور طاقت و قوت سے بھرپور ہوتی ہے اس لئے جنتی مردوں کو یہی عمر عطا کر کے جنت میں داخل کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ تیس یا تینتیس...... میں حرف "یا" راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت نے تیس کا ذکر فرمایا تھا یا تینتیس کا۔

سدرۃ المنتہی کا ذکر

(۲۸) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِیْ بَكْرٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذُكِرَ لَهٗ سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى قَالَ يَسِيْرُ الرَّاكِبُ فِیْ ظِلِّ الْفَنَنِ مِنْهَا مِائَةَ سَنَةٍ اَوْ يَسْتَظِلُّ بِظِلِّهَا مِائَةُ رَاكِبٍ شَكَّ الرَّاوِی فِيْهَا فِرَاشُ الذَّهَبِ كَاَنَّ ثَمَرَهَا الْقِلَالُ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ

"اور حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کہتی ہیں کہ اس وقت جب کہ رسول کریم ﷺ کے سامنے سدرۃ المنتہی کا ذکر کیا گیا، میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (سدرۃ المنتہی ایسا درخت ہے کہ) کوئی (تیز رفتار) سوار اس کی شاخوں کے سائے میں سو سال تک چلتا رہے یا یہ فرمایا کہ اس کے سائے میں بیک وقت سو سوار دم لے سکیں، اس درخت پر سونے کی ٹڈیاں ہیں گویا اس کے پھل مٹکوں کے برابر ہیں۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "سدرۃ المنتہی" کے معنی ہیں "بیری کا وہ درخت جس پر انتہاء ہے۔" اس درخت کو "سدرۃ المنتہی" اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ

جنّت کے اس انتہائی کنارے پر واقع ہے جس کے پرے کسی کو کچھ علم نہیں کیا ہے، اس کے آگے کسی فرشتے تک کو جانے کا حکم نہیں ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آخری رسائی بھی یہیں تک ہے، اس کے آگے وہ بھی، نہیں جا سکتے صرف آنحضرت ﷺ معراج کی رات میں اس درخت سے آگے گئے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ درخت چھٹے آسمان پر ہے لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ ساتویں آسمان پر۔

"اس درخت پر سونے کی ٹڈیاں ہیں۔" سے شاید یہ مراد ہے کہ اس درخت پر جو نورانی فرشتے ہیں ان کے پر اس طرح چمکتے اور جھلملاتے ہیں جیسے اس کی شاخوں پر سونے کی چمکدار ٹڈیاں ادھر ادھر پھدک رہی ہوں یا یہ کہ اس درخت سے جو انوار اٹھتے ہیں اور شاخوں پر ایک خاص قسم کی روشنی پھوٹتی رہتی ہے اس کو سونے کی "ٹڈیاں" سے تعبیر فرمایا۔ واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد "اس درخت پر سونے کی ٹڈیاں ہیں۔" دراصل اس آیت کریمہ اذیغشی السدرۃ مایغشی۔ (جب اس سدرۃ المنتہی کو ڈھانپ رکھا جو کچھ ڈھانپتا ہے) کی تفسیر ہے، چنانچہ بیضاویؒ نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ فرشتوں کی ایک بہت بڑی جماعت جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہے اس درخت کو ڈھانپے رہتی ہے۔

حوض کوثر کا ذکر

(۲۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الْكَوْثَرُ قَالَ ذٰلِكَ نَهْرٌ اَعْطَانِيْهِ اللّٰهُ يَعْنِىْ فِى الْجَنَّةِ اَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ وَاَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ فِيْهِ طَيْرٌ اَعْنَاقُهَا كَاَعْنَاقِ الْجُزُرِ قَالَ عُمَرُ اِنَّ هٰذِهٖ لَنَاعِمَةٌ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكَلَتُهَا اَنْعَمُ مِنْهَا (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے "کوثر" کے بارے میں پوچھا گیا (کہ وہ کیا چیز ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا "وہ ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی ہے یعنی جنّت میں (میرے لئے مخصوص ہے اس نہر کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے، اس میں ایسے پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹ کی گردنوں کی طرح لمبی ہیں۔" حضرت عمرؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ وہ پرندے تو بہت فربہ اور تنومند ہوں گے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ان پرندوں کو کھانے والے (یعنی جنتی لوگ، ان پرندوں سے بھی زیادہ توانا اور خوشحال ہوں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: لفظ "نہر" ہ کے زبر کے ساتھ بھی ہے اور جزم کے ساتھ بھی منقول ہے! مطلب یہ ہے کہ کوثر" پانی کی ایک نہر ہے جس کے دونوں سروں پر دو حوض ہیں ایک حوض تو موقف (میدان محشر) میں ہے اور دوسرا حوض جنّت میں ہے اور چونکہ اس نہر کا زیادہ حصہ جنّت میں ہے اس لئے "یعنی فی الجنۃ کے ذریعہ وضاحت کی گئی ہے کہ وہ نہر جنّت میں آپ ﷺ کے لئے مخصوص ہے جس سے آپ ﷺ کے امتی سیراب ہوں گے۔

کاعناق الجزر (اونٹ کی گردن کی طرح، میں لفظ "جُزُر" اصل میں "جُزُوْر" کی جمع ہے، اور یہ لفظ ایسے اونٹ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو نحرو ذبح کے لئے تیار ہو، لہٰذا اس جملہ کے ذریعہ اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ پرندے جو حوض کوثر میں ہوں گے، نحرو ذبح کے لئے تیار ملیں گے تاکہ حوض کوثر سے سیراب ہونے والے ان کا گوشت کھا سکیں۔

جنتیوں کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے

(۳۰) وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ فِى الْجَنَّةِ مِنْ خَيْلٍ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ فَلَا تَشَآءُ اَنْ تُحْمَلَ فِيْهَا عَلٰى فَرَسٍ مِنْ يَاقُوْتَةٍ حَمْرَآءَ يَطِيْرُ بِكَ فِى الْجَنَّةِ حَيْثُ شِئْتَ اِلَّا فَعَلْتَ وَسَأَلَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ فِى الْجَنَّةِ مِنْ اِبِلٍ قَالَ فَلَمْ يَقُلْ لَهٗ مَا قَالَ لِصَاحِبِهٖ فَقَالَ اِنْ يُدْخِلْكَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ يَكُنْ لَكَ فِيْهَا مَا اشْتَهَتْ نَفْسُكَ وَلَذَّتْ

عَيْنُكَ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا جنّت میں گھوڑے بھی ہوں گے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جنّت میں داخل کیا اور تم نے گھوڑے پر سوار ہونے کی خواہش ظاہر کی تو تمہیں جنّت میں سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار کیا جائے گا اور تم جنّت میں جہاں جانا چاہوگے وہ گھوڑا برق رفتاری کے ساتھ دوڑے گا اور گویا) اڑ کر تمہیں لے جائے گا (اس کے بعد) آپ ﷺ سے ایک اور شخص نے سوال کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! کیا جنّت میں اونٹ بھی ہوں گے؟ حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت نے اس شخص کو وہ جواب نہیں دیا جو آپ ﷺ نے اس کے ساتھی کو دیا تھا (یعنی جس طرح آپ ﷺ نے پہلے شخص کو جواب دیا تھا اس طرح اس شخص کو یہ جواب نہیں دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جنّت میں داخل کیا اور تم نے اونٹ پر سوار ہونے کی خواہش ظاہر کی تو........الخ، بلکہ بطریق کلیہ) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جنّت میں پہنچا دیا تو وہاں تمہیں ہر وہ چیز ملے گی جس کو تمہارا دل چاہے گا اور تمہاری آنکھیں پسند کریں گی۔" (ترمذی)

تشریح: لفظ "فعلت" صیغۂ خطاب کے ساتھ مجہول اور معروف دونوں طرح پڑھا جاتا ہے لفظی ترجمہ کی صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "مگر یہ کہ تو کیا جائے گا، یعنی تو اپنا مقصد و مدعا دیا جائے گا یا مگر یہ کہ تو کرے گا یعنی تو اپنی خواہش میں مطلب یاب ہو گا۔" نیز یہ لفظ "فعلت" تائے تانیث کے ساتھ بصیغہ مجہول بھی منقول ہے، اس صورت میں یہ ترجمہ ہوگا کہ "مگر یہ کہ تمہارے لئے ایسا کیا جائے گا یعنی تمہاری خواہش کے مطابق وہ گھوڑا تیار اور مہیا کیا جائے گا۔" واضح رہے کہ عربی میں فرس (گھوڑا) مذکر اور مونث دونوں آتا ہے۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ جنّت میں ہر شخص کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کرے گا۔

(۳۱) وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْرَابِیٌّ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اُحِبُّ الْخَیْلَ اَفِی الْجَنَّةِ خَیْلٌ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنْ اُدْخِلْتَ الْجَنَّةَ اُوْتِیْتَ بِفَرَسٍ مِّنْ یَاقُوْتَةٍ لَهٗ جَنَاحَانِ فَحُمِلْتَ عَلَیْهِ ثُمَّ طَارَبِكَ حَیْثُ شِئْتَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ لَیْسَ اِسْنَادُهٗ بِالْقَوِیِّ وَاَبُوْسَوْرَةَ الرَّاوِیْ یُضَعَّفُ فِی الْحَدِیْثِ وَسَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ اِسْمٰعِیْلَ یَقُوْلُ اَبُوْسَوْرَةَ هٰذَا مُنْكَرُ الْحَدِیْثِ یَرْوِیْ مَنَاکِیْرَ۔

"اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے گھوڑے بہت پسند ہیں، کیا جنّت میں گھوڑے بھی ہوں گے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر تمہیں جنّت میں داخل کیا گیا تو تمہیں یاقوت کا ایک گھوڑا دیا جائے گا جس کے دو بازو (پر) ہوں گے پھر تمہیں اس گھوڑے پر سوار کیا جائے گا اور تم جہاں جانا چاہو گے وہ گھوڑا تمہیں اڑا کر لے جائے گا۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے اور ابوسورہ جو اس حدیث کے راوی ہیں کسی سبب سے) فن حدیث میں یا اسناد حدیث میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں، نیز میں نے حضرت محمد بن اسماعیل بخاری کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوسورہ منکر الحدیث ہیں وہ منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں۔"

اہل جنّت میں اُمّت محمدیہ کا تناسب

(۳۲) وَعَنْ بُرَیْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَهْلُ الْجَنَّةِ عِشْرُوْنَ وَمِائَةُ صَفٍّ ثَمَانُوْنَ مِنْهَا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاَرْبَعُوْنَ مِنْ سَآئِرِ الْاُمَمِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ کِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنتیوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی، ان میں سے اسّی صفیں اس اُمّت (مسلمانوں) کی ہوں گی اور چالیس صفیں دوسری امتوں کے لوگوں کی۔" اس روایت کو ترمذیؒ و دارمی نے اور بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اُمت محمدیہ کے جنتیوں کی تعداد دوسری امتوں کے مقابلہ میں دو تہائی زائد ہو گی، لیکن پیچھے باب الشفاعت میں ایک روایت گزری ہے جس میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ مجھے امید ہے تم (مسلمان) اہل جنت کی مجموعی تعداد کا نصف حصہ ہوگئے۔ ان دونوں روایتوں میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ پہلے تو آنحضرت ﷺ نے حق تعالیٰ کی بارگاہ سے یہی امید قائم کی ہو کہ آپ ﷺ کی اُمت کے لوگ اہل جنت کی مجموعی تعداد کا نصف حصہ ہوں، مگر بعد میں حق تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے آنحضرت ﷺ کی اس امید کو اور بڑھا دیا ہو اور جنتیوں میں اُمت محمدیہ کی تعداد کو دو تہائی تک کرنے کی بشارت عطا فرمائی ہو اور یہ اضافہ وزیادتی یقیناً رب کریم کے اس خاص فضل وکرم کا آئینہ دار ہے جو صرف آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کی اُمت مرحومہ کا نصیب ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسری امتوں کے چالیس صفوں کے مقابلہ میں اہل اسلام کی اسی صفیں اس طرح کی ہوں گی کہ وہ صفوں کے اعتبار سے تو زیادہ ہوں گی مگر اشخاص کی تعداد کے اعتبار سے چالیس صفوں ہی کے برابر ہوں گی گویا اہل جنت میں جتنے لوگ دوسری امتوں کی چالیس صفوں میں ہوں گے اتنے ہی لوگ اُمت محمدیہ کی اسی صفوں میں ہوں گے لیکن یہ احتمال بس یوں ہی ہے، صحیح توجیہہ وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی۔

جنت کے اس دروازے کی وسعت جس سے اہل اسلام داخل ہوں گے

(۳۳) وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَابُ اُمَّتِيَ الَّذِيْ يَدْخُلُوْنَ مِنْهُ الْجَنَّةَ عَرْضُهٗ مَسِيْرَةُ الرَّاكِبِ الْمُجَوِّدِ ثَلٰثًا ثُمَّ اِنَّهُمْ لَيُضْغَطُوْنَ عَلَيْهِ حَتّٰى تَكَادُ مَنَاكِبُهُمْ تَزُوْلُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ ضَعِيْفٌ وَسَاَلْتُ مُحَمَّدَ بْنَ اِسْمٰعِيْلَ عَنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ فَلَمْ يَعْرِفْهُ وَقَالَ يَخْلُدُ بْنُ اَبِيْ بَكْرٍ يَرْوِي الْمَنَاكِيْرَ۔

"اور حضرت سالم تابعیؒ اپنے والد محترم (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! جنت کے جس دروازے سے میری اُمت کے لوگ داخل ہوں گے اس کی چوڑائی اس سوار کی تین مسافت کے بقدر ہوگی جو گھوڑے کو تیز دوڑانا خوب جانتا ہے پھر بھی وہ لوگ (یعنی میری اُمت کے جنتی) اس دروازے سے داخل ہوتے وقت نہایت تنگی محسوس کریں گے یہاں تک کہ ان کے کاندھے ایک دوسرے سے رگڑ کھائیں گے یعنی باوجودیکہ وہ دروازہ اس قدر چوڑا ہوگا مگر جب اہل اسلام ہجوم در ہجوم اندر داخل ہوں گے تو وہ دروازہ بھی تنگ معلوم ہوگا اور وہ لوگ ایک دوسرے کے کاندھے سے رگڑ کھاتے ہوئے بڑی دشواری کے ساتھ دروازہ پار کریں گے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، جب میں نے حضرت محمد بن اسماعیل بخاری سے اس حدیث کے راوی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا اور فرمایا کہ خالد بن ابی بکر منکر روایتیں بیان کرتے ہیں۔"

تشریح: اس سوار کی تین....... مسافت کے بقدر" میں "تین" مراد سے یا تو تین راتوں کی مسافت ہے یا تین سال کی اور یہی (تین سال کی مسافت مراد لینا، زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس میں زیادہ مبالغہ ہے، پھر تین سال کے مسافت" سے بھی کثرت" مراد لینا پڑے گی تا کہ یہ روایت اس حدیث کے مخالف نہ پڑے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جنت کے دروازوں میں سے ہر دروازے کے دونوں بازوؤں کا درمیانی فاصلہ چالیس سال کی مسافت کے بقدر ہے، اور اگر "تین سال کو اس کے حقیقی مفہوم پر محمول کرتے ہوئے "کثرت" مراد نہ لی جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ ہوسکتا ہے کہ پہلے آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ اس دروازے کی چوڑائی کم بتائی گئی ہو جس کو آپ ﷺ نے تین سال کی مسافت کے فاصلہ سے تعبیر فرمایا اور پھر بعد میں اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی کا علم آپ ﷺ کو عطا کیا گیا ہو، جس کو آپ ﷺ نے "چالیس سال کی مسافت" کے ذریعہ واضح فرمایا! ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان دونوں روایتوں کو جنت میں داخل ہونے

والوں کے اعتبار سے مختلف چوڑائی معلوم ہوگی کہ جس کے دروازے کے ذریعہ کم لوگ داخل ہوں گے وہ بہت زیادہ چوڑا معلوم ہوگا اور جس دروازے سے بہت زیادہ تعداد میں لوگ داخل ہوں گے وہ بہت زیادہ چوڑا ہوجانے کے باوجود کم چوڑا معلوم ہوگا۔

ترمذیؒ نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے، اور مصابیح میں ہے کہ یہ "روایت ضعیف منکر ہے!" نیز مصابیح کے شارحؒ نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس حدیث کو منکر اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ یہ حدیث ان صحیح احادیث کے خلاف ہے جو مذکورہ مضمون سے متعلق منقول ہیں پھر ترمذیؒ نے اس حدیث کے ضعیف ہونے پر حضرت محمد بن اسمٰعیل یعنی امام بخاریؒ سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے اس حدیث سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا اور یہ اصول ہے کہ جب کوئی ایسا عالم حدیث اور امام فن جو حدیث کا تمام طرق واسناد کی کامل بصیرت اور پوری معلومات رکھتا ہو، یہ کہے کہ میں فلاں حدیث کی واقفیت نہیں رکھتا تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ حدیث ضعیف ہے، علاوہ ازیں امام بخاریؒ نے اس حدیث کے راوی کے بارے میں وضاحت سے یہ کہہ کر "وہ منکر حدیثیں نقل کرتے ہیں گویا فیصلہ ہی دے دیا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

امام بخاریؒ کے اس قول کے یخلد ابن ابی بکر، منکر روایتیں بیان کرتے ہیں کے بارے میں سید جمال الدین نے کہا ہے کہ لفظ یخلد صاحب مشکوٰۃ کا سہو ہے اصل نام خالد ابن ابی بکر ہے کیونکہ ترمذیؒ میں خالد ابن ابی بکر ہی منقول ہے اور اسماء رجال کی کتابوں میں بھی اسی طرح ہے۔

جنّت کا ایک بازار

(۳۴) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَسُوْقًا مَا فِيْهَا شِرًى وَّلَا بَيْعٌ اِلَّا الصُّوَرُ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ فَاِذَا اشْتَهَى الرَّجُلُ صُوْرَةً دَخَلَ فِيْهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنّت میں ایک بازار ہے جس میں خرید وفروخت نہیں ہوگی بلکہ وہاں مردوں اور عورتوں کی (طرح طرح کی حسین وجمیل) صورتیں نظر آئیں گی جو شخص (خواہ مرد ہو یا عورت، وہاں جس صورت کو پسند کرے گا اس میں سما جائے گا اور اسی صورت کا ہوجائے گا۔ اس حدیث کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ وہ بازار دراصل حسن وجمال سے مزین ہونے اور اچھی سے اچھی شکل وصورت میں تبدیل ہونے کا ایک مرکز ہوگا، وہاں ہر طرف ایک سے ایک حسین وجمیل صورتیں نظر آئیں گی، اور جنتیوں میں سے جو بھی شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت ان صورتوں میں سے کسی صورت کو اختیار کرنا چاہے گا اس میں سما جائے گا اور اپنی اسی پسندیدہ شکل وصورت اختیار کرے گا جیسا کہ جن اور فرشتے دنیا میں جس شکل وصورت میں چاہتے ہیں ظاہر ہوتے ہیں۔

دیدار الٰہی اور جنّت کا بازار

(۳۵) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّهٗ لَقِيَ اَبَا هُرَيْرَةَ فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ اَسْاَلُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْمَعَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ فِيْ سُوْقِ الْجَنَّةِ فَقَالَ سَعِيْدٌ اَفِيْهَا سُوْقٌ قَالَ نَعَمْ اَخْبَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ اِذَا دَخَلُوْهَا نَزَلُوْا فِيْهَا بِفَضْلِ اَعْمَالِهِمْ ثُمَّ يُؤْذَنُ لَهُمْ فِيْ مِقْدَارِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ مِنْ اَيَّامِ الدُّنْيَا فَيَزُوْرُوْنَ رَبَّهُمْ وَيُبْرِزُ لَهُمْ عَرْشَهٗ وَيَتَبَدّٰى لَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ فَيُوْضَعُ لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُّوْرٍ وَّ مَنَابِرُ مِنْ لُؤْلُؤٍ وَّ مَنَابِرُ مِنْ يَاقُوْتٍ وَّ مَنَابِرُ مِنْ زَبَرْجَدٍ وَّ مَنَابِرُ مِنْ ذَهَبٍ وَّمَنَابِرُ مِنْ فِضَّةٍ وَّيَجْلِسُ اَدْنَاهُمْ وَمَا فِيْهِمْ دَنِيٌّ عَلٰى كُثْبَانِ الْمِسْكِ وَالْكَافُوْرِ مَا يَرَوْنَ اَنَّ اَصْحَابَ الْكَرَاسِيِّ بِاَفْضَلَ مِنْهُمْ مَجْلِسًا قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَهَلْ نَرٰى رَبَّنَا قَالَ نَعَمْ هَلْ تَتَمَارَوْنَ فِيْ رُؤْيَةِ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ قُلْنَا لَا قَالَ كَذٰلِكَ لَا تَتَمَارَوْنَ فِيْ رُؤْيَةِ رَبِّكُمْ وَلَا يَبْقٰى فِيْ ذٰلِكَ الْمَجْلِسِ رَجُلٌ اِلَّا حَاضَرَهُ اللّٰهُ

مُحَاضَرَةً وَحَتّٰى يَقُوْلَ لِلرَّجُلِ مِنْهُمْ يَا فُلَانُ ابْنَ فُلَانٍ اَتَذْكُرُ يَوْمَ قُلْتَ كَذَا وَكَذَا فَيُذَكِّرُهُ بِبَعْضِ غَدَرَاتِهِ فِي الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ يَارَبِّ اَفَلَمْ تَغْفِرْلِيْ فَيَقُوْلُ بَلٰى فَبِسَعَةِ مَغْفِرَتِيْ بَلَغْتَ مَنْزِلَتَكَ هٰذِهٖ فَبَيْنَمَا هُمْ عَلٰى ذٰلِكَ غَشِيَتْهُمْ سَحَابَةٌ مِّنْ فَوْقِهِمْ فَاَمْطَرَتْ عَلَيْهِمْ طِيْبًا لَّمْ يَجِدُوْا مِثْلَ رِيْحِهٖ شَيْئًا قَطُّ وَيَقُوْلُ رَبُّنَا قُوْمُوْا اِلٰى مَآ اَعْدَدْتُّ لَكُمْ مِّنَ الْكَرَامَةِ فَخُذُوْا مَا اشْتَهَيْتُمْ فَنَاْتِيْ سُوْقًا قَدْ حَفَّتْ بِهِ الْمَلٰٓئِكَةُ فِيْهَا مَالَمْ تَنْظُرِ الْعُيُوْنُ اِلٰى مِثْلِهٖ وَلَمْ تَسْمَعِ الْاٰذَانُ وَلَمْ يَخْطُرْ عَلَى الْقُلُوْبِ فَيُحْمَلُ لَنَا مَا اشْتَهَيْنَا لَيْسَ يُبَاعُ وَلَا يُشْتَرٰى وَفِيْ ذٰلِكَ السُّوْقِ يَلْقٰى اَهْلُ الْجَنَّةِ بَعْضُهُمْ بَعْضًا قَالَ فَيُقْبِلُ الرَّجُلُ ذُوالْمَنْزِلَةِ وَالْمُرْتَفِعَةِ فَيَلْقٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ وَمَافِيْهِمْ دَنِيٌّ فَيَرُوْعُهٗ مَايَرٰى عَلَيْهِ مِنَ اللِّبَاسِ فَمَا يَنْقَضِيْ اٰخِرُ حَدِيْثِهٖ حَتّٰى يَتَخَيَّلَ عَلَيْهِ مَاهُوَ اَحْسَنُ مِنْهُ وَ ذٰلِكَ اَنَّهٗ لَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ اَنْ يَّحْزَنَ فِيْهَا ثُمَّ نَنْصَرِفُ اِلٰى مَنَازِلِنَا فَيَتَلَقَّانَا اَزْوَاجُنَا فَيَقُلْنَ مَرْحَبًا وَّاَهْلًا لَقَدْ جِئْتَ وَاِنَّ بِكَ مِنَ الْجَمَالِ اَفْضَلَ مِمَّا فَارَقْتَنَا عَلَيْهِ فَنَقُوْلُ اِنَّا جَالَسْنَا الْيَوْمَ رَبَّنَا الْجَبَّارَ وَيَحِقُّنَا اَنْ نَّنْقَلِبَ بِمِثْلِ مَا انْقَلَبْنَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ

"اور حضرت سعید بن مسیب تابعیؒ سے روایت ہے کہ (ایک دن بازار میں) حضرت ابوہریرہؓ سے ان کی ملاقات ہوئی تو حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ (جس طرح آج مدینہ کے بازار میں ہم دونوں کی ملاقات ہوئی ہے اسی طرح، جنت کے بازار میں ہم دونوں کو ملائے۔ حضرت سعید نے (یہ سن کر) کہا کہ کیا جنت میں بازار بھی ہوگا؟ (حالانکہ بازار تو خرید و فروخت پوری کرنے کے لئے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جنت میں یہ ضرورت پیش نہیں آئے گی) حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا "ہاں" (جنت میں بازار بھی ہوگا مگر وہاں کا بازار دنیاوی بازار جیسی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہیں ہوگا) مجھ کو رسول کریم ﷺ نے بتایا تھا کہ جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو اپنے (اپنے اعمال کی فضیلت و برتری کے لحاظ سے جنت (کی منزلوں اور درجوں) میں فروکش ہوں گے (یعنی جس کے اعمال جتنے زیادہ اور جتنے اعلیٰ ہوں گے اسی کے اعتبار سے اس کو بلند تر اور خوب تر مکانات و منازل ملیں گے) پھر ان کو دنیاوی دنوں کے اعتبار سے جمعہ کے دن اجازت دی جائے گی اور وہ سب اس دن اپنے پروردگار کی زیارت کریں گے پروردگار ان کے سامنے اپنا عرش ظاہر کرے گا اور جنتیوں کو اپنا دیدار کرانے کے لئے جنت کے ایک بڑے باغ میں جلوہ فرما ہوگا، پس (پروردگار کی زیارت کو آنے والے) جنتیوں کے لئے اس باغ میں (مختلف درجات کے منبر یعنی) نور کے منبر، موتیوں کے منبر، یاقوت کے منبر سونے کے منبر اور چاندی کے منبر رکھے جائیں گے جن پر وہ جنتی (اعمال و افعال اور مراتب و درجات کے تفاوت کے اعتبار سے) بیٹھیں گے (کہ جو جنتی جس درجہ مرتبہ کا ہوگا اسی کے مطابق اس کے ان منبروں میں سے ایک منبر مخصوص ہوگا) نیز ان جنتیوں میں سے جو جنتی ادنیٰ مرتبہ و درجہ کا ہوگا (یعنی صرف مرتبہ کے اعتبار سے ادنیٰ) نہ کہ ان میں کوئی معمولی اور ذلیل ہوگا، وہ مشک و کافور کے ٹیلوں پر بیٹھے گا (گویا منبر اور کرسیاں اعلیٰ مرتبہ والوں کے لئے مخصوص ہوں گی اور ادنیٰ مرتبہ کے لوگ ٹیلوں پر بیٹھیں گے جیسا کہ دنیا میں بھی قاعدہ ہے کہ عام اجتماعات میں اونچی حیثیتوں کے لوگ کرسیوں اور شہ نشین پر بیٹھتے ہیں جب کہ کم حیثیت کے لوگ زمین و فرش پر بیٹھتے ہیں) لیکن ٹیلوں پر بیٹھنے والے لوگوں کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ منبر اور کرسیوں پر بیٹھنے والے لوگ جگہ و نشست گاہ کے اعتبار سے اس سے برتر و افضل ہیں۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا اس دن ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں یقیناً کیا تم (دن میں) سورج کو اور (اجالی رات میں) چودھویں شب کے چاند کو دیکھنے میں کوئی شبہ رکھتے ہو؟" ہم نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں، فرمایا "اسی طرح تمہیں اس دن اپنے پروردگار کو دیکھنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوگا، اور دیدار الٰہی کی اسی مجلس میں ایسا کوئی شخص باقی نہیں رہے گا جس سے پروردگار تمام حجابات اٹھا کر براہ راستہ ہم کلام نہیں ہوگا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حاضرین میں سے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ اے فلاں ابن فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب تو نے ایسا ایسا کہا تھا (یعنی اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالے تھے یا ایسے کام کئے تھے جو شرعاً ناجائز تھے؟ وہ شخص یہ سن کر گویا توقف کرے گا اور اپنے کئے ہوئے گناہوں کے اظہار میں تامل کرے گا، پس پروردگار اس کو کچھ وہ عہد شکنیاں یاد دلائے گا جس کا اس نے دنیا میں ارتکاب کیا ہوگا

(یعنی اس کے دنیا کے وہ گناہ یاد دلائے گا جن کے ارتکاب میں عہد ربوبیت کا توڑنا لازم آتا ہے۔) تب وہ شخص عرض کرے گا کہ میرے پروردگار کیا آپ ﷻ نے میرے وہ گناہ بخش نہیں دیئے ہیں!؟ (یعنی میرا جنت میں داخل کیا جانا کیا اس بات کی علامت نہیں ہے کہ میں نے جو وہ گناہ کئے تھے آپ ﷻ نے ان کو بخش دیا ہے) پروردگار فرمائے گا: "بے شک میں نے تیرے وہ گناہ بخش دیئے ہیں اور تو میری وسعت بخشش کے طفیل (آج) اس مرتبہ کو پہنچا ہے۔" پھر وہ لوگ اسی حالت اور اسی جگہ پر ہوں گے کہ ایک بادل آکر ان کے اوپر چھا جائے گا اور ان پر ایسی خوشبو برسائے گا کہ انہوں نے اس جیسی خوشبو کبھی کسی چیز میں نہیں پائی ہوگی۔ اس کے بعد ہمارا پروردگار فرمائے گا کہ (لوگو!) اٹھو اور اس چیز کی طرف آؤ جو ہم نے ازقسم عظمت و بزرگی تمہارے لئے تیار کر رکھی ہے اور تم اپنی پسند و خواہش کے مطابق جو چاہو لے لو (آنحضرت نے فرمایا کہ یہ سن کر) ہم جنتی لوگ اس بازار میں پہنچیں گے جس کو فرشتے گھیرے ہوئے ہوں گے اس بازار میں ایسی ایسی چیزیں موجود ہوں گی کہ ان جیسی کوئی چیز نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوگی نہ کسی کان نے سنی ہوگی اور نہ کسی کے دل میں ان کا تصور آیا ہوگا پھر اس بازار میں سے اٹھا اٹھا کر ہمیں وہ چیزیں دی جائیں گی جن کی ہم خواہش کریں گے درآنحالیکہ اس بازار میں خرید و فروخت جیسا کوئی معاملہ نہیں ہوگا (بلکہ وہ بازار اصل جنتیوں کو ان کی من پسند چیزیں عطا کئے جانے کا مرکز ہوگا) نیز اس بازار میں تمام جنتی آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "(اس بازار میں باہمی ملاقاتوں کے وقت) ایک بلند مرتبہ شخص ایک ایسے شخص کی طرف متوجہ ہوگا اور اس سے ملاقات کرے گا جو (مرتبہ میں) اس سے کمتر ہوگا، لیکن جنتیوں میں (کسی کا اعلیٰ اور کسی کا کمتر ہونا صرف مرتبہ اور درجہ کے اعتبار سے ہوگا) یہ نہیں کہ کوئی معمولی اور ذلیل خیال کیا جائے گا (گویا ذاتی اعتبار سے تو تمام ہی جنتی بلند حیثیت اور بلند عزت ہوں گے تاہم دنیا میں اختیار کئے جانے والے اعمال وافعال کی نسبت سے کچھ لوگ اعلیٰ مرتبہ کے ہوں گے اور کچھ لوگ ان سے کم مرتبہ کے، بہرحال اس بلند مرتبہ شخص کو وہ لباس پسند نہیں آئے گا جو وہ کمتر درجہ کے اس شخص کو پہنے ہوئے دیکھے گا اور ان دونوں کا سلسلہ گفتگو (یا ان کے خیالات کا سلسلہ، ختم بھی نہ ہونے پائے گا کہ وہ بلند مرتبہ شخص محسوس کرے گا کہ میرے مخاطب کا لباس تو میرے لباس سے بھی بہتر ہے، اور یہ (یعنی کمتر درجہ والے شخص کے جسم پر اعلیٰ لباس کا ظاہر ہونا، اس لئے ہوگا کہ جنت میں کسی شخص کو غمگین ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا (آنحضرت ﷺ نے فرمایا) اس کے بعد ہم سب جنتی اپنے اپنے محلات اور مکانوں کی طرف واپس ہوں گے اور وہاں ہماری بیویاں (یعنی دنیا کی بیویاں اور جنت کی حوریں، ہم سے ملیں گی تو مرحبا، خوش آمدید کہہ کر ہمارا استقبال کریں گی اور ہر ایک عورت اپنے مرد سے کہے گی کہ تم اس حال میں واپس آئے ہو کہ اس وقت تمہارا حسن وجمال اس حسن وجمال سے کہیں زیادہ ہے جو ہمارے پاس سے جاتے وقت تم میں تھا پس ہم اپنی بیویوں سے کہیں گے کہ آج ہم نے اپنے پروردگار کے ساتھ ہم نشینی کی عزت حاصل کی ہے جو جسم وبدن اور حسن وجمال کی ہر کمی کو پورا کر کے خوب تر بنانے والا ہے، لہٰذا ہم اپنی اس شان کے ساتھ واپس آنے کے لائق ہیں جس شان کے ساتھ کہ ہم آئے ہیں (کیونکہ جس شخص کو اس ذات کی ہم نشینی حاصل ہو جائے کہ تمام تر حسن وجمال اسی کے نور کا پرتو ہے، تو وہ شخص زیادہ سے زیادہ حسن وجمال کیسے نہیں پائے گا) اس روایت کو ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے، نیز ترمذیؒ نے کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: جنت میں چونکہ نہ شب وروز کی گردش ہوگی اور نہ ایام کا وجود، لہٰذا دنیاوی اعتبار سے جمعہ کے دن۔" سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کا عرصہ جتنے وقت پر مشتمل ہوتا ہے جنت میں اسی عرصہ کا تعین کر کے کچھ وقت کو "جمعہ کا دن" قرار دے دیا جائے گا اور اس اعتبار سے وہ وقت گویا وہ دن ہوگا جو دنیا میں جمعہ کا دن ہوتا تھا اور پھر اس وقت جنتیوں کو حکم ہوگا کہ اپنے پروردگار کی زیارت کے لئے اپنے اپنے محلات اور مکانات سے نکل کر فلاں باغ میں پہنچیں، پس جنت میں پروردگار کی زیارت کے لئے "جمعہ کے دن" کا تعین دراصل اس بات کا نتیجہ اور اجر وانعام ہوگا کہ وہ جنتی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جمعہ کے دن اپنے گھروں سے نکل کر جامع مسجد پہنچتے اور جمعہ کی نماز پڑھتے تھے۔

پروردگار ان کے سامنے اپنا عرش ظاہر کرے گا۔" میں "عرش" سے مراد پروردگار کا نہایت لطف وکرم اور زیادہ سے زیادہ رحمت

وعنایت ہے، ورنہ یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ عرش، جنّت کی چھت ہے، لہٰذا جنتیوں کے سامنے عرش کا ظاہر ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

"نہ کہ ان میں کوئی معمولی اور ذلیل ہوگا۔" یہ جملہ ماقبل عبارت کی وضاحت ہے گویا حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ میں نے جو یہ کہا ہے کہ۔ "ان جنتیوں میں سے جو جنتی ادنی مرتبہ و درجہ کا ہوگا۔" تو "ادنی" سے مراد اعلی درجات اور زیادہ سے زیادہ مراتب رکھنے والے جنتیوں کے مقابلہ پر کمتر درجہ اور قلیل مراتب رکھنا ہے نہ کہ "ادنی" کا لفظ حقارت" کی جگہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ذات کے اعتبار ذلیل و حقیر اور ادنی ہونا ہے پس واضح رہے کہ جنّت میں ذاتی شخصیت کی حد تک ہر جنتی یکساں مرتبہ کا ہوگا، کوئی کسی کے مقابلہ پر ذلیل و حقیر نہیں ہوگا، صرف حیثیت اور مرتبہ کا فرق ہوگا کہ دنیا میں اختیار کئے جانے والے اعمال وافعال کے اعتبار سے کچھ لوگ اعلی درجات اور زیادہ مراتب کے حامل ہوں گے اور کچھ لوگ ان کی بہ نسبت کم درجہ و مرتبہ کے ہوں گے۔

"ٹیلوں پر بیٹھنے والے لوگوں کو یہ احساس نہیں ہوگا........الخ کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ٹیلوں پر بیٹھتے ہوں گے وہ کرسیوں اور منبروں پر بیٹھنے والوں کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں گے کیونکہ جنّت میں ہر شخص اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت پر صابر و شاکر ہوگا، جو لوگ کمتر درجہ کے ہوں گے وہ یہ جاننے کے باوجود کہ ہم کمتر درجہ کے ہیں اور ہمارے مقابلہ پر فلاں لوگ برتر درجہ کے ہیں۔ اپنے طور پر پوری طرح مطمئن ہوں گے، نہ وہ بلند مرتبے کی آرزو کریں گے نہ انہیں بلند مرتبہ کی محرومی کا احساس اور غم ہوگا اور نہ انہیں کسی طرح کی غیرت و خجالت محسوس ہوگی۔

"فیروعہ مایری علیہ من اللباس" اس عبارت کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ لفظ روع کے دو معنی آتے ہیں ایک توڈرانا دوسرے خوش کرنا پہلے معنی مراد لینے کی صورت میں (اس عبارت کا ترجمہ و مطلب وہی ہوگا جو اوپر بیان کیا گیا یعنی جب وہ بلند رتبہ شخص اس کم مرتبہ شخص کے بدن کا لباس دیکھے گا تو اس کو ڈر یعنی کراہت محسوس ہوگی کیونکہ وہ لباس اس کے لباس سے کمتر درجہ کا ہوگا۔ دوسرے معنی کی صورت میں ترجمہ و مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ بلند مرتبہ شخص اس کم مرتبہ شخص کا لباس دیکھے گا تو اسے اس بات کی بہت خوشی محسوس ہوگی کہ خود ان کے بدن پر اعلی لباس ہے، لیکن زیادہ صحیح معنی پہلے ہی ہیں اور اس عبارت سے متعلّق آگے کے جملوں کا ترجمہ بھی اسی پہلے معنی کو بنیاد بنا کر کیا گیا ہے۔

اہل جنّت میں اولاد کی خواہش

(۳۶) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَدْنٰی اَهْلِ الْجَنَّةِ الَّذِیْ لَهٗ ثَمَانُوْنَ اَلْفَ خَادِمٍ وَّاثْنَتَانِ وَسَبْعُوْنَ زَوْجَةً وَّتُنْصَبُ لَهٗ قُبَّةٌ مِّنْ لُؤْلُؤٍ وَزَبَرْجَدٍ وَّیَاقُوْتٍ كَمَا بَیْنَ الْجَابِیَةِ اِلٰی صَنْعَآءَ وَبِهٰذَا الْاَسْنَادِ قَالَ مَنْ مَّاتَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ مِنْ صَغِیْرٍ اَوْ كَبِیْرٍ یُرَدُّوْنَ بَنِیْ ثَلٰثِیْنَ فِی الْجَنَّةِ لَا یَزِیْدُوْنَ عَلَیْهَا اَبَدًا وَّكَذٰلِكَ اَهْلُ النَّارِ وَبِهٰذَا الْاَسْنَادِ قَالَ اِنَّ عَلَیْهِمُ التِّیْجَانَ اَدْنٰی لُؤْلُؤَةٍ مِنْهَا لَتُضِیْءُ مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَبِهٰذَ الْاِسْنَادِ قَالَ الْمُؤْمِنُ اِذَا اشْتَهَی الْوَلَدَ فِی الْجَنَّةِ كَانَ حَمْلُهٗ وَوَضْعُهٗ وَ سِنُّهٗ فِیْ سَاعَةٍ كَمَا یَشْتَهِیْ وَقَالَ اِسْحٰقُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ فِیْ هٰذَا الْحَدِیْثِ اِذَا اشْتَهَی الْمُؤْمِنُ فِی الْجَنَّةِ الْوَلَدَ كَانَ فِیْ سَاعَةٍ وَّلٰكِنْ لَّا یَشْتَهِیْ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَ قَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ وَرَوَی ابْنُ مَاجَةَ الرَّابِعَةَ وَالدَّارِمِیُّ الْاَخِیْرَةَ۔

"اور حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنتیوں میں سب سے کم مرتبہ کا جو شخص ہوگا اس کے اسی ہزار خادم اور بہتر بیویاں ہوں گی، (جن میں سے دو بیویاں دنیا کی عورتوں میں سے اور ستر بیویاں حوران جنت میں سے ہوں گی) اس لئے جو خیمہ کھڑا کیا جائے گا وہ موتی زمرد اور یاقوت سے (بنا ہوگا یا یہ کہ ان چیزوں سے مرصع و مزین) ہوگا۔" اسی اسناد کے ساتھ (حضرت ابو سعیدؓ سے نقل ہونے والی) ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ لوگ جن کو جنت میں داخل کیا جائے گا دنیا میں خواہ چھوٹی عمر میں مرے

بڑی عمر میں جنت کے اندر تیس تیس سال کی عمر کے ہو کر جائیں گے اور وہ کبھی بھی اس عمر سے زیادہ کے نہیں ہوں گے، یہی معاملہ دوزخیوں کا بھی ہوگا۔" اور اسی اسناد کے ساتھ ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جنتیوں کے سروں پر جو تاج ہوگا اس کا سب سے معمولی موتی بھی ایسا ہوگا کہ مشرق سے مغرب تک کو روشن و منور کردے۔" اور اسی اسناد کے ساتھ ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر (بالفرض) کوئی مسلمان جنت میں اولاد کا خواہش مند ہوگا تو (اس کی خواہش اس طرح پوری کی جائے گی کہ) بچہ کا حمل قرار پانا، اس کا پیدا ہونا اور اس کا انتہائی عمر (یعنی تیس سال کی عمر) تک پہنچنا سب کچھ ایک ساعت میں عمل پذیر ہو جائے گا۔" حضرت ابو اسحٰق بن ابراہیمؒ اس آخری روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی مومن جنت میں اولاد کا خواہش مند ہوگا تو اس کی خواہش ایک ساعت میں پوری تو ہو جائے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی خواہش کوئی بھی نہیں کرے گا اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ ابن ماجہؒ نے چوتھی روایت نقل کی ہے اور دارمیؒ نے صرف آخر کا حصہ (جو ابو اسحٰق سے منقول ہے) نقل کیا ہے۔"

تشریح: "یہی معاملہ دوزخیوں کا بھی ہوگا۔" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اہل جنت تیس تیس سال کی عمر کے ہو کر جنت میں داخل ہوں گے خواہ وہ دنیا میں چھوٹی عمر میں مرے ہوں یا بڑی عمر میں، اسی طرح دوزخی بھی تیس تیس سال ہی کی عمر کے ہو کر دوزخ میں جائیں گے اور جنتیوں کی طرف وہ دوزخی بھی ہمیشہ تیس ہی سال کی عمر کے رہیں گے واضح رہے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کے لئے ہمیشہ کی عمر تیس سال مقرر ہونا شاید اس لئے ہو کہ جو مستحق چین و راحت ہوں انہیں کامل راحت نصیب ہو سکے اور جو مستحق عذاب ہوں انہیں کامل عذاب ملے، پس جس طرح اہل جنت دار القرار میں ہمیشہ ہمیشہ اپنی اس بھری عمر کے ساتھ راحت و چین کا پورا سکھ اٹھاتے رہیں گے اسی طرح اہل دوزخ دار البوار میں ہمیشہ ہمیشہ اپنی بھری عمر کے ساتھ عذاب و سختی کا پورا دکھ جھیلتے رہیں گے۔

حوروں کا گیت

(۳۷) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَمُجْتَمَعًا لِلْحُوْرِ الْعِيْنِ يَرْفَعْنَ بِاَصْوَاتٍ لَمْ تَسْمَعِ الْخَلَائِقُ مِثْلَهَا يَقُلْنَ نَحْنُ الْخٰلِدَاتُ فَلَا نَبِيْدُ وَنَحْنُ النَّاعِمَاتُ فَلَا نَبْاَسُ وَنَحْنُ الرَّاضِيَاتُ فَلَا نَسْخَطُ طُوْبٰى لِمَنْ كَانَ لَنَا وَكُنَّا لَهٗ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جنت میں حوران عین کے اجتماع کی ایک جگہ ہوگی (جہاں وہ حوریں سیر و تفریح اور ایک دوسرے سے ملنے کے لئے جمع ہوا کریں گی) اور وہاں بلند آواز سے گیت گائیں گی (ان کی آواز اس قدر دل کش اور حسین، ہوگی کہ) مخلوقات میں سے کسی نے ایسی آواز کبھی نہیں سنی ہوگی، وہ حوریں اس طرح کا گیت گائیں گی: "ہمیں زندگی میں دوام حاصل ہے، ہم کبھی موت کی آغوش میں نہیں جائیں گی ہم عیش و چین کے ساتھ رہنے والی ہیں ہم کبھی سختی و پریشانی نہیں دیکھیں گی ہم اپنے پروردگار یا اپنے خاوندوں سے راضی و خوش رہنے والی ہیں، ہم کبھی ناخوش نہیں ہوں گی ہر اس شخص کے لئے مبارکبادی ہے جو (جنت میں) ہمارے لئے ہے اور ہم اس کے لئے ہیں۔" (ترمذیؒ)

جنّت کے دریا اور نہریں

(۳۸) وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ بَحْرَ الْمَآءِ وَبَحْرَ الْعَسَلِ وَبَحْرَ اللَّبَنِ وَبَحْرَ الْخَمْرِ ثُمَّ تَشَقَّقُ الْاَنْهَارُ بَعْدُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ مُعٰوِيَةَ۔

"اور حکیم ابن معاویہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "جنت میں پانی کا دریا ہے، اور شہد کا دریا ہے، اور دودھ کا دریا ہے اور شراب کا دریا ہے اور پھر (جنت میں جنتیوں کے داخل ہونے کے بعد) ان دریاؤں سے اور نہریں نکلیں گی۔" (ترمذیؒ) دارمیؒ نے اس

روایت کو معاویہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: ظاہر ہے کہ حدیث میں مذکورہ دریاؤں سے مراد ان نہروں کے چشمے اور منبع ہیں جن کا ذکر قرآن کی اس آیت میں کیا گیا ہے۔

فِيهَا اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَّاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ط۔

"اس (جنت) میں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہ ہوگا اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلہ ہوا نہ ہوگا اور بہت سی نہریں شراب کی ہیں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی اور بہت سی نہریں ہیں شہد کی جو بالکل صاف شفاف ہوگا۔"

یہ نہریں وہ ہوں گی جو حدیث میں مذکورہ دریاؤں سے نکلیں گی، اور پھر ان نہروں سے چھوٹی چھوٹی نہریں شاخ در شاخ نکل کر ابرار و اخیار کے خیموں کی طرف جاری ہوں گی اور محلات کے نیچے بہیں گی۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حدیث میں جن دریاؤں کا ذکر ہے وہ دراصل وہی نہریں ہیں جن کو قرآن کی مذکورہ آیت میں "نہر" ہی کے نام سے ذکر کیا گیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ حدیث میں ان کو "دریا" سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن نے ان کو ان کے معنی "جاری ہونے اور بہنے کی مناسبت سے نہر کا نام دیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حوران جنّت کا ذکر

(۳۹) عَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ فِى الْجَنَّةِ لَيَتَّكِئُ فِى الْجَنَّةِ سَبْعِيْنَ مَسْنَدًا قَبْلَ اَنْ يَّتَحَوَّلَ ثُمَّ تَاتِيْهِ امْرَاَةٌ فَتَضْرِبُ عَلٰى مَنْكِبَيْهِ فَيَنْظُرُ وَجْهَهٗ فِىْ خَدِّهَا اَصْفٰى مِنَ الْمِرْاٰةِ وَاِنَّ اَدْنٰى لُؤْلُؤَةٍ عَلَيْهَا تُضِيْءُ مَابَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ فَتُسَلِّمُ عَلَيْهِ فَيَرُدُّ السَّلَامَ وَيَسْاَلُهَا مَنْ اَنْتِ فَتَقُوْلُ اَنَا مِنَ الْمَزِيْدِ وَاِنَّهٗ لَيَكُوْنُ عَلَيْهَا سَبْعُوْنَ ثَوْبًا فَيَنْفُذُهَا بَصَرُهٗ حَتّٰى يَرٰى مُخَّ سَاقِهَا مِنْ وَّرَآءِ ذٰلِكَ وَاِنَّ عَلَيْهَا مِنَ التِّيْجَانِ اِنَّ اَدْنٰى لُؤْلُؤَةٍ مِنْهَا لَتُضِيْءُ مَابَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (رواہ احمد)

"حضرت ابوسعیدؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جنتی مرد جزاء یافتہ شخص، جنت میں ستر مسندوں کا تکیہ لگا کر بیٹھے گا قبل اس کے کہ ایک پہلو سے دوسرا پہلو بدلے پھر جنت کی عورتوں میں سے ایک عورت اس کے پاس آئے گی اور (اس کو اپنی طرف متوجہ و مائل کرنے کے لئے) اس کے کاندھے پر ٹھوکا دے گی، وہ مرد اس طرف متوجہ ہوگا اس کے رخساروں میں، جو آئینہ سے زیادہ صاف و روشن ہوں گے اپنا چہرہ دیکھے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اس عورت کے (کسی زیور یا تاج میں جڑا ہوا) ایک معمولی سا موتی بھی (اس قدر بیش قیمت اور نظر کو خیرہ کرنے والا ہوگا کہ) اگر وہ دنیا میں آجائے تو مشرق سے مغرب تک (کی ہر چیز) کو روشن و منور کردے۔ بہر حال وہ عورت اس مرد کو سلام کرے گی اور مرد اس کے سلام کا جواب دے گا اور پوچھے گا تم کون ہو؟ وہ کہے گی کہ میں "مزید" میں سے ہوں۔ صورت حال یہ ہوگی کہ اس عورت کے جسم پر ستر (رنگ برنگ) کپڑوں کا (تہ در تہ لباس ہوگا اور اس مرد کی نظر عورت کے اس لباس میں سے بھی پار ہو جائے گی (یعنی وہ لباس کے نیچے چھپے ہوئے عورت کے حسن و جمال اور اس کے جسم کی نزاکت و لطافت کا نظارا کرے گا) یہاں تک کہ وہ مرد اس عورت کی پنڈلی کے گودے کو لباس کے پیچھے سے دیکھے گا (گویا اس کی نگاہ اتنی تیز اور صاف ہوگی کہ کوئی بھی چیز اس کے) آگے دیکھنے میں رکاوٹ نہیں بنے گی) اور اس عورت کے سر پر تاج رکھے ہوں گے اور ان تاجوں کا معمولی سا موتی بھی ایسا ہوگا کہ اگر وہ (دنیا میں آجائے) تو مشرق سے مغرب تک (کی ہر چیز) کو روشن و منور کردے۔" (احمدؒ)

تشریح: "قبل اس کے کہ وہ ایک پہلو سے دوسرا پہلو بدلے" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس مرد کے پہلوؤں میں اتنے

زیادہ گاؤ تکئے رکھے ہوں گے کہ وہ ایک ہی پہلو پر بیٹھا ہوا دوسرا پہلو بدلنے تک طرح طرح کے ستر تکیوں سے ٹیک لگائے گا۔

"میں، مزید، میں سے ہوں۔" یعنی ان نعمتوں میں سے ایک نعمت ہوں جن کا حق تعالیٰ نے تمہاری نیکو کاریوں کے بدلہ و جزاء کے علاوہ خصوصی انعام کے طور پر مزید عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا یہ گویا قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہوگا کہ:

لھم مایشاؤن فیھا ولدینا مزید۔

"ان (اہل ایمان) کو جنت میں وہ کچھ ملے گا جو ہم (جزاء کے طور پر) دینا چاہیں گے اس کے علاوہ ہمارے پاس اور بھی (خصوصی انعام) ہیں۔"

اس مضمون کی ایک آیت یہ بھی ہے:

للذین احسنوا الحسنی وزیادۃ۔

"نیک کاروں کے لئے جنت ہیں مزید برآں۔"

ویسے مفسرین نے اس آیت میں زیادۃ (مزید برآں) کی تفسیر "حق تعالیٰ کا دیدار" کیا ہے، تاہم یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ ان مزید نعمتوں (خصوصی انعام) میں سے ایک نعمت بعض حوریں بھی ہیں، رہی یہ بات کے حوران جنت کی اس نعمت کو "مزید یا زیادہ سے کیوں تعبیر فرمایا گیا ہے تو وجہ یہ ہے کہ وہ فضل خداوندی سے بندوں کو ان نیک اعمال کی جزاء میں عطا کی جائیں گی، اب وہ جنت عطا ہونے کے بعد پھر بندوں کو جو کچھ ملے گا وہ خصوصی عنایت و انعام اور فضل بر فضل ہوگا اور ظاہر ہے کہ اصل اجر و بدلہ سے زائد چیز ہوگی۔

جنت میں زراعت کی خواہش اور اس کی تکمیل

(۴۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَتَحَدَّثُ وَعِنْدَهٗ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْبَادِیَةِ اِنَّ رَجُلًا مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ اسْتَاْذَنَ رَبَّهٗ فِی الزَّرْعِ فَقَالَ لَهٗ اَلَسْتَ فِیْمَا شِئْتَ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَزْرَعَ فَبَذَرَ فَبَادَرَ الطَّرْفَ نَبَاتُهٗ وَاسْتِوَاءُهٗ وَاسْتِحْصَادُهٗ فَکَانَ اَمْثَالَ الْجِبَالِ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی دُوْنَکَ یَا ابْنَ اٰدَمَ فَاِنَّهٗ لَا یُشْبِعُکَ شَیْءٌ فَقَالَ الْاَعْرَابِیُّ وَاللّٰهِ لَا تَجِدُهٗ اِلَّا قُرَشِیًّا اَوْ اَنْصَارِیًّا فَاِنَّهُمْ اَصْحَابُ زَرْعٍ وَاَمَّا نَحْنُ فَلَسْنَا بِاَصْحَابِ زَرْعٍ فَضَحِکَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے پاس ایک دیہاتی مسلمان بیٹھا ہوا تھا اور آپ ﷺ یہ حدیث ارشاد فرما رہے تھے کہ: "جنتیوں میں ایک شخص اپنے پروردگار سے کھیتی کی اجازت طلب کرے گا، خداوند تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ موجود نہیں ہے؟ (یعنی جب یہاں ہر جنس کی ہر وہ چیز موجود ہے جس کی تمہیں خواہش ہو، تو پھر کھیتی کرنے کی کیا ضرورت ہے) وہ شخص عرض کرے گا کہ بے شک یہاں سب کچھ موجود ہے لیکن میری خواہش یہی ہے کہ میں کھیتی کروں۔ (آنحضرت ﷺ نے فرمایا) بہر حال اس شخص کو کھیتی کرنے کی اجازت دیدی جائے گی اور وہ زمین میں بیج ڈالے گا اور پلک جھپکتے ہی سبزہ اگ آئے گا اور جب ہی کھیتی بڑھ پک کر کٹ جائے گی اور پہاڑ کے برابر انبار لگ جائیں گے، تب اللہ تعالیٰ اس شخص سے فرمائے گا: "ابن آدم! دیکھ تیری خواہش پوری ہوگئی، حقیقت یہ ہے کہ تیری حرص کا پیٹ کوئی چیز نہیں بھرتی۔" راوی کہتے ہیں کہ (یہ حدیث سن کر) وہ دیہاتی (جو حضور کے پاس بیٹھا تھا، کہنے لگا خدا کی قسم، وہ شخص یقیناً یا تو قریشی ہوگا یا انصاری (یعنی جنت میں کھیتی کرنے کی خواہش کرنے والا شخص یا تو مکہ والوں میں سے ہوگا یا مدینہ والوں میں سے، کیونکہ یہی لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں جہاں تک ہم صحرانشین دیہاتیوں کا تعلق ہے، کھیتی باڑی سے ہمارا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے (ہم جنگلوں میں اونٹ بکری چرا کر اور محنت مزدوری کر کے دودھ اور کھجوروں پر گزارہ کر لیتے ہیں ان چیزوں کے علاوہ ہمیں اور کسی چیز کی خواہش نہیں ہے) پس (اس دیہاتی کی یہ بات سن کر) رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے۔" (بخاریؒ)

تشریح : "تیری حرص کا پیٹ کوئی چیز نہیں بھرتی" کا مطلب یہ ہوگا کہ آدم زادے! یہ تو ہو گیا کہ تو نے ایک خواہش ظاہر کی اور ہم نے تیری وہ خواہش آن واحد میں پوری کر دی مگر ذرا سوچ کہ جنّت میں تجھے ان گنت نعمتیں حاصل ہونے اور تیری خواہش کی ہر چیز تجھے میسر ہونے کے باوجود تو نے کھیتی باڑی کرنے کی جو عجیب و غریب خواہش ظاہر کی وہ کس بات پر دلالت کرتی ہے کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تیری حرص کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتا اور عیش و تنعم کی آخری سے آخری حد بھی تجھے قناعت تک نہیں پہنچا سکتی اس سے معلوم ہوا کہ حرص اور ترک قناعت انسان کی جبلت میں داخل ہے اور یہ ایک ایسی خصلت ہے جو اس میں سے نکل نہیں سکتی خواہ وہ جنّت میں کیوں نہ پہنچا ہوا ہو۔

جنّت میں نیند نہیں آئے گی

(۴۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ رَّسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيَنَامُ اَهْلُ الْجَنَّةِ قَالَ النَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ وَلَا يَمُوْتُ اَهْلُ الْجَنَّةِ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ کیا جنتی سوئیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "نیند یعنی سونا، موت کا بھائی ہے، اور ظاہر ہے کہ جنتی مریں گے نہیں (اور جب وہ مریں گے نہیں تو سوئیں گے بھی نہیں اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

بَابُ رُؤْيَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى
دیدار الٰہی کا بیان

رؤیۃ اللہ یا دیدار الٰہی کا" مطلب ہے اللہ تعالیٰ کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی یہ سعادت مومنین کو آخرت میں نصیب ہوگی جس کی تفصیل و وضاحت کے لئے یہ باب قائم کیا گیا ہے اور اس موضوع سے متعلق احادیث اس میں نقل کی گئی ہیں۔

حق تعالیٰ کی رویت عقلاً ناممکن نہیں : اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ایک ایسی حقیقت ہے جس کا وجود عقلاً بھی درست ہے اور اس دیدار کے لئے اللہ تعالیٰ کا کسی خاص جگہ (مقام پر اور کسی خاص سمت و جہت میں موجود و قائم ہونا نیز اس کی ذات کا اور دیکھنے والوں کا آمنے سامنے ہونا قطعی ضروری اور شرط کے درجہ کی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی ذات اور اپنے وجود کے اعتبار سے جو کچھ بھی ہے اسی حیثیت کے ساتھ اس کا دیکھا جانا ممکن ہے اگرچہ وہ جسم و جسمانیت سے ماوراء، اور مکان و جہت کی قید سے آزاد ہے۔ رہی یہ بات کہ شے مرئی (یعنی کھلی آنکھوں سے نظر آنے والی چیز) کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ جسم ہو، کسی خاص جگہ و مقام پر موجود قائم ہو اور نگاہ کی سمت و جہت میں ہو تو دیکھنے میں ان چیزوں کا عمل دخل ہونا دراصل اس لئے ضروری ہے کہ قدرت نے اسی طرح کا نظام جاری فرمایا ہے اور انسانی نگاہ و بصر کو اپنا فعل انجام دینے کے لئے ان اسباب کا پابند بنا دیا ہے، اگر قادر مطلق اس جاری نظام اور عادت کے برخلاف ان عوامل کے بغیر بھی کسی کو کوئی چیز دکھانا چاہے تو بے شک اس پر قادر ہے اور ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ پس اس میں کوئی خلاف عقل بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کل قیامت کے دن انسانی نگاہ میں بصیرت یعنی چشم قلب کی قوت رکھ دے کہ جس طرح آج دنیا میں اہل ایمان کو بصیرت سے پاتے اور دیکھتے ہیں کل کو آخرت میں بصر یعنی سر کی آنکھوں سے اس کو دیکھیں گے۔

رؤیت کا تعلق آخرت سے ہے : تمام علماء اُمّت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ دیدار تمام اہل ایمان کو آخرت میں نصیب ہوگا اس کا ثبوت وہ قرآنی آیات، احادیث صحیحہ، اجماع صحابہ و تابعین اور اقوال ائمہ ہیں جو اس ضمن میں مذکور و منقول ہیں تاہم کچھ

لوگ ایسے بھی ہیں جو حق تعالیٰ کے اس دیدار کے منکر ہیں انہوں نے دیدار الٰہی سے متعلق قرآنی آیات و احادیث اور منقول دلیل کی جس طرح تاویل کی ہے، اس کی تفصیل اور علماء حق کی طرف سے ان کی تاویلات کے مضبوط جوابات مختلف تحقیقی کتابوں میں مذکور ہیں۔

عورتیں بھی روایت باری سے محروم نہ رہیں گی: عورتوں کے بارے میں اختلاف ہے بعض کہتے ہی کہ ان کو دیدار ہوگا اور بعض انکار کرتے ہیں لیکن درست یہ ہے کہ عورتیں اس سعادت سے محروم نہ رہیں گی مردوں کی طرح ان کو بھی حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا لیکن بعض حضرات نے کہا ہے کہ ان (عورتوں) کو بعض خاص ایام میں جیسے جمعہ کے ایام میں یا عیدین کے دن ہی دیدار کی سعادت ملے گی جو عام بازیابی کے اوقات ہوں گے۔ جو حضرات مطلقاً عورتوں کے دیدار کے منکر ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ عورتیں چونکہ خیموں میں پردہ نشین ہوں گی جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے حور مقصورات فی الخیام لہٰذا ان کو دیدار کیسے ہوسکتا ہے، یہ ایک ناقابل التفات بات ہے کیونکہ اول تو دیدار الٰہی کے بارے میں جو آیات واحادیث منقول ہیں ان میں کوئی خصوص مذکور نہیں ہے بلکہ وہ سب عموم پر محمول ہیں اور مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہیں دوسرے یہ کہ عالم آخرت کو دنیا پر قیاس کرنا اور وہاں عورتوں کے خیمے میں رہنے کو دنیا کے پردہ پر منطبق کرنا بجائے خود غلط ہے کیونکہ جنت کے خیمے (کہ جن میں وہاں کی عورتیں رہیں گی) پردہ وحجاب کو مستلزم نہیں ہوں گے، علاوہ ازیں یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ فاطمہ زہرا ؓ خدیجہ کبریٰ ؓ، عائشہ صدیقہ ؓ اور دوسری امہات المومنین ؓ نیز ان جیسی دیگر عظیم خواتین جو لاکھوں کروڑوں مردوں سے زیادہ عظمت وفضیلت رکھتی ہیں آخر کس طرح دیدار الٰہی کی سب سے بڑی سعادت سے محروم رہ سکتی ہیں۔

جنات اور ملائکہ کو بھی خدا کی رویت حاصل ہوگی: جنات اور ملائکہ کے بارے میں بھی اختلافی اقوال ہے کہ آیا ان کو دیدار الٰہی نصیب ہوگا یا نہیں؟ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے علاوہ دیگر فرشتوں کو خدا کے دیدار کی سعادت حاصل نہیں ہوگی اور حضرت جبرئیل بھی اس سعادت سے ایک ہی بار مشرف ہوں گے اور اسی طرح جنات بھی دیدار الٰہی سے محروم رہیں گے لیکن اس سلسلہ میں صحیح ودرست قول یہی ہے کہ دیدار الٰہی کی سعادت تمام اہل ایمان کے لئے ہے کیا انسان کیا فرشتے اور کیا جنات۔

دنیا میں خدا کی رویت: یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ کیا اس دنیا میں بحالت بیداری کھلی آنکھوں سے خدا کا دیدار ہوسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں ارباب تحقیق نے اس قول کو اختیار کیا ہے کہ حق تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بھی ممکن تو ہے لیکن بالاتفاق غیرواقع ہے، رہی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ کو شب معراج میں خدا کا دیدار ہونا امر واقع ہے تو یہ استثنائی صورت ہے اگرچہ بعض حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو شب معراج میں بچشم سر خدا کا دیدار ہوا تھا یہ ایک الگ بحث ہے جو آگے متعلقہ احادیث کی تشریح میں بیان ہوگی، بہرحال محدثین فقہاء متکلمین اور مشائخ طریقت سب اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ نہ آج تک اس دنیا میں کسی کو بھی، خواہ وہ کوئی بڑے سے بڑا ولی ہی کیوں نہ ہو، خدا کا دیدار حاصل ہوا ہے نہ اولیاء اللہ اور مشائخ میں سے کسی نے اس کا دعویٰ کیا ہے اور نہ آئندہ کسی کو حاصل ہوسکتا ہے، بلکہ مشائخ نے متفقہ طور پر یہاں تک کہا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے خدا کو بیداری کی حالت میں دیکھا ہے (جیسے بعض جاہل اور نام نہاد صوفیاء کہہ دیا کرتے ہیں) تو اس کی تکذیب کرنا اور اس کو گمراہ قرار دینا لازم ہے۔ فقہ شافعیؒ کی مستند کتاب "انوار" میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ میں اس دنیا میں بچشم سر عیاناً خدا کو دیکھتا ہوں اور خدا مجھ سے بالمشافہ گفتگو کرتا ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت ممکن ہے اور انسانی حاسہ بصر میں ایسا کوئی نقص بھی نہیں کہ کسی چیز کو دیکھنے میں رکاوٹ پیش آئے تو پھر حق تعالیٰ کے دیدار نہ ہونے کا سبب کیا ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ دیکھنا اور نظر آنا در اصل نظام قدرت اور تخلیق الٰہی کا سبب ہے نہ کہ اس کی اصل علت وہ حاسہ بصر ہے جو انسان اپنی آنکھوں میں لئے پھرتا ہے۔ حاسہ بصر تو صرف ایسا ظاہری سبب ہے جس کو حق تعالیٰ نے ایک خاص نظام اور معمول کے تحت دیکھنے کا ذریعہ بنا دیا ہے اگر وہ کسی کو دکھانا چاہے تو آنکھوں اور بینائی کے بغیر بھی دکھا سکتا ہے، اور اگر کسی کو نہ دکھانا چاہے تو وہ کھلی آنکھ اور مضبوط بینائی رکھنے کے باوجود نہیں دیکھ سکتا۔ مثلاً

ایک بڑا پہاڑ سامنے ہو اور اللہ کسی کی آنکھوں میں دیکھنے کی صفت پیدا نہ کرے تو وہ اس پہاڑ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح اگر کوئی اندھا شخص دنیا کے مشرقی کنارے پر ہو اور دنیا کے مغربی کنارے پر ایک مچھر پڑا ہو اور اللہ تعالیٰ اس اندھے کو وہ مچھر دکھانا چاہے تو یہ یقیناً دیکھ سکتا ہے پس واضح ہوا کہ دیکھنا یا دکھانا نظام قدرت کے تحت آنکھ کا عمل یا غیر عمل بے شک ہے، لیکن آنکھ کا وہ عمل یا اس عمل کی وہ طاقت جس سے انسان دیکھنے پر قادر ہوتا ہے غیر محدود اور خود مختار نہیں ہے بلکہ اس کی کارکردگی اس حد تک ہے جہاں تک اللہ تعالیٰ نے اس کو کارگر کیا ہے حق تعالیٰ کی مصلحت چونکہ یہی ہے کہ وہ انسان کو دنیا میں اپنا دیدار نہ کرائے اس لئے اس نے حاسہ بصر میں وہ توانائی ہی نہیں رکھی جس سے خدا کو دیکھا جاسکے۔ اس بات کو دنیا کی عام چیزوں پر قیاس کرنا ذہن وقیاس کی مہمل تابعداری ہے۔

خواب کی حالت میں خدا کی رویت: کیا خواب کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوسکتا ہے اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ خواب کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ صرف ممکن بلکہ امر واقع بھی ہے اور یہ ازروئے عقل ونقل کچھ بعید بھی نہیں ہے ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ایک قلبی مشاہدہ ہے جس کا تعلق مثال سے ہوتا ہے نہ کہ مثل سے، اور خدا کا مثل نہیں ہے اگرچہ مثال ہے۔ بہرحال بحالت خواب اللہ تعالیٰ کو دیکھنا خدا رسیدہ لوگوں سے ثابت ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا ہے۔ اسی طرح امام احمدؒ بن حنبل سے بھی یہ منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے، میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو دریافت کیا کہ وہ کون سا عمل ہے جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟ فرمایا تلاوت قرآن کریم۔" پھر پوچھا کہ معانی ومطالب سمجھنے کے ساتھ یا اس کے بغیر؟ فرمایا "خواہ معانی سمجھنے کے ساتھ تلاوت کرے یا اس کے بغیر ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار اور اس کی رویت ہوسکتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کھلی آنکھوں سے خدا کا دیدار

① عَنْ جَرِيْرِبْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَظَرَ اِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ فَقَالَ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهٖ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تُغْلَبُوْا عَلٰى صَلٰوةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا فَافْعَلُوْا ثُمَّ قَرَأَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "وہ وقت آنے والا ہے جب (قیامت میں) تم اپنے پروردگار کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھو گے۔" ایک روایت میں حضرت جریرؓ نے یہ بیان کیا کہ (ایک دن) ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ ﷺ نے چودھویں شب کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا: "تم اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو، اس (پروردگار کو دیکھنے میں تم کوئی رکاوٹ اور پریشانی محسوس نہیں کرو گے پس اگر تم سے ہوسکے تو تم اس نماز کو جو سورج نکلنے سے پہلے کی ہے (یعنی نماز فجر) اور اس نماز کو جو سورج ڈوبنے سے پہلے کی ہے (یعنی نماز عصر) نہ چھوڑو تو یقیناً ایسا کرو پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا اور اپنے پروردگار کی حمد وپاکی بیان کرو یعنی نماز پڑھو سورج نکلنے سے پہلے اور سورج ڈوبنے سے پہلے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔" یہ تشبیہ "دیکھنے" کی "دیکھنے" کے ساتھ ہے نہ کہ "دیکھی جانے والی چیز" کی "دیکھی

جانے والی چیز" کے ساتھ اس جمال و ابہام کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح چاند کو دیکھ رہے ہو تو اس سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ تم جس طرح اس وقت چودھویں شب کے چاند کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور اس چاند کے نظر آنے میں تمہیں کوئی شک وشبہ نہیں یہ مراد ہرگز نہیں تھی کہ جس طرح یہ چاند تمہارے سامنے ہے اور ایک خاص جگہ پر اور ایک خاص سمت میں محدود و قائم نظر آرہا ہے اسی طرح تمہارے پروردگار کی ذات بھی تمہارے سامنے کسی خاص جگہ اور کسی خاص سمت میں محدود و قائم نظر آئے گی۔

"لا تضامون فِي رُؤية" (اس کو دیکھنے میں تم کوئی رکاوٹ و پریشانی محسوس نہیں کرو گے)" میں لفظ تُضَامُوْنَ اس طرح بھی منقول ہے اور تَضَامُّوْنَ بھی نقل کیا گیا ہے لیکن زیادہ تُضَامُوْنَ ہی نقل ہوا ہے اور اس صورت میں یہ لفظ ضم سے ہوگا جس کے معنی "ضرر اور ظلم" کے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ: "پروردگار کے دیدار میں تم پر ظلم نہیں ہوگا کہ کوئی دیکھے اور کوئی محروم رہے یا اس کے دیدار میں تم آپس میں ایک دوسرے پر کوئی ظلم وزیادتی نہیں کرو گے کہ ایک دوسرے کے دیکھنے کا انکار کرو اور کسی کو جھٹلاؤ۔" دوسری صورت میں یہ لفظ تضام سے ہوگا جس کے معنی ہیں آپس میں ایک دوسرے سے ملنا، اژدہام کرنے، دھکا پیل مچانے اور ایک دوسرے پر گرنے پڑنے کی نوبت نہیں آئے گی بلکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ رہ کر نہایت اطمینان و فراغت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا جیسا کہ چودھویں شب میں چمکتے چاند کو دیکھنے کے لئے اس طرح کی زحمت و پریشانی اٹھانا نہیں پڑتی، بخلاف پہلی تاریخ کے چاند کے، کہ وہ دھندلا اور باریک ہونے کی وجہ سے صاف نظر نہیں آتا اور اس کے دیکھنے کے لئے خاصا اہتمام اور جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

"اگر تم سے ہو سکے کہ تم اس نماز کو........ الخ کا مطلب یہ ہے کہ فجر اور عصر کا وقت بہت بابرکت اور اس وقت کی نمازیں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اس لئے تم ان نمازوں کی پابندی کا زیادہ خیال رکھو اور مقدور بھر کوشش کرو کہ یہ نمازیں فوت نہ ہونے پائیں، نیز اس بات کو ذہن میں رکھو کہ نماز کی پابندی کرنے والا اس امر کا زیادہ لائق ہے کہ اس کو پروردگار کا دیدار نصیب ہو کیونکہ نماز کی پابندی ہی سے شہود ذات کا وصف و ملکہ میسر ہوتا ہے! یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی جعلت قرة عيني في الصلوة میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) میں اشارہ فرمایا ہے واضح رہے کہ یوں تو یہ اہمیت تمام نمازوں کی ہیں لیکن اس موقع پر فجر و عصر کی نماز کو اس لئے خاص کیا گیا ہے کہ ان دونوں وقتوں کی نمازیں باقی اوقات کی نمازوں پر فضیلت و برتری رکھتی ہیں اور اس فضیلت و برتری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ صبح کے وقت تو لوگ نیند و استراحت کے جال میں پھنسے رہتے ہیں اور عصر کا وقت دنیا کے کاروبار مثلاً بازار جانے وغیرہ کے چکر میں پھنسنے کا ہے، جو شخص ان دونوں اوقات میں سستی و کوتاہی کا شکار نہیں ہوگا اور رکاوٹوں کے باوجود ان دونوں نمازوں کا خیال رکھے گا وہ دوسرے اوقات کی نمازوں کا خیال بدرجہ اولیٰ رکھے گا جو نسبتاً زیادہ سہل و آسان ہیں حدیث میں دونوں اوقات کی نمازوں کو خاص طور پر ذکر کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ دونوں وقت دوسرے اوقات کی بہ نسبت زیادہ فضیلت و شرف رکھتے ہیں اور یہ کہ آخرت میں پروردگار کا دیدار ان ہی اوقات میں ہوا کرے گا۔

دیدار الٰہی سب سے بڑی نعمت

(۲) وَعَنْ صُهَيْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى تُرِيْدُوْنَ شَيْئًا اَزِيْدُكُمْ فَيَقُوْلُوْنَ اَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوْهَنَا اَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ قَالَ فَيُرْفَعُ الْحِجَابُ فَيَنْظُرُوْنَ اِلٰى وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَمَآ اُعْطُوْا شَيْئًا اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ اِلٰى رَبِّهِمْ ثُمَّ تَلَا لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ (رواہ مسلم)

"اور حضرت صہیبؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب تمام جنتی جنت میں (اپنی اپنی جگہ) پہنچ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ (جو کچھ تمہیں عطا کیا جا چکا ہے) اس سے زیادہ کچھ اور تم مجھ سے چاہتے ہو؟ جنتی (یہ سن کر) عرض کریں گے کہ

(پروردگار!) کیا آپ نے ہمارے چہروں کو روشن و منور نہیں کیا، کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا، کیا آپ نے ہمیں دوزخ کی آگ سے نجات نہیں دی (اتنی بڑی بڑی نعمتوں سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے جو ہم آپ سے مزید چاہیں؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "تب حجاب اٹھا دیا جائے گا اور جنتی ذات اقدس تعالیٰ کی طرف دیکھیں گے (جو صورت و جسم اور جہت و مقام کی قیود و شرائط سے پاک و منزہ ہے) اور (اس وقت معلوم ہوگا کہ اہل جنت کو ایسی کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی جو پروردگار کی طرف ان کے دیکھنے سے زیادہ بہتر پسندیدہ ہو پھر آنحضرت ﷺ نے یہ آیت پڑھی للذین احسنوا الحسنی و زیادۃ۔"

تشریح: "تب حجاب اٹھا دیا جائے گا" کے سلسلہ میں واضح رہے کہ حجاب کا اٹھنا اہل جنت کو حیرانی و تعجب سے نکالنے کے لئے ہوگا یعنی اس وقت جنتی اس حیرانی و تعجب میں ہوں گے کہ آخر اب کونسی نعمت رہ گئی ہے جو حق تعالیٰ ہمیں عطا کرنا چاہتا ہے تب حق تعالیٰ اپنے دیدار کے ذریعہ گویا یہ فرمائے گا کہ دیکھو یہ ہے وہ نعمت عظمیٰ جو میں تمہیں عطا کرنا چاہتا تھا اور یہ نعمت تمہارے اصل بدلہ و جزاء سے زیادہ ہے حق تعالیٰ کی ذات حجاب و پردہ سے پاک و منزہ ہے، ایسا نہیں ہے کہ (نعوذ باللہ) وہ پردے میں چھپا ہوا ہے اور جنتیوں کو دیدار کے وقت گویا اس کی نقاب کشائی ہوگی ظاہر ہے وہ محبوب ہے نہ کہ محجوب وہ غالب مطلق ہے نہ کہ زیر حجاب مغلوب، پس "حجاب اٹھا دیا جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے وہ حجاب ہٹ جائے گا تو وہ اپنے پروردگار کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔ اس کی تائید خود حدیث کے آگے کے جملہ اور جنتی ذات اقدس تعالیٰ کی طرف دیکھیں گے" سے ہوتی ہے۔

"اور اہل جنت کو ایسی کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی .... الخ کے ذریعہ ایک ایسی حقیقت کا اظہار مقصود ہیں جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کیونکہ جس طرح اس دنیا میں حاصل ہونے والے تمام ذاتی و روحانی مراتب و درجات کی رفعت اور بلندیاں ذات باری تعالیٰ پر جا کر ختم ہو گی ہیں اسی طرح آخرت میں حاصل ہونے والی تمام نعمتوں اور سعادتوں کا منتہا ذات اقدس تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

اہل جنّت کے مراتب

(۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَدْنٰی اَھْلِ الْجَنَّۃِ مَنْزِلَۃً لَمَنْ یَّنْظُرُ اِلٰی جِنَانِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَنَعِیْمِہٖ وَخَدَمِہٖ وَسُرُرِہٖ مَسِیْرَۃَ اَلْفِ سَنَۃٍ وَاَکْرَمُھُمْ عَلَی اللّٰہِ مَنْ یَّنْظُرُ اِلٰی وَجْھِہٖ غُدْوَۃً وَّعَشِیَّۃً ثُمَّ قَرَأَ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ (رواہ احمد والترمذی)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جنتیوں میں قدر و مرتبہ کے اعتبار سے ادنی شخص وہ ہوگا جو اپنے باغات، اپنی عورتوں، اپنی نعمتوں، اپنے خدمت گاروں اور اپنے (بیٹھنے و استراحت کرنے کے) تخت و کرسی پر نظر رکھے گا جو ایک ہزار برس کی مسافت کے بقدر رقبہ میں پھیلے ہوئے ہوں گے (یعنی جنت کی لامحدود وسعت میں وہ ادنی مرتبہ کا شخص بھی اس قدر نوازا جائے گا کہ اس کی ملکیت و تسلط کی چیزیں ایک ہزار برس کی مسافت کے بقدر وسیع رقبہ میں پھیلی ہوئی ہوں گی، اور وہ اپنی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہے گا) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے مرتبہ و قدر کا شخص وہ ہوگا جو صبح و شام اپنے پروردگار کی ذات اقدس کے دیدار کی سعادت و صحبت حاصل کرے گا۔" پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ (بہت سے چہرے اس دن اپنے پروردگار کے دیدار سے تروتازہ اور خوش و خرم ہوں گے۔" (ترمذی)

تشریح: "جو صبح و شام اپنے پروردگار .... الخ سے واضح ہوا کہ جنّت میں پروردگار کا دیدار صبح و شام کے وقت نصیب ہوا کرے گا، اسی لئے حکم دیا گیا ہے کہ فجر اور عصر کی نمازوں پر مداومت اختیار کرو اور پابندی کے ساتھ ان نمازوں کو پڑھا کرو تا کہ جنّت میں ان اوقات میں

پروردگار کے دیدار کی سعادت کے حقدار بن سکو۔ "صبح وشام پروردگار کے دیدار" کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے مرتبہ وقدر کا شخص وہ ہوگا جو صبح وشام یعنی دن ورات میں ہروقت اپنے پروردگار کی زیارت سے مشرف ہوتا رہے گا، لیکن یہ مطلب زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اگر بلند مرتبہ جنتی ہروقت پروردگار کے دیدار ہی میں رہیں تو پھر جنت وآخرت کی اور تمام نعمتوں سے بہرہ مند ہونا ان کے لئے ممکن نہیں ہوگا حالانکہ وہ نعمتیں انہی جنتیوں کے لئے پیدا کی گئی ہیں! بہر حال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بندے کی اصل بڑائی اور بلند ہمتی یہی ہے کہ نگاہ ودل کا اصل مرکز ماسوائے حق کے کسی اور چیز کو نہ بنائے، ساری توجہ اور نظر حق تعالیٰ ہی کی طرف رکھے، اس کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنی توجہ والتفات رکھنا پست ہمتی کی دلیل ہے۔

دیدار الٰہی میں کسی طرح کی مزاحمت نہیں ہوگی

④ وَعَنْ اَبِیْ رَزِیْنِ نِ الْعُقَیْلِیِّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَکُلُّنَا یَرٰی رَبَّہٗ مُخْلِیًا بِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ قَالَ بَلٰی قَالَ قُلْتُ وَمَا اٰیَۃُ ذٰلِکَ فِیْ خَلْقِہٖ قَالَ یَا اَبَا رَزِیْنَ اَلَیْسَ کُلُّکُمْ یَرَی الْقَمَرَ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ مُخْلِیًا بِہٖ قَالَ بَلٰی قَالَ فَاِنَّمَا ھُوَ خَلْقٌ مِّنْ خَلْقِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَجَلُّ وَاَعْظَمُ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابورزین عقیلیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا (قیامت کے دن) ہم میں سے ہر شخص بلا مزاحمت غیر تنہا اپنے پروردگار کو دیکھے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں" ابورزینؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے پوچھا کہ کیا پروردگار کی دنیاوی مخلوق میں اس کی کوئی مثال ہے فرمایا: ابورزین! کیا تم میں سے ہر شخص چودہویں شب میں چاند کو بلا مزاحمت غیر تنہا نہیں دیکھتا!؟" میں نے عرض کیا کہ بے شک دیکھتا ہے فرمایا! چاند تو اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ پروردگار کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے اور پروردگار بہت بزرگ وبرتر ہے یعنی جب چاند کو جو پروردگار کی ایک مخلوق ہے، ہر شخص بلا مزاحمت ورکاوٹ دیکھ سکتا ہے تو جب بزرگ وبرتر اپنا دیدار کرانا چاہے گا، اس کو ہر شخص بلا مزاحمت ورکاوٹ کیوں نہ دیکھ سکے گا۔" (ابوداؤدؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

شب معراج میں آنحضرت ﷺ کو دیدار الٰہی

⑤ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ رَاَیْتَ رَبَّکَ قَالَ نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ نے شب معراج میں) اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا! "پروردگار تو ایک نور ہے میں اس کو کیسے دیکھ سکتا ہوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "پروردگار تو ایک نور ہے...... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات، جسم ومکان کی قیود سے ماوراء ایسا نور عظیم ہے جس کی نورانیت کا کمال اور جس کے ظہور کی شدت نہ انسان کے ادراک میں آسکتی ہے اور نہ نگاہ وبصر کو اتنی تاب کہ اس کی خیرہ کر دینے والی تجلیات کے سامنے ٹھہر سکے واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو خود قرآن کریم میں "نور" سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے) یعنی کائنات میں ہر طرف اسی کی تجلیات کا ظہور ہے، اور جو چیز نظر آتی ہے اسی کی روشنی کی بدولت نظر آتی ہے نیز جو چیزیں زمین وآسمان کو روشنی بہم پہنچاتی ہیں جیسے سورج، چاند اور ستارے وغیرہ وہ سب اسی کی روشن کی ہوئی ہیں یا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا نور ہدایت ہے اور زمین پر بسنے والوں اور آسمان میں رہنے والوں ہر ایک کو وہی ہدایت کرنے والا ہے اور اسی کا نور ہدایت بندوں کے دلوں ودماغ کو روشن کرنے والا ہے، نیز پروردگار کے ناموں میں سے ایک نام

"نور" بھی ہے یعنی وہ خود بھی ظاہر روشن ہے اور دوسروں کو ظاہر روشن کرنے والا ہے۔

"نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ" میں لفظ اَنّٰی کتاب کے اکثر نسخوں میں الف کے زبر اور نون کی تشدید کے ساتھ ہی منقول ہے اور اسی کے اعتبار سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے کہ "اللہ تو ایک نور ہے، میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔" لیکن بعض نسخوں میں نُوْرٌ اور اَنّٰی الگ الگ لفظ کے بجائے ایک ہی لفظ یعنی نُوْرَانِی منقول ہے (جس میں ی مشدد نسبت کے لئے ہے اور الف اور نون زائد مبالغہ کے لئے ہیں) اس صورت میں اَرَاہُ کا لفظ اظنہ کا مفہوم ادا کرے گا اور رویۃ بمعنی رائے سے مشتق سمجھا جائے گا اور قال نورانی اراہ کا یہ ترجمہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "میں اس (پروردگار کو نورانی گمان کرتا ہوں۔ پس لفظ اراہ کو اگر الف کے پیش کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی کے اعتبار سے زیادہ مناسب و موزوں ہوگا۔

ابن ملک نے اس حدیث کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا یا نہیں؟ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو شب معراج میں کھلی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوا ہے اور جو حضرات اس کا انکار کرتے ہیں دونوں ہی فریق الفاظ روایت کے مذکورہ بالا اختلاف کے سبب اس حدیث کو اپنی اپنی دلیل قرار دیتے ہیں کیونکہ اگر "نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ" کی روایت کو سامنے رکھا جائے تو اس جملہ کے، استفہام بطریق انکار کے اسلوب کے پیش نظر اس عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ پروردگار کی ذات چونکہ نور محض ہے اور کوئی انسانی آنکھ اس کی طرف نظر اٹھانے پر قادر ہی نہیں ہوسکتی اس لئے میں کہتا ہوں کہ میں نے معراج کی رات میں اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا ہے لیکن اگر نُوْرَانِیٌّ اَرَاہُ کی روایت کو دیکھا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے معراج کی رات میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے البتہ یہ کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات کہنے کے لئے حکایت ماضی (صیغہ حال کا اسلوب اختیار فرمایا۔

آنحضرت کو دیدار الٰہی سے متعلق ایک آیت کی تفسیر

(۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی قَالَ رَاٰهُ بِفُؤَادِهٖ مَرَّتَيْنِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةِ التِّرْمِذِيِّ قَالَ رَاٰى مُحَمَّدٌ رَبَّهٗ قَالَ عِكْرِمَةُ قُلْتُ اَلَيْسَ اللّٰهُ يَقُوْلُ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ قَالَ وَيْحَكَ ذٰلِكَ اِذَا تَجَلّٰى بِنُوْرِهِ الَّذِيْ هُوَ نُوْرُهٗ وَقَدْ رَاٰى رَبَّهٗ مَرَّتَيْنِ۔

"اور حضرت ابن عباس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی (ترجمہ: اور محمد ﷺ کے دل نے محمد ﷺ سے غلط نہیں کہا اس چیز کی بابت جو انہوں نے آنکھوں سے دیکھی یعنی ذات اقدس تعالیٰ کو! اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے پروردگار کو ایک مرتبہ اور دیکھا کی تفسیر میں کہتے ہی کہ آنحضرت ﷺ نے پروردگار کو دل کی آنکھوں سے ہر مرتبہ دیکھا۔ (مسلم) اور ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن عباس نے (مذکورہ آیت کی تفسیر میں) کہا: "محمد ﷺ نے اپنے پروردگار کو دیکھا۔" حضرت عکرمہ کہتے ہیں کہ (میں نے یہ سن کر اپنا اشکال ظاہر کیا اور) حضرت ابن عباس سے کہا کہ (قرآن کریم میں اپنی ذات کے بارے میں) اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟) حضرت ابن عباس نے عکرمہ کے اس اشکال کے جواب میں) کہا کہ اتم پر افسوس ہے (کہ تم بات نہیں سمجھ سکے، حقیقت یہ ہے کہ) یہ (مفہوم جو تم نے اس آیت کے ذریعہ پیش کیا ہے) اس وقت کے لئے ہے جب کہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص تجلی ظاہر فرمائے اور اپنے اس نور کے ساتھ ظاہر ہو جو اس کی ذات خاص کا نور ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے پروردگار کو دو مرتبہ دیکھا۔"

تشریح: اس روایت میں حضرت ابن عباس سے جن آیتوں کی تفسیر و وضاحت منقول ہے وہ سورہ نجم کی ابتدائی آیتوں میں سے ہیں اور مفسرین کے ہاں ان آیتوں کے بارے میں خاص اختلاف ہے کہ ان کا مدلول و محمول کیا ہے۔ صحابہ و تابعین اور آئمہ مفسرین میں سے

ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ سورہ نجم کی ان آیتوں میں در حقیقت اس بات کا ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دو مرتبہ دیکھا ہے ایک مرتبہ تو نبوت کے بالکل ابتدائی زمانہ میں مکہ میں اور دوسری شب معراج میں سدرۃ المنتہی کے پاس۔ اس کے برخلاف صحابہؓ وتابعینؒ اور آئمہ مفسرین کی دوسری جماعت کا، جن میں حضرت ابن عباسؓ کا نام نامی سرفہرست ہے، یہ کہنا ہے کہ ان آیات میں واقعہ معراج کا بیان اور آنحضرت ﷺ کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا ذکر ہے۔

"آنحضرت ﷺ نے پروردگار کو دل کی آنکھوں سے دو مرتبہ دیکھا۔" یعنی اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے قلب میں بینائی کی بھی وہ طاقت ودیعت فرمائی جو آنکھ میں ہوتی ہے اور آپ ﷺ کی آنکھوں کو ادراک کی بھی وہ طاقت عطا فرمائی جو قلب میں ہوتی ہے، پس یہ کہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے پروردگار کو بچشم قلب دیکھا یا یہ کہ بچشم سر دیکھا، دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یہ مطلب اس لئے اختیار کیا گیا، تاکہ جو حضرات جیسے حضرت ابن عباس وغیرہ) یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں پروردگار کو بچشم سر دیکھا ہے، اور حضرات یہ کہتے ہی کہ بچشم قلب دیکھا ہے۔ ان دونوں کے اقوال کی رعایت ہو جائے جیسا کہ اوپر اجمالاً ذکر کیا گیا پہلے اختلاف تو یہی ہے کہ سورہ نجم کی ابتدائی آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے کس کو دیکھنے کا ذکر ہے حق تعالیٰ کو یا حضرت جبرئیل کو؟ حضرت ابن عباسؓ حق تعالیٰ کو دیکھنا مراد لیتے ہیں جمہور صحابہ ان کی تائید میں ہیں اور سلف میں جمہور مفسرین بھی اسی طرف گئے ہیں ان کے نزدیک دنی فتدلی، قاب قوسین او ادنی کے الفاظ (جو ان آیات میں آئے ہیں) معراج کے موقعہ پر بارگاہ ربوبیت میں آنحضرت ﷺ کے قرب اور پروردگار کے مشاہدہ وزیارت کا بیان ہیں۔ پھر اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ شب معراج میں آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو بچشم سر دیکھا ہے یا بچشم قلب؟ بعضوں نے تو یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ نے پروردگار کو دل کی آنکھ سے دیکھا تھا سر کی آنکھوں سے نہیں اور بعضوں نے یہ کہا ہے کہ نہیں آپ ﷺ نے سر ہی کی آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھا، امام نوویؒ کی تحقیق کے مطابق اکثر علماء کے نزدیک ترجیحی قول یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ جو حضرات آیات مذکورہ میں آنحضرت ﷺ کا حضرت جبرئیل کو ان کی اصل صورت میں دیکھنا مراد لیتے ہیں ان میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن مسعودؓ بھی شامل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان آیات میں حضرت جبرئیل کے اس قرب ومشاہدہ کا بیان وذکر ہے جو آنحضرت ﷺ کو جبرئیل امین کی اصل صورت کے ساتھ شب معراج میں اور اس سے پہلے ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں حاصل ہوا تھا۔

علماء کا اختلاف اقوال اس بارے میں بھی ہے کہ شب معراج آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ سے بلا واسطہ کلام کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا یا نہیں؟ چنانچہ اشعریین اور متکلمین میں سے ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس رات میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست کلام کیا اور بعض دوسرے حضرات نے اس کا انکار کیا ہے۔

یہ اس وقت کے لئے ہے جب کہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص تجلی ظاہر فرمائے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات حق تعالیٰ کی مشیت وقدرت پر منحصر ہے اگر اس کی ذات خاص کی تجلی ظاہر ہو تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی کی بھی نگاہ وبصر کی توانائی برداشت کر سکتی ہو تو یقیناً نگاہ اس کی طرف اٹھ سکتی ہے اور آنکھیں دیدار وزیارت کی تاب لا سکتی ہیں! رہی اس آیت کی بات جس کا حوالہ حضرت عکرمہؓ نے دیا تو اس کے متعلق علماء لکھتے ہیں کہ اس آیت میں "ادراک" کا ذکر ہے جس کے لغوی معنی کسی شے کا اس کے تمام اطراف وجوانب اور تمام سرحدوں کے ساتھ احاطہ کرنا ہیں اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے لئے نہ کوئی حد ونہایت ہے اور نہ اس کے اطراف وجانب ہیں، اس کی ذات ان چیزوں سے ماوراء اور لامحدود ہے، اس معنی میں کوئی بھی نگاہ وبصر اس کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اس آیت میں "احاطہ" کی نفی مراد ہے مطلق دیدار کی نفی مراد نہیں ہے جس سے یہ اشکال واقع ہو کہ آپ ﷺ کے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی بات اس آیت کے خلاف پڑتی ہے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت نے اپنے پروردگار کو دو مرتبہ دیکھا۔" میں "دو مرتبہ" کی وضاحت بعض محدثین نے یہ کی

ہے کہ ایک مرتبہ سدرۃ المنتہی کے قریب اور ایک مرتبہ عرش پر اور ملا علی قاریؒ نے اس جملہ کے تحت یہ لکھا ہے کہ "دو مرتبہ دیکھا" سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں مرتبہ دل کی آنکھوں سے دیکھا اور ایک مرتبہ سر کی آنکھوں سے یہ اختلاف مطالب اس لئے ہے کہ کسی بھی روایت میں وضاحت کے ساتھ منقول نہیں ہے (جیسا کہ اس روایت میں بھی نہیں، کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دوبار دیکھا۔

کیا آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا

⑦ وَعَنِ الشَّعْبِيِّ قَالَ لَقِيَ ابْنُ عَبَّاسٍ كَعْبًا بِعَرَفَةَ فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ فَكَبَّرَ حَتّٰى جَاوَبَتْهُ الْجِبَالُ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنَّا بَنُوْهَاشِمٍ فَقَالَ كَعْبٌ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَسَمَ رُؤْيَتَهُ وَكَلَامَهُ بَيْنَ مُحَمَّدٍ وَّمُوْسٰى فَكَلَّمَ مُوْسٰى مَرَّتَيْنِ وَرَاٰهُ مُحَمَّدٌ مَرَّتَيْنِ قَالَ مَسْرُوْقٌ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَقُلْتُ هَلْ رَاٰى مُحَمَّدٌ رَبَّهُ فَقَالَتْ لَقَدْ تَكَلَّمْتَ بِشَيْءٍ قَفَّ لَهُ شَعْرِيْ قُلْتُ رُوَيْدًا ثُمَّ قَرَأْتُ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى فَقَالَتْ اَيْنَ تَذْهَبُ بِكَ اِنَّمَا هُوَ جِبْرَئِيْلُ مَنْ اَخْبَرَكَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَاٰى رَبَّهُ اَوْكَتَمَ شَيْئًا مِمَّا اُمِرَ بِهِ اَوْيَعْلَمُ الْخَمْسَ الَّتِيْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ فَقَدْ اَعْظَمَ الْفِرْيَةَ وَلٰكِنَّهُ رَاٰى جِبْرَئِيْلَ لَمْ يَرَهُ فِيْ صُوْرَتِهِ اِلَّا مَرَّتَيْنِ مَرَّةً عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى وَمَرَّةً فِيْ اَجْيَادٍ لَهُ سِتُّمِائَةِ جَنَاحٍ قَدْ سَدَّ الْاُفُقَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَى الشَّيْخَانِ مَعَ زِيَادَةٍ وَاخْتِلَافٍ وَفِيْ رِوَايَتِهِمَا قَالَ قُلْتُ لِعَائِشَةَ فَاَيْنَ قَوْلُهُ ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى قَالَتْ ذَاكَ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاْتِيْهِ فِيْ صُوْرَةِ الرَّجُلِ وَاِنَّهُ اَتَاهُ هٰذِهِ الْمَرَّةَ فِيْ صُوْرَتِهِ الَّتِيْ هِيَ صُوْرَتُهُ فَسَدَّ الْاُفُقَ

"اور حضرت شعبیؒ کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن میدان عرفات میں حضرت ابن عباسؓ نے حضرت کعب احبارؓ سے ملاقات کی اور ان سے ایک سوال دریافت کیا کہ کیا دنیا میں حق تعالیٰ کا دیدار ممکن ہے؟ حضرت کعبؒ (نے اس سوال کو اتنا عجیب وغریب سمجھا کہ فرط حیرت سے انہوں) نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور ان کے اس زوردار نعرے کی بازگشت سے پہاڑ گونج اٹھے حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ ہم ہاشم کی اولاد ہیں!! حضرت کعبؓ نے فرمایا کہ: "اچھا تمہارے سوال کا مقصد اب میری سمجھ میں آیا تو سنو!۔) اللہ تعالیٰ نے اپنے دیدار اور اپنے کلام کو محمد ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم کیا (یعنی ایک کو اپنے کلام سے مشرف فرمایا، اور ایک کو اپنے دیدار کی سعادت عطا فرمائی) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ موسیٰ سے کلام کیا۔ ایک مرتبہ تو وادی ایمن میں اور دوسری مرتبہ کوہ طور پر) اور محمد ﷺ نے (شب معراج میں) دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔" حضرت مسروقؒ (جو حدیث کے راوی ہیں اور جن سے حضرت شعبیؒ یہ روایت نقل کرتے ہیں) کہتے ہیں کہ (میدان عرفات میں حضرت کعبؒ اور حضرت ابن عباسؓ کے درمیان ہونے والی اس بات چیت کو سن کر میں حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ کیا محمد ﷺ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ (مسروق) تم نے ایسی بات پوچھی ہے جس سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے ہیں (یعنی میرا اعتقادیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ومنزہ ہے کہ وہ کسی کو نظر آئے اس لئے میرے نزدیک دنیا میں اس کے دیدار کا واقع ہونا محال ہے اب تم نے یہ سوال پوچھا تو اس کی اس پاک ذات کی عظمت وخوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے) میں نے عرض کیا کہ، ذرا توقف سے کام لیجئے (یعنی میرے اس سوال سے اتنا پریشان نہ ہوئے اور نہ اتنی جلد دیدار الٰہی کا انکار کیجئے میں چاہتا ہوں کہ آپ　ذرا میری بات پوری طرح سن لیں، پھر میں نے دیدار الٰہی کے ثبوت میں یہ آیت پڑھی لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (گویا حضرت مسروقؒ نے اس آیت کے ذریعہ یہ ظاہر کیا کہ میرے نزدیک آیت میں "بڑی نشانی" سے مراد آنحضرت ﷺ بچشم سر یا بچشم قلب وہ دیدار الٰہی حاصل ہونا ہے جو پروردگار کی عظمت شان یا آنحضرت ﷺ کی تعظیم وتکریم پر دلالت کرتا ہے)۔ حضرت عائشہؓ نے (یہ سن کر فرمایا کہ: "(مسروق) یہ آیتیں تمہیں کہاں لے جارہی

ہیں؟ (یعنی تم درست نہیں سمجھ رہے ہو، ان آیتوں کا مطلب آنحضرت کو دیدار الٰہی حاصل ہونا نہیں ہے بلکہ) "بڑی نشانی" سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں (جن کو آنحضرت نے ان کی اصل صورت میں دیکھا) جو شخص تم سے یہ کہے محمد (ﷺ) نے شب معراج میں اپنے پرور گار کو دیکھا ہے، یا یہ کہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان چیزوں میں سے کچھ چھپالیا ہے جن کے اظہار کا ان کو حکم دیا گیا تھا، اور یا یہ کہے کہ آنحضرت ﷺ ان پانچ غیبی باتوں کا علم رکھتے تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی آیت اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ الخ میں ارشاد فرمایا ہے، تو بلاشبہ اس نے محمد ﷺ پر بہت بڑا بہتان باندھا (جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے جو تم نے پڑھی ہے تو) اس کی مراد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو (ان کی اصل صورت میں آپ ﷺ نے ایک مرتبہ تو سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک (جیسا کہ اس آیت لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى میں فرمایا گیا ہے) اور ایک مرتبہ (مکہ کے نواح) اجیاد میں اور (آنحضرت نے جبرئیل کو ان کی اصل صورت میں اس طرح دیکھا کہ) ان کے چھ سو بازو تھے اور انہوں نے پورے افق کو گھیر رکھا تھا اس روایت کو ترمذیؒ نے (انہی الفاظ میں) اور بخاریؒ و مسلمؒ نے کچھ مزید اور مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے نیز بخاریؒ اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ مسروق نے (حضرت عائشہ سے کہا کہ: "اگر آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا) تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا محمول و مصداق کیا ہے۔ ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: "ان سب کی ضمیروں کا مرجع حضرت جبرئیل ہیں جو عام طور پر آنحضرت ﷺ کے پاس کسی انسان کی شکل و صورت میں (اور وہ بھی اکثر و بیشتر ایک صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ کی صورت میں) آتے تھے اور اس مرتبہ (مکہ کے نواح اجیاد میں) اپنی اس صورت میں آئے تو جو ان کی اصل صورت ہے اور انہوں نے پورے افق کو گھیر رکھا تھا۔"

تشریح: "ہم ہاشم کی اولاد ہیں۔" یعنی ہم نہ صرف اس قبیلہ و خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو ویسے بھی علم و فضیلت، عقل و فراست، اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس خاندن کے بارگاہ نبوت سے نسبت و قربت رکھنے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں علوم و انوار سے اکتساب کرنے کے موقع ہمیں زیادہ بہتر طریقہ پر میسر ہوا ہے اور اس سب سے بڑی خاندانی نسبت و امتیاز کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم و معرفت سے سرفراز فرمایا ہے لہٰذا مجھ سے یہ توقع نہ رکھیئے کہ میں کوئی ایسا سوال کروں گا جو علم و عقل سے بعید ہو، میں نے جو کچھ پوچھا ہے اس گہرائی میں پہنچنے کی کوشش کیجئے اور میرے سوال پر حیرت و غصہ کرنے کی بجائے غور و فکر کر کے جواب دیجئے کہ کیا دنیا میں حق تعالیٰ کا دیدار فی الجملہ ممکن ہے دراصل جب حضرت ابن عباسؓ نے مذکورہ سوال کیا تو حضرت کعبؓ یہ سمجھے کہ ابن عباسؓ دنیا میں مطلق دیدار الٰہی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، اس پر انہیں حیرت ہوئی اور ان کے اس سول کو انہوں نے بعید از عقل جانا لیکن جب حضرت ابن عباسؓ نے اپنے بارے میں ذرا زوردار الفاظ کا اظہار کیا تو حضرت کعبؓ احبار کو ان کے سوال میں غور و فکر کرنا پڑا اور تب وہ ان کی مراد سمجھے کہ ان کے سوال میں مطلق دیدار الٰہی مراد نہیں ہے بلکہ فی الجملہ دیدار الٰہی مراد ہے اس کے بعد انہوں نے جواب دیا کہ صرف آنحضرت ﷺ کے لئے دیدار الٰہی ممکن ہے جو آپ ﷺ کو شب معراج میں حاصل ہوا۔

یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے ان چیزوں میں سے کچھ چھپالیا ہے........الخ" میں "ان چیزوں" سے مراد احکام و شرائع ہیں جن کا لوگوں تک پہنچانا آنحضرت ﷺ کے لئے ضروری قرار دیا گیا جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ

"اے پیغمبر (ﷺ)! جو کچھ احکام و شرائع اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ (ﷺ) پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں تک پہنچا دیجئے اور اگر ایسا نہ کیا تو آپ (ﷺ) خدا کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔"

اور "چھپانے" کا مفہوم عام ہے کہ خواہ تمام احکام و شرائع کو چھپانے کے بارے میں کہا جائے یا ان احکام و شرائع میں سے کچھ کو۔

اس سے شیعہ لوگوں کی اس گمراہ کن بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ کچھ احکام و شرائع ایسے ہیں جن کو آنحضرت ﷺ نے اپنے اہل بیعت کے لئے مخصوص رکھا ہے، ان کا دائرہ پوری اُمت تک وسیع نہیں کیا۔

"تو پھر اللہ کے اس ارشاد کا محمول و مصداق کیا ہے" کے ذریعہ حضرت مسروق نے سورۂ نجم کی ان تمام آیات کی طرف اشارہ کیا جن کے بارے میں صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہؒ مفسرین کے اختلافی اقوال کا ذکر پیچھے بھی کیا جا چکا ہے وہ آیتیں یہ ہیں۔

ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی ۝ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ۝ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی۔

"وہ آپ ﷺ کے نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا تو دونوں کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم پھر خدا نے اپنے بندے پر وحی نازل فرمائی جو کچھ کہ نازل فرمائی تھی جو کچھ انہوں نے دیکھا ان کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔"

پس بظاہر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ دنی کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف پھرتی ہے اسی طرح تَدَلّٰی اور فکان قاب قوسین میں کان کی ضمیریں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف راجع ہیں جس کا ایک ظاہری قرینہ فاوحی کی ضمیر ہے کہ اس کا مرجع یقینی طور پر اللہ تعالیٰ ہے، اس بنیاد پر حضرت مسروقؒ نے اشکال ظاہر کیا کہ اگر شب معراج میں آنحضرت ﷺ کو دیدار الٰہی حاصل نہیں ہوا تھا تو ان آیتوں کے کیا معنی ہوں گے؟ اس اشکال کا جواب حضرت عائشہ نے یہ دیا کہ ان افعال کی ضمیروں کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے ہی نہیں بلکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں، لہٰذا یہ سمجھنا کہ ان آیتوں سے آنحضرت ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ثابت ہوتا ہے غیر درست نتیجہ اخذ کرنا ہے پھر حضرت عائشہؓ نے کَانَ یاتیہ فی صورۃ الرَّجُل الخ کے ذریعہ ایک اور اشکال کا جواب دیا کہ اگر یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو تو آنحضرت ﷺ برابر دیکھا ہی کرتے تھے پھر شب معراج میں ان کو دیکھنے کو اس اہتمام کے ساتھ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو حضرت عائشہؓ نے گویا اس اشکال کے دفعیہ کے لئے فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام عام طور پر آنحضرت ﷺ کے پاس انسانی شکل و صورت میں آیا کرتے تھے، وہ آپ ﷺ کے سامنے اپنی اصل صورت کے ساتھ صرف دو مرتبہ آئے ہیں، ایک دفعہ تو نبوت کے بالکل ابتدائی زمانہ میں مکہ میں جب آنحضرت نے ان کو اس طرح دیکھا تھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے اور پورا افق ان سے معمور تھا، اور پھر اسی اصل صورت و ہیبت کے ساتھ دوسری مرتبہ شب معراج میں سدرۃ المنتہی کے پاس آپ ﷺ کو نظر آئے تھے۔

حاصل یہ کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت کعبؓ احبار کے قول سے استدلال کرتے ہوئے اس کو اختیار کیا کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو دو مرتبہ دیکھا ہے بایں احتمال کہ دونوں مرتبہ بصر (سر کی آنکھوں) سے دیکھا ہو یا بصیرت (دل کی آنکھوں) سے، یا یہ کہ ایک مرتبہ تو بچشم سر دیکھا ہو اور ایک مرتبہ بچشم قلب، اگرچہ اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو بچشم سر دو مرتبہ نہیں دیکھا ہے۔ اور حضرت عائشہ اس سے انکار کرتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا، تو ان کے اس انکار کو مطلق انکار پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے اور مقید انکار پر بھی، مطلق انکار کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ سرے سے آنحضرت ﷺ کے دیدار الٰہی کی منکر ہیں، خواہ بچشم قلب دیکھنا مراد لیا جائے یا بچشم سر اور مقید انکار کا مطلب یہ ہے کہ وہ بچشم سر دیکھنے کی منکر ہیں، بچشم قلب دیکھنے کی نہیں لیکن حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد کو دیکھتے ہوئے زیادہ درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انکار کو مطلق انکار پر محمول کیا جائے۔ اور حافظ ابن حجرؒ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کے اثبات اور حضرت عائشہؓ کے انکار کے درمیان جو تضاد ہے اس کو دور کرنے کے لئے یہ تاویل کی جانی چاہئے کہ حضرت عائشہؓ کا انکار بچشم سر دیکھنے پر اور حضرت ابن عباسؓ کا اثبات بچشم قلب دیکھنے پر محمول ہے، لیکن "بچشم قلب دیکھنے" کا مطلب "مجرد علم" نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا علم و عرفان تو حضور کو ہر وقت ہی حاصل رہتا تھا، اس کو شب معراج کے ساتھ مخصوص کر کے بیان کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوں گے، لہٰذا بچشم قلب دیکھنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس خاص موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے قلب میں وہ بینائی پیدا فرما دی تھی جو آنکھوں میں ہوتی ہے اور اس طرح آنحضرت ﷺ نے قلب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا وہ دیدار حاصل کیا جو کوئی شخص آنکھوں کے ذریعہ دوسری چیزوں کا حاصل کرتا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی تفسیر و تحقیق

⑧ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ فِیْ قَوْلِهٖ فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی وَفِیْ قَوْلِهٖ مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی وَ فِیْ قَوْلِهٖ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی قَالَ فِیْهَا كُلِّهَا رَاٰی جِبْرَئِیْلَ لَهٗ سِتُّمِائَةِ جَنَاحٍ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةِ التِّرْمِذِیِّ قَالَ مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی قَالَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جِبْرَئِیْلَ فِیْ حُلَّةٍ مِنْ رَفْرَفٍ قَدْ مَلَاَ مَابَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلَهٗ وَلِلْبُخَارِیِّ فِیْ قَوْلِهٖ وَلَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی قَالَ رَاٰی رَفْرَفًا اَخْضَرَ سَدَّ اُفُقَ السَّمَآءِ وَسُئِلَ مَالِكُ ابْنُ اَنَسٍ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ فَقِیْلَ قَوْمٌ یَقُوْلُوْنَ اِلٰی ثَوَابِهٖ فَقَالَ مَالِكٌ كَذَبُوْا فَاَیْنَ هُمْ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوْبُوْنَ قَالَ مَالِكٌ اَلنَّاسُ یَنْظُرُوْنَ اِلَی اللّٰهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِاَعْیُنِهِمْ وَقَالَ لَوْلَمْ یَرَالْمُؤْمِنُوْنَ رَبَّهُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ لَمْ یُعَیِّرِ اللّٰهُ الْكُفَّارَ بِالْحِجَابِ فَقَالَ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ان سب آیتوں کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جبرئیل کو (ان کی اصل صورت میں) دیکھا اور درآنحالیکہ ان کے چھ سو باز و تھے۔ اور ترمذیؒ کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی کی تفسیر میں کہا: "آنحضرت ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا جو سبز کپڑوں کا جوڑا پہنے ہوئے تھے اور زمین کے درمیان فضا ان سے معمور تھی۔" نیز ترمذیؒ اور بخاریؒ کی ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی کی تفسیر میں کہا کہ آنحضرت ﷺ نے جامہ سبز پوش (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام) کو دیکھا جنہوں نے پورے آسمانی افق کو گھیر رکھا تھا۔ اور حضرت امام مالکؒ بن انسؓ سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کے بارے میں پوچھا گیا اور ان سے بتایا گیا کہ کچھ لوگ (یعنی معتزلہ اور ان کے ہمنوا دیگر اہل بدعت کہتے ہیں کہ اس آیت میں "اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھنے" سے (مراد اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھنا نہیں ہے بلکہ) اس کے ثواب کو دیکھنا مراد ہے؟ تو حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ وہ لوگ جھوٹے ہیں، آخر ان کی سمجھ کہاں چلی گئی ہے! وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ کو کیوں نہیں دیکھتے پھر حضرت امام مالکؒ نے فرمایا "(اس میں کوئی شبہ نہیں کہ) مسلمان لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور فرمایا: اگر (یہی بات) ہوتی کہ) اہل ایمان قیامت کے دن اپنے پروردگار کو نہیں دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ کفار کو دیدار الٰہی سے محرومی کا عار نہ دلاتا اور یہ نہ فرماتا کہ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "آنحضرت ﷺ نے جبرئیل کو دیکھا " کے ذریعہ حضرت ابن مسعودؓ نے یہ واضح کیا کہ سورہ نجم کی ان آیتوں کی ضمیریں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف راجع ہیں اور ان کا محمول و مصداق آنحضرت ﷺ کو حضرت جبرئیل کی رویت قرب ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی رویت و قرب مراد ہے جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ پس حضرت ابن مسعودؓ کی یہ تاویل و تفسیر حضرت عائشہؓ کی اس تاویل و تفسیر کے مطابق ہے جو ان آیتوں سے متعلق پچھلی حدیث میں ذکر کی گئی۔ واضح رہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی جلالت شان اور ان کا کمال علم مسلمہ ہے اور علماء نے لکھا ہے کہ خلفاء اربعہ کے بعد ابن مسعودؓ ہی تمام صحابہؓ میں سب سے بڑے عالم تھے۔

بہر حال ان روایات و اقوال سے معلوم ہوا کہ شب معراج میں آنحضرت ﷺ کے اللہ تعالیٰ کو بچشم سر دیکھنے کے بارے میں صحابہؓ کے ہاں اختلاف ہے۔ حضرت عائشہؓ کو اس بات سے انکار ہے اور حضرت ابن عباس اس کے قائل ہیں، ان میں سے ہر ایک کو صحابہؓ کی تائید حاصل ہے کہ کچھ صحابہؓ تو حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہیں اور کچھ صحابہؓ حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ، پھر صحابہ کے بعد تابعینؒ و علماء سلف

بھی اسی نقش قدم پر گئے ہیں۔ کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ شب معراج میں آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کچھ حضرات اس کا انکار کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے سکوت و توقف اختیار کیا ہے اور کسی بھی فریق کے ساتھ نہیں گئے ہیں، ان حضرات کا کہنا ہے کہ دونوں میں سے کسی جانب بھی واضح دلیل نہیں ہے اس لئے ہم یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں خاموش رہا جائے اور حقیقت حال اللہ کے سپرد کردی جائے کہ اصل بات اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تاہم جمہور علماء اسی کے قائل ہیں کہ شب معراج میں آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا عینی دیدار حاصل ہوا ہے، حضرت شیخ محی الدین نووی ؒ فرماتے ہیں کہ اکثر علماء کبار کے نزدیک راجح اور مختار یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے معراج کی رات میں) اپنے پروردگار کو سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ نیز انہوں نے کہا کہ اس کا اثبات آنحضرت ﷺ سے سماعت کے بعد ہی ہوا ہے (کہ حضرت ابن عباس ؓ نے جو یہ کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو شب معراج میں اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوا تو انہوں نے یہ بات آنحضرت ﷺ سے سننے کے بعد ہی کہی تھی، جب کہ حضرت عائشہ ؓ نے اس کے انکار میں حدیث سے استدلال نہیں کیا ہے اور اس بارے میں آنحضرت ﷺ سے کچھ سن کر روایت نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کی اس آیت مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْمِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اور اس آیت لاتدرکه الابصار وهو یدرک الابصار سے ان کے اپنے استنباط اجتہاد کا نتیجہ ہے جب کہ ان آیتوں کے بارے میں بھی ائمہ ؒ مفسرین نے لکھا ہے کہ پہلی آیت ما کان لبشر ان یکلمه الله الخ میں جو نفی بیان کی گئی ہے وہ حالت رویت میں کلام کی نفی ہے جس سے رؤیت بے کلام کی نفی قطعا لازم نہیں آتی اور دوسری آیت لا تدرکه الابصار الخ میں "ادراک" کا ذکر ہے جس کے معنی "احاطہ" کے ہیں اور احاطہ کی نفی سے مطلق رویت کی نفی مفہوم نہیں ہوتی! بعض دوسرے علماء نے بھی لکھا ہے کہ مذکورہ مسئلہ میں حضرت ابن عباس ؓ ہی کے قول پر زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے اور یہ طے ہے کہ انہوں نے یہ بات آنحضرت سے سنے بغیر نہیں کہی تھی اور یہ ممکن بھی نہیں کہ وہ اتنی بڑی بات اپنے ظن و اجتہاد سے کہیں، منقول ہے کہ حضرت ابن عمر ؓ نے حضرت ابن عباس ؓ سے کافی بحث و تکرار کی اور پوچھا کہ کیا واقعۃ محمد ﷺ نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا، حضرت ابن عباس ؓ نے پورے وثوق کے ساتھ جواب دیا کہ ہاں دیکھا تھا چنانچہ حضرت ابن عمر ؓ نے ان کی بات کو قطعی طور پر تسلیم کیا اور کسی تردد و انکار کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت عمر ابن راشد ؒ کا قول ہے کہ ہمارے نزدیک حضرت عائشہ ؓ حضرت ابن عباس ؓ سے زیادہ علم کی حامل نہیں ہیں (اس لئے ان کے مقابلہ پر حضرت ابن عباس ؓ ہی کے قول کو راجح اور قابل اعتماد قرار دیا جائے گا، نیز مشائخ صوفیہ بھی رویت ہی کے قائل ہیں۔

اب امام مالک ؒ کی روایت کی طرف آیئے جب ان سے بتایا گیا کہ کچھ لوگ جیسے معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ آخرت میں اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھیں گے اور قرآن کی اس آیت اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَۃٌ کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھنے کے بجائے اس کے ثواب یعنی جنت کی نعمتوں اور وہاں کے مراتب و درجات کو دیکھنا مراد ہے تو امام مالک ؒ نے ان لوگوں کی زبردست تردید کی اور فرمایا کہ وہ لوگ عقل و سمجھ سے کوسوں دور ہیں کہ بالکل ظاہر معنی رکھنے والی اس آیت کی غلط تاویل تو کرتے ہیں لیکن اس آیت کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ کو نہیں دیکھتے جس میں اہل کفر کو اسی بات کا عار دلایا گیا ہے کہ وہ قیامت کے دن پروردگار کے دیدار سے روک دیئے جائیں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی سعادت سے محروم رہیں گے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور اس کے دیدار کی سعادت سے مشرف ہوں گے! اگر یہی بات ہو تو اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے دیدار کی سعادت حاصل نہیں کریں گے تو پھر اہل کفار کو اس سعادت سے محرومی کی اس بھرپور انداز میں خبر دینے اور انہیں عار دلانے کی کیا ضرورت تھی معلوم ہوا کہ آخرت میں اہل کفار کے حق میں سب سے بڑا عذاب یہ ہوگا کہ وہ دیدار الٰہی سے محروم و مخذول قرار دیئے جائیں گے اور ہمیشہ اس محرومی کی حسرت میں مبتلا رہیں گے جس طرح کہ اہل ایمان کے حق میں سب سے بڑا اجر و ثواب دیدار الٰہی ہوگا اور وہ نعمت دیدار سے محظوظ و مشرف ہوں گے۔

دیدار الٰہی کی کیفیت

(۹) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَهْلُ الْجَنَّةِ فِيْ نَعِيْمِهِمْ اِذْ سَطَعَ لَهُمْ نُوْرٌ فَرَفَعُوْا رُؤُسَهُمْ فَاِذَا الرَّبُّ قَدْ اَشْرَفَ عَلَيْهِمْ مِنْ فَوْقِهِمْ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَآ اَهْلَ الْجَنَّةِ قَالَ وَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِيْمِ قَالَ فَنَظَرَ اِلَيْهِمْ وَيَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ فَلَا يَلْتَفِتُوْنَ اِلٰى شَيْءٍ مِّنَ النَّعِيْمِ مَادَامُوْا يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ حَتّٰى يَحْتَجِبَ عَنْهُمْ وَيَبْقٰى نُوْرُهٗ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ "(آپ ﷺ نے فرمایا) جب جنتی اپنی حاصل شدہ نعمتوں سے لذت و کیف اٹھانے میں مشغول ہوں گے کہ اچانک ان کے سامنے ایک عظیم نور پھیل جائے گا وہ (اس نور کو دیکھنے کے لئے) اپنا سر اٹھائیں گے تو کیا دیکھیں گے کہ ان کے اوپر پروردگار جلوہ گر ہے۔ اور پروردگار ان سے فرمائے گا کہ اہل جنت! السلام علیکم اور یہ (یعنی اس وقت پروردگار کا جنتیوں کو سلام کرنا) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِيْمِ سے ثابت ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "پھر اللہ تعالیٰ جنتیوں کی طرف دیکھے گا اور جنتی اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھیں گے اور وہ دیدار الٰہی میں اس قدر محو ہوں گے کہ اس وقت جنتیوں کی نعمتوں میں سے کسی چیز کی طرف توجہ والتفات نہیں کریں گے تاآنکہ پروردگار ان کی نظروں سے مخفی ہو جائے گا اور اس کا نور باقی رہ جائے گا۔"

(ابن ماجہ)

تشریح: "تاآنکہ پروردگار ان کی نظروں سے مخفی ہو جائے گا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب تک چاہے گا ان کی نظروں کے سامنے خود کو جلوہ گر رکھے گا اور پھر ان کی آنکھوں کے سامنے حجاب حائل کر دے گا لیکن اس کے جلوے کی نورانیت اور اس کے دیدار سے حاصل ہونے والے کیف و سرور کا خمار باقی رہے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ حجاب اور جنتیوں کی نظر سے پروردگار کا مخفی ہو جانا بھی اس کی طرف سے اپنے بندوں پر ایک طرح کا لطف و کرم ہی ہوگا کیونکہ پروردگار کا اہل جنت کو برابر اپنی درگاہ اور حضور و شہود میں رکھنا اور ہر وقت ان کی نظر کے سامنے جلوہ گر رہنا ایک ایسی صورت حال ہوگی جو جنتیوں کی تاب و طاقت سے باہر ہوگی، ظاہر ہے، ایک دفعہ دیدار کرنے کے بعد پھر ان کو اتنے عرصہ کی ضرورت ہوگی جس میں وہ خود کو سنبھال سکیں اور اپنی اصل حالت پر واپس آجائیں تاکہ جنت کی دوسری نعمتوں سے لطف اندوز ہو کر ذات باری تعالیٰ کی تجلی کا استحقاق نئے سرے سے حاصل کر سکیں اور ہر بار دیدار الٰہی کا نیا ذوق اور نیا کیف و سرور حاصل کریں۔

بَابُ صِفَةِ النَّارِ وَاَهْلِهَا

دوزخ اور دوزخیوں کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دوزخ کی آگ کی گرمی

(۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَارُكُمْ جُزْءٌ مِّنْ سَبْعِيْنَ جُزْءً مِّنْ نَارِ جَهَنَّمَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كَانَتْ لَكَافِيَةً قَالَ فُضِّلَتْ عَلَيْهِنَّ بِتِسْعَةٍ وَّسِتِّيْنَ جُزْءً كُلُّهُنَّ مِثْلُ حَرِّهَا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ وَفِيْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ نَارُكُمُ الَّتِيْ يُوْقِدُ ابْنُ اٰدَمَ فِيْهَا عَلَيْهَا وَكُلُّهَا بَدَلَ عَلَيْهِنَّ وَكُلُّهُنَّ ۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "تمہاری (دنیا کی) آگ دوزخ کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! یہ تو دنیا کی آگ ہی (عذاب دینے کے لئے) کافی تھی (پھر اس سے بھی زیادہ حرارت و تپش رکھنے والی آگ پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "دوزخ کی آگ کو یہاں (دنیا) کی آگ انہتر حصہ بڑھا دیا گیا ہے اور ان انہتر حصوں میں سے ہر ایک حصہ تمہاری (دنیا کی) آگ کے برابر ہے۔" اس روایت کو بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کیا ہے، لیکن (یہاں مذکورہ) الفاظ بخاریؒ کے ہیں اور صحیح مسلمؒ کی روایت یوں ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا): "تمہاری (دنیا کی) یہ آگ جس کو ابن آدم (انسان) جلاتا ہے دوزخ کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے، نیز مسلمؒ کی روایت میں علیھن اور کلھن کے بجائے علیھا اور کلھا کے الفاظ ہیں (یعنی بخاریؒ کی روایت میں ہے۔"

تشریح: دنیا کی آگ کا دوزخ کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی آگ جو درجہ حرارت رکھتی ہے دوزخ کی آگ اس سے ستر درجہ حرارت زیادہ گرم ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ ستر کے عدد سے مراد دنیا کی آگ کے مقابلہ پر دوزخ کی آگ کی گرمی کی شدت و زیادتی کو بیان کرنا ہو نہ کہ یہ خاص عدد ہی مراد ہے، گویا اصل مفہوم یہ ہوگا کہ دوزخ کی آگ تمہاری دنیا کی آگ کے مقابلہ پر بہت زیادہ درجہ حرارت رکھتی ہے۔

آنحضرت ﷺ سے جو سوال کیا گیا، اس کے جواب میں آپ ﷺ نے جو فرمایا وہ گویا از راہ تاکید اسی جملہ کی تکرار تھی جو آپ ﷺ نے شروع میں فرمایا تھا اور اس سے جواب کا حاصل یہ نکلا کہ بیشک کسی کو جلانے کے لئے یہ دنیا کی آگ ہی بہت ہے کہ اگر تم کسی انسان کو عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے اس آگ میں ڈال دو تو وہ جل کر کوئلہ ہو جائے گا مگر دوزخ کی آگ جس عذاب خداوندی کے لئے تیار کی گئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کی حرارت و گرمی اس دنیا کی آگ کی حرارت و گرمی سے بہت زیادہ ہو تاکہ خدا کا عذاب دنیا والوں کے عذاب سے ممتاز ہے اور دوزخ کی اس آگ میں جلنے والوں کو معلوم ہو کہ ان کے خدا کا عذاب دنیا والوں کے عذاب سے ممتاز ہے اور دوزخ کی اس آگ میں جلنے والوں کو معلوم ہو کہ ان کے خدا کا عذاب اتنا زیادہ شدید اور اتنا زیادہ سخت ہے کہ اگر دنیا میں کوئی شخص انہیں وہاں کی آگ میں جلاتا تو وہ عذاب اس عذاب خداوندی کے مقابلہ پر ہیچ ہوتا حاصل یہ کہ دوزخ کی آگ دراصل عذاب خداوندی ہے جیسا کہ اس کا اصناف عذاب میں ذکر ہوتا ہے، اس لئے اس کو دنیا کی آگ کی بہ نسبت کہیں زیادہ درجۂ حرارت رکھنا ہی چاہئے۔

دوزخ کو لانے کا ذکر

② وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُؤْتٰى بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لَّهَا سَبْعُوْنَ اَلْفَ زِمَامٍ مَعَ كُلِّ زِمَامٍ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ يَجُرُّوْنَهَا (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اس دن (یعنی قیامت کے دن) دوزخ کو (اس جگہ سے کہ جہاں اس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے) لایا جائے گا، اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ پر ستر ہزار فرشتے متعین ہوں گے جو اس کو کھینچے ہوئے لائیں گے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن دوزخ کو لاکھوں فرشتے اس کی جگہ سے کھینچ کر محشر والوں کے سامنے لائیں گے اور ایسی جگہ رکھ دیں گے کہ وہ اہل محشر اور جنت کے درمیان حائل ہو جائے گی اور جنت تک جانے کے لئے اس پلصراط کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوگا جو دوزخ کی پیٹھ پر رکھا ہوا ہوگا، دوزخ کی جو ستر ہزار باگیں ہوں گی ان کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ جب لائی جائے گی تو اہل دوزخ پر اپنی غضبناکی کا اظہار کر رہی ہوگی اور چاہے گی کہ سب وہ نگل لے اور ہڑپ کر جائے پس نگہبان فرشتے اس کو انہی باگوں کے ذریعہ روکیں گے اگر اس کی باگیں چھوڑ دی جائیں اور اس کو حملہ آور ہونے سے باز نہ رکھا جائے تو وہ مؤمن اور کافر سب کو چٹ کر جائے۔

دوزخ کا سب سے ہلکا عذاب

③ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَهْوَنَ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا مَّنْ لَّهٗ نَعْلَانِ وَشِرَاكَانِ مِنْ نَّارٍ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهٗ كَمَا يَغْلِي الْمِرْجَلُ مَا يَرٰى اَنَّ اَحَدًا اَشَدُّ مِنْهُ عَذَابًا وَّاِنَّهٗ لَاَهْوَنُهُمْ عَذَابًا (متفق علیہ)

"اور حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ دوزخیوں میں سے جو شخص سب سے ہلکے عذاب میں مبتلا ہوگا اس کو آگ کی دو جوتیاں پہنائی جائیں گی جن کے اوپر آگ کے دو تسمے ہوں گے (یعنی ان جوتیوں کے تلوے بھی آگ کے ہوں گے جو پیروں کے نیچے کے حصہ میں ہوں گے اور ان کے تسمے بھی آگ کے ہوں گے جو پیروں کے اوپر کے حصہ پر ہوں گے) اور ان دونوں (یعنی جوتیوں کے تلووں اور تسموں کی تپش و حرارت سے اس کا دماغ اس طرح جوش مارے گا جس طرح دیگ جوش کھاتی ہے۔ وہ شخص چونکہ دوسرے دوزخیوں کی حالت و کیفیت سے بے خبر ہوگا اس لئے) یہ خیال کرے گا کہ اس سے زیادہ سخت عذاب میں کوئی مبتلا نہیں ہے حالانکہ وہ سب سے ہلکے عذاب میں مبتلا ہوگا۔"

تشریح: اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کے اعتبار سے اہل دوزخ متفاوت ہوں گے کہ کوئی سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوگا اور کوئی ہلکے عذاب میں۔

دوزخ میں سب سے ہلکا عذاب ابوطالب کو ہوگا

④ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَهْوَنُ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا اَبُوْطَالِبٍ وَّهُوَ مُتَنَعِّلٌ بِنَعْلَيْنِ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهٗ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "دوزخیوں میں سب سے ہلکا عذاب ابوطالب کو ہوگا وہ آگ کی جوتیاں پہنے ہوں گے جن سے ان کا دماغ کھولتا رہے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: ابوطالب، آنحضرت ﷺ کے چچا تھے جن کی شفقت و سرپرستی نے آنحضرت ﷺ کی بہت مدد کی، اگرچہ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا مگر جب تک جیئے) آنحضرت ﷺ کو کفار مکہ کی دشمنی و عداوت سے محفوظ رکھنے کی حتی المقدور کوشش کرتے رہے اور اس کے بدلہ میں ان کو دوزخ میں سب سے ہلکا عذاب ہوگا۔

ایک دوزخی ایک جنتی

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُؤْتٰى بِاَنْعَمِ اَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ اَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً ثُمَّ يُقَالُ يَا ابْنَ اٰدَمَ هَلْ رَاَيْتَ خَيْرًا قَطُّ هَلْ مَرَّبِكَ نَعِيْمٌ قَطُّ فَيَقُوْلُ لَا وَاللّٰهِ يَا رَبِّ وَيُؤْتٰى بِاَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُصْبَغُ صِبْغَةً فِي الْجَنَّةِ فَيُقَالُ لَهٗ يَا ابْنَ اٰدَمَ هَلْ رَاَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ وَهَلْ مَرَّبِكَ شِدَّةٌ قَطُّ فَيَقُوْلُ لَا وَاللّٰهِ يَا رَبِّ مَا مَرَّبِيْ بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَاَيْتُ شِدَّةً قَطُّ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قیامت کے دن دوزخیوں میں سے ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ عیش و آرام کی زندگی گزارتا تھا (اور اپنے اس عیش و آرام سے بدمست ہو کر ظلم و جور میں بہت بڑھا ہوا تھا) پھر اس کو دوزخ میں ایک غوطہ دیا جائے گا (یعنی دوزخ میں ڈبویا جائے گا جس طرح کپڑا رنگ میں ڈبویا جاتا ہے) اور کہا جائے گا کہ اے ابن آدم! کیا تو نے دنیا میں کبھی کوئی راحت و بھلائی دیکھی تھی اور کوئی عیش و آرام اٹھایا تھا؟ وہ دوزخی (دوزخ میں ڈالے جانے کے ڈر سے اس قدر سہم جائے گا کہ دنیا کے ان تمام ناز و نعم اور ان تمام آسائش و راحت کو فراموش کر دے گا جو اس کو حاصل تھیں اور ایسا ظاہر کرے گا جیسے اس کو دنیا

میں کوئی راحت و نعمت نصیب ہی نہیں ہوئی تھی چنانچہ وہ) کہے گا کہ نہیں میرے پروردگار، خدا کی قسم (مجھے کوئی راحت و نعمت نصیب نہیں ہوئی تھی) اس طرح جنتیوں میں سے ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ غم والم اور مشقت و کلفت برداشت کرنے والا تھا، پھر اس کو جنت میں ایک غوطہ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اے ابن آدم! کیا تو نے دنیا میں کوئی غم اٹھایا تھا، اور کسی مشقت و کلفت سے دوچار ہوا تھا؟ وہ جنتی (جنت کی نعمتیں اور راحتیں دیکھ کر اپنے دنیا کے تمام رنج و غم اور کلفت و مشقت بھول جائے گا اور) جواب دے گا کہ نہیں میرے پروردگار، خدا کی قسم میں نے (دنیا میں) کبھی کوئی رنج و غم نہیں دیکھا اور کوئی مشقت و کلفت نہیں اٹھائی۔" (مسلمؒ)

تشریح: جنتی کو چونکہ نہایت درجہ کی خوشی حاصل ہوگی اس لئے وہ جواب میں طوالت اختیار کرے گا اس کے برخلاف دوزخی مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جائے گا۔

شرک کے خلاف انتباہ

(۶) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ لِاَهْوَنِ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَوْ اَنَّ لَكَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَيْءٍ اَكُنْتَ تَفْتَدِيْ بِهٖ فَيَقُوْلُ نَعَمْ فَيَقُوْلُ اَرَدْتُّ مِنْكَ اَهْوَنَ مِنْ هٰذَا وَاَنْتَ فِيْ صُلْبِ اٰدَمَ اَنْ لَّا تُشْرِكَ بِيْ شَيْئًا فَاَبَيْتَ اِلَّا اَنْ تُشْرِكَ بِيْ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دوزخیوں میں سے اس شخص سے جو سب سے ہلکے عذاب میں ہوگا فرمائے گا کہ اگر تیرے پاس روئے زمین کی چیزوں میں سے کوئی ایسی چیز ہوتی جس کو تو بدلہ میں دے سکتا (اور اس کے عوض دوزخ کے عذاب سے خواہ وہ کتنا ہی ہلکا ہو چھٹکارا پاسکتا، تو کیا تو ایسا کرتا وہ دوزخی کہے گا کہ ہاں (میں دنیا کی حاصل شدہ بڑی سے بڑی چیز بدلہ میں دے کر دوزخ کے عذاب سے چھٹکارا پانا چاہوں گا) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ بدنصیب انسان) میں نے تو اسی وقت جب تو آدم کی پشت میں تھا، اس (بدلہ میں کوئی چیز دینے) سے بھی آسان و سہل چیز تیرے لئے طے کر دی تھی اور وہ یہ کہ تو میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا، مگر تو اس سے مکر گیا (اور میرے احکام کی کوئی پابندی نہیں کی) یہاں تک کہ (بتوں وغیرہ کی پرستش و تعظیم کے ذریعہ میرا شریک ٹھہرا کر رہا، پس اب میں اس عذاب دوزخ کے بدلہ میں کوئی چیز قبول نہیں کروں گا خواہ تو دنیا کی تمام چیزیں ہی کیوں نہ لے آئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لفظی ترجمہ کے اعتبار سے اس جگہ اردت منک الخ کے معنی یہ ہوں گے کہ میں نے تجھ سے اس سے بھی آسان و سہل چیز چاہی تھی" اور مظہرؒ نے لکھا ہے کہ یہاں "ارادہ" کا لفظ "امر" کے معنی میں ہے (یعنی چاہنے سے مراد حکم دینا ہے) نیز ارادہ اور امر میں فرق یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے سب اسی کے ارادے و مشیت سے ہوتا ہے جب کہ امر کا اطلاق کبھی اس چیز پر بھی ہوتا ہے جو اس کے ارادہ و مشیت کے خلاف ہو طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ زیادہ درست یہ ہے کہ یہاں "ارادہ" کو میثاق یعنی عہد لینے پر محمول کیا جائے جس کا ذکر قرآن کریم میں یوں فرمایا گیا ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ الخ اور اس کا قرینہ خود حدیث قدسی کے یہ الفاظ وَاَنْتَ فِيْ صلب ادم ہیں (مکرنے) کو "عہد توڑنے" پر محمول کیا جائے۔

عذاب میں تفاوت و درجات

(۷) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْهُمْ مَنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى كَعْبَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى حُجْزَتِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى تَرْقُوَتِهٖ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "دوزخیوں میں سے کچھ لوگ وہ ہوں گے جن کے دونوں

ٹخنوں تک آگ ہوگی، کچھ لوگ ہوں گے جن کے دونوں زانوں تک آگ ہوگی کچھ لوگ وہ ہوں گے جن کی کمر تک آگ ہوگی اور کچھ لوگ وہ ہوں گے جن کی گردن تک آگ ہوگی۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ اہل دوزخ عذاب کے ہلکے اور سخت ہونے میں متفاوت ہوں گے جو دنیا میں جس درجہ کا بدعقیدہ اور بدعمل رہا ہوگا۔ اس کو اسی درجہ کا عذاب ہوگا۔

دوزخیوں کے جسم

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَابَيْنَ مَنْكِبَيِ الْكَافِرِ فِی النَّارِ مَسِيْرَةُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ لِلرَّاكِبِ الْمُسْرِعِ وَفِیْ رِوَايَةٍ ضِرْسُ الْكَافِرِ مِثْلُ اُحُدٍ وَغِلَظُ جِلْدِهٖ مَسِيْرَةُ ثَلٰثٍ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اِشْتَكَتِ النَّارُ اِلٰی رَبِّهَا فِیْ بَابِ تَعْجِيْلِ الصَّلٰوةِ

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "دوزخ میں کافر کے جسم کو اس قدر موٹا اور فربہ بنا دیا جائے گا کہ اس کے) دونوں مونڈھوں کا درمیانی فاصلہ تیز رو سوار کی تین دن کی مسافت کے برابر ہوگا۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ دوزخ میں کافر کا دانت احد پہاڑ کے برابر ہوگا اور اس کے جسم کی کھال تین دن کی مسافت کے برابر موٹی ہوگی۔" (مسلمؒ) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت اشتکت النار الی ربھا باب تعجیل الصلوۃ میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں اہل دوزخ کے جسم کے پھیلاؤ اور مٹاپے کا ذکر ہے، جب کہ ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ قیامت کے دن متکبرین کو میدان حشر میں اس حالت میں لایا جائے گا کہ ان کے جسم تو چیونٹیوں کے برابر ہوں گے اور ان کی صورتیں مردوں کی ہوں گی اور پھر انہیں ہانک کر قید خانہ میں لا یا جائے گا۔ پس ان دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہے کہ "متکبرین" سے مراد مؤمن گناہ گار ہیں جب کہ مذکورہ بالا حدیث میں "کفار" کا ذکر کیا گیا ہے لیکن زیادہ درست یہ کہنا ہے کہ ان کو میدان حشر میں تو چیونٹیوں ہی کے جسم میں لایا جائے گا جہاں وہ لوگوں کے تلووں تلے خوب روندے جائیں گے، اس کے بعد پھر ان کے بدن اپنی اصلی حالت میں آجائیں گے اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے، دوزخ میں ان کے بدن دوبارہ غیر معمولی ساخت کے ہو جائیں گے اور ان کا مٹاپا اور پھیلاؤ اتنا بڑھ جائے گا جس کا ذکر حدیث میں کیا گیا ہے نیز ان کے بدن کو اس قدر موٹا اور فربہ اس لئے کیا جائے گا تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ عذاب ہو سکے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

دوزخ کی آگ کا ذکر

⑨ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُوْقِدَ عَلَی النَّارِ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰی احْمَرَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰی ابْيَضَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰی اسْوَدَّتْ فَهِیَ سَوْدَآءُ مُظْلِمَةٌ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "کہ دوزخ کی آگ کو ایک ہزار برس جلایا گیا یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی پھر ایک ہزار برس اور جلایا گیا جس سے وہ سیاہ ہوگئی ہے پس اب دوزخ کی آگ بالکل سیاہ و تاریک ہے (جس میں نام کو بھی روشنی نہیں ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی۔" یہ آگ کا خاصہ ہے کہ جب وہ دیر تک جلتی رہتی ہے اور خوب صاف و تیز ہو جاتی ہے تو بالکل سفید معلوم ہونے لگتی ہے، پہلے اس میں جو سرخی ہوتی ہے۔ وہ دھویں کی آمیزش کی وجہ سے ہوتی ہے۔

بہرحال یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دوزخ وجود میں آچکی ہے جیسا کہ اہل سُنّت والجماعت کا مسلک ہے۔ اس کے برخلاف معتزلہ کا مسلک یہی ہے کہ دوزخ ابھی تیار نہیں ہوئی ہے اور وجود میں نہیں ہے۔ اہل سُنّت والجماعت کی بڑی دلیل قرآن کی اس آیت وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ میں اُعِدَّتْ کا لفظ ہے جو ماضی کے صیغہ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

کافر دوزخی کی جسامت

⑩ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضِرْسُ الْكَافِرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِثْلُ اُحُدٍ وَ فَخِذُهٗ مِثْلُ الْبَيْضَآءِ وَمَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ مَسِيْرَةُ ثَلٰثٍ مِّثْلُ الرَّبْذَةِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن (دوزخ میں) کافر کے دانت احد پہاڑ کے برابر اور اس کی ران بیضا (پہاڑ کے برابر ہوگی، اور دوزخ میں اس کے بیٹھنے کی جگہ تین دن کی مسافت کے بقدر ہوگی جیسا کہ ربذہ ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "ربذہ" مدینہ کے قصبات میں سے ایک قصبہ تھا جو وہاں سے تین دن کی مسافت پر ذات عرق کے قریب واقع تھا۔ پس "جیسا کہ ربذہ ہے۔" سے مراد یہ ہے کہ کافر دوزخی اپنی لمبی چوڑی جسامت کی وجہ سے اپنے بیٹھنے میں اتنی جگہ گھیرے گا جتنی کہ مدینہ سے ربذہ تک کا فاصلہ ہے۔

⑪ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ غِلَظَ جِلْدِ الْكَافِرِ اثْنَانِ وَاَرْبَعُوْنَ ذِرَاعًا وَاِنَّ ضِرْسَهٗ مِثْلُ اُحُدٍ وَاِنَّ مَجْلِسَهٗ مِنْ جَهَنَّمَ مَا بَيْنَ مَكَّةَ وَ الْمَدِيْنَةِ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "کافر دوزخی کی کھال بیالیس ہاتھ موٹی ہوگی، اس کے دانت احد پہاڑ کے برابر ہوں گے اور دوزخ میں اس کے بیٹھنے کی جگہ مکہ اور مدینہ کے درمیانی فاصلہ کے برابر ہوگی" (ترمذیؒ)

تشریح: ایک روایت میں "بیالیس ہاتھ" کی وضاحت کے لئے بذرع الجبار کے الفاظ بھی منقول ہیں یعنی ہاتھ بھی کونسا، ایک لمبے چوڑے شخص کا ہاتھ اوپر کی حدیث میں کافر دوزخی کے بیٹھنے کی جگہ مدینہ اور ربذہ کے درمیانی فاصلہ کے برابر بیان فرمائی گئی ہے جب کہ اس حدیث میں "مکہ اور مدینہ کے درمیانی فاصلہ" کا ذکر ہے؟ چنانچہ علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ مقدار کا یہ فرق واختلاف دراصل کافر دوزخیوں کو دیئے جانے والے عذاب میں فرق واختلاف کی بنیاد پر ہے کہ جو کافر سخت ترین عذاب کا مستوجب ہوگا اس کی جسامت بھی اسی اعتبار سے لمبی چوڑی ہوگی اور اسی لحاظ سے اس کے بیٹھنے کی جگہ بھی زیادہ لمبی چوڑی ہوگی، اور جو کافر نسبتاً ہلکے عذاب کا مستوجب ہوگا اس کی جسامت نسبتاً کم لمبی چوڑی ہوگی اور اسی لحاظ سے اس کے بیٹھنے کی جگہ بھی کم لمبی چوڑی ہوگی، اسی پر کھال وغیرہ کی مقدار کے اختلاف کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

⑫ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْكَافِرَ لَيُسْحَبُ لِسَانَهُ الْفَرْسَخَ وَ الْفَرْسَخَيْنِ يَتَوَزَّاُهُ النَّاسُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "کافر (دوزخ میں) اپنی زبان تین تین اور چھ چھ کوس تک نکالے گا اور لوگ اس کو (اپنے پیروں سے) روندیں گے یعنی اس زبان پر چلیں پھریں گے۔ (احمدؒ، ترمذیؒ) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

دوزخ کا پہاڑ

⑬ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الصَّعُوْدُ جَبَلٌ مِّنَ النَّارِ يُتَصَعَّدُ فِيْهِ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا

وَّيُهْوٰى بِهٖ كَذٰلِكَ فِيْهِ اَبَدًا (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے: سُعُوْدٌ (جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت سارھقه سعودا۔ میں ہے) دوزخ میں ایک پہاڑ ہے جس پر کافر ستر برس تک چڑھایا جائے گا اور وہاں سے اسی طرح (ستر برس تک) گرایا جائے گا اور برابر یہی سلسلہ جاری رہے گا (یعنی کافر دوزخی ہمیشہ اس پہاڑ پر چڑھائے اور گرائے جاتے رہیں گے۔" (ترمذیؒ)

دوزخیوں کی غذا

⑭ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ قَوْلِهٖ كَالْمُهْلِ اَیْ كَعَكَرِ الزَّيْتِ فَاِذَا قُرِّبَ اِلٰى وَجْهِهٖ سَقَطَتْ فَرْوَةُ وَجْهِهٖ فِيْهِ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد (یعنی اس آیت اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ میں لفظ مھل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ زیتون کی تلچھٹ کی طرح ایک چیز ہوگی، جب اس مھل) کو دوزخی کے منہ کے قریب لیجایا جائے گا تو (مارے گرمی کے) اس کے منہ کی کھال اس میں گر پڑے گی۔" (ترمذی)

گرم پانی کا عذاب

⑮ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْحَمِيْمَ لَيُصَبُّ عَلٰى رُؤُسِهِمْ فَيَنْفُذُ الْحَمِيْمُ حَتّٰى يَخْلُصَ اِلٰى جَوْفِهٖ فَيَسْلُتَ مَافِيْ جَوْفِهٖ حَتّٰى يَمْرُقَ مِنْ قَدَمَيْهِ وَهُوَ الصَّهْرُ ثُمَّ يُعَادُ كَمَا كَانَ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب دوزخیوں کے سر پر گرم پانی ڈالا جائے گا تو وہ گرم پانی اندر کو اترتا ہوا پیٹ تک پہنچ جائے گا اور ان چیزوں کو کاٹ ڈالے گا جو پیٹ کے اندر ہیں (یعنی آنتیں وغیرہ) یہاں تک کہ وہ گرم پانی (پیٹ کے اندر کی چیزوں کو کاٹتا اور گلاتا ہوا پیروں کے راستہ سے باہر نکل جائے گا، اور "صہر" کے یہی معنی ہیں، پھر وہ دوزخی کہ جس کے ساتھ گرم پانی کا یہ عمل ہوگا) ویسا کا ویسا ہو جائے گا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "صہر" کے معنی گلنے اور پگھلنے کے ہیں اور یہ لفظ جس کی وضاحت آنحضرت ﷺ نے مذکورہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی، قرآن کریم کی اس آیت میں آیا ہے۔

يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُؤُسِهِمُ الْحَمِيْمُ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ۔

"(اور) ان کے سر کے اوپر سے تیز گرم پانی چھوڑ دیا جائے گا، جس سے پیٹ کی چیزیں (یعنی انتڑیاں) اور ان کی کھالیں سب گل جاویں گی۔"

"پھر وہ ویسا کا ویسا ہی ہو جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ دوزخیوں کے ساتھ گرم پانی کا یہ عمل، عذاب کے طور پر مسلسل باقی رکھا جائے گا، یعنی اس عذاب کے بعد وہ اپنی سابق حالت پر واپس آجائیں گے ان کی کھال جوں کی توں ہو جائے گی اور ان کی آنتیں پیٹ میں اپنی اپنی جگہ صحیح سالم ہو جائیں گی، تب پھر ان کے سر پر وہی گرم پانی ڈالا جائے گا جو اندر تک تاثیر کرتا ہوا پیٹ تک پہنچے گا اور آنتوں وغیرہ کو کاٹتا گلاتا ہوا دونوں پیروں کے راستہ باہر نکل جائے گا، اسی طرح یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا اس کا ثبوت قرآن کریم کے ان الفاظ سے ملتا ہے۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا

دوزخیوں کے پینے کا پانی

⑯ وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ قَوْلِهٖ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ قَالَ يُقَرَّبُ اِلٰى فِيْهِ

فَيَكْرَهُهُ فَاِذَا اُدْنِيَ مِنْهُ شَوَى وَجْهَهُ وَوَقَعَتْ فَرْوَةُ رَاسِهِ فَاِذَا شَرِبَهُ قَطَّعَ اَمْعَآءَهُ حَتّٰى يَخْرُجَ مِنْ دُبُرِهِ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ وَيَقُوْلُ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ۔
(رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب وہ پانی اس (دوزخی) کے منہ کے قریب لایا جائے گا تو وہ بہت ناک بھوں چڑھائے گا اور پھر جب وہ پانی اس کے منہ میں ڈالا جائے گا تو اس کے منہ کے گوشت کو بھون ڈالے گا اور اس کے سر کی کھال گر پڑے گی، اور جب وہ (دوزخی) اس پانی کو پیئے گا (اور وہ پانی پیٹ میں پہنچے گا) تو آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا، پھر وہ پاخانہ کے راستے سے باہر نکل آئے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ اسی طرح (قرآن میں ایک اور جگہ یوں فرمایا گیا ہے وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ۔" (ترمذیؒ)

دوزخ کی چار دیواری

⑰ وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِىِّ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَسُرَادِقِ النَّارِ اَرْبَعَةُ جُدُرٍ كِثَفُ كُلِّ جِدَارٍ مَسِيْرَةُ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدری نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: دوزخ کے احاطہ کے لئے چار دیواریں ہوں گی جن میں سے ہر دیوار کی چوڑائی چالیس برس کی مسافت کے برابر ہوگی۔" (ترمذیؒ)

⑱ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ دَلْوًا مِّنْ غَسَّاقٍ يُهْرَاقُ فِى الدُّنْيَا لَاَنْتَنَ اَهْلَ الدُّنْيَا۔
(رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "دوزخیوں کے زخموں سے جو زرد پانی بہے گا (یعنی خراب خون اور پیپ) اگر اس کا ایک ڈول بھر کر دنیا میں انڈیل دیا جائے تو یقیناً تمام دنیا والے سڑ جائیں۔" (ترمذیؒ)

⑲ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ قَطْرَةً مِّنَ الزَّقُّوْمِ قَطَرَتْ فِىْ دَارِ الدُّنْيَا لَاَفْسَدَتْ عَلٰى اَهْلِ الْاَرْضِ مَعَايِشَهُمْ فَكَيْفَ بِمَنْ يَّكُوْنُ طَعَامَهٗ، رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے یہ آیت اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا: اگر (دوزخ کے) زقوم یعنی تھوہر کے درخت کا ایک قطرہ بھی اس دنیا کے گھر میں ٹپک پڑے تو یقیناً دنیا والوں کے سامان زندگی کو تہس نہس کر دے پھر (سوچو) اس شخص کا کیا حال ہوگا جس کی خوراک ہی زقوم ہوگی۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: حق تقاته (جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) کا مطلب یہ ہے، واجبات کو بجالانا اور سیئات سے پرہیز کرنا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے ان الفاظ کی تفسیر یوں بیان کی ہے کہ:

هو ان يطاع فلا يعصى ويشكر فلا يكفر ويذكر فلا ينسى۔

"وہ (اللہ سے ڈرنے کا حق) یہ ہے کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے اور کسی حال میں اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور اس کا شکر ادا کیا

جائے، اور کسی بھی حال میں کفران نعمت نہ کیا جائے، اس کو یاد کیا جائے اور کسی بھی حال میں اس کو بھولا نہ جائے۔"

حاکم نے یہ تفسیر و وضاحت آنحضرت ﷺ سے نقل کی ہے، اسی طرح ابن مردویہ اور ابن حاتم نے بھی اور محدثین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، بہر حال اگر یہ الفاظ حق تقاتہ کمال تقویٰ کو بیان کرنے کے لئے ہیں (یعنی یہ کہا جائے کہ "حق تقاتہ" سے مراد کمال تقویٰ ہے) تو پھر کوئی اشکال ہی نہیں ہوگا اور اگر ان الفاظ کو اصل تقویٰ کی تعبیر قرار دیا جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ آیت قرآن ہی کی اس دوسری آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم کے ذریعہ منسوخ ہے کیونکہ اصل تقویٰ یعنی حق تعالیٰ سے اس کے مرتبہ کے لائق حیثیت بھلا کون بشر اختیار کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ آیت تلاوت کرنے کے بعد جو مضمون ارشاد فرمایا وہ اس آیت کے ساتھ کیا مناسبت رکھتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل تقویٰ، عذاب دوزخ سے سلامت و محفوظ رکھنے کا سبب ہے، اور تقویٰ اختیار نہ کرنا گویا عذاب دوزخ میں گرفتار ہونا ہے پس آنحضرت ﷺ نے اس مناسبت سے دوزخ کے بعض عذاب کا ذکر کرنا مناسب سمجھا۔

دوزخیوں کے منہ کی بدہیئتی

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَهُمْ فِیْهَا کَالِحُوْنَ قَالَ تَشْوِیْهِ النَّارُ فَتَقَلَّصُ شَفَتُهُ الْعُلْیَا حَتّٰی تَبْلُغَ وَسَطَ رَاْسِهٖ وَیَسْتَرْخِیْ شَفَتُهُ السُّفْلٰی حَتّٰی تَضْرِبَ سُرَّتَهٗ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابو سعیدؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے آیت قرآنی کے ان الفاظ) وھم کالحون کی وضاحت میں فرمایا کہ "دوزخ کی آگ کافر کے منہ (کے گوشت) کو بھون ڈالے گی جس سے اس کے اوپر کا ہونٹ اوپر کو سمٹ جائے گا یہاں تک کہ سر کے درمیانی حصہ تک پہنچے گا اور نیچے کا ہونٹ لٹک جائے گا یہاں تک کہ ناف تک پہنچ جائے گا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: قرآن کی مذکورہ جس آیت میں ہے وہ پوری یوں ہے۔

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِیْهَا کَالِحُوْنَ۔

"جہنم کی آگ ان دوزخیوں) کے چہروں کو جھلستی ہوگی اور اس (جہنم) میں ان کے چہرے بگڑے ہوں گے۔"

لفظ "کالح" سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کا ہونٹ سکڑ کر اوپر چڑھ گیا ہو اور دانت کھل گئے ہوں۔ بعض مفسرین نے تو کالحون کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "ان کی تیوریاں چڑھی ہوئی ہوں گی" اور بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ ان کے دانت کھلے ہوں گے!" یہ دوسرا ترجمہ آنحضرت ﷺ کی مذکورہ وضاحت کے زیادہ مناسب ہے لیکن ان کے چہرے بگڑے ہوں گے" ایک ایسا ترجمہ ہے جس میں لغوی معنی اور آنحضرت ﷺ کی وضاحت، سب کی رعایت ہو جاتی ہے۔

دوزخی خون کے آنسو روئیں گے

(۲۱) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَاَیُّهَا النَّاسُ ابْکُوْا فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِیْعُوْا فَتَبَاکَوْا فَاِنَّ اَهْلَ النَّارِ یَبْکُوْنَ فِی النَّارِ حَتّٰی تَسِیْلَ دُمُوْعُهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ کَاَنَّهَا جَدَاوِلُ حَتّٰی یَنْقَطِعَ الدُّمُوْعُ فَتَسِیْلَ الدِّمَآءُ فَتَقَرَّحَ الْعُیُوْنُ فَلَوْاَنَّ سُفُنًا اُزْجِیَتْ فِیْهَا لَجَرَتْ رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا! "(لوگو (خدا کے خوف سے) روؤ، اور (رونا چونکہ اختیاری چیز نہیں ہے اس لئے) اگر تمہیں رونا نہ آئے تو بہ تکلف روؤ (یعنی ان احوال کا تصور کرو جو خوف خداوندی سے رلا دے اور رقت طاری کر دے) حقیقت یہ ہے کہ دوزخی جہنم میں روئیں گے اور ان کے آنسو خون بن کر ان کے رخساروں پر اس طرح بہیں گے گویا وہ نالیاں ہیں

اور جب ان کے آنسو ختم ہو جائیں گے تو خون بہنا شروع ہو جائے گا اور آنکھیں لہو لہان ہو جائیں گی ان کی آنکھوں سے بہنے والے خون اور آنسو کی زیادتی اس درجہ کی ہوگی کہ، اگر ان کے آنسوؤں کے بہاؤ میں کشتیاں چھوڑ دی جائیں تو یقیناً وہ چلنے لگیں" اس روایت کو بغوی نے (اپنے اسناد کے ساتھ) شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔"

دوزخیوں کی حالت

(۲۲) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُلْقٰی عَلٰٓی اَهْلِ النَّارِ الْجُوْعُ فَیَعْدِلُ مَا هُمْ فِیْهِ مِنَ الْعَذَابِ فَیَسْتَغِیْثُوْنَ فَیُغَاثُوْنَ لِطَعَامٍ مِنْ ضَرِیْعٍ لَّا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ فَیَسْتَغِیْثُوْنَ بِالطَّعَامِ فَیُغَاثُوْنَ بِطَعَامٍ ذِیْ غُصَّةٍ فَیَذْکُرُوْنَ اَنَّهُمْ کَانُوْا یُجِیْزُوْنَ الْغُصَصَ فِی الدُّنْیَا بِالشَّرَابِ فَیَسْتَغِیْثُوْنَ بِالشَّرَابِ فَیُرْفَعُ اِلَیْهِمُ الْحَمِیْمُ بِکَلَالِیْبِ الْحَدِیْدِ فَاِذَا دَنَتْ مِنْ وُّجُوْهِهِمْ شَوَتْ وُجُوْهَهُمْ فَاِذَا دَخَلَتْ بُطُوْنَهُمْ قَطَّعَتْ مَافِیْ بُطُوْنِهِمْ فَیَقُوْلُوْنَ ادْعُوْا خَزَنَةَ جَهَنَّمَ فَیَقُوْلُوْنَ اَلَمْ تَكُ تَاْتِیْکُمْ رُسُلُکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا بَلٰی قَالُوْا فَادْعُوْا وَمَادُعٰٓؤُا الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ ادْعُوْا مَالِکًا فَیَقُوْلُوْنَ یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ قَالَ فَیُجِیْبُهُمْ اِنَّکُمْ مّٰکِثُوْنَ قَالَ الْاَعْمَشُ نُبِّئْتُ اَنَّ بَیْنَ دُعَآئِهِمْ وَاِجَابَةِ مَالِكٍ اِیَّاهُمْ اَلْفَ عَامٍ قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ ادْعُوْا رَبَّکُمْ فَلَا اَحَدٌ خَیْرٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَیَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَکُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ قَالَ فَیُجِیْبُهُمُ اخْسَئُوْا فِیْهَا وَلَا تُکَلِّمُوْنَ قَالَ فَعِنْدَ ذٰلِكَ یَئِسُوْا مِنْ کُلِّ خَیْرٍ وَعِنْدَ ذٰلِكَ یَاخُذُوْنَ فِی الزَّفِیْرِ وَالْحَسْرَةِ وَالْوَیْلِ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَبْدِالرَّحْمٰنِ وَالنَّاسُ لَا یَرْفَعُوْنَ هٰذَا الْحَدِیْثَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دوزخیوں پر بھوک اس طرح مسلط کر دی جائے گی کہ اس بھوک کی اذیت اس عذاب کے برابر ہوگی جس میں وہ دوزخی پہلے سے گرفتار ہوں گے چنانچہ وہ بھوک کی اذیت سے بے تاب ہو کر فریاد کریں گے اور ان کی فریاد رسی ضریع کے کھانے کے ذریعہ کی جائے گی جو نہ فربہ کرے گا نہ بھوک کو دفع کرے گا پھر وہ۔ (پہلے کھانے کو لا حاصل دیکھ کر) دوسری مرتبہ فریاد کریں گے اور اس مرتبہ ان کی فریاد رسی گلے میں پھنسی جانے والے کھانے کے ذریعہ کی جائے گی، اس وقت ان کو یہ یاد آئے گا کہ جب (دنیا میں) کھاتے وقت ان کے گلے میں کوئی چیز پھنس جاتی تھی تو اس کو وہ کسی پینے والی چیز سے نیچے اتارتے تھے، چنانچہ وہ (اپنے گلے میں پھنسے ہوئے کھانے کو اتارنے کے لئے) کسی پینے والی چیز کی التجا کریں گے، تب ان کو تیز گرم پانی دیا جائے گا جس کو زنبوروں کے ذریعہ پکڑ کر اٹھایا جائے گا (یعنی جن برتنوں میں وہ تیز گرم پانی ہو گا وہ زنبوروں کے ذریعہ پکڑ کر اٹھائے جائیں گے اور اٹھانے والے یا تو فرشتے ہوں گے یا براہ راست دست قدرت ان کو اٹھا کر دوخیوں کے منہ کو لگائے گا) اور جب گرم پانی کے وہ برتن ان کے مونہوں تک پہنچیں گے تو ان کے چہروں (کے گوشت) کو بھون ڈالیں گے اور جب ان برتنوں کے اندر کی چیز (جو ان کو پینے کے لئے دی جائیں گی جیسے پیپ پیلا پانی وغیرہ) ان کے پیٹ میں داخل ہوگی تو پیٹ کے اندر کی چیزوں (یعنی آنتوں وغیرہ) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی پس اس صورت حال سے بیتاب ہو کر" وہ دوزخی (جہنم پر متعین فرشتوں سے) کہیں گے اے دوزخ کے سنتریو! اللہ تعالیٰ سے دعا کرو (کہ کم سے کم ایک ہی دن کے لئے ہمارے اوپر مسلط اس عذاب کو ہلکا کر دے۔) دوزخ کے سنتری جواب دیں گے کہ (اب ہم سے دعا کے لئے کہتے ہو) کیا خدا کے رسول خدائی معجزے اور واضح دلیلیں لے کر تمہارے پاس نہیں آئے تھے (اور تم سے یہ نہ کہتے تھے کہ کفر و سرکشی کی راہ چھوڑ کر خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا راستہ اختیار کر لو تاکہ کل آخرت میں دوزخ کے سخت عذاب سے محفوظ رہ سکو!؟) وہ کہیں گے کہ بے شک (خدا کے رسول) ہمارے پاس آئے تھے اور ان کی تعلیمات ہم تک پہنچی تھی، لیکن وائے افسوس ہم گمراہی میں پڑے رہے اور ایمان و سلامتی کی راہ اختیار نہ کر سکے) دوزخ کے سنتری کہیں گے کہ پھر تو تم خود ہی دعا کرو (اور اپنا معاملہ سمجھو ہم تو تمہاری شفاعت کرنے سے رہے) اور کافروں

کی دعا زبان کاری و بے فائدگی کے علاوہ کچھ نہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "دوزخی (جب جہنم کے سنتریوں سے دعا و شفاعت کرنے میں ناکام ہو جائیں گے اور انہیں سخت مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا تو وہ یقین کر لیں گے کہ ہمیں عذاب خداوندی سے نجات ملنے والی نہیں ہے، پھر کیوں نہ موت ہی مانگی جائے چنانچہ وہ آپس میں کہیں گے کہ مالک یعنی داروغہ جنت سے مدد کی درخواست کرو! اور پھر وہ التجا کریں گے کہ اے مالک! اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمیں موت دے دے (تاکہ ہمیں آرام مل جائے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "دوزخیوں کی التجا سن کر) مالک خود اپنی طرف سے یا پروردگار کی طرف سے) جواب دے گا کہ (اس دوزخ سے نجات یا موت کا خیال چھوڑ دو) تمہیں ہمیشہ ہمیشہ یہیں اور اسی عذاب میں گرفتار رہنا ہے۔" حضرت اعمش (جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ بعض صحابہؓ نے (بطریق مرفوع یا موقوف) مجھ سے بیان کیا کہ مالک سے ان دوزخیوں کی التجا اور مالک کی طرف سے ان کو جواب دینے کے درمیان ایک ہزار برس کا وقفہ ہوگا (یعنی وہ دوزخی مالک سے التجا کرنے کے بعد ایک ہزار سال تک جواب کا انتظار کرتے رہیں گے اور اس دوران بھی اس عذاب میں مبتلا رہیں گے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا! "پھر وہ دوزخی (آپس میں) کہیں گے کہ اب ہمیں براہ راست اپنے پروردگار ہی سے اپنی نجات کی التجا کرنی چاہئے کیونکہ وہی قادر مطلق، رحیم و کریم اور غفار ہے) ہمارے حق میں بھلائی و بہتری کرنے والا اس پروردگار سے بہتر اور کوئی، نہیں، چنانچہ وہ التجا کریں گے کہ ہمارے پروردگار! ہماری بدبختی نے ہمیں گھیر لیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم (توحید کے راستہ سے) بھٹک گئے تھے، اے پروردگار! ہمیں دوزخ (اور یہاں کے عذاب) سے رہائی عطا فرما دے، اگر ہم اس کے بعد بھی کفر و شرک کی طرف جائیں تو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جواب دے گا! "دور ہو کمبختو، کتوں کی طرح ذلیل و خوار رہو اور) اسی دوزخ میں پڑے رہو اور (رہائی و نجات کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرو (تمہاری گلو خلاصی ہرگز نہیں ہو سکتی)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، "آخر کار وہ دوزخی ہر بھلائی سے مایوس ہو جائیں گے اور تب وہ حسرت اور نالہ و فریاد کرنے لگیں گے۔" حضرت عبداللہ بن عبدالرحمنؒ (جو اس حدیث کے راوی ہیں) کہتے ہیں کہ "اس حدیث کو مرفوع قرار نہیں دیا جاتا۔" لیکن ترمذیؒ نے اس حدیث کو (مرفوع) نقل کیا ہے (جیسا کہ روایت کے ابتدائیہ سے معلوم ہوتا ہے۔"

تشریح: "اس بھوک کی اذیت اس عذاب کے برابر ہوگی........الخ کا مطلب یہ ہے کہ ان پر جو بھوک مسلط کی جائے گی اس کی دردناکی، دوزخ کے اور تمام عذاب کی دردناکیوں کے برابر ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بھوک کی آگ دوزخ کی آگ کی مانند ہے۔

اور ان کی فریاد رسی ضریع کے کھانے کے ذریعہ کی جائے گی۔" جب وہ دوزخی بھوک سے بیتاب ہو کر کچھ کھانے کو مانگیں گے تو ان کو کھانے کے لئے ضریع دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ "ضریع" ایک خاردار جھاڑ کو کہتے ہیں جو حجاز میں ہوتا ہے، یہ ایک ایسی زہریلی اور کڑوی گھاس ہوتی ہے جس کے پاس کوئی جانور بھی نہیں پھٹکتا، اور اگر کوئی جانور اس کو کھالیتا ہے تو مر جاتا ہے۔ بہر حال یہاں حدیث میں "ضریع سے مراد آگ کے کانٹے ہیں جو ایلوے سے زیادہ کڑوے مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ بدبودار ہوں گے۔

"فربہ کرے گا اور نہ بھوک دفع کرے گا۔" یہ دراصل قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝۔

"(اور) ان (دوزخیوں) کو ایک خاردار جھاڑ کے سوا اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا جو نہ تو کھانے والوں کو فربہ کرے گا اور نہ ان کی بھوک کو دفع کرے گا۔"

"گلے میں پھنس جانے کے ذریعہ فریاد رسی" کا مطلب یہ ہے کہ دوسری مرتبہ ان کو کھانے کے لئے ہڈی یا آگ کے کانٹے وغیرہ کی طرح کی ایسی چیزیں دی جائیں گی۔" جو گلے میں جا کر پھنس جائیں گی کہ نہ حلق سے نیچے اتر سکیں گی، اور نہ باہر آ سکیں گی پس حدیث کے اس جملہ میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّ لَدَيْنَا اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا وطَعَامًا ذَاغُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا

"حقیقت یہ ہے کہ (کفرو شرک کرنے والوں کے لئے) ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں، اور (دوزخ کی) بھڑکتی آگ ہے) اور گلے میں پھنس جانے والا ہے اور دردناک عذاب ہے۔"

حدیث کے یہ الفاظ وما دعاء الکافرین الافی ضلال۔ (اور کافروں کی دعا زیاں کاری و بے قاعدگی کے علاوہ کچھ نہیں) بھی دراصل قرآن ہی کے الفاظ ہیں اور ان کی دعا کو زیاں کاری سے تعبیر اس لئے کیا گیا ہے کہ اس وقت ان کے حق میں کوئی بھی دعا و شفقت کارگر نہیں ہوگی، خواہ وہ خود دعا کریں اور گڑگڑائیں یا کسی اور سے دعا و شفاعت کرائیں لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ کافرو مشرک کی دعا اس دنیا میں بھی قبول نہیں ہوتی جیسا کہ قرآن وحدیث کے ان الفاظ سے بعض حضرات نے نتیجہ اخذ کیا ہے، حقیقت حال تو یہ ہے کہ اس دنیا میں شیطان تک کی درخواست جو اس نے اپنی عمر کی درازی کے لئے کی تھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی ہے پھر کافر کی دعا قبول کیوں نہیں ہو سکتی، بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرے۔

غلبت علینا شقو تنا (ہماری بدبختی نے ہمیں گھیر لیا) میں شقوۃ شین کے زیر اور قاف کے جزم کے ساتھ ہے اور یہ لفظ شقاوۃ (شین کے زبر کے ساتھ) بھی پڑھا گیا ہے، دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی "بدبختی" جو "سعادت" (نیک بختی) کی ضد ہے۔ مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری تقدیر کہ جس میں ہمارا خاتمہ بد لکھ دیا گیا، پوری ہو کر رہی اور ہم خود اپنی بدبختی کا شکار ہو گئے۔

اگر ہم اس کے بعد بھی کفرو شرک کی طرف جائیں.......الخ۔" کافر دوزخیوں کا یہ کہنا بھی مکرو کذب پر مبنی ہوگا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ

"اور اگر یہ لوگ پھر (دنیا میں) واپس بھی بھیج دیئے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔"

یاخذون فی الزفیر والحسرۃ والویل (حسرت و نالہ و فریاد کرنے لگیں گے) میں لفظ زفیر کے اصل معنی ہیں۔ "گدھے کا سانس اندر لے جانا جیسا کہ شھیق کے معنی "گدھے کا سانس باہر نکالنا" یا یہ کہ جب گدھا رینگنا شروع کرتا ہے تو پہلے اس کی آواز باریک اور چھوٹی نکلتی ہے جس کو "زفیر" کہا جاتا ہے اور آخر میں اس کی آواز تیز اور بڑی ہو جاتی ہے اس کو شھیق سے تعبیر کیا جاتا ہے، حدیث کے ان الفاظ میں قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ۔

"دوزخ میں گدھے کی چھوٹی اور بڑی آواز کی طرح ان دوزخیوں کی چیخ و پکار پڑی رہے گی۔"

بہر حال حدیث کے اس آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی جب بارگاہ خداوندی کا جواب سن لیں گے تو وہ بالکل مایوس و نا امید ہو جائیں گے کہ دوزخ کے سنتریوں کو پکارنا کچھ سودمند نہ ہو داروغہ دوزخ سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے موت ہی دلوادے اس کا بھی فائدہ نہ ہوا آخر میں بارگاہ خداوندی میں روئے گڑگڑائے وہاں بھی کوئی بات قبول نہیں ہوئی، اب کہاں جائیں، کس کے سامنے فریاد کریں۔ ایسے میں وہ بے معنی آوازوں اور بے ہنگم صداؤں میں نالہ و فریاد اور چیخ و پکار کرنے لگیں گے جیسا کہ مایوسی کے عالم میں ہوتا ہے۔

روایت کے آخر میں ان الفاظ "اس حدیث کو مرفوع قرار نہیں دیا جاتا۔" کا مطلب یہ ہے کہ بعض محدثین کے نزدیک یہ حدیث آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے بلکہ حضرت ابودرداءؓ کا اپنا بیان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث بہرصورت مرفوع حدیث

یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی ہی کے حکم میں ہے کیونکہ اس کے احوال، دوزخیوں کی گفتگو اور دوزخ کے عذاب وغیرہ سے متعلق جو مضمون ہے وہ کوئی بھی صحابیؓ آنحضرت ﷺ سے سنے بغیر اپنی طرف سے بیان کر ہی نہیں سکتا۔

عذاب دوزخ سے آگاہی

(۲۳) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ اَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ فَمَا زَالَ يَقُوْلُهَا حَتّٰى لَوْ كَانَ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا سَمِعَهُ اَهْلُ السُّوْقِ وَحَتّٰى سَقَطَتْ خَمِيْصَةٌ كَانَتْ عَلَيْهِ عِنْدَ رِجْلَيْهِ۔

(رواہ الدارمی)

"اور حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "(لوگو!) میں نے تم کو دوزخ کی آگ سے ڈرایا، میں نے تم کو دوزخ کی آگ سے ڈرایا۔" آپ ﷺ یہ الفاظ بار بار فرما رہے تھے (اور ایک عجیب کیفیت کے عالم میں جھوم جھوم کر اتنی بلند آواز سے فرما رہے تھے کہ) اگر آپ اس جگہ تشریف فرما ہوتے جہاں اس وقت میں بیٹھا ہوں تو یقیناً آپ ﷺ کی آواز بازار والے سنتے یہاں تک کہ اس وقت (اس جھومنے کی وجہ سے آپ ﷺ کی کالی کملی، جو کاندھے پر پڑی تھی پیروں میں گر پڑی تھی۔"

تشریح: "میں نے تم کو دوزخ کی آگ سے ڈرایا۔" کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تم کو عذاب دوزخ کے وقوع پذیر ہونے کی خبر دی۔ اس عذاب کی شدت و سختی سے آگاہ کر دیا کھول کھول کر یہ بیان کر دیا کہ عقیدہ و عمل کا کونسا راستہ دوزخ کی طرف لیجاتا ہے اور کونسا راستہ اس سے بچاتا ہے اور میں نے کتنی ہی وہ مختلف صورتیں بتادی ہیں جن کو تم اپنی استطاعت وطاقت کے بقدر اختیار کر کے دوزخ کی آگ سے محفوظ رہ سکتے ہو، میں نے یہاں تک کہا ہے کہ اتقوا النار ولو بشق تمرۃ۔ یعنی (صدقہ و خیرات دوزخ سے بچانے والے ہے) اگر تم کھجور کا ایک ٹکڑا ہی صدقہ و خیرات کر سکتے ہو تو وہی صدقہ و خیرات کر کے دوزخ کی آگ سے بچو اب اگر اس کے بعد بھی تم میں سے کوئی شخص دوزخ کے عذاب سے نہیں ڈرتا اور ایسے راستے اختیار کرتا ہے جو اس کو سیدھا دوزخ میں لے جانے والے ہیں، تو وہ شخص جانے۔

دوزخیوں کو باندھنے کی زنجیر

(۲۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ رَصَاصَةً مِثْلُ هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلٰى مِثْلِ الْجُمْجُمَةِ اُرْسِلَتْ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ وَهِيَ مَسِيْرَةُ خَمْسِ مِائَةِ سَنَةٍ لَبَلَغَتِ الْاَرْضَ قَبْلَ اللَّيْلِ وَلَوْ اَنَّهَا اُرْسِلَتْ مِنْ رَاْسِ السِّلْسِلَةِ لَسَارَتْ اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ قَبْلَ اَنْ تَبْلُغَ اَصْلَهَا اَوْ قَعْرَهَا (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کہتے ہی کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "اگر سیسہ (رانگے) کا ایک گولہ جو اس جیسا ہو۔ اور آپ ﷺ نے (سر کی طرف) اشارہ کیا کہ کھوپڑی جیسا ہو۔ (یعنی سیسے کا وہ گولہ جو کھوپڑی کی طرح گول اور بھاری ہونے کی وجہ سے نہایت سرعت کے ساتھ لڑھکنے والا ہو) آسمان سے زمین کی طرف پھینکا جائے، جس کا درمیانی فاصلہ پانچ سو برس کی مسافت کے برابر ہے تو یقیناً وہ (گولا) ایک رات گزرنے سے پہلے (یعنی بہت مختصر مدت میں) زمین پر پہنچ جائے لیکن اگر وہ گولہ زنجیر کے سرے سے چھوڑا جائے تو چالیس سال تک مسلسل دن ورات لڑھکنے کے باوجود اس زنجیر کی جڑ یعنی اس کے آخری سرے تک یا یہ فرمایا کہ اس کی تہ تک نہ پہنچے۔" (ترمذی)

تشریح: "زنجیر" سے مراد وہ زنجیر ہے جس میں کافر دوزخی اس طرح جکڑا جائے گا کہ وہ اس کی مقعد میں ڈال کو نتھنوں میں سے نکالی جائے گی، اس زنجیر کا ذکر قرآن کریم کے ان الفاظ میں ہے۔

ثم فی سلسلۃ ذرعھا سبعون ذراعا فاسلکوہ۔

"پھر (فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس (دوزخی) کو ایک زنجیر میں جکڑو جس کی لمبائی ستر گز ہے۔"

اس موقع پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن کی رو سے اس زنجیر کی لمبائی ستر گز ہوگی تو وہ اس قدر مسافت کے برابر کیسے ہوسکتی ہے جس کا ذکر حدیث میں کیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ستر گز" سے مخصوص عدد اور زنجیر کی متعین لمبائی مراد نہیں ہے بلکہ اس عدد سے (کثرت و مبالغہ" مراد ہے، دوسرے یہ کہ اس جہاں کے گز کو اس دنیا کے گز پر قیاس نہ کرنا چاہئے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں کا گز کتنا لمبا ہوگا اور اس کی کیا صورت ہوگی۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے۔ آخرت کے "قیراط" کو احد پہاڑ کے برابر فرمایا گیا ہے۔

ایک بزرگ نوف بکالیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: ستر گز اس طرح کے ہوں گے کہ) ہر گز دو ہتوں کے برابر ہوگا اور ہر دو ہتا اس فاصلہ کے برابر لمبا ہوگا جو اس جگہ (کوفہ) اور مکہ کے درمیان ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس گز کی مقدار کیا ہوگی۔

بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس زنجیر میں کافر دوزخی کو جکڑا جائے گا اگر اس کی لمبائی کا اندازہ لگانا چاہو تو اس سے لگاؤ کہ اگر ایک سیسے کا گولہ آسمان سے چھوڑا جائے اور باوجودیکہ زمین و آسمان کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت کے برابر فاصلہ ہے وہ گولہ بہت تھوڑی سی دیر میں زمین پر پہنچ جائے گا کیونکہ گول اور بھاری چیز اوپر سے نیچے کو بہت جلدی آتی ہے لیکن اگر وہی گولہ اس زنجیر کے ایک سرے سے لڑھکایا جائے اور آسمان سے زمین پر آنے والی اسی تیز رفتاری کے ساتھ چالیس سال تک لڑھکتا رہے تب بھی اس زنجیر کے دوسرے سرے تک پہنچ نہیں پائے گا۔

دوزخ کا ہبہب نالہ

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ فِیْ جَهَنَّمَ لَوَادِیًا یُقَالُ لَهٗ هَبْهَبُ یَسْکُنُهٗ کُلُّ جَبَّارٍ

(رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابوبردہؒ (تابعی) اپنے والد (حضرت ابوموسی اشعریؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "دوزخ میں ایک نالا ہے جس کا نام ہبہب ہے اس نالہ میں ہر اس شخص کو رکھا جائے گا جو متکبر و سرکش، حق سے دور مخلوق پر سختی کرنے والا ہے۔" (دارمی)

تشریح: "هبهب" کے اصل معنی تیزی و جلدی" کے ہیں اور مذکورہ نالہ کو "هبهب" کا نام اسی مناسبت سے دیا گیا ہے کہ ایک تو اس نالہ میں بھڑکنے والی آگ سے بہت تیز شعلے اٹھتے ہیں دوسرے یہ کہ اس نالہ میں ڈالے جانے والے گنہگاروں کو عذاب بڑی سرعت کے ساتھ ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

دوزخیوں کی طویل و عریض جسامت

(۲۶) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَعْظُمُ اَهْلُ النَّارِ فِی النَّارِ حَتّٰی اَنَّ بَیْنَ شَحْمَةِ اُذُنِ اَحَدِهِمْ اِلٰی عَاتِقِهٖ مَسِیْرَةُ سَبْعِ مِائَةِ عَامٍ وَّاِنَّ غِلَظَ جِلْدِهٖ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا وَّاِنَّ ضِرْسَهٗ مِثْلُ اُحُدٍ۔

"حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ دوزخ میں دوزخیوں کے بدن بہت بڑے بڑے ہوجائیں گے (جس سے ان کو عذاب بھی زیادہ معلوم ہوگا یہاں تک کہ ایک دوزخی کے کان کی لو سے اس کے کاندھے تک کا فاصلہ سات سو سال کی مسافت کے برابر ہوگا اس کی کھال کی موٹائی ستر گز کی ہوگی اور اس کے دانت احد پہاڑ کے برابر ہوں گے۔"

دوزخ کے سانپ بچھو

(۲۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي النَّارِ حَيَّاتٍ كَاَمْثَالِ الْبُخْتِ تَلْسَعُ اِحْدٰهُنَّ اللَّسْعَةَ فَيَجِدُ حَمْوَتَهَا اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا وَاِنَّ فِي النَّارِ عَقَارِبَ كَاَمْثَالِ الْبِغَالِ الْمُوْكَفَةِ تَلْسَعُ اِحْدٰهُنَّ اللَّسْعَةَ فَيَجِدُ حَمْوَتَهَا اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا (رواہما احمد)

"اور حضرت عبداللہ بن حارث بن حزءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "دوزخ میں بختی اونٹ کے برابر (بہت بڑے بڑے) سانپ ہیں ان میں سے جو سانپ ایک دفعہ بھی جس کو ڈس لے گا وہ اس کے زہر کی ٹیس و لہر اور درد کی شدت میں چالیس سال تک مبتلا رہے گا اس طرح دوزخ میں جو بچھو ہیں وہ پالان بندھے خچروں کے مانند ہیں اور ان میں سے جو بچھو ایک دفعہ جس کو ڈنگ مارے گا وہ اس کی لہر اور درد کی شدت میں چالیس سال تک مبتلا رہے گا۔" (ان دونوں روایتوں کو احمدؒ نے نقل کیا ہے۔"

چاند و سورج سپرد آگ کر دیئے جائیں گے

(۲۸) وَعَنِ الْحَسَنِ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْهُرَيْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ثَوْرَانِ مُكَوَّرَانِ فِي النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَقَالَ الْحَسَنُ وَمَا ذَنْبُهُمَا فَقَالَ اُحَدِّثُكَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَكَتَ الْحَسَنُ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي كِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"اور حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے ہم سے رسول کریم ﷺ کی یہ حدیث بیان کی کہ (آپ ﷺ نے فرمایا)" قیامت کے دن سورج اور چاند کو پنیر کے دو ٹکڑوں کی طرح لپیٹ کر (دوزخ کی آگ) میں ڈال دیا جائے گا حضرت حسنؒ کہتے ہیں کہ (میں نے یہ حدیث سن کر حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا کہ) آخر سورج و چاند کیا گناہ کرتے ہیں (کہ ان کو آگ کے سپرد کر دیا جائے گا حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ رسول کریم ﷺ کی حدیث ہے۔ حضرت حسنؒ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے مذکورہ جواب کے ذریعہ گویا حضرت حسنؒ کو متنبہ کیا کہ تم قیاس کو صریح نص (یعنی حدیث کے مقابل کر رہے ہو، اور یہ سمجھ رہے ہو کہ دخول دوزخ کا اصل موجب عمل ہے حالانکہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ یہ بات طیبیؒ نے لکھی ہے لیکن زیادہ درست یہ وضاحت ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے کہنے کا مقصد گویا، اس خواہش کا اظہار تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ وہ حکمت بھی بیان کر دیں جو سورج و چاند کو دوزخ کی آگ کے سپرد کیے جانے کے پیچھے کارفرما ہوگی، اور حضرت ابوہریرہؓ کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے جو کچھ سنا اس کو تمہارے سامنے بیان کر دیا اس سے زیادہ مجھے بھی کچھ معلوم نہیں۔

ویسے بعض علماء نے لکھا ہے کہ سورج و چاند کو دوزخ میں اس لئے ڈالا جائے گا کہ دوزخ کی آگ میں ان دونوں کی حرارت و تمازت بھی شامل ہو جائے اور دوزخیوں پر عذاب کی شدت اور بڑھ جائے دیلمیؒ نے مسند فردوس میں حضرت عمرؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ سورج اور چاند کا رخ عرش کی طرف ہے اور ان کی پشت دنیا کی طرف ہے۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ان دونوں کا رخ دنیا کی طرف ہوتا تو دنیا والے ان کی حرارت و تمازت ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے! اور بعض نے یہ لکھا ہے کہ مشرک چونکہ چاند و سورج کی پوجا کرتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان دونوں کو دوزخ میں جھونک کر مشرکین کو شرمندہ کرے گا کہ تم لوگ جن چیزوں کو خدا مانتے تھے اب دیکھو ان کا کیا حال ہے۔

شقی کون ہے؟

(۲۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ النَّارَ اِلَّا شَقِیٌّ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنِ الشَّقِیُّ قَالَ مَنْ لَّمْ یَعْمَلْ لِلّٰهِ بِطَاعَةٍ وَّلَمْ یَتْرُكْ لَهٗ بِمَعْصِیَةٍ (رواه ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "دوزخ میں وہی شخص ڈالا جائے گا جو شقی یعنی بد بخت ہے" پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! کون شقی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "شقی وہ ہے جو نہ تو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر (فرض واجب) عبادت وطاعات اختیار کرے اور نہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے (یعنی اس کے خوف سے) گناہ و معصیت ترک کرے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: "شقی" کا لفظ عام مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے یعنی اس سے کافر بھی مراد ہے اور مسلمان فاجر بھی۔

بَابُ خَلْقِ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ
جنت اور دوزخ کی تخلیق کا بیان

اس باب میں وہ احادیث نقل ہوں گی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کی تخلیق ہو چکی ہے اور وہ موجود ہیں جیسا کہ اہل سُنّت والجماعت کا مسلک ہے، اس کے برخلاف مسلمانوں میں ہی کے بعض گمراہ فرقے کہتے ہیں کہ جنت و دوزخ کی ابھی تخلیق نہیں ہوئی ہے اور یہ دونوں قیامت کے دن ہی عالم وجود میں آئیں گی، نیز اس باب میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جن میں ان دونوں سے متعلق بعض خصوصیات کا ذکر ہے اور یہ بیان ہے کہ کس کے لئے جنت پیدا کی گئی ہے اور کس کے لئے دوزخ۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جنّت اور دوزخ کی شکایت

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَحَاجَتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ فَقَالَتِ النَّارُ اُوْثِرْتُ بِالْمُتَكَبِّرِیْنَ وَالْمُتَجَبِّرِیْنَ وَقَالَتِ الْجَنَّةُ فَمَالِیْ لَا یَدْخُلُنِیْ اِلَّا ضُعَفَآءُ النَّاسِ وَسَقَطُهُمْ وَغِرَّتُهُمْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی لِلْجَنَّةِ اِنَّمَا اَنْتِ رَحْمَتِیْ اَرْحَمُ بِكِ مَنْ اَشَاءُ مِنْ عِبَادِیْ وَقَالَ لِلنَّارِ اِنَّمَا اَنْتِ عَذَابِیْ اُعَذِّبُ بِكِ مَنْ اَشَاءُ مِنْ عِبَادِیْ وَلِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنْكُمَا مِلْؤُهَا فَاَمَّا النَّارُ فَلَا تَمْتَلِئُ حَتّٰی یَضَعَ اللّٰهُ رِجْلَهٗ تَقُوْلُ قَطْ قَطْ فَهُنَالِكَ تَمْتَلِئُ وَیُزْوٰی بَعْضُهَا اِلٰی بَعْضٍ فَلَا یَظْلِمُ اللّٰهُ مِنْ خَلْقِهٖ اَحَدًا وَاَمَّا الْجَنَّةُ فَاِنَّ اللّٰهَ یُنْشِئُ لَهَا خَلْقًا (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنت و دوزخ نے آپس میں بحث و تکرار کی چنانچہ دوزخ نے تو یہ کہا کہ مجھے سرکش و متکبر اور ظالموں کے لئے چھانٹا گیا ہے اور جنت نے یہ کہا کہ میں اپنے بارہ میں کیا کہوں میرے اندر بھی تو وہی لوگ داخل ہوں گے جو ضعیف و کمزور ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں گرے ہوئے ہیں اور جو بھلے بھالے اور فریب میں آجانے والے ہیں۔ (یہ سن کر) اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا: "تو میری رحمت کے اظہار کا ذریعہ اور میرے کرم کی آماجگاہ کے علاوہ کچھ نہیں میں اپنے بندوں سے جس کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہوں اس کے لئے تجھے ہی ذریعہ بناتا ہوں۔" اور دوزخ سے فرمایا: "تو میرے عذاب کا محل و مظہر ہونے کے علاوہ کچھ نہیں میں اپنے بندوں میں سے جس کو عذاب دینا چاہتا ہوں اس کے لئے تجھے ہی ذریعہ بناتا ہوں اور میں تم دونوں ہی کو لوگوں سے بھردوں گا البتہ دوزخ کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوگا کہ وہ اس وقت تک نہیں بھرے گی جب تک کہ اس پر اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں نہ رکھ دے گا، چنانچہ جب اللہ

تعالیٰ اپنا پاؤں رکھدے گا تو) دوزخ پکار اٹھے گی کہ بس، بس، بس، اس وقت دوزخ (اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بھر جائے گی اور اس کے حصوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا جائے گا (پس وہ سمٹ جائے گی) مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرے گا رہا جنت کا معاملہ تو (اس کے بھرنے کے لئے) اللہ تعالیٰ نئے لوگ پیدا کر دے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جنت و دوزخ نے آپس میں بحث و تکرار کی۔" کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں نے گویا اپنے اپنے بارے میں ایک طرح کا شکوہ شکایت کیا، دوزخ کا کہنا اگر یہ تھا کہ سرکش و ظالم لوگوں کے لئے مجھے ہی کیوں مخصوص کیا گیا تو جنت نے یہ کہا کہ میرا معاملہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے میرے اندر بھی تو انہی لوگوں کو داخل کیا جائے گا دنیا میں جن کی کوئی شان و شوکت نہیں ہے اور کمزور جسم لاغر بدن خستہ حال و مفلس اور لوگوں کی نظروں میں بے وقعت ہیں۔ ان دونوں کا شکوہ سن کر اللہ تعالیٰ نے ان پر واضح کیا کہ تم میں سے کسی کا بھی اس کے علاوہ کوئی معاملہ نہیں کہ تم دونوں کو محض میری مشیت اور مصلحت کے نتیجہ میں وجود میں لایا گیا ہے کہ میں نے ایک کو اپنی رحمت اور لطف و کرم کا اور دوسری کو اپنے قہر و غضب کا محل و مظہر بنایا پس مؤمن اور کافر کی طرح تم دونوں بھی، یعنی جنت و دوزخ دراصل خدائی جمال و جلال کے مظاہر کا نقطہ کمال ہو اور تم دونوں میں سے کسی کو بھی ایسی کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے جس سے دوسرے کے مقابلہ پر اس کی فضیلت و برتری ظاہر ہو اگرچہ اتنی بات ضرور ہے کہ دوزخ کے معاملات کا تعلق "عدل و انصاف" سے جڑا ہوا ہے، اور جنت کے معاملات "فضل و کرم" سے تعلق رکھتے ہیں۔

"لوگوں کی نظروں میں گرے ہوئے ہیں" یعنی وہ لوگ جو اگرچہ اپنے عقیدہ و عمل اور اخلاق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی قدر و منزلت رکھتے ہیں اور اللہ کے نیک بندوں یعنی علماء و صلحاء اور ارباب باطن کی نظروں میں بھی انہیں قدر و منزلت ہی حاصل ہوتی ہے لیکن ظاہری طور پر ان کے کمزور و ضعیف خستہ حال اور غریب و نادار ہونے کی وجہ سے اکثر دنیا والے ان کو حقیر و کمتر اور ناقابل اعتناء سمجھتے ہیں۔ نیز "میرے اندر وہی لوگ داخل ہوں گے جو کمزور و ضعیف ہیں۔" میں جو حصر ہے اس سے مراد "اکثر و اغلب" ہے کہ جنت میں زیادہ تر لوگ اسی زمرہ کے ہوں گے، ورنہ جنت میں جانے والے تو انبیاء و رسول بھی ہوں گے اور سلاطین و امراء بھی! یا یہ کہا جائے کہ ضعفاء (ضعیف و کمزور) سے مراد وہ بندے ہیں جو اپنے پروردگار کے سامنے بھی ذلت و فروتنی ظاہر کرتے ہیں، مخلوق کے ساتھ بھی تو تواضع و انکساری کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور خود اپنی نظر میں بھی اپنے کو گرائے رکھتے ہیں۔

"جو بھولے بھالے اور فریب میں آجانے والے ہیں۔" یعنی وہ لوگ فکر آخرت میں سرگرداں رہنے کی وجہ سے دنیاوی امور سے غافل اور دنیاوی معاملات میں ناتجربہ کار رہتے ہیں اس لئے دنیا والے ان کو بڑی آسانی کے ساتھ بیوقوف بنا دیتے ہیں اپنے مکر و فریب کے جال میں پھانس لیتے ہیں اسی اعتبار سے ایک حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے کہ "اہل جنت کی اکثریت دنیاوی امور سے نابلند اور نادان) لوگوں پر مشتمل ہوگی ان کے مقابلہ پر کافر و منافق دنیاوی معاملات میں بڑے چالاک اور مکار ہوتے ہیں کیونکہ وہ دنیا کے معاملات کو سب کچھ سمجھ کر اپنے فکر و عمل کی پوری توانائی ادھر ہی لگائے رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یعلمون ظاهرا من الحیوة الدنیا وهم عن الاخرة هم غافلون وہ دوزخ اس وقت تک نہیں بھرے گی...... الخ یعنی جتنے لوگوں کا دوزخ میں جانا مقدر ہوگا ان سب کے دوزخ میں پہنچ جانے کے بعد بھی جب دوزخ کا پیٹ نہیں بھرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے مزید دوزخیوں کا مطالبہ کرے گی، قرآن کریم میں ہے یوم نقول لجهنم هل امتلئت و تقول هل من مزید لیکن اللہ تعالیٰ اس کا پیٹ بھرنے کے لئے یہ نہیں کرے گا کہ بے گناہ لوگوں کو جہنم میں بھر دے یا جو گناہ گار بخشے جانے والے ہوں گے انہی کو دوزخ کے سپرد کر دے یا نئے لوگ اس لئے پیدا کرے کہ ان کو دوزخ کا پیٹ بھرنے کے کام میں لایا جائے، بلکہ یہ کرے گا کہ اپنا پیر دوزخ پر رکھ دے گا جس سے دوزخ کے تمام اطراف ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گی اور دوزخ کا پیٹ سمٹ کر وہاں موجود لوگوں سے بھر جائے گا، یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر ظلم نہیں کرے گا تو اس سے مراد یہ ہے کہ دوزخ کا پیٹ بھرنے کے لئے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرے گا جس کو صورتاً ظلم سے تعبیر کیا جا سکتا ہو، ورنہ اصل بات

یہ ہے اگر پروردگار بے گناہ لوگوں ہی کو دوزخ میں ڈال کر اس کا پیٹ بھرے تو حقیقت میں اس کو ظلم نہیں کہیں گے کیونکہ اپنی ملکیت میں کسی طرح کے بھی تصرف کو ظلم قرار نہیں دیا جاتا مگر اللہ تعالیٰ صورۃً ظلم بھی نہیں کرے گا اس ضمن میں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف "پاؤں" کی نسبت متشابہات میں سے ہے جیسا کہ اس کے لئے ہاتھ، آنکھ اور چہرے کے ذکر کو متشابہات میں سے شمار کیا جاتا ہے اور متشابہات کے سلسلے میں جو حکم قرآن و حدیث میں ہے وہ یہ ہے کہ بس یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس سے جو کچھ مراد ہے وہی درست اور حق ہے اس کی حقیقت و کیفیت کی جستجو میں نہ پڑا جائے یہی سب سے بہتر راستہ ہے اور اسی کو سلف نے اختیار کیا ہے، تاہم متاخرین ارباب طویل میں سے بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس کے "پیر" سے مراد اس کی مخلوق میں سے کسی کا پیر ہے، اس کے علاوہ بعض لوگوں نے کچھ اور ایسی تاویلیں بھی کی ہیں جو ذات اقدس تعالیٰ کی شان کے مطابق ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ان کو یہاں ذکر نہیں کیا جارہا ہے۔

"جنت کو بھرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نئے لوگ پیدا کرے گا۔" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جمع کر کے جنت میں داخل کر دے گا جنہوں نے کبھی کوئی عمل نہیں کیا ہوگا اور جنت کے مستحق نہیں ہوں گے پس یہ رب کریم کی شان رحمت کا اظہار ہوگا کہ وہ دوزخ کو بھرنے کے لئے بے گناہ لوگوں کو تو اس میں نہیں ڈالے گا لیکن بہشت کو بھرنے کے لئے بے عمل لوگوں کو اس میں داخل کر دے گا۔

دوزخ و جنت کو بھرا جائے گا

(۲) وَعَنْ اَنَسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزَالُ جَهَنَّمُ يُلْقٰى فِيْهَا وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ حَتّٰى يَضَعَ رَبُّ الْعِزَّةِ فِيْهَا قَدَمَهٗ فَيَنْزَوِيْ بَعْضُهَا اِلٰى بَعْضٍ فَتَقُوْلُ قَطْ قَطْ بِعِزَّتِكَ وَكَرَمِكَ وَلَا يَزَالُ فِي الْجَنَّةِ فَضْلٌ حَتّٰى يُنْشِئَ اللّٰهُ لَهَا خَلْقًا فَيُسْكِنُهُمْ فَضْلَ الْجَنَّةِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَنَسٍ حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ فِيْ كِتَابِ الرِّقَاقِ۔

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: دوزخ میں برابر (لوگوں) کو ڈالا جاتا رہے گا اور وہ کہتی رہے گی کہ کچھ اور بھی ہے؟ (یعنی ابھی تک میرا پیٹ نہیں بھرا ہے مجھے اور لوگ چاہئیں) آخر کار خداوند بزرگ و برتر اس پر اپنا پاؤں رکھ دے گا اور دوزخ کے حصے ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے (جس سے دوزخ سمٹ جائے گی" تب وہ کہے گی کہ بس بس، تیری عزت اور تیرے کرم کی قسم میں بھر گئی: اس طرح جنت کے اندر وسعت و زیادتی ہوتی رہے گی (یعنی جنتیوں کے جنت میں پہنچ جانے کے باوجود اس کے محلات و مکانات خالی بچ جائیں گے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جنت (کے ان خالی محلات مکانات کو پر کرنے) کے لئے نئے لوگ پیدا کر دے گا جنہیں ان میں بسا دیا جائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت انسؓ کی روایت کتاب الرقاق میں نقل کی جا چکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

جنت کو مکروہات نفس سے اور دوزخ کو خواہشات نفس سے گھیر دیا گیا ہے

(۳) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ قَالَ لِجِبْرَئِيْلَ اذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَيْهَا وَاِلٰى مَا اَعَدَّ اللّٰهُ لِاَهْلِهَا فِيْهَا ثُمَّ جَآءَ فَقَالَ اَيْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا اَحَدٌ اِلَّا دَخَلَهَا ثُمَّ حَفَّهَا بِالْمَكَارِهِ ثُمَّ قَالَ يَا جِبْرَائِيْلُ اذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا قَالَ فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَيْهَا ثُمَّ جَآءَ فَقَالَ اَيْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَقَدْ خَشِيْتُ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَا اَحَدٌ قَالَ فَلَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ النَّارَ قَالَ يَا جِبْرَئِيْلُ اذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا قَالَ فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَيْهَا ثُمَّ جَآءَ فَقَالَ اَيْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا اَحَدٌ فَيَدْخُلُهَا فَحَفَّهَا بِالشَّهَوَاتِ ثُمَّ قَالَ يَا جِبْرَئِيْلُ اذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا قَالَ فَذَهَبَ فَنَظَرَ

اِلَيْهَا فَقَالَ اَیْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَقَدْ خَشِيْتُ اَنْ لَّا يَبْقٰى اَحَدٌ اِلَّا دَخَلَهَا (رواه الترمذی والبوداؤد والنسائی)

"حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جب جنّت کو بنایا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ جاؤ ذرا جنّت کی طرف نگاہ اٹھا کر تو دیکھو، (میں نے کتنی اچھی اور کس قدر نازک اور دیدہ زیب چیز بنائی ہے) چنانچہ وہ گئے اور جنّت کو اور اس کی ان تمام چیزوں کو جو اللہ تعالیٰ نے اہل جنّت کے لئے بنائی ہیں، دیکھا، پھر واپس آ کر عرض کیا کہ پروردگار تیری عزّت کی قسم (تو نے اتنی اعلیٰ اور نفیس جنّت بنائی ہے اور اس کو ایسی ایسی نعمتوں اور خوبیوں سے معمور کیا ہے کہ) جو کوئی بھی اس کے بارے میں سنے گا وہ اس میں داخلہ کی یقیناً خواہش کرے گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے جنّت کے چاروں طرف ان چیزوں کا احاطہ قائم کر دیا، جو نفس کو ناگوار ہیں اور فرمایا کہ جبرئیل! جا کر جنّت کو دوبارہ دیکھ آؤ، چنانچہ وہ گئے اور جنّت کو (اس اضافہ کے ساتھ جو چاروں طرف احاطہ کی صورت میں ہوا تھا) دیکھ کر واپس آئے اور عرض کیا کہ پروردگار! تیری عزّت کی قسم مجھے خدشہ ہے کہ اب شاید ہی کوئی جنّت میں داخل ہونے کی خواہش کرے (کیونکہ اس کے گرد مکروہات نفس کا جو احاطہ قائم کر دیا گیا ہے اس کو عبور کرنے کے لئے نفسانی خواہشات کو مارنا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ انسان خواہشات نفس کو مار کر جنّت تک پہنچنا دشوار سمجھے گا)" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ بنائی تو حکم دیا کہ جبرئیل! جاؤ دوزخ کو دیکھ آؤ (کہ میں نے کتنی ہولناک اور بری چیز بنائی ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا پس جبرئیل گئے اور دوزخ کو دیکھ کر واپس آئے تو عرض کیا کہ پروردگار! تیری عزّت وجلال کی قسم جو کوئی بھی دوزخ کے بارے میں سنے گا وہ ڈر کے مارے اس سے دور رہے گا اور) اس میں جانے کی خواہش نہ کرے گا، تب اللہ تعالیٰ نے دوزخ کے چاروں طرف خواہشات اور لذات دنیا کا احاطہ قائم کر دیا اور جبرئیل سے فرمایا کہ جبرئیل! جاؤ دوزخ کو دوبارہ دیکھ آؤ۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا؟" چنانچہ حضرت جبرائیل گئے اور دوزخ کو (اس احاطہ کے اضافہ کے ساتھ دیکھ کر واپس آئے اور عرض کیا کہ پروردگار! تیری عزّت وجلال کی قسم، مجھے خدشہ ہے کہ اب شاید ہی کوئی باقی بچے جو دوزخ میں نہ جائے (کیونکہ جن خواہشات نفس اور لذات دنیا کا احاطہ دوزخ کے چاروں طرف کر دیا گیا ہے وہ اس قدر دلفریب اور اتنی زیادہ مزیدار ہیں کہ نفس طبیعت کی پیروی کرنے والوں میں سے ایسا کوئی بھی نہیں ہو گا جو ان خواہشات ولذات کی طرف نہ لپکے اور اس کے نتیجہ میں دوزخ میں نہ جانا پڑے۔"

تشریح: مکارہ اصل میں مکرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مکروہ یعنی ناپسندیدہ ودشوار چیز۔ یہاں مکارہ سے مراد وہ شرعی امور ہیں جن کا انسان کو مکلّف قرار دیا گیا ہے کہ فلاں فلاں کو اختیار کیا جائے اور فلاں فلاں سے اجتناب کیا جائے پس جنّت کے چاروں طرف مکارہ کا احاطہ قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور گناہوں سے اجتناب کرنے کی تکلیف ومشقت اٹھائی جائے گی نفس کی خواہشات اور اس کی تمناؤں کو ختم نہ کر دیا جائے گا اس وقت تک جنّت میں داخل ہونا ناممکن ہو گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ کو جنّت ودوزخ کا مشاہدہ

④ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى لَنَا يَوْمًا الصَّلٰوةَ ثُمَّ رَقِيَ الْمِنْبَرَ فَاَشَارَ بِيَدِهٖ قِبَلَ قِبْلَةِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ قَدْ اُرِيْتُ الْاٰنَ مُذْ صَلَّيْتُ لَكُمُ الصَّلٰوةَ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ مُمَثَّلَتَيْنِ فِیْ قِبَلِ هٰذِهِ الْجِدَارِ فَلَمْ اَرَ كَالْيَوْمِ فِی الْخَيْرِ وَالشَّرِّ (رواه البخاری)

"حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی، پھر منبر پر چڑھے اور مسجد کے قبلہ کی طرف اپنے دست مبارک سے اشارہ کر کے فرمایا کہ ابھی جب میں نے تمہیں نماز پڑھائی تو مجھے اس دیوار کے سامنے کے حصہ میں جنّت اور دوزخ کی

تمثیلیں دکھائی گئیں، واقعہ یہ ہے کہ میں نے جتنی اچھی چیز اور جتنی بری چیز آج دیکھی ہے اس جیسی اچھی اور بری چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی۔" (بخاری)

تشریح: لفظ "قبل" قَ کے زیر بَ کے زبر کے ساتھ بھی منقول ہے اور ان دونوں کے پیش کے ساتھ بھی اسی طرح قُ کے پیش بْ کے جزم کے ساتھ بھی نقل ہوا ہے، ان سب صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں یعنی سامنے ہونا۔

"میں نے جتنی اچھی چیز اور جتنی بری چیز آج دیکھی ہے......الخ کا مطلب یہ تھا کہ جو بھی اچھی چیز انسان دیکھ سکتا ہے اس سے زیادہ اچھی چیز میں نے جنت کو دیکھا ہے، اسی طرح جو بھی بری سے بری چیز اس دنیا میں دیکھی جاسکتی ہے اس سے بھی زیادہ بری چیز میں نے دوزخ کو دیکھا ہے۔

یہاں اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ جنت و دوزخ اس قدر وسیع و عریض ہونے کے باوجود حضور ﷺ کے سامنے ایک دیوار میں کس طرح ممثل و منور ہو کر آگئیں؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ کسی بھی چیز کی تمثیل و عکس کے لئے یہ مطلقاً ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اس چیز کے اصل طول و عرض کے ساتھ منعکس ہو۔ سب سے بڑی مثال پانی یا آئینہ میں کسی چیز کے عکس کی ہے، کہ کسی وسیع و عریض باغ یا مکان کا جو پورا عکس پانی یا آئینہ میں آتا ہے، وہ اصل باغ یا مکان کے حقیقی طول و عرض کے ساتھ ہرگز نہیں ہوتا! ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ حدیث کے متعلقہ الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا، جنت یا دوزخ کی تمثیل یا تصویر دیوار کے اوپر نقش یا کندہ ہوگئی ہو بلکہ ان الفاظ میں "ان تمثیل کو دیوار کے سامنے کے حصہ میں دیکھنے" کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تمثیلیں آپ ﷺ کو دیوار کی سمت میں دکھائی گئی ہے اور ان تمثیلوں کا وجود کسی اور عالم میں یا کسی اور جگہ ہو۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ۔

یعنی میں نے جنت اور دوزخ کو اس دیوار کے گوشہ پر دیکھا، اس حدیث کے ضمن میں بھی شارحین حدیث نے مذکورہ بالا اشکال اور اس کا مذکورہ ہی جواب نقل کیا ہے۔

بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی یہ مراد نہیں تھی کہ میں نے جنت اور دوزخ کو اس طرح دیکھا کہ ان کی تمثیل دیوار کے سامنے کے حصہ میں تھیں، بلکہ آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ میں نے (اپنی روحانی آنکھوں سے) جنت اور دوزخ کو دیکھا، جب کہ میں قبلہ کی طرف کی دیوار کے سامنے تھا، اس صورت میں کوئی اشکال واقع نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

بَابُ بَدْءِ الْخَلْقِ وَذِكْرِ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

ابتدائے پیدائش اور انبیاء علیہم السلام کے ذکر کا بیان

"ابتدائے پیدائش" سے مراد اس کائنات کا عالم وجود میں آنا اور مخلوقات کی پیدائش و تخلیق کا سلسلہ شروع ہونا ہے اور انبیاء علیہم السلام چونکہ اس کائنات کا جوہر ہیں، دین و ملت کی تدوین و تربیت کا نقطہ آغاز ان ہی کی ذات ہے، امور عالم کا نظم و انتظام اور اصلاح انہی سے وابستہ ہے اور نوع انسانی کی پیدائش کا سلسلہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام ہی سے شروع ہوتا ہے جو نبی اول بھی ہیں اس لئے ان مقدس نفوس کے ذکر کو عنوان باب کا دوسرا جزء قرار دیا گیا ہے۔

عالم حادث ہے: سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ تمام مذہب سماویہ اور ملتیں یہاں تک مجوسی بھی اس پر متفق ہیں کہ عالم حادث ہے، یعنی یہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز عدم سے وجود میں آئی ہے، خدا کے سوا کوئی بھی شے پہلے موجود نہیں تھی، بعد میں خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ اس بارہ میں سب سے بہتر شہادت مخبر صادق ﷺ کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا۔

كان الله وَلَمْ يكن معه شيء۔

"صرف اللہ کی ذات موجود تھی اس کے ساتھ کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔"

چنانچہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوح وقلم کو پیدا کیا اور مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (تقدیر) لکھی، اس کے بعد عرش، کرسی، آسمانوں، زمینوں، فرشتوں اور جنات وانسان کو پیدا فرمایا۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تمام اجسام اپنی ذات وصفات کے ساتھ حادث ہیں، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اجسام میں سے جو چیز سب سے پہلے پیدا ہوئی وہ پانی ہے کیونکہ یہ خصوصیت صرف پانی کو حاصل ہے کہ وہ ہر شکل وصورت اختیار کر سکتا ہے اور تمام چیزوں کا مادہ تخلیق بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ پانی ہی تھا جس میں لطافت پیدا ہوئی تو "ہوا" عالم وجود میں آئی پھر اس کے جوہر سے "آگ" پیدا ہوئی اور اس کے دھوئیں سے آسمان بنا واضح رہے کہ آسمان پر دخان یعنی دھوئیں کا اطلاق قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ یہ قول کہ "اس کائنات کی ہر چیز کا مادۂ تخلیق پانی ہے، اور پانی ہی کے جوہر سے آگ اور اس کے دھوئیں سے آسمان پیدا ہوا۔" قدیم حکماء میں سے ایک شخص طاس ملطی کی طرف منسوب ہے لیکن علماء نے کہا ہے کہ طاس ملطی نے یہ بات آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے اخذ کر کے کہی ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے اس کی تصدیق نہ صرف حکماء قدیم وجدید کے اقوال سے ہوتی ہے بلکہ قدیم آسمانی کتابوں میں بھی اسی طرح منقول ہے چنانچہ توریت کے پہلے صفحہ میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اس کائنات ارضی وسماوی کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو) ایک جوہر پیدا فرمایا اور اس پر ہیبت وجلال کی نظر ڈالی جس سے اس جوہر کے اجزاء پگھل کر پانی ہو گئے پھر اس میں سے دھوئیں کے مانند بخارات اٹھے جس سے آسمان کو پیدا کیا اور پھر اس پانی پر جھاگ ظاہر ہوا جس سے زمین کو وجود بخشا اور زمین کو جمانے اور قائم رکھنے کے لئے پہاڑوں کو پیدا فرمایا۔ بہر حال ابتدائے تخلیق کائنات کا موضوع بڑا وسیع اور خاصا بحث طلب مانا گیا ہے، ہمیشہ سے حکماء اور دانشور اس میں مصرف تحقیق رہے ہیں، اور کتنے ہی مختلف نظریات واقوال سامنے آچکے ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس موضوع کا تعلق ایسے امور سے ہے جن کو محض عقل وقیاس سے معلوم نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی حقیقت تک رسائی کا مدار خالق کائنات کے عطا کردہ اس علم اور اس علم سے اخذ واستنباط پر ہے جو بذریعہ وحی دنیا میں آیا ہے اور جس کو آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات کے ذریعہ دنیا والوں تک پہنچا بھی دیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

پہلے اللہ کے سوا کچھ نہ تھا

① عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍؓ قَالَ اِنِّیْ كُنْتُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَآءَهُ قَوْمٌ مِّنْ بَنِیْ تَمِيْمٍ فَقَالَ اقْبَلُوا الْبُشْرٰى يَا بَنِیْ تَمِيْمٍ قَالُوْا بَشَّرْتَنَا فَاَعْطِنَا فَدَخَلَ نَاسٌ مِّنْ اَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ اقْبَلُوا الْبُشْرٰى يَآ اَهْلَ الْيَمَنِ اِذْ لَمْ يَقْبَلْهَا بَنُوْ تَمِيْمٍ قَالُوْا قَبِلْنَا جِئْنَاكَ لِنَتَفَقَّهَ فِی الدِّيْنِ وَلِنَسْاَلَكَ عَنْ اَوَّلِ هٰذَا الْاَمْرِ مَا كَانَ قَالَ كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَیْءٌ قَبْلَهٗ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَكَتَبَ فِی الذِّكْرِ كُلَّ شَیْءٍ ثُمَّ اَتَانِیْ رَجُلٌ فَقَالَ يَا عِمْرَانُ اَدْرِكْ نَاقَتَكَ فَقَدْ ذَهَبَتْ فَانْطَلَقْتُ اَطْلُبُهَا وَاَيْمُ اللّٰهِ لَوَدِدْتُّ اَنَّهَا قَدْ ذَهَبَتْ وَلَمْ اَقُمْ (رواہ البخاری)

"حضرت عمران بن حصینؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں رسول کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ (مشہور اور عظیم قبیلہ) بنو تمیم کے کچھ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ بنو تمیم کے لوگو! بشارت حاصل کرو، انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ نے (دین کی تعلیمات کی صورت میں) بشارت تو ہمیں عطا فرمادی، اب کچھ اور بھی عنایت فرمادیجئے۔ پھر کچھ دیر بعد یمن کے کچھ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ (یمن کے لوگو! تم بشارت حاصل کرلو، بنو تمیم کے لوگوں نے تو بشارت حاصل نہیں کی۔" یمن والوں نے عرض کیا کہ) یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم نے بشارت حاصل کی، اور ہم اسی لئے آپ ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ﷺ سے مذہبی معلومات اور دینی شعور و فہم حاصل کریں، چنانچہ ہم آپ سے ابتدائے آفرینش اور مبداء عالم کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس (کائنات کے وجود میں آنے اور مخلوقات کی پیدائش) سے پہلے کیا چیز موجود تھی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "صرف خدا کی ذات موجود تھی (ازل الازال میں) اس کے ساتھ (اور اس سے پہلے) کسی چیز کا وجود نہیں تھا، اور اس کا عرش پانی پر تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا اور لوح محفوظ میں ہر چیز کو لکھا۔" (حدیث کے راوی حضرت عمران ابن حصین ؓ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی یہیں تک سن پایا تھا کہ) ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ عمران جاؤ، اپنی اونٹنی کو تلاش کرو وہ بھاگ گئی ہے! (یہ سنتے ہی میں اپنی اونٹنی کو تلاش کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا، اور اب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کاش میں اس وقت (مجلس نبوی، سے، اٹھ کر نہ جاتا بھلے ہی میری اونٹنی جاتی رہتی۔" (بخاری ؒ)

تشریح: اس موقع پر بنو تمیم کے جو لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ان کا مطمح نظر آنحضرت ﷺ سے اکتساب دین اور حصول معرفت سے زیادہ کوئی دنیاوی طلب وخواہش تھی، اس لئے جب آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ بشارت حاصل کرو، یعنی مجھ سے ایسی چیز حاصل کرو اور وہ بات قبول کرو جو جنّت کی نعمتوں اور دونوں جہان کی سعادتوں کے حصول کی بشارت کا موجب ہے جیسے دین کے عقائد و احکام سیکھنا اور مذہبی معلومات حاصل کرنا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ ﷺ کی عطا کردہ بشارت ہمارے سر آنکھوں پر، دینی عقائد و حکام سیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہمیں تسلیم، لیکن اس وقت ہمارا اصل مقصد کچھ دنیاوی چیزوں کا حاصل کرنا ہے آپ تو ہماری وہ دنیاوی طلب وخواہش پوری فرما دیجئے۔ پس ان لوگوں نے چونکہ فانی دنیا کو زیادہ اہم جانا اور اس کو مذہبی تعلیمات اور دینی فہم و شعور حاصل کرنے پر کہ جو آخرت کے اجر و ثواب اور دارین کی فلاح و سعادت کا باعث ہے، فوقیت دی، اس لئے آپ ﷺ نے ان کی اس بات کو ان کی عدم لیاقت اور یقین و اعتماد میں ان کے ضعف و کمزوری پر محمول فرمایا، اور از راہ غصہ ان کی طرف سے وہ بشارت کو قبول کئے جانے کی نفی فرما دی، چنانچہ آپ ﷺ نے یمن کے لوگوں سے فرمایا کہ بنو تمیم کے لوگوں نے تو بشارت حاصل کی نہیں، تم ہی لوگ اس بشارت کو حاصل کر لو۔

بنو تمیم کے لوگوں کے بعد یمن کے جو لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، ان کی نیت چونکہ بالکل اور سچی تھی اور ان کی آمد کا اصل مقصد ہی یہ پاک جذبہ تھا کہ آنحضرت ﷺ سے کچھ دین کی باتیں سیکھیں، آپ ﷺ کی صحبت سے اپنے عقیدۂ و ایمان کو تازگی بخشیں نہ کہ وہ دنیا کی کوئی چیز حاصل کرنے یا کسی پست مقصد کے لئے حاضر ہوئے تھے لہٰذا ان کو بشارت حاصل ہوئی طاعت و قبول، کی سعادت ان کے حصّہ میں آئی۔ علم و عمل ان کا نصیب بنا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے جب کہ بنو تمیم کے لوگ دنیا طلبی کے چکر میں پڑ کر ان سعادتوں اور نعمتوں سے محروم رہے اور ان کی کم نظری اور پست ہمتی نے ان کو نیچے گرا دیا۔ اس سے معلوم ہوا، کہ بندۂ مؤمن کو ہمیشہ بلند نظر، عالی ہمت اور پاک مقصد ہونا چاہئے کیونکہ بلند نظری، عالی ہمتی اور مقصد کی پاکی بڑے سے بڑے درجہ و مرتبہ کو پہنچا دیتی ہے اور دارین کی فلاح و سعادت سے نوازتی ہے جیسا کہ ایک بزرگ حضرت شیخ ابو العباس مرسی ؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک دن حضرت امیر حمزہ ؓ کی تربت کی زیارت کے ارادے سے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، ایک اور شخص بھی ان کے ساتھ ہو لیا، جو وہ حضرت امیر حمزہ ؓ کے مقبرہ پر پہنچے تو خلاف معمول حضرت شیخ ابو العباس ؒ کے لئے خاص طور پر مقبرہ کا دروازہ کھولا گیا، وہ اندر داخل ہوئے اور تربت پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ عالم غیب کے کچھ لوگوں کی ایک جماعت کسی بھی طرح کی کمی اور عیب سے پاک اپنے اجسام کے ساتھ موجود ہے، حضرت شیخ ؒ ان کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ ساعت قبولیت ہے، یہاں پروردگار سے جو کچھ بھی طلب کیا جائے حاصل ہو گا چنانچہ انہوں نے پروردگار سے دنیا و آخرت میں عفو و عافیت کی دعا مانگی اور پھر از راہ ہمدردی و شفقت اپنے ساتھی سے کہا کہ میرے عزیز! اللہ تعالیٰ سے جو کچھ چاہتے ہو مانگ لو کیونکہ یہ دعا کی قبولیت اور فضل ربی حاصل ہونے کا وقت ہے۔ اس شخص نے بڑی پست ہمتی دکھائی اور ایک دینار کی دعا مانگی (کہ پروردگار! مجھے ایک دینار عطا کر دے) نہ تو اس نے آخرت کا کوئی ذکر کیا اور نہ جنّت و دوزخ کے بارے میں کچھ

عرض مدعا کیا۔ اس کے بعد وہ دونوں مقبرہ سے نکلے اور واپسی کے لئے مدینہ کی طرف چل پڑے اور مدینہ شہر میں داخل ہوئے تو اہل مدینہ میں سے کسی نے اس شخص کے ہاتھ میں ایک دینار تھمادیا پھر شہر میں پہنچ کر وہ دونوں اس زمانے کے مشہور قطب و ولی حضرت سید ابوالحسن شاذلیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت شاذلیؒ پر ان دونوں کا پورا قصہ منکشف ہو گیا انہوں نے بڑے تأسف کے ساتھ اس شخص سے کہا کہ ارے پست ہمت! تجھے قبولیت دعا کا وقت نصیب ہوا اور تو نے ذلیل دنیا کا ایک حقیر ٹکڑا مانگنے پر اکتفا کیا؟ آخر تو نے ابوالعباسؒ کی طرح عفو و عافیت کی دعا کیوں نہیں مانگی، یہ تو وہ نعمت ہے جو تجھے حاصل ہو جاتی تو تیری دنیا بھی تیرے قدموں میں آجاتی اور تیری عاقبت بھی سنور جاتی۔

"صرف خدا کی ذات موجود تھی۔" یعنی جس طرح اس کی پاک ذات ابدالاباد تک رہنے والی ہے اسی طرح ازل الازال میں بھی صرف اسی کی ذات تھی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے موجود ہے اور اس سے پہلے کسی بھی چیز کا وجود نہیں تھا، جس طرح اس کے لئے کوئی انتہا و اختتام نہیں ہے اسی طرح اس کے لئے کوئی ابتداء نہیں ہے، اس کی ذات اور اس کا وجود تغیر و حدث سے پاک و مبرا ہے جو اس کے بندوں اور اس کی مخلوق کا خاصہ ہے۔ پس ثابت ہوا کہ نہ پہلے کبھی اس کی ذات عدم میں تھی اور نہ آئندہ کبھی وہ عدم میں ہوگا کیونکہ جو ذات ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لئے قائم و باقی ہے اس کا عدم محال ہے۔

"اللہ تعالیٰ سے پہلے کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔" یہ پہلے جملہ کی وضاحت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے علاوہ ہر چیز حادث ہے تو اس واجب الوجود سے پہلے کسی اور چیز کے وجود کا تصور تک نہیں ہو سکتا اور چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق و موجد ہے اس لئے جو بھی چیز وجود میں آئی ہے اسی کے بعد اور اسی کی قدرت تخلیق سے وجود پذیر ہوئی ہے۔

"اور اس کا عرش پانی پر تھا...... الخ" اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ عرش اور پانی کی تخلیق زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے ہوئی ہے، نیز شروع میں عرش کے نیچے پانی کے علاوہ زمین و آسمان کی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ پس "عرش کا پانی پر ہونے۔" کا مطلب یہ ہے کہ عرش اور پانی کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی، یہ مطلب نہیں ہے کہ عرش، پانی کی سطح پر قائم تھا، نیز اس پانی سے مراد وہ پانی نہیں ہے جو سمندروں اور دریاؤں میں موجود ہے بلکہ عرش کے نیچے کا وہ پانی قدرت و مشیت الٰہی کا مظہر کوئی اور ہی پانی تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر کتاب کے ابتداء میں باب الایمان بالقدر میں گذر چکا ہے۔

ابن ملکؒ نے مذکورہ جملہ کی تشریح میں لکھا ہے۔ عرش پانی پر تھا، پانی ہوا کی پشت پر تھا اور ہوا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے قائم تھی۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ عرش اور پانی کی تخلیق آسمان اور زمین کی تخلیق سے پہلے ہوئی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پانی سے پیدا فرمایا اس طرح کہ پانی پر اپنی تجلی ڈالی، تو وہ موجیں مارنے لگا اور اس میں زبردست اتھل پتھل ہوئی جس کے سبب سے اس میں جھاگ پیدا ہوا اور وہ جھاگ جمع ہو کر اس جگہ قائم ہوا جہاں خانہ کعبہ ہے اور اس طرح زمین کا سب سے پہلا ٹکڑا عالم وجود میں آیا، اور پھر اسی ٹکڑے سے چاروں طرف زمین پھیلائی گئی اور اس کائنات کا تختہ ارض قائم ہوا، پھر اس تختہ ارض پر پہاڑوں کو پیدا کیا گیا تاکہ زمین ہلنے اور ڈولنے نہ پائے اور پہاڑوں کے دباؤ سے ساکن و جامد رہے اور جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے، سب سے پہلے جو پہاڑ پیدا کیا گیا وہ جبل ابوقبیس ہے، نیز اس پانی میں تموج اور اضطراب سے دھوئیں کی شکل میں جو بخارات اوپر کی طرف بلند ہوئے ان سے آسمان پیدا ہوئے۔

"اور لوح محفوظ میں ہر چیز کو لکھا۔" یعنی اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی پیدائش سے پہلے ہر چیز کے متعلق لوح محفوظ میں ہر وہ بات لکھ دی ہے جو اس کو پیش آنے والی ہے اور اسی کے مطابق دنیا میں ظہور ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کو لوح محفوظ میں اللہ تعالیٰ کے لکھنے سے کیا مراد ہے؟ تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حروف والفاظ پیدا فرمائے ہوں جو اس لوح محفوظ میں مرتسم ہو گئے ہوں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو لکھنے کا حکم دیا اور انہوں نے اس حکم کے مطابق ہر چیز لوح محفوظ میں لکھ دی! یہ واضح رہے کہ لوح محفوظ میں ہر چیز کا

لکھا جانا عرش کی بھی تخلیق سے پہلے ہو گیا تھا۔

روایت کے آخری الفاظ کے ذریعہ حضرت عمران ابن حسینؓ نے اپنے تاسف کا اظہار کیا کہ وہ اپنی اونٹنی کے چکر میں پڑ کر ایسے موقع پر مجلس نبویؐ سے اٹھ گئے جب کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا سلسلہ جاری تھا اور وہ آگے کے ملفوظات نبوی ﷺ نہ سن سکے! صورت حال یہ ہوئی کہ حضرت عمرانؓ جب مجلس نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے تو انہوں نے اپنی اونٹنی دروازے کے باہر باندھ دی تھی، اس دوران کہ آنحضرت ﷺ یمن کے لوگوں کو اس کائنات کے ابتدائے آفرینش اور مبدء عالم کے بارے میں بتا رہے تھے، کسی شخص نے آکر حضرت عمرانؓ سے کہا کہ تمہاری اونٹنی کھل کر بھاگ گئی ہے جلدی جاؤ اور اس کو پکڑو اور وہ یہ سنتے ہی مجبوراً اٹھ گئے اور اپنی اونٹنی کو پکڑنے کے لئے چلے گئے، پھر بعد میں پشیمان ہوئے کہ میں کیوں اٹھ گیا اور آنحضرت ﷺ کی مبارک صحبت اور ان حقائق و علوم سے محروم رہ گیا جو اس وقت بیان فرمائے جا رہے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے ابتدائے آفرینش سے روز قیامت تک کے احوال بیان فرما دیئے تھے

(۲) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقَامًا فَاَخْبَرَنَا عَنْ بَدْءِ الْخَلْقِ حَتّٰى دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ مَنَازِلَهُمْ وَاَهْلُ النَّارِ مَنَازِلَهُمْ حَفِظَ ذٰلِكَ مَنْ حَفِظَهٗ وَنَسِيَهٗ مَنْ نَسِيَهٗ (رواہ البخاری)

"اور امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ خطبہ دینے کے لئے ہمارے سامنے کھڑے ہوئے، آپ ﷺ نے (اس خطبہ کے دوران) ابتدائے آفرینش سے (قیامت کے دن) جنت و دوزخ میں داخل ہونے تک کے تمام احوال و کوائف کا ذکر فرمایا۔ جس شخص نے ان باتوں کو یاد رکھا اس کو یاد ہیں اور جس شخص نے بھلا دیا وہ بھول گیا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ آپ ﷺ نے اس دن بڑی تفصیل کے ساتھ مبداء و معاد کے احوال کو اول سے آخر تک بیان فرمایا یعنی پہلے آپ ﷺ نے تخلیق کائنات کی ابتداء کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو قائم کرنے کا ارادہ کیا تو شروع میں کیا کیا چیزیں بنائیں پھر کس طرح نظام عالم کو قائم فرمایا! اور اس عالم کو انسان نامی مخلوق سے آباد کرنے کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی اور ان کے ذریعہ نسل انسانی کا سلسلہ شروع ہوا، کائنات انسانی کی تہذیبی، اخلاقی اور دینی زندگی کا نظم قائم کرنے اور رب کائنات کی حاکمیت و ہدایت کے ظہور کے لئے کون نبی اور رسول اس دنیا میں آئے، کیسی کیسی ملتیں اور قومیں وجود آئیں، ان ملتوں اور قوموں نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، جن لوگوں نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی اطاعت کی ان کو کیا اجر و انعام ملے اور جن لوگوں نے ان رسولوں کو جھٹلایا اور ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا ان کو کس طرح تباہ و برباد کر دیا گیا اور آخرت میں ان سب ملتوں اور امتوں کا کیا حال ہو گا۔ اور پھر آخر میں آپ ﷺ نے اپنی اُمت کے بارے میں بتایا کہ خدا کے آخری دین "اسلام" کو ماننے والوں یعنی مسلمانوں کی ملی زندگی میں کیسے کیسے انقلاب آئیں گے، انہیں کن کن احوال سے دوچار ہونا پڑے گا، کون کون سی اچھائیاں ان کا طرۂ امتیاز بنیں گی اور کون کون سی برائیاں ان کی دینی و دنیاوی زندگی کو خراب کریں گی! پھر آخرت میں اس اُمت محمدیہ کے ساتھ کیا سلوک ہو گا، کس طرح کے لوگ جنت میں اور کس طرح کے لوگ دوزخ کے سپرد کئے جائیں گے۔

"جس شخص نے ان باتوں کو یاد رکھا ...... الخ سے حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے وہ باتیں جس تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی تھیں، ان کو ان لوگوں نے یاد رکھا جنہوں نے یاد رکھنے کی کوشش کی اور جن کو اللہ تعالیٰ نے یاد رکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور وہ لوگ ان باتوں کو بھول گئے جنہوں نے یاد رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ حاصل یہ کہ بعض لوگوں کو وہ پوری باتیں یاد ہیں اور بعض لوگ ان کو بھول گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی کَتَبَ کِتَابًا قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ الْخَلْقَ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ فَهُوَ مَکْتُوْبٌ عِنْدَهٗ فَوْقَ الْعَرْشِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق یعنی زمین آسمان کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب لکھی اس میں یہ درج ہے کہ "میری رحمت" میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے اور وہ (کتاب یا مذکورہ عبارت) اللہ تعالیٰ کے پاس عرش کے اوپر لکھی ہوئی موجود ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کو تمام خلائق سے پوشیدہ رکھا گیا ہے کہ اس کے مندرجات اللہ تعالیٰ کا ایسا راز ہیں جن کو کسی پر کھولا نہیں گیا ہے اور نہ کسی کے علم و ادراک کو اس قابل بنایا گیا ہے کہ اس کتاب میں لکھی ہوئی باتوں کو جان اور سمجھ سکے۔

تورپشتیؒ نے لکھا ہے کہ احتمال ہے کہ "اس کتاب" سے مراد "لوح محفوظ" ہو اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد "فهو مکتوب عنده" کے معنی یہ ہوں کہ مذکورہ عبارت لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ "کتاب" سے مراد لوح محفوظ نہ ہو بلکہ قضاء یعنی فیصلۂ خداوندی ہو جس کو حق تعالیٰ نے جاری فرمایا ہے، بہرحال دونوں صورتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد عنده فوق العرش میں یہ آگاہی ہے کہ وہ کتاب لکھی گئی اور تمام خلائق کے حیطۂ ادراک سے ماوراء رکھی گئی ہے کہ اس کے مندرجات تک کسی کا علم و فہم نہیں پہنچ سکتا۔

رحمت خداوندی کے غضب الٰہی پر سبقت لے جانے کے معنی یہ ہیں، رحمت کے آثار و مظاہر بہت زیادہ ہیں کہ کیا مؤمن کیا کافر اور کیا متقی کیا گنہ گار سب ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے زیر سایہ ہیں جب کہ اس کا غضب بہت کم ظاہر ہوتا ہے اور کبھی کبھی اور کوئی کوئی ہی اس کا مورد بنتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ان عذابی اصیب بہٖ من اشاء ورحمتی وسعت کل شئ۔

"میں اپنے عذاب میں ان ہی لوگوں کو مبتلا کرتا ہوں جن کو چاہتا ہوں لیکن میری رحمت نے ہر چیز کو اپنے دامن میں لے رکھا ہے۔"

ملائکہ، جنات اور انسان کا جوہر تخلیق

④ وَعَنْ عَائِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خُلِقَتِ الْمَلٰئِکَةُ مِنْ نُّوْرٍ وَ خُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ وَخُلِقَ اٰدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَکُمْ (رواہ مسلم)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے، جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا گیا ہے، جس میں دھواں ملا ہوتا ہے، اور آدم علیہ السلام کو اس چیز سے پیدا کیا گیا ہے جو تمہیں بتادی گئی ہے۔" (مسلم)

تشریح: قاموس میں لکھا ہے کہ "نور" کے معنی یا تو "روشنی" کے ہیں یا روشنی سے پھوٹنے والی شعاع کے ہیں! بہرحال یہاں حدیث میں نور سے مراد اصل روشنی یعنی وہ جوہر ہے جس سے روشنی وجود میں آتی ہے، پس فرشتوں کی تخلیق اسی جوہر روشنی سے ہوئی ہے۔

لفظ "جان" کے معنی یا تو "جن" یا جنات کے ہیں یا اس لفظ سے مراد جنات کی وہ اصل (یعنی ان کا باپ) ہے جس سے جنات کی نسل چلی ہے جیسے انسان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

"جو تمہیں بتادی گئی ہے۔" سے قرآن کریم کے ان الفاظ وخلقہ من تراب (اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا) کی طرف اشارہ ہے، مطلب یہ کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔

بعض روایتوں میں کچھ دوسری چیزوں کے جوہر تخلیق کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جیسے ابن عساکر نے حضرت ابوسعیدؓ سے یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ کھجور، انار اور انگور کو آدم کی مٹی کے فضلے سے پیدا کیا گیا ہے۔ طبرانیؒ نے حضرت ابوامامہؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ حور عین زعفران سے پیدا کی گئی ہے۔

جنات وانسان کی تین تخلیقی اقسام: حکیمؒ ابن ابی الدنیاؒ، ابوالشیخؒ اور ابن مردویہؒ نے حضرت ابودرداؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات کو تین طرح کا پیدا کیا ہے، ان کی ایک قسم وہ ہے جس کو سانپ وبچھو اور حشرات الارض کی صورت دی گئی ہے، دوسری قسم وہ ہے جو فضاء میں ہوا کی مانند ہے اور تیسری قسم کے جنات وہ ہیں جن کو انسان کی طرح خیر وشر کا مکلّف قرار دیا گیا ہے اور ان کو حساب ومواخذہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی تین قسم کا پیدا کیا ہے، ایک قسم تو وہ ہے جو چوپاؤں کے مانند ہے، دوسری قسم کے انسان وہ ہیں جن کے جسم وبدن اور شکل وصورت تو بنی آدم (آدمیوں) کی سی ہے لیکن ان کی ارواح گویا شیاطین کی ارواح ہیں، اور تیسری قسم کے انسان وہ ہیں جو جسم وبدن اور روح دونوں اعتبار سے انسانیت وآدمیت کا پیکر ہیں اور جو قیامت کے دن پروردگار کے سایہ رحمت میں ہوں گے۔

پیکر آدم کے بارے میں شیطان کا اظہار خیال

⑤ وَعَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا صَوَّرَ اللّٰهُ اٰدَمَ فِي الْجَنَّةِ تَرَكَهٗ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَتْرُكَهٗ فَجَعَلَ اِبْلِيْسُ يُطِيْفُ بِهٖ يَنْظُرُ مَاهُوَ فَلَمَّا رَاٰهُ اَجْوَفَ عَرَفَ اَنَّهٗ خُلِقَ خَلْقًا لَا يَتَمَالَكُ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں آدم علیہ السلام کا پیکر بنایا اور شکل وصورت دی تو اس پیکر کو جب تک چاہا جنت میں رکھے رکھا، اس عرصہ میں ابلیس اس پیکر کے گرد چکر کاٹتا رہا اور غور کرتا رہا کہ یہ کیا ہے اور کیسا ہے (یعنی وہ یہ مشاہدہ کرنا چاہتا تھا، کہ اللہ تعالیٰ اس پیکر خاکی کی صورت میں اپنے بندوں کی جو نئی مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی حیثیت وحقیقت کیا ہوگی) اور جب اس نے دیکھا کہ یہ پیکر خاکی اندر سے کھوکھلا ہے تو سمجھ گیا کہ یہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی گئی ہے جو غیر مضبوط ہوگی۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے پیکر اور شکل وصورت کی تخلیق جنت میں ہوئی تھی جب کہ اور روایت اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کی تخلیق اور ان کو پیکر وصورت کا عطا کیا جانا میدان عرفات کے ایک حصہ وادی نعمان میں عمل میں آیا تھا، وہاں ان کے پیکر کو آخری شکل دے کر اور اس میں روح پھونک کر ان کو جنت میں لے جایا گیا پس حدیث میں فی الجنۃ کے الفاظ، جن سے ان کی تخلیق کا جنت میں ہونا مفہوم ہوتا ہے، دراصل ان کی ابتدائی تخلیق کا اظہار کرنے کے لئے نہیں بلکہ تخلیق کے بعد کی صورت حال کو ذکر کرنے کے لئے ہیں، اس اعتبار سے حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو تخلیق کر کے اور ان کے پیکر میں روح پھونک کر ان کو جنت میں رکھا تو ابلیس نے ان کے پیکر کی ساخت وحقیقت کی ٹوہ لگائی اور جب اس نے دیکھا کہ یہ پیکر خاکی کھوکھلا ہے اور اندر سے اس کا پیٹ خالی ہے تو اس کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ انسان نامی مخلوق اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے مضبوط نہیں ہے کیونکہ جو چیز اندر سے ٹھوس نہ ہو اور اس کے تمام اعضاء واجزاء ایک دوسرے سے اس طرح مربوط نہ ہوں کہ ان کے درمیان کوئی خلا نہ رہے تو اس کو پوری طرح ثبات وقرار حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا (اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب اس پیکر خاکی کی جسمانی ساخت اس طرح کی ہے تو لامحالہ اس کی افتاد طبع، اس کا مزاج اور اس کے اندرونی احوال کو بھی ثبات وقرار نہیں ہوگا اور اس افتاد طبع کی

وجہ سے خود کو اپنے معاملات میں ڈانواڈول ہونے اور اپنے احوال میں غیر مستحکم ہونے سے نہ بچا پائے گا، اور اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکے گا کہ مثلاً "غصہ کے وقت بے اختیار ہو جایا کرے گا اور طبعی خواہشات پر قدغن نہیں لگا سکے گا کہ بھوک پیاس مٹانے" جنسی تسکین حاصل کرنے اور اپنی آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے جائز و ناجائز کے درمیان تمیز نہیں کرے گا۔ پس ابلیس گویا خوش ہوا کہ اس نے امید قائم کرلی کہ جو مخلوق اپنی جسمانی ساخت اور طبعی افتاد کی وجہ سے آفات کا مورد بن سکتی ہے اس کو گمراہ کرنا چنداں مشکل نہیں ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اخْتَتَنَ اِبْرَاهِيْمُ النَّبِیُّ وَهُوَ ابْنُ ثَمَانِيْنَ سَنَةً بِالْقَدُوْمِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں "قدوم" سے اپنا ختنہ کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: امام نوویؒ نے اس حدیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ لفظ "قدوم" کی دال کی حرکت میں اختلاف ہے اگر اس دال کو تخفیف کے ساتھ "قَدُوْم" پڑھا جائے تو اس کے معنی بڑھی کے اوزار یعنی بسولے کے ہوں گے، اور حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا ختنہ بسولے سے خود کیا اور اس وقت ان کی عمر اسی سال کی تھی، اور اگر اس لفظ کو دال کی تشدید کے ساتھ "قَدُّوْم" پڑھا جائے تو اس سے مراد ملک شام کا ایک گاؤں ہوگا جس کا نام قدوم تھا، ویسے اس گاؤں کا نام "قدوم" بہ تخفیف دال بھی نقل کیا گیا ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں اپنا ختنہ خود کیا اور اس وقت وہ ملک شام کے گاؤں قدوم میں تھے۔ حاصل یہ کہ جس روایت میں یہ لفظ بہ تشدید دال نقل ہوا، اس میں "قدوم" سے مذکورہ گاؤں ہی مراد ہے اور جس روایت میں بہ تخفیف دال منقول ہوا ہے اس میں بسولہ اور مذکورہ گاؤں، دونوں کا احتمال ہے کہ اس لفظ سے "بسولہ" بھی مراد ہو سکتا ہے، اور مذکورہ گاؤں بھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹ

(۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكْذِبْ اِبْرٰهِيْمُ اِلَّا ثَلٰثَ كَذِبَاتٍ ثِنْتَيْنِ مِنْهُنَّ فِیْ ذَاتِ اللّٰهِ قَوْلُهٗ اِنِّیْ سَقِيْمٌ وَقَوْلُهٗ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا وَقَالَ بَيْنَا هُوَ ذَاتَ يَوْمٍ وَسَارَةُ اِذْ اَتٰى عَلٰى جَبَّارٍ مِّنَ الْجَبَابِرَةِ فَقِيْلَ لَهٗ اِنَّ هٰهُنَا رَجُلًا مَعَهُ امْرَاَةٌ مِنْ اَحْسَنِ النَّاسِ فَاَرْسَلَ اِلَيْهِ فَسَاَلَهٗ عَنْهَا مَنْ هٰذِهٖ قَالَ اُخْتِیْ فَاَتٰى سَارَةَ فَقَالَ لَهَا اِنَّ هٰذَا الْجَبَّارَ اِنْ يَعْلَمْ اَنَّكِ امْرَاَتِیْ يَغْلِبْنِیْ عَلَيْكِ فَاِنْ سَاَلَكِ فَاَخْبِرِيْهِ اَنَّكِ اُخْتِیْ فَاِنَّكِ اُخْتِیْ فِی الْاِسْلَامِ لَيْسَ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ مُؤْمِنٌ غَيْرِیْ وَغَيْرُكِ فَاَرْسَلَ اِلَيْهَا فَاُتِیَ بِهَا قَامَ اِبْرَاهِيْمُ يُصَلِّیْ فَلَمَّا دَخَلَتْ عَلَيْهِ ذَهَبَ يَتَنَاوَلُهَا بِيَدِهٖ فَاُخِذَ وَيُرْوٰى فَغُطَّ حَتّٰى رَكَضَ بِرِجْلِهٖ فَقَالَ ادْعِی اللّٰهَ لِیْ وَلَا اَضُرُّكِ فَدَعَتِ اللّٰهَ فَاُطْلِقَ ثُمَّ تَنَاوَلَهَا الثَّانِيَةَ فَاُخِذَ مِثْلَهَا اَوْ اَشَدَّ فَقَالَ ادْعِی اللّٰهَ لِیْ وَلَا اَضُرُّكِ فَدَعَتِ اللّٰهَ فَاُطْلِقَ فَدَعَا بَعْضَ حَجَبَتِهٖ فَقَالَ اِنَّكَ لَمْ تَاْتِنِیْ بِاِنْسَانٍ اِنَّمَا اَتَيْتَنِیْ بِشَيْطَانٍ فَاَخْدَمَهَا هَاجَرَ فَاَتَتْهُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّیْ فَاَوْمَاَ بِيَدِهٖ مَهْيَمْ قَالَتْ رَدَّ اللّٰهُ كَيْدَ الْكَافِرِ فِیْ نَحْرِهٖ وَاَخْدَمَ هَاجَرَ قَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ تِلْكَ اُمُّكُمْ يَا بَنِیْ مَاءِ السَّمَاءِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا علاوہ تین جھوٹ کے اور ان میں سے بھی دو جھوٹ خدا کے لئے بولے تھے۔ ان میں کا ایک تو ان کا یہ کہنا تھا کہ "میں آج کچھ علیل سا ہوں۔" دوسرا یہ کہنا تھا کہ "بلکہ یہ کام بڑے بت نے کیا ہے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے جو تیسرا جھوٹ نکلا تھا، وہ ان کا

یہ کہنا تھا کہ "یہ میری بہن ہے۔" اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے) جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی سارہؓ (ہجرت کر کے ملک شام کی طرف جارہے تھے کہ ان) کا گذر ایک بڑے ظالم و جابر حاکم کے شہر سے ہوا چنانچہ اس حاکم کو بتایا گیا کہ یہاں (اس شہر میں) ایک شخص آیا ہوا ہے جس کے ساتھ ایک نہایت حسین و جمیل عورت ہے، اس حاکم نے (یہ سنتے ہی) ایک گماشتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلانے کے لئے بھیجا، اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کون عورت ہے اور تمہاری کیا لگتی ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ میری بہن ہے۔ پھر انہوں نے سارہؓ کے پاس واپس آکر (ان کو اس جابر حاکم کے برے ارادے سے نجات پانے کی تدبیر بتائی اور) کہا کہ اگر اس ظالم کو معلوم ہو گیا کہ تم میری بیوی ہو تو تمہیں زبردستی مجھ سے چھین لے گا پس اگر وہ (تمہارے اور میرے تعلق کے بارے میں) پوچھے تو اس کو بتانا کہ تم میری بہن ہو، اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ تم دین کے رشتہ سے میری بہن ہو (لہٰذا خود کو میری بہن بتاتے وقت دینی اخوت کی نیت کر لینا، اور یہ نیت اس لئے بھی صحیح ہوگی کہ) اس سرزمین پر سوائے میرے اور تمہارے کوئی دوسرا مؤمن نہیں ہے۔ لہٰذا اس ظالم نے ایک گماشتہ بھیج کر حضرت سارہؓ کو طلب کیا اور ادھر تو حضرت سارہؓ اس کے پاس لے جائی گئیں ادھر حضرت ابرہیم علیہ السلام (اپنی قیام گاہ پر) نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ سارہؓ جب اس ظالم کے پاس پہنچیں تو (وہ ان کا حسن و جمال دیکھ کر از خود رفتہ ہو گیا اور یا تو ان سے پوچھے اور تحقیق کئے بغیر کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا رشتہ رکھتی ہیں، یا پوچھنے اور سارہؓ کے یہ کہنے کے باوجود یکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی بہن ہیں) اس نے ان پر ہاتھ ڈالنا (اور ان کی عفت و عصمت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا) چاہا مگر (اللہ تعالیٰ نے سارہؓ کی مدد کی اور وہ ظالم پکڑا گیا۔ ایک روایت میں (یا تو "فاخذ" کے بجائے، یا اس لفظ کے ساتھ مزید) "فَغُطَّ" کا لفظ بھی نقل کیا گیا ہے (بہر حال) وہ (عتاب خداوندی کی گرفت میں آنے کے بعد) زمین پر پیر مارنے لگا (یعنی جس طرح کوئی آسیب زدہ یا مرگی میں مبتلا شخص زمین پر زور زور سے پاؤں پٹختا ہے اسی طرح وہ بھی اپنے پیر پٹخنے لگا) پھر اس نے (سارہؓ سے) کہا کہ (میں اپنے ارادۂ بد سے باز آیا) "تم خدا سے دعا کرو (کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے میرا وعدہ ہے کہ) میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا (یعنی تمہارے ساتھ کوئی تعرض نہیں کروں گا) چنانچہ حضرت سارہؓ نے دعا کی اور اس ظالم کی گلو خلاصی ہو گئی، لیکن اس نے دوبارہ دست درازی کرنی چاہی اور پھر پہلے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت (عتاب خداوندی میں، پکڑا گیا اس نے پھر (حضرت سارہؓ سے) کہا کہ خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے اور میں (اب صدق دل کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ) تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا، حضرت سارہؓ نے پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس ظالم کی گلو خلاصی ہو گئی۔ اس کے بعد اس ظالم نے اپنے دربانوں میں سے کسی کو بلایا اور کہا کہ تو میرے پاس انسان کو نہیں لایا ہے (کہ جس پر قابو پا سکتا) بلکہ تو کسی جن کو میرے پاس لے آیا ہے (کہ اس پر قابو پانے کے بجائے خود الٹا مصیبت میں پھنس جاتا ہوں، یہ تو تو نے میرے لئے موت کا سامان فراہم کر دیا ہے) پھر اس نے سارہؓ کی خدمت کے لئے ہاجر نام کی ایک لونڈی دی (اور ان کو واپس بھیج دیا) سارہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس واپس پہنچیں تو وہ نماز پڑھنے میں مشغول تھے (کیونکہ اس وقت تک ان کو اس ظالم کے پنجہ سے سارہؓ کی رہائی کی خبر نہیں ہوئی تھی، وہ بدستور نماز میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھے اور سارہؓ کی باعفت و عافیت واپسی کی دعائیں مانگ رہے تھے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (ان کو دیکھا تو) نماز ہی میں اپنے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ کیا حال ہے اور تم پر کیا بیتی؟ حضرت سارہؓ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کافر کی بدنیتی کو اس کے سینہ میں لوٹا دیا (یعنی اس نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے جس بدنیتی کا اظہار کیا وہ الٹے اس کے گلے پڑ گئی، مجھے تو وہ کوئی نقصان پہنچا نہیں سکا خود عذاب خداوندی میں ضرور پھنس گیا تھا) اور اس نے خدمت کے لئے ھاجر کو میرے ساتھ کر دیا ہے۔" حضرت ابوہریرہؓ نے (یہ حدیث بیان کرنے کے بعد) کہا کہ اے آسمان کے پانی کے بیٹو! وہی ہاجرہ تم سب کی ماں ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا علاوہ تین جھوٹ کے۔" کے بارے میں یہ ذہن نشین رہے کہ تمام انبیاء معصوم ہیں ان سے کوئی بھی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا خواہ وہ جھوٹ ہو یا اور کوئی معصیت، پس حدیث کے مذکورہ جملہ کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زندگی میں جھوٹ جیسے گناہ کا تین بار ارتکاب کیا بلکہ "ان کی طرف جھوٹ بولنے کی نسبت" خود ان کی ذات کے اعتبار سے نہیں، سننے والوں کے اعتبار سے ہے، مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ تینوں باتیں بظاہر تو "جھوٹ" کی صورت میں تھیں مگر حقیقت میں جھوٹ نہیں تھیں، نہ تو اس اعتبار سے کہ وہ باتیں "جھوٹی باتوں" کے زمرہ میں آتی ہیں اور نہ اس اعتبار سے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان باتوں کے ذریعہ غلط بیانی اور دروغ گوئی کا قصد و ارادہ کیا تھا! اس بات کو اگر اور زیادہ خوبصورت انداز میں کہنا ہو تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس مقام پر "کذب" سے مراد یہ ہے کہ "ایسا کلام جو صحیح اور پاک مقصد کے لئے بولا گیا ہو لیکن مخاطب اس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو متکلم کی مراد ہے بلکہ ان الفاظ کو اپنی ذہنی مراد کے مطابق سمجھے۔" یہ انداز کلام معاریض یا تعریض (اشارے کنائے کہ پیرایہ بیان) کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے اور فصحاء و بلغاء کے ہاں اکثر رائج ہے۔ اسی ضمن میں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہاں حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق اس طرح کی صرف تین باتوں کا ذکر ہے، چوتھی بات کا ذکر نہیں ہے جو انہوں نے کواکب کو دیکھ کر کہی تھی کہ ھٰذَا رَبِّیْ (یہ میرا رب ہے) اور اس کے ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات ایام طفولیت میں کہی تھی، اس وقت چونکہ وہ کسی بھی امر کے مکلف نہیں تھے اس لئے اس چوتھی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔

ان میں سے ایک تو ان کا یہ کہنا تھا کہ "میں آج کچھ علیل سا ہوں۔" اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر اور اپنی قوم کے لوگوں کو ہر طرح سے بت پرستی کی خرابیوں کو ظاہر کر کے اس سے باز رکھنے کی سعی کر لی اور ہر قسم کے پند و نصائح کے ذریعہ ان کو یہ باور کرانے میں پوری طاقت صرف کر لی کہ یہ بت نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، اور آزر اور قوم کے دلوں پر کسی بھی پند و نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو انہوں نے یہ تدبیر سوچی کہ اب مجھ کو ارشاد و ہدایت کا ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے ان لوگوں کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ ہم لکڑیوں اور پتھروں کی جن مورتیوں اور بتوں کو پوجتے ہیں وہ ہمارے لئے کسی بھی طرح کارگر اور فائدہ مند نہیں ہیں اور نہ ان کی ذات سے ہمیں کوئی رنج و نقصان پہنچ سکتا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ قوم کا ایک اہم مذہبی میلہ لگنے والا تھا اور سب لوگ اس میں شرکت کے لئے چلنے لگے تو کچھ لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اصرار کیا کہ وہ بھی سیر کے لئے میلہ چلیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اس طرح کے موقع کے انتظار میں تھے، کہ سب لوگ یہاں سے چلے جائیں تو ان کے تمام بتوں کو توڑ پھوڑ کر اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہناؤں، چنانچہ انہوں نے پہلے تو ان لوگوں کے ساتھ جانے سے صاف انکار کیا مگر جب ان کا اصرار بہت بڑھا تو اس وقت انہوں نے کہا اِنِّیْ سَقِیْمٌ (میں آج کچھ علیل سا ہوں۔") ان کی یہ بات بظاہر خلاف واقعہ اور "جھوٹ" معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ اس وقت واقعۃً علیل نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ نہ جانے کے لئے علالت کا بہانہ کیا تھا۔ اس کی تاویل علماء یہ کرتے ہیں اِنِّیْ سَقِیْمٌ کہنے سے حضرت ابراہیم کی مراد یہ تھی کہ ہر انسان کی طرح میرے ساتھ بھی بیماری آزاری لگی رہتی ہے، اور وقتاً فوقتاً بیمار ہو جایا کرتا ہوں۔ پس انہوں نے ایسی مبہم بات کہی کہ اس کے ظاہری اسلوب سے تو یہ مفہوم ہوا کہ میں اس وقت بیمار ہوں تمہارے ساتھ کیسے جاسکتا ہوں لیکن حقیقت میں ان کی مراد اس کے برعکس تھی۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے مذکورہ بات کہہ کر ان کا دھیان ستاروں کی طرف متوجہ کر دیا تھا چنانچہ قوم کے لوگ اپنے عقیدہ کے لحاظ سے یہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام کسی نحس ستارے کے اثر بد میں مبتلا ہیں اور انہوں نے علم نجوم کے ذریعہ معلوم کر لیا ہے، کہ وہ عنقریب بیمار ہونے والے ہیں۔ اس تاویل کا قرینہ قرآن کریم کی اس آیت کا سیاق ہے جس میں اس واقعہ کا ذکر ہے! ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس جملہ "انی سقیم" سے اپنی جسمانی علالت مراد نہیں لی تھی بلکہ "قلب کی ناسازی" مراد لی تھی کہ تمہارے کفر و طغیان نے مجھے دکھی کر دیا ہے اور میرے دل کی حالت سقیم ہے، ایسے میں تمہارے ساتھ میرے جانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

دوسرا کہنا یہ تھا کہ "بلکہ یہ کام بڑے بت نے کیا ہے۔" حضرت ابراہیمؑ کی اس بات کا تعلق بھی مذکورہ بالا پہلے واقعہ ہی سے ہے، ہوا یہ کہ جب ان کی قوم کے تمام لوگ اس میلے میں چلے گئے اور بستی خالی ہو گئی تو وہ اٹھے اور سب سے بڑے بت کے ہیکل (مندر) میں پہنچے،

دیکھا تو وہاں بتوں کے سامنے طرح طرح کے حلووں پھلوں، میووں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے ہوئے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طنزیہ لہجے میں چپکے چپکے ان مورتیوں کو خطاب کر کے کہا کہ سب کچھ موجود ہے، ان کو کھاتے کیوں نہیں؟ اور پھر کہنے لگے کہ میں تم سے مخاطب ہوں، کیا بات ہے کہ تم جواب نہیں دیتے؟۔ اور اس کے بعد انہوں نے سب مورتیوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کے کاندھے پر تبر رکھ کر واپس چلے گئے۔ قوم کے لوگ میلے سے واپس آئے تو انہوں نے مندر میں اپنے دیوتاؤں (بتوں) کو اس خراب حالت میں پایا اور سخت برہمی کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کس کی حرکت ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہو نہ ہو یہ ابراہیم علیہ السلام کا کام ہے، وہی شخص ہے جو ہمارے دیوتاؤں کی برائی کہتا ہے اور اس بستی میں اس کے علاوہ کوئی موجود بھی نہیں تھا، چنانچہ بڑے بڑے پجاریوں، سرداروں کے سامنے ان کی طلبی ہوئی، اور مجمع عام میں ان سے پوچھا گیا کہ ابراہیمؑ! تم نے ہمارے ان دیوتاؤں کے ساتھ یہ کیا حرکت کی ہے؟ اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات کہی کہ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ (بلکہ یہ کام ان سب کے بڑے بت نے کیا ہے۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ جواب بھی گویا خلاف واقعہ تھا، لیکن حقیقت میں ان کے اس جواب کو "جھوٹ" سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی اصل غرض اپنی گمراہ قوم کو متنبہ کرنا اور اس طرح لاجواب کر دینا تھا کہ ان کے غلط عقائد کی قلعی کھل جائے۔ چنانچہ اپنے حریف کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنے اور اس کو راہ راست پر لانے کے لئے ایک بہترین طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ مناظرہ اور تبادلہ خیالات کا موقع آجائے تو اس کے مسلمات میں سے کسی مسلمہ عقیدہ کو صحیح فرض کر کے اس طرح اس کا استعمال کرے کہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ حریف کے خلاف اور اپنے موافق ظاہر ہو! اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مذکورہ واقعہ میں اسی طریقہ کو اختیار کیا، ان کی قوم خدائے واحد کے علاوہ بے شمار دیوتاؤں اور بتوں کو پوجتی تھی، ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ یہ دیوتا اور بت سب کچھ سنتے اور دیکھتے ہیں اور ہماری مرادوں کو پورا کرتے ہیں، اور اپنے اپنے ماننے والوں اور اپنے پجاریوں سے خوش ہوتے ہیں اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سخت انتقام لیتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کی اس خام خیالی اور بد عقیدگی کو عملا ان پر ظاہر کرنے کے لئے ان کے بتوں اور مورتیوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور بڑے بت کو چھوڑ دیا، پھر جب پوچھ گچھ کی نوبت آئی تو انہوں نے مناظرہ کا وہی بہترین طریقہ اختیار کیا جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی قوم، پر یہ بات پوری طرح عیاں ہوگئی کہ جو بت اپنے کو شکست وریخت سے نہ بچا سکے اور اپنے کسی دشمن کی توڑ پھوڑ کا مقابلہ نہ کر سکے وہ کسی دوسرے کو کیا نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں اور عبادت و پرستش کے قابل کیسے ہوسکتے ہیں بعض حضرات نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ جواب کی ایک اور تاویل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو یہ کہا بل فعله کبیرهم تو کبیرهم سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کی ذات تھی۔ گویا اس جملہ کا مطلب یہ تھا کہ ان بتوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اس ذات (یعنی اللہ تعالیٰ) کی طرف سے ہوا ہے جو سب سے بڑا ہے، اور جس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔

اب "تیسرے جھوٹ کو لیجئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہؓ کے بارے میں کہا کہ "یہ میری بہن ہے۔" یہ بات بظاہر خلاف حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے "اپنی بیوی" کو "اپنی بہن" بتایا، لیکن اگر اس بات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اصل مراد کے سیاق میں دیکھا جائے تو ان کا یہ کہنا کہ "یہ میری بہن ہے" خلاف حقیقت نہیں ہوگا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہؓ ہم مذہب (دین اسلام کے پیرو) ہونے کی حیثیت سے دینی بھائی بہن تھے، جیسا کہ خود قرآن نے فرمایا ہے انما المؤمنون اخوة (تمام اہل ایمان ایک دوسرے کے ساتھ اخوت کا تعلق رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بیوی کا رشتہ قائم ہو جانے سے دینی اخوت کا رشتہ منقطع نہیں، ہو جاتا۔ علاوہ ازیں حضرت سارہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا حاران کی بیٹی تھیں اور اس اعتبار سے ان کو بہن کہنا ایسی بات ہرگز نہیں ہے جس پر حقیقی جھوٹ کا اطلاق ہو سکے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سارہؓ سے یہ کہنا کہ "اس سرزمین میں سوائے میرے اور تمہارے کوئی دوسرا مؤمن نہیں ہے۔" صورت

حال کا صحیح بیان تھا کیونکہ اس وقت وہاں کوئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان نہیں لایا تھا، اور اس شہر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص مؤمن و مسلمان نہیں تھا، لہٰذا اس موقع پر یہ اشکال پیدا نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سرزمین پر صرف دو مؤمنوں (یعنی ایک خود حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے حضرت سارہؓ) کے موجود ہونے کی بات کیسے کہی؟ ایک تیسرے مؤمن حضرت لوط علیہ السلام بھی تو تھے جیسا کہ قرآن کریم کی شہادت ہے:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ

"پس ایمان لائے لوط علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام (کے دین) پر۔"

ہاں، یہ اشکال اس صورت میں تو پیدا ہو سکتا تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس جملہ کی مراد یہ ہوتی کہ پوری دنیا میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور مؤمن نہیں ہے، یا یہ کہ اس وقت ان دونوں کے ساتھ حضرت لوط علیہ السلام بھی اس شہر میں ہوتے۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے مذکورہ جملہ کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس موقع پر اسلام کے رشتہ اخوت کو صرف اپنی اور سارہؓ کی ذات تک جو محدود رکھا تو شاید اس کی بنیاد دین اسلام کی وہ نسبت تھی جو ان کو اصالتاً حاصل تھی اور ان کے تعلق کا وہ خاص شرف تھا جو حضرت سارہؓ کو حاصل تھا۔ حضرت شیخؒ نے اس جملہ کے تحت ایک اور اشکال اور اس کا جواب نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جابر حاکم کے سامنے واضح طور پر یہی کیوں نہ کہا کہ "یہ عورت میری بیوی ہے۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام جو جو مقصد حضرت سارہؓ کو "بہن سے تعبیر کر کے حاصل کرنا چاہتے تھے وہی مقصد وہ بیوی بتا کر بھی حاصل کر سکتے تھے کیونکہ پہلے زمانوں کے بد قماش لوگوں کا بھی ایک اصول تھا، وہ کسی شخص سے اسی کی بیوی کو کم ہی چھینتے تھے؟ دوسرے یہ کہ وہ جابر حاکم اگر اتنا ہی ظالم اور ابوالہوس تھا تو اس کو اس بات سے کیا سروکار ہو سکتا تھا کہ کوئی عورت کسی کی بہن ہے یا بیوی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جابر حاکم کی ایک خاص عادت تھی کہ وہ کسی شخص سے اس کی بہن کو نہیں چھینتا تھا لیکن شوہر سے اس کی بیوی کو ضرور لے لیتا تھا، علاوہ ازیں وہ حاکم مذہب کے اعتبار سے آتش پرست تھا اور آتش پرستوں میں بہن اور بھائی کے رشتہ کی ایک خصوصی اہمیت تھی یہاں تک کہ بڑے سے بڑا ابوالہوس آتش پرست بھی کسی کی بہن پر بری نظر نہیں ڈال سکتا تھا اور اپنے اس مذہبی اصول کا احترام کرتا تھا کہ جو عورت اپنے بھائی کی تولیت اور کفالت میں ہے یا جس عورت کو کسی شخص نے اپنی بہن بتا دیا ہے وہ ہر طرح سے محفوظ و مامون ہے اور اس کا بھائی ہی اس کے بارے میں تمام ترحق و اختیار رکھتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاہا کہ اسی کے دین کا سہارا لیں اور سارہؓ کو اس ظالم کے چنگل سے بچانے کے لئے ایسی بات کہیں جو بالکل ہی خلاف واقعہ بھی نہ ہو اور وہ ظالم بھی اپنے برے ارادے سے باز آجائے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اس ظالم پر شیطان کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس نے نہ تو اپنے دین کے اصول کا احترام کیا اور نہ اپنی قماش کے لوگوں کی روایت و عادت کا لحاظ رکھا بلکہ حضرت سارہؓ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے درپے ہوا۔

"حضرت ابراہیمؑ نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ یعنی وہ حضرت سارہؓ کو اس حاکم کی طرف روانہ کر کے خود نماز پڑھنے اور رب العزت میں عرض و مناجات کے لئے کھڑے ہو گئے تاکہ اپنے پروردگار سے التجا کریں کہ اس کی قدرت کاملہ سارہؓ کی عزت کو محفوظ رکھے اور انہیں اس سخت ترین پریشانی سے نجات دے۔ چنانچہ اللہ کے مقرب بندوں کی یہی عادت ہے کہ جب انہیں کوئی سخت پریشانی لاحق ہوتی ہے اور وہ رنج و مصیبت میں گھر جاتے ہیں تو نماز پڑھنے لگتے ہیں اور ان کا یہ عمل قرآن کریم کی اس آیت کے بموجب ہوتا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر و الصلوۃ۔

"اے ایمان والو! صبر و نماز کے واسطہ سے اللہ کی مدد چاہو۔"

"ذھب یتنا ولھابیدہ فاخذ" میں لفظ اخذ (پکڑا گیا) تخفیف کے ساتھ مجہول کا صیغہ ہے، اس لفظ کی وضاحت میں تین قول ہیں، ایک تو یہ کہ جب اس ظالم نے برے ارادے کے ساتھ حضرت سارہؓ کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہا تو قدرت الٰہی نے سارہؓ کی اس طرح مدد کی کہ وہ ظالم اپنے برے ارادے سے باز رکھا گیا۔ دوسرے یہ کہ وہ ظالم اپنے ارادۂ بد کی پاداش میں فوراً پکڑا گیا اور اس پر عذاب خداوندی نازل ہو گیا۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ جونہی اس نے حضرت سارہؓ پر ہاتھ ڈالنا چاہا اس پر بیہوشی طاری کر دی گئی۔ واضح رہے کہ ایک روایت میں لفظ اخذ، تاخیذ سے تشدید کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "کسی پر جادو ٹونا کرا دینا، یعنی افسوں یا سحر کے ذریعہ اس کے دل و دماغ کو اس طرح باندھ دینا کہ وہ حیران و سراسیمہ ہو جائے۔

لفظ "فغط" بھی مجہول کا صیغہ ہے، معنی یہ ہیں کہ اس کا گلا گھونٹا گیا اور دم رک سا گیا۔ یا یہ کہ اس کے حلق سے اس طرح کی آواز (خرخراہٹ) نکلنے لگی، جیسے سوئے ہوئے شخص کے خراٹے کی ہوتی ہے۔

"پھر اس نے سارہؓ کی خدمت کے لئے ہاجر نام کی ایک لونڈی دی۔ مطلب یہ کہ جب اس حاکم نے حضرت سارہؓ کی بزرگی کا اس طور پر مشاہدہ کیا اور جان لیا کہ یہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے بلکہ اپنے خدا کے نزدیک بہت بلند مقام و مرتبہ اور کمال درجہ کا تقرب رکھتی ہے تو اس نے نہ صرف یہ کہ بڑے خوف اور دہشت کے ساتھ ان کو واپس بھیج دیا بلکہ ان کی خدمت کے لئے ایک "لونڈی" ان کے ساتھ کر دی جن کا اصل نام "ہاجر" یا "آجر" تھا مشہور "ہاجرہ" ہے۔ حضرت سارہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں ہوتی تھی، چنانچہ حضرت سارہؓ نے حضرت ہاجرہؓ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دیا اور کہا کہ مجھے امید ہے کہ اس کے بطن سے آپ کے یہاں کوئی بچہ ہوگا۔ ان دنوں حضرت ابراہیم علیہ السلام سو برس کی عمر کے ہو چکے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام عطا فرمایا اور آخر میں حضرت سارہؓ کی گود ہری ہوئی اور ان کے بطن سے حضرت اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے۔

"اے آسمان کے پانی کے بیٹو!" یہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد یعنی اہل عرب سے خطاب ہے! اور حضرت ابوہریرہؓ کا ان (اہل عرب) کو "آسمان کے پانی" سے تعبیر کرنا ان کے نسلی و نسبی شرف و عظمت کے اظہار کے طور پر تھا کیونکہ "آسمان کا پانی" نظافت و پاکیزگی کے لئے ضرب المثل ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: فلاں شخص آسمان کے پانی سے بھی زیادہ پاک و صاف ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اہل عرب کو بنی ماء السماء (آسمان کے پانی کے بیٹے)، اس لئے کہا تھا کہ وہ بارش کے انتظار میں رہتے تھے، جہاں بارش ہوتی وہاں جا کر رہ جاتے تھے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ بنی ماء السماء سے انصار مراد ہیں کیونکہ وہ عامر بن حارثہ ازدی کی اولاد ہیں جو نعمان بن منذر کا دادا تھا اور اس کا لقب ماء السماء تھا، اور یہ لقب اس وجہ سے پڑا تھا کہ اس کی قوم کے لوگ اس کے وسیلہ سے بارش مانگتے تھے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ "ماء السماء" سے مراد زمزم ہے اور حضرت ابوہریرہؓ نے بنی ماء السماء کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا کہ زمزم کا چشمہ حضرت اسمٰعیل کی وجہ سے نمودار ہوا تھا اس کا پانی، آسمان قدس و طہارت سے اس زمین پر آیا تھا اور یہ کہ زمین سے جو بھی فوائد و فیوض برآمد ہوتے ہیں وہ سب صانع حقیقی اللہ تعالیٰ آسمان سے ہی بھیجتا ہے۔ یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ اگرچہ تمام اہل عرب حضرت ہاجرہؓ ہی کے بطن سے تعلق نہیں رکھتے لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی کی اولاد میں سے ہیں اس لئے "اکثر و اغلب" کا اعتبار کرتے ہوئے تمام ہی اہل عرب کو "بنی ماء السماء" سے خطاب کیا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق بعض اہم واقعات کا ذکر

⑧ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ اِذْقَالَ رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ

الْمَوْتٰى وَيَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا لَقَدْ كَانَ يَأْوِيْ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ طُوْلَ مَالَبِثَ يُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِيَ

(متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے لائق ہیں، جب انہوں نے کہا تھا رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (اے پروردگار! مجھے دکھادے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائے گا) اور اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم کرے جو رکن شدید" کا سہارا پکڑنا چاہتے تھے۔ اور اگر میں قید خانے میں اتنی طویل مدت تک رہتا جتنی مدت حضرت یوسف علیہ السلام رہے تو میں یقیناً بلانے والے کی دعوت قبول کر لیتا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جس "شک" کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تذکرہ قرآن کریم میں یوں ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ط قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ط۔

"اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھادے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائے گا ارشاد ہوا کیا آپ (ﷺ) کو یقین نہیں ہے، عرض کی کہ ضرور ہے، لیکن (یہ درخواست) اس لئے ہے کہ قلب کو (اور) اطمینان ہو جائے۔"

اور اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ۔ "ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے لائق ہیں۔" تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو صحابہ میں سے کچھ حضرات نے (آنحضرت کی عظمت اور برتری ظاہر کرنے کے لئے) کہا کہ یہ شک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہوا، ہمارے حضرت ﷺ نے اس طرح کا شک ظاہر نہیں کیا۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے لائق ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے ظاہری اسلوب سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے نہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے بلکہ اپنی ذات شریف کے لئے بھی مذکورہ شک کا اثبات کیا حالانکہ دونوں کا اس طرح کے شک میں مبتلا ہونا امر محال ہے کیونکہ انبیاء کرام صلوٰت اللہ وسلامہ اجمعین جن کی ذات ایمان وایقان کا اولین مظہر بلکہ اصل اور بنیاد ہوتی ہے اور جن کا وجود طمانیت وعرفان کا سرچشمہ ہوتا ہے، فطری طور پر شک وتردد سے محفوظ وماموں ہوتے ہیں، ان میں عدم ایقان اور شک وشبہ کے وجود کے کوئی معنی نہیں۔ لہٰذا مذکورہ ارشاد سے آنحضرت ﷺ کی مراد وہ نہیں ہے جس کا تقاضا ظاہری اسلوب کرتا ہے بلکہ آپ ﷺ کی اصل مراد یہ ہے کہ اس آیت کریمہ سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے جو درخواست کی اس کا تحریک احیاموتی کے نفس وقوع میں کوئی شک وشبہ تھا، وقوع پر تو ان کو پورا ایمان وایقان تھا، وہ صرف مراتب عرفان اور کمالات ایقان میں ترقی کے طلب گار تھے، علم الیقین سے اور آگے بڑھ کر علم الیقین کے درجہ پر پہنچنے کے متمنی تھے جس کو اطمینان قلبی سے تعبیر کیا، یعنی ان کا مدعا یہ تھا کہ احیاء موتی کے وقوع پر ایمان کے درجہ تک تو یقین اب بھی حاصل ہے، صرف یہ چاہتا ہوں کہ مشاہدہ بھی حاصل ہو جائے تاکہ اطمینان قلب کی دولت میں اور اضافہ ہو۔ ان صحابہ پر اسی بات کو واضح کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ نے یہ پیرایہ بیان اختیار فرماتے ہیں کہ دیکھو شک وتردد اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام میں راہ پا سکتا تو یقیناً ہم میں بھی راہ پاتا اور تم یہ جانتے ہی ہو کہ ہم میں شک وتردد کا کسی طرح گذر نہیں ہوتا لہٰذا جان لو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ہماری ہی طرح کمال ایقان وعرفان کے درجہ پر فائز تھے اور ان کے دل ودماغ میں بھی کسی طرح کا کوئی شک وتردد راہ پائے ہوئے نہیں تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ درخواست کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے یہاں کے بادشاہ وقت نمرود اور قوم کے لوگوں کے قلب ودماغ میں خدائے واحد کا یقین پیدا کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کی کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، تو اس موقع پر انہوں نے پروردگار کے حضور یہ درخواست گذاری تاکہ ان کی پیش کردہ دلیل سب کے مشاہدہ میں بھی آجائے۔ بہر حال آنحضرت ﷺ کے مذکورہ ارشاد گرامی کے بین السطور سے آنحضرت ﷺ کی ذات شریف پر حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت و برتری کا اظہار ہوتا ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ کا تمام انبیاء سے افضل و برتر ہونا ثابت شدہ حقیقت ہے یہ باعث خلجان بات ہے، چنانچہ اسی خلجان و اشکال کو دور کرنے کے لئے شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق سے یہاں جو کچھ فرمایا ہے وہ انکسار و تواضع کے طور پر ہے، یا یہ کہ آپ ﷺ کا یہ اشارہ اس وحی کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے کہ آپ تمام اولاد آدم علیہ السلام کے سردار اور سب سے افضل ہیں۔ یہی توجیہ ہر اس حدیث کی ہے جو آنحضرت ﷺ کی عدم افضلیت کا مفہوم ظاہر کرتی ہے۔

"جو رکن شدید کا سہارا پکڑنا چاہتے تھے۔" رکن، اصل میں کسی بھی چیز کے مضبوط کنارے یا مضبوط ستون کو کہتے ہیں، اور یہاں "رکن شدید" سے مراد "مضبوط اور طاقت ور لوگوں کی جماعت" ہے حدیث کے اس جملہ میں حضرت لوط علیہ السلام کے تعلق سے جس بات کا ذکر کیا گیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب قوم لوط علیہ السلام اپنی بد عملی، سرکشی، بے حیائی اور خبیث اخلاقی گراوٹ (ہم جنسی یعنی امرد لڑکوں سے اختلاط) میں حد سے تجاوز کر گئی اور حضرت لوط علیہ السلام کے ابلاغ حق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اس پر مطلق کچھ اثر نہیں ہوا، تو آخر کار حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی سزا و بربادی و ہلاکت کا فیصلہ ہو گیا، چنانچہ عذاب کے فرشتے قوم لوط کے شہر سدوم میں اترے، اور آدمیوں کی شکل و صورت میں حضرت لوط علیہ السلام کے یہاں مہمان ہوئے، یہ فرشتے نہایت حسین و خوبصورت اور عمر میں نوجوان لڑکوں کی شکل و صورت میں تھے، حضرت لوط علیہ السلام نے ان مہمانوں کو دیکھا تو گھبرا گئے اور ڈرے کہ بد بخت قوم کے لوگ میرے ان مہمانوں کے ساتھ نہ معلوم کیا سلوک کریں گے، اس وقت تک حضرت لوط علیہ السلام کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ خدا کے پاک فرشتے ہیں اور اس بد بخت قوم کے لئے عذاب الٰہی کا فیصلہ لے کر آئے حضرت لوط علیہ السلام اسی پریشانی اور تردد میں تھے کہ قوم کو خبر لگ گئی اور یہ مطالبہ لے کر حضرت لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے کہ ان (مہمانوں) کو ہمارے حوالہ کرو، حضرت لوط علیہ السلام نے ان لوگوں کو اس وقت بھی بہت سمجھایا، ان کی بد فطرتی پر ان کو غیرت عار دلائی اور کوشش کی کہ یہ بد بخت ان معزز اور پاکباز نو عمر مہمانوں کے تئیں اپنی بری نیت اور ارادۂ بد سے باز آ جائیں، اور پھر جب انہوں نے دیکھا کہ ان لوگوں کے سیاہ دلوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے اور سب کے سب ان کے مہمانوں کے ساتھ بد اخلاقی پر تلے ہوئے ہیں، تب پریشان خاطر ہو کر انہوں نے فرمایا۔

لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ

"کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے (ذاتی) طاقت حاصل ہوتی یا (طاقت ور ساتھیوں اور حمایتوں کی صورت میں) کوئی مضبوط سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا (اور ان مہمانوں کو تمہارے شر سے محفوظ رکھتا۔"

پس آنحضرت ﷺ نے حضرت لوط علیہ السلام کی اسی "حسرت و تمنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا لوط علیہ السلام پر رحم کرے کہ وہ انسانی طاقت و قوت کا سہارا چاہنے لگے تھے حالانکہ اصل سہارا اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت اور اس کی حفاظت و حمایت کا ہے کہ اہل عرب کے کلام کا یہ خاص اسلوب ہے کہ جب وہ کسی شخص کے ایسے قول و فعل کا ذکر کرتے ہیں جو تقصیر سے تعلق رکھتا ہو یا اس کو وہ کام وکلام نہ کرنا چاہئے تھا کہتے ہیں کہ اللہ اس شخص پر رحم کرے، یا اللہ اس شخص کو معاف فرمائے کہ اس نے ایسا کام کیا یا ایسی بات کہی۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ ارشاد کے ذریعہ کیا اس طرف اشارہ فرمایا کہ نعوذ باللہ حضرت لوط علیہ السلام خدا کی قدرت پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے جو کسی "رکن شدید" کی پناہ کے طالب ہوئے! جواب ہے کہ ہرگز نہیں کیونکہ ایسا سمجھنا نہ صرف یہ کہ خلاف واقعہ ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کے طریق ادب کے بھی منافی ہے، جہاں تک حضرت لوط علیہ السلام کے "رکن شدید" کی پناہ طلب کرنے کا سوال ہے، تو حضرت لوط علیہ السلام خدا کو بھول کر کسی اور کی پناہ کے طالب نہیں تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت اپنی قوم کے ارادۂ بد کو دیکھ کر اس قدر پریشان اور اس درجہ قابل رحم حالت میں تھے کہ طبعی طور پر ان کی یہ تمنا ہوئی کہ کاش! اللہ تعالیٰ میری مدد فرماتا اور اتنی طاقت و قوت عطا فرما دیتا کہ میں اسی وقت ان بد بختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا دیتا، چنانچہ ان کے پروردگار نے آخر ان

کی مدد کی اور ان فرشتوں نے (جو نو عمر مہمانوں کی شکل و صورت میں ان کے یہاں آئے تھے) ان پر اپنا راز ظاہر کر دیا اور ان کو تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں، زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ یہ بدبخت اپنی بدکرداری کے عبرتناک انجام تک پہنچ جائیں گے۔ رہی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی بات، تو جب آنحضرت ﷺ عام لوگوں تک کی غیبت اور عیب جوئی سے منع فرماتے تھے خواہ وہ زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں تو یہ تصور کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ ایک نبی مرسل (لوط علیہ السلام) کے بارے میں ایسی بات فرمائیں جو ان کے رتبہ و درجہ کو کم کرنے یا ان کی کم ہمتی کے اظہار کی موہم ہو، پس آپ ﷺ کے اس ارشاد کی مراد دراصل یہ واضح کرنا تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام ایک انسان تھے اور ایسے نازک وقت میں ان کی بشری جبلت کا اندرونی تقاضا یہ ہوا کہ وہ ان بدکردار اور اوباش لوگوں کو مزہ چکھانے کے لئے مضبوط طاقت ور لوگوں کی مدد کے متمنی ہوں، اور حضرت لوط علیہ السلام کے اس عمل میں ہمارے لئے یہی جواز موجود ہے کہ اس طرح کے موقعوں پر ہم عالم اسباب سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مادی و دنیاوی وسائل و ذرائع سے مدد لے سکتے ہیں باوجودیکہ ہر حالت میں ہمارا اصل بھروسہ رب الارباب پر ہوتا ہے اور ہم حقیقی سہارا اسی کی مدد و نصرت کو جانتے اور مانتے ہیں۔ اب ایک بات اور رہ جاتی ہے کہ پھر آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد کی ابتدا یرحم اللہ کے الفاظ سے کیوں کی؟ تو حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ استعمال ہی اس لئے فرمائے کہ کوئی شخص حضرت لوط علیہ السلام کے اس واقعہ کو کسر شان پر محمول نہ کرے اور اس وہم میں مبتلا نہ ہو جائے کہ انہوں نے "رکن شدید" کا جو سہارا تلاش کیا تھا اس سے ان کے درجہ و مرتبہ کی تنقیص ہوئی یا اس کی وجہ سے ان کی ذات پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ کلام کے شروع میں اس طرح کے الفاظ کا استعمال محض دعاء و تعظیم یا شان و مرتبہ کے تقدس و احترام کو باقی رکھنے کے لئے بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو مخاطب فرمایا گیا ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ

"اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے، آپ ﷺ نے ان کو اجازت کیوں دے دی تھی۔"

"اور اگر میں قید خانہ میں اتنی طویل مدت تک رہتا .... الخ۔" حدیث کے اس آخری جملہ کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام کی مدح و تعریف سے ہے جس میں ان کے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کر کے ان کے صبر و ثبات کے کمال کو ظاہر فرمایا گیا ہے، اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر نے ایک غلام کے طور پر خریدا اور اپنے گھر لایا تو ان کے ساتھ غلاموں کا سا معاملہ نہیں کیا بلکہ اپنی اولاد کی طرح عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور گھریلو زندگی کی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی جوانی کا عالم تھا۔ جمال و رعنائی اور حسن و خوبروئی کے پیکر تھے، ادھر یہ کہ ہر وقت کا ساتھ، عزیز مصر کی بیوی دل پر قابو نہ رکھ سکی اور حضرت یوسف علیہ السلام پر پروانہ وار نثار ہونے لگی، مگر حضرت یوسف علیہ السلام، جو خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ اور منصب نبوت کے لئے منتخب تھے، بھلا ان سے یہ کس طرح ممکن تھا کہ بے کرداری اور فحش میں مبتلا ہو کر عزیز مصر کی بیوی کے ارادۂ بد کو پورا کر دیتے، اس عورت نے پہلے تو آرائش حسن و زینت کی بے پناہ نمائش اور عشوہ طرازیوں کی بارش کے ذریعہ ان کو اپنے جال میں پھانسنا چاہا اور جب کامیاب نہ ہوئی تو زور زبردستی پر اتر آئی، مگر خدا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے خبث نفس کی گرفت سے بچا لیا، پھر اس عورت کے ناکام عشق کا بھید اس کے شوہر عزیز مصر پر بھی کھل گیا لیکن اس نے حقیقت حال سے آگاہ ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام کی ستائش کی اور اپنی عورت کو فہمائش کی اور خفت و رسوائی سے بچنے کے لئے معاملہ کو دبا دیا، مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی اور شدہ شدہ شاہی خاندان کی عورتوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، اور عزیز مصر کی بیوی اپنی ہم جولیوں اور سہیلیوں کی طنز و تعریض کا نشانہ بن کر رہ گئی اس صورت حال نے اس کو بوکھلا دیا اور اس نے طے کیا کہ طنز و تعریض کرنے والی عورتوں کو ایسا سبق دینا چاہئے کہ وہ جس بات پر مجھ پر چھینٹے اڑاتی ہیں خود اس میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ ایک دن اس نے شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتوں کو دعوت دی اور جب سب نے دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے لئے چھری کانٹے ہاتھ میں لئے تو عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم

دیا کہ وہ باہر آئیں، وہ مالکہ کا حکم سن کر باہر نکلے اور جب عورتوں نے جمال یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو رخ انور کی تابانی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ چیزیں کاٹنے کے بجائے چھری کانٹوں سے ہاتھ کاٹ لئے اور یہ دیکھ کر عزیز مصر کی بیوی بہت محظوظ ہوئی اور فخرہ انداز میں کہنے لگی کہ یہی وہ غلام ہے جس کے عشق و محبت کے بارے میں تم نے مجھے مطعون کر رکھا ہے اور تیر ملامت کا نشانہ بنایا ہوا ہے، اب بتاؤ میرا عشق بیجا ہے یا بجا۔؟ عزیز مصر کی بیوی نے اس وقت یہ بھی کہا کہ بیشک میں نے اس شخص کو اپنے قابو میں کرنا اور اس کے دل کو اپنے پنجہ عشق میں لینا چاہا مگر یہ میرے قابو میں نہیں آیا، اب میں یہ کہے دیتی ہوں کہ اس نے میرا کہنا نہ مانا تو قید خانے کی ہوا کھائے گا اور بے عزت ہو کر رہے گا۔ معاملہ جب اس حد تک پہنچ گیا تو عزیز مصر نے باوجودیکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو پاکباز اور پختہ کردار پرکھ لیا تھا، اپنی بیوی کی فضیحت و رسوائی دیکھ کر یہ طے کر لیا کہ یوسف علیہ السلام کو کچھ عرصہ کے لئے قید خانہ میں ڈال دے تاکہ یہ معاملہ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے اور چرچے بند ہو جائیں اور اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ وہ نو برس تک قید خانہ میں پڑے رہے تاآنکہ بعض واقعات کے نتیجہ میں مصر کا بادشاہ فرعون تک ان کی بزرگی، جلالت قدر اور عظمت شان کا قائل ہو گیا تو اس نے ان کی رہائی کا حکم جاری کر دیا، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ پہلے میرے معاملہ کی تحقیق کرو اور جن عورتوں نے مجھے دیکھ کر اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں ان سے میرے کردار اور میری پاکیزگی کی چھان بین کرو، جب تک معاملہ کی اصل صورت سامنے نہیں آجائے گی اور میرا بے قصور اور صاحب عصمت ہونا پوری طرح ظاہر و ثابت نہیں ہو جائے گا میری عزت نفس جیل سے باہر آنا گوارا نہیں کرے گی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر یوسف علیہ السلام کی جگہ میں ہوتا اور مجھے اتنی طویل مدت تک قید خانہ میں رہنا پڑ جاتا تو رہائی کا پروانہ آتے ہی اس کو قبول کر لیتا اور جیل سے باہر آنے میں کوئی توقف نہ کرتا، نہ اس بات کا مطالبہ کرتا کہ صورت حال کی مکمل تحقیق و تفتیش ہو اور نہ اس تحقیق و تفتیش کے نتیجہ کے ساتھ اپنی رہائی کو مشروط کرتا! یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی زبردست تعریف و تحسین اور ان کے صبر و ثبات اور متانت رائے کا اظہار و اعتراف ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ کوئی شخص ایک مدت دراز تک جیل کی کوٹھری میں بند اور وہاں کے مصائب و آلام میں مبتلا رہے اور جب اس کی رہائی کا پروانہ آئے تو وہ شخص اپنی عزت نفس کی خاطر اس پروانے کو ٹھکرا دے اور جیل سے باہر آنے سے اس وقت تک کے لئے انکار کر دے جب تک کہ اس کو بالکل بے داغ اور بے قصور قرار نہ دے دیا جائے۔ صبر و استقامت کی ایک ایسی مثال ہے جس کا کسی اور کے لئے تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام ہی کا کمال تھا کہ انہوں نے بے مثل کردار کا ثبوت دیا۔ تاہم یہ واضح رہے کہ آنحضرت نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس کردار اور ان کی شان استقامت کا ذکر جس انداز میں فرمایا وہ تواضع و کسر نفسی پر محمول ہے ورنہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی صبر و استقامت کا ایسا پیکر جلیل تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام ہی کے اس صبر و استقامت پر بھاری نہیں ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ وصف تمام اولوالعزم انبیاء سے بلند و بالا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایذاء بنی اسرائیل

⑨ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مُوْسٰى كَانَ رَجُلًا حَيِيًّا سِتِّيْرًا لَا يُرٰى مِنْ جِلْدِهٖ شَيْءٌ اِسْتِحْيَاءً فَاٰذَاهُ مَنْ اٰذَاهُ مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ فَقَالُوْا مَاتَسَتَّرَ هٰذَا التَّسَتُّرَ اِلَّا مِنْ عَيْبٍ بِجِلْدِهٖ اِمَّا بَرَصٌ اَوْ اُدْرَةٌ وَاِنَّ اللّٰهَ اَرَادَ اَنْ يُّبَرِّئَهٗ فَخَلَا يَوْمًا وَحْدَهٗ لِيَغْتَسِلَ فَوَضَعَ ثَوْبَهٗ عَلٰى حَجَرٍ فَفَرَّ الْحَجَرُ بِثَوْبِهٖ فَجَمَعَ مُوْسٰى فِيْ اَثَرِهٖ يَقُوْلُ ثَوْبِيْ يَا حَجَرُ ثَوْبِيْ يَا حَجَرُ حَتّٰى انْتَهٰى اِلٰى مَلَاءٍ مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ فَرَاَوْهُ عُرْيَانًا اَحْسَنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ وَقَالُوْا وَاللّٰهِ مَا بِمُوْسٰى مِنْ بَاْسٍ وَاَخَذَ ثَوْبَهٗ وَطَفِقَ بِالْحَجَرِ ضَرْبًا فَوَاللّٰهِ اِنَّ بِالْحَجَرِ لَنَدَبًا مِنْ اَثَرِ ضَرْبِهٖ ثَلٰثًا اَوْ اَرْبَعًا اَوْ خَمْسًا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام ایک نہایت شرمیلے اور سخت پردہ کا اہتمام رکھنے والے آدمی

تھے، ان پر شرم وحیا کا اتنا غلبہ تھا کہ (پورے بدن کو ہر وقت ڈھانپے رہتے تھے اور) ان کے جسم کی کھال کا کوئی بھی حصہ دکھائی نہ دیتا تھا، ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں نے ان کو ایذا اور رنج پہنچانا چاہا تو انہوں نے مشہور کر دیا کہ موسی علیہ السلام اپنے جسم کو اس قدر احتیاط و اہتمام کے ساتھ اس لئے ڈھانپے رہتے ہیں کہ ان کے جسم میں کوئی عیب ہے، یا تو برص (کوڑھ) ہے یا خصیے پھولے ہوئے ہیں۔ (جب یہ بات بہت پھیل گئی تو) اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ جو عیب موسی علیہ السلام پر لگایا جا رہا ہے اس سے ان کو محفوظ و مامون رکھے اور ان کی بے عیبی کو ظاہر و ثابت کرے، چنانچہ ایک دن جب کہ موسی علیہ السلام ایک پوشیدہ جگہ نہانے کے لئے گئے اور اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیئے تو وہ پتھر ان کے کپڑوں کو لے کر بھاگا، موسی علیہ السلام نے (یہ ماجرا دیکھا تو نہایت حیرانی و اضطراب کے عالم میں) اس پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ اے پتھر میرے کپڑے دے، ارے او پتھر میرے کپڑے دے، یہاں تک کہ (آگے آگے پتھر اور اس کے پیچھے پیچھے) حضرت موسی دوڑتے ہوئے بنی اسرائیل کے لوگوں کے ہجوم تک پہنچ گئے، ہجوم نے حضرت موسی علیہ السلام کا برہنہ جسم دیکھا تو ان کو خدا کی مخلوق میں ایک بہترین اور بے عیب جسم کا انسان پایا، تب انہوں نے (بیک آواز) کہا کہ خدا کی قسم، موسی کا بدن کسی بھی عیب و نقصان سے پاک و مبرا ہے۔ اور موسی علیہ السلام نے پتھر کو (لاٹھی سے) مارنا شروع کیا، خدا کی قسم موسی علیہ السلام کے مارنے کی وجہ سے اس پتھر پر نشان پڑ گئے، تین نشان یا چار نشان یا پانچ نشان۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بنی اسرائیل اپنے پیغمبر حضرت موسی علیہ السلام کو کس طرح سخت اذیت و تکلیف پہنچاتے تھے اس کا اندازہ اس حدیث میں مذکورہ واقعہ سے کیا جا سکتا ہے، بت پرستی کی فرمائش، گوسالہ پرستی میں انہماک، قبول تورات سے انکار، ارض مقدس میں داخلہ سے انکار اور من و سلوی پر ناسپاسی حتیٰ کہ ان کی ذات پر بہتان تراشی اور تہمت تراشی ایسی کونسی قولی فعلی ایذا تھی جو ان کی طرف سے حضرت موسی علیہ السلام کو نہیں پہنچی! یہ حضرت موسی علیہ السلام کی اولو العزمی اور ان کے صبر و ضبط کا کمال تھا کہ وہ اپنی قوم کی ہر ایذا کو برداشت کرتے اور اپنے خدا کی طرف سے رشد و ہدایت کے پیغام میں انہماک کے جذبہ عمل کو سرد نہیں ہونے دیتے تھے، اور یہ ان کے خدا کا ان پر انعام تھا کہ ہر مرحلہ پر اس نکمی اور پست قوم کے مقابلہ پر ان کو سرخ روئی اور عزت عطا ہوئی تھی۔ جب بد بخت قوم کے لوگوں نے ان کے وصف شرم و حیاء کی تحسین و تقلید کے بجائے ان کی ذات کو عیب دار بنانے کا بیڑا اٹھالیا اور پوری قوت کے ساتھ یہ مشہور کر دیا کہ موسی علیہ السلام اپنے جسم کو جو اتنا زیادہ چھپاتے ہیں اور اپنے بدن کے ان حصوں پر بھی نگاہ نہیں پڑنے دیتے جو ستر میں شامل نہیں ہیں، یہاں تک کہ سب کی نظروں سے چھپ کر تنہائی میں نہاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے حصۂ جسم پر برص کے داغ ہیں، یا ان کے خصیے پھول گئے ہیں، یا کوئی اسی قسم کا خراب مرض ان کو لاحق ہے! چنانچہ حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ موسی علیہ السلام کے بے عیب اور باوجاہت بدن کا عام مشاہدہ کرا دیا جائے تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے حقیقت حال کو دیکھ لیں اور ایک رسوا کن شہرت کی قلعی کھل جائے! اس طرح پتھر کا کپڑا لے کر بھاگنے کا وہ واقعہ پیش آیا جس کا حدیث میں ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی ہدایت اور دینی خدمت کی راہ میں سرگرم عمل رہنے والے اپنے برگزیدہ بندوں کو ہر اس عیب اور نقصان سے آخر کار بری اور پاک ثابت کر دیتا ہے، جو ان کے مخالف اور نادان لوگ ان کی طرف منسوب کر کے ان کو متہم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے ان مخلص بندوں کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ اس لئے کرتا ہے تاکہ وہ عام لوگوں کی نگاہ میں معزز و مکرم ہوں اور ان کی شخصی وجاہت الزامات و اتہامات کے گرد و غبار سے صاف رہے۔

"مارنے کی وجہ سے اس پتھر پر نشان پڑ گئے......." یعنی جب وہ پتھر حضرت موسی علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تو ان پر اس اچانک واقعہ کا ایسا اثر پڑا کہ وہ غصہ میں جھنجھلا کر پتھر پر لاٹھی کے وار کرنے لگے، اور جب بھی ان کی لاٹھی پتھر پر پڑتی اس پر ایک نشان پڑ جاتا، اس طرح جتنی بار انہوں نے لاٹھی ماری اتنے ہی نشان اس پتھر پر پڑ گئے۔ اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ جب حضرت موسی علیہ السلام گھبراہٹ اور غصہ میں اس پتھر کے پیچھے بھاگے اور آخر کار وہ پتھر بنی اسرائیل کے ایک بڑے مجمع کے سامنے ٹھہر گیا تو

حضرت موسی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ اس پتھر کو اٹھا کر اپنے ساتھ رکھیں، چنانچہ وہ پتھر ان کے ساتھ رہا اور جب وہ بنی اسرائیل کے ساتھ تیہ کے میدان (صحراء سینا) میں پہنچے تو اس وقت انہوں نے پتھر پر اپنی لاٹھی سے ایک ضرب یا کئی ضربیں لگائیں اور پتھر میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ اس قول کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم میں حضرت موسی علیہ السلام کا یہ معجزہ بیان کیا گیا ہے کہ جب بنی اسرائیل صحراء سینا میں پہنچ کر اس خیال سے گھبرا اٹھے کہ اس بے آب وگیاہ میدان میں پانی کہاں سے پئیں گے اور پھر حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا عصا ایک پہاڑی چٹان پر مارا جس کے نتیجہ میں فوراً بارہ سوت ابل پڑے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے جدا جدا چشمے جاری ہو گئے تو اس "پہاڑی چٹان" سے مراد وہی پتھر ہے جو حضرت موسی علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا اور جس کو حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنے ساتھ رکھ چھوڑا تھا۔ بہر حال حدیث سے حضرت موسی علیہ السلام کے دو معجزے ثابت ہوئے، ایک تو بے جان پتھر کا حرکت میں آجانا اور چلنے لگنا اور دوسرا حضرت موسی علیہ السلام کی لاٹھی کی ضرب سے اس پتھر پر نشان پڑ جانا۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پوشیدہ جگہ پر ننگے بدن نہانا جائز ہے اگرچہ ایسی جگہ نہاتے وقت بھی ستر ڈھانکنا افضل ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مخالفین اور نادانوں کی ایذاء انبیاء اور اولیاء اللہ پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں، لیکن اس ایذاء پر صبر وضبط کرتے ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا ایک واقعہ

(۱۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَيُّوْبُ يَغْتَسِلُ عُرْيَانًا فَخَرَّ عَلَيْهِ جَرَادٌ مِّنْ ذَهَبٍ فَجَعَلَ اَيُّوْبُ يَحْثِيْ فِيْ ثَوْبِهٖ فَنَادَاهُ رَبُّهٗ يَا اَيُّوْبُ اَلَمْ اَكُنْ اَغْنَيْتُكَ عَمَّا تَرٰى قَالَ بَلٰى وَعِزَّتِكَ وَلٰكِنْ لَّا غِنٰى بِيْ عَنْ بَرَكَتِكَ

(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! "حضرت ایوب علیہ السلام (جب طویل اور سخت ترین بیماری کی آزمائش وامتحان میں سرخرو ہوئے اور ان کو صحت وعافیت نصیب ہوئی تو انہوں نے غسل صحت کیا اور اسی غسل صحت کے دوران وہ) برہنہ جسم نہا رہے تھے کہ (اللہ تعالیٰ نے ان کے گھر پر سونے کی ٹڈیاں برسانا شروع کیا اور وہ) سونے کی ٹڈیاں ان کے اوپر (یعنی دائیں بائیں) گرنے لگیں، حضرت ایوب ان ٹڈیوں کو سمیٹ کر اپنے کپڑے میں رکھنے لگے (سونے کی ٹڈیوں میں ان کا یہ انہماک دیکھ کر) ان کے پروردگار نے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ ایوب (علیہ السلام)! جو چیز تم دیکھ رہے ہو کیا ہم نے اس سے تمہیں بے نیاز نہیں کر دیا ہے؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے عرض کی! بیشک تیری عزت کی قسم تو نے مجھے اس چیز سے بے پروا کر دیا ہے لیکن میں تیری نعمت کی کثرت اور تیری رحمت کی فراوانی سے ہرگز بے نیاز نہیں ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: "برہنہ جسم نہا رہے تھے۔" کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم پر تہبند کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں تھا، اور وہ تہبند باندھے ہوئے نہا رہے تھے، اس کی تائید آگے کی عبارت یحثی فِیْ ثوبه (سمیٹ سمیٹ کر اپنے کپڑے میں رکھنے لگے) سے بھی ہوتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ اس وقت کسی پوشیدہ جگہ پر بالکل ننگا نہا رہے تھے جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام کے بارے میں پوشیدہ جگہ پر بالکل ننگے نہانا مذکور ہوا، اور اس کے شرعی جواز میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے، لیکن آنحضرت ﷺ نے گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ اپنے پروردگار سے شرم وحیا کی خاطر پوشیدہ جگہ پر بھی نہاتے وقت ستر پوشی افضل ہے اور آنحضرت ﷺ جس مکارم واخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں تشریف لائے اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔

"ان ٹڈیوں کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے کپڑے میں رکھنے لگے۔" بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام برستی ہوئی سونے کی ٹڈیوں کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر یا دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر انہیں تہبند میں سمیٹتے جاتے تھے جو انہوں نے نہانے کے لئے باندھ رکھا

تھایا "کپڑے" سے مراد وہ پوشاک ہے جو انہوں نے نہانے کے بعد پہنی ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کپڑا مراد ہو جو انہوں نے اس وقت تک پہنا نہ ہو بلکہ ان کے قریب ہی رکھا ہوا ہو۔

حضرت ایوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا مذکورہ خطاب، اظہار ناراضگی اور عتاب کے طور پر نہیں تھا بلکہ اظہار شفقت و محبت کے طور پر تھا کہ جب میں نے تمہارے گھر میں اتنا زیادہ سونا برسا دیا ہے اور تمہیں مالا مال کر دیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ تم ان ٹڈیوں کو اٹھا اٹھا کر اپنے کپڑے میں رکھو۔؟ چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے جواب دیا کہ بے شک تو نے مجھے اس قدر مالا مال کر دیا ہے اور میرے گھر میں اتنا سونا بھر دیا ہے کہ میں ان ٹڈیوں کو جمع کرنے اور ان کو اٹھا اٹھا کر رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رکھتا لیکن تیری بارگاہ میں اپنے عجز و احتیاج کے اظہار کے لئے میں تیری رحمتوں کی مزید طلب سے بے نیاز بھی نہیں ہو سکتا خواہ تو مجھے کتنا ہی مالا مال کر دے اور مجھ پر اپنی نعمتوں اور رحمتوں کی کتنی ہی بارش برسا دے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا ان ٹڈیوں کا اٹھانے میں انہماک و دلچسپی رکھنا، دنیا کی حرص و طمع اور مال و دولت میں اضافہ کی خواہش کی بناء پر نہیں تھا بلکہ حق تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت سے مستفید ہونے اور تشکر و امتنان کی بنا پر تھا۔

اور ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جائز مال و دولت میں اضافہ کی حرص اس شخص کے حق میں روا ہے جس کو اپنے نفس پر اعتماد ہو کہ اس مال و دولت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں کوتاہی نہیں ہوگی اور اس کو انہی مقاصد و مصارف میں خرچ کیا جائے گا جن سے حق تعالیٰ راضی و خوش ہوتا ہے۔

ایک نبی کو دوسرے نبی کے مقابلہ پر بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی ممانعت

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ اسْتَبَّ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَرَجُلٌ مِنَ الْيَهُوْدِ فَقَالَ الْمُسْلِمُ وَالَّذِيْ اصْطَفٰى مُحَمَّدًا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ وَالَّذِيْ اصْطَفٰى مُوْسٰى عَلَى الْعٰلَمِيْنَ فَرَفَعَ الْمُسْلِمُ يَدَهُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَلَطَمَ وَجْهَ الْيَهُوْدِيِّ فَذَهَبَ الْيَهُوْدِيُّ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهُ بِمَا كَانَ مِنْ اَمْرِهٖ وَاَمْرِ الْمُسْلِمِ فَدَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ عَنْ ذٰلِكَ فَاَخْبَرَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُخَيِّرُوْنِيْ عَلٰى مُوْسٰى فَاِنَّ النَّاسَ يَصْعَقُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَصْعَقُ مَعَهُمْ فَاَكُوْنُ اَوَّلَ مَنْ يُّفِيْقُ فَاِذَا مُوْسٰى بَاطِشٌ بِجَانِبِ الْعَرْشِ فَلَا اَدْرِيْ كَانَ فِيْمَنْ صَعِقَ فَاَفَاقَ قَبْلِيْ اَوْ كَانَ فِيْمَنِ اسْتَثْنَى اللّٰهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَلَا اَدْرِيْ اَحُوْسِبَ بِصَعْقَةِ يَوْمَ الطُّوْرِ اَوْ بُعِثَ قَبْلِيْ وَلَا اَقُوْلُ اِنَّ اَحَدًا اَفْضَلُ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ لَا تُخَيِّرُوْا بَيْنَ الْاَنْبِيَآءِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ هُرَيْرَةَ لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ اَنْبِيَآءِ اللّٰهِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ (کسی موقع پر ایک مسلمان اور ایک یہودی کے درمیان بدکلامی ہوئی، مسلمان نے کہا خدا کی قسم جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سارے جہاں کے لوگوں میں سے بہتر قرار دیا، اس کے جواب میں یہودی نے یہ کہا کہ اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو جہاں کے لوگوں میں سب سے بہتر قرار دیا اس پر مسلمان نے (طیش میں آکر) یہودی پر ہاتھ اٹھا دیا اور اس کے گال پر طمانچہ مارا یہودی (شکایت لے کر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنا اور اس مسلمان کا پورا واقعہ رکھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو طلب فرمایا اور اس سے صورت حال کی تحقیق کی، اس نے (یہودی کے بیان کردہ واقعہ کی تردید نہیں کی بلکہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوں کی توں ساری بات بتا دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (فریقین کے بیانات سن کر) فرمایا: مجھ کو موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو اس لئے کہ قیامت کے دن (صور پھونکے جانے پر) جب سب لوگ بیہوش ہو کر گر پڑیں گے تو ان کے ساتھ میں بھی بیہوش ہو کر گر جاؤں گا پھر سب سے پہلے ہوش میں آنے والا شخص میں ہوں گا، لیکن (جب میں ہوش میں آؤں گا تو) دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے

کھڑے ہیں، اور میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا اس وقت یہ ہوگا کہ موسیٰ بیہوش ہو جانے والے لوگوں میں شامل ہوں گے اور ان کی بیہوشی مجھ سے پہلے ختم ہو چکی ہوگی یا یہ ہوگا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ قرار دے دیا ہوگا۔ (اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑنے والے لوگوں میں شامل ہی نہیں ہوں گے)۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا اس وقت یہ ہوگا کہ طور پر موسیٰ علیہ السلام کی بیہوشی کو (قیامت کے دن کی) اس بیہوشی کے حساب میں شمار کر لیا جائے گا یا یہ ہوگا کہ (بیہوش ہو کر گر پڑنے والوں میں وہ بھی شامل ہوں گے مگر) وہ مجھ سے بھی پہلے ہوش میں آ جائیں گے۔ (پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اور میں تو یہ بھی نہیں کہتا کہ کوئی شخص یونس بن متی سے افضل ہے۔"

اور حضرت ابن سعید کی روایت میں یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دونوں فریق کے بیانات سن کر) فرمایا: "تم انبیاء میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہ دو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ۔ "تم خدا کے نبیوں میں کسی کو کسی پر فضیلت نہ دو۔"

تشریح: قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے انی اصطفیتک علی النّاسِ (یعنی اے موسیٰ! میں نے تمہیں تمام لوگوں میں سب سے بہتر و افضل قرار دیا ہے) تو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے زمانہ کے تمام لوگوں میں سب سے بہتر قرار دیا تھا، لیکن اس یہودی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برگزیدگی اور افضیلت کے اس مفہوم کو مطلق رکھا اور یہ دعویٰ کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہر زمانہ کے تمام لوگوں سے افضل اور سب سے بہتر ہیں، اور اس طرح اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برگزیدگی اور افضیلت کا انکار کیا، اسی وجہ سے اس کے مخالف مسلمان کو طیش آ گیا اور انہوں نے اس کے طمانچہ رسید کر دیا۔

"یا یہ ہوگا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ قرار دے دیا ہوگا۔ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو یہ فرمایا ہے کہ۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ط

"اور (جب قیامت کے دن) صور میں پھونک ماری جائے گی تو تمام آسمان اور زمین والے بیہوش ہو جائیں گے علاوہ ان کے جن کو اللہ تعالیٰ بیہوش کرنا نہیں چاہے گا (جیسے فرشتے)۔"

تو ہو سکتا ہے کہ جس طرح فرشتوں پر بیہوشی طاری نہیں ہوگی اس طرح اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی بیہوش ہونے سے مستثنیٰ کر دے گا! بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صورتیں ذکر فرما کر یہ واضح کیا کہ دونوں ہی صورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، اگر یہ ہوگا کہ تمام لوگوں کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بیہوش ہو جائیں گے، تو میرا ہوش میں آنے کے بعد ان کو اس طرح دیکھنا کہ وہ عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں، یہ ثابت کرے گا کہ وہ مجھ سے بھی پہلے ہوش میں آ گئے تھے، اس صورت میں مجھ پر ان کی فضیلت بالکل ظاہری بات ہے، اور اگر یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیہوش ہو جانے والوں میں شامل نہیں کیا جائے گا اور وہ سرے سے بیہوش ہی نہیں ہوں گے حالانکہ مجھ پر بیہوشی طاری ہو جائے گی، تو یہ صورت بھی ان کی فضیلت کو ظاہر کرنے والی ہے، اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس معاملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجھ پر فضیلت حاصل ہے تو پھر مجھ کو ان پر فضیلت دینے کے کیا معنی ہیں۔ لیکن اس بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسر نفسی پر محمول کرنا چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہ انکسار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کو اس طرح ظاہر فرمایا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو جو یہ شرف حاصل ہوگا وہ زیادہ سے زیادہ جزوی فضیلت کی نوعیت رکھتا ہے جو اس بات کے منافی نہیں کہ کلی فضیلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے۔ ایک بات یہ بھی کہی جا سکتا ہے کہ آنحضرت کے اس ارشاد سے جو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہیں ہیں، تو یہ اس وقت کا ارشاد ہے جب کہ وہ وحی نازل نہیں ہوئی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ایک سے افضل و اشرف ہونا مذکور ہے، اس وحی کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کسی شک و شبہ کے بغیر ثابت ہو چکی ہے۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ کوہ طور پر بیہوش ہو کر گر پڑنا........الخ۔ اس جملہ کی وضاحت یہ ہے کہ جب حضرت موسی علیہ السلام نے کوہ طور پر حق تعالیٰ کی ذات کے دیدار کی خواہش کی تو بارگاہ رب العزت سے جواب ملا کہ موسی علیہ السلام! تم مشاہدہ ذات کی تاب نہ لاسکو گے اچھا دیکھو ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے اگر یہ اس تجلی کو برداشت کرلے تو پھر تم اپنی خواہش ظاہر کرنا۔ اس کے بعد طور پر حضرت حق کی تجلی نے ظہور کیا تو پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسی علیہ السلام بھی اس نظارہ کی تاب نہ لاکر بیہوش ہو گئے اور گر پڑے۔

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ طور پر حضرت موسی علیہ السلام کی اسی بیہوشی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اگر حضرت موسی علیہ السلام قیامت کے دن اس موقع پر بیہوش ہو کر گر پڑنے سے محفوظ و مستثنیٰ رکھے جائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ اس استثنا کی وجہ ان کی کوہ طور کی بیہوشی ہو جس کو قیامت کی اس بیہوشی کے حساب میں شمار کر لیا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہاں جس صعقہ (یعنی قیامت کے دن بیہوش ہو جانے کا ذکر ہے اس سے وہ صعقہ مراد نہیں ہے جو "موت وہلاکت" کے معنی میں ہے اور جس کا ظہور ابتداء قیامت میں صور پھونکے جانے کے بعد ہو گا کیونکہ اس صعقہ کے وقت، کہ جب پہلا صور پھونکے جانے کے بعد تمام عالم زیر وزبر ہو جائے گا اور ہر متنفس کی موت وہلاکت واقع ہو گی، بھلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسی علیہ السلام کہاں موجود ہوں گے کہ ان پر صعقہ طاری ہو گا، پھر یہ کہ اس صعقہ کے بعد بعث (یعنی دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا) ہو گا نہ کہ افاقت (یعنی بیہوشی کا زائل ہونا) اور یہ بات بھی متفقہ طور پر مسلم ہے کہ اس صعقہ کے بعد (میدان حشر میں) سب سے پہلے اٹھنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ فلا ادری کان فیمن صعق الخ خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صعقہ کا ذکر فرمایا ہے اس سے وہ صعقہ مراد ہے جو بعث کے بعد میدان حشر میں پیش آئے گا کہ سب لوگ بیہوش ہو کر گر پڑیں گے اور اس کے بعد جب سب لوگ افاقہ پائیں گے یعنی ہوش میں آئیں گے تو سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوش آئے گا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھیں گے کہ حضرت موسی علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہو گا کہ یا تو حضرت موسی علیہ السلام بیہوش ہونے والوں میں شامل ہی نہیں ہوں گے یا وہ بھی بیہوش ہوئے ہوں گے تو پھر ان کی بیہوشی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پہلے زائل ہو چکی ہو گی۔ بہر حال اس ارشاد گرامی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ "مجھے موسی علیہ السلام پر فضیلت نہ دو" تو اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ انبیاء کے درمیان شرف و فضیلت کے اعتبار سے کوئی فرق مراتب نہیں اور یہ کہ حضرت موسی علیہ السلام یا کسی بھی نبی کے مقابلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل نہ کہا جائے بلکہ اس ارشاد کا اصل قصد یہ ہدایت دینا ہے کہ کسی نبی کو خواہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات کیوں نہ ہوں، کسی دوسرے نبی کے مقابلہ پر اس طرح اور اس انداز میں افضل واشرف نہ کہو کہ اس (مفضول) نبی کی تحقیر و توہین ہو یا یہ ظاہر ہو کہ ایک نبی کو تو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے اور دوسرے نبی کو مرتبہ سے گرایا جا رہا ہے کیونکہ اس طرح کا اظہار فضیلت نہ صرف یہ کہ انبیاء کی عظمت اور ان کے احترام کے خلاف ہے، بلکہ مختلف نبیوں کے ماننے والوں کے درمیان باہمی خصومت وعداوت کا سبب بھی ہے۔ یا مذکورہ ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ کسی نبی کو کسی نبی کے مقابلہ پر فضل و شرف کے تمام انواع کے ساتھ اس طرح فضیلت و فوقیت نہ دو کہ اس (مفضول) نبی کے لئے کوئی بھی فضیلت باقی نہ رہے۔ اور یا یہ کہ اس ارشاد میں نفس نبوت کے اعتبار سے فضیلت دینے کی ممانعت مراد ہے کیونکہ نفس نبوت کے اعتبار سے تمام انبیاء برابر ہیں اور ہر نبی یکساں حیثیت رکھتا ہے۔

اور میں تو یہ بھی نہیں کہتا کہ کوئی شخص یونس ابن متی سے افضل ہے۔" میں لفظ "متی" حضرت یونس علیہ السلام کے باپ کا نام تھا، جیسا کہ قاموس میں مذکور ہے، لیکن جامع الاصول میں یہ ہے کہ متی ان کی ماں کا نام تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کے خاص طور پر ذکر کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اولو العزمی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ یہ کیا کہ جب ان کی قوم نے ان کی بات نہ مانی اور ان کو ایذاء پہنچائی تو وہ بے صبری اور غصہ کے مارے قوم کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور کشتی میں جا بیٹھے۔ لہٰذا ان کا یہ طرز عمل لوگوں کو اس گمان میں مبتلا کر سکتا تھا کہ ان کے مقابلہ پر کسی نبی کو فضیلت دینا موزوں ہے اور یہ کہنا غیر مناسب بات نہیں ہے کہ حضرت یونس کے مقابلہ پر فلاں نبی

زیادہ افضل ہے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ اپنی اُمت کے لوگوں کو اس گمان سے بھی باز رکھا اور واضح کیا کہ یہ حضرت یونس علیہ السلام کی ذات پر طعن اور ان کی تحقیر کے مرادف ہے۔

"تم کسی نبی کو کسی نبی پر فوقیت نہ دو۔" کا مطلب یہ ہے کہ یوں نہ کہو کہ فلاں نبی کے مقابلہ پر فلاں نبی افضل ہے۔ اور یہی مطلب اس ارشاد کا ہے کہ تم خدا کے نبیوں میں کسی کو کسی پر فضیلت نہ دو۔" اور جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے اس ممانعت سے یا تو یہ مراد ہے کہ نفس نبوت کے اعتبار سے کسی نبی کو کسی نبی کے مقابلہ پر فضیلت و فوقیت نہ دو کیونکہ اصل مرتبۂ نبوت کے اعتبار سے تمام انبیاء برابر ہیں، یا یہ مراد ہے کہ کسی نبی کو کسی نبی کے مقابلہ پر اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش نہ کرو اور کسی نبی کی افضیلت کو اس انداز میں بیان نہ کرو کہ دوسرے نبیوں کی تحقیر و توہین لازم آئے کیونکہ یہ چیز (یعنی کسی نبی کی تحقیر و توہین کا مرتکب ہونا) کفر ہے۔ اور یا یہ کہ آپ ﷺ نے یہ ممانعت اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب کہ آنحضرت ﷺ کی افضیلت کو ظاہر کرنے والی وحی نازل نہیں ہوئی تھی، اس وحی کے نزول کے بعد یہ ممانعت ختم ہوگئی اور یہ بات ثابت قرار پائی کہ آنحضرت ﷺ تمام انبیاء سے افضل ہیں، اور آپ ﷺ کو کسی بھی نبی کے مقابلہ پر افضل و اشرف کہنا درست ہے۔

لا تفضلو ابین انبیاء اللہ لفظ "تفضلوا" مشکوۃ کے اکثر نسخوں میں ضاء ہی کے ساتھ منقول ہے لیکن ایک نسخہ میں یہ لفظ صاد کے ساتھ (لا تفصلوا) منقول ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "تم خدا کے نبیوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہ کرو" اس صورت میں کہا جائے گا کہ یہ ارشاد قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے لا نفرق بین احد منھم۔

حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ایک ہدایت

(۱۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَایَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ اَنْ یَّقُوْلَ اِنِّیْ خَیْرٌ مِنْ یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِلْبُخَارِیِّ قَالَ مَنْ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی فَقَدْ کَذَبَ

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میں یونس علیہ السلام ابن متی سے بہتر ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ) اور بخاریؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص یہ کہے کہ میں یونس ابن متی سے بہتر ہوں تو یقیناً وہ جھوٹا ہے۔

تشریح: "کوئی شخص یہ کہے کہ میں یونس ابن متی سے بہتر ہوں۔" یہ عبارت دو احتمال رکھتی ہے، ایک تو یہ کہ کوئی شخص مجھ کو (یعنی آنحضرت ﷺ کو) یونس ابن متی سے افضل و بہتر نہ کہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کوئی شخص خود اپنے بارے میں یہ نہ کہے کہ میں حضرت یونس علیہ السلام سے بہتر و افضل ہوں! کیونکہ کوئی بڑے سے بڑا ولی بھی کسی نبی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جب کوئی شخص کسی نبی کا ہمسر نہیں ہو سکتا تو نبی سے بہتر و افضل ہونے کا دعوی کیسے کر سکتا ہے۔

"تو یقیناً وہ جھوٹا ہے۔" اگر حدیث کے الفاظ کی مراد دوسرے احتمال کی روشنی میں متعین کی جائے تو پھر یہاں "جھوٹ" سے مراد کفر ہوگا، اس طرح کی بات کہنے والا شخص کافر ہو جائے گا کیونکہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص خود کو کسی بھی نبی اور پیغمبر سے بہتر و افضل قرار دے وہ کافر ہے۔ رہی پہلے احتمال کی بات تو آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ کوئی مجھ کو یونس ابن متی سے بہتر و افضل نہ کہے، تواضع اور کسر نفسی پر محمول ہے کہ آپ ﷺ نے انکسار نفس کے طور پر ایسا فرمایا لہٰذا یہ حدیث اس روایت کے مخالف نہیں ہوگی جس میں آپ نے یہ فرمایا کہ انا سید ولد ادم وَلا فخر یعنی میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں، اور میں یہ بات از راہ فخر نہیں کہتا (بلکہ اظہار حقیقت اور تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں)۔ اور حضرت یونس علیہ السلام کے تخصیص کی وجہ پچھلی حدیث کی تشریح میں بیان کی جا چکی ہے۔

حضرت خضر کا ذکر

⑬ وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغُلَامَ الَّذِیْ قَتَلَہُ الْخَضِرُ طُبِعَ کَافِرًا وَلَوْ عَاشَ لَاَرْھَقَ اَبَوَیْہِ طُغْیَانًا وَکُفْرًا (متفق علیہ)

"اور حضرت ابی ابن کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! "حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو مار ڈالا تھا وہ کفر کی طبیعت لے کر پیدا ہوا تھا، اگر وہ لڑکا زندہ رہتا تو یقیناً اپنے ماں باپ کو کفر و سرکشی میں مبتلا کر دیتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کفر کی طبیعت لے کر پیدا ہوا تھا۔" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مقدر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہوگا۔ پس یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔

کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام۔ "ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔"

کیونکہ "فطرت اسلام پر پیدا ہونے" کا مطلب، فطرت انسانی کا ایسی ساخت کا ہونا ہے جو نور ہدایت کی طرف لپکے اور اسلام کو قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتی ہے۔ اور یہ بات اس چیز کے منافی نہیں ہے کہ کوئی نومولود بچہ آگے چل کر اپنے ماحول اور اپنے نفس کی گمراہیوں کا اس طرح شکار ہو جائے کہ اس کی وہ استعداد و صلاحیت دب کر رہ جائے اور وہ اپنی اصل فطرت کے تقاضوں پر قائم نہ رہ سکے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہو۔

"لفظ خضر" خ کے زیر کے ساتھ خِضر ہے اور ایک نسخے میں یہ لفظ خ کے زیر اور ض کے جزم کے ساتھ خِضْر منقول ہے، یہ ان کا لقب ہے، اصل نام لیان ابن ملکان ہے! بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ یہ حضرت الیاس علیہ السلام کے بھائی ہیں، بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے تھے اور بعض نے ان کو بہفت واسطہ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے کہا ہے اور وضاحت کی ہے کہ ان کے باپ سلاطین میں سے تھے، ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تھے۔ مشہور قول کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام پیغمبر ہیں، عمر طویل رکھتے ہیں، عام نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ زندہ ہیں بلکہ قیامت کے دن تک زندہ رہیں گے کیونکہ انہوں نے آب حیات پی رکھا ہے لیکن بعض بڑے محدثین جیسے بخاریؒ اور ابن مبارکؒ وغیرہ نے ان کی حیات۔ ابدی کا انکار کیا ہے! جمہور علماء صوفیاء اور بہت سے صلحاء ان کی حیات کے قائل ہیں! نیز حضرت خضر علیہ السلام کا بعض صلحاء سے ملاقات کرنا، ان سے ہم کلام ہونا اور خیر و بھلائی کی جگہوں پر ان کا موجود ہونا بہت مشہور ہے، مشائخ کے حالات و کلام میں ان کا بہت ذکر آتا ہے اور عجیب و غریب واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ حضرت غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخؒ کسی مسئلہ پر حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے کہ اچانک انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو ہوا پر سوار گذرتے دیکھا اور فرمایا۔

قف یا اسرائیلی واسمع کلام محمدی۔ "اے اسرائیلی (خضر!) ٹھہریئے کلام محمدی سنتے جایئے۔"

چنانچہ منقول ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ میں سے جو بھی حضرت خضر علیہ السلام کو ملتا، آپ اس کو یہ ہدایت فرماتے کہ شیخ عبدالقادر کی مجلس میں ضرور جایا کرو، کیونکہ ان مجلسوں میں برکتیں نازل ہوتی ہیں اور وہاں فلاح و سعادت حاصل ہوتی ہے۔

خضر کی وجہ تسمیہ

⑭ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا سُمِّیَ الْخَضِرُ لِاَنَّہٗ جَلَسَ عَلٰی فَرْوَۃٍ بَیْضَاءَ فَاِذَا ھِیَ تَھْتَزُّ مِنْ خَلْفِہٖ خَضْرَاءَ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "حضرت خضر علیہ السلام کا نام "خضر" (یعنی سرسبز وشاداب) اس لئے مشہور ہوا کہ وہ ایک خشک وبنجر سفید زمین پر (یا بالکل خشک گھاس پر) بیٹھے تو یکایک وہ زمین (یا خشک گھاس) ان کے پیچھے سے لہلہانے لگی اور وہاں سبزہ پیدا ہو گیا۔" (بخاریؒ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور موت کا فرشتہ

(۱۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَآءَ مَلَكُ الْمَوْتِ اِلٰى مُوْسٰى بْنِ عِمْرَانَ فَقَالَ لَهٗ اَجِبْ رَبَّكَ قَالَ فَلَطَمَ مُوْسٰى عَيْنَ مَلَكِ الْمَوْتِ فَفَقَأَهَا قَالَ فَرَجَعَ الْمَلَكُ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى فَقَالَ اِنَّكَ اَرْسَلْتَنِىْ اِلٰى عَبْدٍ لَكَ لَا يُرِيْدُ الْمَوْتَ وَقَدْ فَقَأَ عَيْنِىْ قَالَ فَرَدَّ اللّٰهُ اِلَيْهِ عَيْنَهٗ وَقَالَ ارْجِعْ اِلٰى عَبْدِىْ فَقُلِ الْحَيٰوةَ تُرِيْدُ فَاِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْحَيٰوةَ فَضَعْ يَدَكَ عَلٰى مَتْنِ ثَوْرٍ فَمَا تَوَارَتْ يَدُكَ مِنْ شَعْرِهٖ فَاِنَّكَ تَعِيْشُ بِهَا سَنَةً قَالَ ثُمَّ مَهْ؟ قَالَ ثُمَّ تَمُوْتُ قَالَ فَالْاٰنَ مِنْ قَرِيْبٍ رَبِّ اَدْنِنِىْ مِنَ الْاَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ رَمْيَةً بِحَجَرٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَوْ اَنِّىْ عِنْدَهٗ لَاَرَيْتُكُمْ قَبْرَهٗ اِلٰى جَنْبِ الطَّرِيْقِ عِنْدَ الْكَثِيْبِ الْاَحْمَرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "(جب) حضرت موسیٰ ابن عمران علیہ السلام (کی موت کا وقت قریب آیا تو ان) کے پاس موت کا فرشتہ (عزرائیل علیہ السلام) آیا اور کہا کہ اپنے پروردگار کی طرف سے پیغام اجل کو قبول فرمایئے (یعنی آپ کی روح قبض ہونے کا وقت آپہنچا ہے، واصل الی اللہ ہونے کے لئے تیار ہو جایئے)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے (یہ سن کر) فرشتہ موت کے طمانچہ رسید کر دیا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: موت کا فرشتہ دربار الٰہی میں واپس گیا اور عرض کیا کہ (پروردگار!) تو نے مجھے (روح قبض کرنے کے لئے) اپنے ایک ایسے بندے کے پاس بھیجا جو موت نہیں چاہتا اور یہ کہ اس نے (طمانچہ رسید کر کے) میری آنکھ بھی پھوڑ دی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے (فرشتہ موت کی یہ شکایت سن کر) اسکی آنکھ درست کر دی اور حکم دیا کہ میرے بندہ (موسیٰ علیہ السلام) کے پاس دوبارہ جاؤ اور ان کو میرا یہ پیغام پہنچاؤ کہ کیا تم طویل زندگی چاہتے ہو؟ اگر تم طویل زندگی چاہتے ہو تو کسی بیل کی کمر پر اپنا (ایک) ہاتھ (یا دونوں ہاتھ) رکھ دو، تمہارے اس ہاتھ (یا دونوں ہاتھوں کے نیچے جتنے بال آجائیں گے، ان میں سے ہر ایک بال کے عوض تمہاری زندگی میں ایک سال کا اضافہ ہو جائے گا (فرشتہ نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنایا تو) انہوں نے کہا کہ اس (طویل زندگی کا بھی آخری نتیجہ موت ہی ہے) تو پھر وہ آج ہی کیوں نہ آجائے (میں اسی وقت موت کی آغوش میں جانے کے لئے تیار ہوں، لیکن میری یہ دعا ضرور ہے کہ) رب کریم! (تدفین کے لئے) مجھے ارض مقدس (یعنی بیت المقدس) سے قریب کر دے اگرچہ ایک پھینکے ہوئے پتھر کے بقدر ہو۔" (اس کے بعد) رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر میں بیت المقدس کے قریب ہوتا تو تمہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر (کا نشان) دکھا دیتا جو ایک راستہ کے کنارے پر سرخ ٹیلے کے قریب ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "رب کریم مجھے ارض مقدس سے قریب کر دے۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آخری وقت میں یہ دعا اس لئے کی کہ وہ بیت المقدس کے قریب دفن ہونا چاہتے تھے، اور اس زمانہ میں وہی جگہ سب جگہوں سے افضل واشرف تھی کیونکہ وہاں انبیاء کا مدفن اور ان کے مزارات تھے۔ ہو سکتا ہے کہ مذکورہ واقعہ کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام میدان تیہ (صحرا سینا) میں ہوں گے لہٰذا انہوں نے آخری وقت میں بیت الرب (یعنی بیت المقدس) کی قربت کی خواہش ظاہر کی اور اس خواہش کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے کہا کہ چاہے یہاں سے وہ قربت اتنے کم فاصلہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو جو ایک پھینکا ہوا پتھر طے کرتا ہے۔ نیز انہوں نے بیت المقدس کے قریب دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی خود بیت المقدس میں دفن ہونے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا، کیونکہ انہیں یہ خوف تھا کہ اگر میں نے بیت المقدس میں دفن

ہونے کی خواہش کی تو میری قبر بہت مشہور اور زیارت گاہ خلائق ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ لوگ اس کی وجہ سے کتنی فتنہ اور برائی میں مبتلا ہو جائیں۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ حدیث میں جس "سرخ ٹیلے" کا ذکر ہے وہ ایک بستی اریحاء کے قریب ہے، اور یہ بستی میدان تیہ کے سب کے قریب وادی مقدس کا علاقہ ہے! بہر حال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صلحاء کے مزارات و مدفن کے قریب اور متبرک جگہوں میں دفن ہونا مستحب ہے۔

یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ بعض لوگوں نے، جو عقل و قیاس کے اسیر ہیں، اس حدیث کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ فرشتہ موت کا آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا کیا معنی رکھتا ہے، روح قبض کرنے کے لئے آنے والے فرشتہ کے طمانچہ رسید کرنا انسانی طاقت کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے اور یہ کہ اس واقعہ سے موت کو غیر پسندیدہ اور غیر مرغوب شئے سمجھنا اور دنیا میں زیادہ دنوں تک باقی رہنے کی آرزو کرنا لازم آتا ہے اور یہ چیز اس انسان کے شایان شان نہیں ہو سکتی جو نبوت و رسالت جیسے عظیم الشان منصب پر فائز ہو۔ ان باتوں کا جواب الفاظ حدیث کی اس تعبیر میں مل جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں موت کا فرشتہ حاضر ہوا تو وہ انسانی شکل و صورت میں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو دیکھ کر پہچان نہ سکے کہ یہ موت کا فرشتہ ہے اور میری روح قبض کرنے آیا ہے، ان کو یہ ناگوار گذرا کہ ایک اجنبی شخص بغیر اجازت کیوں ان کے خلوت کدہ میں گھس آیا ہے، پھر اس نے ان کو موت کا پیغام دیا تو یہ خطرہ بھی ہوا کہ کہیں یہ شخص قتل کرنے کی نیت سے تو میرے پاس نہیں آیا ہے اس لئے ان کو طیش بھی آیا اور انہوں نے اس کے خلاف دفاعی اقدام کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا، فرشتہ بشکل انسان تھا لہٰذا بشری اثرات نے کام کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زبردست طمانچہ کی چوٹ سے اس کی آنکھ جاتی رہی۔ پھر یہ کہ انہوں نے اس کو ایک دروغ گو کی حیثیت میں بھی دیکھا کیونکہ اس نے روح قبض کرنے کا دعوی کیا تھا اور ظاہر تھا کہ کوئی انسان روح قبض کرنے والا نہیں ہو سکتا ہے لہٰذا ان کو اس دروغ گوئی پر غصہ آیا اور دروغ گو پر غصہ للہ فی اللہ ہوتا ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوئی اعتراض کیسے وارد ہو سکتا ہے اور یہی وجہ ہے ان کے اس اقدام پر بارگاہ حق سے کوئی عتاب بھی نہیں ہوا۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس اقدام کے بعد بھی فرشتہ موت نے اپنی اصل حیثیت ظاہر نہ کی اور ان کو یہ بتائے بغیر کہ وہ موت کا فرشتہ ہے غائب ہو گیا اور درگاہ الٰہی میں جا پہنچا، اب اللہ تعالیٰ نے اس کو پھر ملکوتی ہیئت پر واپس کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں دوبارہ بھیجا اور اس طرح وہ اس عیب و نقصان سے بری ہو گیا جو بشری شکل و صورت میں آنکھ مجروح ہو جانے سے پیدا ہو گیا تھا، ادھر فرشتہ موت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیالات سے آشنا ہوئے بغیر خود ہی یہ سمجھ لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موت کے نام سے خفا ہو گئے اور موت نہیں چاہتے اور دربار الٰہی میں جا کر یہی شکایت بھی کی لیکن اللہ تعالیٰ تو اصل صورت حال جانتا تھا اس نے فرشتہ کی غلط فہمی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت شان دونوں کے اظہار کے لئے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ فرشتہ موت دوبارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو اور ایک بلیغ انداز میں موت کا پیغام پہنچائے، ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس اجنبی شخص کے یکایک غائب ہو جانے پر فوراً محسوس کر لیا کہ در حقیقت یہ معاملہ عالم بالا کا ہے، چنانچہ فرشتہ موت نے جب دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغام الٰہی سنایا تو ان کا طرز عمل اور طریقہ گفتگو فوراً بدل گیا پھر انہوں نے پیغام اجل کو لبیک کہنے میں دیر نہیں کی اور رفیق اعلی سے جا ملے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج میں نہایت تیزی و شدت تھی وہ جلال کا مظہر تھے، مزاج اور اصول کے خلاف کوئی بات ان کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ "چلہ کشی" اور تورات لینے کے لئے جبل طور یا حوراب پہاڑ پر تشریف لے گئے تو اپنے پیچھے بنی اسرائیل کا نگہبان اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بنا گئے تھے، جب ان کو گئے ہوئے ایک ماہ سے زائد گذر گیا تو بنی اسرائیل کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا اور ایک بدباطن شخص سامری کے بہکائے میں آکر قوم کے لوگ گوسالہ (بچھڑے) کی پرستش کرنے لگے، حضرت ہارون علیہ السلام نے قوم کو بہت سمجھایا اور اس مشرکانہ حرکت سے لاکھ منع کیا مگر کسی نے ان کی بات پر کان نہیں دھرا، حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا

دیکھا تو بپھر گئے اور یہ خیال کر کے کہ ہارون علیہ السلام نے ان لوگوں کو شرک سے باز رکھنے میں کوتاہی کی ہے، ان کی گردن پکڑلی اور ان کے سر کے بال نوچنے لگے اور داڑھی تک پر ہاتھ ڈال دیا، حضرت ہارون علیہ السلام نے پوری صورت حال بتائی اور اپنا بے قصور ہونا ثابت کر دیا تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جلال اور غصہ سے ان کی خلاصی ہوئی۔

بہرحال اس حدیث کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے، اس پر عقیدہ رکھنا چاہئے اور اگر اس کی کچھ باتیں خلاف قیاس معلوم ہوتی ہوں تو اپنے فہم کا تصور سمجھنا چاہئے اگرچہ مندرجہ بالا صحیح تعبیرات و تاویلات کی روشنی میں دیکھنے کے بعد اس حدیث میں کوئی بات قیاس کے خلاف معلوم ہی نہیں ہو سکتی۔

انبیاء علیہم السلام کے حلیے

⑯ وَعَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عُرِضَ عَلَيَّ الْاَنْبِيَاءُ فَاِذَا مُوْسٰى ضَرْبٌ مِّنَ الرِّجَالِ كَاَنَّهٗ مِنْ رِجَالِ شَنُوْءَةَ وَرَاَيْتُ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ فَاِذَا اَقْرَبُ مَنْ رَاَيْتُ بِهٖ شَبَهًا عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ وَرَاَيْتُ اِبْرَاهِيْمَ فَاِذَا اَقْرَبُ مَنْ رَاَيْتُ بِهٖ شَبَهًا صَاحِبُكُمْ يَعْنِيْ نَفْسَهٗ وَرَاَيْتُ جِبْرَئِيْلَ فَاِذَا اَقْرَبُ مَنْ رَاَيْتُ بِهٖ شَبَهًا دِحْيَةُ بْنُ خَلِيْفَةَ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب انبیاء میرے سامنے لائے گئے تو میں نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام ہلکے بدن کے ہیں جیسے وہ قبیلہ بنو شنوءَ میں کے کوئی آدمی ہوں اور میں نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو دیکھا تو وہ میرے دیکھے ہوئے لوگوں میں عروہ ابن مسعود سے بہت مشابہ نظر آئے، اور میں نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو جن لوگوں کو میں دیکھ چکا ہوں ان میں سے تمہارے دوست یعنی مجھ سے وہ بہت مشابہ نظر آئے اور میں نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا تو وہ میرے دیکھے ہوئے لوگوں میں دحیہؓ ابن خلیفہ سے بہت مشابہ نظر آئے۔" (مسلم)

تشریح: "جب انبیاء میرے سامنے لائے گئے۔" یہ شب معراج کا ذکر ہے، جب آپ ﷺ نے اس رات میں مسجد اقصیٰ میں یا آسمان پر ان انبیاء کرام سے ملاقات فرمائی اور ان کو دیکھا، اس ملاقات کے وقت ان انبیاء کرام کی ارواح مقدسہ کو ان کے ان اجسام کے ساتھ کہ جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، آپ ﷺ کے سامنے لایا گیا، چنانچہ آپ ﷺ نے ان انبیاء کرام کی شکل و صورت اور ان کے سراپا کا خاکہ اپنے صحابہ کرام کے سامنے رکھنے کے لئے ان افراد و اشخاص کا ذکر فرمایا جن کو صحابہؓ نے دیکھ رکھا تھا اور جو جسم و بدن اور تن و توش کے اعتبار سے ان انبیاء کرام کی مشابہت رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آپ ﷺ نے ہلکے بدن کا بتایا اور ان کے سراپا کو قبیلہ شنوءَ کے لوگوں کی طرح قرار دیا، یہ قبیلہ یمن کی سرزمین سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے لوگ دبلے جسم کے ہوتے تھے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آپ ﷺ نے اپنے ایک صحابی حضرت عروہ ابن مسعودؓ کی طرح بتایا کہ عروہ ابن مسعودؓ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بہت مشابہ ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مشابہت کے لئے آپ ﷺ نے خود اپنی ذات شریف کو پیش کیا، جس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ میں بہت زیادہ مشابہت تھی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں بتایا کہ وہ دحیہ ابن خلیفہ کے بہت مشابہ تھے، حضرت دحیہ ایک مشہور صحابی ہیں، اور بہت زیادہ خوبصورت تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام اکثر و بیشتر ان ہی کی شکل و صورت میں آنحضرت ﷺ کے پاس آیا کرتے تھے اور شب معراج میں بھی آنحضرت ﷺ کے سامنے ان کو دحیہؓ ہی کی شکل و صورت میں پیش کیا گیا۔

⑰ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَاَيْتُ لَيْلَةَ اُسْرِيَ بِيْ مُوْسٰى رَجُلًا اٰدَمَ طُوَالًا جَعْدًا كَاَنَّهٗ مِنْ رِجَالِ شَنُوْءَةَ وَرَاَيْتُ عِيْسٰى رَجُلًا مَّرْبُوْعَ الْخَلْقِ اِلَى الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ سَبْطَ الرَّاْسِ وَرَاَيْتُ مَالِكًا خَازِنَ النَّارِ وَالدَّجَّالَ فِيْ اٰيَاتٍ اَرَاهُنَّ اللّٰهُ اِيَّاهُ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهٖ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے شب معراج میں موسی علیہ السلام کو دیکھا وہ گندم گوں اور دراز قد تھے، ان کے بال خمدار تھے، اور (جسم وبدن کے اعتبار سے) قبیلہ شنوئہ کے کسی آدمی کی طرح نظر آتے تھے، اور میں نے عیسی علیہ السلام کو دیکھا وہ خلقی طور پر متوسط قد وقامت کے تھے (نہ بہت لمبے تھے نہ ٹھگنے، اور نہ بہت موٹے تھے نہ دبلے) ان کا رنگ سرخ سفید تھا (جیسے خود حضور ﷺ کے جسم مبارک کا رنگ تھا) اور اُن کے سر کے بال سیدھے (یعنی گھونگھریالے نہیں) تھے۔ اور میں نے دوزخ کے داروغہ مالک کو اور دجال کو بھی دیکھا!" اور آنحضرت ﷺ کا ان سب کو دیکھنا قدرت الٰہی کی ان نشانیوں اور علامتوں کے ضمن میں تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو (شب معراج میں) دکھائیں اس لئے (اے اس حدیث کو پڑھنے اور سننے والے!) اس امر میں کوئی شک وشبہ نہ کر، آنحضرت ﷺ نے ان سب کو دیکھا اور ملاقات فرمائی۔" (بخاریؒ)

تشریح: "جعد" کے معنی ہیں بالوں کا گھونگھریالہ ہونا۔ اور اس کے مقابلہ پر "سبط" کے معنی ہیں بالوں کا سیدھا ہونا! پس یہاں مراد یہ ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام کے بال سیدھے نہیں تھے بلکہ خمدار تھے یعنی گھونگھریالے نظر آتے تھے۔ اور حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اپنی شرح میں "جعد" کے تحت لکھا ہے کہ اس لفظ (جعد) کا اکثر اطلاق گھونگھریالے بالوں پر ہوتا ہے مگر کبھی کبھی یہ لفظ "مضبوط اور گٹھے ہوئے بدن" کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں حدیث میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی حضرت موسی علیہ السلام ایک گٹھے ہوئے بدن کے آدمی تھے۔ حضرت شیخؒ نے "جعد" کے یہ معنی مراد لینے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اگلی حدیث میں حضرت موسی علیہ السلام کے بارے میں یہ منقول ہے کہ وہ "رجل الشعر" تھے اور "رجل" کا اطلاق ایسے بالوں پر ہوتا ہے جو گھونگھریالے نہ ہوں۔ اس کی وضاحت اگلی حدیث میں آرہی ہے۔

روایت کا یہ جملہ فِی اٰیَاتٍ اَرٰھُنَّ اللّٰہُ اِیَّاہُ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا جزء نہیں ہے، نیز یہ آخری جملہ فلا تکن فِی مریۃ من لقائہ حدیث کے ابتدائی جزء سے متعلق ہے جس میں حضرت موسی علیہ السلام کا ذکر ہے، اور اس کے ذریعہ قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ فَلَا تَکُنْ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْ لِّقَآئِہٖ

"اور ہم نے موسی علیہ السلام کو کتاب دی تھی، سو (اے محمد ﷺ) آپ شب معراج میں) موسی علیہ السلام کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے۔"

یعنی آپ جو موسی علیہ السلام سے شب معراج میں ملے تھے، وہ سچی حقیقت ہے کوئی دھوکا یا نظر بندی نہیں۔ لہٰذا مذکورہ جملہ سے اس آیت کی طرف اشارہ کر کے ہر ایک کو آگاہ کیا گیا کہ جب قرآن سے بھی یہ ثابت ہے کہ شب معراج میں آنحضرت ﷺ کا حضرت موسی علیہ السلام سے ملنا ایک سچی حقیقت ہے تو کوئی بھی اس میں شک وشبہ کا شکار نہ ہو۔

شب معراج میں انبیاء سے ملاقات اور آنحضرت ﷺ کا پیالہ شراب قبول کرنے سے انکار

⑱ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃَ اُسْرِیَ بِیْ لَقِیْتُ مُوْسٰی فَنَعَتَہٗ فَاِذَا رَجُلٌ مُضْطَرِبٌ رَجِلُ الشَّعْرِ کَاَنَّہٗ مِنْ رِّجَالِ شَنُوْءَۃَ وَلَقِیْتُ عِیْسٰی رَبْعَۃً اَحْمَرَ کَاَنَّمَا خَرَجَ مِنْ دِیْمَاسٍ یَعْنِی الْحَمَّامَ وَرَاَیْتُ اِبْرَاھِیْمَ وَاَنَا اَشْبَہُ وُلْدِہٖ بِہٖ قَالَ فَاُتِیْتُ بِاِنَائَیْنِ اَحَدُھُمَا لَبَنٌ وَالْاٰخَرُ فِیْہِ خَمْرٌ فَقِیْلَ لِیْ خُذْ اَیَّھُمَا شِئْتَ فَاَخَذْتُ اللَّبَنَ فَشَرِبْتُہٗ فَقِیْلَ لِیْ ھُدِیْتَ الْفِطْرَۃَ اَمَا اِنَّکَ لَوْ اَخَذْتَ الْخَمْرَ غَوَتْ اُمَّتُکَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: میں نے شب معراج میں حضرت موسی علیہ السلام سے ملاقات کی اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت موسی علیہ السلام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ۔ وہ ایک مضطرب شخص نظر آئے، ان کے سر کے بال گھونگھریالے تھے اور نہ بالکل سیدھے، اور ایسا لگتا تھے جیسے وہ قبیلہ شنوء کے کوئی مرد ہوں۔ حضرت عیسی علیہ السلام سے بھی میری ملاقات،

ہوئی، ان کا قد میانہ اور رنگ سرخ تھا اور (ایسا لگتا تھا) جیسے (ابھی نہا کر) دیماس یعنی حمام سے نکلے ہوں۔" اور میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا اور میں ان کی اولاد میں سے سب سے زیادہ ان کے مشابہ ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر میرے سامنے دو پیالے پیش کئے گئے، جن میں سے ایک میں دودھ تھا اور ایک میں شراب تھی، اور مجھ سے کہا گیا کہ ان میں سے جس کو پسند کرو، لے لو (چاہے شراب پسند کر لو چاہے دودھ) میں نے دودھ کا پیالہ لے لیا اور پی لیا، تب مجھ سے کہا گیا (یعنی فرشتوں نے کہا) کہ تمہیں راہ فطرت دکھائی گئی (یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین اسلام کی وہ راہ سمجھادی جو اصل میں انسانی فطرت ہے اور جس پر ہر شخص پیدا ہوتا ہے) جان لو اگر تم (اس وقت) شراب پی لیتے تو تمہاری اُمت گمراہ ہو جاتی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "وہ ایک مضطرب شخص نظر آئے۔" کی وضاحت میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض نے یہ کہا کہ یہاں "مضطرب" دراز قد کے معنی میں ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام لمبے قد کے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ "مضطرب" کے معنی "کم گوشت" کے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام دبلے پتلے، کم گوشت، چھریرے بدن کے تھے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس جملہ میں "مضطرب" کا لفظ "خوف الٰہی سے دہلنے کانپنے والے" کے معنی میں ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے کہ وہ نماز اور عبادت الٰہی کے دوران خوف خدا سے تھر تھر کانپتے رہتے تھے۔

"رجل الشعر" میں لفظ "رجل" ج کے زیر کے ساتھ ہے اور ج کے جزم اور زبر کے ساتھ بھی منقول ہے، اس لفظ کا اطلاق ان بالوں پر ہوتا ہے جو نہ بالکل سیدھے ہوں جن کو "سبط" کہتے ہیں اور نہ بالکل گھونگھریالے ہوں جن کو "جعد" کہا جاتا ہے، بلکہ ہلکا سا خم لئے ہوں! لیکن ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ رجل سے مراد وہ بال ہیں جن میں خمی غالب ہو یعنی گھونگھریالے کے قریب ہوں، انہوں نے یہ معنی اس لئے مراد لئے ہیں تاکہ یہ روایت پچھلی حدیث کے منافی نہ ہو جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بالوں کا خم دار ہونا مذکور ہے۔

اس حدیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رنگت کو سرخ بتایا گیا ہے جب کہ پیچھے کی روایت میں سرخ سفید فرمایا گیا ہے، لیکن دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ جہاں تک ان کی اصل رنگت کا تعلق ہے تو وہ سرخ سفید ہی تھے، اور اس اعتبار سے کہ ان پر سرخی غالب ہوگی، ان کی رنگت پر "سرخ" کا اطلاق درست ہوا۔

من دیماس یعنی الحمام میں یعنی الحمام کے الفاظ اصل حدیث کے نہیں ہیں بلکہ ایک راوی عبدالرزاقؒ کے ہیں جنہوں نے ان الفاظ کے ذریعہ "دیماس" کی وضاحت کی ہے کہ اس لفظ سے آنحضرت ﷺ نے "حمام" مراد لیا تھا۔ بہر حال "جیسے ابھی حمام سے نکلے ہوں" کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رنگت کے نکھار، بدن کی تر و تازگی و شادابی اور روئے مبارک کی تابانی و شگفتگی کی طرف اشارہ کیا جو روحانیت کے غلبہ کا پر تو تھی۔

"لبن" کے ساتھ "فی" استعمال نہ کرنا اور خمر کے ساتھ استعمال کرنا، بظاہر تو از راہ تفنن ہے، لیکن بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ شراب تو کم تھی اور دودھ زیادہ تھا۔ نیز آنحضرت ﷺ کے سامنے ان دونوں چیزوں کے پیش کئے جانے سے مقصود یہ تھا کہ فرشتوں پر آپ کی یہ فضیلت و عظمت ظاہر ہو جائے کہ آپ ہر حالت میں وہی چیز پسند کرتے اور اختیار کرتے ہیں جو بھلائی و بہتری کی ضامن ہوتی ہے اور جو چیز اپنے اندر کسی بھی طرح کی خرابی اور برائی رکھتی ہے اس کو از خود آپ ﷺ کی طبیعت قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

"تمہیں راہ فطرت دکھائی گئی۔" دودھ کا پیالہ پسند اور اختیار کرنے کو راہ فطرت یعنی نور ہدایت سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ اس عالم سفلی میں دودھ ایک ایسی چیز ہے جو پاک و صاف، خالص و لطیف اور سفید و شیریں ہونے کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور بچے کو سب سے پہلی پرورش اور سب سے پہلی غذا دودھ ہی سے حاصل ہوتی ہے، پس عالم بالا میں دودھ کی مثال ہدایت اور فطرت کو قرار دیا

کیا بس سے قوت و توانائی اور غذائے روحانی ملتی ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ عالم بالا میں اس دنیا کی چیزوں کی مثالیں اور صورتیں مقرر ہیں جن سے مناسب معانی اور اشارے اخذ کئے جاتے ہیں! علم تعبیر الرویاء کی مستند کتابوں میں لکھا ہے کہ جو شخص خواب میں دودھ دیکھے یا خود دودھ پیتا دیکھے تو اس کی تعبیر علم، دین اور ہدایت ہے جب کہ شراب کا معاملہ اس کے برعکس ہے، جو اس دنیا میں تمام برائیوں، خباثتوں، فتنوں اور ہر طرح کے نقصان کی جڑ ہے۔

"اگر تم شراب پی لیتے تو تمہاری اُمت گمراہ ہو جاتی۔" یہ اس لئے کہا گیا کہ آنحضرت ﷺ اس وقت شراب کے پیالہ کو اختیار کر لیتے تو آپ ﷺ کی امت کے لئے بھی شراب حلال ہو جاتی، اور اس طرح اس اُمت کے لوگوں میں شراب نوشی کی برائی اور اس کے مضرات داخل ہو جاتے۔ واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذات پاک چونکہ کسی بھی برائی میں مبتلا ہونے سے ازلی وابدی طور پر محفوظ تھی اور آپ ﷺ کا کسی بھی گمراہی میں پڑنا متصور ہی نہیں ہو سکتا، اس لئے آپ ﷺ سے یہ نہیں کہا گیا کہ اگر تم شراب پی لیتے تو تم گمراہ ہو جاتے، بلکہ "گمراہی" کی نسبت آپ ﷺ کی اُمت کے لوگوں کی طرف کی گئی۔ حدیث کے اس جملہ سے یہ نکتہ معلوم ہوا کہ رہبر و پیشوا خواہ نبی ہو یا عالم ہو یا کسی قوم و ملک کا بادشاہ و سربراہ ہو، کی استقامت واولوالعزمی، اس کے پیروؤں اور اس کے ماننے والوں کی استقامت واولوالعزمی کا ذریعہ و سبب ہے کیونکہ اس کو وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو کسی جسم میں دوسرے اعضاء کی نسبت سے دل کو حاصل ہوتی ہے۔

انبیاء اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اعمال خیر کرتے ہیں

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ سِرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ فَمَرَرْنَا بِوَادٍ فَقَالَ اَيُّ وَادٍ هٰذَا فَقَالُوْا وَادِي الْاَزْرَقِ قَالَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى مُوْسٰى فَذَكَرَ مِنْ لَوْنِهٖ وَشَعْرِهٖ شَيْئًا وَاضِعًا اِصْبَعَيْهِ فِيْ اُذُنَيْهِ لَهٗ جُوَارٌ اِلَى اللّٰهِ بِالتَّلْبِيَةِ مَارًّا بِهٰذَا الْوَادِيْ قَالَ ثُمَّ سِرْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا عَلٰى ثَنِيَّةٍ فَقَالَ اَيُّ ثَنِيَّةٍ هٰذِهٖ قَالُوْا هَرْشٰى اَوْ لِفْتٌ فَقَالَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى يُوْنُسَ عَلٰى نَاقَةٍ حَمْرَاءَ عَلَيْهِ جُبَّةُ صُوْفٍ خِطَامُ نَاقَتِهٖ خُلْبَةٌ مَارًّا بِهٰذَا الْوَادِيْ مُلَبِّيًا (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک سفر میں جو مکہ اور مدینہ کے درمیان تھا، ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ تھے، جب ہم ایک جنگل سے گذرنے لگے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کونسا جنگل ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ یہ وادی ازرق ہے۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا: گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں" پھر آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رنگ اور بالوں کا کچھ ذکر کیا (کہ ان کا رنگ گندمی اور بال خمدار ہیں اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے فرمایا کہ) انہوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں دے رکھی ہیں (جس طرح کہ موذن اپنی آواز بلند کرنے کے لئے اذان دیتے وقت اپنی انگلیاں کانوں میں دیئے رہتا ہے) اور روتے گڑگڑاتے، باآواز بلند اپنے پروردگار کے حضور لبیک لبیک کہتے اس جنگل سے گذر رہے ہیں (جس طرح کہ کوئی احرام باندھے ہوئے شخص نہایت فروتنی وعاجزی کے ساتھ لبیک لبیک کہتا ہوا حرم کی طرف چلتا ہے) حضرت ابن عباسؓ کہتے کہ اس کے بعد وہاں سے گذر کر ہم آگے چلے اور ایک گھاٹی میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کونسی گھاٹی اور پہاڑ ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ ہرشا پہاڑ ہے۔ یا۔ لفت پہاڑ ہے! آپ ﷺ نے یہ (یہ سن کر) فرمایا: "گویا میں یونس علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں جو سرخ اونٹنی پر سوار ہیں اور موٹے اون کا جبہ پہنے ہوئے ہیں، ان کی اونٹنی کی نکیل کھجور کی رسی کی ہے اور وہ لبیک لبیک کہتے ہوئے اس گھاٹی سے گذر رہے ہیں۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ انبیاء بعد از موت بھی اعمال خیر کرتے ہیں وہیں "حج" کی اہمیت بھی ثابت ہوئی کہ یہ عبادت اللہ اور اس کے انبیاء کے شعائر میں سے ہے اور انبیاء اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اس کو ترک نہیں کرتے لہٰذا جو بھی شخص حج کی استطاعت وقدرت رکھتا ہو اس کو اس فریضہ کی ادائیگی سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ حج کرتے ہیں اور تلبیہ کہتے ہوئے محو سفر ہوتے ہیں (جیسا کہ اس

حدیث سے ثابت ہوتا ہے) کیونکر ممکن ہے کیونکہ وہ وفات پا چکے ہیں، اور یہ دنیا، دار آخرت نہیں ہے، دار العمل ہے جہاں سے ان کا جسمانی تعلق منقطع ہو چکا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء بھی شہداء کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی افضل ہیں اور شہداء کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ "وہ اپنے خدا کے ہاں زندہ ہیں" تو کیا بعید ہے کہ وہ حج کریں، نماز پڑھیں اور دوسرے جو اعمال خیر چاہیں اختیار کر کے اپنے خدا کا تقرب اور اس کی خوشنودی حاصل کریں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان نبیوں کو دیکھنے کا جو ذکر کیا وہ کھلی آنکھوں دیکھنے یا شب معراج کا واقعہ نہیں ہے بلکہ دراصل آپ ﷺ نے اپنے خواب کا ذکر کیا جس میں ان نبیوں کو مذکورہ حالت و کیفیت میں دیکھا، یہ اور بات ہے کہ انبیاء کا خواب بھی اتنا ہی سچا ہوتا ہے جتنا کھلی آنکھوں دیکھنا! اور حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے یہ لکھا ہے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ تمام انبیاء کرام صلوۃ اللہ علیہم اجمعین حقیقی اور دنیاوی حیات کے ساتھ زندہ ہیں گو ان کی اس حیات کو عام نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے، اور جب یہ بات حقیقت ہے کہ انبیاء کو حیات دنیا حاصل ہے تو اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد ﷺ کو کسی خواب وغیرہ کے واسطہ وذریعہ کے بغیر کھلی آنکھوں سے ان انبیاء کا مشاہدہ کرا دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خُفِّفَ عَلٰی دَاوٗدَ الْقُرْاٰنُ فَكَانَ یَاْمُرُ بِدَوَابِّهٖ فَتُسْرَجُ فَیَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ قَبْلَ اَنْ تُسْرَجَ دَوَابُّهٗ وَلَا یَاْكُلُ اِلَّا مِنْ عَمَلِ یَدَیْهِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور کی تلاوت آسان کر دی گئی تھی، وہ اپنے جانوروں پر زین کسنے کا حکم دیتے اور قبل اس کے کہ زین کسنے کا کام پورا ہو، وہ پورے زبور کی تلاوت مکمل کر لیتے تھے، اور حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی محنت کی روٹی کھاتے تھے۔" (بخاری ؒ)

تشریح: حدیث سے گویہ واضح نہیں ہوتا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس کتنے جانور تھے اور ان جانوروں پر زین کسنے کا کام کتنے عرصہ میں مکمل ہوتا تھا، لیکن یہ ثابت ہوا کہ وہ عرصہ بہر حال اتنا طویل نہیں ہوتا تھا جس میں پورے زبور کی تلاوت مکمل کر لینا عام طور پر ممکن ہوتا، یہ صرف حضرت داؤد علیہ السلام کا وصف تھا کہ وہ بہت تھوڑے عرصہ میں زبور جیسی کتاب کی تلاوت کر لیتے تھے۔ حاصل یہ کہ حضرت داؤد کو یہ وصف فوق العادت کمال کے طور پر حاصل تھا، اور اس خصوصی عطیہ خداوندی سے تعلق رکھتا تھا کہ رب کریم اپنے نیک اور مخصوص بندوں کے لئے زمانہ اور وقت کی طناب کھینچ بھی دیتا ہے اور ڈھیلی بھی کر دیتا ہے، کبھی ایک مختصر سا عرصہ ان بندگان خاص کے حق میں طویل عرصہ کے برابر ہو جاتا ہے اور کبھی ایک طویل عرصہ ایک مختصر عرصہ کے برابر کر دیا جاتا ہے۔ سیدنا امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی سواری کے ایک رکاب میں پیر رکھتے وقت قرآن کریم پڑھنا شروع کرتے اور دوسرے رکاب میں پیر ڈالنے تک پورے قرآن کی تلاوت ختم کر لیتے تھے۔

حدیث کے آخر میں حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک دوسرا وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ باوجود سلطنت و حکمرانی کے اپنی روزی اپنے ہاتھ کی محنت سے حاصل کرتے تھے، زرہ سازی ان کا جز وقتی مشغلہ اور ہنر تھا، اسی کی آمدنی سے ان کا خرچ چلتا تھا۔

ایک قضیہ میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے الگ الگ فیصلے

(۲۱) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتِ امْرَاَتَانِ مَعَهُمَا ابْنَاهُمَا جَآءَ الذِّئْبُ فَذَهَبَ بِابْنِ اِحْدٰهُمَا فَقَالَتْ صَاحِبَتُهَا اِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ وَقَالَتِ الْاُخْرٰی اِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ فَتَحَاكَمَتَا اِلٰی دَاوٗدَ فَقَضٰی بِهٖ لِلْكُبْرٰی فَخَرَجَتَا عَلٰی سُلَیْمَانَ بْنِ دَاوٗدَ فَاَخْبَرَتَاهُ فَقَالَ ائْتُوْنِیْ بِالسِّكِّیْنِ اَشُقُّهٗ بَیْنَكُمَا فَقَالَتِ الصُّغْرٰی لَا تَفْعَلْ یَرْحَمُكَ اللّٰهُ هُوَ ابْنُهَا فَقَضٰی بِهٖ لِلصُّغْرٰی (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا یہ قصہ بیان فرمایا کہ "دو عورتیں تھیں اور ان دونوں کے پاس ایک ایک لڑکا تھا، (ایک دن) ایک بھیڑیا آیا، اور ان میں سے ایک عورت کے لڑکے کو اٹھا کر لے گیا، (اب دونوں نے آپس میں جھگڑنا شروع کیا، ایک نے کہا کہ بھیڑیا جس لڑکے کو لے گیا ہے وہ تیرا تھا، اور دوسری نے کہا کہ نہیں، وہ تیرا لڑکا تھا، آخر کار دونوں اپنا مقدمہ لے کر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس پہنچیں اور حضرت داؤد علیہ السلام نے (دونوں کے بیانات سن کر) موجود لڑکا بڑی عمر کی عورت کو دلوادیا۔ پھر وہ دونوں عورتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئیں اور ان سے (پورا قضیہ اور حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ) بیان کیا (نیز انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے اپنا فیصلہ دینے کو کہا) حضرت سلیمان علیہ السلام نے (صورت واقعہ کی نزاکت اور پیچیدگی کو سمجھ کر (اپنے خادموں سے) کہا کہ ذرا چھری اٹھالاؤ، میں اس لڑکے کو بیچ میں سے دو ٹکڑے کر کے ان دونوں عورتوں میں بانٹ دوں گا۔ چھوٹی عمر کی عورت (نے ان کا یہ فیصلہ سنا تو تڑپ اٹھی اور کہنے لگی: خدا آپ پر رحم کرے ایسا نہ کیجئے! لڑکا بڑی عمر والی عورت ہی کو دے دیجئے، یہ اسی کا ہے (یہ دیکھ کر) حضرت سلیمان علیہ السلام نے چھوٹی عمر والی عورت کے حق میں فیصلہ کیا اور اس کو لڑکا دلوادیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس قضیہ کی بنیاد یہ تھی کہ دونوں عورتیں جو عمر میں ایک دوسرے سے چھوٹی بڑی تھیں ایک ہی جگہ رہتی تھیں، ان دونوں کے پاس ایک ایک بچہ تھا، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بچے ہم عمر بھی تھے اور ہمشکل بھی، اس لئے جب بھیڑیا ان میں سے ایک بچہ کو اٹھا کر لے گیا تو دونوں عورتوں کے درمیان یہ نزاع پیدا ہو گیا کہ بھیڑیا جس بچہ کو اٹھا کر لے گیا ہے وہ کس کا تھا؟ ہر ایک عورت یہ کہتی تھی کہ وہ بچہ اس کا نہیں تھا بلکہ دوسری عورت کا تھا۔ یا یہ کہ وہ بچے ہم عمر اور ہمشکل نہیں تھے، اور دونوں عورتیں خوب جانتی تھیں کہ بھیڑیا کس کے بچہ کو لے گیا ہے، لیکن اس بچہ کی ماں یا تو بدحواسی میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اس کا بچہ جاتا رہا ہے یا وہ دوسرے بچہ کو جو موجود تھا، اس لئے ہتھیانا چاہتی تھی کہ اس کو اپنے پاس رکھ کر اپنے اصل بچہ کا غم ہلکا کر سکے اور یا اس کے اس دعوے کے پیچھے کوئی اور فاسد غرض کار فرما ہوگی، بہرحال جب یہ قضیہ حضرت داؤد کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس بچہ کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا ہے وہ اس عورت کا تھا جو چھوٹی عمر کی ہے اور موجود لڑکے کو بڑی عمر والی عورت کے حوالہ کرنے کا حکم دیا! حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ فیصلہ یا تو اس بنیاد پر کیا کہ وہ بچہ بڑی عمر والی عورت ہی کے پاس تھا اور شرعی قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی چیز کی ملکیت کے بارے میں کوئی واضح اور یقینی ثبوت نہ ہو تو اس چیز کا زیادہ حقدار وہ شخص مانا جائے گا جس کے قبضے میں وہ چیز ہوگی۔ یا یہ کہ وہ بچہ بڑی عمر والی عورت سے کچھ مناسبت رکھتا تھا، لہٰذا حضرت داؤد علیہ السلام نے علم قیافہ سے کام لے کر مذکورہ فیصلہ صادر کیا۔ بہرحال ان کے اس فیصلہ کی بنیاد ان دونوں میں سے کوئی بات ہو یا ان کے علاوہ کسی اور قرینہ اور دلیل کو انہوں نے مدنظر رکھا ہو، یہ بات طے ہے کہ ان کا یہ فیصلہ ان کے اپنے اجتہاد کا نتیجہ تھا، اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی نہیں تھا، کیونکہ اگر اس سلسلہ میں ان پر کوئی وحی آئی ہوتی اور ان کو یہ فیصلہ اسی وحی کے تحت ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے فیصلے کے خلاف اپنا الگ فیصلہ نہ دیتے۔

جب یہ قضیہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اس کا فیصلہ کرنے کا بالکل نفسیاتی طریقہ اختیار کیا، انہوں نے دونوں کے دعوے سن کر کہا کہ ایک چھری لاؤ میں اس بچہ کو بیچ سے کاٹ کر دو ٹکڑے کئے دیتا ہوں۔ اور تم دونوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک ٹکڑا دے دوں گا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ دونوں عورتوں کی ممتا کا امتحان ہو جائے، اس بات پر ان دونوں طرف سے جس رد عمل کا اظہار ہو گا وہ صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں مدد دے گا۔ ظاہر ہے جو عورت اس بچہ کی اصل ماں ہو گی وہ چاہے اس بچہ کو اپنے سے جدا کرنے پر راضی ہو جائے مگر اپنی آنکھوں کے سامنے اس کے دو ٹکڑے کئے جانے کو کسی حال میں برداشت نہیں کرے گی۔ چنانچہ یہی ہوا، جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان دونوں کو پرکھنے کے لئے یہ بات کہی تو بڑی عمر والی عورت خاموش رہی مگر چھوٹی عمر والی عورت تڑپ گئی اور کہنے لگی کہ ایسا ظلم نہ کیجئے، میں اس پر راضی ہوں کہ آپ اس بچہ کو اس بڑی عمر والی عورت کے حوالہ کر دیں، اور یہ بچہ جیتا

رہے، لیکن مجھے یہ گوارا نہیں کہ اس بچے کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جائے اور موت کی آغوش میں پہنچا دیا جائے حضرت سلیمان علیہ السلام کے کہنے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا، انہوں نے اس بچہ کے تئیں چھوٹی عمر والی عورت کی ظاہر کردہ شفقت و محبّت کو اس کی ممتا پر اور بڑی عمر والی عورت کی خاموشی کو اس کی سنگدلی اور بچہ سے بے تعلقی پر محمول کر کے نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ بچہ چھوٹی عمر والی عورت ہی کا ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں بڑی عمر والی عورت نے اقرار بھی کیا ہو گا کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے بلکہ دوسری عورت کا ہے، لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بچہ کو اس کی اصل ماں یعنی چھوٹی عمر والی عورت کے حوالہ کر دیا! اب حضرت سلمان علیہ السلام کے اس فیصلہ کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے حضرت داؤد کے فیصلہ کو کیسے توڑا، جب کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ ایک نبی کا فیصلہ تھا اور کسی نبی کے فیصلہ کو توڑا نہیں جا سکتا، چاہے وہ فیصلہ اس نبی کے اپنے اجتہاد ہی کا نتیجہ کیوں نہ ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس بڑی عمر والی عورت کے حق میں حتمی اور یقینی فیصلہ صادر نہیں کر دیا تھا بلکہ حدیث میں جس فیصلہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ احتمالی نوعیت رکھتا تھا اور اس کی حیثیت انتظامی حکم کی تھی اور اس سے ان کا مقصد اس معاملہ کو محض رفع دفع کرنا تھا، اور ممکن ہے کہ ان کی شریعت میں پائی جانے والی کسی گنجائش کے تحت کسی ایسے حکم کو منسوخ کیا جانا جائز ہو جس کا تعلق وحی الٰہی یا نص شرعی کے بجائے اجتہاد سے ہو۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک واقعہ

(۲۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سُلَيْمٰنُ لَاَطُوْفَنَّ اللَّيْلَةَ عَلٰى تِسْعِيْنَ امْرَاَةً وَفِيْ رِوَايَةٍ بِمِائَةِ امْرَاَةٍ كُلُّهُنَّ تَاْتِيْ بِفَارِسٍ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ لَهُ الْمَلَكُ قُلْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ فَلَمْ يَقُلْ وَنَسِيَ فَطَافَ عَلَيْهِنَّ فَلَمْ تَحْمِلْ مِنْهُنَّ اِلَّا امْرَاَةٌ وَاحِدَةٌ جَاءَتْ بِشِقِّ رَجُلٍ وَاَيْمُ الَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ قَالَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فُرْسَانًا اَجْمَعُوْنَ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(ایک دن) حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کہا (یعنی یہ عزم وارادہ کیا) کہ آج رات میں اپنی نوے بیویوں۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ۔ اپنی سو بیویوں کے ساتھ مباشرت کروں گا ان میں سے ہر بیوی، ایک سوار (بہادر مرد) جنے گی جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرے گا۔ (چونکہ انہوں نے اس عزم وارادہ کے وقت، جو اگرچہ نیک مقصد کے لئے تھا، "انشاء اللہ" نہیں کہا اس لئے اس) فرشتہ نے جو دائیں طرف رہتا ہے یا حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اور یا کسی بھی فرشتہ نے ان سے کہا کہ "انشاء اللہ" کہہ لیجئے! لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام "انشاء اللہ" کہنا بھول گئے، پھر انہوں نے (اپنے ارادہ کے مطابق) ان سب بیویوں کے ساتھ مباشرت کی اور ان میں سے صرف ایک عورت کے علاوہ کوئی بھی حاملہ نہیں ہوئی، اور اس نے بھی آدھا مرد یعنی ناقص الخلقة بچہ جنا۔" (اور پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا) قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے دست قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، سلیمان علیہ السلام اگر "انشاء اللہ" کہہ لیتے تو یقیناً ہر عورت سے بیٹا پیدا ہوتا اور وہ سب اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے اور سوار (بہادر مرد) ثابت ہوتے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "انشاء اللہ کہہ لیجئے۔" اس سے کسی بھی کام کے عزم وارادہ کے وقت "انشاء اللہ" کہنے کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، کہ جب بھی کوئی عزم وارادہ کیا جائے تو اس کو انشاء اللہ کہہ کر مضبوط بنا لینا چاہئے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "میں یہ کام کروں گا، اور اگر خدا نے چاہا تو یہ کام ہو گا۔" اور یہ کہنا ضروری اس لئے ہوتا ہے کہ خدا کے چاہے بغیر کوئی بھی چیز وجود میں نہیں آتی اور بندے کی وہی خواہش بار آور ہوتی ہے جس میں مشیت الٰہی بھی شامل ہو! لہٰذا اس فرشتے نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو گویا یاد دلایا کہ آپ نے جو عزم وارادہ کیا ہے اس کو خدا کی مشیت سے وابستہ نہیں کیا" جس کی وجہ سے اس عزم وارادہ کی بار آوری غیر یقینی ہو گئی ہے۔ آپ اب بھی انشاء اللہ کہہ لیجئے تا کہ

آپ کا یہ عزم وارادہ اب سے بار آور ہونے کا مستحق ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ شیخ عبدالحق ؒ نے اپنی شرح میں حدیث کے مذکورہ جملہ کے تحت لکھا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہ بھول جانے کی وجہ سے اس وقت انشاء اللہ نہیں کہا، جب فرشتہ نے انہیں یاد دلایا تھا بلکہ بعد میں بھی نہیں کہا۔ اور ملا علی قاری ؒ نے اس موقع پر یہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرشتہ کے کہنے کے باوجود "انشاء اللہ" اس لئے نہیں کہا کہ وہ یہ سمجھے کہ جب دل میں "انشاء اللہ" کی نیت کر لی ہے تو زبان سے انشاء اللہ کہنا ضروری نہیں ہے، اس اعتبار سے "نسی" کا لفظ علم کے معنی میں ہوگا۔ نیز ایک روایت میں "نسی" کا لفظ نَ کے پیش اور سَ کی تشدید کے ساتھ نقل ہوا ہے اور یہی زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ ان کے ذہن سے یہ بات فراموش کر دی گئی کہ انشاء اللہ کہنے میں قلب اور زبان دونوں کا جمع ہونا ارباب جمع اور اہل عرفان کے نزدیک اصل درجہ رکھتا ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا انشاء اللہ نہ کہنا ان کی "لغزش" قرار پایا اور یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے ایک ابتلاء تھا اس لئے انہوں نے بعد میں حق تعالیٰ کے حضور اپنی اس لغزش کا اعتراف واقرار اور توبہ واستغفار کیا جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔ بہر حال حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی بھی کام کے ارادہ وعزم کے اظہار کے وقت یہ کہنا مستحب ہے کہ میں فلاں کام کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ، تاکہ اس کام میں حق تعالیٰ کی طرف سے مدد و برکت، حسن تکمیل اور آسانی وسہولت میسر ہو، چنانچہ قرآن کریم میں یہی حکم دیا گیا ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ۔

"اور آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کروں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملا دیا کیجئے (یعنی اس طرح کی بات کہتے وقت انشاء اللہ ضرور کہا کیجئے۔"

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام میں قوت مردمی اور جنسی طاقت کمال درجہ کی تھی اور اس طاقت کا زیادہ ہونا مردوں کے لئے خوبی اور فضیلت کی بات ہے جب کہ اس طاقت کا کم ہونا کمی اور نقصان میں شمار کیا جاتا ہے۔

کمانا انبیاء کی سُنّت ہے

(۲۳) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ زَكَرِيَّاءُ نَجَّارًا (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حضرت زکریا علیہ السلام نجار (یعنی بڑھئی) تھے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ کہ وہ بڑھئی کا کام کرتے تھے اور اپنی روزی اپنے ہاتھ کی محنت سے پیدا کرتے تھے۔ پس اس حدیث میں اور اس حدیث میں جو اوپر حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق گذری، یہ دلیل ہے کہ کمانا اور محنت ومشقت کے ذریعہ اپنا حلال رزق حاصل کرنا انبیاء کی سُنّت میں سے ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت کا باہمی قرب وتعلق

(۲۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلَى النَّاسِ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ الْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ مِّنْ عَلَّاتٍ وَاُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ وَلَيْسَ بَيْنَنَا نَبِىٌّ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "دنیا اور آخرت میں (یا آغاز وانجام میں) حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سب سے زیادہ قریب اور متعلق میں ہوں۔ اور تمام انبیاء آپس میں سوتیلے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور مائیں الگ الگ ہیں، ان سب کا اصل دین ایک ہے، اور ہمارے (یعنی میرے اور عیسیٰ علیہ السلام کے) درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔" (بخاری ؒ ومسلم ؒ)

تشریح: "حضرت عیسی علیہ السلام سے سب سے زیادہ قریب و متعلق میں ہوں۔" اس اعتبار سے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسی علیہ السلام کے درمیان کوئی پیغمبر نہیں ہے حضرت عیسی علیہ السلام ہی نے آنحضرت کے اس دنیا میں مبعوث ہونے کی واضح بشارت دی، آنحضرت کے دین و شریعت کی تمہید بھی انہوں نے ہی قائم کی، اور آخر زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور خلیفہ بھی وہی ہوں گے۔

انبیاء کو ایک دوسرے کا سوتیلا بھائی قرار دینے کا مقصد ان کے درمیان باہمی تعلق اور مناسبت کی ایک خاص نوعیت کو ظاہر کرتا ہے اور "ان کے باپ" سے مراد وہ چیز ہے جو اس دنیا میں ان کی بعثت کا سبب بنی ہے یعنی مخلوق خدا کی ہدایت اور ان کو صحیح راستے پر لگانے کی ذمہ داری، اور "ان کی ماؤں" سے مراد ان کی اپنی اپنی شریعتیں ہیں، جو ایک دوسرے سے مختلف اور الگ الگ ہیں۔

"ان سب کا اصل دین ایک ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ لوگوں کی ہدایت اور ان کے مفاد کی مصلحت و حکمت اور قوم و ملت کے حالات کی رعایت کے پیش نظر ہر نبی کو الگ الگ شریعت دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا لیکن سب کا اصل دین ایک ہی ہے، یعنی توحید۔

حضرت عیسی علیہ السلام کی فضیلت

(۲۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ يَطْعَنُ الشَّيْطٰنُ فِيْ جَنْبَيْهِ بِاِصْبَعَيْهِ حِيْنَ يُوْلَدُ غَيْرَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَهَبَ يَطْعَنُ فَطَعَنَ فِي الْحِجَابِ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب بھی کوئی انسان پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کی دونوں کوکھ میں اپنی انگلیوں سے کونچا مارتا ہے، لیکن عیسی ابن مریم اس سے محفوظ رہے، اس نے ان کی کوکھ میں بھی کونچا مارنا چاہا تھا مگر وہ صرف پردے میں کونچا مار سکا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت عیسی علیہ السلام، شیطان لعین کی تکلیف پہنچانے والی اس حرکت سے محفوظ رہے کہ ان کی نانی اور مریم علیہا السلام کی ماں حنہ نے اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کر دیا تھا کہ:

وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

"(پروردگارا!) میں نے اپنی اس بچی کا نام مریم (علیہا السلام) رکھا اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو مردود شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔"

"پردے" سے مراد وہ جھلی ہے جس میں بچہ پیدائش کے وقت لپٹا ہوا ہوتا ہے اور جس کو عربی میں "مشیمہ" کہا جاتا ہے! مطلب یہ کہ شیطان نے اپنی عادت کے مطابق حضرت عیسی علیہ السلام کی کوکھ میں بھی کونچا مارنا چاہا اور اپنی انگلیاں چلائیں لیکن وہ انگلیاں ان کے جسم تک نہیں پہنچ سکیں، اسی جھلی میں اٹک کر رہ گئیں، اس طرح حضرت عیسی علیہ السلام اس کی اذیت سے محفوظ رہے۔

واضح رہے کہ حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "جب بھی کوئی انسان پیدا ہوتا ہے...... الخ" تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مستثنیٰ اور خارج ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے علاوہ اور تمام بنی آدم کے بارے میں یہ فرمایا ہے چنانچہ حضرت عیسی علیہ السلام کی طرح خود آپ کی ذات بھی شیطان کی اس ایذا رسانی سے محفوظ رہی تھی۔

باکمال عورتوں کا ذکر

(۲۶) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰىؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَمَلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيْرٌ وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَاٰسِيَةُ امْرَاَةُ فِرْعَوْنَ وَفَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَآءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَ ذُكِرَ حَدِيْثُ اَنَسٍؓ يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ وَ حَدِيْثُ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَيُّ النَّاسِ اَكْرَمُ وَحَدِيْثُ بن عمر الكريم ابن الكريم فِيْ باب المفاخرة وَالْعَصَبِيَّةِ۔

"اور حضرت ابوموسیٰؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مردوں میں تو بہت سے باکمال پیدا ہوئے، (جیسے انبیاء خلفاء علماء اور اولیاء اللہ) لیکن عورتوں میں چند ہی کو باکمال ہونا نصیب ہوا اور وہ مریم بنت عمران اور آسیہ زوجہ فرعون ہیں، نیز اور تمام عورتوں پر عائشہ کو وہ فضیلت حاصل ہے جو دوسرے کھانوں پر ثرید کو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت انسؓ کی روایت یاخیر البریۃ الخ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ای النَّاسَ اکرم الخ اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت الکریم ابن الکریم الخ باب المفاخرۃ و العصبیہ میں نقل ہو چکی ہے۔

تشریح: اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں خواتین۔ مریم بنت عمران جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں اور آسیہ زوجۂ فرعون۔ دنیا کی تمام اگلی پچھلی عورتوں پر برتری اور فضیلت رکھتی ہیں، یہاں تک کہ حضرت فاطمہؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہرات پر بھی؟ لیکن یہ بات چونکہ اس طرح نہیں ہے اس لئے اس حدیث کی یہ توجیہ و تاویل کی جاتی ہے کہ مریم بنت عمران اور آسیہ زوجۂ فرعون کو جن عورتوں پر فضیلت دی گئی ہے ان سے اُمّت محمدیہ سے پہلے کی امتوں کی عورتیں مراد ہیں کہ پچھلی تمام امتوں کی عورتوں میں سب سے زیادہ افضل اور سب سے برتر یہ دو عورتیں ہیں! یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حدیث اس زمانہ میں ارشاد فرمائی تھی جب کہ حضرت فاطمہؓ، حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ افضیلت و اکملیت کی ظاہر کرنے والی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔" اور یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اُمّت محمد کی ان افضل خواتین کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام عورتوں کے بارے میں فرمایا کہ ان سب پر فضیلت و برتری مریم بنت عمران اور آسیہ زوجہ فرعون کو حاصل ہے، اور اس استثناء کا قرینہ وہ دوسری احادیث ہیں جن میں حضرت فاطمہؓ وغیرہ کے مناقب و اوصاف کا ذکر ہے جیسے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے "فاطمہ زہراؓ تمام جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔

حدیث کا آخری جزء، جس میں حضرت عائشہؓ کی فضیلت مذکور ہے، کئی احتمال رکھتا ہے، اس میں "عورتوں" سے۔ یا تو بلا استثناء دنیا کی تمام عورتیں مراد ہیں، یا حدیث میں مذکورہ دونوں خواتین، مریم بنت عمران اور آسیہ زوجہ فرعون، کا استثناء کر کے باقی تمام عورتیں مراد ہیں اور ترجمہ میں اسی احتمال کو ترجیح دی گئی ہے، یا جنتی عورتیں مراد ہیں، یا اس اُمّت کی عورتیں مراد ہیں اور یا ازواج مطہرات مراد ہیں۔ واضح رہے کہ "ثرید" اس کھانے کو کہتے ہیں جو روٹی کو شوربے میں چور کر بنایا جاتا ہے! اس زمانہ میں اہل عرب کا سب سے مرغوب کھانا ثرید ہی تھا، کیونکہ یہ کھانا اول تو بہت نرم اور لذیذ ہوتا ہے، دوسرے نہایت زود ہضم اور مقوی سمجھا جاتا ہے۔ علماء کے یہاں اس بارے میں اختلاف ہے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہؓ میں کون سب سے افضل ہیں؟ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت عائشہؓ دنیا کی تمام عورتوں سے افضل ہیں، ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ ﷺ کو حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہ پر فضیلت حاصل ہے۔ اور سبکیؒ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ سب سے افضل حضرت فاطمہؓ بنت محمد ﷺ ہیں، ان کے بعد ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ اور ان کے بعد حضرت عائشہؓ۔

مولف کتاب نے مذکورہ بالا مسئلہ میں اپنا "قول فیصل" اس طرح لکھا ہے! بعض روایتوں سے، جو ابن شیبہؒ وغیرہ سے منقول ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؓ۔ مریم بنت عمران، آسیہ زوجۂ فرعون اور حضرت خدیجۃ الکبری کے بعد تمام جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔ اور حضرت خدیجہ الکبری کو حضرت عائشہؓ پر فضیلت حاصل ہے اور سبکیؒ نے اپنے زمانہ کے بعض ائمہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ، جگر گوشہ رسول اور آپ ﷺ کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے خلفائے اربعہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ) سے افضل ہیں، لیکن یہ افضلیت علی الاطلاق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خلفائے اربعہ اپنے علم و فضل کی جلالت اور دین و ملت کی راہ میں اپنے بے مثال کارناموں کی بناء پر سب سے زیادہ اجر و ثواب کے حامل ہونے کے اعتبار سے حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حسینؓ سے افضل ہیں جیسا کہ ابن حجرؒ نے شمائل ترمذی کی شرح میں بیان کیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جس طرح خلفاء اربعہ اور یہ جگر گوشہ رسول اپنی اپنی مخصوص جہت و حیثیت کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے

ہیں اسی طرح مذکورہ عورتِ مطہرات (حضرت خدیجہ حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ) میں سے کسی کو بھی مجموعی اور کلی طور پر باقی دونوں پر یا ان میں سے کسی ایک پر فضیلت و برتری حاصل نہیں ہے بلکہ تینوں اپنی الگ الگ خصوصیات کے اعتبار سے آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت رکھتی ہیں چنانچہ حضرت عائشہ کو جو بلند تر علمی مقام حاصل تھا اور ان کو جو خصوصیت حاصل تھی کہ اکثر و بیشتر وحی آپ پر اس وقت نازل ہوتی تھی جب آپ کے بستر پر یا ان کے حجرے میں ہوتے تھے تو اس اعتبار سے ان کو حضرت فاطمہ پر فضیلت و برتری حاصل ہے اس کے برخلاف آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک کا ایک حصہ اور آپ کا جگر گوشہ ہونے کا شرف چونکہ حضرت فاطمہ کو حاصل ہے، اس اعتبار سے وہ حضرت عائشہ پر فضیلت رکھتی ہیں اور مریم و آسیہ اپنے اپنے زمانہ کی تمام عورتوں پر فضیلت رکھتی ہیں۔" نیز حضرت خدیجہ الکبریٰ اس اعتبار سے فضیلت رکھتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی پہلی زوجہ مطہرہ ہونے کا شرف ان ہی کو حاصل ہے، آنحضرت ﷺ کی سب سے زیادہ خدمت و معاونت انہوں نے ہی کی اور آنحضرت ﷺ کی اکثر اولاد ان ہی کے بطن سے ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

خدا کے بارے میں ایک سوال

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ رَزِیْنٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیْنَ کَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ خَلْقَہٗ قَالَ کَانَ فِیْ عَمَاءٍ مَاتَحْتَہٗ ھَوَاءٌ وَمَا فَوْقَہٗ ھَوَاءٌ وَ خَلَقَ عَرْشَہٗ عَلَی الْمَآءِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَ قَالَ قَالَ یَزِیْدُ بْنُ ھَارُوْنَ الْعَمَآءُ اَیْ لَیْسَ مَعَہٗ شَیْءٌ۔

"اور حضرت ابورزین بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ (ﷺ)! ہمارا پروردگار اپنی مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا! "عماء میں تھا نہ اس کے نیچے ہوا تھی اور نہ اس کے اوپر، اس نے اپنا عرش پانی پر پیدا کیا۔" اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا: یزید ابن ہارون نے وضاحت کی ہے کہ "عماء" سے مراد یہ ہے کہ "اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی۔"

تشریح: "عماء" کے اصل معنی ابر (بادل) کے ہیں خواہ ہلکا ہو یا گہرا۔ لیکن یہاں یہ اصل معنی مراد نہیں ہیں کہ پروردگار اپنی مخلوقات پیدا کرنے سے پہلے ابر میں تھا، بلکہ اس لفظ سے ایک پورے مفہوم کی طرف اشارہ مقصود ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ سوال میں جس حقیقت کی جستجو ظاہر کی گئی ہے اس تک نہ کسی کا علم پہنچ سکتا ہے، نہ کوئی عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے اور نہ کوئی اس کو بیان کر سکتا ہے۔

"نہ اس کے نیچے ہوا تھی اور نہ اس کے اوپر۔" ان الفاظ کے ذریعہ اس مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مخلوقات سے پہلے صرف اللہ ہی اللہ تھا، اس کے ساتھ کوئی اور چیز موجود نہیں تھی۔ اس اعتبار سے اس جملہ کا حاصل وہی ہے جو اس حدیث کا مضمون ہے۔ کان اللّٰہ ولم یکن معہ شیء (صرف اللہ کی ذات موجود تھی، اس کے ساتھ کسی چیز کا وجود نہیں تھا)۔ اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ماقبل جملہ (عماء میں ہے) سے خدا کی طرف مکان کی نسبت کا واہمہ ہو سکتا تھا، لہٰذا اس واہمہ کے دفعیہ کے لئے مذکورہ جملہ ارشاد فرمایا کہ عماء یعنی ابر سے متعارف ابر مراد نہیں ہے جس کے اوپر نیچے ہوا ہوتی ہے اور جب متعارف ابر مراد نہیں ہے کیونکہ اس کا ہوا کے بغیر ہونا محال ہے تو یہ وہم نہ ہونا چاہئے کہ عماء کے ذریعہ خدا کی طرف کسی مکان اور مقام کی نسبت کی گئی ہے۔

"اس نے اپنا عرش پانی پر پیدا کیا۔" اس جملہ کے بارے میں ایک شارح نے یہ لکھا ہے کہ سائل نے جو سوال کیا تھا اس کا اصل مقصد یہ دریافت کرنا تھا کہ این کان عرش ربنا یعنی (مخلوقات جیسے زمین و آسمان وغیرہ کو پیدا کرنے سے پہلے ہمارے پروردگار کا عرش کہاں تھا، اس کا جواب آپ ﷺ نے یہ دیا کہ عرش الٰہی پانی کے اوپر تھا۔ اس کی تحقیق پیچھے گذر چکی ہے۔

آسمانوں کا ذکر

(۲۸) وَعَنِ الْعَبَّاسِ ابْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ زَعَمَ اَنَّہٗ کَانَ جَالِسًا فِی الْبَطْحَاءِ فِیْ عِصَابَۃٍ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

وَسَلَّمَ جَالِسٌ فِيهِمْ فَمَرَّتْ سَحَابَةٌ فَنَظَرُوْا اِلَيْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاتُسَمُّوْنَ هٰذِهٖ قَالُوْا اَلسَّحَابُ قَالَ وَالْمُزْنَ قَالُوْا وَالْمُزْنَ قَالَ وَالْعَنَانَ قَالُوْا وَالْعَنَانَ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَابُعْدُ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ قَالُوْا لَانَدْرِیْ قَالَ اِنَّ بُعْدَ مَا بَيْنَهُمَا اِمَّا وَاحِدَةٌ وَاِمَّا اثْنَتَانِ اَوْ ثَلٰثٌ وَسَبْعُوْنَ سَنَةً وَالسَّمَآءُ الَّتِیْ فَوْقَهَا كَذٰلِكَ حَتّٰى عَدَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ثُمَّ فَوْقَ السَّمَآءِ السَّابِعَةِ بَحْرٌ بَيْنَ اَعْلَاهُ وَاَسْفَلِهٖ كَمَا بَيْنَ سَمَآءٍ اِلٰى سَمَآءٍ ثُمَّ فَوْقَ ذٰلِكَ ثَمَانِيَةُ اَوْعَالٍ بَيْنَ اَظْلَافِهِنَّ وَوَرِكِهِنَّ مِثْلُ مَابَيْنَ سَمَآءٍ اِلٰى سَمَآءٍ ثُمَّ عَلٰى ظُهُوْرِهِنَّ الْعَرْشُ بَيْنَ اَسْفَلِهٖ وَاَعْلَاهُ مَابَيْنَ سَمَآءٍ اِلٰى سَمَآءٍ ثُمَّ اللّٰهُ فَوْقَ ذٰلِكَ۔ (رواہ الترمذی۔ و ابوداؤد)

"اور حضرت عباسؓ ابن عبد المطلب کہتے ہیں کہ وہ (ایک دن) بطحائے مکہ (میں ایک جگہ محصب) میں لوگوں کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور رسول کریم ﷺ بھی ان میں تشریف فرما تھے کہ اچانک ابر کا ایک ٹکڑا گذرا، لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے: رسول کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم اس (ابر) کو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ "سحاب"! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اور اس کو "مزن" بھی کہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں مزن بھی کہتے ہیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا اور اس کو "عنان" بھی کہتے ہو انہوں نے کہا کہ ہاں، عنان بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ جانتے ہو، آسمان اور زمین کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ کتنا طویل ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں نہیں معلوم۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "زمین و آسمان کے درمیان کا فاصلہ یا تو اکہتر سال یا بہتر سال یا تہتر سال کی مسافت کے بقدر ہے، اور اس (پہلے) آسمان کے اوپر جو (دوسرا) آسمان ہے ان دونوں کے درمیان کا فاصلہ بھی اتنا ہی ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ساتوں آسمانوں کا ذکر کیا (کہ ہر آسمان اپنے نیچے کے آسمان سے کچھ اوپر ستر سال کی مسافت کے بقدر فاصلہ پر ہے، پھر ساتویں آسمان کے اوپر پانی کا بہت بڑا سمندر ہے، اس سمندر کی تہ اور اس کے اوپر کی سطح کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان ہے، اور اس سمندر کے اوپر آٹھ فرشتے ہیں جو پہاڑی بکروں کے مانند ہیں، ان کے کھروں اور کولہوں کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان ہے۔ اور پھر ان فرشتوں کی پشت پر عرش الٰہی ہے جس کے نیچے کے حصہ اور اوپر کے حصہ کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان ہے اور اس عرش کے اوپر اللہ تعالیٰ ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے ظاہری اسلوب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباسؓ نے جس زمانہ کا واقعہ بیان کیا ہے اس وقت تک وہ حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے۔ اس طرح وہ لوگ بھی مسلمان نہیں تھے جن کے ساتھ حضرت عباسؓ اس موقع پر تھے۔ نیز اس موقع پر اور ان لوگوں کے درمیان آنحضرت ﷺ کا موجود ہونا بھی اسی کا احتمال رکھتا ہے کہ وہ سب لوگ مکہ کے رہنے والے تھے اور مسلمان ہو چکے تھے! اور اگر یہ احتمال قائم کیا جائے کہ وہ سب لوگ مکہ کے کفار تھے اور اسلام کے دائرہ میں داخل نہیں ہوئے تھے تو پھر کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ نے اس جگہ ان لوگوں کو جمع دیکھ کر ان کو اسلام کی دعوت دینے کا ارادہ فرمایا ہوگا اور اسی مقصد سے ان کے پاس تشریف لے گئے ہوں۔

"یا تو اکہتر سال اور یا بہتر سال اور یا تہتر سال۔ یہ جملہ راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر ان تینوں میں سے کسی ایک عدد کا ذکر فرمایا تھا، بہر حال حاصل یہ ہے کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک کا درمیانی فاصلہ کچھ اوپر ستر سال کی مسافت کے بقدر ہے۔ لیکن یہ ذہن نشین رہے کہ اس عدد سے مراد تحدید نہیں ہے بلکہ تکثیر و مبالغہ یعنی اس فاصلہ کی وسعت و زیادتی کو بیان کرنا ہے لہٰذا یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں زمین و آسمان کے درمیانی فاصلہ اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک کے درمیانی فاصلہ کو پانچ سو سال کی مسافت کے بقدر فرمایا گیا ہے۔

"ساتویں آسمان کے اوپر پانی کا ایک بڑا سمندر ہے۔" بعض دوسری روایتوں میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا عرش پیدا کرنے کے

ساتھ ہی اس عرش کے نیچے ایک بہت بڑا سمندر پیدا کیا اور وہ سمندر موجود و جاری ہے۔

اور اس عرش کے اوپر اللہ تعالیٰ ہے۔" واضح رہے کہ اس جملہ کی مراد حق تعالیٰ کے مرتبہ کی بلندی، اس کی عظمت و شوکت اور اس کی سلطنت و حکومت کی مافوقیت کو بیان کرنا ہے، نہ کہ مکان وجہت اور استقرار و تمکّن کے اعتبار سے اس کی ذات کا عرش پر ہونا مراد ہے! گویا آپ ﷺ نے پروردگار کی عظمت و برتری کو انسانی ذہن میں اتارنے کے لئے بطور تمثیل یہ جملہ ارشاد فرمایا اور مطلب یہ تھا کہ وہ بڑا ہی عالی مرتبہ اور عظیم البرہان ہے اس کی ذات ہر شئے سے بلند و بالا ہے اور تمام موجودات اسی کے حکم اور اسی کی قدرت کے تحت ہیں؛ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ۔

"اور اللہ سب کو ادھر ادھر سے گھیرے ہوئے ہے۔"

اور اصل بات یہ ہے کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد و ہدایت کا ایسا مضمون اور اسلوب اختیار فرمایا جس سے ان سب کے ذہن و فکر کی پرواز اس عالم سفلی سے منتقل ہو کر عالم علوی کی طرف مائل ہو اور زمین و آسمان کے اقتدار اعلیٰ (حاکمیت الٰہ) ایک ایسا تصوراتی خاکہ ان کے دل و دماغ پر منعکس ہو جس سے وہ لوگ کائنات ارض و سماء کے پیدا کرنے والے اور کل کائنات کا نظام چلانے والے کی ذات کی طرف متوجہ ہو کر بت پرست، اوہام پسندی اور فاسد عقیدہ و خیال کی پستی کا احساس و شعور حاصل کریں اور خود کو ان چیزوں سے باز رکھ سکیں۔

عرش الٰہی کا ذکر

(۲۹) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ اَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ جُهِدَتِ الْاَنْفُسُ وَجَاعَ الْعِيَالُ وَنُهِكَتِ الْاَمْوَالُ وَهَلَكَتِ الْاَنْعَامُ فَاسْتَسْقِ اللّٰهَ لَنَا فَاِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِكَ عَلَى اللّٰهِ وَنَسْتَشْفِعُ بِاللّٰهِ عَلَيْكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ فَمَا زَالَ يُسَبِّحُ حَتّٰى عُرِفَ ذٰلِكَ فِيْ وُجُوْهِ اَصْحَابِهٖ ثُمَّ قَالَ وَيْحَكَ اِنَّهٗ لَا يُسْتَشْفَعُ بِاللّٰهِ عَلٰى اَحَدٍ شَانُ اللّٰهِ اَعْظَمُ مِنْ ذٰلِكَ وَيْحَكَ اَتَدْرِيْ مَا اللّٰهُ اِنَّ عَرْشَهٗ عَلٰى سَمٰوٰتِهٖ لَهٰكَذَا وَقَالَ بِاَصَابِعِهٖ مِثْلَ الْقُبَّةِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَيَئِطُّ بِهٖ اَطِيْطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور جبیر ابن مطعمؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور کہنے لگا کہ (ہمارے ہاں خشک سالی کی وجہ سے) انسانی جانیں قحط کا شکار ہو رہی ہیں، بال بچوں کو بھکری کا سامنا ہے، مال و جائداد کی بربادی ہو رہی ہے، اور مویشی ہلاک ہو رہے ہیں، لہٰذا آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے بارش مانگئے، ہم اللہ تعالیٰ کے حضور آپ ﷺ کو وسیلہ بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کے ہاں شفیع مقرر کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات پاک و منزہ ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک و منزہ ہے۔" آپ ﷺ بار بار تسبیح کے یہی الفاظ فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے صحابہؓ کے چہروں کا رنگ بدل گیا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا!" اے شخص تجھ پر افسوس ہے۔ درحقیقت خدا کو کسی کے ہاں شفیع مقرر نہیں کیا جاتا اور نہ اس کو وسیلہ بنایا جاتا ہے، بلاشبہ خدا کی ذات اور اس کی حیثیت اس سے بالاتر ہے کہ اس کو کسی کا وسیلہ و ذریعہ بنایا جائے۔ تجھ پر افسوس! کیا تجھے معلوم نہیں کہ خدا کی عظمت و جلالت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کا عرش اس کے آسمانوں کو اس طرح محیط ہے۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ہتھیلی کے اوپر قبہ کی صورت میں دکھایا (یعنی آپ ﷺ نے ہاتھ کو گنبد کی صورت میں بنا کر دکھایا کہ جس طرح یہ گنبد نما ہاتھ ہتھیلی کو گھیرے ہوئے ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا عرش زمین تو زمین تمام آسمانوں تک کو اپنے نیچے گھیرے ہوئے ہے) اور وہ عرش اس قدر وسیع و عریض ہونے کے باوجود اس طرح چر چر کرتا ہے جس طرح اونٹ کا پالان یا گھوڑے کی زین (بھاری بھرکم) سوار کے نیچے چر چر کرتی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "ہم اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کے ہاں شفیع مقرر کرتے ہیں۔" اس جملہ سے اس دیہاتی کی مراد تو یہ تھی کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ ﷺ کی ذات کو اور آپ ﷺ کی عظمت و بزرگی کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں، آپ ﷺ کو اپنا شفیع قرار دیتے ہیں، اور آپ ﷺ سے یہ دعا کرنے کی درخواست کرتے ہیں کہ پروردگار ہمارے حال پر رحم فرما کر بارش برسادے، نیز آپ کی سفارش و توجہ چاہنے کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ملتجی ہیں کہ وہ آپ ﷺ کو ہماری طرف متوجہ کردے آپ ﷺ کو ہمارے حق میں سفارش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن اس نے اپنی یہ مراد ظاہر کرنے کے لئے موزوں اسلوب اختیار نہیں کیا، بلکہ گھبراہٹ میں اس کی زبان سے ایسے الفاظ نکلے جن سے نہ صرف یہ کہ اس کی اصل مراد خبط ہوگئی بلکہ یہ ظاہر ہوا کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں وسیلہ بنا رہا ہے اور اس طرح اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کے نظام اور اس کے حکم و اختیار میں آنحضرت ﷺ کو شریک و برابر کر رہا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے حکم و اختیار اور اپنے نظام قدرت میں کسی بھی طرح مشارکت اور کسی بھی طرح ہمسری کی روادار نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْئٌ۔

"خدا کے نظام میں آپ ﷺ کو کوئی دخل نہیں اور یہ بھی فرمایا۔"

مَنْ ذَالَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔

"ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرسکے بدوں اس کی اجازت کے۔"

لہٰذا اس دیہاتی کا یہ کہنا حضور ﷺ کو نہایت ناگوار ہوا، اور آپ ﷺ اس کی طرف سے اس جملہ کی ادائیگی پر اظہار حیرت و تعجب اور اس کو متنبہ کرنے کے لئے بار بار سُبْحَانَ اللّٰہ سُبْحَانَ اللّٰہ فرماتے رہے۔

"یہاں تک کہ آپ ﷺ کے صحابہ کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔" یعنی آنحضرت ﷺ کے بار بار سبحان اللہ کہنے سے اس مجلس میں موجود صحابہؓ سمجھ گئے کہ دیہاتی کے اس کہنے سے آپ ﷺ کو شدید ناگواری اور غصہ ہے، لہٰذا آنحضرت ﷺ کے غضب و غصہ کو محسوس کرکے وہ سب بھی ڈر گئے اور خوف خدا سے ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا، اور پھر آنحضرت ﷺ نے جب ان صحابہؓ کے چہروں پر خوف خدا کا اثر دیکھا تو آپ ﷺ نے سبحان اللہ کہنا موقوف کردیا اور اس دیہاتی کی طرف روئے سخن نہ کیا۔

"وہ عرش اس قدر وسیع و عریض ہونے کے باوجود اس طرح چرچر کرتا ہے الخ۔" کے ذریعہ آپ ﷺ نے گویا اس دیہاتی کی سمجھ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کی تمثیل بیان کی اور اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کا اظہار ہے کہ اتنا بڑا عرش بھی اس کے تحمل سے عاجز ہے۔

وہ فرشتے جو عرش الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں

(۳۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِؓ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُذِنَ لِيْ اَنْ اُحَدِّثَ عَنْ مَلَكٍ مِنْ مَلٰٓئِكَةِ اللّٰهِ مِنْ حَمَلَةِ الْعَرْشِ اِنَّ مَا بَيْنَ شَحْمَةِ اُذُنَيْهِ اِلٰى عَاتِقِهٖ مَسِيْرَةُ سَبْعِمِائَةِ عَامٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابر ابن عبداللہؓ، رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا! "مجھ کو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) یہ اجازت مل گئی ہے کہ میں خدا کے ان فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کا حال بیان کروں جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، اس فرشتہ کے کان کی لو سے اس کے کندھے تک کا درمیانی فاصلہ سات سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔" (ابوداؤدؒ)

دیدار الٰہی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام

(۳۱) وَعَنْ زُرَارَةَ بْنِ اَوْفٰى اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِجِبْرَئِيْلَ هَلْ رَاَيْتَ رَبَّكَ فَانْتَفَضَ جِبْرَائِيْلُ وَقَالَ يَا

مُحَمَّدُ اِنَّ بَيْنِي وَبَيْنَهُ سَبْعِيْنَ حِجَابًا مِنْ نُوْرٍ لَوْ دَنَوْتُ مِنْ بَعْضِهَا لَاحْتَرَقْتُ هٰكَذَا فِي الْمَصَابِيْحِ وَرَوَاهُ اَبُوْنُعَيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ عَنْ اَنَسٍؓ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ فَانْتَقَضَ جِبْرَئِيْلُ۔

"اور حضرت زرارہ ابن اوفیٰ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام (یہ سن کر) تھر تھر کانپنے لگے اور پھر بولے محمد (ﷺ)! میرے اور خدا کے درمیان نور کے ستر پردے ہیں، اگر ان پردوں میں سے کسی پردے کے قریب ہونے کے لئے (ایک انگشت برابر بھی، آگے بڑھوں تو جل جاؤں۔" مصابیح میں روایت اسی طرح ہے، البتہ ابونعیم نے اپنی کتاب "حلیہ" میں اس روایت کو حضرت انس سے نقل کیا ہے (اور ہو سکتا ہے کہ حضرت زرارہ نے بھی حضرت انسؓ سے ہی نقل کیا ہو) لیکن ابونعیم کی نقل کردہ روایت میں فانتقض (حضرت جبرئیل علیہ السلام تھر تھر کانپنے لگے) کے الفاظ نہیں ہیں"

تشریح: حضرت زرارہ ایک جلیل القدر تابعی ہیں، بصرہ کے قاضی اور اپنے زمانہ کے ممتاز علماء وفضل اور مشائخ میں سے تھے، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے سماع رکھتے ہیں، خشیت الٰہی اور آخرت کے خوف کا یہ حال تھا کہ ایک دن فجر کی نماز میں امامت کر رہے تھے، جب اس آیت فاذ انقر فی الناقور پر پہنچے تو چیخ مار کر پڑے اور وہیں جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی، ولید ابن عبدالملک کی خلافت کے زمانہ میں ۷۳ھ کا واقعہ ہے! اور ملا علی قاریؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ حضرت زرارہ صحابی تھے اور ان کی وفات حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ خلافت میں ہوئی ہے۔

"حضرت جبرئیل علیہ السلام تھر تھر کانپنے لگے" یعنی مشاہدۂ ذات باری تعالیٰ سے متعلق آنحضرت ﷺ کے اس سوال نے ان پر زبردست ہیبت طاری کر دی اور وہ اس صورت حال کے تصور ہی سے لرزہ براندام ہو گئے کہ دیدار مشاہدہ جس کمال قرب کو مستلزم ہے، اگر مجھے یہ قرب میسر آتا تو مارے ہیبت کے میرا کیا حال ہوتا! بہر حال آنحضرت ﷺ کے اس سوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کی ذات کا دیدار و مشاہدہ ایک ممکن الوقوع حقیقت ہے کیونکہ اگر یہ دیدار و مشاہدہ محال ہوتا تو آنحضرت ﷺ یہ سوال نہ کرتے، تاہم قیامت کے دن (آخرت میں) فرشتوں اور جنات کو حق تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا یا نہیں، یہ علماء کے درمیان ایک اختلافی بحث ہے۔ جس کی بحث پیچھے گذر چکی ہے۔

میرے اور خدا کے درمیان نور کے ستر پردے حائل ہیں۔" یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دیدار الٰہی کے مرتبہ عظمیٰ تک اپنی رسائی کے عجز کو ظاہر کیا، اور اپنے اس عجز کو انہوں نے اپنے اور ذات حق جل مجدہ کے درمیان ستر پردوں سے تعبیر کیا۔ پس انہوں نے حجاب کا ذکر اپنے اعتبار سے کیا، ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حق تعالیٰ کی ذات ستر پردوں کے پیچھے ہے کیونکہ محجوب (پردہ میں ہونا) مغلوب ہونے کی علامت ہے جو خالق کی صفت نہیں ہو سکتی، وہ ہر حالت میں غالب ہوتا ہے اور کوئی بھی چیز اس کا حجاب نہیں بن سکتی۔ اس کے برخلاف مخلوق چونکہ عجز و نقصان کا حامل ہے اس لئے محجوب ہونا اس کی صفت ہو سکتی ہے! واضح رہے کہ اس جملہ میں ستر ہزار پردے" کے الفاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض کثرت کی طرف اشارہ کرنا مراد ہے نہ کہ کوئی خاص عدد مراد ہے۔

حضرت اسرافیل علیہ السلام کا ذکر

(۳۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اِسْرَافِيْلَ مُنْذُ يَوْمِ خَلَقَهُ صَافًّا قَدَمَيْهِ لَا يَرْفَعُ بَصَرَهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الرَّبِّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى سَبْعُوْنَ نُوْرًا مَامِنْهَا مِنْ نُوْرٍ يَدْنُوْا مِنْهُ اِلَّا احْتَرَقَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو جس وقت پیدا کیا، وہ اسی

وقت سے اپنے دونوں پیروں کو صف بستہ کئے (بالکل تیار) کھڑے ہیں، نظر تک نہیں اٹھاتے ان کے اور ان کے بزرگ و برتر پروردگار کے درمیان نور کے ستر پردے (حائل) ہیں اگر اسرافیل (بفرض محال) ان نور (کے پردوں میں سے) کسی ایک نور (کے پردے) کے قریب پہنچ جائیں تو وہ جل کر رہ جائیں۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: "نظر تک نہیں اٹھاتے۔" یعنی حضرت اسرافیل علیہ السلام اپنی پیدائش کے وقت سے اس طرح مؤدب پابستہ کھڑے ہوئے ہیں کہ ان کی نگاہ بھی ایک ہی جگہ جمی ہوئی ہے، آسمان کی طرف بھی ان کی نظر نہیں اٹھتی۔ یا یہ کہ وہ ہر لمحہ صور کی طرف متوجہ ہیں، اس لئے نگاہ نہیں ہٹاتے! اس کا حاصل یہ ہوگا کہ وہ اپنی پیدائش کے وقت ہی سے صور پھونکنے کے حکم کی بجا آوری کے لئے بالکل مستعد اور اس طرح منتظر کھڑے ہیں کہ شاید اسی لمحہ حکم آپہنچے۔

انسان کی فضیلت

(۳۳) وَعَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ وَذُرِّيَّتَهٗ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يَا رَبِّ خَلَقْتَهُمْ يَاْكُلُوْنَ وَيَشْرَبُوْنَ وَيَنْكِحُوْنَ وَيَرْكَبُوْنَ فَاجْعَلْ لَّهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْاٰخِرَةَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَا اَجْعَلُ مَنْ خَلَقْتُهٗ بِيَدَيَّ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ كَمَنْ قُلْتُ لَهٗ كُنْ فَكَانَ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا! "جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ پروردگار! آپ نے تو ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا ہے جو کھاتی ہے اور پیتی ہے شادی بیاہ کرتی ہے اور (طرح طرح کی سواریوں پر) سوار ہوتی ہے، تو ہماری درخواست ہے کہ دنیا (کی تمام نعمتیں) اس مخلوق کو دے دیجئے اور آخرت (کی تمام نعمتیں) ہمیں مرحمت فرما دیجئے۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اور اس میں اپنی روح پھونکی، اس کو اس مخلوق کے برابر قرار نہیں دے سکتا جس کو میں نے کن کہا تو وہ پیدا ہوگئی۔" (اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: فرشتوں کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب یہ مخلوق روئے زمین پر آپ کی خلافت کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اس کو دنیا کی وہ تمام نعمتیں اور لذتیں عطا کی گئی ہیں جن سے ہمیں محروم رکھا گیا ہے تو ان کو بس دنیا ہی کی سرفرازی تک محدود رکھا جائے، یا یہ کہ دنیا کی ملنے والی نعمتیں ان کے حق میں ہمیشہ باقی رکھی جائیں اور آخرت کی تمام نعمتوں کو ہمارے لئے مخصوص کر دیا جائے کہ جس طرح ہمیں دنیا کی نعمتوں میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا اسی طرح انسان نامی اس مخلوق کو آخرت کی نعمتوں میں سے کوئی حصہ نہ ملے تاکہ ہم دونوں برابر ہو جائیں! گویا فرشتوں نے دونوں کے خدا کی مخلوق ہونے کے اعتبار سے خود کو آدم اور ابن آدم کے مرتبہ و مقام کے برابر جانا، لیکن حق تعالیٰ نے فرشتوں کے اس گمان کی تصحیح فرمائی اور واضح کیا کہ انسان کی تخلیق و پیدائش دوسری تمام مخلوقات جس میں فرشتے بھی شامل ہیں، کی تخلیق و پیدائش سے یکسر مختلف نوعیت رکھتی ہے، مثلاً فرشتوں کی تخلیق و پیدائش تو لفظ کن کے ذریعہ عمل میں آئی کہ صرف کن (پیدا ہو جا) کہہ دیا تو تم فرشتے عالم وجود میں آگئے، اس کے برخلاف انسان کی تخلیق و پیدائش ایک خاص نظام کے تحت ہوئی اور اس کا سلسلہ بتدریج جاری ہے کہ سب سے پہلے آدم علیہ السلام کو بغیر کسی واسطہ اور ذریعہ کے دست قدرت نے براہ راست تخلیق کیا، ان میں روح پھونکی، پھر ان ہی کے اندر سے ان کا جوڑا (حوا کو) پیدا کیا، اور ان دونوں سے توالد وتناسل کا سلسلہ جاری کیا جو ان کے بعد ان کی اولاد در اولاد اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک اس دنیا کے خاتمہ کا وقت نہیں آجاتا، پھر یہ کہ فرشتوں کا خمیر مجرد ہے جب کہ انسان کا خمیر مرکب ہے، اس کے اندر ہدایت قبول کرنے کی بھی صلاحیت ہے اور ضلالت کو اختیار کرنے کا مادہ بھی وہ پروردگار کی صفت جلال کا مظہر بننے کی بھی استعداد رکھتا ہے اور اس کی صفت جمال کا مظہر بھی بن سکتا ہے، لہٰذا جو مخلوق اپنی تخلیق و پیدائش کے اعتبار سے یہ خصوصیت رکھتی ہے وہ اس مخلوق کے برابر کیسے قرار دی جا سکتی ہے جو اس جیسی خصوصیت سے عاری ہو۔ واضح ہوا کہ شرف و کرامت اور قربت میں

فرشتہ انسان کا ہمسر نہیں ہو سکتا، خاص طور پر شرف و کرامت کے اعتبار سے تو انسان فرشتہ سے بہت اونچا ہے اور اس کا مقام و مرتبہ بہت اعلیٰ ہے! اور چونکہ فرشتوں کو معصوم پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے ان کو عذاب سے تو دور رکھا گیا ہے، لیکن ان کو نعمتوں سے بھی محروم رکھا گیا ہے، ان کے برخلاف انسان کو چونکہ نیکی کا راستہ اختیار کرنے اور برائی کے راستہ سے بچنے کا مکلّف و ذمہ دار بنا کر پیدا کیا گیا ہے اس لئے جو انسان اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح ادا کرتا ہے، وہ دونوں جہان کی نعمتوں کا مستحق ہوتا ہے اور جو انسان اس ذمہ داری سے اعراض کرتا ہے وہ دونوں جہان میں عتاب و عذاب کا مستوجب ہوتا ہے۔

آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ "اور اس میں روح پھونکی" میں اللہ کی طرف روح کی نسبت محض روح کی عظمت و بزرگی کے اظہار کے لئے ہے جیسے "بیت اللہ" میں اللہ کی طرف بیت کی نسبت ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

فرشتوں پر انسان کی فضیلت

(۳۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ اَكْرَمُ عَلَی اللّٰهِ مِنْ بَعْضِ مَلَآئِكَتِهٖ۔

(رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "(کامل درجہ کے) مؤمن (یعنی انبیاء اور اولیاء) اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے بعض فرشتوں سے افضل و برتر ہیں۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "بعض فرشتوں" سے مراد یا تو خواص فرشتے ہیں یا وہ سب فرشتے مراد ہیں جو عام فرشتوں میں کسی بھی طرح کی برگزیدگی اور برتری رکھتے ہیں۔ طیبیؒ نے یہ لکھا ہے کہ "مؤمن" سے مراد عام مؤمن ہیں اور "بعض فرشتوں" سے مراد بھی عام فرشتے ہیں محی السنۃؒ کہتے ہیں: یہ کہا جانا زیادہ بہتر ہے کہ عام مؤمن عام فرشتوں سے افضل ہیں اور خواص مؤمن، خواص فرشتوں سے افضل ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ۔

"بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے وہ لوگ بہترین خلائق ہیں۔"

اہل سُنّت والجماعت اسی سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے لیکن بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اجمالی طور پر صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ "انسان" فرشتوں سے افضل ہے" بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تاکہ انسان میں سے ہر کس و ناکس کا فرشتوں سے افضل ہونا مفہوم نہ ہو، اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ اس مسئلہ میں "عوام" اور "خواص" کا مصداق کیا ہے، چنانچہ یہ تفصیل کی جانی چاہئے کہ "خواص مؤمن" سے مراد اللہ کے تمام رسول اور نبی ہیں، اسی طرح "خواص فرشتوں" سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائل علیہ السلام اور حضرت اسرافیل علیہ السلام وغیرہ ہیں، نیز عام مؤمنین" سے مراد کامل درجہ کے اہل ایمان ہیں جیسے خلفاء راشدین اولیاء کاملین اور تمام علماء۔

ابن ماجہؒ میں ایک حدیث اور مذکور ہے جو دو سندوں سے منقول ہے اور وہ حدیث یہ ہے۔

المؤمن اعظم حرمة من الكعبة۔

"مؤمن کا احترام و اکرام کعبہ سے بھی زیادہ ہے۔"

مخلوقات کی پیدائش کے دن

۴۵ وَعَنْهُ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِیَدِیْ فَقَالَ خَلَقَ اللّٰہُ التُّرْبَۃَ یَوْمَ السَّبْتِ وَخَلَقَ فِیْھَا الْجِبَالَ یَوْمَ الْاَحَدِ وَخَلَقَ الشَّجَرَ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَخَلَقَ الْمَکْرُوْہَ یَوْمَ الثُّلٰثَآءِ وَخَلَقَ النُّوْرَ یَوْمَ الْاَرْبِعَآءِ وَ بَثَّ فِیْھَا الدَّوَابَّ یَوْمَ الْخَمِیْسِ وَخَلَقَ اٰدَمَ بَعْدَ الْعَصْرِ مِنْ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ فِیْ اٰخِرِ الْخَلْقِ وَ اٰخِرِ سَاعَۃٍ مِّنَ النَّھَارِ فِیْمَا بَیْنَ الْعَصْرِ اِلَی اللَّیْلِ۔
(رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ میرا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے کہ (جانتے ہو، اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کو جو چھ دن میں پیدا کیا تو کونسی چیز کس دن پیدا ہوئی ہے؟ سنو، بعض چیزوں کے متعلق میں بتاتا ہوں) اللہ تعالیٰ نے مٹی (زمین کو ہفتہ کے دن پیدا کیا، اس زمین پر پہاڑوں کو اتوار کے دن پیدا کیا، درختوں کو پیر کے دن پیدا کیا، بدی اور خراب چیزوں کو منگل کے دن پیدا کیا، روشنی کو بدھ کے دن پیدا کیا، جانوروں کو روئے زمین پر جمعرات کے دن پھیلایا اور آدم کو جمعہ کے دن عصر کے بعد پیدا کیا اور یہ آخری پیدائش دن کے بالکل آخری حصہ میں عصر کے بعد سے رات تک کے درمیان عمل میں آئی۔"

تشریح: "یوم السبت یعنی ہفتہ کے دن" سے اس دن کا وہ بالکل آخری حصہ مراد ہے جس پر دن کا اختتام ہو جاتا ہے اور جس کو عربی میں عشیۃ الاحد یعنی اتوار کی رات کا ابتدائی حصہ" کہتے ہیں، اس اعتبار سے وہ وقت گویا اتوار ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

پس یہ روایت قرآن کریم کی اس آیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ کے منافی نہیں ہے۔

"وخلق النور یوم الاربعاء" (اور روشنی کو بدھ کے دن پیدا کیا۔ میں مسلمؒ نے "نور" ہی کا لفظ نقل کیا ہے اور مشکوٰۃ کے صحیح نسخوں میں بھی یہ لفظ اسی طرح (ر کے ساتھ) ہے، لیکن مشکوٰۃ کے ایک نسخہ میں یہ لفظ ن کے ساتھ، یعنی، "نون" ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ نور یعنی روشنی اور نون یعنی مچھلی دونوں کو ایک ہی دن یعنی بدھ کے دن پیدا کیا گیا ہو۔

حدیث کے آخری جزو سے معلوم ہوا کہ مخلوقات کی پیدائش کا آخری دن جمعہ تھا، اس دن تمام چیزوں کی پیدائش کا سلسلہ پایہ اختتام کو پہنچا اور تمام مخلوقات اس روئے زمین پر جمع ہوگئیں، چنانچہ اس دن کا نام "جمعہ" رکھے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے! نیز اس دن کا وہ وقت کہ جس میں آدم کی تخلیق پر مخلوقات کے سلسلہ تخلیق و پیدائش کی تکمیل ہوئی، دن کا بالکل آخری حصہ تھا، اس مناسبت سے اس دن کے آخری لمحوں (عصر کے بعد سے رات شروع ہونے تک) کو "ساعت قبولیت" کے شرف سے نوازا گیا، چنانچہ اکثر علماء کہتے ہیں کہ جمعہ کے دن اس آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔

زمین و آسمان کا ذکر

۴۶ وَعَنْهُ قَالَ بَیْنَمَا نَبِیُّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ وَاَصْحَابُہٗ اِذْ اَتٰی عَلَیْھِمْ سَحَابٌ فَقَالَ نَبِیُّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ تَدْرُوْنَ مَا ھٰذَا قَالُوا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ ھٰذِہِ الْعَنَانُ ھٰذِہٖ رَوَایَا الْاَرْضِ یَسُوْقُھَا اللّٰہُ اِلٰی قَوْمٍ لَا یَشْکُرُوْنَہٗ وَلَا یَدْعُوْنَہٗ ثُمَّ قَالَ ھَلْ تَدْرُوْنَ مَا فَوْقَکُمْ قَالُوْا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّھَا الرَّقِیْعُ سَقْفٌ مَحْفُوْظٌ وَ مَوْجٌ مَکْفُوْفٌ ثُمَّ قَالَ ھَلْ تَدْرُوْنَ مَا بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَھَا قَالُوا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھَا خَمْسُمِائَۃِ عَامٍ ثُمَّ قَالَ ھَلْ تَدْرُوْنَ مَا فَوْقَ ذٰلِکَ قَالُوا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ سَمَآءَانِ بُعْدُ مَا بَیْنَھُمَا خَمْسُمِائَۃِ سَنَۃٍ ثُمَّ قَالَ کَذٰلِکَ حَتّٰی عَدَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ مَا بَیْنَ کُلِّ سَمَائَیْنِ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ قَالَ ھَلْ تَدْرُوْنَ مَا فَوْقَ ذٰلِکَ قَالُوا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ اِنَّ فَوْقَ ذٰلِکَ الْعَرْشُ وَبَیْنَہٗ وَبَیْنَ السَّمَآءِ بُعْدُ مَا بَیْنَ السَّمَائَیْنِ ثُمَّ قَالَ ھَلْ تَدْرُوْنَ مَا الَّذِیْ تَحْتَکُمْ قَالُوْا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ اِنَّھَا الْاَرْضُ ثُمَّ قَالَ ھَلْ تَدْرُوْنَ مَا تَحْتَ ذٰلِکَ قَالُوْا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ اِنَّ تَحْتَھَا اَرْضًا اُخْرٰی بَیْنَھُمَا

مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ حَتّٰى عَدَّ سَبْعَ اَرَضِيْنَ بَيْنَ كُلِّ اَرْضَيْنِ مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّكُمْ دَلَّيْتُمْ بِحَبْلٍ اِلَى الْاَرْضِ السُّفْلٰى لَهَبَطَ عَلَى اللّٰهِ ثُمَّ قَرَأَهُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ قِرَاءَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاٰيَةَ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهُ اَرَادَ لَهَبَطَ عَلٰى عِلْمِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ وَسُلْطَانِهٖ وَعِلْمُ اللّٰهِ وَقُدْرَتُهٗ وَسُلْطَانُهٗ فِيْ كُلِّ مَكَانٍ وَهُوَ عَلَى الْعَرْشِ كَمَا وَصَفَ نَفْسَهٗ فِيْ كِتَابِهٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ بیٹھے ہوئے تھے کہ ابر کا ایک ٹکڑا گذرا، آپ ﷺ نے (ابر کے اس ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے (صحابہؓ سے پوچھا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے صحابہؓ نے (اپنی عادت کے مطابق) جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "یہ عنان (یعنی ابر) ہے، اور یہ ابر زمین کے "روایا" ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی طرف ہانکتا ہے جو نہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں، اور نہ اس کو پکارتے ہیں۔" پھر فرمایا! "جانتے ہو تمہارے اوپر (جو آسمان ہے وہ) کیا چیز ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارے اوپر کی چیز رقیع ہے جو ایک محفوظ چھت اور نہ گرنے والی موج ہے۔ پھر فرمایا۔ "جانتے ہو تمہارے اور آسمان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا! "تمہارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو برس (کی مسافت کے بقدر فاصلہ) ہے۔" پھر فرمایا! "جانتے ہو کہ آسمان کے اوپر کیا ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا! "اس آسمان کے بعد پھر اوپر نیچے دو آسمان ہیں اور ان دونوں آسمانوں کے درمیان بھی پانچ سو سال کی مسافت ہے۔" اسی طرح آپ ﷺ نے یکے بعد دیگرے ہر آسمان کا ذکر کیا، یہاں تک کہ ساتوں آسمان کے بارے میں بتایا کہ ان میں سے ہر ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک کا فاصلہ وہی ہے جو زمین سے آسمان کے درمیان ہے (یعنی پانچ سو سال کی مسافت کے بقدر۔ اس کے بعد فرمایا! "جانتے ہو، پھر اس (آخری آسمان) کے اوپر کیا ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا! اس ساتویں اور آخری آسمان کے اوپر عرش ہے اور اس عرش اور اس کے نیچے آسمان کے درمیان وہی فاصلہ ہے جو دو آسمانوں کے درمیان ہے۔" پھر فرمایا! "جانتے ہو تمہارے نیچے کیا چیز ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا! سب سے اوپر کی) زمین ہے۔" پھر فرمایا: "جانتے ہو اس کے نیچے کیا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: "اس کے نیچے ایک اور زمین ہے، اور ان دونوں زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت (کے بقدر فاصلہ) ہے۔" اس طرح آپ ﷺ نے سات زمینیں گنائیں اور بتایا کہ ان میں سے ہر ایک زمین سے دوسری زمین تک کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت کے بقدر ہے۔ اور پھر فرمایا! "قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ اگر تم سب سے نیچے والی زمین پر رسی لٹکاؤ تو اللہ تعالیٰ ہی پر اترے گی۔" اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے (اپنے اس ارشاد کی دلیل کے طور پر) یہ آیت پڑھی هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ یعنی وہی (اللہ) اول (قدیم) ہے (کہ اس کے لئے کوئی ابتداء نہیں ہے) اور آخر (باقی) ہے (کہ اس کے لئے کوئی انتہا اور اختتام نہیں ہے) اور (اپنی صفات کے اعتبار سے ظاہر) ہے اور (اپنی ذات کے اعتبار سے) باطن ہے، اور (دونوں جہاں کی) تمام (کلی وجزئی) چیزوں کو جاننے والا ہے (کہ اس کا علم نہایت کامل و اکمل ہے اور ایک ایک چیز کے ہر ہر گوشہ پر محیط ہے۔"

اس روایت کو احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، نیز ترمذیؒ نے کہا ہے کہ رسول کریم ﷺ کا اپنے ارشاد کے بعد اس آیت کو پڑھنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کا علم اس کی قدرت اور اس کی حکومت ہر جگہ ہے اور وہ بذات خود، (یعنی اس کی تجلی) عرش پر ہے جیسا کہ خود اسی نے اپنی کتاب میں اپنا وصف بیان کیا ہے۔

تشریح: "رَوَایا" اصل میں "راویہ" کی جمع ہے اور راویہ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پانی کھینچتا ہے! پس ابر یعنی بادل کو راویہ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جس طرح اونٹ پانی کھینچ کر زمین کو سیراب کرتا ہے اسی طرح بادل بھی پانی برسا کر زمین کو سیراب کرتے ہیں۔

"جو نہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔" اس جملہ کے ذریعہ ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بارش ہونے پر نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے جس کے حکم اور جس کی قدرت سے اس بارش کے نتیجہ میں ان کی زمینیں سیراب ہوتی ہیں، ان کی پانی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور ان کی روزی و آمدنی کے ذرائع بار آور ہوتے ہیں بلکہ وہ اس بارش کی نسبت اس کے اصل مسبب (اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کے بجائے ظاہری اسباب کی طرف یا اپنے فاسد خیال و گمان کے مطابق غیر حقیقی طاقتوں اور ساعت و ستاروں کی طرف کرنے لگتے ہیں! اسی طرح "اور نہ اس کو پکارتے ہیں۔" کے ذریعہ بھی انہیں لوگوں کی بے حسی اور بد عقیدگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ لوگ اللہ کو پکارنے، اس کی مدد چاہنے اور اس کی عبادت کرنے کے بجائے خود تراشیدہ بتوں اور فانی و غیر حقیقی طاقتوں کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور ان کو اپنا کارساز و مددگار سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ پروردگار کا لامحدود کرم اور اس کی بیکراں رحمت ہے کہ وہ ان لوگوں کی ناشکری، بدعملی اور بد عقیدگی کے باوجود ان کو رزق دیتا ہے، ان کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور انہیں امن و عافیت بخشتا ہے۔

"رَقِیْع" ر کے زبر کے ساتھ فعیل کے وزن پر ہے اور یہ پہلے آسمان جس کو آسمان دنیا بھی کہتے ہیں، کا نام ہے لیکن بعض حضرات نے کہا ہے کہ ہر آسمان کو رقیع کہتے ہیں۔

"جو ایک محفوظ چھت اور نہ گرنے والی موج ہے۔" میں آسمان کو ایک ایسی مضبوط چھت سے تشبیہ دی گئی ہے جو گرنے پڑنے سے محفوظ ہوتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو اس طرح قائم فرمایا ہے کہ نہ اس کے زمین پر گر پڑنے کا خدشہ ہے اور نہ اس میں کسی ٹوٹ پھوٹ کا اندیشہ۔ اسی طرح آسمان کو "موج" کے ساتھ بایں مناسبت تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح پانی کی کوئی موج ہوا میں معلق ہو جاتی ہے اسی طرح آسمان بھی بغیر کسی ستون اور سہارے کے خلاء میں معلق ہے۔

"ان میں سے ہر ایک زمین سے دوسری زمین کا درمیانی فاصلہ .... الخ۔" سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تمام زمینوں میں ایک دوسری کا درمیانی فاصلہ وہی ہے، جو تمام آسمانوں میں ایک دوسرے کا درمیانی فاصلہ ہے لہٰذا جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ زمین کے تمام طبقے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان کوئی باہمی بعد اور فاصلہ نہیں ہے، اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں "ارض" زمین کا لفظ بصیغہ مفرد ذکر کیا جاتا ہے جب کہ "سماء" (آسمان) کا ذکر بصیغہ جمع ہوتا ہے، تو یہ حدیث ان کے خلاف پڑتی ہے، ویسے جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن کریم میں "ارض" کا لفظ ہر موقع پر بصیغہ مفرد ذکر کیا جاتا ہے اور اس کی نسبت سے "سماء" بصیغہ جمع آتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ "ارض" سے صرف اسی زمین کا ذکر مقصود ہو جس سے اس کائنات کی مخلوق کا اصل تعلق ہے اور جو اس کے قدموں کے نیچے ہے، باقی اور زمینوں سے کسی کوئی سروکار نہیں، جب کہ آسمانوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے اور ہر ہر آسمان مصدر فیوض و آثار ہے اور تمام آسمانوں سے اس دنیا کا تعلق جڑا ہوا ہے۔

"تو اللہ تعالیٰ ہی پر اترے گی۔" سے مراد جیسا کہ ترمذی نے وضاحت بھی کی ہے، اسی رسی کا اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت اور اس کی حکومت پر اترنا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی معلومات، اس کا دائرہ قدرت و اختیار، اور اس کا حکم و تسلط جس طرح آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں کو گھیرے ہوئے ہے اسی طرح اس روئے زمین پر اور زمین کی آخری گہرائیوں تک پر اس کا علم، اس کی قدرت اور اس کا حکم و تسلط حاوی اور نافذ ہے۔ دراصل آنحضرت ﷺ نے یہ بات اس شبہ کے دفعیہ کے لئے فرمائی کہ شاید کوئی ناسمجھ اور کم فہم "اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے" سے اس وہم و گمان کا شکار ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا دائرہ علم و اختیار اور اس کی قدرت صرف آسمان اور آسمانی کائنات تک محدود ہے۔ آسمان سے نیچے کی چیزیں نہ اس کے علم و معلومات میں ہیں اور نہ اس کے حکم و قدرت کے تحت! لہٰذا آپ ﷺ نے واضح کیا کہ خدا کی قدرت کے آگے آسمانوں کی بلندیاں اور زمینوں کی پہنائیاں، سب یکساں ہے۔ اس کے قدرت اور

اس کے حکم کا ظہور جس شان سے آسمان کے اوپر ہے اسی شان سے زمین کی پشت پر اور زمین کے نیچے بھی ہے، اور غالبا اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے کہا گیا ہے کہ: حضرت یونس علیہ السلام کا معراج، ان کا مچھلی کے پیٹ میں پہنچنا تھا، جس طرح آنحضرت ﷺ کو آسمان کے اوپر معراج حاصل ہوا۔

امام ترمذی نے جو یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر رسی اترنے سے مراد یہ ہے کہ وہ رسی اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی قدرت اور اس کی حکومت پر اترے گی تو انہوں نے یہ وضاحت اس آیت کی روشنی میں کی ہے جو آنحضرت ﷺ نے یہ حدیث ارشاد فرمانے کے بعد پڑھی، چنانچہ اس آیت کے الفاظ "بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" سے تو اس کا علم مفہوم ہوا، اور "ھو الاول والاخر" سے اس کی قدرت کا مفہوم نکلا، یعنی وہ ایسا اول" ہے کہ ہر چیز اس کے ہاتھ میں ہے اور جو بھی چیز موجود ہے وہ اسی کی قدرت سے عدم کا سینہ چیر کر تختہ وجود پر آئی ہے، اور وہ ایسا آخر" ہے کہ سب کچھ فنا ہو جائے گی مگر اس کی ذات باقی اور موجود رہے گی۔ نیز اس کی حکومت، یا یوں کہئے کہ اس کا تصرف اور اس کا غلبہ، والظاہر والباطن سے مفہوم ہوا یعنی وہ ایسا ظاہر ہے کہ ہر چیز اسی کے زیر غلبہ اور زیر تصرف ہے، خود اس پر کوئی چیز غالب نہیں ہے۔ تمام موجود چیزوں میں جس طرح چاہتا ہے مالکانہ اور حاکمانہ تصرف کرتا ہے کیونکہ اس سے مافوق کوئی چیز نہیں ہے جو اس کے تصرف و تسلط میں رکاوٹ ڈالے۔ اور وہ ایسا "باطن" ہے کہ خلقت کی آنکھوں اور خیال و وہم سے پوشیدہ ہونے کے باوجود ملجا و ماوا اس کے علاوہ کوئی نہیں، ہر چیز کے اندرونی حال سے وہ باخبر ہے، کسی کا کوئی راز و بھید اس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔

جیسا کہ خود اسی نے اپنی کتاب میں اپنا وصف بیان کیا۔" کے ذریعہ قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ مقصود ہے:

اَلرَّحْمٰنُ علی العرش استوی۔

"وہ بڑی رحمت والا (پروردگار) عرش پر قائم ہے۔"

اور یہ آیت اگرچہ بظاہر یہ وہم پیدا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جہت اور کسی خاص جگہ پر متمکن ہے۔ لیکن حقیقت میں اس سے مراد ہے۔ اس کی سلطنت و حکومت اور اس کے علم و قدرت کے ظاہر کا ذکر ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا قد

(۳۷) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ طُوْلُ اٰدَمَ سِتِّيْنَ ذِرَاعًا سَبْعَ اَذْرُعٍ عَرْضًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "حضرت آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ہاتھ لمبا اور سات ہاتھ چوڑا تھا۔"

تشریح: "ذراع" اصل میں بانہہ کو کہتے ہیں یعنی کہنی کے سرے سے لے کر بیچ کی انگلی کے سرے تک کا حصہ اور شرعی گز کا اطلاق بھی اسی پر ہوتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قد کو جو ساٹھ ہاتھ لمبا فرمایا گیا ہے تو کس کا ہاتھ مراد ہے، آیا خود حضرت آدم علیہ السلام کا ہاتھ یا موجودہ لوگوں کے ہاتھ؟ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہاتھ مراد نہیں ہے، بلکہ موجودہ لوگوں کا ہاتھ مراد ہے، کہ ان کا قد اس وقت کے لوگوں کے اعتبار سے ساٹھ ہاتھ لمبا تھا، کیونکہ اگر حضرت آدم علیہ السلام کا ہاتھ مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کا ہاتھ، ان کے قد کے صرف ساٹھویں حصہ کے برابر تھا جو ان کے قد کے لمبائی اور تناسب اعضاء کے اعتبار سے بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہو گا اور یہ ناممکن ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی تعداد

(۳۸) وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّؓ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الْاَنْبِيَاءِ كَانَ اَوَّلَ قَالَ اٰدَمُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَنَبِيٌّ كَانَ قَالَ نَعَمْ نَبِيٌّ مُكَلَّمٌ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمِ الْمُرْسَلُوْنَ قَالَ ثَلٰثُمِائَةٍ وَبِضْعَةَ عَشَرَ جَمًّا غَفِيْرًا وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ اَبُوْذَرٍّ

قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَمْ وَفَاءُ عِدَّۃِ الْاَنْبِیَاءِ قَالَ مِائَۃُ اَلْفٍ وَاَرْبَعَۃٌ وَعِشْرُوْنَ اَلْفًا الرُّسُلُ مِنْ ذٰلِکَ ثَلٰثُمِائَۃٍ وَخَمْسَۃَ عَشَرَ جَمًّا غَفِیْرًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ) سب سے پہلے نبی کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "حضرت آدم علیہ السلام! میں نے پھر پوچھا کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے؟ فرمایا ہاں وہ نبی تھے، انہیں اللہ رب العالمین سے شرف تکلم وتخاطب حاصل ہوا ہے۔ اس کے بعد میں نے پوچھا: یارسول اللہ (ﷺ)! انبیاء میں رسول کتنے ہوئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کافی بڑی تعداد میں تین سو دس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے۔" اور ایک روایت میں حضرت ابوامامہؒ (تابعی) سے منقول ہے، یہ الفاظ ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے کہا کہ میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ (ﷺ)! تمام انبیاء کی کل تعداد (خواہ وہ رسول ہوں یا غیر رسول کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا!" ایک لاکھ چوبیس ہزار، ان میں رسول تین سو پندرہ ہوئے ہیں، جو کافی بڑی تعداد ہے۔"

تشریح: انہیں اللہ رب العالمین سے شرف وتکلم وتخاطب حاصل ہوا ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس طرح دنیائے انسانی کے باپ اور اپنی نسل کی دنیوی سعادت وفلاح کے لئے رہنما وہادی تھے اسی طرح اخروی سعادت وفلاح کے پیغامبر بھی تھے، ان کا نبی ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہے اور چونکہ وہ پہلے انسان ہیں اس لئے نسل انسانی کے لئے خدا کی وحی کے ذریعہ جو پیغامات بھی انہوں نے سنائے، وہی ان کے صحیفے اور وہی ان کی شریعت سمجھی جائے گی، اس اعتبار سے وہ صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ رسول بھی تھے کہ ان پر صحیفے بھی اترے اور ان کو شریعت بھی عطا کی گئی۔

"رسول" اور "نبی" میں فرق یہ ہے کہ رسول تو اس پیغمبر کو کہتے ہیں جس کو نئی شریعت وکتاب دی گئی ہو اور مخلوق خدا تک اس شریعت وکتاب کو پہنچانے کا ذمہ دار بنایا گیا ہو، اور "نبی" ہر پیغمبر کو کہتے ہیں چاہے اس کو نئی شریعت اور کتاب دی گئی ہو یا نہ دی گئی ہو بلکہ وہ پہلی شریعت اور کتاب کا تابع ہو اور خواہ وہ تبلیغ کا ذمہ دار بنایا گیا ہو۔ یا نہ بنایا گیا ہو۔

کل انبیاء کی تعداد کے بارے میں اس حدیث میں "ایک لاکھ چوبیس ہزار" کا ذکر ہے، اور بعض روایتوں میں یہ تعداد دو لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے، ظاہر ہے دونوں عدد میں زبردست تضاد ہے اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ اس بارے میں زیادہ تحقیق وجستجو نہ کرنی چاہئے اور نہ کوئی خاص عدد متعین کرنا چاہئے بلکہ یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ انبیاء کی ٹھیک تعداد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور اجمالی طور پر اس طرح ایمان لانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول اور نبی بھیجے ہم ان سب کو برحق رسول اور نبی مانتے ہیں۔ اس عقیدہ اور اجمالی ایمان سے نہ کوئی نبی انبیاء کے زمرہ سے باہر رہے گا اور نہ کوئی غیر نبی ان کے زمروں میں شامل ہوگا۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

(۳۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اَخْبَرَ مُوْسٰی بِمَا صَنَعَ قَوْمُہٗ فِی الْعِجْلِ فَلَمْ یُلْقِ الْاَلْوَاحَ فَلَمَّا عَایَنَ مَا صَنَعُوْا اَلْقَی الْاَلْوَاحَ فَانْکَسَرَتْ رَوَی الْاَحَادِیْثَ الثَّلٰثَۃَ اَحْمَدُ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "کسی چیز کے بارے میں سننا، اس کو آنکھ سے دیکھنے کے برابر نہیں ہوسکتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم کے اس عمل کے بارے میں خبر دی جو انہوں نے گوسالہ پرستی کی صورت میں کیا تھا تو انہوں نے (مارے غصے کے) تختیوں کو نہیں پھینکا لیکن جب وہ اپنی قوم میں واپس آئے اور اپنی آنکھوں سے قوم کے اس عمل کو دیکھا تو (اس درجہ غضبناک ہوگئے کہ) تختیوں کو پھینک دیا اور وہ ٹوٹ گئیں۔" ان تینوں حدیثوں کو احمدؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "کسی چیز کے بارے میں سننا، اس کو آنکھ سے دیکھنے کے برابر نہیں ہوسکتا۔" کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے ایک اہم نفسیاتی نکتہ

کی طرف ارشاد فرمایا ہے، انسان کا خاصہ ہے کہ وہ آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز سے جتنا زیادہ اور جتنی جلدی متاثر ہوتا ہے اتنا زیادہ، اور اتنی جلدی سنی، ہوئی چیز سے متاثر نہیں ہوتا، اگر اس کو یہ خبر و اطلاع دی جائے کہ تمہارا فلاں عزیز سخت بیمار ہے تو اس کا پریشان اور متفکر ہو جانا فطری امر ہے لیکن اس خبر و اطلاع کے مقابلہ میں، خواہ وہ کتنی ہی یقینی کیوں نہ ہو، اس کے دل و دماغ پر وہ فکر اور پریشانی کہیں زیادہ سخت اور سریع الاثر ہوتی ہے جو اس بیمار عزیز کو آنکھوں سے دیکھ لینے کی صورت میں لاحق ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی نکتہ کو ثابت کرنے کے لئے یہ واقع بطور مثال پیش فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام "چلہ کشی" کے لئے جبل طور پر تشریف لے گئے اور وہاں اپنے پروردگار سے راز و نیاز میں مصروف اور اپنی قوم بنی اسرائیل کے لئے آئین الٰہی (تورات) حاصل کرنے میں مشغول تھے تو نیچے وادی سینا میں ان کی قوم نے ایک بدباطن شخص سامری کی قیادت میں گوسالہ کی پوجا شروع کر دی، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ سے مطلع کیا اور فرمایا کہ موسیٰ! تم جس قوم کی ہدایت کے لئے اس قدر کوشاں اور مضطرب ہو اور یہاں (کوہ طور پر) اس کے لئے میری طرف سے کتاب وہدایت (تورات) حاصل کر رہے ہو، وہ تمہارے پیچھے گوسالہ پرستی کی گمراہی میں مبتلا ہو گئی ہے، یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رنج ہوا اور غصہ بھی آیا مگر جب وہ قوم کی طرف واپس آئے اور قوم کے لوگوں کو گوسالہ کی سمادھ لگائے اور اس کی پوجا کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ کہیں زیادہ غضب ناک ہو گئے اور اس غیظ و غضب کی بنا پر انہوں نے ان تختیوں کو جن پر تورات لکھی ہوئی تھی زمین پر پھینک دیا جس سے وہ تختیاں ٹوٹ بھی گئیں۔ ان تختیوں کو پھینک کر گویا انہوں نے یہ واضح کیا کہ یہ آئین الٰہی اہل ایمان ہی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، جن لوگوں نے ایمان و عقیدہ کی راہ ترک کر کے کفر اور سرکشی کو اختیار کر لیا ہے ان کے لئے آئین الٰہی پر مشتمل ان تختیوں کو باقی رکھنے کا اب کیا فائدہ رہ گیا۔ تاہم ان تختیوں کے ٹوٹ جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان میں جو کچھ تھا وہ جاتا رہا، ان تختیوں میں جو احکام و فرمان تھے وہ سب کے سب جوں کے توں موجود تھے اور اصل تورات اپنی جگہ باقی تھی۔

بَابُ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

سید المرسلین ﷺ کے فضائل و مناقب کا بیان

آنحضرت ﷺ کے فضائل و مناقب اور آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات کے اوصاف حمیدہ اور فضائل کبری کا کوئی شمار نہیں، کسی زبان و قلم کو تاب نہیں کہ آپ ﷺ کے تمام فضائل اور اوصاف کا احاطہ کر سکے، تاہم مولف مشکوٰۃ نے ان میں سے کچھ فضائل کے متعلق احادیث و روایات کو اس باب کے تحت جمع کیا ہے۔ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ تمام اولاد آدم کے سردار ہیں، انبیاء میں سب سے افضل واشرف آپ ﷺ ہی ہیں، آپ ﷺ کے بعد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام افضل ہیں، پھر حضرت موسیٰ کلیم اللہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کس کا درجہ ہے اس بارے میں صراحت کے ساتھ علماء سے کچھ منقول نہیں ہے، ویسے بعض علماء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور ان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کو افضل واشرف کہا ہے اور لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی طویل فہرست میں یہ پانچ نبی اولوالعزم سمجھے جاتے ہیں اور راہ حق میں ان کے صبر و استقامت اور عزیمت کا درجہ بے مثال ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت کا خاندانی و نسبی فضل و شرف

① عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ اٰدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰى كُنْتُ مِنَ

الْقَرْنِ الَّذِیْ کُنْتُ مِنْهُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "مجھ کو یکے بعد دیگرے ہر قرن کے بنی آدم کے بہترین طبقوں میں منتقل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ میں اس موجودہ قرن میں پیدا کیا گیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "بہترین طبقوں" سے مختلف زمینوں کا ہر وہ طبقہ مراد ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے آباء واجداد تھے، اور جو اپنے اپنے عہد میں اپنی خاندانی نجابت و شرافت اور انسانی فضل و کمال کے اعتبار سے ممتاز و نمایاں اور قابل تکریم و احترام رہا ہے! جیسے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد، ان کے بعد کے عہد میں کنانہ اور ان کی اولاد، ان کے بعد کے عہد میں ہاشم اور ان کی اولاد۔ پس اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہوا کہ میرا سلسلہ نسب شروع سے لے کر اب تک نسل انسانی کے نہایت مفتخر و معزز افراد پر مشتمل ہے، میرے آباء واجداد کہ جن کی پشت در پشت منتقل ہوتا ہوا میں اس زمانہ میں پیدا ہوا ہوں، اپنے اپنے عہد و زمانہ کے وہ ممتاز و نمایاں افراد تھے جن کی ذات خاندانی نجابت و شرافت، سماجی عزت و شوکت، مجلسی تہذیب و متانت، قومی و وطنی مقبولیت و مرجعیت، ذاتی برگزیدگی وافضیلت اور انسانی خصائل و فضائل کا منبع رہی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی برگزیدگی

(۲) وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى كِنَانَةَ مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ وَاصْطَفٰى قُرَيْشًا مِنْ كِنَانَةَ وَاصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِيْ هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِيْ مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلتِّرْمِذِيِّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى مِنْ وُلْدِ اِبْرَاهِيْمَ اِسْمٰعِيْلَ وَاصْطَفٰى مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ بَنِيْ كِنَانَةَ۔

"اور حضرت واثلہ ابن اسقعؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو چنا اور اولاد کنانہ سے قریش کو چنا اور اولاد قریش میں سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو چنا (مسلمؒ) اور ترمذیؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم علیہ السلام میں اسمٰعیل علیہ السلام کو برگزیدہ کیا اور اولاد اسمٰعیل میں، بنی کنانہ کو برگزیدہ کیا۔"

تشریح: "آنحضرت ﷺ کا نسلی و نسبی تعلق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ہے، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بیٹے قیدار کی اولاد میں ایک شخص عدنان تھے، انہی عدنان کی اولاد بنی اسمٰعیل کے تمام مشہور قبائل پر مشتمل ہے، اسی لئے عرب مستعربہ بنی اسمٰعیل کو عدنانی یا آل عدنان کہا جاتا ہے عدنان کے بیٹے معد اور معد کے بیٹے نزار تھے، نزار کے جو چار مشہور بیٹے بتائے جاتے ہیں ان میں سے دو بیٹے ربیعہ اور مضر سب سے زیادہ نامور اور جزیرہ نما عرب کے بڑے بڑے قبائل کے مورث ہیں، مضر کی اولاد میں آگے چل کر ایک شخص کنانہ ہوئے اور ان کی اولاد مضر کے قبائل میں سب سے زیادہ مشہور و معروف قبیلہ پر مشتمل ہوئی، کنانہ کے بیٹے نضر اور نضر کے بیٹے مالک اور مالک کے بیٹے فہر تھے، یہی وہ فہر ہیں جن کا لقب قریش تھا، فہر کی اولاد میں بہت سے قبائل ہوئے اور سب "قریش" کہلاتے ہیں یہ تمام قبائل مختلف علاقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان نہ باہمی ربط و اتفاق تھا اور نہ کوئی اجتماعی نظام تھا۔ پھر ایک شخص قصی بن کلاب پیدا ہوئے، انہوں نے بڑی محنت اور جدوجہد کر کے تمام قریش کو منظم کیا، ان میں اجتماعیت اور بیداری کی روح پھونکی جس کی بدولت قریش نے نہ صرف مکہ معظمہ بلکہ تمام حجاز پر غلبہ و اقتدار حاصل کر لیا۔ اسی وجہ سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں "قریش" اصل میں قصی بن کلاب کا لقب ہے، کیونکہ یہ لفظ (قریش) قرش سے نکلا ہے جس کے معنی جمع کرنے اور منظم کرنے کے ہیں۔ ویسے زیادہ مشہور یہ ہے کہ "قریش" ایک سمندری جانور کا نام ہے جو نہایت قوت اور زور رکھتا ہے، اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ قریش کا نام اس مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ قریش (قرش) ایک بڑی خطرناک مچھلی کا نام ہے جو سب مچھلیوں

کونگل لیتی ہے لیکن خود اس کو نہ کوئی مچھلی گزند پہنچاتی ہے نہ اس پر قابو پاتی ہے۔ یہی وجہ تسمیہ قاموس میں بھی مذکور ہے۔ ظہور اسلام کے وقت قریش کی شاخوں میں سے جو شاخ سب سے زیادہ مشہور باعزت اور غالب تھی وہ بنوہاشم ہے، آنحضرت ﷺ بنوہاشم میں پیدا ہوئے۔ آپ ﷺ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: محمد ﷺ بن عبداللہ ابن عبدالمطلب ابن ہاشم ابن عبد مناف ابن قصی ابن کلاب ابن مرۃ ابن کعب ابن لوی ابن غالب ابن فہر ابن مالک، ابن نضر ابن کنانہ ابن خزیمہ ابن مدرک ابن الیاس ابن مضر، ابن نزار ابن معد ابن عدنان۔ عدنان سے پہلے کا نسب نامہ زیادہ وثوق کے ساتھ نہیں بتایا جاسکتا۔

اس تفصیل کی روشنی میں حدیث کا مفہوم واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنوکنانہ کو سب سے زیادہ مفتخر کیا، پھر بنوکنانہ میں سب سے زیادہ قوت و غلبہ قریش کو حاصل ہوا، قریش میں سب سے زیادہ برگزیدگی بنوہاشم کو اور بنوہاشم میں سب سے زیادہ برگزیدگی و عظمت آنحضرت ﷺ کو حاصل ہوئی۔ پس آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی اپنے سلسلہ نسب کی تمام تر برگزیدگیوں اور عظمتوں کا نچوڑ ہے۔

قیامت کے دن آنحضرت ﷺ کی سرداری

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَاَوَّلُ مَنْ یَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ وَاَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! "قیامت کے دن میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا، اور سب سے پہلے قبر سے میں ہی اٹھوں گا نیز سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول ہوگی۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ قیامت کے دن تمام انسانی کمالات و صفات اور تمام تر عظمتوں اور ان کا مظہر آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ہوگی، اس دن مخلوقات میں سے نہ کسی کا درجہ آپ ﷺ سے بڑا ہوگا اور نہ آپ ﷺ کے علاوہ کوئی اور ذات سرداری و سربراہی کی سزاوار قرار پائے گی۔ واضح رہے کہ محمد عربی ﷺ دنیا و آخرت دونوں جہان میں تمام لوگوں کے سردار و آقا ہیں، لیکن یہاں "قیامت کے دن" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ اس دن آنحضرت ﷺ کی سرداری اور برتری کا ظہور کسی بھی شخص کے اختلاف و عناد کے اظہار کے بغیر ہوگا، جب کہ اس دنیا میں کفر و شرک اور نفاق کی طاقتیں نہ صرف حیات مبارک میں آپ ﷺ کی سرداری و برتری کی مخالف و معاند رہیں بلکہ بعد میں بھی ان کا اختلاف و عناد ظاہر رہا۔

اس حدیث کے بین السطور سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ فرشتوں پر بھی فضیلت و برتری رکھتے ہیں اور آپ ﷺ کی ذات افضل المخلوقات و اکمل الموجودات ہے، چنانچہ بعض حدیثوں میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ تم لوگ پیغمبروں کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو اور نہ مجھ کو موسیٰ علیہ السلام اور یونس علیہ السلام سے افضل کہو، تو اس مخالفت کی توجیہہ پیچھے گذر چکی ہے۔

اُمت محمدیہ کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی

(۴) وَعَنْ اَنَسٍ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَكْثَرُ الْاَنْبِیَآءِ تَبَعًا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ یَّقْرَعُ بَابَ الْجَنَّةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن پیغمبروں میں سے جس پیغمبر کے ماننے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی وہ میں ہوں گا اور جنت کا دروازہ سب سے پہلے جو شخص کھٹکھٹائے گا (یعنی کھلوائے گا) وہ بھی میں ہی ہوں گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: قیامت کے دن اُمت محمدیہ کی تعداد کی کثرت کے بارے میں پہلے ایک حدیث میں گذر چکا ہے کہ آپ ﷺ کی اُمت تمام اہل

جنت کی مجموعی تعداد کا دو تہائی حصہ ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی اتباع اور پیروی کرنے والوں کی کثرت، اس شخص کی فضیلت و برتری کا باعث بنتی ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مرتبہ زیادہ بلند ہے کیونکہ ائمہ فقہ میں سے ان ہی کا مسلک زیادہ راجح ہے اور مسلمانوں کی اکثریت اسلام کے فروعی احکام میں ان ہی کی پیروکار ہے، اسی طرح قاریوں میں امام عاصمؒ کا مرتبہ بلند تر ہے کیونکہ فن تجوید و قرأت میں ان کے پیروکار زیادہ ہیں۔

جنت کا دروازہ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کے لئے کھولا جائے گا

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰتِي بَابَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَسْتَفْتِحُ فَيَقُوْلُ الْخَازِنُ مَنْ اَنْتَ فَاَقُوْلُ مُحَمَّدٌ فَيَقُوْلُ بِكَ اُمِرْتُ اَنْ لَا اَفْتَحَ لِاَحَدٍ قَبْلَكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جب قیامت کے دن میں جنت کے دروازے پر آؤں گا اور اس کو کھلواؤں گا تو جنت کا نگہبان پوچھے گا کہ تم کون ہو؟ میں کہوں گا کہ میں محمد (ﷺ) ہوں۔ تب نگہبان کہے گا مجھ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ سے پہلے کسی کے لئے دروازہ نہ کھولوں۔" (مسلمؒ)

سب سے پہلے آپ ﷺ شفاعت کریں گے

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ شَفِيْعٍ فِي الْجَنَّةِ لَمْ يُصَدَّقْ نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَآءِ مَاصُدِّقْتُ وَاِنَّ مِنَ الْاَنْبِيَآءِ نَبِيًّا مَاصَدَّقَهُ مِنْ اُمَّتِهِ اِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنت میں سب سے پہلے سفارش کرنے والا میں ہوں گا (یعنی اپنی امت کو) جنت میں داخل کرنے کی یا اہل جنت کے مراتب درجات کی ترقی کی سفارش سب سے پہلے میں کروں گا) انبیاء میں سے جتنی تصدیق میری کی گئی ہے، اتنی کسی کی نہیں کی گئی ہے (یعنی میری نبوت و رسالت کی تصدیق کرنے والوں اور مجھ پر ایمان لانے اور رکھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، اس طرح تمام امتوں کے مقابلہ میں میری اُمت سب سے بڑی ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ انبیاء میں سے ایک نبی ایسے بھی گذرے ہیں جن کی تصدیق صرف ایک مرد نے کی ہے۔" (مسلمؒ)

آنحضرت ﷺ خاتم النبیین ہیں

⑦ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِيْ وَمَثَلُ الْاَنْبِيَآءِ كَمَثَلِ قَصْرٍ اُحْسِنَ بُنْيَانُهُ تُرِكَ مِنْهُ مَوْضِعُ لَبِنَةٍ فَطَافَ بِهِ النُّظَّارُ يَتَعَجَّبُوْنَ مِنْ حُسْنِ بُنْيَانِهِ اِلَّا مَوْضِعَ تِلْكَ اللَّبِنَةِ فَكُنْتُ اَنَا سَدَدْتُ مَوْضِعَ اللَّبِنَةِ خُتِمَ بِيَ الْبُنْيَانُ وَخُتِمَ بِيَ الرُّسُلُ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَاَنَا اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "میری اور دوسرے تمام انبیاء کی مثال اس محل کی سی ہے جس کے درودیوار نہایت شاندار اور عمدہ ہوں، لیکن اس دیوار میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی ہو اور جب لوگ اس محل کے گرد پھر کر عمارت کو دیکھیں تو عمارت کی شان و شوکت اور درودیوار کی خوشنمائی انہیں حیرت میں ڈال دے مگر ایک اینٹ کے بقدر اس خالی جگہ کو دیکھ کر انہیں سخت تعجب ہو پس میں اس اینٹ کی جگہ کو بھرنے والا ہوں، اس عمارت کی تکمیل میری ذات سے ہے اور انبیاء و رسل کے سلسلہ کا اختتام مجھ پر ہو گیا ہے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ۔ "پس میں ہی وہ اینٹ ہوں (جس کی جگہ خالی رکھی گئی تھی) اور میں ہی نبیوں کے سلسلہ کو پایۂ اختتام تک پہنچانے والا ہوں۔"

تشریح: یہ حدیث آنحضرت ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کی واضح دلیل ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے دنیا میں اپنے

رسول اور نبی بھیجنے کا جو سلسلہ انسان اول حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کیا تھا وہ محمد عربی ﷺ پر آکر ختم ہو گیا، آپ ﷺ کے بعد نہ کوئی نبی اور رسول اس دنیا میں آیا ہے اور نہ آئندہ کبھی آئے گا۔

اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے بڑے نفسیاتی طریقہ سے ایک مثال کے ذریعہ فرمایا، کہ مجھ سے پہلے دنیا میں جتنے اور رسول آئے، وہ خدا کی طرف سے جو شریعت، آئین ہدایت، علم و دین اور پیغام و احکام لائے ان کے مجموعہ کو ایک ایسا محل تصور کرو جو نہایت شاندار، مضبوط و پختہ اور دیدہ زیب ہو، لیکن اس کی دیوار میں ایک اینٹ کے برابر جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہو اور وہ خالی جگہ کسی ایسے شخص کی منتظر ہو جو آکر اس کو پر کر دے اور اس خالی جگہ کے نقص کو پورا کر کے محل کی تعمیر کا سلسلہ ختم کر دے۔ پس آنحضرت ﷺ نے پہلے آنے والے انبیاء کی بعثت، ان کی لائی ہوئی شریعت وہدایت اور ان کے تبلیغ و ارشاد کے ذریعہ دین کامل کا محل گویا تیار ہو چکا تھا، لیکن کچھ کسر باقی رہ گئی تھی، اور وہ کسر ہمارے حضرت ﷺ کی بعثت مبارکہ سے پوری ہو گئی، اب نہ خدا کا دین ناقص ہے، نہ شریعت حقہ غیر مکمل ہے، اور نہ کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے۔

سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم

⑧ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنَ الْاَنْبِيَآءِ مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا قَدْ اُعْطِيَ مِنَ الْاٰيَاتِ مَامِثْلُهٗ اٰمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِيْ اُوْتِيْتُ وَحْيًا اَوْحَى اللّٰهُ اِلَيَّ فَارْجُوْا اَنْ اَكُوْنَ اَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "انبیاء میں سے ہر ایک نبی کو معجزات میں سے صرف اتنا دیا گیا جس پر انسان ایمان لا سکے، اور جو معجزہ مجھ کو ملا وہ خدا کی وحی ہے جو اس نے میری طرف بھیجی (اور جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے) اس کی بناء پر مجھے یقین ہے کہ قیامت کے دن میرے ماننے والوں کی تعداد تمام انبیاء کے ماننے والوں سے زیادہ ہوگی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام چونکہ مخلوق کے سامنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالت و نبوت کا دعوی کرتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان کو کچھ ایسے معجزے عطا فرماتا ہے جس کو وہ اپنے دعوے کی دلیل و برہان کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں، چنانچہ جتنے بھی نبی اور رسول اس زمین پر آئے ان کو کسی نہ کسی نوعیت کا ایسا معجزہ دیا گیا جس کو دیکھ کر عقل سلیم رکھنے والا انسان اس نبی کی تصدیق کر سکے اور اس پر ایمان لا سکے لیکن آنحضرت ﷺ سے پہلے جس نبی کو جو بھی معجزہ دیا گیا وہ اس نبی کے زمانہ اور اس کی حیات تک مخصوص اور باقی رہا، اس نبی کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ اس کا معجزہ بھی ختم ہو گیا، مثلاً حضرت موسی علیہ السلام کے زمانہ میں سحر اور جادو کا زبردست چرچا تھا، بڑے بڑے جادوگر اپنے فن کا کمال دکھایا کرتے تھے اور لوگ ان کے فن کے کمال سے متاثر ہوتے تھے، چنانچہ حضرت موسی علیہ السلام کو ید بیضا اور عصا کا معجزہ دیا گیا، ان کے ان دونوں معجزوں نے تمام چھوٹے بڑے جادوگروں کا چراغ گل کر دیا اور نہ صرف عام لوگوں کو بلکہ خود ان جادوگروں کو حضرت موسی علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا، اسی طرح حضرت عیسی علیہ السلام کے زمانہ میں طب و حکمت کا بڑا زور تھا اس وقت ایسے ایسے قابل اور ماہر فن طبیب اور حلیم موجود تھے جو پیچیدہ سے پیچیدہ دکھ اور بیماری کو جڑ سے اکھیڑ دیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت عیسی علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا ہوا کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے، کوڑھی کو تندرست اور اندھے کو بینا بنا دیتے تھے، اس طرح ان کا یہ معجزہ اپنے زمانہ کے نہایت ترقی یافتہ طب و حکمت پر غالب رہا، لیکن نہ حضرت موسی علیہ السلام کا معجزہ ان کے بعد باقی رہا اور نہ حضرت عیسی علیہ السلام کے معجزہ کو دائمی حیثیت حاصل ہوئی۔ تمام انبیاء کے برخلاف آنحضرت ﷺ کو قرآن کریم کی صورت میں جو سب سے بڑا معجزہ عطا ہوا اس کو دائمی حیثیت حاصل ہوئی! آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا زور تھا، عرب فصحاء کا دعوی تھا کہ ان کی فصاحت و بلاغت کے سامنے دنیا کے تمام لوگ "گونگے" ہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ پر قرآن کریم نازل کیا گیا جس کی فصاحت و بلاغت نے عرب کے بڑے سے بڑے فصیح و بلیغ کی فصاحت و بلاغت کو ماند کر

دیا، اپنی زبان دانی اور معجز بیانی کا بلند بانگ دعوی کرنے والے مغلوب ہو گئے، تمام فصیح مل کر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت جیسا کلام بھی پیش نہ کر سکے، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس عظیم معجزہ کو قیامت تک کے لئے باقی رکھا جو ہر زمانے اور ہر طبقہ میں سید العلمین ﷺ کی نبوت و رسالت کی صداقت پر پوری حقانیت اور یقین کے ساتھ گواہی پیش کرتا رہا ہے اور پیش کرتا رہے گا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ مجھے عطا کیا جانے والا یہ عظیم معجزہ چونکہ قیامت تک باقی رہے گا اور لوگ برابر اس پر ایمان لاتے رہیں گے اس لئے قیامت کے دن اکثریت ان اہل ایمان کی ہوگی جو میری نبوت و رسالت پر عقیدہ رکھنے والے اور میرے اس معجزہ قرآن کریم کو ماننے والے ہوں گے۔

آنحضرت ﷺ کے خصائص

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا فَاَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِيْ اَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَ اُحِلَّتْ لِيَ الْمَغَانِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی و رسول کو عطا نہیں ہوئیں، ایک تو مجھ کو اس رعب کے ذریعہ نصرت عطا ہوئی ہے جو ایک مہینے کی مسافت کی دوری پر اثر انداز ہوتا ہے دوسرے ساری زمین کو میرے لئے مسجد اور "پاک کرنے والی" قرار دیا گیا، چنانچہ میری امت کا ہر (وہ) شخص (جس پر نماز واجب ہو) جہاں نماز کا وقت پائے (اگر پانی نہ ہو تیمم کر کے) نماز پڑھ لے، تیسرے میرے لئے مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا، جو مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں تھا، چوتھے مجھے کو شفاعت عظمی عامہ کے مرتبہ سے سرفراز فرمایا گیا اور پانچویں مجھ سے پہلے ہر نبی کو خاص طور پر اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، جب کہ مجھ کو روئے زمین کے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "مجھ کو اس رعب کے ذریعہ نصرت عطا ہوئی ہے...... الخ۔" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اور اسلام کے دشمنوں اور مخالفوں کے مقابلہ پر مجھے اس خصوصیت کے ساتھ فتح و نصرت عطا فرماتا ہے کہ ان کے دلوں میں میرا رعب اور خوف پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ مجھ سے ایک مہینہ کی مسافت کی دوری پر بھی ہوتے ہیں تو میرے نام ہی سے ان کی ہمت پست ہو جاتی ہے اور مارے رعب و دہشت کے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

"ساری زمین کو میرے لئے مسجد...... الخ۔" کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے پہلے کے رسولوں اور نبیوں کی شریعت میں ہر جگہ نماز پڑھنا اور عبادت کرنا درست نہیں تھا، ان کی نماز و عبادت کے لئے جو جگہ عبادت خانہ کے طور پر متعین اور مخصوص ہوتی تھی بس وہیں نماز و عبادت ہو سکتی تھی، لیکن مجھے یہ خصوصیت عطا ہوئی کہ میں اور میری اُمت کے لوگ بیت الخلاء و غسل خانہ اور مقبرہ کے علاوہ پوری روئے زمین پر جس جگہ اور جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں، الا یہ کہ کسی جگہ کی ناپاکی کا علم یقین کے ساتھ ہو جائے تو اس جگہ نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اسی طرح گذشتہ امتوں میں پانی کے بغیر پاکی حاصل نہیں ہوتی تھی، لیکن ہمارے لئے یہ جائز قرار دیا گیا ہے کہ اگر کہیں پانی دستیاب نہ ہو یا پانی کے استعمال میں کوئی شرعی عذر حائل ہو تو پاک مٹی کے ذریعہ تیمم کر کے پاکی حاصل کی جا سکتی ہے۔

"میرے لئے مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا۔" کی وضاحت یہ ہے کہ مال غنیمت کے بارے میں گذشتہ امتوں میں جو یہ معمول تھا کہ حاصل ہونے والا مال غنیمت اگر جانوروں کے علاوہ کسی اور جنس کا ہوتا تو اس کو جمع کر کے ایک جگہ رکھ دیا جاتا اور پھر آسمان سے ایک آگ اترتی اور وہاں جمع شدہ تمام مال و اسباب کو جلا کر واپس چلی جاتی، اور اگر مال غنیمت، مویشیوں اور جانوروں کی صورت میں ہوتا تو

اس کے حقدار صرف وہی لوگ ہوتے تھے جو اس کو دشمنوں سے چھینتے اور اس پر قبضہ کرتے تھے، نبی اور رسول کو اس میں سے کچھ نہ ملتا۔ لیکن ہمارے حضرت ﷺ کے لئے نہ صرف یہ کہ خمس یعنی مال غنیمت کا پانچواں حصہ بلکہ "صفی" لینا بھی جائز کیا گیا۔ "صفی" اس چیز کو کہتے ہیں جو مال غنیمت میں سب سے اچھی ہو، چنانچہ مال غنیمت میں جو چیز سب سے اچھی معلوم ہوتی تھی جیسے تلوار وغیرہ اس کو آنحضرت ﷺ اپنے لئے مخصوص فرمالیتے تھے۔

"مجھ کو شفاعت عظمی عامّہ کے مرتبہ سے سرفراز فرمایا گیا۔" قیامت کے دن یہ مرتبہ خاص صرف آنحضرت ﷺ کو حاصل ہوگا، اور شفاعت کے جتنے بھی مواقع اور مقام ہوں گے وہ سب آنحضرت ﷺ کے اسی مرتبہ کے تحت ہوں گے، اس بارے میں تفصیلی بحث "باب الشفاعۃ" میں گذر چکی ہے۔

"مجھ کو روئے زمین کے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا۔" کے بارے میں یہ ذہن نشین رہے کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت صرف انسانوں ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ کی بعثت جنات کی طرف بھی ہوئی ہے، اپنی رسالت کے ذریعہ جس طرح آپ ﷺ نے روئے زمین کے تمام انسانوں تک خدا کا پیغام ہدایت پہنچایا اسی طرح جنات کی بھی ہدایت فرمائی، اسی لئے آپ ﷺ کو "رسول الثقلین" کہا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جس وقت آپ ﷺ نے یہ حدیث ارشاد فرمائی، اس وقت تک جنات کی طرف آپ ﷺ کی بعثت نہ ہوئی ہو، بعد میں ہوئی ہو اور اسی وجہ سے اس حدیث میں "جنات" کا ذکر نہیں کیا گیا۔

⑩ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فُضِّلْتُ عَلَی الْاَنْبِیَآءِ بِسِتٍّ اُعْطِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَاُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ وَجُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا وَاُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّةً وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "مجھے چھ مخصوص چیزوں کے ذریعہ دوسرے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے، ① مجھے جامع کلمات عطا ہوئے ② دشمنوں کے دل میں میرا رعب ڈالنے کے ذریعہ مجھے فتح و نصرت عطا فرمائی گئی، ③ مال غنیمت میرے لئے حلال ہوا ④ ساری زمین کو میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی قرار دیا گیا، ⑤ ساری مخلوق کے لئے مجھے نبی بنا کر بھیجا گیا ⑥ اور نبوت و رسالت کا سلسلہ مجھ پر ختم کیا گیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "مجھے جامع کلمات عطا ہوئے۔" کا مطلب یہ ہے کہ دین کی حکمتیں اور احکام، ہدایت کی باتیں، اور مذہبی و دنیاوی امور سے متعلق دوسری چیزوں کو بیان کرنے کا ایسا مخصوص اسلوب مجھے عطا فرمایا گیا جو نہ پہلے کسی نبی اور رسول کو عطا ہوا اور نہ دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے فصیح و بلیغ کو نصیب ہوا! اس اسلوب کی خصوصیت یہ ہے کہ تھوڑے سے الفاظ کے ایک چھوٹے سے جملہ میں معانی و مفہوم کا ایک گنجینہ پنہاں ہوتا ہے، پڑھئے اور لکھئے تو چھوٹی سی سطر بھی پوری نہ ہو، لیکن اس کا فہم اور وضاحت بیان کیجئے تو کتاب کی کتاب تیار ہو جائے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے اقوال و ارشادات میں اس طرح کے کلمات کی ایک بڑی تعداد ہے جن کو "جوامع الکلم" سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان میں سے چند کلمات کو بطور مثال یہاں نقل کیا جاتا ہے:

❶ انما الاعمال بالنیات اس میں کوئی شک نہیں کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔

❷ ومن حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ بے فائدہ بات کو ترک کردینا آدمی کے اسلام کا حسن ہے۔

❸ الدین النصیحۃ دین، خیر خواہی کا نام ہے۔

❹ العدۃ دین وعدہ، بمنزلہ دین کے ہے۔

❺ المستشار مو تمن جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانتدار ہے۔

بعض علماء نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کام لے کر احادیث کے ذخائر میں سے اس طرح کی حدیثوں کو، جو "جوامع الکلم" میں سے

ہیں، چناہے (اور انکا مجموعہ تیار کیا ہے! بعض شارحین نے یہ لکھا ہے کہ "مجھے جوامع الکلم یعنی جامع کلمات عطا ہوئے ہیں۔" میں جوامع الکلم سے "قرآن کریم" مراد ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے کلام کا یہ اعجاز نمایاں ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے بڑے مضمون پنہاں ہیں، لیکن پہلی وضاحت ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اسی مضمون کی ایک دوسری روایت میں "اختصہ لی الکلام" کے الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں اس سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں "جوامع الکلم" سے آنحضرت ﷺ کے ارشاد و اقوال مراد ہیں۔

"اور نبوت و رسالت کا سلسلہ مجھ پر ختم کیا گیا۔" کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے وحی آنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا، رسالت تمام ہوئی، اب میرے بعد کوئی اور نبی و رسول نہیں آئے گا کیونکہ خدا کا دین مکمل ہو گیا ہے، قیامت کے قریب حضرت عیسی علیہ السلام کا اترنا بھی اسی دین کو مضبوط بنانے اور زیادہ سے زیادہ پھیلانے کے لئے ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کے لئے خزانوں کی کنجیاں

(۱۱) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَبَيْنَا اَنَا نَائِمٌ رَأَيْتُنِيْ اُتِيْتُ بِمَفَاتِيْحِ خَزَائِنِ الْاَرْضِ فَوُضِعَتْ فِيْ يَدَيَّ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "مجھے جامع کلمات کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے، رعب کے ذریعہ مجھ کو نصرت عطا فرمائی گئی ہے، اور (ایک دن) جب کہ میں سویا ہوا تھا، میں نے خواب میں دیکھا کہ زمین کے خزانوں کی کنجیاں مجھے دینے کے لئے لائی گئیں اور میرے سامنے پیش کر دی گئیں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خواب کے ذریعہ مجھے بشارت عطا فرمائی کہ بڑے بڑے علاقوں اور شہروں کا فتح ہونا اور ان کے خزانوں اور مال و اسباب کا حاصل ہونا میرے لئے اور میری اُمت کے لئے آسان کر دیا گیا۔ یا "خزانوں" سے مراد وہ معدنیات ہیں جو زمین کے نیچے چھپی ہوئی ہیں جیسے سونا، چاندی، اور دوسری قیمتی چیزیں۔

امت محمدیہ ﷺ کے تئیں خصوصی عنایات ربانی

(۱۲) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْاَرْضَ فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَاِنَّ اُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا وَاُعْطِيْتُ الْكَنْزَيْنِ الْاَحْمَرَ وَالْاَبْيَضَ وَاِنِّيْ سَاَلْتُ رَبِّيْ لِاُمَّتِيْ اَنْ لَا يُهْلِكَهَا بِسَنَةٍ عَامَّةٍ لَا يُسَلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ سِوٰى اَنْفُسِهِمْ فَيَسْتَبِيْحَ بَيْضَتَهُمْ وَاِنَّ رَبِّيْ قَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنِّيْ قَضَيْتُ قَضَاءً فَاِنَّهٗ لَا يُرَدُّ وَاِنِّيْ اَعْطَيْتُكَ لِاُمَّتِكَ اَنْ لَا اُهْلِكَهُمْ بِسَنَةٍ عَامَّةٍ وَاَنْ لَا اُسَلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ سِوٰى اَنْفُسِهِمْ فَيَسْتَبِيْحَ بَيْضَتَهُمْ وَلَوِ اجْتَمَعَ عَلَيْهِمْ مَنْ بِاَقْطَارِهَا حَتّٰى يَكُوْنَ بَعْضُهُمْ يُهْلِكُ بَعْضًا وَيَسْبِيْ بَعْضُهُمْ بَعْضًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے میرے لئے روئے زمین کو سمیٹا (یعنی اس کو سمیٹ کر ایک ہتھیلی کے برابر کر دیا اور پھر مجھے دکھایا) چنانچہ میں نے روئے زمین کو مشرق سے لے کر مغرب تک دیکھا اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری اُمت عنقریب روئے زمین کے ان تمام علاقوں کی بادشاہت سے سرفراز ہوگی، جو سمیٹ کر مجھ کو دکھائے گئے ہیں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھ کو سرخ اور سفید دو خزانے عطا کئے گئے ہیں۔ نیز میں نے اپنے پروردگار سے التجا کی کہ میری اُمت کے لوگوں کو عام قحط میں نہ مارے (یعنی ایسا قحط نہ مسلط کرے جس میں مبتلا ہو کر پوری اُمت ہلاک ہو جائے)۔ اور یہ کہ میری اُمت پر مسلمانوں کے علاوہ کسی (غیر مسلم دشمن کو مسلط نہ کرے جو ان کی اجتماعیت اور ملی نظام کے مرکز پر قبضہ کرلے۔ چنانچہ میرے رب نے فرمایا: "اے محمد (ﷺ)! جب میں کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہوں تو وہ بدلا نہیں جا سکتا، پس میں تمہاری اُمت کے حق میں تمہیں اپنا یہ عہد و فیصلہ دیتا ہوں، کہ مسلمانوں کو نہ تو

عام قحط میں ہلاک کروں گا اور نہ خود ان کے علاوہ کوئی اور دشمن ان پر مسلط کروں گا جو ان کی اجتماعیت اور ملی نظام کے ایک مرکز پر قبضہ کرلے اگرچہ ان (مسلمانوں) پر تمام روئے زمین کے غیر مسلم دشمن جمع ہو کر حملہ آور ہوں الآیہ کہ تمہاری اُمت ہی کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں اور ایک دوسرے کو قید و بند کی صعوبت میں ڈالیں۔" (مسلم)

تشریح: "سرخ اور سفید خزانوں" سے سونے اور چاندی کے خزانے مراد ہیں، اور ان دونوں خزانوں کے ذریعہ کسری بادشاہ فارس اور قیصر بادشاہ روم کی سلطنت و مملکت کی طرف اشارہ مقصود ہے، کیونکہ اس زمانہ میں فارس میں سونے کے اور روم میں چاندی کے ذخائر اور خزینے بہت زیادہ تھے، پس آپ ﷺ نے پیشگوئی فرمائی کہ میری اُمت کے لوگ جلد ہی وقت کی ان دونوں عظیم سلطنتوں پر قابض و حکمران ہو جائیں گے اور ان کے تمام خزانے اور مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ لگیں گے، چنانچہ یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔

"الآیہ کہ تمہاری اُمت ہی کے لوگ آپس میں........ الخ" اس جملہ کا سیاق و سباق اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو دو چیزوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون کر دیا ہے، ایک تو یہ کہ عام قحط و فاقہ کشی کی ایسی صورت حال کہ جو مجموعی طور پر تمام مسلمانوں کو ہلاک و فنا کر دے کبھی پیش نہیں آئے گی، دوسرے یہ کہ اگر تمام روئے زمین کی اسلام دشمن اور مسلم مخالف طاقتیں مل کر بھی یہ چاہیں کہ مسلمانوں کی دینی و اجتماعی ہیئت کے مرکز اور ان کی مجموعی طاقت کو صفحہ ہستی سے مٹا کر ان کے تمام علاقوں پر قبضہ کر بھی لیں تو ایسا کبھی نہیں ہوگا، یہ اور بات ہے کہ خود مسلمانوں میں باہمی افتراق و انتشار پیدا ہو جائے، بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ذلیل و رسوا کرنے لگے اور مسلمانوں کی اجتماعی طاقت اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف استعمال ہونے کی بجائے آپس میں دست و گریبان ہو جائے اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ان کا دشمن ان کی اجتماعی طاقت کو کمزور کر دے یا کسی علاقہ کے مسلمانوں کی ملی و دینی اجتماعیت اور ان کے سیاسی مرکز کو نقصان پہنچا دے! یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقدر ہو چکا ہے، اس فیصلہ کو نہ کوئی بدل سکتا ہے اور نہ اس کے خلاف کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

اپنی اُمت کے حق میں آنحضرت ﷺ کی وہ دعا جو قبول نہیں ہوئی

⑬ وَعَنْ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَسْجِدِ بَنِيْ مُعَاوِيَةَ دَخَلَ فَرَكَعَ فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ وَصَلَّيْنَا مَعَهُ وَدَعَا رَبَّهُ طَوِيْلًا ثُمَّ انْصَرَفَ فَقَالَ سَأَلْتُ رَبِّيْ ثَلَاثًا فَاَعْطَانِيْ ثِنْتَيْنِ وَمَنَعَنِيْ وَاحِدَةً سَأَلْتُ رَبِّيْ اَنْ لَّا يُهْلِكَ اُمَّتِيْ بِالسَّنَةِ فَاَعْطَانِيْهَا وَسَأَلْتُ اَنْ لَّا يُهْلِكَ اُمَّتِيْ بِالْغَرَقِ فَاَعْطَانِيْهَا وَسَأَلْتُهُ اَنْ لَّا يَجْعَلَ بَاْسَهُمْ بَيْنَهُمْ فَمَنَعَنِيْهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ (انصار کے ایک قبیلہ) بنی معاویہ کی مسجد کے قریب سے گذرے تو اندر (مسجد میں) تشریف لائے، اور وہاں دو رکعت نماز پڑھی، اس نماز میں آپ کے ساتھ ہم بھی شریک ہوئے، (نماز کے بعد) آپ ﷺ نے اپنے پروردگار سے بڑی طویل دعا مانگی (یعنی بہت دیر تک دعا میں مصروف رہے) پھر جب نماز و دعا سے فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "میں نے (آج اپنی دعا میں) اپنے پروردگار سے تین چیزیں مانگی تھیں، ان میں سے دو چیزیں تو مجھے عطا فرما دی گئیں اور ایک چیز سے منع کر دیا گیا، ایک چیز کی درخواست میں نے یہ کی تھی کہ میری اُمت کو قحط عام میں ہلاک نہ کیا جائے، یہ درخواست قبول فرمالی گئی، دوسری درخواست میں نے یہ کی تھی کہ میری اُمت کو پانی میں غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے (یعنی جس طرح فرعون کی قوم دریائے نیل میں غرق کر کے ہلاک کر دی گئی، یا نوح علیہ السلام کی قوم پانی کے طوفان میں مبتلا کر کے نیست و نابود کر دی گئی۔ اسی طرح میری پوری امت پانی میں ڈبو کر ہلاک نہ کی جائے) اور میری یہ درخواست بھی قبول فرمالی گئی، تیسری درخواست یہ تھی کہ میری اُمت کے لوگ آپس میں دست و گریبان نہ ہوں (یعنی مسلمان، مسلمان سے برسرپیکار نہ ہوں اور آپس میں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی نہ کریں) لیکن میری یہ درخواست قبول نہیں ہوئی۔" (مسلم)

تشریح: "بنو معاویہ" انصار مدینہ کے ایک قبیلہ کا نام تھا، آنحضرت ﷺ ایک دن اس قبیلہ میں تشریف لے گئے ہوں گے کسی فرض نماز کا وقت آگیا ہوگا اور آپ ﷺ نے وہ فرض نماز اس قبیلہ کی مسجد میں ادا فرمائی یا یہ کہ آپ ﷺ نے اس نماز میں التحیات کے دوران یا سلام پھیر کر اللہ تعالیٰ سے اپنی اُمت کے حق میں جو تین دعائیں مانگیں اور ان میں سے جو ایک دعا قبول نہیں ہوئی تو اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کی بھی بعض دعا قبول نہیں ہوتی تھی۔

تورات میں آنحضرت ﷺ کے اوصاف کا ذکر

(۱۴) وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ لَقِيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قُلْتُ اَخْبِرْنِيْ عَنْ صِفَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي التَّوْرٰةِ قَالَ اَجَلْ وَاللّٰهِ اِنَّهُ لَمَوْصُوْفٌ فِي التَّوْرٰةِ قَالَ بِبَعْضِ صِفَتِهِ فِي الْقُرْاٰنِ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَّحِرْزًا لِّلْاُمِّيِّيْنَ اَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ وَلَا سَخَّابٍ فِي الْاَسْوَاقِ وَلَا يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُوْ وَيَغْفِرُ وَلَنْ يَّقْبِضَهُ اللّٰهُ حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ يَّقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيَفْتَحُ بِهَا اَعْيُنًا عُمْيًا وَّاٰذَانًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَكَذَا الدَّارِمِيُّ عَنْ عَطَاءٍ عَنِ ابْنِ سَلَامٍ نَحْوَهٗ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِيْ هُرَيْرَةَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ فِيْ بَابِ الْجُمُعَةِ۔

"اور حضرت عطاء ابن یسارؒ (مشہور جلیل القدر تابعی) کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو ابن عاصؓ کی ملاقات سے مشرف ہوا، تو ان سے عرض کیا کہ (یہودیوں کی آسمانی کتاب) تورات میں رسول کریم ﷺ کی جن صفات وخصوصیات کا ذکر ہے ان کے بارے میں مجھے کچھ بتائے! حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ ضرور بتاؤں گا، خدا کی قسم تورات میں آنحضرت ﷺ کی ان بعض صفات وخصوصیات کا ذکر ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، چنانچہ (اللہ تعالیٰ نے تورات میں آپ ﷺ کی جو صفات و خصوصیات ذکر کی ہیں، ان کو اپنی زبان اور اپنے اسلوب میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ) اے نبی، ہم نے تمہیں اہل ایمان کا شاہد، اجرو انعام کی خوشخبری دینے والا، عذاب وعتاب سے ڈرانے والا اور امیوں کو پناہ دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اے محمد (ﷺ)! تم میرے بندے ہو (کہ عبودیت وبندگی کا وہ مرتبۂ خاص تمہیں حاصل ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں) تم (بندوں کی طرف بھیجے جانے والے میرے خاص رسول ہیں، میں نے تمہارا نام متوکل رکھا ہے (یعنی تمہیں توکل واعتماد کی وہ دولت عطا کی ہے جو کسی اور کو نہیں ملی، اسی بناء پر تم اپنے تمام معاملات ومہمات میں اپنی طاقت وصلاحیت پر اعتماد کرنے کے بجائے صرف میری ذات اور میرے حکم پر بھروسہ رکھتے ہو) نہ تم بدخو ہو، نہ سخت گو اور سخت دل ہو، اور نہ بازاروں میں شور وغل مچانے والے ہو۔" تورات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ) وہ (محمد) برائی کو برائی کے ساتھ دور نہیں کریں گے (یعنی وہ اپنے ساتھ برائی کرنے والے سے انتقام نہیں لیں گے اور اس کو سزا نہیں دیں گے) بلکہ درگذر کریں گے، اور (احسان پر احسان یہ کریں گے کہ) برائی کرنے والے کے لئے دعائے مغفرت کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان (محمد ﷺ) کی روح کو اس وقت تک قبض نہ کرے گا جب تک ان کے ذریعہ کج رو اور گمراہ قوم کو راہ راست پر نہ لے آئے اس طرح کہ قوم کے لوگ اعتراف واقرار کرلیں گے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اور اس وقت ان کی روح قبض نہیں کی جائے گی) جب تک کہ اللہ تعالیٰ کلمہ طیبہ (لا اِلٰہَ الا اللّٰہ) کے ذریعہ اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بے حس دلوں کو درست نہ کردے۔" اس روایت کو بخاری نے (عطاء ابن یسار سے) نقل کیا ہے، نیز یہی حدیث دارمیؒ نے بھی عطاء ابن یسارؒ ہی سے نقل کی ہے، البتہ دارمی میں عطاء ابن یسار کی یہ روایت (عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ کے بجائے) عبداللہ ابن سلامؓ سے منقول ہے۔"

اور حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایت (جو آنحضرت ﷺ کے فضائل سے متعلق ہے اور) جس کی ابتداء نحن الآخرون کے الفاظ سے ہوتی ہے باب الجمعہ میں نقل کی جاچکی ہے۔

تشریح: حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ نہایت عالم فاضل قاری حافظ صحابی تھے، کتابت خوب جانتے تھے، پچھلی آسمانی کتابوں تورات و انجیل پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، حضور ﷺ نے ان کو اپنی احادیث لکھنے کی اجازت عطا فرمائی تھی، چنانچہ آپ آنحضرت ﷺ سے جو سنتے تھے لکھ لیتے تھے، اس لئے حضرت ابوہریرہؓ کی طرح یہ بھی کثیر الاحادیث ہیں، اور بہت سے تابعین آپ سے حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ بہر حال حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے چونکہ توراۃ پڑھ رکھی تھی اور انہیں معلوم تھا کہ اس آسمانی کتاب میں ہمارے حضرت ﷺ کے بارے میں کیا کیا پیشین گوئیاں ہیں اور آپ کے کن فضائل و اوصاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس لئے انہوں نے حضرت عطاء ابن یسار کے سوال پر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے جو بعض اوصاف و فضائل قرآن کریم میں ذکر کئے ہیں اور جن کو ہم نے آپ ﷺ کی زندگی میں دیکھا بھی ہے وہ تورات میں مذکور ہیں، پھر انہوں نے کچھ تفصیل کے ساتھ آنحضرت کے ان اوصاف و فضائل کو بیان کیا جو تورات میں مذکور ہیں، نیز انہوں نے تورات میں مذکورہ باتوں کو بیان کرنے کے لئے تفنن عبارت کے طور پر شروع میں تو وہی اسلوب اختیار کیا جو قرآن میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کا ہے اور پھر وہ اسلوب بھی اختیار کیا جو تورات میں آنحضرت ﷺ کے متعلق پیش گوئی کا ہے۔

"امیوں کو پناہ دینے والا" میں "امیوں" سے مراد اہل عرب ہیں، اور ان کو "امی" سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ ان کی اکثریت پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ اور یا ان کو "ام القری (یعنی اہل مکہ کی طرف منسوب کر کے "امی" کہا گیا۔ نیز یہاں اہل عرب کی تخصیص اس لئے ہے کہ آنحضرت کا نسلی و وطنی تعلق انہی سے ہے اور انہی میں مبعوث فرمائے گئے، تاکہ ان کو غیر عرب کے غلبۂ تسلط سے محفوظ رکھیں اور سب سے پہلے ان ہی کو ایمان و اخلاق کے ہتھیار سے مسلح کر کے ان کی حفاظت و فلاح کا سامان کریں! اور اگر (شیطانی گمراہیوں اور نفسانی آفات سے پناہ مراد لی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا بابرکت وجود تمام ہی عالم کے لئے پشت پناہ ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "پناہ" سے مراد آنحضرت ﷺ کی قوم و ملت کا اس وقت تک عذاب الٰہی میں مبتلا ہونے اور تباہ و ہلاک ہو جانے سے محفوظ و مامون رہنا ہے جب تک آپ ﷺ اپنی قوم و ملت کے درمیان موجود ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ۔

"یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان (مسلمانوں) پر عذاب نازل کرے اور آپ (ﷺ) ان میں موجود ہوں۔"

"اور نہ بازاروں میں شور و غل مچانے والے ہو" میں بازار کی تخصیص محض اس بنا پر ہے کہ عام طور پر شور و غل اور غیر سنجیدہ حرکتوں کی جگہ بازار ہی ہے، جہاں اچھے اچھے لوگ بھی پہنچ کر اپنی متانت و سنجیدگی کھو دیتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

مسلمانوں کے لئے آنحضرت ﷺ کی تین دعائیں

⑮ عَنْ خَبَّابِ بْنِ الْاَرَتِّ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةً فَاَطَالَهَا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّيْتَ صَلٰوةً لَمْ تَكُنْ تُصَلِّيْهَا قَالَ اَجَلْ اِنَّهَا صَلٰوةُ رَغْبَةٍ وَرَهْبَةٍ وَاِنِّيْ سَاَلْتُ اللّٰهَ فِيْهَا ثَلٰثًا فَاَعْطَانِيْ اِثْنَتَيْنِ وَمَنَعَنِيْ وَاحِدَةً سَاَلْتُهٗ اَنْ لَّا يُهْلِكَ اُمَّتِيْ بِسَنَةٍ فَاَعْطَانِيْهَا وَسَاَلْتُهٗ اَنْ لَا يُسَلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِّنْ غَيْرِهِمْ فَاَعْطَانِيْهَا وَسَاَلْتُهٗ اَنْ لَّا يُذِيْقَ بَعْضَهُمْ بَاْسَ بَعْضٍ فَمَنَعَنِيْهَا۔ (رواہ الترمذی و النسائی)

"حضرت خباب بن ارتؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور اس کو خلاف معمول کافی طویل کیا، ہم نے (نماز سے فراغت کے بعد) عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آج تو آپ (ﷺ) نے ایسی طویل نماز پڑھی کہ کبھی بھی اتنی طویل نماز نہیں پڑھی

تھی؟ فرمایا ہاں! یہ نماز (بہت زیادہ طویل اس وجہ سے ہوئی کہ یہ) امید و خواہش اور خوف و دہشت کی نماز تھی (یعنی اس نماز کے دوران اللہ تعالیٰ سے کچھ دعائیں مانگ رہا تھا اور جہاں ان دعاؤں کی قبولیت کی امید تھی وہیں عدم قبولیت کا خوف بھی تھا اس لئے میں بہت زیادہ خشوع و خضوع اور عرض و التجا میں مصروف رہا جس سے پوری نماز بہت طویل ہو گئی) حقیقت یہ ہے کہ میں نے نماز میں اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کی التجا کی، ان میں سے دو مجھ کو عطا کر دی گئیں، اور ایک سے انکار کر دیا گیا، میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک التجا تو یہ کی تھی کہ وہ میری اُمت کو عام قحط (یا اسی طرح کی کسی بھی ایسی آفت وبلا) میں مبتلا نہ کرے جس سے (پوری) اُمت ہلاک و تباہ ہو جائے، میری یہ التجا پوری ہوئی، دوسری التجا یہ تھی کہ مسلمانوں پر کوئی (ایسا) غیر مسلم دشمن مسلط نہ کیا جائے (جو اپنی اسلام اور مسلم دشمنی میں انہیں نیست و نابود کر دے) میری یہ التجا بھی پوری ہوئی، میں نے تیسری التجا یہ کی تھی کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو ہلاکت و عقوبت سے دوچار نہ کریں (یعنی ان کا باہمی اتحاد ہمیشہ بنا رہے، وہ ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا نہ ہوں اور آپس میں لڑائی جھگڑے کر کے اپنی ملی طاقت کو کمزور نہ کریں) لیکن میری یہ التجا قبول نہیں ہوئی۔"

مسلمان تین چیزوں سے محفوظ رکھے گئے ہیں

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ مَالِكِ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَجَارَكُمْ مِنْ ثَلَاثِ خِلَالٍ اَنْ لَّا یَدْعُوْ عَلَیْكُمْ نَبِیُّكُمْ فَتَهْلِكُوْا جَمِیْعًا وَاَنْ لَّا یَظْهَرَ اَهْلُ الْبَاطِلِ عَلٰی اَهْلِ الْحَقِّ وَاَنْ لَا تَجْتَمِعُوْا عَلٰی ضَلٰلَةٍ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "(مسلمانو!) اللہ تعالیٰ نے تمہیں تین چیزوں سے محفوظ رکھا ہے، ایک تو یہ کہ تمہارا نبی تمہارے لئے بددعا نہ کرے جس سے تم ہلاک ہو جاؤ (جیسا کہ پہلے بعض انبیاء نے بددعا کر کے اپنی قوم کو ہلاک و برباد کرا دیا) دوسرے یہ کہ باطل و گمراہ لوگ اہل حق پر غالب نہ ہوں، تیسرے یہ کہ میری ساری اُمت گمراہی پر جمع نہ ہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: "باطل و گمراہ لوگ اہل حق پر غالب نہ ہوں۔" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن، طاقت اور تعداد کے اعتبار سے بہت ہوں اور مسلمان کم ہوں تب بھی وہ تمام مسلمانوں کو ہرگز مٹا نہیں سکیں گے، چنانچہ حاکم نے حضرت عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "قیامت آنے تک ہمیشہ میری اُمت میں سے کوئی نہ کوئی گروہ حق کے ساتھ غالب رہے گا" اور ابن ماجہؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہمیشہ میری اُمت میں سے کوئی نہ کوئی گروہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گا اور ان کا دشمن ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

"میری ساری اُمت گمراہی پر جمع نہ ہو۔" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ سارے مسلمان کسی فاسد نظریہ اور کسی غلط کام پر متفق و متحد ہو جائیں، یہ اور بات ہے کہ مسلمانوں کے کچھ افراد یا کچھ طبقے اپنے اغراض کی خاطر کسی غیر اسلامی بات کو قبول کر لیں اور اس کو جائز قرار دینے لگیں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ پوری دنیا کے مسلمان یا مسلمانوں کا سواد اعظم اس غیر اسلامی بات پر جمع ہو جائے۔ حدیث کا یہ جملہ گویا اس امر کی دلیل ہے کہ "اجماع" حجت ہے، اور "اجماع" سے مراد "اپنے زمانہ کے مجتہد و بابصیرت علماء کا کسی حکم شرعی پر متفق ہونا ہے۔

مسلمان آپس کے افتراق و انتشار کے باوجود اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہوں گے

(۱۷) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَنْ یَجْمَعَ اللّٰهُ عَلٰی هٰذِهِ الْاُمَّةِ سَیْفَیْنِ سَیْفًا مِنْهَا وَسَیْفًا مِنْ عَدُوِّهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عوف ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس اُمت کے خلاف دو تلواروں کو اکٹھا نہیں کرے گا ایک تلوار تو خود مسلمانوں کی اور دوسری تلوار ان کے دشمنوں کی۔" (ابوداؤد)

تشریح: یہ خدائی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف کبھی بھی دو تلواریں جمع نہیں ہوں گی جن سے پوری ملی طاقت تہ وبالا ہو جائے اور مسلمان بحیثیت مجموعی ختم ہو جائیں! دو تلواروں کے جمع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمان آپس میں دست و گریبان ہوں، باہمی افتراق و انتشار کا شکار ہوں، ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے میں مصروف ہوں اور دوسری طرف سے ان کا مشترکہ دشمن یعنی کوئی غیر مسلم طاقت ان پر حملہ آور ہو اور ان باہمی افتراق و انتشار کا فائدہ اٹھا کر ان پر غلبہ و تسلط حاصل کر لے، اور ان کو مٹا کر رکھ دے۔ تورپشتیؒ نے اس حدیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ جب بھی مسلمان آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں گے اور ان میں اتحاد و اتفاق کی جگہ ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی اتنی شدت اختیار کر جائے کہ ملی شیرازہ منتشر ہونے لگے، تو اللہ تعالیٰ ان پر ایسی غیر مسلم طاقت مسلط کر دے گا جس کا ظلم و جور مسلمانوں کی ملی اتفاق و اتحاد کے جھنڈے کے نیچے لے آئے گا اور وہ آپس میں لڑنا جھگڑنا چھوڑ کر باہم شیر و شکر ہو جائیں گے۔ اور طیبی نے یہ لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ اس امت کے لوگوں کو ایک ساتھ دو لڑائیوں کا شکار نہیں بنایا جائے گا، کہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے خلاف لڑیں اور کسی غیر مسلم دشمن کے خلاف بھی نبرد آزما ہوں، بلکہ جب ان کو اپنے غیر مسلم دشمن کی جارحیت اور استیصال کا سامنا ہو گا تو وہ اپنے تمام باہمی اختلاف اور لڑائی جھگڑے مٹا کر اس دشمن کے مقابلہ پر یکجا اور متحد ہو جائیں گے۔

آنحضرت ﷺ کی نسلی و نسبی فضیلت

⑱ وَعَنِ الْعَبَّاسِؓ اَنَّهٗ جَآءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَاَنَّهٗ سَمِعَ شَيْئًا فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ مَنْ اَنَا فَقَالُوْا اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَيْنِ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ فِرْقَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَائِلَ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ قَبِيْلَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُيُوْتًا فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ بَيْتًا فَاَنَا خَيْرُهُمْ نَفْسًا وَخَيْرُهُمْ بَيْتًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے (ایک دن) کفار کو نبی کریم ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائی کرتے سنا تو (افسوس اور غصہ میں بھرے ہوئے آپ ﷺ کی خدمت میں آئے (اور بتایا کہ کفار یہ بکواس کر رہے ہیں کہ اگر اللہ میاں کو مکہ ہی کے کسی شخص کو اپنا نبی اور رسول بنانا تھا تو اس شہر کے بڑے بڑے صاحب دولت و ثروت اور اونچے درجے کے سرداروں کو چھوڑ کر محمد ﷺ کا انتخاب کیوں کرتا) آنحضرت ﷺ (نے یہ سنا تو واضح کرنے کے لئے کہ نسلی و نسبی اور خاندانی عظمت و عزت کے اعتبار سے آپ ﷺ کی شان کیا ہے، اور مرتبہ نبوت پر فائز ہونے کے لئے دوسروں کے مقابلہ آپ ﷺ کی حیثیت و اہمیت کیا ہے) منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ تم لوگ جانتے ہو، میں کون ہوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا (ہاں میں اللہ کا رسول ہوں، لیکن میری نسلی و نسبی اور خاندانی عظمت کیا ہے، اس کو جاننے کے لئے سنو) میں عبداللہ بن عبدالمطلب کا بیٹا محمد (ﷺ) ہوں (اور عبدالمطلب وہ ہستی ہیں جو عرب میں نہایت بزرگ و معزز، بڑے شریف و پاکباز اور انتہائی مشہور و معروف تھے) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق (جنات و انسان) کو پیدا کیا تو مجھے اس مخلوق میں سے بہترین مخلوق (نوع انسانی) میں پیدا کیا، پھر اس بہترین مخلوق (نوع انسانی) کے اللہ تعالیٰ نے دو طبقے کئے (ایک عرب دوسرا عجم) اور مجھے ان دونوں طبقوں میں سے بہترین طبقہ (عرب) میں پیدا کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس بہترین طبقہ (عرب) کو قبائل در قبائل کیا (یعنی اس طبقہ کو مختلف قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا) اور مجھے ان قبائل میں سے بہترین قبیلہ (قریش) میں پیدا کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس بہترین قبیلہ (قریش) کے مختلف گھرانے بنائے اور مجھے ان گھرانوں میں سے بہترین گھرانے (بنو ہاشم) میں پیدا کیا، پس میں ان (تمام نوع انسانی اور تمام اہل عرب) میں ذات و حسب کے اعتبار سے بھی سب سے بہتر و اعلیٰ ہوں اور

خاندان وگھرانے کے اعتبار سے بھی سب سے اونچا ہوں۔" (ترمذی)

تشریح : حضور ﷺ نے اپنی نسلی، نسبی اور خاندانی عظمت و فضیلت کا اظہار کر کے گویا یہ واضح کیا کہ خدا کا آخری نبی بننے اور خدا کی آخری کتاب پانے کا سب سے زیادہ مستحق میں ہی تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکمت الٰہی اس کا لحاظ رکھتی تھی کہ مرتبۂ نبوت و رسالت پر فائز ہونے والی ہستی حسب اور خاندان کے اعتبار سے بلند درجہ اور عالی حیثیت ہو، لیکن انبیاء کی ذات کے لئے حسب و نسب کی عظمت و برتری کا لازم ہونا کوئی بنیادی چیز نہیں ہے، اس کا تعلق محض ان لوگوں کے خلاف اتمام حجت سے ہے جو حسب و نسب کی بڑائی اور خاندانی وجاہت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت جاہل اور بیوقوف کفار کہا کرتے تھے کہ اگر خدا کی آخری کتاب قرآن کو نازل کیا جانا تھا اور نبوت و رسالت قائم کی جانی تھی تو اس کے لئے عرب کے بڑے بڑے سرداروں میں سے کسی کا انتخاب کیوں نہیں کیا گیا! ورنہ جہاں تک نفس نبوت کا تعلق ہے وہ خود اتنا بڑا شرف ہے جس کے سامنے کسی کی بھی طرح کی بڑی سے بڑی وجاہت اور عظمت بے حیثیت چیز ہے، اس کا حصول نہ حسب و نسب کی عظمت و بلندی پر موقوف ہے اور نہ کسی اور سبب و ذریعہ پر، بلکہ محض خدا کا فضل ہے کہ اس نے جس کو چاہا اس شرف و مرتبہ کے لئے منتخب فرمایا، قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسالته۔

"اس کو تو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کے لئے کس کو منتخب کرے ایک اور موقع پر فرمایا۔"

واللہ یختص برحمته من یشآء واللہ ذو الفضل العظیم۔

"اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (عنایت) کے ساتھ جس کو منظور ہوتا ہے، مخصوص فرما لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل (کرنے) والے ہیں۔"

وکان فضل اللہ علیک عظیما۔

"اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کو (اپنی کتاب اور علم و نبوت عطا کر کے) بڑے فضل سے نوازا۔"

آنحضرت ﷺ کی نبوت حضرت آدم علیہ السلام کے وجود پذیر ہونے سے بھی پہلے تجویز ہو گئی تھی

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَتٰی وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ قَالَ وَاٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) صحابہؓ نے پوچھا، کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! نبوت کے لئے آپ (ﷺ) کس وقت نامزد ہوئے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اس وقت جب کہ آدم علیہ السلام روح اور بدن کے درمیان تھے۔" (ترمذی)

تشریح : مطلب یہ کہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی مرتبہ نبوت و رسالت کے لئے اس وقت نامزد بھی ہو چکی تھی۔ جب کہ حضرت آدم علیہ السلام کی روح ان کے پیکر خاکی سے متعلق بھی نہیں ہوئی تھی اور ان کا پتلا زمین پر بے جان پڑا تھا۔ یہ جملہ دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں آنے سے بھی پہلے متعین و مقرر ہو چکی تھی۔

آنحضرت ﷺ اور ختم نبوت

(۲۰) وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِنِّیْ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْتُوْبٌ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ وَاِنَّ اٰدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِیْنَتِهٖ وَسَاُخْبِرُكُمْ بِاَوَّلِ اَمْرِیْ دَعْوَةُ اِبْرَاهِیْمَ وَبِشَارَةُ عِیْسٰی وَرُؤْیَا اُمِّیَ الَّتِیْ رَاَتْ حِیْنَ وَضَعَتْنِیْ وَقَدْ خَرَجَ لَهَا نُوْرٌ اَضَآءَ لَهَا مِنْهُ قُصُوْرُ الشَّامِ رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ مِنْ قَوْلِهٖ سَاُخْبِرُكُمْ اِلٰی اٰخِرِهٖ۔

"اور حضرت عرباض ابن ساریہؓ، رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی وقت سے خاتم النبین لکھا ہوا ہوں جب کہ آدم علیہ السلام اپنی گندھی ہوئی مٹی میں پڑے تھے۔ اور میں تمہیں بتاتا ہوں میرا پہلا امر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہے، اور میری ماں کا خواب ہے جو انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا تھا، حقیقت یہ ہے کہ میری ماں کے سامنے ایک نور ظاہر ہوا تھا جس نے ان پر شام کے محلات کو روشن کر دیا تھا۔" اس روایت کو بغویؒ نے (اپنی اسناد کے ساتھ) شرح السنہ میں نقل کیا ہے۔ نیز امام احمد نے بھی اس روایت کو ساخبر کم سے آخر تک ابوامامہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "وان ادم لمنجدل فی طینه۔" میں لفظ "طینه" کے معنی گوندھی ہوئی مٹی، کیچڑ اور گارے کے ہیں خلقت اور جبلت کو بھی "طینت" کہتے ہیں۔" حضور ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ میرا "خاتم النبیین" کی حیثیت سے اس دنیا میں مبعوث ہونا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت لکھا جا چکا تھا جب کہ حضرت آدم علیہ السلام آب وگل کے درمیان تھے، اور نہ صرف یہ کہ ان کے پتلے میں جان نہیں پڑی تھی بلکہ ان کا پتلا بن کر تیار بھی نہیں ہوا تھا، بن رہا تھا۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق وپیدائش سے بھی پہلے متعین ومقرر ہو جانے سے کیا مراد ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ کے علم اور تقدیر الٰہی میں ہونا مراد ہے تو یہ بات تمام ہی انبیاء کے متعلق کہی جا سکتی ہے، آنحضرت ﷺ کی تخصیص کے کیا معنی، اور اگر آنحضرت ﷺ کی نبوت کا بالفعل ظاہر ہونا مراد ہے تو یہ خلاف واقعہ ہوگا، کیونکہ بالفعل کا تعلق اس دنیا سے ہے، اور ظاہر ہے کہ اس دنیا میں آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اظہار حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق وپیدائش کے ہزاروں سال بعد ہوا۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل مراد آنحضرت ﷺ کی نبوت کا تمام فرشتوں اور روحوں میں ظاہر ومتعارف کر دیا جانا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں آنحضرت ﷺ کے اسم شریف کا عرش، آسمان، اور جنت کے محلات وبالاخانوں پر حور عین کے سینوں پر، جنت کے درختوں اور طوبیٰ درخت کے پتوں پر، اور فرشتوں کی آنکھوں اور بھووں پر لکھا ہونا منقول ہے۔ اور بعض عارفین نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی روح مبارک عالم ارواح میں تمام روحوں کی تربیت واصلاح کرتی تھی جیسا کہ اس دنیا میں تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ کی ذات گرامی اس دنیا میں اجسام انسانی کی مربی ومصلح ہوئی اور یہ بات کسی شک وشبہ کے بغیر ثابت ہے کہ تمام روحیں اپنے اجسام سے بہت پہلے عالم وجود میں آ چکی تھیں۔

"میرا پہلا امر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے........الخ" کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے یہ واضح فرمایا کہ میرا خاتم النبیین ہونا نہ صرف یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وجود پذیر ہونے سے پہلے تجویز اور عالم بالا میں ظاہر ہو چکا تھا بلکہ اس دنیا میں بھی میری جسمانی پیدائش سے بہت پہلے مختلف انبیاء کے ذریعہ میری نبوت ورسالت اور میرے علو مرتبہ کا ظہور ہو چکا تھا، اس کی دلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا ہے جو انہوں نے میری رسالت کے متعلق خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت کی تھی اور جس کو قرآن کریم میں اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

"میرے پروردگار! اور اس جماعت (اسمٰعیل کی اولاد) میں ان ہی کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کر دیجئے، جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے۔ ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاکیزہ کر دیں، بلاشبہ آپ ہی غالب القدرۃ اور کامل الانتظام ہیں۔"

اسی طرح اس دنیا میں میری آمد سے کہیں پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے میری نبوت ورسالت کی خوشخبری دے دی تھی، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَّأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ۔

"اور (اے بنی اسرائیل) میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں اور جن کا نام "احمد" ہوگا میں ان کی بشارت دینے والا ہوں۔"

نیز میری پیدائش سے پہلے میری والدہ محترمہ کا بشارت انگیز خواب دیکھنا اور میری پیدائش کے وقت ان کے ساتھ حیرت ناک واقعات وحالات کا پیش آنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ میری نبوت ورسالت کا نور، اس دنیا میں میرے مبعوث ہونے سے پہلے ہی پرتو فگن ہو چکا تھا۔

حدیث کے اس جملہ "جو انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا تھا" کے تحت طیبی وغیرہ شارحین نے لکھا ہے کہ ان الفاظ کی مراد خواب میں دیکھنا بھی ہوسکتا ہے اور حالت بیداری میں دیکھنا بھی، پہلی صورت میں "پیدائش کے وقت سے کچھ پہلے کا عرصہ مراد ہوگا جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ ؓ کے ہاں ولادت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے خواب میں دیکھا، ایک فرشتہ آیا اور کہہ رہا ہے کہ کہو: "میں اس بچہ کو (جو میرے پیٹ سے پیدا ہونے والا ہے یعنی آنحضرت ﷺ) ہر حسد کرنے والے کے شر سے خدائے واحد کی پناہ میں دیتی ہوں۔" حضرت آمنہ ؓ نے اس سے پہلے استقرار حمل کے وقت بھی خواب میں دیکھا تھا کہ ایک فرشتہ آیا اور کہنے لگا کہ کیا تم جانتی ہو تمہارے پیٹ میں اس اُمت کا سردار نبی ہے۔ دوسری صورت میں بحالت بیداری دیکھنا مراد ہو، کہا جائے گا کہ انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا تھا۔" کا تعلق اس چیز کے دیکھنے سے ہے جس کا ذکر اس جملہ میں محذوف ہے، مگر آگے کی عبارت اس کی پوری وضاحت کرتی ہے، اور بعض روایتوں میں بھی آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش کے وقت حضرت آمنہ ؓ سے ایسا نور ظاہر ہوا کہ ملک شام کے محل ومکانات سامنے نظر آنے لگے۔ اور آنحضرت ﷺ کی پیدائش کے وقت ایسا نور ظاہر ہونا کہ جس سے شام کے محلات تک روشن ونمایاں ہو گئے، اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ اس وقت دنیا میں اس ہستی کا ظہور ہوا ہے جس کی نبوت ورسالت کی روشنی مشرق سے لے کر مغرب تک پوری روئے زمین کو منور کر دے گی اور کفر وضلالت کا اندھیرا ہلکا پڑ جائے گا۔

آنحضرت ﷺ کے خصائص

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا فَخْرَ وَبِیَدِیْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ وَمَا مِنْ نَبِیٍّ یَوْمَئِذٍ اٰدَمُ فَمَنْ سِوَاہُ اِلَّا تَحْتَ لِوَائِیْ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْہُ الْاَرْضُ وَلَا فَخْرَ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن میں تمام بنی آدم کا سردار بنوں گا، اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا (قیامت کے دن مقام محمود میں) حمد کا نیزہ میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا، اس دن کوئی بھی نبی خواہ وہ آدم ہوں، یا کوئی اور، ایسا نہیں ہوگا جو میرے نیزے کے نیچے نہیں آئے گا۔ اور (قیامت کے دن) سب سے پہلے میں زمین پھٹ کر اٹھوں گا، اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا۔" (ترمذی)

تشریح: "اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا۔" سے آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ میرا یہ کہنا شیخی مارنے، اترانے اور خواہ مخواہ کی بڑائی جتانے کے طور پر نہیں ہے بلکہ پروردگار نے اس فضل وبرتری کی جو نعمت مجھے عطا فرمائی ہے اس کا اقرار واظہار کرنے، اس نعمت پر شکر ادا کرنے اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ کی بجا آوری کے لئے ہے، علاوہ ازیں میں اس بات کا اظہار واعلان اس لئے بھی کر رہا ہوں تا کہ لوگ میری قدر ومنزلت اور میری حیثیت وعظمت کو جانیں، اس پر اعتقاد رکھیں اور اس کے مطابق میری توقیر وتعظیم اور میری محبت کے ذریعہ ایمان کو مضبوط بنائیں۔

"لواء" کے معنی جھنڈے اور پرچم کے ہیں لیکن نیزہ کو بھی کہتے ہیں، "حمد کا نیزہ میرے ہاتھ میں ہوگا۔" سے مراد قیامت کے دن آنحضرت ﷺ کا اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں نام آور ہونا ہے، اگر ترجمہ یوں کیا جائے کہ "حمد کا پرچم میرے ہاتھ میں ہوگا، تو اس کی مراد بھی یہی ہوگی۔" کیونکہ جس طرح اہل عرب کسی معاملہ میں اپنی شہرت وناموری کے اظہار کے لئے نیزہ کھڑا کر دیا کرتے تھے اسی طرح پرچم بھی

عظمت وبلندی اور ناموری کے اظہار کی علامت سمجھا جاتا ہے، مطلب یہ کہ اس دن جب یہ نیزہ یا جھنڈا آپ ﷺ کے ہاتھ میں آئے گا، تو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کا دل ایسا کھول دے گا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی وہ وہ تعریف کریں گے جو کوئی دوسرا نہ کر سکے گا۔ واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کو "حمد" کے ساتھ مخصوص نسبت حاصل ہے، آپ ﷺ کا اسم شریف محمد اور احمد ہے، آپ صاحب مقام محمود ہیں، آپ کی اُمت "حمادین" کہلاتی ہے، یعنی ایسے لوگ جو ہر حالت میں، خواہ خوشی کا موقع ہو یا غمی کا، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں، قیامت کے دن آپ ﷺ کی ذات حامد بھی ہوگی اور محمود بھی، اور آپ اللہ تعالیٰ کے حمد کے ذریعہ ہی شفاعت کا دروازہ کھلوائیں گے جیسا کہ باب الشفاعة میں گذرا۔

"اس دن کوئی بھی نبی......الخ" کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن میدان حشر میں آنحضرت ﷺ صرف عام لوگوں ہی کے ماویٰ وملجا نہیں ہوں گے بلکہ ایک ایک کر کے تمام نبی اور رسول بھی آپ ﷺ ہی کے نیزہ یا پرچم تلے جمع ہوں گے، آپ ﷺ کی پناہ کے طلبگار اور آپ ﷺ کے تابع ہوں گے حدیث کے اس جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیزہ یا پرچم کا ذکر محض علامتی طور پر نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں آپ ﷺ کا کوئی نیزہ یا پرچم ہوگا جس کا نام لواء الحمد ہوگا اور جو آپ ﷺ کی سرداری و برتری کے اظہار کے لئے آپ کو عطا ہوگا جیسا کہ اس دنیا میں بادشاہوں اور سرابراہان مملکت کی عظمت و شوکت کے اظہار اور ان کی حیثیت کو ممتاز کرنے کے لئے ان کا اپنا الگ پرچم نصب ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ خدا کے حبیب ہیں

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَلَسَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَرَجَ حَتّٰى اِذَا دَنَا مِنْهُمْ سَمِعَهُمْ يَتَذَاكَرُوْنَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا وَقَالَ اٰخَرُ مُوْسٰى كَلَّمَهُ تَكْلِيْمًا وَقَالَ اٰخَرُ فَعِيْسٰى كَلِمَةُ اللّٰهِ وَرُوْحُهُ وَقَالَ اٰخَرُ اٰدَمُ اصْطَفَاهُ اللّٰهُ فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ قَدْ سَمِعْتُ كَلَامَكُمْ وَعَجَبَكُمْ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلُ اللّٰهِ وَهُوَ كَذٰلِكَ وَمُوْسٰى نَجِيُّ اللّٰهِ وَهُوَ كَذٰلِكَ وَعِيْسٰى رُوْحُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ وَهُوَ كَذٰلِكَ وَاٰدَمُ اصْطَفَاهُ اللّٰهُ وَهُوَ كَذٰلِكَ اَلَا وَاَنَا حَبِيْبُ اللّٰهِ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا حَامِلُ لِوَاءِ الْحَمْدِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَحْتَهُ اٰدَمُ فَمَنْ دُوْنَهُ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ يُحَرِّكُ حَلَقَ الْجَنَّةِ فَيَفْتَحُ اللّٰهُ لِيْ فَيُدْخِلُنِيْهَا وَمَعِيَ فُقَرَاءُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَكْرَمُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ عَلَى اللّٰهِ وَلَا فَخْرَ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کے کچھ صحابی (مسجد نبوی میں) بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ اپنے حجرہ مبارکہ سے نکلے اور جب ان کے قریب پہنچے تو ان کی باتیں کان میں پڑیں، آپ ﷺ نے ایک صحابی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل قرار دیا دوسرے صحابی نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شرف تکلم سے نوازا، ایک اور صحابی نے کہا کہ...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں (یعنی وہ نظام قدرت کے مروجہ اسباب وذرائع کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کے کلمہ کن سے پیدا ہوئے۔ شیر خواری کے زمانہ میں پالنے میں لوگوں سے باتیں کیں، اور اللہ تعالیٰ نے روح الامین کو ان کی ماں کے پاس بھیجا، جس نے پھونک ماری اور اس کے نتیجہ میں ان کی پیدائش ہوئی، اس کے علاوہ ان کی روحانیت کے اور بہت سے آثار و کرشمے ظاہر ہوئے یہاں تک کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے)۔ ایک صحابی نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو برگزیدہ کیا (یعنی انسان اول ہونے کے لئے انہی کا انتخاب کیا، ان کو تمام چیزوں کے نام سکھائے اور ان کے سامنے فرشتوں سے سجدہ کرایا) بہر حال (صحابہؓ اپنی باتوں کے دوران نبیوں کے خصوصی اوصاف تعجب کے ساتھ ذکر کر رہے تھے کہ) رسول کریم ﷺ ان کی مجلس تک پہنچ گئے اور فرمایا کہ میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں، تمہیں تعجب ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کے خلیل

یعنی دوست ہیں تو بے شک ان کی یہی شان ہے (تمہیں تعجب ہے کہ) حضرت عیسی علیہ السلام خدا کا کلمہ اور اس کی روح ہیں، تو بیشک ان کی بھی یہی شان ہے، (تمہیں تعجب ہے کہ) حضرت آدم علیہ السلام کو خدا نے برگزیدہ کیا، تو بیشک ایسا ہی ہے اور ان کی یہی شان ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں خدا کا حبیب ہوں اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا، قیامت کے دن سب سے پہلے شفاعت کرنے والا میں ہوں گا، سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول کی جائے گی، اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا، جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے والوں میں سب سے پہلا شخص میں ہی ہوں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ (فرشتوں کو حکم کے ذریعہ) جنت کا دروازہ میرے لئے کھول دے گا اور (سب سے پہلے) مجھے جنت میں داخل کرے گا اس وقت میرے ساتھ مؤمن فقراء ہوں گے اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا اور بلاشبہ تمام اگلے پچھلوں (خواہ وہ انبیاء ہوں یا دوسرے لوگ) سب ہی سے افضل واکرم ہوں اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا۔" (ترمذی، دارمی)

تشریح: "میں خدا کا حبیب ہوں" کے ضمن میں بعض شارحین نے تو یہ لکھا ہے کہ "خلیل" اور "حبیب" دونوں کے معنی "دوست" کے ہیں، لیکن حبیب اس دوست کو کہتے ہیں جو محبوبیت کے مقام کو پہنچا ہوا، ہو جب کہ "خلیل" مطلق دوست کو کہتے ہیں۔ اور ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ "خلیل" وہ دوست ہے جس کی دوستی کسی حاجت اور غرض کے تحت ہو جبکہ "حبیب" وہ دوست ہے جو اپنی دوستی میں بالکل بے لوث اور بے غرض ہو۔ واضح رہے کہ یوں تو تمام ہی انبیاء ورسول بلکہ تمام ہی اہل ایمان بارگاہ رب العزت کے دوست اور محبوب ہیں، لیکن دوستی اور محبوبیت کے بھی چونکہ مختلف درجات و مراتب ہوتے ہیں اس لئے یہاں گفتگو دوستی و محبوبیت کے اس درجہ و مرتبہ کے بارے میں ہے جو سب سے اعلی اور سب سے بہتر ہے، رہی یہ بات کہ بارگاہ رب العزت میں دوستی و محبوبیت کا سب سے بلند و برتر درجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، تو اس کی سب سے بڑی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

"(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے دوستی رکھے گا۔"

"اس وقت میرے ساتھ مؤمن فقراء ہوں گے۔" کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں سب سے پہلے آنحضرت داخل ہوں گے اور پھر اہل ایمان میں سے جو طبقہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا وہ مہاجر وانصار صحابہ میں سے وہ حضرات ہوں گے جو مفلس و بے مایہ تھے اور جو اپنے اپنے درجات و مراتب کے اعتبار سے آگے پیچھے جنت میں جائیں گے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری اُمت کے فقراء اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صبر واستقامت کی راہ اختیار کرنے والا فقیر (بھکاری نہیں) شکر گذار غنی سے بہتر ہے! اور صوفیاء کے نزدیک فاقہ و احتیاج کا نام فقر نہیں بلکہ ان کے ہاں صرف اللہ تعالیٰ کا محتاج ہونے اور اللہ تعالیٰ سے بھی اس کی رضا و خوشنودی کے علاوہ اور کچھ نہ مانگنے کا نام "فقر" ہے! امام ثوریؒ نے کہا ہے کہ "فقر" یہ ہے کہ مال واسباب نہ ہونے پر تسکین خاطر حاصل ہو اور جب مال میسر ہو تو اس کو خرچ کیا جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس کے فقر سے پناہ مانگی ہے اور غنائے نفس کی تعریف فرمائی ہے حاصل یہ کہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے، جو بھی حالت، خواہ وہ فقر ہو یا غنا اس چیز کے حصول سے باز رکھے وہ بری ہے، تاہم عام طور پر غنا یعنی دولت مندی کی حالت انسان کو برائیوں میں مبتلا کرتی ہے جب کہ فقر کی حالت بہت سی برائیوں میں مبتلا ہونے سے باز رکھتی ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے زیادہ تر انبیاء اور اولیاء کو فقر کی حالت میں رکھا اور ان کا فقر، ان کے مراتب و درجات میں بلندی کا باعث بنا، ایک دلیل یہ ہے کہ جب فقیر کافر کو دوزخ میں غنی کافر سے ہلکا عذاب ہوگا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہی فقر، مؤمن کو جنت میں فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

اُمت محمدی کی خصوصیت

(۲۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ قَيْسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ وَنَحْنُ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاِنِّيْ

قَائِلٌ قَوْلاً غَيْرَ فَخْرٍ اِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ اللّٰهِ وَ مُوْسٰى صَفِيُّ اللّٰهِ وَ اَنَا حَبِيْبُ اللّٰهِ وَ مَعِيَ لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَنِيْ فِيْ اُمَّتِيْ وَ اَجَارَهُمْ مِنْ ثَلٰثٍ لَا يَعُمُّهُمْ بِسَنَةٍ وَلَا يَسْتَأْصِلُهُمْ عَدُوٌّ وَلَا يَجْمَعُهُمْ عَلٰى ضَلَالَةٍ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عمرو بن قیسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: (دنیا میں ظہور و وجود کے اعتبار سے) ہم آخر میں ہیں لیکن قیامت کے دن (جنت میں داخل ہونے اور اعلیٰ مراتب و درجات کے اعتبار سے) ہم اول ہوں گے، اور میں تم سے ایک بات کہتا ہوں اور اس بات کے کہنے سے اظہار فخر مقصود نہیں ہے (بلکہ ایک حقیقت کا اظہار مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تو خدا کے خلیل ہیں، موسیٰ علیہ السلام خدا کے برگزیدہ ہیں اور میں خدا کا حبیب ہوں کہ دنیا و آخرت میں میری حیثیت محب کی بھی ہے اور محبوب کی بھی) اور قیامت کے دن (مقام محمود میں) حمد کا پرچم میرے پاس ہوگا (جو میرے احمد اور محمد ہونے کی علامت ہوگا) نیز اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کو (خیر کثیر عطا کرنے کا اور تین چیزوں سے بچانے کا وعدہ کیا ہے، ایک تو یہ کہ وہ مسلمانوں کو عام قحط میں ہلاک نہیں کرے گا۔ دوسرے یہ کہ کوئی دشمن ان کا استیصال نہ کر سکے گا یعنی دشمنان اسلام سارے مسلمانوں کو نیست و نابود نہ کر سکیں گے اور تیسرے یہ کہ تمام مسلمان کسی گمراہی پر اتفاق نہیں کریں گے یعنی یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ساری اسلامی دنیا کسی ایسی بات پر اتفاق کرلے جو گمراہی کا باعث ہو۔" (دارمی)

حضور ﷺ قائد المرسلین علیہم السلام اور خاتم النبیین ہیں

(۲۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنَا قَائِدُ الْمُرْسَلِيْنَ وَلَا فَخْرَ وَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَلَا فَخْرَ وَ اَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَ مُشَفَّعٍ وَلَا فَخْرَ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "(قیامت کے دن) میں تمام نبیوں اور رسولوں کا قائد ہوں گا (کہ تمام نبی و رسول میدان حشر میں آنے کے لئے میرے پیچھے آئیں گے، اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا، میں انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ کو ختم کرنے والا ہوں یعنی نبوت مجھ پر ختم ہوگئی ہے اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا، شفاعت کرنے والا سب سے پہلا شخص میں ہوں گا اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول ہوگی اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا۔" (دارمیؒ)

قیامت کے دن آنحضرت ﷺ کی عظمت و برتری

(۲۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ النَّاسِ خُرُوْجًا اِذَا بُعِثُوْا وَ اَنَا قَائِدُهُمْ اِذَا وَفَدُوْا وَ اَنَا خَطِيْبُهُمْ اِذَا اَنْصَتُوْا وَ اَنَا مُسْتَشْفِعُهُمْ اِذَا حُبِسُوْا وَ اَنَا مُبَشِّرُهُمْ اِذَا اَيِسُوْا اَلْكَرَامَةُ وَ الْمَفَاتِيْحُ يَوْمَئِذٍ بِيَدِيْ وَ لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَئِذٍ بِيَدِيْ وَ اَنَا اَكْرَمُ وُلْدِ اٰدَمَ عَلٰى رَبِّيْ يَطُوْفُ عَلَيَّ اَلْفُ خَادِمٍ كَاَنَّهُمْ بَيْضٌ مَكْنُوْنٌ اَوْ لُؤْلُؤٌ مَنْثُوْرٌ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ الدَّارِمِيُّ وَ قَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "(قیامت کے دن) جب لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو سب سے پہلے قبر میں سے میں نکلوں گا جب لوگ بارگاہ خداوندی میں پیش ہوں گے تو ان کی قیادت میں کروں گا، جب تمام لوگ خاموش ہوں گے تو میری ہی زبان سب کی ترجمانی کرے گی، اور جب لوگوں کو موقف میں روک دیا جائے گا تو ان کی (خلاصی کے لئے) شفاعت و سفارش میں کروں گا، جب لوگوں پر نا امیدی اور مایوسی چھائی ہوگی تو (اہل ایمان کو) مغفرت و رحمت کی بشارت دینے والا میں ہوں گا، اس (قیامت کے) دن شرف و کرامت اور جنت کی کنجیاں میرے ہاتھ میں (یعنی میرے تصرف) میں ہوں گی، اس دن حمد کا پرچم میرے ہاتھ میں ہوگا، اس دن پروردگار کے نزدیک آدم کے بیٹوں میں سب سے بزرگ و اشرف میری ہی ذات ہوگی، میرے آگے پیچھے ہزاروں خادم پھرتے ہوں گے جیسے وہ چھپے ہوئے انڈے یا بکھرے ہوئے موتی ہوں۔" اس روایت کو ترمذی و دارمی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث

غریب ہے۔"

تشریح: "جب تمام لوگ خاموش ہوں گے........الخ" میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب میدان حشر میں عام دہشت و ہولناکی چھائی ہوگی، ہر شخص متحیر و سراسیمہ ہوگا، کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ اپنی زبان سے دو لفظ ادا کر سکے اور کوئی عذر و درخواست پیش کرے تو اس وقت سردار دو عالم ﷺ ہی کی ذات گرامی آگے آئے گی، آپ ﷺ سب کی طرف سے عذر و معذرت بیان کریں گے شفاعت کی درخواست پیش فرمائیں گے اور اس وقت جب کہ عام لوگ تو درکنار بڑے بڑے انبیاء کو بولنے کی مجال نہیں ہوگی، آپ ﷺ بارگاہ رب العزت میں گویا ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی ایسی تعریف و ثنا بیان فرمائیں گے جو اس کی شان کے لائق ہوگی، اور اس طرح اس وقت آنحضرت ﷺ کے علاوہ اور کسی کو بولنے اور کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ پس قرآن کریم میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ۔

"یہ وہ دن ہوگا جس میں وہ لوگ نہ بول سکیں گے اور نہ ان کو (عذر کی) اجازت ہوگی۔"

تو آنحضرت ﷺ کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے، کہ آپ ﷺ کے علاوہ اور کسی کو بولنے کی اجازت نہیں ہوگی، یا یہ کہ اس آیت میں ابتدائی مرحلہ کا ذکر ہے کہ شروع میں کسی کو بھی بولنے کی اجازت نہیں ہوگی مگر بعد میں آنحضرت ﷺ کو اجازت عطا فرمائی جائے گی، اور یا یہ کہ اس آیت کا تعلق صرف اہل کفر سے ہے۔

"جب لوگوں پر ناامیدی و مایوسی چھائی ہوگی۔" کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو لوگوں پر سخت خوف و دہشت طاری ہوگی اور دوسری طرف وہ ایک ایک کر کے تمام ہی بڑے بڑے انبیاء سے شفاعت و سفارش کی درخواست کریں گے اور کوئی نبی ان کی طرف سے بولنے اور شفاعت کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا، تو ان پر رحمت و مغفرت کی طرف سے ناامیدی چھا جائے گی تب آنحضرت ﷺ بارگاہ رب العزت میں ان کی شفاعت کریں گے اور ان کی مایوسی و ناامیدی کو ختم فرمائیں گے۔

"چھپے ہوئے انڈوں" سے مراد شترمرغ کے انڈے ہیں، آپ ﷺ نے غلاموں، خادموں اور حوروں کو شترمرغ کے انڈوں سے اس لئے تشبیہ دی کہ وہ (انڈے) گرد و غبار وغیرہ سے محفوظ ہونے کی وجہ سے صفائی ستھرائی کی علامت سمجھے جاتے ہیں، ان کا رنگ بھی ایسا سفید ہونے کی وجہ سے کہ جس میں کچھ زردی کی آمیزش ہو بہت پیارا مانا جاتا ہے۔ اور مجمع البحار میں لکھا ہے کہ (چھپے ہوئے انڈوں سے) مراد سیپ کے موتی ہیں، جو لوگوں کے ہاتھوں اور نظروں سے بچے رہنے کی وجہ سے بڑی آب و تاب رکھتے ہیں۔ حاصل یہ کہ اس دن آنحضرت ﷺ کے آگے پیچھے دائیں بائیں جو خادم ہوں گے وہ صفائی ستھرائی، رنگ و روپ اور بالکل نئے نویلے ہونے کی وجہ سے نہایت بھلے معلوم ہوں گے۔

"یا بکھرے ہوئے موتی ہوں۔" میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح آب و تاب رکھنے والے موتی، کسی لڑی میں پروئے ہوئے ہونے کی بہ نسبت یونہی بکھرے ہوئے زیادہ خوبصورت اور چمکدار لگتے ہیں اس طرح وہ خادم بھی آپ ﷺ کے چاروں طرف ادھر ادھر بکھرے ہوئے اور خدمت میں لگے ہوئے بہت زیادہ خوبصورت اور دلکش معلوم ہوں گے۔

حضور ﷺ عرش الٰہی کے دائیں جانب کھڑے ہوں گے

(۲۶) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاُكْسٰى حُلَّةً مِّنْ حُلَلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ اَقُوْمُ عَنْ يَمِيْنِ الْعَرْشِ لَيْسَ اَحَدٌ مِّنَ الْخَلَائِقِ يَقُوْمُ ذٰلِكَ الْمَقَامَ غَيْرِيْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِيْ رِوَايَةِ جَامِعِ الْاُصُوْلِ عَنْهُ اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ فَاُكْسٰى۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "(قیامت کے دن) مجھے جنت کے جوڑوں میں سے ایک

جوڑا پہنایا جائے گا اور پھر میں عرش کے دائیں جانب کھڑا ہوں گا، جہاں میرے سوا مخلوق میں سے کوئی اور کھڑا نہیں ہوگا۔" اور جامع الاصول کی روایت میں، جو حضرت ابوہریرہؓ ہی سے منقول ہے، یوں ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی اور میں باہر آؤں گا، پھر مجھے ایک جنتی جوڑا پہنایا جائے گا الخ۔"

آنحضرت ﷺ کے لئے "وسیلہ" طلب کرو

(۲۷) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْوَسِيْلَةُ قَالَ اَعْلٰى دَرَجَةٍ فِي الْجَنَّةِ لَا يَنَالُهَا اِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ وَاَرْجُوْا اَنْ اَكُوْنَ اَنَا هُوَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (مسلمانو!) میرے لئے اللہ تعالیٰ سے "وسیلہ" مانگا کرو۔ صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! یہ "وسیلہ" کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جنت کے سب سے بڑے درجہ کا نام ہے جو صرف ایک شخص کو ملے گا اور میں امید رکھتا ہوں۔" "کہ وہ شخص میں ہوں۔" (ترمذی)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا اُمت کے لوگوں سے اپنے لئے وسیلہ منگوانا اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی بیچارگی و محتاجگی کے اظہار کے لئے اور کسر نفسی کے طور پر ہے یا یہ مقصد ہے کہ میری اُمت کے لوگ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے وسیلہ کی درخواست کیا کریں گے۔ تو اس کی وجہ سے ان ہی لوگوں کو فائدہ ہوگا اور ثواب پائیں گے اور یا یہ کہ اس حکم کے ذریعہ آپ ﷺ نے اُمت کے لوگوں کو باہمی الفت و تعلق کے اظہار کا یہ طریقہ بتایا کہ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے ہر عزیز اور ہر دوست کی ترقی درجات اور بلندی و مراتب کی دعا کیا کرے۔

"اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ شخص میں ہوں۔" آپ ﷺ نے یہ بات بھی اظہار تواضع و انکساری اور بارگاہ رب العزت میں پاس ادب کی بنا پر فرمائی ورنہ یہ طے شدہ ہے کہ جنت کا وہ سب سے بڑا درجہ جس کو "وسیلہ" سے تعبیر کیا گیا ہے صرف آپ ﷺ ہی کو ملے گا۔

آنحضرت ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام کے امام ہوں گے

(۲۸) وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ كُنْتُ اِمَامَ النَّبِيِّيْنَ وَخَطِيْبَهُمْ وَصَاحِبَ شَفَاعَتِهِمْ غَيْرَ فَخْرٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابی ابن کعبؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب قیامت کا دن ہوگا تو میں (مقام محمود میں کھڑا ہوں گا اور) تمام انبیاء کا امام و پیشوا بنوں گا (جب ان میں کوئی بھی بولنے پر قادر نہیں ہوگا تو میں ان کی ترجمانی کروں گا، اور سب کی شفاعت و سفارش کروں گا، اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا۔" (ترمذی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت

(۲۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وُلَاةً مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَاِنَّ وَلِيِّيْ اَبِيْ وَخَلِيْلُ رَبِّيْ ثُمَّ قَرَأَ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "ہر پیغمبر کے پیغمبروں سے ایک ایک رفیق اور ولی ہیں پس پیغمبروں میں سے جو پیغمبر میرے رفیق اور ولی ہیں وہ میرے باپ اور پروردگار کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔" اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے (اپنے اس قول کی دلیل کے طور پر) یہ آیت پڑھی اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ" ترجمہ: بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ البتہ وہ

لوگ تھے جنہوں نے (ان کے زمانہ میں) ان کا اتباع کیا تھا اور یہ نبی (محمد ﷺ) ہیں اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، اور اللہ تعالیٰ حامی و کارساز ہیں ایمان والوں کے۔" (ترمذی)

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد

(۳۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِىْ لِتَمَامِ مَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ وَكَمَالِ مَحَاسِنِ الْاَفْعَالِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں اور اچھے کاموں کو پورا کروں۔" (شرح السنۃ)

تشریح: مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر اس مقصد سے بھیجا ہے کہ میں مخلوق خدا کی ہدایت کروں، اور ان کو ظاہری اخلاق و معاملات اور عادات و اطوار کے اعتبار سے بھی اور باطنی احوال و سیرت کے اعتبار سے بھی درجہ کمال پر پہنچا دوں۔

تورات میں آنحضرت اور اُمّت محمدی ﷺ کے اوصاف کا ذکر

(۳۱) وَعَنْ كَعْبٍ يَحْكِىْ عَنِ التَّوْرٰةِ قَالَ نَجِدُ مَكْتُوْبًا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَبْدِيَ الْمُخْتَارُ لَا فَظٌّ وَلَا غَلِيْظٌ وَلَا سَخَّابٌ فِي الْاَسْوَاقِ وَلَا يَجْزِىْ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُوْ وَيَغْفِرُ مَوْلِدُهٗ بِمَكَّةَ وَهِجْرَتُهٗ بِطَيْبَةَ وَمُلْكُهٗ بِالشَّامِ وَاُمَّتُهُ الْحَمَّادُوْنَ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِىْ كُلِّ مَنْزِلَةٍ وَيُكَبِّرُوْنَهٗ عَلٰى كُلِّ شَرَفٍ رُعَاةٌ لِلشَّمْسِ يُصَلُّوْنَ الصَّلٰوةَ اِذَا جَاءَ وَقْتُهَا يَتَاَزَّرُوْنَ عَلٰى اَنْصَافِهِمْ وَيَتَوَضَّؤُوْنَ عَلٰى اَطْرَافِهِمْ مُنَادِيْهِمْ يُنَادِىْ فِىْ جَوِّ السَّمَاءِ صَفُّهُمْ فِي الْقِتَالِ وَصَفُّهُمْ فِي الصَّلٰوةِ سَوَآءٌ لَهُمْ بِاللَّيْلِ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ مَعَ تَغْيِيْرٍ يَسِيْرٍ۔

"اور حضرت کعب احبارؒ (جو ایک جلیل القدر تابعی ہیں اور مسلمان ہونے سے پہلے زبردست یہودی عالم تھے) تورات کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے (تورات میں) یہ لکھا ہوا پایا ہے: "محمد ﷺ اللہ کے رسول اور اس کے برگزیدہ بندے ہوں گے، وہ نہ درشت خو ہوں گے، اور نہ سخت گو، نہ بازاروں میں شور مچاتے ہوں گے، اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے لینے والے بلکہ معاف کر دینے والے اور بخش دینے والے ہوں گے، ان کی پیدائش کی جگہ مکہ ہوگا، ان کی ہجرت کی جگہ طیبہ (مدینہ) ہوگا اور ان کی حکومت کی جگہ ملک شام ہوگا، ان کی اُمت خدا کی بہت زیادہ حمد و تعریف اور شکر کرنے والی ہوگی جو ہر حالت میں کیا غمی، کیا خوشی اور کیا فراخی، کیا تنگی، خدا کی حمد و ثنا اور شکر کرے گی، وہ لوگ جہاں بھی اتریں گے یا ٹھہریں گے، خدا کا شکر بجالائیں گے اور جہاں بھی چڑھیں گے خدا کی بڑائی بیان کریں گے (یعنی جب اونچی جگہ پر چڑھیں گے تو اللہ اکبر کہیں گے) اور سورج کا لحاظ رکھا کریں گے، جب نماز کا وقت ہوگا نماز پڑھیں گے، اپنی کمر پر (یعنی ناف کے اوپر ازار باندھیں گے (یعنی ستر پوشی کا بہت زیادہ خیال رکھیں گے) جسم کے اعضاء پر وضو کریں گے (یعنی ہاتھ، پاؤں اور منہ دھوئیں گے اور پورا وضو کریں گے، ان کا منادی کرنے والا زمین و آسمان کے درمیان منادی کرے گا (یعنی موذن کسی بلند جگہ جیسے منارہ وغیرہ پر کھڑا ہو کر اذان دیا کرے گا) جنگ میں اور نماز میں ان کی صف یکساں ہوگی (یعنی وہ دشمنان اسلام کے خلاف میدان جنگ میں بھی صف بندی کے اصول و قواعد کی پابندی کریں گے اور باجماعت نماز ادا کرنے کے لئے بھی اپنی صفیں استوار کریں گے) رات میں (اپنے نفس اور شیطان کی سرکوبی کے لئے عبادت کے وقت) ان کی آواز پست ہوگی (یعنی تسبیح و تہلیل اور ذکر و تلاوت ہلکی آواز سے کیا کریں گے) جیسے شہد کی مکھی کی آواز ہوتی ہے۔" مصابیح نے اس روایت کو انہی الفاظ کے ساتھ اور دارمیؒ نے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ان کی حکومت کی جگہ ملک شام ہوگا" میں حکومت سے مراد دین و نبوت کے ثمرات و آثار کا ظاہر ہونا اور جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ خدا کا پرچم بلند ہونا ہے، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی دعوت اسی ملک میں سب سے زیادہ پھیلی اور مسلمانوں کو جہاد بھی اسی علاقہ میں زیادہ کرنا پڑا، ورنہ جہاں تک آنحضرت ﷺ کی دینی و دنیاوی حکومت کا تعلق ہے اس کا دائرہ اثر کسی خاص ملک یا علاقہ تک محدود نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی حیثیت میں پورے عالم تک پھیلا ہوا ہے۔ یا اس جملہ کی یہ مراد ہے کہ آنحضرت ﷺ کا پایۂ تخت آپ ﷺ کی حیات اور خلفائے راشدین کے زمانہ کے بعد ملک شام کو منتقل ہو جائے گا، چنانچہ تاریخی طور پر ایسا ہی ہوا کہ حضرت معاویہؓ اور بنو امیہ کے زمانہ میں مسلمانوں کا دار الخلافہ ملک شام میں رہا۔

"سورج کا لحاظ رکھا کریں گے۔" کے ذریعہ نماز روزے اور دیگر عبادت کے ایام و اوقات کی پابندی ورعایت کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان سورج کے طلوع و غروب اور زوال کے اعتبار سے اپنی نماز و عبادت کے اوقات کا دھیان رکھیں گے اور جو وقت جس عبادت کا متعین ہوگا اس میں اس عبادت کا اہتمام کریں گے۔ ایک روایت میں، جس کو حاکم نے عبد اللہ بن ابی اوفیؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے، فرمایا گیا ہے: "بلاشبہ خدا کے بندوں میں بہتر لوگ وہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے (اوقات کے تعین کی خاطر) سورج چاند ستاروں اور سایوں کا دھیان رکھتے ہیں۔

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ مَكْتُوْبٌ فِي التَّوْرٰةِ صِفَةُ مُحَمَّدٍ وَّعِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ يُدْفَنُ مَعَهٗ قَالَ اَبُوْ مَوْدُوْدٍ وَقَدْ بَقِيَ فِي الْبَيْتِ مَوْضِعُ قَبْرٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبد اللہ بن سلامؓ کہتے ہیں کہ تورات میں حضرت محمدؐ کے اوصاف کا ذکر ہے اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے حجرۂ اقدس میں جمع کئے جائیں گے۔ حضرت مودودؒ جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کا بیان ہے کہ (حضرت عائشہؓ کے) حجرۂ مبارک میں (جہاں آنحضرت ﷺ زیر زمین آرام فرما ہیں) ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔" (ترمذی)

تشریح: حجرہ مبارک میں، جہاں آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ مدفون ہیں، تینوں قبروں کی ترتیب اس طرح ہے، کہ سب سے آگے قبلہ کی جانب سرکار دو عالم ﷺ کی قبر مبارک ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی قبر اس طرح ہے کہ جہاں آنحضرت ﷺ کا سینہ مبارک ہے وہاں حضرت ابوبکرؓ کا سر ہے، حضرت ابوبکرؓ کی قبر کے بعد حضرت عمرؓ کی قبر اس طرح ہے کہ جہاں حضرت ابوبکرؓ کا سینہ مبارک ہے وہاں حضرت عمرؓ کا سر ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے پہلو میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے اس جگہ میں متعدد صحابہؓ نے دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن خواہش وقصد کے باوجود کسی کو وہاں دفن ہونا نصیب نہ ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ قدرت کی حکمت اس جگہ کو خالی رکھنے ہی میں تھی تاکہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی جگہ دفن کئے جائیں۔ چنانچہ ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (اس دنیا میں اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچیں گے تو حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے جائیں گے، وہاں سے واپس آرہے ہوں گے کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان انتقال فرما جائیں گے، اور ان کی نعش مبارک مدینہ منورہ لائی جائے گی جہاں روضہ اقدس نبوی میں حضرت عمرؓ کے پہلو میں دفن کئے جائیں گے۔ اس طرح یہ دونوں صحابی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ، دو نبیوں کے درمیان تاقیامت آرام فرما رہیں گے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

انبیاء علیہم السلام پر اور آسمان والوں پر آنحضرت ﷺ کی فضیلت کی دلیل

(۳۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى فَضَّلَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْاَنْبِيَآءِ وَعَلٰى اَهْلِ السَّمَآءِ فَقَالُوْا يَا

اَبَاعَبَّاسٍ بِمَ فَضَّلَهُ اللّٰهُ عَلٰى اَهْلِ السَّمَآءِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ لِاَهْلِ السَّمَآءِ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ قَالُوْا وَمَا فَضْلُهٗ عَلَى الْاَنْبِيَآءِ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ الْاٰيَةَ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ فَاَرْسَلَهٗ اِلَى الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (ایک دن اپنی مجلس میں) فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو تمام انبیاء علیہم السلام اور اہل آسمان (فرشتوں) پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ حاضرین مجلس نے (یہ سن کر) سوال کیا کہ اے ابو عباس! اہل آسمان پر آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کس طور پر فضیلت دی ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے اہل آسمان سے تو یوں خطاب فرمایا۔"
(گویا اس خطاب میں نہ صرف یہ کہ نہایت سخت انداز اور رعب و دبدبہ کا اظہار کیا بلکہ سخت عذاب کی دھمکی بھی دی گئی جب کہ آنحضرت ﷺ کو خطاب فرمایا گیا تو بڑی ملائمت، مہربانی اور کرم و عنایت کا انداز اختیار فرمایا گیا چنانچہ) محمد ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ "(اے محمد ﷺ) ہم نے تمہارے لئے عظمتوں اور برکتوں کے دروازے پوری طرح کھول دیئے ہیں (جیسا کہ مکہ کا فتح ہونا) اور یہ اس لئے ہے کہ اللہ نے تمہارے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں لوگوں نے عرض کیا کہ (اچھا یہ بتائے) تمام انبیاء پر آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کس طور سے فضیلت دی ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء کی نسبت یوں فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ الاٰية ہم نے ہر نبی کو اس کی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ قوم کے سامنے خدا کے احکام و قوانین بیان کرے اور اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے الخ۔" جب کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کے بارے میں یہ فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ یعنی: اے محمد (ﷺ)! ہم نے آپ ﷺ کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا۔"

تشریح: "اللہ نے تمہارے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں۔" اس آیت کے متعلق سوال اٹھتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ معصوم ہیں، آپ ﷺ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا، اور نہ کبھی کوئی گناہ آپ ﷺ سے سرزد ہوا تو پھر یہ کہنے کے کیا معنی کہ آپ ﷺ کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دئے گئے؟ چنانچہ مفسرین اور شارحین اس آیت کی مختلف تاویلیں اور توجیہیں کرتے ہیں، ان میں سے سب سے بہتر تاویل یہ سمجھی جاتی ہے کہ آیت قرآنی کا یہ فقرہ اپنے اصل لفظی معنی پر محمول نہیں ہے بلکہ اس سے محض آنحضرت ﷺ کے تئیں کمال عنایت و مہربانی اور آپ ﷺ کی امتیازی خصوصیت و عظمت کا اظہار مقصود ہے، اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب کوئی آقا اپنے کسی غلام کی تابعداری سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے اور اس کے تئیں کمال رضا و خوشنودی کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو اس سے یہ کہتا ہے کہ جا میں نے تجھے بالکل معافی دے دی، تیری ساری خطائیں معاف تجھ پر کوئی دار و گیر نہیں۔ چاہے اس غلام سے کبھی بھی کوئی خطا سرزد نہ ہوئی ہو۔

"پس اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جن و انسان دونوں کا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔" کے ذریعہ حضرت ابن عباسؓ نے الفاظ قرآنی "کافة للناس" کی وضاحت فرمائی اگرچہ یہاں صرف "انسان" کا ذکر ہے اور وہ بھی اس بنا پر کہ اشرف المخلوقات انسان ہی ہے، لیکن مراد "جن و انسان" دونوں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو انسانوں کی طرف بھی مبعوث فرمایا ہے اور جنات کی طرف بھی، اس کی دلیل متعدد آیات قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ میں موجود ہے!۔ اس آیت کا اصل مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا ہے، کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت و نبوت کسی خاص علاقہ یا انسانوں کے کسی خاص طبقہ کے لئے نہیں، بلکہ آپ کی بعثت تمام نوع انسانی کی طرف ہوئی ہے اور اس حقیقت کی وضاحت بھی اس لئے کی گئی ہے تا کہ ان اہل کتاب کی تردید ہو جائے جو کہا کرتے تھے کہ محمد ﷺ کی رسالت تو صرف عرب

والوں کے لئے ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی نبوت کو کیسے جانا

(۳۴) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ الْغِفَارِیِّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ عَلِمْتَ اَنَّکَ نَبِیٌّ حَتّٰی اسْتَیْقَنْتَ فَقَالَ یَا اَبَا ذَرٍّ اَتَانِیْ مَلَکَانِ وَاَنَا بِبَعْضِ بَطْحَاءِ مَکَّۃَ فَوَقَعَ اَحَدُھُمَا اِلَی الْاَرْضِ وَکَانَ الْاٰخَرُ بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ فَقَالَ اَحَدُھُمَا لِصَاحِبِہٖ اَھُوَ ھُوَ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَزِنْہُ بِرَجُلٍ فَوُزِنْتُ بِہٖ فَوَزَنْتُہٗ ثُمَّ قَالَ زِنْہُ بِعَشَرَۃٍ فَوُزِنْتُ بِھِمْ فَرَجَحْتُھُمْ ثُمَّ قَالَ زِنْہُ بِمِائَۃٍ فَوُزِنْتُ بِھِمْ فَرَجَحْتُھُمْ ثُمَّ قَالَ زِنْہُ بِاَلْفٍ فَوُزِنْتُ بِھِمْ فَرَجَحْتُھُمْ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَیْھِمْ یَنْتَثِرُوْنَ عَلَیَّ مِنْ خِفَّۃِ الْمِیْزَانِ قَالَ فَقَالَ اَحَدُھُمَا لِصَاحِبِہٖ لَوْ وَزَنْتَہٗ بِاُمَّتِہٖ لَرَجَحَھَا۔ (رواھما الدارمی)

"اور حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ میں نے (ایک دن) عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) نے کیسے جانا کہ آپ (ﷺ) نبی ہیں اور پھر آپ (ﷺ) کو اپنی نبوت کا یقین کیونکر ہوا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "ابوذر! میں بطحائے مکہ میں ایک جگہ تھا کہ میرے پاس دو فرشتے آئے، ان میں سے ایک فرشتہ تو زمین پر اتر آیا اور دوسرا فرشتہ زمین و آسمان کے درمیان رہا، پھر ان میں سے ایک نے (میری طرف اشارہ کرکے) اپنے ساتھی فرشتہ سے پوچھا کہ کیا یہی وہ شخص ہیں جن کے بارے میں خدا نے ہمیں بتایا ہے کہ میرے ایک پیغمبر ہیں ان کے پاس جاؤ) اس فرشتہ نے جواب دیا کہ ہاں یہی وہ شخص ہیں۔ پھر پہلے فرشتے نے دوسرے فرشتے سے کہا کہ (ان پیغمبر کی اُمت میں سے) ایک آدمی کے ساتھ ان کو تول کر دیکھو، چنانچہ مجھے ایک آدمی کے ساتھ تولا گیا اور میں اس آدمی سے بھاری رہا۔ پھر اس فرشتہ نے کہا کہ اب دس آدمیوں کے ساتھ ان کو تولو۔ چنانچہ مجھے دس آدمیوں کے ساتھ تولا گیا اور میں ان دس آدمیوں سے بھی بھاری رہا، پھر اس فرشتہ نے کہا اچھا سو آدمیوں کے ساتھ ان کو تولو، چنانچہ مجھے سو آدمیوں کے ساتھ تولا گیا، اور میں ان سو آدمیوں کے مقابلہ میں بھی بھاری رہا، پھر اس فرشتہ نے کہا کہ اچھا اب ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ ان کو تولو، چنانچہ مجھے ہزار آدمیوں کے ساتھ تولا گیا اور میں ان ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں بھی بھاری رہا، اور گویا (اب بھی) میں ان ہزار آدمیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ جس پلڑے میں تھے وہ (میرے پلڑے کے مقابلہ میں) اتنا ہلکا تھا (اور اتنا اوپر اٹھ گیا تھا) کہ مجھے لگا جیسے وہ سب کے سب اب میرے اوپر گرے۔ اس کے بعد ان دونوں فرشتوں میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا کہ اگر تم ان کو ان کی ساری اُمت کے ساتھ بھی تولو تو یہ یقیناً ساری اُمت کے مقابلہ میں بھی بھاری رہیں گے۔" ان دونوں روایتوں کو دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔"

حضور ﷺ پر ہر حالت میں قربانی فرض تھی

(۳۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُتِبَ عَلَیَّ النَّحْرُ وَلَمْ یُکْتَبْ عَلَیْکُمْ وَاُمِرْتُ بِصَلٰوۃِ الضُّحٰی وَلَمْ تُؤْمَرُوْا بِھَا۔ (رواہ الدار قطنی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "مجھ پر (ہر حالت میں) قربانی فرض کی گئی ہے (خواہ میں مالی استطاعت رکھوں یا نہ رکھوں) جب کہ تمہارے اوپر اس طرح فرض نہیں ہے (بلکہ اسی حالت میں فرض ہے جب تم مالی استطاعت رکھو) نیز مجھ کو چاشت کی نماز کا حکم (وجوب کے طور پر) دیا گیا ہے جب کہ تمہیں نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس نماز کو تمہارے لئے صرف سُنّت قرار دیا گیا ہے۔"

(دار قطنی)

بَابُ اَسْمَاءِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَصِفَاتِہٖ

نبی کریم ﷺ کے اسماء مبارک اور صفات کا بیان

عنوان باب کے دو جز ہیں، ایک کا تعلق آنحضرت ﷺ کے اسماء مبارک کے ذکر سے ہے اور دوسرے کا تعلق صفات نبوی کے ذکر سے ہے لیکن یہاں "صفات" سے مراد آنحضرت ﷺ کے اخلاق واطوار اور باطنی اوصاف نہیں ہیں جن کا ذکر دوسرے باب میں ہوگا، بلکہ "صفات" سے مراد آپ ﷺ کا حلیہ مبارک قدوقامت، اور ظاہری شکل وصورت ہے۔

اسمائے مبارک کی تعداد: آنحضرت ﷺ کے اسماء مبارک بہت ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر قرآن مجید میں ہے کچھ سابقہ آسمانی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، کچھ کا ذکر انبیاء علیہم السلام کی زبان سے ہوا ہے اور کچھ احادیث میں مذکور ہیں۔ تاہم ان کی کل تعداد کے بارے میں کوئی ایک قول نہیں ہے۔ مواہب لدنیہ میں لکھا ہے: آنحضرت ﷺ کے نام اور القاب قرآن مجید میں بہت آئے ہیں، چنانچہ بعض علماء نے ننانوے نام جمع کئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماء پاک کی بھی تعداد ہے، قاضی عیاضؒ کا قول منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں میں سے تیس نام اپنے حبیب کے لئے مخصوص کئے ہیں۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اگر سابقہ آسمانی کتابوں اور قرآن وحدیث میں آنحضرت ﷺ کے نام تلاش کئے جائیں تو ان کی تعداد تین سو تک، اور ایک قول کے مطابق چار سو تک پہنچتی ہے۔ اور قاضی ابوبکر ابن العربی نے، جو مالکی مسلک کے بڑے عالموں میں سے ہیں لکھا ہے! بعض صوفیاء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہزار نام ہیں اور اس کے حبیب کے بھی ہزار نام ہیں اور یہ کہ "ناموں" سے مراد وہ اوصاف وصفات ہیں جن سے حضور ﷺ کی ذات متصف ہے اور ہر وصف و صفت سے ایک نام نکلتا ہے۔ سیوطیؒ نے بھی مستقل طور پر ایک کتاب تالیف کی ہے جس میں انہوں نے حضور ﷺ کے اسماء مبارک جمع کئے ہیں اور طیبیؒ نے بائیس نام ذکر کئے ہیں اور ان سب کی وضاحت کی ہے، جہاں تک مؤلف مشکوٰۃ شریف کا تعلق ہے تو انہوں نے اس باب میں صرف دو حدیثیں نقل کی ہیں جن میں آنحضرت ﷺ کے متعدد اسماء نقل کئے گئے ہیں۔

اصل اسم مبارک: آنحضرت ﷺ کا اصل نام جو سب سے زیادہ مشہور ورائج ہے "محمد" ہے یہ آپ ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کا رکھا ہوا نام ہے۔ منقول ہے کہ جب عبدالمطلب سے کسی نے کہا کہ تم نے اپنے پوتے کا نام اپنے آباؤاجداد کے نام پر کیوں نہیں رکھا اور ایک ایسے نام کو ترجیح دی جو تمہاری قوم اور تمہارے خاندان میں پہلے کسی کا نہیں رہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا! میں نے اپنے پوتے کا یہ نام اس امید پر رکھا ہے کہ تمام دنیا والے اس کی توصیف میں رطب اللسان ہوں۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں! تاکہ آسمانوں پر اللہ تعالیٰ اس کی تعریف و توصیف کرے اور زمین پر دنیا والے رطب اللسان ہوں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے بہت پہلے حضرت عبدالمطلب نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ ان کی پشت سے چاندی کی ایک زنجیر نکلی جس کا ایک سلسلہ آسمان تک چلا گیا، ایک سلسلہ مشرق کی آخری حدوں تک اور ایک سلسلہ مغرب کی آخری حدوں تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ زنجیر ایک تناور درخت میں تبدیل ہوگئی اور اس درخت کے پتہ پتہ پر نور پھیل گیا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ان نورانی پتوں کے نیچے مشرق سے لے کر مغرب تک کے لوگ جمع ہیں۔ عبدالمطلب نے بیدار ہونے کے بعد اس عجیب وغریب خواب کا ذکر لوگوں سے کیا، تعبیر دینے والوں نے اس خواب کو سن کر کہا کہ مبارک ہو، تمہاری نسل میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جس کی تابعداری کرنے والوں کا سلسلہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوگا، اور زمین وآسمان میں اس کی تعریف ہی تعریف ہوگی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے تو حضرت عبدالمطلب نے آپ ﷺ کا نام "محمد" رکھا۔ آنحضرت ﷺ کی والدۂ ماجدہ حضرت آمنہؓ نے بھی حاملہ ہونے کے بعد خواب میں دیکھا تھا کہ ایک شخص نے ان سے کہا کہ تمہارے بطن میں اس امت کا سردار اور پیغمبر ہے، جب تمہارے ہاں ولادت ہو تو بچہ کا نام "محمد"

رکھنا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ آنحضرت لی پیدائش سے پہلے کبھی کسی کا نام "محمد" نہیں رکھا گیا تھا، ہاں اہل کتاب نے جب اپنی آسمانی کتابوں میں مذکور پیش گوئیوں کے مطابق لوگوں کو بتایا کہ وہ زمانہ آیا ہی چاہتا ہے جب خدا کے آخری پیغمبر پیدا ہوں گے اور ان کا نام "محمد" ہوگا تو یہ سن کر چار لوگوں نے اس آرزو میں اپنے بیٹوں کا نام محمد رکھا کہ شرف نبوت سے مشرف ہوں۔ تاہم یہ چار نام بھی آنحضرت ﷺ کے نام سے پہلے نہیں کہے جاسکتے کیونکہ ان چاروں نے بھی آنحضرت ﷺ کا نام "محمد" سن کر ہی اپنے بیٹوں کے نام محمد رکھے تھے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اسماء نبوی ﷺ

① عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ لِيْ اَسْمَاءً اَنَا مُحَمَّدٌ وَاَنَا اَحْمَدُ وَاَنَا الْمَاحِي الَّذِيْ يَمْحُوا اللّٰهُ بِيَ الْكُفْرَ وَاَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمَيَّ وَاَنَا الْعَاقِبُ وَالْعَاقِبُ الَّذِيْ لَيْسَ بَعْدَهٗ نبي۔ (متفق علیہ)

"حضرت جبیر بن مطعمؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "میرے متعدد نام ہیں جن میں سے میرا (مشہور) نام (ایک تو) محمد ہے اور (دوسرا) احمد ہے۔ میرا نام "ماحی" بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ کفر کو مٹاتا ہے، میرا نام "حاشر" بھی ہے، کہ لوگوں کو میرے نقش قدم پر اٹھایا جائے گا، اور میرا نام "عاقب" بھی ہے یعنی وہ شخص جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: بعض روایتوں میں "محمد" اور "احمد" کے ساتھ ایک نام "محمود" بھی منقول ہے، ان تینوں کا مادہ اشتقاق ایک ہی ہے یعنی "حمد" "محمود" کا مطلب ہے وہ ہستی جس کی ذات وصفات کی تعریف دنیا میں بھی کی گئی اور آخرت میں بھی۔ "محمد" کا مطلب وہ ہستی جس کی بے انتہا تعریف کی گئی۔ "احمد" کا مطلب ہے وہ ہستی جس کی تعریف اگلے پچھلوں اور سابقہ آسمانی کتابوں میں سب سے زیادہ کی گئی۔ "احمد" کے ایک معنی یہ بھی بیان ہوئے ہیں کہ وہ ہستی جو صاحب لوائے حمد ہو اور جو اپنے مولیٰ کی حمد وثنا اتنی زیادہ اور اتنے اچھوتے انداز میں کرے کہ کسی کے علم وگمان کی رسائی اس تک نہ ہو جیسا کہ قیامت کے دن مقام محمود میں ہوگا۔

"ماحی" کے معنی ہیں مٹانے والا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں اور رسولوں کی دعوت وتبلیغ کی بہ نسبت سب سے زیادہ آپ ﷺ ہی کی دعوت وتبلیغ کے ذریعہ کفر کو مٹایا۔

"عاقب" کے معنی ہیں سب سے پیچھے آنے والا۔ یعنی آنحضرت ﷺ وہ نبی اور رسول ہیں، جو تمام رسولوں اور نبیوں کے بعد اس دنیا میں تشریف لائے ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی ورسول اس دنیا میں مبعوث نہیں ہوگا۔

② وَعَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَمِّيْ لَنَا نَفْسَهٗ اَسْمَاءً فَقَالَ اَنَا مُحَمَّدٌ وَاَحْمَدُ وَالْمُقَفِّيْ وَالْحَاشِرُ وَنَبِيُّ التَّوْبَةِ وَنَبِيُّ الرَّحْمَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ہمارے سامنے اپنی ذات مبارک کے متعدد نام بیان فرمایا کرتے تھے، چنانچہ (ایک دن) آپ ﷺ نے فرمایا: "میں "احمد" ہوں میں "محمد" ہوں، میں "مقفی" (تمام پیغمبروں کے پیچھے آنے والا) ہوں، میں حاشر (یعنی قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع کرنے والا) ہوں میں توبہ کا نبی ہوں اور میں رحمت کا نبی ہوں۔" (مسلم)

تشریح: "توبہ کا نبی" یا تو اس اعتبار سے فرمایا کہ خلقت نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور آپ ﷺ کے سامنے پچھلی زندگی کے اعمال خواہ وہ کفر وشرک ہو یا گناہ ومعصیت سے بیزاری کا پختہ عہد کر کے دین اسلام کی کامل تابعداری کا اقرار کیا۔ یا یہ کہ آنحضرت ﷺ چونکہ توبہ

واستغفار بہت کرتے تھے اور رجوع الی اللہ آپ ﷺ کی زندگی کا بنیادی نقطہ و محور تھا، نیز یہ آپ ﷺ ہی کی ذات کا فیض تھا کہ آپ ﷺ کی اُمت کے لوگ اگر پختہ عہد یقین کے ساتھ زبان سے توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان کی زبانی توبہ کو قبول فرما لیتا ہے جب کہ پچھلی امتوں کے لوگ اس وقت قابل معافی قرار نہیں پاتے تھے جب تک ان کے قصور اور جرم کی سزا قتل یا دوسری صورتوں میں ان کو نہ مل جاتی تھی، اس لئے آنحضرت ﷺ کا نام "نبی التوبہ" بھی ہوا۔

"نبی الرحمۃ" یعنی رحمت کا نبی۔ یہ قرآن کریم سے ماخوذ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ۔

"ہم نے آپ ﷺ کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

آنحضرت ﷺ اور کافروں کی گالیاں

(۳) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا تَعْجَبُوْنَ كَيْفَ يَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّيْ شَتْمَ قُرَيْشٍ وَلَعْنَهُمْ يَشْتِمُوْنَ مُذَمَّمًا وَيَلْعَنُوْنَ مُذَمَّمًا وَاَنَا مُحَمَّدٌ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک دن صحابہؓ سے) فرمایا کہ کیا تمہیں اس پر حیرت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو قریش مکہ کی گالیوں اور لعنتوں سے کس طرح محفوظ رکھا ہے!؟ وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور مذمم پر لعنت کرتے ہیں جب کہ میں "محمد" ہوں۔" (بخاری)

تشریح: "مذمم" معنی کے اعتبار سے "محمد" کی ضد ہے، یعنی وہ شخص جس کی مذمت و برائی کی گئی ہو۔ یہ لفظ قریش مکہ کے بغض و عناد کا مظہر تھا، وہ بدبخت آنحضور ﷺ کو "محمد" کہنے کے بجائے مذمم کہا کرتے تھے اور یہی نام لے لے کر آپ ﷺ کی شان میں بدزبانی کرتے اور آپ ﷺ پر لعن طعن کیا کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کو تسلی دینے کے لئے فرمایا کرتے تھے کہ قریش مکہ جو بدزبانی کرتے ہیں اور سب وشتم کے تیر پھینکتے ہیں، ان سے آزردہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بدبخت تو مذمم کو اپنا نشانہ بناتے ہیں اور مذمم پر لعن طعن کرتے ہیں، اور میں مذمم نہیں ہوں بلکہ محمد ہوں، یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ اس نے میرے نام محمد کو، جو میری ذات کا مظہر ہے، ان حاسدوں کی گالیوں اور لعن طعن کا نشانہ بننے سے بچا رکھا ہے۔

چہرۂ اقدس، بال مبارک اور مہر نبوت کا ذکر

(۴) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ شَمِطَ مُقَدَّمُ رَاْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ وَكَانَ اِذَا ادَّهَنَ لَمْ يَتَبَيَّنْ وَاِذَا شَعِثَ رَاْسُهٗ تَبَيَّنَ وَكَانَ كَثِيْرَ شَعْرِ اللِّحْيَةِ فَقَالَ رَجُلٌ وَجْهُهٗ مِثْلُ السَّيْفِ قَالَ لَا بَلْ كَانَ مِثْلَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَكَانَ مُسْتَدِيْرًا وَرَاَيْتُ الْخَاتَمَ عِنْدَ كَتِفِهٖ مِثْلَ بَيْضَةِ الْحَمَامَةِ يُشْبِهُ جَسَدَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ "رسول کریم ﷺ کے سر اور داڑھی کے اگلے حصہ میں کچھ بال سفید ہو گئے تھے جب آپ ﷺ بالوں میں تیل لگا لیتے تو یہ سفیدی ظاہر نہیں ہوتی تھی، البتہ جب سر مبارک کے بال بکھرے ہوئے ہوتے تو یہ سفیدی جھلکنے لگتی تھی اور آنحضرت ﷺ کی داڑھی میں بہت زیادہ بال تھے جب حضرت جابرؓ نے آنحضرت ﷺ کا یہ حلیہ شریف بیان کیا تو) ایک شخص نے کہا آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک (چمک اور دمک میں) تلوار کی طرح تھا۔ حضرت جابرؓ نے کہا کہ نہیں بلکہ آفتاب و ماہتاب کی طرح تھا اور گولائی لئے ہوئے تھا۔ نیز میں نے آپ ﷺ کی مہر نبوت کو دیکھا جو شانہ کے قریب تھی، اور کبوتر کے انڈے کی طرح (گول) تھی، اس کی رنگت آپ ﷺ کے جسم مبارک کے رنگ کی سی تھی۔" (مسلم)

تشریح: تیل لگانے سے بال اکٹھا ہو کر جمے رہتے ہیں، اس لئے آپ ﷺ کے وہ سفید بال جو تعداد میں بہت کم تھے، تیل لگے بالوں میں نظر نہیں آتے تھے، اور جب آپ ﷺ کے بال خشک رہتے تھے، ان میں تیل نہیں ہوتا تھا تو وہ سفید بال جھلکنے لگتے تھے کیونکہ بغیر تیل کے بال بکھرے رہتے ہیں اور اگر کوئی ایک بھی سفید بال ہوتا ہے تو وہ نظر آنے لگتا ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ آخر عمر میں، جب کہ آپ ﷺ پر بڑھاپا طاری ہو گیا تھا، اس وقت بھی آپ ﷺ کے سر اور داڑھی میں سفید بالوں کی مجموعی تعداد بیس سے زیادہ نہیں تھی بلکہ ایک روایت میں اس سے بھی کم کا ذکر ہے۔

"داڑھی میں بہت زیادہ بال کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی داڑھی گھنی تھی، ہلکی نہیں تھی، جیسا کہ ایک روایت میں کث اللحیة کے الفاظ بھی ہیں، کہ آپ ﷺ گھنی داڑھی والے تھے۔ اس بارے میں کوئی واضح بات ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی ریش مبارک کی درازی کیا تھی! تاہم آپ ﷺ کے صحابہؓ اور دوسرے بزرگوں کی ڈاڑھی کے بارے میں واضح روایتیں منقول ہیں۔ چنانچہ منقول ہے کہ حضرت علیؓ کی ڈاڑھی اتنی لمبی چوڑی تھی کہ ان کا پورا سینہ کندھوں تک چھپا رہتا تھا، اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک مشت سے زیادہ ڈاڑھی نہیں رکھتے تھے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کی ڈاڑھی بھی بہت لمبی چوڑی تھی۔ **بہرحال داڑھی کو ایک مشت سے کم رکھنا روا نہیں ہے۔ البتہ ایک مشت سے زائد لمبی داڑھی** ——— کے بارے میں مختلف روایات و آثار منقول ہیں۔

"بلکہ آفتاب و ماہتاب کی طرح تھا۔" اس شخص نے آنحضرت ﷺ کے چہرۂ مبارک کو جو تلوار سے مشابہت دی تو اس سے ایک گمان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ ﷺ کا چہرہ لمبوترا ہوگا جس کو بیضوی یا کتابی چہرہ کہا جاتا ہے، لہٰذا حضرت جابرؓ نے واضح فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کا چہرہ لمبوترا نہیں تھا بلکہ گولائی لئے ہوئے تھا! واضح رہے کہ یہاں حدیث میں "مستدیر" کا جو لفظ ہے یا آفتاب و ماہتاب اور آئینہ کا جو ذکر آیا ہے تو اس سے یہ وہم بھی نہ ہونا چاہئے کہ آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک چاند و سورج کی مانند بالکل گول دائرہ کی طرح تھا ایک حدیث میں وضاحت ہے! لَمْ یکن بالمکلثم "آنحضرت کا چہرۂ مبارک نہ بالکل گول تھا اور نہ بالکل لمبا بلکہ گولائی لئے ہوئے تھا" اسی لئے مستدیر کا ترجمہ گولائی لئے ہوئے کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں بل مثل القمر کے الفاظ ہیں یعنی بلکہ چاند کی طرح تھا۔" ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ و کان وجهه قطعة قمر یعنی آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک ایسا تھا جیسے چاند کا ٹکڑا ہو۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا روئے مبارک اس طرح روشن و تابناک تھا جیسے چودھویں کا چاند روشن ہوتا ہے۔ اور ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ خوشی و مسرت کی حالت میں ہوتے تو آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک آئینہ کی طرح ہوتا تھا کہ دیوار کا عکس آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک میں جھلکنے لگتا۔ مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ جہاں تک ان تشبیہوں کا تعلق ہے تو لوگوں نے اپنی سمجھ کے مطابق اور مروجہ اسلوب و تعبیر بیان کا سہارا لیتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے سراپا اور حسن و جمال کو مختلف چیزوں سے تشبیہ دی ہے ورنہ آنحضرت ﷺ کے جمال باکمال کی شوکت و جلالت اور آپ کے حسن و ملاحت کی تابندگی اور دلربائی سے کوئی بھی چیز مشابہت نہیں رکھ سکتی ہے۔

کسے بحسن ملاحت بیار مانہ رسد　　ترا دریں سخن انکار کار مانہ رسد
ہزار نقش برآیدز کلک صنع ولے　　یکے بخوبی نقش ونگار مانہ رسد

"میں نے آپ ﷺ کی مہر نبوت کو دیکھا جو شانہ کے قریب تھی۔" ایک اور روایت میں منقول ہے کہ مہر نبوت دونوں شانوں کے درمیان تھی، ان دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے دراصل وہ مہر نبوت بائیں شانہ کے قریب تھی، لہٰذا کسی نے تو یہ بیان کیا کہ شانہ کے قریب تھی اور کسی نے یہ کہا کہ دونوں شانوں کے درمیان تھی!

"اس کی رنگت آپ ﷺ کے جسم مبارک کے رنگ کی سی تھی" کا مطلب یہ ہے کہ مہر نبوت جسم پر کسی بدنما داغ یا دھبے کی

صورت میں نہیں تھی کہ وہ بدن مبارک سے الگ کوئی چیز معلوم ہوتی ہو بلکہ جس طرح آپ ﷺ کے جسم مبارک اور تمام اعضاء کا رنگ وروپ تھا اسی طرح مہر نبوت بھی تھی، اس کی آب وتاب اور رنگ وروپ میں جسم مبارک سے سر موفرق نہیں تھا۔

مہر نبوت کی حقیقت: مہر نبوت آنحضرت ﷺ کے بدن مبارک پر ولادت ہی کے وقت سے تھی اور اس کی صورت یہ تھی کہ آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان کبوتر کے انڈے کے برابر ایک جگہ بیضوی شکل میں جسم مبارک سے کچھ ابھری ہوئی تھی، یہی مخصوص ابھار "خاتم نبوت (یعنی نبوت کی مہر اور علامت) کہلاتا تھا، اس مہر نبوت کی مقدار اور رنگت کے بارے میں روایتیں کچھ مختلف ہیں لیکن ان روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ اس کا حجم گھٹتا بڑھتا رہتا تھا، اور اس کی رنگت بھی مختلف ہوتی رہتی تھی، اس طرح اس بارے میں بھی مختلف روایتیں ہیں کہ اس مہر نبوت پر کچھ لکھا ہوا تھا یا نہیں؟ بعض روایتوں میں ہے کہ اس پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ مہر نبوت پر یہ عبارت تھی: وحدہ لا شریک لہ توجہ حیث کنت فانک منصور روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ مہر نبوت میں اتنی نورانیت اور اس قدر چمک تھی کہ اس پر آنکھیں نہیں ٹھہرتی تھیں آنحضرت ﷺ کی اس مہر نبوت کا ذکر پچھلی آسمانی کتابوں تورات اور انجیل وغیرہ میں موجود تھا، اور انبیاءؑ آخر زمانہ میں آنحضرت ﷺ کے ظہور کی جو بشارت دیتے تھے تو یہ علامت خاص طور پر بتاتے تھے کہ ان کی پشت پر مہر نبوت ہوگی۔ حاکم نے مستدرک میں وہب ابن منبہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایسا کوئی نبی اور رسول نہیں گذرا جس کے داہنے ہاتھ پر نبوت کا نشان (یعنی مہر نبوت) نہ ہو مگر ہمارے آقا ﷺ کی نبوت کا نشان آپ کی پشت مبارک پر دونوں شانوں کے درمیان تھا اور اس شان کی حیثیت مہر کی سی تھی جو کسی فرمان ودستاویز کو تغیر وتبدل سے محفوظ رکھنے کے لئے اس پر ثبت کی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کی اس مہر نبوت کو ظاہری چیزوں جیسے کبوتر کے انڈے وغیرہ سے تشبیہ دینا لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہے ورنہ اس کی اصل حقیقت ایک ایسا سر عظیم اور قدرت کی نادر نشانی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

مہر نبوت کہاں تھی

⑤ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَرْجَسٍ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَكَلْتُ مَعَهُ خُبْزًا وَلَحْمًا اَوْقَالَ ثَرِيْدًا ثُمَّ دُرْتُ خَلْفَهُ فَنَظَرْتُ اِلٰى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ عِنْدَ نَاغِضِ كَتِفِهِ الْيُسْرٰى جُمْعًا عَلَيْهِ خِيْلَانٌ كَاَمْثَالِ الثَّاٰلِيْلِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن سرجسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کی زیارت اور آپ کے ساتھ کھانا کھانے کا شرف حاصل کیا، کھانا، روٹی اور گوشت تھا، یا انہوں نے یہ کہا کہ۔ ثرید تھا (یعنی روٹی کے ٹکڑے شوربے میں بھگوئے ہوئے تھے)۔ پھر میں آپ ﷺ کی پشت کی طرف آیا اور مہر نبوت ﷺ کو دیکھا جو آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان بائیں شانہ کی نرم ہڈی کے پاس تھی اور (ہیئت کے اعتبار سے) مٹھی کی مانند تھی اور اس پر مسوں کی مانند تل تھے۔" (مسلم)

بچوں پر شفقت

⑥ وَعَنْ اُمِّ خَالِدٍ بِنْتِ خَالِدِ بْنِ سَعِيْدٍ قَالَتْ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِثِيَابٍ فِيْهَا خَمِيْصَةٌ سَوْدَاءُ صَغِيْرَةٌ فَقَالَ ائْتُوْنِيْ بِاُمِّ خَالِدٍ فَاُتِيَ بِهَا تُحْمَلُ فَاَخَذَ الْخَمِيْصَةَ بِيَدِهٖ فَاَلْبَسَهَا قَالَ اَبْلِيْ وَاَخْلِقِيْ ثُمَّ اَبْلِيْ وَاَخْلِقِيْ وَكَانَ فِيْهَا عَلَمٌ اَخْضَرُ اَوْ اَصْفَرُ فَقَالَ يَا اُمَّ خَالِدٍ هٰذَا سَنَاهُ وَهِيَ بِالْحَبَشَةِ حَسَنَةٌ قَالَتْ فَذَهَبْتُ اَلْعَبُ بِخَاتَمِ النُّبُوَّةِ فَزَبَرَنِيْ اَبِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور خالد ابن سعید کی بیٹی ام خالد کہتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے پاس (ہدیہ میں) کچھ کپڑے آئے جن میں ایک چھوٹی سی کملی بھی

تھی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ام خالد کو میرے پاس لاؤ۔ آپ ﷺ نے وہ کملی اٹھائی اور اپنے ہاتھ سے ام خالد کو اڑھادی اور پھر (جیسا کہ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ جب کوئی نیا کپڑا پہنتا تو اس کو دعا دیتے) ام خالد کو یہ دعا دی: اس کپڑے کو پرانا کرو اور پھر پرانا کرو یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے اور بار بار تمہیں کپڑا استعمال کرنا اور بہت کپڑا پہننا نصیب ہو۔ اس کملی میں سبز یا زرد نشان بنے ہوئے تھے! آپ ﷺ نے فرمایا: "ام خالد! یہ کپڑا تو بہت عمدہ ہے۔ اور لفظ سناہ (جس کا ترجمہ "بہت عمدہ" کیا گیا ہے) حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی عمدہ اور بہترین کے ہیں۔ ام خالد کہتی ہیں کہ پھر میں (آنحضرت ﷺ کی پشت مبارک کی طرف چلی) گئی اور (بچپن کی ناسمجھی کی بنا پر) مہر نبوت سے کھیلتی رہی، میرے باپ نے (یہ دیکھا تو) مجھے ڈانٹنے اور منع کرنے لگے، رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اس کو کھیلنے دو، منع نہ کرو۔" (بخاریؒ)

آنحضرت ﷺ کے قد و قامت وغیرہ کا ذکر

(۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ الْبَائِنِ وَلاَ بِالْقَصِيْرِ وَلَيْسَ بِالْاَبْيَضِ الْاَمْهَقِ وَلاَ بِالْاٰدَمِ وَلَيْسَ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلاَ بِالسَّبْطِ بَعَثَهُ اللّٰهُ عَلٰى رَاْسِ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَاَقَامَ بِمَكَّةَ عَشْرَ سِنِيْنَ وَبِالْمَدِيْنَةِ عَشْرَ سِنِيْنَ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَلٰى رَاْسِ سِتِّيْنَ سَنَةً وَلَيْسَ فِيْ رَاْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ عِشْرُوْنَ شَعْرَةً بَيْضَاءَ وَفِيْ رِوَايَةٍ يَصِفُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ رَبْعَةً مِنَ الْقَوْمِ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَلاَ بِالْقَصِيْرِ اَزْهَرَ اللَّوْنِ وَقَالَ كَانَ شَعْرُ رَاْسِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اَنْصَافِ اُذُنَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ بَيْنَ اُذُنَيْهِ وَعَاتِقِهٖ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ قَالَ كَانَ ضَخْمَ الرَّاْسِ وَالْقَدَمَيْنِ لَمْ اَرَ بَعْدَهٗ وَلاَ قَبْلَهٗ مِثْلَهٗ وَكَانَ بَسْطَ الْكَفَّيْنِ وَفِيْ اُخْرٰى لَهٗ قَالَ كَانَ شَثْنَ الْقَدَمَيْنِ وَالْكَفَّيْنِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا قد نہ تو بہت لمبا تھا اور نہ ٹھگنا، آپ ﷺ کا رنگ نہ بالکل سفید تھا اور نہ بالکل گندمی یعنی مائل بہ سیاہی، آپ ﷺ کے سر کے بال نہ بالکل خمدار تھے اور نہ بالکل سیدھے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس وقت مبعوث فرمایا (یعنی منصب رسالت پر فائز کیا) جب کہ آپ ﷺ کی عمر پورے چالیس سال کی ہوگئی تھی، پھر آپ ﷺ نے دس سال مکہ میں قیام فرمایا اور دس سال مدینہ میں، اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ساٹھ سال کی عمر میں وفات دی، اس وقت آپ ﷺ کے سر مبارک اور ڈاڑھی میں صرف بیس بال سفید تھے۔" ایک اور روایت میں حضرت انسؓ نے نبی کریم ﷺ کی اوصاف بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ آنحضرت لوگوں میں میانہ قد تھے، نہ لابنے تھے نہ ٹھگنے، آپ ﷺ کا رنگ نہایت صاف اور چمکدار تھا۔ حضرت انسؓ نے یہ بھی بیان کیا کہ آپ ﷺ کے سر کے بال آدھے کانوں تک تھے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ ﷺ کے سر کے بال) کانوں اور شانوں کے درمیان تک لمبے تھے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) ایک اور روایت میں، جس کو بخاریؒ نے نقل کیا ہے اس طرح ہے کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا: آنحضرت ﷺ کا سر مبارک بڑا تھا اور پاؤں پُر گوشت تھے، میں نے آپ جیسا (وجیہہ و شکیل انسان) نہ تو آپ ﷺ سے پہلے دیکھا تھا اور نہ آپ ﷺ کے بعد دیکھا اور آپ ﷺ کی ہتھیلیاں فراخ تھیں۔" بخاری ہی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا! آنحضرت ﷺ کو دونوں بازو اور ہتھیلیاں گداز اور پر گوشت تھیں۔

تشریح: قد نہ تو بہت لمبا تھا نہ ٹھگنا۔" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا قد میانہ مائل بہ درازی تھا جس کو ہمارے محاورے میں نکلتا قد کہتے ہیں۔ بعض روایتوں میں جو یہ آیا ہے کہ آنحضرت کسی مجمع میں کھڑے ہوتے تو سب سے بلند دکھائی دیتے تھے، اگرچہ اس مجمع میں دراز قد لوگ بھی ہوتے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ کا قد بہت زیادہ دراز تھا، بلکہ اس کا مقصد آپ ﷺ کی اعجازی حیثیت کو بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ذات کو جو عظمت و رفعت عطا فرمائی تھی وہ ہر موقع پر آپ ﷺ کے قد و قامت سے بھی

ظاہر ہوتی تھی یہاں تک کہ اگر آپ ﷺ دراز قد لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوتے تو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ ہی کے وجود کو سب سے زیادہ نمایاں رکھتا تھا۔

"آپ ﷺ کا رنگ نہ بالکل سفید تھا........الخ۔" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی رنگت نہ تو چونے کی طرح بالکل سفید تھی جس میں سرخی کی جھلک بھی نہیں ہوتی اور نہ بہت گہری گندمی تھی بلکہ ایسی گندم گوں تھی جس کو سرخ سفید رنگ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے سر مبارک کے بال نہ تو اتنے زیادہ گھونگھریالے تھے جیسے افریقی اور حبشی لوگوں کے ہوتے ہیں اور نہ بالکل سیدھے تھے بلکہ ان دونوں کے بیچ بیچ تھے۔

مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے قیام کی مدت دس سال تو بالاتفاق ثابت ہے اور اس میں کوئی اختلافی روایت نہیں ہے لیکن منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد مکہ میں قیام کی مدت کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں۔ تحقیقی طور پر جو قول زیادہ صحیح مانا گیا ہے وہ تیرہ سال کی مدت کا ہے، اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ کی عمر تریسٹھ سال ہوتی ہے، پس اس روایت میں جو ساٹھ سال کہا گیا ہے تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ راوی نے اس راویت میں کسور کے ذکر کو اہمیت نہ دیتے ہوئے تیرہ سال کو تو دس سال کہا، اور تریسٹھ سال کو ساٹھ سال کہا، کیونکہ اس زمانہ میں عام طور پر یہ رواج تھا کہ اعداد و شمار کو بیان کرتے وقت کسور کو ذکر کرنا زیادہ ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے سر کے بالوں کی لمبائی کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، دو روایتیں تو یہاں نقل ہوئیں، ایک روایت میں "دونوں کانوں کی لو تک" کے الفاظ ہیں اور ایک روایت میں "کاندھوں کے قریب تک" کا ذکر ہے۔ روایتوں کے اس اختلاف کا سبب دراصل یہ ہے کہ جس وقت آپ ﷺ اپنے بالوں کو تیل اور کنگھی سے آراستہ کئے ہوئے ہوتے اس وقت بال لمبے معلوم ہوتے اور جب بالوں میں نہ تیل ہوتا اور نہ آپ ﷺ کنگھی کئے ہوئے ہوتے تو اس وقت بال چھوٹے معلوم ہوتے، اس طرح جیسا کہ مجمع البحار میں لکھا ہے، جب بالوں کی اصلاح کرائے ہوئے زیادہ دن گذر جاتے تھے تو قدرتی طور پر بال لمبے ہو جاتے تھے اور جب اصلاح کرا لیتے تھے تو بالوں کی لمبائی کم ہو جاتی تھی، جس شخص نے ان میں سے جس حالت میں آپ ﷺ کے بالوں کو دیکھا اس کے مطابق ان کی لمبائی کو ذکر کیا۔ مجمع البحار کی اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ وقتاً فوقتاً اپنے بالوں کو موزوں مقدار میں کٹواتے رہتے تھے، جہاں تک بالوں کو منڈوانے اور سر بالکل صاف کرانے کا تعلق ہے تو اس کا ثبوت کسی روایت سے نہیں ملتا۔ ہاں صرف حج اور عمرے کے موقع پر آپ ﷺ کا سر منڈوانا ضرور ثابت ہے۔

"سر مبارک بڑا اور پاؤں پر گوشت تھے۔" پیروں کا موٹا یعنی پر گوشت ہونا شجاعت اور ثابت قدمی کی علامت ہے جب کہ سر کا بڑا ہونا سرداری عظمت اور عقلمندی کی نشانی سمجھا جاتا ہے اسی لئے عرب میں بڑے سر والے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس کے برخلاف سر کا چھوٹا ہونا عیب اور کم عقلی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کی دونوں ہتھیلیاں بھی بہت گداز اور پر گوشت تھیں اور یہ چیز بھی قوت و شجاعت کی علامت مانی جاتی ہے۔

⑧ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرْبُوْعًا بعيد مَابَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ لَهُ شَعْرٌ يَبْلُغُ شَحْمَةَ أُذُنَيْهِ رَأَيْتُهُ فِيْ حُلَّةٍ حَمْرَاءَ لَمْ أَرَ شَيْئًا قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ مَارَأَيْتُ مِنْ ذِيْ لِمَّةٍ أَحْسَنَ فِيْ حُلَّةٍ حَمْرَاءَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَعْرُهُ يَضْرِبُ مَنْكِبَيْهِ بَعِيْدُ مَابَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ۔

"اور حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ میانہ قد تھے اور آپ ﷺ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان کافی کشادگی تھی (جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آپ ﷺ کا سینہ مبارک بہت چوڑا تھا) آپ ﷺ کے سر کے بال کانوں کی لو تک تھے اور میں نے آپ ﷺ کو سرخ لباس میں (جو یمنی کپڑے کے تہبند اور چادر پر مشتمل تھا) دیکھا (اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ) میں نے آنحضرت ﷺ سے زیادہ حسین کوئی چیز

نہیں دیکھی۔" بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت براء نے کہا: "میں نے کوئی بالوں والا آدمی سرخ لباس میں رسول کریم ﷺ سے زیادہ حسین ووجیہہ نہیں دیکھا، آپ ﷺ کے سر کے بال مونڈھوں تک تھے۔ آپ ﷺ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان کافی کشادگی تھی۔ اور آپ ﷺ کا قد نہ بہت لمبا تھا اور نہ ٹھگنا۔"

تشریح: محدثین نے تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ "سرخ لباس" سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے جسم مبارک پر جس کپڑے کا تہبند اور چادر تھی اس میں سرخ دھاریاں تھیں، اسی طرح جن حدیثوں میں "سبز لباس" کا ذکر ہے، اس سے بھی یہی مراد ہے کہ وہ لباس ایسے کپڑے کا تھا جس میں سبز دھاریاں تھیں۔

عربی میں انسان کے سر کے بالوں کے لئے عام طور پر تین لفظ مستعمل ہوتے ہیں، ایک جُمَّہ ہے، اس سے مراد وہ بال ہوتے ہیں جو کان کی لو سے اتنے نیچے تک ہوں کہ کاندھوں تک پہنچ جائیں اور کبھی اس لفظ کا اطلاق مطلق بالوں پر بھی ہوتا ہے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ دوسرا لفظ لِمَّہ ہے، یہ لفظ بالوں کی اس زلف کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کانوں کی لو سے متجاوز ہو، لیکن کاندھوں تک نہ پہنچی ہو، اور تیسرا لفظ "وَفْرَہ" ہے، جو کانوں کی لو تک لٹکے ہوئے بالوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۹) وَعَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَلِيْعَ الْفَمِ اَشْكَلَ الْعَيْنِ مَنْهُوْشَ الْعَقِبَيْنِ قِيْلَ لِسِمَاكٍ مَاضَلِيْعُ الْفَمِ قَالَ عَظِيْمُ الْفَمِ قِيْلَ مَا اَشْكَلُ الْعَيْنِ قَالَ طَوِيْلُ شَقِّ الْعَيْنِ قِيْلَ مَامَنْهُوْشُ الْعَقِبَيْنِ قَالَ قَلِيْلُ لَحْمِ الْعَقِبِ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سماکؒ ابن حرب، حضرت جابر ابن سمرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول کریم ﷺ کشادہ دہن تھے آپ ﷺ کی آنکھوں میں سرخی ملی ہوئی تھی اور ایڑیاں کم گوشت تھیں (راوی کہتے ہیں کہ) حضرت سماکؒ سے پوچھا گیا کہ "ضلیع الفم" سے کیا مراد ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ اس کے معنی ہیں بڑے منہ والا! ان سے پوچھا گیا کہ "اشکل العین" کے کیا معنی ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کے معنی ہیں دائرہ چشم کا بڑا ہونا! پھر ان سے پوچھا گیا کہ "منہوش العقبین" کے کیا معنی ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ایڑیاں جن پر گوشت کم ہو۔" (مسلم)

تشریح: "کشادہ دہن" سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے منہ کا بابا بڑا تھا اور یہ چیز عرب میں مردوں کے لئے قابل تعریف سمجھی جاتی ہے جب کہ کسی مرد کے منہ کا بابا چھوٹا ہونا ایک عیب مانا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے "کشادہ دہنی" سے فصاحت وبلاغت مراد لی ہے۔

"آنکھوں کی سفیدی میں سرخی" سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھوں میں سرخ ڈورے بہت نمایاں تھے! واضح رہے، کہ حضرت سماکؒ نے "اشکل العین" کے جو یہ معنی بیان کئے کہ دائرہ چشم کا بڑا ہونا" تو یہ ان کا سہو ہے، اصل معنی وہی ہیں جو ترجمہ میں ذکر کئے گئے ہیں، تمام ائمہ لغت نے بھی اس لفظ کے یہی معنی لکھے ہیں۔

(۱۰) وَعَنْ اَبِى الطُّفَيْلِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اَبْيَضَ مَلِيْحًا مُقَصَّدًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوطفیلؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ سفید ملیح رنگ کے تھے نیز متوسط القامت اور تناسب الاعضاء تھے۔" (مسلم)

آنحضرت ﷺ نے خضاب استعمال نہیں کیا

(۱۱) وَعَنْ ثَابِتٍ قَالَ سُئِلَ اَنَسٌ عَنْ خِضَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّهُ لَمْ يَبْلُغْ مَايَخْضِبُ لَوْشِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتِهِ فِىْ لِحْيَتِهِ وَفِىْ رِوَايَةٍ لَوْشِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتٍ كُنَّ فِىْ رَاْسِهِ فَعَلْتُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِىْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّمَا كَانَ الْبَيَاضُ فِىْ عَنْفَقَتِهِ وَفِى الصُّدْغَيْنِ وَفِى الرَّأْسِ نُبَذٌ۔

"اور حضرت ثابتؒ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ سے رسول کریم ﷺ کے خضاب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: "آنحضرت ﷺ کی عمر اتنی کہاں ہوئی تھی کہ خضاب استعمال فرماتے، اگر میں آپ ﷺ کی ڈاڑھی کے سفید بالوں کو گننا چاہتا تو یقیناً گن سکتا تھا۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اگر میں آپ ﷺ کے سر کے بالوں کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔" (بخاری ومسلم) اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت انسؓ نے کہا: "بالوں کی سفیدی آپ ﷺ کی ڈاڑھی کے نیچے کے حصہ میں اور کن پٹیوں میں تھی اور کچھ سر مبارک میں۔"

تشریح: "آنحضرت ﷺ کی عمر اتنی کہاں ہوئی تھی....... آلخ" سے مراد یہ ہے کہ حضور سرور کائنات ﷺ کا وصال جس عمر میں ہوا وہ کوئی ایسی عمر نہیں تھی جس میں آدمی پر خالص بڑھاپا طاری ہو جاتا ہو، اس عمر کو زیادہ سے زیادہ بڑھاپے کی ابتدا کہا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس عمر میں آنحضرت ﷺ کے بال اتنے زیادہ سفید نہیں ہوئے تھے کہ خضاب کی ضرورت پیش آتی، جو تھوڑے بہت ہو گئے تھے اس کی مقدار اتنی کم تھی کہ بادی النظر میں معلوم بھی نہیں ہوتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کی ہتھیلیاں حریر و دیباج سے زیادہ ملائم اور آپ ﷺ کا پسینہ مشک و عنبر سے زیادہ خوشبودار تھا

⑫ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَزْهَرَ اللَّوْنِ كَانَ عَرَقَهُ اللُّؤْلُؤُ اِذَا مَشٰى تَكَفَّأَ وَمَا مَسِسْتُ دِيْبَاجَةً وَلَا حَرِيْرًا اَلْيَنَ مِنْ كَفِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا شَمِمْتُ مِسْكًا وَلَا عَنْبَرَةً اَطْيَبَ مِنْ رَائِحَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ دمکتے ہوئے رنگ کے تھے اور آپ ﷺ کے پسینے کے قطرے (ہیئت و چمک اور صفائی میں) موتی کی طرح ہوتے تھے، جب آپ ﷺ راستہ چلتے تو آگے کی طرف جھکے ہوئے چلتے، اور میں نے کسی دیباج و حریر کو بھی رسول کریم ﷺ کی ہتھیلیوں سے زیادہ ملائم اور نرم نہیں پایا اور نہ میں نے کوئی ایسا مشک و عنبر سونگھا جس میں نبی کریم ﷺ کے بدن مبارک کی خوشبو سے زیادہ خوشبو ہو۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "آگے کی جانب جھکے ہوئے چلتے۔" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی چال اور رفتار میں بھی ایک خاص قسم کا ایسا وقار ہوتا تھا، جس میں انکساری شامل ہو، اور یہ چال ایسی ہوتی تھی جیسے کوئی شخص بلند زمین سے نشیب میں اتر رہا ہو۔ یا اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ آپ ﷺ جب چلتے تو اس اعتماد اور وقار کے ساتھ قدم اٹھاتے جس طرح کوئی بہادر اور قوی و توانا شخص اپنے قدم اٹھاتا ہے، یہ نہیں تھا کہ چلتے وقت آپ ﷺ کی چال میں کوئی ڈگمگاہٹ یا غیر توانائی محسوس ہوتی ہو اور یا زمین پر پاؤں گھسیٹتے ہوئے چلتے ہوں۔

پسینہ مبارک

⑬ وَعَنْ اُمِّ سُلَيْمٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاتِيْهَا فَيَقِيْلُ عِنْدَهَا فَتَبْسُطُ نِطَعًا فَيَقِيْلُ عَلَيْهِ وَكَانَ كَثِيْرَ الْعَرَقِ فَكَانَتْ تَجْمَعُ عَرَقَهُ فَتَجْعَلُهُ فِى الطِّيْبِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اُمَّ سُلَيْمٍ مَا هٰذَا قَالَتْ عَرَقُكَ نَجْعَلُهُ فِيْ طِيْبِنَا وَهُوَ مِنْ اَطْيَبِ الطِّيْبِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَرْجُوْ بَرَكَتَهُ لِصِبْيَانِنَا قَالَ اَصَبْتِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ام سلیمؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے یہاں آکر قیلولہ فرمایا کرتے تھے (یعنی دوپہر کے وقت ان کے یہاں استراحت کے لئے تشریف لایا کرتے تھے) چنانچہ ام سلیمؓ آپ ﷺ کے لئے چمڑے کا بستر بچھا دیتیں اور آپ ﷺ اسی پر قیلولہ فرماتے۔ آنحضرت ﷺ کو پسینہ زیادہ آیا کرتا تھا (کیونکہ آپ ﷺ کثیر الحیا تھے) ام سلیمؓ آپ ﷺ کا پسینہ جمع کر کے اپنے عطر میں ملا لیتی تھیں)

(ایک دن) آنحضرت ﷺ نے (ان کو پسینہ جمع کرتے دیکھا تو) پوچھا کہ ام سلیم! یہ تم کیا کررہی ہو؟ ام سلیمؓ نے کہا کہ یہ آپ کا پسینہ ہے جس کو جمع کرکے ہم اپنے عطر میں ملالیتے ہیں، بات یہ ہے کہ آپ (ﷺ) کا پسینہ مبارک تمام خوشبوؤں سے بہتر خوشبو ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ام سلیمؓ نے کہا: یارسول اللہ (ﷺ)! اس پسینہ کو ہم اپنے بچوں کے لئے باعث برکت تصور کرتی ہیں (یعنی آپ ﷺ کے مبارک پسینہ کو ہم اپنے بچوں کے بدن اور منہ پر ملتی ہیں اور یقین رکھتی ہیں کہ وہ بچے اس پسینہ کی برکت سے آفات اور بلاؤں سے محفوظ رہیں گے) آپ ﷺ نے فرمایا: "تم نے صحیح کہا اور اچھا کیا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حضرت ام سلیمؓ، حضرت انسؓ کی والدہ ہیں جو آنحضرت ﷺ کے خادم خاص تھے۔ یہ بڑی عاقلہ اور فاضلہ خاتون تھیں، اللہ نے اپنی اور اپنے دین کی اور اپنے رسول کی محبّت کا وافر حصہ ان کو عطا فرمایا تھا، کسی رضاعی یا نسبی رشتے سے آنحضرت ﷺ کی محرم عورتوں میں سے تھیں، اسی لئے آنحضرت ﷺ دوپہر کے وقت ان کے ہاں جاکر قیلولہ فرمالیا کرتے تھے۔

بچوں کے ساتھ پیار

⑭ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الْاُوْلٰى ثُمَّ خَرَجَ اِلٰى اَهْلِهٖ وَخَرَجْتُ مَعَهٗ فَاسْتَقْبَلَهٗ وِلْدَانٌ فَجَعَلَ يَمْسَحُ خَدَّيْ اَحَدِهِمْ وَاحِدًا وَاحِدًا وَاَمَّا اَنَا فَمَسَحَ خَدِّيْ فَوَجَدْتُ لِيَدِهٖ بَرْدًا اَوْ رِيْحًا كَاَنَّمَا اَخْرَجَهَا مِنْ جُؤْنَةِ عَطَّارٍ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ سَمُّوْا بِاِسْمِيْ فِيْ بَابِ الْاَسَامِيْ وَحَدِيْثُ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ نَظَرْتُ اِلٰى خَاتِمِ النُّبُوَّةِ فِيْ بَابِ اِحْكَامِ الْمِيَاهِ۔

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے رسول کریم ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی (جب نماز پڑھ چکے تو) آنحضرت ﷺ اپنے گھر جانے کے لئے مسجد سے باہر نکلے اور آپ ﷺ کے ساتھ میں بھی باہر آیا (اتفاق سے) آنحضرت ﷺ کے سامنے کچھ بچے آگئے، آپ ﷺ نے (پیار کرنے کے لئے) ان میں سے ہر ایک بچہ کے رخساروں پر ہاتھ پھیرا اور پھر میرے رخساروں پر پھیرا۔ اس وقت میں نے آپ ﷺ کے دست مبارک کی ایسی ٹھنڈک اور خوشبو محسوس کی جیسے آپ ﷺ نے ابھی عطروں کے ڈبہ میں سے اپنا ہاتھ نکالا۔ (مسلمؒ) اور حضرت جابرؓ کی روایت "سمو اباسمی الخ" باب الاسامی، میں اور حضرت سائب بن یزید کی روایت نظرت الی خاتم النبوۃ الخ باب احکام المیاہ میں نقل کی جاچکی ہیں، (صاحب مصابیح نے ان دونوں روایتوں کو اس باب میں نقل کیا تھا

تشریح: "واما انافمسح خدی" "اور پھر میرے رخساروں پر اپنا دست مبارک پھیرا" اس جملہ میں لفظ خدی دال کے زیر اور یا کے جزم کے ساتھ بصیغہ مفرد ہے، اور بعض نسخوں میں یہاں بھی یہ لفظ دال کے زیر اور یا کی تشدید کے ساتھ بلفظ تثنیہ ہے، جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے، لیکن ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ اکثر نسخوں میں تو یہاں یہ لفظ بصیغہ تثنیہ ہے اور ایک نسخہ میں بصیغہ مفرد ہے جس سے جنس مراد ہے۔

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے جسم مبارک کی خوشبو کا ذکر ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا خود جسم مبارک خوشبودار تھا، اگر آپ ﷺ خارجی خوشبو کا استعمال نہ بھی کرتے تب بھی جسم مبارک سے خوشبو آیا کرتی تھی، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ اکثر اوقات خارجی خوشبو استعمال فرمایا کرتے تھے، تاکہ آپ ﷺ ملائکہ سے ملنے، وحی حاصل کرنے اور مسلمانوں کے ساتھ ہم نشینی کے وقت زیادہ سے زیادہ معطر رہ سکیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حضور ﷺ کا سراپا

⑮ عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ بِالطَّوِیْلِ وَلَا بِالْقَصِیْرِ ضَخْمَ الرَّاسِ وَاللِّحْیَةِ شَثْنَ الْکَفَّیْنِ وَالْقَدَمَیْنِ مُشْرَبًا حُمْرَةً ضَخْمَ الْکَرَادِیْسِ طَوِیْلَ الْمَسْرُبَةِ اِذَا مَشٰی تَکَفَّأَ تَکَفُّؤًا کَاَنَّمَا یَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ لَمْ اَرَ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"حضرت علی ابن ابی طالبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ تو دراز قد تھے نہ پستہ قد (بلکہ میانہ قد تھے) بڑے سر دار اور گھنی ڈاڑھی والے تھے، ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پاؤں پر گوشت تھے، آپ ﷺ کا رنگ سرخ و سفید تھا، ہڈیوں کے جوڑ موٹے تھے اور سینہ سے ناف تک بالوں کی ایک لمبی لیکر تھی جب آپ ﷺ چلتے تو آگے کی جانب کو جھکے ہوئے چلتے گویا آپ ﷺ بلندی سے نشیب میں جا رہے ہوں حقیقت یہ ہے کہ میں نے آپ جیسا کوئی شخص نہ تو آپ سے پہلے دیکھا اور نہ آپ ﷺ کے بعد دیکھا آپ پر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو۔" اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: "آگے کی جانب کو جھکے ہوئے چلتے۔" کا ایک مطلب تو وہ ہے جو پیچھے بھی گذرا ہے کہ آپ قوی اور بہادر لوگوں کی چال چلتے تھے یعنی قوت کے ساتھ پاؤں زمین سے اٹھاتے اور رکھتے تھے۔ اور بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ کی چال میں اکڑ اور اتراہٹ نہیں ہوتی تھی بلکہ مسکینی اور تواضع کی چال اختیار فرماتے تھے۔

⑯ وَعَنْهُ کَانَ اِذَا وَصَفَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمْ یَکُنْ بِالطَّوِیْلِ الْمُمَّغِطِ وَلَا بِالْقَصِیْرِ الْمُتَرَدِّدِ وَکَانَ رَبْعَةً مِّنَ الْقَوْمِ وَلَمْ یَکُنْ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبْطِ کَانَ جَعْدًا رَجِلًا وَلَمْ یَکُنْ بِالْمُطَهَّمِ وَلَا بِالْمُکَلْثَمِ وَکَانَ بِالْوَجْهِ تَدْوِیْرٌ اَبْیَضُ مُشْرَبٌ اَدْعَجُ الْعَیْنَیْنِ اَهْدَبُ الْاَشْفَارِ جَلِیْلُ الْمُشَاشِ وَالْکَتِدِ اَجْرَدُ ذُوْ مَسْرُبَةٍ شَثْنُ الْکَفَّیْنِ وَالْقَدَمَیْنِ اِذَا مَشٰی یَتَقَلَّعُ کَاَنَّمَا یَمْشِیْ فِیْ صَبَبٍ وَاِذَا الْتَفَتَ الْتَفَتَ مَعًا بَیْنَ کَتِفَیْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ وَهُوَ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ اَجْوَدُ النَّاسِ صَدْرًا وَاَصْدَقُ النَّاسِ لَهْجَةً وَاَلْیَنُهُمْ عَرِیْکَةً وَاَکْرَمُهُمْ عَشِیْرَةً مَنْ رَاٰهُ بَدِیْهَةً هَابَهٗ وَمَنْ خَالَطَهٗ مَعْرِفَةً اَحَبَّهٗ یَقُوْلُ نَاعِتُهٗ لَمْ اَرَ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ جب وہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کرتے تو کہتے: آنحضرت ﷺ نہ تو بہت لمبے تھے اور نہ بہت ٹھگنے بلکہ میانہ قد لوگوں میں تھے، آپ کے بال نہ تو بہت زیادہ گھونگریالے تھے نہ بالکل سیدھے تھے بلکہ خفیف سا بل کھائے ہوئے، نہ منہ بالکل گول اور بھاری تھا اور نہ گال پھولے ہوئے تھے (بلکہ پورا چہرہ ستواں، ورخسار یکساں و برابر تھے اور پیشانی بلند تھی) روئے مبارک کسی قدر گولائی لئے ہوئے تھا، رنگ سرخ و سفید تھا، آنکھیں سیاہ تھیں، پلکیں بڑی بڑی تھیں۔ جوڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور مونڈھوں کا درمیانی حصہ (جہاں دونوں شانوں کی ہڈیاں آکر ملتی ہیں) مضبوط اور پر گوشت تھا، جسم مبارک پر بال نہیں تھے صرف ایک لکیر بالوں کی تھی جو سینہ سے ناف تک چلی گئی تھی، ہاتھ اور پاؤں بھرے ہوئے یعنی پر گوشت تھے، جب راستہ چلتے تو قوت کے ساتھ قدم اٹھاتے، جیسے بلندی سے نیچے اتر رہے ہوں، جب دائیں یا بائیں متوجہ ہونا ہوتا تو پورے جسم کے ساتھ متوجہ ہوتے، اور آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور آپ ﷺ خاتم النبیین تھے، آپ ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ دل کے سخی اور زبان کے نہایت سچے تھے، طبیعت کے بہت نرم اور سب سے معزز و مکرم انسان تھے، جو شخص آپ ﷺ کو پہلی مرتبہ دیکھتا، اس پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی اور جو شخص آپ سے واقفیت رکھتا ہو اور میل جول رکھتا ہو آپ ﷺ سے والہانہ محبت کرتا۔" آنحضرت ﷺ کی ان صفات و خصوصیات کو بیان کرنے والے (حضرت علیؓ) کہتے ہیں کہ آپ ﷺ جیسا کوئی شخص نہ تو میں نے آپ ﷺ سے پہلے دیکھا اور نہ

آپ ﷺ کے بعد دیکھا، اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو آپ ﷺ پر۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "جسم مبارک پر بال نہیں تھے الخ۔" اس جملہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سینے سے ناف تک بالوں کی ایک لکیر کے علاوہ آپ ﷺ کے جسم مبارک پر اور کہیں بال نہیں تھے، جب کہ بعض دوسری روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سینہ یا ناف کے علاوہ بھی بعض جگہوں جیسے کلائی و بازو، پنڈلیوں اور پہنچوں پر بال تھے۔ لہٰذا کہا جائے گا کہ یہاں "اجرد" کا لفظ "اشعر" کے مقابلہ پر استعمال ہوا ہے "اور "اشعر" سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کے تمام بدن پر بال ہوں اور "اجرد" اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پورے بدن پر بال نہ ہوں (بلکہ کہیں کہیں ہوں)۔

"........تو پورے جسم کے ساتھ متوجہ ہوتے۔" کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ کو دائیں یا بائیں کسی کو دیکھنا ہوتا یا کسی کی طرف متوجہ ہونا ہوتا تو بے اعتنائی برتنے والوں کی طرح نظر چرا کر نہ دیکھتے بلکہ پورے التفات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ یا یہ مطلب ہے کہ دائیں، بائیں متوجہ ہونے کے لئے کم ظرف لوگوں کی طرح صرف اکڑی ہوئی گردن نہ گھماتے بلکہ ایک ہمدرد کی طرح اطمینان کے ساتھ اپنا منہ ادھر کو کر کے یا پورے وجود کے ساتھ گھوم کر اس کی طرف دیکھتے اور اپنی کامل توجہ کا اظہار فرماتے۔

"دل کے سخی" سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ دل وجان سے سخاوت کرتے تھے، جس کے پیچھے ایک فطری جذبہ اور محض اخلاص وہمدردی کا تقاضہ ہوتا تھا، نہ کہ دکھانے، سنانے یا کسی جبر واکراہ کے ساتھ آپ ﷺ سخاوت فرماتے تھے۔ اور ملا علی قاریؒ نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ لفظ "اجود" کو اگر "جودت" سے ماخوذ سمجھا جائے تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ دل کے فراخ اور دلیر تھے، اور اسی وجہ سے آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کی خلاف مرضی باتوں سے اور ان پڑھ دیہاتی مسلمانوں کی تکلیف پہنچانے والی حرکتوں سے ملول اور تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ اور اگر اجود کو لفظ "جود" سے ماخوذ مانا جائے جس کے معنی عطا و بخشش کے ہیں تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کوئی بھی چیز دینے اور عطا کرنے میں ذرا سا بھی بخل نہیں کرتے تھے، خواہ مال ہو علم و اخلاق ہو اور تہذیب و تربیت ہو۔ اسی طرح زبان کے نہایت سچے تھے، کہ ایک معنی تو یہی ہیں جو خود ترجمہ سے ظاہر ہیں کہ آپ ﷺ سے زیادہ سچ بولنے والا اور حق گو کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ لفظ لھجۃ کی رعایت سے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کی گفتگو نہایت باوقار، آپ ﷺ کا لہجہ نہایت شاندار اور آپ ﷺ کی زبان نہایت صاف تھی، الفاظ کی ادائیگی نہایت برمحل، موزوں اور مخارج حروف سے ہوتی تھی۔

"جو شخص پہلی مرتبہ آپ ﷺ کو دیکھتا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کے ذاتی اوصاف و خصائل اور اخلاق واطوار سے واقفیت نہ رکھتے ہوئے پہلے پہل آپ ﷺ کے سامنے آتا اور ملاقات کرتا تو اس پر آپ ﷺ کی باوقار شخصیت کا اس قدر رعب طاری ہوتا کہ وہ خوف محسوس کرنے لگتا لیکن جب کچھ دیر آپ ﷺ کی مجلس میں بیٹھتا، آپ ﷺ کے مزاج اور اخلاق کا تجربہ کرتا اور آپ ﷺ کی پر کیف صحبت کی اثر آفرینی محسوس کرتا تو ایک دم کھل اٹھتا اور آپ ﷺ کی محبت وکشش کا اسیر بن جاتا۔

حضور ﷺ کے جسم کی خوشبو گذر گاہ کو معطر کر دیتی تھی

(۱۷) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَسْلُكْ طَرِيْقًا فَيَتْبَعُهُ اَحَدٌ اِلَّا عَرَفَ اَنَّهُ قَدْ سَلَكَهُ مِنْ طِيْبِ عَرْفِهِ اَوْقَالَ مِنْ رِيْحِ عَرَقِهِ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی راستہ سے گذرتے تو آپ ﷺ کے بعد جو شخص اس راستہ سے گذرتا وہ آنحضرت ﷺ کے جسم مبارک کی خوشبو۔ یا یہ کہا کہ۔ آپ ﷺ کے پسینہ مبارک کی خوشبو سے معلوم کر لیتا کہ آنحضرت ﷺ اس راستہ سے تشریف لے گئے ہیں۔" (دارمی)

تشریح: "یا یہ کہا" یہ راوی کا شک ہے کہ حدیث میں اس موقع پر مِنْ طِيْبِ عَرْفِهِ کے الفاظ تھے یا مِنْ رِيْحِ عَرَقِهِ کے، دونوں

صورتوں میں مفہوم ایک ہی رہتا ہے!

لفظ "عرف۔" کے لغوی معنی صرف "بو" کے ہیں خواہ خوشبو ہو یا بدبو، لیکن یہ لفظ اکثر خوشبو ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جس راستہ سے گذرتے اس راستہ کی ہوا آپ ﷺ کے جسم مبارک یا پسینہ مبارک کی خوشبو سے عطر آمیز ہو جاتی تھی اور پورا راستہ مہک اٹھتا تھا، چنانچہ جو شخص آپ ﷺ کے بعد اس راستہ سے گذرتا اس مخصوص خوشبو سے معلوم کر لیتا کہ سرور دو عالم ﷺ ادھر سے گذرے ہیں۔ اور یہ عطر بیزی آپ ﷺ کی ذات کی خوشبو کی ہوتی تھی، نہ کہ آپ ﷺ کے بدن یا کپڑوں کو لگی ہوئی کسی خارجی خوشبو کی۔

آپ ﷺ کا وجود آفتاب کی طرح تھا

⑱ وَعَنْ اَبِي عُبَيْدَةَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ قُلْتُ لِلرُّبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ صِفِي لَنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ يَا بُنَيَّ لَوْ رَاَيْتَهُ رَاَيْتَ الشَّمْسَ طَالِعَةً۔ (رواہ الدارمی)

"محمد ابن عمار ابن یاسرؓ کے صاحبزادے ابوعبیدہؒ کہتے ہیں کہ میں نے معوذ ابن عفراءؓ کی صاحبزادی حضرت ربیعؓ (صحابیہ) سے کہا کہ آپ ہمارے سامنے رسول کریم ﷺ کا وصف بیان کریں تو انہوں نے کہا کہ: میرے بیٹے! اگر تم آنحضرت ﷺ کو دیکھ لیتے تو یہی سمجھتے کہ چمکتا ہوا سورج دیکھ لیا ہے۔" (دارمی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا ایسا دبدبہ اور جلال تھا اور آپ ﷺ کا وجود اس قدر پر نور تھا کہ آپ کو دیکھنا گویا چمکتے ہوئے سورج کو دیکھنا تھا۔

چہرۂ مبارک کی وہ تابانی کہ ماہتاب بھی شرمائے

⑲ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي لَيْلَةٍ اِضْحِيَانٍ فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِلَى الْقَمَرِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ حَمْرَاءُ فَاِذَا هُوَ اَحْسَنُ عِنْدِي مِنَ الْقَمَرِ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں چاندنی رات میں نبی کریم ﷺ کو دیکھ رہا تھا اور صورت یہ تھی کہ کبھی رسول کریم ﷺ کے جمال عالمتاب کی طرف نظر کرتا اور کبھی چاند کو دیکھتا، اس وقت آپ ﷺ کے جسم مبارک پر اس کپڑے کا لباس تھا جس میں سرخ اور سفید دھاریاں تھیں، حقیقت یہ ہے کہ میرے نزدیک آپ ﷺ کا حسن و جمال چاند سے کہیں زیادہ تھا۔" (ترمذی، دارمی)

تشریح: "آپ ﷺ کے حسن و جمال کو چاند سے کہیں زیادہ اس لئے کہا گیا کہ چاند تو ایک خاص نوعیت کا صرف ظاہری حسن رکھتا ہے جب کہ آپ ﷺ کی ذات ہمہ جہت ظاہری حسن و جمال کے علاوہ بے مثال معنوی حسن و کمال کا بھی پر تو تھی۔ رہی یہ بات کہ حضرت جابرؓ نے آنحضرت ﷺ کے اظہار حسن کو میرے نزدیک" کے الفاظ کے ساتھ کیوں مقید کیا تو اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنے ذاتی جذبات عقیدت، وفور محبت اور استلذاذ و ذوق کا اظہار کرنا چاہتے تھے، در حقیقت حضرت جابرؓ کیا تمام ہی ارباب عشق و محبت اور ناقدین حسن و جمال کے نزدیک آپ ﷺ کا جمال جہاں آراء چاند کے حسن و جمال سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

آنحضرت ﷺ کی رفتار

⑳ وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ مَا رَاَيْتُ شَيْئًا اَحْسَنَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنَّ الشَّمْسَ تَجْرِي مِنْ وَجْهِهٖ وَمَا رَاَيْتُ اَحَدًا اَسْرَعَ فِي مَشْيِهٖ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنَّمَا الْاَرْضُ تُطْوٰى لَهٗ اِنَّا لَنُجْهِدُ اَنْفُسَنَا وَاِنَّهٗ لَغَيْرُ مُكْتَرِثٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے زیادہ حسین و جمیل کوئی چیز نہیں دیکھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک آفتاب ہے جو آپ ﷺ کو چہرۂ مبارک سے جلوہ ریز ہو رہا ہے۔ اور میں نے رسول کریم ﷺ سے زیادہ تیز رفتار کسی کو نہیں پایا (جب آپ ﷺ چلتے تو) ایسا لگتا کہ آپ ﷺ کے سامنے کی زمین لپٹی جا رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہم تو سخت جد وجہد اور کوشش کرتے لیکن آپ ﷺ اپنی بے نیاز چال چلتے تھے۔" (ترمذی)

تشریح: "ہم تو سخت جد وجہد اور کوشش کرتے الخ۔" کے ذریعہ حضرت ابوہریرہؓ نے اس طرف اشارہ کیا کہ جب ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے ساتھ راستہ چلتے تو ہم پوری کوشش اور جد وجہد کر کے اپنی رفتار کو بڑھاتے اور آنحضرت ﷺ کے برابر پہنچنا چاہتے لیکن آپ ﷺ بلاتعب و تکلف، اپنی معمولی چال سے چلتے ہوئے سب سے آگے ہی رہتے۔ یہ گویا آنحضرت ﷺ کا معجزہ تھا کہ دوسرے لوگ دوڑتے بھاگتے بھی آپ ﷺ کی اس رفتار کے برابر پہنچ پاتے تھے جو بالکل معمول کے مطابق اور سہولت کے ساتھ ہوتی تھی۔

حضور ﷺ کی پنڈلیاں، آنکھیں اور مسکراہٹ

(۲۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ فِي سَاقَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُمُوْشَةٌ وَكَانَ لَا يَضْحَكُ اِلَّا تَبَسُّمًا وَكُنْتُ اِذَا نَظَرْتُ اِلَيْهِ قُلْتُ اَكْحَلُ الْعَيْنَيْنِ وَلَيْسَ بِاَكْحَلَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی پنڈلیاں سبک و نازک تھیں۔ اور آپ ﷺ (عام طور پر) ہنسا نہیں کرتے تھے بلکہ مسکرایا کرتے تھے اور میں جب آپ ﷺ کی طرف دیکھتا تو دل میں کہتا کہ آپ ﷺ سرمہ لگائے ہوئے ہیں حالانکہ آپ ﷺ سرمہ لگائے نہ ہوتے تھے۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھیں خلقی طور پر سرمہ آگیں ہونے کی وجہ سے بہت حسین و خوبصورت معلوم ہوتی تھیں ۔

دو چشم تو کہ سیاہ اند سرمہ ناکردہ بسان سرمہ سیہ کردہ خانۂ مردم

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضور ﷺ کے دندان مبارک

(۲۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْلَجَ الثَّنِيَّتَيْنِ اِذَا تَكَلَّمَ رُءِيَ كَالنُّوْرِ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ ثَنَايَاهُ۔ (رواہ الدارمی)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اگلے دو دانت کشادہ تھے، جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ آپ ﷺ کے ان دونوں دانتوں کے درمیان سے نور نکل رہا ہے۔" (دارمی)

تشریح: سامنے کے اوپر اور نیچے کے جو دو دو دانت ہوتے ہیں ان کو عربی میں ثنیان اور ثنایا کہتے ہیں، ثنیان تثنیہ ہے اور ثنایا جمع۔ اسی طرح ان دانتوں کے دائیں اور بائیں جو دو دو دانت ہوتے ہیں ان کو رباعیات کہا جاتا ہے۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے سامنے کے یہ دونوں دانت ایک دوسرے سے بالکل جڑے ہوئے نہیں تھے، بلکہ ان دونوں کے درمیان کچھ خلا تھا، نیز الفاظ حدیث سے بظاہر یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ یہ خلا صرف اوپر ہی کے دانتوں کے درمیان نہیں تھا بلکہ نیچے کے دونوں دانتوں کے درمیان بھی تھا۔

حضور ﷺ کی خوش دلی چہرہ سے نمایاں ہوجاتی تھی

(۲۳) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سُرَّ اسْتَنَارَ وَجْهُهُ حَتّٰى كَاَنَّ وَجْهَهُ قِطْعَةُ قَمَرٍ وَكُنَّا نَعْرِفُ ذٰلِكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت کعب ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب خوش ہوتے تو آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک کھل اٹھتا تھا اور ایسا معلوم ہونے لگتا کہ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک چاند کا ٹکڑا ہے اور اس چیز سے ہم (آپ ﷺ کی اندرونی کیفیت پہچان لیتے تھے۔" (بخاری ومسلم)

حضور ﷺ کی صفات وخصوصیات کا تورات میں ذکر

(۲۴) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ غُلَامًا يَهُوْدِيًّا كَانَ يَخْدُمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَرِضَ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُهُ فَوَجَدَ اَبَاهُ عِنْدَ رَاْسِهِ يَقْرَءُ التَّوْرٰةَ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا يَهُوْدِيُّ اُنْشِدُكَ بِاللّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ التَّوْرَاةَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَجِدُ فِي التَّوْرَاةِ نَعْتِيْ وَصِفَتِيْ وَمَخْرَجِيْ قَالَ لَا قَالَ الْفَتٰى بَلٰى وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَجِدُ لَكَ فِي التَّوْرٰةِ نَعْتَكَ وَصِفَتَكَ وَمَخْرَجَكَ وَاِنِّيْ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِهٖ اَقِيْمُوْا هٰذَا مِنْ عِنْدِ رَاْسِهٖ وَلُوْا اَخَاكُمْ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا جو نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا، بیمار ہوا تو نبی کریم ﷺ اس کی عیادت کو اس کے گھر تشریف لائے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تورات کا کوئی حصہ پڑھ رہا ہے (جیسے مسلمانوں میں نزع کے وقت سورہ یٰسین پڑھی جاتی ہے) رسول کریم ﷺ نے (یہ دیکھ کر) اس سے پوچھا کہ یہودی! میں تمہیں اس خدا کی قسم دے کر دریافت کرتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی (سچ سچ بتانا) کیا تم اس تورات میں میری تعریف وتوصیف اور میرے (وطن سے) نکلنے کا ذکر پاتے ہو؟ اس یہودی نے جواب دیا کہ نہیں! لیکن وہ لڑکا بولا: ہاں یارسول اللہ! خدا کی قسم اس تورات میں ہم آپ ﷺ کی تعریف و توصیف اور آپ کے نکلنے کا ذکر پاتے ہیں، اور میں یقینی طور پر اس امر کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس امر کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔" رسول کریم ﷺ نے اس لڑکے کی اس راست گوئی اور اس کے اظہار ایمان واسلام کو دیکھ کر) اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ: اس کے باپ کو اس کے سرہانے سے اٹھادو اور تم اپنے اس (دینی) بھائی کے والی بنو (یعنی اگر اس لڑکے کا انتقال ہوجائے تو پھر اس کے تجہیز وتکفین وغیرہ کے امور تم انجام دو)" اس روایت کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں ذکر کیا ہے۔"

تشریح: "میرے نکلنے" کا ایک مطلب تو وطن یعنی مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آجانا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ مخرج یہاں بعث (منصب رسالت ونبوت پر فائز ہونے) کے معنی میں ہو۔

لفظ "نعت" اور "صفت" لغوی طور پر دونوں ہم معنی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں نعت سے مراد آپ ﷺ کے ذاتی وباطنی اوصاف ہیں اور "صفت" سے ظاہری اوصاف مراد ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت، رحمت خداوندی کا ظہور ہے

(۲۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا! "حقیقت یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی

رحمت ہوں۔" (اس روایت کو دارمی نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میرا وجود، میری رسالت اور میرا لایا ہوا دین اللہ کی وہ عظیم رحمت ہے جو اس نے تمام کائنات کے لئے ہدیہ کے طور پر دنیا میں بھیجا، پس جن لوگوں نے اللہ کے اس ہدیہ اور تحفہ کو قبول کیا وہ مطلب یاب ہوئے اور جن لوگوں نے قبول نہیں کیا وہ سراسر ٹوٹے میں رہے۔ ارشاد گرامی مضمون کے اعتبار سے قرآن کریم کے ان الفاظ کا عکس ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ۔

"(اے محمد ﷺ) ہم نے آپ ﷺ کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

اس حدیث کے بین السطور سے اُمت محمدیہ کی عظمت و کرامت بھی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ شاہی ہدیہ و تحفہ ان ہی لوگوں کے پاس بھیجا جاتا ہے جو باعظمت و باکرامت ہو۔

بَابٌ فِيْ اَخْلَاقِهٖ وَشَمَائِلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

آنحضرت ﷺ کے اخلاق وعادات کا بیان

"اخلاق" خلق کی جمع ہے جس کے معنی طبعی خصلت اور باطنی صفت کے ہیں۔ اور "شمائل" شمال کی جمع ہے جس کے معنی عادت اور خو کے ہیں۔ پس پچھلے باب میں مؤلف کتاب نے آنحضرت ﷺ کی ظاہری شکل و صورت سے متعلق احادیث نقل کیں جس کو صورت اور خلق کہا جاتا ہے، اب یہ باب قائم کر کے ان احادیث کو نقل کیا گیا ہے جن میں آنحضرت ﷺ کے باطنی اوصاف و خصائل ذکر کئے گئے ہیں، جن کو سیرت اور خلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ باطنی اوصاف یا سیرت و خلق سے مراد مردانگی، شجاعت سخاوت، نرمی، مروت، محبت، تحمل، تواضع، رحم و کرم اور شرم و حیا وغیرہ ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بے مثال حسن خلق

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ خَدَمْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَ سِنِيْنَ فَمَا قَالَ لِيْ اُفٍّ وَلَا لِمَ صَنَعْتَ وَلَا اَلَّا صَنَعْتَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی دس سال خدمت کی (اس پورے عرصہ میں) مجھ کو آپ ﷺ نے کبھی اف بھی نہیں کہا، اور نہ کبھی آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا، اور یہ کام تم نے کیوں نہیں کیا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "مسلمؒ" کی روایت میں نو سال کے الفاظ ہیں۔ بہر حال آنحضرت ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت حضرت انسؓ کی عمر، باختلاف روایت آٹھ سال یا دس کی تھی، ان کی والدہ ماجدہ اور ان کے بعض رشتہ دار، جو انصار میں سے تھے، ان کو آنحضرت ﷺ کے پاس لائے اور خدمت مبارک میں دے دیا چنانچہ حضرت انسؓ نے اس دن سے اس وقت تک کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ میں دس سالہ قیام کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے، آپ ﷺ کی مسلسل خدمت کرتے رہے۔ اور اس حدیث میں وہ آنحضرت کے ساتھ اس طویل خادمانہ تعلق کا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس پورے عرصہ میں میری کسی غلطی اور کسی کوتاہی پر ڈانٹنا ڈپٹنا تو کجا کسی بات پر اف تک نہیں کیا۔ الف کے پیش اور ف کی تشدید اور زیر کے ساتھ ہے، ایک نسخہ میں

یہ لفظ ف کے زبر کے ساتھ ایک نسخہ میں تنوین مکسورہ کے ساتھ ہے، یہ لفظ انسان کی زبان سے اس وقت نکلتا ہے جب وہ کسی ناپسندیا تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔

"تم نے یہ کام کیوں کیا........الخ۔" اس جملہ کے ذریعہ بھی حضرت انسؓ نے آنحضرت ﷺ کے حسن سلوک اور کمال خلق کو بیان کیا کہ اس طویل زمانہ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے ازخود کوئی کام کیا ہو اور آنحضرت ﷺ نے یہ اعتراض فرمایا ہو کہ تم نے میری مرضی کے بغیر یہ کام کیوں کیا، یا آنحضرت ﷺ نے مجھ سے کسی کام کے لئے کہا ہو اور میں اس کام کو نہ کرسکا ہوں تو آپ ﷺ نے جواب طلب کیا ہو کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا! لیکن واضح رہے کہ حضرت انسؓ نے آنحضرت ﷺ کا یہ معاملہ اور سلوک دنیاوی امور یا ذاتی خدمت کے تعلق سے بیان کیا ہے نہ دینی معاملات و امور سے متعلق، کیونکہ کسی دینی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر اعتراض پر چشم پوشی روا نہیں ہے۔

طیبیؒ نے لکھا ہے کہ حدیث کے بین السطور سے خود حضرت انسؓ کی خوبی بھی ظاہر ہوتی ہے، یا یوں کہئے کہ ایک طرح سے حضرت انسؓ نے اپنی تعریف بھی بیان کی کہ میں نے ایسا موقع کبھی نہیں آنے دیا کہ آنحضرت ﷺ کو میرے کسی کام پر کوئی اعتراض ہوا ہو، یا مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ لیکن یہ بات کہنا کچھ زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتا، حدیث کا جو سیاق و سباق ہے اور حضرت انسؓ خلق نبوی کے متعلق جن احساسات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں ان کے پیش نظر حدیث کا اصل مفہوم وہی ہے جو پہلے ذکر ہوا۔

شفقت و مروت

② وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَحْسَنِ النَّاسِ خُلُقًا فَاَرْسَلَنِىْ يَوْمًا لِحَاجَةٍ فَقُلْتُ وَاللّٰهِ لَا اَذْهَبُ وَفِىْ نَفْسِىْ اَنْ اَذْهَبَ لِمَا اَمَرَنِىْ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَرَجْتُ حَتّٰى اَمُرَّ عَلٰى صِبْيَانٍ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ فِى السُّوْقِ فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قَبَضَ بِقَفَاىَ مِنْ وَرَائِىْ قَالَ فَنَظَرْتُ اِلَيْهِ وَهُوَ يَضْحَكُ فَقَالَ يَا اُنَيْسُ ذَهَبْتَ حَيْثُ اَمَرْتُكَ قُلْتُ نَعَمْ اَنَا اَذْهَبُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اخلاق و عادات کی خوبی میں تمام لوگوں سے بڑھ کر تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ آپ ﷺ نے مجھے کسی کام سے کہیں بھیجنا چاہا، میں نے آپ ﷺ سے یوں کہہ دیا کہ خدا کی قسم میں نہیں جاؤں گا، لیکن دل میں یہی تھا کہ رسول کریم ﷺ نے جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل کے لئے ضرور جاؤں گا، چنانچہ میں چل پڑا، بازار سے گذرا تو ایک جگہ جہاں بچے کھیل رہے تھے۔ ٹھہر گیا، اچانک رسول اللہ ﷺ وہاں آگئے اور پیچھے سے میری گدی پکڑلی، میں نے مڑکر آپ ﷺ کی طرف دیکھا تو آپ مسکرا رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ فرمانے لگے: ارے انیس تو وہاں جارہا ہے نا، جہاں میں نے تجھے بھیجا تھا؟ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ (ﷺ)! میں اب جارہا ہوں۔" (مسلم)

تشریح: حضرت انسؓ نے یہ واقعہ اس زمانہ کا بیان کیا ہے جب انہیں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا اور ابھی صغیر السن تھے، یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے انہیں کہیں بھیجنا چاہا تو باوجودیکہ ان کا ارادہ آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل کرنا تھا مگر بچپن کی نادانی اور لاابالی پن میں ان کی زبان سے یہ نکل گیا کہ میں تو نہیں جاؤں گا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کی اس بات کو اسی سیاق و سباق میں دیکھا اور اس پر کسی تادیب کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ ان کے ساتھ ہنسی اور نرمی و شفقت کا معاملہ کیا۔

"انیس" انس کی تصغیر ہے، اور آپ ﷺ نے حضرت انسؓ کو ان کے اصل نام "انس" سے مخاطب کرنے کے بجائے اس نام کی تصغیر "انیس" سے مخاطب کیا، جو ان کے تئیں آپ ﷺ کی شفقت و محبت کا اظہار تھا۔

بے مثال تحمل اور خوش اخلاقی

(۳) وَعَنْهُ قَالَ كُنْتُ اَمْشِيْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُرْدٌ نَجْرَانِيٌّ غَلِيْظُ الْحَاشِيَةِ فَاَدْرَكَهُ اَعْرَابِيٌّ فَجَبَذَهُ بِرِدَائِهِ جَبْذَةً شَدِيْدَةً وَرَجَعَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ نَحْرِ الْاَعْرَابِيِّ حَتّٰى نَظَرْتُ اِلٰى صَفْحَةِ عَاتِقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَثَّرَتْ بِهَا حَاشِيَةُ الْبُرْدِ مِنْ شِدَّةِ جَبْذَتِهٖ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ مُرْلِيْ مِنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ عِنْدَكَ فَالْتَفَتَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ ضَحِكَ ثُمَّ اَمَرَ لَهٗ بِعَطَاءٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا، اس وقت آپ ﷺ کے جسم پر (یمن کے شہر نجران کی بنی ہوئی (دھاری دار) چادر تھی، جس کے کنارے بہت دبیز اور موٹے تھے، (اچانک راستہ میں) ایک دیہاتی آنحضرت ﷺ کو مل گیا اور اس نے (اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے آپ ﷺ کی چادر کو پکڑ کر اتنے زور سے کھینچا کہ نبی کریم ﷺ کھنچ کر اس کے سینے کی قریب آ لگے، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس دیہاتی کے اس قدر سختی سے چادر کھینچنے سے رسول کریم ﷺ کی گردن مبارک پر چادر کے کنارے کی رگڑ کا نشان پڑ گیا، پھر اس دیہاتی نے کہا کہ محمد (ﷺ)! تمہارے پاس اللہ کا جو مال ہے اس میں سے کچھ مجھ کو دلواؤ۔ آنحضرت ﷺ نے پہلے تو (حیرت کے ساتھ) اس کی طرف دیکھا پھر (ازراہ تلطف) مسکرائے اور ان کو کچھ دیئے جانے کا حکم صادر فرمایا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ایک دوسری روایت میں ہے کہ مال اللہ الذی عندک کے بعد اس دیہاتی نے یہ بھی کہا: لا من مالک و لا من مال ابیک (نہ تو تمہارے ذاتی مال میں سے مانگ رہا ہوں اور نہ تمہارے باپ کے مال میں سے) اور "اللہ کے مال" سے زکوٰۃ کا مال مراد ہے!

یہ حدیث لوگوں کی سخت گوئی، بے مروتی اور بد اخلاقی پر آنحضرت ﷺ کے کمال ضبط و تحمل کی دلیل ہے اور اس بارے میں سرکار رسالت مآب کا ایک ایسا کردار پیش کرتی ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ مذکورہ دیہاتی پرلے درجہ کا اجڈ، اور نہایت درشت خو تھا، اس نے نہ تہذیب و شائستگی سیکھی اور نہ اخلاق و آداب کے معمولی مراتب سے بھی روشناس تھا، اس لئے اس نے اپنے خالص اجڈپن میں آنحضرت ﷺ سے اس قدر غیر شائستہ انداز میں اپنا مدعا ظاہر کیا۔

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حاکم و سلطان کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنی رعایا اور نادان لوگوں کی ایذاء پر صبر و تحمل کرے، اور دوسری بات یہ کہ اپنی حیثیت عرفی اور اپنے وقار کی حفاظت کے لئے کسی کو کچھ دینا دانشمندی کا تقاضہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اکملیت و جامعیت

(۴) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْسَنَ النَّاسِ وَاَجْوَدَ النَّاسِ وَاَشْجَعَ النَّاسِ وَلَقَدْ فَزِعَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَانْطَلَقَ النَّاسُ قِبَلَ الصَّوْتِ فَاسْتَقْبَلَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ سَبَقَ النَّاسَ اِلَى الصَّوْتِ وَهُوَ يَقُوْلُ لَمْ تُرَاعُوْا لَمْ تُرَاعُوْا وَهُوَ عَلٰى فَرَسٍ لِاَبِيْ طَلْحَةَ عُرْيٍ مَا عَلَيْهِ سَرْجٌ وَفِيْ عُنُقِهٖ سَيْفٌ فَقَالَ لَقَدْ وَجَدْتُهٗ بَحْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (حسن و جمال، فضل و کمال، صفات حمیدہ اور اخلاق فاضلہ میں) تمام لوگوں سے بڑھ کر تھے، تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے، اور تمام لوگوں سے زیادہ دلیر و بہادر تھے۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ مدینہ کے لوگ (کسی سمت سے چور ڈاکو یا کسی دشمن کی آواز سن کر) مضطرب و خوف زدہ ہو گئے (اور ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے) پھر (کچھ) لوگ (جمع ہو کر) اس آواز کی سمت گئے، وہاں انہوں نے اپنے سامنے نبی کریم ﷺ کو موجود پایا، حقیقت یہ ہے آنحضرت ﷺ سب سے پہلے (گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور تن تنہا) اس آواز کی سمت روانہ ہو گئے تھے آپ ﷺ نے ان سب لوگوں کو اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں، کوئی خطرہ

نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ اس وقت ابو طلحہؓ کے گھوڑے پر سوار تھے جو ننگی پیٹھ تھا، اس پر زین نہیں تھی نیز آپ کی گردن میں تلوار پڑی تھی، پھر آپ ﷺ نے فرمایا! "میں نے تو اس گھوڑے کو دریا کی طرح تیز رو پایا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ایک روایت میں یہ وضاحت بھی ہے کہ گھوڑا بہت سست رفتار، تنگ قدم اور سرکش تھا، لیکن اس دن کے بعد سے وہ گھوڑا ایسا تیز رفتار ہوا کہ کوئی بھی گھوڑا اس کے آگے نہیں نکل پاتا تھا پس یہ آنحضرت ﷺ کے معجزات میں سے ہے کہ اس گھوڑے کی حالت آپ ﷺ کی ذرا سی دیر کی سواری سے اس طرح بدل گئی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی طرف سے دشمن وغیرہ کی کوئی آہٹ محسوس ہو تو صورت حال کی تحقیق کے لئے سبقت کرنا اور اس طرف تن تنہا روانہ ہو جانا دلیری بھی ہے اور مستحب بھی بشرطیکہ ہلاکت میں نہ پڑنے کا یقین ہو، اس طرح اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عاریتاً مانگنا اور مستعار گھوڑے (یا کسی بھی سواری) پر جہاد کرنا جائز ہے نیز تلوار کا گردن میں لٹکانا مستحب ہے، یہ بھی اس حدیث سے معلوم ہوا۔

کبھی کسی سائل کو انکار نہیں کیا

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ مَاسُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَطُّ فَقَالَ لَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول کریم ﷺ سے کسی نے سوال کیا ہو اور آپ ﷺ نے اس کو انکار کر دیا ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علامہ ابن حجرؒ نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جب کوئی شخص آپ ﷺ سے کچھ مانگتا اور آپ ﷺ کے پاس ہوتا تو فوراً دے دیتے تھے۔ اگر آپ ﷺ کے پاس دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا اور سائل کا سوال پورا کرنے پر قادر نہ ہوتے تو اس صورت میں بھی صفائی کے ساتھ انکار نہ کرتے بلکہ یا تو خاموشی اختیار کر لیتے، یا مناسب الفاظ میں عذر بیان کرتے، یا دعائیہ جملے ارشاد فرما دیتے، گویا آپ ﷺ کسی بھی حالت میں سائل کے سامنے اپنی زبان پر صاف انکار کا لفظ نہیں لاتے تھے۔

اور شیخ عزالدین نے لکھا ہے: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ لا (انکار کا لفظ) آپ ﷺ کی زبان پر کبھی اس لئے نہیں آیا کہ کسی سائل نے آپ ﷺ سے کوئی سوال کیا ہو اور آپ ﷺ اس سوال کو ٹھکرانا چاہتے ہوں، یہ اور بات ہے کہ کوئی سوال پورا کرنا آپ ﷺ کے بس میں نہ رہا ہو اور آپ ﷺ نے عذر بیان کرنے کے لئے یا کسی اور مقصد کی خاطر اس لفظ کا استعمال فرمایا ہو، جیسے ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا "لا اجد ما احملکم علیه" (میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے کہ تمہیں سوار ہونے کے لئے دوں)۔ مشہور شاعر فرزدق نے آنحضرت ﷺ کے اسی وصف کا، کہ لا (انکار) کا لفظ آپ ﷺ کی زبان پر کبھی نہیں آیا، اپنے شعر میں اس طرح ذکر کیا ہے ؎

ما قَالَ لا قط الافی تشهده لو لا التشهد کَانَتْ لاؤه نعم

اسی مضمون کو ایک فارسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

نہ رفت کلمۂ لا برزبان او ہرگز مگر باشہد ان لا الہ الا اللہ

عطا و بخشش کا کمال

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَنَمًا بَيْنَ جَبَلَيْنِ فَاَعْطَاهُ اِيَّاهُ فَاَتٰى قَوْمَهٗ فَقَالَ اَىْ قَوْمِ اَسْلِمُوْا فَوَ اللّٰهِ اِنَّ مُحَمَّدًا لَيُعْطِىْ عَطَاءً مَا يَخَافُ الْفَقْرَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے اتنی بکریاں مانگیں جو پہاڑوں کے درمیانی نالہ کو بھر دیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو اتنی ہی بکریاں دے دیں، اس کے بعد وہ شخص اپنی قوم میں آیا اور کہا: اے میری قوم کے لوگو! اسلام قبول کرلو، خدا کی قسم محمد (ﷺ) اتنا دیتے ہیں کہ فقر و افلاس سے بھی نہیں ڈرتے۔" (مسلم)

تشریح: شاید سائل کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا اتنا بڑا سوال اتنی آسانی سے پورا کیا جاسکتا ہے، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے اپنے تصرف میں موجود تقریباً ساری ہی بکریاں دے کر اس کا سوال پورا کردیا تو وہ اچھنبے میں پڑ گیا اور آنحضرت کی بخشش و عطا، کا یہ مظاہرہ دیکھ کر اس کو یقین ہوگیا کہ آپ توکل و قناعت اور زہد و استغناء کے جس درجہ کمال پر فائز ہیں وہ اسی مذہب کا پرتو ہوسکتا ہے جس کے رسول بنا کر آپ ﷺ اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں، اس لئے اس نے اپنی قوم میں جاکر لوگوں کو مخلصانہ تلقین کی کہ اگر تم اعلی اخلاقی اقدار اور بلند ترین انسانی کردار کی عظمت حاصل کرنا چاہتے ہو تو حلقہ بگوش اسلام ہو جاؤ اور ان محمد ﷺ عربی کے پیرو بن جاؤ جو سائل کے سوال کو اس طرح پورا کرتے ہیں کہ ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اپنی ضرورت سے بے نیاز ہو کر سب دے دیتے ہیں، اپنے فقر و افلاس کا خدشہ بھی انہیں سائل کی طلب و خواہش کی تکمیل سے نہیں روکتا ۔

ہرچہ آمدت بدست بدادے تو بیش ازاں   این جود آں کسی ست کش از فقر عار نیست

خلق نبوی ﷺ

⑦ وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ بَيْنَمَا هُوَ يَسِيْرُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقْفَلَهُ مِنْ حُنَيْنٍ فَعَلِقَتِ الْأَعْرَابُ يَسْئَلُوْنَهُ حَتّٰى اضْطَرُّوْهُ اِلٰى سَمُرَةٍ فَخَطِفَتْ رِدَاءَهُ فَوَقَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعْطُوْنِيْ رِدَائِيْ لَوْ كَانَ لِيْ عَدَدَ هٰذِهِ الْعِضَاهِ نَعَمٌ لَقَسَمْتُهُ بَيْنَكُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْنِيْ بَخِيْلًا وَلَا كَذُوْبًا وَلَا جَبَانًا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت جبیر ابن مطعم اس وقت کا واقعہ بیان کرتے ہیں جب وہ رسول کریم ﷺ کے ہمراہ غزوۂ حنین سے واپس آرہے تھے، کہ (راستہ میں ایک مقام پر) کچھ (غریب) دیہاتی آپ ﷺ کو لپٹ گئے اور (غنیمت کا مال) مانگنے لگے اور اس حد تک پیچھے پڑ گئے کہ آپ کو (کھینچتے ہوئے) ایک کیکر کے درخت تک لے گئے۔ وہاں آپ کی چادر کیکر کے کانٹوں میں الجھ کر رہ گئی آپ (بڑی بے چارگی کے ساتھ) رک گئے اور فرمایا: "لاؤ میری چادر تو دے دو، اگر میرے پاس ان خاردار درختوں کے برابر بھی چوپائے (یعنی بکریاں اور اونٹ وغیرہ) ہوتے تو میں ان سب کو تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا اور تم جان لیتے کہ میں نہ بخیل ہوں نہ جھوٹا وعدہ کرنے والا اور نہ چھوٹے دل والا ہوں۔"

(بخاری)

تشریح: "غزوۂ حنین" وہ مشہور جنگ ہے جو فتح مکہ کے فوراً بعد طائف اور مکہ کے درمیان آباد بنو ہوازن و بنو ثقیف اور ان کے حلیف قبائل سے آنحضرت ﷺ کو کرنا پڑی تھی۔ اس جنگ میں ابتدائی طور پر کچھ سخت پریشانیوں اور قدرے ہزیمت کے بعد مسلمانوں کو زبردست فتح حاصل ہوئی تھی، دشمن کے چھ ہزار قیدیوں کے علاوہ مال غنیمت میں ۲۴ ہزار اونٹ، ۴۴ ہزار سے زیادہ بھیڑ بکریاں، اور چار ہزار اوقیہ چاندی مسلمانوں کے ہاتھ آئی، اس معرکہ میں مدینہ کے دس ہزار مہاجر و انصار صحابہ کے علاوہ اہل مکہ میں کے وہ دو ہزار لوگ بھی شامل تھے جو فتح مکہ کے موقع پر نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، آپ ﷺ نے غزوہ حنین کا سارا مال غنیمت میدان جنگ کے قریب ہی مقام جعرانہ میں جمع کرنے کا حکم دیا اور وہیں سے اہل طائف کی شورش کو دبانے کے لئے طائف تشریف لے گئے، طائف کی مہم میں کامیاب ہو کر مقام جعرانہ واپس آئے اور وہاں جمع شدہ مال غنیمت کی تقسیم شروع فرمائی۔ زیادہ تر مال آپ ﷺ نے اہل مکہ کی تالیف قلب کے لئے ان کو دے دیا۔ دوسرے مستحقین کو بھی عطا فرمایا اور ایک شخص کو اس کے سوال پر بہت زیادہ بکریاں دینے کا وہ واقعہ، جس کا ذکر پیچھے کی حدیث میں گذرا، اسی موقع پر پیش آیا تھا، اس طرح جب آپ ﷺ وہاں سے روانہ ہوئے تو سارا مال و اسباب

تقسیم کر کے ختم کر چکے تھے، لہٰذا آگے چل کر راستہ میں جب کچھ دیہاتیوں نے آپ ﷺ سے کچھ سوال کیا تو آپ ﷺ ان کا سوال پورا نہیں کر سکے، ایک طرف تو یہ مجبوری تھی کہ سارا مال و اسباب ختم ہو جانے کی وجہ سے آپ ﷺ ان کو کچھ دے نہیں سکتے تھے، دوسری طرف صفائی کے ساتھ انکار کر کے ان کی دل شکنی بھی گوارا نہیں تھی، لیکن جب ان لوگوں نے تنگ اور پریشان کرنے کی حد تک آپ ﷺ کا پیچھا پکڑ لیا تو آپ ﷺ نے ان سے مذکورہ جملے ارشاد فرمائے جس کا مطلب یہ تھا کہ تمہارا سوال پورا نہ کرنے کا حقیقی سبب یہ ہے کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں بچا ہے "جو مال و اسباب میرے پاس تھا سب تقسیم کر چکا ہوں، اگر میرے پاس اس جنگل میں پائے جانے والے بے شمار خار دار درختوں کے برابر بھی مال ہوتا تو میں سب کا سب تم لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتا اس وقت تم لوگوں کو تجربہ ہو جاتا کہ نہ تو میں بخیل ہوں کہ خرچ کرنا نہیں چاہتا، نہ یہ بات کہ اپنا مال بچانے اور محض ٹرخانے کے لئے جھوٹا سچا وعدہ کر کے سائلین سے اپنا پیچھا چھڑا لیا کرتا ہوں اور نہ یہ کہ میں چھوٹے دل کا آدمی ہوں اور اس خوف کی وجہ سے تمہیں کچھ دینا نہیں چاہتا کہ اگر تمہیں دے دیا تو میرے پاس کچھ نہیں رہ جائے گا اور خود مجھے فقر و افلاس گھیر لے گا غرضیکہ بخل و کذب اور جبن جیسی بری خصلتیں میرے اندر نہیں پا سکتے۔ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی میں اس بات کی دلیل ہے کہ اعتماد اور بھروسہ پیدا کرنے کے لئے نہ جاننے والے کے سامنے اوصاف حمیدہ کے ذریعہ اپنی تعریف کرنا جائز ہے۔

مخلوق خدا کے تئیں شفقت و ہمدردی

⑧ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّى الْغَدَاةَ جَاءَ خَدَمُ الْمَدِيْنَةِ بِاٰنِيَتِهِمْ فِيْهَا الْمَاءُ فَمَا يَاْتُوْنَ بِاِنَاءٍ اِلَّا غَمَسَ يَدَهُ فِيْهَا فَرُبَّمَا جَاءُوْهُ بِالْغَدَاةِ الْبَارِدَةِ فَيَغْمِسُ يَدَهُ فِيْهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو اہل مدینہ کے خدام (یعنی لونڈیاں اور غلام، اپنے اپنے برتنوں میں پانی لے کر پہنچ جاتے (تاکہ آپ ﷺ کے دست مبارک کی برکت سے عافیت اور بیماریوں سے شفا حاصل کریں) چنانچہ جو شخص بھی پانی کا برتن لے کر آتا آپ ﷺ (اس کی خوشی کی خاطر اور اس کو اپنی برکت پہنچانے کے لئے) اس برتن میں اپنا ہاتھ ڈال دیتے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ لوگ سردی کے موسم میں صبح ہی صبح اپنے برتن لے کر آتے اور آپ ﷺ (بڑی خوش دلی کے ساتھ) اپنا دست مبارک ان برتنوں میں ڈال دیتے۔" (مسلم)

تشریح: یہ حدیث نہ صرف آپ ﷺ کی اس شفقت و محبت اور ہمدردی کو ظاہر کرتی ہے جو آپ ﷺ اپنی اُمت کے تئیں رکھتے تھے، بلکہ اس طرف رہنمائی بھی کرتی ہے کہ اگر تکلیف و پریشانی کو برداشت کر کے بھی مخلوق خدا کو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہو تو اس سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔

غریب و پریشان حال لوگوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا معاملہ

⑨ وَعَنْهُ قَالَ كَانَتْ اَمَةٌ مِنْ اِمَاءِ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ تَاْخُذُ بِيَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَنْطَلِقُ بِهٖ حَيْثُ شَاءَتْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مدینہ والوں کی لونڈیوں میں سے ایک لونڈی کا یہ معاملہ تھا کہ جب اس کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی) رسول کریم ﷺ کا ہاتھ پکڑتی اور جہاں اس کا جی چاہتا، آپ ﷺ کو لے جاتی۔" (بخاری)

تشریح: مطلب یہ کہ اگر وہ ضرورت سمجھتی تو آپ ﷺ کو مدینہ سے باہر کہیں دور اس طرح لئے چلی جاتی اور وہاں اپنی پریشانی بیان کرتی اور جو کچھ کہنا سننا ہوتا کہتی سنتی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اپنی اُمت کے لوگوں، یہاں تک کہ چھوٹے درجہ کے

افراد سے کس قدر محبت و تعلق تھا اور تواضع و بے نفسی کے کس بلند ترین مقام پر فائز تھے!

(۱۰) وَعَنْهُ اَنَّ امْرَاَةً كَانَتْ فِيْ عَقْلِهَا شَيْءٌ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ اِلَيْكَ حَاجَةً فَقَالَ يَا اُمَّ فُلَانٍ اُنْظُرِيْ اَيَّ السِّكَكِ شِئْتِ حَتّٰى اَقْضِيَ لَكِ حَاجَتَكِ فَخَلَا مَعَهَا فِيْ بَعْضِ الطُّرُقِ حَتّٰى فَرَغَتْ مِنْ حَاجَتِهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک عورت تھی جس کے دماغ میں کچھ خلل تھا، اس نے ایک دن کہا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ (ﷺ) سے میرا ایک کام ہے (جو لوگوں سے پوشیدہ طور پر کہنے کا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا! "فلانے کی ماں! تم جس کوچہ کو (لوگوں کی نظروں سے محفوظ سمجھو) دیکھ لو (میں تمہارے ساتھ وہاں چلنے کو تیار ہوں) تمہارا جو کام ہوگا میں ضرور کروں گا (یعنی تم جس تنہا مقام پر مجھ سے بات کرنا چاہو چلو میں وہاں چل کر تمہاری بات سن لوں گا)۔ چنانچہ آپ ﷺ اس کے ساتھ ایک کوچہ میں تشریف لے گئے اور وہاں تنہائی میں اس عورت کو جو کچھ کہنا سننا تھا اس نے کہا سنا۔" (مسلم)

تشریح: یہ حدیث بھی آنحضرت ﷺ کے علو اخلاق کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف اس پاگل عورت کی طرف توجہ دی بلکہ اس نے جہاں چاہا وہ اپنی بات سنانے آپ ﷺ کو لے گئی۔ نیز اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کا اس عورت کے ساتھ ایک کوچہ میں تنہائی اختیار کرنا گھر میں اور عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرنے کی مانند نہیں تھا کیونکہ اس کوچہ میں آنحضرتؐ اس عورت کے ساتھ بالکل تنہا نہیں تھے بلکہ وہ لوگ تو وہاں موجود ہی تھے جن کے مکانات وہاں موجود تھے لیکن برعایت حسن ادب وہ حضرات اس جگہ سے کچھ فاصلہ پر کھڑے ہوئے تھے، جہاں آپ ﷺ اس عورت کی بات سن رہے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے اوصاف حمیدہ

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَلَا لَعَّانًا وَلَا سَبَّابًا كَانَ يَقُوْلُ عِنْدَ الْمَعْتِبَةِ مَالَهٗ تَرِبَ جَبِيْنُهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نہ تو فحش گو تھے، نہ لعنت کرنے والے اور نہ بد کلام تھے جب کسی پر آپ ﷺ کو غصہ آتا تو بس یہ فرماتے! کیا ہوا اس کو (جو اس نے یہ بات کہی یا یہ کام کیا) خاک آلود ہو اس کی پیشانی۔" (بخاری)

تشریح: "فحش" کے اصل معنی ہیں "کوئی بات کہنے یا کسی بات کا جواب دینے میں حد سے بڑھ جانا۔" زیادہ تر اس کا استعمال اس کلام کے لئے ہوتا ہے جس میں جماع یا جماع سے متعلق باتوں کا کھلم کھلا ذکر ہو! جیسے اوباش و بے حیا اور بد قماش لوگ ماں باپ کی گندی گالیاں اور شرمناک باتیں بکتے ہیں اور اہل حیاء و شریف لوگ ایسی باتوں کا زبان پر لانا تو در کنار، ان کو سننا بھی برداشت نہیں کرتے، بلکہ اگر انہیں اس طرح کوئی بات ضرورۃ بھی کہنا ہوتی ہے تو اس کو اشارے و کنایے میں کہتے ہیں یہاں تک کہ پیشاب و پاخانہ کا ذکر بھی "قضاء حاجت" جیسے مہذب الفاظ میں کنایۃً کرتے ہیں۔ اس طرح "فحش" کا لفظ کثرت و زیادتی، ہر سخت برے گناہ، ہر ایک بری اور قبیح خصلت اور زنا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

"لعن" کے لغوی معنی ہیں، ہانک دینا، محروم کر دینا، ذلیل کرنا، گالی دینا۔ لعن یا لعنت کی نسبت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے پروردگار کا اپنے قرب سے دور کر دینا اور اپنی رحمت سے محروم کر دینا اور اگر اس لفظ کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس سے مراد ہوتا ہے: برا کہنا اور رحمت خداوندی سے دوری و محرومی کی بد دعا کرنا۔ مثلاً اگر کہیں یہ آئے کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت کی، یا فلاں پر اللہ کی لعنت نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اپنے مقام قرب سے دور پھینک دیا اور اپنی رحمت سے دور کر دیا اور اگر یہ آئے کہ فلاں شخص نے لعنت کی یا فلاں شخص نے لعنت بھیجی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص نے خدا کی رحمت سے دوری و محرومی کی بد دعا کی! واضح رہے کہ اس شخص پر لعنت کرنا جو لعنت کا مستحق نہ ہو سخت گناہ ہے اور بار بار لعنت کرنا تو گناہ کبیرہ ہے، نیز

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی معین شخص پر لعنت کرنا حرام ہے اگرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، ہاں اگر کسی شخص کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ کفر ہی کی حالت میں مرگیا ہے جیسے ابوجہل وغیرہ تو اس پر لعنت کرنا حرام نہیں ہے، اسی طرح کسی برائی میں مبتلا لوگوں پر عمومی انداز میں لعنت کرنا جیسے یہ کہنا کہ کافروں یا ظالموں، یا سود خواروں وغیرہ وغیرہ پر خدا کی لعنت ہو، حرام نہیں ہے۔ایک بات یہ بھی جان لینی چاہئے کہ "لعنت" کی دو قسمیں ہیں ایک تو رحمت خداوندی اور دخول جنت سے محرومی دوری اور ابدی عذاب و تباہی (خلود دوزخ) کے ابتلاء کی بددعا یہ قسم کافروں کے ساتھ مخصوص ہے، اور دوسری قسم کا مطلب ہے! اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص، اس کے قرب اور سابقین کے درجہ سے محرومی کی بددعا، اس قسم کا تعلق بعض درجہ کے گنہگاروں اور بدکاروں سے ہے۔ان قسموں کے باہمی فرق کو ملحوظ رکھنے سے اس مسئلہ میں پیدا ہونے والے بہت سے اشکال دور ہوجاتے ہیں!

خاک آلود ہو اس کی پیشانی۔" یہ جملہ ذلت و خواری اور نگوساری سے کنایہ ہے۔مطلب یہ کہ غصہ و ناراضگی کے وقت آپ ﷺ کی طرف سے شدید سے شدید جو ردعمل ظاہر ہوتا تھا وہ بس یہ جملہ تھا جو زبان مبارک سے ادا ہوتا، اور اس میں بھی آپ ﷺ براہ راست اس شخص کو خطاب نہیں فرماتے تھے جو اس غصہ و ناراضگی کا باعث ہوتا، بلکہ اس کی ذات سے اعراض کر کے غائب کا صیغہ استعمال فرماتے۔اسی طرح کا ایک جملہ "خاک آلود ہو اس کی ناک" آتا ہے، جو اسی معنی اور اسی محل میں استعمال ہوتا تھا، تاہم واضح رہے کہ دونوں جملے ذو معنیین (دو متضاد معنوں کے محتمل) ہیں جس طرح ان جملوں کو بددعا پر محمول کر کے ذلت خواری اور نگوساری سے کنایہ کہا جاسکتا ہے اسی طرح ان دونوں جملوں کو دعا پر محمول کر کے عبادت و سجدہ ریزی سے کنایہ بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ عبادت اور سجدہ کرنے والے کی پیشانی اور ناک کو خاک لگتی ہے، اس صورت میں ان جملوں کا مفہوم یہ ہوگا کہ سجد اللہ وجھک (اللہ تعالیٰ تیرے چہرے کو اپنے حضور سجدہ ریز کرے۔

اپنے دشمنوں کے حق میں بھی بددعا نہیں فرماتے تھے

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ادْعُ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ قَالَ اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَاِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! (اپنے دشمن) کافروں کے حق میں بددعا فرمایئے، تاکہ وہ ہلاک ہوں اور ان کی جڑ اکھڑ جائے) تو فرمایا! "مجھ کو لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے، بلکہ مجھ کو تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔" (مسلم)

تشریح: "مجھ کو تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔" کے ذریعہ آپ ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ میں سارے جہاں کے لئے رحمت کا باعث ہوں، کیا مؤمن اور کیا کافر، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔

"اور آپ ﷺ کو تو سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

اس صورت میں جب کہ سب ہی کے حق میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، کافروں کے حق میں بددعا کیسے کر سکتا ہوں خواہ وہ میرے کیسے ہی دشمن کیوں نہ ہوں۔

اہل ایمان کے حق میں آنحضرت ﷺ کا باعث رحمت ہونا تو ظاہر ہی ہے، رہی کافروں کی بات، تو ان کے حق میں آپ ﷺ کا باعث رحمت ہونا اس اعتبار سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے دین اور اس کے رسول کی سخت نافرمانی، سرکشی اور دشمنی کے باوجود محض آنحضرت ﷺ کے بابرکت وجود کے باعث ان پر سے دنیا کا عذاب اٹھالیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ۔

"اس حالت میں کہ آپ ان کے درمیان موجود ہیں اللہ تعالیٰ ان پر (دنیا میں) عذاب نازل نہیں کرے گا۔"

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی اس برکت کو حیات مبارکہ تک ہی محدود نہیں رکھا، ہمیشہ کے لئے اس برکت کو باقی رکھا اور طے فرمادیا کہ کلی استیصال کا عذاب قیامت تک نازل نہیں ہوگا، جب کہ کتنی ہی گذشتہ امتیں اپنے پیغمبروں کی بددعا کی وجہ سے کلیۃً نیست ونابود کردی گئیں اور ان کا معمولی سا وجود بھی باقی نہیں رہا۔

طیبیؒ لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ کسی کو اللہ کی رحمت سے دور کروں بلکہ اس دنیا میں میری بعثت کا مقصد یہی ہے کہ میں اللہ کی نازل کردہ ہدایت، اپنی تعلیمات اور اپنے اخلاق کی طاقت سے لوگوں کو اللہ اور اس کی رحمت کے قریب کروں، ایسی صورت میں جب کہ کسی کے حق میں بددعا کرنا یا کسی پر لعنت بھیجنا میری شان سے بعید اور میرے حال کے غیر مناسب ہے تو میں ان کافروں کے حق میں بھی کیسے بددعا کروں اور کس طرح ان پر لعنت بھیجوں۔

آنحضرت ﷺ کی شرم وحیا

⑬ وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِىِّ قَالَ كَانَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِىْ خِدْرِهَا فَاِذَا رَاٰى شَيْئًا يَكْرَهُهٗ عَرَفْنَاهُ فِىْ وَجْهِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ پردہ میں رہنے والی کنواری لڑکی سے بھی زیادہ باحیا تھے، جب کوئی خلاف مزاج بات (طبعی طور پر غیر پسندیدہ یا غیر شرعی ہونے کی وجہ سے) پیش آجاتی تو ہم آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے آپ ﷺ کی ناگواری کو محسوس کرلیتے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "خدر" پردہ کو کہتے ہیں۔ "پردہ میں رہنے والی کنواری لڑکی۔" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ جتنی زیادہ شرم وحیا اس کنواری لڑکی میں ہوتی ہے جو پردہ میں رہتی ہے اور گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی اتنی اس کنواری لڑکی میں نہیں ہوتی جو بے پردہ ہوتی ہے اور گھر سے باہر پھرتی ہے۔

حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کے سامنے کوئی ایسی بات پیش آتی جو طبعی طور پر غیر پسندیدہ یا غیر شرعی ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے مزاج کے خلاف ہوتی تو اس کی ناگواری کے اثر سے چہرہ مبارک فوراً متغیر ہوجاتا اور ہم اس تغیر سے آپ ﷺ کی ناگواری کو محسوس کرکے اس کے دفعیہ کی کوشش کرتے، چنانچہ آپ ﷺ کے چہرے سے ناگواری کے اثرات ختم ہو جاتے تھے اور یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ آپ ﷺ بالکل غصہ نہیں ہوئے تھے لیکن یہ اس صورت میں ہوتا تھا جب اس خلاف مزاج بات کا تعلق کسی طبعی امر سے ہوتا یا کسی ایسے شرعی امر سے ہوتا جس کا ارتکاب حرام وناجائز نہیں بلکہ مکروہ ہوتا۔

نوویؒ نے یہ مطلب لکھا ہے کہ جو خلاف مزاج بات پیش آتی غلبۂ حیا سے آپ ﷺ اس کے خلاف ناگواری کا اظہار زبان سے نہ کرتے بلکہ اس کے اثرات آپ ﷺ کے چہرے پر ظاہر ہوجاتے تھے، چنانچہ صحابہؓ آپ ﷺ کے چہرے کے تغیر سے آپ کی ناگواری اور ناراضگی کو محسوس کرلیتے تھے۔

اس حدیث سے نہ صرف یہ کہ شرم وحیا کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے بلکہ یہ سبق ملتا ہے کہ اس وصف کو اپنے اندر زیادہ سے زیادہ پیدا کرنا چاہئے تاوقتیکہ اس کی وجہ سے کسی شرعی وانسانی فریضہ کی ادائیگی میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اور کسی طرح کا کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

منہ کھول کر نہیں ہنستے تھے

⑭ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَارَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَجْمِعًا قَطُّ ضَاحِكًا حَتّٰى اَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ وَاِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو کبھی اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ کا سارا منہ کھل گیا ہو اور مجھے آپ ﷺ کے حلق کا کوا نظر آیا ہو، آپ ﷺ کی ہنسی بس مسکراہٹ تک محدود رہتی تھی۔" (بخاری)

تشریح: مطلب یہ کہ جس طرح دوسرے لوگ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنستے ہیں اور اس وقت ان کا پورا منہ اتنا زیادہ کھل جاتا ہے کہ اندر کے مسوڑھے، تالو اور حلق کا کوا تک نظر آجاتا ہے، اس طرح آنحضرت ﷺ کبھی نہیں ہنسے، اکثر کسی خوشی و مسرت کی بات پر آپ مسکرادینے ہی پر اکتفا فرماتے تھے۔ کبھی کبھی ہلکی ہنسی بھی ہنس لیتے تھے، اس کی تفصیل پیچھے اس موضوع سے متعلق باب میں گذر چکی ہے۔

حضور ﷺ کی گفتگو کا بہترین انداز

⑮ وَعَنْهَا قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ يَسْرُدُ الْحَدِيْثَ كَسَرْدِكُمْ كَانَ يُحَدِّثُ حَدِيْثًا لَوْ عَدَّهُ الْعَادُّ لَاَحْصَاهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ تیز تیز اور مسلسل بات نہیں کرتے تھے جس طرح تم لوگ مسلسل بولے چلے جاتے ہو، آپ ﷺ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے کہ اگر کوئی گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔" (بخاری)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ گفتگو کا انداز اور بولنے کا طرز نہایت عام فہم اور دلکش اور باوقار تھا نہایت مہذب و عقلمند اور سنجیدہ لوگوں کی طرح آپ ﷺ بھی ٹھہر ٹھہر کر، ایک ایک جملہ کو الگ الگ کر کے بڑے باوقار لہجہ میں گفتگو کرتے تھے، اگر کوئی چاہتا کہ آپ ﷺ کے الفاظ اور جملوں کو گن لے تو یقیناً گن سکتا تھا، آپ ﷺ کی گفتگو کا انداز وہ بالکل نہیں تھا جو عام لوگوں کا ہوتا ہے کہ جب بات کرتے ہیں تو زبان مسلسل اور تیزی کے ساتھ چلتی رہتی ہے، اس تیزی و روانی میں نہ جملوں کی ترتیب موزوں ہوتی ہے اور نہ الفاظ کی ادائیگی صاف ہوتی ہے جس سے مخاطب کو بات سمجھنے میں دقت اور اشتباہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

گھر کے کام خود کرتے تھے

⑯ وَعَنِ الْاَسْوَدِ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ مَاكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصْنَعُ فِيْ بَيْتِهٖ قَالَتْ كَانَ يَكُوْنُ فِيْ مِهْنَةِ اَهْلِهٖ تَعْنِيْ خِدْمَةَ اَهْلِهٖ فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ خَرَجَ اِلَى الصَّلٰوةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت اسودؒ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ گھر میں کیا کیا کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا: آنحضرت ﷺ اپنے گھر میں خانگی کام کرتے رہتے تھے، اور جب نماز کا وقت آتا تو نماز کے لئے چلے جاتے تھے (اس وقت سارا کام کاج چھوڑ دیتے تھے، اور گھر والوں سے کوئی مطلب نہیں رکھتے تھے۔" (بخاری)

تشریح: مَهْنَةٌ یا مِهْنَةٌ کے معنی ہیں خدمت کرنا اور کام کاج میں لگے رہنا۔ چنانچہ خود حضرت عائشہؓ نے بھی اس لفظ کی یہی وضاحت فرمائی کہ اس سے مراد گھر والوں کی خدمت کرنا اور خانگی کام کاج میں لگے رہنا ہے جیسے بکری کا دودھ دوہنا، جوتی کا مرمت کرنا اور کپڑوں میں پیوند لگانا وغیرہ وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ گھر اور گھر والوں کی خدمت اور کام کاج میں لگے رہنا، انبیاء کی سُنّت اور صالحین کے طور طریقوں میں سے ہے۔

حدیث کے راوی حضرت اسود جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، انہوں نے نبوت کا زمانہ پایا، خلفاء اربعہؓ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور اکابر صحابہؓ سے سماعت حدیث کا شرف حاصل کیا، بڑے عابد وزاہد، نیک متقی اور اعلی اوصاف کے حامل تھے، ان کو ۸۰ حج و عمرے ادا کرنے کی سعادت ملی۔ آخر وقت تک ہمیشہ روزے رکھتے رہے اور ہر رات دو قرآن شریف ختم کرتے تھے، اونچے درجہ کے فقیہہ تھے اور بہت زیادہ روایتیں نقل کرتے ہیں۔

کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے

(۱۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَاخُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَمْرَيْنِ قَطُّ اِلاَّ اَخَذَ اَيْسَرَ هُمَا مَالَمْ يَكُنْ اِثْمًا فَاِنْ كَانَ اِثْمًا كَانَ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهٖ فِيْ شَيْءٍ قَطُّ اِلاَّ اَنْ يُّنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللّٰهِ فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ بِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو جب بھی دو کاموں میں سے کسی ایک کام کو چن لینے کا اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ہمیشہ اسی کام کو چنتے جو ہلکا اور آسان ہوتا، بشرطیکہ وہ گناہ کا موجب نہ ہوتا، اگر وہ (ہلکا اور آسان) کام گناہ کا موجب ہوتا تو آپ اس سے سب سے دور رہنے والے شخص ہوتے۔ اور آنحضرت ﷺ اپنی ذات کے لئے کبھی کسی بات کا انتقام نہیں لیتے تھے، ہاں اگر کوئی ایسی بات ہوتی جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے تو پھر آپ ﷺ اللہ تعالیٰ (کے حکم) کے پیش نظر اس کی سزا دیتے تھے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس حدیث کی وضاحت میں علماء اور شارحین نے لکھا ہے کہ اختیار دینے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بھی ہو سکتا ہے اور لوگوں سے بھی۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار ملنا مراد ہو تو اس صورت میں یہ اشکال پیدا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کا معصوم عن الخطا ہونا نص سے ثابت ہے اور کسی گناہ کی طرف آپ ﷺ کی نسبت ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو ایسی دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز پسند کر لینے کا اختیار کیسے دیا جاسکتا تھا جس میں سے کوئی بھی ایک چیز گناہ کا موجب ہوتی؟ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ "بشرطیکہ اس میں گناہ کی کوئی بات ہوتی۔" میں گناہ سے مراد وہ چیز ہے جو بذات خود تو گناہ کی نہ ہو لیکن وہ کسی بھی درجہ میں گناہ تک پہنچانے کا احتمال رکھتی ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو اختیار دیا تھا کہ دنیاوی زندگی گذارنے کے لئے چاہے دنیا کے خزانے لے لیں جو آپ ﷺ کو دے دیئے جائیں گے، چاہے بقدر ضرورت وحاجت روزی پر قناعت کریں، ان دونوں میں سے دوسری چیز کو آپ ﷺ نے اختیار فرمایا، اور پہلی چیز کو آپ ﷺ نے اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ اگر دنیاوی مال ودولت کے خزانے بذات خود کوئی گناہ کی چیز نہیں لیکن اس بات کا احتمال ضرور ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کے کاروبار اور معاملات میں اس طرح مشغول و مصروف ہو جائے کہ عبادت اور دینی امور کی طرف ضروری توجہ بھی نہ دے سکے پس اس حدیث کا اطلاق اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار ملنے پر کیا جائے تو یہ بات ضرور ملحوظ رکھی جائے کہ "گناہ" سے مراد واقعی گناہ نہیں ہے بلکہ وہ چیز مراد ہے جو گناہ کے احتمال کو ظاہر کرنے والی ہو اور ایسی چیز بذات خود گناہ میں شمار نہیں ہوتی۔ لوگوں کی طرف سے اختیار ملنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کافروں کی طرف سے اختیار ملنا مراد ہو، اس صورت میں بالکل ظاہر ہے کہ ان دو چیزوں میں سے ایک چیز گناہ کا موجب ضرور ہوتی ہوگی، اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے اختیار ملنا مراد ہو تو اس صورت میں گناہ سے مراد وہ چیز ہوگی جو گناہ کا باعث بنتی ہو جیسے مجاہدہ اور اقتصاد کے درمیان اختیار ملنا، ظاہر ہے کہ مجاہدہ اگرچہ گناہ کی چیز نہیں ہے لیکن اگر مجاہدہ میں اتنی زیادتی اور شدت اختیار کی جائے جو ہلاکت کو پہنچا دے تو مجاہدہ ناجائز ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار ملنے کی ایک صورت وہ بھی مراد ہو سکتی ہے جس کا تعلق آپ کی ذات سے نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے واسطہ سے دوسروں کی ذات سے ہو مثلاً اگر اختیار دیا جاتا کہ آپ اپنی اُمت کے حق میں فلاں گناہ کی ان دو سزاؤں میں سے کسی ایک سزا کو

پسند کر لیجئے تو آپ اس سزا کو پسند کرتے جو ہلکی ہوتی، یا اگر یہ کہا جاتا کہ آپ ﷺ اپنی اُمت کے حق میں ان دو چیزوں میں سے اس چیز کو پسند فرماتے جو سزا کا مستوجب کرنے والی نہ ہوتی، یا مثلاً آپ ﷺ کو اختیار دیا گیا تھا کہ جو کفار آپ ﷺ کے زیر تسلط آئیں ان کو چاہے قتل کر دیجئے چاہے ان پر جزیہ عائد کر کے ان کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کیجئے آپ ﷺ نے جزیہ کی صورت پسند فرمائی، اور یا آپ ﷺ کو خدا کے حق میں اختیار دیا گیا تھا کہ اس کی عبادت میں چاہے مجاہدہ کو پسند کر لیں، چاہے اقتصاد کو، آپ ﷺ نے اقتصاد کو پسند فرمایا۔

"اپنی ذات کے لئے کبھی کسی بات کا انتقام نہیں لیتے تھے۔" کے بارے میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے! اس کی مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی کسی غلطی یا جرم کی سزا اپنی ذات کا انتقام لینے یا اپنی طبعی خواہش کی تکمیل کے لئے نہیں دیتے تھے۔ اس وضاحت سے آپ ﷺ کے اس عمل پر کوئی اشکال پیدا نہیں ہو گا کہ آپ ﷺ نے ایسے کئی لوگوں کو قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا جنہوں نے آپ ﷺ کو سخت ایذائیں پہنچائی تھیں۔ ان لوگوں کے قتل کا حکم اس جرم کی سزا دینے کے لئے تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی باتوں کا ارتکاب کیا تھا اور اسلام دشمنی میں حد سے بڑھ جانے کے سبب اللہ کی طرف سے سزا کے مستوجب بن چکے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی کو نہیں مارا۔

(۱۸) وَعَنْهَا قَالَتْ مَاضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَطُّ بِيَدِهٖ وَلَا امْرَأَةً وَلَا خَادِمًا اِلَّا اَنْ يُّجَاهِدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَانِيْلَ مِنْهُ شَيْءٌ قَطُّ فَيَنْتَقِمَ مِنْ صَاحِبِهٖ اِلَّا اَنْ يُّنْتَهَكَ شَيْءٌ مِّنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کبھی کسی چیز (یعنی کسی آدمی) کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، عورت اور خادم کو بھی نہیں، علاوہ اس صورت کے جب آپ ﷺ خدا کی راہ میں جہاد کرتے تھے، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ (کسی شخص کی طرف سے) آپ ﷺ کو کوئی اذیت و تکلیف پہنچی ہو اور آپ ﷺ نے اذیت و تکلیف پہنچانے والے سے انتقام لیا ہو، ہاں اگر خدا کی حرام کی ہوئی کسی چیز کا ارتکاب کیا جاتا تو آپ اللہ (کے حکم کی تعمیل) کے لئے اس کی سزا دیتے تھے۔" (مسلم)

تشریح: ترجمہ میں بین القوسین "آدمی" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ بعض موقعوں پر سواری کے جانور کو مارنا منقول ہے۔ "خادم" کا اطلاق مرد و عورت دونوں صنف کے خادم پر ہوتا ہے! نیز اس ارشاد گرامی میں خادم اور عورت کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا گیا ہے کہ عام طور پر ان دونوں کو "کمزور جان کر زیادہ مارا اور ستایا جاتا ہے اور چونکہ مرد کا عام زندگی میں انہیں دونوں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے، نجی اور خانگی معاملات کا بیشتر انحصار انہی پر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی طرف سے غصہ اور ناراضگی کے مواقع زیادہ آتے رہتے ہیں، اس لئے ان دونوں کو خاص طور پر ذکر کر کے اس طرف اشارہ فرمایا گیا کہ اس باب میں ان دونوں کو غیر اہم نہ جانا جائے، ایسا نہیں ہے کہ ان دونوں کی کمزوری اور لاچاری کا فائدہ اٹھا کر ان کے ساتھ کوئی بھی سلوک روا رکھا جا سکتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر ان کو مارا پیٹا جا سکتا ہے اگرچہ بعض حالات میں اور کچھ شرائط کے ساتھ ان کو تھوڑا بہت مار دینا جائز ہے، لیکن ان حالات میں مارنے سے اجتناب کرنا ہی اولیٰ قرار پاتا ہے۔ اس پر اولاد کو مارنے کے مسئلہ کو قیاس نہ کرنا چاہئے کیونکہ ان کی تادیب سب سے مقدم ہے اور اس سلسلہ میں کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کو مارنا اس کی اصلاح کے لئے ہوتا ہے جب کہ ان دونوں کو مارنے کا تعلق زیادہ تر نفس کے غلط تقاضے سے ہوتا ہے، صحیح تربیت اور تادیب کے پیش نظر اولاد کی غلطی پر اس کو مارنا اولیٰ ہے اور نفس کے تقاضے اور غصہ پر قابو رکھنے کے لئے ان دونوں (خادم اور عورتوں) کے تئیں عفو و درگذر کا معاملہ اولیٰ قرار پایا۔

"علاوہ اس صورت کے جب آپ ﷺ خدا کی راہ میں جہاد کرتے تھے۔" خدا کی راہ میں جہاد خدا کے دشمنوں سے ہوتا ہے، اس لئے اس وقت آنحضرت ﷺ کسی کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ نہیں کرتے تھے، چنانچہ غزوۂ احد میں ایک دشمن خدا ابی ابن خلف کو

آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ نیز یہاں "خدا کی راہ میں جہاد" کا اطلاق صرف خدا کے دشمنوں کو مارنے ہی پر نہیں بلکہ حدود و تعزیرات (شرعی و دینی سزاؤں کے نفاذ) کی صورتیں بھی مراد ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

خدام کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا برتاؤ

(۱۹) عَنْ اَنَسٍ قَالَ خَدَمْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا ابْنُ ثَمَانِ سِنِیْنَ خَدَمْتُہٗ عَشْرَ سِنِیْنَ فَمَا لاَمَنِیْ عَلٰی شَیْءٍ قَطُّ اُتِیَ فِیْہِ عَلٰی یَدَیَّ فَاِنْ لاَمَنِیْ لاَئِمٌ مِنْ اَھْلِہٖ قَالَ دَعُوْہُ فَاِنَّہٗ لَوْ قُضِیَ شَیْءٌ کَانَ ھٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِیْحِ وَرَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ مَعَ تَغَیُّرٍ یَسِیْرٍ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب مجھ کو رسول کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو میری عمر آٹھ سال کی تھی، اس وقت سے مسلسل دس سال تک میں آپ ﷺ کی خدمت کے فرائض انجام دیتا رہا (جو مدینہ میں آپ ﷺ کی کل مدت قیام ہے) اس پورے عرصہ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میرے ہاتھ سے کوئی چیز ضائع ہوگئی ہو اور آپ ﷺ نے مجھ کو ملامت کی ہو، اگر آنحضرت ﷺ کے اہل بیت میں سے کوئی شخص (کسی چیز کے ضائع ہو جانے پر) مجھ کو ملامت کرتا تو آپ ﷺ فرماتے جانے دو، اس کو ملامت نہ کرو، حقیقت یہ ہے کہ جو بات ہونے والی ہوتی ہے ضرور ہو کر رہتی ہے۔" روایت کے یہ الفاظ مصابیح کے ہیں اور بیہقی نے بھی اس روایت کو کچھ الفاظ کے تغیر و تبدل کے ساتھ شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "جو بات ہونے والی ہوتی ہے........ الخ" کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی چیز کا ٹوٹنا پھوٹنا اور تلف ہونا قضا و قدر الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا ظاہری سبب کچھ ہو لہٰذا اگر کوئی شخص کسی چیز کے ضائع ہو جانے کا ظاہری سبب بنا ہے تو اس کو ملامت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر لونڈی و خادمہ کے ہاتھ سے کوئی برتن ٹوٹ جائے تو اس کو مارو نہیں کیونکہ ہر چیز کے لئے فنا ہے اور اس کے باقی رہنے کی ایک مدت مقرر ہے۔"

آنحضرت ﷺ کے اوصاف حمیدہ

(۲۰) وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ لَمْ یَکُنْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَلاَ مُتَفَحِّشًا وَلاَ سَخَّابًا فِی الْاَسْوَاقِ وَلاَ یَجْزِیْ بِالسَّیِّئَۃِ السَّیِّئَۃَ وَلٰکِنْ یَعْفُوْ وَیَصْفَحُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں: رسول کریم ﷺ نہ تو خلقی و طبعی طور پر فحش گو تھے اور نہ قصداً فحش گوئی کرتے تھے۔ (گویا کسی بھی طرح اور کسی بھی حالت میں آپ ﷺ سے فحش گوئی کا صدور نہیں ہوتا تھا) اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے تھے (جیسا کہ عام لوگوں کی عادت ہوتی ہے) اور نہ آپ ﷺ برائی کا بدلہ برائی سے لیتے تھے، بلکہ (برائی کرنے والے کو دل سے) معاف کر دیتے تھے اور (ظاہر میں بھی) اس سے عفو و درگذر کا معاملہ کرتے تھے (اور اس طرح آپ ﷺ حق تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کرتے تھے: (فَاعْفُ عَنْھُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔)" (ترمذی)

حضور ﷺ میں تواضع وانکساری

(۲۱) وَعَنْ اَنَسٍ یُحَدِّثُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّہٗ کَانَ یَعُوْدُ الْمَرِیْضَ وَیَتْبَعُ الْجَنَازَۃَ وَیُجِیْبُ دَعْوَۃَ الْمَمْلُوْکِ وَیَرْکَبُ الْحِمَارَ وَلَقَدْ رَاَیْتُہٗ یَوْمَ خَیْبَرَ عَلٰی حِمَارٍ خِطَامُہٗ لِیْفٌ رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ

الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ نے (ایک موقع پر) نبی کریم ﷺ کے متعلق (بہترین اخلاق وعادات کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کیا کہ: "آپ ﷺ بیمار کی عیادت کرتے، جنازہ کے ساتھ جاتے، مملوک وغلام کی دعوت قبول فرمالیتے اور گدھے پر سوار ہونے میں بھی کوئی تکلف نہیں فرماتے تھے، چنانچہ غزوۂ خیبر کے دن میں نے آپ ﷺ کو ایک گدھے پر سوار دیکھا جس کی باگ کھجور کے پوست کی تھی۔" اس روایت کو ابن ماجہؒ نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "مملوک" سے مراد وہ غلام ہے جو اپنے مالک کی اجازت سے آپ ﷺ کی دعوت کرتا تھا، اس سے ثابت ہوا کہ جب آنحضرت ﷺ کسی غلام کی دعوت وضیافت کو رد کرنا گوارہ نہیں کرتے تھے تو کسی آزاد وخود مختار شخص کی دعوت کو تو بدرجہ اولی رد نہیں کرتے ہوں گے۔

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے جن اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب آپ ﷺ کی کسر نفسی، تواضع، کسی فرق وامتیاز کے بغیر تمام انسانوں سے آپ ﷺ کی محبت وشفقت اور اپنی بڑائی کے اظہار اور غرور وتکبر سے کلیۃً اجتناب پر دلالت کرتے ہیں! وقت ضرورت گدھے پر سوار ہونے سے بھی گریز نہ کرنا اور خصوصاً غزوۂ خیبر کے دن، جو شوکت وسطوت کے اظہار کا دن تھا، گدھے پر سوار ہونا اس بات کی علامت ہے کہ نہ آپ ﷺ میں بادشاہوں اور دنیادار بڑے لوگوں جیسی خوبو تھی اور نہ آپ ﷺ علوئے نفس کے جذبہ سے تکلفات اور ظاہرداری اختیار کرنا گوارہ کرتے تھے۔

اپنا جوتا خود گانٹھ لیتے تھے

(۲۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْصِفُ نَعْلَهُ وَيَخِيْطُ ثَوْبَهُ وَيَعْمَلُ فِيْ بَيْتِهِ كَمَا يَعْمَلُ اَحَدُكُمْ فِيْ بَيْتِهِ وَقَالَتْ كَانَ بَشَرًا مِنَ الْبَشَرِ يَفْلِيْ ثَوْبَهُ وَيَحْلُبُ شَاتَهُ وَيَخْدُمُ نَفْسَهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنی جوتیاں خود گانٹھ لیتے تھے، اپنا (نیا یا پرانا) کپڑا خود سی لیتے تھے اور اپنے گھر کا کام کاج اسی طرح کرتے تھے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے گھر میں کام کاج کرتا ہے۔" اور حضرت عائشہؓ نے مزید فرمایا: "آنحضرت ایک ایسے ہی انسان تھے جیسے دوسرے انسان ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ اپنے کپڑے کی جوئیں خود دیکھتے تھے، اپنی بکری کا دودھ خود دوہتے تھے اور اپنی خدمت آپ ﷺ کر لیتے تھے (یعنی اپنا ذاتی کام خود ہی کر لیا کرتے تھے کسی دوسرے سے کرنے کے لئے کم ہی کہا کرتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اپنے کپڑے کی جوئیں خود دیکھتے تھے۔" سے مراد یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنے کپڑوں کو خود دیکھا کرتے تھے کہ کہیں ان میں جوئیں تو نہیں پڑ گئی ہیں۔ پس یہ بات اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں آیا ہے کہ جوئیں آپ ﷺ کو پریشان نہیں کرتی تھیں! نیز مواہب لدنیہ میں ہے کہ آپ ﷺ کے کپڑوں یا بدن مبارک کے کسی حصہ میں کبھی کوئی جوں نہیں پڑی۔ اسی طرح امام فخر الدین رازیؒ نے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بدن مبارک پر کبھی کوئی مکھی نہیں بیٹھی اور نہ کبھی مچھر وغیرہ نے آپ ﷺ کو پریشان کیا۔

آنحضرت ﷺ ایسے ہی ایک انسان تھے...... الخ۔" اس جملہ کے بارے میں طیبیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے یہ بات بطور تمہید فرمائی جس کا مقصد آگے کہی جانے والی بات کے پس منظر کو ظاہر کرنا تھا۔ دراصل حضرت عائشہؓ نے جب دیکھا اور سنا کہ کفار ومشرکین یہ کہتے ہیں کہ اگر محمد ﷺ اللہ کے نبی اور رسول ہوتے تو وہ اپنا رہن سہن اور طور طریقہ عام لوگوں کی طرح نہ رکھتے، گویا ان کفار کے نزدیک خدا کے رسول کو اس بادشاہ اور سردار کی طرح اپنی زندگی گذارنی چاہئے تھی جو عام لوگوں کے رہن سہن اور طور طریقوں سے اجتناب کرتا ہے، شان وشوکت کے ساتھ رہتا ہے، اپنی بڑائی اور دبدبہ کو ظاہر کرتا ہے۔ کفار کی اس بات کو قرآن نے بھی ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔

"اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ عام لوگوں کی طرح کھانا کھاتا ہے، اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔"

پس حضرت عائشہؓ نے کفار کے اس خیال اور قول کی تردید میں فرمایا کہ آنحضرت ﷺ اللہ کی مخلوقات ہی میں سے ایک مخلوق تھے اور اسی طرح ایک انسان تھے جیسے اولاد آدم میں سے دوسرے انسان ہیں۔ اگر دوسرے انسانوں اور آپ ﷺ میں کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنی رسالت و نبوت کے منصب عظمیٰ سے سرفراز فرمایا، آپ ﷺ کو انسانیت کے اعلیٰ ترین قدروں سے مزین کیا اور آپ ﷺ کو اخلاق و اطوار کی وہ خوبیاں عطا فرمائیں جن سے آپ ﷺ کی ذات آدمیت کے شرف و امتیاز کا مظہر اور نمونہ قرار پائی، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔

"آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں بس فرق یہ ہے کہ) مجھ پر وحی آتی ہے۔"

چنانچہ ذاتی عظمت اور اخلاق انسانی کی بلندی کی اس سے بڑی مثال اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ آپ ﷺ شرف و مرتبت کے سب سے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود ایک عام انسان جیسی زندگی گذارتے تھے اور خدا کے عام بندوں کی طرح نہایت سادگی اور جفاکشی کے ساتھ رہتے تھے، ایک طرف آپ ﷺ روحانی طور پر عرش کی بلندیوں تک رسائی رکھتے تھے، دوسری طرف جسمانی طور پر خاک نشینوں کی سی کسر نفسی رکھتے تھے، عام لوگوں کے ساتھ خلط ملط، ان جیسا رہن سہن، ان جیسی محنت و مشقت اور ان کے ساتھ ہمدردی و غمگساری اور امداد و معاونت آپ ﷺ کی بلند اخلاقی کا پرتو بھی تھا اور آپ ﷺ کے اس عمل و کردار میں دوسرے لوگوں کے لئے یہ تعلیم و تلقین بھی تھی کہ تواضع و انکساری کو انسانی کردار کی بلندی سمجھا جائے اور اللہ تعالیٰ کے پیغام اور اس کی ہدایت کو اس کی مخلوق تک پہنچانے کی ذمہ داری کو ایک ایسا منصب جانا جائے، جس کے فرائض کی انجام دہی عوامی رابطہ کے بغیر ممکن نہیں اور عوامی رابطہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اپنے نفس کو خود بینی و خود پسندی کے جال سے نکال کر اور ظاہر شان و شوکت سے اجتناب کر کے خود کو ایک عام انسان کی صورت میں پیش کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ کا عوامی تعلق

(۲۳) وَعَنْ خَارِجَةَ بْنِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ دَخَلَ نَفَرٌ عَلٰى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَقَالُوْا لَهٗ حَدِّثْنَا اَحَادِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ جَارَهٗ فَكَانَ اِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ بَعَثَ اِلَيَّ فَكَتَبْتُهٗ لَهٗ فَكَانَ اِذَا ذَكَرْنَا الدُّنْيَا ذَكَرَهَا مَعَنَا وَاِذَا ذَكَرْنَا الْاٰخِرَةَ ذَكَرَهَا مَعَنَا وَاِذَا ذَكَرْنَا الطَّعَامَ ذَكَرَهٗ مَعَنَا فَكُلُّ هٰذَا اُحَدِّثُكُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت خارجہ ابن زید ابن ثابت کہتے ہیں کہ (ایک دن) کچھ لوگوں کی جماعت (میرے والد محترم، حضرت زید ابن ثابتؓ کے پاس آئی اور ان سے کہا کہ ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ کی (وہ) حدیثیں بیان کیجئے (جو آنحضرت ﷺ کی خوش خلقی اور عام لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کے بہترین اور خوشگوار تعلقات کو ظاہر کریں) حضرت زیدؓ نے کہا "میں آنحضرت ﷺ کے بالکل پڑوس میں رہا کرتا تھا، جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ ذرا مجھے بلا بھیجتے، میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ ﷺ کے حکم سے وحی لکھتا۔ آنحضرت ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب ہم دنیا (کی خرابیوں یا دنیا کے مزرعۃ الآخرۃ ہونے کے اعتبار سے اس کی خوبیوں) کا ذکر کرتے تو آنحضرت ﷺ بھی ہمارے ساتھ اس دنیاوی ذکر میں شامل ہو جاتے، جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ ﷺ بھی ہمارے

ساتھ آخرت کا ذکر کرتے، اور جب ہم کھانے پینے کا ذکر کرتے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے۔ یہ تمام باتیں میں تم لوگوں کو رسول کریم ﷺ کی بتا رہا ہوں۔" (ترمذی)

تشریح: میں آنحضرت ﷺ کے بالکل پڑوس میں رہا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔الخ" اس جملہ کے ذریعہ حضرت زیدؓ نے اس طرف اشارہ کیا کہ مجھے روحانی اور جسمانی دونوں طور پر بہت زیادہ قربت حاصل تھی، اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ کی خانگی اور سماجی زندگی کی تفصیل اور آپ ﷺ کے روزمرہ کے معاملات و حالات کا علم دوسروں کی بہ نسبت مجھے بہت زیادہ ہے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اور عوام کے درمیان بڑا گہرا سماجی رابطہ تھا، اور آپ ﷺ اپنے صحابہ اور لوگوں کے ساتھ نہایت خوشگوار اور بے تکلفانہ معاشرتی تعلقات رکھتے تھے، آپ ﷺ ان کی سماجی گفت و شنید، علمی بحث و مباحثہ، دینی باتوں کے ذکرو اذکار اور ان دنیاوی معاملات و اخبار میں مساوی طور پر حصہ لیا کرتے تھے جن کا تعلق معاشرہ کے مختلف احوال و کوائف، واقعات و حادثات اور لوگوں کے حقوق و عادات سے ہوتا تھا لیکن یہ گفت و شنید اور ذکرو اذکار اور اس میں آپ ﷺ کی شرکت کا تعلق صرف ان باتوں سے ہوتا تھا جو مذموم و مکروہ نہ ہوتیں، جہاں تک مذموم و مکروہ باتوں کا تعلق ہے تو نہ یہ ہو سکتا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں اور آپ ﷺ کے سامنے ان کا ذکر آئے اور نہ اس ذکرو اذکار میں آپ ﷺ کی شرکت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ پس یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہے کہ:

انہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کان یخزن لسانہ الا فیما یعینہ و ان مجلسہ علم۔

" آنحضرت ﷺ اپنی زبان کو محفوظ (بند) رکھتے تھے علاوہ اس بات کے جو کام کی اور ضروری ہو، یقیناً آپ ﷺ کی مجلس خالص علمی مجلس ہوتی تھی۔"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات دنیاوی معاملات کے ذکرو اذکار سے، بہت سے علمی، معاشرتی معلوماتی، اور ادبی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں، لہٰذا جس مجلس میں کسی بھی ایسے دنیاوی امور سے متعلق گفتگو ہو جن سے مذکورہ فائدے حاصل ہوتے ہوں تو اس مجلس کو علمی مجلس ہی میں شمار کیا جائے گا، اور اگر کسی دنیاوی معاملہ سے متعلق غیر مذہبی بات چیت کے بارے میں یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ وہ مذکورہ فائدوں سے خالی رہی ہو اس صورت میں اس بات چیت اور اس میں آنحضرت ﷺ کی شرکت کو بیان جواز پر محمول کیا جائے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہؓ سے اکثر مباح امور میں بھی بات کر لیا کرتے تھے تاکہ وہ (صحابہؓ) اس کا جواز جان لیں اور بیان جواز کے لئے اس طرح کی بات چیت میں حصہ لینا آنحضرت ﷺ پر واجب بھی تھا۔

یہ تمام باتیں تم لوگوں کو رسول کریم ﷺ کی بتا رہا ہوں" حضرت زیدؓ نے یہ بات حدیث کے صحیح اور مستند ہونے کو اہمیت کے ساتھ ظاہر کرنے اور روایت حدیث کی شرائط کو پورا کرنے کے لئے کہی۔

مصافحہ و مواجہہ اور مجلس میں نشست کا طریقہ

(۲۴) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا صَافَحَ الرَّجُلَ لَمْ يَنْزِعْ يَدَهٗ مِنْ يَدِهٖ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَ الَّذِىْ يَنْزِعُ يَدَهٗ وَلَا يَصْرِفُ وَجْهَهٗ عَنْ وَجْهِهٖ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَ الَّذِىْ يَصْرِفُ وَجْهَهٗ عَنْ وَجْهِهٖ وَلَمْ يُرَ مُقَدِّمًا رُكْبَتَيْهِ بَيْنَ يَدَىْ جَلِيْسٍ لَهٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کسی شخص سے مصافحہ (اور ملاقات) کرتے تو اپنا ہاتھ اس وقت تک علیحدہ نہ کرتے جب تک کہ وہی شخص اپنا ہاتھ علیحدہ نہ کر لیتا اور آپ ﷺ اپنا چہرۂ مبارک اس کے چہرہ کے سامنے سے اس وقت تک نہیں ہٹاتے تھے جب تک کہ وہی شخص اپنا چہرہ آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کے سامنے سے نہ ہٹا لیتا، نیز آنحضرت ﷺ کو کبھی کسی نے اس حال میں نہیں

دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے گھٹنے اپنے ہم نشین کے آگے کر کے بیٹھے ہوں۔" (ترمذی)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے یہ دونوں وصف کہ جب تک مصافحہ کرنے والا خود اپنا ہاتھ علیحدہ نہ کر لیتا آپ ﷺ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے علیحدہ نہ کرتے اور جب تک کہ وہ شخص خود آپ ﷺ کے سامنے سے نہ ہٹ جاتا آپ ﷺ اس کی جانب متوجہ رہتے اور اس کی طرف سے اپنا روئے مبارک نہ ہٹاتے، آپ ﷺ کے علوئے اخلاق، نہایت تحمل و بردباری اور تواضع و انکساری پر دلالت کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کے نزدیک یہ بات بھی آداب مجلس کے خلاف تھی کہ اپنے کو نمایاں، برتر اور بڑا ظاہر کرنے کے لئے مجلس میں اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص سے آگے ہو کر بیٹھیں، چنانچہ جب آپ ﷺ کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو سب کے ساتھ ایک صف میں ہو کر برابر بیٹھتے اور اپنے گھٹنے اور زانو آگے بڑھا کر نہ بیٹھتے جیسے گھمنڈی لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ بعض شارحین نے یہ لکھا ہے کہ اس جملہ سے یہ مراد ہے کہ آپ ﷺ آداب مجلس کی رعایت، مہذب طریقہ پر عمل اور اہل مجلس کی تعظیم کے پیش نظر لوگوں کے سامنے اپنے گھٹنے کھڑے کر کے نہیں بیٹھتے تھے۔ اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ "رکبتین" سے مراد دونوں پاؤں ہیں، اور ان کے آگے بڑھانے سے مراد مجلس میں پاؤں پھیلا کر بیٹھنا ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ آداب مجلس کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی کسی کے سامنے پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ بہرحال اس حدیث میں امت کے لئے یہ تعلیم ہے کہ آنحضرت ﷺ کے طریقہ پر عمل کر کے اپنے ہر مسلمان بھائی کی خاطر داری اور تعظیم و تکریم کرنی چاہئے خواہ وہ مرتبہ میں اپنے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اپنی ذات کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے

(۲۵) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَدَّخِرُ شَيْئًا لِغَدٍ۔ (رواہ الترمذی)

"مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر جو کامل اعتماد اور توکل تھا اور اس کے خزانہ رحمت پر جو پورا بھروسہ تھا اس کے تحت آپ ﷺ نے کبھی کوئی چیز بچا کر اور جمع کر کے نہیں رکھی کہ کل کام آئے گی۔ لیکن یہ بات صرف آنحضرت ﷺ کی ذات خاص کے لئے مخصوص تھی کہ آپ ﷺ اپنی ذات کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے، ورنہ یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ اکثر اپنے اہل و عیال کی خاطر ان کی ایک سال کی اصل ضروریات کے بقدر چیزیں جمع کر کے رکھ دیتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کو ان کے بارے میں یہ خدشہ رہتا تھا کہ شاید یہ لوگ احتیاج کے وقت صبر و تحمل نہ کر سکیں اور انسانی جبلت کے تحت اپنی ضروریات کی طرف سے فکر مند رہیں۔"

آنحضرت ﷺ کی کم گوئی کا ذکر

(۲۶) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَوِيْلَ الصَّمْتِ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ زیادہ تر خاموشی اختیار کئے رہتے تھے۔" اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ کہ کم گوئی آپ ﷺ کا وصف تھا، اگر کوئی ضروری بات کرنی ہوتی تو بولتے ورنہ خاموش رہا کرتے تھے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ:

من کان یومن باللہ والیوم الاخرۃ فلیقل خیرا او لیسکت۔

"جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ یا تو اچھی بات زبان سے نکالے ورنہ خاموش رہے۔"

اور حضرت ابوبکر صدیقؓ فرمایا کرتے تھے:

لیتنی کنت اخرس الا عن ذکر اللہ۔ "کاش میں گونگا ہوتا، بس ذکر اللہ کی حد تک گویائی حاصل ہوتی۔"

حضور ﷺ کی گفتگو کا انداز

(۲۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ فِيْ كَلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرْتِيْلٌ وَّ تَرْسِيْلٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے الفاظ کی ادائیگی میں ترتیل اور ترسیل کا لحاظ ہوتا تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: ترتیل اور ترسیل دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی کسی چیز کو پڑھتے اور بولتے وقت ایک ایک حرف کو علیحدہ علیحدہ کر کے خوب صاف صاف پڑھنا اور بولنا۔ بعض حضرات نے ان دونوں کے معنی میں یہ معمولی فرق بیان کیا ہے کہ ترتیل کے معنی ہیں ہر ایک حرف کو برابر نکالنا اور ترسیل کے معنی ہیں بولنے میں جلدی اور تیزی نہ کرنا بلکہ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں "ترتیل" کا تعلق آنحضرت ﷺ کی تلاوت قرآن کریم سے ہے اور "ترسیل" کا تعلق آپ کی عام بات چیت سے ہے۔

(۲۸) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْرُدُ سَرْدَكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّهٗ كَانَ يَتَكَلَّمُ بِكَلَامٍ بَيِّنَةٍ فَصْلٌ يَحْفَظُهٗ مَنْ جَلَسَ اِلَيْهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ نے بیان کیا: "رسول کریم ﷺ کی گفتگو اس طرح مسلسل اور بے تکان نہیں ہوتی تھی جس طرح تم لوگ مسلسل اور بے تکان بولتے ہو، جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے تو ایک ایک حرف اور جملہ کو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر ادا فرماتے کہ جو شخص آپ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا ہوتا (پوری گفتگو کو) اچھی طرح یاد کر لیتا۔" (ترمذی)

مبارک لبوں پر اکثر مسکراہٹ رہتی تھی

(۲۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ مَا رَاَيْتُ اَحَدًا اَكْثَرَ تَبَسُّمًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن حارث ابن جزءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا۔" (ترمذی)

وحی کا انتظار

(۳۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ يَتَحَدَّثُ يُكْثِرُ اَنْ يَّرْفَعَ طَرْفَهٗ اِلَى السَّمَآءِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب باتیں کرنے بیٹھتے تو آپ ﷺ کی نگاہ اکثر آسمان کی طرف اٹھتی رہتی تھی۔" (ابوداؤد)

تشریح: یعنی آپ ﷺ لوگوں سے گفتگو کے دوران بھی بار بار نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا کرتے تھے اور یہ آپ ﷺ کے اس انتظار کی کیفیت کا اظہار ہوتا جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے اترنے اور وحی آنے کے سلسلہ میں رہتا تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اہل وعیال کے تئیں شفقت و محبت

(۳۱) عَنْ عَمْرِو بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا رَاَيْتُ اَحَدًا كَانَ اَرْحَمَ بِالْعِيَالِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ

اِبْرَاهِيْمُ ابْنُهُ مُسْتَرْضِعًافِي عَوَالِي الْمَدِيْنَةِ فَكَانَ يَنْطَلِقُ وَنَحْنُ مَعَهُ فَيَدْخُلُ الْبَيْتَ وَإِنَّهُ لَيُدَّخَنُ وَكَانَ ظِئْرُهُ قَيْنًا فَيَأْخُذُهُ فَيُقَبِّلُهُ ثُمَّ يَرْجِعُ قَالَ عَمْرٌو فَلَمَّا تُوُفِّيَ اِبْرَاهِيْمُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ ابْنِيْ وَ اِنَّهُ مَاتَ فِي الثَّدْيِ وَاِنَّ لَهُ لَظِئْرَيْنِ تُكَمِّلَانِ رَضَاعَهُ فِي الْجَنَّةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو ابن سعید حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا! "میں نے رسول کریم ﷺ سے زیادہ کسی کو اپنے اہل وعیال پر مہربان اور شفیق نہیں دیکھا۔ آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ (جو ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے) بالائی مدینہ (کے ایک محلہ میں ایک دایہ یعنی دودھ پلانے والی کے یہاں) دودھ پینے کے لئے رکھے گئے تھے، آپ ﷺ اکثر (اپنے بیٹے کو دیکھنے اور ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے) اس محلہ میں جایا کرتے تھے ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے، آپ ﷺ وہاں پہنچ کر (دایہ کے) گھر میں تشریف لے جاتے تھے جہاں دھواں گھٹا ہوتا تھا کیونکہ دایہ کا شوہر لوہار تھا اور ان کی بھٹی کا دھواں گھر میں چاروں طرف بھرا رہتا تھا مگر آپ ﷺ بیٹے کی محبت میں اسی دھوئیں بھرے گھر میں چلے جاتے) پھر ابراہیم رضی اللہ عنہ کو گود میں لیتے، پیار کرتے اور (حال چال معلوم کر کے) اپنے گھر واپس آجاتے۔ حضرت عمرو نے (حضرت انسؓ سے نقل کر کے) بیان کیا کہ جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ابراہیم میرا بیٹا ہے وہ چھاتی میں یعنی شیر خوارگی کی حالت میں اللہ کو پیارا ہوا ہے، اس کے لئے دو دایہ متعین کی گئی ہیں جو جنت میں اس کی مدت شیر خوارگی کو پورا کر رہی ہیں۔" (مسلم)

تشریح: "ظئر" کے معنی دایہ اور انا (کسی بچہ کو دودھ پلانے والی) کے ہیں اور انا کے خاوند کو بھی ظئر کہتے ہیں جس کو اردو میں انگا یا اتکہ کہا جاتا ہے۔ عرب کے قدیم دستور کے مطابق آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم کو، دودھ پلانے کے لئے جن خاتون کی سپردگی میں دیا گیا تھا ان کا نام اُمّ سیف تھا اور ان کے شوہر کا نام ابو سیف تھا جو پیشہ کے اعتبار سے لوہار تھے۔ ابراہیم کا انتقال مدت شیر خوارگی ہی میں ہو گیا تھا، ان کی عمر سولہ مہینے یا سترہ مہینے کی تھی! جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، آنحضرت ﷺ کی برکت اور صاحبزادۂ رسول ہونے کی نسبت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ درجہ عطا کیا کہ نہ صرف بعد وفات ان کو فوراً جنت میں پہنچا دیا گیا بلکہ وفات پاتے ہی ان کے لئے جنت میں دو اناؤں کا بھی انتظام کیا گیا جن کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ وہ ابراہیم کو ان کی شیر خوارگی کی مدت (دو سال) پورے ہونے تک دودھ پلائیں۔

آنحضرت ﷺ کا حسن اخلاق اور ایک یہودی

(۳۶) وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ يَهُوْدِيًا كَانَ يُقَالُ لَهُ فُلَانٌ حَبْرٌ كَانَ لَهُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَنَانِيْرُ فَتَقَاضَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ يَا يَهُوْدِيُّ مَا عِنْدِيْ مَا اُعْطِيْكَ قَالَ فَاِنِّيْ لَا اُفَارِقُكَ يَا مُحَمَّدُ حَتّٰى تُعْطِيَنِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذًا اَجْلِسُ مَعَكَ فَجَلَسَ مَعَهُ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ الْاٰخِرَةَ وَالْغَدَاةَ وَكَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَدَّدُوْنَهُ وَ يَتَوَعَّدُوْنَهُ فَفَطِنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الَّذِيْ يَصْنَعُوْنَ بِهِ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ يَهُوْدِيٌّ يَحْبِسُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنَعَنِيْ رَبِّيْ اَنْ اَظْلِمَ مُعَاهِدًا وَغَيْرَهُ فَلَمَّا تَرَجَّلَ النَّهَارُ قَالَ الْيَهُوْدِيُّ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَشَطْرُ مَالِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمَا وَاللّٰهِ مَا فَعَلْتُ بِكَ الَّذِيْ فَعَلْتُ بِكَ اِلَّا لِاَنْظُرَ اِلٰى نَعْتِكَ فِي التَّوْرٰةِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ مَوْلِدُهُ بِمَكَّةَ وَ مُهَاجَرُهُ بِطِيْبَةَ مُلْكُهُ بِالشَّامِ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ وَلَا سَخَّابٍ فِي الْاَسْوَاقِ وَلَا مُتَزَيٍّ بِالْفُحْشِ وَلَا قَوْلِ الْخَنَا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَهٰذَا مَالِيْ فَاحْكُمْ فِيْهِ بِمَا اَرٰكَ اللّٰهُ وَكَانَ الْيَهُوْدِيُّ كَثِيْرَ الْمَالِ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ (مدینہ میں) فلاں نام کا ایک یہودی عالم تھا اس کے کچھ دینار نبی کریم ﷺ پر چاہئیں تھے (ایک دن) اس یہودی عالم نے آکر نبی کریم ﷺ سے ان دیناروں کا تقاضا کیا، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ، اے یہودی! تمہیں دینے کے لئے اس وقت میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے (یعنی نہ تو میرے پاس دینار ہیں کہ تمہارا قرض چکادوں اور نہ کوئی ایسی چیز ہے جو ان دیناروں کے بدلہ میں تمہیں دے کر تمہارا مطالبہ بے باق کردوں)۔ یہودی نے کہا: "محمد (ﷺ) میں اس وقت تک تمہارے پاس سے نہیں ہٹوں گا جب تک تم میرا قرض ادا نہیں کردو گے۔" رسول کریم ﷺ نے جواب دیا: (اچھا بھائی اگر یہی بات ہے کہ جب تک میں تمہارا قرض ادا نہیں کردوں گا تم مجھے نہیں چھوڑو گے اور میرے پاس سے نہیں جاؤ گے تو پھر) میں تمہارے پاس بیٹھ جاتا ہوں (جب تک تم نہیں کہو گے تمہارے سامنے سے نہیں ہٹوں گا) اور (یہ فرماکر) آپ ﷺ اس کے پاس بیٹھ گئے اور اسی جگہ (یہودی کے سامنے) رسول کریم ﷺ نے ظہر کی عصر کی مغرب، کی عشاء کی اور پھر (اگلی صبح) فجر کی نماز پڑھی، صحابہؓ (یہ صورت حال دیکھ کر سخت طیش میں آرہے تھے اور بار بار) اس یہودی کو ڈرا دھمکا رہے تھے (اور کہہ رہے تھے کہ اگر تو اپنی گستاخی سے باز نہ آیا اور آنحضرت ﷺ کو اس طرح پابند بنائے رکھا تو مجبوراً ہم تجھے یہاں سے اٹھا کر پھینک دیں گے یا قتل کر ڈالیں گے) لیکن جب رسول کریم ﷺ نے یہ دیکھا کہ صحابہؓ اس یہودی کو ڈرا دھمکا رہے ہیں تو آپ ﷺ نے ان کو (سختی سے) منع فرمایا (یا غضبناک نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ کر گویا واضح کیا کہ تمہارا یہ عمل مجھے ہرگز پسند نہیں ہے) صحابہؓ نے (آنحضرت ﷺ کی ناگواری دیکھ کر معذرت کے انداز میں) عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! یہ ایک یہودی ہوکر آپ ﷺ کو پابند بنائے ہوئے ہے اور یہاں بیٹھے رہنے پر مجبور کررہا ہے (ہم اس گستاخانہ حرکت کو کیسے برداشت کریں؟) رسول کریم ﷺ فرمایا!" (کیا تمہیں نہیں معلوم کہ) اللہ تعالیٰ نے مجھے منع کیا ہے کہ میں اس شخص پر ظلم کروں جس سے عہد کیا گیا ہو یا وہ کوئی بھی ہو۔ جب دن نکلا تو وہ یہودی (آنحضرت ﷺ کا کردار و اخلاق دیکھ کر بے ساختہ) بول اٹھا!" میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ (پھر اس نے کہا کہ یارسول اللہ!) میں (قبول اسلام کی توفیق ملنے کے شکرانہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور زیادہ اجر و انعام کی امید میں اپنے مال و زر کا آدھا) حصہ اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ (آپ ﷺ اور یہاں موجود سارے صحابہ) جان لیں کہ خدا کی قسم میں نے اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا اس کا سبب اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ میں آپ ﷺ میں ان اوصاف کو آزمانا چاہتا تھا جس کا ذکر تورات میں موجود ہے (اور تورات میں وہ اوصاف اس طرح مذکور ہیں) کہ ان کا اسم گرامی محمد ﷺ ہوگا، عبداللہ کے بیٹے ہوں گے، ان کی پیدائش مکہ میں ہوگی، وہ مدینہ طیبہ کی طرف، ہجرت کریں گے، ان کی مملکت کی سرحدیں ملک شام (اور اس کے گرد و نواح) تک پھیلی ہوں گی، وہ نہ بدزبان ہوں گے نہ سنگدل، نہ بازاروں میں شور مچانے والے ہوں گے، نہ فحش کی وضع اختیار کرنے والے اور نہ بیہودہ بات بکنے والے ہوں گے اس نے توراۃ میں مذکور یہ باتیں سنانے کے بعد ایک مرتبہ پھر کلمہ شہادت پڑھا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ یقیناً آپ (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ (یارسول اللہ!) یہ میرا مال حاضر ہے آپ (ﷺ) اللہ کے حکم کی روشنی میں اس کے متعلق جو مناسب سمجھیں فیصلہ فرمائیں۔ (راوی کا بیان ہے کہ) وہ یہودی بہت مالدار تھا (اور اللہ نے اس مال کے ساتھ اس کا حال و مآل بھی اچھا کیا) اس روایت کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "......اور پھر فجر کی نماز پڑھی۔" سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے تمام دن ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے گذار دیا اور پوری رات اسی طرح یہودی کے ساتھ بیٹھے رہے، نہ سوئے نہ آرام کیا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مسجد نبوی کے اندر پیش آیا تھا لیکن ایک احتمال یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کسی دوسری جگہ تھے اور وہیں وہ یہودی آگیا، اسی جگہ (خواہ وہ کوئی مکان ہو یا کوئی کھلی ہوئی جگہ) آنحضرت ﷺ اس یہودی کے ساتھ تمام دن اور رات بیٹھے رہ گئے۔

"......یا وہ کوئی بھی ہو" یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے، یعنی آپ ﷺ نے پہلے تو خصوصی طور پر معاہد (جس سے عہد کیا گیا ہو) کا ذکر

کیا کہ یہ یہودی ان ذمیوں میں سے ہے جن کو ہم نے اپنی پناہ اور اپنی حفاظت میں رکھنے کا عہد دیا ہے، اگر میں اس کا قرض واپس کئے بغیر اس سے الگ ہو جاؤں اور اس کے پاس بیٹھنے سے انکار کردوں تو یہ میری طرف سے اس پر ظلم ہوگا اور ظاہر ہے کہ کسی معاہد پر ظلم کرنے سے اللہ تعالیٰ نے مجھ کو منع کیا ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ معاہد ہی کیا، مجھے تو کسی بھی شخص پر ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے خواہ وہ معاہد ہو یا غیر معاہد، مسلم ہو یا غیر مسلم۔ پس اس موقع پر آپ ﷺ نے "تعمیم کے بعد تخصیص" کے بجائے "تخصیص کے بعد تعمیم" کا اسلوب اس لئے اختیار فرمایا کہ یہ موقع اسی اسلوب کا متقاضی تھا، یا آپ ﷺ نے اس بات کو پیش نظر رکھا کہ اگر دنیا میں کسی مسلمان کی حق تلفی ہو یا اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ ہو جائے تو قیامت کے دن اس مسلمان کو تو حق مارنے والے یا ظلم وزیادتی کرنے والے مسلمان کی نیکیاں دے کر راضی کرنا ممکن ہوگا لیکن غیر مسلم ذمی (معاہد) کو اس کا حق مارنے والے یا اس پر ظلم وزیادتی کرنے والے مسلمان کی نیکیاں دے کر بھی راضی کرنا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ نہ تو کسی مسلمان کی نیکیاں اس کو دلوائی جا سکتی ہیں اور نہ وہ نیکیاں اس کے کچھ کام ہی آسکیں گی، اس اعتبار سے قیامت کے دن معاہد کی طرف سے کسی مسلمان کے خلاف ظلم کی فریاد اور اپنے حق کی چارہ جوئی زیادہ سخت مرحلہ ہوگا لہٰذا آنحضرت نے اسی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے پہلے خاص طور پر معاہد کا ذکر کیا اور اس کے بعد عمومی طور پر ہر ایک کا ذکر کیا۔

اس موقع پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آنحضرت اس وقت اس یہودی کا قرض ادا کرنے سے اس درجہ معذور تھے کہ یہودی کی طرف سے عائد کردہ اتنی سخت پابندی آپ ﷺ کو برداشت کرنا پڑی تو کیا وہاں موجود صحابہؓ اس قرض کی ادائیگی پر قادر نہیں تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہی بات رہی ہوگی کہ وہ صحابہؓ بھی آنحضرت ﷺ کے اس قرض کی ادائیگی پر اس وقت قادر نہیں تھے، دوسرے یہ کہ اس یہودی کا جو اصل مقصد تھا یعنی اخلاق وکردار اور ان اوصاف کو آزمانا جن کا ذکر تورات میں اس نے پایا تھا، اس کے پیش نظر وہ صحابہؓ کی طرف سے اس قرض کی ادائیگی پر راضی نہیں ہوا ہوگا۔

"یہ میرا مال حاضر ہے۔" اس نے یہ جملہ مال کی طرف یا اس جگہ کی طرف جہاں اس کا مال تھا، اشارہ کر کے کہا، اور پھر اس نے آنحضرت ﷺ کو مختار بنا دیا کہ آپ ﷺ اس مال کو اللہ کی رضا وخوشنودی اور دین وملت کے مفاد میں جس طرح خرچ کرنا مناسب سمجھیں خرچ کریں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کی مراد اپنا کل مال تھا پہلے تو اس نے اپنے کل مال کا آدھا حصہ اللہ کی راہ میں پیش کرنے کا اعلان کیا، مگر جب ایمان کا نور اس کے دل میں اچھی طرح گھر کر گیا اور خدا اور رسول کی محبت اس پر غالب آگئی تو اس نے نہ صرف کل مال اللہ کی راہ میں دے دینے کا بلکہ اپنی جان تک کو پیش کرنے کا ارادہ کر لیا۔

غریب ولاچار لوگوں کے ساتھ حسن سلوک

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُکْثِرُ الذِّکْرَ وَیُقِلُّ اللَّغْوَ وَیُطِیْلُ الصَّلٰوۃَ وَیُقَصِّرُ الْخُطْبَۃَ وَلَا یَاْنِفُ اَنْ یَّمْشِیَ مَعَ الْاَرْمِلَۃِ وَالْمِسْکِیْنِ فَیَقْضِیَ لَہُ الْحَاجَۃَ۔ (رواہ النسائی والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن اوفی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ذکر میں زیادہ مشغول رہتے، لغو (فضول) باتیں بہت کم کرتے، نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کرتے، اور بیوہ ومسکین کے ساتھ چلنے میں کوئی عار محسوس نہ فرماتے اور ان کا کام کر دیتے تھے۔" (نسائی ودارمی)

تشریح: "ذکر" سے مراد اللہ تعالیٰ کا ذکر اور ہر وہ چیز ہے جو ذکر اللہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ زیادہ، یا مختلف نوعیتوں سے ہر وقت اور ہر لمحہ ہی آپ ﷺ ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔

"لغو (فضول) باتوں" سے مراد ہر وہ بات ہے جو ذکر اللہ کے علاوہ، اور دنیاوی امور سے تعلق رکھتی ہو، واضح رہے کہ ایسے دنیاوی امور کا ذکر بھی، کہ جو مصلحت وحکمت سے خالی نہ ہو، ذکر حقیقی کے اعتبار سے "فضول باتوں" ہی میں شامل ہے، اسی لئے امام غزالیؒ نے فرمایا

تھا:

ضيعت قطعة من العمر العزيز في تاليف البسيط و الوسيط و الوجيز۔

"میں نے اپنی عمر عزیز کا حصہ اپنی کتابوں بسیط، وسیط اور وجیز کی تالیف میں ضائع کیا۔"

گو ایسی دنیاوی باتیں جو حکمت و مصلحت سے خالی نہ ہوں حقیقی معنی میں لغو اور فضول باتوں کے حکم میں نہیں ہوتیں لیکن ان کی ظاہری صورت اور معنیٰ کے اعتبار سے اور ان کی حقیقت سے قطع نظر کر کے ان پر لغو اور فضول" کا اطلاق کیا گیا ہے، اسی تعبیر کو ظاہر کرنے کے لئے عارفین کا یہ قول ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین۔ "لغو" کو اس کے حقیقی معنی "بیکار، لایعنی اور باطل میں مراد لینا یوں بھی صحیح نہیں ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے کبھی بھی کسی لغویات کا صدور نہیں ہوا اور نہ یہ ممکن تھا کیونکہ جب اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کا یہ وصف بیان کرتا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۔ تو آنحضرت ﷺ کے بارے میں لغویات کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے۔"

بعض حضرات نے جو یہ کہا ہے کہ یہاں قلیل (کم) کا لفظ "عدم" کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی بھی کوئی لغوبات زبان سے نہیں نکالتے تھے اور اس کی دلیل میں وہ حضرات کہتے ہی کہ قلیل کا لفظ کبھی مطلق نفی اور اظہار عدم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے قرآن میں فرمایا گیا ہے: قليلا ما يو منون۔ تو یہ قول اگرچہ لفظ "لغو" کے بارے میں بہت سی بحثوں کو ختم کر دیتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے سیاق میں یہ قول زیادہ موزوں و مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ "تکثیر" کا لفظ "یقل" کے لئے جس معنی کا تقاضہ کرتا ہے وہ وہی ہے جو پہلے ذکر کیا گیا۔

"نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کرتے تھے۔" میں خاص طور پر جمعہ کی نماز مراد ہے کیونکہ خطبہ کے ذکر سے یہی بات موزوں معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک خطبہ کے اختصار کی بات ہے تو وہ یوں بھی درست ہے کہ آپ ﷺ اپنے خطبہ جمعہ میں جو الفاظ اور جملے استعمال فرماتے تھے وہ بے حد جامع و مانع ہوتے تھے، ہر جملہ گو الفاظ کے اعتبار سے بہت مختصر مگر مفہوم و معانی کے دریا اپنے اندر رکھتا تھا۔ ویسے خطبہ کی اختصار والی بات اکثر احوال کے اعتبار سے بیان کی گئی ہے ورنہ جب زیادہ نصیحت کرنا مقصود ہوتی تھی تو آپ تفصیل کے ساتھ لمبا خطبہ بھی ارشاد فرماتے تھے۔ بہر حال اس جملہ کا اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ آپ کا خطبہ نماز کی بہ نسبت مختصر ہوتا تھا۔ نیز ایک اور حدیث میں جو باب الجمعہ میں گذر چکی ہے منقول ہے کہ نماز کا طویل ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا فہم و سمجھ اور دانشمندی کی علامت ہے۔" اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز چونکہ مؤمن کی معراج اور پروردگار کی مناجات کا موقع ہے اس لئے طوالت ہی اس کے مناسب ہے جب کہ خطبہ کا تعلق لوگوں کی طرف متوجہ ہونے اور ان کو حق کی طرف بلانے سے ہے جس میں زور بیان اور اثر اندازی کے لئے فصاحت و بلاغت پر توجہ دینی پڑتی ہے اور یہ چیز ایسی ہوتی ہے جس پر ریاء کا گمان کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے خطبہ کو مختصر کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

قریش مکہ آنحضرت ﷺ کی تکذیب کیوں کرتے تھے

(۳۴) وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ اَبَا جَهْلٍ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا لَا نُكَذِّبُكَ وَلٰكِنْ نُكَذِّبُ بِمَا جِئْتَ بِهٖ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْهِمْ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ جب ابوجہل نے نبی کریم ﷺ سے یہ کہا کہ: (اے محمد ﷺ!) ہم (یعنی قریش مکہ) تمہیں نہیں جھٹلاتے (کیونکہ تمہاری صدق گوئی ہم پر خوب عیاں ہے اور ہم نے تمہیں کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا اسی لئے تم اپنوں اور غیروں سب میں صدق و امانت کے ساتھ مشہور ہو) ہم تو اس چیز کو جھٹلاتے ہیں جو تم لے کر آئے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان (قریش مکہ یعنی ابوجہل وغیرہ) کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ "آپ (ﷺ) کو نہیں

جھٹلاتے بلکہ وہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔" (ترمذی)

تشریح: "جو تم لے کر آئے ہو۔" سے مراد وحی الٰہی یعنی کتاب اور شریعت ہے! ابوجہل کا مطلب یہ تھا کہ تمہارے ساتھ ہمارا اختلاف اس دین و شریعت کے بارے میں ہے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو۔ ہم تو تمہاری تکذیب صرف اس لئے کرتے ہیں کہ تمہاری لائی ہوئی کتاب و شریعت کو سچ نہیں مانتے، اگر درمیان میں سے تمہاری یہ کتاب و شریعت ہٹ جائے تو پھر تمہارے ساتھ ہمارا کوئی جھگڑا نہیں رہے گا۔ لیکن وہ لعین اتنا نہیں سمجھا کہ جب محمد (ﷺ) دنیاوی معاملات میں لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتے اور صدق و سچائی ان کا وصف ہے جس کا اقرار و اعتراف خود قریش مکہ کو بھی تھا تو پھر وہ دین و آخرت کے معاملہ میں لوگوں سے کیوں جھوٹ بولیں گے، اور ان کو جھوٹ کی طرف بلائیں گے، اور خدا پر بہتان باندھیں گے۔ اصل بات یہ تھی کہ قریش مکہ کے سارے بڑے بڑے سردار آنحضرت ﷺ کے تئیں سخت بغض و عناد اور حسد کا شکار تھے، ان کو ساری جلن اس بات کی تھی کہ اس یتیم و امی شخص کو اتنا بڑا مرتبہ کیسے مل گیا اور ہم اتنی ساری دنیاوی وجاہتیں رکھتے ہوئے اس کی پیروی کیسے کریں، کس طرح اس کو اپنا بڑا اور قابل اتباع مان لیں۔ اور یہی جلن ان سے طرح طرح کی باتیں کہلواتی تھی، جن میں نہ کوئی معقولیت ہوتی تھی اور نہ کوئی سچائی۔

تفسیر کشاف میں مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں دو مطلب لکھے ہیں! ایک تو یہ کہ اے محمد (ﷺ)! یہ کافر جو تمہیں جھٹلاتے ہیں، اور یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ تم واقعۃً اپنے پروردگار کی طرف سے نئی کتاب و شریعت لے کر مبعوث ہوئے ہو تو یہ تمہیں نہیں جھٹلاتے، درحقیقت خدا کی نازل کردہ آیتوں اور اس کے اتارے ہوئے دین کو جھٹلاتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مالک اپنے اس غلام سے کہ جس کو لوگ ناروا اطوار پر پریشان کرتے اور ستاتے ہوں، یہ کہے کہ وہ لوگ تجھے نہیں ستاتے ہیں بلکہ مجھے ستاتے ہیں، تو دیکھنا میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہوں اور ان کو کیسا مزہ چکھاتا ہوں دوسرا مطلب یہ ہے کہ: اے محمد (ﷺ)! یہ کافر تمہیں نہیں جھٹلاتے ہیں کیونکہ تم تو ان کے نزدیک بڑے سچے اور امین ہو، اور تمہاری سچائی اور امانت ان میں ضرب المثال کی حیثیت رکھتی ہے ہاں یہ لوگ خدا کی آیتوں اور اس کے فرمائے ہوئے دین کو جھٹلاتے ہیں۔ یہ مطلب حدیث کے مضمون سے زیادہ مطابقت اور موزونیت رکھتا ہے۔

حضور ﷺ نے اپنے لئے دولت مندی کو پسند نہیں فرمایا

(۳۵) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَائِشَةُ لَوْ شِئْتُ لَسَارَتْ مَعِيَ جِبَالُ الذَّهَبِ جَاءَنِيْ مَلَكٌ وَاِنَّ حُجْزَتَهُ لَتُسَاوِي الْكَعْبَةَ فَقَالَ اِنَّ رَبَّكَ يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ وَيَقُوْلُ اِنْ شِئْتَ نَبِيًّا عَبْدًا وَاِنْ شِئْتَ نَبِيًّا مَلِكًا فَنَظَرْتُ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَاَشَارَ اِلَيَّ اَنْ ضَعْ نَفْسَكَ وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ فَالْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ كَالْمُسْتَشِيْرِ لَهُ فَاَشَارَ جِبْرَئِيْلُ بِيَدِهٖ اَنْ تَوَاضَعْ فَقُلْتُ نَبِيًّا عَبْدًا قَالَتْ فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذٰلِكَ لَا يَاْكُلُ مُتَّكِئًا يَقُوْلُ اٰكُلُ كَمَا يَاْكُلُ الْعَبْدُ وَاَجْلِسُ كَمَا يَجْلِسُ الْعَبْدُ۔

(رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ مجھ سے فرمانے لگے: "عائشہؓ! اگر میں چاہوں (اور اپنے پروردگار سے اپنے لئے دنیا کا مال و منال طلب کروں) تو یقیناً میرے ساتھ سونے کے پہاڑ چلا کریں۔ (تمہیں ایک دن کی بات بتاتا ہوں کہ) میرے پاس ایک فرشتہ آیا (جو اس قدر دراز تھا کہ) اس کی کمر کعبہ کے برابر تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ (ﷺ) کا پروردگار آپ (ﷺ) کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ چاہے تو بندہ پیغمبر بنو چاہے بادشاہ پیغمبر بننا منظور کر لو (یعنی آپ (ﷺ) کو دونوں باتوں کا اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہے ایسا پیغمبر بن جائے جو عجز و بے چارگی، تنگی اور فقر و مشقت کی زندگی گذارے) میں نے (یہ سن کر) جبرائیل (یعنی اس فرشتہ) کی طرف (سوالیہ انداز میں)

دیکھا (اور گویا ان سے مشورہ طلب کیا کہ تم ہی بتاؤ میرے لئے کونسی صورت بہتر رہے گی، انہوں نے کہا: اپنے نفس کو پست کر دو۔ یعنی فقرو مشقت اور تنگی و محتاجگی کی زندگی کو اختیار کرو نہ کہ عیش و راحت اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی کو " اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ (اللہ تعالیٰ کا مذکورہ پیغام سن کر) جبرائیل علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور مشورہ طلب انداز میں ان کی طرف دیکھا، حضرت جبرئیل نے اپنے ہاتھ سے (زمین کی طرف) اشارہ کر کے بتایا کہ پستی و انکساری اختیار کر لیجئے۔ پس (آنحضرت ﷺ نے فرمایا) میں نے کہا کہ یقیناً میں بندۂ پیغمبر بنوں گا۔" حضرت عائشہؓ نے بیان کیا: "اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے کبھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا اور فرمایا کرتے تھے کہ میں اس طرح کھانا کھاتا ہوں جیسے غلام کھاتا ہے اور میں اس طرح بیٹھتا ہوں جیسے غلام بیٹھتا ہے۔ اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "پستی و انکساری اختیار کر لیجئے۔" یعنی فقرو مشقت اور تنگی و محتاجگی کی زندگی اختیار کر لیجئے جس میں دنیاوی طور پر پستی و انکساری ہے لیکن اللہ کے نزدیک بلند قدری ہے، اس کے برخلاف بادشاہت اور دولتمندی کی زندگی، سرکشی اور خدا فراموشی کی باعث اور تکبر و ناشکری کی موجب ہوتی ہے جس کو اختیار کر کے انسان اپنے پروردگار کی قربت و چاہت سے دور جا پڑتا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ بات گویا غالب احوال کے اعتبار سے بتائی اور اسی لئے اکثر انبیاء اور علماء و صلحا نے فقرو تنگی ہی کی زندگی کو اختیار کیا اور انہوں نے ہمیشہ مال و دولت اور عیش و راحت کی زندگی پر مشقت و محنت کی زندگی کو ترجیح دی۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاحْشُرْنَا مَعَهُمْ۔

"جیسے غلام کھاتا ہے " کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح کسی غلام کو اس کا مالک جیسا ویسا کھانا دے دیتا ہے وہ اس کو صبرو شکر کے ساتھ کھا لیتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی غیر مرغوب اور ادنی درجہ کا کیوں نہ ہو اسی طرح مجھے جس طرح کا بھی کھانا میسر ہوتا ہے اس کو صبرو شکر کے ساتھ کھا لیتا ہوں، نہ اچھے اور اعلیٰ کھانے کی تمنا اور خواہش ہوتی ہے اور نہ ادنی کھانے سے کوئی تنگی و ناگواری محسوس ہوتی ہے۔

"جیسے غلام بیٹھتا ہے " سے دو زانو بیٹھنا مراد ہے جیسے نماز کی حالت میں بیٹھا جاتا ہے اور بیٹھنے کی افضل ترین ہیئت بھی یہی ہے۔ یا کھانے کے وقت بیٹھنے کی وہ ہیئت مراد ہے جس میں ایک زانو کھڑا کر کے اور گوٹ مار کر بیٹھتے ہیں، عام طور پر آنحضرت ﷺ اسی ہیئت سے بیٹھا کرتے تھے۔

بَابُ الْمَبْعَثِ وَبَدْءِ الْوَحیِ

آنحضرت ﷺ کی بعثت اور نزول وحی کا بیان

لفظ "مبعث" بعث اور زمانہ بعث کے معنی میں ہے، اور "بعث" کے معنی ہیں اٹھانا، بھیجنا۔ یہاں اس لفظ سے مراد۔ہے۔ اللہ تعالیٰ کا محمد عربی ﷺ کو اپنا نبی اور رسول بنا کر تمام مخلوق کی طرف بھیجنا۔

لفظ "بدء" کے معنی آغاز، ابتداء اور شروع کے ہیں۔ بعض روایتوں میں "بدء" کے بجائے "بدو" کا لفظ ہے اور اس کے معنی ظہور کے ہیں، مفہوم و مطلب کے اعتبار سے دونوں لفظوں میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن زیادہ بہتر اور موزوں پہلی ہی روایت ہے جس میں "بدء" کا لفظ ہے۔

لفظ "وحی" کے اصل معنی ہیں اشارہ کرنا، لکھنا، رمزو کنایہ میں بات کرنا، آہستہ سے بات کرنا، پیغام بھیجنا، القا اور الہام کرنا۔ اور مشارق الانوار میں لکھا ہے! وحی کا اصل مفہوم ہے تیزی کے ساتھ خفیہ طور پر پیغام رسانی، آنحضرت ﷺ اور دوسرے انبیاء پر نزول وحی (اللہ تعالیٰ کی طرف پیغام و ہدایات آنے) کی مختلف صورتیں تھیں، بعض کو براہ راست حق تعالیٰ سے شرف تکلم حاصل ہوتا تھا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو، اور اس کا ثبوت قرآن کریم سے ملتا ہے۔ یا جیسے ہمارے حضرت ﷺ کو بھی شب معراج میں یہ شرف حاصل

ہوا تھا۔ وحی کی دوسری صورت رسالت اور فرشتے کی وساطت کی ہے کہ حضرت جبرائیل ؑ اللہ تعالیٰ کا پیغام اور ہدایت لے کر آتے اور حرف بحرف رسول و نبی تک پہنچاتے، وحی کی اکثر و بیشتر یہی صورت عمل میں آیا کرتی تھی، وحی کی تیسری صورت القا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بات اور کسی مضمون کا دل میں ڈالا جانا جیسے آنحضرت ﷺ نے فرمایا القی فی روعی (یہ بات میرے دل میں ڈالی گئی) اور کہتے ہیں کہ حضرت داؤد ؑ پر جو وحی آتی تھی وہ زیادہ تر اسی صورت میں ہوتی تھی۔ یہ تو اس "وحی" کا ذکر تھا جس کی نسبت انبیاء کی طرف ہوتی ہے، قرآن میں بعض موقع پر لفظ "وحی" کی نسبت غیر انبیاء کی طرف بھی کی گئی ہے، تو واضح رہے کہ ایسے موقعوں پر "وحی" کا لفظ "الہام" کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے ایک جگہ فرمایا: وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰى (اور ہم نے موسیٰ ؑ کی ماں کو الہام کیا) اسی طرح "وحی" کا لفظ امر (حکم) کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے ایک آیت میں ہے۔ وَاَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ (اور ہم نے حواریین کو حکم دیا) نیز "وحی" سے مراد "طبعی خاصہ" پیدا کرنا بھی ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (اور آپ ﷺ کے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یوں رکھا۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں خلعت نبوت سے سرفراز کیا گیا

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بُعِثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَمَكَثَ بِمَكَّةَ ثَلٰثَ عَشْرَةَ سَنَةً يُوْحٰى اِلَيْهِ ثُمَّ اُمِرَ بِالْهِجْرَةِ فَهَاجَرَ عَشْرَ سِنِيْنَ وَمَاتَ وَهُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَسِتِّيْنَ سَنَةً۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں منصب رسالت و نبوت پر فائز کیا گیا، اس کے بعد آپ ﷺ تیرہ سال مکہ میں رہے اور پھر آپ ﷺ کو ہجرت کا حکم دیا گیا چنانچہ آپ ﷺ نے (مکہ سے) ہجرت فرمائی اور دس سال مدینہ میں رہے جب آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو عمر مبارک تریسٹھ سال کی تھی۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: آپ ﷺ کی عمر مبارک کے بارے میں مختلف روایتیں منقول ہیں لیکن زیادہ صحیح یہی روایت ہے کہ تریسٹھ سال کی عمر میں دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور حضرت ابن عباسؓ ہی کی اپنی روایت میں پینسٹھ سال کی عمر میں وفات کا ذکر ہے، اور حضرت انسؓ کی روایت میں جو آگے آئے گی اس میں ساٹھ سال کی عمر میں وفات کا ذکر ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اگلی روایت میں سن ولادت اور سن وفات کو بھی پورا پورا سال شمار کیا اور ان دو سالوں کو ملا کر کل ۶۵ سال بیان کی جب کہ حضرت انسؓ نے تریسٹھ میں سے کسر یعنی تین کو حذف کر کے ساٹھ سال کا ذکر کیا۔

نزول وحی کی ابتداء

② وَعَنْهُ قَالَ اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَّةَ خَمْسَ عَشْرَةَ سَنَةً يَسْمَعُ الصَّوْتَ وَيَرَى الضَّوْءَ سَبْعَ سِنِيْنَ وَلَا يَرٰى شَيْئًا وَثَمَانَ سِنِيْنَ يُوْحٰى اِلَيْهِ وَاَقَامَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرًا وَتُوُفِّيَ وَهُوَ ابْنُ خَمْسٍ وَسِتِّيْنَ سَنَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (رسالت عطا ہونے کے بعد) پندرہ سال مکہ میں قیام فرمایا اور (ان پندرہ سالوں میں سے) ابتدائی سات سالوں میں (حضرت جبرئیل ؑ کی) آواز (یا محمد ﷺ!) سنتے اور (اندھیری راتوں میں) ایک عجیب و غریب روشنی دیکھتے تھے اس کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ پھر (ان پندرہ سالوں میں سے آخر کے) آٹھ سال کے عرصہ میں وحی نازل ہوتی رہی، اس کے بعد آپ ﷺ نے مدینہ میں دس سال کی مدت گذاری اور جب وفات ہوئی تو آپ ﷺ کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ۶۵ سال کی وضاحت تو اوپر کی حدیث کی تشریح میں گذری منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد مکہ میں آپ ﷺ کے قیام کی

مدت یہاں ۱۵سال بتائی گئی ہے جب کہ اوپر کی حدیث میں ۱۳سال کا ذکر تھا، لہٰذا یہاں بھی یہی توجیہ کی جائے گی کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس روایت میں سن ولادت اور سن ہجرت کو پورا پورا سال شمار کر کے ۱۳سال کے بجائے ۱۵سال کا ذکر کیا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ آواز سننا اور اس عجیب و غریب روشنی کو دیکھنا منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد مکہ" میں پندرہ سالہ قیام کے ابتدائی سات سالوں میں پیش آتا رہا جب کہ تاریخی روایت اور بعض دوسری احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت حال ظہور نبوت (منصب رسالت پر فائز ہونے) سے پہلے پیش آئی تھی اور اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ اس طرح عالم ملکوت سے ایک گونہ مانوس اور آشنا ہو جائیں اور ایسا نہ ہو کہ ماوراء الدنیا حالات و کیفیات کے یک بیک ظہور کو انسانی و بشری حالت و قوت برداشت کرنے سے عاجز رہے۔

حضور ﷺ نے کتنی عمر میں وفات پائی

③ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَلٰی رَأْسِ سِتِّيْنَ سَنَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو ساٹھ سال کی عمر پوری ہونے پر اٹھا لیا۔" (بخاری و مسلم)

آنحضرت ﷺ اور خلفاء اربعہؓ کی عمر

④ وَعَنْهُ قَالَ قُبِضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَسِتِّيْنَ وَاَبُوْبَكْرٍ وَهُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَّ سِتِّيْنَ وَعُمَرُ وَهُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَّسِتِّيْنَ رَوَاهُ مُسْلِمٌ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ اِسْمٰعِيْلَ الْبُخَارِيُّ ثَلٰثٍ وَّ سِتِّيْنَ اَكْثَرُ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات بھی تریسٹھ سال کی عمر میں ہوئی اور حضرت عمر فاروقؓ نے بھی تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (مسلمؒ) اور محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ نے کہا: آنحضرت ﷺ کی عمر کے بارے میں زیادہ روایتیں تریسٹھ سال ہی کی ہیں۔"

تشریح: جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ کی عمر کے بارے میں زیادہ ترصحیح روایت یہی ہے کہ آپ ﷺ تریسٹھ سال کی عمر میں اس دنیا سے تشریف لے گئے، اسی طرح خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں بلا اختلاف ثابت ہے کہ ان کی عمر بھی تریسٹھ سال ہی کی ہوئی، خلافت صدیق کی مدت دو سال چار ماہ ہے، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ آنحضرت ﷺ کے بعد جتنے عرصہ حیات رہے اتنے ہی دن آنحضرت ﷺ سے چھوٹے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی عمر کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، زیادہ صحیح روایت تریسٹھ سال کی ہے، بعض روایتوں میں انسٹھ سال کا ذکر ہے، خود مؤلف مشکوٰۃ نے یہ لکھا ہے کہ "مغیرہ ابن شعبہؓ کے غلام ابولؤلوء نے ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ بدھ کے دن مدینہ میں خنجر سے حملہ کر کے ان کو زخمی کیا اور ۱۰ محرم الحرام ۲۴ھ اتوار کے دن ان کی تدفین عمل میں آئی، اس وقت ان کی عمر تریسٹھ سال تھی اور یہی قول زیادہ صحیح ہے، حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت دس سال چھ ماہ رہی۔

حضرت عثمان غنیؓ نے واقدی کی روایت کے مطابق ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو جمعہ کے دن ایک مصری باغی اسود تجیبی کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا اور شنبہ کے روز جنت البقیع میں دفن کئے گئے اس دن ان کی عمر ۸۲ سال کی تھی بعض حضرات نے کہا ہے کہ ۸۸ سال کی تھی، ان کے بارے میں بعض اور روایتیں بھی نقل کی جاتی ہیں حضرت عثمانؓ کی خلافت کا دور کچھ دن کم بارہ سال رہا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دن خلیفہ منتخب کئے گئے اور ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو جمعہ کے دن ایک شخص عبد الرحمٰن ابن ملجم نے کوفہ میں ان پر قاتلانہ حملہ کیا، جس کے نتیجہ میں وہ شدید زخمی ہوئے اور اس حملہ کے تین دن کے بعد جان جاں آفریں کے سپرد کر دی، اور نجف میں دفن کئے گئے، اس دن ان کی عمر تریسٹھ سال کی تھی، ان کی خلافت کی مدت کچھ دن اوپر چار سال نو مہینے رہی۔

امام بخاری کے قول کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی عمر مبارک کے بارے میں جو مختلف روایتیں منقول ہیں ان میں سب سے زیادہ روایتیں تریسٹھ سال کے قول کی ہیں دوسرے اقوال جیسے ۶۰ سال سے متعلق کم روایتیں ہیں، اسی لئے اصل اعتبار اسی روایت کا کیا جاتا ہے جس میں ۶۳ سال کی ہے! جہاں تک آپ ﷺ کے سن ولادت کا تعلق ہے تو صحیح تر اور مشہور روایت کے مطابق آپ ﷺ کی ولادت مبارکہ واقعہ فیل کے سال ہوئی، بلکہ قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ تاریخ دانوں اور علماء کا اس پر اجماع ہے۔ نیز یوم ولادت کے متعلق اس بات کو علماء اور مؤرخین نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ آپ ﷺ ربیع الاول کے مہینے میں پیر کے دن پیدا ہوئے البتہ تاریخ کے بارے میں اختلاف ہے کہ بارھویں تاریخ تھی یا اٹھارھویں یا دسویں۔ آپ ﷺ کی وفات بھی ربیع الاول ہی کے مہینہ میں ۱۲ تاریخ کو پیر کے دن چاشت کے وقت ہوئی۔

آغاز وحی کی تفصیل

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ اَنْ يَّنْزِعَ اِلٰى اَهْلِهٖ وَيَتَزَوَّدُ لِذٰلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى خَدِيْجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتّٰى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِيْ غَارِ حِرَآءٍ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ اِقْرَأْ فَقَالَ مَا اَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اِقْرَأْ قُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيَ الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اِقْرَأْ قُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ فَرَجَعَ بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فُؤَادُهٗ فَدَخَلَ عَلٰى خَدِيْجَةَ فَقَالَ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ لِخَدِيْجَةَ وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ كَلَّا وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ ثُمَّ انْطَلَقَتْ بِهٖ خَدِيْجَةُ اِلٰى وَرَقَةَ بْنِ نَوْفَلٍ ابْنِ عَمِّ خَدِيْجَةَ فَقَالَتْ لَهٗ يَا ابْنَ عَمِّ اسْمَعْ مِنِ ابْنِ اَخِيْكَ فَقَالَ لَهٗ وَرَقَةُ يَا ابْنَ اَخِيْ مَاذَا تَرٰى فَاَخْبَرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبَرَ مَا رَاٰى فَقَالَ وَرَقَةُ هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى مُوْسٰى يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ فِيْهَا جَذَعًا يٰلَيْتَنِيْ اَكُوْنُ حَيًّا اِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ قَالَ نَعَمْ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهٖ اِلَّا عُوْدِيَ وَاِنْ يُّدْرِكْنِيْ يَوْمُكَ اَنْصُرْكَ نَصْرًا مُّؤَزَّرًا ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ اَنْ تُوُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ الْبُخَارِيُّ حَتّٰى حَزِنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا بَلَغَنَا حُزْنًا غَدَا مِنْهُ مِرَارًا كَيْ يَتَرَدّٰى مِنْ رُءُوْسِ شَوَاهِقِ الْجَبَلِ فَكُلَّمَا اَوْفٰى بِذِرْوَةِ جَبَلٍ لِكَيْ يُلْقِيَ نَفْسَهٗ مِنْهُ تَبَدّٰى لَهٗ جِبْرَائِيْلُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا فَيَسْكُنُ لِذٰلِكَ جَاْشُهٗ وَتَقِرُّ نَفْسُهٗ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ پر نزول وحی کا سلسلہ جس چیز سے شروع ہوا وہ سوتے میں سچے خوابوں کا نظر آنا تھا، آپ ﷺ جو خواب دیکھتے اس کی تعبیر (کسی ابہام و اشتباہ کی آمیزش کے بغیر) اس طرح روشن ہو کر سامنے آجاتی، جیسے صبح کا اجالا (ظاہر ہو جاتا) اس کے بعد جب کہ ظہور نبوت کا وقت آنے کو ہوا) آپ ﷺ کو تنہائی کا شائق بنا دیا گیا۔ اور آپ ﷺ غار حرا میں گوشہ نشین رہنے لگے، اس غار میں آپ ﷺ عبادت کیا کرتے یعنی متعدد راتیں وہیں عبادت میں اس وقت تک مشغول رہتے جب تک کہ گھر والوں (کے پاس جانے) کا اشتیاق پیدا نہ ہو جاتا، آپ ﷺ (ان عبادت کی راتوں کے لئے گھر سے) کھانے پینے کی چیزیں لے جاتے اور

(جب وہ چیزیں ختم ہو جاتیں تو) پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس آتے اور اگلی راتوں کے بقدر کچھ چیزیں لے کر واپس غار میں چلے جاتے (یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا) یہاں تک کہ حق (کے ظہور کا وقت،) آ گیا، آپ ﷺ اس وقت بھی غار حرا ہی میں تھے، آپ ﷺ کے پاس فرشتہ (یعنی جبرائیل اور ایک روایت کے مطابق اسرافیل علیہ السلام) آیا اور کہا کہ پڑھو! آنحضرت ﷺ نے جواب دیا، میں پڑھنا نہیں جانتا۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: فرشتہ نے (میرا یہ جواب سن کر) مجھ کو پکڑ لیا اور (خوب زور سے) بھینچا یہاں تک کہ میں پریشان ہو گیا، پھر اس (فرشتہ) نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو! میں نے وہی جواب دیا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: فرشتہ نے دوسری مرتبہ مجھ کو پکڑ لیا اور (خوب زور سے) بھینچا، یہاں تک کہ میں پریشان ہو گیا، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو! میں نے اب بھی یہی کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ فرشتہ نے تیسری مرتبہ مجھ کو پکڑا اور (خوب زور سے) بھینچا یہاں تک کہ میں پریشان ہو گیا، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ط یعنی پڑھو اپنے پروردگار کے نام پر جس نے (تمہیں اور ہر چیز کو) پیدا کیا، انسان کو (رحم مادر میں) بستہ خون سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے بزرگ و برتر ہے، وہ پروردگار جس نے قلم کے ذریعہ بہت سے علم کی تعلیم دی اور انسان کو ہر وہ چیز سکھائی جس کو وہ نہ جانتا تھا۔ اس کے بعد (فرشتہ تو غائب ہو گیا اور) آنحضرت ان آیتوں کے ساتھ مکہ (اپنے گھر) واپس آئے اس وقت یہ حال تھا کہ (وحی کی شدت رعب سے سخت دہشت زدہ تھے اور نہ صرف) آپ ﷺ کا دل کانپ رہا تھا (بلکہ بخار اور لرزہ کی کیفیت پورے جسم پر طاری تھا) آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر کہا کہ مجھے کپڑے اڑھاؤ، مجھے کپڑے اڑھاؤ حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو کپڑا اڑھا دیا یہاں تک کہ (کچھ دیر کے بعد اس رعب وہیبت کی شدت ختم ہوئی تو) آپ ﷺ کا خوف وہراس جاتا رہا (اور اصل جسمانی حالت بحال ہوئی) تب آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو پورا واقعہ بتایا اور ان سے یہ بھی فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خوف ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے (تسلی دیتے ہوئے) کہا کہ آپ ﷺ قطعاً خوف نہ کریئے۔ (آپ ﷺ جو سوچ رہے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا) خدا کی قسم (مجھے پورا یقین ہے کہ) اللہ تعالیٰ آپ (ﷺ) کو کبھی رسوا اور بے مراد نہیں کرے گا کیونکہ آپ (ﷺ) قرابت داروں سے حسن سلوک و تعلق کا معاملہ رکھتے ہیں (اگرچہ وہ قرابت دار آپ (ﷺ) سے ترک تعلق اور بد سلوکی ہی کا معاملہ کیوں نہ کرتے ہوں) آپ (ﷺ) کبھی کسی سے جھوٹ نہیں بولتے (اگرچہ لوگ آپ (ﷺ) سے جھوٹ بولیں یا آپ (ﷺ) کو جھٹلائیں)۔ بعض روایتوں میں یہاں یہ الفاظ بھی ہیں کہ تو دی الامانة یعنی آپ (ﷺ) امانت کی ادائیگی میں کوئی کو تاہی نہیں کرتے)۔ آپ (ﷺ) (دوسروں کا) بوجھ اٹھاتے ہیں، آپ (ﷺ) غریبوں اور مسکینوں پر خرچ کرنے کے لئے کماتے ہیں، آپ (ﷺ) مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں (اور ان کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں) اور آپ (ﷺ) لوگوں کے حقیقی حادثات و مصائب میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آنحضرت ﷺ کو لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ ابن نوفل کے پاس پہنچیں اور ان سے کہا کہ: اے ابن عم! اپنے بھتیجے کی روداد سن لیجئے! ورقہ آنحضرت ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا میرے بھتیجے! سناؤ تم پر کیا بیتی اور تم کیا دیکھتے اور محسوس کرتے ہو؟ رسول کریم ﷺ نے ان کے سامنے وہ سارا واقعہ بیان کیا جو آپ ﷺ کے ساتھ پیش آیا تھا، ورقہ نے (ساری باتیں سن کر) کہا کہ (تم دونوں کو مبارک ہو) یہ تو وہی ناموس (فرشتہ) ہے جس کو اللہ تعالیٰ وحی دے کر حضرت موسیٰ کے پاس بھیجتا تھا، اے کاش، تمہاری نبوت کے اظہار اور تمہاری دعوت کے اعلان کے وقت میں طاقتور جوان ہوتا، کاش، میں اس وقت زندہ ہی رہتا (چاہے میرے اندر طاقت و توانائی نہ ہوتی) جب تمہاری قوم (یعنی قریش میں سے تمہارے قرابت دار تمہارے شہر سے) تمہیں نکال دیں گے۔ رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر حیرت کے ساتھ) پوچھا! کیا واقعی میری قوم مجھے شہر سے نکال دے گی!؟ ورقہ نے کہا! ہاں (مجھے یقین ہے کہ تمہاری قوم کے لوگ تمہیں شہر سے ضرور نکال دیں گے) کیونکہ (ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ) جب بھی کوئی شخص تمہاری طرح نبوت و شریعت لے کر اس دنیا میں آیا، اس کے ساتھ دشمنی کی گئی (ایک روایت میں یوں ہے: جب بھی کوئی پیغمبر اس دنیا میں آیا کافروں نے اس کے ساتھ دشمنی رکھی اور اس کو سخت ترین ایذائیں پہنچائیں، اگر میں ان ایام میں (جب تم لوگوں کو خدا کے

دین کی طرف بلاؤ گے اور اس کے جواب میں تمہاری قوم کے لوگ تمہیں ایذا پہنچائیں گے اور تمہیں تمہارے شہر سے نکالیں گے) زندہ رہا تو پوری طاقت وقوت سے تمہاری مدد وحمایت کروں گا۔ لیکن اس کے بعد ورقہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور جلدی ہی اس دنیا سے چلے گئے اور آنحضرت ﷺ پر وحی آنے کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔" اس روایت کو یہاں تک بخاریؒ و مسلمؒ دونوں نے نقل کیا ہے لیکن اس کے بعد بخاریؒ نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ: "(نزول وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو) آنحضرت ﷺ پر غم وحزن طاری ہو گیا، جس کا ثبوت ہمیں ان حدیثوں سے بھی ملتا ہے جو ہم تک پہنچی ہیں، اور یہ غم وحزن اتنا شدید اور سخت تھا کہ کئی مرتبہ آپ ﷺ صبح کو اس ارادہ سے پہاڑوں پر گئے کہ اپنے آپ کو ان اونچے پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے گرادیں، جب بھی آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تاکہ اپنے آپ کو نیچے گرادیں تو (اچانک) جبرائیل ظاہر ہوتے اور کہتے: محمد (ﷺ)! بلاشبہ آپ (ﷺ) اللہ کے برحق رسول ہیں اس صورت میں یقیناً آپ (ﷺ) کی ہر کلفت وپریشانی ختم ہو کر رہے گی اور انجام کار دین ودنیا کے ہر معاملہ میں آپ بامراد رہیں گے اگرچہ درمیان میں کتنے ہی مشقت وابتلاء کے مراحل سے گذرنا پڑے) چنانچہ (حضرت جبرائیل علیہ السلام کی یہ بشارت سن کر) آنحضرت ﷺ کے دل کا اضطراب، دہشت اور قلق جاتا رہتا اور آپ ﷺ مطمئن ہو جاتے۔"

تشریح: حضرت عائشہؓ نے یہ روایت، ابتداء نزول وحی کی ساری تفصیل یا تو براہ راست آنحضرت ﷺ سے سن کر یا کسی صحابیؓ سے نقل کر کے بیان کی ہے کیونکہ ظہور نبوت کے ابتدائی زمانہ میں تو حضرت عائشہؓ کا وجود بھی نہیں تھا۔

"وہ سوتے میں سچے خوابوں کا نظر آنا تھا" کے ضمن میں شارحین نے یہ اقوال نقل کئے ہیں کہ ظہور نبوت سے پہلے سچے خواب نظر آنے کی اس کیفیت وحالت کا عرصہ چھ ماہ رہا۔ نیز سچے خواب کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوابیدہ شخص کے دل ودماغ اور اس کے احساسات پر ان چیزوں کا عکس ڈال دیتا ہے جو آئندہ وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہیں یا پہلے ہی وقوع پذیر ہو چکی ہوتی ہیں لیکن پہلے سے اس شخص کے علم میں نہیں ہوتیں اس طرح جیسے بیداری کی حالت میں انسانی دل اور دماغ اور ادراک واحساس بھی بیدار رہتے ہیں تقریباً اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس خوابیدہ شخص کا ادراک واحساس بھی بیدار ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر وبیشتر وہ شخص خواب میں جو کچھ دیکھتا ہے اس کی بعینہٖ عملی اور وجودی تعبیر وہ جاگنے کے بعد دیکھ یا جان لیتا ہے۔ یہ چیز حق تعالیٰ کے حکم وقدرت کے تحت ہے اور عملی دنیا میں ناممکن بالکل نہیں ہے، اس قادر مطلق کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے کہ اس کے کسی حکم وفعل کی راہ میں نہ نیند رکاوٹ بن سکتی ہے اور نہ کوئی اور چیز۔

"آپ ﷺ غار حرا میں گوشہ نشین رہنے لگے۔" حراء اس مشہور پہاڑ کا نام ہے جو مکہ کے نواح میں واقع ہے، اس پہاڑ کو "جبل ثور" بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں سے خانہ کعبہ نظر آتا ہے، اور شاید اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے گوشہ نشینی اور عبادت خداوندی کے لئے اس پہاڑ کے ایک غار کو منتخب فرمایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے بھی واقعہ فیل کے دوران اسی پہاڑ کو اپنی پناہ گاہ بنایا اور اسی جگہ دعا ومناجات میں مشغول رہے۔

حدیث کے اس جملہ کے تحت شارحین حدیث نے خلوت گزینی اور گوشہ نشینی کے بارے میں بڑی مفید باتیں لکھی ہیں، مثلاً خلوت گزینی اللہ کے نیک وصالح اور عارف بندوں کی مخصوص شان ہے اسی لئے ظہور نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ کو اس کا شائق بنایا گیا اور اس کی حکمت یہ ہے کہ خلوت وتنہائی میں دل ودماغ کو مکمل سکون اور فراغت حاصل ہوتی ہے، اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ رہنے کا موقع خوب ملتا ہے، دنیاوی علائق وتفکرات اور انسانی تقاضوں اور بشری مرغوبات سے انقطاع رہتا ہے۔ اللہ کی یاد اور اس کی عبادت میں خشوع وخضوع، نورانیت وطمانیت اور خاطر جمعی بہت اچھی طرح میسر آتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر حالت میں اور ہر موقع پر خلوت گزینی اور گوشہ نشینی ہی سب سے اچھی چیز اور شریعت کی نظر میں زیادہ مطلوب وپسندیدہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خلوت وعزلت کی طرح جلوت اور اختلاط کی بھی اہمیت ہے، اور ان دونوں میں سے کون سی صورت افضل ہے، اس کا مدار پیش آمدہ حالات و

معاملات کے حسن و قبح پر ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک صورت ان شرائط و ضروریات کے تحت، کہ جن کا شریعت میں اعتبار ہے، اپنے اپنے موقع پر افضل و برتر ہے، اگر کسی معاشرہ میں خرابیاں اور برائیاں چھوت کی طرح پھیل گئی ہوں، اور لوگوں کے ساتھ اختلاط رکھنے میں دین وایمان کے نقصان کا خطرہ ہو اور کوئی شخص نصیحت سننے اور اچھی بات ماننے پر تیار نہ ہو تو اس صورت میں خلوت گزینی اور گوشہ نشینی کو افضل کہا جائے گا اور اگر دین وایمان کے نقصان کا خطرہ نہ ہو، لوگ تعلیم و نصیحت کے ضرورت مند ہوں اور یہ بات معلوم ہو کہ لوگوں کو تعلیم و نصیحت کے ذریعہ نیکی کی تربیت دی جاسکتی ہے تو اس صورت میں سب کے ساتھ اختلاط رکھنے اور سماجی زندگی اختیار کرنا ہی افضل ہوگا۔

"تحنث" کے معنی ہیں راتوں کو عبادت کرنا جیسا کہ خود حضرت عائشہؓ نے یا کسی راوی نے فیتحنث فِیهِ کے بعد وَهُو التعبد اللیالی کے ذریعہ اس لفظ کی وضاحت کی ہے۔ بہر حال "متعدد راتوں" سے مراد کئی کئی روز و شب ہیں اور خاص طور پر "راتوں" ہی کا ذکر اس وجہ سے ہی کیا گیا ہے "خلوت کے ساتھ "رات" ہی کا جوڑ زیادہ موزوں اور مناسب تھا نیز "متعدد" کی جو قید لگائی گئی ہے اس سے قلت کی طرف اشارہ مراد ہے کہ مسلسل شب و روز عبادت کی مشغولیت کا سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں بلکہ چند دنوں تک رہتا تھا، تاہم بعض حضرات نے اس سے "کثرت" کا مراد ہونا بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا ہے کیونکہ کسی بھی تسلسل کو ذکر کرنے کی ضرورت اسی صورت میں ہوتی ہے جب کہ وہ غیر معمولی طور پر دراز ہو اور زیادہ دنوں پر مشتمل ہو۔

"جب تک کہ گھر والوں کا اشتیاق پیدا نہ ہو جاتا۔" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ اس غار حرا سے نکل کر شہر میں اسی وقت آتے جب مسلسل کئی کئی دنوں تک عبادت خداوندی میں مشغول رہنے کے بعد گھر والوں کی خبر لینے اور ان کے حقوق و ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان کے پاس جانے کی خواہش پیدا ہو جاتی۔ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ایک روایت میں "ینزع" کے بجائے "یرجع" کا لفظ آیا ہے۔

"اگلی راتوں کے بقدر کچھ چیزیں لے کر واپس غار میں چلے جاتے۔" کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب تک خلوت گزیں اور گوشہ نشین رہے آپ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ عبادت کے لئے غار حراء میں چلے جاتے اور جب وہاں کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا تو شہر میں اپنے گھر آتے اور حضرت خدیجہؓ سے کچھ اور دنوں کا توشہ جیسے ستو وغیرہ لے کر اس غار میں چلے جاتے، اور ان چیزوں کے لے جانے کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ بھوک پیاس کی شدت خلوت گزینی کے معمولات میں رکاوٹ نہ ڈالے اور پوری خاطر جمعی کے ساتھ عبادت میں مشغول رہ سکیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے بقدر توشہ اپنے ساتھ رکھنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ محققین نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خلوت گزینی کی مدت ہر سال ایک مہینہ ہوتی تھا اور وہ مہینہ رمضان کا ہوتا تھا۔

اس بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے سابقہ شریعتوں میں سے کس شریعت کی اتباع کرتے تھے یا اپنی عقل سے جس عمل کو اچھا سمجھتے تھے اس پر عامل رہتے تھے اور یا ہر شریعت میں سے ہر اس عمل کو اختیار فرماتے جس کو آپ ﷺ افضل و اعلیٰ سمجھتے تھے؟ اور یہ کہ اگر سابقہ شریعتوں میں سے کس شریعت کی اتباع کرتے تھے تو وہ کونسی شریعت تھی؟ بہت سے علماء نے اگرچہ اس قول کو اختیار کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی نبوت و شریعت کے ظہور سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر عمل کرتے تھے، اسی لئے ایک روایت میں "یتحنث" کے بجائے "یَتَحَنَّفُ" کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ آپ ﷺ دین حنیف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر عمل کرتے تھے لیکن اس سلسلہ میں زیادہ موزوں اور مناسب اور زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ قبل نبوت آنحضرت ﷺ عملی طور پر کسی بھی دین اور کسی بھی شریعت کے تابع نہیں تھے بلکہ براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کے قلب و دماغ کو بصیرت کا وہ نور عطا فرمایا گیا تھا جو نیک اور اچھے عمل کی طرف آپ ﷺ کی رہنمائی کرتا تھا اور اس طرح آپ ﷺ خود بخود وہی کام اور وہی عمل کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ اور مقبول ہوتا تھا۔ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی

عبادت کا تعلق ذکر و شغل سے ہوتا تھا یا فکر و استغراق سے؟ اس بارے میں بھی کئی قول ہیں اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عبادت ذکر و شغل کی صورت میں ہوتی تھی نہ کہ فکر و استغراق کی صورت میں۔

"میں پڑھنا نہیں جانتا۔" کا مطلب یا تو یہ تھا کہ میں اچھی طرح پڑھنے پر قادر نہیں ہوں، یا یہ کہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے یہ جواب اس خوف و دہشت کی بنا پر نکلا جو اچانک ایک فرشتہ کو دیکھنے اور موقع و محل کے نہایت پر رعب ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے دل و دماغ پر طاری ہو گیا تھا، لہٰذا یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ جواب اس لئے دیا کہ آپ ﷺ امی تھے اور واقعۃً پڑھنے پر قادر نہیں تھے، کیونکہ امی (ان پڑھ) اس شخص کو کہتے ہیں جو پڑھنا نہ جانے، اور ظاہر ہے کہ کسی کے پڑھانے اور سکھانے سے پڑھنا (یعنی کسی کی زبان سے کوئی عبارت اور جملہ سن کر اپنی زبان سے ادا کرنا) امی ہونے کے منافی نہیں ہے خصوصاً ایسے شخص کے حق میں جو فصاحت اور ذہانت میں کامل ہو، جہاں تک کسی لکھی ہوئی عبارت کو دیکھ کر پڑھنے یا لکھنے کا تعلق ہے تو یہ چیز امی ہونے کے منافی ہے چنانچہ قاموس میں لکھا ہے! "امی اس شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا اور کتاب پڑھنا نہ جانے۔" بعض روایتوں میں یہ منقول ہے کہ اس موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایک حریری صحیفہ جو جواہرات سے مرصع تھا آنحضرت ﷺ کو دیا اور آنحضرت ﷺ سے کہا کہ اس کو پڑھو، آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں پڑھنا نہیں جانتا" اور ان حریری اوراق میں مجھے کچھ لکھا ہوا نظر نہیں آتا میں کیا پڑھوں۔ اس روایت کی روشنی میں "میں پڑھنا نہیں جانتا" کے معنی زیادہ واضح اور موزوں طور پر متعین کئے جا سکتے ہیں۔

"یہاں تک کہ میں پریشان ہو گیا۔" حَتّٰی بلغ منی الجھد کا یہ ترجمہ اس صورت میں ہے جب کہ لفظ جھد میں حرف "د" منصوب یعنی جَھْدَ پڑھا جائے اور مطلب یہ ہوگا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کو اپنے سینہ سے لگا کر بہت زور سے بھینچا جس سے آنحضرت ﷺ کو کچھ تکلیف بھی محسوس ہوئی اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کا یہ عمل دراصل آنحضرت ﷺ کے وجود پاک میں ملکوتی نور اور قلب مبارک میں وحی کے عرفان کو منتقل کرنے کی ایک ایسی صورت تھی جس کا مقصد آنحضرت ﷺ کو وحی الٰہی کی عظمتوں کے تحمل کی طاقت و قوت فراہم کرنا تھا۔ اور اگر لفظ "جُھْدُ" کے "د" کو مرفوع یعنی جُھْدُ پڑھا جائے تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مجھے اتنے زور سے بھینچا کہ خود انہیں بڑی مشقت اٹھانا پڑی۔

"جس نے تمہیں اور ہر چیز کو پیدا کیا۔" کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنی ذاتی صلاحیت و طاقت یا کسی دوسرے کی مدد پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرنا چاہئے بلکہ ہر معاملہ میں اور ہر مرحلہ میں صرف اللہ تعالیٰ پر تکیہ کرنا چاہئے اور اسی کی مدد کا طلب گار رہنا چاہئے کیونکہ اس نے ہر ایک کو پیدا کیا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اس موقع پر ایک خاص بحث کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے، اس بارے میں اختلافی اقوال ہیں کہ سب سے پہلے قرآن کی کون سی سورت نازل ہوئی ہے؟ جیسا کہ اس روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ جمہور علماء و مفسرین کا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے سورۂ اقرء نازل ہوئی ہے لیکن بعض حضرات نے کہا ہے کہ سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت یا ایھا المدثر ہے، گو یہ قول بہت کمزور ہونے کی وجہ سے قابل اعتنا نہیں ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے اس ضمن میں جو لکھا ہے اس سے ان دونوں اقوال کے درمیان بڑی لطیف تطبیق ہو جاتی ہے، انہوں نے کہا ہے! میرے نزدیک یہ کہنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ اقرء تو حقیقی پہلی سورت ہے اور "یا ایھا المدثر" اضافی پہلی سورت ہے۔ یعنی پہلی وحی (سورۃ اقرء) نازل ہونے کے بعد نزول وحی کا جو سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے منقطع ہو گیا تھا اور پھر یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تو اس وقت سب سے پہلے یا ایھا المدثر نازل ہوئی۔ ضمنی طور پر اس بات کا ذکر بھی موزوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت ان حضرات کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورت کا جزء نہیں ہے بلکہ اس کا نزول دو سورتوں کے درمیان فصل قائم کرنے کے لئے ہوا ہے۔

"جس نے قلم کے ذریعہ بہت سے علم کی تعلیم دی۔" میں "قلم" سے مراد وہ قلم قدرت بھی ہو سکتا ہے جو اللہ کے حکم سے اولین و آخرین کے تمام علوم کو ضبط تحریر میں لایا، اور تمام آسمانی کتابوں کے معرض وجود میں آنے کا اولین ذریعہ بنا اور ہماری دنیا کا یہ قلم بھی مراد ہو سکتا ہے جو درحقیقت اس کائنات انسانی میں قلم قدرت کا مظہر اور مثال ہے اور جس کے ذریعہ انسان خدا کے عطا کردہ نور علم و ذہانت

کی مدد سے نہ معلوم کتنے علوم و حقائق کا اظہار و انکشاف کرتا ہے۔ مشہور تفسیر کشاف میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ: ہمارا یہ قلم اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال کا عظیم مظہر ہے کہ کیسے عجیب و غریب علوم اس کے ذریعہ لکھے جاتے ہیں۔

انسان کو ہر وہ چیز سکھائی جس کو وہ جانتا نہیں تھا۔" کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اپنے بس کی بات نہیں تھی کہ زمان و مکان میں ہر لمحہ وجود پذیر ہونے والی نئی نئی چیزوں کے علم و انکشاف پر قادر ہوتا، یہ تو اللہ کے عطا کردہ اس نور علم و ذہانت کا کرشمہ ہے جو انسان کو علم و معرفت کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں "انسان" سے مراد انسان کامل یعنی آنحضرت ﷺ کی ذات ہو، اس صورت میں کہا جائے گا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے۔

وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۔

"اور ہر وہ چیز آپ (ﷺ) کو سکھائی جو آپ (ﷺ) نہیں جانتے تھے، اور یہ آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔"

"مجھ کو اپنی جان ہے۔" آنحضرت ﷺ کے اس اظہار خوف کی مختلف وجوہ ہو سکتی تھیں، یا تو اس صورت سے آپ ﷺ کو دفعۃً اتنا شدید خوف طاری ہو گیا تھا کہ آپ ﷺ ہلاکت یا دماغی توازن کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ محسوس کرنے لگے تھے، یا یہ کہ آپ ﷺ کو یہ ڈر تھا کہ منصب نبوت کا بار برداشت سے باہر نہ ہو جائے یا اس منصب کے فرائض کی ادائیگی میں جو مصائب و پریشانیاں اٹھانا پڑیں گی، قوم کی طرف سے جن ایذاؤں اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا قتل و غارت گری کی جو دھمکیاں ملیں گی اور لوگ جس طرح تکذیب و استہزاء کا سلوک کریں گے ان پر صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اور یا آپ کو یہ خوف تھا کہ اہل وطن مجھے اپنے شہر اور وطن سے نکال دیں گے جس کی وجہ سے اپنے محبوب وطن اور کعبۃ اللہ کا قرب چھوٹ جائے گا۔

"آپ ﷺ (دوسروں کا) بوجھ اٹھاتے ہیں۔" یہ تَحْمِلُ الْكَلَّ کا ترجمہ ہے، اور کَلَّ اصل میں بوجھ اور بار کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے کہ اہل و عیال کی خبر گیری اور ان کی ضروریات کی کفالت ایک بوجھ اور بار ہوتا ہے۔ اہل و عیال کو بھی "کل" کہا جاتا ہے لہٰذا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ اپنے اہل و عیال اور زیر کفالت لوگوں کے خرچ و اخراجات اور ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ نہایت خوش دلی کے ساتھ اٹھاتے ہیں اور اس راہ میں پیش آنے والی محنت و مشقت بھی آپ ﷺ کو بددل نہیں کرتی اگرچہ وہ لوگ کہ جن کا بوجھ آپ ﷺ اٹھاتے ہیں آپ سے ترک تعلق اور بے مروتی ہی کا معاملہ کیوں نہ کریں۔ واضح رہے کہ یہاں "بوجھ اٹھانے" کے معنی میں ضعیفوں، یتیموں، بیواؤں اور ناداروں پر خرچ کرنا بھی شامل ہے۔

"آپ غریبوں اور مسکینوں پر خرچ کرنے کے لئے کماتے ہیں۔" یہ تکسب المعدوم کا ترجمہ ہے۔ اور یہ ترجمہ اس صورت میں ہے جب کہ تکسب کو تؔ کے زبر کے ساتھ پڑھا جائے، جیسا کہ زیادہ صحیح اور مشہور ہے اور بعض روایتوں میں یہ لفظ تؔ کے پیش کے ساتھ بھی منقول ہے، اس صورت میں ترجمہ یوں ہو گا کہ آپ ﷺ غریبوں اور مسکینوں کی کمانے میں مدد کرتے ہیں، یعنی ان کو روپیہ پیسہ اور مال دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ اس کے ذریعہ کسب و تجارت کی صورت میں اپنی معاشی حالت درست کریں اور افلاس و تنگ دستی سے چھٹکارا پائیں۔ بہر حال دونوں صورتوں میں مفہوم و مطلب ایک ہی ہو گا۔ یعنی نیک کاموں میں اپنا مال خرچ کرنا۔ بعض حضرات نے "معدوم" کا مصداق صرف "فقیر" کو قرار دیا ہے جو عدم تصرف اور بالکل محتاج ہونے کے اعتبار سے گویا ایک لاشہ ہوتا ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ آپ ﷺ اپنا مال فقیروں پر خرچ کر کے گویا ان کی زندگی اور ان میں حرکت و عمل پیدا ہو جانے کا سبب بنتے ہیں۔

آپ ﷺ لوگوں کے حقیقی حادثات و مصائب میں ان کی مدد کرتے ہیں۔" یہ تعین علی نوائب الحق کا ترجمہ ہے نوائب اصل میں نائبۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ مصیبت و ضرورت جو آن پڑے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ہر اس شخص کی مدد و اعانت فرماتے ہیں جو کسی حقیقی حادثہ اور مصیبت کے سبب درماندہ اور عاجز ہو جاتا ہے مثلاً جو قرض یا دیت کے مال کی ادائیگی پر قادر نہیں ہوتا اور فقر و افلاس میں

مبتلا ہونے کی وجہ سے اپنی مصیبت کو ٹال نہیں پاتا آپ ﷺ اس کو مالی مدد دے کر اس مصیبت سے نجات دلاتے ہیں۔ "نوائب الحق" کی قید سے معلوم ہوا کہ اسی مصیبت زدہ کی مدد و اعانت مستحسن و مطلوب ہے جو قدرتی طور پر مجبور و لاچار ہو۔ اگر کوئی شخص اپنی مصیبت کا خود سبب بنا ہو، اس نے اپنی ہی حرکتوں اور بے عملیوں سے اپنے اوپر مصیبت نازل کرلی ہو جیسے اسراف کی صورت میں اپنا مال و زر لٹا بیٹھا ہو، یا ناروا اطوار پر غضب و غصہ کر کے خود کو کسی نقصان اور آفت میں مبتلا کر بیٹھا ہو تو اس کی مدد کرنا مستحسن و مطلوب نہیں ہے۔

حضرت خدیجہؓ نے اس موقع پر آنحضرت کے محاسن و اوصاف کا ذکر کر کے آپ ﷺ کو جس طرح تسلی دی اس سے معلوم ہوا کہ اچھے اخلاق اور اچھی خصلتیں انسان کو کسی نقصان اور آفت میں پڑنے سے بچاتی ہیں اور حق تعالیٰ ان اوصاف و محاسن کے طفیل میں امن و سلامتی عطا فرماتے ہیں اسی لئے حضرت خدیجہؓ نے یہ دلیل پکڑی کہ آپ ﷺ چونکہ اتنی زیادہ انسانی خوبیوں اور اچھی خصلتوں کے حامل ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو دین و دنیا کی ہر آفت و مصیبت سے محفوظ و سلامت رکھے گا۔ اس سے حضرت خدیجہؓ کے بارے میں بھی ثابت ہوا کہ وہ انتہائی فراست و بصیرت، معرفت و فقاہت اور دور اندیشی و سمجھداری کے بلند و بالا مقام پر فائز تھیں، اور کیوں نہ ہوتیں جب کہ مدت دراز تک آنحضرت ﷺ کی زوجیت و خدمت میں رہیں اور آنحضرت ﷺ پر حقیقی معنی میں سب سے پہلے ایمان لائیں، اس وصف میں ان کا کوئی شریک نہیںؓ۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی خاص مصلحت و حکمت کے تحت بعض حالات میں کسی شخص کی اچھائیوں اور خوبیوں کی تعریف اس کے منہ پر کرنا جائز ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اور کوئی شخص کسی معاملہ میں خوف زدہ ہو تو اس کو اطمینان و تسلی دینا اور اس کے سامنے امن و سلامتی کے اسباب کا ذکر کرنا چاہئے۔ نیز اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا فقر اپنا اختیار کردہ اور پسندیدہ تھا، نہ کہ اضطراری اور غیر پسندیدہ تھا جس کا اصل منشاء سخاوت و کرم کے درجہ کمال کا اظہار تھا! علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی واضح ہوئی کہ آنحضرت ﷺ میں ان اچھائیوں اور خوبیوں کا نبوت سے بھی پہلے موجود ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ تمام انسانی و اخلاقی اوصاف و محاسن آپ ﷺ کی ذات میں طبعی و خلقی طور پر تھے۔

"ورقہ ابن نوفل" حضرت خدیجہؓ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے، کیونکہ وہ خالد ابن اسد ابن عبدالعزی کی بیٹی تھیں اور ورقہ، نوفل اس ابن عبدالعزی کے بیٹے تھے۔ ورقہ اگرچہ مشرکین مکہ ہی سے نسبی تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے زمانہ جاہلیت میں نصرانیت، (عیسائی مذہب) اختیار کرلیا تھا، پھر انہوں نے انجیل پر بڑا عبور حاصل کیا اور عربی میں اس کا ترجمہ بھی کیا، ظہور نبوت کے وقت جب حضرت خدیجہؓ آنحضرت کو لے کر ورقہ کے پاس گئیں تو اس زمانہ میں وہ بہت زیادہ ضعیف اور بوڑھے ہو چکے تھے، یہاں تک کہ آنکھوں کی بینائی بھی بالکل ختم ہو گئی تھی۔

"اے ابن عم! اپنے بھتیجے کی روداد سن لیجئے۔" حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کو ورقہ کا بھتیجا محض ورقہ کے بڑھاپے کی بنا پر اور ان کی تعظیم کے پیش نظر کہا نہ کہ آنحضرت ﷺ حقیقت میں ورقہ کے بھتیجے تھے، ویسے یہ عرب میں عام دستور تھا کہ لوگ آپس میں ملاقات و مخاطبت کے وقت ایک دوسرے کو چچا، بھتیجا کہتے تھے۔

یہ تو وہی ناموس (فرشتہ) ہے...... الخ"۔ ناموس اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بادشاہ کا رازدار اور معتمد علیہ ہو، اس مناسبت سے اہل کتاب حضرت جبرئیل علیہ السلام کو "ناموس" کہا کرتے تھے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ "ناموس خیر (اچھی باتوں) کے رازدار کو کہتے ہیں اور "جاموس" شر (بری باتوں) کے رازدار کو کہا جاتا ہے۔ ورقہ ابن نوفل چونکہ نصرانیت کے پیرو تھے اس اعتبار سے ان کے لئے مناسب اور موزوں یہ تھا کہ وہ یوں کہتے "یہ وہی ناموس ہے جس کو اللہ تعالیٰ وحی دے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجتا تھا۔" لیکن انہوں نے بے جا طور پر دینی تعصب کا شکار ہونے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بجائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کتاب و شریعت کی جامعیت کے اعتبار سے زیادہ جلیل القدر پیغمبر تھے۔

"تو پوری طاقت و قوت سے تمہاری مدد کروں گا۔" کے تحت بعض علماء اور شارحین نے تو یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر ورقہ کے ایمان لانے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، اگر یہ واقعہ نبوت کے ثابت وظاہر ہونے کے بعد کا ہے تو ظاہر ہے کہ ورقہ کو صحابی کہا جائے گا۔ اور اگر اس واقعہ کا تعلق اظہار نبوت کے بالکل ابتدائی مراحل سے ہے تو اس صورت میں ورقہ کو صحابی نہیں کہا جائے گا۔ اور ملا علی قاریؒ نے قاموس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ورقہ کے ایمان و اسلام کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے۔

"اور پھر آنحضرت ﷺ پر وحی آنے کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔" یعنی جب آنحضرت ﷺ پر یہ پہلی وحی آئی اور آپ ﷺ کی نبوت ثابت وظاہر ہوگئی تو اس کے بعد وحی آنی موقوف ہوگئی، بعض حضرات کہتے ہیں کہ پھر تین سال تک کوئی وحی نہیں آئی، بعض حضرات نے یہ مدت چھ ماہ اور بعض نے اڑھائی ماہ بیان کی ہے۔ نیز علامہ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: سلسلہ وحی کے منقطع ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سورۂ اقرء اور یا ایہا المدثر کے نزول کے درمیان آنحضرت ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آمد کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا بلکہ انقطاع وحی سے مراد نزول قرآن کے سلسلہ کا موقوف ہو جانا ہے، اس عرصہ میں حضرت جبرائیل علیہ السلام تو آتے رہتے تھے لیکن قرآن نہیں لاتے تھے اور کچھ عرصہ کے لئے نزول وحی کے موقوف ہو جانے میں مصلحت وحکمت یہ تھی کہ ابتدائی مرحلہ پر آنحضرت ﷺ کے دل میں جو خوف وہراس پیدا ہو گیا تھا اس کے اثرات زائل ہو جائیں اور اس خوف وہراس کی جگہ شوق وانتظار کے جذبات پیدا ہو جائیں ۔

دیر ست کہ دلدار پیامے نہ فرستاد   ننوشت سلامے و کلامے نہ فرستاد

انقطاع کے بعد پہلی وحی

(٦) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْيِ قَالَ فَبَيْنَا اَنَا اَمْشِيْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِيْ فَاِذَا الْمَلَكُ الَّذِيْ جَاءَنِيْ بِحِرَاءٍ قَاعِدٌ عَلٰى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ فَجُئِثْتُ مِنْهُ رُعْبًا حَتّٰى هَوَيْتُ اِلَى الْاَرْضِ فَجِئْتُ اَهْلِيْ فَقُلْتُ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ فَزَمَّلُوْنِيْ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ثُمَّ حَمِيَ الْوَحْيُ وَتَتَابَعَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ سے کچھ دنوں کے لئے انقطاع وحی اور پھر سلسلہ وحی کے دوبارہ شروع ہونے کا حال اس طرح سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (ایک دن مکہ کے کسی راستہ پر یا حراء پہاڑ پر) میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں ایک آسمانی آواز آئی، میں نے اوپر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غار حراء میں میرے پاس آیا تھا، زمین و آسمان کے درمیان ایک تخت پر بیٹھا ہوا ہے (اس پر نظر پڑتے ہی) میرے دل میں اتنا سخت رعب اور خوف پیدا ہو گیا کہ میں (بے ساختہ) زمین پر گر پڑا، پھر میں (اٹھ کر) اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کپڑا اڑھادو، مجھے کپڑا اڑھادو، چنانچہ گھر والوں نے مجھ کو کپڑا اڑھادیا (اور میں اس کپڑے میں دبک کر لیٹ گیا، جب ہی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اے کپڑا اوڑھنے والے اٹھو اور مخلوق کو ڈراؤ اور اپنے رب کو ہی بڑا جانو اور اپنے کپڑوں کو پاک کرو اور پلیدی کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد وحی گرم ہوگئی یعنی مسلسل آنے لگی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "اور مخلوق کو ڈراؤ۔" کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کو تو عذاب خداوندی سے ڈراؤ تاکہ وہ کفر وشرک کی راہ چھوڑ کر ایمان واسلام کے راستہ پر لگ جائیں اور اہل ایمان کو طرح طرح کے اجر وثواب کی بشارت دو تاکہ زیادہ سے زیادہ اچھے کام کرنے کی تحریک اور جذبہ ان میں پیدا ہو۔

"اور اپنے رب ہی کو بڑا جانو۔" کا مطلب یہ ہے کہ بڑائی اور کبریائی کا مالک صرف پروردگار کو جانو، اور اس اعتبار سے صرف اسی کو

قابل تعظیم مان کر اس کے آگے سر جھکاؤ، اس جیسا بڑا کسی اور کو نہ جانو، اور جب بھی غیر اللہ کی طرف سے کوئی بات پیش آئے تو اللہ اکبر کہو۔ منقول ہے کہ جب یہ حکم نازل ہوا تو آنحضرت ﷺ کی زبان سے بے ساختہ اللہ اکبر نکلا اور پھر حضرت خدیجہؓ نے بھی یہ نعرۂ تکبیر بلند کیا، انہیں بے حد مسرت وطمانیت محسوس ہوئی اور ان کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی ہے۔

"اور اپنے کپڑوں کو پاک کرو۔" یعنی اپنے لباس اور اپنے کپڑوں کو نجاست وناپاکی سے محفوظ رکھو اور پاک وستھرائی کی طرف دھیان دو۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ: "کپڑوں کو پاک کرنے میں" کپڑوں سے مراد انسانی صفات ومحاسن ہیں اور "پاک" کرنے سے مراد بری خصلتوں اور خراب باتوں سے اجتناب کرنا ہے۔

"اور پلیدی کو چھوڑ دو۔" سے مراد شرک وگناہ سے اجتناب کرنا اور اس اجتناب پر پابندی کے ساتھ قائم رہنا۔

"بعض شارحین نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے راوی نے اقتصار واختصار کے پیش مذکورہ آیتوں کے آخری حصے کو نقل نہیں کیا ہے جو یہ ہے۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔

"اور کسی کو اس غرض سے مت دو (کہ دوسرے وقت) زیادہ چاہو اور اپنے رب (کی خوشنودی کے لئے) صبر کرو۔"

تفسیر مدارک میں مذکورہ بالا روایت حضرت جابر کے الفاظ میں یوں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں (ایک دن) حراء پہاڑ پر تھا کہ کسی نے ان الفاظ میں مجھے آواز دی یا محمد انک رسول اللہ (اے محمد بلاشبہ تم اللہ کے رسول ہو) میں نے دائیں بائیں دیکھا، پھر اوپر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مجھے آواز دینے والا فرشتہ ہے جو زمین وآسمان کے درمیان ایک تخت پر بیٹھا ہوا ہے، میں اس کو دیکھ کر سہم گیا اور خدیجہؓ کے پاس واپس آکر کہا کہ مجھے کپڑا اڑھاؤ، چنانچہ خدیجہؓ نے مجھ کو کپڑا اڑھادیا، جب ہی جبرائیل آئے اور مجھے یہ پڑھایا، یا ایھا المدثر الخ اس کے بعد روایت کے وہی الفاظ میں جو اوپر نقل ہوئے۔

وحی کس طرح آتی تھی

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ حَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ يَاْتِيْكَ الْوَحْيُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْيَانًا يَاْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّ عَلَيَّ فَيُفْصِمُ عَنِّيْ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَاَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِيْ فَاَعِيْ مَا يَقُوْلُ قَالَتْ عَائِشَةُ وَلَقَدْ رَاَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَاِنَّ جَبِيْنَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حارث ابن ہشامؓ نے (جو ابوجہل کے بھائی تھے اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے تھے) رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: میرے پاس وحی کبھی تو گھنٹال کی آواز کی طرح آتی ہے۔ (یعنی وحی کے الفاظ جو مجھ تک پہنچائے جاتے ہیں گھنٹال کی آواز کی طرح کا صوتی آہنگ رکھتے ہیں) اور یہ وحی مجھ پر سخت ترین وحی ہوتی ہے، چنانچہ فرشتہ، وحی کے جو الفاظ مجھ تک پہنچاتا ہے میں اس کو بڑی محنت اور توجہ سے سن کر یاد کرتا ہوں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل اختیار کر کے مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے میں اس کو محفوظ اور یاد کر لیتا ہوں۔" حضرت عائشہؓ (یہ بیان کر کے) کہتی ہیں!۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب شدید سردی کے دن ہوتے تھے اور آنحضرت ﷺ پر وحی اترتی تھی اور فرشتہ وحی پہنچا کر چلا جاتا تھا تو آپ ﷺ کی پیشانی پسینہ سے شرابور نظر آتی تھی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "اور یہ وحی مجھ پر سخت ترین وحی ہوتی ہے۔" یعنی اس وحی کے الفاظ اور مفہوم ومقصد کو سمجھنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے کیونکہ ایسی بات کو سمجھنا جس کے الفاظ غیر مانوس صوتی آہنگ (مثلاً گھنٹال کی آواز جیسا آہنگ) رکھتے ہوں سخت دشوار ہوتا ہے، اس کی بہ

نسبت وہ بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہے جو کسی انسان سے ہمکلامی و مخاطبت اور مانوس صوتی آہنگ کی صوت میں ہو۔

"فرشتہ انسان کی شکل اختیار کر کے........الخ۔" کے تحت شارحین نے یہ مشہور قول لکھا ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام انسان کی شکل میں آتے تھے تو زیادہ تر ایک صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل و صورت میں آتے تھے نیز علماء نے لکھا ہے کہ استفادہ اور استفاضہ کے لئے یہ بنیادی شرط ہے کہ بات کہنے والے اور اس بات کو سننے والے کے درمیان وہ مناسبت ہونی چاہئے جو ایک کو دوسرے سے وحشت زدہ نہ کرے، چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملکیت اور روحانیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غالب کر دی جاتی تھی اور کچھ عرصہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشریت سے جدا کر دیا جاتا تھا، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل کے ساتھ ملکوتی مناسبت حاصل ہو جاتی تھی یہ وہ صورت ہوتی تھی جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول وحی کا پہلا طریقہ بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کو حضرت جبرئیل علیہ السلام پر غالب کر دیا جاتا تھا اور وہ کچھ عرصہ کے لئے وصف بشریت کے حامل ہو جاتے تھے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے درمیان بشری مناسبت پیدا ہو جاتی تھی، یہ وہ صورت ہوتی تھی جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول وحی کا دوسرا طریقہ بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ لیکن یہ ساری بحث اس وقت ہے جب کہ یہ مانا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو صلصلة الجرس (گھنٹال کی آواز) سے تعبیر فرمایا ہے وہ نفس وحی کی آواز ہوتی تھی جیسا کہ حدیث کی ظاہری عبارت سے واضح ہوتا ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ صلصلة الجرس کی طرح وہ آواز دراصل حضرت جبرئیل علیہ السلام کی اپنی آواز ہوتی تھی جو وحی پہنچانے سے پہلے ان سے ظاہر ہوتی تھی، اور پہلے ان کی اس آواز کے ظاہر ہونے کی حکمت یہ ہوتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو جائیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعت وحی کے اصل الفاظ سننے کے لئے اس طرح تیار اور خالی ہو جائے کہ وحی کے علاوہ اور کسی آواز کے لئے اس (سماعت) میں جگہ ہی نہ رہے، اور اسی لئے نزول وحی کی یہ (پہلی) صورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑی سخت ہوتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر ذہنی و فکری طاقت مجتمع ہو کر صرف وحی کی طرف متوجہ رہتی تھی۔

"........تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پسینہ سے شرابور نظر آتی تھی۔" بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت اس صورت میں پیش آتی تھی جب نزول وحی کا پہلا طریقہ عمل میں آتا تھا، لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں صورتوں میں یہ کیفیت پیش آتی ہو۔

نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت و حالت

(۸) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ كُرِبَ لِذٰلِكَ وَتَرَبَّدَ وَجْهُهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ نَكَسَ رَأْسَهٗ وَنَكَسَ اَصْحَابُهٗ رُؤُسَهُمْ فَلَمَّا اُتْلِيَ عَنْهُ رَفَعَ رَأْسَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو اس کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غم لاحق ہو جاتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر جھکا لیتے تھے اور (اس وقت جو صحابہ (موجود ہوتے وہ) بھی اپنا سر جھکا لیتے تھے، جب وحی اترنا موقوف ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم (اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی) اپنا سر اٹھا لیتے۔" (مسلم)

تشریح: "تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غم لاحق ہو جاتا تھا۔" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی شخص کو اس کی کوئی بہت ہی اہم ذمہ داری غم اور فکر میں مبتلا کر دیتی ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وحی کو بجنسہ یاد و محفوظ رکھنے اور دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری کا سخت غم اور فکر کرتے تھے، اور اس ذمہ داری کی ادائیگی کا اہتمام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلکان کر دیتا تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۔

"(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ قبل اختتام وحی قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی لیں، اس (قرآن) کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قلب و

حافظہ میں) جمع و محفوظ کرا دینا، اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔"

یا یہ غم و فکر آپ ﷺ کو اس سبب سے ہوتا تھا کہ نازل ہونے والی وحی میں غیظ و غضب، سزا و عذاب کا اظہار کرنے والی آیات بھی ہوتی تھیں اور آپ ﷺ ان آیات کی بناء پر اپنی اُمت کے حق میں سخت فکر مند اور غمگین ہو جاتے تھے کہ کہیں میری اُمت کے لوگ اس غیظ و غضب اور عذاب کے مستوجب نہ ہو جائیں۔

صحابہؓ کا سر جھکا لینا یا تو اس بناء پر ہوتا تھا کہ اس وقت آنحضرت ﷺ پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی، کمال تعلق و محبت کی وجہ سے ان کا اثر صحابہؓ میں بھی سرایت کر جاتا تھا، یا یہ کہ صحابہؓ جب آپ ﷺ کو سر جھکاتے دیکھتے تو آپ ﷺ کی اتباع میں وہ بھی اپنا سر جھکا لیتے تھے۔

خدا کے دین کی پہلی دعوت

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى صَعِدَ الصَّفَا فَجَعَلَ يُنَادِيْ يَا بَنِيْ فِهْرٍ يَا بَنِيْ عَدِيٍّ لِبُطُوْنِ قُرَيْشٍ حَتّٰى اجْتَمَعُوْا فَجَعَلَ الرَّجُلُ اِذَا لَمْ يَسْتَطِعْ اَنْ يَّخْرُجَ اَرْسَلَ رَسُوْلًا لِيَنْظُرَ مَا هُوَ فَجَآءَ اَبُوْلَهَبٍ وَ قُرَيْشٌ فَقَالَ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَخْبَرْتُكُمْ اَنَّ خَيْلًا تَخْرُجُ مِنْ صَفْحِ هٰذَا الْجَبَلِ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّ خَيْلًا تَخْرُجُ بِالْوَادِيْ تُرِيْدُ اَنْ تُغِيْرَ عَلَيْكُمْ اَكُنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ قَالُوْا نَعَمْ مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ اِلَّا صِدْقًا قَالَ فَاِنِّيْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ قَالَ اَبُوْلَهَبٍ تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا فَنَزَلَتْ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ (اس حکم کی تعمیل کے لئے فوراً) نکل پڑے اور کوہ صفا پر چڑھ کر (قریش کے قبائل کو) پکارنا شروع کیا: اے فہر کی اولاد! اے عدی کی اولاد! اس طرح آپ ﷺ نے قریش کی تمام شاخوں کو نام بنام پکارا۔ چنانچہ (آپ ﷺ کی اس آواز پر) قریش کے تمام قبائل اور گروہ (آپ ﷺ کے گرد) جمع ہو گئے یہاں تک کہ جو شخص (کسی عذر اور مجبوری کے سبب) خود اس جگہ نہ پہنچ سکا تو اس نے (یہ) معلوم کرنے کے لئے (کہ محمد ﷺ نے کیوں سب کو بلایا ہے) کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیا۔ غرضکہ جب سب اہل قریش اور (آنحضرت ﷺ کا چچا) ابولہب آ گئے تو آپ ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ (جنگجو) سواروں کا ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ۔ سواروں کا ایک دستہ (مکہ کے) جنگل سے نمودار ہوا ہے اور اس کا مقصد قتل و غارت گری کے لئے (دن یا رات کے کسی حصہ میں) تم لوگوں پر اچانک ٹوٹ پڑنا ہے تو بتاؤ کہ کیا تم لوگ میری اس بات کو سچ مانو گے۔" سب نے (ایک زبان ہو کر) کہا کہ ہاں (ضرور سچ مانیں گے) کیونکہ ہم نے تمہیں ہمیشہ سچا پایا ہے۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا! "(تو سنو) میں تم لوگوں کو اس سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو (دنیا یا آخرت میں) تمہارے سامنے پیش (آنے والا) ہے۔" (یہ سننا تھا کہ) ابولہب (بھبک اٹھا اور) کہنے لگا: "ہلاکت اور نقصان میں پڑو تم، کیا تم نے ہمیں اس لئے جمع کیا تھا!؟۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (ہلاک ہو جائے ابولہب، اور وہ ہلاک ہو گیا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ میں يَدَا کا لفظ (جس کے معنی "دونوں ہاتھ" کے ہیں) زائد ہے، یا اس کے دونوں ہاتھوں سے مراد اس کا پورا وجود ہے، اور چونکہ تمام اعضاء انسانی میں ہاتھ ہی ایسا عضو ہے جس سے انسان اپنے تمام خارجی کام کاج کرتا ہے اور اس کا بیشتر انحصار ہاتھوں ہی پر ہوتا ہے، اس اعتبار سے ہاتھ بول کر پورا وجود مراد لیا جاتا ہے جیسا کہ ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ۔ نیز بعض روایتوں میں یہ آیا ہے کہ اس موقع پر ابولہب کے دونوں ہاتھوں میں پتھر تھے، اور جب اس نے آنحضرت ﷺ کی زبان سے مذکورہ الفاظ سنے تو انتہائی غصہ کی حالت میں وہ پتھر آنحضرت کی طرف پھینکے۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہو گا: ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے۔

دعوت حق کی پاداش میں عمائدین قریش کی بدسلوکی اور ان کا عبرتناک انجام

⑮ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ بَیْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ عِنْدَ الْکَعْبَۃِ وَجَمْعُ قُرَیْشٍ فِیْ مَجَالِسِھِمْ اِذْقَالَ قَائِلٌ اَیُّکُمْ یَقُوْمُ اِلٰی جَزُوْرِاٰلِ فُلَانٍ فَیَعْمَدُ اِلٰی فَرْثِھَا وَدَمِھَا وَسَلَاھَا ثُمَّ یُمْھِلُہٗ حَتّٰی اِذَا سَجَدَ وَضَعَہٗ بَیْنَ کَتِفَیْہِ فَانْبَعَثَ اَشْقَاھُمْ فَلَمَّا سَجَدَ وَضَعَہٗ بَیْنَ کَتِفَیْہِ وَ ثَبَتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَاجِدًا فَضَحِکُوْا حَتّٰی مَالَ بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنَ الضَّحْکِ فَانْطَلَقَ مُنْطَلِقٌ اِلٰی فَاطِمَۃَ فَاَقْبَلَتْ تَسْعٰی وَثَبَتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَاجِدًا حَتّٰی اَلْقَتْہُ عَنْہُ وَاَقْبَلَتْ عَلَیْھِمْ تَسُبُّھُمْ فَلَمَّا قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوۃَ قَالَ اَللّٰھُمَّ عَلَیْکَ بِقُرَیْشٍ ثَلٰثًا وَکَانَ اِذَا دَعٰی دَعٰی ثَلَاثًا وَاِذَا سَاَلَ سَاَلَ ثَلٰثًا اَللّٰھُمَّ عَلَیْکَ بِعَمْرِو بْنِ ھِشَامٍ وَعُتْبَۃَ بْنِ رَبِیْعَۃَ وَشَیْبَۃَ ابْنِ رَبِیْعَۃَ وَالْوَلِیْدَبْنِ عُتْبَۃَ وَاُمَیَّۃَ بْنِ خَلْفٍ وَعُقْبَۃَ بْنِ اَبِیْ مُعَیْطٍ وَعُمَارَۃَ بْنِ الْوَلِیْدِ قَالَ عَبْدُاللّٰہِ فَوَاللّٰہِ لَقَدْرَاَیْتُھُمْ صَرْعٰی یَوْمَ بَدْرٍ ثُمَّ سُحِبُوْا اِلَی الْقَلِیْبِ قَلِیْبِ بَدْرٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاُتْبِعَ اَصْحَابُ الْقَلِیْبِ لَعْنَۃً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) جب کہ رسول کریم ﷺ خانہ کعبہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے اور وہاں (کعبہ کے پاس) قریش (کے عمائدین) کا ایک گروہ مجلس جمائے بیٹھا تھا اچانک ان میں سے ایک شخص نے کہا کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو اٹھ کر فلاں محلّہ اور قبیلہ میں) جائے جہاں فلاں خاندان میں ایک اونٹ ذبح کیا گیا ہے اور اس (اونٹ کی) غلاظت سے بھری ہوئی اوجھڑی، اس کا خون اور اس کا پوست اٹھالائے اور ان سب گندی اور غلیظ چیزوں کو) رکھ لے، پھر جب محمد ﷺ سجدہ میں جائیں تو وہ ان سب چیزوں کو ان کے دونوں مونڈھوں کے درمیان ڈال دے۔ (یہ سن کر) ایک انتہائی بدبخت شخص (عقبہ ابن معیط ابوجہل) اٹھا اور چیزوں کو لانے کے لئے چلا گیا (اور یہ سب چیزیں لے کر آگیا) چنانچہ جب آنحضرت ﷺ سجدہ میں گئے تو اس نے ان چیزوں کو آنحضرت ﷺ کے مونڈھوں کے درمیان رکھ دیا اور آنحضرت ﷺ (ان گندی چیزوں کا بوجھ اٹھا نہ سکے اور) سجدے میں پڑے رہ گئے، وہ بدبخت یہ دیکھ کر ہنسنے اور ٹھٹھا مارنے لگے اس ہنسی میں اس قدر بدحال ہوئے اور ہنستے ہنستے ایک دوسرے پر گر گئے، جب ہی کسی شخص نے جا کر حضرت فاطمہؓ سے کہہ دیا، حضرت فاطمہؓ دوڑی ہوئی آئیں اور نبی کریم ﷺ اس وقت تک (ان غلاظتوں میں دبے ہوئے) سجدہ میں پڑے تھے، حضرت فاطمہؓ نے ان تمام چیزوں کو آپ ﷺ کی پشت پر سے اٹھا کر پھینکا اور ان بدبختوں کی طرف متوجہ ہو کر ان کو برا بھلا کہنے لگیں، جب رسول کریم ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو دعا کی: اے اللہ تو ان قریش کو سخت پکڑ، یعنی مشرکین قریش کو ہلاک و برباد فرما۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگتے تو تین بار التجا کرتے۔ پھر عمومی طور پر قریش کے حق میں بددعا فرمانے کے بعد خاص طور سے ان ازلی بدبختوں کا نام لے کر یوں بددعا فرمائی: اے اللہ! تو عمرو ابن ہشام (ابوجہل) کو عتبہ ابن ربیعہ اور شیبہ ابن ربیعہ (دونوں بھائیوں) کو ولید بن عتبہ کو، امیہ ابن خلف کو، عقبہ ابن معیط، اور عمارہ ابن ولید کو سخت پکڑ۔" حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ (راوی) نے (یہ روایت بیان کر کے) کہا کہ خدا کی قسم میں نے جنگ بدر کے دن مذکورہ کافروں کا ہلاک شدہ زمین پر پڑے دیکھا، پھر ان کو میدان سے کھینچ کر ایک کنوئیں میں، جو مقام بدر کا کنواں تھا پھینک دیا گیا اور (اس وقت) آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: ان لوگوں کو جو کنوئیں میں پھینکے گئے ہیں، ملعون قرار دے دیا گیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "اچانک ان میں سے ایک شخص نے کہا" کے تحت شارحین نے لکھا ہے کہ وہ شخص ابوجہل تھا! نیز ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو نماز اور عبادت میں مشغول دیکھ کر اور آپ ﷺ کی طرف اشارہ کر کے ان میں سے ایک شخص نے کہا: الا ینتظرون الی ھٰذا المرائی (ذرا اس ریاکار کو تو دیکھو۔

اس واقعہ کے وقت حضرت فاطمہؓ بہت چھوٹی عمر کی تھیں کیونکہ ان کی پیدائش کے وقت آنحضرت ﷺ کی عمر اکتالیس سال کی تھی، لیکن اس بچپنے میں بھی یہ حضرت فاطمہؓ کی غیر معمولی عالی ہمتی تھی کہ وہ اس خبر کو سنتے ہی عمائدین قریش کے بھرے مجمع میں بھاگی چلی آئیں، اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے بڑی ہمت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی پشت پر سے وہ تمام گندی اور غلیظ چیزیں اٹھا کر پھینکیں، بلکہ ان سب کافروں کو منہ در منہ برا بھلا کہا اور کسی کو بھی ان کے مقابلہ پر آنے کی مجال نہیں ہوئی۔

آنحضرت ﷺ نے مشرکین مکہ میں سے جن لوگوں کے نام لے لے کر ان کے حق میں بددعا فرمائی وہ دراصل خدا کے دین ورسول ﷺ کے دشمنوں کے زبردست سرغنہ تھے اور قریش مکہ کے عمائدین شمار ہوتے تھے، یہی لوگ تھے جو آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک کو تکلیف ونقصان پہنچانے کی کاروائیوں اور سازشوں میں پیش پیش رہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کی ایذا رسانی پر بے مثال صبر وتحمل کا ثبوت دیا، مدتوں برداشت سے کام لیتے رہے، آخر کار جب اللہ تعالیٰ نے انکی تباہی وبربادی کا فیصلہ فرما لیا تو آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے ان کے حق میں بددعا کے الفاظ جاری ہوگئے اور ایک ایک کر کے یہ سارے بدبخت اپنے برے حشر کو پہنچے ۔

لطف حق گرچہ موا ساہا کند لیک چوں از حد بشد رسوا کند

"ان لوگوں کو جو کنوئیں میں پھینکے گئے ہیں، ملعون قرار دے دیا گیا ہے۔" آنحضرت ﷺ نے یہ الفاظ تو صحابہ کی طرف روئے سخن کر کے فرمائے اس کے بعد آپ ﷺ نے کنوئیں میں پھینکی گئی ان مشرکین کی لاشوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: بلاشبہ ہم نے اس چیز (یعنی فتح ونصرت) کو پالیا جس کا ہم سے ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا اور یقیناً تم نے بھی وہ چیز (یعنی عذاب اور سخت ترین سزا) پالی ہوگی جس کا تم سے تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا۔" حدیث کے یہ آخری الفاظ گو یہاں نقل نہیں کئے گئے ہیں، لیکن کتاب الجہاد کی ایک روایت میں نقل ہو چکے ہیں۔ نیز ان تمام عمائدین قریش اور مشرکین مکہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ سب جنگ بدر میں ہلاک وبرباد ہوئے اور ان کی لاشوں کو کنوئیں میں ڈال دیا گیا، اکثر کے اعتبار سے ہے کہ ان میں سے زیادہ تر مشرکوں کا یہی حال ہوا اور ان میں سے بعض مشرکین مثلاً عمارہؓ بن ولید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جنگ بدر میں شریک نہیں تھا بلکہ حبشہ میں مرا، اسی طرح عقبہ ابن ابو معیط جنگ بدر سے توبچ کر آگیا تھا مگر بعد میں بڑی بری طرح مارا گیا، نیز امیہ ابن خلف جنگ بدر ہی میں مارا گیا تھا مگر اس کی لاش اتنی زیادہ پھول گئی تھی کہ بھاری ہو جانے کے سبب اس کو کھینچ کر کنوئیں میں نہیں ڈالا جاسکا، یہ ساری تفصیل سیرت وتاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اس حدیث کے بارے میں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی پشت مبارک پر ناپاک اور گندی چیزیں ڈال دی گئی تھیں تو یقیناً آپ ﷺ کا بدن مبارک اور کپڑے ناپاک ہو گئے ہوں گے تو اس کے باوجود آپ ﷺ نماز میں بدستور کیسے مشغول رہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب خون وغیرہ اور مشرکین کے ذبیحہ کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے آپ ﷺ کی نماز پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا جیسا کہ شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے جب کپڑے کو شراب لگ جاتی تھی تو اس کپڑے میں نماز پڑھ لیتے تھے اور وہ نماز ہو جاتی تھی۔

عقبہ کے سخت ترین مصائب اور آپ ﷺ کا کمال تحمل وترحم

(۱۱) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ اَتٰى عَلَيْكَ يَوْمٌ كَانَ اَشَدَّ مِنْ يَوْمِ اُحُدٍ فَقَالَ لَقَدْ لَقِيْتُ مِنْ قَوْمِكِ وَكَانَ اَشَدَّ مَا لَقِيْتُ مِنْهُمْ يَوْمَ الْعَقَبَةِ اِذْ عَرَضْتُ نَفْسِىْ عَلَى ابْنِ عَبْدِ يَالَيْلَ بْنِ كُلَالٍ فَلَمْ يُجِبْنِىْ اِلٰى مَا اَرَدْتُ فَانْطَلَقْتُ وَاَنَا مَهْمُوْمٌ عَلٰى وَجْهِىْ فَلَمْ اَسْتَفِقْ اِلَّا بِقَرْنِ الثَّعَالِبِ فَرَفَعْتُ رَاْسِىْ فَاِذَا اَنَا بِسَحَابَةٍ قَدْ اَظَلَّتْنِىْ فَنَظَرْتُ فَاِذَا فِيْهَا جِبْرَئِيْلُ فَنَادَانِىْ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ وَمَا رَدُّوْا عَلَيْكَ وَقَدْ بَعَثَ اِلَيْكَ مَلَكَ الْجِبَالِ لِتَاْمُرَهٗ بِمَا شِئْتَ

فِيهِمْ قَالَ فَنَادَانِي مَلَكُ الْجِبَالِ فَسَلَّمَ عَلَيَّ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ وَأَنَا مَلَكُ الْجِبَالِ وَقَدْ بَعَثَنِي رَبُّكَ إِلَيْكَ لِتَأْمُرَنِي بِأَمْرِكَ إِنْ شِئْتَ أَنْ أُطْبِقَ عَلَيْهِمُ الْأَخْشَبَيْنِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ أَرْجُوا أَنْ يُخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (ایک دن) عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! کیا احد کے دن سے بھی زیادہ سخت کوئی دن آپ (ﷺ) پر گذرا ہے؟ (احد کی جنگ میں آنحضرت ﷺ کو بہت زیادہ مصیبتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کا ذکر آگے کی حدیث میں آرہا ہے)۔ آنحضرت ﷺ نے (حضرت عائشہؓ کا یہ سوال سن کر) فرمایا: تمہاری قوم کی طرف سے جو صورت حال پیش آئی تھی وہ احد کے دن سے کہیں زیادہ مجھ پر سخت تھی اور یہ عقبہ کے دن کا واقعہ ہے جب میں نے تمہاری اس قوم سے ایسی سخت اذیتیں اٹھائیں جن سے زیادہ سخت اذیتیں ان کی طرف سے عمر بھر مجھے کبھی نہیں پہنچیں، ہوا یہ تھا کہ میں اس دن ابن عبد یالیل ابن کلال کے پاس پہنچا (اور اس کو اسلام قبول کرنے کی تلقین کی) لیکن اس نے میری (تلقین پر کوئی توجہ نہیں دی اور میں رنجیدہ و غمگین اپنے منہ کی سیدھ میں چل پڑا (اور چلتا ہی رہا) یہاں تک کہ قرن ثعالب پہنچ کر میرے حواس قابو میں آئے، میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک (بڑا) ابر کا ٹکڑا ہے جو مجھ پر سایہ کئے ہوئے ہے اور پھر اچانک میری نظر اس ابر کے ٹکڑے میں جبرئیل علیہ السلام پر پڑی۔ جبرئیل علیہ السلام نے مجھے مخاطب کیا اور کہا کہ آپ ﷺ کے پروردگار نے آپ ﷺ کی قوم کی بات سن لی اور اس کا وہ جواب بھی سن لیا جو اس نے آپ ﷺ کو دیا ہے (یعنی آپ ﷺ کی قوم کا آپ ﷺ کو برا بھلا کہنا، آپ ﷺ کو جھٹلانا اور آپ ﷺ کو ایذا پہنچانا سب معلوم ہے) اور اب اس (پروردگار) نے آپ ﷺ کی خدمت میں پہاڑوں کے فرشتہ کو (جس کے سپرد تمام روئے زمین کے کوہ و جبل کی عملداری ہے) اس لئے بھیجا ہے کہ آپ ﷺ اپنی قوم (کی ہلاکت و تباہی اور ان تمام ظالموں کو پہاڑوں میں دبا دینے) کے بارے میں جو چاہیں حکم صادر فرمائیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتہ نے مجھ کو (یا نبی! یا یا محمد! کہہ کر) مخاطب کیا اور سلام کر کے کہا کہ اے محمد (ﷺ)! اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کی قوم کی بات سن لی ہے، میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں، مجھ کو آپ (ﷺ) کے پروردگار نے آپ (ﷺ) کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ آپ (ﷺ) مجھے اپنے فیصلہ کی تعمیل کا حکم دیں، اگر آپ (ﷺ) فرمائیں تو میں آپ (ﷺ) کی قوم کے لوگوں پر ان دونوں پہاڑوں اخشبین کو الٹ دوں (جن کے نیچے دب کر سب کے سب نیست و نابود ہو جائیں) رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا: "(میں ان کی ہلاکت کا خواہاں نہیں ہوسکتا) بلکہ میں تو یہ امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں سے ایسے لوگ پیدا فرما دے جو صرف اسی ایک خدا کی عبادت کریں اور کسی بھی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں (یعنی نہ شرک جلی میں مبتلا ہوں اور نہ شرک خفی میں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "عقبۃ" اصل میں تو اس راستہ کو کہتے ہیں جو دو پہاڑوں کے درمیان گذرتا ہے، لیکن بظاہر یہاں عقبہ سے مراد وہ جگہ ہے جو منی میں واقع ہے اور جس کی طرف جمرہ کی نسبت کر کے جمرۃ العقبہ کہتے ہیں! آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ حج کے زمانہ میں اور عام اجتماعات کی جگہ پر لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے ان کے سامنے خدا کا پیغام رکھتے تھے، ان کو نیک کاموں کی تلقین و تبلیغ کرتے اور برے کاموں سے باز رکھنے کے لئے خدا کے عذاب سے ڈراتے، چنانچہ اس دن بھی یہی ہوا کہ آپ ﷺ نے عقبہ کے مقام پر جمع لوگوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور تمام قبائل کو خدا کا دین قبول کر لینے کی تبلیغ فرمائی، اسی ضمن میں آپ ﷺ وہاں سے چل کر قبیلہ ثقیف میں پہنچے اور اس قبیلہ کے ایک سردار ابن عبد یالیل ابن کلال کو اسلام کی دعوت دی، لیکن نہ صرف یہ کہ ان لوگوں پر آپ ﷺ کی دعوت و تبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوا اور کسی نے آپ ﷺ کی بات مانی بلکہ وہاں کے جاہلوں اور ظالموں نے آپ ﷺ کے ساتھ انتہائی انسانیت سوز سلوک کیا، آپ ﷺ کو گالیاں دیں، سخت ایذائیں پہنچائیں، انتہا یہ کہ آپ ﷺ پر بے تحاشہ پتھر برسائے جس سے آپ ﷺ خون میں شرابور ہو گئے ؎

زور اغیار واز دیوار سنگ یاری بارد   بلائے درد منداں از در و دیوار مے بارد

ایک طرف تو دین حق سے ان کی بے اعتنائی، دعوت و تبلیغ کی ناکامی، دوسری طرف ان بدبختوں کا اس قدر تکلیف دہ اور جان سوز رویہ کہ پورا جسم لہولہان ہو گیا، اس سخت ترین رنج و غم اور انتہائی ہولناک اذیتوں نے آپ پر شدید قسم کی سراسیمگی اور بدحواسی طاری کر دی، نہ یہ خبر رہی کہ کدھر سے آئے تھے، نہ یہ شعور رہا کہ کہاں جانا ہے، نہ راستہ کا پتہ رہا نہ منزل کی پہچان بس جدھر منہ اٹھا چل کھڑے ہوئے، یوں ہی چلتے چلتے جب کچھ ہوش و حواس بجا ہوئے اور دل و دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ قرن ثعالب کے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں نجد کی میقات ہے اور جس کو قرن منازل کہتے ہیں، اسی جگہ ایک ابر کے ٹکڑے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نمودار ہوئے اور یہیں پہاڑوں پر مامور فرشتہ نے ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی اجازت طلب کی، مگر یہ آپ ﷺ کی رحمت و شفقت تھی کہ اس سخت ترین صورت حال سے دوچار کرنے والوں کے خلاف کوئی فیصلہ کرنا گوارہ نہیں ہوا اور امید یہ قائم کی اگر ان کو ہدایت کی توفیق نصیب نہیں ہوئی تو کیا ہوا، یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی اولاد میں سے ایسے لوگ ضرور پیدا کر دے گا جو کفر و شرک کی راہ چھوڑ کر ایمان و اسلام کی آغوش میں آجائیں گے۔

غزوۂ احد میں آنحضرت ﷺ کے زخمی ہونے کا ذکر

⑫ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُسِرَتْ رَبَاعِيَتُهٗ يَوْمَ اُحُدٍ وَشُجَّ فِيْ رَاْسِهٖ فَجَعَلَ يَسْلُتُ الدَّمَ عَنْهُ وَيَقُوْلُ كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ شَجُّوْا رَاْسَ نَبِيِّهِمْ وَكَسَرُوْا رَبَاعِيَتَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ احد کی لڑائی کے دن رسول کریم ﷺ کے ان چار دانتوں میں ایک دانت توڑ دیا گیا تھا جن کو رباعیہ کہتے ہیں اور آپ ﷺ کا سر مبارک زخمی کر دیا گیا، آپ خون پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ وہ قوم کیونکر فلاح یاب ہو سکتی ہے جس نے اپنے نبی کا سر زخمی کیا اور اس کے دانت توڑ دیئے۔" (مسلم)

تشریح: "رَبَاعِيَه" عربی میں دو اوپر کے اور دو نیچے کے ان چار دانتوں کو کہتے ہیں جو ثنایا اور انیاب کے درمیان ہوتے ہیں چنانچہ آپ ﷺ کے نیچے کے ان دو دانتوں میں سے داہنی طرف کا ایک دانت ٹوٹا تھا اس کے ساتھ نیچے کا لب مبارک بھی زخمی ہو گیا تھا، واضح رہے کہ دانت ٹوٹنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دانت جڑ سے اکھڑ گیا تھا بلکہ اس کا ایک حصہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا نیز جس شخص نے آپ ﷺ پر حملہ کر کے یہ دانت توڑا تھا اس کا نام عقبہ بن ابی وقاص اور مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کا بھائی تھا۔ اس بارے میں اختلافی اقوال ہیں کہ بعد میں عقبہ ابن ابی وقاص مسلمان ہو گیا تھا اور صحابی ہونے کا شرف حاصل کیا تھا یا نہیں، نیز منقول ہے کہ اس شخص کی نسل میں پیدا ہونے والا ہر شخص جب بالغ ہو جاتا تھا تو اس کا آگے کا دانت خود بخود گر پڑتا تھا! اس روایت میں سر مبارک کے زخمی ہونے کا ذکر ہے، جب کہ بعض روایتوں میں پیشانی کا زخمی ہونا ذکر کیا گیا ہے، نیز یہ بھی منقول ہے کہ جونہی آنحضرت ﷺ کو زخم پہنچا پہاڑ کے اوپر سے ایک چٹان نیچے آکر اس شخص پر گری جس نے حملہ کر کے آنحضرت ﷺ کو زخمی کیا تھا اور وہ وہیں ریزہ ریزہ ہو گیا۔ جنگ احد میں آنحضرت ﷺ کو اور بھی بہت سی اذیتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، کافروں نے میدان جنگ میں جگہ جگہ گڑھے کھود کر ان کو گھاس پھوس کے ذریعہ اوپر سے پاٹ دیا تھا، چنانچہ آنحضرت اپنے گھوڑے سمیت ایسے ہی ایک گڑھے میں گر گئے یہ دیکھ کر حضرت طلحہ ابن عبید اللہ ؓ دوڑے ہوئے اور آنحضرت ﷺ کو اپنی گود میں لے کر اس گڑھے سے باہر نکالا، آنحضرت نے فرمایا اوجبہ طلحۃ یعنی طلحہ نے اپنے لئے جنت کو واجب کر لیا، اسی طرح آنحضرت ﷺ کے سر مبارک پر جو لوہے کا خود تھا اس کی دو کڑیاں آپ ﷺ کے رخسار مبارک میں پیوست ہو گئی تھیں اور اس بری طرح پیوست ہوئیں کہ جب حضرت ابو عبیدہ بن الجراح ؓ نے ان کو اپنے دانتوں میں پکڑ کر کھینچا تو ان کے دانت ٹوٹ کر الگ ہو گئے، حضرت مالک ابن سنان ؓ نے آگے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کے زخم سے بہتے ہوئے خون کو چوس چوس کر صاف کرنا شروع کیا، اس وقت بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے میرا بہتا ہوا خون چوس کر

صاف کیا اس کے لئے جنّت واجب ہوگئی۔ سر مبارک کے زخم کو صاف کرنے کے لئے حضرت علیؓ اپنی سپر میں پانی بھر کر لائے اور حضرت فاطمہ زہراءؓ نے نمدے کا ایک ٹکڑا جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھری جس سے خون کا بہنا موقوف ہوا۔ بعض روایتوں میں منقول ہے کہ جب زخموں کی اذیت سے بتقاضائے بشریت آنحضرت ﷺ کے مزاج مبارک میں کچھ تغیر پیدا ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

لیس لکَ من الامر شیٔ اویتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظلمون۔

"آپؐ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جاویں اور یا ان کو کوئی سزا دے دیں کیونکہ انہوں نے بڑا ظلم کیا ہے۔"

یہ بھی منقول ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے زخموں سے خون بہنا شروع ہوا تو آپ ﷺ خون کو زمین پر گرنے سے روکنے کے لئے صاف کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اگر میرے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گر گیا تو ان (کافروں) پر آسمان سے عذاب اترنے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ احد کی لڑائی کے دن آنحضرت ﷺ کے چہرۂ مبارک پر تلوار کی ستر ضربیں پڑیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان ضربوں کے اثر سے محفوظ رکھا۔

رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ سے مارا جانے والا خدا کے سب سے سخت عذاب میں مبتلا ہوگا

(۱۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰی قَوْمٍ فَعَلُوْا بِنَبِيِّهٖ يُشِيْرُ اِلٰی رَبَاعِيَتِهٖ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰی رَجُلٍ يَقْتُلُهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کا سخت ترین غضب اس قوم پر ہے جس نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔" (ایسے سلوک سے) آپ ﷺ کا اشارہ اپنے دانتوں کی طرف تھا (جن میں ایک دانت کو کفار نے جنگ احد میں شہید کر دیا تھا۔ اور اللہ کا سخت ترین غضب اس شخص پر ہے جس کو (اللہ کا رسول) اللہ کے راستہ (جہاد) میں قتل کر دے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "جہاد" کی قید کے ذریعہ گویا حد اور قصاص میں مارے جانے والے شخص کو مستثنیٰ قرار دیا کہ ایسا شخص اس وعید میں داخل نہیں ہے، نیز "اللہ کے رسول" سے یا تو آنحضرت ﷺ نے خود اپنی ذات مراد لی یا پھر ہر پیغمبر مراد ہے، اور پیغمبر کے ہاتھوں قتل کئے جانے والے شخص کو اللہ کے سخت ترین غضب کا مورد اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کو پیغمبر کا قتل کرنا اس کا پختہ ثبوت ہوتا ہے کہ وہ شخص کسی بھی صورت میں معافی کے قابل اور کسی بھی طرح رعایت کے لائق نہیں تھا اور اس کے قتل کا فیصلہ ذرا بھی شک وشبہ کے بغیر بالکل مبنی بر حقیقت تھا، اس صورت میں اس کا واجب القتل اور دوزخی ہونا یقینی بات بن جاتا ہے۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِیْ

اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

(۱۴) عَنْ يَحْيَی بْنِ اَبِیْ كَثِيْرٍ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا سَلَمَةَ بْنَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ اَوَّلِ مَانَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ قَالَ يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُلْتُ يَقُوْلُوْنَ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ قَالَ اَبُوْسَلَمَةَ سَاَلْتُ جَابِرًا عَنْ ذٰلِكَ وَقُلْتُ لَهٗ مِثْلَ الَّذِیْ قُلْتَ لِیْ فَقَالَ لِیْ جَابِرٌ لَا اُحَدِّثُكَ اِلَّا بِمَا حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ جَاوَرْتُ بِحِرَاءٍ شَهْرًا فَلَمَّا قَضَيْتُ جِوَارِیْ هَبَطْتُ فَنُوْدِيْتُ عَنْ يَمِيْنِیْ فَلَمْ اَرَ شَيْئًا وَنَظَرْتُ عَنْ شِمَالِیْ فَلَمْ اَرَ شَيْئًا وَنَظَرْتُ عَنْ خَلْفِیْ فَلَمْ اَرَ شَيْئًا فَرَفَعْتُ رَاْسِیْ فَرَاَيْتُ شَيْئًا فَاَتَيْتُ خَدِيْجَةَ فَقُلْتُ دَثِّرُوْنِیْ فَدَثَّرُوْنِیْ وَصَبُّوْا عَلَیَّ مَاءً بَارِدًا فَنَزَلَتْ يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ

فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ وَذٰلِكَ قَبْلَ اَنْ تُفْرَضَ الصَّلٰوةُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت یحییٰ ابن کثیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو سلمہؓ ابن عبدالرحمٰن ابن عوف سے (جو اونچے درجہ کے تابعین، مشاہیر علماء اور فقہاء سبعہ میں سے ہیں) پوچھا کہ قرآن مجید کا کونسا حصہ سب سے پہلے نازل ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ میں نے عرض کیا کہ لوگ (یعنی اکثر علماء) تو یہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اِقْرَأْ باسم ربک نازل ہوئی ہے!؟ حضرت ابو سلمہ نے فرمایا: "میں نے حضرت جابرؓ سے یہی سوال کیا تھا (کہ قرآن کا کونسا حصہ سب سے پہلے نازل ہوا ہے؟ تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا جو میں نے تمہیں دیا ہے) پھر میں نے بھی ان سے یہی کہا جو تم نے مجھ سے کہا ہے (کہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے (اقرا باسم ربک الذی اتری ہے) تو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے وہی حدیث بیان کرتا ہوں جو رسول کریم ﷺ نے ہمارے سامنے ارشاد فرمائی تھی، آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ: میں ایک مہینہ تک غار حراء میں خلوت گزیں۔ اور معتکف تھا، جب میری خلوت گزینی اور اعتکاف کی مدت پوری ہوئی اور میں پہاڑ سے اترا تو (اچانک میرے کانوں میں آواز آئی کہ) کوئی مجھے مخاطب کر رہا ہے، میں نے دائیں طرف (مڑکر) دیکھا لیکن مجھے کوئی چیز نظر نہیں آئی بائیں طرف دیکھا تو ادھر بھی کوئی چیز نظر نہیں آئی، پیچھے کی طرف نظر کی تو ادھر بھی کوئی دکھائی نہیں دیا، پھر جب میں نے اوپر نظر اٹھائی تو مجھے کچھ نظر آیا یعنی ایک فرشتہ دکھائی دیا، میں (اس کو دیکھ کر سہم گیا اور مارے خوف کے کانپتا ہوا) خدیجہؓ کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کپڑا اڑھاؤ مجھے کپڑا اڑھاؤ۔ خدیجہؓ نے (فورا) مجھ کو ایک کپڑا اڑھادیا اور (میرے حواس بحال کرنے کے لئے) مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالا، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی یا ایھا المدثر قم فانذر وربک فکبر وثیابک فطھر والرجز فاھجر (یعنی: اے کپڑا اوڑھنے والے اٹھ کھڑے ہو اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو اور اپنے کپڑے کو پاک رکھو اور ناپاکی سے اجتناب کرو) اور نزول وحی کا یہ واقعہ نماز فرض ہونے سے پہلے کا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایت حدیث کے وقت نسیان کے سبب راوی کے ذہن میں مسئلہ کی اصل نوعیت پوری طرح محفوظ نہیں رہی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے یہ حدیث اس طرح بیان کی کہ گویا یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سب سے پہلی وحی "یاایھا المدثر" الخ ہے حالانکہ حقیقت میں سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی ہے وہ اقرا باسم ربک الخ ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اقرا باسم ربک کے بعد وحی کا نزول کچھ عرصہ کے لئے جب منقطع ہو گیا اور یہ سلسلہ پھر دوبارہ شروع ہوا تو اس وقت سب سے پہلے جو وحی اتری وہ یا ایھا المدثر الخ ہے، جیسا کہ اس کا تفصیلی ذکر پیچھے حضرت عائشہؓ کی روایت میں گذرا پس یا ایھا المدثر الخ کی اولیت اضافی ہے نہ کی حقیقی، چنانچہ خود حضرت جابرؓ کی جو روایت پہلے گذری ہے اس میں انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انقطاع وحی کے بارے میں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ۔ میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان سے آتی ہوئی ایک آواز سنی، اوپر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ ہے جو میرے پاس کوہ حراء میں آیا تھا۔...... الخ۔ اس سے بھی صریحی طور پر یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ یہاں اس حدیث میں حضرت جابرؓ نے اضافی اولیت مراد لی ہے۔

یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس حدیث کے راوی نے اختصار سے کام لیا ہے اور سب سے پہلے اترنے والی وحی اقرء باسم ربک کے ذکر کو حذف کر کے اس وحی کو ذکر کیا جو انقطاع کے بعد سلسلہ وحی دوبارہ شروع ہونے پر سب سے پہلے اتری تھی۔

بَابُ عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ

نبوت کی علامتوں کا بیان

"علامات" علامت کی جمع ہے اور علامت اصل میں تو مطلق نشان کو، اور خاص طور پر اس نشان کو کہتے ہیں جو راستہ کے سرے پر قائم

کیا جاتا ہے اور جس کا مقصد مسافروں اور راہ گیروں کو ان کے راستے اور ان کی منزل کا پتہ بتانا ہوتا ہے۔ اسی قبیل کے دو اور لفظ مَعْلَمْ اور عَلَمْ کے بھی یہی معنی ہیں لیکن یہاں علامات (یا علامتوں) سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو آنحضرت ﷺ کی پیغمبری کو ظاہر و ثابت کرتی ہیں اور آپ ﷺ کی ذاتی و اخلاقی صفات و خصوصیات، آپ ﷺ کے فضائل و شمائل اور آپ ﷺ کے افعال و احوال پر اس طرح دلالت کرتی ہیں کہ کوئی بھی عقلمند اور سمجھ دار شخص ان کے ذریعہ آنحضرت کی نبوت و رسالت کا یقین حاصل کر سکتا ہے۔ نیز سابقہ آسمانی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کی جن صفات و خصوصیات اور احوال کا ذکر ہے وہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔

"واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو جتنے معجزے عطا ہوئے وہ سب آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی علامتوں میں سے ہیں، اس اعتبار سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مؤلف مشکوٰۃ نے جو دو باب قائم کئے ہیں، ایک تو یہی "نبوت کی علامتوں کا بیان" اور دوسرا "معجزات کا بیان" اس کا کیا سبب ہے اور انہوں نے "علامتوں" اور "معجزوں" کے درمیان کیا فرق ملحوظ رکھا ہے، جب کہ ان دونوں میں خوارق (معجزات) ہی کا ذکر ہے شارحین مشکوٰۃ بسیار غور و فکر کے باوجود اس کی کوئی مضبوط وجہ بیان کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

شق صدر کا واقعہ

① عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَاهُ جِبْرَئِيْلُ وَهُوَ يَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ فَاَخَذَهٗ فَصَرَعَهٗ فَشَقَّ عَنْ قَلْبِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ عَلَقَةً قَالَ هٰذَا حَظُّ الشَّيْطَانِ مِنْكَ ثُمَّ غَسَلَهٗ فِيْ طَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ لَاَمَهٗ وَاَعَادَهٗ فِيْ مَكَانِهٖ وَجَآءَ الْغِلْمَانُ يَسْعَوْنَ اِلٰى اُمِّهٖ يَعْنِيْ ظِئْرَهٗ فَقَالُوْا اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ فَاسْتَقْبَلُوْهُ وَهُوَ مُنْتَقِعُ اللَّوْنِ قَالَ اَنَسٌ فَكُنْتُ اَرٰى اَثَرَ الْمَخِيْطِ فِيْ صَدْرِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ (اپنے بچپن میں جب دایہ حلیمہ کے پاس تھے تو اس وقت کا واقعہ ہے کہ (ایک دن آپ ﷺ) بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبرئیلؑ آئے اور آپ ﷺ کو پکڑ کر چت لٹادیا، پھر انہوں نے آپ ﷺ کے (سینہ کو) دل کے قریب سے چاک کیا اور آپ ﷺ کے دل میں سے بستہ خون کا ایک سیاہ ٹکڑا نکال لیا اور کہا کہ یہ تمہارے جسم کے اندر شیطان کا حصہ ہے (اگر یہ ٹکڑا تمہارے جسم میں یوں ہی رہنے دیا جاتا تو شیطان کو اس کے ذریعہ تم پر قابو پانے کا موقع ملتا رہتا) اس کے بعد انہوں نے آپ ﷺ کے دل کو ایک سونے کی لگن میں زمزم کے پانی سے دھویا اور پھر دل کو اس کی جگہ رکھ کر سینۂ مبارک کو اوپر سے برابر کر دیا۔ (وہ) بچے (جو اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ تھے یہ پورا منظر دیکھ کر گھبرا گئے اور) بھاگے ہوئے آنحضرت ﷺ کی ماں یعنی آپ ﷺ کی دایہ (حلیمہؓ) کے پاس آئے اور کہا کہ محمد ﷺ کو مار ڈالا گیا ہے (دایہ حلیمہؓ کے گھر اور پڑوس کے) لوگ (یہ سنتے ہی) اس جگہ پہنچے جہاں آنحضرت ﷺ موجود تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کو صحیح سالم دیکھا لیکن آپ ﷺ کو اس حال میں پایا کہ خوف و دہشت سے) آپ ﷺ (کے چہرہ) کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ حضرت انسؓ (یہ روایت بیان کر کے) کہتے تھے کہ میں...... آنحضرت ﷺ کے سینۂ مبارک پر سلائی کا نشان دیکھا کرتا تھا۔" (مسلم)

تشریح: جامع الاصول میں عن قلبه کے بعد واستخرجه کا لفظ بھی منقول ہے اور پوری عبارت یوں ہے فشق عن قلبه واستخرجه فاستخرج مِنْهُ علقه۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا: پھر انہوں نے آپ کے (سینہ کو) دل کے قریب سے چاک کیا اور دل کو نکالا اور پھر دل میں سے بستہ خون کا ایک سیاہ ٹکڑا نکال لیا (جو برائیوں اور گناہوں کی جڑ ہوتا ہے) سونے کے لگن میں زمزم کے پانی سے دھویا۔" سونے کی لگن کا استعمال آپ ﷺ کی عظمت و کرامت کے اظہار کے لئے تھا جہاں تک سونے کے استعمال کی ممانعت کا

سوال ہے تو اس کا تعلق اس دنیا کی عام زندگی سے امتحان و آزمائش سے ہے جس کا مقصد انسان کو اس دنیاوی زندگی میں ایسی بہت سی چیزوں سے باز رکھ کر اس کی بندگی کو آزمانا ہے جس میں کامیاب ہونے کے بعد آخرت میں وہی چیزیں اس کو اجرو انعام کے طور پر حاصل ہوں گی، اسی لئے آخرت میں نہ صرف یہ کہ سونے کا استعمال جائز ہوگا بلکہ جنّت کے ظروف و برتن بھی سونے کے ہوں گے۔ پس شق صدر کا یہ تمام واقعہ جو اس وقت یا شب معراج میں پیش آیا، اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ عالم غیب اور دوسرے جہان کے احوال سے تعلق رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ نقطہ بھی محفوظ خاطر رہنا چاہئے کہ سونے کی لگن کا استعمال خود آنحضرت ﷺ کی طرف سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا استعمال فرشتے نے کیا تھا جو احکام و مسائل میں ہماری طرح مکلف نہیں تھا۔ ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ سونے کی لگن کے استعمال کا یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب احکام و مسائل کا نفاذ ہی نہیں ہوا تھا اور شرعی طور پر کسی چیز کی حلت و حرمت نازل اور معلوم نہیں ہوئی تھی۔

حدیث کے اس ٹکڑے سے یہ ثابت ہوا کہ زمزم کا پانی سب پانیوں سے افضل و برتر ہے یہاں تک کہ جنّت کے پانی پر بھی فضیلت و برتری رکھتا ہے کیونکہ اگر کوئی شبہ نہیں کہ وہ پانی جو بطور معجزہ آنحضرت ﷺ کی انگلیوں سے ابل کر نکلا تھا۔ یہاں تک کہ آب زمزم پر بھی فضیلت و برتری رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ پانی آنحضرت ﷺ دست مبارک کے اثر سے نکلا تھا جب کہ زمزم کا پانی حضرت اسمٰعیل ﷺ کے پیروں کے اثر سے برآمد ہوا ہے۔

یہ حدیث اور اسی طرح کی دوسری حدیثیں اس قبیل سے تعلق رکھتی ہیں جن کو جوں کا توں تسلیم کرنا واجب ہے اور بطریق مجاز تاویل و توجیہہ کے ذریعہ ان کے ظاہری مفہوم و معانی سے اعراض کرنا نہ تو جائز ہے اور نہ اس کی کچھ ضرورت ہے کیونکہ ان حدیثوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ انسانی عقل و فہم سے کتنا ہی ماوراء کیوں نہ ہو، اس کے برحق اور سچ ہونے کے لئے یہی ایک بات کافی ہے کہ اس کا تعلق قادر مطلق، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ظہور سے ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جن کی خبر صادق و مصدوق (ﷺ) نے دی ہے، لہٰذا ان کی صداقت شمہ برابر بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

شق صدر میں حکمت: آنحضرت ﷺ کے سینہ مبارک کو چاک کر کے قلب مبارک کو صاف کرنے میں قدرت کی یہ حکمت کارفرما تھی کہ آپ ﷺ کا باطن اس طرح نجس پاکیزہ اور قلب مبارک اس قدر لطیف و روشن ہو جائے کہ وحی الٰہی کا نور جذب کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے اور منصب رسالت کا بار اٹھانے کے لئے قلب و دماغ پہلے سے تیار رہے، نفسانی وسوسوں کا آپ ﷺ میں کہیں سے گذر نہ ہو، اور شیطان آپ ﷺ کو حق کی طرف سے غافل کرنے میں نہ صرف یہ کہ کامیاب نہ ہو سکے بلکہ آپ ﷺ سے بالکل مایوس ہو جائے، جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے الفاظ ھٰذا حظ الشیطان منک اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یہ بتادینا ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ شق صدر سینہ چاک کئے جانے) کا واقعہ چار مرتبہ ظہور میں آیا ہے، ایک مرتبہ تو بچپن میں دایہ حلیمہؓ کے پاس، جس کا ذکر اس حدیث میں ہے، دوسری مرتبہ دس سال کی عمر میں، تیسری مرتبہ ظہور نبوت کے وقت اور چوتھی مرتبہ شب معراج میں اس وقت جب جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کو لینے آئے۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ سینۂ مبارک کا چاک کیا جانا اور قلب مبارک کا دھویا جانا صرف آنحضرت ﷺ کے لئے مخصوص تھا یا دوسرے پیغمبروں کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ سے جو روایت "تابوت" اور "سکینہ" کے بارے میں منقول ہے اس میں انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس (تابوت) میں (دوسرے تبرکات کے علاوہ) وہ طشت بھی تھا، جس میں انبیاء علیہم السلام کے دل دھوئے گئے تھے، اس روایت سے ان علماء کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کے بھی سینے چاک کئے گئے اور ان کے دل دھوئے گئے تھے۔

پتھر کا سلام

(۲) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ لَاعرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ اَنْ اُبْعَثَ اِنِّيْ لَاعْرِفُهُ الْاٰنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو مکہ میں ظہور نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا، میں اب بھی اس کو (خوب) پہچانتا ہوں۔" (مسلم)

تشریح: "مجھے سلام کیا کرتا تھا۔" یعنی جب بھی میں اس پتھر کے سامنے سے گذرتا تو مجھے اس میں آتی ہوئی یہ آواز سنائی دیتی۔ السلام علیک یانبی اللہ!

بعض محدثین نے کہا ہے کہ اس پتھر سے مراد حجرا سود ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے، جو "زقاق الحجر" کے نام سے مشہور ہے اور وہ اب تک مکہ میں موجود ہے، یہ پتھر جس جگہ ہے وہ مسجد حرام اور حضرت خدیجہؓ کے گھر کے درمیان واقع ہے۔

ایک روایت حضرت عائشہؓ سے منقول ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا "جب حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس رسالت لے کر آئے (اور مجھے نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کر دیا گیا) تو اس کے بعد جب بھی میں کسی درخت یا پتھر کے سامنے سے گذرتا تو وہ کہتا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔

شق قمر کا معجزہ

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ اَهْلَ مَكَّةَ سَاَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّرِيَهُمْ اٰيَةً فَاَرَاهُمُ الْقَمَرَ شِقَّتَيْنِ حَتّٰى رَاَوْحِرَاءَ بَيْنَهُمَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مکہ کے کافروں نے (جمع ہو کر) رسول کریم ﷺ سے مطالبہ کیا کہ (اگر تم (نبوت کے دعوے میں) سچے ہو تو کوئی نشانی (معجزہ دکھاؤ، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے (اپنے دست مبارک کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھا دیئے، یہاں تک کہ ان کافروں نے حراء پہاڑ کو چاند کے ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان دیکھا۔" (بخاری و مسلم)

(۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ انْشَقَّ الْقَمَرُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِرْقَتَيْنِ فِرْقَةً فَوْقَ الْجَبَلِ وَفِرْقَةً دُوْنَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِشْهَدُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں چاند درمیان سے شق ہو کر اس طرح دو ٹکڑے ہو گیا کہ ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر کی جانب تھا اور دوسرا نیچے کی طرف رسول کریم ﷺ نے (کافروں کی طلب پر یہ معجزہ دکھا کر ان سے) فرمایا کہ میری نبوت یا میرے معجزہ کی شہادت دو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "شہادت دو۔" کے ایک معنی بعض حضرات نے یہ لکھے ہیں کہ۔ "آؤ اور اس معجزہ کو دیکھو۔ اس معنی کی صورت میں اشہدوا کو شہادت سے مشتق کہا جائے گا، پہلے معنی کی صورت میں (جو ترجمہ میں بیان ہوئے ہیں اشہدو کو شہود سے مشتق مانا جائے گا۔

شق القمر کا معجزہ، یعنی آنحضرت ﷺ کے دست مبارک کے اشارہ پر چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا، ایک حقیقی واقعہ ہے، جس کی صداقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اس واقعہ سے متعلق روایت کو صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک بہت بڑی جماعت نے بیان کیا ہے اور ان کے واسطہ سے بے شمار محدثین نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ علامہ ابن سبکیؒ نے شرح مختصر ابن حاجب میں لکھا ہے کہ میرے

نزدیک صحیح یہ ہے کہ شق قمر کی روایت متواتر ہے اور اس کو بخاری و مسلم نیز دوسرے بہت سے ائمہ حدیث نے اتنے زیادہ طرق سے نقل کیا ہے کہ اس میں کہیں سے بھی شک کا گذر نہیں، علاوہ ازیں اس معجزہ کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت خود قرآن کریم ہے چنانچہ تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق و اجماع ہے کہ اس آیت کریمہ۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○۔

"قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا اور اگر یہ لوگ (کافر) کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو روگردانی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔"

میں وہی شق قمر مراد ہے جو آنحضرت ﷺ کے معجزہ کے طور پر واقع ہوا، نہ کہ وہ انشقاق قمر مراد ہے جو قیامت کے دن واقع ہوگا، اس کی واضح دلیل خود آیت کے الفاظ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا الخ ہیں۔ بہت سے بے دینوں اور فلسفیوں نے اس معجزہ کا انکار کیا ہے۔ ان کے انکار کی بنیاد اس اعتقاد پر ہے کہ فلکیات میں خرق و التیام ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہی فلکیات کا خالق اور قادر مطلق ہے، تمام فلک اس کی قدرت کے مسخر اور اس کے حکم کے تابع ہیں۔ اس کائنات میں جو کچھ ہے، خواہ زمین ہو یا آسمان، چاند، ستارے ہوں یا سورج، ان میں سے جس کو چاہے وہ توڑ پھوڑ کر ایک طرف کر سکتا ہے، خود اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ قیامت کے دن وہ آسمان کو اس طرح لپیٹ دے گا جس طرح کاغذ کو لپیٹ دیا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ فلکیات میں خرق و التیام کے محال کا نظریہ جو اس وقت بھی بہت سے فلاسفہ کے نزدیک محل نظر تھا تحقیق و تجربہ کے بعد اب بالکل ہی باطل ہو چکا ہے۔ اس دور کے انسان نے چاند پر پہنچ کر شق القمر کے معجزہ کو زبردست تائید بھی پہنچائی ہے لہٰذا خرق و التیام کی بحث اٹھا کر اس معجزہ کے خلاف دلیل قائم کرنا بالکل بے معنی بات ہوگئی ہے۔ منکرین صداقت ایک اعتراض اور کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ چاند میں اتنا زبردست تغیر ہو جانا کہ وہ ٹکڑوں میں بٹ گیا کوئی معمولی بات نہیں تھی اگر حقیقت میں ایسا ہوا تھا تو اس کا مشاہدہ صرف اہل مکہ تک محدود نہ رہتا بلکہ اس کرشمہ کو تمام اہل زمین دیکھتے اور بلا تفریق مذہب و ملت تمام مورخین تواتر کے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اس معجزہ کا وقوع کچھ خاص لوگوں کے مطالبہ پر ہوا تھا اور انہیں کو یہ کرشمہ دکھانا اور ان کو لاجواب کرنا مقصود تھا، علاوہ ازیں یہ رات کے وقت کا واقعہ ہے، جو ایک لمحہ کے لئے تھا، ظاہر ہے کہ ایسے میں جب کہ اکثر لوگ محو خواب ہوں گے اس لمحاتی کرشمہ کا عام مشاہدہ کیسے ممکن تھا! دوسرے یہ کہ اختلاف مطالع کی بناء پر یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ چاند ایک ہی وقت میں ایک ہی مطلع پر دنیا کے تمام خطوں میں نظر آئے اس لئے معجزہ کے وقوع کے وقت کا چاند دنیا کے تمام خطوں میں سے کچھ کو نظر آیا اور کچھ کو نہیں، جیسا کہ جب چاند گرہن ہوتا ہے تو اس وقت کچھ خطوں میں نظر آتا ہے اور کچھ خطوں میں نظر نہیں آتا، علاوہ ازیں بعض روایتوں میں آتا ہے اس دن عرب کے باہر کے جو لوگ مکہ مکرمہ یا اس کے قریبی علاقوں میں آئے ہوئے تھے انہوں نے اپنے شہروں اور علاقوں میں پہنچ کر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ جہاں تک تاریخ میں اس عجیب و غریب واقعہ (شق قمر) کے ذکر کا تعلق ہے تو اسلامی تاریخ و سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر تواتر کے ساتھ موجود ہی ہے، گو اسلام مخالف اور دین بیزار لوگ اس سے انکار کریں، لیکن اسلامی تاریخ کے علاوہ بعض دوسری قوموں کے تذکرہ اور احوال میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، جیسے ہندوستان کے علاقہ ملیبار یا مالوہ کے شہر وہار کے راجہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ تو صرف اس واقعہ کے مشاہدہ یا تصدیق کی وجہ ہی سے مشرف باسلام ہو گئے تھے۔

قدرت کی طرف سے ابوجہل کو تنبیہ

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ اَبُوْجَهْلٍ هَلْ يُعَفِّرُ مُحَمَّدٌ وَجْهَهُ بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ فَقِيْلَ نَعَمْ فَقَالَ وَاللَّاتِ وَالْعُزّٰى لَئِنْ رَاَيْتُهُ يَفْعَلُ ذٰلِكَ لَاَطَاَنَّ عَلٰى رَقَبَتِهِ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّيْ زَعَمَ لِيَطَاَ عَلٰى رَقَبَتِهِ فَمَا

فَجِئْهُمْ مِنْهُ اِلاَّ وَهُوَ يَنْكُصُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَيَتَّقِيْ بِيَدَيْهِ فَقِيْلَ لَهُ مَالَكَ فَقَالَ اِنَّ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ لَخَنْدَقًا مِنْ نَارٍ وَهَوْلاً وَاَجْنِحَةً فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْدَنَامِنِّيْ لَاخْتَطَفَتْهُ الْمَلٰئِكَةُ عُضْوًا عُضْوًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) ابوجہل نے (لوگوں کے سامنے بڑی تحقیر کے ساتھ) کہا کہ کیا محمد (ﷺ) تمہارے سامنے اپنے چہرہ کو خاک آلود کرتا ہے (یعنی نماز پڑھتا ہے اور سجدہ کرتا ہے!؟) لوگوں نے کہا کہ ہاں! ابوجہل بولا۔ لات و عزیٰ۔ (دونوں بڑے بتوں) کی قسم اگر میں نے محمد (ﷺ) کو ایسا کرتے (یعنی نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے) دیکھ لیا تو (اپنے پیروں سے) اس کی گردن روند ڈالوں گا۔ چنانچہ (ایک دن) جب کہ رسول کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھا (اور سجدہ میں تھے) ابوجہل اس (ناپاک) ارادہ کے ساتھ آپ ﷺ کی گردن مبارک کو اپنے پاؤں سے کچل دے، لیکن پھر وہ آنحضرت ﷺ کی طرف بڑھتے بڑھتے اچانک رک گیا اور فوراً پچھلے پاؤں اپنے لوگوں کی طرف لوٹنے لگا اور ایسا دکھائی دیا جیسے وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کسی چیز کو روک رہا ہو (یعنی جب وہ لوٹ کر اپنے لوگوں تک پہنچا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سخت آفت اس پر ٹوٹ پڑی ہے اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کو روک رہا ہے) لوگوں نے (یہ دیکھ کر) اس سے پوچھا کہ آخر کیا ماجرا ہے (کہ تو اپنا ارادہ پورا کئے بغیر الٹے پاؤں لوٹ آیا اور اپنے ہاتھوں سے کوئی چیز روکنے کی کوشش کر رہا ہے؟) ابوجہل نے (نہایت بوکھلائے لہجہ) میں کہا! (میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ) میرے اور محمد ﷺ کے درمیان آگ کی خندق ہے، بڑا خوفناک منظر ہے اور (محافظ فرشتوں کے) پر و بازو ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا! "اگر ابوجہل میرے قریب آجاتا تو فرشتے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے جاتے (یعنی ہر فرشتہ اس کے بدن کا ایک ایک عضو نوچ کر لے جاتا۔"

ایک پیش گوئی جو حرف بحرف پوری ہوئی

(۶) وَعَنْ عَدِيِّ ابْنِ حَاتِمٍ قَالَ بَيْنَا اَنَا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاهُ رَجُلٌ فَشَكَا اِلَيْهِ الْفَاقَةَ ثُمَّ اَتَاهُ الْاٰخَرُ فَشَكٰى اِلَيْهِ قَطْعَ السَّبِيْلِ فَقَالَ يَا عَدِيُّ هَلْ رَاَيْتَ الْحِيْرَةَ فَاِنْ طَالَتْ بِكَ حَيٰوةٌ فَلَتَرَيَنَّ الظَّعِيْنَةَ تَرْتَحِلُ مِنَ الْحِيْرَةِ حَتّٰى تَطُوْفَ بِالْكَعْبَةِ لَا تَخَافُ اَحَدًا اِلاَّ اللّٰهَ وَلَئِنْ طَالَتْ بِكَ حَيٰوةٌ لَتُفْتَحَنَّ كُنُوْزُ كِسْرٰى وَلَئِنْ طَالَتْ بِكَ حَيٰوةٌ لَتَرَيَنَّ الرَّجُلَ يُخْرِجُ مِلْاَ كَفِّهٖ مِنْ ذَهَبٍ اَوْ فِضَّةٍ يَطْلُبُ مَنْ يَقْبَلُهُ فَلَا يَجِدُ اَحَدًا يَقْبَلُهُ مِنْهُ وَلَيَلْقَيَنَّ اللّٰهَ اَحَدُكُمْ يَوْمَ يَلْقَاهُ وَلَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَرْجُمَانٌ يُتَرْجِمُ لَهُ فَلَيَقُوْلَنَّ اَلَمْ اَبْعَثْ اِلَيْكَ رَسُوْلًا فَيُبَلِّغَكَ فَيَقُوْلُ بَلٰى فَيَقُوْلُ اَلَمْ اُعْطِكَ مَالًا وَاُفْضِلْ عَلَيْكَ فَيَقُوْلُ بَلٰى فَيَنْظُرُ عَنْ يَمِيْنِهٖ فَلَا يَرٰى اِلاَّ جَهَنَّمَ وَيَنْظُرُ عَنْ يَسَارِهٖ فَلَا يَرٰى اِلاَّ جَهَنَّمَ اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ قَالَ عَدِيٌّ فَرَاَيْتُ الظَّعِيْنَةَ تَرْتَحِلُ مِنَ الْحِيْرَةِ حَتّٰى تَطُوْفَ بِالْكَعْبَةِ لَا تَخَافُ اِلاَّ اللّٰهَ وَكُنْتُ فِيْمَنِ افْتَتَحَ كُنُوْزَ كِسْرَى بْنِ هُرْمُزَ وَلَئِنْ طَالَتْ بِكُمْ حَيٰوةٌ لَتَرَوُنَّ مَاقَالَ النَّبِيُّ اَبُو الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُخْرِجُ مِلْاَ كَفِّهٖ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عدی ابن حاتمؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ اچانک ایک شخص آیا اور آپ ﷺ سے اپنے فقر و فاقہ اور افلاس کا شکوہ کرنے لگا، پھر ایک اور شخص آیا، اس نے راہزنی کی شکایت کی (کہ راستہ میں کچھ ڈاکوؤں اور قزاقوں نے مجھے لوٹ لیا ہے) آنحضرت ﷺ نے (ان دونوں کی باتیں سننے کے بعد مجھ سے) فرمایا: عدی! تم نے تو حیرہ دیکھا ہو گا!؟ اگر تمہاری عمر بڑی ہوئی تو تم یقیناً دیکھو گے کہ ایک عورت تنہا اونٹنی پر سوار ہو کر حیرہ سے چلے گی اور (مکہ پہنچ کر) کعبہ کا طواف کرے گی اور سوائے اللہ تعالیٰ کے اس کو کسی (لیٹرے اور راہزن) کا خوف نہیں ہو گا، اگر تم زیادہ دنوں تک زندہ رہے تو (دیکھو گے کہ) کسریٰ (فارس کے بادشاہ) کے خزانے (مسلمانوں کے لئے) کھول دیئے جائیں گے (جو غنیمت کے طور پر ہاتھ لگیں گے اور تمام مسلمانوں میں تقسیم ہوں گے) اور اگر تمہاری عمر زیادہ ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا یا چاندی (خیرات کرنے کو) نکلے گا، اور قبول کرنے والے (یعنی کسی محتاج و مفلس) کو

ڈھونڈتا پھرے گا مگر اس کو ایسا کوئی شخص نہیں ملے گا جو اس سے خیرات کا مال لے لے۔ اور (یاد رکھو) قیامت کے دن تم میں سے ایک شخص اللہ کے حضور اس طرح پیش ہوگا کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا جو اس کا حال بیان کرے، پھر اللہ تعالیٰ اس سے سوال کرے گا کہ کیا میں نے تجھ کو دین کے احکام پہنچانے اور قیامت کے دن کی خبر دینے کے لئے رسول نہیں بھیجا تھا؟ وہ شخص کہے گا کہ بیشک آپ نے رسول بھیجا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں نے تجھ کو مال و زر عطا نہیں کیا تھا اور کیا میں نے تجھ پر فضل واحسان نہیں کیا تھا؟ وہ کہے گا بیشک آپ نے مجھ کو مال بھی عطا کیا تھا اور مجھ پر فضل واحسان بھی فرمایا تھا۔ اس کے بعد وہ شخص اپنے دائیں طرف دیکھے گا تو اس کو دوزخ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا (جس کو اس نے ترک طاعت وعبادت کے سبب اپنے لئے واجب کر رکھا ہوگا) پھر وہ اپنے بائیں طرف دیکھے گا تو اس کو دوزخ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا (جس کو اس نے ارتکاب معصیت کے سبب اپنے پر واجب کر رکھا ہوگا)۔ پس رسول کریم ﷺ نے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ لوگو! دوزخ کی آگ سے (خیرات کے ذریعہ) اپنے آپ کو بچاؤ۔ اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی خیرات کرنے کی استطاعت رکھتے ہو، اور اگر کوئی شخص (اللہ کے نام پر خرچ کرنے کے لئے کھجور کا ایک ٹکڑا بھی نہ رکھتا ہو تو نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ بات کر کے (خود کو دوزخ کی آگ سے) بچائے۔" حضرت عدی ابن حاتمؓ نے (یہ روایت بیان کرنے کے بعد) کہا: (آنحضرت ﷺ کی اس پیش گوئی کے مطابق) میں نے یہ تو دیکھ لیا کہ اونٹنی سوار عورت خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے لئے حیرہ سے تنہا سفر کرتی ہے۔ اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے ڈر نہیں لگتا اور میں خود ان لوگوں میں شامل تھا۔ جنہوں نے کسریٰ ابن ہرمز ابن نوشیرواں (فارس کے بادشاہ) کے خزانوں کو کھولا، اب اگر تم زیادہ دنوں زندہ رہے تو نبی کریم ابوالقاسم (محمد ﷺ) کی اس پیش گوئی کو بھی حرف بحرف پورا ہوتے دیکھ لوگے کہ ایک شخص مٹھی بھر کر (سونا چاندی خیرات کرنے کو نکلے گا (اور کوئی شخص اس کو لینے والا نہیں ملے گا۔"

(بخاری)

تشریح: اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے تین باتوں کی پیش گوئی فرمائی، ایک تو یہ کہ ملک عرب میں مکمل امن وامان ہو جائے گا، ڈکیتی اور رہزنی جیسے جرائم جو عام زندگی کو خوف وہراس میں مبتلا کر دیتے ہیں اس طرح ختم ہو جائیں گے کہ حیرہ، جو کوفہ کے پاس ایک پرانا شہر ہے اور مکہ معظمہ سے بہت دور ہے، وہاں سے ایک عورت زیارت بیت اللہ اور طواف کعبہ کے لئے مکہ معظمہ تک اونٹنی یا کسی بھی سواری پر تنہا سفر کرے گی اور اس کی جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ مجاہدین اسلام کے ہاتھوں فارس (ایران) کی عظیم سلطنت فتح کرائے گا اور وہاں کے بادشاہ کسریٰ کے خزانوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا، اور تیسرے یہ کہ اسلامی حدود سلطنت میں اقتصادی خوش حالی اور مال ودولت کی فراوانی سے چند لوگ یا کوئی خاص طبقہ نہیں بلکہ تمام لوگ اس طرح بہرہ مند ہوں گے کہ زکوٰۃ خیرات نکالنے والا اپنے ہاتھ میں سونا چاندی اور روپیہ پیسہ لئے پھرے گا مگر ڈھونڈنے سے بھی کوئی صدقہ لینے والا اس کو نہیں ملے گا کیونکہ پوری اسلامی قلمرو میں جب کوئی بھوکا محتاج ہی نہیں ہوگا تو صدقہ خیرات کا سونا چاندی لینے والا کون ہوگا۔ ان تینوں پیش گوئیوں میں سے دو تو پوری ہو گئیں اور ان کا مشاہدہ خود حدیث کے راوی حضرت عدی ابن حاتمؓ نے کیا اور تیسری پیش گوئی کے بارے میں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد پوری ہوگی کہ ان کے عہد سلطنت میں کوئی شخص بھوکا محتاج نہیں ہوگا اور عام خوشحالی کا یہ عالم ہوگا کہ ڈھونڈنے پر بھی کوئی صدقہ خیرات لینے والا نہیں ملے گا۔ اس کا ذکر اس حدیث میں گذر چکا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے باب میں پیچھے نقل ہوئی ہے۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ تیسری پیش گوئی بھی حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کی خلافت کے زمانہ میں پوری ہو چکی ہے۔ بیہقی نے اس قول کو جزم کے ساتھ اختیار کیا ہے، چنانچہ ان کے عہد میں عام لوگوں کی اقتصادی حالت اتنی زیادہ بہتر تھی کہ صدقہ وخیرات کا مال لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا! آنحضرت ﷺ نے جو پہلی پیش گوئی فرمائی وہ دراصل اس شخص کے جواب میں تھی جس نے رہزنی کی شکایت کی تھی اور دوسری پیش گوئی اس شخص کے جواب میں تھی جس نے اپنے فقر و افلاس کی شکایت کی تھی، روئے سخن آپ ﷺ نے حضرت عدی ابن حاتمؓ کی طرف رکھا جو اس وقت مجلس شریف میں حاضر تھے اور خطاب عام

تھا! مقصد یہ تھا کہ ان باتوں کی بشارت تمام صحابہ سن لیں اور اس ضمن میں ان دونوں شکایت کنندہ کو جواب بھی حاصل ہو جائے جس سے ان کو تسلی ہو۔

یہ بشارت دینے کے بعد کہ مسلمانوں پر معاشی خوشحالی اور مالی وسعت کا زمانہ جلد آنے والا ہے، آپ ؐ نے یہ واضح کر دینا بھی ضروری سمجھا کہ مال و دولت کی فراوانی چونکہ عام طور پر انسان کو دنیا کے عیش و عشرت میں ڈال کر آخرت سے غافل کر دیتی ہے اس لئے اہل ایمان کو چاہئے اس فراخی و تونگری کے زمانہ میں یہ بات فراموش نہ کریں کہ دنیا میں مال و دولت کی آسائش و راحت دراصل آخرت میں تنگی و سختی اور ندامت کا باعث ہے، ہاں اگر مال و دولت کو دنیاوی آسائش و راحت کے ساتھ مصارف خیر میں خرچ کر کے آخرت کا توشہ بھی بنا لینے کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہو جائے تو دنیا و آخرت دونوں جگہ آسائش ہی آسائش ہو گی! حاصل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی اس شان نبوت کے تحت کہ آپ ؐ بھلائیوں کی بشارت دینے والے بھی ہیں اور خرابیوں سے ڈرانے والے بھی ہیں، مسلمانوں کو وسعت رزق اور فراغت معیشت کی بشارت بھی عطا فرمائی اور قیامت کے دن کی سختی و شدت اور ہولناکی سے ڈرایا بھی۔

"ترجمان" اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی بات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کرے، اس کو مترجم بھی کہا جاتا ہے پس۔ "اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہو گا۔" کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ اور اس کے بندے کے درمیان کسی مترجم وغیرہ کا واسطہ نہیں ہو گا، پروردگار کے حضور بندہ کی براہ راست پیشی اور گفتگو ہو گی۔

"کیا میں نے تجھ کو مال و زر عطا نہیں کیا تھا؟" ۔ یہ استفہام اقراری ہے یعنی! میں نے تجھ کو مال و دولت سے سرفراز کیا، تجھ پر اپنا فضل و انعام کیا، اس مال و دولت کو خرچ کرنے اس سے فائدہ اٹھانے اور مستحق و ضرورت مند لوگوں پر اس کو صرف کرنے کی قدرت عطا کی۔

دائیں اور بائیں دوزخ کو دیکھنے کا ذکر کرنا دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ اس دن بندہ اپنے کو چاروں طرف سے دوزخ کے درمیان گھرا ہوا دیکھے گا، اور اس ہولناک جگہ سے گو خلاصی کا راستہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو گا کہ اس کو دوزخ کے اوپر (پل صراط) سے گذرنا پڑے گا، اگر دنیا میں ایمان و تقویٰ کی زندگی اختیار کی ہو گی اور اللہ کا فضل شامل حال رہا تو اس کے اوپر سے گذر کر جنت میں پہنچ جائے گا ورنہ دوزخ میں گر پڑے گا۔ ارشاد ربانی ہے:

و ان منکم الا واردھا کَانَ علی ربک حتما مقضیا ثُمّ ننجی الذین اتقوا۔

"اور تم میں ایسا کوئی شخص نہیں جس کو اس (دوزخ) کے اوپر سے گذرنا نہ پڑے گا، یہ تمہارے رب کا حتمی فیصلہ ہے، پھر ہم پرہیز گاروں کو نجات دیں گے۔"

اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ اور اس کا ایک بہترین طریقہ صدقہ خیرات بھی ہے۔ جس قدر مالی وسعت ہو، جتنی ہمت ہو اس کے مطابق غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کی مالی مدد کر کے اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا چاہئے اگر کوئی سائل تمہارے سامنے دست سوال دراز کرے تو تمہیں جو کچھ بھی میسر ہو اس کو دے دو، یہاں تک کہ تم کھجور کے ایک ٹکڑے کے برابر کوئی معمولی چیز دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں دے سکتے تو وہی معمولی چیز دے کر اس کا سوال پورا کرو، اور اگر سرے سے کچھ بھی دینے کی استطاعت نہیں رکھتے تو کم سے کم یہ کرو کہ اپنے کھرے اور بھدے جواب کے ذریعہ اس کی دل شکنی کرنے کے بجائے نہایت نرمی و ملائمت کے ساتھ اس کے سامنے اپنا عذر بیان کرو اور ایسے الفاظ و اسلوب میں اس کو جواب دو کہ وہ تمہارے برتاؤ ہی سے خوش ہو جائے، بشرطیکہ اس میں دین کی مداہنت نہ ہو۔

دین کی راہ میں سخت سے سخت اذیت سہنا ہی اہل ایمان کا شیوہ ہے

⑦ وَعَنْ خَبَّابِ بْنِ الْاَرَتِّ قَالَ شَكَوْنَا اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُتَوَسِّدٌ بُرْدَةً فِيْ ظِلِّ الْكَعْبَةِ وَلَقَدْ لَقِيْنَا

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ شِدَّةً فَقُلْنَا اَلَا تَدْعُوا اللّٰهَ فَقَعَدَ وَهُوَ مُحْمَرٌّ وَجْهُهُ وَقَالَ كَانَ الرَّجُلُ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ يُحْفَرُ لَهٗ فِي الْاَرْضِ فَيُجْعَلُ فِيْهِ فَيُجَآءُ بِمِنْشَارٍ فَيُوْضَعُ فَوْقَ رَأْسِهٖ فَيُشَقُّ بِاثْنَيْنِ فَمَا يَصُدُّهٗ ذٰلِكَ عَنْ دِيْنِهٖ وَيُمْشَطُ بِاَمْشَاطِ الْحَدِيْدِ مَادُوْنَ لَحْمِهٖ مِنْ عَظْمٍ وَ عَصَبٍ وَمَا يَصُدُّهٗ ذٰلِكَ عَنْ دِيْنِهٖ وَ اللّٰهِ لَيَتِمَّنَّ هٰذَا الْاَمْرُ حَتّٰى يَسِيْرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ اِلٰى حَضْرَمَوْتَ لَا يَخَافُ اِلَّا اللّٰهَ اَوِ الذِّئْبَ عَلٰى غَنَمِهٖ وَلٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُوْنَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت خباب ابن ارت ؓ کہتے ہیں کہ ایک دن ہم نے نبی کریم ﷺ سے اس وقت جب کہ آپ ﷺ کعبۂ اقدس کے سائے میں سر کے نیچے کملی رکھے ہوئے لیٹے تھے، (کفار کی سخت ترین مخالفت اور دشمنی کی) شکایت کی کہ ان سے ہم لوگوں کو بہت اذیت اور تکلیف پہنچتی ہے اور عرض کیا کہ (جب وہ لوگ ایذا رسانی سے باز نہیں آتے تو) آپ ﷺ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے (ہماری یہ بات سنتے ہی) آپ ﷺ اٹھ بیٹھے اور چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا، فرمایا: "تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں ان میں ایک وہ شخص تھا جس کے لئے زمین میں ایک گڑھا کھودا جاتا تھا پھر اس شخص کو اس گڑھے میں بٹھایا یا کھڑا کیا جاتا تھا اور پھر آرہ لاکر اس کے سر پر رکھا جاتا تھا اور اس آرہ سے اس کو چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے، لیکن یہ سخت عذاب بھی اس کو دین سے پھرنے نہیں دیتا تھا، اور ایک وہ شخص تھا جس کے جسم پر لوہے کی (تیز) کنگھی چلائی جاتی تھی جو گوشت کے نیچے ہڈیوں اور پٹھوں تک چیرتی چلی جاتی تھی، لیکن یہ سخت ترین عذاب بھی اس کو دین سے پھرنے نہیں دیتا تھا، خدا کی قسم یہ دین یقیناً درجۂ کمال کو پہنچے گا اور تم مصیبتوں اور پریشانیوں کے ختم ہوجانے والے اس دور کے بعد آسانیوں اور اطمینان کا وہ زمانہ بھی دیکھو گے کہ) ایک شخص صنعاء سے حضر موت تک تنہا سفر کرے گا اور خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرے گا، یا یہ کہ کسی شخص کو اپنی بکریوں کے بارے میں بھیڑیوں سے بھی کوئی خوف و خطرہ نہیں ہوگا، لیکن تم جلدی کرتے ہو۔" بخاری

تشریح: "چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا۔" یہ دراصل اس کرب اور اس اندرونی کیفیت کا اظہار تھا جو صحابہ ؓ کی زبان سے کافروں اور دین کے دشمنوں کے ظلم و ستم اور ان کی ایذا رسانیوں کو سن کر آپ ﷺ پر طاری ہوئی! یا یہ کہ آپ ﷺ کو چونکہ یہ پسند نہیں تھا کہ کافروں کے ظلم و ستم پر آپ ﷺ کے صحابہ ؓ بے صبری کا اظہار کریں اور زبان پر حرف شکایت لائیں اس لئے جب ان صحابہ ؓ نے کفار کی مخالفت و دشمنی اور ایذا رسانی کی شکایت کی تو ناگواری اور غصہ کی وجہ سے آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا۔ آپ ﷺ نے آگے جو فرمایا اس کو دیکھتے ہوئے یہی مطلب زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"صنعاء" دمشق (شام) کے نواح میں ایک گاؤں کا نام تھا جیسا کہ قاموس میں لکھا ہے اور اصل میں جزیرہ نما عرب کے مشہور ملک "یمن" کا سب سے بڑا شہر اور دار الحکومت ہے۔ پانی کی فراوانی اور درختوں کی کثرت کی وجہ سے یمن کی سرسبزی و شادابی اور زرخیزی بہت مشہور ہے۔

"حضر موت" بھی پہلے یمن ہی کا ایک حصّہ تھا اور ایک جگہ کا نام تھا لیکن اب "عدن" کے مشرقی سمت کے ایک بڑے علاقہ پر مشتمل بہت سے شہروں اور آبادیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایک زمانہ میں یہاں صلحاء اور اہل اللہ کی اس قدر کثرت رہا کرتی تھی اور اس سرزمین پر اتنے اولیاء اللہ پیدا ہوتے تھے کہ یہ مقولہ ہی ہوگیا تھا: حضر موت منبت الاولیاء یعنی حضر موت وہ جگہ ہے جہاں اولیاء اللہ اگتے ہیں۔ اس جگہ کا نام "حضر موت" اس وجہ سے مشہور ہے کہ جلیل القدر پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کا انتقال یہیں ہوا تھا اور وفات کے وقت انہوں نے یہ جملہ فرمایا تھا حضر الموت (موت حاضر ہوگئی) اسی وقت سے اس جگہ کا نام ہی "حضر موت" پڑ گیا۔ اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ایک اور پیغمبر حضرت جرجیس علیہ السلام کی موت اسی جگہ آئی تھی اور اس وقت سے اس کو حضر موت کہا جانے لگا۔

"کسی شخص کو اپنی بکریوں کے بارے میں...... الخ کے اصل معنی مراد نہیں ہیں، یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ واقعۃً بھیڑیئے بکریوں پر حملہ کرنا اور ان کو درندگی کا نشانہ بنانا چھوڑ دیں گے کیونکہ عادتاً ایسا ممکن ہی نہیں ہے، اگرچہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اس دنیا میں نازل ہوں گے اور عام درو بست ان کے ہاتھ میں ہوگا تو اس وقت اتنا بابرکت امن و امان قائم ہوگا کہ بھیڑیئے بھی بکریوں پر حملہ

کرنے سے باز رہیں گے۔ بلکہ اس جملہ کا اصل مقصد انسانوں کے باہمی اعتبار و اعتماد اور اُمن و امان کو شدت کے ساتھ ظاہر کرنا ہے کہ اس وقت لوگ ایک دوسرے کے ظلم و ستم اور زور زبردستی سے بالکل محفوظ و مامون ہوں گے اور پورا معاشرہ اس طرح کے امن و عافیت سے بھرپور ہو گا جس کا تصور بھی زمانہ جاہلیت میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"لیکن تم جلدی کرتے ہو۔" کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے گویا صحابہؓ کو تسلی دی کہ تمہیں گھبراہٹ اور پریشانی کا شکار نہ ہونا چاہئے اور نہ اس بات کی توقع رکھنی چاہئے کہ جس عظیم مقصد کی راہ میں تم لگے ہوئے ہو اس کو بغیر اذیت و پریشانی اٹھائے اور بہت جلد سر کر لو گے۔ اس راہ میں بڑی رکاوٹیں بھی ہیں اور شدید ترین مصائب بھی، جہاں ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے سخت ترین جدوجہد کرنا پڑے گی وہیں ان مصائب پر صبر و استقامت کا دامن بھی تھامے رکھنا ہو گا، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ خدا نے چاہا تو اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کا عناد آمیز رویہ اور اذیت ناک برتاؤ جلد ختم ہو جائے گا اور آخر الامر خدا کے دین کا بول بالا ہو گا، لہٰذا تم دین کی راہ میں تمام مصائب پر صبر کرو جیسا کہ گذشتہ امتوں کے اہل حق اور اہل ایمان لوگوں نے ان مصائب اور اذیتوں پر اپنے یقین و ایمان کی قوت کے سہارے صبر کیا جو تمہیں پیش آنے والے مصائب اور اذیتوں سے کہیں زیادہ دردناک اور سخت ترین تھیں۔

ایک خواب اور دعا

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُ عَلٰى اُمِّ حَرَامٍ بِنْتِ مِلْحَانَ وَكَانَتْ تَحْتَ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ فَدَخَلَ عَلَيْهَا يَوْمًا فَاَطْعَمَتْهُ ثُمَّ جَلَسَتْ تَفْلِيْ رَأْسَهٗ فَنَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ وَهُوَ يَضْحَكُ قَالَتْ فَقُلْتُ مَا يُضْحِكُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اُنَاسٌ مِنْ اُمَّتِيْ عُرِضُوْا عَلَيَّ غُزَاةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَرْكَبُوْنَ ثَبَجَ هٰذَا الْبَحْرِ مُلُوْكًا عَلَى الْاَسِرَّةِ اَوْ مِثْلَ الْمُلُوْكِ عَلَى الْاَسِرَّةِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ادْعُ اللّٰهَ اَنْ يَجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ فَدَعَا لَهَا ثُمَّ وَضَعَ رَأْسَهٗ فَنَامَ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ وَهُوَ يَضْحَكُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يُضْحِكُكَ قَالَ اُنَاسٌ مِنْ اُمَّتِيْ عُرِضُوْا عَلَيَّ غُزَاةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَا قَالَ فِي الْاُوْلٰى فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ادْعُ اللّٰهَ اَنْ يَجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ قَالَ اَنْتِ مِنَ الْاَوَّلِيْنَ فَرَكِبَتْ اُمُّ حَرَامٍ الْبَحْرَ فِيْ زَمَنِ مُعَاوِيَةَ فَصُرِعَتْ عَنْ دَابَّتِهَا حِيْنَ خَرَجَتْ مِنَ الْبَحْرِ فَهَلَكَتْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت اُمّ حرام بنت ملحانؓ کے ہاں آیا جایا کرتے تھے جو حضرت عبادہ بن صامتؓ کی بیوی تھیں، ایک دن (حسب معمول) آنحضرت ﷺ اُمّ حرامؓ کے ہاں تشریف لائے تو ام حرامؓ نے آپ کو کھانا کھلایا، اور پھر آپ ﷺ کے سر مبارک میں جوئیں دیکھنے بیٹھ گئیں، اس دوران آپ ﷺ سو گئے پھر (کچھ ہی دیر بعد) آپ ﷺ ہنستے ہوئے بیدار ہو گئے! اُمّ حرامؓ نے بیان کیا کہ میں نے (آپ ﷺ کو اس حالت میں ہنستے ہوئے دیکھا تو) پوچھا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ (ﷺ) کو کس چیز نے ہنسایا؟ فرمایا" (خواب میں) میری اُمت میں سے ایک جماعت اس حال میں میرے سامنے لائی گئی اور مجھ کو دکھائی گئی کہ وہ خدا کی راہ میں جہاد کر رہی تھی اور سمندر میں اس طرح محو سفر تھی جیسے بادشاہ اپنے تخت پر ہوتے ہیں۔ یا یہ فرمایا کہ۔ بادشاہوں کی طرح جو تخت پر جلوہ گر ہوں۔" میں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ ان مجاہدوں میں جو سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے خدا کی راہ میں جہاد کو نکلیں، مجھ کو بھی شامل کر دے۔ آپ ﷺ نے اُمّ حرامؓ کے حق میں دعا کر دی۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے (تکیہ پر) سر رکھا اور پھر سو گئے (کچھ دیر بعد) پھر آپ ﷺ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) اب کیوں ہنسے؟ فرمایا: (اب پھر (خواب میں) میری اُمت میں سے کچھ لوگ میرے سامنے اس حال میں پیش کئے گئے کہ وہ خدا کی راہ میں جہاد کر رہے تھے جیسا کہ آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ فرمایا تھا (اس مرتبہ بھی وہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ وہ لوگ سمندر میں اس طرح محو سفر تھے جیسے بادشاہ اپنے تخت پر ہوتے ہیں) میں نے (یہ سن کر اس مرتبہ) پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) اللہ تعالیٰ سے دعا

کیجئے کہ وہ ان مجاہدوں میں مجھ کو بھی شامل کردے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! "پہلی جماعت میں ہو۔" چنانچہ حضرت اُمّ حرامؓ نے حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں (جہاد کی غرض سے) بحری سفر کیا اور جب سمندر سے اتر کر جانور پر سوار ہوئیں تو (اچانک) جانور کی پشت سے زمین پر گر پڑیں اور (راہ خدا میں شہادت کا مرتبہ پاکر اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: ام حرامؓ ملحان ابن خالد کی بیٹی ہیں، قبیلہ بنی نجار سے تعلق رکھتی ہیں، حضرت انسؓ کی خالہ ہیں اور ان کی والدہ حضرت اُمّ سلیم کی بہن ہیں، یہ دونوں یعنی حضرت اُمّ حرامؓ اور حضرت اُمّ سلیمؓ دودھ کے رشتہ سے یا کسی نسبی قرابت سے آنحضرت ﷺ کی خالہ تھیں، امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت اُمّ حرامؓ آنحضرت ﷺ کی محرم تھیں اسی لئے آپ ﷺ بے تکلفی کے ساتھ دو پہر میں ان کے ہاں جا کر قیلولہ فرمایا کرتے تھے، لیکن کیفیت محرمیت میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، کسی نے کسی تعلق سے محرم کہا ہے اور کسی نے کسی کے تعلق سے! حضرت ام حرامؓ مشرف باسلام ہوئیں اور آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی، اور حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں اپنے خاوند حضرت عبادہ ابن صامتؓ کے ساتھ، جو انصار میں سے ایک جلیل القدر صحابی ہیں، خدا کی راہ میں جہاد کے لئے نکلیں اور سرزمین روم میں پہنچ کر مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئیں۔

"سر مبارک میں جوئیں دیکھنے بیٹھ گئیں۔" پہلے یہ تحقیقی قول گذر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بدن مبارک کے کسی بھی حصہ میں جوئیں نہیں تھیں، حضرت اُمّ حرامؓ کا اصل مقصد آپ ﷺ کے مبارک بالوں کو گرد وغبار سے صاف کرنا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ کہیں کوئی جوں تو نہیں ہے۔ اگر ہو تو نکال دیں۔

"یا یہ فرمایا کہ بادشاہوں کی طرح جو تخت پر جلوہ گر ہوں۔" اس موقع پر دراصل راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے کہ یہاں آنحضرت ﷺ نے ملوکا علی الاسرۃ کے الفاظ ارشاد فرمائے یا مثل الملوک علی الاسرۃ کے الفاظ دونوں جملوں میں بہت معمولی سا لفظی فرق ہے، معنی ومفہوم کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ اس جملہ میں آنحضرت ﷺ نے سمندر کے سینہ کو گویا زمین کی پشت سے اور کشتی کو تخت سے مشابہت دی اور کشتی میں سوار ہونے کو تخت سلطنت پر بادشاہ کے بیٹھنے کے مشابہ قرار دیا، اور اس طرح آپ ﷺ نے یہ اشارہ فرمایا کہ وہ لوگ اگرچہ اپنی جان، ہتھیلی پر رکھ کر اتنی خطرناک مہم پر روانہ ہوں گے لیکن قصد کے تئیں اخلاص ویقین اور رضائے الٰہی کے حصول کا جذبۂ صادق رکھنے کی وجہ سے ان کے دلوں میں نہ کوئی خوف ہوگا نہ گھبراہٹ وہ اس قدر ذہنی ودماغی اطمینان و سکون اور قلبی طمانیت ونشاط کے ساتھ کھلے سمندر میں سفر کریں گے اور کشتیوں میں بیٹھے ہوں گے جیسے کوئی بادشاہ اپنے محفوظ ومامون محل میں تخت سلطنت پر اطمینان سے بیٹھا ہو۔

"تم پہلی جماعت میں ہو۔" اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو دوسری مرتبہ خواب میں جو جماعت دکھائی دی۔ وہ اس جماعت کے علاوہ دوسرے لوگوں پر مشتمل تھی جو پہلی مرتبہ دکھائی گئی تھی، اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ اس امت کی کوئی نہ کوئی جماعت برابر سمندری سفر کر کے راہ خدا میں جہاد کرتی رہے گی، کبھی کوئی لشکر برسرپیکار ہوگا اور کبھی کوئی لشکر سمندروں کا سینہ چیرتا ہوا دشمنان حق پر حملہ آور ہوگا۔ لہٰذا جب حضرت اُمّ حرامؓ نے دوسری مرتبہ آنحضرت ﷺ سے دعا کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے حق میں تو پہلی مرتبہ کی دعا قبول ہو چکی ہے اور تم اس جماعت میں شامل ہوگی جو سب سے پہلے بحری سفر کر کے راہ خدا میں جہاد کرے گی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا مرتبہ کہ جنہیں پہلے جہاد کی سعادت نصیب ہوئی، بعد کے مجاہدین کے مرتبہ سے بلند ہے۔

روایت کے آخری الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سفر جہاد میں حضرت ام حرامؓ کی روانگی اور سواری کے جانور کی پشت سے گر کر ان کے وفات پانے کا واقعہ حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت کے زمانہ کا ہے جب کہ اسماء الرجال اور سیر کی کتابوں میں ان کی وفات حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں بیان کی گئی ہے، تو اس سلسلہ مین اصل بات یہ ہے کہ یہاں "حضرت معاویہؓ کے زمانہ سے مراد ان کی گورنری کا زمانہ ہے، یعنی حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں جب حضرت معاویہؓ عامل وگورنر تھے تو اس وقت یہ واقعہ پیش آیا

تھا نہ کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت معاویہؓ بذات خود تخت امارت و حکومت پر فائز تھے، اس وضاحت سے دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تضاد باقی نہیں رہتا۔

زبان رسالت کا اعجاز

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ اِنَّ ضِمَادًا قَدِمَ مَكَّةَ وَكَانَ مِنْ اَزْدِ شَنُوْءَةَ وَكَانَ يَرْقِىْ مِنْ هٰذَا الرِّيْحِ فَسَمِعَ سُفَهَآءَ اَهْلِ مَكَّةَ اِنَّ يَقُوْلُوْنَ مُحَمَّدًا مَجْنُوْنٌ فَقَالَ لَوْ اِنِّىْ رَاَيْتُ هٰذَا الرَّجُلَ لَعَلَّ اللّٰهُ يَشْفِيْهِ عَلٰى يَدِىْ قَالَ فَلَقِيَهُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنِّىْ اَرْقِىْ مِنْ هٰذَا الرِّيْحِ فَهَلْ لَكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَالَ اَعِدْ عَلَىَّ كَلِمَاتِكَ هٰؤُلَآءِ فَاَعَادَهُنَّ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ لَقَدْ سَمِعْتُ قَوْلَ الْكَهَنَةِ وَقَوْلَ السَّحَرَةِ وَقَوْلَ الشُّعَرَآءِ فَمَا سَمِعْتُ مِثْلَ كَلِمَاتِكَ هٰؤُلَآءِ وَقَدْ بَلَغْنَ قَامُوْسَ الْبَحْرِ هَاتِ يَدَكَ اُبَايِعْكَ عَلَى الْاِسْلَامِ قَالَ فَبَايَعَهٗ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِىْ بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ بَلَغْنَا نَاعُوْسَ الْبَحْرِ وَذُكِرَ حَدِيْثَا اَبِىْ هُرَيْرَةَ وَ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ يَهْلِكُ كِسْرٰى وَالْاٰخَرُ لَتَفْتَحَنَّ عِصَابَةٌ فِىْ بَابِ الْمَلَاحِمِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ازد شنوءہ سے تعلق رکھنے والا ایک شخص جس کا نام ضماد تھا (اسلام کے ابتدائی زمانہ میں) مکہ آیا وہ ہوا (یعنی آسیب وجن) اتارنے کے لئے جھاڑ پھونک کیا کرتا تھا، جب اس نے مکہ کے بیوقوفوں کی زبان سے یہ سنا کہ محمد ﷺ دیوانہ ہوگیا ہے تو اس نے کہا کہ اگر میں اس شخص (محمد ﷺ) کو دیکھوں (تو علاج کردوں) شاید اللہ تعالیٰ اس کو میرے علاج سے ٹھیک کردے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ضماد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اے محمد (ﷺ)! میں جھاڑ پھونک کے ذریعہ آسیب وجن دفع کرتا ہوں، اگر تم چاہو تو میں اپنی جھاڑ پھونک کے ذریعہ تمہارا علاج کروں!؟ رسول کریم ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: "تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، ہم اسی کی حمد و ثنا کرتے ہیں، (اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں) اور اسی سے (ذکر وطاعت اور عبادت کی توفیق اور) مدد چاہتے ہیں، وہ جس کو سیدھا راستہ دکھادے (اور مقصد یاب کرے) اس کو کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جس کو وہ گمراہ کردے اس کو کوئی ہدایت نہیں کرسکتا اور منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں، بعد ازاں۔" ضماد (یہاں تک سننے کے بعد) بیساختہ بولا کہ ان جملوں کو ایک مرتبہ پھر میرے سامنے ارشاد فرمائے آنحضرت ﷺ نے ان جملوں کو پھر ارشاد فرمایا اور تین بار ارشاد فرمایا۔ ضماد نے کہا: "میں نے کاہنوں کے اقوال سنے ہیں، میں نے ساحروں کے کلمات سنے ہیں میں نے شاعروں کے اشعار سنے ہیں، لیکن (خدا کی قسم) آج تک میں نے آپ (ﷺ) کے ان کلمات واقوال کے مانند کوئی کلام نہیں سنا، حقیقت تو یہ ہے کہ آپ (ﷺ) کے یہ کلمات (فصاحت وبلاغت اور تاثیر کے اعتبار سے) دریائے علم وکلام کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچے ہوئے ہیں، لایئے اپنا ہاتھ بڑھائیے، میں (آپ (ﷺ) کے دست مبارک پر) اسلام کی بیعت کرتا ہوں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ضماد نے (اسی وقت) آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مسلمان ہوگیا۔" (مسلم)

تشریح: مصابیح کے بعض نسخوں میں (بلغن کی جگہ) بلغنا ہے اور (قاموس البحر کی جگہ) ناعوس البحر ہے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت یھلک کسری الخ اور حضرت جابر ابن سمرہ کی روایت لتفتحن عصابۃ الخ باب الملاحم میں نقل کی جاچکی ہیں۔

تشریح: "ضماد" ویسے توضؔ کے زیر اور آخر میں دؔ کے ساتھ (ضماد) ہے لیکن بعض حضرات نے اس نام کو آخر میں مؔ کے ساتھ یعنی ضمام نقل کیا ہے۔ شنوءۃ یمن کے ایک بہت بڑے قبیلہ کا نام ہے اور ازد اسی قبیلہ کی ایک شاخ کو کہتے ہیں۔ ضماد اپنے وقت کا ایک بڑ

غیب بھی تھا فسوں گر بھی، علم کے میدان سے اچھا خاصا تعلق رکھتا تھا۔ عملیات یعنی جھاڑ پھونک اس کا خاص فن اور پیشہ تھا، زمانۂ نبوت سے پہلے ہی آنحضرت ﷺ سے اس کی شناسائی تھی، اسی لئے جب اعلان نبوت کے بعد وہ مکہ آیا اور بدباطن مشرکین مکہ کے عناد آمیز اور شرانگیز پروپیگنڈہ کے ذریعہ اس تک یہ بات پہنچی کہ (نعوذ باللہ) محمد (ﷺ) پر آسیب کا اثر ہے یا ان پر دیوانگی کا مرض غالب آ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں، تو اس نے اپنے پچھلے تعلق کی بنا پر از خود اور بزعم خود آنحضرت ﷺ کا علاج کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا، آنحضرت ﷺ نے اس کی بات سن کر یہ مناسب سمجھا کہ مخالفین اسلام کے بے سروپا پروپیگنڈہ کے زیر اثر اس نے جو رائے قائم کی ہے اس کی تردید براہ راست نہ کی جائے بلکہ اس کے سامنے خدا کا پیغام اور دین کی بات اس انداز اور پیرایہ میں رکھی جائے جس سے خود جان جائے کہ جس شخص کو بے وقوف لوگ دیوانہ یا آسیب زدہ کہتے ہیں وہ درحقیقت کیا حیثیت رکھتا ہے اور عقل و دانائی کے کس مقام پر فائز ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے سامنے پند و نصیحت پر مشتمل خطبہ ارشاد کرنے کے لئے ابھی حمد و ثنا کے کلمات اور تمہیدی جملے ہی ارشاد فرماتے تھے اور اما بعد (بعد ازاں) کہہ کر اصل خطبہ شروع کرنا چاہتے تھے کہ زبان رسالت کے اعجاز نے ضماد کو آگے کچھ اور سننے کی ضرورت ہی باقی نہ رہنے دی اس کو خطبہ کے ان تمہیدی جملوں ہی سے اپنے دل و دماغ کی دنیا بدلتی محسوس ہونے لگی، اس نے درخواست کر کے بار بار ان الفاظ کو زبان رسالت سے سنا اور جب اس کے دل و دماغ نے گواہی دے دی کہ یہ شخص نہ دیوانہ ہے اور نہ آسیب و جن کے زیر اثر، بلکہ حقیقت میں خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور اس کے بارے میں مخالفین و معاندین کا جو گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے اس کا اصل مقصد لوگوں کو اس شخص سے اور اس کی سچی باتوں سے دور رکھنا ہے تو اس نے فوراً آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کر لی اور مسلمان ہو گیا، اس طرح ضمادؓ ان خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جنہیں ابتدائے اسلام ہی میں حلقہ بگوش دین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ رضی اللہ عنہ۔

"قاموس البحر" میں اصل لفظ "قاموس" ہے یا "ناعوس" اس کے متعلق شارح مسلم امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ ہم نے اس لفظ کو دونوں طرح یعنی ناعوس بھی نقل کیا ہے اور قاموس بھی ہمارے یہاں صحیح مسلم کے جو نسخے پائے جاتے ہیں اس میں "ناعوس" ہی کا لفظ ہے، لیکن صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتابوں کی مشہور روایتوں میں لفظ "قاموس" لکھا ہے۔ اور قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ بعض حضرات نے "ناعوس" کا لفظ نقل کیا ہے اور ہمارے شیخ ابو الحسنؒ نے کہا ہے کہ "ناعوس" کے وہ معنی ہیں جو "قاموس" کے ہیں۔ لیکن تورپشتیؒ نے کہا ہے کہ (صحیح لفظ "قاموس" ہی ہے) ناعوس کا لفظ خطاء و تصحیف اور کسی راوی کا وہم ہے۔ ویسے یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہ لفظ "قاعوس" بھی منقول ہے، نیز لغت کی مشہور کتابوں میں، ناعوس، کا لفظ نہیں ملتا۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِيْ
اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان کی گواہی

(۱۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبُوْسُفْيَانَ بْنُ حَرْبٍ مِنْ فِيْهِ اِلٰى فِيَّ قَالَ انْطَلَقْتُ فِي الْمُدَّةِ الَّتِيْ كَانَتْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَبَيْنَا اَنَا بِالشَّامِ اِذْ جِيْءَ بِكِتَابٍ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى هِرَقْلَ قَالَ وَكَانَ دِحْيَةُ الْكَلْبِيُّ جَاءَ بِهٖ فَدَفَعَهٗ اِلٰى عَظِيْمِ بُصْرٰى فَدَفَعَهٗ عَظِيْمُ بُصْرٰى اِلٰى هِرَقْلَ فَقَالَ هِرَقْلُ هَلْ هٰهُنَا اَحَدٌ مِنْ

قَوْمِ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِیْ یَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِیٌّ قَالُوْا نَعَمْ فَدُعِیْتُ فِیْ نَفَرٍ مِّنْ قُرَیْشٍ فَدَخَلْنَا عَلٰی هِرَقْلَ فَاَجْلَسَنَا بَیْنَ یَدَیْهِ فَقَالَ اَیُّکُمْ اَقْرَبُ نَسَبًا مِّنْ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِیْ یَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِیٌّ قَالَ اَبُوْسُفْیَانَ فَقُلْتُ اَنَا فَاَجْلَسُوْنِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَجْلَسُوْا اَصْحَابِیْ خَلْفِیْ ثُمَّ دَعَا بِتَرْجُمَانِهٖ فَقَالَ قُلْ لَهُمْ اِنِّیْ سَائِلٌ هٰذَا عَنْ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِیْ یَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِیٌّ فَاِنْ کَذَبَنِیْ فَکَذِّبُوْهُ قَالَ اَبُوْسُفْیَانَ وَ اَیْمُ اللّٰهِ لَوْ لَا مَخَافَةُ اَنْ یُّؤْثَرَ عَلَیَّ الْکَذِبُ لَکَذَبْتُهٗ ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِهٖ سَلْهُ کَیْفَ حَسَبُهٗ فِیْکُمْ قَالَ قُلْتُ هُوَ فِیْنَا ذُوْحَسَبٍ قَالَ فَهَلْ کَانَ مِنْ اٰبَائِهٖ مِنْ مَّلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ کُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْکَذِبِ قَبْلَ اَنْ یَّقُوْلَ مَا قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ وَمَنْ یَّتَّبِعُهٗ اَشْرَافُ النَّاسِ اَمْ ضُعَفَآءُهُمْ قَالَ قُلْتُ بَلْ ضُعَفَاءُهُمْ قَالَ اَیَزِیْدُوْنَ اَمْ یَنْقُصُوْنَ قَالَ قُلْتُ لَا بَلْ یَزِیْدُوْنَ قَالَ هَلْ یَرْتَدُّ اَحَدٌ مِّنْهُمْ عَنْ دِیْنِهٖ بَعْدَ اَنْ یَّدْخُلَ فِیْهِ سَخْطَةً لَّهٗ قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ قَاتَلْتُمُوْهُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَکَیْفَ کَانَ قِتَالُکُمْ اِیَّاهُ قَالَ قُلْتُ یَکُوْنُ الْحَرْبُ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهٗ سِجَالًا یُّصِیْبُ مِنَّا وَ نُصِیْبُ مِنْهُ قَالَ فَهَلْ یَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَ نَحْنُ مِنْهُ فِیْ هٰذِهِ الْمُدَّةِ لَا نَدْرِیْ مَا هُوَ صَانِعٌ فِیْهَا قَالَ وَ اللّٰهِ مَا اَمْکَنَنِیْ مِنْ کَلِمَةٍ اُدْخِلُ فِیْهَا شَیْئًا غَیْرَ هٰذِهٖ قَالَ فَهَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ اَحَدٌ قَبْلَهٗ قُلْتُ لَا ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِهٖ قُلْ لَهٗ اِنِّیْ سَاَلْتُكَ عَنْ حَسَبِهٖ فِیْکُمْ فَزَعَمْتَ اَنَّهٗ فِیْکُمْ ذُوْ حَسَبٍ وَ کَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِیْ اَحْسَابِ قَوْمِهَا وَ سَاَلْتُكَ هَلْ کَانَ فِیْ اٰبَائِهٖ مَلِكٌ فَزَعَمْتَ اَنْ لَّا فَقُلْتُ لَوْ کَانَ مِنْ اٰبَائِهٖ مَلِكٌ قُلْتُ رَجُلٌ یَّطْلُبُ مُلْكَ اٰبَائِهٖ

وَسَاَلْتُكَ عَنْ اَتْبَاعِهٖ اَضُعَفَاءُ هُمْ اَمْ اَشْرَافُهُمْ فَقُلْتَ بَلْ ضُعَفَاءُ هُمْ وَهُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ وَسَاَلْتُكَ هَلْ کُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْکَذِبِ قَبْلَ اَنْ یَّقُوْلَ مَا قَالَ فَزَعَمْتَ اَنْ لَّا فَعَرَفْتُ اَنَّهٗ لَمْ یَکُنْ لِیَدَعَ الْکَذِبَ عَلَی النَّاسِ ثُمَّ یَذْهَبُ فَیَکْذِبُ عَلَی اللّٰهِ وَسَاَلْتُكَ هَلْ یَرْتَدُّ اَحَدٌ مِّنْهُمْ عَنْ دِیْنِهٖ بَعْدَ اَنْ یَّدْخُلَ فِیْهِ سَخْطَةً لَّهٗ فَزَعَمْتَ اَنْ لَّا وَ کَذٰلِكَ الْاِیْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ وَ سَاَلْتُكَ هَلْ یَزِیْدُوْنَ اَمْ یَنْقُصُوْنَ فَزَعَمْتَ اَنَّهُمْ یَزِیْدُوْنَ وَکَذٰلِكَ الْاِیْمَانُ حَتّٰی یَتِمَّ وَسَاَلْتُكَ هَلْ قَاتَلْتُمُوْهُ فَزَعَمْتَ اَنَّکُمْ قَاتَلْتُمُوْهُ فَتَکُوْنُ الْحَرْبُ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهٗ سِجَالًا یَّنَالُ مِنْکُمْ وَتَنَالُوْنَ مِنْهُ وَ کَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْتَلٰی ثُمَّ تَکُوْنُ لَهَا الْعَاقِبَةُ وَ سَاَلْتُكَ هَلْ یَغْدِرُ فَزَعَمْتَ اَنَّهٗ لَا یَغْدِرُ وَ کَذٰلِكَ الرُّسُلُ لَا تَغْدِرُ وَسَاَلْتُكَ هَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ اَحَدٌ قَبْلَهٗ فَزَعَمْتَ اَنْ لَّا فَقُلْتُ لَوْ کَانَ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ اَحَدٌ قَبْلَهٗ قُلْتُ رَجُلٌ اِئْتَمَّ بِقَوْلٍ قِیْلَ قَبْلَهٗ قَالَ ثُمَّ قَالَ بِمَا یَاْمُرُکُمْ قُلْنَا یَاْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّکٰوةِ وَ الصِّلَةِ وَ الْعَفَافِ قَالَ اِنْ یَّكُ مَا تَقُوْلُ حَقًّا فَاِنَّهٗ نَبِیٌّ وَ قَدْ کُنْتُ اَعْلَمُ اَنَّهٗ خَارِجٌ وَلَمْ اَكُ اَظُنُّهٗ مِنْکُمْ وَلَوْ اَنِّیْ اَعْلَمُ اَنِّیْ اَخْلُصُ اِلَیْهِ لَاَحْبَبْتُ لِقَائَهٗ وَلَوْ کُنْتُ عِنْدَهٗ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَیْهِ وَ لَیَبْلُغَنَّ مُلْکُهٗ مَا تَحْتَ قَدَمَیَّ ثُمَّ دَعَا بِکِتَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَاَهٗ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَ قَدْ سَبَقَ تَمَامُ الْحَدِیْثِ فِیْ بَابِ الْکِتَابِ اِلَی الْکُفَّارِ۔

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ابوسفیان ابن حرب نے مجھ سے منہ در منہ یہ بیان کیا کہ اس صلح (حدیبیہ) کی مدت میں جو میرے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تھی (اور نہ صرف یہ کہ میں مسلمان نہیں ہوا تھا بلکہ دشمنان اسلام کا سردار تھا) میں نے سفر کیا اور اتفاق سے اس وقت جب کہ نبی کریم ﷺ کا نامۂ مبارک ہرقل (قیصر روم کے پاس پہنچا میں ملک شام میں مقیم تھا! ابوسفیان نے کہا کہ نامہ مبارک دحیہ کلبی لے کر آئے تھے جس کو انہوں نے بصری کے حاکم کے پاس پہنچایا اور بصری کے حاکم نے اس نامۂ مبارک کو ہرقل کی خدمت میں پیش کیا، ہرقل نے پوچھا کہ کیا اس شخص کی قوم کا کوئی آدمی یہاں ہے جو اپنے نبی ہونے کا دعوی کرتا ہے (تاکہ میں اس مدعی نبوت کے بارے میں معلومات حاصل کر کے یہ جان سکوں کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا؟) اس کے عملہ نے بتایا کہ ہاں (اس شخص کی قوم سے تعلق رکھنے والا ایک شخص ہے جو ہمارے یہاں تجارت کی غرض سے آیا ہوا ہے) چنانچہ مجھے قریش کی ایک جماعت کے ساتھ (جو بیس آدمیوں پر مشتمل تھی) ہرقل کے دربار میں طلب کیا گیا۔ جب ہم ہرقل کے پاس پہنچے تو ہمیں اس کے سامنے بٹھایا گیا (تاکہ آسانی کے ساتھ ہم اس کی اور وہ ہماری

بات سن سکے) سب سے پہلے ہرقل نے پوچھا کہ تم میں سے کون آدمی اس شخص کا قریبی رشتہ دار ہے جو نبوت کا مدعی ہے؟ ابوسفیان کا بیان ہے کہ (یہ سن کر) میں نے کہا کہ اس شخص کا سب سے قریبی رشتہ دار میں ہوں۔ اس کے بعد تنہا مجھ کو ہرقل کے سامنے تخت شاہی کے قریب) بٹھادیا گیا اور میرے ساتھ والوں کو میرے پیچھے بٹھلایا گیا۔ پھر ہرقل نے اپنے مترجم کو طلب کیا (جو عربی اور رومی دونوں زبانیں جانتا تھا) اور اس سے کہا کہ تم اس شخص (ابوسفیان) کے ساتھیوں سے کہہ دو میں اس (ابوسفیان) سے اس شخص کے حالات معلوم کروں گا جو نبوت کا دعوے کرتا ہے، اگر یہ (ابوسفیان مجھ کو کوئی غلط بتائے تو تم لوگ (بلا جھجک) اس کی تردید کرنا اور مجھے صحیح بات بتادینا۔ ابوسفیان کا بیان ہے کہ خدا کی قسم اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ مجھے دروغ گو مشہور کر دیا جائے گا تو یقیناً میں ہرقل کے سامنے جھوٹ بولتا (اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں اس کو صحیح بات نہ بتاتا) اس کے بعد ہرقل نے اپنے مترجم سے کہا کہ ابوسفیان سے پوچھو! تمہارے درمیان اس شخص (آنحضرت ﷺ) کا حسب کیسا ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے کہا: وہ شخص ہم میں حسب والا ہے یعنی اعلی حسب رکھتا ہے۔ پھر ہرقل نے پوچھا کیا اس شخص کے باپ دادا میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ میں نے کہا کبھی نہیں! پھر ہرقل نے پوچھا، جو کچھ وہ اب کہتا ہے اس سے پہلے بھی اس نے کبھی کوئی ایسی بات کہی جس کو تم نے جھوٹ سمجھا ہو (یعنی نبوت کا دعوی کرنے سے پہلے کے زمانہ میں کیا وہ جھوٹ بولا کرتا تھا یا کسی شخص نے کبھی اس پر جھوٹ کا الزام لگایا تھا؟) میں نے کہا نہیں! پھر ہرقل نے پوچھا! اس کا اتباع کرنے والے (اور اس پر ایمان لانے والے) لوگ کون ہیں، شرفاء یا کمزور ضعیف لوگ؟ ابوسفیان نے کہا کہ میں نے جواب دیا: اس کے اتباع کرنے والے، کمزور و ضعیف لوگ ہیں۔ ہرقل نے پوچھا: اس شخص کے تابعداروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ میں نے جواب دیا: کم نہیں ہو رہی بلکہ زیادہ ہو رہی ہے۔ پھر ہرقل نے پوچھا: اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص اس سے ناخوش ہو کر (یا اس دین کی راہ میں پیش آنے والی سختیوں سے بیزار ہو کر) دین کو چھوڑ بھی بیٹھتا ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ میں نے جواب دیا: نہیں کوئی نہیں چھوڑتا۔ پھر ہرقل نے پوچھا! کیا تم لوگ اس سے لڑتے ہو؟ میں نے جواب دیا: ہاں! پھر ہرقل نے پوچھا! اس سے تمہاری لڑائی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ میں نے جواب دیا: ہمارے اور اس کے درمیان ہونے والی جنگ دو ڈولوں کی مانند ہوتی ہے، کبھی ہم اس کو بھگتتے ہیں اور کبھی وہ ہم کو بھگتتا ہے (یعنی ہمارے اور اس کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کا حال ان دو ڈولوں کی طرح ہے جن کو بیک وقت پانی سے بھرنے کی کوشش کی جائے کہ کبھی ایک بھر جاتا ہے تو دوسرا خالی رہ جاتا ہے اور کبھی دوسرا بھر جاتا ہے تو پہلا خالی ہو جاتا ہے ایسے ہی کبھی ہم اس مدعی نبوت اور اس کے ساتھیوں پر غالب آجاتے ہیں اور کبھی وہ ہم پر غالب آجاتا ہے، اسی طرح کبھی ہم اس کی وجہ سے مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ ہماری وجہ سے مصائب و تکلیف اٹھاتا ہے) پھر ہرقل نے پوچھا: کیا وہ عہد شکنی کرتا ہے یعنی کسی سے صلح کرنے کے بعد اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیتا ہے؟) میں نے کہا: نہیں (پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے کسی سے صلح کی ہو اور اس کو از خود ختم کر دیا ہو، البتہ آج کل ہمارے اور اس کے درمیان جو صلح (یعنی صلح حدیبیہ) ہے اس کے بارے میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی روش کیا رہے گی (آیا وہ اس صلح کو اس کی مدت ختم ہونے سے پہلے توڑ دے گا یا باقی رکھے گا)۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ خدا کی قسم (ہرقل سے پورے سوال و جواب کے درمیان) صرف ایک بات ایسی تھی جو میں نے اپنے جذبات کے تحت کہی تھی اس کے علاوہ اور کوئی بات میں نے اپنی طرف سے نہیں کہی (یعنی میں ہرقل کے کسی بھی سوال کے جواب میں کوئی ایسی بات کہنے پر قادر نہیں ہو سکا جو میرے نزدیک خلاف حقیقت تھی یا جس سے آنحضرت ﷺ کی توہین و تنقیص ہوتی، ہاں اس ایک بات کا اظہار اپنی طرف سے میں نے بیشک کیا کہ آج کل ہمارے اور ان کے درمیان جو صلح چل رہی ہے اس کے بارے میں ہمیں یہ خوف ہے کہ کہیں وہ عہد شکنی نہ کریں میری اس بات سے ذات رسالت کی طرف عہد شکنی کی نسبت کا احتمال ظاہر ہوتا تھا) بہر حال پھر ہرقل کا سوال یہ تھا کہ کیا اس طرح کی بات اس سے پہلے بھی کسی نے کہی ہے (یعنی مشہور پیغمبروں جیسے ابراہیم علیہ السلام، اسمعیل علیہ السلام، اسحق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، اسباط علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ وغیرہ کے علاوہ تمہاری قوم سے کسی اور شخص نے بھی اس سے پہلے نبوت کا دعوی کیا ہے؟) میں نے جواب دیا! نہیں۔ (ان تمام سوال و

جواب کے بعد) ہرقل نے (ضروری سمجھا کہ اپنے ان سوالوں کو جو نبوت و رسالت کے باب میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں عقل و نقل اور تجربہ و معلومات کی روشنی میں واضح کرے۔ چنانچہ اس نے) اپنے مترجم سے کہا کہ تم اس (سفیان) سے کہو کہ میں نے تمہارے درمیان اس شخص کے حسب کے بارہ میں تم سے پوچھا اور تم نے بتایا کہ وہ حسب والا ہے تو حقیقت یہی ہے کہ رسول اور نبی اپنی قوم کے اشراف ہی میں سے ہوتے رہے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا تھا کہ اس کے آباء واجداد میں کوئی بادشاہ تھا اور تم نے بتایا کہ کوئی نہیں، تو میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ اگر اس کے آباء واجداد میں کوئی بادشاہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو اپنے باپ دادا کی حکومت کا طالب ہے (اور حکمرانی و سرداری کی اپنی اس طلب وخواہش کو نبوت کے دعوے کے ذریعہ ظاہر کر رہا ہے) پھر میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس کی اتباع کرنے والے لوگ اپنی قوم کے شرفاء (یعنی دولت و ثروت اور دنیاوی جاہ و حشم رکھنے والے ہیں یا کمزور و ضعیف (یعنی مفلس و مسکین اور گوشہ نشین لوگ) ہیں اور تم نے بتایا کہ کمزور و ضعیف لوگ اس کے تابعدار ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے تابعدار (عام طور پر) کمزور وضعیف لوگ ہی ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس وقت وہ جو کچھ کہتا ہے (یعنی دعوی نبوت) اس سے پہلے کیا تمہیں کبھی اس کے جھوٹ کا تجربہ ہوا ہے۔ اور تم نے بتایا کہ نہیں، تو میں نے سمجھ لیا کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص لوگوں سے تو جھوٹ بولنے سے اجتناب کرے اور اللہ کی نسبت جھوٹ بولے۔ میں نے پوچھا تھا کہ اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص اس سے ناخوش ہو کر دین کو چھوڑ بھی بیٹھتا ہے؟ اور تم نے بتایا تھا کہ نہیں، تو در حقیقت ایمان کا یہی حال ہے کہ وہ جب دلوں میں جگہ پکڑ لے اور روح اس کی لذت وحلاوت سے آشنا ہو جائے، تو پھر ہرگز جدا نہیں ہوتا (اور اگر شاذ و نادر کوئی شخص دین چھوڑ بھی بیٹھے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ایمان سرے سے داخل و راسخ ہی نہیں ہوا تھا، میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس شخص کے تابعداروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ اور تم نے بتایا تھا کہ بڑھ رہی ہے تو در حقیقت ایمان کا یہی حال ہے (کہ روز بروز اس کا دائرہ اثر وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور اہل ایمان کی تعداد بڑھتی رہتی ہے) اور آخر کار وہ پایہ تکمیل و اتمام کو پہنچ جاتا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم لوگ اس سے لڑتے ہو؟ اور تم نے جواب دیا تھا کہ ہاں لڑتے ہیں اور لڑائی کا انجام دو ڈولوں کی طرح ہوتا ہے کہ کبھی وہ تم سے مصیبت اٹھاتا ہے اور کبھی تم اس سے مصیبت اٹھاتے ہو، تو حقیقت یہ ہے کہ رسولوں کا امتحان اسی طرح لیا جاتا (کہ کبھی ان کو دشمنان دین پر غلبہ عطا کیا جاتا ہے اور کبھی دشمنوں کو ان پر غالب کر دیا جاتا ہے) لیکن انجام کار رسولوں اور ان کے تابعداروں ہی کو کامل فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے اور ان کا دین چھا جاتا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا وہ شخص عہد شکنی کرتا ہے اور تم نے جواب دیا تھا کہ وہ عہد شکنی نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول عہد شکنی نہیں کرتے اور میں نے تم سے سوال کیا تھا کہ ——— تمہاری قوم میں اس سے پہلے بھی کسی نے ایسی بات کہی ہے یعنی نبوت کا دعوی کیا ہے؟ اور تم نے جواب دیا تھا کہ نہیں، تو میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ اگر اس سے پہلے کسی نے اس طرح نبوت کا دعوی کیا ہوتا تو کہا جاسکتا تھا کہ یہ بھی پہلے شخص کی پیروی میں اس طرح کا دعوی کر رہا ہے۔ ابوسفیان کا بیان ہے کہ اس کے بعد ہرقل نے مجھ سے پوچھا کہ (اچھا یہ بتاؤ) وہ شخص تم کو کس بات کا حکم دیتا ہے؟ میں نے کہا! وہ ہم سے کہتا ہے کہ نماز پڑھو، زکوۃ دو، ناتے داروں سے محبت اور اچھا سلوک کرو اور حرام چیزوں سے بچو۔ ہرقل نے (یہ سن کر) کہا: اگر تمہارا بیان درست ہے تو یقیناً وہ شخص پیغمبر ہے۔ اور مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ (آخر زمانہ میں) ایک پیغمبر پیدا ہونے والا ہے لیکن میرا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ تمہاری قوم میں پیدا ہو گا، اگر میں جانتا کہ ان تک پہنچ سکوں گا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے ملاقات کرنا میرے لئے سب سے زیادہ پسندیدہ بات ہوتی۔ اور اگر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو ان کے دونوں پاؤں (اپنے ہاتھ سے) دھوتا اور (میں تم کو بتاتا ہوں) اس کی حکومت واقتدار کا دائرہ اس زمین (ملک روم وشام) تک پہنچ جائے گا جو میرے قدموں کے نیچے ہے، پھر ہرقل نے آپ ﷺ کا نامہ مبارک مانگا اور اس کو پڑھا۔ (بخاری و مسلم) اور یہ حدیث پیچھے باب الکتاب الی الکفار میں پوری نقل ہو چکی ہے"

تشریح: "ابوسفیان نے مجھ سے منہ در منہ یہ بیان کیا۔" کا مطلب طیبی نے یہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے گویا یہ وضاحت کی ہے کہ ابوسفیان نے اپنا یہ واقعہ مجھ سے براہ راست خود بیان کیا ہے، یہ نہیں کہ کسی واسطہ و ذریعہ سے مجھ تک نقل ہوا ہے۔ لیکن یہ کہنا زیادہ

صحیح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ان الفاظ کے ذریعہ گویا یہ واضح کیا کہ جب ابوسفیان نے یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا تو اس وقت میرے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا، چنانچہ "حدثنی" کا لفظ بھی اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے۔

"اس مدت میں جو میرے اور رسول کریم ﷺ کے درمیان تھی۔" میں "مدت" سے مراد صلح حدیبیہ کا زمانہ ہے، یہ صلح ۶ھ میں ہوئی تھی اور صلح نامہ کی رو سے اس کی مدت دس سال قرار پائی تھی لیکن خود کفار مکہ نے اس صلح کو درمیان ہی میں اس طرح ختم کر دیا تھا کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے حلیف قبیلہ خزاعہ کے بعض لوگوں کو ناحق قتل کر دیا تھا، جس کی بناء پر آنحضرت ﷺ کو کفار مکہ سے جنگ کرنا پڑی اور اس کے نتیجہ میں مکہ فتح ہوا۔ یہ ۸ھ کا واقعہ ہے۔

"جب کہ نبی کریم ﷺ کا نامۂ مبارک ہرقل کے پاس پہنچا" ہرقل کا لفظ ہ کے زیر اور ر کے زبر اور ق کے جزم کے ساتھ (یعنی ہِرَقْل) بھی آتا ہے اور ہ کے زبر ر کے جزم اور ق کے زبر کے ساتھ (یعنی ہَرْقَل) بھی منقول ہے، یہ اس وقت کی رومی سلطنت کے بادشاہ کا نام تھا، دراصل رومی سلطنت جو اپنے وقت کی سب سے بڑی عالمی طاقت تھی اور جس کے زیر نگیں علاقوں میں تمام براعظم یورپ، مصر اور ایشیائے کوچک شامل تھا جب چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو مغربی حصہ کا دار السلطنت اٹلی کا شہر روما ہی رہا اور مشرقی حصہ کا دار السلطنت قسطنطنیہ قرار پایا جس طرح قدیم اور متحد رومی سلطنت کے حکمراں کو "قیصر" کہا جاتا تھا اسی طرح ان دونوں منقسم سلطنتوں کے حکمرانوں نے بھی اپنے اپنے لئے "قیصر" ہی کے لقب کو اختیار کیا، یہی وجہ ہے کہ قسطنطنیہ سلطنت کے بادشاہ کو بھی "قیصر روم" کہا جاتا تھا جس کے تحت مصر، حبش، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک وبلقان کے ممالک تھے، اس مشرقی رومی سلطنت کی شان و شوکت اور قوت و سطوت کے آگے مغربی روم کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی، آنحضرت ﷺ کی ولادت کے وقت قسطنطنیہ کی سلطنت میں زبردست بغاوت ہوئی اور اس وقت کے قیصر فوقا کو امرائے سلطنت اور رعایائے ملک نے تخت سے اتار کر قتل کر دیا اور افریقی مقبوضات کے گورنر یعنی فرمانروائے مصر کو قسطنطنیہ کا تخت سنبھالنے کی دعوت دی، گورنر افریقہ پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ جا سکا لیکن اس کا جوان العمر بیٹا "ہرقل"، قسطنطنیہ پہنچ کر اس عظیم سلطنت کا فرمانروا بن گیا، اور ارکان سلطنت نے بھی ہرقل کی شہنشاہی کو بخوشی تسلیم کر لیا، پوری سلطنت کی طرح خود ہرقل بھی عیسائی تھا، دیناروں پر ٹھپہ لگا کر اس کو باقاعدہ شکل دینے والا پہلا بادشاہ یہی ہرقل ہے، عیسائی دنیا میں یہ امتیاز بھی اسی کو حاصل ہے کہ گرجا گھر سب سے پہلے اسی نے تعمیر کرائے اور آنحضرت ﷺ نے دوسرے بادشاہوں اور سرداروں کے ساتھ جس "قیصر روم" کو اسلام کی دعوت کا نامۂ مبارک روانہ فرمایا تھا وہ یہی ہرقل فرمانروائے سلطنت قسطنطنیہ تھا۔

"بصری، شام میں ایک شہر کا نام تھا اور سلطنت قسطنطنیہ (قیصر روم) کے زیر نگیں تھا، اس شہر کا حاکم، قیصر روم کے گورنر کی حیثیت سے دربار سلطنت سے قریبی تعلق رکھتا تھا، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے قیصر روم کے نام اپنا نامۂ مبارک حضرت دحیۃ کلبیؓ کے ذریعہ پہلے حاکم بصری ہی کے پاس روانہ کیا تھا اور اس نے اس نامۂ مبارک کو قیصر روم تک پہنچایا تھا۔

تم میں سے کون آدمی اس شخص کا قریبی رشتہ دار ہے۔" کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ کسی شخص کے احوال و کوائف چونکہ اس آدمی کو زیادہ بہتر طور پر معلوم ہوتے ہیں اور وہی ان کو زیادہ صحیح طور پر بیان کر سکتا ہے، جو نسب اور رشتہ داری میں آنحضرت ﷺ سے زیادہ قریبی رشتہ داری رکھتے ہیں تو ان ہی کو سوال و جواب کے لئے منتخب کیا۔

"اور میرے ساتھ والوں کو میرے پیچھے بٹھلایا گیا۔" ہرقل نے صحیح جوابات حاصل کرنے کے لئے یہ مزید احتیاط برتی کہ ابوسفیان کے تمام ساتھیوں کو ان کے پیچھے بٹھلایا تا کہ اگر ابوسفیان جواب دینے میں کچھ غلط بیانی کریں تو ان کے ساتھی آنکھ کے سامنے کا لحاظ کر کے ان کی تردید کرنے میں جھجک کا شکار نہ ہوں۔ یا ان لوگوں کو پیچھے بٹھانے میں ہرقل کا یہ مقصد بھی ہو سکتا تھا کہ اگر اور تمام لوگ ابوسفیان کے برابر میں یا اس کے سامنے بیٹھے ہوں گے تو شاید خود وہ لوگ آنکھ وسر یا ہاتھ کے اشارے سے ابوسفیان کو کوئی بات بیان کرنے سے منع کر دیں۔

"اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ مجھے دروغ گو مشہور کردیا جائے گا الخ۔ اس جملہ سے ابوسفیان کی مراد یہ تھی کہ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہاں موجود میرے ساتھی مکہ واپس ہو کر میری قوم کے سامنے یہ کہیں گے کہ ابوسفیان نے ہرقل کے دربار میں غلط بیانی کے ذریعہ محمد ﷺ کے خلاف فضا بنانے کی کوشش کی اور ہرچند کہ میری قوم کے لوگ وقتی طور پر خوش ہوجائیں گے مگر اس طرح میرا دروغ گو ہونا بھی مشہور ہوجائے گا جس سے میری قوم کی نظر میں میرے کردار کی عظمت باقی نہیں رہے گی۔ تو اس وقت آنحضرت ﷺ سے جو بغض و عناد اور سخت ترین مخالفانہ جذبات میں رکھتا تھا اس کے تحت ہرقل کے سامنے ضرور غلط بیانی کرتا اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں وہ صحیح باتیں ہرگز نہ بتلاتا جس سے آپ ﷺ کے دعوی نبوت کا برحق ہونا ثابت ہوتا تھا۔ لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اس جملہ کا زیادہ صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میں نے اس موقع پر اگر کوئی غلط بیانی کی تو یہاں موجود میرے ساتھی میری تردید کریں گے اور ہرقل کی نظر میں میرا جھوٹا ہونا ثابت ہوجائے گا تو میں ہرقل کے سوالات کے جوابات میں ضرور غلط بیانی سے کام لیتا۔ اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں صحیح باتیں نہ بتاتا۔

"وہ شخص ہم میں حسب والا ہے۔" حسب کے لغوی معنی شریف الاصل ہونا، اور صفت کے ہیں، یعنی وہ ذاتی اور آبائی و خاندانی صفات و خصوصیات جو کسی شخص کو شرف و فضیلت دے کر معاشرہ میں مفتخر بناتی ہیں، اس اعتبار سے "حسب" کے تحت "نسب" کا مفہوم بھی آجاتا ہے لہٰذا ابوسفیان نے اس جواب کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا کہ وہ شخص (محمد ﷺ) نہایت شریف خاندان کا ہے اور اس کا نسبی تعلق بنی ہاشم سے ہے جو قریش میں سب سے افضل۔ نیز بخاری میں "حسب" کے بجائے "نسب" کا لفظ ہے۔ اس کی عبارت یوں ہے۔ کیف نسبہ فیکم الخ (تم لوگوں میں اس کا نسب کیسا ہے)۔

"اس کی اتباع کرنے والے لوگ کون ہیں، شرفاء ہیں یا کمزور و ضعیف لوگ؟" سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیاداروں کی نظر میں عزت و وجاہت کے حامل ہوں اور وہ خود اپنی حیثیت عرفی پر مغرور و نازاں ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر شرفاء کے لغوی و عرفی معنی مراد لئے جائیں تو بنی ہاشم سے تعلق رکھنے والے حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ وغیرہ اور اکابر قریش کی صف سے تعلق رکھنے والے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور دوسرے جلیل القدر قریشی صحابہؓ سے بڑھ کر شرفاء کون ہوسکتے تھے جو ہرقل اور ابوسفیان کے اس سوال وجواب سے پہلے مشرف باسلام ہوچکے تھے۔

"اس کی اتباع کرنے والے کمزور و ضعیف لوگ ہیں۔" ابواسحٰق کی روایت میں یہاں ابوسفیان کا جواب ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: اس کی اتباع جن لوگوں نے کی ہے وہ کمزور و ضعیف، مسکین اور نوعمر لوگ ہیں، جہاں تک اعلی نسب و شرف رکھنے والوں کا تعلق ہے تو انہوں نے اس کی اتباع نہیں کی ہے۔ اگر ابوسفیان نے ان الفاظ میں جواب دیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات اکثر واغلب پر محمول کر کے کہی تھی۔

"تابعداروں کی تعداد روزبروز بڑھ رہی ہے یا کم ہورہی ہے؟" ہرقل کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ آیا یہ صورت ہے کہ اس شخص کی بات ماننے اور اس پر ایمان لانے والوں کی تعداد میں دن بدن نئے نئے لوگوں کا اضافہ ہوتا جارہا ہے یا اس کے تابعداروں کی تعداد اس طرح گھٹ رہی ہے کہ ایک دفعہ جن لوگوں کو ایمان لانا تھا وہ تو ایمان لے آئے، اب ان میں سے اگر کوئی آدمی اس کا دین چھوڑ کر اپنے پچھلے دین یعنی کفر و شرک کی طرف لوٹ جاتا ہے یا کوئی شخص مرجاتا ہے تو اس کی کمی و نقصان کو پورا کرنے والے نئے لوگ اس کے دین میں داخل نہیں ہوتے؟ اس کا جواب ابوسفیان نے دیا کہ اس کے تابعداروں کی تعداد کسی بھی صورت میں گھٹ نہیں رہی ہے بلکہ دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔

"پیغمبروں کے تابعدار کمزور و ضعیف لوگ ہی ہوتے ہیں۔" ہرقل نے یہ بات بالکل درست کہی کہ جب بھی حق کی آواز بلند ہوئی ہے اس کو لبیک کہنے کے لئے سب سے پہلے کمزور و ضعیف، نادار و مفلس اور مسکین لوگ ہی آگے نکل کر آتے ہیں، جہاں تک دولت و ثروت

اور دنیاوی عزت واثر رکھنے والے لوگوں کا تعلق ہوتا ہے، وہ اپنے کاروبار، ناز و نعم اور جاہ و تکبر میں گرفتار رہنے کی وجہ سے اس سعادت سے محروم رہتے ہیں ہاں جب مجبور ہو جاتے ہیں اور حق کی پناہ حاصل کرنے کے علاوہ اور کوئی راہ نجات انہیں نظر نہیں آتی تو پھر وہ بھی اہل ایمان اور اہل دین کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔

"لوگوں سے تو جھوٹ بولنے سے اجتناب کرے اور اللہ کی نسبت جھوٹ بولے۔" یعنی یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اپنے خالق اور پروردگار کے حق میں جھوٹ بولنا اور اس کے تعلق سے کذب بیانی کرنا نہایت ہی برا ہے لہٰذا جس شخص کے بارے میں خود تمہارا اقرار ہے کہ اس نے لوگوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی کسی نے اس کو جھوٹا نہیں کہا، تو وہ شخص اللہ کے بارے میں اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے کہ اللہ نے اس کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے، خود تمہارے اقرار نے ثابت کر دیا کہ وہ شخص اپنی بات میں سچا ہے اور یقیناً اللہ کا رسول ہے۔

"اور آخر کار وہ پایہ تکمیل واتمام کو پہنچ جاتا ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین اسی طرح پھلتا پھولتا ہے کہ ایک طرف تو اس کے تابعداروں اور حامیوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جاتی ہے اور دوسری طرف خود اس دین کے اصولی اور بنیادی احکام و قوانین بتدریج نازل ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ نقطۂ عروج آجاتا ہے جہاں پہنچ کر دین کو آخری اور کامل شکل مل جاتی ہے اور اہل دین کو مؤثر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دین اسلام کا معاملہ ایسا ہی ہوا کہ ایک طرف تو رسول کریم ﷺ کی مسلسل جدوجہد اور سعی و کوشش سے حلقہ بگوشان اسلام کی تعداد دن بہ دن بڑھتی رہی دوسری طرف اسلام کے احکام و قوانین جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی فرضیت نازل ہوتی رہی، اور پھر وہ دن آگیا جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی آخری عمر میں اپنے دین کے نام لیواؤں کو مؤثر غلبہ بھی عطا فرما دیا اور دین کو کامل و مکمل کر کے یہ آیت نازل فرمائی۔

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي۔

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کیں۔"

"میرا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ تمہاری قوم میں پیدا ہوگا۔" ہرقل کا مطلب یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اکثر و بیشتر انبیاء چونکہ ہماری قوم یعنی حضرت اسحٰق کی اولاد میں ہوئے ہیں اس لئے میرا گمان یہ تھا کہ نبی آخر الزمان بھی ان ہی کی نسل سے ہوں گے، تمہاری قوم یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے نہیں ہوں گے جو اہل عرب (حجاز) کے مورث اعلیٰ ہیں۔ نیز ہرقل کا ابوسفیان سے یہ کہنا کہ تم نے جو باتیں بیان کی ہیں اگر وہ سچ ہیں تو وہ شخص (محمد ﷺ) یقیناً پیغمبر ہے، اس بات کی علامت ہے کہ ہرقل سابقہ آسمانی کتابوں کا علم رکھتا تھا اور چونکہ ان کتابوں میں آنحضرت کی نبوت و رسالت کے متعلق مذکورہ علامتیں لکھی ہوئی تھیں، اس لئے ہرقل نے اپنے علم کے مطابق جب یہ یقین حاصل کر لیا کہ اس مدعیٔ نبوت میں یہ تمام علامتیں پائی جاتی ہیں تو اس نے ابوسفیان پر واضح کر دیا کہ اس شخص کے نبی اور رسول ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ علاوہ ازیں ہرقل نجوم و کہانت میں بھی درک رکھتا تھا اور اس علم کے ذریعہ بھی وہ آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت کی مذکورہ علامتوں کو جانتا تھا جیسا کہ بخاری ہی کی ایک اور روایت میں ابن ناطور حاکم بیت المقدس کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ ہرقل قیصر روم جب بیت المقدس میں مقیم تھا تو ایک روز صبح کو گھبرایا ہوا اٹھا، ایک شخص نے پریشانی کا سبب پوچھا تو ہرقل نے کہا کہ آج رات میں نے ستاروں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ مختون قوم کا بادشاہ تمام ممالک پر غالب آنے والا ہے۔ اس کے بعد اس نے دریافت کیا کہ وہ کون قوم ہے جس میں ختنہ کا رواج ہے تو اس کو بتایا گیا کہ عربوں میں ختنہ کا رواج ہے لیکن یہ ہرقل کی سب سے بڑی بدنصیبی رہی کہ وہ اپنے علم ذہانت سے آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت کی حقیقت کو جاننے کے باوجود ایمان کی دولت سے محروم رہا اور اپنے علم و آگہی سے فائدہ حاصل نہ کر سکا اور اس نے نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اسلام قبول نہیں کیا بلکہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کا صحابہؓ کے خلاف نبرد آزما بھی ہوا۔ اس نے مجاہدین اسلام کے خلاف متعدد بار اس

زمانہ کی رومی سلطنت کی انتہائی ترقی یافتہ فوجیں روانہ کیں، اور مختلف علاقوں اور شہروں میں اسلامی شیروں کو اس کے جابر لشکروں کا مقابلہ کرنا پڑا، مگر چونکہ اللہ کی مدد اپنے نام لیواؤں کے ساتھ ہوتی تھی اس لئے ہر میدان جنگ میں اور ہر موقع پر ہرقل کی رومی فوج کو زبردست پسپائی وہلاکت کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اور اس کے لشکر کے بہت ہی کم لوگوں کو میدان جنگ سے صحیح وسالم واپس ہونے کا موقع نصیب ہوتا تھا، ہرقل اپنی عظیم سلطنت اور زبردست فوج کی طاقت کے بل پر اسلام اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ایمانی طاقت کو مسدود اور محدود کردینے کی کاروائیوں میں زندگی بھر مصروف رہا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اس کو اہل اسلام کے مقابلہ پر مغلوب کیا یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کو شکست فاش دینے کی حسرت وتمنا لئے ہوئے مرگیا اور اس کی عظیم سلطنت کا ایک بڑا حصہ جیسے ملک شام وغیرہ کے اکثر علاقے مسلمانوں نے فتح کر لئے۔ ہرقل کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن اسلام کے مقابلہ پر زوال پذیر رومی سلطنت کو وہ بھی سہارا نہ دے سکا اور اس کے مرنے کے بعد تو اس سلطنت کا وجود ہی چراغ سحری ہو کر رہ گیا، اور پھر وہ زمانہ آیا جب ان ہی رومیوں میں سے ایک قوم (ترک) کو اللہ تعالیٰ نے ایمان واسلام کی سعادت عطا فرمائی، اس قوم نے اپنی بے پناہ شجاعت وبہادری اور ایمان کی زبردست طاقت سے نہ صرف یہ کہ اپنے زمانہ میں دنیا بھر کے عیسائیوں کی مشترکہ طاقت کو پسپا کیا، کفر وشرک کے مقابلہ پر اسلام کی حفاظت کی، بلکہ خود کو مسلمان کہلانے والے اس فرقہ رافضیہ کا بھی قلع قمع کیا جو مکروسازش کے ذریعہ اسلامی حکومت کی شان وشوکت مٹانے اور اسلام اور مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھا، یہ ترک ہی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرمین شریفین کی تعمیر وترقی اور خدمت ومحافظت کی سعادت عطا کی۔ انہوں نے مسجد حرام، مکہ مکرمہ اور حرم نبوی، مدینہ منورہ کی خدمت ومحافظت، اہل مکہ، اور اہل مدینہ کی دیکھ بھال اور مالی امداد واعانت اور علماء ومشائخ کی تعظیم وتکریم جس اخلاص، جس عقیدت اور جس لگن سے کی، اس کی کوئی مثال نہیں ہے! اس سے معلوم ہوا کہ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمادے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں پڑا رہنے دے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا، ایک طرف تو وہ ہرقل تھا جس کو آنحضرت ﷺ کی پوری حقیقت معلوم تھی لیکن اس کی سچی معلومات اس کے کوئی کام نہیں آسکیں کیونکہ اس کا اصل مطمع نظر وہ ریاست وسلطنت تھی جس کو وہ کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور مال ودولت کی وہ محبت تھی جس نے اس کے دل ودماغ پر حقیقت پسندی سے زیادہ جاہ پسندی کی چھاپ ڈال رکھی تھی۔ لہٰذا وہ توفیق الٰہی اور ازلی سعادت سے محروم رہا اور ابدی بدبختی کا مستوجب بنا، دوسری طرف اسی کے علاقہ اور اسی کی قوم سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ تھے جو اپنی ازلی اور ابدی سعادت کی بناء پر نہ صرف یہ کہ ایمان واسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوئے بلکہ دنیا کی زبردست طاقت عظیم فاتح اور مثالی حکمراں بنے۔

اس موقع پر ہرقل کی اس خوبی کا ذکر بھی ناگزیر ہے کہ جب اس کے پاس رسول کریم ﷺ کا نامۂ مبارک پہنچا تو اس نے نہ صرف یہ کہ اس کو اشتیاق والتفات کے ساتھ پڑھا بلکہ اس کی بڑی تعظیم وتکریم کی، اور اس نامۂ مبارک کو محفوظ رکھنے کا زبردست اہتمام کیا اس کے برخلاف فارس (ایران) کے بادشاہ کسریٰ نے نامۂ مبارک کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ کیا اور اس بدبخت نے نامۂ مبارک کو چاک کر کے پارہ پارہ کر دیا، تو اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اس کی سلطنت کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس کی اولاد ذلت ورسوائی کے ساتھ دربدر ماری ماری پھری اور اس کی آئندہ نسل میں سے کسی کو بھی تخت وتاج کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

صحیح بخاری میں یہ روایت منقول ہے کہ ہرقل قیصر روم نے آنحضرت ﷺ کا مذکورہ نامۂ مبارک پڑھ کر اپنے ملک کے اعیان سلطنت اور عمائدین مملکت کو اپنے محل میں جمع کیا اور پھر بند کمرہ میں ان کی مجلس منعقد کی اور سب کو مخاطب کر کے کہا کہ "لوگو! اگر تم اپنی مراد کو پہنچنا چاہتے ہو اور فلاح یاب ہونے کے خواہش مند ہو تو اس نبی آخر الزمان (ﷺ) کی دعوت قبول کرو اور ان پر ایمان لے آؤ۔ یہ سنتے ہی ان تمام لوگوں نے سخت برہمی اور نفرت کا اظہار کیا اور اس قدر مشتعل ہوئے کہ ہرقل بھی ان کا ردعمل دیکھ کر گھبرا گیا، اس نے کہا کہ تم لوگوں کو اس قدر برہم اور وحشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے دین پر قائم رہو، میں نے تو صرف یہ آزمانے کے لئے کہ تم

لوگ اپنے دین اور اپنے عقیدہ میں کسی قدر مستحکم اور مضبوط ہو، یہ بات کہی تھی۔ تب وہ اعیان سلطنت اور عمائدین مملکت مطمئن وخوش ہوئے اور اس کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔

بعض حضرات نے ہرقل کے ایمان کی طرف اشارہ کیا ہے اور مختلف آثار و قرائن کے تحت اس کو مؤمن کہا ہے لیکن راجح قول اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ کفر و شرک پر عامل تھا اور کافر و مشرک ہی مرا، ایمان و اسلام کی دولت اس کو نصیب نہیں ہوئی، چنانچہ مسند امام احمد میں ایک روایت منقول ہے کہ اس نے مقام تبوک سے آنحضرت ﷺ کو لکھا تھا کہ میں مسلمان ہوں، لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہرقل بالکل جھوٹ کہتا ہے، وہ نصرانیت (عیسائیت) پر قائم ہے۔ بہرحال ہرقل کے واقعہ کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ علم و دانائی، ہدایت پانے کے لئے کافی نہیں ہے، جب تک کہ حق تعالیٰ کی توفیق اور فطرت سلیم کی وہ رہنمائی حاصل نہ ہو جو قبول حق تک پہنچاتی ہے۔ عشق کاریست کہ موقوف ہدایت باشد۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت اور جاہ و اقتدار کی حرص، حق کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

بَابٌ فِي الْمِعْرَاجِ
معراج کا بیان

"مِعْرَاج" کا لفظ "عُرُوْج" سے ہے جس کے معنی ہیں، چڑھنا، اوپر جانا۔ اور مِعْرَاج اس چیز کو کہتے ہیں جو اوپر چڑھنے کا ذریعہ بنے یعنی سیڑھی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جو آسمانوں کی سیر کرائی اور وہاں خاص خاص نشانیاں آپ ﷺ کو دکھلائیں۔ اس کو معراج اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ گویا آنحضرت ﷺ کے لئے سیڑھی رکھی گئی۔ جس پر چڑھ کر آپ ﷺ آسمان پر تشریف لے گئے اور ایک روایت میں "معراج" یعنی سیڑھی کا تذکرہ بھی آیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کا عالم بالا کا سفر شروع ہوا تو آپ ﷺ کے لئے سیڑھی رکھی گئی جس کے ذریعہ آسمان کے اوپر تشریف لے گئے اور یہ وہی سیڑھی ہے جس کے ذریعہ فرشتے آسمان سے آمد و رفت رکھتے ہیں اور جس پر سے بنی آدم کی ارواح آسمان تک چڑھتی ہیں۔

معراج کا زمانہ۔: اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ معراج نبوت کے بارھویں سال یعنی ہجرت سے ایک سال پہلے ربیع الاول کے مہینہ میں ہوئی اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ رمضان کی ستائیس تاریخ کو ہوئی، کچھ حضرات کا قول ستائیسویں رجب کا ہے اور عوام میں بھی یہی مشہور ہے، کچھ حضرات ہجرت سے تین سال پیشتر اور کچھ حضرات ہجرت کے پانچ سال پیشتر معراج ہونے کے قائل ہیں۔

معراج اور اسراء کا فرق: جاننا چاہئے کہ ایک تو "معراج" ہے اور ایک "اسراء"۔ اسراء اس سفر کو کہتے ہیں جو آنحضرت ﷺ نے اس شب میں مسجد حرام (بیت اللہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک کیا، اور مسجد اقصیٰ سے آسمان تک کے سفر کو معراج کہا جاتا ہے۔ اِسراء نص قرآن سے ثابت ہے اور اس کا انکار کرنا دائرۂ اسلام سے خارج ہونا ہے اور معراج، مشہور و متواتر حدیثوں سے ثابت ہے، اس کا انکار کرنے والا گمراہ اور بدعتی کہلاتا ہے۔

خواب میں یا عالم بیداری میں۔: اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو جو معراج پیش آئی وہ خواب کا واقعہ ہے یا عالم بیداری کا؟ یہ واقعہ ایک بار پیش آیا یا متعدد بار؟ یا یہ کہ ایک بار تو عالم بیداری میں پیش آیا اور خواب میں متعدد بار پیش آیا؟ یا یہ کہ اگر یہ واقعہ خواب میں بھی پیش آیا تو کیا وہی اصلی واقعہ ہے یا وہ اس حقیقی واقعہ کا ابتدائیہ اور تمہید تھی جو عالم بیداری میں پیش آیا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جسمانی طور پر آسمانوں کی سیر کرنے سے پہلے آپ ﷺ میں روحانی اور نفسیاتی طور پر اس عالم بالا سے ایک گونہ مناسبت اور تعلق پیدا ہو جائے جیسا کہ ابتدائے نبوت میں رویائے صادقہ ہی کو وحی اور عالم بالا سے آپ ﷺ کی مناسبت کا ذریعہ بنایا گیا

تھا؟ اور یا یہ کہ اسراء یعنی مسجد حرام سے مسجد اقصی تک کے سفر کا واقعہ تو جسمانی طور پر پیش آیا تھا اور معراج یعنی مسجد اقصی سے عالم بالا تک کا واقعہ محض روحانی طور پر پیش آیا تھا؟ بہرحال ان تمام اقوال اور ان سے متعلق بحث و دلائل سے صرف نظر کرتے ہوئے اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس بارے میں جو قول تحقیقی اور زیادہ صحیح سمجھا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ معراج کا واقعہ ایک بار پیش آیا ہے اور عالم بیداری میں جسم و روح کے ساتھ پہلے آپ ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصی تک پھر مسجد اقصی سے آسمانوں تک اور پھر آسمانوں سے ان خاص مقامات تک جہاں تک اللہ نے چاہا، آپ ﷺ کو لے جایا گیا۔ جمہور فقہا و علماء محدثین و متکلمین، اور صوفیاء کا یہی مسلک ہے۔ نیز اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی صحیح حدیثیں اور صحابہ کرام کے اقوال نہایت کثرت سے منقول ہیں جن میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر معراج کے واقعہ کا تعلق محض خواب سے ہوتا (جیسا کہ گمان کیا جا سکتا ہے) تو نہ اس غیر معمولی انداز میں اس واقعہ کو بیان کیا جاتا اور نہ اس سے متعلق وہ تمام بحث و تحقیق ہوتی جو علماء و محققین نے کی ہے، علاوہ ازیں اس مسئلہ کو لے کر بعض لوگوں نے جو فتنہ خیزی اور غوغا آرائی کی ہے نہ وہ ہوتی اور نہ یہ مسئلہ اختلاف و انکار نیز ارتداد کے ابتلاء کا باعث بنتا۔

معراج آنحضرت ﷺ کا خصوصی شرف ہے: جسم و روح کے ساتھ معراج کا حاصل ہونا آنحضرت ﷺ کا خصوصی شرف ہے یہ مرتبہ کسی اور نبی اور رسول کو حاصل نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اپنے آخری نبی رسول اللہ ﷺ کی عظمت و برگزیدگی کو ظاہر کرنے کے لئے یہ خارق عادت قدرت ظاہر فرمائی۔ لہٰذا واقعہ معراج کو اسی سیاق و سباق میں دیکھنا چاہئے، اس مسئلہ کو عقل و قیاس کے پیمانہ سے ناپنا بے سود بھی ہے اور حقیقت واقعہ کو محض دماغی قابلیت کے بل پر سمجھنا اور سمجھانا قطعاً ان عقل کے بس سے باہر بھی ہے یہ مسئلہ خالص یقین و اعتقاد کا ہے بس اس پر ایمان لانا اور اس کی حقیقت و کیفیت کو علم الٰہی کے سپرد کر دینا ہی عین عبادت ہے، اور ویسے بھی نبوت، وحی اور معجزوں کے تمام معاملات احاطہ عقل و قیاس سے باہر کی چیزیں ہیں، جو شخص ان چیزوں کو قیاس کے تابع اور اپنی عقل و فہم پر موقوف رکھے اور کہے کہ یہ چیز جب تک عقل میں نہ آئے میں اس کو نہیں مانوں گا اور اس پر اعتقاد نہیں رکھوں گا تو سمجھنا چاہئے کہ وہ شخص ایمان کے اپنے حصہ سے محروم ہے، ہاں اولیاء اللہ اور عارفین بیشک معرفت کے ایک خاص مقام تک پہنچنے کے بعد اتنی صلاحیت کے حامل ہو جاتے ہیں کہ ان پر ان چیزوں کی کچھ حقیقت روشن اور واضح ہو جاتی ہے، جو لوگ معرفت کے اس مقام کو نہ پہنچے ہوں ان کے لئے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ اور اس کا رسول جو کچھ فرما دیں بس اس کو مان لیں اور بلا چون و چرا اس پر ایمان لے آئیں، سلامتی اور نجات کی راہ اس کے علاوہ کوئی نہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

واقعہ معراج کا ذکر

① عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ صَعْصَعَةَ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَهُمْ عَنْ لَيْلَةِ اُسْرِىَ بِهٖ قَالَ بَيْنَمَا اَنَا فِي الْحَطِيْمِ وَرُبَمَا قَالَ فِي الْحِجْرِ مُضْطَجِعًا اِذْ اَتَانِىْ اٰتٍ فَشَقَّ مَابَيْنَ هٰذِهٖ اِلٰى هٰذِهٖ يَعْنِىْ مِنْ ثُغْرَةِ نَحْرِهٖ اِلٰى شِعْرَتِهٖ فَاسْتَخْرَجَ قَلْبِىْ ثُمَّ اُتِيْتُ بِطَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مَمْلُوٍّ اِيْمَانًا فَغُسِلَ قَلْبِىْ ثُمَّ حُشِىَ ثُمَّ اُعِيْدَ وَفِىْ رِوَايَةٍ ثُمَّ غُسِلَ الْبَطْنُ بِمَآءِ زَمْزَمَ ثُمَّ مُلِئَ اِيْمَانًا وَحِكْمَةً ثُمَّ اُتِيْتُ بِدَابَّةٍ دُوْنَ الْبَغْلِ وَفَوْقَ الْحِمَارِ اَبْيَضَ يُقَالُ لَهُ الْبُرَاقُ يَضَعُ خَطْوَهٗ عِنْدَ اَقْصٰى طَرْفِهٖ فَحُمِلْتُ عَلَيْهِ فَانْطَلَقَ بِىْ جِبْرَئِيْلُ حَتّٰى اَتَى السَّمَآءَ الدُّنْيَا فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِىْءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا فِيْهَا اٰدَمُ فَقَالَ هٰذَا اَبُوْكَ اٰدَمُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَبِىْ حَتّٰى اَتَى السَّمَآءَ الثَّانِيَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ

قِيْلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ إِذَا يَحْيَى وَعِيْسَى وَهُمَا ابْنَا خَالَةٍ قَالَ هٰذَا يَحْيَى وَهٰذَا عِيْسَى فَسَلِّمْ عَلَيْهِمَا فَسَلَّمْتُ فَرَدَّا ثُمَّ قَالَا مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ إِلَى السَّمَاءِ الثَّالِثَةِ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ إِذَا يُوْسُفُ قَالَ هٰذَا يُوْسُفُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ حَتّٰى أَتَى السَّمَاءَ الرَّابِعَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا إِدْرِيْسُ فَقَالَ هٰذَا إِدْرِيْسُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ حَتّٰى أَتَى السَّمَاءَ الْخَامِسَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا هَارُوْنُ قَالَ هٰذَا هَارُوْنُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ حَتّٰى أَتَى السَّمَاءَ السَّادِسَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا مُوْسٰى قَالَ هٰذَا مُوْسٰى فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ فَلَمَّا جَاوَزْتُ بَكٰى قِيْلَ لَهُ مَا يُبْكِيْكَ قَالَ أَبْكِيْ لِأَنَّ غُلَامًا بُعِثَ بَعْدِيْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِهِ أَكْثَرُ مِمَّنْ يَدْخُلُهَا مِنْ أُمَّتِيْ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ بُعِثَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا إِبْرَاهِيْمُ قَالَ هٰذَا أَبُوْكَ إِبْرَاهِيْمُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ رُفِعْتُ إِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى فَإِذَا نَبِقُهَا مِثْلُ قِلَالِ هَجَرٍ وَإِذَا وَرَقُهَا مِثْلُ اٰذَانِ الْفِيَلَةِ قَالَ هٰذَا سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى فَإِذَا أَرْبَعَةُ أَنْهَارٍ نَهْرَانِ بَاطِنَانِ وَنَهْرَانِ ظَاهِرَانِ قُلْتُ مَا هٰذَانِ يَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ أَمَّا الْبَاطِنَانِ فَنَهْرَانِ فِي الْجَنَّةِ وَأَمَّا الظَّاهِرَانِ فَالنِّيْلُ وَالْفُرَاتُ ثُمَّ رُفِعَ لِيَ الْبَيْتُ الْمَعْمُوْرُ ثُمَّ أُتِيْتُ بِإِنَاءٍ مِنْ خَمْرٍ وَإِنَاءٍ مِنْ لَبَنٍ وَإِنَاءٍ مِنْ عَسَلٍ فَأَخَذْتُ اللَّبَنَ فَقَالَ هِيَ الْفِطْرَةُ أَنْتَ عَلَيْهَا وَأُمَّتُكَ ثُمَّ فُرِضَتْ عَلَيَّ الصَّلٰوةُ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ فَمَرَرْتُ عَلٰى مُوْسٰى فَقَالَ بِمَ أُمِرْتَ قُلْتُ أُمِرْتُ بِخَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ قَالَ إِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيْعُ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ وَإِنِّيْ وَاللّٰهِ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ لِأُمَّتِكَ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّيْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّيْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّيْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّيْ عَشْرًا فَأُمِرْتُ بِعَشْرِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَأُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ بِمَا أُمِرْتَ قُلْتُ أُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ قَالَ إِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيْعُ خَمْسَ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ وَإِنِّيْ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ لِأُمَّتِكَ قَالَ سَأَلْتُ رَبِّيْ حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ وَلٰكِنِّيْ أَرْضٰى وَأُسَلِّمُ قَالَ فَلَمَّا جَاوَزْتُ نَادٰى مُنَادٍ أَمْضَيْتُ فَرِيْضَتِيْ وَخَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِيْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت قتادہؒ (تابعی) حضرت انس ابن مالکؓ سے اور وہ حضرت مالک ابن صعصعہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے سراء اور معراج کی رات کے احوال وواردات کی تفصیل صحابہؓ سے بیان کرتے ہوئے فرمایا: "اس رات میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا اور بعض موقعوں پر آپ ﷺ نے "حجر" میں لیٹنے کا ذکر فرمایا۔ کہ اچانک ایک آنے والا (فرشتہ) میرے پاس آیا اور اس نے (میرے جسم کے)

یہاں سے یہاں تک کے حصّہ کو چاک کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ "(یہاں سے یہاں تک" سے) آنحضرت ﷺ کی مراد گردن کے گڑھے سے زیر ناف بالوں تک کا پورا حصّہ تھا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس فرشتہ نے اس طرح میرا سینہ چاک کر کے) میرے دل کو نکالا۔ اس کے بعد میرے سامنے سونے کا ایک طشت لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا اور اس میں میرے دل کو دھویا گیا، پھر دل میں (اللہ کی عظمت و محبت یا علم وایمان کی دولت) بھری گئی اور پھر دل کو سینہ میں اس کی جگہ رکھ دیا گیا۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ پھر میرے پیٹ (کے اندر کی تمام چیزیں یا دل کی جگہ) کو زمزم کے پانی سے دھویا گیا۔ اور پھر اس میں ایمان وحکمت بھرا گیا، اس کے بعد سواری کا ایک جانور لایا گیا جو خچر سے نیچا اور گدھے سے اونچا تھا، یہ جانور سفید رنگ کا تھا اور اس کا نام براق تھا (اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ) جہاں تک اس کی نظر جاتی تھی وہاں اس کا ایک قدم پڑتا تھا، مجھے اس پر سوار کیا گیا، اور جبرئیل مجھے لے کے چلے یہاں تک کہ میں آسمان دنیا (یعنی پہلے آسمان) پر پہنچا، جبرئیل علیہ السلام نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو (دربان فرشتوں کی طرف سے) پوچھا گیا کہ کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: میں جبرئیل ہوں پھر پوچھا گیا: اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا! محمد ﷺ ہیں۔ اس کے بعد سوال کیا گیا! ان (محمد ﷺ) کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا (یا از خود آئے ہیں) جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا بلائے ہوئے آئے ہیں۔ تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت آدم علیہ السلام میرے سامنے کھڑے ہیں، جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ تمہارے باپ (یعنی جد اعلیٰ) آدم ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سلام کیا، انہوں نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا! میں نیک بخت بیٹے اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اوپر دوسرے آسمان پر آئے، انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: میں جبرئیل علیہ السلام ہوں۔ پھر پوچھا گیا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد ﷺ ہیں۔ پھر سوال کیا گیا: ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا ہاں! تب دربان فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کھڑے ہیں جو ایک دوسرے کے خالہ زاد بھائی تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ یحییٰ ہیں اور یہ عیسیٰ ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے دونوں کو سلام کیا اور دونوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: نیک بخت بھائی اور پیغمبر صالح کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور تیسرے آسمان پر آئے انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کون ہے؟ جبرئیل نے کہا: میں جبرئیل ہوں۔ پھر پوچھا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد ﷺ ہیں۔ پھر سوال کیا گیا: ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا ہاں! تب ان فرشتوں نے کہا ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں تیسرے آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام سامنے کھڑے ہیں، جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ یوسف ہیں، ان کو سلام کرو۔ میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: میں نیک بخت بھائی اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد جبرئیل مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور چوتھے آسمان پر آئے انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا: اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد ﷺ ہیں۔ پھر سوال کیا گیا: ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا ہاں! تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں چوتھے آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ادریس علیہ السلام سامنے کھڑے ہیں، جبرئیل علیہ السلام نے کہا یہ ادریس علیہ السلام ہیں، ان کو سلام کرو۔ میں نے ان کو سلام کیا، اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: میں نیک بخت بھائی اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور پانچویں آسمان پر آئے۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کون ہے؟ جبرئیل نے کہا: میں جبرئیل ہوں، پھر

پوچھا گیا! اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا: محمد (ﷺ) ہیں۔ پھر سوال کیا گیا: ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا ہاں! تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد (ﷺ) کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں پانچویں آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ہارون علیہ السلام ہیں، جبرئیل نے کہا یہ ہارون علیہ السلام ہیں ان کو سلام کرو، میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا میں نیک بخت بھائی اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور چھٹے آسمان پر آئے انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کہ کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا میں جبرئیل (علیہ السلام) ہوں، پھر پوچھا گیا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد (ﷺ) ہیں۔ پھر سوال کیا گیا: ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا ہاں! تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد (ﷺ) کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آنے والے کو آنا مبارک ہو۔

اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں چھٹے آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میرے سامنے کھڑے ہیں، جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: میں نیک بخت بھائی اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد جب میں آگے بڑھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رونے لگے، پوچھا گیا: آپ کیوں روتے ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ایک نوجوان جس کو میرے بعد رسول بنا کر دنیا میں بھیجا گیا اس کی اُمت کے لوگ میری اُمت کے لوگوں سے کہیں زیادہ جنت میں داخل ہوں گے۔ بہر حال (اس چھٹے آسمان سے گذر کر) جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور ساتویں آسمان پر آئے، انہوں نے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کہ کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: میں جبرئیل ہوں۔ پھر پوچھا گیا: اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد (ﷺ) ہیں، پھر سوال کیا گیا: ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا ہاں! تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد (ﷺ) کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں ساتویں آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میرے سامنے کھڑے ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ تمہارے باپ (مورث اعلیٰ) ابراہیم علیہ السلام ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: میں نیک بخت بیٹے اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا، میں نے دیکھا کہ اس کے پھل یعنی بیر، مقام ہجر کے (بڑے بڑے) مٹکوں کے برابر تھے اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر تھے، جبرائیل نے (وہاں پہنچ کر) کہا: یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے! میں نے وہاں چار نہریں بھی دیکھیں، دو نہریں تو باطن کی تھیں اور دو نہریں ظاہر کی تھیں، میں نے پوچھا: جبرئیل! یہ دو طرح کی نہریں کیسی ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام نے بتایا: یہ باطن کی دو نہریں جنت کی ہیں اور یہ ظاہر کی دو نہریں نیل اور فرات ہیں، پھر مجھ کو بیت المعمور دکھلایا گیا اور اس کے بعد ایک پیالہ شراب کا، ایک پیالہ دودھ کا اور ایک پیالہ شہد کا میرے سامنے لایا گیا (اور مجھے اختیار دیا گیا کہ ان تینوں میں سے جس چیز کا پیالہ پسند ہو لے لوں) چنانچہ میں نے دودھ کا پیالہ لے لیا، جبرائیل علیہ السلام نے (یہ دیکھ کر کہ میں نے دودھ کے پیالہ کو اختیار کیا) کہا: دودھ فطرت ہے اور یقیناً تم اور تمہاری اُمت کے لوگ اسی فطرت پر (قائم وعامل) رہیں گے (اور جہاں تک شراب کا معاملہ ہے تو وہ اُم الخبائث اور شر و فساد کی جڑ ہے) اس کے بعد وہ مقام آیا جہاں مجھ پر (ایک دن اور ایک رات کی) پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر (جب ملاء اعلیٰ کا میرا سفر تمام ہوا اور درگاہ رب العزت سے) میں واپس ہوا تو ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رخصت ہو کر چھٹے آسمان پر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا (اور ان سے رخصت ہونے لگا) تو انہوں نے پوچھا: تمہیں کس عبادت کا حکم دیا گیا ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ (ہر شب و روز میں) پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے (یہ سن کر) کہا تمہاری امت (نسبتاً کمزور قوی رکھنے کے سبب یا کسل و سستی کے سبب) رات دن میں پچاس نمازیں ادا نہیں کر سکے گی، خدا کی قسم، میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں (کہ عبادت خداوندی کے راستہ میں مشقت و تعب برداشت کرنا ان کی طبیعتوں پر کس قدر بار تھا) اور

بنی اسرائیل کی اصلاح و درستی کی سخت ترین کوشش کر چکا ہوں (لیکن وہ اصلاح پذیر نہ ہوئے باوجودیکہ ان کے قویٰ تمہاری اُمت کے لوگوں سے زیادہ مضبوط تھے، تو پھر تمہاری اُمت کے لوگ اتنی زیادہ نمازوں کی مشقت کیسے برداشت کر سکیں گے لہٰذا تم اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ اور اپنی اُمت کے حق میں تخفیف اور آسانی کی درخواست کرو۔ چنانچہ میں (اپنے پروردگار کی بارگاہ میں) دوبارہ حاضر ہوا اور میرے پروردگار نے میرے عرض کرنے پر) دس نمازیں کم کر دیں، میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا (اور ان کو بتایا کہ دس نمازیں کم کر کے چالیس نمازیں رہنے دی گئی ہیں) لیکن انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا (کہ میں پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں، تمہاری اُمت کے لوگ چالیس نمازیں بھی ادا نہیں کر سکیں گے: اب پھر بارگاہ رب العزت میں جا کر مزید تخفیف کی درخواست کرو) چنانچہ میں پھر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوا اور (چالیس میں سے) دس نمازیں کم کر دی گئیں، میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا، چنانچہ میں بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوا اور (تیس میں سے) دس نمازیں کم کر دی گئیں، میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا، چنانچہ میں بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوا اور مجھ کو دس نمازوں کا حکم دیا گیا، میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا۔ چنانچہ میں پھر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوا اور مزید پانچ نمازوں کی تخفیف کر کے مجھ کو ہر شب و روز میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا گیا، میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پوچھا کہ اب تمہیں کیا حکم ملا ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ اب مجھے رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: حقیقت یہ ہے کہ تمہاری اُمت کے اکثر لوگ (پوری پابندی اور تسلسل کے ساتھ) رات دن میں پانچ نمازیں بھی نہیں پڑھ پائیں گے، حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں اور بنی اسرائیل کی اصلاح و درستی کی سخت کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں (وہ تو اس سے بھی کہیں کم عبادت خداوندی پر عامل نہیں رہ سکے تھے) لہٰذا تم پھر پروردگار کے پاس جاؤ اور اپنی اُمت کے لئے (پانچ نمازوں میں بھی) تخفیف کی درخواست کرو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (کہ اس موقع پر میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا) کہ میں بار بار اپنے پروردگار سے تخفیف کی درخواست کر چکا ہوں، اور مجھ کو شرم آتی ہے (اگرچہ اُمت کی طرف سے پانچ نمازوں کی بھی پابندی نہ ہو سکنے کا گمان ہے مگر مزید تخفیف کی درخواست کرنا اب میرے لئے ممکن نہیں ہے) میں اپنے پروردگار کے اس حکم کو (برضاء و رغبت) قبول کرتا ہوں (اور اپنا اور اپنی اُمت کا معاملہ اس کے سپرد کر دیتا ہوں کہ وہ اپنی توفیق و مدد سے اُمت کے لوگوں کو ان پانچ نمازوں کی ادائیگی کا پابند بنائے)۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس گفتگو کے بعد) جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) یہ ندائے غیبی آئی: میں نے (پہلے تو) اپنے فرض کو جاری کیا اور پھر (اپنے پیارے رسول کے طفیل میں اپنے بندوں کے حق میں تخفیف کر دی (مطلب یہ کہ اب میرے بندوں کو نمازیں تو پانچ ہی پڑھنی پڑیں گی لیکن ان کو ثواب پچاس نمازوں کا ملے گا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "حطیم" خانہ کعبہ کی شمالی دیوار سے ڈیڑھ گز کے فاصلہ پر ایک ہلالی شکل کی دیوار ہے، اس دیوار کے اندر کا حصہ حطیم کہلاتا ہے، اور حجر (ح کے زیر کے ساتھ) بھی اسی حطیم کو کہا جاتا تھا یہ جگہ (یعنی حطیم یا حجر اصلاً خانہ کعبہ کا حصہ ہے۔ معراج کی رات میں جب کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کو لینے کے لئے آئے آپ ﷺ اسی جگہ استراحت فرما تھے۔

"یہاں سے یہاں تک کے حصہ کو چیرا۔" شق صدر (سینہ مبارک کے چاک کئے جانے) کا یہ واقعہ اس کے علاوہ ہے جو بچپن میں پیش آیا تھا، اس وقت (بچپن میں آپ ﷺ کے سینہ مبارک کے چاک کئے جانے کا مقصد آپ ﷺ کے اندر سے وہ مادہ نکالنا تھا جس کے ذریعہ انسان کو گمراہ کرنے کا موقع شیطان کو ملتا ہے یا جس کے سبب خود انسان کا نفس گمراہی اور برائی میں مبتلا ہوتا ہے، اور اس موقع پر (معراج کی رات میں) شق صدر کا مقصد آپ ﷺ کے قلب مبارک میں علم و معرفت کا کمال بھرنا تھا۔

"سونے کا ایک طشت لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا۔" یہ کنایہ اور تمثیل کے طور پر کہا گیا ہے یا یہ کہ ایمان کو ظاہری جسم دے کر واقعۃً اس طشت میں بھرا گیا، جیسا کہ قیامت کے دن اعمال کو مجسم کیا جائے گا تاکہ ان کو میزان میں تولا جا سکے۔

"اس کا نام براق تھا۔" آنحضرت ﷺ کی سواری کے لئے مخصوص اس جانور کا نام "براق" اس مناسبت سے رکھا گیا کہ وہ برق (بجلی) کی طرح تیز رفتار اور روشنی کی طرح چمکدار تھا۔ اس کی تیز رفتاری کے بارے میں جو یہ فرمایا کہ اس کا ایک قدم حد نظر پر پڑتا تو اس سے بعض حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ وہ براق ایک ہی قدم میں آسمان پر پہنچ گیا ہوگا کیونکہ زمین سے اس کی حد نظر آسمان ہی تھا، اس اعتبار سے ساتویں آسمان تک وہ سات قدموں میں پہنچا ہوگا۔ اس براق کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ براق تمام انبیاء کی سواری کے لئے متعین تھا اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہر نبی کے لئے اس کی حیثیت و مرتبہ کے مطابق الگ الگ براق تھے۔ جیسا کہ آخرت میں ہر نبی کے لئے اس کے مرتبہ و مقام کے مطابق الگ الگ حوض بنے ہوئے ہیں، چنانچہ حدیث کے اس جملہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ براق آنحضرت ﷺ کی سواری کے لئے مخصوص و متعین تھا۔

"مجھے اس پر سوار کیا گیا۔" اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس براق پر آنحضرت ﷺ کا سوار ہونا محض اللہ تعالیٰ کی مدد اور قدرت سے ممکن ہوا، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت جبرئیل نے اپنی قوت ملکیت کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کو اس براق پر سوار کرایا تھا، اور یہ بات بعید از امکان اس لئے نہیں ہو سکتی کہ آنحضرت ﷺ پر وحی اترنے اور آپ ﷺ تک فیض الٰہی پہنچنے کا اصل ذریعہ حضرت جبرئیل ہی تھے، اور اس سفر معراج میں بھی ان کی حیثیت اس رفیق سفر اور خادم کی تھی جس کا مقصد ہر طرح کی راحت و مدد پہنچانا ہوتا ہے چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کی رکاب پکڑ رکھی تھی اور میکائیل علیہ السلام براق کی باگ تھامے ہوئے تھے۔

"یہاں تک کہ میں آسمان دنیا پر پہنچا۔" اس سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سواری ہی کے ذریعہ آسمان میں داخل ہوئے۔ نیز جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ معراج کا واقعہ اس شب سے الگ ایک دوسری شب میں پیش آیا تھا جس میں صرف اسراء یعنی بیت المقدس تک کا سفر پیش آیا تھا اور جس کو "لیلۃ الاسراء" (اسراء کی رات) کہا جاتا ہے، وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس روایت میں بیت المقدس تک کے سفر کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ مسجد حرام سے براق پر سوار ہو کر روانہ ہونے کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوا کہ اسراء یعنی بیت المقدس تک کا سفر ایک دوسری شب میں پیش آیا تھا اور اس حدیث میں جس شب کا ذکر کیا جا رہا ہے اس میں صرف معراج پیش آئی تھی۔ معراج کے وقت جب آپ ﷺ آسمان پر تشریف لے گئے تو براق پر سوار تھے یا سیڑھی کے ذریعہ عروج وصعود فرمایا؟ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے، اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ براق پر سوار ہو کر آپ ﷺ آسمان پر تشریف لے گئے، جب کہ دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان تک آپ ﷺ کا عروج وصعود سیڑھی کے ذریعہ ہوا۔ لہٰذا ملا علی قاریؒ نے روایتوں کے اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے لکھا ہے کہ یہاں اس روایت میں راوی نے اختصار سے کام لیا ہے اور واقعہ کی تفصیل ذکر کرنے کے بجائے اجمال پر اکتفا کیا تفصیلی روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ براق پر سوار ہو کر بیت المقدس پہنچے اور آپ ﷺ نے براق کو اس حلقہ سے باندھ دیا جس سے انبیاء کرام اپنے براقوں کو باندھتے تھے، بیت المقدس کے مشاغل (جیسے انبیاء کرام کو نماز پڑھانا اور ان سے ملاقات وغیرہ) سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے آسمان کی طرف عروج وصعود فرمایا، اور یہ عین ممکن ہے کہ سیڑھی کے ذریعہ آپ ﷺ آسمان پر تشریف لے گئے ہوں اور براق بدستور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کے دروازہ پر بندھا رہا۔ پس راوی نے اس درمیانی تفصیل کو حذف کر کے بس آسمان پر پہنچنے کا ذکر کر دیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ براق پر سوار ہو کر ہی سیڑھی کے ذریعہ آسمان پر تشریف لے گئے ہوں جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں تمام روایتیں متفق ہو جاتی ہیں۔

"پوچھا گیا کہ کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: میں جبرئیل ہوں۔" اس سے معلوم ہوا کہ آسمان میں حقیقۃً دروازے ہیں اور ان دروازوں پر دربان مقرر ہیں نیز کہا جاتا ہے کہ وہ دروازے بیت المقدس کے محاذات میں ہیں۔ حدیث کے اس جملہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کسی کے گھر جا کر دروازے پر آواز یا دستک دی جائے اور گھر کے اندر سے پوچھا جائے کہ کون ہے؟ تو اس کے جواب میں صرف یہ نہ

کہا جائے کہ "میں ہوں۔" جیسا کہ عام طور پر لوگوں کی عادت ہے اور اس کی ممانعت منقول ہے بلکہ اپنا نام لے کر جواب دیا جائے۔ مثلاً یوں کہا جائے "میں زید ہوں۔"

"ان کو سلام کرو" کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو سلام میں سبقت (پہلے سلام کرنے) کا حکم اظہار تواضع و شفقت کی تعلیم کے طور پر تھا کیونکہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ کو وہ عالی مرتبہ و مقام حاصل ہوا تھا جس سے بلند و برتر مرتبہ و مقام کا تصور بھی کسی اور کے لئے نہیں کیا جاسکتا لہٰذا آپ ﷺ پر لازم تھا، کہ تواضع و انکساری اور شفقت و محبت کا اظہار کریں اور سلام میں سبقت اس کا بہترین ذریعہ تھا۔ نیز بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ ان انبیاء کے پاس سے گذر رہے تھے اور اس اعتبار سے آپ ﷺ اس شخص کے حکم میں تھے جو کھڑا ہو، اور انبیاء اپنی اپنی جگہ پر پہلے سے موجود و برقرار تھے، اور اس اعتبار سے وہ اس شخص کے حکم میں تھے جو بیٹھا ہو، اور اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کھڑا ہو اور ایک شخص بیٹھا ہو، تو کھڑا ہوا شخص پہلے سلام کرے اگرچہ وہ بیٹھے ہوئے شخص سے افضل ہو، لہٰذا ان انبیاء کرام کو آنحضرت ﷺ کا پہلے سلام کرنا اس اشکال کو لازم نہیں کرتا کہ آنحضرت ﷺ چونکہ تمام انبیاء سے افضل ہیں اس لئے سلام میں آپ ﷺ کو سبقت کا حکم کیوں دیا گیا۔

"میں نیک بخت بیٹے اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔" نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام بلکہ حدیث میں مذکور تمام انبیاء نے آپ ﷺ کا استقبال کرتے ہوئے آپ ﷺ کی مدح و تعریف میں صلاح یعنی نیک بختی کا ذکر کیا، اس سے معلوم ہوا کہ نیک بختی وہ عظیم مرتبہ اور بلند ترین مقام ہے جو تمام انسانی و اخلاقی خوبیوں اور بھلائیوں کا مجموعہ ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ صالح یعنی نیک بخت وہ شخص ہے جو اللہ اور اللہ کے بندوں کے تمام لازمی حقوق کی ادائیگی پر عامل و قائم ہو، نیز اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں انبیاء کا اصل وصف صلاح ہی بیان کیا ہے، جیسا کہ فرمایا: وَكُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ اور۔ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ۔

"اس کی اُمت کے لوگ میری اُمت کے لوگوں سے کہیں زیادہ جنت میں داخل ہوں گے۔" کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رونے کا جو یہ سبب بیان کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کی اُمت کی فضیلت و بڑائی کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں حسد یا جلن جیسی کوئی چیز تھی، کیونکہ حسد اور جلن تو وہ برا جذبہ ہے جس سے عام مؤمنین کے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور اس جہان (آخرت) میں تو معمولی درجہ کے اہل ایمان کے دلوں میں سے بھی یہ برا جذبہ نکال باہر کیا جائے گا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی عظیم ہستی اس برے جذبہ میں مبتلا ہوتی جس کو حق تعالیٰ نے اپنا برگزیدہ بنایا، منصب نبوت و رسالت پر فائز کیا اور شرف تکلم سے سرفراز فرمایا۔ لہٰذا کہا جائے گا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رونا اس حسرت و افسوس کے سبب تھا کہ ان کی اُمت کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام و تعلیمات کی مخالفت کر کے اور سرکشی و نافرمانی کے راستہ پر جمے رہ کر اپنی مجموعی اور ملی حیثیت کو زبردست نقصان پہنچایا جس کا اثر یہ ہوا کہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ اجر و انعام جاتا رہا جس سے ان کے مراتب و درجات کی ترقی کا راستہ کھلا رہتا، اس طرح ان کی اُمت کے لوگوں نے خود اپنا ہی نقصان نہیں کیا بلکہ اپنے پیغمبر (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کے اجر و ثواب کے نقصان کا سبب بھی بنے کیونکہ ہر پیغمبر کو اس شخص کا ثواب ملتا ہے جو اس کی متابعت کرتا ہے اور جن لوگوں کو خود ثواب نہ ملتا ہو وہ اپنے پیغمبر کے اجر و ثواب میں اضافہ اور ترقی کا باعث کیسے بن سکتے ہیں جو ایک طرح سے اس پیغمبر کے حق میں نقصان ہے، اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کے لوگ ان کی بات مان کر سرکشی اور گناہ کے راستہ سے بچنے اور اللہ کی طاعت و فرمانبرداری کی راہ پر چلتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی وہی ثواب ملتا جس کے حقدار ان کی اُمت کے لوگ ہوتے کیونکہ جتنا ثواب اس شخص کو ملتا ہے جو کوئی نیک عمل کرتا ہے، اتنا ہی ثواب اس نیک عمل کی راہ دکھانے والے کو بھی ملتا ہے، پس قوم موسیٰ کی سرکشی اور نافرمانی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملنے والا یہ اجر و ثواب جاتا رہا، اس کے برخلاف جب انہوں نے آنحضرت ﷺ کی فضیلت اور آپ ﷺ کے ان بلند مراتب و درجات کو دیکھا جو آپ ﷺ کی اُمت کی

اطاعت وفرمانبرداری کے سبب آپ ﷺ کو ملنے والے تھے تو وہ اپنے اجر وثواب کی محرومی پر ازراہ تأسف رو پڑے۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رونا دراصل اپنی قوم کی قابل رحم حالت پر حسرت افسوس اور شفقت ومحبت کا بیساختہ اظہار تھا، جب انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو میری اُمت کے لوگ ہیں جن کو اللہ نے بڑی بڑی عمر دی۔ مضبوط قوی سے نوازا، کارگاہ حیات میں زیادہ طویل عرصہ تک مصروف عمل رہنے کا موقع دیا لیکن انہوں نے نہ تو میری اتباع سے وہ فائدہ اٹھایا جو محمد ﷺ کی اُمت کے لوگ چھوٹی چھوٹی عمر اور کمزور قوی رکھنے کے باوجود اپنے پیغمبر کے اتباع کی صورت میں اٹھائیں گے اور نہ میری اُمت کے لوگ اس کثرت کو پہنچ سکے جو محمد ﷺ کی اُمت کے لوگوں کو نصیب ہوگی تو اس شفقت کے تحت کہ جو کسی بھی دوسرے تعلق اور رشتہ سے کہیں زیادہ اپنی اُمت کے تئیں ایک پیغمبر کے دل میں ہوتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام رونے لگے، ان کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسی مبارک ساعت ہے جس میں حق تعالیٰ کا دریائے رحم وکرم جوش میں ہے، شاید اللہ تعالیٰ اس مبارک ساعت کی برکت سے اس وقت میری اُمت پر بھی رحم فرمادے اور ان کے ساتھ وہ سخت معاملہ نہ کرے جس کے وہ مستوجب ہو چکے ہیں۔

اور بعض حضرات نے لکھا ہے! اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رونے کا مقصد ہمارے حضرت ﷺ کے دل کو خوش کرنا تھا، یعنی انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے زبان حال سے گویا یہ اعتراف و اظہار کیا کہ آپ ﷺ کے تابعداروں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی اور جنت میں جتنے لوگ دوسری امتوں کے داخل ہوں گے ان سب سے زیادہ آپ ﷺ کے امتی جنت میں جائیں گے۔ واضح رہے کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ کہا کہ "ایک نوجوان جس کو میرے بعد رسول بنا کر دنیا میں بھیجا گیا الخ"، تو اس سے آنحضرت ﷺ کی حقارت یا توہین مقصود نہیں تھی بلکہ یہ جملہ (جس میں "غلام" کا لفظ استعمال کیا) اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور کمال کرم پر اظہار تعجب کے طور پر تھا، یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ کہتے: پروردگار کی قدرت کی بڑائی کے کیا کہنے، اس نے اس نوجوان کو اس چھوٹی سی عمر میں وہ مرتبہ وفضل عطا فرمایا جو پہلے نبیوں اور رسولوں کو بڑی بڑی عمر میں نصیب نہیں ہوا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے "غلام" (نوجوان) کا لفظ آنحضرت ﷺ کی عمر کے اعتبار سے ہی استعمال کیا ہو کیونکہ اس وقت انبیاء کرام کی ان عمروں کی بہ نسبت کہ جو وہ دنیا میں گذار کر آئے تھے اور پھر جتنا طویل عرصہ ان کو عالم برزخ میں گذارتے ہو گیا تھا، آنحضرت ﷺ کی عمر یقیناً بہت چھوٹی تھی اور ان کے سامنے آپ ﷺ بالکل نو عمر تھے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آسمانوں میں جن انبیاء کرام سے آنحضرت ﷺ کی ملاقات کرائی گئی وہ جسم وروح کے ساتھ وہاں موجود تھے یا ان کی موجودگی محض روحانی تھی؟ اگر وہ جسم وروح کے ساتھ وہاں موجود تھے تو پھر یہ اشکال لازم آتا ہے کہ ان کے اجسام تو قبروں میں ہیں، آسمانوں میں ان کی موجودگی کیسے تھی؟ اس سلسلہ میں علماء نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ان انبیاء کرام کے اجسام اصلیہ تو قبروں ہی میں رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو اجسام مثالیہ کے ساتھ متمثل کر کے آپ ﷺ کی ملاقات کے لئے جمع کیا البتہ آپ ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر جسم اصلی کے ساتھ دیکھا کیونکہ وہ اسی جسم کے ساتھ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے، اسی طرح حضرت ادریس علیہ السلام کو جسم اصلی کے ساتھ دیکھا وہ بھی آسمان پر زندہ اٹھائے گئے تھے۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے اعزاز واکرام کے لئے ان انبیاء کرام کو مع اجسام عنصریہ کے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور آسمانوں میں جمع کیا، اس طرح آنحضرت نے تمام ہی انبیاء کو ان کے اجسام اصلی کے ساتھ دیکھا، اور اللہ کی قدرت کے آگے کچھ محال نہیں تھا کہ ایک شب کے لئے ان انبیاء کے اجسام عنصریہ ان کی قبروں سے بیت المقدس، اور پھر آسمانوں پر جمع کئے گئے اور پھر ان کو ان کی قبروں میں واپس کر دیا گیا۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آسمانوں میں ان ہی چند حضرات انبیاء کو آنحضرت ﷺ کی ملاقات کے لئے کیوں مخصوص کیا گیا اور یہ کہ انبیاء میں سے ہر نبی کو ایک آسمان کے ساتھ کس سبب سے مخصوص کیا گیا اور اس میں کیا حکمت تھی؟ اس بارے میں علماء نے یہ لکھا ہے کہ ان ہی چند حضرات انبیاء سے آنحضرت ﷺ کی ملاقات کرانے اور ان میں سے ہر نبی کو تفاوت ودرجات کی ترتیب سے ایک ایک

آسمان کے ساتھ مخصوص کرنے میں ان خاص حالات کی طرف اشارہ مقصود تھا جو حضور ﷺ کو بعد میں وقتاً فوقتاً پیش آئے چنانچہ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی سب سے پہلے نبی ہیں اور ہر انسان کے پہلے باپ ہیں، اس لئے سب سے پہلے ان ہی سے ملاقات کرائی گئی اور اس ملاقات میں ہجرت کی طرف اشارہ تھا کہ جس طرح حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے دشمن (ابلیس) کی وجہ سے آسمان اور جنّت سے زمین کی طرف ہجرت فرمائی اسی طرح آپ ﷺ بھی اپنے دشمنوں کی وجہ سے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائیں گے، اور حضرت آدم علیہ السلام کی طرح آپ ﷺ کو بھی وطن مالوف کی مفارقت طبعاً شاق ہوگی۔ دوسرے آسمان پر حضرت عیسی علیہ السلام سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام انبیاء میں جس نبی سے آنحضرت ﷺ کو سب سے زیادہ زمانی قرب حاصل ہے وہ حضرت عیسی علیہ السلام ہیں، نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں دجال کے قتل کے لئے آسمان سے اتریں گے اور اُمّت محمدیہ میں ایک مجدد ہونے کی حیثیت سے شریعت محمدیہ کو جاری فرمائیں گے اور قیامت کے دن تمام لوگوں کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں وہی حاضر ہوں گے اور آپ ﷺ سے شفاعت کی درخواست کریں گے، ان وجوہ سے حضرت عیسی علیہ السلام سے ملاقات کرائی گئی اور حضرت عیسی علیہ السلام کے ساتھ حضرت یحیٰی علیہ السلام کی معیت محض ان کی نسبی قرابت کی وجہ سے تھی۔ تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آنحضرت ﷺ کو حضرت یوسف ﷺ کے ساتھ اس بناء پر سب سے زیادہ مخصوص قرب حاصل ہے، کہ جب آنحضرت ﷺ کی اُمّت جنت میں داخل ہوگی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی شکل وصورت کے حسن و جمال کی حامل ہوگی، نیز اس ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح آپ ﷺ کو بھی اپنے خاندانی بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں سے سخت تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں گی اور بالآخر آپ ﷺ ان پر غالب آکر ان سے درگذر فرمائیں گے۔ چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا۔ اور چونکہ ساتوں آسمانوں میں درمیانی اور معتدل چوتھا آسمان ہی ہے اس لئے ان کو چوتھے آسمان پر رکھا گیا، نیز اس ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ آنحضرت سلاطین عالم کو دعوت اسلام کے خطوط روانہ فرمائیں گے، کیونکہ خط وکتابت کے اول موجد حضرت ادریس علیہ السلام ہی ہیں۔ پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ (حضرت ہارون) حضرت موسی علیہ السلام کے بھائی ہونے کی حیثیت سے ان سے بہت قریب بھی تھے اور دعوت حق کے راستہ میں ان کے معتمد مددگار بھی، اس اعتبار سے ان کو حضرت موسی علیہ السلام کے آسمان سے قریب پانچویں آسمان پر رکھا گیا، اور ان کے اوپر چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رکھا گیا، کیونکہ وہ "کلیم اللہ" کی فضیلت رکھنے کے سبب دوسرے نبیوں سے اوپر چھٹے آسمان ہی سے موزونیت رکھتے تھے نیز اس ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام ملک شام میں جبارین سے جہاد وقتال کے لئے گئے اور اللہ نے ان کو فتح دی اسی طرح آنحضرت ﷺ بھی دشمنان دین سے جہاد وقتال کے لئے ملک شام میں داخل ہوں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ شام میں غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لے گئے اور دومۃ الجندل کے رئیس نے جزیہ دے کر صلح کی درخواست پیش کی اور آنحضرت ﷺ نے اس کی صلح کی درخواست منظور فرمالی اور جس طرح ملک شام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کے ہاتھ پر فتح ہوا اسی طرح حضور پر نور ﷺ کے بعد حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر پورا ملک شام فتح ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل ہیں، اس اعتبار سے ہمارے حضرت ﷺ کے بعد تمام نبیوں میں وہ سب سے افضل و اشرف ہیں، لہٰذا ان کو تمام انبیاء کے اوپر ساتویں آسمان پر رکھا گیا، حضرت ابراہیم ﷺ چونکہ بانی کعبہ بھی ہیں اس لئے اس آخری ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ آنحضرت ﷺ وفات سے پیشتر حج بیت اللہ فرمائیں گے اور آخر کار مکہ مکرمہ آپ ﷺ کے ہاتھوں فتح ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہاں یہ احتمال ہے کہ اس شب میں آسمان پر تمام انبیاء کو جمع کرنے کے بجائے ان چند مخصوص انبیاء کو جمع کرنا کافی سمجھا گیا ہو، وہیں یہ احتمال بھی ہے کہ باقی تمام انبیاء بھی جمع کئے گئے ہوں اور اس موقع پر وہ سب اپنی اپنی حیثیت اور درجہ کے مطابق

مقامات پر آسمانوں میں موجود ہوں لیکن ذکر میں صرف ان مخصوص و مشہور انبیاء کے اسماء پر اکتفا کیا گیا ہو اور باقی انبیاء کے ذکر کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی ہو۔

"اس کے بعد مجھ کو سدرۃ المنتہی تک پہنچایا گیا۔" "سدرۃ المنتہٰی" ساتویں آسمان پر ایک بیری کا درخت ہے جس کی جڑ چھٹے آسمان میں ہے۔ سدرہ کے معنی بیر کے درخت کے ہیں، اور منتہی کے معنی ہیں وہ جگہ جہاں ہر چیز پہنچ کر رک جاتی ہے۔ چنانچہ زمین سے جو بھی چیز اوپر جاتی ہے وہ سدرۃ المنتھی پر جا کر منتہی ہو جاتی اور پھر اوپر اٹھائی جاتی ہے، اسی طرح ملاء اعلی سے جو چیز اترتی ہے وہ سدرۃ المنتھی پر آکر ٹھہر جاتی ہے پھر نیچے لائی جاتی ہے۔ گویا یہ وہ مقام ہے جس کے آگے فرشتے بھی نہیں جا سکتے۔ یہ سعادت صرف ہمارے حضرت ﷺ کو حاصل ہوئی کہ آپ ﷺ اس مقام سے بھی آگے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ کے علاوہ اور کوئی اس مقام سے آگے نہیں گیا۔

وَاِذَا ورقھا اذان الفیلة (اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر تھے)" اس جملہ میں لفظ فیلہ اصل میں فیل (ہاتھی) کی جمع ہے اور دِیَک کے وزن پر ہے جو دیک (مرغ) کی جمع ہے۔ سدرۃ المنتھی کے پھلوں کو بڑے بڑے مٹکوں کے برابر اور اس کے پتوں کو ہاتھی کے کانوں کے برابر کہنا عوام کو سمجھانے اور قیاس عقل میں لانے کے لئے ہے حقیقت یہ ہے کہ لفظی طور پر نہ تو خود اس درخت کی لمبائی موٹائی حد حصر میں آسکتی ہے اور نہ اس کے پھل اور پتوں کے بڑے پن کا کائی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ سدرۃ المنتھی ہے" حضرت جبرئیل کا یہ کہنا یا تو آنحضرت ﷺ کو اس مقام سے متعارف کرانا اور اس بات کی مبارکباد دینا تھا کہ آپ ﷺ اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جو تمام خلائق کے عقل و علم کا منتہی ہے اور جس کے آگے آپ ﷺ کے علاوہ اور کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے یا حضرت جبرئیل علیہ السلام کے اس کہنے کا مقصد یہ عذر بیان کرنا تھا کہ اب وہ مقام آگیا ہے جس کے آگے مجھے بھی جانے کی اجازت اور تاب نہیں ہے، اس لئے میں یہاں سے آگے آپ ﷺ کی رفاقت و مصاحبت میں نہیں رہ سکوں گا۔

"یہ باطن کی دو نہریں جنت کی ہیں" کے بارے میں طیبیؒ نے لکھا ہے کہ جنت کی ان دونوں نہروں میں سے ایک نہر تو سلسبیل تھی اور دوسری نہر کوثر تھی۔ نیز ان دونوں نہروں کو باطن (پوشیدہ) اس اعتبار سے کہا گیا ہے، کہ وہ جنت میں بہتی ہیں، وہاں سے باہر نہیں نکلتیں۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے: جنت کی ان دونوں نہروں کو "باطن" اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ عقل ان کے اوصاف و خصوصیات کی حقیقت و کہنہ کا ادراک نہیں کر سکتی۔

"اور یہ ظاہر کی دو نہریں نیل و فرات ہیں" کے بارے میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نہروں سے مراد مصر کا دریائے نیل اور عراق کا دریائے فرات ہے، جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ یہ دونوں اصل میں سدرۃ المنتھی کی جڑ سے نکل کر زمین تک آئے ہیں اور سوئے زمین کے ان علاقوں میں بہتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے یہ کہا کہ ان دونوں نہروں کو نیل اور فرات سے تعبیر کرنا یا تو تشبیہ اور استعارہ کے طور پر ہے کہ دریائے نیل اور دریائے فرات کا پانی شیرینی و لطافت اور فوائد و منافع کے اعتبار سے جنت کے پانی کے مشابہ ہے اور یا یہ محض اسمی اشتراک ہے کہ جیسے زمین کے دو دریاؤں کے نام نیل و فرات ہیں ایسے ہی جنت کی دو نہروں کے نام بھی نیل اور فرات ہیں۔

"پھر مجھ کو بیت المعمور دکھلایا گیا۔" بیت المعمور بھی "اللہ" کا گھر" ہے جو قبلۂ ملائک ہے اور ساتویں آسمان پر واقع ہے۔ اس کا محل وقوع ٹھیک خانۂ کعبہ کے محاذات میں ہے، بالفرض اگر وہ گرے تو عین کعبہ پر آکر گرے۔ اس کا ذکر آگے کی حدیث میں آرہا ہے۔

"دودھ فطرت ہے الخ" فطرت سے مراد دین اسلام ہے جس کو حق تعالیٰ نے ہر انسان کی پیدائش و خلقت کی بنیاد بنایا ہے۔ دودھ اور فطرت یعنی دین اسلام میں مماثلت و مناسبت یہ ہے کہ جس طرح دین اسلام انسان کی روحانی اور اعتقادی تخلیق کی خشت اول ہے

اسی طرح دودھ انسان کی جسمانی پرورش اور اٹھان کا بنیادی عنصر ہے، یہ دودھ ہی ہوتا ہے جس سے آدمی کی پیدائش ہوتے ہی پرورش شروع ہو جاتی ہے، اور پھر دودھ میں جو فطری خوبیاں، لطافت و پاکیزگی، شیرینی و منفعت اور خوشگواری ہے، اس سے دین فطرت یعنی اسلام کو بہت مناسبت حاصل ہے، اسی لئے عالم بالا میں دین اور علم کی مثال دودھ کو قرار دیا گیا ہے، اور علماء کہتے ہیں اگر کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ وہ دودھ پی رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس شخص کو دین اور علم سے، بہت زیادہ حصہ اور بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔

"تم اور تمہاری اُمت کے لوگ اسی فطرت پر رہیں گے۔" یہ حضرت جبرئیل کی طرف سے بشارت تھی کہ آپ ﷺ نے چونکہ دودھ کے پیالہ کو اختیار فرمایا اس لئے ثابت ہو گیا کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی اُمت کے لوگ دین اور علم کی راہ پر گامزن رہیں گے دودھ کے مقابلہ پر شراب ہے، جو ہر برائی کی جڑ بتائی گئی ہے اور آپ ﷺ نے اس کو ترک کر کے گویا اپنی اُمت کے لوگوں کو بالعموم برائی کے راستہ پر جانے سے روک دیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں یہ منقول ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ بھی کہا تھا: اگر آپ شراب کا پیالہ لے لیتے تو پھر آپ ﷺ کی اُمت میں فتنہ و فساد یعنی تمام خرابیوں کی جڑ پڑ جاتی واضح رہے کہ (معراج کا واقعہ) جس زمانہ کا ہے اس وقت شراب پینا مباح تھا، خصوصاً شراب جنّت (جو آپ ﷺ کو اس موقع پر پیش کی گئی، کی حیثیت دوسری تھی لیکن اس کے باوجود عالم بالا میں جس چیز کو برائی اور خرابی کی مثال قرار دیا گیا وہ شراب ہی ہے۔ اب رہ گئی شہد کی بات، تو اگرچہ شہد بھی ایک لطیف اور پاکیزہ چیز ہے اور اس کو شفا کا ذریعہ بھی بتایا گیا ہے لیکن اس کی لطافت و پاکیزگی اور خوشگواری چونکہ دودھ سے بڑھ کر نہیں، بلکہ اس سے کم ہی ہے اور اس کی حیثیت بھی دودھ کی بہ نسبت غیر اہم ہے، اس لئے آپ ﷺ نے دودھ کے مقابلہ پر شہد کو بھی ترجیح نہیں دی۔ ویسے آگے جو حدیث آرہی ہے اس میں شہد کا ذکر بھی نہیں ہے، صرف دودھ اور شراب کے پیالوں کا ذکر ہے۔ نیز اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ چیزوں کے پیالے آپ ﷺ کے سامنے اس وقت پیش کئے گئے جب آپ ﷺ سدرۃ المنتہی کے پاس تھے جب کہ آگے آنے والی حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ پیالے آپ ﷺ کے سامنے بیت المقدس میں پیش کئے گئے، لہٰذا علماء نے لکھا ہے کہ یہ پیالے آپ ﷺ کے سامنے دو مرتبہ پیش کئے گئے تھے، ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ میں نماز سے فارغ ہونے کے بعد، اس وقت صرف دو پیالے پیش کئے گئے یعنی ایک دودھ کا اور ایک شراب کا، جیسا کہ اگلی حدیث میں ذکر ہے اور دوسری مرتبہ آسمان پر (سدرۃ المنتہی کے پاس) تین پیالے پیش کئے گئے جن میں سے ایک دودھ کا تھا، ایک میں شہد تھا اور ایک میں شراب تھی۔

"تم پھر پروردگار کے پاس جاؤ اور اپنی اُمت کے لئے (پانچ نمازوں میں بھی) تخفیف کی درخواست کرو۔" کے تحت خطابیؒ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آنحضرت ﷺ کو بار بار اللہ تعالیٰ کے پاس بھیجنا اور ان کے مشورہ پر آنحضرت ﷺ کا اللہ تعالیٰ سے نمازوں کی تعداد میں تخفیف کی درخواست کرنا اس بات کی علامت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمازوں کی فرضیت کا جو ابتدائی حکم صادر ہوا ہے وہ وجوب قطعی کے طور پر نہیں ہے، اس میں تبدیلی کی گنجائش ہے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات معلوم نہ ہوتی تو وہ بار بار تخفیف کی درخواست کا مشورہ نہ دیتے، نیز آنحضرت ﷺ کی طرف سے بار بار درخواست پیش کرنا اور ہر مرتبہ اس درخواست کا منظور ہونا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پہلا حکم قطعا وجوب کے طور پر نہیں تھا کیونکہ جو حکم وجوب قطعی کے طور پر جاری ہوتا ہے اس میں تخفیف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ملا علی قاریؒ نے خطابیؒ کے اس قول کو طیبیؒ کے حوالہ سے نقل کرنے کے بعد اپنی طرف سے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے نزدیک خطابی کی بات وزن دار نہیں ہے، ان کا کہنا ہے کہ تخفیف کی درخواست کرنا اصل میں علامت ہی اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم وجوب کے طور پر تھا۔ کیونکہ جو چیز واجب نہ ہو اس میں تخفیف کی درخواست کی ضرورت پیش نہیں آتی، لہٰذا اس سلسلہ میں صحیح بات وہی ہے جو بعض حضرات نے نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے پچاس نمازیں ہی فرض کی تھیں پھر اپنے بندوں کے حال پر رحم کرتے ہوئے تخفیف کی درخواست قبول فرمائی اور پچاس نمازوں کے حکم کو منسوخ کر کے پانچ نمازوں کا حکم جاری و نافذ فرمایا جیسا کہ اور بعض احکام میں بھی تبدیلی و منسوخی کا عمل ہوا ہے۔

اسراء اور معراج کا ذکر

(۲) وَعَنْ ثَابِتِ نِ الْبُنَانِيِّ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُتِيْتُ بِالْبُرَاقِ وَهُوَ دَابَّةٌ اَبْيَضُ طَوِيْلٌ فَوْقَ الْحِمَارِ دُوْنَ الْبَغْلِ يَقَعُ حَافِرُهٗ عِنْدَ مُنْتَهٰى طَرْفِهٖ فَرَكِبْتُهٗ حَتّٰى اَتَيْتُ بَيْتَ الْمُقَدَّسِ فَرَبَطْتُهٗ بِالْحَلْقَةِ الَّتِيْ تَرْبِطُ بِهَا الْاَنْبِيَآءُ قَالَ ثُمَّ دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ فَصَلَّيْتُ فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ خَرَجْتُ فَجَآءَنِيْ جِبْرَئِيْلُ بِاِنَاءٍ مِّنْ خَمْرٍ وَّاِنَآءٍ مِّنْ لَبَنٍ فَاخْتَرْتُ اللَّبَنَ فَقَالَ جِبْرَئِيْلُ اِخْتَرْتَ الْفِطْرَةَ ثُمَّ عُرِجَ بِنَا اِلَى السَّمَآءِ وَسَاقَ مِثْلَ مَعْنَاهُ قَالَ فَاِذَا اَنَا بِاٰدَمَ فَرَحَّبَ بِيْ وَدَعَالِيْ بِخَيْرٍ وَقَالَ فِي السَّمَآءِ الثَّالِثَةِ فَاِذَا اَنَا بِيُوْسُفَ اِذَا هُوَ قَدْ اُعْطِيَ شَطْرَ الْحُسْنِ فَرَحَّبَ بِيْ وَدَعَالِيْ بِخَيْرٍ وَلَمْ يَذْكُرْ بُكَآءَ مُوْسٰى وَقَالَ فِي السَّمَآءِ السَّابِعَةِ فَاِذَا اَنَا بِاِبْرَاهِيْمَ مُسْنِدًا ظَهْرَهٗ اِلَى الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ وَاِذَا هُوَ يَدْخُلُهٗ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ لَا يَعُوْدُوْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ ذَهَبَ بِيْ اِلَى السِّدْرَةِ الْمُنْتَهٰى فَاِذَا وَرَقُهَا كَاٰذَانِ الْفِيَلَةِ وَاِذَا ثَمَرُهَا كَالْقِلَالِ فَلَمَّا غَشِيَهَا مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ مَا غَشِيَ تَغَيَّرَتْ فَمَا اَحَدٌ مِّنْ خَلْقِ اللّٰهِ يَسْتَطِيْعُ اَنْ يَّنْعَتَهَا مِنْ حُسْنِهَا وَاَوْحٰى اِلَيَّ مَا اَوْحٰى فَفَرَضَ عَلَيَّ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ فَنَزَلْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مَا فَرَضَ رَبُّكَ عَلٰى اُمَّتِكَ قُلْتُ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَاِنِّيْ بَلَوْتُ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَخَبَرْتُهُمْ قَالَ فَرَجَعْتُ اِلٰى رَبِّيْ فَقُلْتُ يَا رَبِّ خَفِّفْ عَلٰى اُمَّتِيْ فَحَطَّ عَنِّيْ خَمْسًا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقُلْتُ حَطَّ عَنِّيْ خَمْسًا قَالَ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ قَالَ فَلَمْ اَزَلْ اَرْجِعُ بَيْنَ رَبِّيْ وَبَيْنَ مُوْسٰى حَتّٰى قَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّهُنَّ خَمْسُ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ لِكُلِّ صَلٰوةٍ عَشْرٌ فَذٰلِكَ خَمْسُوْنَ صَلٰوةً مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كُتِبَتْ لَهٗ حَسَنَةً فَاِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ لَهٗ عَشْرًا وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا لَمْ تُكْتَبْ لَهٗ شَيْئًا فَاِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ لَهٗ سَيِّئَةً وَّاحِدَةً قَالَ فَنَزَلْتُ حَتّٰى انْتَهَيْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ قَدْ رَجَعْتُ اِلٰى رَبِّيْ حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ مِنْهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ثابت بنانیؒ (تابعی) حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: میرے سامنے براق لایا گیا جو ایک سفید رنگ کا، درازبنی، میانہ قد، چوپایہ تھا، گدھے سے اونچا اور خچر سے نیچا تھا، جہاں تک اس کی نگاہ جاتی تھی وہاں اس کا ایک قدم پڑتا تھا، میں اس پر سوار ہوا اور بیت المقدس میں آیا، اور میں نے اس براق کو (مسجد کے دروازہ پر) اس حلقہ سے باندھ دیا جس میں انبیاء (اپنے براقوں کو یا اس براق کو) باندھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعت نماز پڑھی، پھر میں مسجد سے باہر آیا اور جبرئیل علیہ السلام میرے سامنے ایک پیالہ شراب کا اور ایک پیالہ دودھ کا لائے، میں نے دودھ کا پیالہ لے لیا تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا: آپ ﷺ نے فطرت (یعنی دین اسلام) کو اختیار کرلیا اور پھر ہمیں آسمان کی طرف چڑھایا۔" اس کے بعد حضرت انسؓ نے حدیث کا وہی مضمون بیان کرتے ہوئے جو سابق حدیث میں گذرا کہا کہ (آنحضرت ﷺ نے فرمایا:) میں نے (پہلے آسمان پر) حضرت آدم علیہ السلام (ان الفاظ میں) مرحبا کہا (کہ میں نیک بخت بیٹے اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں) اور میرے لئے دعائے خیر کی۔ پھر آپ ﷺ نے تیسرے آسمان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہاں میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا جن کو آدھا حسن عطا کیا گیا تھا، انہوں نے بھی مجھ کو مرحبا کہا اور میرے لئے دعائے خیر کی۔ راوی یعنی ثابت بنانیؒ نے (حضرت انسؓ سے اس روایت میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رونے کا ذکر نہیں کیا (جیسا کہ حدیث سابق میں تھا) اور آنحضرت ﷺ نے ساتویں آسمانوں کو ذکر کرتے ہوئے (سابق حدیث کی بہ نسبت مزید) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وہاں میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا جو بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے، اور بیت المعمور میں ہر روز ستر ہزار فرشتے (طواف کے لئے) داخل ہوتے ہیں جن کو دوبارہ داخل ہونا نصیب نہیں ہوتا (یعنی ہر دن نئے ستر ہزار فرشتے طواف کے لئے آتے ہیں کیونکہ فرشتوں کی کثرت کی بناء پر کسی فرشتہ کو ایک مرتبہ کے بعد پھر دوبارہ بیت المعمور میں داخل

ہونے کا کبھی موقع نہیں ملتا) اس کے بعد مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لے جایا گیا (جو ساتویں آسمان پر بیری کا درخت ہے) میں نے دیکھا کہ اس (سدرۃ المنتھی) کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر اور اس کے پھل (یعنی بیر) مٹکوں کے برابر تھے، پھر جب سدرۃ المنتھی کو اللہ کے حکم سے ڈھانکنے والی چیز نے ڈھک دیا تو اس کی حالت بدل گئی (یعنی اس میں پہلے سے زیادہ اعلیٰ تبدیلی آگئی، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس کی خوبی اور وصف (کے کمال) کو بیان نہیں کر سکتا، پھر اللہ تعالیٰ نے جو وحی چاہی میری طرف بھیجی (یعنی مجھ سے بلا واسطہ کلام فرمایا) پھر مجھ پر دن رات میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں، پھر میں اس بلند مقام سے نیچے اترا اور (ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رخصت ہوتا ہوا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس "چھٹے آسمان پر" آیا، انہوں نے پوچھا: تمہارے پروردگار نے تمہاری اُمت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا رات دن میں پچاس نمازیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ اور (نمازوں کی تعداد میں) تخفیف کی درخواست کرو کیونکہ تمہاری اُمت اتنی طاقت نہیں رکھتی، میں بنی اسرائیل کو آزما کر اور ان کا امتحان لے کر پہلے دیکھ چکا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ پر) میں بارگاہ خداوندی میں پھر حاضر ہوا اور، کہا: میرے پروردگار! میری اُمت کے حق میں آسانی فرما دیجئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے میری اُمت کے حق میں (آسانی فرما کر) پانچ نمازیں کم کردیں۔ پھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ میری درخواست پر پانچ نمازیں کم کردی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا! تمہاری اُمت اتنی (نمازیں ادا کرنے کی بھی) طاقت نہیں رکھتی، تم پھر اپنے پروردگار کے پاس جاؤ اور مزید تخفیف کی درخواست کرو! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں اسی طرح اپنے پروردگار اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان آتا جاتا رہا (اور تخفیف کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا کہ میری درخواست پر ہر مرتبہ پانچ نمازیں کم کردی جاتیں) یہاں تک کہ (جب آخری مرتبہ بھی تخفیف ہوگئی اور رات دن میں صرف پانچ نمازیں رہ گئیں تو) پروردگار نے فرمایا محمد (ﷺ)! رات دن میں فرض تو یہ پانچ نمازیں ہیں لیکن ان میں سے ہر نماز کا ثواب دس نمازوں کے برابر ہے، اس طرح یہ پانچ نمازیں ثواب میں پچاس نمازوں کے برابر ہیں اور ہمارا اصول یہ ہے کہ) جس شخص نے نیکی کا قصد کیا اور اس کو (کسی شرعی عذر یا کسی دوسری رکاوٹ کے سبب) پورا نہ کر سکا تو اس کے حساب میں (صرف اس قصد ہی کی وجہ سے) ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر اس قصد کے بعد اس نے اس نیکی کو کرلیا تو اس کے حساب میں وہ نیکی دس گنا لکھی جاتی ہے۔ اور جس شخص نے برے کام کا قصد وارادہ کیا اور پھر اس برے کام کو نہ کر سکا تو اس کے حساب میں وہ برائی نہیں لکھی جائے گی اور اگر اس نے اپنے قصد کے مطابق اس برے کام کو کرلیا تو اس کے حساب میں وہی ایک برائی لکھی جائے گی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا! پھر بارگاہ خداوندی سے نیچے (چھٹے آسمان پر) واپس آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صورت حال بتائی، انہوں نے پھر وہی مشورہ دیا کہ اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ اور (پانچ نمازوں میں بھی) تخفیف کی درخواست کرو! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میں بار بار اپنے پروردگار کے پاس جا چکا ہوں اب مجھ کو اس کے پاس جاتے شرم آتی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا" کے تحت ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اسراء یعنی مسجد اقصیٰ تک کے سفر پر سب علماء کا اتفاق ہے اور کسی نے اس کی واقعیت سے اختلاف نہیں کیا ہے، البتہ مسجد اقصیٰ سے آسمان تک کے سفر یعنی واقعہ معراج میں بعض لوگوں جیسے معتزلہ نے اختلاف کیا ہے، اور ان کا یہ اختلاف بھی علمائے قدیم کے اس نظریہ کو ماننے کی وجہ سے ہے کہ آسمان میں خرق والتیام محال ہے۔

"اور دو رکعت نماز پڑھی" یہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں تھی جو آپ ﷺ نے مسجد اقصیٰ میں داخل ہونے کے بعد پڑھیں، اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ اس نماز کا ذکر ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے امامت فرمائی اور دوسرے انبیاء نے جن کو آنحضرت ﷺ کے اعزاز میں بیت المقدس میں جمع کیا گیا تھا، آپ ﷺ کی اقتداء کی تھی، پس راوی نے اس موقع پر آنحضرت ﷺ کی امامت کا ذکر یا تو اختصار کے پیش نظر نہیں کیا یا وہ اس جزء کو ذکر کرنا بھول گئے جیسا کہ سابق حدیث میں آنحضرت ﷺ کے مسجد اقصیٰ میں جانے کا بھی کوئی ذکر

نہیں ہے۔

"جبرئیل۔ میرے سامنے ایک پیالہ شراب کا اور ایک پیالہ دودھ کا لائے " ہوسکتا ہے کہ راوی نے یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف دو پیالوں کا ذکر کیا اور تیسرے پیالے یعنی شہد کے پیالہ کے ذکر کی ضرورت نہ سمجھی، اور جیسا کہ پیچھے بیان ہوا یہ بھی ممکن ہے کہ مسجد اقصیٰ میں تو آپ ﷺ کے سامنے دو پیالے یعنی ایک پیالہ شراب کا اور ایک پیالہ دودھ کا لائے گئے تھے، البتہ آسمان پر تین پیالے پیش کئے گئے جن میں ایک پیالہ شہد کا بھی تھا۔

"پھر ہمیں آسمان کی طرف چڑھایا " یہ ثُمَّ عُرِجَ بِنَا اِلَی السَّمَاءِ کا لفظی ترجمہ ہے، اس جملہ میں لفظ عرج عؔ اور رؔ کے زبر سے ہے جیسا کہ نوویؒ اور سیوطیؒ نے لکھا ہے، اس صورت میں عرج کا فاعل یا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کہا جائے گا یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے چونکہ آگے بنا کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اس لئے عرج کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوا، مطلب یہ کہ "پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اور جبرئیل علیہ السلام کو اوپر آسمان تک پہنچایا۔" اور یہ بھی ممکن ہے کہ بنا کا لفظ محض اظہار تعظیم کے لئے ہو، تو پھر عرج کا فاعل حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی ٹھہریں گے۔ نیز ایک نسخہ میں عرج کا لفظ بصیغہ مجہول نقل ہوا ہے، اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا! "پھر ہمیں اوپر آسمان تک لے جایا گیا۔"

"حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا جن کو آدھا حسن عطا کیا گیا تھا۔" آدھے حسن سے کیا مراد ہے، اس سلسلہ میں زیادہ صحیح اور تحقیقی قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گویا یہ ظاہر فرمایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں جتنا حسن و جمال تمام لوگوں میں تھا اس کا آدھا حصہ تنہا حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا تھا، اور بعض حضرات نے اس جملہ سے آنحضرت کی یہ مراد بیان کی ہے کہ "حضرت یوسف علیہ السلام کو میرے حسن کا آدھا حصہ عطا کیا گیا تھا۔" یعنی آنحضرت ﷺ کو جو حسن و جمال عطا کیا گیا تھا اس کا آدھا حصہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا تھا۔ اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام حسن و جمال میں ہمارے حضرت ﷺ سے بڑھ کر نہیں تھے بلکہ متعدد صاحب تحقیق اور قابل اعتماد علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ، حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ حسن و جمال کے مالک تھے اور اس کی ایک دلیل یہ بیان کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ کہیں نہیں آیا ہے کہ ان (حضرت یوسف علیہ السلام) کی صورت کے جمال کا عکس مثل آئینہ کے دیوار پر پڑتا ہو اور سامنے کی چیزیں اس میں نظر آتی ہوں جب کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ نقل ہوا ہے کہ آپ ﷺ کے روئے انور کا جمال اسی درجہ کا تھا، یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اس روشن جمال کے بہت کچھ حصہ کو آپ ﷺ کے صحابہؓ پر پوشیدہ رکھا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا اور آپ ﷺ کے رخ روشن کا جمال اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ ریز رہا کرتا تو نہ کسی کو تاب نظارہ ہوتی، اور نہ کسی کو روئے انور کے دیدار کی سعادت حاصل ہوسکتی تھی، جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا جو کچھ حسن و جمال تھا سب کی نظروں کے سامنے تھا، اس میں کوئی حصہ پوشیدہ نہیں رکھا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے دوسری بات لکھی ہے، ان کا کہنا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں اور ان کے حسن و جمال کی تعریف میں جو باتیں منقول اور ثابت ہیں۔ ان میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ذہن میں یہ بات ڈالتی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال بے مثال تھا، جیسا کہ اسی واقعہ معراج سے متعلق ایک روایت میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا! "اس شب میں ایک ایسے شخص (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام) کو بھی دیکھا اور ان سے ملنا ہوا جو قدرت کی سب سے حسین تخلیق تھا اور جو اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ حسن و جمال سے نوازا گیا تھا۔ جس طرح تمام ستاروں میں چاند سب سے زیادہ روشن دکھائی دیتا ہے۔" لیکن دوسری طرف وہ حدیث بھی ہے جو ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی نبی اور رسول مبعوث نہیں کیا جو خوبرو اور خوش آواز نہ ہو اور سب سے زیادہ خوبرو اور خوش آواز تمہارے پیغمبر ﷺ تھے۔ جہاں تک شب معراج سے متعلق اس حدیث کا تعلق ہے جس کو شیخ عبدالحق دہلویؒ نے پیش کیا ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود اپنی ذات کو

الگ کر کے یہ بات فرمائی تھی، یعنی آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ ذات رسالت مآب ﷺ کو چھوڑ کر باقی تمام مخلوق خدا میں سب سے زیادہ حسین و جمیل حضرت یوسف علیہ السلام تھے اور اس تاویل کی گنجائش یوں بھی موجود ہے کہ کلام کرنے والا عموم خطاب میں داخل نہیں ہوتا! حضرت شیخ ابن حجر مکیؒ نے شرح شمائل ترمذی میں لکھا ہے: آنحضرت ﷺ پر کامل ایمان میں سے ایک جزء یہ اعتقاد رکھنا بھی ہے کہ جتنا حسن و جمال آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس اور ظاہری شکل و صورت کو عطا ہوا اتنا حسن و جمال کسی بھی انسان کی ذات کو اور ظاہری شکل و صورت کو نہیں دیا گیا، جیسا کہ جتنا فضل و کمال آنحضرت ﷺ کے باطن میں رکھا گیا اتنا فضل و کمال کسی اور انسان کے باطن کو نصیب نہیں ہوا، اور چونکہ کسی بھی انسان کا ظاہر، اس کے باطن کا غماز اور مظہر ہوا کرتا ہے اس لئے جس طرح آپ ﷺ کا باطن بے مثال اسی طرح آپ ﷺ کا ظاہر بھی بے مثال! نیز آنحضرت ﷺ کے ظاہری و باطنی حسن و جمال کی مدح و تعریف میں بس یہی بات اصول کا درجہ رکھتی ہے کہ مرتبہ الوہیت کے علاوہ فضل و کمال کے اور جتنے بھی مرتبے اور درجے ہو سکتے ہیں وہ سب آنحضرت ﷺ کے لئے ثابت ہیں، اور آپ ﷺ سے بڑھ کر ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کے برابر بھی کوئی کامل انسان نہ آج تک پیدا ہوا اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہو سکتا ہے۔

ترا دریں سخن انکار کار ما نرسد	کسے بحسن و ملاحت بیار ما نرسد
یکے بسکہ صاحب عیار ما نرسد	ہزار نقد بازار کائنات آرند

اور اسی حقیقت کو دوسرے انداز میں ایک اور شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

من وجھک المنیر لقد نور القمر	یا صاحب الجمال ویا سید البشر
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر	لایمکن الثناء کما کان حقہ

"سدرۃ المنتہی کو اللہ کے حکم سے ڈھانکنے والی چیز نے ڈھک دیا" اس بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ کس چیز نے سدرۃ المنتہی کو ڈھک دیا تھا؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ جو بے شمار فرشتے سدرۃ المنتہی کو گھیرے ہوئے تھے ان کے پروں کی روشنی اور چمک نے گویا پورے درخت پر نور و جمال کی چادریں ڈال دی تھیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اللہ کے جلال و عظمت کا نور سونے کے پروانوں کی طرح اس پر گر رہا تھا جس کے نیچے پورا درخت چھپ سا گیا تھا۔ بعض حضرات نے یوں کہا ہے: سونے کے پتنگے و پروانے اور دوسری رنگ برنگ کی عجیب و غریب چیزوں نے جن کی حقیقت و کیفیت کوئی نہیں جانتا سدرۃ المنتہی کو ڈھک دیا۔

"پھر اللہ تعالیٰ نے جو وحی چاہی میری طرف بھیجی" یہ وہ موقع تھا جب آنحضرت ﷺ بارگاہ بے نیاز کے حریم قرب میں پہنچے اور نور السموات والارض کے جمال بے مثال کو حجاب کبریائی سے دیکھا اور بلا واسطہ کلام خداوندی اور براہ راست وحی ایزدی سے مشرف و سرفراز ہوئے۔ وہ کلام کیا تھا اور وہ وحی کن الفاظ میں تھی؟ یہ ایک رمز ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ادب و احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو مبہم و مجمل ہی رکھا جائے اور اس کی وضاحت و تشریح کی کوشش نہ کی جائے۔

"چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے میری اُمت کے حق میں پانچ نمازیں کم کر دیں۔" اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پچاس نمازوں میں جو تخفیف ہوئی وہ ہر مرتبہ پانچ پانچ کم ہونے میں ہوئی جب کہ سابق حدیث میں ہر مرتبہ دس دس اور آخر میں پانچ نمازیں کم ہونے کی صوت ذکر کی گئی ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہاں اصل عبارت اس طرح ہو کہ "........ میری اُمت کے حق میں پانچ اور پھر پانچ نمازیں کم کر دیں۔" گویا ہر دفعہ پانچ پانچ کر کے دس نمازیں کم کی گئی ہوں گی اور اس طرح اس حدیث کی سابق حدیث سے مطابقت ہو جائے گی۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر مرتبہ پانچ پانچ نمازوں ہی کی تخفیف ہوتی رہی، اور سابق حدیث میں طوالت سے بچنے کے لئے ہر مرتبہ پانچ پانچ کا ذکر کرنے کے بجائے دس دس کا ذکر کر کے کلام کو مختصر کر دیا گیا اس کی تائید اسی حدیث کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ:

"(آنحضرت ﷺ نے فرمایا) پھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ میری درخواست پر پانچ نمازیں کم کردی گئی ہیں۔"

"تو اس کے حساب میں وہ نیکی دس گنی لکھی جاتی ہے۔" یعنی نیکی تو وہ ایک ہی کرے گا مگر اس کے نامۂ اعمال میں ثواب دس نیکیوں کا لکھا جائے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کی بشارت یوں دی ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔

"جو کوئی ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو ایسی دس نیکیاں ملیں گی"

اور غیر حرم میں تضاعف کا یہ سب سے ادنیٰ درجہ ہے یعنی حرم شریف کے علاوہ دوسری جگہوں پر کئے جانے والے کسی ایک نیک عمل پر جو کئی کئی گنا زیادہ ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے اس میں "دس گنا" سب سے ادنیٰ درجہ ہے، چنانچہ دوسری حدیثوں سے ثابت ہے بعض صورتوں میں ایک عمل پر دس گنا سے بھی زائد یہاں تک کہ سات سو گناہ تک ثواب ملتا ہے، بلکہ صدق واخلاص کی حیثیت وکیفیت کے بقدر سات سو گنا سے بھی زیادہ ثواب مل سکتا ہے۔

"اور پھر اس برے کام کو نہ کر سکا تو اس کے حساب میں وہ برائی نہیں لکھی جائے گی۔" یعنی اگر کسی شخص نے کوئی برا کام کرنے کا ارادہ کیا اور پھر کسی وجہ کے بغیر یا کسی ایسے سبب سے کہ جو مباح میں سے ہو، اس نے وہ برا کام نہیں کیا تو اس کے نامۂ اعمال میں کوئی برائی نہیں لکھی جائے گی بشرطیکہ وہ ارادہ محض سطحی طور پر پیدا ہوا ہو، دل میں مضبوطی اور پختگی کے ساتھ نہ رہا ہو۔ اور اگر اس نے برے کام کا ایسا ارادہ کیا تھا جو دل میں مضبوطی و پختگی کے ساتھ تھا اور پھر اس نے وہ برا کام نہیں کیا تو دیکھا جائے گا کہ اس نے پختہ ارادہ کے باوجود وہ برا کام کس سبب سے نہیں کیا؟ اگر یہ سبب۔ کہ اس ارادہ کے بعد اس کے دل پر خدا کا خوف غالب آگیا اور اس نے محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس برے کام سے اجتناب کیا تو اس صورت میں اس کے نامۂ اعمال میں ایک برائی لکھ دی جائے گی۔

"تو اس کے حساب میں صرف وہی ایک برائی لکھی جائے گی۔" کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ایک نیکی کرنے پر نامۂ اعمال میں وہ نیکی دس گنی لکھی جاتی ہے اس طرح ایک برائی کرنے پر نامۂ اعمال میں وہ برائی دس گنی نہیں لکھی جاتی۔ بلکہ ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے کیونکہ کمیت کے اعتبار سے برائی مضاعف نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔

"اور جو کوئی ایک برائی لے کر آئے اسے ویسی ہی سزا ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

نیز "اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا" سے واضح ہوا کہ برائی کا مضاعف نہ ہونا عدل خداوندی کا اظہار ہے جب کہ نیکی کا مضاعف ہونا فضل خداوندی ہے۔

معراج کا ذکر

(۳) وَعَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَبُوْذَرٍّ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فُرِجَ عَنِّيْ سَقْفُ بَيْتِيْ وَاَنَا بِمَكَّةَ فَنَزَلَ جِبْرَئِيْلُ فَفَرَجَ صَدْرِيْ ثُمَّ غَسَلَهٗ بِمَآءِ زَمْزَمَ ثُمَّ جَآءَ بِطَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مُمْتَلِئٍ حِكْمَةً وَاِيْمَانًا فَاَفْرَغَهٗ فِيْ صَدْرِيْ ثُمَّ اَطْبَقَهٗ ثُمَّ اَخَذَ بِيَدِيْ فَعُرِجَ بِيْ اِلَى السَّمَاءِ فَلَمَّا جِئْتُ اِلَى السَّمَآءِ الدُّنْيَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ لِخَازِنِ السَّمَآءِ افْتَحْ قَالَ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هَلْ مَعَكَ اَحَدٌ قَالَ نَعَمْ مَعِيَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ فَلَمَّا فَتَحَ عَلَوْنَا السَّمَآءَ الدُّنْيَا اِذَا رَجُلٌ قَاعِدٌ عَلٰى يَمِيْنِهٖ اَسْوِدَةٌ وَعَلٰى يَسَارِهٖ اَسْوِدَةٌ اِذَا نَظَرَ قِبَلَ يَمِيْنِهٖ

ضَحِكَ وَاِذَا نَظَرَ قِبَلَ شِمَالِهِ بَكٰى فَقَالَ مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ (وَالْاِبْنِ الصَّالِحِ) قُلْتُ لِجِبْرَئِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا اٰدَمُ وَهٰذِهِ الْاَسْوِدَةُ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ نَسَمُ بَنِيْهِ فَاَهْلُ الْيَمِيْنِ مِنْهُمْ اَهْلُ الْجَنَّةِ وَالْاَسْوِدَةُ الَّتِيْ عَنْ شِمَالِهٖ اَهْلُ النَّارِ فَاِذَا نَظَرَ عَنْ يَمِيْنِهٖ ضَحِكَ وَاِذَا نَظَرَ قِبَلَ شِمَالِهٖ بَكٰى حَتّٰى عُرِجَ بِيْ اِلَى السَّمَآءِ الثَّانِيَةِ فَقَالَ لِخَازِنِهَا افْتَحْ فَقَالَ لَهٗ خَازِنُهَا مِثْلَ مَاقَالَ الْاَوَّلُ قَالَ اَنَسٌ فَذَكَرَ اَنَّهٗ وَجَدَ فِي السَّمٰوٰتِ اٰدَمَ وَاِدْرِيْسَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى وَاِبْرَاهِيْمَ فِي السَّمَاءِ السَّادِسَةِ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَاَخْبَرَنِيْ ابْنُ حَزْمٍ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ وَاَبَا حَبَّةَ الْاَنْصَارِيَّ كَانَا يَقُوْلَانِ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ عُرِجَ بِيْ حَتّٰى ظَهَرْتُ لِمُسْتَوًى اَسْمَعُ فِيْهِ صَرِيْفَ الْاَقْلَامِ وَقَالَ ابْنُ حَزْمٍ وَاَنَسٌ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَفَرَضَ اللّٰهُ عَلٰى اُمَّتِيْ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً فَرَجَعْتُ بِذٰلِكَ حَتّٰى مَرَرْتُ عَلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مَافَرَضَ اللّٰهُ لَكَ عَلٰى اُمَّتِكَ قُلْتُ فَرَضَ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً قَالَ فَارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ فَرَاجَعْتُ فَوَضَعَ شَطْرَهَا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقُلْتُ وَضَعَ شَطْرَهَا فَقَالَ رَاجِعْ رَبَّكَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَرَجَعْتُ فَرَاجَعْتُ فَوَضَعَ شَطْرَهَا فَرَجَعْتُ اِلَيْهِ فَقَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَرَاجَعْتُهٗ فَقَالَ هِيَ خَمْسٌ وَهِيَ خَمْسُوْنَ لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ رَاجِعْ رَبَّكَ فَقُلْتُ اسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَبِّيْ ثُمَّ انْطَلَقَ بِيْ حَتّٰى انْتَهٰى بِيْ اِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى وَغَشِيَهَا اَلْوَانٌ لَا اَدْرِيْ مَاهِيَ ثُمَّ اُدْخِلْتُ الْجَنَّةَ فَاِذَا فِيْهَا جَنَابِذُ اللُّؤْلُؤِ وَاِذَا تُرَابُهَا الْمِسْكُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن شہاب زہریؒ (تابعی) حضرت انس ابن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: حضرت ابوذرؓ بیان کرتے تھے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "میں مکہ میں اپنے گھر میں (سویا ہوا) تھا کہ (اچانک) مکان کی چھت کھلی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے، انہوں نے میرا سینہ چاک کر کے آب زمزم سے دھویا پھر وہ سونے کا ایک طشت لائے جو ایمان و حکمت سے بھرا ہوا تھا، اس کو میرے سینہ میں الٹ دیا گیا اور پھر میرے سینہ (کی چاکی) کو ملا کر برابر کر دیا گیا۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آسمان کی طرف چڑھا کر لے گئے، جب میں آسمان۔ دنیا پر پہنچا تو جبرئیل علیہ السلام نے آسمان کے داروغہ سے کہا کہ (دروازہ) کھولو، داروغہ نے پوچھا: کیا تمہارے ساتھ اور کوئی بھی ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: ہاں، میرے ساتھ محمد (ﷺ) ہیں۔ داروغہ نے پوچھا: کیا ان کو بلوایا گیا ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: ہاں! چنانچہ دروازہ کھولا گیا اور جب ہم آسمان دنیا کے اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اور (ان کی اولاد و ذریات میں سے) کچھ لوگ ان کے دائیں اور کچھ لوگ ان کے بائیں بیٹھے ہوئے ہیں (پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ) جب وہ اپنی دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں (کیونکہ اس طرف جنتی لوگ تھے اور ان کو دیکھنا یقیناً خوشی و مسرت کا باعث تھا) اور جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو رونے لگتے ہیں (کیونکہ اس طرف دوزخی لوگ تھے جن کو دیکھنا رنج و غم کا باعث تھا) انہوں نے (سلام و جواب کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر) کہا: پیغمبر صالح اور نیک بخت بیٹے کو میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا! یہ آدم علیہ السلام ہیں اور یہ لوگ جو ان کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں ان کی اولاد کی روحیں ہیں، ان میں سے جو لوگ ان کے دائیں بیٹھے ہیں وہ جنتی ہیں اور جو لوگ ان کے بائیں بیٹھے ہیں وہ دوزخی ہیں، اسی لئے جب یہ (آدم علیہ السلام) اپنی دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر دوسرے آسمان پر چڑھے اور انہوں نے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو اس کے داروغہ نے بھی وہی سوال کیا جو پہلے آسمان کے داروغہ نے کیا تھا۔"

راوی کہتے ہیں! غرضیکہ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے تمام آسمانوں پر پہنچنے اور وہاں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ادریس، حضرت عیسٰی علیہ السلام، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر فرمایا، لیکن ان کے منازل و مقامات کی کیفیت و احوال کو بیان نہیں کیا، صرف حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے آسمان پر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چھٹے آسمان پر ملنے کا ذکر فرمایا۔ ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ مجھ کو ابن

حزمؒ نے بتایا کہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوحبہ انصاری نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا!" پھر مجھ کو اور اوپر لے جایا گیا، یہاں تک میں ایک ہموار اور بلند مقام پر پہنچا جہاں قلموں سے لکھنے کی آوازیں آرہی تھیں " ابن حزمؒ اور حضرت انسؓ نے یہ بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں، چنانچہ (پچاس فرض نمازوں کا یہ حکم اور اس پر عمل آوری کا ارادہ لے کر) میں واپس ہوا، لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا تو انہوں نے پوچھا کہ: پروردگار نے تمہارے ذریعہ تمہاری اُمت پر کیا چیز فرض کی ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ انہوں نے کہا: اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ (اور ان نمازوں میں تخفیف کی درخواست کرو) کیونکہ تمہاری اُمت اتنی نمازیں ادا نہیں کر سکے گی۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مجھ کو بارگاہ رب العزت میں واپس کیا (یعنی ان کے کہنے پر میں نے پروردگار کی بارگاہ میں واپس جاکر درخواست پیش کی) اور ان میں سے کچھ نمازیں (یعنی دس نمازیں) کم کردی گئیں۔ میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان (پچاس نمازوں) کا کچھ حصہ معاف کردیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اپنے پروردگار کے پاس پھر جاؤ (اور عرض معروض کرکے مزید تخفیف کی درخواست کرو) کیونکہ تمہاری اُمت اتنی نمازیں ادا کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھے گی۔ میں پھر واپس گیا (اور مزید تخفیف کے لئے عرض معروض کی) چنانچہ ان میں سے کچھ اور نمازیں کم کردی گئیں، اسکے بعد پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ پھر اپنے پروردگار کے پاس جاؤ (اور مزید تخفیف کی درخواست کرو) کیونکہ تمہاری اُمت اتنی نمازیں ادا کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھے گی، چنانچہ میں پھر گیا (اور پروردگار سے خوب عرض معروض کی) پس (پروردگار نے مزید تخفیف کردی، یہاں تک کہ جب دس نمازیں رہ گئیں اور آخری مرتبہ بارگاہ رب العزت میں لوٹ کر گیا اور میری درخواست پر ان میں بھی تخفیف کرکے پانچ نمازوں کا حکم دے دیا تو) پروردگار نے فرمایا: فرض تو یہ پانچ نمازیں ہیں لیکن (اجر وثواب کے اعتبار سے) پچاس نمازوں کے برابر ہیں، میرا قول تبدیل نہیں ہوتا۔ میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ اب پانچ نمازیں فرض رہ گئی ہیں) تو انہوں نے پھر مجھ کو بارگاہ رب العزت میں واپس جانے (اور ان پانچ نمازوں میں بھی تخفیف کی درخواست کرنے) کا مشورہ دیا، لیکن میں نے کہا کہ اب مجھ کو اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے۔ اس کے بعد (آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ) مجھ کو سدرۃ المنتھی تک لے جایا گیا جس پر (جلال کبریائی کے انوار یا ملائکہ کے پروں کی چمک یا کسی اور چیز کے) اس طرح کے رنگ چھائے ہوئے تھے جن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز تھی (یعنی یا تو اس وقت جو کچھ میں نے دیکھا اور محسوس کیا اس کو اب بیان کرنے پر قادر نہیں ہوں یا یہ کہ اس وقت میں ذات حق کی طرف اس طرح متوجہ اور مستغرق تھا کہ میری نظر کو سدرۃ المنتھی پر چھائے ہوئے رنگوں کی حقیقت تک پہنچنے اور جاننے کا موقع ہی نہیں ملا) اس کے بعد مجھ کو جنت میں پہنچایا گیا وہاں میں نے موتیوں کے گنبد دیکھے اور یہ بھی دیکھا کہ جنت کی مٹی مشک تھی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: لفظ "فُرِجَ" یہ تخفیف مجہول کا صیغہ ہے، اور بعض حضرات نے اس کو تشدید کے ساتھ یعنی فُرِّجَ بھی نقل کیا ہے، دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں، یعنی حضرت جبرئیل مکان کی چھت ہٹا کر اوپر سے آئے۔ اسراء اور معراج کے سفر کی ابتدا کہاں سے ہوئی اس سلسلہ میں بظاہر مختلف ومتضاد روایتیں منقول ہیں۔ بعض روایتوں میں حطیم، بعض میں حجر کا ذکر ہے جیسا کہ سابق حدیث سے معلوم ہوا، بعض روایتوں میں شعب ابی طالب کا ذکر ہے اور بعض روایتوں میں یہ ذکر ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کو لینے آئے تو اس وقت آپ ﷺ حضرت ام ہانیؓ کے مکان میں بستر استراحت پر آرام فرما تھے اور یہی روایت زیادہ مشہور ہے۔ ان تمام روایتوں میں بہترین تطبیق وہ ہے جو صاحب فتح الباری نے لکھی ہے یعنی اس شب میں کہ اسراء اور معراج کا واقعہ پیش آیا نبی کریم ﷺ حضرت اُم ہانیؓ کے مکان میں سوئے ہوئے تھے جو شعب ابی طالب میں واقع تھا چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام مکان کی چھت پھاڑ کر آنحضرت ﷺ کے پاس تشریف لائے اور آپ ﷺ کو جگا کر مسجد حرام میں خانہ کعبہ کے پاس لائے جہاں حطیم اور حجر ہے۔ آپ ﷺ حطیم میں لیٹ گئے اور چونکہ نیند کا اثر باقی تھا اس لئے آپ ﷺ وہاں پھر سوگئے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پھر آپ ﷺ کو جگایا اور

شق صدر وغیرہ کے مراحل سے گذارنے کے بعد آپ ﷺ کو مسجد حرام کے دروازہ پر لائے جہاں آپ ﷺ کو براق پر سوار کر کے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا۔ پس اسراء اور معراج کے سفر کی ابتداء دراصل حضرت اُم ہانیؓ کے گھر سے ہوئی جس کو آپ ﷺ نے "اپنا گھر" اس اعتبار سے فرمایا کہ آپ ﷺ اس شب میں اسی گھر میں مقیم تھے۔

"اور پھر میرے سینہ کو ملا کر برابر کر دیا گیا" اس شق صدر کے سلسلہ میں وضاحت پیچھے پہلی فصل کی پہلی حدیث کے تحت گزر چکی ہے، وہاں حدیث کے جو الفاظ تھے ان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے قلب مبارک کو سونے کے طشت میں دھویا گیا اور اس کے بعد علم و ایمان سے بھرا گیا، لیکن یہاں حدیث کے جو الفاظ ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے سینۂ مبارک کو زمزم کے پانی سے دھویا گیا اور پھر ایمان و حکمت سے بھرا ہوا سونے کا طشت لایا گیا اور اس کو سینۂ مبارک میں الٹ دیا گیا۔ تاہم ان دونوں میں کوئی گہرا تضاد نہیں ہے، صورت واقعہ کی ترتیب یہ تھی کہ آپ ﷺ کے سینہ مبارک کو چاک کیا گیا پھر قلب مبارک نکال کر اس کو زمزم کے پانی سے دھویا گیا اور پھر ایمان و حکمت سے بھرا ہوا طشت لایا گیا اور اس ایمان و حکمت کو آپ ﷺ کے قلب مبارک میں بھر دیا گیا۔

"اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آسمان کی طرف چڑھا کر لے گئے۔" یہاں نہ تو براق لائے جانے اور اس پر آنحضرت ﷺ کو سوار کرنے کا ذکر ہے اور نہ مسجد اقصیٰ میں لے جانے کا ذکر ہے۔ اسی بناء پر بعض حضرات نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اسراء اور معراج دو الگ الگ واقعے ہیں اور دونوں واقعے الگ الگ شب میں پیش آئے، نیز براق کی سواری اسراء کی شب میں تھی جب کہ معراج کی شب میں سیڑھی کے ذریعہ آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔

"اور یہ لوگ جو ان کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں ان کی اولاد کی روحیں ہیں" کے تحت شارحین نے لکھا ہے کہ چونکہ منقول ہے کہ مؤمنوں کی روحیں تو "علیین" میں چین کرتی ہیں اور کافروں کی روحیں "سجین" میں محبوس ہیں لہٰذا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ سب روحیں ایک مقام میں (یعنی آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام کے دائیں بائیں) کیسے جمع ہوئیں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ شاید ایک وقت معین میں یہ روحیں حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پیش ہوتی ہوں گی، اور آنحضرت ﷺ جب آسمان دنیا پر پہنچے اور حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کی تو وہ وہی وقت تھا جب تمام روحیں حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پیش تھیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں حضرت آدم علیہ السلام کے دائیں بائیں جو روحیں دیکھی تھیں وہ ان لوگوں کی تھیں جو اس وقت تک دنیا میں پیدا نہیں ہوئے تھے اور وہ روحیں اپنے اپنے اجسام میں نہیں گئی تھیں اور ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے رہنے کی جگہ حضرت آدم علیہ السلام کے دائیں بائیں ہو، نیز حضرت آدم علیہ السلام ان روحوں کا انجام جانتے تھے کہ جو روحیں دائیں طرف ہیں وہ دنیا میں اچھے عقائد و اعمال اختیار کر کے جنت میں جائیں گی اور جو روحیں بائیں طرف ہیں وہ دنیا میں برے عقائد و اعمال اختیار کر کے دوزخ میں جائیں گی۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چھٹے آسمان پر ملنے کا ذکر کیا " حضرت شہابؒ کی یہ روایت جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شب معراج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آنحضرت علیہ السلام کی ملاقات چھٹے آسمان پر ہوئی تھی، گویا اس روایت کے مطابق ہے جو حضرت انسؓ سے ایک دوسرے راوی حضرت شریکؒ نے نقل کی ہے، ان روایتوں کے علاوہ باقی اور تمام روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ساتویں آسمان پر ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ معراج کا واقعہ ایک سے زائد مرتبہ پیش آیا تھا تو اس صورت میں ان متضاد روایتوں سے کوئی اشکال پیدا نہ ہوگا، ہاں اشکال اس وقت پیدا ہوگا جب یہ کہا جائے کہ جسمانی معراج کا واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا تھا جیسا کہ معتمد و مشہور قول ہے، دریں صورت اس اشکال کا جواب یہ ہوگا کہ معراج کے سلسلہ میں سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ صحیح روایت وہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو وہ بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے، اور یہ بات کسی اختلاف کے بغیر ثابت ہے کہ بیت معمور ساتویں آسمان پر ہے۔ علاوہ ازیں یہاں

راوی نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تمام آسمانوں پر پہنچنے اور وہاں حضرت آدم علیہ السلام، اور ادریس علیہ السلام وغیرہ سے ملاقات کا ذکر فرمایا لیکن ان کے منازل و مقامات کو بیان نہیں فرمایا، اس سے یہ خود ثابت ہو جاتا ہے کہ راجح اور زیادہ قابل اعتماد روایت وہی قرار پائے گی جس میں ہر نبی اور رسول کے بارے میں وضاحت کے ساتھ ذکر ہے کہ کس نبی سے کس آسمان پر ملاقات ہوئی۔ حاصل یہ کہ آسمانوں کے تعین اور انبیاء سے ملاقات کے بارے میں حدیثوں میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ اختلاف راویوں کے اشتباہ کی وجہ سے ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھٹے آسمان پر بھی دیکھا ہو اور ساتویں آسمان پر بھی، اس لئے کسی روایت میں چھٹے آسمان پر ملاقات کو بیان کیا گیا، اور کسی روایت میں ساتویں آسمان پر ملاقات کا ذکر ہے۔

"........ جہاں قلموں کے لکھنے کی آوازیں آرہی تھیں" یہ مقام صریف الاقلام، کا ذکر ہے۔ "صریف الاقلام" قلم کی اس آواز کو کہتے ہیں جو لکھنے کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جب آنحضرت ﷺ کو اور عروج ہوا تو آپ ﷺ اس بلند مقام پر پہنچے جہاں قضاء و قدر کے قلم مشغول کتابت تھے، ملائکۃ اللہ امور الٰہی کی کتابت اور احکام خداوندی کو لوح محفوظ سے نقل کرنے میں مصروف تھے، کتابت اور قلم چلنے سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی اس کو آپ ﷺ نے سنا۔

بعض علمائے محققین نے حدیث کے اس جملہ کی وضاحت میں لکھا ہے! آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اس عروج کے دوران میں اس مقام تک لے جایا گیا جہاں رفعت مرتبہ کے سبب اس جگہ تک پہنچنا بھی نصیب ہوا جو کائنات کے نظام قدرت احکام خداوندی کے صدور اور مخلوق کے تمام خدائی نظم و نسق کا بلا تشبیہ و تمثیل مرکزی دفتر اور صدر مقام ہے اس طرح اس جگہ پہنچ کر گویا مجھ پر کائنات سے متعلق نظام قدرت کے رموز کا انکشاف ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ ﷺ سے پہلے کسی اور کو پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ رہی یہ بات کہ وہ قلم کیسے تھے اور ان کی شکل و صورت کیا تھی؟ تو اس کا علم اللہ اور اللہ کے رسول کے سوا کسی کو معلوم نہیں، اس بارہ میں تحقیق و جستجو بیکار ہے، ویسے قلم کی حقیقت کے بارے میں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ وہ اس چیز کا نام ہے جس سے نقوش و حرف پیدا ہوں اور اس کی حقیقت و حیثیت کچھ بھی ہوسکتی ہے، کسی دھات کا ہولڈر یا نب اور یا سرکنڈا، قلم کی حقیقت میں داخل نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے یہاں قلم کی وضاحت میں تاویل کا طریقہ اختیار کیا ہے، اور اس کے ظاہری معنی مراد نہیں لئے ہیں، لیکن یہ غیر مناسبات ہے، خالص اعتقادی نقطۂ نظر سے تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ "قلم" کو اس کے ظاہری معنی ہی پر محمول کیا جانا چاہئے اور وجود قلم کا عقیدہ رکھنا چاہئے اور یہ کہ اس قلم کی حقیقت و کیفیت کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

"میرا قول تبدیل نہیں ہوتا۔" ان الفاظ کے دو معنی ہوسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ میں نے اجر و ثواب کے اعتبار سے پانچ نمازوں کو پچاس نمازوں کے برابر کر دیا ہے۔ اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور دوسرے یہ کہ تمہارے بار بار کہنے پر میں نے پچاس نمازوں کی جگہ پانچ نمازیں کر دی ہیں، اور اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

"اب مجھ کو اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے" آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ "اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔" تو پھر اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا اور مزید تخفیف کی درخواست کرنا حیا کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں اس بات سے بھی آپ ﷺ کو شرم محسوس ہوئی کہ اب تک اتنی مرتبہ تخفیف کی درخواست لے کر جا چکا ہوں اور ہر مرتبہ رخصتی سلام کر کے واپس آجاتا ہوں اور پھر درخواست لے کر پہنچ جاتا ہوں، لہٰذا آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہہ دیا کہ اب میں تخفیف کی درخواست لے کر نہیں جاؤں گا۔

"وہاں میں نے موتیوں کے گنبد دیکھے" مسلم کی ایک اور روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ۔ "میں جنت کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک ایک نہر دیکھی جس کے دونوں کناروں پر (بڑے بڑے) مجوف موتیوں کے گنبد تھے۔

"اور یہ بھی دیکھا کہ جنت کی مٹی مشک تھی۔ یعنی جنت کی مٹی سے ایسی خوشبو پھوٹ رہی تھی جیسے مشک مہک رہا ہو یا یہ کہ جنت کی جو مٹی

ہے وہ دراصل مشک ہے اور اس کی خوشبو اتنی زیادہ ہے کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے جنّت کی خوشبو کی لپٹ پانچ سو سال کی مسافت کی دوری تک پہنچتی ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ لَمَّا اُسْرِىَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْتُهِىَ بِهٖ اِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى وَهِىَ فِى السَّمَآءِ السَّادِسَةِ اِلَيْهَا يَنْتَهِى مَايُعْرَجُ بِهٖ مِنَ الْاَرْضِ فَيُقْبَضُ مِنْهَا وَاِلَيْهَا يَنْتَهِىْ مَا يُهْبَطُ بِهٖ مِنْ فَوْقِهَا فَيُقْبَضُ مِنْهَا قَالَ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَايَغْشٰى قَالَ فَرَاشٌ مِنْ ذَهَبٍ قَالَ فَاُعْطِىَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثًا اُعْطِىَ الصَّلٰوَاتِ الْخَمْسَ وَاُعْطِىَ خَوَاتِيْمَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ وَغُفِرَ لِمَنْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ مِنْ اُمَّتِهٖ شَيْئًا نِ الْمُقْحِمَاتُ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کو رات میں (بیت المقدس اور آسمانوں کی) سیر کرائی گئی تو آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا اور سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان پر ہے، نیز جو بھی چیز زمین سے اوپر لے جائی جاتی ہے، وہ سدرۃ المنتہیٰ پر جا کر منتہی ہو جاتی ہے اور پھر کسی واسطہ و ذریعہ کے بغیر اوپر اٹھائی جاتی ہے، اسی طرح جو چیز ملاءِ اعلیٰ سے زمین پر اتاری جاتی ہے وہ بھی اسی سدرۃ المنتہیٰ سے لی جاتی ہے۔" اس کے بعد حضرت ابن مسعودؓ نے یہ آیت پڑھی اذیغشی السدرۃ مایغشی (یعنی: اس وقت کہ ڈھانک لیا سدرہ کو جس چیز نے ڈھانک لیا) اور کہا کہ "وہ چیز (جس نے سدرہ کو ڈھانکا ہے سونے کے پتنگے ہیں۔" حضرت ابن مسعودؓ نے یہ بھی کہا کہ: شب معراج میں رسول کریم ﷺ کو تین چیزیں عطا کی گئیں ① پانچ نمازوں کی فرضیت عطا ہوئی ② سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں عنایت ہوئیں ③ اور آنحضرت ﷺ کی اُمت میں سے اس شخص کے گناہ کبیرہ کی معافی کا پروانہ عطا ہوا جو کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائے۔" (مسلم)

تشریح: "سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان پر ہے" اس جملہ کے بارے میں بعض شارحین نے کہا ہے کہ یہ کسی راوی کا وہم ہے، یعنی اصل حدیث میں حضرت ابن مسعودؓ نے تو سدرۃ المنتہیٰ کے ساتویں آسمان پر ہونے کا ذکر کیا تھا لیکن ان کے بعد کسی راوی نے غلط فہمی سے یا بھول کر چھٹے آسمان کا ذکر کر دیا، چنانچہ تحقیقی بات یہی ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے، اور جمہور راویوں نے یہی نقل کیا ہے، قاضیؒ نے کہا: یہی بات زیادہ صحیح ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے اور جمہور راویوں نے یہی نقل کیا ہے۔ ایک اور بڑے محقق و محدث خلیلؒ نے کہا: سدرہ ساتویں آسمان پر ہے جو تمام آسمانوں اور جنّت پر چھایا ہوا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ (اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اس حدیث میں چھٹے آسمان کا ذکر کسی راوی کا وہم نہیں بلکہ روایت کے اصل الفاظ ہیں تو اس صورت میں) اس روایت اور ان روایتوں کے درمیان کہ جن میں سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ چونکہ چھٹے آسمان میں ہے اس لئے اس کا چھٹے آسمان پر ہونا ذکر کیا گیا ہے۔ اس (سدرہ) کا اصل ظہور اور شاخیں چونکہ ساتویں آسمان پر ہیں اس لئے زیادہ تر روایتوں میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے۔

"........وہ اسی سدرۃ المنتہیٰ پر جا کر منتہی ہو جاتی ہے الخ۔" اس پوری عبارت کا مطلب یہ ہے کہ زمین سے جو بھی چیزیں یعنی بندوں کے اعمال اور ان کی روحیں فرشتوں کے ذریعہ اوپر جاتی ہیں وہ سب اس سدرۃ المنتہیٰ پر جا کر ٹھہر جاتی ہیں، اس کے آگے چونکہ فرشتوں کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے اس لئے یہاں سے وہ چیزیں فرشتوں کے واسطہ و ذریعہ کے بغیر، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اوپر اٹھا لیتا ہے، اسی طرح جو چیزیں بارگاہ قدس سے زمین پر نازل ہوتی ہیں جیسے اوامر و احکام الٰہی وہ سب اوپر سے آ کر سدرۃ المنتہیٰ پر ٹھہر جاتی ہیں اور وہاں متعین فرشتے ان چیزوں کے لئے ہیں اور نیچے تک پہنچاتے ہیں۔ پس مخلوق کے علوم اور فرشتوں کے عروج کی آخری حد سدرۃ المنتہیٰ ہی ہے، اس کے آگے اور اوپر جانے کی اجازت مقرب ترین فرشتوں کو بھی نہیں ہے، یہ صرف ہمارے حضرت ﷺ کی ذات گرامی ہیں جن کو سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے جانے کا شرف حاصل ہوا، بلکہ آپ ﷺ تو اس "مقام" تک تشریف لے گئے جو مقام لکان سے ماوراء ہے۔

"اسوقت کہ ڈھانک لیا سدرہ کو جس چیز نے ڈھانک لیا" یہ آیت کریمہ اذیغشی السدرۃ الخ کا ترجمہ ہے جو حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ نے سدرۃ المنتھی کے ذکر کی مناسبت سے پڑھی، گویا حق تعالیٰ نے بھی اس چیز کو مبہم ہی رکھا جس نے سدرۃ المنتھی کو ڈھانک رکھا ہے، اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک ایسی چیز ہے جس کی حقیقت کنہ کوئی نہیں جان سکتا اور نہ کوئی یہ بتا سکتا کہ وہ چیز مقدار و تعداد میں کتنی ہے اور کیفیت و حیثیت کے اعتبار سے کیسی ہے۔ نیز مبہم انداز بیان کا مقصد اس چیز کی عظمت اور کثرت کو بیان کرنا ہے اور سابق حدیث میں آنحضرت ﷺ کے ان الفاظ لا ادری ماھیتہ (میں نہیں جانتا وہ کیا چیز تھی) سے بھی یہی مراد ہے، نہ کہ واقعۃ علم و ادراک کی نفی مراد ہے۔ ایک اور روایت میں اسی سدرۃ المنتھی کے متعلق یہ آیا ہے کہ اس کے ہر پتہ پر فرشتہ کھڑا ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول ہے اور ایک روایت میں یوں ہے کہ (اس کی شاخوں اور پتوں پر) سبز رنگ کے پرندوں کا جھنڈ ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ سبز رنگ کے پرندے دراصل انبیاء اور اولیاء کی روحیں ہیں۔

"وہ چیز سونے کے پتنگے ہیں۔" حضرت ابن مسعودؓ کا "اس چیز" کو سونے کے پتنگوں سے تعبیر کرنا اس کی حقیقت و ماہیت بیان کرنے کے لئے نہیں کہ وہ چیز واقعۃ سونے کے پتنگے ہیں، بلکہ یہ تو انہوں نے محض تشبیہ کے طور پر ذکر کیا ہے، مطلب یہ کہ جو بے شمار فرشتے سدرۃ المنتھی پر متعین و مقرر ہیں ان کے پیروں کی چمک ایسا منظر پیش کرتی ہے جیسے سونے کے پتنگے (پروانے) پورے سدرہ کو ڈھانکے ہوئے ہوں، نیز اس تعبیر میں "فراش" کا استعمال سدرہ پر نازل ہونے والے نور اقدس حق تعالیٰ کے تئیں ان فرشتوں کی شیفتگی و فریفتگی اور حیرانی و سرگردانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک روایت میں جراد من ذھب (سونے کی ٹڈی) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اور یہ بھی تمثیل و تشبیہ کے طور پر ہے کیونکہ جب ٹڈیاں کسی درخت پر ٹھہر جاتی ہیں تو اوپر سے پورا درخت ان کے نیچے چھپ کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح من ذھب کے الفاظ بھی چمک دمک سے کنایہ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ الفاظ کے ظاہری و حقیقی معنی ہی مراد ہوں، یعنی وہ پتنگے یا ٹڈیاں واقعۃ سونے کی ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔

"شب معراج میں رسول کریم ﷺ کو تین چیزیں عطا کی گئیں۔" حقیقت یہ ہے کہ اس شب میں علم و عمل، معرفت و حقائق، اسرار و فیوض اور انوار و برکات کی قسم سے جو عظیم خزانے آنحضرت ﷺ کو عطا ہوئے ان کی لامحدودیت حصرو شمار سے ماوراء ہے، یہ تین چیزیں تو حضرت ابن مسعودؓ نے وہ بیان کی ہیں جو امت کے تعلق سے مخصوص شرف و کرامت رکھتی ہیں اور ان کی خاص اہمیت کے اعتبار سے ان کا ذکر کیا جانا ضروری بھی تھا۔

سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں عنایت ہوئیں۔" میں امن الرسول سے آخری سورہ تک کی دونوں آیتیں مراد ہیں اور شب معراج میں ان آیتوں کے عطا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دعاؤں کو قبولیت کا پروانہ عطا فرمایا جو ان آیتوں میں مذکور ہیں۔ پس یہ روایت اس روایت کے منافی نہیں ہوگی، جو صحیح مسلم وغیرہ میں منقول ہے کہ "ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے اچانک اپنے اوپر (دروازہ کھلنے کی سی) ایک آواز سنی، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر کہا کہ یہ ایک فرشتہ ہے جو زمین پر آیا ہے اور آج سے پہلے کبھی یہ زمین پر نہیں آیا تھا، اس کے بعد اس نووارد فرشتہ نے (آنحضرت ﷺ کو) سلام کیا اور کہا: آپ (ﷺ) کو مبارک ہو (میں یہ خوشخبری لے کر آیا ہوں) کہ آپ ﷺ کو وہ دو نور عطا کئے گئے ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے کسی اور نبی کو عطا نہیں ہوئے، ایک تو فاتحۃ الکتاب یعنی سورۂ فاتحہ اور دوسرا سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں، آپ ان دونوں میں سے جو حرف بھی پڑھیں گے اس کے عوض (اجر و ثواب یا اس میں مذکورہ دعا کی قبولیت سے) نوازے جائیں گے" گویا شب معراج میں ان آیتوں کا دیا جانا ان عطایائے خداوندی میں کا ایک حصہ تھا جن سے اس اہم موقع پر اور اس رفیع الشان مقام یعنی بارگاہ کبریائی میں آپ ﷺ کو سرفراز فرمایا گیا اور جس کی ایک یادگار نماز پنجگانہ ہے، اور مسلمؒ وغیرہ کی اس روایت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ فرشتے کا آسمان سے اترنا، آپ ﷺ کو شب معراج میں عطا شدہ ان آیتوں کی اہمیت و فضیلت کو ظاہر کرنے اور یہ

بشارت دینے کے لئے تھا کہ آپ ﷺ کو جو یہ سب سے بڑی چیز عطا ہوئی ہے آپ ﷺ سے پہلے کسی بھی نبی کو عطا نہیں ہوئی۔ اس صورت میں ان دونوں روایتوں کے درمیان کسی تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہاں یہاں ایک یہ اشکال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ وہ سورت ہے جس کو "مدنی" کہا گیا ہے (یعنی یہ سورہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے) جب کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے پہلے مکہ کی سکونت کے زمانہ کا ہے، دوسرے لفظوں میں، سورۂ بقرہ کی آیتوں کے شب معراج میں عطا ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ آیتیں مدنی نہیں، بلکہ مکی ہیں؟ اس کا جواب محدثین و شارحین نے یہ دیا ہے کہ سورۂ بقرہ کو مدنی اس اعتبار سے نہیں کہا گیا ہے کہ اول سے آخر تک اس کی تمام آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، بلکہ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ ان دو آخری آیتوں کے علاوہ اور تمام آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ ابن ملکؒ نے حسنؒ، ابن سیرینؒ اور مجاہدؒ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی وحی حضرت جبرئیل کے واسطہ کے بغیر شب معراج میں براہ راست خود عطا فرمائی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان حضرات کے نزدیک پوری سورۂ بقرہ مکی ہے، تاہم جمہور مفسرین اور محدثین کا قول یہی ہے کہ یہ پوری سورۃ مدنی ہے، اور اس قول کی روشنی میں اس روایت کے اس مفہوم کو کہ سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں شب معراج میں عطا ہوئیں " کی یہی وضاحت کی جائے گی کہ عطا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بذات خود یہ آیتیں شب معراج میں آپ ﷺ کو عطا ہوئیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آیتوں کے الفاظ (غفرانک سے آخر تک میں جو دعا تلقین کی گئی ہے آنحضرت ﷺ اور ان آیتوں کے پڑھنے والوں کے حق میں اس دعا کی قبولیت کا پروانہ شب معراج میں عطا ہوا۔

"اور آنحضرت ﷺ کی اُمت میں سے اس شخص کے گناہ کبیرہ کی معافی کا پروانہ عطا ہوا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ شب معراج میں آنحضرت ﷺ سے اُمت کی مغفرت کا وعدہ کیا گیا یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا۔ بغیر عذاب کے بھی بخش دے گا خواہ وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو لیکن شرط یہ ہے کہ اس نے شرک کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔

"اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا (اور گناہ) جس کو چاہے بخش دے گا۔"

پس حدیث کے اس جملہ سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کھلی معافی دے دی گئی ہے اور کسی بھی ایسے مؤمن و موحد کو عتاب و عذاب کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جو گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے، کیونکہ ان مؤمنین و موحدین کا عذاب میں مبتلا کیا جانا جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں، نصوص شرعیہ اور اجماع اُمت سے ثابت ہے۔ رہا یہ سوال کہ اگر گناہ کبیرہ کے مرتکب کی مغفرت کا تعلق مشیت الٰہی سے ہے تو پھر حدیث میں اس کا ذکر کیوں نہ کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ۔ مغفرت کا انحصار مشیت الٰہی پر ہونا چونکہ ایک کھلی ہوئی بات تھی جس کا علم پہلے ہی سب کو ہے اس لئے مشیت الٰہی کے ذکر کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ اور ابن حجرؒ نے یہ لکھا ہے کہ "گناہ کبیرہ کی معافی" سے مراد یہ ہے کہ مؤمنین و موحدین میں سے کوئی بھی شخص دوزخ میں ہمیشہ نہیں رکھا جائے گا خواہ اس نے کتنے ہی گناہ کبیرہ کئے ہوں، جب کہ مشرکین ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے ابن حجرؒ کی اس بات پر نقد کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس صورت میں نہ تو اس اُمت کی کوئی خصوصیت باقی رہتی ہے اور نہ اس کے مرتبہ کی بلندی ظاہر ہوتی ہے، لہٰذا یہ کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ "معافی و مغفرت" سے مراد اُمت محمدیہ ﷺ کے اکثر افراد کو معافی و مغفرت کا پروانہ عطا ہوتا ہے یعنی دوسری امتوں کے مقابلہ میں یہ خصوصیت آنحضرت ﷺ کی اُمت ہی کو حاصل ہوگی کہ اس کے اکثر و بیشتر لوگ پروردگار کی خصوصی رحمت کے تحت بخش دیئے جائیں گے، اور انہیں عذاب دوزخ کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا، اور اسی اعتبار سے اس اُمت کو اُمت مرحومہ کہا گیا ہے۔

قریش کے سوالات پر بیت المقدس آنحضرت ﷺ کے سامنے لایا گیا

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ رَاَيْتُنِیْ فِی الْحِجْرِ وَ قُرَيْشٌ تَسْاَلُنِیْ عَنْ

مَسْرَایَ فَسَاَلَتْنِیْ عَنْ اَشْیَآءَ مِنْ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ لَمْ اُثْبِتْھَا فَکُرِبْتُ کَرْبًا مَاکُرِبْتُ مِثْلَہٗ فَرَفَعَہُ اللّٰہُ لِیْ اَنْظُرُ اِلَیْہِ یَسْاَلُوْنِیْ عَنْ شَیْءٍ اِلاَّ اَنْبَأْتُھُمْ وَقَدْ رَاَیْتُنِیْ فِیْ جَمَاعَۃٍ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ فَاِذَا مُوْسٰی قَآئِمٌ یُصَلِّیْ فَاِذَا رَجُلٌ ضَرْبٌ جَعْدٌ کَاَنَّہٗ مِنْ رِجَالِ شَنُوْءَۃَ وَاِذَا عِیْسٰی قَائِمٌ یُصَلِّیْ اَقْرَبُ النَّاسِ بِہٖ شَبْھًا عُرْوَۃُ بْنُ مَسْعُوْدٍ الثَّقَفِیُّ وَاِذَا اِبْرَاھِیْمُ قَائِمٌ یُصَلِّیْ اَشْبَہُ النَّاسِ بِہٖ صَاحِبُکُمْ یَعْنِیْ نَفْسَہٗ فَحَانَتِ الصَّلٰوۃُ فَاَمَمْتُھُمْ فَلَمَّا فَرَغْتُ مِنَ الصَّلٰوۃِ قَالَ لِیْ قَائِلٌ یَا مُحَمَّدُ ھٰذَا مَالِکٌ خَازِنُ النَّارِ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ فَالْتَفَتُّ اِلَیْہِ فَبَدَاَنِیْ بِالسَّلَامِ رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَھٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِیْ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے آپ کو حجر (حطیم) میں دیکھا، اس حال میں کہ (میں کھڑا تھا) اور قریش مکہ مجھ سے میرے شب معراج کے سفر کے بارے میں سوالات کر رہے تھے اور بیت المقدس کی وہ چیزیں اور نشانیاں دریافت کر رہے تھے جو مجھ کو اس وقت یاد نہیں رہی تھیں۔ اس بات سے (کہ قریش کی پوچھی ہوئی باتوں کا جواب نہ دے پایا تو یہ سب لوگ میرے بیت المقدس کے سفر اور معراج کے واقعہ کو ایک جھوٹا دعویٰ سمجھیں گے، میں اتنا سخت پریشان اور غمگین ہو گیا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا پریشان اور غمگین نہیں ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی اور، بیت المقدس کو بلند کر دیا جو میری نظروں کے سامنے آگیا (یعنی قادر مطلق نے میرے اور بیت المقدس کے درمیان سارے فاصلے سمیٹ دیئے اور سارے حجابات اٹھادیئے، جس سے بیت المقدس کی پوری عمارت اپنے گردو پیش کے ساتھ میری نظروں کے سامنے آگئی اور میں اس قابل ہو گیا کہ قریش مکہ بیت المقدس کی جس چیز اور علامت کے بارے میں پوچھیں، میں اس کو دیکھ دیکھ کر بتاتا رہوں) چنانچہ وہ مجھ سے (بیت المقدس کے بارے میں) جو کچھ پوچھتے میں ان کو (سامنے دیکھ کر) بتادیتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ (اسراء و معراج کی رات میں) میں نے اپنے آپ کو انبیاء کے درمیان دیکھا، میں نے (اس وقت) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا جو کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک میانہ قد مرد نظر آئے جیسے وہ (قبیلہ) شنوہ سے تعلق رکھنے والے ایک مرد ہوں میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی دیکھا جو کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے، ان سے سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والے شخص عروہ ابن مسعود ثقفی ہیں، پھر میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی دیکھا جو کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے، ان سے سب سے زیادہ مشابہت جو شخص رکھتا ہے وہ تمہارا دوست ہے، "(تمہارے دوست" سے) آنحضرت ﷺ کی مراد خود اپنی ذات تھی۔ پھر (آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ) جب نماز کا وقت آیا تو میں ان سب (انبیاء) کا امام بنا، اور جب میں نماز سے فارغ ہوا تو (آسمان پر جانے سے پہلے یا آسمان پر پہنچنے اور بارگاہ رب العزت میں حاضری کے بعد) ایک کہنے والے نے مجھے مخاطب کر کے کہا: محمد ﷺ! یہ دوزخ کا داروغہ موجود ہے (اپنے پروردگار کی قہاریت کی تعظیم کے لئے یا جیسا کہ ابرار و صالحین کے آداب میں سے ہے ازراہ تواضع و انکسار، اس کو سلام کرو! چنانچہ میں (سلام کرنے کے لئے) اس (داروغہ دوزخ) کی طرف متوجہ ہوا، لیکن سلام میں پہل اسی نے کی۔" (مسلم)

تشریح: میں نے اپنے آپ کو انبیاء کے درمیان دیکھا" یہ آپ ﷺ نے اس وقت کا ذکر کیا ہے جب شب معراج میں آپ ﷺ مکہ سے روانہ ہوئے اور آسمانوں پر جانے سے پہلے بیت المقدس میں تشریف لائے۔ لہٰذا علماء و محققین کا متفقہ قول ہے کہ یہ دیکھنا اس دیکھنے کے علاوہ ہے جو آسمانوں میں تھا۔ مطلب یہ کہ ایک دفعہ تو آپ ﷺ نے انبیاء کرام کو مسجد اقصیٰ میں اس وقت دیکھا جب آپ ﷺ آسمانوں پر جانے سے پہلے بیت المقدس میں تشریف لائے اور دوبارہ ان انبیاء کو آسمانوں میں دیکھا اور ان سے ملاقات کی۔ نیز بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ان انبیاء کو آسمانوں میں دیکھنا ان کی روحوں کے دیکھنے پر محمول ہے یعنی وہ انبیاء آسمانوں میں اپنے جسموں کے ساتھ موجود نہیں تھے بلکہ ان کی روحوں کو وہاں جمع کیا گیا تھا) البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ ان کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ اپنے جسم کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں اور وہاں موجود ہیں، اسی طرح بعض حضرات نے حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی کہا ہے۔ رہا مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کا معاملہ، کہ وہاں انبیاء کا نماز پڑھنا کس صورت پر محمول

ہے؟ تو یہ بھی احتمال ہے کہ محض ان کی روحوں نے نماز پڑھی تھی اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کے جسموں نے اپنی روحوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ یہ دوسرا احتمال زیادہ قرین قیاس یوں ہے کہ پہلے گذر ہی چکا ہے کہ انبیاء کرام اپنے پروردگار کے یہاں زندہ ہیں اور اللہ نے انبیاء کے جسموں کو کھانا زمین پر حرام کیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین انبیاء کے جسم کو نہیں کھاتی اور وہ اپنی قبروں میں جوں کے توں موجود ہیں) اور چونکہ ان کے جسم و بدن عام جسموں کی طرح کثیف نہیں ہیں بلکہ روحوں کی طرح لطیف ہیں لہٰذا قادر مطلق اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سبب عالم ملک و ملکوت میں کہیں بھی ان کے حاضر و جمع ہونے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ خود حدیث کے وہ الفاظ بھی جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہما السلام کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے، اسی بات کی تائید کرتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام نماز پڑھتے وقت بیت المقدس میں اپنے جسم اور روح دونوں کے ساتھ تھے، کیونکہ نماز کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ مختلف افعال جو اعضاء جسم کے ذریعہ صادر ہوں نہ کہ محض روح کے ساتھ۔ یہاں ایک اشکال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انبیاء کو مسجد اقصیٰ میں آنحضرت کے پیچھے نماز پڑھی اور پھر ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال و تکریم کے لئے آسمانوں پر پہنچادیا گیا ہے، یا یہ کہ مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کے بعد ان کی روحوں کو آسمانوں میں متشکل کردیا گیا جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں ملاقات فرمائی. البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام اپنے جسموں کے ساتھ ہی آسمانوں میں تھے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان انبیاء کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھانے اور ان کے ساتھ جمع ہونے کا واقعہ سدرۃ المنتہیٰ سے واپسی کے بعد پیش آیا ہو۔ تاہم اس سلسلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، اس نے جس طرح چاہا اپنی قدرت کا کرشمہ ظاہر کیا، اگر اولیاء اللہ کو متعدد صورتوں کے ساتھ مختلف جگہوں پر لوگ دیکھ سکتے ہیں (جیسا کہ بعض بزرگوں کے حالات میں لکھا ہے، تو انبیاء کے ساتھ ایسی صورت پیش آنے میں کیا استبعاد ہے اور خوارق عادات (یعنی معجزوں اور کرشموں) کا مطلب بھی تو یہی ہے کہ جو چیزیں عقل و قیاس میں آنے والی نہ ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ظہور میں آئیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک میانہ قد مرد نظر آئے "میں "میانہ قد" لفظ **جعد** کا ترجمہ ہے ویسے لغت میں اس لفظ کے مختلف معنی آتے ہیں جن میں سے ایک تو یہی "میانہ قد" ہے، دوسرے ہلکا لیکن گول گٹھا ہوا مضبوط جسم، اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مضبوط بدن کے آدمی تھے، اور تیسرے گھونگھریالے بال، لیکن جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے، ان تیسرے کا اطلاق حضرت موسیٰ علیہ السلام پر موزوں نہیں ہو گا کیونکہ دوسری روایتوں سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بال گھونگھریالے نہیں تھے بلکہ وہ سیدھے بال والے تھے۔

"جب نماز کا وقت آیا تو میں ان سب کا امام بنا "اس موقع پر ان انبیاء کا مسجد اقصیٰ میں جمع ہونا اور نماز پڑھنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نماز دراصل مؤمن کی معراج ہے، یعنی یہی وہ عبادت ہے جو بندے کو اپنے خالق سے ملاتی ہے، اور عبودیت کا سب سے بڑا مرتبہ عطا کرتی ہے کیونکہ اپنے رب کے آگے حضور اور پروردگار کے کمال قرب کی حالت اسی عبادت سے نصیب ہوتی ہے اور یہ حالت عشاق کے نزدیک سب سے بڑی لذت اور سب سے زیادہ کیف آور ہے۔ حدیث کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انبیاء کو یہ نماز آسمان پر جانے سے پہلے بیت المقدس میں پڑھائی اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان انبیاء کے نماز پڑھنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا واقعہ آسمان پر بھی پیش آیا ہو، گو حدیث کے الفاظ اس طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ اس واقعہ کا بیت المقدس، ہی میں پیش آنا مفہوم ہوتا ہے۔ نیز یہ نماز جس کی امامت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، یا تو نماز تحیۃ تھی یا معراج کی مناسبت سے وہ مخصوص نماز تھی جو صرف اسی موقع پر پڑھی گئی۔ یہاں بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ مکہ سے لے کر بیت المقدس تک آسمانوں تک معراج کا سارا واقعہ اس دنیا سے ماوراء عالم ملک و ملکوت سے تعلق رکھتا ہے اور وہ عالم عبادات و ا(؟) مسئولیت عائد نہیں کرتا، تو پھر انبیاء نے نماز کیوں پڑھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو انبیاء کرام

کے ساتھ زندہ ہیں، اور چونکہ وہ زندہ ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ انہیں نماز کی ادائیگی کا مکلف بنایا گیا ہو، دوسرے یہ کہ اس عالم میں نماز یا کسی بھی عبادت کا وجوب بیشک اٹھا ہوا ہے لیکن ان کا وجود نہیں اٹھایا گیا:

"لیکن سلام میں پہل اسی نے کی" یعنی آنحضرت ﷺ کا دبدبہ اور شان رحمت چونکہ دوزخ کی آگ اور داروغہ دوزخ پر غالب ہے لہٰذا آپ ﷺ کے اس تفوق و برتری کی بناء پر داروغہ دوزخ نے خود بڑھ کر سلام کیا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آسمان پر پیش آیا جیسا کہ ترجمہ کے دوران بھی اشارہ کیا گیا۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِيْ

اور اس میں دوسری فصل نہیں ہے

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بیت المقدس کا آنحضرت کے سامنے لایا جانا

⑥ عَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَمَّا كَذَّبَنِيْ قُرَيْشٌ قُمْتُ فِي الْحِجْرِ فَجَلَّى اللّٰهُ لِيْ بَيْتَ الْمُقَدَّسِ فَطَفِقْتُ اُخْبِرُهُمْ عَنْ اٰيَاتِهٖ وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا! "جب قریش نے (شب معراج میں میرے بیت المقدس جانے کے بارے میں) مجھے جھٹلایا (اور بیت المقدس کی عمارتی علامات اور نشانیاں مجھ سے پوچھنے لگے) تو میں حجر یعنی حطیم میں کھڑا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے لئے نمایاں کر دیا، چنانچہ میں بیت المقدس کی طرف دیکھ دیکھ کر اس کی نشانیاں اور علامات ان لوگوں کو بتاتا رہا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے سامنے نمایاں کر دیا" کا مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر جب کہ قریش مکہ بیت المقدس کی عمارتوں اور ان کی نشانیوں کے بارے میں مجھ سے سوالات کر رہے تھے اور میرے ذہن میں بیت المقدس کا پورا عمارتی نقشہ اور اس کی نشانیاں محفوظ نہ رہنے کے سبب میں ان عمارتوں کو دوبارہ دیکھے بغیر ان کے سوالات کے جواب نہ دے سکتا تھا، قادر مطلق نے میری یوں مدد فرمائی کہ میرے اور بیت المقدس کے درمیان کے سارے فاصلے سمیٹ دیئے اور میری نگاہوں کے سامنے سے وہ ساری رکاوٹیں دور کر دیں جو میرے اور بیت المقدس کے درمیان حائل تھیں اس طور سے پورا بیت المقدس میری نگاہوں کے سامنے آگیا اور میں کسی اشتباہ و احتمال کے بغیر اس کی ایک ایک چیز اچھی طرح دیکھ کر قریش مکہ کے ایک ایک سوال کا بالکل صحیح جواب دینے پر قادر ہو گیا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ پورا بیت المقدس اٹھا کر لایا گیا ہو اور آنحضرت ﷺ کے سامنے رکھ دیا گیا ہو، جیسا کہ ایک روایت میں، جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے، بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "چنانچہ مسجد اقصیٰ اٹھا کر لائی گئی اور دار عقیل کے پاس رکھی گئی......!
اور حقیقت یہ ہے کہ ظہور معجزہ میں کامل ترین صورت بھی یہی ہے، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں ثابت ہے کہ بلقیس کا تخت ایک لمحہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا تھا۔

معراج کا باب ختم ہو رہا ہے، لیکن مؤلف کتاب نے اس باب میں ایسی کوئی حدیث نقل نہیں کی جس سے بارگاہ رب العزت میں ﷺ کے حاضر ہونے اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا ذکر ہوتا؟ دراصل علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت ﷺ کو شب معراج حاصل ہوا یا نہیں، اور اگر دیدار حاصل ہوا تو وہ سر کی آنکھوں سے تھا یا دل کی آنکھوں سے؟ واضح رہے کہ دل جز ہے اور جاننا ایک دوسری چیز ہے، بعض حضرات سے جن میں صحابہ اور تابعین میں سے بھی کچھ

حضرات شامل ہیں، یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کو شب معراج میں دیدار خداوندی تو حاصل ہوا لیکن وہ دیدار بصری نہیں تھا، قلبی تھا یعنی آپ ﷺ نے دل کی آنکھوں سے دیکھا، سر کی آنکھوں سے نہیں! جب کہ جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے پروردگار کو سر کی آنکھوں سے دیکھا اور محققین کے نزدیک یہی قول راجح اور حق ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل اللہ تعالیٰ کے دیدار کے باب میں پہلے گذر چکی ہے۔

بَابٌ فِي الْمُعْجِزَاتِ

معجزوں کا بیان

"مُعْجِزَات" مُعْجِزَة کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ خارق عادت جس کو اللہ تعالیٰ کسی نبی و رسول کے ہاتھ سے ظاہر کردے اور دوسرے اس سے عاجز ہوں۔ لفظ معجزہ اصل میں عجز سے مشتق ہے جس کے معنی ناتواں ہونا' عاجز ہونا کے ہیں اور جو "حزم" (قادر ہونا) کی ضد ہیں۔ اسی لفظ سے معجز بنا ہے جس کے معنی ہیں، عاجز کرنے والا، اعجاز دکھانے والا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کی سچائی ثابت کرنے کے لئے اور ان کی نبوت و رسالت کی دلیل کے طور پر جو خارق عادت نشانیاں ظاہر فرماتا ہے ان کو معجزہ اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ جس نبی و رسول کے ہاتھ سے معجزہ ظاہر ہوتا ہے اس کی اُمت اور قوم کے لوگ نہ صرف یہ کہ مقابلہ میں اس معجزہ کی طرح کا کوئی کرشمہ دکھانے اور پیش کرنے سے عاجز ہوتے ہیں بلکہ اگر کوئی چاہے کہ اس معجزہ کا توڑ کردے تو یہ بھی ممکن نہیں ہوتا۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے: "معجزہ کا لفظ" اعجاز "سے لیا گیا ہے جس کے معنی عاجز کرنے کے ہیں اور معجزہ اس چیز کو کہتے ہیں جو خارق عادت ہو اور جس سے نبوت و رسالت کا دعویٰ ظاہر و ثابت ہوتا ہو اور جو خوارق عادات ظہور نبوت سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں ان کو معجزات نہیں کہتے بلکہ ارہاصات کہتے ہیں جو ارہاص کی جمع ہے، ارہاص کے لغوی معنی مکان کو اینٹ مٹی اور پتھر کے ساتھ مضبوط و مستحکم بنانے کے ہیں، لہٰذا ظہور نبوت سے پہلے ظاہر ہونے والے خوارق عادات گویا نبوت و رسالت کی عمارت کو مستحکم و مضبوط بنانے کا ابتدائی ذریعہ ہوتے ہیں۔

خوارق عادات کی قسمیں

خارق عادت، یعنی ایسی چیز کا وقوع پذیر ہونا جو جاری نظام قدرت سے الگ اور عادت و عام طریقہ کے خلاف ہو، اور جس کو کرشمہ سمجھا جاتا ہو، کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں اور اسی اعتبار سے ان کی الگ الگ قسمیں ہیں! اور پھر ان قسموں کو الگ الگ ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے، تاکہ ان سب کی اپنی اپنی حیثیت بھی متعین ہو جائے اور ایک دوسرے سے ممتاز بھی رہیں، چنانچہ خوارق عادات کی پہلی قسم تو وہ ہے جو نبی اور رسول سے ظاہر ہو جس کو معجزہ کہا جاتا ہے، دوسری قسم وہ ہے جو عام مسلمانوں سے ظاہر ہو، اس کو "معونت" کہا جاتا ہے۔ تیسری قسم وہ ہے، جو اولیائے اللہ سے ظاہر ہو اور جس کو کرامت کہا جاتا ہے، اور چوتھی قسم وہ ہے جو کافروں اور فاسقوں سے ظاہر ہو، اس کو "استدراج" کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان چاروں قسموں میں سے اول الذکر قسم کو چھوڑ کر باقی تینوں قسمیں اپنے مفہوم و مصداق کے اعتبار سے دعویٰ نبوت کی قید سے باہر ہیں، گویا ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کو بھی "معجزہ" نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ معجزہ تو وہی خرق عادت ہے جو نبوت کے دعویٰ کے ساتھ ہو۔

سحر خرق عادت نہیں ہے

شعبدہ اور سحر یعنی جادو کو خرق عادت نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ شعبدہ اور سحر کا صدور و ظہور اسباب ظاہری کے تابع ہوتا ہے اور کوئی بھی

شخص ان اسباب، میں درک مہارت حاصل کر کے شعبدہ اور سحر ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا جو چیز ظاہری اسباب کے ذریعہ وجود میں آئے اس پر خرق عادت کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اسی وجہ سے دواؤں اور طبی تدابیر کے ذریعہ حاصل ہونے والی شفاء کو بھی خارق عادت نہیں کہا جاتا اگر اس کو کوئی خارق عادت کہہ دے تو ظاہری صورت کے اعتبار سے ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

غار ثور کا واقعہ

① عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ اَبَابَكْرِنِ الصِّدِّيْقَ قَالَ نَظَرْتُ اِلٰى اَقْدَامِ الْمُشْرِكِيْنَ عَلٰى رُؤُسِنَا وَ نَحْنُ فِى الْغَارِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ اَنَّ اَحَدَهُمْ نَظَرَ اِلٰى قَدَمِهٖ اَبْصَرَنَا فَقَالَ يَا اَبَابَكْرٍ مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت انس ابن مالکؓ راوی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بیان فرمایا: جب ہم غار میں چھپے ہوئے تھے اور میں نے مشرکوں کے پیروں کی طرف دیکھا جو گویا ہمارے سروں پر تھے تو میں نے عرض کیا! کہ یا رسول اللہ! اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی نظر اپنے پیروں کی طرف چلی گئی تو ہم کو دیکھ لے گا۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا۔ "ان دو شخصوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا ساتھی خدا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "غار" سے مراد مشہور پہاڑ جبل ثور کے بالائی حصہ کی وہ غار ہے جس میں رسول کریم ﷺ نے مکہ سے مدینہ کو سفر ہجرت کے دوران تین راتیں بسر فرمائی تھیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے ساتھ تھے، جبل ثور مکہ کے مشرقی جنوبی سمت تقریباً ساڑھے تین سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جب آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا وطن عزیز چھوڑ کر مدینہ منورہ جانے کے لئے مکہ سے روانہ ہوئے اور آپ ﷺ کی روانگی کے بعد مشرکین مکہ کو جیسے ہی پتہ چلا انہوں نے اپنے گماشتے آپ ﷺ کے تعاقب میں روانہ کر دیئے، ان کو حکم دیا گیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو محمد ﷺ کو مکہ واپس لایا جائے آنحضرت ﷺ اپنے رفیق سفر حضرت ابوبکر کے ساتھ جبل ثور کے اس غار میں چھپے ہوئے تھے کہ اچانک ان گماشتوں کی ایک ٹولی اس غار کے دہانے تک پہنچ گئی، اس غار کا محل وقوع اس طرح کا ہے کہ اگر کوئی شخص غار کے باہری کنارہ پر کھڑا ہو تو غار کے اندر موجود شخص کی نظر اس کے پیروں پر پڑتی ہے اور اگر باہری کنارہ پر کھڑا ہوا شخص نیچے نظر کر کے اپنے پیروں کی طرف دیکھے تو وہ غار کے اندر موجود شخص کو بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دیکھا کہ مشرکین مکہ کے گماشتے آنحضرت ﷺ کی تلاش میں اس غار تک پہنچ گئے ہیں اور وہ لوگ بالکل غار کے منہ پر کھڑے ہوئے ہیں، جوں ہی ان میں سے کسی شخص کی نظر ان کے اپنے پیروں کی طرف جائے گی، وہ ہمیں دیکھ لے گا اور اس طرح آنحضرت ﷺ پر دسترس کا موقع ان لوگوں کو مل سکتا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے اپنی اس تشویش اور گھبراہٹ کا اظہار آپ ﷺ کے سامنے کیا لیکن آپ ﷺ نے بڑے یقین کے ساتھ ان کو اطمینان دلایا کہ ہم اور تم وہ دو شخص ہیں جن کے ساتھ ایک تیسری ذات اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت بھی ہے ہمارا پروردگار ہماری حفاظت فرمائے گا اور ہمیں اپنے دشمنوں کے چنگل میں پڑنے سے بچائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول ﷺ اور آپ کے پیارے ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اس طرح حفاظت فرمائی کہ وہ مشرکین مکہ جو غار کے بالکل منہ پر کھڑے ہوئے اپنی تیز نگاہوں سے ادھر ادھر آنحضرت ﷺ کو تلاش کر رہے تھے اور اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ آنحضرت ﷺ اسی غار میں موجود ہیں، عین موقع پر حوصلہ ہار بیٹھے، نہ تو ان کو آگے تلاش کا موقع ملا اور نہ انہیں پیروں کی طرف غار کے اندر دیکھنا نصیب ہو سکا، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ اور آنحضرت ﷺ کے معجزہ کا ظہور تھا۔

طیبیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے ان مشرکوں کے حق میں یہ بددعا فرمائی تھی، اے اللہ! ان کی آنکھوں کی

بینائی معطل کردے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان سب کو اس طرح بے بصر کردیا کہ وہ غار کے چاروں طرف گھومتے تھے مگر اس کے اندر موجود آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھنے پر قادر نہیں ہوتے تھے اور جیسا کہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اس موقع پر کبوتروں نے غار کے منہ پر انڈے رکھ دیئے اور مکڑیوں نے جالا تن دیا یہ بھی معجزہ ہی تھا۔

سفر ہجرت کے دوران دشمن کے خلاف معجزہ کا ظہور

(۲) وَعَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ قَالَ لِاَبِيْ بَكْرٍ يَا اَبَا بَكْرٍ حَدِّثْنِيْ كَيْفَ صَنَعْتُمَا حِيْنَ سَرَيْتَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَسْرَيْنَا لَيْلَتَنَا مِنَ الْغَدِ حَتّٰى قَامَ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ وَخَلَا الطَّرِيْقُ لَا يَمُرُّ فِيْهِ اَحَدٌ فَرُفِعَتْ لَنَا صَخْرَةٌ طَوِيْلَةٌ لَهَا ظِلٌّ لَمْ يَاْتِ عَلَيْهَا الشَّمْسُ فَنَزَلْنَا عِنْدَهَا وَسَوَّيْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَانًا بِيَدِيْ يَنَامُ عَلَيْهِ وَبَسَطْتُ عَلَيْهِ فَرْوَةً وَقُلْتُ نَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاَنَا اَنْفُضُ مَا حَوْلَكَ فَنَامَ وَخَرَجْتُ اَنْفُضُ مَا حَوْلَهٗ فَاِذَا اَنَا بِرَاعٍ مُقْبِلٍ قُلْتُ اَفِيْ غَنَمِكَ لَبَنٌ قَالَ نَعَمْ قُلْتُ اَفَتَحْلِبُ قَالَ نَعَمْ فَاَخَذَ شَاةً فَحَلَبَ فِيْ قَعْبٍ كُثْبَةً مِّنْ لَبَنٍ وَمَعِيَ اِدَاوَةٌ حَمَلْتُهَا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْتَوِيْ فِيْهَا يَشْرَبُ وَيَتَوَضَّاُ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَرِهْتُ اَنْ اُوْقِظَهٗ فَوَافَقْتُهٗ حَتّٰى اسْتَيْقَظَ فَصَبَبْتُ مِنَ الْمَاءِ عَلَى اللَّبَنِ حَتّٰى بَرَدَ اَسْفَلُهٗ فَقُلْتُ اشْرَبْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَشَرِبَ حَتّٰى رَضِيْتُ ثُمَّ قَالَ اَلَمْ يَاْنِ لِلرَّحِيْلِ قُلْتُ بَلٰى فَارْتَحَلْنَا بَعْدَ مَا مَالَتِ الشَّمْسُ وَاتَّبَعَنَا سُرَاقَةُ بْنُ مَالِكٍ فَقُلْتُ اُتِيْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَدَعَا عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَارْتَطَمَتْ بِهٖ فَرَسُهٗ اِلٰى بَطْنِهَا فِيْ جَلَدٍ مِّنَ الْاَرْضِ فَقَالَ اِنِّيْ اَرَاكُمَا دَعَوْتُمَا عَلَيَّ فَادْعُوْا لِيْ فَاللّٰهُ لَكُمَا اَنْ اَرُدَّ عَنْكُمَا الطَّلَبَ فَدَعَا لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَجَا فَجَعَلَ لَا يَلْقٰى اَحَدًا اِلَّا قَالَ كُفِيْتُمْ مَا هٰهُنَا فَلَا يَلْقٰى اَحَدًا اِلَّا رَدَّهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ اپنے والد محترم (حضرت عازبؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے ابوبکر! جب (آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے ارادہ سے مکہ چھوڑا اور مدینہ روانہ ہوئے اور) تم نے رات میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ سفر کیا تو (غار سے نکلنے کے بعد) تمہیں کیا کیا حالات، اور واردات پیش آئے؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا! "(غار سے نکل کر) ہم ساری رات چلتے رہے اور اگلے دن کا کچھ حصہ بھی (یعنی دوپہر تک) سفر میں گزرا یہاں تک کہ جب ٹھیک دوپہر ہوگئی اور سورج ٹھہر گیا اور راستہ (آنے جانے والوں سے) بالکل خالی ہوگیا تو ہمیں ایک چٹان نظر آئی جس کے نیچے سایہ تھا اور سورج اس پر نہیں آیا تھا (یعنی اس چٹان کے نیچے جو کھوہ یا غار تھا اس میں دھوپ نہیں تھی۔ چنانچہ ہم اس چٹان کے نیچے اتر گئے اور میں نے وہاں رسول کریم ﷺ کے لئے ایک جگہ اپنے ہاتھوں سے ہموار اور صاف کی تاکہ آپ ﷺ اس پر سو رہیں پھر میں نے اس جگہ پر پوستین بچھایا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) یہاں سو جائیے، میں آپ (ﷺ) کے ادھر ادھر نگرانی رکھوں گا کہ کسی طرف سے دشمن کا کوئی آدمی تو ہماری ٹوہ میں نہیں ہے، اگر کوئی ادھر آئے گا تو اس کو روکوں گا) رسول کریم ﷺ سو گئے اور وہاں سے نکل کر آنحضرت ﷺ کی حفاظت کے لئے چاروں طرف نگرانی رکھے ہوئے تھا کہ اچانک میں نے ایک چرواہے کو دیکھا جو سامنے سے آرہا تھا (جب وہ میرے قریب آگیا تو) میں نے پوچھا کہ کیا تمہاری بکریوں میں دودھ ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں ہے۔ میں نے کہا: کیا تو دودھ دوہ کردے گا؟ اس نے کہا: ہاں! پھر اس نے ایک بکری کو پکڑا اور لکڑی کے پیالے میں تھوڑا سا دودھ دوہ دیا، میرے پاس ایک چھاگل تھی جو میں نے نبی کریم ﷺ کے استعمال کے لئے رکھی تھی، اس میں پانی رہتا تھا جو آپ ﷺ کے پینے اور وضو کے کام آتا تھا، میں دودھ لے کر) نبی کریم ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ سو رہے تھے، میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور خود بھی آپ ﷺ کا ساتھ دیا، یہاں تک کہ آپ ﷺ خود بیدار ہوئے (اور میں بھی اٹھ گیا) پھر میں نے دودھ میں (اتنا) پانی ڈالا کہ نیچے تک ٹھنڈا ہوگیا اور پھر عرض کیا یا رسول اللہ! نوش فرمایئے۔ آپ ﷺ نے وہ دودھ نوش فرمایا

اور میں بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا کوچ کا وقت نہیں آیا؟ میں نے کہا! ہاں آگیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ پس ہم نے سورج ڈھلنے کے بعد (ٹھنڈے وقت) وہاں سے کوچ کیا اور، (آگے سفر شروع ہوا تو) پیچھے سے سراقہ ابن مالک آگیا، میں نے (اس کو دیکھ کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ! دشمن ہمیں پکڑنے آگیا ہے.... آنحضرت ﷺ نے فرمایا ڈرو نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے سراقہ کے لئے بددعا کی اور سراقہ کا گھوڑا اس کو لئے ہوئے پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ (اس صورت حال سے دوچار ہو کر بدحواس ہو گیا اور) کہنے لگا کہ میں جانتا ہوں، تم دونوں نے میرے لئے بددعا کی ہے، اب میری نجات و خلاصی کے لئے بھی تم دعا کرو مجھ کو اس گرفت سے نجات دلادو تو) میں اللہ کو گواہ بنا کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں کفار کو تمہارا تعاقب کرنے سے روک دوں گا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے دعا فرمائی اور وہ اس گرفت سے نجات پا گیا۔ اور پھر سراقہ نے (اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے یہ کیا) کہ آنحضرت ﷺ کی تلاش میں مکہ سے روانہ ہونے والے کافروں میں سے) جو بھی کافر اس کو راستہ میں ملتا وہ اس سے کہتا کہ تمہارے لئے میرا تلاش کرنا کافی ہے (یعنی میں بہت دور سے محمد ﷺ کو تلاش کر کے دیکھ چکا ہوں ان کا کہیں پتہ نہیں چلا تم ان کو تلاش کرنے کی زحمت برداشت نہ کرو) سراقہ کو جو شخص بھی ملتا اس کو وہ یہی کہہ کر واپس کر دیتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اور خود بھی آپ ﷺ کا ساتھ دیا" یہ فوافقته کا ترجمہ ہے، یعنی آپ ﷺ کو سوتا دیکھ کر نہ صرف یہ کہ میں نے آپ ﷺ کو جگانا پسند نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کی طرح میں خود بھی وہیں ایک طرف کو لیٹ کر سو گیا۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ "ف پر ق کی تقدیم کے ساتھ ہے، اس صورت میں ترجمہ و مطلب یہ ہو گا کہ میں نے آپ ﷺ کو سوتا دیکھ کر توقف کیا یعنی آپ ﷺ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا اور اس وقت تک انتظار کرتا رہا جب تک آپ ﷺ خود بیدار نہ ہو گئے۔

"پھر میں نے دودھ میں پانی ڈالا" عربوں کی عام عادت تھی کہ دودھ کی حرارت کو زائل کرنے کے لئے اس میں ٹھنڈا پانی ملا لیتے تھے اور پھر اس کو پیتے تھے، چنانچہ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس عادت و معمول کے مطابق بکری کے اس دودھ میں اتنا پانی ملا دیا جس سے وہ دودھ خوب ٹھنڈا ہو گیا۔

"اور میں بہت خوش ہوا۔" یعنی حضرت ابوبکرؓ کو اس بات سے بہت زیادہ خوشی و طمانیت محسوس ہوئی کہ ان کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ کو کچھ دیر استراحت کا موقع مل گیا بلکہ اتنا دودھ بھی فراہم ہو گیا جس کو آپ ﷺ نے بشاشت و خوش طبعی کے ساتھ نوش فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ محب کی اصل خوشی محبوب کی خوشی اور راحت میں ہوتی ہے۔

اس موقع پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی بکریوں کا دودھ کیسے دوہا اور پیا گیا جس کے مالک کی اجازت حاصل نہیں تھی؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ وہ بکریاں کسی ایسے شخص کی تھیں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دوست اور معتمد تھا۔ اور حضرت ابوبکرؓ اپنے اس دوست کی اجازت کا اعتماد رکھتے تھے، دوسرا جواب یہ ہے کہ عربوں اور خاص طور پر اہل مکہ کی عادت تھی کہ وہ اپنے چرواہوں کو پہلے ہی اجازت دیدیتے تھے کہ انہیں جو مسافر یا بھوکا ملے اور طلبگار ہو تو اس کو بلاتوقف دودھ نکال کر دے دیا کریں، اور ایک تیسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے مطلوبہ قیمت دیکر وہ دودھ حاصل کیا ہو گا!۔

"سراقہ ابن مالک" ان لوگوں میں سے ایک تھا جن کو قریش مکہ نے آنحضرت ﷺ کے تعاقب پر مامور کیا تھا اور یہ اعلان کیا تھا کہ جو شخص بھی محمد ﷺ کو پکڑ لائے گا اور ہمارے حوالے کر دے گا اس کو بطور انعام سو اونٹ دیئے جائیں گے۔ یہ سراقہ ابن مالک فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گئے تھے!۔

"اور وہ گرفت سے نجات پا گیا" .... ایک روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بددعا کے نتیجہ میں سراقہ کے زمین میں دھنسنے اور پھر آنحضرت ﷺ کی دعا کے بعد نجات پانے کا واقعہ تین بار ہوا۔ یعنی وہ ہر بار آنحضرت ﷺ سے دعا کرا کر نجات پا جاتا اور پھر آپ ﷺ کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھنے لگتا، یہاں تک کہ وہ جب تیسری مرتبہ اپنے گھوڑے کے ساتھ زمین میں دھنسا اور اس کی

لجاجت پر آنحضرت ﷺ نے اس کے حق میں دعا کر کے اس کو نجات دلوائی تو وہ اپنے برے ارادہ سے باز آگیا اور پھر نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ کو پکڑنے کے لئے خود آگے نہیں بڑھا بلکہ واپسی میں اس کو جو شخص بھی آنحضرت ﷺ کے تعاقب میں آتا ہوا ملا اس کو اس نے واپس کر دیا اور کسی کو آنحضرت ﷺ تک پہنچنے نہیں دیا۔

اس حدیث سے جہاں آنحضرت ﷺ کے معجزے اور مختلف وجوہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے وہیں کئی قیمتی اور مفید باتیں بھی سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ تابع کو اپنے متبوع کی خدمت میں اپنی پوری کوشش اور صلاحیت صرف کرنی چاہئے، دوسرے یہ کہ سفر میں ایسا برتن (یعنی چھاگل یا لوٹا وغیرہ) ساتھ رکھنا کہ جو پانی پینے اور طہارت و وضو کے کام آئے نہایت ضروری ہے، اور تیسرے یہ کہ بندہ کو ہر حالت میں اپنے اللہ پر اعتماد اور توکل رکھنا چاہئے کہ نتیجہ اور انجام کی بہتری اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔

عبداللہ ابن سلامؓ کے ایمان لانے کا واقعہ

﴿۳﴾ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ سَمِعَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ بِمَقْدَمِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِيْ اَرْضٍ يَخْتَرِفُ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ سَائِلُكَ عَنْ ثَلٰثٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ اِلَّا نَبِيٌّ فَمَا اَوَّلُ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ وَمَا اَوَّلُ طَعَامِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَمَا يَنْزِعُ الْوَلَدَ اِلٰى اَبِيْهِ اَوْاِلٰى اُمِّهٖ قَالَ اَخْبَرَنِيْ بِهِنَّ جِبْرَئِيْلُ اٰنِفًا اَمَّا اَوَّلُ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ فَنَارٌ تَحْشُرُ النَّاسَ مِنَ الْمَشْرِقِ اِلَى الْمَغْرِبِ وَ اَمَّا اَوَّلُ طَعَامٍ يَاْكُلُهٗ اَهْلُ الْجَنَّةِ فَزِيَادَةُ كَبِدِ حُوْتٍ وَاِذَا سَبَقَ مَاءُ الرَّجُلِ مَاءَ الْمَرْاَةِ نَزَعَ الْوَلَدَ وَاِذَا سَبَقَ مَاءُ الْمَرْاَةِ نَزَعَتْ قَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْيَهُوْدَ قَوْمٌ بُهُتٌ وَاِنَّهُمْ اِنْ يَّعْلَمُوْا بِاِسْلَامِيْ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَسْئَلَهُمْ يَبْهَتُوْنِيْ فَجَاءَتِ الْيَهُوْدُ فَقَالَ اَيُّ رَجُلٍ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ فِيْكُمْ قَالُوْا خَيْرُنَا وَ ابْنُ خَيْرِنَا وَسَيِّدُنَا وَابْنُ سَيِّدِنَا قَالَ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَسْلَمَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ قَالُوْا اَعَاذَهُ اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ فَخَرَجَ عَبْدُاللّٰهِ فَقَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالُوْا شَرُّنَا وَابْنُ شَرِّنَا فَانْتَقَصُوْهُ قَالَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُ اَخَافُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن سلام ایک جگہ درختوں سے پھل چن رہے تھے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کے (مکہ سے مدینہ میں) آنے کا حال سنا، وہ فوراً نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں (نبوت کی علامتوں کی تصدیق کے لئے) آپ ﷺ سے تین باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں، جن کو نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا، ایک تو یہ کہ قیامت کی پہلی علامت کیا ہوگی؟ دوسرے یہ کہ جنتیوں کا پہلا کھانا کیا ہوگا۔ (جو وہ جنت میں پہنچ کر سب سے پہلے کھائیں گے) تیسرے یہ کہ وہ کونسی چیز ہے جو اولاد کو ماں یا باپ کے مشابہ کرتی ہے (یعنی اولاد جو شکل وصورت کے اعتبار سے کبھی باپ کے مشابہ ہوتی ہے اور کبھی ماں کے مشابہ، تو اس کا کیا سبب ہے؟) آنحضرت ﷺ نے (عبداللہ ابن سلام کے یہ تینوں سوال سنکر) فرمایا، ابھی ابھی جبرئیل علیہ السلام نے ان سوالوں کے جواب سے آگاہ کیا ہے (اور وہی تمہیں بتاتا ہوں) کہ قیامت کی پہلی علامت تو وہ آگ ہوگی جو لوگوں کو مشرق کی طرف سے مغرب کی طرف جمع کر کے لے جائے گی اور جنتی جنت میں سب سے پہلے جو کھانا کھائیں گے وہ مچھلی کے جگر کا زائد حصہ ہوگا (یعنی مچھلی کے جگر کا وہ حصہ جو جگر سے علیحدہ لٹکتا ہے اور جو مچھلی کا لذیذ ترین جزء ہوتا ہے) اور جہاں تک اولاد میں ماں باپ کی مشابہت کا سوال ہے تو) اگر مرد کا پانی (منی) عورت کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو مرد اولاد کو اپنی مشابہت کی طرف کھینچ لیتا ہے، اور اگر عورت کا پانی (مرد کے پانی پر) غالب آجاتا ہے تو عورت اولاد کو اپنی مشابہت کی طرف کھینچ لیتی ہے۔ عبداللہ ابن سلام نے (اپنے سوالوں کے یہ جواب سن کر) کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ آپ ﷺ یقیناً اللہ کے رسول ہیں (اس قبول اسلام کے بعد عبداللہ ابن سلام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ یہودی بڑے افتراش اور بہتان تراش ہیں، اگر آپ ﷺ کے پوچھنے سے پہلے ان کو میرا مسلمان ہونا معلوم ہوگیا تو مجھ پر جھوٹے بہتان

باندھیں گے (یعنی اگر ان کو یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں مسلمان ہوگیا ہوں، آپ ﷺ ان سے میرے بارے میں کچھ پوچھیں گے تو وہ مخالفت پر اتر آئیں گے اور مجھ پر بڑے بڑے الزام لگا ڈالیں گے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان کو میرے اسلام کی خبر ہونے سے پہلے آپ ان سے میرے بارے میں جو پوچھنا چاہیں پوچھ لیں تاکہ وہ میرے متعلق صحیح حالات سے آپ ﷺ کو آگاہ کریں)۔ چنانچہ اتفاقاً یا آنحضرت ﷺ کے بلانے پر، اسی وقت) کچھ یہودی مجلس نبوی میں آگئے اور عبداللہ ابن سلام ایک گوشہ میں چھپ گئے، آنحضرت ﷺ نے ان یہودیوں سے پوچھا کہ تم میں (یا تمہارے گمان وعلم میں) عبداللہ ابن سلام کیسے شخص ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ ہم میں سے بہترین آدمی ہیں، ہم میں سے بہترین آدمی کا بیٹا ہے (یعنی عبداللہ ابن سلام نہ صرف یہ کہ اپنی ذات کا اعتبار سے ہم میں، علمی، اخلاقی اور سماجی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمارے سردار ہیں بلکہ حسب و نسب کے اعتبار سے بھی ہم پر ان کو فضیلت حاصل ہے (آنحضرت ﷺ نے ان کا یہ جواب سن کر) پھر یہ پوچھا کہ اچھا بتلاؤ کہ عبداللہ ابن سلام مسلمان ہوجائیں (تو کیا تم بھی مسلمان ہوجاؤ گے، یہودیوں نے کہا: خدا اس کو اسلام سے بچائے اور اپنی حفاظت میں رکھے (یا یہ کہ معاذ اللہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے) جبھی عبداللہ ابن سلام ان کے سامنے آگئے اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ بلاشبہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ یہودیوں نے یہ (سنتے ہی) کہنا شروع کردیا کہ یہ شخص تو ہم میں بہت برا ہے اور بدترین شخص کا بیٹا ہے اور ان میں طرح طرح کے عیب نکالنے لگے۔ عبداللہ ابن سلام نے کہا (آپ (ﷺ) نے دیکھا) یا رسول اللہ! یہی وہ بات ہے جس سے میں ڈرتا تھا (اور اسی وجہ سے میں نے آپ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ ان سے میرا حال پہلے پوچھ لیجئے، تاکہ آپ ﷺ کو اندازہ ہوجائے کہ یہ قوم کیسی دوغلی اور جھوٹی ہے۔" (بخاری)

تشریح: "عبداللہ ابن سلام ایک جگہ درختوں کے پھل چن رہے تھے" یا تو صورت واقعہ یہی تھی کہ عبداللہ ابن سلام اپنے باغ میں درختوں سے پھل اتارنے اور اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ کسی نے آکر ان کو بتایا ہوگا کہ نبوت کا دعویٰ اور دین اسلام کی دعوت لے کر محمد (ﷺ) مدینہ میں آگئے ہیں، یہ سنتے ہی وہ اپنا سارا کام کاج چھوڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے.... یا یہ کہ عبداللہ ابن سلام آنحضرت ﷺ کی آمد کی خبر سن کر آپ ﷺ کی خدمت میں جس عجلت و اشتیاق کے ساتھ حاضر ہوئے اس کو ان الفاظ کے ذریعہ مبالغہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے مطلب یہ کہ عبداللہ ابن سلام اگر چاہتے تو اپنا کام کاج نمٹانے کے بعد فرصت کے وقت اور اطمینان سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے، لیکن انہوں نے چونکہ تورات میں آنحضرت ﷺ کی صفات و خصوصیات کو پڑھ رکھا تھا اور نبی آخر الزمان کے ظہور کے شدت سے منتظر تھے اس لئے جوں ہی ان کو آنحضرت کی آمد کی خبر ملی وہ ذرا بھی توقف کئے بغیر خدمت اقدس میں پہنچ گئے ؎

مدتے برد کہ مشتاق نقایت بودم لاجرم روئے ترا دیدار واز جارفتم

عبداللہ ابن سلام کا سلسلہ نسب حضرت یوسف علیہ السلام سے ملتا ہے، یہود مدینہ کے سرداروں میں سے تھے، بڑے عقل مند و عالم، دانشور اور تورات پر زبردست عبور رکھتے تھے، آنحضرت ﷺ، مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو یہ اس تشریف آوری کا علم ہوتے ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایمان و اسلام کی دولت سے سرفراز ہو کر نہایت اونچے درجہ کے صحابہ کرام میں شمار ہوئے۔ رضی اللہ عنہ۔

"جن کو نبی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔" اس سے عبداللہ ابن سلام کی یہ مراد تھی کہ میں جو تین چیزیں پوچھ رہا ہوں ان کے بارے میں صحیح بات جاننا اور بتانا صرف نبی کے بس میں ہے۔ نبی کے علاوہ وہی شخص جان سکتا ہے جس کو یا تو نبی نے بتایا ہو یا اس نے خدا کی کتاب سے معلوم کیا ہو۔ یہ بیان مراد اس لئے ضروری ہے کہ خود عبداللہ ابن سلام بھی تو ان چیزوں کے بارے میں اجمالی و تفصیلی طور پر جانتے تھے اور ان کو یہ علم تورات سے حاصل ہوا تھا اور ان سوالات سے ان کا اصل مقصد آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت کی تصدیق حاصل کرنا تھا، ان تینوں چیزوں کے جوابات گویا ان کے حق میں آنحضرت کا معجزہ ثابت ہوئے اور ان کو آنحضرت ﷺ کی رسالت و نبوت کا

علم یقین حاصل ہوا اور غالباً اسی مناسبت سے اس حدیث کو یہاں معجزات کے باب میں نقل کیا گیا ہے۔

"ابھی ابھی جبرئیل علیہ السلام نے مجھے ان سوالوں کے جواب سے آگاہ کیا ہے۔" اپنے سوالات کے جواب سن کر عبداللہ ابن سلام کو یہ وہم اور شبہ ہوسکتا تھا کہ انہوں نے (یعنی آنحضرت ﷺ نے) شاید کسی اہل کتاب (تورات جاننے والے) سے پہلے ہی یہ باتیں سن رکھی ہوں گی۔ اور اسی بنیاد پر میرے سوالات کے جواب دیئے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس وہم اور شبہ کی راہ پہلے ہی روک دینے کے لئے واضح فرمایا کہ یہ جواب جو میں تمہارے سامنے بیان کررہا ہوں اللہ کی طرف سے جبرئیل نے مجھ تک پہنچائے ہیں، نیز ان الفاظ سے آپ ﷺ کا مقصد عبداللہ ابن سلام کو متنبہ فرمانا بھی تھا کہ گوش ہوش سے اپنے سوالات کے جواب سنو، علاوہ ازیں ان کو وجود وحی اور نزول جبرئیل سے آگاہ کرنا بھی مقصود تھا۔

" اِذَاسبق ماءُ الرَّجُلِ الخ "میں سبق کے معنی ملا علی قاریؒ نے علا اور غلب لکھے ہیں اور ترجمہ میں اسی معنی کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اور شیخ عبدالحقؒ نے اس کے معنی "پیش میشود" یعنی رحم میں پہلے پہنچنا لکھے ہیں مطلب یہ ہے کہ مرد اور عورت میں جس کا پانی عورت کے رحم میں پہلے پڑتا ہے اس کی شکل وشباہت کی چھاپ اولاد پر پڑتی ہے، شیخ عبدالحقؒ نے بعد میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کے ماں باپ کے مشابہ ہونے کا سبب ان دونوں میں سے ایک کے پانی کا سبقت کرنا ہے جب کہ ایک اور حدیث میں جو باب الغسل میں نقل ہوئی ہے مشابہت کا سبب غلبہ۔ اور سبقت دونوں کو بتایا گیا ہے۔ اس اعتبار سے سبق کے معنی غلبہ اور سبقت دونوں کے ہوسکتے ہیں؟

جنگ بدر سے متعلق پیش خبری کا معجزہ

④ وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاوَرَ حِيْنَ بَلَغَنَا اِقْبَالُ اَبِىْ سُفْيَانَ وَقَامَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نُخِيْضَهَا الْبَحْرَ لَاَخَضْنَاهَا وَلَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَضْرِبَ اَكْبَادَهَا اِلٰى بَرْكِ الْغِمَادِ لَفَعَلْنَا قَالَ فَنَدَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ فَانْطَلَقُوْا حَتّٰى نَزَلُوْا بَدْرًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ وَيَضَعُ يَدَهٗ عَلَى الْاَرْضِ هٰهُنَا وَهٰهُنَا قَالَ فَمَا مَاطَ اَحَدُهُمْ عَنْ مَوْضِعِ يَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس وقت جب کہ ہمیں ابوسفیان کے آنے کی خبر ملی، (مدینہ والوں سے) صلاح مشورہ کیا تو سعد ابن عبادہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! اس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر آپ (ﷺ) ہمیں اپنی سواری کے جانوروں کو سمندر میں ڈال دینے کا حکم دیں تو بلاشبہ ہم ایسا ہی کریں گے (یعنی روئے زمین پر موقوف نہیں اگر آپ ﷺ کا حکم ہوگا تو ہم دشمن تک پہنچنے اور اس کا قلع قمع کرنے کے لئے سمندر میں اپنے گھوڑے دوڑا دیں گے) اور اگر آپ (ﷺ) کا حکم ہو کہ ہم اپنے اونٹوں اور گھوڑوں کے جگر کو برک غماد تک ماریں تو ہم بے شک ایسا ہی کریں گے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے تمام لوگوں یعنی مہاجرین و انصار کو (جنگ کے لئے) جوش و خروش سے بھر دیا اور تیار کیا اور سب لوگ روانہ ہوگئے یہاں تک کہ جب بدر کے مقام پر پہنچے (معرکہ آرائی کے لئے اس جگہ کو منتخب کیا گیا) تو رسول کریم ﷺ نے (مجاہدین اسلام کو مخاطب کرکے) فرمایا (دیکھو) یہ جگہ فلاں شخص کے ہلاک ہونے اور اس کی نعش گرنے کی ہے (اور اس جگہ فلاں شخص قتل ہوکر گرے گا) اس طرح آپ ﷺ مکہ کے کفار و اشقیاء کے نام لیتے جاتے تھے اور) زمین پر (ایک ایک جگہ) ہاتھ رکھتے (اور کہتے جاتے تھے کہ) فلاں شخص یہاں مرکر گرے گا اور فلاں شخص کی لاش یہاں گرے گی۔" حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے جہاں جہاں ہاتھ رکھ دیا تھا وہاں سے ایک شخص بھی متجاوز نہیں ہوا۔" (مسلم)

تشریح: "جب کہ ہمیں ابوسفیان کے آنے کی خبر ملی۔" یہ غزوۂ بدر کے ابتدائی مرحلہ کا ذکر ہے کہ مکہ کا ایک سردار ابوسفیان اپنے تجارتی قافلہ کے ہمراہ ملک شام سے مکہ واپس آرہا تھا، قافلہ میں آدمی تو صرف چالیس سوار تھے لیکن مال اسباب بہت زیادہ تھا، جب مدینہ میں مسلمانوں کو ابوسفیان کے اس تجارتی قافلہ کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے اہل مکہ پر بھرپور اقتصادی ومالی ضرب لگانے کے لئے اس موقع کو غنیمت جانا، ان کا خیال تھا کہ قافلہ کے چالیس سواروں کو زیر کر کے ان تمام مال و اسباب پر قبضہ کرلیا جائے گا، لیکن اول تو خود ابوسفیان کو مسلمانوں کے حملہ کی اطلاع مل گئی اور اس نے عام راستہ چھوڑ کر ساحلی راستہ اختیار کرلیا جس سے مسلمانوں کی زد سے وہ محفوظ ہو گیا دوسرے یہ خبر مکہ بھی پہنچ گئی اور اہل مکہ نے مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ کرنے کا ارادہ کرلیا، چنانچہ ابوجہل نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اہل مکہ کو مسلمونوں کے خلاف للکارا اور انہیں نہایت مشتعل کر کے جنگ پر آمادہ کیا! جب پوری تیاری ہوگئی تو ابوجہل زبردست حربی طاقت کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوا، راستہ میں کچھ لوگوں نے اس کو سمجھایا بھی کہ جب ہمارا قافلہ ساحلی علاقہ پر لگ گیا ہے اور مسلمانوں کی زد سے محفوظ واپس آرہا ہے تو اب مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لئے جانے میں کوئی عقلمندی نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ مکہ لوٹ جائیں لیکن ابوجہل کے تو زوال کا وقت آگیا تھا، اس نے لوگوں کا یہ مشورہ ماننے سے انکار کردیا اور بدر پہنچ گیا۔

اسی موقع پر حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور آنحضرت ﷺ کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں صورتوں میں سے ایک صورت کا وعدہ کیا ہے، چاہے قافلہ کو زیر کر کے مال حاصل کرلو اور چاہے (جنگ کر کے) دشمنوں پر فتح حاصل کرلو۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مہاجر و انصار صحابہ کو جمع کر کے مشورہ فرمایا کہ ابوسفیان تو ساحلی راستہ اختیار کر کے ہماری زد سے بچ گیا ہے اور اب جب کہ ابوجہل ہمیں نیست و نابود کردینے کا عزم لے کر زبردست فوجی طاقت کے ساتھ ہمارے مقابلہ پر نکل کھڑا ہوا ہے تو ہمیں کیا رویہ اور طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے! آنحضرت ﷺ کا یہ مشورہ طلب کرنا دراصل انصار مدینہ کو آزمانا اور ان کا ردعمل جاننا تھا، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ابتداء میں ان سے جو بیعت لی تھی اس میں یہ بات شامل نہیں تھی کہ وہ (انصار) جہاد کے لئے آنحضرت ﷺ کے ساتھ نکلیں گے اور دشمن کے مقابلہ پر مسلمانوں کی اقدامی کارروائی میں جانی و مالی مدد دیں گے، ان سے صرف اس بات پر بیعت لی گئی تھی کہ وہ ان لوگوں سے، آنحضرت ﷺ کی حفاظت کریں گے جو آپ پر حملہ آور ہوں گے، اس وقت یہ صورت حال تھی کہ کوئی دشمن آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں پر حملہ آور نہیں ہو رہا تھا بلکہ خود مسلمانوں کی طرف سے ابوسفیان کے تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا اور اس کے شاخسانہ کے طور پر اہل مکہ مسلمانوں سے جنگ کرنے نکل کھڑے ہوئے تھے، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے ضروری جانا کہ انصار سے مشورہ کر کے ان کا ردعمل جان لیا جائے کہ آیا وہ اس کارروائی میں ہماری مدد کرتے ہیں یا نہیں۔ آنحضرت ﷺ کو انصار کی طرف سے نہایت حوصلہ افزا جواب ملا انہوں نے نہ صرف اس موقع پر تن من، دھن سے جان نثاری کا ثبوت دیا بلکہ بعد میں بھی جب کوئی ایسا موقع آیا انہوں نے پوری یگانگت اور موافقت کے ساتھ خود کو آنحضرت اور مہاجرین کے دوش بدوش رکھا۔ آنحضرت ﷺ کے اس مشورہ طلب کرنے میں امت کے لئے بھی تلقین و ترغیب ہے کہ اپنے مسائل و معاملات میں اصحاب عقل و دانش اور اپنے رفقاء و معاونین سے مشورہ کرنا حسن مآل تک پہنچنے کا بابرکت ذریعہ ہے۔

"سعد ابن عبادہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا... جیسا کہ اوپر مذکور ہوا مشورہ طلب کرنے سے آنحضرت ﷺ کا اصل مقصد چونکہ انصار کا ردعمل جاننا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر حضرت سعد ابن عبادہ جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے جو انصار کے ایک سردار تھے انہوں نے آنحضرت ﷺ کو جواب دیا اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کسی بھی حالت میں آپ کی مدد کرنے سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ یہ تو بہت نزدیک کے دشمن کے مقابلہ پر جانے کی بات ہے اگر ہمیں دور دراز علاقوں میں جانے کا حکم دیں تو چاہے ہمیں زمین پر سفر کرنا پڑے چاہے سمندر میں اتر کر جانا پڑے ہم آپ ﷺ کے دشمنوں کا مقابلہ کریں گے۔

"برک غماد" ایک مقام کا نام تھا جو مدینہ سے بہت دور یمن میں واقع تھا، یا بحر کے پرلے کنارہ پر اور یا اس کی آبادیوں کے بالکل

آخری کنارہ پر تھا... اونٹوں یا گھوڑوں کے جگر کو مارنا، سواری کے جانور کو نہایت تیز ہانکنے سے کنایہ ہے۔ اور اس میں لفظی مناسبت یہ ہے کہ جب کوئی شخص مثلاً گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور گھوڑا تیز بھاگتا ہے تو سوار کے پیر اس گھوڑے کے جسم کے اس حصہ پر زور زور سے لگتے جاتے ہیں جہاں جگر ہوتا ہے اس جملہ کا مطلب یہی تھا کہ اگر آپ ہمیں اپنی سواریوں کو تیز بھگا کر برک غماد تک جو یہاں سے بہت دور واقع ہے، دشمن کے مقابلہ پر پہنچنے کا حکم دیں تو ہم آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں یہاں سے فوراً روانہ ہو جائیں گے اور کہیں رکے بغیر نہایت تیز رفتاری سے برک غماد پہنچ کر ہی دم لیں گے۔

حدیث کے آخر میں آنحضرت ﷺ کے ایک بڑے معجزہ کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے بدر کے مقام پر پہنچ کر جنگ شروع ہونے سے بھی پہلے ستر کافروں کی لاشیں گرنے کی جگہوں کے بارے میں بتادیا تھا، آپ ﷺ نے ان سب کے نام لے لے کر اور ایک ایک جگہ ہاتھ رکھ کر اپنے صحابہؓ کو آگاہ فرمایا تھا کہ ان میں سے فلاں شخص اس جگہ مقتول ہو کر گرے گا اور فلاں شخص کی لاش یہاں گرے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب جنگ شروع ہوئی اور مجاہدین اسلام نے کافروں کو قتل کرنا شروع کیا آپ ﷺ نے جس کافر کے لئے جس جگہ کا اشارہ فرمادیا وہ اسی جگہ مارا گیا اور اس کی لاش وہاں سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں گری۔

جنگ بدر کے دن آنحضرت ﷺ کی دعا

⑤ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَهُوَ فِيْ قُبَّةٍ يَوْمَ بَدْرٍ اَللّٰهُمَّ اَنْشُدُكَ عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ اَللّٰهُمَّ اِنْ تَشَأْلَا تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ فَاَخَذَ اَبُوْبَكْرٍ بِيَدِهٖ فَقَالَ حَسْبُكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَلْحَحْتَ عَلٰى رَبِّكَ فَخَرَجَ وَهُوَ يَثِبُ فِي الدِّرْعِ وَهُوَ يَقُوْلُ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جنگ بدر کے دن ایک خیمہ میں یہ دعا مانگ رہے تھے۔ "اے اللہ! میں تجھ سے تیری امان مانگتا ہوں اور تیرے وعدہ کا ایفاء چاہتا ہوں اے اللہ! اگر تو یہی چاہتا ہے (کہ یہاں دشمنوں کے مقابلہ پر مسلمان ہلاک ہو جائیں) تو (روئے زمین پر کوئی مسلمان باقی نہیں رہے گا اور) آج کے بعد تیری عبادت نہیں ہوگی" جب آپ ﷺ گڑگڑا کر یہ دعا مانگتے ہی رہے تو حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: یا رسول اللہ! بس کیجئے اتنا ہی دعا مانگنا بہت کافی ہے، آپ ﷺ نے بہت الحاح وزاری کے ساتھ اپنے پروردگار سے فتح و نصرت کی التجا کی ہے۔" اس کے بعد آنحضرت ﷺ زرہ پہنے ہوئے تھے (فرط مسرت سے) بڑی تیزی کے ساتھ اپنے خیمہ سے باہر آئے اور یہ آیت (جو اس وقت نازل ہوئی تھی) آپ ﷺ (باآواز بلند) پڑھ رہے تھے۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔

"(کفار کی) یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ اس روایت کو بخاری نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "تیرے وعدہ کا ایفاء چاہتا ہوں" یہ آپ ﷺ نے اس آیت، وَاِذْيَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ اور جب اللہ تعالیٰ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کرتے تھے کہ وہ تمہارے ہاتھ آجائے گی) کی طرف اشارہ کیا جس میں حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر مسلمان کفار مکہ سے جنگ کو اختیار کریں گے تو انہیں اس جنگ میں فتح عطا کی جائے گی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ تو عارف باللہ تھے اور خوب جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو وعدہ فرمالیتے ہیں اس کے خلاف نہیں ہوتا اور جب اللہ نے فتح کا وعدہ فرمالیا تھا تو وہ حاصل ہونی ہی تھی ایسی صورت میں آپ ﷺ نے دعا کیوں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اس دعا سے آپ کا مقصد اس حکم کی تعمیل تھا کہ بندہ کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے مدد و توفیق اور حصول مقصد کی دعا و التجا کرنی چاہئے خواہ اس مقصد کے حصول کا یقینی ہونا اس کو معلوم ہو یا نہ ہو، دوسرے یہ کہ علم باللہ بجائے خود حق تعالیٰ سے خوف، کا متقاضی ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام اس خوف سے خالی نہیں ہوتے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے محض اس خوف کے پیش نظر دعا کی ہو کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے فتح و

نصرت کا وعدہ فرمایا ہے، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ خود میری طرف سے کوئی ایسی چیز پیش آجائے جو فتح و نصرت کی راہ کی رکاوٹ بن جائے اور حق تعالیٰ کی طرف سے وہ موعودہ فتح و نصرت رد کردی جائے۔ نیز یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ سے نصرت کا وعدہ بیشک فرمایا تھا لیکن عطائے نصرت کا کوئی وقت متعین نہیں کیا تھا اور آنحضرت ﷺ تاخیر سے ڈرتے تھے اس لئے آپ ﷺ نے دعا مانگی کہ وہ وعدہ آج ہی پورا ہو جائے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ شاید اس موقع پر آنحضرت ﷺ کا ذہن اس آیت وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ اور اس آیت ان اللہ لغنی عن العلمین کے مفہوم کی طرف متوجہ ہو گیا ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی کامل بے پرواہی اور بے نیازی پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان آیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حق تعالیٰ سے مدد و نصرت کی دعا فرمائی۔ اسی بات کو امام غزالیؒ نے بھی لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا احساس و ادراک نہایت کامل تھا اور حق تعالیٰ کی شان بے نیازی اور اس کے سطوت و جلال کے تئیں آپ ﷺ کا علم و عرفان وسیع تر تھا اس لئے آپ ﷺ نے حق تعالیٰ کے وعدہ نصرت کے باوجود فتح کی دعا نہایت منت و سماجت کے ساتھ فرمائی جب کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نظر محض حق تعالیٰ کے ظاہری وعدہ پر تھی اس لئے انہوں نے زیادہ دعا کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر پورا بھروسہ اور اعتماد رکھنے کے باوجود آنحضرت ﷺ کا دعا کرنا اور اس دعا میں الحاح وزاری اختیار کرنا ایک خاص مقصد بھی رکھتا تھا، اور وہ تھا صحابہؓ اور مجاہدین اسلام کے دل کو تقویت دینا، ان کو ثابت قدم رکھنا اور ان میں ولولہ اور حوصلہ پیدا کرنا کیونکہ صحابہؓ جانتے تھے کہ آنحضرتؐ کی دعا یقینی طور پر مستجاب ہے، خصوصاً وہ دعا جو زیادہ سے زیادہ الحاح اور زاری سے ہو۔"

"فرط مسرت سے" بڑی تیزی کے ساتھ اپنے خیمہ سے باہر آئے....الخ۔ پہلے تو آنحضرتؐ خوف و رجاء کے درمیان تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کا یہ حتمی وعدہ نازل ہوا کہ دشمنوں کو شکست ہوگی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے تو رجاء (امید) کا پہلو غالب آگیا اور آپ کفار کے مقابلہ پر فتح کے احساس سے خوش ہو گئے، اسلامی مجاہدین کو کفار کی شکست اور مسلمانوں کی فتح کی خوش خبری دینے کیلئے آپ مذکورہ آیت باآواز بلند پڑھتے ہوئے خیمہ سے باہر تشریف لائے اور یہ ایک معجزہ تھا کہ دشمنوں کے مقابلہ پر مسلمانوں کی فتح کی بات جو اس وقت تک اللہ کے علاوہ اور کسی کے علم میں نہیں تھی، آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت و اطلاع پا کر لوگوں کو بتادی۔

جنگ بدر میں جبرئیل علیہ السلام کی شرکت

(۶) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَ بَدْرٍ هٰذَا جِبْرَئِيْلُ اٰخِذٌ بِرَاْسِ فَرَسِهٖ عَلَيْهِ اَدَاةُ الْحَرْبِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جنگ بدر کے دن فرمایا "یہ جبرئیل علیہ السلام ہیں جو اپنے گھوڑے کا سر (یعنی باگ) پکڑے ہوئے (لڑنے کے لئے مستعد کھڑے) ہیں، اور جنگ کا سامان لئے ہوئے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے اس معجزہ کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے جنگ بدر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے کفار کو شکست دلانے اور مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کرانے کے لئے آسمان سے اترے تھے۔ واضح رہے کہ "بدر" دراصل ایک کنوئیں کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان مدینہ سے چار منزل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ کفار مکہ اور اہل اسلام کے درمیان ہونے والی یہ پہلی باقاعدہ جنگ، جو ۱۷ رمضان سن ۲ھ جمعہ کے دن ہوئی۔ اس کنوئیں کے پاس ایک میدان میں ہوئی تھی اس لئے اس کو جنگ بدر یا غزوہ بدر کہا جاتا ہے۔

آسمانی کمک کا کشف و مشاہدہ

(۷) وَعَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ يَشْتَدُّ فِيْ اَثَرِ رَجُلٍ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اَمَامَهٗ اِذَا سَمِعَ ضَرْبَةً بِالسَّوْطِ فَوْقَهٗ وَصَوْتَ الْفَارِسِ يَقُوْلُ اَقْدِمْ حَيْزُوْمُ اِذَا نَظَرَ اِلَى الْمُشْرِكِ اَمَامَهٗ خَرَّ مُسْتَلْقِيًا فَنَظَرَ اِلَيْهِ فَاِذَا هُوَ قَدْ خُطِمَ اَنْفُهٗ

وَشُقَّ وَجْهُهُ كَضَرْبَةِ السَّوْطِ فَاخْضَرَّ ذٰلِكَ اَجْمَعُ فَجَآءَ الْاَنْصَارِيُّ فَحَدَّثَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ صَدَقْتَ ذٰلِكَ مِنْ مَدَدِ السَّمَآءِ الثَّالِثَةِ فَقَتَلُوْا يَوْمَئِذٍ سَبْعِيْنَ وَاَسَرُوْا سَبْعِيْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس دن (یعنی جنگ بدر کے دن) جب کہ ایک مسلمان ایک مشرک کا تعاقب کر رہا تھا جو آگے بھگا جا رہا تھا، تو اچانک اس (مسلمان) نے مشرک پر پڑتے ہوئے چابک کی آواز سنی، پھر اس نے ایک سوار کی آواز سنی جو یہ کہہ رہا تھا "حیزوم" اقدام کر... پھر اس مسلمان کی نظر اپنے آگے بھاگتے ہوئے مشرک کی طرف گئی تو دیکھا کہ وہ زمین پر چت پڑا ہوا ہے، اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس مشرک کی ناک پر نشان پڑا ہوا تھا اور اس کا منہ پھٹا ہوا تھا جو چابک کی مار کی علامت تھی اور وہ تمام جگہ جہاں چابک پڑا تھا سبز و سیاہ ہو گئی تھی (یعنی) جس طرح کوئی جگہ چوٹ کھا کر نیلی ہو جاتی ہے اسی طرح اس کی ناک کا وہ حصہ جس پر چابک کا وہ نشان نظر آ رہا تھا، نیلا پڑ گیا تھا۔ چنانچہ وہ انصاری مسلمان (جس نے اس مذکورہ مشرک کو مذکورہ حال میں دیکھا تھا) آنحضرت ﷺ کے پاس جب آیا تو آپ ﷺ سے (یہ سارا واقعہ) بیان کیا، آپ ﷺ نے (پورا واقعہ سن کر فرمایا، کہ تم سچ کہتے ہو، وہ فرشتہ (جس نے اس مشرک کو چابک مار کر ہلاک کیا) تیسرے آسمان کی فوجی کمک کا فرشتہ تھا" اس دن (کی جنگ میں) مسلمانوں نے ستر کافروں کو قتل کیا اور ستر کو گرفتار کر لیا تھا۔" (مسلم)

تشریح: "حیزوم اقدام کر" یہ اَقْدِمْ حَيْزُوْمُ کا ترجمہ کیا گیا ہے، اصل میں "اقدام" کے معنی ہیں! جنگ میں دشمن کو للکارنا اور خوفزدہ کرنا، اور جرءت و بہادری دکھانا! لیکن یہ معنی اس صورت میں مراد لئے جاتے ہیں جب لفظ اَقْدِمْ۔ ا کے زبر، ق کے جزم اور د کے زیر کے ساتھ ہو، اور اگر یہ لفظ آ اور دؔ کے پیش کے ساتھ ہو تو پھر اس کے معنی آگے بڑھنے کے ہوں گے، اس صورت میں اقدم حیزوم کا ترجمہ یہ ہوگا کہ حیزوم! آگے بڑھ کر... حیزوم حضرت جبرئیلؑ کے گھوڑے کا نام ہے جیسا کہ قاموس میں ذکر کیا گیا ہے، لیکن بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ ایک اور فرشتہ کے گھوڑے کا نام ہے۔

جنگ بدر میں مسلمانوں کو جو غیب سے آسمانی مدد حاصل ہوئی اور اس مدد سے تعلق رکھنے والے ایک فرشتہ کی کاروائی ایک صحابی پر مذکورہ بالا صورت میں جو کشف و اظہار ہوا وہ دراصل ان صحابی کی "کرامت" ہے۔ اور تابع "یعنی صحابیؓ" سے ظاہر ہونے والی کرامت چونکہ اس کے متبوع "یعنی نبی ﷺ" کے معجزہ ہی کی ایک صورت ہوتی ہے خاص طور سے ایسی حالت میں جب کہ وہ کرامت نبی ﷺ کی موجودگی میں ظاہر ہوئی ہو، اس کی مناسبت سے اس حدیث کا معجزات کے باب میں نقل کیا جانا غیر موزوں نہیں ہے... یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث میں جس واقعہ کا ذکر ہے اس کی خبر صحابی ثقہ نے دی اور صادق و مصدوق، (ﷺ) نے اس کی تصدیق کی اور یہ تصدیق صرف آپ کا کام تھا، جس کا علم اعجاز رسالت ہے ہے، لہٰذا اس واقعہ کو آنحضرت ﷺ کے معجزات میں شمار کرنا بھی صحیح ہے۔

جنگ احد میں فرشتوں کی مدد کا معجزہ

⑧ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ قَالَ رَاَيْتُ عَنْ يَمِيْنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَنْ شِمَالِهِ يَوْمَ اُحُدٍ رَجُلَيْنِ عَلَيْهِمَا ثِيَابٌ بِيْضٌ يُقَاتِلَانِ كَاَشَدِّ الْقِتَالِ مَا رَاَيْتُهُمَا قَبْلُ وَلَا بَعْدُ يَعْنِيْ جِبْرَئِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاص کہتے ہیں کہ میں نے احد کی لڑائی میں، رسول کریم ﷺ کے دائیں بائیں سفید کپڑوں میں ملبوس دو آدمیوں کو دیکھا (جن میں سے ایک تو آنحضرت ﷺ کے دائیں طرف اور ایک بائیں طرف تھا) اور وہ دونوں نہایت شدت کے ساتھ (ہمارے دشمنوں سے لڑ رہے تھے، ان دونوں کو میں نے نہ تو اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ اس کے بعد کبھی دیکھا (اس سے ثابت ہوا کہ وہ دونوں دراصل فرشتے (یعنی، حضرت جبرئیل اور میکائیل تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "یعنی حضرت جبرئیل اور میکائیل تھے" یہ وضاحت خود راوی نے کی ہے اور انہوں نے ان دونوں کا فرشتہ جبرئیل و میکائیل ہونا یا تو اسی بات سے سمجھا کہ نہ کبھی اس سے پہلے انہوں نے ان دونوں کو دیکھا تھا اور نہ اس کے بعد ہی کبھی دیکھا، یا انہوں نے خود

آنحضرت ﷺ سے سنا ہوگا کہ وہ دونوں اجنبی حضرت جبرئیل اور میکائیل تھے۔

دست مبارک کے اثر سے ایک صحابی کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ درست ہوگئی

⑨ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَهْطًا اِلٰى اَبِيْ رَافِعٍ فَدَخَلَ عَلَيْهِ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَتِيْكٍ بَيْتَهٗ لَيْلاً وَهُوَ نَائِمٌ فَقَتَلَهٗ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَتِيْكٍ فَوَضَعْتُ السَّيْفَ فِيْ بَطْنِهٖ حَتّٰى اَخَذَ فِيْ ظَهْرِهٖ فَعَرَفْتُ اَنِّيْ قَتَلْتُهٗ فَجَعَلْتُ اَفْتَحُ الْاَبْوَابَ حَتّٰى اَنْتَهَيْتُ اِلٰى دَرَجَةٍ فَوَضَعْتُ رِجْلِيْ فَوَقَعْتُ فِيْ لَيْلَةٍ مُقْمِرَةٍ فَانْكَسَرَتْ سَاقِيْ فَعَصَبْتُهَا بِعِمَامَةٍ فَانْطَلَقْتُ اِلٰى اَصْحَابِيْ ... فَانْتَهَيْتُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَدَّثْتُهٗ فَقَالَ اُبْسُطْ رِجْلَكَ فَبَسَطْتُ رِجْلِيْ فَمَسَحَهَا فَكَاَنَّمَا لَمْ اَشْتَكِهَا قَطُّ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ ؓ کی ایک جماعت کو ابورافع کی طرف بھیجا، چنانچہ (جب وہ جماعت اس کے قلعہ پر پہنچی تو ایک صحابی) عبداللہ ابن عتیکؓ رات کے وقت ابورافع کی خوابگاہ میں جب کہ سو رہا تھا، داخل ہوگئے اور اس کو مار ڈالا عبداللہ ابن عتیکؓ نے بیان کیا کہ میں نے ابورافع کے پیٹ پر تلوار رکھی یہاں تک کہ وہ پشت کے طرف سے باہر نکل گئی، جب میں نے سمجھ لیا کہ اس کا کام تمام ہوگیا ہے تب میں نے (قلعہ) کے دروازے کھولنے شروع کئے (تاکہ جماعت کے باقی لوگ بھی جو میرے ساتھ اس مہم میں آئے تھے، اندر آجائیں) اور پھر میں ایک زینہ پر پہنچا اور (اس خیال سے آگے زمین ہے) جونہی میں نے پاؤں رکھا پھیلی ہوئی چاندنی میں (اس طرح) گر پڑا (کہ) میری پنڈلی ٹوٹ گئی، میں نے اپنا عمامہ کھول کر پنڈلی کو باندھ لیا اور اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا (جو قلعہ کے نیچے کھڑے تھے) پھر میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے سارا ماجرا بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنا پاؤں پھیلاؤ! میں نے اپنا پاؤں پھیلا دیا، آنحضرت ﷺ نے میرے پاؤں پر اپنا دست مبارک پھیرا اور اسی وقت میرا پاؤں اس طرح اچھا ہوگیا جیسے اس میں کبھی کوئی تکلیف ہی نہیں ہوئی تھی۔" (بخاری)

تشریح: ابورافع ایک یہودی تاجر تھا، اس کی کنیت ابوالحقیق تھی نہایت بدظن اور کمینہ خصلت شخص تھا تمام طرح یہ بھی آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کا دشمن تو تھا ہی، لیکن اس نے اپنی عہد شکنیوں، فتنہ انگیزیوں اور اذیت رسانیوں سے آنحضرت ﷺ کو بہت زیادہ تنگ کر دیا تھا، اس بدبخت نے رسالت مآب ﷺ کی شان اقدس میں ناپاک ہجو بھی کہی تھی، آخر کار آنحضرت ﷺ نے مجبور ہو کر اس کے خلاف سخت کاروائی کرنے کا ارادہ فرمالیا، اور حضرت عبداللہ ابن عتیکؓ کی سرکردگی میں چند انصاری نوجوانوں کو اس کے قید کرنے یا قتل کر ڈالنے کے لئے بھیجا جو پہلے سے صورت حال کا اندازہ لگا کر اپنے محفوظ قلعہ میں محصور ہوگیا، عبداللہ ابن عتیکؓ ایک بڑی عجیب اور حیرت انگیز تدبیر کے ساتھ (جو واقعہ کی پوری تفصیل کے ساتھ تاریخ وسیر کی کتابوں کے علاوہ خود بخاری کی کتاب المغازی کی تفصیلی روایت میں مذکور ہے) پہلے اس کے قلعہ میں اور پھر جب رات کے کھانے کے بعد ابورافع سو گیا تھا اس کی خواب گاہ میں داخل ہوگئے اور اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

جب وہ اپنی کاروائی مکمل کر کے واپس ہونے لگے تو انہیں ایک زینہ سے اترنا پڑا اور وہ جب نیچے اتر رہے تھے تو چاند رات ہونے کی وجہ سے اندر زینہ تک اس طرح کی روشنی رہ گی جس میں نگاہ الجھ جاتی ہے، چنانچہ عبداللہ ابن عتیکؓ نے یہ سمجھ کر اپنا قدم اٹھایا کہ زینہ ختم ہوگیا ہے اور آگے زمین ہے مگر وہاں ابھی تک ایک زینہ باقی تھا اور ان کا پاؤں اس طرح پڑا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے گر گئے اس کی وجہ سے ان کی پنڈلی ٹوٹ گئی، بعد میں وہ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور پورا واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے ان کے پاؤں پر اپنا دست مبارک پھیرا اور اس کی برکت سے ٹوٹی ہوئی پنڈلی درست ہوگئی اور ساری تکلیف بھی جاتی رہی، یہ ذات رسالت کا اعجاز تھا۔

غزوۂ احزاب میں کھانے کا معجزہ

(۱۵) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنَّا يَوْمَ الْخَنْدَقِ نَحْفِرُ فَعَرَضَتْ كُدْيَةٌ شَدِيْدَةٌ فَجَاءُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا هٰذِهِ كُدْيَةٌ عَرَضَتْ فِي الْخَنْدَقِ فَقَالَ اَنَا نَازِلٌ ثُمَّ قَامَ وَبَطْنُهُ مَعْصُوْبٌ بِحَجَرٍ وَلَبِثْنَا ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ لَا نَذُوْقُ ذَوَاقًا فَاَخَذَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمِعْوَلَ فَضَرَبَ فَعَادَ كَثِيْبًا اَهْيَلَ فَانْكَفَأْتُ اِلَى امْرَأَتِي فَقُلْتُ هَلْ عِنْدَكِ شَيْءٌ فَاِنِّي رَأَيْتُ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْصًا شَدِيْدًا فَاَخْرَجَتْ جِرَابًا فِيْهِ صَاعٌ مِنْ شَعِيْرٍ وَلَنَا بُهَيْمَةٌ دَاجِنٌ فَذَبَحْتُهَا وَطَحَنَتِ الشَّعِيْرَ حَتّٰى جَعَلْنَا اللَّحْمَ فِي الْبُرْمَةِ ثُمَّ جِئْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَارَرْتُهُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ذَبَحْنَا بُهَيْمَةً لَنَا وَطَحَنْتُ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ فَتَعَالَ اَنْتَ وَنَفَرٌ مَعَكَ فَصَاحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَهْلَ الْخَنْدَقِ اِنَّ جَابِرًا صَنَعَ سُوْرًا فَحَيَّ هَلًا بِكُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُنْزِلُنَّ بُرْمَتَكُمْ وَلَا تُخْبِزُنَّ عَجِيْنَكُمْ حَتّٰى اَجِيْءَ وَجَاءَ فَاَخْرَجْتُ لَهُ عَجِيْنًا فَبَصَقَ فِيْهِ وَبَارَكَ ثُمَّ عَمَدَ اِلٰى بُرْمَتِنَا فَبَصَقَ وَبَارَكَ ثُمَّ قَالَ ادْعِ خَابِزَةً فَلْتَخْبِزْ مَعَكِ وَاقْدَحِي مِنْ بُرْمَتِكُمْ وَلَا تُنْزِلُوْهَا وَهُمْ اَلْفٌ فَاُقْسِمُ بِاللّٰهِ لَاَكَلُوْا حَتّٰى تَرَكُوْهُ وَانْحَرَفُوْا وَاِنَّ بُرْمَتَنَا لَتَغِطُّ كَمَا هِيَ وَاِنَّ عَجِيْنَنَا لَيُخْبَزُ كَمَا هُوَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ (یعنی صحابہؓ) خندق کے دن (یعنی غزوہ احزاب کے موقع پر دشمنوں سے بچاؤ کے لئے مدینہ کے گرد) خندق کھود رہے تھے کہ سخت پتھر نکل آیا (جو کسی طرح ٹوٹ نہیں رہا تھا) صحابہؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ کھدائی کی جگہ ایک سخت پتھر نکل آیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں خود (خندق میں) اتر کر دیکھوں گا، چنانچہ آپ ﷺ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اس وقت (شدت بھوک سے) آپ ﷺ کے شکم مبارک پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ اور ہم بھی لوگ تین دن سے اس حال میں تھے کہ ہم نے کچھ نہیں کھایا تھا کوئی چیز چکھی تک نہیں تھی، آنحضرت ﷺ نے کدال ہاتھ میں لیا اور (خندق میں اتر کر) پتھر پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ سخت پتھر ریت کی مانند (ذرہ ذرہ ہو گیا) بکھر گیا۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں وہاں سے اپنے گھر آیا اور اپنی بیوی (سہیلہ بنت معوذ انصاری سے) پوچھا کہ کیا تمہارے پاس (کھانے کی کوئی) چیز ہے؟ میں نے رسول کریم ﷺ پر بھوک کا شدید اثر دیکھا ہے (یہ سن کر) میری بیوی نے تھیلا نکال کر دیا جس میں تقریباً سیر جو تھے اور ہمارے ہاں بکری کا (دنبہ اور یا گھر کی پلی ہوئی بھیڑ کا) ایک چھوٹا سا بچہ تھا، میں نے اس بچہ کو ذبح کیا اور میری بیوی نے آٹا پیسا اور پھر ہم نے گوشت کو ہانڈی میں ڈال کر (چولہے پر) چڑھا دیا پھر میں نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچا اور آپ ﷺ سے چپکے سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم نے بکری کا ایک بچہ ذبح کیا ہے اور میری بیوی نے تقریباً ساڑھے تین سیر جو پیسے ہیں (اس طرح کچھ لوگوں کے لئے میں نے کھانا تیار کرا لیا ہے) اب آپ ﷺ چند لوگوں کے ساتھ تشریف لے چلئے۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے باآواز بلند اعلان کیا کہ خندق والو! چلو، جابرؓ نے تمہاری ضیافت کے لئے کھانا تیار کیا ہے، جلدی چلو۔ پھر آپ ﷺ نے (مجھ سے) فرمایا کہ تم جا کر کھانے کا انتظام کرو لیکن، اپنی ہانڈی چولہے سے نہ اتارنا اور نہ آٹا پکانا جب تک میں نہ آجاؤں۔ پھر آپ ﷺ (اپنے تمام ساتھیوں سمیت میرے ہاں، تشریف لائے، میں نے گندھا ہوا آٹا آپ ﷺ کے سامنے لا کر رکھ دیا، آپ ﷺ نے اس میں اپنا لعاب دہن ڈال کر برکت کی دعا فرمائی پھر ہانڈی کی طرف بڑھے اور اس میں لعاب دہن ڈال کر برکت کی دعا فرمائی اس کے بعد آپ ﷺ نے (میری بیوی کے بارے میں) فرمایا کہ روٹی پکانے والی کو بلاؤ تاکہ وہ تمہارے ساتھ روٹی پکا کر دیتی رہے اور تم چمچے سے ہانڈی میں سالن نکالتے رہو لیکن ہانڈی کو چولہے پر رہنے دینا۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ اس وقت خندق والے ایک ہزار آدمی تھے (جو تین دن سے بھوکے تھے) اور میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان سب نے (اس کھانے میں سے خوب شکم سیر ہو کر) کھایا لیکن کھانا (جوں کا توں) بچا رہا، جب وہ سب لوگ واپس ہوئے تو ہانڈی اسی طرح چولہے پر پک رہی تھی جیسی کہ پہلے تھی اور آٹا اسی طرح پکایا جا رہا تھا جیسا کہ وہ شروع میں تھا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حدیث میں لفظ "سور" جس کا ترجمہ ضیافت کا کھانا، کیا گیا ہے، دراصل فارسی کا لفظ ہے، جو آنحضرت کی زبان مبارک پر جاری ہوا، یہ لفظ اہل فارس کی اصطلاح میں "شادی کے کھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ اس لفظ کے علاوہ فارسی کے اور بھی کئی الفاظ مختلف مواقع پر آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے۔

کھانے کی اس مقدار نے جو چند ہی آدمیوں کے لئے کافی ہو سکتی تھی نہ صرف یہ کہ ایک ہزار آدمیوں کو شکم سیر کرا دیا بلکہ جوں کا توں بچ بھی گیا دراصل اس ذات گرامی کی برکت کا طفیل تھا جو تمام برکتوں کی منبع و مخزن ہے اور تمام ذات کائنات بلکہ زمین و آسمان ان ہی کی برکتوں سے معمور ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس طرح کے بے شمار معجزات یعنی کھانے کی قلیل مقدار کا بڑھ جانا انگلیوں سے پانی کا ابل پڑنا اور ذرا سے پانی کا بہت ہو جانا، کھانے سے تسبیح کی آواز آنا، کھجور کے درخت کے تنہ کا آہ و زاری کرنا، وغیرہ وغیرہ ایسے واقعات ہیں جو احادیث اور تاریخ و سیر کی کتابوں میں کثرت سے مذکور ہیں اور ان سے متعلق روایتیں حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں جن سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے، ان معجزات کو جو آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت کی دلیل ہیں، مختلف محقق علماء نے بڑی کاوش و محنت کر کے اپنی کتابوں میں جمع کیا ہے، اس سلسلہ میں زیادہ عمدہ کتاب امام بیہقیؒ کی دلائل النبوۃ کو مانا گیا ہے۔

عمار ابن یاسرؓ کے بارے میں پیشن گوئی

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِعَمَّارٍ حِیْنَ یَحْفِرُ الْخَنْدَقَ فَجَعَلَ یَمْسَحُ رَاْسَہٗ وَیَقُوْلُ بُؤْسَ ابْنُ سُمَیَّۃَ تَقْتُلُکَ الْفِئَۃُ الْبَاغِیَۃُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ عمار ابن یاسرؓ خندق کھود رہے تھے اور رسول کریم ﷺ ان کے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کے سر سے دھول مٹی جھاڑتے جاتے تھے اور یہ فرماتے جاتے تھے ہائے سمیہ کے بیٹے عمار ابن یاسرؓ) کی سختی و مصیبت تمہیں باغیوں کا گروہ قتل کر ڈالے گا۔" (مسلم)

تشریح: "سمیة" ایک صحابی خاتون کا نام ہے، انہوں نے بالکل شروع ہی میں مکہ میں اسلام قبول کیا تھا اور دوسرے مسلمانوں کی طرح یہ بھی کفار مکہ کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنی تھیں، ایک عورت ہو کر بھی انہوں نے ظالموں کے ہاتھوں سخت سے سخت اذیتیں اور مصیبتیں سہیں لیکن دین کے راستہ سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوئیں، آخر کار لعین ابوجہل نے ایک دن ان کی شرمگاہ میں خنجر مار کر ان کو شہید کر دیا، حضرت عمار ابن یاسرؓ اسلام کی ان ہی مایہ ناز خاتون کے عظیم سپوت تھے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب مدینہ کی حفاظت کے لئے صحابہ کرام خندق کھود رہے تھے تو حضرت عمار ابن یاسر بھی پوری جان فشانی اور محنت کے ساتھ اس کام میں مصروف تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھا ان کی محنت و مشقت کا احساس فرمایا اور پھر عالم الغیب نے آپ ﷺ پر منکشف کر دیا کہ عمارؓ کی موت باغیوں کے ہاتھوں ہوگی، چنانچہ آپ ﷺ کا قلب مبارک عمارؓ کے تئیں جذبہ ترحم و محبت سے لبریز ہو گیا اور آپ ﷺ کی زبان مبارک پر مذکورہ حسرتناک الفاظ جاری ہو گئے ان الفاظ میں آپ ﷺ نے یا تو عمارؓ کی سختی و مصیبت کو کیا مگر اصل مخاطب خود عمارؓ تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ عمارؓ مجھے تمہارے اوپر بڑا ترس آرہا ہے، تمہیں ایک دن ایسی سختی و مصیبت کا سامنا بھی کرنا ہوگا کہ باغیوں کی ایک جماعت جس نے امام برحق اور خلیفہ وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہوگا، تمہیں شہید کر دے گا۔

حدیث کا مصداق

شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اس پیشن گوئی کو پورا ہونا تھا اور وہ پوری ہوئی، حضرت عمارؓ ابن یاسر جنگ صفین میں امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے شریک ہوئے اور حضرت معاویہؓ کے گروہ کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس سے

معلوم ہوا کہ اس تنازعہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حق پر تھے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ عمارؓ کی موت باغیوں کے ہاتھوں ہوگی اور حضرت معاویہؓ کے گروہ نے انہیں قتل کر دیا۔ ایک روایت میں نقل کیا گیا ہے کہ جب اس جنگ میں حضرت عمارؓ شہید ہو گئے تو حضرت عمرو بن العاص جو حضرت معاویہ کے ساتھ تھے، نہایت سراسیمہ ہوئے اور حضرت معاویہؓ کے پاس آکر کہنے لگے یہ تو بڑی پریشانی کی بات پیدا ہوگئی کہ عمارؓ ہمارے لشکر کے ہاتھوں مارے گئے معاویہؓ نے کہا: کیوں اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ عمرو بن العاص نے کہا: میں نے آنحضرت ﷺ کو عمارؓ سے یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ تمہیں باغیوں کا گروہ قتل کرے گا۔ معاویہؓ نے جواب دیا: تو عمار کو ہم نے کب قتل کیا ہے، اصل میں تو علیؓ نے ان کو مارا ہے وہی ان کو اپنے ساتھ جنگ میں لائے تھے۔ یہ بھی منقول ہے کہ حضرت معاویہؓ اس حدیث کے الفاظ میں تاویل کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ لفظ باغیہ، یہاں بغی سے مشتق نہیں ہے جس کے معنی بغاوت کے ہیں بلکہ بغاء سے مشتق ہے جس کے معنی ڈھونڈھنا، طلب کرنا ہیں اس اعتبار سے ان کے نزدیک آنحضرت ﷺ کے ارشاد تقتلک الفئة الباغیة کا ترجمہ یہ ہوا کہ (عمار) تمہیں مطالبہ کرنے والوں کا ایک گروہ قتل کرے گا، مطلب یہ کہ جو گروہ قصاص اور خون بہا کا مطالبہ کرے گا، اسی کے ہاتھوں عمارؓ کا قتل ہوگا، چنانچہ حضرت معاویہ کہا کرتے تھے کہ: نحن فئة باغیة طالبة لدم عثمان (ہم مطالبہ کرنے والا گروہ ہیں۔ جو حضرت عثمانؓ کے خون بہا کا طالب ہے) لیکن عقل و نقل کی روشنی میں حضرت معاویہؓ کی یہ تاویل نہیں بلکہ صریح تحریف ہے۔ بعض روایتوں میں تو یہاں تک نقل کیا گیا ہے۔ کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت معاویہؓ کے سامنے مذکورہ پریشانی کا ذکر کیا تو معاویہؓ نے ان سے کہا کہ تم عجیب آدمی ہو، اپنے سے کمتر آدمی کے معاملہ میں پھسلے جاتے ہو یعنی عمارؓ تو تمہارے مقابلہ میں ایک ادنیٰ شخص تھے، پھر یہ کیا ہے کہ تم ان کا معاملہ لے کر تذبذب کا شکار ہو گئے ہو اور ہماری رفاقت سے الگ ہونا چاہتے ہو۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے شیخ اکمل الدین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ دونوں باتیں حضرت معاویہؓ پر افتراء ہے، انہوں نے نہ تو حدیث کی یہ تاویل کی ہے جو تحریف کے مرادف ہے اور نہ حضرت عمارؓ کے بارے میں ایسی پست بات کہی۔

انتباہ

بلاشبہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جو محاذ آرائی ہوئی اس میں حضرت علیؓ حق پر تھے اور جو لوگ بھی ان کی اطاعت سے باہر ہو کر جنگ کے لئے کمربستہ ہوئے انہوں نے "خراج" کیا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لوگ اس حدیث کو دیکھ کر اور اس کے محمول و مصداق کو جان کر حضرت معاویہؓ کے حق میں زبان لعن و طعن دراز کریں اور ان کی ذات کو ہدف ملامت کریں۔ راسخ العقیدہ اور صحیح الخیال مسلمان کے لئے صرف یہی نجات کی راہ ہے کہ اس نازک مسئلہ میں اپنی زبان کو روکے اور ان دونوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دے، حضرت معاویہؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے اور دربار رسالت میں بڑی عزت و اہمیت رکھتے تھے، ان کی شان میں کوئی بھی نازیبا بات زبان سے نکالنا صحابی کی شان میں گستاخی کرنا ہے اور صحابیؓ کی شان میں گستاخی کرنا اللہ کا عذاب مول لینا ہے، آنحضرت ﷺ نے اپنے تمام صحابہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: لوگو! میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان کو کبھی ہدف ملامت نہ بنانا (یاد رکھو!) جس شخص نے میرے صحابہؓ کو دوست رکھا اس نے مجھ سے محبت رکھنے کے سبب ان کو دوست رکھا اور جس شخص نے میرے صحابہؓ کو مبغوض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھنے کے سبب ان کو مبغوض رکھا اور جس شخص نے میرے صحابہ کو (اپنے قول و عمل سے) ایذا پہنچائی اس نے در حقیقت مجھ کو ایذا پہنچائی اور جس شخص نے مجھ کو ایذا پہنچائی اس نے (گویا) اللہ تعالیٰ کو ایذاء پہنچائی اور جس شخص نے اللہ کو ایذا پہنچائی اس کو جلد ہی اللہ تعالیٰ عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اس ارشاد گرامی کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور اس کتاب میں بھی آگے فضائل صحابہؓ کے باب میں ایسی بہت سی احادیث آئیں گی، نیز اس طرح کی بھی بہت حدیثیں منقول ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سکوت ہی میں بھلائی ہے، ان میں سے یہی ایک حدیث سبق حاصل کرنے کے لئے بہت کافی ہے کہ من سکت سلم و من سلم نجا (جس نے سکوت اختیار کیا سلامت رہا اور جو سلامت رہا نجات پا گیا)۔ اس کے علاوہ بعض حدیثیں خود حضرت معاویہؓ کی

فضیلت میں منقول ہیں، جیسے پیچھے باب علامت النبوۃ میں یہ حدیث گزر چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، میری اُمت میں سے ایسے لوگوں کی ایک جماعت میرے سامنے پیش کی گئی جن کو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے اور سمندر کی پشت پر اس طرح سفر کرتے ہوئے دکھایا گیا جیسے وہ بادشاہوں کی مانند تخت پر بیٹھے ہوں.... الخ۔" اس حدیث کا مصداق یہی حضرت معاویہؓ اور ان کے لشکر والے تھے جنہوں نے سمندر پار کر کے کفار کے ساتھ جہاد کیا۔ غرض یہ کہ حضرت معاویہؓ کی شان میں گستاخی کرنے ان سے بغض و نفرت رکھنے اور ان کو برا بھلا کہنے سے پوری طرح اجتناب کرنا چاہئے کیونکہ یہ رفض و شیعت کے عقائد میں سے ہے اللہ تعالیٰ اس قسم کے برے عقیدہ سے محفوظ رکھے"۔ بعض سنی بھی جہالت و نادانی کے سبب اس فتنہ کا شکار ہو جاتے ہیں اور صحابی کے حق میں نہایت نازیبا الفاظ و خیال کا اظہار کرتے ہیں! ملا علی قاریؒ نے شرح، فقہ اکبر میں صاف طور پر (حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ سے متعلق) اس معاملہ کو خطائے اجتہادی پر محمول کیا ہے۔ پس اہل سُنت کو تو خاص طور پر اس سلسلہ میں احتیاط کا دامن پکڑنا چاہئے! اور اپنے دل کو کسی بھی صحابی کے بغض سے پاک رکھنا چاہئے خواہ ان کا تعلق اہل بیت نبوی سے ہو، یا عام صحابہؓ کی جماعت سے، نیز آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد پر نظر رکھتے ہوئے اپنی زبان پر مہر سکوت لگا لینی چاہئے کہ:

لیحجرک عن النّاسِ ماتعلم من نفسک۔

اور جب عام لوگوں کے بارے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وَلاَ تذکر الناس الابخیر (لوگوں کا ذکر کرو تو اچھائی کے ساتھ کرو) تو صحابہؓ تو بدرجہ اولیٰ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے تذکرے میں ایسا کوئی لفظ نہ آئے جس سے ان کی شان اور ان کی حیثیت پر حرف آتا ہو، اور ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جن مقدس، ہستیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَنَزَعْنَامَافِیْ صُدُوْرِھِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًاعَلٰی سُرُرٍ مُتَقٰبِلِیْنَ (اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم سب دور کریں گے اور سب بھائی بھائی کی طرح رہیں گے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے، تو کیا یہ بدبختی نہیں ہے کہ ہم ان ہستیوں کے بارے میں طعن و تشنیع کے ذریعہ اپنی زبانیں گندی کریں۔

ایک پیش گوئی جو پوری ہوئی

⑫ وَعَنْ سُلَیْمَانَ بْنِ صُرَدٍ قَالَ قَالَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ اُجْلِیَ الْاَحْزَابُ عَنْہُ الْاٰنَ نَغْزُوْھُمْ وَلاَیَغْزُوْنَ نَحْنُ نُسِیْرُ اِلَیْھِمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سلیمان ابن صردؓ کہتے ہیں کہ جب غزوۂ احزاب سے دشمنوں کا لشکر بھاگ گیا (اور مدینہ منورہ کا محاصرہ ہٹ گیا) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اب دشمن ہم پر چڑھائی نہ کر سکیں گے، ہاں ہم ان سے جہاد کریں گے اور ان پر لشکر کشی کریں گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ غزوۂ خندق کا ذکر ہے جب تمام کفار بشمول یہود ہزارہا کی تعداد میں مدینہ پر چڑھ آئے تھے اور مدینہ کی حفاظت کے لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہؓ کے ساتھ مل کر شہر کے گرد خندق کھودی تھی، قریش کے لشکر کے سردار ابوسفیان تھے، اسی طرح مشرکین و کفار کے دوسرے گروہوں کے بھی اپنے الگ الگ سردار تھے، دشمن نے مسلسل ایک مہینہ تک مدینہ کا محاصرہ رکھا اور خندق کے اس پار ڈٹے رہے اس عرصہ میں کوئی باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی، کبھی کبھار تیر اندازی اور پتھراؤ کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے شروع ہو جاتا تھا، آخر کار اللہ تعالیٰ نے اپنی غیبی مدد ظاہر فرمائی، ملائکہ نازل ہوئے جو دشمن کی نگاہوں میں ظاہر نہ ہونے کے باوجود اس کے قلع قمع میں لگ گئے، ہوا اور آندھی کا ایسا سخت طوفان آیا جس نے کفار کے لشکر میں سخت ابتری پھیلا دی اور اس طرح ان کے دلوں میں ایسا خوف اور رعب بیٹھ گیا کہ پورا لشکر تتر بتر ہو کر بھاگ کھڑا ہوا، اسی مناسبت سے اس کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے، اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ آج مشرکوں کی ہمت بالکل ٹوٹ گئی ہے، اب کبھی بھی ہمارے دشمن کو ہم پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوگی، تو اب ہم ہی ان پر لشکر کشی کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس غزوہ کے بعد کفار کا لشکر مدینہ پر حملہ آور نہیں ہوا بلکہ رسول کریم ﷺ

نے مکہ اور دوسرے مقامات پر لشکر کشی فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ہر موقع پر مسلمانوں کو فتح دی۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام اور فرشتوں کی مدد کا معجزہ

(۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا رَجَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْخَنْدَقِ وَوَضَعَ السِّلَاحَ وَاغْتَسَلَ اَتَاهُ جِبْرَئِيْلُ وَهُوَ يَنْفُضُ رَاْسَهُ مِنَ الْغُبَارِ فَقَالَ قَدْ وَضَعْتَ السِّلَاحَ وَاللّٰهِ مَا وَضَعْتُهُ اُخْرُجْ اِلَيْهِمْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَيْنَ فَاَشَارَ اِلٰى بَنِىْ قُرَيْظَةَ فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْهِمْ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِىْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ قَالَ اَنَسٌ كَاَنِّىْ اَنْظُرُ اِلَى الْغُبَارِ سَاطِعًا فِىْ زُقَاقِ بَنِىْ غَنْمٍ مَوْكِبَ جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ حِيْنَ سَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى بَنِىْ قُرَيْظَةَ۔

"اور حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے غزوہ خندق سے واپس آکر (اپنے جسم سے) ہتھیار اتارے اور غسل (کا ارادہ) کیا تھا کہ آپ ﷺ کی خدمت میں حضرت جبرئیل آئے، درآنحالیکہ وہ اپنے سر سے (غزوہ خندق میں پڑی ہوئی) گرد و غبار جھاڑ رہے تھے، اور کہنے لگے کہ آپ ﷺ نے تو ہتھیار اتار کر رکھ دیئے اور قسم اللہ کی میں نے ابھی ہتھیار نہیں اتارے ہیں (جیسا کہ آپ ﷺ مجھے دیکھ ہی رہے ہیں) چلئے ابھی تو ان کافروں پر لشکر کشی کرنی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا: کہاں چلنا ہے، کس پر لشکر کشی کرنی ہے؟ حضرت جبرئیل نے بنی قریظہ کی طرف اشارہ کیا اور آنحضرت ﷺ (فوراً مسلح ہو کر اپنے صحابہ کے ساتھ بنی قریظہ کی طرف روانہ ہوگئے (جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فتح عطا فرمائی) (بخاری) اور بخاری کی ایک روایت میں حضرت انسؓ سے یہ الفاظ بھی منقول ہیں کہ۔ گویا میں اس غبار کو اب بھی دیکھ رہا ہوں جو بنوغنم کے کوچہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہمراہ چلنے والی (سوار فرشتوں کی) جماعت کے سبب اس وقت اٹھ رہا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ بنو قریظہ کی طرف جا رہے تھے۔"

تشریح: "غسل کیا تھا" سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے غسل کا ارادہ کیا تھا اور نہانے جا ہی رہے تھے کہ حضرت جبرئیل آگئے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ جس وقت حضرت جبرئیل آئے تو آپ ﷺ غسل کر رہے تھے، سر کا ایک حصہ دھونا باقی تھا، گویا اس وقت تک آپ ﷺ کا غسل پورا نہیں ہوا تھا۔ درآنحالیکہ وہ اپنے سر سے (غزوہ خندق میں پڑی ہوئی) گرد و غبار جھاڑ رہے تھے۔" اس میں "ہو" کی ضمیر حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور آنحضرت ﷺ کی طرف بھی، حاصل یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا آنا اور آنحضرت کا بنی قریظہ سے جنگ کے لئے روانہ ہونا غزوۂ خندق سے واپسی کے فوراً بعد کا واقعہ ہے۔

"بنو قریظہ" سے مراد یہودیوں کی وہ قوم ہے جو مدینہ شہر سے باہر تین چار میل کے فاصلہ پر آباد تھی، وہاں ان کی حویلیاں تھیں اور ایک بہت مضبوط قلعہ بھی تھا، انہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا اور آنحضرت ﷺ سے مصالحانہ معاہدہ کے باوجود غزوۂ خندق میں دشمنوں کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کی تباہی کا پورا منصوبہ بنایا تھا۔ بہر حال آنحضرت ﷺ نے ان سے جنگ کی اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فتح عطا فرمائی اس کی تفصیل تاریخ و سیر کی کتابوں میں مذکور ہے۔

"غنم" انصار کے ایک قبیلہ کا نام ہے، آنحضرت بنو قریظہ کی طرف جاتے ہوئے اس قبیلہ کے محلّہ سے گزرے تھے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس محلّہ کے گلی کوچہ میں لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی، اسی وجہ سے اس کوچہ میں اٹھتا ہوا گرد و غبار دیکھ کر حضرت انسؓ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فرشتوں کا لشکر ساتھ چل رہا ہے اور اس کے قدموں سے یہ گرد و غبار اٹھ رہا ہے، نیز غالب گمان یہ ہے کہ فرشتوں کے اس لشکر کے کمانڈر حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے جو یا تو لشکر کے ساتھ ہی تھے یا آنحضرت کے ہمراہ چل رہے تھے۔

اس حدیث میں جو چیز آنحضرت ﷺ کا معجزہ کو ظاہر کرتی ہے وہ ایک تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مسلح ہو کر اپنے لشکر سمیت آنحضرت ﷺ کے دشمنوں سے جنگ کے لئے آنا ہے اور دوسری چیز فرشتوں کے قدموں سے اٹھتے ہوئے گرد و غبار کا نظر ہے جب کہ خود

وہ فرشتے کسی کو نظر نہیں آرہے تھے۔

انگلیوں سے پانی نکلنے کا معجزہ

(۱۴) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ عَطِشَ النَّاسُ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ يَدَيْهِ رَكْوَةٌ فَتَوَضَّأَ مِنْهَا ثُمَّ أَقْبَلَ النَّاسُ نَحْوَهُ قَالُوْا لَيْسَ عِنْدَنَا مَاءٌ نَتَوَضَّأُ بِهِ وَنَشْرَبُ إِلَّا مَا فِيْ رَكْوَتِكَ فَوَضَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ فِي الرَّكْوَةِ فَجَعَلَ الْمَاءُ يَفُوْرُ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ كَأَمْثَالِ الْعُيُوْنِ قَالَ فَشَرِبْنَا وَتَوَضَّأْنَا قِيْلَ لِجَابِرٍ كَمْ كُنْتُمْ قَالَ لَوْ كُنَّا مِائَةَ أَلْفٍ لَكَفَانَا كُنَّا خَمْسَ عَشْرَةَ مِائَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ مقام حدیبیہ میں (ایک دن ایسا ہوا کہ پانی کی شدید قلت کے سبب) لوگوں کو سخت پیاس کا سامنا کرنا پڑا، اس وقت آنحضرت ﷺ کے پاس ایک لوٹا تھا جس سے آپ ﷺ نے وضو فرمایا تھا (اور اس میں بہت تھوڑا سا پانی بچا) لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہمارے لشکر میں پینے اور وضو کرنے کے لئے بالکل پانی نہیں ہے۔ بس وہی تھوڑا سا پانی ہے جو آپ ﷺ کے لوٹے میں بچ گیا ہے (اور ظاہر ہے) کہ اس سے سب لوگوں کا کام نہیں چل سکتا) آپ ﷺ نے (یہ سن کر) اپنا دست مبارک اس لوٹے (کے اندر یا اس کے منہ) میں ڈال دیا اور آپ ﷺ کی انگلیوں کے درمیان سے اس طرح پانی ابلنے لگا جیسے چشمے جاری ہو گئے ہوں۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ ہم سب لوگوں نے خوب پانی پیا اور وضو کیا۔ حضرت جابرؓ سے پوچھا گیا کہ اس موقع پر تم سب کتنے آدمی تھے؟ تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم ایک لاکھ (آدمی) ہوتے تب بھی وہ پانی کافی ہوتا، ویسے اس وقت ہماری تعداد پندرہ سو تھی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "ہم سب لوگوں نے خوب پانی پیا" کتنے قابل رشک تھے وہ لوگ جن کو اس مقدس پانی کے پینے کی سعادت نصیب ہوئی اور اس کے طفیل میں ظاہر و باطن کی کیسی پاکیزگی ان کو حاصل ہوئی، کیونکہ زمین و آسمان میں اس پانی سے زیادہ افضل اور کوئی پانی نہیں تھا۔

"اگر ہم ایک لاکھ ہوتے" حضرت جابرؓ کا یہ جواب ایک لطیف طنز تھا، کہ بھلا معجزہ کے معاملہ میں کمیت کے بارے میں پوچھنا بھی کوئی بات ہوئی! تاہم انہوں نے بعد میں واضح جواب دیا کہ اس وقت ہماری تعداد پندرہ سو تھی نیز انہوں نے "ایک ہزار پانچ سو" کہنے کے بجائے "پندرہ سو" اس نکتہ کے پیش نظر کہا کہ کثرت کا جو شدید تاثر "پندرہ سو" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے وہ "ایک ہزار پانچ سو" کے الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتا، علاوہ ازیں بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر مقام حدیبیہ میں جو صحابہ کرام موجود تھے وہ الگ الگ جماعتوں کی صورت میں تقسیم تھے اور ہر جماعت ایک سو افراد پر مشتمل تھی، لہٰذا حضرت جابرؓ نے "پندرہ سو" کے ذریعہ پندرہ جماعتوں کی طرف اشارہ کیا۔

آب دہن کی برکت سے خشک کنواں لبریز ہو گیا

(۱۵) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْبَعَ عَشْرَةَ مِائَةً يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ وَالْحُدَيْبِيَةُ بِئْرٌ فَنَزَحْنَاهَا فَلَمْ نَتْرُكْ فِيْهَا قَطْرَةً فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَتَاهَا فَجَلَسَ عَلَى شَفِيْرِهَا ثُمَّ دَعَا بِإِنَاءٍ مِنْ مَاءٍ فَتَوَضَّأَ ثُمَّ مَضْمَضَ وَدَعَا ثُمَّ صَبَّهُ فِيْهَا ثُمَّ قَالَ دَعُوْهَا سَاعَةً فَأَرْوَوْا أَنْفُسَهُمْ وَرِكَابَهُمْ حَتّٰى ارْتَحَلُوْا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ حدیبیہ میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ ہم چودہ سو افراد تھے، حدیبیہ میں ایک کنواں تھا جس کا پانی ہم سب نے کھینچ کر استعمال کر لیا تھا اور اس میں ایک قطرہ بھی پانی نہیں رہا تھا، جب نبی کریم ﷺ کو یہ معلوم ہوا (کہ کنواں خشک ہو گیا ہے اور پانی ختم ہو جانے کی وجہ سے لشکر کے تمام لوگ پریشان ہیں) تو آپ ﷺ کنویں پر تشریف لائے اور اس کے کنارے بیٹھ گئے، پھر

آپ ﷺ نے وضو کے پانی کا برتن منگا کر وضو کیا اور وضو کے بعد منہ میں پانی لیا اور دعا مانگی، اس کے بعد آپ ﷺ نے وہ آب دہن کنویں میں ڈال دیا اور فرمایا کہ ساعت بھر کنویں کو چھوڑ دو، اور پھر (ایک ساعت کے بعد کنویں میں اتنا پانی ہو گیا کہ) تمام لشکر والے خود بھی اور ان کے مویشی بھی خوب سیراب ہوئے اور جب تک وہاں سے کوچ کیا اسی کنویں سے پانی لیتے رہے۔" (بخاری)

تشریح: حضرت جابرؓ کی روایت میں پندرہ سو کی تعداد بیان کی گئی تھی جب کہ یہاں حضرت براءؓ کی روایت میں چودہ سو کی تعداد بیان کی گئی ہے، تو جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے، اصل تعداد چودہ سو سے زائد اور پندرہ سو سے کم تھی جس راوی نے کسر کو شمار کر کے بیان کیا اس نے پندرہ سو کی تعداد بیان کی اور جس راوی نے کسر کو چھوڑ دیا اس نے چودہ سو کی تعداد بیان کی۔ یا یہ کہ اہل حدیبیہ چونکہ جماعتوں میں تقسیم تھے اور ایسا ہوتا تھا کہ پانی کے لئے کچھ جماعتیں آتی تھیں تو کچھ جماعتیں پانی لے کر چلی جاتی تھیں اس صورت میں ۔ اوقت مجموعی تعداد چودہ سو ہو جاتی تھی اور کسی وقت پندرہ سو... لہٰذا جس راوی نے جو تعداد دیکھی اس کو بیان کر دیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے پہلے کل تعداد پندرہ سو تھی جس کو حضرت جابرؓ نے بیان کیا اور جب براءؓ نے بیان کیا تو اس وقت تعداد گھٹ کر چودہ سو ہو گئی تھی، ایک قول یہ بھی ہے کہ ان میں سے کسی بھی راوی نے ایک ایک آدمی کو شمار کر کے یقینی تعداد نہیں بیان کی ہے بلکہ جس نے جو بھی تعداد بیان کی اندازہ اور تخمینہ کے طور پر بیان کی ہے کسی نے چودہ سو کا اندازہ لگایا تو کسی نے پندرہ سو کا۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ اس واقعہ سے کہ جس کو حضرت براءؓ نے بیان کیا ہے، پہلے کا ہے اور حدیبیہ میں اس طرح کے معجزے متعدد بار ظہور میں آئے لہٰذا تعدد واقعہ کو دیکھتے ہوئے ان دونوں روایتوں میں بیان تعداد کا کوئی تضاد نہیں رہ جاتا۔

"ساعت بھر کنویں کو چھوڑ دو" کا مطلب یہ تھا کہ تھوڑی سی دیر کے لئے اس کنویں کو اسی طرح رہنے دو، ابھی اس میں سے پانی نکالنے کا ارادہ نہ کرو، کچھ دیر بعد جب کنواں بھر جائے گا تو اس میں سے پانی کھینچنا۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح آپ ﷺ نے یہ اشارہ فرمایا ہو کہ کنویں میں پانی بڑھ جانے کی جو دعا کی گئی ہے اس کی قبولیت کی ساعت بتدریج آئے گی۔

پانی میں برکت کا معجزہ

(۱۶) وَعَنْ عَوْفٍ عَنْ اَبِیْ رَجَآءٍ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ قَالَ کُنَّا فِیْ سَفَرٍ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاشْتَکٰی اِلَیْہِ النَّاسُ مِنَ الْعَطَشِ فَنَزَلَ فَدَعَا فُلَانًا کَانَ یُسَمِّیْہِ اَبُوْرَجَاءٍ وَنَسِیَہٗ عَوْفٌ وَ دَعَا عَلِیًّا فَقَالَ اذْھَبَا فَابْتَغِیَا الْمَآءَ فَانْطَلَقَا فَتَلَقَّیَا امْرَاَۃً بَیْنَ مَزَادَتَیْنِ اَوْسَطِیْحَتَیْنِ مِنْ مَآءٍ فَجَاءَ ابِھَا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاسْتَنْزَلُوْھَا عَنْ بَعِیْرِھَا وَ دَعَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِاِنَآءٍ فَفَرَّغَ فِیْہِ مِنْ اَفْوَاہِ الْمَزَادَتَیْنِ وَنُوْدِیَ فِی النَّاسِ اسْقُوْا فَاسْتَقُوْا قَالَ فَشَرِبْنَا عِطَاشًا اَرْبَعِیْنَ رَجُلًا حَتّٰی رَوِیْنَا فَمَلَانَا کُلَّ قِرْبَۃٍ مَعَنَا وَ اِدَاوَۃٍ وَایْمُ اللّٰہِ لَقَدْ اُقْلِعَ عَنْھَا وَ اِنَّہٗ لَیُخَیَّلُ اِلَیْنَا اَنَّھَا اَشَدُّ مِلْئَۃً مِنْھَا حِیْنَ ابْتُدِئَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عوف (تابعی) حضرت ابورجاءؒ (تابعیؒ) سے اور وہ حضرت عمران ابن حصینؓ (صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی حضرت عمرانؓ نے) بیان کیا: ایک سفر میں ہم (کچھ صحابہؓ) نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، ایک موقع پر لوگوں نے آپ سے (پانی نہ ہونے کے سبب) پیاس کی شکایت کی، آپ ﷺ (یہ سن کر) اسی جگہ اتر پڑے اور فلاں شخص کو بلایا۔ اس فلاں شخص کا نام ابورجاءؒ نے تو بیان کیا تھا لیکن (ان کے بعد کے راوی) عوفؒ اس شخص کا نام بھول گئے اس لئے انہوں نے اس شخص کو لفظ فلاں سے تعبیر کیا۔ نیز آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھی طلب کیا اور ان دونوں کو حکم دیا کہ جاؤ پانی تلاش کرو، چنانچہ وہ دونوں (یعنی وہ شخص اور حضرت علیؓ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر پھرنے لگے، انہوں نے ایک جگہ ایک عورت کو دیکھا، جو اونٹ پر (لٹکے ہوئے) دو مشکیزوں کے درمیان بیٹھی تھی، یا یہ کہ پانی کے دو سطیحوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی، دونوں حضرات اس عورت کو، (اس کے مشکیزے سمیت) نبی کریم ﷺ

کے پاس لائے، پھر اس عورت کو (یا جیسا کہ بعض حضرات نے لکھا ہے اس کے مشکیزوں کو اونٹ سے اتار اگیا، نبی کریم ﷺ نے ایک برتن منگا کر اس میں دونوں مشکیزوں کے دہانوں سے پانی انڈیلنے کا حکم دیا اور پھر لوگوں کو آواز دی گئی کہ آؤ پانی پیو اور پلاؤ (اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لو...) چنانچہ سب لوگوں نے خوب پانی پیا (اور اپنے اپنے برتنوں میں اچھی طرح بھر بھی لیا)۔ حضرت عمران ؓ کہتے ہیں کہ اس وقت ہم لوگ چالیس آدمی تھے جو بری طرح پیاسے تھے ہم سب نے اس برتن میں سے خوب سیر ہو کر پانی پیا بھی اور اپنی اپنی مشکیں اور چھاگلیں بھی ہمارے ساتھ تھیں اچھی طرح بھر لی گئیں، خدا کی قسم جب ہم لوگوں کو روک دیا گیا یعنی جب ہم پانی لے لے کر اس چھاگل کے پاس سے ہٹے تو ہم نے محسوس کیا کہ چھاگل پہلے سے زیادہ بھری ہوئی ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب نے اس چھاگل سے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور جس جس کے پاس جو بھی برتن تھا اس کو اچھی طرح بھر بھی لیا گیا، اس کے بعد اس چھاگل میں نہ صرف یہ کہ پانی جوں کا توں موجود تھا بلکہ یہ ایسا محسوس ہوا کہ یہ چھاگل اس وقت سے بھی زیادہ بھری ہوئی ہے جب اس سے پانی لینا، شروع کیا گیا تھا۔ اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں جو یہاں نقل نہیں ہوئے ہیں کہ: اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو کھانا اور غلہ وغیرہ دیا، جب وہ وہاں سے واپس ہو کر اپنی قوم میں پہنچی تو لوگوں سے سارا ماجرا بیان کر کے کہنے لگی کہ وہ شخص یا تو اتنا بڑا جادوگر ہے کہ اس کے برابر کوئی جادوگر زمین وآسمان میں نہیں ہے یا وہ شخص نبی برحق ہے۔

درختوں کی اطاعت کا معجزہ

(۱۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سِرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى نَزَلْنَا وَادِيًا اَفْيَحَ فَذَهَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْضِىْ حَاجَتَهٗ فَلَمْ يَرَ شَيْئًا يَسْتَتِرُ بِهٖ وَاِذَا شَجَرَتَيْنِ بِشَاطِئِ الْوَادِىْ فَانْطَلَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اِحْدٰهُمَا فَاَخَذَ بِغُصْنٍ مِّنْ اَغْصَانِهَا فَقَالَ انْقَادِىْ عَلَىَّ بِاِذْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَانْقَادَتْ مَعَهٗ كَالْبَعِيْرِ الْمَخْشُوْشِ الَّذِىْ يُصَانِعُ قَائِدَهٗ حَتّٰى اَتَى الشَّجَرَةَ الْاُخْرٰى فَاَخَذَ بِغُصْنٍ مِّنْ اَغْصَانِهَا فَقَالَ انْقَادِىْ عَلَىَّ بِاِذْنِ اللّٰهِ فَانْقَادَتْ مَعَهٗ كَذٰلِكَ حَتّٰى اِذَا كَانَ بِالْمَنْصَفِ مِمَّا بَيْنَهُمَا قَالَ الْتَئِمَا عَلَىَّ بِاِذْنِ اللّٰهِ فَالْتَأَمَتَا فَجَلَسْتُ اُحَدِّثُ نَفْسِىْ فَحَانَتْ مِنِّىْ لَفْتَةٌ فَاِذَا اَنَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُقْبِلًا وَاِذَا الشَّجَرَتَيْنِ قَدِ افْتَرَقَتَا فَقَامَتْ كُلُّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا عَلٰى سَاقٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ایک جگہ پہنچ کر ایک وسیع وعریض میدان میں اترے اور رسول کریم ﷺ قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے وہاں آپ ﷺ کو (ٹیلہ وغیرہ کی طرح کی) کوئی چیز ایسی نظر نہیں آئی جس کی اوٹ میں آپ ﷺ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر قضائے حاجت کے لئے بیٹھ سکتے، اچانک آپ ﷺ کی نظر دو درختوں پر پڑی جو میدان کے کنارہ پر کھڑے تھے، چنانچہ رسول کریم ﷺ ان میں ایک درخت کے پاس پہنچے اور اس کی ایک ٹہنی پکڑ کر فرمایا کہ خدا کے حکم سے (اوٹ بننے کے لئے) میری اطاعت کر۔ یہ سنتے ہی وہ درخت آپ ﷺ کے سامنے زمین پر) اس طرح جھک گیا جیسے نکیل پڑا ہوا اونٹ (اپنے ہانکنے والے کی اطاعت کرتا ہے) پھر آپ دوسرے درخت کے پاس پہنچے اور اس کی ایک ٹہنی پکڑ کر فرمایا کہ خدا کے حکم سے میری اطاعت کر، پہلے درخت کی طرح اس درخت نے بھی فوراً اطاعت کی (اور زمین پر جھک گیا) اس کے بعد آپ ﷺ نے ان دونوں درختوں کے درمیانی فاصلہ کے بیچوں بیچ پہنچ کر فرمایا کہ اب تم دونوں خدا کے حکم سے (ایک دوسرے کے قریب آکر) آپس میں اس طرح مل جاؤ کہ میں تمہارے نیچے چھپ جاؤں، چنانچہ وہ دونوں درخت مل گئے (اور آپ ﷺ ان دونوں درختوں کی اوٹ میں بیٹھ کر قضائے حاجت سے فارغ ہوئے۔ حضرت جابر ؓ کہتے ہیں کہ میں (اس واقعہ کو دیکھ کر حیران تھا اور اس عجیب وغریب کرشمہ سے متعلق غور وفکر کر کے سوچ

رہا تھا کہ اللہ نے اپنے محبوب نبی ﷺ کے ذریعہ یہ کیسا معجزہ ظاہر کیا ہے، یا یہ کہ اس واقعہ سے الگ میں اپنی کسی گہری سوچ میں پڑا ہوا تھا، کہ اچانک میری نظر ایک طرف کو اٹھی تو رسول کریم ﷺ کو تشریف لاتے دیکھا اور پھر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں درخت ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنی اپنی جگہ پر جا کھڑے ہوئے ہیں۔" (مسلم)

زخم سے شفایابی کا معجزہ!۔

⑱ وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ اَبِيْ عُبَيْدٍ قَالَ رَاَيْتُ اَثَرَ ضَرْبَةٍ فِيْ سَاقِ سَلَمَةَ ابْنِ الْاَكْوَعِ فَقُلْتُ يَا اَبَا مُسْلِمٍ مَا هٰذِهِ الضَّرْبَةُ قَالَ ضَرْبَةٌ اَصَابَتْنِيْ يَوْمَ خَيْبَرَ فَقَالَ النَّاسُ اُصِيْبَ سَلَمَةُ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَفَثَ فِيْهِ ثَلٰثَ نَفَثَاتٍ فَمَا اشْتَكَيْتُهَا حَتَّى السَّاعَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت یزید ابن عبید (تابعی) کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے حضرت سلمہ ابن اکوع ؓ کی پنڈلی پر زخم کا نشان دیکھ کر ان سے پوچھا کہ ابو مسلم! یہ کیسے زخم کا نشان ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ زخم خیبر کی لڑائی میں تھا (اور زخم بھی اتنا سخت تھا کہ) لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ سلمہ کام آگیا (یعنی زخم کی تاب نہ لا کر شہید ہو گیا) لیکن ہوا یہ کہ میں (اس زخم کے ساتھ) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچا، آپ ﷺ نے اس زخم پر تین بار دم کیا اور اس کی برکت سے وہ زخم (یک لخت) ایسا اچھا ہو گیا کہ پھر اب تک مجھ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" (بخاری)

ان دیکھے واقعہ کی خبر دینے کا معجزہ

⑲ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ نَعَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَيْدًا وَجَعْفَرًا وَ ابْنَ رَوَاحَةَ لِلنَّاسِ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ خَبَرُهُمْ فَقَالَ اَخَذَ الرَّايَةَ زَيْدٌ فَاُصِيْبَ ثُمَّ اَخَذَ جَعْفَرٌ فَاُصِيْبَ ثُمَّ اَخَذَ ابْنُ رَوَاحَةَ فَاُصِيْبَ وَعَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ حَتّٰى اَخَذَ الرَّايَةَ سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ اللّٰهِ يَعْنِيْ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيْدِ حَتّٰى فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے زید ؓ، جعفر ؓ اور ابن رواحہ ؓ کی شہادت کا حال، ان تینوں کے بارے میں خبر آنے سے پہلے ہی لوگوں کو سنا دیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: زید ؓ نے جھنڈا لیا اور وہ شہید ہو گئے۔ پھر جعفر ؓ نے جھنڈا لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ پھر ابن رواحہ ؓ نے جھنڈا لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ آپ ﷺ یہ بیان کر رہے تھے اور (ان شہداء کے غم میں) آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "آخر کار اس شخص نے جھنڈا لیا جو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔" حضرت انس ؓ یا بعد کے کسی راوی کا بیان ہے کہ) اس سے آنحضرت ﷺ کی مراد خالد بن ولید ؓ کی ذات تھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرما دی۔" (بخاری)

تشریح: یہ واقعہ جنگ موتہ کا ہے "موتہ" ایک جگہ کا نام ہے جو ملک شام میں واقع ہے، یہ جنگ سن ۸ ھجری میں رومیوں سے ہوئی تھی اور آنحضرت ﷺ نے وہاں لشکر بھیجتے ہوئے مذکورہ بالا تینوں جلیل القدر صحابہ کو نامزد فرمایا تھا کہ اگر جنگ کے دوران امیر لشکر زید بن حارث ؓ شہید ہو جائیں تو ان کے بعد جعفر ؓ امیر لشکر ہوں گے اور اسلام کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں ہو گا، چنانچہ اس جنگ میں ایسا ہی ہوا کہ یہ تینوں حضرات یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے اور پھر اسلامی لشکر نے حضرت خالد ابن ولید ؓ کو اپنا امیر چن لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائی۔ پس آنحضرت ﷺ کی شہادت کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آئی تھی، مقام موتہ سے ایک ماہ کی مسافت کے فاصلہ پر (مدینہ منورہ میں) بیٹھے بیٹھے اس واقع کی خبر دے دی تھی۔" یہ آپ ﷺ کا معجزہ ہوا۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ موت کی خبر پہنچانا جائز ہے۔

"جو اللہ کی تلوار میں ایک تلوار ہے۔ کا مطلب یہ ہے کہ: جو اللہ تعالیٰ کے بہادر ترین بندوں میں سے ایک بہادر تر بندہ ہے اور اسی مناسبت سے ان کا لقب سیف اللہ (اللہ کی تلوار) ہے، پس اس جملہ میں اللہ کی طرف تلوار کی نسبت، دراصل حضرت خالد ؓ کی عظمت اور

ان کی بے مثال شجاعت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے، چنانچہ منقول ہے کہ وہ دشمن کے ایک ایک ہزار سپاہیوں پر تنہا حملہ کر کے ان کو پچھاڑ دیتے تھے اور اس دن لڑتے لڑتے ان کے ہاتھ آٹھ تلواریں ٹوٹی تھیں۔"

"یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمادی۔" کے تحت محدثین اور شارحین کے اس بارہ میں اختلافی اقوال ہیں کہ اس جنگ میں دشمنوں کو کامل ہزیمت اور شکست اٹھانا پڑی تھی اور مسلمان مال غنیمت کے ساتھ فائز المرام لوٹے تھے۔ یا "فتح" سے مراد مسلمانوں کا اپنے دفاع میں کامیاب ہو جانا ہے، کہ اسلامی لشکر دشمن کی تباہ کن طاقت کا پامردی سے مقابلہ کر کے صحیح و سالم واپس آگیا تھا؟ حضرت شیخ عبدالحق نے یہاں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح عطا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رومیوں کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کی مدد فرمائی اور مسلمان ان کے ہاتھوں شکست و ہزیمت اٹھانے سے محفوظ رہے۔

غزوۂ حنین کا معجزہ

(۲۰) وَعَنْ عَبَّاسٍ قَالَ شَهِدْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ حُنَيْنٍ فَلَمَّا الْتَقَى الْمُسْلِمُوْنَ وَالْكُفَّارُ وَلَّى الْمُسْلِمُوْنَ مُدْبِرِيْنَ فَطَفِقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْكُضُ بَغْلَتَهٗ قِبَلَ الْكُفَّارِ وَاَنَا اٰخِذٌ بِلِجَامِ بَغْلَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكُفُّهَا اِرَادَةَ اَنْ لَّا تُسْرِعَ وَاَبُوْسُفْيَانَ بْنُ الْحَارِثِ اٰخِذٌ بِرِكَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَىْ عَبَّاسُ نَادِ اَصْحَابَ السَّمُرَةِ فَقَالَ عَبَّاسٌ وَكَانَ رَجُلًا صَيِّتًا فَقُلْتُ بِاَعْلٰى صَوْتِىْ اَيْنَ اَصْحَابُ السَّمُرَةِ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَكَاَنَّ عَطْفَتَهُمْ حِيْنَ سَمِعُوْا صَوْتِىْ عَطْفَةُ الْبَقَرِ عَلٰى اَوْلَادِهَا فَقَالُوْا يَا لَبَّيْكَ يَا لَبَّيْكَ قَالَ فَاقْتَتَلُوْا وَالْكُفَّارَ وَالدَّعْوَةُ فِى الْاَنْصَارِ يَقُوْلُوْنَ يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ قَالَ ثُمَّ قُصِرَتِ الدَّعْوَةُ عَلٰى بَنِىْ الْحَارِثِ بْنِ الْخَزْرَجِ فَنَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَلٰى بَغْلَتِهٖ كَالْمُتَطَاوِلِ عَلَيْهَا اِلٰى قِتَالِهِمْ فَقَالَ هٰذَا حِيْنَ حَمِىَ الْوَطِيْسُ ثُمَّ اَخَذَ حَصَيَاتٍ فَرَمٰى بِهِنَّ وُجُوْهَ الْكُفَّارِ ثُمَّ قَالَ انْهَزَمُوْا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ فَوَاللّٰهِ مَا هُوَ اِلَّا اَنْ رَمَاهُمْ بِحَصَيَاتِهٖ فَمَا زِلْتُ اَرٰى حَدَّهُمْ كَلِيْلًا وَاَمْرَهُمْ مُدْبِرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک تھا (ایک موقع پر) جب کہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان شدید خون ریزی ہوئی تو پشت دے کر مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے (یہ نازک صورت حال دیکھ کر) رسول کریم ﷺ نے اپنے خچر کو ایڑ لگانا اور (بلاخوف) کفار کی طرف بڑھنا شروع کیا، اس وقت میں تو رسول کریم ﷺ کے خچر کی لگام پکڑے ہوئے تھا، اور اس خیال سے اس کو روک رہا تھا کہ کہیں وہ تیزی کے ساتھ کافروں میں نہ جا گھسے، اور (آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی) ابوسفیان بن الحارث (جن کا اصلی نام مغیرہ بن حارث بن عبدالمطلب تھا، اظہار عقیدت و محبت اور محافظت کے طور پر) رسول کریم ﷺ کی رکاب تھامے ہوئے تھے، اسی دوران رسول کریم ﷺ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ عباسؓ!! اصحاب سمرہؓ کو آواز دو! حضرت عباسؓ جو ایک بلند آواز آدمی تھے، کہتے ہیں کہ میں نے (آنحضرت ﷺ کے حکم پر) پکار کر کہا: کہاں ہیں اصحاب سمرہ!؟ (کیا تم اپنی وہ بیعت بھول رہے ہو جو تم نے آنحضرت ﷺ کی مدد و حفاظت کے لئے درخت کے نیچے کی تھی!؟ حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم (میری یہ پکار سن کر) اصحاب سمرہ اس طرح لوٹے اور دوڑتے ہوئے آئے (فرط محبت و اشتیاق سے) جیسے گائیں اپنے بچوں کی طرف (دوڑتی ہوئی) لوٹ کر آتی ہے) اور وہ (اصحاب سمرہ) کہہ رہے تھے: اے قوم ہم حاضر ہیں، اے قوم ہم حاضر ہیں۔

اس کے بعد مسلمان از سر نو ہمت اور جوش کے ساتھ) کافروں سے بھڑ گئے۔ اور انصار صحابہؓ) نے آپس میں ایک دوسرے کو بلانے، اور حوصلہ دلانے کے لئے غازیوں کی مانند) اس طرح پکارنا شروع کیا: کہ اے گروہ انصار! اے گروہ انصار! ہمت سے کام لو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو) پھر یہ پکارنا قبیلہ بنو حارث بن خزرج تک محدود ہو گیا (یعنی صرف اولاد حارث ہی کو، جو انصار کا سب سے بڑا قبیلہ ہے، اے

اولاد حارث اے اولاد حارث: کہہ کرپکارا جانے لگا) اس دوران رسول کریم ﷺ نے، جو اپنے خچر پر ایک طاقتور اور قابو یافتہ سوار کی طرح جمے ہوئے تھے، لڑتے ہوئے مسلمانوں پر نظر ڈالی (اور بعض حضرات نے کالمتطاول کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جو "خچر پر گردن اونچی کر کے دیکھنے والے کی طرح بیٹھے ہوئے تھے، یعنی جس طرح کوئی اپنے سے دور کسی چیز کو دیکھنے کے لئے گردن اونچی کر کے نگاہ ڈالتا ہے اسی طرح آپ ﷺ نے کچھ کنکریاں ہاتھ میں اٹھائیں اور شَاهَتِ الْوُجُوْهُ کہتے ہوئے ان کنکریوں کو کافروں کے منہ پر پھینک مارا اور (اتو از راہ تفاول یا پیش خبری کے طور پر) فرمایا "رب محمد (ﷺ) کی قسم کافروں کو شکست ہوگئی۔" (حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ) خدا کی قسم! یہ شکست جو کافروں کو ہوئی صرف آپ ﷺ کی کنکریاں پھینکنے کے سبب ہوئی (کنکریاں پھینکنے کے بعد آخر تک) برابر دیکھتا رہا کہ کافروں کی تیزی اور شدت سے چلنے والی تلواریں ہلکی اور کند پڑ رہی تھیں اور ان کا انجام ذلت و خواری سے بھرا ہوا تھا۔"

تشریح: "حنین" مکہ اور طائف کے درمیان عرفات سے آگے ایک مقام کا نام ہے جہاں فتح مکہ کے بعد شوال سن ۸ ھ میں مسلمانوں اور اس علاقہ میں آباد مشہور قبائل ہوازن و ثقیف کے درمیان زبردست جنگ ہوئی تھی، ابتداء جنگ میں مسلمانوں کو دشمن فوج کی طرف سے صبح کاذب کی تاریکی میں اتنے سخت و شدید اور اچانک حملہ کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ (مسلمان) سراسیمہ ہو کر رہ گئے اور سب سے پہلے اہل مکہ میں سے وہ لوگ جو بالکل نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، حواس باختہ ہو کر بھاگے تو ان کو دیکھ کر انصار و مہاجر صحابہؓ بھی سخت پریشانی میں ادھر ادھر منتشر ہونے لگے وہ دراصل مدد اور تحفظ چاہنے کے لئے لوٹ لوٹ کر آنحضرت ﷺ کے پاس آ رہے تھے لیکن اس افراتفری میں محسوس یہ ہو رہا تھا کہ مسلمان پشت دے کر بھاگ رہے ہیں، جب کہ درحقیقت نہ انہوں نے پشت دکھائی تھی اور نہ وہ بھاگ کھڑے تھے، بہرحال مسلمانوں میں اس طرح کی ہلچل اور افراتفری ضرور پیدا ہوگئی تھی جس سے جنگ کا نقشہ مسلمانوں کے خلاف بھی ہو سکتا تھا لیکن آنحضرت ﷺ کی انتہائی شجاعت و استقلال، نہایت کامیاب حکمت عملی اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت نے تھوڑی ہی دیر بعد مسلمانوں کو سنبھال لیا اور دشمنوں کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا۔"

اس جنگ میں آنحضرت ﷺ جس خچر پر سوار تھے اس کا نام دلدل تھا اور فروہ ابن نفاثہ نے، جو ایک مشرک تھا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحفۃً بھیجا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ مشرکوں کا ہدیہ قبول کیا جا سکتا ہے، لیکن جیسا کہ احادیث میں منقول ہے آنحضرت ﷺ نے بعض مشرکوں کے ہدیے رد کر دیئے تھے، لہٰذا بعض حضرات نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا (دلدل) ہدیہ کا قبول کر لینا اس عمل کا ناسخ ہے کہ آپ ﷺ نے بعض مشرکوں کا ہدیہ قبول نہیں کیا تھا، لیکن یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ تاریخ کے تعین کے ساتھ یہ بات ثابت نہیں ہے کہ قبول کرنے کا واقعہ پہلے کا ہے یا رد کرنے کا واقعہ پہلے پیش آیا تھا؟ نیز اکثر حضرات کا قول یہ ہے کہ رد منسوخ نہیں ہے، آپ ﷺ نے جو قبول کیا تو اس مشرک کا ہدیہ قبول کیا جس کے مسلمان ہو جانے کی توقع اور جس کے ذریعہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کی امید آپ ﷺ کو تھی، اور جن مشرکوں کا معاملہ اس کے برعکس تھا ان کا ہدیہ آپ ﷺ نے رد کر دیا۔"

"سمرہ" کیکر کے درخت کو کہتے ہیں، حدیبیہ میں آپ ﷺ نے بہت سے صحابہ سے جس درخت کے نیچے جان نثاری کی بیعت لی تھی وہ کیکر کا درخت تھا اس بیعت کو "بیعت الرضوان" اور جن صحابہؓ سے بیعت لی گئی ان کو "اصحاب سمرہ" کہا جاتا ہے۔

"اصحاب سمرہ کو آواز دے دو" سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جو لوگ حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے اور جنہوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کی تھی ان کو آواز دے کر کہو کہ یہی وقت تمہاری آزمائش کا ہے اللہ کی راہ میں اور میری حمایت و حفاظت کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دینے کا تم نے جو عہد کیا تھا اب اس کو پورا کرنے کے لئے پہنچو۔

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے دو معجزوں کا ذکر ہے، ایک تو یہ کہ آپ ﷺ نے پہلے سے خبر دے دی کہ کفار کو شکست ہوگئی اور دوسرا معجزہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کنکریاں اٹھا کر دشمن کے منہ پر پھینکیں تو وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔"

غزوہ حنین میں آنحضرت ﷺ کی شجاعت و پامردی

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلْبَرَآءِ یَا اَبَا عُمَارَۃَ فَرَرْتُمْ یَوْمَ حُنَیْنٍ قَالَ لَا وَاللّٰہِ مَاوَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلٰکِنْ خَرَجَ شُبَّانُ اَصْحَابِہٖ لَیْسَ عَلَیْھِمْ کَثِیْرُ سِلَاحٍ فَلَقُوْا قَوْمًا رُمَاۃً لَا یَکَادُ یَسْقُطُ لَھُمْ سَھْمٌ فَرَشَقُوْھُمْ رَشْقًا مَایَکَادُوْنَ یُخْطِئُوْنَ فَاَقْبَلُوْا ھُنَاکَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی بَغْلَتِہِ الْبَیْضَاءِ وَ اَبُوْسُفْیَانَ بْنُ الْحَارِثِ یَقُوْدُہٗ فَنَزَلَ وَاسْتَنْصَرَ وَقَالَ اَنَا النَّبِیُّ لَاکَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ ثُمَّ صَفَّھُمْ رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَلِلْبُخَارِیِّ مَعْنَاہُ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَھُمَا قَالَ الْبَرَاءُ کُنَّا وَاللّٰہِ اِذَا احْمَرَّ الْبَاْسُ نَتَّقِیْ بِہٖ وَاِنَّ الشُّجَاعَ مِنَّا لَلَّذِیْ یُحَاذِیْ بِہٖ یَعْنِی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

"اور حضرت ابواسحق" (تابعی) روایت کرتے ہیں (ایک موقع پر) ایک شخص نے حضرت براء ابن عازب (صحابی) سے پوچھا کہ اے ابوعمارہ کیا (کیا یہ سچ ہے کہ) آپ لوگ غزوۂ حنین میں دشمن کے مقابلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ حضرت براء نے جواب دیا: نہیں خدا کی قسم رسول کریم ﷺ نے ہرگز پشت نہیں دکھائی تھی صرف اتنا ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے کچھ نوجوان صحابہ کا جن کے پاس زیادہ ہتھیار نہیں تھے (اچانک) ایک تیر انداز قوم (بنو ہوازن) سے مقابلہ ہوگیا، اس کے لوگ ایسے (خطرناک) تیر انداز تھے کہ ان کا تیر کوئی زمین پر نہیں گرتا تھا (یعنی نشانہ خالی نہ جاتا تھا) ان لوگوں نے نوجوان صحابہ پر تیر برسانا شروع کیا تو ان کا کوئی تیر خطا نہیں کررہا تھا، اس وقت وہ نوجوان صحابہ دشمن کے سامنے سے ہٹ کر رسول کریم ﷺ کے پاس آگئے۔ آنحضرت ﷺ (اس وقت) اپنے سفید خچر (دلدل) پر سوار تھے اور ابوسفیان ابن حارث (خچر کی لگام پکڑے ہوئے آگے تھے، آپ ﷺ (جنگ کا یہ پریشان کن نقشہ اور اپنے صحابہ کی سرآسیگی دیکھ کر) خچر سے اترے اور اللہ تعالیٰ سے مدد اور فتح کی دعا کی، آپ ﷺ نے (بآواز بلند یہ بھی فرمایا: میں نبی ہوں، اس میں کچھ جھوٹ نہیں ہے میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ اس کے بعد (جب کہ اسلامی لشکر دشمن کے مقابلہ کے لئے از سر نو ہمت و ولولہ کے ساتھ مستعد ہوا اور مذکورہ نوجوان آپ ﷺ کے پاس جمع ہوگئے تو) آپ ﷺ نے تمام مجاہدین کی صف بندی کی۔ (مسلم) اور بخاری نے بھی اسی مضمون کی روایت (اپنے الگ الفاظ میں) نقل کی ہے۔

نیز بخاری و مسلم کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ براء ابن عازب نے کہا، خدا کی قسم جب لڑائی سخت ہوئی، (یعنی دشمنوں کا حملہ سخت ہوجاتا اور ہم ہتھیاروں کی کمی یا کسی کمزوری کے سبب زیادہ دباؤ محسوس کرتے) تو آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ کر اپنی حفاظت کرتے (اور ذات گرامی کی برکت سے مدد و نصرت کے طلب گار ہوتے) بلاشبہ اس وقت ہم میں زیادہ بہادر اور شجاع وہی شخص تھا جو ان کے یعنی رسول کریم ﷺ کے برابر میں آکر کھڑا ہوجاتا تھا۔"

تشریح: "رسول کریم ﷺ نے ہرگز پشت نہیں دکھائی تھی"... حضرت براء ابن عازب کا یہ جواب نہایت ہوشمندی و سمجھداری اور ذات رسالت پناہ کے تئیں انتہائی ادب و احترام پر مبنی تھا، دراصل پوچھنے والے کا مطلب یہ تھا کہ کیا آپ سب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ اور "سب لوگ" میں چونکہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا سوال بھی پوشیدہ ہوسکتا تھا اس لئے حضرت براء نے سب سے پہلے تو بڑے زوردار انداز اور واضح الفاظ میں بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے نہ تو حقیقتاً پشت دکھائی تھی اور نہ آپ ﷺ ان لوگوں میں شامل تھے جو دشمن کے سامنے سے ہٹ آئے تھے اور جن پر صورۃً پشت دکھانے کا اطلاق ہوسکتا تھا، پھر حضرت براء نے اس وقت کی اصل صورت حال کی وضاحت کی کہ ان لوگوں نے بھی حقیقتاً پشت نہیں دکھائی تھی بلکہ ہوا یہ تھا کہ وہ چند نوجوان صحابہ جن کے پاس کافی ہتھیار نہیں تھے جب دشمن کے مدمقابل ہوئے تو ان پر ایک ایسی جماعت نے نہایت شدت سے تیر برسانا شروع کردیا جو تیر اندازی میں بہت ماہر اور کامیاب نشانہ باز تھی ان لوگوں کا کوئی تیر بھی خطا نہیں کررہا تھا، ایسی صورت میں ان نوجوان صحابہ نے یہی مناسب سمجھا

کہ بیکار اپنی جانیں گنوانے کے بجائے دشمن کے سامنے سے ہٹ جائیں اور آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچ کر اور آپ ﷺ کی مدد سے دشمن کے خلاف کوئی دوسرا محاذ بنائیں! پس دشمن کے سامنے سے وقتی طور پر ان کے لوٹ آنے کو پشت دکھانا یا فرار اختیار کرنا ہرگز نہیں کہا جاسکتا، وہ صرف مدد حاصل کرنے آئے تھے کہ کمک لے کر دشمن کے خلاف زیادہ مؤثر طور پر لڑسکیں۔" یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے حضرت عباسؓ کی روایت میں "پشت دے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔" کے الفاظ ہیں" جب کہ حضرت براءؓ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ صحابہؓ دشمن کے سامنے سے ہٹ کر آنحضرت ﷺ کے پاس آگئے۔ ان دونوں تعبیر بیان میں تضاد معلوم ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دشمن کے حملہ اور تیر اندازی کی شدت کے وقت شروع میں تو ایسا ہی دکھادیا کہ جیسے اسلامی لشکر کے لوگ میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں لیکن جب فوراً ہی آنحضرت ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوگئے اور حضرت عباسؓ نے ان کو پکارنا شروع کیا جس سے اسلامی لشکر میں جوش اور ولولہ کی ایک نئی لہر پیدا ہوگئی تو ان کو میدان چھوڑ کر بھاگنے کے بجائے آنحضرتؐ کی طرف متوجہ ہونے اور آپ ﷺ کے قریب پہنچ کر جمع ہونے کی سعادت حاصل ہوگئی تو اس طرح وہ عمل جو فرار کی صورت میں نظر آیا تھا بعد میں قرار و استقامت کی صورت میں بدل گیا پس حضرت عباسؓ نے تو ابتدائی صورت حال کا نقشہ کھینچا اور حضرت براءؓ نے بعد کی صورت حال بیان کی۔

اور ابوسفیان ابن حارثؓ (خچر کی لگام پکڑے ہوئے) آگے تھے... اس حدیث کا یہ جملہ بھی بظاہر حضرت عباسؓ کی روایت کے معارض ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خچر کی لگام تو حضرت عباس نے پکڑ رکھی تھی، اور حضرت ابوسفیانؓ رکاب تھامے ہوئے تھے؟ لیکن حقیقت میں ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد و تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ اس بات کو تناوب (باری باری پکڑنے) پر محمول کیا جاسکتا ہے، یعنی کبھی تو حضرت عباسؓ لگام پکڑتے ہوں گے اور کبھی ابوسفیان رکاب تھامے رہتے ہوں گے اور کبھی حضرت ابوسفیان لگام پکڑ لیتے ہوں گے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ایسا موقع آگیا ہو کہ دونوں حضرات کے لئے خچر کی لگام پکڑنا ضروری ٹھہرا ہو، لہٰذا ان دونوں روایتوں میں الگ الگ ان دونوں حضرات کا ذکر کیا گیا۔

میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں یہ انا النبی لاکذب انا ابن عبدالمطلب کا ترجمہ ہے اور اس جملہ کے لفظ کذب اور مطلب کے ب پر جزم ہے، جو اس جملہ کی شعری ترکیب پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہ جملہ آپ ﷺ کی موزونی طبیعت کے تحت بلا قصد آپ ﷺ کی زبان پر بروزن شعر جاری ہوگیا تھا لہٰذا اس کو شعر نہیں کہا جاسکتا۔ اس جملہ میں آپ ﷺ نے اپنی نسبت اپنے والد ماجد حضرت عبداللہ کی طرف نہ کرکے اپنے جد امجد عبدالمطلب کی طرف کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ عزت و بزرگی میں عبدالمطلب ہی زیادہ مشہور تھے۔ نیز اس جملہ میں آپ ﷺ نے اپنی جو تعریف کی تو یہ غرور و تکبر یا اپنی ذات و حیثیت کی نامناسب نمائش کے طور پر نہیں تھی بلکہ اس طرح کی تھی جیسے عام طور پر میدان جنگ میں غازی اور مجاہد دشمنوں کے سامنے اپنی شجاعت وجوانمردی کا اظہار کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ایسے مواقع پر اور اس مقصد سے اپنی تعریف کرنا جائز ہے۔

"اس وقت ہم میں زیادہ بہادر اور شجاع وہی شخص تھا... الخ" یعنی اس وقت میدان جنگ کا نقشہ اتنا خطرناک اور دشمن کا حملہ اتنا خوفناک تھا کہ کوئی بھی مسلمان آنحضرت ﷺ سے زیادہ پامردی کے ساتھ جمے رہنے پر قادر نہیں تھا زیادہ سے زیادہ ایسا تھا کہ جو لوگ بہت زیادہ بہادر اور جوانمرد تھے وہ ادھر ادھر سے آکر اس جگہ پہنچنے کی کوشش کرتے جہاں آنحضرت ﷺ ہوتے اس طرح وہ لوگ اپنے اس حوصلہ کا اظہار کرتے تھے کہ وہ کسی بھی حال میں آنحضرت ﷺ کو تنہا چھوڑ کر میدان جنگ میں نہیں جائیں گے بلکہ ذات گرامی سے مدد و حوصلہ پاکر دشمن کے خلاف سینہ سپر ہوں گے، اگر کوئی شخص بزدل ہوتا تو وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کے پاس آنے کے بجائے وہاں سے بھاگ کھڑے ہونے ہی میں اپنی عافیت دیکھتا۔ اس سے آنحضرت ﷺ کی بے پناہ شجاعت و بہادری اور اللہ کی ذات پر آپ ﷺ کے کامل اعتماد اور بھروسہ کا اظہار ہوتا ہے۔

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے اس معجزہ کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر اپنے خچر سے اتر کر اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت

کی دعا مانگی (اور کنکریاں اٹھا کر دشمن کے منہ پر پھینک ماریں) جس کے سبب اس طاقتور دشمن کو شکست فاش ہوئی۔

کنکریوں کا معجزہ

(۲۲) وَعَنْ سَلمَةَ ابْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُنَيْنًا فَوَلّٰى صَحَابَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا غَشُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزَلَ عَنِ الْبَغْلَةِ ثُمَّ قَبَضَ قَبْضَةً مِنْ تُرَابٍ مِنَ الْاَرْضِ ثُمَّ اسْتَقْبَلَ بِهٖ وُجُوْهَهُمْ فَقَالَ شَاهَتِ الْوُجُوْهُ فَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْهُمْ اِنْسَانًا اِلَّا مَلَأَ عَيْنَيْهِ تُرَابًا بِتِلْكَ الْقَبْضَةِ فَوَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ فَهَزَمَهُمُ اللّٰهُ وَقَسَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَنَائِمَهُمْ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سلمہ ابن اکوع ؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ (کافروں سے جہاد کے لئے) غزوہ حنین میں شریک تھے چنانچہ (اس غزوہ میں) جب رسول کریم ﷺ کے بعض صحابہ دشمن کے سامنے سے بھاگنے لگے اور کافروں نے رسول کریم ﷺ کو گھیر لیا تو آپ ﷺ اپنے خچر سے اترے اور زمین سے ایک مٹھی خاک اٹھائی (جس میں کنکریاں بھی تھیں) پھر اس خاک (اور کنکریوں) کو کافروں کے منہ کے سامنے پھینک مارا اور فرمایا: خراب ہوئے ان کے منہ (یا یہ کہ "خراب ہوں ان کے منہ") چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان میں کوئی ایسا انسان پیدا نہیں کیا تھا (یعنی اس وقت دشمنوں میں ایسا کوئی شخص نہیں تھا) جس کی دونوں آنکھوں کو اللہ تعالیٰ نے اس ایک مٹھی خاک سے بھر نہ دیا ہو، پھر تو سارے کافر بھاگ کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شکست دی اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے ان کے مال کو (جو بطور غنیمت ہاتھ لگا) مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں گویا تین معجزوں کا ذکر ہے، ایک تو یہ کہ آپ ﷺ نے جو ایک مٹھی مٹی کافروں کے منہ کی طرف، پھینک ماری وہ ان سب کی آنکھوں تک پہنچ گئی، دوسرے یہ کہ اتنی تھوڑی مٹی سے ان سب لوگوں کی آنکھیں بھر گئیں جن کی تعداد چار ہزار تھی اور تیسرے یہ کہ ظاہری طاقت کے بغیر محض اس مٹی اور کنکریوں کے ذریعہ اتنے بڑے لشکر کو شکست ہوگئی۔

ایک حیرت انگیز پیش گوئی جو بطور معجزہ پوری ہوئی

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ شَهِدْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُنَيْنًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِرَجُلٍ مِمَّنْ مَعَهٗ يَدَّعِی الْاِسْلَامَ هٰذَا مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَلَمَّا حَضَرَ الْقِتَالُ قَاتَلَ الرَّجُلُ مِنْ اَشَدِّ الْقِتَالِ وَكَثُرَتْ بِهِ الْجِرَاحُ فَجَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ الَّذِیْ تُحَدِّثُ اَنَّهٗ مِنْ اَهْلِ النَّارِ قَدْ قَاتَلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مِنْ اَشَدِّ الْقِتَالِ فَكَثُرَتْ بِهِ الْجِرَاحُ اَمَا اِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَكَادَ بَعْضُ النَّاسِ يَرْتَابُ فَبَيْنَمَا هُوَ عَلٰى ذٰلِكَ اِذْ وَجَدَ الرَّجُلُ اَلَمَ الْجِرَاحِ فَاَهْوٰى بِيَدِهٖ اِلٰى كِنَانَتِهٖ فَانْتَزَعَ سَهْمًا فَانْتَحَرَ بِهَا فَاشْتَدَّ رِجَالٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَدَّقَ اللّٰهُ حَدِيْثَكَ قَدِ انْتَحَرَ فُلَانٌ وَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللّٰهُ اَكْبَرُ اَشْهَدُ اَنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ يَا بِلَالُ قُمْ فَاَذِّنْ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَاِنَّ اللّٰهَ لَيُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّيْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ غزوہ حنین میں شریک تھے وہاں جنگ شروع ہونے سے پہلے (میدان جنگ میں) رسول کریم ﷺ نے اپنے لشکر کے لوگوں میں سے ایک ایسے شخص کے بارے میں کہ جو اپنے کو مسلمان کہتا تھا فرمایا یہ شخص دوزخی ہے۔ پھر جب لڑائی شروع ہوئی تو وہ شخص بڑی بے جگری سے لڑا اور اس کا جسم زخموں سے چور ہوگیا (یہ دیکھ کر صحابہ ؓ میں سے) ایک صاحب نے آکر، اظہار تعجب کے طور پر) عرض کیا کہ یارسول اللہ! اس شخص کی حقیقت حال مجھے بتایئے جس کے بارے میں

آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ وہ دوزخی ہے (جب کہ ظاہری حال تو یہ ہے کہ) وہ اللہ کی راہ میں بڑی بے جگری سے لڑا ہے اور بہت زخم اس نے کھائے ہیں. جس سے اس کا جنتی ہونا معلوم ہوتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "یاد رکھو وہ دوزخیوں میں سے ہے. یعنی حقیقت حال وہی ہے جو میں نے پہلے بتائی ہے کہ وہ شخص دوزخی ہے اگرچہ اس کا ظاہر حال اس کے خلاف ہی کیوں نہ نظر آئے، بات یہ ہے کہ آخرت کے متعلق ظاہری اعمال کا کچھ اعتبار نہیں اصل مدار حسن احوال اور حسن خاتمہ پر ہے۔ اور پھر قریب تھا کہ بعض (ضعیف الایمان) لوگ (میدان جنگ میں کافروں کے خلاف اس شخص کی جانفروشانہ لڑائی کو دیکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی سچائی میں) شک وشبہ کا شکار ہو جاتے، لیکن (اسی وقت لوگوں نے دیکھا کہ) یکایک اس شخص نے اپنے زخموں کی تکلیف سے بے چین ہو کر اپنا ہاتھ ترکش کی طرف بڑھایا اور ایک تیر نکال کر اس کو اپنے سینہ میں پیوست کر لیا۔ (یہ دیکھنا تھا کہ) بہت سے مسلمان دوڑے ہوئے رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کی (یہ) بات سچی کر دی (کہ وہ شخص دوزخی ہے) اس نے اپنا سینہ چیر کر خودکشی کر لی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ بہت بڑا ہے. میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔" (یہ الفاظ آپ ﷺ نے اس خوشی کے اظہار کے لئے فرمائے کہ آپ ﷺ کا کہنا سچ ہوا اس کے بعد آپ ﷺ نے حکم دیا کہ) بلال کھڑے ہو اور لوگوں کو آگاہ کر دو کہ جنت میں صرف مؤمن داخل ہوگا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو فاسق شخص کے ذریعہ بھی مضبوط کرتا ہے۔

(بخاری)

تشریح: یہاں اس واقعہ کا ذکر غزوہ حنین کی نسبت سے کیا گیا ہے جب کہ مواہب لدنیہ میں اس کا ذکر غزوہ خیبر کے موقع پر ہوا ہے اور صحیح بخاری میں یہی منقول ہے لہٰذا ہو سکتا ہے اس طرح کا واقعہ دونوں غزووں میں پیش آیا ہو۔ حدیث میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام قزمان تھا اور وہ ایک منافق تھا اگرچہ اس کا منافق ہونا ظاہر نہیں تھا۔

"اور ایک تیر نکال کر اس کو اپنے سینہ میں پیوست کر لیا" بخاری کی اکثر روایتوں میں سَهْمًا کے بجائے جمع کا صیغہ اسهما نقل کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے اپنے ترکش سے بیک وقت کئی تیر کھینچ کر ان سب کو اپنے سینہ میں گھسیڑ لیا تھا، نیز صحیح بخاری ہی کی ایک روایت میں نقل کیا گیا ہے کہ اس شخص نے اپنی تلوار زمین پر رکھی اور اس کی دھار پر اپنا سینہ رکھ کر زور سے دبایا یہاں تک کہ مر گیا۔ لیکن ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے پہلے تیر کے ذریعہ اپنا کام تمام کرنا چاہا ہو اور جب فوری طور پر وہ نہ مر سکا ہو گا تو پھر تلوار کے ذریعہ خودکشی کا عمل پورا کیا ہو گا۔ حاصل یہ کہ اس شخص کی موت اس حال میں آئی کہ اس کے اندر خبث باطن (نفاق تھا)، یا پھر وہ خودکشی کر لینے کے سبب فاسق کی موت مرا۔

"اللہ تعالیٰ اس دین کو فاسق شخص... الخ" میں "فاسق" سے مراد یا تو منافق ہے یا وہ لوگ مراد ہیں جو نام و نمود کے لئے اور نمائش کے جذبہ سے اچھے عمل کرتے ہیں یا اچھے عمل بھی کرتے ہیں اور گناہ کے کام بھی کرتے رہتے ہیں اور یا یہ کہ زندگی بھر تو اچھے عمل کرتے رہتے ہیں لیکن آخر میں کوئی ایسی بدعملی کر لیتے ہیں جس سے خاتمہ بالخیر نہیں ہوتا۔ ایک احتمال تو یہ ہے کہ اس جملہ کا تعلق بھی اس اعلان سے ہے جس کا حکم آنحضرت ﷺ نے حضرت بلال کو دیا، لیکن دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس جملہ کا تعلق اعلان سے نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ نے یہ جملہ الگ سے فرمایا اور اس کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ زبانی قول و دعوی اور ظاہری اعمال بہر صورت حقیقت حال کے ترجمان نہیں ہوتے ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص زبان سے اپنی نیکی کا دعوی بھی کرتا ہے اور بظاہر نیک کام بھی کرتا دکھائی دیتا ہے مگر اس کے اندر نیت کے فساد یا نفاق کی ایسی برائی ہوتی ہے جس سے اس کی حقیقی احوال اور اس کے باطن کا اس کے ظاہر ہونے سے تعلق نہیں ہوتا اگرچہ اس کے ظاہری اعمال کے سبب دین کو فائدہ پہنچتا ہے اس کی بڑی مثال وہ لوگ ہیں جو محض مالی مفاد اور دنیاوی اغراض فاسدہ کے تحت دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا کام کرتے ہیں، یا اذان دیتے ہیں، امامت کرتے ہیں، وعظ و تقریر کرتے ہیں اور مسجد و مدرسہ بناتے ہیں، اس طرح کے لوگ بظاہر حسن عمل اور حسن خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں اور ان کے اس عمل و خدمت

سے یقیناً اسلام کو، مسلمانوں اور نیکی کے طلبگاروں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے اور وہ دین وملت کی تقویت کا باعث بنتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ خود اپنے اس عمل وخدمت پر اجر وثواب سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔

خودکشی کا مرتکب دوزخی

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قتل نفس (یعنی خودکشی) کا مرتکب دوزخ میں جائے گا، لیکن اس مسئلہ میں علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایسا شخص (کہ جس نے خودکشی کر کے اپنے آپ کو ختم کر لیا ہو) مؤمن ہے اور تصدیق ایمانی رکھتا تھا تو دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہے گا، جیسا کہ کسی مؤمن کو عمداً قتل کرنے والے مؤمن کا حکم ہے، چنانچہ کسی مؤمن کا اپنے آپ کو ختم کر لینا (یعنی خودکشی کر لینا) ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی دوسرے مؤمن کو قتل کر دیا ہو۔ واضح رہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں قاتل مؤمن کے متعلق خلود نار (دوزخ کے ابدی عذاب) کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ لیکن علماء نے اس آیت میں تاویلیں کی ہیں کیونکہ قرآن کریم ہی کی دوسری آیتوں اور احادیث سے مؤمن کے قتل عمد کا ارتکاب کرنے والے کے بارے میں عدم خلود نار (دوزخ کے غیر ابدی عذاب) کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ تاہم وہ محدثین جن کا تعلق اہل ظواہر سے ہے انہوں نے کہا ہے کہ ایسا شخص (جس نے خودکشی کر لی ہو) اگرچہ مؤمن بھی ہو تو دوزخ کے ابدی عذاب کا مستوجب ہوگا، گویا ان کے نزدیک دوزخ کا ابدی عذاب کافر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے مگر یہ قول شاذ ہے اور اہل سنت والجماعت کے متفقہ مسلک کے بالکل خلاف ہے۔

آنحضرت ﷺ پر سحر کئے جانے کا واقعہ

(۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سُحِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اِنَّهٗ لَيُخَيَّلُ اِلَيْهِ اَنَّهٗ فَعَلَ الشَّيْءَ وَمَا فَعَلَهٗ حَتّٰى اِذَا كَانَ ذَاتَ يَوْمٍ عِنْدِيْ دَعَا اللّٰهَ وَدَعَاهُ ثُمَّ قَالَ اَشَعَرْتِ يَا عَائِشَةُ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَفْتَانِيْ فِيْمَا اسْتَفْتَيْتُهٗ جَاءَنِيْ رَجُلَانِ جَلَسَ اَحَدُهُمَا عِنْدَ رَاْسِيْ وَالْاٰخَرُ عِنْدَ رِجْلِيْ ثُمَّ قَالَ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهٖ مَا وَجْعُ الرَّجُلِ قَالَ مَطْبُوْبٌ قَالَ وَمَنْ طَبَّهٗ قَالَ لَبِيْدُ بْنُ الْاَعْصَمِ الْيَهُوْدِيُّ قَالَ فِيْمَا ذَا قَالَ فِيْ مُشْطٍ وَمُشَاطَةٍ وَجُفِّ طَلْعَةِ ذَكَرٍ قَالَ فَاَيْنَ هُوَ قَالَ فِيْ بِئْرِ ذَرْوَانَ فَذَهَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اُنَاسٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ اِلَى الْبِئْرِ فَقَالَ هٰذِهِ الْبِئْرُ الَّتِيْ اُرِيْتُهَا وَكَاَنَّ مَاءَهَا نُقَاعَةُ الْحِنَّاءِ وَكَاَنَّ نَخْلَهَا رُءُوْسُ الشَّيَاطِيْنِ فَاسْتَخْرَجَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (جب) رسول کریم ﷺ پر جادو کیا گیا تو (تو آپ ﷺ کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ) کسی کام کے بارے میں آپ ﷺ کا خیال ہوتا کہ کر لیا ہے حالانکہ وہ کام کیا نہ ہوتا تھا (کافی دنوں تک آپ ﷺ کی یہی حالت رہی) تا آنکہ ایک دن اس وقت جب کہ آپ ﷺ میرے پاس تھے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور پھر دعا کی اور پھر آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ عائشہ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ بات بتا دی ہے جو میں نے اس سے دریافت کی تھی؟ اس کے بعد آپ ﷺ نے بیان کیا کہ (اللہ تعالیٰ نے میری حالت کے بارے میں مجھ پر اس طرح منکشف کیا کہ) میرے پاس آدمیوں کی صورت میں دو فرشتے آئے، ان میں سے ایک تو میرے سرہانے بیٹھا اور دوسرا پائینتی، پھر ان میں سے ایک نے دوسرے سے (میری طرف اشارہ کر کے) پوچھا! اس شخص کو کیا بیماری ہے؟ دوسرے نے کہا: اس پر جادو کیا گیا ہے۔ پھر پہلے نے پوچھا جادو کس نے کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا لبید ابن اعصم یہودی نے۔ پہلے نے پوچھا کس چیز میں جادو کیا گیا ہے، دوسرے نے جواب دیا: کنگھی میں، ان بالوں میں جو کنگھی سے جھڑتے ہیں اور تر کھجور کے خوشہ کے خول میں۔ پہلے نے پوچھا: یہ جادو کی ہوئی چیزیں کہاں رکھی ہیں؟ دوسرے نے جواب دیا: مدینہ کے ایک کنویں ذروان میں۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ اپنے چند مخصوص صحابہ کے ساتھ اس کنویں پر تشریف لے گئے اور فرمایا، یہی وہ کنواں ہے جو مجھ کو دکھایا گیا ہے۔"
اس کنویں کا پانی حنا کی طرح سرخ تھا، اور کھجور کے وہ خوشے (جو اس کنویں میں ڈالے گئے تھے) ایسے تھے جیسے وہ شیطانوں کے سر ہوں،

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سب چیزوں کو کنوئیں سے نکال لیا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "کسی کام کے بارے میں آپ ﷺ کا خیال ہوتا... الخ" بعض شارحین نے اس جملہ کا مطلب یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر جو سحر (جادو) کیا گیا تھا اس کے اثر سے آپ ﷺ پر نسیان (بھول) کا غلبہ اس طرح ہو گیا تھا کہ کسی کام کرنے کے یا نہ کرنے کا خیال بھک جاتا تھا، مثلاً آپ ﷺ کے خیال میں یہ بات آجاتی تھی کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ وہ کام آپ ﷺ کا کیا نہ ہوتا تھا، اسی طرح ایک کام کر چکے ہوتے اور خیال یہ ہوتا تھا کہ وہ کام نہیں کیا ہے۔ اس نسیان کا تعلق صرف دنیاوی معاملات سے ہوتا تھا، کسی بھی دینی معاملہ میں یہ صورت ہرگز پیش نہیں آتی تھی۔ اس حدیث میں آپ ﷺ کی ذہنی کیفیت و حالات کو ظاہر کرنے کے لئے یخیل کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کی نظیر قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی یعنی موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ بات آئی کہ جادو کے اثر سے خود یہ رسیاں دوڑ رہی ہیں، حالانکہ رسیاں نہیں دوڑ رہی تھیں، بلکہ یا تو ان کافر جادوگروں کی طرف سے نظر بندی کا اثر تھا کہ زمین پر پڑی ہوئی ساکت و صامت رسیاں خیال میں دوڑتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں یا یہ کہ جادوگروں نے ان رسیوں پر پہلے سے پارہ جیسی کوئی چیز مل رکھی تھی اور، جب وہ رسیاں دھوپ میں زمین پر ڈال دی گئیں تو سورج کی تمازت سے ان کی ظاہری سطح پر اس طرح کی لرزش، اور تھر تھراہٹ نمایاں ہوئی جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں آیا کہ یہ رسیاں خود حرکت کر رہی ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ اس حالت کو جو سحر کے اثر سے آپ ﷺ میں پیدا ہوئی تھی، اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خیال میں آتا کہ اپنی کسی بیوی سے ہمبستری کریں لیکن پھر نہیں کرتے تھے، یعنی آپ ﷺ میں خواہش پیدا ہوتی تھی اور یہ جانتے تھے کہ ہمبستری کی قدرت رکھتا ہوں لیکن جب بیوی کے پاس جاتے تھے تو ان پر قادر نہیں ہوتے تھے۔ واضح رہے کہ دوسرے امراض کی طرح سحر بھی ایک مرض ہی ہوتا ہے پس انبیاء کی بشریت کے تحت جس طرح ان پر دوسرے جسمانی امراض اور بیماریوں کا اثر ہوتا تھا اسی طرح سحر کا بھی ان پر اثر انداز ہونا ان کی نبوت کے منافی نہیں ہے، نیز آنحضرت ﷺ کے جسم شریف میں سحر کی تاثیر اس حکمت کا اظہار بھی تھا کہ سحر کی تاثیر کا ایک حقیقت ہونا اس طرح ثابت ہو جائے کہ جب اشرف المخلوقات کی سب سے عظیم شخصیت بھی سحر سے متاثر ہو سکتی ہے تو دوسروں کی کیا حیثیت ہے اس سے آنحضرت ﷺ کی نبوت کی ایک واضح دلیل بھی ان کفار کے سامنے آئی جو آنحضرت ﷺ کو ساحر کہا کرتے تھے، چونکہ سحر خود ساحر پر اثر انداز نہیں ہوتا... اور آنحضرت ﷺ پر سحر نے اثر کیا تھا لہذا ثابت ہوا کہ آپ ﷺ ساحر نہیں ہیں۔

آپ ﷺ سے سحر کئے جانے کا یہ واقعہ ذی الحجہ سن ۶ھ کا ہے جب کہ آپ ﷺ صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے تھے اور علماء نے لکھا ہے کہ سحر کا یہ اثر آپ ﷺ پر چالیس دن تک رہا، ایک روایت میں چھ مہینے کی مدت بھی منقول ہے، اور ایک قول کے مطابق تو یہ اثر پورے سال تک رہا۔ تاہم ان روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ غالب گمان یہ ہے کہ اس سحر کا اثر پوری شدت اور غلبہ کے ساتھ تو چالیس دن تک رہا پھر اس کی کچھ علامتیں چھ ماہ تک باقی رہیں اور باقی کچھ ہلکا سا اثر پورے سال تک رہا۔ بہرحال جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے بیان کیا ہے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ صورت میں آپ ﷺ پر اس سحر کی حقیقت کو منکشف فرمایا اور اس سے نجات عطا فرمائی۔

"اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور پھر دعا کی ...." کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ بار بار دعا کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے التجا میں مسلسل مصروف رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی ناپسندیدہ اور تکلیف دہ صورت حال کے پیش آجانے اور کسی آفت و بلاء کے نازل ہونے پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور گلو خلاصی کی دعا مانگنا مستحب ہے۔

اس موقع پر علماء نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے خاص اور برگزیدہ بندوں کے دل میں دعاء کا داعیہ اس وقت ڈالتا ہے

جب قبولیت کی گھڑی آجاتی ہے ان کے برخلاف عام لوگوں کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے ان کو ان کی حالت پر چھوڑے رکھا جاتا ہے کہ وہ دعا کئے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب وقت قبولیت آتا ہے تو ان کی دعا قبول ہوتی ہے۔

"لبید ابن اعصم یہودی نے"۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ یہاں لبید سے مراد اس کی بیٹیاں ہیں، گویا اس فرشتے نے بتایا کہ لبید ابن اعصم کی بیٹیوں نے آنحضرت ﷺ پر سحر کیا ہے، ان حضرات نے یہ مراد قرآن کریم کی سورہ قل اعوذ برب الفلق کے ان الفاظ کی بنیاد پر بیان کی ہے کہ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ یعنی جادوگروں کا پڑھ پڑھ کر گنڈہ پر پھونکنا اور گرہ لگاتے جانا۔ بھی ہوسکتا ہے۔

قاضیؒ نے خاص طور شر نفاثات سے پناہ مانگنے کا سبب لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ایک یہودی نے آنحضرت ﷺ پر جو سحر کیا تھا اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ اس (یہودی) نے کمان کے چلہ کو گنڈہ بنایا اور اس میں گیارہ گرہیں لگائیں (جن پر وہ منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتا رہا) اور پھر اس نے اس چلہ (یا گنڈہ) کو کنویں میں گاڑدیا، چنانچہ آنحضرت ﷺ اس سحر کے اثر سے بیمار ہوگئے، تب اللہ تعالیٰ نے معوذتین یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس نازل فرمائی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کو وہ کنواں بتایا جہاں گنڈہ دفن تھا، آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیجا اور وہ اس گنڈہ کو نکال کر لائے اور اس پر یہ دونوں سورتیں پڑھائیں۔ حضرت علیؓ جب ایک آیت پڑھتے تو اس گنڈہ کی ایک ایک گرہ خود بخود کھل جاتی، اس طرح ہر آیت پر ایک ایک گرہ کر کے تمام گرہیں کھل گئیں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی حالت میں کچھ تخفیف محسوس کی، قاضیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس واقعہ سے اس وقت کے کافروں کی اس بات کا سچ ثابت ہونا لازم نہیں آتا جو وہ کہا کرتے تھے کہ محمد (ﷺ) تو سحر زدہ ہیں۔ وہ تو یہ بات اس معنی میں کہا کرتے تھے کہ محمد ﷺ پر کسی ایسے سحر کا اثر ہے جس نے (نعوذ باللہ) ان کی عقل کو ماؤف کردیا ہے اور ان پر دیوانگی طاری کردی ہے جب کہ آنحضرت ﷺ پر کئے جانے والے اس سحر اور اس کے اثرات کی نوعیت بالکل دوسری تھی۔ بہر حال بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاضیؒ نے جو روایت بیان کی ہے وہ ایک دوسرا واقعہ ہے اور اس واقعہ کے علاوہ ہے جو یہاں (حضرت عائشہ کی) حدیث میں بیان کیا گیا ہے، تاہم یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ واقعہ تو ایک ہی ہے مگر الگ الگ دو صورتوں میں ایک ساتھ پیش آیا تھا۔ یعنی خود لبید نے بھی اپنی تدبیروں کے ساتھ آنحضرت ﷺ پر سحر کیا اور اس کی بیٹیوں نے بھی کیا تھا اور اس طرح حق تعالیٰ نے گویا آپ کے ثواب کو دوچند کرنے کے لئے دونوں سحر کے اثرات میں مبتلا کیا۔

"جیسے وہ شیطانوں کے سر ہوں"۔ کھجور کے وہ خوشے کچھ تو منتر کے اثرات کی وجہ سے اور کچھ پانی میں پڑے رہنے یا نم زمین میں دفن رہنے کی وجہ سے جتنے زیادہ بدہیئت اور جس قدر وحشت ناک ہوگئے تھے اس کو ظاہر کرنے کے لئے ان کو شیطانوں کے سروں کے ساتھ مشابہت دی کیونکہ اہل عرب شیطان کے سر کو بدہیئتی اور وحشت ناکی کی علامت جانتے تھے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں شیطانوں کے سر سے ہیبت ناک سانپ مراد ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کھجور کے وہ خوشے اس طرح کے ہوگئے تھے جیسے ہیبتناک سانپ ہوں۔ اس واقعہ سے متعلق حضرت ابن عباسؓ کی بھی ایک روایت ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ سحر اور اس کی جگہ کا انکشاف ہونے کے بعد) آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ کو سحر کی یہ چیزیں نکالنے کے لئے ذروان کنویں پر بھیجا۔ جب ان دونوں نے کھجور کا وہ خوشہ کنویں سے نکالا تو اس کے خول میں ان کو موم کا بنا ہوا آنحضرت ﷺ کا ایک پتلا ملا، اس پتلے میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں اور اس کے اوپر ایک ڈورا گیارہ گرہوں کے ساتھ لپٹا ہوا تھا پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام معوذتین (سورہ قل اعوذ برب الناس اور قل اعوذ برب الفلق) لے کر نازل ہوئے ان دونوں سورتوں کا پڑھا جانا شروع ہوا تو ہر آیت پر ایک گرہ کھلنے لگی اور اس پتلے میں سے جب کوئی سوئی نکالی جاتی تو آنحضرت ﷺ کو تسکین و راحت محسوس ہوتی اسی طرح ایک ایک کر کے تمام گرہیں کھل گئیں اور اس پتلے میں سے سب سوئیاں نکال لی گئیں۔ اس روایت کے متعلق شارحین نے لکھا ہے کہ ان دونوں حضرات کے ساتھ آنحضرت ﷺ بھی تشریف لے گئے ہوں گے اور حضرت علیؓ و حضرت عمارؓ کو کنویں میں جاکر ان چیزوں کے نکال لانے کا حکم فرمایا

ہوگا۔ دوسری روایتوں میں بھی یہ آیا ہے کہ سحر اور ساحر کے اس انکشاف کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس یہودی کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی، اور نہ کچھ کہا بلکہ یہ فرمایا! کہ میں فتنہ ابھارنے کو پسند نہیں کرتا۔"

فرقہ خوارج کے بارہ میں پیشگوئی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ بَیْنَمَا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَقْسِمُ قَسْمًا اَتَاهُ ذُوالْخُوَيْصِرَةِ وَهُوَ رَجُلٌ مِنْ بَنِی تَمِيْمٍ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِعْدِلْ فَقَالَ وَيْلَكَ فَمَنْ يَّعْدِلُ اِذَا لَمْ اَعْدِلْ قَدْ خِبْتَ وَخَسِرْتَ اِنْ لَّمْ اَكُنْ اَعْدِلُ فَقَالَ عُمَرُ ائْذَنْ لِّیْ اَنْ اَضْرِبَ عُنُقَهُ فَقَالَ دَعْهُ فَاِنَّ لَهُ اَصْحَابًا يَحْقِرُ اَحَدُكُمْ صَلٰوتَهُ مَعَ صَلٰوتِهِمْ وَصِيَامَهُ مَعَ صِيَامِهِمْ يَقْرَؤُنَ الْقُرْاٰنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ يَنْظُرُ اِلٰى نَصْلِهِ اِلٰى رُصَافِهِ اِلٰى نَضِيِّهِ وَهُوَ قِدْحُهُ اِلٰى قُذَذِهِ فَلَا يُوْجَدُ فِيْهِ شَیْءٌ قَدْ سَبَقَ الْفَرْثَ وَالدَّمَ اٰيَتُهُمْ رَجُلٌ اَسْوَدُ اِحْدٰى عَضُدَيْهِ مِثْلُ ثَدْيِ الْمَرْاَةِ اَوْمِثْلُ الْبَضْعَةِ تَدَرْدَرُ وَيَخْرُجُوْنَ عَلٰى خَيْرِ فِرْقَةٍ مِّنَ النَّاسِ قَالَ اَبُوْسَعِيْدٍ اَشْهَدُ اَنِّیْ سَمِعْتُ هٰذَا الْحَدِيْثَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَشْهَدُ اَنَّ عَلِیَّ ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ قَاتَلَهُمْ وَاَنَا مَعَهُ فَاَمَرَ بِذٰلِكَ الرَّجُلِ فَالْتُمِسَ فَاُتِیَ بِهٖ حَتّٰى نَظَرْتُ اِلَيْهِ عَلٰى نَعْتِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِیْ نَعَتَهُ وَفِیْ رِوَايَةٍ اَقْبَلَ رَجُلٌ غَائِرُ الْعَيْنَيْنِ نَاتِئُ الْجَبْهَةِ كَثُّ اللِّحْيَةِ مُشْرِفُ الْوَجْنَتَيْنِ مَحْلُوْقُ الرَّاْسِ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اتَّقِ اللّٰهَ فَقَالَ فَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ اِذَا عَصَيْتُهُ فَيَاْمَنُنِیْ اللّٰهُ عَلٰى اَهْلِ الْاَرْضِ وَلَا تَاْمَنُوْنِیْ فَسَاَلَ رَجُلٌ قَتْلَهُ فَمَنَعَهُ فَلَمَّا وَلّٰى قَالَ اِنَّ مِنْ ضِئْضِئِ هٰذَا قَوْمًا يَقْرَؤُنَ الْقُرْاٰنَ لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الْاِسْلَامِ مُرُوْقَ السَّهْمِ مِنَ الرَّمِيَّةِ فَيَقْتُلُوْنَ اَهْلَ الْاِسْلَامِ وَيَدْعُوْنَ اَهْلَ الْاَوْثَانِ لَئِنْ اَدْرَكْتُهُمْ لَاَقْتُلَنَّهُمْ قَتْلَ عَادٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں: کہ اس وقت جب کہ ہم (مقام جعرانہ میں) رسول کریم ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ (غزوہ حنین میں حاصل شدہ) مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا اور جو (مشہور قبیلہ) بنی تمیم سے تعلق رکھتا تھا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر کہنے لگا کہ یارسول اللہ (مال غنیمت کی تقسیم میں) عدل و انصاف سے کام لیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر) فرمایا، تجھ پر افسوس ہے، میں عدل و انصاف نہیں کروں گا تو کون کرے گا، اگر میں عدل و انصاف سے کام نہ لوں تو یقیناً تو محروم ہو جائے گا اور ٹوٹے میں رہے گا۔ حضرت عمرؓ نے بارگاہ رسالت میں اس شخص کی یہ گستاخانہ فقرہ بازی دیکھ کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ! اجازت دیجئے کہ اس (گستاخ اور بدبخت) انسان کا سر قلم کردوں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (نہیں) اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ کچھ لوگ اس کے تابعدار ہوں گے جن کی نمازوں کے مقابلہ پر تم اپنی نمازوں کو) اور جن کے روزوں کے مقابلہ پر تم اپنے روزوں کو حقیر جانو گے، وہ لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہ جائے گا۔ اور وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح جب تیر شکار کو چھیدتا اور پار نکل جاتا ہے تو چاہے اس کے پیکان کو دیکھا جائے چاہے اس کے رصاف کو دیکھا جائے چاہے اس کے پروں کو دیکھا جائے کہیں بھی کچھ نہیں پایا جاتا حالانکہ وہ تیر) نجاست اور خون میں سے ہو کر نکلتا ہے، اور اس شخص (ذوالخویصرہ) کے تابعداروں (کے سردار) کی علامت یہ ہے کہ وہ سیاہ رنگ کا آدمی ہوگا جس کے ایک بازو میں عورت کے پستان کے مانند (ابھرا ہوا گوشت) یا گوشت کا ایک ٹکڑا ہوگا جو ہلتا ہوگا (اسی بناء پر اس کو ذوالثدیہ کہا جائے گا) اور وہ لوگ (یعنی اس شخص کے تابعدار) لوگوں کے ایک بہترین طبقہ (یعنی حضرت علیؓ اور ان کے تابعداروں) کے خلاف بغاوت کریں گے۔ حضرت ابوسعیدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے خود یہ حدیث رسول کریم ﷺ سے سنی ہے اور پھر یہ بھی شہادت دیتا ہوں کہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس فرقہ کے لوگوں سے (جن کی طرف آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا) جنگ کی اور میں اس جنگ میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھا حضرت علیؓ نے (اس جنگ

میں فتحیاب ہونے اور دشمنوں کی پسپائی کے بعد،) اس شخص کو تلاش کرنے کا حکم دیا (جس کے بارے آنحضرت ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی، چنانچہ مقتولین میں سے تلاش کر کے حضرت علیؓ کے پاس اس شخص کو لایا گیا تو میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی جو علامت بیان کی تھی وہ اس میں (ہو بہو) موجود تھی۔

اور ایک روایت میں (آنحضرت کے پاس ذوالخویصرہ کی آمد کے ذکر کے بجائے یوں مذکور ہے کہ: (اس وقت جب کہ آنحضرت ﷺ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے) ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں، پیشانی ابھری ہوئی تھی، داڑھی گنجان تھی رخسارے اٹھے ہوئے تھے اور سر منڈا ہوا تھا، اس نے کہا کہ اے محمد ﷺ! اللہ سے ڈرو (یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور تقسیم میں عدل و انصاف سے کام لو) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اگر میں ہی اللہ کی نافرمانی کروں گا تو پھر کون اللہ کی اطاعت کرے گا (یعنی میں مقام نبوت و عصمت پر فائز ہونے کی بنا پر اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور سب سے زیادہ اس کی اطاعت کرنے والا ہوں، بھلا تو مجھ کو اطاعت گزاری کا کیا سبق دیتا ہے) مجھ کو اللہ تعالیٰ روئے زمین کے لوگوں میں (سب سے بڑا) امین جانتا ہے (اور مخلوق میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے مجھے اس دنیا میں بھیجا ہے) صرف تو ہے جو مجھ کو امین نہیں سمجھتا اور مجھ پر اعتماد نہیں کرتا۔ ایک صحابی یعنی حضرت عمرؓ نے (اس شخص کی یہ گستاخی دیکھ کر) آنحضرت ﷺ سے اس شخص کا سر قلم کر دینے کی اجازت چاہی لیکن آپ ﷺ نے اس کو منع فرمایا اور جب وہ شخص واپس چلا گیا تو فرمایا: اس شخص کی اصل سے ایک قوم نمودار ہوگی۔ وہ لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں جائے گا، اسلام (یعنی کمال اسلام کے دائرہ یا امام وقت کی اطاعت) سے وہ اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار میں سے نکل جاتا ہے، پھر وہ لوگ (یعنی خارجی، اہل اسلام کو تو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں گے (مطلب یہ کہ جن لوگوں سے جنگ کرنا زیادہ اہم ہوگا، یعنی کافروں اور بت پرستوں سے، ان سے تو جنگ کریں گے نہیں البتہ مسلمانوں کے خلاف جنگ و جدل میں مصروف رہیں گے) اگر میں ان لوگوں کو پاؤں تو ان کو اس طرح قتل کر دوں جس طرح قوم عاد کے لوگ قتل کئے گئے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ذوالخویصرہ نامی شخص جس کا حدیث میں ذکر ہوا، دراصل منافق تھا اور جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے پیش گوئی فرمائی، امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں جس طبقہ نے حضرت علیؓ سے خروج و بغاوت کی راہ اختیار کی تھی جو فرقہ خوارج کے نام سے مشہور ہوا اس کی اصل اور بنیاد یہی شخص تھا اس کے حق میں قرآن کی یہ آیت وَمَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ نازل ہوئی تھی۔ ایک شارح نے جو یہ کہا ہے کہ ذوالخویصرہ، خارجیوں کا سردار تھا تو یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ خارجیوں کا ظہور حضرت علیؓ کے زمانہ میں ہوا ہے۔

غزوہ حنین میں غنیمت کے طور پر جو مال و اسباب اسلامی لشکر کے ہاتھ لگا تھا اس کو آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں میں اس طرح تقسیم فرمایا کہ جس شخص کی جتنی ضرورت و حاجت تھی اس کو اسی اعتبار سے عطا فرمایا اس منافق ذوالخویصرہ کو یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے اپنی بدظنی کے اظہار میں آنحضرت ﷺ پر گویا یہ اعتراض کیا کہ آپ ﷺ کو مال غنیمت کی تقسیم اس طرح نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ ہر شخص کو برابر برابر تقسیم کرنا چاہئے اس پر آنحضرت ﷺ نے جو جواب دیا اس کا حاصل یہ تھا کہ انصاف اور عدل کے تقاضہ کو مجھ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔ مال غنیمت کی تقسیم کا جو طریقہ میں نے اختیار کیا ہے اس کی بنیاد عدل و انصاف کے سوا کچھ نہیں، عدل کا مطلب یہی نہیں ہے کہ ہر شخص کو برابر برابر دیا جائے خواہ کسی کی ضرورت کتنی ہی زیادہ ہو، اور کسی کی حاجت کتنی ہی کم ہو، یہ بھی عدل ہی ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ ضرورت مند ہے اس کو اتنا ہی زیادہ دے کر اس کی ضرورت کو پورا کیا جائے اور جو شخص کم ضرورت رکھتا ہے اس کو کم دیا جائے، پھر آپ ﷺ نے اس شخص سے واضح فرمایا کہ میں رحمۃ للعالمین بنا کر دنیا میں بھیجا گیا ہوں تاکہ ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کروں، اگر کوئی شخص میری عدالت اور میری انصاف پسندی پر انگلی اٹھاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کے نصیب میں مایوسی و محرومی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، لہٰذا تیری بہرہ مندی اور امیدواری تو اسی صورت میں تھی جب تجھے میری عدالت پر اعتماد ہوتا، اگر میرے

عدل پر تجھے بھروسہ نہیں ہے اور تیرے نزدیک میں انصاف سے کام نہیں لے رہا ہوں تو سمجھ لے کہ تو خود اپنے گمان کے مطابق ناامید محروم ہو گیا اور ٹوٹے میں رہا۔

شرح السنۃ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کو تو اس شخص کے قتل سے منع کر دیا، لیکن دوسری روایت کے بموجب آپ ﷺ نے اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا کہ اگر میں اس شخص کے تابعداروں کو پاؤں تو قتل کر دوں؟ ان دونوں میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے عزم کے اظہار کی صورت میں ان لوگوں کے قتل کو جو مباح فرمایا تو اس کا تعلق اس صورت سے ہے، جب وہ لوگ باقاعدہ اپنا گروہ بنائیں اور بہت سارے مل کر اور ہتھیار باندھ کر دوسرے لوگوں (یعنی اہل اسلام) سے تعارض کریں اور ان کے خلاف جنگ وجدال کا معرکہ گرم کرنے کے درپے ہوں، جب کہ حضرت عمرؓ کو منع کرنے کے وقت یہ صورت نہیں تھی وہ تو بس ایک شخص تھا جس نے اپنی بدباطنی اور اپنے نفاق کا اظہار کر دیا تھا یہ اس کے فتنہ انگیز تابعداروں کا ظہور اور ان کے فتنہ وفساد کی اصل ابتداء حضرت علیؓ کے زمانہ میں ہوئی۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے ان کا مقابلہ کیا اور ان میں سے بہت سوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ لیکن زیادہ صحیح اور عمدہ بات وہ ہے جو ایک شارح نے لکھی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا حضرت عمرؓ کو اس شخص کی قتل کی اجازت نہ دینا دراصل آنحضرت ﷺ کی اس حسن اخلاق اور کمال تحمل وبردباری کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کبھی بھی اپنی ذات کے بارے میں کسی سے بدلہ و انتقام نہیں لیتے تھے حالانکہ اس شخص نے زیادتی اور عداوت کے اظہار میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس نے براہ راست ذات رسالت کو مخاطب کر کے کہا، عدل و انصاف سے کام لو، دوسری روایت کے مطابق اس نے یہ کہا کہ: اللہ سے ڈرو۔ اور یک روایت میں اس کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ: (اے محمد ﷺ!) تم جس طرح مال غنیمت تقسیم کر رہے ہو اس میں عدل و انصاف نہیں ہے اس کے اس طرح کے الفاظ اس بات کے لئے کافی تھے کہ اس کو فوراً قتل کر دیا جاتا، کیونکہ اس نے رسول کریم ﷺ کی نکتہ چینی کی اور آپ ﷺ کو عیب لگایا، اسی لئے اگر کوئی شخص آج بھی ذات رسالت ﷺ کے متعلق اس طرح کے الفاظ زبان سے نکالے تو اس پر کفر وارتداد کا حکم لگا دیا جائے گا، لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ نے اس سے دارو گیر نہیں کی اور اس کو قرار واقعی سزا دینے کی اجازت عطا نہیں فرمائی۔

"جن کی نمازوں کے مقابلہ پر تم اپنی نمازوں کو..... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے تابعدار وہ لوگ (جو فرقہ خوارج کے نام سے موسوم اور مشہور ہوں گے، بظاہر بڑے دین دار اور متبع شریعت نظر آئیں گے، وہ عام مسلمانوں کی نظر میں اپنا سکہ جمانے کے لئے ایسی اچھی نمازیں پڑھیں گے اور ایسے اچھے روزے رکھیں گے کہ بڑے بڑے پکے اور سچے، مسلمان بھی ان کے مقابلہ پر اپنی نمازوں اور روزوں کو کمتر محسوس کریں گے، وہ قرآن کی تلاوت بھی کریں گے اور اس طرح کریں گے کہ ترتیل و تجوید اور مخارج حروف کی رعایت کے تمام آداب وشرائط پر اتریں گے، لیکن ان کے دل میں چونکہ نفاق ہو گا اس لئے ان کی تلاوت حلق سے نیچے نہیں جائے گی، یعنی نہ ان کی تلاوت وقرأت عند اللہ مقبول ہو گی اور نہ ان کی عبادت وریاضت اور اعمال اوپر چڑھیں گے اور ثمر آور ہوں گے یا یہ کہ ان کی تلاوت صرف ان کی زبان تک محدود رہے گی، نہ دل تک جائے گی اور نہ اس کے اثرات روح تک پہنچیں گے۔ پھر جب وہ لوگ اپنا مضبوط اور وسیع جتھہ بنالیں گے اور طاقتور جماعت کی صورت اختیار کر لیں گے تو پھر دین کی اطاعت وفرمانبرداری یا امام وقت کی اطاعت اور یا سرے سے اسلام کے دائرہ سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کے بیچ میں سے نکل جاتا ہے، چنانچہ جس طرح شکار کے بیچ سے نکلے ہوئے تیر کے اوپر سے لے کر نیچے تک، کسی بھی حصہ پر خون یا نجاست کا نشان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا، حالانکہ وہ تیر خون اور نجاست ہی میں سے باہر نکلتا ہے اسی طرح ان لوگوں کے دین سے نکلنے کے بعد ان پر دینداری، اسلام کی وابستگی اور مسلمانوں کی محبت کا ذرا بھی کوئی اثر نہیں رہے گا حالانکہ وہ بڑے نمازی، قرآن کی بہت تلاوت کرنے والے، اور تہجد گزار و شب بیدار ہوں گے۔

وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے... الخ حدیث کا یہ جملہ ان علماء کی دلیل ہے جو خوارج کی تکفیر کے قائل ہیں اور خطابیؒ نے کہا

ہے کہ "دین سے نکل جائیں گے۔" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ لوگ سرے سے دین اسلام کے دائرہ ہی سے خارج ہو جائیں گے بلکہ ان کا امام وقت کے خلاف بغاوت کرنا مراد ہے۔

"اور سر منڈا ہوا تھا" یہ گویا اس شخص کی طرف سے اس ہیئت وصورت کی ظاہری مخالفت تھی جس پر آنحضرت ﷺ کے اکثر صحابہؓ کرام تھے، چنانچہ اکثر صحابہ کرامؓ سر پر بال رکھتے تھے منڈاتے نہیں تھے علاوہ اس موقع کے جب حج سے فارغ ہونے کے بعد سر منڈانا ضروری ہوتا ہے، البتہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اکثر اپنا سر منڈایا کرتے تھے اور وہ بھی اس احتیاط کے پیش نظر کہ غسل میں کہیں بالوں کی وجہ سے پانی سر تک پہنچنے سے نہ رہ جائے۔

"جس طرح قوم عاد کے لوگ قتل کئے گئے تھے" میں قتل سے مراد ان کی اجتماعی ہلاکت اور ان کا مکمل استیصال ہے اور اس چیز یعنی ہلاکت و استیصال کو "قتل" سے تعبیر کرنا محض مشاکلت کے لئے ہے ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے تو قوم عاد کو قتل نہیں کیا گیا تھا، بلکہ سخت آندھی اور طوفان کے ذریعہ اس طرح ان کو ہلاک و برباد کیا گیا تھا کہ قوم کی قوم نیست و نابود ہو کر رہ گئی تھی۔

حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کے اسلام لانے کا واقعہ

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كُنْتُ اَدْعُوْا اُمِّیْ اِلَی الْاِسْلَامِ وَهِیَ مُشْرِكَةٌ فَدَعَوْتُهَا یَوْمًا فَاَسْمَعَتْنِیْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَكْرَهُ فَاَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَبْكِیْ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ یَهْدِیَ اُمَّ اَبِیْ هُرَیْرَةَ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اهْدِ اُمَّ اَبِیْ هُرَیْرَةَ فَخَرَجْتُ مُسْتَبْشِرًا بِدَعْوَةِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا صِرْتُ اِلَی الْبَابِ فَاِذَا هُوَ مُجَافٌ فَسَمِعَتْ اُمِّیْ خَشْفَ قَدَمَیَّ فَقَالَتْ مَكَانَكَ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ وَ سَمِعْتُ خَضْخَضَةَ الْمَآءِ فَاغْتَسَلَتْ فَلَبِسَتْ دِرْعَهَا وَ عَجِلَتْ عَنْ خِمَارِهَا فَفَتَحَتِ الْبَابَ ثُمَّ قَالَتْ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ فَرَجَعْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَبْكِیْ مِنَ الْفَرَحِ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَقَالَ خَیْرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں اپنی والدہ کو جو مشرکہ تھیں قبول اسلام کی تلقین کیا کرتا تھا، چنانچہ ایک دن میں نے ان کو (معمول کے مطابق) اسلام قبول کرنے کی تلقین کی تو انہوں نے رسول کریم ﷺ کی شان اقدس میں (ایک ایسی نازیبا اور گستاخانہ) بات کہی کہ مجھ کو سخت ناگوار ہوئی (بلکہ میں تو اب بھی اس کو نقل کرنا گوارا نہیں کرتا میں (اس بات سے مغموم اور رنجیدہ ہو کر کہ انہوں نے میرے سامنے اتنے برے الفاظ زبان سے نکالے ہیں اور ماں ہونے کی وجہ سے میں ان کی تادیب بھی نہیں کر سکتا) روتا ہوا رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اب تو آپ ہی اللہ سے دعا فرما دیجئے کہ ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت عطا فرمائے، آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔ اے اللہ! ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت عطا فرما! میں نبی کریم ﷺ کی دعا سے بڑی خوش آیند امید لے کر (بارگاہ نبوت سے) واپس لوٹا اور جب اپنی والدہ کے گھر کے دروازہ پر پہنچا تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے، لیکن میری والدہ نے میرے قدموں کی آواز سن لی تھی انہوں نے، (اندر سے آواز دے کر) کہا کہ "ابوہریرہؓ! وہیں ٹھہرو (یعنی ابھی گھر میں نہ آؤ) پھر میں نے پانی گرنے کی آواز سنی "میری والدہ نے غسل کیا، کپڑا پہنا اور مارے جلدی کے دوپٹہ اوڑھے بغیر دروازہ کھول دیا اور (مجھے دیکھ کر) کہا، میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتی ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں یہ دیکھتے ہی کہ میری پیاری ماں کو ہدایت مل گئی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا، الٹے پاؤں لوٹا اور خوشی کے آنسو گراتا ہوا رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے اللہ کی تعریف کی اور میری والدہ کے اسلام پر شکر ادا کیا اور "اچھا فرمایا۔" (مسلم)

تشریح: "اور خوشی کے آنسو گراتا ہوا... الخ" حقیقت یہ ہے کہ انسان محض رنج و غم کے وقت ہی آنسو نہیں بہاتا بلکہ انتہائی مسرت اور

خوشی کے موقع پر بھی اس کی آنکھیں آنسو بہانے لگتی ہیں۔ کسی زندہ دل نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ خوشی کا رونا اس سبب سے ہوتا ہے کہ غم آنسوؤں کی صورت میں بہہ کی نکل جانا چاہتا ہے۔

"اور اچھا فرمایا" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خوشخبری سن کر دعا و بشارت پر مشتمل کوئی اچھا جملہ ارشاد فرمایا۔ یا یہ کہ "خیر" کا لفظ ایک ایسی عبارت سے متعلق ہے جو الفاظ میں تو مذکور نہیں ہے لیکن اس کا مفہوم مراد لیا گیا ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے گویا یہ فرمایا: اے ابوہریرہؓ! تم اپنی والدہ کے اسلام لانے کے سبب اچھا اجر و انعام پانے کے مستحق ہو گئے۔

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے اس معجزہ کا ذکر ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ باوجود یہ کہ کفر و انکار پر شدت سے قائم تھیں اور اسلام کے تئیں سخت بغض و نفرت رکھتی تھیں، لیکن آنحضرت ﷺ کی دعا نے فوراً اثر کیا اور ان کے قلب و دماغ میں حیرت انگیز طور پر انقلاب آیا کہ دین اسلام کی آغوش میں آگئیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کا کثیر الروایت ہونا اعجاز نبوی کا طفیل ہے

(۲۷) وَعَنْهُ قَالَ اِنَّكُمْ تَقُوْلُوْنَ اَكْثَرَ اَبُوْهُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهُ الْمَوْعِدُ وَاِنَّ اِخْوَتِيْ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْاَسْوَاقِ وَاِنَّ اِخْوَتِيْ مِنَ الْاَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمْ عَمَلُ اَمْوَالِهِمْ وَكُنْتُ امْرَءً مِسْكِيْنًا اَلْزَمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مِلْءِ بَطْنِيْ وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا لَنْ يَبْسُطَ اَحَدٌ مِنْكُمْ ثَوْبَهٗ حَتّٰى اَقْضِيَ مَقَالَتِيْ هٰذِهٖ ثُمَّ يَجْمَعَهٗ اِلٰى صَدْرِهٖ فَيَنْسٰى مِنْ مَقَالَتِيْ شَيْئًا اَبَدًا فَبَسَطْتُ نَمِرَةً لَيْسَ عَلَيَّ ثَوْبٌ غَيْرُهَا حَتّٰى قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقَالَتَهٗ ثُمَّ جَمَعْتُهَا اِلٰى صَدْرِيْ فَوَالَّذِيْ بَعَثَهٗ بِالْحَقِّ مَا نَسِيْتُ مِنْ مَقَالَتِهٖ ذٰلِكَ اِلٰى يَوْمِيْ هٰذَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نے (ایک دن) تابعینؒ کو مخاطب کر کے یا جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے صحابہؓ متاخرین کو مخاطب کر کے) کہا کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ حدیثیں نقل کرتے ہیں (تو پہلے یہ سمجھ لو کہ) اللہ کا وعدہ (برحق ہے) اور پھر سنو میں زیادہ حدیثیں بیان کرنے کا سبب تمہیں بتاتا ہوں کہ میرے مہاجر بھائیوں کو تو بازار میں ہاتھ پر ہاتھ مارنے (یعنی خرید و فروخت کی مشغولیت الجھائے رکھتی تھی اور میرے انصار بھائیوں کو ان کی زمین جائیداد فرصت نہیں دیتی تھی، جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں ایک مسکین و مفلس شخص تھا اور پیٹ بھر کر کھانا مل جانے پر قناعت کر کے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں پڑا رہتا تھا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ) رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص اپنا کپڑا پھیلائے اور اس وقت تک پھیلائے رہے جب تک میں اپنی بات (یعنی دعا) پوری نہ کر لوں اور پھر وہ شخص اپنے کپڑے کو سمیٹ کر اپنے سینہ سے لگا لے تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ میری بات (حدیث) کو کلی طور پر یا جزوی طور پر کبھی بھی بھول جائے۔ چنانچہ میں نے (فوراً) اپنی کملی پھیلا لی جس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی کپڑا نہیں تھا اور اس کو اس وقت تک پھیلائے رکھا جب تک آپ ﷺ نے اپنی بات پوری نہ کر لی اور پھر اس کو سمیٹ کر اپنے سینہ سے لگا لیا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آنحضرت ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا (اس کے بعد سے) آج تک میں آنحضرت ﷺ سے سنا ہوا کوئی ارشاد نہیں بھولا ہوں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "اللہ کا وعدہ برحق ہے" میں اللہ کے وعدہ سے مراد قیامت کا دن ہے، اس بات سے حضرت ابوہریرہؓ کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن ہم سب کو اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے اگر میں نے آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کرنے میں کمی بیشی یا خیانت کی ہوگی تو یقیناً اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مجھ کو سزا دے گا، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرما دیا ہے کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے یعنی میری طرف نسبت کر کے جھوٹی حدیث بیان کرے تو اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں تیار سمجھنا چاہئے۔

دوسرے صحابہؓ کی بہ نسبت حضرت ابوہریرہؓ زیادہ حدیثیں کیوں بیان کرتے ہیں؟ خود انہوں نے اس کے دو سبب بیان کئے ہیں،

پہلا تو یہ کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سب سے زیادہ حاضر باشی کی سعادت انہی کو حاصل تھی، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا مہاجر صحابہؓ جو زیادہ تر تجارت پیشہ تھے، اپنی تجارت اور کاروباری مصروفیات کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ہمہ وقت حاضر نہیں رہتے تھے، اسی طرح انصار صحابہ اپنی زمین جائیداد کی مصروفیت جیسے کھجور کے باغات کی دیکھ بھال اور کھیتی باڑی وغیرہ میں لگے رہنے کے سبب بارگاہ نبوت میں خاص خاص اوقات میں ہی حاضر ہوتے تھے ان سب کے برعکس حضرت ابوہریرہؓ کا نہ گھربار تھا نہ کاروبار، زراعت اور نہ معاشی زندگی کی کوئی مشغولیت، وہ تو ایک مفلس وقلاش انسان تھے ان کی قناعت کے لئے یہی بہت کافی تھا کہ کہیں سے کھانے پینے کی کوئی چیز آگئی اور انہوں نے اپنی بھوک مٹالی، اس کے علاوہ اور کسی چیز کی نہ ان کو ضرورت تھی اور نہ خواہش اس وجہ سے وہ اپنا تقریباً سارا وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر باشی میں گزارتے تھے اور اسی بناء پر آنحضرت ﷺ کے احوال ومعاملات کو دیکھنے اور آپ ﷺ کے ارشادات کو سننے کا سب سے زیادہ موقع ان ہی کو ملتا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے جو دوسرا سبب بیان کیا وہ دراصل ارشادات نبوی ﷺ کو سن کر جوں کا توں اپنے دماغ میں محفوظ رکھنے کا وہ خصوصی وصف تھا جو ایک سعادت کے طور پر انہیں اعجاز نبوی کے طفیل میں حاصل ہوا، اس سعادت کے حصول کی جو صورت پیش آئی اور حضرت ابوہریرہؓ نے اس کا ذکر جن الفاظ میں کیا اس کی وضاحت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ چاہتے تھے کہ میری امت کے جو لوگ مجھ سے حدیث سنیں وہ اس کو اچھی طرح یاد رکھیں تاکہ اس کے ذریعہ ہدایت و اصلاح کا سلسلہ بلاکم وکاست جاری رہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک دن فرمایا کہ اس وقت میں اپنے پروردگار سے یہ دعا کرنے جا رہا ہوں کہ میرے صحابہ میری جو حدیثیں سنیں وہ ان کے دماغ میں پوری طرح محفوظ رہیں۔ لہٰذا اس موقع پر جو شخص اپنا کپڑا پھیلائے گا اور میری دعا ختم ہونے تک اس کپڑے کو پھیلائے رکھے گا اور اس کے بعد پھر اس کپڑے کو سمیٹ کر اپنے سینہ سے لگائے گا تو اس دعا کی برکت سے، جو پہلے کپڑے میں اور پھر کپڑے کے ذریعہ سینہ تک پہنچے گی اس کا حافظہ اس قدر قوی ہو جائے گا کہ وہ میری جو حدیث بھی سنے گا اس کو زندگی بھر کبھی نہیں بھولے گا، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے اپنی کملی کو جو اس وقت ان کے پاس واحد کپڑا تھا، فوراً پھیلا دیا آنحضرت ﷺ نے دعا مانگنی شروع کر دی اور جب تک آپ دعا مانگتے رہے، حضرت ابوہریرہؓ اپنی کملی پھیلائے بیٹھے رہے، جب آنحضرت ﷺ نے دعا ختم کر لی تو حضرت ابوہریرہؓ نے کملی کو سمیٹ کر اپنے سینہ سے لگا لیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت ﷺ سے جو بھی ارشاد گرامی سنتے وہ جوں کا توں آپ کے دماغ میں محفوظ ہو جاتا اس طرح آپ کا سینہ اور دماغ احادیث نبوی ﷺ کا محفوظ گنجینہ بن گیا۔

حضرت جریرؓ کے حق میں دعا

(۲۸) وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا تُرِيْحُنِيْ مِنْ ذِي الْخَلَصَةِ فَقُلْتُ بَلٰى وَكُنْتُ لَا اَثْبُتُ عَلَى الْخَيْلِ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَرَبَ يَدَهُ عَلٰى صَدْرِيْ حَتّٰى رَاَيْتُ اَثَرَ يَدِهِ فِيْ صَدْرِيْ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْهُ وَاجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا قَالَ فَمَا وَقَعْتُ عَنْ فَرَسِيْ بَعْدُ فَانْطَلَقَ فِيْ مِائَةٍ وَخَمْسِيْنَ فَارِسًا اَحْمَسَ فَحَرَّقَهَا بِالنَّارِ وَكَسَرَهَا (متفق علیہ)

"اور حضرت جریرؓ ابن عبداللہ بجلیؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم ذوالخلصہ کو توڑ کر مجھے راحت نہیں پہنچاؤ گے؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں (اس کو توڑ کر آپ کو ضرور راحت پہنچاؤں گا (لیکن میرے لئے ایک پریشانی یہ تھی کہ) میں گھوڑے کی سواری پر پوری طرح قادر نہیں تھا اور کبھی کبھی گر پڑتا تھا) لہٰذا میں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا (کہ ذوالخلصہ تک پہنچنے کے لئے گھوڑے پر سفر کرنا پڑے گا اور میں گھوڑے کی سواری پر پوری طرح قادر نہیں ہوں) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) میرے سینے پر (اتنے زور سے) ہاتھ مارا کہ میں نے اس کا اثر اپنے سینہ کے اندر تک محسوس کیا اور پھر (میرے حق میں) یہ دعا فرمائی: اے اللہ! اس (جریر) کو

(ظاہر و باطن میں) ثابت و قائم رکھ اور اس کو راہ راست دکھانے والا اور راہ راست پانے والا بنا۔ حضرت جریرؓ کہتے ہیں کہ اس دعا کے بعد میں کبھی گھوڑے سے نہیں گرا، اور پھر احمس کے ڈیڑھ سو سواروں کو لے کر جریرؓ (ذوالخلصہ توڑنے کے لئے) روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر انہوں نے ذوالخلصہ کو آگ لگادی اور اس کو توڑ پھوڑ ڈالا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: ذُوالخَلَصَه (یا ذُو الْخُلُصَهْ) عرب کے قبیلہ خثعم کے بت خانہ کا نام تھا اس کو کعبۃ الیمامہ بھی کہا جاتا تھا، اس میں ایک بہت بڑا بت تھا جس کا نام خلصہ تھا، اس بت کی بڑے پیمانہ پر پوجا ہوتی تھی، یہ صورت حال آنحضرتؐ کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی اس لئے آپ ﷺ نے حضرت جریرؓ سے فرمایا کہ اگر تم بت خانہ کو توڑ پھوڑ ڈالو تو مجھے چین مل جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفوس مقدسہ اور کاملین کو غیر اللہ کی عبادت و پرستش اور خلاف شرع امور دیکھ کر سخت صدمہ ہوتا ہے اور اذیت محسوس ہوتی ہے۔

"اَحْمَسْ" جو اَحْمَرْ کے وزن پر ہے، دراصل لفظ "حماسہ" سے بنا ہے جس کے معنی شجاعت و بہادری کے ہیں، قریش کے کچھ قبیلے جو شجاعت و بہادری اور جنگجوئی میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے ان کو "احمس" کہا جاتا ہے۔

"اور پھر "احمس" کے ڈیڑھ سو سواروں کو لے کر جابر روانہ ہوئے... الخ" روایت میں اس آخری جزء کے بارے میں شارحین نے لکھا ہے کہ یہ اس راوی کے الفاظ ہیں جس نے اس روایت کو حضرت جریرؓ سے نقل کیا ہے، لیکن بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ جملے بھی اصل روایت ہی کے ہیں اور حضرت جریرؓ کے اپنے الفاظ ہیں، روایت میں یہاں پہنچ کر انہوں نے وہ اسلوب اختیار کیا جس کو التفات کہا جاتا ہے۔ یعنی اس جملہ میں انہوں نے اپنے ذکر کے لئے متکلم کا صیغہ چھوڑ کر غائب کا صیغہ اختیار کیا۔

زبان مبارک سے نکلا ہوا لفظ اٹل حقیقت بن گیا

(۲۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ رَجُلاً كَانَ يَكْتُبُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَارْتَدَّ عَنِ الْاِسْلَامِ وَلَحِقَ بِالْمُشْرِكِيْنَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْاَرْضَ لَا تَقْبَلُهُ فَاَخْبَرَنِيْ اَبُوْطَلْحَةَ اَنَّهُ اَتَى الْاَرْضَ الَّتِيْ مَاتَ فِيْهَا فَوَجَدَهُ مَنْبُوْذًا فَقَالَ مَاشَانُ هٰذَا فَقَالُوْا دَفَنَّاهُ مِرَارًا فَلَمْ تَقْبَلْهُ الْاَرْضُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص جو نبی کریم ﷺ کی وحی لکھتا تھا، مرتد ہو گیا اور مشرکوں سے جاملا، نبی کریم ﷺ (کو اس کے بارے میں یہ اطلاع ملی تو آپ ﷺ) نے فرمایا "اس کو زمین قبول نہیں کرے گی۔" حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ابو طلحہؓ نے (جو میری ماں کے شوہر تھے) مجھ کو بتایا کہ جب وہ (ابو طلحہؓ) اس مقام پر پہنچے جہاں اس شخص کی موت و تدفین ہوئی تھی تو دیکھا کہ وہ قبر سے باہر پڑا ہوا ہے، انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ اس کو کیا ہوا (کہ قبر سے باہر پڑا ہوا ہے؟) لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس شخص کو کئی بار دفن کر چکے ہیں لیکن زمین اس کو قبول نہیں کرتی (ہر مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم اس کو دفن کر کے گئے اور جب آ کر دیکھا تو باہر پڑا ہوا پایا۔ آخر تنگ آ کر ہم نے اس کو دفن کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: وہ شخص پہلے نصرانی (عیسائی) تھا پھر ایمان لایا اور مسلمان ہو گیا، چونکہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کو وحی کی کتابت پر مامور کر دیا، لیکن پھر نہ معلوم کیا ہوا کہ اسلام سے پھر گیا اور مرتد ہو کر دوبارہ نصرانی بن گیا اور مخالفین اسلام یعنی مشرکوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ اس بات سے آنحضرت ﷺ کو سخت تکلیف ہوئی اور زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ اس شخص کو تو زمین بھی قبول نہیں کرے گی اور اس کی لاش کو اپنے اندر سے باہر پھینک دے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب وہ شخص مرا اور مشرکوں نے ان کی لاش کو دفن کر دیا تو صبح ہو کر انہوں نے دیکھا کہ اس کی لاش قبر سے باہر پڑی ہوئی ہے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کا کام ہے کہ قبر کھود کر اس کی لاش کو باہر ڈال دیا ہے اور پھر انہوں نے بڑی محنت سے جہاں تک کھود سکے بہت گہری قبر

کھودی اور اس کو دفن کردیا، جب اگلی صبح کو پھر آکر دیکھا تو لاش قبر سے باہر پڑی ہوئی ہے اب ان کو احساس ہوا کہ یہ کسی آدمی کا کام نہیں ہے، چنانچہ وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے اور لاش کو اسی جگہ پڑے رہنے دیا۔

قبور یہود کے احوال کا انکشاف

(۳۰) وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ وَجَبَتِ الشَّمْسُ فَسَمِعَ صَوْتًا فَقَالَ يَهُوْدُ تُعَذَّبُ فِیْ قُبُوْرِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ غروب آفتاب کے بعد گھر سے نکلے تو ایک آواز سنی اور (وہ آواز سن کر) فرمایا: یہ یہود ہیں (یعنی یہ آواز ان یہودیوں کی ہے) جن کو قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "ایک آواز سنی" کے بارے میں شارحین نے لکھا ہے کہ وہ آواز یا تو ان ملائکہ کی تھی جو قبر میں آواز دینے پر مامور تھے یا ان یہودیوں کی تھی جن کو قبروں میں عذاب دیا جا رہا تھا اور یا وقوع عذاب کی آواز تھی۔ حدیث کی عبارت یھود تعذب فی قبورھا کے پیش نظر دوسرا احتمال زیادہ قرین قیاس ہے۔

اس حدیث سے عذاب قبر کا ثبوت ملتا ہے اور آنحضرت ﷺ کا یہ معجزہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر ان یہودیوں کی قبر کا حال منکشف ہوا اور آپ ﷺ نے اس کو بیان فرمایا۔

آندھی دیکھ کر ایک منافق کے مرنے کی خبر دینے کا معجزہ

(۳۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَدِمَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَفَرٍ فَلَمَّا كَانَ قُرْبَ الْمَدِيْنَةِ هَاجَتْ رِيْحٌ تَكَادُ اَنْ تَدْفِنَ الرَّاكِبَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُعِثَتْ هٰذِهِ الرِّيْحُ لِمَوْتِ مُنَافِقٍ فَقَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَاِذَا عَظِيْمٌ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ قَدْ مَاتَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ سفر سے واپس مدینہ تشریف لا رہے تھے کہ مدینہ کے قریب پہنچے تو سخت آندھی آئی اور سخت بھی اتنی کہ سوار کو زمین میں دفن کردے (یعنی اس آندھی کی شدت اور تیزی دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی سوار زمین پر قائم نہیں رہ سکے گا، طوفانی آندھی کا کوئی سخت جھونکا اڑا کر لے جائے گا اور کہیں (دور نامعلوم جگہ پر ہلاک کر ڈالے گا) آنحضرت ﷺ نے (اس موقع) پر فرمایا: یہ آندھی ایک منافق کے مرنے پر بھیجی گئی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ منافقوں کا ایک بڑا سردار مر گیا ہے۔" (مسلم)

تشریح: بعض حضرات نے تو یہ لکھا ہے کہ مرنے والے منافق کا نام رفاعہ بن درید تھا اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب آپ ﷺ غزوہ تبوک کے سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس منافق کا نام رافع تھا اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب آنحضرت ﷺ غزوہ بنی مصطلق سے واپس آرہے تھے۔

اس بڑے منافق کے مرنے پر اتنی سخت آندھی آنا دراصل اس وحشت وبدحالی اور آلودگی وپراگندگی کا قدرت کی طرف سے اظہار تھا جس سے منافق وبدکار مرتے وقت دوچار ہوتے ہیں اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ آئندہ کی زندگی (آخرت) میں بھی اس طرح کے لوگوں کو اسی حالت سے کہ جو سراسر کلفت وپریشانی اور تباہی میں مبتلا کرنے والی ہے، دوچار ہونا ہوگا۔

مدینہ کی حفاظت کے بارے میں معجزانہ خبر

(۳۲) وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى قَدِمْنَا عُسْفَانَ فَاَقَامَ بِهَا لَيَالِیَ

فَقَالَ النَّاسُ مَانَحْنُ هٰهُنَا فِيْ شَيْءٍ وَاِنَّ عِيَالَنَا لَخُلُوْفٌ مَانَاْمَنُ عَلَيْهِمْ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَافِي الْمَدِيْنَةِ شِعْبٌ وَلَا نَقْبٌ اِلَّا عَلَيْهِ مَلَكَانِ يَحْرُسَانِهَا حَتّٰى تَقْدَمُوْا اِلَيْهَا ثُمَّ قَالَ اِرْتَحِلُوْا فَارْتَحَلْنَا وَاَقْبَلْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَوَالَّذِيْ يُحْلَفُ بِهٖ مَاوَضَعْنَا رِحَالَنَا حِيْنَ دَخَلْنَا الْمَدِيْنَةَ حَتّٰى اَغَارَ عَلَيْنَا بَنُوْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ غَطْفَانَ وَمَا يُهَيِّجُهُمْ قَبْلَ ذٰلِكَ شَيْءٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ (مکہ سے مدینہ روانہ ہوئے) اور جب (مکہ سے تقریباً ۳۲ میل کے فاصلہ پر) مقام عسفان پہنچے تو آنحضرت ﷺ نے وہاں کئی راتیں قیام کیا بعض لوگوں (یعنی منافقوں اور ضعیف الاسلام لوگوں نے (اس جگہ کے قیام سے گھبرا کر) کہا کہ ہم یہاں بیکار کیوں پڑے ہوئے ہیں جب کہ ہمارے اہل وعیال ہم سے دور (مدینہ میں تنہا) ہیں اور ہمیں ان کے بارے میں اطمینان نہیں ہے (کہ ہماری عدم موجودگی) کا فائدہ اٹھا کر کہیں کوئی دشمن ان کی غارت گری پر نہ اتر آئے) ان لوگوں کی یہ بات نبی کریم ﷺ تک بھی پہنچی، آپ ﷺ نے یہ (سن کر) فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مدینہ کا کوئی راستہ اور کوئی کوچہ ایسا نہیں ہے جس پر دو دو فرشتے متعین نہ ہوں اور وہ فرشتے (مدینہ کے راستوں اور کوچوں کی) نگہبانی اور حفاظت پر اس وقت تک مامور رہیں گے جب تک تم مدینہ نہیں پہنچ جاؤ گے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے وہاں سے کوچ کا حکم دیا اور ہم روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچ گئے، قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم کھائی جاتی ہے (یعنی اللہ کی قسم) ہم نے (مدینہ پہنچ کر) ابھی (اپنے اونٹوں کی پیٹھ سے) اپنا سامان بھی نہیں اتارا تھا کہ (اچانک) بنو عبداللہ بن غطفان ہم (اہل مدینہ) پر چڑھ آئے جب کہ ہمارے آنے سے پہلے ایسی کوئی بات پیش نہیں آئی جو ان کو جنگ پر ابھارنے والی ہوتی۔" (مسلم)

تشریح: لفظ شعب کے لغوی معنی اس راستہ کے ہیں جو پہاڑ کے درمیان سے گزرتا ہو، اسی طرح "نقب" کے معنی بھی اس راستہ کے ہیں جو پہاڑوں کے درمیان ہو، لیکن یہاں حدیث میں شعب سے مراد وہ راستہ ہے جو شہر و آبادی میں آنے جانے کا ذریعہ ہو اور نقب سے مراد وہ گزرگاہ ہے جو دونوں طرف بنے ہوئے مکانات کے درمیان ہو جس کو گلی اور کوچہ کہتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے: انقاب مدینہ (مدینہ کے گلی کوچوں) پر فرشتے متعین ہیں ان کی وجہ سے مدینہ شہر میں نہ تو طاعون آئے گا اور نہ دجال داخل ہو سکے گا۔

"بنو عبداللہ ابن غطفان ہم پر چڑھ آئے۔" بنو عبداللہ ابن غطفان ایک قبیلہ کا نام ہے، مطلب یہ کہ ہم لوگوں کی عدم موجودگی میں مدینہ بالکل محفوظ تھا جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے بطور معجزہ ہمیں بتایا تھا اور اس وقت تک ہمارے کسی بھی دشمن کے جارحانہ عزائم کی راہ میں فرشتوں کی نگہبانی اور حفاظت گیری کے علاوہ کوئی بھی ظاہری رکاوٹ نہیں تھی، چنانچہ مدینہ پہنچنے کے بعد ہم نے آنحضرت ﷺ کی دی ہوئی اس خبر کی صداقت کا مشاہدہ کر لیا کہ جب تک ہم لوگ مدینہ نہیں پہنچے فرشتوں کی نگہبانی کی وجہ سے کوئی بھی دشمن حملہ آور نہیں ہو سکا اور نہ ہمارے اہل وعیال کو کوئی نقصان پہنچا سکا، ہمارے مدینہ پہنچتے ہی ایک ایسا دشمن قبیلہ ہم پر حملہ آور ہو گیا جس کے حملہ کا باعث ہماری آمد سے پہلے پیدا نہیں ہوا تھا، ایسا محسوس ہوا کہ محض ہمیں نقصان پہنچانے کے لئے اس دشمن کو حملہ آور ہونا پڑا اور ہماری عدم موجودگی اس کے جارحانہ عزائم کی تکمیل کا بہترین موقع ثابت ہونا چاہئے تھی، مگر یہ غیبی طاقت ہی تھی جس نے اس دشمن سے ہمارے اہل و عیال کی حفاظت کی اور اس کو ہماری عدم موجودگی میں مدینہ میں داخل نہیں ہونے دیا اور آبادی پر حملہ کرنے سے باز رکھا۔

بارش سے متعلق قبولیت دعا کا معجزہ

۳۳ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اَصَابَتِ النَّاسَ سَنَةٌ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ قَامَ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ هَلَكَ الْمَالُ وَجَاعَ الْعِيَالُ فَادْعُ اللّٰهَ لَنَا فَرَفَعَ يَدَيْهِ وَمَا نَرٰى فِي السَّمَآءِ قَزَعَةً فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا وَضَعَهَا حَتّٰى ثَارَ السَّحَابُ اَمْثَالَ الْجِبَالِ ثُمَّ لَمْ يَنْزِلْ عَنْ مِنْبَرِهٖ حَتّٰى

رَاَیْتُ الْمَطَرَ یَتَحَادَرُ عَلٰی لِحْیَتِهٖ فَمُطِرْنَا یَوْمَنَا ذٰلِكَ وَمِنَ الْغَدِوَ مِنْ بَعْدِ الْغَدِ حَتَّی الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰی وَقَامَ ذٰلِكَ الْاَعْرَابِیُّ اَوْ غَیْرُهٗ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ تَهَدَّمَ الْبِنَآءُ وَغَرِقَ الْمَالُ فَادْعُ اللّٰهَ لَنَا فَرَفَعَ یَدَیْهِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا فَمَا یُشِیْرُ اِلٰی نَاحِیَةٍ مِنَ السَّحَابِ اِلَّا انْفَرَجَتْ وَصَارَتِ الْمَدِیْنَةُ مِثْلَ الْجَوْبَةِ وَسَالَ الْوَادِیْ قَنَاةُ شَهْرًا وَلَمْ یَجِیْٔ اَحَدٌ مِنْ نَاحِیَةٍ اِلَّا حَدَّثَ بِالْجُوْدِ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ اَللّٰهُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا اَللّٰهُمَّ عَلَی الْاٰكَامِ وَالظِّرَابِ بُطُوْنِ الْاَوْدِیَةِ وَمَنَابِتِ الشَّجَرِ قَالَ فَاَقْلَعَتْ وَخَرَجْنَا نَمْشِیْ فِی الشَّمْسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں (ایک مرتبہ خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑ گیا، انہی دنوں نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک دیہاتی نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمارے مال و اسباب (یعنی کھیتی باڑی) مویشی، اور باغات پانی نہ ملنے کی وجہ سے) برباد ہو گئے اور اہل و عیال بھوک بلبلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے دعا فرمائیں کہ آپ ﷺ نے (یہ سنتے ہی) اپنے دست مبارک (دعا کے لئے) اٹھا دیئے اس وقت آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی ہمیں نظر نہیں آ رہا تھا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے آپ ﷺ نے (دعا ختم کر کے) ابھی اپنے ہاتھ نہ چھوڑے تھے کہ اچانک پہاڑوں کی مانند بادل اٹھا اور آپ ﷺ منبر سے نیچے نہ اترنے پائے تھے کہ میں نے دیکھا کہ بارش کا پانی آپ ﷺ کی ریش مبارک پر گرنے لگا تھا پھر اس (جمعہ کے) دن (کے باقی حصے میں) پانی برسا دوسرے روز برسا اور تیسرے روز برسا یہاں تک کہ دوسرے جمعہ تک اس بارش کا سلسلہ جاری رہا اور (جب مسلسل بارش جاری رہنے کی وجہ سے لوگوں کا نقصان ہونے لگا تو) دوسرے جمعہ کو (آنحضرت ﷺ کے خطبہ کے دوران) وہی دیہاتی (یا کوئی دوسرا شخص) کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! مکان گر رہے ہیں اور مال و اسباب ڈوب رہے ہیں آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے دعا فرمائیے (کہ اب بارش تھم جائے۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی!" اے اللہ! ہمارے اطراف میں (یعنی کھیتوں اور باغات پر) برسا، ہمارے اوپر (یعنی ہمارے گھروں پر) نہ برسا۔" (اس دعا کے بعد) آپ ﷺ جس طرف اشارہ کرتے جاتے تھے ابر اس جانب سے کھلتا جاتا تھا یہاں تک کہ مدینہ کے ایک گول گڈھے کی مانند ہو گیا (یعنی مدینہ شہر کے باہری حصوں میں چاروں طرف بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش ہو رہی تھی جب کہ بیچ میں مدینہ شہر کا مطلع بالکل صاف ہو کر گول گڈھے کی طرح ایسا نمایاں ہو گیا تھا کہ پوری آبادی کے اوپر بادل کا کوئی ٹکڑا نظر نہیں آ رہا تھا) اور (مدینہ کے باہری اطراف میں مسلسل بارش کی وجہ سے) وہ نالہ جس کا نام قناۃ تھا ایک مہینہ تک بہتا رہا۔ ان اطراف سے جو بھی شخص (مدینہ شہر میں) آیا اس نے کثرت سے بارش ہونے کی خبر دی۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یوں دعا فرمائی: اے اللہ! ہمارے اطراف میں برسا ہم پر نہ برسا۔ اے اللہ! ٹیلوں پر، پہاڑوں پر، نالوں کے اندر اور درختوں کے اگنے کی جگہ (یعنی کھیتی و باغات) پر برسا۔" حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ (اس دعا کے بعد شہر کے باہر اطراف میں تو بارش ہوتی رہی، لیکن آبادی کے حصہ میں) ابر بالکل کھل گیا اور ہم اس حال میں باہر نکلے کہ دھوپ میں چل رہے تھے۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: لفظ یتحادر اصل میں تو ینزل و یقطر کے معنی ظاہر کرتا ہے لیکن یہاں حدیث میں یہ لفظ یتساقط کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ بارش کا پانی براہ راست آپ ﷺ کی ریش مبارک پر گر رہا تھا۔

مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں علی لحیتہ کے الفاظ ہیں اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن بعض نسخوں میں عن لحیۃ کے الفاظ ہیں چنانچہ حضرت شیخ عبدالحقؒ نے اس کے اعتبار سے یہ ترجمہ کیا ہے کہ بارش کا پانی آپ ﷺ کی ریش مبارک پر ٹپکنے لگا تھا... حاصل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے بارش کی دعا فرمائی اور ابھی آپ ﷺ منبر سے اترے بھی نہیں تھے اور مسجد سے باہر نہیں نکلے تھے کہ زوردار بارش شروع ہو گئی۔

امام نوویؒ نے اس حدیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بارش کا سلسلہ زیادہ شدت کے ساتھ طویل

ہو جائے اور اس کی وجہ سے مکانات وغیرہ کو نقصان پہنچنے لگے تو یہ دعا مانگنا مستحب ہے کہ اے اللہ اب ہمارے گھروں پر بارش نہ برسا! لیکن اس دعا کے لئے نماز پڑھنا اور آبادی سے باہر جنگل و میدان میں جاکر دعا مانگنا، جیسا کہ استسقاء کی نماز کا حکم ہے) مشروع نہیں ہے۔

اسطوانہ حنانہ کا معجزہ

(۳۴) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَطَبَ اسْتَنَدَ اِلٰى جِذْعِ نَخْلَةٍ مِنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ فَلَمَّا صُنِعَ لَهُ الْمِنْبَرُ فَاسْتَوٰى عَلَيْهِ صَاحَتِ النَّخْلَةُ الَّتِيْ كَانَ يَخْطُبُ عِنْدَهَا حَتّٰى كَادَتْ اَنْ تَنْشَقَّ فَنَزَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَخَذَهَا فَضَمَّهَا اِلَيْهِ فَجَعَلَتْ تَئِنُّ اَنِيْنَ الصَّبِيِّ الَّذِيْ يُسَكَّتُ حَتّٰى اسْتَقَرَّتْ قَالَ بَكَتْ عَلٰى مَا كَانَتْ تَسْمَعُ مِنَ الذِّكْرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب (مسجد نبوی میں) خطبہ ارشاد فرماتے تو کھجور کے اس سوکھے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے جو ایک ستون کے طور پر مسجد میں کھڑا تھا، پھر جب منبر تیار ہو گیا اور آنحضرت ﷺ خطبہ پڑھنے کے لئے اس (منبر) پر کھڑے ہوئے تو کھجور کا وہ تنا جس سے (منبر بننے سے پہلے) ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے چلانے لگا (یعنی زور زور سے رونے لگا) اور قریب تھا کہ وہ (آنحضرت ﷺ کے فراق کی اذیت کی شدت سے پھٹ جائے کہ نبی کریم ﷺ (منبر سے) اترے اور اس کے پاس جا کر اس کو (ہاتھوں سے پکڑا اور پھر (اس کی تسلی کے لئے) اس کو گلے لگایا اس کے بعد تو اس ستون نے اس بچہ کی طرح رونا شروع کر دیا جس کو (مختلف حیلوں تدبیروں سے) چپ کرایا جاتا ہے (اور وہ جلدی چپ نہیں ہوتا) آخر کار اس ستون کو قرار آگیا اور وہ چپ ہو گیا۔ پھر آنحضرت نے (اس ستون کے رونے کا سبب یہ) بیان فرمایا: یہ ستون اس وجہ سے رویا کہ (اللہ کا) جو ذکر سنتا تھا اس سے محروم ہو گیا ہے۔" (بخاری)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مسجد نبوی ﷺ کے ستون کھجور کے سوکھے تنوں کے تھے، چنانچہ ابتدائی زمانہ میں جب کہ منبر شریف بنکر تیار نہیں ہوا تھا آنحضرت خطبہ ارشاد فرماتے وقت انہی ستونوں میں سے ایک ستون سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے، جب منبر تیار ہو گیا اور آپ ﷺ خطبہ دینے کے لئے اس ستون سے ٹیک لگا کر کھڑے ہونے کے بجائے منبر پر کھڑے ہوئے تو وہ ستون اپنی اس سعادت کی محرومی پر بلک بلک کر رونے لگا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر یعنی خطبہ کے وقت اس کو میرا جو قرب حاصل تھا اور نہایت قریب سے میرا جو خطبہ سنتا تھا اس سے محرومی نے اس کو رونے پر مجبور کر دیا ہے اس واقعہ کے بعد سے اس ستون کو اسطوانہ حنانہ کہا جانے لگا۔

یہ حدیث جس میں اس ستون کے رونے کا ذکر ہے، جماعت صحابہؓ کے اتنے متعدد طرق سے منقول ہے کہ اس کے بارہ میں کوئی شک و شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا اور بعض محدثین نے تو اس حدیث کو "متواتر" کہا ہے، یہ دراصل آنحضرت کا ایک بڑا معجزہ تھا کہ کھجور کے سوکھے تنے جیسی بے جان چیز آنحضرت ﷺ کے قرب کی سعادت سے محرومی پر رونے لگی اور اس کے رونے کی آواز کو مسجد نبوی میں موجود صحابہؓ نے اپنے کانوں سے سنا۔ حضرت حسن بصری کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ اس حدیث کو بیان کرتے تو بے اختیار رونے لگتے تھے اور کہا کرتے تھے: لوگو! کھجور کی سوکھی ہوئی لکڑی آنحضرت ﷺ کی شوق و محبت میں روتی تھی تمہیں تو اس سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی محبت اور شوق ملاقات میں بے قرار رہنا چاہئے۔

زآد میی دان کہ درو معرفتی نیست   سنگے وگیا ہے کہ درد خاصیتے ہست

جھوٹا عذر بیان کرنے والا اپنے ہاتھ کی توانائی سے محروم ہو گیا

(۳۵) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ اَنَّ رَجُلًا اَكَلَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِمَالِهٖ فَقَالَ كُلْ بِيَمِيْنِكَ قَالَ لَا

اسْتَطِيْعُ قَالَ لَا اسْتَطَعْتَ مَامَنَعَهُ اِلَّا الْكِبْرُ قَالَ فَمَارَفَعَهَا اِلٰى فِيْهِ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت سلمہ ابن اکوع ؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ کے سامنے بائیں ہاتھ سے کھایا تو آپ ﷺ نے اس کو نصیحت فرمائی کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اس شخص نے (اس شخص نے نصیحت پر عمل کرنے کے بجائے) جواب دیا کہ میں داہنے ہاتھ سے نہیں کھاسکتا، آنحضرت ﷺ نے (بد دعا کے طور پر) فرمایا: تمہیں داہنے ہاتھ سے کھانے پر کبھی قدرت نہ ہو۔ (دراصل) اس شخص نے گھمنڈ میں آکر داہنے ہاتھ سے نہیں کھایا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کی اس بد دعا کے نتیجہ میں) وہ شخص اپنا داہنا ہاتھ منہ تک پہنچانے پر کبھی قادر نہیں ہوسکا۔" (مسلم)

تشریح: اس شخص نے گھمنڈ میں آکر دائیں ہاتھ سے نہیں کھایا تھا " یہ راوی کے الفاظ ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو رحمۃ للعلمین ہونے کے باوجود اس شخص کے حق میں جو بد دعا فرمائی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کی نصیحت سن کر صحیح عمل کرنے کے بجائے اپنے غلط عمل کی جھوٹی تاویل کی اور جھوٹا عذر بیان کیا، اس شخص کا بائیں ہاتھ سے کھانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ اس کے دائیں ہاتھ میں کوئی خرابی تھی یا وہ دائیں ہاتھ سے کھانے سے واقعۃً مجبور تھا بلکہ اس نے ایک گھمنڈی شخص کی طرح بلا کسی واقعی عذر کے اپنے بائیں ہاتھ سے کھایا اور آنحضرت کی نصیحت کا بڑی بے باکی اور بیہودگی سے جواب دیا، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس کے حق میں بد دعا فرمائی اس بد دعا کا اثر یہ ہوا کہ وہ شخص اپنے دائیں ہاتھ سے کھانے پر کبھی قادر نہیں ہوسکا اس کا دایاں ہاتھ اس طرح بیکار ہوگیا کہ سخت کوشش کے باوجود منہ تک اٹھتا ہی نہیں تھا۔

آنحضرت ﷺ کی سواری کی برکت سے سُست رفتار گھوڑا تیز رفتار ہوگیا

(۳۶) وَعَنْ اَنَسٍ ؓ اَنَّ اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ فَزِعُوْا مَرَّةً فَرَكِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَسًا لِاَبِيْ طَلْحَةَ بَطِيْئًا وَكَانَ يَقْطِفُ فَلَمَّا رَجَعَ قَالَ وَجَدْنَا فَرَسَكُمْ هٰذَا بَحْرًا فَكَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ لَا يُجَارٰى وَفِيْ رِوَايَةٍ فَمَا سُبِقَ بَعْدَ ذٰلِكَ الْيَوْمِ۔

(رواه البخاری)

"اور حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رات میں) اہل مدینہ (چوروں یا کسی دشمن کا خطرہ محسوس کر کے) گھبرا گئے) اور چیخ و پکار کرنے لگے، نبی کریم ﷺ (صورت حال کی تحقیق کے لئے) ابوطلحہ ؓ کے (ننگی پیٹھ) گھوڑے، جو بہت سُست رفتار اور منھتا تھا سوار ہوکر (اس سمت کہ جدھر سے خطرہ محسوس ہوا تھا) تشریف لے گئے اور جب واپس آئے تو (ابوطلحہ ؓ سے) فرمایا کہ ہم نے، تو تمہارے گھوڑے کو پانی کی طرح (تیز رو اور کشادہ قدم) پایا۔ پس (آنحضرت کی سواری کے بعد) وہ گھوڑا ایسا تیز رفتار ہوگیا کہ کوئی گھوڑا اس سے آگے تو کیا نکلتا) اس کے ساتھ بھی نہیں چل سکتا تھا۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ: پس اس دن کے بعد کوئی گھوڑا اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔" (بخاریؒ)

کھجوروں میں برکت کا معجزہ

(۳۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ تُوُفِّيَ اَبِيْ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ فَعَرَضْتُ عَلٰى غُرَمَائِهِ اَنْ يَّاْخُذُوا التَّمْرَ بِمَا عَلَيْهِ فَاَبَوْا فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ قَدْ عَلِمْتَ اَنَّ وَالِدِيْ قَدِ اسْتُشْهِدَ يَوْمَ اُحُدٍ وَتَرَكَ دَيْنًا كَثِيْرًا وَاِنِّيْ اُحِبُّ اَنْ يَرَاكَ الْغُرَمَاءُ فَقَالَ لِيْ اِذْهَبْ فَبَيْدِرْ كُلَّ تَمْرٍ عَلٰى نَاحِيَةٍ فَفَعَلْتُ ثُمَّ دَعَوْتُهُ فَلَمَّا نَظَرُوْا اِلَيْهِ كَاَنَّهُمْ اُغْرُوْا بِيْ تِلْكَ السَّاعَةَ فَلَمَّا رَاٰى مَايَصْنَعُوْنَ طَافَ حَوْلَ اَعْظَمِهَا بَيْدَرًا ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ جَلَسَ عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ ادْعُ لِيْ اَصْحَابَكَ فَمَا زَالَ يَكِيْلُ لَهُمْ حَتّٰى اَدَّى اللّٰهُ عَنْ وَالِدِيْ اَمَانَتَهُ وَاَنَا اَرْضٰى اَنْ يُّؤَدِّيَ اللّٰهُ اَمَانَةَ وَالِدِيْ وَلَا اَرْجِعُ اِلٰى اِخْوَاتِيْ بِتَمْرَةٍ فَسَلَّمَ اللّٰهُ الْبَيَادِرَ

كُلَّهَا وَحَتَّى اَنِّى اَنْظُرَ اِلَى الْبَيْدَرِ الَّذِىْ كَانَ عَلَيْهِ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنَّهَا لَمْ تَنْقُصْ تَمْرَةٌ وَاحِدَةٌ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت جابر ابن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ جب میرے والد کی وفات ہوئی تو ان کے ذمہ بہت سا قرضہ تھا، چنانچہ میں نے ان کے قرض خواہوں کو پیشکش کی کہ ہمارے پاس جتنی کھجوریں ہیں وہ سب اس قرض کے بدلہ میں جو میرے والد پر تھا لے لیں۔ لیکن انہوں نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا (کیونکہ وہ قرض خواہ، جو یہودی تھے ان کھجوروں کو اپنے دیئے ہوئے قرض کے مقابلہ میں بہت کم جانتے تھے) آخر کار میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ کو معلوم ہے میرے والد احد کی جنگ میں شہید ہو گئے ہیں اور انہوں نے بہت سا قرض چھوڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ قرض خواہ آپ ﷺ کو (میرے پاس) دیکھیں (یعنی کوئی ایسی صورت ہو کہ جب قرض خواہ میرے پاس آئیں تو آپ ﷺ تشریف فرما ہوں تاکہ وہ آپ ﷺ کو دیکھ کر میرے ساتھ کوئی رعایت کر دیں۔ آپ ﷺ نے (یہ سن کر) مجھ سے فرمایا کہ جاؤ اور ہر قسم کی کھجوروں کی الگ الگ ڈھیری بنالو: چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا (کہ میرے پاس جتنی کھجوریں تھیں سب کو الگ الگ ڈھیریوں میں کر دیا) اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو بلا لایا۔ قرض خواہوں نے آنحضرت ﷺ کو تشریف لاتے دیکھا تو اس وقت انہوں نے فوراً ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے وہ مجھ پر حاوی ہو گئے ہوں (یعنی انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ آنحضرت ﷺ کلی یا جزوی طور پر قرض معاف کرنے کی ہمیں تلقین کریں گے یا کچھ اور دنوں تک صبر کرنے کا مشورہ دیں گے، لہٰذا آنحضرت ﷺ کو دیکھتے ہی انہوں نے مجھ پر برسنا اور بڑے لب ولہجہ میں قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا اور اس طرح انہوں نے پہلے ہی سے اپنا ایسا رویہ ظاہر کیا جیسے وہ بتانا چاہتے ہوں کہ پورے قرض کی فوری واپسی کے علاوہ اور کسی بات پر تیار نہیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے جب ان قرض خواہوں کا یہ رویہ دیکھا (تو ان سے کچھ کہے بغیر) کھجوروں کی سب سے بڑی ڈھیری کے گرد تین بار چکر لگایا اور پھر ڈھیری پر بیٹھ کر (مجھ سے) فرمایا کہ اپنے قرض خواہوں کو بلاؤ (جب وہ آگئے تو) آپ ﷺ کے حکم سے اس ڈھیری میں سے ناپ ناپ کر قرض خواہوں کو دینا شروع ہوا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے والد کا تمام قرضہ ادا کرا دیا، اگرچہ میری خوشی کے لئے یہی کیا کم تھا کہ اللہ تعالیٰ میری ان کھجوروں سے میرے والد کا تمام قرضہ ادا کرا دیتا خواہ اپنی بہنوں کے پاس لے جانے کے لئے ایک کھجور بھی باقی نہ بچتی لیکن اللہ تعالیٰ نے تو (آنحضرت ﷺ کے معجزے سے) ساری ڈھیریوں کو محفوظ رکھا اور جس ڈھیری پر نبی کریم ﷺ بیٹھے ہوئے تھے میں نے اس کی طرف نظر اٹھائی تو ایسا لگا کہ اس میں سے بھی ایک کھجور کم نہیں ہوئی ہے اور جب اس ڈھیری ہی میں سے کچھ کم نہ ہوا جس میں سے ان قرض خواہوں کو ان کے مطالبہ کے بقدر دیا گیا تھا تو باقی ڈھیریاں بدرجہ اولی محفوظ وسالم رہیں۔" (بخاری)

تشریح: حضرت جابرؓ کے والد نے اپنے پسماندگان میں کئی بیٹیاں چھوڑی تھیں جو حضرت جابرؓ کی بہن ہوئیں حضرت جابرؓ کا مطلب یہ تھا کہ کھجوروں میں اپنے لئے یا اپنی بہنوں کے لئے میری کوئی خواہش نہیں تھی، میں تو اس میں خوش تھا کہ کسی طرح میرے والد کا تمام قرضہ اتر جائے خواہ ہمارے لئے ان کھجوروں میں سے کچھ نہ بچے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی برکت اور آپ ﷺ کے معجزے کے طفیل میں ان کھجوروں کے ذریعہ نہ صرف میرے والد کا تمام قرضہ ادا کرا دیا بلکہ تمام کھجوریں جوں کی توں بچ گئیں۔

گھی کی کپی کے متعلق ایک معجزہ

(۳۸) وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ اُمَّ مَالِكٍ كَانَتْ تُهْدِىْ لِلنَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ عُكَّةٍ لَهَا سَمْنًا فَيَاتِيْهَا بَنُوْهَا فَيَسْأَلُوْنَ الْاُدْمَ وَلَيْسَ عِنْدَهُمْ شَيْءٌ فَتَعْمِدُ اِلَى الَّذِىْ كَانَتْ تُهْدِىْ فِيْهِ لِلنَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَجِدُ فِيْهِ سَمْنًا فَمَا زَالَ يُقِيْمُ لَهَا اُدْمَ بَيْتِهَا حَتّٰى عَصَرَتْهُ فَاَتَتِ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عَصَرْتِيْهَا قَالَتْ نَعَمْ قَالَ لَوْ تَرَكْتِيْهَا مَازَالَ قَائِمًا۔

(رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک انصاری صحابیہ) حضرت ام مالکؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک کپی میں گھی کا ہدیہ بھیجا کرتی تھیں، (چنانچہ اس کپی میں اتنی برکت آگئی تھی کہ) جب ام مالکؓ کے بیٹے (گھر میں) آکر روٹی کے ساتھ کھانے کے لئے) کوئی سالن مانگتے اور ان کے پاس کوئی سالن موجود نہیں ہوتا تھا (کیونکہ روغن وگھی کی قسم سے ان کے پاس جو کچھ بھی ہوتا تھا اس کو وہ آنحضرت ﷺ کے پاس خدمت میں بھیج دیا کرتی تھیں) تو ام مالکؓ کا آسرا وہی کپی بنتی جس میں وہ نبی کریم ﷺ کے لئے گھی بھیجا کرتی تھی، (یعنی وہ اس کپی کو اٹھا کر اس میں گھی دیکھتیں) اور ان کو اس میں سے گھی مل جاتا تھا، (کافی دنوں تک) یہی سلسلہ جاری رہا کہ اس کپی میں لگا ہوا گھی ان کے پورے گھر کے لئے سالن کی ضرورت پوری کر دیا کرتا تھا پھر (ایک دن ایسا ہوا کہ (ام مالکؓ نے (زیادہ گھی حاصل کرنے کی طمع میں) اس کپی کو پوری طرح نچوڑ لیا (یعنی اس کپی میں جو گھی لگا ہوا تھا اس کو نچوڑ نچوڑ کر سارا نکال لیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ اس کی برکت سے محروم ہو گئیں اور گھر والوں کو روٹی کھانے کے لئے جس چیز کا سہارا تھا، وہ ملنی بند ہو گئی کیونکہ حرص وطمع تو ہے ہی بری بلا، جس سے آخر الامر محرومی کے علاوہ کچھ نہیں ملتا) ام مالکؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچیں (اور یہ ماجرہ بیان کیا) آنحضرت ﷺ نے پوچھا: کیا تم اس گھی کی کپی کو بالکل نچوڑ لیا تھا؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم کپی کو اس طرح نہ نچوڑتیں تو ہمیشہ تمہیں اس کپی سے سالن (گھی) ملا کرتا (کیونکہ اس کپی میں اگر ذرا سا بھی گھی لگا رہتا تو اس میں برکت اترتی رہتی اور جب کسی چیز میں برکت اترتی ہے تو وہ چیز کتنی ہی ذرا سی کیوں نہ ہو، بڑھ کر بہت ہو جاتی ہے۔" (مسلم)

کھانے میں برکت کا معجزہ

(۳۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ اَبُوْطَلْحَةَ لِاُمِّ سُلَيْمٍ لَقَدْ سَمِعْتُ صَوْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَعِيْفًا اَعْرِفُ فِيْهِ الْجُوْعَ فَهَلْ عِنْدَكِ مِنْ شَيْءٍ فَقَالَتْ نَعَمْ فَاَخْرَجَتْ اَقْرَاصًا مِنْ شَعِيْرٍ ثُمَّ اَخْرَجَتْ خِمَارًا لَهَا فَلَفَّتِ الْخُبْزَ بِبَعْضِهٖ ثُمَّ دَسَّتْهُ تَحْتَ يَدِيْ وَلَاثَتْنِيْ بِبَعْضِهٖ ثُمَّ اَرْسَلَتْنِيْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَهَبْتُ بِهٖ فَوَجَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ وَمَعَهُ النَّاسُ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِمْ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْسَلَكَ اَبُوْطَلْحَةَ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ بِطَعَامٍ قُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَنْ مَعَهُ قُوْمُوْا فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقْتُ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ حَتّٰى جِئْتُ اَبَاطَلْحَةَ فَاَخْبَرْتُهُ فَقَالَ اَبُوْطَلْحَةَ يَا اُمَّ سُلَيْمٍ قَدْ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ وَلَيْسَ عِنْدَنَا مَا نُطْعِمُهُمْ فَقَالَتِ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ فَانْطَلَقَ اَبُوْطَلْحَةَ حَتّٰى لَقِيَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَبُوْطَلْحَةَ مَعَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلُمِّيْ يَا اُمَّ سُلَيْمٍ مَا عِنْدَكِ فَاَتَتْ بِذٰلِكَ الْخُبْزِ فَاَمَرَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَفُتَّ وَعَصَرَتْ اُمُّ سُلَيْمٍ عُكَّةً فَاَدَمَتْهُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهِ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّقُوْلَ ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَاَذِنَ لَهُمْ فَاَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ ثُمَّ لِعَشَرَةٍ فَاَكَلَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ وَشَبِعُوْا وَالْقَوْمُ سَبْعُوْنَ اَوْ ثَمَانُوْنَ رَجُلًا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ اَنَّهٗ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَدَخَلُوْا فَقَالَ كُلُوْا وَسَمُّوا اللّٰهَ فَاَكَلُوْا حَتّٰى، فَعَلَ ذٰلِكَ بِثَمَانِيْنَ رَجُلًا ثُمَّ اَكَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَهْلُ الْبَيْتِ وَتَرَكَ سُؤْرًا وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ قَالَ اَدْخِلْ عَلَيَّ عَشَرَةً حَتّٰى عَدَّ اَرْبَعِيْنَ ثُمَّ اَكَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ هَلْ نَقَصَ مِنْهَا شَيْءٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ ثُمَّ اَخَذَ مَا بَقِيَ فَجَمَعَهٗ ثُمَّ دَعَا فِيْهِ بِالْبَرَكَةِ فَعَادَ كَمَا كَانَ فَقَالَ دُوْنَكُمْ هٰذَا۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ابوطلحہ انصاریؓ (جو میرے سوتیلے باپ تھے، گھر میں آکر میری ماں، ام سلیم سے کہنے لگے، کہ (آج) میں نے رسول کریم ﷺ کی آواز میں بڑی کمزوری محسوس کی جس سے مجھے محسوس ہوا کہ آپ بھوکے ہیں، کیا تمہارے پاس کھانے

کی کوئی چیز ہے؟ اُمّ سلیم نے جواب دیا کہ ہاں کچھ ہے، اور پھر انہوں نے جو کی چند روٹیاں نکالیں، اور پھر اپنی اوڑھنی لی اور اس کے ایک حصّہ میں تو روٹیوں کو لپیٹا اور ایک حصّہ سے میرے سر کو لپیٹ دیا اور پھر اوڑھنی میں لپٹی ہوئی ان روٹیوں کو میرے ہاتھ کے نیچے چھپایا اور مجھے رسول کریم ﷺ کے پاس بھیجا، میں وہ روٹیاں لے کر پہنچا تو رسول اللہ ﷺ اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے اور بہت سارے لوگ (جن کی تعداد اسّی تھی) آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے سب کو سلام کیا رسول کریم ﷺ نے (سلام کا جواب دینے کے بعد) مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہیں ابو طلحہؓ نے بھیجا ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں! پھر آپ ﷺ نے پوچھا کیا کھانا دے کر بھیجا ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں! رسول کریم ﷺ نے میرا جواب (سن کر) ان لوگوں سے جو آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے فرمایا کہ اٹھو (ابو طلحہؓ کے گھر چلو) اس کے بعد آنحضرت ﷺ اور وہ تمام لوگ (ابو طلحہؓ کے گھر کی طرف) روانہ ہوئے اور میں بھی آپ ﷺ کے آگے چل پڑا (جیسا کہ خادم اور میزبان آگے آگے چلتے ہیں، یا اس خیال سے آگے چلا کہ پہلے پہنچ کر ابو طلحہؓ کو آنحضرت ﷺ کے تشریف لانے کی اطلاع کر دوں) چنانچہ ابو طلحہؓ کے پاس پہنچ کر ان کو (آپ ﷺ کی تشریف آوری کی) خبر دی، ابو طلحہؓ نے (آنحضرت ﷺ کے ساتھ اتنے سارے آدمیوں کے آنے کی خبر سنی تو) بولے کہ اُمّ سلیمؓ! رسول کریم ﷺ تشریف لا رہے ہیں، اور آپ ﷺ کے ساتھ صحابہؓ بھی ہیں جب کہ ہمارے پاس (ان چند روٹیوں کے علاوہ کہ جو ہم نے آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجی تھیں) اتنے سارے آدمیوں کے کھلانے کے لئے کوئی چیز نہیں ہے، اُمّ سلیمؓ نے جواب دیا: اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔ پھر ابو طلحہؓ (آنحضرت ﷺ کے استقبال کے لئے) گھر سے باہر نکلے اور (راستہ میں پہنچ کر) رسول کریم ﷺ سے ملاقات کی اس کے بعد رسول کریم ﷺ ابو طلحہؓ کے تشریف لائے اور (گھر میں پہنچ کر) فرمایا کہ: اُمّ سلیمؓ: (از قسم روٹی) جو کچھ تمہارے پاس ہے، لاؤ اُمّ سلیمؓ نے وہ روٹیاں جو ان کے پاس تھیں، لا کر (آنحضرت ﷺ کے سامنے) رکھ دیں، آنحضرت ﷺ نے (ابو طلحہؓ کو یا کسی اور کو حکم دیا کہ وہ روٹیوں کو توڑ توڑ کر چورا کر دیں، چنانچہ ان روٹیوں کو چورا کیا گیا اور اُمّ سلیمؓ نے (گھی کی) کپی کو نچوڑ کر گھی نکالا اور اس کو سالن کے طور پر رکھا، اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے اس روٹی سالن کے بارے میں وہ فرمایا جو اللہ نے کہلانا چاہا۔ پھر آپ ﷺ نے (مجھے یا ابو طلحہؓ کو یا اور کسی دوسرے کو) حکم دیا کہ دس آدمیوں کو بلاؤ، چنانچہ دس آدمیوں کو بلایا گیا اور انہوں نے پیٹ بھر کر کھایا، پھر جب وہ دس آدمی اٹھ کر چلے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (اسی طرح) دس آدمیوں کو بلا کر کھلاتے رہو (اور دس دس آدمیوں کو بلا کر کھلایا جاتا رہا) یہاں تک کہ تمام لوگوں نے (اس تھوڑے سے کھانے میں خوب سیر ہو کر کھایا اور یہ سب ستّر یا اسّی آدمی تھے۔ (بخاری ومسلم)

اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، دس آدمیوں کو کھانے پر بلاؤ، اور جب وہ (دس آدمی) آئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر کھاؤ! چنانچہ انہوں نے (اللہ کا نام لے کر) کھانا کھایا، اسی طرح (دس دس آدمی کر کے) اسی آدمیوں کو کھلایا گیا، اور جب سب لوگ کھا چکے تو) آخر میں نبی کریم ﷺ نے اور گھر کے آدمیوں نے کھانا کھایا اور پھر بھی پس خوردہ باقی رہا۔ اور بخاری کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: دس آدمیوں کو میرے پاس لاؤ۔ اسی طرح (دس دس آدمی کر کے) چالیس آدمیوں کو شمار کیا اور ان کے بعد خود نبی کریم ﷺ نے کھانا تناول فرمایا اور میں برابر دیکھے جا رہا تھا کہ کھانے میں سے کچھ کم ہوا ہے یا نہیں (لیکن مجھے قطعاً کوئی کمی نظر نہیں آ رہی تھی۔

اور مسلم کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ (جب سب لوگ شکم سیر ہو چکے) تو آنحضرت ﷺ نے پس خوردہ کو) اٹھا اٹھا کر جمع کیا اور اس میں برکت کی دعا فرمائی، چنانچہ وہ ایسا ہی ہو گیا، جیسا کہ پہلے تھا (یعنی جس مقدار میں پہلے وہ کھانا تھا اتنا ہی اب ہو گیا) پھر آپ ﷺ نے فرمایا: لو اس کو رکھو (اور پھر کھا لینا)۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کو کھانا کھلانے اور تھوڑے سے کھانے میں برکت ہونے کا یہ واقعہ اسی طرح کا ہے جیسا کہ حضرت جابرؓ کے ساتھ پیش آیا تھا اور حضرت جابرؓ کے واقعہ کی طرح یہ واقعہ بھی غزوۂ خندق کے موقع کا ہے لہٰذا حضرت انسؓ کے ان الفاظ

"رسول کریم ﷺ! اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے۔" میں مسجد میں سے مراد خندق کے قریب کی وہ جگہ ہے جس کو آپ ﷺ نے دشمنوں کی طرف سے مدینہ کے محاصرہ اور خندق کھودے جانے کے موقع پر نماز پڑھنے کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے اس سوال پر کہ کیا تمہیں ابو طلحہؓ نے بھیجا ہے؟ حضرت انسؓ کا "ہاں" کہنا اس بات کے منافی نہیں تھا کہ ان کی والدہ اُمّ سلیمؓ نے بھیجا تھا کیونکہ اصل تو ابو طلحہؓ ہی تھے جن کے کہنے پر اُمّ سلیمؓ نے حضرت انسؓ کو روٹیاں دے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا۔

"کیا کھانا دے کر بھیجا ہے؟" آنحضرت کا اس بات کو پہلی بات (کیا تمہیں ابو طلحہؓ نے بھیجا ہے) سے الگ کر کے پوچھنا یا تو سمجھانے کے لئے تھا یا وحی اور علم کی تاخیر کے مطابق تھا، یعنی پہلے تو آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ صرف اس بات کا علم حاصل ہوا تھا کہ انسؓ کو ابو طلحہؓ کے کہنے پر بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا آپؐ نے بس یہی سوال کیا کہ کیا تمہیں ابو طلحہؓ نے بھیجا ہے؟ پھر بعد میں جب دوبارہ وحی کے ذریعہ آپ ﷺ کو یہ علم ہوا کہ انسؓ کے ساتھ کھانا بھی ہے تو آپ ﷺ نے پھر یہ سوال کیا کہ کیا کھانا دے کر بھیجا ہے؟

"اٹھو (ابو طلحہؓ کے گھر چلو)" کے تحت شارحین نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو چونکہ (وحی کے ذریعہ) یہ معلوم ہو چکا تھا کہ انسؓ کے ساتھ چند ہی روٹیاں ہیں لہٰذا آپ ﷺ نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ اتنے مجمع میں خود تنہا یا دو تین آدمیوں کے ساتھ کھا کر بیٹھ جائیں اور باقی لوگ بھوکے رہیں، اس کے ساتھ آپ ﷺ کا ارادہ اس معجزہ کے اظہار کا بھی ہوا جس کے نتیجہ میں چند روٹیوں سے ایک بڑی جماعت شکم سیر ہوئی اور اسی کے ضمن میں دوسرا معجزہ ابو طلحہؓ کے گھر میں کپی میں خیر و برکت کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے، تاکہ انہوں نے اور ان کے گھر والوں نے آنحضرت ﷺ کے تئیں جس اخلاص و محبت، نیک نیتی اور خدمت گزاری کے جذبہ و عمل کا اظہار کیا اس کا پھل ان کو حصول برکت کی صورت میں ملے، پس آنحضرت ﷺ اپنے صحابہؓ کو لے کر ابو طلحہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔

"اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں" اس جواب کے ذریعہ اُمّ سلیمؓ نے دراصل ابو طلحہؓ کو اطمینان دلایا کہ اگر آنحضرت ﷺ اتنے سارے صحابہؓ کو لے کر تشریف لا رہے ہیں تو اس کی وجہ سے ہمیں اس گھبراہٹ میں مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ ہم اتنا تھوڑا سا کھانا اتنے زیادہ آدمیوں کو کس طرح کھلا پائیں گے، کیونکہ اس میں ضرور کوئی حکمت و مصلحت ہے، جس کو اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں اور اپنے صحابہ کے ساتھ ہمارے ہاں آپ ﷺ کی آمد یقیناً ہمارے لئے خیر و برکت کا باعث ہوگی۔ گویا اُمّ سلیمؓ نے فوراً محسوس کر لیا کہ آنحضرت ﷺ کی آمد ضرور کسی معجزے کے اظہار کے لئے ہے، اس سے اُمّ سلیمؓ کی دینداری دانشمندی اور قوت یقین کا اظہار ہوتا ہے کہ انہیں جماعت صحابہؓ کے ساتھ آپ ﷺ کی آمد سے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی، بلکہ فوری طور پر ان کے دماغ میں یہی بات آئی کہ آنحضرت ﷺ کو کھانے کی نوعیت اور مقدار کا خوب علم ہے، اگر آپ ﷺ کوئی مصلحت نہ سمجھتے تو سب کو لے کر یہاں آنے کی ضرورت کیوں محسوس فرماتے، چونکہ آپ ﷺ کا کوئی فعل مصلحت و حکمت سے خالی نہیں ہوتا اس لئے جماعت کے ساتھ آپ ﷺ کی آمد میں یقیناً کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔ یہ بھی فیض رسالت کا اعجاز ہی تھا کہ اس زمانہ کی ایک عورت ہمارے زمانہ کے بہت سے مردوں سے بھی زیادہ یقین و ایمان کی قوت رکھتی تھی۔ رضی اللہ عنہا و عن اهل عصرها و جعلنا في زمرتهم امين يارب العلمين۔

"وہ فرمایا جو اللہ نے کہلانا چاہا۔" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خیر و برکت کی دعا فرمائی، یا اسماء الٰہی پڑھ کر اس کھانے پر دم کیا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ بسم الله اللّٰهم اعظم فيها البركة

"پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ دس آدمیوں کو بلاؤ۔" آپ ﷺ نے پوری جماعت کو ایک ہی مرتبہ کھانے پر بلانے کے بجائے دس دس آدمیوں کو بلا کر کھلانے کا حکم اس لئے دیا کہ جس برتن میں وہ کھانا تھا وہ بس اتنا ہی بڑا تھا کہ اس کے گرد دس آدمی بیٹھ کر اطمینان سے کھا سکتے تھے، اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ مکان میں گنجائش کی کمی کے سبب سب آدمیوں کو بیک وقت بلانے کے بجائے دس دس آدمیوں کو بلا کر کھلانے کا حکم دیا گیا۔

"اور یہ سب ستر یا اسی آدمی تھے" کی وضاحت میں اب ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہاں تو تعداد کا ذکر شک ہی کے ساتھ ہے لیکن

دوسری روایت میں تعین اور یقین کے ساتھ اسی کا ذکر ہے، نیز اس روایت میں اسی سے کچھ اوپر کا ذکر ہے تاہم ان دونوں روایتوں میں منافات نہیں ہے۔ کیونکہ اسی (۸۰) والی روایت کے بارے میں احتمال ہے کہ راوی نے تعداد ذکر کرتے وقت کسر کو حذف کر دیا ہو، البتہ ایک اور روایت میں جس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے جو یہ بیان کیا گیا ہے، کہ "اس کھانے میں چالیس آدمیوں نے کھایا اور پھر بھی کھانا جوں کا توں باقی رہا" یا یہاں ہی امام بخاریؒ کی جو دوسری روایت نقل کی گئی ہے اور جس میں چالیس آدمیوں کے کھانے اور ان کے بعد آنحضرت ﷺ کے کھانے کا ذکر ہے تو اس سے ان روایتوں میں واقعہ کا تعدد معلوم ہوتا ہے یعنی ان روایتوں میں ایک ہی واقعہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ الگ الگ دو واقعوں کا ذکر ہے کہ ایک واقعہ میں تو اسی آدمیوں نے کھایا تھا اور ایک واقعہ میں چالیس آدمیوں نے، لیکن ایک شارح نے کہا ہے کہ واقعہ متعدد نہیں بلکہ ایک ہی ہے جس کا ذکر ان روایتوں میں ہے اور ان روایتوں میں تطبیق یہ ہے کہ ان اسی (۸۰) آدمیوں نے دو مرحلوں میں کھانا کھایا تھا، پہلے دس دس کر کے چالیس آدمی کھانے سے فارغ ہوئے اور اس کے بعد ان چالیس آدمیوں نے کھانا کھایا جو آنے میں پہلے چالیس آدمیوں سے پیچھے رہ گئے تھے یا آنحضرت ﷺ نے ان کو بعد میں بلا بھیجا تھا۔ اس تطبیق کی روشنی میں بخاری کی دوسری روایت کے یہ الفاظ کہ "چالیس آدمیوں نے کھایا اور ان کے بعد آنحضرت ﷺ نے کھانا تناول فرمایا" کی وضاحت یہ ہوئی کہ جب چالیس آدمی کھانے سے فارغ ہو گئے تو چالیس آدمیوں کی دوسری جماعت آنے سے پہلے آپ ﷺ نے کھانا تناول فرما لیا، اس طرح آپ ﷺ کی برکت پہلی جماعت کو بھی حاصل ہوگئی اور دوسری جماعت کو بھی۔

انگلیوں سے پانی ابلنے کا معجزہ

(۴۰) وَعَنْهُ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاِنَاءٍ وَهُوَ بِالزَّوْرَاءِ فَوَضَعَ يَدَهُ فِي الْاِنَاءِ فَجَعَلَ الْمَاءُ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ اَصَابِعِهٖ فَتَوَضَّاَ الْقَوْمُ قَالَ قَتَادَةُ قُلْتُ لِاَنَسٍ كَمْ كُنْتُمْ قَالَ ثَلٰثَ مِائَةٍ اَوْ زُهَاءَ ثَلٰثَ مِائَةٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں (ایک موقع پر) جب کہ نبی کریم ﷺ (مدینہ کے قریب) زوراء گاؤں میں تشریف فرما تھے آپ ﷺ کی خدمت میں (پانی کا) ایک برتن لایا گیا، آپ ﷺ نے اپنا مبارک ہاتھ اس برتن میں رکھ دیا اور آپ ﷺ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی کا فوارہ ابلنے لگا، چنانچہ پوری جماعت نے اسی پانی سے وضو کیا۔ (حدیث کے ایک راوی) حضرت قتادہ تابعیؒ (جنہوں نے یہ روایت حضرت انسؓ سے نقل کی ہے؟) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے سوال کیا: اس موقع پر آپ لوگ کتنے آدمی تھے؟ حضرت انسؓ نے جواب دیا: تین سو، یا تخمیناً تین سو (آدمی ہوں گے)۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "انگلیوں کے درمیان سے پانی کا فوارہ ابلنے لگا۔" کی وضاحت میں دو قول ہیں، ایک تو یہ کہ خود انگلیوں ہی سے پانی نکلنے لگا تھا۔ یہ قول مزنیؒ کا ہے اور اکثر علماء کا رجحان اسی طرف ہے: نیز اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ فرایت الماء من اصابعه یعنی میں نے آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی ابلتے دیکھا۔" اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اصل معجزہ کی بڑائی بھی اسی بات سے ثابت ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ کے اس معجزہ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ سے افضل ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے عصا کی ضرب سے پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس برتن میں جو پانی پہلے موجود تھا اس کو دست مبارک کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اتنا زیادہ کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیان سے فوارے کی طرح ابلنے لگا۔

انگشتہائے مبارک سے پانی نکلنے اور کھانے سے تسبیح کی آواز آنے کا معجزہ

(۴۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنَّا نَعُدُّ الْاٰيَاتِ بَرَكَةً وَاَنْتُمْ تَعُدُّوْنَهَا تَخْوِيْفًا كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَقَلَّ الْمَاءُ فَقَالَ اطْلُبُوْا فَضْلَةً مِنْ مَاءٍ فَجَاءُوْا بِاِنَاءٍ فِيْهِ مَاءٌ قَلِيْلٌ فَاَدْخَلَ يَدَهُ فِي الْاِنَاءِ ثُمَّ قَالَ حَيَّ عَلَى الطَّهُوْرِ الْمُبَارَكِ وَالْبَرَكَةُ مِنَ اللّٰهِ وَلَقَدْ رَاَيْتُ الْمَاءَ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ اَصَابِعِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَقَدْ كُنَّا

نَسْمَعُ تَسْبِیْحَ الطَّعَامِ وَھُوَیُوکَلُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: (ہم صحابہؓ) تو آیات کو برکت و خوشحالی کا سبب سمجھتے تھے، اور (اے لوگو) تم سمجھتے ہو کہ آیات بس (منکرین صداقت کو) ڈرانے کے لئے ہیں۔ (اس کے بعد حضرت ابن مسعودؓ نے ایک معجزہ بیان کیا، کہ) ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ (راستہ میں) پانی کی قلت کا مسئلہ پیدا ہوگیا، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ (کسی کے پاس برتن میں تھوڑا سا بھی) بچا ہوا پانی ہو تو اس کو دیکھ کر (میرے پاس لاؤ چنانچہ صحابہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں ایک ایسا برتن لے کر آئے جس میں بہت تھوڑا سا پانی تھا آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک اس برتن میں ڈال دیا اور فرمایا: "آؤ جلدی سے یہ پاک اور بابرکت پانی حاصل کرو اور یہ وہ برکت ہے جو (کسی ظاہری سبب و ذریعہ سے نہیں بلکہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔" اور (حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے کہا) اس وقت رسول کریم ﷺ کی مبارک انگلیوں سے فوارہ کی طرح پانی ابلتے میں نے خود دیکھا۔ نیز (حضرت ابن مسعودؓ نے ایک اور معجزہ یہ بیان کیا کہ) کھانا کھاتے وقت ہم کھانے کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔" (بخاری)

تشریح: "آیات" سے مراد یا تو قرآن کریم کی آیتیں ہیں جو آسمان سے نازل ہوئی تھی یا وہ معجزات مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ ظاہر فرماتا ہے، زیادہ صحیح اور حدیث کے سیاق سے زیادہ مناسب یہی ہے کہ "آیات" سے مراد "معجزات" لئے جائیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ آیات اگرچہ کافروں اور منکروں کو ڈرانے کے لئے ہیں لیکن اہل ایمان کے حق میں کہ جو ان آیات کے محب اور معتقد ہیں، بشارت و برکت اور زیادتی ایمان کا موجب ہیں، یہ وضاحت حضرت شیخ عبدالحقؒ نے طیبیؒ کے حوالہ سے نقل کی ہے، اور ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ "آیات" سے مراد صرف معجزات اور کرامات ہیں، انہوں نے واضح کیا ہے کہ یہاں "آیات" سے آیات قرآنی مراد لینا غیر موزوں ہے۔

اس حدیث کے الفاظ سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں ہی سے پانی نکلتا تھا، جیسا کہ جمہور علماء کا قول ہے اور اسی نسبت سے آنحضرت ﷺ کے اس معجزے کو پتھر سے پانی نکلنے کے حضرت موسیٰ کے معجزہ پر ترجیح دی جاتی ہے لہٰذا یہ قول ناقابل اعتناء ٹھہر جاتا ہے کہ پانی انگلیوں سے نہیں نکلا تھا، بلکہ جو تھوڑا سا پانی برتن میں پہلے موجود تھا وہی بڑھ گیا اور اتنا زیادہ آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیان سے فوارہ کی طرح ابلنے لگا، یہ قول دراصل الفاظ حدیث کی تاویل ہے اور نہیں معلوم کہ حدیث کے واضح مفہوم کے باوجود اس تاویل کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ پانی کے اس معجزہ کا اظہار تو خالی برتن کے ذریعہ بھی ہوسکتا تھا، پھر تھوڑا سا پانی تلاش کرا کے منگانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں یقیناً کوئی حکمت و مصلحت ہی ہوگی لیکن وہ حکمت و مصلحت کیا تھی محدثین و شارحین بسیار غور و فکر کے بعد بھی اس کی جڑ تک نہیں پہنچ سکے ہیں، لہٰذا اس کا علم اللہ کے سپرد کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔

حضرت انسؓ نے دوسرے معجزہ میں کھانے کی تسبیح کا ذکر کیا ہے، انہی کی ایک اور روایت میں یہ ہے کہ (ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ایک مٹھی میں سنگریزے اٹھائے تو وہ سنگریزے آپ ﷺ کے دست مبارک میں تسبیح (یعنی اللہ کی پاکی بیان) کرنے لگے اور ہم نے خود ان کی تسبیح کی آواز سنی۔

پانی کا ایک اور معجزہ

(۴۲) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّكُمْ تَسِیْرُوْنَ عَشِیَّتَكُمْ وَلَیْلَتَكُمْ وَ تَاتُوْنَ الْمَآءَ اِنْشَآءَ اللّٰهُ غَدًا فَانْطَلَقَ النَّاسُ لَایَلْوِیْ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ قَالَ اَبُوْقَتَادَةَ فَبَیْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَسِیْرُ حَتّٰی ابْهَارَّ اللَّیْلُ فَمَالَ عَنِ الطَّرِیْقِ فَوَضَعَ رَاْسَهٗ ثُمَّ قَالَ احْفَظُوْا عَلَیْنَا صَلٰوتَنَا فَكَانَ اَوَّلَ من اسْتَیْقَظَ رَسُوْلُ

اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالشَّمْسُ فِیْ ظَھْرِہٖ ثُمَّ قَالَ ارْکَبُوْا فَرَکِبْنَا فَسِرْنَا حَتّٰی اِذَا ارْتَفَعَتِ الشَّمْسُ نَزَلَ ثُمَّ دَعَا بِمِیْضَأَۃٍ کَانَتْ مَعِیَ فِیْھَا شَیْءٌ مِنْ مَّآءٍ فَتَوَضَّأَ مِنْھَا وُضُوْءً دُوْنَ وُضُوْءٍ قَالَ وَبَقِیَ فِیْھَا شَیْءٌ مِنْ مَآءٍ ثُمَّ قَالَ احْفَظْ عَلَیْنَا مِیْضَأَتَکَ فَسَیَکُوْنُ لَھَا نَبَأٌ ثُمَّ اَذَّنَ بِلَالٌ بِالصَّلٰوۃِ فَصَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَکْعَتَیْنِ ثُمَّ صَلَّی الْغَدَاۃَ وَرَکِبَ وَرَکِبْنَا مَعَہٗ فَانْتَھَیْنَا اِلَی النَّاسِ حِیْنَ امْتَدَّ النَّھَارُ وَحَمِیَ کُلُّ شَیْءٍ وَھُمْ یَقُوْلُوْنَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ھَلَکْنَا وَعَطِشْنَا فَقَالَ لَا ھُلْکَ عَلَیْکُمْ وَدَعَا بِالْمِیْضَأَۃِ فَجَعَلَ یَصُبُّ وَاَبُوْقَتَادَۃَ یَسْقِیْھِمْ فَلَمْ یَعْدُ اَنْ رَاَی النَّاسُ مَاءً فِی الْمِیْضَأَۃِ تَکَابُّوْا عَلَیْھَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحْسِنُوا الْمَلَا کُلُّکُمْ سَیُرْوٰی قَالَ فَفَعَلُوْا فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَصُبُّ وَاَسْقِیْھِمْ حَتّٰی مَابَقِیَ غَیْرِیْ وَغَیْرُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ صَبَّ فَقَالَ لِیْ اشْرَبْ فَقُلْتُ لَا اَشْرَبُ حَتّٰی تَشْرَبَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَقَالَ اِنَّ سَاقِیَ الْقَوْمِ اٰخِرُھُمْ قَالَ فَشَرِبْتُ وَشَرِبَ قَالَ فَاَتَی النَّاسُ الْمَاءَ جَامِّیْنَ رِوَاءً رَوَاہُ مُسْلِمٌ ھٰکَذَا فِیْ صَحِیْحِہٖ وَکَذَا فِیْ کِتَابِ الْحُمَیْدِیِّ وَجَامِعِ الْاُصُوْلِ وَزَادَ فِی الْمَصَابِیْحِ بَعْدَ قَوْلِہٖ اٰخِرُھُمْ لَفْظَۃَ شُرْبًا۔

"اور حضرت ابوقتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک سفر کے دوران) ہمارے سامنے خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ تم اس رات کے اول حصہ میں اور آخر حصہ میں (یعنی پوری رات) سفر کرو گے اور انشاء اللہ کل تمہیں پانی مل جائے گا (یعنی آپ ﷺ نے گویا اس پانی کی طرف اشارہ فرمایا جو بطریق معجزہ حاصل ہونا تھا اور جس کا ذکر آگے آرہا ہے) چنانچہ تمام لوگ اس طرح (بے تحاشا) چلنے لگے کہ کسی کو کسی، کی پرواہ نہیں تھی (کیونکہ ہر شخص پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح جلد سے جلد پانی تک پہنچ جائے اور اس دھن میں نہ کسی کو کسی کا ساتھ پکڑنے کا خیال تھا اور نہ کوئی کسی کو ساتھ لے کر چلنے کی طرف دھیان دے رہا تھا) بلکہ ہر شخص علیحدہ علیحدہ چلا جا رہا تھا)۔ ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ (اسی رات میں) رسول کریم ﷺ بھی چلے جا رہے تھے کہ جب آدھی رات گزر گئی تو آپ ﷺ (سونے کے ارادہ سے) راستہ سے ہٹ کر (ایک کنارے پر) اتر گئے اور سر رکھ کر لیٹ گئے، اور (سونے سے پہلے کسی خادم کو) ہدایت فرمائی کہ ہماری نماز کا خیال رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ سب لوگ بے خبر سو جائیں اور فجر کے وقت آنکھ نہ کھلنے کے سبب نماز قضاء ہو جائے، لیکن ایسا ہی ہوا کہ سب لوگ بے خبر ہو گئے اور نیند کے غلبہ سے فجر کے وقت کسی کی بھی آنکھ نہیں کھلی) پھر سب سے پہلے رسول کریم ﷺ بیدار ہوئے جب کہ دھوپ آپ ﷺ کی پشت مبارک پر پڑنے لگی آپ ﷺ نے (سب کو جگا کر) فرمایا کہ فوراً تیار ہو جاؤ (اور یہاں سے چل دو) چنانچہ ہم لوگ (جلدی جلدی) اپنی سواریوں پر بیٹھے اور وہاں سے چل پڑے یہاں تک کہ جب سورج (ایک نیزہ کے بقدر یا اس سے زیادہ) بلند ہوا تو آنحضرت ﷺ (سواری سے) اتر گئے، پھر آپ ﷺ نے وضو کا برتن منگایا جو میرے پاس تھا اور جس میں تھوڑا سا پانی باقی تھا اور اس سے آپ ﷺ نے مختصر وضو کیا (یعنی جن اعضاء کو تین تین بار دھویا جاتا ہے ان کو آپ ﷺ نے پانی کی قلت کے سبب ایک ایک بار یا دو دو بار ہی دھونے پر اکتفا کیا)۔ اور ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ (وضو کے بعد) ذرا سا اس برتن میں بچ گیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اس برتن (کے پانی) کو حفاظت سے رکھنا، اس لئے کہ عنقریب اس پانی سے (بطریق معجزہ) ایک (اہم اور عظیم الشان) بات ظہور پذیر ہوگی (جس کا بڑا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا) اس کے بعد بلالؓ نے نماز کے لئے اذان کہی اور رسول کریم ﷺ نے (سنّت کی) دو رکعتیں پڑھ کر (ہمراہی صحابہؓ کے ساتھ) فجر کی قضاء نماز باجماعت ادا کی۔ نماز سے فراغت کے بعد آنحضرت ﷺ سوار ہوئے اور ہم بھی اپنی سواریوں پر بیٹھ گئے (اور آگے کا سفر شروع ہو گیا) یہاں تک کہ ہم (قافلہ کے ان) لوگوں سے جا ملے (جو ہم سے کچھ آگے جا کر اترے تھے، اس وقت دن چڑھ چکا تھا اور سورج اوپر آگیا تھا جس سے ہر چیز تپنے لگی تھی لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یا رسول اللہ! ہم تو ہلاک ہو گئے (یعنی گرم ہوا کے تھپیڑوں اور دھوپ کی تمازت نے ہمارا برا حال کر دیا ہے) اور چونکہ پانی نہیں ہے اس لئے) پیاس (کی شدت بڑھ رہی ہے)... آنحضرت ﷺ نے فرمایا، تمہارے لئے ہلاکت نہیں)۔ پھر آپ ﷺ نے وضو کے پانی کا وہی برتن طلب فرمایا اور اس برتن سے پانی ڈالنا شروع کر دیا اور ابوقتادہؓ

نے لوگوں کو پلانا شروع کیا، اہل قافلہ نے جیسے ہی اس برتن سے پانی گرتے (اور کچھ لوگوں کو پیتے) دیکھا تو سب کے سب ایک دم ٹوٹ پڑے اور ایک دوسرے پر گرنے لگے، آنحضرت ﷺ نے (ان کی بے صبری دیکھ کر) فرمایا، خوش اسلوبی اختیار کرو اور اخلاق سے کام لو، تم سب لوگ اس پانی سے) سیراب ہو جاؤ گے۔" چنانچہ فوراً ہی) سب لوگوں نے تنظیم وخوش اسلوبی اختیار کی (اور الگ الگ ہو کر وقار وقطار کے ساتھ کھڑے ہو گئے) پھر رسول کریم ﷺ نے پانی ڈالنا اور میں نے پانی پلانا شروع کیا یہاں تک کہ جب (سب لوگ سیراب ہو گئے اور) میرے اور رسول کریم ﷺ کے علاوہ کوئی باقی نہ رہا، تو آپ ﷺ نے پانی ڈالا اور مجھ سے فرمایا کہ لو پیو، میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت تک نہیں پی سکتا جب تک آپ (ﷺ) نہ پی لیں، آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کا ساقی ان کا آخری آدمی ہوتا ہے۔" یعنی جو شخص لوگوں کو پلاتا ہے وہ خود سب کے بعد پیتا ہے کیونکہ یہ آداب میں سے ہے کہ ساقی جب سب کو سیراب کرلے تب خود پئے، حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ (ارشاد گرامی کی اتباع میں) میں نے پی لیا اور پھر آنحضرت ﷺ نے پانی نوش فرمایا۔ ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اہل قافلہ پانی (کی جگہ) پر اس حال میں پہنچے کہ سیراب تھے اور راحت پا چکے تھے۔ اس روایت کو مسلم نے نقل کیا ہے اور صحیح مسلم میں اسی طرح منقول ہے، نیز کتاب حمیدی اور جامع الاصول میں بھی یہ روایت ان ہی الفاظ کے ساتھ منقول ہے، البتہ مصابیح میں، ساقی القوم اخرھم کے بعد شربًا کا لفظ مزید ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے جو آنکھ کھلتے ہی قضاء نماز نہیں پڑھی بلکہ اس کو کچھ مؤخر کر کے اس جگہ سے روانہ ہو گئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کسی ایسی جگہ پہنچ کر نماز پڑھنا چاہتے تھے، جہاں پانی دستیاب ہو، یا یہ وجہ تھی کہ جس وقت آپ ﷺ کی آنکھ کھلی وہ نماز کے لئے وقت کراہت تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس وقت کراہت کو نکالنے کے لئے نماز کو کچھ اور مؤخر کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے جیسا کہ پہلی روایت کے الفاظ فرکبنافسرنا حتّٰی اِذَا ارتفعت الشمس دلالت کرتے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جگہ سے فوراً منتقل ہو جانا چاہئے جہاں حکم خداوندی کی تعمیل میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہو یا کسی ممنوع بات کا ارتکاب ہو گیا ہو اگرچہ وہ ارتکاب قصدًا نہ ہوا ہو۔ نیز آپ ﷺ نے فجر کی قضاء نماز ادا کرنے سے پہلے جو رکعتیں پڑھیں وہ سنتیں تھیں اور مسئلہ یہی ہے کہ اگر آنکھ نہ کھلنے یا کسی اور سبب سے فجر کی نماز وقت پر ادا نہ ہو سکے اور پھر اس کی قضاء زوال آفتاب سے پہلے ادا کی جائے تو اس کے ساتھ سُنّت کی دو رکعتیں بھی پڑھنی چاہئیں، ہاں اگر فرض نماز فوت نہ ہوئی ہو بلکہ صرف سنتیں فوت ہوئی ہوں تو اس کی قضا نہیں ہے لیکن امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ طلوع آفتاب کے بعد زوال آفتاب سے پہلے فوت شدہ سنتوں کی قضاء نماز پڑھ لینی چاہئے، گویا کسی بھی امام کے مسلک میں زوال آفتاب کے بعد اس کی قضاء نہیں ہے۔

"فجر کی قضاء نماز (باجماعت) ادا کی" سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہؓ کے پاس بھی اپنے اپنے برتن تھے جن میں وہ اتنا پانی رکھتے تھے کہ اس وقت وضو کر کے آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز میں شریک ہوئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہؓ کے پاس اتنا بھی پانی نہیں تھا کہ آنحضرت ﷺ کی طرح مختصر ہی وضو کر لیتے، لہٰذا انہوں نے تیمم کر کے نماز میں شرکت کی، بہرحال اس سلسلہ میں حدیث کے الفاظ بالکل خاموش ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے علاوہ باقی لوگوں نے وضو کیا یا تیمّم کیا تھا۔

"تم پر ہلاکت نہیں ہے" اس ارشاد کے ذریعہ آپ ﷺ نے لوگوں کو گویا تسلی و بشارت دی کہ گھبراؤ نہیں، تمہیں کسی ہلاکت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے غیب سے پانی بھیجے گا، اس اعتبار سے یہ جملہ خبریہ ہوا، یا یہ کہ یہ ارشاد دراصل جملہ دعائیہ تھا یعنی آپ ﷺ نے گویا یہ فرمایا، اللہ تعالیٰ تمہیں ہلاکت سے دور رکھے اور غیب سے تمہاری سیرابی کا انتظام فرمائے۔

تبوک میں کھانے کی برکت کا معجزہ

(۴۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ لَمَّا كَانَ یَوْمُ غَزْوَةِ تَبُوْكَ اَصَابَ النَّاسَ مَجَاعَةٌ فَقَالَ عُمَرُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ادْعُهُمْ بِفَضْلِ

اَزْوَادِھِمْ ثُمَّ اُدْعُ اللّٰہَ لَھُمْ عَلَیْھَا بِالْبَرَکَۃِ فَقَالَ نَعَمْ فَدَعَا بِنَطْعٍ فَبُسِطَ ثُمَّ دَعَا بِفَضْلِ اَزْوَادِھِمْ فَجَعَلَ الرَّجُلُ یَجِیْءُ بِکَفِّ ذُرَۃٍ وَیَجِیْءُ الْاٰخَرُ بِکَفِّ تَمْرٍ وَیَجِیْءُ الْاٰخَرُ بِکَسْرَۃٍ حَتّٰی اجْتَمَعَ عَلَی النَّطْعِ شَیْءٌ یَسِیْرٌ فَدَعَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْبَرَکَۃِ ثُمَّ قَالَ خُذُوْا فِیْ اَوْعِیَتِکُمْ فَاَخَذُوْا فِیْ اَوْعِیَتِھِمْ حَتّٰی مَا تَرَکُوْا فِی الْعَسْکَرِ وِعَاءً اِلَّا مَلَاؤُہٗ قَالَ فَاَکَلُوْا حَتّٰی شَبِعُوْا وَفَضَلَتْ فَضْلَۃٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ لَا یَلْقَی اللّٰہَ بِھِمَا عَبْدٌ غَیْرُ شَاکٍّ فَیُحْجَبَ عَنِ الْجَنَّۃِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے دن (توشہ کی کمی کے سبب) جب سخت بھوک نے لوگوں کو ستایا تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! جو تھوڑا بہت توشہ لوگوں کے پاس بچا ہوا ہے اس کو منگوا لیجئے اور پھر اس توشہ پر ان کے لئے اللہ سے برکت کی دعا فرمائیے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اچھا۔ اور پھر آپ ﷺ نے چمڑے کا دستر خوان منگوا کر بچھوایا اور لوگوں سے ان کا بچا ہوا توشہ لانے کے لئے کہا گیا" چنانچہ لوگوں نے چیزیں لانا شروع کیں، کوئی مٹھی بھر چنے لے کر آیا، کوئی مٹھی بھر کھجور لے کر آیا، اور کوئی روٹی کا ٹکڑا لایا، اس طرح اس دستر خوان پر کچھ تھوڑی سی چیزیں جمع ہوگئیں تو رسول کریم ﷺ نے نزول برکت کی دعا فرمائی، اور پھر (سب لوگوں سے) فرمایا لو (جس کا جتنا جی چاہے اس میں سے اپنا برتن بھرلے) چنانچہ لوگوں نے اپنے اپنے برتن میں لینا شروع کیا یہاں تک کہ لشکر میں کوئی ایسا برتن نہیں بچا جس کو بھر نہ لیا گیا ہو... حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ پھر سارے لشکر نے (جو تقریباً ایک لاکھ مجاہدین پر مشتمل تھا) خوب پیٹ بھر کر کھایا اور پھر بھی بہت سارا کھانا بچ رہا۔ اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ بلاشبہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اور یاد رکھو) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ان دو گواہیوں کے ساتھ کہ جن میں اس کو کوئی شک وشبہ نہ ہو، اللہ تعالیٰ سے جاکر ملے اور پھر اس کو جنت میں جانے سے روکا جائے۔" (مسلم)

تشریح: "تبوک" ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے تقریباً ۴۶۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ماہ رجب سن ۹ھ میں آنحضرت ﷺ غزوہ کے لئے وہاں اسلامی لشکر لے کر گئے تھے کہا جاتا ہے کہ اس لشکر میں ایک لاکھ کے قریب مجاہدین اسلام شامل تھے اور آنحضرت ﷺ کا یہ سب سے آخری غزوہ تھا۔

"جو تھوڑا بہت توشہ لوگوں کے پاس بچا ہوا تھا... الخ" سے مراد حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ عام طور پر اہل لشکر غذائی سامان کی قلّت کا شکار ہیں اور بہت سے لوگ بھوکے رہ رہے ہیں، تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے پاس ان کی حاجت وضرورت سے زائد کچھ سامان خوراک ہوگا، لہٰذا آپ ﷺ ان لوگوں کو ہدایت فرمائیے، کہ وہ اس بچے ہوئے سامان خوراک کو لے کر آپ ﷺ کے پاس آجائیں۔ دراصل اس روایت میں یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے، پوری روایت یوں ہے کہ جب (اہل لشکر کو سامان خوراک کی قلت کا سامنا کرنا پڑا اور) لوگ بھوکے رہنے لگے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر آپ ﷺ اجازت دیں تو ہم اپنے اونٹ ذبح کر کے اپنی غذائی ضرورت پوری کرلیں، آنحضرت ﷺ نے ان کو اجازت دے دی، لیکن جب حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا تو وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر آپ (ﷺ) نے لوگوں کو اونٹ ذبح کرنے کی اجازت دے دی تو اس سے لشکر کو سواریوں کی قلّت کا (زیادہ پریشان کن) مرحلہ پیش آجائے گا؟ لہٰذا آپ ﷺ ان لوگوں کو (اپنے اونٹ ذبح کرنے کی اجازت دینے کے بجائے) یہ حکم دیجئے کہ جس شخص کے پاس جو بچا ہوا توشہ ہو اس کو آپ ﷺ کے پاس لے آئے... الخ"۔

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص... الخ اس ارشاد گرامی کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ جس شخص نے کامل یقین و اعتقاد کے ساتھ توحید ورسالت کی گواہی دی (یعنی کلمہ گو ہوا) اور پھر ذرا بھی تشکیک وتردد رکھے بغیر اسی یقین و اعتقاد کے ساتھ اس حالت میں اس کا انتقال ہوگیا تو اس کو جنت میں جانے سے روکا نہیں جائے گا۔

ام المؤمنین حضرت زینبؓ کے ولیمہ میں برکت کا معجزہ

(۴۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرُوْسًا بِزَيْنَبَ فَعَمِدَتْ اُمِّيْ اُمُّ سُلَيْمٍ اِلٰى تَمْرٍ وَّ سَمْنٍ وَّاَقِطٍ فَصَنَعَتْ حَيْسًا فَجَعَلَتْهُ فِيْ تَوْرٍ فَقَالَتْ يَا اَنَسُ اذْهَبْ بِهٰذَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْ بَعَثَتْ بِهٰذَا اِلَيْكَ اُمِّيْ وَهِيَ تُقْرِئُكَ السَّلَامَ وَ تَقُوْلُ اِنَّ هٰذَا لَكَ مِنَّا قَلِيْلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَذَهَبْتُ فَقُلْتُ فَقَالَ ضَعْهُ ثُمَّ قَالَ اذْهَبْ فَادْعُ لِيْ فُلَانًا وَّفُلَانًا وَ فُلَانًا رِجَالًا سَمَّاهُمْ وَادْعُ لِيْ مَنْ لَقِيْتَ فَدَعَوْتُ مَنْ سَمّٰى وَمَنْ لَقِيْتُ فَرَجَعْتُ فَاِذَا الْبَيْتُ غَاصٌّ بِاَهْلِهٖ قِيْلَ لِاَنَسٍ عَدَدُكُمْ كَمْ كَانُوْا قَالَ زُهَاءَ ثَلٰثِمِائَةٍ فَرَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى تِلْكَ الْحَيْسَةِ وَ تَكَلَّمَ بِمَا شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ جَعَلَ يَدْعُوْا عَشَرَةً عَشَرَةً يَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَقُوْلُ لَهُمْ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ وَلْيَاْكُلْ كُلُّ رَجُلٍ مِمَّا يَلِيْهِ قَالَ فَاَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا فَخَرَجَتْ طَآئِفَةٌ وَ دَخَلَتْ طَآئِفَةٌ حَتّٰى اَكَلُوْا كُلُّهُمْ قَالَ لِيْ يَا اَنَسُ ارْفَعْ فَرَفَعْتُ فَمَا اَدْرِيْ حِيْنَ وَضَعْتُ كَانَ اَكْثَرَ اَمْ حِيْنَ رَفَعْتُ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا اُمّ المؤمنین حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح ہوا تو (شب عروسی کے بعد) میری والدہ ام سلیمؓ نے کھجور، گھی اور قروت (پنیر) لے کر مالیدہ سا بنا لیا اور اس مالیدہ کو ایک پیالہ میں رکھ کر مجھ سے کہا کہ انسؓ! اس کو رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لے جاؤ اور کہنا کہ میری ماں نے یہ (حقیر ہدیہ) آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا ہے اور آپ ﷺ کو سلام عرض کیا ہے اور کہا ہے کہ (یا رسول اللہ!) یہ ایک چھوٹا سا ہدیہ (جو) ہماری طرف سے آپ ﷺ کے لئے ہے (اگرچہ آپ ﷺ کی شان کے لائق نہیں لیکن آپ ﷺ کے الطاف کریمانہ سے امید ہے کہ اس کو قبول فرمائیں گے) چنانچہ میں اس کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو کچھ میری والدہ نے کہا تھا عرض کر دیا۔ آپ ﷺ نے (بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے) فرمایا کہ اس کو رکھ دو اور پھر فرمایا کہ فلاں فلاں اور فلاں شخص کو جن کے نام آپ ﷺ نے بتائے تھے جا کر بلا لاؤ اور (دیکھو) راستہ میں جو شخص ملے اس کو بھی بلاتے لانا چنانچہ میں گیا اور ان لوگوں کو جن کا نام آپ ﷺ نے لیا تھا اور ان لوگوں کو کہ جو مجھے راستہ میں ملے، بلا کر لے آیا، اور جب میں گھر میں واپس آیا، تو دیکھا کہ پورا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کہ (اس وقت) تم سب کتنے لوگ ہوگے؟ حضرت انس نے جواب دیا کہ تین سو کے قریب۔ پھر میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے اس مالیدہ پر اپنا دست مبارک رکھ کر وہ کہا جو اللہ نے چاہا (یعنی خیر و برکت کی دعا فرمائی، اس کے بعد آپ ﷺ نے دس دس آدمیوں کو بلانا شروع کیا اور وہ (یکے بعد دیگرے دس دس) آدمی کھانے (کے لئے آنے) لگے اور (جو لوگ کھانے پر آتے ان سے) آپ ﷺ فرماتے! اللہ کا نام لے کر کھاؤ اور ہر شخص کو اپنے سامنے سے کھانا چاہئے (کیونکہ کھانے کا یہ مسنون طریقہ ہے جس سے تہذیب و شائستگی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کھانے میں خیر و برکت بھی اترتی ہے۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں: جب دس آدمیوں کی ایک جماعت کھانے سے فارغ ہو کر چلی جاتی تو (اتنے ہی آدمیوں) کی دوسری جماعت آجاتی، یہاں تک کہ سب لوگوں نے (خوب آسودہ ہو کر) کھا لیا اور پھر آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا، انس! (سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے ہیں) اب اس پیالہ کو اٹھا لو۔ میں نے پیالہ کو اٹھا لیا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ جس وقت میں نے پیالہ رکھا تھا اس وقت اس میں مالیدہ زیادہ تھا، یا اس وقت جب کہ (تمام لوگوں کے اس کھانے سے فراغت کے بعد) میں نے اس کو اٹھایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جن کے نام آپ ﷺ نے بتائے تھے"۔ ان الفاظ کے ذریعہ حضرت انسؓ نے یہ بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے تو متعین و مشخص کر کے ان تین آدمیوں کے نام بتائے تھے لیکن اس وقت میرے ذہن میں وہ تینوں نام محفوظ نہیں ہیں لہٰذا میں نے یہاں ان تینوں کو فلاں فلاں اور فلاں لفظ سے تعبیر کیا ہے اس سے واضح ہوا کہ رِجَالًا سَمَّاهُمْ کے الفاظ خود حضرت انسؓ کے ہیں جو نحوی طور پر فُلَانًا وَّفُلَانًا وَ فُلَانًا کا بدل واقع ہوئے ہیں یا یہ کہ ان الفاظ سے پہلے اعنی یا یعنی کا لفظ مقدر (محذوف) ہے۔

"اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ... الخ" یعنی ظاہری صورت کے اعتبار سے تو میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ مالیدہ پہلے زیادہ تھا یا جب میں نے وہاں سے اٹھایا تو اس وقت زیادہ تھا، تاہم جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا بابرکت ہاتھ رکھے جانے اور ان کے مقدس صحابہؓ کا پس خوردہ ہونے کے سبب وہ مالیدہ اس وقت جب کہ میں نے اس کو وہاں سے اٹھایا زیادہ بابرکت تھا۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حدیث کے ظاہری مفہوم سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت زینبؓ کا ولیمہ اسی مالیدہ سے ہوا جو حضرت انسؓ کی والدہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا، لیکن دوسری روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ولیمہ کا کھانا روٹی اور گوشت پر مشتمل تھا جیسا کہ خود حضرت انسؓ کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت زینبؓ کے ولیمہ میں بکری ذبح کی اور اس موقع پر ایک ہزار آدمیوں کو گوشت اور روٹی سے شکم سیر کیا۔ لہٰذا ان دونوں روایتوں میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے اس کو دور کرنے کے لئے) یہ کہا گیا ہے کہ دراصل وہ مالیدہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس وقت پہنچا تھا جب آپ ولیمہ کا کھانا (جو گوشت اور روٹی پر مشتمل تھا) لوگوں کو کھلانے جا رہے تھے، اس طرح اس دعوت ولیمہ میں دونوں چیزیں کھلائی گئیں، یعنی مالیدہ بھی اور گوشت روٹی بھی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دن تو یہ مالیدہ والا واقعہ ہوا ہوگا اور دوسرے دن روٹی اور گوشت کھلانے کا واقعہ پیش آیا ہوگا! ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کی شرح میں یہ لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت انسؓ کی والدہ نے جو مالیدہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا اسی کا ولیمہ ہوا بلکہ انہوں نے وہ مالیدہ ہدیہ کے طور پر آپ ﷺ کو بھیجا تھا جس کو آپ ﷺ نے تین سو کے قریب لوگوں کو کھلایا تھا اور پھر اسی دن شام کو یا اگلے دن آنحضرت ﷺ نے بکری ذبح کر کے ولیمہ کیا اور اس ایک بکری کے گوشت اور روٹی میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی کہ ایک ہزار شکم سیر ہوئے پس نہ تو ان دونوں روایتوں میں کوئی منافات ہے اور نہ ان دونوں معجزوں میں کوئی معارضہ۔

اونٹ سے متعلق معجزہ

(۴۵) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا عَلٰى نَاضِحٍ قَدْ اَعْيٰى فَلَا يَكَادُ يَسِيْرُ فَتَلَاحَقَ بِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا لِبَعِيْرِكَ قُلْتُ قَدْ عَيِيَ فَتَخَلَّفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَزَجَرَهُ فَدَعَالَهُ فَمَا زَالَ بَيْنَ يَدَيِ الْاِبِلِ قُدَّامَهَا يَسِيْرُ فَقَالَ لِيْ كَيْفَ تَرٰى بَعِيْرَكَ قُلْتُ بِخَيْرٍ قَدْ اَصَابَتْهُ بَرَكَتُكَ قَالَ اَفَتَبِيْعُنِيْهِ بِوَقِيَّةٍ فَبِعْتُهُ عَلٰى اَنَّ لِيْ فَقَارَ ظَهْرِهٖ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ غَدَوْتُ عَلَيْهِ بِالْبَعِيْرِ فَاَعْطَانِيْ ثَمَنَهٗ وَرَدَّهٗ عَلَيَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں ایک جہاد کے سفر میں رسول کریم ﷺ کے ہمراہ تھا اور آب کش اونٹ پر سوار تھا، وہ اونٹ (اتنا زیادہ) تھک گیا تھا) کہ جیسا اس کو چلنا چاہئے تھا اس طرح چلنے پر قادر نہیں تھا (ایک جگہ پہنچ کر) میرا اور نبی کریم ﷺ کا ساتھ ہو گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے اونٹ کو کیا ہو گیا ہے (کہ اچھی طرح نہیں چل رہا ہے) میں نے کہا کہ تھک گیا ہے (یہ سن کر رسول کریم ﷺ میرے اونٹ کے پیچھے آ گئے اور (یا تو کسی چیز سے مار کر یا محض آواز کے ذریعہ) اس کو ہانکا اور پھر اس کے حق میں (تیز روی کی) دعا فرمائی اس کا اثر یہ ہوا کہ میرا اونٹ سب سے آگے رہنے لگا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا: (کہو) اب تمہارے اونٹ کا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا آپ ﷺ کی برکت سے اب خوب چلتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس اونٹ کو چالیس درہم کے بدلے بیچتے ہو؟ میں نے اس شرط پر اس اونٹ کو (آپ ﷺ کے ہاتھ) بیچ دیا کہ مدینہ تک یہ اونٹ میری ہی سواری میں رہے گا۔ پھر رسول کریم ﷺ (اور ہم لوگ) جب مدینہ پہنچ گئے تو اگلے ہی دن صبح کو میں اونٹ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (تاکہ اونٹ سپرد کر کے اس کی طے شدہ رقم لے

لوں) آپ ﷺ نے معاملہ کے مطابق) قیمت مجھے عطا فرمادی لیکن (ازراہ) عنایت وہ اونٹ بھی مجھ ہی کو دے دیا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: میں نے اس شرط پر اس اونٹ کو بیچ دیا... الخ" سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز بیچتے وقت ایسی شرط عائد کرنا جس سے بیچنے والے کو فائدہ ہو جائز ہے حالانکہ مسئلہ کی رو سے یہ جائز نہیں ہے! پس یا تو اس مسئلہ میں یہ حدیث منسوخ کے حکم میں ہے یا یہ کہ مذکورہ شرط کا تعلق عین عقد سے نہیں تھا بلکہ خرید و فروخت کا معاملہ ہو جانے کے بعد یا تو حضرت جابرؓ کی درخواست پر یا خود آنحضرت ﷺ کی عنایت سے یہ طے پایا کہ مدینہ تک یہ اونٹ جابرؓ کی سواری میں رہے گا تاہم یہ وضاحت حدیث کی ظاہری عبارت سے میل نہیں رکھتی۔

غزوۂ تبوک کے موقع کے تین اور معجزے

(۴۶) وَعَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ السَّاعِدِیِّ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَزْوَةَ تُبُوْكَ فَاَتَيْنَا وَادِيَ الْقُرٰى عَلٰى حَدِيْقَةٍ لِامْرَاَةٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اخْرُصُوْهَا فَخَرَصْنَاهَا وَخَرَصَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَةَ اَوْسُقٍ وَقَالَ اَحْصِيْهَا حَتّٰى تَرْجِعَ اِلَيْكِ اِنْشَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَانْطَلَقْنَا حَتّٰى قَدِمْنَا تُبُوْكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَهُبُّ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَةَ رِيْحٌ شَدِيْدَةٌ فَلَا يَقُمْ فِيْهَا اَحَدٌ فَمَنْ كَانَ لَهٗ بَعِيْرٌ فَلْيَشُدَّ عِقَالَهٗ فَهَبَّتْ رِيْحٌ شَدِيْدَةٌ فَقَامَ رَجُلٌ فَحَمَلَتْهُ الرِّيْحُ حَتّٰى اَلْقَتْهُ بِجَبَلَيْ طَيِّئٍ ثُمَّ اَقْبَلْنَا حَتّٰى قَدِمْنَا وَادِيَ الْقُرٰى فَسَاَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَرْاَةَ عَنْ حَدِيْقَتِهَا كَمْ بَلَغَ ثَمَرُهَا فَقَالَتْ عَشْرَةَ اَوْسُقٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوحمید ساعدیؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ غزوۂ تبوک کے لئے (مدینہ سے) روانہ ہو کر جب مدینہ سے تین دن کی مسافت پر واقع) وادی قریٰ میں پہنچے تو ایک باغ سے گزرے جو ایک عورت کا تھا، رسول کریم ﷺ نے (اس باغ میں پہنچ کر ہم لوگوں سے فرمایا: اندازہ کر کے بتاؤ اس باغ میں کتنے پھل ہوں گے؟ ہم سب نے اپنا اپنا اندازہ بتایا (کسی کا اندازہ کچھ ہوا اور کسی کا کچھ) پھر رسول کریم ﷺ نے بھی اندازہ کیا اور فرمایا کہ اس باغ میں دس وسق پھل ہوں گے۔ اس کے بعد اس عورت سے فرمایا (جب پھل اتریں اور تم ان کا وزن کرو تو) وزن کو یاد رکھنا تا آنکہ ہم لوٹ کر آئیں انشاء اللہ۔ وہاں سے روانہ ہو کر جب ہم تبوک پہنچے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ آج کی رات تم پر سخت آندھی آئے گی اس وقت کوئی شخص (اپنی جگہ سے) کھڑا نہ ہو اور جس کے پاس اونٹ ہو وہ اس کے عقال (رسی) مضبوطی سے باندھ دے (مطلب یہ کہ آندھی سے حفاظت کے پیش نظر اس وقت کوئی شخص نہ تو چلے پھرے اور نہ اپنے اونٹ کو کھلی جگہ چھوڑ دے) چنانچہ (ایسا ہی ہوا کہ رات میں اتنی) سخت آندھی آئی (کہ) ایک شخص کو جو آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے مخالف کھڑا ہو گیا تھا، اڑا کر لے گئی اور طے کے پہاڑوں کے درمیان پھینک دیا۔ جب ہم (غزوۂ تبوک سے فارغ ہو کر) واپس (مدینہ) روانہ ہوئے اور وادی قریٰ میں پہنچے تو رسول کریم ﷺ نے اس عورت سے باغ کے بارے میں پوچھا کہ (اب بتاؤ) پھل کتنے ہوئے اس نے کہا دس وسق!" (بخاری ومسلم)

تشریح: "طے" دراصل اس مشہور قبیلہ کے مورث اعلیٰ کا نام ہے جو قبیلہ طے کہلاتا ہے اور سابق جغرافیائی تقسیم کے مطابق یمن میں آباد تھا، مشہور تاریخی شخصیت حاتم طائی کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا، وہ علاقہ جہاں قبیلہ طے آباد تھا، اور جو "تلاد طے" کہلاتا تھا اور وہاں کے پہاڑ "جبال طے" کے نام سے مشہور تھے، موجودہ جغرافیائی تقسیم میں سعودی عرب کے خطہ نجد میں شامل ہے، اور "منطقہ شمر" کہلاتا ہے۔

اس حدیث میں گویا آنحضرت ﷺ کے تین معجزوں کا ذکر ہے، ایک تو پھلوں کا، کہ آپ ﷺ نے درخت پر لگے ہوئے پھلوں کا بالکل صحیح وزن بتادیا، دوسرا سخت آندھی کا معجزہ کہ آپ ﷺ نے کسی ظاہری علامت یا آثار کے نمودار ہوئے بغیر سخت آندھی کی پیش گوئی فرمائی جو جوں کی توں درست ہوئی اور تیسرا معجزہ یہ ہوا کہ جس شخص نے آپ کی ہدایت پر عمل نہیں کیا اس کو آندھی نے اڑا لیا اور اتنی دور

لے جاکر پھینک دیا۔ اس موقع پر ان تینوں معجزوں کا اظہار یا تو ان منافقوں پر آپ ﷺ کی نبوت کی صداقت ظاہر کرنے کے لئے ہوا جو آپ ﷺ کے لشکر میں شامل تھے یا اہل ایمان کے یقین و اعتقاد کو مزید پختہ کرنے کے لئے۔

فتح مصر کی پیش گوئی

(۴۷) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّکُمْ سَتَفْتَحُوْنَ مِصْرَ وَھِیَ اَرْضٌ یُسَمّٰی فِیْھَا الْقِیْرَاطُ فَاِذَا فَتَحْتُمُوْھَا فَاَحْسِنُوْا اِلٰی اَھْلِھَا فَاِنَّ لَھَا ذِمَّۃً وَرَحِمًا اَوْقَالَ ذِمَّۃً وَصِھْرًا فَاِذَا رَاَیْتُمْ رَجُلَیْنِ یَخْتَصِمَانِ فِیْ مَوْضِعِ لَبِنَۃٍ فَاخْرُجْ مِنْھَا قَالَ فَرَاَیْتُ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ شُرَحْبِیْلَ بْنِ حَسَنَۃَ وَاَخَاہُ رَبِیْعَۃَ یَخْتَصِمَانِ فِیْ مَوْضِعِ لَبِنَۃٍ فَخَرَجْتُ مِنْھَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یقیناً وہ وقت قریب ہے، جب تم مصر کو فتح کرلو گے اور مصر وہ زمین ہے جہاں "قیراط" بولا جاتا ہے۔ جب تم مصر کو فتح کرلو تو وہاں کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کیونکہ ان کو امان ہے اور ان سے قرابت ہے۔ یا یہ فرمایا کہ۔ ان کو امان ہے۔ اور ان سے سسرالی رشتہ ہے، اور جب تم لوگ دیکھو کہ وہاں دو آدمی ایک اینٹ کی جگہ پر جھگڑا کرتے ہیں، تو تم وہاں سے نکل آنا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے (اپنے قیام مصر کے دوران) عبدالرحمن ابن شرحبیل ابن حسنہ اور اس کے بھائی ربیعہ کو ایک اینٹ کی جگہ پر جھگڑتے دیکھا تو سرزمین مصر سے نکل آیا۔" (مسلم)

تشریح: "قیراط" ایک سکہ کا نام تھا جو پانچ جو سونے کے برابر ہوتا تھا اور اس زمانہ میں مصر میں رائج تھا، مصر کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی "قیراط" کا چلن تھا اور مختلف اوزان و مالیت رکھتا تھا مثلاً مکہ معظمہ اور اس کے علاقوں میں ایک قیراط دینار کے چوبیسویں حصہ کے برابر اور عراق میں دینار کے بیسویں حصہ کے برابر ہوتا تھا۔

"جہاں قیراط بولا جاتا ہے" کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ نے اس کے سکہ سے مصر کا تعارف کرایا اور پتہ بتایا بلکہ اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس ملک کے لوگ، جو اس وقت قبطی کافر تھے، دناءۃ اور خست کا مزاج رکھتے تھے جس کی علامت یہ ہے کہ ان کی زبان پر "قیراط" کا ذکر بہت رہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ عالی حوصلہ اور کریم النفس ہوتے ہیں ان کی زبان پر حقیر و خسیس چیزوں کا ذکر زیادہ نہیں رہتا۔

"وہاں کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا"۔ اس ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ مصری لوگ اپنی مخصوص مزاجی کیفیت (یعنی دناءۃ و خست) کے اعتبار سے تم لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہوں گے مگر اس کے باوجود ان کے ساتھ تمہیں اچھا سلوک کرنا چاہئے۔ اگر تم ان کے ایسے افعال و اعمال دیکھو جو تمہارے نزدیک برے ہوں اور ان سے تمہیں ذہنی یا جسمانی اذیت پہنچتی ہو تو تم بہرحال ان سے عفو و درگزر کا معاملہ کرنا، ایسا نہ ہو کہ ان کی کسی بات یا کسی فعل سے مشتعل ہو کر تم ان کو تکلیف پہنچانے کے درپے ہو جاؤ۔ اور یہ ہدایت اس لئے ہے کہ مصریوں سے ہمارے دو خصوصی تعلق ہیں ایک تو اس امان و حرمت کے سبب جو ہمارے بیٹے ابراہیم ابن محمد ﷺ کی نسبت سے مصریوں کو حاصل ہے، ابراہیم کی والدہ جن کا نام ماریہ قبطیہ تھا، مصری قوم ہی سے تعلق رکھتی تھیں، اور ان سے دوسرا تعلق یہ ہے کہ ہمارے جد امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت سے مصریوں سے ہماری قرابت بھی ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ مصری النسل تھیں"۔

"یا یہ فرمایا کہ۔ ان کو امان ہے اور ان سے سسرالی رشتہ ہے"۔ یہاں الفاظ او شک کے لئے ہے جس کے ذریعہ راوی نے یہ ظاہر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو فَاِنَّ لَھَا ذِمَّۃً وَرَحِمًا کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے، یا فَاِنَّ لَھَا ذِمَّۃً وَصِھْرًا کے الفاظ، اس دوسری روایت کی صورت میں ذمہ (امان) کا تعلق حضرت ہاجرہ کی نسبت سے ہوگا اور مصاہرت (سسرالی رشتہ) کا تعلق حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی نسبت

ہے۔

جب تم لوگ دیکھو کہ وہاں دو آدمی... الخ" ان الفاظ کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے گویا اہل مصر کی (دناءۃ اور خست کا حال بیان فرمایا کہ وہ لوگ ایک ایک اینٹ کی جگہ کے لئے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اس جملہ میں جو رَاَیْتُمْ (تم لوگ دیکھو) کا لفظ (بصیغہ جمع) فرمایا گیا ہے، اس کی مناسبت سے آگے جمع ہی کے صیغہ فاخرجوا (تو تم لوگ وہاں سے نکل آنا) کا لفظ استعمال ہونا چاہئے تھا لیکن آپ ﷺ نے واحد کا صیغہ واخرج استعمال فرما کر صرف حضرت ابوذرؓ کو خطاب فرمایا جو حضرت ابوذرؓ کے تئیں آنحضرت ﷺ کے خصوصی تعلق اور کمال شفقت پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عمومی خطاب ہی مراد ہو۔

مصر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہوا اور حضرت ابوذرؓ نے وہاں اپنے قیام کے دوران دو آدمیوں کو ایک اینٹ کی جگہ پر جھگڑتے دیکھا تو فوراً مصر چھوڑ کر چلے آئے، یہ حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ پس آنحضرت کو غیب سے معلوم ہو گیا تھا کہ ایک اینٹ کی جگہ پر جھگڑنا دراصل مصریوں کی خصومت، جنگ جوئی اور فتنہ آرائی کی وہ علامت ہوگی جس کے پیچھے فتنہ وفساد اور شرانگیزی کا جنم لینے والا ایک طویل سلسلہ چھپا ہوگا اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں اور اسلام کو زبردست نقصان سے دوچار ہونا ہوگا، چنانچہ بعد میں مصریوں کا خلافت عثمانی سے بغاوت کر کے مدینہ پر چڑھ آنا، حضرت عثمانؓ کو شہید کر دینا اور پھر مصر میں حضرت علیؓ کی طرف سے تعینات حاکم حضرت محمد ابن ابوبکرؓ کو قتل کر دینا وہ واقعات ہیں جن کا علم آنحضرت ﷺ کو پہلے ہو گیا تھا، اسی لئے آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کو ہدایت اور وصیت فرمائی کہ جب مصر میں ذرا سی بات میں دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا ہونے لگے تو تم ان سے ملنے جلنے ان کے درمیان رہنے اور ان کے ملک میں قیام کرنے سے اجتناب کرنا، چنانچہ حضرت ابوذرؓ نے ایسا ہی کیا۔

منافقوں کے عبرتناک انجام کی پیش خبری

(۴۸) وَعَنْ حُذَيْفَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ اَصْحَابِيْ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ وَفِيْ اُمَّتِي اِثْنَا عَشَرَ مُنَافِقًا لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدُوْنَ رِيْحَهَا حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ثَمَانِيَةٌ مِنْهُمْ تَكْفِيْهِمُ الدُّبَيْلَةُ سِرَاجٌ مِنْ نَارٍ يَظْهَرُ فِيْ اَكْتَافِهِمْ حَتّٰى تَنْجُمَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ لَاُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ غَدًا فِيْ مَنَاقِبِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَحَدِيْثَ جَابِرٍ مَنْ يَّصْعَدُ الثَّنِيَّةَ فِيْ جَامِعِ الْمَنَاقِبِ اِنْشَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت حذیفہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے صحابہ میں۔ ایک اور روایت میں یہ ہے کہ۔ میری امت میں بارہ منافق ہیں جو جنت میں نہیں داخل ہوں گے بلکہ جنت کی بو بھی نہیں پائیں گے جب تک کہ سوئی کے ناکہ میں سے اونٹ نہ گزر جائے۔ اور ان بارہ میں آٹھ منافقوں کو تو دبیلہ نمٹا دے گا (یعنی ان کو ہلاک کرے ان کے شر اور فتنہ کو ختم کر دے گا) وہ (دبیلہ) ایک آگ کا شعلہ ہوگا جو ان کے مونڈھوں میں پیدا ہوگا اور پھر سینوں یعنی پیٹوں تک پہنچ جائے گا۔" (مسلم)

اور ہم حضرت سہل ابن سعد کی روایت لاعطین ھذہ الرایۃ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب میں اور حضرت جابرؓ کی روایت من یصعد الثنیۃ کو جامع المناقب میں نقل کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

تشریح: "جب تک کہ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ نہ گزر جائے" یہ مبالغہ اور تعلیق بالمحال ہے، مطلب کہ جس طرح سوئی کے ناکہ میں سے اونٹ کا گزرنا محال اور ناممکن ہے، اسی طرح ان منافقوں کا جنت میں جانا محال اور ناممکن ہے، قرآن میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں اور وہاں یہ بات کفار کے حق میں فرمائی گئی ہے۔ ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط یعنی: اور وہ کافر جنت میں داخل نہیں ہونگے، جب تک کہ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ نہ گزر جائے۔

واضح رہے کہ "امت" کا اطلاق منافقوں پر ہو سکتا ہے اگر اُمّت سے مراد امت دعوت ہو، لہٰذا میری اُمّت میں بارہ منافق ہیں۔ میں

"میری امت" سے آپ ﷺ کی مراد اُمت دعوت ہی تھی یعنی انسانیت عامہ جو آپ ﷺ کی دعوت اسلام کی مخاطب ہے اور جس کو اسلام کی طرف بلانا آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہے، ہاں "منافقوں" پر "صحابہ" کا اطلاق نہیں ہوسکتا، لہٰذا "میرے صحابہ میں بارہ منافق ہیں" کی یہ تاویل کی جائے گی کہ آپ ﷺ نے ان منافقوں پر صحابہ کا اطلاق ان کے ظاہری احوال کے اعتبار سے کیا کہ اگرچہ ان کے اندر نفاق تھا لیکن بظاہر وہ کلمہ گو تھے اور اپنی اس ظاہری حیثیت کی بناء پر وہ جماعت صحابہ سے اختلاط رکھتے اور ان کے درمیان رہتے سہتے تھے، مطلب یہ کہ ان کے ظاہری احوال کے اعتبار سے اور صحابہ کے ساتھ ان کے اختلاط کو دیکھتے ہوئے آپ ﷺ نے ان کو مجازاً اصحابی فرمایا، اس اعتبار سے "امت" کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ "امت دعوت" نہیں بلکہ "امت اجابت" ہی مراد ہے۔

حضرت حذیفہ کی ایک روایت میں منقول ہے کہ ان منافقین کی تعداد چودہ ۱۴ تھی لیکن ان میں سے دو نے توبہ کرلی تھی اور بارہ نفاق پر قائم رہے اور جیسا کہ مخبر صادق ﷺ نے خبر دی تھی وہ بدبخت اسی حالت میں مرے۔ بہرحال آنحضرت ﷺ نے اپنے بعض مخصوص اور مقرب صحابہ کو ان منافقین کے بارے میں تشخص کے ساتھ بتادیا تھا، تاکہ وہ ان کے مکروفریب اور فتنہ پردازیوں سے ہوشیار رہیں، ان منافقین نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے عناد آمیز عزائم کے تحت جو فتنہ پردازیاں کیں ان کے ذکر سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے، ان بدبختوں کے مکروہ عزائم کا نقطہ عروج اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے غزوۂ تبوک سے واپسی کے سفر کے دوران ایک گھاٹی میں دغا اور فریب کی راہ میں آنحضرت ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو محفوظ رکھا۔

"دُبَیْلَۃَ" دُبَلٌ یا دُبْلَۃٌ کی تصغیر ہے، جس کے معنی اس پھوڑے کے ہیں جو پیٹ میں ہوتا ہے اور جس کے سبب اکثر موت واقع ہوجاتی ہے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ "دبیلہ" طاعون کا ورم مراد ہے جس کو انگریزی میں پلیگ کہتے ہیں ویسے "دبل" کے ایک معنی آفت اور مصیبت کے بھی ہیں۔

جو ان کے مونڈھوں میں پیدا ہوگا.... الخ ان الفاظ کے ذریعہ دبیلہ کی وضاحت کی گئی ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ آنحضرت ﷺ کے اصل ارشاد کا جزو نہیں بلکہ حضرت حذیفہ کے اپنے الفاظ ہیں، نیز ان الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ دبیلہ سے طاعون کا ورم ہی مراد ہے۔ حضرت حذیفہ سے ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان منافقوں کے بارے میں مجھے پوری طرح بتادیا تھا کہ وہ کون کون سے لوگ ہیں اور کس طرح مریں گے) چنانچہ وہ سب اسی طرح مرے جس طرح آنحضرت ﷺ نے مجھے بتایا تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بحیرا راہب کا واقعہ

(۴۹) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ خَرَجَ اَبُوْطَالِبٍ اِلَی الشَّامِ وَخَرَجَ مَعَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ اَشْیَاخٍ مِنْ قُرَیْشٍ فَلَمَّا اَشْرَفُوْا عَلَی الرَّاهِبِ هَبَطُوْا فَحَلُّوْا رِحَالَهُمْ فَخَرَجَ اِلَیْهِمُ الرَّاهِبُ وَکَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ یَمُرُّوْنَ بِهٖ فَلَا یَخْرُجُ اِلَیْهِمْ قَالَ فَهُمْ یَحُلُّوْنَ رِحَالَهُمْ فَجَعَلَ یَتَخَلَّلُهُمُ الرَّاهِبُ حَتّٰی جَآءَ فَاَخَذَ بِیَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هٰذَا سَیِّدُ الْعٰلَمِیْنَ هٰذَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یَبْعَثُهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ فَقَالَ لَهٗ اَشْیَاخٌ مِنْ قُرَیْشٍ مَاعِلْمُكَ فَقَالَ اِنَّكُمْ حِیْنَ اَشْرَفْتُمْ مِنَ الْعَقَبَةِ لَمْ یَبْقَ شَجَرٌ وَلَا حَجَرٌ اِلَّا خَرَّ سَاجِدًا وَلَا یَسْجُدَانِ اِلَّا لِنَبِیٍّ وَاِنِّیْ اَعْرِفُهٗ بِخَاتَمِ النُّبُوَّةِ اَسْفَلَ مِنْ غُضْرُوْفِ کَتِفِهٖ مِثْلَ التُّفَّاحَةِ ثُمَّ رَجَعَ فَصَنَعَ لَهُمْ طَعَامًا فَلَمَّا اَتَاهُمْ بِهٖ وَکَانَ هُوَ فِیْ رِعْیَةِ الْاِبِلِ فَقَالَ اَرْسِلُوْا اِلَیْهِ فَاَقْبَلَ وَعَلَیْهِ غَمَامَةٌ تُظِلُّهٗ فَلَمَّا دَنَا مِنَ الْقَوْمِ وَجَدَهُمْ قَدْ سَبَقُوْهُ اِلٰی فَیْءِ شَجَرَةٍ فَلَمَّا جَلَسَ مَالَ فَیْءُ الشَّجَرَةِ عَلَیْهِ فَقَالَ انْظُرُوْا اِلٰی فَیْءِ الشَّجَرَةِ مَالَ عَلَیْهِ فَقَالَ اُنْشِدُکُمُ اللّٰهَ اَیُّکُمْ وَلِیُّهٗ قَالُوْا اَبُوْطَالِبٍ فَلَمْ یَزَلْ یُنَاشِدُهٗ حَتّٰی رَدَّهٗ

اَبُوْطَالِبٍ وَبَعَثَ مَعَهُ اَبُوْبَكْرٍ بِلَالًا وَزَوَّدَهُ الرَّاهِبُ مِنَ الْكَعْكِ وَالزَّيْتِ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں (کہ ایک مرتبہ) ابوطالب نے (تجارت کی غرض سے) شام کا سفر کیا تو ان کے ساتھ نبی کریم ﷺ بھی گئے (جو اس وقت بارہ سال کی عمر کے تھے، یہ تجارتی قافلہ (ملک شام کے ایک مقام بصری میں) ایک راہب یعنی عیسائی پادری (بحیرا نامی) کے ہاں مقیم ہوا) اور سب نے اپنے کجاوے کھول لئے" راہب ان لوگوں سے ملاقات کے لئے خود چلا آیا، حالانکہ اس سے پہلے جب بھی یہ لوگ ادھر سے گزرے اور اس راہب کے ہاں قیام کیا تو اس نے کبھی باہر آکر ان سے ملاقات نہیں کی تھی۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے کجاوے کھول رہے تھے اور راہب ان کے درمیان کسی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا، یہاں تک کہ اس نے آکر نبی کریم ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا، اور بولا یہی ہے، تمام جہانوں کا سردار، یہی ہے تمام جہانوں کے پروردگار کا رسول (جو انسانیت عامہ کی ہدایت کے لئے آیا ہے) یہی وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام جہان والوں کے لئے رحمت ورأفت کا ذریعہ بنا کر بھیجا ہے۔ قریش کے شیوخ نے راہب کو یہ کہتے سنا تو) کسی شیخ نے اس سے پوچھا کہ: تم اس (نوعمر) کے بارے میں (یہ سب باتیں) کہاں سے جانتے ہو؟ راہب نے جواب دیا: جب تم دو پہاڑوں کے درمیان والے راستہ سے نکل کر سامنے آئے تو (میں یہاں سے دیکھ رہا تھا کہ، کوئی درخت اور کوئی پتھر ایسا نہ تھا جو سجدہ میں نہ گرا ہو اور درخت وپتھر بڑے پیغمبر کے علاوہ اور کسی کو سجدہ نہیں کرتے، نیز میں نے ایک اس شخص کو اس مہر نبوت کے ذریعہ بھی پہچانا ہے جو اس کے شانہ کی ہڈی کے نیچے سیب کے مانند واقع ہے۔ پھر وہ راہب اپنے گھر میں گیا اور قافلہ والوں کے لئے کھانا تیار کیا اور جب وہ کھانا لے کر ان کے پاس آیا تو) آنحضرت ﷺ اونٹ چرانے گئے ہوئے تھے، راہب نے قافلہ والوں سے کہا کہ اس شخص کو بلوالو (کیونکہ میرا مہمان خصوصی اصل میں وہی شخص ہے اور اسی کے اعزاز میں میں نے کھانا تیار کرایا ہے) چنانچہ (بلا بھیجنے پر یا ازخود) آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے اور جب آپ آرہے تھے ابر کا ایک ٹکڑا آپ پر سایہ کئے ہوئے تھا، پھر جب آپ ﷺ لوگوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایسی جگہوں پر کہ جہاں درخت کا سایہ تھا وہ لوگ پہلے ہی قبضہ کر کے بیٹھ گئے تھے (اور آپ ﷺ کے لئے کوئی سایہ دار جگہ خالی نہیں تھی، لہٰذا جب آپ ﷺ ایک غیر سایہ دار جگہ پر بیٹھے تو فوراً درخت کی شاخوں نے ایک ٹکڑا آپ ﷺ پر سایہ کر لیا (یہ ماجرا دیکھ کر) راہب نے (قافلہ والوں سے کہا کہ درخت کے سایہ کو دیکھو جو اس شخص پر جھک آیا ہے۔ پھر اس نے کہا، میں تم لوگوں کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں) یہ بتاؤ کہ تم میں سے کون شخص اس (نوعمر) کا سرپرست ہے؟ لوگوں نے کہا: ابوطالب ہیں۔ (یہ سن کر) راہب بڑی دیر تک) ابوطالب کو اس بات کے لئے سمجھاتا رہا اور قسم دیتا رہا کہ وہ آپ ﷺ کو مکہ واپس بھیج دیں بالآخر ابوطالب نے آنحضرت ﷺ کو مکہ واپس بھیج دیا، نیز ابوبکرؓ نے بلال کو آپ ﷺ کے ہمراہ کر دیا اور راہب نے کنک اور روغن زیت کا توشہ آپ ﷺ کے ساتھ کیا۔" (ترمذی)

تشریح: نیز میں نے اس شخص کو اس مہر نبوت کے ذریعہ بھی پہچانا ہے ... الخ" بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ راہب اہل قافلہ کو یہ جواب دینے کے بعد کھڑا ہوا اور آنحضرت ﷺ کو گلے لگایا اور پھر اہل قافلہ سے آنحضرت ﷺ کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت سے سوال کئے کہ ان کے شب وروز کس طرح گزرتے ہیں، ان کے رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، لیٹنے، سونے اور کھانے پینے کا کیا انداز ہے اور لوگوں کے ساتھ ان کے اخلاق ومعاملات کیسے ہیں وغیرہ وغیرہ اہل قافلہ نے جو جواب دیئے ان کو اس نے اپنی کتابوں میں پڑھی ہوئی باتوں اور اپنی معلومات کے بالکل مطابق پایا۔

درخت کی شاخوں نے جھک کر آپ ﷺ پر سایہ کر لیا" کے تحت شارحین نے لکھا ہے کہ اگرچہ اس وقت آنحضرت ﷺ کے سر پر ابر کے اس ٹکڑے کا سایہ موجود تھا جو راستہ سے آپ ﷺ پر سایہ فگن چلا آرہا تھا لیکن اس کے باوجود درخت نے جھک کر آپ ﷺ پر جو سایہ کیا وہ آپ ﷺ کی امتیازی حیثیت اجاگر کرنے اور آپ ﷺ کے اعزاز کو ظاہر کرنے کے لئے تھا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت ابر کا سایہ ہٹ گیا تھا، اس لئے درخت نے جھک کر سایہ کر لیا جس میں آپ ﷺ کے معجزہ کا اظہار تھا۔ بہرحال سر مبارک پر بادل کا سایہ فگن ہونا آپ ﷺ کے معجزات میں سے ہے، لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ صورت ہمیشہ نہیں رہتی تھی بلکہ کبھی

کبھی ضرورت و احتیاج کے وقت یہ معجزہ ظاہر ہوتا تھا۔

"درخت کے سایہ کو دیکھو جو اس پر جھک آیا ہے" سے راہب کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم (بادل کی صورت میں) آسمان کے سایہ کو نہیں دیکھ سکتے تو زمین کے اس سایہ ہی کو دیکھ لو جو درخت کی شاخوں کی صورت میں اس ہستی پر جھکا ہوا ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ راہب کی مراد اہل قافلہ کو سر کی آنکھوں سے نہیں دل کی آنکھوں سے دیکھنے کی طرف متوجہ کرنا تھا کیونکہ سر کی آنکھوں سے تو وہ لوگ خود ہی دیکھ رہے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی فطرت سلیم مسخ کر کے جہل و انکار کی تاریکی میں بھٹکنا ہی اپنا مقدر بنا لیا تھا ان کی دل کی آنکھیں تو تعصب اور ہٹ دھرمی سے ایسی بند ہوئیں کہ انہوں نے پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی آسمانی صداقت کی اس بڑی سے بڑی علامتیں کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود نور ہدایت کی کوئی کرن حاصل نہیں کی، وہ آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی سب نشانیاں (سر کی آنکھوں سے) دیکھتے تھے لیکن دل کی آنکھوں کا) ایسا دیکھنا ان کو نصیب نہیں ہوتا تھا جو ان کے کام آتا اور ان کو راہ راست پر لگا دیتا جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا:

وَتَرٰهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ۔

"اور ان کافروں) کو آپ دیکھتے ہیں کہ گویا آپ کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔"

"بالآخر ابوطالب نے آنحضرت ﷺ کو مکہ واپس بھیج دیا" بات در اصل یہ تھی کہ بصری رومی سلطنت کے زیر نگین تھا جہاں عیسائی شہنشاہیت کا پرچم لہرا رہا تھا، اور وہاں بڑے بڑے عیسائی پادریوں نے اپنے علم و قیافہ کی بنیاد پر نبی آخر الزمان کی بعثت کی خبر دی تھی، جس سے ایک طرح کی سراسیمگی اس عیسائی شہنشاہیت پر طاری ہو گئی تھی اور اس بات کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا گیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس نئے نبی کو اپنے اثرات پھیلانے سے پہلے ہی دنیا سے ختم کر دیا جائے! راہب بحیرا چونکہ آسمانی کتابوں کا سچا عالم تھا اور نبی آخر الزمان کے تئیں عقیدت رکھتا تھا اس لئے اس نے آنحضرت کو پہچان کر حضرت ابوطالب پر زور ڈالا کہ آپ کو مکہ واپس کر دیں، اس کو خوف تھا کہ اگر رومی سلطنت کے گماشتوں کو آنحضرت ﷺ کی بھنک مل گئی تو وہ فوراً گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور قتل کر ڈالیں گے، چنانچہ ترمذی اور حاکم نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ادھر تو حضرت ابوطالب کے تجارتی قافلہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا سفر شروع ہوا ادھر رومی سلطنت کے گماشتے جن کی تعداد سات تھی، آپ ﷺ کی ٹوہ میں لگ گئے کہ جہاں بھی ملیں قتل کر دیا جائے، اس ٹوہ میں وہ بحیرا راہب تک بھی پہنچ گئے، بحیرا نے ان کو دیکھ کر کہا کہ تم لوگ یہاں کیا کرنے آگئے؟ انہوں نے کہا: ہمیں معلوم ہوا ہے کہ پیغمبر آخر الزمان ﷺ اس مہینے (اپنے ملک سے) سفر پر روانہ ہونے والے ہیں، لہٰذا ہر ہر راستہ پر آدمی لگا دیئے گئے ہیں کہ وہ جب بھی ہماری سلطنت کی حدود میں) داخل ہوں ان کو فوراً مار ڈالا جائے۔ بحیرا نے کہا: مجھے یہ بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو مقدر کر دیا ہے تو کیا کوئی شخص اس کو بدل سکتا ہے، ان گماشتوں نے جواب دیا نہیں، تب بحیرا نے کہا (میں تمہیں سچی بات بتاتا ہوں کہ تم لوگ جس شخص کی تلاش میں ہو وہ یقیناً اللہ کا سب سے بڑا پیغمبر بننے والا ہے، دنیا کی کوئی طاقت اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی لہٰذا تم اپنے اس خیال خام سے باز آجاؤ کہ اس کو قتل کر دو گے اور بہتر یہی ہے کہ) تم اس کی اطاعت قبول کر کے اس کے ساتھ عقیدت و محبت رکھو۔

"کعک اور روغن زیت کا توشہ آپ ﷺ کے ہمراہ کیا" کعک موٹی روٹی کو کہتے ہیں، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ کعک اس خاص قسم کی روٹی کو کہتے تھے جو آٹے، دودھ اور شکر کو ملا کر بناتے تھے، اس روٹی کے ساتھ روغن زیت اس لئے دیا تھا کہ روٹی سے لگا کر کھانے کے کام آئے۔ جزری ؒ نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ ویسے تو اس کی اسناد صحیح ہے اور اس کے رجال بخاری اور صحیح مسلم یا ان دونوں میں سے کسی ایک کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں، تاہم اس حدیث میں حضرت ابوبکر ؓ اور حضرت بلال ؓ کا جو ذکر ہے، وہ غیر محفوظ ہے (یعنی اصل روایت کا جزو نہیں ہے) کسی راوی کے سہو سے یہ جزو نقل ہو گیا ہے) کیونکہ اس وقت خود آنحضرت ﷺ کی عمر بارہ سال کی اور حضرت ابوبکر ؓ آنحضرت ﷺ سے دو یا ڈھائی سال چھوٹے تھے اور حضرت بلال ؓ تو شاید ان دنوں میں پیدا بھی نہ ہوئے

ہوں گے۔ پس یہ کہنا کہ ابوبکرؓ اور بلالؓ کو آنحضرت ﷺ کے ہمراہ کر دیا تھا کوئی معنی نہیں رکھتا، اسی لئے ذہبیؒ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے گو بعض حضرات نے ذہبیؒ کے اس قول کو مسترد کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے راوی ثقات ہیں، اور اس میں کوئی منکر نہیں ہے علاوہ اس جزء کے (جس میں یہ مذکور ہے کہ ابوبکرؓ نے بلالؓ کو آنحضرت ﷺ کے ہمراہ کر دیا تھا۔ بہر حال یہ بات تو ثابت ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، ہاں اسکے مذکور جزء کے بارے میں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے یہ اصل روایت کا جزء نہیں ہے بلکہ کسی راوی کے سہو سے نقل ہو گیا ہے۔

درخت اور پتھر کے سلام کرنے کا معجزہ

(۵۰) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَّةَ فَخَرَجْنَا فِيْ بَعْضِ نَوَاحِيْهَا فَمَا اسْتَقْبَلَهٗ جَبَلٌ وَلَا شَجَرٌ اِلَّا وَهُوَ يَقُوْلُ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت علی ابن ابی طالب کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ میں تھا (ایک دن) جب ہم مکہ کے نواح میں ایک طرف گئے تو جو بھی پہاڑ (یعنی پتھر) اور درخت سامنے آیا اس نے کہا: السلام علیک یا رسول اللہ!" (ترمذی و دارمی)

تشریح: زیادہ صحیح تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی پتھر اور درخت آنحضرت ﷺ کو سلام کرتا تھا اس کی آواز حضرت علیؓ بھی سنتے تھے اس اعتبار سے واقعہ معجزہ اور کرامت دونوں کو ظاہر کرتا ہے، معجزہ آنحضرت ﷺ کی نسبت سے اور کرامت حضرت علیؓ کی نسبت سے۔ تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ ان کے سلام کرنے کی آواز خود حضرت علیؓ نے نہیں سنی تھی بلکہ ان کو آنحضرت ﷺ نے بتایا تھا۔

براق کے متعلق معجزہ

(۵۱) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِالْبُرَاقِ لَيْلَةَ اُسْرِيَ بِهٖ مُلْجَمًا مُسْرَجًا فَاسْتَصْعَبَ عَلَيْهِ فَقَالَ لَهٗ جِبْرَئِيْلُ اَبِمُحَمَّدٍ تَفْعَلُ هٰذَا فَمَا رَكِبَكَ اَحَدٌ اَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنْهُ قَالَ فَارْفَضَّ عَرَقًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ شب معراج میں جب نبی کریم ﷺ کی سواری کے لئے براق لایا گیا جس کی زین کسی ہوئی اور لگام چڑھی ہوئی تھی اور آنحضرت ﷺ اس پر سوار ہونے لگے تو وہ شوخیاں کرنے لگا۔ (جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کو اس پر سوار ہونا دشوار ہو گیا) پس حضرت جبرئیل نے اس (براق) کو مخاطب کر کے کہا کیا محمد (ﷺ) کے ساتھ تو یہ شوخیاں کر رہا ہے (جب کہ تو نے اس سے پہلے کسی نبی کے ساتھ شوخی نہیں کی، اور اگر پہلے نبیوں کے ساتھ بھی شوخی کی تھی تب بھی ان کے ساتھ تو ہرگز شوخی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ) یہ وہ ذات گرامی ہے اللہ کی نظر میں جن سے بہتر کوئی شخص تجھ پر سوار نہیں ہوا۔ راوی کا بیان ہے کہ (حضرت جبرئیل علیہ السلام کی یہ بات سن کر) براق پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "یہ وہ ذات گرامی ہے... الخ" اس عبارت کے بین السطور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس براق پر آنحضرت ﷺ سے پہلے دوسرے انبیاء بھی سوار ہو چکے تھے، اس سلسلہ میں تفصیلی تحقیق باب المعراج میں گزر چکی ہے"۔

"براق پسینہ پسینہ ہو گیا" کے تحت شارحین نے لکھا ہے کہ وہ براق تو اس خوشی کے مارے اچھل رہا تھا کہ آنحضرت کی سواری کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ گمان کیا کہ اس کی اچھل کود شوخی کے طور پر ہے لہٰذا جب حضرت جبرئیل نے براق کو متنبہ کیا اور براق کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے اس گمان کا احساس ہوا تو مارے شرم کے پسینہ پسینہ ہو گیا۔

معراج سے متعلق ایک اور معجزہ

(۵۲) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا انْتَهَيْنَا اِلٰى بَيْتِ الْمَقْدِسِ قَالَ جِبْرَئِيْلُ بِاِصْبَعِهٖ فَخَرَقَ بِهَا الْحَجَرَ فَشَدَّ بِهِ الْبُرَاقَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (معراج کی رات میں) جب ہم بیت المقدس پہنچے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا اور اس اشارہ کے ذریعہ پتھر میں سوراخ ہوگیا، اور پھر (میں نے یا حضرت جبرئیل علیہ السلام نے) اس سوراخ کئے ہوئے پتھر سے براق کو باندھا۔" (ترمذی)

تشریح: باب المعراج میں حضرت انسؓ کی یہ روایت گزری ہے کہ براق کو اس حلقہ سے باندھا جس سے تمام انبیاء (اپنے براق) باندھتے تھے، پس اس روایت اور اس روایت کے درمیان بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے اس کو رفع کرنے کے لئے شارحین نے لکھا ہے کہ حضرت انسؓ والی روایت میں "حلقہ" سے مراد شاید وہ جگہ ہوگی، جہاں حلقہ (سوراخ) تھا اور پھر بند ہوگیا تھا، شب معراج میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنی انگلی سے اشارہ کر کے اسی بند سوراخ کو کھولا ہوگا، دونوں روایتوں میں بس فرق یہ ہے کہ حضرت انسؓ کی روایت میں تو حلقہ (سوراخ) کھولنے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور یہاں حضرت بریدہؓ کی روایت میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

اونٹ کی شکایت، درخت کے سلام اور ایک کے اثرات بد سے نجات کا معجزہ

(۵۳) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ مُرَّةَ الثَّقَفِيِّ قَالَ ثَلٰثَةُ اَشْيَاءَ رَاَيْتُهَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا نَحْنُ نَسِيْرُ مَعَهٗ اِذْ مَرَرْنَا بِبَعِيْرٍ يُسْنٰى عَلَيْهِ فَلَمَّا رَاٰهُ الْبَعِيْرُ جَرْجَرَ فوضع جرانه فوقف عليه النبى ﷺ فقال اين صاحب هذا البعير فَجَاءَهٗ فَقَالَ بِعْنِيْهِ فَقَالَ بَلْ نَهَبُهٗ لَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنَّهٗ لِاَهْلِ بَيْتٍ مَالَهُمْ مَعِيْشَةٌ غَيْرُهٗ قَالَ اَمَّا اِذَا ذَكَرْتَ هٰذَا مِنْ اَمْرِهٖ فَاِنَّهٗ شَكٰى كَثْرَةَ الْعَمَلِ وَقِلَّةَ الْعَلَفِ فَاَحْسِنُوْا اِلَيْهِ ثُمَّ سِرْنَا حَتّٰى نَزَلْنَا مَنْزِلًا فَنَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَتْ شَجَرَةٌ تَشُقُّ الْاَرْضَ حَتّٰى غَشِيَتْهُ ثُمَّ رَجَعَتْ اِلٰى مَكَانِهَا فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَكَرْتُ لَهٗ فَقَالَ هِيَ شَجَرَةٌ اسْتَاْذَنَتْ رَبَّهَا فِيْ اَنْ تُسَلِّمَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَذِنَ لَهَا قَالَ ثُمَّ سِرْنَا فَمَرَرْنَا بِمَاءٍ فَاَتَتْهُ امْرَاَةٌ بِابْنٍ لَهَا بِهٖ جِنَّةٌ فَاَخَذَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْخِرِهٖ ثُمَّ قَالَ اخْرُجْ فَاِنِّيْ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ ثُمَّ سِرْنَا فَلَمَّا رَجَعْنَا مَرَرْنَا بِذٰلِكَ الْمَاءِ فَسَاَلَهَا عَنِ الصَّبِيِّ فَقَالَتْ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا رَاَيْنَا مِنْهُ رَيْبًا بَعْدَكَ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"حضرت یعلی ابن مرہ ثقفیؓ کہتے ہیں کہ میں نے (ایک ہی سفر میں) رسول کریم ﷺ (کے معجزات میں) سے تین چیزیں دیکھیں، وہ اس طرح کے ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ جارہے تھے کہ ناگہاں آب کش (پانی کھینچنے والے) اونٹ کے پاس سے گزرے اس اونٹ نے جب آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو بڑبڑ کر کے اپنی گردن (زمین پر رکھ دی) نبی کریم ﷺ اس کے پاس ٹھہر گئے اور پوچھا کہ اس اونٹ کا مالک کہاں ہے؟ ملک حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچ دو! اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اس اونٹ کو بیچ تو نہیں سکتا ہاں (آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کے احترام میں) اس کو آپ ﷺ کی خدمت میں (بلاقیمت نذر کرتا ہوں، ویسے (یہ عرض کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتا کہ) یہ اونٹ ایسے گھر والوں کا ہے (یعنی میرا اور میرے اہل وعیال کا) کہ جن کا ذریعہ معاش اس اونٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہے آپ ﷺ نے یہ سن کر، فرمایا جب کہ تم نے اس اونٹ کے بارے میں حقیقت حال بیان کر دی ہے تو (میں بھی تمہیں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ میں اپنی ضرورت کے لئے اس اونٹ کو خریدنا نہیں چاہتا تھا، بلکہ اصل مقصد اس اونٹ کو تنگی اور مصیبت سے نجات دلانا تھا کیونکہ) اس اونٹ نے درحقیقت مجھ سے شکوہ کیا ہے کہ اس سے کام زیادہ لیا جاتا ہے اور کھانے کو کم دیا جاتا ہے، پس

(اگر تم اس اونٹ کو بیچ کر اپنے سے جدا نہیں کر سکتے تو یہ تو کر سکتے ہو کہ) اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو (یعنی اس کو گھاس دانہ خوب دو اور کام کم لو، اگرچہ زیادہ کھلا کر زیادہ کام لینا جائز ہے، یا اگر چارہ زیادہ دینے کی استطاعت نہیں ہے تو کام بھی کم لینا چاہئے، لیکن یہ ظلم کی بات ہے کہ کھلاؤ کم اور کام زیادہ لو)۔ اس کے بعد حضرت یعلیٰؓ نے دوسرا معجزہ بیان کیا کہ) پھر ہم آگے روانہ ہوئے، یہاں تک کہ ایک جگہ اتر کر آرام کرنے لگے اور نبی کریم ﷺ سو گئے اس وقت (میں نے دیکھا کہ) ایک درخت زمین کو چیرتا ہوا آیا اور آنحضرت ﷺ کو ڈھانک لیا (یعنی آپ ﷺ پر جھک گیا) اور پھر وہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا، جب رسول کریم ﷺ بیدار ہوئے تو میں نے آپ ﷺ سے اس درخت کے آنے اور جانے) کا ذکر کیا آپ ﷺ نے (پورا واقعہ سن کر) فرمایا: یہ وہ درخت ہے جس نے اپنے پروردگار سے اس بارے میں اجازت مانگی تھی کہ وہ رسول خدا ﷺ کو سلام کرے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اجازت دے دی (اور وہ مجھے سلام کرنے آیا تھا)۔ حضرت یعلیٰؓ تیسرا معجزہ بیان کرتے ہوئے) کہتے ہیں کہ ہم پھر آگے بڑھے اور ایک پانی کی جگہ (یعنی ایسی آبادی میں) پہنچے (جہاں پانی دستیاب تھا) وہاں ایک عورت اپنے لڑکے کو لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئی، اس لڑکے پر دیوانگی طاری تھی (یعنی کسی جن یا شیطان کے اثرات بد میں گرفتار تھا) آنحضرت ﷺ نے لڑکے کی ناک پکڑ کر (اس جن یا شیطان سے) کہا کہ نکل جاؤ، میں محمد ﷺ اللہ کا رسول ہوں۔ اس کے بعد ہم نے آگے کا سفر پورا کیا اور جب واپسی میں اس پانی والی آبادی کے پاس سے گزرے تو آنحضرت ﷺ نے اس عورت سے اس لڑکے کا حال دریافت کیا، عورت نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، ہم نے آپ ﷺ (کے جانے) کے بعد (یا آپ ﷺ کی دعا کے بعد) اس لڑکے میں تشویش کی کوئی بات نہیں دیکھی (یعنی وہ بالکل اچھا ہو گیا ہے) اور سارے اثرات بد زائل ہو گئے ہیں) اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔"

ایک اور لڑکے کے شیطانی اثر سے نجات پانے کا معجزہ

۵۴ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ اِنَّ امْرَأَةً جَاءَتْ بِابْنٍ لَهَا اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ان ابني به جنون و انه لياخذه عند غدائنا وعشائنا فمسح رسول الله ﷺ صدره وَدَعَا فَثَعَّ ثَعَّةً وَخَرَجَ مِنْ جَوْفِهٖ مِثْلَ الْجِرْوِ الْاَسْوَدِ يَسْعٰى۔ (رواہ الداری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک عورت... اپنے بیٹے کو لے کر حاضر ہوئی اور بولی کہ یارسول اللہ! میرے بیٹے پر جنون کا اثر ہے جس کا دورہ (ہر دن) دوپہر اور رات کے کھانے کا وقت آنے پر (یا صبح اور شام کے وقت پڑتا ہے)۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر) اس لڑکے کے سینہ پر دست مبارک پھیرا اور دعا فرمائی، چنانچہ اس لڑکے کو ایک بڑی قے ہوئی جس کے ذریعہ اس کے پیٹ سے ایک ایسی (ہیبتناک) شئے نکلی جیسے دوڑتا ہوا کالا پلہ ہو۔" (ترمذی)

درخت کا معجزہ

۵۵ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ جِبْرَئِيْلُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ جَالِسٌ حَزِيْنٌ قَدْ تَخَضَّبَ بِالدَّمِ مِنْ فِعْلِ اَهْلِ مَكَّةَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ تُحِبُّ اَنْ نُرِيَكَ اٰيَةً قَالَ نَعَمْ فَنَظَرَ اِلَى شَجَرَةٍ مِنْ وَرَائِهٖ فَقَالَ ادْعُ بِهَا فَدَعَا بِهَا فَجَاءَتْ فَقَامَتْ بَيْنَ يَدَيْهِ فَقَالَ مُرْهَا فَلْتَرْجِعْ فَاَمَرَهَا فَرَجَعَتْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَسْبِيْ حَسْبِيْ۔ (رواہ الداری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہایت غمگین اور زخموں کے خون میں لتھڑے ہوئے بیٹھے تھے، جو اہل مکہ نے پہنچائے تھے کہ اتنے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور بولے کہ یارسول اللہ! اگر آپ ﷺ پسند کریں تو میں آپ ﷺ کو (آپ ﷺ کا) ایک معجزہ دکھاؤں (جو آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی علامت ہوگی اور جس سے آپ ﷺ کو تسلی

ہو جائے گی کہ اللہ کی راہ میں یہ اذیت و پریشانی اٹھانا آپ ﷺ کے مراتب و درجات کی بلندی میں اضافہ کا باعث ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ضرور دکھاؤ۔ جبرئیل علیہ السلام نے اس درخت کی طرف دیکھا جو ان کے پیچھے تھا اور پھر آنحضرت ﷺ سے کہا کہ اس درخت کو بلایئے، آنحضرت ﷺ نے درخت کو بلایا اور وہ آپ ﷺ کے سامنے (تابعداروں کی طرح) آکر کھڑا ہو گیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا اب اس کو واپس جانے کا حکم دیجئے، آنحضرت ﷺ نے اس کو واپسی کا حکم دیا تو واپس چلا گیا۔ رسول کریم ﷺ نے یہ دیکھ کر) فرمایا، مجھ کو کافی ہے، مجھ کو کافی ہے۔" (دارمی)

تشریح: "جو اہل مکہ نے پہنچائے تھے" سے کفار مکہ کی وہ بدسلوکی اور اذیت رسانی مراد ہے جو ان کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو جنگ احد میں پہنچی تھی جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کا دندان مبارک شہید ہوا اور رخسار مبارک زخمی ہو گیا تھا۔

"مجھ کو کافی ہے، مجھ کو کافی ہے" سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ بس یہ عنایت حق تعالیٰ کی میرے لئے کافی ہے، اس معجزہ کی صورت میں بارگاہ حق میں اپنا بلند مرتبہ و مقام اور اپنی عظمت دیکھ کر مجھے اپنے زخموں کی اذیت کا احساس رہ گیا ہے اور نہ کوئی رنج و غم رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خارق عادت (یعنی معجزہ یا کرامت) کا ظہور یقین و اعتقاد کی مضبوطی اور غم و حزن کے دفعیہ میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے، نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ جن بندگان عالی کو بارگاہ رب العزت میں تقرب اور عظمت کا مقام حاصل ہوتا ہے اگر ان کو دشمنوں کی اور مخالفوں کی طرف سے جسمانی یا روحانی اذیت و تکلیف اور رنج و غم پہنچے تو اس پر صبر کرنا چاہئے کیونکہ دین کی راہ میں جس قدر مشقت اور پریشانی آتی ہے اتنا ہی اجر بڑھتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی رسالت کی گواہی کیکر کے درخت کی زبانی

(۵۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَاَقْبَلَ اَعْرَابِيٌّ فَلَمَّا دَنَا قَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ قَالَ وَمَنْ يَّشْهَدُ عَلٰى مَا تَقُوْلُ قَالَ هٰذِهِ السَّلَمَةُ فَدَعَاهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ بِشَاطِئِ الْوَادِيْ فَاَقْبَلَتْ تَخُدُّ الْاَرْضَ حَتّٰى قَامَتْ بَيْنَ يَدَيْهِ فَاسْتَشْهَدَهَا ثَلٰثًا فَشَهِدَتْ ثَلٰثًا اَنَّهُ كَمَا قَالَ ثُمَّ رَجَعَتْ اِلٰى مَنْبَتِهَا۔ (رواه الدارمی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ ایک جہاد کے سفر میں تھے کہ (لشکر گاہ کے پاس) ایک دیہاتی آگیا اور جب رسول کریم ﷺ کے قریب پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم اس امر کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو یکتا ہے اور جس کا کوئی شریک و ہمسر نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں"۔ دیہاتی نے کہا: آپ ﷺ نے جو کچھ کہا ہے (یعنی نبوت و رسالت کا جو دعویٰ کیا ہے) اس کی گواہی و شہادت دینے والا (نوع انسانی کے علاوہ) اور کوئی بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کیکر کا درخت (جو سامنے کھڑا ہے گواہی دے گا) اور پھر آپ ﷺ نے کیکر کو بلایا، اس وقت آپ ﷺ ایک وادی کے کنارہ پر ٹھہرے ہوئے تھے، کیکر کا درخت (آپ ﷺ کا حکم سن کر) زمین چیرتا ہوا آیا اور آپ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو گیا، آپ ﷺ نے اس سے تین بار گواہی دینے کو کہا اور اس درخت نے تین بار گواہی دی (کہ آپ ﷺ اپنے دعوے میں سچے ہیں اور یقیناً رسول رب العلمین ہیں) اس کے بعد وہ درخت اپنے اگنے کی جگہ واپس چلا گیا (یعنی جس جگہ سے آیا تھا وہیں واپس جا کر کھڑا ہو گیا۔" (دارمی)

کھجور کے خوشہ کی گواہی

(۵۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَآءَ اَعْرَابِيٌّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بِمَا اَعْرِفُ اَنَّكَ نَبِيٌّ قَالَ اِنْ دَعَوْتُ هٰذَا الْعِذْقَ مِنْ هٰذِهِ النَّخْلَةِ يَشْهَدُ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَدَعَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ يَنْزِلُ مِنَ النَّخْلَةِ حَتّٰى سَقَطَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ ارْجِعْ فَعَادَ فَاَسْلَمَ الْاَعْرَابِيُّ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور کہنے لگا کہ میرے لئے اس بات کو جاننے (اس پر یقین کرنے) کا ذریعہ کیا ہے کہ آپ نبی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذریعہ سے کہ میں ابھی اس کھجور کے درخت پر لگے ہوئے خوشہ کو بلاتا ہوں وہ (یہاں آکر) گواہی دے گا کہ میں اللہ کا نبی، اور رسول ہوں۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس خوشہ کو بلایا اور وہ (خوشہ) کھجور کے درخت سے الگ ہو کر اترنے لگا اور نبی کریم ﷺ کے قریب زمین پر آکر گرا (اور آنحضرت ﷺ کی نبوت ورسالت کی گواہی دی) پھر آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ واپس جاؤ اور وہ خوشہ واپس (اپنی جگہ) چلا گیا، (یہ دیکھ کر) اس دیہاتی نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔"

بھڑیئے کے بولنے کا معجزہ

(۵۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ جَآءَ ذِئْبٌ اِلٰی رَاعِیْ غَنَمٍ فَاَخَذَ مِنْهَا شَاةً فَطَلَبَهُ الرَّاعِیْ حَتّٰی انْتَزَعَهَا مِنْهُ قَالَ فَصَعِدَ الذِّئْبُ عَلٰی تَلٍّ فَاَقْعٰی وَاسْتَثْفَرَ وَقَالَ قَدْ عَمَدْتُ اِلٰی رِزْقٍ رَزَقَنِیْهِ اللّٰهُ اَخَذْتُهٗ ثُمَّ انْتَزَعْتَهٗ مِنِّیْ فَقَالَ الرَّجُلُ تَاللّٰهِ اِنْ رَاَیْتُ كَالْیَوْمِ ذِئْبٌ یَتَكَلَّمُ فَقَالَ الذِّئْبُ اَعْجَبُ مِنْ هٰذَا رَجُلٌ فِی النَّخَلَاتِ بَیْنَ الْحَرَّتَیْنِ یُخْبِرُكُمْ بِمَا مَضٰی وَمَا هُوَ كَائِنٌ بَعْدَكُمْ فَقَالَ فَكَانَ الرَّجُلُ یَهُوْدِیًّا فَجَآءَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهٗ وَاَسْلَمَ فَصَدَّقَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهَا اَمَارَاتٌ بَیْنَ یَدَیِ السَّاعَةِ قَدْ اَوْشَكَ الرَّجُلُ اَنْ یَّخْرُجَ فَلَا یَرْجِعُ حَتّٰی یُحَدِّثَهٗ نَعْلَاهُ وَسَوْطُهٗ بِمَا اَحْدَثَ اَهْلُهٗ بَعْدَهٗ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک بھیڑیا (بکریوں) کے ایک ریوڑ میں، جہاں اس کا چرواہا بھی موجود تھا، گھس آیا اور اس میں سے ایک بکری اٹھا کر بھاگا، چرواہے نے اس کا تعاقب کیا اور آخر کار بکری کو اس بھیڑیئے سے چھڑا لیا۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ: پھر وہ بھیڑیا ایک ٹیلہ پر چڑھا اور وہاں اس طرح بیٹھ گیا جیسے کوئی بھیڑیا سرین کے بل بیٹھتا ہے اور دونوں پاؤں کھڑے کر کے اپنی دم ان دونوں پاؤں کے درمیان داخل کرلی اور چرواہے کو (زور سے) مخاطب کر کے بولا: میں نے اپنا وہ رزق لینا چاہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کیا ہے لیکن تم نے میرا رزق مجھ سے چھین لیا۔ چرواہے نے (جو ایک بھیڑیئے کو بولتے دیکھا تو ششدر رہ گیا، چنانچہ اس نے بھڑیئے ہی کو مخاطب کر کے کہا: خدا کی قسم، جیسا عجوبہ، میں نے آج دیکھا ہے ایسا تو کبھی نہیں دیکھا کہ ایک بھیڑیا (آدمی کی طرح) باتیں کر رہا ہے۔ بھیڑیا پھر بولا: اس سے بڑا عجوبہ تو اس شخص (محمد ﷺ) کا حال ہے، جو کھجوروں کے درختوں کے پیچھے دو سنگستانوں کے درمیان (یعنی مدینہ میں) رہتا ہے، وہ شخص تمہیں وہ باتیں بتادے گا جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں اور وہ باتیں بھی بتادے گا جو تمہارے بعد وقوع پذیر ہونے والی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ وہ آدمی (چرواہا) جو ایک یہودی تھا بھیڑیئے کی زبانی سن کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کے سامنے (بھیڑیئے کے بولنے کا) قصہ بیان کر کے مسلمان ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے بیان کردہ قصہ کو درست تسلیم کیا اور پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس طرح کی باتیں قیامت سے پہلے کی (یعنی قرب قیامت کی) علامتیں ہیں، وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے کہ آدمی (اپنے گھر سے) باہر جائے گا اور جب لوٹ کر (گھر میں) آئے گا تو اس کے جوتے اور اس کا کوڑا (وغیرہ) اس کو وہ تمام باتیں بتادے گا، جو اس کے گھر والوں نے اس کی عدم موجودگی میں کی ہوں گی۔" (شرح السنۃ)

تشریح: تورپشتیؒ نے لکھا ہے کہ اس چرواہے کا نام جو بعد میں مسلمان ہو کر شرف صحابیت سے سرفراز ہوئے اہبار بن اوس خزاعی تھا، اس واقعہ کی نسبت سے ان کو "مُكَلِّمُ الذئب" کہا جانے لگا تھا...... لیکن روایت کے یہ الفاظ کہ "جو ایک یہودی تھا" اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ اہبار ابن اوسؓ خزاعی تھے "کیونکہ قبیلۂ خزاعہ کے لوگ یہودی نہیں تھے، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہبار اوس کا تعلق قبیلۂ خزاعہ ہی سے تھا اور انہوں نے اپنے قبیلہ والوں کے برخلاف یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا اس صورت میں تورپشتیؒ کے

قول پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوگا۔

"کھجور کے درختوں کے پیچھے دو سنگستانوں کے درمیان" سے مراد مدینہ شہر تھا اور "دو سنگستانوں" دراصل حرتین کا ترجمہ ہے، حرتین تثنیہ ہے حرۃ کا، جس کے معنی "کالی پتھریلی زمین" کے ہیں مدینہ شہر ایک ایسے میدان میں آباد ہے جو اپنی مشرقی اور مغربی سمتوں سے دو حروں (یعنی دو سنگستانوں کے درمیان واقع ہے۔"

"پہلے گزرنے والی باتوں" سے پچھلی امتوں کے احوال انجام مراد ہیں اور "بعد میں وقوع پذیر ہونے والی باتیں بتائے" سے مراد آنے والے زمانوں میں جو اہم واقعات وحوادث رونما ہوں گے ان کی پیش خبری بھی ہے اور عقبی وآخرت کے حقائق وکوائف بتانا بھی۔

برکت کہاں سے آتی تھی

(۵۹) وَعَنْ اَبِی الْعَلَآءِ عَنْ سَمُرَۃَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ کُنَّا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَتَدَاوَلُ مِنْ قَصْعَۃٍ مِنْ غُدْوَۃٍ حَتّٰی اللَّیْلِ یَقُوْمُ عَشَرَۃٌ وَیَقْعُدُ عَشَرَۃٌ قُلْنَا فَمَا کَانَتْ تُمَدُّ قَالَ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ تَعْجَبُ مَا کَانَتْ تُمَدُّ اِلَّا مِنْ ھٰھُنَا وَاَشَارَ بِیَدِہٖ اِلَی السَّمَآءِ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوالعلاءؒ (تابعی) سمرۃ ابن جندبؓ (صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا" (ظہور معجزہ کے وقت) ہم سب نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک بڑے پیالہ میں سے (دس دس آدمی باری باری صبح سے شام تک (یعنی پورے دن) کھاتے رہتے تھے، ہوتا یہ کہ دس آدمی کھا کر اٹھ جاتے تو (ان کی جگہ) دوسرے دس آدمی آکر بیٹھ جاتے تھے۔ ہم نے (حضرت سمرۃؓ سے) پوچھا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس کے ذریعہ پیالہ کی مدد ہوتی تھی (یعنی اس پیالہ میں سے کھانا کس چیز کے ذریعہ اور کہاں سے اتنا زیادہ ہوجاتا تھا؟)۔ حضرت سمرۃؓ نے جواب دیا: تمہارے لئے اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اس پیالہ میں (کھانے کا اضافہ) وہاں سے، یہ کہہ کر انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔" (ترمذی، دارمی)

تشریح: "تمہارے اس میں تعجب کی کیا بات ہے" سوال تو ان سب تابعین کی طرف سے تھا جن کے سامنے حضرت سمرۃؓ بیان کر رہے تھے، لیکن حضرت سمرۃؓ نے جواب میں صرف حضرت ابوالعلاءؒ کو مخاطب کیا کیونکہ اول تو وہ بھی سوال کرنے والوں میں سے ایک تھے اور دوسرے یہ کہ اس مجلس میں حضرت ابوالعلاءؒ کی حیثیت جلیل القدر تابعین میں سے ہونے کی وجہ سے سب سے نمایاں تھی۔ یا یہ کہ حضرت سمرۃؓ نے کسی ایک شخص کو یا صرف اس مجلس کے لوگوں کو مخاطب نہیں کیا بلکہ ان کا خطاب عمومی طور پر ہر شخص سے ہے جو اس حدیث کو سنے یا پڑھے، بہرحال حضرت سمرۃؓ کا مطلب یہ تھا کہ اس میں تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس ایک پیالہ میں موجود (تھوڑے سے کھانے سے اتنے زیادہ آدمی دن بھر کھاتے رہتے تھے باوجودیکہ ظاہری طور پر ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا تھا جس سے اس پیالہ کے کھانے میں اضافہ ہوسکتا، کیونکہ یہ تو معجزے کی بات تھی، اللہ اور اللہ کے رسول کا معاملہ تھا، اللہ کے رسول دعا کرتے تھے اور اپنے دست مبارک سے اس پیالہ کو چھوتے تھے جس کے سبب اللہ آسمان سے برکت نازل کرتا تھا اور اس پیالہ میں غیر مرئی طور پر عالم بالا سے کھانا اترتا رہتا تھا، اس میں گویا قرآن کریم کی اس آیت وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ کی طرف اشارہ ہے۔

جنگ بدر میں قبولیت دعا کا معجزہ

(۶۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ یَوْمَ بَدْرٍ فِیْ ثَلٰثِمِائَۃٍ وَخَمْسَۃَ عَشَرَ قَالَ اَللّٰھُمَّ اِنَّھُمْ حُفَاۃٌ فَاحْمِلْھُمْ اَللّٰھُمَّ اِنَّھُمْ عُرَاۃٌ فَاکْسُھُمْ اَللّٰھُمَّ اِنَّھُمْ جِیَاعٌ فَاَشْبِعْھُمْ فَفَتَحَ اللّٰہُ لَہٗ فَانْقَلَبُوْا وَمَا مِنْھُمْ رَجُلٌ اِلَّا وَقَدْ رَجَعَ بِجَمَلٍ اَوْ جَمَلَیْنِ وَاکْتَسَوْا وَشَبِعُوْا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جنگ بدر کے دن تین سو پندرہ آدمیوں کو لے کر نکلے اور دعا فرمائی: اے اللہ! یہ (میرے صحابہ جو تیری راہ میں لڑنے کے لئے نکلے ہیں ننگے پاؤں ہیں ان کو سواری عطا فرما! اے اللہ! یہ ننگے بدن ہیں (کہ ان کے جسم پر تہبند کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں) ان کو لباس عطا کر، اے اللہ! یہ بھوکے ہیں، ان کو (ظاہری و باطنی طور پر) شکم سیر فرما (تاکہ ان کو تیری طاعت و عبادت کی طاقت حاصل ہو" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو (مشرکین مکہ کے مقابلہ پر) فتح یاب کیا (دشمن کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر آدمی جنگی قیدیوں کے طور پر ہاتھ لگے) مجاہدین اسلام، اس حالت میں واپس ہوئے کہ ان میں سے کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کے پاس ایک یا دو اونٹ نہ ہوں، نیز سب کو لباس بھی نصیب ہوئے اور سب شکم سیر بھی ہوئے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ کہ ہزیمت خوردہ دشمن کے جو اونٹ، کپڑے اور غذائی سامان مال غنیمت کے طور پر اسلامی لشکر کے ہاتھ لگا۔ اس کی وجہ سے ان مجاہدین کو اونٹ بھی مل گئے، کپڑے بھی ملے اور شکم سیری بھی ہوگئی، پس آنحضرت ﷺ کی ایک ایک دعا قبول ہوئی.......
اس سے معلوم ہوا کہ دعا کا قبول ہونا خصوصاً اتنی جلدی اور اتنے مکمل طور پر قبول ہونا خارق عادت (یعنی معجزہ وکرامت) کے قبیل سے ہے اور یہ نتیجہ تھا اس اس صبر کا جس کا مظاہرہ اللہ کی راہ میں پیش آنے والی تمام صعوبتوں اور پریشانیوں پر آنحضرت ﷺ اور مجاہدین اسلام کی طرف سے ہوا، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے اِنَّ الصَّبرَ عَلٰی مَایَکرَہُ فِیہِ خَیرٌ کَثِیرٌ۔ (ناگوار اور پریشان کن امور پر صبر کرنا درحقیقت بہت ساری بھلائیوں اور فائدوں کا استحقاق حاصل کرنا ہے) نیز اس صبر کا یہ تو وہ فوری ثمرہ تھا، جو اس دنیا میں ملا، اصل ثمرہ تو باقی ہی رہا، جو آخرت میں ملے گا۔ وَالاٰخِرَۃُ خَیرٌ وَّاَبقٰی۔

ایک بشارت ایک ہدایت

(۶۱) وَعَنِ ابنِ مَسعُودٍ عَن رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّکُم مَنصُورُونَ وَمُصِیبُونَ وَمَفتُوحٌ لَکُم فَمَن اَدرَکَ ذٰلِکَ مِنکُم فَلیَتَّقِ اللّٰہَ وَلیَأمُر بِالمَعرُوفِ وَلیَنہَ عَنِ المُنکَرِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعودؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے زمانہ آئندہ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی پیش خبری اور ان واقعات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے فوائد کی بشارت کے طور پر صحابہؓ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ یقیناً تمہیں (دشمنوں کے مقابلہ پر) مدد و نصرت عطا ہوگی، تمہیں (مال غنیمت کی صورت میں بہت کچھ) ملے گا، اور تمہارے ہاتھوں بہت بڑے بڑے علاقے اور مال و دولت سے بھرے ہوئے بہت سارے شہر فتح ہوں گے، پس تم میں سے جو شخص ان (مذکورہ چیزوں) سے سرفراز ہو اس کو چاہئے کہ وہ (درجہ کمال کو پہنچنے کے لئے اپنے تمام دینی و دنیاوی معاملات و مشاغل میں) اللہ سے ڈرتا رہے لوگوں کو نیکی کی ہدایت و تلقین اور بری باتوں سے باز رکھنے کی سعی کرتا رہے۔"

تشریح: اس ارشاد کے ذریعہ آپ ﷺ نے گویا اعتدال و توازن کے راستہ کی رہنمائی فرمائی تاکہ کوئی شخص فتح و کامرانی حکومت و تاجداری اور مال و دولت کی سرفرازی میں اپنی حیثیت اور اپنے منصب و مقصد سے غافل نہ ہو جائے اور غرور و تکبر، اسراف و خود نمائی، اور ظلم و ناانصافی کے راستہ پر چل کر اللہ کے غضب کا مورد نہ بن جائے دراصل اس ارشاد گرامی کے ذریعہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو قرآن کریم کی اس آیت کی طرف متوجہ کیا جس میں فرمایا گیا ہے۔

اَلَّذِینَ اِن مَّکَّنّٰہُم فِی الاَرضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوا بِالمَعرُوفِ وَنَہَوا عَنِ المُنکَرِ۔

"یہ (سچے مسلمان) لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت اور امارت دے دیں تو یہ لوگ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو بھی) نیک کاموں کی تلقین و ہدایت کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔"

زہر آلود گوشت کی طرف سے آگاہی کا معجزہ

(۶۲) وَعَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ یَهُوْدِيَّةً مِنْ اَهْلِ خَيْبَرَ سَمَّتْ شَاةً مَصْلِيَّةً ثُمَّ اَهْدَتْهَا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الذِّرَاعَ فَاَكَلَ مِنْهَا وَاَكَلَ رَهْطٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ مَعَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِرْفَعُوْا اَيْدِيَكُمْ وَاَرْسَلَ اِلَى الْيَهُوْدِيَّةِ فَدَعَاهَا فَقَالَ سَمَمْتِ هٰذِهِ الشَّاةَ فَقَالَتْ مَنْ اَخْبَرَكَ قَالَ اَخْبَرَتْنِيْ هٰذِهٖ فِيْ يَدِيْ لِلذِّرَاعِ قَالَتْ نَعَمْ قُلْتُ اِنْ كَانَ نَبِيًّا فَلَنْ تَضُرَّهٗ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ نَبِيًّا اِسْتَرَحْنَا مِنْهُ فَعَفَا عَنْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يُعَاقِبْهَا وَتُوُفِّيَ اَصْحَابُهُ الَّذِيْنَ اَكَلُوْا مِنَ الشَّاةِ وَاحْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى كَاهِلِهٖ مِنْ اَجْلِ الَّذِيْ اَكَلَ مِنَ الشَّاةِ حَجَمَهٗ اَبُوْهِنْدٍ بِالْقَرْنِ وَالشَّفْرَةِ وَهُوَ مَوْلًى لِبَنِيْ بَيَاضَةَ مِنَ الْاَنْصَارِ۔

(رواہ أبو داؤد والدارمی)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ اہل خیبر میں سے ایک یہودی عورت نے بھنی ہوئی بکری میں زہر ملایا اور پھر اس کو رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا، رسول کریم ﷺ نے اس بکری میں سے ایک دست لے کر خود بھی کھانا شروع کیا اور آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے صحابہؓ کی بھی ایک جماعت کھانے لگی، پھر (ایک دم) رسول کریم ﷺ نے فرمایا اپنے ہاتھ روک لو (اس میں سے کچھ نہ کھاؤ) اس کے بعد آپ ﷺ نے اس یہودی عورت کو بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا (وہ آگئی تو) آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے اس بکری میں زہر ملایا ہے؟ عورت نے کہا آپ ﷺ کو کیسے معلوم ہوا؟ آپ (ﷺ) کے اللہ نے آپ (ﷺ) کو بتایا ہے یا مخلوق میں سے کسی نے؟) آپ ﷺ نے فرمایا؟ مجھے اس نے بتایا ہے جو میرے ہاتھ میں ہے، یہ بات آپ ﷺ نے دست کی طرف اشارہ کر کے کہی۔ تب اس عورت نے (اعتراف کرتے ہوئے) کہا کہ ہاں میں نے اس بکری کو زہر آلود کر دیا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا کہ اگر محمد (ﷺ) نبی ہوں گے تو زہر آلود بکری ان کو ہرگز نقصان نہیں پہنچائے گی اور اگر وہ نبی نہ ہوں گے تو (زہر کے اثر سے ختم ہو جائیں گے اور) ہمیں ان سے نجات اور راحت مل جائے گی۔ پس رسول کریم ﷺ نے اس عورت کو معاف کر دیا اور کوئی سزا نہیں دی، اور صحابہؓ میں سے جن لوگوں نے اس بکری میں سے کھایا تھا (ان میں سے ایک صحابیؓ حضرت بشرؓ) مر گئے، نیز رسول کریم ﷺ نے بھی اس زہر آلود بکری کا گوشت کھا لیا تھا اس کے اثرات کے دفعیہ کے لئے مونڈھوں کے درمیان سینگیاں کھنچوائیں اور ابوہندؓ نے (جن کا اصل نام یسار حجام تھا اور) جو (ایک انصاری قبیلہ) بنو بیاضہ کے آزاد کردہ غلام تھے، شاخ اور چوڑی چھری کے ذریعہ سینگیاں کھینچیں۔" (ابوداؤد، دارمی)

تشریح: اس یہودی عورت کا نام زینت حارث تھا اور سلام ابن مشکم کی بیوی تھی۔ ایک اور روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ اس عورت نے پہلے ہی کچھ لوگوں سے معلوم کر لیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کو کس حصہ کا گوشت زیادہ مرغوب ہے اس نے ایک بکری کا بچہ جو اس کے پاس تھا ذبح کیا اور اس کو بھون کر اس میں ایسا سریع الاثر زہر ملا دیا کہ آدمی کھاتے ہی مر جائے، دست اور شانہ کے حصہ میں تو اس نے خصوصیت سے بہت زیادہ زہر ملایا اور پھر وہ بکری لا کر آنحضرت ﷺ اور ان صحابہؓ کے سامنے کہ جو اس وقت مجلس نبوی ﷺ میں حاضر تھے پیش کی۔"

"تو یہ زہر آلود بکری ہرگز نقصان نہیں پہنچائے گی" یعنی یا تو اس وجہ سے کہ انبیاء پر زہر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتا کہ ان کی زندگی ہی لے لے، یا اس بناء پر کہ دعوت اسلام کے اتمام اور دین کی تکمیل سے پہلے آپ ﷺ کی موت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پہلے احتمال کی صورت میں وہ روایت خلجان کی باعث ہو سکتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات اس زہر کی تاثیر کے سبب ہوئی جو خیبر میں آپ ﷺ کو کھانے میں دیا گیا ہے"...... لیکن چونکہ محققین نے لکھا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے اس کے خلجان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ایک روایت میں تو یہ آیا ہے کہ کسی نے آنحضرت ﷺ سے (مرض الموت میں) کہا کہ آپ ﷺ میں اس زہر کا

اثرات سرایت کررہا ہے جو خیبر میں آپ ﷺ کو دیا گیا تھا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مجھ کو اس کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی جو میرے مقدر میں لکھی ہے اور جو اللہ چاہے۔

"اس عورت کو معاف کردیا اور کوئی سزا نہیں دی" اس ضمن میں بعض حضرات نے تو یہی کہا ہے کہ اس عورت کو نہ قتل کیا گیا اور نہ کوئی دوسری سزا دی گئی ہے اور اس نے اسلام قبول کرلیا تھا، چنانچہ سلیمان تیمیؒ نے تو اپنی کتاب المغازی میں یہ روایت نقل کرتے ہوئے فلن یضرہ کے بعد یوں نقل کیا ہے کہ وَاِنْ كُنْتَ كَاذِبًا اَرَحْتُ النَّاسَ مِنْكَ وَقَدِ اسْتَبَانَ لِي اَنَّكَ صَادِقٌ وَاَنَا اَشْهَدُكَ وَمَنْ حَضَرَ عَلٰى دِيْنِكَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ یعنی اس عورت نے کہا میں نے سوچا تھا کہ اگر محمد ﷺ نبی ہوں گے تو یہ زہر آلود بکری ان کو ہرگز نقصان نہیں پہنچائے گی) اور اگر آپ ﷺ جھوٹے ہیں تو میں (اس زہر کے ذریعہ آپ ﷺ کا کام تمام کر کے) لوگوں کو آپ ﷺ سے نجات اور راحت پاؤں گی، لیکن اب مجھ پر واضح ہوگیا ہے کہ یقیناً آپ ﷺ (سچے) (اور نبی) ہیں، میں آپ ﷺ کو اور اس شخص کو جو آپ ﷺ کے دین پر قائم ہے، گواہ کرکے اقرار کرتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں بلاشبہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ لیکن طیبیؒ نے لکھا ہے کہ اس بارے میں اختلاف ہے (کیونکہ جس طرح بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو معاف کردیا اور کوئی سزا نہیں دی اسی طرح ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت کے قتل کئے جانے کا حکم صادر فرمایا، چنانچہ اس کو قتل کردیا گیا۔ پس ان دونوں طرح کی روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ شروع میں آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو معاف کردیا تھا اور کوئی سزا نہیں دی تھی (اسی اعتبار سے بعض روایتوں میں معافی کا ذکر کیا گیا ہے) لیکن پھر بعد میں جبکہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس زہر آلود بکری کو کھانے والوں میں سے ایک صحابی حضرت بشر ابن براء ابن معرور کا انتقال اس زہر آلود گوشت کے کھانے کے سبب ہوگیا۔ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے منع کرنے سے پہلے ہی گوشت کا ایک ٹکڑا اپنے حلق سے نیچے اتار لیا تھا تو آنحضرت ﷺ نے اس یہودی عورت کے قتل کا حکم صادر فرمایا، چنانچہ وہ عورت حضرت بشرؓ کے قصاص میں قتل کردی گئی (اور اسی وجہ سے بعض روایتوں میں اس عورت سے قتل کئے جانے اور سزا پانے کا ذکر ہے۔

غزوۂ حنین میں فتح کی پیش گوئی کا ذکر

(۶۳) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ الْحَنْظَلِيَّةِ اَنَّهُمْ سَارُوْا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ حُنَيْنٍ فَاَطْنَبُوا السَّيْرَ حَتّٰى كَانَ عَشِيَّةً فَجَاءَ فَارِسٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ طَلَعْتُ عَلٰى جَبَلِ كَذَا وَكَذَا فَاِذَا اَنَا بِهَوَازِنَ عَلٰى بَكْرَةِ اَبِيْهِمْ بِظُعْنِهِمْ وَنَعَمِهِمْ اِجْتَمَعُوْا اِلٰى حُنَيْنٍ فَتَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ تِلْكَ غَنِيْمَةُ الْمُسْلِمِيْنَ غَدًا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ قَالَ مَنْ يَّحْرُسُنَا اللَّيْلَةَ قَالَ اَنَسُ بْنُ اَبِيْ مَرْثَدِ الْغَنَوِيّ اَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ ارْكَبْ فَرَكِبَ فَرَسًا لَهٗ فَقَالَ اسْتَقْبِلْ هٰذَا الشِّعْبَ حَتّٰى تَكُوْنَ فِيْ اَعْلَاهُ فَلَمَّا اَصْبَحْنَا خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى مُصَلَّاهُ فَرَكَعَ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ قَالَ هَلْ حَسَسْتُمْ فَارِسَكُمْ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَسَسْنَا فَثُوِّبَ بِالصَّلٰوةِ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّيْ يَلْتَفِتُ اِلَى الشِّعْبِ حَتّٰى اِذَا قَضَى الصَّلٰوةَ قَالَ اَبْشِرُوْا فَقَدْ جَآءَ فَارِسُكُمْ فَجَعَلْنَا نَنْظُرُ اِلٰى خِلَالِ الشَّجَرِ فِي الشِّعْبِ فَاِذَا هُوَ قَدْ جَآءَ حَتّٰى وَقَفَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّي انْطَلَقْتُ حَتّٰى كُنْتُ فِيْ اَعْلٰى هٰذَا الشِّعْبِ حَيْثُ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اَصْبَحْتُ طَلَعْتُ الشِّعْبَيْنِ كِلَيْهِمَا فَلَمْ اَرَ اَحَدًا فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ نَزَلْتَ اللَّيْلَةَ قَالَ لَا اِلَّا مُصَلِّيًا اَوْ قَاضِيَ حَاجَةٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَا عَلَيْكَ اَنْ لَّا تَعْمَلَ بَعْدَهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سہل ابن حنظلیہؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ حنین کے موقع پر (حنین کے مقام پر جانے کے لئے) صحابۂ کرام رسول کریم ﷺ کے ساتھ روانہ ہوئے تو سفر کا سلسلہ طویل ہوگیا (یعنی کہیں رکے بغیر مسلسل چلتے رہے) یہاں تک کہ جب رات آئی تو (ایک جگہ پہنچ کر جہاں

پڑاؤ ڈالنا تھا) ایک سوار خدمت اقدس میں) حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ: میں ایسے اور ایسے پہاڑ پر چڑھا (اور دشمن کا جائزہ لے رہا تھا) کہ اچانک میں نے دیکھا کہ ہوازن (جو مشہور اور بہت بڑا قبیلہ ہے) اپنے باپ کے اونٹ پر آگیا ہے یعنی قبیلہ کے تمام لوگ آگئے ہیں، ان کے ساتھ ان کی عورتیں بھی ہیں اور ان کے مویشی بھی ہیں اور وہ سب حنین کے مقام پر جمع ہو گئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ (یہ سن کر معنی خیز انداز میں) مسکرائے اور فرمایا۔ "انشاء اللہ یہ سب چیزیں کل کے دن مسلمانوں کا مال غنیمت ہوں گی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے (تمام اہل لشکر کی طرف روئے سخن کر کے) فرمایا: آج کی رات ہماری نگہبانی کا ذمہ کون لیتا ہے؟ (ایک صحابی) حضرت انس ابن ابی مرثد غنوی ؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! تم اس پہاڑی راستہ سے جا کر اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاؤ (اور وہاں سے دشمن پر نگاہ رکھو)"۔ پھر جب صبح ہوئی تو رسول کریم ﷺ نماز پڑھنے کی جگہ تشریف لائے (جو پہلے سے مقرر تھی) آپ ﷺ نے (فجر کی سنت کی) دو رکعتیں پڑھیں اور (اہل لشکر کو مخاطب کر کے فرمایا کیا تمہیں اپنے سوار کی کچھ آہٹ ملی؟ (یعنی تم میں سے کسی نے اس کو آتے دیکھا ہے یا اس کی آواز کسی نے سنی ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ کس حال میں ہے؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! نہیں (ہم میں سے کسی کو کوئی آہٹ وخبر نہیں ہے) اتنے میں نماز فجر کی تکبیر کہی گئی (اور نماز شروع ہوگئی) رسول کریم ﷺ (کے اضطراب کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ) نماز کے دوران بھی کن انکھیوں سے اسی پہاڑی راستہ کی طرف دیکھتے رہے یہاں تک کہ جب نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا: خوش ہو جاؤ، تمہارا (وہ) سوار آرہا ہے (جو تمہاری نگہبانی کر رہا تھا۔) چنانچہ ہم لوگوں نے اس پہاڑی راستہ کے درختوں میں دیکھنا شروع کیا یہاں تک وہ سوار آتا ہوا دکھائی دیا اور پھر وہ آکر رسول کریم ﷺ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بیان کیا کہ میں (یہاں سے) روانہ ہوا پہاڑی راستہ سے ہوتا ہوا (پہاڑ کی) اس چوٹی پر پہنچا، جہاں جانے کا رسول کریم ﷺ نے حکم دیا تھا (اور پوری رات اسی جگہ کھڑا ہوا نگہبانی کرتا رہا) پھر جب صبح ہوئی تو میں پہاڑ کے دونوں راستوں (اور اس کی ادھر ادھر کی گھاٹیوں) میں آیا (تا کہ اس بات کا اچھی طرح اندازہ لگالوں کہ دشمن کے کچھ لوگ ادھر ادھر تو نہیں چھپے ہوئے ہیں، لیکن میں نے وہاں کسی کو نہیں دیکھا۔ رسول کریم ﷺ نے انس ؓ ابن مرثد سے پوچھا کیا رات میں گھوڑے سے اترے تھے؟ انہوں نے کہا صرف نماز پڑھنے کے لئے یا استنجا کرنے کے لئے (ذرا سی دیر کے لئے) اترا تھا (ورنہ پوری رات گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا نگہبانی کرتا رہا) آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا: پھر تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس رات کے بعد کوئی عمل نہ کرو۔" (ابوداؤد)

تشریح: "بَکْرَۃ"۔ جوان اونٹ کو کہتے ہیں اور علٰی بَکْرَۃِ ابیھم۔ (اپنے باپ کے اونٹ پر) دراصل عربوں کا ایک محاورہ ہے ان لوگوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے جو کسی جگہ آئیں اور سب کے سب آجائیں ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے۔ یہ محاورہ یہاں سے چلا کہ کسی زمانہ میں ایک جگہ عربوں کی ایک جماعت کے لوگ کہیں جانے کے لئے تیار ہوئے چنانچہ جب انہوں نے کوچ کیا تو جس شخص کو جہاں بھی کوئی اونٹ کھڑا ہوا ملا اس نے اس کو پکڑا اور اس پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا، اتفاق کی بات کہ وہ اونٹ خود ان لوگوں کی ذاتی ملکیت نہیں تھے بلکہ ان کے باپ کے تھے۔ جو ادھر ادھر چر رہے تھے اس طرح وہ تمام لوگ ان اونٹوں پر سوار ہو کر منزل مقصود کو روانہ ہو گئے ان میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں بچا جو ان اونٹوں میں سے کسی اونٹ پر بیٹھ کر روانہ نہ ہوا ہو، پس اس کے بعد یہ محاورہ ہو گیا کہ جب کسی جماعت یا قبیلے کے لوگ اجتماعی طور پر کہیں آتے تو ان کی اس اجتماعیت کو اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے کہا جاتا کہ: جَاؤُا عَلٰی بَکْرَۃِ اَبِیْھِمْ۔ (وہ لوگ اپنے باپ کے اونٹوں پر آگئے)

اور قاضی ؒ نے لکھا ہے کہ عَلٰی بَکْرَۃِ اَبِیْھِمْ دراصل مع کے معنی میں ہے اور یہ جملہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اور یہ مثل یہاں سے چلی کہ ایک عرب خاندان کے کچھ لوگوں کے کسی حادثہ یا واقعہ کے پیش آجانے پر اپنی آبادی چھوڑنا پڑا، چنانچہ ان تمام لوگوں نے یہاں سے کوچ کیا، چونکہ وہ لوگ اپنے پیچھے کوئی چیز چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لئے ایک ایک چیز اپنے ساتھ لے لی، یہاں تک کہ اونٹ جو ان کے پاس تھا اس کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اس پر کچھ لوگوں نے کہا جَاؤُا عَلٰی بَکْرَۃِ اَبِیْھِمْ۔ یہ لوگ (سب کچھ لے کر) آگئے یہاں تک کہ اپنے باپ کا اونٹ بھی لیتے آئے اس کے بعد سے یہ جملہ ایسے لوگوں کے حق میں ضرب المثل کے طور پر

استعمال ہونے لگا جو اپنے ساتھ اپنے تمام مال و اسباب اور تمام آدمیوں کو لے کر پہنچتے چاہے ان کے ساتھ اونٹ ہوتا یا نہ ہوتا اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ ایک شخص اپنی تمام اولاد کو اپنے اونٹ پر لئے پھرتا تھا، اس کو دیکھ کر کسی نے یہ جملہ کہا اور جب سے یہ ضرب المثل بن گیا۔"

"کہ اس رات کے بعد کوئی عمل نہ کرو" اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اس سوار یعنی حضرت انس ابن مرثد کو بشارت دی کہ تمہارے لئے اللہ کے نزدیک آج کی رات ہی کافی ہے۔ تمہارے نامۂ اعمال میں اس رات کی خدمت کے عوض اتنا اجر و ثواب جمع ہو گیا ہے اور تمہیں اتنی فضیلت مل گئی ہے کہ اگر تم از قسم فضائل و نوافل اور کوئی عمل نہ بھی کرو، تو آخرت میں بلندی درجات کی طرف سے تمہیں کوئی فکر نہ ہونی چاہئے۔ پس اس جملہ میں یہاں "عمل" سے نوافل و حسنات مراد ہیں نہ کہ فرائض، کیونکہ فرائض تو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں "عمل" سے "مراد" جہاد" ہے، مطلب یہ ہے کہ تم نے آج کی رات اللہ کی راہ میں ہماری نگہبانی کی ذمہ داری جس محنت و مشقت اور جان نثاری کے جذبہ سے نبھائی ہے، اس کے بعد اگر تم جہاد میں شریک نہ بھی ہو تو تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔"

کھجوروں میں برکت کا معجزہ

(۶۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَمَرَاتٍ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُدْعُ اللّٰهَ فِيْهِنَّ بِالْبَرَكَةِ فَضَمَّهُنَّ ثُمَّ دَعَالِیْ فِيْهِنَّ بِالْبَرَكَةِ قَالَ خُذْهُنَّ فَاجْعَلْهُنَّ فِیْ مِزْوَدِكَ كُلَّمَا اَرَدْتَ اَنْ تَاْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا فَاَدْخِلْ فِيْهِ يَدَكَ فَخُذْهُ وَلَا تَنْثُرْهُ نَثْرًا فَقَدْ حَمَلْتُ مِنْ ذٰلِكَ التَّمْرِ كَذَا وَكَذَا مِنْ وَسْقٍ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَكُنَّا نَاْكُلُ مِنْهُ وَنُطْعِمُ وَكَانَ لَا يُفَارِقُ حَقْوِیْ حَتّٰى كَانَ يَوْمُ قُتِلَ عُثْمَانَ فَاِنَّهُ انْقَطَعَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں رسول کریم ﷺ کے پاس (اکیس) ۲۱ کھجوریں لے کر آیا اور عرض کیا کہ یا رسول (ﷺ) خدا سے ان کھجوروں میں برکت کی دعا فرما دیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کھجوروں کو اپنے ہاتھ میں لیا (یا یہ کہ ان کھجوروں پر اپنا ہاتھ رکھا) اور پھر میرے لئے ان کھجوروں میں برکت کی (اور ان کھجوروں کے کھانے میں کثرت خیر کی اور ان کے باقی رہنے کی) دعا فرمائی اور اس کے بعد فرمایا کہ: لو اور ان کھجوروں کو اپنے توشہ دان میں رکھ لو، جب تم ان میں سے کچھ لینا چاہو تو توشہ دان میں اپنا ہاتھ ڈالو اور نکال لو اور اس توشہ دان کو جھاڑ پھونک کر کبھی خالی نہ کرنا" حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے (آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق ان کھجوروں کو ایک توشہ دان میں رکھ لیا اور پھر ان چند کھجوروں میں اتنی برکت دیکھی کہ اس توشہ دان سے نکال نکال کر) اتنے اتنے وسق تو کھجوریں خدا کی راہ میں خرچ کر دیں اور ہم (یعنی میرے دوست و احباب) ان کھجوروں میں سے کھاتے اور کھلاتے رہتے تھے، وہ توشہ دان میری کمر (پر بندھا رہتا تھا جہاں) سے کسی وقت الگ نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کے شہید ہونے کے دن وہ توشہ دان میری کمر سے کھل کر گر پڑا (اور ضائع ہو گیا)۔" (ترمذی)

تشریح: روایت کے آخری الفاظ سے معلوم ہوا کہ جب معاشرہ میں فتنہ و فساد پھیل جاتا ہے اور لوگوں میں افتراق و انتشار بڑھ جاتا ہے تو خیر و برکت اٹھ جاتی ہے، ایک روایت میں منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دن حضرت ابوہریرہؓ اپنا درد و کرب اس شعر کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔

للناس هم ولی الیوم همان بینهم   هم الجراب وهم الشیخ عثمانا

(آج کے دن اور لوگوں کو تو ایک ہی غم کا سامنا ہے اور مجھ پر دو غم پڑے ہیں ایک غم تو توشہ دان کے ضائع ہونے کا اور ایک غم حضرت عثمان کی شہادت کا)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

شب ہجرت کا واقعہ اور غار ثور کے محفوظ ہونے کا معجزہ

(۶۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ تَشَاوَرَتْ قُرَيْشٌ لَيْلَةً بِمَكَّةَ فَقَالَ بَعْضُهُمْ اِذَا اَصْبَحَ فَاَثْبِتُوْهُ بِالْوَثَاقِ يُرِيْدُوْنَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلِ اقْتُلُوْهُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلْ اَخْرِجُوْهُ فَاَطْلَعَ اللّٰهُ نَبِيَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى ذٰلِكَ فَبَاتَ عَلِيٌّؓ عَلٰى فِرَاشِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ اللَّيْلَةَ وَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى لَحِقَ بِالْغَارِ وَبَاتَ الْمُشْرِكُوْنَ يَحْرُسُوْنَ عَلِيًّا يَحْسَبُوْنَهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اَصْبَحُوْا ثَارُوْا عَلَيْهِ فَلَمَّا رَاَوْا عَلِيًّا رَدَّ اللّٰهُ مَكْرَهُمْ فَقَالُوْا اَيْنَ صَاحِبُكَ هٰذَا قَالَ لَا اَدْرِيْ فَاقْتَصُّوْا اَثَرَهُ فَلَمَّا بَلَغُوا الْجَبَلَ اخْتَلَطَ عَلَيْهِمْ فَصَعِدُوا الْجَبَلَ فَمَرُّوْا بِالْغَارِ فَرَاَوْا عَلٰى بَابِهِ نَسْجَ الْعَنْكَبُوْتِ فَقَالُوْا لَوْ دَخَلَ هٰهُنَا لَمْ يَكُنْ نَسْجُ الْعَنْكَبُوْتِ عَلٰى بَابِهِ فَمَكَثَ فِيْهِ ثَلٰثَ لَيَالٍ۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قریش مکہ نے ایک روز رات کے وقت (دار الندوہ) میں اپنی مجلس مشاورت منعقد کی (جس میں ابلیس شیطان بھی ایک نجدی شیخ کی صورت میں شریک ہوا) چنانچہ بعض نے یہ مشورہ دیا کہ صبح ہوتے ہی اس شخص کی مشکیں کس لو (یعنی رسیوں سے باندھ کر قید میں ڈال دو) "اس شخص" سے ان کی مراد نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی تھی، بعض نے یہ رائے دی کہ (نہیں بلکہ اس کو قتل کر ڈالو اور بعض نے (حقارت کے ساتھ) یہ کہا کہ اس کو اپنی سرزمین سے نکال کر باہر کرو یعنی جلا وطن کر دو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ) اپنے نبی ﷺ کو (قریش مکہ کے مشورہ وفیصلہ سے) آگاہ کر دیا (اور حکم دیا کہ آپ ﷺ آج کی رات اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلا دیں اور ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر بارادۂ ہجرت مکہ سے روانہ ہو جائیں چنانچہ اس رات میں حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ کے بستر پر سوئے اور نبی کریم ﷺ (حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر) مکہ سے نکلے اور غار ثور میں جا چھپے۔ ادھر قریش مکہ نے یہ سمجھ کر پوری رات حضرت علیؓ کی نگرانی میں گزار دی کہ وہ نبی کریم ﷺ ہیں (یعنی گھر کے اندر آنحضرت ﷺ کے بستر پر تو حضرت علیؓ سوئے ہوئے تھے اور قریش مکہ آنحضرت ﷺ کو سویا ہوا سمجھ کر پوری رات گھر کی نگرانی کرتے رہے) یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو انہوں نے (یعنی قریش مکہ نے) اس (بستر) پر (کہ جہاں حضرت علیؓ سوئے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ کا گمان کر کے) دھاوا بول دیا لیکن جب انہوں نے (آنحضرت ﷺ کے بجائے) حضرت علیؓ کو دیکھا اور اللہ نے ان کی بدخواہی کو انہی پر لٹا دیا تو (وہ بڑے سٹپٹائے اور) حضرت علیؓ سے پوچھنے لگے کہ تمہارا یہ دوست (جس کا یہ بستر ہے یعنی محمد ﷺ) کہاں گیا؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ مجھ کو نہیں معلوم۔ قریش مکہ (صورت حال سمجھ کر فوراً حرکت میں آ گئے اور آپ ﷺ کو ڈھونڈھ کر پکڑ لانے کے لئے) آپ ﷺ کے قدموں کے نشان پر آپ ﷺ کے تعاقب میں نکل پڑے، یہاں تک کہ وہ لوگ جبل ثور تک پہنچ گئے مگر وہاں قدموں کے نشان مشتبہ ہو گئے تھے (جس کی وجہ سے ان کو آگے رہنمائی نہیں مل سکی) پھر وہ پہاڑ کے اوپر گئے اور ادھر ادھر ٹوہ لگاتے ہوئے) غار کے منہ پر پہنچ گئے (ان کا گمان تھا کہ آنحضرت ﷺ اس غار میں چھپے ہوں گے) لیکن انہوں نے غار کے منہ پر مکڑی کا جالا دیکھا تو کہنے لگے کہ اگر محمد (ﷺ) اس غار میں داخل ہوئے ہوتے تو اس کے منہ پر مکڑی کا جالا نہ ہوتا (اس طرح وہ لوگ وہاں سے مایوس ہو کر واپس ہو گئے) اور آنحضرت ﷺ تین رات دن اسی غار میں چھپے رہے۔" (احمدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ جب مشرکین مکہ کو یہ معلوم ہوا کہ محمد (ﷺ) کی دعوت اسلام مدینہ تک پہنچ گئی ہے اور وہاں کے متعدد بااثر لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے ہیں تو انہیں سخت تشویش ہوئی، اس مسئلہ پر غور وفکر اور آنحضرت کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے لئے ان کے سارے بڑے بڑے سردار اور زعماء دار الندوہ میں جمع ہوئے، عین اس وقت جب

کہ ان سرداروں کی مشاورتی مجلس شروع ہونے والی تھی ابلیس ایک بوڑھے اور تجربہ کار ظاہر ہونے والے شخص کی صورت میں اس مشاورتی مجلس میں پہنچا اور بولا کہ میں نجد سے آیا ہوں، جب مجھے تم لوگوں کے اس اجتماع کا علم ہوا تو میری خواہش ہوئی کہ میں بھی تمہارے اس اجتماع میں شریک ہو کر کوئی مناسب اور کارگر رائے پیش کروں بلاشبہ عقل ودانائی اور خیر خواہی میں تم میں سے کوئی شخص مجھ سے بڑھا ہوا نہیں ہے۔ حاضرین مجلس ابلیس کی اس بات سے بہت متاثر ہوئے اور اس کو عزت و احترام کے ساتھ اپنے درمیان جگہ دی۔ اس کے بعد اس مشاورتی کمیٹی کی کار وائی کا آغاز ہوا اور مختلف لوگوں کی طرف سے اظہار خیال و آراء کا سلسلہ شروع ہو گیا، ابوالبختری نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ اس شخص (محمد ﷺ) کو قید کر کے کسی ایسی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دو جس میں آمد و رفت کا کوئی ذریعہ اور کوئی دروازہ و در کھلا نہ رہ جائے، صرف ایک ایسا بڑا سوراخ باقی رکھا جائے، جس میں سے اس کے کھانے پینے کی چیزیں ڈال دی جایا کریں، اور اس کو اس کوٹھڑی میں اس وقت تک محبوس رکھنا چاہئے جب تک کہ وہ اس میں پڑا پڑا مر نہ جائے۔ یہ سن کر اس شیخ نجدی (کی صورت میں ابلیس) نے کہا یہ رائے نہایت غیر موزوں ہے، کیونکہ جب تم اس کو قید کرو گے تو اس کے خاندان کے لوگ اس کے عزیز و اقارب تم پر دھاوا بول دیں گے اور جنگ و جدل کے ذریعہ تمہاری قید سے اس کو آزاد کرا کے لے جائیں گے۔ پھر ہشام ابن عمرو نے یہ رائے دی کہ اس شخص کو اچھی طرح ذلیل و رسوا کر کے ایک اونٹ پر سوار کرا دو اور اپنی سرزمین سے باہر نکال دو، وہ یہاں جلاوطن ہو کر جہاں کہیں جائے گا اور وہاں اپنے نئے دین کی اشاعت میں جو کچھ کرے گا اس سے کم از کم تم لوگ تو محفوظ رہو گے۔ ابلیس نے اس رائے کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ اس طرح تو اس شخص کو کھیل کھیلنے کا خوب موقع مل جائے گا اور یہاں سے کہیں اور جا کر اپنی مظلومیت کے قصے سنائے گا اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اگرچہ یہاں کے لوگ اس کی دعوت سے محفوظ رہیں گے مگر وہ دوسری جگہ کے لوگوں کو اپنا ہمنوا اور ہمدرد بنالے گا اور پھر ان لوگوں کی مدد سے طاقت پا کر تم پر حملہ آور ہو جائے گا آخر میں لعین ابوجہل بولا اور اس نے رائے دی کہ تم لوگ ہر قبیلہ و خاندان میں سے ایک ایک نوجوان منتخب کر لو اور ان سب کو تلواریں دے کر کہو کہ وہ سب ایک ساتھ اس شخص پر اپنی تلواروں سے حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیں، اس طرح اس کا خون تمام قبیلوں اور خاندانوں میں پھیل جائے گا یعنی اس کے قتل کا کوئی ایک قبیلہ و خاندان ذمہ دار ہونے کے بجائے اجتماعی جنگ کرنے اور اس شخص کے خون کا قصاص لینے سے عاجز ہوں گے۔ اور مجبوراً دیت (خون بہا) لینے پر راضی ہو جائیں گے...... جب وہ دیت طلب کریں گے تو ہم سب مل کر ان کو دیت دے دیں گے اور قصہ تمام ہو جائے گا۔ ابلیس نے اس رائے کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ اس جوان نے بالکل صحیح بات کہی پھر تو سب لوگ ہی ابوجہل کی رائے پر متفق ہو گئے اور یہی طے پایا کہ آج رات بھر محمد (ﷺ) کے گھر کا محاصرہ رکھا جائے اور صبح ہوتے ہی ان پر حملہ کر کے قصہ تمام کر دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر قریش کی اس سازشی کارروائی سے آنحضرت ﷺ کو آگاہ کر دیا کہ آپ ﷺ اپنے بستر پر علیؓ کو سلا کر ابوبکرؓ کے ساتھ ہجرت کے ارادہ سے رات ہی میں مکہ سے نکل جائیں، قرآن کریم کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُبِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْيَقْتُلُوْكَ اَوْيُخْرِجُوْكَ۔

"اور جب (مکہ کے) کافر آپ (ﷺ) کے بارہ میں یہ سازش کر رہے تھے کہ آپ ﷺ کو قید میں ڈال دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ ﷺ کو جلاوطن کر ڈالیں۔"

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلا دیا اور خود حضرت ابوبکرؓ کو لے کر راتوں رات مکہ سے نکل کر جبل ثور کے ایک غار میں جا چھپے اس وقت جب کہ قریش مکہ کی ایک خونخوار جماعت آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کئے ہوئے تھی، آپ ﷺ کا گھر سے باہر نکلنا اور ان کافروں کا آپ ﷺ کو گھر سے نکلتے ہوئے دیکھنا، پھر ان سے آپ ﷺ کا گفتگو کرنا اور ان کی نظروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے صاف بچ کر نکل جانا ایک حیرت انگیز قصہ اور زبردست معجزہ تھا جس کی تفصیل تاریخ سیر کی کتابوں میں مذکور ہے۔

بہر حال قریش مکہ اپنے اس گمان کے مطابق کہ محمد ﷺ گھر کے اندر سوئے ہوئے ہیں رات بھر آپ ﷺ کے گھر کی نگرانی کرتے رہے ان کا منصوبہ تھا کہ پوری رات آپ ﷺ کی نگرانی رکھنے کے بعد صبح سویرے گھر میں گھس پڑیں گے اور آپ ﷺ کا کام تمام کر دیں گے حالانکہ گھر کے اندر تو حضرت علی سوئے ہوئے تھے اور آنحضرت ﷺ ان کی نظروں کے سامنے سے باہر نکل گئے تھے، چنانچہ صبح ہوتے ہی جب انہوں نے گھر کے اندر دھاوا بول دیا تو وہاں حضرت علیؓ کو دیکھ کر سخت حیران ہوئے اور فوراً آپ ﷺ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے وہ آپ ﷺ کے قدموں کے نشان دیکھ دیکھ کر جبل ثور تک پہنچ گئے اور پھر اس غار کے منہ پر بھی جا پہنچے، جہاں آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ چھپے ہوئے تھے، اس جگہ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کا معجزہ ظاہر ہوا جس غار کے اندر آپ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ چھپے ہوئے تھے اس کا منہ صرف ایک بالشت چوڑا اور ایک ہاتھ لمبا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی وقت دو کبوتر بھیج دئے جنہوں نے غار کے منہ کے نیچے کی جانب انڈے دیئے اور قدرت کے حکم سے ایک مکڑی نے آکر جھبی غار کے منہ پر جالا تن دیا، ایسی صورت میں قریش مکہ کے ان گماشتوں کو، جو آنحضرت ﷺ کے تعاقب میں غار تک پہنچ گئے تھے، یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس غار کے اندر دو انسان چھپے ہوئے ہیں، لہٰذا وہ اس جگہ سے مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ ایک روایت میں تو یہ بھی آیا ہے کہ قریش مکہ کے وہ گماشتے غار کے منہ کے قریب ایسی جگہ پر پہنچ گئے تھے کہ اگر ان کی نظر اپنے پیروں کی طرف چلی جاتی تو بڑی آسانی سے وہ لوگ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کو غار کے اندر دیکھ لیتے، حضرت ابوبکرؓ غار کے اندر سے ان لوگوں کو اپنے سر پر کھڑا دیکھ ہی رہے تھے، انہیں آنحضرت ﷺ کے تئیں سخت تشویش ہوئی چنانچہ انہوں نے آنحضرت سے اپنے خوف کا اظہار کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ان دو آدمیوں کے بارہ میں تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا ساتھی اللہ تعالیٰ ہے (یعنی ہم دونوں یہاں بے یار و مددگار نہیں ہیں بلکہ ایک تیسری ذات یعنی اللہ تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ ہے جو یقیناً ہم دونوں کی حفاظت کرے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کو اس طرح بے بصر کر دیا کہ وہ غار کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھتے تھے لیکن غار کے اندر آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ نہیں پائے۔

تفسیر بحر العلوم میں اس آیت اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ کے تحت لکھا ہے "کہ اس آیت میں صاحب (ساتھی) سے مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں، جو ہجرت کی رات میں اس موقع پر جب کہ کفار مکہ نے آنحضرت ﷺ کے قتل کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، آنحضرت ﷺ کے ساتھ مکہ سے نکلے تھے اور دونوں غار ثور میں جا کر چھپ گئے تھے اس غار میں ابوبکرؓ نے جب دیکھا کہ کفار مکہ غار کے منہ تک آپہنچے ہیں تو آنحضرت ﷺ سے کہا کہ اگر ان کفار میں سے کسی نے بھی اپنے پیروں کی طرف دیکھا تو اس کی نظر یقیناً ہم تک پہنچ جائے گی، اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ (فکر و تشویش کی کوئی بات نہیں ہے (اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ابوبکر! ان دو آدمیوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا ساتھی اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہیں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت کا منکر، نص قرآن کے انکار کے سبب، "کافر" ہے جب کہ دوسرے صحابہ کی صحابیت کا منکر کافر نہیں بلکہ مبتدع ہے۔

واقعۂ ہجرت کے سلسلہ میں جو روایت حضرت عائشہؓ سے منقول ہے اس میں انہوں نے یوں بیان کیا ہے کہ: میرے والدین اپنے زمانہ عقل و بلوغ کی ابتداء ہی سے دیندار تھے، اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا کہ آنحضرت ﷺ ہمارے ہاں صبح و شام نہ آتے ہوں، جب مسلمانوں پر کفار مکہ کا ظلم و ستم اپنے عروج کو پہنچ گیا تو آنحضرت ﷺ نے (ایک دن) میرے والد حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ تمہارا دار الہجرت مجھے دکھایا گیا ہے، وہ دو سنگستانوں کے درمیان کھجوروں کے باغات والی ایک بستی ہے اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے حکم سے مسلمانوں کا مدینہ کو ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے والے مسلمان بھی مدینہ آگئے اسی بناء پر حضرت ابوبکرؓ نے بھی مدینہ کو ہجرت کی تیاری شروع کی لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ! تم ابھی توقف کرو، میں امید رکھتا ہوں کہ مجھے بھی ہجرت کی اجازت ملنے والی ہے اس دن سے حضرت ابوبکرؓ کا یہ حال ہو گیا کہ وہ ہر وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے کسی

موقع پر بھی آپ ﷺ سے جدا نہیں ہوتے تھے، علاوہ ازیں انہوں نے پہلے ہی سے دو اونٹ مہیا کر لئے تھے جو کسی بھی وقت روانگی کی تیاری کے ساتھ چار مہینے تک گھر میں بندھے کھڑے رہے تا آنکہ ایک دن ٹھیک دوپہر میں آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو ہجرت کی اجازت مل گئی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے ایک اونٹ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، عائشہؓ اور اسماءؓ نے زاد راہ تیار کیا، اور پھر اسی دن جو ربیع الاول ۱۴ نبوی کی پہلی تاریخ تھی اور پنجشنبہ کا دن تھا، رات کے وقت آپ ﷺ (اپنے مکان سے نکل کر) حضرت ابوبکرؓ کے گھر آئے اور وہاں سے یہ دونوں روانہ ہو کر جبل ثور کے ایک غار میں جا چھپے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اسی رات میں اس غار کے منہ پر کیکر کا درخت اگ آیا، جنگلی کبوتر نے غار کے منہ پر گھونسلہ بنا کر انڈے دیئے اور مکڑی نے جالا تن دیا، کفار مکہ جب اس غار کے قریب پہنچے تو اس کے حصہ پر ایسی علامتیں دیکھ کر جو غار کے اندر کسی شخص کی موجودگی کی نفی کرتی تھیں محروم و مایوس واپس لوٹ گئے۔

نیز جب آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ رات کی تاریکی میں مکہ سے روانہ ہوئے تو پورے راستہ حضرت ابوبکرؓ کبھی آنحضرت ﷺ کے آگے چلتے تھے، اور کبھی پیچھے ہو جاتے تھے اور اس کا مقصد اس بات کی نگرانی رکھنا تھا کہ کوئی کافر آگے سے یا پیچھے سے آ کر اچانک دھاوا نہ بول دے، پھر جب غار کے قریب پہنچے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو باہر کھڑا کیا اور پہلے خود غار کے اندر جا کر اس کو صاف کیا اور پھر آنحضرت ﷺ کو غار کے اندر لے گئے، یہ دونوں تین راتیں اسی غار میں چھپے رہے انہوں نے اپنے دونوں اونٹ بنی الدئل کے ایک شخص کے حوالہ کر کے اس کو اس بات پر تیار کر لیا تھا کہ وہ تین راتیں گزرنے پر ان اونٹوں کو لے کر غار کے قریب موجود رہے، نیز اس کو معقول معاوضہ دیا گیا اور اس کام کے لئے بھی آمادہ کر لیا تھا کہ وہ مدینہ تک رہبری کے فرائض انجام دے، غار ثور میں قیام کے دوران تینوں راتوں میں حضرت عبداللہ ابن ابوبکرؓ کفار مکہ کے تمام حالات اور دن بھر کی تمام کارروائیوں سے رات کے وقت آ کر مطلع کرتے رہے، پھر تین راتوں کے بعد یہ دونوں حضرات اپنے اپنے اونٹ پر سوار ہوئے اور اس رہبر کو ساتھ لے کر عام راستہ کے بجائے ساحل سمندر کے ساتھ والے راستہ کے ذریعہ مدینہ کو روانہ ہوئے، جب بنی مدلج کے علاقوں میں پہنچے تو پیچھے سے سراقہ ابن مالک آ پہنچا جو قریش مکہ کی طرف سے آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لانے کے عوض بھاری انعام کے لالچ میں ان دونوں کا تعاقب کر رہا تھا، جب وہ ان دونوں کے قریب پہنچا تو اچانک اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ زمین پر گر پڑا، اور پھر اٹھ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور اتنا قریب پہنچ گیا کہ آنحضرت ﷺ کی گفتگو اس کو سنائی دینے لگی اور عین اس وقت کہ وہ دھاوا بولنا چاہتا تھا اس کے گھوڑے کے دونوں پاؤں زانوں تک زمین میں دھنس گئے اور سراقہ الٹے منہ زمین پر گر پڑا اب اس کو تنبہ ہوا اور وہ گڑگڑا کر امان کی دہائی دینے لگا، آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اس کی آواز سن کر کھڑے ہو گئے سراقہ نے ان دونوں کی خدمت میں کچھ زاد راہ پیش کرنا چاہا لیکن آنحضرت ﷺ نے قبول نہیں فرمایا البتہ اس کو معاف کرتے ہوئے یہ حکم دیا کہ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا، چنانچہ سراقہ وہاں سے واپس لوٹا اور راستہ میں جو بھی کافر" آنحضرت ﷺ کے تعاقب میں آتا ہوا ملتا اس کو تدبیروں سے واپس کر دیتا تھا، اس طرح آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ بحفاظت تمام مدینہ پہنچ گئے۔

خیبر کے یہودیوں کے متعلق معجزہ

(۶۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ لَمَّا فُتِحَتْ خَیْبَرُ اُهْدِیَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ شَاةٌ فِیْهَا سَمٌّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اجْمَعُوْا لِیْ مَنْ کَانَ هٰهُنَا مِنَ الْیَهُوْدِ فَجَمَعُوْا لَهٗ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ سَائِلُکُمْ عَنْ شَیْءٍ فَهَلْ اَنْتُمْ مُصَدِّقِیَّ عَنْهُ قَالُوْا نَعَمْ یَا اَبَا الْقَاسِمِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَبُوْکُمْ قَالُوْا فُلَانٌ قَالَ کَذَبْتُمْ بَلْ اَبُوْکُمْ فُلَانٌ قَالُوْا صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ قَالَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُصَدِّقِیَّ عَنْ شَیْءٍ اِنْ سَاَلْتُکُمْ عَنْهُ قَالُوْا نَعَمْ یَا اَبَا الْقَاسِمِ وَاِنْ کَذَبْنَاكَ عَرَفْتَ کَمَا عَرَفْتَهٗ فِیْ اَبِیْنَا فَقَالَ لَهُمْ مَنْ اَهْلُ النَّارِ قَالُوْا نَکُوْنُ فِیْهَا یَسِیْرًا ثُمَّ

تَخلُفُونَا فِيهَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخسَئُوْا فِيهَا وَاللّٰهِ لَا نَخلُفُكُمْ فِيهَا اَبَدًا ثُمَّ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ عَنْ شَيْءٍ اِنْ سَاَلْتُكُمْ عَنْهُ فَقَالُوْا نَعَمْ يَا اَبَا الْقَاسِمِ قَالَ هَلْ جَعَلْتُمْ فِي هٰذِهِ الشَّاةِ سَمًّا قَالُوْا نَعَمْ قَالَ فَمَا حَمَلَكُمْ عَلٰى ذٰلِكَ قَالُوْا اَرَدْنَا اِنْ كُنْتَ كَاذِبًا اَنْ نَسْتَرِيْحَ مِنْكَ وَاِنْ كُنْتَ صَادِقًا لَمْ يَضُرُّكَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب خیبر فتح ہو گیا تو رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بھنی ہوئی بکری بطور ہدیہ پیش کی گئی جس میں زہر ملا ہوا تھا، رسول کریم ﷺ نے حکم دیا کہ اس جگہ (خیبر میں) جتنے یہودی ہوں سب کو میرے پاس لایا جائے، چنانچہ تمام یہودیوں کو جمع کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا، رسول کریم ﷺ نے ان (یہودیوں) سے فرمایا: کیا میں تم سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں (اور یہ کہ اگر تم نے میرے سوال کا جواب غلط دیا اور میں نے اس کی تردید کی تو) تم میری اس بات کو باور کرو گے؟ یہودیوں نے کہا: ہاں ابوالقاسم (ہم آپ ﷺ کے سوال کا جواب دیں گے اور اگر آپ ﷺ نے ہمارے جواب کی صحیح تردید کی تو ہم اس کو باور کریں گے) پس رسول کریم ﷺ نے ان سے سوال کیا کہ تمہارا باپ (یعنی تمہارا جد اعلیٰ جس کو "قبیلہ کا باپ" کہا جاتا ہے) کون ہے؟ یہودیوں نے (آنحضرت ﷺ کو پرکھنے کے لئے اپنے جد اعلیٰ کا صحیح نام نہیں بتایا بلکہ غلط طور پر کوئی اور نام لے کر) کہا کہ فلاں شخص ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، تم غلط کہتے ہو، تمہارا باپ تو فلاں شخص ہے۔ یہودیوں نے کہا: آپ (ﷺ) نے سچ فرمایا اور بجا فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اگر میں تم سے سوال کوئی اور کروں (اور تمہارے غلط جواب کی تردید کرتے ہوئے صحیح بات بتاؤں) تو کیا تم میری اس بات کو باور کر لو گے؟ یہودیوں نے کہا ہاں اے ابوالقاسم! اگر ہم جھوٹ بولیں گے تو آپ ﷺ کو ہمارا جھوٹ معلوم ہو جائے گا، جیسا کہ آپ ﷺ کو ہمارے باپ کے بارے میں (ہمارا غلط جواب) معلوم ہو گیا تھا۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: (تو پھر بتاؤ) دوزخی کون ہے؟ (یہودیوں نے جواب دیا: کچھ دن تو ہم لوگ رہیں گے اور پھر جب ہم دوزخ سے باہر آئیں گے تو) ہمارے جانشین تم لوگ ہوں گے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ارے کم بختو، پرے رہو دوزخ کے بارے میں (اتنی جھوٹ بات مت کہو) خدا کی قسم ہم دوزخ میں کبھی بھی تمہارے جانشین نہ ہوں گے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اگر میں تم سے کوئی اور سوال کروں۔ (اور تمہارے غلط جواب کی تردید کرتے ہوئے صحیح بات بتاؤں) تو کیا تم میری اس بات کو باور کر لو گے؟ یہودیوں نے کہا کہ ہاں اے ابوالقاسم! آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا (اچھا بتاؤ) کیا تم نے اس بکری میں زہر ملایا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! آپ ﷺ نے پوچھا **تمہیں کس چیز نے اس ذلیل حرکت پر اکسایا ہے؟ انہوں نے کہا دراصل ہم نے سوچا تھا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ نبوت جھوٹا ہے** تو (یہ زہر آپ (ﷺ) کی ہلاکت کا سبب بن جائے گا اور) ہم کو آپ (ﷺ) سے نجات اور راحت مل جائے گی اور اگر آپ (ﷺ) اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو یہ (زہر) آپ (ﷺ) کو کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا۔" (بخاری)

تشریح: "ہاں اے ابوالقاسم" آپ ﷺ کو مخاطب کرنے کا یہ یہودیوں کا خاص اسلوب تھا، وہ بدنصیب آپ ﷺ کو "محمد ﷺ" کہہ کر مخاطب نہیں کرتے تھے، کیونکہ یہ مبارک نام تورات اور انجیل میں مذکور اور مشہور تھا اور جو آپ ﷺ کے دعویٰ نبوت کی واضح دلیل تھا لہٰذا تعصب اور مخاصمت کی بناء پر انہیں گوارا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی زبان سے اس نام کا اظہار کریں جو خود ان کی آسمانی کتابوں کی رو سے پیغمبر آخر الزمانؐ کی صداقت کی علامت تھا۔

"پھر ہمارے جانشین تم لوگ ہو گے" یہودی مسلمانوں سے یہی کہا کرتے کہ جنت کے اصل مستحق ہم ہی ہیں، اگر ہم اپنی کسی بدعملی کی وجہ سے دوزخ میں داخل بھی ہو گئے تو وہ چند دنوں کی سزا ہو گی، جب ہم اپنی سزا کی وہ مدت پوری کر کے دوزخ سے نکالے جائیں گے تو پھر تم مسلمانوں کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا، جہاں تم لوگ ہمیشہ ہمیشہ رہو گے ان کی اس بات کو قرآن کریم نے بھی یوں نقل کیا ہے:

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ۔

"(یہودی یوں کہتے ہیں کہ) ہم کو صرف گنتی کے تھوڑے دنوں تک دوزخ کی آگ لگے گی۔"

یہ گویا ان یہودیوں کا عقیدہ تھا جو حقیقت کے اعتبار سے اعتقاد باطل اور زعم فاسد سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تاہم وہ اپنے اعتقاد کے مطابق جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اور آنحضرت ﷺ کے سوال کا جو جواب ان کے نزدیک صحیح تھا وہی انہوں نے بیان کیا۔"

"تو یہ زہر آپ ﷺ کو کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا" یہودیوں کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تو محض امتحان و آزمائش کے جذبہ سے بکری میں زہر ملا دیا تھا کہ اگر آپ (ﷺ) اپنی نبوت کے دعویٰ میں جھوٹے ہوں گے تو اس زہر آلود بکری کا گوشت کھا کر ہلاک ہو جائیں گے اور اس صورت میں ہمیں آپ (ﷺ) سے نجات مل جائے گی اور اگر آپ ﷺ اپنے دعویٰ نبوت میں سچے ہوں گے تو یہ زہر آپ (ﷺ) پر اثر انداز نہیں ہو گا اس صورت میں ہم آپ (ﷺ) کو نبی تسلیم کرلیں گے۔ یہ تو یہودیوں کی بات تھی اور وہ اپنے اس قول میں کہاں تک سچے تھے اس کا اندازہ تو اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب زہر نے آنحضرت ﷺ پر کوئی اثر نہیں کیا تو اس کے اپنے کہنے کے مطابق آنحضرت ﷺ کا نبی ہونا سچ ثابت ہو گیا تھا لیکن وہ لوگ نہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور نہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی سے باز آئے۔

قیامت تک پیش آنے والے تمام اہم وقائع اور حوادث کی خبر دینے کا معجزہ

(۶۷) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ اَخْطَبَ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا الْفَجْرَ وَصَعِدَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَخَطَبَنَا حَتّٰى حَضَرَتِ الظُّهْرُ فَنَزَلَ فَصَلّٰى ثُمَّ صَعِدَ الْمِنْبَرَ فَخَطَبَنَا حَتّٰى حَضَرَتِ الْعَصْرُ ثُمَّ نَزَلَ فَصَلّٰى ثُمَّ صَعِدَ الْمِنْبَرَ حَتّٰى غَرَبَتِ الشَّمْسُ فَاَخْبَرَنَا بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ فَاَعْلَمُنَا اَحْفَظُنَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو بن اخطب انصاری کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور پھر منبر پر چڑھ کر ہمارے سامنے (وعظ) ارشاد فرمایا جس کا سلسلہ ظہر کے وقت تک جاری رہا، پھر منبر سے اتر کر آپ ﷺ نے (ظہر کی) نماز پڑھائی اور پھر منبر پر چڑھ کر وعظ ارشاد فرمانے لگے یہاں تک کہ عصر کا وقت آگیا، پھر منبر سے اتر کر آپ ﷺ نے (عصر کی) نماز پڑھائی اور پھر منبر پر چڑھ کر وعظ ارشاد فرمانے لگے اور وعظ کا یہ سلسلہ غروب آفتاب پر جا کر ختم ہو گیا (گویا پورا دن وعظ ہی میں گزر گیا) اور (اس وعظ کے دوران) آپ ﷺ نے ان تمام باتوں سے ہمیں مطلع کیا جو قیامت تک پیش آنے والی ہیں! یہ روایت بیان کرنے کے بعد (حضرت عمرو ابن اخطب نے کہا:) (آج) ہمارے درمیان ان تمام باتوں کو سب سے زیادہ یاد رکھنے والا وہ شخص ہے جو آج کل ہم میں دانا تر ہے۔" (مسلم)

تشریح: حضرت عمرو بن اخطبؓ، جو ایک انصاری صحابی ہیں، اپنی کنیت ابوزید اعرج کے ساتھ زیادہ مشہور تھے آنحضرت ﷺ کے ساتھ غزووں میں شریک رہا کرتے تھے۔ منقول ہے کہ ان کو تیرہ غزووں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، ایک دن آنحضرت ﷺ نے ان کے سر پر اپنا دست مبارک پھیر کر خوبصورتی کی دعا فرمائی تھی، اس کی برکت ان کو اس طرح حاصل ہوئی، کہ سو سال اوپر ان کی عمر ہوئی اور آخر تک چہرہ گلاب کی طرح تر و تازہ رہا سر اور ڈاڑھی کے بال بھی بس چند ہی سفید ہوئے تھے۔

جنات کی آمد کی اطلاع درخت کے ذریعہ

(۶۸) وَعَنْ مَعْنِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ سَمِعْتُ اَبِيْ قَالَ سَاَلْتُ مَسْرُوْقًا مَنْ اٰذَنَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجِنِّ لَيْلَةَ اسْتَمَعُوا الْقُرْاٰنَ فَقَالَ حَدَّثَنِيْ اَبُوْكَ يَعْنِيْ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ اَنَّهٗ قَالَ اٰذَنَتْ بِهِمْ شَجَرَةٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت معن ابن عبدالرحمن تابعی (جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے پوتے ہیں) کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (حضرت عبدالرحمن) سے سنا وہ فرماتے تھے کہ جب میں نے (جلیل القدر تابعی) حضرت مسروقؒ سے پوچھا کہ اس رات میں، جب کہ جنات نے قرآن مجید سنا، ان (جنات) کی آمد کی اطلاع نبی کریم ﷺ کو کس نے دی تھی؟ تو حضرت مسروقؒ نے کہا کہ مجھ سے تمہارے والد یعنی حضرت عبداللہ ابن

مسعودؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ کو جنات کے آنے کی خبر ایک درخت نے دی تھی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: یعنی بطور معجزہ ایک درخت نے اطلاع دی کہ یارسول اللہ (ﷺ)! جنات ایمان لانے اور قرآن سننے کے لئے آئے ہیں چنانچہ نبی کریم ﷺ آبادی سے باہر تشریف لے گئے اور ایک جگہ پہنچ کر جنات کو دیکھا اور ان کے سامنے قرآن کریم پڑھا۔

جنگ سے پہلے ہی مقتول کافروں کے نام ان کی لاشیں گرنے کی جگہوں کی نشاندہی کا معجزہ

(۶۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا مَعَ عُمَرَ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ فَتَرَاءَيْنَا الْهِلَالَ وَكُنْتُ رَجُلًا حَدِيْدَ الْبَصَرِ فَرَاَيْتُهٗ وَلَيْسَ اَحَدٌ يَزْعَمُ اَنَّهٗ رَاٰهُ غَيْرِي فَجَعَلْتُ اَقُوْلُ لِعُمَرَ اَمَا تَرَاهُ فَجَعَلَ لَا يَرَاهُ قَالَ يَقُوْلُ عُمَرُ سَاَرَاهُ وَاَنَا مُسْتَلْقٍ عَلٰى فِرَاشٍ ثُمَّ اَنْشَاَ يُحَدِّثُنَا عَنْ اَهْلِ بَدْرٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُرِيْنَا مَصَارِعَ اَهْلِ بَدْرٍ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُ هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ غَدًا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ وَهٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ غَدًا اِنْشَآءَ اللّٰهُ قَالَ عُمَرُ وَالَّذِيْ بَعَثَهٗ بِالْحَقِّ مَا اَخْطَؤُا الْحُدُوْدَ الَّتِيْ حَدَّهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ فَجُعِلُوْا فِيْ بِئْرٍ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ فَانْطَلَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى انْتَهٰى اِلَيْهِمْ فَقَالَ يَا فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ حَقًّا فَاِنِّيْ قَدْ وَجَدْتُّ مَا وَعَدَنِيَ اللّٰهُ حَقًّا فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ تُكَلِّمُ اَجْسَادًا لَا اَرْوَاحَ فِيْهَا فَقَالَ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَا اَقُوْلُ مِنْهُمْ غَيْرَ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ اَنْ يَرُدُّوْا عَلَيَّ شَيْئًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک سفر کے موقع پر) ہم لوگ حضرت عمر ابن خطابؓ کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان (ایک جگہ پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے) کہ وہاں) ہم نے نئے مہینے کا چاند دیکھنے کی کوشش کی، میں چونکہ ایک تیز نظر شخص تھا اس لئے میں نے چاند کو دیکھ لیا میرے علاوہ اور کوئی شخص نہیں تھا جس نے یہ کہا ہو کہ اس نے چاند دیکھا ہے میں عمرؓ کو چاند دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے ان سے کہتا تھا کہ کیا آپ کو چاند نظر نہیں آرہا ہے (دیکھئے وہ کیا ہے) لیکن وہ چاند کو دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (جب میرے بار بار دکھانے پر بھی حضرت عمرؓ کو چاند نظر نہیں آسکا تو) انہوں نے کہا: بس رہنے دو) میں تو عنقریب اپنے بستر پر لیٹا ہوا اس چاند کو دیکھ لوں گا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ہمارے سامنے (کافروں میں سے ان) اہل بدر کا ذکر شروع کر دیا، جو جنگ بدر میں مارے گئے تھے) اور بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے جنگ سے ایک دن پہلے ہی مارے جانے والے مشرکوں کے مقتول ہونے کی جگہ ہمیں بتادی تھیں چنانچہ آپ (ایک ایک جگہ کی طرف اشارہ کر کے) فرماتے تھے کہ (دیکھو) یہ وہ جگہ ہے) جہاں کل انشاء اللہ فلاں مشرک مارا جائے گا اور یہ وہ جگہ ہے جہاں انشاء اللہ فلاں مشرک مرا ہوا پڑا ہوگا (گویا کہ آپ نے اہل اسلام کے ہاتھوں قتل ہونے والے مشرکوں کے نام لے لے کر ان کی نشاندہی کر دی تھی بلکہ ان میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ جگہیں تک متعین کر کے بیان کر دی تھیں جہاں ان مشرکوں کی لاشیں پڑنے والی تھیں، پھر حضرت عمرؓ نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آنحضرت ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا، رسول کریم ﷺ نے جو جگہیں متعین کر کے بیان کی تھیں قتل ہونے والے مشرک ان سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے (یعنی آپ ﷺ نے جس مشرک کے بارے میں جو جگہ متعین کر کے بتائی تھی وہ قتل ہو کر ٹھیک اسی جگہ گرا) پھر جب ان مشرکوں کی لاشوں کو ایک کے اوپر ایک کر کے (اس) کنویں میں ڈال دیا گیا (جو پانی لینے کے کام نہیں آتا تھا، تو رسول کریم ﷺ چل کر کنویں پر آئے اور ان (مشرکوں) کے نام لے لے کر (ان) کو مخاطب کیا اور فرمایا! اے فلاں ابن فلاں اور اے فلاں ابن فلاں: کیا تم نے اس چیز کو حق اور درست پایا جس کا تم سے اللہ نے اور رسول نے وعدہ کیا تھا؟ میں نے تو اس چیز کو حق اور درست پایا جس کا مجھ سے میرے اللہ نے وعدہ فرمایا تھا۔ عمرؓ نے (یہ بھی بیان کیا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو ان مشرکوں کی لاشوں سے اس طرح مخاطب دیکھ کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ایسے جسموں سے کس طرح مخاطب ہیں جو روحوں سے خالی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کو تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو ہاں وہ جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتے (مطلب یہ کہ

میری یہ بات جس طرح تم نے سنی ہے اس طرح ان سب نے بھی سنی ہے بس فرق یہ ہے کہ جواب دینے کی قدرت ان کو حاصل نہیں ہے۔" (مسلم)

تشریح: "میں تو عنقریب اپنے بستر پر لیٹا ہوا........ الخ ان الفاظ کے ذریعہ دراصل حضرت عمرؓ نے اس چاند کو دیکھنے کے لئے زیادہ جدوجہد اور کوشش کے غیر ضروری ہونے کی طرف اشارہ کیا، ان کا مطلب یہ تھا کہ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھ لیا ہے ان کی شہادت پر روایت ثابت ہو جائے گی، یا یہ کہ مجھے خود نیا چاند دیکھنا ہی ہوگا تو کچھ دنوں کے بعد یا اگلے دن جب چاند زیادہ بڑا اور زیادہ روشن ہو جائے گا اور آسانی سے نظر آ جائے گا تو دیکھ لوں گا، اس وقت جب چاند مجھے نظر نہیں آرہا ہے تو اس کو دیکھنے کے لئے زیادہ تعب اور مشقت اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز ضروری نہ ہو اس کی کھوج کرید میں اپنا وقت اور اپنی طاقت ضائع کرنا ایک لایعنی چیز میں وقت اور طاقت جیسی قیمتی شے گنوانا ہے۔

ایک پیش گوئی کے حرف بحرف صادق آنے کا معجزہ

(۷۰) وَعَنْ اُنَیْسَةَ بِنْتِ زَیْدِ ابْنِ اَرْقَمَ عَنْ اَبِیْهَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰی زَیْدٍ یَعُوْدُهٗ مِنْ مَرَضٍ کَانَ بِهٖ قَالَ لَیْسَ عَلَیْكَ مِنْ مَرَضِكَ بَاْسٌ وَلٰکِنْ کَیْفَ لَكَ اِذَا عُمِّرْتَ بَعْدِیْ فَعَمِیْتَ قَالَ اَحْتَسِبُ وَاَصْبِرُ قَالَ اِذَنْ تَدْخُلَ الْجَنَّةَ بِغَیْرِ حِسَابٍ قَالَ فَعَمِیَ بَعْدَ مَامَاتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ رَدَّ اللّٰهُ عَلَیْهِ بَصَرَهٗ ثُمَّ مَاتَ۔

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ کی بیٹی حضرت انیسہؓ اپنے والد (حضرت زید ابن ارقمؓ) سے نقل کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ زید ابن ارقم کی عیادت کو تشریف لے گئے جو بیمار ہو گئے تھے آپ ﷺ نے (ان کو تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرمایا: اس مرض کا تمہیں کوئی خوف نہیں ہونا چاہئے (کیونکہ تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے) لیکن اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم میرے بعد زندہ رہو گے اور تمہاری بینائی جاتی رہے گی؟ زید ابن ارقم نے عرض کیا: میں ثواب کا آرزومند ہوں گا اور (اپنے رب کے حکم پر) صابر و راضی رہوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے (ان کا یہ جواب سن کر) فرمایا: پھر تو تم بغیر حساب کتاب کے جنت میں جاؤ گے "راوی نے (خواہ وہ حضرت انیسہ ہوں یا ان کے علاوہ دوسرا) بیان کیا ہے کہ زید ابن ارقمؓ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد اندھے ہو گئے تھے، پھر (بہت زمانہ کے بعد) اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی دوبارہ واپس کر دی اور پھر ان کا انتقال ہوا۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کی مذکورہ پیش گوئی حرف بحرف صادق ہوئی کہ جس بیماری میں آنحضرت ﷺ زید کی عیادت کو گئے تھے اس سے وہ صحت یاب ہو گئے پھر آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ان کی بینائی جاتی رہی۔ تاہم آنحضرت ﷺ نے یہ بھی پیش گوئی کرتے وقت زید ابن ارقمؓ کے سامنے ان کی بینائی کے پھر بحال ہونے کا جو ذکر نہیں فرمایا تو اس کی وجہ شاید آپ ﷺ کی یہ خواہش ہو گی کہ اس صورت میں زید ابن ارقمؓ صبر میں زیادہ سے زیادہ تعب اور تکلیف برداشت کریں اور پھر اس کے بعد ان کو زیادہ سے زیادہ اذیت اور پریشانی ہوتی اور نہ ان کو کامل صبر کا وہ مقام نصیب ہوتا جس کے سبب اللہ تعالیٰ کی مدد نصرت ان کو حاصل ہوئی۔

جھوٹی حدیث بیان کرنے والے کے بارے میں وعید

(۷۱) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَقَوَّلَ عَلَیَّ مَالَمْ اَقُلْ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ وَذٰلِكَ اَنَّهٗ بَعَثَ رَجُلًا فَکَذَبَ عَلَیْهِ فَدَعَا عَلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَوُجِدَ مَیِّتًا وَقَدِ انْشَقَّ بَطْنُهٗ وَلَمْ تَقْبَلْهُ الْاَرْضُ رَوَاهُمَا الْبَیْهَقِیُّ فِیْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت اسامہ ابن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے "جو شخص (قصداً) میری طرف کوئی ایسی بات منسوب

کرے جس کو میں نے نہ کہا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تیار سمجھے اور اس ارشاد گرامی کا پس منظر یہ ہے کہ (ایک مرتبہ) آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو (کچھ لوگوں کی طرف یا کسی شخص کے پاس) بھیجا تھا اس نے آپ ﷺ کی طرف سے کوئی جھوٹی بات بنا کر کہی، (جب) رسول کریم ﷺ (پر یہ منکشف ہوا یا کسی ذریعہ سے آپ ﷺ کو اس بات کی خبر ہوئی تو (آپ ﷺ) نے اس شخص کے حق میں بددعا فرمائی، چنانچہ وہ شخص (ایک دن) اس حال میں مردہ پایا گیا کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور (جب اس کو دفن کیا گیا تو) زمین نے اس کو قبول نہیں کیا۔ دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: روایت کے آخری الفاظ اس بات کی علامت ہیں کہ وہ شخص ہمیشہ کے لئے دوزخی قرار پایا، اس اعتبار سے یہ روایت اس قول کی مؤید ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قصداً آنحضرت کی طرف کسی بات کی جھوٹی نسبت کرنے والا (یعنی جھوٹی حدیث گھڑنے والا) "کافر" ہو جاتا ہے۔

برکت کا معجزہ

(۷۲) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَهُ رَجُلٌ يَسْتَطْعِمُهُ فَاَطْعَمَهُ شَطْرَ وَسْقِ شَعِيْرٍ فَمَازَالَ الرَّجُلُ يَاْكُلُ مِنْهُ وَامْرَاَتُهُ وَضَيْفُهُمَا حَتّٰى كَالَهُ فَفَنِيَ فَاَتَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَوْلَمْ تَكِلْهُ لَاَكَلْتُمْ مِنْهُ وَلَقَامَ لَكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر کھانا مانگا، آپ ﷺ نے اس کو آدھا وسق جو عطا فرمائے، (اس نے وہ جو لے کر گھر میں رکھ دیئے اور پھر) نہ صرف خود وہ شخص بلکہ اس کی بیوی اور ان دونوں کے (ہاں آنے جانے والے) مہمان مستقل اسی جو میں سے لے کر کھاتے تھے (لیکن وہ جو ختم نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ ایک دن، اس شخص نے (باقی ماندہ) جوؤں کو ماپا (جس کا اثر یہ ہوا کہ) پھر وہ جو بہت جلد ختم ہو گئے، اس کے بعد وہ شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (اور صورت حال عرض کی، آپ ﷺ نے فرمایا! "اگر تم اس جو کو نہ ماپتے تو تم لوگ ہمیشہ اسی جو میں سے لے کر کھاتے رہتے اور (میری برکت کے سبب) وہ (جوں کے توں) تمہارے پاس باقی رہتے۔" (مسلم)

مشتبہ کھانا حلق سے نیچے نہیں اترا

(۷۳) وَعَنْ عَاصِمِ بْنِ كُلَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جِنَازَةٍ فَرَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَلَى الْقَبْرِ يُوْصِي الْحَافِرَ يَقُوْلُ اَوْسِعْ مِنْ قِبَلِ رِجْلَيْهِ اَوْسِعْ مِنْ قِبَلِ رَاْسِهِ فَلَمَّا رَجَعَ اسْتَقْبَلَهُ دَاعِيَ امْرَاَتِهِ فَاَجَابَ وَنَحْنُ مَعَهُ فَجِيْئَ بِالطَّعَامِ فَوَضَعَ يَدَهُ ثُمَّ وَضَعَ الْقَوْمُ فَاَكَلُوْا فَنَظَرْنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلُوْكُ لُقْمَةً فِيْ فِيْهِ ثُمَّ قَالَ اَجِدُ لَحْمَ شَاةٍ اُخِذَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ اَهْلِهَا فَاَرْسَلَتِ الْمَرْاَةُ تَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اَرْسَلْتُ اِلَى النَّقِيْعِ وَهُوَ مَوْضِعٌ يُبَاعُ فِيْهِ الْغَنَمُ لِيُشْتَرٰى لِيْ شَاةٌ فَلَمْ تُوْجَدْ فَاَرْسَلْتُ اِلٰى جَارٍ لِيْ قَدِ اشْتَرٰى شَاةً اَنْ يُرْسِلَ بِهَا اِلَيَّ بِثَمَنِهَا فَلَمْ يُوْجَدْ فَاَرْسَلْتُ اِلَى امْرَاَتِهِ فَاَرْسَلَتْ اِلَيَّ بِهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَطْعِمِيْ هٰذَا الطَّعَامَ الْاَسْرٰى رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت عاصم ابن کلیبؒ (تابعی) اپنے والد سے اور وہ ایک انصاری شخص (یعنی ایک انصاری صحابیؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا (ایک دن) ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ ایک جنازہ کی نماز اور تدفین میں شرکت کے لئے گئے (قبرستان پہنچ کر) میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ قبر (کے کنارہ) پر بیٹھ گئے اور کن کو ہدایت دینے لگے، آپ ﷺ اس (گورکن) سے فرماتے تھے کہ پائنتی کی

جانب سے قبر کو کشادہ کردو اور سر کی جانب سے اور کشادہ کردو۔ پھر جب آپ ﷺ (تدفین سے فارغ ہو کر) واپس ہونے لگے، تو سامنے سے ایک شخص نے آکر آنحضرت ﷺ کو میت کی بیوی کی طرف سے کھانے کی دعوت دی جس کو آپ ﷺ نے قبول فرمالیا (چنانچہ آنحضرت ﷺ اس کے گھر تشریف لے گئے اور) ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہوئے (کیونکہ یا تو اس عورت نے جماعت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو کھانے پر بلایا تھا یا یہ کہ ہم لوگ آپ ﷺ کے طفیل میں ساتھ ہو لئے) جب کھانا لایا گیا تو آنحضرت ﷺ نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سب لوگوں نے بھی اپنے ہاتھ بڑھائے اور کھانا کھانے لگے، لیکن پھر (کھانا کھاتے کھاتے) ہم نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ (نے جو پہلا) لقمہ (منہ میں ڈالا تھا اسی) کو چبائے جا رہے ہیں یعنی اپنے منہ میں ادھر ادھر گھمار ہے ہیں (ابھی ہم حیرت سے یہ دیکھ ہی رہے تھے کہ) آپ ﷺ نے فرمایا میں اس گوشت کو ایک ایسی بکری کا گوشت محسوس کر رہا ہوں جس کو اس کی مالک کی اجازت ورضا کے بغیر لے لیا گیا ہے۔ اس عورت (کو آنحضرت ﷺ کی اس بات کا علم ہوا تو اس) نے آدمی بھیج کر صورت حال عرض کرائی کہ یا رسول اللہ! میں نے بکری خریدنے کے لئے ایک آدمی کو نقیع بھیجا تھا۔ وہ (نقیع) ایک جگہ کا نام ہے جہاں بکریوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ لیکن وہاں بکری دستیاب نہیں ہوئی تو میں نے اپنے ہمسایہ کے پاس آدمی بھیجا جس نے ایک بکری خرید رکھی تھی اور کہلوایا کہ اس نے جس قیمت پر وہ بکری خریدی ہے اسی قیمت پر اس بکری کو میرے ہاتھ فروخت کردے، لیکن وہ ہمسایہ بھی اپنے گھر نہ ملا۔ تب میں نے اس ہمسایہ کی بیوی کے پاس آدمی بھیجا اور اس نے وہ بکری میرے پاس بھیج دی۔ (یہ تفصیل سن کر) رسول کریم ﷺ نے فرمایا: یہ کھانا قیدیوں کو کھلا دو۔“

اس روایت کو ابوداؤد نے اور دلائل النبوۃ میں بیہقی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ میت کے کھانے کے سلسلہ میں فقہاء کے جو اقوال ہیں بظاہر یہ حدیث ان کے خلاف ہے مثلاً بزازیہ میں لکھا ہے کہ (میت کے ورثاء کی طرف سے، پہلے دن (یعنی موت والے دن) یا تیسرے دن اور ساتویں دن کھانا کھلانا مکروہ ہے، اسی طرح خلاصہ میں مذکور ہے کہ: تیسرے دن (تیجا کے نام پر) کھانے کا اہتمام کرنا اور لوگوں کو اس کھانے پر بلانا مباح نہیں ہے۔ زیلعیؒ نے کہا ہے کہ: تین دن تک (غم منانے کے لئے) بیٹھنے میں مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ ممنوع چیزوں کا ارتکاب نہ ہو، جیسے بچھونے بچھانا اور دعوت وضیافت کا اہتمام کرنا۔ نیز ابن ہمام نے بھی لکھا ہے کہ اہل میت کا ضیافت کرنا مکروہ ہے۔ ان فقہاء نے علت یہ بیان کی ہے کہ ضیافت خوشی میں مشروع ہے نہ کہ غمی میں اور ابن ہمام نے یہ بھی کہا ہے کہ اہل میت کا ضیافت (جو غمی میں دی جائے) بدعت سیئہ ہے نیز امام احمدؒ اور ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت جریر ابن عبداللہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ (تدفین کے بعد) میت کے گھر میں لوگوں کے جمع ہونے اور اہل میت کی طرف سے کھانا دیئے جانے کو ہم نوحہ میں شمار کرتے تھے (جس کی سخت ممانعت منقول ہے)۔ پس عاصم ابن کلیب کی روایت کردہ مذکورہ حدیث چونکہ فقہاء کے ان اقوال کے خلاف جاتی ہے اس لئے (اس حدیث اور فقہی روایتوں کے درمیان تطبیق کی خاطر) ضروری ہے کہ فقہاء کے اقوال کو یا تو خاص نوعیت کے ساتھ مقید کیا جائے مثلاً یہ کہا جائے کہ فقہی روایتوں کے مطابق میت کے گھر لوگوں کو اکٹھا ہونے کی جو ممانعت ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ لوگ محض رسمی طور پر یا ظاہر داری کے لئے میت کے گھر اکٹھا ہوں اور اہل میت کو شرما شرمی ان کے کھانے کا انتظام کرنے پر مجبور ہونا پڑے (جیسا کہ ہمارے ہاں دستور ہے کہ دور قریب کی عورتیں میت کے گھر جا کر ڈھئی دیتی ہیں اور میت کے پسماندگان اگر استطاعت نہیں رکھتے تو قرض ادھار کر کے شرما شرمی ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں) یا ان فقہی روایتوں کو اس صورت پر محمول کیا جائے جس میں کھانے کا انتظام میت کے ترکہ میں سے ہو اور ورثاء میں سے کچھ صغیر السن ہوں یا موجود نہ ہوں اور یا ان کی اجازت ورضا معلوم نہ ہو، یا یہ کہ کھانے کا انتظام کسی شخص نے اپنے ذاتی مال سے نہ کیا ہو بلکہ میت کے اس مال سے کیا ہو جو ورثاء کے درمیان تقسیم نہ ہوا ہو، ان کے علاوہ کچھ دوسری صورتیں بھی ہیں جن میں میت کا کھانا مختلف اسباب کی بنا پر مکروہ ہے (جیسے ہمارے یہاں بعض مقامات پر دستور ہے کہ بعض مقررہ

تاریخوں پر یا ان سے ذرا آگے پیچھے کھانا پکا کر محض نام آوری کے لئے کھلوایا یا بانٹا جاتا ہے اور بعض لوگ تو قرض ادھار کر کے اس طرح کے اسراف کا مرتکب ہوتے ہیں) نیز قاضی خاں کا یہ قول بھی انہی صورتوں پر محمول ہے کہ غمی اور مصیبت کے دنوں میں ضیافت کا اہتمام کرنا مکروہ ہے کیونکہ وہ دن رنج والم کے اظہار کے ہیں، اور جو چیز خوشی و مسرت کے موقع پر لی غماز ہوتی ہے (جیسے ضیافت اور تقریب کا اہتمام) اس کو غمی کے موقع پر اختیار کرنا نہایت غیر موزوں ہے ہاں اگر (میت کو ثواب پہنچانے کی نیت سے) فقراء کو کھلانے کے لئے کھانے کا اہتمام کیا جائے تو یہ بے شک اچھا عمل ہوگا، جہاں تک اس صورت کا تعلق ہے اگر کوئی شخص یہ وصیت کر جائے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے مال میں سے کھانے کا اہتمام کر کے لوگوں کو تین دن تک کھلایا جائے تو زیادہ صحیح روایت کے مطابق یہ وصیت سرے سے باطل قرار پائے گی، گو بعض حضرات نے کہا ہے کہ وصیت تہائی مال میں جائز ہوگی اور یہی قول زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ نقل ہوا ہے وہ ملا علی قاریؒ کے کلام کا خلاصہ ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ انہوں نے فقہی روایتوں کو چند صورتوں پر محمول کر کے باقی اور تمام صورتوں میں اہل میت کی طرف سے کھانے کے اہتمام کو مطلق جائز قرار دے دیا ہے، بلکہ ان صورتوں میں غور کیا جائے، جن کو ممنوع اور مکروہ کہا گیا ہے، تو حقیقت واضح ہوگی کہ میت کے کھانے کی جو بھی صورتیں اور قسمیں ہمارے یہاں رائج ہیں کہ وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اور کسی نہ کسی سبب کی بناء پر ممنوع اور مکروہ صورتوں اور قسموں کے دائرہ حکم سے باہر نہیں جاتیں، کہیں ممانعت وکراہت کا کوئی ایک سبب پایا جاتا ہے اور کہیں متعدد اسباب پائے جاتے ہیں۔ رہی اس حدیث کی بات جس میں آنحضرت ﷺ کا میت کے کھانے کی دعوت قبول کرنے کا ذکر ہے تو اس کی حقیقت خود حدیث میں غور و فکر کے بعد واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ حدیث میں کھانا کھلانے کی اس صورت کا ذکر ہے جس کے بارے قاضی خاںؒ نے لکھا ہے کہ اگر (میت کو ثواب پہنچانے کی نیت سے) فقراء کو کھانا کھلایا جائے تو یہ اچھا عمل ہوگا۔" پس بظاہر یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ حدیث میں جس کھانے کا ذکر ہے وہ دراصل میت کی بیوی نے ایصال ثواب کی نیت سے فقراء اور مساکین کو بطور صدقہ کھلانے کے لئے تیار کیا تھا اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں وہ کھانا بطور ہدیہ پیش کیا گیا، اسی بناء پر آنحضرت ﷺ اپنے ان صحابہؓ کرام کے ساتھ کہ جو ضرورت مند اور مفلس تھے، میت کے گھر اس کھانے پر تشریف لے گئے، علاوہ ازیں بعض فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ جو لوگ تجہیز و تکفین اور تدفین میں شریک ہوں ان کے لئے اہل میت کی طرف سے پیش کئے جانے والے طعام کو کھانا درست ہے یہی نہیں بلکہ جو فقہاء طعام مصیبت (میت وغیرہ کے موقع پر تیار کئے گئے کھانے) کو مکروہ لکھتے ہیں انہوں نے بھی اس صورت کو مستثنیٰ رکھا ہے لہٰذا میت کے گھر کھانے پر آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے جانے کو اس صورت پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہ سب تجہیز و تکفین اور تدفین میں شریک تھے اس لئے میت کے اہل بیت کی دعوت پر کھانا کھانے چلے گئے۔ اس بحث کی روشنی میں یہ واضح ہو گیا کہ اس حدیث اور فقہی روایتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔"

" وَهُوَ مَوْضِعٌ يُبَاعُ فِيهِ الْغَنَمُ۔ (وہ ایک جگہ کا نام ہے جہاں بکریوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے)"" یہ الفاظ اصل روایت کا جزء نہیں ہے بلکہ کسی راوی نے "نقیع" کی وضاحت کے لئے روایت میں شامل کئے ہیں واضح رہے کہ "نقیع" جس کا پہلا حرف نون ہے) مدینہ منورہ سے وادی عقیق کی جانب تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر ایک جگہ کا نام ہے، جہاں زمانہ قدیم میں بکریوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی "نقیع" اس "بقیع" کے علاوہ ہے (جس کا پہلا حرف ب ہے اور جہاں مدینہ منورہ کا مشہور قبرستان ہے۔

اور اس نے وہ بکری میرے پاس بھیج دی ") میت کی بیوی نے "بکری" حاصل کرنے کی جو تفصیل بیان کی اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ بکری درست طور پر خرید کر حاصل نہیں کی گئی تھی کیونکہ اس ہمسایہ کی رضامندی کہ جو بکری کا اصل مالک تھا، اس بکری کی فروختگی کے لئے صریحاً حاصل نہیں تھی اس بکری کی خرید و فروخت کے مذکورہ معاملہ میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صورت کے قریب تھا جس کو فقہاء نے "بیع فضولی" سے تعبیر کیا ہے اور اس صورت میں بیع کا صحیح ہونا مالک کی اجازت کے حصول پر موقوف رہتا ہے۔ بہر حال یہ بات طے تھی کہ اس بکری کا گوشت "مشتبہ مال" تھا اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس گوشت کو آپ ﷺ کے پیٹ میں

جان سے باز رکھا۔

یہ کھانا قیدیوں کو کھلادو۔ میں قیدیوں سے مراد جنگی قیدی ہیں اور جن کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ وہ مفلس تھے، اور جیسا کہ طیبیؒ نے لکھا ہے کہ وہ کافر بھی تھے۔ مطلب یہ کہ اس وقت چونکہ بکری کا اصل مالک موجود نہیں تھا جس کی اجازت اور رضامندی حاصل کر کے بکری کی خریداری کو درست قرار دیا جاتا اور اس کے گوشت سے تیار شدہ طعام آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کو کھانا روا ہوتا اور اگر مالک کے آنے اور دستیاب ہونے کا انتظار کیا جاتا تو یہ طعام خراب ہو جانے کے سبب کسی کے بھی کھانے کے مصرف کا نہ رہ جاتا، ادھر ان قیدیوں کے کھانے کا بھی انتظام کرنا ہی تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے وہ پورا کھانا قیدیوں کو کھلانے کا حکم دے دیا، تاہم اس بکری کے تلف ہونے کی وجہ سے مالک کے لئے اس کی پوری قیمت ادا کرنا اس عورت کے لئے ضروری قرار پایا تھا جس کو اس نے ادا بھی کیا لہٰذا اس کھانے کا ان قیدیوں کو کھلانا اس عورت کی طرف سے صدقہ کے حکم میں ہو گیا۔"

اُمّ معبدؓ کی بکری سے متعلق ایک معجزہ کا ظہور

(۷۴) وَعَنْ حِزَامِ بْنِ هِشَامٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ حُبَيْشِ بْنِ خَالِدٍ وَهُوَ اَخُ اُمِّ مَعْبَدٍ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ اُخْرِجَ مِنْ مَكَّةَ خَرَجَ مُهَاجِرًا اِلَى الْمَدِيْنَةِ هُوَ وَاَبُوْبَكْرٍ وَمَوْلٰى بْنِ بَكْرٍ عَامِرُ بْنُ فُهَيْرَةَ وَدَلِيْلُهُمَا عَبْدُاللّٰهِ اللَّيْثِيُّ مَرُّوْا عَلٰى خَيْمَتَيْ اُمِّ مَعْبَدٍ فَسَئَلُوْهَا لَحْمًا وَتَمْرًا لِيَشْتَرُوْا مِنْهَا فَلَمْ يُصِيْبُوْا عِنْدَهَا شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ وَكَانَ الْقَوْمُ مُرْمِلِيْنَ مُسْنِتِيْنَ فَنَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى شَاةٍ فِيْ كَسْرِ الْخَيْمَةِ فَقَالَ مَاهٰذِهِ الشَّاةُ يَا اُمَّ مَعْبَدٍ قَالَتْ شَاةٌ خَلَّفَهَا الْجُهْدُ عَنِ الْغَنَمِ قَالَ هَلْ بِهَا مِنْ لَبَنٍ قَالَتْ هِيَ اَجْهَدُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ اَتَاذَنِيْنَ لِيْ اَنْ اَحْلُبَهَا قَالَتْ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ اِنْ رَاَيْتَ بِهَا حَلْبًا فَاحْلُبْهَا فَدَعَا بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَسَحَ بِيَدِهٖ ضَرْعَهَا وَسَمَّى اللّٰهَ تَعَالٰى وَدَعَا لَهَا فِيْ شَاتِهَا فَتَفَاجَتْ عَلَيْهِ وَدَرَّتْ وَاجْتَرَّتْ فَدَعَا بِاِنَاءٍ يُرْبِضُ الرَّهْطَ فَحَلَبَ فِيْهِ ثَجًّا حَتّٰى عَلَاهُ الْبَهَاءُ ثُمَّ سَقَاهَا حَتّٰى رَوِيَتْ وَسَقٰى اَصْحَابَهٗ حَتّٰى" رَوُوْا ثُمَّ شَرِبَ اٰخِرُهُمْ ثُمَّ حَلَبَ فِيْهِ ثَانِيًا بَعْدَ بَدْءٍ حَتّٰى مَلَاَ الْاِنَاءَ ثُمَّ غَادَرَهٗ عِنْدَهَا وَبَايَعَهَا وَارْتَحَلُوْا عَنْهَا رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَابْنُ عَبْدِالْبَرِّ فِي الْاِسْتِيْعَابِ وَابْنُ الْجَوْزِيْ فِيْ كِتَابِ الْوَفَاءِ وَفِي الْحَدِيْثِ قِصَّةٌ۔

"اور حضرت حزام ابن ہشام اپنے والد (حضرت ہشام) سے اور وہ حزام کے دادا (یعنی اپنے والد) حبیشؓ سے، جو اُمّ معبدؓ کے بھائی ہیں، روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو جب مکہ چھوڑ دینے کا حکم ہوا اور آپ ہجرت کر کے مدینہ روانہ ہوئے تو آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ، اور حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام عامر ابن فہیرہ اور ان دونوں (یعنی آنحضرت ﷺ اور ابوبکرؓ) کو راستہ بتانے والے عبداللہ لیثی (ان چاروں) کا گزر (مدینہ کے راستہ میں ایک جگہ، اُمّ معبد کے، دو خیموں پر ہوا (جو اس، ویرانے میں قیام پذیر تھیں) ان حضرات نے اہل خیمہ سے کچھ گوشت اور کھجوریں خریدنی چاہیں لیکن ان دونوں کو اُمّ معبد کے پاس ان میں سے کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی کیونکہ اس زمانہ میں عام طور پر لوگ قحط زدگی اور بے سروسامانی کا شکار تھے۔ اتنے میں اچانک رسول کریم ﷺ کی نظر ایک بکری کی طرف گئی، جو خیمہ کی ایک جانب (بندھی کھڑی) تھی، آپ ﷺ نے وہ بکری دیکھ کر) پوچھا کہ اُمّ معبد! اس بکری کو کیا ہوا؟ اُمّ معبد نے جواب دیا: اس کے دبلے پن نے اس کو ریوڑ سے الگ کر رکھا ہے (یعنی اتنی کمزور اور لاغر ہے کہ چرنے کے لئے دوسری بکریوں کے ساتھ چراگاہ تک جانے پر قادر نہیں ہے) آپ ﷺ نے پوچھا! کیا یہ دودھ دیتی ہے؟ اُمّ معبد نے کہا! جس مصیبت میں یہ مبتلا ہے اس میں دودھ کہاں سے دے سکتی ہے (مطلب یہ کہ ذرا سا بھی دودھ دینے کی صلاحیت اس میں باقی نہیں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم مجھے اجازت دیتی ہو کہ میں اس کا دودھ دوہوں؟ اُمّ معبدؓ نے کہا: میرے ماں باپ آپ (ﷺ) پر قربان، اگر آپ (ﷺ) کو اس میں دودھ معلوم ہوتا ہو تو ضرور دوہ لیں

(یعنی جب اس میں سرے سے دودھ ہے ہی نہیں تو آپ ﷺ دوہیں گے؟!) رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر بکری کو منگوایا، پھر آپ ﷺ نے اس کے تھنوں پر اپنا دست مبارک پھیرا، بسم اللہ پڑھی اور اُمّ معبدؓ کے لئے ان کی بکری کے تئیں برکت کی دعا فرمائی، چنانچہ بکری نے دودھ دینے کے لئے اپنے پاؤں آنحضرت ﷺ کے سامنے کشادہ کر دیئے (جیسا کہ دودھ والے جانور کی عادت ہوتی ہے کہ دوہے جانے کے وقت اپنے دونوں پاؤں کو پھیلا دیتا ہے۔ پھر وہ بکری دودھ بہانے اور جگالی کرنے لگی، آپ ﷺ نے ایک اتنا بڑا برتن منگایا جو ایک جماعت کو شکم سیر کرے اور اس برتن میں خوب بہتا ہوا دودھ دوہا یہاں تک کہ دودھ کے جھاگ برتن کے اوپر تک آ گئے، اس کے بعد آپ ﷺ نے وہ دودھ (پہلے اُمّ معبدؓ کو پلایا جنہوں نے خوب سیر ہو کر پیا پھر اس کے ساتھیوں کو پلایا، وہ بھی اچھی طرح سیر ہو گئے اور پھر سب کے بعد خود آپ ﷺ نے پیا، کیونکہ خود آپ ﷺ کا ارشاد ہے! لوگوں کو پلانے والا خود سب کے بعد پیتا ہے۔) پھر پہلی مرتبہ دوہنے کے بعد (کچھ دیر) بعد آپ ﷺ نے دوبارہ اسی برتن میں دوہا، یہاں تک کہ وہ برتن دودھ سے لبریز ہو گیا اور وہ دودھ آپ ﷺ نے اُمّ معبد کے پاس چھوڑ دیا (تاکہ وہ اپنے خاوند کو بھی یہ معجزہ دکھادیں) پھر آپ ﷺ نے اُمّ معبد کو مسلمان کیا اور ان کے ہاں سے روانہ ہو گئے...... اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں، ابن عبد البرؒ نے استیعاب میں اور ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں نقل کیا ہے نیز حدیث میں واقعہ کی اور بھی تفصیل ہے۔

تشریح: اُمّ معبدؓ کا اصلی نام عاتکہ بنت خالد خزاعیہ ہے، آنحضرت ﷺ اپنے سفر ہجرت کے دوران ان کے خیمہ میں تشریف لائے تھے اور ان کو حلقہ بگوش اسلام فرمایا تھا اُمّ معبد بڑے مضبوط اعصاب اور قوی دل و دماغ کی مالک خاتون تھیں اور اس ویرانہ میں قیام پذیر تھیں، وہ اپنے خیمہ کے باہر مسند لگا کر بیٹھ جایا کرتی تھی اور راہ چلتے ہر ضرورت مند و مسکین کے کھانے پینے کی ضرورت پوری کیا کرتی تھیں۔

"اس حدیث میں واقعہ کی اور تفصیل بھی ہے۔" اور وہ یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اُمّ معبدؓ کے خیمہ سے آگے سفر پر روانہ ہو گئے اور اُمّ معبدؓ کے خاوند ابو معبدؓ نے (پورا واقعہ بیان کیا اور) نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں آنحضرت ﷺ کے اوصاف و فضائل بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک نہایت بابرکت ہستی ہمارے خیمہ میں آئی تھی اور یہ دودھ اسی کی مبارک آمد کے طفیل ہے ابو معبدؓ نے (یہ سب کچھ سن کر) کہا! یقیناً وہ ہستی قریش میں سے وہی شخص ہے جس کے بہت سے اوصاف میں نے مکہ میں سنے ہیں۔ اگر میں جانے کی قدرت رکھوں تو بخدا میں اس ہستی کی خدمت میں باریاب ہونے اور اس کی صحبت سے سرفراز ہونے کا قصد رکھتا ہوں۔

ایک روایت میں منقول ہے کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کی رات میں حضرت ابوبکرؓ کو لے کر مکہ سے روانہ ہو گئے اور اہل مکہ یہ معلوم کرنے میں ناکام رہے کہ آنحضرت ﷺ کہاں اور کس طرف گئے ہیں تو ایک مسلمان جن جبل ابوقبیس پر چڑھا اور وہاں زور زور سے کچھ اشعار پڑھنے لگا مکہ کے لوگ حیرت سے اس آواز کو سن رہے تھے، جو ان کے کانوں میں صاف آ رہی تھی لیکن وہ آواز جس طرف سے آ رہی تھی وہاں ان کو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، ان اشعار میں سے دو شعر یہ ہیں ؎

جَزَى اللّٰهُ رَبُّ النَّاسِ خَيْرَ جَزَائِهٖ رَفِيْقَيْنِ حَلَّا خَيْمَتَيْ أُمِّ مَعْبَدِ
هُمَا نَزَلَا بِالْهُدٰى وَاهْتَدَيْتَ بِهٖ فَقَدْ فَازَ مَنْ اَمْسٰى رَفِيْقَ مُحَمَّدِ

باب الکرمات

کرامتوں کا بیان

کرامت کی تعریف: "کَرَامَاتٌ" دراصل "کَرَامَۃٌ" کی جمع ہے جو اکرام اور تکریم کا اسم ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی "نفیس ہونا، عزت دار ہونا اور سخی ہونا" کے ہیں، لیکن اصطلاحی طور پر کرامت اس خارق عادات فعل (یعنی کرشمہ) کو کہتے ہیں جو مؤمن نیکو کار کے ہاتھ پر

ظاہر ہو لیکن وہ نہ تو نبوت کے دعوے کے ساتھ ہو اور نہ اس کا مقصود کفار کا معارضہ و مقابلہ ہو کیونکہ جو خارق عادات فعل نبوت کے دعوے کے ساتھ ہو اور کفار کے معارضہ و مقابلہ پر ہو اس کو "معجزہ" کہتے ہیں اہل سُنّت کرامت کے مقر اور قائل ہیں جب کہ معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں۔

کرامت کا اثبات: اہل حق (یعنی تمام اہل سُنّت و جماعت) کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ولی سے کرامت کا ظاہر ہونا واقعی اور حقیقی چیز ہے۔ ولی اللہ کے اس نیک بندے کو کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا بقدر طاقت بشری عرفان رکھتا ہو، طاعات (نیکی) کرنے اور منہیات (برائی) کے ترک پر قائم و دائم ہو، دنیاوی لذات و خواہشات میں غیر منہمک ہو اور اتباع سُنّت و تقویٰ میں بحسب تفاوت مراتب کامل ہو اولیاء اللہ سے کرامتوں کے ظہور و وقوع کا اثبات عقلا تو یوں محال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی چیز مشکل اور بعید از امکان نہیں ہے، اس کی ذات جس طرح اپنے پیارے پیغمبروں کے ذریعہ معجزوں کا ظہور کرا سکتی ہے اسی طرح اپنے پیغمبر کے سچے تابعداروں اور نیکوکار مؤمنوں کے ہاتھ پر کرامتوں کا ظہور بھی کرا سکتی ہے، جہاں تک نقلا اثبات کا تعلّق ہے تو قرآن پاک اور احادیث رسول دونوں میں کرامت کا ثبوت صراحۃً مذکور ہے، پھر صحابۂ کرام اور صحابہؓ کے بعد کے زمانہ کے اولیا اللہ سے صادر ہونے والی کرامتوں کی روایتیں جس تسلسل کے ساتھ منقول ہیں وہ حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اور قدر مشترک میں تو تواتر معنی اس درجہ کا ہے کہ اگر صاف ذہن اور کھلے دل و دماغ سے دیکھا جائے تو اس بارہ میں کسی کو شک و شبہ اور انکار کی مجال نہیں ہو سکتی، خصوصا بعض اکابر مشائخ طریقت جیسے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامتیں نہ صرف یہ کہ اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں بلکہ وہ اتنے تواتر کے ساتھ منقول ہیں کہ ان کا انکار کوئی عقل کا دشمن ہی کر سکتا ہے، ان کے زمانہ کے بعض مشائخ کا یہ قول منقول ہے کہ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامتیں رشتہ مروارید کی طرح تھیں کہ پے در پے صادر ہوتی تھیں کبھی خود ان کی ذات میں ظاہر ہوتیں اور کبھی ان کی ذات میں ظاہر ہوتیں۔

کرامت کا صدور اختیاری بھی ہوتا ہے اور غیر اختیاری بھی: بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ ولی سے کوئی بھی کرامت اس کے قصد و اختیار کے تحت صادر نہیں ہوتی بلکہ بلا قصد و اختیار صادر ہوتی ہے انہی بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ کرامت، معجزہ کی جنس سے نہیں ہوتی، یعنی جو چیزیں معجزہ کے طور پر ظاہر ہو چکی ہیں جیسے تھوڑے سے کھانے کا بہت ہو جانا اور انگلیوں سے پانی کا ابل پڑنا وغیرہ، وہ کرامت کے طور پر ظاہر نہیں ہوتی لیکن اس سلسلہ میں تحقیقی قول یہ ہے کہ کرامت کا قصد و اختیار کے تحت بھی صادر ہونا ممکن ہے اور بلا قصد اختیار بھی۔ اسی طرح کا ظہور ان چیزوں کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے جو معجزہ کے طور ظاہر ہو چکی ہیں اور ان کے علاوہ دوسری صورتوں میں بھی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دو صحابیوں کی کرامت

① عَنْ اَنَسٍ اَنَّ اُسَیْدَ بْنَ حُضَیْرٍ وَعَبَّادَ بْنَ بِشْرٍ تَحَدَّثَا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حَاجَۃٍ لَھُمَا حَتّٰی ذَھَبَ سَاعَۃٌ مِّنَ اللَّیْلِ سَاعَۃً فِیْ لَیْلَۃٍ شَدِیْدَۃِ الظُّلْمَۃِ ثُمَّ خَرَجَا مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَنْقَلِبَانِ وَبِیَدِ کُلِّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا عُصَیَّۃٌ فَاَضَاءَتْ عَصَا اَحَدِھِمَا لَھُمَا حَتّٰی مَشَیَا فِیْ ضَوْءِھَا حَتّٰی اِذَا افْتَرَقَتْ بِھِمَا الطَّرِیْقُ اَضَاءَتْ لِلْاٰخَرِ عَصَاہُ فَمَشٰی کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا فِیْ ضَوْءِ عَصَاہُ حَتّٰی بَلَغَ اَھْلَہٗ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن دو جلیل القدر صحابی) حضرت اسید ابن حضیرؓ اور حضرت عباد ابن بشرؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے اپنے کسی (اہم معاملہ میں گفتگو کر رہے تھے (اور وہ گفتگو اتنی طویل ہوگئی تھی کہ) اس کا سلسلہ ایک ساعت یعنی بڑی رات گئے

تک جاری رہا، جب کہ وہ رات بھی نہایت تاریک تھی، جب یہ دونوں حضرات اپنے گھروں کو لوٹنے کے لئے نبی کریم ﷺ کے پاس سے اٹھ کر باہر نکلے تو اس وقت ان دونوں میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، ان دونوں میں سے ایک کی لاٹھی (اچانک) روشن ہوگئی اور اس کی روشنی میں وہ چلنے لگے، یہاں تک کہ جب دونوں کے راستے جدا ہوئے (یعنی اس جگہ پہنچے جہاں سے ہر ایک کے گھر کی طرف الگ الگ راستہ جاتا تھا، تو دوسرے کی لاٹھی بھی روشن ہوگئی اور پھر وہ دونوں اپنی اپنی لاٹھی کی روشنی میں چل کر اپنے اہل و عیال یعنی اپنے گھروں تک پہنچ گئے۔" (بخاری)

تشریح: بخاری کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: "وہ دونوں صحابی سخت اندھیری رات میں آنحضرت ﷺ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے تو اس وقت (ایسا لگا) جیسے ان دونوں کے ساتھ دو چراغ ہیں (جو ان کے راستے کو روشن رکھتے ہوئے ساتھ چل رہے ہیں، پھر جب وہ صحابی (اس جگہ پہنچ کر کہ جہاں سے ان دونوں کے گھروں کو الگ الگ راستے جاتے تھے) ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو ایک ایک چراغ ہر ایک کے ساتھ ہو گیا یہاں تک کہ وہ دونوں اپنے اہل و عیاں میں پہنچ گئے۔

جو کہا تھا وہی ہوا

(۲) وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ لَمَّا حَضَرَ اُحُدٌ دَعَانِیْ اَبِیْ مِنَ اللَّیْلِ فَقَالَ مَا اُرَانِیْ اِلاَّ مَقْتُوْلاً فِیْ اَوَّلِ مَنْ یُقْتَلُ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِنِّیْ لَا اَتْرُکُ بَعْدِیْ اَعَزَّ عَلَیَّ مِنْکَ غَیْرَ نَفْسِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِنِّیْ لَا اَتْرُکُ بَعْدِیْ اَعَزَّ عَلَیَّ مِنْکَ غَیْرَ نَفْسِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِنَّ عَلَیَّ دَیْنًا فَاقْضِ وَاسْتَوْصِ بِاَخَوَاتِکَ خَیْرًا فَاَصْبَحْنَا فَکَانَ اَوَّلَ قَتِیْلٍ وَدَفَنْتُہٗ مَعَ اٰخَرَ فِیْ قَبْرٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب جنگ احد پیش آئی تو رات میں میرے والد نے مجھے بلایا اور کہا: میرا خیال ہے کہ (اس جنگ) میں نبی کریم ﷺ کے جو صحابہ مارے جائیں گے ان میں سب سے پہلے مارا جانے والا شخص میں ہونگا۔ اور اس میں شک نہیں کہ میں اپنے پیچھے ایسا کوئی شخص نہیں چھوڑ رہا ہوں جو مجھے تم سے زیادہ عزیز ہو سوائے رسول کریم ﷺ کی ذات گرامی کے، (یعنی ایک آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی تو ایسی ہے جو مجھے تمام لوگوں سے زیادہ بلکہ خود اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہے، باقی میرے اپنے پسماندگان میں تم ایسے شخص ہوگے جو مجھ سے زیادہ عزیز ہے، لہٰذا اس خصوصی تعلق کی بناء پر تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ) میرے ذمہ (جو بہت سا) قرضہ ہے، اس کو (جلد سے جلد) ادا کر دینا، نیز اپنی بہنوں کے حق میں (جو نو ہیں) میری یہ وصیت سن لو کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا (حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ اس رات کے بعد) جب صبح ہوئی (اور میدان کارزار گرم ہوا) تو میرے والد ہی شہید ہونے والوں میں سب سے پہلے شخص تھے اور میں نے ان کو ایک اور شخص کے ساتھ قبر میں دفن کیا۔" (بخاری)

تشریح: جنگ احد کے شہداء کی تدفین کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے حکم دیا تھا کہ دو دو کو ایک ایک قبر میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے اپنے والد کو ایک دوسرے شہید کے ساتھ ایک قبر میں دفن کیا اور وہ دوسرے شہید حضرت عمرو بن الجموعؓ تھے، جو حضرت جابرؓ کے والد کے دوست بھی تھے اور ان کے بہنوئی بھی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت ایک قبر میں دو کو دفن کرنا جائز ہے۔

کھانے میں اضافہ کا کرشمہ

(۳) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَکْرٍؓ قَالَ اِنَّ اَصْحَابَ الصُّفَّۃِ کَانُوْا اُنَاسًا فُقَرَاءَ وَاِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَ عِنْدَہٗ طَعَامُ اثْنَیْنِ فَلْیَذْھَبْ بِثَالِثٍ وَمَنْ کَانَ عِنْدَہٗ طَعَامُ اَرْبَعَۃٍ فَلْیَذْھَبْ بِخَامِسٍ اَوْسَادِسٍ وَاِنَّ اَبَابَکْرٍ جَاءَ

بِثَلٰثَةٍ وَانْطَلَقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَشَرَةٍ وَاِنَّ اَبَابَكْرٍ تَعَشّٰى عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ لَبِثَ حَتّٰى صُلِّيَتِ الْعِشَاءُ ثُمَّ رَجَعَ فَلَبِثَ حَتّٰى تَعَشّٰى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ بَعْدَ مَامَضٰى مِنَ اللَّيْلِ مَاشَاءَ اللّٰهُ قَالَتْ لَهُ امْرَاَتُهُ مَاحَبَسَكَ عَنْ اَضْيَافِكَ قَالَ اَوَمَا عَشَّيْتِ بِهِمْ قَالَتْ اَبَوْا حَتّٰى تَجِيْءَ فَغَضِبَ وَقَالَ وَاللّٰهِ لَا اَطْعَمُهُ اَبَدًا فَحَلَفَتِ الْمَرْاَةُ اَنْ لَّا تُطْعِمَهُ وَحَلَفَ الْاَضْيَافُ اَنْ لَّا يَطْعَمُوْهُ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ كَانَ هٰذَا مِنَ الشَّيْطٰنِ فَدَعَا بِالطَّعَامِ فَاَكَلَ وَاَكَلُوْا فَجَعَلُوْا لَا يَرْفَعُوْنَ لُقْمَةً اِلَّا رَبَتْ مِنْ اَسْفَلِهَا اَكْثَرُ مِنْهَا فَقَالَ لِامْرَاَتِهِ يَا اُخْتَ بَنِيْ فِرَاسٍ مَاهٰذَا قَالَتْ وَقُرَّةِ عَيْنِيْ اِنَّهَا الْاٰنَ لَاَكْثَرُ مِنْهَا قَبْلَ ذٰلِكَ بِثَلٰثِ مِرَارٍ فَاَكَلُوْا وَبَعَثَ بِهَا اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذُكِرَ اَنَّهُ اَكَلَ مِنْهَا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَذُكِرَ حَدِيْثُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ كُنَّا نَسْمَعُ تَسْبِيْحَ الطَّعَامِ فِي الْمُعْجِزَاتِ۔

"اور حضرت عبد الرحمن ابن ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ مفلس لوگ تھے (جن کے خور دونوش کا انتظام تمام مسلمان اپنی اپنی حیثیت واستطاعت کے مطابق کیا کرتے تھے، چنانچہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ "جس شخص کے ہاں (اپنے اہل وعیال کے، دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے شخص کو (اصحاب صفہ میں سے، لے جائے، اور جس شخص کے ہاں چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں شخص کو (اصحاب صفہ میں سے لے جائے، یا چھٹے شخص کو بھی لے جائے" (یہ سن کر) حضرت ابوبکرؓ نے تین آدمیوں کو لیا اور نبی کریم ﷺ کے ہاں کھانا کھایا اور وہیں (کھانا کے بعد بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت، میں حاضر رہے یہاں تک کہ جب عشاء کی نماز ہو گئی تو وہ (نماز کے بعد بھی اپنے گھر نہیں گئے بلکہ) آنحضرت ﷺ کے گھر چلے آئے اور اس وقت تک خدمت اقدس میں حاضر رہے۔ جب تک کہ نبی کریم ﷺ (تنہا یا اپنے مہمانوں کے ساتھ) کھانا نہیں کھالیا۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ جب اپنے گھر پہنچے تو رات کا اتنا حصہ کہ جو اللہ نے چاہا، گذر چکا تھا۔ اور اس وقت تک نہ صرف ان کے اہل وعیال بلکہ ان کے مہمان بھی گھر میں بیٹھے ان کا انتظار کرتے رہے، گھر میں ان کے داخل ہوتے ہی، ان کی بیوی نے کہا: کس چیز نے آپ کو اپنے مہمانوں سے روک رکھا تھا، یعنی آپ نے گھر آنے میں اتنی تاخیر کیوں کی جب کہ یہاں آپ کے مہمان کھانے کے لئے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ بولے: تو کیا تم نے اب تک مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا؟ بیوی بولیں: ان مہمانوں نے آپ کے آنے تک کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا تاکہ کھانے میں ان کے ساتھ آپ بھی شریک رہیں حضرت ابوبکرؓ (یہ سن کر اپنے گھر والوں پر) سخت غضبناک ہوئے کیونکہ ان کو یہ خیال گذرا کہ گھر والوں ہی کی کوتاہی ہے جو انہوں نے اصرار کر کے مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا، چنانچہ انہوں نے (اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے) کہا کہ: خدا کی قسم، میں یہ کھانا ہرگز نہیں کھاؤں گا پھر ان کی بیوی نے بھی قسم کھالی کہ وہ اس کھانے کو (ہرگز نہیں کھائیں گی اور مہمانوں نے بھی قسم کھائی کہ وہ بھی اس کھانے کو (یا تو مطلق یا تنہا) نہیں کھائیں گے پھر چند ہی لمحوں بعد) حضرت ابوبکرؓ کہنے لگے کہ میرا اس طرح غضبناک ہو جانا اور قسم کھالینا (کوئی موزوں بات نہیں ہے بلکہ) شیطان (کے بہکا دینے کے سبب) سے تھا (جس پر مجھے اب سخت پشیمانی ہو رہی ہے اور میں اپنے اللہ سے توبہ واستغفار کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر) انہوں نے کھانا منگایا اور پھر سب لوگوں نے (یعنی خود انہوں نے ان کے گھر والوں نے اور ان کے مہمانوں نے کھانا کھایا۔ (کھانے کے دوران یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ) حضرت ابوبکرؓ اور ان کے مہمان (برتن سے منہ کی طرف) جو لقمہ بھی اٹھاتے تھے اس کی جگہ کھانا اور بڑھ جاتا تھا (یعنی جب وہ لوگ لقمہ اٹھاتے تو برتن میں اس لقمہ کی جگہ کھانا کم ہونے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ ہو جاتا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے (یہ حیرت انگیز بات دیکھ کر) اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہا: ارے بنو فراس کی بہن! ذرا دیکھنا) یہ کیسا عجیب معاملہ ہے۔ بیوی بولیں: اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کی قسم، (میں خود بھی حیرت سے یہی دیکھے جا رہی ہوں) یہ کھانے کا برتن جتنا پہلے بھرا ہوا تھا اس سے سہ چند زیادہ اب بھرا ہوا ہے، بہرحال سب نے (خوب سیر ہو کر) کھانا کھایا اور پھر حضرت ابوبکرؓ نے وہ کھانا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھی بھیجا، اور بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کھانے میں سے تناول فرمایا (بخاریؒ ومسلمؒ) اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت كُنَّا نَسْمَعُ تَسْبِيْحَ الطَّعَامِ باب المعجزات میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مسجد نبوی ﷺ سے متصل اور حجرۂ نبوی سے شمالی جانب واقع ایک چبوترہ تھا، جس کو "صفہ" کہا جاتا تھا، جو غریب و مفلس مہاجر صحابہؓ نہ گھر بار رکھتے تھے اور نہ بال بچے، وہ اس چبوترہ پر شب باش رہتے تھے، اسی نسبت سے ان کو "اصحاب صفہ" کہا جاتا تھا، یہ صحابہؓ اضیاف المسلمین (مسلمانوں کے مہمان) بھی کہلاتے تھے کیونکہ ان کے فقرو افلاس اور بے مائیگی کی بناء پر ان کے خورد و نوش کا انتظام عام مسلمان اپنی اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق کرتے تھے اور خالص اخلاقی و انسانی بنیاد پر ان کی مہمانداری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ جو لوگ کہیں باہر سے مدینہ آتے تھے اگر مدینہ میں ان کے جان پہچان والے ہوتے تو وہ انہی کے ہاں اترتے ورنہ یہی صفہ ان کی امامت گاہ بنتا مشہور صحابہ ابوذر غفاریؓ، عمار ابن یاسرؓ، سلمان فارسیؓ، صہیبؓ، ابوہریرہؓ جناب ابن ارتؓ، حذیفہ بن الیمانؓ، ابوسعید خدریؓ بشیر بن انحصاصیہؓ، اور آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام ابو مویہبہؓ اصحاب صفہ ہی میں سے ہیں۔

"یا چھٹے شخص کو بھی لے جائے" یہ حکم اس پس منظر میں تھا کہ جس شخص کے گھر میں اس کے اہل و عیال کے چار آدمیوں کا کھانا موجود ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ وہ کھانا زیادہ سے زیادہ پانچ آدمیوں کی بھوک دفع کر سکتا ہے تو اپنے ساتھ پانچویں آدمی یعنی اصحاب صفہ میں سے ایک شخص کو لے جائے، اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ چار آدمیوں کا وہ کھانا اتنا ہے کہ چھ آدمی بھی اپنی بھوک مٹا سکتے ہیں تو پھر وہ پانچویں کے ساتھ چھٹے آدمی کو بھی یعنی اصحاب صفہ میں سے دو اشخاص کو اپنے ساتھ لے جائے۔ اس صورت میں لفظ اَوْ تنویع کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور تخییر کے لئے بھی۔ تاہم یہ احتمال بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ یہ لفظ اَو شک کو ظاہر کرنے کے لئے ہے، یعنی اصل حدیث کا جز نہیں ہے بلکہ راوی نے اس لفظ کے ذریعہ اپنے شک کا اظہار کیا ہے اور ایک بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لفظ اَوْ دراصل بل کے معنی میں ہے جو ضیافت کے باب میں مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے مطلب یہ کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے گویا یہ فرمایا: "جس شخص کے ہاں چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ اپنے ساتھ پانچویں شخص کو بلکہ چھٹے شخص کو بھی لے جائے" اس وضاحت کی بنیاد وہ تناسب ہے جو ارشاد گرامی "جس شخص کے ہاں اپنے اہل و عیال کے لئے دو آدمیوں کا کھانا ہو تو وہ ایک تیسرے آدمی کو لے جائے" سے واضح ہوتا ہے اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کے ہاں اپنے اہل و عیال کے چار آدمیوں کا کھانا تھا اس کو ایک نہیں، دو مہمان کا لے جانے کا حکم دیا جاتا، بلکہ احمدؒ مسلمؒ ترمذیؒ اور نسائیؒ نے حضرت جابرؓ سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لئے کافی ہو سکتا ہے، دو آدمیوں کا کھانا چار آدمیوں کو کافی ہو سکتا ہے اور چار آدمیوں کا کھانا آٹھ آدمیوں کو کافی ہو سکتا ہے۔

"اور اس وقت تک خدمت اقدس میں ظاہر رہے جب تک کہ نبی کریم ﷺ نے کھانا نہیں کھایا۔ یہ جملہ بظاہر عبارتی تکرار ہے یعنی آنحضرت ﷺ کے ہاں کھانے کا ذکر پہلے کیا جا چکا تھا، اب پھر یہاں اسی کو ذکر کر کے واقعہ کو از سر نو آگے تک بیان کرنا مقصود ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے تو صرف حضرت ابوبکرؓ کے کھانے کا ذکر کیا گیا تھا کہ انہوں نے گھر میں اپنی بیٹی (حضرت عائشہؓ) کے پاس بیٹھ کر کھانا کھا لیا ہوگا اور یہاں آنحضرت ﷺ کے کھانے کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے عشاء کی نماز کے بعد تنہا یا اپنے ان مہمانوں کے ساتھ کھایا جن کو آپ صفہ سے لیکر آئے تھے۔

"انہوں نے کھانا منگایا اور پھر سب لوگوں نے کھانا کھایا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے پہلے تو کھانا نہ کھانے کی قسم کھالی اور پھر کھانا منگا کر کھا بھی لیا اس طرح انہوں نے قسم کے خلاف کیسے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے غصہ میں آکر قسم تو کھالی مگر پھر جب ان کو اپنے غصہ پر پشیمانی ہوئی اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی طرف دھیان گیا کہ: اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھالے اور بعد میں وہی چیز بہتر دکھائی دے جو اس قسم کے خلاف ہو تو اس کو چاہئے کہ قسم کے خلاف عمل کرے لیکن قسم کا کفارہ ادا کر دے" تو انہوں نے قسم توڑ کر کھانا منگایا اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کر دیا۔

ارے بنو فراس کی بہن! حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر اپنی بیوی کو فرط حیرت سے ان کے آبائی قبیلہ کی طرف منسوب کر کے مخاطب

اور متوجہ کیا۔ وہ جس قبیلہ سے آبائی تعلق رکھتی تھیں اس کا نام "فراس تھا۔

"اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کی قسم" یہ بیوی کا والہانہ انداز تھا جو انہوں نے اپنے محبوب شوہر حضرت ابوبکرؓ کے حیرت بھرے خطاب کے جواب میں اختیار کیا۔ لیکن یہ بات اس صورت میں کہی جائے گی جب یہ مانا جائے کہ آنکھوں کی ٹھنڈک" سے مراد حضرت ابوبکرؓ ہی تھے، کیونکہ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں "آنکھوں کی ٹھنڈک" سے آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے۔

"قرة العین" (آنکھوں کی ٹھنڈک) دراصل عربی کی ایک محاوراتی اصطلاح ہے جس سے محبوب کے دیدار اور اس دیدار سے حاصل ہونے والی لذت و خوشی کو تعبیر کیا جاتا ہے ویسے لفظ "قرة" یا "قر" ق کے پیش اور زبر دونوں کے ساتھ الگ الگ معنی رکھتا ہے لیکن یہ محاوراتی اصطلاح (قرة العین) دونوں معنی! میں صادق آتی ہے کیونکہ اگر ق کے پیش کے ساتھ (قرہ) ہو تو اس کے معنی خنکی اور ٹھنڈک کے ہوتے ہیں اور محبوب کا دیدار بلاشبہ آنکھ کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ اور اگر یہ لفظ ق کے زبر کے ساتھ "قرہ" ہو تو اس کے معنی قرار کے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب محبوب نظر کے سامنے آتا ہے تو آنکھ کو گویا قرار آجاتا ہے اور نگاہ روئے محبوب پر اس طرح جم جاتی ہے کہ پھر دائیں بائیں اٹھنے کی روادار نہیں ہوتی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نجاشی کی قبر پر نور

④ عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ لَمَّا مَاتَ النَّجَاشِي كُنَّا نَتَحَدَّثُ اَنَّهُ لَا يَزَالُ يُرٰى عَلٰى قَبْرِهٖ نُوْرٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نجاشی کے انتقال کے بعد ہمارے درمیان اس بات کا چرچا ہوتا تھا کہ نجاشی کی قبر پر ہمیشہ نور دکھائی دیتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "نَجَاشِیْ" سے مراد حبشہ کے دو بادشاہ ہیں۔ جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت اپنے ملک کے حکمراں تھے، وہ پہلے دین نصرانیت (عیسائیت) کے پیرو تھے پھر آنحضرت ﷺ پر ایمان لا کر پکے اور سچے مسلمان بن گئے تھے، انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی اور آنحضرت ﷺ کے دل میں اونچی جگہ بنائی، چنانچہ جب حبشہ ہی میں ان کا انتقال ہوا اور آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ملی تو آپ ﷺ نے انتہائی افسوس کا اظہار کیا اور اپنے صحابہ کے ساتھ مدینہ میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ ان کے انتقال کے بعد کا ذکر حضرت عائشہؓ فرما رہی ہیں کہ مدینہ میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ نجاشی کی قبر پر نور دیکھا جاتا ہے، کیونکہ جن صحابہ کا حبشہ آنا جانا ہوتا تھا وہ وہاں ان کی قبر دیکھ کر مدینہ میں آکر یہی بتاتے تھے اور چونکہ سب لوگوں کا کسی غلط بات پر متفق ہونا ممکن نہیں تھا اس لئے یہ بات "خبر متواتر" کے قریب کی ہے۔ رہی یہ بات کہ نور دکھائی دینے سے کیا مراد ہے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی کی قبر پر نور کا اس طرح کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتا تھا جیسے کسی چراغ، چاند اور سورج کی روشنی دیکھی جاتی ہے، تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ نور دکھائی دینا" دراصل اس نورانیت، تازگی اور روحانی طمانیت کی تعبیر ہے جو اس قبر کی زیارت کرنے والے کو حاصل ہوئی تھی۔

جسد اطہر کو غسل دینے والوں کی غیب سے رہنمائی

⑤ وَعَنْهَا قَالَتْ لَمَّا اَرَادُوْا غُسْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا لَا نَدْرِيْ اَنُجَرِّدُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ ثِيَابِهٖ كَمَا نُجَرِّدُ مَوْتَانَا اَمْ نَغْسِلُهٗ وَعَلَيْهِ ثِيَابُهٗ فَلَمَّا اخْتَلَفُوْا اَلْقَى اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّوْمَ حَتّٰى مَا مِنْهُمْ رَجُلٌ اِلَّا وَذَقْنُهٗ فِيْ صَدْرِهٖ ثُمَّ كَلَّمَهُمْ مُكَلِّمٌ مِنْ نَاحِيَةِ الْبَيْتِ لَا يَدْرُوْنَ مَنْ هُوَ اغْسِلُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهِ ثِيَابُهٗ فَقَامُوْا فَغَسَلُوْهُ وَعَلَيْهِ قَمِيْصُهٗ يَصُبُّوْنَ الْمَاءَ فَوْقَ الْقَمِيْصِ وَيَدْلُكُوْنَهٗ بِالْقَمِيْصِ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ

النُّبُوَّۃِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (وفات کے بعد) جب نبی کریم ﷺ کے جسد اطہر کو غسل دینے کا ارادہ کیا گیا تو (وہاں موجود صحابہؓ یا اہل بیت کے درمیان) یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ آیا رسول اکرم ﷺ کے کپڑے بھی اسی طرح اتار دیئے جائیں جس طرح ہم (غسل دینے کے لئے) اپنے مردوں کے کپڑے اتار دیتے ہیں (کہ صرف ستر کے اوپر ایک کپڑا چھوڑ کر باقی پورے جسم کو برہنہ کر دیا جاتا ہے، یا آپ ﷺ کو (آپ ﷺ کی خصوصیت کی بناء پر) کپڑوں ہی کے اندر غسل دیدیا جائے؟ جب (اس سوال پر) صحابہ میں اختلاف رائے کا اظہار ہوا (کہ کچھ لوگوں نے میت کو غسل دینے کے مروج طریقہ پر قیاس کرتے ہوئے جسد اطہر پر سے کپڑے اتارنے کا مشورہ دیا اور کچھ حضرات نے جسد اطہر کو برہنہ کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور سب کا کسی ایک بات پر اتفاق نہیں ہو سکا تو اچانک) اللہ تعالیٰ نے ان سب پر نیند کو مسلّط کر دیا یہاں تک کہ کوئی شخص ایسا وہاں نہیں رہا جس کی ٹھوڑی اس کے سینہ پر نہ آگئی ہو (مطلب یہ کہ نیند کے اچانک غلبہ نے سب کو غافل کر دیا، اور پھر ان لوگوں نے گھر کے ایک کونہ سے کسی ایسے بولنے والے کی آواز سنی جس سے وہ لوگ بالکل ناواقف تھے، وہ کہہ رہا تھا: نبی کریم ﷺ کو کپڑوں کے اندر غسل دو چنانچہ وہ سب لوگ (یہ آواز سنتے ہی ہوشیار ہو گئے اور) اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ ﷺ کے جسم مبارک کو کپڑوں ہی کے اندر اس طرح غسل دیا کہ اس وقت جسد اطہر پر جو کرتا تھا اسی پر پانی ڈالتے جاتے تھے اور کرتے ہی سے بدن کو ملتے جاتے تھے اس روایت کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: نوویؒ نے اس ضمن میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ صحیح روایت یہی ہے کہ غسل دیتے وقت جسد اطہر پر جو کپڑا (کرتا) تھا اس کو کفن دیتے وقت اتار دیا گیا تھا، اور یہ روایت ضعیف ہے کہ تکفین کے وقت بھی اس کرتے کو نہیں اتارا گیا تھا بلکہ اس کو کفن کے نیچے ہی رہنے دیا گیا تھا، اور یہ روایت، لہٰذا اس روایت سے استناد و استدلال صحیح نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام سفینہؓ کی کرامت

⑥ وَعَنِ ابْنِ الْمُنْكَدِرِ اَنَّ سَفِيْنَةَ مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخْطَأَ الْجَيْشَ بِاَرْضِ الرُّوْمِ اَوْ اُسِرَ فَانْطَلَقَ هَارِبًا يَلْتَمِسُ الْجَيْشَ فَاِذَا هُوَ بِالْاَسَدِ فَقَالَ يَا اَبَا الْحَارِثِ اَنَا مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ مِنْ اَمْرِىْ كَيْتَ وَكَيْتَ فَاَقْبَلَ الْاَسَدُ لَهٗ بَصْبَصَةٌ حَتّٰى قَامَ اِلٰى جَنْبِهٖ كُلَّمَا سَمِعَ صَوْتًا اَهْوٰى اِلَيْهِ ثُمَّ اَقْبَلَ يَمْشِىْ اِلٰى جَنْبِهٖ حَتّٰى بَلَغَ الْجَيْشَ ثُمَّ رَجَعَ الْاَسَدُ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور (جلیل القدر تابعی) ابن منکدرؒ بیان کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت سفینہؓ، رومی علاقہ میں لشکر کا راستہ بھول گئے تھے یا دشمن کے ہاتھوں قید کر لئے گئے، پھر وہ دشمن کے قبضہ سے نکل بھاگے اور اپنے لشکر کی تلاش میں لگ گئے اسی دوران (کسی جنگل میں) ان کی مڈبھیڑ ایک بڑے شیر سے ہو گئی انہوں نے نہ صرف یہ کہ خطرناک شیر کو سامنے دیکھ کر بھی اپنے اوسان بحال رکھے بلکہ اس کو اس کی کنیت کے ذریعہ مخاطب کر کے) کہا: اے ابو حارث میں رسول اللہ ﷺ کا آزاد کردہ غلام ہوں اور میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے (کہ میں اپنے لشکر سے بھٹک گیا ہوں، یا یہ کہ دشمن کے ہاتھوں قید ہو گیا تھا، اب ان کے قبضہ سے نکل بھاگا ہوں اور اپنے لشکر کی تلاش میں سرگرداں ہوں، شیر (یہ سنتے ہی) دم ہلاتا ہوا (کہ جو جانور کے مطیع و فرمانبردار ہو جانے کی علامت ہے) ان کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا، اور پھر کسی طرف سے کوئی خوفناک (درندے وغیرہ کی) آواز آئی تو شیر (اس کے دفعیہ کے لئے) اس آواز کی طرف لپکتا اور پھر واپس آجاتا، اسی طرح وہ شیر (ایک محافظ اور رہبر کی مانند) سفینہؓ کے پہلو بہ پہلو چلتا رہا یہاں تک کہ سفینہؓ اپنے لشکر میں پہنچ گئے اور شیر واپس چلا گیا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "یا دشمن کے ہاتھوں قید کر لئے گئے" یہاں راوی نے اپنے شک کو ظاہر کیا ہے کہ یا تو یہ صورت حال پیش آئی تھی کہ اس علاقہ

میں حضرت سفینہؓ اسلامی لشکر سے بچھڑ گئے تھے اور اس کی تلاش میں ادھر ادھر سرگرداں تھے یا یہ کہ کہیں موقع پا کر دشمن نے ان کو اچک لیا تھا اور قید میں ڈال دیا تھا۔ "سفینہؓ" نام نہیں، لقب ہے، اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ ان کا اصل نام کیا تھا اور یہ لقب اس لئے مشہور ہوا کہ وہ ایک سفر میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے اور بہت سارا سامان اپنے اوپر لادے ہوئے تھے، اس کے باوجود شرکاء سفر میں سے جو شخص تھک جاتا تھا وہ اپنا سامان بھی ان پر لاد دیتا تھا اور وہ ہنسی خوشی سب کا بوجھ اپنے اوپر لادتے جاتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان کو اس حال میں دیکھا تو مزاحا فرمایا کہ انت السفینة (تم تو کشتی ہو) بس اسی دن سے وہ "سفینہ" کے لقب سے اس طرح مشہور ہوئے کہ لوگوں کو ان کے اصل نام کا پتہ نہیں چلتا تھا، اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ تمہارا اصل نام کیا ہے تو وہ جواب دیتے: میرا نام بس وہی ہے جو میرے آقا ﷺ نے رکھ دیا تھا یعنی سفینہ۔

قبر مبارک کے ذریعہ استسقاء

⑦ وَعَنْ اَبِي الْجَوْزَآءِ قَالَ قُحِطَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ قَحْطًا شَدِيْدًا فَشَكَوْا الى عَائِشَةَ فَقَالَتْ اُنْظُرُوْا قَبْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاجْعَلُوْا مِنْهُ كُوًى اِلَى السَّمَاءِ حَتّٰى لَا يَكُوْنَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ السَّمَاءِ سَقْفٌ فَفَعَلُوْا فَمُطِرُوْا مَطَرًا حَتّٰى نَبَتَ الْعُشْبُ وَسَمِنَتِ الْاِبِلُ حَتّٰى تَفَتَّقَتْ مِنَ الشَّحْمِ فَسُمِّيَ عَامَ الْفَتْقِ۔ (رواه الدارمی)

"اور مشہور تابعی ابوالجوزاء" کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ خشک سالی کی وجہ سے، مدینہ والے سخت قحط میں مبتلا ہو گئے تو انہوں نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا ذکر کیا (تاکہ وہ بارش کی دعا کریں اور کوئی تدبیر بتائیں) حضرت عائشہ نے کہا: ایسا کرو تم نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک پر رجوع کرو اور حجرہ کی چھت میں سے کچھ سوراخ آسمان کی طرف اس طرح کھول دو کہ قبر شریف اور آسمان کے درمیان چھت حائل نہ رہے چنانچہ لوگوں نے حضرت عائشہ کے کہنے کے مطابق عمل کیا اور پھر جو بارش ہوئی ہے تو ہرا چارہ بھی اتنا نکلا کہ (خوب کھا کھا کر) اونٹ فربہ ہو گئے یہاں تک کہ چربی کی زیادتی سے ان کی کوکھیں پھول گئیں، اور اس سال کا نام ہی "فتق کا سال" پڑ گیا۔ (دارمی)

تشریح: "کوی" (ک کے زبر کے ساتھ اور پیش کے ساتھ بھی) دراصل "کوۃ" (ک کے زبر اور پیش دونوں کے ساتھ) کی جمع ہے، جس کے معنی اس سوراخ یا روشن دان کے ہیں جو گھر کی چھت یا دیوار میں کھلا ہو حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا کہ آنحضرت کی قبر شریف جس حجرہ میں ہے اس کی چھت میں اس طرح کے متعدد روشن دان کھول دو کہ قبر شریف اور آسمان کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ رہے، تاکہ جب آسمان آپ ﷺ کی قبر شریف دیکھے تو آپ کی وفات کے صدمہ کو یاد کر کے روئے، تم پر پانی برسائے اور یہی ہوا کہ جب حجرۂ شریف کی چھت میں بڑے بڑے سوراخ کر دیئے گئے اور آسمان نے قبر مبارک دیکھی تو رونے لگا اور اس کے رونے کی وجہ سے ندی نالے بہہ پڑے واضح رہے کہ آسمان کے رونے کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے، فرمایا گیا فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ اس آیت میں ان لوگوں پر آسمان کے نہ رونے کا ذکر ہے، جو اللہ کے مبغوض بندے تھے، لہٰذا اللہ کے محبوب اور برگزیدہ بندوں کے حق میں اس کے برعکس ہوتا ہے کہ آسمان ان کے لئے روتا ہے اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے مشورہ پر حجرۂ شریف کی چھت میں سوراخ کا کھولا جانا دراصل قبر مبارک سے وسیلہ وسفارش حاصل کرنا تھا، مطلب یہ کہ حیات مبارکہ میں تو لوگ آنحضرت ﷺ کی ذات مبارکہ کے ذریعہ بارش کے طلب گار ہوتے تھے اور جب ذات مبارک نے اس دنیا سے پردہ فرما لیا استسقاء (طلب بارش) کی ضرورت پیش آئی تو حضرت عائشہؓ نے حکم دیا کہ قبر مبارک کے اوپر سے چھت کھول دی جائے تاکہ رحمت حق جوش میں آئے اور پانی برسنے لگے گویا انہوں نے ظاہر میں تو قبر مبارک کو بارش کی طلب گاری کا ذریعہ بنایا لیکن حقیقت میں آپ ﷺ کی ذات مبارک ہی اس طلبگاری کا ذریعہ اور وسیلہ تھی اور قبر مبارک کی چھت کا کھولا جانا اس طلبگاری کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے اور پریشان حال لوگوں کی اضطراری

کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے تھا۔

"فتق" کے معنی ہیں پھول جانا۔ اور بعض نے اس کے معنی پھٹ جانا، اور بعض نے "پھیل جانا" بھی بیان کئے ہیں مطلب یہ کہ بارش ہو جانے سے قحط کا اثر ختم ہو گیا، چاروں طرف ارزانی ہوئی، جنگل اور کھیت بھی ہریالے ہو گئے اور ہرا چارہ اتنا زیادہ نکلا کہ مویشیوں نے خوب کھایا پیا، اور پھر ان میں چربی اور فربہی بھی اتنی زیادہ ہو گئی کہ ان کی کوکھیں پھول گئیں یا ان کے بدن پھیل گئے اور پھٹ گئے۔

حضرت عائشہؓ کا بارش کی طلب گاری میں قبر شریف کے ذریعہ ذات مبارک سے سفارش و وسیلہ حاصل کرنا اور اس کے اثرات کا ظاہر ہونا حضرت عائشہؓ کی کرامت تو ہے ہی لیکن حقیقت میں آنحضرت ﷺ کا معجزہ تھا، اور ویسے بھی امت کے اولیاء کی کرامتیں پیغمبر اُمت کے معجزوں میں شمار ہوتی ہیں۔

ایک معجزہ ایک کرامت

⑧ وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ قَالَ لَمَّا كَانَ اَيَّامُ الْحَرَّةِ لَمْ يُؤَذَّنْ فِيْ مَسْجِدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثًا وَلَمْ يُقَمْ وَلَمْ يَبْرَحْ سَعِيْدُ بْنُ الْمُسَيِّبِ الْمَسْجِدَ وَكَانَ لَا يَعْرِفُ وَقْتَ الصَّلٰوةِ اِلَّا بِهَمْهَمَةٍ يَسْمَعُهَا مِنْ قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواه الدارمی)

"اور حضرت سعید ابن عبدالعزیزؒ جو جلیل القدر تبع تابعین میں سے ہیں اور جو نہ صرف یہ کہ زبردست فقیہ تھے اور حدیث کو صحت کے ساتھ بیان کرنے میں امتیازی حیثیت رکھتے بلکہ بڑے گریاں و ترساں بزرگ تھے) بیان کرتے ہیں کہ واقعہ حرہ کے دنوں میں تین روز تک مسجد نبویؐ میں نہ تو اذان دی گئی نہ تکبیر کہی گئی اور نہ حضرت سعید ابن مسیب مسجد سے باہر نکلنے پائے (کیونکہ ان ایام میں لوگوں کا مسجد میں آنا بالکل بند کر دیا گیا تھا) (مسیبؒ ان پرُ آفات دنوں میں) نماز کا وقت صرف اس آہستہ گنگناہٹ جیسی آواز سے شناخت کرتے تھے جو آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے حجرہ کے اندر سے آتی ہوئی وہ سنتے تھے۔" (دارمی)

تشریح: "حرہ" مدینہ کے باہر اس قطعہ زمین کو کہتے تھے جو کالے پتھروں اور سنگریزوں والا تھا اور واقعہ حرہ" سے مراد مدینہ والوں پر یزید ابن معاویہ کی وہ لشکر کشی ہے جس کے نتیجہ میں مدینہ شہر کو سخت تباہی و بربادی اور اہل مدینہ کو ہیبت ناک قتل و غارت گری کا شکار ہونا پڑا تھا، یہ المناک واقعہ تاریخ اسلام کے سخت ترین واقعات میں سے ہے۔ اس کے دردناک حالات کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلسل تین دن تک مسجد نبوی اذان و تکبیر سے محروم رہی۔

یزید کا لشکر چونکہ اسی حرہ کی طرف سے مدینہ پر حملہ آور ہوا تھا اس لئے اس کو "واقعہ حرہ" سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حضرت سعید ابن مسیبؒ اونچے درجہ کے تابعین میں سے تھے، بڑے فقیہ محدث، عابد اور متقی۔ انہوں نے چالیس حج کئے تھے، ۹۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

حضرت انسؓ کی کرامت

⑨ وَعَنْ اَبِيْ خَلْدَةَ قَالَ قُلْتُ لِاَبِي الْعَالِيَةِ سَمِعَ اَنَسٌ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَدَمَهُ عَشْرَ سِنِيْنَ وَدَعَالَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ لَهُ بُسْتَانٌ يَحْمِلُ فِيْ كُلِّ سَنَةٍ الْفَاكِهَةَ مَرَّتَيْنِ وَكَانَ فِيْهَا رَيْحَانٌ يَجِيْءُ مِنْهُ رِيْحُ الْمِسْكِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابو خلدہؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے (بزرگ تابعی) حضرت ابوالعالیہؒ سے پوچھا: کیا حضرت انسؓ نے نبی کریم ﷺ سے حدیثیں سنی ہیں؟ حضرت ابوالعالیہؒ نے جواب دیا: حضرت انسؓ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دس سال رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

نیز ان کو نبی کریم ﷺ کی دعا لگی ہوئی تھی، ان کا جو باغ تھا اس میں سال کے اندر دو دفعہ پھل آتے تھے اور اس باغ میں جو پھول تھے ان سے مشک کی خوشبو پھوٹتی تھی اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: حضرت ابوخلدہؒ نے حضرت انسؓ کے بارے میں حضرت ابوالعالیہؒ سے جو سوال کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت انسؓ جو حدیثیں روایت کرتے ہیں وہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے بلاواسطہ اور براہ راست سنی ہیں یا وہ مرسل روایتیں ہیں، اگرچہ مرسل روایتوں کی حجیت میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہے؟ اس سوال کے بین السطور سے یہ بات جھلکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد کچھ لوگوں کو حضرت انسؓ کی روایت کے بارے میں تردد ہوا ہو گا حضرت ابوالعالیہؒ نے جو بزرگ تابعین میں سے تھے ابوخلدہؒ کا جواب براہ راست نہیں دیا بلکہ انہوں نے وہ بات بتائی جس سے حضرت انسؓ کی اہمیت شان واضح ہوتی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت انسؓ نے جو دس سال کی عمر میں یا بعض روایتوں کے مطابق آٹھ سال کی عمر میں آنحضرت ﷺ کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے گئے تھے مسلسل دس سال تک آپ کی خدمت کی اور یہ ان کی والہانہ اور مخلصانہ خدمت گذاری ہی کا مبارک صلہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں عمر اور مال کی برکت کی دعا فرمائی تھی اور اس دعا کے اثر سے ان کو ایک سو تین سال کی لمبی عمر حاصل ہوئی، اللہ نے ان کو کثرت اولاد سے بھی اس طرح نوازا کہ ان کے تہتر تو لڑکے تھے اور ستائیس لڑکیاں۔ ان کے یہاں مال میں برکت کا یہ حال تھا کہ دوسروں کے باغات تو سال میں ایک ہی مرتبہ پھل دیتے تھے لیکن ان کے باغ میں سال کے اندر دو دفعہ پھل آتے تھے۔ ان کی عظمت شان کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے باغ میں جو پھول کھلتے تھے ان سے مشک کی خوشبو پھوٹا کرتی تھی، لہٰذا واضح ہوا کہ جس ہستی کو ایسا مرتبہ ملا ہو، جس کو اتنے طویل عرصہ تک آنحضرت کی خدمت و ملازمت میں رہنے اور شرف صحبت حاصل کرنے کی سعادت ملی ہو اس نے آنحضرت ﷺ سے براہ راست حدیثیں کیسے نہیں سنی ہوں گی اور وہ حدیثیں روایت کیوں نہیں کرے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت سعید ابن زیدؓ کی کرامت

⑮ وَعَنْ عُرْوَةَ ابْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّ سَعِيْدَ بْنَ زَيْدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ نُفَيْلٍ خَاصَمَتْهُ اَرْوٰى بِنْتُ اَوْسٍ اِلٰى مَرْوَانَ ابْنِ الْحَكَمِ وَادَّعَتْ اَنَّهُ اَخَذَ شَيْئًا مِنْ اَرْضِهَا فَقَالَ سَعِيْدٌ اَنَا كُنْتُ اٰخُذُ مِنْ اَرْضِهَا شَيْئًا بَعْدَ الَّذِيْ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَاذَا سَمِعْتَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا طُوِّقَهُ اللّٰهُ اِلٰى سَبْعِ اَرْضِيْنَ فَقَالَ لَهُ مَرْوَانُ لَا اَسْئَلُكَ بَيِّنَةً بَعْدَ هٰذَا فَقَالَ سَعِيْدٌ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَتْ كَاذِبَةً فَاَعْمِ بَصَرَهَا وَاقْتُلْهَا فِيْ اَرْضِهَا فَقَالَ فَمَا مَاتَتْ حَتّٰى ذَهَبَ بَصَرُهَا وَبَيْنَمَا هِيَ تَمْشِيْ فِيْ اَرْضِهَا اِذْ وَقَعَتْ فِيْ حُفْرَةٍ فَمَاتَتْ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ بِمَعْنَاهُ وَاَنَّهُ رَاٰهَا عَمْيَاءَ تَلْتَمِسُ الْجُدُرَ تَقُوْلُ اَصَابَتْنِيْ دَعْوَةُ سَعِيْدٍ وَاِنَّهَا مَرَّتْ عَلٰى بِئْرٍ فِي الدَّارِ الَّتِيْ خَاصَمَتْهُ فِيْهَا فَوَقَعَتْ فِيْهَا فَكَانَتْ قَبْرَهَا۔

"حضرت عروہؒ ابن زبیر بن العوام (جو اونچے درجہ کے تابعین میں سے ہیں اور "عشرۂ مبشرہ" میں کے ایک مشہور صحابی حضرت زبیر بن العوامؓ کے بیٹے ہیں) بیان کرتے ہیں کہ (ایک عورت) اروی بنت اوس کو حضرت سعید ابن زید ابن عمرو ابن نفیلؓ سے مخاصمت ہوئی اور ان کے خلاف استغاثہ لیکر مروان ابن حکم کی عدالت میں گئی (جو حضرت معاویہؓ کی طرف سے مدینہ کا حاکم تھا، اروی نے دعوی کیا کہ سعید ابن زیدؓ نے میرا ایک قطعہ زمین (زبردستی، دبالیا ہے حضرت سعیدؓ نے یہ دعوی سن کر اس کو بعید از امکان قرار دینے کے لئے) کہا: رسول کریم ﷺ کا ارشاد سننے کے بعد بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اس عورت کی زمین دبالوں گا۔ مروان نے پوچھا: تم نے رسول

کریم ﷺ سے کیا سنا ہے؟ حضرت سعیدؓ نے بیان کیا: میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بالشت بھر زمین بھی زبردستی ہتھیالے گا تو (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ اس زمین کے ساتوں طبقوں کو طوق بنا کر اس شخص کے گلے میں ڈالے گا، مروان نے (یہ سن کر) حضرت سعیدؓ سے کہا کہ اس دلیل کے بعد میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا کہ تم سے گواہ طلب کروں تاہم حضرت سعیدؓ نے (زمین کا وہ قطعہ اس عورت کے حق میں چھوڑ دیا اور) کہا: اے اللہ! یہ عورت اگر جھوٹی ہے تو اس کی بینائی چھین لے اور اس کو اسی زمین میں موت دے۔ حضرت عروہؒ بیان کرتے ہیں کہ مرنے سے پہلے وہ عورت اندھی ہوگئی تھی اور ایک دن اسی (مذکورہ) زمین پر چل رہی تھی کہ اچانک ایک گہرے گھڑے میں گری اور وہیں مرگئی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک روایت میں، جو حضرت محمدؒ ابن زید ابن عبداللہ ابن عمر (تابعی) سے اس روایت کے ہم معنی منقول ہے یوں ہے کہ انہوں نے (یعنی محمدؒ ابن زید نے ایک دن) دیکھا کہ وہ عورت، جو اندھی ہو چکی تھی، (ایک دیوار کے سہارے) ٹٹولتی ہوئی چل رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ مجھے سعید ابن زیدؓ کی بددعا کھاگئی، اور پھر یہ ہوا کہ (ایک دن) جب وہ اس کنویں (یعنی گہرے گڑھے) کے پاس سے گذر رہی تھی جو اسی مذکورہ زمین پر واقع گھر میں تھا تو اچانک اس میں گر کر مرگئی اور وہی کنواں (گڑھا) اس کی قبر بن گیا۔

تشریح: حضرت سعید ابن زیدؓ عشرہ مبشرہ یعنی ان دس جلیل القدر صحابہ میں سے ایک ہیں جنہیں آنحضرت ﷺ نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت عطا فرمادی تھی، یہ حضرت عمر فاروقؓ کے بہنوئی اور بڑے باکرامت و مستجاب الدعوات تھے اروی کے بارے میں یہ تحقیق سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کوئی صحابیہ تھی یا تابعیہ۔ بہرحال اس عورت نے مروان حاکم مدینہ کی عدالت میں حضرت سعید ابن زیدؓ کے خلاف یہ جھوٹا دعویٰ دائر کیا کہ انہوں نے زور زبردستی کر کے میری زمین کا کچھ حصہ دبا لیا ہے جب کہ حقیقت میں وہ زمین حضرت سعیدؓ ابن زید کی اپنی جائز ملکیت اور قبضے میں تھی چنانچہ انہوں نے اس جھوٹے دعوے پر سخت حیرت اور استبعاد کا اظہار کیا اور مروان کے سامنے کہا کہ جس شخص نے کسی کی زمین ہتھیانے کی وعید آنحضرت ﷺ سے خود سن رکھی ہو بھلا وہ کیسے جرأت کر سکتا ہے کہ کسی کی زمین پر زبردستی قبضہ کرلے۔ مروان نے حضرت سعیدؓ سے اس وعید سے متعلق حدیث سننے کی خواہش ظاہر کی، حضرت سعیدؓ نے وہ حدیث، جس کو انہوں نے خود براہ راست آنحضرت ﷺ سے سنا تھا، بیان کردی۔ مروان کو حضرت سعیدؓ کی سچائی کا یقین ہوگیا اور اس وقت اس نے حضرت سعیدؓ سے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے تمہارے سچا ہونے کا پورا یقین ہے کیونکہ میں تمہاری اندرونی زندگی تک جانتا ہوں، تم کسی پر ظلم کر ہی نہیں سکتے اور پھر تم سے یہ حدیث سننے کے بعد تو اس کی بھی ضرورت نہیں رہ گئی ہے کہ عدالتی طور پر تمہاری بات تسلیم کرنے کے لئے تم سے کوئی گواہ طلب کروں۔ یا مروان کا مطلب یہ تھا کہ تمہارے روایت حدیث میں مجھے کوئی شک نہیں ہے اور نہ اس حدیث کو صحیح ماننے کے لئے میں کسی اور راوی کی بھی روایت کا محتاج ہوں، تم خود اپنی معروف حیثیت کے اعتبار سے دو راویوں بلکہ اس سے بھی زائد راویوں کے برابر ہو۔ غرضیکہ مروان نے اس عورت کا دعویٰ خارج کردیا۔ مگر جیسا کہ کرمانیؒ نے لکھا ہے اور خود روایت سے بھی مفہوم ہوتا ہے، حضرت سعیدؓ نے احتیاطاً اس زمین سے دست کشی اختیار کر کے اسی عورت کے قبضہ میں جانے دی جس نے اس زمین کا دعویٰ کیا تھا، تاہم انہوں نے بددعا ضرور کی کہ وہ عورت اگر جھوٹی ہو تو اسی دنیا میں اپنے جھوٹ کی سزا پائے اور دنیا والوں کی نظر میں اس کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بددعا کا اثر ظاہر کیا اور جیسا کہ حضرت سعیدؓ نے کہا تھا وہ عورت مرنے سے پہلے اندھی بھی ہوگئی اور وہی زمین اس کی قبر بھی بنی، کیونکہ جب وہ اس زمین میں واقع گھر کے اندر) ایک کنویں نما گڑھے میں گر کر مرگئی تو کسی نے اس کی لاش نکال کر علیحدہ سے دفن کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔

حضرت عمرؓ کی کرامت

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بَعَثَ جَيْشًا وَاَمَّرَ عَلَيْهِمْ رَجُلًا يُدْعٰى سَارِيَةَ فَبَيْنَمَا عُمَرُ يَخْطُبُ فَجَعَلَ يَصِيْحُ يَا سَارِيَ

الْجَبَلَ فَقَدِمَ رَسُوْلٌ مِّنَ الْجَيْشِ فَقَالَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَقِيْنَا عَدُوَّنَا فَهَزَمُوْنَا فَاِذَا بِصَائِحٍ يَصِيْحُ يَا سَارِيَ الْجَبَلَ فَاَسْنَدْنَا ظُهُوْرَنَا اِلَى الْجَبَلِ فَهَزَمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے (ایران کے صوبہ ہمدان کے جنوب میں واقع مقام نہاوند کو) جو لشکر بھیجا تھا اس (کے ایک حصہ فوج) کا سپہ سالار ساریہ نامی شخص کو بنایا تھا، (ایک دن) جب کہ فاروق اعظمؓ (مسجد نبوی میں) خطبہ ارشاد فرمارہے تھے (اور حاضرین میں اکابر صحابہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ وتابعین بھی تھے) تو انہوں نے (دوران خطبہ) اچانک چلا چلا کر کہنا شروع کیا کہ ساریہ! پہاڑ کی طرف جاؤ (یعنی میدان جنگ کا موجودہ مورچہ چھوڑ کر پہاڑ کے دامن میں چلے جاؤ اور پہاڑ کو پشت بان کر کے نیا مورچہ بنالو) لوگوں کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا اور پھر جب (چند دنوں کے بعد) لشکر سے ایک ایلچی آیا اور اس نے (میدان جنگ کے حالات سنا کر) کہا کہ امیر المؤمنین! دشمن نے تو ہمیں آلیا تھا اور ہم شکست سے دوچار ہوا ہی چاہتے تھے کہ اچانک (ہمارے کانوں میں ایک شخص کی آواز آئی) جو چلا چلا کر کہہ رہا تھا: "ساریہ! پہاڑ کی طرف جاؤ" چنانچہ (یہ آواز سن کر) ہم نے (اپناوہ مورچہ چھوڑ دیا اور پہاڑ کی سمت جا کر) پہاڑ کو اپنا پشت بان بنالیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کو شکست دی (اس روایت کو بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ جب لوگوں نے خطبہ کے دوران حضرت فاروقؓ کو اس طرح بآواز بلند ساریہ کو مخاطب کرتے سنا تو حیرت زدہ ہو کر کہا کہ یہاں ساریہ کو پکار رہے ہیں وہ تو (سینکڑوں میل دور) نہاوند کے مقام پر دشمن کا مقابلہ کرنے میں مصروف ہے؟ فاروق اعظم نے فرمایا: دراصل میں نے ایسا ہی منظر دیکھا کہ مسلمان مصروف جنگ ہیں اور ان کے لئے پہاڑ کو پشت بان بنالینا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے بے اختیار میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے جب ساریہ کا خط اور ایلچی آیا تو ٹھیک جمعہ کے روز عین نماز جمعہ کے وقت اس تاریخ کا واقعہ اس خط میں لکھا ہوا تھا اور ایلچی نے زبانی بھی بیان کیا۔

اس ایک واقعہ سے حضرت عمر فاروقؓ کی کئی کرامتیں ظاہر ہوئیں، ایک تو یہ کہ انہوں نے جنگ نہاوند کا منظر سینکڑوں میل دور مدینہ میں دیکھا، دوسرے یہ کہ ان کی آواز جو مدینہ میں بلند ہوئی تھی سینکڑوں میل دور نہاوند کے مقام تک پہنچی اور وہاں سب اہل لشکر نے اس کو سنا، اور تیسرے یہ کہ ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس جنگ میں اہل اسلام کو فتح عطا فرمائی۔

کعب احبارؓ کی کرامت

⑭ وَعَنْ نُبَيْهَةَ بْنِ وَهْبٍ اَنَّ كَعْبًا دَخَلَ عَلٰى عَائِشَةَ فَذَكَرُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كَعْبٌ مَامِنْ يَوْمٍ يَطْلُعُ اِلَّا نَزَلَ سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنَ الْمَلٰئِكَةِ حَتّٰى يَحُفُّوْا بِقَبْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضْرِبُوْنَ بِاَجْنِحَتِهِمْ وَ يُصَلُّوْنَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اِذَا اَمْسَوْا عَرَجُوْا وَهَبَطَ مِثْلُهُمْ فَصَنَعُوْا مِثْلَ ذٰلِكَ حَتّٰى اِذَا انْشَقَّتْ عَنْهُ الْاَرْضُ خَرَجَ فِيْ سَبْعِيْنَ اَلْفًا مِّنَ الْمَلٰئِكَةِ يَزُفُّوْنَهٗ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت نبیہ ابن وہبؒ (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت کعب احبارؓ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جب اس مجلس میں رسول کریم ﷺ (کی بعض صفات وخصوصیات یا آپ ﷺ کے وصال کے حالات کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا: کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ فجر طلوع ہی ستر ہزار فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور وہ (فرشتے) رسول کریم ﷺ کی قبر شریف کو گھیر لیتے ہیں اور (قبر کے اوپر سے گرد وغبار صاف کرنے کے لئے یا انوار قبر سے برکت حاصل کرنے کے لئے) اپنے پروں کو قبر شریف پر مارتے ہیں اور رسول کریم ﷺ پر درود پڑھتے رہتے ہیں یہاں تک جب شام ہوتی ہے تو وہ فرشتے آسمان پر چلے جاتے ہیں اور (انہی کی طرح ستر ہزار) دوسرے فرشتے اترتے ہیں، جو ان (دن والے فرشتوں) کی طرح صبح تک یہی کرتے ہیں (یعنی قبر شریف کو گھیر لیتے ہیں اور اس پر اپنے پر مارتے ہیں اور درود پڑھتے رہتے ہیں، یہ سلسلہ (یعنی ہر روز صبح شام اس طرح ستر ہزار فرشتوں کا اترنا) اس وقت جاری رہے گا جب کہ

(قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا اور) قبر شریف شق ہوگی اور آپ ﷺ قبر سے اٹھیں گے اور ستر ہزار فرشتے (اپنے جلو میں لے کر) محبوب کو حبیب تک پہنچائیں گے۔"

تشریح: حضرت کعب احبار، کبار تابعین میں سے ہیں، ویسے انہوں نے آنحضرت ﷺ کا زمانہ پایا تھا لیکن آپ ﷺ کو دیکھا نہیں، مسلمان حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ہوئے تھے۔

فرشتوں کے اترنے کی یہ بات حضرت کعبؓ کو یا تو سابقہ آسمانی کتابوں میں مذکورہ پیشین گوئیوں سے معلوم ہوئی ہوگی یا انہوں نے پہلے زمانہ کے بڑے بوڑھوں اور سابقہ آسمانی کتابوں کے عالموں سے سنی ہوں گی اور یا یہ کہ خود ان کا کشف اور کراماتی مشاہدہ ہوگا اور یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوئی ہے کیونکہ اس سے ان کی کرامت ظاہر ہوتی ہے۔

باب وفاة النبيّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
نبی کریم ﷺ کی وفات کا بیان

مشکوۃ المصابیح کے اکثر نسخوں میں صرف "باب" کا لفظ منقول ہے، ایک نسخہ میں باب وفات النبی ﷺ کے الفاظ ہیں جن سے باب کے موضوع کا اظہار ہوتا ہے اور یہی زیادہ صحیح اور زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ مولف مشکوہ کا معمول یہ ہے کہ وہ صرف باب کا لفظ اس موقع پر لاتے ہیں جہاں پچھلے باب سے تعلق رکھنے والی بقیہ حدیثوں کو نقل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جب کہ یہاں ایسی صورت نہیں ہے، اس باب میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں وہ سابقہ باب سے کوئی نسبت اور تعلق رکھنے کے بجائے ایک مستقل موضوع یعنی آنحضرت ﷺ کے وصال کے حالات سے متعلق ہیں نیز اس باب کے بعد جو باب آرہا ہے وہاں مولف نے موضوع کا ذکر کئے بغیر صرف "باب" کا لفظ لکھ دیا ہے اور اس باب میں اسی باب کے موضوع یعنی نبی کریم ﷺ سے متعلق احادیث منقول ہیں، اس بات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہاں "باب" کا ذکر اپنے موضوع یعنی نبی کریم ﷺ کی وفات کے اظہار کے ساتھ ہو اگلا باب اپنے موضوع کے اظہار کے بغیر ہو جس میں اس باب سے متعلق بقیہ احادیث منقول ہوں۔

مرض الموت کی ابتدا: آنحضرت ﷺ کے مرض الموت کی ابتداء کس دن ہوئی، اس بارے میں مختلف اقوال ہیں ایک قول یہ ہے کہ ہجرت کے گیارہویں سال ماہ صفر کے آخر میں ۲۷ یا ۲۸/ تاریخ کو درد سر کے شدید حملہ سے آپ ﷺ کے مرض الموت کا آغاز ہوا ایک روایت کے مطابق محرم کے مہینے ہی میں آپ ﷺ پر بخار کا حملہ ہو گیا تھا، ۲۶ صفر کو بیماری سے کسی قدر آفاقہ محسوس ہوا تھا اور ۲۸ صفر ہی کو پھر بیماری میں اشتداد ظاہر ہو گیا، ایک روایت ہے کہ مرض الموت کا آغاز ماہ ربیع الاول شروع میں ہوا۔ ابن جوزیؒ کی کتاب الوفاء میں یہ لکھا ہے کہ آپ ﷺ کے مرض وفات کا آغاز ماہ صفر کی اس تاریخ کو ہوا۔ جب کہ مہینہ ختم ہونے میں دس راتیں باقی تھیں اور آپ ﷺ کا وصال ۱۲ ربیع الاول کو ہوا سلیمان تیمیؒ نے جو ایک ثقہ اور انتہائی قابل اعتماد راوی ہیں، اپنا یہ یقین بیان کیا کہ "آنحضرت ﷺ کے مرض الموت کی ابتداء بدھ کے دن ۲۲ صفر کو ہوئی اور آپ ﷺ کا وصال پیر (دوشنبہ) کے دن ربیع الاول کی دوسری تاریخ کو ہوا بہت سے علماء اس قول کو اگرچہ اس بناء پر قابل ترجیح کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہراءؓ کا انتقال رمضان المبارک کی تیسری تاریخ کو ہوا تھا اور تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؓ کی وفات آنحضرت ﷺ کے وصال کے ٹھیک ٹھیک چھ ماہ بعد ہوئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر روایتوں میں آپ ﷺ کی تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول ہی منقول ہے۔

سختی مرض: شدید درد سر اور بخار کی صورت میں جو مرض لاحق ہوا تھا وہ بڑھتا گیا، شدت مرض سے آپ کے کرب کا یہ حال ہوتا تھا کہ بستر پر پڑے پڑے کروٹ پر کروٹ بدلتے مگر کسی صورت چین نہیں ملتا تھا، اس وقت آپ ﷺ فرماتے تھے کہ بیماری جتنی سخت ہم لوگوں یعنی

انبیاء) کی ہوتی ہے اتنی سخت کسی کی نہیں ہوتی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اجر و ثواب بھی ہمیں ہی زیادہ ملتا ہے۔ اپنی اس بیماری کے دوران آنحضرت ﷺ نے چالیس غلام آزاد کئے، اور علاوہ تین روز کے، پوری مدت مرض اپنے صحابہ کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرتے رہے بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے سترہ نمازیں نہیں پڑھائیں اور حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

آخری تلقین و نصیحت: روایتوں میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے مرض الموت میں سب سے زیادہ جس چیز کی نصیحت فرمایا کرتے تھے ان میں سے ایک تو یہ تھی کہ نماز سے غافل مت ہونا اور دوسری یہ تھی کہ اپنے غلاموں اور اپنی باندیوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا معاملہ کرنا۔ وفات کے دن فجر کے وقت آپ ﷺ حجرہ شریف سے نکل کر مسجد میں آئے اور حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں فجر کی نماز ادا کی، بعد نماز آپ ﷺ نے صحابہ کو آخری بار خطاب کیا اور فرمایا: مسلمانو: میں تم لوگوں کو خدا حافظ کہتا ہوں اور تم سب کو اللہ کی حفاظت میں دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہی تمہارے حق میں میرا خلیفہ یعنی بہتر کارساز ہے اب چونکہ میں دنیا چھوڑ رہا ہوں اور تم سے جدا ہو رہا ہوں اس لئے تمہیں یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تقویٰ (پرہیزگاری اختیار کرنا اور نیک کاری کو ہمیشہ مد نظر رکھنا۔

مرض الموت کے دوران: مرض وفات کے دوران جو بعض غیر معمولی واقعات پیش آئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پنجشنبہ کے دن، جب کہ آپ ﷺ پر بیماری کا شدید غلبہ تھا، آپ ﷺ نے ایک وصیت نامہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ سے فرمایا کہ بکری کے شانہ کی ہڈی (کہ جو چوڑی ہونے کے سبب لکھنے کے لئے زیادہ پسند کی جاتی تھی، یا کوئی تختہ لے آؤ تاکہ میں اس پر ابوبکرؓ کے لئے وصیت لکھ دوں۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ آپ ﷺ نے فرمائے کے مطابق ہڈی یا تختہ لانے کے لئے اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا رہنے دو، اب ضرورت محسوس نہیں کرتا (مجھے یقین ہے کہ) اللہ اور مسلمان ابوبکرؓ کے حق میں اختلاف نہیں کریں گے (مطلب یہ کہ ابوبکرؓ کی خلافت کو اللہ تعالیٰ بھی پسند فرمائے گا اور تمام مسلمان بھی متفقہ طور پر ان کے ہاتھ بیعت کرلیں گے)

منقول ہے کہ (جب آنحضرت ﷺ کی حالت زیادہ بگڑی تو) حضرت عباسؓ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا: عبدالمطلب کے اولاد کے چہروں کی مجھے خوب شناخت ہے کہ آثار موت ان پر کس طرح ظاہر ہوتے ہیں، میں ڈر رہا ہوں کہ آنحضرت ﷺ اس بیماری سے شاید اب جاں بر نہ ہو سکیں، لہٰذا میری رائے ہے کہ (اس آخری وقت کو غنیمت جانو اور) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس چیز (یعنی خلافت) کا مطالبہ کرو حضرت علیؓ نے جواب دیا: کہ آپ جانتے ہیں کہ اگر میں آنحضرت ﷺ سے یہ چیز مانگوں اور آپ ﷺ نہ دیں تو کیا پھر بھی لوگ مجھے یہ چیز دیدیں گے؟ (مطلب یہ کہ خلافت کا مسئلہ عام مسلمانوں کی رائے اور ان کے اتفاق سے تعلق رکھتا ہے اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ تمام مسلمان ہر حالت میں مجھے ہی ترجیح دیں گے تو میں آنحضرت ﷺ سے بھی طلب گار ہو جاتا، لیکن جب میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابھی مجھ سے تو پھر میں آنحضرت ﷺ سے اپنے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا)

روایتوں میں آتا ہے کہ مرض الموت کے درمیان آنحضرت ﷺ کے پاس پانچ یا چھ اور یا سات دینار تھے جو حضرت عائشہؓ کی تحویل میں رکھ دیئے گئے تھے، آپ ﷺ نے ان دیناروں کے صدقہ کر دینے کا حکم دیا تاکہ آپ ﷺ اپنے پیچھے کچھ نہ چھوڑ جائیں۔

یوم وفات: چونکہ مرض الموت کی ابتداء کے دن و تاریخ اور وفات کے دن و تاریخ کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں اس لئے تعین کے ساتھ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آپ ﷺ کتنے دن مرض الموت میں مبتلا رہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مذکورہ اختلاف اقوال کی بناء پر آپ ﷺ بارہ یا اٹھارہ دن بیمار رہے اور علمائے کے معتمد قول کے مطابق ۲ ربیع الاول ۱۱ دو شنبہ (پیر) کے دن اس دار فانی سے آپ ﷺ نے انتقال فرمایا منقول ہے کہ اس وقت جب کچھ لوگوں کو تردد ہوا کہ آپ ﷺ کی روح مبارک، جسد پاک سے پرواز کر گئی ہے یا نہیں تو حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے، جو پہلے جعفرؓ ابن ابو طالب کے نکاح میں تھیں اور ان کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے نکاح میں آگئیں اور پھر ان کی وفات کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نکاح میں آگئی تھیں، آنحضرت ﷺ کے جسد پاک پر شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر دیکھا اور کہا: رسول اللہ ﷺ اس جہان فانی سے کوچ فرما چکے ہیں اور آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان

جو مہر نبوت تھی وہ اٹھالی گئی۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ وفات کے دن میں نے اپنا ہاتھ سرکار دو عالم ﷺ کے سینہ مبارک پر رکھ کر دیکھا تھا اس دن کے بعد سے کئی ہفتوں تک میرے (اس ہاتھ سے مشک کی خوشبو آتی رہی حالانکہ میں ہر کھانے کے وقت (اور ویسے بھی وضو وغیرہ) پابندی سے ہاتھ دھویا کرتی تھی۔ اور شواہد النبوۃ میں حضرت علیؓ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا: آپ ﷺ کا حافظہ اور فہم اتنا اچھا کس طرح ہو گیا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: جب میں نے سرکار دو عالم ﷺ کے جسد اطہر کو غسل دیا تو آپ ﷺ کی پلکوں میں جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو میں نے اپنی زبان سے اٹھایا تھا اور پی گیا تھا، اسی چیز کو میں اپنے حافظہ وفہم کی قوت کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

تکفین: آنحضرت ﷺ کے کفن کے بارے میں مختلف روایتیں منقول ہیں لیکن صحیح روایت، کہ جو حضرت عائشہؓ سے منقول ہے، یہ ہے کہ آپ ﷺ کو تین سوتی کپڑوں میں کفنایا گیا تھا، ان میں کرتا اور عمامہ نہیں تھا ویسے حضرت عائشہؓ کی اس روایت کے بیان مطلب میں بھی اختلافی اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ارشاد ان میں کرتا اور عمامہ نہیں تھا" کا مطلب یہ ہے کہ کرتا اور عمامہ ان تین کپڑوں میں نہیں تھا بلکہ کرتا اور عمامہ ان تین کپڑوں کے علاوہ تھے گویا آپ ﷺ کے کفن میں مجموعی طور پر پانچ کپڑے تھے، لیکن یہ بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی، اصل مطلب وہی ہے جو دوسرے حضرات نے بیان کیا ہے کہ آپ کے کفن میں ان تین کپڑوں کے علاوہ کرتا اور عمامہ بالکل نہیں تھا یعنی صرف تین ہی کپڑوں یعنی ازار، کفنی، اور لفافہ (لوٹ کی چادر) کا کفن مستحب ہے۔

نماز جنازہ: آپ ﷺ کی نماز جنازہ باجماعت ادا نہیں کی گئی اور نہ کسی نے امامت کی بلکہ یہ صورت اختیار کی گئی تھی کہ جسد پاک کو نہلا کفنا کر حجرہ مبارک میں، کہ جہاں تدفین ہوئی تھی، رکھ دیا گیا تھا۔ لوگ ٹولیوں کی شکل میں تنہا تنہا نماز جنازہ پڑھ کر باہر نکل جاتے اس طرح پہلے مردوں نے پھر عورتوں نے اور پھر بچوں نے الگ الگ نماز پڑھی۔

تدفین: حضرت عائشہؓ کے حجرہ مبارک میں، کہ جہاں آپ کی پاک روح نے جسد اطہر سے پرواز کی تھی قبر تیار کی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔ جب قبر میں اتارا جانے لگا تو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت شقرانؓ نے لحد میں آپ ﷺ کے نیچے آپ ﷺ کی چادر مبارک بچھادی اور کہا کہ مجھے یہ گوارہ نہیں کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی دوسرا شخص اس چادر کو اوڑھے۔ لیکن ایک روایت کے مطابق صحابہؓ نے شقرانؓ کی اس بات کو پسند نہیں کیا اور مٹی ڈالنے سے پہلے وہ چادر نکال لی گئی تھی، اسی لئے تمام علماء نے قبر میں میت کے نیچے کسی طرح کی چادر وغیرہ بچھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کی تدفین چہار شنبہ (بدھ) کی شب میں، یا ایک روایت کے مطابق سہ شنبہ (منگل) کے دن سورج ڈھلنے کے بعد عمل میں آئی تھی۔

قبر شریف: آنحضرت ﷺ کی قبر بغلی (لحد) بنائی گئی اور لحد کا منہ نو کچی اینٹیں کھڑی کر کے بند کیا گیا، اور اس قبر کو مُسنّم (یعنی اونٹ کے کوہان کی طرح اٹھی ہوئی) بنایا گیا پھر اس پر سنگریزے بچھائے گئے اور پانی چھڑکا گیا اسی بناء پر بالاتفاق چاروں ائمہ کے ہاں، قبر کو مُسنّم بنانا مستحب ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جب اہل مدینہ کے نصیب جاگے تھے

① عَنِ الْبَرَآءِ قَالَ اَوَّلُ مَنْ قَدِمَ عَلَيْنَا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُصْعَبُ ابْنُ عُمَيْرٍ وَابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ فَجَعَلَا يُقْرِءُ اِنَنَا الْقُرْاٰنَ ثُمَّ جَآءَ عَمَّارٌ وَبِلَالٌ وَسَعْدٌ ثُمَّ جَآءَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِيْ عِشْرِيْنَ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ جَآءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا رَاَيْتُ اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ فَرِحُوْا بِشَيْءٍ فَرَحَهُمْ بِهٖ حَتّٰى

رَاَیْتُ الْوَلَائِدَ وَ الصِّبْیَانَ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ جَآءَ فَمَا جَآءَ حَتّٰی قَرَأْتُ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی فِیْ سُوَرٍ مِثْلِھَا مِنَ الْمُفَصَّلِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت براء ابن عازبؓ (جو انصار مدینہ میں سے مشہور ترین صحابی ہیں) کہتے ہیں کہ (ہجرت نبوی سے قبل) رسول کریم ﷺ کے صحابہ میں جو حضرات سب سے پہلے ہمارے ہاں (مدینہ آئے وہ حضرت مصعب ابن عمیرؓ اور حضرت ابن اُمّ مکتومؓ تھے ان دونوں حضرات نے (آتے ہی) ہمیں قرآن کی تعلیم دینا شروع کر دیا تھا پھر حضرت عمار ابن یاسرؓ، حضرت بلال ابن رباحؓ اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ آئے اور پھر حضرت عمر ابن خطابؓ نبی کریم ﷺ کے بیس صحابہ کے ساتھ تشریف لائے، ان کے بعد نبی کریم ﷺ نے (حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ) نزول اجلال فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ (اس دن جب کہ اہل مدینہ کے نصیب جاگ گئے تھے میں نے مدینہ والوں کو آپ کی تشریف آوری پر جتنا فرحاں وشاداں دیکھا تھا اتنی وجت وشادمانی ان کو کسی (بڑی سے بڑی دنیاوی) خوشی کے موقع پر حاصل نہیں تھی، میں نے یہاں تک دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں (مارے خوشی کے) یہ نعرے لگا رہے تھے: یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں، جو ہماری بستی میں) تشریف لائے ہیں اور میں نے (آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہی مفصّل (یعنی اوساط مفصّل کی ہم مثل سورتوں میں سے سورہ سبح اسم ربک الاعلی سیکھ لی تھی (یا یہ کہ اوساط مفصّل کی دوسری ہم مثل سورتوں کے ساتھ ساتھ سورہ سبح اسم ربک الاعلی بھی سیکھ لی تھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سورۂ سبح اسم ربک الاعلی مکہ میں نازل ہوئی ہے، لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سورۃ کی آیات قد افلح من تزکی ۞ وذکر اسم ربہ فصلی چونکہ صدقہ فطر کے بارے میں ہے اور صدقہ فطر اور نماز عید کا واجب قرار دیا جانا ۲ھ کا واقعہ ہے اس لئے سورۂ سبح اسم ربک الاعلی کو مکی سورۃ کہنے پر اشکال واقع ہو سکتا ہے ہاں اگر یہ کہا جائے کہ ان دو آیتوں یعنی قد افلح من تزکی ۞ وذکر اسم ربہ فصلی ۞ کے علاوہ بقیہ پوری سورۃ مکہ میں نازل ہوئی ہے تو پھر مذکورہ اشکال واقع نہیں ہوگا مگر حقیقت میں نہ اشکال صحیح ہے اور نہ یہ احتمال، کیونکہ صحیح تر روایت کے مطابق یہ سورۃ اپنی تمام آیتوں کے ساتھ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور بعد میں مدینہ آکر جب صدقہ فطر اور نماز عید کو واجب قرار دیا گیا تو رسول کریم ﷺ نے اس وقت ان دونوں آیتوں کی مراد بیان فرمائی کہ ان کا مضمون دراصل صدقہ فطر اور نماز عید کی اہمیت وفضیلت کے اظہار سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں مجرد مالی وبدنی عبادتوں (صدقہ وزکوٰۃ اور صلوٰۃ) کی تلقین وترغیب ہے جس میں اصل مراد کا بیان نہیں ہے، اس اصل مراد کو بعد میں سُنّت نے اس وقت بیان کیا جب صدقہ فطر اور نماز عید کو واجب قرار دیا گیا۔

وہ رمز جس کو صرف صدیق اعظمؓ نے پہچانا

(۴) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَلَسَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ اِنَّ عَبْدًا خَیَّرَہُ اللّٰہُ بَیْنَ اَنْ یُّؤْتِیَہٗ مِنْ زَھْرَۃِ الدُّنْیَا مَاشَآءَ وَ بَیْنَ مَاعِنْدَہٗ فَاخْتَارَ مَاعِنْدَہٗ فَبَکٰی اَبُوْبَکْرٍ قَالَ فَدَیْنَاکَ بِاٰبَائِنَا وَاُمَّھَاتِنَا فَعَجِبْنَا لَہٗ فَقَالَ النَّاسُ اُنْظُرُوْا اِلٰی ھٰذَا الشَّیْخِ یُخْبِرُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ عَبْدٍ خَیَّرَہُ اللّٰہُ بَیْنَ اَنْ یُّؤْتِیَہٗ مِنْ زَھْرَۃِ الدُّنْیَا وَبَیْنَ مَاعِنْدَہٗ وَھُوَ یَقُوْلُ فَدَیْنَاکَ بِاٰبَائِنَا وَاُمَّھَاتِنَا فَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھُوَ الْمُخَیَّرَ وَکَانَ اَبُوْبَکْرٍ اَعْلَمَنَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (مرض وفات کے ایام میں ایک دن، یا جیسا کہ ایک روایت میں وضاحت بھی ہے، وفات سے پانچ راتیں پہلے) منبر پر تشریف فرما ہوئے اور (ہمیں خطاب کرتے ہوئے) فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک بندہ کو دونوں چیزوں کے درمیان

اختیار دے دیا ہے کہ چاہے تو وہ اس دنیا کی بہار کا انتخاب کرلے جو اللہ دینا چاہے (یا جو خود بندہ لینا چاہے) اور چاہے اس چیز کا انتخاب کرلے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے (یعنی آخرت کی نعمتیں) پس اس بندہ نے اللہ کے ہاں کی نعمتوں (اور آخرت کے اجر و ثواب) کا انتخاب کرلیا ہے (کیونکہ اصل اور ابدی نعمتیں تو وہی ہیں) حضرت ابوبکرؓ (آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سن کر) ایک دم رو پڑے اور عرض کیا: (یارسول اللہ! اگر ہماری جانوں کا نذرانہ کچھ کارگر ہوسکے تو) ہم آپ (ﷺ) پر قربان ہوں، ہمارے ماں باپ آپ (ﷺ) پر قربان ہو جائیں۔ ہم لوگوں (یعنی وہاں موجود صحابہ) کو حضرت ابوبکرؓ پر سخت حیرت ہوئی (کہ آخر اس موقع پر جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کا باعث کیا چیز بنی ہے!؟ چنانچہ کچھ لوگوں نے تو (آپس میں ایک دوسرے سے) یہ بھی کہا کہ ذرا ان بڑے میاں کو تو دیکھو (اتنی پختہ عمر اور عقل رکھنے کے باوجود کیسی بے تکی بات کر رہے ہیں کہ) رسول کریم ﷺ تو کسی بندے کا حال بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دونوں چیزوں کا اختیار دے دیا ہے کہ چاہے دنیا کی بہار کا انتخاب کرے اور چاہے اللہ کے ہاں کی نعمتوں کا، اور یہ بڑے میاں کہہ رہے ہیں کہ (یارسول اللہ!) ہم آپ ﷺ پر قربان ہوں، ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں!؟ (لیکن مراد خود اپنی ذات مبارک تھی) بلاشبہ حضرت ابوبکرؓ ہم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ دانا تھے (انہوں نے شروع ہی میں اس (رمز کو پہچان لیا کہ جس بندہ کو اختیار دیئے جانے کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ خود آنحضرت ﷺ ہی ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فہم و ادراک کا کمال تھا، انہوں نے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سنتے ہی تاڑ لیا کہ ذات رسالت پناہ ﷺ کی مفارقت کا وقت قریب آگیا ہے، اور ہمارے درمیان آپ ﷺ چند ہی دنوں کے مہمان ہیں انہوں نے یہ حقیقت یا تو آپ ﷺ کی شدید علالت قرینیہ سے پہچانی تھی یا انہوں نے اس گہرائی میں جا کر ارشاد گرامیؐ کے رمز کو تلاش کیا کہ دنیا کی عزت اور پر بہار نعمتوں سے منہ موڑ لینا اور آخرت کی ابدی حقیقتوں کو برضاء و رغبت اختیار کرلینا وہ وصف ہے جو صرف اللہ کے نیک ترین اور مقرب ترین بندوں کے مقام تسلیم و رضا اور قرب کو ظاہر کرتا ہے، ادھر وہ جانتے ہی تھے کہ اس دنیا کی نعمتیں، مقام سید الانبیاء کے شایان شان نہیں ہیں، لہٰذا ان کا ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل ہوگیا کہ آنحضرت ﷺ "ایک بندہ" کے ذریعہ دراصل اپنی ذات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ دنیاوی حیات و بقا کو چھوڑ کر موت اور بقاء حق کو اختیار کرلینے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔

وداعی نماز اور وداعی خطاب

(۴) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى قَتْلٰى اُحُدٍ بَعْدَ ثَمَانِ سِنِيْنَ كَالْمُوَدِّعِ لِلْاَحْيَاءِ وَالْاَمْوَاتِ ثُمَّ طَلَعَ الْمِنْبَرَ فَقَالَ اِنِّيْ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ فَرَطٌ وَاَنَا عَلَيْكُمْ شَهِيْدٌ وَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْحَوْضُ وَاِنِّيْ لَاَنْظُرُ اِلَيْهِ وَاَنَا فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا وَاِنِّيْ قَدْ اُعْطِيْتُ مَفَاتِيْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ وَاِنِّيْ لَسْتُ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ اَنْ تُشْرِكُوْا بَعْدِيْ وَلٰكِنِّيْ اَخْشٰى عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا اَنْ تَنَافَسُوْا فِيْهَا وَزَادَ بَعْضُهُمْ فَتَقْتَتِلُوْا فَتَهْلِكُوْا كَمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک ایسے شخص کی مانند کہ جو زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو، احد کے شہیدوں پر (ان کی تدفین کے) آٹھ سال بعد نماز پڑھی اور پھر منبر پر جلوہ افروز ہو کر (ہمیں خطاب کیا اور) فرمایا: "میں تمہارے آگے تمہارا میر منزل ہوں، میں تمہارا شاہد ہوں، تم سے کیا گیا وعدہ پورا ہونے کی جگہ حوض کوثر ہے اور یقین جانو میں اس وقت بھی اپنے منبر پر بیٹھا ہوا حوض کوثر دیکھ رہا ہوں، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں اور میں اس بات سے تو نہیں ڈرتا کہ تم سب میرے بعد کفر و شرک اختیار کرلو گے البتہ مجھے یہ ڈر ضرور ہے کہ دنیا میں تمہاری دلچسپی زیادہ ہو جائے گی" بعض راویوں نے یہاں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں "اور (دنیا میں تمہاری دلچسپی حد سے زیادہ بڑھ جانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) تم (ملک و دولت اور حکومت و اقتدار کی چھینا جھپٹی میں ایک دوسرے کا) قتل و قتال کرنے لگو گے اور پھر تم لوگ بھی اسی طرح ہلاکت و تباہی کا شکار ہو جاؤ گے جیسے پہلے لوگ ہلاک و تباہ ہو گئے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جیسے عام طور پر ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے موجودہ مقام سے کسی دوسرے مقام کو منتقل ہوتا ہے اور جدائی سے پہلے اپنے لوگوں سے وداعی سلام وکلام کرتا ہے، اسی طرح آنحضرت ﷺ نے اپنے آخر زمانہ حیات میں یعنی یوم وفات سے چند دن پہلے شہدائے احد کے لئے نماز پڑھی جو گویا مردوں کو وداع کہنا تھا اور پھر منبر پر جلوہ افروز ہو کر اپنے صحابہ کے سامنے ایسا بلیغ وعظ ارشاد فرمایا جس سے آپ کا اس دنیا سے رخصت ہونا اور زندوں کو وداع کہنا مفہوم ہوتا تھا۔ پس مردوں کو وداع کہنے کا مطلب تو یہ تھا کہ ان کے ساتھ اس دنیاوی تعلق کا وہ سلسلہ اب ختم ہونے والا ہے جو دعاء استغفار اور ایصال ثواب کی صورت میں زندگی بھر جاری رہا اور زندوں کو وداعی کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ بہت جلد اپنے صحابہ اور اپنے متعلقین کے درمیان سے اٹھ جائیں گے اور اس دنیا میں ذات رسالت کے وجود سے جو نور ہدایت اور فیضان صحبت حاصل ہوتا وہ کسی کو پھر کبھی اس دنیا میں حاصل نہیں ہوگا۔

"شہدائے احد کے لئے نماز پڑھی" کے تحت ایک چھوٹی سی فقہی بحث بھی ہے اور وہ یہ کہ حنفیہ کے مسلک میں چونکہ شہداء کی بھی نماز جنازہ ہے اس لئے حنفی علماء کے نزدیک یہاں "نماز" کا لفظ اپنے معروف معنی یعنی نماز جنازہ کے لئے استعمال ہوا ہے جب کہ شافعی علماء جن کے مسلک میں شہداء کے لئے نماز جنازہ نہیں ہے کہتے ہیں کہ شہداء احد کے لئے نماز پڑھنے سے مراد یہ ہے کہ آپ نے شہداء احد کے حق میں دعاء استغفار کیا۔

"میں تمہارے آگے تمہارا میر منزل ہوں" میں "میر منزل" فرط کا ترجمہ ہے، اور فرط عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جو قافلہ پیچھے چھوڑ کر خود منزل پر پہلے پہنچ جائے تاکہ وہاں قافلہ کے لئے پہلے سے قیام وطعام اور جملہ آسائش وضروریات کا انتظام درست رکھے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ میں تم لوگوں سے پہلے عالم آخرت میں جارہا ہوں تاکہ وہاں تم لوگوں (یعنی اپنی اُمت کی) کی کارسازی اور نجات وشفاعت کے اسباب مہیا کروں، یا یہ کہ حشر میں تمہاری شفاعت چونکہ مجھے کرنی ہے اس لئے تم سے پہلے وہاں پہنچ کر میں شفاعت کے لئے تیار ہوں گا۔

"میں تمہارا شاہد ہوں" سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اگر میں تم لوگوں کو چھوڑ کر جارہا ہوں مگر تمہارے احوال ومعاملات سے بے تعلق اور لاعلم نہیں رہوں گا کیونکہ تمہارے اعمال وحالات وہاں میرے سامنے پیش کئے جاتے رہیں گے۔ یا یہ کہ میں تمہارا شاہد یعنی گواہ ہوں، وہاں میں تمہاری فرمانبرداری وطاعت اور تمہارے دعوت اسلام قبول کرنے کی گواہی دوں گا۔

"وعدہ پورا ہونے کی جگہ حوض کوثر ہے" کا مطلب تھا کہ آخرت میں حوض کوثر وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر نیک باطن اور بدباطن اور مؤمن اور منافق کے درمیان خط امتیاز قائم ہو جائے گا، اس طرح محشر میں تمہاری شفاعت خاص کا جو میرا وعدہ ہے وہ حوض کوثر پر پورا ہوگا کہ وہاں صرف اہل ایمان کو میری شفاعت پر حوض کوثر سے سیراب ہونے کا موقع ملے گا یہ مطلب ملا علی قاری نے لکھا ہے اور حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ محشر میں میرے دیدار کا تم سے جو وعدہ ہے اس کے پورا ہونے اور میرے اور تمہارے درمیان ملاقات کی جگہ حوض کوثر ہے۔

"حوض کوثر دیکھ رہا ہوں" یہ ارشاد گرامی اپنے ظاہری معنی پر ہی محمول تھا، اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں، مطلب یہ کہ اس وقت جبکہ آپ ؐ اپنے منبر پر بیٹھے ہوئے صحابہؓ کو خطاب کر رہے تھے گویا آپ ؐ کے لئے حوض کو آخرت کے پردوں سے بے حجاب کر دیا گیا تھا اور آپ ﷺ اپنی ظاہری آنکھوں سے اس کو دیکھ رہے تھے۔

"مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دیدی گئی ہیں" کا مطلب یہ تھا کہ میرے بعد مجاہدین اُمت کے ہاتھوں جو بڑے بڑے علاقے اور شہر فتح ہوں گے اور وہاں کے لوگ ایمان واسلام قبول کرلیں گے، ان کے خزانے میری اُمت کے ہاتھوں میں آجائیں گے۔

"دنیا میں تمہاری دلچسپی زیادہ ہو جائے گی" کے ذریعہ آپ ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ میرے بعد بھی تم لوگ انشاء اللہ ایمان ودین پر قائم (رہو) گے، یہ اور بات ہے کہ بعض بدنصیب لوگ کفر وشرک کے اندھیروں کی طرف پھر لوٹ جائیں مگر بحیثیت مجموعی ساری اُمت دوبارہ گمراہ نہیں ہو سکتی، ہاں یہ تو ہو سکتا ہے کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ تمہاری دینی زندگی میں بھی اضمحلال آجائے اور تم دنیا

میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگو جو تمہاری شان اور تمہاری حیثیت سے فروتر بات بھی ہوگی اور تمہاری دینی وملی زندگی پر اس کے مضر اثرات بھی مرتب ہوں گے۔ دراصل اس ارشاد گرامی میں اُمت کے لئے یہ تنبیہ ہے کہ اہل ایمان کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا کی فانی نعمتوں اور لذتوں کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہوں اور ان کی بڑی دلچسپی کا مرکز دنیا بن جائے، ان کی شان تو یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر دلچسپی اور اپنی ساری رغبت آخرت کی نعمتوں میں رکھیں کیونکہ باقی اور قائم رہنے والی نعمتیں تو وہی ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے۔

وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔

"اور نعمتوں کے شائقین (یعنی اہل ایمان) کو چاہیے کہ وہ اسی (آخرت) کی نعمتوں سے رغبت ودلچسپی رکھیں۔"

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے آنحضرت ﷺ کے متعدد معجزوں کا اظہار ہوتا ہے ایک تو یہ کہ آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ میری امت زمین کے خزانوں کی مالک بنے گی بالکل سچ اور واقعہ کے مطابق ثابت ہوا، دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے اپنی اُمت کے بارے میں جو یہ خبر دی کہ وہ مرتد نہیں ہوگی تو ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدی کو کفر وارتداد سے بچایا، اور تیسرے یہ کہ آپ ﷺ کا یہ فرمانا بھی کہ میری اُمت کے لوگ دنیا میں زیادہ دلچسپی لینے لگیں گے بالکل صحیح ثابت ہوا۔

حیات نبوی کے آخری لمحات

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ مِنْ نِعَمِ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَیَّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُوُفِّیَ فِیْ بَيْتِیْ وَفِیْ يَوْمِیْ وَ بَيْنَ سَحْرِیْ وَنَحْرِیْ وَاِنَّ اللّٰهَ جَمَعَ بَيْنَ رِيْقِیْ وَرِيْقِهٖ عِنْدَ مَوْتِهٖ وَدَخَلَ عَلَیَّ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ اَبِیْ بَكْرٍ وَبِيَدِهٖ سِوَاكٌ وَاَنَا مُسْنِدَةٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَاَيْتُهٗ يَنْظُرُ اِلَيْهِ وَعَرَفْتُ اَنَّهٗ يُحِبُّ السِّوَاكَ فَقُلْتُ اٰخُذُهٗ لَكَ فَاَشَارَ بِرَاْسِهٖ اَنْ نَعَمْ فَتَنَاوَلْتُهٗ فَاشْتَدَّ عَلَيْهِ وَقُلْتُ اُلَيِّنُهٗ لَكَ فَاَشَارَ بِرَاْسِهٖ اَنْ نَعَمْ فَلَيَّنْتُهٗ فَاَمَرَّهٗ وَبَيْنَ يَدَيْهِ رَكْوَةٌ فِيْهَا مَاءٌ فَجَعَلَ يُدْخِلُ يَدَيْهِ فِی الْمَاءِ فَيَمْسَحُ بِهِمَا وَجْهَهٗ وَيَقُوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ ثُمَّ نَصَبَ يَدَهٗ فَجَعَلَ يَقُوْلُ فِی الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰی حَتّٰی قُبِضَ وَمَالَتْ يَدُهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن انعامات سے مجھے خصوصی طور پر نوازا ان میں سے یہ بھی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے میرے گھر میں اور میری باری کے دن وفات پائی، آپ ﷺ نے میرے سینہ اور ہنسلی کے درمیان اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی وفات کے وقت میرے اور آپ کے لعاب دہن کو جمع کر دیا (جس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ آپ ﷺ کے ان آخری لمحات میں میرے عزیز بھائی عبدالرحمن ابن ابوبکرؓ جب میرے پاس آئے تو ان کے ہاتھ میں مسواک تھی اور رسول کریم ﷺ میرے سینہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی نظر (بار بار) ان کی طرف (یعنی عبدالرحمن کی طرف یا یہ کہ ان کی مسواک کی طرف) اٹھ رہی ہے۔ میں یہ بات چونکہ جانتی تھی کہ آپ ﷺ (عام طور پر یا تبدیلی ذائقہ کے وقت خاص طور پر) مسواک کو بہت پسند فرماتے ہیں اس لئے میں نے پوچھا کہ کیا عبدالرحمن سے یہ مسواک آپ (ﷺ) کے لئے لے لوں؟ آپ ﷺ نے سر کے اشارہ سے بتایا کہ ہاں لے لو۔ میں نے عبدالرحمن سے مسواک لے کر آپ ﷺ کو دیدی۔ آپ ﷺ نے (مسواک کرنی چاہی تو اس کے سخت ہونے کی وجہ سے) دشواری محسوس کی، اب میں نے عرض کیا کہ میں آپ کی آسانی کے لئے اس مسواک کو (اپنے دانتوں سے) نرم کر دوں؟ آپ ﷺ نے پھر سر کے اشارہ سے اجازت دی تو میں نے مسواک کو نرم کر دیا اور آپ ﷺ نے وہ مسواک اپنے دانتوں پر پھیری (بالکل آخری لمحات اس طرح گذرے کہ اس وقت) آپ ﷺ کے سامنے پانی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا، اس پانی میں آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ ڈالتے اور (بھگو کر) اپنے چہرۂ مبارک پر پھیر لیتے تھے اور فرماتے: لا الٰہ الا اللہ، موت کے

وقت سختیاں ہیں پھر آپ ﷺ نے (دعا کے لئے یا آسمان کی طرف اشارہ کرنے کے لئے) ہاتھ اٹھا کر یہ کہنا شروع کیا: (اے اللہ!) مجھ کو رفیق اعلی میں شامل فرما! یہاں تک کہ روح پرواز کر گئی اور آپ ﷺ کے دست مبارک نیچے گر پڑے۔" (بخاری)

تشریح: "اور میری باری کے دن وفات پائی" کے ذریعہ حضرت عائشہؓ نے اس طرف اشارہ کیا کہ اگرچہ آنحضرت ﷺ وفات کے دن تک مرض الموت کی پوری مدت میں میرے ہی گھر میں رہے لیکن میری مزید خوش بختی یہ رہی کہ جس دن آپ ﷺ کی وفات ہوئی وہ حساب کے اعتبار سے وہی دن تھا جس میں میرے ہاں قیام کی باری آتی جامع الاصول میں لکھا ہے کہ جس دن آنحضرت ﷺ کے مرض الموت کی ابتداء سر کے درد سے ہوئی اس دن بھی آپ ﷺ حضرت عائشہ ہی کے ہاں تھے اور اس کے بعد جس دن درد سر اور بیماری میں شدت پیدا ہوئی تو آپ ﷺ حضرت میمونہؓ کے ہاں تھے، اس وقت آپ ﷺ کی ازواج مطہرات سے بہ رضا ورغبت آپ ﷺ کو اجازت دیدی مرض الموت کی شدت بارہ دن رہی اور آپ ﷺ کی وفات ربیع الاول کے مہینے میں دو شنبہ (پیر) کے دن چاشت کے وقت ہوئی، تاریخ کے بارے میں بعض حضرات نے ۱۲ ربیع الاول بیان کی ہے اور اکثر روایتوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے

"میرے سینہ اور ہنسلی کے درمیان" کا مطلب یہ ہے کہ پاک روح نے جس وقت جسد اطہر سے پرواز کی تو آپ حضرت عائشہؓ کے سینہ اور گردن سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ یہ بات حضرت عائشہؓ کے مقام محبوبیت اور کمال قرب و تعلق پر دلالت کرتی ہے حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد طرق کثیرہ سے نقل کی گئی حاکمؒ اور ابن سعدؒ کی اس روایت: "اس وقت آنحضرت ﷺ کا سر مبارک حضرت علیؓ کی گود میں تھا" کے معارض نہیں ہے **کیونکہ اول تو ان دونوں نے جن طرق کثیرہ سے اس روایت کو نقل کیا ہے ان میں سے کوئی بھی طریق سند ایسا نہیں ہے جو** ـــــــــ کسی بھی طرح کی ایک خرابی سے خالی نہ ہو، دوسرے یہ کہ اگر ان طرق کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس روایت کی تاویل یہ کی جائے گی کہ آپ ﷺ کا سر مبارک حضرت علیؓ کی گود میں وفات سے پہلے تھا۔

"میرے اور آپ ﷺ کے لعاب دہن کو جمع کر دیا تھا" یعنی جب آنحضرت ﷺ نے عبدالرحمنؓ کی مسواک اپنے منہ میں لے کر کرنی چاہی اور اس کے سخت ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کو دشواری ہوئی تو پھر حضرت عائشہؓ نے اس مسواک کو اپنے دانتوں سے نرم کیا اور آپ ﷺ نے وہ نرم کی ہوئی مسواک اپنے دانتوں پر پھیری اس طرح دونوں کے لعاب دہن حضرت عائشہؓ کے منہ میں بھی جمع ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے منہ میں بھی پس حضرت عائشہؓ نے گویا یہ واضح کیا کہ آنحضرت ﷺ کے مقدس لعاب دہن کی برکت حاصل ہونا یوں تو ہمیشہ میرے لئے بڑی نعمت رہا لیکن عین وفات کے وقت کے اس لعاب دہن کی برکت کا حصول تو میرے لئے بہت بڑی نعمت تھی کیونکہ وہ وقت تمام برکتوں اور سعادتوں کا منتہائے آخر تھا یا اس جملہ کے ذریعہ حضرت عائشہؓ نے اس طرف اشارہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کے لعاب دہن کی برکت مجھے اسی وقت حاصل ہوئی اس سے قبل اور کبھی یہ نعمت مجھے حاصل نہیں ہوئی تھی۔

"اور بھگو کر اپنے چہرہ مبارک پر پھیر لیتے تھے" اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اس وقت آپ ﷺ کے مزاج مبارک پر حرارت کا بہت غلبہ تھا اور بھیگا ہوا ہاتھ چہرہ پر پھیر لینے سے ایک گونہ تسکین مل جاتی تھی لیکن اس میں آنحضرت کی طرف سے اپنے عجز اور عبودیت کے اظہار کا اشارہ بھی تھا اور اس سے یہ بات بھی نکلی کہ سکرات الموت کے وقت یہ عمل ہر مریض کو اختیار کرنا چاہئے اور اگر خود مریض اس پر قادر نہ ہو تو تیمار داروں کو چاہیئے کہ وہ اس سُنّت پر عمل کرتے ہوئے، پانی میں ہاتھ تر کر کے مریض کے چہرے پر پھیریں یا اس کے حلق میں پانی ٹپکائیں کیونکہ اس سے کرب میں تخفیف ہوئی ہے بلکہ اگر حاجت شدید ہو تو پھر پانی ٹپکانا واجب ہو جاتا ہے۔

"سکرات" دراصل "سکرۃ" کی جمع ہے جس کے معنی سختی کے ہیں اور "سکرات الموت" سے جان کنی کے وقت کی وہ سختیاں اور دشواریاں مراد ہیں جو اندرونی تپش و سوزش اور مزاج و طبیعت کو پیش آنے والی سخت تلخیوں کی صورت میں جاں بہ لب کو برداشت کرنا پڑتی ہیں، اور ان سختیوں اور دشواریوں کا سامنا انبیاء اور ارباب حق کو بھی کرنا پڑتا ہے اور صرف حق تعالیٰ کا فضل و کرم ہی اس آڑے وقت میں دستگیری کرتا ہے لہذا سکرات الموت سے پناہ، مانگنا اور جان بہ لب مریض کے لئے ان سختیوں میں آسانی کی دعا کرنا نہایت ضروری

ہوتا ہے۔

ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ: میں نے آنحضرت ﷺ کو نزع کے وقت دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے پاس رکھے ہوئے پانی کے پیالہ میں اپنا ہاتھ تر کر کے چہرہ مبارک پر پھیرتے جاتے تھے اور زبان مبارک پر یہ دعا جاری تھی لا الہ الا اللہ ان للموت سکرات ایک روایت میں سکرات الموت کے بجائے منکرات الموت کے الفاظ ہیں، مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے کہ: الٰہی! موت کی ان سختیوں کے وقت میری مدد فرما! "مجھ کو رفیق اعلی میں شامل فرما" لفظ "رفیق" اسم جنس ہے کہ اس کا اطلاق فرد واحد پر بھی ہوتا ہے اور بہت سوں پر بھی پس رفیق اعلی" سے مراد انبیاء کرام ہیں جو اعلی علیین میں پہنچ چکے ہیں، اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں اس دعا کے یہ الفاظ بھی مذکور ہیں کہ (یعنی انبیاء کے ساتھ) صدیقین کے ساتھ شہداء کے ساتھ اور صالحین کے ساتھ کہ وہی لوگ (اچھے رفیق ہیں) یا یہ کہ "رفیق اعلی" سے مراد ملاء اعلی اور عالم ملکوت یعنی آسمانوں میں رہنے والے فرشتے وغیرہ ہیں اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ "رفیق اعلی" سے مراد اللہ رب العزت ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بھی "رفیق" کا اطلاق منقول ہے، جیسے ایک روایت میں آیا ہے کہ: اس کی طرف سے آپ ﷺ کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ چاہے آپ ﷺ (ابھی کچھ دن اور) دنیا میں رہنا پسند کر لیں چاہے اس کے پاس (بارگاہ حق میں) پہنچ جائیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اخترت الرفیق الاعلی (میں نے رفیق اعلی کو اختیار کیا)

انبیاء کو موت سے پہلے اختیار

⑤ وَعَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ نَبِيٍّ يَمْرَضُ اِلَّا خُيِّرَ بَيْنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَكَانَ فِيْ شَكْوَاهُ الَّذِيْ قُبِضَ اَخَذَتْهُ بُحَّةٌ شَدِيْدَةٌ فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ فَعَلِمْتُ اَنَّهُ خُيِّرَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "ہر نبی کو اس کے مرض الموت میں دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیدیا جاتا ہے (کہ چاہے تو وہ کچھ مدت تک دنیا کی زندگی کو اختیار کئے رہے اور چاہے عالم آخرت کے سفر کو اختیار کر لے لیکن ہمیشہ ایسا ہوا کہ ہر نبی نے دنیا کی زندگی کو رد کر کے اللہ کے ہاں جانے کو پسند و اختیار کیا کیونکہ جو کچھ اللہ کے ہاں ہے اصل نعمت وہی ہے اور اسی کو دوام و قرار ہے)" پھر جب آنحضرت ﷺ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور (وہ مرحلہ آیا کہ) آواز سخت بھاری ہوگئی (جیسے جان کنی کے وقت سانس یا بلغم حلق میں آکر اٹک جاتا ہے اور اس کی وجہ سے آواز میں خرخراہٹ اور بھاری پن پیدا ہو جاتا ہے) تو اس وقت میں نے سنا آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: "(الٰہی) مجھ کو ان لوگوں میں شامل فرما جن پر تو نے اپنا فضل وانعام کیا ہے کہ وہ انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں (وہی لوگ اچھے رفیق ہیں)" ان دعائیہ الفاظ سے میں سمجھ گئی کہ آنحضرت ﷺ کو (دنیاوی زندگی اور عالم آخرت میں سے کسی ایک کو چن لینے کا) اختیار (دیدیا گیا ہے (اور آخر آپ ﷺ نے دنیاوی زندگی کو چھوڑ کر عالم آخرت کو چن لیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

حضرت فاطمہؓ کا غم و حزن

⑥ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ لَمَّا ثَقُلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَعَلَ يَتَغَشَّاهُ الْكَرْبُ فَقَالَتْ فَاطِمَةُ وَاكَرْبَ اَبَاهُ فَقَالَ لَهَا لَيْسَ عَلٰى اَبِيْكِ كَرْبٌ بَعْدَ الْيَوْمِ فَلَمَّا مَاتَ قَالَتْ يَا اَبَتَاهُ اَجَابَ رَبًّا دَعَاهُ يَا اَبَتَاهُ مَنْ جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ مَاْوَاهُ يَا اَبَتَاهُ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ نَنْعَاهُ فَلَمَّا دُفِنَ قَالَتْ فَاطِمَةُ يَا اَنَسُ اَطَابَتْ اَنْفُسُكُمْ اَنْ تَحْثُوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ التُّرَابَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں: جب (وفات کے دن) نبی کریم ﷺ کی حالت بہت بگڑ گئی اور مرض کی شدت آپ ﷺ پر (بار بار بیہوشی طاری کرنے لگی تو حضرت فاطمہؓ (بیتاب ہو کر) کہنے لگیں: ہائے میرے بابا جان کو کیسی سختی نے گھیرا ہے آنحضرت ﷺ نے (یہ سنا تو)

ان کو مخاطب کر کے فرمایا: آج کے بعد پھر تمہارے باباجان کو کوئی سختی نہیں گھیرے گی! مطلب یہ تھا کہ کرب اور سختی مرض کی شدت کی وجہ سے ہے اور اس کرب وسختی کا احساس وظاہر جسم سے تعلق رکھنے کے سبب سے ہے، لیکن آج کے دن کے بعد جب اس جسم سے تعلق ختم ہو چکا ہوگا اور صرف روحانی و معنوی علائق باقی رہ جائیں گے تو پھر سکون ہی سکون ہوگا، اور پھر جب آپ کا انتقال ہو گیا تو حضرت فاطمہؓ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے: اے میرے باباجان! اللہ نے آپ ﷺ کو اپنے پاس بلایا اور آپ اس دعوت کو قبول کر کے اپنے پروردگار کے پاس چلے گئے۔ اے میرے باباجان! اے وہ مقدس ذات جس کا مستقر جنت الفردوس ہے۔ اے میرے باباجان! ہم آپ ﷺ کی وفات کی خبر جبرئیل علیہ السلام کو پہنچاتے ہیں بعد میں جب آپ کو دفن کر دیا گیا تو حضرت فاطمہؓ بے اختیار ہو کر کہنے لگیں ارے انسؓ اور اے صحابہ رسول! تم لوگوں نے آخر یہ کیسے گوارہ کر لیا کہ رسول اللہ ﷺ پر مٹی ڈال دو؟۔" (بخاریؒ)

اس موقع پر حضرت فاطمہؓ کے دو شعر مندرجہ ذیل ہیں ؎

مَاذَا عَلٰی مَنْ شَمَّ تُرْبَۃَ اَحْمَد اِنْ لَمْ یَشُمَّ مَدَی الزَّمَانِ غَوَا لِیَا

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّھَا صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَا لِیَا

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

مدینہ غم واندوہ میں ڈوب گیا

(۷) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمَدِیْنَۃَ لَعِبَتِ الْحَبَشَۃُ بِحِرَابِھِمْ فَرَحًا لِقُدُوْمِہٖ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَفِیْ رِوَایَۃِ الدَّارِمِیِّ قَالَ مَارَأَیْتُ یَوْمًا قَطُّ کَانَ اَحْسَنَ وَلَا اَضْوَءَ مِنْ یَوْمٍ دَخَلَ عَلَیْنَا فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَا رَاَیْتُ یَوْمًا کَانَ اَقْبَحَ وَلَا اَظْلَمَ مِنْ یَوْمٍ مَاتَ فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَفِیْ رِوَایَۃِ التِّرْمِذِیِّ قَالَ لَمَّا کَانَ الْیَوْمُ الَّذِیْ دَخَلَ فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمَدِیْنَۃَ اَضَاءَ مِنْھَا کُلُّ شَیْءٍ فَلَمَّا کَانَ الْیَوْمُ الَّذِیْ مَاتَ فِیْہِ اَظْلَمَ مِنْھَا کُلُّ شَیْءٍ وَمَا نَفَضْنَا اَیْدِیَنَا عَنِ التُّرَابِ وَاِنَّا لَفِیْ دَفْنِہٖ حَتّٰی اَنْکَرْنَا قُلُوْبَنَا۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں: رسول کریم ﷺ نے مدینہ میں نزول اجلال فرمایا تھا تو (تمام لوگوں نے بے پناہ خوشی و مسرت کا اظہار کیا یہاں تک کہ) حبشیوں نے (بھی جشن مسرت منانے کے طور پر) نیزوں کے کھیل کرتب دکھائے تھے یہ (روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے، اور دارمیؒ نے جو روایت نقل کی ہے اس میں یوں ہے کہ حضرت انسؓ نے کہا: "میں نے اس دن سے زیادہ حسین اور روشن دن اور کوئی نہیں دیکھا جس دن (مدینہ میں) ہمارے درمیان رسول کریم ﷺ تشریف لائے تھے، اور میں نے اس دن سے زیادہ برا اور تاریک دن اور کوئی نہیں دیکھا جس دن رسول کریم ﷺ کی وفات ہوئی" اور ترمذیؒ کی روایت میں ہے کہ حضرت انسؓ نے کہا: جب وہ دن آیا کہ رسول کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو (مدینہ کی) ہر چیز (یعنی درو دیوار وغیرہ) پر نور پھیل گیا جب وہ دن آیا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی تو ہر چیز (غم اندوہ کی) تاریکی میں ڈوب گئی اور آپ ﷺ کی تدفین کے بعد ہم نے ابھی اپنے ہاتھوں سے مٹی جھاڑی بھی نہیں تھی بلکہ آپ ﷺ کی تدفین ہی میں مشغول تھے کہ اپنے دلوں میں ایک دوسرے سے ناآشنائی محسوس کرنے لگے تھے۔"

تشریح: مدینہ میں آنحضرت کی آمد کا دن نہایت حسین بھی تھا بڑا تابناک بھی، کیونکہ وہ دن مشتاقان جمال کے لئے وصال وقرب کا دن تھا ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کا دن تھا، نہ صرف یہ کہ ان کے دل و دماغ کھل اٹھے تھے بلکہ ان کے درودیوار تک نور نبوت کی جلوہ ریزی سے جگمگا اٹھے تھے اور پھر جب وہ دن آیا کہ آفتاب نبوت اس دنیا سے رخصت ہوا تو مدینہ والوں کی دنیا اندھیری ہو گئی، ہر سو غم

واندوہ کی تاریکی چھاگئی کیونکہ وہ دن عشاقان جمال نبوت کے لئے فراق کا دن تھا، ان کی مسرتوں اور شادمانیوں کی جدائی کا دن تھا۔

"ایک دوسرے سے آشنائی محسوس کرنے لگے تھے۔" مطلب یہ کہ ہمارے درمیان سے آنحضرت ﷺ کے اٹھ جانے اور اس دنیا سے آفتاب نبوت کے رخصت ہوجانے کے سبب ہم پر جو تاریکی چھائی تو ہمیں بین طور پر محسوس ہوا کہ ہمارے دلوں کی وہ پاکیزگی اور نورانیت جو ذات رسالت کے مشاہدہ وصحبت کے نتیجہ میں حاصل ہوتی رہتی تھی اس کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے اور ہمارے قلوب میں صدق و اخلاص اور مہروو فا کی وہ پہلی والی کیفیت باقی نہیں رہی ہے۔

تدفین کے بارے میں اختلاف اور حضرت ابوبکرؓ کی صحیح راہنمائی

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِخْتَلَفُوْا فِيْ دَفْنِهٖ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَالَ مَا قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيًّا اِلَّا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِيْ يُحِبُّ اَنْ يُّدْفَنَ فِيْهِ اُدْفُنُوْهُ فِيْ مَوْضِعِ فِرَاشِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کا انتقال ہوگیا اور آپ ﷺ کی تدفین کے بارے میں صحابہؓ کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا: میں نے (اس سلسلہ میں) خود رسول کریم ﷺ سے ایک بات سنی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا تھا: "اللہ تعالیٰ ہر نبی کی روح اس جگہ قبض کرتا ہے جہاں وہ نبی دفن ہونا پسند کرتا ہے (یا یہ کہ جہاں اللہ تعالیٰ اس نبی کا دفن کیا جانا پسند کرتا ہے)" لہٰذا آنحضرت ﷺ کو اس جگہ دفن کرنا چاہئے جہاں آپ بستر مرگ پر تھے (اور جہاں آپ ﷺ کی وفات ہوئی ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "صحابہؓ کے درمیان اختلاف رائے ہوا" یعنی بعض حضرات کا کہنا تو یہ تھا کہ آپ ﷺ کی تدفین بقیع قبرستان میں ہونی چاہئے اور بعض حضرات یہ کہہ رہے تھے کہ مسجد نبوی میں دفن کرنا زیادہ موزوں ہے جب کہ کچھ حضرات کی رائے یہ بھی تھی کہ آپ کی تدفین بیت المقدس میں عمل میں آنی چاہئے کیونکہ اکثر انبیاء کی قبریں وہیں ہیں یا یہ کہ سرے سے دفن کرنے ہی کے بارے میں یہ اختلاف رائے پیدا ہوگیا تھا کہ آیا آپ ﷺ کو دفن کیا جائے یا نہیں؟ چنانچہ ترمذیؒ ہی کی اور روایت میں یوں ہے کہ اس موقع پر صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے رجوع کیا اور ان سے پوچھا کہ اے صاحب رسول! رسول کریم ﷺ کو دفن کیا جائے یا نہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اسی جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی روح قبض کی ہے اور جہاں آپ ﷺ کی روح قبض کی گئی ہے وہ پاک وطاہر جگہ ہے صحابہؓ سمجھ گئے کہ ابوبکرؓ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے (اور اس طرح حجرۂ عائشہ میں کہ جہاں آپ ﷺ کی وفات ہوئی تھی تدفین عمل میں آئی)۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

وفات سے پہلے ہی نبی کو جنّت میں اس کا مستقر دکھا دیا جاتا ہے

⑨ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ وَهُوَ صَحِيْحٌ اَنَّهٗ لَنْ يُّقْبَضَ نَبِيٌّ حَتّٰى يُرٰى مَقْعَدَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُخَيَّرُ قَالَتْ عَائِشَةُ فَلَمَّا نَزَلَ بِهٖ وَرَاْسُهٗ عَلٰى فَخِذِيْ غُشِيَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَفَاقَ فَاَشْخَصَ بَصَرَهٗ اِلَى السَّقْفِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى قُلْتُ اِذَنْ لَا يَخْتَارُنَا قَالَتْ وَعَرَفْتُ اَنَّهُ الْحَدِيْثُ الَّذِيْ كَانَ يُحَدِّثُنَا بِهٖ وَهُوَ صَحِيْحٌ فِيْ قَوْلِهٖ اَنَّهٗ لَنْ يُّقْبَضَ نَبِيٌّ قَطُّ حَتّٰى يُرٰى مَقْعَدَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُخَيَّرُ قَالَتْ عَائِشَةُ فَكَانَ اٰخِرُ كَلِمَةٍ تَكَلَّمَ بِهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْلُهٗ اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (مرض الموت میں مبتلا ہونے سے قبل) اپنی تندرستی کے زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ کسی نبی کی روح اس وقت قبض نہیں کی جاتی جب تک کہ جنت کا اس کا مستقر (یعنی وہ منازل عالیہ جو اس کے لئے جنت میں مخصوص ہیں) اس کو

دکھا کر اس کو اختیار نہیں دے دیا جاتا (کہ چاہے ابھی اور دنیا میں رہو اور چاہے یہاں ہماری بارگاہ میں آجاؤ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ پھر جب (مرض وفات میں آنحضرت ﷺ کی موت کا وقت قریب آیا تو اس وقت جب کہ آپ ﷺ کا سر مبارک میری ران پر تھا اور (شدت مرض سے) آپ ﷺ بار بار بے ہوش ہو رہے تھے، (ایک بار) جو ہوش آیا تو آپ ﷺ نے چھت (یعنی آسمان) کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا: الٰہی! میں رفیق اعلیٰ کو پسند کرتا ہوں (مجھے رفیق اعلیٰ میں شامل فرما) میں نے (آپ ﷺ کے یہ الفاظ سنتے ہی) کہا: اب آنحضرت ﷺ نے ہمیں (یعنی دنیا کی زندگی کو) ناپسند کر دیا ہے (اور عالم آخرت کی زندگی کو اختیار کر لیا ہے) کیونکہ مجھے وہ ارشاد گرامی یاد آگیا جو آپ ﷺ نے تندرستی کے زمانہ میں فرمایا تھا کہ کسی نبی کی روح اس وقت تک قبض نہیں کی جاتی جب تک کہ جنت کا اس کا مستقر اس کو دکھا کر اس کو اختیار نہیں دے دیا جاتا (پس آپ ﷺ کا آسمان کی طرف نگاہ اٹھانا گویا جنت میں اپنا مستقر دیکھنا تھا) اور **اللھم رفیق الاعلی** کے الفاظ آپ ﷺ کے اس فیصلہ کا اعلان ہے کہ ملے ہوئے اختیار کے تحت میں نے دنیا کی زندگی کو چھوڑ کر عالم آخرت کو پسند کر لیا ہے) حضرت عائشہؓ نے بیان کیا: نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے جو آخری الفاظ نکلے وہ یہی **اللھم رفیق الاعلی** کے الفاظ تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک والے آخری الفاظ **اللھم الرفیق الاعلی** تھے اور جیسا کہ سہیلیؒ نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے سب سے پہلے جو الفاظ نکلے تھے وہ تھے اللہ اکبر، اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ اپنے زمانہ شیر خوارگی میں دایہ حلیمہؓ کے پاس تھے۔ اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ جب روز ازل حق تعالیٰ نے تمام ارواح عالم سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا تھا جس کو عہد الست کہا جاتا ہے تو اس وقت حق تعالیٰ کے سوال اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ کے جواب میں بلیٰ (جی ہاں یقیناً آپ ہمارے رب ہیں) سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی روح پاک نے کہا تھا۔

زہر کا اثر

⑩ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ يَا عَائِشَةُ مَا اَزَالُ اَجِدُ اَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِيْ اَكَلْتُ بِخَيْبَرَ وَهٰذَا اَوَانُ وَجَدْتُ اِنْقِطَاعَ اَبْهَرِيْ مِنْ ذٰلِكَ السَّمِّ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے مرض وفات میں فرمایا کرتے تھے کہ عائشہؓ! میں نے خیبر میں جو (زہر آلود) کھانا کھالیا تھا (اس کے تکلیف دہ اثرات تو برابر محسوس کرتا تھا لیکن اب اس مرض میں) تو ایسا لگتا ہے کہ اسی زہر کے اثر سے میری رگ جان کٹ جائے گی۔" (بخاری)

تشریح: زہر آلود کھانے سے مراد وہ زہر آلود بکری ہے جو سازش کے تحت ایک یہودی عورت نے فتح خیبر کے موقع پر آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کی تھی اور آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ حصہ کھالیا تھا، اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ پیچھے ایک موقع پر گزر چکا ہے اس وقت اگرچہ ظہور معجزہ کے تحت زہر کا ایسا اثر نہیں ہوا کہ ہلاکت واقع ہو جاتی لیکن اس کے مضر اثرات بہر حال قائم رہ گئے تھے جس کا ظہور بعد میں کبھی کبھی ہو جاتا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے بظاہر اس حکمت کے تحت کہ آپ ﷺ کو درجہ شہادت بھی مل جائے، مرض الموت میں اس زہر کا اصل اثر ظاہر کیا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی موت اس سانپ کے زہر کے اثر سے واقع ہوئی تھی جس نے مدتوں پہلے مکہ سے مدینہ کے سفر ہجرت کے دوران غار ثور میں ان کو ڈسا تھا۔

مرض الموت میں ارادۂ تحریر کا قصہ

⑪ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا حُضِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِي الْبَيْتِ رِجَالٌ فِيْهِمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ

النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلُمُّوْا اَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُ فَقَالَ عُمَرُ قَدْ غَلَبَ عَلَيْهِ الْوَجَعُ وَعِنْدَكُمُ الْقُرْاٰنُ حَسْبُكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ فَاخْتَلَفَ اَهْلُ الْبَيْتِ وَاخْتَصَمُوْا فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُوْلُ قَرِّبُوْا يَكْتُبْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُوْلُ مَا قَالَ عُمَرُ فَلَمَّا اَكْثَرُوا اللَّغَطَ وَالْاِخْتِلَافَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُوْمُوْا عَنِّيْ قَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ فَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ اِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ اَنْ يَّكْتُبَ لَهُمْ ذٰلِكَ الْكِتٰبَ لِاخْتِلَافِهِمْ وَلَغَطِهِمْ وَفِيْ رِوَايَةِ سُلَيْمَانَ بْنِ اَبِيْ مُسْلِمِ الْاَحْوَلِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَوْمَ الْخَمِيْسِ وَمَا يَوْمُ الْخَمِيْسِ ثُمَّ بَكٰى حَتّٰى بَلَّ دَمْعُهُ الْحَصٰى قُلْتُ يَا ابْنَ عَبَّاسٍؓ وَمَا يَوْمُ الْخَمِيْسِ قَالَ اشْتَدَّ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ فَقَالَ ائْتُوْنِيْ بِكَتِفٍ اَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوْا بَعْدَهُ اَبَدًا فَتَنَازَعُوْا وَلَا يَنْبَغِيْ عِنْدَ نَبِيٍّ تَنَازُعٌ فَقَالُوْا مَا شَانُهُ اَهَجَرَ اسْتَفْهِمُوْهُ فَذَهَبُوْا يَرُدُّوْنَ عَلَيْهِ فَقَالَ دَعُوْنِيْ ذَرُوْنِيْ فَالَّذِيْ اَنَا فِيْهِ خَيْرٌ مِمَّا تَدْعُوْنَنِيْ اِلَيْهِ فَاَمَرَهُمْ بِثَلٰثٍ فَقَالَ اَخْرِجُوا الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَاَجِيْزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا كُنْتُ اُجِيْزُهُمْ وَسَكَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ اَوْ قَالَهَا فَنَسِيْتُهَا قَالَ سُفْيَانُ هٰذَا مِنْ قَوْلِ سُلَيْمَانَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (یوم وفات یعنی دوشنبہ سے تین دن قبل پنجشنبہ کے دن) اس وقت جب کہ رسول کریم ﷺ پر مرض کا شدید غلبہ تھا اور گھر میں آپ ﷺ کے بستر مرض کے قریب حضرت عمر بن الخطابؓ سمیت بہت سے لوگ موجود تھے، نبی کریم ﷺ (اچانک فرمانے لگے: لاؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں تاکہ اس کے بعد تمہاری گمراہی کا کوئی سوال پیدا نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے (یہ سن کر وہاں موجود لوگوں سے کہا: (اس وقت) آنحضرت ﷺ پر بیماری کا شدید غلبہ ہے، ویسے تم لوگوں کے پاس قرآن موجود ہی ہے اور تمہیں (راہ مستقیم پر گامزن رکھنے کے لئے) یہ اللہ کی کتاب بہت کافی ہے لیکن وہ لوگ جو (اہل بیت میں سے بھی تھے اور دوسرے صحابہ میں سے بھی اور اس وقت) گھر میں موجود تھے (اس مسئلہ میں خاموشی اختیار کرنے کے بجائے) آپس میں بحث و مباحثہ کرنے لگے، ان میں سے کچھ لوگ تو یہ کہہ رہے تھے کہ (لکھنے کا سامان) لاکر سامنے رکھ دینا چاہئے تاکہ رسول کریم ﷺ تمہارے لئے کوئی تحریر مرتب فرمادیں اور کچھ لوگ وہی بات کہہ رہے تھے جو حضرت عمرؓ نے کہی تھی (کہ مرض اور تکلیف کی شدت دیکھتے ہوئے اس وقت آنحضرت ﷺ کو کوئی زحمت نہیں دینی چاہئے اور پھر جب ان لوگوں کے اختلاف رائے کا اظہار بڑھتا ہی رہا اور کافی شور و شغب ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اچھا اب تم سب لوگ میرے پاس سے اٹھ کر چلے جاؤ (میں نے کوئی چیز لکھنے کا ارادہ ترک کردیا ہے کیونکہ کتاب وسنت کی موجودگی ہی تمہارے لئے کافی ہوگی، عبید اللہ" (جو حضرت ابن عباسؓ سے اس حدیث کے راوی) ہیں کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ (یہ واقعہ بیان کر کے) کہا کرتے تھے: مصیبت ہے پوری مصیبت جو ان لوگوں کے اختلاف اور شور وغل کی صورت میں رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے وصیت نامہ لکھنے کے ارادہ کے درمیان حائل ہوگئی تھی (کاش وہ لوگ اس طرح اختلاف کا اظہار اور شور و شغب نہ کرتے تو آنحضرت ﷺ کوئی ایسا وصیت نامہ ضرور مرتب فرمادیتے جو ہر مرحلہ پر ہم سب کی رہنمائی کرتا رہتا) اور سلیمان ابن مسلم احول" (جو ثقات اور ائمہ دین میں سے ہیں) کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا: (آہ) جمعرات کا دن، وہ جمعرات کا دن کیا عجیب تھا (جب ایک زبردست المیہ واقع ہوا تھا) اور یہ کہہ کر رونے لگے اور اتنا روئے کہ (وہاں پڑے ہوئے سنگریزے) ان کے آنسوؤں سے تر ہوگئے میں نے عرض کیا: ابن عباسؓ (کون سی) جمعرات کے دن کا ذکر ہے اور اس دن) کیا ہوا تھا (کہ آپ اتنے تأسف بھرے انداز میں اس کو بیان کررہے ہیں) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: (یہ اس جمعرات کا دن کا ذکر ہے) جب رسول کریم ﷺ کی بیماری بہت نازک صورت حال اختیار کرگئی تھی اور آپ ﷺ نے فرمایا تھا مجھے شانہ کی ہڈی لاکر دو تاکہ میں تمہارے لئے ایک ایسا نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوسکو (اس وقت آنحضرت ﷺ کے پاس موجود) لوگوں نے (یہ بات سن کر) اختلاف و نزاع کا اظہار شروع کردیا حالانکہ نبی کے سامنے اختلاف و نزاع کا اظہار مناسب نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا تھا کہ بات آنحضرت ﷺ کی کس حالت کی غماز ہے؟ کیا

آنحضرت ﷺ (دنیا کو) چھوڑ رہے ہیں؟ آنحضرت سے معلوم کرنا چاہئے (کہ آپ ﷺ کیا فرما رہے ہیں اور آپ ﷺ کا کیا منشا ہے؟) اور پھر ان (میں سے بعض) لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ تکرار کرنا شروع کر دیا تھا، آخر کار سرکار رسالتمآب ﷺ نے فرمایا: مجھ کو چھوڑ دو، مجھے اپنی حالت پر رہنے دو (یعنی اس وقت میرے پاس شور وشغب مت کرو اور مجھے دوسری باتوں میں نہ الجھاؤ) کیونکہ اس وقت میں جس حالت میں ہوں اس حالت سے بہتر وافضل ہے جس کی طرف تم مجھے متوجہ کر رہے ہو اس کے بعد (جب لوگوں نے بحث وتکرار ختم کر دی اور ذات رسالت کی طرف متوجہ ہوئے تو) آپ ﷺ نے ان کو تین باتوں کا حکم دیا: ایک تو یہ کہ مشرکوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دو، دوسرا یہ کہ (دوسرے ملکوں اور حکومتوں کے) جو ایلچی اور قاصد آئیں ان کے ساتھ عزت و احترام کا وہی برتاؤ کرو جو میں کرتا تھا، اور تیسری بات پر ابن عباسؓ نے (یا تو بھول جانے کی وجہ سے یا اختصار کی خاطر) خاموشی اختیار کرلی یا یہ کہ ابن عباسؓ نے وہ تیسری بات بھی بیان کی تھی لیکن میں اس کو بھول گیا ہوں سفیان ابن عیینہؒ کہتے ہیں: یہ الفاظ (کہ ابن عباسؓ نے خاموشی اختیار کی "یا یہ کہ" میں اس کو بھول گیا ہوں)" سلیمان احولؒ کے ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "لاؤ میں تمہارے لئے نوشتہ لکھ دوں" کے تحت نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے: یہ ناممکن اور محال تھا کہ آنحضرت ﷺ جھوٹ بولتے، یہ بھی ناممکن اور محال تھا کہ آپ ﷺ احکام شریعت میں سے کسی بھی چیز میں کوئی تغیر و تبدل کرتے خواہ آپ ﷺ تندرست و توانا ہوتے یا مرض میں مبتلا، یہ بھی ناممکن اور محال تھا کہ آپ ﷺ اس چیز کو بیان و نافذ کرنا ضروری سمجھتے جس کے بیان و نفاذ کا حکم آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف دیا جاتا، اور یہ بھی ناممکن اور محال تھا کہ جس چیز کی تلقین و تبلیغ کرنا اللہ نے آپ کے لئے واجب اور ضروری قرار دیا تھا اس کی تلقین و تبلیغ سے آپ ﷺ صرف نظر کر لیتے (کیونکہ یہ سب وہ قبائح ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو معصوم بنایا تھا اس لئے آپ ﷺ سے ایسی چیزوں کے صدور کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ہاں یہ بات ناممکن اور محال نہیں تھی کہ آپ ﷺ کسی ایسے جسمانی مرض میں مبتلا نہ ہوتے جس سے نہ آپ ﷺ کے مرتبۂ نبوت اور شان رسالت کو کوئی نقصان پہنچتا، اور نہ آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت پر کوئی فرق پڑتا یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ پر سحر کیا گیا تو آپ ﷺ اس کی زد میں آگئے اور آپ ﷺ کے اعضائے جسمانی اور حواس اس حد تک متاثر ہوگئے تھے کہ ایک کو سمجھتے کہ میں کر چکا ہوں حالانکہ آپ ﷺ نے اس کو نہ کیا ہوتا، تاہم اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے مرتبہ عصمت کو اس طرح محفوظ رکھا کہ اس دوران آپ ﷺ کی زبان سے احکام شریعت کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں نکلی جو آپ ﷺ کی پہلے کہی ہوئی کسی بات کے مخالف ہوتی (یا آپ ﷺ کے خیال وعمل کا مذکورہ تخالف کسی ایسے معاملہ میں رونما نہیں ہوا جس کا تعلق دینی وشرعی معمولات و عبادات سے ہوتا) نیز روایت میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مرض وفات کے آخری دنوں میں کوئی نوشتہ مرتب کرنے کا ارادہ فرمایا تھا اور پھر اس ارادہ کو پورا نہیں فرمایا تو اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ مثلاً بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ دراصل آنحضرت ﷺ نے یہ چاہا تھا کہ تحریری طور پر اپنے صحابہ میں سے کسی ایک کو منصب خلافت کے لئے نامزد فرمادیں تاکہ بعد میں عام مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف و نزاعی صورت حال پیدا نہ ہو بعض دوسرے حضرات کا قول یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اصل منشاء ایک ایسا نوشتہ تیار کرا دینا تھا جس میں دین و شریعت کے اہم احکام و مسائل کی تدوین و ترتیب اور ان کی تلخیص و وضاحت ہوتی، تاکہ بعد میں علمائے امت ان احکام و ہدایات کے بیان اور ان کی وضاحت و ترجمانی میں اختلاف و نزاع کا شکار نہ ہوں اور منصوص علیہ پر امت میں کامل اتفاق و اتحاد رہے، یہاں تک نوویؒ کے ملفوظات تھے اور ان ملفوظات کو ملا علی قاریؒ نے نہ صرف نقل کیا ہے بلکہ مذکورہ دونوں اقوال نقد بھی کیا ہے چنانچہ انہوں نے پہلے قول کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تو بہت ہی بعید از حقیقت ہے کیونکہ اگر آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ میں سے کسی کو خلافت کے لئے نامزد کرنا اور مثلاً حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ وغیرہم میں سے کسی ایک کے نام کو متعین و مشخص کرنا چاہتے تو اس کے لئے آپ ﷺ کو نوشتہ یا دستاویز مرتب کرنے کی ضرورت ہرگز نہیں تھی، صرف زبان سے آپ ﷺ کا کہہ دینا کافی تھا، اور ایسا ہوا بھی کہ آپ ﷺ نے

حضرت ابوبکرؓ کو اپنی زندگی ہی میں نماز کی امامت کے لئے متعین فرما کر نہ صرف عملی طور پر ان کی خلافت کی طرف اشارہ فرما دیا تھا بلکہ اپنے ارشاد یابی اللّٰہ والمؤمنون الا ابابکر کے ذریعہ زبانی طور پر صراحت بھی فرمادی تھی ہاں اگر یہ کہا جائے کہ آنحضرت ﷺ دراصل ایک ایسا نوشتہ مرتب فرما دینا چاہتے تھے جس میں خلافت کے اہل اور مستحق افراد کی نامزدگی کا ایسا طریقہ لکھا ہوتا جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد سے امام مہدیؓ کے ظہور اور حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول تک یکے بعد دیگرے بلا کسی اختلاف و نزاع کے خلافت کے تقرر کو بروئے کار لاتا رہتا، تو یہ ایک ایسی بات ہو سکتی ہے جس کو کسی حد تک معقول اور قرین قیاس کہا جا سکتا ہے اور اس صورت میں کہا جائے گا کہ حکمت خداوندی چونکہ یہی تھی کہ خلافت کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے شدہ اور ظاہر ہو جانے کے بجائے غیر متعین اور پوشیدہ رہے اس لئے آنحضرت ﷺ وہ تحریر مرتب نہ فرما سکے دوسرے قول کے بارے میں ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ جہاں تک خود آنحضرت ﷺ کے زمانہ کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ اس وقت دین و شریعت کے اہم احکام و مسائل کے متعلق کوئی باہمی اختلاف و نزاع نہیں تھا کہ اس کو ختم کرنے اور صحابہؓ کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کرنے کے لئے آپ ﷺ کسی نوشتہ کے تحریر کرنے کی ضرورت محسوس فرماتے، رہی یہ بات کہ آپ ﷺ کے اس ارادۂ تحریر کا تعلق آپ کے بعد کے زمانہ میں ممکنہ اختلاف و نزاع کے دفعیہ سے تھا تو یہ بات بھی قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی کیونکہ زمانہ نبوت کے بعد دینی احکام و مسائل کی وضاحت و ترجمانی اور مسائل قیاسی میں علماء اُمت کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا محض امکان کے درجہ کی چیز نہیں تھی بلکہ ایک حقیقی چیز تھی جس کے بارے میں خود آنحضرت ﷺ نے پہلے ہی خبر دے دی تھی، مثلاً ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا: اختلاف امتی رحمة یا آپ ﷺ کا ارشاد گرامی: اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم یا آپ ﷺ نے فرمایا: علیکم بالسواد الاعظم اور آپ ﷺ نے فرمایا: استفت قلبک وان افتاک المفتون ویسے بھی تمام لوگوں کا کسی نقطہ پر جمع ہو جانا اور دین و مذہب میں باہمی اختلاف کا رونما ہونا ایک ایسی ناممکن بات ہے جس کی خبر خود قرآن کریم نے بھی دی ہے مثلاً فرمایا گیا ہے: وَلَا یزالون مختلفین الا من رحم ربک وبذالک خلقھم یعنی: اور لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر آپ ﷺ کے رب کی رحمت ہو اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے۔ اگر زمانہ رسالت کے بعد دینی معاملات و مسائل میں اُمت (یعنی علماء و مجتہدین) کے درمیان پیدا ہونے والے باہمی اختلاف کے بارے میں آپ ﷺ کو واضح احکام و ہدایات کو مرتب کرانا ہوتا تو اس کے لئے آپ ﷺ اپنی زندگی کے ان آخری لمحات میں ارادہ نہ فرماتے بلکہ بہت پہلے ہی جب کہ آپ ﷺ اپنے صحابہؓ کو ان آئندہ اختلافات کی خبر دیا کرتے تھے، مذکورہ نوشتہ تحریر فرما دیتے علاوہ ازیں یہ بات بھی سمجھ میں نہ آنے والی نہیں ہے کہ دین و شریعت کے وہ تمام احکام و مسائل جن کے نزول اور وجوب و نفاذ کا زمانہ بیس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا تھا، آخری ایام حیات کے اس مختصر ترین عرصہ میں کس طرح سمیٹے جا سکتے تھے اور یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ ﷺ اس وقت ان تمام احکام و مسائل کو اس طرح ملخص و مرتب فرما دیتے کہ آئندہ ان کے بارے میں کسی اختلاف کی ذرہ برابر گنجائش باقی نہ رہ جاتی۔ لہٰذا اس قول کو تسلیم کرنا ممکن نہیں، ہاں یہ بات تو ایک حد درجہ میں کہی جا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس وقت ایک ایسا نوشتہ لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا جس میں ان احکام و مسائل کا ذکر ہوتا کہ جو پچھلے زمانوں میں تو موجود تھے لیکن کتاب و سُنّت میں ان کا ذکر نہیں ہے، یا یہ کہ آپؐ اس نوشتہ میں مسلمانوں کے فرقہ ناجیہ کے طور طریقوں اور علامتوں کو ذکر کرنا اور ان گمراہ فرقوں کے احوال و عواقب کو تفصیلی طور پر بیان کرنا چاہتے تھے جو بعد میں اس اُمت کے درمیان پیدا ہوئے جیسے معتزلہ، خوارج، روافض اور تمام بدعتی، لیکن حکمت خداوندی کو یہ منظور نہ تھا اس لئے آپؐ وہ نوشتہ تیار نہ فرما سکے۔

(اس وقت) آنحضرت ﷺ پر بیماری کا شدید غلبہ ہے۔ اس بات سے حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگوں کی دینی زندگی کو سنوارنے اور مستحکم رکھنے کے لئے اللہ کی کتاب موجود ہی ہے جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

یعنی تم سب اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی سے تھامے رہو۔ رہی حدیث و سُنّت کی بات تو وہ بھی قرآن ہی کے ضمن میں آتی ہے کیونکہ حدیث و سُنّت کا اصل موضوع قرآن کی وضاحت و ترجمانی ہی ہے۔ پس حضرت عمرؓ کا مقصد آنحضرت ﷺ کی بات کو کاٹنا نہیں تھا بلکہ

ان کے مخاطب تو وہ لوگ تھے جنہوں نے اس وقت بحث و نزاع شروع کر دی تھی اور اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے لکھنے کا سامان لے آنا چاہئے تاکہ آپ ﷺ اپنے ارادہ کے مطابق کوئی ہدایت نامہ مرتب فرمادیں، اور اس بات کا محرک ان کا یہ جذبہ تھا کہ اس وقت جب کہ آنحضرت ﷺ پر مرض کا شدید غلبہ ہے اور آپ ﷺ سخت کرب میں مبتلا ہیں. زیادہ سے زیادہ راحت و آرام کا موقع آپ ﷺ کو ملنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ ان کی فراست نے جان لیا تھا کہ آپ ﷺ کا یہ حکم وجوب و جزم کے ساتھ نہیں ہے بلکہ خود صحابہ اور مسلمانوں کی مصلحت کے تحت ہے کہ اگر وہ اس پر عمل کریں تو یہ ان کا اختیار ہے اور اگر عمل نہ کریں تو ان کی مرضی چنانچہ یہ آپ ﷺ کا ہمیشہ معمول تھا کہ جب آپ ﷺ کسی معاملہ میں ایسا حکم دیتے جو وجوب و لزوم کے ساتھ نہ ہوتا تو صحابہ کرام کو اس میں اظہار رائے کی پوری آزادی ہوتی اگر وہ اس میں اشکال و تردد کا اظہار کرتے تو آپ ﷺ اس حکم کی تعمیل کو ضروری قرار نہ دیتے بلکہ صحابہؓ کی رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیتے تھے ہاں جو حکم وجوب و لزوم کے طور پر ہوتا ہے اور اس کی تعمیل ضروری ہوتی. اس کو آپ ﷺ صحابہؓ کی رائے اور صوابدید پر نہ چھوڑتے تھے، نیز حضرت عمرؓ کو یہ احساس بھی ہوا ہو گا کہ اس وقت آنحضرت ﷺ جو کچھ تحریر فرمانا چاہتے ہیں شاید وہ کوئی ایسا حکم ہو جس کی تعمیل صحابہؓ کے لئے شاق اور سخت دشواری کا باعث بن جائے اور پھر اس کی وجہ سے پوری اُمت کو کسی فتنہ اور آزمائش سے دوچار ہونا پڑ جائے لہٰذا اپنے مذکورہ الفاظ کے ذریعہ انہوں نے اس طرف اشارہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کا اپنے اس ارادہ کو ترک کر دینا ہی اولیٰ ہے اور ان کے اس اشارہ کو سمجھ کر آنحضرت ﷺ نے اس ارادہ کو ترک بھی فرما دیا اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو ابتدائے کتاب (باب الایمان) میں گزرا کہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوہریرہؓ سے فرمایا کہ جاکر لوگوں کو بشارت دے دو کہ جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہو گا اور پھر جب ابوہریرہؓ نے یہ بشارت سب سے پہلے حضرت عمرؓ تک پہنچائی تو انہوں نے نہ صرف یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ کو یہ بشارت اور لوگوں تک پہنچانے سے روک دیا بلکہ دربار رسالت میں عرض کیا کہ (یہ بشارت عام نہ کیجئے ورنہ) لوگ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے اور عمل کرنے میں سُست ہو جائیں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کے اس مشورہ کو قبول فرمالیا اور اس بشارت کو عام لوگوں تک پہنچانے کا حکم واپس لے لیا ان وضاحتوں کے علاوہ ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح حضرت عمرؓ کے دوسرے موافقات ہیں کہ کئی مسئلوں میں ان کا اتفاق بصورت اختلاف ظاہر ہوا ہے اسی طرح اس واقعہ کو اور ان کے مذکورہ قول کو بھی موافقت ہی پر محمول کیا جائے اس صورت میں مخالفت کا الزام ان پر اٹھ جائے گا اس پہلو کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کی بات سن کر سکوت فرمایا یعنی کوئی ہدایت نامہ یا وصیت نامہ لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ایک طبقہ کا کہنا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حکم از خود نہیں دیا تھا بلکہ صورت حال یہ ہوئی تھی کہ پہلے بعض صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی تھی کہ کچھ وصیتی کلمات تحریر فرمادیں، ان کی درخواست پر آپ ﷺ نے کچھ لکھنے کا اپنا رجحان ظاہر کیا اور سامان کتابت لانے کا حکم دیا مگر جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ کچھ صحابہ جیسے حضرت عمرؓ اور ان کی تائید کرنے والوں کا رجحان اس کے خلاف ہے تو آپ ﷺ نے تحریر کا ارادہ ترک فرمادیا بیہقیؒ نے لکھا ہے: سفیان ابن عیینہؒ نے ثقہ اہل علم سے نقل کیا ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ یہ چاہتے تھے کہ منصب خلافت کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو نامزد کر دیں اور اس کے بارے میں ایک تحریر مرتب فرما دیں لیکن بعد میں آپ ﷺ نے اس اعتماد پر تحریر کا ارادہ ترک کر دیا کہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ خود بخود سامنے آجائے گا اور عام مسلمان بھی اس فیصلہ سے انحراف نہیں کریں گے، چنانچہ آپ کا ارشاد گرامی یابی اللّٰہ والمؤمنون الا ابابکر (اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمان ابوبکر کے علاوہ اور کسی کو خلافت کے لئے قبول نہیں کریں گے) سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے (یہ حدیث تفصیل کے ساتھ آگے آرہی ہے)۔

رہی شیعوں کی بات جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کے ارادہ تحریر کا اصل مقصد حضرت علیؓ کے حق میں خلافت کی وصیت کرنا تھا تو وہ خود اپنے دعووں کے باہمی تضاد کا شکار ہیں، ایک طرف تو وہ یہ دعوی کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کا دعوی یہ

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "غدیر خم" میں پہلے ہی حضرت علیؓ کی خلافت کا معاملہ طے کر دیا تھا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارے قول کے مطابق جب آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کی خلافت کا فیصلہ پہلے کر دیا تھا تو پھر اب وصیت نامہ لکھنے کی ضرورت کیا باقی رہ گئی تھی۔

"تم سب لوگ میرے پاس سے اٹھ کر چلے جاؤ" گویا آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں پر واضح کر دیا کہ میں نے اس اعتماد اور بھروسہ پر اب کچھ لکھنے کا قصہ چھوڑ دیا ہے کہ کتاب وسُنّت کی موجودگی ہی تمہاری ہدایت وراہنمائی کے لئے کافی ہے اس موقع پر نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس وقت یا تو یہ صورت حال پیش آئی تھی کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی اُمت کے مفاد و مصلحت میں بعض چیزیں تحریر میں لے آنا خود اپنی رائے اور اپنے خیال کے مطابق مناسب سمجھا تھا لیکن پھر آپ ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ کچھ نہ لکھنا ہی عین مصلحت ہے تو آپ ﷺ نے اپنی رائے اور اپنا خیال تبدیل کر دیا یا یہ ہوا تھا کہ آپ نے یہ ارادہ وحی کے ذریعہ خدائی ہدایت آنے کے بعد کیا لیکن پھر بعد میں دوسری وحی کے ذریعہ جب اس ارادہ کو موقوف کر دینے کا حکم آیا تو آپ ﷺ نے لکھنے کا ارادہ ترک فرما دیا۔ نوویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر (وہاں موجود لوگوں کو مخاطب کر کے) جو یہ فرمایا تھا کہ حسبکم کتاب اللہ یعنی تمہارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے، تو اس سے ان کے کمال تفقہ اور فہم ونظر کا اظہار ہوتا ہے، دراصل حضرت عمرؓ کو یہ خوف ہوا کہ کہیں آنحضرت ﷺ نے ایسے احکام تحریر فرما دئے جس پر عمل کرنا عام مسلمانوں کے لئے ممکن نہ ہو سکا تو ان احکام کے منصوص ہونے کے سبب ان میں اجتہاد و تاویل کی قطعاً گنجائش نہ ہوگی اور لوگ ان پر عمل نہ کرنے کی بناء پر عذاب الٰہی کے مستوجب ہو جائیں گے۔ نیز انہوں نے اپنے قول حسبکم کتاب اللّٰہ کے ذریعہ گویا اللہ تعالیٰ کے ارشاد مافرطنا فی الکتاب من شیء اور اس ارشاد الٰہی الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کی طرف اشارہ کیا۔

"مصیبت ہے پوری مصیبت" اس جملہ کے ذریعہ حضرت ابن عباسؓ نے دراصل اس موقع پر صحابہؓ کے اظہار اختلاف اور شور وشغب کو ایک ایسی بری صورت حال سے تعبیر کیا جس نے آنحضرت ﷺ کو اپنے ارادۂ تحریر کی تکمیل سے باز رکھا، ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کاش، وہ لوگ اختلاف ونزاع کا اظہار نہ کرتے تو آنحضرت ﷺ کوئی ایسا نوشتہ مرتب فرما دیتے جو اُمّت کے لئے ہمیشہ ہدایت وراستی کا ذریعہ بنتا گویا حضرت ابن عباسؓ کا رجحان حضرت عمرؓ اور ان کے مؤیدین کی رائے کے خلاف تھا اور وہ اس بات کے حق میں تھے کہ آنحضرت ﷺ کو اس وقت لکھنے کا موقع ضرور دینا چاہئے بیہقیؒ نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کا اصل مقصد یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ مرض کے اس شدید غلبہ کے وقت لکھنے کی زحمت اور تکلیف برداشت نہ کریں، اگر آنحضرت ﷺ اس وقت کوئی چیز لکھنا ضروری اور واجب سمجھتے تو حضرت عمرؓ یا کسی کے بھی اختلاف رائے کے اظہار سے اپنا ارادہ موقوف نہ فرماتے، کیونکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا: بلغ ما انزل الیک من ربک (جو بھی بات آپ ﷺ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل ہو اس کو لوگوں تک پہنچا دیجئے) چنانچہ جو باتیں لوگوں تک پہنچانی ضروری تھیں ان کی تبلیغ و اشاعت آپ ﷺ نے ہر صورت میں کی اگرچہ دشمنان دین اور مخالفین اسلام نے آپ ﷺ کی لاکھ مخالفت کی، یا جیسا کہ اسی موقع پر ہوا کہ جس چیز کی وصیت وہدایت کرنا آپ ﷺ نے ضروری سمجھا (یعنی جزیرۂ عرب سے یہودیوں کا نکالنا وغیرہ) اس کی ہدایت آپ نے کی غرضیکہ اس وقت آنحضرت ﷺ جو چیز لکھنا چاہتے تھے وہ چونکہ ضروری نہیں تھی اس لئے حضرت عمرؓ کی عقل میں آیا کہ شدت مرض کے کرب اور بے چینی کی حالت میں آپ ﷺ کو لکھنے کی زحمت کیوں دی جائے اور پھر دین وشریعت کا ایسا کون سا حکم اور ہدایت ہے جو کتاب اللہ اور سُنّت رسول اللہ میں موجود نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الیوم اکملت لکم دینکم اس ارشاد الٰہی سے جو کچھ مفہوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ دین وشریعت سے متعلق قیام قیامت تک پیش آنے والی ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کا حکم اور مسئلہ کتاب وسُنّت میں خواہ دلالۃً خواہ صراحۃً موجود نہ ہو، حضرت عمرؓ کے معمولی فہم وادراک میں ایک یہ بات بھی آگئی تھی کہ آنحضرت ﷺ کوئی ایسا نوشتہ مرتب فرمانا چاہتے ہیں جس میں دینی احکام ومسائل کا بطریق اتمام بیان ہو اس صورت میں اجتہاد کا جواز ختم ہو جائے گا اور اہل علم و استنباط پر اجتہاد کا دروازہ بند ہو جائے گا لہٰذا

انہوں نے آنحضرت ﷺ کو شدت مرض میں لکھنے کی تکلیف سے بچانے اور ارباب اجتہاد کو ان کی فضیلت سے محروم نہ ہونے دینے کی نیت سے اسی بات کو زیادہ اچھا سمجھا کہ آنحضرت ﷺ تحریر کا ارادہ ترک فرما دیں، اور آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کی بات کو رد نہ کر کے اور اپنے ارادۂ تحریر کو ترک فرما کر گویا حضرت عمرؓ اور ان کے مؤیدین کے فہم و ادراک سے کہیں زیادہ مضبوط اور قوی تھا۔

"یہ کہہ کر وہ رونے لگے اور اتنا روئے" حضرت ابن عباسؓ کے رونے کا سبب یا تو یہ تھا کہ اس دن کا ذکر کرتے ہوئے ان کو آنحضرت ﷺ کی وفات کا سانحہ یاد آ گیا تھا، یا یہ کہ ان کے گمان کے مطابق آنحضرت ﷺ اس دن جو نوشتہ مرتب فرمانا چاہتے تھے وہ چونکہ اُمت کے حق میں خیر کثیر کا باعث بنتا اس لئے یہ سوچ کر کہ اس نوشتہ کے نہ لکھے جانے سے اُمت خیر کثیر سے کس طرح محروم ہو گئی ان کا دل بھر آیا وہ رونے لگے۔ یہ دوسرا احتمال اس موقع سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

"ایک ایسا نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو" علماء نے لکھا ہے کہ عبارت کا ظاہری اسلوب صاف بتا رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارادہ دین و شریعت کے احکام و مسائل کو تفصیل وضاحت کے ساتھ لکھنے کا تھا نہ کہ خلافت کے بارے میں کوئی وصیت کرنے کا۔

"نبی کے سامنے اختلاف و نزاع کا اظہار مناسب نہیں ہے" عبارت کے سیاق سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ حضرت ابن عباسؓ کا اپنا ہے، جس کو انہوں نے روایت کے درمیان داخل کیا، جب کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اصل میں یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جس کو اس موقع پر ابن عباسؓ نے استدلال کے طور پر نقل کیا ہے۔

"کیا آنحضرت ﷺ (دنیا کو) چھوڑ رہے ہیں" یہ لفظ اھجر کا ترجمہ ہے، فتح الباری میں قرطبیؒ کے حوالہ سے اس لفظ کے معنی میں کئی احتمال بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک احتمال یہ نقل کیا گیا ہے کہ لفظ اھجر دراصل ھجر (بمعنی چھوڑنا) کا فعل ماضی ہے اور اس کا مفعول الحیوۃ محذوف ہے، اسی احتمال کو زیادہ موزوں اور مناسب سمجھتے ہوئے ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے اور حضرت شیخ عبدالحقؒ نے یہ ترجمہ بیان کیا ہے کہ: (یہ بات آنحضرت ﷺ کی کس حالت کی غماز ہے؟) کیا (شدت مرض کے سبب) آپ ﷺ کا کلام مختلط ہو گیا ہے؟ (جیسے عام بیماروں کی حالت میں سمجھا جاتا ہے کہ ان کی زبان سے کبھی کچھ نکلتا ہے اور کبھی کچھ) اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ جملہ استفہام انکاری پر محمول ہے اور ان لوگوں کی بات کو کاٹنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا جو یہ کہہ رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ کچھ نہ لکھیں گویا اس جملہ کے قائلین یہ کہنا چاہتے تھے کہ کیا تم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لکھنے کا سامان لانے کا حکم حواس و شعور کے ساتھ نہیں دیا ہے بلکہ بیماری کی شدت کے سبب آپ ﷺ کی زبان سے یہ بات یونہی نکل گئی ہے؟ آنحضرت ﷺ کے بارے میں اس طرح کا گمان و خیال قائم کر لینا چونکہ نہایت غیر موزوں ہے لہذا آپ ﷺ کے اس حکم کو پورا کرو اور لکھنے کا سامان لا کر رکھ دو تاکہ آپ ﷺ جو لکھنا چاہتے ہیں لکھ دیں۔

"اس حالت سے بہتر و افضل ہے جس کی طرف تم مجھے متوجہ کر رہے ہو" اس بات سے آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت میں عالم آخرت کے سفر کی آخری تیاری، پروردگار سے ملنے کے اشتیاق، اور ذات حق میں تفکر و استغراق کی اعلی حالت میں ہوں، لیکن تم لوگ آپس کے لفظی تکرار و بحث اور شور و شغب اور اظہار اختلاف کے ذریعہ میرا دھیان بٹانا چاہتے ہو اور اپنی طرف متوجہ کر رہے ہو۔ لہذا تم سب لوگ یہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ تاکہ میں تمہاری ادنی حالت کے بجائے اپنی اعلی حالت کی طرف متوجہ ہوں اس موقع پر ملا علی قاریؒ نے خطابیؒ کے حوالہ سے مشہور حدیث اختلاف امتی رحمۃ (میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے) کے بارے میں لکھا ہے کہ دین و شریعت میں اختلاف کی تین قسمیں ہیں، ایک تو صانع یعنی حق تعالیٰ کے اثبات اور اس کی وحدانیت میں اختلاف، پس یہ اختلاف (کہ جس کی بنیاد حق تعالیٰ کے وجود و وحدانیت سے انکار پر ہوتی ہے) صریح کفر ہے، دوسرے حق تعالیٰ کی صفات اور مشیت میں اختلاف، یہ اختلاف (کہ جس کی بنیاد ذات باری تعالیٰ کی صفات اور مشیت کے انکار پر ہوتی ہے) بدعت اور گمراہی ہے، اور تیسرا اختلاف (کہ جس کی

بنیاد وہ ہے جو دین وشریعت کے ایسے فروعی احکام مسائل کے استنباط وبیان سے تعلّق رکھتا ہے جو مختلف جہات اور متعدد معنی کا احتمال رکھتے ہیں اور یہی وہ اختلاف ہے جو ارباب علم و اجتہاد کے درمیان ہوتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے علماء و مجتہدین کے لئے رحمت وکرامت قرار دیا ہے ملا علی قاریؒ نے مازریؒ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ اس موقع پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب آنحضرت ﷺ نے وہاں موجود صحابہ کو امر (حکم) فرمایا کہ (میرے پاس لکھنے کا سامان) لاؤ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ لکھ دوں تو صحابہ کے لئے اختلاف کی گنجائش کیا تھی اور انہوں نے (حکم کی فوری تعمیل کے بجائے) اختلاف کا اظہار کیسے کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ دراصل وہ اوامر (احکام) کہ جن کے صدور میں کچھ خارجی قرائن بھی شامل ہوں، ان کی حیثیت اور نوعیت تبدیل ہوسکتی ہے، چنانچہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ اوامر کی اصل وجوب ہے ان کے نزدیک بھی ان قرائن کے سبب وجوب کا حکم استحباب میں بدل جاتا ہے جیسا کہ جو حضرات کہتے ہیں کہ اوامر کی اصل استحباب ہے ان کے نزدیک بھی قرائن کے سبب استحقاق کا حکم وجوب میں بدل جاتا ہے، پس ہوسکتا ہے کہ یہ حکم دیتے وقت آنحضرت ﷺ سے ایسے قرائن ظاہر ہوئے ہوں جن سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ اس حکم کی تکمیل واجب اور ضروری نہیں ہے بلکہ اختیاری ہے لہٰذا صحابہ نے اپنے اپنے اجتہاد کے تحت جس پہلو کو مناسب جانا اختیار کیا۔ اور اسی سے ثابت ہوا کہ صحابہؓ کرام دین وشریعت کے معاملات میں ضرورت کے وقت اجتہاد کا سہارا لیتے تھے رہی یہ بات کہ حضرت عمرؓ کے اجتہاد نے نوشتہ نہ لکھے جانے کے پہلو کو جو اختیار کیا تو اس کی بنیاد کیا تھی؟ تو ہوسکتا ہے کہ (ان کو یقین حاصل ہوا ہو کہ آنحضرت ﷺ کے ارادہ اور حکم کا عدم وجوب ظاہر ہوتا تھا۔

"مشرکوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دو" اس کی وضاحت باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب میں پیچھے گزر چکی ہے، اسی طرح "جزیرہ عرب" کی تشریح بھی کتاب کے ابتدائی ابواب میں سے باب الوسوسۃ میں ہو چکی ہے۔

"جو ایلچی وقاصد آئیں" اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے ملکوں اور سربراہان مملکت کے جو ایلچی اور سفراء تمہارے ہاں آئیں ان کے مراتب اور ان کی حیثیت کے مطابق ان کے ساتھ اعزاز وتکریم، خاطر مدارت اور حسن سلوک و احسان کا معاملہ اسی انداز اور طور طریقے کی مناسبت کے ساتھ کرنا جو میرا معمول تھا آپ نے یہ حکم اس لئے دیا تھا کہ ایک طرف تو اسلامی اخلاق و معاملات کی بلندی کا اظہار ہو دوسری طرف ان ایلچیوں اور قاصدوں کو خوشی و اطمینان ہو اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا حسن سلوک دیکھ کر مؤلفۃ القلوب میں سے دوسرے لوگوں کا رجحان اسلام اور مسلمانوں کی طرف بڑھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ حسن سلوک کا یہ حکم ہر قاصد و ایلچی کے بارے میں ہے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔

"لیکن میں اس کو بھول گیا ہوں" کے تحت ملا علی قاریؒ نے تو نوویؒ کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ (سفیان ابن عیینہ نے اس جملہ کی نسبت جس طور سے سلیمان احول کی طرف کی ہے وہ صحیح نہیں ہے) بلکہ حقیقت میں خاموشی اختیار کرنے والے تو حضرت ابن عباسؓ تھے اور لیکن میں اس کو بھول گیا ہوں کہنے والے حضرت سعید ابن جبیرؓ ہیں جو حضرت ابن عباسؓ سے اس روایت کے راوی ہیں اور ان سے سلیمان احولؒ نقل کرتے ہیں اور حضرت شیخ عبدالحقؒ نے اپنی شرح میں "سکت" (خاموشی اختیار کرلی) کا فاعل آنحضرت ﷺ کو قرار دیا ہے، ان کے مطابق گویا یہ بات حضرت ابن عباسؓ بیان کر رہے ہیں کہ یا تو آنحضرت ﷺ نے تیسری بات فرمائی ہی نہیں، یا یہ کہ آپ ﷺ نے تیسری بات بھی فرمائی تھی مگر میں اس کو بھول گیا ہوں بہرحال محدثین نے لکھا ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ نے جو تیسری بات فرمائی تھی وہ حضرت اسامہؓ کے لشکر کا سامان درست کرنے کا حکم تھا کہ جس کی درستی اور تیاری میں آپ ﷺ مشغول ہی تھے کہ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے یا وہ تیسری بات قبر پرستی کی ممانعت سے متعلّق تھی جیسا کہ ایک روایت میں اس کے لئے یہ الفاظ منقول ہیں: لا تتخذو اقبری وثنا یعبد (میری قبر کو بت مت بنالینا کہ اس کو پوجا جانے لگے)۔

نزول وحی منقطع ہوجانے کا غم

⑫ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ لِعُمَرَ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْطَلِقْ بِنَا اِلٰى اُمِّ اَيْمَنَ نَزُوْرُهَا كَمَا

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَزُوْرُهَا فَلَمَّا انْتَهَيْنَا اِلَيْهَا بَكَتْ فَقَالَا لَهَا مَا يُبْكِيْكِ اَمَا تَعْلَمِيْنَ اَنَّ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اِنِّيْ لَا اَبْكِيْ اِنِّيْ لَا اَعْلَمُ اَنَّ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ اَبْكِيْ اَنَّ الْوَحْيَ قَدِ انْقَطَعَ مِنَ السَّمَآءِ وَهَيَّجَتْهُمَا عَلَى الْبُكَاءِ فَجَعَلَا يَبْكِيَانِ مَعَهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں: رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد ایک دن حضرت ابوبکر ؓ حضرت عمر فاروق ؓ سے بولے کہ آؤ اُمّ ایمن ؓ کے ہاں چلیں اور ان کی زیارت کریں جس طرح رسول کریم ﷺ ان کی ملاقات کو تشریف لے جایا کرتے تھے چنانچہ جب ہم تینوں (یعنی میں اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر ؓ) اُمّ ایمن ؓ کے ہاں پہنچے تو وہ (ہمیں دیکھ کر) رونے لگیں۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ؓ دونوں نے کہا کہ کاہے کو روتی ہو کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے لئے اللہ کے ہاں (درجات و مراتب اور اعزاز و انعام کی صورت میں) جو کچھ ہے وہ بہتر ہی بہتر ہے اُمّ ایمن بولیں: میرے رونے کا سبب یہ نہیں ہے کہ میں اس بات سے لاعلم ہوں کہ اللہ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کے لئے جو کچھ ہے بہتر ہی بہتر ہے (کیونکہ یہ تو بالکل ظاہری چیز ہے اور ہر شخص جانتا ہے) بلکہ میں اس لئے رو رہی ہوں کہ آسمان سے وحی آنے کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے (اور ہم دنیا والے اس کی برکتوں سے محروم ہو گئے ہیں) اُمّ ایمن (کے ان الفاظ) نے حضرت ابوبکر ؓ اور حضرت عمر ؓ پر بھی رقت طاری کر دی اور وہ دونوں حضرات بھی ان کے ساتھ رونے لگے۔" (مسلم)

تشریح: ام ایمن ؓ حضرت اسامہ ابن زید ؓ کی ماں ہیں اور آنحضرت ﷺ کی آزاد کردہ باندی ہیں۔ ان کا اصل نام برکۃ تھا اور آنحضرت ﷺ کے والد ماجد عبداللہ کی باندی تھیں، بعد میں ان کا حق ملکیت بطور وراثت آنحضرت ﷺ کو ملا تو آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا تھا اور حضرت زید ؓ کے نکاح میں دے دیا تھا۔ حضرت زید ؓ بھی پہلے غلام تھے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی ملکیت میں تھے آنحضرت ﷺ نے ان کو خدیجہ ؓ سے مانگا تو انہوں نے زید ؓ کو بطور ہبہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور پھر آپ نے ان کو آزاد کر دیا۔ حضرت اُمّ ایمن ؓ حبشی النسل تھیں اور صحابی عورتوں میں اونچا مقام رکھتی تھیں، آنحضرت ﷺ ان کی بڑی عزت و توقیر فرماتے تھے۔ اُمّ ایمن ؓ بھی اسلام اور مسلمانوں کی محبت سے پوری طرح سرشار تھیں، میدان جنگ میں مجاہدین اسلام کو پانی پلانا اور زخمی ہو جانے والوں کی دوا دارو اور دیکھ بھال کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا تھا، حضرت عمر فاروق ؓ کے انتقال کے بیس دن بعد ان کی وفات ہوئی۔

مسجد نبوی کے منبر پر آخری خطبہ

(۱۳) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ وَنَحْنُ فِي الْمَسْجِدِ عَاصِبًا رَاْسَهُ بِخِرْقَةٍ حَتّٰى اَهْوٰى نَحْوَ الْمِنْبَرِ فَاسْتَوٰى عَلَيْهِ وَاتَّبَعْنَاهُ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنِّيْ لَاَنْظُرُ اِلَى الْحَوْضِ مِنْ مَّقَامِيْ هٰذَا ثُمَّ قَالَ اِنَّ عَبْدًا عُرِضَتْ عَلَيْهِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا فَاخْتَارَ الْاٰخِرَةَ قَالَ فَلَمْ يَفْطِنْ لَهَا اَحَدٌ غَيْرُ اَبِيْ بَكْرٍ فَذَرَفَتْ عَيْنَاهُ فَبَكٰى ثُمَّ قَالَ بَلْ نَفْدِيْكَ بِاٰبَائِنَا وَاُمَّهَاتِنَا وَاَنْفُسِنَا وَاَمْوَالِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ ثُمَّ هَبَطَ فَمَا قَامَ عَلَيْهِ حَتَّى السَّاعَةَ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابوسعید خدری ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے مرض وفات میں (ایک دن) اپنے حجرہ سے نکل کر مسجد نبوی میں تشریف لائے جہاں ہم (پہلے سے) بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت آپ ﷺ نے اپنے سر کو کپڑا باندھ رکھا تھا (جیسا کہ درد سر کا مریض اپنے سر کو باندھے رکھتا ہے) پھر آپ منبر کی طرف چلے اور اس پر کھڑے ہوئے، آپ کے ساتھ ہم بھی آگے بڑھ کر آپ ﷺ کے سامنے) بیٹھ گئے، اس وقت آپ ﷺ نے (حمد وثنا کے بعد) فرمایا: "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں اس وقت اپنی جگہ (یعنی اس منبر پر کھڑا ہوا حوض کوثر کو دیکھ رہا ہوں" پھر فرمایا: "ایک بندہ ہے جس کے سامنے (فانی) دنیا اور دنیا کی (فانی) بہاریں پیش کی گئیں لیکن اس نے (مٹ جانے والی دنیا پر) آخرت (کی کبھی نہ مٹنے والی نعمتوں) کو ترجیح دے دی ہے" حضرت ابوسعید ؓ کہتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی

کے رمز کو سوائے ابوبکرؓ کے کوئی نہ سمجھ سکا، چنانچہ (زبان رسالت سے یہ الفاظ سن کر) ابوبکرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور وہ رونے لگے، پھر بولے: (نہیں) یارسول اللہ! (نہیں، ایسی دلدوز بات نہ فرمایئے) ہم اپنے باپوں کو، اپنی ماؤں کو، اپنی جانوں کو اور اپنے مالوں کو آپؐ پر سے صدقہ کردیں گے۔ حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ: اس کے بعد آنحضرت ﷺ منبر پر سے اتر کر تشریف لے گئے اور اس وقت تک پھر کبھی اس منبر پر کھڑے نہ ہوئے (یعنی اس دن آپ کا منبر پر کھڑا ہونا آخری کھڑا ہونا تھا)۔" (دارمیؒ)

تشریح: دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت جبرئیل نے آپ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چاہے تو آپ دنیا میں ابھی اور رہیں اور ہم دنیا کے خزانے آپ (ﷺ) کے سپرد کریں اور ان پہاڑوں کو آپ کے لئے سونا چاندی کا بنادیں بغیر اس کے کہ ہمارے ہاں (آخرت میں) آپ کے لئے جو درجہ اور اجر و انعام مقرر ہے اس میں ذرہ برابر کمی ہو اور چاہے آپ (ﷺ) ہمارے پاس آجائیں۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے سر جھکالیا (جیسا کہ کسی اہم فیصلہ کا اعلان کرنے سے پہلے ارباب غور و فکر سر جھکا کر سوچنے لگتے ہیں) اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کے غلاموں سے ایک غلام وہاں موجود تھا، اس نے جو یہ بات سنی کہ آپ ﷺ کو دولت و زر کی اتنی زبردست پیشکش کے ساتھ دنیا میں رہنے کا اختیار دیا جارہا ہے) تو وہ بولا: یارسول اللہ! اس میں کیا حرج ہے اگر آپ ﷺ کچھ مدت اور دنیا میں رہنا منظور فرمالیں، آپ ﷺ کے طفیل میں حاصل ہونے والے مال و زر سے ہم لوگ بھی آرام و آسائش کی زندگی گزارلیں گے، آنحضرت ﷺ نے اس غلام کی بات پر توجہ دینے کے بجائے نگاہ اٹھا کر حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف دیکھا اور جاننا چاہا کہ پیشکش اور اختیار کا اصل مقصد کیا ہے اور (جب سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل مقصد اپنے پاس بلانا ہے تو) فرمایا: میں وہاں آنا چاہتا ہوں اس طرح آپ ﷺ نے آخرت کو اختیار کرلیا جس کو فنا نہیں، زوال نہیں ہے اور دنیا کو ٹھکرادیا جس کا انجام فنا اور زوال کے علاوہ کچھ نہیں اسی بنیاد پر بعض عارفوں نے بہت خوب کہا ہے کہ اگر کسی سمجھ دار کو ایسے دو پیالوں میں سے کسی ایک پیالہ کو چن لینے کا اختیار دیا جائے جن میں سے ایک پیالہ تو مٹی کا ہو لیکن پائیدار رکھتا ہو اور دوسرا پیالہ سونے کا ہو مگر پائیداری نہ رکھتا ہو تو وہ سمجھدار یقیناً اس پیالہ پر کہ جو اگرچہ سونے کا ہے مگر جلد ہی ختم ہوجانے والا ہے اس پیالہ کو ترجیح دے گا جو مٹی کا ہونے کے باوجود پائیدار اور باقی رہنے والا ہے، اور اگر کہیں صورت حال اس کے برعکس ہو یعنی سونے کے پائیدار پیالہ اور مٹی کے پائیدار پیالہ اور مٹی کے غیر پائیدار پیالہ میں سے کسی ایک پیالہ کو پسند کرلینے کا اختیار ہو تو پھر کوئی انتہائی نادان اور بے وقوف ہی شخص ہوگا جو پائیدار سونے کے پیالہ کو چھوڑ کر جلد ضائع ہوجانے والے مٹی کے پیالہ کو پسند کرے گا۔ پس جان لینا چاہئے کہ آخرت کی مثال اس پیالہ کی سی ہے جو پائیدار بھی ہے اور سونا کا بھی ہے جب کہ دنیا کی مثال اس پیالہ کی ہے جو نہ صرف یہ کہ مٹی کا ہے بلکہ جلد ہی ضائع اور فنا ہوجانے والا ہے، قرآن کریم میں اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: والآخرة خیر و ابقی اور آخرت ہی بہتر و اعلیٰ بھی ہے، اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی۔

حضرت فاطمہؓ سے وفات کی پیش بیانی

(۱۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةُ قَالَ نُعِيَتْ اِلَيَّ نَفْسِيْ فَبَكَتْ قَالَ لَا تَبْكِيْ فَاِنَّكِ اَوَّلُ اَهْلِيْ لَاحِقٌ بِيْ فَضَحِكَتْ فَرَاٰهَا بَعْضُ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَ يَا فَاطِمَةُ رَاَيْنَاكِ بَكَيْتِ ثُمَّ ضَحِكْتِ قَالَتْ اِنَّهُ اَخْبَرَنِيْ اَنَّهُ قَدْ نُعِيَتْ اِلَيْهِ نَفْسُهُ فَبَكَيْتُ فَقَالَ لِيْ لَا تَبْكِيْ فَاِنَّكِ اَوَّلُ اَهْلِيْ لَاحِقٌ بِيْ فَضَحِكْتُ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَجَاءَ اَهْلُ الْيَمَنِ هُمْ اَرَقُّ اَفْئِدَةً وَالْاِيْمَانُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب سورہ اذا جاء نصر اللہ والفتح نازل ہوئی تو رسول کریم ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو بلایا اور

ان سے فرمایا کہ مجھ کو میری موت کی خبر دے دی گئی ہے حضرت فاطمہؓ (یہ سنتے ہی آپ ﷺ کی دائمی جدائی کا احساس کر کے) رونے لگیں، آپ ﷺ نے فرمایا: (میری بیٹی) روؤ نہیں، میرے اہل بیت میں سے تم ہی سب سے پہلے مجھ سے ملو گی" (یہ سن کر مارے خوشی کے) حضرت فاطمہؓ ہنسنے لگیں، (وہاں موجود) بعض ازواج مطہرات نے حضرت فاطمہؓ کو اس طرح (پہلے روتے اور پھر ہنستے) دیکھا تو پوچھا کہ فاطمہ! یہ کیا بات ہے کہ ہم نے پہلے تو تمہیں روتے دیکھا اور پھر ہنستے دیکھا؟ حضرت فاطمہؓ بولیں: آنحضرت ﷺ نے پہلے مجھے یہ بتایا تھا کہ آپ ﷺ کو آپ کی موت کی خبر دے دی گئی ہے، یہ سن کر میں رونے لگی تھی اور پھر جب آپ نے یہ فرمایا کہ روؤ نہیں، میرے اہل بیت میں سے تم ہی سب سے پہلے مجھ سے ملو گی تو میں ہنسنے لگی، اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور (مکہ کی) فتح حاصل ہو گی اور یمن کے لوگ آ گئے جو دل کے نرم ہیں، ایمان یمنی ہے اور حکمت بھی یمنی ہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: "مجھ کو میری موت کی خبر دے دی گئی ہے" گویا آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ یہ سورۃ دراصل اس دنیا سے میری رحلت کا اعلامیہ ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اور فتح و کامرانی، اور دین میں لوگوں کے جوق در جوق داخل ہونے کی خبر دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی تسبیح و تحمید کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا میں میرے رہنے اور میری بعثت کا جو مقصود ہے یعنی اتمام دعوت اور تکمیل دین وہ پورا ہو گیا ہے اب مجھے تسبیح و تحمید اور ذات حق کی طرف کامل توجہ و استغراق کے ذریعہ سفر آخرت کی تیاری کرنی چاہئے۔

"تم ہی سب سے پہلے مجھ سے ملو گی" یہ الفاظ حضرت فاطمہؓ کی محض تسلی کے لئے نہیں تھے بلکہ ان کے سامنے اس حقیقت کی پیش گوئی کے طور پر تھے کہ میری رحلت کے بعد میرے اہل بیت میں سے جس کی موت سب سے پہلے ہو گی وہ تم ہی ہو، اور میری جدائی کا غم تمہیں زیادہ دن برداشت نہیں کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی رحلت کے چھ ماہ بعد ہی حضرت فاطمہؓ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں زیادہ صحیح روایت یہی ہے لیکن ایک روایت میں آنحضرت ﷺ کی رحلت کے آٹھ ماہ بعد ایک روایت میں تین یا دو مہینے بعد اور ایک روایت میں ستر روز بعد ان کی وفات کا ذکر ہے۔

"بعض ازواج مطہرات" سے حضرت عائشہؓ مراد ہیں جیسا کہ طیبیؒ نے لکھا ہے لہٰذا کہا جائے گا کہ فقلن تو انہوں نے کہا جمع کا صیغہ حضرت عائشہؓ کی تعظیم شان کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ تاہم یہ بعید نہیں ہے کہ اس موقع پر حضرت عائشہؓ کے علاوہ کچھ دوسری ازواج مطہرات بھی موجود رہی ہوں اور ان سب نے حضرت فاطمہؓ کو پہلے روتے اور پھر ہنستے دیکھ کر ان سے صورت حال کے بارے میں سوال کیا ہو، بلکہ ظاہری عبادت بعض یعنی ازواج النبی اور فقلن کے الفاظ سے یہی احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے، نیز آنحضرت ﷺ نے حضرت فاطمہ سے مذکورہ بات چونکہ بہت چپکے سے کہی تھی اس لئے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ اور کسی نے اس بات کو نہیں سنا اور اسی لئے انہوں نے حضرت فاطمہؓ سے دریافت کیا، بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے ان ازواج مطہرات کے پوچھنے پر بھی اس وقت اصل بات نہیں بتائی تھی، بلکہ صرف یہ جواب دیا تھا کہ میرے اور رسول خدا کے درمیان ایک راز ہے، میں کسی اور کو نہیں بتاؤں گی۔ اور پھر آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد انہوں نے یہ بات بتائی تھی۔

"اور یمن کے لوگ آ گئے" اس کے ذریعہ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور ان کی قوم کے لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا، نحوی طور پر وجاء اهل اليمن کا عطف جاء نصر الله پر ہے اور اصل میں یہ جملہ (کہ اور اہل یمن آ گئے (مذکورہ سورۃ کے ان الفاظ ورایت النّاسَ یدخلون فِیْ دین اللّٰه افواجا کی وضاحت و تفسیر ہے، مطلب یہ کہ اس آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ نے لوگوں کو دین میں داخل ہوتے دیکھ لیا "تو لوگوں" سے مراد اہل یمن ہیں۔

"جو دل کے نرم ہیں" یہ الفاظ آپ نے اہل یمن کی مدح و تعریف میں فرمائے کہ وہ لوگ احکام و ہدایات کو بہت جلد مان لیتے ہیں ان کے دل وعظ و نصیحت سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں، قبول حق کی استعداد ان میں زیادہ ہے اور قلب کی قساوت سے وہ محفوظ ہیں۔

"ایمان یمنی ہے" یعنی ایمان کا لفظ "یمن" سے نکلا ہے جو ملک یمن سے لفظی ہی نہیں بلکہ معنوی مناسبت بھی رکھتا ہے۔ دراصل یہ جملہ بھی اہل یمن کی مدح میں یعنی ان کے اس درجہ کمال کو ظاہر کرنے کے لئے ہے جو وہ ایمان و اسلام اور اطاعت و انقیاد میں رکھتے ہیں۔

"اور حکمت بھی یمنی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ علم و حکمت کو، جو حقائق اشیاء اور ان کے احوال و خواص کی معرفت سے عبارت ہے اہل یمن سے خصوصی نسبت حاصل ہے کیونکہ وہ تحقیق و جستجو کا خاص ذہن فکر رکھتے ہیں۔ ان الفاظ کے ذریعہ دراصل آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوموسی اشعریؓ کے ان سوالات کی طرف اشارہ فرمایا جو انہوں نے احوال مبداء و معاد، اور ابتدائے پیدائش کے حقائق و معارف سے متعلق آنحضرت ﷺ سے کئے تھے، یہ روایت جس میں حضرت ابوموسی اشعریؓ کے سوالات اور آنحضرت ﷺ کے جواب ہیں۔ کتاب بدء الخلق کے شروع میں پیچھے گزرچکی ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ایمان اور حکمت کی نسبت یمن کی طرف اس اعتبار سے کی گئی ہے کہ ایمان مکہ سے شروع ہوا اور مکہ تہامہ کی زمین سے ہے اور تہامہ کا تعلق یمن سے بھی ہے، اسی لئے کعبہ کو کعبۂ یمانیہ بھی کہا جاتا ہے اور بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ حدیث تبوک میں ارشاد فرمائی جو ملک شام کا علاقہ ہے اور وہاں سے مکہ و مدینہ کی سمت وہی ہے جو یمن کی ہے، پس آپ ﷺ نے اشارہ تو یمن کی طرف کیا لیکن مراد آپ ﷺ کی مکہ اور مدینہ سے تھی۔ اور ابوعبیدؒ کا قول یہ ہے کہ "یمن" سے مراد انصار مدینہ ہیں جن کا اصل وطن یمن تھا۔ پس انصار مدینہ کی تعریف و توصیف کو پرزور انداز میں بیان کرنے کے لئے ایمان و حکمت کی نسبت یمن کی طرف کی گئی ہے۔ بہرحال اس حدیث کا مقصد محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ یمنی لوگ کامل ایمان رکھتے ہیں اور اس سے چونکہ کسی دوسرے کے ایمان کی نفی ظاہر نہیں ہوتی اس لئے اس حدیث اور اس روایت کے درمیان منافات نہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ الایمان فی اھل الحجاز (اہل حجاز میں ایمان ہے) نیز اس ارشاد گرامی ﷺ سے یمن کے وہ کلمہ گو مراد ہیں جو اس زمانہ میں تھے نہ کہ ہر زمانہ کے اہل ایمان یمن مراد ہیں۔ واضح رہے کہ سیاق حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد گرامی کو جو ایک دوسری حدیث کا ٹکڑا ہے، وہاں سے اٹھا کر یہاں نقل کردیا ہے۔

حکمت کے معنی: حکمت کے لغوی معنی عقل و دانائی کے ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں: حکمت ہر چیز کی حقیقت دریافت کرنے کے علم کو کہتے ہیں۔ طیبی کا قول ہے کہ حکمت کا لفظ خوب علم حاصل کرنے اور خوب عمل کرنے سے عبارت ہے۔ قرآن کریم میں "حکمت" کا ذکر یوں فرمایا گیا ہے ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا اور (حقیقت تو یہ ہے کہ) جس کو حکمت ملی اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

الحکمۃ تزید الشریف شرفا و ترفع العبد المملوک حتّٰی تجلسہ مجالس الملوک۔

"حکمت وہ جوہر ہے جو عزت دار و شریف کی عزت و شرف کو زیادہ کرتا ہے اور ایک مملوک غلام کے مرتبہ و حیثیت کو بڑھا کر باد شاہوں کی مجلسوں میں بیٹھنے کے قابل بنا دیتا ہے۔"

اور حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ حکمت کے دس حصے ہیں ان میں سے نو حصے تو عزلت یعنی گوشہ نشینی میں ہیں اور ایک حصہ خاموشی میں۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے بارے میں وصیت

⑮ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ وَارَأْسَاهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاكِ لَوْ كَانَ وَاَنَا حَيٌّ فَاَسْتَغْفِرُلَكِ وَاَدْعُوْلَكِ فَقَالَتْ عَائِشَةُ وَاثُكْلِيَاهُ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ تُحِبُّ مَوْتِيْ فَلَوْ كَانَ ذٰلِكَ لَظَلِلْتَ اٰخِرَ يَوْمِكَ مُعَرِّسًا بِبَعْضِ اَزْوَاجِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ اَنَا وَارَأْسَاهُ لَقَدْ هَمَمْتُ اَوْاَرَدْتُ اَنْ اُرْسِلَ اِلٰى اَبِيْ بَكْرٍ وَابْنِهٖ وَاَعْهَدَ اَنْ

يَقُوْلَ الْقَائِلُوْنَ اَوْيَتَمَنَّى الْمُتَمَنُّوْنَ ثُمَّ قُلْتُ يَاْبَى اللّٰهُ وَيَدْفَعُ الْمُؤْمِنُوْنَ اَوْيَدْفَعُ اللّٰهُ وَيَاْبَى الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (ایک دن رسول کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے اپنے سردرد کی شدت کا اظہار کرتے ہوئے) کہا: ہائے میرا سر (پھٹا جارہا ہے) رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا (عائشہؓ!) وہ (یعنی تمہاری موت) اگر ایسی صورت میں آئی کہ میں زندہ رہا تو تمہارے لئے (سیئات سے) مغفرت و بخشش کی دعا مانگوں گا اور تمہارے (درجات و مراتب کی بلندی) کے لئے بھی دعا کروں گا، حضرت عائشہؓ بولیں: ہائے میرے درد کی مصیبت! خدا کی قسم میرا تو خیال ہے کہ میری موت کو پسند فرماتے ہیں؟ اگر ایسا ہوا (کہ میں مرگئی) تو آپ (ﷺ) اسی دن کے آخری حصہ میں اپنی کسی بیوی کے ساتھ شب باشی فرمائیں گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (عائشہ! چھوڑو اس بات کو اور سنو) میرا قصد تھا۔ یا آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ میرا ارادہ تھا کہ میں (تمہارے والد) ابوبکرؓ اور ان کے بیٹے (یعنی تمہارے عزیز بھائی عبدالرحمٰن) کو بلا بھیجوں اور ان کے حق میں وصیت کردوں تاکہ پھر کہنے والے کچھ نہ کہیں یا آپ نے یہ فرمایا کہ تاکہ متمنی لوگ (ابوبکرؓ کے بجائے خود اپنے لئے یا کسی اور کے لئے خلافت کی) تمنا کا اظہار نہ کریں، پھر میں نے اپنے دل میں کہا خود اللہ تعالیٰ (ابوبکرؓ کے علاوہ کسی دوسرے کی خلافت کو) منظور نہیں کرے گا) اور مسلمان بھی مدافعت کریں گے۔ یا آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ خود اللہ تعالیٰ مدافعت کرے گا، اور مسلمان بھی نہیں مانیں گے۔" (بخاری)

تشریح: "ہائے میرا سر" بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کے مرض الموت ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ کسی دن حضرت عائشہؓ کے سر میں شدید سردرد ہوا ہوگا اور انہوں نے اس شکایت کا اظہار آنحضرت ﷺ کے سامنے ان الفاظ میں کیا ہوگا اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ سر سے مراد "ذات" ہے۔ جس کے ذریعہ حضرت عائشہؓ نے اپنی موت کی طرف اشارہ کیا۔

واثکلیاہ " ے میرے سردرد کی مصیبت" لفظ ثکل (ثؔ کے زبر اور پیش دونوں کے ساتھ) کے اصل معنی لڑکے یا دوست کے مرنے کے ہیں اور یہاں اس لفظ سے حضرت عائشہؓ نے خود اپنی ذات مراد لی ہے۔ کہ مرض کا ذکر موت کی یاد دلاتا ہے، ویسے یہ ایک محاوراتی لفظ ہے۔ جو ہر اضطراب و پریشانی کے وقت اہل عرب کی زبان پر آتا ہے خواہ اس کے حقیقی معنی مراد ہوں، یا مراد نہ ہوں۔

"آپ ﷺ میری موت کو پسند فرماتے ہیں" آنحضرت ﷺ کو مخاطب کرکے حضرت عائشہؓ نے یہ الفاظ اس ناز و نیاز اور پیار و محبت کے طور پر کہے جو ان کے اور آنحضرت ﷺ کے درمیان تھا گویا حضرت عائشہؓ نے یہ کہا کہ میں مرگئی تو آپ کی بلا سے، آپ ﷺ تو مجھے فوراً بھلادیں گے اور اپنی دوسری بیویوں میں مشغول ہوجائیں گے۔

"میرے سر کے درد اور میری موت کا ذکر کرو" یعنی: یہ تم اپنے سر کے درد اور اپنی موت کا ذکر لے کر کیوں بیٹھ گئیں، تمہیں تو میرے سر کے درد اور میرے بارے میں سوچنا چاہئے۔ میں جو اس دنیا سے رخت سفر باندھ رہا ہوں، تمہیں تو ابھی بہت زندہ رہنا ہے اور میرے بعد بھی بہت زمانہ تک اس دنیا میں رہنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ پتہ چل گیا تھا کہ درد سر دراصل میرا مرض الموت ہے جب کہ عائشہؓ کا درد سر اتفاقی ہے اور ان کی زندگی ابھی بہت باقی ہے۔ آنحضرت ﷺ اور حضرت عائشہؓ کی مرض کی اس یکسانیت میں اس کمال محبت کی طرف لطیف اشارہ ہے جو ان دونوں کے درمیان تھا۔

"میرا قصد تھا" جب آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے سامنے اپنی موت کا ذکر فرمایا تو قدرتی طور پر اس بات کی طرف متوجہ کرنا بھی ضروری تھا کہ آپ کے بعد کون شخص ملت کی دینی و دنیاوی قیادت سنبھالے گا؟ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی طرف واضح اشارہ فرمایا، اور اس کا مقصد حضرت عائشہؓ کی دلجوئی اور ان کو ان کے باپ کے لئے اس عظیم دولت و نعمت کی بشارت دینا بھی تھا۔

"تاکہ پھر کہنے والے کچھ نہ کہیں" ان یقول القائلین کا ترجمہ تو یہی ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ابوبکرؓ کو اپنا ولی عہد بنا کر ان کی خلافت کو وصیت کردینے سے پھر بعد میں لوگوں کو کچھ کہنے سننے کا موقع نہ رہے گا۔ اور ایک ترجمہ یہ ہوگا کہ "کبھی کہنے والے

کچھ کہیں" اس صورت میں آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ میرے اس ارادہ کی بنیاد یہ تھی کہ اگر میں نے ابوبکرؓ کے لئے خلافت کبریٰ (ملت کی دینی و دنیاوی قیادت) کی وصیت نہ کی تو شاید لوگ یہ کہنے لگیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر کے لئے خلافت صغریٰ (نماز کی امامت) ہی پر اکتفا کر لیا، ان کے لئے خلافت کبریٰ کی واضح وصیت کیوں نہ کی، باوجودیکہ خلافت صغریٰ میں خلافت کبریٰ کا اشارہ بھی موجود ہے۔

"پھر میں نے (اپنے دل میں) کہا" یہاں سے آنحضرت ﷺ نے اپنے مذکورہ ارادہ پر عمل نہ کرنے کا سبب بیان فرمایا کہ اول تو اللہ کا فیصلہ یہی ہوگا۔ کہ میرے بعد پہلے خلیفہ ابوبکر ہوں۔ دوسرے یہ کہ مسلمان بھی ابوبکرؓ کی خلافت کو برضا و رغبت قبول کریں گے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ میں نے اپنی بیماری کی حالت میں نماز کی امامت کے لئے ابوبکرؓ کو منتخب کیا جو اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی قیادت عظمیٰ (منصب خلافت) کی ذمہ داریاں پوری کرنے کی سب سے زیادہ اہلیت ابوبکرؓ میں ہے۔ پس جب کہ تقدیر الٰہی بھی یونہی ہوگی اور عام مسلمان بھی ابوبکرؓ کے علاوہ کسی دوسرے کی خلافت پر تیار نہیں ہوں گے، تو میں سمجھتا ہوں کہ ابوبکرؓ کی خلافت کے لئے باقاعدہ وصیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا فرمائے کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ ہی منتخب ہوئے اور جب بعض لوگوں کی طرف سے اس بارہ کسی قدر اختلاف رائے کا اظہار ہوا تو حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے حق میں اسی خلافت صغریٰ (امامت نماز) سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا: جب آنحضرت ﷺ نے ابوبکر کو ہمارے دین کے معاملہ میں منتخب فرمایا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ان کو اپنی دنیا کے معاملہ میں منتخب نہ کریں۔ دراصل مسئلہ خلافت میں حضرت ابوبکرؓ کے حق میں اس سے بڑی دلیل اور کوئی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

اور مسلمان بھی نہیں مانیں گے اس جملہ میں نہ صرف یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی طرف واضح اشارہ ہے بلکہ اس میں ان لوگوں کی تکفیر کی طرف بھی اشارہ ہے جو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو برحق نہیں مانتے۔

مرض وفات کی ابتداء

(۱۶) وَعَنْهَا قَالَتْ رَجَعَ اِلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ مِنْ جَنَازَةٍ مِنَ الْبَقِيْعِ فَوَجَدَنِيْ وَاَنَا اَجِدُ صُدَاعًا وَاَنَا اَقُوْلُ وَارَأْسَاهُ قَالَ بَلْ اَنَا يَاعَائِشَةُ وَارَأْسَاهُ قَالَ وَمَا ضَرَّكِ لَوْ مُتِّ قَبْلِيْ فَغَسَلْتُكِ وَكَفَّنْتُكِ وَصَلَّيْتُ عَلَيْكِ وَدَفَنْتُكِ قُلْتُ لَكَاَنِّيْ بِكَ وَاللّٰهِ لَوْ فَعَلْتَ ذٰلِكَ لَرَجَعْتَ اِلٰى بَيْتِيْ فَعَرَّسْتَ فِيْهِ بِبَعْضِ نِسَائِكَ فَتَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ بُدِئَ فِيْ وَجْعِهِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ (مدینہ کے قبرستان) بقیع میں ایک جنازہ کو دفن کر کے میرے پاس تشریف لائے تو مجھ کو اس حالت میں پایا کہ میں سر کے درد میں مبتلا تھی اور میں کہہ رہی تھی: ہائے میرا سر (پھٹا جا رہا ہے) آپ نے مجھے اس حالت میں دیکھ کر اور میرے یہ الفاظ سن کر) فرمایا: عائشہ! (تم اپنے کو کیا کہہ رہی ہو) میں کہتا ہوں کہ میرا سر درد کر رہا ہے (پھر بڑے پیار سے ازراہ مذاق) آپ نے فرمایا: اس میں نقصان کیا ہے۔ اگر تم مجھ سے پہلے مر جاؤ میں تمہیں غسل دوں گا، میں کفناؤں گا، میں تمہاری نماز جنازہ پڑھوں گا اور تمہیں دفناؤں گا۔ (یہ سن کر) میں نے کہا: خدا کی قسم یہ تو مجھے آپ (ﷺ) کے بارے میں ابھی سے نظر آ رہا ہے کہ اگر آپ (ﷺ) نے ایسا کیا (یعنی ایسی نوبت آئی کہ میں آپ (ﷺ) کے سامنے مر گئی اور آپ (ﷺ) نے میری تجہیز و تکفین اور تدفین وغیرہ کی تو آپ (ﷺ) ان سب امور سے فارغ ہو کر) میرے گھر واپس آتے ہی اپنی کسی بیوی کے ساتھ شب باش ہو جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ میرے ان الفاظ کو سن کر جو میری غیرت و حمیت پر دلالت کرتے تھے) مسکرائے، اور پھر (اسی دن سے) آپ ﷺ کی اس بیماری کا سلسلہ شروع ہوا جس میں آپ نے وفات پائی۔" (داری)

تشریح: "اور میں تمہیں دفناؤں گا" آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر حضرت عائشہؓ ذات رسالت مآب کی موجودگی میں وفات پا جائیں تو یقیناً ان کو سعادت و سرفرازی کا وہ خصوصی مرتبہ حاصل ہوتا تو آنحضرت ﷺ کے بعد زندہ رہنے اور وفات پانے کی صورت میں ان کو حاصل نہیں ہوا۔

وصال نبوی کے بعد حضرت خضرؑ کی تعزیت

(۱۷) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَجُلاً مِنْ قُرَيْشٍ دَخَلَ عَلٰى اَبِيْهِ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَقَالَ اَلَا اُحَدِّثُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَلٰى حَدِّثْنَا عَنْ اَبِي الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا مَرِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَاهُ جِبْرَئِيْلُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَنِيْ اِلَيْكَ تَكْرِيْمًا لَكَ وَتَشْرِيْفًا لَكَ خَاصَّةً لَكَ يَسْاَلُكَ عَمَّا هُوَ اَعْلَمُ بِهِ مِنْكَ يَقُوْلُ كَيْفَ تَجِدُكَ قَالَ اَجِدُنِيْ يَا جِبْرَئِيْلُ مَغْمُوْمًا وَاَجِدُنِيْ يَا جِبْرَئِيْلُ مَكْرُوْبًا ثُمَّ جَآءَهُ الْيَوْمَ الثَّانِيْ فَقَالَ لَهُ ذٰلِكَ فَرَدَّ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا رَدَّ اَوَّلَ يَوْمٍ ثُمَّ جَآءَهُ الْيَوْمَ الثَّالِثَ فَقَالَ لَهُ كَمَا قَالَ اَوَّلَ يَوْمٍ وَرَدَّ عَلَيْهِ كَمَا رَدَّ عَلَيْهِ وَجَآءَ مَعَهُ مَلَكٌ يُقَالُ لَهُ اِسْمٰعِيْلُ عَلٰى مِائَةِ اَلْفِ مَلَكٍ كُلُّ مَلَكٍ عَلٰى مِائَةِ اَلْفِ مَلَكٍ فَاسْتَاْذَنَ عَلَيْهِ فَسَاَلَهُ عَنْهُ ثُمَّ قَالَ جِبْرَئِيْلُ هٰذَا مَلَكُ الْمَوْتِ يَسْتَاْذِنُ عَلَيْكَ مَا اسْتَاْذَنَ عَلٰى اٰدَمِيٍّ قَبْلَكَ وَلَا يَسْتَاْذِنُ عَلٰى اٰدَمِيٍّ بَعْدَكَ فَقَالَ ائْذَنْ لَهُ فَاَذِنَ لَهُ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَنِيْ اِلَيْكَ فَاِنْ اَمَرْتَنِيْ اَنْ اَقْبِضَ رُوْحَكَ قَبَضْتُ وَاِنْ اَمَرْتَنِيْ اَنْ اَتْرُكَهُ تَرَكْتُهُ فَقَالَ وَتَفْعَلُ يَا مَلَكَ الْمَوْتِ قَالَ نَعَمْ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاُمِرْتُ اَنْ اُطِيْعَكَ قَالَ فَنَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ فَقَالَ جِبْرَئِيْلُ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ قَدِ اشْتَاقَ اِلٰى لِقَائِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَلَكِ الْمَوْتِ امْضِ لِمَا اُمِرْتَ بِهِ فَقَبَضَ رُوْحَهُ فَلَمَّا تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَآءَتِ التَّعْزِيَةُ سَمِعُوْا صَوْتًا مِنْ نَاحِيَةِ الْبَيْتِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ اِنَّ فِي اللّٰهِ عَزَاءً مِنْ كُلِّ مُصِيْبَةٍ وَخَلَفًا مِنْ كُلِّ هَالِكٍ وَدَرَكًا مِنْ كُلِّ فَائِتٍ فَبِاللّٰهِ فَاتَّقُوْا وَاِيَّاهُ فَارْجُوْا فَاِنَّمَا الْمُصَابُ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابَ فَقَالَ عَلِيٌّ اَتَدْرُوْنَ مَنْ هٰذَا هُوَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت امام جعفر صادق ابن محمدؒ اپنے والد (حضرت امام محمد باقرؒ) سے روایت کرتے ہیں کہ قریش میں سے ایک شخص ان کے والد حضرت امام علیؒ زین العابدین ابن حسین (نبیرہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت امام علی زین العابدین نے اس سے کہا کہ کیا میں تمہارے سامنے رسول کریم ﷺ کی حدیث بیان کروں اس شخص نے کہا: ہاں ہمارے سامنے حضرت ابوالقاسم (محمد ﷺ) کی حدیث ضرور بیان کیجئے۔ چنانچہ امام علی زین العابدینؒ نے بیان کیا جب رسول کریم ﷺ بیمار ہوئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام (عیادت کرنے اور پیغام خداوندی پہنچانے کے لئے) آپ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا: اے محمد (ﷺ)! اللہ تعالیٰ نے آپ کی تکریم کے لئے اور آپ (ﷺ) کی تعظیم کے لئے مجھے آپ (ﷺ) کی خدمت میں بھیجا ہے اور یہ تعظیم و تکریم (جس بات کی صورت میں ہے وہ صرف) آپ (ﷺ) کے لئے مخصوص ہے (اور وہ بات یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ آپ (ﷺ) سے وہ چیز دریافت کرتا ہے۔ جس کو وہ آپ ﷺ سے زیادہ جانتا ہے (کیونکہ ظاہر و باطن کی کون سی چیز اس سے پوشیدہ ہے) تاہم وہ دریافت کرتا ہے کہ آپ (ﷺ) اپنے کو کیسا پاتے ہیں یعنی آپ کا کیا حال ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جبرئیل امیں اپنے آپ کو مغموم پاتا ہوں اور اے جبرئیل میں اپنے آپ کو مضطرب و پریشان پاتا ہوں حضرت جبرئیل علیہ السلام (یہ جواب لیکر چلے گئے اور) پھر دوسرے دن آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہی الفاظ کہے جو پہلے دن کہے تھے، نبی کریم ﷺ نے بھی جواب میں وہ بات کہی جو پہلے کہی تھی، تیسرے دن حضرت جبرئیل علیہ السلام پھر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور وہی الفاظ کہے جو پہلے تھے، نبی کریم ﷺ نے بھی جواب میں وہی بات کہی جو پہلے کہی تھی اور اسی دن یا

اس کے بعد کسی اور دن حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ایک اور فرشتہ بھی تھا جس کو اسمٰعیل کہا جاتا ہے اور ایسے ایک لاکھ فرشتوں کا افسر ہے۔ جن میں ایک ایک فرشتہ ایک ایک لاکھ فرشتوں کا افسر ہے، اس اسمٰعیل فرشتے نے آپ کی خدمت میں باریاب ہونے کی اجازت مانگی، آنحضرت ﷺ نے اسمٰعیل فرشتہ کو باریابی کی اجازت دی اور پھر حضرت جبرئیلؑ نے (کچھ لمحے توقف کے بعد) کہا کہ یہ موت کا فرشتہ (عزرائیل) بھی حاضر ہے اور باریابی کی اجازت چاہتا ہے، حالانکہ اس فرشتہ موت نے نہ تو کبھی آپ ﷺ سے پہلے کسی شخص سے اجازت مانگی ہے۔ اور نہ کبھی آپ ﷺ کے بعد کسی شخص سے اجازت مانگے گا (یعنی یہ صرف آپ ﷺ کا اعزاز و شرف ہے کہ اس کو آپ ﷺ سے اجازت مانگنے کی ضرورت ہوئی ہے) ورنہ دوسرے آدمیوں کے پاس تو اچانک پہنچتا ہے اور روح قبض کر لیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس کو اجازت دے دو۔ چنانچہ حضرت جبرئیل نے فرشتہ موت کو اجازت سے آگاہ کیا اور اس نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا (اور آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیا) اس کے بعد فرشتہ موت نے عرض کیا کہ اے محمد (ﷺ)! اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ اگر آپ (ﷺ) اپنی روح قبض کرنے کا حکم دیں تو قبض کر لوں اور اگر آپ ﷺ یہ حکم دیں کہ میں آپ کو چھوڑ دوں تو میں چھوڑ دوں گا آپ نے فرمایا: اے فرشتہ موت! کیا تم (وہی) کرو گے (جو میں تمہیں حکم دوں گا) فرشتہ موت نے جواب دیا بیشک مجھے تو حکم ہی یہ دیا گیا ہے (کہ آپ (ﷺ) کو اختیار دیدوں) اور آپ (ﷺ) جو کچھ فرمائیں اس کی اطاعت کروں۔ امام علی زین العابدینؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (فرشتہ موت کی یہ بات سن کر) حضرت جبرئیل کی طرف دیکھا (گویا ان سے مشورہ چاہا کہ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے۔) حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: اے محمد! حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ (ﷺ) کی ملاقات کے مشتاق ہیں۔ آنحضرت نے یہ سنا تو بلا تامل فرشتہ موت سے فرمایا کہ: جس بات کا تم کو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرو، چنانچہ فرشتہ موت نے آپ ﷺ کی پاک روح قبض کر لی۔ جب رسول کریم ﷺ کا وصال ہو گیا اور ایک تعزیت کرنے والا (اہل بیت کو تسلی دینے) آیا تو لوگوں نے گھر کے ایک گوشہ سے آتی ہوئی آواز سنی کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے: اے اہل بیت اور وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں تم پر سلامتی ہو۔ اللہ کی مہربانی اور اس کی برکتیں نازل ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی کتاب یا اللہ کے دین میں ہر مصیبت کے وقت تسکین و تسلی کا سامان موجود ہے، اللہ تعالیٰ ہر ہلاک ہونے والی چیز کا بدلہ عطا کرنے والا اور ہر فوت ہونے والی شے کا تدارک کرنے والا ہے جب صورت یہ ہے تو اللہ کی مدد سے تقویٰ اختیار کرو، اس سے امید رکھو، مصیبت زدہ حقیقت میں وہ شخص ہے؟ جو ثواب سے محروم کر دیا گیا، حضرت علیؓ نے کہا تم لوگ جانتے ہو (تعزیت و تسلی کے الفاظ کہنے والا) یہ کون شخص ہے؟ یہ حضرت خضرؑ ہیں۔" (اس روایت کو بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے)

تشریح: "اپنے آپ کو مضطرب و پریشان پاتا ہوں" بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل کے سامنے اپنے جس غم و کرب اور اضطراب و پریشانی کا اظہار کیا اس کا تعلق امت کے مستقبل سے تھا کہ میرے بعد میری امت نہ معلوم کن حالات سے دوچار ہو اور مسلمانوں کو کن نقصانات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے۔

"اسماعیل فرشتہ" کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ یہ آسمان دنیا کا درواغہ ہے۔ نیز حدیث میں جس طرح اسماعیل فرشتہ کے آنے کا ذکر ہے۔ اسی طرح فرشتہ موت یعنی عزرائیل کی آمد کا ذکر نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت فرشتہ موت کا آنا بالکل ظاہر بات ہے۔ جس کو بیان کرنے کی حاجت نہیں تھی یا یہ کہ فرشتہ موت حضرت جبرئیل علیہ السلام اور اسمٰعیل فرشتہ کے آنے کے بعد عین اسی وقت حاضر ہوا ہو گا جب حضرت جبرئیل نے اس کی حاضری کی اطلاع اور اس کی طرف سے اجازت باریابی کی درخواست آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی اور سیوطی نے بیہقیؒ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ تیسرے دن جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے تو ان کے ساتھ فرشتہ موت بھی تھا اور ان دونوں کے ساتھ ہوا میں ایک اور فرشتہ تھا جس کو اسمٰعیل کہا جاتا ہے اور جو ایسے ستر ہزار فرشتوں پر حاکم مقرر ہے جن میں سے ایک ایک فرشتہ دوسرے ستر ہزار فرشتوں کا افسر اعلیٰ ہے۔

"چنانچہ فرشتہ موت نے آپ ﷺ کی روح قبض کر لی" کے تحت شیخ عبدالحق لکھتے ہیں۔ "جب حضرت جبرئیل اور ان کے ساتھ

فرشتہ موت اور ایک تیسرا فرشتہ حضرت اسمٰعیل آئے اور مذکورہ گفتگو پوری ہوگئی تو اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو تھوڑی دیر مہلت ملی اور اس مہلت میں آپ ﷺ نے صحابہؓ کو اس سارے واقعہ اور گفتگو کی خبر دی اور پھر اس کے بعد فرشتہ موت نے آپ ﷺ کی روح قبض کی یا یہ ہوا کہ عالم غیب کا یہ سارا واقعہ اور گفتگو بعض ان صحابہؓ پر بھی منکشف ہوئی جو اس وقت آپؐ کے پاس موجود تھے اور انہی صحابہ میں سے کسی نے امام علی زین العابدینؒ سے یہ واقعہ بیان کیا جن کو امام علی زین العابدینؒ نے روایت کے شروع میں "قریش میں سے ایک شخص" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ہمارا دل یوں کہتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام ایک قریشی شخص کی صورت میں حضرت امام علی زین العابدین کے پاس آئے تھے اور انہوں نے یہ حدیث ان سے بیان کی اسی لئے امام زین العابدینؒ نے راوی کا ذکر مبہم الفاظ میں کیا"

ایک روایت میں حضرت اُم سلمہؓ سے منقول ہے کہ انتقال کے وقت نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک پر وصیت و نصیحت کے جو الفاظ بہت زیادہ تھے وہ یہ تھے:

اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔

"نماز اور اپنے ملوک غلاموں کا خاص خیال رکھنا۔"

ان فی اللہ عزاء کے معنی و مطلب میں شارحین حدیث کے مختلف اقوال ہیں) مثلاً ایک قول یہ ہے کہ فی اللہ (اللہ میں) کے الفاظ دراصل فی کتاب اللہ (اللہ کی کتاب میں) کا مفہوم رکھتے ہیں، مطلب یہ مصیبت و غم کے موقع پر تسلی و تسکین دینے یا حاصل کرنے کی راہنمائی کتاب اللہ میں موجود ہے، پس ان الفاظ میں گویا اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے:

وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْھُمْ مُصِیْبَۃٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

"اور آپ ﷺ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہے) کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے ہی ملک ہیں اور اسی کے پاس جانے والے ہیں۔"

دوسرا قول یہ ہے کہ فی اللہ دراصل فی دین اللہ (اللہ کے دین میں) کے معنی میں ہے اور مطلب یہ کہ اللہ کے دین میں ہر مصیبت و غم کے موقع پر اس "صبر" کی صورت میں تسلی کا سامان موجود ہے جس کی تلقین شارع علیہ السلام نے کی ہے۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اللہ میں تسکین و تسلی کا سامان موجود ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مصیبت و غم کے وقت صبر اور تسکین و تسلی عطا کرنے والا ہے۔ گویا علم بیان کی اصطلاح میں یہ بات "تجرید" کے طور پر کہی گئی ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ عربی میں کہا جاتا ہے:

رأیت فِیْ زید اسدا۔ "میں نے زید میں شیر دیکھا۔"

اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے زید کو شیر کی طرح طاقتور اور بہادر پایا۔ یہ احتمال مابعد عبارت کے اعتبار سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

خلفا من کل ھالک و درکا من کل فائت کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ترجمہ میں مذکور ہوئے کہ اللہ ہر ہلاک ہونے والی چیز کا بدلہ عطا کرنے والا اور ہر فوت ہونے والی شئے کا تدارک کرنے والا ہے اور ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اللہ کے دین یا اللہ کی کتاب مین وہ تعلیمات مذکور ہیں کہ ان پر عمل کرکے انسان بڑی سے بڑی محرومی امر بڑے سے بڑے نقصان کو اپنے حق میں نعم البدل یعنی اخروی اجر وانعام کا باعث بنا سکتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ کی مدد سے تقویٰ اختیار کرو" یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم و فیصلہ کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرکے اور اس کی مدد توفیق کے ذریعہ صبر و استقامت اختیار کرو، رونے دھونے اور بے صبری و بے قراری سے دور رہو۔ ان الفاظ میں گویا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کرنے

کی تلقین ہے کہ:

وَاصْبِرْ وَمَاصَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ "اور صبر کرو اور تمہارا صبر کرنا اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔"

اور ایک روایت میں یہاں (فاتقوا یعنی تقویٰ اختیار کرو، کے بجائے) فثقوا کا لفظ ہے (جیسا کہ حصن حصین میں بھی منقول ہے) اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اللہ پر اعتماد کرو اور کہا جائے گا کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے کہ:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ۔ "اور اسی حی لایموت (اللہ) پر توکل رکھو۔"

"اسی سے امید رکھو" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی سے اپنی امیدیں وابستہ نہ کرو کیونکہ امید اسی ذات سے وابستہ کی جاسکتی ہے جو معبود ہو اور معبود اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ صبر پر تمہارے لئے اللہ کے ہاں جو اجر و ثواب ہے اس کی پوری پوری امید رکھو۔ جو ثواب سے محروم کردیا گیا کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی مصیبت زدہ وہ شخص نہیں ہے جو کسی دنیاوی مصیبت میں مبتلا ہو کیونکہ کسی دنیاوی مصیبت پر صبر کرکے بحسب مرتبہ بڑے سے بڑا ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے بلکہ حقیقی مصیبت زدہ تو وہ ہے جو مصیبت پر صبر نہ کرے اور پھر اخروی اجر و ثواب سے محروم قرار پائے۔ واضح رہے کہ اللہ کے نزدیک وہی صبر معتبر ہے جو مصیبت و صدمہ کے وقت شروع ہی میں حاصل ہو جائے۔ "حضرت علیؓ نے کہا: تم لوگ جانتے ہو؟ یہ اس نامعلوم آواز کی وضاحت تھی جو گھر کے ایک گوشہ سے آرہی تھی، چنانچہ حضرت علیؓ نے بتایا یہ آواز دراصل حضرت خضر علیہ السلام کی ہے۔ جو اہل بیت نبوی اور صحابہ کرام سے تعزیت کے لئے یہاں آئے ہیں۔ نیز عبارت کے ظاہری سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "علی" سے مراد امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ کی ذات ہے جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ تاہم اس احتمال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ حدیث کے راوی امام علی زین العابدین ہی مراد ہوں، اور انہوں نے یہ حدیث روایت کرتے وقت اس آواز کی وضاحت میں یہ بات کہی ہو۔"

حصن حصین میں رمز مستدرک کے ساتھ یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح عالم بالا کو پرواز کرگئی تو فرشتوں نے (غیبی آواز کی صورت میں) صحابہ اور اہل بیت نبوی سے تعزیت کی۔ تعزیت کے وہی الفاظ نقل کرنے کے بعد کہ جو اوپر حدیث میں نقل ہوئے ہیں، ایک اور روایت یوں نقل کی ہے: (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد) ایک سفید ریش شخص، جو نہایت تنومند اور خوش شکل تھا۔ اچانک (حجرہ نبوی میں) داخل ہوا اور صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ الفاظ کہے:

فی اللّٰہ عزاء۔ "اللہ کی کتاب یا اللہ کے دین میں ہر مصیبت حادثہ کے وقت تسکین و تسلی کا سامان موجود ہے۔"

حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے وہاں موجود لوگوں کو بتایا کہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ اس روایت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اوپر کی حدیث میں "علی" سے مراد حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ مراد ہیں۔

باب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مالی وصیت نہیں کی

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

(۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَاتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَ لَا شَاةً وَّلَا بَعِيْرًا وَّلَا اَوْصٰى بِشَيْءٍ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے بعد نہ کوئی دینار چھوڑا، اور نہ کوئی درہم نہ کوئی بکری چھوڑی اور نہ آپ

نے کسی چیز کی وصیت کی۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اور نہ آپ ﷺ نے کسی چیز کی وصیت کی" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے از قسم مال کسی چیز کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کی کیونکہ جب آپ ﷺ سرے سے کوئی جائیداد چھوڑ کر ہی نہیں جارہے تھے تو وصیت کی نوبت کیوں آتی رہا بنی نضیر اور فدک وغیرہ کی زمین جائداد کا معاملہ تو اس کو آپ ﷺ نے اپنی حیات ہی میں تمام مسلمانوں کے لئے صدقہ کردیا تھا صرف اپنے اہل وعیال کے نفقہ کے بقدر اسمیں سے لیتے تھے۔

اس موقع پر نوویؒ لکھتے ہیں: ایک اور روایت میں منقول ہے کہ "جب لوگوں نے حضرت عائشہؓ کے سامنے یہ ذکر کیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا وصی بنایا، تو حضرت عائشہؓ نے (حیرت سے) فرمایا: آپ ﷺ نے کب وصیت فرمائی تھی؟ میں (تو آخر وقت تک آپ ﷺ کے پاس رہی اور) جب تک کہ آپ ﷺ کی روح پرواز نہیں کرگی آپ ﷺ کا تکیہ بنی بیٹھی رہی اور (اگر آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کے حق میں کوئی وصیت کی ہوتی اور ان کو اپنا وصی یعنی اپنے مال وجائیداد کا وارث یا نگراں بنایا ہوتا تو اس کا علم مجھ سے زیادہ کس کو ہوتا۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں غلط کہتے ہیں، آپ ﷺ نے کسی کو وصی نہیں بنایا" پس حدیث کے الفاظ ولا اوصی بشئی کا موضوع مالی وصیت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نہ تو اپنے مال کے تہائی حصہ کی وصیت نہ تہائی سے زیادہ یا کم کی، کیونکہ آپ ﷺ کے پاس نہ کوئی مال تھا نہ جائیداد کہ اس کے بارے میں وصیت کرتے اسی طرح آپ ﷺ نے نہ تو حضرت علیؓ کے حق میں کوئی وصیت کی اور نہ کسی دوسرے کے حق میں جیسا کہ شیعوں کا غلط گمان ہے۔ جہاں تک ان احادیث صحیح کا تعلق ہے جن میں کتاب اللہ کے متعلق وصیت کرنے یا غیر قوموں کے ایلچیوں اور وفدوں کی خاطرداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرنے کا ذکر ہے تو وہ دوسرا موضوع ہے۔ جو حدیث کے مذکورہ الفاظ ولا وصی بشئی کی مراد نہیں ہے بعض سیرت نگاروں نے جو یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس بہت اونٹ تھے، دس اونٹنیاں تھیں اور ان اونٹنیوں اور اونٹوں کو نواح مدینہ میں رکھا جاتا تھا جہاں سے اونٹنیوں کا دودھ نکال کر لوگ روزانہ رات میں لایا کرتے تھے، نیز آپ ﷺ کے پاس سات بکریاں بھی تھیں جن کا دودھ آپ ﷺ پیا کرتے تھے۔ تو یہ روایت اول تو اس حیثیت کی نہیں ہے کہ مذکورہ بالا حدیث کی معارض بن سکے دوسرے اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس بات پر محمول ہوگی کہ وہ اونٹ وغیرہ صدقہ کا مال تھے اور ان کے ذریعہ جو دودھ حاصل ہوتا اس کو اصحاب صفہ اور دوسرے غیر مستطیع ومفلس لوگ پیا کرتے تھے۔

حضور ﷺ نے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا

② وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْحَارِثِ اَخِیْ جُوَیْرِیَةَ قَالَ مَاتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ مَوْتِهٖ دِیْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَّلَا عَبْدًا وَّلَا اَمَةً وَّلَا شَیْئًا اِلَّا بَغْلَتَهُ الْبَیْضَاءَ وَسِلَاحَهٗ وَاَرْضًا جَعَلَهَا صَدَقَةً۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عمرو ابن حارثؓ جو (صحابی ہیں اور) ام المؤمنین حضرت جویریہؓ کے بھائی ہیں کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنی وفات کے وقت نہ کوئی دینار چھوڑا، نہ درہم چھوڑا، نہ غلام چھوڑا، نہ لونڈی چھوڑی اور نہ کوئی اور چیز چھوڑی، البتہ آپ کا ایک سفید خچر تھا (جس کو دلدل کہا جاتا تھا اور جو مقوقس حاکم اسکندریہ نے تحفہ کے طور پر آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا) آپ ﷺ کے کچھ ہتھیار تھے، اور آپ ﷺ کی کچھ زمین تھی اس کو بھی آپ ﷺ نے صدقہ کردیا تھا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "نہ غلام چھوڑا نہ کوئی لونڈی چھوڑی۔" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی لونڈی اور غلام نہیں تھا جو رق یعنی بطور مملوک آپ ﷺ کی غلامی میں رہے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض روایتوں میں آنحضرت ﷺ کے بردوں (لونڈی غلاموں) کا جو ذکر آیا ہے تو یا وہ سب آپ ﷺ کی حیات ہی میں مرگئے ہوں گے یا آپ ﷺ نے ان کو آزاد کردیا ہوگا۔

"آپ ﷺ کے کچھ ہتھیار تھے۔" میں ہتھیار سے مراد وہ ہتھیار ہیں جو خاص آپ ﷺ کے استعمال میں رہتے تھے جیسے تلوار، نیزے، زرہ، خود اور بھالدار عصا یعنی برچھا۔ اور ایک روایت میں صرف یک زرہ کا ذکر ہے جو وفات کے وقت آپ ﷺ نے چھوڑی تھی اور وہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ حدیث میں جو حصر ہے (کہ وفات کے وقت آپ ﷺ کے پاس صرف یہ چند چیزیں تھیں) وہ اضافی ہے اور اس بات پر مبنی ہے کہ استعمال کے کپڑے اور معمولی گھریلو سامان جیسی چھوٹی موٹی چیزوں کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا اور نہ ان چیزوں کا مال و جائیداد میں شمار ہوتا ہے، چنانچہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کچھ کپڑے وغیرہ چھوڑے تھے۔

"اس کو بھی آپ ﷺ نے صدقہ کر دیا تھا" کے بارے میں ایک شارح نے لکھا ہے کہ **جعلها** کی ضمیر تمام مذکورہ چیزوں یعنی خچر ہتھیار اور زمین کی طرف راجع ہے جب کہ بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ **جعلها** کی ضمیر صرف زمین کی طرف راجع ہے نیز عسقلانی نے لکھا ہے: "اس کو صدقہ کر دیا تھا" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے زمین کی منفعت کو صدقہ کر دیا تھا یعنی یہاں "صدقہ وقف" کے حکم میں ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس زمین کو، اس کے باقی و قائم رہنے تک اپنی حیات ہی میں صدقہ جاریہ باقیہ کر دیا تھا، اس طرح وہ زمین جب تک باقی رہے گی اس کے صدقہ کا ثواب آنحضرت ﷺ کو ملتا رہے گا۔ پس یہ بات اس کے منافی نہیں ہے کہ جو باقی چیزیں آپ ﷺ کے پاس تھیں وہ آپ ﷺ کی وفات ہوتے ہی خود بخود صدقہ ہو گئیں۔ علامہ کرمانیؒ شرح بخاری میں لکھتے ہیں: (حدیث میں "زمین" کا جو ذکر ہے تو اس سے) وادی قریٰ کی آدھی زمین خیبر کی زمین کا پانچواں حصہ۔ اور بنو نضیر کی زمین جائداد کا وہ حصہ مراد ہے جو آپ ﷺ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا، نیز **جعلها** کی ضمیر حدیث میں مذکورہ تینوں چیزوں (یعنی خچر، ہتھیار اور زمین) کی طرف راجع ہے نہ کہ صرف زمین کی طرف اور یہ بات آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے ثابت ہوتی ہے کہ: ہماری انبیاء کی جماعت میراث نہیں چھوڑتی ہے، ہمارا جو کچھ ترکہ ہوتا ہے وہ سب صدقہ ہو جاتا ہے۔

حضور ﷺ کا ترکہ وارثوں کا حق نہیں

(۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقْتَسِمُ وَرَثَتِیْ دِیْنَارًا مَاتَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ نِسَائِیْ وَمُؤْنَةِ عَامِلِیْ فَهُوَ صَدَقَةٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "میری وفات کے بعد میرے وارث دینار نہیں بانٹیں گے، میرا جو کچھ بھی ترکہ ہو گا وہ عورتوں کے خرچ اور عامل کی اجرت کے بعد باقی سب صدقہ ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "میرے وارث دینار نہیں بانٹیں گے" یہ آنحضرت ﷺ کا حقیقی طور پر خبر دینا ہے کہ میں اپنے ترکہ میں کوئی دینار و درہم نہیں چھوڑوں گا، اور جب میں کوئی دینار و درہم چھوڑوں ہی گا نہیں تو میرے مرنے کے بعد میرے ورثاء کے درمیان دینار و درہم تقسیم ہونے کی نوبت بھی نہیں آئے گی یا یہ کہ یہ جملہ ظاہری اسلوب کے اعتبار سے تو خبر دینے کے طور پر ہے مگر حقیقت میں نہی (ممانعت) کا مفہوم رکھتا ہے جس کا مطلب یہ ہو گا میں جو کچھ چھوڑ کر جاؤں ان کو میرے ورثاء آپس میں تقسیم نہ کریں۔ اور پھر آگے اس ممانعت کی علت بیان فرمائی کہ میرا سارا ترکہ میری بیویوں کے مصارف اور میرے عاملوں کی اجرت کے بعد باقی سب صدقہ ہو گا۔ واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کا حکم وہ نہیں جو عدت والی عورتوں کا ہوتا ہے کیونکہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد کسی اور سے نکاح کر لینا ان کے لئے جائز نہیں تھا، اس لئے ان کے خرچ کی کفالت اور ان کا نفقہ پورا آپ ﷺ کے ترکہ سے متعلق رہا۔ نیز "عامل" سے مراد وہ حضرات ہیں جو آپ ﷺ کے بعد مسند خلافت پر فائز ہوئے۔ پس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہوا کہ میرے ترکہ میں سے میری بیویوں کا نفقہ پورا کیا جائے اور میرے خلفاء بھی اپنے مصارف میں خرچ کریں، اور پھر جو باقی رہے اس کو فقراء و مستحقین پر صرف کیا جائے جیسا کہ میں صرف کیا کرتا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے اہل و عیال کا نفقہ "صفایا" کی آمدنی سے پورا

کرتے تھے۔ جو بنی نضیر کی جائداد میں سے آپ ﷺ کے حصے اور فدک کی زمین پر مشتمل تھا، بقدر نفقہ لینے کے بعد آمدنی کا باقی تمام حصہ مسلمانوں کے مصالح و مصارف میں خرچ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد مذکورہ زمین جائداد کے متولی حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ہوئے اور وہ اپنے ذاتی مال و دولت کی وجہ سے اس زمین جائداد کی آمدنی سے مستغنی رہے۔ تو انہوں نے وہ ساری زمین جائداد اپنے اقارب میں سے مروان وغیرہ کو عطا کر دی، جس پر وہ لوگ قابض رہے یہاں تک حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مروان وغیرہ کے ورثاء سے اس زمین جائداد کو واپس لے کر حسب سابق مصارف کے لئے مخصوص کر دیا۔

نبی کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی

④ وَعَنْ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوبکر کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "ہم (انبیاء) جو کچھ (زمین جائداد یا مال) چھوڑتے ہیں اس میں میراث جاری نہیں ہوتی بلکہ وہ صدقہ ہے"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انبیاء از قسم مال و جائداد جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ میراث کے طور پر ان کے پسماندگان کا حق نہیں ہوتا بلکہ صدقہ کا مال ہوتا ہے جس کا مصرف فقراء و مساکین ہوتے ہیں اور صوفیہ کے نزدیک "فقیر" کی تعریف یہ ہے کہ وہ شخص جو کسی چیز کا مالک نہ ہو"۔ پس انبیاء کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ بظاہر ان کا ہوتا ہے لیکن حقیقت میں امانت یا وقف اور یا صدقہ کے طور پر ان کے پاس رہتا ہے اور جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے اسی وجہ سے نہ انبیاء کی مالی میراث جاری ہوتی ہے اور نہ کوئی شخص ان کا وارث قرار پاتا ہے، اور جب ان کی وراثت ہی قائم نہیں ہوتی تو ان کے ورثاء اور پسماندگان میں کسی کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ ان کا ترکہ پانے کی تمنا میں ان کی موت سے خوش ہو، تفصیلی روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ حدیث اس وقت بیان کی تھی جب حضرت فاطمہؓ کی طرف سے میراث کا مطالبہ سامنے آیا تھا، انہوں نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ: میں رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں، میں آپ ﷺ کا ترکہ انہی مصارف میں خرچ کرتا ہوں جہاں آنحضرت ﷺ خرچ فرمایا کرتے تھے اور اسی اعتبار سے میں تمہاری غمخواری بھی اسی طرح کرتا ہوں جس طرح آنحضرت ﷺ تمہاری غمخواری کرتے تھے یہ حدیث میں نے خود آنحضرت ﷺ سے سنی ہے کہ ہم انبیاء کی (مالی) وراثت قائم نہیں ہوتی۔ یہ بھی منقول ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات صرف فاطمہؓ سے نہیں کہی تھی بلکہ ازواج مطہرات سے بھی کہی تھی جنہوں نے میراث کا مطالبہ کیا تھا، اور حضرت ابوبکرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کی مالی میراث قائم نہیں ہوگی، تنہا اپنی مرضی سے نہیں دیا تھا بلکہ انہوں نے تمام بڑے بڑے صحابہؓ کو بلا کر مشورہ کیا، اور جب سب صحابہؓ نے یہی کہا کہ آپ ﷺ کی وراثت قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم نے خود آنحضرت ﷺ سے ایسا ہی سنا ہے تو حضرت ابوبکرؓ نے مذکورہ فیصلہ دیا۔

امت مرحومہ کے نبی اور امت غیر مرحومہ کے نبی کی وفات کے درمیان امتیاز

⑤ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَرَادَ رَحْمَۃَ اُمَّۃٍ مِنْ عِبَادِہٖ قَبَضَ نَبِیَّھَا قَبْلَھَا فَجَعَلَہٗ لَھَا فَرَطًا وَّ سَلَفًا بَیْنَ یَدَیْھَا وَاِذَا اَرَادَ ھَلَکَۃَ اُمَّۃٍ عَذَّبَھَا وَنَبِیُّھَا حَیٌّ فَاَھْلَکَھَا وَھُوَ یَنْظُرُ فَاَقَرَّ عَیْنَیْہِ بِھَلَکَتِھَا حِیْنَ کَذَّبُوْہُ وَعَصَوْا اَمْرَہٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس اُمت کو اپنی رحمت و مہربانی سے نوازنا چاہتا ہے اس اُمت کے نبی کو اس اُمت (کی مجموعی ہلاکت) سے پہلے اٹھالیتا ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ اس نبی کو اس امت کا میر منزل اور پیش رو بنا دیتا ہے۔ (یعنی اگر وہ نبی اپنی اُمت سے راضی اور خوش جاتا ہے تو آخرت میں اپنی اُمت کا شافع ہوتا

ہے)اور جب اللہ تعالیٰ کسی اُمت کو ہلاک کردینا چاہتا ہے تو اس اُمت پر اس نبی کی زندگی ہی میں عذاب مسلط کردیتا ہے، چنانچہ اُمت ہلاکت وتباہی کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ نبی اپنی اُمت کی ہلاکت تباہی کو اپنی نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے یعنی خوش ہوتا ہے کیونکہ وہ اُمت اپنے نبی کو جھٹلاتی تھی اور اس کے احکام کی نافرمانی کرتی تھی۔" (مسلمؒ)

ذات رسالت ﷺ سے اُمت کی عقیدت ومحبت کی پیش خبری

(۶) وعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اَحَدِكُمْ يَوْمٌ وَلَا يَرَانِیْ ثُمَّ لَاَنْ يَرَانِیْ اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنْ اَهْلِهٖ وَمَالِهٖ مَعَهُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، ایک دن تم لوگوں پر ایسا آئے گا جو شخص مجھ کو نہیں دیکھے گا، اس کو میرا دیکھنا اس سے کہیں زیادہ پسند ہوگا کہ وہ اپنے اہل وعیال اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنے مال ومتاع کو دیکھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یا تو آپ ﷺ کے اس ارشاد کا تعلق آپ ﷺ کی حیات میں آپ ﷺ کو دیکھنا اور آپ ﷺ کی محبت اختیار کرنے سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے صحابہؓ کو مجھ سے اتنی زیادہ محبت اور تعلق ہے کہ اگر وہ مجھ کو ایک دن نہ دیکھیں اور میری صحبت سے محروم رہیں تو ان کا اشتیاق واضطراب کہیں بڑھ جائے، اس صورت میں وہ اپنے اہل وعیال اور اپنے مال ومتاع کو دیکھنے اور ان کے پاس رہنے سے زیادہ اس بات کو پسند کریں گے کہ میرا دیدار کریں اور میری صحبت میں رہیں۔ یا اس ارشاد گرامی میں دراصل اس بات کی پیش خبری ہے کہ میرے تئیں میری اُمت کی عقیدت ومحبت میری وفات کے بعد بھی کم نہیں ہوگی بلکہ مسلمان اپنے اہل وعیال اور اپنے مال ومتاع کی طرف رغبت وتعلق رکھنے سے کہیں زیادہ یہ چاہیں گے کہ کسی بھی طرح خواہ خواب میں خواہ بیداری میں، میرا دیدار کرلیں، مجھے دیکھ لیں، سیاق کلام کو دیکھتے ہوئے یہی مطلب زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے پس یہی وہ کیفیت ہے جو ان مشتاقان جمال کا سرمایۂ حیات بنی رہتی ہے جو ذات رسالت پناہ ﷺ کے جمال وکمال کے تصور میں مستغرق رہتے ہیں۔

باب مناقب قریش وذکر القبائل
قریش کے مناقب اور قبائل کے ذکر کا بیان

"مناقب" لفظ "منقب" کی جمع ہے جس کے معنی شرف اور فضیلت کے ہیں اور "قریش" عرب کے مشہور قبیلہ کا نام ہے ویسے "قریش" کے لغوی معنی ایک بڑے خطرناک اور طاقتور سمندری جانور کے ہیں، لیکن اصل میں یہ نضر ابن کنانہ (یا فہر ابن مالک ابن نضر) کا لقب تھا جن کی اولاد مختلف شاخ در شاخ خاندانوں میں پھیلی اور ان سب خاندانوں پر مشتمل قبیلہ مورث اعلیٰ کے لقب کی مناسبت سے "قریش" کہلایا "قبائل" لفظ "قبیلہ" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: ایک باپ کی اولاد۔ اور قبائل کے ذکر سے مراد عرب کے مختلف قبیلوں کی خصوصیات اور ان کی اچھائیاں یا برائیاں بیان کرنا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قریش کی فضیلت

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ النَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَيْشٍ فِیْ هٰذَا الشَّاْنِ مُسْلِمُهُمْ تَبَعٌ لِمُسْلِمِهِمْ

وَكَافِرُهُمْ تَبَعٌ لِكَافِرِهِمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اس بات میں لوگ قریش کے تابع ہیں، قریش کے مسلمان (تمام غیر قریشی) مسلمانوں کے اور قریش کے کافر (تمام غیر قریشی) کافروں کے سردار ہیں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: حدیث کے ظاہری سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اس بات" سے مراد دین وشریعت ہے خواہ اس کے وجود کا اعتبار ہو یا اس کے عدم کا۔ مطلب یہ کہ دین کے قبول یا عدم قبول یعنی ایمان وکفر کے معاملہ میں تمام لوگ قریش کے پیچھے ہیں اور قریش اقدامی وپیشوائی حیثیت رکھتے ہیں، بایں طور کہ ایک طرف تو دین کا ظہور سب سے پہلے قریش میں ہوا اور سب سے پہلے قریش کے لوگ ایمان لائے اور پھر ان کی اتباع میں دوسرے لوگوں نے بھی ایمان لانا شروع کیا، دوسری طرف وہ یعنی قریش ہی کے لوگ تھے جنہوں نے دین کی سب سے پہلے مخالفت کی اور مسلمانوں کی راہ روکنے کے لئے سب سے پہلے آگے آئے اس طرح اگر قریش کے کافروں کے تابعدار ہوئے۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ فتح مکہ سے پہلے تمام اہل عرب، قریش مکہ کے اسلام لانے کا انتظار کرتے تھے۔ جب اہل اسلام کے ہاتھوں مکہ فتح ہو گیا اور قریش مکہ مسلمان ہو گئے تو تمام عرب کے لوگ بھی جماعت در جماعت اسلام میں داخل ہو گئے جیسا کہ سورہ اذا جاء نصر اللہ سے واضح ہوتا ہے۔

بہر حال اس ارشاد کا مقصد قریش کی قائدانہ حیثیت کو بیان کرنا ہے کہ قیادت امارت کا جوہر انہی کو نصیب ہے خواہ وہ اپنے عہد جاہلیت سے وابستہ رہے ہوں یا عہد اسلام سے، لیکن ان کی قیادت وامارت کو "فضل وشرف" کا اعتبار صرف اسلام کی صورت میں حاصل ہے نہ کہ کفر کی حالت میں۔ اور اگر "فضل وشرف" کی قید مقصود نہ ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں قریش مطلق قیادت وامارت کا ذکر ہے خواہ اس کا تعلق دنیاوی امور سے ہو خواہ مذہبی امور سے، چنانچہ زمانہ جاہلیت میں بھی نہ صرف دنیاوی اعتبار سے قریش مکہ تمام عرب قبائل میں "سردار" قبیلہ کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ اس وقت کے ان کے مذہبی معاملات جیسے اللہ کی تولیت وکلید داری اور پانی پلانے وغیرہ کی ذمہ داریوں کا اعزاز بھی انہی کو حاصل تھا۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ "اس بات" سے مراد امامت کبریٰ اور منصب خلافت ہے جیسا کہ دوسری حدیثوں میں وضاحت کے ساتھ منقول بھی ہے اور اس ارشاد گرامی کا مقصد قریش کی قیادت تسلیم کرنے اور ان کی اتباع کا حکم دینا ہے۔ پس اگر لوگ اس ارشاد گرامی کی روح اور اس سے اخذ شدہ حکم پر عمل نہ کرتے ہوئے قریش کی قیادت کو تسلیم نہ کریں اور ان کی اتباع سے انکار کریں تو یہ بات اس ارشاد گرامی کے اثبات کے منافی نہیں ہوگی، کیونکہ کسی بھی حکم کے اثبات کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ عملی اور واقعاتی طور پر اس کا ظہور بھی ہو، حکم کا مقصد تو کسی چیز کو ثابت کرنا ہوتا ہے، اگر کوئی اس حکم پر عمل نہ کرے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ حکم اپنی قوت اثبات ونفاذ سے خالی ہے، پس آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ قریش کی قیادت وامارت کو اختیار وقبول کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ قریش قیادت وامارت کا استحقاق اور اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں، خواہ کوئی ان کی قیادت وامارت کو تسلیم کرے اور ان کی تابعداری کرے یا نہ کرے۔

قریش ہی سردار ہیں

(۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ النَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَيْشٍ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "لوگ خیر اور شر (دونوں حالتوں) میں قریش کے تابع ہیں۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: "خیر" سے مراد "اسلام" ہے اور "شر" سے مراد "کفر" جیسا کہ اوپر کی حدیث کی تشریح میں تفصیل بیان ہوئی ہے۔

خلافت اور قریش

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَزَالُ هٰذَا الْاَمْرُ فِي قُرَيْشٍ مَا بَقِيَ مِنْهُمُ اثْنَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "یہ امر یعنی خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گا جب تک کہ ان میں سے دو آدمی بھی باقی رہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ہمیشہ قریش میں رہے" کا مطلب یہ ہے کہ خلافت کا استحقاق چونکہ قریش ہی سب سے زیادہ رکھتے ہیں اس لئے خلافت کا منصب جلیلہ قریش ہی کے پاس رہنا چاہئے اور غیر قریش کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ شرعاً جائز نہیں چنانچہ صحابہؓ کے زمانہ میں اس پر اجماع تھا اور یہی ارشاد گرامی ان انصار صحابہؓ کے مقابلہ پر مہاجر صحابہؓ کی دلیل بنا جنہوں نے خلافت کو انصار کا حق قرار دینا چاہا تھا۔

"جب تک کہ ان میں سے دو آدمی باقی رہے" یہ بات آپ ﷺ نے منصب خلافت کے تئیں قریش کے ترجیحی استحقاق کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے فرمائی کہ اگر قریش میں سے دو بھی باقی رہیں کہ ایک تو خلیفہ بن سکے اور دوسرا اس کا اطاعت گذار (یا یہ کہ خلیفہ کے علاوہ دو آدمی مراد ہیں) تو اس صورت میں بھی خلافت کو قریش ہی کا حق سمجھنا چاہئے۔

اس حدیث کی شرح میں نوویؒ لکھتے ہیں: "یہ اور اس جیسی دوسری احادیث کو جن میں خلافت کا استحقاق قریش کے لئے ذکر کیا گیا ہے، اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ خلافت کا منصب قریش کے لئے مخصوص ہے. غیر قریشی کو خلیفہ بنانا جائز نہیں ہے چنانچہ اسی نکتہ پر نہ صرف صحابہؓ کے زمانہ میں بلکہ صحابہؓ کے بعد بھی اُمّت کا اجماع رہا ہے، اہل بدعت یعنی اہل سنت و جماعت کے متفقہ مسلک سے انحراف کرنے والوں میں سے جن لوگوں نے اس مسئلہ میں اختلاف و انکار کی راہ اختیار کی (ان کی بات کو نہ صرف یہ اُمّت کے سواد اعظم نے تسلیم نہیں کیا) بلکہ ان کی تردید و تغلیط کے لئے یہی دلیل پیش کی گئی کہ قریش کے استحقاق خلافت پر صحابہؓ کا اجماع تھا" امام نوویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ یہ خبر دی ہے کہ یہ حکم (جس سے منصب خلافت کا قریش کے ساتھ مخصوص ہونا ظاہر ہوتا ہے) آخر زمانہ تک برابر جاری و نافذ رہے گا جب تک کہ اس دنیا میں دو آدمی بھی باقی رہیں پس آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا اور جو خبر دی وہی واقعہ کے اعتبار سے ثابت بھی ہوا کہ آج تک قریش کی خلافت اور ان کی بالادستی قائم ہے"۔ لیکن نوویؒ کا یہ نتیجہ بیان کرنا تاریخی حقیقت کے مطابق نہیں ہے، ان کے زمانہ تک تو قریش کی خلافت قائم تھی لیکن بعد میں قریش کی خلافت و امامت تمام عالم اسلام پر زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکی، ابتداء میں کچھ اوپر دو سو برس تک کا عرصہ تو ایسا گذرا کہ اس میں اکثر اسلامی علاقوں اور شہروں پر قریش کی خلافت و بالادستی قائم رہی مگر اس کے بعد خود مختاریوں کا دور شروع ہو گیا اور عالم اسلام میں مختلف حکمرانوں اور بادشاہوں کی اپنی اپنی حکومت و بالادستی قائم ہوگئی لہٰذا اس سلسلہ میں تحقیقی قول یہ ہے کہ یہ خبر دراصل امر یعنی حکم کے معنی میں ہے گویا آنحضرت ﷺ نے خبر کے اسلوب میں یہ حکم دیا ہے کہ جو بھی شخص ایمان و اسلام سے بہرہ ور ہو اس پر لازم ہے کہ وہ قریش کو اپنا سردار مانے، ان کی اتباع کرے اور ان کی امامت و قیادت سے انحراف نہ کرے، ویسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اپنے ظاہری معنی ہی پر محمول ہے مگر ما اقاموا الدین کے الفاظ کے ساتھ مقید ہے جو اگلی حدیث میں مذکور ہیں، اس صورت میں اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ: "منصب خلافت و امارت اس وقت تک برابر قریش میں رہے گا جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں گے"۔ چنانچہ یہی ہوا کہ قریش نے جب تک کہ خلافت کو دین کے تابع رکھا اور اسلام کی خدمت و اشاعت میں مصروف رہے، منصب خلافت ان کے ہاتھ سے نہیں گیا، لیکن جب انہوں نے نہ صرف یہ کہ دین کی طرف سے بے توجہی اختیار کرلی بلکہ حرام و ناجائز امور میں مبتلا ہو کر دین کی بے حرمتی کا مظاہرہ کرنے لگے تو خلافت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ سے چھن کر غیر قریش میں پہنچ گئی۔

قریش کا استحقاق خلافت دین کے ساتھ مقید ہے

④ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ فِيْ قُرَيْشٍ لَا يُعَادِيْهِمْ اَحَدٌ اِلَّا كَبَّهُ اللّٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ مَا اَقَامُوا الدِّيْنَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت امیر معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "بلاشبہ یہ امر یعنی منصب خلافت، قریش میں رہے گا جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں گے، جو بھی شخص ان (قریش) سے دشمنی وعداوت رکھے گا اس کو اللہ تعالیٰ الٹا لٹکا دے گا یعنی ذلت و خواری کا طوق اس کے گلے میں ڈال دے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ خلافت کا اصل مقصد چونکہ دین کو قائم کرنا اور اسلام کے جھنڈے کو سربلند رکھنا ہے اس لئے قریش جب تک دین و شریعت کی ترویج و اشاعت میں لگے رہیں گے اور اسلام کے جھنڈے کو سربلند رکھنے کی سعی و کوشش کرتے رہیں گے، وہ منصب خلافت کا استحقاق رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی سرداری و قیادت کو قائم رکھے گا لیکن جب وہ اپنے اصل فرض یعنی اقامت دین و اسلام سے غافل ہو جائیں گے اور خلافت کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنا چھوڑ دیں گے تو مستوجب غزل ہوں گے اور خلافت و امارت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ سے چھن جائے گی اور بعض شارحین نے یہ لکھا ہے کہ "دین قائم" کرنے سے مراد "نماز قائم کرنا" ہے جیسا کہ ایک روایت میں ما اقام الصلوۃ ہی کے الفاظ منقول بھی ہیں اور ویسے بھی بعض موقع پر دین اور ایمان کا اطلاق نماز پر آیا ہے، اسی بنیاد پر بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس ارشاد گرامی کا اصل مقصد قریش کو نماز قائم رکھنے کی تلقین و ترغیب اور اس بات سے ڈرانا ہے کہ اگر نماز قائم نہ رکھیں گے تو ہو سکتا ہے کہ منصب خلافت و امارت ان کے ہاتھ سے نکل جائے اور دوسرے لوگ ان پر غلبہ و تسلط حاصل کر لیں۔

قریش میں سے بارہ خلفاء کا ذکر

⑤ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَزَالُ الْاِسْلَامُ عَزِيْزًا اِلٰى اِثْنَيْ عَشَرَ خَلِيْفَةً كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا يَزَالُ اَمْرُ النَّاسِ مَاضِيًا مَا وَلِيَهُمُ اثْنَا عَشَرَ رَجُلًا كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا يَزَالُ الدِّيْنُ قَائِمًا حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ اَوْ يَكُوْنَ عَلَيْهِمُ اثْنَا عَشَرَ خَلِيْفَةً كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابر ابن سمرةؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا "اسلام کو بارہ خلفاء تک قوت وغلبہ حاصل رہے گا اور سب قریش میں سے ہوں گے" ایک روایت میں یوں ہے کہ "(آپ ﷺ نے فرمایا) لوگوں کے (دینی ومذہبی امور میں استقامت، ملی و ملکی معاملات میں استحکام اور عام نظم و نسق میں عدل وانصاف اور حق وراستی پر مبنی) نظام کار کا سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ ان کے حاکم وہ بارہ شخص ہوں گے جن کا تعلق قریش سے ہو گا" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ "(آپ ﷺ نے فرمایا) دین برابر قائم رہے گا یہاں تک کہ قیامت آئے اور لوگوں پر ان بارہ خلیفہ کی حکومت قائم ہو جو قریش میں سے ہوں گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے معنی مفہوم کے تعین میں مختلف اقوال بھی ہیں اور علماء نے اشکال کا اظہار بھی کیا ہے۔ اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث سے بظاہر جو بات مفہوم ہوتی ہے وہ یہ کہ "آنحضرت ﷺ کے بعد متصلاً یکے بعد دیگرے بارہ خلفاء ہوں گے جن کے زمانہ خلافت میں دین کا نظام مستحکم و برقرار رہے گا، ان کے وجود سے اسلام کو شان وشوکت حاصل ہو گی، اور نہ صرف یہ کہ خود وہ تمام بارہ خلفاء دین ومذہب کے سچے پابند وتابعدار ہوں گے بلکہ انکی خلافت وعدالت سے حق وانصاف کے مطابق احکام وہدایات کا اجراء ونفاذ ہو گا۔" حالانکہ تاریخی اور واقعاتی طور پر جو کچھ پیش آیا ہے وہ اس بات کی شہادت نہیں دیتا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے منصب خلافت وامارت پر فائز ہونے والوں میں بنی مروان میں کے وہ خلفاء و امراء بھی تھے جو نہ صرف یہ کہ اپنی سیرت اور طور طریقوں کے اعتبار سے دین ومذہب

سے مناسبت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی ظالمانہ اور مفسدانہ کاروائیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو شدید نقصانات اور مصائب برداشت کرنا پڑے علاوہ ازیں وہ صحیح حدیث بھی ہے جس کے مطابق آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ "میرے بعد تیس سال تک تو خلافت کا نظام قائم رہے گا اور اس کے بعد ظلم وزیادتی پر مبنی بادشاہت آجائے گی"۔ چنانچہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تیس برس کے عرصہ یعنی خلافت راشدہ کے بعد جو نظام حکومت ظاہر ہوا اس کو خلافت نہیں بلکہ بادشاہت و امارت کہنا چاہئے یہ ایک اہم اشکال ہے اور اسی بناء پر علماء نے اس حدیث کی توجیہ و تاویل میں مختلف اقوال پیش کئے ہیں ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ "بارہ خلیفوں" سے مراد وہ بارہ لوگ ہیں جو آنحضرت ﷺ کے بعد سریر آرائے خلافت اور حکومت و سلطنت ہوئے اور ان کے زمانہ اور اقتدار و حکومت میں مسلمانوں کے ظاہری حالات و معاملات اور رعایا کے مفاد کے اعتبار سے سلطنت و حکومت کا نظام مستحکم و متوازن رہا اگرچہ ان میں سے بعض برسر اقتدار لوگ ظلم و بے انصافی کے راستہ پر بھی چلے، باہمی اختلاف و نزاع اور خرابیوں کا بھیانک ظہور ولید بن یزید بن عبدالملک بن مروان کے عہد اقتدار میں ہوا جو ان میں بارہواں شخص تھا، اس شخص کی امارت اس وقت قائم ہوئی جب اس کے چچا ہشام ابن عبدالملک کا انتقال ہوا پہلے تو لوگوں نے ولید ابن یزید کی امارت پر اتفاق کیا اور ان کا اتفاق چار برس تک قائم رہا، لیکن چار برس کے بعد لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو مار ڈالا، اس دن سے صورتحال میں تغیر پیدا ہو گیا اور فتنہ وفساد پوری طرح پھیل گیا یہ قول قاضی عیاض مالکیؒ کی طرف منسوب ہے اور علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس قول کی تحسین کی ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی جتنی توجیہات کی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں جتنے اقوال منقول ہیں ان سب میں یہی قول سب سے زیادہ مناسب اور سب سے زیادہ قابل ترجیح ہے اور اس کی تائید ان الفاظ سے ہوتی ہے جو اسی حدیث کے جزء کے طور پر بعض صحیح طرق میں منقول ہیں کہ "کلھم یجتمع علیه امر الناس" اور "جمع" سے مراد ان خلفاء کی بیعت پر لوگوں کا اتفاق و اجتماع اور ان کی قیادت و سرداری کو قبول کرنا ہے اگرچہ کراہت کے ساتھ ہو۔ نیز اس حدیث سے ان خلفاء کی جو مدح و توصیف مفہوم ہوتی ہے۔ وہ دین، عدالت، اور حقانیت کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ سیاسی و انتظامی معاملات میں استحکام و استواری اور حکومت و امارت کے تئیں اتفاق و اتحاد کے اعتبار سے ہے۔ رہی اس صحیح حدیث کی بات جس میں آپ ﷺ نے خلافت کو تیس سال میں منحصر بیان فرمایا ہے تو وہاں "خلافت" سے مراد "خلافت کبریٰ" ہے جو اصل میں خلافت نبوت ہے، جب کہ اس حدیث میں "خلافت امارت" مراد ہے، چنانچہ خلفائے راشدین کے بعد جو امراء (سربراہان حکومت) گذرے ان کو بھی خلیفہ ہی کہا جاتا ہے، اگرچہ ان کو خلیفہ کہنا مجازی معنی کے اعتبار سے ہے، مذکورہ بالا پہلے قول کو اگرچہ علامہ ابن حجرؒ نے اولی و ارجح قرار دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ لایزال الاسلام عزیزا اور لایزال الدین قائما کے ساتھ یہ قول کھلی ہوئی عدم مناسبت کا حامل ہے کیونکہ یہ الفاظ ان بارہ خلفاء کی اس مدح و تعریف کا صریح مظہر ہیں کہ ان کے زمانہ خلافت و امارت میں دین کو استحکام حاصل رہے گا، حق کا بول بالا ہو گا اور ان کے عدل و انصاف کے ذریعہ اسلام کی شان و شوکت اور قوت کا اظہار ہو گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "خلفاء" سے مراد عادل و انصاف پرور خلفاء اور نیک طینت و پاکباز امراء ہیں جو اپنے ذاتی اوصاف حمیدہ کی بناء پر "خلافت" کا صحیح مصداق اور منصب امارت کے اہل ہوں، اس صورت میں حدیث کا لازمی مطلب یہ بیان کرنا نہیں ہو گا کہ یہ بارہ خلفاء آنحضرت ﷺ کے زمانہ کے بعد متصلاً یکے بعد دیگرے منصب خلافت و امارت پر متمکن ہوں گے جب کہ ہو سکتا ہے کہ اصل مقصد اس طرح کے خلفاء و امراء کی محض تعداد بیان کرنا ہو خواہ ان کا ظہور کسی بھی عہد و زمانہ میں ہو اور بارہ کا عدد قیامت تک کسی وقت جا کر پورا ہو، تورپشتیؒ کے مطابق اس حدیث اور اس بارہ میں منقول دوسری احادیث کے مفہوم و معنی کے تعین میں یہی قول زیادہ بہتر و مناسب اور قابل ترجیح ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس حدیث میں اس طرح کے ان بارہ خلفاء و امراء کا ذکر مراد ہے جو حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانہ کے بعد منصب خلافت و امارت پر فائز ہوں گے! گویا مخبر صادق ﷺ نے پیش خبری فرمائی کہ آخر زمانہ میں قریش سے نسبی تعلق رکھنے والے ایسے بارہ افراد مسلمانوں کی ملی و ملکی اور حکومتی قیادت کے امین بنیں گے جن کے زمانہ اقتدار و امارت میں دین و مذہب کو

عروج حاصل ہوگا اور اسلام کی شان وشوکت دوبالا ہوگی۔ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جب مہدیؑ کا انتقال ہوگا تو قیادت و اقتدار کے مالک، یکے بعد دیگرے جو پانچ آدمی ہوں گے، وہ سبط اکبر یعنی حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے ہوں گے، ان کے بعد قیادت و اقتدار کی باگ ڈور یکے بعد دیگرے ان پانچ آدمیوں کے ہاتھ میں آئے گی جو سبط اصغر یعنی حضرت امام حسین شہیدؓ کی اولاد میں سے ہوں گے اور ان میں کا آخری شخص اپنا ولی عہد ایک ایسے شخص کو بنائے گا جو حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے ہوگا اور مملکت وملت کی امامت و سربراہی کے اس سلسلہ کا گیارہواں فرد ہوگا، پھر جب یہ گیارہواں شخص اپنا زمانہ اقتدار پورا کر کے انتقال کرے گا تو اس کا جانشین اس کا بیٹا ہوگا اور مسند اقتدار کا مالک بنے گا، اس طرح بارہ کا عدد پورا ہو جائے گا اور ان بارہ میں کا ہر شخص امام عادل اور ہادی مہدی ہوگا جس کی عدالت، انصاف پسندی، دینداری اور رعایا پروری سے اسلام اور مسلمانوں کو زبردست شان وشوکت اور سربلندی وہردلعزیزی حاصل ہوگی" اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر مذکورہ بالا دوسرے قول کو ایک معقول اور بہترین توجیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ویسے ایک روایت حضرت ابن عباسؓ کی بھی نقل کی جاتی ہے جس میں انھوں نے حضرت امام مہدی کے اوصاف و محاسن بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان (امام مہدیؑ) کے وجود سے ہر رنج و فکر کو دور کر دے گا اور ان کے عدل سے ہر ظلم وفتنہ کا سدباب ہو جائے گا، ان کے زمانہ کے بعد پھر قیادت و اقتدار کی باگ ڈور ان بارہ آدمیوں کے ہاتھ میں آجائے گی جو یکے بعد دیگرے ڈیڑھ سو سال تک مملکت کی زمام کار سنبھالے رہیں گے۔

اور چوتھا قول یہ ہے کہ اصل مراد ایک ہی زمانہ میں بارہ خلفاء کا پایا جانا ہے جو اپنی اپنی جگہ خود مختار حیثیت کا دعوی کریں گے اور ان میں سے ہر ایک کی اطاعت کرنے والے لوگوں کا الگ الگ گروہ ہوگا اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ (ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا) "وہ وقت آنے والا ہے جب میرے بعد خلیفہ ہوں گے اور بہت ہوں گے" اس ارشاد گرامی سے آنحضرت ﷺ کا اصل مقصد یہ خبر دینا تھا کہ میرے بعد نت نئے فتنوں کا ظہور ہوگا اور طرح طرح کے اختلافی و نزاعی معاملات اٹھ کھڑے ہوں گے یہاں تک کہ ایک زمانہ میں بارہ خلفاء اپنی الگ الگ خلافت کا دعوی کریں گے۔ اس آخری قول کے مطابق حدیث کی مراد گویا یہ ہوگی کہ بیک وقت بارہ خلفاء کے وجود کے زمانہ سے پہلے کے زمانہ تک تو مسلمانوں کی موثر اجتماعی و تنظیمی حیثیت برقرار رہے گی، دین کا نظام مستحکم و استوار رہے گا اور اسلام کی عزت و شوکت بڑھتی رہے گی لیکن اس زمانہ میں (جب کہ بیک وقت بارہ خلفاء ہوں گے) اختلاف و نزاع کا فتنہ پھوٹ پڑے گا، اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی منتشر ہونے لگے گی۔ لیکن پہلے اقوال کے مطابق حدیث کی مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان بارہ خلفاء کے زمانہ تک اسلام اور مسلمانوں کا نظام ملک وملت مستحکم و استوار رہے گا، اس نظام میں جو خلل و اضطراب پیدا ہوگا وہ اس زمانہ کے بعد ہوگا۔

شیعوں نے اس حدیث میں بارہ خلفاء کے ذکر کو اس پر محمول و منطبق کیا ہے کہ وہ اہل بیت میں سے ہوں گے خواہ وہ منصب خلافت پر حقیقۃً فائز ہوں خواہ خلافت کا استحقاق رکھنے کے باوجود منصب خلافت پر فائز نہ ہو سکیں۔ ان شیعوں کے مطابق سب سے پہلے خلیفہ حضرت علیؓ ہیں، پھر حضرت حسنؓ، پھر حضرت حسینؓ، پھر حضرت زین العابدین، پھر حضرت محمد باقر پھر حضرت جعفر صادق، پھر حضرت موسیٰ کاظم، پھر حضرت علی رضا، پھر حضرت محمد تقی، پھر حضرت علی نقی، پھر حضرت حسین عسکری پھر حضرت محمد مہدی۔

چند عرب قبائل کا ذکر

(۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غِفَارٌ غَفَرَ اللّٰهُ لَهَا وَاَسْلَمُ سَالَمَهَا اللّٰهُ وَعُصَيَّةُ عَصَتِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(قبیلہ) غفار کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (قبیلہ) اسلم کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھے

اور (قبیلہ) عصیہ (تو وہ قبیلہ ہے) جو اللہ اور اللہ کے رسول کی معصیت میں مبتلا ہوا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "غفار" عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے، ممتاز صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، کہا جاتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ قبیلہ حاجیوں کا مال چرایا کرتا تھا اور اپنی اس برائی کے سبب عام قبائل میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اسی پر آنحضرت ﷺ نے اس قبیلہ کے حق میں دعا فرمائی کہ اس قبیلہ کے دامن پر جو پہلا داغ لگا ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کو مٹائے اور قبیلہ والوں کو مغفرت و بخشش سے نوازے کیونکہ اب اسی قبیلہ کے لوگ خوشی خوشی اسلام میں داخل ہو گئے ہیں اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ارشاد گرامی دعائیہ جملہ کے بجائے جملہ خبریہ ہے یعنی آپ ﷺ نے ان الفاظ کے ذریعہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اس قبیلہ کی جاہلی زندگی کے واقعات کو کالعدم قرار دے دیا ہے اور اب اہل قبیلہ کو ان کے ایمان و اسلام کی بدولت مغفرت و بخشش سے نواز دیا ہے۔

"اسلم" بھی ایک قبیلہ کا نام ہے، اس قبیلہ کے لوگوں نے چونکہ لڑائی کے بغیر اسلام قبول کر لیا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس قبیلہ کے لوگوں کو سلامت رکھے اس قبیلہ کے بارے میں مذکورہ جملہ بھی جملہ خبریہ کا احتمال رکھتا ہے یعنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس جملہ کے ذریعہ یہ خبر دی ہو کہ یہ وہ قبیلہ ہے جس نے مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کو پسند نہیں کیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس قبیلہ کے لوگوں کو قتل و تباہی سے سلامت و محفوظ رکھا۔

"عصیہ" اس بد نصیب قبیلہ کا نام ہے جس نے مسلمان قاریوں کو بیر معونہ پر مکر و فریب کے ذریعہ بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا تھا، آنحضرت ﷺ کو اس پر بڑا رنج ہوا تھا اور آپ ﷺ قنوت میں اس قبیلہ کے لوگوں پر لعنت اور بد دعا فرمایا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے حق میں مذکورہ حدیث کے الفاظ صرف جملہ خبریہ کے طور پر ہیں، ان میں جملہ دعائیہ کا کوئی احتمال نہیں ہے تاہم ان الفاظ میں اس قبیلہ کا ذکر جس طرح شکوہ کو ظاہر کرتا ہے وہ بجائے خود بد دعا کو مستلزم ہے لیکن اس مفہوم میں نہیں کہ اہل قبیلہ گناہ و معصیت میں زیادہ سے زیادہ مبتلا ہوں بلکہ اس مفہوم میں کہ قبیلے والوں نے جس عظیم معصیت اور سرکشی کا ارتکاب کیا اس پر ان کو دنیا و آخرت میں ذلت و خواری نصیب ہو۔

چند قبائل کی فضیلت

(۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قُرَیْشٌ وَّالْاَنْصَارُ وَجُهَیْنَةُ وَمُزَیْنَةُ وَاَسْلَمُ وَغِفَارُ وَاَشْجَعُ مَوَالِیَّ لَیْسَ لَهُمْ مَوْلًى دُوْنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: قریش (کے مسلمان یعنی اہل مکہ وغیرہ) انصار، (یعنی اہل مدینہ) قبیلہ جہینہ (کے مسلمان) قبیلہ اسلم، (کے مسلمان) قبیلہ غفار، (کے مسلمان) اور قبیلہ اشجع، (کے مسلمان) میرے دوست اور مددگار ہیں، ان کا مددگار اور دوست اللہ اور اللہ کے رسول کے سوا کوئی نہیں ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لفظ مَوَالِیَّ متکلم کی طرف مضاف ہے اور مولیٰ کی جمع ہے اور ایک روایت میں یہ لفظ (ی متکلم کے بغیر) مَوَالٍ منقول ہے، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ (ان قبائل کے مسلمان) آپس میں ایک دوسرے کے معین اور مددگار اور دوست ہیں۔

دو حلیف قبیلوں کا ذکر

(۸) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَسْلَمُ وَغِفَارٌ وَمُزَیْنَةُ وَجُهَیْنَةُ خَیْرٌ مِّنْ بَنِیْ تَمِیْمٍ وَمِنْ بَنِیْ عَامِرٍ وَالْحَلِیْفَیْنِ مِنْ بَنِیْ اَسَدٍ وَغَطْفَانَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اسلم غفار مزینہ اور جھینہ یہ سب قبیلے بنو تمیم سے، اور دونوں حلیف قبیلوں یعنی بنو اسد اور غطفان سے بہتر ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "دونوں حلیف قبیلے بنو اسد اور غطفان بھی دو قبیلوں کے نام ہیں یہ دونوں قبیلے آپس میں ایک دوسرے کے حلیف تھے اور جیسا کہ اس زمانہ میں عرب کا عام دستور تھا ان دونوں نے ایک دوسرے کے سامنے قسم کھا کر عہد و پیمان کر رکھا تھا کہ باہم و گرمددگار و معین رہیں گے۔

حدیث میں مذکورہ قبیلوں کو اس لئے بہتر فرمایا کہ ان قبائل کے لوگوں نے قبول اسلام میں سبقت کا شرف حاصل کیا اور اپنے اچھے احوال و معاملات کا قابل تحسین مظاہرہ کیا۔

بنو تمیم کی تعریف

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ مَازِلْتُ اُحِبُّ بَنِیْ تَمِیْمٍ مُنْذُ ثَلٰثٍ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْهِمْ سَمِعْتُهٗ یَقُوْلُ هُمْ اَشَدُّ اُمَّتِیْ عَلَی الدَّجَّالِ قَالَ وَجَاءَتْ صَدَقَاتُهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهٖ صَدَقَاتُ قَوْمِنَا وَکَانَتْ سَبِیَّةٌ مِّنْهُمْ عِنْدَ عَائِشَةَ فَقَالَ اَعْتِقِیْهَا فَاِنَّهَا مِنْ وُّلْدِ اِسْمٰعِیْلَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں بنو تمیم کو اس وقت سے ہمیشہ عزیز اور دوست رکھتا ہوں جب سے میں نے ان کی تین خاص خوبیوں کا ذکر رسول کریم ﷺ سے سنا ہے (چنانچہ ان کی پہلی خوبی کے بارے میں) آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میری اُمت میں سے بنو تمیم ہی وہ لوگ ہوں گے جو دجال کے مقابلے پر سب سے زیادہ سخت اور بھاری ثابت ہوں گے" حضرت ابوہریرہؓ نے (ان کی دوسری خوبی کے بارے میں یہ) بیان کیا کہ (ایک مرتبہ بنی تمیم کی طرف سے) صدقات (یعنی زکوٰۃ کے اموال و مویشی وغیرہ) آئے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا "یہ ہماری قوم کی طرف سے آئے ہوئے صدقات ہیں" اور (ان کی تیسری خوبی اس طرح ظاہر ہوئی کہ) بنی تمیم سے تعلق رکھنے والی ایک لونڈی حضرت عائشہؓ کے پاس تھی، اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے عائشہؓ سے فرمایا کہ اس لونڈی کو آزاد کر دو کیونکہ یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "سب سے زیادہ سخت اور بھاری ثابت ہوں گے یعنی جب دجال لعین کا ظہور ہوگا تو بنی تمیم ہی کے لوگ سب سے زیادہ اس کا مقابلہ کریں گے اس کے توڑ میں سب سے زیادہ سعی و کوشش کریں گے اور اس کی تردید و تغلیط میں سب سے آگے رہیں گے اس طرح ان الفاظ میں بنو تمیم کی خصوصیت و فضیلت کا تو ذکر ہے ہی لیکن اس کے ساتھ یہ پیشین گوئی بھی ہے کہ بنو تمیم کی نسل کے لوگ اسی کثرت کے ساتھ ظہور دجال کے زمانہ میں بھی ہوں گے۔

"یہ ہماری قوم کے صدقات ہیں" ان الفاظ کے ذریعہ آپ ﷺ نے بنو تمیم کو اس طرح شرف و فضیلت سے نوازا کہ ان کو اپنی طرف منسوب کر کے ان کی قوم کو اپنی قوم فرمایا۔

"یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے" کا مطلب یہ تھا کہ یہ لونڈی بنو تمیم میں سے ہونے کی بناء پر عربی النسل ہے اور عرب چونکہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہیں اس لئے یہ لونڈی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوئی اگرچہ یہ نسلی وصف تمام عرب کا مشترک وصف ہے، صرف بنو تمیم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے لیکن آپ ﷺ نے بنو تمیم کو ایک طرح سے فضل و شرف عطا فرمانے کے لئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

قریش کو ذلیل نہ کرو

⑩ وَعَنْ سَعْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ یُّرِدْ هَوَانَ قُرَیْشٍ اَهَانَهُ اللّٰهُ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت سعدؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے قریش کی ذلت وخواری چاہی، اس کو اللہ تعالیٰ ذلیل وخوار کرے گا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ قریش کی عزت اور ان کا احترام ہر صورت میں لازم ہے ان کی عزت کے در پے ہونا اور ان کی ذلت ورسوائی چاہنا اللہ کی ناراضگی کو مول لینا ہے، خواہ وہ امامت کبریٰ یعنی منصب خلافت پر فائز ہوں یا فائز نہ ہوں۔ ان کے خلیفہ و امیر ہونے کی صورت میں ان کی اہانت وبے عزتی کرنے کی ممانعت اور تہدید کی وجہ تو ظاہر ہے، رہی وہ صورت جب کہ وہ خلافت و امارت کے منصب پر فائز نہ ہوں تو اس صورت میں بھی ان کی اہانت وبے عزتی کرنے کی ممانعت اس اعتبار سے سمجھی جائے گی کہ ان کو آنحضرت ﷺ کی نسبت حاصل ہے اور ان کا یہ خصوصی فضل وشرف اسی بات کا متقاضی ہے۔

قریش کے حق میں دعا

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اَذَقْتَ اَوَّلَ قُرَيْشٍ نَكَالًا فَاَذِقْ اٰخِرَهُمْ نَوَالًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے دعا کی: اے اللہ! تو نے قریش کو ابتداء میں (غزوۂ بدر اور غزوۂ احزاب کے موقع پر شکست وتباہی کا) عذاب چکھایا (جب کہ انہوں نے دین حق کی مخالفت اور تیرے رسول کی عداوت کا راستہ اختیار کر رکھا تھا) پس اب (جب کہ انہوں نے اسلام قبول کر کے اور تیرے رسول کی اطاعت اختیار کر کے دین اور مسلمانوں کو تقویت ومدد پہنچائی ہے تو) آخر میں ان کو عطاء وبخشش سے نواز دے۔" (ترمذیؒ)

دو یمنی قبیلوں کی خوبیاں اور ان کی تعریف

(۱۲) وَعَنْ اَبِىْ عَامِرِ الْاَشْعَرِىِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ الْحَىُّ الْاَسَدُ وَالْاَشْعَرُوْنَ لَا يَفِرُّوْنَ فِى الْقِتَالِ وَلَا يَغُلُّوْنَ وَهُمْ مِنِّىْ وَاَنَا مِنْهُمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابو عامر اشعریؓ (جو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے چچا ہیں) بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اسد اور اشعری بہت اچھے قبیلے ہیں، یہ دونوں قبیلے نہ کفار کے مقابلہ پر جنگ سے بھاگتے ہیں اور نہ مال غنیمت میں خیانت کرتے ہیں، وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں، اس روایت کو ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: اَسَد یمن کے ایک قبیلہ کے مورث اعلیٰ کا نام ہے اور یہ قبیلہ اسی کے نام سے مشہور ومتعارف ہوا، اسی قبیلہ کو "ازد" اور "ازد شنوہ" بھی کہا جاتا ہے، تمام انصار مدینہ اسی قبیلہ سے نسلی تعلق رکھتے تھے اَشْعَر دراصل عمرو ابن حارثہ اسدی کا لقب تھا جو اپنے زمانہ میں یمن کا ایک ممتاز اور سربر آوردہ شخص تھا یہ بھی اپنے قبیلہ کا مورث اعلیٰ تھا اور اس کے لقب کی نسبت سے اس کا قبیلہ "اشعری" کہلاتا تھا اس قبیلہ کے لوگوں کو "اشعریون" اور "اشعرون" بھی کہا جاتا ہے، مشہور وممتاز صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور ان کی قوم کے لوگ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

"وہ مجھ سے ہیں" کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری اتباع کرنے والے اور میری سنت اور میرے اسوہ پر چلنے والے لوگ ہیں، یا یہ کہ ان قبیلوں کے لوگ میرے دوستوں اور مددگاروں میں سے ہیں، اسی طرح "میں ان کا ہوں" کا مطلب یہ تھا کہ میں بھی ان کا دوست اور ان کا مددگار ہوں! گویا ان الفاظ کے ذریعہ اس طرح اشارہ کیا گیا کہ ان قبیلوں کے مؤمن ومسلمان، تقویٰ و پرہیزگاری کے مقام پر ہیں۔ اور یہ بات قرآن کریم کے ان الفاظ سے ثابت ہوتی ہے کہ:

وَاِنْ اَوْلِيَآؤُهٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ۔

"اور ان کے (یعنی محمد ﷺ کے) جو بھی دوست و رفیق ہیں سب متقی و پرہیزگار ہیں۔"

ازد، ازد اللہ ہیں

⑬ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاَزْدُ اَزْدُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ وَيُرِيْدُ النَّاسُ اَنْ يَّضَعُوْهُمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّا اَنْ يَّرْفَعَهُمْ وَلَيَاْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَقُوْلُ الرَّجُلُ يَالَيْتَ اَبِيْ كَانَ اَزْدِيًّا وَيَالَيْتَ اُمِّيْ كَانَتْ اَزْدِيَّةً رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قبیلہ ازد کے لوگ، روئے زمین پر اللہ کے ازد (یعنی اللہ کا شکر اور اس کے دین کے معاون و مددگار) ہیں لوگ اس قبیلہ کو ذلیل و خوار کرنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کے برخلاف اس قبیلہ کے لوگوں کو عزت و بلندی عطا کرنا چاہتے ہیں، یقیناً لوگوں پر وہ زمانہ آنے والا ہے جب آدمی یہ کہتا نظر آئے گا کہ کاش میرا باپ ازدی ہوتا اور کاش میری ماں قبیلہ ازد سے ہوتی" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: قبیلہ ازد کی نسبت اللہ کی طرف کر کے ان کو ازد اللہ کہنا یا تو ان کو اس لقب کے ساتھ متعارف کرانا تھا، یا اس اعتبار سے کہ اس قبیلہ کے لوگ اللہ کے دین اور اللہ کے رسول کے معاون و مددگار ہونے کی حیثیت سے اللہ کا لشکر تھے، ان کے فضل و شرف کو ظاہر کرنے کے لئے ان کے قبیلے کی نسبت اللہ کی طرف کی۔ اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ازد اللہ دراصل اسد اللہ (اللہ کے شیر) کے معنی میں استعمال ہوا ہے مطلب یہ کہ قبیلہ ازد کے لوگ معرکۂ شجاعت و دلاوری کے شیر ثابت ہوتے ہیں۔

"کاش میرا باپ ازدی ہوتا" مطلب یہ کہ ایک زمانہ میں اس قبیلہ کا مرتبہ ایسا وقیع ہوتا اور اس قبیلہ سے تعلق رکھنے والے لوگ اتنے باعزت و سربلند ہوں گے کہ دوسرے قبائل کے لوگ ان پر رشک کریں گے اور اس آرزو کا اظہار کرتے نظر آئیں گے کہ کاش ہم بھی اس قبیلہ کے ہوتے۔

تین قبیلوں کے بارے اظہار ناپسندیدگی

⑭ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ مَاتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَكْرَهُ ثَلٰثَةَ اَحْيَاءٍ ثَقِيْفٍ وَبَنِيْ حَنِيْفَةَ وَبَنِيْ اُمَيَّةَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ تین قبیلوں، ثقیف، بنوحنیفہ، اور بنوامیہ سے ناخوش اس دنیا سے تشریف لے گئے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مذکورہ بالا تینوں قبیلوں میں ایسے افراد پیدا ہوئے جن سے اسلام کے مخالفین کو فائدہ پہنچا اور مسلمانوں کو شدید رنج و الم اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو آگاہ کر دیا تھا کہ آگے چل کر ان قبائل سے کیسے کیسے فتنے اور کیسے کیسے ظالم لوگ پیدا ہوں گے اس لئے آنحضرت ﷺ ان تینوں قبیلوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، چنانچہ ثقیف تو وہ قبیلہ ہے جس میں حجاج ابن یوسف جیسا مشہور ظالم شخص پیدا ہوا، بنوحنیفہ وہ قبیلہ ہے جس نے مسیلمہ کذاب جیسے فتنہ ساز کو جنم دیا اور بنوامیہ وہ قبیلہ ہے جس میں عبیداللہ ابن زیاد پیدا ہوا، یہ وہی عبیداللہ ابن زیاد ہے جو یزید ابن معاویہ کی طرف سے کوفہ و بصرہ کا گورنر تھا اور جس نے محض دربار امارت میں خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی ماتحت فوج سے حضرت سید الشہداء امام حسینؓ کو شہید کرایا، عبیداللہ ابن زیاد انتہائی بدبخت اور کمینہ شخص تھا، منقول ہے کہ جب اس کی فوج کے لوگ میدان کربلا سے حضرت سید الشہداءؓ کا سر مبارک لے کر اس

کے پاس آئے تو اس نے سر مبارک کو ایک طشت میں رکھوایا اور ایک چھڑی کے ذریعہ اس پر ضربیں لگاتا جاتا اور جگر گوشۂ رسول ﷺ کی شان میں گستاخانہ کلمات بکتا جاتا، لیکن اس بد نصیب کا انجام بھی بہت برا ہوا، نہایت بے دردی کے ساتھ ایک جنگ میں مارا گیا، اور ترمذیؒ نے اپنی جامع میں عمارہ ابن عمیرؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا، جب عبید اللہ ابن زیاد میدان جنگ میں مارا گیا تو (اس کی دشمن فوج نے اس کی بے سر لاش کو نذر آتش کر دیا، پھر) اس کے فوجی اس کا سر لے کر شہر آئے اور مسجد کے چبوترے پر رکھ دیا جہاں اس کے دوسرے ساتھی اور حوالی موالی بیٹھے ہوئے تھے، عمارہ ابن عمیرؒ کہتے ہیں کہ اس موقع پر میں بھی وہاں پہنچ گیا، پھر میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھیوں نے چلانا شروع کیا، وہ آیا وہ آیا (میں نے حیرت کے ساتھ دیکھا تو) اچانک ایک سانپ آتا ہوا دکھائی دیا، اور پھر وہ سانپ بڑی تیزی کے ساتھ عبید اللہ ابن زیاد کے سر کی طرف بڑھا اور) اس کی ناک میں گھس گیا۔ تھوڑی سی دیر اندر رہا اور پھر باہر نکل کر چلتا بنا یہاں تک کہ نظروں سے غائب ہو گیا، (یہ ششدر کن منظر دیکھ کر ابھی لوگوں پر حیرانی و سراسیمگی طاری ہی تھی کہ) اچانک انہوں نے پھر شور کیا، وہ آیا، دیکھو وہ سانپ پھر آ رہا ہے، اتنے میں وہ سانپ سر کے پاس پہنچ کر پھر نتھنے میں گھس کر اندر چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد باہر نکل کر چلتا بنا، اسی طرح دو یا تین بار ہوا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں حدیث کی وضاحت میں "بنو امیہ" کے تحت صرف عبید اللہ ابن زیاد کا ذکر کیوں کیا گیا ہے، حالانکہ یزید ابن معاویہ بھی بنو امیہ میں سے تھا اور اس اعتبار سے اس کا ذکر کرنا زیادہ ضروری تھا کہ عبید اللہ ابن زیاد اسی کا مقرر کردہ گورنر اور اس کا ماتحت تھا، اور عبید اللہ نے جو کچھ کیا یزید کے حکم اور اس کی رضامندی سے کیا، لیکن اس بات کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے، بنو امیہ کے باقی لوگوں نے اپنی بدذاتیوں میں کونسی کسر اٹھا رکھی تھی، دولت و اقتدار کی ہوس میں مبتلا ہو کر انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والی جو جو حرکتیں کیں وہ سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں ایک یزید ابن معاویہ یا عبید اللہ ابن زیاد ہی کو کیا کہا جائے، مقصد تو بنو امیہ کی برائی بیان کرنا تھا، علامتی طور پر عبید اللہ ابن زیادہ کا ذکر کر دیا گیا، اب اور سب کو اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے، ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ کچھ بندر مسجد نبوی کے منبر شریف پر کھیل تماشہ دکھا رہے ہیں، آپ ﷺ نے اس خواب کی تعبیر میں بنو امیہ کا ذکر کیا۔

بنو ثقیف کے دو شخصوں کے بارے میں پیش گوئی

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ ثَقِيْفٍ كَذَّابٌ وَمُبِيْرٌ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عِصْمَةَ يُقَالُ الْكَذَّابُ هُوَ الْمُخْتَارُ بْنُ اَبِيْ عُبَيْدٍ وَالْمُبِيْرُ هُوَ الْحَجَّاجُ بْنُ يُوْسُفَ وَقَالَ هِشَامُ بْنُ حَسَّانٍ اَحْصَوْا مَا قَتَلَ الْحَجَّاجُ صَبْرًا فَبَلَغَ مِائَةَ اَلْفٍ وَعِشْرِيْنَ اَلْفًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوٰى مُسْلِمٌ فِي الصَّحِيْحِ حِيْنَ قَتَلَ الْحَجَّاجُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ قَالَتْ اَسْمَاءُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَنَا اَنَّ فِيْ ثَقِيْفٍ كَذَّابًا وَمُبِيْرًا فَاَمَّا الْكَذَّابُ فَرَاَيْنَاهُ وَاَمَّا الْمُبِيْرُ فَلَا اِخَالُكَ اِلَّا اِيَّاهُ وَسَيَجِيْئُ تَمَامُ الْحَدِيْثِ فِي الْفَصْلِ الثَّالِثِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قبیلہ ثقیف میں انتہا درجہ کا جھوٹا شخص پیدا ہوگا اور ایک انتہا درجہ کا مفسد و بلاکو" حضرت عبد اللہ ابن عصمہ تابعیؒ (اس جھوٹے شخص کے تعین کے بارے میں) کہتے ہیں کہ علماء کا کہنا ہے، "جھوٹے شخص" سے مراد مختار ابن عبید اور "مفسد و بلاکو" سے مراد حجاج ابن یوسف (مشہور ظالم) ہے۔ اور ہشام ابن حسانؒ (جو اونچے درجہ کے فقیہہ اور علم حدیث میں زبردست درک و مہارت رکھنے والے ایک مشہور متقی و

بزرگ ہیں اور جن کا شمار ائمہ حدیث میں ہوتا ہے) کا بیان ہے کہ حجاج ابن یوسف نے جس قدر لوگوں کو (جنگ و معرکہ میں نہیں، بلکہ) یوں ہی پکڑ پکڑ کر اور قید خانہ میں ڈال کر قتل کیا ہے ان کی تعداد لوگوں نے شمار کی ہے جو ایک لاکھ بیس ہزار ہے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔ اور امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں یہ روایت نقل کی ہے کہ: جب حجاج ابن یوسف نے حضرت عبد اللہ ابن زبیرؓ کو شہید کر دیا تو حضرت

اسماءؓ نے (جو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی والدہ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی ہیں) کہا: ہم سے رسول کریم ﷺ نے بیان کر دیا تھا کہ قبیلہ ثقیف میں ایک انتہادرجہ کا جھوٹا شخص پیدا ہوگا اور ایک بڑا مفسد وہلاکو پس جہاں تک جھوٹے شخص کا تعلق ہے تو اس کو ہم دیکھ چکے، اب رہی مفسد وہلاکو کی بات، تو میرا خیال ہے کہ اے حجاج وہ مفسد وہلاکو تو ہی ہے، یہ پوری حدیث تیسری فصل میں آرہی ہے۔"

تشریح: "حجاج" لغوی طور پر تو "حاج" کا اسم مبالغہ ہے جس کے معنی ہیں: بحث کرنے والا، حجت یعنی دلیل وثبوت لانے والا، حجاج ابن یوسف تاریخ اسلام کا مشہور ظالم شخص ہے جس نے ہزارہاہزار اچھے اور نیک لوگوں کو جن میں صحابہؓ وتابعینؒ بھی شامل ہیں، ناحق موت کے گھاٹ اتارا، عبداللہ ابن زبیرؓ کو شہید کیا اور ہزاروں بے خطا انسانوں کو قید وبند میں ڈالے رکھا، کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو اس نے کسی معرکہ آرائی اور جنگ وجدل کے بغیریوں ہی پکڑ پکڑ کر جیل خانہ میں ڈالا اور پھر ان کو قتل کرا دیا ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے، جو لوگ جنگوں اور جھگڑوں میں مارے گئے ان کی تعداد علیحدہ ہے، یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے قید خانہ سے پچاس ہزار آدمیوں کی ایک بڑی تعداد تو ایک ہی وقت میں نکلی تھی، اور اس شخص کی سنگدلی کا اندازہ لگانے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس نے جو قید خانہ بنوا رکھا تھا اس میں چھت کا کوئی نام ونشان نہیں تھا اس کے تمام قیدی کھلے آسمان کے نیچے گرمی وسردی اور دھوپ وبارش کی صعوبتیں جھیلتے تھے، حجاج ابن یوسف ثقفی دراصل اموی امیر عبدالملک ابن مروان کا زبردست معتمد وبہی خواہ تھا اور امارت وسلطنت کے معاملات میں بڑا اثر ورسوخ رکھتا تھا، عبدالملک ابن مروان نے اس کو عراق وخراسان کا حاکم اعلیٰ (گورنر) بنا رکھا تھا، اور عبداللہ ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاز کا ولی بھی بنا، عبدالملک ابن مروان کے بعد ولید ابن عبدالملک کے زمانہ امارت میں بھی عراق وخراسان پر اس کا اقتدار برقرار رہا، اس کے ظلم وستم کے واقعات اور وحشیانہ کاروائیوں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں، وسط شوال ۹۵ھ میں بعمر ۵۴ سال اس کا انتقال ہوا۔

مختار ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابوعبید ابن مسعود ثقفیؓ کا بیٹا تھا، مختار کی ولادت ہجرت کے پہلے سال ہوئی اس کو آنحضرت ﷺ کی صحبت وروایت، یعنی صحابیت کا شرف حاصل نہیں ہوا، ابتدا میں یہ شخص علم وفضل اور نیکی وتقویٰ کے ساتھ مشہور تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ خبث باطن کا شکار ہے اور محض دنیا سازی کے لئے علم وتقویٰ کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا، پہلے یہ شخص اہل بیت نبوت سے سخت بغض وعناد رکھتا تھا، پھر اچانک اس میں ایسا انقلاب آیا کہ اہل بیت نبوت کی محبت کا دم بھرنے لگا اور اس بارے میں صحیح فکر و عقیدے کا حامل نظر آنے لگا اہلِ بیت کے تئیں اس کی یہ ظاہری محبت اتنی بڑھی کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد یزیدیوں کا کھلم کھلا دشمن ہوگیا اور ان میں سے بہت لوگوں کو اس نے خون حسینؓ کے قصاص میں موت کے گھاٹ بھی اتارا، غرضیکہ اس نے طلب دنیا اور حب جاہ میں بہت چولے بدلے، اپنی نت نئی حرکتوں سے طرح طرح کے فتنے جگائے، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے خلاف عراق میں علم بغاوت بلند کیا، مکروفریب اور عیاریوں کے ذریعہ جاہل اور کمزور عقیدہ لوگوں پر اپنی نام نہاد روحانی بزرگی وکرامت کا ایسا سکہ جمایا کہ اس کے حامیوں اور معتقدوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس کے گرد جمع ہوگئی، اس کا حلقہ اثر جوں جوں بڑھتا گیا اتنا ہی وہ عقیدہ کی خرابی رائے وخیال کی گمراہی اور نفس کی خواہشات کا شکار ہوتا گیا جھوٹ اور فریب کاری کے سہارے اس نے پوری خلافت اسلامیہ پر قبضہ کر لینے کا منصوبہ بنایا اور اپنی فتنہ انگیزیوں کے ذریعہ کوفہ پر قابض بھی ہوگیا، نبوت کا مدعی بھی بنا اور اس بات کا دعویٰ کرنے لگا کہ جبرئیل میرے پاس وحی لے کر آتے ہیں، آخرکار حضرت مصعب ابن زبیرؓ نے جو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی طرف سے بصرہ کے گورنر تھے، اپنی فوج لے کر کوفہ پر چڑھائی کی، مختار نے بھی مقابلہ کیا مگر شکست کھا گیا اور پھر ۱۴ رمضان ۶۷ھ کو مقتول ہوا، مختار کے انہی فریب اور جھوٹ سے بھرے حالات کی بناء پر علماء نے اس کو کذابوں میں سے ایک بڑا کذاب شمار کیا ہے اور حدیث کے الفاظ یخرج من ثقیف کذاب ومبیر (قبیلہ ثقیف میں ایک انتہادرجہ کا جھوٹا اور ایک انتہادرجہ کا مفسد وہلاکو پیدا ہوگا) کا مصداق ومحمول مختار اور حجاج کو قرار دیا ہے۔

قبیلہ ثقیف کے حق میں بددعا کے بجائے دعاء ہدایت

(۱۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَحْرَقَتْنَا نِبَالُ ثَقِيْفٍ فَادْعُ اللّٰهَ عَلَيْهِمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اهْدِ ثَقِيْفًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) کچھ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قبیلہ ثقیف کے تیروں نے ہم کو بھون ڈالا، ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے بددعا کیجئے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! قبیلہ ثقیف کو (قبول اسلام اور اطاعت احکام کی) ہدایت و توفیق عطا فرما۔" (ترمذیؒ)

قبیلہ حمیر کے لئے دعا

(۱۷) وَعَنْ عَبْدِالرَّزَّاقِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ مِيْنَاءَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَهُ رَجُلٌ اَحْسِبُهُ مِنْ قَيْسٍ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ الْعَنْ حِمْيَرًا فَاَعْرَضَ عَنْهُ ثُمَّ جَاءَهُ مِنَ الشِّقِّ الْاٰخَرِ فَاَعْرَضَ عَنْهُ ثُمَّ جَاءَهُ مِنَ الشِّقِّ الْاٰخَرِ فَاَعْرَضَ عَنْهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَ اللّٰهُ حِمْيَرًا اَفْوَاهُهُمْ سَلَامٌ وَاَيْدِيْهِمْ طَعَامٌ وَهُمْ اَهْلُ اَمْنٍ وَاِيْمَانٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِالرَّزَّاقِ وَيُرْوٰى عَنْ مِيْنَاءَ هٰذَا اَحَادِيْثُ مَنَاكِيْرُ۔

"اور حضرت عبدالرزاق ابن ہمامؒ (جو جلیل القدر عالم و فقیہ اور کثیر التصانیف بزرگ ہیں) اپنے والد مکرم (حضرت ہمام ابن نخعی تابعیؒ) سے اور وہ حضرت میناؒ سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی حضرت ابوہریرہؓ نے) بیان کیا: (ایک دن) ہم لوگ نبی کریم ﷺ کی مجلس مبارک میں حاضر تھے کہ ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا، جس کے بارے میں میرا گمان ہے کہ وہ قبیلہ قیس سے تعلق رکھتا تھا، اس نے کہا یا رسول اللہ! قبیلہ حمیر پر لعنت فرمائیے یعنی ان کے حق میں بددعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اس قبیلہ کے لوگوں کو اپنی رحمت سے دور رکھے آنحضرت ﷺ نے (یہ سنا تو) اس شخص کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا، وہ شخص پھر دوسری طرف سے آپ ﷺ کے سامنے آگیا، آپ ﷺ نے ادھر سے بھی منہ پھیر لیا، پھر وہ شخص دوسری طرف سے آپ ﷺ کے سامنے آیا تو آپ ﷺ نے اس طرف سے بھی منہ پھیر لیا (یعنی آپ ﷺ کسی طرح بھی اس کی طرف متوجہ ہونے اور اس کی بات ماننے پر تیار نہیں ہوئے) اور پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حمیر پر اپنی رحمت نازل فرمائے، ان کے منہ سلام ہیں، ان کے ہاتھ طعام ہیں، اور وہ اہل امن بھی ہیں اور اہل ایمان بھی" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، اس روایت کو ہم عبدالرزاق ابن ہمامؒ کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے نہیں جانتے اور میناؒ سے نقل کی جانے والی روایتیں منکر ہیں (مطلب یہ اگرچہ عبدالرزاق ابن ہمامؒ مسلمہ فقیہ و محدث اور قوی ثقہ راوی ہیں مگر میناؒ ایک ضعیف راوی ہیں)۔"

تشریح: "ان کے منہ سلام ہیں اور ان کے ہاتھ طعام ہیں" کے ذریعہ حمیر کی دو بڑی خوبیوں کی طرف اشارہ فرمایا، ایک تو یہ کہ ان کے ہاں سلام کا بہت چرچا ہے، جب بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں ان کے منہ سے سلام علیک ضرور نکلتا ہے اور دوسری خوبی یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے لوگوں کو کھانا خوب کھلاتے اور خوب تقسیم کرتے ہیں اس اعتبار سے یہ لوگ انکساری اور سخاوت جیسی دونوں عظیم صفتوں کے جامع ہیں اور جو اس بات کی علامت ہے کہ ان کو فضیلت و بزرگی کا مقام اور حقوق العباد کی ادائیگی کی سعادت حاصل ہے۔

"وہ اہل امن بھی ہیں اور اہل ایمان بھی" یعنی یہ لوگ کامل و پختہ ایمان کے حامل بھی ہیں، اور ہر قسم کی آفات و بلیات اور مضرات سے محفوظ و مامون بھی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ اور ان کا قبیلۂ دوس

⑱ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّنْ أَنْتَ قُلْتُ مِنْ دَوْسٍ قَالَ مَاكُنْتُ أُرٰى أَنَّ فِي دَوْسٍ أَحَدًا فِيْهِ خَيْرٌ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے مجھ سے پوچھا تم کس قبیلہ سے ہو؟ میں نے عرض کیا (یمن کے مشہور قبیلہ ازدکی ایک شاخ) دوس سے تعلق رکھتا ہوں، آپ ﷺ نے (حیرت ظاہر کرتے ہوئے) فرمایا: "مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ قبیلۂ دوس میں کوئی ایسا شخص بھی ہوسکتا ہے جس میں نیکی و بھلائی ہو"۔ (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ کی تعریف و تحسین ہے اور ان کے قبیلۂ دوس کی مذمت، کہ اگر ابوہریرہؓ نہ ہوتے تو اس قبیلہ میں کوئی بھی خوبی و بھلائی نہ ہوتی۔

اہل عرب سے دشمنی آنحضرت سے دشمنی رکھنا ہے

⑲ وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُبْغِضْنِيْ فَتُفَارِقَ دِيْنَكَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ أَبْغِضُكَ وَبِكَ هَدَانَا اللّٰهُ قَالَ تُبْغِضُ الْعَرَبَ فَتُبْغِضُنِيْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ مجھ سے فرمانے لگے، مجھ سے دشمنی نہ رکھنا ورنہ تم اپنے دین سے جدا ہوجاؤ گے میں نے (یہ سنا تو حیرت سے) عرض کیا: بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں آپ ﷺ سے دشمنی (تو دشمنی، دشمنی کا تصور بھی) رکھوں! درانحالیکہ (آپ ﷺ اللہ کے حبیب ہیں، اپنی پوری اُمت کے محبوب ہیں اور) آپ ﷺ کے ذریعہ ہی اللہ تعالیٰ نے ہمیں (اسلام کا اور اچھے کاموں کا) سیدھا راستہ دکھایا، آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تم عرب سے دشمنی رکھو گے تو گویا مجھ سے دشمنی رکھو گے" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم عام طور پر تمام اہل عرب سے بغض وعداوت اور دشمنی رکھو گے تو چونکہ میں بھی عرب میں شامل ہوں اس لئے مجھ سے بھی تمہارا دشمنی رکھنا لازم ہوگا، پس اسی اعتبار سے میں نے کہا کہ تم مجھ سے دشمنی نہ رکھنا، اس سے معلوم ہوا کہ اہل عرب سے بغض وعداوت رکھنا چونکہ سید الخلق علیہ الصلوۃ والتسلیم کے تئیں بغض وعداوت کا سبب بھی بعض صورتوں میں بن سکتا ہے اس لئے اہل عرب کے تئیں بغض وعداوت رکھنے سے، بہر صورت اجتناب کرنا چاہئے تاکہ اتنی بڑی خرابی میں پڑنے کی نوبت نہ آئے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمانؓ چونکہ عجمی اور فارسی النسل تھے اس لئے اس پرانی اور اصلی وطنی نسبت کے تحت ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل جایا کرتی ہوگی یا ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوجاتی ہوگی جس سے تمام عرب یا کچھ عرب کے تئیں حقارت یا بے ادبی کا اظہار ہوتا ہوگا، ورنہ جہاں تک حقیقی بغض وعداوت رکھنے کا تعلق ہے تو حضرت سلمانؓ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عرب کے تئیں اس طرح کے جذبات رکھتے ہوں گے، تاہم ان کی اس طرح کی بات یا حرکت چونکہ صورۃً بغض وعداوت ہی کی مظہر ہوتی تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو متنبہ فرمایا کہ اس بارے میں احتیاط رکھیں اور اپنی زبان یا اپنے عمل سے کسی ایسی بات کا ارتکاب نہ کریں جس سے حقیقۃً نہ سہی صورۃً ہی عرب دشمنی کا اظہار ہوتا ہو کیونکہ اگر اس کا سلسلہ حقیقۃً بغض وعداوت رکھنے تک پہنچ گیا تو یہ چیز مجھ سے بغض وعداوت رکھنے کے مترادف ہوجائے گی۔

اہل عرب سے فریب ودغابازی آنحضرت ﷺ کی شفاعت خاص سے محرومی کا باعث ہے

⑳ وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ غَشَّ الْعَرَبَ لَمْ يَدْخُلْ فِيْ شَفَاعَتِيْ وَلَمْ

تَنَلْهُ مَوَدَّتِیْ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِیْثِ حُصَیْنِ بْنِ عُمَرَ وَلَیْسَ هُوَ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِیْثِ بِذٰلِكَ الْقَوِیِّ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عثمان ابن عفانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اہل عرب سے فریب و دغابازی کرے گا وہ میری شفاعت میں داخل نہیں ہوگا اور نہ اس کو میری دوستی کی سعادت حاصل ہوگی" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اس روایت کو ہم حصین ابن عمر کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے نہیں جانتے اور محدثین کے نزدیک وہ (حصین ابن عمر) اس درجہ کے قوی نہیں ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: غشّ (فریب و دغابازی) کا مطلب ہے، دھوکا دینا، دل میں تو کچھ ہو مگر زبان سے کچھ اور کہنا خیر خواہی نہ کرنا، کینہ رکھنا اور کسی کو اس بات پر ابھارنا جو اس کے مفاد و مصلحت کے خلاف ہو، "شفاعت" سے شفاعت صغریٰ یعنی "خصوصی شفاعت" مراد ہے، نہ کہ شفاعت کبریٰ جو بہر حال ہر ایک امتی کے لئے ہوگی۔ "دوستی کی سعادت حاصل نہ ہونے" سے یا تو یہ مراد تھی کہ اس شخص کو کبھی یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ میں اس کو اپنا دوست رکھوں یا آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ: اس شخص کو کبھی یہ سعادت حاصل نہیں ہو سکتی کہ وہ مجھے اپنا دوست و محبوب رکھے، بہر حال دونوں صورتوں میں مراد نفی کمال ہے۔

"اور وہ اس درجہ کے قوی نہیں ہیں" امام ترمذیؒ کے ان الفاظ کا مطلب یہ ہوا کہ عمران ابن حصین چونکہ روایت حدیث میں "قوی" نہیں سمجھے جاتے اس لئے ان کی روایت کردہ یہ حدیث "ضعیف" کہلائے گی، لیکن اول تو یہ کہ فضائل کے سلسلہ میں ضعیف حدیث بھی معتبر مانی جاتی ہے، دوسرے یہ کہ اس روایت کی تائید ان بہت سی حدیثوں سے ہوتی ہے جو تواتر معنوی کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں، مثلاً حاکمؒ نے حضرت انسؓ سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

حب العرب ایمان و بغضهم نفاق۔

"اہل عرب کی دوستی ایمان ہے اور ان سے بغض رکھنا نفاق ہے۔"

طبرانیؒ نے اوسط میں حضرت انسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے:

حب قریش ایمان و بغضهم کفر وحب العرب ایمان وبغضهم کفر فمن احب العرب فقد احبنی و من ابغض العرب فقد ابغضنی۔

"قریش سے دوستی رکھنا ایمان ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے نیز عرب سے محبت رکھنا ایمان ہے، عرب سے بغض رکھنا کفر ہے پس جس نے عرب سے محبت رکھی اس نے در حقیقت مجھ سے محبت رکھی اور جس نے عرب سے بغض رکھا اس نے در حقیقت مجھ سے بغض رکھا۔"

طبرانیؒ نے کبیر میں حضرت سہل ابن سعدؓ سے یہ حدیث نقل کیا ہے:

احبوا قریشا فانه من احبهم احبه الله۔

"قریش کو دوست رکھو کیونکہ جس نے قریش کو دوست رکھا اس کو اللہ دوست رکھے گا۔"

حاکمؒ نے مستدرک میں حضرت ابوہریرہؓ سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ:

احبوا الفقراء وجالسوهم واحبوا العرب من قلبک ویسرک من الناس ما تعلم من نفسک۔

"فقراء و مساکین سے محبت رکھو اور ان میں بیٹھا کرو، اور اہل عرب سے دلی محبت رکھو، اور چاہئے کہ وہ عیوب کہ جو تم خود اپنے میں پاتے ہو تمہیں دوسروں کی عیب گیری سے باز رکھیں۔"

ایک پیشین گوئی

(۲۱) وَعَنْ اُمِّ الْحَرِيْرِ مَوْلَاةِ طَلْحَةَ بْنِ مَالِكٍ قَالَتْ سَمِعْتُ مَوْلَایَ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اِقْتِرَابِ السَّاعَةِ هَلَاكُ الْعَرَبِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت اُمّ حریرؒ (تابعیہ) جو ایک صحابی حضرت طلحہ ابن مالکؓ کی آزاد کردہ باندی ہیں، کہتی ہیں کہ میں نے اپنے آقا (حضرت طلحہؓ) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت اہل عرب کا ہلاک ہو جانا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اہل عرب" سے مراد یا تو مسلمان عرب ہیں یا جنس عرب (یعنی تمام عرب خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان)، بہرحال مطلب یہ ہے کہ جب اہل عرب اس دنیا سے اٹھ جائیں تو سمجھو کہ قیامت آیا چاہتی ہے، اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ عرب کو قیادت و سیاست کا مقام حاصل ہے، تمام غیر عرب ان کے تابع ہیں۔ واضح رہے کہ جب قیامت آئے گی تو اس وقت صرف بدکار (برے لوگ ہی) اس دنیا میں ہوں گے کوئی بھی کلمہ گو (توحید و رسالت پر ایمان و اعتقاد رکھنے والا) موجود نہیں ہو گا۔

خلافت و امارت قریش کو سزاوار ہے

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُلْكُ فِيْ قُرَيْشٍ وَالْقَضَاءُ فِي الْاَنْصَارِ وَالْاَذَانُ فِي الْحَبْشَةِ وَالْاَمَانَةُ فِي الْاَزْدِ يَعْنِي الْيَمَنَ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَوْقُوْفًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا اَصَحُّ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خلافت و بادشاہی قریش میں ہے، قضاء انصار میں ہے، اذان حبشیوں میں ہے، اور امانت ازد (یعنی ازد شنوءۃ) میں ہے (جو یمن کا ایک قبیلہ ہے یا یہ کہ) ازد سے آپ ﷺ کی مراد تمام اہل یمن تھے، ایک روایت میں یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی موقوف حدیث کے طور پر منقول ہے، اور ترمذیؒ نے، جو اس روایت کے ناقل ہیں کہا ہے کہ یہی بات زیادہ صحیح ہے (یعنی سند کے اعتبار سے وہ روایت زیادہ صحیح ہے جو حدیث موقوف کے طور پر نقل ہوئی ہے)۔"

تشریح: "قضا" سے مراد "نقابت" ہے، نقابت کے معنی ہیں، نقیب بننا، یعنی نگران حال، خبر رکھنے والا، نبی کریم ﷺ نے لیلۃ العقبہ میں انصار کی ہر شاخ و قبیلہ کے ایک نقیب مقرر کر دیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے قبیلہ میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرے، لوگوں کو سمجھا بجھا کر اسلام کی طرف مائل کرے اور جو لوگ مسلمان ہو جائیں ان کے حالات و معاملات کا نگراں رہے، چنانچہ ان نقیبوں نے اپنے فرائض منصبی کو نہایت خوش اسلوبی، ہوشیاری اور پوری تندہی کے ساتھ انجام دیا اور دربار رسالت سے تعریف و تحسین کے مستحق قرار پائے۔

اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں "قضا" کا لفظ اپنے معروف معنی ہی میں استعمال ہوا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کو جو جلیل القدر انصاری صحابی ہیں، یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا، یہ قول زیادہ واضح اور زیادہ قرین قیاس ہے۔

"اذان حبشیوں میں ہے" کا مطلب یہ تھا کہ اذان دینے کی خدمت حبشی لوگ زیادہ عمدگی اور زیادہ موزونیت کے ساتھ انجام دیتے ہیں، آپ ﷺ نے یہ بات حضرت بلالؓ کو سامنے رکھ کر فرمائی جو آپ ﷺ کے مؤذنوں کے سردار تھے اور وہ حبشی تھے۔

"امانت ازد میں ہے" میں "ازد" کے لفظ سے کیا مراد ہے، اس بارہ میں دو قول ہیں، ایک تو یہ کہ اس سے یمن کا وہی مشہور قبیلہ مراد ہے جس "ازد شنوءۃ" کہا جاتا ہے اور ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ امانت کی ذمہ داری نہایت اطمینان بخش طور پر قبیلہ ازد شنوءۃ کے یمنی لوگ انجام دیتے ہیں، اور دوسرا قول اس راوی کا ہے کہ جنہوں نے روایت میں یعنی الیمن کے الفاظ کا اضافہ کر کے یہ بتایا ہے

کہ "ازد" سے یمن کا صرف ایک قبیلہ "ازد شنوۃ" مراد نہیں ہے بلکہ بالعموم تمام اہل یمن مراد ہیں، جیسا کہ ایک روایت میں اہل یمن کے بارہ میں عمومی طور پر فرمایا گیا ہے کہ وہ رقیق القلب ہیں اہل امن اور اہل ایمان ہیں۔

بہر حال حدیث کا مجموعہ حاصل یہ ہے کہ ان مناصب یعنی قضا یا نقابت، مؤذنی اور امانت کے لئے افراد کا انتخاب کرتے وقت مذکورہ قبائل کے لوگوں کو ترجیح دینی چاہئے کیونکہ ان قبائل کے لوگوں میں ان مناصب کی ذمہ داری و خدمت انجام دینے کی مخصوص صلاحیت اور اس سلسلہ میں ان کو ایک خاص نسبت حاصل ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قریش کے بارے میں ایک پیشین گوئی

(۲۳) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مُطِیْعٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ لَا یُقْتَلُ قُرَشِیٌّ صَبْرًا بَعْدَ ھٰذَا الْیَوْمِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عبداللہ ابن مطیع تابعیؒ (جو سادات قریش میں سے ہیں) اپنے والد (حضرت مطیعؓ صحابی) سے (جن کا اصل نام عاصی یا عاص تھا اور آنحضرت ﷺ نے اس نام کو تبدیل کر کے مطیع رکھ دیا تھا) روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول کریم ﷺ کو فتح مکہ کے دن یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "آج (فتح مکہ کے دن) کے بعد سے قیامت کے دن تک کسی قریشی کو حبس وقید کر کے نہیں مارا جائے گا (یہ اور بات ہے کہ اپنے دشمن کے مقابلہ پر جنگ وجدل میں مارے جائیں)۔" (مسلمؒ)

تشریح: "حبس وقید کر کے نہیں مارا جائے گا" سے کیا مراد ہے، اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، ملا علی قاریؒ نے طیبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہاں نفی سے نہی مراد ہے مطلب یہ کہ اس ارشاد گرامی سے آنحضرت ﷺ کا مقصد مختلف اعتراض کر کے اس کو بگاڑ دیا ہے اور پھر حمیدیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بعض محدثین نے اس ارشاد گرامی کی تاویل کی ہے اور کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آج فتح مکہ کے دن کے بعد سے قیامت کے دن تک ایسی نوبت کبھی نہیں آئے گی کہ کوئی قریشی شخص اسلام سے مرتد ہو جائے اور پھر اسلامی قانون کے مطابق اس کو حبس وقید میں ڈال دیا جائے اور وہ ارتداد (یعنی کفر) پر ثابت وقائم رہے یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ اس تاویل کی بنیاد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کی ایسی مثالیں تو موجود ہیں جب کسی قریشی شخص کو اس بناء پر قید وبند میں ڈال کر موت کے گھاٹ اتارا گیا کہ وہ اسلام سے کفر و انکار اور اسلام کی دشمنی پر قائم تھا لیکن کوئی ایسی مثال نہیں پائی جاتی جب کوئی قریشی مسلمان مرتد ہو گیا ہو اور اس بنا پر اس کو قید وبند میں ڈال کر قتل کر دیا گیا ہو کہ وہ اپنے ارتداد سے باز نہیں آیا اور کفر پر قائم و ثابت رہا، لہٰذا اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ قریش کے دلوں میں دین و ایمان اس طرح راسخ کر دے گا اور ان کو اسلام کے راستہ پر اس مضبوطی سے لگا دے گا کہ کبھی بھی ان میں کا کوئی شخص مرتد نہیں ہو گا، جس کے سبب اس کو قید وبند میں ڈال کر قتل کر دینے کی نوبت آئے، اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ: ان الشیطان قد ایس من جزیرۃ العرب (حقیقت یہ ہے کہ شیطان جزیرۃ العرب سے مایوس ہو گیا ہے)۔

حجاج کے سامنے حضرت اسماء کی حق گوئی

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ نَوْفَلٍ مُعَاوِیَۃَ بْنِ مُسْلِمٍ قَالَ رَاَیْتُ عَبْدَاللّٰہِ بْنَ الزُّبَیْرِ عَلٰی عَقَبَۃِ الْمَدِیْنَۃِ قَالَ فَجَعَلَتْ قُرَیْشٌ تَمُرُّ عَلَیْہِ وَالنَّاسُ حَتّٰی مَرَّ عَلَیْہِ عَبْدُاللّٰہِ بْنُ عُمَرَ فَوَقَفَ عَلَیْہِ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَبَا خُبَیْبٍ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَبَا خُبَیْبٍ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَبَا خُبَیْبٍ اَمَا وَاللّٰہِ لَقَدْ کُنْتُ اَنْھٰكَ عَنْ ھٰذَا اَمَا وَاللّٰہِ لَقَدْ کُنْتُ اَنْھٰكَ عَنْ ھٰذَا اَمَا وَاللّٰہِ لَقَدْ کُنْتُ اَنْھٰكَ عَنْ

هٰذَا اَمَا وَاللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مَا عَلِمْتُ صَوَّامًا قَوَّامًا وَصُوْلاً لِلرَّحِمِ اَمَا وَاللّٰهِ لَاُمَّةٌ اَنْتَ شَرُّهَا لَاُمَّةُ سُوْءٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَاُمَّةُ خَيْرٍ ثُمَّ نَفَذَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَبَلَغَ الْحَجَّاجَ مَوْقِفُ عَبْدِاللّٰهِ وَقَوْلُهُ فَاَرْسَلَ اِلَيْهِ فَاُنْزِلَ عَنْ جِذْعِهِ فَاُلْقِيَ فِيْ قُبُوْرِ الْيَهُوْدِ ثُمَّ اَرْسَلَ اِلٰى اُمِّهِ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ فَاَبَتْ اَنْ تَاْتِيَهُ فَاَعَادَ عَلَيْهَا الرَّسُوْلَ لَتَاْتِيَنِّيْ اَوْلَاَبْعَثَنَّ اِلَيْكِ مَنْ يَسْحَبُكِ بِقُرُوْنِكِ قَالَ فَاَبَتْ وَقَالَتْ وَاللّٰهِ لَا اٰتِيْكَ حَتّٰى تَبْعَثَ اِلَيَّ مَنْ يَسْحَبُنِيْ بِقُرُوْنِيْ قَالَ فَقَالَ اَرُوْنِيْ سِبْتَيَّ فَاَخَذَ نَعْلَيْهِ ثُمَّ انْطَلَقَ يَتَوَذَّفُ حَتّٰى دَخَلَ عَلَيْهَا فَقَالَ كَيْفَ رَاَيْتِنِيْ صَنَعْتُ بِعَدُوِّ اللّٰهِ قَالَتْ رَاَيْتُكَ اَفْسَدْتَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ وَاَفْسَدَ عَلَيْكَ اٰخِرَتَكَ بَلَغَنِيْ اَنَّكَ تَقُوْلُ لَهُ يَابْنَ ذَاتِ النِّطَاقَيْنِ اَنَا وَاللّٰهِ ذَاتُ النِّطَاقَيْنِ اَمَّا اَحَدُهُمَا فَكُنْتُ بِهِ اَرْفَعُ طَعَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَطَعَامَ اَبِيْ بَكْرٍ مِنَ الدَّوَابِّ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَنِطَاقُ الْمَرْاَةِ الَّتِيْ لَا تَسْتَغْنِيْ عَنْهُ اَمَا اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَنَا اَنَّ فِيْ ثَقِيْفٍ كَذَّابًا وَمُبِيْرًا فَاَمَّا الْكَذَّابُ فَرَاَيْنَاهُ وَاَمَّا الْمُبِيْرُ فَلَا اِخَالُكَ اِلَّا اِيَّاهُ قَالَ فَقَامَ عَنْهَا فَلَمْ يُرَاجِعْهَا۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابونوفل معاویہ ابن مسلم تابعیؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ (کی نعش) کو مدینہ (کے راستہ پر واقع مکہ) کی گھاٹی میں (ایک سولی پر لٹکے ہوئے) دیکھا ابونوفلؒ کہتے ہیں کہ قریش کے لوگوں نے اس نعش کے پاس آنا جانا شروع کیا اور دوسرے لوگ بھی آتے جاتے رہے، یہاں تک کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ بھی وہاں آئے اور نعش کے سامنے کھڑے ہو کر یوں گویا ہوئے۔ اسلام علیک اے ابوخبیب! السلام علیک اے ابوخبیب! السلام علیک اے ابوخبیب! آگاہ ہو، خدا کی قسم میں تم کو اس کام سے منع کرتا تھا، آگاہ ہو، خدا کی قسم، میں تم کو اس کام سے منع کرتا تھا، آگاہ ہو خدا کی قسم میں تم کو اس کام سے منع کرتا تھا۔ (تین مرتبہ یہ الفاظ کہنے کے بعد پھر انہوں نے کہا) آگاہ ہو، خدا کی قسم، بلاشبہ تم وہ شخص تھے جس کو میں جانتا تھا کہ تم بہت زیادہ روزے رکھنے والے، بہت زیادہ شب بیدار و شب خیز اور اہل قرابت سے بہت زیادہ احسان و سلوک کرنے والے ہو، آگاہ ہو خدا کی قسم! وہ گروہ جس کی نظر میں تم برے ہو، یقیناً ایک برا اور بدتر گروہ ہے اور ایک روایت میں لامۃ سوء کے بجائے لامۃ خیر کے الفاظ ہیں، اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ وہاں سے چلے گئے، پھر جب یہ خبر حجاج کے پاس پہنچی کہ عبداللہ ابن عمر نے (عبداللہ ابن زبیرؓ کی نعش کے پاس) کھڑے ہو کر ایسا ویسا کہا ہے تو اس نے (فوراً) ایک آدمی بھیجا اور نعش کو اس لکڑی (یعنی سولی) پر سے اتروا کر یہودیوں کے قبرستان میں ڈلوا دیا، پھر حجاج نے ابن زبیرؓ کی والدہ حضرت اسماءؓ (دختر حضرت ابوبکر صدیقؓ) کے پاس ایک آدمی بھیجا (اور ان کو طلب کیا) حضرت اسماءؓ نے اس کے ہاں آنے سے انکار کر دیا، حجاج نے دوبارہ آدمی بھیجا اور کہلایا کہ یا تو فوراً چلی جاؤ ورنہ پھر ایک ایسے آدمی کو بھیجوں گا جو تمہاری چوٹی پکڑ کر کھینچتا ہوا یہاں لائے گا، ابونوفلؒ کہتے ہیں کہ حضرت اسماءؓ نے پھر انکار کر دیا اور حجاج کو کہلا بھیجا کہ خدا کی قسم میں تیرے پاس ہرگز نہیں آؤں گی، اب تو توکسی ایسے آدمی کو بھیج کر دیکھ لے جو میری چوٹیاں پکڑ کر مجھے کھینچتا ہوا لے جائے، راوی کہتے ہیں کہ حجاج (نے یہ سنا تو آگ بگولا ہو گیا اور بڑے غضب ناک انداز میں) بولا: لاؤ میری جوتیاں میرے سامنے رکھو، پھر اس نے اپنی جوتیاں پیروں میں ڈالیں اور اکڑتا اتراتا ہوا تیز تیز چل کر حضرت اسماءؓ کے ہاں پہنچا اور (زہریلے لہجہ میں) ان سے بولا کہ (ذرا بتانا) تم نے اس دشمن خدا (یعنی اپنے بیٹے ابن زبیرؓ) کے ساتھ سلوک کرنے میں مجھے کیسا پایا! حضرت اسماءؓ بولیں: میں نے تو ایسا پایا کہ تو نے اس کی دنیا تباہ کر دی اور اس نے تیری عاقبت کا ستیاناس کر دیا (یعنی اس ظالمانہ قتل نے تجھے عذاب دوزخ کا مستوجب بنا دیا ہے، اور ہاں مجھے معلوم ہے کہ تو میرے بیٹے ابن زبیرؓ کو (اس کی زندگی میں یا اس کی شہادت کے بعد) "دو کمر بند والی عورت" کا بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا تھا؟ (تو سن لے) خدا کی قسم میں بلاشبہ دو کمر بند والی عورت ہوں، ایسے دو کمر بند کہ جن میں ایک کمر بند تو وہ تھا جس کے ذریعہ میں آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا کھانا جانوروں سے محفوظ رکھتی تھی اور دوسرا کمر بند عورت کا وہ کمر بند تھا جس سے کوئی عورت بے پرواہ نہیں ہو سکتی، اور یاد رکھ ہم سے رسول کریم ﷺ نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی کہ قبیلہ ثقیف میں ایک نہایت درجہ کا جھوٹا شخص پیدا ہوگا اور ایک نہایت درجہ کا مفسد و ہلاکو، تو تیرے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ وہ مفسد و ہلاکو جس کی خبر

آنحضرت ﷺ نے دی تھی، تو ہی ہے، راوی ابونوفلؒ کا بیان ہے کہ (یہ الفاظ سن کر) حجاج حضرت اسماءؓ کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور ان کو کوئی جواب نہیں دیا۔" (مسلم)

تشریح: "مدینہ کی گھاٹی" سے مراد مکہ شہر کا بالائی سرا ہے جو مشرقی سمت واقع ہے، مدینہ کا راستہ چونکہ اسی جگہ سے گزرتا ہے، اور مدینہ سے آنے والے یہیں سے مکہ شہر میں داخل ہوتے تھے اس مناسبت سے اس کو "مدینہ کی گھاٹی" سے تعبیر کیا گیا، جب ظالم حجاج ابن یوسف نے اپنے لشکر جرار کے ذریعہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو مسجد حرام میں محصور کر کے نہایت بے دردی سے شہید کیا تو بعد میں اس نے ان کی نعش مبارک کو مذکورہ جگہ ایک سولی پر لٹکا دیا تھا اور پھر اسی جگہ کے قریب حجون یعنی جنت المعلاۃ میں ان کی تدفین عمل میں آئی، لیکن اب تو ان کی قبر کا کوئی نشان باقی بھی نہیں ہے اور نہ کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ ان کی قبر کس جگہ تھی، اسی طرح جنت المعلیٰ میں اور جو صحابہ کرام مدفون ہوئے ان کی قبریں بھی متعین و معلوم نہیں ہیں، حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی قبر بھی اسی جنت المعلاۃ میں ہے مگر ان کی قبر بھی اسی طرح غیر معلوم تھی، ایک زمانہ میں کسی بزرگ نے خواب کی بنیاد پر ان کی قبر کا تعین کیا تھا اور اس قبر پر قبہ بھی بنایا گیا تھا مگر اب وہ بھی بے نشان ہے۔

"میں نے تم کو اس کام سے منع کیا تھا" میں "کام" سے مراد یزید ابن معاویہؓ سے خروج اور اپنی خلافت و امارت کا دعویٰ ہے جو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے کیا تھا، اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت امیر معاویہؓ کے بعد ان کا بیٹا یزید تخت خلافت و امارت پر بیٹھا، تو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے اس کی اطاعت و بیعت سے انکار کر دیا اور مکہ مکرمہ کے لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے چونکہ جلیل القدر صحابی اور بلند و بالا نسبتوں کے اعتبار سے بہت زیادہ عزت و منزلت رکھتے تھے اس لئے جلد ہی ان کی خلافت کو قبول کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا اور مختلف علاقوں اور خطوں پر ان کو کنٹرول حاصل ہو گیا، بلکہ جیسا کہ مؤرخین لکھتے ہیں شام کے علاوہ تقریباً تمام ہی عالم اسلام میں وہ خلیفہ تسلیم کر لئے گئے۔ یزید کے بعد پھر مروان ابن حکم اور اس کے بعد عبدالملک ابن مروان کی امارت کو بھی انہوں نے تسلیم نہیں کیا اور بدستور اپنی خلافت کے دعوے اور اقتدار پر قائم رہے، لیکن عبدالملک ابن مروان نے ان کے خلاف زبردست فوجی کاروائی کی اور حجاج ابن یوسف ثقفی کو لشکر جرار کے ساتھ مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے اپنے قلیل ترین ساتھیوں کے ساتھ حجاج کی زبردست فوج کا جس بہادری و پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا وہ شجاعت و بہادری اور عزیمت و جرأت کی تاریخ کا نادر المثال کارنامہ ہے، آخر کار انہوں نے جام شہادت نوش کیا، بدبخت حجاج نے ان کا سر تن سے جدا کر کے مدینہ منورہ روانہ کیا اور باقی جسم کو سولی پر لٹکا دیا، اس سے پہلے یہی لشکر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوا تھا، اس وقت یزید زندہ تھا، (اس لشکر نے مدینہ کو جس طرح تباہ و برباد کیا اور وہاں کے لوگوں کا جس طرح قتل عام کیا وہ "واقعہ حرہ" کے نام سے اپنی لرزہ خیز تفصیل کے ساتھ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ پس حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے سولی پر لٹکی ہوئی حضرت ابن زبیرؓ کی نعش کے سامنے کھڑے ہو کر انہی دلدوز واقعات اور ظالم و فاسد لوگوں کے اس گروہ کی وحشیانہ کاروائیوں پر تاسف و تحسّر کا اظہار کرتے ہوئے حضرت ابن زبیرؓ کو مخاطب کیا اور کہا کہ میں تمہیں پہلے ہی منع کرتا تھا کہ تم ان ظالموں اور بدکرداروں کے مقابلہ پر نہ آؤ اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے یکسو ہو جاؤ، مگر تم نہ مانے، حق کی حکمرانی قائم کرنے کے تمہارے پاک جذبہ نے تمہیں خلافت کے دعوے پر مجبور رکھا اور تم نتائج سے بے پرواہ ہو کر ان دنیادار اور مفسد حکمرانوں کے خلاف ڈٹے رہے آخر کار تمہیں اس لرزہ خیز انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

"تم بہت زیادہ روزے رکھنے والے" بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ بہت زیادہ روزے رکھا کرتے تھے، ایسا بھی ہوتا تھا کہ پندرہ پندرہ دن تک مسلسل روزے سے رہا کرتے تھے جس کو طے کے روزے کہا جاتا ہے اور پوری پوری رات نوافل، تلاوت اور ذکر اللہ میں گزارا کرتے تھے قرابتداروں سے حسن سلوک کے معاملہ میں امتیازی شہرت رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اس موقع پر

حضرت ابن زبیرؓ کے ان اوصاف کا ذکر اس لئے کیا کہ حجاج ان کو عدو اللہ (اللہ کا دشمن) اور ظالم کہا کرتا تھا اور نہ معلوم کیا کیا واہی تباہی بکا کرتا تھا لہٰذا حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ضروری سمجھا کہ حضرت ابن زبیرؓ کی وہ خوبیاں اور نیکیاں بیان کریں جن سے حجاج کی لغو بے ہودہ باتوں کی تردید ہو اور عام لوگوں پر واضح ہو جائے کہ ابن زبیرؓ کس پایہ کے عابد و زاہد اور بلند مرتبہ مسلمان تھے۔

"اور ایک روایت لامۃ خیر" کے الفاظ ہیں، یعنی اصل روایت میں تو یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے حجاج ابن یوسف اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں واضح الفاظ کے ذریعہ اپنا یہ تاثر بیان کیا کہ جو گروہ عبداللہ ابن زبیرؓ کو برا اور راہ حق سے ہٹا ہوا سمجھتا ہے دراصل خود وہی گروہ اپنی بداعتقادی اور اپنے خیال فاسد کی بناء پر ایک برا اور بدتر گروہ ہے کہ تم جیسے شخص کو شریر اور فسادی لوگوں میں شمار کرتے ہیں، لیکن ایک روایت میں یہاں "ایک برا اور بدتر گروہ ہے" کے بجائے یہ ہے کہ "وہ کیا اچھا گروہ ہے" ان الفاظ میں بھی اسی تاثر کا اظہار مقصود ہے جو اصل روایت سے ظاہر ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اس دوسری روایت کے مطابق حضرت ابن عمرؓ نے گویا طنز و تعریض اور استہزاء کا اسلوب اختیار کیا، جیسا کہ عام طور پر کسی برے اور فسادی شخص کی شرارت اور بدطینی پر چوٹ کرنے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ واہ میاں تم بھی کیا خوب ہو آپس میں تفرقہ ڈلواتے ہو، تاہم زیادہ موزوں اور قریب الفہم وہی الفاظ ہیں، جو اصل روایت میں مذکور ہیں۔

"یہودیوں کے قبرستان میں ڈلوادیا" یعنی مکہ میں رہنے والے یہودی یا باہر سے آئے ہوئے اتفاقاً مکہ میں مرجانے والے یہودی جس جگہ دفن کئے جاتے تھے وہاں حجاج نے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی نعش ڈلوادی تھی۔ لیکن یہ بات اس کے منافی نہیں کہ حضرت عبداللہ ابن زبیر کی تدفین جنت المعلاۃ میں عمل میں آئی تھی، کیونکہ یہ صورت حال ابتداءً پیش آئی تھی۔ کہ ان کی نعش یہودیوں کے قبرستان میں ڈلوادی گئی تھی، لیکن پھر بعد میں ان کی نعش مبارک کو وہاں سے اٹھا کر جنت المعلاۃ میں دفن کیا گیا تھا، واضح رہے کہ اب تو بہت زمانہ سے وہ جگہ متعارف نہیں ہے جہاں یہودیوں کا قبرستان یا ان کی قبریں تھیں، لیکن اس زمانہ میں ایسی کوئی جگہ ضرور تھی جو یہودیوں کی قبروں کے لئے مخصوص تھی اور اسی لئے حجاج نے حکم دیا تھا، کہ عبداللہ ابن زبیرؓ کی نعش کو سولی سے اتار کر یہودیوں کے قبرستان میں ڈال دیا جائے۔

"لاؤ میری جوتیاں میرے سامنے رکھو" یہ ارونی سبتی کا بامطلب ترجمہ ہے۔ سبتی دراصل یٔ متکلم کے ساتھ سبتیۃ کا تثنیہ ہے۔ اور سبتیۃ اس پاپوش کو کہتے تھے جو دباغت دیئے ہوئے اور بال وغیرہ سے بالکل صاف نرم چمڑے کا بنا ہوتا تھا، اس زمانہ میں امراؤ سلاطین اور عیش پسند لوگ اسی طرح کے جوتے پہنا کرتے تھے۔

"دو کمربند والی عورت" ذات النطاقین کا ترجمہ ہے، اور یہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر صدیقؓ کا لقب تھا جو آنحضرت ﷺ نے ایک خاص واقعہ کی بناء پر مرحمت فرمایا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ ان کے مکان سے روانہ ہورہے تھے تو حضرت اسماءؓ نے ان دونوں کے لئے کچھ توشہ تیار کیا تھا۔ توشہ دان باندھنے کے لئے انہیں کوئی تسمہ وغیرہ نہیں ملا تو انہوں نے اپنا کمربند پھاڑ کر اس کے دو ٹکڑے کئے، ایک ٹکڑے سے توشہ دان باندھا اور دوسرے ٹکڑے کو اپنی کمر پر لپیٹ لیا۔ دراصل نطاق کا ترجمہ کمربند کے بجائے کمرپٹہ کرنا زیادہ موزوں ہے، اس زمانہ میں جب کہ عرب عورتوں میں پاجامہ و شلوار جیسی چیز کا زیادہ رواج نہیں تھا، وہ اپنے تہ بند کے اوپر کمرپٹہ استعمال کیا کرتی تھیں تاکہ کام کاج کرتے وقت تہ بند کے کھلنے کا امکان نہ رہے؛ بہر حال اس موقع پر حضرت اسماءؓ نے جس بے ساختگی کے ساتھ اپنا کمرپٹہ کھول کر اس کے دو حصے کر کے گویا دو نطاق بنائے اس کی مناسبت سے آنحضرت ﷺ نے ان کو ذو النطاقین کے لقب سے نوازا۔ اس اعتبار سے یہ لقب خود ان کے لئے تو فخر کا موجب تھا کہ اپنی کوئی چیز آنحضرت ﷺ کے استعمال و کام میں آجائے اس سے بڑی فضیلت اور کیا ہوسکتی ہے لیکن نادان حجاج ان کے اس لقب کو ان کی حقارت پر محمول کرتا تھا کہ ان کو ایک ایسی چیز کے ذریعہ ملقب کیا گیا جو عام طور پر گھروں کا کام کاج کرنے والی عورتوں اور باہر نکلنے والی

خادماؤں کی علامت ہے۔

"ہاں، خدا کی قسم میں دو کمر بند والی عورت ہوں" ذوالنطاقین کا لقب حجاج کے خیال فاسد کے برخلاف حضرت اسماءؓ کے لئے چونکہ تفاخر دارین کا موجب تھا اس لئے انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس لقب کو فخر کے ساتھ قبول و تسلیم کیا اور حجاج کے سامنے اس کا برملا اظہار و اعتراف بھی کیا بلکہ اس کے بعد وہ وجہ بیان کی جس نے ان کو اس اعزاز تک پہنچایا۔ چنانچہ انہوں نے واضح کیا کہ میں نے اپنے ایک کمر بند کے جو دو کمر بند کر لئے تھے ان میں ایک کے ذریعہ تو آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا کھانا دستر خوان میں لپیٹ کر کسی اونچی جگہ لٹکا دیتی تھی، تاکہ جانوروں یعنی چوہے اور چیونٹی وغیرہ سے محفوظ رہے اور دوسرا کمر بند اس کام کے لئے تھا جس سے کوئی عورت بے پرواہ نہیں ہو سکتی، "بے پرواہ نہیں ہو سکتی" کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی بھی عورت کی تعریف و تحسین اسی صورت میں ہوتی ہے جب وہ اپنے گھر کا کام کاج پوری لگن اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کرتی ہو، نطاق یعنی کمر بند یا کمر پٹہ کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ عورت اس اپنے تہبند پر باندھ لے تاکہ اس کو تہ بند کھل جانے کا خوف نہ ہو اور وہ اپنے گھر کا کام کاج پورے اطمینان سے کر سکے، پس حضرت اسماءؓ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ جو عورت اپنے گھر سے اور اپنے گھر کے کام کاج سے دلچسپی رکھتی ہو وہ نطاق سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، دوسرا مطلب یہ ہے کہ عورتوں میں نطاق کا ایک استعمال اس مقصد کے لئے بھی ہوتا تھا کہ پیٹ بڑھنے نہ پائے۔ جیسا کہ ایک زمانے میں عرب عورتوں میں اس کا بہت رواج تھا کہ وہ اپنے پیٹ کی ہیئت درست رکھنے کے لئے چمڑے کا کمر پٹہ استعمال کرتی تھیں بلکہ مالدار عورتیں تو سونے چاندی کے کام کا کمر پٹہ باندھتی تھیں، پس حضرت اسماءؓ نے اس کی طرف اشارہ کیا کہ دوسرا نطاق میں اس مقصد کے لئے استعمال کرتی تھی اور یہ ایک ایسا مقصد تھا جس سے کوئی عورت بے پرواہ نہیں ہو سکتی تھی۔

"اور ان کو کوئی جواب نہیں دیا" یہ بہادر خاتون حضرت اسماءؓ کی جرأت و بے باکی اور حق گوئی کا اثر تھا کہ ظالم حجاج جیسا شخص ان کی باتیں سن کر خاموش ہو گیا اور ان کا جواب دینے کی جرأت نہ کر سکا، منقول ہے کہ حضرت اسماءؓ اپنے بیٹے عبداللہ ابن زبیرؓ کے سانحہ شہادت کے بیس دن بعد انتقال کر گئیں، اس وقت ان کی عمر سو سال تھی اور ان کا ایک بھی دانت نہیں ٹوٹا تھا۔

علامہ نوویؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر نے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی نعش کے سامنے کھڑے ہو کر ان کو جو سلام کیا اس سے معلوم ہوا کہ میت کو سلام کرنا اور ایک سے زائد مرتبہ کرنا مستحب ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میت کے سامنے اس کی ان خوبیوں اور اوصاف کو بیان کرنا جن کے ذریعہ وہ مشہور تھا جائز ہے۔ اس حدیث سے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی بھی زبردست فضیلت و خصوصیت واضح ہوتی ہے کہ وہ حق بات کہنے سے باز نہ رہے باوجودیکہ وہ جانتے تھے کہ یہاں میں جو کچھ کہوں گا اس کا ایک ایک لفظ ظالم حجاج تک پہنچے گا۔

خلافت کا دعویٰ کرنے سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا انکار

(۲۵) وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ اَتَاهُ رَجُلَانِ فِي فِتْنَةِ ابْنِ الزُّبَيْرِ فَقَالَا اِنَّ النَّاسَ صَنَعُوْا مَا تَرٰى وَاَنْتَ ابْنُ عُمَرَ وَصَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا يَمْنَعُكَ اَنْ تَخْرُجَ فَقَالَ يَمْنَعُنِيْ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلٰى دَمَ اَخِي الْمُسْلِمِ قَالَا اَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ تَعَالٰى وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ قَدْ قَاتَلْنَا حَتّٰى لَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ وَكَانَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ وَاَنْتُمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تُقَاتِلُوْا حَتّٰى تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت نافعؒ (جو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں) روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے متعلق ہنگامہ آرائی کے زمانہ میں (ان کی شہادت سے پہلے) دو شخص حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ لوگوں نے (خلافت و امارت کے بارے میں اختلاف و نزاع اور ہنگامہ آرائی کی صورت میں) جو کچھ کیا ہے وہ آپ نے دیکھ ہی لیا، آپ حضرت عمر فاروقؓ کے

بیٹے ہیں (جو خلیفہ تھے) نیز آپ رسول کریم ﷺ کے صحابی بھی ہیں (اس اعتبار سے عبدالملک ابن مروان کے مقابلہ پر آپ کہیں زیادہ مستحق ہیں کہ خلافت کا دعویٰ کریں جس کی نااہلیت کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ اس کے امراء اور گورنروں میں حجاج ابن یوسف جیسا ظالم شخص ہے) پھر آخر کیا چیز مانع ہے کہ آپ (خلافت و امارت کے دعوے اور ظالموں سے بدلہ لینے کے اعلان کے ذریعہ) خروج نہیں کر رہے ہیں! حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے (یہ سن کر) فرمایا! جو چیز میرے لئے مانع ہے، وہ میرا یہ علم ہے کہ مسلمان بھائی کا خون بہانا اللہ تعالیٰ نے میرے لئے حرام قرار دیا ہے، ان دونوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ وقاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ (یعنی لڑو تم لوگوں سے یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے)! حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا: ہم (آنحضرت ﷺ اور خلفاء راشدین کے ساتھ) ان لوگوں سے یقیناً لڑے یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر و شرک کا خاتمہ ہو گیا اور صرف اللہ کا دین اسلام رہ گیا، اور (اب) تم یہ چاہتے ہو کہ تم جنگ و جدال کرو یہاں تک ان (مسلمانوں) میں فتنہ پھیل جائے اور غیر اللہ کا دین قائم ہو جائے۔" (بخاری)

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے میرے حرام قرار دیا ہے" اس جملہ کے ذریعہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا مقصد اس بات کو اہمیت اور تاکید کے ساتھ بیان کرنا تھا کہ خون ریزی سے اجتناب اور مسلمانوں کے درمیان باہمی جنگ وجدل سے گریز ہیں اپنے لئے ہر حالت میں ضروری سمجھتا ہوں اور خاص طور پر اس صورت میں جب کہ مسئلہ خلافت و امارت کی طلب و خواہش کا ہو، پس اس جملہ میں عَلَیَّ (میرے لئے) کا لفظ اس مقصد کے تحت استعمال ہوا ہے ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ مسلمان بھائی کا خون بہانا تو ہر شخص کے لئے حرام قرار دیا گیا ہے۔

"اور غیر اللہ کا دین قائم ہو جائے" دراصل ان دونوں شخصوں کا خیال یہ تھا کہ اول تو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اپنی خلافت کا دعویٰ کریں لیکن اگر وہ اس پر تیار نہ ہوں تو پھر ان کو کم سے کم یہ چاہئے کہ ان لوگوں کے خلاف تلوار اٹھائیں جو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی خلافت تسلیم نہیں کرتے اور ان کے مقابلہ پر ظالموں اور نااہلوں کی امارت کے وفادار ہیں۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا خیال یہ تھا کہ عام مسلمانوں کو باہمی اختلاف و نزاع اور جنگ وجدل سے بچانے کے لئے ایسا کوئی اقدام مناسب نہیں ہے کیونکہ مسلمان کا مسلمان کے خلاف تلوار اٹھانا، اور وہ بھی اقتدار و امارت کے سلسلہ میں، آخر کار باہمی افتراق و انتشار کی ایک ایسی صورت حال کے پیدا ہونے کا موجب بن سکتا ہے جو اسلام کے نظام دین و شریعت کے منزول اور مسلمانوں کی ملی زندگی کو کمزور بنا دے، یہاں تک کہ اسلام دشمن طاقتوں کو اپنا غلبہ و تسلط جما لینے کا موقع مل جائے، اسی احساس کے تحت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت ابن زبیرؓ کے حق میں یہی بہتر سمجھتے تھے کہ وہ خلافت کے مسئلہ میں قتل و قتال کو ترک کر دیں اور یکسوئی اختیار کر کے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

قبیلہ دوس کے حق میں دعا

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ جَآءَ الطُّفَیْلُ ابْنُ عَمْرٍو الدَّوْسِیُّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ دَوْسًا قَدْ هَلَکَتْ وَعَصَتْ وَاَبَتْ فَادْعُ اللّٰہَ عَلَیْهِمْ فَظَنَّ النَّاسُ اَنَّهٗ یَدْعُوْا عَلَیْهِمْ فَقَالَ اللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَاْتِ بِهِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ طفیل ابن عمرو دوسیؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ (یارسول اللہ) مجھے یقین ہے کہ قبیلۂ دوس ہلاک ہو گیا (یعنی اس قبیلہ کے لوگوں نے قبول اسلام اور اطاعت دین سے انکار کر کے خود کو ہلاکت و تباہی کا مستوجب بنا لیا ہے) لہٰذا آپ اس قبیلہ کے لئے بددعا کیجئے (کہ اللہ تعالیٰ اس پر عذاب مسلط کرے) لوگوں نے (تو یہ سن کر) خیال کیا کہ آنحضرت ﷺ اس قبیلہ کے لئے بددعا کریں گے، لیکن (آنحضرت ﷺ تو رحمۃ للعٰلمین ہیں اور لوگوں کو راہ راست دکھا کر فلاح و نجات سے ہمکنار کرنے کے لئے اس دنیا میں مبعوث ہوئے نہ کہ بددعا کر کے تباہ و برباد کرنے کے لئے، اس لئے) آپ ﷺ نے دعا فرمائی: الٰہی قبیلۂ دوس کو راہ راست دکھا، اور اس قبیلہ کے لوگوں کو (مدینہ کی جانب) لا (یعنی ان کو قبول اسلام کے بعد ہجرت کی بھی توفیق عطا فرمایا

یہ کہ ان کو اہل اسلام کے طور طریقوں کی طرف مائل فرما اور ان کے دلوں کو قبول اسلام کی طرف پھیر دے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت طفیل ابن عمرو دوسیؓ جلیل القدر صحابی ہیں، قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے اور اہل حجاز میں شمار ہوتے تھے، مکہ میں مشرف باسلام ہوئے اور پھر اپنے قبیلہ میں واپس چلے گئے۔ جب آنحضرت ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو بعد میں انہوں نے بھی اپنا قبیلہ اور وطن چھوڑ کر ہجرت کی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس موقع پر حاضر ہوئے جب آپ ﷺ خیبر میں تھے، اور پھر آپ ﷺ کے رحلت فرمانے تک مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کے پاس رہے، ان کو "ذوالنور" کا لقب حاصل تھا اور یہ لقب اس بناء پر مشہور ہوا تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ان کو اسلام کی تبلیغ کے لئے ان کے قبیلہ کی طرف روانہ فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی نشانی عطا فرما دیجئے جس کو دیکھ کر لوگ میری تصدیق کریں، آپ ﷺ نے دعا فرمائی، الٰہی اس کو نور عطا فرما! اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور جگمگا اٹھا۔ اب انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے خوف ہے کہ لوگ اس نور کو میری بدہیئی پر محمول کرنے لگیں گے اس کے بعد وہ نور اس جگہ سے ان کی کوڑی پر منتقل ہو گیا۔ اندھیری رات میں ان کے سینہ کا یہ حصہ اس طرح جگمگاتا جیسے ان کے سینہ پر مشعل روشن ہو، حضرت طفیلؓ اپنے قبیلہ میں پہنچ کر اسلام کی دعوت و تبلیغ کے کام میں منہمک ہو گئے، ان کے باپ تو ان کی تبلیغ کے نتیجہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے لیکن ان کی ماں کو ایمان کی ہدایت نصیب نہیں ہوئی۔

عربوں سے محبّت کرنے کی وجوہ

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلٰثٍ لِاَنِّيْ عَرَبِيٌّ وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "تین اسباب کی بناء پر تمہیں عرب سے محبت رکھنی چاہئے ایک تو اس وجہ سے کہ میں عرب میں سے ہوں (اور ظاہر ہے کہ جو چیز حبیب کی طرف سے منسوب ہوتی ہے اس کو محبوب ہونا چاہئے) دوسرے اس وجہ سے کہ قرآن عربی زبان میں ہے۔ (یعنی قرآن کریم اس زبان میں اترا ہے جو عرب کی زبان ہے اور ان کی زبان و لغت ہی کے ذریعہ اس کی فصاحت و بلاغت جانی جاتی ہے) اور تیسرے اس وجہ سے کہ جنتیوں کی زبان عربی ہے۔ (اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے)۔"

تشریح: "جنتیوں کی زبان عربی ہے" سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ دوزخیوں کی زبان عربی نہیں ہوگی، بہرحال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ عرب اور اہل عرب کو دنیا اور آخرت دونوں جگہ فضیلت و برتری حاصل ہے نیز اس حدیث میں محبت کرنے کے صرف وہ تین اسباب بیان کئے گئے ہیں جو اس بارے میں نہایت اعلیٰ ہیں، ورنہ ان کے علاوہ اور بھی اسباب و وجوہ ہیں جن کے بناء پر عرب اور اہل عرب سے محبت کرنا یا محبت ہونا لازمی چیز ہے مثلاً یہ کہ اہل عرب ہی نے شارع علیہ السلام سے براہ راست دین و شریعت کا علم حاصل کیا اور پھر اس علم کو ہم تک پہنچایا انہوں نے آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال، عادات، اور معجزات کو منضبط و محفوظ کیا اور اس سرمایہ کو ہم تک منتقل کیا، عرب اور اہل عرب دراصل اسلام کے مددگار اور ہماری ملی زندگی کی جوہری توانائی ہیں انہوں نے اسلام کی خاطر دنیا بھر سے لوہا لیا، بڑی بڑی طاقتوں سے جنگیں کیں، جان و مال کی قربانیاں دے کر بڑے بڑے علاقے فتح کئے، شہر شہر، قریہ قریہ، اسلام پھیلایا، اطراف عالم میں دین کا جھنڈا بلند کیا، اور مسلمانوں کو جو عزت، برتری اور شان و شوکت حاصل ہوئی، وہ انہی کی جدوجہد اور کوششوں کا نتیجہ ہے، ہماری ملی تاریخ کی تمام تر عظمت و سربلندی انہی کی مرہون منت ہے، اہل عرب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں، ان کی نسلی و انسانی خصوصیات اور خوبیوں کے امین ہیں اور نہ صرف یہ کہ ان کی زبان اہل جنت کی زبان ہوگی، بلکہ قبر میں منکر نکیر کا سوال بھی انہی کی زبان

میں ہو گا، اور انہی اسباب کی بناء پر کہا گیا ہے۔

مَنْ اَسْلَمَ فَهُوَ عَرَبِیٌّ۔

"جو بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوا وہ عربی ہے۔"

بَابُ مَنَاقِبِ الصَّحَابَةِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَجْمَعِیْنَ

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے مناقب کا بیان

"مناقب" اصل میں "منقبت" کی جمع ہے۔ منقبت کے معنی ہیں فضیلت اور فضیلت اس اچھی خصلت وخصوصیت (تعریف کے کام) کو کہتے ہیں جس کے سبب اللہ کے نزدیک یا مخلوق کی نظروں میں شرف و عزت اور بلند قدری حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اصل اعتبار اسی شرف و عزت اور بلند قدری کا ہے جو اللہ کے نزدیک حاصل ہو، مخلوق کی نظر میں حاصل ہونے والی عزت و شرف اور بلند قدری کا کوئی اعتبار نہیں، ہاں اگر یہ عزت و شرف اور بلند قدری اللہ کے نزدیک بلند قدر بنانے کا وسیلہ ذریعہ بنتی ہو تو اس صورت میں اس کا بھی اعتبار ہو گا، پس جب یہ کہا جائے گا کہ فلاں شخص بافضیلت اور بلند قدر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے فکر و عقیدہ اعمال و کردار اور اخلاص و اخلاق کی بناء پر اللہ کے نزدیک بلند قدر ہے، نیز یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ فضیلت و بلند قدری کی طرف نسبت اسی صورت میں معتبر ہے جب کہ وہ آنحضرت ﷺ سے منقول ہو، یعنی کسی بھی شخص کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ وہ ذی منزلت و بلند قدر ہے کوئی معنی نہیں رکھتا، اسی شخص کو افضل اور بلند قدر کہنا معتبر ہو گا جس کی فضیلت و بلند قدری کے بارے میں سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی سلسلہ در سلسلہ نقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہو۔

صحابی کس کو کہتے ہیں؟: "صحابی" اس مسلمان کو کہتے ہیں جس نے بہ حالت بیداری اپنی آنکھوں سے سرکار دو عالم ﷺ کو دیکھا یا آپ ﷺ کی صحبت میں رہا ہو اور ایمان ہی کی حالت میں یعنی دین و اسلام پر اس کا خاتمہ ہوا ہو اگرچہ اس درمیان میں ارتداد بھی خلل انداز ہوا ہو جیسے اشعث یا اشعث ابن قیسؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے اور بعض حضرات نے صحابی ہونے کے لئے طول صحبت کو شرط قرار دیا ہے، یعنی ان کے نزدیک "صحابی" اسی مسلمان کو کہا جا سکتا ہے جو آنحضرت ﷺ کی صحبت میں کافی عرصہ تک رہا ہو، اس نے آنحضرت ﷺ سے اکتساب علم کیا ہو، اور آپ ﷺ کے ساتھ غزوات میں شامل ہوا ہو۔ ان حضرات نے "طول صحبت" یا "کافی عرصہ" کی کم سے کم مدت چھ مہینہ بیان کی ہے، لیکن اس چھ مہینہ کے تعین کی دلیل ان کے پاس کیا ہے، یہ معلوم نہیں، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس نے زیادہ سے زیادہ عرصہ آنحضرت ﷺ کی خدمت و صحبت میں گزارا اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوا اس کا مرتبہ ان لوگوں کی بہ نسبت یقیناً سوا ہے جنہیں زیادہ عرصہ کی خدمت و صحبت کا موقع نہیں ملا، جو آپ ﷺ کے ساتھ کسی جہاد میں شریک نہیں ہوئے، جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو محض ایک دور کی نظر سے دیکھا، آنحضرت ﷺ سے کلام و گفتگو کی سعادت سے، بہت کم سرفراز ہوئے یا جنہوں نے صرف اپنی طفولیت کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو دیکھا، اگرچہ مجرد شرف صحبت سب کو حاصل ہے۔

"صحابی" کو جاننے کا ذریعہ: جو بھی "صحابی" ہے اس کا صحابی ہونا تواتر کے ذریعہ جانا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا صحابی ہونا تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ یا خبر مشہور کے ذریعہ جانا جاتا ہے، یا کوئی صحابی اپنے غیر کے بارے میں بیان کرے کہ وہ صحابی ہے، یا خود صحابی اپنے بارے میں کہے کہ میں صحابی ہوں بشرطیکہ وہ روایت کے سلسلۂ معیار پر پورا اترتا ہو اور "عادل" ہو، ویسے یہ بات ملحوظ رہے کہ کتاب و سنّت اور اجماع معتبر سے واضح طور پر ثابت ہے کہ تمام صحابہ "عدول" ہیں۔

افضلیت صحابہؓ: شرح السنۃ میں ابو منصور بغدادیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ہمارے تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحابہ میں

سب سے افضل خلفاء اربعہ ہیں اور ان میں بھی ترتیب خلافت کا اعتبار ہے، یعنی سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہیں، ان کے بعد حضرت عمر فاروق ؓ، ان کے بعد حضرت عثمان غنی ؓ، اور ان کے بعد حضرت علی ؓ۔ خلفاء اربعہ کے بعد پھر سب سے افضل وہ تمام صحابہ ہیں جن کو "عشرہ مبشرہ" کہا جاتا ہے۔ ان کے بعد سب سے افضل وہ صحابہ ہیں جو جنگ بدر میں شریک تھے، ان کے بعد سب سے افضل وہ صحابہ ہیں جو جنگ احد میں شریک تھے، ان کے بعد بیعت رضوان میں شریک صحابہ، ان کے بعد وہ انصار صحابہ ؓ جنہوں نے دونوں مرتبہ بیعۃ العقبۃ الاولی اور بیعۃ العقبۃ الثانیہ کے موقع پر مکہ میں آکر آنحضرت ﷺ سے بیعت کی تھی۔ اسی طرح وہ صحابہ ؓ جن کو "سابقون اولون" کہا جاتا ہے یعنی جنہوں نے قبول اسلام میں سبقت کی اور ابتداء اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے تھے اور جن کو دونوں قبلوں یعنی بیت المقدس اور کعبہ مکرمہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا موقع ملا ان صحابہ ؓ سے افضل ہیں جو ان کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

حضرت عائشہ ؓ اور حضرت خدیجہ ؓ کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ کون دوسری سے افضل ہے، اسی طرح حضرت عائشہ ؓ اور حضرت فاطمہ کے بارے میں بھی اختلافی اقوال ہیں واضح رہے کہ حضرت معاویہ ؓ عدول اہل فضل اور خیار صحابہ میں سے ہیں، ان کے بارے میں کوئی بھی برا خیال رکھنا یا ان کی شان میں کوئی بھی ایسی بات کہنا جو مرتبہ صحابیت کے منافی ہو، اسی طرح ممنوع ہے جس طرح دوسرے صحابہ کے بارے میں۔ رہی یہ بات کہ بعض صحابہ ؓ کے درمیان جو باہمی نزع ہوا، یا باہمی جنگ وجدل کے نوبت آئی، تو اس پر بحث و تمحیص کرنا اور اس سے کوئی نتیجہ نکال کر کسی کی تنقیص کرنا ہمارا مقام نہیں ہے، وہ سارے معاملات ان کے اپنے اجتہاد سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی صحابی ایسا نہیں تھا جس نے ان معاملات میں نفسانی تقاضوں یا دنیاوی اغراض کے تحت شرکت کی ہو، وہ سب صحابہ اپنے اپنے موقف کے درست اور جائز ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے اور اپنی باہمی لڑائیوں اور تنازعات کی بنا پر ان میں سے کوئی عدول کے زمرہ سے خارج نہیں ہوگا اور نہ اس کی حیثیت اور اس کے مرتبہ میں کوئی نقص آیا، مختصر یہ کہ اہل سنّت وجماعت کا مسلک یہ ہے کہ ان کے بارے میں زبان کھولتے وقت محتاط رہا جائے، ان کے حق میں منہ سے وہی بات نکالی جائے جو تعریف اور بھلائی کی ہو، اگر ان میں سے کسی کے متعلق کوئی ایسی چیز منقول ہو جو بظاہر تعریف کے کام کے خلاف نظر آتی ہو تو اس سے صرف نظر کیا جائے۔ دین و ایمان کی سلامتی اسی میں ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

صحابہ ؓ کو برا نہ کہو

① عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ فَلَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَھَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِھِمْ وَلَا نَصِیْفَہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدری ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میرے صحابہ کو برا نہ کہو، حقیقت یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص احد کے پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو اس کا ثواب میرے صحابہ کے ایک مد یا آدھے مد کے ثواب کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: "تم" کے مخاطب خود صحابہ میں کے بعض حضرات تھے، جیسا کہ ایک روایت میں اس ارشاد گرامی کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت خالد ابن ولید ؓ اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف ؓ کے درمیان کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور حضرت خالد ابن ولید ؓ نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف ؓ کو برا کہا، اس وقت آپ ﷺ نے حضرت خالد ابن ولید ؓ وغیرہ کو خطاب کر کے فرمایا میرے صحابہ ؓ کو برا نہ کہو پس "میرے صحابہ" سے وہ مخصوص صحابہ مراد ہیں جو ان مخاطب صحابہ یعنی حضرت خالد ابن ولید ؓ وغیرہ سے پہلے اسلام لائے تھے اور

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس حدیث میں "تم" کے ذریعہ پوری اُمت کو مخاطب کیا گیا ہو اور چونکہ نور نبوت نے پہلے ہی یہ دیکھ لیا تھا کہ آگے چل کر میری اُمت میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے، جو میرے صحابہ کو برا بھلا کہیں گے، ان کی شان میں گستاخیاں کریں گے (جیسا کہ روافض و خوارج کی صورت میں مختلف گروہ ایک دوسرے کے ممدوح صحابہ کے حق میں سب وشتم کرتے ہیں) اس لئے آپ ﷺ نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں احترام صحابہؓ کے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے حکم دیا کہ کوئی شخص میرے کسی صحابی کو برا نہ کہے۔

مد اس زمانہ کے ایک پیمانہ کا نام تھا جس میں سیر بھر کے قریب جو وغیرہ آتا تھا، حدیث کے اس جزء کی مراد ان صحابہؓ کے بلند و بالا مقام و مرتبہ کا تعین کرنا ہے کہ ان لوگوں کے کمال اخلاص وللّٰہیت کی بناء پر ان کا چھوٹا سا نیک عمل اپنے بعد والوں کے اسی طرح کے بڑے سے بڑے نیک عمل پر بھاری ہے۔ مثلاً اگر ان صحابہ میں سے کوئی شخص سیر بھر یا آدھ سیر جو وغیرہ خدا کی راہ میں خرچ کرے تو اس عمل پر ان کو جتنا ثواب ملتا ہے اتنا ثواب ان کے بعد والوں کو اس صورت میں بھی نہیں مل سکتا کہ اگر وہ اللہ کے راہ میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دیں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اخلاص و صدق نیت اور جذبۂ ایثار وللّٰہیت کا جو کمال ان کے اندر تھا وہ بعد والوں کو نصیب نہیں ہوسکتا دوسرے یہ کہ ان کا مال خالص طیب و پاکیزہ ہوتا تھا، اور ان کی اپنی حاجتیں وضرورتیں اس بات کا تقاضا کرتی تھیں کہ ان کے پاس جو کچھ ہے اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کریں لیکن اس کے باوجود اپنی استطاعت کے مطابق وہ اللہ کی راہ میں خوش دلی کے ساتھ خرچ کرتے اور اپنی تمام ضرورتوں کو پس پشت ڈال دیتے، یہ تو ان کے راہ خدا میں خرچ کرنے کے اجر و ثواب کا ذکر ہے۔ اسی پر قیاس کر کے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ انہوں نے انتہائی سخت حالات میں اللہ کے دین کا جھنڈا بلند کرنے اور اللہ کے رسول کا پیغام پہنچانے کے لئے ریاضت و مجاہدہ کے جن سخت ترین مراحل کو طے کیا۔ یہاں تک کہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اس کی بناء پر ان کو کیا اجر و ثواب ملا ہوگا اور ان کے درجات و مراتب کس قدر بلند ہوئے ہوں گے۔ حدیث کے پہلے جزء سے اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد گرامی "میرے صحابہ کو برا نہ کہو" مخصوص اصحاب کے حق میں ہے لیکن اس سے یہ بات بہر حال ثابت ہوتی ہے، کہ کسی غیر صحابی کا صحابی کو برا کہنا بطریق اولی ممنوع ہے۔ کیونکہ حدیث کا اصل مقصد ان لوگوں کے حق میں بدگوئی اور بدزبانی سے اجتناب کی تلقین وہدایت کرنا ہے۔ جن کو قبول اسلام میں سبقت کی فضیلت و برتری حاصل ہے اور جو اپنی اس فضیلت و برتری کی بناء پر بعد والوں کے لئے یقیناً واجب التعظیم ہیں۔ علی ابن حرب طائیؒ اور خثیمہ ابن سلیمانؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ:

لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابَ مُحَمَّدٍ فَلَمُقَامُ اَحَدِهِمْ سَاعَةً خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِ اَحَدِكُمْ عُمُرَهٗ۔

"اصحاب محمد ﷺ کو برا نہ کہو، درحقیقت ان کو (اپنی عبادتوں کا) یہ مقام حاصل ہے۔ کہ ان کا ساعت بھر کا نیک عمل تمہارے پوری عمر کے نیک عمل سے بہتر ہے۔"

اور عقیلیؒ نے ضعفا میں نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اخْتَارَلِیْ وَاخْتَارَ لِیْ اَصْحَابًا وَّ اَنْصَارًا وَّ اَصْحَارًا وَّسَیَاتِیْ قَوْمٌ یَسُبُّوْنَهُمْ وَلَیَسْتَنْقِصُوْنَهُمْ فَلَا تُجَالِسُوْهُمْ وَلَا تُشَارِبُوْهُمْ وَلَا تُوَاكِلُوْهُمْ وَلَا تُنَاكِحُوْهُمْ۔

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے منتخب کیا اور میرے لئے میرے اصحاب، میرے انصار اور میرے قرابتدار تجویز و مقرر کئے گئے۔ اور (یاد رکھو، عنقریب کچھ لوگ پیدا ہوں گے جو میرے صحابہ کو برا کہیں گے اور ان میں نقص نکالیں گے، پس تم نہ ان لوگوں کے ساتھ میل ملاپ اختیار کرنا نہ ان کے ساتھ کھانا پینا اور نہ ان کے ساتھ شادی بیاہ کرنا۔"

صحابہ کو برا بھلا کہنے والے کے بارہ میں شرعی حکم: شرح مسلم میں لکھا ہے، جاننا چاہئے کہ صحابہؓ کو برا کہنا جرم ہے اور اکبر فواحش (سخت بڑے گناہوں) میں سے ہے، ہمارا اور جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ جو کوئی صحابہؓ کو برا کہے اس کو سزا دی جائے اور بعض مالکیہ نے

کہا ہے کہ اس کو قتل کیا جائے، اسی طرح کی بات طیبیؒ نے بھی لکھی ہے اور قاضی عیاضؒ نے کہا ہے کہ صحابہؓ میں سے کسی کو بھی برا کہنا گناہ کبیرہ ہے اور ہمارے بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ جو شخص شیخین (یعنی ابوبکرؓ و عمرؓ) کو برا کہے وہ مستوجب قتل ہے۔ مشہور کتاب الاشباہ و النظائر کی کتاب السیر میں لکھا ہے جو بھی کافر اپنے کفر سے توبہ کر لے اس کے لئے دنیا و آخرت کے لئے معافی ہے۔ لیکن جو لوگ اس بناء پر کافر قرار پائے ہوں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو برا کہا تھا، یا شیخین کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو برا کہا تھا، یا سحر کاری کے مرتکب ہوئے تھے اور یا زندقہ میں مبتلا تھے، اور پھر توبہ کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کر لیا گیا ہو تو اب اگر وہ توبہ کریں تو ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور ان کو معافی نہیں ملے گی اسی طرح صاحب اشباہ علامہ زین ابن نجیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ، شیخین کو برا کہنا یا ان کو لعنت کرنا کفر ہے، اور جو شخص حضرت علیؓ کو شیخین پر فضیلت دے وہ مبتدع ہے۔ اور مناقب کردری میں لکھا ہے اگر وہ شخص (جو شیخینؓ پر حضرت علیؓ کی فضیلت کا قائل ہے) اور دونوں یعنی شیخین کی خلافت کا منکر بھی ہو تو اس کو کافر کہا جائے گا اسی طرح اگر وہ ان دونوں سے دلی بغض و عناد رکھے تو بھی اس کو کافر کہا جائے گا۔ بایں سبب کہ اس نے ان ہستیوں سے قلبی بغض و عناد رکھا جن سے آنحضرت ﷺ کو قلبی محبت تھی، ہاں اگر (یہ صورت ہو کہ) کوئی شخص (نہ تو شیخینؓ پر حضرت علیؓ کی فضیلت کا قائل ہے، نہ شیخین کی خلافت کا منکر ہے، نہ ان دونوں سے بغض و عناد رکھتا ہے اور نہ ان کو برا کہتا ہے مگر شیخین کی بہ نسبت حضرت علیؓ کے تئیں زیادہ پسندیدگی و گرویدگی اور محبت رکھتا ہے۔ تو وہ محض اس بناء پر ماخوذ نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں ان دونوں یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی تخصیص کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان دونوں کی فضیلت میں آنحضرت ﷺ کی احادیث جس مخصوص طور سے منقول ہیں اس طرح سے کسی اور صحابی کے بارے میں منقول نہیں ہیں جیسا کہ آگے آنے والے ایک علیحدہ باب میں منقول احادیث سے واضح ہوگا، یا وجہ تخصیص یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی خلافت پر مسلمانوں کا مکمل اجماع تھا، ان کی قیادت و سربراہی کو کسی طرف سے بھی چیلنج نہیں کیا گیا، ان کے برخلاف حضرت عثمانؓ ہوں یا حضرت علیؓ اور یا حضرت معاویہؓ وغیرہ دوسرے خلفاء ان کی خلافت پر اس درجہ کا اجماع نہیں تھا، بلکہ ان میں سے ہر ایک کے زمانے میں بغاوت و خروج کا عمل ظاہر ہوا۔

خلافت ابوبکرؓ کا انکار کرنے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں: حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ فرقہ امامیہ کے لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے منکر ہیں اور فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جو شخص خلافت صدیقؓ کا انکار کرے۔ وہ اجماع قطعی کا منکر قرار پاتا ہے اور اجماع قطعی کا منکر کافر ہو جاتا ہے، چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے۔

الرافضی إذا كانَ يسب الشيخين ويلعنها العياذ بالله فهو كافر وان كانَ يفضل عليا كرم الله تعالٰى وجهه على ابى بكر لا يكون كافرا لكنه مبتدع ولو قذف عائشةؓ كفر بالله۔

"اور رافضی اگر شیخین کو برا کہے اور العیاذ باللہ ان کو لعنت کرے تو وہ کافر ہے۔ اور اگر حضرت ابوبکرؓ پر حضرت علیؓ کو فضیلت دے تو کافر نہیں ہوتا البتہ مبتدع قرار پاتا ہے، نیز اگر وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی پاکدامنی کو تہمت لگائے تو اللہ (نے حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی کی جو تصدیق قرآن میں کی ہے اس) کا منکر ہوگا۔"

-اور فتاوی عالمگیری ہی میں یوں ہے:

من انكر امامة ابى بكر الصديق فهو كافر على قول بعضهم وقال بعضهم هو مبتدع وليس بكافر والصحيح انه كافر كذلك من انكر خلافة عمر فى اصح الاقوال ويجب اكفار الروافض فى قولهم برجعة الاموات الى الدنيا وتناسخ الارواح۔

"جس شخص نے ابوبکرؓ کی امامت کبریٰ کا انکار کیا وہ بعض حضرات کے قول کے مطابق کافر ہے، جب کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہ مبتدع

قرار پائے گا اس کو کافر نہیں کہیں گے لیکن صحیح بات یہی ہے کہ وہ کافر ہے، اسی طرح قول صحیح کے مطابق وہ شخص بھی کافر ہو جائے جو حضرت عمرؓ کی خلافت کا انکار کرے گا، نیز رافضیوں کو اس بناء پر کافر قرار دینا واجب ہے کہ وہ مردوں کے دنیا میں لوٹنے اور تناسخ ارواح کے قائل ہیں۔"

دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے دلائل: سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرقہ امامیہ کے لوگ (یا روافض و اہل تشیع) اگر صحابہ بالخصوص شیخینؓ کو برا کہتے ہیں یا ان کی خلافت کے منکر ہیں تو اس کی وجہ سے ان کو کس دلیل سے کافر قرار دیا جاتا ہے؟ تو جاننا چاہئے کہ ان کے کفر کی ایک نہیں متعدد مضبوط دلائل و براہین ہیں، پہلی بات یہ کہ صحابہ کرام اور اصل حاملان وحی، راویان قرآن اور ناقلان دین و شریعت ہیں، جو شخص ان صحابہؓ کی حقانیت و صداقت کا منکر ہو گا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ قرآن وغیرہ ایمانیات متواترات کے ساتھ اس کا ایمانی تعلق قائم ہو اور جب قرآن وغیرہ سے اس کا ایمانی تعلق قائم نہیں ہو گا تو اس کو مؤمن کون نادان کہے گا۔ دوسرے یہ کہ ان صحابہ کی حقانیت، صداقت اور فضیلت کا شاہد خود قرآن کریم ہے، نص قرآن کا منکر مؤمن ہرگز نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ وہ احادیث جن میں حضرت علیؓ کے علاوہ تینوں خلفاء راشد کے فضائل و مناقب بھی منقول ہیں، ان کی تعداد ان گنت ہے، نیز وہ حدیثیں تعدد طرق اور کثرت رواۃ کے سبب متواتر بالمعنی قرار پائی ہیں۔ پس ان احادیث و روایات کے مفہوم و معنی اور مدلول و مضمون کا انکار کفر کے زمرہ میں آتا ہے، اور یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اس درجہ کی احادیث کے استناد و اعتبار سے ائمہ مجتہدین میں سے کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ جو ائمہ مجتہدین میں نہایت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، "خبر واحد" کو بھی قیاس پر ترجیح دیتے ہیں یہاں تک کہ اقوال صحابہؓ کو بھی، چہ جائیکہ متواتر بالمعنی کی حیثیت رکھنے والی احادیث۔

آیئے سب سے پہلے قرآن کریم کو دیکھیں کہ اللہ کے کلام سے ہمیں صحابہؓ کے بارے میں اور صحابہؓ یا کسی صحابی رسول کو برا کہنے اور لعنت کرنے والوں کے بارہ میں کیا رہنمائی ملتی ہے:

❶ اللہ تعالیٰ نے صحابہ سے اپنا راضی ہونا اور خوش ہونا بیان فرمایا ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ۔

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے راضی و خوش ہوا جب کہ یہ لوگ آپ ﷺ سے درخت (سمرہ) کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔"

ایک اور موقع پر یوں فرمایا گیا:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔

"اور جو مہاجرین و انصار (ایمان لانے میں سب سے) سابق اور مقدم ہیں اور (بقیہ اُمت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی و خوش ہوا۔"

پس اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں جن لوگوں کی تعریف کرے، جن سے اپنی رضامندی و خوشنودی ظاہر کرے اور جن کے بلند و بالا مقام و مرتبہ کو واضح فرمائے ان پر یہ لوگ (روافض و شیعہ) لعنت کریں بلکہ ان کو غاصب اور کافر جانیں، تو ان دونوں باتوں میں بالکل تضاد ہے لہٰذا یہ لوگ ان صحابہ کو برا کہہ کر اور ان کو لعنت کر کے چونکہ قرآن کی مخالفت کرتے ہیں اور قرآن کی مخالفت کرنے والا کافر ہوتا ہے اس لئے ان کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا۔

❷ خلفاء راشدین کی خلافت قرآن کریم سے ثابت ہے، بایں طور کہ ارشاد فرمایا گیا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ۔

"(اے اہل ایمان، تم میں جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو روئے زمین پر اقتدار و حکومت

عطافرمائے گا۔"

مستند و معتبر مفسرین نے وضاحت فرمائی ہے۔ کہ آیت خلفاء راشدین کی خلافت کے مبنی پر صداقت و صحت ہونے کی واضح دلیل ہے کہ آیت میں مذکورہ وعدہ کے مطابق جن لوگوں کو روئے زمین پر حکومت و اقتدار نصیب ہوا اور جو اس آیت کے مطابق ایمان و عمل صالح کے حامل تھے۔ وہ یہی خلفائے راشدین ہیں۔ پس جو لوگ ان کی خلافت کو صحیح اور برحق نہ مانیں وہ قرآن کریم کی تردید و تغلیط کرنے کے سبب دائرہ ایمان سے خارج قرار پائیں گے۔ کیونکہ اسی آیت میں آگے چل کر یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ مَنْ كَفَرَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ یعنی: جنہوں نے کفر کیا (کہ اللہ کے اس وعدہ کو یا وعدہ کے ظہور کو برحق نہ جانا) تو وہ فاسق ہیں" اور چونکہ قرآن کی اصطلاح میں "فاسق" سے مراد "فاسق کامل" ہوتا ہے اور "فاسق کامل" کافر کو کہتے ہیں اس لئے "وہ فاسق ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ وہ کافر ہیں۔ اس بات کی دلیل کہ قرآن کی اصطلاح میں "فاسق" سے مراد "فاسق کامل" ہوتا ہے، یہ آیت ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۔

"اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ بالکل فاسق (یعنی کافر) ہیں۔"

۳ قرآن کریم نے صحابہؓ کو صادق یعنی سچا کہا ہے، جیسا کہ آیت میں مذکور ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝۔

"اور ان حاجت مند مہاجرین کا (بالخصوص) حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے (جبرًا و ظلمًا) جدا کر دیئے گئے، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل (یعنی جنت) اور رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں اور یہی لوگ سچے ہیں۔"

تمام صحابہؓ حضرت صدیق اکبرؓ کو "یا خلیفۃ اللہ" کہہ کر مخاطب کرتے تھے لیکن شیعہ ان کو کاذب یعنی جھوٹا کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صادق اور کاذب کے درمیان صریح فرق ہے، پس جو شخص ان کو کاذب کہتا ہے وہ دراصل قرآن کریم کی تردید اور مخالفت کرتا ہے اور یہ کفر نہیں تو اور کیا ہے۔

۴ صحابہ کرامؓ "فلاح یاب" ہیں اور ان کا "فلاح یاب" ہونا نص قرآن سے ثابت ہے کہ ان کے حق میں ——— اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اور یہی لوگ فلاح یاب ہیں) فرمایا گیا ہے، پس جو لوگ اس نص قرآن کے خلاف ان کو یہ کہیں کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (یہی لوگ بے فلاح و ناکام ہیں) تو ان مخالفین قرآن کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا۔

۵ اللہ تعالیٰ نے کثرت سے اپنے کلام شریف میں ان صحابہؓ کی خوبیاں بیان فرمائی ہیں اور جا بجا تعریف و توصیف کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، مثلاً ایک موقع پر ارشاد ہوا:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۝۔

"محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ آپ ﷺ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز اور آپس میں مہربان ہیں، اے مخاطب تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں، یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں۔ اور انجیل میں ان کا یہ وصف ہے کہ جیسے کھیتی اس نے اپنی

سوئی نکالی پھر اس نے اس کو قوی کیا پھر وہ اور موٹی ہوئی پھر اپنے سے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی۔ تاکہ ان سے کافروں کو غصہ دلائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان صحابہ سے کہ جو ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔"

پس ان لوگوں کے بارے میں کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے جو قرآن کریم کی اتنی زبردست شہادت کے باوجود صحابہ رسول کو برا کہیں اور ان کو ملعون قرار دیں۔ نیز اس آیت میں صحابہ کا یہ جو وصف بیان کیا گیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلہ میں تو تیز و سخت ہیں لیکن آپس میں نرم و مہربان ہیں، تو اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپس میں بے الفت و بے مہر اور ایک دوسرے سے دشمنی رکھنے والا جانے (جیسا کہ شیعوں کا کہنا ہے) تو وہ قرآن کا منکر ہے۔ اسی طرح جو شخص صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض و حسد رکھے اور ان کے تئیں غیظ و غضب میں مبتلا ہو تو خود اس پر کفر کا اطلاق مذکور ہے۔ کیونکہ لیغیظ بھم الکفار (تاکہ ان سے کافروں کو غصہ دلائے) کا واضح مطلب یہی ہے۔ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے تئیں غیظ و غضب کا اظہار اور ان سے غصہ کرنا کافروں کا کام ہے۔ اس آیت سے ان لوگوں کی بھی تردید و تغلیط ہو جاتی ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں گو اچھے عقائد و اعمال کے حامل تھے لیکن آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد بددین ہوگئے تھے، ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ انہی کے لئے ہوتا ہے جو مرتے دم تک ایمان اور عمل صالح پر قائم رہیں، ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں اس وعدے کا نازل ہونا خود اس بات کی علامت تھا کہ (ان کو دم آخر تک ایمان اور عمل صالح کی توفیق حاصل رہے گی اب اگر کوئی شخص ان کے بارے میں ایسی بے تکی بات کہتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ نص قرآن کے خلاف بات کہتا ہے۔ بلکہ العیاذ باللہ، حق تعالیٰ کی طرف جہل اور لاعلمی کی نسبت بھی کرتا ہے۔

❻ جس ہستی نے مخلفین اعراب (پیچھے رہ جانے والے دیہاتیوں) کو جہاد کے لئے بلایا وہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اس بات پر نہ صرف یہ کہ تمام اہل سنّت کا اتفاق ہے بلکہ خود شیعوں کو بھی انکار و اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ مخلفین اعراب کے سلسلہ میں قرآن کریم نے جو یہ فرمایا تھا:

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔

"آپ ﷺ ان پیچھے رہ جانے والے دیہاتیوں سے کہہ دیجئے کہ عنقریب تم لوگ ایسے لوگوں (سے لڑنے) کی طرف بلائے جاؤ گے، جو سخت لڑنے والے ہوں گے کہ یا تو ان سے لڑتے رہو یا وہ مسلمان ہو جائیں سو اگر تم اطاعت کرو گے تو تم کو اللہ تعالیٰ نیک عوض (یعنی جنت) دے گا اور اگر تم روگردانی کرو گے جیسا کہ اس کے قبل روگردانی کر چکے ہو تو دردناک عذاب کی سزا دے گا۔"

تو اس آیت میں مذکور پیشین گوئی کے مطابق ان مخلفین اعراب کو دشمنان اسلام کے مقابلہ پر لڑنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں بلایا بایں اعتبار اس آیت سے نہ صرف یہ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ، ابن قتیبہ رحمہ اللہ، شیخ ابوالحسن رحمہ اللہ اور امام ابوالعباس وغیرہم نے وضاحت کی ہے بلکہ یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے جیسا کہ جہاد کے لئے ان کے بلاوے سے روگردانی کرنے والا عذاب الیم کا مستوجب ہوگا، پس جس ہستی کے بارے میں قرآن کریم سے اتنی بڑی بات ثابت ہوتی ہو اس پر لعنت کرنے والوں اور اس کو کافر کہنے والوں کو اپنے حشر سے ڈرنا چاہئے۔

❼ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا جنتی ہونا نصوص قطعیہ سے ثابت ہے، جیسا کہ ایک موقع پر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔

"تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کر چکے اور لڑ چکے برابر نہیں، وہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد میں خرچ کیا اور لڑے اور (ویسے تو) اللہ تعالیٰ نے بھلائی (یعنی جنت) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے۔"

پس ان صحابہ کے جنتی ہونے کا انکار نصوص کے انکار کو مستلزم ہے اور یہ کفر ہے۔

❽ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان میں قرآن کریم میں یوں فرمایا ہے:

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔

"(مکہ سے مدینہ کو ہجرت کے موقع پر) دو آدمیوں میں ایک آپ ﷺ تھے جس وقت کہ دونوں (ثور) غار میں تھے جب کہ آپ ﷺ اپنے ساتھیوں سے فرما رہے تھے تم غم نہ کرو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں جس ہستی کا ذکر اپنے رسول ﷺ کے ساتھی اور جاں نثار کی حیثیت سے کرے، اس کو برا کہنے والوں کا انجام کیا ہو گا اس کا اندازہ خود لگا لینا چاہئے۔

❾ قرآن کریم کی اس آیت:

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ۔

"اور جو لوگ تم میں (دینی) بزرگی والے اور (دنیاوی) وسعت والے ہیں۔"

میں جس ہستی کی طرف اشارہ مقصود ہے وہ حضرت ابوبکرؓ کی ذات ہے جیسا کہ محقق مفسرین اور علماء اسلام نے وضاحت کی ہے، پس ان کے "فضل" کا انکار کرنا قرآن کریم کا صریح رد کرنا ہے۔

❿ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی ۝ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی وَلَسَوْفَ یَرْضٰی۔

"اور اس (دوزخ) سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہے، جو اپنا مال (محض) اس غرض سے دیتا ہے کہ (گناہوں سے) پاک ہو جائے اور بجز اپنے عالیشان پروردگار کی رضاجوئی کے اس کے ذمہ کسی کا احسان نہ تھا کہ اس کا بدلہ اتارنا مقصود ہوتا اور یہ شخص عنقریب خوش ہو جائے گا (یعنی آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ملیں گی)۔"

یہ آیتیں بھی حضرت ابوبکرؓ کی شان میں ہیں، حضرت علیؓ کی شان میں نہیں ہو سکتیں، چنانچہ ماہرین تفسیرین نے اسی حقیقت کے پیش نظر ان آیتوں کا محمول و مدلول حضرت ابوبکرؓ کو قرار دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ آیتوں کا شان نزول حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے محض اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے بڑی مقدار میں اپنا مال خرچ کر کے حضرت بلالؓ وغیرہ کو کافروں سے خریدا اور آزاد کر دیا پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ "بڑا پرہیزگار" بتائے وہ رحمت و رضوان کا مستحق ہو گا یا لعنت و خذلان کا مستوجب؟

اب صحیح احادیث کو دیکھنا چاہئے کہ ان سے کیا ثابت ہوتا ہے، روافض کا کفر یا ایمان؟ واضح رہے کہ یہاں چند ہی احادیث پر اکتفا کیا جائے گا جب کہ اس سلسلہ میں بے شمار حدیثیں منقول ہیں:

عَنْ عویمر ابن ساعدۃ اِنَّهٗ صلی اللّٰه علیه وسلم قَالَ ان اللّٰه اختارلی واختار لی اصحابا فجعل لی منهم وزراء وانصارا واصهارا فمن سبهم فعلیه لعنة اللّٰه والملئکة والناس اجمعین وَلَا یقبل اللّٰه مِنْهُ صرفا وَلَا عدلا۔

(محاملی، طبرانی، حاکم)

"عویمر ابن ساعدہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے مجھے منتخب فرمایا اور میرے لئے رفقاء اور ساتھی بھی منتخب فرمائے اور پھر ان رفقاء میں سے کچھ کو میرا وزیر، کچھ کو میرا مددگار اور کچھ کو میرا رشتہ دار بنایا، پس جس شخص نے ان کو برا کہا اس پر اللہ کی لعنت، فرشتوں کی لعنت اور تمام لوگوں کی لعنت، اللہ تعالیٰ نہ تو اس کی توبہ قبول کرے گا اور نہ اس کا فدیہ یا یہ کہ نہ نفل اس کا مقبول ہوگا نہ فرض۔"

عَنْ علی عن النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ سیاتی من بعدی قوم یُّقَال لھم الرفضۃ فَاِنْ ادرکتھم فاقتلھم فانھم مشرکون قَالَ قُلْتُ یارسول اللّٰہ ما العلامۃ فیھم قَالَ یفوطونک بمالیس فیک ویطعنون علی السلف دار قطنی۔

"حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: عنقریب میرے بعد ایک گروہ پیدا ہوگا جن کو "رافضی" کہا جائے گا پس اگر تم ان کو پاؤ تو ان کو قتل کرنا کیونکہ وہ مشرک ہوں گے۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ان کی پہچان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "وہ لوگ تمہیں ان چیزوں کے ذریعہ نہایت اونچا دکھائیں گے جو تم میں نہیں ہوں گی اور صحابہ پر لعن طعن کریں گے، اور دار قطنی ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ۔"

وذلک یسبون ابابکر وعمر ومن سب اصحابی فعلیہ لعنت اللّٰہ والملئکۃ والناس۔

"اور ان لوگوں کو مشرک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ابوبکرؓ و عمرؓ کو برا کہیں گے اور جس شخص نے میرے صحابہؓ کو برا کہا اس پر اللہ کی لعنت، فرشتوں کی لعنت اور لوگوں کی لعنت۔"

اسی طرح کی روایت حضرت انسؓ، حضرت عیاض انصاریؓ، حضرت جابرؓ، حضرت حسن ابن علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت فاطمہ زہراؓ، اور حضرت اُمّ سلمہؓ سے بھی منقول ہے اور یہ بھی آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

من ابغضھم فقد ابغضنی ومن اذاھم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللّٰہ۔

"جس شخص نے صحابہؓ کو دشمن رکھا اس نے درحقیقت مجھ کو دشمن رکھا، اور جس شخص نے ان کو ایذا پہنچائی اس نے درحقیقت مجھ کو ایذا پہنچائی اور جس نے مجھ کو ایذا پہنچائی اس۔نے درحقیقت اللہ کو ایذا پہنچائی۔"

ابن عساکر نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

ان رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ حب ابی بکر وعمر ایمان وبُغضھما کفر۔

"رسول کریم ﷺ نے فرمایا؟ ابوبکر و عمر کو دوست و محبوب رکھنا ایمان ہے اور ان دونوں سے بغض و عناد رکھنا کفر ہے۔"

عبداللہ ابن احمدؒ نے حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ:

انی لارجو لامتی فِیْ حبھم لابی بکر وعمر ما ارجو لھم فِیْ قول لا الٰہ الا اللّٰہ۔

"بلاشبہ میں اپنی اُمت کے لئے، ان کی اس محبت کے عوض کہ جو وہ ابوبکر و عمر کے تئیں رکھیں گے، اس چیز کی امید رکھتا ہوں جو ان کے لئے کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ کے عوض مقرر ہے۔"

نیز محبت اور بغض کے درمیان چونکہ تناقض ہے اس لئے جب ابوبکر و عمر سے محبت رکھنے کا یہ حال معلوم ہوا کہ اس کا اجر سلامتی ایمان اور دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی کی صورت میں ہے تو منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ ان سے بغض و نفرت رکھنا کفر اور اس کا انجام دنیا و آخرت میں ذلت و تباہی کی صورت میں ہے۔

ان احادیث کے بعد اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس بارہ میں ائمہ دین اور رہنمایان شریعت کے ارشادات و اقوال کیا ہیں پہلے

اس اصول کو ذہن میں رکھ لینا چاہئے، کہ تکفیر مؤمنین یعنی کسی مؤمن و مسلمان کو کافر کہنا بجائے خود کفر ہے کیونکہ صحیح حدیث میں منقول ہے کہ جو شخص کسی کو کافر کہے یا عدو اللہ (اللہ کا دشمن) کہے اور حقیقت میں وہ ایسا نہ ہو تو کفر لوٹ کر خود کہنے والے پر آجاتا ہے پس صحابہ ؓ کا مومن و مسلمان ہونا چونکہ قطعی ہے اس لئے جو شخص ان کو کافر کہے گا وہ کفر خود اسی پر لوٹ جائے گا یہاں یہ بات ذکر کر دینا موزوں ہے کہ روافض نہ صرف یہ کہ تکفیر صحابہ ؓ اور قذف عائشہ صدیقہ ؓ کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ ان دونوں چیزوں کو، کہ جو اعظم موجبات کفر میں سے ہیں، ترقی درجات کا سبب بھی مانتے ہیں حالانکہ یہ سب کے نزدیک مسلمہ ہے کہ محض استحلال معصیت ہی کفر ہے چہ جائیکہ کفر کو ترقی درجات کا موجب مانا جائے۔

امام ابوزرعہ ؒ نے جو امام مسلم کے جلیل القدر شیوخ میں سے ہیں کہا ہے کہ اگر کوئی شخص رسول کریم ﷺ کے صحابہ ؓ میں سے کسی کی تنقیص و توہین کرے تو بلاشبہ وہ زندیق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حق ہے اور رسول جو کچھ (دین و شریعت) لے کر آئے وہ حق ہے، نیز ان سب (قرآن اور دین و شریعت) کو نقل اور ہدایت کے ذریعہ ہم تک پہنچانے والے ان صحابہ ؓ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے پس جس شخص نے ان صحابہ ؓ میں عیب و نقص نکالا اس نے دراصل کتاب و سُنّت کو باطل اور لغو قرار دینے کا ارادہ کیا۔ اس اعتبار سے سب سے بڑا عیب دار اور ناقص خود وہی شخص قرار پائے گا اور اس پر زندقہ و ضلالت کا حکم راست و درست آئے گا۔

حضرت سہل ابن عبداللہ تستری ؒ کا قول ہے، اس شخص کو آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والا ہرگز نہیں کہا جا سکتا جس نے آنحضرت ﷺ کے صحابہ ؓ کی توقیر نہ کی۔

محیط میں حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ رافضیوں کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی خلافت کے منکر ہیں۔

خلاصہ میں لکھا ہے: من انکر خلافة الصدیق فھو کافر یعنی جس شخص نے ابوبکر صدیق ؓ کی خلافت کا انکار کیا وہ کافر ہے۔

مرغینانی میں مذکور ہے کہ اہل اھواء اور مبتدعین کے پیچھے نماز مکروہ ہے جب کہ رافضیوں کے پیچھے ناجائز ہے۔

قاضی ؒ نے شفا میں لکھا ہے کہ حضرت مالک ابن انس ؒ وغیرہ کا قول ہے:

من ابغض الصحابة و سبھم فلیس لهُ فِيَ المسلمین حق۔

"جس شخص نے صحابہ ؓ سے بغض رکھا اور ان کو برا کہا اس کا مسلمانوں کے مال فے میں کوئی حق نہیں۔"

انہی کا یہ قول بھی ہے کہ:

من غاظه اصحاب محمد صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فھو کافر قَالَ اللّٰہ تعالٰی لیغیظ بھم الکفار۔

"جس شخص نے اصحاب ؓ محمد کے تئیں بغض و غصہ رکھا، وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "تاکہ ان سے کافروں کو غصہ دلائے" کے بموجب کافر ہے۔"

قاضی ابوبکر باقلانی ؒ نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے اور بیہقی ؒ نے امام اعظم ابوحنیفہ ؒ سے بھی ایسا ہی قول نقل کیا ہے، بلکہ فقہائے حنفیہ نے شیعوں کو جو کافر کہا ہے اس کی بنیاد حضرت امام اعظم ؒ ہی کا یہی قول ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ شیعوں اور رافضیوں کے معتقدات کو سب سے زیادہ جاننے والے حضرت امام اعظم ؒ ہی ہیں کیونکہ وہ کوفی ہے اور رفض و تشیع کا اصل منبع و مرکز کوفہ ہی رہا ہے۔ پس اگر امام اعظم ؒ نے خلافت صدیق ؓ کے منکر کی تکفیر کی ہے تو حضرت ابوبکر ؓ و حضرت عمر ؓ یا کسی بھی صحابی کو لعنت کرنے والا ان کے نزدیک بدرجۂ اولیٰ کافر ہوگا۔

حضرت امام مالک ؒ نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ ؓ میں سے کسی کو بھی مثلاً حضرت ابوبکر ؓ کو یا حضرت عمر ؓ کو اور یا حضرت عثمان ؓ کو برا

کہنے والے کے بارہ میں حکم بیان کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے کہ:

فان قال کانوا علی ضلال اَو کفر قتل۔

"اگر وہ شخص یہ کہے کہ وہ (صحابہ) گمراہ تھے یا کافر تھے تو اس شخص کو قتل کیا جائے۔"

حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کے قول و ارشادات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی روافض کے ارتداد کے قائل تھے، بہرحال روافض کے کفر کی یہ چند دلیلیں ہیں، اگرچہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں درازگی کے خوف سے انہی چند دلائل کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ عام مسلمان بھائی شک و شبہ کا شکار نہ رہیں ان کو صحابہؓ کی عظمت اور ان کو برا کہنے والوں کی برائی معلوم ہو جائے۔ رافضیوں کے فریب سے ہوشیار رہیں، اپنا عقیدہ خراب نہ کریں، ان کے میل جول سے اجتناب کریں اور ان کے ساتھ رشتہ ناتہ جوڑنے سے باز رہیں، اور اگر صحابہؓ کے فضائل و مناقب سے متعلق ان آیات و احادیث کو دیکھ کر شائد کسی شیعہ کو توفیق الٰہی نصیب ہو جائے تو وہ توبہ کر کے اپنی عاقبت درست کر لے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب: ہوسکتا ہے کوئی رافضی یہ اعتراض کرے کہ مشہور کتاب شرح عقائد نسفی میں اس بات کو آسان نہیں بتایا گیا ہے کہ شیخین کو برا کہنے والے کو کافر قرار دے دیا جائے، نیز صاحب جامع الاصول اور صاحب مواقف نے شیعوں کو اسلامی فرقوں میں شمار کیا ہے، اسی طرح شیخ ابوالحسن اشعریؒ اور امام غزالی نے بھی اس کو مناسب نہیں سمجھا ہے کہ اہل قبلہ کو کافر کہا جائے، لہٰذا جو لوگ شیعوں کو کافر کہتے ہیں ان کا قول سلف اہل سُنّت کے موافق نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ان بزرگان اُمّت اور اساطین علم نے شیعوں کی تکفیر میں احتیاط کا دامن تھاما ہے اور اس فرقہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے میں تامل کیا ہے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان حضرات نے شیعوں کے تمام عقائد و نظریات اور ان کے احوال و معاملات کو پوری طرح جاننے کے باوجود ان کی تکفیر سے اعراض کیا ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کے ذہن میں شیعیت کا مسئلہ پوری طرح واضح نہیں تھا اور شیعوں کے متعلق تمام چیزوں کی حقیقی اور واقعاتی حیثیت پورے بسط کے ساتھ ان کے علم میں نہیں تھی جس کی بناء پر انہوں نے شیعوں کے بارے میں اسی خیال و نظریہ کا اظہار کیا جو ان کے اس وقت کے علم اور معلومات کے مطابق اور اس طرح کی بہت نظیریں ملتی ہیں کہ جلیل القدر صحابہ تک کو بعض مسائل میں اشتباہ ہوا اور ان کا قول یا عمل ان کے مسائل کے حقیقی پہلو سے مختلف ظاہر ہوا، مثال کے طور پر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو نماز میں اطباق یدین کے مسئلہ میں اشتباہ کا ہونا یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بیع امہات اولاد کے اور زندیقوں کو آگ میں جلادینے کے مسئلہ میں اشتباہ ہونا اور یا حضرت عمر فاروقؓ کو جنبی کے تیمم کے مسئلہ میں اشتباہ ہونا، پس مذکورہ بالا بزرگوں کی نظر، محض اس بات پر گئی کہ شیعہ اہل قبلہ اور کلمہ گو ہیں اور اسی بناء پر انہوں نے ان کی تکفیر سے احتیاط برتی، اگر ان کے علم میں شیعوں کے وہ تمام عقائد اور حالات تفصیل کے ساتھ آجاتے جو ان کے اہل قبلہ اور کلمہ گو ہونے کے صریح منافی ہیں اور جو کسی بھی شخص کی تکفیر کے لئے واضح ثبوت اور دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں تو یقیناً وہ بزرگ بھی ان کی تکفیر کے قائل ہوتے جب خلیفۃ المؤمنین حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زکوٰۃ کی فرضیت اور ادائیگی سے انکار کرنے والے کے خلاف تلوار اٹھانے کا فیصلہ کیا تو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے ان لوگوں کے کلمہ گو ہونے ہی کی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ان کی سفارش کی اور کہا کہ ہم ان لوگوں کے خلاف جنگ و قتال کیسے کر سکتے ہیں جب کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

امرت ان اقاتل النّاسَ حتّٰی یقولو الا الٰہ الا اللّٰہ۔

"مجھے (پروردگار کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللّٰہ کہیں۔"

حضرت ابوبکرؓ نے پورے عزم کے ساتھ جواب دیا کہ میں ہر اس شخص کے خلاف جنگ و قتال کروں گا جو نماز اور روزہ کے درمیان

فرق کرے گا (اور اس کی کلمہ گوئی میرے ارادہ میں حائل نہیں ہوگی) حضرت عمرؓ بولے: میں نے دیکھ لیا کہ اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ نے ابوبکرؓ کو شرح صدر عطا فرمادیا ہے اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ حق وہی ہے جو ابوبکرؓ کہہ رہے ہیں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ محولہ بالا بزرگوں نے اپنے ان اقوال و نظریات کا اظہار ان شیعوں کے بارہ میں فرمایا ہو، جو اس زمانہ میں ایسے برے اور فاسد عقائد و احوال نہیں رکھتے تھے جیسے بعد میں شیعوں اور رافضیوں نے اختیار کر لئے۔ اس کی تائید مرقاۃ میں ملا علی قاریؒ کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ:

قلت وهذا في حق الرافضة والخارجة في زماننا كانهم يعتقدون كفر اكثر اكابر الصحابة فضلا من سائر اهل السنة والجماعة فهم كفرة بالاجماع بلا نزاع۔

"میں کہتا ہوں کہ یہ بات ہمارے زمانہ کے رافضیوں اور خارجیوں کے حق میں صادق آتی ہے کیونکہ ان فرقوں کے لوگ اکابر صحابہؓ میں سے اکثر کے کفر کا عقیدہ رکھتے ہیں اور تمام اہل سنّت و الجماعت کو بھی کافر سمجھتے ہیں ان فرقوں کے کافر ہونے پر اجماع ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

صحابہؓ کا وجود اُمّت کے لئے امن و سلامتی کا باعث تھا

④ وَعَنْ اَبِيْ بُرْدَةَؓ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَفَعَ يَعْنِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاْسَهٗ اِلَى السَّمَاءِ وَكَانَ كَثِيْرًا مَا يَرْفَعُ رَاْسَهٗ اِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ النُّجُوْمُ اَمَنَةٌ لِلسَّمَآءِ فَاِذَا ذَهَبَتِ النُّجُوْمُ اَتَى السَّمَآءَ مَا تُوْعَدُ وَاَنَا اَمَنَةٌ لِاَصْحَابِيْ فَاِذَا ذَهَبْتُ اَنَا اَتَى اَصْحَابِيْ مَا يُوْعَدُوْنَ وَاَصْحَابِيْ اَمَنَةٌ لِاُمَّتِيْ فَاِذَا ذَهَبَ اَصْحَابِيْ اَتَى اُمَّتِيْ مَا يُوْعَدُوْنَ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوبردہ اپنے والد (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے یعنی حضرت ابوموسیٰؓ نے بیان کیا کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے آسمان کی طرف اپنا سر مبارک اٹھایا اور آپ ﷺ اکثر (وحی کے انتظار میں) آسمان کی طرف دیکھا کرتے تھے، اور پھر فرمایا، ستارے آسمان کے لئے امن و سلامتی کا باعث ہیں، جس وقت یہ ستارے جاتے رہیں گے تو آسمان کے لئے وہ چیز آجائے گی جو موعود و مقدر ہے، میں اپنے صحابہؓ کے لئے امن و سلامتی کا باعث ہوں، جب میں (اس دنیا سے) چلا جاؤں گا تو میرے صحابہؓ میری اُمّت کے لئے امن و سلامتی کا باعث ہیں، جب میرے صحابہؓ (اس دنیا سے) رخصت ہو جائیں گے تو میری اُمّت پر وہ چیز آپڑے گی جو موعود و مقدر ہے۔" (مسلم)

تشریح: "ستارے" کا لفظ سورج اور چاند کو بھی شامل ہے۔ اور "ستاروں کے جاتے رہنے" سے مراد سورج، چاند اور تمام ستاروں کا بے نور ہو جانا ٹوٹ پھوٹ کر گر پڑنا اور معدوم ہو جانا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ۔

"جب (قیامت کے دن) آفتاب بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔"

"آسمان کے لئے جو چیز موعود و مقدر ہے" سے مراد قیامت کے دن آسمانوں کا پھٹ جانا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر روئی کے گالوں کی طرح اڑنا ہے، اس کی خبر قرآن کریم نے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (جب آسمان پھٹ جائے گا) اور اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (جب آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا) کے الفاظ میں دی ہے۔

"صحابہ کے لئے موعود و مقدر چیز" سے مراد فتنہ و فساد، اختلافات و نزاعات، باہمی جنگ و جدل اور بعض اعرابی قبائل کا مرتد ہو جانا

اسی طرح "اُمت کے لئے موعود و مقدر چیز" سے مراد بداعتقادی و بدعملی کے فتنوں کا امنڈ پڑنا، بدعات کا زور ہو جانا، مسلمانوں پر دینی و ملی سانحات و حادثات کا واقع ہونا، اہل خیر و برکت کا اس دنیا سے اٹھ جانا، اہل شر کا باقی رہنا اور ان (اہل شر) پر قیامت قائم ہونا، پس اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اہل خیر کا وجود شر کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جب اہل خیر اٹھ جاتے ہیں تو شر کو در آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا وجود آپ ﷺ کے صحابہؓ کے لئے شر سے حفاظت کا مکمل ضامن تھا، کسی بھی معاشرے میں فتنہ کی ابتداء مختلف الذہن اور مختلف الخیال لوگوں کی باہمی آویزش اور ایک دوسرے کے خلاف رائے رکھنے سے ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یہ صورت حال تھی کہ جب کسی بھی مسئلہ میں صحابہؓ کا باہمی اختلاف رائے ہوتا تو آنحضرت ﷺ وہ پہلو بیان فرما دیتے جو حقیقت کے مطابق ہوتا اور تمام صحابہؓ اسی پر جم جاتے تھے۔ اسی صورت میں کسی فتنہ کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، جب آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے، تو صورت حال مختلف ہوگئی۔ صحبت رسول ﷺ سے محروم مسلمانوں کی کثرت ہوتی گئی، خود رائی کا رجحان پیدا ہونے لگا، اور چونکہ اس خود رائی کی بنیاد ذاتی اغراض اور نفسیاتی خواہشات ہوتی تھی اس لئے فتنہ و فساد جنم لینے لگے، وہ تو صحابہؓ کی بڑی تعداد موجود تھی جو کسی بھی معاملہ میں اپنی ذاتی خواہش اور رجحان کو اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ ہر معاملہ اور ہر مسئلہ میں آنحضرت ﷺ کے قول یا فعل اور یا دلالت حال سے استناد کرتے تھے اور ذات رسالت پناہ کی صحبت و رفاقت کے انوار سے بھرپور تھے، اس لئے ان کا وجود بہرحال اتنا باعث خیر و برکت تھا کہ فتنوں اور برائیوں کے اندھیرے زیادہ پھیلنے نہیں پائے لیکن جب ان صحابہؓ کا وجود بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو انوار و برکات میں بہت ہی کمی آگئی اور تاریکیوں کو بڑھنے پھیلنے کا موقع مل گیا۔ اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے ستاروں اور آسمان کی مثال کے ذریعہ پہلے سے بیان فرما دیا تھا کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آسمان کا وجود اسی وقت تک ہے۔ جب تک چاند سورج اور ستارے اپنی ضیا پاشیوں کے ساتھ موجود ہیں، جب یہ ستارے ختم ہو جائیں گے تو آسمان کے وجود کے خاتمہ کا وقت آ جائے گا، اور جب آسمان کا وجود ختم ہو جائے گا تو پوری کائنات اپنے عدم کی تاریکی میں گم ہو جائے گی۔ پس صحابہؓ ان ستاروں کی مانند ہیں جن کے وجود سے کائنات کو روشنی ملتی ہے اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمْ اِقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ۔

"میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو گے راہ یاب ہو گے۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم کی برکت

(۳) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ فَيَغْزُوْ فِئَامٌ مِّنَ النَّاسِ فَيَقُوْلُوْنَ هَلْ فِيْكُمْ مَنْ صَاحَبَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ فَيُفْتَحُ لَهُمْ ثُمَّ يَاْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ فَيَغْزُوْا فِئَامٌ مِّنَ النَّاسِ فَيُقَالُ هَلْ فِيْكُمْ مَنْ صَاحَبَ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ فَيُفْتَحُ لَهُمْ ثُمَّ يَاْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ فَيَغْزُوْا فِئَامٌ مِّنَ النَّاسِ فَيُقَالُ هَلْ فِيْكُمْ مَنْ صَاحَبَ مَنْ صَاحَبَ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ فَيُفْتَحُ لَهُمْ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ يَاْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يُبْعَثُ مِنْهُمُ الْبَعْثُ فَيَقُوْلُوْنَ انْظُرُوْا هَلْ تَجِدُوْنَ فِيْكُمْ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُوْجَدُ الرَّجُلُ فَيُفْتَحُ لَهُمْ ثُمَّ يُبْعَثُ الْبَعْثُ الثَّانِيْ فَيَقُوْلُوْنَ هَلْ فِيْهِمْ مَنْ رَاٰى اَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُفْتَحُ لَهُمْ ثُمَّ يُبْعَثُ الْبَعْثُ الثَّالِثُ فَيُقَالُ انْظُرُوْا هَلْ تَرَوْنَ فِيْهِمْ مَنْ رَاٰى مَنْ رَاٰى اَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يَكُوْنُ الْبَعْثُ الرَّابِعُ فَيُقَالُ انْظُرُوْا هَلْ تَرَوْنَ فِيْهِمْ اَحَدًا رَاٰى مَنْ رَاٰى اَحَدًا رَاٰى اَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُوْجَدُ الرَّجُلُ فَيُفْتَحُ لَهٗ۔

"اور حضرت ابو سعید خدری ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، "لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جہاد کرنے نکلے گی، اور پھر وہ لوگ (آپس میں) ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص بھی ہے جس کو رسول کریم ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا۔ وہ لوگ جواب میں کہیں گے کہ ہاں (ہمارے درمیان صحابی رسول موجود ہیں) پس ان لوگوں کے لئے قلعہ و شہر کے دروازے وا ہو جائیں گے (یعنی صحابہ ؓ کی برکت و شوکت سے دشمنوں کے مقابلہ پر ان کو فتح حاصل ہوگی) پھر لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جہاد کے لئے نکلے گی اور پھر وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص بھی موجود ہے جس نے رسول کریم ﷺ کے صحابہ ؓ کی صحبت کا شرف حاصل کیا ہے (جس کو تابعی کہتے ہیں) وہ جواب میں کہیں گے کہ ہاں (ہمارے درمیان تابعی موجود ہیں پس (تابعی کی برکت سے) ان کے لئے قلعہ و شہر کے دروازے وا ہو جائیں گے پھر لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جہاد کے لئے نکلے گی اور پھر وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے رسول کریم ﷺ کے صحابہ ؓ کے صحبت یافتہ حضرات کی صحبت کا شرف حاصل کیا۔ (جس کو تبع تابعی کہتے ہیں) وہ جواب میں کہیں گے کہ ہاں (ہمارے درمیان تبع تابعی موجود ہیں) پس (تبع تابعی کی برکت سے) ان لوگوں کے لئے قلعہ و شہر کے دروازے وا ہو جائیں گے (بخاری ؒ و مسلم ؒ) اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس وقت لوگوں میں سے ایک لشکر (دشمنوں کے مقابلہ پر لڑنے کے لئے) بھیجا جائے گا اور پھر وہ اہل لشکر آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ذرا دیکھو، تمہارے درمیان رسول کریم ﷺ کے صحابہ ؓ میں سے کوئی موجود ہے یا نہیں؟ (تلاش کرنے کے بعد) پتہ چلے گا کہ (لشکر میں) ایک صحابی ؓ موجود ہیں، پس (ان صحابی کی برکت سے) اس لشکر کو فتح حاصل ہوگی۔ اس کے بعد (اگلے زمانہ میں) ایک دوسرا لشکر (کسی دوسرے علاقہ کی طرف دشمنوں کے مقابلہ پر) روانہ کیا جائے گا اور پھر وہ اہل لشکر کے آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ذرا دیکھو، تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص موجود ہے یا نہیں جس نے رسول کریم ﷺ کے صحابہ ؓ کو دیکھا ہو؟ (تلاش کرنے پر) پتہ چلے گا کہ (لشکر میں) ایک ایسے شخص یعنی تابعی موجود ہیں۔ پس (ان تابعی کی برکت سے) اس لشکر کو فتح حاصل ہوگی۔ پھر اس کے بعد (اگلے زمانہ میں) ایک تیسرا لشکر روانہ کیا جائے گا اور پھر وہ لشکر آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ذرا دیکھو، تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص موجود ہے یا نہیں۔ جس نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہو جس نے رسول کریم ﷺ کے صحابہ ؓ کو دیکھا ہو؟ (تلاش کرنے پر) پتہ چلے گا کہ (لشکر میں) ایسے شخص موجود ہیں، پس (ان کی برکت سے) اس لشکر کو فتح حاصل ہوگی۔ پھر اس کے بعد (اگلے زمانہ مین) ایک چوتھا لشکر روانہ کیا جائے گا اور پھر وہ لشکر آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ذرا دیکھو تمہارے درمیان کوئی ایسا لشکر موجود ہے یا نہیں جس نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہو جس نے رسول کریم ﷺ کے صحابہ ؓ کو دیکھنے والے کسی شخص کو دیکھا ہو؟ (تلاش کرنے پر) پتہ چلے گا کہ (لشکر میں) ایک ایسے شخص موجود ہیں، پس (ان کی برکت سے) اس لشکر کو فتح حاصل ہوگی۔"

تشریح: ان دونوں روایتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس معجزہ کا ذکر تو ہے ہی کہ آپ ﷺ نے ایک ایسی حقیقت کی پیش بیانی فرمائی جو آپ ﷺ کے بعد تین یا چار قرنوں (زمانوں) میں وقوع پزیر ہونے والی تھی اس کے ساتھ ہی ان روایتوں میں آپ ﷺ کے صحابہ ؓ، تابعین، تبع تابعین اور تبع اتباع تابعین کی فضیلت اور ان کا باعث خیر و برکت ہونا بھی مذکور ہے، ان دونوں روایتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی روایت میں تو تین فرقوں یعنی صحابہ ؓ، "تابعین" تبع تابعین" کا ذکر ہے جب کہ مسلم ؒ کی دوسری روایتوں میں چار فرقوں یعنی صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اور تبع اتباع تابعین کا ذکر ہے، اور بخاری کی بھی ایک، صحیح روایت میں جو حدیث خیر القرون سے متعلق ہے۔ چار قرنوں کا ذکر ہے چونکہ اس درجہ کے اہل خیر چوتھے قرن میں نادر و کمیاب تھے اور پہلے تین قرنوں میں اہل خیر و برکت اور اہل علم و دانش کی کثرت تھی، کوتاہ بینی، ناسمجھی اور فتنہ و فساد کی راہ مسدود تھی اس لئے اکثر روایتوں میں تین ہی قرنوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ ؓ سے بطریق مرفوع منقول ہے کہ:

خیر النّاس القرن الذی انا فیہ ثُمَّ الثانی ثُمَّ الثالث۔

"(آپ ﷺ نے فرمایا) بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانہ میں ہیں پھر دوسرے زمانہ کے اور پھر تیسرے زمانہ کے لوگ۔"

طبرانیؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ:

خیر النّاس قرنی ثُمَّ الثانی ثُمَّ الثالث ثُمَّ تجئی قوم لا خیر فیھم۔ (طبرانی)

"بہترین لوگ وہ ہیں، جو میرے زمانہ میں ہیں پھر دوسرے زمانہ کے لوگ پھر تیسرے زمانہ کے لوگ، اور پھر جو قوم آئے گی اس سے (پہلے زمانے جیسے) بہترین لوگ نہیں ہوں گے۔"

"جس نے رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ کو دیکھا ہو" یہ مسلم کی دوسری روایت کے الفاظ ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ "تابعی" ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ اس نے صحابہؓ کو دیکھا ہو جیسا کہ "صحابی" ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ اس نے آنحضرت ﷺ کی زیارت کی ہو، لیکن بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ "صحابی" ہونے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اس نے آنحضرت ﷺ کی زیارت کی ہو لیکن "تابعی" ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو صحابہؓ کی صحبت وملازمت بھی نصیب ہوئی ہو جیسا کہ پہلی روایت میں شرف صحبت کا ذکر ہے۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ یہاں "صحابہ کو دیکھا ہو" سے مراد یہ ہے کہ وہ صحابہؓ کی صحبت میں رہا ہو۔

④ وَعَنْ عِمْرَانَ ابْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ اِنَّ بَعْدَهُمْ قَوْمٌ يَشْهَدُوْنَ وَلَا يُسْتَشْهَدُوْنَ وَيَخُوْنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمَنُوْنَ وَيَنْذِرُوْنَ وَلَا يَفُوْنَ وَيَظْهَرُ فِيْهِمُ السِّمَنُ وَفِي رِوَايَةٍ وَيَحْلِفُوْنَ وَلَا يُسْتَحْلَفُوْنَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ ثُمَّ يَخْلُفُ قَوْمٌ يُحِبُّوْنَ السَّمَانَةَ۔

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میری اُمّت کے بہترین لوگ میرے قرن کے لوگ (یعنی صحابہؓ) ہیں، پھر وہ لوگ جو ان سے متصل ہیں (یعنی تابعی) اور پھر وہ لوگ جو ان سے متصل ہیں۔ اور پھر ان قرنوں کے بعد جن لوگوں کا زمانہ آئے گا ان میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو خود بخود گواہی دیں گے اور کوئی ان کی گواہی نہ چاہے گا ایسے لوگ بھی ہوں گے جو خیانت کریں گے اور ان کی دیانت و امانت پر اعتماد نہیں کیا جائے گا، ایسے لوگ بھی ہوں گے جو نذر مانیں گے اور اپنی نذر کو پورا نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا فربہی پیدا ہوگی، اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جو (بلاضرورت وبلاوجہ) قسمیں کھائیں گے حالانکہ ان کو قسم نہیں دلائی جائے گی۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلم کی ایک روایت میں جو حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے یہ الفاظ ہیں کہ "پھر ان لوگوں کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو موٹاپے کو یعنی فربہی کو پسند کریں گے۔"

تشریح: "قرن" عہد یا زمانہ کو کہتے ہیں، جس کی مقدار بعض حضرات نے چالیس سال، بعض نے اسی سال اور بعض نے سو سال مقرر کی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ "قرن" کا اطلاق ماہ وسال کے تعین کے اعتبار سے محدود عہد یا زمانہ پر نہیں ہوتا بلکہ ہر وہ عہد یا زمانہ "قرن" کہلاتا ہے، جو تقریباً یکساں عمر رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہو گویا "قرن" جو لفظ "اقتران" سے ماخوذ ہے ایسی مقدار ہے جس میں اس زمانہ کے لوگ اپنی عمروں اور احوال کے اعتبار سے ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے ہیں، پس آنحضرت ﷺ کے قرن سے مراد صحابہؓ کا قرن ہے۔ اس قرن کی ابتداء زمانہ رسالت سے ہوتی ہے اور اس کا آخر وہ زمانہ ہے جب تک کہ ایک صحابی بھی دنیا میں باقی رہا یعنی ۱۲۰ھ تک۔ دوسرا قرن کہ جو تابعین کا قرن ہے ۱۰۰ھ سے ۱۷۰ھ تک کے زمانہ پر مشتمل ہے اور تیسرا قرن کہ جو اتباع تابعین کا قرن ہے۔ تابعین کے قرن کے بعد سے شروع ہو کر تقریباً ۲۲۰ھ تک کے زمانہ پر مشتمل ہے اس قرن کے بعد اس مخصوص خیر وبرکت کا سلسلہ ختم ہو گیا، جو قرن اول (یعنی زمانہ رسالت اور قرن صحابہؓ) اور اس سے ملے ہوئے دونوں قرنوں کو زمانی فرق کی نسبت سے کم و بیش حاصل رہی، پھر تو بدعتوں کا ظہور شروع ہو گیا، دین کے نام پر عجیب وغریب چیزیں پیدا ہونے لگیں، فلاسفہ اور نام نہاد عقلاء نے سر اٹھائے، معتزلہ کا جنم

ہوا اور انہوں نے دین کو مسخ کرنے کا بیڑہ اٹھایا، قرآن کو مخلوق کہنے کا فتنہ اٹھا، جس نے اہل علم کو زبردست آزمائش و امتحان سے دوچار کیا، لوگوں کی دینی زندگی کو گھن لگنے لگا، نت نئے افکار و خیالات جنم لینے لگے، اختلاف و نزاعات پھیلنے لگے، آخرت کا خوف کم ہوا اور دنیا کی طرف رجحان بڑھنے لگا، احکام شریعت اور سُنّت کی اتباع میں اس قدر خلل و نقصان پڑا کہ اخلاقی زندگی مجروح ہونے لگی۔ اور لوگوں کا وہ حال ہونے لگا کہ جس کی خبر مخبر صادق ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمائی۔

"جو خود بخود گواہی دیں گے اور کوئی ان کی گواہی نہ چاہے گا" حدیث کے ان الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر طلب گواہی دینا ایک بری حرکت ہے، جب کہ ایک دوسری حدیث میں یہ آیا ہے کہ "گواہوں میں بہتر وہ گواہ ہے جو گواہی دے اس سے پہلے کہ اس سے گواہی کی درخواست کی جائے" بظاہر ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہے۔ لیکن در حقیقت ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں کیونکہ بغیر طلب گواہی دینے کی برائی ظاہر کرنے والی حدیث کا تعلق اس شخص سے ہے۔ جس کے بارہ میں معلوم ہو کہ وہ فلاں واقعہ یا معاملہ کا گواہ ہے لیکن اس کے باوجود صاحب معاملہ (مثلاً مدعی) نہ تو اس سے گواہی دینے کی درخواست کرتا ہے اور نہ اس کو عدالت میں بطور گواہ پیش کرنا چاہتا ہے، ایسی صورت میں اگر وہ شخص از خود (بغیر طلب) گواہی دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی گواہی کے کوئی معنی تو ہوں گے نہیں البتہ یہ ضرور ثابت ہو گا کہ وہ اس گواہی کے پردہ میں کوئی فاسد غرض رکھتا ہے، اس کے برخلاف اگر یہ صورت ہو کہ ایک شخص کسی واقعہ یا معاملہ کا گواہ ہے۔ لیکن اس کا گواہ ہونا صاحب معاملہ کو معلوم نہیں۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ اگر میں نے گواہی نہ دی تو ایک مسلمان بھائی کا حق ڈوب جائے گا یا اس کو بلا وجہ کوئی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑے گا، اس جذبۂ خیر کے ساتھ وہ صاحب معاملہ کو بتاتا ہے کہ میں اس واقعہ یا معاملہ کا گواہ ہوں، اور اگر تم چاہو تو تمہاری طرف سے عدالت میں پیش ہو کر گواہی دے سکتا ہوں، بغیر طلب گواہی دینے والا ایسا شخص یقیناً قابل تعریف ہو گا اور کہا جائے گا کہ دوسری حدیث (جس میں بغیر طلب گواہی دینے والے کو بہترین گواہ فرمایا گیا ہے) ایسے شخص کے حق میں ہے۔ یا یہ کہ بغیر طلب گواہی دینے کی اچھائی بیان کرنے والی حدیث دراصل اس بات کو مبالغہ کے طور پر یعنی زیادہ سے زیادہ شدت اور تاکید کے ساتھ بیان کرنے کے لئے ہے کہ جو شخص کسی واقعہ یا معاملہ کا سچا گواہ ہو اس کو چاہئے کہ گواہی دینے سے اعراض نہ کرے اور جب اس سے کوئی گواہی طلب کی جائے تو دیر نہ کرے فوراً حاضر ہو اور گواہی نہ چھپائے، اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بغیر طلب گواہی دینے کی برائی ظاہر کرنے والی یہ حدیث اس شخص کے حق میں ہے جو گواہ بننے کا اہل نہ ہو یا اس شخص پر محمول ہے جو جھوٹی گواہی دے بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ بغیر طلب گواہی دینے کی برائی بیان کرنے والی اس حدیث کا تعلق حقوق العباد سے متعلق گواہی دینے سے ہے اور اچھائی بیان کرنے والی حدیث کا محمول حقوق اللہ سے متعلق گواہی دینا ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ گواہی کو چھپانے میں کوئی مصلحت نہ ہو اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس حدیث میں "شہادت" سے مراد سوگند (قسم) ہے۔ اس صورت میں حدیث کے ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہو گا: ان میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو جھوٹی قسم کھائیں گے اس سے پہلے کہ کوئی ان کو قسم دے اور قسم کھلوائے۔

"جو خیانت کریں گے اور ان کی دیانت و امانت پر اعتماد نہیں کیا جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ خیانت و بد دیانتی میں وہ اس قدر جری اور مشہور ہو جائیں گے کہ لوگ ان کو امانت دار اور بادیانت ماننا ہی چھوڑ دیں گے اور ان کو امانت کے وصف سے خالی سمجھا جائے گا۔ ہاں اگر کسی سے کبھی کبھار کوئی خیانت سرزد ہو جائے تو اس کا اعتبار نہیں۔

"جو نذر مانیں گے اور اپنی نذر کو پورا نہیں کریں گے" یعنی نہ صرف یہ کہ نذر پوری نہیں کریں گے بلکہ اس بات کو کوئی اہمیت بھی نہیں دیں گے کہ نذر مان کر اس کا پورا کرنا کتنی بری بات ہے۔ حالانکہ نذر پوری کرنا لازم ہے اور اللہ کے جو نیک بندے اس پر عمل کرتے ہیں ان کی تعریف قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے:

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا۔

"وہ (اللہ کے نیک بندے) نذر پوری کرتے ہیں، اور اس (قیامت کے) دن سے ڈرتے ہیں۔"

"اور ان میں موٹاپا یعنی فربہی پیدا ہوگی" لفظ "سمن" کے معنی موٹاپے، کے ہیں جو بہت کھانے پینے اور تنعم و ترفہ کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ پس یہاں وہ موٹاپا مراد نہیں ہے جو خلقی اور طبعی طور پر ہو۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ یہاں "فربہی" سے مراد احوال میں فربہی ہے یعنی فخر و شیخی کی راہ سے اپنے تئیں مالدار اور خوشحال ظاہر کریں گے اور عزت و شرف کی ان باتوں کا دعوی کریں گے جو سرے سے ان میں نہیں ہوں گی، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "فربہی" سے مراد مال و دولت جمع کرنا اور تن پروری میں مشغول رہنا ہے۔ تورپشتیؒ نے لکھا ہے "ان میں فربہی پیدا ہوگی" کے الفاظ دراصل اس بات سے کنایہ ہیں کہ دینی معاملات اور احکام شریعت کی بجا آوری میں غفلت و کوتاہی کا شکار ہوں گے اور اوامر و نواہی کو ملحوظ رکھنے کا وہ اہتمام نہیں کریں گے جو دین و شریعت کا اصل تقاضا ہیں۔ اس بات کو "فربہی" سے تعبیر کرنے کی وجہ مناسبت یہ ہے کہ عام طور پر موٹے لوگ سست و کاہل ہوتے ہیں، محنت و مشقت سے جی چراتے ہیں، نفس کو ریاضت میں ڈالنے سے کتراتے ہیں۔ اور ان کا زیادہ تر اہتمام نفس کی لذت کوشی، تن پروری اور راحت و آرام کے ساتھ اپنے بستروں پر پڑے رہنے تک محدود رہتا ہے۔

شرح مسلم میں لکھا ہے کہ علماء نے وضاحت کی ہے۔ کہ وہ فربہی مذموم ہے، جو (عیش و تنعم کے ذریعہ) قصداً پیدا کی جائے۔ خلقی و طبعی فربہی نہ مذموم ہے نہ اس پر اس طرح کی روایتوں کا اطلاق ہوتا ہے! اس وضاحت سے اس روایت کے معنی بھی صاف ہو جاتے ہیں جس میں فرمایا گیا کہ:

اِنَّ اللّٰہَ یُبْغِضُ الْحِبْرَ السَّمِیْنَ۔

"اللہ تعالیٰ فربہ عالم کو سخت ناپسند کرتا ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

صحابہؓ کی تعظیم و تکریم لازم ہے

⑤ عَنْ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکْرِمُوْا اَصْحَابِیْ فَاِنَّھُمْ خِیَارُکُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ یَظْھَرُ الْکِذْبُ حَتّٰی اَنَّ الرَّجُلَ لَیَحْلِفُ وَلَا یُسْتَحْلَفُ وَیَشْھَدُ وَلَا یُسْتَشْھَدُ اِلَّا مَنْ سَرَّہٗ بُحْبُوْحَۃَ الْجَنَّۃِ فَلْیَلْزَمُ الْجَمَاعَۃَ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْفَذِّ وَھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ وَلَا یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِاِمْرَاَۃٍ فَاِنَّ الشَّیْطٰنَ ثَالِثُھُمْ وَمَنْ سَرَّتْہُ حَسَنَتُہٗ وَسَآءَتْہُ سَیِّئَتُہٗ فَھُوَ مُؤْمِنٌ رَوَاہُ النَّسَائِیُّ وَاَسْنَادُہٗ صَحِیْحٌ وَرِجَالُہٗ رِجَالُ الصَّحِیْحِ اِلَّا اِبْرَاھِیْمَ ابْنَ الْحَسَنِ الْخَثْعَمِیِّ فَاِنَّہٗ لَمْ یُخْرِجْ عَنْہُ الشَّیْخَانِ وَھُوَ ثِقَۃٌ ثَبْتٌ۔

"حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میرے اصحابؓ کی تعظیم و تکریم کرو، کیونکہ وہ تمہارے برگزیدہ اور بزرگ ترین لوگ ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہیں یعنی تابعین اور پھر وہ لوگ جو ان (تابعین) کے قریب ہیں یعنی تبع تابعین اور اس کے بعد جھوٹ ظاہر ہو جائے گا یہاں تک کہ ایک شخص قسم کھائے گا، درانحالیکہ اس سے قسم کھانے کا مطالبہ نہ ہوگا اور گواہی دے گا، حالانکہ اس سے گواہی دینے کو نہ کہا جائے گا یاد رکھو، جو شخص جنت کے بالکل درمیان (کہ جو جنت کی بہترین جگہ ہے) رہنا چاہے تو اس کو چاہئے کہ جماعت کو لازم پکڑے کیونکہ شیطان اس شخص کا ساتھی بن جاتا ہے جو (خود رائے اور جماعت سے) علیحدہ و تنہا ہوتا ہے، شیطان تو دو شخصوں سے بھی (جو اجتماعیت و اتحاد کے ساتھ ہوں) دور بھاگتا ہے اور ہاں کوئی مرد کسی اجنبی یعنی غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی میں ہرگز نہ رہے، کیونکہ ان کا تیسرا ساتھی شیطان ہوتا ہے، (جو ان دونوں کو بہکانے سے ہرگز نہیں چوکے گا) نیز جس شخص کو اس کی نیکی خوشی و اطمینان بخشے اور اس کی بدی

اس کو غمگین و مضطرب کر دے وہ مؤمن ہے۔"

تشریح : اس حدیث میں بھی اسلام کے ابتدائی تینوں قرنوں کے لوگ یعنی جماعت صحابہ طبقۂ تابعین اور طبقۂ تبع تابعین کی فضیلت تمام اُمت پر ظاہر کی گئی ہے کہ یہ افراد اُمت کے وہ تین طبقے ہیں جو اُمت کے سب سے بہترین لوگ ہیں، ملت کے سردار و مقتدا ہیں اور ان تینوں طبقوں کے لوگوں میں اور ان کے زمانوں میں غلبہ صدق و دیانت اور عفت و امانت کو حاصل تھا یہاں تک کہ ان طبقوں کے جن لوگوں کے احوال و کوائف غیر معلوم تھے (جنہیں اصطلاح میں مستور الحال کہا جاتا ہے) ان کو بھی "عادل" مانا گیا ہے، یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کسی شاذ و نادر کے بارے میں ایسا نہ کہا جائے کیونکہ ان طبقوں کے لوگ بھی بہرحال غیر "معصوم" انسان تھے۔ پھر ان تینوں طبقوں میں سے بھی طبقۂ اول یا قرن اول کے لوگ یعنی "صحابۂ کرام" کی عظمت و منزلت کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں، ان کی تعظیم و تکریم کرنا ہر امتی پر لازم ہے۔ یہ حکم ان کی زندگی میں بھی ہر مسلمان کے لئے تھا اور ان کے مرنے کے بعد بھی باقی رہا اور قیامت تک اسی طرح باقی رہے گا، کوئی شخص علم و فضل، ذہانت و ذکاوت تقوی و پرہیزگاری اور عزیمت و استقامت کے کتنے ہی بلند سے بلند تر مقام پر پہنچ جائے مگر وہ "صحابیٔ رسول" کا ہمسر نہیں ہو سکتا، صحابیٔ رسول کا ناقد نہیں بن سکتا، اور صحابۂ رسول کے عمل و کردار کی نکتہ چینی نہیں کر سکتا، اگر کوئی شخص ایسی جرأت کرتا ہے تو وہ ارشاد رسول ﷺ کے خلاف کرتا ہے، اور صحابۂ رسول کی عزت و حرمت کو مجروح کرنے کے سبب اپنا ایمان خطرہ میں ڈالتا ہے۔ بلاشبہ صحابۂ کرام اُمت کے وہ سب سے برگزیدہ اور نیک ترین فرد ہیں جو بارگاہ رسالت کے مصاحب، خادم اور حاضر باش تھے۔ جو ذات رسالت پناہ ﷺ کے علم و عمل کے براہ راست خوشہ چین اور تربیت یافتہ تھے، ان میں سے جن لوگوں کو صحبت و خدمت کا شرف حاصل نہیں ہوا اور محض جمال باکمال کے دیدار ہی کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ ان کا مقام بھی اُمت کے بڑے سے بڑے عالم و فاضل عابد و زاہد اور غازی و مجاہد سے بڑھ کر ہے، شیخ ابو طالب مکیؒ نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ: جمال رخ مصطفیٰ ﷺ پر پڑنے والی ایک نظر سے اتنا کچھ حاصل ہو جاتا تھا اور مطلب براری کی وہ دولت مل جاتی تھی جو اوروں کو بڑے بڑے چلوں اور خلوتوں سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی، ایمان عیانی اور یقین شہودی کا جو مقام ان کو نصیب تھا۔ اس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں۔

"اس کے بعد جھوٹ ظاہر ہو جائے گا" یعنی ان تینوں زمانوں میں تو دین اپنی بالکل اصلی حالت میں رہے گا اور اخلاص و للّٰہیت سے سارے کام انجام پاتے رہیں گے، لیکن قرن ثالث یعنی تبع تابعین کے زمانہ کے بعد جو زمانہ آئے گا وہ دین و دیانت کے لئے محفوظ و مامون نہیں ہو گا۔ گویا اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تبع تابعین کے قرن کے خاتمہ کے بعد بدعات اور نفسانی خواہشات و جذبات کی کارفرمائی کا دور شروع ہو جائے گا، اگرچہ غیر اسلامی افکار و نظریات کے حامل لوگوں جیسے معتزلہ، ریہ اور مرجیہ وغیرہ کا ظہور و شیوع اور بعد کے زمانوں میں ہوا لیکن ان سے پہلے بدعات اور خود رائی کا ظہور و شیوع ہو چکا تھا۔

"جماعت کو لازم پکڑے" میں جماعت سے مراد ملت کا سواد اعظم ہے۔ مطلب یہ کہ دینی و ملی مسائل و معاملات میں انہی اصول و تعلیمات کو راہنما بنایا جائے، جو جمہور صحابہ و تابعین اور سلف صالحین سے منقول ہیں اور انہی کی متابعت اختیار کی جائے ان سے صرف نظر کر کے خود رائے بننا اپنے آپ کو شیطان کا کھلونا بنانا ہے۔ پس اس حکم میں صحابہؓ و تابعین اور سلف صالحین کی محبت اور ان کی تعظیم و توقیر بھی شامل ہے۔

"وہ مؤمن ہے" یعنی مؤمن کامل کی علامت یہ ہے کہ نیکی کرنے سے خوش و مطمئن ہو اور اگر بدی وجود میں آئے تو رنجور و ناخوش ہو۔ اسی بات کو علماء نے دل کے زندہ و حساس ہونے کی علامت قرار دیا ہے، چنانچہ جو شخص نہ تو نیکی سے خوش ہوتا ہے اور نہ بدی سے ناخوش و مضطرب ہوتا ہے وہ ایسے انسان کی مانند ہے جس کا دل مر چکا ہو، جس کے احساسات فنا ہو چکے ہوں، جیسا کہ منافق، جو قیامت و آخرت کے عقیدہ سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک نیکی اور بدی دونوں برابر ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ۔

"اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی۔"

صحابہؓ و تابعین کی فضیلت

(۶) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَمَسُّ النَّارُ مُسْلِمًا رَاٰنِيْ اَوْرَاٰى مَنْ رَاٰنِيْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اس مسلمان کو (دوزخ کی) آگ نہ چھوئے گی جس نے مجھ کو دیکھا ہو یا اس شخص کو دیکھا ہو جس نے مجھ کو دیکھا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ جس شخص نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا یا آنحضرت ﷺ کو دیکھنے والے یعنی صحابی کو دیکھا وہ جنت میں جائے گا بشرطیکہ اس کا خاتمہ ایمان و اسلام پر ہوا ہو، اس شرط کی بنیاد پر (کہ خاتمہ ایمان و اسلام پر ہوا ہو) آنحضرت ﷺ کی اس بشارت کے پیش نظر صحابی و تابعی تو جنتی ہیں ہی لیکن حق تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ ہر مسلمان جنتی ہے۔ واضح رہے کہ کسی کے جنتی ہونے کی امید رکھی جاتی ہے جو ایمان و اسلام کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا لیکن کچھ مخصوص لوگ ایسے ہیں جن کے جنتی ہونے کی واضح بشارت آنحضرت ﷺ نے اس طرح دی ہے کہ اسی دنیا میں بتایا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ یقینی طور پر جنتی ہیں جیسے عشرۂ مبشرہ، یا جیسے صحابہ و تابعین کے بارے میں آپ ﷺ نے اس حدیث میں عمومی بشارت عطا فرمائی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی بشارت سے دوسرے مسلمان محروم ہیں، درحقیقت جب آپ ﷺ نے احساس فرمایا کہ صحابہ و تابعین کے بارے میں یہ بشارت دیکھ کر وہ مسلمان کہ جن کو نہ بارگاہ رسالت کی حاضری و صحبت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اور نہ رویت صحابہؓ سے مشرف ہوئے ہیں آپ محرومی پر دل گیر ہوں گے تو آپ ﷺ نے ان کو تسلی کے لئے فرمایا طُوْبٰى لِمَنْ رَاٰنِيْ وَاٰمَنَ بِيْ مَرَّةً وَطُوْبٰى لِمَنْ لَّمْ يَرَنِيْ وَاٰمَنَ بِيْ سَبْعَ مَرَّاتٍ۔

صحابہؓ کے فضائل

(۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِيْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ وَمَنْ اٰذَاهُمْ فَقَدْ اٰذَانِيْ وَمَنْ اٰذَانِيْ فَقَدْ اٰذَى اللّٰهَ وَمَنْ اٰذَى اللّٰهَ فَيُوْشِكُ اَنْ يَّاْخُذَهٗ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مغفلؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (پوری اُمّت کو خطاب کر کے) فرمایا: اللہ سے ڈرو، پھر اللہ سے ڈرو میرے صحابہؓ کے حق میں، میرے بعد تم ان (صحابہؓ) کو نشانہ ملامت نہ بنانا (یاد رکھو) جو شخص ان کو دوست رکھتا ہے، تو وہ میری وجہ سے ان کو دوست رکھتا ہے اور جو شخص ان سے دشمنی رکھتا ہے، تو وہ مجھ سے دشمنی رکھنے کے سبب ان کو دشمن رکھتا ہے۔ اور جس شخص نے ان کو اذیت پہنچائی اس نے گویا مجھ کو اذیت پہنچائی اور جس شخص نے مجھ کو اذیت پہنچائی اس نے گویا خدا کو اذیت پہنچائی اور جس شخص نے خدا کو اذیت پہنچائی تو وہ دن دور نہیں جب خدا اس کو پکڑے گا، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "اللہ سے ڈرو" یہ الفاظ آپ ﷺ نے تاکید و مبالغہ کے لئے دوبار ارشاد فرمائے صحابہؓ کے حق میں اللہ سے ڈرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی عزت و توقیر کی جائے۔ ان کی عظمت و فضیلت کو ہر حالت میں ملحوظ رکھا جائے، اور صحبت رسول کا جو بلند ترین مقام ان کو حاصل ہے اس کا حق ادا کیا جائے۔

"نشانہ ملامت نہ بناؤ" کا مطلب یہ ہے کہ ان کی طرف بدگوئی کے تیر مت پھینکو، ان کی عظمت کے منافی کوئی بات زبان سے نہ نکالو، ان کی عیب جوئی اور نکتہ چینی سے پرہیز کرو۔

"میری وجہ سے ان کو دوست رکھتا ہے" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ان کو دوست رکھنے والا اس سبب سے دوست رکھتا ہے کہ میں

ان کو دوست رکھتا ہوں، یا یہ مطلب ہے کہ ان کو دوست رکھنے والا اس سبب سے دوست رکھتا ہے۔ کہ میں ان کو دوست رکھتا ہوں یہ مطلب اگلے جملہ کے سیاق میں زیادہ موزوں ہے، بہر حال اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ میرے صحابہؓ کو دوست رکھنے والا مجھ کو دوست رکھنے والا ہے، اور میرے صحابہؓ کو دشمن رکھنے والا مجھ کو دشمن رکھنے والا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مالکیہ کا یہ مسلک حق ہے کہ جس شخص نے صحابہؓ کو برا کہا وہ دنیا میں واجب القتل قرار پاتا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ کسی ذات سے محبت کے صحیح و صادق ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ محبّت محبوب کی ذات سے گزر کر اس کے متعلقین تک پہنچ جائے، پس حق تعالیٰ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ اس کے رسول سے بھی محبت ہو اور رسول سے محبّت کی علامت یہ ہے کہ اس کے آل و اصحاب سے بھی محبت ہو۔

"جب خدا اس کو پکڑے گا" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے اس جذبہ و عمل کے ذریعہ یہ ظاہر کرے گا کہ گویا وہ خدا کی اذیت پہنچانے کے پے درپے ہے تو وہ شخص خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا یعنی آخرت میں تو وہ عذاب خداوندی میں گرفتار ہو گا ہی اس دنیا میں بھی اس کو عذاب بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث شائد اس ارشاد خداوندی سے ماخوذ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۔

"بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ ایمان والے مردوں کو اور ایمان لانے والی عورتوں کو بدون اس کے کہ انہوں نے کچھ کیا ہو ایذا پہنچاتے ہیں تو وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا بار لیتے ہیں۔"

صحابہؓ اور اُمّت کی مثال

⑧ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ اَصْحَابِىْ فِىْ اُمَّتِىْ كَالْمِلْحِ فِى الطَّعَامِ لَا يَصْلُحُ الطَّعَامُ اِلَّا بِالْمِلْحِ قَالَ الْحَسَنُ فَقَدْ ذَهَبَ مِلْحُنَا فَكَيْفَ نَصْلُحُ رَوَاهُ فِىْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میری اُمّت کے درمیان میرے صحابہ کی مثال کھانے میں نمک کی سی ہے کھانا اس وقت تک اچھا یعنی خوش ذائقہ نہیں ہوتا جب تک اس میں نمک نہ ہو" حضرت حسن بصریؒ نے (اس حدیث کو سن کر) فرمایا ہمارا نمک جاتا رہا پھر ہم اچھے کیسے ہوں۔ اس روایت کو بغویؒ نے (اپنی اسناد سے) شرح السنۃ میں نقل کیا ہے (اسی طرح ابو یعلیٰؒ نے بھی اس روایت کو اپنی مسند میں حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت حسن بصریؒ نے اس حدیث کو سن کر اپنا جو تاثر بیان کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ اُمّت کے درمیان صحابہ کا وجود چونکہ اُمّت کے بناؤ اور سنوار کا ضامن تھا اس لئے اب جب کہ صحابہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہم اچھے اور سنورے ہوئے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کے اس تاثر میں زبردست حسرت ہے اور انہوں نے اس حسرت کا اظہار اس حقیقت کے باوجود کیا کہ ان کے زمانہ میں کچھ صحابہؓ موجود تھے۔ واضح رہے کہ حضرت حسن کا انتقال ۱۱۰ھ میں ہوا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے حضرت حسن بصریؒ کے اس حسرت آمیز قول کو نقل کرنے کے بعد بڑی عارفانہ بات کہی ہے کہ اگرچہ اس دنیا میں اور اُمّت کے درمیان صحابہؓ موجود نہیں ہیں لیکن ہم اچھے بن سکتے ہیں اور سنور سکتے ہیں ان کے اقوال و ارشادات سے، ان کی نقل کردہ روایتوں سے، ان کے بلند کردار و حالات کی روشنی سے اور ان کے اخلاق و اوصاف کی پیروی سے کیونکہ اصل اعتبار تو ان ہی چیزوں کا

ہے نہ کہ ذات و اجسام کا۔

قیامت کے دن جو صحابی جہاں سے اٹھے گا وہاں کے لوگوں کو جنّت لے جائے گا

(۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اَحَدٍ مِنْ اَصْحَابِيْ يَمُوْتُ بِاَرْضٍ اِلَّا بُعِثَ قَائِدًا وَنُوْرًا لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ ابْنِ مَسْعُوْدٍ لَا يُبَلِّغُنِيْ اَحَدٌ فِيْ بَابِ حِفْظِ اللِّسَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن بریدہ اپنے والد (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میرے صحابہؓ میں سے جو شخص جس زمین میں مرے گا وہاں اپنی قبر سے قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس زمین کے لوگوں کو جنت کی طرف کھینچ کر لے جانے والا ہو گا، اور ان کے لئے نور (یعنی جنت کا راستہ دکھانے والا) ہو گا" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کردہ حدیث لا یبلغنی احد الخ (جس میں صحابہؓ کا ذکر ہے اور جس کو صاحب مصابیح نے اس باب میں نقل کیا تھا) پیچھے باب حفظ اللسان میں نقل کی جا چکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

صحابہؓ کو برا کہنے والا مستوجب لعنت ہے

(۱۰) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَيْتُمُ الَّذِيْنَ يَسُبُّوْنَ اَصْحَابِيْ فَقُوْلُوْا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى شَرِّكُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو برا کہتے ہیں تو تم کہو اللہ کی لعنت ہو تمہاری بری حرکت پر"۔ (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ صحابہؓ کو برا کہنے والے کی برائی (لعنت) خود اسی کی طرف لوٹ جاتی ہے کیونکہ فتنہ و شر والا تو وہی ہوتا ہے۔ جب کہ صحابہؓ اہل خیر میں سے ہیں اور اس اعتبار سے وہ صرف رضا و رحمت کے سزاوار ہیں نیز حدیث میں مذکور حکم اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اس شخص (کہ جو صحابہؓ کو برا کہے) کی ذات پر لعنت کرنے کے بجائے اس کے فعل پر لعنت کرنا احتیاط کے قرین ہے۔

مذکورہ بالا روایت کو ترمذیؒ کے علاوہ خطیبؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ نیز ابن عدیؒ نے حضرت عائشہ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ:

اِنَّ اَشْرَارَ اُمَّتِيْ اَجْرَؤُهُمْ عَلٰى اَصْحَابِيْ۔

"بلا شبہ میری اُمت کے برے لوگ وہ ہیں جو میرے صحابہؓ کے بارہ میں گستاخ ہیں۔"

ایک اور حدیث مرفوع میں ہے کہ:

يَكُوْنُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ يُسَمُّوْنَ الرَّافِضَةَ يَرْفِضُوْنَ الْاِسْلَامَ فَاقْتُلُوْهُمْ فَاِنَّهُمْ مُشْرِكُوْنَ۔

"آخر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن کو "رافضی" کہا جائے گا یہ لوگ اسلام کے تارک ہوں گے پس تم ان کو قتل کرنا کیونکہ وہ شرک ہیں۔"

ایک اور روایت میں یوں فرمایا گیا ہے:

وَيَنْتَحِلُوْنَ حُبَّ اَهْلِ الْبَيْتِ وَلَيْسُوْ كَذٰلِكَ وَاٰيَةُ ذٰلِكَ اَنَّهُمْ يَسُبُّوْنَ اَبَابَكْرٍ وَ عُمَرَ۔

"اور وہ لوگ اہل بیت کی صحبت کا دعویٰ کریں گے، حالانکہ وہ ایسے نہیں ہوں گے۔ ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ وہ ابوبکرؓ و عمرؓ کو برا کہیں گے۔"

اس دنیا میں ایسے لوگوں کا پیدا ہونا، جو بعض جلیل القدر صحابہؓ کو برا کہتے ہیں جیسے روافض یا بعض جلیل القدر اہل بیت کے بارے میں برے عقائد و خیالات رکھتے ہیں اور بدگوئی کرتے ہیں جیسے خوارج، شائد اس حکمت کے تحت ہے کہ جب وہ جلیل القدر ہستیاں اس دنیا سے رخصت ہوگئیں اور ان کے نیک اعمال کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو حق تعالیٰ نے چاہا کہ ان کے نامۂ اعمال میں ثواب کا اضافہ ہمیشہ جاری رہے تاکہ جنت میں ان کے درجات بلند سے بلند تر ہوتے رہیں اور ان کے دشمن سخت سے سخت اور زیادہ سے زیادہ عذاب سے دوچار ہوں۔ لہٰذا ان جلیل القدر ہستیوں کو برا کہنے والے ان کے ثواب کے اس اضافہ کا سبب بنتے ہیں اور خود اپنے گرد عذاب کا گھیرا سخت سے سخت کرتے جاتے ہیں۔

صحابہؓ کی اقتداء ہدایت کا ذریعہ ہے

(۱۱) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ سَاَلْتُ رَبِّيْ عَنْ اِخْتِلَافِ اَصْحَابِيْ مِنْ بَعْدِيْ فَاَوْحٰى اِلَيَّ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ اَصْحَابَكَ عِنْدِيْ بِمَنْزِلَةِ النُّجُوْمِ فِي السَّمَاءِ بَعْضُهَا اَقْوٰى مِنْ بَعْضٍ وَلِكُلٍّ نُوْرٌ فَمَنْ اَخَذَ بِشَيْءٍ مِمَّا هُمْ عَلَيْهِ مِنْ اِخْتِلَافِهِمْ فَهُوَ عِنْدِيْ عَلٰى هُدًى قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ فَبِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت عمر بن خطابؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، میں نے اپنے پروردگار سے اپنے صحابہؓ کے درمیان اختلاف کے بارے میں پوچھا جو (شریعت کے فروعی مسائل میں) میرے بعد واقع ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ مجھ کو آگاہ کیا کہ اے محمد! حقیقت یہ ہے کہ تمہارے صحابہؓ میرے نزدیک ایسے ہیں جیسے آسمان پر ستارے، (جس طرح) ان ستاروں میں سے اگرچہ بعض زیادہ قوی یعنی زیادہ روشن ہیں لیکن نور (روشنی) ان میں سے ہر ایک میں ہے (اسی طرح صحابہؓ میں سے ہر ایک اپنے اپنے مرتبہ اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق نور ہدایت رکھتا ہے) پس جس شخص نے (علمی و فقہی مسائل میں) ان اختلاف میں سے جس چیز کو بھی اختیار کر لیا میرے نزدیک وہ ہدایت پر ہے حضرت عمرؓ کہتے ہیں، اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں (پس تم ان کی پیروی کرو) ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے۔" (رزین)

تشریح: "ایسے ہیں جیسے آسمان کے ستارے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح گھپ اندھیری رات میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے مسافروں کو دریا و جنگل کے راستوں کا نشان بتاتے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (اور ستاروں کے ذریعہ وہ راستہ پاتے ہیں) میں اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح صحابہؓ بھی سچائی کے راستے کو ظاہر کرنے اور برائی کے اندھیروں کو دور کرنے والے ہیں کہ ان کے نورانی وجود، ان کے اخلاق و کردار اور ان کے روایات و تعلیمات کی روشنی میں راہ حق نمودار ہوتی ہے اور بدی کا اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔

"میرے نزدیک وہ ہدایت پر ہے" اس سے ثابت ہوا کہ ائمہ دین کا باہمی اختلاف اُمت کے لئے رحمت ہے، لیکن جیسا کہ طیبیؒ نے وضاحت کی ہے۔ اختلاف سے مراد وہ اختلاف ہے جو دین کے فروعی و ذیلی مسائل میں ہو نہ کہ اصول دین میں، اور سید جمال الدین نے لکھا ہے: بظاہر یہ بات زیادہ صحیح ہے کہ اس حدیث میں صحابہ کے جس اختلاف کی طرف اشارہ ہے، اس سے وہ اختلاف مراد ہے۔ جو دینی معاملات و مسائل میں رونما ہو نہ کہ وہ اختلافات جو دنیوی معاملات میں رونما ہوئے۔ اس وضاحت کی روشنی اس اختلاف پر کوئی اشکال

وارد نہیں ہوگا، جو خلافت و امارت کے سلسلہ میں بعض صحابہؓ کے درمیان رونما ہوئے۔

لیکن اس موقع پر ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ خلافت و امارت سے متعلق رونما ہونے والے اختلافات بھی "فروع دین میں اختلاف" کے زمرہ میں آتے ہیں کیونکہ اس بارے میں ان کے درمیان جو اختلاف واقع ہوا وہ اجتہادی تھا نہ کہ کسی دنیاوی غرض اور نفسانی جذبہ و خواہش کے تحت، جیسا دنیاوی بادشاہوں کے ہاں ہوتا ہے۔

"جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے" چونکہ ولکل نور (نور ان میں سے ہر ایک میں ہے) کے ذریعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ہر صحابی اپنے اپنے مرتبہ و استعداد کے مطابق علم و فقہ کا نور ہدایت ضرور رکھتا ہے اور اس اعتبار سے کوئی بھی صحابی دین و شریعت کے علم سے خالی نہیں ہے، اس لئے جو بھی صحابی اپنے مرتبہ و استعداد کے مطابق دین و شریعت کی جو بھی بات بیان کرتا ہے۔ اس کی پیروی ہدایت کی ضامن ہوگی۔

واضح رہے کہ اس حدیث اصحابی کالنجوم الخ میں علماء نے کلام کیا ہے، چنانچہ ابن حجرؒ نے اس حدیث پر طویل گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف واہی ہے بلکہ ابن حزمؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ یہ حدیث موضوع باطل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بیہقیؒ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ مسلم کی ایک حدیث سے اس حدیث کے بعض معنی ثابت ہوتے ہیں، مسلمؒ کی حدیث میں ہے: النجوم امنة السماء (ستارے آسمان کے محافظ و امین ہیں) اور پھر اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں: واصحابی امنة لامتی (اور میرے اصحاب میری اُمت کے امین و محافظ ہیں)۔

باب مناقب ابی بکرؓ

حضرت ابوبکرؓ کے مناقب و فضائل کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِنْ اَمَنِ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِهٖ وَمَالِهٖ اَبُوْبَکْرٍ وَعِنْدَ الْبُخَارِیِّ اَبَابَکْرٍ وَّلَوْکُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلاً لَاتَّخَذْتُ اَبَابَکْرٍ خَلِیْلاً وَّلٰکِنْ اُخُوَّةُ الْاِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهٗ لَا تُبْقَیَنَّ فِی الْمَسْجِدِ خَوْخَةٌ اِلَّا خَوْخَةُ اَبِیْ بَکْرٍ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَوْکُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلاً غَیْرَ رَبِّیْ لَاتَّخَذْتُ اَبَابَکْرٍ خَلِیْلاً۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابو سعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: انسانوں میں سب سے زیادہ جس شخص نے میرا ساتھ دیا اور میری خدمت میں اور میری خوشنودی میں اپنا وقت اور اپنا مال سب سے زیادہ لگایا وہ ابوبکر، یا بخاری کی روایت کے مطابق ابابکر ہیں۔ اگر میں کسی شخص کو اپنا خلیل یعنی سچا جانی دوست بناتا تو یقیناً ابوبکر کو ایسا دوست بناتا تاہم اسلامی اخوت و محبت اپنی جگہ (بلند تر) ہے۔ مسجد نبوی میں ابوبکرؓ کے گھر کی کھڑکی یا روشندان کے علاوہ اور کوئی کھڑکی یا روشندان باقی نہ رکھا جائے" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) اگر میں اللہ کے سوا کسی کو اپنا خلیل بناتا تو یقیناً ابوبکر ہی کو خلیل بناتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "وہ ابوبکر ہیں" مطلب یہ کہ جس لگن اور تندہی کے ساتھ ابوبکرؓ نے میری خدمت گزاری کی اور جس ایثار و اخلاص کے ساتھ میری ذات پر یا میری رضا و خوشنودی کے لئے دین کی راہ میں اپنا مال بے دریغ خرچ کیا وہ ان کا ایسا امتیازی وصف ہے جو میرے تمام صحابہ اور میری پوری اُمت میں ان کو سب سے بلند و برتر مقام عطا کرتا ہے۔

"خلیل" کو اگر خُلَّةٌ سے مشتق مانا جائے تو اس کے معنی سچے اور جانی دوست کے ہوں گے۔ خُلَّةٌ کا لفظ دراصل "سرایت کر جانے

والی دوستی اور محبت" کا مفہوم رکھتا ہے، یعنی وہ سچی دوستی و محبت جو محب کے دل کے اندر اس طرح سرایت کر جائے کہ محبوب کو محب کے ظاہر تو ظاہر باطن یعنی جذبات خیالات اور احساسات تک پر حکمران اور اس کا محرم اسرار بنا دینے کا تقاضا کرے۔ پس آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ: اگر میرے لئے روا ہوتا کہ میں مخلوق میں سے کسی کو اس صفت کے ساتھ اپنا سچا جانی دوست بناؤں کہ اس کی محبت میرے دل کے اندر تک سرایت کر جائے اور وہ میرا محرم اسرار بن جائے تو یقیناً میں ابوبکر کو اپنا اسی طرح کا دوست بناتا کیونکہ وہ دوستی کی اس صفت کی استعداد اور اہلیت رکھتے ہیں لیکن اس درجہ وصف کی محبت کا میرا تعلق صرف خدا کے ساتھ ہے۔ کہ اسی کی محبت میرے ظاہر پر بھی حکمران ہے اور میرے باطن پر بھی اور وہی میرا محرم اسرار ہے ہاں ظاہر دل کی محبت کا میرا جو تعلق تمام مسلمانوں کے ساتھ ہے اس میں ابوبکرؓ کا مقام یقیناً سب سے اونچا ہے۔

یا یہ کہ "خلیل" دراصل خَلَّۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی "احتیاج" کے ہیں اس صورت ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہوگا کہ: اگر میں کسی کو اپنا ایسا دوست بناتا کہ جس کی طرف میں اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے وقت رجوع کروں اور اپنے معاملات و مہمات میں اس پر اعتماد و اعتبار کروں تو یقیناً ابوبکرؓ کو ایسا دوست بناتا لیکن ایسے تمام امور و معاملات میں میرا واحد رجوع اللہ کی طرف ہے اور تمام احوال و مہمات میں میرا واحد سہارا اور ملجا اسی کی ذات ہے۔ ہاں اسلامی اخوت و محبت کا جو میرا ظاہری و قلبی تعلق پوری اُمت کے ساتھ ہے۔ اس میں ابوبکرؓ کا مقام یقیناً سب سے بلند ہے۔ یہ دوسرے معنی اگرچہ سیاق حدیث سے زیادہ قربت و مناسبت رکھتے ہیں لیکن محدثین نے پہلے ہی معنی کو اوجہ و اولیٰ قرار دیا ہے۔

"ابوبکرؓ کے گھر کی کھڑکی یا روشن دان کے علاوہ" حدیث میں یہاں خَوْخَة کا لفظ ہے جس کے معنی "روشن دان" کے ہیں۔ یعنی (سوراخ) جو گھر یا کمرہ کی روشنی کے لئے دیوار میں کھولا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ خوخہ کے معنی دریچہ یعنی کھڑکی کے ہیں۔ ابتدا میں مسجد نبوی سے ملے ہوئے جو مکان تھے ان کی کھڑکیاں مسجد شریف کی جانب کھلی ہوئی تھیں جن کے ذریعہ مسجد آتے جاتے تھے، یا ان کے مکانوں میں مسجد شریف کی جانب ایسے روشن دان کھلے ہوئے تھے۔ جن کے ذریعہ مسجد کا اندرونی حصہ نظر آتا تھا اور ان مکانوں کے مکین اپنے انہی روشن دانوں کے ذریعہ دیکھ لیا کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف لائے ہیں یا نہیں۔ پس آنحضرت ﷺ نے مرض وفات میں جو آخری خطبہ ارشاد فرمایا اس میں یہ حکم دیا کہ مسجد کی جانب گھروں کی کھڑکیاں یا روشن دان بند کر دیئے جائیں صرف ابوبکرؓ کے گھر کی کھڑکی یا روشن دان کھلا رہے۔ اس حکم کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت اور ان کی تکریم کا اظہار تو مقصود تھا ہی لیکن اصل میں یہ اس بات سے کنایہ بھی تھا کہ میرے بعد اُمت کی سربراہی و قیادت اور امامت کبریٰ یعنی خلافت کے لئے ابوبکرؓ کو منتخب کیا جائے اور اس مسئلہ میں بحث و گفتگو اور اختلاف و نزاع کا دروازہ کسی طرف سے نہ کھولا جائے منقول ہے کہ آپ ﷺ کا یہ حکم سن کر جب کچھ لوگوں نے کلام کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں کہی ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہی ہے۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے (یہ حکم سن کر) درخواست کی کہ مجھے اپنی دیوار میں ایک روشندان کھلا رکھنے کی اجازت عطا فرمائی جائے تاکہ اس کے ذریعہ مجھے مسجد میں آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کا علم ہو جایا کرے تو آپ نے فرمایا: نہیں سوئی کے ناکہ کے برابر بھی سوراخ کھلا نہ رکھا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کے بارے میں روایتوں کا اختلاف: حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے صحیح بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ متعدد طرق سے ایسی حدیثیں منقول ہیں جو بظاہر اس حدیث کے مخالف و معارض نظر آتی ہیں جس میں حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں یہ حکم ہے کہ مسجد نبوی کی جانب ان کے گھر کی کھڑکی یا روشن دان کے علاوہ اور کوئی کھڑکی یا روشن دان باقی نہ رکھا جائے۔ ان میں ایک حدیث تو وہ ہے جو حضرت سعد ابن وقاصؓ سے منقول ہے کہ "رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ کے گھروں کے ان دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا جو مسجد نبوی کے جانب تھے لیکن حضرت علیؓ کے گھر کے دروازے کو کھلا رہنے دیا" اس حدیث کو احمدؒ اور نسائی نے نقل کیا ہے اور

اس کی اسناد کے قوی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ نیز طبرانی نے اوسط میں ثقہ راویوں کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ صحابہؓ جمع ہو کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے اور صحابہؓ کے دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا لیکن علیؓ کے دروزے کو کھلا رہنے دیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دروازے نہ میں نے بند کروائے ہیں نہ کھلا رہنے دیا ہے بلکہ خدا نے بند کرائے ہیں اور کھلا رہنے دیا ہے در حقیقت اللہ کی طرف سے مجھے حکم ہے کہ علیؓ کے دروزے کے علاوہ اور سب دروازے بند کرادوں، اسی طرح کی روایت احمدؒ اور نسائیؒ نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے نقل کی ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ ان تین سے ہر ایک حدث قابل حجت اور لائق استناد ہے خصوصاً اس صورت میں کہ ان میں سے بعض حدیث کو بعض حدیث سے مزید قوت ملی ہوئی ہے۔ ابن حجرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو حدیث حضرت علیؓ کی شان میں وارد ہوتی ہے، اس کو ابن جوزیؒ نے موضوع (گڑھی ہوئی) قرار دیا ہے، اور اس کے بعض طرق میں اس بناء پر کلام کیا ہے کہ یہ حدیث ان صحیح احادیث کے معارض ہے۔ جو حضرت ابوبکرؓ کی شان میں منقول ہیں اور کہا ہے کہ روافض نے حضرت ابوبکرؓ کی شان میں منقول ہے احادیث کے مقابلہ پر حدیث وضع کی ہے لیکن ابن حجرؒ نے ابن جوزیؒ کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا ہے اور کہا ہے کہ محض اس مفروضہ کی بنا پر کہ یہ حدیث حضرت ابوبکرؓ سے متعلق حدیث کے معارض ہے۔ اس کو موضوع قرار دینا مناسب نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے متعلق حدیث ایسے طرق کثیرہ سے منقول ہے جن میں سے بعض طرق حد صحت کو پہنچے ہوئے ہیں اور بعض مرتبہ حسن کو، دراصل ابن حجرؒ بنیادی طور پر اس بات کو نہیں مانتے کہ ان دونوں حدیثوں کے مابین کوئی تعارض و تضاد ہے۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ حضرت علیؓ سے متعلق اس حدیث اور حضرت ابوبکرؓ کی شان میں منقول حدیث کے درمیان کسی طرح کا معارضہ نہیں ہے اور وجہ توافق انہوں نے یہ لکھی ہے کہ دوسرے صحابہؓ کے دروازوں کو بند کرنے کا حکم اور حضرت علیؓ کے دروزے کے کھلا رہنے کی اجازت اس ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے جب مسجد نبوی نئی نئی بنی تھی، حضرت علیؓ کا مکان بھی مسجد نبوی سے ملحق تھا اور اس مکان کا دروازہ مسجد کی طرف اس طرح تھا کہ حضرت علیؓ مسجد میں سے گزر کر اپنے مکان میں آتے جاتے تھے۔ اور بطریق صحت منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کے سامنے فرمایا تھا، اس مسجد میں کوئی جنبی (ناپاکی کی حالت میں کوئی شخص) نہ آئے البتہ مجھے اور تمہیں اس مسجد میں سے گزر کر اپنے گھر آنے جانے کی اجازت ہے۔ رہی اس حدیث کی بات جس میں حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ اور گھروں کی کھڑکیاں اور روشندان بند کرانے کا حکم منقول ہے، تو یہ ارشاد گرامی اس آخری زمانے کا ہے جب آنحضرت ﷺ مرض وفات میں تھے اور انتقال سے دو تین دن پہلے آپ ﷺ نے یہ حکم صادر فرمایا تھا۔ اس بات کی اصل وہ روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کے علاوہ اور سب دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا تو حضرت حمزہؓ ابن عبد المطلب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، دراصل اس وقت حضرت حمزہؓ آشوب چشم میں مبتلا تھے اور ان کی آنکھوں سے پانی بہا کرتا تھا اور اسی بناء پر ان کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے مذکورہ حکم کی تعمیل میں کچھ توقف ہو گیا تھا، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے اپنے چچا کو (یعنی مجھے) تو باہر کر دیا اور چچا کے بیٹے (یعنی ابن ابوطالب ابن عبد المطلب) کو اندر رکھا؟ آنحضرت ﷺ نے (ان کی یہ بات سن کر) فرمایا: چچا جان! حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں میرا کوئی اختیار نہیں ہے، میں نے وہی کیا ہے، جو مجھے حکم دیا گیا ہے۔ پس اس واقعہ میں حضرت حمزہؓ کے ذکر سے ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ سے متعلق مذکورہ حدیث بالکل ابتدائی زمانہ کی ہے کیونکہ حضرت حمزہؓ غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے جو ۳ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت ابوبکر افضل صحابہ ہیں

① وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْكُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا وَلٰكِنَّهُ اَخِيْ وَصَاحِبِيْ وَقَدِ اتَّخَذَ اللّٰهُ صَاحِبَكُمْ خَلِيْلًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر میں کسی کو "خلیل" بناتا تو ابوبکرؓ کو

"خلیل" بناتا، تاہم ابوبکر میرے بھائی ہیں اور میرے رفیق و ساتھی ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے صاحب کو (یعنی مجھ کو) اللہ نے اپنا خلیل بنالیا ہے"۔ (مسلمؒ)

تشریح: امام احمد ابن حنبلؒ کی روایت میں یوں ہے کہ: اَخِيْ فِي الدِّيْنِ وَصَاحِبِيْ فِي الْغَارِ ابوبکر میرے دینی بھائی ہیں اور میرے یار غار ہیں اور سند ابویعلیٰ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں:

ابوبکر صاحبی ومونسی فی الغار سدوا کل خوخة فی المسجد غیر خوخة ابی بکرؓ۔

"ابوبکر میرے غار کے رفیق اور مونس ہیں، مسجد کی جانب تمام کھڑکیاں یا روشن دان بند کردیئے جائیں علاوہ ابوبکر کی کھڑکی یا روشن دان کے۔"

اس روایت کو ابوحاتمؒ نے بھی نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد: سدوا الخ دراصل اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ میرے بعد خلافت کا پہلا استحقاق ابوبکر کا ہے ان کے علاوہ باقی تمام لوگوں کی آرزوئے خلافت کا دروازہ بند ہے۔

"اللہ نے اپنا خلیل بنالیا ہے" پہلی حدیث سے تو یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ کو اپنا خلیل بنایا ہے اور یہاں اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ نے آنحضرت ﷺ کو اپنا خلیل بنایا، اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ جو شخص محبت میں صادق و خالص ہوتا ہے وہ خود مرتبۂ محبوبیت کو پہنچ جاتا ہے یحبھم ویحبونہ ۔

ہر کہ او در عشق صادق آمدہ است　　بر سرش معشوق عاشق آمدہ است

دراصل آنحضرت ﷺ "حبیب اللہ" تھے اور "حبیب" اس محبت کو کہتے ہیں جو مرتبۂ محبوبیت کو پہنچ جائے، بعض حضرات خلت کو اعلیٰ اخص قرار دیتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کو مرتبہ محبت اور خلت کا جامع کہتے ہیں۔ نیز امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خلت سے زیادہ کامل اور اتم ہے، بہرحال مذکورہ بالا حدیث اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ افضل صحابہ ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے حق میں خلافت کی وصیت

③ وَعَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَرَضِهٖ اُدْعِيْ لِيْ اَبَابَكْرٍ اَبَاكِ وَاَخَاكِ حَتّٰى اَكْتُبَ كِتَابًا فَاِنِّيْ اَخَافُ اَنْ يَّتَمَنّٰى مُتَمَنٍّ وَيَقُوْلُ قَائِلٌ اَنَا وَلَا وَيَاْبَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَابَكْرٍ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ اَنَا اَوْلٰى بَدَلَ اَنَا وَلَا۔

"اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے مرض وفات میں (ایک دن) مجھ سے فرمایا کہ اپنے باپ ابوبکرؓ اور اپنے بھائی (عبدالرحمٰنؓ) کو میرے پاس بلوالو کہ میں ایک تحریر لکھوادوں، دراصل مجھ کو اندیشہ ہے کہ (اگر میں نے ابوبکر کی خلافت کے بارے میں نہ لکھوایا تو) کہیں خلافت کا کوئی آرزو مند آرزو نہ کرے، اور کوئی کہنے والا یہ نہ کہے کہ (خلافت کا مستحق) میں ہوں حالانکہ (ابوبکر کی موجودگی میں کوئی بھی شخص خلافت کا مستحق نہیں ہوسکتا) ابوبکر کے علاوہ کسی کی خلافت کو نہ اللہ چاہے گا اور نہ اہل ایمان تسلیم کریں گے، (مسلمؒ) اور کتاب حمیدی میں انا ولا کے بجائے انا اولی (خلافت کا سب سے بڑا مستحق میں ہوں) کے الفاظ ہیں۔"

تشریح: طیبیؒ نے قاضی عیاضؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت "اجود" ہے اور اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی طرف واضح اشارہ ہے۔ رہا روافض کا یہ کہنا کہ حضرت علیؓ کی خلافت پر نص وارد ہے اور آنحضرت ﷺ نے ان کے استحقاق خلافت کی وصیت کی تھی تو یہ بالکل بے اصل بات اور ایک لغو و باطل دعویٰ ہے، تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ حضرت

علیؓ کے بارے میں نہ کوئی نص وارد ہے اور نہ آنحضرت ﷺ نے کوئی زبانی یا تحریری وصیت کی تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دعویٰ کی سب سے پہلی تردید خود حضرت علی کی طرف سے ہوئی تھی۔ جب کسی نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو قرآن میں موجود نہیں ہے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا: نہیں، میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ وہی ہے جو اس صحیفہ میں موجود ہے، اگر ان کے پاس کوئی نص موجود ہوتی تو وہ یقیناً اس کو ظاہر کرتے۔

حضرت ابوبکرؓ کے حق میں خلافت کی وصیت

④ وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ اَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ امْرَاَةٌ فَكَلَّمَتْهُ فِيْ شَيْءٍ فَاَمَرَهَا اَنْ تَرْجِعَ اِلَيْهِ قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ جِئْتُ وَلَمْ اَجِدْكَ كَاَنَّهَا تُرِيْدُ الْمَوْتَ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدِيْنِيْ فَاْتِيْ اَبَابَكْرٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جبیر ابن مطعم کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور کسی معاملہ میں آپ ﷺ سے گفتگو کی (یعنی یا تو اس نے کوئی مسئلہ پوچھا یا کسی حاجت کی طلب گار ہوئی) آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ وہ کسی اور وقت آپ کے پاس آئے (تاکہ اطمینان سے اس کی بات کا جواب دیں یا اس کی حاجت پوری کریں) اس عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ! (میرا مکان مدینہ سے دور ہے شائد دوبارہ آنے کا موقع نہ مل سکے اس لئے بعد میں) اگر میں آئی اور آپ کو نہ پایا تو (پھر) کیسے بات بنے گی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کہنے سے اس عورت کا مقصد آپ ﷺ کے انتقال کی طرف اشارہ کرنا تھا (یعنی بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدمت اقدس میں اس عورت کے آنے کا یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب آپ ﷺ مرض وفات میں مبتلا تھے اور اس کو خدشہ تھا کہ اگر میں کچھ دنوں بعد آئی تو شاید آپ ﷺ اس دنیا میں موجود نہیں ہوں گے) آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا: اگر تم مجھ کو نہ پاؤ تو ابوبکرؓ کے پاس چلی جانا۔"

(بخاری و مسلم)

تشریح: یہ حدیث بلاشبہ اس امر کی طرف واضح اشارہ تھا کہ آپ کے بعد خلیفہ اول ابوبکرؓ ہوں گے اگرچہ اس بارے میں اس حدیث کو نص قطعی کا درجہ نہیں دیا جاسکتا لیکن حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت و منقبت کی بین دلیل ضرور ہے۔

واضح رہے کہ جمہور علماء کے نزدیک نص قطعی کسی کی بھی خلافت کے حق میں وارد نہیں ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی حقانیت و صحت اس دلیل کے تحت ہے کہ ان کی خلافت پر صحابہؓ کا اجماع تھا ویسے علامہ ابن ہمام نے مسایرہ میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے حق میں نص کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے اس دعویٰ کو ثابت بھی کیا ہے۔

اسمٰعیلیؒ نے اپنی معجم میں حضرت سہل ابن ابی حثمہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک اعرابی نے آنحضرت ﷺ کو کچھ اونٹ اس وعدے پر بیچے کہ ان کی قیمت بعد میں لے لیگا، حضرت علیؓ نے اس اعرابی سے کہا کہ آنحضرت ﷺ سے جاکر پوچھو کہ اونٹوں کی قیمت لینے کے لئے اگر میں اس وقت آیا کہ آپ اس دنیا میں موجود نہ ہوں تو پھر قیمت کی ادائیگی کون کرے گا؟ اعرابی نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ تمہیں قیمت ادا کریں گے۔ وہ اعرابی لوٹ کر حضرت علیؓ کے پاس آیا اور آنحضرت کا جواب ان کو بتایا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ اب پھر جاؤ اور پوچھو کہ اگر میں ابوبکرؓ کے پاس بھی اس وقت آیا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں تو پھر قیمت کی ادائیگی کون کرے گا؟ اعرابی نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: عمرؓ تمہیں قیمت ادا کریں گے۔ وہ اعرابی لوٹ کر حضرت علیؓ کے پاس آیا اور آنحضرت ﷺ کا جواب ان کو بتایا، حضرت علی نے اس سے کہا کہ اب پھر جاؤ اور آنحضرت ﷺ سے حضرت عمرؓ کے بعد کے بارے میں پوچھو چنانچہ اعرابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت عمرؓ کے بعد کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: عثمانؓ تمہیں قیمت ادا کریں گے۔ اعرابی نے آکر یہ جواب بتایا تو حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ اب جاکر یہ پوچھو کہ اگر میں عثمانؓ کے پاس ان کے انتقال کے بعد آیا تو پھر قیمت کی ادائیگی کون

کرے گا؟ اعرابی نے حاضر ہو کر آپ ﷺ سے یہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا جب ابوبکرؓ مرجائیں گے، عمر بھی مرجائیں گے اور عثمان بھی مرجائیں گے تو پھر تم ہی زندہ رہ کر کیا کرو گے۔

مردوں میں سب سے زیادہ محبّت کہہ کر ابوبکرؓ سے تھی

⑤ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَهُ عَلٰی جَیْشِ ذَاتِ السَّلَاسِلِ قَالَ فَاَتَیْتُهُ فَقُلْتُ اَیُّ النَّاسِ اَحَبُّ اِلَیْكَ قَالَ عَائِشَةُ قُلْتُ مِنَ الرِّجَالِ قَالَ اَبُوْهَا قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ عُمَرُ فَعَدَّ رِجَالًا فَسَکَتُّ مَخَافَةَ اَنْ یَّجْعَلَنِیْ فِیْ اٰخِرِهِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرو ابن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان کو ایک لشکر کا امیر (کمانڈر) بنا کر ذات السلاسل بھیجا جو ایک جگہ کا نام ہے) وہ بیان کرتے ہیں کہ (لشکر کی روانگی سے پہلے یا واپسی کے بعد) جب میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے پوچھا کہ آپ (ﷺ) کو سب سے زیادہ کس سے محبت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہؓ (کہ عورتوں میں وہی محمد ﷺ کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب ہیں) میں نے عرض کیا: میرا سوال مردوں کے بارے میں تھا (کہ مردوں میں سب سے زیادہ عزیز اور محبوب آپ ﷺ کے نزدیک کون ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہؓ کے باپ یعنی ابوبکر، میں نے پوچھا ان کے بعد پھر کون (آپ کو زیادہ عزیز و محبوب ہے؟) فرمایا: عمرؓ، اس کے بعد (میرے پوچھنے کے مطابق) آپ ﷺ نے متعدد لوگوں کا ذکر کیا اور پھر اس خوف سے خاموش ہو گیا کہ کہیں میرا نام سب سے آخر میں نہ آئے (یعنی جب آپ ﷺ میرے پوچھنے پر دوسرے لوگوں کے نام لیتے رہے تو پھر میں نے آگے نہ پوچھنا ہی بہتر جانا کہ میرا نام کہیں سب سے آخر میں نہ آئے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "میرا سوال مردوں کے بارے میں تھا" یعنی حضرت عمرو بن العاصؓ کی مراد یا تو ان سب مردوں سے تھی جو آپ ﷺ کے زمانے میں تھے یا یہ کہ اس لشکر کے لوگ مراد تھے جس کا امیر ان کو بنایا گیا تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کے اس سوال کا سبب دراصل یہ تھا کہ جب ان کو مذکورہ لشکر کا امیر بنا کر دشمن کے مقابلہ پر بھیجا گیا تو بعد میں ان کی مدد کے لئے دو سو مجاہدین اسلام کا ایک اور لشکر حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کی کمانڈری میں روانہ کیا گیا ان دو سو مجاہدین میں انصار و مہاجرین میں سے جو بڑے بڑے حضرات صحابہ تھے ان میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شامل تھے، اور لشکر کی امامت نماز حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اسلام کو فتح عطا فرمائی اور دشمنان دین بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس موقعہ پر حضرت عمرو بن العاصؓ کے خیال میں یہ بات آئی کہ اس لشکر کے تمام لوگوں میں میرا مرتبہ سب سے بلند ہے جبھی تو مجھ کو ان سب لوگوں کا امیر بنایا گیا ہے۔ اور ان کو میری کمان میں دشمن کے مقابلہ پر بھیجا گیا۔ چنانچہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ فتح یاب ہو کر واپس آئے تو آنحضرت ﷺ نے مذکورہ سوال کیا، آنحضرت ان کو جو جواب دیا اس سے ان کو معلوم ہو گیا کہ میرے خیال میں جو بات آئی تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا احتمال زیادہ قوی ہے یعنی یہ کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے سوال کی مراد اس لشکر کے لوگوں سے تھی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے پہلی مرتبہ پوچھنے پر جو جواب دیا اس سے پہلے احتمال کی تائید ہوتی ہے کہ ان کی مراد آنحضرت ﷺ کے زمانہ کے تمام لوگوں سے تھی۔

افضلیت صدیق کی شہادت حضرت علی کی زبان سے

⑥ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِیَّةِ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ بَعْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ عُمَرُ وَخَشِیْتُ اَنْ یَّقُوْلَ عُثْمَانُ قُلْتُ ثُمَّ اَنْتَ قَالَ مَا اَنَا اِلَّا رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت محمد ابن حنفیہؒ (جو حضرت فاطمہ زہراؓ کے علاوہ دوسری بیوی کے بطن سے حضرت علیؓ کے فرزند ہیں) کہتے ہیں کہ میں نے

اپنے والد ماجد (حضرت علیؓ) سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کون شخص سب سے بہتر و افضل ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ "حضرت ابوبکرؓ! پھر میں نے پوچھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد کون شخص سب سے بہتر و افضل ہے؟ انہوں نے فرمایا "حضرت عمرؓ" (محمد ابن حنفیہؒ کہتے ہیں کہ) مجھے یہ خدشہ ہوا کہ (اگر میں نے پوچھ لیا کہ حضرت عمرؓ کے بعد کون شخص سب سے بہتر و افضل ہے تو) کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں کہ حضرت عثمانؓ، لہٰذا میں نے (سوال کا عنوان بدل کر یوں) کہا کہ پھر (حضرت عمرؓ کے بعد) سب سے بہتر و افضل آپ ہیں! انہوں نے (یہ سن کر) فرمایا، میں تو بس ایک مسلمان مرد ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: "میں تو بس ایک مسلمان مرد ہوں" حضرت علیؓ کا یہ ارشاد تواضع اور انکسار پر مبنی تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جب کہ ان سے یہ سوال کیا گیا تھا یعنی حضرت عثمانؓ کے سانحہ شہادت کے بعد پوری ملت اسلامیہ میں سب سے بہتر و افضل انہی کی ذات والا صفات تھی۔

زمانہ نبوی میں تمام صحابہ کے درمیان حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت مسلّم تھی

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ كُنَّا فِي زَمَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نَعْدِلُ بِاَبِيْ بَكْرٍ اَحَدًا ثُمَّ عُمَرَ ثُمَّ عُثْمَانَ ثُمَّ نَتْرُكُ اَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نُفَاضِلُ بَيْنَهُمْ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاوٗدَ قَالَ كُنَّا نَقُوْلُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيٌّ اَفْضَلُ اُمَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَهٗ اَبُوْبَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ ثُمَّ عُثْمَانُ رِضْوَانُ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم یعنی صحابہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں (صحابہ میں سے) کسی کو بھی حضرت ابوبکرؓ کے برابر نہیں سمجھتے تھے (بلکہ اور تمام صحابہ پر ان کو فضیلت دیتے تھے) ان کے بعد حضرت عمرؓ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے اور پھر حضرت عثمانؓ کے بعد نبی کریم ﷺ کے صحابہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔ کہ ان کے درمیان کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دیتے تھے۔ (بخاریؒ) اور ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا ہم رسول کریم ﷺ کی حیات مبارکہ میں کہا کرتے تھے نبی کریم ﷺ کی اُمت میں آپ کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہم۔"

تشریح: "ان کے درمیان کسی کو کسی پر فضیلت نہ دیتے" سے مراد یہ ہے کہ جو صحابہ ایک طرح کی حیثیت اور یکساں خصوصیت و مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کے درمیان کسی کو کسی پر فضیلت نہ دیتے تھے۔ ورنہ جہاں تک بعض صحابہ کا بعض صحابہ سے افضل ہونے کا سوال ہے تو یہ بات ثابت ہے کہ اہل بدر احد، اہل بیعت الرضوان اور اہل علم صحابہ باقی تمام صحابہ پر فضیلت رکھتے ہیں۔ ویسے اس احتمال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ شائد تفاضل بین الاصحاب مراد ہو یعنی (حضرت عثمان کے بعد) پھر کسی اور صحابی کو کسی دوسرے صحابی پر ہم فضیلت نہیں دیتے تھے۔ واضح رہے کہ اہل بیت نبوی کی حیثیت اخص ہے اور اسی وجہ سے ان کا حکم دوسرے تمام صحابہ سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے کہ وہ اپنی مخصوص نسبت کے اعتبار سے بلاشبہ وہ مخصوص فضیلت رکھتے ہیں جو ان کے علاوہ دوسروں کو حاصل نہیں اور ان کا اپنی مخصوص فضیلت رکھنا اظہر من الشمس ہے، لہٰذا یہاں یہ اعتراض نہیں ہونا چاہئے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا ہے یا حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ، آنحضرت ﷺ کے دونوں چچاؤں یعنی حضرت امیر حمزہؓ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کی فضیلت کا بیان کیوں نہیں ہوا۔ ایک شارح نے لکھا ہے، یہاں صحابہ سے حضرت ابن عمرؓ کی مراد وہ بوڑھے اور عمر رسیدہ صحابہ ہیں جو بارگاہ رسالت میں اصحاب الرائے اور اصحاب مشورہ کی حیثیت رکھتے تھے اور جن سے آنحضرت ﷺ پیش آمدہ معاملات و مسائل میں مشورہ فرمایا کرتے تھے جہاں تک حضرت علی کا تعلق ہے تو وہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جوان اور نو عمر تھے اور اس اعتبار

سے مذکورہ صحابہ کے زمرہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اسی بناء پر حضرت ابن عمرؓ نے ان کا ذکر نہیں کیا اور نہ تو حضرت عثمانؓ کے بعد تمام صحابہؓ پر ان کی فضیلت کا کوئی منکر نہیں ہے، اور صحابہ کے درمیان تفاضل بلاشبہ ثابت ہے جیسے اہل بدرؓ، اہل بیعت رضوان اور علماء صحابہ کو اور تمام صحابہؓ پر فضیلت و برتری حاصل ہے۔

امام احمدؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت میں یوں نقل کی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم حضرت ابوبکرؓ کو (آنحضرت کے بعد) سب سے بہتر و افضل انسان جانتے تھے اور ان کے بعد حضرت عمرؓ کو۔ رہی حضرت علیؓ کی بات تو حقیقت یہ ہے کہ ان کو وہ تین عظیم خصوصیتیں حاصل ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہو تو میں خود کو دنیا و مافیہا سے بہتر و افضل جانوں آنحضرت ﷺ نے ان سے اپنی عزیز ترین بیٹی یعنی حضرت فاطمہؓ کا نکاح کیا اور آپ کی نسل انہی کے ذریعہ چلی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے دروازے کے علاوہ اور سب کے دروزے (مسجد نبوی کی طرف) بند کرادئے تھے، آنحضرت ﷺ نے جنگ خیبر کے دن اپنا نیزہ ان کو عطا کیا اور نسائیؒ کی روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے مذکورہ بالا حدیث بیان کی اور اس کے بعد کہا: علیؓ کی شان میں مت پوچھو اور نہ ان پر کسی کو قیاس کرو (ان کا مقام تو یہ ہے کہ) ان کے علاوہ اور سب کے دروازے بند کردئے گئے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حضرت ابوبکر کی افضلیت

⑧ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَنَا یَدٌ اِلَّا وَقَدْ كَافَیْنَاهُ مَا خَلَا اَبَابَكْرٍ فَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا یَدًا یُكَافِیْهِ اللّٰهُ بِهَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَحَدٍ قَطُّ مَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَبُوْبَكْرٍ وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِیْلًا اَلَا وَاِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِیْلُ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ایسا کوئی شخص نہیں جس نے ہمیں کچھ دیا ہو ہماری امداد کی ہو اور ہم نے اس کا (جوں کا توں یا اس سے بھی زیادہ) بدلہ اس کو نہ دے دیا ہو علاوہ ابوبکرؓ کے یہ حقیقت ہے کہ ابوبکرؓ نے ہمارے ساتھ عطاء و امداد کا جو عظیم سلوک کیا ہے اس کا بدلہ (یعنی کامل بدلہ) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی ان کو عطا کرے گا کسی شخص کے مال نے مجھ کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا ابوبکر کے مال نے پہنچایا ہے۔ اگر میں کسی کو اپنا خلیل یعنی جانی دوست بناتا تو یقیناً ابوبکر کو اپنا خلیل بناتا۔ یاد رکھو تمہارے صاحب (یعنی رسول اللہ) اللہ کے خلیل ہیں (کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی کو حقیقی دوست نہیں رکھتے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: ید سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے فائدہ حاصل کیا جا سکے، اس اعتبار سے یہ لفظ مال و دولت، جان اور آل اولاد سب کو شامل ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ اور رسول کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے اپنا یہ سب کچھ اللہ کی راہ میں اور اللہ کے رسول کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ فَاِنَّ لَهٗ عندنا یداً یکافئه اللّٰه الخ کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ کے جس عطاء و امداد کے عظیم سلوک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے ان کا وہ عظیم مالی ایثار مراد ہے جو انہوں نے حضرت بلالؓ کو کافروں سے خرید کر اللہ کے رسول کی خوشنودی کی راہ میں آزاد کردینے کی صورت میں کیا تھا۔ اور جس کی طرف قرآن کریم نے بھی اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔

وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی۔

"اور اس (دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ) سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہے اور جو اپنا مال اس غرض سے اللہ کی راہ میں خرچ

کرتا ہے کہ (گناہوں سے) پاک ہو جائے۔"

"جتنا ابوبکرؓ کے مال نے پہنچایا ہے" اس کی سب سے بڑی دلیل وہ واقعہ ہے کہ جب ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے اللہ کی راہ میں مالی امداد و تعاون کے لئے کہا تو ہر شخص نے اپنی اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق جو کچھ مناسب سمجھا لا کر دیا اور حضرت ابوبکرؓ گھر کا سارا اثاثہ و سامان سمیٹ کر لے آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا، اپنی اور اپنے اہل و عیال کی بڑی سے بڑی ضرورت کا بھی کوئی سامان گھر میں نہیں رہنے دیا۔ یہاں تک کہ جب تمام مال و سامان اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اور بدن کے کپڑوں تک کے لئے کچھ نہیں رہا، تو کملی کو بدن پر اس طرح لپیٹ لیا کہ کانٹے لگا کر اس کا خرقہ سا بنا لیا۔ اسی مناسبت سے حضرت ابوبکرؓ کا ایک لقب "ذوالخلال" بھی ہے، خلال کانٹے کو کہتے ہیں۔

ریاض الصالحین میں یہ روایت ہے کہ: جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کسی شخص کے مال نے مجھ کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا ابوبکرؓ کے مال نے پہنچایا ہے تو (یہ سن کر) حضرت ابوبکرؓ رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میری جان اپنی ہے۔ نہ میرا مال اپنا ہے۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے سب آپ ہی کی ملکیت ہے۔

موافقات میں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان شخص کا مال میرے لئے ابوبکرؓ کے مال سے زیادہ نافع نہیں ہے، نیز حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت ﷺ پر چالیس ہزار درہم خرچ کئے، عروہؒ کی روایت ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کیا تو اس وقت ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے اور وہ سب انہوں نے آنحضرت کے زمانے میں فی سبیل اللہ خرچ کئے۔ عروہؒ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے وہ سات غلام خرید کر اللہ کی راہ میں آزاد کئے جو (قبولیت اسلام) کی وجہ سے اپنے آقاؤں اور مالکوں کی طرف سے سخت ظلم و تشدد کا شکار تھے۔ حضرت بلالؓ اور حضرت عامر ابن فہیرہؓ ان ہی سات میں سے ہیں۔

حضرت ابوبکر صحابہ کے سردار ہیں

(۹) وَعَنْ عُمَرَؓ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ سَيِّدُنَا وَخَيْرُنَا وَاَحَبُّنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "حضرت ابوبکرؓ (حسب و نسب کے اعتبار سے) ہمارے سردار ہیں، (علم و عمل اور کار خیر کے اعتبار سے) ہم سب سے افضل ہیں اور رسول کریم ﷺ کے سب سے زیادہ چہیتے ہیں۔" (ترمذیؒ)

یار غار رسول

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاَبِيْ بَكْرٍ اَنْتَ صَاحِبِيْ فِي الْغَارِ وَصَاحِبِيْ عَلَى الْحَوْضِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے (ایک دن) یوں فرمایا: تم میرے یار غار یعنی غار کے رفیق و ساتھی ہو اور حوض کوثر پر میرے مصاحب ہو گے"۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ تھا کہ تم میرے دنیا کے بھی رفیق و ساتھی ہو اور آخرت کے بھی، واضح رہے کہ غار سے مراد مکہ سے تین میل دور واقع جبل ثور کا وہ غار ہے جہاں سفر ہجرت کے ابتدائی مرحلہ میں آنحضرت ﷺ ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ چھپے تھے اور اس آیت کریمہ ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا میں حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت و رفاقت کی طرف اشارہ ہے اور علماء و مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ اس آیت میں صاحبہ سے مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ذات ہے، اسی بنیاد پر علماء کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے برخلاف دوسروں یعنی حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، اور حضرت علیؓ، وغیرہ کی صحابیت کا انکار کرنے والا کافر نہیں ہوتا، بہر حال

آنحضرت کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ ابوبکر! تم میرے ایسے دوست و رفیق ہو کہ اللہ نے تمہاری دوستی و رفاقت کی گواہی دی ہے اور غالباً اسی بنا پر "یار غار" کا لفظ سچے اور پکے دوست و رفیق کے معنی میں محاورۃً استعمال ہونے لگا ہے۔

افضلیت ابوبکرؓ

(۱۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْبَغِيْ لِقَوْمٍ فِيْهِمْ اَبُوْبَكْرٍ اَنْ يَّؤُمَّهُمْ غَيْرُهٗ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس قوم و جماعت میں ابوبکرؓ موجود ہوں اس کے لئے موزوں نہیں ہے کہ اس کی امامت ابوبکرؓ کے علاوہ کوئی شخص کرے" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: یہ حدیث امامت کے بارے میں ایک اصولی حکم کی بھی حیثیت رکھتی ہے کہ کسی بھی جماعت کی امامت کا سزاوار وہ شخص ہے۔ جو اس جماعت میں سب سے افضل ہو، اور اس کو اس بات کی واضح دلیل بھی قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ تمام صحابہ میں سب سے افضل ہیں، جب یہ بات ثابت ہوئی تو یہ بھی ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد خلافت کے اصل مستحق وہی تھے، کیونکہ "فاضل" کی موجودگی میں کسی "مفضول" کو خلیفہ بنانا غیر موزوں بات ہے۔ اسی لئے حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا، جب آنحضرت ﷺ نے آپ کو (نماز کا امام بنا کر) ہمارے دین کا پیشوا بنایا تو پھر ہماری دنیا کے معاملہ (یعنی خلافت) میں کون شخص آپ کو پس پشت ڈال سکتا ہے۔

ابوبکرؓ یہاں بھی سبقت لے گئے

(۱۲) وَعَنْ عُمَرَؓ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَتَصَدَّقَ وَوَافَقَ ذٰلِكَ عِنْدِيْ مَالًا فَقُلْتُ الْيَوْمَ اَسْبِقُ اَبَابَكْرٍ اِنْ سَبَقْتُهٗ يَوْمًا قَالَ فَجِئْتُ بِنِصْفِ مَالِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَبْقَيْتَ لِاَهْلِكَ فَقُلْتُ مِثْلَهٗ وَاَتٰى اَبُوْبَكْرٍ بِكُلِّ مَا عِنْدَهٗ فَقَالَ يَا اَبَابَكْرٍ مَا اَبْقَيْتَ لِاَهْلِكَ فَقَالَ اَبْقَيْتُ لَهُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ قُلْتُ لَا اَسْبِقُهٗ اِلٰى شَيْءٍ اَبَدًا۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عمر فاروقؓ بیان کرتے ہیں (ایک موقع پر) رسول کریم ﷺ نے صدقہ (یعنی اللہ کی راہ میں اپنے اپنے مال کا کچھ حصہ پیش کرنے) کا حکم ہمیں دیا اور آپ کا یہ حکم مال کے اعتبار سے میرے موافق پڑ گیا (یعنی حسن اتفاق سے اس وقت میرے پاس بہت مال و دھن تھا) لہٰذا میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں کسی دن ابوبکرؓ سے بازی لے جا سکتا ہوں تو وہ آج کا دن ہے کہ (اپنے مال کی زیادتی و فراوانی سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ راہ خدا میں پیش کروں گا اور) اسے معاملہ میں ان کو پیچھے چھوڑ دوں گا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں، پس میں نے آدھا مال لا کر آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا، رسول کریم ﷺ نے (اتنا زیادہ مال و اسباب دیکھ کر) مجھ سے پوچھا: گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ آئے ہو؟ میں نے عرض کیا، جتنا لایا ہوں اتنا ہی گھر والوں کے لئے چھوڑ آیا ہوں، اس کے بعد حضرت ابوبکر آئے اور ان کے پاس جو کچھ تھا سب لا کر آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آنحضرت نے ان سے پوچھا: گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ آئے ہو؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، ان کے لئے اللہ اور اللہ کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔ (حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ) میں نے اپنے دل میں کہا: ابوبکرؓ پر میں کبھی بھی سبقت نہیں لے جا سکوں گا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "اور ان کے پاس جو کچھ تھا" ان الفاظ سے اشارۃً یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے مال کا جو آدھا حصہ لے کر آئے تھے وہ شائد مالیت و مقدار کے اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ کے مال و اسباب سے زیادہ تھا لیکن اس اعتبار سے کہ حضرت عمرؓ اپنا آدھا مال تو گھر

والوں کے لئے چھوڑ آئے تھے اور حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر والوں کے لئے کچھ بھی چھوڑے بغیر سب کچھ لے کر آگئے تھے۔ افضلیت کا مقام حضرت ابوبکرؓ ہی کو حاصل ہوا حقیقت یہ ہے کہ اصل قیمت جذبہ ایثار کی ہوتی ہے۔ ایک شخص کے پاس دس لاکھ روپے ہوں اور ان میں سے پانچ لاکھ روپے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کردے تو یقیناً اس کو بڑا مرتبہ و مقام ملے گا لیکن اس سے بڑا مقام و مرتبہ اس شخص کا ہوگا جس کی کل کائنات پانچ سو روپے ہو اور وہ ان پانچ سو روپیوں کو اس بات سے بے نیاز ہو کر اللہ کی راہ میں خرچ کردے کہ بعد میں اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضرورت کا کیا ہوگا، اسی حقیقت کے پیش نظر ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے: افضل الصدقة جهد المقل (افضل صدقہ وہ ہے جو کم مال والا ایثار کر کے نکالے)۔

"اللہ اور اللہ کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں" اس جواب کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی رضا و خوشنودی ہی میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے دونوں جہان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے، اس سرمایہ کا مقابلہ میں دنیاوی مال و اسباب کی بڑی سے بڑی پونجی بے وقعت ہے۔ یا حضرت ابوبکرؓ کے جواب کا یہ مطلب تھا کہ میرے گھر میں جو کچھ مال و اسباب تھا وہ سب میں لے آیا ہوں اور اللہ کی راہ میں پیش کردیا ہے جہاں تک گھر والوں کی ضروریات کا سوال ہے تو اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان، اس کی رزاقیت اور اس کے رسول کی امداد و اعانت کا یقین ان کے لئے کافی ہے۔ اگر حضرت ابوبکرؓ کا تمام مال حضرت عمرؓ کے آدھے مال سے زیادہ تھا تو اس میں افضلیت ابوبکرؓ بلاشک وشبہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور اگر ان کا مال حضرت عمرؓ کے مال سے کم بھی رہا تو بھی ان کی افضلیت اس اعتبار سے تسلیم کی جائے گی کہ انہوں نے اپنا سب کچھ لا کر اللہ کی راہ میں پیش کردیا تھا۔

"میں ابوبکرؓ پر کبھی بھی سبقت نہ لے جاسکوں گا" حضرت عمرؓ نے تو سوچا تھا کہ ہر نیک کام میں ابوبکرؓ مجھ پر سبقت لے جاتے ہیں آج ایسا موقع ہے کہ میں ان کو پیچھے چھوڑ دوں گا، مگر جب انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کا کامل جذبہ ایثار و اطاعت دیکھا تو بول اٹھے کہ سبقت لے جانے کا اتنا بھرپور ذریعہ موجود ہونے کے باوجود اگر میں آج بھی ان سے پیچھے رہ گیا ہوں تو یقین ہے کہ اب کبھی بھی میں ان پر سبقت نہیں لے جاسکوں گا بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا: مابينكم كما بين كلمتكما (مرتبہ و مقام کا) تمہارے درمیان وہی فرق ہے جو تم دونوں کے (مذکورہ) الفاظ میں پایا جاتا ہے۔

عتیق نام کا سبب

⑬ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ اَبَابَكْرٍ دَخَلَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَنْتَ عَتِيْقُ اللّٰهِ مِنَ النَّارِ فَيَوْمَئِذٍ سُمِّيَ عَتِيْقًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے: (ایک دن) حضرت ابوبکرؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا "تم دوزخ کی آگ سے اللہ کے آزاد کردہ ہو" اسی دن سے ان کا ایک نام "عتیق" پڑ گیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "عتیق" کے معنی "بری" اور "آزاد" کے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا ایک نام "عتیق" بھی مشہور ہے اور اس نام کی وجہ تسمیہ یہ حدیث بیان کر رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو عتیق اللہ من النّار فرمایا تھا۔ بعض حضرات نے اس نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ "عتیق" چونکہ حسن و جمال، شرافت و نجابت اور صاحب خیر کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہ تمام خوبیاں حضرت ابوبکرؓ کی ذات میں موجود تھیں اس لئے ان کو "عتیق" کہا جاتا تھا، لیکن خود حدیث نے چونکہ اس نام کی وجہ تسمیہ کی صراحت کردی ہے کہ "عتیق" سے مراد "دوزخ کی آگ سے آزاد شخص" ہے۔ اس لئے کوئی دوسری وجہ تسمیہ بیان کرنا معتبر نہیں ہوگا ایک اور روایت میں بھی آیا ہے:

قال صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ من اراد ان ينظر الى عتيق من النّار فلينظر الى ابى بكر۔

"آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دوزخ کی آگ سے بری اور آزاد شخص کے دیدار کی تمنا رکھتا ہو وہ ابوبکرؓ کو دیکھ لے۔"

اصل نام و نسب: حضرت ابوبکرؓ کا اصل نام "عبداللہ" ہے اور ابوقحافہ عثمان کے بیٹے ہیں۔ سلسلۂ نسب: عبداللہ ابن ابوقحافہ عثمان ابن عامر ابن عمرو ابن کعب ابن سعد ابن تیم ابن مرہ جو ساتویں پشت میں جا کر نبی کریم ﷺ کے سلسلۂ نسب سے مل جاتا ہے حضرت ابوبکر وہ پہلے مرد ہیں جنہوں نے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی تصدیق کی اور ایمان و اسلام سے مشرف ہوئے۔ حیات نبوی ﷺ کا ایسا غزوہ اور اہم واقعہ نہیں ہے جس میں ان کو شرکت، رفاقت اور ہمراہی کا شرف حاصل نہ ہوا ہو، یہ واحد شخص ہیں جو نہ تو اپنے زمانۂ جاہلیت میں آنحضرت ﷺ سے جدا رہے اور نہ زمانۂ اسلام میں کبھی جدا ہوئے۔ جو خود بھی صحابی ہو اس کے ماں باپ بھی صحابی ہوں۔ اس کی اولاد بھی صحابی ہو اور اولاد کی اولاد بھی صحابی ہو، یہ عظیم تر خصوصیت اگر کسی صحابی کو حاصل ہے تو وہ صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں، حضرت ابوبکرؓ نہ صرف سیرت اور باطن کے اعتبار سے تمام صحابہ میں بے مثال تھے بلکہ ان کا سراپا اور ظاہری جمال بھی مثالی تھا۔ سفید رنگت، ہلکا جسم، ابھری ہوئی پیشانی، خفیف رخسارے اور خوبصورت آنکھیں، ان سب نے مل کر ان کی شخصیت کو بڑی دل آویز اور پر کشش بنا دیا تھا۔ واقعہ فیل کے دو سال چار ماہ اور کچھ روز بعد مکہ شریف میں پیدا ہوئے اور جمادی الثانی ۱۳ھ کی بائیسویں تاریخ (یا آٹھویں) کو منگل کے دن مغرب وعشاء کے درمیان بعمر ۶۳ سال مدینہ منورہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے وصیت کی تھی کہ میری میت کو میری بیوی اسما بنت عمیس غسل دیں چنانچہ حضرت اسماءؓ نے آپ کو غسل دیا اور حضرت عمر فاروقؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ دو سال چار ماہ آپ کی خلافت رہی، صحابہ اور تابعین کی بہت بڑی تعداد کو آپ سے روایت حدیث کا شرف حاصل ہے۔ لیکن رحلت رسالت مآب ﷺ کے بعد چونکہ تھوڑے دن زندہ رہے۔ اس کی وجہ سے آپ کی روایتوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

آنحضرت کے بعد سب سے پہلے ابوبکرؓ قبر سے اٹھیں گے

⑭ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ ثُمَّ اَبُوْبَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ ثُمَّ آتِيْ اَهْلَ الْبَقِيْعِ فَيُحْشَرُوْنَ مَعِيْ ثُمَّ اَنْتَظِرُ اَهْلَ مَكَّةَ حَتّٰى اُحْشَرَ بَيْنَ الْحَرَمَيْنِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ان لوگوں کا سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جو زمین سے برآمد ہوں گے (یعنی قیامت کے دن جب تمام خلقت اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں آئے گی تو سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی اور اپنی قبر سے اٹھنے والا سب سے پہلا شخص میں ہوں گا) میرے بعد ابوبکرؓ اور ان کے بعد عمرؓ (اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے) پھر میں بقیع قبرستان کے مدفونوں کے پاس آؤں گا اور ان کو ان کی قبروں سے اٹھا کر میرے ساتھ جمع کیا جائے گا اور پھر میں اہل مکہ کا انتظار کروں گا تاآنکہ مجھے حرمین یعنی اہل مکہ اور اہل مدینہ کے درمیان حشر میں پہنچایا جائے گا۔" (ترمذی)

تشریح: قیامت کے دن سب سے پہلے آنحضرت ﷺ اپنی قبر سے اٹھیں گے، آپ ﷺ کے بعد سب سے پہلے اٹھنے والے حضرت ابوبکرؓ ہوں گے اور پھر حضرت عمر اٹھیں گے۔ آنحضرت ﷺ اپنی قبر سے اٹھ کر بقیع قبرستان پہنچیں گے، وہاں اہل بقیع آپ ﷺ کے سامنے اپنی اپنی قبروں سے باہر آکر آپ ﷺ کے پاس جمع ہوں گے، اسی جگہ آپ اہل مکہ کا انتظار کریں گے جن کو اپنی اپنی قبروں سے اٹھا کر یہاں لایا اور آپ ﷺ کے پاس جمع کیا جائے گا پھر اہل مکہ مدینہ کے ساتھ آپ میدان حشر کا رخ کریں گے اور وہاں تمام خلقت کے ساتھ جمع ہوں گے۔

محمد ﷺ کے غلاموں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر جنت سے سرفراز ہوں گے

⑮ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَانِيْ جِبْرَئِيْلُ فَاَخَذَ بِيَدِيْ فَاَرَانِيْ بَابَ الْجَنَّةِ الَّذِيْ يَدْخُلُ مِنْهُ اُمَّتِيْ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَدِدْتُ اَنِّيْ كُنْتُ مَعَكَ حَتّٰى اَنْظُرَ اِلَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا اِنَّكَ يَا اَبَابَكْرٍ اَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِيْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر انہوں نے مجھے جنّت کا وہ دروازہ دکھلایا جس سے میری اُمت کے لوگ جنت میں داخل ہوں گے" حضرت ابوبکرؓ نے (یہ ارشاد سن کر) عرض کیا یا رسول اللہ! میرے دل میں یہ حسرت بھری خواہش مچل رہی ہے کہ کاش اس وقت میں آپ ﷺ کے ساتھ ہوتا تو مجھے بھی جنت کا دروازہ دیکھنا نصیب ہو جاتا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ابوبکر! آگاہ رہو کہ میری اُمت میں سے جو لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ ان میں سب سے پہلے شخص تم ہی ہوگے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "مجھے جنّت کا دروازہ دکھلایا" یا تو یہ شب معراج کا واقعہ ہے، جس کا آپ نے اس موقع پر ذکر فرمایا یا کسی اور وقت کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ کو جنّت کی سیر کرائی گئی ہوگی، "ان میں سب سے پہلے شخص تم ہی ہوگے" یعنی تم جنّت میں تو جاؤ ہی گے اور سب سے پہلے جاؤ گے تو اسی وقت جنّت کا دروازہ بھی دیکھ لینا یا ان الفاظ سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جنّت کا دروازہ دیکھنے کی کیا آرزو کرتے ہو، تمہارے لئے تو وہ چیز مقدر ہے جو اس سے کہیں اعلیٰ و افضل ہے۔ یعنی میرے ساتھ تمہارا جنت میں داخل ہونا، بہرحال یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اُمت محمدی میں سب سے افضل شخص ہیں، اگر ان کو افضلیت حاصل نہ ہوتی تو اُمت کے لوگوں میں سب سے پہلے جنّت میں داخل ہونے کا شرف ان کے لئے کیوں مقدر ہوتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت ابوبکر کے دو عمل جو دوسروں کی ساری زندگی پر بھاری ہیں

(۱۶) عَنْ عُمَرَ ذُكِرَ عِنْدَهٗ اَبُوْبَكْرٍ فَبَكٰى وَقَالَ وَدِدْتُ اَنَّ عَمَلِيْ كُلَّهٗ مِثْلُ عَمَلِهٖ يَوْمًا وَاحِدًا مِنْ اَيَّامِهٖ وَلَيْلَةً وَّاحِدَةً مِنْ لَيَالِيْهِ اَمَّا لَيْلَتُهٗ فَلَيْلَةٌ سَارَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْغَارِ فَلَمَّا انْتَهَيَا اِلَيْهِ قَالَ وَاللّٰهِ لَا تَدْخُلُهٗ حَتّٰى اَدْخُلَ قَبْلَكَ فَاِنْ كَانَ فِيْهِ شَيْءٌ اَصَابَنِيْ دُوْنَكَ فَدَخَلَ فَكَسَحَهٗ وَوَجَدَ فِيْ جَانِبِهٖ ثُقْبًا فَشَقَّ اِزَارَهٗ وَسَدَّهَا بِهٖ وَبَقِيَ مِنْهَا اِثْنَانِ فَاَلْقَمَهُمَا رِجْلَيْهِ ثُمَّ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُدْخُلْ فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَضَعَ رَاْسَهٗ فِيْ حَجْرِهٖ فَنَامَ فَلُدِغَ اَبُوْبَكْرٍ فِيْ رِجْلِهٖ مِنَ الْحُجْرِ وَلَمْ يَتَحَرَّكْ مَخَافَةَ اَنْ يَّنْتَبِهَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَقَطَتْ دُمُوْعُهٗ عَلٰى وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَالَكَ يَا اَبَابَكْرٍ قَالَ لُدِغْتُ فِدَاكَ اَبِيْ وَاُمِّيْ فَتَفَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَهَبَ مَا يَجِدُهٗ ثُمَّ انْتَقَضَ عَلَيْهِ وَكَانَ سَبَبَ مَوْتِهٖ وَاَمَّا يَوْمُهٗ فَلَمَّا قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ارْتَدَّتِ الْعَرَبُ وَقَالُوْا لَا نُؤَدِّيْ زَكٰوةً فَقَالَ لَوْ مَنَعُوْنِيْ عِقَالًا لَجَاهَدْتُهُمْ عَلَيْهِ وَقُلْتُ يَا خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ تَاَلَّفِ النَّاسَ وَارْفُقْ بِهِمْ فَقَالَ لِيْ اَجَبَّارٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَخَوَّارٌ فِي الْاِسْلَامِ اِنَّهٗ قَدِ انْقَطَعَ الْوَحْيُ وَتَمَّ الدِّيْنُ اَيَنْقُصُ وَاَنَا حَيٌّ۔ (رواہ رزین)

"سیدنا عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ان کے سامنے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر چھڑ گیا تو وہ (ان کی پاکیزہ و بلند قدر زندگی کو یاد کر کے) رونے لگے اور پھر بولے: مجھ کو آرزو ہے کہ کاش میری پوری زندگی کے اعمال (قدر و قیمت کے اعتبار سے) حضرت ابوبکرؓ کے صرف اس ایک دن کے عمل کے برابر ہو جاتے جو (آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات کے) دنوں میں سے ایک دن تھا۔ یا ان کی اس ایک رات کے عمل کے برابر ہو جاتے جو (آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات کی) راتوں میں سے ایک رات تھی یہ ان کی اس رات کا ذکر ہے جس میں وہ رسول کریم ﷺ کے ساتھ سفر ہجرت پر روانہ ہوئے اور غار ثور ان کی پہلی منزل بنا تھا، جب آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اس غار پر پہنچے (اور آنحضرت ﷺ نے غار میں داخل ہونا چاہا) تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا: خدا کے واسطے آپ (ﷺ) اس غار میں ابھی داخل نہ ہوں، پہلے

میں اندر جاتا ہوں تاکہ اگر اس میں کوئی موذی چیز (جیسے سانپ بچھو وغیرہ) ہو اور وہ ضرر پہنچائے تو مجھ کو ضرر پہنچائے نہ کہ آپ (ﷺ) کو۔ اور یہ (کہہ کر) حضرت ابوبکرؓ (آنحضرت ﷺ سے پہلے) غار میں داخل ہوگئے اور اس کو جھاڑ جھٹک کر صاف کیا۔ انہوں نے غار کے ایک کونے میں کئی سوراخ بھی دیکھے تھے ان میں سے بیشتر سوراخوں کو انہوں نے اپنے تہبند سے چیتھڑے پھاڑ کر بند کر دیا اور جو دو سوراخ (اس وجہ سے) باقی رہ گئے تھے (کہ ان کو بند کرنے کے لئے تہبند کے چیتھڑوں میں سے کچھ نہیں بچا تھا) ان کے منہ میں وہ اپنے دونوں پاؤں (کی ایڑیاں) اڑا کر بیٹھ گئے (تاکہ کسی زہریلے اور موذی جانور کے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہ رہے) پھر انہوں نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اب اندر تشریف لے آیئے! چنانچہ رسول کریم ﷺ غار میں داخل ہوئے اور اپنا سر مبارک حضرت ابوبکرؓ کی گود میں رکھ کر سو گئے، اسی دوران ایک سوراخ کے اندر سے سانپ نے حضرت ابوبکرؓ کے پاؤں میں کاٹ لیا لیکن (وہ اسی طرح بیٹھے رہے اور) اس ڈر سے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کی کہ کہیں رسول کریم ﷺ جاگ نہ جائیں۔ آخر کار (شدت تکلیف سے) ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل گئے، اور رسول کریم ﷺ کے چہرہ مبارک پر گرے (جس سے آپ ﷺ کی آنکھ کھل گئی) آپ ﷺ نے (ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو) پوچھا: ابوبکرؓ! یہ تمہیں کیا ہوا؟ انہوں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے (کسی زہریلے جانور یعنی سانپ نے) کاٹ لیا ہے آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) اپنا مبارک لعاب دہن (ان کے پاؤں میں کاٹی ہوئی جگہ پر) ٹپکا دیا اور (تکلیف و اذیت کی) جو کیفیت ان کو محسوس ہو رہی وہ فوراً جاتی رہی۔ اسی سانپ کا وہ زہر تھا جو حضرت ابوبکرؓ پر دوبارہ اثر انداز ہوا، اور اسی کے سبب ان کی موت واقع ہوئی، اور ان کا وہ دن (کہ جس کے بارے میں میری آرزو ہے کہ کاش میرے زندگی بھر کے اعمال ان کے صرف اس دن کے عمل کے برابر قرار پائیں) وہ دن تھا جب رسول کریم ﷺ نے اس دنیا سے رحلت فرمائی تھی۔ اور بعض عرب قبائل مرتد ہو گئے تھے ان (قبائل کے) لوگوں نے کہا تھا کہ ہم زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کا کہنا تھا کہ اگر یہ لوگ (زکوٰۃ میں اونٹ کے پاؤں باندھنے کے بقدر) رسی بھی دینے سے مجھے انکار کریں گے تو یقیناً میں ان سے جہاد کروں گا۔ میں نے (ان کا یہ فیصلہ سن کر) عرض کیا تھا: اے خلیفۂ رسول اللہ! (یہ بڑا نازک موقع ہے) آپ کو لوگوں سے الفت و خیر سگالی کا برتاؤ اور نرمی کا سلوک کرنا چاہئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے (بڑے تیکھے لہجہ میں) مجھے جواب دیا تھا "کیا تم اپنے زمانۂ جاہلیت ہی میں غیور و بہادر اور قوی و غصہ ور تھے؟ اور اب اپنے زمانۂ اسلام میں بزدل و پست ہمت ہوگئے ہو؟ اس حقیقت کو نہ بھولو کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اور دین کامل ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں دین کمزور و ناقص ہو جائے، ایسا میں اپنی زندگی میں ہرگز نہیں ہونے دوں گا"۔ (رزینؒ)

تشریح: "اور اسی کے سبب ان کی موت واقع ہوئی" یعنی اس رات میں غار ثور کے سوراخ سے سانپ نے حضرت ابوبکرؓ کے پاؤں کو جو ڈسا تھا اس وقت تو اس کے زہر کا اثر آنحضرت کے لعاب مبارک کی برکت سے زائل ہو گیا تھا۔ لیکن پھر اس واقعہ کے عرصۂ دراز کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی آخر عمر میں اس زہر کے اثرات نے عود کیا اور آخر کار اسی کے سبب سے ان کی موت ہوئی۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ کو وہ مرتبہ ملا جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے کو ملتا ہے کیونکہ جس زہر کے اثر سے ان کا انتقال ہوا وہ ان کو اس وقت پہنچا تھا۔ جب انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کی خوشنودی کے لئے سفر ہجرت میں اللہ کے رسول کی معیت اختیار کی اور اللہ کے رسول کو کسی بھی ضرر و گزند سے محفوظ رکھنے کے لئے خود کو ہر ضرر و گزند کے آگے کر دیا تھا، اثرات زہر کے عود کرنے کا ایسا ہی قصہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا، غزوہ خیبر کے موقع پر بھنی ہوئی بکری کے گوشت میں زہر ملا کر آپ ﷺ کو دیا گیا تھا، اس وقت تو اللہ تعالیٰ نے اس زہر کے مضرات سے آپ کو محفوظ رکھا لیکن مرض الموت میں پھر اسی زہر کے اثرات ظاہر ہو گئے تھے۔

"ہم زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے" ان قبائل کا زکوٰۃ ادا کرنے کے بارے میں یہ کہنا، انکار کے طور پر تھا یعنی یا تو وہ سرے سے وجوب زکوٰۃ ہی کے منکر ہو گئے تھے، یا علی الاعلان وہ تارک زکوٰۃ ہو گئے تھے۔ اس کی تفصیل پیچھے "کتاب الزکوٰۃ" میں گزر چکی ہے۔ ہمارے بعض علماء نے لکھا ہے۔ کہ اگر کسی شخص کو شرعی طور پر حکم دیا جائے کہ زکوٰۃ ادا کرو، اور وہ شخص جواب دے کہ نہیں، میں زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، تو وہ شخص

کافر ہو جائے گا۔

"اگر یہ لوگ رسی بھی دینے سے مجھے انکار کریں گے" یہ لو منعونی عقالاً کا ترجمہ ہے! عقال دراصل اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کے پاؤں باندھے جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے پاس اونٹ ہوں اور ان اونٹوں میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہو اور پھر وہ نصاب کے مطابق ایک یا ایک سے زائد اونٹ زکوٰۃ میں نکالے۔ تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ محصل زکوٰۃ کو عقال سمیت اونٹ سپرد کرے۔ کیونکہ مالک (زکوٰۃ ادا کرنے والے) کو لازم ہے کہ وہ زکوٰۃ میں نکالی گئی چیز (خواہ روپیہ پیسہ ہو یا کوئی جانور وغیرہ) زکوٰۃ لینے والے کے قبضہ اور سپردگی میں دے، ظاہر ہے کہ اونٹ پوری طرح قبضہ و سپردگی میں اسی وقت آسکتا ہے۔ جب وہ عقال کے ساتھ (یعنی رسی وغیرہ سے بندھا ہوا) لیا جائے۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے۔ "عقال" اصل میں اونٹ یا بکری کی ایک سال کی "زکوٰۃ" کو کہتے ہیں، ویسے تو لغت میں "عقال" کے یہ دونوں معنی آئے ہیں لیکن زیادہ مشہور و متعارف معنی اول یعنی رسی ہی ہے۔ صاحب قاموس نے اس لفظ کو دوسرے معنی میں ذکر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ حضرت ابوبکر کے الفاظ لو منعونی عقالا میں عقل کے یہی معنی مراد ہیں یعنی اونٹ یا بکری کی ایک سال کی زکوٰۃ، ایک روایت میں "عقالا" کے بجائے "عناقا" کا لفظ نقل کیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں، بکری کا وہ بچہ جو پورے ایک سال کا نہ ہوا ہو۔

"بزدل و پست ہمت ہو گئے ہو" ان الفاظ کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے کے خلاف گویا شدید ناگواری کا اظہار کیا ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب تم مسلمان نہیں ہوئے تھے اور تمہارا زمانہ جاہلیت تھا اس وقت تو تم بڑے بہادر بھی تھے اور غیور بھی، ذرا ذرا سی بات پر تمہیں اتنا غصہ آجاتا تھا کہ تلوار سونت کر کھڑے ہو جاتے تھے، مگر اب تمہیں کیا ہوا ہے کہ اسلام کے اتنے بڑے حکم سے انکار کرنے والوں کے تئیں نرمی و مروت کا رویہ اختیار کرنے کا مشورہ مجھے دے رہے ہو اور ان مرتدوں کے خلاف تلوار اٹھانے سے مجھے روکنا چاہتے ہو۔ یہ مشورہ تم جیسے بہادر اور غیور مسلمان کے شایان شان نہیں ہے، یہ تو نری بزدلی اور مداہنت کی بات ہے۔ ان عرب قبائل کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کا یہ سخت رویہ اور ان کا بعزیمت فیصلہ دراصل ان کی بے مثال شجاعت و بہادری اور ان کی زبردست دینی حمیّت و غیرت کا غماز ہے۔ اگرچہ حضرت عمرؓ کی مذکورہ رائے میں حضرت علیؓ بھی شریک تھے، لیکن اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ کی باکمال بصیرت اور دور اندیشی نے اس رائے کو اہمیت نہیں دی اور پوری جرأت کے ساتھ ان مرتدوں کے خلاف تلوار اٹھانے کا فیصلہ کیا ان کی پختگی و مضبوطی کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کو اپنی رائے بدلنا پڑی اور نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اسی موقع پر برملا اعتراف کیا کہ اب اللہ نے میرا سینہ کھول دیا ہے۔ اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہی بات صحیح و صواب ہے جو حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ بلکہ وہ اس واقعہ کے بعد بھی اکثر حضرت ابوبکرؓ کے اس باعزیمت فیصلہ کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اور جیسا کہ اس حدیث میں ہے، یہاں تک کہا کرتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ کی زندگی کا محض یہی ایک فیصلہ اتنا عظیم کارنامہ ہے کہ اگر میری پوری زندگی کے نیک اعمال ان کے اس ایک عمل کے برابر قرار پا جائیں تو میں اپنی بڑی خوش بختی تصور کروں۔

"وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور" یہ بات حضرت ابوبکرؓ نے اس معنی میں کہی کہ پہلے تو آنحضرت ﷺ اس دنیا میں موجود تھے، دینی ہدایت و راہنمائی براہ راست وحی کی صورت میں حاصل ہو جایا کرتی تھی، مگر اب صورت حال بدل چکی ہے، اجتہاد کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے جو ہمیں کسی ایسے پیش آمدہ کے مسئلہ میں کہ جو قرآن و حدیث میں واضح طور پر مذکور نہ ہو صحیح فیصلہ پر پہنچا سکے، لہٰذا کسی بھی دینی معاملہ و مسئلہ میں رائے دیتے وقت اچھی طرح غور و فکر کر لینا چاہئے اور معاملہ کے تمام پہلوؤں کو ذہن میں رکھ کر بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ اجتہاد کرنا چاہئے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم کے مطابق دین چونکہ اللہ کے رسول کے ذریعہ اپنی مکمل صورت میں ہم تک پہنچا ہے۔ اس لئے خلیفۂ رسول ہونے کی حیثیت سے میری ذمہ داری ہے کہ دین کی اس کی اصل اور مکمل

صورت کے ساتھ حفاظت کروں اور کسی بھی ایسے فتنہ کو سر نہ اٹھانے دوں جس سے دین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

بَابُ مَنَاقِبِ عُمَرَؓ

حضرت عمرؓ کے مناقب وفضائل کا بیان

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے مناقب وفضائل بے شمار ہیں ان کی عظیم ترین شخصیت وحیثیت اور ان کے بلند ترین مقام ومرتبہ کی منقبت میں یہی ایک بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک ﷺ کی دعا قبول کر کے ان کو اسلام قبول کرنے کی توفیق دی اور ان کے ذریعہ اپنے دین کو زبردست حمایت وشوکت عطا فرمائی۔ ان کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ کہ منجانب اللہ راہ صواب ان پر روشن ہو جاتی تھی، الہام و القاء کے ذریعہ غیبی طور پر ان کی راہنمائی ہوتی تھی ان کے دل میں وہی بات ڈالی جاتی تھی جو حق ہوتی تھی اور ان کی رائے وحی الٰہی اور کتاب اللہ کے موافق پڑتی تھی، اسی بناء پر علما نے لکھا ہے، کہ حضرت ابوبکرؓ کے حق میں ان کی رائے خلافت صدیق کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ جیسا کہ حضرت عمار ابن یاسرؓ کی شہادت کو حضرت علی مرتضیٰؓ کے حق ہونے کی دلیل مانا جاتا ہے۔

ابن مردویہؒ نے حضرت مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ (کسی مسئلہ و معاملہ میں) حضرت عمر فاروقؓ جو رائے دیتے تھے اسی کے موافق آیات قرآنی نازل ہوتی تھیں، ابن عساکرؒ نے سیدنا علی مرتضیٰؓ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، قرآن حضرت عمرؓ کی رائے میں سے ایک رائے ہے، یعنی قرآنی آیات کا ایک بڑا حصہ حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے بطریق مرفوع روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر (کسی مسئلہ میں اختلاف رائے ہو کہ) تمام لوگوں کی رائے کچھ ہو اور عمر کی کچھ، اور پھر (اس مسئلہ سے متعلق) قرآن کی آیت نازل ہو تو وہ عمرؓ کی رائے کے مطابق ہوگی" اس روایت کو سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ "موافقات عمرؓ" (یعنی حضرت عمرؓ کی رائے سے قرآن کریم میں جہاں جہاں اتفاق کیا گیا ہے ایسے مواقع) بیس ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضرت عمرؓ محدث تھے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ کَانَ فِیْمَا قَبْلَکُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَّكُ اَحَدٌ فِیْ اُمَّتِیْ فَاِنَّهٗ عُمَرُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، تم سے پہلے (سابقہ امتوں کے) لوگوں میں محدث ہوا کرتے تھے۔ اگر میری اُمت میں کوئی شخص محدث ہوا تو وہ بس عمرؓ ہوں گے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "اگر میری اُمت میں کوئی محدث ہوا تو" کا مقصود اس اُمت میں محدث کے وجود کو مشکوک و مشتبہ کرنا نہیں ہے، اُمت محمدی تو پچھلے تمام امتوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اگر پچھلی امتوں میں محدث ہوا کرتے تھے تو اس اُمت میں ان کا وجود یقینی طور پر بطریق اولیٰ ہوگا۔ پس ان الفاظ کا مقصد تاکید و تخصیص ہے، یعنی اس اُمت میں صرف عمرؓ ان خصوصیات و اوصاف کے حامل ہیں جن سے ان کا محدث ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس جملہ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے کسی مخلص ترین دوست کی خصوصی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لئے کہے کہ دنیا میں اگر کوئی شخص میرا دوست ہے تو بس وہی ہے جس طرح اس جملہ کی مراد اس شخص کی دوستی کے درجۂ کمال کو نہایت خصوصیت کے ساتھ بیان کرنا ہوتی ہے۔ اسی طرح حدیث کے مذکورہ بالا جملہ کی مراد مذکورہ وصف کے ساتھ حضرت عمرؓ کی نہایت خصوصی نسبت کو بیان کرنا ہے۔

محدث کے معنی: "محدث" یہاں ملہم (صاحب الہام) کے معنی میں ہے، یعنی وہ (روشن ضمیر) شخص جس کے دل میں غیب سے کوئی بات پڑے۔ اس کو محدث اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ گویا اس سے غیبی طاقت بات کرتی ہے، اس کو وہ بات بتاتی ہے، جو دوسروں کو معلوم نہیں ہوتی اور پھر وہ شخص اس بات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ مجمع البحار میں لکھا ہے، محدث اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کوئی بات ڈالی جاتی ہے اور پھر وہ شخص ایمانی حدس وفراست کے ذریعہ اس بات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، اور یہ مرتبہ اسی شخص کو نصیب ہوتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نوازنا چاہے، بعض حضرات نے کہا ہے: محدث وہ شخص ہے جس کا ظن، یعنی گمان (کسی بھی مختلف فیہ بات کے) اسی پہلو کو اختیار کرے جو صواب یعنی صحیح ہو اور آخر میں اس کی رائے اس طرح صائب ثابت ہو جیسے کسی جاننے والے نے اس کو بتا رکھا ہو۔ اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے۔ "محدث" کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جس کے فرشتے اس سے کلام کرتے ہوں، یہ قول غالباً اس بنیاد پر ہے کہ ایک روایت میں "محدثون" کے بجائے "متکلمون" کا لفظ نقل ہوا ہے۔

حضرت عمرؓ سے شیطان کی خوف زدگی

(۲) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍؓ قَالَ اسْتَاْذَنَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَہٗ نِسْوَۃٌ مِنْ قُرَیْشٍ یُکَلِّمْنَہٗ وَیَسْتَکْثِرْنَہٗ عَالِیَۃً اَصْوَاتُھُنَّ فَلَمَّا اسْتَاْذَنَ عُمَرُ قُمْنَ فَبَادَرْنَ الْحِجَابَ فَدَخَلَ عُمَرُ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَضْحَکُ فَقَالَ اَضْحَکَ اللّٰہُ سِنَّکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَجِبْتُ مِنْ ھٰؤُلَاءِ اللّٰتِیْ کُنَّ عِنْدِیْ فَلَمَّا سَمِعْنَ صَوْتَکَ ابْتَدَرْنَ الْحِجَابَ قَالَ عُمَرُ یَا عَدُوَّاتِ اَنْفُسِھِنَّ اَتَھَبْنَنِیْ وَلَا تَھَبْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَ نَعَمْ اَنْتَ اَفَظُّ وَاَغْلَظُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِیْہٍ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَا لَقِیَکَ الشَّیْطٰنُ سَالِکًا فَجًّا قَطُّ اِلَّا سَلَکَ فَجًّا غَیْرَ فَجِّکَ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَقَالَ الْحُمَیْدِیُّ زَادَ الْبَرْقَانِیُّ بَعْدَ قَوْلِہٖ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا اَضْحَکَکَ۔

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ بیان کرتے ہیں: (ایک دن) حضرت عمر ابن خطابؓ حجرۂ نبوی کے دروازے پر کھڑے ہو کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، اس وقت آپ ﷺ کے پاس قریش کی چند خواتین یعنی ازواج مطہرات بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں، ان کی باتوں کا موضوع (اس) خرچہ میں اضافہ کا مطالبہ تھا (جو آنحضرت ﷺ ان کو پہنچاتے تھے) اور وہ باتیں زور زور سے کر رہی تھیں جب حضرت عمرؓ اجازت طلب کر کے اندر داخل ہونے لگے۔ تو وہ خواتین (چھپنے کے لئے) آنحضرت ﷺ کے پاس سے اٹھ کر پردہ کے پیچھے چلی گئیں۔ حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے تو (دیکھا کہ) رسول کریم ﷺ مسکرا رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے (آپ ﷺ کی مسکراہٹ دیکھ کر) کہا: اللہ آپ کے دانتوں کو ہمیشہ خنداں رکھے۔ (یعنی دانتوں کا کھلنا مسکراہٹ خوشی کی غماز ہوتی ہے۔ میری دعا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ شاداں وفرحاں رکھے، لیکن آخر وہ کون سی بات ہے جس نے اس وقت آپ ﷺ کو خنداں کر دیا ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا مجھے اس بات پر ہنسی آگئی۔ کہ وہ عورتیں (کہاں تو) میرے پاس بیٹھی ہوئی (شور مچا رہی) تھیں اور (کہاں) تمہاری آواز سنتے ہی (مارے ڈر کے) پردے کے پیچھے بھاگ گئیں، حضرت عمرؓ (نے یہ سنا تو ان خواتین کو مخاطب کر کے) بولے: اری اپنی جان کی دشمن عور تو! (یہ کسی الٹی بات ہے کہ) مجھ سے تو اس قدر خوف کا اظہار (کہ میری آواز سنتے ہی ڈر کے مارے پردے کے پیچھے جا چھپی ہو) اور رسول کریم ﷺ سے تم ذرا بھی ڈرتیں (کہ آپ کے پاس بیٹھ کر شور مچا رہی تھیں؟) ان خواتین نے جواب دیا: ہاں (تم سے ڈرنا ہی چاہئے) کیونکہ تم نہایت سخت خو نہایت سخت گو ہو (جب کہ رسول کریم ﷺ نہایت خوش مزاج اور خوش خلق ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ابن خطاب! چھوڑو، اور کوئی بات کرو (ان عورتوں نے جو جواب دیا ہے اس کو اہمیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے) قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ

میں میری جان ہے (تم وہ شخص ہو کہ) اگر شیطان تمہیں دیکھ لیتا ہے تو اس راستہ سے کترا کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ جس پر تم چلتے ہو، (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حمیدیؒ نے (اپنی کتاب "جامع بین الصحیحین" میں) کہا ہے کہ برقانیؒ نے (جو خوارزم کے ایک گاؤں برقان کے رہنے والے تھے اور مشہور محدث ہیں) حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ: یارسول اللہ کس چیز نے آپ کو ہنسایا ہے؟۔"

تشریح: "اور باتیں بھی زور زور سے کر رہی تھیں" یعنی ان کی آواز پر حاوی تھی! پس اس بارے میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب رسول کریم ﷺ کے سامنے شور مچانے یعنی آپ کی آواز سے اونچی آواز میں بولنے کی ممانعت قرآن میں نازل نہیں ہوئی تھی اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان سب کی آوازیں مل کر پر شور ہو گئی تھیں جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ اگر چند آدمی ایک ساتھ آہستہ آہستہ بھی بولتے ہیں تو سب کی آوازیں مل کر پر شور ہو جاتی ہیں، یہ صورت نہیں تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی یا کسی ایک کی تنہا آواز اس حد سے بلند تھی جس کی ممانعت آئی ہے۔ ان دونوں احتمالوں کو ملا علی قاریؒ نے نقل کیا ہے اور پھر لکھا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ الفاظ حدیث سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی آواز اتنی زیادہ بلند تھی کہ آنحضرت ﷺ کی آواز سے اونچی ہو گئی تھی، اور جب یہ بات ثابت ہی نہیں ہوتی تو پھر ارشاد ربانی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ الاٰیۃ کے تحت کوئی اشکال بھی وارد نہیں ہوتا، الفاظ حدیث سے جو بات مفہوم ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ازواج مطہرات عام طور پر آنحضرت ﷺ کے سامنے جس دھیمے لب و لہجہ میں اور جس دھیمی آواز میں بات کیا کرتی تھیں اس موقع پر ان کی آواز اس عادت و معمول سے ذرا کچھ بلند ہو گئی تھی جو نہ تو حد ادب سے تجاوز تھی اور نہ آنحضرت ﷺ کی خوش خلقی اور خوش مزاجی کی ناگواری کا باعث بنی تھی۔

"اس راستہ سے کترا کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے" مطلب یہ کہ: تمہاری ہیبت اتنی ہے کہ شیطان تمہارے تصور سے بھی کانپتا ہے، اس کی اتنی مجال بھی نہیں ہوتی کہ تمہارے سامنے آجائے جس جگہ تم ہو گے وہاں شیطان کا گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک روایت میں یوں آیا ہے: شیطان عمرؓ کے سایہ سے بھی بھاگتا ہے، واضح رہے کہ "فج" کے معنی "کشادہ راستہ" کے آتے ہیں۔ اگرچہ ایک احتمال یہ ہے کہ "فج" سے مطلق راستہ مراد ہے خواہ وہ تنگ ہو یا کشادہ، تاہم زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ لفظ یہاں اپنے ظاہری معنی یعنی "کشادہ راستہ" کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ شیطان عمرؓ کو چوڑے اور کشادہ راستہ پر بھی دیکھ کر کترا جاتا ہے۔ اور دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ چاہے تو اس کشادہ راستہ کے کسی ایک کنارے سے گزر سکتا ہے لیکن اس پر تو عمرؓ کا خوف اور ان کی ہیبت ہی اتنی سوار ہے کہ وہ سرے سے اس راستہ کی طرف آنے ہی سے گھبراتا ہے، جس پر عمرؓ چل رہے ہوں!

جنت میں عمرؓ کا محل جو حضورؐ نے فرمایا

(۴) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَاِذَا اَنَا بِالرُّمَیْصَاءِ امْرَاَةِ اَبِیْ طَلْحَةَ وَسَمِعْتُ خَشَفَةً فَقُلْتُ مَنْ هٰذَا فَقَالَ هٰذَا بِلَالٌ وَرَاَیْتُ قَصْرًا بِفِنَائِهٖ جَارِیَةٌ فَقُلْتُ لِمَنْ هٰذَا فَقَالُوْا لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاَرَدْتُ اَنْ اَدْخُلَهٗ فَاَنْظُرَ اِلَیْهِ فَذَكَرْتُ غَیْرَتَكَ فَقَالَ عُمَرُ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَعَلَیْكَ اَغَارُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: (معراج کی رات میں) جب میں جنت میں داخل ہوا تو اچانک دیکھا کہ میرے سامنے رمیصا زوجہ ابوطلحہؓ موجود ہیں۔ پھر میں نے قدموں کی چاپ سنی اور پوچھا کہ یہ کون شخص ہے (جس کے چلنے پھرنے کی آواز آرہی ہے) مجھے (جبرئیل یا کسی اور فرشتہ نے یا داروغہ جنت نے) بتایا کہ یہ بلالؓ ہیں۔ اس کے بعد (ایک جگہ پہنچ کر) میں نے ایک عالیشان محل دیکھا، جس کے ایک گوشہ میں (یا صحن میں) ایک نوجوان عورت (یعنی حور جنت) بیٹھی ہوئی تھی، میں نے پوچھا! یہ محل کس کا ہے؟ (اور ہمہ انواع کی یہ نعمتیں جو اس محل میں اور اس محل کے ارد گرد ہیں کس کے لئے ہیں) مجھ کو جنتیوں نے (یا اس محل پر متعین فرشتوں نے) بتایا کہ یہ (محل اپنے تمام ساز و سامان اور نعمتوں سمیت) عمر ابن خطابؓ کا ہے (یہ سن کر) میں نے چاہا کہ محل میں جاؤں اور اس کو اندر سے بھی

دیکھوں لیکن پھر (اے عمرؓ) مجھے غیرت کا خیال آگیا (کہ تمہارے محل کے اندر داخل ہونا تمہاری غیرت و حمیت کے منافی ہوگا اس لئے میں نے اندر جانے سے اجتناب کیا) حضرت عمرؓ نے (یہ سنا تو) عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، کیا میں آپ ﷺ (کے داخل ہونے) سے غیرت کروں گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "رمیصا" حضرت ابوطلحہؓ انصاری کی بیوی اور حضرت انس ابن مالکؓ کی والدہ ماجدہ ہیں، پہلے یہ مالک ابن نضر کے نکاح میں تھیں جن سے حضرت انسؓ پیدا ہوئے، مالک کے بعد ابوطلحہؓ نے ان سے عقد کر لیا تھا، ان کے اصل نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ ام سلیم بھی کہی جاتی تھیں اور رمیصاء بھی، ایک مشہور نام غمیصاء بھی ہے، رمیصاء دراصل "رمص" سے ہے، جس کے معنی اس سفید چیپڑ (میل کچیل) کے ہیں جو آنکھ کے کونے میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور "غمیصا" غمص سے ہے اس کے معنی ہیں: آنکھ سے چیپڑ بہنا۔

"کیا میں آپ (ﷺ) سے غیرت کروں گا" یہ اَعَلَیْكَ اَغَارُ کا ترجمہ ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس جملہ میں قلب الفاظ ہے۔ یعنی اصل جملہ یوں ہے: اَغَارُ مِنْكَ نیز بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے (آنحضرت ﷺ کا ارشاد سن کر) یہ بھی کہا: وَهَلْ رَفَعَنِيَ اللّٰهُ اِلَّا بِكَ وَهَلْ هَدَانِيَ اللّٰهُ اِلَّا بِكَ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ جو بلند مرتبہ عطا فرمایا وہ محض آپ کے طفیل سے ہے مجھے اللہ تعالیٰ نے ہدایت و راستی اور سرفرازی تک آپ ﷺ ہی کے ذریعہ پہنچایا ہے۔

دین کی شان و شوکت سب سے زیادہ حضرت عمرؓ نے دوبالا کی

④ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَنَا نَائِمٌ رَاَيْتُ النَّاسَ يُعْرَضُوْنَ عَلَيَّ وَعَلَيْهِمْ قُمُصٌ مِنْهَا مَا يَبْلُغُ الثُّدِيَّ وَ مِنْهَا مَادُوْنَ ذٰلِكَ وَعُرِضَ عَلَيَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَعَلَيْهِ قَمِيْصٌ يَجُرُّهٗ قَالُوْا فَمَا اَوَّلْتَ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الدِّيْنُ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(ایک دن) جب کہ میں سو رہا تھا تو (خواب میں) کیا دیکھتا ہوں کہ (میری اُمت کے) کچھ لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، وہ سب کرتا پہنے ہوئے تھے جن میں بعض کے کرتے تو ان کے سینے تک تھے، اور بعض کے کرتے ان سے بھی چھوٹے تھے۔ پھر جب عمر بن خطابؓ میرے سامنے پیش ہوئے تو ان کا کرتا اتنا لمبا تھا کہ زمین سے گھسٹ رہا تھا، بعض صحابہ نے (یہ سن کر) پوچھا کہ یارسول اللہ! (عمرؓ کے اس لمبے کرتے کی) تعبیر آپ (ﷺ) کیا بیان فرماتے ہیں؟ فرمایا دین و مذہب!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اور بعض کے کُرتے ان سے بھی چھوٹے تھے" یعنی بعض لوگوں کے جسم کے کرتے تو اتنے تھے جو سینے تک پہنچتے تھے۔ اور بعض لوگوں کے کرتے اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے سینے تک بھی نہیں پہنچتے تھے بلکہ سینے سے اوپر تھے۔ ومنہا مادون ذٰلِكَ کا مطلب عام طور پر یہی بیان کیا گیا ہے مگر ملا علی قاری نے اس جملہ کی جو وضاحت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے نزدیک یہ معنی بھی ہیں اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ان کے کُرتے ان کے کُرتوں سے لمبے تھے۔

حضرت عمرؓ کے کُرتے کی درازی کی تعبیر میں "دین و مذہب" کے ذکر سے یہ مراد ہے کہ عمرؓ کی ذات سے دین کو تقویت حاصل ہوگی اور کیونکہ ان کی خلافت کا زمانہ طویل ہوگا لہٰذا ان کے زمانہ میں دین کی شان و شوکت نہایت درجہ دوبالا ہوگی، بے شمار شہر و ملک فتح ہوں گے اور ان فتوحات کے نتیجہ میں بیت المال کی آمدنی وسیع تر ہو جائے گی، یا یہ کہ دین کو کرتے کے ساتھ تشبیہ دینا گویا اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ جس طرح انسان کا لباس نہ صرف یہ کہ اس کے وجود کی زیبائش و آرائش اور مختلف پر مضر اثرات سے حفاظت و آرام کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ حقیقت میں اس کے جسم کا لازمی تقاضہ بھی ہوتا ہے اسی طرح دین نہ صرف یہ کہ انسان کی تہذیب و شائستگی اور اس کے روحانی اطمینان و سکون کا ذریعہ اور دونوں جہاں میں اس کی حفاظت کا ضامن ہوتا ہے بلکہ حقیقت میں انسانیت کا لازمی جزء اور انسانی فطرت سلیم

کا عین تقاضا بھی ہے۔

حضرت عمرؓ کی علمی بزرگی

(۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بَيْنَا اَنَا نَائِمٌ اُتِيْتُ بِقَدَحِ لَبَنٍ فَشَرِبْتُ حَتّٰى اِنِّيْ لَاَرَى الرِّيَّ يَخْرُجُ فِيْ اَظْفَارِيْ ثُمَّ اَعْطَيْتُ فَضْلِيْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالُوْا فَمَا اَوَّلْتَهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الْعِلْمُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: میں سو رہا تھا کہ (خواب میں) دودھ سے بھرا ہوا پیالہ لا کر مجھے دیا گیا، میں نے اس دودھ کو پیا، پھر میں نے دیکھا کہ (زیادہ ہونے کے سبب اس دودھ کی) تری اور تازگی میرے ناخنوں سے پھوٹ رہی ہے اور پھر میں نے اپنا بچایا ہوا دودھ عمر بن الخطابؓ کو (پینے کے لئے) دے دیا، بعض صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا یا رسول اللہ! اس دودھ کی تعبیر میں آپ ﷺ کیا فرماتے ہیں فرمایا: علم!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ علم کی صورت مثالیہ عالم بالا میں دودھ ہے، اسی لئے اگر کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ دودھ پی رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ قرار پاتی ہے۔ کہ اس شخص کو خالص و نافع علم نصیب ہوگا، علم اور دودھ کے درمیان وجہ مشابہت یہ ہے کہ جس طرح دودھ انسانی جسم کی پہلی غذا اور بدن کی اصلاح و تقویت کا بنیادی ذریعہ ہے اسی طرح علم انسانی روح کی پہلی غذا اور اس کی اصلاح و تقویت کا بنیادی ذریعہ ہے۔ بعض عارفین نے یہ لکھا ہے کہ عالم مثال سے تجلی علم کا انعکاس صرف چار چیزوں یعنی پانی، دودھ، شراب اور شہد کی صورت میں ہوتا ہے اور یہی وہ چار چیزیں ہیں جن کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ قرآن کریم نے ان چار نہروں کا ذکر یوں فرمایا گیا ہے:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَا اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى۔

"جنت، جس کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بو نہیں کرے گا اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہیں بدلے گا اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لئے (سراسر) لذت ہے اور شہد مصفا کی نہریں۔"

پس جس شخص نے (خواب میں) پانی پیا اس کو علم لدنی عطا ہوگا، جس شخص نے دودھ پیا اس کو اسرار شریعت کا علم عطا ہوگا، جس شخص نے شراب پی اس کو علم کمال عطا ہوگا اور جس شخص نے شہد پیا اس کو بطریق وحی علم عطا ہوگا۔ اور عارفین ہی میں سے بعض نے اس ضمن میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جنت کی یہ چاروں نہریں در حقیقت چاروں خلفاء سے عبارت ہیں اور اس اعتبار سے حدیث بالا میں دودھ کی نسبت سے صرف حضرت عمرؓ کا ذکر ہونا نہایت موزوں ہے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر حضرت عمرؓ کا علم ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں عرب کے تمام قبائل (کے اہل علم) کو جمع کر کے رکھا جائے اور پھر وزن کیا جائے تو حضرت عمرؓ کے علم کا پلڑا ان سب کے علم سے وزن میں بھاری رہے گا، اور اسی وجہ سے تمام صحابہؓ کا اعتقاد تھا کہ دس حصوں میں سے نو حصے علم تنہا حضرت عمرؓ پا گئے ہیں۔

حضرت عمرؓ سے متعلق آنحضرت کا ایک اور خواب

(۶) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بَيْنَا اَنَا نَائِمٌ رَاَيْتُنِيْ عَلٰى قَلِيْبٍ عَلَيْهَا دَلْوٌ فَنَزَعْتُ مِنْهَا مَا شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ اَخَذَهَا ابْنُ اَبِيْ قُحَافَةَ فَنَزَعَ مِنْهَا ذَنُوْبًا اَوْ ذَنُوْبَيْنِ وَفِيْ نَزْعِهٖ ضَعْفٌ وَاللّٰهُ يَغْفِرُ لَهٗ ضَعْفَهٗ ثُمَّ اسْتَحَالَتْ غَرْبًا فَاَخَذَهَا ابْنُ الْخَطَّابِ فَلَمْ اَرَ عَبْقَرِيًّا مِنَ النَّاسِ يَنْزِعُ نَزْعَ عُمَرَ حَتّٰى ضَرَبَ النَّاسُ بِعَطَنٍ وَفِيْ

رَوَایَۃُ ابْنِ عُمَرَ قَالَ ثُمَّ اَخَذَھَا ابْنُ الْخَطَّابِ مِنْ یَدِ اَبِیْ بَکْرٍ فَاسْتَحَالَتْ فِیْ یَدِہٖ غَرْبًا فَلَمْ اَرَ عَبْقَرِیًّا یَفْرِیْ فَرِیَّہٗ حَتّٰی رَوَی النَّاسُ وَضَرَبُوْا بِعَطَنٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا "میں سورہا تھا کہ (خواب میں) دیکھا میں ایک بغیر من کے کنویں پر ہوں جہاں ایک ڈول بھی رکھا ہوا ہے۔ میں نے (ڈول کے ذریعہ) اس کنویں سے پانی کھینچا جس قدر کہ اللہ نے چاہا، میرے بعد ابن ابوقحافہ یعنی ابوبکر نے ڈول سنبھالا اور کنویں سے پانی کھینچنے لگے لیکن وہ ایک یا دو ڈول سے زائد پانی نہیں کھینچ سکے، دراصل پانی کھینچنے میں وہ سُست اور کمزور پڑ رہے تھے اور ان کی سستی و کمزوری کو اللہ تعالیٰ معاف کرے پھر وہ ڈول ایک چرس (یعنی بڑے ڈول) میں تبدیل ہو گیا اور عمر ابن خطابؓ نے اس کو لے لیا، حقیقت یہ ہے کہ میں نے کسی جوان اور قوی تر شخص کو ایسا نہیں پایا جو عمرؓ کی طرح اس چرس کے ذریعہ پانی کھینچتا ہو، چنانچہ (انہوں نے اتنا پانی کھینچا کہ نہ صرف تمام لوگ سیراب ہوئے اور انہوں نے اپنے اونٹوں کو سیراب کیا بلکہ) لوگوں نے (پانی کی فراوانی کے سبب) اس جگہ کو اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ بنا لیا۔ ابن عمرؓ کی روایت میں یوں ہے کہ پھر ابوبکرؓ کے ہاتھ سے اس ڈول کو عمر ابن خطابؓ نے لے لیا۔ جو ان کے ہاتھ میں پہنچ کر چرس بن گیا حقیقت یہ ہے کہ میں نے کسی جوان اور قوی تر شخص کو ایسا نہیں پایا جو پانی کھینچنے کے اس کام میں عمرؓ کی طرح چاق و چوبند اور کارگزار ہو، چنانچہ انہوں نے (اتنا پانی کھینچا کہ) لوگوں کو سیراب کر ڈالا اور (پانی کی فراوانی کے سبب) لوگوں نے اس جگہ کو اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ بنا لیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قلیب اس کنویں کو کہا جاتا ہے جس پر من یعنی منڈیر نہ بنی ہو، اس کے برخلاف جس کنویں پر پتھر اور اینٹ کی من بنی ہوتی ہے اس کے لئے طوی کا لفظ آتا ہے۔ علماء نے یہ نکتہ لکھا ہے کہ خواب میں طوی کے بجائے قلیب کا نظر آنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اہل دین کا عزم و حوصلہ حقیقی مطلوب و مراد پر موقوف ہوتا ہے، نہ کہ اوپر بنے ہوئے قوالب پر۔

"ایک یا دو ڈول سے زائد" یہاں راوی کو شک ہوا ہے کہ آپ نے ذنوبا (ایک ڈول) کا لفظ فرمایا تھا یا ذنوبین (دو ڈول) کا، تاہم صحیح یہ ہے کہ یہاں اصل لفظ ذنوبین (دو ڈول) ہے۔ اس لفظ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت کا اشارہ پوشیدہ ہے جو کچھ اوپر دو سال سے زائد نہیں ہوا۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ذنوبا اور ذنوبین میں حرف او دراصل بل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس صورت میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہے گی کہ یہاں راوی اصل لفظ یاد رکھنے سے چوک گیا جس کی بناء پر اس نے اپنے شک کو ظاہر کرتے ہوئے دونوں لفظ نقل کر دئے۔

"وہ سُست اور کمزور پڑ رہے تھے" ان الفاظ میں حضرت ابوبکرؓ کے مرتبہ و مقام کی تنقیص نہیں ہے اور نہ الفاظ کا مقصد حضرت ابوبکرؓ پر حضرت عمرؓ کی فضیلت و برتری کو ثابت کرنا ہے بلکہ اصل مقصد اس طرف اشارہ کرنا تھا کہ ابوبکر کا زمانہ امارت و خلافت بہت مختصر ہو گا جب کہ عمرؓ کا زمانہ امارت و خلافت بہت طویل ہو گا، اور اس زمانہ میں مخلوق خدا کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا بعض شارحین نے "ضعف" کا ترجمہ "سستی اور کمزوری" کے بجائے "نرمی و مروت" کیا ہے۔

"اللہ تعالیٰ معاف کرے" اس دعائیہ جملہ کا بھی مقصد حضرت ابوبکرؓ کی طرف گناہ اور تقصیر کی نسبت ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا جملہ ہے جو محاورۃً زبان زد خاص و عام ہے جیسا کہ کسی شخص کا کوئی کام یا قول بیان کرتے ہوئے یوں کہہ دیا جائے! اس نے یہ کام کیا یا یہ بات کہی اللہ اس کی مغفرت کرے۔

"اس جگہ کو اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ بنا لیا" عَطَن اصل میں اس جگہ کو کہا جاتا تھا جہاں پانی جمع ہوتا تھا اور اس کے ارد گرد اونٹ بیٹھا کرتے تھے، واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس خواب میں مختلف چیزوں کی طرف اشارہ تھا یعنی کنواں دین کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جس طرح "کنواں" اس پانی کا منبع ہے جو دنیاوی زندگی کی حیات و بقاء کا بنیادی وسیلہ اور ہر جاندار کے معاش و معیشت کی اساس ہے، اسی طرح دین بھی ان حقائق کا سرچشمہ ہے جن پر انسانیت کی حیات و بقاء کا انحصار ہے اور جو انسان کی تہذیبی فکری اور روحانی

اقدار کی بنیاد ہیں۔ کنویں سے پانی کھینچنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ دین کی زمام کار رسول کریم ﷺ سے حضرت ابوبکرؓ کو اور ان سے حضرت عمرؓ کو منتقل ہوگی۔ حضرت ابوبکر کا کنویں سے ایک یا دو ڈول کھینچنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کا زمانہ خلافت بہت قلیل ہوگا، یعنی دین اور اس کے توسط سے ملت کی قیادت و زمام کار ان کے ہاتھوں میں ایک سال یا دو سال رہے گی، اور پھر حضرت عمرؓ کو منتقل ہو جائے گی جن کی مدت خلافت حضرت ابوبکرؓ کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوگی، چنانچہ حضرت عمرؓ دس سال تین ماہ خلیفہ رہے۔ پانی کھینچنے میں حضرت ابوبکرؓ کا سُست و کمزور پڑنا یا تو اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کے زمانہ خلافت میں دین کو کمزور کرنے کی کوشش کی جائے گی جیسا کہ بعض عرب قبائل کے ارتداد کی صورت میں اضطراب و اختلاف کی سی کیفیت پیدا بھی ہوئی۔ یا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ابوبکرؓ چونکہ فطرتاً نرم مزاج، بردبار اور بامروت واقع ہوئے ہیں اس لئے ملکی حکومتی معاملات میں رعب و دبدبہ سے زیادہ کام نہیں لیں گے، اس کی تائید آپ ﷺ کے ارشاد: ان اللّٰہ یغفر لہ ضعفہ (ان کی سستی و کمزوری کو اللہ تعالیٰ معاف کرے) سے بھی ہوتی ہے۔ تاہم یہ جملہ دعائیہ معترضہ ہے جس کا مقصد یہ واضح کر دینا ہے کہ ان کی یہ سستی و کمزوری یا نرمی و مروت ایسی چیز ہے جو اللہ کے نزدیک قابل عفو و درگزر ہے۔ اور جس سے ان کے مرتبہ و مقام پر ذرا بھی فرق نہیں پڑتا، اور ڈول کا حضرت عمرؓ کے ہاتھ تک پہنچ کر چرس بن جانا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ دین کو چار دانگ عالم میں پھیلانے، بڑھانے اور مضبوط کرنے میں ایسی سعی و کوشش کریں گے جس کا اتفاق نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد کسی اور کو حاصل ہوگا، امام نوویؒ نے لکھا ہے: آنحضرت کے ارشاد: "میں نے اس کنویں سے پانی کھینچا جس قدر اللہ نے چاہا اور میرے بعد ابن ابو قحافہ یعنی ابوبکرؓ نے ڈول سنبھالا" اس میں آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت و نیابت اور اس دنیا سے رخصت ہو جانے کی صورت میں آنحضرت ﷺ کے دنیا کے رنج و آلام اور شدائد و تکالیف سے راحت پانے کی طرف اشارہ ہے، نیز آنحضرت ﷺ کے ارشاد: پھر اس ڈول کو ابوبکر کے ہاتھ سے عمر بن خطابؓ نے لے لیا، اور لوگوں نے اس جگہ کو اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ بنا لیا، میں اس طرف اشارہ ہے، کہ مرتدوں کی سرکوبی اور اہل اسلام کو مجتمع رکھنے کی صورت میں دین کو مضبوط رکھنے اور فتوحات اسلام کی جو ابتداء حضرت ابوبکرؓ نے کی وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اپنے ثمرات کے ساتھ عروج پر پہنچے گی، اور ایک شارح نے لکھا ہے: حضرت عمرؓ کا اتنا زیادہ پانی کھینچنا اس طرف اشارہ کرتا تھا کہ ان کا زمانہ خلافت، ہر خاص و عام اور ہر چھوٹے بڑے کے لئے دینی و دنیاوی فوائد و مصالح سے بھرپور ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حضرت عمرؓ کا وصف حق گوئی

⑦ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِہٖ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ دَاوٗدَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ وَضَعَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ یَقُوْلُ بِہٖ۔

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان پر اور ان کے قلب میں حق و صداقت جاری فرما دیا ہے۔" (ترمذیؒ)

"اور ابوداؤد کی روایت میں جو حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے، یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان پر حق رکھ دیا ہے"۔ اسی لئے وہ حق بات کہتے ہیں (حق کے علاوہ اور کوئی بات ان کے منہ سے نہیں نکلتی۔"

عمرؓ کی باتوں سے لوگوں کو سکینت و طمانیت ملتی تھی

⑧ وَعَنْ عَلِیٍّؓ قَالَ مَا کُنَّا نُبْعِدُ اَنَّ السَّکِیْنَۃَ تَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ۔ (رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ہم (اہل بیت یا جماعت صحابہ) اس بات کو بعید نہیں جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ کی زبان پر سکینت وطمانیت جاری ہوتی ہے۔(اس روایت کو بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے)۔"

تشریح: حضرت علیؓ کا مطلب یہ تھا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ جب بھی کسی مسئلہ و معاملہ میں اظہار خیال کرتے ہیں تو ایسی بات کہتے ہیں جس سے سننے والوں کو سکون واطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اور مضطرب سے مضطرب دل کو بھی قرار آجاتا ہے۔ یا "سکینہ" سے مراد فرشتہ بھی ہو سکتا ہے جو حق اور موزوں بات دل میں ڈالتا ہے اور پھر وہی بات زبان سے ادا ہوتی ہے۔ اس کی تائید حضرت علیؓ کی ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے۔ جس کو طبرانیؒ نے اوسط میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا "لوگو! جب صالحین کا تذکرہ کرو تو عمرؓ کے تذکرہ کو مقدم رکھو۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ ان کا قول الہام ہو اور وہ فرشتہ کی زبانی بیان کر رہے ہوں"۔ اس سلسلے میں اس روایت کو بھی سامنے رکھنا چاہئے جس میں منقول ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: میں نے جب بھی عمرؓ کو دیکھا تو (ایسا محسوس ہوا کہ) ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان فرشتہ موجود ہے جو ان کو صحیح راستہ بتا رہا ہے۔

عمرؓ کے اسلام کی دعائے نبوی ﷺ

⑨ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَعِزَّالْاِسْلَامَ بِاَبِيْ جَهْلِ بْنِ هُشَامٍ اَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاَصْبَحَ عُمَرُ فَغَدَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ صَلّٰى فِي الْمَسْجِدِ ظَاهِرًا۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابن عباس نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ (ایک رات) آپ ﷺ نے دعا فرمائی "الہٰی! ابوجہل ابن ہشام یا عمر ابن الخطاب کے ذریعے اسلام کو سربلند و غالب کر دے (یعنی ان دونوں میں سے کسی ایک کو مسلمان بننے کی توفیق عطا فرما دے تاکہ ان کے سبب دین اسلام کو طاقت نصیب ہو) چنانچہ اگلے ہی دن جب صبح ہوئی تو عمر ابن الخطابؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان بن گئے اور پھر آنحضرت ﷺ نے مسجد حرام میں علانیہ نماز پڑھی۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: دعوت اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جب قریش نے مکہ نے داعی حق ﷺ اور حق کے نام لیواؤں کے خلاف ظالمانہ محاذ قائم کر رکھا تھا۔ اور اہل اسلام کو تشدد آمیز کارروائیوں کے ذریعے مجبور و ہراساں کرتے تھے تو مکہ میں کوئی مسلمان علانیہ نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔ آنحضرت ﷺ دار ارقم میں رہا کرتے تھے اور اسی مکان میں پوشیدہ طور پر اللہ کا نام لیا جاتا تھا، اللہ کی بندگی کی جاتی تھی اور اللہ کا رسول اللہ کا دین زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی تدبیر میں لگا رہتا تھا۔ آنحضرت ﷺ جانتے تھے کہ زعماء قریش میں دو آدمی یعنی ابوجہل اور عمر اس حیثیت کے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی اسلام قبول کر کے ہمارے ساتھ آجائے تو اسلام جو آج قریش مکہ کے ظلم و ستم کی وجہ سے دار ارقم میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اتنی طاقت پا جائے گا کہ مسلمانوں کو چھپ کر اللہ کا نام لینے اور اللہ کی عبادت کرنے پر مجبور نہیں ہونا پڑے گا، وہ علانیہ نماز پڑھنے لگیں گے اور کھلے طور اسلام کی دعوت پیش کر سکیں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مذکورہ دعا کی یہ دعا کس طرح قبول ہوئی اور حضرت عمرؓ کس طرح مشرف باسلام ہوئے اس کی تفصیل ایک روایت میں، جس کو ابو حاکم عبداللہ نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ابوجہل نے اعلان کیا کہ جو شخص محمد ﷺ کو قتل کر دے اس کو انعام میں ایک سو اونٹنیاں اور ہزار چاندی میں دوں گا۔ عمر (یہ سن کر) بولے الضمان صحیح یعنی تاوان صحیح ہے! ابوجہل نے کہا: ہاں فوراً ادا کروں گا، ذرا بھی تاخیر نہیں ہوگی! عمر وہاں سے اٹھ کر چل پڑے۔ راستے میں ایک شخص مل گیا، اس نے پوچھا: عمر! خیر تو ہے، کہاں کے ارادے سے چلے؟ عمر نے جواب دیا، محمد کی طرف جا رہا ہوں، ارادہ ہے کہ آج ان کا کام تمام کر دوں۔ اس شخص نے کہا: کیا (محمد کے خاندان) بنی ہاشم (کے انتقام) کا کوئی خوف نہیں ہے؟ عمر بولے: معلوم ہوتا ہے تم نے بھی اپنا دھرم تیاگ دیا (جبھی تو بنی ہاشم کے انتقام سے ڈرا کر مجھے محمد کے قتل سے باز رکھنا چاہتے ہو) اس شخص نے کہا: اس سے زیادہ حیرتناک بات تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ

تمہارے بہن اور بہنوئی نے اپنا پرانا مذہب چھوڑ دیا ہے اور محمد ﷺ کے ساتھ مل گئے ہیں۔ (یہ سنتے ہی) عمرؓ اپنی بہن کے گھر کی طرف مڑ گئے، وہاں پہنچے تو اس وقت ان کی بہن گھر کے اندر قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول تھیں اور سورۂ طٰہٰ پڑھ رہی تھیں عمرؓ نے کچھ دیر تو دروازے پر کھڑے ہو کر ان کو پڑھتے ہوئے سنا پھر دروازہ کھٹکھٹایا جب اندر داخل ہوئے تو بہن کو دیکھتے ہی سوال کیا: پڑھنے کی یہ آواز کیسی آرہی تھی؟ بہن نے ان کو پوری بات اور ان پر واضح کر دیا کہ ہم صدق دل سے مسلمان ہو گئے ہیں (اب تم یا کوئی چاہے جتنی سختی کرے، جو دین ہم نے قبول کر لیا ہے اس سے دستبردار نہیں ہوں گے) عمر (کے لئے یہ صورت حال انتہائی پریشان کن اور اضطراب انگیز تھی، ایک طرف تو فوری اشتعال نے انہیں بیاہی بہن اور عزیز بہنوئی کو مارنے پیٹنے پر مجبور کر دیا دوسری طرف خود ان کی زندگی میں آنے والا انقلاب ان کے دل و دماغ پر دستک دے رہا تھا، اس سخت) اضطرابی کیفیت میں رات بھر مبتلا رہے۔ ادھر رات ھر ان کے بہن وبہنوئی (معمول کے مطابق) اٹھے اور عبادت خداوندی وتلاوت قرآن کریم میں پھر مشغول ہو گئے انہوں نے طٰهٰ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰى (طٰہٰ، ہم نے آپ (ﷺ) پر قرآن مجید اس لئے نہیں اتارا کہ آپ ﷺ تکلیف اٹھائیں) سے پڑھنا شروع کیا۔ (اب) عمر (سے رہا نہ گیا، ایسا معلوم ہوا جیسے تلاوت قرآن کریم کی اس آواز نے ان کی روح کو آخری طور پر جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے) کلام اللہ کی ابدی صداقت ان کے دل و دماغ پر چھانے لگی، بڑی بے تابی کے ساتھ بولے: لاؤ یہ کتاب مجھے دو، ذرا میں بھی تو (پڑھ کر) دیکھوں۔ (بہن نے محسوس کر لیا کہ بھیا کا وہ سخت دل جس کو کفر وشرک نے پتھر بنا دیا تھا، پگھل رہا ہے، خدائی پکار کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ ایسے نہیں، اس مقدس کتاب کو تو صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ عمر نے غسل کیا، پاک ہوئے اور کلام اللہ کو ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئے جب طٰہٰ سے پڑھنا شروع کیا اور جب اس آیت: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کے اچھے اچھے نام ہیں) پر پہنچے تو بے اختیار بول اٹھے: بار خدایا: بلاشبہ تو ہی عبادت کا سزاوار ہے، تیرے علاوہ اور کوئی نہیں جس کو معبود بنایا جائے: اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد ارسول اللہ پھر وہ پوری رات انہوں نے اسی طرح جاگ کر گذاری کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد واشوقاہ واشوقاہ کا نعرہ مارتے۔ جب صبح ہوئی تو خباب ابن ارتؓ (جو اس گھر میں پہلے سے موجود تھے اور عمرؓ کے داخل ہوتے ہی کہیں چھپ گئے تھے، اب جو انہوں نے دیکھا کہ عمرؓ کی دنیا بدل چکی ہے، کفر وشرک کا اندھیرا چھٹ گیا ہے اور اسلام کی روشنی نے ان کے وجود کو جگمگا دیا ہے تو) عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے: عمر! مبارک ہو اللہ نے تمہیں اپنے دین اسلام سے سرفراز کیا، شاید تمہیں معلوم نہیں کہ رسول کریم ﷺ نے پوری رات جاگ کر اس دعا میں گذاری تھی کہ الٰہی! ابوجہل یا عمر بن الخطاب کے ذریعے اسلام کو سربلند وغالب کر دے! میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ آنحضرت ﷺ کی دعا ہی تھی جو تمہارے قبول اسلام کا پیش خیمہ بنی ہے۔ اس کے بعد عمرؓ تلوار گلے میں ڈال کر آنحضرت ﷺ کی قیام گاہ (دار ارقم) کی طرف روانہ ہوئے، وہاں پہنچے تو آنحضرت ﷺ نے بنفس نفیس باہر تشریف لا کر ان کا استقبال کیا اور دعوت اسلام پیش کی: عمر! معبودان باطل کو چھوڑ کر خدائے واحد کی چوکھٹ پر جھک جاؤ، سرخروئی اسی میں ہے کہ اسلام قبول کر لو، ورنہ تم پر بھی دنیا وآخرت کی ذلت ورسوائی کا وہی عذاب نازل ہوگا جو ولید ابن مغیرہ پر نازل ہوا۔ عمر (یہ پر جلال آواز رسالت سن کر) تھر تھر کانپنے لگے، لرزتے مونڈھوں اور تھرتھراتے ہاتھوں سے تلوار گر پڑی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا: اشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمد ارسول اللہ اور پھر انہوں نے کہا: جب ہم لات وعزیٰ کی پرستش کی پوجا پہاڑوں پر اور وادیوں میں (کھلم کھلا) کرتے تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کی عبادت ہم ڈر چھپ کر کریں!! نہیں، خدا کی قسم آج کے بعد اللہ کی عبادت ہم چھپ کر ہرگز نہیں کریں گے۔ اس کے بعد عمرؓ تمام مسلمانوں کو لے کر کعبہ اقدس میں پہنچے اور وہاں علی الاعلان نماز وعبادت ہوئی (اور اس طرح اللہ نے حضرت عمرؓ کے ذریعے اسلام کو طاقت وشوکت عطا فرمائی)۔

سیدنا فاروق اعظمؓ: حضرت عمرؓ کا نسب نامہ یہ ہے: عمرؓ بن خطاب بن فضیل بن عبدالعزی بن ریاح بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب بن لوی کعب پر پہنچ کر یہ سلسلہ نسب آنحضرت ﷺ کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی کنیت ابوحفص اور لقب

"فاروق" ہے امام نوویؒ کی تحقیق کے مطابق آپ کی ولادت واقعہ فیل سے تیرہ سال بعد ہوئی اور جیسا کہ ذہبیؒ نے لکھا ہے۔ بعمر ۲۷ سال ۶ ھ نبوی میں مشرف بہ اسلام ہوئے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ ۵ ھ نبوی میں اسلام لائے اس وقت تک چالیس مردوں اور گیارہ عورتوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ آپ کو "فاروق" کا لقب اس واقعہ کے بعد ملا کہ ایک یہودی اور ایک منافق کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا اور تصفیہ کے لئے یہودی نے آنحضرت ﷺ کو ثالث بنانے کی تجویز رکھی، منافق مشرکین قریش کے ایک سردار کعب ابن اشرف کو ثالث بنانے پر مصر تھا، کافی حیل وحجت کے بعد دونوں نے آنحضرت ﷺ کو ثالث بنانا مان لیا۔ چنانچہ وہ دونوں اپنا قضیہ لے کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آنحضرت ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیا کیونکہ اس کا حق پر ہونا ثابت تھا لیکن منافق نے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا اور کہنے لگا کہ اب ہم عمرؓ کو ثالث بنائیں گے، وہ جو فیصلہ دیں ہے ہم دونوں کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ یہودی نے معاملہ کو نمٹانے کی خاطر منافق کی یہ بات بھی مان لی اور اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس گیا۔ یہودی نے حضرت عمرؓ کو بتایا کہ ہم دونوں پہلے محمد ﷺ کو ثالث مان کر ان کے پاس گئے تھے اور انہوں نے میرے حق میں فیصلہ دیا تھا مگر یہ شخص (منافق) محمد ﷺ کے فیصلے پر راضی نہ ہوا اور اب مجھے تمہارے پاس لے کر آیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے منافق سے پوچھا: اس (یہودی) نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صحیح ہے؟ منافق نے تصدیق کی کہ ہاں اس کا بیان بالکل درست ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: تم دونوں یہیں ٹھہرو، جب تک میں نہ آؤں واپس نہ جانا۔ یہ کہہ کر گھر میں گئے اور تلوار لے کر باہر نکلے، اور پھر اس تلوار سے منافق کی گردن اڑا دی اور کہا: جو شخص اللہ اور اللہ کے رسول کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے اس کے حق میں میرا فیصلہ یہی ہوتا ہے۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ۔

"کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی، وہ اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں (حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ اس کو نہ مانیں)۔"

اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آ کر کہا: عمر، حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔ اس دن سے حضرت عمر، کا لقب "فاروق" مشہور ہو گیا۔

حضرت عمرؓ کی فضیلت وبرتری

(۱۵) وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَالَ عُمَرُ لِاَبِیْ بَكْرٍ يَا خَيْرَ النَّاسِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَمَا اِنَّكَ اِنْ قُلْتَ ذٰلِكَ فَلَقَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ عَلٰى رَجُلٍ خَيْرٍ مِّنْ عُمَرَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) سیدنا عمر فاروقؓ نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو ان الفاظ میں مخاطب کیا، اے وہ ذات گرامی جو رسول ﷺ کے بعد سب انسانوں سے بہتر ہے؟ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے (یہ سن کر) فرمایا: عمر! اگر تم میرے بارے میں یہ کہتے ہو (کہ آنحضرت ﷺ کے بعد سب سے بہتر انسان میں ہوں) تو تم (خود اپنے بارے میں بھی) جان لو کہ میں نے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے" آفتاب کسی ایسے شخص پر طلوع نہیں ہوا جو عمرؓ سے بہتر ہو" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حضرت عمرؓ کے حق میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی یا تو ان کے ایام خلافت پر محمول ہے یعنی وہ (عمرؓ) اپنے زمانہ خلافت میں تمام انسانوں سے بہتر تھے، اور اس حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے پہلے بیان فرما دیا تھا! یا یہ کہ اس ارشاد گرامی میں "ابوبکر کے بعد"

کے الفاظ محذوف و مقدر ہیں یعنی آنحضرت ﷺ نے گویا یہ فرمایا کہ: آفتاب کسی ایسے شخص پر طلوع نہیں ہوا جو ابوبکر کے بعد عمر سے بہتر ہو اور یا یہ کہ آنحضرت کے اس ارشاد کا مقصد "عدالت" اور "سیاست" کے باب میں حضرت عمرؓ کی افضلیت و برتری کو ظاہر کرنا ہے۔ غرض یہ کہ حدیث چونکہ ان احادیث کے بظاہر معارض نظر آتی ہے۔ جن سے حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت و برتری ثابت ہوتی ہے اس لئے ان حدیثوں کے درمیان تطبیق کی خاطر مذکورہ بالا توجیہات یا اسی طرح کی کوئی اور توجیہہ بیان کرنی پڑے گی۔

حضرت عمرؓ کی انتہائی منقبت

(۱۱) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍؓ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْكَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: اس طرح کی بات امر محال میں بھی مبالغۃً کہی جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ اگر بالفرض والتقدیر میرے بعد کوئی نبی آتا تو وہ عمر ہوتے، لیکن حقیقت چونکہ یہ ہے کہ نبوت کا دروازہ مجھ پر بند ہو چکا ہے اور میرے بعد کسی اور نبی کے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے عمر مرتبہ نبوت پر تو فائز نہیں ہو سکتے اور نہ صاحب وحی بن سکتے ہیں لیکن ان میں بعض خصوصیات ایسی ضرور ہیں جو انبیاء کے علاوہ اور تمام انسانوں کے درمیان ان کی ممتاز و منفرد حیثیت کو نمایاں کرتی ہیں اور عالم وحی سے ان کی ایک طرح کی مناسبت کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً یہ کہ اللہ کی طرف سے ان کو الہام ہوتا ہے اللہ کے حکم سے فرشتہ ان کے دل و دماغ میں حق القاء کرتا ہے اور غیبی طور سے راہ حق ان پر روشن ہو جاتی ہے۔

حضرت عمرؓ کا وہ رعب و دبدبہ جس سے شیطان بھی خوف زدہ رہتا تھا

(۱۲) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْضِ مَغَازِيْهِ فَلَمَّا انْصَرَفَ جَاءَتْ جَارِيَةٌ سَوْدَاءُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ كُنْتُ نَذَرْتُ اِنْ رَدَّكَ اللّٰهُ صَالِحًا اَنْ اَضْرِبَ بَيْنَ يَدَيْكَ بِالدُّفِّ وَ اَتَغَنّٰى فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كُنْتِ نَذَرْتِ فَاضْرِبِيْ وَاِلَّا فَلَا فَجَعَلَتْ تَضْرِبُ فَدَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عَلِيٌّ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَاَلْقَتِ الدُّفَّ تَحْتَ اِسْتِهَا ثُمَّ قَعَدَتْ عَلَيْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَيَخَافُ مِنْكَ يَا عُمَرُ اِنِّيْ كُنْتُ جَالِسًا وَهِيَ تَضْرِبُ فَدَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ وَهِيَ تَضْرِبُ فَلَمَّا دَخَلْتَ اَنْتَ يَا عُمَرُ اَلْقَتِ الدُّفَّ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت بریدہ اسلمیؓ کا بیان ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ جہاد میں تشریف لے گئے تھے، جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو ایک سیاہ فام چھوکری (جو یا تو سیاہ رنگت ہی رکھتی تھی یا حبشی النسل تھی) خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ یا رسول اللہ (ﷺ) میں نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ (ﷺ) کو (اس سفر جہاد سے) فتح و سلامتی کے ساتھ واپس لائے گا تو میں آپ (ﷺ) کے سامنے دف بجاؤں گی اور (فتح و سلامتی کی شادمانی کے گیت) گاؤں گی۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا! "اگر تم نے واقعی منت مان رکھی ہے تو دف بجا لو ورنہ ایسا مت کرو" اس چھوکری نے (چونکہ واقعی منت مان رکھی تھی اس لئے) دف بجانا شروع کر دیا۔ اتنے میں ابوبکرؓ (مسجد نبوی میں) داخل ہوئے لیکن وہ چھوکری دف بجانے میں مشغول رہی۔ پھر علیؓ آئے اور وہ اس وقت بھی دف بجاتی رہی۔ پھر عثمانؓ آئے تب بھی اس نے اپنا دف بجانا جاری رکھا اور پھر جب عمرؓ آئے تو اس نے (ان کی ہیبت کے مارے جلدی سے) دف کو اپنے کولہوں کے نیچے سرکا دیا

اور کولہوں کے بل (اس طرح) بیٹھ گئی (کہ دف نیچے چھپ کر رہ جائے اور عمرؓ کی نظر اس پر نہ پڑے) اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا: عمر! تم سے شیطان بھی خوف زدہ رہتا ہے۔ یہ چھوکری میری موجودگی میں دف بجا رہی تھی، پھر ابوبکرؓ آئے تو اس وقت بھی بجاتی رہی، پھر علیؓ آئے تو اس وقت بھی دف بجاتی رہی۔ پھر عثمانؓ آئے تو اس وقت بھی بجاتی رہی، مگر اے عمر! جب تم آئے تو اس چھوکری نے دف کو اٹھا کر چھپا دیا، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "دف" کا لفظ زیادہ فصیح اور زیادہ صحیح تو دال کے پیش کے ساتھ (دُف) ہے لیکن بعض روایتوں میں دال کے زبر کے ساتھ (دَف) بھی منقول ہوا ہے اور "دف" سے مراد وہ گول باجا ہے جو چھلنی کی وضع کا اور ایک طرف سے منڈھا ہوا ہو، اور اس میں جھانج نہ ہو۔

"اگر تم نے واقعی منت مان رکھی ہے" یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نذر (منت) کا پورا کرنا کہ جس میں اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہو واجب ہے۔ آنحضرت ﷺ کی مراجعت پر اور خصوصا اس سفر جہاد سے باعافیت مراجعت پر کہ جس میں جانیں چلی جاتی ہیں، مسرت و شادمانی کا اظہار کرنا یقیناً ایسی چیز تھی جس سے اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

"ورنہ ایسا مت کرنا" اس سے ثابت ہوا کہ ویسے تو دف بجانا جائز نہیں ہے لیکن اس طرح کے مواقع پر جائز ہے جن میں شارع علیہ السلام کی اجازت منقول ہوئی ہے جیسے مذکورہ نوعیت کی نذر پوری کرنا یا نکاح کا اعلان کرنا۔ پس بعض علاقوں (جیسے یمن) کے بعض مشائخ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ حالت ذکر میں دف بجاتے تھے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جانا چاہئے۔ ان کا وہ فعل حدیث کے بالکل معارض تھا۔ واضح رہے کہ ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کے جملہ "اور گاؤں گی" کے تحت جو کچھ لکھا ہے کہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورت کا ایسا گانا (یا ترانہ) سننا کہ (جو نہ ساز کے ساتھ ہو، نہ فحش اور غیر اخلاقی مضامین پر مشتمل ہو اور) اس سے کسی چھوٹی یا بڑی برائی میں مبتلا ہونے کا خدشہ بھی نہ ہو، جائز ہے، اور اسی طرح بعض حضرات نے عرسوں اور عید وغیرہ (جیسی تقریبات اور خوشی و مسرت کے مواقع پر) اس کو جائز و مختار کہا ہے۔ لیکن یہ بات فقہ حنفی کی روایتوں کے خلاف ہے کیونکہ بحسب ظاہر روایت فقہاء مطلق راگ (گانا) حرام ہے جیسے کہ درمختار اور بحر الرائق وغیرہ میں لکھا ہے بلکہ ہدایہ میں تو اس کو "گناہ کبیرہ" لکھا ہے اگرچہ وہ راگ محض اپنا دل خوش کرنے کے لئے ہو۔ ان فقہاء کے نزدیک جواز کی حدیثیں منسوخ ہیں۔

"تم سے تو شیطان بھی خوفزدہ رہتا ہے" میں شیطان سے یا مراد وہ سیاہ فام چھوکری تھی، جس نے ایک شیطانی کام کر کے "شیطان الانس" (انسانی شیطان) کا مصداق بن گئی تھی۔ یا وہ شیطان مراد ہے جو اس چھوکری پر مسلط تھا جس نے اس کو ایک غیر مناسب اور مکروہ فعل پر ابھارا تھا اور وہ "مکروہ فعل" دف بجانے اور گانے میں وہ حد سے زائد انہماک تھا جس نے اس کو تفریح طبع کے لئے "لہو" کی حد تک پہنچا دیا تھا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب: یہ تو حدیث کی اجزائی وضاحت تھی اس سے قطع نظر اگر حدیث کے مجموعی سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو ذہن میں ایک اشکال ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس چھوکری نے آپ ﷺ کے سامنے دف بجانے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی پھر اس نے دف بجانا شروع کیا تو آپ ﷺ خاموش رہے۔ نہ پسندیدگی کا اظہار کیا اور نہ ناگواری کا (گویا وہ صورت رہی جس کو اصطلاح حدیث میں "تقریر" کہا جاتا ہے) اور یہی صورت اس وقت بھی رہی جب حضرت ابوبکرؓ آئے، پھر حضرت علیؓ آئے اور پھر حضرت عثمانؓ آئے، لیکن جب حضرت عمرؓ آئے اور اس چھوکری نے دف بجانا بند کر دیا تو آخر میں آپ ﷺ نے اس کو "شیطان" سے تعبیر کیا، آخر ایسا کیوں!؟ اسی خلجان کی راہ روکنے کے لئے علماء نے لکھا ہے: بات یہاں سے چلی کہ آنحضرت ﷺ سفر جہاد کو نکلے تو اس چھوکری نے انتہائی عقیدت و محبت کے تحت آپ ﷺ کی فتح و سلامتی کی دعا مانگی، جب آپ ﷺ فتح و سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لائے تو اس چھوکری نے اس باعافیت مراجعت کو اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت سمجھا جو اس کے نزدیک یقیناً شکر

گزاری کا موجب بھی تھی اور اظہار خوشی و مسرت کی متقاضی بھی۔ اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے اس کو نذر پوری کرنے کی اجازت دے دی۔ پس اس کے ایک اچھی نیت اور اچھے جذبے پر مبنی ہونے کی وجہ سے اور آنحضرت ﷺ کی مخصوص اجازت کے تحت، یہ دف بجانا "لہو" کے حکم سے نکل کر "حقانیت" کے حکم میں اور کراہیت کی صورت سے نکل کر استحباب کی صورت میں داخل ہو گیا لیکن ایسا ہونا اس پر منحصر تھا کہ یہ عمل (دف بجانا) بہت محدود وقت اور اتنی کم سے کم حد تک رہتا جس سے ایفاء نذر کا مقصد پورا ہو جاتا۔ مگر ہوا یہ کہ اس چھوکری نے دف بجانا شروع کیا تو اتنی منہمک ہوئی کہ اس حد سے گذر گئی اور اس کا یہ عمل کراہت کے دائرہ میں داخل ہو گیا لیکن اتفاق سے جس وقت وہ حد سے متجاوز ہوئی تو عین اسی وقت حضرت عمرؓ آ گئے۔ پس آنحضرت ﷺ نے مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ جن میں اس طرف اشارہ تھا کہ یہ کام بس اتنا ہی جائز ہے جتنے کی اجازت دی گئی ہے اس سے زیادہ ممنوع ہے اور بلا ضرورت بجانا (یعنی محض تفریح اور شوق کی خاطر تو) اس کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ آپ ﷺ نے صریحاً اس چھوکری کو منع کیوں نہیں فرمایا تو اس میں یہ نکتہ تھا کہ صریحاً منع کر دینے سے حد تحریم کو پہنچ جاتا۔ اس احتمال کو بھی بعید از قیاس قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں ضرورت کے تحت جتنی دیر تک دف بجایا جاتا تھا اور جو جواز کے دائرہ میں آتا تھا وہ بس اتنے ہی وقت کے برابر تھا جو اس چھوکری کے دف بجانے کی ابتداء سے مجلس نبوی میں حضرت عمرؓ کی آمد کے وقت تک پر مشتمل تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ کی آمد سے پہلے تک اس کا دف بجانا چونکہ جواز کی حد میں تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے اتنی دیر تک تو خاموشی اختیار کئے رکھی لیکن جوں ہی وقت جواز کی حد ختم ہوئی اور کراہت کی حد شروع ہو گئی حضرت عمرؓ کی آمد اس چھوکری کے لئے بروقت تنبیہ ثابت ہوئی۔ کچھ تو اس احساس کے تحت کہ وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے حد سے متجاوز ہو رہی تھی اور کچھ حضرت عمرؓ کی ہیبت سے اس چھوکری نے گھبرا کر دف کو اپنے کولہوں کے نیچے چھپا لیا۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عمر! تم سے تو شیطان بھی اتنا خوفزدہ رہتا ہے کہ جدہر کو تمہارے قدم اٹھے ادھر سے وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے اب اسی وقت شیطان اس لڑکی کو ورغلا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ اتنی دیر تک دف بجاتی رہے جس سے اس کا یہ فعل "برائی" کے دائرہ میں داخل ہو جائے مگر تمہارے آتے ہی شیطان بھاگ کھڑا ہوا اور اس چھوکری نے دف بجانا فوراً روک دیا۔

ایک توجیہ یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ دراصل حضرت عمرؓ اس مباح چیز کو بھی پسند نہیں کرتے تھے جو برائی کے مشابہ ہو اگرچہ کسی جہت سے اس میں کوئی اچھائی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی تائید متعدد روایتوں سے ہوتی ہے جن کو صاحب مرقاۃ نے نقل کیا ہے۔ پس دف کے مسئلہ میں اگرچہ ضرورت کے تحت جواز کی گنجائش نکلتی ہے اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس چھوکری کو اجازت دی کہ وہ اپنی نذر پوری کرنے کے لئے دف بجا لے مگر دف بجانا بہرحال ایک ممنوع چیز (باجا بجانے) کی صورت رکھتا ہے اس لئے حضرت عمرؓ اس کو کیسے گوارا کر لیتے یہی بات جانتے ہوئے اس چھوکری نے حضرت عمرؓ کو آتا دیکھ کر نہ صرف یہ کہ دف بجانا روک دیا بلکہ اس دف کو ان کی نظروں سے چھپا لیا اور آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کی اسی خصوصیت کے پیش نظر مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

جلال فاروقیؓ

(۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا فَسَمِعْنَا لَغَطًا وَصَوْتَ صِبْيَانٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا حَبَشِيَّةٌ تَزْفِنُ وَالصِّبْيَانُ حَوْلَهَا فَقَالَ يَا عَائِشَةُ تَعَالِى فَانْظُرِى فَجِئْتُ فَوَضَعْتُ لَحْىَ عَلٰى مَنْكِبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ اِلَيْهَا مَا بَيْنَ الْمَنْكِبِ اِلٰى رَاْسِهٖ فَقَالَ لِىْ اَمَا شَبِعْتِ اَمَا شَبِعْتِ فَجَعَلْتُ اَقُوْلُ لَا لِاَنْظُرَ مَنْزِلَتِىْ عِنْدَهٗ اِذْ اَطَّلَعَ عُمَرُ فَارْفَضَّ النَّاسُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّىْ لَاَنْظُرُ اِلٰى شَيَاطِيْنِ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ قَدْ فَرُّوْا مِنْ عُمَرَ قَالَتْ فَرَجَعْتُ رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ (میرے پاس) بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک پر شور آواز ہمارے کانوں میں آئی، پھر

ہم نے بچوں کا شور و غل سنا۔ رسول کریم ﷺ (یہ جاننے کیلئے کیسا شور و غل ہے) کھڑے ہو گئے آپ ﷺ نے دیکھا (باہر) ایک حبشی عورت اچھل کود رہی ہے اور اس کے چاروں طرف بچے کھڑے ہوئے (تماشہ دیکھ رہے) ہیں۔ آپ ﷺ نے (مجھ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ: عائشہ! آؤ یہ تماشہ تم بھی دیکھو۔ چنانچہ میں اٹھ کر آنحضرت ﷺ کے پاس کھڑی ہوگئی اور اپنا گال رسول کریم ﷺ کے کندھے پر رکھ کر آپ ﷺ کے کندھے اور سر کے درمیان سے اس عورت کا تماشہ دیکھنے لگی، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آنحضرت ﷺ مجھ سے پوچھتے: کیا تمہارا جی نہیں بھرا، کیا ابھی تمہارا جی نہیں بھرا!؟ اور میں جواب دیتی: نہیں، ابھی میرا جی نہیں بھرا، دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ آنحضرت ﷺ کے دل میں میرا کیا مقام ہے اور آپ ﷺ مجھ سے کتنی زیادہ محبت کرتے ہیں، پھر اچانک عمرؓ نمودار ہوئے اور پھر وہ لوگ جو اس عورت کا تماشہ دیکھ رہے تھے (محض ان کی ہیبت سے یا اس ڈر سے کہ عمرؓ اس تماش بینی کو پسند نہیں کریں گے۔ ان کو دیکھتے ہی) ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "میں دیکھ رہا ہوں کہ انسانوں اور جنوں کے شیطان عمرؓ کے خوف سے (کس طرح) بھاگ رہے ہیں" حضرت عائشہؓ کہتی ہیں: اس کے بعد میں بھی وہاں سے ہٹ گئی، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح غریب ہے۔

تشریح: "دراصل میں معلوم کرنا چاہتی تھی" یعنی میرے اس جواب کا یہ مطلب نہیں تھا کہ واقعۃً میرا جی نہیں بھرا تھا اور اس تماش بینی کا مجھے کچھ زیادہ شوق تھا بلکہ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آنحضرت ﷺ کو مجھ سے کتنا تعلق ہے اور آپ ﷺ کے دل میں میری چاہت اور محبوبیت کا کتنا بلند مقام ہے۔

"انسانوں اور جنوں کے شیطان" سے مراد وہ بچے تھے جو اس حبشی عورت کی اچھل کود کا تماشہ دیکھ رہے تھے اور ان کو ان الفاظ سے تعبیر کرنا ایک تو انہی بچوں کی شرارتوں اور شور و غل کے اعتبار سے تھا جیسا کہ عام طور پر شور و غل مچاتے ہوئے بچوں کو کہہ دیتے ہیں کہ "کیسے شیطان بچے ہیں جو اتنا شور و شغب کر رہے ہیں" اور دوسرے اس عورت کی کرتب بازی اور تماشہ آرائی کی اس ظاہری صورت کے اعتبار سے جو "لہو و لعب" کی صورت سے مشابہ تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے بھی وہ سب کچھ "لہو و لعب" ہی کے حکم میں تھا، اگر ایسا ہوتا تو آنحضرت ﷺ خود کیوں دیکھتے اور حضرت عائشہؓ کو کیوں دکھاتے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دراصل وہ عورت نیزہ وغیرہ کے ذریعہ مشاقی دکھا رہی تھی جو جہاد کے لئے ایک کار آمد چیز تھی اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی وہ مشاقی خود بھی دیکھی اور حضرت عائشہؓ کو بھی دکھلائی، لیکن اس مشاقی میں مقصدیت اسی وقت تک رہی جب تک اس کا مظاہرہ ضرورت کے تحت ہوتا رہا اور وہ ضرورت ایک محدود وقت میں پوری ہو جاتی تھی، لیکن عین اس وقت جب کہ وہ مشاقی، ضرورت اور وقت جواز حد سے متجاوز ہو کر لہو و لعب اور شیطانی کام کے دائرہ میں داخل ہو رہی تھی حضرت عمرؓ وہاں آگئے اور شیطان کو اپنا داؤ چلنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ پس حضرت عمرؓ کے آنے سے پہلے وہ مشاقی، حد جواز میں تھی جس کو آنحضرت ﷺ نے اور حضرت عائشہؓ نے بھی دیکھا اور اس سے پہلے کہ شیطانی اثرات اپنا کام کرتے اور اس عورت کے ارد گرد موجود بچے اور لوگ ان اثرات کا شکار ہوتے حضرت عمرؓ کی پر جلال آمد نے ان سب شیطانوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا، بہرحال توجیہہ کچھ بھی کی جائے، ایک بات جو حدیث سے واضح طور پر ثابت ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر "صفت جمال" کا غلبہ تھا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش اخلاقی، خوش طبعی اور مروت و بردباری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا، جبکہ حضرت عمرؓ پر صفت جلال کا غلبہ تھا جس نے ان کی شخصیت کو اتنا پر رعب اور اتنی پر ہیبت بنا دیا تھا۔ کہ ان کے سامنے برائی اور کراہت کا شائبہ رکھنے والا بھی کوئی فعل سرزد نہیں ہو سکتا تھا۔

"یہ حدیث صحیح غریب ہے" کے تحت یہ بات مدنظر رہنی چاہے کہ حبشیوں کے اچھل کود اور مشاقی کے مظاہرہ سے متعلق ایک اور دوسرے طریق سے صحیحین (بخاری و مسلم) میں بھی منقول ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن کچھ حبشی لوگ مسجد نبوی میں نیزہ بازی کے کرتب کا مظاہرہ دکھا رہے تھے۔ اور آنحضرت ﷺ، حضرت عائشہؓ کو ان کرتب کا مظاہرہ دکھا رہے تھے کہ حضرت عمرؓ آگئے انہوں نے

ان حبشیوں کو اس مظاہرہ بازی سے روکنا چاہا بلکہ ان کی طرف کچھ پتھر اچھالے (تاکہ وہ بھاگ جائیں) تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عمرؓ! ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، آج عید کا دن ہے (یعنی عید کے دن اس طرح کی تھوڑی سی تفریح طبع میں کوئی حرج نہیں ہے۔) اوپر کی حدیث میں چونکہ عورت اور تماش بین بچوں کا ذکر ہے اس لئے نہ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اجنبیوں کو دیکھا اور نہ یہ جواب دینے کی ضرورت ہے کہ اس وقت خود ان کی عمر چھوٹی تھی اور اجنبی مردوں کی طرف دیکھنا ان کے لئے ممنوع نہیں تھا نیز بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی کی نقل کردہ روایت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ اس واقعہ کے علاوہ ہے جس کا ذکر بخاری و مسلم کی روایت میں ہوا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

موافقات عمرؓ

(۱۴) عَنْ اَنَسٍ وَ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ عُمَرَ قَالَ وَافَقْتُ رَبِّیْ فِیْ ثَلٰثٍ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوِ اتَّخَذْنَا مِنْ مَقَامِ اِبْرَاهِیْمَ مُصَلّٰی وَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ یَدْخُلُ عَلٰی نِسَائِكَ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ فَلَوْ اَمَرْتَهُنَّ یَحْتَجِبْنَ فَنَزَلَتْ اٰیَةُ الْحِجَابِ وَاجْتَمَعَ نِسَاءُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الْغَیْرَةِ فَقُلْتُ عَسٰی رَبُّهٗ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ فَنَزَلَتْ کَذٰلِكَ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ عُمَرُ وَافَقْتُ رَبِّیْ فِیْ ثَلَاثٍ فِیْ مَقَامِ اِبْرَاهِیْمَ وَفِی الْحِجَابِ وَفِیْ اُسَارٰی بَدْرٍ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ اور حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تین باتوں میں میرے پروردگار کا حکم میری رائے کے مطابق نازل ہوا۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نے عرض کیا تھا: "یا رسول اللہ (ﷺ) اگر مقام ابراہیم کو ہم نماز پڑھنے کی جگہ بنائیں تو بہتر ہو (یعنی طواف کعبہ کے بعد کی جو دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں اگر وہ مقام ابراہیم کے پاس پڑھی جائیں تو زیادہ بہتر رہے گا)" پس یہ آیت نازل ہوئی: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِیْمَ مُصَلّٰی اور بناؤ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ۔" اور (دوسری بات یہ کہ) میں نے عرض کیا تھا: "یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) کی ازواج مطہرات کے سامنے نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں (اور یہ بات میں آپ ﷺ کی شان عظمت کے مناسب نہیں سمجھتا) اگر آپ ﷺ ازواج مطہرات کو پردہ میں رہنے کا حکم فرما دیں (تاکہ غیر محرم لوگوں کے سامنے ان کا آنا بند ہو جائے) تو بہتر ہو۔" "پس (میرے اس عرض کرنے پر) پردہ کی آیت نازل ہوئی۔ اور (تیسری بات یہ کہ) جب نبی کریم ﷺ کی بیبیوں نے رشک و غیرت والے معاملہ پر اتفاق کر لیا تھا۔ تو میں نے (ان سب کو مخاطب کر کے) کہا تھا: اگر آنحضرت ﷺ تمہیں طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا" پس میرے انہی الفاظ و مفہوم میں آیت نازل ہوئی۔

اور حضرت ابن عمرؓ کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تین باتوں میں میرے پروردگار کا حکم میری رائے کے مطابق نازل ہوا، ایک تو مقام ابراہیم (کو نماز ادا کرنے کی جگہ قرار دینے) کے بارے میں، دوسرے (آنحضرت ﷺ کی بیبیوں کے) پردے کے بارے میں اور تیسرے بدر کے قیدیوں کے بارے میں۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حافظ عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ یہاں صرف "تین باتوں" کے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ موافقات عمر کی تعداد تین سے زائد نہ ہو در حقیقت ان مواقع کی تعداد تین سے کہیں زیادہ ہے جن میں حضرت عمرؓ کی رائے اور مشورہ کے مطابق حکم الٰہی نازل ہوا، ان میں جو زیادہ مشہور ہیں وہ تو ایک بدر کے قیدیوں ہی کا معاملہ ہے، ایک منافقوں کی نماز جنازہ پڑھنے والا واقعہ بھی ہے اسی طرح بعض محققین نے تلاش و جستجو کے بعد جن موافقات عمرؓ کو جمع کیا ہے ان کی تعداد پندرہ سے زائد ہوتی ہے (جیسا کہ علامہ سیوطیؒ نے بیس موافقات عمر کا ذکر کیا ہے)

"مقام ابراہیم" سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نشان بطور معجزہ پڑ گیا تھا اور جس پر کھڑے ہو کر آپ بیت

اللہ کی چنائی کرتے تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ: آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کا ہاتھ پکڑ کر بتایا کہ مقام ابراہیم ہے۔ اس وقت حضرت عمر نے کہا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس مقام کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مجھے اس بارے میں کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اور پھر اسی دن آفتاب غروب بھی نہیں ہوا تھا کہ مذکورہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر طواف کے بعد جو دو رکعتیں پڑھنی واجب ہیں وہ مقام ابراہیم کے پاس (اس طرح) پڑھا کرو (کہ مقام ابراہیم بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی) اس آیت میں امر کا صیغہ استحباب کے لئے ہے اور بعض حضرات نے وجوب کے لئے کہا ہے، یعنی طواف کے بعد دو رکعتیں پڑھنی تو واجب ہیں لیکن مستحب یہ ہے کہ یہ دونوں رکعتیں خاص مقام ابراہیم کے پیچھے متصلاً پڑھی جائیں۔ ہاں جس شخص کو خاص مقام ابراہیم کے پیچھے جگہ نہ ملے اور حرم میں کسی بھی جگہ یہ رکعتیں پڑھ لے تو اس حکم کی پوری تعمیل ہو جائے گی۔ امام شافعیؒ کے مسلک میں ان دو رکعتوں کے وجوب کے بارے میں دو قول ہیں۔

"پس پردہ کی آیت نازل ہوئی" اور آیت یہ ہے۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ۔

"اور جب تم ان (ازواج النبی ﷺ) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر سے مانگا کرو۔"

واضح رہے کہ ازواج مطہرات پر جو یہ پردہ واجب ہوا تھا وہ اس "ستر عورت" کے علاوہ ہے جو اور تمام عورتوں پر واجب ہے یعنی اس آیت کے ذریعہ ان ازواج مطہرات کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ غیر محرموں کے سامنے بالکل نہ آئیں اگرچہ کپڑوں میں لپٹی اور چھپی ہوئی ہی کیوں نہ ہوں یہ حکم خاص طور پر صرف ازواج مطہرات کو دیا گیا تھا، جب کہ اور عورتوں کو اجازت ہے کہ اگر اپنے جسم کو خوب ڈھانک چھپا کر وہ باہر نکلنا چاہیں تو نکل سکتی ہیں۔

"رشک و غیرت والے معاملہ پر اتفاق کر لیا تھا" اس سے آنحضرت ﷺ کے شہد پینے سے متعلق مشہور واقعہ مراد ہے: آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ عصر کے بعد کھڑے کھڑے اپنی ازواج کے پاس تشریف لاتے تھے۔ ایک مرتبہ اسی معمول کے مطابق آپ ﷺ ایک زوجہ مطہرہ حضرت زینبؓ کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے کہیں سے آیا ہوا شہد آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا جو آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھا اور اسی وجہ سے حضرت زینبؓ نے آپ ﷺ کے لئے اس کو رکھ چھوڑا تھا، شہد پینے میں آپ ﷺ کو کچھ وقت لگا۔ اور اس سبب سے حضرت زینب کے یہاں آپ ﷺ معمول سے زیادہ ٹھہرے رہے۔ یہ بات حضرت عائشہؓ اور بعض دوسری ازواج مطہرات کے لئے رشک و غیرت کا باعث بن گئی، ام المؤمنین حضرت عائشہ نے ام المؤمنین حضرت حفصہؓ (بنت عمرؓ) سے مشورہ کیا اور دونوں اس رائے پر متفق ہو گئیں کہ آنحضرت ﷺ ہم میں جس کے پاس بھی تشریف لائیں وہ یوں کہے کہ آپ ﷺ میں سے مغافیر کی بو آ رہی ہے۔ اور پھر جب آنحضرت ﷺ ان کے یہاں تشریف لائے تو ان میں سے ہر ایک نے یوں ہی کہا، آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا میں نے تو مغافیر کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، صرف شہد پیا تھا، پھر مغافیر کی بو کہاں سے آئی۔ انہوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ اس شہد کی مکھیاں مغافیر پر بیٹھ گئی ہوں، جس کے سبب اس شہد میں مغافیر کی بو شامل ہو گئی ہو۔ اس بات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ شہد پینے کے لئے آئندہ حضرت زینبؓ کے یہاں نہ ٹھہریں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے ان کی بات کو صداقت پر محمول کیا اور احتیاطا شہد پینا اپنے اوپر حرام کر لیا۔ پھر بعد میں سارا بھید کھلا کہ یہ تو "سوکناپے" کا چکر تھا جس میں آنحضرت ﷺ کو مبتلا کیا گیا اور ایک بدنما صورت حال پیدا ہوئی۔ اسی موقعہ پر حضرت عمرؓ نے ان ازواج مطہرات کو تنبیہ و تہدید کرتے ہوئے مذکورہ الفاظ کہے اور پھر جب قرآن میں اس واقعہ سے متعلق فرمان الٰہی نازل ہوا تو اس میں حضرت عمرؓ کے الفاظ اور مفہوم کو جوں کا توں شامل کیا گیا۔ سورۂ تحریم میں ہے۔

عَسٰی رَبُّہٗ اِنْ طَلَّقَ کُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ۔

"اگر آنحضرت ﷺ تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دیدیگا۔"

"بدر کے قیدیوں کے بارے میں" یعنی: غزوہ بدر میں فتحیابی کے بعد جنگی قیدیوں کے متعلق آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہو اور ان کا معاملہ کس طرح نمٹایا جائے تو حضرت ابوبکرؓ نے رائے دی کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان دشمنان اسلام کو قتل کر دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو پسند فرمایا اور ان قیدیوں کو ان کی حیثیت و استطاعت کے مطابق فدیے لے کر رہا کر دیا۔ لیکن جب قرآن کریم میں اس کے متعلق آیت نازل ہوئی تو وہ حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق نکلی۔ اس کی تفصیل اگلی حدیث میں آ رہی ہے۔

وہ چار باتیں جن میں عمرؓ کو فضیلت حاصل ہوئی

(۱۵) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ فُضِّلَ النَّاسَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ بِاَرْبَعٍ بِذِکْرِ الْاُسَارٰی یَوْمَ بَدْرٍ اَمَرَ بِقَتْلِھِمْ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ وَبِذِکْرِہِ الْحِجَابَ اَمَرَ نِسَآءَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّحْتَجِبْنَ فَقَالَتْ لَہٗ زَیْنَبُ وَاِنَّکَ عَلَیْنَا یَا ابْنَ الْخَطَّابِ وَالْوَحْیُ یَنْزِلُ فِیْ بُیُوْتِنَا فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ وَبِدَعْوَۃِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰھُمَّ اَیِّدِ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ وَبِرَاْیِہٖ فِیْ اَبِیْ بَکْرٍ کَانَ اَوَّلَ نَاسٍ بَایَعَہٗ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ: حضرت عمر ابن خطابؓ کو دوسروں پر چار باتوں کے سبب خصوصی فضیلت حاصل ہے۔ ایک بات تو جنگ بدر کے قیدیوں کی بابت ان کی رائے تھی، ان کا یہ کہنا تھا کہ ان قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ یعنی: اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا (کہ خطاء اجتہادی کا مرتکب مستوجب عذاب نہیں ہوگا) یا کوئی بری سزا واقع ہوتی۔ دوسری بات پردہ کی بابت ان کا مشورہ دینا تھا۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کو پردہ (میں رہنے) کی طرف متوجہ کیا تھا اور (ان کے توجہ دلانے پر) ام المؤمنین حضرت زینبؓ نے ان سے کہا تھا کہ اے عمر ابن خطابؓ! پردہ میں رہنے کی بات ہم سے تم کہہ رہے ہو حالانکہ وحی ہمارے گھروں میں اترتی ہے؟ اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی: وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (یعنی: اور جب تم ان (ازواج النبی) سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کے باہر سے مانگا کرو)۔ تیسری بات، وہ دعا تھی جو ان کے حق میں نبی کریم ﷺ نے مانگی تھی کہ الٰہی: عمرؓ کے ذریعہ اسلام کو تقویت عطا فرما۔ اور چوتھی بات ابوبکرؓ کے حق میں ان کی رائے تھی کہ انہوں نے (حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ اول بنانے کی تجویز پیش کر کے بڑے نازک وقت میں تمام مسلمانوں کی بروقت راہنمائی کی اور اپنی زبردست قوت اجتہاد کے ذریعہ انہی کو خلافت اول کا اہل و مستحق جان کر) سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی (اور پھر ان کی پیروی میں اور سب لوگوں نے خلافت صدیق پر بیعت کی) (احمدؒ)

تشریح: "جنگ بدر کے قیدیوں کی بابت ان کی رائے تھی" اس کی تفصیل خود حضرت عمرؓ ایک روایت میں جو ریاض الصالحین میں منقول ہے۔ یوں بیان کرتے ہیں کہ: جنگ بدر کے دن (جب اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو فتح و غلبہ عطا فرمایا اور قیدیوں کی ایک بڑی تعداد مسلمانوں کے ہاتھ لگی تو) رسول اللہ ﷺ کی مجلس مشاورت منعقد کی اور ان قیدیوں کے بارے میں مشورہ چاہا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ان قیدیوں میں سب اپنے ہی رشتے ناطے کے لوگ ہیں، کوئی چچا کا بیٹا ہے تو کوئی بھائی کا بیٹا ہے، کوئی خاندان کا فرد ہے تو کوئی قبیلے کا، اگر ہم ان سب سے فدیہ (مالی معاوضہ) لے کر ان کو رہا کر دیں تو اس سے ہمیں دشمنان دین کے مقابلہ کے لئے اگلی تیاریوں میں بڑی مدد ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان رہا ہونے والوں کو ہدایت فرما دے اور یہ

اسلام قبول کرکے ہمارے معاون و مددگار بن جائیں۔ آنحضرت ﷺ نے (ابوبکر کی یہ رائے سن کر) فرمایا کہ عمرؓ! اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں ابوبکرؓ کی رائے کو موزوں نہیں سمجھتا، دراصل یہ سارے قیدی کفر وضلالت کی پیشوائی کرنے والے اور دشمنان دین کے سردار ہیں، ان کو زندہ چھوڑ دینا خطرہ مول لینا ہے، ان سب کی گردنیں آڑا دینا ہی مناسب ہے۔ آخر کار آنحضرت ﷺ نے ابوبکرؓ کی رائے کو پسند فرمایا اور فدیہ لے کر ان قدیوں کو رہا کر دیا۔ اگلے دن صبح کو جب میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ اور ابوبکرؓ گریاں ولرزاں بیٹھے ہوئے ہیں میں نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ خیر تو ہے! آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے یہ رفیق (ابوبکر) رو کیوں رہے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عمر! (کیا پوچھتے ہو، سمجھو بس اللہ نے خیر ہی کر دی، نہیں تو) عذاب تو میرے سامنے اس درخت سے بھی قریب آ گیا تھا (جو بالکل سامنے نظر آ رہا ہے) اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔

"پیغمبر کو شایاں نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیئے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (دشمنان دین کی) خونریزی نہ کر لیں۔ تو تم دنیا کے مال واسباب چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو چاہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست اور بڑے حکمت والے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی۔"

اس سے واضح ہوا کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں انسب رائے وہی تھی جو حضرت عمرؓ نے ظاہر کی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے اس مصلحت پر مبنی تھی کہ اس وقت اہل اسلام کے لئے مالی تنگیوں اور پریشانیوں کا بڑا نازک مرحلہ درپیش ہے۔ دشمنان دین اس جنگ میں ہزیمت خوردہ ہونے کے باوجود اپنی معاندانہ روش کو ترک نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کے خلاف انکے جارحانہ عزائم جوں کے توں ہیں اور وہ اپنی تمام مالی وانسانی قوت کو مجتمع کرکے اہل اسلام کو پھر میدان جنگ میں لانے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے، ان کی رہائی کی صورت میں ایک طرف تو ہم میں سے کسی کے دل ودماغ پر یہ بوجھ نہیں رہے گا کہ اپنے خونی رشتہ داروں اور اعزاو اقرباء کو اپنے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس احسان کو خود یہ قیدی محسوس کریں، اور ان کو ایمان قبول کرنے اور ہمارا مددگار بن جانے کی توفیق مل جائے، دوسری طرف فدیہ کی شکل میں ان سے حاصل ہونے والا مال واسباب ہماری بڑی مدد کرے گا، اس کے ذریعہ ہم اپنی طاقت بڑھائیں گے اور دشمنان دین سے لڑنے کے لئے جنگی وسائل وذرائع فراہم کریں گے ایک اعتبار سے یہ رائے حضرت ابوبکرؓ کی "صفت جمال" کا مظہر بھی تھی اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں سے جن حضرات کے مزاج میں نرمی اور مروت کا زیادہ دخل تھا ان سب نے بھی اس رائے کی تائید کی۔ دوسری طرف حضرت عمرؓ کی رائے ان کی "صفت جمال" کا مظہر تھی اور جن صحابہؓ پر اس صفت کا غلبہ تھا انہوں نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی نبی رحمت ﷺ اگرچہ تمام صفات وکمالات کے جامع تھے مگر واقعہ یہ کہ آپ ﷺ مائل "صفت جمال" ہی کی طرف تھے اور اسی وجہ سے اس موقع پر آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو پسند فرمایا۔ تاہم اللہ کی علیم وخبیر ذات کے علاوہ اور کون اس فیصلہ کے اصل عواقب ونتائج کو جان سکتا تھا، اس کی بارگاہ حکمت میں قیدیوں کی رہائی کا یہ فیصلہ غیر موزوں قرار پایا اور اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں جن سے حضرت عمرؓ کی اصابت رائے کی توثیق ہوئی۔

عمرؓ جنت میں بلند ترین مقام پائیں گے

(۱۶) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ الرَّجُلُ اَرْفَعُ اُمَّتِيْ دَرَجَةً فِي الْجَنَّةِ قَالَ اَبُوْ سَعِيْدٍ وَاللّٰهِ مَا كُنَّا نَرٰى ذَاكَ الرَّجُلَ اِلَّا عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ حَتّٰى مَضٰى لِسَبِيْلِهٖ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ شخص میری اُمت میں جنت کا بلند تر مقام و مرتبہ رکھنے والا ہے" ابوسعیدؓ کا بیان ہے کہ "اس شخص" (جس کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا) کے بارے میں بخدا ہمارا خیال اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ اس سے حضرت عمر ابن خطاب کی ذات مراد ہے اور حضرت عمرؓ جب تک اس دنیا میں ہے ہم اپنے اسی خیال پر قائم رہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "وہ شخص" یہ بات آپ ﷺ نے مبہم کہی اور تعیین نہیں فرمائی کہ "وہ شخص" کون ہے۔ اور اس ابہام سے مقصود یہ تھا کہ اُمت کا ہر شخص طاعات و عبادات میں زیادہ سے زیادہ جدوجہد اور محنت کر کے یہ بڑا مرتبہ پانے کی کوشش کرے اور جان لے کہ یہ مرتبہ صرف اسی شخص کو مل سکتا ہے جو طاعات و عبادات میں نہایت جدوجہد اور محنت کے ساتھ برابر لگا رہے اور اخلاق و کمالات سے متصف ہو کر اس کا استحقاق پیدا کرے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجلس نبوی ﷺ میں کسی ایسے شخص کا ذکر آیا ہو جو مذکورہ اوصاف سے متصف تھا اور اس کے ضمن میں آنحضرت ﷺ نے اشارہ فرمایا ہو کہ جو شخص بھی ان اوصاف کا حامل ہوگا اس کو جنت میں بلند تر درجہ ملے گا۔

"اور حضرت عمرؓ جب تک اس دنیا میں رہے" یہ الفاظ اس شک کے دفعیہ کے لئے ہیں کہ شائد وقتی طور حضرت عمرؓ کی طرف لوگوں کا خیال چلا گیا ہو اور پھر بعد میں وہ خیال بدل گیا ہو۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوسعیدؓ کے الفاظ سے یہ لازم آتا ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ سے افضل تھے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا؟ اس کا جواب الفاظ حدیث کی مذکورہ بالا وضاحت سے مل جاتا ہے یعنی یہ کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں مبہم اشارہ کا مقصد اس طرف متوجہ کرنا تھا کہ اُمت کا ہر فرد شریعت کی اطاعت و فرمانبرداری اور اچھے کاموں میں لگن، محنت اور اخلاص کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جدوجہد اور کوشش کرے تاکہ اس بلند تر مقام کو پہنچے۔ وہ بلند تر مقام اسی شخص کو نصیب ہو سکتا ہے۔ جو طاعات و عبادت میں کوشاں رہے، اخلاص و کمالات سے متصف ہو، دین میں خوب غور کے ذریعہ اجتہاد کرے اور اچھے کاموں میں لگا رہے۔ پس جن لوگوں نے یہ خوبیاں جتنی زیادہ، جتنی بھرپور اور جتنی موثر حضرت عمرؓ کی ذات میں ابتداء سے لے کر ان کی زندگی کے آخری لمحات تک دیکھیں اتنی زیادہ، اتنی بھرپور اور اتنی موثر چونکہ کسی اور صحابی میں ان کو نظر نہیں آئیں اس لئے انہوں نے یہی گمان کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں "اس شخص" سے مراد صرف حضرت عمرؓ کی ذات تھی نہ کہ کسی اور کی۔ اگر اخفاء لیلۃ القدر کا مسئلہ ذہن میں رہے تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس روایت میں حضرت عمرؓ کے ذکر سے حضرت ابوبکرؓ پر ان کی افضلیت کا مفہوم لازم نہیں آتا۔ حاصل کلام یہ کہ "اس شخص" سے حضرت عمرؓ کا مراد ہونا ایک ظنی بات ہے اور وہ بھی بعض حضرات کے نزدیک نہ کوئی یقینی بات ہے لہٰذا اس روایت سے یہ استدلال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ سے افضل تھے، جب کہ جمہور علماء کا اتفاق حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت پر ثابت بھی ہے اور اہل سنت و جماعت کا متفقہ اعتقاد بھی اسی پر ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابوسعیدؓ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ بات حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے کو سامنے رکھ کر کہی تھی۔ کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا مصداق حضرت عمرؓ سے بڑا اور کسی کو نہیں سمجھا جاتا تھا تو پھر اصل حدیث کے بارے میں کوئی اشکال ہی پیدا نہیں ہوگا کیونکہ اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عمرؓ بلاشبہ سب سے افضل تھے۔

نیک کاموں میں سب سے زیادہ سرگرم کار

(۱۷) وَعَنْ اَسْلَمَ قَالَ سَاَلَنِي ابْنُ عُمَرَ بَعْضَ شَأْنِهٖ يَعْنِي عُمَرَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ مَارَاَيْتُ اَحَدًا قَطُّ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حِيْنَ قُبِضَ كَانَ اَجَدَّ وَاَجْوَدَ حَتّٰى انْتَهٰى مِنْ عُمَرَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت اسلمؒ (جو حضرت عمر فاروقؓ کے آزاد کردہ غلام اور تابعی ہیں) کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے (ایک دن) مجھ سے حضرت عمر

فاروق ؓ کے کچھ احوال و خصائل جاننے چاہے تو میں نے ان کو (بہت سی باتیں) بتائیں اور کہا ہے کہ: رسول کریم ﷺ (کی رحلت) کے بعد میں نے حضرت عمر ؓ سے بڑھ کر کسی شخص کو نہیں دیکھا جو اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک اچھے کاموں میں سب سے زیادہ سرگرم کار اور سب سے زیادہ نیک رہا ہو۔" (بخاری ؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ یہ بات حضرت عمر فاروق ؓ کے "زمانہ خلافت" پر محمول رکھا جائے تا کہ اس کے الفاظ سے جو عموم مفہوم ہوتا ہے اس سے حضرت ابوبکر ؓ کی ذات مستثنٰی رہے۔

دین وملت کی غم گساری

(۱۸) وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ لَمَّا طُعِنَ عُمَرُ جَعَلَ يَأْلَمُ فَقَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ وَكَانَّهُ يُجَزِّعُهُ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا كُلُّ ذٰلِكَ لَقَدْ صَحِبْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَحْسَنْتَ صُحْبَتَهُ ثُمَّ فَارَقَكَ وَهُوَ عَنْكَ رَاضٍ ثُمَّ صَحِبْتَ اَبَا بَكْرٍ فَاَحْسَنْتَ صُحْبَتَهُ ثُمَّ فَارَقَكَ وَهُوَ عَنْكَ رَاضٍ ثُمَّ صَحِبْتَ الْمُسْلِمِيْنَ فَاَحْسَنْتَ صُحْبَتَهُمْ وَلَئِنْ فَارَقْتَهُمْ لَتُفَارِقَنَّهُمْ وَهُمْ عَنْكَ رَاضُوْنَ قَالَ اَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ صُحْبَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِضَاهُ فَاِنَّمَا ذٰلِكَ مَنٌّ مِنَ اللّٰهِ مَنَّ بِهِ عَلَيَّ وَاَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ صُحْبَةِ اَبِيْ بَكْرٍ وَرِضَاهُ فَاِنَّمَا ذٰلِكَ مَنٌّ مِنَ اللّٰهِ مَنَّ بِهِ عَلَيَّ وَاَمَّا مَا تَرٰى مِنْ جَزَعِيْ فَهُوَ مِنْ اَجْلِكَ وَمِنْ اَجْلِ اَصْحَابِكَ وَاللّٰهِ لَوْ اَنَّ لِيْ طِلَاعَ الْاَرْضِ ذَهَبًا لَافْتَدَيْتُ بِهِ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ قَبْلَ اَنْ اَرَاهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مسور ابن مخرمہ ؓ کہتے ہیں: حضرت عمر فاروق ؓ (ابولؤلؤ کے خنجر سے) زخمی ہوئے تو کرب یا بے چینی کا اظہار کرنے لگے (یعنی ان کی عیادت کے لئے آنے والوں کو ایسا لگتا تھا جیسے فاروق اعظم ؓ زخم کی اذیت سے شدید کرب اور بے چینی میں ہیں جس کا اظہار کراہ وغیرہ کی صورت میں ہو رہا ہے) چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس ؓ نے (یہ صورت دیکھ کر) گویا حضرت عمر ؓ کو فزع اور بے صبری کی نسبت دی (یا یہ کہ حضرت عمر ؓ کو تسلی و تشفی دی) اور کہا کہ امیر المؤمنین! یہ سب (یعنی جزع وفزع اور بے قراری و بے صبری کا اظہار آپ کی شان کے شایاں) نہیں ہے، آپ تو وہ ہستی ہیں جس کو رسول کریم ﷺ کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل ہوا اور بہت اچھی صحبت حاصل ہوئی (بایں طور کہ) آپ نے رفاقت رسول کا کامل حق ادا کیا اور تمام تر آداب و شرائط پورے کر کے آنحضرت ﷺ کی صحبت و خدمت سے فیضیاب ہوئے اور رسول کریم ﷺ اس حال میں آپ سے جدا ہوئے کہ آپ سے راضی و خوش تھے (جس کا ثبوت یہ ارشاد رسول ﷺ ہے کہ فرمایا: اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے) پھر ابوبکر صدیق ؓ کی رفاقت و مجالست آپ کو نصیب ہوئی اور ان کے ساتھ بھی آپ کی رفاقت بہت اچھی رہی یہاں تک کہ جب وہ آپ سے جدا ہوئے تو آپ سے خوش تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے آپ ہی کو اپنا جانشین نامزد فرمایا اور پھر (اپنی خلافت کے زمانہ میں) آپ کو مسلمانوں کی خدمت و رفاقت کا موقع ملا اور ان کی خدمت و رفاقت کا فریضہ بھی آپ نے بڑی اچھی طرح نبھایا (کہ مسلمانوں کے ساتھ عدل و انصاف، رعایا پروری اور کامیاب ترین حکمرانی میں آپ کے نام کا ڈنکا چار دوانگ عالم میں بج اٹھا) اب اگر مسلمانوں سے جدا ہوں گے تو اس حال میں جدا ہوں گے کہ تمام مسلمان آپ سے راضی و خوش ہیں۔ فاروق اعظم ؓ نے (یہ سن کر) فرمایا: (اے عباس!) تم نے آنحضرت ﷺ کی صحبت اور آپ ﷺ کی رضا و خوشنودی کا جو ذکر کیا ہے تو بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا احسان ہے جو اس نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھ پر کیا ہے، اسی طرح تم نے حضرت ابوبکر ؓ کی صحبت و رفاقت اور ان کی خوشنودی کا جو ذکر کیا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ایک بڑا احسان ہے جس کے ذریعہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے سرفراز کیا۔ رہی میری بے صبری و بے قراری جو تم دیکھ رہے ہو تو (اس کا تعلق زخم کی تکلیف اور درد و بے چینی پر جزع و نزع سے نہیں ہے بلکہ درحقیقت) یہ تمہارے اور تمہارے دوستوں اور ساتھیوں کے سبب سے ہے۔ خدا کی قسم اگر میرے پاس تمام زمین کے برابر سونا ہو تو میں اس کو اللہ کے

عذاب کے بدلے میں قربان کردوں اس سے پہلے کہ میں اللہ کو (یا اللہ کے عذاب کو) دیکھوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت ابن عباسؓ نے گویا اس طرف اشارہ کیا کہ جب اللہ کا رسول آپ سے راضی وخوش گیا اللہ کے رسول کا چہیتا آپ سے راضی وخوشی اس دنیا سے رخصت ہوا اور تمام مسلمان آپ سے راضی وخوش ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا اللہ آپ سے راضی وخوش ہے اور آپ اپنے اللہ سے راضی وخوش ہیں اس صورت میں تو آپ اس ارشاد ربانی کی بشارت کا مصداق ہیں:

يَآيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔

"اے اطمینان والی روح، تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔"

پھر آپ اتنا پریشان کیوں ہیں، اتنی بے قراری کیوں ہے، اس زخم کی تکلیف نے آپ کو بے چین کر دیا ہے یا موت کے تصور نے؟ موت تو مؤمن کے لئے "تحفہ" ہے وہ تحفہ جو مقام اعلی میں بندہ کو اپنے آقا سے ملائے گا، رضائے مولی کی ابدی نعمتوں اور سعادتوں تک پہنچائے گا۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو جو جواب دیا اس کا حاصل یہ تھا کہ یہ محض تمہارا خیال ہے کہ میری بے چینی وبے قراری زخم کی تکلیف یا موت کے خوف سے ہے، درحقیقت میرا یہ سارا اضطراب اور اظہار کرب تم لوگوں (اہل اسلام) کے مستقبل کے بارے میں چند خطرات وخدشات کا احساساتی تاثر ہے۔ میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں میرے بعد فتنے سر نہ ابھارنے لگیں، اختلاف وانتشار اور دین سے بے توجہی کی خرابیاں مسلمانوں میں نہ در آئیں، فتنہ وفساد کے وہ دروازے جن کو میں نے ملت اسلامیہ پر بڑی مضبوطی سے بند کر رکھا تھا ڈھیلے نہ پڑ جائیں علاوہ ازیں خود اپنے بارے میں آخرت کا خوف بھی میرے لئے کچھ کم اضطراب انگیز نہیں ہے بے شک حق تعالیٰ نے مجھے بڑی بڑی سعادتوں سے نوازا اور اس دنیا میں مجھ پر بے پایاں فضل وانعام فرمایا، لیکن میں نے حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں جو جو کوتاہیاں کی ہیں ان پر آخرت میں مواخذہ بھی ہو سکتا ہے، اگر عدل خداوندی نے مجھے مستوجب عذاب گردان دیا تو کیا حشر ہوگا، استیعاب میں منقول ہے کہ: حضرت عمر فاروقؓ جب زخمی ہو کر گرے تو اپنے بیٹے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی گود میں سر رکھے پڑے تھے اور بار بار کہہ رہے تھے: ظلوم النفسی غیر انی مسلم اصلی صلاتی کلھا واصوم میں اپنے نفس پر بڑا ہی ظلم کرنے والا ہوں باوجودیکہ میں مسلمان ہوں، تمام نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور روزے بھی رکھتا ہوں۔

قاتلانہ حملہ اور شہادت: مدینہ منورہ میں ایک پارسی غلام "فیروز" نام کا تھا جس کی کنیت ابولؤلؤ تھی، اس نے ایک دن حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے آقا مغیرہ ابن شعبہؓ کی شکایت کی کہ انہوں نے مجھ پر بہت بھاری ٹیکس عائد کر رکھا ہے آپ کم کرا دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے اس ٹیکس کی مقدار اور اس کے کام کی صلاحیت وآمدنی وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اس سے کہا کہ یہ ٹیکس کچھ زائد نہیں ہے، ابولؤلؤ یہ سن کر دل میں سخت ناراض ہوا اور حضرت عمرؓ کے پاس سے واپس چلا آیا۔ دوسرے دن ابولؤلؤ ایک زہر آلود دو دھاری خنجر لے کر اندھیرے منہ مسجد میں آکر ایک کونے میں چھپ گیا اور جب حضرت عمرؓ فجر کی نماز کے لئے تشریف لائے اور امامت کے لئے آگے بڑھنے لگے تو اس نے دفعۃً گھات میں سے نکل کر ان پر خنجر کے چھ وار کئے، جن میں سے ایک ناف کے نیچے پڑا زخم اتنا کاری تھا کہ حضرت عمرؓ تاب نہ لا کر فوراً گر پڑے، حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ نے چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر جلدی جلدی نماز پڑھائی، نماز کے بعد حضرت عمرؓ کو اٹھا کر گھر لایا گیا۔

حملہ کے تین دن کے بعد حضرت عمرؓ نے جان جاں آفریں کے سپرد کی، اور محرم ۲۴ھ کی پہلی تاریخ شنبہ کے دن مدفون ہوئے حضرت صہیبؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ بعض حضرات نے حملہ کا واقعہ ذی الحجہ ۲۳ھ کی ۲۷ تاریخ چہار شنبہ کے دن کا لکھا ہے اور تاریخ مدفون ۱۰ محرم ۲۴ھ بروز یکشنبہ بیان کی ہے، حضرت عمرؓ کی خلافت ساڑھے دس سال رہی اور عمر تحقیقی قول کے مطابق ۶۳ سال کی

ہوئی، صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت نے ان سے احادیث روایت کی ہیں جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور باقی عشرہ مبشرہ صحابہ بھی شامل ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک بڑی کرامت: مستند کتابوں میں معتبر و ثقہ راویوں کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ جب مصر فتح ہوا تو وہاں کے عامل (گورنر) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مقرر ہوئے ان سے ایک دن مصریوں نے آکر کہا کہ زمانۂ قدیم سے دریائے نیل ہر سال ایک کنواری نوجوان لڑکی کی بھینٹ لیتا چلا آیا ہے، جب تک یہ بھینٹ نہیں دی جاتی پانی جاری نہیں ہوتا۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ہر سال چاند کی گیارہویں کی رات کو ایک نوجوان لڑکی کو اس کے والدین کی رضامندی کے ساتھ بیش بہا کپڑے اور عمدہ زیور پہنا کر اور خوب بناؤ سنگھار کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں، اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو دریا خشک ہونے لگتا ہے اور پھر شہروں اور دیہاتوں میں پانی کی کمی کے سبب قحط پڑ جاتا ہے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصریوں سے کہا کہ یہ ایک بے ہودہ رسم ہے چونکہ اسلام میں اس طرح کی لغویات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا، چنانچہ اس سال یہ رسم نہیں کی گئی اور دریائے نیل تقریباً سوکھ گیا، پورے مصر میں قحط و خشک سالی کی سی کیفیت پیدا ہو جانے کے سبب اہل مصر ترک وطن پر مجبور ہونے لگے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے صورت حال کی تفصیلی رپورٹ حضرت عمر فاروق کی خدمت میں روانہ کی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ رپورٹ دیکھی اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ تم نے اس رسم پر عمل کرنے کی اجازت نہ دے کر بالکل ٹھیک کیا، واقعی اسلام اس طرح کی رسوم کی بیخ کنی کرتا ہے، میں ایک پرچہ بھیج رہا ہوں تم اس کو دریائے نیل میں ڈال دینا اس پرچہ میں لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بندۂ اللہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین کی جانب سے دریائے نیل کے نام۔ بعد حمد و صلوۃ (اے دریائے نیل!) اگر تو اپنے اختیار اور اپنی قوت سے بہتا ہے تو مجھ کو تجھ سے کچھ نہیں کہنا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مرضی سے تو بہتا ہے تو میں اللہ واحد و قہار کے نام پر تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ جاری اور رواں ہو جا، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عامل مصر نے اس پرچہ کو دریائے نیل میں ڈال دیا اور صبح اٹھ کر لوگوں نے دیکھا کہ ایک ہی رات میں دریائے نیل سولہ ہاتھ اوپر آگیا ہے اور پورے زور شور کے ساتھ رواں ہے اور پھر ہر سال چھ ہاتھ بڑھتا رہا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے باشندگان مصر کی اس قدیم رسم کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس دن سے اب تک دریائے نیل برابر جاری ہے۔

بَابُ مَنَاقِبِ اَبِیْ بَکْرٍ رضی اللہ عنہ وَ عُمَرَ رضی اللہ عنہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مناقب کا بیان

بعض ایسی روایتیں منقول ہیں جن میں شیخین یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے، اس لئے مؤلف مشکوۃ نے ان روایتوں پر مشتمل ایک الگ باب یہاں قائم کیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں حضرات اپنی اس مشترکہ خصوصیت کی بناء پر اکثر مواقع پر ایک ساتھ ذکر کئے جاتے تھے کہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی معاون و مددگار، بارگاہ رسالت میں وقت بے وقت حاضری اور تقرب کی سعادت رکھنے والے تمام دینی و ملی معاملات و مسائل کے مشیر و امین، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اوقات و احوال کے مصاحب و ہمنشین تھے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ ایمان و یقین کے بلند ترین مقام پر فائز تھے

(۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَمَا رَجُلٌ يَّسُوْقُ بَقَرَةً اِذَا عْيٰى فَرَكِبَهَا فَقَالَتْ اِنَّا لَمْ

نُخلَق لِهٰذَا اِنَّمَا خُلِقْنَا لِحِرَاثَةِ الْاَرْضِ فَقَالَ النَّاسُ سُبْحَانَ اللّٰهِ بَقَرَةٌ تَكَلَّمُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنِّيْ اُوْمِنُ بِهٖ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرُ وَمَا هُمَا ثَمَّ وَقَالَ بَيْنَمَا رَجُلٌ فِيْ غَنَمٍ لَهٗ اِذْ عَدَا الذِّئْبُ عَلٰى شَاةٍ مِنْهَا فَاَخَذَهَا فَاَدْرَكَهَا صَاحِبُهَا فَاسْتَنْقَذَهَا فَقَالَ لَهُ الذِّئْبُ فَمَنْ لَهَا يَوْمَ السَّبُعِ يَوْمَ لَا رَاعِيَ لَهَا غَيْرِيْ فَقَالَ النَّاسُ سُبْحَانَ اللّٰهِ ذِئْبٌ يَتَكَلَّمُ فَقَالَ اُوْمِنُ بِهٖ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرُ وَمَا هُمَا ثَمَّ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ایک شخص ایک گائے کو ہانکتا ہوا لے جا رہا تھا، جب وہ (چلتے چلتے) تھک گیا تو گائے پر سوار ہو گیا، گائے بولی، ہماری تخلیق اس کام (یعنی سواری) کے لئے نہیں ہوئی ہے، ہم تو زراعت و کاشت کاری کے کام میں آنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، لوگوں (یعنی حاضرین مجلس) نے (یہ سن کر اظہار تعجب کے طور پر) کہا: سبحان اللہ، گائے بھی بات کرتی ہے (درآنحالیکہ وہ بے زبان چوپایہ ہے؟) اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "میں اس بات پر ایمان لاتا ہوں، اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی ایمان لاتے ہیں" اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اس مجلس میں موجود نہیں تھے، نیز حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ ایک شخص اپنی بکریوں کے ریوڑ کے درمیان تھا کہ ناگہاں ایک بھیڑیا آیا اور ریوڑ میں سے ایک بکری اٹھا لے گیا بکری کے مالک نے بھیڑیئے کا تعاقب کر کے اپنی بکری اس سے چھڑا لی بھیڑیا اس سے بولا: (اب تو تم نے اپنی بکری مجھ سے چھڑا لی ہے لیکن یہ بتاؤ) سبع کے دن بکریوں کا رکھوالا کون ہوگا، جب میرے سوا بکریوں کا چرانے والا کوئی نہ ہوگا۔ لوگوں نے (یہ واقعہ سن کر اظہار تعجب کیا اور) کہا: سبحان اللہ، بھیڑیا اور بات کرے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں اس پر ایمان لاتا ہوں اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی ایمان لائے" اس وقت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ہماری تخلیق اس کام کے لئے نہیں ہوتی ہے" اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ گائے پر سواری گانٹھنا یا اس پر بوجھ لادنا موزوں نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ علماء نے حدیث کے ان الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ چوپاؤں اور مویشیوں کو ان مقاصد کے علاوہ اور کسی کام میں نہ لانا چاہئے جو عام طور پر ان سے منسوب سمجھے جاتے ہیں اور جن کے لئے ان کا استعمال عادت و معمول کے تحت ہوتا ہے، تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ اس بات کا منشاء محض اولیت و افضلیت کی طرف اشارہ کرنا ہے نہ کہ حصر کرنا، یعنی افضل اور بہتر یہ ہے کہ چوپایہ و مویشی سے وہی کام لیا جائے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ اور جس کام میں استعمال ہونا اس کی عادت و معمول میں شامل ہو چکا ہو۔ پس جن چوپاؤں کو حلال کر کے گوشت کھایا جاتا ہے ان کے ذبح کرنے پر کوئی اشکال نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ انسانی غذا کے لئے گوشت فراہم کرنا ان چوپایوں کے مقصد تخلیق میں شامل ہے اور ذبح کر کے ان کا گوشت کھانا عادت و معمول کے مطابق ہے۔

"میں اس بات پر ایمان لاتا ہوں" یعنی میں اس بات میں اپنا کامل یقین ظاہر کرتا ہوں کہ اللہ کی قدرت اور اس کے حکم سے گائے انسان کی زبان میں بات کر سکتی ہے، یا اس بات کو دل سے مانتا ہوں کہ گائے واقعۃً زراعت اور انسانی غذاؤں کی فراہمی کے مقاصد کے لئے پیدا کی گئی ہے نہ کہ سواری اور بار برداری کے لئے۔

"اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی ایمان لاتے ہیں" صرف انہی دو حضرات کے ذکر کئے جانے میں اس طرف اشارہ تھا کہ مضبوط ایمان و اعتقاد اور کامل یقین و اعتماد کا خصوصی درجہ کمال انہی کو حاصل ہے۔ یہاں یہ اشکال نہیں ہونا چاہئے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نہ وہاں موجود ہی تھے نہ انہوں نے اس واقعہ کو دیکھا، نہ سنا اور نہ اس پر اپنے یقین و اعتقاد کا اظہار ہی کیا تو پھر ان کے بارے میں کیونکر فرمایا کہ "ابوبکرؓ و عمرؓ بھی ایمان لائے" دراصل آپ ﷺ نے یہ بات اس معنی میں کہی تھی کہ یہ واقعہ یعنی گائے کا بات کرنا، ایک ایسی حقیقت ہے، جو اگر ابوبکرؓ و عمرؓ کے سامنے آئے تو وہ بھی فوراً اس پر ایمان لے آئیں۔ اس کی واقعیت میں ان دونوں کو ذرا بھی تردد اور شک نہیں ہوگا۔

"ابوبکرؓ و عمرؓ اس مجلس میں موجود نہیں تھے" یعنی: آنحضرت ﷺ نے ان دونوں حضرات کے بارے میں مذکورہ الفاظ ارشاد

فرمائے تو اس وقت وہ دونوں ہی وہاں موجود نہیں تھے۔ پس ان کی عدم موجودگی میں آپ ﷺ کا اس طرح فرمانا در حقیقت ان دونوں کی قوت ایمانی اور ان کے درجہ کمال کی نہایت اعلی پیرایہ میں تعریف و توصیف کرنا تھا، اس کو وضاحت کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں حضرات کو ایمان و اعتقاد اور کمال تعلق کے ساتھ بارگاہ رسالت میں تقریب اور حضوری کا جو خصوصی مقام حاصل تھا اس کی مدح و ستائش کی ایک عام صورت تو یہ تھی کہ دوسروں کے ساتھ یہ دونوں حضرات بھی اسوقت مجلس مبارک میں حاضر ہوتے اور آنحضرت ﷺ مذکورہ واقعہ پر اعتقاد و یقین کے اظہار میں اپنے ساتھ صرف ان دونوں کا ذکر کر کے ایمان و یقین کے تعلق سے ان کی خصوصی حیثیت اور ان کے خصوصی مرتبہ کو ظاہر فرماتے مگر جب آپ نے ان دونوں کی غیر موجودگی میں مذکورہ الفاظ ارشاد فرما کر ان کی خصوصی حیثیت اور ان کے خصوصی مرتبہ کا اظہار فرمایا تو گویا ان کی مدح و ستائش کی وہ غیر معمولی صورت رونما ہوئی جس سے ان دونوں کا تمام صحابہؓ پر افضلیت و برتری رکھنا بھی معلوم ہوا اور صراحۃً یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ دونوں ایمان و یقین کے سب سے بلند درجہ پر ہیں۔

"سبع کے دن" یہ یوم السبع کا ترجمہ ہے اور "سبع" کا لفظ بؔ کے جزم کے ساتھ بھی نقل ہوا ہے اور پیش کے ساتھ بھی، نیز "سبع کے دن" کی وضاحت میں مختلف اقوال بیان ہوئے ہیں بعض حضرات نے لکھا ہے کہ "سبع" اور "سباع" کے معنی اچک لینا کے آتے ہیں یعنی کسی چیز کو بے کار و مہمل سمجھ کر چھوڑ دیا جائے اور کوئی اس کو اڑا کر لے جائے، چنانچہ "سبع" کا لفظ بیکار و مہمل چیز کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس اعتبار سے یوم السبع (بؔ کے جزم کے ساتھ) مراد "فتنہ و فساد" ہے یعنی جب لوگوں میں اختلاف و انتشار پھیل جائے گا اور آپس میں جنگ و جدال کرنے لگیں گے تو نہ کسی کو اپنے مویشیوں کا دھیان رہے گا اور نہ اپنی بکریوں کا اس وقت بکریاں اپنے گلہ بانوں کے بغیر ادھر ادھر ماری ماری پھریں گی، ان کا کوئی والی وارث نہیں ہوگا۔ پس بھیڑیئے نے قادر مطلق کے حکم سے انسانوں کی زبان میں چرواہے کو ان مصائب اور فتنوں سے آگاہ کیا جو آنے والے زمانوں میں وقوع پزیر ہونے والے تھے، بھیڑیئے نے طنز کیا کہ اس وقت دیکھوں گا تم میں کون شخص اپنی بکریوں کی حفاظت و نگہبانی کرتا نظر آئے گا۔ سب لوگ اپنے اپنے جھگڑوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کی بکریوں کا میں ہی نگہبان ہوں گا، مزے سے ان کو چٹ کروں گا، اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یوم السبع (ب کے جزم کے ساتھ) ایک تہوار کو کہتے تھے جو زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کے یہاں منایا جاتا تھا، اس دن ایک خاص میلہ لگتا تھا اور تمام لوگ اس میلہ میں اس طرح آآ کر جمع ہوتے تھے کہ پھر ان کو کسی اور چیز کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی، مویشیوں کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیتے تھے جو جنگل اور بیابانوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور بھیڑیئے بڑے اطمینان سے ان کو اپنا شکار بنا لیتے تھے، پس بھیڑیئے نے گویا زمانہ جاہلیت کے اسی تہوار کے دن کی یاد چرواہے کو دلائی کہ اس دن بکریوں کی رکھوالی کون کرتا تھا جو تم آج بڑے نگہبان اور رکھوالے بن کر آئے ہو، یا یہ کہ عید کا دن تو اب بھی ہر سال آتا ہے، اب جب عید کا دن آئے گا اور تم عید کی مصروفیات میں لگے رہو گے تو پھر دیکھوں گا کہ تمہاری بکریوں کی حفاظت کون کرتا ہے اور میرے چنگل سے کوئی بکری کیسے چھڑا لی جائے گی۔

سبع (بؔ کے پیش کے ساتھ) کے معنی "درندہ" کے آتے ہیں اس صورت میں بھی یوم السبع کا مطلب مذکورہ بالا مفہوم میں بیان کیا جاسکتا ہے یعنی یہ کہ جب فتنہ و فساد کا زور ہوگا اور لوگ اپنے اپنے جھگڑوں میں مبتلا ہوں گے یا فتنہ و فساد کے خوف سے مال اسباب چھوڑ کر اپنے گھروں سے بھاگ جائیں گے۔ تو بکریاں اپنے وارث ولی کے بغیر پھریں گی، اس وقت درندہ یعنی بھیڑیا ہی ان کا نگہبان ہوگا اور مزے سے ان کو چٹ کرے گا، اس اعتبار سے وہ "درندوں کا دن" کہلائے گا، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ سبع (بؔ کے پیش کے ساتھ) کے معنی بھی "تہوار کا دن" کے آتے ہیں، اور مشارق میں لکھا ہے کہ! یہ لفظ دراصل یوم السیع (یعنی بؔ کے بجائے ی کے ساتھ) ہے جس سے مراد "نقصان کا دن" ہے کیونکہ "سیع" کا لفظ ضیاع (تلف ہو جانے، بے کار ہو جانے) کے معنی میں بھی آتا ہے۔

قدم قدم کے ساتھی اور شریک

(۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ اِنِّیْ لَوَاقِفٌ فِیْ قَوْمٍ فَدَعَوُا اللّٰہَ لِعُمَرَ وَقَدْ وُضِعَ عَلٰی سَرِیْرِہٖ اِذَا رَجُلٌ مِّنْ خَلْفِیْ قَدْ وَضَعَ

مِرْفَقَهُ عَلٰى مَنْكِبِيْ يَقُوْلُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ اِنِّيْ لَاَرْجُوْا اَنْ يَجْعَلَكَ اللّٰهُ مَعَ صَاحِبَيْكَ لِاَنِّيْ كَثِيْرًا مَا كُنْتُ اَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ كُنْتُ وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَفَعَلْتُ وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَانْطَلَقْتُ وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَدَخَلْتُ وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَخَرَجْتُ وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ فَالْتَفَتُّ فَاِذَا عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (حضرت عمر فاروقؓ کی وفات کے دن) اس وقت میں بھی ان لوگوں کے درمیان کھڑا تھا، جب حضرت عمرؓ کا جسد خاکی (نہلانے کیلئے) تختۂ مرگ پر رکھا ہوا تھا اور لوگ (یعنی حضرت عمرؓ کے قریبی ساتھی و اعزاء) کھڑے ہوئے ان کے حق میں دعائے خیر و مغفرت کررہے تھے، اسی دوران اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے کھڑے ہوئے کسی شخص نے اپنی ٹھوڑی میرے مونڈھے پر رکھی ہے۔ پھر اس شخص نے (حضرت عمرؓ کو مخاطب کرکے) کہنا شروع کیا: "اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ پر نازل ہو شک میں پوری امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ (قبر میں یا جنت میں) آپ کو آپ کے دونوں دوستوں (یعنی آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ) کے ساتھ ہی رکھے گا، کیونکہ میں رسول کریمؐ کی زبان سے اکثر یہی الفاظ سنتا تھا کہ "میں (فلاں جگہ) تھا اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی (میرے ساتھ تھے، میں نے (امور عبادت سے یا معمولات زندگی میں سے فلاں کام) کیا اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی (میرے شریک کار تھے) میں (فلاں مقام پر) گیا اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی (میرے ساتھ تھے) میں (فلاں مسجد یا فلاں مکان میں) داخل ہوا، اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی (میرے ساتھ تھے) میں (فلاں مکان یا فلاں جگہ سے) باہر آیا اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی (میرے ساتھ تھے) میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ الفاظ کہنے والے علی ابن ابی طالبؓ تھے" (بخاری و مسلم)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

ابوبکرؓ و عمرؓ علیین میں بلند تر مقام پر ہوں گے

③ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ لَيَتَرَاءَوْنَ اَهْلَ عِلِّيِّيْنَ كَمَا تَرَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ فِيْ اُفُقِ السَّمَآءِ وَاِنَّ اَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ مِنْهُمْ وَاَنْعَمَا رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوٰى نَحْوَهُ اَبُوْ دَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ۔

"حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنتی لوگ علیین والوں کو (نہایت بلندی پر) اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم کنارۂ آسمان کے بہت روشن ستارہ کو دیکھتے ہو۔ اور ابوبکرؓ و عمرؓ علیین والوں میں سے ہیں، بلکہ (اپنے اعزاز و رتبہ کے اعتبار سے) ان سے بڑھے ہوئے ہیں" اس روایت کو بغویؒ نے (اپنی اسناد کے ساتھ) شرح السنہ میں نقل کیا ہے، نیز اسی طرح کی روایت ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے بھی نقل کیا ہے۔"

تشریح: "علیین" ساتویں آسمان پر ایک مقام کا نام ہے جہاں نیک بندوں کی ارواح چڑھ کر جاتی ہیں، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ "علیین" ملائکہ حفظہ کے دفتر کا نام ہے جہاں نیک لوگوں کے اعمال پہنچائے جاتے ہیں یا یہ کہ "علیین" جنت کے اس درجہ اور مقام کو کہتے ہیں جو تمام درجات سے زیادہ بلند اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب ہے۔

"بہت روشن ستارہ" یہ الکوکب الدری کا ترجمہ ہے دری میں "ی" نسبت کی ہے اور "در" کے معنی "بڑے موتی" کے ہیں "ستارہ" کو بڑے موتی سے موسوم کرنا اس کی روشنی، چمک اور صفائی کے اعتبار سے ہے۔

اہل جنت کے سردار

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرُ سَيِّدَا كُهُوْلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ مِنَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ اِلَّا النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ عَلِيٍّ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جنت میں جتنے بھی ادھیڑ عمر والے ہوں، خواہ وہ اگلوں میں کے ہوں یا پچھلوں میں کے، ان سب کے سردار ابوبکرؓ و عمرؓ ہوں گے۔ سوائے نبیوں اور رسولوں کے، (ترمذیؒ) ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: ظاہر ہے جنت میں تو کوئی بھی ادھیڑ عمر کا نہیں ہو گا سب "جوان" ہوں گے اس لئے "ادھیڑ عمر والوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو ادھیڑ عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوں گے۔

"اگلوں" سے مراد گزشتہ امتوں کے لوگ مراد ہیں جن میں اصحاب کہف، آل فرعون کے اہل ایمان اور حضرت خضر بھی شامل ہیں بشرطیکہ وہ قول صحیح ہو جس کے مطابق حضرت خضر، نبی نہیں ولی ہیں، اور پچھلوں سے مراد اس اُمّت کے لوگ ہیں جن میں تمام اولیاء اللہ اور شہداء بھی شامل ہیں۔

"سوائے نبیوں اور رسولوں کے" کی قید سے حضرت عیسیٰ اور دوسرے نبیوں رسولوں کا بھی استثناء ہو گیا اور ان حضرات کے مطابق حضرت خضر بھی مستثنیٰ ہو گئے جن کا کہنا ہے کہ حضرت خضر نبی ہیں۔

ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت حکم نبوی ﷺ کے مطابق تھی

⑤ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّىْ لَآ اَدْرِىْ مَا بَقَائِىْ فِيْكُمْ فَاقْتَدُوْا بِاللَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِىْ اَبِىْ بَكْرٍ وَعُمَرَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (ایک دن) فرمانے لگے: مجھے نہیں معلوم تمہارے درمیان میری زندگی اب کتنی باقی رہ گئی ہے (ابھی کچھ دن اور جینا مقدر ہے یا وقت موعود قریب آگیا ہے) لہٰذا (آگاہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ) تم لوگ میرے بعد ان دونوں کی پیروی کرنا، (جو یکے بعد دیگرے میرے جانشین اور خلیفہ ہوں گے) اور وہ ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں۔" (ترمذیؒ)

ایک اور خصوصیت

⑥ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ لَمْ يَرْفَعْ اَحَدٌ رَاْسَهٗ غَيْرَ اَبِىْ بَكْرٍ وَعُمَرَ كَانَ يَتَبَسَّمَانِ اِلَيْهِ وَيَتَبَسَّمُ اِلَيْهِمَا رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تو (پاس ادب سے سب کی نگاہیں نیچی ہو جاتی تھیں یا یہ کہ آپ کی ہیبت سے) کوئی اپنا سر اوپر نہیں اٹھا سکتا تھا سوائے ابوبکرؓ و عمرؓ کے (صرف یہی دو اصحاب تھے جو روئے مبارک کی طرف نظر اٹھانے کی تاب رکھتے تھے) یہ دونوں آپ ﷺ کو دیکھتے ہی مسکرانے لگتے تھے اور آنحضرت ﷺ ان دونوں کو دیکھ کر مسکرا اٹھتے تھے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: یہ محبت کی خاصیت اور باہم محبت رکھنے والوں کی عادت ہے کہ جب آپس میں ان کی ایک دوسرے پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار مسکرانے لگتے ہیں اور شاداں و فرحاں ہو جاتے ہیں۔

قیامت کے دن ابوبکرؓ و عمرؓ حضور کے ساتھ اٹھیں گے

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ ذَاتَ يَوْمٍ وَدَخَلَ الْمَسْجِدَ وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ اَحَدُهُمَا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَالْاٰخَرُ عَنْ شِمَالِهٖ وَهُوَ اٰخِذٌ بِاَيْدِيْهِمَا فَقَالَ هٰكَذَا نُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ حجرۂ شریف سے نکل کر مسجد میں اس طرح داخل ہوئے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ میں سے ایک صاحب آپ کے دائیں طرف تھے اور ایک صاحب بائیں طرف، اور آپ ﷺ نے دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن ہمیں اسی طرح اٹھایا جائے گا، (یعنی ہم تینوں اپنی قبروں سے اسی طرح ایک ساتھ اٹھیں گے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میدان حشر تک پہنچیں گے) اس روایت کو ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

خصوصی حیثیت و اہمیت

⑧ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ حَنْطَبٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَاٰی اَبَابَکْرٍ وَّ عُمَرَ فَقَالَ ھٰذَا نِ السَّمْعُ وَالْبَصَرُ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ مُرْسَلاً۔

"اور حضرت عبداللہ ابن حنطبؒ (تابعی) کی روایت میں ہے کہ: (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو دیکھ کر فرمایا: یہ دونوں بمنزلہ، کان اور آنکھ کے ہیں۔ اس روایت کو ترمذی نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ کہ جس طرح جسم کے اعضاء کان اور آنکھ اپنی خصوصی اہمیت و حیثیت کی بناء پر سب سے زیادہ خوبی و عمدگی رکھتے ہیں اسی طرح یہ دونوں (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) اپنی خصوصی اہمیت و حیثیت کے اعتبار سے ملت اسلامیہ میں سب سے زیادہ شرف و فضیلت رکھتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے تقریباً یہی مطلب یوں لکھا ہے کہ: دین میں ان دونوں کی وہی حیثیت و اہمیت ہے جو اعضاء جسم میں کان اور آنکھ کی، یا اس ارشاد گرامی ﷺ کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ: یہ دونوں میرے لئے بمنزلہ کان اور آنکھ کے ہیں کہ میں ان کے واسطہ سے دیکھتا ہوں اور ان کے واسطہ سے سنتا ہوں۔ یہ مطلب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں حضرات کو اپنے کان اور اپنی آنکھ سے تعبیر کرکے گویا یہ واضح فرمایا کہ یہ دونوں میرے وزیر، میرے نائب، اور میرے وکیل و مشیر ہیں۔ اور یا یہ کہ ان دونوں کو "بمنزلہ کان اور آنکھ کے" قرار دینا درحقیقت اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ حق سننے اور اس کی اتباع کرنے اور ذات و کائنات میں حق کا مشاہدہ کرنے میں یہ دونوں بہت زیادہ حریص ہیں۔

وزراء رسالت

⑨ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ نَبِیٍّ اِلاَّ وَلَہٗ وَزِیْرَانِ مِنْ اَھْلِ السَّمَاءِ وَوَزِیْرَانِ مِنْ اَھْلِ الْاَرْضِ فَاَمَّا وَزِیْرَایَ مِنْ اَھْلِ السَّمَاءِ فَجِبْرَائِیْلُ وَمِیْکَائِیْلُ وَاَمَّا وَزِیْرَایَ مِنْ اَھْلِ الْاَرْضِ فَاَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس کے دو وزیر آسمان والوں میں سے اور دو وزیر زمین والوں میں سے نہ ہوں۔ پس آسمان والوں میں سے میرے دو وزیر تو "جبرئیل" اور "میکائیل" ہیں، اور زمین والوں میں سے میرے دو وزیر ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "آسمان والوں" سے مراد فرشتے ہیں، ان فرشتوں میں سے جو دو فرشتے نبی اور رسول کے وزیر مقرر ہوتے ہیں ان کا کام عالم ملکوت سے اس نبی اور رسول کی امداد و اعانت کرنا ہوتا ہے۔

"زمین والوں" سے مراد اس نبی اور رسول کی اُمت کے لوگ اور اس کے رفقاء اور محبین ہیں، ان رفقاء و محبین میں سے جو دو آدمی اس نبی اور رسول کے بہت قریب اور بہت زیادہ دانا، دور اندیش اور باصلاحیت ہوتے ہیں ان کا وہی مقام و مرتبہ ہوتا ہے جو کسی بادشاہ کے وزیروں کا، ان دونوں "وزیروں" کا کام اس عالم ناسوت میں اپنے نبی و رسول کی خدمت و نصرت کرنا ہوتا ہے اور جب کوئی مشورہ

طلب مسئلہ پیش آتا ہے تو نبی و رسول ان سے مشورہ کرتا ہے۔

اس حدیث سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام (بلکہ تمام فرشتوں) سے افضل و اعلی ہیں، اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تمام صحابہ سے افضل و اعلی ہیں جب کہ تمام صحابہ تمام لوگوں میں سب سے افضل و اعلی ہیں نیز "ابوبکر و عمر" کے الفاظ اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے افضل ہیں کیونکہ ان الفاظ میں حرف و اگرچہ مطلق جمع کے لئے ہے لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ صاحب حکمت و دانائی کا کلام ہے اور ممکن نہیں ہے کہ ان دونوں ناموں کے ذکر میں مذکورہ ترتیب (کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کا نام آیا اور پھر حضرت عمرؓ کا) حکمت و مصلحت سے خالی ہو، اور حکمت و مصلحت اس کے علاوہ کیا ہوسکتی ہے کہ جب دو ناموں کا ایک ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تو پہلے وہی نام آتا ہے جو دوسرے سے افضل و اعلی ہوتا ہے۔

خلافت نبوت ابوبکر و عمر پر منتہی

⑮ وَعَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَيْتُ كَاَنَّ مِيْزَانًا نَزَلَ مِنَ السَّمَآءِ فَوُزِنْتَ اَنْتَ وَاَبُوْبَكْرٍ فَرَجَحْتَ اَنْتَ وَوُزِنَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ فَرَجَحَ اَبُوْبَكْرٍ وَوُزِنَ عُمَرُ وَعُثْمَانُ فَرَجَحَ عُمَرُ ثُمَّ رُفِعَ الْمِيْزَانُ فَاسْتَاءَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِىْ فَسَاءَهُ ذٰلِكَ فَقَالَ خِلَافَةُ نُبُوَّةٍ ثُمَّ يُؤْتِى اللّٰهُ الْمُلْكَ مَنْ يَّشَاءُ۔

(رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت ابی بکرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر ایک شخص نے عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک ترازو آسمان سے اتری اور (اس ترازو میں) آپ ﷺ کو اور ابوبکرؓ کو تولا گیا تو آپ کا وزن زیادہ رہا پھر ابوبکرؓ اور عمرؓ کو تولا گیا تو ابوبکرؓ کا وزن زیادہ رہا اور پھر عمرؓ اور عثمانؓ کو تولا گیا، تو عمرؓ کا وزن زیادہ رہا۔ اس کے بعد ترازو کو اٹھا لیا گیا۔ رسول کریم ﷺ اس شخص کے اس خواب سے غمگین ہوگئے، یعنی اس خواب نے آپ ﷺ کو رنجیدہ بنا دیا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: یہ خلافت نبوت ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا ملک عطا فرمادے گا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "غمگین ہوگئے" یعنی: آپ ﷺ نے اس خواب کو سن کر یہ تعبیر لی کہ عمرؓ کی خلافت کے بعد فتنوں کا دور شروع ہوجائے گا، دینی و ملی امور میں انتشار و اضمحلال آجائے گا اور عالم اسلام کی اس شان و شوکت کو نقصان پہنچانے کی کوششیں اپنا اثر دکھانے لگیں گی جو خلافت عمرؓ میں اپنے عروج پر پہنچ چکی ہوں گی۔

"یہ خلافت نبوت ہے" یعنی: ابوبکرؓ اور عمرؓ کی خلافت ہی حقیقی معنی میں خالص خلافت نبوت کہلانے کی مستحق ہوگی، جس میں بادشاہت و ملوکیت کی ذرا بھی آمیزش نہیں ہوگی اور ان کی خلافت سے اختلاف و انکار کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا، گویا آنحضرت ﷺ نے "ترازو اٹھ جانے" کی تعبیر یہ دی کہ حقیقی و خالص اور متفق علیہ خلافت کا زمانہ ابوبکرؓ و عمرؓ پر کامل و منتہی ہوگا، عمرؓ کے بعد خلافت کا جو دور آئے گا اس میں ملوکیت (بادشاہت) کی آمیزش در آئے گی۔ نبوت اور خلافت نبوت کے منہاج کے خلاف کچھ باتیں شامل ہوجائیں گی اور حکومت و ملت کے انتظامی ڈھانچے میں بعض بے قاعدگیاں راہ پاجائیں گی، اور پھر خلافت اربعہ کے بعد تو پوری طرح ملوکیت قائم ہوجائے گی جس کو "گزندہ بادشاہت" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ "ترازو کے اٹھ جانے" سے مذکورہ تعبیر کس بناء پر سمجھی گئی تو اس کو اس سیاق میں دیکھنا چاہئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ انہی چیزوں کو تولا جاتا ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے لگ بھگ ہوں، جو چیز آپس میں بعید و متبائن (ان میل) ہوں ان کو ایک دوسرے کے ساتھ تولنا کوئی معنی نہیں رکھتا اس لئے ترازو کا اٹھا لیا جانا اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تولنے کا سلسلہ موقوف ہوجانا اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ جو چیزیں آپس میں ایک دوسرے کے لگ بھگ ہوسکتی

ہیں اور جن کا تولا جانا مقصود ہو سکتا ہے وہ ختم ہو چکی ہیں اسی بنیاد پر آنحضرت ﷺ نے تعبیر لی کہ یہ خواب ابوبکرؓ اور عمرؓ کے بعد امر خلافت میں انحطاط کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ابوبکرؓ کا وزن زیادہ رہا سے یہ مطلب نکلا کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے افضل ہیں، اسی طرح "عمر کا وزن زیادہ رہا" کا یہ مطلب ہوا کہ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ سے افضل ہیں۔

خواب دیکھنے والے نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا تولا جانا نہیں دیکھا۔ یہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا تفاضل کا مسئلہ سلف کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے جیسا کہ بعض کتب کلامیہ میں مذکور بھی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ابوبکرؓ و عمرؓ کے جنتی ہونے کی شہادت

(۱۱) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَطَّلِعُ عَلَیْکُمْ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَاطَّلَعَ اَبُوْبَکْرٍ ثُمَّ قَالَ یَطَّلِعُ عَلَیْکُمْ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَاطَّلَعَ عُمَرُ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ (ایک دن) فرمانے لگے: "(دیکھو ابھی) تمہارے سامنے ایک ایسا شخص آئے گا جو جنتیوں میں سے ہے" پس (آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہی تھا کہ) حضرت ابوبکرؓ سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ آپ نے پھر فرمایا: "(دیکھو ابھی) تمہارے سامنے ایک ایسا شخص آئے گا جو جنتیوں میں سے ہے" پس (آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہی تھا کہ) حضرت عمرؓ سامنے سے آتے نظر آئے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: جنت کی بشارت مختلف احادیث میں متعدد صحابہ کے لئے آئی ہے، اس حدیث میں یہ بشارت چونکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے لئے ایک ساتھ مذکور ہے اس لئے اس حدیث کو یہاں نقل کیا گیا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی نیکیاں

(۱۲) وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ بَیْنَا رَاْسُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حِجْرِیْ فِیْ لَیْلَۃٍ ضَاحِیَۃٍ اِذْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ھَلْ یَکُوْنُ لِاَحَدٍ مِنَ الْحَسَنَاتِ عَدَدَ نُجُوْمِ السَّمَاءِ قَالَ نَعَمْ عُمَرُ قُلْتُ فَاَیْنَ حَسَنَاتُ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ اِنَّمَا جَمِیْعُ حَسَنَاتِ عُمَرَ کَحَسَنَۃٍ وَاحِدَۃٍ مِنْ حَسَنَاتِ اَبِیْ بَکْرٍ۔ (رواہ رزین)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک چاندنی رات میں جب کہ رسول کریم ﷺ کا سر مبارک میری گود میں تھا میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا کسی کی اتنی نیکیاں بھی ہیں جتنے آسمان پر ستارے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں وہ عمرؓ ہیں (جن کی نیکیاں آسمان کے ستاروں کے برابر ہیں) پھر میں نے عرض کیا کہ اور ابوبکرؓ کی نیکیوں کا کیا حال ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "عمرؓ کی تمام نیکیاں ابوبکرؓ کی نیکیوں میں سے ایک نیکی کے برابر ہیں"۔ (رزین)

تشریح: "ایک نیکی کے برابر ہیں" مطلب یہ کہ ابوبکرؓ کی نیکیاں عمرؓ کی نیکیوں سے کہیں زیادہ ہیں اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ عمرؓ کی نیکیاں ابوبکرؓ کی نیکیوں سے کہیں زیادہ ہیں تو بھی ابوبکرؓ افضل ہیں کیونکہ ان کو کمال اخلاص اور شہود معرفت کا جو خصوصی مرتبہ حاصل ہے اس نے ان کی نیکیوں کو کیفیت و حیثیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ گرانقدر اور بلند مرتبہ بنا دیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ ابوبکرؓ کو تم پر جو فضیلت و برتری حاصل ہے وہ اس بناء پر نہیں ہے۔ کہ ان کی نمازیں تمہاری نمازوں سے زیادہ ہیں اور ان کے روزے تمہارے روزوں سے زیادہ ہیں بلکہ اس جوہر کی بناء پر ہے جو ان کے دل میں رکھا گیا ہے۔

بَابُ مَنَاقِبِ عُثْمَانَ رضی اللہ عنہ

حضرت عثمانؓ کے مناقب کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُضْطَجِعًا فِيْ بَيْتِهٖ كَاشِفًا عَنْ فَخِذَيْهِ اَوْسَاقَيْهِ فَاسْتَاذَنَ اَبُوْبَكْرٍ فَاَذِنَ لَهٗ وَهُوَ عَلٰى تِلْكَ الْحَالِ فَتَحَدَّثَ ثُمَّ اسْتَاْذَنَ عُمَرُ فَاَذِنَ لَهٗ وَهُوَ كَذٰلِكَ فَتَحَدَّثَ ثُمَّ اسْتَاْذَنَ عُثْمَانُ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَوّٰى ثِيَابَهٗ فَلَمَّا خَرَجَ قَالَتْ عَائِشَةُ دَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ فَلَمْ تَهْتَشَّ لَهٗ وَلَمْ تُبَالِهٖ ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَلَمْ تَهْتَشَّ لَهٗ وَلَمْ تُبَالِهٖ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ فَجَلَسْتَ وَسَوَّيْتَ ثِيَابَكَ فَقَالَ اَلَا اَسْتَحْيِيْ مِنْ رَجُلٍ يَسْتَحْيِيْ مِنْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ اِنَّ عُثْمَانَ رَجُلٌ حَيِيٌّ وَاِنِّيْ خَشِيْتُ اِنْ اَذِنْتُ لَهٗ عَلٰى تِلْكَ الْحَالَةِ اَنْ لَّا يَبْلُغَ اِلَيَّ فِيْ حَاجَتِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں: (ایک دن) رسول کریم ﷺ اپنے گھر میں اپنی رانیں یا پنڈلیاں کھولے ہوئے لیٹے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حاضری کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے ان کو اندر بلالیا اور اسی حالت میں لیٹے رہے، حضرت ابوبکرؓ (کچھ دیر تک بیٹھے) آپ ﷺ سے باتیں کرتے رہے پھر حضرت عمرؓ نے حاضری کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے ان کو اندر بلالیا اور اسی طرح لیٹے رہے حضرت عمرؓ (بھی کچھ دیر تک بیٹھے) آپ ﷺ سے باتیں کرتے رہے، اور پھر جب حضرت عثمانؓ نے حاضری کی اجازت چاہی (اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہوئے) تو رسول کریم ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے، اور کپڑوں کو درست کرلیا (یعنی رانیں یا پنڈلیاں ڈھک لیں) جب حضرت عثمانؓ (اور خدمت اقدس میں حاضر دوسرے لوگ) چلے گئے تو عائشہؓ نے عرض کیا کہ حضرت ابوبکرؓ اندر آئے تو آپ نے نہ جنبش کی اور نہ ان کی پرواہ کی (بلکہ اسی طرح لیٹے رہے اور اپنے کپڑے بھی درست نہیں کئے) اسی طرح حضرت عمرؓ اندر آئے تو آپ ﷺ نے اس وقت بھی نہ حرکت کی اور نہ ان کی پرواہ کی، مگر جب حضرت عثمانؓ اندر داخل ہوئے تو آپ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور اپنے کپڑے درست کرلئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے حیا کرتے ہیں" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ عثمانؓ بہت حیادار آدمی ہیں میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے عثمانؓ کو اسی حالت میں بلالیا (کہ میری رانیں یا پنڈلی کھلی ہوئی ہوں) تو وہ مجھ سے اپنا مقصد پورا نہیں کریں گے یعنی اگر وہ مجھ کو اس حالت میں دیکھیں گے تو غلبۂ ادب اور شرم وحیا سے میرے پاس نہیں بیٹھیں گے اور جس مقصد سے یہاں آئے ہیں اس کو پورا کئے بغیر واپس چلے جائیں گے۔" (مسلم)

تشریح: "اپنی رانیں یا پنڈلیاں کھولے ہوئے تھے" حدیث کی شرح میں اس عبارت کے تحت امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ مالکی اور دوسرے حضرات نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ "ران" جسم کا وہ حصہ نہیں ہے جس کو "ستر" میں شمار کیا جائے، لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ اول تو یہی بات یقینی نہیں ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ اپنی رانیں کھولے ہوئے لیٹے تھے اگر یہ یقینی ہوتا تو حدیث کے راوی کو "اپنی رانیں یا پنڈلیاں" کے الفاظ سے یہ شک وتردد ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کہ اس وقت آنحضرت ﷺ اپنے جسم مبارک جو حصہ کھولے ہوئے لیٹے تھے وہ رانیں تھیں یا پنڈلیاں؟ جب الفاظ حدیث سے رانوں کا کھولنا یقینی طور پر ثابت نہیں تو پھر رانوں کا ستر نہ ہونا یعنی رانیں کھولنے کا جواز اس حدیث سے ثابت کرنا غیر موزوں بات ہے دوسرے اس بات کا قریبی امکان ہے کہ "رانیں کھولنے" سے مراد "رانوں پر سے کرتے کا دامن ہٹا ہوا ہونا" ہو یعنی ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی رانیں بالکل کھلی

ہوئی تھیں کہ ان پر نہ تہبند تھا اور نہ کرتے کا دامن بلکہ یہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے تہبند تو باندھ رکھا تھا جس میں رانیں چھپی ہوئی تھیں مگر رانوں کے اوپر سے کرتے کا دامن ہٹا ہوا تھا، اس کی تائید نہ صرف یہ کہ آگے کی عبارت سے سمجھ میں آتی ہے بلکہ آنحضرت ﷺ کی عادت، مزاج اور اس معمول کے پیش بھی یہی بات زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے جو آل و اصحاب کے ساتھ مخالطت و مجالست کے مواقع پر آپ ﷺ کا تھا۔

"اور کپڑوں کو درست کر لیا" ان الفاظ میں اس طرف واضح اشارہ ہے کہ آپ ﷺ رانوں یا پنڈلیوں میں سے کوئی بھی عضو پوری طرح کھولے ہوئے نہیں لیٹے تھے بلکہ تہبند کے علاوہ اور کوئی کپڑا رانوں یا پنڈلیوں پر نہیں تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ کی رانیں پوری طرح کھلی ہوئی ہوتیں تو یہاں وسوی ثیابہ (اور کپڑوں کو درست کر لیا) کے بجائے یہ الفاظ ہوتے کہ: وستر فخذیہ (اور اپنی رانوں کو ڈھک لیا)۔

"جس سے فرشتے حیا کرتے ہیں" امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ یہ ارشاد گرامی حضرت عثمانؓ کی فضیلت کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ "حیاء" فرشتوں کی ایک اعلیٰ صفت ہے جو مذکورہ الفاظ کے ذریعہ حضرت عثمانؓ میں ثابت کی گئی ہے اور مظہر نے لکھا ہے: یہ الفاظ حضرت عثمانؓ کی اس عزت و توقیر کو ظاہر کرتے ہیں جو آنحضرت ﷺ کے نزدیک تھی لیکن اس سے نہ تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اس مقام و مرتبہ پر کوئی فرق پڑتا ہے جو بارگاہ رسالت ﷺ میں ان کو حاصل تھا اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمانؓ کی بہ نسبت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی، دراصل حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو تعلق، محبت اور قربت کا جو خصوصی مقام بارگاہ رسالت میں حاصل تھا وہ اسی "بے تکلفی" کا متقاضی تھا، جس کا اظہار ان دونوں کی آمد پر آنحضرت ﷺ نے کیا کہ جس طرح لیٹے تھے اسی طرح لیٹے رہ گئے۔ سب جانتے ہیں کہ محبت جب کامل اور بہت ہوتی ہے تو تکلف کا حجاب درمیان سے اٹھ جاتا ہے اور بے تکلفی ہی صحبت و ہم نشینی کا جذباتی تقاضہ بن جاتی ہیں، جیسا کہ کہا گیا ہے: اذا حصلت الالفة بطلت الکفة اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ حدیث فضیلت عثمانؓ کے موضوع سے زیادہ فضیلت ابوبکرؓ و عمرؓ کے موضوع سے تعلق رکھتی نظر آتی ہے مگر حدیث کا ظاہری مفہوم اور اس کا سیاق و سباق چونکہ حضرت عثمانؓ کی تعظیم و توقیر پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس حدیث کو حضرت عثمانؓ کے مناقب کے باب میں ذکر کرنا ہی زیادہ موزوں ہے، یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کے رفقاء و صحابہ میں سے جو شخص جس صفت کا زیادہ حامل ہوتا تھا اور جس کی طبیعت و مزاج پر جس خصلت و خوبی کا غلبہ ہوتا تھا آپ اسی صفت و خصلت کی رعایت سے اس کے ساتھ سلوک فرماتے تھے، چنانچہ حضرت عثمانؓ پر چونکہ صفت حیا کا غلبہ تھا اس لئے آپ ہمیشہ ان کا حجاب و لحاظ کرتے تھے جب کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ چونکہ آپ سے بہت بے تکلف تھے اس لئے ان کے ساتھ بے تکلفی کا معاملہ رکھتے تھے۔

فرشتوں نے حضرت عثمانؓ سے جن مواقع پر حیا کی ہے ان میں ایک یہ نقل کیا گیا ہے کہ مدینہ میں ایک قضیہ کے دوران حضرت عثمانؓ جو آگے بڑھے تو ان کا سینہ کھل گیا اور فرشتے فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ اسی وقت آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمان کو متوجہ کیا کہ اپنا سینہ ڈھک لیں۔ اس کے بعد فرشتے اپنی جگہ واپس آ گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان فرشتوں سے ان کے پیچھے ہٹنے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ عثمانؓ کی حیا سے ہم پیچھے ہٹ گئے تھے اور جب انہوں نے آپ ﷺ کے توجہ دلانے پر اپنا سینہ ڈھک لیا تو ہم اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِي

حضرت عثمان آنحضرت ﷺ کے رفیق جنت ہیں

② عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِكُلِّ نَبِيٍّ رَفِيْقٌ وَرَفِيْقِي يَعْنِي فِي الْجَنَّةِ عُثْمَانُ

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ اِسْنَادُهُ بِالْقَوِيِّ وَهُوَ مُنْقَطِعٌ۔

"حضرت طلحہ ابن عبید اللہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کا ایک رفیق (یعنی ہمراہی اور مہربان ساتھی و دوست) ہوتا اور میرے رفیق، یعنی جنت میں عثمانؓ ہیں، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، اور ابن ماجہؒ نے بھی یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے، نیز ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اور اس کی اسناد قوی نہیں ہے اور یہ منقطع ہے۔"

تشریح: "یعنی جنت میں" یعنی فِي الجنة یہ جملہ معترضہ ہے جو مبتدا اور خبر کے درمیان واقع ہوا ہے اور یہ آنحضرت ﷺ کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ یا تو خود حضرت طلحہؓ نے یا کسی اور راوی نے کسی قرینہ کی بنیاد پر ان الفاظ کے ذریعہ یہاں پر وضاحت کی کہ "میرے رفیق عثمانؓ ہیں" سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جنت میں میرے رفیق عثمانؓ ہیں، بہرحال الفاظ حدیث سے یہ بات ہرگز مفہوم نہیں ہوتی کہ حضرت عثمانؓ کے علاوہ اور کسی کو آنحضرت ﷺ نے اپنا "رفیق" قرار نہیں دیا تھا اور اسی لئے اس حدیث کو اس روایت کے منافی نہیں کہا جاسکتا ہے جو طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کی ہے اور جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ہر نبی اپنے اصحاب میں سے کسی کو اپنا مقرب اور مخصوص دوست بنالیتا ہے، میرے اصحاب میں سے میرے مقرب اور مخصوص دوست ابوبکرؓ اور عمرؓ ہیں" ہاں یہ بات ضرور معلوم ہوئی کہ ہر نبی ایک ہی "رفیق" رکھتا تھا جب کہ آنحضرت ﷺ کے متعدد رفیق تھے۔

"یہ حدیث غریب ہے" لیکن یہ غرابت مضمون حدیث کے صحیح ہونے کے منافی نہیں ہے، اسی لئے ترمذیؒ نے وضاحت کی کہ اس کی اسناد میں ضعف ہے اور باعتبار اسناد کے اس کو "منقطع" کہا گیا ہے، بہرحال ترمذیؒ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روایت ضعیف ہے لیکن فضائل کے باب میں ضعیف روایت کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس حدیث کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو ابن عساکرؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

لکل نبی خلیل فِيْ امته وان خلیلی عثمان ابن عفان۔

"ہر نبی اپنی اُمت میں سے کسی کو اپنا مخصوص دوست بنالیتا ہے اور میرے مخصوص دوست عثمان ابن عفان ہیں۔"

راہِ خدا میں مالی ایثار

(۴) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ خَبَّابٍؓ قَالَ شَهِدْتُّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَحُثُّ عَلٰى جَيْشِ الْعُسْرَةِ فَقَامَ عُثْمَانُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَيَّ مِائَةُ بَعِيْرٍ بِاَحْلَاسِهَا وَاَقْتَابِهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ حَضَّ عَلَى الْجَيْشِ فَقَامَ عُثْمَانُ فَقَالَ عَلَيَّ مِائَتَا بَعِيْرٍ بِاَحْلَاسِهَا وَاَقْتَابِهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ حَضَّ عَلَى الْجَيْشِ فَقَامَ عُثْمَانُ فَقَالَ عَلَيَّ ثَلٰثُمِائَةِ بَعِيْرٍ بِاَحْلَاسِهَا وَاَقْتَابِهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاَنَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْزِلُ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَقُوْلُ مَا عَلٰى عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ مَا عَلٰى عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت عبدالرحمن ابن خبابؓ بیان کرتے ہیں: اس وقت میں بھی نبی کریم ﷺ کی مجلس مبارک میں حاضر تھا جب آپ جیش عسرۃ (جنگ عسرۃ) کی مالی امداد کے لئے لوگوں کو جوش دلا رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ (آپ ﷺ کی پرجوش تلقین سن کر) کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ کی راہ میں کام آنے کے لئے سو اونٹ مع ان کی جھولوں اور پالانوں کے میں اپنے ذمہ لیتا ہوں (یعنی اس جنگ کے لئے میں اللہ کی راہ میں سو اونٹ مع ان کے ساز و سامان کے پیش کرتا ہوں) اس کے بعد (اسی مجلس میں یا کسی اور موقع پر) آنحضرت ﷺ نے پھر لوگوں کو اس جنگ کے لئے امداد و معاونت کی طرف متوجہ اور راغب کیا تو حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ (پہلے سو اونٹوں کے علاوہ مزید) دو سو اونٹ مع ان کی جھولوں اور پالانوں کے اللہ کی راہ میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ پس (حضرت

عبدالرحمٰن ابن خباب کہتے ہیں کہ) میں نے دیکھا رسول کریم ﷺ منبر سے اترتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اس عمل کے بعد اب عثمان جو بھی کریں ان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، اس عمل کے بعد اب عثمانؓ جو بھی کریں اس سے ان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: جَیشُ عُسرَۃ اس اسلامی لشکر کو کہتے ہیں جو غزوۂ تبوک یا جنگ تبوک کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ دراصل "عسرۃ" تنگی اور مالی اور بدحالی کو کہتے ہیں اور وہ زمانہ، کہ جب جنگ تبوک کا مرحلہ درپیش تھا مسلمانوں کے لئے سخت عسرت و تنگی کا تھا، ایک طرف تو خشک سالی اور قحط نے نہ صرف یہ کہ غذا اور پانی کی کمیابی کے سبب انسانوں کو درخت کے پتے کھانے اور منہ کی خشکی دور کرنے کے لئے اونٹوں کی اوجھ نچوڑنے پر مجبور کر رکھا تھا، دوسری طرف مسلمانوں کی کمی اور ان کے مقابلہ پر دشمنوں کی کثرت، محاذ جنگ کی نہایت دوری سامان جنگ اور زاد راہ کی کمی، شدید گرمی اور دھوپ اور بے سرو سامانی کی پریشانی نے نہایت سخت صورت حال پیدا کر رکھی تھی۔ اس لئے جنگ تبوک کے لشکر کا نام جیش عسرۃ (پریشان حال لشکر) ہوگیا۔

اس روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے چھ سو اونٹ اس لشکر کے لئے اللہ کی راہ میں پیش کئے، پہلی مرتبہ سو اونٹ پیش کئے، پھر دو سو اونٹ اور پھر تین سو اونٹ، اس طرح کل ملا کر چھ سو اونٹ کی پیش کش ان کی طرف سے ہوئی۔ اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر ساڑھے نو سو اونٹ اپنی طرف سے پیش کئے تھے۔ اور ہزار کا عدد پورا کرنے کے لئے پچاس گھوڑے بھی دیئے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے اس زبردست مالی ایثار اور ان کے حوصلہ پر آنحضرت ﷺ نے جو الفاظ ارشاد فرمائے اور اہمیت ظاہر کرنے کے لئے بار بار ارشاد فرمائے ان کا حاصل یہ تھا کہ عثمانؓ کا یہ عمل نہ صرف یہ کہ ان کے گزشتہ گناہوں اور لغزشوں کا کفارہ بن گیا ہے بلکہ آئندہ بھی اگر بالفرض ان سے کوئی خطا صادر ہو تو وہ اس عمل کے سبب معاف ہو جائے گی پس ان الفاظ میں گویا اس بشارت کی طرف اشارہ تھا کہ عثمانؓ کو خاتمہ بخیر کی سعادت حاصل ہوگی۔ اور ایک شارح نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ اس عمل کے بعد عثمانؓ اب اگر از قسم نفل (نہ کہ از قسم فرض) کوئی عبادت اور کوئی نیک کام نہ بھی کریں تو ان کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ ان کا یہ عظیم عمل تمام نفل عبادتوں اور نیکیوں کے واسطے کافی ہوگیا ہے۔

ایثار عثمانؓ

④ وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ جَاءَ عُثْمَانُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَلْفِ دِيْنَارٍ فِيْ كُمِّهٖ حِيْنَ جَهَّزَ جَيْشَ الْعُسْرَةِ فَنَثَرَهَا فِيْ حَجْرِهٖ فَرَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَلِّبُهَا فِيْ حَجْرِهٖ وَيَقُوْلُ مَاضَرَّ عُثْمَانَ مَاعَمِلَ بَعْدَ الْيَوْمِ مَرَّتَيْنِ۔ (رواه احمد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ اس وقت جب کہ جیش عسرۃ یعنی لشکر تبوک کا سامان جہاد تیار اور فراہم کیا جا رہا تھا، حضرت عثمانؓ ایک ہزار دینار اپنے کرتہ کی آستین میں بھر کر نبی کریم ﷺ کے پاس لائے اور ان کو آپ ﷺ کی گود میں بکھیر دیا، میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ ان دیناروں کو اپنی گود میں الٹ پلٹ کر دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ آج کے اس مالی ایثار کے بعد عثمانؓ سے اگر کوئی گناہ بھی سرزد ہو جائے تو ان کا کچھ نہیں بگڑے گا، یہ الفاظ آپ ﷺ نے دو مرتبہ ارشاد فرمائے۔" (احمدؒ)

تشریح: ایک روایت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: "میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر تھا جب حضرت عثمانؓ جَیشِ عُسرَۃ کے لئے سونے کے نو سو اوقیہ لے کر آئے" اس طرح جیش عسرۃ کے لئے حضرت عثمانؓ کی مالی امداد و معاونت کے سلسلہ میں متعدد روایتیں ہو جاتی ہیں جو باہم مختلف ہیں۔ اور جن سے تناقض کا گمان ہو سکتا ہے اس لئے ان

روایتوں میں تطبیق کی خاطر یہ وضاحت ضروری ہے کہ دراصل حضرت عثمانؓ نے پہلے تو چھ سو اونٹ مع ان کے سازو سامان کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کئے۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں گزرا، پھر اہل لشکر کی دوسری ضروریات کی فراہمی کے لئے انہوں نے کچھ نقد امداد دینا بھی ضروری سمجھا اور ایک ہزار دینار لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے محسوس کیا ہوگا۔ کہ اہل لشکر کے لئے سواری کے مزید انتظام کی ضرورت ہے۔ اور دوسری ضروریات کی فراہمی کے لئے مزید نقدی بھی درکار ہوگی تو انہوں نے ایک طرف تو مزید اونٹ اور پچاس گھوڑے پیش کر کے ہزار کا عدد پورا کردیا، اور دوسری طرف مزید نو سو اوقیہ سونا دے کر ایک ہزار دینار میں بھی اضافہ کردیا۔

حضرت عثمان کی ایک فضیلت

⑤ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ لَمَّا اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَيْعَةِ الرِّضْوَانِ كَانَ عُثْمَانُ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى مَكَّةَ فَبَايَعَ النَّاسَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عُثْمَانَ فِيْ حَاجَةِ اللّٰهِ وَحَاجَةِ رَسُوْلِهٖ فَضَرَبَ بِاِحْدٰى يَدَيْهِ عَلَى الْاُخْرٰى فَكَانَتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعُثْمَانَ خَيْرًا مِنْ اَيْدِيْهِمْ لِاَنْفُسِهِمْ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ کو بیعت رضوان کا حکم دیا تو اس وقت حضرت عثمانؓ رسول کریم ﷺ کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے مکہ گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں سے (جاں نثاری کی) بیعت لی اور (جب تمام مسلمان بیعت کر چکے اور حضرت عثمانؓ وہاں موجود نہیں تھے تو) رسول کریم ﷺ نے فرمایا: عثمانؓ! اللہ (کے دین) اور اللہ کے رسول کے کام پر گئے ہوئے ہیں اور (یہ کہہ کر) آپ ﷺ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا پس رسول کریم ﷺ کا وہ ہاتھ جو حضرت عثمانؓ کی طرف سے تھا باقی تمام صحابہؓ کے ان ہاتھوں سے کہیں افضل و بہتر تھا جو ان کے اپنی طرف سے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "بیعت رضوان" اس بیعت کو کہتے ہیں جو مکہ سے تقریباً پندرہ سولہ میل کے فاصلہ پر مقام حدیبیہ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آنحضرت ﷺ نے تمام مسلمانوں سے لی تھی۔ یہ نام قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے جو اسی واقعہ سے متعلق نازل ہوئی تھی۔

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ۔

"بالتحقیق اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوش ہوا جب کہ یہ لوگ آپ ﷺ سے درخت (سمر) کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔"

اس واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ذی قعدہ ۶ھ میں آنحضرت ﷺ اہل اسلام کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ عمرہ کے لئے مکہ روانہ ہوئے جب حدیبیہ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش مکہ نے مسلمانوں کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل ہونے کی اجازت سے انکار کردیا ہے، آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو اپنا نمائندہ خصوصی بنا کر قریش مکہ کے پاس روانہ کیا تاکہ وہ ان کو سمجھائیں۔ کہ مسلمانوں کی آمد کا مقصد جنگ وجدال نہیں ہے۔ بلکہ صرف عمرہ کرنا ہے، لہٰذا اہل مکہ کو چاہئے کہ مسلمانوں کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل ہونے دیں، حضرت عثمانؓ اپنے مشن پر مکہ میں تھے کہ یہاں حدیبیہ میں مشہور ہوگیا کہ حضرت عثمانؓ کو اہل مکہ نے قتل کردیا ہے۔ یہ شہرت سن کر مسلمانوں میں سخت اضطراب و ہیجان پیدا ہوگیا، اور طے ہوا کہ خون عثمانؓ کا بدلہ لیا جائے گا، چنانچہ اسی موقع پر آنحضرت ﷺ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر تمام مسلمانوں سے اس بات کا عہد و اقرار لیا کہ اپنی جانوں کی بازی لگا کر خون عثمان کا بدلہ اہل مکہ سے لیں گے، صحابہ میں ایک ایک آدمی آتا تھا اور آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر بیعت کرتا تھا، جب سب لوگ بیعت کر چکے تو آنحضرت ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کو حضرت عثمان کے ہاتھ کے قائم مقام کیا اور اس ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ پر مار کر گویا حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت کی۔ اس طرح حضرت عثمان کو خصوصی فضیلت حاصل ہوئی، کہ اگر وہ خود اس موقعہ

پر موجود ہوتے، اور اپنا ہاتھ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر مار کر بیعت کرتے جیسا کہ اور لوگوں نے کیا تو ان کو یہ شرف نصیب نہ ہوتا کہ آنحضرت ﷺ کا دست مبارک ان کے ہاتھ کے قائم مقام ہوا اور اس بناء پر ان کی طبیعت گویا سب لوگوں کی طبیعت سے افضل و اشرف رہی۔ پس اس موقع پر ان کا غیر موجود ہونا ان کے مرتبہ میں نقصان کا باعث نہ ہوا بلکہ ان کی فضیلت اور منقبت کا سبب بن گیا۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے جس ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کے ہاتھ قائم مقام کیا تھا وہ بایاں ہاتھ تھا لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ دایاں ہاتھ تھا۔

باغیوں سے جرا تمندانہ خطاب

(۶) وَعَنْ ثُمَامَةَ بْنِ حَزْنِ الْقُشَيْرِيِّؓ قَالَ شَهِدْتُّ الدَّارَ حِيْنَ اَشْرَفَ عَلَيْهِمْ عُثْمَانُ فَقَالَ اَنْشُدُكُمُ اللّٰهَ وَالْاِسْلَامَ هَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ وَلَيْسَ بِهَا مَاءٌ يُسْتَعْذَبُ غَيْرَ بِئْرِ رُوْمَةَ فَقَالَ مَنْ يَّشْتَرِيْ بِئْرَرُوْمَةَ يَجْعَلُ دَلْوَهٗ مَعَ دِلَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ بِخَيْرٍ لَّهٗ مِنْهَا فِي الْجَنَّةِ فَاشْتَرَيْتُهَا مِنْ صُلْبِ مَالِيْ وَاَنْتُمُ الْيَوْمَ تَمْنَعُوْنَنِيْ اَنْ اَشْرَبَ مِنْهَا حَتّٰى اَشْرَبَ مِنْ مَّاءِ الْبَحْرِ فَقَالُوْا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ اَنْشُدُكُمُ اللّٰهَ وَالْاِسْلَامَ هَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ الْمَسْجِدَ ضَاقَ بِاَهْلِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّشْتَرِيْ بُقْعَةَ اٰلِ فُلَانٍ فَيَزِيْدُهَا فِي الْمَسْجِدِ بِخَيْرٍ لَّهٗ مِنْهَا فِي الْجَنَّةِ فَاشْتَرَيْتُهَا مِنْ صُلْبِ مَالِيْ فَاَنْتُمُ الْيَوْمَ تَمْنَعُوْنَنِيْ اَنْ اُصَلِّيَ فِيْهَا رَكْعَتَيْنِ فَقَالُوْا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ اَنْشُدُكُمُ اللّٰهَ وَالْاِسْلَامَ هَلْ تَعْلَمُوْنَ اِنِّيْ جَهَّزْتُ جَيْشَ الْعُسْرَةِ مِنْ مَّالِيْ قَالُوْا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ اَنْشُدُكُمُ اللّٰهَ وَالْاِسْلَامَ هَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عَلٰى ثَبِيْرِ مَكَّةَ وَمَعَهٗ اَبُوْبَكْرٍ وَّ عُمَرُ وَاَنَا فَتَحَرَّكَ الْجَبَلُ حَتّٰى تَسَاقَطَتْ حِجَارَةٌ بِالْحَضِيْضِ فَرَكَضَهٗ بِرِجْلِهٖ قَالَ اسْكُنْ ثَبِيْرُ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ نَبِيٌّ وَّصِدِّيْقٌ وَّشَهِيْدَانِ قَالُوْا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ اللّٰهُ اَكْبَرُ شَهِدُوْا وَرَبِّ الْكَعْبَةِ اِنِّيْ شَهِيْدٌ ثَلَاثًا۔ (رواہ الترمذی والنسائی والدار قطنی)

"اور حضرت ثمامہ ابن حزن قشیری بیان کرتے ہیں کہ میں اس وقت حضرت عثمانؓ کے مکان پر موجود تھا (جب اس کو مفسدوں اور باغیوں کی ایک بڑی جماعت نے محاصرہ میں لے رکھا تھا اور اندر گھس کر حضرت عثمانؓ کو قتل کر دینا چاہتے تھے) حضرت عثمانؓ نے اوپر سے جھانک کر ان باغیوں کو مخاطب کیا اور فرمایا: میں اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر تم لوگوں سے پوچھتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب رسول کریم ﷺ (مکہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ میں تشریف لائے تھے تو اس وقت مدینہ میں رومہ کے کنویں کے علاوہ میٹھے پانی کا کنواں نہ تھا، پھر آنحضرت ﷺ نے جب فرمایا تھا کہ کون شخص ہے جو رومہ کے کنویں کو خریدے اور اپنے ڈول کو مسلمانوں کا ڈول بنا دے اس نیکی اور بہتر اجر کے بدلہ میں جو اس (کنویں کو خرید کر وقف کرنے والے) کو اس کنویں کے سبب جنت میں ملے گا۔ تو میں ہی تھا جس نے (آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر) اپنے اصل اور خالص مال سے اس کنویں کو خریدا اور آج مجھ کو اس کنویں کا پانی پینے سے روک رہے ہو یہاں تک کہ میں سمندر کا (یعنی سمندر جیسا کھاری) (پانی پینے پر مجبور ہو رہا ہوں، لوگوں نے (یہ سن کر) کہا: ہاں اے اللہ! ہمیں اس کا علم ہے (کہ عثمانؓ ہی نے اس کنویں کو خرید کر وقف کیا تھا) پھر حضرت عثمانؓ نے فرمایا: میں اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر تم سے پوچھتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب مسجد نبوی نمازیوں کی زیادتی کے سبب تنگ پڑنے لگی تھی تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا: کون شخص ہے جو فلاں شخص کی اولاد کی زمین خریدے اور اس کے ذریعہ مسجد کی توسیع کر دے، اس نیکی اور بہتر اجر کے بدلہ میں جو اس (زمین کو خرید کر مسجد کی توسیع کے لئے وقف کرنے والے) کو اس زمین کے سبب جنت میں ملے گا، پس یہ میں تھا جس نے اس زمین کو اپنے اصل اور خالص مال سے خریدا، اور آج تم مجھ کو اسی زمین پر (چہ جائیکہ اصل مسجد میں) دو رکعت نماز پڑھنے سے روکتے ہو، لوگوں نے (یہ سن کر) کہا: ہاں، اے اللہ! ہمیں اس کا علم ہے پھر حضرت عثمان نے فرمایا: میں اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر تم سے پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ میں ہی

تھا جس نے جیش عسرۃ (یعنی غزوۂ تبوک میں جانے والے لشکر) کی تیاری اپنے مال سے کرائی تھی (اور میری اس مالی خدمت پر آنحضرت ﷺ نے میرے حق میں جو قیع الفاظ ارشاد فرمائے تھے وہ میرے حسن حال اور حسن مال پر دلالت کرتے ہیں) لوگوں نے (یہ سن کر کہا: ہاں، اے اللہ! ہمیں معلوم ہے، پھر حضرت عثمان نے فرمایا: میں اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر تم سے پوچھتا ہوں، کیا تمہیں یہ معلوم ہے، کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ مکہ کی پہاڑی پر ثبیر پر کھڑے تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور میں بھی تھا اور جب وہ پہاڑی (اپنے اوپر آنحضرت ﷺ کے باوجود کو دیکھ کر جوش مسرت سے) ہلنے لگی اور اس کے ہلنے سے پہاڑی پر پتھر نیچے کی سمت اور دامن کوہ میں گرنے لگے تو آنحضرت ﷺ نے پہاڑی پر ٹھوکر ماری اور فرمایا: (اے ثبیر! ٹھہر جا حرکت نہ کر، اس وقت تیرے اوپر ایک نبی ہے، ایک صدیق ہے اور دو (حقیقی) شہید ہیں، لوگوں نے (یہ سن کر) کہا: ہاں، اے اللہ! ہمیں اس کا علم ہے، اور پھر حضرت عثمانؓ نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور کہا: ان لوگوں نے میری باتوں کی تصدیق کی ہے۔ رب کعبہ کی قسم، میں یقیناً شہید ہوں، یہ الفاظ انہوں نے تین بار فرمائے۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ، دار قطنیؒ)

تشریح: "بئر رومہ یعنی رومہ کا کنواں" یہ مدینہ کے اس بڑے کنویں کا نام ہے جو وادی عقیق میں مسجد قبلتین کے شمالی جانب واقع ہے۔ اس کنویں کا پانی نہایت شیریں، لطیف اور پاکیزہ ہے۔ اس مناسبت سے کہ آنحضرت ﷺ کی بشارت کے مطابق اس کنویں کو خریدنے اور وقف کرنے کے سبب حضرت عثمانؓ کا جنتی ہونا ثابت ہوا، اس کنویں کا ایک نام "بئر جنت یعنی جنتی کنواں" بھی مشہور ہے، اس زمانہ میں حضرت عثمانؓ نے اس کنویں کو ایک لاکھ درہم کے عوض خریدا تھا۔

"اور اپنے ڈول کو مسلمانوں کا ڈول بنادے" یہ "وقف کرنے" سے کنایہ ہے، یعنی جو شخص اس کنویں کو خریدے اور اس کو اپنی ذاتی ملک قرار نہ دے بلکہ رفاہ عام کے لئے وقف کر دے تاکہ جس طرح خود وہ شخص اس کنویں سے فائدہ اٹھائے۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھاسکیں اس سے ______ معلوم ہوا کہ سقایات (یعنی کنواں، تالاب، اور حوض وغیرہ) وقف کرنا جائز ہے اور یہ کہ وقف کی ہوئی چیز وقف کرنے والے کی ملکیت سے نکل جاتی ہے۔

"ہاں، اے اللہ" ان الفاظ کے ذریعہ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی تصدیق کی کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کی صداقت میں ہمیں ذرہ برابر شبہ نہیں ہے۔ پہلے اَللّٰھُمَّ (اے اللہ) کا لفظ لانا اسم الٰہی کے ساتھ حصول برکت کے لئے بھی تھا اور اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے بھی۔

"فلاں شخص کی اولاد" سے مراد انصار سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان کے وہ افراد تھے جو مسجد نبوی کے قریب آباد تھے اور ان کی ملکیت میں ایک ایسی زمین تھی جس کو مسجد نبوی میں شامل کر دینے سے مسجد شریف وسیع اور کشادہ ہو جاتی، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو متوجہ کیا کہ جو شخص ہمت و استطاعت رکھتا ہو وہ اس زمین کو خرید کر مسجد میں شامل کرنے کے لئے وقف کر دے، اور حضرت عثمان غنیؓ نے آنحضرت ﷺ کی خواہش کے مطابق اس زمین کو بیس ہزار یا پچیس ہزار درہم کے عوض خرید کر مسجد نبوی میں شامل کرنے کے لئے وقف کر دیا، مسجد نبوی کی اصل تعمیر آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہوئی تھی جب آپ ﷺ نے ہجرت کے پہلے ہی سال صحابہ کرام کے ساتھ مل کر اپنے دست مبارک سے اس مسجد کی تعمیر کی اور پھر ہجرت کے ساتویں سال آپ ﷺ نے اس مسجد میں اضافہ فرما کر مربع شکل میں کر دیا۔ اس وقت اس کی دیواریں اینٹ کی تھیں اور چھت کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں سے بنائی گئی تھی۔ اور اس کے ستون کھجور کے تنوں پر مشتمل تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں اس مسجد میں کوئی ترمیم و توسیع نہ ہوئی، پھر ۱۷ھ میں حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی مرمت کرائی اور اضافہ بھی فرمایا۔ اس کے بعد ۲۹ھ میں حضرت عثمانؓ نے اس کی از سر نو تعمیر کروائی اور اس کی وسعت و کشادگی کو بھی بڑھایا۔ انہوں نے اس کی دیواریں اور ستون منقش پتھروں اور چونے سے بنوائے اور چھت ساکھو کی لکڑی کی کروائی۔ حضرت عثمانؓ کے بعد خلفاء اور بادشاہ اپنے اپنے دور میں اضافے اور مرمت کراتے رہے، یہاں تک کہ ۱۲۶۵ھ میں سلطان عبدالمجید عثمانی نے نئے انداز پر اس مسجد کی پر شکوہ تعمیر کرائی۔ اور پھر اس تعمیر کی دوبارہ تجدید اور توسیع ۱۳۷۲ھ میں شاہ ابن سعود

مرحوم کے حکم سے کی گئی۔

"اور دو (حقیقی) شہید ہیں" یعنی آپ ﷺ نے گویا پیشین گوئی فرمائی کہ اس وقت یہاں پہاڑی پر جو چار آدمی موجود ہیں ان میں میرے اور ابوبکر صدیقؓ کے علاوہ باقی دو آدمیوں یعنی عمرؓ اور عثمانؓ کو شہادت حقیقی حاصل ہوگی۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات حقیقی معنی میں شہید ہوئے کہ ایک (حضرت عمرؓ) نے تو قاتلانہ حملہ کے نتیجہ میں خنجر کے زخم سے شہادت پائی اور دوسرے (حضرت عثمانؓ) کو باغیوں نے گھر میں گھس کر نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کر کے جام شہادت پلایا۔ پس حدیث کے یہ الفاظ اس بات کے منافی نہیں ہیں، کہ شہادت حکمی آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کو بھی حاصل ہوئی کیونکہ آنحضرت ﷺ کی موت اس زہر کے اثر عود کرنے سے ہوئی تھی، جو آپ ﷺ کو کافی عرصہ پہلے غزوۂ خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت نے بکری کے گوشت میں ملا کر دیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ کی موت اس سانپ کے زہر کے اثرات عود کرنے سے ہوئی تھی جس نے ان کو سفر ہجرت کے دوران غار ثور میں ڈس لیا تھا۔

"اللہ اکبر کا نعرہ لگایا" یعنی حضرت عثمانؓ نے اس موقع پر پہلے "اللہ اکبر" کہا اور پھر بعد میں مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے، اور یہ "اللہ اکبر" کہنا اپنے باغیوں اور دشمنوں پر زیادہ سے زیادہ حجت قائم کرنے کی نیت سے بھی تھا اور اس امر پر اظہار تعجب کے لئے بھی کہ یہ لوگ ایک طرف تو میری باتوں کی تصدیق کر رہے ہیں اور خود اپنی زبان سے ان حقائق کو تسلیم کر رہے ہیں جن سے میری منقبت ظاہر ہوتی ہے اور دوسری طرف اپنی مفسدانہ اور باغیانہ کاروائیوں میں بدستور لگے ہوئے ہیں اور فتنہ و فساد پھیلانے اور مجھے ہلاک کر دینے کے اپنے عزائم سے باز آنے پر تیار نہیں ہیں۔

راست روی کی پیشین گوئی

(۷) وَعَنْ مُرَّةَ بْنِ كَعْبٍ قَالَ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذَكَرَ الْفِتَنَ فَقَرَّبَهَا فَمَرَّ رَجُلٌ مُقَنَّعٌ فِيْ ثَوْبٍ فَقَالَ هٰذَا يَوْمَئِذٍ عَلَى الْهُدٰى فَقُمْتُ اِلَيْهِ فَاِذَا هُوَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ قَالَ فَاَقْبَلْتُ عَلَيْهِ بِوَجْهِهٖ فَقُلْتُ هٰذَا قَالَ نَعَمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت مرہ ابن کعبؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کے وہ ارشادات (اپنے کانوں سے) سنے جن میں آپ ﷺ نے (زمانۂ نبوت کے بعد) وقوع پذیر ہونے والے پر فتن حادثات کا (بطور پیشین گوئی) ذکر فرمایا تھا، آپ ﷺ نے ان فتنوں کا تعلق بالکل قریبی زمانہ سے قائم کیا (یعنی یہ بھی فرمایا کہ یہ فتنے مستقبل قریب ہی میں وقوع پزیر ہونے والے ہیں نیز عین اس وقت کہ آپ کے ان ارشادات کا سلسلہ جاری تھا) ایک شخص کپڑا اوڑھے ہوئے سامنے سے گزرا تو آنحضرت ﷺ نے (اس کی طرف اشارہ کر کے) فرمایا: "یہ شخص ان (پر فتن و پر آشوب) ایام میں راہ راست پر ہوگا" حضرت مرہؓ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کے یہ الفاظ **سن کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس شخص کی طرف بڑھا کہ دیکھوں** ______ یہ کون شخص ہے) تو دیکھا کہ وہ حضرت عثمان ابن عفانؓ ہیں، حضرت مرہ کا بیان ہے کہ: پھر میں نے حضرت عثمانؓ کا چہرہ گھما کر آنحضرت ﷺ کو دکھلایا اور پوچھا کہ کیا یہی صاحب ہیں (جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ان پر فتن ایام میں یہ شخص راہ راست پر ہوگا؟ (آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ہاں" اس روایت کو ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

خلافت کی پیشین گوئی اور منصب خلافت سے دستبردار ہونے کی ہدایت

(۸) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا عُثْمَانُ اِنَّهٗ لَعَلَّ اللّٰهُ يُقَمِّصُكَ قَمِيْصًا فَاِنْ اَرَادُوْكَ عَلٰى خَلْعِهٖ فَلَا تَخْلَعْهُ لَهُمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ فِي الْحَدِيْثِ قِصَّةٌ طَوِيْلَةٌ۔

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایکدن) رسول کریم ﷺ نے (حضرت عثمانؓ سے) فرمایا کہ اے عثمان! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ شائد تمہیں ایک کرتہ (یعنی خلعت خلافت) پہنا دے۔ پس اگر لوگ تمہارے اس کرتہ کو اتروانا چاہیں اور تمہیں اس پر

مجبور کریں تو ان کی وجہ سے اس کرتہ کو (ہرگز) نہ اتارنا، اس روایت کو ترمذیؒ اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے اس حدیث کے ضمن میں ایک طویل (دردناک) داستان ہے۔"

تشریح: "اگر لوگ" اس ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ اگر کچھ لوگ تمہاری خلافت وحکومت کے تئیں باغیانہ اور معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے تم سے مطالبہ کریں کہ منصب خلافت چھوڑ دو تو ان لوگوں کے کہنے میں ہرگز نہ آنا اور محض ان کے مفسدانہ مطالبہ پر خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ سے نہ جانے دینا کیونکہ وہ لوگ باطل پر ہوں گے، اور تم حق و راستی پر ہو گے، ان کا مقصد تمہاری خلافت کا خاتمہ کر کے ملت اسلامیہ میں افتراق و انتشار پھیلانا ہوگا، جب کہ تمہاری خلافت حق و صداقت کی سربلندی اور ملت کی شیرازہ بندی کی علامت ہوگی، پس یہی وہ حدیث تھی جس نے حضرت عثمانؓ کو خلافت کے باغیوں اور مفسدوں کے آگے گھٹنے ٹیکنے سے باز رکھا۔ انہوں نے ان ظالموں کے محاصرہ میں جام شہادت نوش کرنے کو ترجیح دی مگر آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی تعمیل میں ہزار اصرار اور ہزار مطالبوں کے باوجود منصب خلافت سے دستبرداری اختیار نہیں کی۔

"ایک طویل داستان ہے" ان الفاظ کے ذریعہ ترمذیؒ نے ان پر فتن حادثات وواقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری زمانے میں پیش آئے تھے اور جن سے اسلام کی شوکت اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی کو بڑا نقصان پہنچا، مصر میں حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ گورنر (عبداللہ ابن ابی سرح) کے خلاف مصریوں کا شکایت لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس آنا، مصریوں کی شکایت اور اجلہ صحابہؓ کے مشورہ پر حضرت عثمانؓ کا عبداللہ ابن سرح کو معزول کر دینا اور محمد ابن ابی بکرؓ کو نیا گورنر مقرر کر کے مصر روانہ کرنا، مروان کی سازش اور جعلسازی کے نتیجہ میں محمد ابن ابی بکرؓ کا مصر نہ پہنچنا اور اثناء راہ سے واپس آجانا، اس کے نتیجہ میں مصریوں اور ان کے ہمنواؤں کا مشتعل ہو کر حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کرنا اور پھر ان کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کا مظلومانہ طور پر شہید ہو جانا، وہ المناک اور لرزہ خیز واقعات ہیں جن پر وہ "دردناک طویل داستان" مشتمل ہے۔ اور جو دراصل اسلام اور ملت اسلامیہ کی تاریخ میں فتنہ وفساد کی ابتداء مانے جاتے ہیں ان کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مظلومانہ شہادت کی پیشین گوئی

(۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِتْنَةً فَقَالَ يُقْتَلُ هٰذَا فِيْهَا مَظْلُوْمًا لِعُثْمَانِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادًا۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (مستقبل قریب میں وقوع پذیر ہونے والے) پر فتن حادثات کا ذکر کیا اور حضرت عثمانؓ کے حق میں فرمایا کہ "یہ شخص ان حادثات میں مظلومانہ طور پر مارا جائے گا" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث اسناد کے اعتبار سے حسن غریب ہے۔"

ارشاد نبوی کی تعمیل میں صبر و تحمل کا دامن پکڑے رہے

(۱۰) وَعَنْ اَبِيْ سَهْلَةَ قَالَ قَالَ لِيْ عُثْمَانُ يَوْمَ الدَّارِ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ عَهِدَ اِلَيَّ عَهْدًا وَاَنَا صَابِرٌ عَلَيْهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور (حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلام) حضرت ابو سہلہ بیان کرتے ہیں کہ دار کے دن حضرت عثمانؓ نے مجھ سے فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو وصیت کی تھی (کہ مفسدین و مخالفین کے مطالبہ پر منصب خلافت سے دستبردار نہ ہونا، یا یہ کہ قوم کی جفا کاریوں سے مشتعل ہو کر ان کے خلاف تلوار نہ اٹھانا بلکہ صبر وتحمل کا دامن پکڑے رہنا) پس میں اسی وصیت کے مطابق صبر وتحمل اختیار کئے

ہوئے ہوں، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: "دار کے دن" سے مراد وہ پر آشوب دن ہے جس دن حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت کا المناک سانحہ پیش آیا تھا۔ اس دن کو "یوم الدار" یعنی دار (گھر) کا دن اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ مفسدوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا سخت محاصرہ کئے رکھا اور اسی محاصرہ کے دوران گھر کے اندر گھس کر ان کو شہید کیا۔

"صبر و تحمل اختیار کئے ہوئے ہوں" یہ الفاظ اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اگر آنحضرت ﷺ کی وصیت نہ ہوتی، اور حضرت عثمانؓ چاہتے تو طاقت کے ذریعہ ان مفسدوں کی سرکوبی کر سکتے تھے چنانچہ بعض صحابہؓ نے ان کو مشورہ بھی دیا تھا کہ آپ خلیفہ وقت ہیں، مسلمانوں کی بڑی طاقت آپ کے پشت پر ہے گھر سے باہر نکلئے اور ان مفسدوں کے خلاف تلوار اٹھائیے، یہ لوگ آپ کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی نہیں پائیں گے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور صبر و تحمل کا دامن پکڑے رہے یہاں تک کہ ان مفسدوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

مخالفین عثمانؓ کو ابن عمرؓ کا مسکت جواب

(۱۱) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ مَوْهَبٍ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ مِصْرَ يُرِيْدُ حَجَّ الْبَيْتِ فَرَاٰى قَوْمًا جُلُوْسًا فَقَالَ مَنْ هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ قَالُوْا هٰؤُلَآءِ قُرَيْشٌ قَالَ فَمَنِ الشَّيْخُ فِيْهِمْ قَالُوْا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ قَالَ يَابْنَ عُمَرَ اِنِّيْ سَائِلُكَ عَنْ شَيْءٍ فَحَدِّثْنِيْ هَلْ تَعْلَمُ اَنَّ عُثْمَانَ فَرَّ يَوْمَ اُحُدٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ تَعْلَمُ اَنَّهٗ تَغَيَّبَ عَنْ بَدْرٍ وَلَمْ يَشْهَدْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ تَعْلَمُ اَنَّهٗ تَغَيَّبَ عَنْ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ فَلَمْ يَشْهَدْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ اللّٰهُ اَكْبَرُ قَالَ ابْنُ عُمَرَ تَعَالَ اُبَيِّنُ لَكَ اَمَّا فِرَارُهٗ يَوْمَ اُحُدٍ فَاَشْهَدُ اَنَّ اللّٰهَ عَفَا عَنْهُ وَاَمَّا تَغَيُّبُهٗ عَنْ بَدْرٍ فَاِنَّهٗ كَانَتْ تَحْتَهٗ رُقَيَّةُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ مَرِيْضَةً فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لَكَ اَجْرَ رَجُلٍ مِمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا وَسَهْمَهٗ وَاَمَّا تَغَيُّبُهٗ عَنْ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ فَلَوْ كَانَ اَحَدٌ اَعَزَّ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ عُثْمَانَ لَبَعَثَهٗ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُثْمَانَ وَكَانَتْ بَيْعَةُ الرِّضْوَانِ بَعْدَمَا ذَهَبَ عُثْمَانُ اِلٰى مَكَّةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ الْيُمْنٰى هٰذِهٖ يَدُ عُثْمَانَ فَضَرَبَ بِهَا عَلٰى يَدِهٖ وَقَالَ هٰذِهٖ لِعُثْمَانَ ثُمَّ قَالَ ابْنُ عُمَرَ اِذْهَبْ بِهَا الْاٰنَ مَعَكَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عثمان ابن عبداللہ ابن موہب (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ ایک مصری شخص حج بیت اللہ کے ارادہ سے (مکہ) آیا، اس نے (ایک جگہ) کچھ لوگوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اس کو بتایا گیا کہ یہ اکابرین قریش ہیں، پھر اس نے پوچھا: ان کا شیخ (یعنی علم وفضل اور مشیخت کے اعتبار سے ان میں سب سے بڑا شخص) کون ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: عبداللہ ابن عمرؓ! تب اس مصری شخص نے (حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی طرف متوجہ ہو کر) کہا: اے ابن عمرؓ! میں تجھ سے کچھ سوالات کرنا اور ان کے جواب پانا چاہتا ہوں، کیا تم کو معلوم ہے کہ عثمانؓ جنگ احد کے دن بھاگ کھڑے ہوئے تھے (درآنحالیکہ کفار کے مقابلے سے بھاگ پڑنا بہت برا ہے؟) حضرت ابن عمرؓ نے جوابدیا: ہاں ایسا ہی ہوا تھا (کہ اس دن عثمانؓ مورچہ سے ہٹ گئے تھے) پھر اس شخص نے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ عثمانؓ جنگ بدر میں غائب رہے تھے اور معرکہ میں شریک نہیں ہوئے، (جس کی بناء پر ان کو وہ اعزاز حاصل نہیں ہوا جس سے اہل بدر سرفراز ہوئے) حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا: ہاں (عثمانؓ جنگ بدر میں شریک نہیں تھے) پھر وہ شخص بولا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ عثمانؓ (حدیبیہ میں) بیعت رضوان کے موقع پر غائب تھے اور اس بیعت میں شریک نہیں ہوئے؟ حضرت ابن عمرؓ نے کہا: ہاں (عثمانؓ بیعت رضوان میں شریک نہیں ہو سکے تھے) اس شخص نے (جو دراصل حضرت عثمانؓ کے بارے میں برے خیالات رکھتا تھا، جب دیکھا کہ حضرت ابن عمرؓ نے اس

کی ایک ایک بات کی تصدیق کر دی ہے تو اس حیرت اور خوشی کے اظہار کے طور پر کہ عثمانؓ پر وارد ہونے والے اعتراضات اتنی عظیم اور معتبر ہستی کے ذریعہ ثابت ہوگئے ہیں۔ زوردار آواز میں) کہا: اللہ اکبر لیکن (جبھی) حضرت ابن عمرؓ نے اس سے فرمایا: (در اصل تم احمقانہ خیالات کا شکار ہو، جن باتوں کو تم عثمانؓ کی تنقیص کی دلیل سمجھتے ہو اور جن کی واقعاتی تصدیق تم نے مجھ سے کرائی ہے وہ اس طرح نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو، حقائق کچھ اور ہی ہیں اور اگر ان حقائق کو تم جاننا چاہتے ہو تو) آؤ میں تمہیں وضاحت کے ساتھ بتاتا ہوں: جنگ احد کے دن عثمانؓ کے بھاگ کھڑے ہونے کے بارے میں تو میں گواہی دیتا ہوں کہ ان کی اس بات کو اللہ تعالیٰ معاف کر چکا ہے (اور یہ سب کو معلوم ہے کہ جو بات معاف کی جا چکی ہو اس پر عیب جوئی یا تنقیص کی بنیاد رکھنا نری حماقت ہے) اور جنگ بدر میں عثمانؓ جو شریک نہیں ہوئے تھے تو اس کی یہ وجہ پیش آئی تھی کہ رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ ان کے نکاح میں تھیں اور ان دنوں وہ سخت بیمار تھیں پس رسول اللہ ﷺ نے عثمانؓ (جنگ بدر میں جانے سے روک دیا تھا اور ان) سے فرمایا تھا کہ تمہیں بھی وہی ثواب اور حصہ ملے گا جو اس جنگ میں شریک ہونے والوں میں سے کسی ایک شخص کو مل سکتا ہے، اب رہا بیعت رضوان میں عثمانؓ کا شریک نہ ہونا تو (پہلے اس حقیقت کو مدنظر رکھو کہ) اگر صحابہ میں) کوئی اور شخص (خاندانی طاقت اور وجاہت کے اعتبار سے) مکہ میں عثمانؓ سے زیادہ عزت و اثر رکھنے والا ہوتا تو آنحضرت ﷺ یقیناً اسی کو (اپنا نمائندہ خصوصی بنا کر اہل مکہ کے پاس) بھیجتے (لیکن خاندانی عزت و اثرات کے اعتبار سے چونکہ کوئی اور شخص مکہ والوں کی نظر میں حضرت عثمانؓ سے زیادہ بھاری بھر کم نہیں تھا بلکہ بعض صحابہؓ نے تو یہی کہہ کر اس مشن پر مکہ جانے سے معذرت کر دی تھی کہ وہاں ہمارے ایسے حامیوں اور عزیزوں کا کوئی جتھ نہیں ہے جو ہماری مدد کرے اور ہمارا پشت پناہ بن کر ہماری محافظت کرے) اس لئے رسول کریم ﷺ نے عثمانؓ کو مکہ روانہ کیا اور عثمانؓ کے مکہ جانے کے بعد بیعت رضوان کا واقعہ پیش آیا پھر (بیعت رضوان کے وقت) رسول کریم ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ یہ میرا ہاتھ عثمان کے ہاتھ کے قائم مقام ہے اور پھر آپ ﷺ نے اپنا وہ (دایاں) ہاتھ اپنے بائیں پر مار کر فرمایا: "یہ بیعت عثمانؓ کی طرف سے ہے" اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ نے اس مصری شخص سے کہا: (تمہارے سوالات کے جواب میں) اب میں نے جو کچھ کہا ہے اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔" (بخاریؒ)

تشریح: "ان کی اس بات کو اللہ تعالیٰ معاف کر چکا ہے" حضرت ابن عمرؓ نے ان الفاظ کے ذریعہ گویا اس آیت کی طرف ارشاد کیا:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۔

"یقیناً تم میں جن لوگوں نے پشت پھیر دی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دی ان کے بعض اعمال کے سبب سے، اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا واقعی اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں بڑے حلم والے ہیں۔"

دراصل ہوا یہ تھا جنگ احد کے دن آنحضرت ﷺ نے کچھ صحابہ کے ایک دستہ کو، جن میں حضرت عثمانؓ بھی تھے، ایک بہت اہم اور نازک مورچہ پر کھڑا کر دیا تھا اور ان کو حکم دیا تھا کہ اس مورچہ کو کسی حالت میں خالی نہ چھوڑا جائے اور ہر شخص اپنی جگہ پر جما رہے۔ مگر جب دشمن کو شکست ہوگئی اور وہ بھاگنے لگا تو اسلامی مجاہدین نے ان کا تعاقب شروع کیا، دشمن کے فرار اور مجاہدین اسلام کے تعاقب کو دیکھ کر اس مورچہ پر متعین دستہ یہ سمجھا کہ جنگ ختم ہوگئی ہے اور دشمن پوری طرح بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ اور پھر اس دستہ کے اکثر مجاہد بھی مورچہ کو چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دشمن کا تعاقب کرنے اور اس کا مال غنیمت اکٹھا کرنے میں مشغول ہوگئے، بھاگتے ہوئے دشمن کے ہوشیار کمانڈر جو اس مورچہ کی اہمیت کو پہلے ہی تاڑے ہوئے تھے، اب انہوں نے اس کو خالی دیکھا تو اپنے فوجیوں کے ساتھ تقریباً ایک میل کا چکر کاٹ کر پیچھے سے اس مورچہ پر پہنچ گئے اور وہاں سے مجاہدین اسلام پر گھات لگا کر ٹوٹ پڑے، عقب سے دشمن کے اس اچانک حملہ

نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ آکر چھن گئی۔ مورچہ چھوڑ کر ہٹ جانا چونکہ رسول برحق ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی تھی اور ان مجاہدین کی کمزوری و کوتاہی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے تنبیہ و تہدید فرمائی لیکن اپنے فضل و کرم سے اس کوتاہی کو معاف بھی فرمادیا۔ پس حضرت عثمانؓ سے عناد رکھنے والوں نے اس واقعہ کو حضرت عثمانؓ کی تحقیر و تنقیص کا ذریعہ بنایا حالانکہ اول تو جب اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے درگزر فرمادیا تو اب دوسروں کو مواخذہ یا طعن کرنے کا کیا حق رہ گیا، دوسرے اس واقعہ میں صرف حضرت عثمانؓ ہی کی ذات تو ماخوذ تھی نہیں، مورچہ چھوڑنے والے سارے صحابہ اس میں شامل تھے جب کوتاہی ہوئی تو سب سے ہوئی اور پھر معافی ملی تو سب کو ملی، لہٰذا تنہا حضرت عثمانؓ کو نشانہ بنانا ویسے بھی غیر منصفانہ بات ہے۔

"تمہیں بھی وہی ثواب اور حصہ ملے گا" آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ جنگ بدر میں تمہارا شریک نہ ہونا چونکہ واقعی عذر اور میرے حکم کے تحت ہے اس لئے تم دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے ان لوگوں کے حکم میں سمجھے جاؤ گے جو اس جنگ میں شریک ہوں گے، پس حضرت عثمانؓ کا جنگ بدر میں شریک نہ ہونا، ان کے حق میں نقصان کا موجب ہرگز نہ ہوا اور نہ اس بنیاد پر ان کی تنقیص کرنے کا حق کسی کو پہنچتا ہے، اس جنگ میں ان کی عدم شرکت ایسی ہی ہے جیسے غزوۂ تبوک کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لئے مدینہ میں چھوڑ دیا تھا اور وہ اسلامی لشکر کے ساتھ تبوک نہیں گئے تھے، تاہم یہ بات تحقیقی طور پر معلوم نہیں ہوئی کہ آنحضرت ﷺ نے جنگ بدر کے مال غنیمت میں حضرت عثمانؓ کا بھی حصہ لگایا تھا یا نہیں۔

حضرت رقیہؓ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی تھیں، جنگ بدر کے دنوں میں وہ سخت بیمار تھیں اور آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ بدر میں شامل نہ ہوں بلکہ رقیہؓ کی تیمارداری اور خبر گیری کے لئے مدینہ ہی میں رہیں، آنحضرت ﷺ کو حضرت عثمان سے کس قدر تعلق خاطر تھا اور ان سے آپ ﷺ کس قدر راضی و خوش تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی ایک بیٹی ان کے نکاح میں دی اور پھر اس بیماری میں جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوگیا تو اپنی دوسری بیٹی ام کلثومؓ کا بھی نکاح حضرت عثمان سے کردیا، اسی سبب حضرت عثمانؓ "ذوالنورین" کے لقب سے مشہور ہوئے، اور پھر جب حضرت ام کلثومؓ کا بھی انتقال ہوگیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا، اگر میری کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں اس کا نکاح بھی عثمان سے کردیتا، ایک اور روایت میں جس کو طبرانی نے نقل کیا ہے، آپ نے یہ بھی فرمایا: میں نے عثمان سے اپنی دونوں پیاری بیٹیوں کا نکاح وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم آنے پر کیا تھا۔

"عثمانؓ کو مکہ روانہ کیا" حضرت عثمانؓ کو اس مشن پر روانہ کیا گیا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے اہل مکہ سے گفتگو کریں اور ان کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل ہونے سے نہ روکیں، جن مصالح کو سامنے رکھ کر اس مشن کے لئے حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہوا تھا وہ درست ثابت ہوئے، مکہ میں اسلام اور اہل اسلام کے معاندین و مخالفین کو حضرت عثمان کے خلاف کسی ایسے اقدام کی جرأت نہیں ہوئی جس سے بعض صحابہؓ نے خطرہ کا اظہار کیا تھا حضرت عثمانؓ کے اعزاء اور متعلقین نے مکہ میں ان کی آمد کی اطلاع پاکر ان کا پرتپاک استقبال کیا، سواری پر بٹھا کر ان کو اپنے آگے کیا اور جلوس کی شکل میں لے کر چلے، ان سب لوگوں نے یہ اعلان بھی کردیا کہ عثمانؓ ہمارے معزز مہمان اور ہماری پناہ میں ہیں، کوئی ان سے تعرض کی جرأت نہ کرے، نہ صرف یہ بلکہ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ تم عمرہ کی نیت سے خانہ کعبہ کا طواف بھی کرسکتے ہو تمہیں کوئی منع نہیں کرے گا، مگر حضرت عثمانؓ نے ان کی اس پیش کش کو شکریہ کے ساتھ رد کردیا اور فرمایا نہیں، میں آنحضرت ﷺ کے بغیر اور آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں تنہا طواف ہرگز نہیں کروں گا۔

"عثمان کے مکہ جانے کے بعد" یعنی بیعت رضوان کا واقعہ حضرت عثمانؓ کی موجودگی میں پیش ہی نہیں آیا تھا کہ اس میں ان کی شرکت یا عدم شرکت کی بحث کھڑی ہوئی، صورت یہ ہوئی تھی کہ جب حضرت عثمانؓ مکہ پہنچ گئے اور وہاں مصالحتی گفتگو شروع ہوئی تو اس

نے طول کھینچا اور حضرت عثمانؓ کی واپسی میں تاخیر ہوگئی، اس سے مسلمانوں میں بے چینی تو پیدا ہو ہی گئی تھی مستزادیہ کہ کہیں سے یہ خبر آکر مشہور ہوگئی کہ نہ صرف حضرت عثمانؓ کا مصالحتی مشن ناکام ہوگیا ہے بلکہ اہل مکہ اس حد تک آمادۂ شر ہیں کہ وہ اپنا لشکر جمع کر کے مسلمانوں پر حملہ کی نیت سے حدیبیہ کی طرف بڑھ رہے ہیں بلکہ ایک خبر یہ بھی آئی کہ حضرت عثمانؓ کو اہل مکہ نے قتل کر دیا ہے، اس پر آنحضرت ﷺ نے تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور دشمنان دین کے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی، آپ ﷺ نے ایک درخت کے نیچے ایک ایک مسلمانوں سے یہ بیعت لی کہ کوئی یہاں سے بھاگے گا نہیں، بلکہ اپنی جان گنوا کر بھی دشمن کا مقابلہ کرے گا اور اگر عثمانؓ واقعۃً قتل کر دیئے گئے ہیں تو ان کے خون کا بدلہ لے گا۔

"اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ" یعنی عثمانؓ کے بارے میں اگر تم مجھ سے کچھ معلومات جمع کر کے لے جانا چاہتے ہو تو میری ان باتوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ تمہارے سوالات اور میرے جواب اگر کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں تو تمہیں ہی نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ کہ ہمیں یا ان الفاظ سے حضرت ابن عمرؓ کی مراد یہ تھی کہ: اگر تم حق کے متلاشی اور سچائی جاننے کے خواہش مند ہو تو میں نے تفصیلی طور پر اب جو حقائق تمہارے سامنے بیان کئے ہیں ان کو پلے باندھ لو اور دل و دماغ میں رکھ کر لے جاؤ اور عثمانؓ کے حق میں جو برے خیالات اور بدگمانیاں رکھتے ہو ان سے اپنا ذہن پاک و صاف کر لو۔

جان دے دی مگر آنحضرت ﷺ کی وصیت سے انحراف نہیں کیا

⑫ وَعَنْ اَبِیْ سَھْلَةَ مَوْلٰی عُثْمَانَ قَالَ جَعَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُسِرُّ اِلٰی عُثْمَانَ وَلَوْنُ عُثْمَانَ یَتَغَیَّرُ فَلَمَّا کَانَ یَوْمُ الدَّارِ قُلْنَا اَلَا نُقَاتِلُ قَالَ لَا اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَھِدَ اِلَیَّ اَمْرًا فَاَنَا صَابِرٌ نَفْسِیْ عَلَیْہِ۔

"اور حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابوسہلہؒ کہتے ہیں کہ (ایک دن کا واقعہ ہے) نبی کریم ﷺ حضرت عثمانؓ سے چپکے چپکے کچھ باتیں کر رہے تھے اور (ان باتوں کو سن سن کر) حضرت عثمانؓ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جا رہا تھا (اس وقت تو یہ راز کسی پر نہ کھلا کہ آنحضرت ﷺ چپکے چپکے حضرت عثمانؓ کو بتا رہے تھے کہ تمہارے زمانہ میں کس طرح فتنہ و فساد برپا ہوگا کیسی کیسی مفسدہ پردازیاں ہوں گی، تمہارے مخالفین و معاندین کس ظالمانہ طریقہ سے تمہیں قتل کرنا چاہیں گے اور انہی کے ہاتھوں تمہیں شہادت ملے گی۔ اور اس کے ساتھ آنحضرت ﷺ ان کو تلقین و وصیت فرما رہے تھے کہ ان فتنوں اور ہنگاموں میں صبر کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہ چھوڑنا اور سخت سے سخت حالات میں بھی مشتعل نہ ہونا بلکہ اپنی مظلومیت کو برقرار رکھنا) چنانچہ جب دار کا دن آیا (اور مفسدوں نے مکان کا محاصرہ کر کے حضرت عثمانؓ کا چراغ زندگی گل کر دینا چاہا) تو ہم نے (حضرت عثمانؓ سے) عرض کیا کہ (اس خلفشار کو روکنے اور مفسدوں کے خطرناک عزائم کی راہ مارنے کے لئے) کیا ہمارے لئے مناسب نہیں ہے کہ ہم ان لوگوں سے لڑیں، حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: نہیں (میں لڑائی ہرگز نہیں چاہتا) کیونکہ رسول کریم ﷺ نے مجھے ایک بات کی وصیت کی تھی اور میں اپنے آپ کو اس وصیت پر صابر و شاکر رکھے ہوئے ہوں۔"

عثمان کی اطاعت کا حکم نبوی ﷺ

⑬ وَعَنْ اَبِیْ حَبِیْبَةَ اَنَّہٗ دَخَلَ الدَّارَ وَعُثْمَانُ مَحْصُوْرٌ فِیْھَا وَاَنَّہٗ سَمِعَ اَبَا ھُرَیْرَةَ یَسْتَأْذِنُ عُثْمَانَ فِی الْکَلَامِ فَاَذِنَ لَہٗ فَقَامَ فَحَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّکُمْ سَتَلْقَوْنَ بَعْدِیْ فِتْنَةً وَاخْتِلَافًا اَوْ قَالَ اِخْتِلَافًا وَفِتْنَةً فَقَالَ لَہٗ قَائِلٌ مِنَ النَّاسِ فَمَنْ لَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوْ مَا تَاْمُرُنَا بِہٖ قَالَ عَلَیْکُمْ بِالْاَمِیْرِ وَاَصْحَابِہٖ وَھُوَ یُشِیْرُ اِلٰی عُثْمَانَ بِذٰلِکَ رَوَاھُمَا الْبَیْھَقِیُّ فِیْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت ابوحبیبہؒ (تابعی) سے روایت ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے گھر میں اس وقت گئے تھے جب حضرت عثمانؓ اس گھر میں محصور کر

دیئے گئے تھے انہوں نے سنا کہ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عثمانؓ سے (یا تو خود ان کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی یا) کا محاصرہ کئے ہوئے مفسدوں کے سامنے) کچھ باتیں کہنے کی اجازت مانگ رہے ہیں، حضرت عثمانؓ نے ان کو اجازت دی (کہ کہو کیا کہنا چاہتے ہو) تب حضرت ابوہریرہؓ کھڑے ہوئے اور (جیسا کہ خطبہ و تقریر کا قاعدہ ہے) پہلے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر کہا: (ایک دن) میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ "میرے بعد تم لوگ فتنوں اور باہمی اختلافات کی آزمائش سے دوچار ہوگے، یا آپ ﷺ نے پہلے "اختلافات" کا اور پھر "فتنوں" کا لفظ ارشاد فرمایا۔ (یہ ارشاد گرامی سن کر) وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ! پھر (ان فتنوں اور اختلافات کے زمانہ میں) ہمارا کون ہوگا؟ (یعنی اس وقت ہمیں کس شخص کی حمایت اور پیروی کرنی چاہئے۔ کہ جس سے ہمارا دین و دنیا کا فائدہ ہو اور ہم خرابی و نقصان سے بچ سکیں) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "امیر اور اس کے رفیقوں کی اطاعت و پیروی تم پر لازم ہے" اور حضرت ابوہریرہؓ نے ("امیر" کے لفظ پر زور دیتے ہوئے) حضرت عثمانؓ کی طرف اشارہ کیا۔ ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "حضرت عثمانؓ کی طرف اشارہ کیا" یعنی حضرت ابوہریرہؓ نے اس حدیث سے یہ ثابت کیا کہ اس وقت مسلمانوں کے "امیر" چونکہ حضرت عثمانؓ ہیں اس لئے ہر حالت میں ان کی اطاعت ہر مسلمان پر لازم ہے۔

مختصر سوانحی خاکہ: سیدنا عثمان غنیؓ عام فیل کے چھٹے سال پیدا ہوئے، دعوت اسلام کے آغاز ہی میں دولت ایمان سے بہرہ ور ہو گئے تھے اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، اس وقت تک نبی کریم ﷺ دار ارقم میں نہیں گئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے دو مرتبہ ہجرت کی، پہلے حبشہ اور پھر مدینہ، آپ میانہ قد، گوری رنگت خوبصورت گھنی داڑھی اور دلکش خدوخال کے مالک اور پرکشش شخصیت کے حامل تھے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے بعد تیسرے خلیفہ ہوئے اور محرم ۲۴ھ کی پہلی تاریخ کو خلافت کی باگ ڈور سنبھالی، سخت خلفشار اور ہنگامہ کے دوران ۳۵ھ میں ذی الحجہ کی اٹھارہ تاریخ کو مصر کے بلوائیوں اور مفسدوں میں سے ایک شخص اسود بحنسی نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ محصور گھر کی دیوار کود کر آپؓ کو اس وقت شہید کیا جب آپؓ تلاوت کلام اللہ میں مصروف تھے۔ بعض حضرات نے آپؓ کے قاتل کا نام دوسرا بیان کیا ہے۔ تین دن تک آپ کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ آخر بعض صحابہؓ کی کوشش سے تین دن کے بعد رات کے وقت عشاء مغرب کے درمیان تدفین عمل میں آئی حضرت جبیر ابن مطعمؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، بغیر غسل کے انہی کپڑوں میں جو جام شہادت نوش کرتے وقت پہنے ہوئے تھے دفن کئے گئے۔ اس دن حضرت عثمانؓ کی عمر ۸۲ سال، یا ایک قول کے مطابق ۸۸ سال تھی۔ آپؓ کی خلافت کچھ دن کم بارہ سال رہی اور صحابہؓ و تابعین کی ایک بڑی جماعت نے آپؓ سے احادیث نبوی روایت کی ہیں۔

بَابُ مَنَاقِبِ هٰؤُلَآءِ الثَّلٰثَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

ان تینوں (یعنی خلفاء ثلاثہ) رضی اللہ عنہم کے مناقب کا بیان

پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مناقب پر مشتمل احادیث نقل ہوئیں، پھر حضرت عمر فاروقؓ کے مناقب سے متعلق احادیث کو نقل کیا گیا، اس کے بعد ایک الگ باب قائم کر کے وہ احادیث نقل کی گئیں جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مناقب کا ایک ساتھ ذکر تھا، پھر حضرت عثمان غنیؓ کے مناقب کی حدیثیں گزشتہ باب کے تحت نقل کی گئیں اور چونکہ بعض ایسی احادیث بھی منقول ہیں جن میں ان تینوں حضرات یعنی سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ اور سیدنا عثمانؓ کے مناقب ایک ساتھ مذکور ہیں، لہٰذا ان احادیث کو نقل کرنے کے لئے مذکورہ بالا باب قائم کیا گیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید

① عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَعِدَ اُحُدًا وَاَبُوْبَکْرٍ وَ عُمَرُ وَ عُثْمَانُ فَرَجَفَ بِھِمْ فَضَرَبَہٗ بِرِجْلِہٖ فَقَالَ اثْبُتْ اُحُد فَاِنَّمَا عَلَیْکَ نَبِیٌّ وَصِدِّیْقٌ وَّشَھِیْدَانِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ (مدینہ کے مشہور پہاڑ) احد پر چڑھے تو وہ (خوشی کے مارے) ہلنے لگا، آنحضرت ﷺ نے اپنا پیر اس پر مارا اور فرمایا: "ارے احد، تھم جا، تیرے اوپر ایک نبی ہے، ایک صدیق ہے اور دو شہید ہیں"۔ (بخاری)

تینوں کو جنّت کی بشارت

② وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّؓ قَالَ کُنْتُ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حَائِطٍ مِنْ حِیْطَانِ الْمَدِیْنَۃِ فَجَاءَ رَجُلٌ فَاسْتَفْتَحَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ افْتَحْ لَہٗ وَبَشِّرْہُ بِالْجَنَّۃِ فَفَتَحْتُ لَہٗ فَاِذَا اَبُوْبَکْرٍ فَبَشَّرْتُہٗ بِمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَمِدَ اللّٰہَ ثُمَّ جَاءَ رَجُلٌ فَاسْتَفْتَحَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ افْتَحْ لَہٗ وَبَشِّرْہُ بِالْجَنَّۃِ فَفَتَحْتُ لَہٗ فَاِذَا ھُوَ عُمَرُ فَاَخْبَرْتُہٗ بِمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَمِدَ اللّٰہَ ثُمَّ اسْتَفْتَحَ رَجُلٌ فَقَالَ لِیْ افْتَحْ لَہٗ وَبَشِّرْہُ بِالْجَنَّۃِ عَلٰی بَلْوٰی تُصِیْبُہٗ فَاِذَا عُثْمَانُ فَاَخْبَرْتُہٗ بِمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَمِدَ اللّٰہَ ثُمَّ قَالَ اللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسی اشعریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدینہ کے ایک باغ میں تھا کہ اچانک ایک شخص (باہر پھاٹک پر) آیا (جس کے بارے میں اس وقت تک ہمیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ کون شخص ہے) پھر اس نے پھاٹک کھولنے کے لئے کہا، نبی کریم ﷺ نے (مجھ سے) فرمایا کہ "جاؤ پھاٹک کھول دو اور آنے والے شخص کو جنّت کی (یعنی جنّت کے اعلی درجات کی) بشارت دے دو" میں نے جا کر پھاٹک کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ابوبکرؓ ہیں۔ میں نے رسول کریم ﷺ کے کہنے کے مطابق ان کو جنّت کی بشارت سنائی اور انہوں نے (اس نعمت عظمی کی بشارت سن کر) اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، (کچھ دیر بعد) پھر ایک شخص نے آکر پھاٹک کھلوایا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جاؤ پھاٹک کھول دو اور آنے والے شخص کو جنّت کی بشارت دے دو" میں نے جا کر پھاٹک کھولا تو دیکھا کہ وہ عمرؓ تھے، چنانچہ میں نے نبی کریم ﷺ کے کہنے کے مطابق ان کو جنّت کی بشارت سنائی اور انہوں نے بھی (یہ بشارت سن کر) اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، پھر (کچھ دیر بعد) ایک اور شخص نے آکر پھاٹک کھلوایا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جاؤ پھاٹک کھول دو اور آنے والے شخص کو ان عظیم آفات و مصائب کے بعد جنّت کی بشارت دے دو۔ جن کا وہ (اپنی زندگی میں) شکار ہوگا" میں نے جا کر پھاٹک کھولا تو دیکھا کہ وہ حضرت عثمانؓ تھے چنانچہ میں نے ان کو وہ بات سنائی جو نبی کریم ﷺ نے فرمائی تھی، حضرت عثمانؓ نے (اس بات کو سن کر پہلے تو) اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور پھر کہا: اللہ ہی سے مدد طلب کی جانی چاہئے (یعنی میں اللہ سے مدد کا طلب گار ہوں کہ ان آفات و مصائب کے وقت یہی صبر و استقامت عطا فرمائے گا)۔" (بخاری و مسلم)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

زمانۂ نبوت میں ان تینوں کا ذکر کس ترتیب سے ہوتا تھا

③ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ کُنَّا نَقُوْلُ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَیٌّ اَبُوْبَکْرٍ وَ عُمَرُ وَ عُثْمَانُ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ حیات میں ہم یوں کہا کرتے تھے: ابوبکر اور عمر اور عثمان، اللہ ان سے راضی ہو۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ کہ یہ تینوں صحابیؓ بارگاہ رسالت میں سب سے زیادہ تقرب و منزلت رکھتے تھے اور اپنی اسی حیثیت کی بناء پر تمام ہی صحابہ میں ممتاز و منفرد شہرت کے حامل تھے۔ صحابہ کی مجلسوں میں کثرت سے ان کا چرچا ہوا کرتا تھا ان کے اوصاف و محاسن کے تذکرے کئے جاتے تھے۔ اور اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے جب بھی کسی مسئلہ و معاملہ کا ذکر ہوتا تو سب سے پہلے ان تینوں کا ذکر آتا اور جب بھی ان تینوں کا ذکر آتا تو ان کے نام اس ترتیب سے لئے جاتے کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ، پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا نام آتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

خلفاء ثلاثہؓ کی ترتیب خلافت کا غیبی اشارہ

④ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اُرِیَ اللَّیْلَۃَ رَجُلٌ صَالِحٌ کَاَنَّ اَبَابَکْرٍ نِیطَ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنِیطَ عُمَرُ بِاَبِیْ بَکْرٍ وَنِیطَ عُثْمَانُ بِعُمَرَ قَالَ جَابِرٌ فَلَمَّا قُمْنَا مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُلْنَا اَمَّا الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَرَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَاَمَّا نَوْطُ بَعْضِھِمْ بِبَعْضٍ فَھُمْ وُلَاۃُ الْاَمْرِ الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰہُ بِہٖ نَبِیَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ فرمانے لگے کہ آج کی رات ایک نیک شخص کو خواب میں دکھلایا گیا کہ جیسے ابوبکرؓ رسول کریم ﷺ کے ساتھ لٹکے ہوئے یعنی جڑے ہوئے ہیں، اور عمرؓ، ابوبکرؓ کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں اور عثمانؓ، عمرؓ کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں، حضرت جابرؓ کہتے ہیں: جب ہم لوگ (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ کی مجلس مبارک سے اٹھے تو (اپنے اجتہاد اور ظن غالب کے مطابق) ہم نے (آپس میں) کہا کہ "نیک شخص" سے مراد تو خود رسول کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے اور رہا "بعض کا بعض کے ساتھ لٹکنا یعنی جڑنا" تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ تینوں حضرات (یعنی ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ، مذکورہ ترتیب کے مطابق یکے بعد دیگرے) اس مشن کے سربراہ ہوں گے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اس دنیا میں بھیجا ہے۔" (ابوداؤد)

بَابُ مَنَاقِبِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ

حضرت علیؓ بن ابی طالب کے مناقب کا بیان

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں جتنی زیادہ حدیثیں آپ کی تعریف و توصیف اور فضیلت میں منقول ہیں اتنی صحابہ میں سے کسی کے حق میں منقول نہیں ہیں، اگرچہ ان میں سے بہت سی روایتیں "موضوع" (گھڑی ہوئی) بھی ہیں، چنانچہ حضرت شیخ مجد الدین شیرازیؒ نے جس طرح ان بعض روایتوں کے بارے میں، کہ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مناقب میں نقل کی گئی ہیں، یہ وضاحت کی ہے کہ یہ موضوع روایتیں ہیں کیونکہ ان کا بے اصل و بے بنیاد ہونا معمولی عقل و فہم رکھنے والا بھی جان سکتا ہے اسی طرح انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے مناقب میں لوگوں نے بے شمار جھوٹی حدیثیں بنالی ہیں اور ان جھوٹی حدیثوں کا سب سے بڑا ذخیرہ وہ ہے جس کو انہوں نے "وصایا" نامی کتاب میں جمع کیا ہے اور جس میں کی ہر حدیث یاعلی کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ ہاں ان میں سے صرف ایک حدیث یاعلی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسی بے شک ایسی حدیث ہے جو ثابت ہے۔

بہرحال حضرت علیؓ کے مناقب میں جو صحیح احادیث منقول ہیں ان کے بارے میں امام احمدؒ اور امام نسائی وغیرہ نے کہا ہے کہ ان کی تعداد ان احادیث سے کہیں زیادہ ہے جو دوسرے صحابہؓ کے حق میں منقول ہیں، اور سیوطیؒ نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ متاخر ہیں اور ان کے زمانہ میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف ونزاع کی خراب صورت حال پیدا ہوگئی تھی بلکہ خود سیدنا علیؓ کی مخالفت کرنے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جنہوں نے ان کے خلاف جنگیں بھی لڑیں اور ان کی خلافت سے انحراف بھی کیا، لہٰذا علماء اور محدثین نے مقام علیؓ کی حفاظتی اور مخالفین علیؓ کی تردید وتغلیط کی خاطر منقبت علیؓ سے متعلق احادیث کو چن چن کر جمع بھی کیا، اور ان احادیث کو پھیلانے میں بہت سرگرم جدوجہد بھی کی، ورنہ جہاں تک خلفاء ثلاثہؓ کے مناقب کا تعلق ہے تو وہ حقیقت میں حضرت علی کے مناقب سے بھی زیادہ ہیں۔

نام ونسب: علیؓ ابن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر ابن کنانہ۔

آپؓ کا ایک نام حیدر بھی ہے، حیدر دراصل حضرت علی کے نانا اسد کا نام تھا، جب آپ پیدا ہوئے تو اسی وقت آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد نے آپ کا نام اپنے باپ کے نام پر "حیدر" رکھا پھر بعد میں ابوطالب نے اپنی طرف سے بیٹے کا نام "علی" رکھا، اور جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے: خود میرے نزدیک "ابوتراب" سے زیادہ پسندیدہ کوئی نام نہیں ہے۔

کنیت: "ابوتراب" سیدنا علیؓ کی کنیت ہے اور یہ کنیت اس طرح پڑی کہ ایک دن رسول کریم ﷺ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت علیؓ گھر میں نہیں ہیں۔ پوچھا: علیؓ کہاں ہیں؟ حضرت فاطمہؓ نے جواب دیا: میرے اور ان کے درمیان کچھ ان بن ہوگئی تھی، اسی غصہ میں گھر سے چلے گئے ہیں، آج تو انہوں نے اس گھر میں قیلولہ بھی نہیں کیا، آنحضرت ﷺ نے جبھی حضرت انسؓ کو حکم دیا کہ جا کر دیکھو، علیؓ کہاں ہیں، حضرت انسؓ نے بتایا کہ یارسول اللہ؟ وہ تو مسجد میں سوئے ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ فوراً مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت علیؓ مسجد کی دیوار سے لگے ہوئے ننگی زمین پر لیٹے محو خواب ہیں، چادر کاندھے سے کھسک کر الگ ہوگئی تھی اور پیٹھ وپہلو پر مٹی لگی ہوئی تھی، اس وقت آنحضرت ﷺ ان کے جسم کے اوپر سے مٹی صاف کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے: اٹھو، اے ابوتراب اٹھو، جبھی سے حضرت علیؓ کی کنیت "ابوتراب" مشہور ہوگئی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

علیؓ اور ہارونؑ

① عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لِعَلِیٍّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا: (دنیا وآخرت میں قرابت ومرتبہ میں اور دینی مددگار ہونے کے اعتبار سے) تم میرے لئے ایسے ہی ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہارون علیہ السلام تھے بس فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ جب اپنی زندگی کے آخری غزوۂ غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو حضرت علیؓ کو اپنے اہل وعیال کی خبرگیری وحفاظت کے لئے مدینہ میں چھوڑ دیا تھا، اس پر منافقوں نے حضرت علیؓ کو طعنہ دیا کہ رسول اللہ تمہیں بے قدر جان کر مدینہ میں چھوڑ گئے ہیں، حضرت علیؓ نے منافقوں کا یہ طعنہ سنا تو بڑی غیرت محسوس کی اور فوراً ہتھیار باندھ کر نکل کھڑے ہوئے اور "جرف"

پہنچ گئے جو مدینہ سے تقریباً تین میل شمال میں واقعہ ایک جگہ ہے اور جہاں آنحضرت ﷺ اسلامی لشکر کے ساتھ پڑاؤ کئے ہوئے تھے، انہوں نے حضرت اقدس ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! منافقین میرے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہہ رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: وہ جھوٹے ہیں میں نے تو تمہیں مدینہ میں اپنے اہل و عیال پر بھی میرا خلیفہ بن کر رہو اور پھر اسی وقت آپ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ علیؓ! کیا تم اس سے خوش نہیں ہو کہ تمہارا مجھ سے وہی تعلق ہے جو ہارون علیہ السلام کا موسی سے تھا، کہ جب موسی چلا دیئے کوہ طور پر گئے تھے تو اپنی قوم میں ہارون کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے۔

شیعوں کی کج رائی: حضرت علیؓ سے کہے گئے آنحضرت ﷺ کے ان الفاظ کو شیعہ لوگ "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" کے مصداق اپنے بے بنیاد عقیدے کی دلیل بنا کر بیٹھ گئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر حضرت علیؓ کو "خلافت" کا بار سونپا تھا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد خلافت کا اولین استحقاق حضرت علیؓ کا تھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ روافض نے تو اس کج رائی کا شکار ہو کر تمام صحابہؓ کو "کافر" تک کہہ ڈالا ہے، اس وجہ سے کہ ان کے بقول ان صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ کی وصیت سے انحراف کیا اور خلافت کے بارے میں حضرت علیؓ پر دوسروں کو مقدم کیا، بلکہ ان میں سے بعض ستم ظریفوں نے تو حضرت علیؓ کو بھی نہیں بخشا اور کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے چونکہ اپنا حق طلب نہیں کیا اور خلافت کا دعوی لے کر مضبوطی سے نہیں اٹھے اس لئے وہ بھی کافر ایسے نادانوں سے بس یہی کہنا چاہئے کہ تم سے بڑا کافر کون ہو سکتا ہے، جو لوگ تمام اُمت کو کافر کہیں خصوصاً طبقہ اول (صحابہؓ) پر کفر کا اطلاق کریں اور اس طرح گویا یہ ثابت کریں کہ وہ پوری شریعت کو غیر معتبر قرار دے رہے ہیں اور اسلام کی ساری عمارت کو ڈھا رہے ہیں تو ان کے کفر میں کس کو شک ہوگا۔

بہر حال اہل سُنّت و الجماعت نے اس حدیث سے شیعوں کے مذکورہ استدلال کو "دور از کار" قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ الفاظ حدیث سے جو بات مفہوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی کو اپنا خلفیہ محض اس عرصہ کے لئے بنایا تھا جو غزوۂ تبوک کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے مدینہ سے باہر گزارا تھا جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اس عرصہ کے لئے اپنی قوم پر خلیفہ بنایا تھا جو انہوں نے چلہ کے لئے کوہ طور پر گزارا تھا، اگر اس عرصہ کے لئے حضرت علیؓ کو اپنا خلفیہ بنانے سے آنحضرت ﷺ کا مقصد اس بات کی وصیت کرنا یا اس طرف اشارہ کرنا ہوتا کہ اسی طرح میرے وصال کے بعد بھی پہلے خلیفہ علیؓ ہوں گے تو آپ ﷺ اس موقع پر حضرت علیؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ ہرگز نہ دیتے کیونکہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسی علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ نہیں بنے تھے، وہ حضرت موسی علیہ السلام کے انتقال سے چالیس سال پہلے ہی وفات پا چکے تھے، علاوہ ازیں آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں اپنی عدم موجودگی کے اسی عرصہ میں امامت نماز کے لئے اپنا خلیفہ ایک دوسرے صحابی حضرت ام مکتومؓ کو بنایا تھا، چنانچہ اس عرصہ میں حضرت علیؓ تو آنحضرت ﷺ کے اہل و عیال کی خبر گیری اور حفاظت کے فرائض انجام دیتے تھے اور حضرت ام مکتومؓ نماز میں لوگوں کی امامت کرتے تھے، اگر خلافت مطلق ہوتی تو اصول کے مطابق آنحضرت ﷺ امامت نماز کی ذمہ داری بھی یقیناً حضرت علی ہی کو سونپ کر جاتے، اس کے لئے ایک دوسرے آدمی کو نامزد نہ فرماتے۔

وجہ تشبیہ: آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا کہ تم میرے لئے ایسے ہی ہو جیسے موسیؑ کے لئے ہارونؑ تھے۔ ان الفاظ کے ذریعے حضرت علیؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ دینا تو صاف سمجھ میں آتا تھا لیکن وجہ تشبیہ ظاہر نہیں ہوئی تھی کہ آپ ﷺ نے ان کو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ کس اعتبار سے تشبیہ دی، اسی بات کی وضاحت کے لئے آپ ﷺ نے آگے فرمایا "بس فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا" یعنی اگر تم دونوں میں کچھ فرق ہے تو بس یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام ایک نبی تھے اور تم نبی نہیں ہو، پس معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون کی باہمی قرابت و وابستگی کی مثال کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اور حضرت علیؓ کے درمیان جس قرابت و وابستگی کو ظاہر کیا وہ "نبوت" کے اعتبار سے نہیں تھی بلکہ "خلافت" کے اعتبار سے تھی جو مرتبہ میں نبوت

کے قریب ہے، لیکن خلافت کا اعتبار بھی دونوں صورتوں کو محتمل ہوسکتا تھا کہ یا تو آپ ﷺ کی مراد اپنی زندگی میں ایک خاص عرصہ کے لئے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ بنا کر ان کے تئیں اپنی قربت ووابستگی اور اعتماد کو ظاہر کرنا تھا یا اپنی وفات کے بعد ان کے استحقاق خلافت کی طرف اشارہ کر کے قربت ووابستگی اور اعتماد کو ظاہر کرنا تھا جہاں تک اس دوسری صورت کا تعلق ہے تو یہ یوں خارج از امکان قرار پائی جاتی ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام تو حضرت موسی علیہ السلام سے پہلے وفات پاگئے تھے اور وہ حضرت موسی علیہ السلام کے بعد خلیفہ کب بنے تھے کہ ان کی مثال کے ذریعہ آنحضرت ﷺ اپنی وفات کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت کی طرف اشارہ کرتے لامحالہ ماننا پڑے گا کہ آنحضرت ﷺ کے مذکورہ الفاظ سے جو مفہوم متعین طور پر ثابت ہوتا ہے وہ وہی ہے جو پہلی صورت میں بیان ہوا، یعنی یہ کہ آپ ﷺ نے اس موقعہ پر حضرت علیؓ کو صرف اس عرصہ کے لئے خلیفہ بنانے کی بات کہی تھی جو غزوۂ تبوک کے لئے آپ ﷺ نے مدینہ سے باہر گزارا، خلاصہ کے طور پر یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت علیؓ کی وہ خلافت جزوی تھی جو آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں ایک خاص عرصہ کے لئے عارضی اور وقتی انتظام کے طور پر عمل میں آئی تھی اس صورت میں کہ وہ عرصہ ختم ہونے پر یعنی غزوۂ تبوک سے آنحضرت ﷺ کی واپسی کے بعد وہ خلافت ختم بھی ہوگئی تھی، وہ جزوی خلافت آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ان کی کلی خلافت کی دلیل کیسے بن سکتی ہے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد: میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ حضرت عیسی بن مریم جب آسمان سے اتریں گے تو نبی کے طور پر نہیں اتریں گے بلکہ دین محمد ﷺ کا نفاذ کرنے والے اور اسلامی امراء وحکام میں سے ایک امیر وحاکم بن کر اتریں گے اور ان کا کام ہی یہ ہوگا کہ لوگوں کو شریعت محمدی ﷺ کا پابند و متبع بنائیں، لیکن ملا علی قاریؒ کا کہنا ہے کہ حدیث کے الفاظ اس بات کے منافی نہیں ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام نبی کی حیثیت میں اتریں اور ہمارے نبی ﷺ کی شریعت کے متبع کے طور پر دین محمدی کے اجراء و نفاذ اور اسوۂ رسالت محمدی کی ترویج و اشاعت کا فریضہ انجام دیں اور اس میں بھی کوئی استبعاد نہیں کہ اس فریضہ کی ادائیگی میں ان کی راہنمائی وحی کے ذریعہ ہو، اس صورت میں "میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا" کی مراد یہ بیان کی جائے گی کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہوگا اور آپ ﷺ "خاتم النبیین" اس اعتبار سے ہیں کہ نئے پیدا ہونے والے نبیوں کا سلسلہ آپ ﷺ پر ختم ہوگیا ہے، آپ ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی اس دنیا میں نہیں آئے گا۔

اس حدیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جس بڑی فضیلت و منقبت کی طرف اشارہ ہے فرمایا گیا کہ اگر آنحضرت ﷺ "خاتم النبیین" نہ ہوتے اور آپ ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ بند نہ ہوگیا ہوتا تو حضرت علیؓ بھی ایک نبی ہوتے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ پھر یہ حدیث اس حدیث کے منافی ہو جائے گی جو صراحت کے ساتھ حضرت عمرؓ کے حق میں وارد ہوئی ہے کہ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے" درحقیقت ان دونوں حدیثوں کا مفہوم فرضی اور تقدیری ہے، یعنی آپ ﷺ نے ایک امر محال کو فرض کر کے گویا یوں فرمایا کہ اگر بالفرض میرے بعد اگر نبوت کا دروازہ کھلا رہتا تو میرے صحابہؓ میں سے متعدد لوگ نبی ہوتے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: ایک حدیث علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کے مانند ہیں) کا بڑا چرچا کیا جاتا ہے اور اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ واقعی حدیث ہے لیکن جیسا کہ حفاظ حدیث مثلاً زرکشی، عسقلانیؒ، دمیریؒ، سیوطیؒ نے تصریح کی ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔

علیؓ سے محبت ایمان کی علامت ہے

(۲) وَعَنْ زِرِّبْنِ حُبَيْشٍ قَالَ قَالَ عَلِيٌّ وَالَّذِيْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ اِنَّهُ لَعَهْدُ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اِلَیَّ اَنْ لَّا یُحِبُّنِیْ اِلاَّ مُؤْمِنٌ وَّلَا یُبْغِضُنِیْ اِلاَّ مُنَافِقٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت زر بن حبیش (تابعی کہتے ہیں کہ سیدنا علیؓ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو پھاڑا (یعنی اگایا) اور ذی روح کو پیدا کیا درحقیقت نبی امی ﷺ نے مجھ کو یقین دلایا تھا کہ جو (کامل) مؤمن ہو گا وہ مجھ سے (یعنی علیؓ سے) محبت رکھے گا اور جو منافق ہو گا وہ مجھ سے عداوت رکھے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: محبت سے مراد وہ محبت ہے جو شرعی تقاضوں کے ہم آہنگ واقع کے مطابق اور نقصان و زیادتی کے بغیر ہو، پس جس طرح وہ لوگ کہ جو حضرت علیؓ کے حقیقی مقام و مرتبہ کو گھٹاتے ہیں جیسے فرقہ خارجیہ کے لوگ حب علی کی محرومی کے سبب اس حدیث میں مذکورہ "مؤمن" کا مصداق نہیں بن سکتے اسی طرح وہ لوگ بھی کہ جو حضرت علیؓ کی محبت میں غیر شرعی اور غیر حقیقی غلو کرتے ہیں اور اس غلو کے نتیجہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے بغض و عداوت رکھتے ہیں جیسے شیعوں کے بعض طبقے۔ اس حدیث میں مذکور "مؤمن" کا مصداق ہرگز نہیں ہو سکتے۔

بہرحال حضرت علیؓ سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض و عداوت رکھنا نفاق کی نشانی ہے ایک اور روایت میں جو حضرت علیؓ ہی سے منقول ہے، یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

من احبنی واحب هذین واباهما وامهما کان معی فی درجتی یوم القیامة۔

"جس شخص نے مجھ سے اور ان دونوں (حسنؓ و حسینؓ) سے اور ان دونوں کے باپ اور ان دونوں کی ماں سے محبت رکھی وہ قیامت کے دن میرے ساتھ ہو گا۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

لیکن آنحضرت ﷺ، حضرت علیؓ اور اہل بیت نبوی سے محبت کا عین تقاضہ یہ ہے کہ ان سب صحابہؓ سے محبت و عقیدت رکھنی چاہئے جن سے آنحضرت ﷺ، حضرت علیؓ، اور اہل بیت نبوی ﷺ محبت و تعلق رکھتے تھے جس طرح حضرت علیؓ کی محبت ایمان کی علامت ہے اسی طرح تمام صحابہ کی محبت ایمان کی علامت ہے اور جس طرح حضرت علیؓ سے بغض رکھنا نفاق کی نشانی ہے اسی طرح دوسرے کسی بھی صحابیؓ سے بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے، ابن عساکرؒ نے حضرت جابرؓ سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

حب ابی بکر و عمر من الایمان وبغضهما کفر و حب الانصار من الایمان وبغضهم کفر و حب العرب من الایمان وبغضهم کفر و من سب اصحابی فعلیه لعنة الله ومن حفظنی فیهم انا احفظه یوم القیٰمة۔

"ابوبکرؓ و عمرؓ کی محبت جزو ایمان ہے اور ان سے بغض کفر ہے انصار کی محبت جزو ایمان ہے اور ان سے بغض کفر ہے اہل عرب کی محبت جزو ایمان ہے اور ان سے بغض کفر ہے اور جس شخص نے میرے صحابہؓ کو سب و شتم کیا اس پر اللہ کی لعنت ہو اور جس شخص نے صحابہؓ کو (دوسروں کے سب و شتم سے بچایا اس کو قیامت کے دن کی ہولناکیوں اور سختیوں سے) میں بچاؤں گا۔"

غزوہ خیبر کے دن سرفرازی

③ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَ خَيْبَرَ لَاُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَلَمَّا اَصْبَحَ النَّاسُ غَدَوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّهُمْ يَرْجُوْنَ اَنْ يُّعْطَاهَا فَقَالَ اَيْنَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَالُوْا هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ يَشْتَكِيْ عَيْنَيْهِ قَالَ فَاَرْسِلُوْا اِلَيْهِ فَاُتِيَ بِهٖ فَبَصَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ عَيْنَيْهِ فَبَرَأَ حَتّٰى كَاَنْ لَّمْ يَكُنْ بِهٖ وَجَعٌ فَاَعْطَاهُ الرَّايَةَ فَقَالَ عَلِيٌّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُقَاتِلُهُمْ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مِثْلَنَا قَالَ انْفُذْ عَلٰى رِسْلِكَ حَتّٰى تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ وَاَخْبِرْهُمْ

بِمَا يَجِبُ عَلَيْهِمْ مِنْ حَقِّ اللّٰهِ فِيْهِ فَوَاللّٰهِ لَاَنْ يَهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ تَكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَذُكِرَ حَدِيْثُ الْبَرَآءِ لِعَلِيٍّ اَنْتَ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْكَ فِيْ بَابِ بُلُوْغِ الصَّغِيْرِ۔

"اور حضرت سہل بن سعدؓ ساعدی سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے غزوۂ خیبر کے دن فرمایا: "کل میں یہ جھنڈا (کہ جو کمانداری کی علامت ہے) ایک ایسے شخص کو عطا کروں گا کہ جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا اور وہ شخص اللہ اور اللہ کے رسول کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اور اللہ کا رسول اس کو دوست رکھتے ہیں" چنانچہ تمام صحابہؓ نے اس انتظار اور شوق میں پوری رات جاگ کر گزاری کہ دیکھئے کل صبح یہ سرفرازی کس کے حصہ میں آتی ہے اور جب) صبح ہوئی تو ہر شخص اس آرزو کے ساتھ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ جھنڈا اسی کو ملے، آنحضرت ﷺ نے (تمام صحابہؓ پر نظر ڈال کر فرمایا کہ "علی ابن ابی طالب کہاں ہیں" دراصل حضرت علیؓ آشوب چشم میں مبتلا ہو گئے تھے اور اس وجہ سے اس وقت وہاں حاضر نہیں تھے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آنکھوں نے ان کو پریشان کر رکھا ہے (اور اس عذر کی بنا پر وہ یہاں موجود نہیں ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کسی کو بھیج کر ان کو بلوا لو، چنانچہ حضرت علیؓ کو بلا کر لایا گیا، رسول کریم ﷺ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں ڈالا اور وہ آنکھیں اکدم اس طرح اچھی ہو گئیں جیسے ان میں کوئی تکلیف اور خرابی تھی ہی نہیں، اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کو جھنڈا عطا فرمایا۔ حضرت علیؓ (اس سرفرازی سے بہت خوش ہوئے اور) بولے: یا رسول اللہ! میں ان لوگوں (دشمنوں سے) اس وقت تک لڑتا رہوں جب تک وہ ہماری طرح (مسلمان نہ ہو جائیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جاؤ اور نرمی و بردباری کے ساتھ چل کر ان (دشمنوں) کے علاقہ میں پہنچو، پھر (سب سے پہلے) ان کو اسلام کی دعوت دو اور ان کو اللہ کے وہ حقوق بتاؤ جو اسلام میں ان پر عائد ہوتے ہیں (اور پھر اگر وہ دعوت اسلام کو ٹھکرا دیں تو ان سے جزیہ طلب کرو، اگر وہ جزیہ پر صلح کرنے سے انکار کر دیں تو پھر آخر میں ان کے خلاف اعلان جنگ کرو اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں یا جزیہ دے کر اسلامی نظام کی سیاسی اطاعت قبول کرنے پر تیار نہ ہو جائیں) پس (اے علیؓ) خدا کی قسم، یہ بات کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے، تمہیں ملنے والے سرخ اور چوپائیوں سے کہیں بہتر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "خیبر" ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے ساٹھ میل دور ملک شام کی سمت واقع ہے، یہ غزوہ ۷ھ میں پیش آیا تھا۔

"پس (اے علیؓ) خدا کی قسم ......" آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کی جو راہ نمائی فرمائی تھی کہ کفار کو اپنے اسلام کی دعوت دیں تو اسی کی تاکید کے لئے آپ ﷺ نے آگے کے جملے قسم کھا کر ارشاد فرمائے، اس پر تاکید راہنمائی کی وجہ یہ احساس تھا کہ جنگ و قتال کی صورت میں اگرچہ مال غنیمت مثلاً اعلیٰ و عمدہ اونٹ اور چوپائے وغیرہ حاصل ہوتے ہیں لیکن اگر کفار کو نرمی و بردباری کے ساتھ اسلام کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ دعوت اکثر بارآور ہو جاتی ہے اور مخالفین اسلام کی بڑی تعداد جنگ و جدل کے بغیر مسلمان ہو جاتی ہے جو اسلام کا اصل منشاء و مقصد ہے علامہ ابن ہمام نے اسی بنیاد پر بڑی پیاری بات کہی ہے کہ: ایک مؤمن کا پیدا کرنا ہزار کفار کو معدوم کرنے سے بہتر ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

کمال قرب و تعلق کا اظہار

④ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ عَلِيًّا مِنِّيْ وَاَنَا مِنْهُ وَهُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ۔

(رواہ الترمذی)

"حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ علیؓ مجھ سے اور میں علیؓ سے ہوں نیز وہ علیؓ تمام

اہل ایمان کے دوست و مددگار ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "علیؓ مجھ سے ہیں........" یہ ارشاد گرامی دراصل کمال قرب و تعلق اخلاص و یگانگت اور نسب و نسل میں باہم اشتراک سے کنایہ ہے وہ (علیؓ) تمام اہل ایمان........ ان الفاظ میں قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔

"تمہارے دوست و مددگار تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اہل ایمان ہیں جو اس طرح نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں کہ ان میں خشوع ہوتا ہے۔"

⑤ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں جس کا دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جس شخص کو میں دوست رکھتا ہوں اس کو علیؓ بھی دوست رکھتے ہیں، اور ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص میرا حامی و مددگار اور دوست ہے اس کے حامی و مددگار اور دوست علی ہوتے ہیں، اس حدیث کی باقی وضاحت آگے تیسری فصل میں آرہی ہے۔

⑥ وَعَنْ حُبْشِيِّ بْنِ جُنَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلِيٌّ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْ عَلِيٍّ وَلَا يُؤَدِّيْ عَنِّيْ اِلَّا اَنَا اَوْ عَلِيٌّ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ اَبِيْ جُنَادَةَ۔

"اور حضرت حبشی بن جنادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "علیؓ مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں، میری طرف سے (نبذ عہد کی ذمہ داری) کوئی ادا نہ کرے علاوہ میرے اور علیؓ کے، (ترمذی اور احمدؒ نے اس روایت کو "ابو جنادہ" سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: کسی معاہدہ کو اس طرح توڑنا کہ فریق ثانی کو پہلے سے مطلع کر دیا گیا ہو "نبذ عہد" کہلاتا تھا، دراصل اہل عرب میں یہ اصول رائج تھا کہ جب دو فریقوں کے درمیان کسی صلح اور مفقیہ باہمی کا وصل قرار ہوتا یا کسی صلح اور معاہدہ کو توڑنا ہوتا تو اس سلسلہ کی ضروری کاروائی اور بات چیت کی ذمہ داری ہر فریق میں سے صرف وہ شخص انجام دیتا ہے جو اپنی قوم و جماعت کا سردار اور سربراہ ہوتا، یا پھر اس کی عدم موجودگی میں اس کی نیابت صرف وہ شخص کر سکتا تھا جو اس (سردار و سربراہ) کا قریب ترین عزیز و رشتہ دار ہوتا، اس حدیث کا پس منظریہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد ۹ھ کے حج کے موقع پر بعض اہم دینی و ملی مصروفیات کے سبب آنحضرت ﷺ حج کے لئے تشریف نہ لے جا سکے تو آپ ﷺ نے اپنی جگہ حضرت ابوبکرؓ کو "امیر الحج" بنا کر مکہ روانہ کیا حضرت ابوبکرؓ کی روانگی کے بعد آنحضرت ﷺ پھر حضرت علیؓ کو مکہ روانہ کیا اور ان کو اپنی طرف سے یہ ذمہ داری سپرد کی کہ وہ حج کے موقعہ پر اس صلح نامہ اور معاہدہ کی منسوخی کے فیصلہ کا اعلان کریں جو تین سال قبل ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر آنحضرت ﷺ اور قریش مکہ کے درمیان عمل میں آیا تھا، سورۂ براہ (سورہ توبہ) مشرکوں کو پڑھ کر سنائیں جس میں اس بات سے متعلق آیتیں نازل ہوئی تھیں، اور یہ اعلان کر دیں کہ مشرک نجس و ناپاک ہیں اس کے بعد کوئی مشرک مسجد حرام کے پاس نہ آئے اور اس ضمن میں جو دوسرے احکام و فرامین نازل ہوئے ہیں ان سے سب کو آگاہ کر دیں، اسی موقع پر آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی جس کا مقصد حضرت علیؓ کی عزت افزائی بھی تھا اور حقیقت میں مذکورہ ذمہ داری حضرت ابوبکرؓ کے سپرد نہ کئے جانے کا عذر بیان کرنا بھی تھا کہ "امیر الحج" ہونے کی حیثیت سے اس سفر حج میں دربار رسالت کا نمائندہ اول تو ابوبکرؓ ہیں لیکن عرب میں رائج اصول کی مجبوری کے تحت نقض عہد (معاہدہ کی منسوخی) کے اعلان کی ذمہ داری علیؓ کے سپرد کی گئی ہے، اسی لئے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علیؓ سے اسی وقت وضاحت کرالی تھی جب وہ پیچھے سے آکر ان کے قافلہ میں شامل ہوئے کہ تم "امیر" ہو کر آئے ہو یا "مامور" ہو کر حضرت علیؓ نے واضح کیا کہ میں "امیر" ہو کر نہیں آیا ہوں "مامور" ہو کر آیا ہوں۔

اس واقعہ سے محققین یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اس میں در حقیقت اس طرف اشارہ تھا کہ علیؓ کی خلافت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے بعد قائم ہوگی۔

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ اٰخٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَ اَصْحَابِہٖ فَجَاءَ عَلِیٌّ تَدْمَعُ عَیْنَاہُ فَقَالَ اٰخَیْتَ بَیْنَ اَصْحَابِکَ وَلَمْ تُوَاخِ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اَحَدٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہؓ کے درمیان بھائی چارہ قائم کرایا. تو حضرت علیؓ اس حال میں (آنحضرت ﷺ کے پاس) آئے کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور عرض کیا کہ آپ (ﷺ) نے اپنے اور صحابہؓ کے درمیان تو بھائی چارہ قائم فرمادیا لیکن کسی سے میرا بھائی چارہ قائم نہیں کیا؟ (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ نے (ان سے) فرمایا: تم میرے بھائی ہو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے پر سب سے پہلے جس چیز کی طرف خصوصی توجہ دی وہ باشندگان مدینہ یعنی انصار اور مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین کے درمیان برادرانہ بنیادوں پر مخلصانہ و مستحکم تعلق قائم کرانا تھا، چنانچہ مدینہ پہنچنے کے پانچویں ہی ماہ آپ ﷺ نے ایک دن تمام انصار اور مہاجرین کو جمع کر کے اخوت اسلامی کا آفاقی فلسفہ پیش کیا اور انفرادی سطح پر عموماً ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم فرمایا۔

حضرت علیؓ ان چند صحابہؓ میں سے ایک تھے جن کا کسی کے ساتھ بھائی چارہ قائم نہیں ہوا تھا اس پر حضرت علیؓ کو سخت ملال ہوا اور وہ سمجھے کہ شاید مجھے نظر انداز کر دیا گیا ہے، لہٰذا وہ روتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور شکوہ کیا کہ آپ (ﷺ) نے دوسرے صحابہؓ جیسے حضرت ابوبکرؓ اور خارجہ ابن زبیر انصاریؓ کے درمیان حضرت عمر فاروقؓ، اور حضرت عتبان بن مالک انصاری کے درمیان حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت ثابت بن منذر انصاریؓ کے درمیان اور حضرت سلمانؓ و حضرت ابو درداء انصاریؓ وغیرہ وغیرہ کے درمیان تو بھائی چارہ قائم کر کے ان کو ایک دوسرے کا دینی بھائی بنا دیا ہے لیکن کسی انصاری صحابی کے ساتھ میرا بھائی چارہ قائم نہیں فرمایا، اس پر آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں تو تمہارا بھائی موجود ہی ہوں، دنیاوی رشتہ و قرابت کے اعتبار سے بھی. تو پھر تمہیں کیا ضرورت ہے کسی کے ساتھ تمہارا بھائی چارہ قائم کراؤں۔

علی خدا کے محبوب ترین بندے

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَیْرٌ فَقَالَ اللّٰھُمَّ ائْتِنِیْ بِاَحَبِّ خَلْقِکَ اِلَیْکَ یَاْکُلُ مَعِیَ ھٰذَا الطَّیْرَ فَجَاءَہٗ عَلِیٌّ فَاَکَلَ مَعَہٗ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہی کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے سامنے (بھنا یا پکا ہوا) پرندہ رکھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے دعا مانگی: "اے اللہ! تیری مخلوق میں جو بہت زیادہ تجھ کو محبوب ہو اس کو میرے پاس بھیج دے تاکہ وہ میرے ساتھ اس پرندہ کا گوشت کھائے" پس حضرت علیؓ آئے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ کھایا، اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث "غریب" ہے۔"

تشریح: ابن جوزیؒ کا کہنا تو یہ ہے کہ یہ حدیث "موضوع" ہے لیکن حاکمؒ نے اس کو "موضوع" قرار دیا ہے نیز "مختصر" میں یہ لکھا ہے کہ یہ روایت گو بہت سے طرق سے منقول ہے مگر وہ سارے طرق ضعیف ہیں، بہرحال یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اللہ کے نزدیک اس کی مخلوق میں محبوب ترین بندے تھے۔ تاہم شارحین نے حدیث کا یہ مطلب بعض تخصیصات و قیود کے

ساتھ بیان کیا ہے مثلاً یہ کہ سیدنا علیؓ اللہ کے محبوب ترین بندے تھے، سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ترین بندوں میں سے ایک تھے یا یہ کہ آنحضرت ﷺ کے عم زادوں یا آپ ﷺ کے قریب ترین رشتہ داروں میں اللہ کے محبوب ترین بندے سیدنا علیؓ تھے اور یا یہ مراد ہے کہ: آنحضرت ﷺ کے حسن سلوک اور احسان کا ترجیحی بنیاد پر سب سے زیادہ استحقاق رکھنے والوں میں اللہ کے نزدیک اس کے محبوب ترین بندے سیدنا علیؓ تھے۔ ان تحقیقات اور قیود سے شارحین کا مقصد غالباً یہ ہے کہ الفاظ حدیث سے یہ مطلب اخذ کیا جاسکے کہ سیدنا علیؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ سے بھی زیادہ محبوبیت رکھتے تھے، حالانکہ حقیقت میں ان تخصیصات وقیود کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اول تو یہ یقینی بات ہے کہ حدیث میں "مخلوق" سے علی العموم تمام مخلوق مراد نہیں ہے، اگر علی العموم تمام مخلوق مراد لی جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ سیدنا علیؓ کا مرتبہ آنحضرت ﷺ سے بھی بڑھا ہوا تھا جو نہ صرف یہ کہ علی الطلاق محبوب ترین بندے ہیں بلکہ سید المحبوبین اور افضل المخلوقین بھی ہیں، اس لئے آنحضرت ﷺ پر سیدنا علیؓ کو کیا کسی کو بھی فضیلت نصیب ہی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی خاص نسبت اور کسی مخصوص حیثیت کے اعتبار سے سیدنا علیؓ کا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے بھی محبوب تر بندہ ہونا ثابت ہو تو بجمیع وجوہ مراد نہ ہونے کے سبب اس کو ابوبکرؓ و عمرؓ پر علیؓ کی جزوی فضیلت کہیں گے اور یہ جزوی فضیلت ان دونوں کی اس کلی فضیلت کے منافی ہرگز نہیں ہوگی جو کثرت اجر اور ثواب کی بنا پر اور بجمیع وجوہ ان کو حاصل ہے، لہٰذا روافض اگر اس حدیث سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل پر دلیل لیتے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ پر ان کی کلی فضیلت و برتری ثابت کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی نادانی ہے۔ ان کو دیکھنا چاہئے کہ اس طرح کے الفاظ حضرت عمرؓ کی منقبت میں بھی منقول ہیں، جیسے ایک حدیث میں فرمایا گیا ما طلعت الشمس علی خیر من عمر (عمرؓ سے بہتر کسی انسان پر سورج طلوع نہیں ہوا) یا ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں ارفع درجة فی الجنة عمر (جنت میں عمرؓ کا درجہ بلند تر ہوگا) تو کیا ان حدیث کے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے روافض و شیعہ یہ تسلیم کریں گے کہ علی العموم تمام انسانوں میں سب سے زیادہ افضل و اعلی حضرت عمرؓ ہیں کیونکہ ان حدیث سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ روئے زمین پر عمرؓ سے بہتر کوئی انسان نہیں اور جنت میں کسی کا بھی درجہ عمرؓ سے بلند نہیں ہوگا، ظاہر ہے اہل رفض و تشیع اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ یہ مطلب تو اہل سنت و الجماعت بھی مراد نہیں لیتے بلکہ چند تخصیصات وقیود کے ساتھ الفاظ حدیث کا مطلب بیان کرتے ہیں تو پھر حضرت علیؓ سے متعلق اس روایت کو مطلق اس کے ظاہری معنی پر محمول کر کے ان کی علی الاطلاق افضیلت پر ان روافض اور شیعوں کو اصرار کیوں ہے، ایک بات اہل سنت سے بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ "افضلیت" کا مسئلہ "ظنی" ہے اس کو ایمان و کفر کا معاملہ نہ بنانا چاہئے، اسی طرح اس روایت کو موضوع قرار دینے پر زور صرف کرنا چاہئے، فنی اور تحقیقی طور پر کتنا ہی درست ہو مگر ظاہری طور پر اس کو شدت و تنگی بلکہ تعصب پر محمول کیا جانا مستبعد نہیں ہے۔

عطاء و بخشش کا خصوصی معاملہ

(۹) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اِذَا كُنْتُ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَانِيْ وَاِذَا سَكَتُّ ابْتَدَأَنِيْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ. وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ سے جب بھی کچھ مانگتا تو آپ ﷺ عطا فرما دیتے اور جب میں خاموش رہتا یعنی مانگنے سے حجاب برتتا تو آپ ﷺ از خود دے دیتے تھے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

علیؓ علم و حکمت کا دروازہ ہیں

(۱۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَقَالَ رَوٰى بَعْضُهُمْ هٰذَا الْحَدِيْثَ عَنْ شَرِيْكٍ وَلَمْ يَذْكُرُوْا فِيْهِ عَنِ الصُّنَابِحِيِّ وَلَا نَعْرِفُ هٰذَا الْحَدِيْثَ عَنْ

اَحَدٍ مِنَ الثِّقَاتِ غَیْرَ شَرِیْكٍ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "میں حکمت و دانائی کا گھر ہوں اور علیؓ اس گھر کا دروازہ ہیں" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ حدیث غریب ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ: بعض راویوں نے اس حدیث کو شریک تابعیؒ سے نقل کیا ہے لیکن ان کی اس حدیث کی اسناد میں صنابحیؒ کا ذکر نہیں ہے (جیسا کہ ان کی اور روایتوں کے سلسلہ اسناد میں اس نام کا ذکر آتا ہے) نیز اس روایت کو ثقات میں سے شریکؒ کے علاوہ اور کسی سے ہم نہیں جانتے۔"

تشریح: ایک روایت میں یوں آیا ہے انا مدینة العلم و علی بابها (یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس شہر کا دروازہ ہیں) ایک اور روایت میں آگے یہ الفاظ بھی ہیں فمن اراد العلم فلیاته من بابه (یعنی پس جو شخص حصول علم کا آرزو مند ہو اس کو اس دروازہ کے ذریعہ آنا چاہئے۔

بہر حال "علیؓ دروازہ ہیں" سے یہ مراد نہیں ہے کہ تنہا علیؓ ہی دروازہ ہیں، بلکہ یہ معنی مراد ہیں کہ علیؓ دروازوں میں سے ایک دروازہ ہیں تاہم اس معنی میں بھی صرف حضرت علیؓ کا ذکر ان کی فضیلت اور تکریم کو ظاہر کرتا ہے اور واقع میں حضرت علیؓ ایسا رتبہ رکھتے بھی ہیں، اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ طبقہ صحابہؓ میں علم و حکمت کا جو خصوصی درجہ کمال سیدنا علیؓ کو حاصل ہے وہ چند ہی صحابہؓ کو نصیب ہوا اور اس اعتبار سے سیدنا علیؓ کو اگر اکثر صحابہؓ کی بہ نسبت سب سے زیادہ علمی فضیلت و بزرگی رکھنے والا کہا جائے تو غیر موزوں نہیں ہوگا۔ رہی یہ بات کہ اس روایت کے ظاہری معنی کے مطابق تنہا علیؓ کو دروازہ کیوں قرار دیا جائے اور دوسرے صحابہ کو بمنزلہ در دروازہ کیوں مانا جائے، تو اس سلسلہ میں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیا جائے کہ آنحضرت ﷺ سے اکتساب فیض کرنے والے تمام ہی صحابہؓ اُمت کے لئے مدار علم ہیں، اُمت تک دین کا جو بھی علم پہنچا ہے وہ تمام صحابہؓ نے مشترک طور پر پہنچایا ہے، کسی بھی صحابیؓ کے بارہ میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اُمت کو علم نبوت تنہا اسی نے منتقل کیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے بعد علوم دین کا واحد مدار اسی کی ذات ہے۔ اس کی دلیل میں بہت سی حدیثیں پیش کی جا سکتی ہیں ان میں سے ایک حدیث تو آنحضرت ﷺ کا یہی ارشاد ہے کہ: اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم میرے تمام صحابہؓ آسمان ہدایت کے ستارے ہیں ان میں سے جس کی بھی اقتداء کرو گے ہدایت پاؤ گے علاوہ ازیں یہ بات تاریخی اور واقعاتی طور پر ثابت شدہ ہے کہ تابعینؒ نے دین و شریعت کے جو مختلف علوم و فنون اخذ کئے جیسے قرأۃ تجوید، تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ، وہ سب انہوں نے تنہا حضرت علیؓ سے اخذ نہیں کئے بلکہ تمام صحابہؓ سے اخذ کئے ہیں لہٰذا اس کے علاوہ چارہ نہیں کہ "بابیت یعنی علم و حکمت کے شہر کے دروازہ ہونے) کو تنہا حضرت علیؓ کے حق میں منحصر نہ رکھا جائے۔ ہاں اگر قضا (عدالت و منصفی) کے علم و فن کے ساتھ مخصوص کر کے حضرت علیؓ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ان کی ذات۔ بے مثال تھی اور اس باب میں وہ تمام صحابہؓ پر فضیلت و برتری رکھتے تھے تو یقیناً بجا ہوگا کیونکہ ان کے حق میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے: اِنَّهٗ اقضاکم علیؓ تم سب سے بڑے قاضی ہیں جیسا کہ حضرت ابی کے حق میں فرمایا اِنَّهٗ اقراء کم (ابی تم میں سب سے بڑے قاری ہیں) اور حضرت معاذ بن جبلؓ کے حق میں فرمایا اِنَّهٗ اعلمکم بالحلال و الحرام تم میں حلال و حرام کا علم سب سے زیادہ رکھنے والے ہیں۔

علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں: شیعہ اس حدیث میں مذکور تمثیل سے تمسک کرتے ہیں کہ رسول اللہ سے علم و حکمت پہنچنے کا واحد ذریعہ حضرت علیؓ ہیں ان کے واسطہ کے بغیر کسی کو اس (علم و حکمت) میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ گھر میں داخل ہونے کا اصل ذریعہ دروازہ ہی ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہے واتو البیوت من ابوابها اور چونکہ آنحضرت ﷺ نے خود کو علم و حکمت کا گھر بتایا ہے اور اس گھر کا دروازہ حضرت علیؓ کو قرار دیا ہے، اس لئے حضرت علیؓ وہ "دروازہ" ہیں جس کے ذریعہ علم و حکمت کے "گھر" میں رسائی ہو سکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیعہ جو کچھ کہتے ہیں اس کی ذرہ برابر دلیل اس حدیث میں نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت علیؓ کو علم و حکمت کا گھر جنت کے گھر سے زیادہ وسیع و فراخ نہیں ہے؟ جب جنت کے آٹھ دروازے ہیں تو علم و حکمت کے گھر کے دروازے اس

سے زیادہ کیوں نہیں ہوسکتے۔

آخر میں یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ اس حدیث کا اصل ناقل ابی الصلت عبد السلام بن صلاح ہروی ہے جو اگرچہ شیعہ ہے، لیکن محدثین کے نزدیک "راست گو" ہے علاوہ ازیں اس حدیث کے بارے میں محدثین کے اختلافی اقوال ہیں بعض محدثین نے اس کو "صحیح" کہا ہے تو بعض نے حسن۔ اسی طرح بعض نے اس کو "ضعیف" قرار دیا ہے تو بعض نے کہا ہے کہ "منکر" ہے یحیی بن معین نے کہا ہے کہ اس حدیث کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور کچھ لوگوں نے اس کو "موضوع" قرار دینے کی بھی کوشش کی ہے تاہم حافظ ابوسعید نے وضاحت کردی ہے کہ یہ حدیث باعتبار طرق کے "حسن" ہے نہ صحیح ہے نہ ضعیف اور نہ موضوع، نیز محدثین نے اس حدیث کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے: انامدینة العلم و ابو بکر اساسها و عمر حیطانها و عثمان سقفها و علی بابها یعنی: میں علم کا شہر ہوں، ابوبکر اس شہر کی بنیاد ہیں، عمرؓ اس شہر کی فصیل ہیں، عثمانؓ اس شہر کی چھت ہیں اور علیؓ اس شہر کا دروازہ ہیں۔

خاص فضیلت

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلِيًّا يَوْمَ الطَّائِفِ فَانْتَجَاهُ فَقَالَ النَّاسُ لَقَدْ طَالَ نَجْوَاهُ مَعَ ابْنِ عَمِّهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا انْتَجَيْتُهٗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ انْتَجَاهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ طائف کے دن رسول اللہ ﷺ نے علیؓ کو بلایا اور ان سے سرگوشی کرنے لگے (یعنی ایسا نظر آرہا تھا جیسے کسی خاص مسئلہ پر ان کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کررہے ہیں اور جب ان باتوں کا سلسلہ کچھ دراز ہوگیا) تو (منافقین نے یا صحابہؓ میں سے عام) لوگوں نے کہا: اپنے چچا کے بیٹے کے ساتھ تو رسول اللہ نے بڑی دیر تک کاناپھوسی کی؟ رسول اللہ ﷺ نے (یہ سنا تو) فرمایا: "علی کے ساتھ میں نے سرگوشی نہیں کہ بلکہ اللہ نے ان سے سرگوشی کی ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "بلکہ اللہ نے سرگوشی کی"، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا تھا کہ بعض باتیں چپکے چپکے علیؓ تک پہنچادوں، اس لئے حکم الٰہی کی تعمیل میں میں نے ان کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کی ہیں نہ کہ میں ان کے ساتھ وہ کاناپھوسی کررہا تھا جو آداب مجلس کے خلاف ہے اور چونکہ وہ سرگوشی اللہ کے حکم کی تعمیل میں تھی لہٰذا اس صورت میں گویا اللہ نے ان سے سرگوشی کی، مصداق کے اعتبار سے یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسا ایک آیت قرآن کا یہ فقرہ:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔

"اور آپ ﷺ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی بلکہ وہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔"

اس سلسلہ میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ حضرت علیؓ سے آنحضرت ﷺ کی اس سرگوشی کا موضوع دراصل اس غزوہ کی بابت کچھ ایسے نقطے اور راز کی باتیں بتانا تھیں جن کا تعلق دین کے ضمن میں آنے والے دنیاوی انتظام و معاملات سے تھا اور جن کا برسرعام تذکرہ حکمت و پالیسی کے خلاف تھا یہ نہیں کہ آپ ﷺ نے منجانب اللہ نازل شدہ دین کی کوئی بات یا دینی امور سے متعلق کچھ احکام سب لوگوں سے چھپا کر حضرت علیؓ کو دیئے خود حضرت علیؓ نے اس طرح کے خیال کے مبنی بر حقیقت ہونے کی تردید کی ہے، چنانچہ بخاری کی روایت میں ہے کہ: جب کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی ایسی چیز (یعنی کوئی ایسا خدائی حکم و فرمان) ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے! حضرت علیؓ نے جواب دیا اس ذات کی قسم جس نے زمین سے دانہ اگایا اور ذی روح کو پیدا کیا، میرے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں جو قرآن میں موجود ہے، ہاں کتاب اللہ کی وہ سمجھ مجھے حاصل ہے جو (حق تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کے تحت) کسی کو حاصل ہوتی ہے اور یہ ایک صحیفہ میرے پاس ہے (جس میں وراثت و دیت وغیرہ کے کچھ احکام لکھے ہوئے ہیں)۔

خصوصی فضیلت

⑫ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِعَلِیٍّ یَا عَلِیُّ لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ یُجْنِب فِیْ ھٰذَا الْمَسْجِدِ غَیْرِیْ وَغَیْرُكَ قَالَ عَلِیُّ بْنُ الْمُنْذِرِ فَقُلْتُ لِضِرَارِبْنِ صُرَدٍ مَا مَعْنٰی ھٰذَا الْحَدِیْثِ قَالَ لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ یَسْتَطْرِقُهٗ جُنُبًا غَیْرِیْ وَغَیْرُكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا اے علیؓ! میرے اور تمہارے سوا کسی کو جائز نہیں کہ وہ جنابت یعنی ناپاکی کی حالت میں مسجد میں آئے "علی بن منذر کا بیان ہے کہ میں نے ضرار ابن صردؒ سے پوچھا کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے بتایا! (اس کے معنی یہ ہیں کہ) میرے اور تمہارے سوا کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ جنابت یعنی ناپاکی کی حالت میں مسجد کو گزر گاہ بنائے اور اس کے اندر سے آئے جائے، اس کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے (لیکن جزریؒ کا کہنا یہ ہے کہ متفقہ طور پر تمام محدثین نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے)۔"

تشریح: اتفاق سے آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ کے گھروں کے دروازے مسجد نبوی کے اندر واقع تھے اور اپنے اپنے گھر میں آنے جانے کے لئے ان کو مسجد میں سے گزرنا پڑتا تھا۔

علی ابن منذر تیسری ہجری کی ایک مشہور ہستی ہیں، اونچا علمی مقام تو رکھتے ہی تھے لیکن عابد وزاہد ہونے کے اعتبار سے بھی امتیازی شخصیت کے مالک تھے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پچپن حج کئے۔ ائمہ حدیث کی ایک جماعت سے حدیث سننے اور روایت کا شرف ان کو حاصل ہے، اگرچہ شیعہ تھے لیکن مستند فقیہ اور محدثین کی اصطلاح میں "صدوق" مانے گئے ہیں اور ابن حبان نے ان کا ذکر ثقہ راویان حدیث میں کیا ہے۔

محبوب رسول خدا

⑬ وَعَنْ اُمِّ عَطِیَّةَ قَالَتْ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَیْشًا فِیْھِمْ عَلِیٌّ قَالَتْ فَسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ رَافِعٌ یَدَیْہِ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ لَا تُمِتْنِیْ حَتّٰی تُرِیَنِیْ عَلِیًّا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ام عطیہؓ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے کسی جنگی مہم پر) ایک لشکر روانہ فرمایا تو اس میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے، ام عطیہ کا بیان ہے کہ اس موقعہ پر (جب کہ آپ ﷺ لشکر کو رخصت کر رہے تھے یا لشکر کی واپسی کا دن قریب تھا) میں نے رسول کریم ﷺ کو ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگتے سنا! "الٰہی مجھ کو اس وقت تک موت نہ دینا جب تک کہ تو علیؓ کو (عافیت و سلامتی کے ساتھ واپس لا کر) مجھ کو نہ دکھادے"۔ (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے اس چیز کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے کس درجہ تعلق اور کتنی شدید محبت تھی کہ ان کی جدائی سے آپ ﷺ دل گرفتہ ہوجاتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

علیؓ سے بغض رکھنے والا منافق ہے

⑭ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُحِبُّ عَلِیًّا مُنَافِقٌ وَلَا یُبْغِضُهٗ مُؤْمِنٌ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ اِسْنَادًا۔

"حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا علی سے منافق محبت نہیں رکھتا اور (کامل) مومن علیؓ سے بغض اور دشمنی نہیں رکھتا۔ اس روایت کو احمدؒ و ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث باعتبار اسناد کے غریب ہے۔"

علیؓ کو برا کہنا حضور ﷺ کو برا کہنا ہے

(۱۵) وعنہ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سب علیا فقد سبنی۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے (نسب و نسل کے اعتبار سے) علیؓ کو برا کہا اس نے درحقیقت مجھ کو برا کہا۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں بدگوئی اور فحش کلامی کرنا گویا آنحضرت ﷺ کی شان میں بدگوئی اور فحش کلامی کرنا ہے پس حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ جو شخص حضرت علیؓ کی شان میں بدگوئی کرے ان کو کافر قرار دیا جانا چاہئے یا یہ کہا جائے کہ یہ حدیث دراصل تہدید و وعید پر محمول ہے یا یہ کہ بدگوئی کرنے والے کو کافر اس صورت میں قرار دیا جائے گا جبکہ وہ ان کی شان میں بدگوئی کو حلال جانے۔

اس روایت کو حاکمؒ نے بھی نقل کیا ہے، نیز طبرانیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ۔ من سب اصحابی فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین جس شخص نے میرے صحابہؓ کی شان میں بدگوئی کی اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت۔

اور طبرانیؒ ہی نے حضرت علیؓ سے یوں نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

من سب الانبیاء قتل ومن سب اصحابی جلد۔

"انبیاء کی شان میں بدگوئی کرنے والے کو قتل کر دیا جائے اور میرے صحابہؓ کی شان میں بدگوئی کرنے والے کو کوڑے لگائیے جائیں۔"

ایک مثال ایک پیش گوئی

(۱۶) وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْكَ مَثَلٌ مِّنْ عِیْسٰی اَبْغَضَتْہُ الْیَهُوْدُ حَتّٰی بَهَتُوْا اُمَّهٗ وَاَحَبَّتْهُ النَّصَارٰی حَتّٰی اَنْزَلُوْهُ بِالْمَنْزِلَةِ الَّتِیْ لَیْسَتْ لَهٗ ثُمَّ قَالَ یَهْلِكُ فِیَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ یُقَرِّظُنِیْ بِمَا لَیْسَ فِیَّ وَمُبْغِضٌ یَحْمِلُهٗ شَنَانِیْ عَلٰی اَنْ یَّبْهَتَنِیْ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا، "تم میں عیسیٰ علیہ السلام سے ایک طرح کی مشابہت ہے یہودیوں نے ان (عیسیٰ) سے بغض و عناد رکھا تو اتنا زیادہ رکھا کہ ان کی ماں (مریم) پر (زنا کا) بہتان باندھا اور عیسائیوں نے ان سے محبت و وابستگی قائم کی تو اتنی (زیادہ اور غلو کے ساتھ قائم کی) کہ ان کو اس مرتبہ و مقام پر پہنچا دیا جو ان کے لئے ثابت نہیں ہے (یعنی ان کو "اللہ" یا "ابن اللہ" قرار دے ڈالا) یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت علیؓ نے کہا (مجھے یقین ہے کہ اس ارشاد نبوی ﷺ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح میرے بارے میں بھی) دو شخص یعنی دو گروہ اس طرح ہلاک (یعنی گمراہ) ہوں گے کہ ان میں سے ایک تو جو مجھ سے محبت رکھنے والا ہوگا اور اس محبت میں حد سے متجاوز ہوگا، مجھ کو ان خوبیوں اور بڑائیوں کا حامل قرار دے گا جو مجھ میں نہیں ہوں گی، اور ایک جو مجھ سے بغض و عناد رکھنے والا ہوگا، میری دشمنی سے مغلوب ہو کر مجھ پر بہتان باندھے گا۔" (احمدؒ)

تشریح: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں جو پیش گوئی فرمائی اور جس کی طرف خود حضرت علیؓ نے واضح طور پر اشارہ کیا وہ پوری ہو کر رہی۔ روافض اور شیعوں نے حب علیؓ میں حد سے اس قدر تجاوز کیا کہ تمام

صحابہؓ پر یہاں تک کہ انبیاء پر ان کی فضیلت کے قائل ہوئے بلکہ بعض طبقوں (جیسے نصیریوں وغیرہ) نے تو حضرت علیؓ کو مقام الوہیت تک پہنچا دیا، ان کے مقابلہ پر دوسرا گروہ وہ خارجیوں کا پیدا ہوا، وہ حضرت علیؓ کی دشمنی میں حد تک بڑھ گئے کہ کوئی بڑے سے بڑا بہتان ایسا نہیں چھوڑا جو ان کی پاکیزہ شخصیت پر انہوں نے نہ باندھا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ محبت وعقیدت وہی مستحسن ومطلوب ہے جو حد سے زیادہ متجاوز نہ ہو اور عقل وشریعت کے مسلمہ اصول کے مطابق ہو، ایسی محبت وعقیدت جو حد سے متجاوز ہو درحقیقت گمراہی کی طرف لے جاتی ہے اور غیر معتدل ہونے کے سبب راہ مستقیم سے باہر کر دیتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی محبت وعقیدت رکھنے والے شخص کو جو اگرچہ بظاہر مسلمان و دیندار نظر آتا ہے "گمراہ انسان" کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اہل سُنّت والجماعت کو جس چیز نے راہ مستقیم پر گامزن کر رکھا ہے وہ محبت وعقیدت کے باب میں ان کا اعتدال وتوازن ہے کہ وہ افراط اور تفریط دونوں سے محفوظ ہیں، بہر حال اہل ایمان واسلام کی زندگی کا سرمایہ سعادت دو چیزیں ہیں ایک تو خاندان نبوت کی محبت اور دوسری اصحاب نبی ﷺ کی تعظیم جو شخص اس سرمایہ سعادت کو حاصل کر کے اپنی دنیا اور عقبی بنانا چاہئے اس کو لازم ہے کہ ان دونوں کے درمیان اعتدال وتوازن رکھے اور اسی اعتدال وتوازن کے ساتھ ان دونوں کی محبت کو اپنے اندر جمع کرے۔

امام احمدؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ سیدنا علیؓ نے فرمایا:

یحبنی اقوام حتی یدخلوا النار فِیْ حبی ویبغضنی اقوام حتی یدخلوا النار فِیْ بغضی۔

"کچھ گروہ مجھ سے محبت رکھیں گے یہاں تک کہ میری محبت (میں غلو) کے سبب ان کو دوزخ میں ڈالا جائے گا اور کچھ گروہ مجھ سے دشمنی رکھیں گے یہاں تک کہ میری دشمنی کے سبب وہ دوزخ میں جائیں گے۔"

امام احمدؒ نے حضرت علیؓ کی یہ دعا نقل کی ہے۔

اللھم العن کل مبغض لنا وکل محب لنا غال۔

"الٰہی! ہم سے دشمنی رکھنے والوں پر لعنت کر اور ہمارے غالی محبین پر بھی لعنت کر۔"

غدیر خم کا واقعہ

⑰ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ وَزَيْدِ بْنِ اَرْقَمَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا نَزَلَ بِغَدِيْرِ خُمٍّ اَخَذَ بِيَدِ عَلِيٍّ فَقَالَ اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنِّيْ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا بَلٰى قَالَ اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنِّيْ اَوْلٰى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهٖ قَالُوْا بَلٰى فَقَالَ اللّٰهُمَّ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ فَلَقِيَهٗ عُمَرُ بَعْدَ ذٰلِكَ فَقَالَ لَهٗ هَنِيْئًا يَا بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ اَصْبَحْتَ وَاَمْسَيْتَ مَوْلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ وَّمُؤْمِنَةٍ۔ (رواہ احمد)

"حضرت براء بن عازبؓ اور زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے جب غدیر خم میں پڑاؤ کیا تو آپ ﷺ نے (صحابہؓ کو جمع کیا اور جیسا کہ ایک روایت میں ہے، اونٹوں کے پلانوں کا منبر بنا کر اس پر کھڑے ہوئے اور پھر) حضرت علیؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: "(اے میرے اصحاب!) یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ اہل ایمان کے نزدیک میں ان کی جانوں سے زیادہ عزیز ہوں؟ سب نے عرض کیا جی ہاں، اس کے بعد آپ ﷺ نے یوں فرمایا: تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ایک ایک مومن کے نزدیک اس کی جان سے زیادہ عزیز و محبوب ہوں! صحابہؓ نے عرض کیا: جی ہاں تب آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! جس شخص کا میں دوست ہوں علیؓ اس کا دوست ہے۔ الٰہی تو اس شخص کو دوست رکھ جو علیؓ کو دوست رکھے اور تو اس شخص کو اپنا دشمن قرار دے جو علیؓ سے دشمنی رکھے" اس واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ جب حضرت

علیؓ سے ملے تو ان سے بولے اے ابن ابی طالب مبارک ہو تم تو صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی (یعنی ہر آن و ہر لحہ) ہر مسلمان مرد و عورت کے دوست و محبوب ہو۔" (احمدؒ)

تشریح: "غدیر خم" ایک مقام کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے مابین حجفہ کے قریب واقع ہے، مکہ سے حجفہ کا فاصلہ تقریباً ۵۰، ۶۰ میل ہے اور حجفہ سے "غدیر خم" تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ۱۰ھ میں رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے سفر واپسی میں یہاں قیام فرمایا تھا اور اس وقت صحابہؓ کی بہت بڑی تعداد آپ ﷺ کے ہمراہ تھی جن کو آپ ﷺ نے جمع کر کے حضرت علیؓ کے حق میں مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔

یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ اہل ایمان کے نزدیک......... ان الفاظ کے ذریعہ آپ ﷺ نے صحابہؓ کو قرآن کریم کی اس آیت اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (نبی اہل ایمان کے نزدیک خود ان کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہیں) کی طرف متوجہ کیا، نیز ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین بار ارشاد فرمائے تھے۔

"میں ایک ایک مؤمن کے نزدیک ...." پہلے آپ ﷺ نے علی العموم "اہل ایمان" کا لفظ ارشاد فرمایا تھا، پھر اسی بات کو دوہرانے کے لئے اور زیادہ وضاحت کی خاطر "ایک ایک مؤمن" کا لفظ استعمال فرمایا۔ بہرحال ان الفاظ کے ذریعہ آپ ﷺ نے اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ ایک ایک مؤمن جو مجھ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ میں اہل ایمان کو انہی باتوں کا حکم دیتا ہوں جو ان کی دینی یا دنیاوی بھلائی و بہتری اور فلاح و نجات کی ضامن ہیں جب کہ ان کا اپنا نفس، بتقضائے بشریت ان کو برائی اور بگاڑ کی طرف بھی لے جانا چاہتا ہے، اور یہ انسان کی فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے کہ وہ جس ذات کو ہر آن اپنا خیر خواہ پاتا ہو اس کو ذات سے زیادہ عزیز و محبوب رکھے جو ہر آن یا کبھی کبھار ہی سہی بد خواہی پر آمادہ پائی جاتی ہو۔

"الٰہی تو اس شخص کو دوست رکھ ......" ایک روایت میں یہاں آپ ﷺ کے الفاظ یوں منقول ہیں:

اللهم احب من حبه وابغض من ابغضه وانصر من انصره واخذل من خذله وادر الحق معه حیث دار۔

"الٰہی! تو اس شخص کو محبوب رکھ جو علیؓ کو محبوب رکھے اور اس شخص سے بغض رکھ جو علیؓ سے بغض رکھے اور اس شخص کی مدد کر جو علیؓ کا مددگار ہو اور اس شخص کی مدد نہ کر جو علی کی مدد نہ کرے، اور حق کو علیؓ کے ساتھ رکھ کہ جدھر علی رہے ادھر ہی حق رہے۔"

شیعوں کا استدلال: شیعہ جماعت جن احادیث اور روایتوں سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل اور ان کی اولیت و افضلیت پر استدلال کرتی ہے ان میں سے اس حدیث کو وہ نہایت مضبوط اور قوی تر دلیل دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ "مولا" کے معنی "عزیز و محبوب اور مددگار" کے نہیں ہیں بلکہ دراصل یہ لفظ "اولی بالخلافت" کے معنی میں ہے، وہ اپنی دلیل میں ماقبل عبارت کے الفاظ انی اولی بالمؤمنین پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے بارہ میں جو یہ الفاظ فرمائے تھے ان کے معنی یہ ہیں کہ "میں اہل ایمان پر خود ان کے نفس سے زیادہ تصرف و حکومت کا حق رکھتا ہوں"۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ان الفاظ کے معنی "اہل ایمان کے نزدیک ان کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز و محبوب مراد ہوتے تو محض اس بات کو بیان کرنے کے لئے" صحابہؓ کو اس قدر اہتمام سے جمع کرنے ان کو اتنی اہمیت کے ساتھ اور اس پر زور انداز میں مخاطب کرنے اور حضرت علیؓ کے حق مذکورہ دعا کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہ بات اتنی واضح اور عام تھی کہ تمام صحابہ جانتے اور مانتے تھے۔ علاوہ ازیں جو دعا آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کے حق میں کی وہ اس ذات کے علاوہ اور کسی کے حق میں ہو ہی نہیں سکتی جو امام معصوم مفروض الطاعۃ ہو۔ اس طرح شیعہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس حدیث سے آنحضرت ﷺ نے پوری اُمت کے حق میں جو "ولا" اپنے لئے بیان کیا وہی "ولا" حضرت علیؓ کے

لئے بھی واضح طور پر ثابت ہوا پس یہ حدیث حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کے حق میں نص قطعی و صریح ہے۔

الزامی جواب: ماننا چاہئے کہ یہ حدیث صحیح ہے، ائمہ حدیث مثلاً امام ترمذیؒ امام نسائیؒ اور امام احمدؒ وغیرہ کی ایک جماعت نے اس کو نقل کیا ہے، اس کے طرق بھی بہت ہیں اور متعدد سلسلۂ اسناد سے منقول ہے اور ان میں سے اکثر سلسلۂ اسناد "صحاح" اور "حسان" ہیں۔ سولہ صحابہؓ اس حدیث کے راوی ہیں بلکہ امام احمدؒ نے ایک روایت میں نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنا زمانۂ خلافت میں ایک موقع پر، جب کہ ان کے مخالفین کا گروہ ان کی خلافت کو نزاعی مسلہ بنائے ہوئے تھا، لوگوں کو ایک میدان میں جمع کر کے ان سے فرمایا کہ میں تم سے ہر ایک کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تم نے غدیر خم کے مقام پر رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنا تھا وہ بیان کرو تو اس پر تیس صحابہؓ نے کھڑے ہو کر یہ حدیث بیان کی اور خلافت علیؓ کے حق میں شہادت دی۔ لہٰذا اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ بعض حضرات نے اس حدیث کے صحیح ہونے میں کلام کیا ہے یا یہ کہا ہے کہ حدیث کا آخری حصہ اللھم وال من والاہ الخ حقیقت میں اس حدیث کا جزء نہیں ہے بلکہ من گھڑت ہے اور بعد میں اس حدیث کا جزء بنایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حصہ بھی حدیث کا جزء ہے اور اس کو متعدد طرق سے نقل کیا گیا ہے جن میں اکثر کو ذہبیؒ نے "صحیح" قرار دیا ہے، لیکن جہاں تک اس حدیث سے شیعوں کے مذکورہ استدلال کا تعلق ہے تو اس کی یقیناً کوئی بنیاد نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کو ان کی ناسمجھی یا دانستہ طور پر غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا، لزامی جواب کے طور پر سب سے پہلی بات تو شیعوں سے یہ کہی جاسکتی ہے کہ خود تم اس بات پر متفق ہو کہ "امامت" کے مسئلہ میں دلیل کے نقطۂ نظر سے تواتر کا اعتبار ہے، یعنی امامت و خلافت کا استحقاق ثابت کرنے کے لئے وہی حدیث معتبر قرار پاسکتی ہے جو "متواتر" ہو، جو حدیث متواتر نہیں ہے اس کے ساتھ صحت امامت پر استدلال نہ کرنا چاہئے جب کہ یہ حدیث جس کو تم لوگ نص قطعی و صریح قرار دے کر اپنا مستدل بناتے ہو، یقینی طور پر متواتر نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے تو صحیح ہونے میں بھی اختلاف ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس اختلاف کو قبول نہیں کیا گیا۔ جن حضرات نے اس حدیث کو "مطعون" قرار دیا ہے ان میں ابوداؤد سجستانی اور ابوحاتم رازیؒ جیسے ائمہ حدیث اور ارباب عدل بھی شامل ہیں جن کی طرف علم حدیث میں رجوع کیا جاتا ہے اور جن کی ذات محدثین کے ہاں مرجع مانی جاتی ہے، علاوہ ازیں اہل حفظ و اتقان مثلاً بخاریؒ، مسلمؒ۔ واقدی اور دوسرے اکابر محدثین میں سے کسی نے بھی اس حدیث کو نقل نہیں کیا ہے جب کہ یہ حضرات حدیث کی طلب و جستجو میں شہر شہر، قریہ قریہ پھرتے تھے اور صحیح احادیث کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرتے تھے گویا بات نہ فنی طور پر اس حدیث کی صحت رخنہ ڈالتی ہے اور نہ ہم اس حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کرتے ہیں لیکن کیا یہ حیرت و استعجاب کی بات نہیں ہے کہ ایسی حدیث کو "حدیث متواتر" قرار دینے کی کوشش کی جائے، جب شیعہ صحت امامت کی دلیل میں حدیث متواتر کا ہونا شرط مانتے ہیں تو اس کا صاف مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہوا کہ وہ اس حدیث کو نص قطعی و صریح مان کر گویا اس حدیث کو متواتر قرار دے رہے ہیں۔

لفظ "مولا" کے معنی: اب آیئے یہ دیکھیں کہ شیعہ جس لفظ "مولا" کی بنیاد پر اس حدیث کو حضرت علیؓ کے استحقاق خلافت بلافصل پر نص صریح قرار دیتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے "مولا" کے ایک دو نہیں کئی معنی ہیں: رب، مالک، آقا، مددگار، دوست تابع، پیروی کرنے والا، پڑوسی چچازاد بھائی، حلیف، داماد، آزاد کردہ غلام اور احسان مند وغیرہ وغیرہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ اگر کسی کلام میں کوئی ایسا لفظ لایا گیا ہو جو مختلف معانی رکھتا ہو اور ان میں سے کچھ معنی ایک دوسرے سے ترادف واشتراک بھی رکھتے ہوں تو ان میں سے کسی خاص معنی کو متعین اور مراد لینا اس صورت میں معتبر ہو گا جب کہ اس کی کوئی دلیل اور واضح قرینہ موجود ہو، یا اگر وہ لفظ متنازعہ بن گیا ہو تو اس معنی کو مراد لینا زیادہ صحیح مانا جاتا ہے جس میں قدر مشترک پایا جاتا ہو اس اصول کے تحت اہل سُنّت والجماعت کہتے ہیں کہ لفظ "مولا" کے معنی حاکم و والی مراد لینا صحیح نہیں ہے، صحیح تو دوست و مددگار مراد لینا ہیں کیونکہ اول تو سیاق حدیث کا واضح قرینہ اور دلیل اس معنی کے حق میں ہے، دوسری دلیل یہ کہ لفظ "مولا" کا امام یعنی حاکم والی کے معنی میں مستعمل ہونا معہود و معلوم نہیں ہے نہ لغت میں اور نہ شرع میں اور ائمہ لغت میں

سے کسی نے بھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ "مفعل" بمعنی ( ) میں آتا ہے یعنی یہ تو کہا جاتا ہے کہ یہ چیز فلاں چیز سے اولی ہے یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ چیز فلاں چیز سے "مولا" ہے دوسرے یہ کہ خود شیعہ حضرت علیؓ کو پوری اُمّت کا دوست و محبوب و مددگار ہیں پس اس قدر مشترک کے اعتبار سے اس لفظ کے یہ معنی مراد لینا زیادہ موزوں ہے۔ رہی یہ بات کہ اگر آنحضرت ﷺ نے یہی مفہوم مراد لیا تھا تو پھر اس کو اتنے اہتمام سے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ یہ بات سب ہی کو معلوم تھی تو اس موالات کے بیان کرنے سے آنحضرت ﷺ کا اصل مقصد لوگوں کو اس بات متنبّہ کرنا تھا کہ کوئی بھی شخص علیؓ سے بغض و عناد نہ رکھے۔ اس تنبیہ کے اظہار کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو جمع کیا جاتا اور پھر علیؓ کی عظمت و بزرگی ثابت کرنے کے لئے ان الفاظ میں ان کی منقبت بیان کی جاتی۔ اسی لئے آپ ﷺ نے پہلے یوں فرمایا الستم تعلمون انی والی بالمؤمنین اور پھر بعد میں جو دعا فرمائی وہ بھی انہی الفاظ کی جہت و مناسبت سے رکھی، واضح ہو کہ یہ روایت جن دوسرے طرق سے منقول ہے ان میں سے بعض طرق میں پہلے تو اہل بیت نبوت کا عموماً ذکر ہے اور پھر حضرت علیؓ کا خصوصی ذکر ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا اصل مقصد تمام اہل بیت خصوصاً حضرت علیؓ کی محبت و توقیر کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا اور اس بارہ میں تاکید کرنا تھا بعض روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ ارشاد نبوت دراصل اس ضرورت کے تحت تھا کہ بعض صحابہؓ کو اس شکوہ پر تنبیہ کی جائے جس کا انہوں نے حضرت علیؓ کے خلاف اظہار کیا تھا۔ یہ وہ صحابہؓ تھے جو ایک خاص مشن پر حضرت علیؓ کے ساتھ یمن گئے تھے۔ جب یہ صحابہ بشمول حضرت علیؓ حجۃ الوداع کے موقعہ پر یمن سے آکر آنحضرت ﷺ کے شریک حج ہوئے تو انہوں نے حضرت علیؓ کی نسبت بعض معاملات میں آنحضرت ﷺ سے کچھ شکایات بیان کیں جو اہل یمن کی بعض غلط فہمیوں کے سبب پیدا ہوئی تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ بعض صحابہؓ نے حضرت علیؓ کی کسی بات کا انکار بھی کیا تھا۔ ان صحابہؓ میں ایک صحابی بریدہ اسلمیؓ بھی تھے، صحیح بخاری کی روایت میں جس کو ذہبیؒ نے بھی صحیح قرار دیا ہے یوں ہے کہ: جب آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کی شان میں ان صحابہؓ کے شکایتی الفاظ سنے تو (غصہ کے مارے) آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا اور فرمایا: "اے بریدہؓ! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اہل ایمان کے نزدیک میں ان کی جانوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہوں" اور پھر آپ ﷺ نے وہی الفاظ ارشاد فرمائے جو اوپر حدیث میں ہیں، بات چونکہ بہت اہم تھی اس لئے آپ ﷺ نے تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور تاکیداً ان کے سامنے مذکورہ حدیث ارشاد فرمائی۔

دعوی پھر بھی ثابت نہیں ہوتا: علماء اہل سُنّت والجماعت کہتے ہیں: چلئے ہم نے مانا کہ اس حدیث میں "مولا" کا لفظ "اولی" کے معنی میں ہے، لیکن یہ کہاں لازم آتا ہے کہ "امامت و حکومت خلافت میں اولی" مراد ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "قربت اور اتباع میں اولی" کے معنی مراد ہوں، اس کا قرینہ قرآن کی اس آیت میں بھی موجود ہے۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ۔

"حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سب سے زیادہ خصوصیت اور قرابت وہ لوگ رکھتے تھے جنہوں نے ان کا اتباع کیا تھا۔"

اور شیعوں کے پاس دلیل قاطع تو درکنار کوئی ظاہر تر دلیل بھی ایسی نہیں ہے جو اس احتمال کو نفی کرنے والی ہو، اور پھر چلئے ہم نے یہ بھی مان لیا کہ "امامت و حکومت میں اولی" مراد ہے لیکن یہ تو بتایا جائے کہ اس لفظ (اولی) سے بلا کسی مزید صراحت کے "فی الحال اور بلا فصل) کی قید کا لزوم کس دلیل کے تحت مان لیا گیا ہے۔ ایسی کوئی بھی دلیل اور واضح قرینہ موجود نہیں ہے جو یہ ثابت کرے کہ اگر اس لفظ سے آنحضرت ﷺ نے "اولی بالحکومت" مراد لیا تھا تو آپ ﷺ کی مراد یہ بھی تھی کہ علی اس وقت سے میرے ولی عہد ہیں اور میرے پہلے جانشین مقرر ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مال کے اعتبار سے "اولی بالحکومت" مراد لیا ہو یعنی آپ نے اس لفظ کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا ہو کہ کبھی نہ کبھی ایک وقت ایسا آئے گا جب علیؓ ہی تمام مسلمانوں میں سب سے افضل و برتر ہوں گے اور

امامت وخلافت کی باگ ڈور سنبھالیں گے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معنی میں تو اہل سُنّت و الجماعت بھی حضرت علیؓ کو اولی بالخلافت تسلیم کرتے ہیں۔ جب ان کا وقت آیا تو مسلمانوں کے ارباب حل وعقد نے ان کو اَولی بالخلافت قرار دے کر منصب خلافت راشدہ پر انھی کو متمکن کیا اور اس وقت اہل اسلام میں سب سے افضل وبرتر وہی قرار پائے، مختصر یہ کہ "مولا" کو "اولی" کے معنی میں مان لینے کے بعد بھی شیعوں کا دعوی کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔

خود حضرت علیؓ سے کس کی تائید حاصل ہوتی ہے: شیعوں کی بات تو بعد کی ہے کہ وہ اس حدیث کو حضرت علی کی خلافت بلافصل پر نص قطعی مانتے ہیں اور لفظ "مولی" کے وہ معنی مراد لیتے ہیں جو لغوی، نقلی اور عقلی طور پر کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتے۔ ان سے پہلے تو حضرت علیؓ کی ذات ہے کہ اس حدیث کا براہ راست تعلق بھی انہی سے ہے اور وہی "صاحب معاملہ بھی ہیں لہذا دیکھنا چاہئے کہ خود حضرت علیؓ نے بھی اس حدیث کا وہی مفہوم مراد لیا ہے جو شیعہ علماء بیان کرتے ہیں یا ان کے نزدیک حدیث کو وہ معنی ہیں جو اہل سُنّت و الجماعت مراد لیتے ہیں، جہاں تحقیق ودرایت کا تعلق ہے تو بلاشبہ یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک اس حدیث کا وہ مفہوم ومطلب نہیں تھا جو شیعہ علماء بیان کرتے ہیں پہلی دلیل تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ علی الترتیب تینوں کی خلافت، جو حضرت علیؓ کی خلافت سے مقدم تھی، اجماع اُمّت کے تحت قائم ہوئی تھی اور حضرت علیؓ اس اجماع میں شامل تھے قطع نظر اس بات کے کہ بعض صریح روایتوں سے آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا خلیفہ اور جانشین رسول ظاہر ہوتا تھا اگر زیر بحث حدیث حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل اور آنحضرت ﷺ کے بعد تمام اُمّت پر ان کی افضلیت وبرتری کی طرف کسی بھی صورت میں صراحت یا اشارہ کرتی تو حضرت علیؓ کسی بھی طرح اس اجماع اُمّت میں شامل نہ ہوتے جس نے نہ صرف حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ اول مقرر کیا بلکہ بعد میں حضرت عمرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ کی خلافت قائم کی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر بقول شیعہ علماء یہ حدیث حضرت علیؓ کے لئے خلافت بلافصل کی نص قطعی ہوتی تو حضرت علیؓ یا حضرت عباسؓ اور یا خاندان نبوت کا کوئی بھی فرد آنحضرت ﷺ کے وصال کے فوراً بعد، جب کہ آنحضرت ﷺ کی خلافت اور جانشینی کا مسئلہ زیر مشورہ آیا، اس حدیث کو پیش کرتے اور اس کی بنیاد پر استحقاق علیؓ کا دعوی کرتے لیکن ہوا یہ کہ حضرت علیؓ نے تقویت وحمایت حاصل کرنے کے لئے اس حدیث کو بطور دلیل پیش بھی کیا تو اس وقت پیش کیا جب وہ مسند خلافت پر فائز ہو چکے تھے اور گروہ ان کی خلافت سے انحراف کر رہا تھا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حضرت علیؓ خوب جانتے تھے کہ یہ حدیث آنحضرت ﷺ کے فوراً وصال کے بعد ان کے استحقاق خلافت پر نص پیش نہیں کرتی۔ تیسری دلیل یہ کہ بعض صحیح روایتوں کے مطابق خود حضرت علیؓ نے وضاحت کی تھی کہ آنحضرت ﷺ سے ایسی کوئی چیز منصوص نہیں ہے جس سے ان کی یا کسی دوسرے کی خلافت ثابت ہوتی ہو، یہاں صرف اس نکتہ پر مرکوز رہنا چاہئے کہ حضرت علیؓ اس حدیث کو اپنی خلافت بلا فصل پر "نص" نہیں مانتے تھے اور چوتھی دلیل وہ روایت ہے جو صحیح بخاری وغیرہ میں آئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے آخر مرض الموت میں ایک دن جب حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ آپ ﷺ کے پاس آئے تو حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آنحضرت ﷺ سے اس امر یعنی خلافت کی درخواست کر کے دیکھ لو، اگر یہ اعزاز ہمارے ہی خاندان میں رہنے والا ہے تو اچھا ہے کہ ہمیں اس کا علم خود آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے ذریعہ ہو جائے لیکن حضرت علیؓ نے حضرت عباسؓ کی بات کو نہیں مانا اور صاف انکار کر دیا کہ میں ایسی کوئی درخواست آنحضرت ﷺ سے نہیں کروں گا، اس سے بھی بخوبی ثابت ہوا کہ شیعوں کا دعوی سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اگر یہ حدیث حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کے حق میں نص ہوتی تو اس بارے میں آنحضرت ﷺ کی طرف رجوع کرنے اور پوچھنے کی ضرورت کاہے کو پیش آتی اور حضرت عباسؓ یہ بات کیوں کہتے کہ اچھا ہے اس کا علم خود آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے ذریعہ ہو جائے، درآنحالیکہ اس حدیث اور غدیر خم کا واقعہ دو ڈھائی ماہ پہلے ہی پیش آیا تھا اور بالکل قریبی عرصہ کی بات ہونے کے سبب ان دونوں حضرات کے ذہن میں پوری طرح مستحضر تھا۔

لفظ "مولی" کے معنی تمام صحابہؓ نے کیا سمجھے: واقعہ غدیر خم کے دن تقریباً سوا لاکھ مؤمنین کا جم غفیر اس موقع پر موجود تھا اور اس اجتماع عظیم میں بکثرت وہ صحابہؓ کرام بھی موجود تھے جن کے ایمان و عمل اور صدق و امانت کی شہادت کلام اللہ اور کلام رسول میں کثرت کے ساتھ وارد ہے، اس تمام جماعت مسلمین کی مادری زبان عربی ہی تھی اور اس جماعت میں بڑے بڑے فصحاء و ادبا اور نکتہ دانان الفاظ و معانی بھی موجود تھے، بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سب نے یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سنی تو اس کا کیا مطلب انہوں نے سمجھا تھا اور لفظ "مولا" کے کیا معنی انہوں نے مراد لئے تھے، آیا اس مقدس مجمع میں اس کلام رسول کا وہ مطلب اخذ کیا گیا تھا جو اہل سنّت و الجماعت بیان کرتے ہیں۔ یعنی حضرت علیؓ کی محبت و مودت کی تاکید، یا وہ مطلب سمجھا گیا تھا جو شیعہ بیان کرتے ہیں، یعنی آنحضرت ﷺ کی خلافت بلا فصل اور رسول اللہ ﷺ کی جانشینی و ولی عہدی کا اعلان! اس سوال کا واضح جواب ناقابل تردید وجوہ کی بناء پر یہ ہے کہ واقعہ غدیر کے دن تمام حاضرین نے اس حدیث کے مطلب اور لفظ "مولا" کے معنی وہی سمجھے تھے جو اہل سنّت والجماعت بیان کرتے ہیں ان تمام لوگوں نے رسول مقبول ﷺ کی وفات کے بعد جو متفقہ طور سے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، ان کو آنحضرت ﷺ کا جانشین اول تسلیم کیا اور حضرت علیؓ کی بیعت خلافت کا انہوں نے کوئی ذکر ہی نہیں کیا تو یہ اس بات کی مضبوط ترین دلیل ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس حدیث سے حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل مراد نہیں ہے۔ نہ تو بات قرین قیاس ہے کہ واقعہ غدیر کے محض دو ڈھائی ماہ بعد ہی تقریباً سوا لاکھ آدمیوں کی پوری جماعت حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرتے وقت اس حدیث کو سرے سے بھول گئی ہو اور نہ عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے کہ سوا لاکھ اہل ایمان اور ارباب دین و دیانت میں سے سب کے سب اس ارشاد رسول ﷺ سے منحرف ہو گئے ہوں، یا انہوں نے دیدہ دانستہ اس حدیث کو پردۂ غفلت میں رہنے دیا ہو۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہئے کہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ واقعہ غدیر کے بعد ایک دن رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی شان و فضیلت اور ان کے استحقاق کو آشکارا کرتے ہوئے ان دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا: میرے بعد تم پر کوئی حاکم حکومت نہ کرے گا، ظاہر ہے کہ اگر مذکورہ حدیث سے آپ ﷺ کی مراد حضرت علیؓ کو اپنا جانشین اور خلیفہ نامزد کرنا ہوتا تو پھر بعد میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے یوں ہرگز نہ فرماتے کہ میرے بعد تم پر کوئی حاکم حکومت نہ کرے گا۔ واضح دلائل اور براہین کے ذریعہ ثابت ہے کہ اس حدیث سے آنحضرت ﷺ کا اصل مقصد حضرت علیؓ کی محبت اور ان سے حسن تعلق قائم رکھنے کی تلقین و تاکید کرنا ہے اور اہل بیت نبوت کے بارے میں اس طرح کی تلقین و تاکید آپ ﷺ نے متعدد مواقع پر ارشاد فرمائی ہے لیکن محبت اور خلافت کے درمیان بہر حال فرق ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

تمام صحابہؓ پر ارتداد کا الزام: شیعوں کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اور حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے موقع پر یہ حدیث تمام صحابہؓ کے ذہن میں تھی کوئی اس کو بھولا نہیں تھا لیکن ان سب نے ظلم و تعدی بغض و عناد اور مکابرہ کے فاسد جذبات سے مغلوب ہو کر اس ارشاد رسول سے صریح انحراف کیا دراصل شیعوں کا ایک مستقل عقیدہ ہے، وہ صحابہؓ کو گمراہ کہتے ہیں بلکہ روافض تو ان کے ارتداد اور کفر کے قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ رسول ﷺ کی وفات ہوتے ہی تمام مسلمان مرتد ہو گئے تھے اور علیؓ اور ان کے چند رفقاء کے علاوہ باقی سب صحابہؓ اس دنیا سے کفر کی حالت میں رخصت ہوئے۔ (معاذ اللہ)۔

حضرت علیؓ پر تہمت!: شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "امیر المؤمنین حضرت علیؓ نے خلفاء ثلاثہ کی بیعت میں جو شرکت کی یا انہوں نے اس موقع پر اپنی خلافت کا جو دعوی نہیں کیا اور یا انہوں نے خلافت بلا فصل کا اپنا حق ثابت کرنے کے لئے اس حدیث سے جو استدلال نہیں کیا تو اس کا سبب "تقیہ" تھا یعنی انہوں نے ظلم کے ڈر سے حق پوشی کی مجبوراً اور بکراہت خلفا ثلاثہ کی بیعت میں شامل ہوئے اور عامہ مسلمین کے سماجی و سیاسی دباؤ کے تحت غاصبین کا یعنی ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی خلافت سے انحراف نہیں کیا اور اسی طرح معاذ اللہ یہ نادان کذب و افتراء کے ذریعہ سیدنا علیؓ کی ذات پر بزدلی اور کم ہمتی اور نفاق کی تہمت دھرنے کے مرتکب ہوئے کیونکہ سیدنا علیؓ جتنی

زبردست افرادی و ذاتی قوت رکھتے تھے اور جس بے مثال شجاعت و مردانگی کے حامل تھے اس کی بنا پر یہ بات محالات میں سے ہے کہ انہوں نے اپنی خلافت بلافصل کے لئے یہ نص سنی ہو اور موقع پر اس کو پیش کرنے اور اس پر عمل کرنے سے باز رہے ہوں۔

ان کو یہ احسان نہیں کہ صحابہؓ کی آڑ میں بات ذات رسالت تک پہنچتی ہے: (صحابہؓ کرام اور صدر اول کے اہل ایمان کے بارہ میں اس قدر جارحانہ اور انتہا پسندانہ عقیدہ و نظریہ رکھنے کی صورت میں) روافض نے جو نکتہ نظر اختیار کیا ہے اس کے سبب دین و اسلام کو کلیۃً باطل قرار دینا لازم آتا ہے کیونکہ وہ عظیم ہستیاں جو دین و شریعت کے نقل و روایت کا مدار ہیں، اگر شیعہ اور رافضی جماعت کے بقول محض نفسیاتی جذبات و خواہشات کے تحت نصوص کو چھپا سکتی ہیں ظلم و تعدی کی راہ اختیار کر سکتی ہیں، حق پر کذب و افتراء کا پردہ ڈال سکتی ہیں تو پھر کیا چیز باقی رہ جاتی ہے جو واضح طور پر ثابت کردے کہ ان ہستیوں نے جو اسلام ہم تک پہنچایا ہے اور احادیث و روایات کی صورت میں دین و شریعت کا جو بنیادی سرمایہ ہم تک منتقل کیا ہے وہ سب لغو و باطل اور جھوٹ کا پلندہ نہیں ہے معاذ اللہ بلکہ حقیقت میں تو بات ذات رسالت پناہ تک پہنچتی ہے کہ (معاذ اللہ) غیر معتبر، بددیانت اور ایسے بے کردار لوگوں کا اتنا بڑا گروہ آپ ﷺ کے دامن صحبت میں مدتوں رہا جس کو آپ ﷺ کی ایک ربع صدی کی مسلسل تبلیغی مساعی اور تربیتی جدوجہد بھی دین و مذہب اور اخلاق و کردار کی راہ مستقیم پر گامزن رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی واللہ ان ھذا الشیء عجاب اور پھر جیسا کہ پہلے ذکر ہوا خود سیدنا علیؓ کی ذات کہاں محفوظ رہی ایک بڑا الزام تو ان پر بھی آتا ہے کہ انہوں نے حق کی تاکید کرنے اور حق مانگنے میں سستی و کمزوری دکھائی اور مداہنت کا راستہ اختیار کیا۔

فاطمہ زہراءؓ کا نکاح

⑱ وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ خَطَبَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ فَاطِمَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهَا صَغِيْرَةٌ ثُمَّ خَطَبَهَا عَلِيٌّ فَزَوَّجَهَا مِنْهُ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں: حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے فاطمہؓ سے نکاح کا پیغام دیا تو رسول کریم ﷺ نے کہہ دیا کہ وہ کمسن ہے اور پھر جب حضرت علیؓ نے فاطمہؓ سے اپنے نکاح کا پیغام دیا تو آپ ﷺ نے ان سے فاطمہؓ کا نکاح کر دیا۔" (نسائی)

تشریح: "کہہ دیا کہ وہ کمسن ہے" اور ایک روایت میں فَسَكَتَ کے الفاظ ہیں، یعنی آپ ﷺ نے ان دونوں کا پیغام آنے پر سکوت اختیار فرمایا، کوئی جواب نہیں دیا پس ہو سکتا ہے کہ یہ جواب دینے کی صورت دوسری مرتبہ پیغام دینے پر پیش آئی ہو یعنی پہلی مرتبہ کے پیغام پر تو آپ ﷺ نے سکوت اختیار فرما لیا ہو اور جب انہوں نے دوسری مرتبہ پیغام دیا تو آپ ﷺ نے یہ جواب دیا ہو کہ فاطمہؓ کم سن ہے۔

"پھر جب حضرت علیؓ نے ...." بعض روایتوں میں آیا ہے کہ ام ایمنؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ فاطمہ کے لئے آنحضرت ﷺ سے تم کیوں نہیں درخواست کر کے دیکھتے، تم تو آنحضرت ﷺ کے چچا کے بیٹے ہو، تمہاری درخواست قبول ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر جواب دیا: آنحضرت ﷺ سے یہ بات کہتے ہوئے مجھ کو حجاب آتا ہے پھر کسی ذریعہ سے یہ بات آنحضرت ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے رضامندی کا اظہار فرمایا اور جب حضرت علیؓ کو آنحضرت ﷺ کی رضامندی معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنی درخواست آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی اور آنحضرت ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کا نکاح ان سے کر دیا۔

ایک اور روایت میں جو ابوالخیر قزوینی حاکمیؒ نے حضرت انس بن مالکؓ سے نقل کی ہے۔ حضرت فاطمہؓ کے نکاح کا واقعہ تفصیل کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے کہ: پہلے حضرت ابوبکرؓ نے فاطمہؓ کے لئے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی تو آپ ﷺ نے ان کو جواب دیا کہ اے ابوبکرؓ! فاطمہ کے بارے میں ابھی تک فیصلہ خداوندی نازل نہیں ہوا ہے پھر حضرت عمرؓ نے اور بعض دوسرے قریش نے یہی

درخواست اپنی طرف سے پیش کی تو آنحضرت ﷺ نے ان سب کو وہی جواب دیا جو حضرت ابوبکرؓ کو پہلے دے چکے تھے، پھر بعد میں کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ سے کہا کہ فاطمہؓ کے لئے اگر تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرو تو امید ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کا نکاح تمہارے ساتھ کر دیں گے، حضرت علیؓ نے کہا: جب قریش کے معززین حضرات کی یہ درخواست شرف قبولیت نہیں پا سکی تو بھلا میں اپنی درخواست کے بارہ میں کیسے امید رکھوں۔ آخر کار حضرت علیؓ نے پیغام ڈال دیا اور ان کے پیغام پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میرے بزرگ و برتر پروردگار نے مجھ کو اس کا حکم دے دیا ہے۔ حضرت انسؓ آگے بیان کرتے ہیں کہ: چند دنوں بعد آنحضرت ﷺ نے مجھ کو طلب کیا اور فرمایا کہ جاؤ اور ابوبکر صدیقؓ، عمر بن الخطابؓ عثمان بن عفانؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، سعد بن ابی وقاصؓ طلحہؓ، زبیرؓ اور انصار کے فلاں فلاں کو میرے پاس بلا لاؤ۔ انسؓ کہتے ہیں کہ میں ان سب کو بلا لایا اور یہ حضرات آ آ کر آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے، اس وقت حضرت علیؓ کے کام سے کہیں گئے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے یہ خطبہ پڑھا: الحمد للّٰه المحمود بنعمة المعبود بقدرته المطاع بسلطانه المرهوب من عذابه وسطوته النافذ امره فی سمائه وارضه الذی خلق الخلق بقدرته ومیزهم باحکامه واعزهم بدینه واکرمهم بنبیه محمد صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ان اللّٰه تبارک و تعالٰی اسمه وعظمته جعل المصاهرة سببا لاحقا وامرا مفترضا او شج به الارحام والزمه للانام فقال عز من قائل وهو الذی خلق من الماء بشرا فجعله نسبا وصهرا وکان ربک قدیرا وامر اللّٰه تعالی یجری الی قضائه وقضاؤه یجری الی قدره ولکل قضاء قدر ولکل قدر اجل ولکل اجل کتاب یمحو اللّٰه مایشاء ویثبت وعنده ام الکتاب پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں اپنی بیٹی فاطمہ بنت خدیجہ کا نکاح علی بن ابی طالب سے کر دوں، پس تم لوگ گواہ رہو کہ میں نے فاطمہؓ سے علیؓ کا نکاح چار سو مثقال چاندی پر کر دیا اگر علیؓ راضی ہوں، پھر آپ ﷺ نے چھوہاروں کا ایک طباق منگا کر ہمارے سامنے رکھا اور فرمایا کہ لوٹ لو۔ ہم نے وہ چھوہارے لوٹے ابھی ہم ان چھوہاروں کو لوٹ ہی رہے تھے کہ اچانک حضرت علیؓ بھی آ کر آنحضرت ﷺ کے قریب بیٹھ گئے، آپ ﷺ ان کو دیکھ کر مسکرائے اور پھر ان کو دیکھ کر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ تمہارے ساتھ فاطمہؓ کا نکاح چار سو مثقال چاندی پر کر دوں، اگر تم راضی ہو، حضرت علیؓ نے جواب دیا، یقیناً میں اس پر راضی ہوں یا رسول اللہ! اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی:

جمع اللّٰه شملکما واسعد جدکما وبارک علیکما واخرج منکما کثیرا طیبا۔

"اللہ تعالیٰ تم دونوں کو دلجمعی اور حسن رفاقت عطا کرے، تم دونوں کو نصیبے ور بنائے، تم دونوں پر برکتیں نازل فرمائے اور تم دونوں کو نہایت پاکیزہ نفس اولاد سے بہرہ ور کرے۔"

حضرت انسؓ کہتے تھے کہ: خدا کی قسم (آنحضرت ﷺ کی اسی دعا کے طفیل) اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو نہایت پاکیزہ نفس اولاد سے سرفراز کیا۔

مسجد میں علیؓ کا دروازہ

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِسَدِّ الْاَبْوَابِ اِلَّا بَابَ عَلِيٍّ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (مسجد نبوی کے اندر) حضرت علیؓ کے دروازہ کے علاوہ اور سب دروازوں کو بند کرا دیا تھا، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: بعض صحابہؓ کے گھروں کے دروازے مسجد نبوی کے اندر تھے اس احتیاط کے پیش نظر کہ کوئی حائضہ عورت یا کوئی جنبی مرد ان دروازوں کے ذریعہ اپنے گھروں میں آنے جانے کے لئے مسجد کے اندر نہ آئے۔ آپ ﷺ نے ان سب صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ اپنے

گھروں کے ان دروازوں کو جو مسجد کے اندر واقع ہیں بند کر دیں، ہاں حضرت علیؓ کو آپ ﷺ نے اس حکم سے مستثنیٰ رکھا اور ان کا دروازہ مسجد کے اندر کھلا رہنے دیا۔ اس طرح آنحضرت ﷺ کے حکم کے تحت ان کو یہ خصوصی اجازت حاصل رہی کہ وہ جنابت یعنی ناپاکی کی حالت میں مسجد کے اندر سے گزر سکتے ہیں۔ رہی اس حدیث کی بات جو مناقب ابوبکرؓ کے باب میں پیچھے نقل ہوئی ہے اور جس میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے دریچہ کے علاوہ اور صحابہؓ کے گھروں کے ان دریچوں کو بند کر دینے کا حکم دیا جو مسجد نبوی میں کھلے ہوئے تھے تو اس حدیث اور اس حدیث کے مابین کوئی تضاد اور منافات نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ سے متعلق اس بات کی وضاحت ہے کہ آپ ﷺ نے وہ حکم اپنے زمانۂ مرض الموت میں دیا تھا جب کہ حضرت علیؓ سے متعلق اس حدیث میں ایسی کوئی وضاحت نہیں ہے، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ یہ حکم آپ ﷺ نے کبھی پہلے دیا تھا اور یہی بات کہ حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت و خصوصیت کو ظاہر کرنے والا حکم زمانہ مرض الموت کا ہے۔ علماء کے اس قول کو مضبوط بناتی ہے کہ اس حکم کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کا اصل مقصد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی طرف اشارہ کرنا تھا، علاوہ ازیں حضرت ابوبکرؓ سے تعلق رکھنے والی حدیث زیادہ صحیح اور زیادہ مشہور ہے کیونکہ اس کو بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کیا ہے جب کہ حضرت علیؓ سے تعلق رکھنے والی حدیث زیادہ صحیح اور زیادہ مشہور ہے کیونکہ اس کو بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کیا ہے جب حضرت علیؓ سے تعلق رکھنے والی اس حدیث کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، خواہ متن اسناد کے اعتبار سے اس کو انہوں نے "غریب" قرار دیا ہو یا معنی و مفہوم کے اعتبار سے۔

ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کے تحت جو بحث کی ہے اس سے ترمذیؒ کا اس حدیث کو "غریب کہنا محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے امام احمدؒ وغیرہ کے حوالہ سے حضرت زید بن ارقمؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: درحقیقت مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ علیؓ کے دروازہ کے علاوہ اور سب دروازوں کو بند کرادوں۔ ریاض کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس میں احمدؒ نے حضرت زید بن ارقمؓ سے یوں نقل کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہؓ کے دروازے مسجد کو ان کی گزر گاہ بنائے ہوئے تھے، چنانچہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ علیؓ کے سوا اور تمام دروازے بند کر دئے جائیں۔ زیدؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ کا یہ حکم سن کر چند لوگوں نے کچھ کلام کیا تو آنحضرت ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور حمد و ثناء کے بعد فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ مجھ کو (اللہ کی طرف سے) حکم ہوا ہے کہ علیؓ کے دروازہ کے علاوہ اور سب دروازوں کو بند کرادوں، اب تم میں سے کچھ لوگوں نے اس بارہ میں کلام کیا ہے تو میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نہ میں نے اس کو بند کرنے کا حکم اپنی طرف سے دیا ہے اور نہ کسی دروازے کو کھلا رکھنے کا استثناء اپنی طرف سے کیا ہے، مجھ کو جو حکم جس طرح دیا گیا ہے اسی طرح میں نے اس کو نافذ کر دیا ہے، نیز ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اوپر کی حدیث ابن عباسؓ کے علاوہ حضرت جابرؓ سے بھی منقول ہے۔ تاہم ملا علی قاریؒ نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ حدیث "صحیح" نہیں ہے صحیح وہی حدیث ہے جو ابوسعیدؓ سے بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ابوبکرؓ کے دروازہ یا دریچہ کے علاوہ اور کوئی دروازہ یا دریچہ مسجد نبوی میں کھلا نہ چھوڑا جائے! اور حضرت علیؓ سے تعلق رکھنے والی حدیث "صحیح" بھی ہو تو ان دونوں حدیثوں کو الگ الگ حالات اور مصالح پر محمول کیا جائے گا تاکہ ان دونوں کے درمیان تضاد اور منافات معلوم نہ ہو۔

قربت اور بے تکلفی کا خصوصی مقام

(۲۰) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَتْ لِيْ مَنْزِلَةٌ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ تَكُنْ لِاَحَدٍ مِنَ الْخَلَائِقِ اٰتِيْهِ بِاَعْلٰى سَحَرٍ فَاَقُوْلُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَانَبِيَّ اللّٰهِ فَاِنْ تَنَحْنَحَ انْصَرَفْتُ اِلٰى اَهْلِيْ وَاِلَّا دَخَلْتُ عَلَيْهِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ کی نظر میں مجھ کو ایک ایسی قدر و منزلت حاصل تھی جو خلقت میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی، میں آپ ﷺ کے ہاں علی الصبح (بالکل اندھیرے منہ) پہنچ جاتا تھا (پہلے دروازہ پر کھڑے ہو کر طلب اجازت کے

لئے) کہتا: السلام علیک یا نبی اللہ! اگر آنحضرت ﷺ (میرا سلام سن کر) کھنگار دیتے تو میں (یہ سمجھ کر کہ اس وقت آپ ﷺ کسی مشغولیت میں ہیں اور کوئی شرعی یا عرفی رکاوٹ ایسی ہے جس کے سبب مجھ کو اندر نہیں جانا چاہئے) اپنے گھر واپس چلا آتا اور اگر آپ ﷺ نہ کھنگارتے تو میں (بے تکلف) آنحضرت ﷺ کے پاس چلا جاتا۔" (نسائی)

تشریح: علماء کے اس قول کے مطابق کہ کسی کے گھر میں داخلے کی اجازت چاہنے کے لئے جو سلام کیا جاتا ہے اس کے جواب میں سلام کرنا صاحب خانہ کے لئے ضروری ہے، یہ وضاحت کی جائے گی کہ حضرت علیؓ کا سلام سن کر آنحضرت ﷺ پہلے ان کے سلام پر جوابی سلام کرتے اور پھر کھنکارتے تھے، اور جن علماء کے مطابق صاحب خانہ پر جوابی سلام ضروری نہیں ہے، ان کے نزدیک اس وضاحت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

سیدنا علیؓ نے اس روایت کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ اپنی جس قربت اور بے تکلفی کا ذکر کیا ہے وہ یقیناً انہی کا خصوصی مرتبہ تھا جو ان کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں تھا کیونکہ وہ حضرت فاطمہؓ کی نسبت سے اور آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی ہونے کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کے گھر میں بے تکلفا آمد و رفت اور غیر معمولی مخالطت و مجالست کا حق سب سے زیادہ رکھتے تھے۔

وہ دعا جو مستجاب ہوئی

(٢١) وَعَنْهُ قَالَ كُنْتُ شَاكِيًا فَمَرَّبِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ اَجَلِيْ قَدْ حَضَرَ فَارِحْنِيْ وَاِنْ كَانَ مُتَاَخِّرًا فَارْفِغْنِيْ وَاِنْ كَانَ بَلَآءً فَصَبِّرْنِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ قُلْتَ فَاَعَادَ عَلَيْهِ مَا قَالَ فَضَرَبَهٗ بِرِجْلِهٖ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ عَافِهٖ اَوِ اشْفِهٖ شَكَّ الرَّاوِيْ قَالَ فَمَا اشْتَكَيْتُ وَجْعِيْ بَعْدُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میں (سخت بیمار ہو گیا اور (حسن اتفاق سے) رسول کریم ﷺ میرے پاس سے گزر رہے تھے جب میں (مرض کی شدت سے بے تاب ہو کر بآواز بلند) یہ دعا مانگ رہا تھا: الٰہی! اگر میری موت کا وقت آپہنچا تو مجھ کو (موت دے کر مرض کی اذیت سے نجات اور ابدی) سکون عطا فرما اور اگر ابھی وقت نہیں آیا ہے تو (صحت بحال کر کے) مجھ کو راحت و کشادگی (یعنی صحت و تندرستی کی خوشی) عطا فرما اور اگر یہ بیماری امتحان و آزمائش ہے تو مجھے صبر و برداشت کی قوت دے (تاکہ میں بے تابی و بے قراری کا اظہار نہ کروں) رسول کریم ﷺ نے (مجھے یوں دعا مانگتے سنا تو) فرمایا کہ تم کیا دعا مانگ رہے تھے؟ میں نے دعا کے الفاظ آپ ﷺ کے سامنے دوہرا دیئے۔ آپ ﷺ نے (دعا کے الفاظ سننے کے بعد) اپنے پاؤں سے علیؓ کو ٹھوکا دیا اور پھر یوں دعا فرمائی الٰہی! اس (علیؓ) کو عافیت عطا فرما" یا یہ فرمایا کہ اس کو شفا بخش" یہ راوی کا اظہار شک ہے حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس دعا کے بعد پھر مجھ کو وہ بیماری کبھی لاحق نہیں ہوئی، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: فارفغنی ف کے زبر اور غین کے جزم کے ساتھ منقول ہے جو رفاغۃ سے ہے اور جس کے معنی کشادگی اور فراغت کے ہیں اور ایک صحیح نسخہ میں یہ لفظ عین کے ساتھ فارفعنی منقول ہے۔

"آپ ﷺ نے اپنے پاؤں سے علیؓ کو ٹھوکا دیا" تاکہ وہ اس معاملہ میں اپنی غفلت پر متنبہ ہوں، حرف شکایت زبان پر لانے سے باز رہیں، پائے مبارک کی ضرب کی برکت سے بہرہ مند ہوں اور ذات رسالت پناہ کی قدم بقدم کمال متابعت ان کو حاصل ہو۔

"یہ راوی کا اظہار شک ہے" یہ جملہ بعد کے کسی راوی کا ہے جس نے واضح کیا ہے کہ اس موقع پر پہلے راوی نے اپنا شک ظاہر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو اللھم عافہ (الٰہی! اس کو عافیت عطا فرما، کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے یا اللھم اشفہ الٰہی! اس کو شفا بخش) کے الفاظ، بہر حال آنحضرت ﷺ کی اس دعا میں یہ تعلیم اور تلقین پوشیدہ ہے کہ مریض کو بس یہ دعا مانگنی چاہئے کہ اے اللہ! مجھ کو عافیت

عطا فرمایا اے اللہ! مجھ کو شفا بخش دعا میں "تردید" کا پہلو اعتبار کرنا یعنی یوں کہنا کہ یا یہ کر یا وہ کر، جیسا کہ حضرت علیؓ کی دعا تھی غیر مناسب بات ہے کیونکہ تردید کا پہلو ایک طرح سے جبر اور دباؤ کا مفہوم ظاہر کرتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ پر جبر کرنے اور دباؤ ڈالنے والا کوئی نہیں ہے۔

سوانحی خاکہ: امیر المؤمنین سیدنا علیؓ ابن ابو طالب قریشی ہیں کنیت "ابوالحسن" بھی تھی اور "ابوتراب" بھی کم عمروں میں اسلام لانے والے سب سے پہلے شخص ہیں، قبول اسلام کے وقت ان کی عمر کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ قبول اسلام کے دن آپ کی عمر پندرہ سال تھی، بعض حضرات نے آٹھ سال اور بعض نے دس سال بیان کی ہے سیدنا علیؓ غزوۂ تبوک کے علاوہ اور سب غزوں میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے ہیں، غزوۂ تبوک کے لئے جاتے ہوئے آنحضرت ﷺ ان کو اپنے اہل و عیال پر خلیفہ مقرر کر کے مدینہ چھوڑ گئے تھے اور ان سے فرمایا تھا کہ کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ میرے نزدیک تمہارا وہی درجہ ہے جو موسیٰ کے نزدیک ہارون کا تھا، حضرت علیؓ گہرے گندمی رنگ کے تھے آنکھیں بڑی بڑی تھیں، قد میانہ مائل بہ پستی تھا، پیٹ بڑا اور سر کے بال کسی قدر اڑے ہوئے تھے، داڑھی گھنی اور لمبی تھی، دہن کشادہ تھا اور سر اور داڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ جمعہ کے دن جو حضرت عثمانؓ کا یوم شہادت ہے، حضرت علیؓ مسند آرائے خلافت ہوئے اور ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ جمعہ ہی کے دن فجر کی نماز کے وقت مسجد میں ایک شقی، عبدالرحمن ابن ملجم نے تلوار سے قاتلانہ حملہ کیا جس کے صدمہ سے تین راتوں کے بعد واصل بحق ہو گئے اور مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے بعض مؤرخین نے تاریخ وفات ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ لکھی ہے اور قاتلانہ حملہ کا وقوع اس تاریخ سے دو دن پہلے کا بیان کیا ہے غسل دینے والوں میں دونوں صاحبزادوں حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ بھی شامل تھے، حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور منہ اندھیرے تدفین عمل میں آئی، حضرت علیؓ کی عمر تریسٹھ سال کی اور بعض حضرات کے مطابق پینسٹھ سال کی اور ایک قول کے مطابق ستر سال کی ہوئی، ان کی خلافت چار سال نو ماہ رہی۔

بَابُ مَنَاقِبِ الْعَشَرَةِ الْمُبَشَّرَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کے مناقب کا بیان

"عشرہ مبشرہ" ان دس جلیل القدر صحابہؓ کی جماعت کو کہتے ہیں جنہیں آنحضرت ﷺ نے خصوصی بشارت عطا فرمائی تھی، اور وہ ہیں، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ، اور حضرت سعید بن زیدؓ، یہ سب حضرات قریشی ہیں اور ان کے لئے جو افضلیت، مناقب اور احادیث منقول ہیں وہ اوروں کے حق میں منقول نہیں ہیں یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جنت کی یہ خصوصی بشارت صرف انہی دس صحابہ کے حق میں منقول نہیں ہے بلکہ اہل بیت نبوت یعنی آنحضرت ﷺ کی اولاد اور ازواج مطہرات کے حق میں بھی اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے صحابہؓ کے حق میں بھی منقول ہے۔

صرف ان دس صحابہؓ کے ذکر کے لئے اس علیحدہ باب کے قائم کرنے کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ کسی ایک حدیث میں یا الگ الگ حدیثوں میں مختلف خصوصی حیثیتوں سے ان کا جو ذکر آیا ہے وہ یکجا ہو جائے، تاہم اس باب میں اس طرف اشارہ ضرور پایا جاتا ہے کہ صحابہؓ کی اس مبارک جماعت (عشرہ مبشرہ) کو اس ترتیب کے ساتھ تمام صحابہؓ پر فضیلت و برتری حاصل ہے کہ پہلے خلفاء اربعہ سب سے افضل ہیں اور پھر باقی حضرات دیگر تمام صحابہؓ سے افضل ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضرت عمرؓ نے نامزد کردہ مستحقین خلافت

① عَنْ عُمَرَؓ قَالَ مَا اَحَدٌ اَحَقُّ بِھٰذَا الْاَمْرِ مِنْ ھٰؤُلَآءِ النَّفَرِ الَّذِیْنَ تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ عَنْھُمْ رَاضٍ فَسَمّٰی عَلِیًّا وَّعُثْمَانَ وَالزُّبَیْرَ وَطَلْحَۃَ وَسَعْدًا وَعَبْدَ الرَّحْمٰنِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (اپنی وفات کے وقت ارباب حل وعقد اور اصحاب شوریٰ کو مستحقین خلافت کے بارہ میں وصیت کرتے ہوئے) فرمایا تھا: اس امر یعنی منصب خلافت کا ان لوگوں سے زیادہ کوئی مستحق نہیں جن سے رسول اللہ ﷺ راضی اور خوش اس دنیا سے تشریف لے گئے اور پھر حضرت عمرؓ نے یہ نام لئے: علیؓ، عثمانؓ، زبیر طلحہ) سعد اور عبدالرحمن۔" (بخاری)

تشریح: ......راضی اور خوش اس دنیا سے تشریف لے گئے۔" یعنی یوں تو آنحضرت ﷺ اپنے تمام ہی صحابہؓ سے راضی اور خوش تھے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں سے بہت زیادہ راضی اور خوش تھے اور ان سے آپ ﷺ کا راضی اور خوش ہونا یقینی طور پر سب کو معلوم بھی تھا، یا حضرت عمرؓ کی مراد ان لوگوں کے تئیں آنحضرت ﷺ کی کسی ایسی مخصوص رضا اور خوشنودی کی طرف اشارہ کرنا تھا جس کے سبب ان کا مستحقین خلافت ہونا ثابت ہوتا تھا۔ بہر حال ان الفاظ کا اصل مقصد مذکورہ حضرات کی ترجیح حیثیت کو ظاہر کرنا تھا جس کی بنیاد حضرت عمرؓ نے گویا یہ بیان کی کہ ان لوگوں کے عشرہ مبشرہ میں سے ہونے کے سبب آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کی بہ نسبت ان لوگوں سے زیادہ راضی اور خوش تھے۔

حضرت عمرؓ نے اس موقع پر عشرہ مبشرہ میں سے محض چھ حضرات کا ذکر اس لئے کیا کہ حضرت ابوبکرؓ اور خود حضرت عمرؓ کا سب سے زیادہ افضل ہونا تو سب کو معلوم تھا، اس بنا پر ان دونوں ناموں کے ذکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تیسرے صاحب حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراحؓ، جن کو آنحضرت ﷺ نے "امین امت" اور "امین حق الامین" فرمایا تھا حضرت عمرؓ سے پہلے ہی وفات پاچکے تھے اور چوتھے صحابہ حضرت سعید بن زیدؓ چونکہ حضرت عمرؓ کے بہنوئی تھے اس لئے حضرت عمرؓ نے اس احتیاط کے مدنظر ان کا ذکر نہیں کیا کہ کہیں کوئی یہ تہمت نہ دھردے کہ مستحقین خلافت کی فہرست میں سعیدؓ کا نام قرابت داری کی جہت سے آیا ہے، ویسے بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے سعیدؓ کا نام ان لوگوں کے زمرہ میں تو ذکر کیا تھا جن سے رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے خوش و راضی تشریف لے گئے لیکن ارباب حل وعقد اور اصحاب شوریٰ میں ان کا نام نہیں رکھا تھا۔

قیام خلافت: جاننا چاہئے کہ امامت وخلافت شرعی طور پر جائز اور قانونی (واجب التسلیم) یا تو اس صورت میں ہوئی ہے کہ ارباب حل وعقد اس شخص کو امام و خلیفہ مقرر کردیں جو اس عظیم منصب کا اہل اور مستحق ہو جیسے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت قائم ہوئی۔ یا اس صورت میں ہوتی ہے کہ امام و خلیفہ تعین و صراحت کے ساتھ کسی ایسے شخص کو اپنا جانشین نامزد کرجائے جو منصب خلافت کی ذمہ داریاں نبھانے کی اہلیت ولیاقت رکھتا ہو جیسے حضرت ابوبکرؓ کے نامزد کردینے پر حضرت عمرؓ کی خلافت قائم ہوئی، نیز اگر کوئی ایسا شخص خلیفہ منتخب و مقرر ہوجائے جو اپنی وجاہت وحیثیت کے اعتبار سے منقول ہو اور اس سے افضل شخص موجود ہو تو اس کی خلافت شرعی اور قانونی طور پر جائز مانی جائے گی کیونکہ خلفاء راشدین کے بعد قریش میں سے ایسے بعض لوگوں کی خلافت پر علماء کا اجماع ثابت ہے جو اپنے سے افضل لوگوں کی موجودگی میں خلیفہ مقرر ہوئے تھے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی ایک غیر افضل شخص ملکی وحکومتی اور سیاسی امور میں افضل شخص سے زیادہ باصلاحیت ثابت ہوتا ہے اور اس خصوصی صلاحیت کی بنا پر ایسا شخص دینی معاملات کی بہتر طور پر نگرانی رکھ سکتا ہے، کاروبار حکومت کو کارگر طریقہ سے انجام دے سکتا ہے، رعایا کی خوب خبرگیری کرسکتا ہے، ملک وملت کو نقصان پہنچانے والے فتنوں اور سازشوں سے مؤثر انداز میں نمٹ سکتا ہے اور یہ کہ ملکی وملی استحکام و سالمیت کو اچھی طرح برقرار رکھ سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ

"امامت و خلافت کی سزاوار وہی ذات ہو سکتی ہے جو "معصوم" ہو ہاشمی" ہو اور اس کے ہاتھ پر کوئی ایسا معجزہ ظاہر ہو جس سے اس کی راستی اور سچائی جانی جائے"، تو یہ محض شیعوں کا خرافاتی نظریہ ہے اور ان کی جہالت کا آئینہ دار بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہی نظریہ ان کی گمراہیوں کی تمہید اور مقدمہ ہے جن کے ذریعہ انہوں نے ملت اسلامیہ میں افتراق وانتشار اور طبقاتی و گروہی محاذ آرائی کی بنیاد ڈالی۔ ان میں سے ایک بڑی گمراہی تو ان کی یہی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کے علاوہ باقی تمام خلفاء کی امامت و خلافت کو بے اصل اور باطل مانتے ہیں۔

حضرت طلحہؓ کی جانثاری

② وَعَنْ قَیْسِ بْنِ اَبِیْ حَازِمٍ قَالَ رَاَیْتُ یَدَ طَلْحَۃَ شَلَّاءَ وَقٰی بِھَا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ اُحُدٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت قیس بن ابی حازم (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت طلحہؓ کا وہ ہاتھ دیکھا جو (سالہا سال بعد بھی) بالکل بیکار اور شل تھا، انہوں نے اس ہاتھ سے غزوۂ احد کے دن نبی کریم ﷺ کو (کفار کے حملوں سے) بچایا تھا۔" (بخاری)

تشریح: غزوۂ احد کے دن حضرت طلحہؓ نے کمال جانثاری کا ثبوت دیا تھا اور آنحضرت ﷺ کو کفار کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خود کو سپر بنالیا تھا، وہ تلواروں کو اپنے ہاتھ پر روک روک کر آنحضرت ﷺ کو گزند سے بچاتے تھے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ ان کا ہاتھ زندگی بھر کے لئے شل اور بے کار ہو کر رہ گیا تھا بلکہ ان کے پورے جسم پر اسی زخم لگے تھے اور عضو مخصوص بھی زخمی ہو گیا تھا صحابہؓ کرام جب بھی غزوۂ احد کے دن کا تذکرہ کرتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ وہ دن تو در حقیقت طلحہؓ کی جانثاری اور فدا کاری سے بھرپور دن تھا۔

حضرت طلحہؓ عبید اللہ کے بیٹے اور قریشی ہیں، کنیت ابو محمد (یا ایک قول کے مطابق ابو عمرو) تھی، قدیم الاسلام ہیں۔ غزوۂ بدر کے علاوہ اور تمام غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ شریک رہے ہیں غزوۂ بدر میں اس وجہ سے شریک نہیں ہو سکے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے کام سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ حضرت طلحہؓ کا رنگ گندمی تھا اور بال کثرت سے تھے، بڑے وجیہ اور خوبصورت آدمی تھے۔ ۶۴ سال کی عمر میں جنگ جمل کے موقع پر ۲۰ جمادی الثانی ۳۶ھ پنجشنبہ کے دن شہید ہوئے اور بصرہ میں دفن کئے گئے۔

حضرت زبیرؓ کی فضیلت

③ وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ یَّاْتِیْ بِخَبَرِ الْقَوْمِ یَوْمَ الْاَحْزَابِ قَالَ الزُّبَیْرُ اَنَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِکُلِّ نَبِیٍّ حَوَارِیًّا وَحَوَارِیَّ الزُّبَیْرُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ احزاب (یعنی غزوۂ خندق) کے موقع پر ایک دن نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کون شخص ہے جو (دشمن کے) لوگوں کی خبر میرے پاس لائے؟ زبیر بولے: میں لاؤں گا۔ تب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ہر نبی کے حواری (یعنی خاص دوست اور مدد گار ہوتے ہیں اور میرے حواری زبیر ہیں"۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "حزب کی جمع ہے جس کے معنی "گروہ" کے ہیں۔ اس موقع پر چونکہ مختلف اسلام دشمن گروہ یعنی قریش اور غیر قریش کے قبائل اور مدینہ کے وہ یہودی جن کا تعلق بنو قریظہ اور جلاوطن بنو نضیر سے تھا، متحد اور جمع ہو کر آنحضرت ﷺ سے لڑنے آئے تھے اس لئے اس غزوہ کو "غزوۂ احزاب" کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں دشمن کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی اور مجاہدین اسلام کل تین ہزار نفر دشمن در اصل مرکز اسلام کو تاخت و تاراج کر دینے کے منصوبے کے تحت حملہ آور ہوا تھا اور اس کا ٹڈی دل لشکر تقریبا ایک مہینہ تک مدینہ کو گھیرے پڑا رہا۔ آنحضرت ﷺ نے تمام مجاہدین اسلام کی مدد سے وفاعی کاروائی کے طور پر مدینہ شہر کے گرد خندق کھودی تھی اور اس مناسبت سے اس غزوہ کو "غزوہ خندق" بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بڑے سخت دن تھے اور اہل اسلام نہایت پریشانیوں اور دشواریوں میں گھر کر رہ گئے تھے۔ باقاعدہ صف آرائی اور جنگ کی نوبت نہیں آئی، تاہم سنگ باری اور تیر اندازی کے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے

فرشتوں کا لشکر نازل کیا اور ایسی آندھی بھیجی کہ دشمن کے خیمے اکھڑے گئے، چولہوں پر سے دیگچیاں اوندھی ہو گئیں جا بجا ڈیروں میں آگ گل ہو گئی اور ہیبت ناک اندھیرا چھا گیا اور دشمن کا لشکر خوف و دہشت کے مارے راتوں رات بھاگ کھڑا ہوا۔ ان دنوں چونکہ یہودیوں اور منافقوں کے سبب مدینہ شہر کے اندر اور دشمن کے محاصرہ کے سبب باہر تک ہر طرف ایسی خطرناک صورت حال تھی کہ جنگی مصالح و حاد سے متعلق معلومات فراہم کرنا اور دشمنوں کے بارہ میں خبریں منگانا سخت دشوار مرحلہ تھا، اس لئے جب حضرت زبیرؓ نے تمام خطرات اور دشواریوں کے باوجود اس خدمت کے لئے خود کو پیش کیا تو آنحضرت ﷺ نے ان کی زبردست تحسین فرمائی اور ان کو اپنا حواری ہونے کا اعزاز عطا فرمایا۔

حضرت زبیرؓ: حضرت زبیرؓ، عوام کے بیٹے اور ابو عبداللہ قرشی کی کنیت سے مشہور ہیں۔ ان کی والدہ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب آنحضرت ﷺ کی حقیقی پھوپھی تھیں، زبیر بن العوامؓ قدیم الاسلام ہیں یعنی ابتداء ہی میں اسلام کی دولت سے بہرہ مند ہو گئے تھے اور اس وقت سولہ سال کے تھے۔ اس چھوٹی سی عمر میں جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو ان کے چچا نے ان پر بڑے ظلم ڈھائے یہاں تک کہ ان کو دھوئیں میں بند کر دیا گیا تاکہ اس عذاب سے گھبرا کر اسلام ترک کر دیں لیکن انہوں نے نہایت استقامت کے ساتھ اس سخت عذاب کو برداشت کیا اور اسلام سے پھرے نہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور سب سے پہلے اسلام کی راہ میں تلوار کھینچنے والے یہی زبیر بن العوامؓ تھے۔ غزوۂ احد کے دن بڑے استقلال اور ثابت قدمی سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے اور شجاعت و جاں نثاری کے جوہر دکھائے۔ حضرت زبیرؓ طویل قامت، قدرے نحیف الجثہ اور گورے رنگ کے تھے۔ ۳۶ھ میں جنگ صفین سے واپسی پر راستہ ہی میں بصرہ کے علاقہ میں سفوان پر عمرو بن جرموز نے ان کو شہید کر دیا، اس وقت ان کی عمر ۶۴ سال کی تھی وادی اسباع میں دفن کیے گئے پھر نعش مبارک بصرہ منتقل کر دی گئی اور مشہور ہے کہ ان کی قبر وہیں (بصرہ میں) ہے۔

حضرت زبیرؓ کی قدر و منزلت

④ وَعَنِ الزُّبَيْرِؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّاْتِىْ بَنِىْ قُرَيْظَةَ فَيَاْتِيْنِىْ بِخَبَرِهِمْ فَانْطَلَقْتُ فَلَمَّا رَجَعْتُ جَمَعَ لِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبَوَيْهِ فَقَالَ فِدَاكَ اَبِىْ وَاُمِّىْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "کون ہے جو بنی قریظہ (کے یہودیوں) میں جائے اور ان کے بارہ میں ضروری معلومات لا کر مجھے دے۔" چنانچہ (آپ ﷺ کا یہ ارشاد سن کر) میں روانہ ہو گیا اور جب ان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے واپس آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ماں باپ دونوں مجھ پر جمع کر دیئے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے ماں باپ تم پر صدقے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بنو قریظہ کے یہودیوں نے غزوۂ احزاب کے موقع پر ایسی عہد شکنی اور بد معاملگی کا ارتکاب کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کی سرکوبی ضروری سمجھا اور غزوۂ احزاب سے فارغ ہوتے ہی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے پندرہ روز تک (اور ایک تاریخی روایت کے مطابق پچیس روز تک) ان کا محاصرہ کیے رکھا اور آخر کار ان کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ پس اسی موقع پر آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی کہ کون بہادر ہے جو بنو قریظہ کے بارہ میں جنگی معلومات فراہم کر کے میرے پاس لائے یا یہ کہ غزوۂ احزاب میں بھی بنو قریظہ دشمن کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے خلاف جنگی کاروائیوں میں شامل تھے ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر بنو قریظہ کے بارہ میں ضروری معلومات آپ ﷺ کو درکار ہوں اور آپ ﷺ نے یہ بات ‌ مائی ہو۔

"میرے ماں باپ تم پر صدقے۔" یہ بارگاہ رسالت کی طرف سے حضرت زبیرؓ کی قدر و منزلت کی توثیق کرنا اور ان کے اس کارنامہ پر ان کو زبردست اعزاز عطا کرنا تھا جو انہوں نے نہایت جرأت و بہادری کے ساتھ انجام دیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کوئی بھی شخص

یہ الفاظ اسی ہستی کے حق میں استعمال کرتا ہے جس کو وہ نہایت معزز و مکرم سمجھتا ہے اور اس کی تعظیم کرتا ہے اس اعتبار سے حضرت زبیرؓ کی شان میں آنحضرت ﷺ کا یہ جملہ ارشاد فرمانا ان کو تعظیم و تکریم کے مرتبہ سے نوازنا تھا، ایک روایت میں حضرت زبیرؓ نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دو مرتبہ، اپنے ماں باپ دونوں مجھ پر جمع کیے (یعنی یوں فرمایا کہ: میرے ماں باپ تم پر صدقے) ایک مرتبہ تو جنگ احد کے موقع پر اور دوسری مرتبہ بنو قریظہ کے خلاف کاروائی کے موقع پر ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت زبیرؓ نے اپنے بیٹے حضرت عروہؒ سے کہا: برخوردار! میرے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو رسول اللہ ﷺ کی معیت میں (جنگوں کے دوران) زخمی نہ ہوا ہو۔

حضرت سعدؓ کی فضیلت

⑤ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَمَعَ اَبَوَيْهِ لِاَحَدٍ اِلَّا لِسَعْدِ بْنِ مَالِكٍ فَاِنِّيْ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ يَوْمَ اُحُدٍ يَا سَعْدُ اِرْمِ فِدَاكَ اَبِيْ وَاُمِّيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو کسی کے لئے اپنے ماں باپ کو جمع کرتے نہیں سنا علاوہ سعد بن مالکؓ کے۔ چنانچہ جنگ احد کے دن (جبکہ سعدؓ دشمن کافروں کو آنحضرت ﷺ تک پہنچنے سے روکنے کے لئے جواں مردی کے ساتھ تیر مار مار کر ان کو پیچھے ہٹا رہے تھے) میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: سعد! چلاؤ اور تیر چلاؤ میرے ماں باپ تم پر صدقے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: سعد بن مالک سے مراد سعد بن ابی وقاص ہیں، دراصل ابی وقاص کا نام مالک ابن وہب تھا اور اس اعتبار سے سعد بن ابی وقاص کو سعد بن مالک بھی کہا جاتا تھا۔

اوپر کی حدیث میں آنحضرت ﷺ کا اپنے ماں باپ کو جمع کرنا، حضرت زبیرؓ کے حق میں بھی منقول ہے جبکہ یہاں حضرت علیؓ یہ فرما رہے ہیں کہ سعد بن مالکؓ کے علاوہ اور کسی کے لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے ماں باپ کو جمع نہیں کیا۔ لہٰذا اوپر کی حضرت زبیرؓ کی روایت اور حضرت علیؓ کی اس روایت دونوں کے درمیان مطابقت کی خاطر یہ کہا جائے گا کہ دراصل حضرت علیؓ کو معلوم نہیں تھا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت زبیرؓ کے حق میں بھی یہ جملہ ارشاد فرمایا یا کہ حضرت علیؓ کی مراد یہ تھی کہ خود میں نے کسی واسطہ کے بغیر آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے جملہ سعدؓ کے علاوہ اور کسی کے حق میں نہیں سنا پس ان کا یہ کہنا اس بات کے منافی نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ جملہ حضرت زبیرؓ کے حق میں بھی فرمایا ہو اور اس کا علم حضرت علیؓ کو بالواسطہ طور پر ہوا ہو۔

حضرت سعد بن ابی وقاص: حضرت سعدؓ کی کنیت ابو اسحٰق ہے اور زہری و قرشی کر کے مشہور ہیں۔ قدیم الاسلام ہیں یعنی آغاز دعوت اسلام ہی میں سترہ سال کی عمر میں مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں تیسرا مسلمان ہوں مجھ سے پہلے صرف دو آدمی اسلام لائے تھے، اور اللہ کی راہ میں اسلام کی طرف سے سب سے پہلے تیر چلانے والا میں ہوں۔ حضرت سعدؓ آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں اور "مستجاب الدعوات" مانے جاتے تھے۔ ان کی یہ حیثیت عوام و خواص میں اس قدر مشہور تھی کہ لوگ ان کی بد دعا سے ڈرتے تھے اور ان کی نیک دعاؤں کے طلب گار رہا کرتے تھے۔ دراصل ان کو یہ مقام اس بنا پر حاصل ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی: اے اللہ! سعدؓ کی دعائیں قبول فرما۔ حضرت زبیرؓ کے علاوہ صرف حضرت سعدؓ ہی وہ خوش نصیب ہستی ہیں جن کے لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے ماں باپ کو جمع کیا، یعنی الگ الگ موقعوں پر ان دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: میرے ماں باپ تم پر صدقے، یہ عظیم اعزاز ان دونوں کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ حضرت سعدؓ کا رنگ گندمی تھا اور ان کے بدن پر بہت بال تھے ۵۵ھ میں اس محل میں ان کا انتقال ہوا جو انہوں نے مدینہ شہر کے قریب وادی عتیق میں بنوایا تھا، جنازہ مدینہ منورہ لایا گیا اور اس وقت کے حاکم مدینہ ابن الحکم نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی اس وقت حضرت سعدؓ کی عمر کچھ

اوپر ستر سال کی تھی اور عشرہ مبشرہ میں سب کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا حکم مقرر کیا تھا، پھر بعد میں حضرت عثمان نے بھی اس منصب پر ان کو دوبارہ کوفہ بھیجا تھا۔ صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک بڑی جماعت کو ان سے احادیث کی سماعت اور روایت کا شرف حاصل ہے۔

اللہ کی راہ میں سب سے پہلا تیر حضرت سعدؓ نے چلایا

⑥ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍؓ قَالَ اِنِّيْ لَاَوَّلُ الْعَرَبِ رَمٰى بِسَهْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں پہلا عرب مسلمان ہوں جس نے اللہ کی راہ میں تیر پھینکا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: یعنی میں وہ شخص ہوں جس نے اسلام میں سب سے پہلے اللہ کے دشمنوں پر تیر چلایا مجھ سے پہلے کسی نے اللہ کی راہ میں تیر نہیں چلایا تھا۔ یہ ۱ھ کا واقعہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن الحارث کی سرکردگی میں ساٹھ سواروں کا ایک چھوٹا سا لشکر ابوسفیانؓ بن حرب اور اس کے ساتھی مشرکین کے مقابلہ پر روانہ فرمایا تھا، جنگ کی نوبت نہیں آئی، صرف اتنا ہوا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ان دشمنان اسلام کی طرف ایک تیر پھینکا اور یہ سب سے پہلا تیر تھا جو اہل اسلام کی طرف سے دشمنان اسلام پر چلایا گیا۔

سعدؓ کی کمال وفاداری

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَهِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقْدَمَهُ الْمَدِيْنَةَ لَيْلَةً فَقَالَ لَيْتَ رَجُلًا صَالِحًا يَحْرُسُنِيْ اِذْ سَمِعْنَا صَوْتَ سِلَاحٍ فَقَالَ مَنْ هٰذَا قَالَ اَنَا سَعْدٌ قَالَ مَا جَاءَ بِكَ قَالَ وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ خَوْفٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجِئْتُ اَحْرُسُهُ فَدَعَالَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ نَامَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (ایک مرتبہ کسی غزوہ سے) مدینہ میں (واپس) آکر (دشمنان دین سے خطرہ کے سبب) رات میں سوئے نہیں اور پھر آپ ﷺ فرمانے لگے کہ کاش کوئی نیک بخت مرد (آج کی رات) میری نگہبانی کرتا آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہی تھا کہ اچانک ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی (جیسے کوئی شخص تلوار و کمان سنبھالے باہر چوکی پہرے پر ہو اور اس کے ہتھیار کھڑ کھڑا رہے ہوں) آپ ﷺ نے (یہ آواز سن کر) پوچھا: کون ہے! جواب ملا: میں سعدؓ ہوں! آنحضرت ﷺ نے سوال کیا: (اتنی رات گئے) یہاں تم کیسے آگئے؟ سعدؓ بولے: میرے دل میں رسول اللہ ﷺ کی نسبت خوف پیدا ہوا (کہ کہیں دشمنان دین آپ کو ضرر نہ پہنچائیں) لہٰذا میں یہاں حاضر ہو گیا ہوں کہ آپ ﷺ کی نگہبانی کروں (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے سعدؓ کو دعائیں دیں اور (اطمینان سے) سو گئے۔"

(بخاریؒ ومسلمؒ)

ابوعبیدہ کو "امین الامت" کا خطاب

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَمِيْنٌ وَاَمِيْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبُوْعُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ۔

(متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "ہر امت کا ایک "امین" ہوتا ہے (کہ وہ اللہ اور اللہ کے بندوں کے حقوق میں اور اپنے نفس کے بارہ میں خیانت نہیں کرتا) اور اس مت کے آمین ابوعبیدہ ابن الجراح ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اگرچہ تمام ہی صحابہؓ وصف امانت کے حامل تھے لیکن صرف حضرت ابوعبیدہ کو اس اُمّت کا امین اس اعتبار سے فرمایا گیا کہ یا تو ان میں یہ وصف دوسرے صحابہؓ کی بہ نسبت زیادہ غالب تھا یا یہ کہ خود ان کے دوسرے اوصاف کی بہ نسبت یہ وصف ان پر زیادہ غالب

تھا۔ بہر حال حضرت ابوعبیدہؓ اپنے ذاتی محاسن و کمالات کی بنا پر بڑے شان والے صحابیؓ ہیں اور ان کے مناقب و فضائل میں اور بھی بہت سی روایتیں منقول ہیں۔ ان کے جو مختلف پند و نصائح مختلف کتابوں میں مذکور ہیں ان میں سے ایک یہ نصیحت نہایت قیمتی ہے۔

بادروا السیئات القدیمات بالحسنات الحادثات و الارب مبیض لثیابه مدلس لدینه و الارب مکرم لنفسه و هو لها مهین۔

"پچھلے گناہوں پر (خمیازہ بھگتنے سے پہلے) نئی نیکیاں بڑھالو، اور یاد رکھو ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی پوشاک تو اجلی رکھتے ہیں لیکن اپنا دین میلا رکھتے ہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ بعض لوگ اپنے آپ کو عزت دار محسوس کرتے ہیں حالانکہ انجام کے اعتبار سے وہ خود کو ذلت و خواری میں ڈالنے والے ہیں۔"

حضرت ابوعبیدہؓ: حضرت ابوعبیدہؓ کا اصل نام عامر بن عبداللہ بن جراح ہے فہری قرشی کہلاتے ہیں، آپ حضرت عثمان بن مظعونؓ کے ساتھ دائرہ اسلام و ایمان میں داخل ہوئے تھے، پہلے حبشہ کو ہجرت کی پھر دوسری بار ہجرت کر کے مدینہ آگئے تھے، آپ تمام غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ شریک ہوئے ہیں اور غزوۂ احد میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ میدان جنگ میں ثابت قدم رہے۔ جب اس غزوہ میں آنحضرت ﷺ زخمی ہوئے اور خود کی کڑیاں آپ ﷺ کے چہرہ مبارک میں پیوست ہوگئیں تو حضرت ابوعبیدہؓ ہی نے ان کڑیوں کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر باہر کھینچا اور اس کی وجہ سے ان کے سامنے کے دو دانت گر پڑے تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ دراز قد خوب رو اور ہلکے بدن کے تھے۔ ۱۸ھ میں طاعون اسواس میں مبتلا ہو کر اردن میں واصل بحق ہوئے اور نبیان کے مقام پر دفن کئے گئے اس وقت آپؓ کی عمر اٹھاون سال کی تھی اور نماز جنازہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے پڑھائی۔

حضرت ابوعبیدہؓ کی فضیلت

(۹) وَعَنِ ابْنِ اَبِیْ مُلَیْکَةَ قَالَ سَمِعْتُ عَائِشَةَ وَ سُئِلَتْ مَنْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَخْلِفًا لَوِ اسْتَخْلَفَهٗ قَالَتْ اَبُوْبَکْرٍ فَقِیْلَ ثُمَّ مَنْ بَعْدَ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَتْ عُمَرُ قِیْلَ مَنْ بَعْدَ عُمَرَ قَالَتْ اَبُوْعُبَیْدَةَ ابْنُ الْجَرَّاحِ۔

(رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن ابی ملیکہؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضؓ سے اس وقت سنا جب ان سے پوچھا گیا کہ (فرض کیجئے) اگر رسول اللہ ﷺ خلافت کے لئے (صراحۃ) کسی کو نامزد فرماتے تو آپ کی نگاہ انتخاب کس پر جاتی؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: حضرت ابوبکرؓ پر! پھر ان سے پوچھا گیا: حضرت ابوبکرؓ کے بعد کس کو نامزد فرماتے؟ حضرت عائشہ نے جواب دیا: عمرؓ کو پھر پوچھا گیا اور حضرت عمرؓ کے بعد کس کا نمبر آتا ہے؟ حضرت عائشہ بولیں: ابوعبیدہ بن الجراحؓ کا۔" (مسلم)

تشریح: ابوعبیدہؓ چونکہ "امین الامت" تھے اور منصب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی اہلیت و لیاقت رکھتے تھے اس لئے ان کا مستحقین خلافت میں شمار ہونا عین موزوں تھا چنانچہ وصال نبوی کے بعد جب آنحضرت ﷺ کے جانشین اور خلیفہ کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ! بار خلافت اٹھانے کے لئے مجھے آگے کیوں کرتے ہو تمہارے درمیان یہ عمرؓ ہیں، علی ہیں یہ ابوعبیدہ بن الجراحؓ ہیں ان میں سے جس کو چاہو خلیفہ منتخب کر لو لیکن حل و عقد اور عمائدین ملت کا کہنا تھا کہ آپ سے زیادہ اہل و لائق اور کون ہو سکتا ہے، جب آنحضرت ﷺ نے اپنے مرض الموت میں ہماری دینی قیادت (یعنی نماز کی امامت کے لئے) آپ ﷺ ہی کو آگے کیا تھا تو پھر کس کی مجال ہے کہ ہماری دنیاوی و ملی قیادت کے لئے آپ کو ترجیح نہ دے۔ بہر حال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اس نظریہ کی حامل تھیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد باقی اصحاب شوریٰ میں حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراحؓ ہی خلافت کے سب سے زیادہ اہل اور مستحق تھے۔

حرا پہاڑ پر ایک نبی ایک صدیق اور پانچ شہید

⑮ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عَلٰى حِرَآءٍ هُوَ وَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَ عُثْمَانُ وَعَلِیٌّ وَّطَلْحَةُ وَالزُّبَیْرِ فَتَحَرَّكَتِ الصَّخْرَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِهْدَءْ فَمَا عَلَیْكَ اِلَّا نَبِیٌّ اَوْصِدِّیْقٌ اَوْشَهِیْدٌ وَزَادَ بَعْضُهُمْ وَسَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ وَلَمْ یَذْكُرْ عَلِیًّا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ غنی، حضرت علیؓ حضرت طلحہ اور حضرت زبیرؓ حراء پہاڑ پر کھڑے تھے کہ (ان کے پیروں کے نیچے کا) پتھر حرکت کرنے لگا۔ رسول کریم ﷺ نے (اس پتھر کو مخاطب کر کے فرمایا: ٹھہر جا، تیرے اوپر کوئی دوسرا نہیں کھڑا ہے۔ یا نبی ہے یا صدیق ہے یا شہداء ہیں، اور بعض راویوں نے "اور سعد بن ابی وقاصؓ" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے اور علیؓ کا ذکر نہیں کیا ہے۔"

تشریح: "شہداء" سے حضرت عمرؓ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ مراد تھے۔ چنانچہ ان سب حضرات کو شہادت ہی کی موت ملی۔ ان میں سے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جنگ جمل کے موقع پر ہلاک کئے گئے اور اگرچہ ان کی موت عین جنگ کے دوران واقعہ نہیں ہوئی تھی بلکہ جنگ سے باہر ظلماً مارے گئے تھے لیکن چونکہ یہ ثابت ہے کہ جس شخص کو ظلماً قتل کر دیا جائے وہ شہید ہوتا ہے اس لئے ان دونوں کو بھی شہادت کا مرتبہ نصیب ہوا۔

اور علیؓ کا ذکر نہیں کیا ہے۔" اس سے پہلے جملہ میں "زاد" کا لفظ کسی ناقل روایت کے تسامح کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ اس راوی کی روایت میں حضرت علیؓ کے بجائے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا ذکر "معاوضہ اور مبادلہ" کی صورت ہے نہ کہ "اضافہ" کی۔ بہرحال اس روایت میں، کہ جس میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا ذکر ہے۔ یہ اشکال پیش آتا ہے کہ ان کو تو شہادت کی موت نہیں بلکہ وادی عقیق واقع اپنے محل میں فوت ہوئے تھے!؟ اس اشکال کو دور کرنے کے لئے یا تو یہ توجیہ کی جائے گی کہ آپ ﷺ نے ان سب حضرات کو تغلیباً شہید فرمایا تھا، گویا آپ ﷺ کی مراد یہ تھی ایک نبی اور ایک صدیق کے علاوہ باقی وہ لوگ ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر شہید ہوں گے یا جیسا کہ سید جمال الدینؒ نے لکھا ہے، یہ کہا جائے گا کہ حضرت سعدؓ کی موت کسی ایسے مرض کے سبب واقع ہوئی تھی جس میں مبتلا ہو کر مرنے والا "شہید" کے حکم میں ہوتا ہے، جیسے پیٹ کی بیماری وغیرہ۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

عشرۂ مبشرہ

⑪ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ فِی الْجَنَّةِ وَعُمَرُ فِی الْجَنَّةِ وَعُثْمَانُ فِی الْجَنَّةِ وَعَلِیٌّ فِی الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِی الْجَنَّةِ وَالزُّبَیْرُ فِی الْجَنَّةِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِی الْجَنَّةِ وَسَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ فِی الْجَنَّةِ وَسَعِیْدُ بْنُ زَیْدٍ فِی الْجَنَّةِ وَ اَبُوْعُبَیْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فِی الْجَنَّةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ زَیْدٍ۔

"حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ابوبکرؓ جنت میں ہیں، عمرؓ جنت میں ہیں، عثمانؓ جنت میں ہیں، علیؓ جنت میں ہیں، طلحہؓ جنت میں ہیں، عبدالرحمن بن عوفؓ جنت میں ہیں، سعد بن ابی وقاصؓ جنت میں ہیں، سعید ابن زیدؓ جنت میں ہیں اور ابوعبیدہ بن الجراحؓ جنت میں ہیں"۔ (ترمذیؒ) اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو سعید ابن زیدؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت سعید بن زیدؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں، حضرت عمر فاروقؓ کے بہنوئی تھے۔ حضرت عمرؓ کی بہن حضرت فاطمہؓ ان

سے منسوب تھی اور یہی وہ فاطمہؓ ہیں جو حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کا ذریعہ بنی تھی۔ حضرت سعیدؓ ۵۱ھ میں بعمر ستر سال واصل بحق ہوئے اور بقیع میں دفن کئے گئے۔

حدیث میں مذکورہ یہ دس جلیل القدر صحابہؓ جنّت کی بشارت کے ساتھ جو بہت زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ تو اس کی مختلف وجوہات میں سے ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ان سب حضرات کے حق میں جنت کی بشارت ایک ساتھ ایک حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے، ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ جنت کی اس طرح کی مخصوص بشارت ان کے علاوہ اور کسی کے لئے منقول نہیں ہے، اوروں کو بھی اس بشارت سے نوازا گیا ہے۔

ایک نکتہ جو بہت اہمیت کا حامل ہے: یہاں اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ احادیث میں جہاں بھی خلفاء اربعہ کا ذکر آیا ہے وہ اسی ترتیب کے ساتھ آیا ہے جو اوپر کی حدیث سے ظاہر ہے یعنی پہلے حضرت ابوبکرؓ کا نام، پھر حضرت عمرؓ کا نام پھر حضرت عثمانؓ کا نام اور پھر حضرت علیؓ کا نام۔ اس سے اہل سُنّت والجماعت کے عقیدہ و مسلک کا درست اور برحق ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ گمان کرنا کہ شاید احادیث کے راویوں نے اپنے عقیدہ و مسلک کی رعایت کرتے ہوئے ان احادیث میں خلفاء اربعہ کے ذکر کی ترتیب میں ردوبدل کر دیا ہو، بدترین درجہ کی ناانصافی ہوگی۔ حاشا و کلا کہ اگر راوی کسی موقع پر حدیث کے ترتیب بیان میں تھوڑی تبدیلی اور معمولی تقدیم و تاخیر ضروری سمجھ کر کرتے بھی ہیں تو اسی صورت میں جبکہ حدیث کے مفہوم اور مقصد و منشاء میں ہلکا سا بھی فرق پیدا نہ ہو، ایسی صورت میں تصور بھی، نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اتنے اہم معاملہ میں کسی تبدیلی اور تقدیم و تاخیر کے روادار ہو سکتے ہیں زبان رسالت سے جس ترتیب کے ساتھ خلفاء اربعہ کا ذکر ہوتا ہے۔ بعینہٖ اسی ترتیب کے ساتھ راوی بیان کرتے ہیں۔

چند صحابہ رضی اللہ عنہم کی خصوصی حیثیتوں کا ذکر

(۱۲) وَعَنْ اَنَسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْحَمُ اُمَّتِيْ بِاُمَّتِيْ اَبُوْبَكْرٍ وَاَشَدُّ هُمْ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ عُمَرُ وَاَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ وَاَفْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَاَقْرَؤُهُمْ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَاَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَمِيْنٌ وَاَمِيْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبُوْعُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ. وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ وَرُوِيَ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ قَتَادَةَ مُرْسَلًا وَفِيْهِ وَاَقْضَاهُمْ عَلِيٌّ۔

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میری اُمت میں ابوبکرؓ ہی میری اُمت کے لوگوں کے حق میں سب سے زیادہ مہربان اور سب سے بڑے دردمند ہیں (کہ وہ نہایت لطف و مہربانی اور دردمندی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور ان کو فلاح و نجات کے راستہ پر لگاتے ہیں) اور میری اُمت کے لوگوں میں عمرؓ اللہ کے دین کے معاملات میں سب سے زیادہ سخت ہیں (کہ نہایت سختی اور مضبوطی کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں) اور میری اُمت کے لوگوں میں عثمانؓ سب سے سچے حیادار ہیں، اور میری اُمت کے لوگوں میں سب سے بڑے فرائض داں زید بن ثابتؓ ہیں، اور میری اُمت کے لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والے اور سب سے بڑے ماہر تجوید قرآن ابی ابن کعب ہیں، اور میری اُمت میں حلال و حرام کو سب سے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبلؓ ہیں اور ہر اُمت میں ایک امین ہوتا ہے اور اس اُمت کے امین ابوعبیدہ بن الجراحؓ ہیں۔ (احمدؒ و ترمذیؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس حدیث کو معمرؒ نے بھی قتادہؒ سے بطریق ارسال نقل کیا ہے اور (معمرؒ کی) اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ: "میری اُمت کے لوگوں میں حق کے مطابق سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں۔"

تشریح: ...... عثمانؓ سب سے سچے حیادار ہیں۔" حیا کا وصف، کہ جو ایمان کی ایک بڑی شاخ ہے۔ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ایک طرح کی خصوصی اور امتیازی نسبت رکھتا تھا اور ان کی حیاداری اور غیرت مندی کو مثالی حیثیت حاصل تھی رہی یہ بات کہ "سچی حیاداری" سے

کیا مراد ہے تو اس میں دراصل اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ بسا اوقات حیا اور غیرت کا اظہار طبعی تقاضہ کے تحت ایسے موقع پر بھی ہوتا ہے جو شرعی نکتہ نظر سے حیا اور غیرتِ تقاضا نہیں کرتا اور نہ اس موقع پر حیا کرنا دین کے اعتبار سے حق بجانب اور درست ہوتا ہے۔ سچی اور معتبر حیا وہی ہے جو دین وشریعت کے تقاضہ کے تحت اور اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے مطابق ہو۔ پس حضرت عثمانؓ اسی سچی اور معتبر حیا کے حامل تھے۔

"...... سب سے بڑے فرائض واں زید بن ثابتؓ ہیں۔" یعنی فرائض اور میراث کا علم فنی اور تحقیقی مضبوطی کے ساتھ زید بن ثابتؓ میں بہت زیادہ ہے بلاشبہ حضرت زید بن ثابتؓ بڑے فقہا، صحابہؓ میں سے تھے اور علم فرائض کے ماہر سمجھے جاتے تھے، کاتب وحی ہونے کا شرف بھی ان کو حاصل تھا اور انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں قرآن کو لکھنے اور جمع کرنے کی خدمت بڑی خوبی کے ساتھ انجام دی۔

"...... سب سے بڑے ماہر تجوید قرآن ابی بن کعبؓ ہیں۔" حضرت ابی بن کعبؓ انصاری خزرجی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ایک کاتب وحی یہ بھی تھے جن چھ صحابہؓ نے حضور ﷺ کے عہد مبارک میں پورا قرآن کریم حفظ کیا تھا ان میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ان کو "سید القراء" کہا جاتا تھا اور خود سرکار ﷺ نے ان کو "سید الانصار کا لقب دیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ "سید المسلمین" کے لقب سے پکارتے تھے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جب سورۂ نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے ابی بن کعبؓ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ یہ سورۃ تمہارے سامنے پڑھوں اور تمہیں سناؤں۔ ابی نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟ حضور نے فرمایا: ہاں اللہ نے تمہارا نام لیا ہے۔ یہ سن کر ابیؓ رونے لگے اور ان کے ساتھ آنحضرت ﷺ بھی رو دیئے۔ ان کی وفات ۱۹ھ میں مدینہ میں ہوئی۔ ایک بہت بڑی جماعت کو ان سے روایت حدیث کا شرف حاصل ہے۔

حلال وحرام کو سب سے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبلؓ انصار میں سے ہیں اور ان ستر خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جو آنحضرت ﷺ کی ہجرت مدینہ سے پہلے مکہ آئے تھے۔ اور بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے، مدینہ میں آنحضرت ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان جو عام بھائی چارہ کرایا تھا اس کے تحت حضرت معاذ بن جبلؓ کا بھائی چارہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یا ایک روایت کے مطابق حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے قائم ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے آپ ﷺ کو قاضی اور معلّم بنا کر یمن بھیجا تھا اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی طاعون عمو اس میں بعمر اڑتیس سال ۱۸ھ میں آپؓ نے انتقال کیا، انتقال کے وقت آپ بار بار کہتے تھے: الٰہی! یہ (سخت ترین طاعون بعض اعتبار سے) درحقیقت تیرے بندوں پر تیری رحمت ہے الٰہی! معاذ اور معاذ کے اہل وعیال کو اس رحمت سے محروم نہ رکھ۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ دم رخصت حضرت معاذؓ کی زبان پر کچھ اس طرح کے الفاظ تھے: الٰہی! موت کی سختی کم کردے جتنا تو چاہے قسم ہے تیری عزت کی تو خوب جانتا ہے کہ میں تجھ کو دوست رکھتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ہم معاذ بن جبلؓ کو اس آیت كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا۔ کے مضمون میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ ﷺ کے ساتھ تشبیہ دیا کرتے تھے حضرت معاذ بن جبلؓ کی علمی فضیلت وبزرگی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی فتویٰ دینے کی اہم ذمہ داری آپ کے سپرد تھی اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں بھی۔ جب آپ معلّم وقاضی ہو کر یمن چلے گئے تو حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے: معاذؓ نے یمن جا کر اہل مدینہ میں فقہ کا خلاء پیدا کر دیا ہے حضرت معاذؓ جنگ بدر میں بھی شریک تھے اور دوسری جنگوں میں بھی مجاہدین اسلام کے دوش بدوش رہے۔ منقول ہے کہ رحلت کے وقت آپ کے ساتھی رونے لگے تو ان سے پوچھا: تم لوگ کیوں رو رہے ہو؟ ان سب نے کہا کہ ہم علم کو رو رہے ہیں جو آپ کی موت کے سبب منقطع ہوا چاہتا ہے، حضرت معاذ نے کہا: علم اور ایمان لازوال ہیں قیامت تک باقی رہنے والے ہیں، حق جس سے بھی ملے حاصل کرو باطل پر جو بھی ہو اس کی تردید ومخالفت کرو۔

"اس اُمّت کے امین ابوعبیدہ بن الجراحؓ ہیں۔" حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت کا سب سے بڑا کامیاب

امتحان اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار کر دیا۔ دشمنان اسلام کی طرف سے اہل اسلام کے خلاف میدان جنگ میں آیا تھا جنگ احد میں پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ میدان کارزار میں ڈٹے رہے اور ذات رسالتماب کو دشمن کے حملوں سے بچانے میں فداکاری کے جوہر دکھائے۔ خلافت صدیقی میں آپ بیت المال کے مہتمم اور افسر اعلیٰ تھے حضرت عمر فاروق نے آپ کو حضرت خالد بن ولید کی جگہ اسلامی فوج کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا اور شام و فلسطین کی اکثر فتوحات آپ ہی کے زیر کمان حاصل ہوئیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے دن فرمایا تھا: اگر آج ابوعبیدہؓ زندہ ہوتے تو اس معاملہ (یعنی خلافت) کی زمام کار (یا یہ کہ انتخاب خلیفہ کے لئے مشاورت کا انتظام و اختیار) میں انہی کو سونپ جاتا۔ حضرت ابوعبیدہؓ زہد و قناعت کے جس درجۂ کمال کے حامل تھے اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جاسکتا ہے جو بعض مستند کتابوں میں عروہ بن زبیر سے منقول ہے کہ جب امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ شام و فلسطین کے دورہ پر آئے تو اس خطہ کے مختلف علاقوں میں تعینات اسلامی افواج کے کمانڈر اور بڑے بڑے عمال و حکام امیر المؤمنین کے استقبال کے لئے موجود تھے حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ جو شام و فلسطین میں اسلامی افواج کے سپہ سالار اعظم تھے، اس وقت تک وہاں نہیں پہنچے تھے، حضرت عمرؓ نے استقبال کرنے والے امراء اور عمائدین سے پوچھا کہ میرا بھائی کہاں ہے؟ لوگوں نے پوچھا: کون آپ کا بھائی؟ فاروق اعظمؓ نے فرمایا: ابوعبیدہ بن الجراحؓ! لوگوں نے کہا کہ وہ آتے ہی ہوں گے۔ جب حضرت ابوعبیدہؓ آگئے تو امیر المؤمنین سواری سے اترے اور ان کو گلے لگایا، پھر ان کے گھر گئے، انہوں نے سپہ سالار اعظم ابوعبیدہؓ کے گھر میں پہنچ کر دیکھا تو وہاں ان کو ایک چھوٹی سی تلوار، ایک سپر کے علاوہ اور کوئی سامان نظر نہ آیا۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ: امیر المؤمنینؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ سے کہا کہ چلو ہمیں اپنے گھر لے چلو اور پھر امیر المؤمنین حضرت ابوعبیدہؓ کے گھر آئے اور اندر پہنچ کر دیکھا تو پورا مکان خالی نظر آیا کہیں کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ امیر المؤمنینؓ نے حیرت سے پوچھا: ابوعبیدہؓ! تمہارا سامان کہاں ہے، یہاں تو ایک نمدہ، ایک رکابی اور ایک تلوار کے علاوہ کچھ بھی مجھے نظر نہیں آرہا ہے حالانکہ تم تو اس علاقہ کے حاکم اعلیٰ اور اسلامی افواج کے سپہ سالار اعظم ہو، کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں؟ حضرت ابوعبیدہؓ یہ سن کر گھر کے ایک کونے میں گئے اور وہاں سے روٹی کے چند خشک ٹکڑے اٹھا کر لائے، فاروق اعظمؓ نے یہ دیکھا تو بے اختیار رونے لگے اور بولے: ابوعبیدہؓ! بس تم ہی ایک مرد افگن نکلے، باقی ہم سب کو تو دنیا نے اپنے فریب کا شکار بنالیا۔"

"..... حق کے مطابق سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں۔" بلاشبہ حضرت علیؓ اس اُمت کے سب سے بڑے قاضی ہیں، قضایا نمٹانے اور حق بجانب فیصلہ کرنے میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا اسی لئے حضرت عمرؓ ان کے مشورہ اور ان کے فتوے کے بغیر کوئی حکم اور فیصلہ صادر نہیں کرتے تھے، اگر حضرت علیؓ موجود نہ ہوتے تو ان کے آنے تک فیصلہ کی کاروائی ملتوی رکھتے تھے۔ بہرحال حدیث کے الفاظ "اقضاھم" کے بظاہر یہی معنی ہیں کہ: "علیؓ فیصلہ طلب مقدموں اور قضیوں کے شرعی اور عدالتی احکام و قوانین سب سے زیادہ جانتے ہیں اور سب سے اچھا فیصلہ دیتے ہیں، تاہم اس سے حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؓ پر حضرت علیؓ کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ حضرت علیؓ کی جزئی فضیلت ہے اور جزئی فضیلت کلی فضیلت کے منافی نہیں ہوتی، جبکہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی شان میں جو نصوص موجود ہیں ان سے علی الترتیب ان دونوں حضرات کا تمام اُمت سے افضل ہونا ثابت ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت کی ایک صریح دلیل تو ایک یہی آیت ہے لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا۔ یہ آیت خاص حضرت ابوبکرؓ ہی کے حق میں نازل ہوئی ہے کیونکہ صرف انہوں نے ہی فتح مکہ سے پہلے اپنا مال جہاد میں لگایا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوئی مسلمان ان کے برابر نہیں ہوسکتا، اس میں بھی کوئی شبہ کہ اس بارہ میں حدیثیں متعارض اور دلیلیں متناقض ہیں اور روایت و دلائل کا یہ تعارض و تناقض اس بات کا مقتضی ہے کہ اس نکتہ کو تسلیم کیا جائے جس پر جمہور صحابہؓ نے اتفاق کیا ہو۔ پس جس نکتہ پر جمہور صحابہؓ نے اتفاق کیا ہے وہ وہی ہے جس پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے یعنی یہ کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اجر و ثواب کی کثرت کے اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ افضل ہیں پھر حضرت عمرؓ، پھر عثمانؓ اور پھر حضرت علیؓ۔

سیدنا علیؓ اور امیر معاویہؓ کا معاملہ: یہاں واضح کردینا ضروری ہے کہ سیدنا علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان جو محاذ آرائی اور جنگ و خصومت واقع ہوئی اس کو "اجتہادی اختلاف" پر محمول کرنے چاہیے۔ حضرت علیؓ نے دینی و شرعی طور پر اپنے کو خلافت کا مستحق سمجھا جبکہ امیر معاویہؓ اپنی خلافت کو برحق جانتے تھے، دونوں نے اپنے اپنے حق میں اجتہاد کیا یہ اور بات ہے کہ سیدنا علیؓ کا اجتہاد درست ظاہر ہوا اور ثابت ہوگیا کہ اس وقت تمام لوگوں میں اُمّت اسلامیہ کے سب سے بڑے آدمی اور سب سے افضل وہی تھے، ان کے برخلاف امیر معاویہؓ اپنے اجتہاد میں درست ثابت نہیں ہوئے کیونکہ حضرت علیؓ کی موجودگی میں وہ خلافت کے ہرگز مستحق نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود فریقین میں سے کسی نے بھی اپنے مخالف فریق کو کافر نہیں کہا دونوں فریق الگ الگ جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے، دونوں کے درمیان زبردست معرکہ آرائی بھی ہوئی، دونوں فریقوں میں سے کچھ لوگوں نے ایک دوسرے کو برا بھی کہا، ایک دوسرے کے خلاف سب وشتم بھی کیا مگر ان میں سے کسی نے کسی کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا، اگرچہ ان میں سے بعض لوگ جہالت و نادانی اور تعصب میں مبتلا ہونے کے سبب ایسے امور کے مرتکب ہوئے جن سے ان کا گناہ گار ہونا یقیناً ثابت ہوتا ہے، پس کسی مؤمن کو ہرگز روا نہیں کہ ان میں سے کسی کی بھی طرف کفر کی نسبت کرے اور ان کے بارے میں ایسا عقیدہ و خیال رکھے جو ایک مؤمن کے حق میں رکھ ہی نہیں سکتا۔

طلحہؓ کے لئے جنّت کی بشارت

⑫ وَعَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ كَانَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ أُحُدٍ دِرْعَانِ فَنَهَضَ إِلَى الصَّخْرَةِ فَلَمْ يَسْتَطِعْ فَقَعَدَ طَلْحَةُ تَحْتَهُ حَتّٰى اسْتَوٰى عَلَى الصَّخْرَةِ فَسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَوْجَبَ طَلْحَةُ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ جنگ احد کے دن نبی کریم ﷺ کے جسم پر دو زرہیں تھیں (دوران جنگ ایک موقع پر) آپ ﷺ نے ایک چٹان چڑھنا چاہا (تاکہ دشمن کے لشکر کا جائزہ لیں اور مجاہدین اسلام کو بلندی پر سے دکھائی دیں) لیکن (دونوں زرہوں کے بوجھ کی وجہ سے) اوپر چڑھنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ طلحہؓ نے (آپ ﷺ کو چٹان پر چڑھنے کی کوشش کرتے اور پھر کامیاب نہ ہوتے دیکھا تو فوراً) آپ ﷺ کے نیچے بیٹھ گئے تا آنکہ آنحضرت ﷺ ان کے اوپر چڑھ کر چٹان پر پہنچ گئے اور پھر میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا: طلحہؓ نے (جنت کو) واجب کرلیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ کے ارشاد: خُذُوْا حِذْرَكُمْ (اے ایمان والو! اپنی احتیاط رکھو) کی زیادہ سے زیادہ تعمیل کی خاطر آپ ﷺ نے دو زرہیں اس دن پہن رکھی تھیں کیونکہ زرہ اور سپر جیسی چیزیں سامان جنگ میں سے ہیں اور میدان جنگ میں دشمن کے حملوں سے بچاؤ کے لئے لازمی ذریعہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دشمن کے مقابلہ پر ہتھیاروں کا استعمال اور تحفظ کے مادی ذرائع اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر دو زرہیں پہن کر گویا اُمّت کو بتایا کہ دشمن کے مقابلہ پر اپنے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہئے۔

"طلحہؓ نے (جنت کو) واجب کرلیا۔" "جنت" کا لفظ بعض روایتوں میں صریح آیا ہے اس جملہ کا مطلب یہ تھا کہ طلحہؓ نے اپنے اس ایک عمل کے ذریعہ یا اپنے ان مجاہدانہ کارناموں کے ذریعہ جو انہوں نے اس جنگ میں انجام دیئے ہیں، اپنے لئے جنّت کا استحقاق اور وجوب پیدا کرلیا ہے۔ بلاشبہ اس جنگ میں حضرت ابو طلحہؓ کی جانثاری و فداکاری اسی طرح کی تھی کہ آنحضرت ﷺ ان کو اس بشارت سے نوازتے۔ انہوں نے جان کی بازی لگا کر اپنے جسم کو آنحضرت ﷺ کی ڈھال بنالیا تھا اور آنحضرت کی طرف آنے والے تمام تیر اپنے بدن پر روک رہے تھے، ان کا پورا جسم زخموں سے چھلنی ہوگیا تھا، ان کا ہاتھ تو زندگی بھر معطل اور شل رہا۔ اسی ۸۰ سے اوپر زخم ان کے بدن پر شمار کئے گئے تھے یہاں تک کہ ان کا عضو مخصوص بھی زخمی ہونے سے نہیں بچا تھا۔ بعد میں صحابہ کرامؓ جب بھی غزوۂ احد کا

ذکر کرتے تو کہا کرتے تھے کہ جنگ کا وہ پورا دن طلحہؓ کی سرفروشی اور فدا کاری کا دن تھا۔

جنگ احد کے دن آنحضرت ﷺ پر کیا گزری: حضرت ابو سعید خدریؓ نے ایک روایت میں بیان کیا ہے کہ جنگ احد کے دن ایک دشمن دین عتبہ بنؓ وقاص نے آنحضرت ﷺ کو ایک پتھر پھینک کر مارا جس کی چوٹ سے آپ ﷺ کا دائیں طرف کا دندان مبارک شہید ہو گیا اور نیچے کا ہونٹ زخمی ہو گیا ایک اور بد بخت عبداللہ بن شہاب زہری کے حملہ کے نتیجہ میں آپ ﷺ کی مبارک پیشانی پر سخت زخم آیا اور خود کی دو کڑیاں رخسار مبارک میں پیوست ہو گئیں۔ دشمنوں نے میدان جنگ میں پوشیدہ طور پر کچھ گڑھے کھود کر ان کو اوپر سے اس طرح برابر کر دیا تھا کہ نادانستگی میں جس مسلمان کا پیر اس کے اوپر پڑے وہ گڑھے میں گر جائے چنانچہ ایسے ہی ایک گڑھے میں آنحضرت ﷺ بھی گر پڑے تھے، فوراً حضرت علیؓ نے آگے بڑھ کر آپ ﷺ کا دست مبارک تھاما اور پھر حضرت طلحہؓ بن عبیداللہؓ نے آپ ﷺ کو اٹھایا اور گڑھے سے باہر نکال کر کھڑا کیا چہرۂ مبارک کے زخموں سے جو خون نکل رہا تھا اس کو ابو سعید خدریؓ نے اپنے منہ سے چوسا اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میرا خون چوس کر صاف کیا ہے۔ اس کو دوزخ کی آگ چھونے بھی، نہیں پائے گی۔

حضرت طلحہؓ کی فضیلت

⑭ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ قَالَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى رَجُلٍ يَمْشِىْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ وَقَدْ قَضٰى نَحْبَهٗ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى هٰذَا وَفِىْ رِوَايَةٍ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى شَهِيْدٍ يَمْشِىْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے طلحہ بن عبیداللہ کی طرف (محبت بھری نظروں سے) دیکھا اور فرمایا: "جس شخص کی خواہش ہو کہ اس انسان کو دیکھے جو زمین پر چلتا پھرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ مردہ ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس انسان (طلحہؓ) کو دیکھے۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص ایسے شہید کا دیدار کرنا چاہے جو زمین پر چلتا پھرتا ہے تو وہ طلحہ بن عبیداللہؓ کو دیکھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "حقیقت میں وہ مردہ ہے" یہ قضی نحبہ کا ترجمہ ہے۔ اصل میں تو نحب کے معنی ہیں: منت ماننا، نذر کرنا، عہد کرنا۔ لیکن اس کے ایک معنی موت اور اجل کے بھی آتے ہیں چنانچہ قرآن کریم کی اس آیت! من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ و منھم من ینتظر۔ میں مفسرین نے قضی نحبہ کی تفسیر میں دونوں معنی مراد لئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس حدیث میں بھی قضی نحبہ کو اگرچہ دونوں معنی پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن دوسرے معنی تو (موت کے مفہوم میں) مراد لینا زیادہ صحیح اور زیادہ موزوں ہے جیسا کہ دوسری روایت شہید یمشی علی وجہ الارض سے بھی ظاہر ہے۔ بہر صورت اس ارشاد گرامی سے آنحضرت ﷺ کا مقصد لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ طلحہؓ وہ شخص ہے جس نے اللہ کی راہ میں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے سرفروشی اور فدا کاری کا جو عہد کیا تھا اس کو پورا کر دیا اور میدان جنگ میں اس نے جان سپاری کے ذریعہ در حقیقت موت کا مزہ چکھ لیا یہ اور بات ہے کہ وہ ابھی زندہ نظر آتا ہے، یہ معلوم ہی ہے کہ جنگ احد کے دن حضرت طلحہؓ نے خود کو آنحضرت ﷺ کی ڈھال بنا لیا تھا اور اس کے نتیجہ میں ان کے جسم کا کوئی حصہ کوئی عضو زخمی ہونے سے نہیں بچا تھا۔

بعض حضرات نے لکھا ہے اس حدیث میں حضرت طلحہؓ کے تعلق سے جو کچھ فرمایا گیا اس میں "در حقیقت اس اختیاری موت" کی طرف اشارہ ہے جو اہل سلوک اور ارباب فناہ کو حاصل ہوتی ہے یا مردہ ہونے" سے ذات باری تعالیٰ کی طرف انجذاب اور ذکر الٰہی اور مشاہدہ ملکوت میں پوری طرح مستغرق ہونے کے سبب عالم شہادت سے غائب ہونا ہے جو در اصل (اختیاری موت) کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ

بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے "مردہ" کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہو کہ مآل کار حضرت طلحہؓ کو شہادت کی موت اور حسن خاتمہ کی سعادت نصیب ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت طلحہؓ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔

طلحہؓ اور زبیرؓ کی فضیلت

⑮ وَعَنْ عَلِيٍّؓ قَالَ سَمِعتُ اُذُنَيَّ مِنْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ طَلْحَةُ وَالزُّبَيْرِ جَارَايَ فِي الْجَنَّةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میرے کانوں نے رسول کریم ﷺ کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے سنے: "طلحہؓ اور زبیرؓ جنت میں میرے پڑوسی ہیں۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: ان الفاظ کے ذریعہ کنایۃً اس کمال قرب و تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے جو ان دونوں حضرات اور نبی کریم ﷺ کے مابین تھا۔

سعدؓ کے لئے دعا

⑯ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَئِذٍ يَعْنِيْ يَوْمَ اُحُدٍ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ رَمْيَتَهٗ وَاَجِبْ دَعْوَتَهٗ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے (ان کے حق میں) اس دن یعنی غزوۂ احد کے دن یوں دعا فرمائی خداوندا! اس (سعدؓ) کی تیر اندازی میں شدت و قوت عطا فرما اور اس کی دعا قبول کر۔" (شرح السنۃ)

تشریح: اس موقع پر تیر اندازی میں شدت و قوت کے ساتھ اجابت دعا کا ذکر اس مناسبت سے تھا کہ عرف عام میں تیر اور دعا کے درمیان گہرا تعلق ہے، تیر کا دعا سے استعارہ کیا جاتا ہے اور "تیر دعا" دعا کا تیر بہدف ہونا" بڑا مشہور محاورہ تو خود اردو زبان میں بھی ہے اس مناسبت سے بطور نکتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت سعدؓ کا مستجاب الدعوات بن جانا گویا اس تیر کا اثر تھا جو انہوں نے اللہ کی راہ میں اسلام میں سب سے پہلے تیر چلایا تھا۔

⑰ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰهُمَّ اسْتَجِبْ لِسَعْدٍ اِذَا دَعَاكَ۔ (رواہ الترمذی۔)

"اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے دعا فرمائی تھی: "خداوندا! سعدؓ جب تم سے دعا مانگے تو اس کو قبول فرما۔" (ترمذیؒ)

سعدؓ کی فضیلت

⑱ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ مَا جَمَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبَاهُ وَاُمَّهٗ اِلَّا لِسَعْدٍ قَالَ لَهٗ يَوْمَ اُحُدٍ اِرْمِ فِدَاكَ اَبِيْ وَاُمِّيْ وَقَالَ لَهٗ اِرْمِ اَيُّهَا الْغُلَامُ الْحَزَوَّرُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے ماں باپ کو سعدؓ کے علاوہ کسی کے لئے جمع نہیں کیا چنانچہ غزوۂ احد کے دن ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: "تیر چلائے جا، تجھ پر میرے ماں باپ صدقے۔" نیز (اس دن) آپ ﷺ نے سعدؓ کو مخاطب کر کے یوں بھی فرمایا تھا: "تیر پھینکے جا اے جواں مرد۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اور اس "جواں مرد" نے جب ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا تو اس وقت اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ ان پے چھ حالات پیچھے گزر چکے ہیں، انہوں نے اپنے زمانۂ اسلام کے ہر اہم معاملہ اور واقعہ میں سرگرم حصہ لیا تھا اور دین کی سربلندی کے لئے بڑی بڑی

قربانیاں پیش کیں آخر میں جب ملت انتشار و تنازعہ کی صورت حال سے دوچار تھی اور خلافت و اقتدار کے مسئلہ پر مختلف گروہوں کی محاذ آرئیاں ہو رہی تھیں تو انہوں نے تمام معاملات سے کامل یکسوائی اختیار کرلی تھی اور خود کو گھر کے اندر محصور کر کے ایک قبر تک محدود کر لیا تھا اور اپنے گھر کے لوگوں کو ہدایت دیدی تھی کہ باہر کی کوئی خبر مجھ تک نہ پہنچائی جائے تاآنکہ اُمّت کسی ایک امام پر متفق و متحد ہو جائے۔

⑲ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَقْبَلَ سَعْدٌ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھٰذَا خَالِی فَلْیُرِنِی امْرُأٌ خَالَہٗ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ کَانَ سَعْدٌ مِنْ بَنِیْ زُھْرَۃَ وَکَانَتْ اُمُّ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ بَنِیْ زُھْرَۃَ فَلِذٰلِکَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھٰذَا خَالِیْ وَفِی الْمَصَابِیْحِ فَلْیُکْرِمَنَّ بَدَلَ فَلْیُرِنِیْ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) سعد بن ابی وقاص (مجلس مبارک میں) آئے تو نبی کریم ﷺ نے (ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "یہ میرے ماموں ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسا ماموں رکھتا ہے تو وہ مجھ کو دکھائے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سعدؓ (قریش کے ایک قبیلہ) بنی زہرہ سے تھے اور (چونکہ آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ بھی بنی زہرہ ہی سے تھیں) اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ نے ان کے بارہ میں فرمایا یہ میرے ماموں ہیں نیز مصابیح میں فلیرنی (تو وہ مجھ کو دکھائے) کے بجائے فلیکرمن (تو وہ اپنے اس ماموں کی تکریم کرے) کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں (لیکن ابن حجرؒ نے اس تبدیلی کو "تصحیف" کہا ہے بلکہ ملا علی قاریؒ نے تو "تحریف" قرار دیا ہے۔"

تشریح: "...... تو وہ مجھ کو دکھائے" یعنی اگر کوئی شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کا ماموں میرے ماموں جیسا ہے نہیں ہو سکتا۔

"زہرہ" عورت کا نام ہے جو کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب کی بیوی تھی، اس کی اولاد کو بنوزہرہ کہا جاتا ہے اور یہ قریش کی ایک مشہور شاخ تھی۔ آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ اور حضرت سعد بن وقاصؓ کا نسبی تعلق اسی شاخ سے تھا اور اس اعتبار سے حضرت آمنہ اور سعد بن وقاصؓ بہن بھائی ہوئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اسلام میں سب سے پہلا تیر سعدؓ نے چلایا

⑳ عَنْ قَیْسِ بْنِ اَبِیْ حَازِمٍ قَالَ سَمِعْتُ سَعْدَ بْنَ اَبِیْ وَقَّاصٍ یَقُوْلُ اِنِّیْ لَاَوَّلُ رَجُلٍ مِنَ الْعَرَبِ رَمٰی بِسَھْمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَرَاَیْتُنَا نَغْزُوْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَالَنَا طَعَامٌ اِلَّا الْحُبْلَۃُ وَوَرَقُ السَّمُرِ وَاِنْ کَانَ اَحَدُنَا لَیَضَعُ کَمَا تَضَعُ الشَّاۃُ مَالَہٗ خِلْطٌ ثُمَّ اَصْبَحَتْ بَنُوْ اَسَدٍ تُعَزِّرُنِیْ عَلَی الْاِسْلَامِ لَقَدْ خِبْتُ اِذًا وَضَلَّ عَمَلِیْ وَکَانُوْا وَشَوْا بِہٖ اِلٰی عُمَرَ وَقَالُوْا لَا یُحْسِنُ یُصَلِّیْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت قیس بن ابی حازمؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو یہ فرماتے سنا: یقیناً میں عرب میں پہلا شخص ہوں جس نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا اور ہم نے وہ (زمانہ دیکھا ہے جب ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ مصروف جہاد رہا کرتے تھے اور ہمارے پاس خوراک نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی، ہاں کیکر کی پھلیاں (جو لوبیہ کے مشابہ ہوتی ہیں اور کیکر کی پتیاں ضرور مل جاتی تھیں (جنہیں ہم پیٹ میں پہنچا کر بھوک کی آگ کچھ ٹھنڈی کر لیتے تھے) اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ہم لوگ بکری کی مینگنیوں کی مانند خشک پاخانہ پھرتے تھے جس میں رطوبت اور چپچپاہٹ کا نام تک نہ ہوتا تھا پھر (اب وہ زمانہ بھی دیکھنا پڑ رہا ہے کہ بنو اسد مجھ کو اسلام (یعنی نماز) کے بارہ میں نصیحت (یا تنبیہ) کرتے ہیں۔ (بخدا اگر میں اب بھی بنو اسد کی نصیحت کا محتاج اور دین کے بارہ میں ان سے کمتر ہوں) تو پھر اس میں کیا شبہ کہ

میں حرماں نصیب ہی رہا اور میرا کیا دھرا اکارت ہوا۔ (یہ سعدؓ نے اس وجہ سے کہا کہ) بنو اسد نے حضرت عمر فاروقؓ سے سعد کی چغل خوری اور شکایت کی تھی اور کہا تھا کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "بنو اسد" سے زبیر بن العوام بن خویلد بن اسد کی اولاد اور اہل خاندان مراد ہیں۔ دراصل اس زمانہ میں جبکہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے کوفہ کی گورنری کے منصب پر فائز تھے، بنو اسد لوگوں کی زبانی یا تحریری طور پر حضرت عمرؓ کے پاس یہ شکایت بھیجا کرتے تھے کہ سعدؓ نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے یعنی یا تو نماز کی شرائط اور ارکان اور یا سنن کی ادائیگی خوب طرح نہیں کرتے اور اس کے آداب و محاسن کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس شکایت پر حضرت عمرؓ نے سعدؓ سے جواب طلب کیا اور ان کو تنبیہ و تہدید لکھ بھیجی، حضرت سعدؓ نے صورت حال کی وضاحت کی اور امیر المؤمنین کو بتایا کہ میں آنحضرت ﷺ کی نماز کے مطابق ہی لوگوں کو نماز پڑھاتا ہوں، چنانچہ پہلی دونوں رکعتیں تو طویل رکھتا ہوں اور بعد کی دونوں رکعتوں کو مختصر کرتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے سعدؓ کی وضاحت کو قبول کیا۔ نماز پڑھانے کے ان کے طریقہ کی تصویب کی اور فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ تم نے جو بیان کیا ہے وہ صحیح ہے۔ بنو اسد کا حضرت سعدؓ کے خلاف دربار خلافت میں شکایت پہنچانا اور اچھی طرح نماز نہ پڑھنے کا الزام ان پر عائد کرنا یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ تھا جس نے حضرت سعدؓ کے جذبات و احساسات کو زبردست ٹھیس پہنچائی اور مجبورًا انہیں اپنے اس افتخار کا اظہار کرنا پڑا کہ انہیں پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ دور اول کی اس انقلابی جدوجہد میں بھرپور شرکت کا اعزاز حاصل ہے جو اسلام کے نام لیواؤں کے لئے سراسر مشقت، جان کاہی اور سخت جسمانی و روحانی آزمائشوں کا موجب تھی۔ حضرت سعدؓ نے گویا اس تاثر کا اظہار کیا کہ جب سخت ترین دور بھی میری دینی زندگی میں کوئی اضمحلال اور تساہلی پیدا نہ کرسکا اور بڑی سے بڑی پریشانی اور سختی برداشت کر کے بھی میں نے اسلام کے فرائض کو کماحقہ، ادا کیا تو اب نماز جیسی سب سے اہم عبادت میں کسی سہل انگاری یا تساہلی کا روادار کیسے ہوسکتا ہوں یہ کتنی ناانصافی کی بات ہے کہ بنو اسد نے قبول اسلام میں میری سبقت اسلام کے لئے میری جدوجہد اور قربانیاں اور دین کے راستہ میں میری ثابت قدمی اور میری تمام طاعات و عبادات کو نظر انداز کر کے مجھ پر ایسا الزام عائد کیا جو میرے لئے عار کا باعث ہے اور مجھے سخت ذہنی و روحانی اذیت میں مبتلا کردینے والا ہے حضرت سعدؓ نے جن الفاظ میں اپنے احساسات کا اظہار کیا اس سے معلوم ہوا کہ دینی مصلحت کے تحت اور معاندانہ عیب جوئی و تنقیص کے ازالہ کی خاطر اپنے علم و فضل اور اوصاف کمالات کا واقعاتی اور حقیقی پیرایۂ بیان میں فخریہ اظہار شریعت میں جائز ہے۔ چنانچہ یہ ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ صالح اور صحت مند اغراض کے تحت اپنے اوصاف و کمالات کا آپس میں فخریہ اظہار کیا کرتے تھے۔

حضرت سعدؓ کا افتخار

(۲۱) وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ رَاَيْتُنِيْ وَاَنَا ثَالِثُ الْاِسْلَامِ وَمَا اَسْلَمَ اَحَدٌ اِلَّا فِي الْيَوْمِ الَّذِيْ اَسْلَمْتُ فِيْهِ وَلَقَدْ مَكَثْتُ سَبْعَةَ اَيَّامٍ وَاِنِّيْ لَثُلُثُ الْاِسْلَامِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سعدؓ نے کہا: میں اپنے بارہ میں (دوسروں سے زیادہ) جانتا ہوں، اسلام کی فہرست میں میرا نمبر تیسرا ہے اور (مجھ سے پہلے مشرف باسلام ہونے والے ان دونوں میں سے بھی) کوئی شخص اس دن سے دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوا تھا جس دن کہ میں نے اسلام قبول کیا تھا اور پھر سات دن تک میں اسلام کا تہائی حصہ بنا رہا۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت سعدؓ کا مطلب یہ تھا سب سے پہلے دن جن تین آدمیوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا ان میں سے دو تو حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوبکرؓ تھے اور تیسرا آدمی میں خود تھا، اس طرح اگرچہ حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن ہم تینوں کے اسلام قبول کرنے کا دن بہرحال ایک ہی تھا، پھر میرے قبول اسلام کے بعد سات دنوں تک کسی شخص نے

اسلام قبول نہیں کیا۔ میرے بعد جو لوگ مسلمان ہوئے وہ سب ان سات دنوں کے بعد ہی ہوئے یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حضرت سعدؓ کی مراد یہ تھی کہ آزاد اور بالغ لوگوں میں ہم تین آدمیوں کے علاوہ اور کوئی شخص ان سات دنوں میں مسلمان نہیں ہوا۔ یا یہ کہ حضرت سعدؓ کو شاید اور لوگوں کے اسلام کی خبر نہ ہوئی ہوگی۔ اس وضاحت سے نہ تو یہ اشکال پیدا ہوگا کہ جب حضرت علیؓ (جو قبول اسلام کے وقت نابالغ تھے اور حضرت زید بن حارثہؓ (غلام کے بارے میں ثابت ہے کہ ان دونوں نے بھی پہلے ہی دن اسلام قبول کر لیا تھا تو حضرت سعدؓ نے یہ بات کیسے کہی اور نہ حضرت عمارؓ کی اس روایت سے حضرت سعدؓ کی اس روایت کا تناقض لازم آئے گا جس میں انہوں نے (یعنی عمارؓ نے کہا: جب میں نے (پہلی مرتبہ) رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تو اس وقت پانچ غلاموں، دو عورتوں اور ایک ابوبکرؓ کے علاوہ اور کوئی شخص آپ ﷺ کے ساتھ مسلمان نہیں تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی فضیلت

(۲۲) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ لِنِسَآئِهٖ اِنَّ اَمْرَكُنَّ مِمَّا يُهِمُّنِيْ مِنْ بَعْدِيْ وَلَنْ يَصْبِرَ عَلَيْكُنَّ اِلَّا الصَّابِرُوْنَ الصِّدِّيْقُوْنَ قَالَتْ عَائِشَةُ يَعْنِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ثُمَّ قَالَتْ عَائِشَةُ لِاَبِيْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ سَقَى اللّٰهُ اَبَاكَ مِنْ سَلْسَبِيْلِ الْجَنَّةِ وَكَانَ ابْنُ عَوْفٍ قَدْ تَصَدَّقَ عَلٰى اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِحَدِيْقَةٍ بِيْعَتْ بِاَرْبَعِيْنَ اَلْفًا۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں سے فرمایا: تمہارا معاملہ کچھ اس نوعیت کا ہے کہ مجھ کو میرے بعد کے فکر میں ڈالتا ہے اور تمہارے خرچہ پر وہی جو صبر کریں گے (صابر ہیں اور صدیق ہیں حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ (صابر اور صدیق سے) آنحضرت ﷺ کی مراد وہ لوگ ہیں جو صدقہ دینے والے اور کار خیر کرنے والے ہیں پھر حضرت عائشہؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے بیٹے حضرت ابوسلمہ تابعیؒ کے سامنے (ان کے والد بزرگوار کے زبردست مالی ایثار پر اظہار تشکر اور جذبہ منت گزاری کے تحت) کہا: "اللہ تعالیٰ تمہارے باپ کو جنت کی سلسبیل سے سیراب فرمائے" اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات (کے خرچہ) کے لئے ایک باغ دیا تھا جو چالیس ہزار دینا کو بیچا گیا تھا۔"

تشریح: "جو صابر ہیں" یعنی وہ لوگ کہ جو اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر اپنا مال اور اپنی دولت خرچ کرتے ہیں، صدقہ و خیرات کے ذریعہ اس دنیا کی پونجی کو تو کم کرتے ہیں مگر آخرت کے سرمایہ میں اضافہ کرتے ہیں اور اس طرح مال و دولت کے خرچ ہونے پر نفس کو جو ناگواری ہوتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں۔

"...... صدیق ہیں یعنی وہ لوگ جو صدقہ معاملہ میں کامل ہیں، ادائے حقوق میں سب سے آگے ہیں اور جود و سخا میں کثیر الصدق ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات سے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اختیار دیا تھا کہ چاہے تو زوجیت رسول کے شرف کی صورت میں آخرت کو اختیار کر لو، چاہو آسائش و آرام کی زندگی گزارنے کی خاطر اس شرف کو چھوڑ دینا اختیار کر لو، تو اس وقت تم نے اگرچہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دی تھی اور میری رفاقیت و زوجیت میں رہنے کے فیصلہ کو اس کامل یقین کے ساتھ برقرار رکھا تھا کہ اس عظیم ترین شرف و اعزاز کی خاطر دنیا کے بڑے مصائب اور بڑی سے بڑی سختی کو بھی خوش دلی سے انگیز کرو گی، تاہم مجھ کو کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں تمہارے لئے میراث چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں، نہ معلوم میری وفات کے بعد تمہیں کن حالات سے دوچار ہونا پڑے۔ تمہارے ساتھ لوگ کیا معاملہ اور کیسا سلوک رکھیں گے کون شخص تمہارے گزارے کا متکفل بنے گا اور کس شخص کو تمہاری خبر گیری کی توفیق نصیب ہوگی اور جو تمہارے مصارف کے لئے اپنے مال اور اپنی جائداد کا نذرانہ پیش کریں گے ان کا وہی مقام و مرتبہ ہوگا جو اللہ کے نزدیک "صابر" اور "صدیق" کا ہوتا ہے حضرت عائشہ نے ارشاد نبوت کے سیاق میں، صابر اور صدیق کے معنی بیان

کئے اور پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حق میں، ان کے بیٹے کے سامنے، جو دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے اس سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی وہ فضیلت ظاہر ہوئی جو انہوں نے ازواج مطہرات کے لئے اپنی بڑی ایک جائداد کا نذرانہ پیش کر کے اس حدیث کے مطابق حاصل کی۔

اللہ کی راہ میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی مالی قربانیاں: حدیث بالا میں یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے باغ ازواج مطہرات کے لئے دیا تھا وہ چالیس ہزار دینار کو بیچا گیا، لیکن ترمذیؒ ہی کی ایک اور روایت میں، جس کو ترمذیؒ نے "حسن غریب" کہا ہے، یوں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ازواج مطہرات کے مصارف کے لئے اپنا ایک پورا باغ اللہ کی راہ میں دیدیا تھا جو چار لاکھ درہم یا دینار کو بیچا گیا۔ یہ تو ابن عوفؓ کی مالی قربانیوں کی صرف ایک مثال ہے، وہ بہت بڑے تاجر تھے اور وسیع بنیادوں پر پھیلی ہوئی اپنی تجارت کے ذریعہ جتنا زیادہ مال واسباب پیدا کرتے تھے اتنا ہی اللہ کی راہ میں خرچ بھی کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ان کی زندگی اور ان کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا مطلقاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی تمام تر تجارت اور کسب مال کا مقصد ہی اللہ کی راہ میں اور دین کی سربلندی کے لئے خرچ کرنا تھا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک مرتبہ اپنے آدھے مال واسباب اور چار ہزار دینار یا درہم نقد کا نذرانہ پیش کیا، پھر انہوں نے چالیس ہزار دینار تصدق کیے، پھر پانچ سو گھوڑے جہاد کے لئے اللہ کی راہ میں دیئے، اور پھر جہاد ہی کے لئے اللہ کی راہ میں انہوں نے ڈیڑھ ہزار اونٹنیاں پیش کیں اور ان تمام مال واسباب میں سے اکثر حصہ ان کے تجارتی مال وسرمایہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق ایک دن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ایک سو پچاس ہزار یعنی ڈیڑھ لاکھ دینار اللہ کی خوشنودی کے لئے صحابۂ کرام کو دیئے، پھر جب رات آئی تو گھر میں قلم کاغذ لے کر بیٹھے اور اپنا تمام مال مہاجرین وانصار صحابہؓ میں تقسیم کرنے کے لئے ایک فہرست مرتب کی، اس فہرست میں انہوں نے اپنے بدن کے کپڑوں تک کے بارے میں لکھا کہ میرے بدن پر جو قمیص ہے وہ فلاح صاحب کے لئے ہے اور میرا عمامہ فلاں صاحب کے لئے اس طرح انہوں نے اپنے مال واسباب میں سے کچھ باقی نہیں رہنے دیا، ایک ایک چیز حاجتمندوں کے نام لکھ دی، اس کام سے فارغ ہو کر سو گئے۔ صبح ہوئی تو نماز فجر کے لئے مسجد پہنچے اور آنحضرت ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی اتنے میں حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے کہا کہ اے محمد ﷺ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عبدالرحمٰنؓ کو میری طرف سے سلام کہو اور وہ فہرست (جو انہوں نے آج رات میں بنائی ہے) ان سے قبول کر کے پھر ان کو واپس کر دو اور ان سے کہو کہ اللہ نے تمہارا صدقہ قبول کر لیا، اس سارے مال واسباب میں تم اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے وکیل ہو، اپنی مرضی سے اس میں سے لین دین کرو اور اپنے سابقہ حق تصرف کے ساتھ چاہو خرچ کرو، اس کا تم سے کوئی حساب نہیں لیا جائے گا اس کے ساتھ ہی ان کو جنت کی بشارت عطا کی گئی۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے تیس ہزار غلام، آزاد کئے۔ پسماندگان میں انہوں نے چار بیویاں چھوڑی تھیں اور منقول ہے کہ ایک ایک بیوی کے حصہ میں اسی اسی ہزار درہم آئے تھے بلکہ ایک روایت میں یوں ہے کہ عبداللہ بن عوفؓ کا ترکہ سولہ سہام پر تقسیم، ہوا اور ہر بیوی کے حصہ میں دو دو لاکھ درہم آئے۔

خداوندا! عبدالرحمٰن بنؓ عوف کو جنّت کی نہر سے سیراب فرما

(۲۳) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لِاَزْوَاجِهٖ اِنَّ الَّذِىْ يَحْثُوْ عَلَيْكُنَّ بَعْدِى هُوَ الصَّادِقُ الْبَارُّ اَللّٰهُمَّ اسْقِ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ مِنْ سَلْسَبِيْلِ الْجَنَّةِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو اپنی بیویوں سے یوں فرماتے سنا: "حقیقت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد جو شخص مٹھیاں بھر بھر کر تم پر خرچ کرے گا یعنی پوری فراخ دلی اور کامل سخاوت کے ساتھ تمہارے مصارف میں اپنا مال خرچ کرے گا وہ

صادق الایمان صحاب احسان ہے خداوندا! عبدالرحمن بن عوفؓ کو جنت کی نہر سلسبیل سے سیراب کر۔" (احمدؒ)

تشریح: ظاہر تو یہ ہے کہ دعائیہ الفاظ حضرت ام سلمہؓ کے اپنے ہیں جیسا کہ پچھلی روایت میں حضرت عائشہؓ سے نقل ہوا، لیکن بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ دعائیہ الفاظ بھی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا حصہ ہیں۔ دراصل آنحضرت ﷺ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ عبدالرحمن بن عوفؓ میری بیویوں کے ساتھ کتنا بڑا احسان کریں گے اور اس لئے آپ ﷺ نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی۔ اس اعتبار سے یہ حدیث آنحضرت ﷺ کے اعجاز کو ظاہر کرتی ہے۔

حضرت ابوعبیدہؓ کی فضیلت

(۲۴) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ جَآءَ اَهْلُ نَجْرَانَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ابْعَثْ اِلَيْنَا رَجُلًا اَمِيْنًا فَقَالَ لَاَبْعَثَنَّ اِلَيْكُمْ رَجُلًا اَمِيْنًا حَقَّ اَمِيْنٍ فَاسْتَشْرَفَ لَهَا النَّاسُ قَالَ فَبَعَثَ اَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (جو کبار صحابہؓ میں سے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے محرم راز تھے) کہتے ہیں کہ نجران کے لوگوں نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے پاس (حاکم وقاضی بنا کر) ایسے شخص کو بھیجئے جو امانت دار ہو یعنی ہمارے حقوق میں کوئی خیانت نہ کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یقیناً میں ایک ایسے شخص کو (حاکم یا قاضی بنا کر تمہارے ہاں بھیجوں گا جو امین ہے اور اس لائق ہے کہ اس کو امانت دار کہا جائے۔ (یہ سن کر) لوگ اس شرف کے حصول کی تمنا اور انتظار کرنے لگے (کہ دیکھیں کون شخص اس منصب کا شرف وامتیاز حاصل کرتا ہے) حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ: آنحضرت ﷺ نے ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو بھیجا۔"

(بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "نجران" یمن میں ایک جگہ کا نام ہے جس کو ۱۰ھ میں فتح کیا گیا تھا اور ایک قول یہ ہے کہ "نجران" حجاز اور شام کے درمیان واقع ایک جگہ کا نام ہے...... تمنا اور انتظار کرنے لگے "اس تمنا اور اظہار کا تعلق جاہ طلبی کے جذبہ اور حصول منصب کی خواہش سے ہرگز نہیں تھا بلکہ اس تمنا واشتیاق کی بنیاد صفت امانت سے متصف قرار پانے کی طلب وخواہش تھی۔

امارت وخلافت کے بارہ میں آنحضرت سے ایک سوال اور اس کا جواب

(۲۵) وَعَنْ عَلِيٍّؓ قَالَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ نُؤَمِّرُ بَعْدَكَ قَالَ اِنْ تُؤَمِّرُوْا اَبَا بَكْرٍ تَجِدُوْهُ اَمِيْنًا زَاهِدًا فِي الدُّنْيَا رَاغِبًا فِي الْاٰخِرَةِ وَاِنْ تُؤَمِّرُوْا عُمَرَ تَجِدُوْهُ قَوِيًّا اَمِيْنًا لَا يَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَاِنْ تُؤَمِّرُوْا عَلِيًّا وَلَا اُرَاكُمْ فَاعِلِيْنَ تَجِدُوْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا يَاْخُذُ بِكُمُ الطَّرِيْقَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ کسی نے سوال کیا: یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) کے بعد ہم کس کو اپنا امیر وسربراہ بنائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم میرے بعد ابوبکرؓ کو اپنا امیر وسربراہ بناؤ گے تو ان کو امانت دار، دنیا سے بے پرواہ اور آخرت کی طرف راغب پاؤ گے۔ اگر عمرؓ کو اپنا امیر وسربراہ بناؤ گے تو ان کو (بار امانت اٹھانے میں) بہت مضبوط، امین اور ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے خوف پاؤ گے، اور اگر علیؓ کو اپنا امیر وسربراہ بناؤ گے، درآنحالیکہ میرے خیال میں تم ان کو (اختلاف ونزاع کے بغیر) اپنا امیر وسربراہ بنانے والے نہیں ہو۔ تاہم جب بناؤ گے تو ان کو راہ راست دکھانے والا (یعنی مکمل مرشد) بھی پاؤ گے اور کامل ہدایت یافتہ بھی) جو تمہیں صراط مستقیم پر چلائیں گے۔"

(احمدؒ)

تشریح: "امانت دار دنیا سے بے پرواہ" یعنی حقوق دین کی ادائیگی میں ان سے کوئی خیانت نہیں ہوگی۔ وہ دین وملت کے معاملہ میں جو بھی حکم وفیصلہ صادر کریں گے، اس کی بنیاد میں عدل اور دیانت ہی کار فرما ہوگی۔ اسی طرح ان کو دنیا سے کوئی محبت نہیں ہوگی بلکہ ان کی

تمام تر توجہ اور دلچسپی آخرت کی طرف ہوگی۔ ان الفاظ کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ میرے بعد خلافت و امارت کا استحقاق کے لئے ان اوصاف کو پہلا معیار بنانا چاہئے، کیونکہ جس شخص میں یہ اوصاف ہوں گے وہ دراصل "اخلاص" کے درجہ کمال پر فائز ہوگا اور "اخلاص" ہی وہ جوہر ہے جو "خلاص یعنی نجات" کو لازم کرتا ہے۔ ایک روایت میں تجدوہ مسلما امینا (تو تم ان کو امانتدار مسلمان پاؤ گے) کے الفاظ ہیں اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں تجد وہ قویا فی امر اللہ ضعیفا فی نفسہ..... (تو تم ان کو ایسا انسان پاؤ گے جو اللہ کے معاملہ میں تو نہایت سخت اور مضبوط ہوگا اور اپنی ذات کے معاملہ میں کمزور و ضعیف ہوگا۔

ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے خوف۔" یعنی دین کے معاملہ میں وہ کسی بھی خارجی خوف و مصلحت سے بے نیاز ہوں گے، شریعت کے نفاذ و اشاعت میں کوئی رو رعایت نہیں کریں گے۔ دین و ملت کے مفاد میں جو بھی قدم اٹھائیں گے اور جو بھی کاروائی کریں گے اس میں پوری مضبوطی اور استقلال کا ثبوت دیں گے، نہ کسی مخالف کی مخالفت انہیں خوف زدہ کرے گی، نہ کسی نکتہ چیں کی نکتہ چینی ان کو متاثر کرپائے گی نہ کسی معترض کا اعتراض ان کو ڈگمگائے گا اور نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرسکے گی اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں تجدوہ قویا فی امر اللہ قویا فی نفسہ۔ (تم ان کو اللہ کے معاملہ میں بھی مضبوط پاؤ گے اور خود ان کی ذات کے معاملہ میں بھی۔)

اس حدیث میں حضرت عثمانؓ کا ذکر نہیں ہے یا تو آنحضرت ﷺ نے ان کا ذکر ہی نہیں کیا تھا، یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے تو ذکر کیا تھا لیکن راوی ان کا ذکر کرنا بھول گئے۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ: سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کا ذکر کرنا خلافت کے بارہ میں ان کے تقدم اور ان کی فوقیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نیز آپ ﷺ نے اگرچہ حضرت عثمانؓ کا ذکر صریحاً نہیں کیا لیکن حضرت علیؓ کے ذکر میں لا اراکم فاعلین (میرے خیال میں تم ان کو اپنا امیر و سربراہ بنانے والے نہیں ہو) کے الفاظ میں حضرت علیؓ پر حضرت عثمانؓ کے تقدم کی طرف اشارہ ضرور ملتا ہے۔ ویسے ان الفاظ (لا اراکم فاعلین کا ایک مطلب تو وہی ہے جس کی طرف ترجمہ میں بین القوسین اشارہ کیا گیا، یعنی یہ کہ: میرا خیال ہے کہ ان کی خلافت پر تمام مسلمانوں کا اجماع نہیں ہوگا بلکہ ان سے اختلاف کرنے والے لوگوں کی بڑی تعداد بھی موجود رہے گی اور ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ: میرا خیال ہے کہ تم لوگ میری وفات کے بعد سب سے پہلے علیؓ کو خلیفہ اور اپنا امیر نہیں بناؤ گے کیونکہ قضا و قدر الٰہی سے مجھ کو معلوم ہوگیا ہے کہ علیؓ کی عمر طویل ہوگی اور وہ مذکورہ دونوں آدمیوں یعنی ابوبکرؓ اور عمرؓ سے زیادہ جئیں گے۔ اگر میرے بعد سب سے پہلے علیؓ ہی خلیفہ و امیر بنائے جائیں تو ان دونوں کی خلافت قائم ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے جو علیؓ سے پہلے فوت، ہونے والے ہیں جبکہ ان لوگوں کا خلیفہ ہونا بھی مقدر ہوچکا ہے۔ یہ مطلب مراد لینے کی صورت میں "خیال میں" (ظن) کو یقین کے معنی میں لیا جائے گا۔ یعنی آپ ﷺ نے گویا یہ فرمایا: مجھے یقین ہے کہ تم میرے بعد سب سے پہلے علیؓ کو خلیفہ اور اپنا امیر نہیں بناؤ گے۔ بہر حال آنحضرت ﷺ نے سائل کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا حاصل یہ تھا کہ: اے مسلمانو! میرے بعد اہل اسلام کی قیادت اور ملی سربراہی (یعنی خلافت و امارت) کا معاملہ درحقیقت خود تمہارے اوپر موقوف ہے تم دین و ملت کے بارہ میں "امین" بھی ہو اور مجتہد بھی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنی بصیرت اور حق تک پہنچنے کی ایسی ایمانی قوت عطا فرمائی ہے کہ حالات اور تقاضوں کا جائزہ لے کر صحیح فیصلہ پر پہنچ سکتے ہو۔ پس میرے بعد تم اپنے اجتہاد کے ذریعہ جس شخص کی بھی امارت و خلافت پر متفق اور متحد ہو جاؤ گے وہی تمہارا برحق امیر و خلیفہ ہوگا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں کا اجماع و اتحاد حق و سچائی کے علاوہ کسی بات پر نہیں ہوسکتا۔ حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نص صریح کی صورت میں اور تعیین کے ساتھ کسی کو بھی اپنا جانشین نامزد یا مقرر نہیں فرمایا۔

چاروں خلفاء کے فضائل

(۲۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَ اللّٰهُ اَبَا بَكْرٍ زَوَّجَنِىْ اِبْنَتَهٗ وَحَمَلَنِىْ اِلٰى دَارِ الْهِجْرَةِ

وَصَحِبَنِیْ فِی الْغَارِ وَاَعْتَقَ بِلَالًا مِّنْ مَالِہٖ رَحِمَ اللّٰہُ عُمَرَ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا تَرَکَہُ الْحَقُّ وَمَالَہٗ مِنْ صَدِیْقٍ رَحِمَ اللّٰہُ عُثْمَانَ تَسْتَحْیِ مِنْہُ الْمَلَآئِکَۃُ رَحِمَ اللّٰہُ عَلِیًّا اَللّٰھُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَہٗ حَیْثُ دَارَ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ انہوں نے اپنی بیٹی (عائشہ) کا نکاح مجھ سے کردیا اپنی اونٹنی پر سوار کر کے مجھ کو دار ہجرت (یعنی مدینہ) لے آئے، (سفر ہجرت کے دوران) غار ثور میں میرے ساتھ رہے اور اپنے مال سے بلالؓ کو (خرید کر) آزاد کیا (اور میری خدمت میں دیدیا) اللہ تعالیٰ عمرؓ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، وہ جو بات کہتے ہیں خواہ کسی کو تلخ ہی کیوں نہ لگے اور حق گوئی نے ان کو اس حال پر پہنچا دیا کہ ان کا کوئی دوست نہیں۔ اللہ تعالیٰ عثمانؓ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، ان سے تو فرشتے بھی حیا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ علیؓ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، اے اللہ! حق کو علیؓ کے ساتھ رکھ کہ جدھر علی رہے ادھر ہی حق رہے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب۔"

تشریح: "اپنی اونٹنی پر سوار کر کے" بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے[2] اونٹنیاں پال کر اور تیار کر کے رکھ چھوڑی تھیں کہ نامعلوم کب ہجرت کا حکم آجائے چنانچہ جب ہجرت کا حکم آگیا تو وہ ایک اونٹنی لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! سفر ہجرت میں سواری کے لئے اس اونٹنی کو قبول فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اس اونٹنی کو اپنی سواری کے لئے اس صورت میں لوں گا کہ تم اس کو میرے ہاتھ فروخت کردو۔ آخر کار حضرت ابوبکرؓ نے اس اونٹنی کو آپ کے ہاتھ فروخت کیا اور آپ ﷺ نے آٹھ سو درہم قرض کے عوض اس اونٹنی کو خرید لیا۔

"......ان کا کوئی دوست نہیں یعنی ان کا کوئی ایسا دوست نہیں جو دوستی کے ناتے ان سے رعایتی سلوک اور مداہنت کی توقع رکھے ورنہ جہاں تک مطلق دوستی کا تعلق ہے تو سارے ہی مخلص اور سچے مسلمان ان کے دوست تھے اور سب سے بڑھ کر تو صدیق اکبرؓ ہی ان کے صدیق (دوست) تھے۔

"جدھر علیؓ رہے ادھر ہی حق رہے۔" یہ الفاظ ایسے ہی ہیں جیسے ایک اور روایت میں کہ، جس کو سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں نقل کیا ہے۔ فرمایا گیا ہے القران مع علی وعلی مع القران۔ (یعنی قرآن علیؓ کے ساتھ ہے اور علیؓ قرآن کے ساتھ)

بَابُ مَنَاقِبِ اَھْلِ بَیْتِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
نبی کریم ﷺ کے گھر والوں کے مناقب کا بیان

اہل بیت رسول ﷺ کا اطلاق کن کن پر ہوتا ہے: اہل بیت "یعنی آنحضرت کے گھر والوں" سے کون کون لوگ مراد ہیں؟ اس بارہ میں مختلف روایتیں ہیں۔ اہل بیت کا اطلاق ان لوگوں پر بھی آیا ہے جن کو زکوٰۃ کا مال لینا حرام ہے یعنی بنو ہاشم اور ان میں آل عباس، آل علی، آل جعفر اور آل عقیل شامل ہیں۔ بعض روایتوں میں آنحضرت ﷺ کے اہل و عیال کو "اہل بیت" کہا گیا ہے جن میں ازواج مطہرات یقینی طور پر شامل ہیں، لہٰذا جو لوگ ازواج مطہرات کو اہل بیت سے خارج قرار دیتے ہیں وہ مکابرہ کا شکار ہیں اور قرآن کریم کی اس آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ سے اپنا اختلاف ظاہر کرتے ہیں، کیونکہ جب اس کے پہلے بھی اور بعد میں بھی ازواج مطہرات ہی کو مخاطب کیا گیا ہے تو پھر ان کو (یعنی ازواج مطہرات کو) درمیان آیت کے مضمون (اھل البیت) اور اس کے مصداق میں شامل نہ کرنا آیت کو اس کے عبارتی تسلسل اور معنوی سیاق وسباق سے الگ کر دینا ہے، چنانچہ امام محمد فخر الدین رازیؒ نے لکھا ہے کہ "یہ آیت آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کو شامل ہے کیونکہ آیت کا سیاق وسباق

پوری شدت سے اس کا مقاضی ہے، پس ازواج مطہرات کو اہل بیت کے مصداق سے خارج کرنا اور ان کے علاوہ دوسروں کو اس مصداق کے ساتھ مختص کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ "امام رازیؒ آگے لکھتے ہیں۔ "یہ کہنا زیادہ بہتر اور اولی ہے کہ "اہل بیت" کا مصداق آنحضرت ﷺ کی اولاد اور ازواج مطہرات ہیں، اور ان میں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ بھی شامل ہیں، نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ، بھی آنحضرت ﷺ سے خصوصی نسبت و تعلق اور خانگی قرب رکھنے کے سبب اہل بیت میں سے ہیں، تاہم بعض مواقع پر اہل بیت کا اطلاق اس طرح بھی آیا ہے کہ جس سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس کا مصداق صرف فاطمہ زہراؓ، علی مرتضیٰؓ، حسنؓ اور حسینؓ ہیں، جیسے حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جب نماز فجر کے لئے مسجد میں آتے تو راستہ میں حضرت فاطمہؓ کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے یوں فرماتے الصلوة یا اهل البيت، انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهر كم تطهيرا۔ اس روایت، کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح ام المؤمنین حضرت ام سلمہ روایت کرتی ہیں کہ (ایک دن) میں آنحضرت ﷺ کے پاس (گھر میں) بیٹھی ہوئی تھی کہ خادم نے آکر بتایا کہ علیؓ اور فاطمہؓ باہر دروازہ پر کھڑے ہیں۔ آنحضرتؐ نے (یہ سن کر) مجھ سے فرمایا کہ تم ایک کنارے ہو جاؤ چنانچہ میں گھر کے ایک گوشہ میں چلی گئی۔ علیؓ اور فاطمہؓ اندر آگئے اور ان کے ساتھ حسنؓ و حسینؓ بھی تھے جو اس وقت ننھے منے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حسنؓ اور حسینؓ کو آغوش مبارک میں بٹھالیا اور ایک ہاتھ سے علیؓ کو اور دوسرے ہاتھ سے فاطمہؓ کو پکڑ کر اپنے بدن سے چمٹایا، پھر آپ ﷺ نے اپنی وہ کالی کملی ان سب پر لپیٹی جو اس وقت جسم مبارک پر تھی اور فرمایا: خداوندا! یہ میرے اہل بیت ہیں، مجھ کو اور میرے اہل بیت کو اپنی طرف بلا نہ کہ آگ کی طرف" اور حضرت ام سلمہؓ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: میری یہ مسجد ہر حائضہ عورت اور ہر جنبی مرد پر حرام ہے (یعنی جو عورت حیض کی حالت میں ہو یا جو مرد ناپاکی کی حالت میں ہو وہ میری مسجد میں ہرگز داخل نہ ہو) ہاں محمد اور محمد (ﷺ) کے اہل بیت پر کہ وہ علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ ہیں، حرام نہیں ہے" اس روایت کو بیہقیؒ نے نقل کیا ہے اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ بہرحال ایک طرف تو وہ روایتیں ہیں جن سے بنو ہاشم اور آنحضرت ﷺ کے اہل و عیال پر "اہل بیت" کا اطلاق ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ روایتیں ہیں جن سے اہل بیت کا مصداق صرف حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ معلوم ہوتے ہیں بلکہ ان ہی چہار تن پاک پر اہل بیت کا اطلاق شائع اور مشہور بھی ہے لہذا علماء نے ان تمام روایتوں میں تطبیق اور ان کے اطلاقات کی توجیہ میں یہ کہا ہے کہ "بیت" کی تین نوعیتیں ہیں ① بیت نسب ② بیت سکنی ③ بیت ولادت۔ پس بنو ہاشم یعنی عبد المطلب کی اولاد کو تو نسب اور خاندان کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ کا اہل بیت (اہل خاندان) کہا جائے گا۔ دراصل عرب میں جد قریب کی اولاد کو بیت (یعنی خاندان یا گھرانہ) کہا بھی جاتا تھا اور خود اردو میں بھی جب یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں کا گھرانہ بہت معزز ہے یا فلاں شخص شریف خاندان کا ہے تو گھرانہ) یا خاندان سے اس شخص کے باپ اور دادا کی اولاد مراد ہوتی ہے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کو اہل بیت سکنی (اہل خانہ) کہا جائے گا چنانچہ عرف عام میں کسی شخص کی بیویوں کو اس کے اہل بیت یا "گھر والی" سے تعبیر کیا جانا مشہور ہی ہے اور آنحضرت ﷺ کی اولاد (ماجد کو اہل بیت ولادت کہا جائے گا اور اگرچہ آپ ﷺ کی تمام ہی اولاد پر اہل بیت ولادت کا اطلاق کیا جانا چاہئے لیکن تمام اولاد میں حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ کو جو خاص فضل و شرف اور آنحضرت ﷺ سے جو کمال قرب و تعلق حاصل تھا اور یہ کہ ان کے فضائل و مناقب جس کثرت سے احادیث میں وارد ہیں اس کی بناء پر اہل بیت ولادت کا خصوصی و امتیازی مصداق صرف یہی چار تن مانے جائیں گے۔

واضح ہو کہ اس باب میں مولف مشکوۃ نے جو احادیث اور روایات نقل کی ہیں، اہل بیت کی نسبت سے ان کا تعلق بعض بنو ہاشم سے بھی ہے اور علیؓ و فاطمہؓ اور حسنؓ و حسینؓ سے بھی، اور ابراہیم بن رسول اللہ سے بھی ہے۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں حضرت زید بن حارثہؓ اور ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ کا ذکر بھی آیا ہے اور ان دونوں کا ذکر یا تو غالبا اس بناء پر ہے کہ ان دونوں پر آنحضرت ﷺ کی بے انتہا

محبت وعنایت تھی یا اس سبب سے ہے کہ شاید ان دونوں کو بھی مؤلف مشکوٰۃ نے اہل بیت میں شمار کیا ہے اسی طرح مولف مشکوٰۃ نے جو اس باب میں ازواج مطہرات کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ان کے لئے علیحدہ سے ایک باب قائم کیا ہے تو اس کی وجہ بھی یا تو یہ ہے کہ ان کے مخصوص مناقب وفضائل کے اعتبار سے ان کا ذکر مستقل طور پر علیحدہ ہی باب میں کیا جانا موزوں جانا گیا یا عرف عام کی رعایت سے ان کا ذکر "اہل بیت" سے الگ کر کے کیا گیا کیونکہ عام طور سے "اہل بیت" کا اطلاق انھی چارتن پر ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آیت مباہلہ اور اہل بیت

① عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍؓ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَاءَ كُمْ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلِيًّا وَّفَاطِمَةَ وَحَسَنًا وَّحُسَيْنًا فَقَالَ اللّٰهُمَّ هٰؤُلَآءِ اَهْلُ بَيْتِیْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت: قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَاءَكُمْ۔ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ کو بلوایا اور کہا خداوندا! یہ میرے اہل بیت ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: پوری آیت یوں ہے: فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۔ پس جو شخص آپ (ﷺ) نے اس (قرآن یا دین) کے بارہ میں (اب بھی) حجت کرے بعد اس کے کہ آپ ﷺ کے پاس علم قطعی آچکا ہے، تو آپ (ﷺ) اس سے کہیے کہ آجاؤ ہم اور تم بلالیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو، پھر ہم (سب مل کر) خوب دل سے دعا کریں بایں صورت کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو (اس بارہ میں) ناحق پر ہوں اس آیت کو "آیت مباہلہ" کہا جاتا ہے۔ مباہل کا لفظ بَهْلٌ یا بَهْلَةٌ سے بنا ہے جس کے معنی لعنت بھیجنے اور لعنت کے ہیں مباہلہ کا مطلب ہوتا ہے: ایک دوسرے پر لعنت بھیجنا اور ملعون ہوجانے کی بد دعا کرنا۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ابتہال کا لفظ تھا، لیکن بعد میں اس لفظ (ابتہال) کا اطلاق اس دعا پر کیا جانے لگا۔ جس میں تضرع، خشوع وخضوع اور عاجزی وفروتنی کی صورت، بہت زیادہ اختیار کی گئی ہو بہر حال، عربوں کی یہ عادت تھی کہ جب کسی معاملہ میں دو فریق آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت وتکذیب کرتے اور ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی کا الزام عائد کرتے تو آخر میں اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر کسی خاص جگہ پر جمع ہوتے اور ایک دوسرے کے خلاف بد دعا کرتے ایک دوسرے پر لعنت بھیجتے اور یوں دعا مانگتے: یا اللہ! ہم میں سے جو شخص ناحق پر ہو یا ظالم ہو اس پر لعنت بھیج پس جب نصاری (مسیحوں) نے دین اسلام یا قرآن کی حقانیت وصداقت کے بارہ میں آنحضرت ﷺ سے بحث ومباحثہ کا دروازہ کھولا اور پیغمبر اسلام کی مخالفت وتکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو مذکورہ بالا آیت کے ذریعہ حکم دیا کہ آپ (ﷺ) ان مسیحوں کو مباہلہ کی دعوت دیجئے اور ان سے کہے کہ آؤ بر سر عام اپنا فیصلہ کرالیں کہ ہم میں سے کون حق پر ہے اور کون ناحق پر چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر آنحضرت ﷺ اپنے عزیز ترین اور قریب ترین اہل بیت کو لے کر مباہلہ کے لئے اس طرح نکلے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو، جو اس وقت بہت چھوٹے چھوٹے تھے آپ نے گود میں اٹھا رکھا، حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کے پیچھے تھیں، اور حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کے پیچھے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں جب مباہلہ میں دعا کردوں تو تم سب مل کر آمین کہنا مسیحوں کے پیشوا کی نظر ان نورانی چہروں پر پڑی تو اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بے اختیار بول اٹھا: تم پر افسوس ہے میں تو ان نورانی چہروں کو ایسا دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ خدا سے یوں درخواست کریں کہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے اکھیڑ دے تو بالیقین خدا (ان کی درخواست قبول کر کے) پہاڑ کو اس کی جگہ سے اکھیڑ دے گا پھر اس نے پرزور انداز میں اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ (ان لوگوں کے ساتھ مباہلہ ہرگز نہ کرنا ورنہ جڑ سے اکھاڑ دیئے جاؤ گے۔ آخر کار ان

مسیحوں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ مباہلہ نہیں کیا اور جزیہ قبول کر کے آنحضرت ﷺ کی سیاسی اطاعت پر مجبور ہوئے، لیکن ان کے اندر چونکہ اسلام اور پیغمبر اسلام سے قلبی وابستگی اور مناسبت نہیں تھی اس لئے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے محروم رہے ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ بعد میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر وہ لوگ مباہلہ کرتے تو نتیجہ کے طور پر ان کی صورتیں مسخ ہو کر بندروں اور سوروں کی سی ہو جاتیں، تمام بیابان و جنگل آگ ہی آگ ہو جاتا اور وہ آگ نہ صرف ان کو بسم کر کے سرے سے نیست و نابود کر دیتی بلکہ درختوں پر پرندوں تک کو جلا ڈالتی۔

آیت قرآنی میں مذکور "اہل بیت" کا محمول و مصداق

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَدَاةً وَّعَلَيْهِ مِرْطٌ مُّرَحَّلٌ مِّنْ شَعْرٍ اَسْوَدَ فَجَآءَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ فَاَدْخَلَهٗ ثُمَّ جَآءَ الْحُسَيْنُ فَدَخَلَ مَعَهٗ ثُمَّ جَآءَتْ فَاطِمَةُ فَاَدْخَلَهَا ثُمَّ جَآءَ عَلِيٌّ فَاَدْخَلَهٗ ثُمَّ قَالَ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دن صبح کو نبی کریم ﷺ برآمد ہوئے، اس وقت آپ ﷺ کے بدن مبارک پر ایک سیاہ بالوں کی کملی تھی جس پر اونٹ کے کجاووں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اتنے میں حسن ابن علی، آگئے اور آپ ﷺ نے ان کو اپنی کملی کے اندر لے لیا پھر حسینؓ آئے اور آپ ﷺ نے ان کو بھی حسنؓ کے ساتھ کملی کے اندر لے لیا، پھر فاطمہؓ آئیں اور آپ ﷺ نے ان کو بھی کملی کے اندر لے لیا اور پھر علیؓ آئے اور آپ ﷺ نے ان کو بھی کملی کے اندر لے لیا اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ (یعنی اے اہل بیت) اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم کو (گناہوں اور برائیوں کی) پلیدی (اور غیر اخلاقی و غیر انسانی باتوں کے میل کچیل میں آلودہ ہونے) سے بچائے (جیسا کہ اکثر لوگ آلودہ ہو جاتے ہیں) اور تم کو ایسا پاک صاف رکھے جیسا کہ پاک، صاف رہنا چاہئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس آیت کا سیاق و سباق پوری وضاحت کے ساتھ اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں سے ہیں کیونکہ اس سے پہلی آیت میں بھی يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ کے ذریعہ ازواج مطہرات ہی کو خطاب کیا گیا ہے اور بعد کی آیت میں بھی واذکرن مایتلی فِیْ بیوتکن میں بھی انہی کا ذکر ہے۔ رہی یہ بات کہ پھر عنکم الرجس میں جمع مذکر کی ضمیر کیوں لائی گئی ہے تو اس کی وجہ یا تو اظہار عظمت ہے یا اہل بیت کے مردوں کی فوقیت و برتری کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ابراہیم بن رسول اللہ

(۳) وَعَنِ الْبَرَآءِ قَالَ لَمَّا تُوُفِّيَ اِبْرَاهِيْمُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لَهٗ مُرْضِعًا فِي الْجَنَّةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت براءؓ بن عازبؓ کہتے ہیں کہ جب (حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے آنحضرت ﷺ کے فرزند) ابراہیم کا (شیر خوارگی کی عمر میں) انتقال ہوا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا (ابراہیم کو جنت میں (پہنچا دیا گیا ہے اور وہاں) اس کے لئے ایک دودھ پلانے والی یعنی دایہ (مقرر ہو گئی) ہے (جو اس کے دودھ پلانے کے زمانہ کو پورا کرے گی۔" (بخاریؒ)

تشریح: بعض شارحین نے دودھ پلائے جانے سے یہ مراد لیا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کے لئے جنت کی تمام نعمتیں مہیا کر دی ہیں اور وہ بہشت میں مزے لوٹ رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب کسی لفظ کے حقیقی معنی امکان وقوع رکھتے ہوں تو اس کے مجازی معنی مراد لینا جائز بھی نہیں ہے۔

لفظ "مُرْضِعًا" زیادہ تر نسخوں میں م کے پیش اور ض کے زیر کے ساتھ منقول ہے جس کے معنی "دایہ" کے ہیں اور ایک صحیح نسخہ

میں م اور ض دونوں کے زبر کے ساتھ ہے جس کا لفظی ترجمہ دودھ پلانے کی جگہ" ہے اس صورت میں مرضعافی الجنة کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی شیر خوارگی کی مدت پوری ہونے کی جگہ جنّت میں ہے ویسے مُرْضَعًا کو مصدر یعنی دودھ پلانا بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ حدیث ظاہرًا اس بات کی دلیل ہے کہ پاک نفس و پاکباز لوگ مرنے کے بعد اسی وقت جنّت میں پہنچادیئے جاتے ہیں اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ موعودہ جنّت وجود میں آچکی ہے اور موجود ہے۔

حضرت فاطمہؓ کی فضیلت

④ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنَّا اَزْوَاجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهُ فَاَقْبَلَتْ فَاطِمَةُ مَا تَخْفٰى مِشْيَتُهَا مِنْ مِّشْيَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا رَاٰهَا قَالَ مَرْحَبًا بِابْنَتِيْ ثُمَّ اَجْلَسَهَا ثُمَّ سَارَّهَا فَبَكَتْ بُكَآءً شَدِيْدًا فَلَمَّا رَاٰى حُزْنَهَا سَارَّهَا الثَّانِيَةَ فَاِذَا هِيَ تَضْحَكُ فَلَمَّا قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاَلْتُهَا عَمَّا سَارَّكِ قَالَتْ مَاكُنْتُ لِاُفْشِيَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِرَّهُ فَلَمَّا تُوُفِّيَ قُلْتُ عَزَمْتُ عَلَيْكِ بِمَالِيْ عَلَيْكِ مِنَ الْحَقِّ لَمَّا اَخْبَرْتِنِيْ قَالَتْ اَمَّا الْاٰنَ فَنَعَمْ اَمَّا حِيْنَ سَارَّنِيْ فِي الْاَمْرِ الْاَوَّلِ فَاِنَّهٗ اَخْبَرَنِيْ اَنَّ جِبْرَئِيْلَ كَانَ يُعَارِضُنِي الْقُرْاٰنَ كُلَّ سَنَةٍ مَرَّةً وَاِنَّهٗ عَارَضَنِيْ بِهِ الْعَامَ مَرَّتَيْنِ وَلَا اُرَى الْاَجَلَ اِلَّا قَدِ اقْتَرَبَ فَاتَّقِي اللّٰهَ وَاصْبِرِيْ فَاِنِّيْ نِعْمَ السَّلَفُ اَنَالَكِ فَبَكَيْتُ فَلَمَّا رَاٰى جَزَعِيْ سَارَّنِي الثَّانِيَةَ قَالَ يَا فَاطِمَةُ اَلَا تَرْضَيْنَ اَنْ تَكُوْنِيْ سَيِّدَةَ نِسَآءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ اَوْنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَسَارَّنِيْ فَاَخْبَرَنِيْ اَنَّهٗ يُقْبَضُ فِيْ وَجَعِهٖ فَبَكَيْتُ ثُمَّ سَارَّنِيْ فَاَخْبَرَنِيْ اَنِّيْ اَوَّلُ اَهْلِ بَيْتِهٖ اَتْبَعُهٗ فَضَحِكْتُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کی بیویاں (آپ کے مرض الموت سے کچھ ہی پہلے یا ایام مرض الموت کے دوران ایک دن) آپ ﷺ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں کہ فاطمہؓ آئیں۔ ان کی چال کی وضع اور ہیئت رسول کریم ﷺ کی چال کی وضع اور ہیئت رسول کریم ﷺ کی چال کی واضع اور ہیئت سے (ذرا بھی) مختلف نہیں تھی (یعنی آنحضرت ﷺ کے چلنے کا انداز اس قدر یکساں تھا کہ کوئی بھی ان دونوں کی چال میں امتیاز نہیں کر سکتا تھا) بہر حال آنحضرت ﷺ نے جب فاطمہؓ کو (آتے) دیکھا تو فرمایا: میری بیٹی مرحبا پھر آپ ﷺ نے ان کو (اپنے پاس) بٹھالیا اور چپکے چپکے ان سے باتیں کیں، اتنے میں فاطمہؓ رونے لگیں اور زور زور روئیں۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ فاطمہؓ بہت رنجیدہ ہوگئی ہیں تو پھر ان سے سرگوشی کرنے لگے اور فاطمہ اکدم کھلکھلا کر ہنس دیں پھر جب رسول اللہ ﷺ (استنجاء وغیرہ کے لئے یا نماز پڑھنے کے لئے وہاں سے) اٹھکر چلے گئے تو میں نے فاطمہؓ سے پوچھا کہ تم سے آنحضرت چپکے چپکے کیا باتیں کر رہے تھے؟ فاطمہؓ نے جواب دیا کہ: رسول اللہ ﷺ کا راز افشاء کرنے والی نہیں ہوں (اس وقت تو میں خاموش ہوگئی لیکن) جب آنحضرت ﷺ نے اس دنیا سے پردہ فرمایا تو (ایک دن) میں نے فاطمہؓ سے کہا کہ (ایک ماں ہونے کی حیثیت سے یا دینی اخوت اور یا باہمی محبت و تعلق رکھنے کے اعتبار سے) تم پر میرا جو حق ہے اس کا واسطہ اور قسم دے کر کہنا چاہتی ہوں کہ میں تم سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگتی کہ مجھ کو اس سرگوشی کے بارہ میں بتادو جو (اس دن) آنحضرت ﷺ نے تم سے کی تھی فاطمہؓ بولیں: ہاں اب (جب کہ آنحضرت اس دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں اس راز کو ظاہر کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے ہوئے) میں بتاتی ہوں کہ آنحضرت ﷺ نے جو پہلی بار مجھ سے سرگوشی کی تھی تو اس میں مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ جبرائیل علیہ السلام مجھ سے سال بھر میں ایک مرتبہ (یعنی رمضان میں) قرآن کا دور کیا کرتے تھے لیکن اس سال (رمضان میں) انہوں نے مجھ سے دوبار دور کیا اور اس کا مطلب میں نے یہ نکالا ہے کہ میری موت کا وقت قریب آگیا ہے، پس (اے فاطمہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتی رہنا (یعنی تقوی پر قائم رہنا یا یہ کہ جہاں تک ہو سکے زیادہ تقوی اور پرہیز گاری اختیار کرنا) اور (اللہ کی اطاعت وعبادت میں مشغول رہنے اور معصیت سے بچنے کے لئے جو بھی تکلیف اور مشقتیں اٹھانا پڑیں اور جو بھی آفت وحادثہ پیش آئے خصوصًا

میری موت کے سانحہ پر) صبر کرنا، بلاشبہ میں تمہارے لئے بالخصوص) بہترین پیش رو ہوں" (یہ تو وہ بات تھی جس کو سن کر اور آنحضرت ﷺ کی جدائی کا احساس کر کے) میں رونے لگی تھی اور پھر جب آپ ﷺ نے مجھ کو بہت زیادہ مضطرب اور بے صبر پایا تو دُوبارہ مجھ سے سرگوشی کی اور اس وقت یوں فرمایا: اے فاطمہ! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تم جنت میں (تمام) عورتوں یا (خاص طور (اس اُمت کی عورتوں کی سردار بنائی جاؤ" (یہ سن کر میں ہنسنے لگی تھی) اور ایک روایت میں حضرت فاطمہؓ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ جب آپ ﷺ نے (پہلی مرتبہ) مجھ سے سرگوشی کی تو اس میں یہ فرمایا تھا کہ آپ ﷺ اس بیماری میں وفات پا جائیں گے اور (یہ سن کر) میں رونے لگی تھی، پھر (دوسری مرتبہ) آپ ﷺ نے مجھ سے سرگوشی کی اس میں مجھ کو یہ بتایا تھا کہ آپ ﷺ کے اہل بیت میں سب سے پہلے میں ہی آپ ﷺ سے جا کر ملوں گی (یعنی یہ تسلی دی تھی کہ مضطرب نہ ہو، میری وفات کے بعد بہت جلد تم بھی اس دنیا سے رخصت ہو کر میرے پاس آجاؤ گی) چنانچہ (یہ سن کر) میں ہنسنے لگی تھی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: راز میں افشا کرنے والی نہیں ہوں" یعنی: جس بات کو آنحضرت ﷺ نے چھپایا اس کو میں کیسے ظاہر کر دوں کیونکہ اگر آپ ﷺ کے نزدیک اس بات کا اظہار مناسب ہوتا تو مجھ سے چپکے چپکے نہ فرماتے بلکہ سب کے سامنے اونچی آواز میں فرماتے اس سے معلوم ہوا کہ اپنے بڑوں، عزیزوں اور دوستوں کا راز دوسروں سے چھپانا مستحب ہے۔

دو بار دور کیا)" یعنی: سال بھر میں جتنا قرآن نازل ہوتا تھا (اس سب کا دور حضرت جبرئیلؑ رمضان میں آنحضرت ﷺ سے کرتے تھے تاکہ اول تو آپ ﷺ کے ذہن میں قرآن ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کے ساتھ پوری طرح محفوظ رہے اور دوسرے یہ ظاہر ہو جایا کرے کہ کون سی آیت ناسخ ہو کر نازل ہوئی ہے اور کون سی آیت منسوخ ہو گئی ہے حدیث کے اس جزاء سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ قرآن کا دور (یعنی دو حافظوں کا ایک دوسرے کو قرآن حفظ سنانا مستحب ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی عمر کے آخری رمضان کے بعد ارشاد ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب میں نے نکالا ہے" یعنی! جبرئیلؑ نے اس سال معمول کے خلاف جو دوبار دور کیا ہے وہ اس بات کی آگاہی ہے کہ قرآن کی صورت میں نزول ہدایت کا سلسلہ پایۂ اتمام کو پہنچ گیا ہے اور تکمیل دین کی سرفرازی و نعمت عطا ہو گئی ہے۔ لہذا اب قرآن کو ذہن میں پوری طرح محفوظ کر لینا چاہئے اور اس کے احکام خوب یاد کر لینے چاہئیں۔

"کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو" یعنی: یہ جان کر کہ میں اس دنیا سے جلد ہی رخصت ہونے والا ہوں تمہیں تنگ دل اور مضطرب نہیں رہنا چاہئے، اللہ کے حکم اور فیصلہ پر راضی رہو اور اس بات پر اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اتنا بڑا رتبہ اور اعزاز عطا کیا ہے۔

فاطمہ زہراؓ کی افضلیت: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت فاطمہؓ تمام عورتوں سے افضل ہیں یہاں تک حضرت مریمؑ حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ پر بھی ان کو خاص شخصیت حاصل ہے، چنانچہ سیوطیؒ نے یہی لکھا ہے رہی اس حدیث کی بات جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاطمہؓ زہراؓ) حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام کے علاوہ باقی تمام عورتوں پر فضیلت رکھتی ہیں یا ایک وہ حدیث ہے کہ جس میں فرمایا گیا ہے کہ اس اُمت میں فاطمہؓ کا وہی مرتبہ ہے جو مریم بنت عمران کو اپنی قوم میں حاصل ہے یعنی جس طرح حضرت مریمؑ اپنی قوم کی تمام عورتوں سے افضل ہیں اسی طرح اس اُمت کی تمام عورتوں میں سب سے افضل فاطمہؓ ہیں۔ تو روایتوں کا اختلاف شاید اس سبب سے نظر آتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا رتبہ تدریجی طور پر بڑھتا رہا ہو گا اور اسی تدریج کے ساتھ ان کی افضلیت کی اطلاع اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی اور اس کے فرشتہ کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کو ملتی رہی ہوگی جس کا اظہار مختلف احادیث کے ذریعہ ہوتا رہا اور پھر جب آخر میں حضرت فاطمہؓ کا رتبہ آخری درجہ تک بڑھ گیا تو بلا استثناء عالم کی تمام عورتوں پر ان کی افضلیت ثابت ہو گئی بعض علماء نے حضرت عائشہؓ کو حضرت فاطمہؓ سے افضل قرار دیا ہے اور دلیل میں یہ بات پیش کی ہے کہ جنت میں حضرت عائشہؓ تو آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہوں گی جب کہ حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ کے ساتھ ہوں گی اور یہ ظاہر ہی ہے کہ آنحضرت کا درجہ اور محل حضرت علیؓ کے درجہ

اور محل سے اعلیٰ واشرف ہوگا۔ لیکن یہ دلیل ان حدیثوں کے سامنے بے معنی ہو جاتی ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو خطاب کر کے فرمایا: میں، تم علیؓ، حسنؓ اور حسینؓ جنّت میں ایک ہی درجہ اور ایک ہی محل میں ہوں گے۔ حضرت عائشہؓ کی افضلیت کے قائلین کی طرف سے ایک دلیل یہ بھی دیجاتی ہے کہ ان کو اجتہاد کا مقام حاصل تھا، مجتہد تسلیم کی جاتی تھیں اور خلفاء اربعہ کے زمانہ میں فتوی دیا کرتی تھیں سیوطیؒ نے فتاوی میں لکھا ہے کہ! اس مسئلہ میں (فاطمہؓ افضل ہیں یا عائشہؓ) تین مسلک ہیں، اور ان تینوں مسلکوں میں سب سے صحیح مسلک یہ ہے کہ فاطمہؓ عائشہؓ سے افضل ہیں۔ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ فاطمہؓ اور عائشہؓ، دونوں کا رتبہ یکساں ہے جب کہ کچھ حضرات اس بارہ میں خاموش رہنے ہی کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں ان میں بعض حنفی اور بعض شافعی علماء خصوصیت سے اس طرف مائل ہیں حضرت امام مالکؒ کے متعلق منقول ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپؒ حضرت فاطمہؓ کو افضل سمجھتے ہیں یا حضرت عائشہؓ کو؟ تو انہوں نے جواب دیا: فاطمہؓ پیغمبرؐ کے گوشت کا ٹکڑا ہیں، اور میں رسول اللہ ﷺ کے گوشت کے ٹکڑے پر کسی کو بھی فضیلت نہیں دیتا امام سبکیؒ نے لکھا ہے کہ! ہمارے نزدیک اور ہمارے مسلک کے اعتبار سے جو بات زیادہ معتبر اور زیادہ صحیح ہے وہ یہ ہے کہ سب سے افضل حضرت فاطمہؓ ہیں، ان کے بعد ان کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہؓ اور ان کے بعد حضرت عائشہؓ صدیقہ ویسے حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ کے بارہ میں بھی علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ بعض نے حضرت خدیجہؓ کو افضل کہا ہے اور بعض نے حضرت عائشہؓ کو بہرحال ان مذکورہ جلیل القدر خواتین اسلام کی الگ الگ حیثیتیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو اس کی اپنی حیثیت و خصوصیت کے اعتبار سے فضیلت و برتری حاصل ہے، تاہم بعض حضرات نے کثرت ثواب کو افضلیت کی بنیاد بنایا ہے جس کا علماء کے ہاں اعتبار بھی ہے، اور اس حیثیت سے حضرت فاطمہؓ چاہے سب سے افضل نہ ہوں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شرف ذات پاگیزگی طینت اور تقدس جوہر کے اعتبار سے کوئی بھی حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ سے افضل و برتر نہیں ہوسکتا۔

فاطمہ زہراءؓ: حضرت فاطمہ زہراءؓ، ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے بطن سے رسول اللہ ﷺ کی سب سے چھوٹی بیٹی ہیں تمام عالم کی عورتوں کی سردار ہیں ۲ھ کے رمضان میں حضرت علیؓ سے ان کا نکاح ہوا اور ذی الحجہ میں رخصت ہو کر حضرت علیؓ کے گھر آئیں ان کے بطن سے حسنؓ، حسینؓ، محسنؓ، زینبؓ، ام کلثومؓ اور رقیہؓ پیدا ہوئیں، آنحضرت ﷺ کے وصال کے چھ ماہ بعد یا ایک قول کے مطابق تین ماہ بعد مدینہ میں حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا اور اس وقت ان کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔ حضرت علیؓ نے غسل دیا اور نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت فاطمہؓ سے جن حضرات نے احادیث روایت کی ہیں ان میں حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور دوسرے، بہت سے لوگ شامل ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں: میں نے فاطمہؓ سے زیادہ صادق القول ان کے باپ (رسول اللہ) کے علاوہ اور کسی کی نہیں دیکھا۔

جس نے فاطمہؓ کو خفا کیا اس نے مجھ کو خفا کیا

⑤ وَعَنِ الْمِسْوَرِبْنِ مَخْرَمَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّىْ فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِىْ وَفِىْ رِوَايَةٍ يُرِيْبُنِىْ مَا اَرَابَهَا وَيُؤْذِيْنِىْ مَا اٰذَاهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مسور ابن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فاطمہؓ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جس نے فاطمہؓ کو خفا کیا اس نے مجھے خفا کیا اور ایک روایت میں یہ لفظ (بھی) ہیں: "جو چیز فاطمہؓ کو بری معلوم ہوتی ہے وہ مجھ کو بھی بری معلوم ہوتی ہے اور جو چیز فاطمہؓ کو دکھ دیتی ہے وہ مجھ کو بھی دکھ دیتی ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: اس نے مجھ کو خفا کیا" یعنی: فاطمہ چونکہ میرے گوشت پوست کا ایک حصّہ ہے اور اس اعتبار سے میرے اور اس کے درمیان جو یگانگت اور یک پن ہے اس کی بناء پر فاطمہؓ کو خفا کرنا، یا فاطمہؓ کو دکھ پہنچانا گویا مجھ کو خفا کرنا اور دکھ پہنچانا ہے۔ پس اس ارشاد گرامی میں

دراصل ایک طرح کی بلیغ تشبیہ ہے اور اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ بعض علماء کا اس حدیث سے یہ استدلال کرنا موزوں ہے کہ جس نے فاطمہؓ کو برا کہا وہ کافر ہو گیا، کیونکہ اس طرح کی احادیث کا اصل محمول کمال اتحاد و اختلاط اور نہایت تعلق کا اظہار ہے چنانچہ اسی قبیل سے وہ روایت بھی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی مسلمان کو دکھ دیا اس نے (گویا) مجھ کو دکھ دیا اور جس نے مجھ کو دکھ دیا اس نے (گویا) اللہ تعالیٰ کو دکھ پہنچایا وہ روایت کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے انصار کو عزیز و محبوب رکھا اس نے اللہ تعالیٰ کو عزیز و محبوب رکھا اور جس شخص نے انصار سے دشمنی رکھی اس نے اللہ تعالیٰ سے دشمنی رکھی۔ اسی طرح آپ کا یہ ارشاد گرامی کہ: قریش کو دوست رکھنا ایمان ہے اور ان سے دشمنی رکھنا کفر ہے نیز عربوں کو دوست رکھنا ایمان ہے اور ان سے دشمنی رکھنا کفر ہے، جس شخص نے عربوں کو دوست رکھا اس نے مجھ کو دوست رکھا اور جس شخص نے عربوں سے دشمنی رکھی اس نے مجھ سے دشمنی رکھی۔

"وہ مجھ کو دکھ دیتی ہے" بعض روایتوں میں آیا ہے کہ ابوجہل کے بھائی حارث بن ہشام نے چاہا تھا کہ ابوجہل کی بیٹی غورا کا نکاح حضرت علیؓ سے کر دے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ خود حضرت علیؓ کی خواہش تھی کہ غوراء سے نکاح کریں، بہرحال جب اس بارہ میں آنحضرت ﷺ سے طلب اجازت کا مرحلہ آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس بات کی اجازت کبھی نہیں دوں گا اور پھر یہ حدیث ارشاد فرمائی، نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ: میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار نہیں دیتا لیکن یہ ضرور ہے کہ اللہ کے دوست کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ہرگز یکجا نہیں ہوسکتیں۔ حضرت علیؓ نے۔ آنحضرت ﷺ کے یہ سخت تاثرات سنے تو فوراً خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اظہار معذرت کے بعد عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں وہ کام کبھی نہیں کروں گا جو آپ ﷺ کو پسند نہ ہو۔

واضح ہو کہ حضرت مسورؓ کی یہ حدیث مختلف طرق سے منقول ہے، چنانچہ ایک اور روایت میں اس حدیث کو اس طرح نقل کیا گیا ہے: حضرت مسورؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو منبر پر کھڑے ہوئے یہ فرماتے سنا کہ ہشام ابن مغیرہ کے بیٹے حارث مجھ سے اس بات کی منظوری چاہتے ہیں کہ ابوجہل کی بیٹی کا نکاح علی ابن ابی طالب سے کر دیں لیکن میں اس بات کو منظور نہیں کرتا اور مکرر کہتا ہوں کہ میں منظور نہیں کروں گا ہاں اگر ابن ابی طالب نے ارادہ ہی کر لیا ہے تو وہ میری بیٹی کو طلاق دیدیں اور ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کر لیں۔ فاطمہ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جس نے فاطمہؓ کو خفا کیا اس نے مجھ کو خفا کیا۔

فاطمہؓ کی موجودگی میں علیؓ کو کسی اور عورت سے نکاح کی ممانعت: شرح مسلم میں اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی ایسا کام کرنا جس سے نبی کریم ﷺ کو دکھ پہنچے بہرصورت حرام ہے اگرچہ وہ کام مباح ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے ہے آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کی جو اجازت نہیں دی تو اس کی دو وجہیں تھیں، ایک تو یہ کہ اس نکاح سے حضرت فاطمہؓ کو خفگی ہوتی اور ایک طرح سے ان کو دکھ پہنچتا اور حضرت فاطمہؓ کے دکھی ہونے سے آنحضرت کو دکھ ہوتا اور یہ بات حضرت علیؓ کے لئے تباہی کا باعث بنتی لہٰذا خود حضرت علیؓ کے حق میں خیر خواہی اور آنحضرت ﷺ کی شفقت کا تقاضا یہی تھا کہ ان کو اس نکاح سے باز رکھا جائے دوسری وجہ آنحضرت ﷺ کا یہ خوف تھا کہ اس نکاح سے فاطمہؓ کی غیرت و حمیت کے منافی ہونے کے سبب کہیں وہ سخت آزمائش اور ابتلاء سے دوچار نہ ہو جائیں۔ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ "میں اس بات کو منظور نہیں کرتا" سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ نہیں تھی کہ فاطمہؓ کی موجودگی میں کسی اور عورت سے نکاح کرنا علیؓ کے لئے ممنوع ہے بلکہ ان الفاظ کے ذریعہ دراصل آپ ﷺ نے اس بات کا اعلان کیا کہ قضاء و قدر الٰہی یوں ہے کہ علیؓ کے نکاح میں فاطمہؓ اور بنت ابوجہل ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ لیکن دوسری روایتوں اور اقوال سے اس قول کی تائید نہیں ہوتی مثلاً یحییٰ بن سعید بن القطانؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے عبداللہ بن داؤدؒ سے آنحضرت ﷺ کے ان الفاظ "میں اس بات کو منظور نہیں کرتا ہاں اگر ابن ابی طالب نے ارادہ کر ہی لیا ہے تو وہ میری بیٹی کو طلاق دے دیں اور ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کر لیں" کا تذکرہ کیا تو

انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علیؓ پر حرام تھا کہ وہ فاطمہؓ کی زندگی میں ان کے ساتھ کسی اور عورت کو اپنے نکاح میں رکھنی اور یہ حرمت قرآن کی آیات: وما اٰتکم الرسول فخذوہ ومانھٰکم عنه فانتھوا اے اہل ایمان! رسول جو کچھ تمہیں دیں اس کو قبول کرو اور جس بات سے تم کو منع کریں اس سے باز رہو) سے ثابت ہوتی ہے۔ جب آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ "میں منظور نہیں کرتا: تو علیؓ کے لئے حلال اور جائز نہیں رہا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی اجازت اور منظوری کے علی الرغم فاطمہؓ کی موجودگی میں کسی اور عورت سے نکاح کریں۔ اسی طرح یحییٰ ابن سعیدؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے عمر بن داؤدؒ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ جب آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ: فاطمہؓ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے۔ جو چیز فاطمہؓ کو بری معلوم ہوتی ہے وہ مجھ کو بھی بری معلوم ہوتی ہے اور جو چیز فاطمہؓ کو دکھ دیتی ہے وہ مجھ کو بھی دکھ دیتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت علیؓ پر حرام ہو گیا تھا کہ وہ فاطمہؓ کی موجودگی میں کسی اور عورت سے نکاح کر کے آنحضرت ﷺ کو دکھ پہنچائیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے ما کان لکم ان تو ذوا رسول الله (تمہارے لئے قطعی روا نہیں کہ رسول خدا کو دکھ پہنچاؤ) یحییٰ بن سعیدؒ کی ان دونوں روایتوں کی حافظ اور ابو القاسم دمشقیؒ نے نقل کیا ہے۔

ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، جو چیز فاطمہؓ کو دل گرفتہ بناتی ہے وہ مجھ کو بھی دل گرفتہ کر دیتی ہے اور جو چیز فاطمہؓ کو شگفتہ دل بناتی ہے شگفتہ دل کر دیتی ہے۔ جان لو، قیامت کے دن سب نسبی رشتے کٹ جائیں گے صرف میرا نسبی، اور سسرالی رشتہ باقی رہے گا ایک اور روایت میں، جو حضرت ابوایوبؓ سے منقول ہے، یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن (ایک مرحلہ پر) عرش میں سے ایک آواز آوے گی جیسے منادی کرنے والا منادی کر رہا ہے۔

يا اهل الجمع نكسوا رء وسكم وغضوا ابصاركم حتى مرت فاطمة بنت محمد على الصراط۔

"اے اہل محشر! اپنے سر جھکا لو اور اپنی آنکھیں بند کر لو تاآنکہ محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ پل صراط پر سے گزر جائیں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ فتمر مع سبعين الف جارية من الحور العين كمر البرق۔ پس فاطمہؓ ستر ہزار حور عین باندیوں کے جلو میں پلصراط پر سے اس طرح گزر جائے گی جیسے بجلی گزر جاتی ہے۔

روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ جب رسول کریم ﷺ سفر پر روانہ ہوتے تو سب سے رخصت ہونے کے بعد آخر میں حضرت فاطمہؓ سے ملنے کو آتے اور جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لاتے۔

ایک وضاحت: یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو حضرت علیؓ کو حضرت فاطمہؓ کی خفگی کے پیش نظر دوسرا نکاح کرنے سے منع کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کسی کی بیوی اپنے خاوند کے دوسرا نکاح کرنے سے ناراض اور خفا ہو تو وہ دوسرا نکاح نہ کرے یہ صرف آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے ہے یعنی معاملہ کی اس مخصوص نوعیت کے پیش نظر کہ آنحضرت ﷺ کو دکھ نہ پہنچے حضرت علیؓ کے حق میں یہ ممنوع تھا جیسا کہ بعض دوسری روایتوں سے واضح ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں نہ کوئی عورت حضرت فاطمہؓ کے برابر ہے اور نہ کسی عورت کا باپ حضرت فاطمہؓ کے باپ سرور کائناتؐ کے برابر ہو سکتا ہے کہ جس کی ناراضگی کے سبب دوسرا نکاح کرنا کسی کا جائز نہ ہو۔ پس نکاح ثانی کا جو جواز قرآن کریم کی اس آیت: فانكحوا ما طاب لكم من النساء مثنى وثلث ورباع عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے) ثابت ہے وہ اپنی جگہ سب سے بڑی دلیل ہے اور یہ عمومی جواز حدیث بالا میں مذکور مخصوص اور منفرد نوعیت سے متاثر نہیں ہوگا۔

اس عذاب سے ڈرو جو اہل بیت کے حقوق کی کوتاہی کے سبب ہوگا

(۶) وَعَنْ زَيْدِبْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فِيْنَا خَطِيْبًا بِمَآءٍ يُّدْعٰى خَمًّا بَيْنَ مَكَّةَ وَ الْمَدِيْنَةِ

فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰی عَلَیْهِ وَوَعَظَ وَذَکَّرَ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ اَلَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ یُوْشِكُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ رَسُوْلُ رَبِّیْ فَاُجِیْبَ وَاَنَا تَارِكٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ اَوَّلُهُمَا کِتَابُ اللّٰهِ فِیْهِ الْهُدٰی وَالنُّوْرُ فَخُذُوْا بِکِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتَمْسِکُوْا بِهٖ فَحَثَّ عَلٰی کِتَابِ اللّٰهِ وَرَغَّبَ فِیْهِ ثُمَّ قَالَ وَاَهْلُ بَیْتِیْ اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ وَفِیْ رِوَایَةٍ کِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ مَنِ اتَّبَعَهٗ کَانَ عَلَی الْهُدٰی وَمَنْ تَرَکَهٗ کَانَ عَلَی الضَّلَالَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ایک دن مکہ و مدینہ کے درمیان پانی والے مقام پر کہ جس کو خم کہا جاتا تھا خطاب عام کے لئے ہمارے سامنے کھڑے ہوئے۔ پہلے اللہ کی حمد و ثنا کی، پھر لوگوں کو (اچھی باتوں اور اچھے اعمال کی) نصیحت فرمائی، ان کو اللہ کا ثواب و عذاب یاد دلایا (اور غفلت و کوتاہی کے خلاف خبردار کیا اور پھر فرمایا: بعد ازاں۔ اے لوگو! آگاہ ہو، میں تمہارے ہی مانند ایک انسان ہوں (اس امتیاز کے ساتھ کہ اللہ نے تمہاری ہدایت کے لئے مجھ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر وحی آتی ہے) وہ وقت قریب ہے جب میرے پروردگار کا فرستادہ (یعنی ملک الموت عزرائیل علیہ السلام مجھ کو اس دنیا سے لے جانے کے لئے یا تو تنہا یا جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ) آئے اور میں اپنے پروردگار کا حکم قبول کروں میں تمہارے درمیان دو عظیم بانفیس چیزیں چھوڑ جاؤں گا، جن میں سے ایک کتاب اللہ ہے جس میں ہدایت (یعنی دین و دنیا کی فلاح و کامیابی تک لیجانے والی راہ راست کا بیان) اور نور ہے پس تم کتاب اللہ کو مضبوط پکڑ لو (یعنی اپنے مسائل کا حل اسی کی روشنی میں ڈھونڈو اسی کو اپنا رہنما اور مستدل بناؤ، اس کو یاد کر کے اپنے سینوں میں محفوظ کرو اور اس کے علوم و معارف کو حاصل کرو) غرض کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو کتاب اللہ کے تئیں خوب جوش دلایا اور اس کی طرف راغب کیا، پھر فرمایا اور (ان دو عظیم چیزوں میں سے دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں میں تمہیں اللہ کا وہ عذاب یاد دلاتا ہوں جو میرے اہل بیت کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی اور تقصیر کے سبب ہوگا" میں (دوبارہ) تمہیں اللہ کا وہ عذاب یاد دلاتا ہوں جو میرے اہل بیت کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کے سبب ہوگا" اور ایک روایت میں (جن میں سے ایک کتاب اللہ ہے" کی جگہ) یہ الفاظ ہیں: کتاب اللہ، اللہ کی رسی ہے، جو شخص کتاب اللہ کی اطاعت کرے گا (یعنی اس پر ایمان لائے گا اس کو، یاد کرے گا، اخلاص کے ساتھ اس کا علم حاصل کرے گا اور اس پر عمل پیرا رہے گا تو وہ راہ راست پر رہے گا اور جو شخص اس کو چھوڑ دے گا (یعنی نہ تو اس پر ایمان لائے گا، نہ اس کو یاد کرے گا، نہ اس کے علم و عمل میں مخلص ہوگا) تو وہ گمراہ رہے گا۔" (مسلم)

تشریح: "خم" مکہ اور مدینہ کے درمیان جحفہ کے قریب ایک مشہور جگہ کا نام ہے جس کو "غدیر خم" بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل "غدیر" پانی کے حوض کو کہتے ہیں اور اس جگہ کسی حوض یا تالاب کی شکل میں پانی موجود رہا ہوگا، اس مناسبت سے اس جگہ کو "غدیر خم" کہا جانے لگا جیسا کہ حضرت علیؓ کے مناقب کے بیان میں گزر چکا ہے، خطاب عام کی یہ صورت اس وقت پیش آئی تھی جب آپ ﷺ حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر مکہ سے مدینہ کو واپس لوٹ رہے تھے اور غدیر خم پر پڑاؤ ڈالا گیا تھا۔

"اور میں اپنے پروردگار کا حکم قبول کروں" یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اس دنیا سے آپ ﷺ کی رخصت کا وقت قریب آچکا ہے، چنانچہ یہ بات آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے سفر واپسی کے دوران آخر ماہ ذی الحجہ ۱۰ھ میں فرمائی تھی اور تقریباً تین ماہ بعد ربیع الاول ۱۱ھ میں آپ ﷺ کا وصال ہوا۔

"دو عظیم یا نفیس چیزیں" یہ "ثقلین" کا ترجمہ ہے۔ ثقل (ث کے زیر کے ساتھ) کے معنی تو بھاری اور بوجھ کے ہیں اور ثقل (ث و ق) کے زبر کے ساتھ) مسافر کے سامان اور حشم و خدم اور کسی بھی اعلی و نفیس چیز کو کہتے ہیں یہاں حدیث میں اس لفظ کے یہی معنی نفیس مراد ہیں۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ "ثقلین" سے "دو عظیم چیزیں" مراد ہیں اور کتاب اللہ اور اہل بیت کو دو عظیم چیزیں یا تو ان کے عظیم المرتبت ہونے کے اعتبار سے فرمایا گیا یا اس سبب سے کہا گیا کہ ان پر عمل کرنا مشکل اور بھاری ہے، ہر شخص ان کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا جن و انس کو بھی ثقلین اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ زمین کے بوجھ میں یعنی جس طرح جانور کی پشت پر بوجھ لادتے ہیں اسی طرح زمین نے ان

دونوں (جن و انس کا بوجھ اپنی پشت پر اٹھار کھا ہے: بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ دونوں یعنی کتاب اللہ اور اہل بیت دین کی متاع ہیں کہ ان کے ذریعہ دین کی اصلاح، درستی اور آبادی ہوتی ہے جیسے ثقلین یعنی جن وانس زمین کی متاع ہیں کہ انہی سے دنیا کی آبادی ہے۔ "جس میں ہدایت اور نور ہے" یعنی کتاب اللہ میں ان احکام واعمال کا بیان ہے جن سے راہ حق روشن ہوتی ہے اور جو طالب کو منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں، اور اس کے علم و عرفان میں وہ نور حق ہے جو ذہن وفکر کی استقامت و سلامتی کا ذریعہ بنتا ہے اور یہی نور قیامت کے دن رہنما بنے گا واضح رہے کہ "نور" قرآن کا ایک نام بھی ہے۔

"کتاب اللہ کو مضبوط پکڑلو" یعنی اپنے فکر ونظر، اعتقاد و انقیاد اور عمل و کردار کی بنیاد کتاب اللہ کو قرار دو، اسی میں عقیدہ و یقین رکھو اور اسی پر عمل کرو یہ بات ذہن نشین رہے کہ احادیث رسول اللہ ﷺ پر عمل کرنا بھی منجملہ کتاب اللہ ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ما اٰتکم الرسول فخذوہ و مانھٰکم عنه فانتھوا۔ (اے اہل ایمان! رسول جو کچھ تمہیں دیں اس کو قبول کرو اور جس بات سے تمہیں منع کریں اس سے باز رہو) اور فرمایا و من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ (اور جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی) اور فرمایا: قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ۔ (آپ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے) ایک روایت میں یہاں حدیث کا یہ فقرہ یوں نقل کیا گیا ہے فتمسکوا بکتاب اللّٰہ و خذوا (پس کتاب اللہ کو مضبوط پکڑلو اور اس کو اختیار کرو) خوب جوش دلایا" یعنی حاضرین کو اس امر کی جانب بہت تاکید اور شدومد کے ساتھ متوجہ کیا کہ کتاب اللہ پڑھنے) اس کو حفظ کرنے، اس کے الفاظ و معانی کے آداب و قواعد کی رعایت ملحوظ رکھنے اور جو احکام و مضامین اس میں ہیں ان پر عمل کرنے میں ذرا غفلت و کوتاہی نہ کی جائے۔

"راغب کیا" یعنی آپ ﷺ نے کتاب اللہ کی طرف راغب کرنے والی باتوں کا ذکر کیا جو شخص اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑے رہے گا اور اپنی تمام تر فکری اعتقادی اور عملی زندگی کا محور اسی کو بنائے رہے گا اس کو دین و دنیا کی فلاح و کامرانی حاصل ہوگی اور اس کو بلند تر مراتب و درجات حاصل ہوں گے یہاں اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ نے راغب کرنے والی اور بشارت دینے والی باتوں کے ساتھ اس عذاب سے ڈرانے والی باتیں بھی ذکر کی ہوں جو کتاب اللہ کے احکام پر عمل نہ کرنے والوں کو ہوگا تاہم یہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے صرف بشارت دینے والی باتوں پر اکتفا کر کے وسعت رحمت باری، اپنی شان رحمۃ للعالمین اور اپنی اُمت کے اُمت مرحومہ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہو۔

"میں (دُبارہ) تمہیں اللہ کا وہ عذاب یاد دلاتا ہوں" یہ جملہ آپ ﷺ نے تاکید اور زیادہ سے زیادہ اہمیت ظاہر کرنے کے لئے دو مرتبہ ارشاد فرمایا تاہم یہ بات بھی بعید از امکان نہیں ہے کہ ایک بار کے جملہ میں، اہل بیت، سے مراد "اولاد" ہو اور دوسری باری کے جملہ میں ازواج مطہرات" مراد ہوں، چنانچہ پہلے بیان بھی کیا جا چکا ہے کہ "اہل بیت" کا اطلاق اولاد اور ازواج دونوں پر ہوتا ہے ایک روایت میں یہاں قَالَ ثلاث مرات کے الفاظ ہیں، یعنی آپ ﷺ نے یہ جملہ تین بار ارشاد فرمایا۔

کتاب اللہ اللہ کی رسی ہے "حبل" کے لغوی معنی "رسی" کے ہیں اور اس سے مراد ہے: عہد امان اور وہ چیز جو بندہ کو اس کے رب کی طرف لے جائے اور اس کے قرب و رضا کا وسیلہ ہو مطلب یہ کہ قرآن بندہ کی فلاح و کامیابی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عہد و اقرار ہے، اس کے عذاب سے امان ہے اور اس کے قرب کا وسیلہ ہے اس کو مضبوط پکڑنے والا عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے، قرب خداوندی کی سرفرازی پاتا ہے اور اخروی فلاح اور کامرانیوں کے بلند درجات تک پہنچتا ہے اس کے برخلاف جو شخص اپنی اعتقادی عملی زندگی کا محور کتاب اللہ کو نہیں بناتا اور قرآن کے احکام وہدایات پر عمل پیرا نہیں رہتا وہ گمراہی یعنی دین و دنیا کی محرومیوں اور نامرادیوں کے علاوہ کچھ نہیں پاتا۔ پس قرآن کریم دونوں اعتبار سے "رسی" کی مانند ہے، کہ ہدایت چاہنے والے کو ترقی درجات تک پہنچاتا ہے اور سرکشی کرنے والے کو محرومیوں اور نامرادیوں کی نچلی سطح تک گرا دیتا ہے یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔ چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ

القران حجة لك او علیک یعنی: قرآن شریف یا تو تیری سند ہے (تجھ کو نجات دلائے گا) یا تیرے مقابلہ میں سند بنے گا (تجھ کو عذاب میں گرفتار کرائے گا۔

اور خود باری تعالیٰ فرماتا ہے۔

وننزل من القران ماھو شفاء ورحمة للمؤمنین ولا یزید الظّٰلمین الاخسارا۔ (اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو شفاء ورحمت ہے اور نا انصافوں کو اس سے اور الٹا نقصان بڑھتا ہے۔)

حضرت جعفر کا لقب

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا سَلَّمَ عَلَى ابْنِ جَعْفَرٍ قَالَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ابْنَ ذِي الْجَنَاحَيْنِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ وہ (یعنی ابن عمرؓ) جب حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے صاحبزادے عبد اللہ کو سلام کرتے تو یوں کہتے: اے دو بازوؤں والے کے بیٹے تجھ پر سلامتی ہو۔" (بخاریؒ)

تشریح: "دو بازوؤں والے" یہ "ذوالجناحین" کا ترجمہ ہے اور ذالجناحین" حضرت جعفر طیار کا لقب تھا جو ابو طالب کے بیٹے اور آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی ہیں۔ حضرت جعفرؓ جنگ موتہ (۸ھ) میں نہایت بہادری اور پامردی کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوگئے تھے، یہ جنگ عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کی پہلی جنگ تھی جو شام کے علاقہ (موتہ) میں ہوئی تھی اور قیصر روم کا لشکر جرار مقابلہ پر تھا، اس جنگ کے دوران ایک دن آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں اپنی نگاہ اعجاز سے دیکھا کہ جعفرؓ کو دس بازو عطا کئے گئے ہیں جن کے ذریعہ فرشتوں کے ساتھ اڑتے پھر رہے ہیں آنحضرت ﷺ سخت حیران ہوئے کہ اس نظارہ کا کیا مطلب ہے۔ اور پھر جب ان کی شہادت کی خبر مدینہ پہنچی تو عقدہ کھلا، چنانچہ اس دن سے ان کو (جعفر طیار" کہا جانے لگا اور" ذوالجناحین" کا لقب دیا گیا۔ اور ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں نے جعفرؓ کو جنت کی فضاؤں میں فرشتوں کے ساتھ اڑتے دیکھا ہے۔" چنانچہ اس دن سے وہ "ذوالجناحین" اور "طیار" کے لقب سے موسوم ہوگئے۔

حضرت جعفر طیارؓ قدیم الاسلام ہیں، ان سے پہلے صرف اکتیس آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت جعفرؓ اپنے بھائی حضرت علی بن ابی طالبؓ سے دس سال بڑے تھے اور خلقا و خلقا آنحضرت ﷺ سے بہت مشابہ تھے ۸ھ میں جنگ موتہ میں شہید ہوئے، اس وقت ان کی عمر اکتالیس سال کی تھی۔ پورے بدن پر تیر اور تلواروں کے نوے زخم آئے تھے حضرت جعفر طیارؓ سے احادیث روایت کرنے والوں میں دوسرے صحابہ کے علاوہ ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہؓ بھی شامل ہیں۔

حسنؓ کے لئے دعا

⑧ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ عَلٰى عَاتِقِهٖ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ میں نے (ایک دن) نبی کریم ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ حسن ابن علیؓ آپ ﷺ کے کاندھے پر سوار تھے اور آپ ﷺ فرما رہے تھے، اے اللہ! میں اس سے (بہت) محبت رکھتا ہوں، تو بھی اس سے محبت رکھ۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "تو بھی اس سے محبت رکھ" بلاشبہ آنحضرت ﷺ کی یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت حسنؓ کو اپنا پیارا اور چہیتا بنایا بس جب اللہ نے اور اللہ کے رسولؐ نے حضرت حسنؓ کو محبوب رکھا تو ہر مسلمان کو لازم ہے کہ وہ حسنؓ کی محبت سے اپنے دل و دماغ کی دنیا معمور رکھے۔

حسنؓ و حسینؓ: حضرت حسنؓ حضرت فاطمہ زہراءؓ کے بطن سے حضرت علیؓ کے صاحبزادے اور رسول اللہ ﷺ کے نواسے، آپ ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، اور آپ ﷺ کے آنگن پھول تھے۔ اور تمام جنتی جوانوں کے سردار ہیں حضرت حسنؓ کی کنیت "ابو محمد" تھی۔ صحیح تر روایت کے مطابق سن تین ہجری کے ماہ رمضان کی پندرہ تاریخ کو پیدا ہوئے اور سن پچپن میں وفات ہوئی۔ بعض حضرات نے سن وفات ۵۸ھ، بعض نے ۴۹ھ اور بعض ۴۴ھ لکھا ہے۔ بقیع میں دفن کئے گئے۔ ان سے ایک بڑی جماعت کو شرف روایت حاصل ہے جس میں ان کے صاحبزادے حضرت حسن ابن حسنؓ اور حضرت ابوہریرہؓ بھی شامل ہیں تاریخی روایت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کی شہادت (رمضان ۴۰ھ) کے بعد کوفہ میں جن لوگوں نے حضرت حسنؓ کو خلیفہ بنایا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی ان کی تعداد چالیس ہزار تھی لیکن وہ اُمت کو افراق وانتشار سے بچانے کی خاطر چھ ماہ بعد ہی ۱۵ جمادی الاول ۴۱ھ کو حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔

سید الشہداء حضرت حسینؓ کی کنیت ابوعبداللہ ہے، سن چار ہجری کے ماہ شعبان کی پانچ تاریخ کو پیدا ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی حضرت حسنؓ سے صرف ۱۰ ماہ ۲۰ دن چھوٹے تھے۔ ۱۰ محرم ۶۱ھ جمعہ کے دن کربلا (عراق) کی سرزمین پر یزید ابن معاویہ کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ایک روایت تو یہ ہے کہ سنان ابن انس نخعی نے آپ کو شہید کیا جب کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ شمر ذی الجوش نے شہید کیا اور آپ کی نعش مبارک اور آپ کے اہل بیت کو میدان کربلا سے عبداللہ ابن زیاد کے پاس خولی ابن یزید اصبحی لے کر آیا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ کے ساتھ آپ کی اولاد، آپ کے بھائیوں اور اہل بیت میں سے ۲۳ مردوں کو شہید کیا گیا۔ شہادت کے دن حضرت حسینؓ کی عمر اٹھاون سال کی تھی۔

حسن سے آنحضرت ﷺ کا تعلق خاطر

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ طَائِفَةٍ مِّنَ النَّهَارِ حَتّٰى اَتٰى خِبَاءَ فَاطِمَةَ فَقَالَ اَثَمَّ لُكَعُ اَثَمَّ لُكَعُ يَعْنِیْ حَسَنًا فَلَمْ يَلْبَثْ اَنْ جَاءَ يَسْعٰى حَتَّى اعْتَنَقَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا صَاحِبَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ وَاَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دن کے ایک حصہ میں باہر نکلا جب آپ ﷺ حضرت فاطمہؓ کے گھر میں پہنچے تو پوچھا: کیا یہاں منا ہے کیا یہاں منا ہے آپ ﷺ کی مراد حضرت حسنؓ سے تھی (جن کو ڈھونڈتے ہوئے آپ ﷺ آئے تھے) ابھی آپ نے چند ہی لمحے گزارے تھے کہ حسنؓ دوڑتے ہوئے آئے، پھر حسنؓ آنحضرت کے گلے سے اور آنحضرت ﷺ حسنؓ کے گلے سے لپٹ گئے اور پھر رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "خدایا! میں اس سے محبت رکھتا ہوں، تو بھی اس سے محبت رکھ اور اس شخص سے بھی محبت رکھ جو اس سے محبت رکھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے ایک تو معانقہ کا جائز ہونا ثابت ہوا، دوسرے جیسا کہ نوویؒ نے لکھا ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچوں سے محبت و شفقت اور نرمی ومہربانی کا برتاؤ کرنا یعنی ان کو گلے لگانا، گود میں اٹھالینا اور ان کو پیار کرنا مستحب ہے نیز بچوں اور اپنے چھوٹوں کے سامنے بھی انکساری وفروتنی اختیار کرنا اور ان کی خاطرداری کرنا مستحب ہے۔

امام حسنؓ کی فضیلت

⑩ وَعَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَالْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ اِلٰى جَنْبِهٖ وَهُوَ يُقْبِلُ عَلَى النَّاسِ مَرَّةً وَّعَلَيْهِ اُخْرٰى وَيَقُوْلُ اِنَّ ابْنِیْ هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيْمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوبکرہؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں منبر پر (خطبہ دیتے ہوئے) دیکھا کہ حسن ابن علیؓ آپ ﷺ کے (دائیں یا بائیں) پہلو میں تھے کبھی تو آپ ﷺ (وعظ و نصیحت میں تخاطب کے لئے) لوگوں کی طرف دیکھتے اور کبھی (پیار و محبت بھری نظروں سے) حسن بن علیؓ کی طرف دیکھنے لگتے اور فرماتے کہ "یہ میرا بیٹا "سید" ہے، امید رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "سید" کے معنی اس شخص کے ہیں جو نیکی میں فائق ہو اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ "سید" اس شخص کو کہتے ہیں جو غصہ سے مغلوب نہ ہوتا ہو یعنی حلیم الطبع ہو۔ ویسے "سید" کا اطلاق کئی معنوں پر ہوتا ہے مثلاً مربی، مالک، شریف، فاضل، کریم، حلیم، اپنی قوم کی ایذاء پر تحمل کرنے والا، رئیس، سردار اور پیشواء۔

دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔" یہ ارشاد نبوت دراصل ان واقعات و حالات کی سچی پیش گوئی تھا، جو حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے بعد ظہور پذیر ہوئے۔ اس وقت ملت اسلامیہ کا بڑا حصہ واضح طور پر دو طبقوں میں بٹ گیا تھا، ایک طبقہ حضرت امام حسنؓ کی خلافت و امارت کا قائل تھا اور دوسرے طبقہ نے حضرت امیر معاویہؓ کی امارت و حکمرانی کو تسلیم کیا تھا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں خلافت و امارت کے سب سے بڑے حقدار حضرت حسنؓ ہی تھے کیونکہ نہ صرف ذاتی، نسبی، اور دینی عظمت و حشمت و بزرگی اور فضیلت و برتری ان کو حاصل تھی، جس کی ایک بڑی دلیل یہی حدیث ہے کہ لسان نبوت نے ان کو "سید" فرمایا بلکہ ملی و سیاسی سطح پر بھی ان کو زبردست حمایت و طاقت حاصل تھی، اور چالیس ہزار جوانمردوں کا لشکر جان کی بازی لگا دینے کا عہد کر کے اور امیر معاویہؓ سے لڑنے مارنے مرنے کا حلف اٹھائے ہوئے ان کی پشت پر تھا، لیکن اس استحقاق اور طاقت کے باوجود انہوں نے محض اس خوف سے کہ نانا جان کی اُمت افتراق و انتشار اور باہمی خونریزی کا شکار ہو جائے گی، حکمرانی اور ملکی و دنیاوی سیادت کو ٹھکرا دیا اور آخرت کی فلاح و کامرانی کو اپنا منتہائے مقصود سمجھا چنانچہ انہوں نے کسی کمزوری کے تحت نہیں، بلکہ اتحاد اُمت کے مقصد کے تحت اپنی مرضی اور خوش دلی کے ساتھ امیر معاویہؓ سے صلح کر لی اور ان کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے حضرت امام حسنؓ اس زمانہ میں فرمایا کرتے تھے، خدا کی قسم، مجھ کو یہ گوارا نہیں کہ اُمت محمدیہ میں سے کسی کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرے۔ اُمت کو خونریزی سے بچانے کے لئے خلافت سے دستبرداری کا فیصلہ حضرت امام حسنؓ کے بہت سے ساتھیوں کے لئے ناقابل قبول تھا، بعض انتہا پسندوں نے سیدنا حسنؓ کو اس حد تک ہدف ملامت بنایا کہ ان کی مجلس میں پہنچ کر ان کو یوں مخاطب کرتے السلام علیک یا عار المؤمنین۔ اور سیدنا حسنؓ نہایت تحمل و بردباری کے ساتھ ان سے فرماتے العار خیر من النار اور سیدنا حسنؓ نہایت تحمل و بردباری کے ساتھ ان سے فرماتے العار خیر من النار (عار، نار سے بہتر ہے)

حضرت حسنؓ کے حق میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی (اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا) اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ دونوں ہی فرقے (یعنی امیر معاویہؓ کے پیرو اور سیدنا علیؓ اور ان کے بعد سیدنا حسنؓ کے پیرو) ملت اسلامیہ کا جزاء اور مسلمان تھے باوجودیکہ ان میں سے ایک فرقہ مصیب تھا اور ایک مخطی۔ نیز سیدنا حسنؓ کا امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو جانا اور ان سے صلح کر لینا اہل سنت و جماعت کے نزدیک اس امر کی دلیل ہے کہ اس صلح کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت و امارت شرعی طور پر قانونی اور جائز تھی یہاں یہ انتباہ ضروری ہے کہ اس زمانہ میں جو کچھ ہوا، یعنی صحابہ کے درمیان اختلاف و نزاع کی جو صورت پید اور بعض مواقع پر ان کے درمیان جنگ و جدل کی جو نوبت آئی اور جس کو "مشاجرات صحابہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کے بارے میں تمام سلف اور بزرگان دین نے ہمیشہ اپنی زبان بند رکھی صحابہ کی مقدس ہستیوں کو ہدف بنانا تو کجا، ان سے متعلق ان واقعات و حالات کو تنقید و تبصرہ کا موضوع بنانا بھی اسلاف میں سے کسی عالم اور بزرگ کو گوارہ نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو ان کے خون سے دور رکھا ہے تو پھر ہم اپنی زبانوں کو ان پر تنقید و تبصرہ اور ان کی نکتہ چینی سے کیوں ملوث

کریں۔

بہرحال سیدنا حسنؓ کا فضل و شرف اس بات سے عیاں ہے کہ سرکار دو عالمﷺ نے ان کو "سید" فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ ایک اور روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھانے میں مشغول ہوتے تھے کہ حسن، جو اس وقت چھوٹے سے تھے، مسجد میں آجاتے اور جب آنحضرت ﷺ سجدہ میں جاتے تو وہ آپ ﷺ کی گردن اور پیٹھ پر چڑھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ پھر آنحضرت ﷺ سجدہ سے اپنا سر اس قدر آہستگی اور احتیاط سے اٹھاتے کہ حسن نیچے اتر جاتے۔ (ایک دن) بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم آپ ﷺ کو اس منے کے ساتھ وہ معاملہ کرتے دیکھتے ہیں جو کسی اور کے ساتھ کرتے نہیں دیکھا! آپ ﷺ نے جواب دیا "یہ منا میری دنیا کا پھول ہے، بلاشبہ میرا یہ بیٹا "سید" ہے۔ امید رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو فرقوں کے درمیان صلح کرائے گا اور امام احمدؒ نے حضرت امیر معاویہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حسن کی زبان یا ان کے ہونٹ چوسا کرتے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس زبان یا ہونٹ کو عذاب سے ہرگز دوچار نہیں کرے گا جس کو رسول ﷺ چوسا ہو۔

حسنؓ و حسینؓ میری دنیا کے دو پھول ہیں

(۱۱) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ نُعْمٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ وَسَاَلَهٗ رَجُلٌ عَنِ الْمُحْرِمِ قَالَ شُعْبَةُ اَحْسِبُهٗ یَقْتُلُ الذُّبَابَ قَالَ اَهْلُ الْعِرَاقِ یَسْاَلُوْنِیْ عَنِ الذُّبَابِ وَقَدْ قَتَلُوْا ابْنَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ هُمَا رَیْحَانَیَّ مِنَ الدُّنْیَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعمؒ کہتے ہیں میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے سنا جبکہ (اہل کوفہ میں سے) کسی شخص نے ان سے محرم کے بارے میں پوچھا تھا (اس روایت کو حضرت عبدالرحمٰنؒ سے روایت کرنے والے راوی) حضرت شعبہؒ کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ پوچھنے والے نے مکھی کو مار ڈالنے کا حکم دریافت کیا تھا۔ اس پر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: "عراق یعنی کوفہ کے لوگ مجھ سے مکھی مار ڈالنے کے بارہ میں شرعی حکم دریافت کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کے بیٹے کو مار ڈالا جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ "یہ دونوں میری دنیا کے دو پھول ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: کسی کوفی نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا ہوگا کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص محرم ہو یعنی حج کا احرام باندھے ہوئے ہو اور اس حالت میں وہ مکھی مار ڈالے تو اس کا بدلہ کیا ہے، آیا اس پر دم لازم ہوگا یا صدقہ، اور یا کچھ لازم نہیں ہوگا؟ اس پر حضرت ابن عمرؓ نے بڑا گہرا طنز فرمایا کہ یہ کوفہ والے مجھ سے مکھی مار ڈالنے کے بارہ میں شرعی حکم دریافت کر کے گویا یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم کو شرع کا بہت پاس لحاظ ہے اور تقویٰ و احتیاط کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہایت بے دردی سے نواسہ رسول (حسینؓ) کو شہید کر ڈالا اور اپنا نام ظالموں کی فہرست میں سب سے اوپر لکھوایا۔

میری دنیا کے دو پھول ہیں۔" لغت میں "ریحان" کے کئی معنی آتے ہیں: رحمت، راحت روزی، رزق، چین اور آسائش۔ اور اسی مناسبت سے بیٹے کو بھی "ریحان" کہتے ہیں کہ اس سے دل کو راحت اور آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے، نیز خوشبودار گھاس اور پھول کو بھی "ریحان" کہا جاتا ہے اور از راہ تشبیہ اس معنی کا بھی اطلاق بیٹے اور اولاد پر ہو سکتا ہے کیونکہ جس طرح خوشبودار چیز یعنی پھول وغیرہ کو سونگھا جاتا ہے اسی طرح لوگ اولاد کو بھی سونگھتے اور چومتے ہیں اور اس طرح اپنا دل خوش کرتے ہیں۔

سرکار رسالتﷺ سے حسنینؓ کی جسمانی مشابہت

(۱۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمْ یَکُنْ اَحَدٌ اَشْبَهَ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیٍّ وَقَالَ فِی الْحُسَیْنِ اَیْضًا کَانَ اَشْبَهَهُمْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والا حسن بن علی کے علاوہ کوئی نہیں تھا نیز حضرت انس ؓ نے حضرت حسین ؓ کے بارہ میں بھی کہا کہ وہ بھی رسول اللہ سے بہت زیادہ مشابہ تھے۔" (بخاری)

تشریح: آگے دوسری فصل میں حضرت علی ؓ کی روایت آرہی ہے جس میں انہوں نے تفصیل بیان فرمائی ہے کہ سر سے سینہ تک تو حسن ؓ آنحضرت ﷺ سے زیادہ مشابہ تھے اور باقی نیچے کے جسم میں حسین ؓ آنحضرت ﷺ سے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔

ابن عباس ؓ کے لئے دعاء علم و حکمت

(۱۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ؓ قَالَ ضَمَّنِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى صَدْرِهٖ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ وَفِيْ رِوَايَةٍ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ کو اپنے سینۂ مبارک سے لپٹا کر یوں دعا فرمائی تھی: اس کو حکمت عطا فرما" اور ایک روایت میں (دعا کے) یہ الفاظ آئے ہیں کہ خداوندا اس کو کتاب اللہ کا علم عطا فرمایئے۔" (بخاری)

تشریح: سینہ سے لپٹانا دراصل اس طرف اشارہ تھا کہ علم کا منبع و مصدر اور حکمت کا مخزن و معدن یہی سینہ مبارک ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ "حکمت" سے مراد "حکمت فلسفہ نہیں بلکہ اتفاق علم و عمل یعنی علم میں تمام اوصاف و محاسن کے ساتھ تکمیل کرنا اور امور دین میں فہم صحیح" مراد ہے۔ اور انسان کے لئے یہ وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: یوتی الحکمۃ من یشاء و من یوتی الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ مذکورہ دعا میں "حکمت" سے مراد حقائق اشیاء کا پہنچانا اور اس چیز پر عمل کرنے ہے جو سزاوار عمل ہو۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حکمت سے مراد صحت کردار اور درست گفتار ہے اور بعض نے حکمت کا مصداق سُنّت نبوی (اقوال و افعال اور تقریر) کو قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

الغرض آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کے لئے علم و حکمت اور فہم کتاب کی دعا فرمائی ہے اور وہ اس اُمت کے جلیل القدر عالم تھے ان کے علم و فضل اور حکمت و دانشمندی کا بڑے بڑے صحابہ کرام نے اعتراف و اقرار کیا ہے اور نبی کریم ﷺ نے ان کے لئے علم و حکمت کی دعا فرمائی ہے۔

حضرت ابن عباس ؓ ہجرت سے تین سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئے اور جب رسول کریم ﷺ کا وصال ہوا اس وقت ابن عباس ؓ تیرہ سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت پندرہ برس کے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے وقت دس سال کے تھے انہوں نے دوبار جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا ہے اور دوبار آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی ہے۔ آخری عمر میں آنکھوں سے نابینا ہوگئے تھے وہ ۶۸ ھ میں مقام طائف میں فوت ہوئے ابن زبیر ؓ کا دور حکومت تھا اور انہوں نے اکہتر سال عمر پائی۔

آپ ﷺ کا دعا دینا

(۱۴) وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْخَلَاءَ فَوَضَعْتُ لَهٗ وَضُوْءً فَلَمَّا خَرَجَ قَالَ مَنْ وَضَعَ هٰذَا فَاُخْبِرَ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور ان ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بیت الخلا میں داخل ہوئے تو میں نے آپ ﷺ کے لئے وضو کا پانی رکھا۔ پس جب آپ ﷺ نکلے تو فرمایا یہ (پانی) کس نے رکھا ہے؟ آپ ﷺ کو خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا کر

دے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: یہ واقعہ اس رات کا ہے جس رات حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنی خالہ میمونہؓ ام المؤمنین کے گھر ٹھہرے تھے تاکہ وہ آنحضرت ﷺ کی نماز تہجد کا طریقہ معلوم کر سکیں چنانچہ یہ پورا واقع باب قیام اللیل (نماز تہجد کے بیان) میں گذر چکا ہے۔

اس دعا کا مطلب یہ ہے اے اللہ ان (ابن عباسؓ) کو ایسا عالم بنا دے جو دین کے اصول وفروع اور اس کے کلیات وضربات اچھی طرح جان و پہچان لیں اور انہیں اعلی درجہ کی علمی مہارت وفقاہت اور دین میں سمجھ بوجھ حاصل ہو۔ اس فقہ سے مراد صرف وہ متعارف فقہ نہیں ہے جس کا تعلق فروعی مسائل و معاملات، صوری عبادات اور فصل خصومات سے ہے بلکہ اس سے دین کی مکمل سمجھ بوجھ اور کامل مہارت مراد ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے فقہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور غائبانہ دعا کا مستحب ہونا واضح ہوتا ہے اور جو شخص کوئی خدمت انجام دے یا کوئی بھلائی کرے اس کے حق میں دعا کرنے کا استحباب مفہوم ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت سے ابن عباسؓ کو علم میں بلند واعلیٰ رتبہ عطا فرمایا اور یہ آپ کی خدمت کا صلہ تھا ۔

که　مرداں　زخدمت　بجائے　رسند

اسامہ بن زیدؓ اور امام حسنؓ کے حق میں دعا

(۱۵) وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْخُذُهُ وَالْحَسَنَ فَيَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اَحِبَّهُمَا فَاِنِّيْ اُحِبُّهُمَا وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْخُذُنِيْ فَيُقْعِدُنِيْ عَلٰى فَخِذِهٖ وَيُقْعِدُ الْحَسَنَ ابْنَ عَلِيٍّ عَلٰى فَخِذِهِ الْاُخْرٰى ثُمَّ يَضُمُّهُمَا ثُمَّ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُمَا فَاِنِّيْ اَرْحَمُهُمَا۔ (رواہ البخاری)

"اسامہ بن زید سے منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ اسامہؓ کو اور امام حسنؓ کو پکڑ کر فرماتے اے اللہ ان دونوں سے محبت فرما کہ میں بھی ان دونوں سے محبت کرتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ اسامہؓ نے کہا رسول اللہ ﷺ مجھے پکڑ کر اپنی ران مبارک پر بٹھاتے اور حضرت حسن بن علیؓ کو دوسری ران مبارک پر بٹھا کر پھر ان دونوں کو ملا کر فرمایا کرتے تھے اے اللہ ان دونوں پر رحم فرما کہ میں بھی ان پر مہربان ہوں۔" (بخاری)

تشریح: حضرت اسامہؓ کے والد ماجد حضرت زید بن حارثہؓ آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور آپ ﷺ کے متبنی (منہ بولے بیٹے) تھے آپ ﷺ نے ان کا عقد اپنی خادمہ خاص (برکہ) ام ایمنؓ سے کر دیا تھا۔ یہ خاتون آپ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کی آزاد کردہ تھیں۔ ان کے بطن سے حضرت زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہؓ تھے۔ آپ ﷺ کو حضرت زیدؓ اور ان کے بیٹے اسامہؓ سے بے حد محبت تھی۔

حضرت اسامہؓ کو جن کے والدین پر غلامی کا دور گذر چکا تھا انہیں اپنے نواسے کے ساتھ اپنی ران مبارک پر بٹھا کر دعائیں دینا جہاں آپ کی شان رحیمی کو واضح کرتا ہے وہاں ان دو حضرات کی رفعت جلالت شان اور عظمت کی آپ کے اس طرز عمل سے نشان دہی ہوتی ہے بیت ۔

زانکه　ترابر　من　مسکیں　نظرست　　　آثارم　از　آفتاب　مشهور　ترست

آنحضرت ﷺ کے وصال اور دنیا سے رخصت ہونے کے وقت اسامہؓ کی عمر بیس برس کے قریب تھی وہ وادئ القراء میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہاں ہی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے وفات پائی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ انہوں نے ۵۴ھ میں

وفات پائی ہے اور علامہ ابن عبد البرؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

اسامہ بن زیدؓ کو آپ ﷺ کا امیر لشکر بنانا

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بَعْثًا وَّاَمَّرَ عَلَيْهِمْ اُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ فَطَعَنَ بَعْضُ النَّاسِ فِيْ اِمَارَتِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كُنْتُمْ تَطْعَنُوْنَ فِيْ اِمَارَتِهٖ فَقَدْ كُنْتُمْ تَطْعَنُوْنَ فِيْ اِمَارَةِ اَبِيْهِ مِنْ قَبْلُ وَاَيْمُ اللّٰهِ اِنْ كَانَ لَخَلِيْقًا لِّلْاِمَارَةِ وَاِنْ كَانَ لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ وَاِنَّ هٰذَا لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ بَعْدَهٗ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ نَحْوُهٗ وَفِيْ اٰخِرِهٖ اُوْصِيْكُمْ بِهٖ فَاِنَّهٗ مِنْ صَالِحِيْكُمْ۔

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک فوج روانہ کی اور اس پر اسامہؓ بن زیدؓ کو امیر بنا کر بھیجا تو کچھ لوگوں نے اس کی امارت پر طعنہ زنی کی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم لوگ اس (اسامہؓ) کی امارت پر معترض ہوئے ہو تو اس سے پہلے تم اس کے باپ (زیدؓ) کی امارت پر بھی طعنہ زنی (اور اعتراض) کر چکے ہو اور اللہ کی قسم وہ (زیدؓ) امارت کے قابل بھی تھا اور تمام لوگوں سے مجھے محبوب و عزیز تر بھی تھا اور اس کے بعد یہ (اسامہؓ) بھی مجھے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب و عزیز تر ہے بخاری و مسلم اور مسلم کی ایک روایت میں اسی طرح ہے اور اس کے آخر میں اتنا اضافہ بھی کہ "لوگوں میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ یقیناً یہ تمہارے نیک لوگوں میں سے ہے۔

تشریح: طعنہ دینے اور اعتراض کرنے والے لوگ یا تو منافق تھے جن کا شیوہ ہی یہ تھا کہ وہ کوئی موقع ہاتھ آنے کی انتظار میں رہتے تھے اور جہاں انہیں کوئی موقع ملا زبان کو بے لگام کر دیا اور یا پھر طعنہ دینے والے نو مسلم تھے جو زمانۂ جاہلیت کے طور طریقوں کے عادی چلے آئے تھے اور ان کے نزدیک انسان کی قدر و قیمت ذاتی صلاحیت و علمی و عملی قابلیت کی بجائے خاندانی وجاہت اور اہل و دولت کی بنیاد پر تسلیم کی جاتی تھی۔

اسامہؓ کے باپ حضرت زید بن حارثہؓ نہایت جلیل القدر صحابی اور سابق الایمان بزرگ تھے آنحضرت ﷺ کو ان سے بے حد محبت تھی اور ذاتی طور پر بھی وہ نہایت قابل شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی عسکری صلاحیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب بھی کوئی فوج روانہ کی جس میں زید بن حارثہؓ کو روانہ کیا تو آپ ﷺ نے انہیں امیر ہی بنا کر روانہ کیا۔

۸ھ میں شام کی سرحد پر رومی افواج جمع ہو چکی تھیں اس لئے آپ ﷺ نے ایک فوج اس طرف روانہ کی اور اس پر حضرت زیدؓ کو امیر بنا کر روانہ فرمایا۔ یہ شام گئے نصرانی کفار سے مقابلہ ہوا حضرت زید، حضرت جعفر طیار اور عبداللہ بن رواحہ شہید ہوئے اس جنگ کو جنگ موتہ کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر لوگوں نے حضرت زید کی امارت پر اعتراض کیا تھا اگلے سال آپ نے حضرت زید شہید کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو امیر فوج بنا کر سرحد پر روانہ کیا تو کچھ لوگوں نے پھر اعتراض کیا اور اس بات کو اعتراض کی بنیاد بنایا کہ ایک تو کم سن ہیں اور دوسرا یہ کہ ان کے والدین پر غلامی کی حالت گذر چکی ہے بالخصوص جب منافقین نے یہ دیکھا کہ اسامہؓ کی ماتحتی میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابی موجود ہیں تو انہیں اور بھی اعتراض کا موقع ہاتھ آگیا۔ انہیں کیا معلوم کہ اسلام رنگ و نسل و مال و دولت کے تمام عارضی امتیازات کو مٹا کر شرافت و بزرگی کی بنیاد پر ذاتی قابلیت، علم و عمل اور تقویٰ و پرہیزگاری و اعلیٰ اخلاق کو قرار دیتا ہے "اللہ کی قسم وہ امارت کے قابل تھے" اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیت تقویٰ و پرہیزگاری سبقت اسلام اور میری اطاعت و محبت کی بنیاد پر یقیناً امارت کے اہل اور سیادت کے لائق تھے اور ان کے بعد اسامہؓ بھی اس قابل ہیں کہ انہیں ملکی مہمات اور اہم خدمات پر مامور کیا جائے کہ وہ بھی اپنے باپ کے بعد مجھے سب سے زیاد عزیز اور میرے نزدیک اس عہدہ کے قابل اور زیادہ قابل وثوق ہیں۔

زید بن محمد کہنے کی ممانعت

(۱۷) وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاكُنَّا نَدْعُوْهُ اِلَّا زَيْدَبْنَ مُحَمَّدٍ حَتّٰى نَزَلَ الْقُرْاٰنُ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَذُكِرَ حَدِيْثُ الْبَرَاءِ قَالَ لِعَلِيٍّ اَنْتَ مِنِّيْ فِيْ بَابِ بُلُوْغِ الصَّغِيْرِ وَحِضَانَتِهٖ۔

"اور یہ بھی عبداللہ بن عمرؓ سے ہی مروی ہے کہ انہوں نے کہا ہم لوگ اس (زیدؓ) کو صرف زید بن محمد ہی کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تم ان کو ان کے باپ کے ناموں کی نسبت سے پکارا اور بلایا کرو۔" (بخاری ومسلم) اور حضرت براءؓ کی حدیث جس میں آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا اَنْتَ مِنِّیْ (تم مجھ سے ہو) بلوغ صغیر اور (اس کی حضانت کے باب میں گذر چکی ہے۔

تشریح: مکمل آیت اس طرح ہے وَمَاجَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَيَهْدِي السَّبِيْلَ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَاَقْسَطُ عِنْدَاللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ الخ۔

اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے نہیں قرار دیا یہ تو تمہارے اپنے ہی منہ کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ درست بات کہتا ہے اور صحیح راہ دکھاتا ہے۔ تم ان کو ان کے باپوں کے نام کی نسبت سے پکارو اور بلایا کرو اس لئے کہ یہ بات اللہ کے نزدیک زیادہ عدل وانصاف کی مظہر ہے اور اگر ان کے باپ تمہیں معلوم نہ ہوں تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے دوست ہیں۔

اس آیت کے نزول کے بعد انہیں لوگ زید بن حارثہؓ کہنے لگے۔ اس روایداد سے بھی بخوبی واضح ہوتا ہے کہ رحمت عالم ﷺ کے ساتھ زید بن حارثہؓ کو کسی قدر رتبۂ محبت وقرب حاصل تھا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

(۱۸) عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَجَّتِهٖ يَوْمَ عَرَفَةَ وَهُوَ عَلٰى نَاقَتِهِ الْقَصْوَاءِ يَخْطُبُ فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ يَآاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَ بَيْتِيْ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت جابرؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا میں رسول اللہ ﷺ کو آپ کے حج کے موقع پر عرفہ کے دن اپنی قصواء نامی اونٹنی پر خطبہ دیتے سنا کہ فرمایا: لوگو! میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری اولاد۔ میرے اہل بیت۔" (ترمذی)

تشریح: قصواء اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس کے کان کا کوئی کونہ کٹا ہوا ہو۔ آنحضرت ﷺ کی اونٹنی کا کان پیدائشی طور پر ایسا ہی تھا اور کٹا ہوا نہ تھا۔ یہ وجہ تسمیہ بھی ہو سکتی ہے کہ قصواء بمعنی بعید ہو۔ چنانچہ منقول ہے کہ آپ ﷺ کی یہ اونٹنی نہایت تیز رفتار تھی اور دور دور تک تیز رفتار سے چلتی جاتی تھی۔

اَخَذْتُمْ بِهٖ تم مضبوطی سے پکڑے رہو۔ پکڑنے سے مراد اطاعت وانقیاد اور عمل وپیروی ہے ابن مالکؒ نے کہا کہ کتاب کو پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور عترت واولاد کو پکڑنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان سے محبت کی جائے ان کی سیرت اختیار کی جائے اور ان کو قولاً فعلاً کسی طرح بھی ایذا نہ دی جائے۔

عترت سے آپ کی اولاد مراد ہے اور اہل بیت سے مراد آپ کے قرابت دار اور جد قریب کی اولاد بھی ہے اور آپ کی ازواج مطہرات بھی رضوان اللہ علیہم۔

آج عالم اسلام میں جس قدر پریشانیاں موجود ہیں ان کا واحد حل صرف اور صرف یہ ہے کہ اہل اسلام حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان کو بالکل بھول چکے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی وصیت

⑲ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ اَحَدُهُمَا اَعْظَمُ مِنَ الْاٰخَرِ. كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلُ بَيْتِيْ وَلَنْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ فَانْظُرُوْا كَيْفَ تَخْلُفُوْنِيْ فِيْهِمَا. (رواہ الترمذی)

"حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں میرے بعد جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ ایک ان میں دوسری سے عظیم تر ہے۔ وہ ایک تو اللہ کی کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ کی آسمان سے زمین کی طرف پھیلی ہوئی رسی ہے اور دوسری میری اولاد میرے گھر والے ہیں اور وہ الگ الگ نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر وہ میرے پاس آپہنچیں گے پس تم لوگ سوچ لو کہ تم میرے بعد ان سے کیا معاملہ کرتے ہو اور کیسے پیش آتے ہو۔" (ترمذی)

تشریح: اس واقعہ کے بیان کرنے والے زید بن ارقم الانصاری الخزرجی مشہور صحابی ہیں غزوہ احد میں بوجہ کمسنی کے حضور ﷺ نے ان کو شریک نہیں فرمایا۔ غزوہ خندق اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے انہوں نے عبداللہ بن ابی بن سلول کے منافقانہ اقوال (جن کا ذکر قرآن پاک میں آیہ کریمہ لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل میں ہے) کو حضرت سے نقل کیا تھا مگر عبداللہ انکار کر گیا اور زید کو صحابہؓ نے سچا نہ جانا اس کے بعد سورہ منافقین نازل ہوئی جس میں زید کی تصدیق کی گئی تھی۔ زید حضور انورؐ کے ساتھ سترہ غزوات میں شریک ہوئے ۶۶ھ میں وفات پائی۔ تمام کتب صحاح میں آپ کی بکثرت احادیث مروی ہیں مختصر یہ کہ آپ ایک بہت بڑے پائے کے صحابی ہیں۔

اس حدیث میں بھی کتاب اللہ (قرآن مجید) کی طرف اپنی اُمت کو توجہ دلائی ہے اور اپنے اہل کے حقوق بھی یاد دلائے اور اہل بیت کی عظمت بیان فرمادی کہ تم لوگ میری نسبت کے خیال سے انؓ کے حقوق کی ادائیگی میں جتنے زیادہ سرگرم رہو گے اور ان کی ہر طرح کی خبر گیری میں جتنا زیادہ حصہ لو گے اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ اور تمہیں دنیا و آخرت میں خیر و عافیت نصیب ہوگی آپ ﷺ کا یہ فرمانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص باپ دم رخصت اپنی اولاد کے بارہ میں کسی کو وصیت کرتا ہے کہ میں یہ اپنی اولاد چھوڑ کر جارہا ہوں تم ان کی خوب دیکھ بھال کرنا اور ان کے حقوق و مفادات کا تحفظ کرنا۔

"اور یہ دونوں الگ الگ نہیں ہوں گی" یعنی قیامت کے تمام مواقف و مراحل پر ان دونوں یعنی کتاب اللہ اور عترت رسول کا ساتھ رہے گا، کہیں بھی یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔ یہاں تک کہ یہ دونوں مل کر حوض کوثر پر میرے پاس آئیں گی اور دنیا میں جس جس نے ان دونوں کے حقوق اچھی طرح ادا کئے ہوں گے اس کا نام لے کر میرے سامنے شکریہ ادا کریں گی اور پھر میں بدلہ میں ان سب کے ساتھ نہایت اچھا سلوک اور احسان کروں گا اور اللہ تعالیٰ بھی ان سب کو کامل جزا اور انعام عطا فرمائیں گے اور ان لوگوں نے دنیا میں ان دونوں کی حق تلفی کی ہوگی اور دونوں کے ساتھ کفران نعمت کیا ہوگا ان کے ساتھ اس کے برعکس معاملہ ہوگا۔

"پس تم دیکھو کہ" یعنی میں نے ان دونوں کی حیثیت و اہمیت تمہارے سامنے واضح کردی ہے۔ اب تمہیں خود اپنا احتساب کرنا ہے کہ ان دونوں یعنی کتاب اللہ، اور میری عترت کے تئیں تم میرے خلف الصدق ثابت ہوتے ہو یا ناخلف۔ اگر تم نے میرے بعد دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رکھا اور ان کے ساتھ وہ وابستگی رکھی جو ان کا حق تو میرے خلف الصدق قرار پاؤ گے اور اگر ان کے ساتھ اچھی وابستگی نہ رکھی اور ان کے تئیں اچھا رویہ اختیار نہ کیا تو ناخلف سمجھے جاؤ گے۔

چہار تن پاک کا دشمن گویا آنحضرت ﷺ کا دشمن

⑳ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِعَلِيٍّ وَّفَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ اَنَا حَرْبٌ لِّمَنْ حَارَبَهُمْ

وَسَلْمٌ لِمَنْ سَالَمَهُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ کے حق میں فرمایا کہ "جو کوئی ان سے لڑے میں اس سے لڑوں گا اور جو کوئی ان سے مصالحت رکھے میں اس سے مصالحت رکھوں گا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ جس نے ان چہار تن پاک کو دوست اور محبوب رکھا، اس نے آنحضرت ﷺ کو دوست و محبوب رکھا۔ اور جس نے ان چاروں کو دشمن رکھا اس نے آنحضرت ﷺ کو دشمن رکھا ایک روایت میں حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے مجھ کو دوست رکھا، ان دونوں یعنی حسنؓ و حسینؓ کو دوست رکھا اور ان دونوں کے باپ اور ان دونوں کی ماں یعنی علیؓ اور فاطمہؓ کو دوست رکھا تو وہ قیامت کے دن میرے درجہ میں میرے ساتھ ہوگا۔" احمد اور ترمذی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے جس کے آخری الفاظ یوں ہیں۔ "تو وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

علیؓ وفاطمہؓ کی فضیلت

(۲۱) وَعَنْ جُمَيْعِ بْنِ عُمَيْرٍ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ عَمَّتِيْ عَلٰى عَآئِشَةَ فَسَأَلْتُ اَيُّ النَّاسِ كَانَ اَحَبَّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ فَاطِمَةُ فَقِيْلَ مِنَ الرِّجَالِ قَالَتْ زَوْجُهَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جمیع بن عمیر (تابعی) کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں اپنی پھوپی کے ساتھ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے پوچھا، رسول کریم ﷺ کو سب سے زیادہ محبت کس سے تھی؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا فاطمہؓ سے پھر میں نے پوچھا، اور مردوں میں سب سے زیادہ محبت کس سے تھی؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: فاطمہؓ کے شوہر (علی مرتضیٰؓ) سے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہاں حضرت عائشہؓ کی منصف مزاجی اور صدق گوئی نوٹ کرنے کے قابل ہے انہوں نے اخلاص کے ساتھ سچی بات بیان کر دی۔ حالانکہ اگر وہ چاہتیں تو کہہ سکتی تھیں کہ آنحضرت کو سب سے زیادہ محبت مجھ سے اور میرے باپ سے تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر یہی سوال حضرت فاطمہؓ سے کیا جاتا تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ آنحضرت ﷺ کو سب سے زیادہ محبت عائشہؓ اور ان کے باپ سے تھی۔ اب اس حدیث کے آئینہ میں ذرا وہ متعصب اور کجرو اپنا چہرہ دیکھیں جو حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہ کے درمیان اختلاف و عناد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہرحال یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ سب سے زیادہ محبوب ہونے کا مطلب "سب سے افضل ہونا" ہرگز نہیں ہے اولاد اور نزدیکی اقارب سے زیادہ محبت ہونا ایک طبعی چیز ہے۔ ایک شخص یقینی طور پر جانتا ہے کہ غیر اولاد میں فلاں فلاں آدمی اس کی اولاد سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود اپنی ہی اولاد سے زیادہ محبت رکھتا ہے۔ ہاں اپنی اولاد کا غیر اولاد سے افضل ہونا اس بات کو لازم کرتا ہے کہ اس سے محبت بھی زیادہ ہو۔

جس نے میرے چچا کو ستایا اس نے مجھ کو ستایا

(۲۲) وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيْعَةَ اَنَّ الْعَبَّاسَ دَخَلَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُغْضَبًا وَّاَنَا عِنْدَهٗ فَقَالَ مَا اَغْضَبَكَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَالَنَا وَلِقُرَيْشٍ اِذَا تَلَاقَوْا بَيْنَهُمْ تَلَاقَوْا بِوُجُوْهٍ مُّبْشَرَةٍ وَاِذَا لَقُوْنَا لَقُوْنَا بِغَيْرِ ذٰلِكَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى احْمَرَّ وَجْهُهٗ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يَدْخُلُ قَلْبَ رَجُلٍ الْاِيْمَانُ حَتّٰى يُحِبَّكُمْ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ ثُمَّ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ مَنْ اٰذٰى عَمِّيْ فَقَدْ اٰذَانِيْ فَاِنَّمَا عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِيْهِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِي الْمَصَابِيْحِ عَنِ الْمُطَّلِبِ۔

"اور حضرت عبدالمطلب بن ربیعہؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت عباسؓ غصہ میں بھرے ہوئے آئے (یعنی کسی نے کوئی ایسی حرکت کردی تھی یا کوئی ایسی بات کہہ دی تھی جس سے حضرت عباسؓ کو سخت غصہ آیا اور اسی غصہ کی حالت میں وہ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے) آنحضرت نے پوچھا کہ ایسی کیا بات پیش آگئی جس سے تمہیں اتنا غصہ آرہا ہے؟ حضرت عباسؓ بولے اے اللہ کے رسول! ہمارے (یعنی بنی ہاشم) اور (باقی) قریش کے درمیان کیا (بیگانگی) ہے کہ جب وہ (قریش) آپس میں ملتے ہیں تو کشادہ روئی سے ملتے ہیں اور جب ہمارے ساتھ ملتے ہیں تو اس طرح نہیں ملتے رسول کریم ﷺ (نے حضرت عباسؓ سے یہ بات سنی تو ان قریش کے اس برے رویہ پر) سخت غصہ ہوئے یہاں تک کہ غصہ کی شدت سے آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا پھر) حضرت عباسؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کسی شخص کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوگا اگر وہ تم (اہل بیت) کو اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دوست نہیں رکھے گا۔" اور پھر فرمایا: لوگو: جان لو، جس شخص نے خصوصا) میرے چچا کو ستایا اس نے (گویا) مجھ کو ستایا، کیونکہ کسی کا چچا اس کے باپ کی مانند ہوتا ہے" (ترمذیؒ) اور مصابیح میں (عبدالمطلب بن ربیعہ" کی جگہ) "مطلب بن ربیعہ" ہے (جبکہ صحیح عبدالمطلب بن ربیعہ" ہی ہے جو ترمذی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: ایمان داخل نہیں ہوگا" یا تو مطلق ایمان مراد ہے اور اس صورت میں ارشاد گرامی کو شدید ترین وعید پر محمول کیا جائے گا یا: کامل ایمان" مراد ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ آنحضرت کے ارشاد کا مقصد سخت تاکید کے ساتھ اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ دل و دماغ کو اہل بیت کی محبت و عقیدت سے معمور کئے بغیر ایمان کامل کی دولت نصیب نہیں ہو سکتی۔

قریش کی جو متعدد شاخیں تھیں ان میں سے "بنو ہاشم" (آنحضرت ﷺ کا خاندان) سب سے باعزت شاخ تھی ایسے اکثر مناصب جو سماجی عزت و وجاہت عطا کرتے تھے۔ اسی شاخ کے افراد کے سپرد تھے۔ پھر سب سے بڑا شرف یعنی نبوت و رسالت کا منصب عظمیٰ بھی اسی شاخ کا نصیب بنا۔ ان وجوہ سے قریش کی دوسری شاخیں بنو ہاشم سے ایک طرح کی پرخاش رکھتی تھیں اور ان کو اپنا حریف قرار دیتی تھیں۔ چنانچہ ابوجہل آنحضرت ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہوئے یہی کہا کرتا تھا کہ مکہ اور قریش کی سرداری بنو ہاشم نے لے رکھی ہے حاجیوں کو زمزم پلانے کے اعزاز پر بنو ہاشم نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر بنو ہاشم میں نبوت و رسالت بھی آجائے تو پھر باقی قریش کے پاس کیا رہ جائے گا۔

حضرت عباسؓ کی فضیلت

(۲۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَبَّاسُ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عباسؓ مجھ سے ہیں اور میں عباس سے ہوں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "عباس مجھ سے ہیں" یعنی میرے خاص قرابتیوں میں سے ہیں یا یہ کہ میرے اہل بیت میں سے ہیں علماء لکھتے ہیں کہ فضل و شرف اور شرف اور نبوت کے اعتبار سے تو آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی اصل ہے جبکہ نسب اور چچا ہونے کے اعتبار سے حضرت عباسؓ اصل ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ مذکورہ ارشاد گرامی دراصل بکمال محبت و تعلق، یک جہتی و یگانگت اور اخلاص و اختلاط سے کنایہ ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کے حق میں بھی فرمایا تھا کہ (اے علیؓ) میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔

حضرت عباسؓ: حضرت عباس ابن عبدالمطلب آنحضرت ﷺ کے چچا ہیں ان کی ولادت واقعہ فیل سے ایک سال قبل ہوئی ان کی والدہ قبیلہ نمر بن قاسط سے تعلق رکھتی تھیں اور وہ پہلی عرب خاتون ہیں جس نے کعبۂ اقدس پر حریر و دیباج اور نوع بہ نوع قیمتی کپڑوں کا غلاف چڑھایا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عباسؓ بچپن میں کہیں گم ہو گئے تھے اور جب تلاش بسیار کے بعد ہاتھ نہیں لگے تو ان کی والدہ نے منت مانی کہ اگر میرا بیٹا مل جائے گا تو میں بیت الحرام پر غلاف چڑھاؤں گی۔ چنانچہ جب حضرت عباسؓ کا سراغ لگ گیا اور وہ گھر آگئے تو ان کی والدہ نے بڑے اہتمام کے ساتھ منت پوری کی۔ حضرت عباسؓ زمانہ جاہلیت میں بھی مکہ اور قریش میں زبردست اثر و

رسوخ رکھتے تھے۔ اور ایک بڑے سردار تسلیم کئے جاتے تھے۔ "عمارۃ" اور سقایۃ" کے اہم مناسب ان کے سپرد تھے۔ وہ آنحضرت ﷺ سے دو سال بڑے تھے اور چچا ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ کا غیر معمولی ادب احترام کرتے تھے۔ منقول ہے کہ ایک دن کسی نے ان سے سوال کیا انت اکبر او النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (آپ بڑے ہیں یا آنحضرت ﷺ ؟) تو انہوں نے جواب دیا هو اکبر وانا اسن (بڑے تو آنحضرت ﷺ ہی ہیں ہاں عمر میری زیادہ ہے) حضرت عباسؓ کا یہ بلیغ جواب ان کی سلامت طبع اور ذہانت وذکاوت کی غمازی کرتا ہے حضرت عباسؓ نے اسلام تو بہت پہلے قبول کر لیا تھا لیکن بعض مصالح کے تحت اپنے اسلام کا اظہار نہیں کرتے تھے چنانچہ جنگ بدر میں وہ بڑی کراہت کے ساتھ اور مجبوری کے تحت مشرکین مکہ کے ساتھ شریک تھے اور آنحضرت ﷺ نے مجاہدین اسلام سے فرمادیا تھا کہ جس شخص کا سامنا عباسؓ سے ہو جائے وہ ان کو قتل نہ کرے کیونکہ وہ مجبورًا اس جنگ میں مشرکین مکہ کی طرف سے شریک ہیں جنگ کے خاتمہ پر حضرت عباسؓ بھی قیدیوں میں شامل ہوئے اور ابوالیسیر بن کعب بن عمر نے ان کو قید کیا۔ پھر انہوں نے فدیہ (مالی معاوضہ) ادا کر کے رہائی حاصل کی اور مکہ واپس آگئے بعد میں وہاں سے باقاعدہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئے ۳۶ھ میں ۱۲رجب جمعہ کے دن ان کی وفات ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۸ سال کی تھی اور جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی وفات کے وقت ستر غلام آزاد کئے۔

عباسؓ اور اولاد عباسؓ کے لئے دعا

(۴۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلْعَبَّاسِ اِذَا کَانَ غَدَاۃُ الْاِثْنَیْنِ فَاْتِنِیْ اَنْتَ وَوَلَدُکَ حَتّٰی اَدْعُوَلَکُمْ بِدَعْوَۃٍ یَنْفَعُکَ اللّٰہُ بِھَا وَوَلَدَکَ فَغَدَا وَغَدَوْنَا مَعَہٗ وَاَلْبَسَنَا کِسَاءَہٗ ثُمَّ قَالَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْعَبَّاسِ وَوَلَدِہٖ مَغْفِرَۃً ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً لَا تُغَادِرُ ذَنْبًا اَللّٰھُمَّ احْفَظْہُ فِیْ وَلَدِہٖ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَزَادَ رَزِیْنٌ وَاجْعَلِ الْخِلَافَۃَ بَاقِیَۃً فِیْ عَقِبِہٖ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (میرے والد) حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ پیر کے دن صبح کے وقت تم اپنی اولاد کو لے کر میرے پاس آنا تاکہ میں تمہارے لئے دعا کروں جس کے سبب اللہ تعالیٰ تمہیں اور تمہاری اولاد کو نفع پہنچائے چنانچہ (جب پیر کا دن آیا تو) صبح کے وقت حضرت عباسؓ اور ان کے ساتھ ہم سب (ان کی اولاد) آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آنحضرت ﷺ نے اپنی چادر مبارک ہم سب کو اڑھائی اور پھر یوں دعا فرمائی خداوندا! عباسؓ کو اور ان کی اولاد کو بخش دے اور ظاہر و باطن کی ایسی بخشش عطا فرما جو کوئی گناہ باقی نہ چھوڑے۔ الٰہی! عباسؓ کو ان کی اولاد میں قائم و محفوظ رکھو۔" ترمذیؒ اور رزینؒ نے اس دعاء کے آخر میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ امارت و بادشاہی کو ان کی اولاد میں باقی رکھ" ! ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح : اپنی چادر مبارک ہم سب کو اڑھائی " یہ اس بات سے کنایہ تھا کہ جس طرح میں نے ان سب پر یہ چادر پھیلائی ہے اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا سایہ ان سب پر پھیلائے۔

"عباسؓ کو ان کی اولاد میں قائم و محفوظ رکھ" یعنی اے اللہ! تو عباسؓ کو عزت و شوکت عطا فرما اور ان کو تمام آفات و بلیات سے محفوظ رکھ تاکہ یہ اپنے اولاد کے حقوق و مفاد کا تحفظ کر سکیں۔

"امارت و بادشاہی کو ان کی اولاد میں باقی رکھ" یعنی طویل مدت تک اولاد عباسؓ کو تخت حکمرانی اور سیادت و ثروت سے نوازے رکھ چنانچہ یہ دعا مقبول ہوئی کہ وہ زمانہ آیا جب کئی صدیوں تک خلافت و حکمرانی کا اعزاز عباسیوں میں رہا یا یہ دعائیہ الفاظ دراصل اُمت کے لئے ایک ہدایت تھی کہ خلافت و امارت کا استحقاق اولاد عباسؓ کو بھی حاصل ہے۔ خلیفہ و امیر منتخب کرتے وقت ان کے ترجیح استحقاق کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

ابن عباس ؓ کی فضیلت

(۲۵) وَعَنْهُ اَنَّهٗ رَاٰی جِبْرَئِیْلَ مَرَّتَیْنِ وَدَعَالَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَرَّتَیْنِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے دوبار حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دو مرتبہ دعا فرمائی۔" (ترمذی)

تشریح: "دوبار حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا" اس سلسلہ کی تفصیلی روایت سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں اس طرح نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس ؓ نے بیان کیا: ایک دن میں بہت سفید کپڑے پہنے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا تو دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم دحیہ کلبی ؓ سے سرگوشی کررہے ہیں۔ جب کہ حقیقت میں وہ دحیہ کلبی ؓ نہیں تھے بلکہ ان کی صورت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے، لیکن اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ جبرئیل ہیں میں وہاں سے گزرتا چلا گیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بولے کہ یارسول اللہ یہ ابن عباس ؓ اگر ہمیں سلام کرتا تو میں اس کے سلام کا جواب دیتا۔ ابن عباس ؓ تو بہت سفید کپڑوں میں ہے مگر اس کے بعد اس کی اولاد سیاہ کپڑے پہننے پر مجبور ہوگی۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان پر چلے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے لوٹ کر آئے اور مجھ فرمایا: ہمارے پاس سے گزرتے وقت تم نے ہمیں سلام کیوں نہیں کیا تھا؟ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ اس وقت دحیہ کلبی ؓ سے بات چیت اور سرگوشی میں مصروف تھے۔ میں نے اچھا نہیں سمجھا کہ آپ میرے سلام کا جواب دیں اور اس طرح میں آپ کے سلسلہ گفتگو میں رکاوٹ بنوں تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ وہ دحیہ کلبی ؓ نہیں تھے بلکہ جبرئیل تھے۔ ابن عباس نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اس موقع پر لکھتے ہیں: یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آمد عام طور دحیہ کلبی کی شکل وصورت میں ہوتی تھی اور دوسرے صحابہ ؓ بھی ان کو دیکھا کرتے تھے۔ تو پھر خاص طور پر حضرت ابن عباس ؓ کے بارہ میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ کس وجہ سے بیان کی گئی کہ انہوں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دوبار دیکھا پھر اس کا جواب حضرت شیخؒ نے یہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس ؓ نے بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان دونوں مرتبہ دحیہ کلبی ؓ ہی کی شکل میں دیکھا تھا لیکن ان کا دیکھنا عالم ملکوت میں تھا جبکہ ان کے علاوہ کسی صحابی نے حضرت جبرئیلؒ کو عالم ملکوت میں نہیں دیکھا۔ دوسرے صحابہ ان کو عالم ناسوت میں دیکھا کرتے تھے ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس ؓ سے فرمایا تھا نبی ورسول کے علاوہ جس انسان نے بھی جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا اس کی بینائی جاتی رہی، لہٰذا اے ابن عباس تمہاری بینائی بھی چلی جائے گی۔ لیکن موت کے دن تمہاری بینائی پھر تمہارے پاس آجائے گی۔ چنانچہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ حضرت ابن عباس ؓ نابینا ہوگئے تھے اور منقول ہے کہ جب ان کی وفات ہوئی اور ان کا جسد خاکی کفن میں لپیٹ دیا گیا تو اچانک ایک سفید پرندہ نمودار ہوا اور ان کی میت کے پاس آکر کفن کے اندر گھسا اور غائب ہوگیا۔ لوگوں نے ہر چند تلاش کی اور ادھر ادھر دیکھا لیکن اس سفید پرندہ کا سراغ نہیں لگا۔ بالآخر حضرت ابن عباس ؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت عکرمہ ؓ نے کہا کہ کیا تم لوگ احمق ہوگئے ہو) وہ واقعۃً پرندہ نہیں تھا بلکہ ان کی بینائی تھی جس کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ موت کے دن ان کے پاس واپس آجائے گی روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضرت ابن عباس ؓ کو لحد میں رکھ دیا گیا تو غیب سے ایک آواز آئی جس کو سب نے سنا یاایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف واپس جا، تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔

اور ان کے حق میں دو مرتبہ دعا فرمائی یعنی ایک بار تو وہ دعا فرمائی جس کا ذکر پیچھے الفصل الاول کی ایک حدیث میں گزرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس ؓ کو اپنے سینہ سے لپٹا کر یہ دعا دی اللھم علمه الحکمة (اے اللہ اس کو حکمت عطا فرما) یا یوں فرمایا تھا

اللهم علمه الکتاب (اے اللہ اس کو کتاب اللہ کا علم عطا فرما) دوسری مرتبہ کی دعا وہ ہے جس کے بارہ میں بھی حضرت ابن عباسؓ کی روایت پیچھے گزر چکی ہے کہ آنحضرت استنجاء کے لئے تشریف لے گئے تو میں نے وضو کے لئے پانی بھر کر رکھ دیا جب آپ کو بتایا گیا کہ ابن عباسؓ نے رکھا ہے تو اس وقت آپ ﷺ نے یہ دعا دی اللهم فقه في الدين (خداوندا! ابن عباسؓ کو دین کا فقیہ بنا دے) تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ ایک مرتبہ کی دعا تو مراد ہو جو آپ ﷺ نے پانی رکھنے پر خوش ہو کر دی تھی اور دوسری مرتبہ کی دعا سے وہ دعا مراد ہو جو آنحضرت ﷺ نے حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کے حق میں فرمائی تھی۔

ابن عباس کو عطائے حکمت کی دعا

(۲۶) وَعَنْهُ اَنَّهُ قَالَ دَعَالِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّؤْتِیَنِیَ اللّٰهُ الْحِکْمَةَ مَرَّتَیْنِ۔ (رواہ الترمذی۔)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول کریم ﷺ نے میرے لئے دو مرتبہ یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو حکمت عطا فرمائے۔" (ترمذی)

تشریح: یعنی اس مفہوم کی دعا کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو دین و شریعت کا علم اصول و فروع عطا فرمائے، ایک مرتبہ تو لفظ "حکمت" کے ساتھ کی اور ایک مرتبہ لفظ "فقہ" کے ساتھ اور ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ دونوں دعائیں الگ الگ دو موقعوں پر کیں جیسا کہ پیچھے گزرا۔

حضرت جعفر کی کنیت

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَانَ جَعْفَرٌ یُحِبُّ الْمَسَاکِیْنَ وَیَجْلِسُ اِلَیْهِمْ وَیُحَدِّثُهُمْ وَیُحَدِّثُوْنَهٗ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُکَنِّیْهِ بِاَبِی الْمَسَاکِیْنِ۔ (رواہ الترمذی۔)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالبؓ مساکین سے (بہت محبت رکھتے تھے، وہ ان کے پاس اٹھتے بیٹھتے اور ان سے (دلجوئی و غمخواری کی) باتیں کرتے اور مساکین ان سے (اپنے دکھ درد کی) باتیں کیا کرتے تھے۔ اور رسول کریم ﷺ نے (اسی بناء پر) ان کی کنیت "ابوالمساکین" رکھ چھوڑی تھی۔" (ترمذی)

تشریح: مطلب یہ کہ حضرت جعفرؓ چونکہ بہت زیادہ مساکین نواز تھے اور ان کے ساتھ بہت زیادہ اٹھنا بیٹھنا رکھتے تھے اسی مناسبت سے آنحضرت ﷺ نے ان کی کنیت "ابوالمساکین" رکھ دی تھی جیسا کہ حضرت علیؓ کی کنیت "ابوتراب" اس مناسبت سے رکھ دی تھی کہ وہ بیٹھنے اور لیٹنے کے لئے "فرش خاک" زیادہ پسند کرتے تھے اور مٹی پر بلا تکلف بیٹھ یا لیٹ جایا کرتے تھے یا جیسا کہ مسافر کو "ابن السبیل" اور صوفی کو "ابوالوقت" مخصوص معنوی مناسبت سے کہا جاتا ہے۔

حضرت جعفر کی فضیلت

(۲۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَاَیْتُ جَعْفَرًا یَطِیْرُ فِی الْجَنَّةِ مَعَ الْمَلٰٓئِکَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! میں نے جعفرؓ کو جنت میں فرشتوں کے ساتھ اڑتے ہوئے دیکھا ہے اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حضرت جعفرؓ جنگ موتہ میں اسلامی لشکر کے کماندار تھے اور اسلام کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس جنگ میں انہوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ اصل میں تو اس جنگ کے اسلامی کماندار حضرت زید بن حارثہؓ تھے، لیکن دوران جنگ ان کے شہید ہو جانے کے

بعد اسلامی لشکر کی کمانداری اور اسلام کا جھنڈا حضرت جعفرؓ کے ہاتھ میں آیا چنانچہ حضرت جعفرؓ کمال مردانگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں لڑے پہلے ان کا ایک ہاتھ کام آیا، پھر دوسرا ہاتھ بھی گیا اور پھر ٹانگیں بھی قربان ہو گئیں۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے ادھر تو میدان جنگ میں حضرت جعفرؓ شہید ہوئے، ادھر مدینہ منورہ میں آنحضرت ﷺ کو حالت مکاشفہ میں یا خواب میں دکھایا گیا کہ جعفرؓ کے دو پنکھ ہیں جو خون میں لتھڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے ان پنکھوں کے ذریعہ فرشتوں کے ساتھ جنت میں اڑے اڑے پھر رہے ہیں۔

بہشت کے جوانوں کے سردار

(۲۹) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حسنؓ اور حسینؓ دونوں بہشت کے جوانوں کے سردار ہیں۔" (ترمذی)

تشریح: طیبیؒ کے مطابق الفاظ حدیث کی مراد یہ ہے کہ حسن اور حسین ان تمام اہل اسلام سے افضل ہیں جو اللہ کی راہ میں جوانی کی حالت میں مرے لیکن یہ بات محل کلام ہے کیونکہ ان دونوں کو صرف ان تمام اہل اسلام سے افضل قرار دینے کی کوئی وجہ تخصیص نہیں ہے جو جوان مرے بلکہ حقیقت تو یہ کہ حسنؓ و حسینؓ ان بہت سے اہل اسلام سے بھی افضل ہیں جو بڑی عمروں میں مرے پس بعض حضرات کا یہ قول زیادہ صحیح ہے کہ اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ حسن اور حسین تمام اہل جنت کے سردار ہیں کیونکہ تمام اہل جنت جوان ہوں گے۔ لیکن انبیاء اور خلفاء راشدین مستثنیٰ ہیں یعنی ان سے یہ دونوں افضل نہیں ہوں گے۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ یہاں شباب یعنی "جوان" کا لفظ "جوان العمر" کے مفہوم میں نہیں ہے بلکہ فتوت یعنی جوانمرد سخی اور کریم کے معنی میں ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ دونوں تمام جوانمردوں کے سردار ہیں علاوہ انبیاء اور خلفاء راشدین کے یا یہ کہ جنت کے "جوانوں" سے مراد تمام اہل جنت ہیں اور ان کو "شباب" کے لفظ سے تعبیر کرنا۔ اظہار محبت و شفقت کے تحت ہے، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ باپ جب اپنے بیٹے کا ذکر کرتا ہے تو اس کو لڑکا، بچہ، وغیرہ کے الفاظ ہی سے تعبیر کرتا ہے خواہ وہ کتنا ہی مسن اور عمر رسیدہ ہو۔

حسن و حسین میری دنیا کے دو پھول ہیں

(۳۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ ھُمَا رَیْحَانَایَ مِنَ الدُّنْیَا۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَدْ سَبَقَ فِی الْفَصْلِ الْاَوَّلِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ حسن اور حسین میری دنیا کے دو پھول ہیں" (ترمذی) یہ حدیث فصل اول میں گزر چکی ہے۔"

تشریح: سید جمال الدینؒ نے "یہ حدیث فصل اول میں گزر چکی ہے" کے بارے میں لکھا ہے کہ صاحب مشکوٰۃ کے ان الفاظ میں صاحب مصابیح پر اعتراضات کی طرف اشارہ ہے لیکن ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ اعتراض (کہ مصابیح نے ایک روایت کو مکرر نقل کر دیا ہے) اس طرح کالعدم قرار پا جاتا ہے فصل اول کی روایت بخاری کی ہے جو اپنی جگہ پر نقل ہوئی ہے اور یہ روایت ترمذی کی ہے جس کو اس کی جگہ پر نقل کیا گیا ہے جب کہ ان دونوں روایتوں کے الفاظ میں فی الجملہ تغایر بھی ہے۔

حسینؓ سے محبت و تعلق

(۳۱) وَعَنْ اُسَامَۃَ بْنِ زَیْدٍ قَالَ طَرَقْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَیْلَۃٍ فِیْ بَعْضِ الْحَاجَۃِ فَخَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُشْتَمِلٌ عَلٰى شَيْءٍ لَا اَدْرِيْ مَا هُوَ فَلَمَّا فَرَغْتُ مِنْ حَاجَتِيْ قُلْتُ مَا هٰذَا الَّذِيْ اَنْتَ مُشْتَمِلٌ عَلَيْهِ فَكَشَفَهُ فَاِذَا الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ عَلٰى وَرِكَيْهِ فَقَالَ هٰذَانِ ابْنَايَ وَابْنَا بِنْتِيْ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهُمَا فَاَحِبَّهُمَا وَاَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهُمَا۔ (رواه الترمذی)

"حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دن رات میں اپنی کسی ضرورت سے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ (اپنے گھر کے اندر سے) اس حال میں باہر تشریف لائے کہ کسی چیز کو اپنے ساتھ لپیٹے ہوئے تھے اور میں نہیں جانتا تھا کہ وہ چیز کیا چیز تھی پھر جب میں اپنی ضرورت کو عرض کر چکا تو پوچھا کہ یہ کیا چیز آپ ﷺ نے لپیٹ رکھی ہے آپ ﷺ نے اس چیز کو کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ حسنؓ و حسینؓ ہیں جو آپ ﷺ کی دونوں کوکھوں پر تھے (یعنی آپ ﷺ نے ان دونوں کی طرف گود میں لے کر چادر سے لپیٹ رکھا تھا) اور پھر آپ ﷺ نے فرمایا، دونوں (حکماً) میرے بیٹے ہیں اور (حقیقۃً) میری بیٹی کے بیٹے ہیں خداوند: میں ان دونوں کو محبوب رکھتا ہوں، تو بھی ان کو محبوب رکھ اور ہر اس شخص کو محبوب رکھ جو ان دونوں کو محبوب رکھے۔" (ترمذی)

تشریح: یہ دونوں (حکماً) میرے بیٹے ہیں" اس سے معلوم ہوا کہ بیٹی کا بیٹا اپنے ہی بیٹے کے حکم میں ہوتا ہے جیسا کہ بیٹے کا بیٹا یعنی پوتا اپنے بیٹے کے حکم میں ہوتا ہے۔ نیز اس حدیث کو اس بات کی بھی دلیل بنایا جاسکتا ہے کہ نسب کا شرف ماں کی طرف سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت اسامہ کے سامنے آنحضرت ﷺ کا مذکورہ دعا فرمانا شاید ان کو اور دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ اور راغب کرنے کے لئے تھا کہ حسنینؓ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ محبت اور قلبی تعلق رکھیں۔

شہادت حسینؓ اور ام سلمہؓ کا خواب

(۳۲) وَعَنْ سَلْمٰى قَالَتْ دَخَلْتُ عَلٰى اُمِّ سَلَمَةَ وَهِيَ تَبْكِيْ فَقُلْتُ مَا يُبْكِيْكِ قَالَتْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعْنِيْ فِي الْمَنَامِ وَعَلٰى رَاْسِهٖ وَلِحْيَتِهِ التُّرَابُ فَقُلْتُ مَالَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ شَهِدْتُّ قَتْلَ الْحُسَيْنِ اٰنِفًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت سلمٰی (جو حضرت ابو رافعؓ کی زوجہ ہیں) بیان کرتی ہیں کہ (ایک دن) میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئی کیا دیکھتی ہوں کہ وہ رو رہی ہیں میں نے پوچھا کیوں رو رہی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا! میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا یعنی خواب میں اس حالت میں دیکھا کہ آپ ﷺ کا سر اور ڈاڑھی گرد آلو ہے پھر جب میں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ، آپ (ﷺ) گرد آلود کیوں ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں ابھی حسین کے قتل گاہ میں موجود تھا اور وہاں دیکھ رہا تھا کہ میرے جگر کے ٹکڑے کو ظالموں نے کس بے دردی کے ساتھ شہید کیا) اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: ام المؤمنین حضرت ام سلمہ کی وفات ۵۹ ھ میں ہوئی ہے اور بعض حضرات نے ان کا سن وفات ۶۳ ھ لکھا ہے لیکن زیادہ صحیح قول پہلا ہی ہے۔ ادھر حضرت امام حسین کی شہادت عظمٰی کا سانحہ ۶۱ ھ میں پیش آیا ہے حضرت ام سلمہؓ کے سن وفات کے بارہ میں اگر دوسرے قول کو صحیح مانا جائے تو اس حدیث کے تحت کوئی اشکال لازم نہیں آتا ہاں پہلے قول کو صحیح ماننے کی صورت میں تھوڑا اشکال لازم آتا ہے مگر اس تاویل سے یہ اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آنے سے پہلے ہی حضرت ام سلمہؓ کے خواب میں اس کا وقوع دکھا دیا گیا تھا اس سورت میں لفظ انفًا (ابھی) کے استعمال کی توجیہ یہ کی جائے گی کہ اس لفظ کا استعمال اس صورت حال کے تحقیق کے اعتبار سے ہے جو بصورت شہادت حسینؓ آنحضرت ﷺ کے خواب میں اس وقت دکھائی گئی تھی۔

آنحضرت ﷺ کو اپنے اہل بیت میں سب سے زیادہ محبت حسن و حسینؓ سے تھی

(۳۳) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ اَهْلِ بَيْتِكَ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ

وَكَانَ يَقُوْلُ لِفَاطِمَةَ اُدْعِيْ لِيَ ابْنَيَّ فَيَشُمُّهُمَا وَيَضُمُّهُمَا اِلَيْهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ کے اہل بیت میں سے کون شخص آپ کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: حسنؓ اور حسینؓ اور (انسؓ نے یہ بھی بیان کیا کہ) آنحضرت ﷺ (کسی وقت حسن و حسینؓ کو گھر میں نہ دیکھتے تو) حضرت فاطمہؓ سے فرماتے کہ میرے دونوں بیٹوں کو بلاؤ۔ پھر (جب حسن و حسین آجاتے تو) آپ ان دونوں کے جسموں کو سونگھتے (کیونکہ وہ آپ ﷺ کے پھول تھے) اور ان کو اپنے گلے سے لگاتے ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

حسنین سے کمال محبّت کا اظہار

(۳۴) وَعَنْ بُرَيْدَةَؓ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُنَا اِذَا جَآءَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ وَعَلَيْهِمَا قَمِيْصَانِ اَحْمَرَانِ يَمْشِيَانِ وَيَعْثُرَانِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمِنْبَرِ فَحَمَلَهُمَا وَوَضَعَهُمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ثُمَّ قَالَ صَدَقَ اللّٰهُ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ نَظَرْتُ اِلٰى هٰذَيْنِ الصَّبِيَّيْنِ يَمْشِيَانِ وَيَعْثُرَانِ فَلَمْ اَصْبِرْ حَتّٰى قَطَعْتُ حَدِيْثِيْ وَرَفَعْتُهُمَا۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت بریدہؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اچانک حسنؓ اور حسینؓ آگئے۔ وہ دونوں سرخ کرتے پہنے ہوئے تھے اور (کم سنی ناطاقتی کے سبب) اس طرح چل کر آرہے تھے کہ گر گر پڑتے تھے چنانچہ رسول کریم ﷺ (ان کو دیکھ کر منبر سے اتر آئے اور ان دونوں کو اپنی گود میں اٹھالیا اور پھر ان کو اپنے پاس بٹھا کر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے کہ انما اموالکم واولادکم فتنة میں نے ان دونوں بچوں کو دیکھا (کہ ان سے چلا نہیں جارہا ہے اور) گرتے پڑتے چلے آرہے ہیں تو (ان کی محبّت میں) مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں نے اپنی بات دینی وعظ نصیحت اور بیان احکام و مسائل کا سلسلہ منقطع کیا اور منبر سے اتر کر) ان کو گود میں اٹھالیا۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا خطبہ کے درمیان منبر سے اتر کر حسنین کو اٹھانا دراصل ایک ایسا عمل تھا جس کا تحرک شفقت و ترحم اور رقت و محبت کا وہ جذبہ تھا جو ان شاہزادوں کو اس حال میں دیکھ کر قلب نبوت میں امنڈ آیا تھا چونکہ اولاد اور بچوں پر شفقت و مہربانی کرنا ایک مستحسن و مستحب اور پسندیدہ حق چیز ہے اور خطبہ کے دوران خطیب کا کچھ لمحات کے لئے کسی نیک عمل کی طرف متوجہ ہو جانا جائز ہے اس لئے اس خطبہ کے دوران آنحضرت ﷺ کے اس عمل کو تداخل فی العبادات کی ایک قسم کہا جائے گا۔ آپ ﷺ نے اپنے اس عمل کا جو عذر بیان فرمایا، وہ ایک تو کسر نفسی کے تحت تھا۔ دوسرے سامعین و حاضرین کو متنبّہ کرنا بھی مقصود تھا کہ میرے اس ل کو مستقل دلیل بنا کر خود کو اس کا عادی نہ بنالیں اور یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ جب میں نے ایسا کیا ہے تو ہر شخص جب چاہے ایسا کر سکتا ہے۔

(۳۵) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ مُرَّةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُسَيْنٌ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْ حُسَيْنٍ اَحَبَّ اللّٰهُ مَنْ اَحَبَّ حُسَيْنًا حُسَيْنٌ سِبْطٌ مِنَ الْاَسْبَاطِ۔ (رواہ الترمذی۔)

"اور حضرت یعلی ابن مرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حسینؓ مجھ سے ہے اور میں حسینؓ سے ہوں اور جس شخص نے حسینؓ سے محبت رکھی، اس نے اللہ تعالیٰ سے محبت رکھی۔ حسین اسباط میں سے ایک سبط ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: ایک شارح نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ جس وقت یہ الفاظ ارشاد فرمار ہے تھے اس وقت آپ ﷺ نے گویا نور نبوت سے اس المیہ کے پہلے ہی ادراک کر لیا تھا جو تقریباً نصف صدی بعد یزیدیوں کی طرف سے حضرت حسینؓ کی شہادت کی صورت میں پیش آنے والا تھا۔ لہٰذا آپ نے اس ارشاد گرامی میں خاص طور پر صرف حضرت حسینؓ کا ذکر کیا اور واضح کیا کہ میں اور میرا حسینؓ ایک جان دو قالب

ہیں، ہم دونوں کے درمیان ایسا جسمانی و روحانی قرب و اتصال ہے کہ جس طرح مجھ سے محبّت رکھنا واجب ہے۔ اسی طرح حسینؓ سے محبّت رکھنا واجب ہے اور جس طرح مجھ سے مخالفت و مخاصمت رکھنا اور مجھ سے لڑنا حرام ہے۔ اسی طرح حسینؓ سے مخالفت و مخاصمت رکھنا اور حسینؓ سے لڑنا حرام ہے۔

"اس نے اللہ تعالیٰ سے محبّت رکھی" کیونکہ حسینؓ سے محبّت رکھنا رسولؐ سے محبّت رکھنا ہے اور رسول سے محبّت رکھنا اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا ہے واضح ہو کہ احب اللّٰہ میں اگرہ کو زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا ترجمہ وہی ہو گا جو اوپر مذکور ہوا اور اگرہ کو پیش کے ساتھ پڑھا جائے تو ترجمہ یہ ہو گا کہ (جس شخص نے حسینؓ سے محبت رکھی) اس سے اللہ تعالیٰ محبت رکھے گا۔

حسینؓ اسباط میں سے ایک سبط ہے" یعنی حسین امیر بیٹا ہے۔ سبط (س کے زیر کے ساتھ) کا ماخذ اصل میں سبط ہے اور سبط اس درخت کو کہتے ہیں جس کی جڑ تو ایک ہو مگر اس کی شاخیں بہت ہوں۔ پس باپ گویا درخت کی مانند ہو اور اولاد اس کی شاخوں کی مانند۔ بعض حضرات نے سبط من الاسباط کے معنی یہ لکھے ہیں کہ: حسین امتوں میں سے ایک اُمّت ہے یعنی خیر و بھلائی اور شرف و سعادت کے اعتبار سے ایک پوری اُمّت کے برابر ہے ایک شارح لکھتے ہیں سبط کا لفظ ولد کے معنی میں ہے اس صورت مذکورہ جملہ کا ترجمہ یہ ہو گا کہ: حسین میری اولاد ہے سبط کے ایک معنی قبیلہ کے بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ایک آیت ہے وقطعناهم اثنتي عشرة اسباطا (یعنی! اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں یا قبیلوں میں تقسیم کردیا) اس معنی کی مناسبت سے کہا جاسکتا ہے کہ اس جملہ سے شاید یہ مراد ہو کہ حسین ایک بڑے قبیلہ اور بڑی نسل کے مورث بنیں گے، اللہ تعالیٰ ان کی اولاد میں بہت برکت دے گا اور ان کی اولاد سلسلہ رسلسلہ نہ صرف یہ کہ بہت پھیلے گی بلکہ قائم و باقی رہے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت حسینؓ کی نسل بہت پھیلی، بہت بڑھی، ان کی اولاد میں بے شمار صحیح النسب سادات موجود ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ سبط س کے زیر اور بے کے جزم کے ساتھ) کے معنی ہیں: اولاد (یعنی بیٹے یا بیٹی) کی اولاد۔ اسباط اسی کی جمع ہے۔ جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ساری اولاد کو "اسباط" کہا جاتا ہے۔ دراصل یہودیوں کے لئے "اسباط" کا لفظ معنی مستعمل ہوتا ہے جس معنی میں عرب کے لئے قبیلہ کا لفظ۔ اور سبط اس اور بے کے زبر کے ساتھ) کے معنی اس درخت کے ہیں جس کی ڈالیاں اور شاخیں بہت ہوں اور جڑ ایک ہو۔ پس حضرت حسنؓ کو سبط سے تعبیر کرنا اس طرف اشارہ ہے ان کی نسل سے بے شمار لوگ پیدا ہوں گے۔

حسنین کی حضور ﷺ سے مشابہت

۳۶ وَعَنْ عَلِيٍّؓ قَالَ الْحَسَنُ اَشْبَهُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَيْنَ الصَّدْرِ اِلَى الرَّاْسِ وَالْحُسَيْنُ اَشْبَهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا كَانَ اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: "حسنؓ تو رسول کریم ﷺ کے سر سے لے کر سینہ تک کے حصہ میں بہت مشابہ ہیں اور حسینؓ نبی کریم ﷺ کے سینہ کے بعد سے جسم کے باقی حصہ (یعنی پنڈلی اور پاؤں وغیرہ) میں بہت مشابہ ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: گویا دونوں شاہزادے مل کر آنحضرت ﷺ کی پوری شبیہ تھے اور آنحضرت ﷺ کا جسم مبارک ان دونوں کے درمیان منقسم ......تھا۔

فاطمہؓ اور حسنینؓ کی فضیلت

۳۷ وَعَنْ حُذَيْفَةَؓ قَالَ قُلْتُ لِاُمِّيْ دَعِيْنِيْ اٰتِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاُصَلِّيْ مَعَهُ الْمَغْرِبَ وَاَسْاَلُهُ اَنْ يَّسْتَغْفِرَ لِيْ وَلَكِ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ الْمَغْرِبَ فَصَلّٰى حَتّٰى صَلَّى الْعِشَآءَ ثُمَّ انْفَتَلَ

فَتَبِعْتُهٗ فَسَمِعَ صَوْتِیْ فَقَالَ مَنْ هٰذَا حُذَیْفَةُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ مَا حَاجَتُكَ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ وَلِاُمِّكَ اِنَّ هٰذَا مَلَكٌ لَمْ يَنْزِلِ الْاَرْضَ قَطُّ قَبْلَ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ اسْتَاْذَنَ رَبَّهٗ اَنْ يُّسَلِّمَ عَلَيَّ وَيُبَشِّرَنِيْ بِاَنَّ فَاطِمَةَ سَيِّدَةُ نِسَآءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک روز) میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آج مغرب کی نماز جا کر رسول کریم ﷺ کے ساتھ پڑھوں اور پھر آنحضرت ﷺ سے درخواست کروں کہ وہ میرے اور آپ کے لئے بخشش و مغفرت کی دعا فرمائیں چنانچہ (میری والدہ نے مجھے اجازت دے دی اور) میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی آپ ﷺ (مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد) نوافل پڑھتے رہے یہاں تک کہ پھر عشاء کی نماز پڑھی اور جب آپ ﷺ نے میری آواز (یعنی میرے قدموں یا جوتوں کی آواز) سن لی (یا یہ کہ میں نے کسی سے کوئی بات کی جس کی آواز آپ نے بھی سن لی، چنانچہ آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے (جو اس وقت اپنے گھر جانے کے بجائے میرے پیچھے پیچھے آرہے ہو) اللہ تمہیں اور تمہاری ماں کو عفو و بخشش سے نوازے، (دیکھو) یہ ایک فرشتہ ہے جو اس رات سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اترا، اس (فرشتہ) نے اپنے پروردگار سے اس بات کی اجازت لی ہے کہ (زمین پر) آکر مجھ کو سلام کرے اور مجھ کو یہ خوش خبری سنائے کہ فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہے اور حسن و حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مجھے اجازت دیجئے شاید حذیفہؓ کا مکان مسجد نبوی سے خاصے فاصلہ پر رہا ہوگا اور ان کی والدہ یا تو خود اپنی تنہائی کی وجہ سے یا حذیفہؓ کے تئیں احتیاط کے پیش نظر ان کو اس وقت اتنی دور جانے سے منع کر رہی ہوں گی۔

"یہاں تک کہ پھر عشاء کی نماز پڑھی" اس سے مغرب و عشاء کے درمیان نوافل میں مشغول رہنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے جس کو مشائخ کے ہاں "احیاء مابین العشائین" کہا جاتا ہے۔

"پہلے کبھی زمین پر نہیں اترا" اس میں اس مقصد کی اہمیت و عظمت کی طرف اشارہ ہے جس کے لئے وہ فرشتہ زمین پر اترا تھا۔

اچھی سواری، اچھا سوار

(۳۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَامِلًا الْحَسَنَ ابْنَ عَلِيٍّ عَلٰى عَاتِقِهٖ فَقَالَ رَجُلٌ نِعْمَ الْمَرْكَبُ رَكِبْتَ يَا غُلَامُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنِعْمَ الرَّاكِبُ هُوَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک روز) رسول کریم ﷺ حسن ابن علیؓ کو اپنے کندھے پر بٹھائے ہوئے تھے کہ ایک شخص بولا اے (خوش نصیب) منے! کیسی اچھی سواری پر تم سوار ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا "اور وہ سوار بھی تو کتنا اچھا ہے۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ سواری تو اچھی ہے ہی لیکن خود سوار بھی بہت اچھا ہے پس ان الفاظ سے حضرت حسنؓ کی کمال توصیف و منقبت اور نہایت فضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔

حضرت اسامہؓ کی فضیلت

(۳۹) وَعَنْ عُمَرَؓ اَنَّهٗ فَرَضَ لِاُسَامَةَ فِيْ ثَلٰثَةِ الْاٰفٍ وَخَمْسِ مِائَةٍ وَفَرَضَ لِعَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ فِيْ ثَلٰثَةِ الْاٰفٍ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لِاَبِيْهِ لِمَا فَضَّلْتَ اُسَامَةَ عَلَيَّ فَوَاللّٰهِ مَا سَبَقَنِيْ اِلٰى مَشْهَدٍ قَالَ لِاَنَّ زَيْدًا كَانَ اَحَبَّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَبِيْكَ وَكَانَ اُسَامَةُ اَحَبَّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْكَ فَاٰثَرْتُ حُبَّ رَسُوْلِ

اللّٰهِ ﷺ عَلٰی حِبِّیْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (اپنے زمانہ خلافت میں) اسامہؓ بن زیدؓ کی سالانہ تنخواہ تین ہزار پانچ سو درہم مقرر کی اور اپنے فرزند عبداللہ کی تین ہزار درہم۔ اس پر عبداللہ نے اپنے باپ سے عرض کیا کہ آپ نے اسامہ کو مجھ پر کیوں ترجیح دی (کہ میری تنخواہ ان سے پانچ سو درہم کم رکھی) حالانکہ بخدا اسامہؓ نے کسی مشہد میں مجھ پر سبقت و بازی حاصل نہیں کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ اسامہؓ کا باپ (زیدؓ) رسول کریم ﷺ کو تمہارے باپ (یعنی مجھ سے) زیادہ عزیز و محبوب تھے لہٰذا میں نے رسول کریم ﷺ کے محبوب (اسامہ) کو اپنے محبوب (یعنی تم) پر ترجیح دی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "مشہد" کے معنی ہیں: حاضر ہونے کی جگہ جہاں کسی اچھے کام یا اچھی بات میں حصّہ لیا جائے لیکن یہاں یہ لفظ شہید ہونے کی جگہ یعنی میدان جنگ اور معرکہ جنگ کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا شکوہ اس احساس کی بناء پر تھا کہ جب اسامہؓ کی تنخواہ میری تنخواہ سے زیادہ مقرر کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسامہؓ کو مجھ پر فضیلت و برتری حاصل ہے، حالانکہ علمی، دینی اور خدماتی لحاظ سے اسامہؓ کا مرتبہ میرے مرتبہ سے یقیناً کم ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے ان کو سمجھایا کہ اسامہ کی تنخواہ اس لئے زیادہ نہیں ہے کہ وہ باعتبار علم و عمل اور خدمات کے تم سے افضل ہیں بلکہ اس محبّت خاص کی رعایت سے ہے جو ان سے رسول کریم ﷺ کو تھی اور کسی کا دوسروں کے مقابلہ پر زیادہ محبوب ہونا اس بات کو مستلزم نہیں ہوتا کہ وہ ان دوسروں سے افضل بھی ہو، رہی یہ بات کہ حضرت اسامہؓ اور ان کے والد حضرت زیدؓ آنحضرت ﷺ کو زیادہ عزیز و محبوب کیوں تھے تو اس کی ایک ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ وہ دونوں اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ کے اہل بیت میں سے تھے کہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اور کسی شخص کا آزاد کردہ غلام اس کے افراد خانہ میں شمار ہوتا ہے۔

حضرت زیدؓ کا آنحضرت کو چھوڑ کر اپنے گھر جانے سے انکار

(۴۰) وَعَنْ جَبَلَةَ بْنِ حَارِثَةَؓ قَالَ قَدِمْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ابْعَثْ مَعِیَ اَخِیْ زَيْدًا قَالَ هُوَذَا فَاِنِ انْطَلَقَ مَعَكَ لَمْ اَمْنَعْهُ قَالَ زَيْدٌ يَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاللّٰهِ لَا اَخْتَارُ عَلَيْكَ اَحَدًا قَالَ فَرَاَيْتُ رَاْیَ اَخِیْ اَفْضَلَ مِنْ رَاْيِیْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جبلہ بن حارثہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے بھائی زیدؓ کو میرے ساتھ بھیج دیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ زید موجود ہے (اور اپنی مرضی کا مختار ہے) اگر یہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو میں اس کو منع نہیں کرتا، زیدؓ نے یہ سن کر) کہا: یارسول اللہ! خدا کی قسم میں آپ ﷺ (کی صحبت و خدمت میں رہنے کی سعادت) پر کسی کو بھی ترجیح نہیں دیتا (خواہ وہ بھائی یا والدین ہی کیوں نہ ہوں) جبلہؓ کہتے ہیں کہ میں نے (زیدؓ کا یہ مضبوط فیصلہ سنا تو) مان لیا کہ میرے بھائی کی عقل میری عقل سے بڑھی ہوئی ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "میں اس کو منع نہیں کرتا" یعنی: جب میں اس کو آزاد کر چکا ہوں تو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق اس کو مل گیا ہے اب نہ تو میں اس کو جانے سے روک سکتا ہوں اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ چلے جاؤ، وہ جانا چاہے تو چلا جائے اور نہ جانا چاہے تو شوق سے میرے پاس رہے۔

میری عقل سے بڑھی ہوئی ہے جبلہؓ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ پہلے تو میری رائے یہ تھی کہ زید کو میرے اپنے گھر واپس چلنا چاہئے مگر زیدؓ کا فیصلہ سننے کے بعد ان کی رائے کی اصابت اور برتری کا میں قائل ہو گیا۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کی صحبت و خدمت میں رہنے والا کوئی بھی صاحب ایمان اس دنیاوی و آخروی سعادت و عظمت اور خیر و بھلائی کو چھوڑنے پر آمادہ ہو ہی نہیں سکتا آنحضرت ﷺ کی خدمت

میں حضرت زیدؓ کے بھائی کی آمد اور ان کو اپنے ساتھ وطن لے جانے کی درخواست پیش کرنے کا یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت زید غلام نہیں رہ گئے تھے بلکہ آنحضرت ﷺ ان کو خلعت آزادی سے سرفراز فرما چکے تھے اور وہ اپنی مرضی کے پوری طرح مختار تھے، لیکن ظاہر ہے کہ خدمت بابرکت اور صحبت پر سعادت کی لذت ان کو کہاں جانے دیتی تھی۔

حضرت زید بن حارثہؓ کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے وہ یمن کے باشندہ تھے بچپن میں جب کہ ان کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ کچھ قریش مکہ ان کو پکڑ کر لائے تھے اور بطور غلام بازار میں فروخت کر ڈالا تھا، حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام نے اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لئے ان کو خرید لیا تھا۔ جب حضرت خدیجہؓ آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئیں تو انہوں نے زید کو بطور ہدیہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ اور اپنی آزاد کردہ لونڈی ام ایمن سے ان کا نکاح کر دیا، ام ایمن کے بطن سے حضرت اسامہؓ پیدا ہوئے، بعد ازاں آنحضرت ﷺ نے زیدؓ کا دوسرا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش سے کیا جن کو کچھ دنوں بعد حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی بعض حضرات کے قول کے مطابق بیس سال چھوٹے تھے۔ بدر اور دوسرے غزووں میں شریک ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں ان کا بھائی چارہ حضرت جعفرؓ بن ابی طالبؓ کے ساتھ قائم کیا تھا۔ غزوۂ موتہ ۸ھ میں بعمر ۵۵ سال شہید ہوئے۔

اسامہؓ کے تئیں شفقت و محبت کا اظہار

(۴۱) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ لَمَّا ثَقُلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَبَطْتُّ وَهَبَطَ النَّاسُ الْمَدِيْنَةَ فَدَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ اُصْمِتَ فَلَمْ يَتَكَلَّمْ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضَعُ يَدَيْهِ عَلَيَّ وَيَرْفَعُهُمَا فَاَعْرِفُ اَنَّهٗ يَدْعُوْلِيْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ ان دنوں جب کہ رسول کریم ﷺ (مرض وفات میں) بہت زیادہ کمزور اور نحیف ہو چکے تھے، میں اور دوسرے لوگ مدینہ میں اترے، میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ پر خاموشی طاری تھی (یعنی شدت مرض و ضعف کے سبب طاقت گویائی بھی باقی نہیں رہ گئی تھی) چنانچہ (مجھ کو دیکھ کر) آپ ﷺ زبان سے کچھ نہیں بولے تاہم رسول کریم ﷺ نے یہ ضرور کیا کہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھ پر رکھتے اور پھر اٹھاتے (نور ولایت اور ظہور فراست کے سبب) میں سمجھ گیا کہ آنحضرت ﷺ میرے حق میں دعا فرما رہے ہیں، اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے حضرت اسامہؓ کی ماتحتی میں مہاجرین و انصار کا ایک لشکر تیار کیا تھا جو محاذ جنگ کو روانہ ہونے کے لئے مدینہ سے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے لیکن آنحضرت ﷺ کی مرض وفات کی خبر سن کر یہ لشکر مدینہ میں واپس آگیا تھا، اسی موقعہ کا ذکر حضرت اسامہؓ نے کیا ہے۔

مدینہ میں آنے کو حضرت اسامہؓ نے جو "ہبوط" سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی "اوپر سے نیچے اترنے" کے ہیں، تو وہ اس مناسبت سے ہے کہ لشکر نے جس جگہ پڑاؤ ڈال رکھا تھا وہ نواح مدینہ کے بالائی حصہ میں واقع تھی جس کو جوف کہا جاتا تھا جیسا کہ میدان عرفات مکہ کے بالائی نواح میں واقع ہے اہل عرب کا یہ اسلوب ہے کہ وہ ایسے مواقع پر گفتگو و کلام میں بلندی و نشیب کی لفظی رعایت رکھتے، چنانچہ اگر ان کو یہ کہنا ہو کہ "ہم عرفات گئے" (تو یوں کہیں گے ھبطنا الی مکة یعنی ہم مکہ سے عرفات کو چڑھے اسی طرح مدینہ سے جوف کو جانا "صعود" (چڑھنے) سے تعبیر کیا جاتا تھا اور جوف سے مدینہ میں آنے کو "ہبوط" سے تعبیر کرتے تھے اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد حرام کے اندر سے باب السلام کی طرف جاتا ہے جو عرفات کی سمت میں ہے تو یوں کہتا ہے۔ صعدنا الی باب السلام۔

ملا علی قاریؒ نے ھبطت و ھبط النَّاسَ المدینة کا ترجمہ یہ بیان کیا ہے کہ میں اپنے مکان سے (جو نواح شہر کے بالائی حصہ میں تھا)

مدینہ میں اترا اور دوسرے لوگ بھی اپنے مکانوں سے مدینہ میں اترے۔

"میرے حق میں دعا فرما رہے ہیں" یعنی آنحضرت ﷺ کے دل میں اسامہ ؓ کی جو محبت اور ان کی خدمت اطاعت کی جو قدر تھی اس کی بناء پر آپ ﷺ نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔ اس سے حضرت اسامہ ؓ کے تیئں آنحضرت ﷺ کے کمال کرم و عنایت اور شفقت و مہربانی کا اظہار ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے سخت و نازک وقت میں بھی ان کو اپنی دعاؤں سے نوازا۔

(۴۲) وَعَنْ عَائِشَةَ ؓ قَالَتْ اَرَادَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُنَحِّيَ مُخَاطَ اُسَامَةَ قَالَتْ عَائِشَةُ دَعْنِيْ حَتّٰى اَنَا الَّذِيْ اَفْعَلُ قَالَ يَا عَائِشَةُ اَحِبِّيْهِ فَاِنِّيْ اُحِبُّهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور ام المؤمنین حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے اسامہ ؓ (کے بچپن میں ان) کی رینٹ کو صاف کرنا چاہا (جیسا کہ بچوں کی ناک صاف کر دیا کرتے ہیں) تو میں نے (اس بات کو خلاف ادب جان کر کہ میری موجودگی میں اسامہ کی رینٹ کو آنحضرت ﷺ صاف کریں) عرض کیا کہ آپ رہنے دیجئے یہ کام میں کردوں گی آپ ﷺ نے فرمایا "عائشہ ؓ! تم اسامہ ؓ سے محبت رکھو کیونکہ میں اس کو عزیز و محبوب رکھتا ہوں۔" (ترمذی)

تشریح : آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ ؓ کو گویا اس طرف متوجہ فرمایا کہ اگر اسامہ ؓ سے تم کو طبعاً محبّت و انسیت نہ بھی ہو تو بھی اس بناء پر کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے اسامہ کو عزیز و محبوب رکھو کیونکہ میں اس کو عزیز و محبوب رکھتا ہوں حقیقت میں کمال محبت یہی ہے کہ محبوب سے گزر کر اس کے متعلقین اور اس سے وابستہ چیزوں تک سرایت کر جائے خواہ وہ آدمی ہوں یا دیار و وطن وغیرہ۔

(۴۳) وَعَنْ اُسَامَةَ ؓ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا اِذْ جَآءَ عَلِيٌّ وَالْعَبَّاسُ يَسْتَاْذِنَانِ فَقَالَا لِاُسَامَةَ اسْتَاْذِنْ لَنَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِيٌّ وَالْعَبَّاسُ يَسْتَاْذِنَانِ فَقَالَ اَتَدْرِيْ مَا جَآءَ بِهِمَا قُلْتُ لَا قَالَ لٰكِنِّيْ اَدْرِيْ اِئْذَنْ لَهُمَا فَدَخَلَا فَقَالَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ جِئْنَاكَ نَسْاَلُكَ اَيُّ اَهْلِكَ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) قَالَا مَا جِئْنٰكَ نَسْاَلُكَ عَنْ اَهْلِكَ قَالَ اَحَبُّ اَهْلِيْ اِلَيَّ مَنْ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتُ عَلَيْهِ اُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ قَالَا ثُمَّ مَنْ قَالَ ثُمَّ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَالَ الْعَبَّاسُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ جَعَلْتَ عَمَّكَ اٰخِرَهُمْ قَالَ اِنَّ عَلِيًّا سَبَقَكَ بِالْهِجْرَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَذُكِرَ اَنَّ عَمَّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِيْهِ فِيْ كِتَابِ الزَّكٰوةِ۔

"اور حضرت اسامہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) میں (آنحضرت ﷺ کے دروازہ پر) بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت علی ؓ اور حضرت عباس ؓ آئے جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری کی اجازت کے طلب گار تھے چنانچہ ان دونوں نے اسامہ ؓ سے (جو ان دنوں چھوٹی عمر کے تھے) کہا کہ تم رسول کریم ﷺ سے ہمارے لئے حاضری کی اجازت طلب کرو میں نے (گھر کے اندر جا کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! حضرت علی ؓ اور حضرت عباس ؓ حاضری کی اجازت کے طلب گار ہیں آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) مجھ سے پوچھا کہ تم جانتے ہو یہ دونوں کس مقصد سے آئے ہیں؟ میں نے عرض کیا: مجھ کو معلوم نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: لیکن میں جانتا ہوں، جاؤ ان دونوں کو اندر بلا لاؤ چنانچہ دونوں حضرات اندر آئے اور بولے کہ یا رسول اللہ! ہم آپ کی خدمت میں یہ سوال لے کر آئے ہیں کہ آپ (ﷺ) کے اہل بیت میں سے کون شخص آپ (ﷺ) کے نزدیک زیادہ محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میری بیٹی فاطمہ بنت محمد (ﷺ) مجھ کو زیادہ محبوب ہے ان دونوں حضرات نے عرض کیا کہ ہمارے سوال کا تعلق آپ کے گھر والوں یعنی آپ کی اولاد و ازواج سے نہیں ہے (بلکہ آپ کے دوسرے اقارب و متعلقین سے ہے) آپ نے فرمایا: میرے گھر والوں میں سے وہ شخص میرے نزدیک زیادہ عزیز و محبوب ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام و فضل کیا اور میں نے بھی اس کو انعام و احسان سے نوازا اور وہ اسامہ بن زید ہے حضرت علی اور حضرت عباس نے پوچھا: پھر اسامہ کے بعد کون شخص (آپ ﷺ کو زیادہ محبوب و عزیز ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: پھر علی بن ابی طالب (یہ سنکر) حضرت عباس ؓ بولے یا رسول اللہ! آپ نے اپنے چچا (یعنی مجھ کو) اپنے گھر والوں میں آخر میں رکھا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا علی ؓ نے ہجرت میں تم پر سبقت کی ہے (ترمذی)

اور روایت ان عم الرجل صنو ابیه (جو حضرت عباسؓ کی منقبت میں ہے) پیچھے کتاب الزکوٰۃ میں نقل کی جاچکی ہے۔"

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام و فضل کیا ہے اور میں نے بھی" اللہ تعالیٰ کے انعام و فضل سے تو مراد قبول اسلام کی توفیق ملنا ہدایت و راستی کی دولت سے سرفراز ہونا اور عزت و اکرام کا ملنا ہے۔" آنحضرت کے انعام و احسان ہیں" سے مراد خلعت آزادی سے سرفراز ہونا، متبنی رسول کا شرف حاصل ہونا، اور پروردہ تربیت یافتہ رسول کا اعزاز ملنا ہے جاننا چاہئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے یہ وہ انعام و احسان ہیں جو اصل میں تو حضرت اسامہؓ کے والد حضرت زیدؓ کی نسبت ہے قرآن کریم میں مذکور ہیں لیکن باپ کو حاصل ہونے والے انعامات چونکہ اس کے بیٹے تک بھی بہر صورت پہنچتے ہیں اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ نے اس آیت کریمہ اگرچہ زیدؓ کے حق میں نازل ہوئی ہے مگر اس میں جن انعامات کا ذکر ہے وہ زیدؓ کو تو حاصل تھے ہی لیکن زیدؓ کا بیٹا اور اس کا تابع ہونے کی حیثیت سے وہ انعامات اسامہؓ کو بھی حاصل ہیں اور اسی لئے دونوں ہی باپ بیٹا مجھ کو زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔

"پھر علی بن ابی طالب" یعنی آپ ﷺ نے اپنے نزدیک عزیز و محبوب ہونے میں حضرت علیؓ کو حضرت اسامہؓ کے بعد کا درجہ دیا اور یہ اہل سنّت و جماعت کے اس مسلک کی واضح دلیل (نص جلی) ہے کہ زیادہ عزیز و محبوب ہونا افضلیت کے مترادف نہیں ہے، یعنی جو شخص سب سے زیادہ محبوب مانا جائے یہ ضروری نہیں کہ وہ سب سے افضل بھی ہو چنانچہ یہ بات بالاجماع مسلم ہے کہ حضرت علیؓ حضرت اسامہؓ سے افضل ہیں، علاوہ ازیں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت اسامہؓ کے زیادہ عزیز اور محبوب ہونے کی جو وجہ بیان فرمائی اس کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ محبت و تعلق میں آنحضرت ﷺ کے نزدیک حضرت اسامہؓ کو حضرت علیؓ پر علی الاطلاق فوقیت و ترجیح حاصل تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں تعدد وجوہ و حیثیات کا اعتبار مد نظر رکھنا ضروری ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت اسامہؓ تو بسبب خدمت گزاری وغیرہ کے زیادہ محبوب تھے اور حضرت علیؓ قرابت اور علم و فضل کے اعتبار سے زیادہ محبوب تھے، پس آنحضرت ﷺ بعض جہات سے حضرت اسامہؓ کو زیادہ محبوب رکھتے تھے اور بعض جہات سے حضرت علیؓ کو آپ ﷺ نے اپنے چچا کو۔ حضرت عباسؓ کا مطلب یہ تھا کہ اب اگر میں آپ سے یہ سوال کروں کہ پھر علیؓ کے بعد اہل بیت میں سے کون شخص آپ کو زیادہ عزیز و محبوب ہے تو یقیناً آپ کا جواب میرے بارہ میں ہوگا جس کے معنی یہ ہیں کہ میرا درجہ علیؓ کے بھی بعد کا ہے۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے واضح کیا کہ تم سے پہلے علیؓ کا میرے نزدیک زیادہ عزیز و محبوب ہونا قرابت و رشتہ داری کے کسی طبعی تقاضہ کی بناء پر نہیں بلکہ ان کی اس فضیلت کی بناء پر ہے کہ انہوں نے جس طرح قبول اسلام میں تم پر سبقت حاصل کی تھی اسی طرح ہجرت میں بھی ان کو تم پر سبقت حاصل ہے۔ اس کی نظیر وہ روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز حضرت عباسؓ، حضرت ابوسفیانؓ، حضرت بلال حبشیؓ، اور حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت عمر فاروقؓ، کے ہاں آئے اور دروازے پر کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت چاہی، خادم نے اندر جا کر حضرت عمر فاروقؓ، کو ان حضرات کی آمد کی اطلاع دی اور پھر باہر آکر بولا کہ (پہلے) بلالؓ کو اندر جانے کی اجازت ہے۔ حضرت ابوسفیان (کو یہ بات قدرے ناگوار ہوئی کہ میری اور عباسؓ کی موجودگی میں پہلے بلالؓ کو اندر جانے کی اجازت کیسے مل گئی چنانچہ وہ) حضرت عباسؓ سے بولے کہ تم نے دیکھا، عمرؓ آزاد کردہ غلاموں کو ہم پر فوقیت دیتے ہیں، حضرت عباسؓ نے جواب دیا کہ ہم (قبول اسلام اور ہجرت میں) جو پیچھے رہ گئے تھے یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حسنؓ آنحضرت ﷺ سے بہت مشابہ تھے

(۴۴) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ صَلَّى اَبُوْبَكْرِ الْعَصْرَ ثُمَّ خَرَجَ يَمْشِيْ وَمَعَهُ عَلِيٌّ فَرَاَى الْحَسَنَ يَلْعَبُ مَعَ الصِّبْيَانِ فَحَمَلَهُ عَلٰى عَاتِقِهٖ وَقَالَ بِاَبِيْ شَبِيْهٌ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ شَبِيْهًا بِعَلِيٍّ وَعَلِيٌّ يَضْحَكُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عقبہ بن حارثؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ (اپنے زمانہ خلافت میں یا اس سے پہلے ایک دن) عصر کی نماز پڑھ کر باہر نکلے اور (کہیں جانے کے لئے) چلنے لگے، اس وقت ان کے ساتھ حضرت علیؓ بھی تھے (راستہ میں) حضرت ابوبکرؓ نے جب حسنؓ کو دیکھا جو بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے تو ان کو اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھالیا (از راہ خوش طبعی) بولے: میرا باپ قربان ہو، یہ (حسنؓ) نبی کریم ﷺ سے بہت مشابہ ہیں- علی کے مشابہ نہیں ہے (یہ سن کر) حضرت علیؓ (اظہار خوشی کے طور پر) ہنسنے لگے-" (بخاریؒ)

شہید اعظمؓ کے سر مبارک کے ساتھ ابن زیاد کا تمسخر و استہزاء

(۴۵) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ اُتِیَ عُبَیْدُاللّٰہِ بْنُ زِیَادٍ بِرَاْسِ الْحُسَیْنِ فَجُعِلَ فِیْ طَسْتٍ فَجَعَلَ یَنْکُتُ وَقَالَ فِیْ حُسْنِہٖ شَیْئًا قَالَ اَنَسٌ فَقُلْتُ وَاللّٰہِ اِنَّہٗ کَانَ اَشْبَہَھُمْ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَکَانَ مَخْضُوْبًا بِالْوَسْمَۃِ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃِ التِّرْمِذِیِّ قَالَ کُنْتُ عِنْدَ ابْنِ زِیَادٍ فَجِیْءَ بِرَاْسِ الْحُسَیْنِ فَجَعَلَ یَضْرِبُ بِقَضِیْبٍ فِیْ اَنْفِہٖ وَیَقُوْلُ مَارَاَیْتُ مِثْلَ ھٰذَا حُسْنًا فَقُلْتُ اَمَا اِنَّہٗ کَانَ مِنْ اَشْبَھِھِمْ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ-

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت حسینؓ کا سر مبارک (تن پاک سے جدا کر کے) عبیداللہ بن زیاد کے سامنے لا کر ایک طشت میں رکھا گیا تو وہ بدبخت اپنی چھڑی سے اس سر مبارک کو چھیڑنے لگا (یعنی حضرت حسینؓ کے تئیں اپنی نفرت و حقارت ظاہر کرنے کے لئے چھڑی کا سرا بار بار ناک وغیرہ پر مارتا رہا) پھر اس نے ان کے حسن کے بارے میں کچھ کہا حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے (اس شقی کی یہ حرکت دیکھ کر اور اس کے الفاظ کو سن کر) کہا، خدا کی قسم یہ وہ مقدس انسان ہے جو اہل بیت میں سب سے زیادہ رسول کریم ﷺ سے مشابہ تھا اس وقت حضرت حسینؓ کا سر مبارک وسمہ سے رنگا ہوا تھا (بخاری) اور ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا اس وقت میں ابن زیاد کے پاس موجود تھا جب حضرت حسینؓ کا سر مبارک اس کے سامنے لایا گیا، ابن زیاد ان کی ناک پر چھڑی مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا ایسا حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا میں نے کہا تجھے معلوم بھی ہے، یہ وہ شخص ہے جو رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ مشابہ تھا- ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح حسن غریب ہے-"

تشریح: اور طبرانیؒ نے حضرت انسؓ کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں کہ جب عبیداللہ ابن زیاد اپنی اس چھڑی سے جو اس کے ہاتھ میں تھی حضرت حسینؓ کی آنکھ اور ناک کو کوچنے لگا تو میں نے کہا (ارے بدبخت) اپنی چھڑی ہٹالے، جن جگہوں کو تو اپنی چھڑی سے کوچ رہا ہے، وہاں میں نے رسول اللہ ﷺ کا منہ رکھا ہوا دیکھا ہے اور بزارؒ کی روایت میں حضرت انس کے الفاظ یوں ہیں کہ میں نے عبیداللہ ابن زیاد کو مخاطب کر کے کہا، جہاں تو اپنی چھڑی سے کوچ رہا ہے وہاں میں نے رسول اللہ ﷺ کو نگھتے دیکھا ہے، میرے یہ کہنے پر ابن زیاد نے اپنی چھڑی ہٹالی-

بہر حال عبیداللہ ابن زیاد وہ شخص ہے جو کوفہ میں یزید ابن معاویہ کا گورنر تھا اور یزید نے اسی کو اس لشکر کا کمانڈر بنایا تھا جو حضرت حسینؓ کو شہید کرنے کے لئے متعین ہوا تھا، اس شخص نے جس بے دردی سے حضرت حسینؓ اور ان کے رفقاء و اعزاء کو قتل کرایا اور پھر بعد میں حضرت حسینؓ کے سر مبارک کے ساتھ جس تمسخر و استہزا بلکہ حقارت و تنفر کا سلوک کیا وہ اس کی شقاوت قلبی کا ثبوت ہے چنانچہ خود اس کو قدرت کے انتقام کا اس طرح شکار ہونا پڑا کہ ۶۶ھ میں مختار ابن ابی عبید کے زمانہ میں بمقام موصل ابراہیم ابن مالک ابن الاشتر النخعی کے ہاتھوں اپنے بہت سارے لوگوں کے ساتھ موت کے گھاٹ اترا، اور ذخائر میں عمارۃ بن عمیر کی روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا جب میدان جنگ سے ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں کے سرتن سے جدا کر کے شہر کی جامع مسجد میں لائے گئے تو اس وقت مسجد کے چبوترہ پر میں بھی موجود تھا، ابن زیاد کا کٹا ہوا سر وہاں رکھا تھا، اچانک لوگوں نے ایک طرف کو دیکھ کر چلانا شروع کیا وہ آیا وہ آیا، میں نے

جو دیکھا تو ایک سانپ تیزی سے ابن زیاد کے سر کی طرف چلا آرہا تھا اور آناً فاناً اس کے نتھنے میں گھس گیا، کچھ دیر وہ اندر رہا پھر باہر نکل کر چلا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ آیا وہ آیا کا شور پھر بلند ہوا اور وہ سانپ تیزی سے آکر ابن زیاد کے نتھنے میں گھس گیا اور کچھ دیر رہ کر پھر نکلا اور چلا گیا، یہ عجیب و غریب ماجرا دو یا تین بار پیش آیا۔

"پھر اس نے اس کے حسن کے بارہ میں کچھ کہا" اس جملہ کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ابن زیاد نے حضرت حسینؓ کا سر مبارک دیکھ کر ان کے حسن اور ان کی خوبصورتی کے بارہ میں کوئی عیب جویانہ بات کہی، لیکن ایک مطلب جو ترمذیؒ کی روایت سے ظاہر بھی ہوتا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ ابن زیاد نے اس وقت حضرت حسین کے حسن و جمال کے بارہ میں تعریف و تحسین کے اس طرح مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کئے جیسے کوئی مذاق اڑانے والا کیا کرتا ہے وہ الفاظ ظاہر تو تعریف کے تھے مگر حقیقت میں اس خوشی کے اظہار کے لئے جو اس بدبخت کو حضرت حسینؓ کے قتل سے حاصل ہوئی تھی تمسخر و استہزاء کے طور پر تھے۔

ایک خواب جس میں ولادت حسینؓ کا مژدہ تھا ایک پیشین گوئی جس میں قتل حسینؓ کی پیش خبری تھی

(۴۶) وَعَنْ اُمِّ الْفَضْلِ بِنْتِ الْحَارِثِ اَنَّهَا دَخَلَتْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ رَاَيْتُ حُلْمًا مُنْكَرًا اللَّيْلَةَ قَالَ وَمَا هُوَ قَالَتْ اِنَّهٗ شَدِيْدٌ قَالَ وَمَا هُوَ قَالَتْ رَاَيْتُ كَاَنَّ قِطْعَةً مِّنْ جَسَدِكَ قُطِعَتْ وَوُضِعَتْ فِيْ حِجْرِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَيْتِ خَيْرًا تَلِدُ فَاطِمَةُ اِنْشَآءَ اللّٰهُ غُلَامًا يَكُوْنُ فِيْ حِجْرِكِ فَوَلَدَتْ فَاطِمَةُ الْحُسَيْنَ وَكَانَ فِيْ حِجْرِيْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلْتُ يَوْمًا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَضَعْتُهٗ فِيْ حِجْرِهٖ ثُمَّ كَانَتْ مِنِّي الْتِفَاتَةٌ فَاِذَا عَيْنَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُهْرِيْقَانِ الدُّمُوْعَ قَالَتْ فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ مَالَكَ قَالَ اَتَانِيْ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَاَخْبَرَنِيْ اَنَّ اُمَّتِيْ سَتَقْتُلُ ابْنِيْ هٰذَا فَقُلْتُ هٰذَا قَالَ نَعَمْ وَاَتَانِيْ بِتُرْبَةٍ مِّنْ تُرْبَتِهٖ حَمْرَآءَ۔

"اور حضرت ام فضل بنت حارثؓ سے جو حضرت عباس کی زوجہ اور آنحضرت ﷺ کی چچی ہیں روایت ہے کہ وہ (ایک روز) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بولیں کہ یارسول اللہ (ﷺ)! آج کی رات میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے آنحضرت نے پوچھا وہ کیا ہے؟ ام فضل نے عرض کیا، سخت ڈراؤنا ہے (نہ تو میں اس کو بیان کرنا پسند کرتی ہوں اور نہ آپ اس کو سن کر پسند کریں گے) آنحضرت نے فرمایا (مجھ کو سناؤ تو سہی آخر وہ کیا ہے، ام فضل نے کہا میں نے دیکھا کہ گویا آپ کے جسم مبارک سے ایک ٹکڑا کاٹا گیا ہے اور میری گود میں رکھ دیا گیا ہے۔ (یہ سن کر) رسول کریم ﷺ نے فرمایا، تم نے تو بہت اچھا اور مبارک خواب دیکھا ہے (اس کی تعبیر یہ ہے) کہ انشاء اللہ فاطمہؓ کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا اور اس لڑکے کو تمہاری گود میں دیا جائے گا (کیونکہ خاندان کی عورتوں میں تمہارا ہی رشتہ بڑا ہے اور تم اس لڑکے کی زیادہ بہتر طور پر تربیت کر سکو گی) چنانچہ فاطمہؓ کے ہاں لڑکا (حسینؓ) پیدا ہوا اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اس لڑکے کو میری گود میں دیا گیا۔ پھر ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گئی اور حسین کو آپ کی گود میں دے کر ذرا دوسری طرف متوجہ ہو گئی اور پھر (مڑ کر میں نے جو آپ کی طرف نظر اٹھائی) تو کیا دیکھتی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، ام فضل کہتی ہیں میں نے (گھبرا کر) پوچھا: اے اللہ کے نبی، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، آپ ﷺ کو کیا ہوا (جو رو رہے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا: (ابھی) میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ میری اُمّت (یعنی مسلمانوں ہی میں سے بعض لوگوں کی جماعت) میرے اس بیٹے کو (نہایت ظالمانہ طریقے سے) عنقریب قتل کر دے گی، میں نے (بڑی حیرت کے ساتھ) پوچھا: کیا اس بیٹے کو؟ آپ نے فرمایا، ہاں (اسی بیٹے کو) بلکہ جبرئیل تو میرے پاس اس خاک زمین سے کچھ مٹی بھی لے کر آئے تھے (جہاں میرے اس جگر پارے کا خون بہایا جائے گا) اور وہ مٹی سرخ تھی۔"

تشریح: ایک روایت ذخائر میں سلمیٰؓ سے منقول ہے وہ بیان کرتی ہیں کہ ایک روز میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں میں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے (خواب میں) رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ کے سر اقدس اور ریش مبارک پر خاک اور دھول جمی ہوئی تھی جب میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ اس حالت میں کیوں ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا میں ابھی قتل گاہ حسینؓ سے ہو کر آ رہا ہوں اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے نیز بغوی نے بھی یہ روایت حسان میں نقل کی ہے۔

شہادت حسینؓ اور ابن عباسؓ کا خواب

(۴۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّهٗ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْمَا یَرَی النَّائِمُ ذَاتَ یَوْمٍ بِنِصْفِ النَّهَارِ اَشْعَثَ اَغْبَرَ بِیَدِهٖ قَارُوْرَةٌ فِیْهَا دَمٌ فَقُلْتُ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ مَا هٰذَا قَالَ هٰذَا دَمُ الْحُسَیْنِ وَاَصْحَابِهٖ لَمْ اَزَلْ اَلْتَقِطُهٗ مُنْذُ الْیَوْمِ فَاُحْصِیَ ذٰلِكَ الْوَقْتُ فَاُجِدُ قُتِلَ ذٰلِكَ الْوَقْتَ رَوَاهُمَا الْبَیْهَقِیُّ فِیْ دَلَآئِلِ النُّبُوَّةِ وَاَحْمَدُ الْاَخِیْرَ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا۔ ایک دن دوپہر میں میں نے نبی کریم ﷺ کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی سونے والا کسی کو دیکھتا ہے (یعنی خواب میں دیکھا) کہ آپ ﷺ کے بال بکھرے ہوئے اور گرد آلودہ ہیں اور آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک بوتل ہے جو خون سے بھری ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان یہ کیا ہے (یعنی کیا حادثہ پیش آیا ہے کہ آپ نہایت پریشان حال اور گرد آلود ہیں اور ایک خون بھری بوتل ہے) آپ نے فرمایا: یہ حسینؓ اور اس کے ساتھیوں کا خون ہے جس کو میں آج قتل گاہ حسین میں صبح سے اب تک اس بوتل میں اکٹھا کرتا رہا ہوں، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (اس خواب کے بعد میری آنکھ کھل گئی) اور پھر میں نے اس وقت کو یاد رکھا (جس وقت یہ خواب دیکھا تھا) چنانچہ (جب قتل حسینؓ کی خبر آئی) تو میں نے پایا کہ شہادت حسینؓ کا المیہ (اسی دن اور اسی وقت پیش آیا تھا) جب میں نے مذکورہ خواب دیکھا تھا) ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اور اس دوسری روایت کو احمدؒ نے بھی نقل کیا ہے۔"

اہل بیت کو عزیز و محبوب رکھو

(۴۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا یَغْذُوْكُمْ مِّنْ نِعْمَةٍ وَاَحِبُّوْنِیْ لِحُبِّ اللّٰهِ وَاَحِبُّوْا اَهْلَ بَیْتِیْ لِحُبِّیْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ تم اللہ سے محبت رکھو کیونکہ وہی تمہیں اپنی نعمتوں سے رزق پہنچاتا ہے اور تمہاری پرورش کرتا ہے اور اس بناء پر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو مجھ سے محبت رکھو اور میرے اہل بیت کو میری محبت کی وجہ سے عزیز و محبوب رکھو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اپنی نعمتوں سے رزق پہنچاتا ہے" یعنی تمہیں ایسی طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے جن سے تمہاری پرورش بھی ہوتی ہے اور تمہیں نوع بنوع لذتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمتوں کے دروازے نہ کھولے اور اپنے خزانہ قدرت سے تمہارا رزق نہ دیتا رہے تو نہ تم زندہ رہ سکتے ہو اور نہ کھانے پینے کی کوئی لذت حاصل کر سکتے ہو، تم جو کچھ کھاتے پیتے ہو وہ سب اسی کی طرف سے تمہیں پہنچتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے فمابکم من نعمة فمن اللہ حاصل یہ کہ اگر تم اللہ سے محبت صرف اس بناء پر رکھ سکتے ہو کہ وہ تمہارا پالن ہار ہے اور تمہیں نعمتیں پہنچاتا ہے تو اس کو ضرور دوست رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ سبحانہ عارفین محبین کے نزدیک محبوب لذاتہ وصفاتہ ہے، اس سے ہر حالت میں محبت رکھنی چاہئے خواہ وہ نعمتیں عطا کرے یا نہ کرے پس یہ حدیث معنوی اسلوب و انداز کے اعتبار

سے ایسی ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فلیعبدو ارب هٰذا البیت۔
"اور اس بناء پر کہ تم اللہ سے محبت رکھتے ہو" یعنی جب وہ سبب ثابت وظاہر ہو گیا جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا لازمی ہو جاتا ہے اور اسی سبب سے تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر مجھ سے بھی محبت رکھو کیونکہ محبوب کا محبوب اپنا محبوب ہوتا ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اپنی شرح میں لحب اللّٰہ کے تحت یوں لکھا ہے کہ تم مجھ سے اس بناء پر محبت رکھو کہ تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، یا یہ کہ تم مجھ سے اس بناء پر محبت رکھو کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے محبت رکھتا ہے۔
"میرے اہل بیت کو میری محبت کی وجہ سے" اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ چونکہ میں اپنے اہل بیت کو عزیز و محبوب رکھتا ہوں لٰہذا تم بھی میرے اہل بیت کو عزیز و محبوب رکھو، اور دوسرا مطلب یہ کہ چونکہ تم مجھ کو عزیز و محبوب رکھتے ہو لٰہذا میرے اہل بیت کو بھی عزیز و محبوب رکھو۔

اہل بیت اور کشتی نوح میں مماثلت

(۴۹) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّهٗ قَالَ وَهُوَ اٰخِذٌ بِبَابِ الْكَعْبَةِ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلَآ اِنَّ مِثْلَ اَهْلِ بَيْتِیْ فِيْكُمْ مِثْلُ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا هَلَكَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے کعبہ کے دروازہ کو پکڑ کر یوں بیان کیا، میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "یاد رکھو، تمہارے حق میں میرے اہل بیت کی وہی اہمیت ہے جو نوح کی کشتی میں سوار ہو گیا اس نے نجات پالی اور جو شخص اس کشتی میں سوار ہونے سے رہ گیا وہ ہلاک ہوا۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ جس طرح طوفان نوح کے وقت وہی شخص زندہ سلامت بچا اور اس دنیا میں باقی رہا جو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہو گیا تھا اور جو شخص کشتی میں سوار نہیں ہوا وہ ہلاک ہونے سے بچ نہیں سکا، طوفان کی بلاخیز موجوں نے اس کا نام ونشان تک مٹا کر رکھ دیا ٹھیک اسی طرح اُمت محمدیہ کے حق میں اہل بیت محمد ﷺ ایک ایسی پناہ گاہ ہیں کہ جو شخص ان کے دامان عاطفت سے وابستہ ہو گیا، جس نے ان کے اکرام و احترام اور ان کی محبت ومتابعت کو لازم پکڑ لیا اس نے دارین میں نجات پالی، اور جو شخص ان کے دامن محبت ومتابعت سے وابستہ نہیں ہو سکا وہ دونوں جہان میں ہلاک ہونے سے بچ نہیں سکتا خواہ وہ کتنا ہی مال لٹا دے، کیسی ہی عزت وجاہ کا سہارہ لے لے، کتنی بڑی طاقت سے اپنے آپ کو وابستہ کر لے پس آنحضرت ﷺ نے گویا دنیا اور دنیا کی چیزوں یعنی یہاں کی فریب کاریوں، کفر وشرک کی گمراہیوں، بدعات وجہالت کے اندھیروں اور فاسد و بیہودہ خواہشات و آرزوؤں کو ایسے گہرے اور بپھرے ہوئے سمندر سے مشابہت دی جس کی سطح پر تہ در تہ موجوں کی بلاخیزی ہو اس کے اوپر فضا میں گھنے اور کالے بادلوں کا جماؤ ہو، چاروں طرف تاریکی ہو اور سمندر نے ساری آبادیوں اور زمینوں کو گھیر رکھا ہو۔ اور پھر آپ ﷺ نے آگاہ کیا کہ اس سمندر کی بلاخیزی اور ہلاکت آمیزی سے وہی شخص زندہ سلامت بچ سکتا ہے، نجات پا سکتا ہے جو میرے اہل بیت کی محبت کی کشتی میں سوار ہو جائے، اس معنوی سیاق میں دیکھا جائے تو اس حدیث کہ جس میں فرمایا گیا ہے اصحابی مثل النجوم من اقتدی بشیء منه اهتدی (او کما قال) اور اس ارشاد گرامی کہ: میرے اہل بیت نوح کی کشتی کی مانند ہیں" کے درمیان گہرا اور لطیف ربط خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے اور اسی ربط کو سامنے رکھ کر امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں بڑی پیاری بات لکھی ہے کہ "ہم اہل سنت وجماعت الحمد للہ اہل بیت کی محبت کی کشتی میں سوار ہوئے اور راہ ہدایت کے ستاروں یعنی اصحاب محمد ﷺ کے ذریعہ راہ یاب ہوئے چنانچہ ہم قیامت کی ہولناکیوں، تاریکیوں اور دوزخ کی ہلاکت خیزیوں سے نجات کی، اور درجات نجات اور وہاں کی ابدی نعمتوں تک پہنچنے کا راستہ پانے کی امید رکھتے ہیں" اس سے یہ

نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص اس کشتی میں سرے سے سوار ہی نہیں ہوا جیسے خوارج تو وہ ہلاک ہونے والوں کے ساتھ اول دہلہ ہی میں ہلاک ہو گیا، اور جو شخص اس کشتی میں سوار تو ہوا لیکن ہدایت کے ستاروں کے ذریعہ راستہ پانے سے محروم رہا جیسے روافض تو وہ گمراہی اور تاریکیوں میں اس طرح پھنس کر رہ گیا کہ اس کا زندہ سلامت بچ نکلنا ناممکن ہے۔

بَابُ مَنَاقِبِ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُنَّ

نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے مناقب کا بیان

نبی کریم ﷺ نے پہلا نکاح مکہ میں حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے کیا، اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۴۰ سال کی تھی حضرت خدیجہ نے ہجرت سے تین سال قبل وفات پائی، اور ان کے بعد مکہ ہی میں آپ ﷺ نے ایک پچاس سالہ خاتون حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر بھی تقریباً ۵۰ سال ہی کی تھی، حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا سن وفات ۵۴ھ یا ایک قول کے مطابق ۴۱ھ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صدیقہ بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا نکاح مکہ میں ۱۰ نبوی میں ہوا جب کہ وہ چھ برس کی تھیں اور جب ۱ھ میں وہ رخصت کرا کر حضور ﷺ کے ہاں آئیں اس وقت ان کی عمر ۹ سال کی تھی ان کا سن وفات ۵۵ھ یا ۵۸ھ ہے حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح ۲ھ یا ۳ھ میں ہوا اور انہوں نے ۴۱ھ یا ۴۵ھ میں وفات پائی حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا ۳ھ میں آپ کے نکاح میں آئیں اور نکاح سے کچھ ہی ماہ بعد ۴ھ میں (اور ایک روایت کے مطابق ۳ھ ہی میں) انتقال کر گئیں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بنت امیہ مخزومی سے آپ نے ۳ھ یا ۴ھ میں نکاح کیا اور ان کا انتقال ۵۹ھ میں ہوا اور ایک قول کے مطابق ۶۲ھ میں ہوا۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ۵ھ میں آپ کی زوجیت میں آئیں اور ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں انتقال کیا، آنحضرت کے وصال کے بعد سب سے پہلے جس زوجہ مطہرہ نے انتقال کیا وہ حضرت زینب ہی ہیں۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں پہلے عبداللہ بن جحش کے نکاح میں تھی، دونوں میاں بیوی مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، وہاں عبداللہ بن جحش نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا اور وہیں مر گیا تھا، حضرت ام حبیبہ اپنے مذہب (اسلام) پر قائم رہیں ۶ھ میں نجاشی بادشاہ حبشہ نے ان کا نکاح آنحضور ﷺ سے کیا اور اپنے پاس سے ان کا مہر جو چار ہزار درہم مقرر ہوا تھا ادا کیا، حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ۴۴ھ میں انتقال کیا، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا غزوہ مریسیع میں جس کو غزوہ بنی المصطلق بھی کہتے ہیں اور جو ۶ھ میں ہوا تھا اسیر ہو کر آئیں آنحضرت نے ان کو آزاد کیا اور پھر ان سے نکاح کر لیا ان کا انتقال ۵۶ھ میں ہوا۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خالہ ہیں ۷ھ میں آنحضرت کی زوجیت کے شرف سے سرفراز ہوئیں ان کا انتقال ۶۱ھ یا ۵۱ھ میں ہوا، حضرت صفیہ بنت حی ابن اخطب ۷ھ میں جنگ خیبر میں اسیر بنائی گئیں اس وقت ان کی عمر ۱۷ سال کی تھی آنحضرت نے ان کو آزاد فرمایا اور پھر نکاح کر لیا، انہوں نے ۵۰ھ یا ایک روایت کے مطابق ۵۲ھ میں وفات پائی۔ آنحضرت ﷺ کی گیارہ ازواج مطہرات کی یہ وہ تعداد ہے جس پر روایات کا اتفاق ہے بارہویں زوجہ مطہرہ یعنی حضرت ریحانہ رضی اللہ عنہا کے بارہ میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے ان کو حرم (کنیز) قرار دیا ہے۔ لیکن بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ ریحانہ رضی اللہ عنہا جو ایک یہودی خاندان کی خاتون تھیں جنگی اسیر ہو کر آئی تھیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کو آزاد کیا اور ۶ھ میں ان سے نکاح کر لیا بہر حال آنحضرت نے ان تمام خواتین سے، جو اُمت کی مائیں ہیں، نکاح کیا اور سب کے ساتھ دخول بھی فرمایا۔ بیس یا بیس سے زائد ایسی خواتین کا ذکر بھی روایتوں میں آتا ہے جن سے آپ نے نکاح تو کیا لیکن دخول سے پہلے ہی جدائی کی نوبت آگئی، بعض ایسی خواتین بھی تھیں جن سے نکاح کی بات چیت چلی لیکن ان سے نکاح نہیں کیا، اسی طرح بعض روایتوں میں ایسی عورتوں کا بھی ذکر آتا ہے جو آپ ﷺ کے نکاح میں تھیں اور جب یہ آیت کریمہ یایھا النبی قل لازواجک الخ نازل ہوئی تو انہوں نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی اور آپ سے جدائی اختیار کر لی۔ جہاں تک آنحضرت کی حرموں (کنیزوں) کا تعلق

ہے تو ان کی تعداد چار بیان کی جاتی ہے جن میں سب سے مشہور ماریہ قبطیہؓ ہیں جن کے بطن سے ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے تھے ان کا انتقال ۱۶ھ میں ہوا دوسری وہی حضرت ریحانہ بنت سمون یا بنت زید ہیں جن کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہ آپ کے نکاح میں نہیں تھیں، بلکہ "حرم" تھی ان کو آپ نے آزاد نہیں کیا تھا، اور بسبب ملک یمین ان سے مجامعت فرمائی، باقی دو میں سے ایک تو وہ کنیز تھیں جو ام المؤمنین زینب بنت جحش نے بطور ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کی تھی، اور ایک کنیز وہ تھیں جو کسی غزوہ میں اسیر ہو کر آئی تھیں۔

مذکورہ بالا تفصیل شیخ عبدالحق دہلویؒ کی شرح مشکوۃ سے ماخوذ ہے، جو انہوں نے جامع الاصول کے حوالہ سے جمع کی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کی تعداد، ان کے نکاح کی ترتیب آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد انتقال کرنے والی ازواج مطہرات کے سنین وفات، جن ازواج کے ساتھ دخول نہیں کیا یا جن خواتین کے ہاں پیغام دیا مگر ان کے ساتھ نکاح نہیں ہوا ان سب کی تعداد کے بارہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں اور عام روایتوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خدیجۃ الکبریٰؓ کی فضیلت

① عَنْ عَلِيٍّؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ خَيْرُ نِسَآءِهَا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَخَيْرُ نِسَآءِهَا خَدِيْجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ اَبُوْكُرَيْبٍ وَاَشَارَ وَكِيْعٌ اِلَى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔

"حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا مریم بنت عمران اپنی اُمت میں سب سے بہتر عورت ہیں، اور خدیجہؓ بنت خویلد اپنی اُمت میں سب سے بہتر عورت ہیں (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ابوکریب نے یہ بیان کیا کہ حضرت وکیع نے (جو حفاظ حدیث میں سے ہیں اور حضرت امام مالکؒ اور ان کے ہمعصروں کے ہم پلہ ہیں) آسمان اور زمین کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا کہ اس حدیث کے مطابق یہ دونوں خواتین اپنی امتوں میں دنیا بھر کی عورتوں سے افضل و اشرف ہیں۔"

تشریح: اس حدیث سے یہ تو معلوم ہوا کہ حضرت مریمؑ جو حضرت عیسی علیہ السلام کی والدہ ہیں اپنی اُمت میں اور ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ اپنی اُمت (امت محمدیہ) میں سب عورتوں سے افضل ہیں لیکن اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ خود ان دونوں میں کون کس سے افضل ہے، حضرت خدیجہ سے افضل ہیں یا حضرت خدیجہؓ حضرت مریم سے افضل ہیں تاہم تفسیر نسفی میں لکھا ہے کہ صحیح قول کے مطابق حضرت مریم سے حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ افضل ہیں کیونکہ حضرت مریم پیغمبر تو ہیں نہیں، اور یہ بھی طے ہے کہ یہ اُمت مرحومہ دوسری تمام امتوں سے بہتر و افضل ہے تو اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں اسی طرح حضرت عائشہ پر حضرت فاطمہؓ کی فضیلت بھی مختلف فیہ ہے اور امام مالکؒ کا یہ قول ہے کہ فاطمہؓ پیغمبر کی جگر پارہ ہیں اور میں جگر پارۂ پیغمبر ﷺ کو کسی خاتون پر فضیلت نہیں دیتا۔

② وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ اَتٰى جِبْرَئِيْلُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذِهٖ خَدِيْجَةُ قَدْ اَتَتْ مَعَهَا اِنَآءٌ فِيْهِ اِدَامٌ اَوْ طَعَامٌ فَاِذَا اَتَتْكَ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَّبِّهَا وَمِنِّيْ وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ وَّلَا صَخَبَ فِيْهِ وَلَا نَصَبَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور بولے کہ یا رسول اللہ ابھی خدیجہؓ (مکہ سے چل کر غار حرا میں) آرہی ہیں، ان کے ساتھ ایک برتن ہے جس میں سالن (اور روٹی) ہے یا کھانا ہے جب وہ آپ کے پاس پہنچ جائیں تو آپ ﷺ ان کے پروردگار کی طرف سے بھی ان کو سلام کہہ دیجئے اور میری طرف سے اور ان کو جنت میں ایک محل کی خوش خبری سنا

دیجئے جو خولدار موتی ہے اور اس محل میں نہ شور و غل ہے نہ تکلیف و تکان ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب آنحضرت ﷺ خلوت کے لئے غار حرا چلے جاتے تھے اور کئی کئی دن تک وہاں عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ اپنے ساتھ کھانے پینے کی کچھ چیزیں (جیسے ستو) اور پانی وغیرہ لے لیتے تھے تاکہ بھوک اور پیاس کا غلبہ خلوت گزینی میں مخل نہ ہو، ایک دن خدیجۃ الکبریٰؓ آپ کے کھانے پینے کا کچھ سامان خود لے کر غار حرا پہنچیں اور مذکورہ سعادت و بشارت سے سرفراز ہوئیں۔ واضح ہو کہ عام طور پر ثابت تو یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا خلوت گزینی کے لئے غار حرا میں جانا اور وہاں عبادت و ذکر الٰہی میں مشغول رہنا اس زمانہ کا معمول تھا جب کہ آپ خلعت نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے اور آپ کے پاس حضرت جبرائیل کا آنا جانا شروع نہیں ہوا تھا، لیکن اس میں کچھ استبعاد نہیں کہ مرتبہ نبوت پر فائز ہوتے اور حضرت جبرئیل کی آمد شروع ہو جانے کے بعد بھی کچھ دنوں تک آپ نے یہ معمول جاری رکھا ہو اور انہی دنوں حضرت خدیجہؓ کسی دن آپ کا کھانا لے کر غار حرا میں گئی ہوں۔

"ان کو سلام کہہ دیجئے" علماء نے لکھا ہے کہ رب العلمین کا سلام ایسا شرف ہے جو حضرت خدیجہؓ کے سوا دنیا کی کسی عورت کو حاصل نہیں ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ کو بھی سلام کہلایا تھا لیکن صرف اپنی طرف سے ۔ اسی لئے اس حدیث کو حضرت عائشہؓ پر حضرت خدیجہؓ کی فضیلت کی دلیل قرار دیا جاتا ہے۔

"جو خولدار موتی کا ہے" "قصب" کا اطلاق اس موتی پر ہوتا ہے جو بہت بڑا ہو اور اندر سے خالی ہو، روایتوں میں آتا ہے کہ جنّت کے محلات پر جو گنبد ہوں گے وہ دراصل قبہ جیسے بڑے بڑے موتی ہوں گے جن کے اندر سے خلا ہو گا۔ لہٰذا اس جملہ کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس محل کا گنبد ایک پورا موتی ہو گا، یا یہ کہ وہ پورا محل موتی کا ہو گا یعنی ایک اتنا بڑا موتی ہو گا جس کے اندر کا خلاء ایک پورے محل پر محیط ہو گا۔

"اس محل میں نہ شور و غل ہے نہ تکلیف اور تکان ہے" بطور خاص ان دونوں چیزوں کی نفی اس اعتبار سے کی گئی ہے کہ دنیاوی گھروں میں رہنے والوں کو دو ناگوار چیزوں کا زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے ایک تو شور و غل کا اور دوسرے اس محنت و مشقت اور تکلیف و تکان کا جو گھروں کو بنانے، سنوارنے اور سجانے میں ہوتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ جنّت کے محلات ان ناگوار اور تکلیف دہ چیزوں سے خالی ہوں گے نیز علماء نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے حق میں یہ بشارت گو اس مقام کا اعلان تھا جو ان کو اس بات کے بدلہ میں عطا ہوا کہ انہوں نے آنحضرت کی دعوت اسلام کو سب سے پہلے بطیب خاطر اور بخوشی قبول کر لیا تھا انہوں نے خدائی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنا آبائی مذہب یک لخت اس طرح ترک کر دیا کہ نہ تو کسی طرح کا شور شرابہ ہونے دیا نہ بحث و تکرار اور لڑنے جھگڑنے کے تعب میں پڑیں۔

حضرت خدیجہؓ کی خصوصی فضیلت

(۴۳) وَعَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ مَاغِرْتُ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْ نِّسَآءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاغِرْتُ عَلٰى خَدِيْجَةَ وَمَا رَاَيْتُهَا وَلٰكِنْ كَانَ يُكْثِرُ ذِكْرَهَا وَرُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ ثُمَّ يقطعُهَا اَعْضَآءً ثُمَّ يَبْعَثُهَا فِيْ صَدَآئِقِ خَدِيْجَةَ فَرُبَّمَا قُلْتُ لَهٗ كَاَنَّهٗ لَمْ تَكُنْ فِي الدُّنْيَا اِمْرَاَةٌ اِلَّا خَدِيْجَةَ فَيَقُوْلُ اِنَّهَا كَانَتْ وَكَانَتْ وَكَانَ لِيْ مِنْهَا وَلَدٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی بیویوں میں جتنی غیرت اور جتنا رشک میں حضرت خدیجہؓ سے کرتی تھی اتنا کسی بیوی سے نہیں، حالانکہ میں نے حضرت خدیجہ کو دیکھا بھی نہیں تھا، البتہ آنحضرت ﷺ ان کو بہت یاد کرتے تھے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ آپ ﷺ بکری ذبح کرتے اور اس کا عضو کاٹ کر بوٹیا بناتے پھر اس گوشت کو ان عورتوں کے ہاں بھجواتے جو حضرت خدیجہ کی سہیلیاں تھیں، اکثر اوقات میں آپ سے یہ کہہ دیا کرتی تھی کہ (آپ ﷺ) تو خدیجہ کے تئیں اس قدر شائستگی اور محبت ظاہر کرتے ہیں) جیسے دنیا میں ایک خدیجہؓ کے علاوہ

اتنی خوبیوں والی اور کوئی عورت ہی نہیں، آپ (میری اس بات کے جواب میں) فرماتے: وہ تو واقعی اس طرح کی تھیں اور ایسی ہی تھیں، اور پھر میری اولاد بھی تو انہی کے بطن سے ہے۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: "ایسی ہی تھیں" یعنی وہ بڑی عابدہ زاہدہ تھیں روزے رکھا کرتی تھیں، شب بیدار رہتی تھیں، میری خدمت اور میری امداد و راحت رسانی میں بڑی بڑی مشقتیں اٹھاتی تھیں، حسن سلوک اور احسان کیا کرتی تھیں وغیرہ وغیرہ حضرت خدیجہ ؓ کی ان خوبیوں کو صریحًا ذکر کرنے کے بجائے مبہم فرمانے سے آپ ﷺ کا مقصد ان کی حیثیت و فضیلت کو زیادہ بلیغ انداز میں پیش کرنا اور اس طرف اشارہ کرنا ہوتا تھا کہ ان کے اوصاف اور خوبیاں حد شمار و قیاس سے باہر ہیں۔

میری اولاد بھی تو انہی کے بطن سے ہے اس سے حضرت خدیجہ کی اس خاص فضیلت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا تھا جس کی ہمسری کا دعویٰ آنحضرت کی کوئی بھی زوجہ مطہرہ نہیں کر سکتی تھیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی تمام اولاد امجاد حضرت خدیجہ ؓ ہی کے بطن سے ہوئی، سوائے ابراہیم بن محمد ﷺ کے جو ماریہ قبطیہ ؓ کے بطن سے تھے اور وہ آپ کی "حرم" تھیں اور اولاد بھی ایسی کہ جس میں حضرت فاطمہ زہرا ؓ جیسی بیٹی بھی شامل ہیں، جن کے فضائل و مناقب کا کوئی ٹھکانا نہیں باقی ازواج سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، دوسری طرف یہ نکتہ موجود ہے کہ عورتوں سے خاص ترغرض اور ان کا سب سے بڑا فائدہ ان سے اولاد کا ہونا ہے۔

خدیجہ الکبریٰ ؓ: ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ خویلد بن اسد کی بیٹی ہیں جو عرب کے مشہور تاجر اور قریش کے معزز و نامور فرد تھے حضرت خدیجہ ؓ کا پہلا نکاح ابن ہالہ بن زرارہ سے ہوا تھا، اس کے فوت ہو جانے کے بعد دوسرا نکاح عتیق بن عائذ سے ہوا تھا ان کا تیسرا نکاح جب آنحضرت ﷺ سے ہوا تو اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال تھی اور نبی کریم ﷺ کا یہ پہلا نکاح تھا آپ نے نہ تو ان سے پہلے کسی عورت سے نکاح کیا تھا اور نہ ان کی موجودگی میں کسی اور سے نکاح کیا۔

حضرت خدیجہ ؓ کو اول مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہے یعنی تمام مردوں اور عورتوں میں سب سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کا انتقال بعمر ۶۵ سال آنحضرت ﷺ کی ہجرت مدینہ سے پانچ سال قبل مکہ معظمہ میں ہوا۔ بعض حضرات نے ان کا سن وفات ہجرت سے چار سال قبل اور بعض نے تین سال قبل یعنی ۱۰ نبوی لکھا ہے۔ آنحضرت سے ان کی رفاقت کی مدت ۲۴ سال چھ ماہ یا پانچ ماہ ہے۔

حضرت عائشہ ؓ کی فضیلت

④ وَعَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ ؒ اَنَّ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَآئِشُ هٰذَا جِبْرَئِيْلُ يُقْرِئُكِ السَّلَامَ قَالَتْ وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ قَالَتْ وَهُوَ يَرٰى مَالَا اَرٰى۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو سلمہ ؒ (تابعی) سے روایت ہے کہ ام المؤمنین عائشہ ؓ صدیقہ ؓ نے (ایک روز مجھ سے) فرمایا: عائشہ ؓ! یہ جبرئیل (یہاں میرے سامنے) ہیں تم کو سلام کہتے ہیں۔ عائشہ ؓ نے (اس سلام کے جواب میں) کہا وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ (اور جبرئیل پھر بھی اللہ کی سلامتی اور راحت نازل ہو) حضرت عائشہ ؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ ان (جبرئیل) کو دیکھ رہے تھے اور میں ان کو نہیں دیکھ رہی تھی۔" (بخاری و مسلم)

عائشہ ؓ کے بارہ میں آنحضرت کا خواب

⑤ وَعَنْ عَآئِشَةَ ؓ قَالَتْ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُرِيْتُكِ فِي الْمَنَامِ ثَلٰثَ لَيَالٍ يَجِيْءُ بِكِ الْمَلَكُ فِيْ سَرَقَةٍ مِّنْ حَرِيْرٍ فَقَالَ لِيْ هٰذِهٖ اِمْرَأَتُكَ فَكَشَفْتُ عَنْ وَجْهِكِ الثَّوْبَ فَاِذَا اَنْتِ هِيَ فَقُلْتُ اِنْ يَّكُنْ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ يُمْضِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک روز) مجھ سے فرمایا کہ تین رات مسلسل تمہیں میرے خواب میں لایا گیا جس کی صورت یہ تھی کہ ایک فرشتہ نہایت شاندار ریشمی کپڑے پر تمہاری تصویر کو میرے سامنے لاتا اور مجھ سے کہتا کہ یہ (تصویر) تمہاری (ہونے والی) بیوی کی ہے، اور جب میں (تصویر کا) پردہ اٹھا کر تمہارا چہرہ دیکھتا تو ہو بہو تمہارا ہی چہرہ ہوتا تھا، پھر میں (فرشتہ کے جواب میں) کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر یہ خواب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ خود ہی اس کو پورا کرے گا یعنی اس معاملہ کو تکمیل تک وہی پہنچائے گا اور اس عورت سے میرے نکاح کے اسباب پیدا فرمادے گا۔"

تشریح: "ریشمی کپڑے پر تمہاری تصویر کو" ایک اور روایت میں حضرت عائشہ ؓ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ مجھ (عائشہ ؓ) سے نکاح کریں تو حضرت جبرئیل اپنی ہتھیلی پر میری تصویر (آنحضرت کے خواب میں) لے کر آئے۔ پس ان دونوں روایتوں میں وجہ تطبیق یہ ہے کہ تصویر ریشمی کپڑے پر تھی اور وہ ریشمی کپڑا حضرت جبرئیل کی ہتھیلی پر تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت جبرئیل نے حضرت عائشہ ؓ کی تصویر دو بار لا کر دکھائی ہو، ایک بار تو ریشمی کپڑے پر اور ایک بار ہتھیلی پر اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت جبرئیل تو اپنی ہتھیلی پر تصویر لائے تھے اور کوئی دوسرا فرشتہ ریشمی کپڑے پر اور ایک بار اپنی ہتھیلی پر اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت جبرئیل تو اپنی ہتھیلی پر تصویر لائے تھے اور کوئی دوسرا فرشتہ ریشمی کپڑے پر لے کر آیا تھا۔ فناذا انتھی

الخ کا ایک ترجمہ تو وہی ہے جو اوپر لکھا گیا، اس کا دوسرا ترجمہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ (نکاح و شادی کے بعد) جب میں نے تمہارے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ تو تمہارا ہی چہرہ ہے جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔

"اگر یہ خواب اللہ کی طرف ہے" یہاں اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ اس خواب کے بارے میں شک کا اظہار کیا معنی رکھتا ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام خصوصاً آنحضرت ﷺ کا خواب تو وحی کی ایک صورت ہے جس کے تحقق میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں تو اس کا جواب علماء نے یہ لکھا ہے کہ اگر خواب کے اس واقعہ کو آنحضرت کے مرتبہ نبوت پر فائز ہونے سے پہلے کا مانا جائے تو پھر یہ اشکال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہاں اس صورت میں یہ سوال اٹھے گا کہ فرشتہ کا آنا اس بات کے منافی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خواب نبوت سے پہلے دیکھا تھا لیکن اگر ذہن میں یہ بات ہو کہ فرشتہ کو دیکھنا خصوصاً خواب میں دیکھنا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، نبی کے ساتھ جو چیز مخصوص ہے۔ وہ فرشتہ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لانا ہے تو یہ سوال بھی کوئی معنی رکھے گا۔ اور اگر یہ واقعہ و خواب مرتبہ نبوت پر فائز ہونے کے بعد کا ہے تو کہا جائے گا کہ آپ نے یہ الفاظ اظہار شک کے لئے نہیں بلکہ اس کے وقوع کے یقینی ہونے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے فرمائے تھے دراصل اس طرح کا جملہ استعمال ہی ایسے موقع پر ہوتا ہے جب کوئی بات متحقق اور ثابت شدہ ہوتی ہے جیسے کوئی حاکم یوں کہے اگر میں حاکم ہوں تو دیکھنا میں کیا کچھ نہیں کروں گا اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس جملہ میں جو شک ہے وہ اصل خواب سے متعلق نہیں ہے بلکہ تعبیر سے متعلق ہے کہ نہ معلوم ظاہر کے مطابق مراد سامنے آئے یا ظاہر کے خلاف کچھ اور یا یہ کہ نہ معلوم "بیوی" سے مراد دنیا کی بیوی ہے یا آخرت کی بیوی۔

حضرت عائشہ ؓ صدیقہ: عائشہ ؓ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی بیٹی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے پیغام ڈالا اور ہجرت سے تین سال قبل شوال ۱۰ نبوی میں مکہ میں ان سے نکاح کیا، حضرت عائشہ ؓ جب شوال ۲ھ میں رخصت کرا کر مدینہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئیں تو اس وقت ان کی عمر ۹ سال تھی بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے مدینہ آنے کے سات مہینے بعد حضرت عائشہ ؓ رخصت کرا کر مدینہ منورہ آپ ﷺ کے گھر آئیں، سرکار دو عالم ﷺ کی رفاقت ان کو ۹ سال حاصل رہی، آنحضرت ﷺ کے وصال کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی امہات المؤمنین میں یہی وہ طیبہ ہیں جن کا پہلا نکاح آنحضرت ﷺ سے ہوا آنحضرت ﷺ نے ان کے علاوہ اور کسی باکرہ (کنواری) سے نکاح نہیں کیا۔

حضرت عائشہ ؓ علم و دانائی اور ذاتی محاسن و کمالات کے اعتبار سے منفرد مقام رکھتی تھیں، زبردست عالمہ فاضلہ فصیحہ اور فقیہہ تھیں

آنحضرت ﷺ کی بے شمار احادیث ان کو یاد تھیں، بہت زیادہ حدیثیں روایت کرتی ہیں، شعر و ادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں نامور شعراء عرب کے کلام پر ان کی پوری نظر تھی اور اشعار ادبیات کی ایک بڑی تعداد ان کے حافظہ میں تھی، ان سے احادیث روایت کرنے والوں کی تعداد صحابہؓ اور تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت پر مشتمل ہے ۱۷ رمضان ۵۷ھ یا ۵۸ھ اور ایک روایت کے مطابق ۷ ۲ رمضان ۵۷ھ منگل کی شب میں بعمر ۶۳ سال مدینہ منورہ میں ان کی وفات ہوئی انہوں نے رات میں دفن کئے جانے کی وصیت کی تھی چنانچہ رات ہی میں جنت البقیع میں ان کو دفن کیا گیا اور حضرت ابوہریرہؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، اس وقت امیر معاویہ کی جانب سے مروان مدینہ کا گورنر تھا۔

عائشہؓ کی امتیازی فضیلت

⑥ وَعَنْهَا قَالَتْ اِنَّ النَّاسَ كَانُوْا يَتَحَرَّوْنَ بِهَدَايَاهُمْ يَوْمَ عَائِشَةَ يَبْتَغُوْنَ بِذٰلِكَ مَرْضَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَتْ اِنَّ نِسَآءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنَّ حِزْبَيْنِ فَحِزْبٌ فِيْهِ عَائِشَةُ وَّحَفْصَةُ وَصَفِيَّةُ وَسَوْدَةُ وَالْحِزْبُ الْاٰخَرُ اُمُّ سَلَمَةَ وَسَائِرُ نِسَآءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَلَّمَ حِزْبُ اُمِّ سَلَمَةَ فَقُلْنَ لَهَا كَلِّمِىْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلْيُهْدِهٖ اِلَيْهِ حَيْثُ كَانَ فَكَلَّمَتْهُ فَقَالَ لَهَا تُؤْذِيْنِىْ فِىْ عَائِشَةَ فَاِنَّ الْوَحْىَ لَمْ يَاْتِنِىْ وَاَنَا فِىْ ثَوْبِ امْرَأَةٍ اِلَّا عَائِشَةَ قَالَتْ اَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اَذَاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ثُمَّ اِنَّهُنَّ دَعَوْنَ فَاطِمَةَ فَاَرْسَلْنَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَلَّمَتْهُ فَقَالَ يٰبُنَيَّةُ اَلَا تُحِبِّيْنَ مَا اُحِبُّ قَالَتْ بَلٰى قَالَ فَاَحِبِّىْ هٰذِهٖ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَنَسٍ فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَآءِ فِىْ بَابِ بَدْءِ الْخَلْقِ بِرِوَايَةِ اَبِىْ مُوْسٰى۔

"اور حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ لوگ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ وہ اپنے ہدیے اور تحائف اس دن پیش کریں جو عائشہؓ کی باری کا دن ہو یعنی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ہدیے اور تحائف لانے والے اس دن کا انتظار کرتے تھے جس روز کہ آپ میرے ہاں تشریف فرما ہوتے تھے اور اس سے ان کا مقصد صرف رسول اللہ ﷺ کی (زیادہ سے زیادہ) رضا و خوشنودی حاصل کرنا ہوتا تھا حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی بیویاں دو ٹولیوں میں منقسم تھیں اور ان میں سے ہر ٹولی یکساں مزاج، یکساں رائے، اور یکساں طرز معاشرت و اختلاط رکھنے والی بیویوں پر مشتمل تھی) ایک ٹولی تو وہ تھی جس میں عائشہؓ حفصہؓ، صفیہؓ اور سودہؓ تھیں اور دوسری ٹولی وہ تھی جس میں اُمّ سلمہؓ اور رسول اللہ ﷺ کی باقی تمام بیویاں تھیں پس (ایک روز) اُمّ سلمہؓ سے بات چیت کی اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے عرض کرو کہ آپ لوگوں سے یہ فرمادیں کہ کوئی ہدیہ و تحفہ پیش کرنا چاہئے وہ (عائشہؓ کی باری کے دن کی تخصیص نہ کرے بلکہ) پیش کردے چاہے آپ کسی جگہ ہوں (خواہ وہ عائشہؓ کے گھر میں ہوں خواہ کسی اور بیوی کے گھر میں تاکہ عائشہؓ اور دوسری بیویوں کے درمیان سے وہ امتیاز اٹھ جائے جس سے ان بیویوں کو غیرت محسوس ہوتی ہے) چنانچہ ام سلمہؓ نے اس بارہ میں آنحضرت ﷺ سے گفتگو کی اور آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم مجھ کو عائشہؓ کے معاملہ میں تکلیف نہ پہنچاؤ (تم شاید نہیں جانتیں کہ) اس وقت میرے پاس وحی نہیں آتی جب میں کسی بیوی کے لحاف یا چادر میں ہوتا ہوں سوائے عائشہؓ کے ام سلمہؓ (یہ سن کر) بولیں یا رسول اللہ، میں اللہ کے حضور اس بات سے توبہ کرتی ہوں کہ آپ (ﷺ) کو تکلیف پہنچاؤں (یا کسی ایسے کام کا ارادہ بھی کروں جو آپ کو تکلیف پہنچانے کا باعث ہو) پھر ام سلمہؓ کی ٹولی کی عورتوں نے فاطمہؓ کو بلوایا اور ان کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا (تاکہ اس بارہ میں اب وہ آنحضرت ﷺ سے بات کریں) چنانچہ فاطمہؓ نے اس بارہ میں آپ سے گفتگو کی اور ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات سے لاعلم ہی ہوں کہ اس سے پہلے ام سلمہؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا چکی ہیں اور آنحضرت ان کو کن الفاظ میں جواب دے چکے ہیں، بہرحال آنحضرت ﷺ نے فاطمہ کی گفتگو سن کر ان سے فرمایا میری بیٹی! کیا تو اس سے محبت نہیں رکھتی جس سے میں محبت رکھتا ہوں فاطمہؓ بولیں کیوں نہیں (یقیناً میں ہر اس ذات سے محبت رکھتی ہوں اور محبت رکھوں گی

جس سے آپ محبت رکھتے ہیں) آپ نے فرمایا: تو پھر تم عائشہؓ سے محبت رکھو اور کسی ایسی بات کا ذکر نہ کرو جس سے عائشہؓ کو ناگواری ہو)
بخاری و مسلم اور حضرت انس کی روایت کردہ حدیث **فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الاطعمة باب بدا الخلق** میں ابو موسیٰ کی روایت سے نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: حضرت عائشہؓ کی ٹولی میں جو ازواج مطہرات تھیں ان کی سردار حضرت عائشہؓ تھیں کیونکہ تمام ازواج مطہرات میں آنحضرت کی سب سے چہیتی حضرت عائشہؓ ہی تھیں یہ نکتہ نوٹ کرنے کا ہے کہ ام المؤمنین حضرت حفصہؓ بن عمرؓ بھی نہ صرف یہ کہ حضرت عائشہؓ کی ٹولی میں تھی بلکہ اس کے اور عائشہؓ کے درمیان وہی کامل رفاقت و دوستی اور اتفاق و اتحاد تھا جو ان دونوں کے باپوں یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے درمیان تھا، حضرت ام سلمہؓ کی ٹولی میں جو امہات المؤمنین تھیں ان کی سردار حضرت ام سلمہؓ ہی تھیں یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ لوگوں نے آنحضرت کی خدمت میں ہدیے اور تحائف پیش کرنے کے لئے حضرت عائشہؓ کی باری کے دن کی جو تخصیص کر رکھی تھی وہ آنحضرت ﷺ کے کسی حکم اور ایماء کے تحت نہیں تھی اور چونکہ یہ معاملہ ازواج مطہرات کے حقوق سے متعلق نہیں تھا اس لئے آنحضرت ﷺ لوگوں کو اس سے منع بھی نہیں کرتے تھے۔

"سوائے عائشہؓ کے" یعنی صرف عائشہؓ ہی میری ایک ایسی بیوی ہے کہ اگر میں ان کے لحاف اور بستر میں ہوتا ہوں تو اس وقت بھی مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ ایک روایت میں فرماتی ہیں کہ آیت کریمہ انک لا تھدی من احببت الخ نازل ہوئی تو اس وقت میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ اپنے لحاف میں تھی۔

"اور حضرت انس کی روایت کردہ حدیث" یعنی صاحب مصابیح نے اس حدیث کو حضرت انسؓ کی روایت سے یہاں اس باب میں نقل کرا تھا جب کہ صاحب مشکوٰۃ نے اس کو حضرت ابوموسیٰ کی روایت سے باب بدء الخلق میں شامل کیا ہے واضح ہو کہ اس حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "عائشہؓ کی فضیلت دوسری عورتوں پر" تو پیچھے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اس بارہ میں مختلف اقوال ہیں کہ "عورتوں" سے کیا مراد ہے؟ ایک قول تو یہ ہے کہ عورتوں کی جنس یعنی کل عورتیں مراد ہیں ایک قول یہ ہے کہ "ازواج مطہرات" مراد ہیں، اور اس میں بھی اختلافی اقوال ہیں کہ آیا تمام ازواج مطہرات مراد ہیں یا حضرت خدیجہؓ کے علاوہ باقی ازواج مطہرات تاہم زیادہ صحیح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عائشہؓ تمام عورتوں سے افضل ہیں اور حضرت عائشہؓ کے علمی و عملی کمالات کا جامع ہونے کے سبب کہ جس کو آپ نے ثرید کی مشابہت کے ذریعہ واضح فرمایا ہے ظاہر اطلاق بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔

ابتداء باب میں ازواج مطہرات کے متعلق کچھ باتیں ذکر کی جا چکی ہیں پھر حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ کے بارے میں قدرے تفصیل بھی گذر چکی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ باقی ازواج مطہرات کے بھی کچھ احوال ذکر کر دیئے جائیں۔

حضرت سودہؓ: بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سکران بن عمرو بن عبدود کے نکاح میں تھیں جو ان کے عم زاد تھے انہوں نے پہلے اسلام قبول کیا پھر ان کی ترغیب پر سکران بھی مسلمان ہو گئے اور دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے حبشہ میں سکران کا انتقال ہو گیا تو آنحضرت نے ان کی دلداری کے لئے حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد ۱۰ نبوی میں ان سے نکاح کر لیا اسوقت تک آپ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح نہیں کیا تھا اور حضرت سودہ کی عمر پچاس سال تھی ایک زمانہ میں آنحضرت نے بعض حالات کے تحت ان کو طلاق دینی چاہی مگر پھر ان کی درخواست پر آپ ﷺ نے اپنا ارادہ منسوخ کر دیا تھا اور اسی وقت سے انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے دی تھی ان کا انتقال ۱۹ھ کے ماہ شوال میں مدینہ میں ہوا جب کہ ایک روایت میں ان کا سن وفات ۵۴ اور ایک روایت میں ۴۱ منقول ہے۔

حضرت حفصہؓ: حضرت حفصہؓ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق کی بیٹی ہیں ان کی ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا یہ پہلے جیش بن عقافہ سہمی کے نکاح میں تھیں، اپنے خاوند حضرت حبیشؓ کے ساتھ مکہ سے ہجرت کی اور مدینہ آگئی تھیں غزوہ بدر میں حضرت حبیشؓ شہید ہو گئے۔ تو حضرت عمرؓ نے ان کا نکاح حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عثمانؓ سے کرنا چاہا لیکن ان دونوں نے انکار کر دیا تب رسول اللہ ﷺ نے اپنا پیغام

ڈالا اور شعبان ۳ھ میں ان سے نکاح کیا ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے ان کو ایک طلاق دیدی تھیں لیکن جب آپ کے پاس وحی آئی کہ حفصہ ؓ سے رجوع کر لیجئے کیونکہ وہ بہت عبادت گزار بہت روزہ دار عورت ہے اور وہ جنت میں آپ کی زوجہ ہے تو آنحضرت نے رجوع کر لیا صحابہ تابعین ؒ کی ایک جماعت ان سے آنحضرت ﷺ کی احادیث نقل کرتی ہے انہوں نے بعمر ۶۰ سال شعبان ۴۵ھ میں وفات پائی۔

حضرت زینب بنت خزیمہ ؓ: یہ زمانہ جاہلیت ہی سے ام المساکین کے لقب سے یاد کی جاتی تھیں ان کا پہلا نکاح عقیل سے اور دوسرا عبیدہ سے ہوا ان دونوں کے بعد تیسرا نکاح حضرت عبداللہ بن جحش ؓ سے ہوا عبداللہ بن جحش ؓ جنگ احد میں شہید ہو گئے تو ۳ھ میں آنحضرت ﷺ نے زینب سے نکاح کر لیا لیکن نکاح کے چند ہی ماہ بعد انتقال کر گئیں۔

حضرت ام سلمہ ؓ: ان کا اصل نام ہند تھا نبی کریم ﷺ سے پیشتر حضرت ابوسلمہ ؓ عبداللہ بن عبدالاسد کے نکاح میں تھیں ابوسلمہ کی وفات کے بعد جو جنگ احد کے زخموں کی تاب نہ لا کر موت شہادت سے ہمکنار ہوئے تھے۔ اسی سال یا ۴ھ میں آنحضرت ﷺ نے ام سلمہ ؓ سے نکاح کیا ان کا انتقال بعمر ۸۴ سال مدینہ منورہ میں ۵۹ یا ایک روایت کے مطابق ۶۲ھ اور ایک روایت کے مطابق ۶۰ھ میں ہوا اور بقیع میں دفن کی گئیں۔

حضرت زینب بنت جحش ؓ: ان کی والدہ امیمہ عبدالمطلب کی بیٹی اور آنحضرت ﷺ کی پھوپھی تھیں یہ پہلے حضرت زید بن حارثہ کے نکاح میں تھیں جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، زید ؓ کے طلاق دینے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا ان کا اصل نام برہ تھا جس کو بدل کر آنحضرت ﷺ نے زینب نام رکھا تھا ان کا انتقال ۵۲ سال یا ایک روایت کے مطابق ۵۷ سال کی عمر میں مدینہ میں ہوا ان کے بارہ میں حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کا کہنا تھا میں نے کوئی عورت نہیں دیکھی جو دین میں زینب ؓ سے بہتر اور اللہ کا خوف ان سے زیادہ رکھنے والی ہو ان سے زیادہ سچ بولنے والی ہو ناتے داروں سے ان سے زیادہ حسن سلوک کرنے والی ہو، اللہ کی راہ میں اور اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنا مال اور اپنا نفس ان سے زیادہ لگانے والی ہو۔

حضرت ام حبیبہ ؓ: ان کا اصل نام رملہ تھا ابوسفیان بن صخر کی بیٹی ہیں ان کی ماں کا نام صفیہ بنت ابوالعاص تھا جو حضرت عثمان بن عفان ؓ کی پھوپھی ہیں ان کے پہلے شوہر عبید اللہ بن جحش کے انتقال کے بعد جو حبشہ میں جا کر عیسائی ہو گیا تھا اور بحالت ارتداد وہیں فوت ہوا حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے ۶ھ میں ان کا نکاح آنحضرت ﷺ سے کیا ان کا انتقال ۴۴ھ میں مدینہ منورہ میں ہوا۔

حضرت جویریہ ؓ: حضرت جویریہ بنت الحارث جب غزوہ مریسیع میں اسیر ہو کر آئیں تو حضرت ثابت بن قیس ؓ کے حصہ میں آئی تھیں کیونکہ انہوں ہی نے ان کو اسیر کیا تھا پھر حضرت ثابت بن قیس نے ان کو مکاتب کر دیا تھا، آنحضرت ﷺ نے ان کا زر کتابت ادا کر کے ان کو آزاد کر دیا اور پھر ان سے نکاح کر لیا، ان کا اصل نام برہ تھا جس کو آنحضرت ﷺ نے تبدیل کر کے جویریہ کر دیا تھا ۵۶ھ میں بعمر ۶۵ سال ان کی وفات ہوئی۔

حضرت صفیہ ؓ: حضرت صفیہ ؓ بنت حیی بن اخطب بن شعبہ سبط ہارون علیہ السلام سے ہیں، ان کا پہلا نکاح کنانہ بن ابی الحقیق یہودی سے ہوا تھا جنگ خیبر (محرم ۷ھ) میں کنانہ مارا گیا اور صفیہ ؓ اسیر ہو کر آئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنے لئے مخصوص کر لیا لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ حضرت دحیہ کلبی ؓ کے حصے میں آئی تھیں بعد میں آنحضرت ﷺ نے ان کو دحیہ کلبی ؓ سے خرید لیا پھر انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور آنحضرت نے ان سے نکاح کر لیا ان کی آزادی کو آنحضرت ﷺ نے ان کا مہر قرار دیا تھا ۵۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور بقیع میں مدفون ہوئیں۔

حضرت میمونہ ؓ: ان کا اصل نام بھی برہ تھا جس کو آنحضرت ﷺ نے بدل دیا اور میمونہ نام رکھا یہ پہلے مسعود بن عمرو ثقفی کے نکاح میں

تھیں، کچھ دونوں بعد مسعود بن عمرو نے ان کو چھوڑ دیا تو پھر ابودرہم کے مرنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان سے مکہ سے دس کو اس کے فاصلہ پر مقام سرف میں نکاح کیا جب کہ آپ عمرۃ القضا کے سفر میں تھے اور اتفاق کی بات ہے کہ ۶۱ھ یا ایک روایت کے مطابق ۵۱ھ میں ان کا انتقال بھی اس مقام سرف میں ہوا ام المؤمنین حضرت میمونہ آنحضرت ﷺ کی آخری زوجہ مطہرہ ہیں ان کی ایک بہن توام الفضل ہیں جو حضرت عباسؓ کی بیوی اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی والدہ ہیں ایک اور بہن حضرت اسماء بنت عمیسؓ ہیں جو حضرت جعفر طیار کے گھر میں تھیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

خواتین عالم میں سے چار افضل ترین خواتین

⑦ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ حَسْبُكَ مِنْ نِّسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَخَدِیْجَةُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ وَفَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَاٰسِیَةُ امْرَاَةُ فِرْعَوْنَ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام جہان کی عورتوں میں سے چار عورتوں کے مناقب و فضائل کا جان لینا تمہارے لئے کافی ہے اور وہ ہیں مریم بنت عمران یعنی حضرت عیسی علیہ اسلام کی والدہ ماجدہ خدیجہؓ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد ﷺ فرعون کی بیوی آسیہ۔" (ترمذیؒ)

تشریح: ظاہر یہ ہے کہ تمام جہان کی عورتوں میں سے افضل ترین چار خواتین کا ذکر اس حدیث میں جس ترتیب سے ہوا ہے وہی ترتیب ان چاروں کے درمیان فرق مراتب کی بھی ہے رہی یہ بات کہ اس موقع پر حضرت عائشہؓ کا ذکر کیوں نہیں ہوا تو اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کا بھی افضل ترین خواتین میں سے ہونا چونکہ بعض دوسری حدیثوں میں مذکور ہے اس لئے یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے یہ حدیث شاید اس وقت ارشاد فرمائی ہوگی کہ جب تک حضرت عائشہؓ کو وہ مقام کمال اور آنحضرت ﷺ کے وصال کا شرف حاصل نہیں ہوا ہوگا جس سے ان کی افضلیت کا تعین ہونا ہے تاہم یہاں وہ حدیث بھی سامنے رہنی چاہئے جس کو احمدؒ بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؒ سے بطریق مرفوع نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا مردوں میں تو بہت سے لوگ درجہ کمال کو پہنچے لیکن عورتوں میں سے فرعون کی بیوی آسیہ　　اور مریم بنت عمران کے علاوہ کوئی کامل نہیں ہوئی اور اسمیں تو کچھ شبہ نہیں کہ تمام عورتوں میں عائشہؓ کی افضلیت اور عورتوں پر ایسی ہی ہے جیسے ثرید کی فضیلت دوسرے کھانوں پر۔

سیوطیؒ نے نقایہ میں لکھا ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ تمام جہاں کی عورتوں میں سب سے افضل مریم علیہا السلام اور فاطمہ ہیں اور آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں سب سے افضل خدیجہؓ اور عائشہؓ میں سے کون زیادہ افضل ہے اس بارہ میں ایک قول تو حضرت خدیجہؓ کی افضیلت کا ہے اور دوسرا قول حضرت عائشہؓ کی افضلیت کا ہے اور تیسرا قول توقف کا ہے ملا علی قاریؒ نے سیوطیؒ کے ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے اور میرا کہنا ہے کہ صرف حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ ہی کے بارہ میں نہیں بلکہ ان سب مذکورہ خواتین کے بارہ میں توقف یعنی سکوت کرنا اولی ہے کیونکہ اس مسئلہ میں کوئی قطعی دلیل وارد نہیں ہے جس کی بنیاد پر حتمی طور سے کہا جاسکے کہ ان میں سے فلاں خاتون زیادہ افضل ہے اور جو ظنی دلیلیں موجود بھی ہیں وہ باہم متعارض ہیں اور ان کا عقائد کے باب میں کہ جو یقینیات پر مبنی ہیں کوئی فائدہ نہیں۔

حضرت عائشہؓ کی فضیلت

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَؓ اِنَّ جِبْرَئِیْلَ جَآءَ بِصُوْرَتِهَا فِیْ خِرْقَةٍ مِّنْ حَرِیْرٍ خَضْرَآءَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

فَقَالَ هٰذِهٖ زَوْجَتُكَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ حضرت جبرائیل سبز ریشمی کپڑے پر ان کی یعنی عائشہؓ کی تصویر رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دکھانے لائے اور کہا کہ یہ تمہاری بیوی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔" (الترمذیؒ)

تشریح: سبز ریشمی کپڑے پر اس سے معلوم ہوا کہ پیچھے کی حدیث میں خرقۃ من حریر کے جو الفاظ گزرے اس کی واحد مراد سفید ریشمی کپڑا لینا ٹھیک نہیں ہے جیسا کہ بعض حضرات نے بیان کیا ہے ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح کا خواب آپ نے متعدد بار دیکھا تو پھر اس مراد میں کوئی اشکال وارد نہیں ہوگا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک روایت سرقۃ من حریر کے الفاظ اور ایک روایت میں خرقۃ من حریر کے الفاظ نقل ہونا راوی کا اشتباہ ہے۔

حضرت صفیہؓ کی دلداری

(۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ بَلَغَ صَفِيَّةَ اَنَّ حَفْصَةَ قَالَتْ لَهَا بِنْتُ يَهُوْدِيٍّ فَبَكَتْ فَدَخَلَ عَلَيْهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهِيَ تَبْكِيْ فَقَالَ مَا يُبْكِيْكِ فَقَالَتْ قَالَتْ لِيْ حَفْصَةُ اِنِّيْ اِبْنَةُ يَهُوْدِيٍّ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكِ لَابْنَةُ نَبِيٍّ وَاِنَّ عَمَّكِ لَنَبِيٌّ وَاِنَّكِ تَحْتَ نَبِيٍّ فَفِيْمَ تَفْتَخِرُ عَلَيْكِ ثُمَّ قَالَ اتَّقِي اللّٰهَ يَا حَفْصَةُ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کو معلوم ہوا کہ ام المؤمنین حضرت حفصہؓ نے ان کو یہودی کی بیٹی کہا ہے تو وہ رونے لگیں اور جب رسول کریم ﷺ ان کے ہاں تشریف لے آئے تو وہ اس وقت بھی رو رہی تھیں، آپ نے ان سے پوچھا کیوں رو رہی ہو انہوں نے کہا میرے بارہ میں حفصہؓ نے کہا ہے کہ میں یہودی کی بیٹی ہوں یہ سنکر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم ان کے کہنے کا غم نہ کرو حقیقت تو یہ ہے کہ تم پیغمبر کی بیٹی ہو تمہارا چچا بھی پیغمبر تھا اور اب تم ایک پیغمبر کی یعنی میری بیوی ہو پھر آپ نے حفصہ کو متنبہ کیا کہ اے حفصہ، تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہئے۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: حضرت حفصہؓ کا باپ حیی بن اخطب دراصل حضرت ہارون پیغمبر علیہ السلام کی اولاد سے تھا اور حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے اس اعتبار سے حضرت صفیہؓ کے باپ یعنی جد اعلیٰ بھی پیغمبر ہوئے اور ان کے چچا بھی پیغمبر ہوئے یا یہ بات اپنے جد اکبر یعنی حضرت اسحٰق کے اعتبار سے فرمائی کہ گویا حضرت صفیہؓ کو حضرت اسحٰق کی بیٹی کہا اور حضرت اسمٰعیل کو ان کا چچا کہا اور اب تم ایک پیغمبر کی بیوی ہو یعنی حفصہؓ کو سوچنا چاہئے کہ تمہاری انسب اعلیٰ و اشرف نسبتوں کے مقابلہ پر خود ان کو ... اور کون سی اس سے بھی بڑی نسبت حاصل ہے اور ایسی کون سی بڑی فضیلت ان میں ہے کہ وہ تم پر فخر کرتی ہیں۔ اور نسب و نسل میں تمہیں اپنے سے کمتر سمجھتی ہیں واضح ہو کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا مقصد حضرت صفیہؓ کی دلداری اور اس تنقیص و تحقیر کا ازالہ کرنا تھا جو حضرت حفصہؓ کے الفاظ سے حضرت صفیہؓ نے محسوس کی تھی جب کہ وہ صفیہؓ نہ صرف اپنی ذات کے اعتبار سے ایک سردار خاندان کی معزز خاتون تھیں بلکہ اپنے دینی محاسن اور اوصاف کے اعتبار سے بھی ایک جامع شخصیت تھیں یہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت صفیہ کے حق میں یہ باتیں دوسری ازواج مطہرات پر ان کی کسی فضیلت و بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے فرمائی تھیں کیونکہ نسبتوں کا یہ شرف تنہا حضرت صفیہؓ کا حصہ نہیں تھا۔ اس شرف میں تو دوسری ازواج مطہرات بھی اس اعتبار سے شریک ہیں کہ وہ بھی تو ایک پیغمبر حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے ہیں جو حضرت اسحٰق کے بھائی تھے اور وہ سب بھی آنحضرت ﷺ کی بیویاں ہیں۔

تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہئے یعنی صفیہ کی مخالفت یا عداوت کے جذبہ سے تمہیں ایسی باتیں زبان سے نہیں نکالنی چاہئیں جو زمانہ جاہلیت کی یادگار ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ کسی حالت میں پسند نہیں کرتا۔

حضرت مریم علیہا السلام بنت عمران کا ذکر

⑩ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَا فَاطِمَةَ عَامَ الْفَتْحِ فَنَاجَاهَا فَبَكَتْ ثُمَّ حَدَّثَهَا فَضَحِكَتْ فَلَمَّا تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلْتُهَا عَنْ بُكَائِهَا وَضِحْكِهَا فَقَالَتْ اَخْبَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ يَمُوْتُ فَبَكَيْتُ ثُمَّ اَخْبَرَنِيْ اَنِّيْ سَيِّدَةُ نِسَاءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ اِلَّا مَرْيَمَ بِنْتَ عِمْرَانَ فَضَحِكْتُ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے ساتھ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فاطمہؓ کو اپنے قریب بلایا اور ان سے چپکے چپکے کچھ باتیں سنکر رونے لگیں پھر آنحضرت ﷺ نے دوبارہ ان سے اسی سرگوشی کے سے انداز میں باتیں کیں تو اب وہ ہنسنے لگیں اور پھر جب رسول اللہ ﷺ نے اس دنیا سے پردہ فرمالیا تو ایک روز میں نے ان کے اس دن کے رونے اور پھر ہنسنے کا سبب دریافت کیا انہوں نے بتایا کہ پہلے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی موت کے بارہ میں مجھ کو آگاہ کیا تھا جس کو سنکر میں رونے لگی تھیں پھر آپ نے جب مجھ کو بتایا کہ میں مریم بنت عمران کے سوا جنت کی ساری عورتوں کی سردار ہوں تو ہنسنے لگی تھی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اسی طرح کی روایت پیچھے گزر چکی ہے جس میں حضرت عائشہؓ کا ذکر ہے کہ انہوں نے جب حضرت فاطمہؓ سے رونے اور ہنسنے کا ماجرا پوچھا تو انہوں نے بتانے سے انکار کر دیا تھا لیکن حضور ﷺ کے بعد حضرت فاطمہؓ نے بتایا تھا اور یہاں بھی حضرت ام سلمہؓ نے بھی ذکر کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد فاطمہؓ نے بتایا، تاہم اس حدیث میں حضرت ام سلمہؓ کا اس واقعہ کو فتح مکہ کے سال کا ذکر کرنا ایک بڑا سہو ہے کیونکہ تحقیقی اور تاریخی طور پر اس قصہ کا وقوع فتح مکہ کے سال میں ثابت نہیں ہے بلکہ یہ واقعہ یا تو آنحضرت ﷺ کے حجۃ الوداع کے زمانہ کا ہے یا مرض الموت کے دوران کا دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت فاطمہؓ کے یہ الفاظ کہ آپ نے مجھ کو جب یہ بتایا کہ میں مریم بنت عمران کے سوا جنت کی ساری عورتوں کی سردار ہوں تو ہنسنے لگی مذکورہ سابق روایت کے منافی نہیں ہیں جس میں یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے یہ بھی کہا تھا کہ میرے اہل بیت میں سے تم ہی سب سے پہلے مجھ سے آکر ملوگی۔

اس روایت کے تحت ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث کو اس باب سے کیا مناسبت ہے اس میں چونکہ حضرت فاطمہؓ کی منقبت وفضیلت کا ذکر ہے، لہٰذا یہ حدیث مناقب اہل بیت کے باب میں نقل کی جانی چاہئے تھی نہ کہ اس باب میں جو ازواج مطہرات کے مناقب کے ساتھ مخصوص ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ظاہری طور پر کوئی مناسبت سمجھ میں نہیں آتی بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ روایت ضمناً اس روایت سے متعلق ہے جو اس فصل دوم کی پہلی روایت ہے اور جس میں حضرت خدیجہؓ اور حضرت مریمؑ کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کا بھی ذکر ہے اس کو یوں کہہ لیجئے کہ اس فصل کے شروع میں جو روایت نقل کی گئی اس کے بعض حصہ کے بارہ میں چونکہ کچھ مزید باتیں اس حدیث سے معلوم ہوتی تھیں اس لئے اس کو یہاں نقل کر دیا گیا اگرچہ حدیث اصلاً اس سے تعلق نہیں رکھتی اور یہ بھی بعید نہیں کہ اس حدیث کو اس باب میں نقل کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہو جو حضرت مریمؑ کے بارہ میں نقل ہوئی ہے کہ وہ جنت میں آنحضرت ﷺ کی بیوی ہوں گی۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت عائشہؓ کی علمی عظمت

⑪ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰىؓ قَالَ مَا اَشْكَلَ عَلَيْنَا اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ

اِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ ﷺ کو جب بھی کسی حدیث یا دینی مسائل سے متعلق کسی بات میں کوئی اشکال پیش آتا تو ہم حضرت عائشہؓ سے رجوع کرتے اور ہمیں اس حدیث یا مسئلہ سے متعلق کافی علم حضرت عائشہؓ کے مل جاتا اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ کہ حضرت عائشہؓ نے جو بے پناہ علم آنحضرت ﷺ سے سن کر اپنی قوت اجتہاد سے حاصل کیا تھا اس کے ذریعہ وہ صحابہؓ کے مشکل علمی سوال حل کر دیتی تھیں اور حدیث وغیرہ کے بارے میں جو بھی اشکال ان کو پیش آتا تھا اس کو دور کر دیتی تھیں۔

عائشہؓ سے زیادہ فصیح کسی کو نہیں پایا

⑫ وَعَنْ مُوْسَی بْنِ طَلْحَةَ قَالَ مَا رَاَیْتُ اَحَدًا اَفْصَحَ مِنْ عَائِشَةَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت موسیٰ بن طلحہؒ تابعی کہتے ہیں کہ میں نے عائشہؓ سے زیادہ فصیح کسی کو نہیں پایا اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔"

تشریح: ابن طلحہؒ نے یہ بات یا تو حضرت عائشہؓ کی انتہائی تعریف میں کہی ہے یا واقعۃً انہوں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ فصیح کوئی شخص نہ دیکھا اور نہ پایا ہو۔

باب جامع المناقب

مناقب کا جامع بیان

اس باب میں مؤلف نے کسی خاص جماعت و زمرہ کی تخصیص کے بغیر اور الگ الگ باب قائم کرنے کے بجائے مجموعی طور پر کچھ مشاہیر صحابہ کے فضائل و مناقب پر مشتمل احادیث نقل کی ہیں ان مشاہیر میں خلفائے راشدین بھی ہیں اور اہل بیت بھی، عشرہ مبشرہ بھی ہیں اور ازواج مطہرات بھی مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی اور ان کے علاوہ دوسرے صحابہ بھی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت

① عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ رَاَیْتُ فِی الْمَنَامِ کَاَنَّ فِیْ یَدِیْ سَرَقَةً مِنْ حَرِیْرٍ لَا اَهْوِیْ بِهَا اِلٰی مَکَانٍ فِی الْجَنَّةِ اِلَّا طَارَتْ بِهِ اِلَیْهِ فَقَصَصْتُهَا عَلٰی حَفْصَةَ فَقَصَّتْهَا حَفْصَةُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اَخَاكِ رَجُلٌ صَالِحٌ اَوْ اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ رَجُلٌ صَالِحٌ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں میں نے ایک روز خواب میں دیکھا کہ گویا میرے ہاتھ میں ریشم کے کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے اور میں ریشمی ٹکڑے کے ذریعہ جنت کے جس محل کی طرف بھی جانا چاہتا ہوں وہ ٹکڑا مجھ کو اڑا کر وہاں تک پہنچا دیتا ہے یعنی مجھ کو ایسا لگا جیسے وہ ٹکڑا میرے لئے پنکھ بن گیا ہے اور میں جنت کے جس بلند درجہ و محل تک جانا چاہتا ہوں اس پنکھ کے ذریعہ اڑ کر پہنچ جاتا ہوں پھر میں نے یہ خواب اپنی بہن ام المؤمنین حفصہؓ سے بیان کیا اور انہوں نے اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ

تمہارا بھائی مرد صالح ہے۔ یا یہ الفاظ فرمائے حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ مرد صالح ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: گویا آپ ﷺ نے یہ تعبیر دی کہ وہ ریشمی ٹکڑا دراصل عبداللہ کے نیک اعمال اور اس کی پاکیزہ زندگی کے اوراق ہیں جو ان کو جنت کے بلند مراتب و مدارج تک پہنچائیں گے۔

عبداللہ ابن عمرؓ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے بیٹے ہیں جس سال آنحضرت ﷺ نبوت سے سرفراز ہوئے اس سے ایک سال قبل ان کی ولادت ہوئی، چھوٹی ہی عمر میں انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت عمرؓ کے ساتھ مکہ میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ غزوہ خندق کے بعد کے تمام غزوؤں میں شریک رہے ہیں علم و دانائی زہد و ورع اور تقویٰ میں کامل جانے جاتے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ فرمایا کرتے تھے۔ مامنا احد الا مالت بہ الدنیا و مال الیھا ماخلا عمر و ابنہ عبداللہ حضرت نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ ابن عمر نے مرتے دم تک جن انسانوں غلاموں کو آزاد کیا ان کی تعداد ایک ہزار بلکہ اس سے بھی متجاوز ہے۔ اتباع نبوی اور حب رسول میں ابن عمرؓ کا امتیازی مقام ہے۔

وہ جب بھی حج کو جاتے تو ان مقامات پر، کہ جہاں آنحضرت ﷺ حج میں ٹھہرا کرتے تھے جیسے عرفات وغیرہ تمام حاجیوں سے پہلے پہنچ جایا کرتے تھے۔ منقول ہے کہ ایک دن حجاج بن یوسف نے فجر یا عصر کی نماز میں تاخیر کی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس سے کہا کہ نماز پڑھ لو، ورنہ سورج تمہارا انتظار نہیں کرے گا حجاج کو ان کا یہ کہنا بہت ناگوار گذرا، چنانچہ وہ بولا جی چاہتا ہے کہ تمہاری آنکھیں پھوڑدوں یا یوں کہا کہ جی چاہتا ہے کہ تمہارا سر قلم کردوں حضرت عبداللہؓ نے یہ سن کر فرمایا اگر تم ایسا کر گذرو تو کیا بعید کیونکہ تم تو ایک نادان حاکم کی صورت میں ہم پر مسلط ہو۔ اور بعض حضرات نے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے یہ بات آہستہ سے کہی تھی اور حجاج نے نہیں سنا تھا بہرحال حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی اس حق گوئی و صاف بیانی کے سبب یا کسی اور وجہ سے حجاج ان سے سخت ناراض ہوگیا اور اس نے ایک شخص کو حکم دیا کہ ابن عمر کا نیزہ قبضہ میں لے کر ان کو نہتا کردو اور پھر اس نے نہ صرف یہ کہ راستہ میں ان پر پتھراؤ کرایا بلکہ زہر میں بجھے ہوئے حربہ سے ان کے پاؤں کی پشت میں کاری زخم لگوایا۔ اسی کے سبب حضرت ابن عمرؓ چند روز سخت بیمار رہ کر انتقال فرماگئے۔ یہ واقعہ حضرت ابن زبیرؓ کے حادثہ شہادت کے تین ماہ بعد ۷۳ھ میں پیش آیا۔ اس وقت حضرت ابن عمرؓ ۸۴ سال کی تھے ان کا جسد خاکی ذی طوی میں سپرد خاک کیا گیا۔

عبداللہ ابن مسعود کی فضیلت

(۲) وَعَنْ حُذَيْفَةَؓ قَالَ اِنَّ اَشْبَهَ النَّاسِ دَلًّا وَّسَمْتًا وَّهَدْيًا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَابْنُ اُمِّ عَبْدٍ مِنْ حِيْنَ يَخْرُجُ مِنْ بَيْتِهٖ اِلٰى اَنْ يَّرْجِعَ اِلَيْهِ لَا نَدْرِيْ مَا يَصْنَعُ فِيْ اَهْلِهٖ اِذَا خَلَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ وقار، میانہ روی اور راست روی میں رسول کریم ﷺ سے سب سے زیادہ وہ مشابہت رکھنے والا آدمی ام عبد کا بیٹا ہے، اس وقت سے کہ اپنے گھر سے باہر آتے ہیں اور اس وقت تک کہ جب وہ گھر میں جاتے ہیں۔ گھر والوں کے درمیان یعنی گھر میں اہل و عیال کے ساتھ یا تنہا وہ کس حال میں رہتے ہیں یہ ہم کو معلوم نہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: "ام عبد کے بیٹے" سے مراد حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں۔ ان کی والدہ کی کنیت ام عبد تھی۔

دَلّ کے معنی سیرت، حالت، ہیبت کے بھی آتے ہیں اور بعض حضرات نے اس کے معنی خوش کلامی، خوش گوئی بھی بیان کئے ہیں کہ یہ لفظ گویا "دلالت" سے ماخوذ ہے اور جس کے ذریعہ کسی انسان کی اس ظاہری حالت و خوبی کو تعبیر کیا جاتا ہے جو اس کے حسن سیرت اور اس کی نیک خصلتی پر دلالت کرے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ دل کے قریب قریب وہی معنی ہیں جو ھدی کے ہیں لیکن یہاں حدیث میں اس لفظ سے سکینت یعنی متانت و سنجیدگی وقار اور خوبصورتی کے معنی مراد ہیں۔ اور مجمع البحار میں لکھا ہے دل کا لفظ شکل و شمائل کے معنی رکھتا ہے

"سمت" کے معنی ہیں راستہ، میانہ روی اور اس لفظ کا استعمال اہل خیر و صلاح کے طور طریق اور اس کی ہیئت و حالت کے لئے بھی کیا جاتا ہے چنانچہ قاموس میں "سمت" کے معنی طریق یعنی راستہ اور اہل خیر کی ہیئت کے لکھے ہیں۔ اور صراح میں لکھا ہے "سمت" کے معنی ہیں نیک راہ و روش۔

ھدی کے معنی طریقہ سیرت۔ اہل خیر کی ہیئت و حالت کے ہیں۔ حاصل یہ کہ یہ تینوں لفظ یعنی دل سمت ھدی معنی و مفہوم میں قریب قریب ہیں اور عام طور پر یہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ ہی استعمال ہوتے ہیں۔

اس وقت سے کہ یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ کی جو ظاہری زندگی ہمارے سامنے ہے اور ان کے جو احوال ہم پر عیاں ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نہایت پاکیزہ نفس اور راست رو ہیں اور ہم ظاہری احوال ہی کے بارے میں گواہی دے سکتے ہیں باطن کا حال ہمیں معلوم نہیں، کہ اندر کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔

(۳) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّؓ قَالَ قَدِمْتُ اَنَا وَاَخِیْ مِنَ الْیَمَنِ فَمَکَثْنَا حِیْنًا مَانُرٰی اِلَّا اَنَّ عَبْدَاللّٰہِ بْنَ مَسْعُوْدٍ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ بَیْتِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِمَا نُرٰی مِنْ دُخُوْلِہٖ وَدُخُوْلِ اُمِّہٖ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی یمن سے مدینہ منورہ آئے تو یہاں در نبوت پر ایک عرصہ تک مقیم رہے، اس دوران ہم نے ہمیشہ یہی خیال کیا کہ عبداللہ ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ کے گھروالوں میں سے ایک آدمی ہیں، کیونکہ ہم ان کو اور ان کی والدہ کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں وقت بے وقت آتے جاتے دیکھا کرتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ایک روایت میں آیا ہے آنحضرت ﷺ نے عبداللہ ابن مسعودؓ کو کہہ رکھا تھا کہ اگر ایک آدمی میرے پاس دیکھو تو اجازت طلب کئے بغیر آجایا کرو، اور ایک روایت میں ضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے یوں بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمارکھا تھا کہ جب پردہ نہ پڑا ہوا ہو اور تم میری آواز سنو تو بس یہی تمہارے لئے اجازت ہے، جب تک کہ میں تمہیں منع نہ کروں اجازت طلب کئے بغیر آیا جایا کرو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی، ہذلی ہیں۔ صاحب السواد والسواک کے لقب سے مشہور تھے ان کو ابتدائے دعوت ہی میں قبول اسلام کی توفیق نصیب ہوگئی تھی چنانچہ آنحضرت ﷺ کے دار ارقم میں منتقل ہونے سے پہلے ہی مسلمان ہوگئے تھے۔ اس وقت تک حضرت عمرؓ نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ چھٹے مسلمان ہیں، ان سے پہلے صرف پانچ آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا قبول اسلام کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اپنی متعدد خدمتیں ان کے سپرد کردی تھیں، چنانچہ آپ ﷺ کی مسواک انہی کے پاس رہا کرتی تھی، آپ ﷺ کو جوتی پہنایا کرتے تھے۔ سفر میں آپ ﷺ کے لئے طہارت و وضو وغیرہ کا پانی رکھتے تھے اور جب آنحضرت ﷺ غسل فرماتے تو یہ پردہ کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے حبشہ کو بھی ہجرت کی تھی اور پھر مدینہ کو بھی ہجرت کی بدر اور دوسرے غزوات و مشاہد میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی جنت کی بشارت دی تھی۔ اور فرمایا تھا میں اپنی امت کے لئے وہ چیز پسند کرتا ہوں جو ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کو پسند ہے۔ اور میں اپنی ——— امت کے حق میں اس چیز کو ناپسند کرتا ہوں جو ابن ام عبد کو ناپسند ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ گندم گوں تھے۔ اور ان کا جسم اس قدر دبلا و نحیف اور قد اتنا چھوٹا تھا کہ بیٹھا ہوا لانبا آدمی ان کے برابر نظر آتا تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو کوفہ کا قاضی اور وہاں کے بیت المال کا نگراں مقرر کیا تھا۔ اور خلافت عثمانی کے ابتدائی عہد تک اسی منصب پر فائز رہے۔ پھر مدینہ آگئے تھے۔ اور مدینہ ہی میں ۳۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر کچھ اوپر ساٹھ سال تھی۔ ان سے روایت حدیث کرنے والوں میں صحابہ و تابعین کی ایک بڑی جماعت کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت

عثمانؓ بھی شامل ہیں۔ ہمارے ائمہ کا کہنا ہے کہ خلفائے اربعہ کے استثناء کے بعد تمام صحابہ میں سب سے بڑے فقیہہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ ہی تھے۔

وہ چار صحابہؓ جن سے قرآن سیکھنے کا حکم آنحضرت ﷺ نے دیا

④ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍؓ وَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اسْتَقْرِؤُ الْقُرْاٰنَ مِنْ اَرْبَعَۃٍ مِّنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَسَالِمٍ مَوْلٰی اَبِیْ حُذَیْفَۃَ وَاُبَیِّ ابْنِ کَعْبٍ وَمُعَاذِبْنِ جَبَلٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن ان چار آدمیوں سے حاصل کرو اور ان سے پڑھو عبداللہ ابن مسعودؓ سے ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ سے ابی بن کعبؓ سے اور معاذ بن جبلؓ سے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: ان چاروں حضرات صحابہؓ نے قرآن کریم براہ راست سرکار دوعالم ﷺ سے حاصل کیا اور سیکھا تھا جب کہ اوروں نے دوسرے حضرات سے قرآن سیکھا اور حاصل کیا تھا۔ یہ چاروں حافظ قرآن بھی تھے اور صحابہؓ میں بڑے قاری بھی تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان چاروں کی خصوصی فضیلت سے لوگوں کو آگاہ فرمایا۔

حضرت سالمؓ: ان کا نام سالم بن معقلؓ ہے حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس کے آزاد کردہ غلام ہیں فارس ایران کے شہر اصطرخ یا اصطحرخ کے رہنے والے تھے ارباب فضل و کمال جلیل القدر اور بزرگ صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے غزوہ بدر میں شریک تھے مدینہ میں ان مہاجرین کی امامت نماز کا شرف انہی کو حاصل ہوتا تھا جو آنحضرت ﷺ سے پہلے ہجرت کر کے آگئے تھے باوجودیکہ ان میں عمرؓ اور حضرت ابوسلمہ بھی موجود ہوتے تھے۔ حضرت ابوحذیفہؓ کا اصل نام ہشام تھا۔ فضلائے صحابہ اور مہاجرین اولین میں سے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے دار ارقم میں آنے سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

حضرت ابی بن کعبؓ: حضرت ابی بن کعبؓ انصار صحابہؓ میں سے ہیں بڑے قاری ہیں، ان کو سید القراء کہا جاتا تھا حضرت عمرؓ ان کو سید المسلمین کے لقب سے یاد کرتے تھے آنحضرت ﷺ کے کاتب وحی ہیں۔

حضرت معاذ بن جبلؓ: حضرت معاذؓ بھی انصار سے ہیں۔ ان کے فضائل و مناقب بھی بے شمار ہیں آنحضرت ﷺ نے ان کے اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے درمیان بھائی چارہ کرایا تھا۔

ابن مسعودؓ، عمارؓ اور حذیفہؓ کی فضیلت

⑤ وَعَنْ عَلْقَمَۃَ قَالَ قَدِمْتُ الشَّامَ فَصَلَّیْتُ رَکْعَتَیْنِ ثُمَّ قُلْتُ اللّٰھُمَّ یَسِّرْلِیْ جَلِیْسًا صَالِحًا فَاَتَیْتُ قَوْمًا فَجَلَسْتُ اِلَیْھِمْ فَاِذَا شَیْخٌ قَدْجَاءَ حَتّٰی جَلَسَ اِلٰی جَنْبِیْ قُلْتُ مَنْ ھٰذَا قَالُوْا اَبُوْدَرْدَاءَ قُلْتُ اِنِّیْ دَعَوْتُ اللّٰہَ اَنْ یُّسَیِّرَلِیْ جَلِیْسًا صَالِحًا فَیَسَّرَکَ لِیْ فَقَالَ مَنْ اَنْتَ قُلْتُ مِنْ اَھْلِ الْکُوْفَۃِ قَالَ اَوَلَیْسَ عِنْدَکُمْ ابْنُ اُمِّ عَبْدٍ صَاحِبَ النَّعْلَیْنِ وَالْوِسَادَۃِ وَ الْمِطْھَرَۃِ وَفِیْکُمُ الَّذِیْ اَجَارَہُ اللّٰہُ مِنَ الشَّیْطٰنِ عَلٰی لِسَانِ نَبِیِّہٖ یَعْنِیْ عَمَّارًا اَوَلَیْسَ فِیْکُمْ صَاحِبُ السِّرِّ الَّذِیْ لَا یَعْلَمُہٗ غَیْرُہٗ یَعْنِیْ حُذَیْفَۃَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت علقمہؒ (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ جب میں ملک شام پہنچا اور دمشق کی جامع مسجد میں حاضر ہوا تو وہاں دو رکعت نماز پڑھی اور پھر میں نے دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھ کو نیک ہمنشیں میسر فرما! پھر میں ایک جماعت میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اچانک ایک بزرگ آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ میں نے (لوگوں سے) پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ مشہور صحابی حضرت ابودرداءؓ ہیں میں یہ سن کر خوشی سے کھل اٹھا اور حضرت ابودرداءؓ سے بولا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ مجھ کو نیک ہمنشین میسر فرما اور اللہ تعالیٰ نے آپ

جیسا نیک ہمنشین مجھ کو میسر فرمادیا یہ سن کر حضرت ابودرداءؓ نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں کوفہ کا رہنے والا ہوں اور وہیں سے آیا ہوں حضرت ابودرداءؓ بولے کیا تمہارے یہاں (کوفہ میں) ابن ام عبد یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ نہیں ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ کی جوتیاں تکیہ اور چھاگل رکھنے کا شرف حاصل تھا کیا تمہارے یہاں وہ صاحب نہیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی لسان مبارک کے ذریعہ شیطان سے پناہ وامان عطا کی ہے۔ یعنی عمارؓ اور کیا تمہارے یہاں وہ صاحب نہیں ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ کے اس راز کا محرم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جس کو ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا ہے یعنی حذیفہؓ۔" (بخاری)

تشریح: نیک ہمنشیں میں نیک سے مراد یا تو عالم باعمل ہے یا وہ شخص کہ جو اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے بھی "آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے" یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی دعا کا جواب تھا کہ انہوں نے نیک ہمنشیں کی مخلصانہ درخواست کی اور حق تعالیٰ نے صحابی رسول جیسی جلیل القدر ہستی ان کے پاس بھیج دی یہاں وہ روایت مدنظر رہنی چاہئے کہ جس میں فرمایا گیا ہے۔ ان للہ ملائکۃ تجر الاھل الی الاھل۔

اور چھاگل رکھنے کا شرف حاصل تھا حضرت ابودرداءؓ کی مراد حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ وہ سرکار دوعالم ﷺ کے ذاتی خادم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ آپ ﷺ کی خدمت میں موجود رہتے تھے سفر و حضر میں آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ رہتے، جب آنحضرت ﷺ سونے کا ارادہ فرماتے تو وہ آپ کا بستر ٹھیک کرتے اور آپ ﷺ کا تکیہ لاکر رکھتے جب آپ ﷺ وضو کے لئے اٹھتے تو وہ وضو کا پانی تیار رکھتے اور سفر وغیرہ میں آپ کے پانی کی چھاگل اپنے ساتھ رکھتے اور ضرورت کے وقت آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کردیتے۔ پس حضرت ابودرداءؓ نے حضرت علقمہ کو گویا توجہ دلائی کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو آنحضرت ﷺ کی صحبت و خدمت میں جس زبردست قربت ووابستگی اور لزوم وتسلسل کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے اس نے ان کو دین و شریعت کے علم میں یقیناً اتنا لائق فائق اور اتنا کامل بنادیا ہے کہ کوئی طالب علم ان کو چھوڑ کر کسی دوسرے صاحب علم کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرسکتا۔ اس سے ایک تو اس بات کی تائید ہوتی ہے جو علماء نے طلب علم اور طالبان علم کے آداب میں بیان کی ہے کہ طالب علم کو پہلے اپنے شہر اور اپنے علاقہ کے علماء سے علم حاصل کرنا اور ان سے خوب استفادہ کرنا چاہئے اگر مزید علم حاصل کرنے کا ارادہ ہو تب دوسرے شہروں کو جائے اور سفر و مسافرت کے تعب و پریشانی میں مبتلا ہو۔ دوسرے یہ بات معلوم ہوئی کہ عالم کو چاہئے کہ اگر دوسرے عالم کو اپنے سے افضل جانتا ہے تو طالب علم کو اس کا حوالہ دیدے۔

"یعنی عمارؓ" حضرت عمارؓ کو آنحضرت ﷺ نے "طیب" اور "مطیب" (پاک اور پاکیزہ) سے تعبیر فرمایا تھا، ان کو جنت کی بشارت عطا فرمائی تھی، اور جب دشمنان دین ان کو سخت اذیتیں پہنچایا کرتے تھے یہاں تک کہ ایک مرتبہ ان کو آگ میں ڈال دیا گیا تو اس وقت آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا، اے آگ! عمار کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی کا ذریعہ بن جا جیسا کہ تو ابراہیم خلیل اللہ کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی کا ذریعہ بن گئی تھی، نیز ایک موقع پر آپ ﷺ نے ان کو مخاطب کرکے فرمایا تھا! تم کو باغیوں کا گروہ قتل کرے گا۔ تم ان کو جنت کی طرف بلاؤ گے اور وہ تم کو آگ کی طرف لے جانا چاہیں گے۔ پس حضرت عمارؓ کے حق میں آنحضرت ﷺ کے ان ارشادات اور بشارتوں کا مطلب یہ تھا کہ وہ راہ حق پر ثابت قدم رہیں اور شیطانی وسوسے ان کو بھٹکائیں نہیں۔ اور اسی کو حضرت ابودرداءؓ نے اس بات سے تعبیر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے عمار کو اپنے پیغمبر کی لسان مبارک کے ذریعہ شیطان سے پناہ و امان عطا کی ہے۔

حضرت عمارؓ کے والد کا نام "یاسرؓ" اور والدہ کا نام سمیہ ہے، یاسر کا وطن یمن تھا لیکن مکہ میں آکر رہ پڑے تھے اور یہاں انہوں نے ابوحذیفہ بن مغیرہ سے، جو بنو مخزوم میں سے تھے، حلف کی دوستی کرلی تھی اور انہی کی لونڈی "سمیہؓ" سے نکاح کرلیا تھا حضرت عمارؓ انہی "سمیہؓ" سے پیدا ہوئے ان کے پیدا ہونے کے بعد ابوحذیفہ نے ان کو آزاد کردیا تھا۔ اور اسی اعتبار سے حضرت عمارؓ بنو مخزوم کے آزاد کردہ غلام کہے جاتے ہیں۔ حضرت عمار بن یاسرؓ ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اسلام کی طرف سبقت کی تھی، ابتدائے

اسلام میں کفار مکہ جن کمزور ولاچار مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بناتے تھے اور ان کو اسلام سے منحرف کرنے کے لئے نہایت سخت اور وحشیانہ اذیتیں پہنچاتے تھے، اور ان میں حضرت عمارؓ سرفہرست تھے۔ شقی القلب مشرک ان کو آگ کے عذاب میں مبتلا کیا کرتے تھے۔ اور آنحضرت ﷺ ان کے پاس پہنچتے تو ان کے سر اور جسم پر اپنا دست مبارک پھیرتے جاتے اور فرماتے جاتے۔ یانار کونی برداوسلاماعلی عمار کماکنت علی ابراهیم (اے آگ! عمار پر ٹھنڈی ہو جیسا کہ تو ابراہیم خلیل اللہ پر ٹھنڈی ہوگئی تھی) حضرت عمارؓ اولین مہاجرین میں ہیں، غزوۂ بدر اور دوسرے تمام جہادوں میں شریک ہوئے اور ۳۷ ھ میں جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا اور اس وقت ان کی عمر ۹۳ سال تھی۔

"یعنی حذیفہؓ" حضرت حذیفہؓ کو "صاحب سر رسول اللہ ﷺ" کہا جاتا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ان پر وہ مختلف راز اور بھید منکشف فرما رکھے تھے جن کا عام انکشاف دینی وملی مصالح کے تحت مناسب نہیں تھا ان بھیدوں میں ایک بھید تو یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو منافقین اسلام کے نام، ان کے نسب، اور نفاق کی علامتیں بتادی تھیں، اس بناء پر ان کو پوری طرح معلوم تھا کہ کون شخص مخلص مسلمان نہیں ہے بلکہ منافق ہے، منقول ہے کہ ایک روز امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق نے پوچھا کہ اے حذیفہ، کیا تم میرے اندر نفاق کی کوئی علامت دیکھتے ہو؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا: نہیں، خدا کی قسم آپ میں مجھ کو نفاق کی کوئی علامت نظر نہیں آتی، ہاں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کے دسترخوان پر رنگ برنگ کے کھانے موجود ہوتے ہیں لیکن جب اس کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ دسترخوان پر کچھ انڈے رکھے ہوتے تھے جو توڑے جانے کے بعد زرد و سفید رنگ کی صورت میں الگ الگ چیز معلوم ہوتے تھے۔ حضرت حذیفہؓ نے ۳۵ ھ میں بمقام مدائن، وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

حضرت انس کی والدہ ام سلیم اور حضرت بلال کی فضیلت

(۶) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اُرِیْتُ الْجَنَّۃَ فَرَاَیْتُ امْرَاَۃَ اَبِیْ طَلْحَۃَ وَسَمِعْتُ خَشْخَشَۃً اَمَامِیْ فَاِذَا بِلَالٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: مجھ کو جنت دکھائی گئی تو میں نے اس میں ابو طلحہؓ کی بیوی کو دیکھا، پھر میں نے اپنے آگے قدموں کی چاپ سنی تو کیا دیکھتا ہوں کہ بلالؓ ہیں (جو آگے آگے جنت میں چلے جارہے ہیں۔" (مسلم)

تشریح: "ابو طلحہ کی بیوی" سے مراد حضرت ام سلیمؓ ہیں جو حضرت انسؓ کی والدہ ماجدہ ہیں۔ ان کے نام کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ان کا پہلا نکاح مالک بن نضر سے ہوا تھا اور اسی سے حضرت انس پیدا ہوئے، مالک بن نضر مشرک تھا اور شرک ہی کی حالت میں مارا گیا، اس کے بعد ام سلیمؓ مسلمان ہوگئیں اور ابو طلحہؓ نے ان سے نکاح کا پیغام دیا اس وقت تک ابو طلحہؓ نے اسلام قبول نہیں کیا تھا چنانچہ حضرت ام سلیم نے ان کا پیغام رد کردیا اور ان کو اسلام کی دعوت دی ابو طلحہؓ نے اسلام قبول کیا تو حضرت ام سلمہؓ نے ان سے نکاح کرلیا اور کہا کہ میں خود کو تمہارے اسلام کے عوض تمہاری زوجیت میں دیتی ہوں، تمہارا یہ اسلام قبول کرنا ہی میرا مہر ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

حضرت بلالؓ، ابورباح کے بیٹے تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں، نہایت قدیم الاسلام ہیں، مکہ میں اپنے اسلام کا سب سے پہلے اعلان و اظہار کرنے والے یہی ہیں، آنحضرت ﷺ کے مؤذن خاص تھے انہوں نے غزوۂ بدر اور اس کے بعد جہادوں میں شرکت کی، آخر میں شام چلے گئے اور وہیں کے سکونت پزیر ہوگئے تھے۔ ۲۰ ھ میں بمقام دمشق فوت ہوئے، اور باب الصغیر میں دفن کئے گئے اس وقت ان کی عمر ۶۳ سال تھی انہوں نے اپنا کوئی وارث نہیں چھوڑا، صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کو ان سے روایت حدیث کا شرف حاصل ہے۔ حضرت بلالؓ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو قبول اسلام کی "پاداش" میں کفار مکہ کے سخت ظلم و ستم کا نشانہ

بنے تھے۔ امیہ بن خلف ان کو نہایت سخت اذیتیں پہنچایا کرتا تھا اور تقدیر الٰہی سے ایسا ہوا کہ غزوۂ بدر میں وہ موذی حضرت بلالؓ ہی کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔ ایک روایت میں حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے۔ ابو بکر سیدنا و اعتق سیدنا یعنی ابوبکرؓ ہمارے آقا ہیں اور انہوں نے ہمارے آقا (بلال) کو آزاد کیا۔

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جن لوگوں نے اسلام کا انکشاف و اظہار کیا وہ سات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمارؓ، حضرت عمارؓ کی والدہ حضرت سمیہؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت مقدادؓ۔ پس اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو تو دشمنان دین کی اذیتوں سے آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کے ذریعہ محفوظ رکھا، اور حضرت ابوبکرؓ کو ان کے قبیلہ و خاندان کے سبب تحفظ حاصل رہا، باقی پانچوں کو مشرکوں نے کمزور و لاچار جان کر اپنا ہدف بنالیا۔ وہ ظالم ان کو وحشیانہ سزائیں دیتے تھے، یہاں تک کہ ان کو لوہے کی زر ہیں پہنا کر تپتی ہوئی دھوپ میں ڈال دیا کرتے تھے۔ پھر ان پانچوں میں سے سوائے بلالؓ کے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے پنجے سے نجات دلائی اور ان کو ذی عزت بنا دیا۔ مگر بلالؓ کمزور و لاچار ہی رہے، اللہ کی راہ میں مصائب و شدائد سے بچانے والی کوئی خاندانی و قبائلی طاقت ان کو حاصل نہیں ہوئی۔ مشرکین مکہ کی ظالمانہ گرفت ان پر سخت سے سخت ہوگئی، انہوں نے ان کو مکہ کے اوباش لونڈوں کے سپرد کر دیا، وہ لونڈے ان کو (رسیوں میں جکڑ کر) مکہ کے گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے اور ان کی زبان پر احد احد (اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے) کا نعرہ ہوتا تھا۔

جن صحابہ کو قریش نے حقیر جانا ان کو اللہ تعالیٰ نے عزت عطا کی

(۷) وَعَنْ سَعْدٍؓ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةَ نَفَرٍ فَقَالَ الْمُشْرِكُوْنَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُطْرُدْ هٰؤُلَاءِ لَا يَجْتَرِءُوْنَ عَلَيْنَا قَالَ وَكُنْتُ اَنَا وَابْنُ مَسْعُوْدٍ وَرَجُلٌ مِّنْ هُذَيْلٍ وَبِلَالٌ وَرَجُلَانِ لَسْتُ اُسَمِّيْهِمَا فَوَقَعَ فِيْ نَفْسِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّقَعَ فَحَدَّثَ نَفْسَهٗ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہم چھ آدمی تھے (مکہ کے) مشرکین (میں سے بعض سرداروں نے) نبی کریم ﷺ سے مطالبہ کیا کہ تم (اگر چاہتے ہو کہ ہم لوگ تمہارے پاس آئیں جائیں، تمہاری دعوتی باتیں سنیں اور قبول اسلام کے بارے میں سوچیں تو اپنے ساتھیوں میں سے) ان لوگوں کو (جو آزاد کردہ غلام ہیں اور ہماری سماجی زندگی میں بے وقعت و بے حیثیت مانے جاتے ہیں اپنی مجلس سے) دور رکھو تا کہ یہ لوگ (ہمارے برابر میں بیٹھنے اور ہمارے ساتھ بات چیت میں شریک ہونے کا فائدہ اٹھا کر) ہم پر جری اور دلیر نہ ہو جائیں۔ حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ ان چھ آدمیوں میں ایک تو میں تھا، ایک عبد اللہ بن مسعودؓ تھے۔ ایک شخص قبیلہ ہذیل کا تھا اور دو آدمی اور تھے جن کے نام میں نہیں بتاتا۔ بہر حال (ان سرداروں کا مطالبہ سن کر) رسول کریم ﷺ کے خیال میں وہ بات آئی جو اللہ نے چاہا کہ آئے پھر آپ ﷺ نے (اس بارے میں سوچا ہی تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ یعنی ان لوگوں کو نہ ہٹایئے جو صبح و شام اپنے رب کو یاد کرتے اور پکارتے ہیں اور اس (عبادت وذکر) سے ان کا مقصد اپنے رب کی خوشنودی چاہنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔" (مسلم)

تشریح: "دو آدمی اور تھے" کے تحت شارحین نے لکھا ہے کہ وہ دونوں آدمی حضرت خباب بن ارتؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ تھے۔ اور بیان کرنے والے نے جو یہ کہا کہ "جن کے نام میں نہیں بتاتا" تو یہ بات انہوں نے اس بناء پر کہی کہ اپنی کس مصلحت کے تحت وہ ان دونوں ناموں کا ذکر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یا جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے، انہوں نے یہ دونوں نام اس لئے نہیں بتائے کہ روایت حدیث کے وقت ان کو یاد نہیں رہا تھا کہ وہ دو آدمی کون تھے، تاہم روایت کے الفاظ سے پہلا ہی قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

"رسول کریم ﷺ کے خیال میں وہ بات آئی" یعنی، وہ سرداران قریش چونکہ اپنی سماجی برتری و وجاہت کے زعم میں یہ بات گوارا نہیں کرتے تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ ﷺ کی مجلس میں بیٹھیں تو اس مجلس میں وہ مسلمان بھی موجود ہوں اور برابری کی سطح پر شریک گفتگو رہیں جو کبھی غلام ہوا کرتے تھے، اور اس اعتبار سے قریش مکہ کی سماجی زندگی میں ان کو حقیر و کمتر مانا جاتا تھا لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اس لالچ میں کہ شائد ان سرداران قریش کو اسلام کی توفیق نصیب ہو جائے، ان کی بات رکھنے کا ارادہ فرمایا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسئلہ بہت اہم تھا۔ ایک طرف تو آپ ﷺ کی یہ شدید خواہش کہ اتنے بڑے بڑے سرداران قریش اسلام قبول کر لیں، دوسری طرف ان کا ایسا مطالبہ تھا جس سے بعض مخلص اور جاں نثار مسلمانوں کی تحقیر ہوتی تھی، چنانچہ آپ ﷺ کچھ اس طرح کی تدبیر سوچ رہے تھے جس سے ان سرداروں کی تالیف قلب بھی ہو جائے جو آخر کو ان کے قبول اسلام کا باعث بن سکے، اور اسلام کی نظر میں ان مخلص مسلمانوں کو جو عزت و توقیر ہے اس کو بھی تحفظ حاصل رہے۔ اس کی صورت آپ ﷺ کے ذہن میں یہ آئی ہوگی کہ جب وہ سرداران قریش مجلس نبوی میں بیٹھے ہوئے ہوں تو وہ مسلمان از خود مجلس میں نہ آئیں یا اگر وہ مجلس نبوی میں پہلے سے موجود ہوں اور سرداران قریش آجائیں تو از خود اٹھ کر چلے جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان مخلص اور سچے مسلمانوں کی عزت و توقیر قائم کرنے کے لئے اس صورت کو بھی ناپسند فرمایا اور مذکورہ آیت کریمہ کے ذریعہ گویا واضح فرمایا کہ ان سرداران قریش کے مطالبہ کو کسی صورت میں قبول نہیں کرنا چاہئے۔

ابو موسیٰ اشعریؓ کی فضیلت

⑧ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَہٗ یَا اَبَا مُوْسٰی لَقَدْ اُعْطِیْتَ مِزْمَارًا مِّنْ مَّزَامِیْرِ آلِ دَاوٗدَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: اے ابو موسیٰ! تمہیں ایسی خوش آوازی عطا کی گئی ہے جو داؤد علیہ السلام کی خوش آوازی کا ایک حصہ ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مزمار" اصل میں تو ساز یعنی بانسری، دف اور طنبورہ وغیرہ کے ساتھ گانے کو کہتے ہیں نہ کہ محض آواز کے ساتھ گانے کو۔ لیکن یہاں حدیث میں اس لفظ سے صرف "خوش آوازی و خوش الحانی" مراد ہے۔ نیز "آل داؤد" سے مراد خود حضرت داؤد کی ذات ہے، اور "آل" کا لفظ زائد ہے کیونکہ خوش آوازی و خوش الحانی کی صفت حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ مشہور ہے نہ کہ آل داؤد کے ساتھ۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ یہاں "آل" کا لفظ شخص واحد کے معنی میں ہے۔ اور وہ خود حضرت داؤد کی ذات ہے۔ بہرحال مشہور پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام نہایت خوش آواز اور خوش الحان تھے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بھی خوش آوازی اور خوش الحانی کی بڑی صفت عطا فرمائی تھی، جب وہ اپنی پرسوز اور خوش الحان آواز میں کلام اللہ کی تلاوت کرتے تو آنحضرت ﷺ بھی نہایت شوق سے ان کی تلاوت سنتے تھے۔

حضرت ابو موسیٰ: ان کا اصل نام عبداللہ بن قیس اشعری ہے، ابو موسیٰ کی کنیت سے مشہور ہیں۔ انہوں نے مکہ ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور حبشہ کو ہجرت کرنے والوں میں شامل تھے بعد میں حبشہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس وقت آئے جب آپ ﷺ خیبر میں تھے۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے ۲۰ھ میں ان کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا تھا اور حضرت عثمان غنیؓ کے شروع عہد خلافت تک بصرہ ہی میں مقیم رہے، پھر معزول ہو کر بصرہ کی سکونت ترک کی اور کوفہ آگئے۔ جب اہل کوفہ نے سعید بن عاص (حاکم کوفہ) کو وہاں سے نکال دیا اور حضرت عثمانؓ سے درخواست کی کہ ابو موسیٰ کو ہمارا حاکم بنا دیجئے تو حضرت عثمانؓ نے ان کو دوبارہ کوفہ کا حاکم بنا دیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ نے ان کو معزول کر دیا اور پھر واقعہ تحکیم کے بعد حضرت ابو موسیٰ مکہ مکرمہ میں منتقل ہو گئے اور وہیں

۵۲ھ میں فوت ہوئے۔

چار حافظ قرآن صحابہؓ کا ذکر

(۹) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ جَمَعَ الْقُرْاٰنَ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعَةٌ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَمَعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَاَبُوْزَيْدٍ قِيْلَ لِاَنَسٍ مَنْ اَبُوْزَيْدٍ قَالَ اَحَدُ عُمُوْمَتِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں جن چار صحابہ نے قرآن کو جمع کیا یعنی پورا قرآن حفظ یاد کیا وہ ہیں، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ، اور ابوزیدؓ، حضرت انس سے پوچھا گیا کہ ابوزیدؓ کون ہیں تو انہوں نے کہا، میرے ایک چچا ہیں۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: حضرت ابوزیدؓ کے نام میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے سعید بن عمیر لکھا ہے اور بعض نے قیس بن سکن۔

یہ چاروں صحابہ انصار مدینہ کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں جو حضرت انسؓ کا قبیلہ ہے، اس اعتبار سے کہنا چاہئے کہ حضرت انسؓ نے جو بات کہی ہے وہ انہوں نے اظہار فخر کے طور پر کہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہمارے قبیلہ کے چار آدمیوں کو پورے کلام اللہ کا حافظ ہونے کا فخر حاصل تھا، اور اگر ان کے الفاظ کو (اظہار فخر کے طور پر نہیں بلکہ) عام بیان پر بھی محمول کیا جائے تو بھی ان الفاظ میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مذکورہ چار صحابہؓ کے علاوہ اور کوئی صحابی پورے کلام اللہ کا حافظ نہیں تھا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ایسے مواقع پر عدد کا مفہوم کوئی خاص اعتبار نہیں رکھتا دوسرے یہ کہ صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت کا پورے کلام اللہ کا حافظ ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، ان میں سے ایک صحیح حدیث تو وہی ہے جس میں مذکور ہے کہ یمامہ میں جن ستر صحابہ کو شہید کیا گیا تھا وہ ان صحابہ میں سے تھے جنہوں نے پورا قرآن مجید حفظ یاد کر رکھا تھا، نیز خود خلفائے اربعہ بھی حفاظ قرآن صحابہ میں شامل ہیں۔

مصعب بن عمیرؓ کی فضیلت

(۱۰) وَعَنْ خَبَّابِ بْنِ الْاَرَتِّؓ قَالَ هَاجَرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبْتَغِيْ وَجْهَ اللّٰهِ تَعَالٰی فَوَقَعَ اَجْرُنَا عَلَى اللّٰهِ فَمِنَّا مَنْ مَضٰى لَمْ يَاْكُلْ مِنْ اَجْرِهٖ شَيْئًا مِنْهُمْ مُصْعَبُ ابْنُ عُمَيْرٍ قُتِلَ يَوْمَ اُحُدٍ فَلَمْ يُوْجَدْ لَهٗ مَا يُكَفَّنُ فِيْهِ اِلَّا نَمِرَةٌ فَكُنَّا اِذَا غَطَّيْنَا رَاْسَهٗ خَرَجَتْ رِجْلَاهُ وَاِذَا غَطَّيْنَا رِجْلَيْهِ خَرَجَ رَاْسُهٗ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَطُّوْا بِهَا رَاْسَهٗ وَاجْعَلُوْا عَلٰى رِجْلَيْهِ مِنَ الْاِذْخِرِ وَمِنَّا مَنْ اَيْنَعَتْ لَهٗ ثَمَرَتُهٗ فَهُوَ يَهْدِبُهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت خباب بن ارتؓ کہتے ہیں کہ: رسول کریم ﷺ کے ساتھ ہمارا ہجرت کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے جذبہ کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتا تھا، چنانچہ ہمارے اس عمل کا اجر و ثواب اللہ کے نزدیک (محض اس کے فضل و کرم سے دنیا و آخرت میں) ثابت و قائم ہو گیا۔ پھر ہم میں سے بعض لوگ تو وہ ہیں جو (دنیا کا) کوئی بھی اجر و انعام پائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جن میں سے ایک مصعب بن عمیرؓ ہیں وہ احد کے دن شہید ہوئے، اور ان کے لئے کوئی ایسا کپڑا بھی میسر نہ ہوا جس میں ان کو (پوری طرح) کفنایا جاتا۔ (ان کے جسم پر) چیتے کی کھال جیسی سپید و سیاہ دھاریوں والی صرف ایک کملی تھی (اور وہ بھی اتنی مختصر کہ) جب ہم (اس کملی سے کفناتے وقت) مصعبؓ کے سر کو ڈھانکتے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور ان کے پاؤں کو ڈھانکتے تو ان کا سر کھل جاتا تھا۔ چنانچہ (ان کے کفن کے سلسلہ میں ہماری اس پریشانی کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کملی سے سر کی طرف کو ڈھانک دو اور پاؤں پر اذخر (گھاس) ڈال دو اور ہم میں سے بعض لوگ وہ ہیں جن کا پھل پختہ ہو گیا اور وہ اس پھل کو چن رہے ہیں۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: "کوئی بھی اجر و انعام پائے بغیر" یعنی وہ لوگ دین کی راہ میں سخت جدوجہد اور قربانیوں کے بعد اس دنیا سے اس حال میں رخصت ہو گئے کہ ابھی اسلام کی فتوحات اور مسلمانوں کی کشور کشائیوں کا دور شروع نہیں ہوا تھا اور اس کے نتیجہ حاصل ہونے والے اس مال غنیمت سے ان کو کوئی حصہ نصیب نہیں ہوا جو اس زمانہ کے لوگوں کو مل رہا ہے۔ پس ان کا پورا اجر ان کو آخرت میں ملے گا۔

"اور وہ اس پھل کو چن رہے ہیں" یہ مال غنیمت سے کنایہ ہے، یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے فتوحات اور کشور کشائیوں کا زمانہ پایا اور اس کے نتیجہ میں جو مال غنیمت ملا اس میں سے اپنا حصہ حاصل کر رہے ہیں۔ حضرت خبابؓ کے کہنے کا مطلب گویا یہ تھا کہ ہم میں سے بعض لوگ تو وہ ہیں کہ جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، قربانیاں دیں اور پھر اسلام کی عظیم اور وسیع فتوحات کے بعد مال و زر کی فراوانی ہوئی تو اس سے ان کو مستفید ہونے کا موقع ملا اور اس طرح انہوں نے اپنے اجر و ثواب کا کچھ حصہ اسی دنیا میں حاصل کر لیا۔ اور ان کے مقابلہ میں بعض لوگ وہ ہیں کہ جنہوں نے اللہ کی راہ میں جو بڑی سے بڑی قربانیاں دیں اور جو سخت سے سخت مصائب جھیلے ان کا کوئی ثمرہ اس دنیا میں حاصل کرنے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے چلے گئے اور اس طرح ان کا پورا ثواب باقی رہا جو ان کو آخرت میں ملے گا، اور انہیں لوگوں میں مصعب بن عمیرؓ بھی ہیں پس اس حدیث میں دراصل حضرت مصعب بن عمیرؓ کی فضیلت کا بیان ہے۔ کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کا اخروی اجر و ثواب جوں کا توں قائم ہے۔ اس میں سے کچھ کم نہیں ہوا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ مجاہدین کی جو بھی جماعت اللہ کی راہ میں جہاد کرتی ہے اور اس جہاد میں مال غنیمت پاتی ہے تو گویا دو تہائی ثواب اس دنیا ہی میں مل جاتا ہے اور ایک تہائی ثواب باقی رہ جاتا ہے جو اس کو آخرت میں ملے گا۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ: حضرت مصعب بن عمیرؓ، قرشی عبدری ہیں، اجلہ اور فضلاء صحابہ میں سے ہیں انہوں نے آنحضرت ﷺ کے دار ارقم میں آنے سے پہلے مکہ میں (اسلام قبول کیا تھا اور اول ہجرت حبشہ کرنے والوں کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی۔ پھر جنگ بدر میں شریک ہوئے، آنحضرت ﷺ نے ان کو عقبہ ثانیہ کے بعد مدینہ بھیجا تھا اور وہاں اہل مدینہ کو قرآن کی تعلیم دینے اور دین سکھانے کی خدمت ان کے سپرد فرمائی تھی، ہجرت نبوی سے قبل مدینہ میں جس نے سب سے پہلے جمعہ پڑھا وہ مصعب بن عمیرؓ ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں حضرت مصعب بن عمیرؓ بڑے عیش و آرام کی زندگی گزارتے تھے، اعلیٰ سے اعلیٰ لباس زیب تن کرتے تھے۔ مگر جب مسلمان ہو گئے تو زہد اختیار کیا اور دنیا کے ہر عیش و آرام اور ہر راحت سے دست کش ہو گئے حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن مصعب بن عمیرؓ اس حال میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ (جسم پر ایک کملی تھی اور) کمر پر بکرے کے چمڑے کا تسمہ بندھا ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھ کر حاضرین مجلس سے فرمایا کہ اس شخص کو دیکھو جس کا قلب اللہ تعالیٰ نے نور ایمان سے جگمگا رکھا ہے۔ میں نے اس شخص کو مکہ میں اس حال میں دیکھا کہ اس کے ماں باپ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں کھلاتے پلاتے تھے اور میں نے اس کے جسم پر ایسا جوڑا دیکھا ہے جو دو سو درہم میں خریدا گیا تھا۔ مگر اب اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت نے اس کو اس حالت میں پہنچا دیا ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو عقبہ اولیٰ کے بعد مدینہ بھیجا تھا، وہاں یہ اسلام کی دعوت لے کر انصار کے گھر گھر جاتے، ان کو تبلیغ کرتے اور ان کو مسلمان بنانے کی پوری پوری جدوجہد کرتے، چنانچہ ان کی اسی جدوجہد کے نتیجہ میں ایک ایک اور دو دو کر کے لوگ مسلمان ہوتے رہے، یہاں تک کہ مدینہ میں اسلام کا نور پھیل گیا اور اہل مدینہ کی بڑی تعداد دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی، تب انہوں نے مدینہ میں جمعہ قائم کرنے اور مسلمانان مدینہ کو نماز جمعہ پڑھانے کی اجازت آنحضرت ﷺ سے منگوائی، اس کے بعد حضرت مصعبؓ ستر آدمیوں کی وہ جماعت لے کر مکہ آئے جو عقبہ ثانیہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی قرآن کریم کی یہ آیت: من المومنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه انہی حضرت مصعبؓ کی شان میں نازل ہوئی۔

سعد بن معاذ کی فضیلت

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ اهْتَزَّ الْعَرْشُ لِمَوْتِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ وَفِي رِوَايَةٍ اهْتَزَّ

الرَّحْمٰنُ لِمَوْتِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، سعد بن معاذؓ کے مرنے پر عرش ہل گیا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ "سعد بن معاذؓ کے مرنے پر رحمٰن ہل گیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس بارے میں شارحین حدیث کے مختلف اقوال ہیں کہ عرش کے ہلنے کے کیا معنی ہیں اور اس کے ہلنے کا سبب کیا تھا؟ ایک قول میں یہ معنی بیان کئے گئے ہیں کہ جب حضرت سعدؓ کا انتقال ہوا تو عرش الٰہی اس خوشی میں کہ پاک روح آئی ہے واقعۃً جھوم اٹھا۔ اور ایک قول میں یہ کہا گیا کہ "عرش ہل گیا" کے الفاظ دراصل حضرت سعدؓ کی پاک روح آنے کے سبب عرش الٰہی کے حقیقی یا مجازی فرح و نشاط سے کنایہ ہیں لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ "ہلنے" کے لفظ کو حقیقی معنی پر محمول کیا جائے جیسا کہ پہلے قول سے ثابت ہوتا ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جمادات میں بھی علم و تمیز کا مادہ رکھا ہے۔ جس کا ثبوت قرآن کریم کے ان الفاظ: وان منها لما يهبط من خشية الله سے بھی ملتا ہے اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے بھی جو آپ ﷺ نے احد پہاڑ کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم کو محبوب رکھتا ہے۔ بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ "عرش ہلنے" سے مراد اہل عرض یعنی فرشتوں کا خوش ہونا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ کے سانحہ موت کو عرش کے ہلنے سے تعبیر فرمایا۔ اور بعض حضرات نے لکھا ہے۔ یہ الفاظ حضرت سعدؓ کی وفات کے عظیم شان سے کنایہ ہیں۔ جیسا کہ جب کسی بہت ہی اہم اور بڑی شخصیت کا انتقال ہو جاتا ہے۔ تو کہہ دیتے ہیں کہ اس کی وفات سے دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ یا یوں کہتے ہیں کہ فلاں کے مرنے پر قیامت آگئی۔

حضرت سعد بن معاذؓ: حضرت سعد بن معاذ بن نعمانؓ مدینہ کے انصار میں سے ہیں اور اشہلی اوسی ہیں۔ ان کا شمار اجلہ اور اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مدینہ میں حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا جن کو آنحضرت ﷺ نے اپنی ہجرت سے پہلے دین کی تبلیغ و تعلیم کے لئے مدینہ بھیجا تھا۔ حضرت سعدؓ کے اسلام لانے کے سبب بنی عبد الاشہل کا پورا خاندان دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو "سید الانصار" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ جنگ بدر اور جنگ احد میں شریک ہوئے ہیں جنگ احد کے دن پوری جاں نثاری کے ساتھ ثابت قدم رہے اور آنحضرت ﷺ کے پاس سے ہرگز نہیں ہٹے غزوہ خندق کے موقع پر ان کی رگ ہفت اندام میں ایک تیر آکر لگا جس سے خون جاری ہو گیا اور کسی طرح رک کر نہ دیا یہاں تک کہ اسی کے سبب تقریباً ایک ماہ بعد ذیقعدہ ۵ھ میں انتقال کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۷ سال کی تھی بقیع میں مدفون ہوئے، اسی موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: سعدؓ کی موت پر ستر ہزار فرشتے اترے اور عرش الٰہی ہل گیا۔

⑫ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ أُهْدِيَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُلَّةُ حَرِيْرٍ فَجَعَلَ أَصْحَابُهُ يَمَسُّوْنَهَا وَيَتَعَجَّبُوْنَ مِنْ لِيْنِهَا فَقَالَ أَتَعْجَبُوْنَ مِنْ لِيْنِ هٰذِهٖ لَمَنَادِيْلُ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِّنْهَا وَأَلْيَنُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براء بن عازبؓ (جو مشاہیر صحابہ میں سے ہیں) بیان کرتے ہیں کہ (ایک عجمی ملک کے بادشاہ کی طرف سے) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ریشمی کپڑے کا جوڑا بطور ہدیہ پیش کیا گیا تو آپ ﷺ کے صحابہ اس جوڑے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اس کی نرمی اور ملائمت پر تعجب اور حیرانی کا اظہار کرنے لگے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم اس کپڑے کی نرمی اور ملائمت پر کیا تعجب کر رہے ہو جنت میں سعد بن معاذؓ کو جو رومال ملے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ نرم اور ملائم ہیں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "تعجب اور حیرانی کا اظہار کرنے لگے" ایک روایت میں آیا ہے کہ صحابہؓ نے چونکہ اتنا بیش قیمت اور ایسا نفیس جوڑا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لئے اس جوڑے کو دیکھ کر نہایت تعجب اور حیرانی کے ساتھ وہ یوں کہتے تھے کہ یہ جوڑا آنحضرت ﷺ پر آسمان سے نازل ہوا ہے۔

"مناديل"، اصل میں "منديل" کی جمع ہے اور منديل اس رومال کو کہتے ہیں جس سے ہاتھ وغیرہ پونچھنے کا کام لیا جاتا ہے پس اس موقع پر آپ ﷺ نے مبالغةً منديل کا ذکر کر کے گویا واضح فرمایا کہ جب جنت کے کپڑوں کی ایسی چھوٹی موٹی چیزیں اس دنیا کے بیش قیمت اور نفیس ترین کپڑوں سے بھی اعلیٰ و افضل ہوں گی تو وہاں کے اصل کپڑوں اور لباسوں کا کیا پوچھنا ہے۔

حضرت انسؓ کے حق میں مستجاب دعا

⑬ وَعَنْ اُمِّ سُلَيْمٍ اَنَّهَا قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَسٌ خَادِمُكَ اُدْعُ اللّٰهَ لَهٗ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَكْثِرْ مَالَهٗ وَوَلَدَهٗ وَبَارِكْ لَهٗ فِيْمَا اَعْطَيْتَهٗ قَالَ اَنَسٌ فَوَاللّٰهِ اِنَّ مَالِيْ لَكَثِيْرٌ وَاِنَّ وَلَدِيْ وَوَلَدَ وَلَدِيْ لَيَتَعَادُّوْنَ عَلٰى نَحْوِ الْمِائَةِ الْيَوْمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ام سلیمؓ سے (جو حضرت انسؓ کی والدہ ہیں) روایت ہے کہ انہوں نے (جب اپنے بیٹے انسؓ کو ان کی چھوٹی سی عمر میں آنحضرت ﷺ کی خدمت بابرکت میں پیش کیا تو اس وقت) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ انس ہے جس کو آپ ﷺ کا خادم بنا کر آپ کی خدمت اقدس میں پیش کر رہی ہوں۔ (اس کو حصول ایمان اور آپ کی بابرکت صحبت و خدمت کے سبب آخرت کا اجر و انعام تو ملے ہی گا، رہی دنیاوی خوشحالی و برکت کی بات، تو اس بارے میں) اس کے لئے دعا فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی "خدایا، اس (انس) کے مال کو زیادہ کر، اس کی اولاد کو بڑھا اور (اپنی طرف سے) جو نعمتیں تو نے اس کو عطا کی ہیں ان میں برکت دے۔ حضرت انسؓ کہتے تھے کہ خدا کی قسم (آنحضرت ﷺ کی اسی دعا کے سبب) میرا مال نہایت بہتات اور نہایت برکت کے ساتھ ہے۔ اور میری (بلاواسطہ) اولاد اور میری اولاد کی اولاد آج شمار میں سو کے قریب ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "آج شمار میں سو کے قریب ہیں" حضرت انسؓ نے اپنی بلاواسطہ اور بالواسطہ اولاد کی یہ تعداد تو اس وقت بیان کی تھی جب انہوں نے اس بات کا ذکر کیا تھا، اس کے بعد ان کی اولاد میں اور بھی اضافہ ہوا، چنانچہ ابن حجر نے حضرت انسؓ کی وہ روایت نقل کی ہے جو انہوں نے اس دن کے کافی عرصہ بعد بیان کی تھی اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میری اولاد کی اولاد کے علاوہ جو اولاد بلا واسطہ میری صلب سے مجھ کو عطا کی ہے۔ وہ تعداد میں ایک سو پچیس ہیں، جن میں دو لڑکیوں کے علاوہ باقی سب لڑکے ہیں اور (میرے مال میں بہتات و برکت کا یہ عالم ہے کہ) میرے باغات سال میں دو مرتبہ پھل دیتے ہیں۔ نیز حضرت انسؓ کے ایک صاحبزادے نے بیان کیا کہ والد محترم حضرت انسؓ کی صلبی اولاد میں سے جن کو میں نے دفنایا ہے۔ ان کی ہی تعداد سو کے قریب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال و منال اور اولاد اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں ہیں بشرطیکہ وہ یاد الٰہی سے غفلت کا موجب اور گناہ و معصیت کا باعث نہ ہوں۔ اور امام نوویؒ لکھتے ہیں: یہ (حضرت انسؓ کا اس قدر کثیر الاولاد ہونا اور کثیر المال ہونا) دراصل آنحضرت ﷺ کی نبوت کا ایک اعجاز ہے۔ نیز یہ حدیث ان حضرات کے حق میں جاتی ہے جو فقیر و مفلس پر غنی و مالدار کی فضیلت کے قائل ہیں۔ لیکن دوسرے حضرات کی طرف سے اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس معاملہ کی خصوصی نوعیت ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت انسؓ کے حق میں دعا فرمائی اور اس دعا کی وجہ سے ان کے مال میں برکت ہوئی، اور جب برکت (الٰہی کا دخل ہوا تو اس مال کا وہ پہلو جاتا رہا جس کو شریعت کی نظر میں "فتنہ" کہا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ مال حضرت انسؓ کے حق میں نہ تو تقصیر اور برائی کا باعث بنا اور نہ ادائے حقوق اللہ میں کوتاہی کا موجب اسی بناء پر علماء نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے اس بات کا استحباب ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دنیا سے تعلق رکھنے والی کسی چیز کی دعا مانگے تو اس دعا میں طلب برکت کو بھی شامل کرے یعنی اللہ سے اس چیز کو مانگنے کے ساتھ یہ بھی دعا مانگے کہ اللہ، اس چیز میں برکت عطا فرما اور مجھ کو اس کے فتنہ و آفات سے محفوظ رکھ۔

حضرت انسؓ: حضرت انسؓ بن مالک بن نضر، مدینہ کے باشندہ اور خزرجی ہیں، ابوحمزہ ان کی کنیت ہے۔ ان کو ان کی والدہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مدینہ میں اس وقت پیش کیا تھا جب وہ بارہ سال کے تھے انہوں نے حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں

بصرہ کی سکونت اس مقصد سے اختیار کرلی تھی کہ وہاں کے لوگوں کو دین کی تعلیم دیں گے اور بصرہ ہی میں ۹۱ھ میں انتقال کیا، اس وقت ان کی عمر ۱۰۳ سال تھی بصرہ میں فوت ہونے والے صحابہ میں حضرت انس ؓ آخری صحابی ہیں۔ ابن عبدالبر ؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت انس ؓ کے بیٹوں کی تعداد سو تھی، اور یہی قول زیادہ صحیح ہے بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ان کی اولاد کی تعداد اسی تھی جن میں اٹھتر بیٹے تھے اور دو بیٹیاں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن حجر نے جو روایت نقل کی ہے (اور جس میں حضرت انس کی اولاد کی تعداد ۱۲۵ بیان ہوئی ہے) وہ نہ صرف ان روایتوں کے خلاف پڑتی ہے (کہ جن میں ان کی اولاد کی تعداد ایک سو یا اسی بیان کی گئی ہے) بلکہ مذکورہ بالا حدیث کے بھی مخالف نظر آتی ہے، کیونکہ اس حدیث کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت انس ؓ کی بلاواسطہ اور بالواسطہ اولاد کی مجموعی تعداد سو یا سو سے کچھ متجاوز تھی نہ کہ یہ تعداد صرف ان کی بلاواسطہ اولاد کی ہے۔ واللہ اعلم۔

عبداللہ بن سلام کی فضیلت

(۱۴) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ ؓ قَالَ مَا سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لِاَحَدٍ یَمْشِیْ عَلٰی وَجْہِ الْاَرْضِ اَنَّہٗ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ اِلَّا لِعَبْدِ اللّٰہِ بْنِ سَلَامٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن سلام ؓ کے علاوہ کسی اور شخص کے بارے میں کہ جو زمین پر چلتا ہو، نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے نہیں سنا کہ وہ جنتی ہے۔" (بخاری ؒ ومسلم ؒ)

تشریح: حضرت عبداللہ بن سلام ؓ نہایت جلیل القدر صحابی ہیں ان کا سلسلۂ نبوت حضرت یوسف علیہ السلام سے ملتا ہے۔ چنانچہ یہ پہلے ایک یہودی تھے اور نہایت ممتاز درجہ کے علماء یہود میں شمار ہوتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت فرمائی اور انہوں نے دائرہ اسلام میں داخل ہوکر اسلام اور مسلمانوں کی نمایاں خدمات انجام دیں، انہی حضرت عبداللہ بن سلام ؓ کے بارے میں حضرت سعد ؓ کہتے ہیں کہ میں نے صرف ان کی نسبت آنحضرت ﷺ کی لسان مقدس سے یہ بشارت سنی ہے کہ عبداللہ بن سلام جنتی ہیں۔

"جو زمین پر چلتا ہو" یہ صفت احترازیہ ہے، یعنی حضرت سعد ؓ نے یہ الفاظ اس لئے کہے تاکہ عشرۂ مبشرہ میں سے ان حضرات کا استثناء ہوجائے جو حضرت عبداللہ بن سلام سے پہلے انتقال کرچکے تھے۔ گویا ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت روئے زمین پر جو لوگ زندہ ہیں ان میں صرف عبداللہ بن سلام ؓ وہ واحد شخص ہیں جن کی نسبت میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے اپنے کان سے سنا ہے کہ وہ جنتی ہیں۔

نووی ؒ لکھتے ہیں: یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں حضرت ابوبکر ؓ اور حضرت عمر ؓ وغیرہ دس صحابہ کی نسبت جنتی ہونے کی بشارت مذکور ہے کیونکہ حضرت سعد ؓ نے محض اپنے سننے کی نفی کی ہے، یعنی انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کی زبان سے یہ بشارت صرف عبداللہ بن سلام کے بارے میں سنی ہے اور کسی کے بارے میں نہیں سنی ہے۔ لہٰذا کسی اور کے بارے میں ان کا سننا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ جنتی ہونے کی بشارت عبداللہ بن سلام ؓ کے علاوہ اور شخص کو عطا نہیں ہوئی۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ کسی واقعہ کے بارے میں نفی اور اثبات دونوں پہلوؤں کو ظاہر کرنے والی روایات موجود ہوں تو ترجیح اسی روایت کو ہوتی ہے جس سے اثبات ظاہر ہوتا ہے۔

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سلام ؓ کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ کو جنتی ہونے کی بشارت عطا فرمائی ہے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور تو وہی دس صحابہ ہیں جن کو اسی بشارت کی بناء پر "عشرہ مبشرہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور خود حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ بھی ان میں شامل ہیں۔ لہٰذا اس حدیث کے تحت جو اشکال واقع ہوتا ہے اس کا کچھ ازالہ تو مذکورہ بالا وضاحتوں سے ہوجاتا ہے، باقی کے لئے شارحین نے کچھ اور باتیں لکھی ہیں مثلاً یہ کہ ہوسکتا ہے کہ جب حضرت سعد ؓ نے عبداللہ بن

سلام کے علاوہ کسی اور کے حق میں مذکورہ بشارت سننے کی یہ نفی کی تھی اس وقت تک یہ بشارت آنحضرت ﷺ نے دوسروں کو عطا نہیں فرمائی تھی، یا یہ کہ حضرت سعدؓ نے یہ نفی اس وقت کی ہوگی جب کہ باقی صحابہ مبشرین اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ چنانچہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ ان صحابہ مبشرین کے بعد تک بقید حیات رہے اور جب ان کا انتقال ہوا تو عشرہ مبشرہ میں سے حضرت سعدؓ اور حضرت سعیدؓ کے علاوہ کوئی زندہ نہیں تھا اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو دارقطنی نے نقل کی ہے اور جس میں حضرت سعدؓ کے الفاظ یوں ہیں کہ: میں نے عبداللہ بن سلامؓ کے علاوہ کسی اور شخص کے بارے میں کہ جو اس وقت زندہ ہے اور چلتا پھرتا ہے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے نہیں سنا کہ وہ جنتی ہے، اب رہا یہ سوال کہ حضرت سعدؓ نے یہ بات کہتے ہوئے خود اپنی ذات کو اور حضرت سعیدؓ کو ملحوظ کیوں نہیں رکھا تو کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے خود اپنا ذکر تو اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کو اپنے حق میں اس بشارت کا علم کسی دوسرے ذریعہ سے ہوا ہوگا، خود انہوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ بشارت نہیں سنی ہوگی، یا یہ کہ انہوں نے کسر نفی کے تحت اپنا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اور جہاں تک حضرت سعیدؓ کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں اشکال اس وضاحت سے صاف ہو جاتا ہے کہ حضرت سعدؓ نے یمشی علی وجه الارض (جو زمین پر چلتا ہو) کے جو الفاظ کہے ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے حق میں یہ بشارت ارشاد فرمائی تھی اس وقت وہ زمین پر چل رہے تھے جب کہ دوسروں کے حق میں یہ بشارت دوسری حالتوں میں ارشاد فرمائی گئی۔

حضرت عبداللہ بن سلام کا خواب اور ان کو جنت کی بشارت

⑮ وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عُبَادٍ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا فِيْ مَسْجِدِ الْمَدِيْنَةِ فَدَخَلَ رَجُلٌ عَلٰى وَجْهِهِ اَثَرُ الْخُشُوْعِ فَقَالُوْا هٰذَا رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ تَجَوَّزَ فِيْهِمَا ثُمَّ خَرَجَ وَتَبِعْتُهُ فَقُلْتُ اِنَّكَ حِيْنَ دَخَلْتَ الْمَسْجِدَ قَالُوْا هٰذَا رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ قَالَ وَاللّٰهِ مَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ اَنْ يَّقُوْلَ مَا لَا يَعْلَمُ فَسَاُحَدِّثُكَ لِمَ ذَاكَ رَاَيْتُ رُؤْيَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَصَصْتُهَا عَلَيْهِ وَرَاَيْتُ كَاَنِّيْ فِيْ رَوْضَةٍ ذَكَرَ مِنْ سَعَتِهَا وَخُضْرَتِهَا وَسْطَهَا عَمُوْدٌ مِّنْ حَدِيْدٍ اَسْفَلُهٗ فِي الْاَرْضِ وَاَعْلَاهُ فِي السَّمَآءِ فِيْ اَعْلَاهُ عُرْوَةٌ فَقِيْلَ لِيَ ارْقَهْ فَقُلْتُ لَا اَسْتَطِيْعُ فَاَتَانِيْ مِنْصَفٌ فَرَفَعَ ثِيَابِيْ مِنْ خَلْفِيْ فَرَقِيْتُ حَتّٰى كُنْتُ فِيْ اَعْلَاهُ فَاَخَذْتُ بِالْعُرْوَةِ فَقِيْلَ اسْتَمْسِكْ فَاسْتَيْقَظْتُ وَاِنَّهَا لَفِيْ يَدِيْ فَقَصَصْتُهَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ تِلْكَ الرَّوْضَةُ الْاِسْلَامُ وَذٰلِكَ الْعَمُوْدُ عَمُوْدُ الْاِسْلَامِ وَتِلْكَ الْعُرْوَةُ الْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى فَاَنْتَ عَلَى الْاِسْلَامِ حَتّٰى تَمُوْتَ وَذٰلِكَ الرَّجُلُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت قیس بن عبادؒ (جو ایک ثقہ تابعی ہیں) بیان کرتے ہیں میں (ایک روز) مدینہ کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب (مسجد میں) آئے جن کے چہرہ سے خشوع (یعنی وقار و سکون اور قربت الٰہی کا نور) ظاہر تھا (مسجد میں جو صاحبان موجود تھے ان میں سے) بعض نے کہا یہ صاحب جنتی ہیں، پھر ان صاحب نے (تحیۃ المسجد کی یا کوئی اور) دو رکعت نماز پڑھی اور دونوں رکعتیں ہلکی و مختصر پڑھیں اور پھر مسجد سے چلے گئے میں بھی (مسجد سے نکل کر) ان کے پیچھے پیچھے ہولیا اور (ایک جگہ پہنچ کر) ان سے بولا کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوئے تھے تو بعض لوگوں نے کہا تھا کہ "یہ صاحب جنتی ہیں" (اس بارے میں آپ مجھ کو کچھ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیے) ان صاحب نے کہا بخدا، (میں اس کی تصدیق نہیں کر سکتا کیونکہ) کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس بات کو کہے جس کو نہیں جانتا، اور میں تم کو اس (عدم تصدیق) کی وجہ بتاتا ہوں۔ (بات یہ ہوئی تھی کہ) رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں (ایک روز) میں نے ایک خواب دیکھا تھا اور وہ خواب میں نے آنحضرت ﷺ سے بیان کر دیا تھا میں نے (خواب میں) دیکھا تھا کہ گویا میں ایک باغ میں ہوں۔ پھر ان صاحب نے اس باغ کی وسعت و کشادگی اور تر و تازگی و شادابی کا ذکر کیا اور (کہا کہ پھر میں نے دیکھا کہ) اس باغ کے بیچوں بیچ لوہے کا ایک ستون ہے کہ جس کا نیچے کا سرا

زمین کے اندر ہے اور اس کے اوپر کا سرا آسمان میں ہے اور اس ستون کے اوپر ایک حلقہ ہے، پھر مجھ سے کہا گیا کہ اوپر چڑھو! میں نے کہا: میں چڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا، تب ایک خادم میرے پاس آیا جس نے پیچھے سے میرے کپڑے اٹھائے اور میں اوپر چڑھنے لگا، یہاں تک کہ میں اس ستون کی آخری بلندی تک پہنچ گیا اور اس حلقہ کو پکڑ لیا۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ اس حلقہ کو مضبوط پکڑے رہنا۔ اور پھر میری آنکھ کھل گئی اس حال میں کہ وہ حلقہ میرے ہاتھ میں تھا جب نبی کریم ﷺ کے سامنے میں نے یہ خواب بیان کیا تو آپ ﷺ نے (اس خواب کی تعبیر میں) فرمایا "وہ باغ (جو تم نے نہایت وسعت وکشادگی اور تروتازگی کے ساتھ دیکھا) دین اسلام ہے، اور وہ ستون اسلام کا ستون ہے (یعنی اسلام کے احکام و ارکان سے عبارت ہے جن پر بنائے مسلمانی ہے) اور وہ حلقہ (کہ جس کو تم نے دیکھا اور پکڑا) عروۂ وثقی ہے۔ پس (اس خواب میں اس طرف اشارہ ہے کہ) تم اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اسلام پر ثابت قدم رہو گے" اور (قیس بن عباد کہتے ہیں کہ) وہ صاحب حضرت عبداللہ بن سلام تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کسی شخص کے لئے مناسب نہیں ہے کہ" ان الفاظ کے ذریعہ ان صاحب یعنی حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے گویا ان لوگوں کی تصدیق کرنے سے انکار کیا جنہوں نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ یہ صاحب جنتی ہیں اور نوویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے ان کی تصدیق سے یہ انکار اس جہت سے کیا کہ ان لوگوں نے قطعی ویقینی انداز میں ان کے جنتی ہونے کی بات کہی تھی۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے تو یہ بات اس بناء پر کہی تھی کہ ان کے علم میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی وہ حدیث تھی جس میں آنحضرت ﷺ کی طرف سے عبداللہ بن سلامؓ کو جنتی ہونے کی بشارت عطا کئے جانے کا ذکر ہے اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے ان کی اس بات کی تصدیق اس لئے نہیں کہ انہوں نے اپنے بارے میں یہ بشارت نہیں سنی ہوگی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی مذکورہ روایت ان تک نہیں پہنچی ہوگی۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو بھی اپنے بارے میں مذکورہ بشارت کا علم تو تھا۔ لیکن انہوں نے کسر نفسی کے تحت اس وقت یہ پسند نہیں کیا کہ ان لوگوں کی تصدیق کر کے اپنی عظمت وبڑائی کے اظہار کا سبب بنیں اور اس بشارت کی بنیاد پر لوگوں میں شہرت حاصل کریں۔ گویا ان کے اس انکار کا مطلب یہ تھا کہ بلاشبہ آنحضرت ﷺ کی عطا کردہ بشارت کے تحت میں جنتی ہونے کی توقع رکھتا ہوں لیکن اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس بشارت کی بنا پر میری عظمت وبڑائی بیان کی جائے، اور میری ذات کو شہرت دی جائے کیونکہ اس طرح کی بشارت میرے علاوہ اور لوگوں کو بھی عطا ہوئی، پھر مجھ میں ہی کیا خصوصیت ہے کہ میں اس بشارت کے ذریعہ مشہور ونمایاں کیا جاؤں، اور جیسا کہ طیبیؒ نے لکھا ہے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن سلامؓ اپنے ان الفاظ "اور میں تم کو اس کی وجہ بتاتا ہوں" کے ذریعہ دراصل ان لوگوں کی تصدیق سے انکار کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی انہوں نے گویا یہ کہا کہ میں ان لوگوں کی تصدیق نہیں کر سکتا اور تصدیق نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے یہ خواب دیکھا، اس خواب کو آنحضرت ﷺ سے بیان کیا اور آنحضرت ﷺ نے اس کی تعبیر میں یہ فرمایا، میرے علم کی حد تک تو ساری بات بس اتنی ہی ہے اور یہ بات اس امر میں کہ میں یقینی طور پر جنتی ہوں میرے نزدیک آنحضرت ﷺ کی طرف سے نص قطعی کا درجہ ہرگز نہیں رکھتی جیسا کہ دوسروں کے حق میں اس طرح کی بشارت نص قطعی کی صورت میں مذکور ہے۔ اور بعض شارحین نے یہ بھی لکھا ہے کہ مذکورہ الفاظ کے ذریعہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے ان لوگوں کی بات کی تصدیق سے انکار نہیں کیا بلکہ دراصل انہوں نے ان کی بات کی تصدیق کی۔ یعنی انہوں نے گویا یہ کہا کہ جو بھی شخص آنحضرت ﷺ کی صحبت سے فیضیاب ہو چکا ہے یا جو شخص آنحضرت ﷺ کی احادیث اور آپ ﷺ کے ارشادات سے باخبر ہے وہ ایسی کوئی بات کہہ ہی نہیں سکتا جو اس کے علم سے باہر کی ہو، پس وہ لوگ اس بات کو جانتے ہی ہوں گے جو انہوں نے میرے متعلق کہا کہ میں جنتی ہوں، اور خود میں بھی اس بارے میں تھوڑا بہت جو جانتا ہوں اس کو بیان کئے دیتا ہوں اور وہ یہ خواب ہے۔

"اس حال میں کہ وہ حلقہ میرے ہاتھ میں تھا" یعنی خواب میں اس حلقہ کو میں پکڑے ہی ہوئے تھا کہ اسی لمحہ میری آنکھ کھل گئی۔ پس اس جملہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ آنکھ کھلنے کے بعد بھی وہ حلقہ ان کے ہاتھ میں تھا، ویسے اگر روایت کے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی پر

محمول کیا جائے کہ بیدار ہونے کے بعد بھی وہ حلقہ ان کے ہاتھ میں تھا تو اس میں کچھ استبعاد بھی نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کی قدرت میں ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے بلکہ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے، اور نہ ان الفاظ سے حضرت عبداللہ بن سلام کی یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اس خواب کا اثر جاگنے کے بعد بھی میرے ہاتھ میں باقی تھا، یعنی جب صبح ہوئی اور میری آنکھ کھلی تو میری مٹھی اسی حالت میں بند تھی۔ جیسا کہ میں نے خواب میں اس حلقہ کو پکڑ رکھا تھا۔

"اور وہ حلقہ عروہ وثقی ہے" انہوں نے دراصل اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی (اور جس شخص نے اللہ پر ایمان رکھا تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) کی طرف اشارہ فرمایا کہ خواب میں تمہارا استون کے اوپر چڑھنا اور اس کے حلقہ کو پکڑنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ تمہارا ایمان و اخلاص کامل ہے اور تم نے دین اسلام کو اس مضبوطی سے تھام رکھا ہے کہ درجات و مراتب کی اپنی آخری بلندیوں تک پہنچ گئے ہو۔

"وہ صاحب عبداللہ بن سلامؓ تھے" ظاہر تو یہی ہے کہ یہ الفاظ حضرت قیس بن عبادؓ کے ہیں، لیکن یہ بھی بعید نہیں کہ یہ خود حضرت عبداللہ بن سلامؓ ہی کے الفاظ ہوں جن کے ذریعہ انہوں نے اپنے بارے میں وضاحت کی اور اپنے کو غائب سے تعبیر کیا۔

حضرت ثابت بن قیس کو جنّت کی بشارت

(۱۶) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ کَانَ ثَابِتُ بْنُ قَیْسِ بْنِ شَمَّاسٍ خَطِیْبَ الْاَنْصَارِ فَلَمَّا نَزَلَتْ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ اِلٰی اٰخِرِ الْاٰیَةِ جَلَسَ ثَابِتٌ فِیْ بَیْتِهٖ وَاحْتَبَسَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَعْدَ بْنَ مُعَاذٍ فَقَالَ مَاشَانُ ثَابِتٍ اَیَشْتَکِیْ فَاَتَاهُ سَعْدٌ فَذَکَرَ لَهٗ قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ثَابِتٌ اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰیَةُ وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّیْ مِنْ اَرْفَعِکُمْ صَوْتًا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَنَا مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَذَکَرَ ذٰلِکَ سَعْدٌ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَلْ هُوَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماسؓ انصار کے خطیب تھے (یعنی انصار میں یہ وہ شخص تھے جن کی بات چیت فصاحت و بلاغت سے پر ہوتی تھی اور جو نثر کے مانے ہوئے ادیب و خطیب تھے) جب یہ آیت نازل ہوئی: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ الایة (یعنی اے ایمان والو، اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو الخ) تو ثابتؓ اپنے گھر میں بیٹھ رہے اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آنا جانا بند کر دیا، پس نبی کریم ﷺ نے (ایک دن) سعد بن معاذؓ سے (جو انصار کے سردار تھے) پوچھا کہ ثابت کو کیا ہوا (کہ انہوں نے آنا جانا بند کر رکھا ہے اور کہیں دکھائی نہیں دیتے) کیا وہ بیمار ہیں؟ سعدؓ (چپ رہے انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ خود ان کو ثابتؓ کے بارے میں معلوم نہیں تھا اور تحقیق کئے بغیر کوئی جواب دینے سے قاصر تھے، چنانچہ وہ تحقیق حال کے لئے) ثابتؓ کے پاس پہنچے اور ان کے سامنے رسول کریم ﷺ کے الفاظ نقل کئے (کہ آنحضرت ﷺ تمہیں پوچھ رہے تھے اور فرمایا کہ کیا ثابت بیمار ہیں جو ہمارے پاس نہیں آتے) ثابتؓ نے (یہ سن کر) کہا کہ: یہ آیت یا ایھاالذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی الخ نازل ہوئی (جو آنحضرت ﷺ کے سامنے بلند آواز میں بات چیت کرنے سے منع کرتی ہے) اور تم جانتے ہی ہو کہ تم میں سب سے زیادہ میری ہی آواز رسول کریم ﷺ کی آواز سے بلند ہے، لہٰذا میں تو دوزخی ہوں، سعدؓ نے آکر نبی کریم ﷺ سے ثابتؓ کے الفاظ نقل کئے اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ثابت تو جنتی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "کیا وہ بیمار ہیں؟" ظاہر یہ ہے کہ حضرت ثابتؓ کے صدق حال نے تاثیر کی اور آنحضرت ﷺ کے دریافت کرنے کا باعث ہوا،

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کے بارے میں پوچھا اور تشویش ظاہر فرمائی کہ وہ کہیں بیمار تو نہیں ہیں جو ہماری مجلس میں ان کا آنا جانا بند ہے۔

حالت خویش چہ حاجت کہ بوئے شرح دہم　　　　گر مرا سوز دلی ہست اثر خواھد کرد

"میں تو دوزخی ہوں" دراصل حضرت ثابتؓ طبعی و جبلی طور پر بلند آواز تھے اور خطابت کے وصف نے ان کی آواز اور ان کے لب و لہجہ کو اور زیادہ جاندار اور بلند کر دیا تھا چنانچہ بات چیت میں ان کی آواز بلا قصد بھی بلند ہو جایا کرتی تھی۔ جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو وہ یہ سمجھے کہ میں اپنی آواز کو پست رکھنے پر چونکہ قادر ہی نہیں ہوں اور آنحضرت ﷺ کے سامنے بھی میری آواز لامحالہ بلند رہتی ہے اس لئے میں اس آیت کی عدم تعمیل کا مرتکب ہوں، اور اسی کے سبب میرے سارے اعمال برباد ہو گئے، میں دوزخی ہو گیا، انہوں نے یہ نہیں جانا کہ اس آیت کی مراد آنحضرت ﷺ کے سامنے اس اونچی آواز میں گفتگو کرنے سے منع کرنا ہے جو قصد و اختیار کے تحت ہو اور جس سے بے ادبی ظاہر ہوتی ہو۔

"ثابت تو جنتی ہے" یعنی ثابت نے میرے ادب و احترام میں جس شدت سے احتیاط کا پہلو اختیار کیا کہ طبعی و جبلی بلند آوازی کو بھی ناجائز رکھا اس کی بناء پر اس نے جنت کا استحقاق پیدا کر لیا ہے اور وہ جنت میں جائے گا، چنانچہ حضرت ثابت بن قیسؓ کا جنتی ہونا واقعاتی طور پر بھی اس طرح ثابت ہوا کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ جنگ یمامہ میں شرکت کی اور جام شہادت نوش کیا۔ منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب مسیلمہ کذاب کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور مجاہدین اسلام کو تیاری کا حکم دیا تو حضرت ثابت بن قیسؓ نے اپنا کفن تیار کرایا اور اسی کفن کو پہن کر جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑے، یہاں تک کہ وہی کفن پہنے ہوئے شہید ہوئے۔

اس حدیث کے تحت ایک اشکال بھی واقع ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مذکورہ آیت کا ۹ھ میں نازل ہونا بیان کیا جاتا ہے جب کہ حضرت سعد بن معاذؓ اس سے پہلے ۵ھ ہی میں وفات پا چکے تھے؟ اس کا جواب شارحین نے یہ لکھا ہے کہ اس حدیث میں حضرت ثابتؓ کے تعلق سے جس آیت کا ذکر ہے وہ بس وہی ہے جس میں فقط آواز بلند نہ کرنے کا حکم مذکور ہے یعنی یا ایھا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم الخ نہ کہ سورت کی پہلی آیت یعنی یا ایھا الذین آمنوا لا تقدموا بین یدی اللہ الخ کا پس سورت کی یہ پہلی آیت تو ۹ھ میں نازل ہوئی ہوگی اور حدیث میں مذکورہ آیت حضرت سعد بن معاذؓ کے انتقال سے پہلے نازل ہو چکی ہوگی۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی فضیلت

(۱۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ نَزَلَتْ سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ فَلَمَّا نَزَلَتْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ قَالُوْا مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَفِيْنَا سَلْمَانُ الْفَارِسِيُّ قَالَ فَوَضَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهٗ عَلٰى سَلْمَانَ ثُمَّ قَالَ لَوْ كَانَ الْاِيْمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهٗ رِجَالٌ مِّنْ هٰؤُلَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک سورۂ جمعہ نازل ہوئی اور جب یہ آیت آئی: وَ آخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (اور ان میں کچھ دوسرے لوگ وہ ہیں جو ابھی ان سے آکر نہیں ملے ہیں) تو صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں (جو ابھی آکر نہیں ملے ہیں؟) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ: اس وقت ہمارے درمیان سلمان فارسیؓ بھی تھے۔ نبی کریم ﷺ نے (صحابہؓ کا یہ سوال سن کر) اپنا ہاتھ سلمانؓ پر رکھا اور فرمایا: اگر ایمان ثریا ستارے پر بھی ہوتا تو بلاشبہ ان لوگوں میں کتنے ہی اس کو پالیتے اور حاصل کرتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: پوری آیت اپنے سیاق کے ساتھ یوں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ الاية۔

"(اللہ) وہی تو ہے جس نے (عرب کے) امی لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر (ﷺ) بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (برے عقائد اور بری عادتوں سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب و دانائی (کی باتیں) سکھاتے ہیں۔ اور یہ لوگ (ان پیغمبر ﷺ کی بعثت سے) پہلے کھلی گمراہی میں تھے اور ان میں سے (کہ جن میں اللہ نے پیغمبر بھیجا ہے) دوسرے لوگ وہ ہیں جو ابھی ان میں آکر شامل نہیں ہوئے ہیں اور وہ (اللہ) زبردست حکمت والا ہے۔"

اس آیت میں (امی یعنی ناخواندہ لوگوں) سے مراد اہل عرب ہیں اور اشارہ صحابہ کرام کی طرف ہے جنہوں نے گمراہی و جہالت کا راستہ چھوڑ کر نبی آخر الزماں کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ "آخرین" (دوسرے لوگوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جو نزول قرآن کے وقت موجود نہیں تھے بلکہ بعد کے زمانہ میں یعنی صحابہ کے وقت، اسلام لانے والوں میں شامل ہوئے، گویا تابعین کی طرف اشارہ ہے اور تابعین بھی خاص طور پر وہ جن کا تعلق غیر عرب یعنی عجم سے ہے، چنانچہ تابعین کی اکثر تعداد عجمیوں ہی پر مشتمل ہے جیسا کہ چند کو چھوڑ کر باقی سب صحابہ عرب سے ہیں، بہرحال آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں گویا حضرت سلمانؓ کی تعریف کی جو غیر عرب یعنی عجمی ہیں اور ان کی نسبت سے واضح فرمایا کہ آیت میں "آخرین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس وقت تو دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہیں یا تو اس وجہ سے کہ وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے ہیں اور یا اس وجہ سے کہ ان تک ابھی دعوت اسلام نہیں پہنچی ہے، لیکن بعد میں وہ تمہارے پاس آئیں گے اور دائرہ اسلام میں داخل ہوں گے اور ان میں سے اکثر عجمی ہوں گے۔ وہ لوگ دین اور علم کے ایسا جویا ہوں گے کہ اگر دین و ایمان اور علم کا سرمایہ ثریا کی بلندی پر پہنچ جائے تو وہ اس کو وہاں سے بھی حاصل کریں گے چنانچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تابعین نے جس جستجو و محنت سے دین و ایمان حاصل کیا اور علم و اجتہاد کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ صحابہ کے بعد صرف انہی کا وصف ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ: نام "سلمان" اور کنیت "ابوعبداللہ" ہے۔ ان کا وطنی تعلق فارس (ایران) سے تھا اس لئے "فارسی" کی نسبت سے مشہور ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے ان کو ایک یہودی سے خرید کر آزاد کیا تھا۔ حضرت سلمانؓ کا شمار نہایت جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ فارس کی مشہور نسل "رام ہرمز" سے ہیں جو مذہبًا مجوسی تھی اور ابلق گھوڑوں کی پجاری سمجھی جاتی تھی، حضرت سلمانؓ شروع ہی سے "دین حق" کی جستجو میں لگ گئے تھے اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے عیسائیت کو اختیار کر لیا تھا۔ اور اس کی مذہبی کتابوں کا علم حاصل کیا، ان کے والد اور اعزا و اقربا کو ان کا عیسائی بن جانا پسند نہیں آیا، چنانچہ ان سب نے ان کو سخت سزائیں اور اذیتیں دیں مگر انہوں نے ہر سختی اور ہر اذیت کو برداشت کیا اور عیسائیت کو ترک نہیں کیا۔ پھر یہ اپنا ملک و وطن چھوڑ کر شام آگئے اور یہاں عرب سے آئے ہوئے بعض لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ جنہوں نے ان کو مدینہ لا کر ایک یہودی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں حضرت سلمانؓ یکے بعد دیگرے دس آدمیوں کے ہاتھوں بیچے گئے۔ اور ان سب کی غلامی میں رہے۔ تاآنکہ نبی کریم ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو یہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا: سلمان جنتیوں میں سے ہے اور ان میں سے ایک ہیں جن کا جنت کو اشتیاق و انتظار ہے۔ حضرت سلمانؓ کی عمر بہت طویل ہوئی۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ وفات کے وقت ان کی عمر ساڑھے تین سو سال کی تھی، اور بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے ڈھائی سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور زیادہ صحیح یہی قول ہے۔ انہوں نے یہ طویل عمر "دین حق" کی جستجو میں کھپائی یہاں تک کہ آخر میں نبی آخر الزمان ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گوہر مقصود کو پہنچ گئے۔ حضرت سلمانؓ محنت و مشقت کر کے اپنی روزی کماتے تھے اور اپنی کمائی کا زیادہ سے زیادہ حصہ راہ خدا میں خرچ کر دینا ان کا معمول تھا۔ ان کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں، سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی بہت زیادہ مدح و تعریف فرمائی ہے۔ ۳۵ھ میں بمقام مدائن ان کا

انتقال ہوا۔

حضرت ابوہریرہ کے حق میں دعائے محبوبیت

⑱ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ عُبَيْدَكَ هٰذَا يَعْنِىْ اَبَاهُرَيْرَةَ وَاُمَّهُ اِلٰى عِبَادِكَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَحَبِّبْ اِلَيْهِمَا الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے دعا فرمائی: اے اللہ! اپنے اس چھوٹے سے بندے یعنی ابوہریرہ کو اور اس کی ماں کو اپنے مؤمن بندوں کا محبوب بنا اور اہل ایمان کو ان کا محبوب بنادے۔" (رواہ مسلم)

تشریح: یعنی: اے اللہ! ایسا کر کہ یہ دونوں، جو نہایت غریب و نادار، اور لاچار و بیکس ہیں، تیرے مؤمن بندوں کی نظر میں محبت و توجہ کا مرکز بن جائیں اور خود یہ بھی تیرے مسلمان بندوں کو اپنا محبوب، دوست اور غم خوار سمجھتے رہیں۔

کمزوروں اور لاچاروں کی عزت افزائی

⑲ وَعَنْ عَائِذِبْنِ عَمْرٍوؓ اَنَّ اَبَا سُفْيَانَ اَتٰى عَلٰى سَلْمَانَ وَصُهَيْبٍ وَبِلَالٍ فِىْ نَفَرٍ فَقَالُوْا مَا اَخَذَتْ سُيُوْفُ اللّٰهِ مِنْ عُنُقِ عَدُوِّ اللّٰهِ مَاخَذَهَا فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَتَقُوْلُوْنَ لِهٰذَا الشَّيْخِ قُرَيْشٍ وَسَيِّدِهِمْ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهُ فَقَالَ يَا اَبَابَكْرٍ لَعَلَّكَ اَغْضَبْتَهُمْ لَئِنْ كُنْتَ اَغْضَبْتَهُمْ لَقَدْ اَغْضَبْتَ رَبَّكَ فَاَتَاهُمْ فَقَالَ يَا اِخْوَتَاهُ اَغْضَبْتُكُمْ قَالُوْا لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ يَا اَخِىْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائذ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ (امیر معاویہؓ کے والد) ابوسفیان (جب مدینہ آئے اور ایک موقع پر) صحابہ کی ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے سلمان فارسیؓ صہیب رومیؓ اور بلال حبشیؓ کے سامنے سے گزرے تو ان تینوں نے (ابوسفیان کو دیکھ کر) کہا: کیا اللہ (کے ان بندوں) کی تلواروں نے (کہ جو اللہ کے حکم کی تعمیل میں سرگرم رہتے ہیں) ادائے حق میں اس دشمن خدا کی گردن ابھی نہیں اڑائی؟ حضرت ابوبکرؓ (نے یہ سنا تو ان تینوں حضرات کو مخاطب کر کے) بولے اتم قریش کے اس بڑے آدمی کے بارے میں ایسی بات کہہ رہے ہو جو اپنی قوم کا سردار بھی ہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آنحضرت ﷺ نے (ساری تفصیل سن کر) فرمایا: ابوبکر! تم نے شاید ان تینوں کو ناراض کردیا ہے، اور اگر تم نے ان کو ناراض کیا ہے تو خدا کی قسم تم نے اپنے پروردگار کو ناراض کردیا۔ حضرت ابوبکرؓ (یہ سنتے ہی کانپ اٹھے اور فوراً بھاگے ہوئے) ان تینوں کے پاس آئے اور بولے: اے میرے بھائیو! کیا تم مجھ سے غصہ اور ناراض ہوگئے ہو؟ ان تینوں نے جواب دیا: نہیں، اے میرے بھائی۔ اللہ آپ کو معاف کرے (ہم آپ سے ناراض نہیں ہوئے ہیں)۔" (مسلم)

تشریح: مدینہ میں ابوسفیانؓ کی آمد کا یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے اور صلح نامہ حدیبیہ کی تجدید کے مشن پر قریش مکہ کے نمائندہ کے طور پر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے تھے۔ قریش مکہ دعوت اسلام کی راہ میں جس جارحانہ مزاحمت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اہل اسلام کو جس بے دردی کے ساتھ اور جس ظالمانہ طریقہ سے ستاتے اور تکلیف پہنچاتے تھے۔ اور خود صلح نامہ حدیبیہ کی پامالی اور عہد شکنیوں کے جس طرح مرتکب تھے اس کی بناء پر دین کے ان تینوں پر جوش اور مخلص خادموں یعنی سلمانؓ۔ صہیبؓ اور بلالؓ کا ابوسفیان کو مدینہ میں دیکھ کر اس تاسف کا اظہار کرنا کہ اتنا بڑا مشرک ابھی تک ہمارے ہاتھ سے نہیں مارا گیا۔ بالکل فطری امر تھا۔ تاہم ان تینوں کے اس طرح کے جذبات کے برملا اظہار پر حضرت ابوبکرؓ نے جس ناگواری کا اظہار فرمایا وہ بھی تدبر اور مصلحت وقت کا تقاضا تھا کیونکہ اول تو ابوسفیان اس وقت ایک سفارتی مشن پر مدینہ آئے ہوئے تھے اور ان کو جان و مال اور عزت کے تحفظ کی ضمانت

حاصل تھی اور اس ضمانت (امان) کا لحاظ کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری تھا۔ دوسرے دین کی طرف مائل کرنے کے لئے اور مصالح کے تحت ابوسفیان کی دلجوئی کا مقصد بھی حضرت ابوبکرؓ کے سامنے تھا جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ بھی ایسے مواقع پر بعض مشرک سرداروں کے ساتھ خیر سگالی اور دلجوئی کا سلوک فرماتے تھے۔

"تم نے شائد ان تینوں کو ناراض کر دیا ہے" یعنی: تم نے ان تینوں کی بات پر جو مخالفانہ ردعمل ظاہر کیا ہے وہ چاہے تدبر اور مصلحت کے تحت تھا لیکن یہ بات مت بھولو کہ وہ تینوں دین کے مخلص خادم ہر حالت میں اللہ کے محب اور محبوب ہیں اور انہوں نے ابوسفیان کے تئیں جو کچھ کہا وہ صرف اللہ اور اللہ کے دین کی محبت میں اور ایک دشمن دین و خدا کی نفرت میں کہا، لہٰذا اس جہت سے تم نے ان تینوں کی مخالفت کر کے اگر ان کو ناراض کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اللہ کے محبوب بندوں کے مقابلہ پر ایک دشمن دین کے پہلو کی رعایت کرنے کا مرتکب ہو گئے جس کے سبب گویا تم نے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لے لی ہے۔ لہٰذا تم فوراً ان تینوں کے پاس جاؤ، ان سے معذرت کرو، اگر وہ ناراض ہو گئے ہیں تو ان کی ناراضگی کو دور کرو۔

"نہیں، اے میرے بھائی" ظاہری اسلوب کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہاں یَا اَخَانَا (اے ہمارے بھائی) کہا جاتا، تاہم ہو سکتا ہے کہ یا اخی (اے میرے بھائی) کا لفظ ان تینوں کی طرف سے نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی طرف سے نقل کیا گیا ہے، یعنی ان تینوں میں سے ہر ایک نے الگ الگ یوں کہا کہ "نہیں اے میرے بھائی (میں آپ سے ناراض نہیں ہوں) واضح ہو کہ مشکوٰۃ کے بہت سے نسخوں میں یہ لفظ ہمزہ کے پیش کے ساتھ بصیغہ تصغیر یعنی "اُخَی" نقل ہوا ہے اور ایک نسخہ میں ہمزہ کے زیر اور یٰ کے جزم کے ساتھ بھی مذکور ہے ویسے ہمزہ کے زبر کے ساتھ بھی یہ لفظ کوئی قباحت نہیں رکھتا۔

مذکورۃ الصدر تینوں حضرات یعنی سلمان فارسیؓ، صہیب رومیؓ، اور بلال حبشیؓ صحابہ کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو "غلامی" کی نسبت سے غیر مسلم سماج میں کمتر و پست سمجھے جاتے تھے اور معاشی و اقتصادی طور پر بھی نہایت غریب اور مفلوک الحال تھے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ ان حضرات کی دلداری و دلجوئی کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ اور ایسی کوئی بات نہیں ہونے دیتے تھے۔ جس سے ان مخلصوں کو اپنی کمزوری ولاچاری کا احساس ہو اور ان کی عزت و نفس کو دھکا لگے —— جس کی ایک مثال یہی حدیث ہے۔ چنانچہ اس حدیث سے نہ صرف یہ کہ سماجی و معاشی طور پر مفلس و کمزور صحابہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے بلکہ آنحضرت ﷺ نے گویا اس طرف توجہ دلائی کہ ان کی تعظیم و تکریم اور ان کی رعایت خاطر کو ہر حالت میں ملحوظ رکھا جائے۔

حضرت صہیب رومیؓ: صہیب بن سنانؓ عبداللہ بن جدعان تیمی کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ ابویحییٰ کنیت ہے۔ یہ اصل میں دجلہ و فرات کے درمیان "موصل" کے رہنے والے تھے۔ جب رومی فوجوں نے اس علاقہ پر دھاوا بولا اور لوٹ مار کی تو صہیبؓ بھی ان لوگوں میں تھے جن کو رومی فوج قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس وقت یہ چھوٹی عمر کے تھے۔ جب بڑے ہوئے تو شکل و شباہت سے بالکل رومی لگنے لگے۔ بعد میں قبیلہ کلب کے کچھ لوگوں نے ان کو رومیوں سے خرید لیا اور ان کو مکہ لے آئے۔ پھر عبداللہ بن جدعان نے ان کو خریدا اور آزاد کر دیا۔ عبداللہ بن جدعان کی موت تک حضرت صہیبؓ اسی کے ساتھ رہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ صہیبؓ جب روم میں رہتے ہوئے بڑے ہو گئے اور عقل و سمجھ آ گئی تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور مکہ آ گئے۔ مکہ میں عبداللہ بن جدعان کے پاس پہنچے اور اس کے حلیف بن کر اسی کے ساتھ رہنے لگے۔ حضرت صہیبؓ قدیم الاسلام ہیں۔ انہوں نے دعوت اسلام کے ابتدائی زمانہ ہی میں مکہ میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت صہیبؓ اور عمار بن یاسرؓ نے ایک ہی دن اسلام قبول کیا تھا جب کہ رسول اللہ ﷺ دار ارقم میں مقیم تھے۔ اور اس وقت تک کچھ اوپر تیس آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت صہیبؓ بھی ان کمزور و لاچار مسلمانوں میں ہیں جن کو اللہ کی راہ میں سخت ترین آزمائشوں سے گزرنا پڑا، اور جو قریش مکہ کے بہت زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ بعد میں انہوں نے مکہ چھوڑ دیا اور ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ ۳۸ھ میں بعمر ۷۰ سال مدینہ میں ان کا انتقال ہوا اور بقیع میں مدفون ہوئے۔

قرآن کی آیت و من النّاس من یشری نفسه ابتغاء مرضات اللّٰہ انہی کی شان میں نازل ہوئی تھی۔

انصار کی فضیلت

(۲۰) وَعَنْ اَنَسٍؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اٰیَۃُ الْاِیْمَانِ حُبُّ الْاَنْصَارِ وَاٰیَۃُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْاَنْصَارِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (یعنی کمال ایمان) کی نشانی (تمام) انصار سے محبت رکھنا۔ اور نفاق کی نشانی انصار سے بغض و دشمنی رکھنا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "انصار" کا لفظ لغوی طور پر "ناصر" یا "نصر" کی جمع ہے اور اصطلاحًا اس لفظ کا اطلاق مدینہ کے ان لوگوں پر ہوتا ہے جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور جان و مال سے آپ ﷺ کی مدد کی دراصل مدینہ میں دو قبیلے آباد تھے۔ ایک کے مورث اعلیٰ کا نام "اوس" اور دوسرے کے مورث اعلیٰ کا نام "خزرج" تھا اوس و خزرج دونوں بھائی تھے اور آگے چل کر ان دونوں کی نسلوں نے دو زبردست قبیلوں کی صورت اختیار کرلی۔ مدینہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام کی آمد سے پہلے یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے خلاف بھیانک مخاصمت و دشمنی رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہجرت نبوی کے وقت تک مسلسل ایک سو بیس سال سے ان دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ و عداوت چلی آرہی تھی، لیکن جوں ہی انہوں نے اسلام و توحید اور پیغمبر اسلام ﷺ سے تعلق قائم کیا ان کی باہمی عداوت و مخاصمت، باہمی محبت و موانست میں بدل گئی۔ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں قبیلوں کو "انصار" کا لقب عطا فرمایا اور اسی لقب کے ذریعہ ان قبیلوں کے لوگ مشہور و ممتاز ہوئے۔ ان کے بعد ان کی اولاد، ان کی نسلوں، اور ان کے آزاد کردہ غلاموں کے لئے بھی یہ لقب باقی رہا۔ انصار کے فضائل و مناقب کا کوئی ٹھکانا نہیں، اسلام میں بلند تر، شرف و اعزاز ان کو حاصل ہے قرآن کریم میں ان کی تعریف مذکور ہے اور یہ عظیم تر رتبہ ان کو اس بناء پر حاصل ہوا کہ انہوں نے نہایت مخلصانہ طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کو ٹھکانا دیا۔ جان و مال سے آپ ﷺ کی مدد کی اور آپ ﷺ کے دعوتی مشن کے نہایت زبردست اور موثر معاون بنے۔ اور چونکہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی معاونت کر کے تمام عرب و عجم کے دشمنان دین کی عداوت مول لی۔ اس لئے ضروری ہوا کہ ان کی محبت کو ایمان کی علامت اور ان کی عداوت کو کفر و نفاق کی علامت، اسی طرح ان کے تئیں کمال محبت کو کمال ایمان کا موجب اور ان کے تئیں نقصان محبت کو نقصان ایمان کا موجب قرار دیا جائے۔ بلکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر کوئی شخص اس بناء پر ان سے عداوت رکھے کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے معاون و مددگار بنے تو وہ شخص یقینی طور پر حقیقی کافر ہے۔

انصار کو محبوب رکھنے والا اللہ کا محبوب

(۲۱) وَعَنِ الْبَرَاءِؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْاَنْصَارُ لَا یُحِبُّھُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَّلَا یُبْغِضُھُمْ اِلَّا مُنَافِقٌ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ اَحَبَّ اللّٰہُ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ اَبْغَضَہُ اللّٰہُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براء بن عازب انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا "انصار سے وہی محبت رکھتا ہے جو (کامل) مؤمن ہے اور انصار سے وہی شخص عداوت و دشمنی رکھتا ہے جو (حقیقی) منافق یا مجازی منافق یعنی فاسق ہے۔ بس جو شخص انصار کو محبوب رکھے گا اللہ اس کو محبوب رکھے گا۔ اور جو شخص انصار سے دشمنی رکھے گا اللہ اس سے دشمنی رکھے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

بعض انصار کے شکوہ پر آنحضرت کا پر اثر جواب

(۲۲) وَعَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ نَاسًا مِّنَ الْاَنْصَارِ قَالُوْا حِیْنَ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَمْوَالِ ھَوَازِنَ مَا اَفَآءَ فَطَفِقَ یُعْطِیْ رِجَالًا مِّنْ قُرَیْشٍ اَلْمِائَۃَ مِنَ الْاِبِلِ فَقَالُوْا یَغْفِرُ اللّٰہُ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُعْطِیْ قُرَیْشًا وَیَدَعُنَا وَسُیُوْفُنَا تَقْطُرُ

مِنْ دِمَآئِهِمْ فَحُدِّثَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَقَالَتِهِمْ فَاَرْسَلَ اِلَى الْاَنْصَارِ فَجَمَعَهُمْ فِيْ قُبَّةٍ مِّنْ اَدَمٍ وَلَمْ يَدَعْ مَعَهُمْ اَحَدًا غَيْرَهُمْ فَلَمَّا اجْتَمَعُوْا جَآءَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا حَدِيْثٌ بَلَغَنِيْ عَنْكُمْ فَقَالَ فُقَهَاءُ هُمْ اَمَّا ذُوُوْرَاْيِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَلَمْ يَقُوْلُوْا شَيْئًا وَاَمَّا اُنَاسًا مِّنَّا حَدِيْثَةً اَسْنَانُهُمْ قَالُوْا يَغْفِرُ اللّٰهُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِيْ قُرَيْشًا وَيَدَعُ الْاَنْصَارَ وَسُيُوْفُنَا تَقْطُرُ مِنْ دِمَآئِهِمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ اُعْطِيْ رِجَالًا حَدِيْثِيْ عَهْدٍ بِكُفْرٍ اَتَاَلَّفُهُمْ اَمَا تَرْضَوْنَ اَنْ يَّذْهَبَ النَّاسُ بِالْاَمْوَالِ وَتَرْجِعُوْنَ اِلٰى رِحَالِكُمْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ رَضِيْنَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں انصار کے بعض لوگوں نے اس وقت شکوہ کا اظہار کیا جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو قبیلہ ہوازن کا وہ مال غنیمت عطا کیا جو عطا کرنا تھا اور آنحضرت ﷺ نے قریش میں کے کئی لوگوں کو سو سو اونٹ دینا شروع کئے۔ چنانچہ انصار میں سے ان بعض لوگوں نے کہا: اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو بخشے، آپ ﷺ قریش کو تو (اتنا زیادہ) عطا کر رہے ہیں اور ہم کو (زیادہ) نہیں دے رہے ہیں۔ حالانکہ ہماری تلواروں سے قریش کا خون ٹپک رہا ہے. چنانچہ رسول کریم ﷺ کے علم میں جب ان لوگوں کا یہ شکوہ لایا گیا تو آپ ﷺ نے ان تمام انصار کو بلا بھیجا اور ان کو اپنے اس خیمہ میں جمع کیا جو چمڑے کا بنا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ کسی دوسرے کو نہیں بلایا گیا تھا۔ (یعنی صرف انصار ہی کو جمع کیا گیا، ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں بلایا گیا تھا) جب سب انصار جمع ہوئے تو رسول کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: وہ کیا بات ہے جو تمہاری طرف سے مجھ کو پہنچائی گئی ہے؟ ان (انصار) میں جو عقل مند و دانا لوگ تھے وہ بولے: یا رسول اللہ! ہم میں سے عقلمند اور ذی رائے لوگوں نے کچھ نہیں کہا ہاں ہم میں سے کچھ نوعمر اور نوجوان لوگوں نے (ناسمجھی سے) (یہ بات ضرور کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو بخشے۔ آپ ﷺ قریش کو تو (اتنا زیادہ) عطا کر رہے ہیں اور ہم انصار کو (زیادہ) نہیں دے رہے ہیں۔ حالانکہ ہماری تلواروں سے قریش کا خون ٹپک رہا ہے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ابھی ابھی (چند ہی روز پہلے) کافر تھے انہی کو میں (اس مال میں سے) دے رہا ہوں (اور اس طرح) ان کا دل ملاتا ہوں (یعنی ان کو زیادہ دینے کا واحد مقصد تالیف قلوب ہے۔ تاکہ وہ اسلام پر قائم رہیں) اس کے علاوہ اور کوئی مقصد یا جذبہ کار فرما نہیں ہے۔ اور اے انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ (تمہارے علاوہ وہ) لوگ (کہ جو مولفۃ القلوب ہیں) مال و اسباب لے کر یہاں سے لوٹیں اور تم لوگ رسول اللہ ﷺ کو لے کر اپنے مکانوں کو واپس جاؤ۔ انصار (آپ ﷺ کا یہ پر اثر ارشاد سن کر) بول اٹھے، ہاں یا رسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "وہ مال غنیمت عطا کیا جو عطا کرنا تھا" اس جملہ میں کثرت اموال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس موقع پر بنو ہوازن سے جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا وہ بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ روایتوں میں اس مال غنیمت کی جو تفصیل آئی ہے اس کے مطابق چھ ہزار قیدی، چوبیس ہزار اونٹ، چار ہزار اوقیہ چاندی (ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے) اور چالیس ہزار سے زائد بکریاں ہاتھ آئی تھیں اور ایک روایت میں تو یہ ہے کہ بکریوں کی تعداد شمار سے باہر تھی۔

"سو سو اونٹ دینا شروع کئے" جن لوگوں کو آپ ﷺ نے زیادہ تعداد میں اونٹ وغیرہ دیئے وہ دراصل مکہ کے لوگ تھے جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے اور دائرہ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے ان لوگوں کے اندر ایمان نے ابھی پوری طرح جگہ نہیں پکڑی تھی اور "مولفۃ القلوب" کا مصداق تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تالیف قلوب کے تحت ان کو سو سو اونٹ دینا شروع کئے تھے۔ تاکہ اسلام کی طرف ان کا میلان اور اہل اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی مضبوط ہو جائے۔ امیر معاویہؓ کے والد ابو سفیانؓ بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔ مہاجرین و انصار میں سے جو باقی مخلص و صادق مسلمان تھے ان کو آپ ﷺ سو سو سے کم اونٹ عطا فرما رہے تھے۔ مال غنیمت کی تقسیم کا یہ واقعہ مقام جعرانہ کا ہے جہاں آپ ﷺ نے (۸ھ) فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین نامی جنگ میں بنو ہوازن وغیرہ کو پسپا کر

کے ان سے حاصل شدہ تمام مال و اسباب جمع کرا دیا تھا اور پھر طائف سے واپس آکر اس مال غنیمت کو مجاہدین اسلام کے درمیان تقسیم فرمایا۔

"ہماری تلواروں سے قریش کا خون ٹپک رہا ہے" ان لوگوں کا اشارہ ان غزوات اور معرکہ آرائیوں کی طرف تھا جن میں انصار نے پوری پامردی و جانثاری کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے دوش بدوش مشرکین قریش کے خلاف نبرد آزمائی کی۔ اللہ کی راہ میں ان کا خون بہایا۔ ان لوگوں نے دراصل اس خیال کے تحت یہ بات کہی کہ آنحضرت ﷺ قومی تعلق اور قرابت داری کے تقاضہ سے قریش کے لوگوں کو زیادہ عطا کر رہے ہیں اور ان کے ساتھ رعایت کر رہے ہیں۔

"اور تم لوگ رسول اللہ ﷺ کو لے کر" یعنی اگر ان کو مکہ والوں کو زیادہ مال و اسباب مل گیا تو کیا ہوا یہ لوگ تو دنیاوی مال و متاع لے کر اپنے گھروں کو لوٹیں گے جب کہ تم لوگ رسول خدا ﷺ کی بابرکت ذات کو لے کر اپنے گھروں کو واپس جاؤ گے۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ دنیاوی مال و متاع تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے یا اس مال و متاع کے مقابلہ میں رسول خدا ﷺ کی ذات زیادہ بہتر اور زیادہ قیمتی ہے۔

"ہم اس پر راضی ہیں" بلاشبہ ان سعید روحوں کو یہی جواب دینا تھا، رسول خدا کی ذات کے مقابلہ پر دنیاوی مال و متاع کی بڑی سے بڑی تعداد بھی ان کی نظروں میں ہیچ تھی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

رضينا قسمة الجبار فينا لنا علم وللاعداء مال
فان المال يفنى عن قريب وان العلم باق لا يزال

انصار کی فضیلت

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَأً مِّنَ الْاَنْصَارِ وَلَوْ سَلَكَ النَّاسُ وَادِیًا وَسَلَكَتِ الْاَنْصَارُ وَادِیًا اَوْشِعْبًا لَسَلَكْتُ وَادِیَ الْاَنْصَارِ وَشِعْبَهَا الْاَنْصَارُ شِعَارٌ وَالنَّاسُ دِثَارٌ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ بَعْدِیْ اَثَرَةً فَاصْبِرُوْا حَتّٰی تَلْقَوْنِیْ عَلَی الْحَوْضِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار میں کا ایک آدمی ہوتا۔ اگر لوگ ایک وادی میں (یعنی حسی یا معنوی راستہ پر) چلیں اور انصار کسی دوسرے راستہ پر چلیں۔ یا یہ فرمایا کہ (اور انصار) کسی دوسرے پہاڑی درہ میں چلیں تو میں اسی راستہ پر یا اسی پہاڑی درہ میں چلوں جو جماعت انصار کا راستہ ہے۔ انصار تو شعار کے مانند ہیں اور دوسرے لوگ دثار کے مانند۔ (اے انصار) تم میرے بعد دیکھو گے کہ دوسرے لوگوں کو تم پر بلا استحقاق فضیلت دی جائے گی تو تم صبر کئے رہنا یہاں تک کہ مجھ سے حوض کوثر پر آکر ملو۔" (بخاریؒ)

تشریح: "تو میں بھی انصار میں کا ایک آدمی ہوتا" اس سے نسب ولادی (پیدائشی نسب و نسل) میں تبدیلی کی خواہش یا تمنا کا اظہار مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو نسب ولادی میں تبدیلی حرام ہے دوسرے یہ کہ خود آنحضرت ﷺ کا نسب چونکہ دنیا کے تمام نسبوں اور نسلوں سے اعلی و اشرف ہے اس لئے اس نسب و نسل کی نسبت کو چھوڑ کر کسی دوسرے نسب و نسل کی طرف نسبت کی خواہش یا تمنا کے اظہار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں یہاں نسب بلادی یعنی وطنیت و شہریت کی نسبت ضرور مراد ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہجرت کا تعلق اگر دین سے نہ ہوتا اور اس کی طرف منسوب ہونا ضروری نہ ہوتا تو میں اس بات کو پسند کرتا کہ اپنی اصل وطنی و شہری نسبت کو ترک کر کے انصار کے شہر کی طرف اپنے کو منسوب کرتا اور "مہاجر" کہلانے کے بجائے "انصار" کہلاتا۔ لیکن "ہجرت" چونکہ بجائے خود ایک بہت بڑا دینی شرف ہے اور اس کی طرف منسوب ہونا بڑی فضیلت کی بات ہے اس لئے میں اپنی اس خواہش یا تمنا کی تکمیل نہیں کر سکتا پس اس ارشاد

گرامی میں اگرچہ "انصار" کا اکرام اور ان کی زبردست عزت افزائی نیز "نصرت" کی طرف منسوب ہونے کی بڑی فضیلت ہے۔ لیکن اس میں "ہجرت" کی افضلیت اور رتبۂ مہاجرین کی برتری کی طرف بھی ارشاد ہے کیونکہ مہاجرین تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت میں اپنا محبوب وطن و دیار، اپنا گھربار اپنے اہل و عیال اور اپنے قرابتداروں کو چھوڑ دینے کی بے مثال قربانی دی۔ جب کہ انصار نے گو اللہ کے دین اور اللہ کے رسول کی مدد و نصرت اور اس راہ میں بے پناہ ایثار کی فضیلت کاملہ حاصل کی لیکن وہ بہرحال ترک وطن، ترک قبیلہ اور ترک اہل و عیال جیسی عقوبت سے دوچار نہیں ہوئے۔ لہٰذا نصرت کی فضیلت ہجرت کے بعد کی اور انصار کی فضیلت مہاجرین کے بعد کی ہے اور بعض حضرات نے اس ارشاد گرامی کی مراد یہ بیان کی ہے کہ جو چیز مجھ کو انصار سے ممتاز کرتی ہے وہ ہجرت کی فضیلت ہے۔ اگر ہجرت کا شرف اور اس کی فضیلت میرے ساتھ نہ ہوتی۔ تو پھر میں بھی انصار کے ایک فرد کی طرح ہوتا اور رتبہ میں ان کے برابر اور ان کے مثل ہوتا، اس صورت میں کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے لئے تو تواضع اور کسر نفی کا پہلو اختیار فرمایا اور انصار کا دل ملانے کے لئے ان کی رفعت و منزلت ظاہر فرمائی۔

"یا یہ فرمایا کہ" یہاں روای کو شک ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہاں یا تو "وادیا" کا لفظ فرمایا تھا یا "شعبا" کا اصل میں "وادی" تو اس قطعۂ زمین یا اس راستہ کو کہتے ہیں جو دو پہاڑوں یا دو ٹیلوں کے درمیان ہو جس کو عربی میں فرجہ بھی کہتے ہیں اور فارسی میں "کاواک" اور شعب اس راستہ کو کہتے ہیں جو کسی پہاڑ کے اندر ہو کر گزرتا ہے۔ حجاز میں چونکہ پہاڑ اور پہاڑیاں بہت ہیں اس لئے وادیاں اور شعب یعنی درے اور گھاٹیاں بھی کثرت سے ہیں۔ اس زمانہ میں ہوتا یہ تھا کہ کسی قافلہ یا قبیلہ کا سردار جس درے یا گھاٹی میں کو ہو کر گزرنا چاہتا سارا قافلہ اور سارا قبیلہ اس کے پیچھے پیچھے اسی درے یا گھاٹی میں داخل ہوتا اور پھر وہاں سے گزر کر سب اپنی منزل یا کھلے راستہ پر پہنچ جاتے۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ تمام لوگ دو گروہوں میں بٹ کر کسی منزل کی طرف چلیں، ان میں سے ایک گروہ انصار پر مشتمل ہو اور دوسرا گروہ باقی لوگوں پر، اور ان دونوں گروہوں کے راستے الگ الگ ہوں تو میں دوسرے گروہ کا راستہ چھوڑ کر اس راستہ پر چلوں گا جو انصار نے اختیار کیا ہو گا، اس صورت میں کہا جائے گا کہ اس ارشاد گرامی ﷺ کا مقصد انصار کے تئیں آنحضرت ﷺ کے کمال تعلق دارتباط اور ان پر آپ کے کمال عنایت و شفقت کا اظہار ہے اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ وادی اور شعب کے جو معنی یہاں مراد ہیں وہ "مسلک" اور "رائے" کے ہیں مطلب یہ کہ کسی معاملہ میں لوگوں کے درمیان رائے اور مسلک کے اختلاف کا اظہار ہو تو میں اسی رائے اور مسلک کو اختیار کروں گا، جو انصار کا اختیار کردہ ہو گا اور انہی کی موافقت کروں گا۔ اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ اس ارشاد گرامی سے آپ ﷺ کا مقصد انصار کے ساتھ حسن موافقت و مرافقت کا اظہار کرنا ہے۔ کیونکہ انصار نے بھی آپ ﷺ کے تئیں حسن وفا اور اچھی خدمت گزاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے انصار کی اتباع اور ان کی طرف احتیاج کا اظہار کیا ہے کیونکہ آپ ﷺ کی ذات تو متبوع مطلق ہے اور سب آپ کے تابع ہیں۔

"شعار" اور "دثار" "شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو پہننے میں جسم اور شعر یعنی جسم کے بالوں سے لگا ہو جیسے کرتا وغیرہ اور "دثار" اس کپڑے کو کہتے ہیں جو پہنے ہوئے کپڑوں کے اوپر رہتا ہے جیسے چادر وغیرہ۔ پس آپ ﷺ نے انصار کو شعار کے ساتھ اس اعتبار سے تشبیہ دی کہ صدق ایمان اور خلوص محب کا جوہر ان میں پیوست ہے گویا آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ انصار میرے خاص اعتباری اور راز دار لوگ ہیں سب لوگوں میں باعتبار قدر و منزلت کے مجھ سے بہت قریب یہی لوگ ہیں۔

"دوسرے لوگوں کو تم پر بلا استحقاق فضیلت دی جائے گی" اَثَرَۃً یا اُثْرَۃً یا اِثْرَۃً کے معنی ہیں، حق تلفی اور بلا استحقاق دوسرے کسی شخص کو عہدہ یا منصب یا عطا میں فضیلت دینا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا کہ میرے بعد وہ زمانہ آئے گا جب لوگ عہدہ و منصب کی تقسیم میں اپنی ذات کو مقدم رکھیں گے اور تم پر ترجیح دیں گے، امارت و حکومت پر خود کو فائز کریں گے اور ایسے ایسے لوگ کہ جو حقیقی مرتبہ و منزلت کے اعتبار سے کم رتبہ ہوں گے اعلیٰ عہدہ و مناصب حاصل کر لینے کے سبب تم سے بالاتر و افضل بن جائیں گے، چنانچہ مخبر

صادق ﷺ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ پورا ہو کر رہا، خصوصاً حضرت امیر المؤمنین عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں بعض عمّال خلافت کی طرف سے اور اموی دور حکومت میں عام طور پر انصار کی بڑی حق تلفیاں کی گئیں۔ ان کے فضل و شرف کو نظر انداز کیا گیا اور حکومت و امارت کے مناصب سے ان کو محروم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ یا اس ارشاد گرامی سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ فتوحات میں حاصل ہونے والا مال غنیمت امراء و حکام خود بانٹ لیا کریں گے اور عطا کے مال میں تمہارے حق کو نظر انداز کر کے اپنی ذات کو یا تم سے کم تر لوگوں کو تم پر فضیلت و ترجیح دیں گے۔

"یہاں تک کہ مجھ سے حوض کوثر پر آ کر ملو" یعنی: حق تلفی کی صورت میں تمہیں جس دل شکستگی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا اگر تم نے اس پر صبر کیا اور تمامتر شکایات کے باوجود نہ تو حاکم وقت سے بغاوت کے مرتکب ہوئے اور نہ ملی شیرازہ بکھرنے کا سبب بنے تو اس کا اجر تم کو اس وقت ملے گا جب حشر کے دن تم حوض کوثر پر آ کر مجھ سے ملو گے، کہ میری زیارت اور وہاں کی لازوال نعمتیں تمہیں باغ باغ کر دیں گی، پس یہ ارشاد گرامی دراصل انصار کے اس صبر کے عوض ان کے لئے سرفرازیٔ جنت کی بشارت ہے منقول ہے کہ امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں ایک دن بعض انصار ان کے پاس بعض مہاجرین کی شکایت لے کر آئے، حضرت امیر معاویہؓ ان کی شکایت کا ازالہ نہ کر سکے۔ اس پر انصار نے امیر معاویہؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے سچ ہی فرمایا تھا کہ (اے انصار) تم میرے بعد دیکھو گے کہ دوسرے لوگوں کو تم پر بلا استحقاق ترجیح دی جائے گی (یہ سن کر) امیر معاویہؓ نے پوچھا پھر اس وقت کے لئے آنحضرت ﷺ نے تمہیں کیا حکم دیا تھا، انصار نے کہا صبر کرنے کا، حضرت امیر معاویہؓ بولے: تو پھر (شکوہ شکایت کے بجائے) تمہیں صبر ہی کرنا چاہئے۔ کیونکہ رسول خدا ﷺ نے تمہیں اسی بات کا حکم دیا ہے۔

انصار سے کمال قرب و تعلّق کا اظہار

(۲۴) وَعَنْهُ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْفَتْحِ فَقَالَ مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِىْ سُفْيَانَ فَهُوَ اٰمِنٌ وَمَنْ اَلْقَى السِّلَاحَ فَهُوَ اٰمِنٌ فَقَالَتِ الْاَنْصَارُ اَمَّا الرَّجُلُ فَقَدْ اَخَذَتْهُ رَاْفَةٌ بِعَشِيْرَتِهٖ وَرَغْبَةٌ فِىْ قَرْيَتِهٖ وَنَزَلَ الْوَحْىُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قُلْتُمْ اَمَّا الرَّجُلُ اَخَذَتْهُ رَاْفَةٌ بِعَشِيْرَتِهٖ وَرَغْبَةٌ فِىْ قَرْيَتِهٖ كَلَّا اِنِّىْ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ هَاجَرْتُ اِلَى اللّٰهِ وَاِلَيْكُمْ اَلْمَحْيَا مَحْيَاكُمْ وَالْمَمَاتُ مَمَاتُكُمْ قَالُوْا وَاللّٰهِ مَا قُلْنَا اِلَّا ضِنًّا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ قَالَ فَاِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُصَدِّقَانِكُمْ وَيَعْذُرَانِكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں فتح مکہ کے دن ہم لوگ رسول کریم ﷺ کی معیت میں تھے (اس دن) آپ ﷺ نے اعلان فرمایا تھا کہ مشرکین میں سے جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ امن میں ہے اور (مشرکین میں سے) جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ امن میں ہے (بعض) انصار (یہ اعلان سن کر آپس میں) کہنے لگے کہ اس شخص (یعنی آنحضرت ﷺ) پر اپنی قوم کے تئیں مروت و مہربانی اور اپنی بستی والوں (یعنی اہل مکہ) کے تئیں رغبت و چاہت کا جذبہ (طبعی طور پر) غالب آ گیا چنانچہ رسول کریم ﷺ پر وحی نازل ہوئی (جس کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا گیا کہ انصار اس اس طرح کہہ رہے ہیں اس پر آپ نے انصار کو بلایا) اور (ان سے) فرمایا: تم نے یہ کہا ہے کہ اس شخص پر اپنی قوم کے تئیں مروت و مہربانی اور اپنی بستی والوں کے تئیں رغبت و چاہت کا جذبہ غالب آ گیا ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول ہوں میں نے اللہ کی طرف (یعنی اللہ کے حکم سے اور اللہ کا اجر و انعام حاصل کرنے کے لئے) اور تمہاری طرف (یعنی تمہارے دیار کی طرف) ہجرت کی ہے اب تو زندگی بھی تمہاری زندگی کے ساتھ ہے اور مرنا بھی تمہارے ساتھ ہے (یہ سن کر) ان انصار نے (معذرت کا اظہار کرتے ہوئے) عرض کیا: بخدا ہم نے یہ بات صرف اس لئے کہی کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ ہم کو بخل تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ اور اس کا رسول تمہاری تصدیق کرتے ہیں اور تمہیں راست گو مانتے ہیں اور تمہاری یہ معذرت قبول

کرتے ہیں۔" (مسلم)

تشریح: "وہ امن میں ہے" یعنی: جو مشرک ابوسفیان کے گھر میں پہنچ جائے اور جو مشرک ہتھیار ڈال دے اس کو جان کی امان دی جاتی ہے، کوئی مسلمان اس پر تلوار نہ اٹھائے. اس کو مارے نہیں۔ ابوسفیان بن صخر بن حرب، امیر معاویہؓ کے والد ہیں۔ قریش کے بڑے سرداروں اور زعماء میں سے تھے۔ فتح مکہ کے دن انہوں نے اسلام قبول کیا اور جنگ حنین میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے۔ چونکہ یہ "مولفۃ القلوب" تھے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس جنگ کے مال غنیمت میں سے ان کو حصہ سے زائد عطا کیا جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک سو اونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی ان کو دی گئی۔ محاصرۂ طائف کے دوران ان کی ایک آنکھ بے کار ہو گئی تھی. اور ہمیشہ کے لئے کانے ہو گئے تھے. پھر جنگ یرموک میں ان کی دوسری آنکھ بھی پتھر کی چوٹ سے پھوٹ گئی تھی۔ ۳۴ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا اور بقیع میں مدفون ہوئے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ فتح مکہ کے دن جب ابوسفیانؓ نے اسلام قبول کر لیا تو حضرت عباسؓ نے بارگاہ نبوت میں عرض کیا یا رسول اللہ یہ شخص عزت اور بڑائی کی چاہ رکھتا تھا، اس لئے اس کو کوئی ایسی عزت بخش دیجئے جس کو یہ اپنے لئے باعث فخر سمجھے۔ چنانچہ حضرت عباسؓ کے اسی مشورہ پر آنحضرت ﷺ نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ جو شخص ابوسفیانؓ کے گھر میں داخل ہو جائے وہ امن میں ہے۔ اور بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی مکی زندگی میں جب کہ قریش آپ ﷺ کی ایذا رسانی کے درپے رہتے تھے، ایک دن ابوسفیانؓ نے آپ ﷺ کو امن (تحفظ) دیا تھا۔ اور اپنے گھر لے آئے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن ان کے گھر کو جو "دار الامن" قرار دیا وہ ان کے اسی دن کے عمل کا بدلہ تھا۔

"رغبت و چاہت کا جذبہ غالب آ گیا ہے" دراصل انصار نے جب یہ دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نے اس ابوسفیان کو اتنی بڑی عنایت و عزت اور رعایت سے نوازا ہے جو اتنے طویل عرصہ تک آنحضرت ﷺ مسلمانوں اور اسلام کا سخت ترین معاند و دشمن رہا ہے تو ان کو سخت حیرت ہوئی۔ اور یہ بات ان کو اپنی غیرت و حمیت کے منافی محسوس ہوئی چنانچہ اسی حمیت و غیرت کے تحت سادگی اور ناسمجھی میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔

"نہیں. ایسا نہیں ہے" یعنی: حقیقت میں وہ بات نہیں ہے جو تمہارے خیال میں آئی ہے کہ میں نے ابوسفیان کو اس طرح کی عزت عطا کر کے گویا اس امر کا اظہار کیا ہے کہ میں اب مکہ ہی میں رہ پڑوں گا اور مدینہ واپس نہیں جاؤں گا، بلکہ میری ہجرت آخری اور حتمی ہے اور وہ ہجرت چونکہ اللہ کے حکم سے اور خالص اللہ کے لئے ہوئی ہے، لہٰذا اس سے پھرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"میں اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول ہوں" یعنی میری اس حیثیت اور میرے اس منصب کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اب میں اس شہر کا تصور ہی نہ لاؤں جس کو میں نے اللہ کی خاطر چھوڑ دیا تھا اور اپنے اس سابقہ وطن میں ذرا بھی رغبت اور دلچسپی ظاہر نہ کروں جہاں سے میں اللہ کے لئے ہجرت کر چکا ہوں۔

"اور میں تمہاری طرف" یعنی اصل میں تو میری ہجرت اللہ کی طرف تھی اور یہ اسی کے حکم پر منحصر تھا کہ کون سا دیار میرا دار الہجرت بنتا ہے پس چونکہ تم لوگ میرے اور مہاجرین کے تئیں قلبی تعلق و میلان رکھتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: والذین تبوء الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم لہٰذا اللہ نے تمہارے دیار کو میرا دار الہجرت قرار دیا اور میں اپنے قبیلہ اور اپنی قوم کا دیار چھوڑ کر تمہارے دیار وطن میں آ گیا۔

"اور مرنا بھی تمہارے مرنے کے ساتھ ہے" یعنی زندگی اور موت کسی حال میں تم سے جدا نہیں ہوں گا، تم میرے ساتھ ہو اور میں تمہارے ساتھ رہوں گا، جب تک زندہ ہوں تمہارے ہی شہر میں رہوں گا اور مروں گا بھی تو تمہارے شہر میں. اس بارے میں خاطر جمع رکھو۔

"اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ ہم کو بخل تھا" یعنی یہ بات ہم نے محض اس وجہ سے کہی ہے کہ آپ ﷺ کی میزبانی اور آپ کی

ہمسائیگی و قرب کا جو عظیم تر اعزاز اور فضل و شرف ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول نے عطا کیا ہے اس میں کسی اور کی شرکت ہمیں گوارا نہیں ہے یہ بات ہماری غیرت کو ابھارنے والی ہے۔ کہ آپ ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کا میلان دوسروں کی طرف ظاہر ہو۔ جو ہمیں آپ ﷺ کی عنایت و شفقت آپ ﷺ کی محبت و قربت اور آپ ﷺ کی ہمسائیگی و صحبت سے محروم کردے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی غیرت و حمیتِ محبت کو مستلزم ہے اور محبت کو ہرگز گوارا نہیں ہوتا کہ محبوب غیروں کی طرف توجہ و التفات کی نظر سے دیکھے۔

غیر تم باتو چنا نست کہ گر دست دہد نہ گزارم کہ در آئے بہ خیال دگیراں

انصار کی اس مراد کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ جیسی نعمت ہمیں عطا کی ہے۔ چونکہ آدمی اپنے اقارب اور اپنے وطن کی محبت پر مجبور ہے اس لئے ہمیں خدشہ ہوا کہ شائد آپ ﷺ اپنی صحبت و قربت سے ہمیں محروم کرکے اہل مکہ کو نوازنا چاہتے ہیں اور اس خوف نے ہمیں اتنا مضطر کردیا کہ ایسے الفاظ اپنی زبان سے نکال بیٹھے اس سورت میں ان انصار پر اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم: لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا کے باوجود ایسا معمولی جملہ زبان سے کیوں ادا کیا۔

انصار کی فضیلت

(۲۵) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى صِبْيَانًا وَّنِسَاۤءً مُقْبِلِيْنَ مِنْ عُرْسٍ فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اَنْتُمْ مِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ اَللّٰهُمَّ اَنْتُمْ مِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ يَعْنِیْ الْاَنْصَارَ۔ متفق علیہ

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے (انصار کے) بچوں اور عورتوں کو کسی شادی وغیرہ کی دعوت طعام سے واپس آتے دیکھا تو نبی کریم ﷺ (ان کے راستہ میں، یا ان سے ملنے کے لئے ایک جگہ پر) کھڑے ہوگئے اور (ان کو مخاطب کرکے) فرمایا: خداوند: (میں تجھ کو گواہ کرکے انصار کی ان عورتوں اور بچوں سے کہتا ہوں کہ اے انصار) تمام لوگوں میں تم میرے نزدیک محبوب ترین ہو، خداوندا! (میں تجھ کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ اے انصار) تمام لوگوں میں تم میرے نزدیک محبوب ترین ہو، آنحضرت ﷺ کی مراد تمام انصار سے تھی۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "تمام لوگوں میں تم میرے نزدیک محبوب ترین ہو" یہ بات دوبار آپ ﷺ نے تاکیداً فرمائی اور صحیح بخاری کی روایت میں ان الفاظ کا تین بار فرمانا نقل ہوا ہے۔ نیز بعض نسخوں میں اِلَیَّ (میرے نزدیک) کے بجائے اِلَی اللّٰہِ (اللہ کے نزدیک) کے الفاظ مذکور ہیں۔ لیکن بخاری کی روایت میں اس ارشاد گرامی کا تین بار مذکور ہونا اِلَیَّ ہی کے لفظ کو زیادہ صحیح ظاہر کرتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ (خداوند) کا لفظ یا تو قسم کے معنی میں استعمال ہوا ہے یا اس معنی میں کہ اے خدا: تو خوب جانتا ہے کہ میں یہ بات صدق دل سے کہہ رہا ہوں۔ گویا آنحضرت ﷺ نے جب ان عورتوں اور بچوں کو خوش خوش آتے دیکھا تو ان پر نظر پڑتے ہی آپ ﷺ باغ باغ ہوگئے اور ان کے تئیں آپ ﷺ کے جذبات محبت امڈ پڑے جن کا اظہار آپ ﷺ نے مذکورہ الفاظ میں کیا اور کمال عنایت و مکرمت کے سبب ان جذبات و احساسات پر حق سبحانہ تعالیٰ کو گواہ کیا۔

انصار کی فضیلت

(۲۶) وَعَنْهُ قَالَ مَرَّ اَبُوْبَكْرٍ وَالْعَبَّاسُ بِمَجْلِسٍ مِنْ مَجَالِسِ الْاَنْصَارِ وَهُمْ يَبْكُوْنَ فَقَالَا مَا يُبْكِيْكُمْ قَالُوْا ذَكَرْنَا مَجْلِسَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَّا فَدَخَلَ اَحَدُهُمَا عَلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهٗ بِذٰلِكَ فَخَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ عَصَبَ عَلٰى رَاْسِهٖ حَاشِيَةَ بُرْدٍ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ وَلَمْ يَصْعَدْ بَعْدَ ذٰلِكَ الْيَوْمِ فَحَمِدَ اللّٰهَ

وَاَثْنٰی عَلَیْهِ ثُمَّ قَالَ اُوْصِیْکُمْ بِالْاَنْصَارِ فَاِنَّهُمْ کِرْشِیْ وَعَیْبَتِیْ وَقَدْ قَضَوُا الَّذِیْ عَلَیْهِمْ وَبَقِیَ الَّذِیْ لَهُمْ فَاقْبَلُوْا مِنْ مُحْسِنِهِمْ وَتَجَاوَزُوْا عَنْ مُسِیْئِهِمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کے مرض وفات کے دوران ایک دن) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ انصار کی ایک مجلس کے پاس سے گزرے تو (دیکھا کہ) وہ اہل مجلس بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے ان سے پوچھا: کیوں رو رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ہمارے درمیان نبی کریم ﷺ کی مجلس ہمیں یاد آگئی تھی۔ (یہ سن کر) ان دونوں میں ایک صاحب (یعنی یا تو حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عباسؓ) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو اس بات سے آگاہ کیا۔ (کہ انصار کی جماعت آپ ﷺ کی مجلس مبارک کو یاد کر کے رو رہی ہے) چنانچہ نبی کریم ﷺ اس حالت میں حجرہ مبارک سے باہر تشریف لائے کہ (درد سر کو کم کرنے کے لئے) چادر کا ایک کونہ بطور پٹی سر مبارک پر باندھ رکھا تھا، پھر آپ ﷺ (خطبہ دینے کے لئے) منبر پر چڑھے اور اس دن کے بعد پھر آپ ﷺ کو منبر پر چڑھنا نصیب نہیں ہوا۔ پہلے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی کامل ثنا بیان کی اور پھر فرمایا: (اے مہاجرو) میں تم کو انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں (کہ ان کے ساتھ رعایت و حمایت اور حسن سلوک کا رویہ اختیار کئے رہنا) کیونکہ انصار میرا معدہ اور میری گٹھری ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان پر جو حق تھا اس کو انہوں نے ادا کر دیا اور جو کچھ ان کا ہے (یعنی اجر و ثواب اور سرفرازئ جنت) وہ اللہ کے ہاں باقی ہے پس ان کے نیک لوگوں کا عذر (کہ جو وہ اپنی لغزش اور کوتاہی کے سلسلہ میں بیان کریں) قبول کرو اور ان کے برے لوگوں برے کاموں سے (کہ جن کا عذر پیش کرنے سے وہ عاجز ہوں) درگزر کرو" (بخاری)

تشریح: کرش (اور ایک نسخہ کے مطابق کرش) اصل میں چوپایوں (یعنی بیل اور گائے وغیرہ) کے کوٹھے یا اوجھ کو کہتے ہیں جو آدمیوں کے لئے معدہ کہلاتا ہے۔ اور "عیبہ" جامہ دانی یعنی بقچی یا گٹھری کو کہتے ہیں۔ پس "انصار میرا معدہ اور میری گٹھری ہیں" سے مراد یہ ہے کہ انصار میرے رازدار، دلی دوست اور تمام امور میں میرے محرم اسرار اور معتمد علیہ ہیں۔ گویا آپ ﷺ نے انصار کو ان چیزوں سے مشابہت اس بناء پر دی کہ جیسے اوجھ یا معدہ میں چارہ اور کھانا جا کر جمع ہو جاتا ہے، اور جامہ دانی میں کپڑے محفوظ رکھے جاتے ہیں. اسی طرح آنحضرت ﷺ کی راز کی باتیں اور امانتیں انصار کے پاس رہتی ہیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ لغت میں "کرش" کے ایک معنی عیال. چھوٹے بچوں اور جماعت کے بھی آتے ہیں لہٰذا حدیث میں مذکورہ "کرش" کا لفظ اس معنی پر بھی معمول کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ انصار میری جماعت میرے اصحاب و رفیق اور میرے لئے میرے عیال اور میرے چھوٹے بچوں کی مانند ہیں۔ جن پر میری شفقت و مہربانی ہے۔ اور جن کا میں غمخوار ہوں۔

"ان پر جو حق تھا" میں "حق" سے مراد جان و مال سے امداد و معاونت اور خیر خواہی ہے۔ اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ انصار کے نمائندوں نے مدینہ سے مکہ پہنچ کر لیلۃ العقبہ میں میرے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرتے ہوئے جو وعدہ اور جو عہد کیا تھا کہ اللہ کی راہ میں جان مال سے ہر طرح میری مدد کریں گے۔ اور اس کے عوض میں اللہ تعالیٰ نے ان سے جنت کا وعدہ کیا تھا۔ جیسا کہ اس موقع پر نازل ہونے والی اس آیت ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسهم و اموالهم بان لهم الجنة سے واضح ہے. تو اپنے اس عہد و وعدہ کو انصار نے کما حقہ پورا کر دیا ہے۔

انصار کی فضیلت

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ مَرَضِهِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْهِ حَتّٰی جَلَسَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰی عَلَیْهِ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ النَّاسَ یَکْثُرُوْنَ وَیَقِلُّ الْاَنْصَارُ حَتّٰی یَکُوْنُوْا فِی النَّاسِ بِمَنْزِلَةِ الْمِلْحِ فِی الطَّعَامِ فَمَنْ وَلِیَ مِنْکُمْ شَیْئًا یَضُرُّ فِیْهِ قَوْمًا وَیَنْفَعُ فِیْهِ اٰخَرِیْنَ فَلْیَقْبَلْ مِنْ مُحْسِنِهِمْ وَلْیَتَجَاوَزْ عَنْ مُسِیْئِهِمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی اس بیماری کے دوران کہ جس میں آپ ﷺ نے وفات پائی، (ایک دن) حجرۂ مبارک سے باہر آئے اور منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ اول آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی ثنا بیان کی، پھر فرمایا، بعد ازاں۔ جان لو، لوگ یعنی مسلمانوں کی تعداد (روز بروز) بڑھے گی (جن میں کا معتدبہ حصہ اپنے اپنے وطن چھوڑ کر بہ نیت ہجرت مدینہ میں آئے گا) اور انصار کی تعداد کم ہو جائے گی یہاں تک دوسرے لوگوں میں ان (انصار) کا تناسب کھانے میں نمک کے برابر رہ جائے گا، پس (اے مہاجرین) تم میں سے جو شخص کسی بھی طرح کے اقتدار کا مالک بنے اور اس کے سبب وہ کچھ لوگوں یعنی نیکو کاروں کو فائدہ پہنچانے اور کچھ لوگوں یعنی بدکاروں کو نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہو اس شخص کو چاہئے کہ انصار کے نیکو کاروں (کی نیکی) کو قبول کرے اور ان کے بدکاروں (کی برائی) سے در گزر کرے۔" (بخاری)

تشریح: "اور انصار کی تعداد کم ہو جائے گی" یعنی "انصار" چونکہ صحابہ کی اس جماعت سے عبارت ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنے یہاں ٹھکانہ دیا اور جان و مال سے آپ ﷺ کی اور مسلمانوں کی مدد کی اس لئے "انصار ہونا" ایک ایسا وصف ہے جو ایک خاص زمانہ میں جن لوگوں کا نصیب بننا تھا بن گیا، اب آگے یہ وصف کسی کو حاصل نہیں ہوگا اور اس اعتبار سے انصار کی جماعت میں اضافہ کا کوئی سوال نہیں، جب کہ "ہجرت" کا وصف باقی ہے۔ اور باقی رہے گا جوں جوں لوگ اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑ کر اور ہجرت کر کے مدینہ آتے رہیں گے ویسے مہاجرین کی جماعت مدینہ میں بڑھتی رہے گی۔ پس ظاہر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ کے ذریعہ گویا یہ پیشین گوئی فرمائی کہ مہاجرین تو بڑھتے رہیں گے، ان کی اولاد کا سلسلہ بھی بہت پھیلے گا اور وہ نہ صرف یہ کہ مختلف شہروں اور علاقوں میں وسیع بنیادوں پر سکونت اختیار کریں گے۔ بلکہ ملکوں کی حکمرانی و جہانبانی بھی انہی کے حصہ میں آئے گی۔ ان کے برخلاف "انصار" کا طبقہ روز بروز محدود ہوتا جائے گا اور پوری ملت میں ان کا وجود نہایت محدود تعداد میں رہ جائے گا۔ چنانچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ واقع میں وہی ہوا جو مخبر صادق ﷺ نے خبر دی تھی۔

"کھانے میں نمک کے برابر" اس تشبیہ میں بھی انصار کے کم ہو جانے کی خبر ہے۔ اور ان کی تعریف کی طرف اشارہ بھی ہے۔ یعنی جس طرح نمک کھانے کا ذائقہ سنوارتا، بناتا ہے۔ اسی طرح انصار کا وجود اہل اسلام کے سنوار اور بناؤ کا باعث ہوگا۔

انصار اور ان کی اولاد در اولاد کے حق میں دعا

(۲۸) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَلِاَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ وَ اَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت زید بن ارقمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے دعا فرمائی: اے اللہ! انصار کو، انصار کے بیٹوں کو، اور انصار کے پوتوں کو بخش دے۔" (مسلم)

تشریح: پہلے درجہ والے تو صحابہ ہوئے، دوسرے درجہ والے تابعین اور تیسرے درجہ والے تبع تابعین ہوئے، پس آنحضرت ﷺ نے انصار کے تینوں قرنوں کے حق میں دعا فرمائی جو "خیر القرون" کا مصداق ہیں اور یہ بھی بعید نہیں کہ "بیٹوں" اور "پوتوں" سے ان کی قیامت تک کی نسلیں مراد ہوں جن میں "بیٹوں" کے ساتھ "بیٹیاں" بھی شامل ہوں کیونکہ "ابناء" کا لفظ "اولاد" کے معنی پر بھی محمول ہو سکتا ہے۔

انصار کے بہترین قبائل

(۲۹) وَعَنْ اَبِيْ اُسَيْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ دُوْرِ الْاَنْصَارِ بَنُوْ النَّجَّارِ ثُمَّ بَنُوْ عَبْدِ الْاَشْهَلِ ثُمَّ

بَنُو الْحَارِثِ ابْنِ الْخَزْرَجِ ثُمَّ بَنُوْ سَاعِدَةَ وَفِیْ كُلِّ دُوْرِ الْاَنْصَارِ خَيْرٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابی اسید کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا؟ انصار کے بہترین گھر یعنی ان کے افضل قبائل "بنو نجار" پھر "بنو عبدالاشہل" پھر "بنو حارث بن خزرج" اور پھر "بنو ساعدہ" ہیں اور انصار کے تمام ہی قبیلوں میں بھلائی اور نیکی ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "اور انصار کے تمام ہی قبیلوں میں" میں تعمیم بعد تخصیص ہے۔ یعنی پہلے تو آپ ﷺ نے بعض خاص خاص قبیلوں کی فضیلت کا ذکر فرمایا اور پھر مجموعی طور پر تمام ہی قبیلوں کے بارے میں فرمایا کہ انصار کے سارے ہی قبائل خیر و بھلائی کی فضیلت رکھتے ہیں۔ اور ان کے سب قبیلے دوسرے تمام اہل مدینہ سے افضل ہیں۔ عسقلانی نے لکھا ہے کہ پہلے جو "خیر" کا لفظ ہے وہ تو "افضل" کے معنی میں ہے اور دوسرا "خیر" فضل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ یوں تو انصار کے تمام ہی قبائل کو خیر و بھلائی حاصل ہے۔ لیکن مراتب کے اعتبار سے ان میں تفاوت ہے۔ اور علماء لکھتے ہیں کہ یہ تفاوت قبول اسلام میں سبقت کے اعتبار سے یعنی جس قبیلے نے قبول اسلام میں جس قدر سبقت کی تھی اسی قدر اس کی فضیلت بڑھی ہوئی ہے واضح ہو "دار" (یعنی گھر) سے مراد قبیلہ ہے۔ انصار کے تمام قبائل مدینہ کے اپنے الگ الگ محلوں میں رہتے تھے۔ اور جس محلہ میں جو قبیلہ رہتا تھا۔ وہ اسی قبیلہ کی نسبت سے "دار بنو فلاں" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ چنانچہ اس اعتبار سے کہ "قبیلہ" کا اصل نام "بنو فلاں" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا، بہت سی روایتوں میں "بنو فلاں" کا لفظ "دار" کے بغیر ہی نقل ہوا ہے۔

اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ اقوام و قبائل اور اشخاص میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دینا اور اس کی افضلیت بیان کرنا جائز ہے، اس کا شمار غیبت میں نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی بنیاد کسی کی عداوت یا تنقیص اور یا خواہش نفس نہ ہو۔

حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ

(۳۰) وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ بَعَثَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا وَالزُّبَیْرَ وَالْمِقْدَادَ وَفِیْ رِوَایَةٍ وَاَبَا مَرْثَدٍ بَدَلَ الْمِقْدَادِ فَقَالَ انْطَلِقُوْا حَتّٰی تَاْتُوْا رَوْضَةَ خَاخٍ فَاِنَّ بِهَا ظَعِیْنَةً مَعَهَا كِتَابٌ فَخُذُوْهُ مِنْهَا فَانْطَلَقْنَا تَتَعَادٰی بِنَا خَیْلُنَا حَتّٰی اَتَیْنَا اِلَی الرَّوْضَةِ فَاِذَا نَحْنُ بِالظَّعِیْنَةِ فَقُلْنَا اَخْرِجِی الْكِتَابَ قَالَتْ مَا مَعِیْ مِنْ كِتَابٍ فَقُلْنَا لَتُخْرِجِنَّ الْكِتَابَ اَوْ لَنُلْقِیَنَّ الثِّیَابَ فَاَخْرَجَتْهُ مِنْ عِقَاصِهَا فَاَتَیْنَا بِهِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِذَا فِیْهِ مِنْ حَاطِبِ بْنِ اَبِیْ بَلْتَعَةَ اِلٰی نَاسٍ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ مِنْ اَهْلِ مَكَّةَ یُخْبِرُهُمْ بِبَعْضِ اَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا حَاطِبُ مَا هٰذَا فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَا تَعْجَلْ عَلَیَّ اِنِّیْ كُنْتُ امْرَاً مُلْصَقًا فِیْ قُرَیْشٍ وَلَمْ اَكُنْ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَكَانَ مَنْ مَعَكَ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ لَهُمْ قَرَابَةٌ یَحْمُوْنَ بِهَا اَمْوَالَهُمْ وَاَهْلِیْهِمْ بِمَكَّةَ فَاَحْبَبْتُ اِذْ فَاتَنِیْ ذٰلِكَ مِنَ النَّسَبِ فِیْهِمْ اَنْ اَتَّخِذَ فِیْهِمْ یَدًا یَحْمُوْنَ بِهَا قَرَابَتِیْ وَمَا فَعَلْتُ كُفْرًا وَلَا ارْتِدَادًا عَنْ دِیْنِیْ وَلَا رِضًی بِالْكُفْرِ بَعْدَ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ قَدْ صَدَقَكُمْ فَقَالَ عُمَرُ دَعْنِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَضْرِبْ عُنُقَ هٰذَا الْمُنَافِقِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ قَدْ شَهِدَ بَدْرًا وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ اللّٰہَ اطَّلَعَ عَلٰی اَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةُ وَفِیْ رِوَایَةٍ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے مجھ کو، زبیرؓ کو اور مقدادؓ کو اور ایک روایت میں مقدادؓ کے بجائے ابو مرثدؓ کا ذکر کیا۔ روانگی کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم لوگ (تیز رفتاری سے) سفر کر کے روضۂ خاخ پہنچو، وہاں ایک عورت ملے گی جو اونٹ کی سواری پر کجاوہ میں بیٹھی ہوگی، اس کے پاس ایک خط ہوگا، تم لوگ وہ خط اس سے حاصل کر کے لے آؤ۔ چنانچہ ہم (فوراً) روانہ

ہو گئے۔ اور اپنے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑاتے ہوئے روضہ خاخ پہنچے اور اس عورت کو جالیا۔ ہم نے (اس عورت سے) کہا لاؤ، خط نکال کر ہمارے حوالہ کرو! وہ عورت بولی: میرے پاس کوئی خط وط نہیں ہے۔ ہم نے (ذرا تیز ہو کر) کہا: تو خط نکالتی ہے یا ہم تیرے کپڑے اتروائیں (یعنی اگر تو نے خط نکال کر نہیں دیا تو مجبوراً تجھ کو ننگی کرنا پڑے گا تاکہ وہ خط برآمد ہو جائے) تب اس عورت نے وہ خط اپنی چوٹی سے نکال کر ہمارے حوالہ کر دیا اور ہم اس خط کو لے کر نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، (جب وہ خط کھول کر دیکھا گیا تو) اس میں لکھا تھا: حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف اہل مکہ میں سے مشرکین کے نام، اور پھر آگے حاطب نے مشرکین مکہ کو رسول خدا ﷺ کے بعض اہم اقدامات اور منصوبوں کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں۔ چنانچہ رسول خدا ﷺ نے (حاطب کو طلب کیا اور اس سے) فرمایا: ارے حاطب! یہ کیا ہے؟ (مجھے بتا تو نے یہ کیا حرکت کی ہے اور کیوں کی ہے) حاطب بولا، یا رسول اللہ! میرے بارے میں عجلت نہ کیجئے (یعنی میری پوری بات سنے بغیر اس حرکت کی پاداش میں میرے متعلق کفر اور سزا کا فیصلہ نہ کیجئے) دراصل میں ایک ایسا شخص ہوں جو قریش کے لوگوں میں باہر سے آ کر مل گیا ہے (یعنی قریش سے میرا کوئی نسبی اور قرابتی تعلق نہیں ہے، بلکہ باہر سے آ کر ان میں شریک ہو گیا ہوں اور محض ان کا حلیف ہوں، جب کہ آپ ﷺ کے ساتھ جو (دوسرے) مہاجرین ہیں وہ مکہ والوں سے قرابت رکھتے ہیں اور مشرکین مکہ اس قرابت کا لحاظ کر کے مکہ میں ان مہاجرین کے مال و جائیداد اور ان کے اہل و عیال کی دیکھ بھال رکھتے ہیں، پس اس بناء پر کہ میرے اور مشرکین مکہ کے درمیان نسبی و قرابتی تعلق معدوم ہے میں نے چاہا کہ ان کے لئے کوئی ایسا کارنامہ انجام دوں جس کے بدلے میں وہ مکہ میں میرے قرابتداروں کی حفاظت کریں (آپ کو صدق دل سے یقین دلاتا ہوں کہ) میں نے یہ حرکت اس وجہ سے نہیں کہ میں (سرے سے دائرہ ایمان و اسلام میں داخل ہی نہیں ہوا تھا اور) کافر ہوں، نہ اس وجہ سے کہ میں (پہلے مسلمان تو ہو گیا تھا لیکن اب دائرہ اسلام سے نکل گیا ہوں اور) مرتد ہو گیا ہوں اور نہ اس وجہ سے کہ اسلام کے بعد اب کفر مجھ کو اچھا لگتا ہے (اور نور ایمان سے تعلق توڑ کر کفر کے اندھیرے میں جانا چاہتا ہوں) (حاطب کا یہ پورا بیان سن کر) رسول خدا ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حاطب نے تمہارے سامنے بالکل سچا بیان دیا ہے (حقیقت حال یہی ہے جو اس نے بتائی ہے) لیکن عمر فاروقؓ نے کہا: یا رسول اللہ! مجھ کو اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: (اس طرح مت سوچو اور) اس حقیقت پر نظر رکھو کہ حاطب غزوہ بدر میں شریک ہوا ہے (اس پر حضرت عمرؓ بولے ہوں گے کہ یہ اگر غزوۂ بدر میں شریک ہوا ہے تو ہوا کرے۔ اب تو اس نے جاسوسی کر کے گویا غداری کا ارتکاب کیا ہے اور اس پر قرار واقعی سزا کا مستوجب ہو گیا ہے۔ تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہو گا:) اور تمہیں حقیقت حال کا کیا علم ہے (یعنی تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو کہ حاطب مستوجب قتل ہو گیا ہے) ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو اپنی خصوصی نظر کرم و مغفرت سے نواز رکھا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "تم جو چاہو کرو، حقیقت تو یہ ہے کہ جنت تمہارے لئے واجب ہو گئی ہے" اور ایک روایت میں (تمہارے لئے جنت واجب ہو چکی ہے کے بجائے) یہ ہے کہ "میں تم کو بخش چکا ہوں" اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے (حاطب اور اس جیسے لوگوں کو اس طرح کی مذموم حرکت کے خلاف متنبہ کرنے کے لئے) یہ آیت نازل فرمائی (جس کا ترجمہ ہے:) اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو (یعنی وہ لوگ کہ جن کو میں دشمن رکھتا ہوں یا جن سے تم دشمنی رکھتے ہو، ان کو) اپنا دوست نہ سمجھو الخ۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "مقداد کے بجائے ابو مرثدؓ کا ذکر ہے" یعنی اس روایت میں تو یہ ہے کہ اس مہم پر بھیجے جانے والوں میں حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ تھے۔ جب کہ دوسری روایت میں حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت زبیرؓ اور حضرت ابو مرثدؓ کا بھیجا جانا مذکور ہے۔ بہر حال حضرت مقدادؓ عمرو کندی کے بیٹے ہیں۔ نہایت قدیم الاسلام ہیں، ایک روایت کے مطابق یہ چھٹے مسلمان ہیں۔ ان سے پہلے صرف پانچ آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا ان کا انتقال ۳۵ھ میں مدینہ سے تین کوس کے فاصلہ پر مقام جوف میں ہوا اور ان کا جسد خاکی وہاں سے مدینہ منورہ لا کر بقیع میں دفن کیا گیا اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ اور حضرت ابو مرثدؓ بھی جو حصین غنوی کے بیٹے ہیں، کبار صحابہ میں سے ہیں غزوۂ بدر، میں انہوں نے بھی شرکت کی تھی اور ان کے بیٹے حضرت مرثدؓ بھی شریک تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ:

حضرت ابومرثدؓ غزوۂ بدر، غزوہ احد، غزوہ خندق اور دوسرے تمام غزوات میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے، ان کا انتقال مدینہ میں بعہد خلافت ابوبکرؓ ۱۲ھ میں انتقال کے وقت چھیاسٹھ برس کے تھے۔

"روضہ خاخ پہنچو" "روضہ خاخ" ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے مکہ کے راستہ پر مدینہ کے قریب ہی واقع ہے دراصل "روضہ" تو باغ اور سبزہ زار کو کہتے ہیں اور "خاخ" ایک پھل "شفتالو" کو کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر شفتالو کے درخت بہت تھے اس مناسبت سے وہ جگہ "روضہ خاخ" کے نام سے جانی جاتی ہے۔

"وہاں ایک عورت ملے گی" اس عورت کا نام "سارہ" تھا، اور بعض حضرات نے ام سارہ لکھا ہے۔ وہ قریش میں کی ایک آزاد کردہ باندی تھی اور مشرکین مکہ کے نام ایک خط لے کر مدینہ سے مکہ کو جا رہی تھی، یہاں آنحضرت ﷺ کا یہ معجزہ ثابت ہوا کہ جاسوسی کی اتنی بڑی کاروائی آپ ﷺ پر بغیر کسی مادی وسیلہ و ذریعہ کے منکشف ہوگئی۔

"وہ خط اپنی چوٹی سے نکال کر" اور ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ اس نے وہ خط اپنی کمر سے نکال کر دیا تھا پس ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ اس کی چوٹی خاص دراز ہوگی جو کمر تک پہنچتی ہوگی اور اس خط کو اس نے چوٹی کے نچلے حصہ میں باندھ کر کمر میں اڑس رکھا ہوگا۔

"بعض اہم اقدامات اور منصوبوں کے بارے میں" وہ اقدامات اور منصوبے فتح مکہ کے لئے لشکر کشی سے متعلق جن کو آنحضرت ﷺ نے جنگی مصالح کے تحت پوشیدہ رکھا تھا۔ اس قصہ کی اصل یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے قصد سے مسلمانوں کو سفر اور لڑائی کی تیاری کا حکم دیا تو ساتھ ہی آپ ﷺ نے جنگ کی اس تیاری اور اصل منصوبہ کو پوشیدہ رکھنے کی تاکید بھی مجاہدین اسلام کو فرمائی تھی۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق، آپ ﷺ نے قصد تو مکہ کا کیا تھا اور روانگی خیبر کے لئے ظاہر فرمائی تھی یہ احتیاط خالص جنگی مصالح کے تحت تھی اور اس وقت کے حالات میں اس جنگی منصوبہ کا پوشیدہ رکھا جانا نہایت ضروری تھا۔ حاطب بن ابی بلتعہؓ ایک صحابی تھے، وہ اس منصوبہ کو جانتے تھے۔ انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر آنحضرت ﷺ کے اصل منصوبہ کی اطلاع قریش مکہ کو دینی چاہی اور نہایت خفیہ طور پر ایک خط مذکورہ عورت کے ہاتھ مکہ روانہ کر دیا، اس خط میں انہوں نے اہل مکہ کو مطلع کیا تھا کہ پیغمبر اسلام اپنے لشکر کے ساتھ تم پر چڑھائی کے لئے آرہے، ہوشیار رہنا۔ لیکن اس عورت کے روانہ ہوتے ہی حضرت جبرائیل نازل ہوئے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کو آگاہ کیا کہ ایک عورت ایسا ایسا خط لے کر مکہ جا رہی ہے اور روضہ خاخ تک پہنچ چکی ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ وغیرہ کو اسی وقت روانہ فرمایا اور خط منگوا کر ملاحظہ کیا، یہاں یہ معلوم ہوا کہ جاسوسوں کی پردہ دری اور ان کے خطوط پڑھنا جائز ہے، اسی طرح کسی بھی مفسد کی پردہ دری جائز ہے جب کہ مصلحت اس کی متقاضی ہو یا پردہ پوشی کسی مفسدہ کو جنم دینے کا باعث بنتی ہو۔

"ان کے لئے کوئی ایسا کارنامہ انجام دوں الخ" اپنے آخر تک یہ جملہ اس عبارت کا ترجمہ ہے: ان اتخذ فیھم یدا یحمون بھا قرابتی اور طیبیؒ نے لکھا ہے کہ "یحمون" صفت ہے "یداً" کی اور ید (ہاتھ) سے مراد یا تو انعام عطا کرنے والا ہاتھ ہے یا مدد پہنچانے والی طاقت و قدرت، اس طرح اس عبارت کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا: (میں نے چاہا کہ) ان سے یہ انعام یا ایسی طاقت و قدرت حاصل کروں کہ وہ لوگ میری قرابت یا قرابتداروں کی مدد و حمایت کریں۔ حاطبؓ کا مطلب یہ تھا کہ اس حرکت بیجا سے میری اصل غرض و غایت اپنے قرابتداروں کا تحفظ حاصل کرنا تھی۔ میں اتنی مفید معلومات فراہم کر کے قریش مکہ کو خوش کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ میری اس خوشامد کے سبب مکہ میں میرے قرابتداروں کی دیکھ بھال رکھ سکیں، واضح رہے کہ حاطبؓ نے اہل مکہ کو جو خط بھیجنا چاہا تھا اس سے ان کا مقصد آنحضرت ﷺ کو زک اور ایذا پہنچانا ہرگز نہیں تھا، اگر ان کا مقصد یہ ہوتا تو پھر ان کے کافر ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا، حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنے طور پر یہ خیال کر کے کہ میرے اس خط لکھنے سے آنحضرت ﷺ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، اس حرکت کے ارتکاب

کی نادانی کر بیٹھے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنا اصل مقصد بیان کیا جو ان کے خط لکھنے کا محرک بنا تھا، تو آنحضرت ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اگر ان کی نیت اور ان کے مقصد میں آنحضرت ﷺ کو تکلیف یا نقصان پہنچانے کا ارادہ شامل ہوتا تو لسان نبوت ان کے بیان کی تصدیق ہرگز نہ کرتی۔ ہاں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک بڑے اجتہادی قصور میں مبتلا ہوئے بایں طور کہ انہوں نے اپنے اس معاملہ کو چھپایا اور آنحضرت ﷺ سے اجازت لئے بغیر ایسا کام کیا۔

"اس منافق کی گردن اڑا دوں" اس عبارت کے تحت ملا علی قاریؒ نے تو یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے حاطبؓ کے بیان عذر کی تصدیق فرمائی لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے جو یہ بات کہی تو اس کا محرک دین کے تئیں وہ شدت اور سخت گیری تھی جو حضرت عمرؓ کی ذات کا خاصہ تھا۔ وہ دین و مذہب کے معاملات میں ذرا بھی نرمی اور رعایت کے قائل نہیں تھے اور پھر حاطبؓ کا معاملہ تو ویسے بھی بڑی سنگین نوعیت کا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں بعض لوگ تھے بھی اس طرح کہ ان کی طرف نفاق کی نسبت کی جاتی تھی، چنانچہ انہوں نے یہی سوچا کہ جس شخص نے نبی کریم ﷺ کی مخالفت کی ہے وہ قتل کا مستوجب ہو گیا لیکن اس سوچ میں چونکہ خود ان کے نزدیک بھی یقین کا پہلو غالب نہیں تھا اس لئے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے حاطبؓ کے قتل کی اجازت مانگی۔ رہی یہ بات کہ انہوں نے حاطبؓ پر "منافق" کا اطلاق کس وجہ سے کیا تو ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس بارہ میں بھی یہ سوچا ہو کہ حاطبؓ نے شائد صحیح بات نہیں بتائی ہے، ان کے دل میں کچھ اور ہے اور بیان انہوں نے کچھ اور دیا ہے، ان کا مذکورہ عذر محض بات بنانے کے لئے ہے اور حضرت شیخ عبدالحقؒ لکھتے ہیں: ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کو بیان کرنے میں کچھ تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو۔ ورنہ آنحضرت ﷺ کی تصدیق کے بعد حضرت عمرؓ کا یہ بات کہنا مستبعد معلوم ہوتا ہے، گویا حضرت شیخؒ کے نزدیک اس بات کا قوی احتمال ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ بات پہلے ہی کہی ہو اور آنحضرت ﷺ کی تصدیق کا جزء بعد کا ہو۔

"تم جو چاہو کرو" یہ اہل بدر ہی کو خطاب ہے اور اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ عملی زندگی میں تمہیں پوری طرح آزادی دے دی گئی ہے کہ اچھا برا جو بھی عمل چاہو کرو اور فرائض و ارکان دین کی بجا آوری میں بھی ہر تقصیر و کوتاہی تمہارے لئے معاف ہے بلکہ اس ارشاد قدسی کی اصل مراد اہل بدر کے تئیں حق تعالیٰ کے خصوصی کرم اور اس کی خصوصی عنایت کو ظاہر کرنا اور ان کے اس خصوصی مرتبہ کی نشاندہی کرنا ہے کہ غزوۂ بدر میں شرکت کے عوض تمہیں آخرت کے تمام بلند مراتب و درجات حاصل ہو گئے ہیں وہاں کی تمہاری اعلیٰ حیثیت متعین ہو گئی ہے۔ اب تمہیں اجازت ہے کہ اعمال صالحہ اور افعال نافلہ میں سے چاہے تھوڑا کرو چاہے بہت کرو، جو بھی کر لو گے کافی ہو جائے گا۔

"جنت تمہارے لئے واجب ہو گئی ہے" یعنی یہ ثابت ہو گیا کہ تم جنت میں جاؤ گے یا یہ کہ حق تعالیٰ کے وعدے کے بموجب تمہارے لئے جنت واجب ہو چکی ہے۔ نیز طیبیؒ نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے لعل (ممکن ہے) کا جو لفظ استعمال فرمایا وہ اپنے اعتبار سے نہیں فرمایا بلکہ اس میں ترجی اور امید رکھنے کے معنی حضرت عمرؓ کی طرف راجع ہیں، کیونکہ آنحضرت ﷺ کے نزدیک تو یہ بات محقق اور یقینی تھی۔ اور زیادہ قرین یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہل بدر کے جنتی اور مغفور ہونے کے پہلو کو لفظ لعل کے ساتھ اس لئے بیان فرمایا تاکہ اہل بدر اس پر اس طرح اعتماد اور بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں کہ فرائض و واجبات تک سے غفلت اختیار کر لیں اور اعملوا ما شئتم (تم جو چاہو کرو) سے یہ نتیجہ اخذ کر لیں کہ ہر فعل و عمل کی آزادی ہمیں مل گئی ہے۔ اب ہم جو چاہے کرتے پھریں۔

"میں تم کو بخش چکا ہوں" یعنی، میں نے تم لوگوں کو اپنی نظر رحمت و مغفرت سے نواز دیا ہے۔ اہل بدر کے حق میں یہ جملہ (جنت تمہارے لئے واجب ہو گئی ہے) سے زیادہ وزن دار اور زیادہ موثر ہے اور یہاں نوویؒ نے لکھا ہے کہ اہل بدر کے حق میں اس عفو و مغفرت کا تعلق صرف آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا سے بھی، مطلب یہ کہ ان میں سے اگر کوئی شخص کسی ایسے فعل کا مرتکب ہو جائے جس پر حد وغیرہ جاری ہوتی ہے تو وہ مستوجب مواخذہ ہوگا، چنانچہ ایک صحابی مسطح بن اثاثہ حالانکہ اہل بدر میں سے تھے۔ لیکن جب انہوں نے

حضرت عائشہؓ پر افترا باندھا اور قرآن کریم نے ان کے افترا کا پردہ چاک کر کے عائشہ صدیقہؓ کی پاکدامنی کی تصدیق کی۔ تو آنحضرت ﷺ نے مسطح کو مستوجب مواخذہ گرانا اور ان پر حد افترا قائم فرمائی۔

"یہ آیت نازل فرمائی" اس سے سورۂ ممتحنہ کی وہ ابتدائی آیتیں مراد ہیں جن کا شان نزول حاطبؓ کا یہی قصہ ہے یہ آیتیں یوں ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ. اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰۗؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۔

"اے ایمان والو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو حالانکہ تمہارے پاس جو دین آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں، رسول کو اور تم کو اس بناء پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے شہربدر کر چکے ہیں. اگر تم میرے رستہ پر جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی ڈھونڈنے کی غرض سے (اپنے گھروں سے) نکلے ہو، تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو حالانکہ مجھ کو سب چیزوں کا خوب علم ہے تم جو کچھ چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو (یاد رکھو) جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا تو راہ راست سے بھٹکے گا اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو (فوراً) اظہار عداوت کرنے لگیں (بایں طور کہ) تم پر برائی کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں، وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ تمہارے رشتہ دار اور اولاد قیامت کے دن تمہارے کام نہ آویں گے خدا تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کو خوب دیکھتا ہے، تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام میں اور ان لوگوں میں جو کہ ان کے ساتھ تھے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ جب کہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ. لیکن ابراہیم کی اتنی بات تو اپنے باپ سے ہوئی تھی کہ میں تمہارے لئے استغفار ضرور کروں گا اور تمہارے لئے (استغفار سے زیادہ) مجھ کو خدا سے آگے کسی بات کا اختیار نہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ پر توکل کرتے ہیں اور آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔"

یہ آیات کریمہ اگرچہ حاطبؓ کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی لیکن خطاب عمومی طور پر ہے تاکہ حاطبؓ جیسے لوگ بھی اس کے تحت آجائیں، اسی لئے کہا گیا ہے العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب یعنی یہ اصولی قاعدہ ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ مطلب یہ کہ کوئی آیت مثلاً کسی خاص واقعہ کے سلسلہ میں یا کسی خاص شخص کے متعلق نازل ہوئی تو یہ نہیں کہ وہ آیت بس اسی واقعہ یا اسی شخص کے ساتھ مخصوص سمجھی جائے گی بلکہ اس کا مصداق و محمول عمومی نوعیت کا ہوگا کہ جو بھی شخص اس آیت کے مفہوم و مضمون سے مطابقت رکھے گا وہ اس آیت کے تحت آئے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ گویا یہ آیت اسی شخص کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

اصحاب بدر کا مرتبہ

(۳۱) وَعَنْ رِفَاعَةَ ابْنِ رَافِعٍ قَالَ جَآءَ جِبْرَئِيْلُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا تَعُدُّوْنَ اَهْلَ بَدْرٍ فِيْكُمْ قَالَ مِنْ

اَفْضَلِ الْمُسْلِمِيْنَ اَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا قَالَ وَ كَذَالِكَ مَنْ شَهِدَ بَدْرًا مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت رفاعہ بن رافع ؓ بیان کرتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور پوچھا کہ غزوہ بدر میں شریک ہونے والوں کو آپ اپنوں میں سے کس طبقہ کے لوگوں میں شمار کرتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہم ان کو سب سے اعلیٰ و سب سے بہتر مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں، یا آپ ﷺ نے اسی طرح کے کچھ اور الفاظ میں جواب دیا (اور ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یوں فرمایا ہو گا هم افضل المسلمين یعنی وہ اصحاب بدر سب سے اعلیٰ و سب سے بہتر مسلمان ہیں) حضرت جبرئیل علیہ السلام (یہ سن کر) بولے: ایسا ہی ان فرشتوں کے بارے میں (ہم سمجھتے ہیں) جو غزوہ بدر میں (اہل اسلام کی مدد کے لئے) شریک ہوئے تھے۔" (بخاری)

تشریح: حضرت جبرئیل کا مطلب یہ تھا کہ آپ ﷺ اصحاب بدر کو دوسرے تمام مسلمانوں سے افضل جانتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ ہم فرشتوں میں سے جو فرشتے غزوہ بدر میں شریک ہوئے وہ ان تمام فرشتوں سے افضل ہیں جن کو اس غزوہ میں شرکت کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

اصحاب بدر و حدیبیہ کی فضیلت

(۳۲) وَعَنْ حَفْصَةَ ؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ لَّا يَدْخُلَ النَّارَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اَحَدٌ شَهِدَ بَدْرًا وَالْحُدَيْبِيَةَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَيْسَ قَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا قَالَ فَلَمْ تَسْمَعِيْهِ يَقُوْلُ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا يَدْخُلُ النَّارَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنْ اَصْحَابِ الشَّجَرَةِ اَحَدٌ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا تَحْتَهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور ام المؤمنین حضرت حفصہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: میں امید رکھتا ہوں کہ جو شخص بدر اور حدیبیہ میں شریک ہوا ہے وہ انشاء اللہ دوزخ کی آگ میں داخل نہ ہو گا، میں نے (یہ سن کر) عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دوزخ پر وارد نہ ہو! آنحضرت ﷺ نے فرمایا کیا تم نے یہ نہیں سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اس کے بعد) یہ بھی فرمایا ہے کہ پھر ہم ان لوگوں کو "دوزخ میں جانے سے" بچائیں گے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اصحاب شجرہ میں سے کوئی بھی شخص ان شاء اللہ دوزخ کی آگ میں داخل نہ ہو گا، اور "اصحاب شجرہ" سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے (حدیبیہ کے مقام پر) درخت کے نیچے بیعت کی تھی۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ان منکم الا واردها یہ قرآن کی آیت کے الفاظ ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو پل صراط سے گزرنا ہو گا اور پل صراط چونکہ دوزخ کے اوپر قائم کیا جائے گا اس لئے دوزخ کا سامنا لامحالہ ہر شخص کو کرنا پڑے گا اور نووی ؒ نے لکھا ہے کہ "دوزخ پر وارد ہونے" سے مراد پل صراط سے گزرنا ہے، بہر حال جب پل صراط پر سے لوگ گزریں گے تو ان میں سے جو دوزخی ہوں گے وہ پل صراط پر سے گر کر نیچے دوزخ میں جا پڑیں گے اور جو جنتی ہوں گے وہ پل پر سے گزرنے کا مرحلہ سلامتی کے ساتھ طے کر لیں گے۔ اور جنت بس چلے جائیں گے۔ لیکن حضرت حفصہ ؓ کے خیال میں یہ بات تھی کہ قرآن کے ان الفاظ میں واردها کے معنی داخلها (اور دوزخ میں اخل ہونے) کے ہیں، چنانچہ انہوں نے سوچا کہ جب قرآن کے ان الفاظ کے مطابق دوزخ میں داخل ہونے سے کوئی بھی شخص مستثنیٰ ہیں ہو گا تو اہل بدر و حدیبیہ کے حق میں دخول دوزخ کی نفی کا مصداق و محمول کیا ہو سکتا ہے اس پر آنحضرت ﷺ نے ان کو سمجھایا کہ خود ہی آیت میں ان الفاظ کے بعد ثم ننجی الذین اتقوا کے جو الفاظ ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر شخص دوزخ میں داخل نہیں ہو گا بلکہ ہی لوگ دوزخ میں جائیں گے جو نجات کے مستحق نہیں ہوں گے بلکہ مستوجب عذاب قرار دیئے جا چکے ہوں گے اور یہ کہ واردها کے عنی دوزخ میں داخل ہونے کے نہیں بلکہ دوزخ کے اوپر سے گزرنے کے ہیں واضح رہے کہ حضرت حفصہ ؓ نے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ن کر جو کچھ کہا وہ مناظرہ بازی کے انداز میں اور اعتراض کے طور پر نہیں تھا بلکہ اصل میں جب حضرت حفصہ ؓ نے آنحضرت ﷺ کے

ارشاد کو اپنے خیال کے مطابق بظاہر آیت قرآنی کے موافق نہیں پایا تو ان کو حدیث کا مفہوم سمجھنے میں دقت ہوئی اور تب انہوں نے بغرض استفادہ مذکورہ الفاظ میں آنحضرت ﷺ سے سوال کیا۔ گویا حضرت حفصہؓ کا یہ سوال اس حکم کی تعمیل میں تھا کہ اگر کسی آیت یا کسی حدیث کے معنی سمجھ میں نہ آئیں، یا کسی آیت اور حدیث کے درمیان تطبیق سمجھ میں نہ آئے اور یا کوئی بھی دینی بات سمجھ میں نہ آتی ہو تو اس کو کسی عالم سے پوچھ لینا چاہئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فسئلو اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (پس تم اہل ذکر یعنی اہل علم سے دریافت کر لو اگر تم ناواقف اور لاعلم ہو)۔

اہل حدیبیہ کی فضیلت

(۳۳) وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ كُنَّا يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ اَلْفًا وَاَرْبَعَ مِائَةٍ قَالَ لَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْتُمُ الْيَوْمَ خَيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْاَرْضِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ حدیبیہ کے موقع پر ہماری تعداد ایک ہزار اور چار سو تھی (اور) ہمارے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا، آج کے دن تم زمین والوں میں سب سے بہتر لوگ ہو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "ایک ہزار چار سو" حدیبیہ کے موقع پر موجود صحابہ کی تعداد کے بارے میں جو اختلافی روایتیں ہیں اور ان مختلف روایتوں کے درمیان جو وجہ تطبیق بیان کی جاتی ہے اس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔

اسی حدیث کے مطابق بعض حضرات نے جن میں سیوطیؒ بھی ہیں لکھا ہے کہ صحابہ میں سب سے افضل خلفائے اربعہ ہیں۔ پھر عشرہ مبشرہ، پھر اہل بدر، پھر اہل احد اور پھر اہل حدیبیہ۔

اصحاب بدر کا مرتبہ

(۳۴) وَعَنْهُؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّصْعَدُ الثَّنِيَّةَ ثَنِيَّةَ الْمُرَارِ فَاِنَّهٗ يُحَطُّ عَنْهُ مَا حُطَّ عَنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ فَكَانَ اَوَّلُ مَنْ صَعِدَهَا خَيْلُنَا خَيْلُ بَنِي الْخَزْرَجِ ثُمَّ تَتَامَّ النَّاسُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّكُمْ مَغْفُوْرٌ لَّهٗ اِلَّا صَاحِبَ الْجَمَلِ الْاَحْمَرِ فَاَتَيْنَاهُ فَقُلْنَا تَعَالَ يَسْتَغْفِرْلَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاَنْ اَجِدَ ضَالَّتِيْ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ يَّسْتَغْفِرَلِيْ صَاحِبُكُمْ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اَقْرَأَ عَلَيْكَ فِيْ بَابٍ بَعْدَ فَضَائِلِ الْقُرْاٰنِ۔

"اور حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ (حدیبیہ کے سفر کے دوران) رسول کریم ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ ثنیۃ المرار پر جو چڑھے گا اس کے گناہ اسی طرح معاف کر دیئے جائیں گے جیسے بنی اسرائیل کے گناہ معاف کر دیئے گئے تھے "تو سب سے پہلے جو لوگ اس (ثنیۃ المرار) پر چڑھے وہ ہمارے گھوڑے یعنی قبیلہ خزرج کے (گھوڑ سوار) تھے۔ اس کے بعد آگے پیچھے سب لوگ چڑھے، پس رسول کریم ﷺ نے فرمایا: سب کو بخش دیا گیا علاوہ اس شخص کے جو سرخ اونٹ والا ہے (یعنی منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی) (آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سن کر) ہم اس (سرخ اونٹ والے شخص یعنی عبداللہ بن ابی) کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ آؤ ہمارے ساتھ چلو تاکہ ہم رسول کریم ﷺ سے تمہارے حق میں بھی بخشش و مغفرت کی درخواست کریں، مگر وہ (بدبخت) بولا: حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی گم شدہ چیز پا جاؤں، یہ میرے نزدیک اس بات سے زیادہ پسندیدہ اور عزیز ہے کہ تمہارے صاحب میرے لئے بخشش و مغفرت چاہیں۔" (مسلم) اور حضرت انسؓ کی حدیث قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اَقْرَءَ عَلَيْكَ "فضائل قرآن" کے بعد والے باب میں نقل کی جا چکی ہے (یعنی صاحب مصابیح نے اس حدیث کو یہاں اس باب میں نقل کیا تھا لیکن اس حدیث میں چونکہ قرآن کا ذکر تھا اس

لئے مؤلف مشکوہ نے اس کو وہاں نقل کیا)۔"

تشریح: "ثنیۃ المرار" میں "ثنیۃ" سے مراد پہاڑ کے درمیان (گھاٹی) کا راستہ ہے۔ اور "مرار" ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان اس راستہ پر واقع ہے جو حدیبیہ کو ہو کر گزرتا ہے۔ یہ ارشاد گرامی اس وقت کا ہے جب آپ ﷺ ۶ ھ میں عمرہ کی نیت سے مکہ کو روانہ ہوئے تھے لیکن حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر رک گئے تھے اور "صلح حدیبیہ" کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا، اسی سفر کے دوران جب آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ رات میں "ثنیۃ المرار" (مرار کی گھاٹی) پر پہنچے، تو لوگوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اور حوصلہ بڑھانے کی ضرورت یا تو اس لئے پیش آئی تھی کہ وہ گھاٹی نہایت دشوار گزار تھی اور اوپر چڑھنا کوئی آسان کام نہیں تھا، یا یہ کہ آپ ﷺ کو چونکہ یہ اندیشہ تھا کہ اس گھاٹی کے پیچھے شاید اہل مکہ گھات لگائے بیٹھے ہوں اور منصوبہ بند طریقہ سے رات کی تاریکی میں اچانک حملہ آور ہو جائیں اس لئے صورت حال کی ٹوہ لینا ضروری تھا اور اس مقصد کے لئے اوپر چڑھنا ظاہر ہے جان جوکھوں کا کام تھا۔

"جیسے بنی اسرائیل کے گناہ معاف کر دیئے گئے تھے" ان الفاظ کے ذریعہ بنی اسرائیل سے متعلق قرآن کریم کے ان الفاظ: وقولوا حطۃ نغفر لکم خطایاکم کی طرف اشارہ ہے۔ اصل قصہ یوں ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام کے زمانہ میں جب بنی اسرائیل میدان تیہ میں چالیس سال تک پریشان و سرگرداں پھرتے رہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے ازراہ کرم و عنایت ان کو بادل کا سایہ مہیّا کیا اور ان کے کھانے کو من و سلوی نازل فرمایا اور پھر ان کو ملک شام کے ایک شہر "اریحا" جانے کا حکم دیا گیا۔ اس وقت ان کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ اس شہر میں داخل ہوتے وقت عجز و انکساری اور فروتنی اختیار کرنا اور حطۃ (توبہ ہے، توبہ ہے) کہتے ہوئے داخل ہونا، اگر تم نے ہماری اس ہدایت پر عمل کیا اور توبہ و انابت اور استغفار کرتے ہوئے اس شہر میں داخل ہوئے تو ہم تمہارے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیں گے اور تمہیں مغفرت و بخشش سے نوازیں گے۔ لیکن بنی اسرائیل نے نہ صرف یہ کہ اس خدائی حکم و ہدایت پر عمل نہیں کیا بلکہ یہ شرارت بھی کی کہ شہر میں داخل ہوتے وقت اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اس لفظ کو جو طلب توبہ و استغفار کے معنی رکھتا تھا، بدل کر ایک ایسا لفظ بولنے لگے جو ان کی دنیاوی طلب و خواہش کے معنی رکھتا تھا، اس کی پاداش میں ان پر طاعون کا سخت عذاب نازل کیا گیا جس نے ان کے ستر ہزار آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا پس آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ "جیسے بنی اسرائیل کے گناہ معاف کر دیئے گئے تھے" تو گناہ معاف کئے جانے سے مراد "گناہ معاف کرنے کا وعدہ ہے" گویا آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح بنی اسرائیل سے مغفرت کا وعدہ کیا گیا تھا اور اگر وہ اس وقت خدائی حکم و ہدایت پر عمل کر لیتے تو ان کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

"وہ ہمارے گھوڑے یعنی قبیلہ خزرج" "خزرج" انصار مدینہ کا ایک قبیلہ تھا اور حضرت جابرؓ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ "اوس" اور "خزرج" دو بھائی تھے اور آگے چل کر ان دونوں کی اولاد اور نسلیں دو الگ الگ قبیلوں میں تبدیل ہو گئیں اور یہ دونوں قبیلے اپنے اپنے مورث اعلی کے نام سے موسوم ہوئے۔ چنانچہ انصار مدینہ میں سے کچھ لوگ تو قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ لوگ قبیلۂ خزرج سے۔

"میں اپنی گم شدہ چیز پا جاؤں" بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عبداللہ بن ابی کا وہی سرخ اونٹ ادھر ادھر ہو گیا ہوگا، یا اس کی کوئی اور چیز گم ہو گئی ہوگی۔ چنانچہ صحابہؓ نے اس سے کہا کہ چلو، ہم رسول اللہ ﷺ سے درخواست کرتے ہیں کہ تمہارے حق میں بھی استغفار کریں اور تمہاری بخشش کی دعا کریں تو اس نے نہایت بے اعتنائی سے کہا کہ اس وقت تمہارے صاحب (رسول اللہ) کے پاس مجھے جانے کی فرصت کہاں ہے، اپنی گم شدہ چیز کو تلاش کرنا اور پالینا میرے نزدیک اس بات سے زیادہ اہم اور زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں طلب مغفرت کے لئے تمہارے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤں، عبداللہ ابن ابی کے یہ الفاظ یقینی طور پر اس کے صریح کفر کے غماز تھے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ وہ اپنے خبث باطن کے سبب راندۂ درگاہ تھا۔ اور راندۂ درگاہ ہی رہا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُوْنَ ۝ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ (الاية)

"اور جب ان (منافقوں) سے کہا جاتا ہے کہ آؤ (رسول اللہ کے پاس چلو) تاکہ رسول اللہ ﷺ تمہارے لئے استغفار کردیں تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور آپ ﷺ ان کو دیکھیں گے کہ وہ (اس ناصح سے اور تحصیل استغفار سے) تکبر کرتے ہوئے بے رخی کرتے ہیں۔ (جب ان کے کفر کی یہ حالت ہے تو) ان کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں خواہ ان کے لئے آپ استغفار کریں یا ان کے لئے استغفار نہ کریں۔ (اور) اللہ تعالی ہرگز ان کی مغفرت نہیں فرمائیں گے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

شیخین اور ابن مسعودؓ کی فضیلت

(۳۵) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اقْتَدُوْا بِاللَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِيْ مِنْ اَصْحَابِيْ اَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَاهْتَدُوْا بِهَدْيِ عَمَّارٍ وَتَمَسَّكُوْا بِعَهْدِ ابْنِ اُمِّ عَبْدٍ وَفِيْ رِوَايَةِ حُذَيْفَةَ مَا حَدَّثَكُمُ ابْنُ مَسْعُوْدٍ فَصَدِّقُوْهُ بَدَلَ وَتَمَسَّكُوْا بِعَهْدِ ابْنِ اُمِّ عَبْدٍ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "تم ان دونوں کی پیروی جو میرے صحابہؓ میں سے ہیں اور میرے بعد خلیفہ ہوں گے، وہ ابوبکر اور عمر ہیں، عمار بن یاسر کی سیرت اور ان کی راہ و روش اختیار کرکے سیدھی سچی راہ پر چلو اور ام عبد کے بیٹے (عبداللہ ابن مسعود) کے عہد کو مضبوط پکڑو اور ایک دوسری روایت میں، جو حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے "ام عبداللہ کے بیٹے کے عہد کو پکڑو" کے بجائے یہ الفاظ ہیں کہ: ابن مسعود تم سے جو حدیث بیان کریں (اور دین کے احکام و مسائل سے متعلق جو بات بتائیں) اس میں ان کو راست گو جانو۔" (ترمذی)

تشریح: "اور میرے بعد خلیفہ ہوں گے" یہ ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق کے ترجمہ کے مطابق ہے۔ جب کہ ملا علی قاریؒ کے مطابق ترجمہ یوں ہونا چاہئے کہ: تم میری وفات کے بعد یا میری پیروی کے بعد ان دونوں کی پیروی کرو جو میرے صحابہ میں سے ہیں اور وہ ابوبکر و عمر ہیں پس نحوی اعتبار سے ابوبکر و عمر بدل یا بیان ہے الذین کا۔

"سیدھی سچی راہ پر چلو" واضح ہو کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے تعلق سے تو "اقتداء" کا لفظ لایا گیا ہے جب کہ حضرت عمار بن یاسر کے تعلق سے "اہتداء" کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے اقتداء میں اہتداء سے زیادہ عمومیت ہے بایں جہت کہ "اقتداء" میں قول اور فعل، دونوں کا لحاظ ہوتا ہے جب کہ "اہتداء" کا تعلق صرف فعل سے ہوتا ہے گویا اقتداء تو مطلق پیروی کرنے کو کہتے ہیں خواہ فعل میں ہو یا قول میں اور اہتداء فقط فعل کی پیروی کو کہتے ہیں۔

حدیث کے ان الفاظ میں نہ صرف یہ کہ حضرت عمار بن یاسرؓ کی فضیلت و کمال کا ذکر ہے کہ ان کا کوئی بھی فعل و عمل جادۂ حق سے ہٹا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کا برحق اور مبنی بر صداقت ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان جو معرکہ آرائی پیش آئی تھی اس میں حضرت عمارؓ سیدنا حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔

"ام عبد کے بیٹے کے عہد" میں "عہد" سے مراد قول اور وصیت ہے، یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ دینی احکام و مسائل میں جو بات کہیں

اور جو تلقین و وصیت کریں اس کو پلے باندھ لو اور اس پر پوری طرح عمل کرو، چنانچہ یہی وہ حکم رسول ہے جس کو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نے اپنے فقہ کی ایک مضبوط بنیاد بنایا ہے۔ استنباط مسائل میں حضرت امام اعظم، خلفائے اربعہ کے بعد تمام صحابہ میں سے سب سے زیادہ جس صحابی کی روایت اور قول کو اختیار کرتے ہیں وہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہی ہیں جس کے کمال فقاہت اور اخلاص وصیت میں کسی کو شبہ نہیں تورپشتیؒ نے بھی عہد کے تقریباً یہی معنی بیان کئے ہیں لیکن انہوں نے اپنے نزدیک اس بات کو اولیٰ قرار دیا ہے کہ "ام عبد کے عہد" سے مراد "خلافت کے بارے میں عبداللہ ابن مسعود کی رائے اور ان کا فیصلہ" ہے گویا اس ارشاد رسالت کے ذریعہ امّت کو ہدایت کی گئی کہ وصال نبوی کے بعد خلافت کے بارے میں عبداللہ ابن مسعود اپنی جس رائے اور جس فیصلہ کا اظہار کریں اسی سے تم سب لوگ رہنمائی حاصل کرو، چنانچہ آنحضرت کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی حقانیت و صحت کی گواہی سب سے پہلے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہی نے دی اور تمام اکابر صحابہ کی رائے اور مشورہ خلافت صدیق کے قیام میں شامل رہا۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ استحقاق خلافت میں ہم اس ہستی کو پیچھے کیسے رکھ سکتے ہیں جس کو رسول اللہ ﷺ نے (اپنے مرض وفات میں ہماری نماز کی امامت کے لئے) آگے کیا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ جس شخص کو آنحضرت ﷺ نے (امامت نماز کی صورت میں) ہمارے دینی پیشوائی کے لئے منتخب کیا تھا اس کو ہم (بصورت خلافت) اپنی دنیاوی قیادت کے لئے منتخب نہ کریں۔ اسی طرح کا مضمون سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے بھی منقول ہے، بہرحال حدیث کے اول جز اقتدوا بالذین من بعدای ابوبکر و عمر اور آخری جز تمسکو ابعهد ابن ام عبد کے درمیان جو مناسبت ہے اس سے تو تورپشتیؒ کے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن دوسری روایت میں حضرت حذیفہؓ نے جو الفاظ نقل کئے ہیں ان سے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ "عہد" سے مراد "قول اور وصیت" ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی فضیلت

(۳۶) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْكُنْتُ مُؤَمِّرًا اَحَدًا مِنْ غَيْرِ مَشْوَرَةٍ لَاَمَّرْتُ عَلَيْهِمْ ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک موقعہ پر) رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا: اگر میں مشورہ کے بغیر کسی کو امیر و حاکم بناتا تو لوگوں کا امیر و حاکم ام عبد کے بیٹے یعنی عبداللہ ابن مسعود کو بناتا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ ایسی صلاحیت و کمال رکھتے ہیں کہ ان کو امیر و حاکم بنانے میں کسی مشورہ اور غور و فکر کی حاجت نہیں ہے، علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات کسی خاص لشکر کا امیر و سردار بنانے کے سلسلہ میں کہی تھی یا اپنی حیات ہی میں کسی خاص معاملہ کی ذمہ داری سونپنے کے سلسلہ میں کہی تھی، بہرصورت آپ کے ارشاد کا مطلب اس خلافت عامہ سے ہرگز نہیں تھا۔ جو وصال نبوی کے بعد قائم ہوئی۔ خلافت کی ایک بڑی شرط قریشی النسل ہونا تو آپ ﷺ خود بیان فرما چکے تھے اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ قریش میں سے تھے نہیں۔

چند مخصوص صحابہؓ کے فضائل

(۳۷) وَعَنْ خَيْثَمَةَ ابْنِ اَبِىْ سَبْرَةَ قَالَ اَتَيْتُ الْمَدِيْنَةَ فَسَاَلْتُ اللّٰهَ اَنْ يُّيَسِّرَلِىْ جَلِيْسًا صَالِحًا فَيَسَّرَلِىْ اَبَا هُرَيْرَةَ فَجَلَسْتُ اِلَيْهِ فَقُلْتُ اِنِّىْ سَاَلْتُ اللّٰهَ اَنْ يُّيَسِّرَلِىْ جَلِيْسًا صَالِحًا فَوُفِّقْتَ لِىْ فَقَالَ مِنْ اَيْنَ اَنْتَ قُلْتُ مِنْ اَهْلِ الْكُوْفَةِ جِئْتُ اَلْتَمِسُ الْخَيْرَ وَاَطْلُبُهٗ فَقَالَ اَلَيْسَ فِيْكُمْ سَعْدُ بْنُ مَالِكٍ مُجَابُ الدَّعْوَةِ وَابْنُ مَسْعُوْدٍ صَاحِبُ طَهُوْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ نَعْلَيْهِ وَحُذَيْفَةُ صَاحِبُ سِرِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَمَّارٌ الَّذِىْ اَجَارَهُ اللّٰهُ مِنَ الشَّيْطٰنِ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَلْمَانُ صَاحِبُ الْكِتَابَيْنِ يَعْنِى الْاِنْجِيْلَ وَالْقُرْاٰنَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت خیثمہ بن ابی سبرۃؒ (جو کبار تابعین اور ثقات میں سے ہیں) بیان کرتے ہیں کہ میں جب مدینہ آیا تو میں نے اللہ سے دعا مانگی کہ مجھ کو نیک ہمنشین میسر ہو (یعنی مجھ کو کوئی ایسا نیک بخت مل جائے جو ہمنشین بننے کی کامل استعداد و صلاحیت رکھتا ہو اور اس کی ہمنشینی سے استفادہ کیا جاسکتا ہو) چنانچہ حق تعالیٰ نے حضرت ابوہریرہؓ جیسی ہستی مجھ کو میسر فرمائی جن کی صحبت و ہم نشینی میں نے اختیار کی اور (بغرض استفادہ ان کی خدمت میں حاضری دینے لگا) میں نے (ایک دن ان سے) عرض کیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ مجھ کو نیک ہمنشین میسر ہو اور اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر کے آپ جیسا ہمنشین مجھ کو میسر فرمایا، حضرت ابوہریرہؓ نے پوچھا، تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے عرض کیا: میں کوفہ کا رہنے والا ہوں اور (کوفہ سے چل کر) یہاں اس لئے آیا ہوں کہ (نیک و بابرکت ہمنشینی کے ذریعہ) خیر کا جویا اور (اپنے نفس کے لئے) خیر کا طلب گار ہوں۔ (یہ سن کر) حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: کیا تمہارے درمیان (یعنی تمہارے شہر میں) سعد بن مالکؓ نہیں ہیں جو مستجاب الدعوات ہیں کیا تمہارے یہاں عبداللہ ابن مسعودؓ نہیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ (کے خادم خاص ہونے کی حیثیت سے سفر و حضر میں آپ ﷺ کے ساتھی ہیں کہ مسواک و نعلین مبارک (اور تکیہ و چھاگل وغیرہ) اپنے پاس رکھا کرتے تھے، کیا تمہارے یہاں حذیفہؓ نہیں ہیں (جو منافقین وغیرہ سے متعلق) رسول اللہ ﷺ کے محرم اسرار تھے، کیا تمہارے یہاں عمارؓ جیسی ہستی نہیں ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی زبان مبارک کے ذریعہ شیطان سے امن و تحفظ عطا کیا۔ اور کیا تمہارے یہاں سلمانؓ نہیں ہیں جو دو کتابوں یعنی انجیل اور قرآن کے ماننے والے ہیں؟ (جب خیر و برکت اور علم و فضل رکھنے والی اتنی بڑی بڑی ہستیاں خود تمہارے شہر میں موجود ہیں تو محض صحبت و ہمنشینی کے ذریعہ طلب خیر اور استفادہ علم کی خاطر تمہیں اپنا شہر چھوڑ کر یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی)۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اور اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر کے" یہ فَوُفِّقْتَ لِیْ کا توضیحی ترجمہ ہے۔ وُفِّقْتَ اصل میں وَفْقٌ سے صیغہ مجہول ہے جس کے معنی ہیں: موافق ہونا سازوار پڑنا، واضح ہو کہ مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں فوفقت لی سے پہلے فَیَسَّرَلِیْ کے الفاظ منقول ہیں۔

"خیر کا جویا اور" میں "خیر" سے مراد علم و عمل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں "حکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے و من یوتی الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔

"سعد بن مالکؓ" یہ وہی سعد بن ابی وقاصؓ ہیں جن کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے اور جن کا مستجاب الدعوات ہونا بھی بیان ہوا ہے، ابی قاص کا اصل نام مالک تھا اور اسی وجہ سے حضرت سعدؓ کو "سعد بن ابی وقاص" بھی کہا جاتا ہے اور "سعد بن مالک" بھی۔

"حضرت عمارؓ" کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے چونکہ یہ دعا جاری ہوئی تھی کہ "اللہ تعالیٰ عمار کو شیطان اور شیطان کی پیروی سے محفوظ رکھے" اور یہ دعا قبول ہوئی اس لئے حضرت عمارؓ گویا آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک کے طفیل میں شیطان اور شیطان کی ذریات سے امن و پناہ میں ہیں:

"جو دو کتابوں یعنی انجیل اور قرآن کے ماننے والے ہیں" یعنی حضرت سلمانؓ چونکہ اسلام کی روشنی تک پہنچنے سے پہلے عیسائیت کے پیرو تھے۔ انہوں نے انجیل پڑھی اور اس پر ایمان لائے اور پھر دعوت اسلام پاتے ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسلام لائے، قرآن پڑھا، اور قرآن پر عمل پیرا ہوئے، اس اعتبار سے وہ دونوں کتابوں کے ماننے والے ہوئے، حضرت سلمانؓ کا ذکر خیر پہلے گزر چکا ہے۔ انہوں نے ڈھائی سو سال کی طویل عمر پائی ان کا لقب سلمان الخیر تھا۔ ان کے باپ کا نام کوئی نہیں جانتا تھا اگر کوئی شخص ان سے ان کا نسب اور ان کے باپ کا نام پوچھتا تو وہ جواب دیتے: انا ابن الاسلام یعنی میں اسلام کا بیٹا ہوں۔

چند صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت

(۳۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ الرَّجُلُ اَبُوْبَكْرٍ نِعْمَ الرَّجُلُ عُمَرُ ؓ نِعْمَ الرَّجُلُ

اَبُوْعُبَیْدَةَ بْنَ الْجَرَاحِؓ نِعْمَ الرَّجُلُ اُسَیْدُ بْنُ حُضَیْرٍؓ نِعْمَ الرَّجُلُ ثَابِتُ بْنُ قَیْسِ ابْنِ شَمَّاسٍؓ نِعْمَ الرَّجُلُ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍؓ نِعْمَ الرَّجُلُ مُعَاذُ بْنُ عَمْرِو بْنِ الْجَمُوْحِؓ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ابوبکر بھی کیا اچھا آدمی ہے، عمر بھی کیا اچھا آدمی ہے، ابوعبیدہ بن الجراح بھی کیا اچھا آدمی ہے اسید بن حضیر بھی کیا اچھا آدمی ہے، ثابت بن قیس بن شماس بھی کیا اچھا آدمی ہے، معاذ بن جبل بھی کیا اچھا آدمی ہے۔ عمرو بن الجموح بھی کیا اچھا آدمی ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا ابوعبیدہؓ، سیدنا ثابت بن قیسؓ اور سیدنا معاذ بن جبلؓ کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ سیدنا اسید بن حضیرؓ انصار مدینہ میں سے ہیں اور قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے ہیں۔ بیعت عقبہ میں حاضر ہونے والوں اور غزوۂ بدر میں شریک ہونے والوں میں شامل ہیں بعد کے غزوات میں بھی شریک ہوئے صحابہ کی ایک جماعت نے ان سے احادیث کی روایت کی ہے۔ مدینہ میں ۲۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور بقیع میں مدفون ہوئے۔

سیدنا عمرو بن الجموحؓ بھی انصار مدینہ میں سے ہیں لیکن ان کا تعلق قبیلۂ خزرج سے ہے، یہ بھی بیعت عقبہ میں حاضر تھے اور بدری ہیں۔ ان کا انتقال حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں ہوا۔ بہرحال حدیث میں مذکورہ تمام صحابہ کبار مہاجرین و انصار میں سے ہیں، غالباً یہ سب حضرات کسی موقع پر آنحضرت ﷺ کی مجلس مبارک میں یکجا رہے ہوں گے۔ کہ آپ ﷺ نے ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ مدح و ثنا سے مشرف فرمایا، یا مذکورہ تعریفی الفاظ میں ان سب کے الگ الگ ذکر کا کوئی خاص سبب پیش آیا ہوگا۔

وہ تین صحابہ، جنّت جن کی مشتاق ہے

(۳۹) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْجَنَّةَ تَشْتَاقُ اِلٰی ثَلٰثَةٍ عَلِیٍّؓ وَعَمَّارٍؓ وَسَلْمَانَؓ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ جنّت تین آدمیوں کی (بہت) مشتاق ہے اور وہ علیؓ، عمارؓ، اور سلمانؓ ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا اصل مقصد ان تینوں حضرات کے جنتی ہونے کو زیادہ سے زیادہ بلیغ اور زوردار انداز میں بیان کرنا ہے۔ گویا آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ یہ تینوں شخص ایسے جنتی ہیں کہ خود جنت بھی ان کی بہت مشتاق ہے اور تیار ہو کر ان کے انتظار میں ہے۔ کہ کب یہ لوگ میرے اندر آتے ہیں اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ جنّت کے مشتاق ہونے سے مراد اہل جنّت یعنی ملائکہ اور حور و غلمان وغیرہ کا مشتاق ہونا ہے۔ نیز طیبی نے لکھا ہے کہ ان تینوں کے تئیں جنّت کا مشتاق ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ پیچھے ایک حدیث میں حضرت سعد بن معاذؓ کے انتقال پر عرش کے ہلنے کا ذکر آیا ہے۔

حضرت عمارؓ کی فضیلت

(۴۰) وَعَنْ عَلِیٍّؓ قَالَ اسْتَاْذَنَ عَمَّارٌؓ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ائْذَنُوْا لَهٗ مَرْحَبًا بِالطَّیِّبِ الْمُطَیَّبِ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) عمارؓ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو اندر آنے دو، پاک و پاکیزہ شخص کو خوش آمدید۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "طیب" سے تو حضرت عمارؓ کے جوہر ذات کی پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے۔ اور مطیب سے ان کی اس پاکیزگی و بزرگی کی طرف

اشارہ ہے۔ جو تہذیب اخلاق و صفات کے ذریعہ ان کو حاصل ہوئی۔ اور ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ حضرت عمارؓ کے نفس کی پاکی اور ان کے اخلاق و کردار کی پاکیزگی کو تعریف و تحسین کے نہایت بلیغ انداز میں بیان کرنے کے لئے طیب مطیب کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں جیسا کہ کسی سایہ کو مبالغۃً بیان کرنے کے لئے ظل ظلیل کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

حضرت عمارؓ کی فضیلت

(۴۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا خُيِّرَ عَمَّارٌ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ اِلَّا اخْتَارَ اَشَدَّهُمَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: عمار کو جب بھی دو کاموں میں سے کسی ایک کام کا اختیار دیا گیا تو اس نے ہمیشہ سخت ترین اور مشکل کام کو اختیار کیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ ان دونوں کاموں میں سے جو کام طبیعت پر بہت بھاری اور نفس کے لئے دشوار ہوتا تھا اور اسی اعتبار سے زیادہ فضیلت بھی اسی کام کی ہوتی تھی تو عمارؓ اسی کو اختیار کرتے جیسا کہ سالکان راہ قرب و ولایت کا طریقہ ہے۔ رہا آنحضرت ﷺ کا معاملہ کہ آپ ﷺ دو اختیاری کاموں میں سے اسی کام کو اختیار کرتے تھے جو سب سے آسان اور ہلکا ہوتا تھا تو اس کا مقصد اُمت کے لئے آسانی اور سہولت پیدا کرنا ہوتا تھا۔

ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ "عمار کو جب بھی دو کاموں میں سے کسی ایک کام کا اختیار دیا گیا تو انہوں نے اسی کام کو اختیار کیا۔ جو زیادہ آسان ہوتا تھا، چونکہ ان دونوں روایتوں میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ اوپر والی روایت کا معنی تو یہ ہے کہ خود حضرت عمارؓ کس کام کو سخت ترین اور دشوار سمجھتے تھے، چنانچہ وہ جس کام کو دوسرے کام کی بہ نسبت زیادہ سخت اور دشوار سمجھتے تھے۔ اسی کو اختیار کرتے تھے، اور اس دوسری روایت کا مبنی یہ ہے کہ ان کے علاوہ دوسرا آدمی کس کام کو زیادہ سخت اور دشوار سمجھتا تھا، یعنی دوسرا آدمی تو یہ سمجھتا تھا کہ عمارؓ نے جس کام کو اختیار کیا ہے وہ آسان اور سہل ہے لیکن حقیقت میں حضرت عمارؓ کے نزدیک وہی کام زیادہ سخت اور دشوار ہوتا تھا۔

حضرت سعد بن معاذؓ کی فضیلت

(۴۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمَّا حُمِلَتْ جَنَازَةُ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ قَالَ الْمُنَافِقُوْنَ مَا اَخَفَّ جَنَازَتَهُ ذٰلِكَ لِحُكْمِهِ فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ كَانَتْ تَحْمِلُهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب سعد بن معاذؓ کا جنازہ اٹھا کر لوگ چلے (اور ان کو وہ جنازہ ہلکا لگا) تو منافقوں نے کہا کہ اس کا جنازہ کتنا ہلکا اس فیصلہ کی وجہ سے ہے جو اس نے بنو قریظہ کے بارے میں دیا تھا۔ منافقوں کی یہ بات نبی کریم ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے جنازے کو فرشتے اٹھائے لئے جا رہے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اس فیصلہ کی وجہ سے ہے" قصہ یہ ہوا تھا کہ مدینہ کے یہودیوں کے قبیلہ "بنو قریظہ" نے جب غزوہ خندق (ذیقعدہ ۵ھ) کے موقع پر آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی اور اعتماد شکنی کا بدترین مظاہرہ کیا تو آنحضرت ﷺ نے اس غزوہ سے فارغ ہوتے ہی بنو قریظہ کا رخ کیا اور ان کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تاکہ ان کی مسلسل ریشہ دوانیوں، سازشوں اور بدعہدیوں کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا جائے۔ بنو قریظہ کے یہودی نہ تو اپنے قلعہ سے باہر آکر مجاہدین اسلام کے مقابلہ کی ہمت پاتے تھے اور نہ آنحضرت ﷺ کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ آخر کار جب یہ محاصرہ پچیس روز تک جاری رہا اور قلعہ کے اندر محصور یہودیوں کو کوئی راہ نجات نظر نہیں آئی تو

انہوں نے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم اپنے آپ کو اس شرط پر آپ ﷺ کے سپرد کرتے ہیں کہ سعاد بن معاذؓ ہمارے لئے جو سزا تجویز کریں وہی سزا ہم کو دی جائے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو قبول فرمالیا اور حضرت سعد بن معاذؓ کو حکم دیا کہ ان کے حکم میں ازراہ عدل و انصاف جو سزا مناسب سمجھو تجویز کرو۔ حضرت سعد بن معاذؓ نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ سنایا کہ: بنو قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیئے جائیں ان کی عورتوں اور ان کے بچوں کے ساتھ اسیران جنگ کا سلوک کیا جائے اور ان کے اموال و املاک کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے، آنحضرت ﷺ نے اس فیصلہ پر عمل کیا اور حضرت سعد بن معاذؓ سے فرمایا کہ تمہارا یہ فیصلہ حق تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق ہے جو اس نے ساتوں آسمانوں کے اوپر صادر کیا۔ پس جب حضرت سعد بن معاذؓ کا انتقال ہوا اور ان کا جنازہ لے جایا جانے لگا تو ان منافقین نے کہ جو ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام سے پوشیدہ دشمنی اور دشمنان دین سے خفیہ ساز باز اور ہمدردی رکھتے تھے، حضرت سعد بن معاذؓ کے متعلق زبان اعتراض کھولنے کا موقع پایا اور ان پر طعن کیا کہ سعد کا یہ جنازہ اس سبب سے ہلکا پڑ گیا ہے کہ انہوں نے بنو قریظہ کے بارے میں غیر منصفانہ فیصلہ دیا تھا۔ گویا ان منافقین نے حضرت سعدؓ کی طرف ظلم کی نسبت کی اور ان کے فیصلہ کو ایک ظالمانہ فیصلہ قرار دیا، حالانکہ یہ ان منافقوں کا خبث باطن تھا جو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں سے عناد کے تحت حضرت سعدؓ کے نہایت موزوں اور مبنی بر حقیقت فیصلہ کو ظالمانہ فیصلہ سمجھا اور ان کے جنازہ کے سبک ہونے کو مذکورہ فیصلہ سے جوڑ کر نہایت بیہودہ اور لغو بات کہی۔

"ان کے جنازہ کو فرشتے اٹھائے لئے جارہے تھے" یعنی سعدؓ کے جنازہ کا سبک و ہلکا ہونا اس بات سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا جو ان جاہل منافقوں کے ذہن میں ہے اور جس کا اظہار بھی انہوں نے کیا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ سعدؓ کے جنازہ کو اٹھا کر چلنے والوں میں فرشتے بھی شامل تھے اور چونکہ وہ جنازہ فرشتوں نے اٹھا رکھا تھا اس لئے لوگوں کو ہلکا اور سبک لگ رہا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ میت (نعش کا ہلکا و سبک ہونا بذات خود اچھی علامت ہے جب کہ اس کا بھاری لگنا کچھ اچھی علامت نہیں سمجھا جاتا۔ عارفین کا کہنا ہے کہ میت کا بھاری ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ شخص دنیا میں زیادہ رغبت و تعلق رکھتا تھا جب کہ میت کا ہلکا اور سبک ہونا دنیا سے اس کی بے رغبتی، آخرت اور مولیٰ کے تئیں اس کے کمال اشتیاق اور مقصد اعلیٰ کی طرف اس کی روح کے جلد پرواز کرنے کو ظاہر کرتا ہے۔ بہر حال منافقوں نے مذکورہ بات چونکہ حضرت سعدؓ کی حقارت و سبکی کا پہلو ملحوظ رکھ کر کہی تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس طرح جواب دیا کہ جنازہ کے ہلکا و سبک ہونے سے حضرت سعدؓ کی شان و حیثیت کا بڑھنا اور ان کی عظمت کا ظاہر ہونا لازم آجائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ للہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون (عزت تو اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمن بندوں کے لئے لیکن منافق نہیں جانتے)۔

حضرت ابوذرؓ کی فضیلت

(۴۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَآءُ وَلَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَآءُ اَصْدَقَ مِنْ اَبِیْ ذَرٍّ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے سنا: ابوذرؓ سے بڑھ کر سچی زبان کے آدمی پر نہ نیلگوں آسمان نے سایہ کیا اور نہ غبار آلود زمین نے ان سے بڑھ کر سچے آدمی کو اٹھایا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حضرت ابوذر غفاریؓ ان بزرگان صحابہ میں سے ہیں جو زہد و قناعت، فقر و استغناء اور تجرد کی زندگی گزارنے کے سبب دنیا کی ہر لذت و نعمت سے اپنے آپ کو دور رکھتے تھے۔ ان کا ذکر پیچھے اپنے موقع پر ہو چکا ہے۔

یہاں حضرت ابوذرؓ کے ذکر میں جو حصر ہے اس سے تاکید اور مبالغہ مراد ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ علی الاطلاق سب سے

بڑھ کر سچی زبان والے تھے، اور کوئی بھی شخص ان سے زیادہ سچا نہیں تھا۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اس امت کے صدیق ہیں اور نبی کریم ﷺ کے بعد اس اُمت کے سب سے افضل و اعلیٰ شخص ہیں لہٰذا یہ کہنا موزوں نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابوذرؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بھی بڑھ کر سچی زبان والے تھے، اور پھر خود رسول کریم ﷺ اور انبیاء علیہم السلام یقینی طور پر حضرت ابوذرؓ سے کہیں زیادہ سچے اور ان سے کہیں بڑھ کر سچی زبان والے تھے۔

(۴۴) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَآءُ وَلَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَآءُ مِنْ ذِیْ لَھْجَۃٍ اَصْدَقُ وَلَا اَوْفٰی مِنْ اَبِیْ ذَرٍّ شِبْہِ عِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ یَعْنِیْ فِی الزُّھْدِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کسی ایسے بولنے والے پر نہ تو نیلگوں آسمان نے سایہ کیا اور نہ زمین نے اس کو اٹھایا جو ابوذرؓ سے زیادہ راست گو ہو اور اللہ اور اللہ کے رسول کا حق ابوذرؓ سے زیادہ ادا کرنے والا ہو۔ وہ ابوذرؓ جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے مشابہ ہیں یعنی زہد میں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اوفی کا ترجمہ بعض شارحین نے یہ کیا ہے کہ: جو کلام و گفتگو کا حق ابوذرؓ سے زیادہ ادا کرنے والا ہو، اور کلام کا ایک حق تو یہ ہے کہ صحیح، سچی اور نیک بات کے علاوہ اور کچھ زبان پر نہ لایا جائے اور ایک حق یہ ہے کہ تلفظ کی ادائیگی، جملوں کی ساخت الفاظ کے استعمال اور مفہوم و معنی کے اظہار میں کوئی فروگزاشت نہ ہو پس حدیث کا حصل یہ ہے کہ ابوذرؓ اظہار حق میں ذرا بھی چشم پوشی و مداہنت نہیں کرتے ہمیشہ راست گفتاری و صاف گوئی سے کام لیتے ہیں جس بات کو حق اور سچ سمجھتے ہیں برملا کہہ دیتے ہیں چاہے وہ کیسی ہی تلخ ہو اور کسی کے لئے کتنی ہی ناگوار ہو نیز وہ اللہ اور اللہ کے رسول کے پکے مطیع و فرمانبردار ہیں، یا یہ کہ وعدہ اور عہد کو پورا کرتے ہیں اور یا یہ کہ اپنی بات کو بڑی وضاحت اور فصاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ غرضیکہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر کوئی شخص ابوذرؓ کے برابر راست گو اور اپنی بات کا پورا، یا اللہ اور اللہ کے رسول کا حق ادا کرنے والا یا فصیح اللسان نہیں ہے۔

"جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے مشابہ ہیں" ان الفاظ میں حضرت ابوذرؓ کے کمال زہد و ورع اور ان کے تجرد کی طرف اشارہ ہے چنانچہ ان کے زہد اور دنیا سے ان کی بے تعلقی و بے رغبتی کا عالم یہ تھا کہ دنیا کی ناجائز و مباح لذتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے تھے، تجرد کی بے کیف زندگی پر پوری طرح قانع و صابر تھے، مال جمع کرنا ان کے نزدیک حرام تھا، چاہے وہ کتنے ہی جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ اور زکوٰۃ وغیرہ کتنی ہی پابندی و احتیاط سے ادا کی گئی ہو۔ منقول ہے کہ ایک دن حضرت ابوذرؓ ہاتھ میں عصا لئے ہوئے سیدنا عثمان غنیؓ کی مجلس میں آئے تو وہاں حضرت کعبؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سیدنا عثمان غنیؓ نے حضرت کعبؓ سے پوچھا، کعبؓ (تمہیں معلوم ہی ہے) عبدالرحمٰن بن عوفؓ اس حال میں اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں کہ ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی تھی۔ ان کا ترکہ نہایت کثیر مقدار سونے چاندی اور دوسرے مال و اسباب پر مشتمل ہے اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے (مال و دولت کی اس قدر کثرت و فراوانی عبدالرحمٰنؓ کے درجہ کمال کی راہ میں کسی نقصان کا باعث تھی یا نہیں) حضرت کعبؓ بولے: اگر عبدالرحمٰنؓ اس مال و دولت میں اللہ کا حق یعنی زکوٰۃ وغیرہ ادا کرتے تھے تو پھر اس مال و دولت میں ان کے لئے کوئی نقصان اور خدشہ کی کوئی بات نہیں، حضرت ابوذرؓ نے حضرت کعبؓ کی جو یہ بات سنی تو اپنا عصا اٹھا کر ان کو مارا اور بولے: میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر میرے پاس اس پہاڑ (یعنی احد پہاڑ) کے برابر سونا ہو اور میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کروں تو اس کے باوجود کہ میرا وہ خرچ کرنا قبول کر لیا جائے میں بالکل پسند نہیں کروں گا کہ میں اس میں سے چھ اوقیہ (دو سو چالیس درہم کے برابر) بھی سونا چھوڑ جاؤں، پھر حضرت ابوذرؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ بتاؤ تم نے بھی آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے یہ ارشاد سنا ہے؟ ابوذرؓ نے یہ بات تین مرتبہ کہی، حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔ ہاں: آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے میں نے بھی یہ ارشاد سنا ہے۔ بہرحال حضرت ابوذرؓ چونکہ کامل درویش اور تارک الدنیا تھے اور زہد و فقر پر سختی سے کاربند تھے اس لئے ان کا مسلک یہ تھا رویہ

پیسہ اور مال وزر جمع کرنا، بچا کر رکھنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ دے سب اسی کی راہ میں خرچ کر دینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں ان کے مزاج میں اتنی شدت تھی کہ دولت کے جواز میں کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ جب حضرت کعبؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کی دولت کے جواز میں بات کہی تو حضرت ابوذرؓ پر ان کا یہی سخت جذبہ غالب آگیا اور انہوں نے حضرت کعبؓ پر اپنا عصا کھینچ مارا۔ لیکن جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے تو جمہور کا مسلک یہی ہے کہ اگر زکوٰۃ وغیرہ ادا کی جاتی رہے تو مال و دولت جمع کرنے اور بچا کر رکھنے میں کوئی گناہ نہیں ہے خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ رہی آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی بات جو حضرت ابوذرؓ نے بیان کیا تو اس سے مال و دولت کی برائی یا مال و دولت جمع کرنے کے عدم جواز کا کوئی پہلو نہیں نکلتا جیسا کہ شائد حضرت ابوذرؓ سمجھتے تھے آنحضرت ﷺ نے تو محض اپنے جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ اور دنیاوی مال و دولت سے اپنی بے رغبتی کا اظہار فرمایا تھا نہ کہ اس دولت کے جمع کرنے اور رکھنے کے عمومی عدم جواز کا اظہار مقصود تھا جو جائز وسائل وذرائع سے آتی ہو۔ اور جس کے حق (یعنی زکوٰۃ وغیرہ) کی ادائیگی کا اہتمام رکھا جاتا ہو۔

"یعنی زہد میں" یہ الفاظ کسی راوی کے ہیں، اصل روایت کا جزء نہیں ہیں۔ واضح رہے کہ صاحب استیعاب نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں رسول کریم ﷺ کے یہ الفاظ بیان کئے گئے ہیں: "جو شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تواضع و انکسار کے دیکھنے کی خوشی و سعادت حاصل کرنا چاہتا ہو وہ ابوذرؓ کو دیکھ لے" اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث بالا میں آنحضرت ﷺ نے ابوذرؓ کی جس صفت میں حضرت عیسیٰ کے مشابہ فرمایا ہے وہ تواضع اور انکسار ہے۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ جس راوی نے یعنی فی الزھد کے الفاظ میں "مشابہت" کی توضیح کرنی چاہی ہے اس کے علم میں وہ حدیث نہیں تھی، جس کو صاحب استیعاب نے نقل کیا ہے اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ زہد اور تواضع کے درمیان کوئی منافات نہیں یہ دونوں صفتیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں بلکہ جو شخص "زاہد" ہو گا وہ متواضع و منکسر المزاج بھی یقیناً ہو گا۔ علاوہ ازیں "یعنی فی الزہد" کے الفاظ اصل کتاب یعنی مصابیح میں موجود نہیں ہیں بلکہ صاحب مشکوٰۃ کے بڑھائے ہوئے ہیں۔

علمی بزرگی رکھنے والے چار صحابہؓ

(۴۵) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ لَمَّا حَضَرَتِ الْمَوْتُ قَالَ الْتَمِسُوا الْعِلْمَ عِنْدَ اَرْبَعَةٍ عِنْدَ عُوَيْمِرٍ اَبِي الدَّرْدَاءِ وَعِنْدَ سَلْمَانَ وَعِنْدَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَعِنْدَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ الَّذِيْ كَانَ يَهُوْدِيًّا فَاَسْلَمَ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهٗ عَاشِرُ عَشَرَةٍ فِي الْجَنَّةِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ علم چار آدمیوں سے حاصل کرو، عویمرؓ سے جن کی کنیت ابو درداءؓ ہے سلمان فارسیؓ سے، عبداللہ بن مسعودؓ سے اور عبداللہ بن سلامؓ سے جو یہودی تھے۔ اور پھر انہوں نے اسلام قبول کیا میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ وہ (عبداللہ بن سلام) جنت کے دس شخصوں میں سے دسواں شخص ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "علم چار آدمیوں سے حاصل کرو" میں "علم" سے مراد یا تو عمومی طور پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا علم ہے یا اس علم کمال کا وہ خاص فن کہ جس سے حلال و حرام امور کی معرفت و پہچان حاصل ہوتی ہے اور یہ دوسرا احتمال زیادہ قوی اور زیادہ واضح ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد: اعلمکم بالحلال والحرام معاذ بن جبل (حلال و حرام امور کا علم تم میں سے سب سے زیادہ معاذ بن جبل کو حاصل ہے) کے بموجب اسی خاص علم و فن سے حضرت معاذ بن جبلؓ کو مناسبت تامہ بھی حاصل ہے اور اسی سے ان کی وجہ خصوصیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

"جن کی کنیت ابو درداء ہے" ان کا اصل نام "عویمر" ہی تھا لیکن مشہور اپنی کنیت "ابو درداء" کے ساتھ تھے "درداء" ان کی بیٹی کا

نام تھا۔ حضرت عویمرؓ یعنی حضرت ابودرداءؓ انصاری خزرجی ہیں، زبردست فقیہہ، بلند پایہ عالم، بزرگ مرتبہ زاہد، اور نہایت اونچے درجہ کے حکیم ودانا تھے۔ اصحاب صفہ میں سے ہیں اور آنحضرت ﷺ نے ان کے اور حضرت سلمان فارسیؓ کے درمیان بھائی چارہ کرایا تھا۔ بعد میں انہوں نے ملک شام میں سکونت اختیار کرلی تھی اور ۳۲ھ میں بمقام دمشق ان کا انتقال ہوا۔

"اور پھر انہوں نے اسلام قبول کیا" حضرت عبداللہ بن سلامؓ پہلے یہودی تھے اور دین موسوی کے زبردست عالم مانے جاتے تھے، تورات کے علوم پر پورا عبور رکھتے تھے۔ اور اس کے رموز و اشارات سے پوری طرح واقف تھے اس آسمانی کتاب میں آنحضرت ﷺ سے متعلق جتنی پیشینگوئیاں اور ہدایات تھیں ان کو پوری طرح سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کو ابتداہی سے آنحضرت ﷺ کی بعثت کا انتظار اور آپ ﷺ کے دیدار کا اشتیاق پوری شدت کے ساتھ تھا، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو پہلے ہی دن انہوں نے خدمت اقدس میں حاضری دی اور اسی وقت مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

"دس شخصوں میں سے دسواں شخص ہے" ان الفاظ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن سلامؓ "عشرہ مبشرہ" میں شامل ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس لئے ان الفاظ کے معنی یوں بیان کئے جائیں گے کہ عبداللہ بن سلامؓ گویا ان دس شخصوں میں کے دسویں شخص کی مانند ہیں جن کو جنت کی بشارت ہوئی، اور ایک شارح نے اس جملہ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ: عبداللہ بن سلامؓ صحابہ میں کے نو شخصوں کے بعد بہشت میں داخل ہوں گے۔ یعنی صحابہ جس ترتیب کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے اس میں دسواں نمبر عبداللہ بن سلامؓ کا ہوگا۔ لیکن اس معنی میں یہ خرابی ہے کہ اس سے عبداللہ بن سلامؓ کا بعض عشرہ مبشرہ سے بھی پہلے جنت میں داخل ہونا لازم آتا ہے، بہرحال اس جملہ کے ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ عبداللہ بن سلامؓ ان دس یہودیوں میں کے دسویں شخص ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ یا یہ معنی مراد ہیں کہ عشرہ مبشرہ کے بعد جو پہلے دس شخص جنت میں داخل ہوں گے ان میں کے دسویں شخص عبداللہ بن سلامؓ ہیں۔ اس طرح صحابہؓ جس ترتیب کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے ان میں عبداللہ بن سلام کا نمبر انیسواں ہوگا۔

حذیفہ اور ابن مسعود کی فضیلت

(۴۶) وَعَنْ حُذَيْفَةَؓ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوِ اسْتَخْلَفْتَ قَالَ اِنِ اسْتَخْلَفْتُ عَلَيْكُمْ فَعَصَيْتُمُوْهُ عُذِّبْتُمْ وَلٰكِنْ مَا حَدَّثَكُمْ حُذَيْفَةُ فَصَدِّقُوْهُ وَمَا اَقْرَاَكُمْ عَبْدُ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) چند صحابہ بولے کہ یارسول اللہ: اگر آپ (ﷺ) (اپنے سامنے ہی صحابہ میں سے کسی کو اپنا خلیفہ مقرر فرمادیتے تو اچھا ہوتا (یا یہ معنی ہیں کہ یارسول اللہ! اگر آپ ﷺ خود کسی کو اپنا خلیفہ مقرر فرماتے تو وہ کون ہوتا!) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر میں کسی کو تمہارے اوپر خلیفہ مقرر کردوں اور پھر تم اس کی نافرمانی کرو تو تم عذاب میں پکڑے جاؤ گے، تاہم (میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ) حذیفہؓ تم سے جو کچھ کہیں یا جو حدیث بیان کریں اس کو سچ جانو اور عبداللہ بن مسعودؓ تم کو جو کچھ پڑھائیں اس کو پڑھو۔" (ترمذی)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے جس انداز میں جواب دیا، اس کا تعلق حکیمانہ اسلوب سے ہے۔ آپ ﷺ نے گویا یوں فرمایا کہ یہ بات تمہارے لئے اتنی اہم اور ضروری نہیں ہے کہ ابھی سے خلافت کی فکر میں لگ جاؤ اور منصب خلافت کے لئے کسی کو نامزد یا مقرر کرنے درخواست مجھ سے کرو۔ کیونکہ یہ تو وہ معاملہ ہے جو اللہ کے حکم سے اپنے وقت پر تمہارے سامنے بہرصورت ظاہر ہو جائے گا، بایں طو کہ تم جس اہل و موزوں شخص پر اتفاق و اجماع کرلو گے وہی خلیفہ بن جائے گا۔ علاوہ ازیں، میری طرف سے منصب خلافت کے لئے کسی شخص کی نامزدگی یا تقرری میں ایک مانع یہ بھی ہے کہ فرض کرو کہ میں نے تمہاری درخواست پر کسی کو ابھی سے خلیفہ متعین یا نامزد کر اور پھر میرے بعد تم نے اس خلیفہ کی نافرمانی کی یا اس کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تو بالیقین اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب میں پکڑے جاؤ گے۔

لہٰذا تم خلافت کی فکر چھوڑو اور کتاب وسنت پر عمل پیرا اور ان کے راستہ پر مضبوطی سے گامزن رہنے کی دھن باندھو کہ یہی بات تمہارے لئے سب سے اہم اور سب سے ضروری ہے۔

"حذیفہؓ تم سے جو کچھ کہیں" یہاں خاص طور پر انہی دونوں صحابہ یعنی حضرت حذیفہؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا ذکر اس سبب سے ہوا کہ اول تو علم ویقین میں ان کی ممتاز حیثیت اور ان کی بڑھی ہوئی فضیلت کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا، دوسرے یہ کہ کسی صاحب ایمان کو جس چیز سے اجتناب و پرہیز سب سے زیادہ کرنا چاہئے وہ "نفاق" ہے اور جس چیز کو سب سے زیادہ ماننا اور بجالانا چاہئے، وہ "احکام شریعت" ہیں چنانچہ پہلی چیز یعنی "نفاق" کا علم و ادراک رکھنے والے سب سے اہم صحابی حضرت حذیفہؓ تھے کہ ان کو "صاحب سر رسول اللہ ﷺ" کا خصوصی درجہ حاصل تھا اور منافقوں کے بارے میں جتنا کچھ وہ جانتے تھے اتنا کوئی صحابی نہیں جانتا تھا۔ دوسری چیز یعنی احکام شریعت کا بہت زیادہ علم رکھنے والے صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ تھے جن کے بارے میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے رضیت لامتی مارضی بہ ابن ام عبد (میری اُمت کے لئے ابن ام عبد یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کی پسند میری پسند ہے۔) نیز آپ ﷺ نے فرمایا: تمسکوا بعھد ابن ام عبد (اے مسلمانو! ابن ام عبد یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کی تلقین و نصیحت اور ان کی رائے پر پوری طرح عمل کرو) یہاں علماء نے بطور نکتہ لکھا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں اور اسی طرح اس فصل کی پہلی حدیث میں ایک طرح سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا بیان بھی ہے چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد جب خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا۔ تو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنانے کی رائے دیتے ہوئے کہا تھا: ابوبکر وہ شخص ہیں جن کو آنحضرت نے ہماری پیشوائی (یعنی امامت نماز کے لئے) آگے کیا تھا اس لئے ہمیں اپنی دنیاوی قیادت کے لئے بھی انہی کو آگے رکھنا چاہئے۔

حضرت محمد بن مسلمہؓ کی فضیلت

(۴۷) وَعَنْهُ قَالَ مَا اَحَدٌ مِنَ النَّاسِ تُدْرِكُهُ الْفِتْنَةُ اِلَّا اَنَا اَخَافُهَا عَلَيْهِ اِلَّا مُحَمَّدَ بْنَ مُسْلِمَةَ فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَضُرُّكَ الْفِتْنَةُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَ سَكَتَ عَنْهُ وَاَقَرَّهُ عَبْدُ الْعَظِيْمِ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ: جب (دنیاوی بدامنی وانتشار اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف و افتراق کا) فتنہ لوگوں کو گھیرے گا تو مجھ کو خوف ہے کہ کوئی شخص اس کے اثر سے محفوظ نہ رہے گا علاوہ محمد بن مسلمہؓ کے چنانچہ میں نے رسول کریم ﷺ کو (محمد بن سلمہؓ سے) یہ فرماتے سنا ہے کہ فتنہ تم کو ضرر نہ پہنچائے گا اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے تاہم (نامور محدث) عبدالعظیم منذریؒ نے اس حدیث کو ثابت کیا ہے۔"

تشریح: حضرت محمد بن مسلمہؓ انصاری خزرجی اشہلی، بلند پایہ صحابی ہیں انہوں نے مدینہ میں حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے غزوہ تبوک کے موقع پر انہی کو مدینہ میں اپنا خلیفہ چھوڑا تھا، آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق انہوں نے باہمی اختلاف و انتشار کے ہر فتنہ سے اپنا دامن بچائے رکھا، جب بھی اس طرح کا کوئی ناگوار موقع آتا تھا۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ گوشہ نشین ہوجاتے تھے اور اس طرح فتنہ وفساد کے شرر و ضرر سے محفوظ رہتے تھے۔ باختلاف روایات ۴۳ھ یا ۴۶ھ میں واصل بحق ہوئے۔

"اور اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے" یعنی امام ابوداؤدؒ نے اس حدیث کو نہ مطعون کیا ہے اور نہ اس کی تصحیح و تحسین کی ہے واضح ہو کہ جس حدیث کے بارے میں امام ابوداؤدؒ نے سکوت اختیار کیا ہو اس کے متعلق محدثین کے اختلافی اقوال ہیں۔ بعض حضرات ایسی حدیث کو "صحیح" کا درجہ دیتے ہیں، بعض حضرات "حسن" کہتے ہیں اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ حدیث "ضعیف" ہے مگر لائق

استناد ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں رواہ کے بعد جگہ خالی چھوٹی ہوئی ہے۔ اور حاشیہ پر مذکورہ بالا عبارت جزری ؒ کے حوالہ سے لکھی ہوئی ہے۔

عبداللہ بن زبیرؓ

(۴۸) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى فِيْ بَيْتِ الزُّبَيْرِ مِصْبَاحًا فَقَالَ يَا عَائِشَةُ مَا اُرٰى اَسْمَاءَ اِلَّا قَدْ نُفِسَتْ وَلَا تُسَمُّوْهُ حَتّٰى اُسَمِّيَهٗ فَسَمَّاهُ عَبْدَاللّٰهِ وَحَنَّكَهٗ بِتَمْرَةٍ بِيَدِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ (ایک رات کو خلاف معمول) نبی کریم ﷺ نے زبیرؓ کے گھر میں چراغ جلتے دیکھا تو فرمایا کہ عائشہ! میرے خیال میں اسماءؓ کے بچہ پیدا ہوا ہے (کیونکہ ان کے ہاں ولادت قریب تھی اور اس وقت خلاف معمول چراغ کا جلنا اس بات کی علامت ہے) تم لوگ اس بچہ کا نام نہ رکھنا جب تک کہ میں نام نہ رکھوں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس بچہ کا نام "عبداللہ" رکھا اور کھجور کے ذریعہ اپنے دست مبارک سے اس بچہ کو تحنیک کیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: تحنیک کے معنی ہیں: کچا چبا کر بچہ کے منہ میں دینا، چنانچہ کھجور یا کوئی میٹھی چیز چبا کر نو مولود بچہ کے منہ میں دینا یا اس کے تالوں کو لگانا مستحب ہے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس کے یہاں بچہ پیدا ہو تو اس کو چاہئے کہ کسی نیک و صالح شخص سے اس بچہ کا نام رکھوائے اور کھجور یا شہد اور یا کسی بھی میٹھی چیز کے ساتھ اس کی تحنیک کرائے جس سے اس کو برکت حاصل ہو۔

حضرت زبیر بن العوام، آنحضرت ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے داماد ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی بہن حضرت اسماءؓ ان کے نکاح میں تھیں۔ بڑی قدر منزلت رکھنے والے صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

حضرت عبداللہؓ، حضرت زبیرؓ، و حضرت اسماءؓ کے بیٹے ہیں، سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی کنیت ان کے نانا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کنیت پر رکھی تھی اور ان کا نام بھی نانا ہی کے نام پر رکھا تھا، ہجرت کے بعد مدینہ میں مہاجرین کے یہاں جو لڑکے پیدا ہوئے ان میں سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ہی اھ میں پیدا ہوئے تھے جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے کان میں اذان دی، حضرت اسماءؓ ان کو آنحضرت ﷺ کے پاس لائیں اور آپ ﷺ کی بابرکت گود میں دیا، آنحضرت ﷺ نے کھجور منگائی اور اس کو اپنے منہ میں ڈال کر چبایا پھر اپنا مبارک لعاب دہن ان کے منہ میں ڈالا اور ان کو تحنیک کیا، اس طرح حضرت عبداللہ کے پیٹ میں جو چیز سب سے پہلے داخل ہوئی وہ آنحضرت ﷺ کا مبارک لعاب دہن تھا، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے خیر و برکت کی دعا فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نہایت پاکباز اور پاک نفس انسان تھے، روزے بہت رکھتے تھے اور نمازیں بھی بہت پڑھتے تھے۔ صلہ رحمی کا بہت خیال رکھتے تھے اور ناتے داروں سے حسن سلوک میں مشہور تھے۔ نہایت بہادر اور زبردست سپہ سالار تھے، میدان جنگ میں ان کی شجاعت اور شہ سواری تمام قریش میں ضرب المثل اور وجہ افتخار تھی حق گوئی ان کا طرہ امتیاز تھا، نہایت خوش تقریر اور جہر الصوت تھے، جب بولتے تھے تو آواز پہاڑوں سے جا کر ٹکرایا کرتی تھی، ایک بہت بڑی جماعت کو ان سے روایت حدیث کا شرف حاصل ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ان صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید بن معاویہ کی امارت و حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا تھا اور امارت معاویہؓ کے مقرر کردہ حاکم مدینہ کے تسلط سے نکل کر مکہ مکرمہ آ گئے تھے، یہاں مکہ کے شرفاء اور عمائدین کی اکثریت پہلے ہی سے یزید کے خلاف تھی، ان سب نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مکہ پر ان کی حکومت قائم کرادی اور یزید اپنی سخت ترین کوششوں کے باوجود اپنی پوری مدت حکومت میں مکہ پر کبھی بھی اپنا تسلط قائم نہ کر پایا، یزید کی موت کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ۶۴ھ میں باقاعدہ اپنی خلافت کا اعلان کیا اور عام لوگوں سے بیعت لی، جس کے بعد بہت جلد شام کے بعض مقامات کے سوا تمام

عالم اسلام نے ان کی خلافت کو تسلیم کر لیا اور تقریباً نو سال تک حجاز عراق، یمن اور خراسان وغیرہ ممالک ان کی خلافت کے تحت رہے۔ جمادی الاول ۷۲ھ میں دمشق (شام) کے اموی حکمران عبدالملک نے مشہور ظالم حجاج بن یوسف ثقفی کی کمانداری میں ایک زبردست لشکر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف مکہ پر چڑھائی کے لئے روانہ کیا۔ اس لشکر نے پہلے طائف پر قبضہ کیا اور یہاں سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف جنگی کاروائیاں جاری کیں، جن کا سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا پھر حجاج نے عبدالملک سے مزید کمک منگوائی اور زبردست جنگی تیاریوں کے ساتھ رمضان المبارک ۷۲ھ میں بہت بڑا حملہ کر کے مکہ مکرمہ کا محاصرہ کر لیا، یہ محاصرہ بھی کئی ماہ تک جاری رہا، جس کے دوران حجاج کی فوجیں شہر مکہ اور کعبۃ اللہ پر منجنیق سے سنگ باری کر کے تباہی پھیلاتی رہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اپنی محدود فوجی طاقت کے ساتھ حجاج کا مقابلہ بڑی بہادری اور جانبازی سے کرتے رہے، ایک ایک کر کے ان کے تمام سپاہی کام آ گئے، یہاں تک کہ دنیا کا عظیم الشان بہادر و متقی انسان تن تنہا داد شجاعت دیتا ہوا اس ظالم فوج کے ہاتھوں شہید ہوا۔ حجاج نے اس مردہ شیر کا سر تن سے جدا کر کے لاش کو ایک دار پر لٹکوایا اور پھر کافی دنوں بعد اس نے لاش کو دفن کرنے کی اجازت دی۔

حضرت معاویہؓ

(۴۹) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ عُمَیْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ لِمُعَاوِیَةَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِیًا مَهْدِیًّا وَاهْدِبِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبدالرحمن بن عمیرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت معاویہؓ کے حق میں یوں دعا فرمائی: اے اللہ! اس کو راہ راست دکھانے والا اور راہ راست پایا ہوا بنا اور اس کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت عطا فرما۔" (ترمذی)

تشریح: اس میں شک نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی دعا مستجاب ہے پس جس شخص کے حق میں آپ ﷺ نے یہ مستجاب دعا فرمائی ہو اس کے بارے میں کسی طرح کا شک وشبہ ظاہر کرنا اور کوئی برا خیال قائم کرنا ہر گز روا نہیں ہے۔

حضرت معاویہؓ اموی قریشی ہیں ان کی ماں کا نام ہندہ ہے جو قریش کے ایک بڑے سردار عقبہ کی بیٹی تھیں اور ان کے والد ابوسفیان ہیں جو خود قریش کے ایک بڑے سردار تھے جن لوگوں نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا ابوسفیان ان میں سے ایک ہیں۔ مسلمان ہو جانے کے بعد یہ ابوسفیان کچھ دنوں تک "مؤلفۃ القلوب" میں شمار ہوئے پھر اسلام اور مسلمانوں کے جاں نثار اور وفا شعار خادم بنے حضرت معاویہؓ ان صحابہؓ میں سے ایک ہیں جو آنحضرت ﷺ کے کاتب تھے، لیکن بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وحی کی کتابت انہوں نے مطلق نہیں کی البتہ خطوط نویسی کا کام ان کے سپرد تھا گویا آنحضرت ﷺ کے منشی تھی حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں شام کے حاکم مقرر ہوئے اور تقریباً بیس سال یعنی حضرت عثمان غنیؓ کے آخر عہد خلافت تک اسی عہدہ پر رہے۔ پھر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت اور معاویہؓ کی حکومت شام کے درمیان ٹکراؤ رہا اور باقاعدہ جنگوں تک کی نوبت آئی۔ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد جب سیدنا امام حسنؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان مصالحت ہو گئی تو تمام عالم اسلام نے امیر معاویہؓ کو خلیفہ وقت تسلیم کیا اور تقریباً بیس سال تک تمام اسلامی دنیا کے خلیفہ و امیر رہے ماہ رجب ۶۰ھ میں بعمر اٹھتر سال دمشق میں ان کا انتقال ہوا آخر عمر میں ان کو لقوہ ہو گیا تھا، اپنے آخر زمانہ میں بڑی حسرت سے فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں قریش کے معمولی فرد کی طرح (مکہ کے ایک مقام) ذی طویٰ میں پڑا رہتا اور اس حکومت و خلافت کی کوئی چیز نہ دیکھتا، منقول ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کے پاس آنحضرت ﷺ کے کچھ تبرکات محفوظ تھے جن میں آپ ﷺ کی ایک چادر، ایک تہبند اور ایک کرتا تھا، ان مبارک کپڑوں کے علاوہ آپ ﷺ کے کچھ موئے مبارک اور ناخن بھی تھے مرتے وقت حضرت امیر معاویہ نے وصیت کی کہ آنحضرت ﷺ کے کرتے میں مجھ کو کفنایا جائے، آپ ﷺ کی چادر میں مجھ کو لپیٹا جائے آپ ﷺ کے تہبند کو میرا ازار بنایا جائے۔ اور آپ ﷺ کے جو موئے مبارک اور ناخن ہیں ان میں سے کچھ کو میرے حلق کے

گڑھے میں بھر دیا جائے اور کچھ کو میرے سجدے کی جگہوں پر باندھ دیا جائے اور پھر میرے اور ارحم الراحمین کے درمیان تخلیہ کر دیا جائے، یعنی دفنا کر کے مجھ کو میرے خدا کے سپرد کر دیا جائے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ

⑤⓪ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْلَمَ النَّاسُ وَآمَنَ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِالْقَوِيِّ۔

"اور حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: لوگوں نے تو اسلام قبول کیا اور عمرو بن العاصؓ ایمان لائے، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث "غریب" ہے اور اس کی اسناد قوی نہیں۔"

تشریح: "لوگوں نے اسلام قبول کیا" میں "لوگوں" سے مکہ اور قریش کے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے دن اس حالت میں اسلام قبول کیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا جب اسلام ایک فاتح طاقت کی حیثیت سے ان پر غالب آگیا تھا اور پیغمبر اسلام کے دامن عاطفت میں پناہ لینے کے علاوہ اور کوئی راستہ ان کے سامنے نہیں رہ گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو پھر ان کا ایمان مضبوط اور کامل ہوا اور وہ سب مخلص مؤمن و مسلمان بن گئے ان لوگوں کے برخلاف حضرت عمرو بن العاصؓ فتح مکہ سے ایک سال پہلے برضا و رغبت ایمان لے آئے تھے، اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت میں اپنا پیارا وطن مکہ چھوڑ کر ہجرت کی اور مدینہ منورہ آگئے تھے پس آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان گویا یہ جتلانا ہے کہ اہل قریش میں سے جو لوگ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے، انہوں نے توڑ کی وجہ سے اسلام قبول کیا تھا۔ جب کہ عمرو بن العاص برضا و رغبت اور اخلاص و یقین کے ساتھ ایمان لائے تھے۔

ایک شارح نے یہ لکھا ہے کہ: آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر خاص طور سے عمرو بن العاصؓ کے برضا و رغبت ایمان لانے کا ذکر اس پس منظر کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے کیا جو ان کے قبول اسلام کا محرک و سبب بنا۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت عمرو بن العاص کو مکہ اور قریش کے سرداروں نے اپنا خصوصی نمائندہ بنا کر حبش کے بادشاہ نجاشی کے پاس اس مشن پر بھیجا تھا کہ وہ ان مسلمانوں کو حبش سے مکہ واپس لائیں جو مکہ سے ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے اور نجاشی کی پناہ میں تھے، عمرو بن العاص نے اپنے اس مشن کے تحت جب نجاشی سے ان مسلمانوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تو نجاشی نے ان کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا، اور ان سے کہا: عمرو! مجھے بڑی حیرت ہے کہ محمد (ﷺ) تمہارے چچا کے بیٹے ہیں اور تم ان کی حقیقت سے اتنے بے خبر ہو! خدا کی قسم، وہ اللہ کے سچے رسول ہیں عمرو (یہ سن کر) بولے: آپ ایسا کہتے ہیں؟ نجاشی نے کہا: ہاں خدا کی قسم یہ میں کہہ رہا ہوں تم میری بات کو سچ مانو، بس اسی وقت ان کے دل و دماغ میں نور ایمان کی کرن پھوٹی اور وہ اپنے مشن سے دست بردار ہو کر بارادۂ ایمان وہاں سے لوٹ پڑے کسی نے ان کو ایمان کی دعوت نہیں دی کسی نے ان کو اسلام کی طرف نہیں بلایا، از خود ان کی فطرت سلیم بیدار ہو گئی اپنے آپ قبول ایمان کا جذبہ ان میں امڈ پڑا اور وہ دوڑتے بھاگتے سوئے مدینہ چلے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مشرف بایمان ہوئے اور مخلص و صادق مسلمان بن گئے، آنحضرت ﷺ نے ان کی بڑی پذیرائی کی، یہاں تک کہ مسلمان ہوتے ہی ان کو ایسے لشکر کا سردار بنا دیا جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو یہ اعزاز اور یہ فضیلت اس بنا پر عطا فرمائی کہ وہ چونکہ قبول اسلام سے پہلے آنحضرت ﷺ سے سخت عداوت رکھتے تھے اور آنحضرت اور مسلمانوں کے آزار و ہلاکت کے بہت درپے رہتے تھے، اس لئے قبول اسلام کے بعد وہ اپنے ماضی کے تئیں نہ صرف بہت دہشت زدہ بھی تھے بلکہ مسلمانوں کے درمیان خود کو اپنی نظر میں اجنبی اجنبی سا بھی محسوس کر رہے تھے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے ان کو ایک دم اتنا بڑا اعزاز عطا فرمایا تا کہ ان کے دل و دماغ سے اس اجنبیت و وحشت کا اثر بھی زائل ہو جائے اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے اپنے کو مطمئن و مامون سمجھیں، نیز اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں، ایک روایت

میں آیا ہے کہ عمرو بن العاص جب قبول اسلام کے ارادہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خود ان کی درخواست پر آنحضرت ﷺ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ وہ دست مبارک پر بیعت کر کے ایمان لائیں تو معًا انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، آنحضرت ﷺ نے پوچھا، عمرو! تم نے اپنا ہاتھ کیوں کھینچ لیا، عمرو بولے: میں کچھ شرط کرنا چاہتا ہوں۔ آنحضور ﷺ نے پوچھا: کیا شرط ہے؟ انہوں نے کہا: میں اس شرط پر ایمان لاتا ہوں کہ میں نے پہلے جو گناہ کئے ہیں ان کو معاف کر دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عمرو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام ان تمام گناہوں کو ڈھانپ لیتا ہے جو قبول اسلام سے پہلے کئے گئے ہوں اور ہجرت ان تمام گناہوں کو ڈھانپ لیتی ہے جو اس ہجرت سے پہلے کئے گئے ہوں او کما قال، ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "عمرو بن العاص اور ان کے بھائی ہشام بن العاص دونوں (مخلص و صادق) مؤمن ہیں، ایک حدیث میں فرمایا گیا: عمرو بن العاص، قریش میں سے ہیں ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عمرو بن العاص کو مخاطب کر کے فرمایا: انک الرشید (بلاشبہ تم ہدایت یافتہ ہو) اور یہ بھی آنحضرت ہی کا ارشاد ہے کہ عمرو بن العاص اوروں سے بہتر صدقہ لے کر آئے ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص نہایت ذکی اور ذہین اور عقلمند انسان تھے۔ تمام عرب میں ان کی دانائی اور ان کے تدبر کا لوہا مانا جاتا تھا، حضرت عمر فاروق ؓ جب کسی احمق مالدار کو دیکھتے تو کہتے: سبحان اللہ جس ذات نے اس شخص کو پیدا کیا ہے اسی نے عمرو بن العاص کو بھی پیدا کیا منقول ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں حضرت عمرو بن العاص ؓ پر خوف، بے تابی، اور بے قراری کا زبردست غلبہ ہو گیا تھا، خشیت الٰہی کا غیر معمولی اثر ان پر نمایاں رہتا تھا، ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک دن ان کے بیٹے عبداللہ بن عمرو بولے! ابا جان، آپ کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہے نگاہ رسالت میں آپ کو اعتبار و اعتماد کا بلند مقام حاصل تھا، جہادوں میں آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے پھر آپ پر آخر اتنی گھبراہٹ اور اتنا خوف کیوں طاری ہے؟ حضرت عمرو بن العاص نے (یہ سن کر) کہا: جان پدر! تم جانتے ہو میری پوری زندگی تین مختلف مرحلوں پر گزری ہے۔ پہلے میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا سخت معاند اور دشمن رہا۔ پھر اللہ نے مجھے ہدایت عطا فرمائی اور میں مسلمان ہو کر رسول اللہ ﷺ کے فیض سے بہرہ ور ہوتا رہا۔ اور پھر میری امارت و حکمرانی کا دور آیا کہ اسلامی حکومت کی طرف سے مختلف علاقوں میں عامل و حاکم کی حیثیت سے سرفراز رہا اور اس کے سبب دنیا سے جو کچھ حصہ مجھے ملنا تھا ملا، اب میں نہیں جانتا کہ ان تینوں مرحلوں میں کس مرحلہ کے مطابق میرے ساتھ سلوک ہونا ہے اور کس طرح کا انجام میرے سامنے آنے والا ہے (اسی فکر میں ہر وقت لرزاں و ترساں رہتا ہوں)۔

حضرت جابر ؓ کے والد کی فضیلت

(۵۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ لَقِيَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا جَابِرُ مَالِیْ اَرَاكَ مُنْكَسِرًا قُلْتُ اسْتُشْهِدَ اَبِیْ وَتَرَكَ عِيَالًا وَدَيْنًا قَالَ اَفَلَا اُبَشِّرُكَ بِمَا لَقِیَ اللّٰهُ بِهٖ اَبَاكَ قُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا كَلَّمَ اللّٰهُ اَحَدًا قَطُّ اِلَّا مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ وَاَحْيَا اَبَاكَ فَكَلَّمَهٗ كِفَاحًا قَالَ يَا عَبْدِیْ تَمَنَّ عَلَیَّ اُعْطِكَ قَالَ يَا رَبِّ تُحْيِيْنِیْ فَاُقْتَلُ فِيْكَ ثَانِيَةً قَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اِنَّهٗ قَدْ سَبَقَ مِنِّیْ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ فَنَزَلَتْ فَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا الاية۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابر ؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ سے میری ملاقات ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: جابر ؓ! کیا بات ہے کہ میں تم کو افسردہ و غمگین دیکھ رہا ہوں؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ: میرے والد (حضرت عبداللہ) کو غزوۂ احد میں شہید کر دیا گیا اور وہ (ایک بڑا) کنبہ اور قرضہ چھوڑ گئے ہیں، گویا میری پریشانی اور افسردگی کے کئی سبب پیدا ہو گئے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کیا میں اس معاملہ کی خبر دے کر تمہیں خوش نہ کر دوں جو اللہ نے تمہارے والد کے ساتھ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! (مجھ کو خوش خبری سے ضرور

نوازیئے) آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب بھی کسی سے کلام کیا ہے۔ حجاب کے پیچھے سے کیا ہے، مگر تمہارے والد کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا اور پھر ان سے رو در رو کلام فرمایا (یعنی اللہ تعالیٰ اور تمہارے والد کے درمیان نہ کوئی حجاب حائل تھا اور نہ کوئی دوسرا واسطہ اور فرمایا: اے میرے (خاص) بندے میرے فضل و کرم کے سہارے آرزو کر (یعنی جس چیز کی خواہش ہو مجھ سے مانگ) میں تجھ کو عطا کروں گا۔ (یہ سن کر) تمہارے والد گویا ہوئے، میرے پروردگار! (میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ) مجھ کو زندہ کرکے دنیا میں پھر بھیج دے تاکہ تیری راہ میں لڑتا ہوا ایک مرتبہ پھر مارا جاؤں (اور تیری رضا و خوشنودی مزید حاصل کرنے کا ایک اور وسیلہ مجھ کو مل جائے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اس بارہ میں یہ حقیقت ملحوظ رہنی چاہئے کہ میرا یہ حکم پہلے سے نافذ ہے کہ جو مر چکے ہیں دنیا میں لوٹ کر نہیں آئیں گے" اور پھر (انہی تمہارے والد اور دوسرے شہداء احد کے حق میں) یہ آیت نازل ہوئی: (جس کا ترجمہ ہے) اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں ان کو مردہ مت خیال کرو الخ۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اور تمہیں خوش نہ کردوں" آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ دنیا کی جو بھی پریشانی آتی ہے اور جو بھی غم پڑتا ہے وہ دیر سویر زائل ہو جاتا ہے اور آسانی کی راہ نکل ہی آتی ہے۔ تمہارے والد نے جو بڑا کنبہ چھوڑا ہے اللہ اس کے تکفل کا انتظام کرا دے گا، اور جو قرضہ وہ چھوڑ گئے ہیں اللہ کے فضل سے اس کی ادائیگی بھی ہو جائے گی۔ لہٰذا اس وقت جس دنیاوی غم و اندوہ کا تمہیں سامنا ہے اس کو صبر و شکر کے ساتھ انگیز کرنا چاہئے اور محض اس کی وجہ سے اپنے آپ کو غمگین و دل گیر نہ رکھنا چاہئے، بلکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کو شہادت کا مرتبہ عظمیٰ عطا فرمایا اور اس سعادت سے مشرف فرمایا جو مولیٰ کی رضا و قرب اور مولیٰ کے کرم کو ظاہر کرتی ہے۔ پس اس ارشاد گرامی میں ایک تو اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اولاد سیدھی راہ پر ہو تو باپ کی فضیلت و بزرگی اس میں بھی سرایت کرتی ہے، اور دوسرے اس طرف اشارہ ہے کہ باپ کو حاصل ہونے والی خوشی و سعادت پر اولاد کو بھی خوش ہونا چاہئے۔

"اللہ نے جب بھی کسی سے کلام کیا" یعنی تمہارے والد سے پہلے جس کسی سے بھی اللہ تعالیٰ نے کلام کیا تو رو در رو کلام نہیں کیا بلکہ پردہ کے پیچھے سے کیا۔ ان الفاظ میں گویا اسطرف اشارہ ہے کہ وہ (یعنی جابرؓ کے والد) بالخصوص ان تمام شہیدوں سے افضل ہیں جو ان سے پہلے شہید ہوئے کیونکہ ان میں سے جس کسی سے بھی اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ہوگا پردہ کے پیچھے سے کیا ہوگا۔ واضح ہو کر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ الآیۃ یہ تو اس کا تعلق صرف اس دنیا سے ہے نہ کہ آخرت سے "تمہارے والد کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا" یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شہیدوں کے بارے میں جب یہ فرمایا کہ بل احیاء عند ربھم (بلکہ وہ شہداء اپنے رب کے پاس زندہ ہیں) تو پھر حضرت جابرؓ کے شہید والد کے متعلق آنحضرت کا یہ فرمانا کہ "ان کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا" کیا معنی رکھتا ہے! اس کا جواب ایک شارح نے یوں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو سبز جانور کے قلب میں منتقل کیا اور پھر اس جانور کو اس روح کے ذریعہ حیات عطا کی جیسا کہ ہر شہید کے ساتھ ہوتا ہے، پس آنحضرت ﷺ نے ان کو اسی طرح کی حیات عطا کئے جانے کو "زندہ کیا" سے تعبیر فرمایا، اور ایک جواب یہ لکھا ہے کہ یہاں "زندہ کرنے" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو اتنی قوت عطا فرمائی جس سے ان کو رو در رو کلام میں دیدار الٰہی کا تحمل حاصل ہوا۔

"دنیا میں لوٹ کر نہیں آئیں گے" یعنی یہ تو اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے کہ جو مر چکے ہیں ان کو اس دنیا میں اس طرح دوبارہ زندگی نہیں ملے گی کہ پھر وہ مدت دراز تک جیتے رہیں اور اس مدت میں نیکیاں کرتے ہیں۔ اس وضاحت کی روشنی میں یہ ارشاد گرامی اس بات کے منافی نہیں ہوگا کہ بعض مردوں کا دوبارہ اسی دنیا میں جی اٹھنا ثابت ہے جیسا کہ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ اعجاز منقول ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے کچھ عرصہ کے لئے مردوں کو دوبارہ زندہ کر دیتے تھے۔ اور اس سے بھی زیادہ وضاحت یہ ہے کہ: یہ حق تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے کہ جو لوگ ایک مرتبہ مر چکے ہیں وہ درخواست یا آرزو کرکے اس دنیا میں دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے اس صورت میں شہید دجال والی روایت کے تحت بھی) اس ارشاد گرامی پر کوئی اشکال لازم نہیں آئے گا، نیز سید جمال الدینؒ نے یوں لکھا ہے کہ: انھم لا یرجعون (وہ

دنیا میں لوٹ کر نہیں آئیں گے) میں انھم کی ضمیر کا مرجع صرف شہداء میں اور "شہداء" سے بھی چاہے جنگ احد کے شہداء مراد لئے جائیں یا مطلق شہداء اور یہ خاص مرجع متعین کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ کی بنا پر اس ارشاد گرامی میں اشکال واقع نہ ہو۔

"پھر یہ آیت نازل ہوئی" اور پوری آیت یوں ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۔

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں ان کو مردہ مت خیال کرو، بلکہ وہ لوگ اپنے رب کے پاس (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں، ان کو رزق بھی ملتا ہے (اور) وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔"

حضرت جابرؓ

(۵۲) وَعَنْهُ قَالَ اسْتَغْفَرَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسًا وَعِشْرِيْنَ مَرَّةً۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے میرے لئے پچیس مرتبہ مغفرت کی دعا مانگی ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: ایک احتمال تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جابرؓ کے حق میں مغفرت کی دعا پچیس بار ایک ہی وقت میں مانگی، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ مختلف اوقات اور مختلف مواقع پر مجموعی طور سے پچیس بار مغفرت کی دعا مانگی۔ لیکن حضرت جابرؓ ہی کی ایک اور روایت سے پہلے احتمال کی تائید ہوتی ہے، اس روایت کے الفاظ ہیں استغفر لی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لیلة البعیر خمسا و عشرین (رسول کریم ﷺ نے جس رات کو میرا اونٹ خریدا میرے لئے پچیس بار مغفرت کی دعا مانگی)۔

حضرت جابر بن عبد اللہ مشہور صحابی ہیں انصار مدینہ میں سے ہیں اور سلمی ہیں، ان سے بہت زیادہ روایتیں نقل کی جاتی ہیں، غزوہ بدر میں شریک تھے اور اس کے بعد تقریبًا اٹھارہ غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے، شام و مصر کی مہمات میں بھی شامل تھے۔ ان سے روایت حدیث کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ اخیر عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے، ان کا انتقال مدینہ میں ۷۴ھ میں ہوا اس وقت ان کی عمر چورانوے سال تھی۔ ایک قول کے مطابق مدینہ میں وفات پانے والے آخری صحابی یہی جابر بن عبد اللہؓ ہیں۔

حضرت براء بن مالکؓ

(۵۳) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمْ مِنْ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِيْ طِمْرَيْنِ لَا يُؤْبَهُ لَهٗ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ مِنْهُمُ الْبَرَاءُ بْنُ مَالِكٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کتنے ہی لوگ ہیں جو (بظاہر تو) پراگندہ حال، خاک آلودہ بال اور دو پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہیں (اور اپنی اس ظاہری حالت کے سبب اس طرح حقیر سمجھے جاتے ہیں کہ) کوئی نہ ان کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ان کی طرف ملتفت ہوتا ہے لیکن (ان کے باطن کا یہ حال ہوتا ہے کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اس قسم میں سچا کرتا ہے۔ (یعنی اگر وہ قسم کھا کر کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کی لاج رکھتا ہے اور ویسا ہی کرتا ہے۔ یا یہ کہ اگر وہ اپنے کسی کام کے بارہ میں قسم کھا کر کہہ دیتے ہیں کہ ہم فلاں کام کر کے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کام کے ذرائع و اسباب مہیا فرما دیتا ہے اور ان کو اس

کام کے کرنے کی توفیق وطاقت عطا فرما دیتا ہے) اور ایسے ہی لوگوں میں سے ایک براء بن مالک بھی ہیں اس روایت کو ترمذی نے اور دلائل النبوۃ میں بیہقی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت براء بن مالکؓ، حضرت انس بن مالکؓ، کے حقیقی بھائی ہیں، فضلاء صحابہ میں سے ہیں عرب کے نامور دلیروں اور پہلوانوں میں شمار ہوتے ہیں احد اور اس کے بعد غزوات میں شریک ہوئے، اللہ نے اتنی شجاعت اور طاقت عطا فرمائی تھی کہ باقاعدہ مقابلہ کی صورت میں انہوں نے ایک سو دشمنوں کو تنہا موت کے گھاٹ اتارا، دوسروں کے ساتھ مل کر جن دشمنوں کو انہوں نے جہنم رسید کیا ان کی تعداد اس کے علاوہ ہے، جنگ یمامہ میں (بعہد خلافت صدیقؓ) انہوں نے بے پناہ شجاعت وبہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور ۲۰ھ میں شہید ہوئے۔

اہل بیت اور انصار

﴿۵۴﴾ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اِنَّ عَیْبَتِیَ الَّتِیْ اٰوِیْ اِلَیْھَا اَھْلُ بَیْتِیْ وَاِنَّ کَرْشِیَ الْاَنْصَارُ فَاعْفُوْا عَنْ مُسِیْئِھِمْ وَاقْبَلُوْا عَنْ مُحْسِنِھِمْ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جان لو، میرے خاص لوگ اور میرے محرم اسرار و امین، کہ جن کے درمیان میں ٹھکانا حاصل کرتا ہوں میرے اہل بیت ہیں اور میرے ولی ودوست انصار ہیں۔ پس تم ان (انصار) کے خطا کاروں کی خطاؤں سے چشم پوشی کرو اور ان کے نیکوکاروں کے عذر کو قبول کرو۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔"

تشریح: لفظ "عیبہ" کی تفصیلی وضاحت اول میں حضرت انسؓ کی روایت کے تحت ہو چکی ہے اس روایت میں یہ لفظ انصار کی تعریف میں نقل ہوا ہے۔ لیکن یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ ان کے علاوہ بھی کسی کی تعریف میں یہ لفظ منقول ہو خصوصاً اہل بیت کی تعریف میں کہ جو اس لفظ سے بہت ہی خاص مناسبت رکھتے ہیں۔

انصار کی فضیلت

﴿۵۵﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یُبْغِضُ الْاَنْصَارَ اَحَدٌ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ انصار سے بغض وعداوت نہیں رکھتا، اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

ابو طلحہؓ کی قوم کی فضیلت

﴿۵۶﴾ وَعَنْ اَنَسٍؓ عَنْ اَبِیْ طَلْحَۃَؓ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِقْرَأْ قَوْمَکَ السَّلَامَ فَاِنَّھُمْ مَا عَلِمْتُ اَعِفَّۃٌ صُبُرٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ (اپنے سوتیلے باپ) حضرت ابو طلحہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا: رسول کریم ﷺ نے مجھ کو فرمایا تھا کہ تم اپنی قوم کو میرا سلام پہنچا دو، کیونکہ جہاں تک مجھ کو علم ہے کہ وہ پاکباز اور صابر لوگ ہیں۔" (ترمذیؒ)

اہل بدر کی فضیلت

﴿۵۷﴾ وَعَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ عَبْدًا لِحَاطِبٍؓ جَاءَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَشْکُوْا حَاطِبًا اِلَیْہِ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَیَدْخُلَنَّ

لَيَدْخُلَنَّ حَاطِبٌ النَّارَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَبْتَ لَا يَدْخُلُهَا فَاِنَّهُ قَدْ شَهِدَ بَدْرًا وَالْحُدَيْبِيَّةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) حاطب بن ابی بلتعہؓ کا غلام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور آپ ﷺ سے حاطبؓ کی سخت شکایت کی اور بولا کہ: یا رسول اللہ! حاطب (چونکہ مجھ پر بڑی سختیاں کرتے ہیں اس لئے وہ) ضرور دوزخ میں جائیں گے، رسول اللہ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا: تو اپنی اس بات میں کہ (حاطبؓ ضرور دوزخ میں جائیں گے) جھوٹا ہے، حاطب دوزخ میں نہیں جائیں گے کیونکہ وہ بدر اور حدیبیہ میں شریک رہے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ جو لوگ جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں یا حدیبیہ میں آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر اللہ کی راہ میں جاں نثاری کی بیعت کرنے والوں میں شامل تھے ان کے بارہ میں یہ یقین ہے یا قوی امید ہے کہ وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ و مامون رہیں گے۔ اور حاطبؓ بھی چونکہ بدر و حدیبیہ میں شریک تھے اس لئے ان کے بارہ میں جزم و یقین کے ساتھ یہ کہنا کہ وہ دوزخ میں جائیں گے، کذب گوئی ہے، علاوہ ازیں حاطبؓ کا صاحب ایمان ہونا خود قرآن کی اس آیت یا ایھا الذین آمنو الا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء الآیۃ سے ثابت ہوتا ہے جس کے پہلے مخاطب حاطبؓ ہی ہیں اور جو ان کی ایک بڑی غلطی پر سرزنش کے نازل ہوئی تھی، لہٰذا کسی صاحب ایمان کو یقینی طور پر دوزخی کہنا صریحاً کذب گوئی اور لغوبات ہے۔

سلمان فارسیؓ اور اہل فارس

(۵۸) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ ذَكَرَ اللّٰهُ اِنْ تَوَلَّيْنَا اسْتُبْدِلُوْا بِنَا ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَنَا فَضَرَبَ عَلٰى فَخِذِ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّؓ ثُمَّ قَالَ هٰذَا وَقَوْمُهُ وَلَوْ كَانَ الدِّيْنُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَتَنَاوَلَهُ رِجَالٌ مِّنَ الْفُرْسِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے یہ آیت وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ تلاوت فرمائی تو بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں جن کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر ہم روگردانی کریں تو ان کو ہماری جگہ کھڑا کر دیا جائے اور وہ ہماری طرح نہ ہوں؟ (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے سلمان فارسیؓ کی ران پر ہاتھ مارا اور فرمایا: وہ لوگ، یہ سلمان اور اس کی قوم والے (یعنی اہل عجم اور اہل فارس) ہیں اگر دین ثریا (کی بلندی) پر بھی ہو تو ان (اہل فارس میں سے) کتنے لوگ اس کو وہاں سے بھی حاصل کرنے سے باز نہ رہتے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "فرس" سے یا تو مطلق اہل عجم یعنی غیر عرب مراد تھے یا وہ لوگ مراد تھے جن کی زبان فارسی تھی اور یا یہ کہ صرف وہ لوگ مراد تھے جن کا نسلی و وطنی تعلق فارس (ایران) سے تھا، اور زیادہ صحیح پہلا احتمال ہے کیونکہ اس کی تائید اگلی حدیث سے ہوتی ہے۔

اہل عجم پر اعتماد

(۵۹) وَعَنْهُ قَالَ ذُكِرَتِ الْاَعَاجِمُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنَا بِهِمْ اَوْبِبَعْضِهِمْ اَوْثَقُ مِنِّيْ بِكُمْ اَوْ بِبَعْضِكُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک موقع پر) رسول کریم ﷺ کے سامنے عجمی لوگوں کا ذکر ہوا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ: میں (دین کی مخالفت اور دیانتداری کے معاملہ میں) ان عجمی لوگوں یا ان میں سے بعض لوگوں پر تم (اہل عرب) سے یا تمہارے بعض لوگوں سے زیادہ اعتماد و بھروسہ رکھتا ہوں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: طیبیؒ کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کے مخاطب عرب کے ایک خاص قبیلہ کے لوگ تھے جن کو

آنحضرت ﷺ نے جہاد میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا تھا اور انہوں نے اس حکم کی تعمیل میں کچھ سستی و کاہلی دکھائی تھی۔ بہر حال اس حدیث میں اہل عجم کی تعریف اور ان کے تئیں آنحضرت ﷺ کی شفقت و عنایت اور توجہ التفات کا اظہار ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت کے نجباء و رقباء

(۶۰) عَنْ عَلِيٍّؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ سَبْعَةَ نُجَبَاءَ وَرُقَبَاءَ وَاُعْطِيْتُ اَنَا اَرْبَعَةَ عَشَرَ قُلْنَا مَنْ هُمْ قَالَ اَنَا وَابْنَايَ وَجَعْفَرٌ وَحَمْزَةُ وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَمُصْعَبُ بْنُ عُمَيْرٍ وَبِلَالٌ وَسَلْمَانُ وَعَمَّارٌ وَعَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ وَاَبُوْذَرٍّ وَالْمِقْدَادُ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کو سات نہایت مخصوص و برگزیدہ ترین لوگ اور اس کی ہر حالت میں نگہبانی و حفاظت کرنے والے عطا کئے جاتے تھے لیکن مجھ کو ایسے لوگ چودہ (یعنی دو چند) عطا کئے گئے ہیں (راوی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ہمارے سامنے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا تو) ہم نے ان سے پوچھا کہ وہ چودہ کون کون ہیں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا: ایک تو میں ہوں، اور میرے دونوں بیٹے (حسنؓ و حسینؓ) ہیں۔ جعفر بن ابی طالب ہیں، حمزہؓ بن عبد المطلب ہیں، ابوبکرؓ ہیں، عمرؓ ہیں، مصعبؓ بن عمیر ہیں، بلالؓ ہیں، سلمانؓ ہیں، عمارؓ ہیں، عبد اللہؓ ابن مسعود ہیں، ابوذرؓ ہیں، اور مقدادؓ ہیں۔" (ترمذی)

تشریح: حضرت حمزہؓ کے علاوہ باقی حضرات کے اجمالی احوال پیچھے بیان ہو چکے ہیں حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب آنحضرت ﷺ کے چچا ہیں، ان کی کنیت ابو عمارہ تھی۔ ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے آنحضرت ﷺ کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اور حضرت حمزہؓ کو بھی اس لئے آنحضرت ﷺ اور حمزہؓ دودھ شریک بھائی بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت حمزہؓ عمر میں آنحضرت ﷺ سے چار سال بڑے تھے، لیکن ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جب ثوبیہ نے دونوں کو دودھ پلایا ہے تو عمروں کا یہ تفاوت کیسے ہو سکتا ہے ہاں اگر یہ مانا جائے کہ ثوبیہ نے دونوں کو الگ الگ زمانوں میں دودھ پلایا ہے تو عمروں کا تفاوت ممکن ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے حضرت حمزہ دو سال بڑے تھے۔ سید نا حمزہؓ نہایت بہادر اور جری انسان تھے ان کا لقب اسد اللہ ہے۔ قدیم الاسلام ہیں ایک قول کے مطابق انہوں نے نبوت کے دوسرے سال اسلام قبول کیا تھا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت حمزہؓ ۶ نبوی میں اسلام قبول کیا جب کہ آنحضرت ﷺ دار ارقم میں قیام پذیر تھے ان کے مسلمان ہونے سے اسلام کو زبردست طاقت و شوکت حاصل ہوئی اور اللہ نے ان کے ذریعہ اپنے دین کو بہت سربلند کیا، جنگ بدر میں شریک تھے اور جنگ احد میں وحشی بن حرب کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

حضرت عمارؓ بن یاسرؓ

(۶۱) وَعَنْ خَالِدِبْنِ الْوَلِيْدِؓ قَالَ كَانَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ كَلَامٌ فَاَغْلَظْتُ لَهُ فِي الْقَوْلِ فَانْطَلَقَ عَمَّارٌ يَشْكُوْنِي اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ خَالِدٌ وَهُوَ يَشْكُوْهُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَجَعَلَ يُغْلِظُ لَهُ وَلَا يَزِيْدُهُ اِلَّا غِلْظَةً وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاكِتٌ لَا يَتَكَلَّمُ فَبَكٰى عَمَّارٌ وَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا تَرَاهُ فَرَفَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاْسَهُ وَقَالَ مَنْ عَادٰى عَمَّارًا عَادَاهُ اللّٰهُ وَمَنْ اَبْغَضَ عَمَّارًا اَبْغَضَهُ اللّٰهُ قَالَ خَالِدٌ فَخَرَجْتُ فَمَا كَانَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ رِضٰى عَمَّارٍ فَلَقِيْتُهُ بِمَا رَضِيَ فَرَضِيَ۔

"اور حضرت خالد بن ولیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک موقع پر کسی معاملہ میں) میرے اور عمار بن یاسرؓ کے درمیان گفتگو چل رہی تھی کہ میں نے ان

کے خلاف ایک سخت بات کہہ دی۔ چنانچہ عمار میری شکایت لے کے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچے، اور وہ نبی کریم ﷺ سے شکایت کر رہے تھے کہ ادھر سے خالد بھی آ گئے۔ راوی کا بیان ہے کہ (دربار رسالت میں اپنی شکایت سن کر) خالد (کو غصہ آ گیا اور وہ) عمار کو سخت سُست کہنے لگے اور ان کی سخت کلامی و درشت گوئی میں اضافہ ہوتا رہا، اس وقت نبی کریم ﷺ چپ چاپ بیٹھے سن رہے تھے، ایک حرف زبان سے نہ فرماتے تھے (یہ صورت حال دیکھ کر کہ خالد کی سخت گوئی بڑھتی جا رہی ہے اور آنحضرت ﷺ خاموش بیٹھے ہیں) عمار (مارے غصہ کے صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور بے اختیار) رونے لگے اور (بلکتے ہوئے) بولے: یا رسول اللہ کیا آپ (ﷺ) دیکھ نہیں رہے (کہ خالد کیا کر رہے ہیں اور آپ کے سامنے مجھ کو کیا کیا کہہ رہے ہیں؟) نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا: "جو شخص عمارؓ سے (زبان کی) دشمنی رکھے گا، اس کو اللہ دشمن رکھے گا اور جو شخص عمارؓ سے (دل کا) بغض رکھے گا اللہ اس سے بغض رکھے گا" حضرت خالدؓ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سنتے ہی ہوش ٹھکانے آ گئے اور میں یہ طے کر کے آپ کی مجلس سے) باہر آیا (کہ جس طرح بھی ہو گا عمارؓ کو خوش اور راضی کروں گا) اور اس وقت کوئی چیز میری نظر میں عمارؓ کے راضی و خوش ہو جانے سے زیادہ پسندیدہ اور بہتر نہیں تھی پھر یہ ہوا کہ میں نے عمارؓ کو راضی و خوش کرنے کے لئے ان کے ساتھ ایسا سلوک اور ایسا رویہ اختیار کیا کہ وہ مجھ سے راضی و خوش ہو گئے (یعنی میں نے ان سے معافی کی تلافی کی، ان کے گلے لگا، ان کے ساتھ تواضع و انکساری سے پیش آنے لگا، اور ان کو تحفے تحائف بھیجے اور ان سب باتوں نے ان کی ناراضگی اور ان کے غصہ کو زائل کر دیا اور وہ مجھ سے بالکل خوش ہو گئے)۔"

تشریح: "خالد بھی آ گئے" یہ الفاظ اس راوی کے ہیں جس نے حضرت خالدؓ سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور فجاء خالد سے پہلے قَالَ کا لفظ محذوف ہے، اس کی تائید آگے عبارت میں قَالَ خالد فخرجت کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ تاہم ایک شارح کے مطابق یہ احتمال بھی ہے کہ یہ الفاظ خود حضرت خالدؓ کے ہوں اور بیان حال میں یہاں انہوں نے اسلوب بدل دیا ہو۔

حضرت خالد "سیف اللہؓ"

(۶۲) وَعَنْ اَبِي عُبَيْدَةَؓ اَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ خَالِدٌ سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَنِعْمَ فَتَى الْعَشِيْرَةِ رَوَاهُمَا اَحْمَدُ۔

"اور حضرت ابو عبیدہؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: خالد، اللہ بزرگ و برتر کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے، وہ اپنے قبیلہ (بنی مخزوم) کا (جو قریش کی ایک شاخ ہے) بہترین جوان ہے، ان دونوں روایتوں کو احمدؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار" یعنی خالد ایک ایسی تلوار کی طرح ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے خلاف نیام سے باہر نکالا ہو، اور کفار کے سروں پر مسلّط کیا ہو یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خالد کو "صاحب شمشیر" بنایا ہے۔ بہرصورت ان الفاظ کے ذریعہ حضرت خالد کی شجاعت و بہادری کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں دشمنان دین سے خوب لڑے ہیں۔

علیؓ ابوذرؓ، مقدادؓ، سلمانؓ

(۶۳) وَعَنْ بُرَيْدَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَمَرَنِيْ بِحُبِّ اَرْبَعَةٍ وَاَخْبَرَنِيْ اَنَّهُ يُحِبُّهُمْ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَمِّهِمْ لَنَا قَالَ عَلِيٌّ مِنْهُمْ يَقُوْلُ ذٰلِكَ ثَلٰثًا وَاَبُوْذَرٍّ وَالْمِقْدَادُ وَسَلْمَانُ اَمَرَنِيْ بِحُبِّهِمْ وَاَخْبَرَنِيْ اَنَّهُ يُحِبُّهُمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھ کو چار آدمیوں سے (علی الخصوص) محبت رکھنے کا حکم

دیا اور یہ بتایا کہ وہ (اللہ سبحانہ، وتعالیٰ) بھی ان چاروں سے محبت رکھتا ہے (یہ ارشاد سن کر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمیں بھی ان چاروں کے نام بتادیجئے (تاکہ ہم بھی ان سے اس بناء پر محبت رکھیں کہ اللہ اور اللہ کا رسول ان سے محبت رکھتا ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا، ان میں سے ایک تو علیؓ ہیں، یہ الفاظ آپ نے تین مرتبہ فرمائے (تاکہ لوگ جان لیں کہ ان چاروں میں سب سے افضل علیؓ ہیں یا اس طرف اشارہ کرنے کے لئے یہ الفاظ تین بار فرمائے کہ جتنی محبت مجموعی طور پر باقی تینوں سے رکھی جائے اتنی تنہا علیؓ سے رکھنی چاہئے) ایک ابوذرؓ ہیں ایک مقدادؓ ہیں اور ایک سلمانؓ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں ان چاروں سے محبت رکھوں اور یہ بتایا کہ وہ بھی ان چاروں سے محبت رکھتا ہے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب حسن ہے۔"

ابوبکرؓ بزبان عمرؓ

(۶۴) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ عُمَرُ يَقُوْلُ اَبُوْبَكْرٍ سَيِّدُنَا وَاَعْتَقَ سَيِّدَنَا يَعْنِىْ بِلَالًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے، ابوبکرؓ ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار کو آزاد کیا ہے یعنی بلالؓ کو۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت عمر فاروقؓ کا حضرت بلالؓ کو "سردار" کہنا ان کی کسر نفسی تھا، ورنہ حقیقت میں حضرت عمرؓ ان سے افضل ہیں اور اس پر تمام اُمّت کا اجماع ہے۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ان الفاظ سے حضرت عمرؓ کی مراد اس طرف اشارہ کرنا تھا کہ بلالؓ بھی اہل اسلام کے سرداروں میں سے ایک سردار ہیں اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سیادت (سرداری) افضلیت کو مستلزم نہیں، اس لئے حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت بلالؓ حضرت عمرؓ سے افضل ہوں۔ اور ایک شارح نے یوں لکھا ہے کہ: ایک تو یہ کہ ضمیر متکلم مع الغیر، ضروری نہیں کہ ہر حال میں "سب" کو شامل ہو بلکہ "اکثر" کے اعتبار سے بھی اس کا مدعا و مرجع پورا ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ سیدنا میں "نا" کی ضمیر سے صحابہؓ کی طرف اشارہ ہے پس پہلے "سیدنا" میں تو "نا" کی ضمیر مع الغیر سب صحابہ کو شامل ہے اور دوسرے سیدنا میں "نا" کی ضمیر اکثر صحابہ کو شامل ہے نیز اس "سیدنا" میں جو اضافت ہے وہ تخصیص کے لئے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے گویا فرمایا، اور انہوں نے یعنی ہم سب کے سردار ابوبکرؓ نے اس شخص یعنی بلال کو آزاد کیا جو ہم میں سے اکثر صحابہ کا سردار ہے۔

حضرت بلالؓ

(۶۵) وَعَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِىْ حَازِمٍ اَنَّ بِلَالًا قَالَ لِاَبِىْ بَكْرٍ اِنْ كُنْتَ اِنَّمَا اشْتَرَيْتَنِىْ لِنَفْسِكَ فَاَمْسِكْنِىْ وَاِنْ كُنْتَ اِنَّمَا اشْتَرَيْتَنِىْ لِلّٰهِ فَدَعْنِىْ وَعَمَلَ اللّٰهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت قیس بن ابی حازمؒ (تابعی) سے روایت ہے کہ حضرت بلالؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا تھا کہ: اگر آپ نے اپنی ذاتی خوشی کے لئے مجھ کو خریدا تھا تو مجھ کو اپنے پاس رکھ لیجئے (اور جس خدمت پر چاہیں مامور کر دیجئے) لیکن اگر آپ نے محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے مجھ کو خریدا تھا تو پھر مجھ کو اللہ کے کام کے لئے آزاد چھوڑ دیجئے۔" (بخاری)

تشریح: حضرت ابوبکرؓ سے حضرت بلالؓ کی اس گفتگو کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت بلالؓ پہلے ایک غلام تھے اور دشمنان دین کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک بڑی رقم خرچ کر کے ان کو خریدا اور آزاد کر دیا، اس کے بعد وہ نبی کریم ﷺ کے خصوصی خادموں میں شامل ہوئے اور آنحضرت ﷺ نے ان کو اذان دینے کی خدمت پر مامور کر دیا اور وصال نبی تک حضرت بلالؓ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ جب آنحضرت ﷺ کا وصال ہوا تو عشق نبوی سے سرشار حضرت بلالؓ کے لئے مدینہ کا قیام ایک بڑی آزمائش بن

گیا۔ اس تصور ہی سے ان کا پیمانۂ صبر چھلک جاتا تھا کہ آنحضرت موجود نہ ہوں اور وہ مسجد نبوی کی طرف دیکھیں اور اس میں جا کر اذان دیں، چنانچہ انہوں نے ملک شام چلے جانے کا ارادہ کر لیا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت بلالؓ کو روکنا چاہا اور ان سے درخواست کی کہ آپ یہیں میرے پاس رہیں اور آنحضرت ﷺ کے زمانہ کی طرح مسجد نبوی میں اذان دیتے رہیں، اس وقت حضرت بلالؓ نے یہ بات کہی کہ اگر آپ نے مجھ کو اس لئے خریدا تھا کہ میں آپ کی خوشی اور آپ کی خواہش کی تکمیل کرتا رہوں تو میں آپ کی بات ماننے پر مجبور ہوں، جو بھی خدمت آپ میرے سپرد کریں گے اس کو انجام دینا اپنا فرض سمجھوں گا، لیکن اگر آپ نے مجھ کو اس مقصد کے لئے نہیں خریدا تھا بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کی خاطر خریدا اور آزاد کیا تو پھر میں چاہوں گا کہ آپ مجھ کو اپنا پابند نہ بنائیں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے کہ میں جہاں چاہوں چلا جاؤں اور مخلوق سے کوئی سروکار نہ رکھتے ہوئے اپنے خالق کے کاموں میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف رہوں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت بلالؓ نے یہ بھی کہا تھا کہ مجھ کو گوارا نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بغیر اس طرف نظر اٹھاؤں جہاں آنحضرت ﷺ رہا کرتے تھے آپ ﷺ کے بغیر اب یہاں رہنا میرے لئے ناممکن ہے۔

چہ مشکل ترا زیں بر عاشق زار　　　　که بے دلدار بیند جائے دلدار

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلال کو مدینہ میں روکنے کی کوشش نہیں کی اور وہ اس لشکر میں شامل ہو کر سوئے دمشق روانہ ہو گئے جو شام جا رہا تھا، پھر آخر عمر تک وہیں قیام پذیر رہے یہاں تک کہ ۱۸ھ یا ایک روایت کے مطابق ۲۰ھ میں واصل بحق ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ روایت کے بالکل بے بنیاد ہے جس میں حضرت بلالؓ کے شام جانے اور پھر وہاں خواب میں آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر مدینہ لوٹ آنے اور مسجد نبوی میں اذان دینے اور اتنے دنوں بعد ان کی آذان سن کر مدینہ اور اہل مدینہ کے لرز جانے کا ذکر ہے۔

حضرت ابو طلحہؓ

(۶۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ مَجْهُوْدٌ فَاَرْسَلَ اِلٰى بَعْضِ نِسَائِهٖ فَقَالَتْ وَالَّذِیْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا عِنْدِیْ اِلَّا مَاءٌ ثُمَّ اَرْسَلَ اِلٰى اُخْرٰى فَقَالَتْ مِثْلَ ذٰلِكَ وَقُلْنَ كُلُّهُنَّ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّضَيِّفُهٗ يَرْحَمُهُ اللّٰهُ فَقَامَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ يُقَالُ لَهٗ اَبُوْطَلْحَةَ فَقَالَ اَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَانْطَلَقَ بِهٖ اِلٰى رَحْلِهٖ فَقَالَ لِامْرَاَتِهٖ هَلْ عِنْدَكِ شَیْءٌ قَالَتْ لَا اِلَّا قُوْتُ صِبْيَانِیْ قَالَ فَعَلِّلِيْهِمْ بِشَیْءٍ وَنَوِّمِيْهِمْ فَاِذَا دَخَلَ ضَيْفُنَا فَاَرِيْهِ اِنَّا نَاْكُلُ فَاِذَا اَهْوٰى بِيَدِهٖ لِيَاْكُلَ فَقُوْمِیْ اِلَى السِّرَاجِ كَیْ تُصْلِحِيْهِ فَاَطْفِئِيْهِ فَفَعَلَتْ فَقَعَدُوْا وَاَكَلَ الضَّيْفُ وَبَاتَا طَاوِيَيْنِ فَلَمَّا اَصْبَحَ غَدَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ عَجِبَ اللّٰهُ اَوْ ضَحِكَ اللّٰهُ مِنْ فُلَانٍ وَفُلَانَةَ وَفِیْ رِوَايَةٍ مِثْلُهٗ وَلَمْ يُسَمِّ اَبَا طَلْحَةَ وَفِیْ اٰخِرِهَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور بولا کہ میں نہایت پریشان حال اور تکلیف و مشقت میں گرفتار ہوں (یعنی فقرو افلاس نے مجھ کو گھیر رکھا ہے اور بھوک سے پریشان حال ہو کر اس امید پر یہاں آیاں ہوں کہ آپ ﷺ کھانے کو کچھ عطا فرمائیں گے۔ (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے کسی آدمی کو اپنی بیوی کے پاس بھیجا (اور کہلایا کہ اگر گھر میں کچھ موجود ہو تو اس مصیبت زدہ شخص کے لئے بھیج دیں) انہوں نے جواب میں بھیجا کہ: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میرے پاس ایک پانی کے سوا (کھانے پینے کی) اور کوئی چیز موجود نہیں ہے پھر آپ ﷺ نے ایک دوسری بیوی کے پاس آدمی بھیجا اور انہوں نے بھی وہی جواب بھجوایا جو پہلی بیوی نے بھیجا تھا اور اس طرح (آپ ﷺ نے ایک ایک کر کے اپنی تمام

بیویوں کے پاس آدمی بھیجے اور) سب بیویوں کے ہاں ایسا ہی جواب آیا، تب رسول کریم ﷺ نے (حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ: جو شخص اس آدمی کو مہمان بنائے گا اس پر اللہ تعالیٰ اپنی (خاص) رحمت نازل فرمائے گا۔ (یہ سنتے ہی) انصار میں کے ایک شخص کہ جن کو..... ابو طلحہؓ کہا جاتا تھا، کھڑے ہوئے اور بولے کہ یا رسول اللہ! اس آدمی کو میں اپنا مہمان بناؤں گا، اور پھر ابو طلحہؓ اس شخص کو ساتھ لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ (گھر پہنچ کر) انہوں نے اپنی بیوی (ام سلمہؓ) سے دریافت کیا: تمہارے پاس کچھ کھانا ہے؟ ان کی بیوی بولیں: بس اتنا ہے کہ جو بچوں کی ضرورت کو ایک حد تک پورا کر دے۔ ابو طلحہؓ نے کہا بچوں کو کسی طرح بہلا پھسلا کر سلائے رکھنا۔ اور جب ہمارا مہمان کھانے کے لئے گھر میں آئے (اور دسترخوان پر بیٹھے) تو ایسا ظاہر کرنا کہ گویا ہم بھی اس کے ساتھ (اسی کھانے میں) کھا رہے ہیں اور جوں ہی ہمارا مہمان لقمہ اٹھانے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھائے تو تم یہ ظاہر کر کے کہ جیسے چراغ کی بتی کو ٹھیک کرنے اور اس کی روشنی بڑھانے کا ارادہ ہے، چراغ کی طرف جانا (اور آہستہ سے پھونک مار کر یا کسی اور طرح سے) چراغ گل کر دینا۔ (تاکہ اندھیرا ہو جائے، اور مہمان پر یہ ظاہر نہ ہو کہ ہم کھانا نہیں کھا رہے ہیں) چنانچہ ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا اور یہ ہوا (کہ دسترخوان پر) بیٹھے تو وہ تینوں (یعنی ابو طلحہؓ ان کی بیوی اور مہمان) لیکن کھانا صرف مہمان نے کھایا، اِن دونوں میاں بیوی نے بھوکے رات گزاری، پھر جب صبح ہوئی اور ابو طلحہؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ (کو چونکہ بذریعہ کشف یا بذریعہ وحی یہ سارا قصہ معلوم ہو چکا تھا اس لئے آپ ﷺ) نے فرمایا! فلاں مرد (یعنی ابو طلحہؓ) اور فلاں عورت (یعنی ابو طلحہؓ کی بیوی ام سلیم) کا یہ کام اللہ تعالیٰ کو بہت پسند لگا، یا یہ فرمایا کہ (ان دونوں کے) اس کام پر اللہ تعالیٰ کو ہنسی آگئی، (مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ اس عمل پر ان دونوں سے بہت خوش ہوا) ابو ہریرہؓ ہی کی ایک دوسری روایت میں (جو لفظاً و معناً اسی روایت کی طرح ہے) ابو طلحہؓ کے نام کا ذکر نہیں ہے (یعنی اس میں یُقال لہٗ ابو طلحہ کے الفاظ نہیں ہے) نیز اس روایت کے آخر میں یہ بھی ہے کہ: اسی واقعہ کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ یعنی اور وہ لوگ جو اپنے آپ پر دوسروں کو (یعنی اپنے مہمانوں کو یا کسی بھی حاجت مند کو) ترجیح دیتے ہیں اگر وہ خود حاجت مند اور بھوکے ہوں الخ۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "سب بیویوں کے ہاں سے ایسا ہی جواب آیا" بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ فتح خیبر اور غنائم و اموال کی آمد شروع ہو جانے سے پہلے کا ہے، جب کہ آنحضرت اور تمام ازواج مطہرات کا بہت ہی تنگی ترشی کے ساتھ گزارا ہوتا تھا اور زیادہ تر بے سرو سامانی کی حالت رہا کرتی تھی۔

"جو بچوں کی ضرورت کو ایک حد پورا کر دے" مطلب یہ کہ اس وقت گھر میں کھانے کی قسم سے جو کچھ ہے وہ بس اس قلیل مقدار کی صورت میں ہے جو چھوٹے بچوں کے لئے اس ضرورت سے اٹھا کر رکھ دیا گیا ہے کہ رات یا دن میں ان کو بار بار بھوک لگتی ہے اور وہ کسی وقت بھی کھانا مانگنے لگتے ہیں یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اگر وہ کھانا بچوں کو اسی وقت کے کھانے کے لئے ہوتا تو پھر مہمان کو نہیں کھلا سکتے تھے، کیونکہ بچوں کو بھوکا رکھ کر مہمان کو کھلانا جائز نہیں ہے۔

"کسی طرح بہلا پھسلا کر سلائے رکھنا" یعنی بچے اگر جاگ رہے ہوں تو ان کو بہلا پھسلا کر جلدی سے سلا دو، یا یہ کہ بچے اگر سو رہے ہوں تو کوشش کرنا کہ وہ جاگنے نہ پائیں تاکہ مہمان کو کھاتے دیکھ کر اس کھانے میں سے کچھ مانگنے نہ لگیں جیسا کہ چھوٹے بچوں کی عادت ہوتی ہے۔

"گویا ہم بھی اس کے ساتھ کھا رہے ہیں" حضرت ابو طلحہؓ نے یہ بات اس لئے کہی کہ کھانا اتنی مقدار میں تو تھا نہیں کہ مہمان کے ساتھ وہ دونوں بھی کھا سکتے، ادھر اگر وہ دونوں مہمان کے ساتھ کھانے پر بیٹھتے تو مہمان کو کھانے میں تکلف ہوتا، کیونکہ مہمان اگر دیکھتا ہے کہ صاحب خانہ اس کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہے، تو وہ کھاتے ہوئے جھجک محسوس کرتا اور اس کو خلجان ہوتا ہے کہ کہیں کھانے کی کمی کی وجہ سے تو صاحب خانہ میرے ساتھ کھانا نہیں کھا رہا ہے، واضح رہے کہ یہ واقعہ غالباً پردہ کا حکم نافذ ہونے سے پہلے کا ہے اسی لئے

حضرت ابو طلحہؓ کو اپنے اس مہمان کو گھر میں لانے اور بیوی کے سامنے کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوا۔

خالدؓ بن ولید

(۶۷) وَعَنْهُ قَالَ نَزَلْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْزِلاً فَجَعَلَ النَّاسُ يَمُرُّوْنَ فَيَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ هٰذَا يَا اَبَا هُرَيْرَةَ فَاَقُوْلُ فُلاَنٌ فَيَقُوْلُ نِعْمَ عَبْدُاللّٰهِ هٰذَا وَيَقُوْلُ مَنْ هٰذَا فَاَقُوْلُ فُلاَنٌ فَيَقُوْلُ بِئْسَ عَبْدُاللّٰهِ هٰذَا حَتّٰى مَرَّ خَالِدُبْنُ الْوَلِيْدِ فَقَالَ مَنْ هٰذَا فَقُلْتُ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ فَقَالَ نِعْمَ عَبْدُاللّٰهِ خَالِدُبْنُ الْوَلِيْدِ سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک سفر کے دوران) ہم لوگوں نے رسول کریم ﷺ کے ساتھ ایک مقام پر پڑاؤ کیا تو اس وقت (جب کہ رسول کریم ﷺ اپنے خیمہ کے اندر آرام فرمار ہے تھے اور میں خیمہ کے باہر تھا) لوگ (آنحضرت ﷺ کے خیمہ کے سامنے سے) ادھر ادھر آنے جانے لگے، چنانچہ رسول کریم ﷺ (جب خیمہ کے باہر کسی شخص کے گزرنے کی آہٹ پاتے تو) پوچھتے، ابوہریرہؓ! گزرنے والا کون شخص ہے، اور میں آپ ﷺ کو بتاتا کہ فلاں شخص ہے، پھر آپ ﷺ (اس شخص کا نام سن کر) فرماتے کہ یہ اللہ کا اچھا بندہ ہے۔ یا (کسی شخص کے بارہ میں) آپ ﷺ پوچھتے کہ یہ کون شخص ہے؟ اور میں آپ ﷺ کو بتاتا کہ فلاں شخص ہے تو آپ ﷺ (اس شخص کا نام سن کر) فرماتے: یہ اللہ کا برا بندہ ہے۔ (یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا) یہاں تک کہ جب خالد بن ولید گزرے اور آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے تو میں نے بتایا کہ خالد بن ولید ہیں۔ آپ ﷺ نے (ان کا نام سن کر) فرمایا: خالد بن ولید اللہ کا اچھا بندہ ہے، اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔" (ترمذی)

تشریح: "یہ اللہ کا برا بندہ ہے" یہ بات آپ ﷺ کسی ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہوں گے جس کا "منافق" ہونا آپ ﷺ کے علم میں ہوگا، ورنہ کسی مؤمن کے بارے میں تو اس طرح فرمانا آپ ﷺ کی شان سے بعید معلوم ہوتا ہے اور نہ کہیں یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے کسی بھی مؤمن کے بارے میں اس طرح کے الفاظ فرمائے ہوں خواہ کوئی برے ہی راستہ پر آپ ﷺ کو کیوں نہ نظر آیا ہو۔ علاوہ ازیں اس وقت کے اہل ایمان میں اس طرح کے برے لوگ تھے بھی نہیں کہ آپ ﷺ کسی کے حق میں ایسی بات فرماتے اور اگر کوئی ایسا رہا بھی ہوتا تو شاذ و نادر رہا ہوگا۔

انصار کے ساتھ شفقت و عنایت

(۶۸) وَعَنْ زَيْدِبْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَتِ الْاَنْصَارُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ لِكُلِّ نَبِيٍّ اَتْبَاعٌ وَاِنَّا قَدِ اتَّبَعْنَاكَ فَادْعُ اللّٰهَ اَنْ يَجْعَلَ اَتْبَاعَنَا مِنَّا فَدَعَا بِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور زید ابن ارقمؓ کہتے ہیں کہ (ایک موقع پر) انصار نے عرض کیا یا رسول اللہ! جس طرح ہر نبی کے کچھ تابعدار تھے اسی طرح آپ ﷺ کے (سچے و پکے) تابعدار ہم لوگ ہیں، آپ ﷺ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تابعداروں کو بھی ہم میں سے کر دے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے دعا کر دی۔" (بخاری)

تشریح: یعنی ہمارے اخلاف و موالی کا بھی ہمارے ہی زمرہ میں شمار ہو بایں طور کہ ان کو بھی "انصار" کہا جائے تاکہ آپ ﷺ نے ہمارے ساتھ احسان اور اچھے سلوک کی جو تلقین و وصیت عام مسلمانوں کو کی ہے اس میں ہمارے وہ اخلاف و موالی بھی شامل رہیں جیسے آپ ﷺ نے عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: اوصیکم بالانصار یعنی (اے مسلمانو) میں تم کو انصار کے تئیں اچھے سلوک اور احسان و اکرام کا برتاؤ کرنے کی تلقین و وصیت کرتا ہوں یا آپ نے فرمایا: ان (انصار) کے نیکوکاروں کی معذرت قبول کرو اور ان کے

بدکاروں سے چشم پوشی کرو۔ غرض کہ جو بھی مناقب و فضائل آپ ﷺ نے ہمارے حق میں ارشاد فرمائے ہیں اور اپنی جن خصوصی عنایتوں مہربانیوں اور عزت افزائیوں سے ہمیں نوازا ہے ان کے فضل و شرف اور ان کی برکات کے تحت ہمارے اخلاف و موالی بھی آجائیں یا انصار کا یہ مطلب تھا کہ آپ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تابعداروں یعنی ہمارے اخلاف و موالی اور ہماری اور ہماری اولاد کو ہمارا واقعی تابعدار اور سچا پیروکار بنادے بایں طور کہ جس نیک اور سیدھے راستہ پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں گامزن کیا ہے اسی پر وہ چلیں اور ہماری روش و سیرت اور ہمارے طور طریقوں کی پیروی کریں۔

انصار کی فضیلت

(۶۹) وَعَنْ قَتَادَةَ ؒ قَالَ مَانَعْلَمُ حَيًّا مِّنْ اَحْيَاءِ الْعَرَبِ اَكْثَرَ شَهِيْدًا اَعَزَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْاَنْصَارِ قَالَ وَقَالَ اَنَسٌ ؓ قُتِلَ مِنْهُمْ يَوْمَ اُحُدٍ سَبْعُوْنَ وَيَوْمَ بِئْرِ مَعُوْنَةَ سَبْعُوْنَ وَيَوْمَ الْيَمَامَةِ عَلٰى عَهْدِ اَبِيْ بَكْرٍ سَبْعُوْنَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت قتادہ ؒ (تابعی) سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: قبائل عرب میں سے کسی قبیلہ یا قوم کے بارہ میں ہمیں یہ علم نہیں کہ اس کے شہیدوں کی تعداد انصار کے شہیدوں سے زیادہ ہو اور قیامت کے دن انصار سے زیادہ باعزت مانے جائیں حضرت انس ؓ کا بیان ہے کہ احد کی جنگ میں ستر انصار شہید ہوئے، بیر معونہ میں ستر انصار (جو قراء تھے) شہید ہوئے اور یمامہ کی جنگ میں جو حضرت ابوبکر ؓ کے عہد خلافت میں (مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی) ستر انصار شہید ہوئے۔" (بخاری ؒ)

تشریح: "انصار سے زیادہ وہ باعزت مانے جائیں" مطلب یہ کہ جس قبیلہ کے شہیدوں کی تعداد زیادہ ہوگی قیامت کے دن اسی کو زیادہ عزت ملے گی لہٰذا ہمارے علم کے مطابق انصار ہی چونکہ ایک ایسا قبیلہ اور ایسی قوم ہے جس کے افراد نے اللہ کی راہ میں سب سے زیادہ اپنی جانیں قربان کی ہیں اور اس اعتبار سے، ان کے شہیدوں کی تعداد الگ الگ سب قبیلوں اور قوموں کے شہیدوں سے زیادہ ہے اس لئے قیامت کے دن وہ عزت کہ جو اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کے لئے اللہ کے ہاں مقرر ہے سب سے زیادہ انصار ہی کو ملے گا۔

"احد کی جنگ میں ستر انصار شہید ہوئے" یہاں مراد یہ ہے کہ جنگ احد میں جو ستر اہل ایمان شہید ہوئے تھے ان میں چند کو چھوڑ کر سب ہی انصار تھے، یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ حدیث و تاریخ اور سیر کی مستند روایتوں کے مطابق جنگ احد میں کل ستر مسلمان شہید ہوئے تھے جن میں سے چونسٹھ انصار میں سے تھے اور چھ مہاجرین میں سے۔

اصحاب بدر

(۷۰) وَعَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِيْ حَازِمٍ ؒ قَالَ كَانَ عَطَآءُ الْبَدْرِيِّيْنَ خَمْسَةَ الْاٰفٍ وَقَالَ عُمَرُ لَاُفَضِّلَنَّهُمْ عَلٰى مَنْ بَعْدَهُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت قیس بن ابی حازم ؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ جو لوگ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے ان میں سے ہر ہر شخص کا وظیفہ پانچ پانچ ہزار درہم تھا جو بیت المال سے ادا کیا جاتا تھا اور حضرت عمر ؓ نے فرمایا تھا: میں جنگ بدر میں شریک ہونے والوں کو (مرتبہ میں) دوسرے تمام لوگوں پر ترجیح دیتا ہوں۔" (بخاری ؒ)

تشریح: جنگ بدر میں شریک ہونے والے ہر صحابی کے لئے حضرت ابوبکر ؓ کے عہد خلافت میں بیت المال سے پانچ ہزار درہم سالانہ کا وظیفہ مقرر تھا جو مقدار میں دوسرے تمام لوگوں کے وظائف سے زیادہ تھا، حضرت عمر فاروق ؓ نے اپنے عہد خلافت میں وظائف کے جو منضبط درجات قائم کئے اس میں بھی چند مخصوص لوگوں (جیسے حضرت عباس ؓ اور ازواج مطہرات) کو چھوڑ کر تمام درجات کے وظائف کی تعداد اصحاب بدر کے وظائف کی تعداد سے کم ہی رکھی، اور اس طرح حضرت عمر فاروق ؓ نے بھی نہ صرف یہ کہ عملی طور پر اصحاب بدر ہی کا

درجہ ورتبہ دوسرے تمام لوگوں سے بلند و برتر رکھا بلکہ مذکورہ بالا الفاظ کے ذریعہ گویا وضاحت بھی کر دی کہ اگرچہ آنحضرت کی مخصوص نسبت کا لحاظ کر کے میں نے بعض وظائف اصحاب بدر کے وظائف سے زائد مقرر کئے ہیں لیکن جہاں تک درجاتی رتبہ کا تعلق ہے تو میرے نزدیک بھی اصحاب بدر ہی کا درجہ دوسرے تمام لوگوں کے درجات سے بلند ہے اور ان کے وظائف دوسرے تمام درجات کے وظائف سے زیادہ ہونے چاہئیں۔

تَسْمِيَةُ مَنْ سُمِّيَ مِنْ اَهْلِ بَدْرٍ فِي الْجَامِعِ لِلْبُخَارِيِّ

اہل بدر میں سے ان صحابہؓ کے ناموں کا ذکر جو جامع بخاری میں مذکور ہیں

واضح ہو کہ امام بخاریؒ نے جنگ بدر میں شریک ہونے والے صحابہؓ میں سے کچھ مخصوص صحابہؓ کے اسماء اپنی کتاب "بخاری شریف" کے ایک الگ باب میں بطریق اجمال مفصل ذکر کئے ہیں، یہ بدری صحابہؓ وہ ہیں جن کے بدری ہونے کا ذکر بخاری میں آیا ہے اور جن کی روایتیں اس کتاب (بخاری) میں نقل ہوئی ہے، اور ایک الگ باب میں ان مخصوص بدری صحابہؓ کے اسماء کے ذکر سے امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے تمام بدری صحابہؓ پر ان مخصوص صحابہؓ کی فضیلت سبقت اور برتری کا اظہار ہو اور ان کے حق میں الگ سے بطور خاص دعاء رحمت ورضوان کی جائے، یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے، جو علماء نے لکھی ہے کہ بخاریؒ شریف کے اس باب میں اصحاب بدر کے جو اسماء مذکور ہیں ان کے ذکر و بیان کے وقت جو بھی دعا مانگی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول فرماتا ہے۔ امام بخاریؒ اس باب میں سب سے پہلے سرکار دو عالم ﷺ کا اسم مبارک، پھر خلفاء اربعہ کے اسماء گرامی لائے ہیں اور پھر باقی صحابہؓ کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کئے گئے ہیں۔ امام بخاریؒ کے مقصد اور ان کی اتباع کی برکت حاصل کرنے کے لئے مشکوۃ المصابیح کے مؤلف نے بھی ان اسماء مبارک کو جوں کا توں یہاں نقل کیا ہے۔

اور ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے اس باب میں ان اصحابؓ بدر کے ناموں کا ذکر ہے جن کے حقیقۃً یا حکماً بدری ہونے کا ذکر صحیح بخاریؒ میں آیا ہے اور یہ (حقیقۃً یا حکماً کی قید) اس لئے ہے تاکہ اس زمرہ میں حضرت عثمان غنیؓ کا نام شامل کرنا درست مانا جائے (جو آنحضرت ﷺ کے حکم سے حقیقۃً تو جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے لیکن حکماً ان کو بھی بدری مانا جاتا ہے پس اس باب میں ان بدری صحابہؓ کے نام نہیں ہیں جو نہ تو بخاریؒ نے اپنے اس باب میں بیان کئے ہیں اور نہ سرے سے ان کا ذکر بخاری میں آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام بخاریؒ نے اصحابؓ بدر کی فہرست پر مشتمل اپنے اس باب میں صرف ان بدری صحابہؓ کے نام ذکر کئے ہیں جن کے متعلق صحیح بخاریؒ شریف میں صراحت کے ساتھ ذکر ہوا ہے کہ انہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے خواہ خود ان صحابہؓ نے اپنے بارہ میں صراحۃً ایسا بیان کیا ہو یا دوسروں نے جنگ بدر میں ان کے شریک ہونے کو صراحت کے ساتھ روایت کیا ہو۔ اسی طرح ان بدری صحابہؓ نے اپنے بارہ میں صراحۃً ایسا بیان کیا ہو یا دوسروں نے جنگ بدر میں ان کے شریک ہونے کو صراحت کے ساتھ روایت کیا ہو۔ اس طرح ان بدری صحابہؓ کے نام اس باب میں ذکر نہیں ہوئے ہیں جن کا ذکر گو صحیح بخاریؒ شریف میں آیا ہے، مگر اس صراحت کے ساتھ نہیں آیا ہے کہ وہ جنگ بدر میں شریک تھے۔ اس وضاحت کی روشنی میں اس بات پر حیرت و اشکال کا موقع نہیں رہ جاتا کہ مخصوص بدری صحابہؓ کی فہرست پر مشتمل اس باب میں ایک جلیل القدر بدری صحابی حضرت عبیدۃ الجراحؓ کا اسم گرامی ذکر نہیں ہوا ہے۔ حضرت عبیدہؓ بلاشبہ جنگ بدر میں شریک تھے اور اس پر تمام ہی محدثین اور اصحاب سیر کا اتفاق ہے، علاوہ ازیں بخاریؒ شریف میں متعدد مواقع پر ان کا ذکر بھی آیا ہے مگر بخاریؒ کی کسی روایت میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوا ہے کہ وہ جنگ بدر میں شریک تھے۔

مخصوص اہل بدر کے اسماء گرامی

① اَلنَّبِيُّ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْهَاشِمِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُثْمَانَ اَبُوْبَكْرِنِ الصِّدِّيْقُ الْقُرَشِيُّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ الْعَدَوِيُّ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ الْقُرَشِيُّ خَلَّفَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اِبْنَتِهٖ رُقَيَّةَ وَضَرَبَ لَهٗ بِسَهْمِهٖ عَلِيُّ ابْنُ اَبِيْ طَالِبِ الْهَاشِمِيُّ اِيَاسُ بْنُ بُكَيْرٍ بِلَالُ بْنُ رَبَاحٍ مَوْلٰى اَبِيْ بَكْرِنِ الصِّدِّيْقِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ الْهَاشِمِيُّ حَاطِبُ بْنُ اَبِيْ بَلْتَعَةَ حَلِيْفٌ لِقُرَيْشٍ اَبُوْحُذَيْفَةَ بْنُ عُتْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ الْقُرَشِيُّ حَارِثَةُ ابْنُ رُبَيِّعِنِ الْاَنْصَارِيُّ قُتِلَ يَوْمَ بَدْرٍ وَهُوَ حَارِثَةُ ابْنُ سُرَاقَةَ كَانَ فِي النَّظَّارَةِ خُبَيْبُ بْنُ عَدِيِّ الْاَنْصَارِيُّ خُنَيْسُ ابْنُ حُذَافَةَ السَّهْمِيُّ رِفَاعَةُ ابْنُ رَافِعِ الْاَنْصَارِيُّ رِفَاعَةُ ابْنُ عَبْدِ الْمُنْذِرِ اَبُوْلُبَابَةَ الْاَنْصَارِيُّ الزُّبَيْرُ بْنُ الْعَوَّامِ الْقُرَشِيُّ زَيْدُ بْنُ سَهْلٍ اَبُوْطَلْحَةَ الْاَنْصَارِيُّ اَبُوْزَيْدِنِ الْاَنْصَارِيُّ سَعْدُ بْنُ مَالِكِنِ الزُّهْرِيُّ سَعْدُ بْنُ خَوْلَةَ الْقُرَشِيُّ سَعِيْدُ بْنُ زَيْدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ نُفَيْلِنِ الْقُرَشِيُّ سَهْلُ بْنُ حُنَيْفِنِ الْاَنْصَارِيُّ ظُهَيْرُ بْنُ رَافِعِنِ الْاَنْصَارِيُّ وَاَخُوْهُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدِنِ الْهُذَلِيُّ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفِنِ الزُّهْرِيُّ عُبَيْدَةُ ابْنُ الْحَارِثِ الْقُرَشِيُّ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ الْاَنْصَارِيُّ عَمْرُو بْنُ عَوْفٍ حَلِيْفُ بَنِيْ عَامِرِ بْنِ لُؤَيٍّ عُقْبَةُ بْنُ عَمْرِونِ الْاَنْصَارِيُّ عَامِرُ بْنُ رَبِيْعَةَ الْعَنَزِيُّ عَاصِمُ بْنُ ثَابِتِنِ الْاَنْصَارِيُّ عُوَيْمُ بْنُ سَاعِدَةَ الْاَنْصَارِيُّ عِتْبَانُ بْنُ مَالِكِنِ الْاَنْصَارِيُّ قُدَامَةُ بْنُ مَظْعُوْنٍ قَتَادَةُ بْنُ النُّعْمَانِ الْاَنْصَارِيُّ مُعَاذُ ابْنُ عَمْرِو بْنِ الْجَمُوْحِ مُعَوِّذُ بْنُ عَفْرَاءَ وَاَخُوْهُ مَالِكُ بْنُ رَبِيْعَةَ اَبُوْاُسَيْدِ الْاَنْصَارِيُّ مِسْطَحُ بْنُ اُثَاثَةَ بْنِ عَبَّادِ بْنِ الْمُطَّلِبِ بْنِ عَبْدِ مَنَافٍ مُرَارَةُ بْنُ رَبِيْعِنِ الْاَنْصَارِيُّ مَعْنُ بْنُ عَدِيِّنِ الْاَنْصَارِيُّ مِقْدَادُ بْنُ عَمْرِونِ الْكِنْدِيُّ حَلِيْفُ بَنِيْ زُهْرَةَ هِلَالُ ابْنُ اُمَيَّةَ الْاَنْصَارِيُّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔

"نبی کریم محمد بن عبداللہ ہاشمی ﷺ ، عبداللہ بن عثمان جو ابوبکر صدیق ؓ کی کنیت سے مشہور ہیں اور قریشی ہیں، عمر بن الخطاب عدوی، عثمان بن عفان قریشی جن کو نبی کریم ﷺ نے اپنی بیمار بیٹی رقیہ ؓ کی تیمارداری کے لئے مدینہ میں چھوڑ دیا تھا اور پھر جنگ بدر کے مال غنیمت میں ان کا حصہ لگایا تھا، علی ابن ابی طالب ہاشمی، ایاس بن بکیر، بلال بن رباح جو ابوبکر صدیق کے آزاد کردہ غلام ہیں، حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی، حاطب بن ابی بلتعہ، قریش کے حلیف، ابوحذیفہ ابن عقبہ بن ربیع قریشی، حارثہ بن ربیع انصاری جو جنگ بدر میں شہید ہوئے اور اس کا اصل نام حارثہ بن سراقہ ہے، نیز یہ صاحب جنگ میں شریک نہیں تھے بلکہ دشمنوں پر نظر رکھنے اور ان کو خبر دینے پر مامور تھے، خبیب بن عدی انصاری، خنیس بن خدافہ سہمی، رفاعہ بن رافع انصاری، رفاعہ بن عبدالمنذر، ابولبابہ انصاری، زبیر بن عوام قریشی، زید بن سہل، ابوطلحہ انصاری، ابوزید انصاری، سعد بن مالک زہری، سعد بن خولہ قریشی، سعید بن عمرو بن نفیل قریشی، سہل بن حنیف انصاری، ظہیر بن رافع انصاری، ظہیر بن رافع کے بھائی، عبداللہ بن مسعود ہذلی، عبدالرحمٰن بن عوف زہری، عبیدہ بن حارث قریشی، عبادہ بن صامت انصاری، عمرو بن عوف، بنو عامر لوی کے حلیف، عقبہ بن عمرو انصاری، عامر بن ربیعہ عنزی، عاصم بن ثابت انصاری، عویم بن ساعدہ انصاری، عتبان ابن مالک انصاری، قدامہ بن مظعون، قتادہ بن نعمان انصاری، معاذ بن عمرو بن الجموع، معوذ بن عفراء، معوذ بن عفراء کے بھائی مالک بن ربیعہ ابواسید انصاری، مسطح بن اثاثہ بن عباد بن مطلب بن عبدمناف، مرارہ بن ربیع انصاری، معن بن عدی انصاری، مقداد بن عمرو کندی، جو بنو زہرہ کے حلیف، حلال بن امیہ انصاری، اللہ ان سب سے راضی اور خوش ہوا۔"

تشریح: ان مبارک ناموں کے ذکر کی ابتداء آنحضرت ﷺ کے اسم پاک سے یا تو خیر و برکت حاصل کرنے کے لئے کی گئی ہے یا آپ ﷺ کا نام ذکر کرنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس مخصوص فہرست میں آپ ﷺ کا اسم مبارک نہ پا کر کوئی یہ خیال نہ کر بیٹھے کہ آنحضرت ﷺ جنگ بدر میں بنفس نفیس شریک نہیں تھے۔ آنحضرت ﷺ کے بعد خلفاء اربعہ کے اسماء ہیں اور پھر باقی حضرات کے نام

حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کئے گئے ہیں۔ اس باب میں مذکورہ بدری حضرات کے سوانحی خاکہ بطریق اختصار و اجمال پیش کئے جاتے ہیں۔

النبی محمد بن عبداللہ الہاشمی ﷺ: آنحضرت ﷺ کی ولادت پاک مکہ میں واقعہ فیل کے سال ہوئی اور عمر مبارک کو جب چالیسواں سال لگا تو بعثت ہوئی، یعنی اللہ تعالیٰ نے مرتبۂ نبوت ورسالت سے سرفراز کیا۔ آپ ﷺ کی نبوت کا زمانہ ۲۳ سال اور کل عمر مبارک ۶۳ سال کی ہوئی۔ آپ ﷺ تمام رسولوں کے سردار اور خاتم النبیین ﷺ ہیں وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ واحزابہ اجمعین۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ: اسلامی نام "عبداللہ" ہے باپ کا نام عثمان تھا۔ "ابوبکر" کنیت ہے اور "صدیق" لقب ہے۔ قریشی ہیں اور تیم بن مرہ کے سلسلہ سے ہیں، مرہ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے نسب میں مل جاتے ہیں، زمانہ جاہلیت میں ان کا نام "عبدرب الکعبہ" تھا جن کو بدل کر آنحضرت ﷺ نے "عبداللہ نام رکھا تھا اور ایک نام عتیق" بھی عطا فرمایا تھا، اسی طرح ان کی کنیت "ابوبکر" بھی آنحضرت ﷺ ہی نے رکھی تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ "عتیق" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قدیمی نام ہے اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر چونکہ بہت حسین وخوب رو اور نہایت شریف النسل تھے اس لئے ان کو عتیق کہا جاتا تھا۔ کیونکہ "عتیق" کے ایک معنی کرم وجمال اور نجابت کے بھی آتے ہیں، اور روایتوں میں آتا ہے کہ ان کی ماں کے ہاں بچہ جیتا نہیں تھا، اور جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو ان کی ماں ان کو لے کر کعبہ اقدس کے سامنے پہنچیں اور دعا کی کہ خدایا! اس بچہ کو موت سے آزاد رکھ اور مجھ کو مرحمت فرما تمام اُمت محمدی کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا لقب "صدیق ہے" کیونکہ انہوں نے بے خوف ہو کر آنحضرت ﷺ کی بلا تامل تصدیق فرمائی اور ہر حالت میں صدق کو اپنے لئے لازم رکھا، معراج کے متعلق بھی انہوں نے کفار کے مقابلہ میں ثابت قدمی دکھائی اور آنحضرت ﷺ کے قول کی فوراً تصدیق فرمائی، ان کے والد عثمان رضی اللہ عنہ اپنی کنیت "ابوقحافہ" کے ساتھ مشہور ہیں، ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا اور شروع ۱۴ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے چھ ماہ اور چند روز کے بعد ۹۷ سال کی عمر میں فوت ہوئے آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد ربیع الاول ۱۱ھ میں تمام اُمت نے بالاتفاق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ اول مقرر کیا اور ۲۲ اور ۲۳ جمادی الثانی ۱۳ھ کی درمیانی شب میں انہوں نے بعمر ۶۳ سال داعی اجل کو لبیک کہا، اس طرح دو سال اور تین ماہ سے کچھ اوپر ان کی خلافت رہی۔ حضرت ابوبکر صدیق متوسط القامت، خوش رو، آئینہ جمال، نحیف البدن، اور ہلکے رخساروں والے تھے، ان کے رخساروں پر نیل گوں رگیں نمایاں تھیں۔ رضی اللہ عنہ۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ عدی بن کعب کی اولاد سے ہیں اور قریشی ہیں "ابوحفصہ" کنیت ہے، پانچویں پشت پر ان کا اور آنحضرت ﷺ کا سلسلہ نسب ایک ہو جاتا ہے، زمانہ اسلام سے پہلے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت اہم عمائدین قریش میں ہوتا تھا، اور اس زمانہ میں اہل مکہ کی طرف سے سفارت ونمائندگی کی ذمہ داری انہی کے سپرد تھی، یعنی جب بھی کسی موقع پر اہل مکہ اور قریش دوسرے قبائل کے سرداروں یا دوسری جگہ کے چودھریوں کے پاس کوئی اہم پیغام یا مشن بھیجتے تو اس کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا انتخاب کیا جاتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت گورے چٹے تھے، چہرہ نہایت سفید وچمکدار آنکھیں سرخ اور قد اتنا بلند اور پر شکوہ تھا کہ جب لوگوں کے درمیان کھڑے ہوتے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اونٹ پر سوار ہیں اور دوسرے لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہیں، وہب بن منبہ کی روایت ہے کہ توریت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف ان الفاظ میں ہوئی ہے قرن حدید شدید امین یعنی وہ پہاڑ کی چوٹی کی طرح بلند پر شکوہ ہے، تیز ہے، سخت ہے اور امانت دار ہے، اسلام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لقب "فاروق" ہے کیونکہ ان کی ذات حق وباطل اور کفر واسلام کے درمیان فرق کر دینے والی تھی، اللہ نے ان کے ایمان کے ذریعہ اپنے دین اسلام کو زبردست عزت وشوکت عطا فرمائی ان کی بے پناہ شخصیت شجاعت وبہادری کا معیار تھی، ان کی ہیبت اتنی زبردست تھی کہ ان کی بڑی سے بڑی مخالف طاقت بھی ان سے لرزاں رہتی تھی، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی آنحضرت ﷺ کے حکم پر راہ ہجرت اختیار کی تھی۔ منقول ہے کہ جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے ارادہ سے مکہ کو

چھوڑنا چاہا تو تلوار گلے میں ڈالی، کمان کا چلہ چڑھایا اور تیر ہاتھ میں لئے ہوئے خانہ کعبہ میں آئے جہاں قریش کے تمام سردار اور کفار مکہ عمائدین پہلے سے موجود تھے، فاروق اعظمؓ نے ان سب کے سامنے کعبہ اقدس کا طواف کیا دو رکعت نماز پڑھی اور پھر قریش و کفار مکہ کے سرداروں کی ایک ٹولی کے پاس الگ الگ آئے اور ان کو مخاطب کر کے بولے، تمہارے چہروں پر پھٹکار برسے، تم میں سے جو شخص یہ پسند کرتا ہو کہ اس کی ماں زندگی بھر اس کو روتی رہے اس کا بیٹا یتیم ہو جائے اور اس کی بیوی اپنا سہاگ گنوا بیٹھے تو وہ میرے تعاقب میں نکلے اور اس وادی یعنی مکہ شہر سے باہر مجھ سے ملے لیکن ان میں سے کسی کو فاروق اعظمؓ کے تعاقب کی ہمت نہیں ہوئی۔

حضرت عمر فاروقؓ اسلام کے دوسرے خلیفہ ارشد ہیں، ان کی خلافت کی مدت ساڑھے دس سال ہے، اور مشہور قول کے مطابق ان کی عمر تریسٹھ سال کی ہوئی، رضی اللہ عنہ۔

عثمان غنیؓ: حضرت عثمانؓ بن عفان قریشی ہیں، ان کی ولادت واقعہ فیل کے چھٹے سال ہوئی اور انہوں نے اس وقت اسلام قبول کر لیا تھا جب آنحضرت ﷺ دار ارقم میں قیام پذیر نہیں ہوئے تھے، ان سے پہلے حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ اور حضرت زید ابن حارثہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے، انہوں نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کی دعوت و ترغیب پر اسلام قبول کیا تھا اور منقول ہے کہ جب انہوں نے اسلام قبول کیا اور ان کے چچا حکم بن العاص بن امیہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے ان کو باندھ کر قید میں ڈال دیا اور بولا کہ تو نے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر نیا دین اختیار کر لیا ہے خدا کی قسم تجھے اس وقت تک اس قید سے رہا نہیں کروں گا جب تک کہ تو اس نئے دین کو چھوڑ نہیں دیتا، حضرت عثمانؓ نے جواب دیا تو پھر چچا جان آپ بھی سن لیجئے کہ میں اس دین کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا جو آپ کے جی میں آئے کیجئے، حکم بن ابو العاص نے جب حضرت عثمانؓ کی اس سختی اور مضبوطی کو دیکھا تو ان کو رہا کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ حضرت عثمانؓ کے نکاح میں تھیں، جنگ بدر کے دنوں میں وہ سخت بیمار تھیں، جب آنحضرت ﷺ بدر کو روانہ ہونے لگے تو حضرت عثمانؓ کو حکم دیا کہ تم ہمارے ساتھ مت چلو، مدینہ میں رہ کر رقیہؓ کی تیمارداری کرو اور اس کی دیکھ بھال رکھو۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے، لیکن چونکہ آنحضرت ﷺ کے حکم پر ان کو مدینہ میں رہ جانا پڑا تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے جنگ بدر میں حاصل ہونے والے مال غنیمت میں ان کا حصہ بھی لگایا اور اس اعتبار سے ان کو اصحاب بدر میں شمار کیا۔ اسی بیماری میں حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: اگر میرے پاس تیسری بیٹی ہوتی تو میں اس کو بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دے دیتا، حضرت عثمانؓ کے علاوہ اور کوئی ایسا نہیں گزرا جس کے نکاح میں کسی پیغمبر کی دو بیٹیاں آئی ہوں اور اس اعتبار سے "ذوالنورین" حضرت عثمانؓ کا لقب قرار پایا۔

حضرت عثمانؓ میانہ قد، خوش رو، بزرگ ریش اور سرخ سفید رنگت کے تھے۔ ان کے منہ پر چیچک کے نشان تھے ان کا سراپا نہایت دلکش، جاذب نظر اور پر جمال تھا، منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بیٹی ام کلثومؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: میں نے اس شخص کے ساتھ تمہارا نکاح کیا جو تمہارے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور تمہارے باپ محمد ﷺ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ حضرت عثمانؓ شرم و حیا کے مثالی پیکر تھے، روایتوں میں آتا ہے کہ گھر کے اندر دروازہ بند کر کے غسل کرتے تھے کیا مجال جو کوئی پیٹ اور پیٹھ بھی عریاں دیکھ لے، یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ حیا کے مارے اپنی پیٹھ سیدھی نہیں کر سکتے تھے۔

عثمان غنیؓ اسلام کے تیسرے خلیفہ ارشد ہیں، ۳۵ھ میں ایام تشریق کے دوران شہید ہوئے اور ان کی خلافت تیرہ سال رہی، عمر مبارک ۸۲ سال کی ہوئی، بعض حضرات نے ۸۳ سال اور بعض نے ۸۶ سال کی عمر لکھی ہے۔ رضی اللہ عنہ۔

علی کرم اللہ وجہہ: حضرت علیؓ بن ابی طالب آنحضرت ﷺ کے چچازاد ہیں، اور نہ صرف اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ کے بھائی ہیں، بلکہ آنحضرت ﷺ کا ان کے ساتھ بھائی چارہ بھی ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی لاڈلی فاطمہ زہراؓ کے خاوند ہیں، حسنؓ اور حسینؓ کے باپ ہیں اور پہلے شخص ہیں جو باپ کی طرف سے بھی ہاشمی ہیں اور ماں کی طرف سے بھی، حضرت علیؓ کو قدیم الاسلام ہونے کا بھی شرف

حاصل ہے اور ایک بڑی جماعت کے بقول صحابہؓ میں سب سے پہلے جس نے اسلام قبول کیا وہ حضرت علیؓ ہیں علماء نے لکھا ہے کہ پیر (دوشنبہ) کے دن آنحضرت ﷺ منصب نبوت سے سرفراز ہوئے اور اگلے ہی دن یعنی منگل کو حضرت علیؓ نے اسلام قبول کرلیا اس وقت ان کی عمر تین سال تھی اور بعض روایتوں کے مطابق سات سال کی تھی۔ اسلام میں حضرت علیؓ کے جو بہت سارے لقب ہیں ان میں سے ہیں، امین شریف، ہادی، مہدی یعسوب المسلمین، ابوالریحانین، اور ابوتراب۔ حضرت علیؓ میانہ قد تھے، رنگ گندم گوں مائل بسرخی تھا، کشادہ دہن چہرہ ایسا روشن و تاباں جیسے چودھویں کا چاند آنکھیں بڑی بڑی اور نہایت سیاہ ڈاڑھی بہت زیادہ گھنی، پیٹ نکلا ہوا جسم بھاری بھرکم، یہ ہے سراپا حضرت علیؓ کا سیدنا علیؓ علم و معرفت اور عقل و دانائی میں اپنی صف کے یکتا، زہد و تقوی کے پیکر، سخی النفس، قوی دل اور نہایت بہادر و شجاع تھے، "منصور" بھی تھے یعنی اللہ تعالیٰ کی مدد ان کو حاصل ہوتی تھی اور ہر مہم میں فتح یاب ہوتے تھے ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ غزوۂ بدر کے دن علیؓ نے رسول خدا ﷺ کا نیزہ لیا تھا، اور ایک روایت میں آیا ہے کہ علیؓ نے غزوۂ بدر میں اور دوسرے غزوات میں بھی آنحضرت ﷺ کا نیزہ لیا تھا۔

سیدنا علیؓ اسلام کے چوتھے خلیفہ ارشد ہیں، ان کی خلافت کا زمانہ پانچ سال رہا اور ۴۱ھ میں سترہویں رمضان کو شب جمعہ میں بوقت سحر شہید ہوئے، صحیح و مختار قول کے مطابق ان کی عمر ۶۳ سال کی ہوئی۔ رضی اللہ عنہ۔

ایاس بن بکیرؓ: ان کا نام "ایاس" ہے اور بکیر کے بیٹے ہیں، بعض نسخوں میں بکیر (بکر کی تصغیر) کا لفظ لام کے ساتھ، البکیر بھی مذکور ہوا ہے، اور بعض حضرات نے بخاریؒ کی روایت کے حوالہ سے اس لفظ کو بکیر بھی نقل کیا ہے، بہرحال ایاسؓ کا شمار مہاجرین اولین میں ہوتا ہے، غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے اور پھر بعد کے دوسرے جہادوں میں بھی شریک ہوئے، انہوں نے اور ان کے بھائی عامر بن بکیرؓ نے مکہ میں اس زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا جب آنحضرت ﷺ دار ارقم میں قیام پذیر تھے۔ ان کی وفات ۳۴ھ میں ہوئی۔ رضی اللہ عنہ۔

بلال بن رباحؓ: یہ مشہور صحابی حضرت بلالؓ ہیں جو آنحضرت کے مؤذن تھے، ان کے باپ کا نام رباح اور ماں کا نام حمامہ تھا، حضرت ابوبکرؓ صدیق کے آزاد کردہ غلام ہیں، ان کی کنیت "ابوعبدالرحمٰن" ہے بعض حضرات نے "ابوعبداللہ" بعض نے "ابوعبدالکریم" اور بعض نے ابوعامر بھی کنیت لکھی ہے۔ حضرت بلالؓ قدیم الاسلام ہیں سب سے پہلے انہوں نے ہی مکہ میں اسلام کا اظہار کیا تھا جس کے سبب خدا کے دین کی راہ میں ان کو نہایت سخت عذاب جھیلنا پڑے، اس زمانہ میں حضرت بلالؓ ایک دشمن دین امیہ بن خلف جمحی کے غلام تھے۔ امیہ ان کو نہایت ہولناک اذیتیں پہنچایا کرتا تھا، وہ ان کو لوہے کی زرہ میں کس کر جلتی دھوپ میں ڈال دیتا تھا، لکڑی کے موصل سے ان کی پٹائی کرتا تھا، آخر کار حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو اس کے ظالم مالک سے بھاری قیمت کے عوض خرید کر آزاد کیا اور پھر جنگ بدر میں وہی امیہ انہی حضرت بلال کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تھا کہ خانہ کعبہ میں اذان دیں، حضرت بلالؓ کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں ان کی فضیلت و بزرگی کے اظہار کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: سابقین چار ہیں، میں سابق عرب ہوں، بلالؓ سابق حبشہ ہیں، صہیبؓ سابق روم ہیں، اور سلیمانؓ سابق فارس ہیں، حضرت بلالؓ کا رنگ گندم گوں تھا، دراز قد تھے، جسم پر بال بہت زیادہ تھے، انہوں نے دمشق میں ۲۰ھ میں وفات پائی اور ایک قول یہ ہے کہ ان کی وفات ۱۸ھ میں ہوئی۔ وفات کے وقت کچھ اوپر ساٹھ سال کے تھے، بعض حضرات نے ان کی عمر ۷۰ سال لکھی ہے۔ رضی اللہ عنہ۔

حمزہؓ بن عبدالمطلب: حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب ہاشمی آنحضرت ﷺ کے چچا ہیں ان کو سید الشہداء کا لقب عطا ہوا تھا بعض حضرات نے "اسد اللہ" کا لقب بھی لکھا ہے، ان کی ماں کا نام ہالہ بنت وہب ہے جو آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کی بہن ہیں، اور اس اعتبار سے حضرت حمزہؓ آنحضرت ﷺ کے خالہ زاد بھائی ہیں۔

سید الشہداء حضرت حمزہؓ شجاع قوی اور دلاور انسان تھے، ان کی شجاعت و بہادری کے واقعات سے اسلامی تاریخ و سیر کی کتابیں

بھری ہیں، ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ فرشتے حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حنظلہؓ بن راہب کو غسل دے رہے ہیں، اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ حمزہؓ اللہ کے نزدیک ساتویں آسمان پر یوں لکھے ہوئے ہیں حمزة بن عبدالمطلب اسد اللہ و اسد رسولہ (حمزہؓ بن عبدالمطلب، جو اللہ کا اور اللہ کے رسول کا شیر ہے)۔ رضی اللہ عنہ۔

حاطب بن ابی بلتعہ: ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے اور غزوۂ خندق میں بھی اور اس کے بعد کے چاروں میں بھی شریک ہوئے۔ ان سے جو ایک لغزش ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مدینہ منورہ سے ایک خفیہ خط اہل مکہ کے نام روانہ کیا تھا جس میں آنحضرت ﷺ کے ایک جنگی منصوبہ کا انکشاف تھا اور پھر وہ خط راستہ ہی میں پکڑ کر آنحضرت ﷺ کے پاس واپس لایا گیا تھا، اس کا تفصیلی ذکر پیچھے آچکا ہے، انہوں نے ۳۰ھ میں مدینہ میں بعمر ۶۵ سال وفات پائی۔

ابوحذیفہ بن عتبہ: حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ قریشی کے اصل نام میں اختلاف ہے مشہور قول کے مطابق ان کا نام "ہشام" ہے باپ کا نام عتبہ ہے جو ربیعہ بن عبدالشمس کا بیٹا تھا، حضرت ابوحذیفہؓ اجلہ اور فضلاء صحابہؓ میں سے ہیں۔ ان کا شمار مہاجرین اول میں ہوتا ہے یہ ان اہل اسلام میں سے ہیں جنہیں دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا اتفاق حاصل ہوا۔ حضرت ابوحذیفہؓ کی ہجرتیں بھی دو ہوئیں۔ یعنی حبشہ ہجرت کرنے والوں میں بھی شامل تھے اور پھر مدینہ کو ہجرت کی۔ انہوں نے مکہ میں اس وقت اسلام قبول کر لیا تھا جب آنحضرت ﷺ دار ارقم میں قیام پذیر نہیں ہوئے تھے، ان کو غزوۂ بدر میں بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور اس کے بعد جہادوں میں بھی جنگ یمامہ میں جام شہادت سے سرفراز ہوئے اس وقت ان کی عمر ۵۳ سال یا ۵۴ سال کی تھی۔ رضی اللہ عنہ۔

حارثہؓ بن ربیع انصاری: رُبَیِّع (یا ایک روایت کے مطابق ربیع) اصل میں حضرت حارثہؓ کی ماں کا نام ہے ان کے باپ کا نام سراقہ تھا۔ حضرت حارثہؓ جنگ بدر میں شہید ہو گئے تھے۔ اگرچہ یہ میدان جنگ میں نہیں تھے بلکہ اس دستہ میں شامل تھے جو دشمنوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لئے میدان جنگ سے الگ ایک جگہ پر مامور تھا تا کہ وہ دشمنوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں اور جو کچھ دیکھیں آکر خبر دیں، انہی صحابہؓ میں حضرت حارثہؓ بھی تھے جو جوان العمر اور بڑے چاق و چوبند تھے، یہ جنگ کے وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس جگہ کھڑے تھے کہ اچانک کسی کا ایک تیر آکر ان کے حلق میں لگا اور حضرت حارثہؓ اس کاری زخم کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔ بعد میں ان کی ماں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بولیں کہ یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) جانتے ہی ہیں میری نظر میں حارثہ کی کیا حیثیت تھی مجھ کو اس سے کتنا لگاؤ تھا، کتنا پیار تھا مجھ کو بتائیے کہ وہ جنت میں گیا ہے یا دوزخ میں، اگر جنت میں گیا ہے تو صبر کروں، اور اگر دوزخ میں گیا ہے تو پھر جتنا رو سکتی ہوں روؤں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: حارثہ کی ماں! وہاں ایک جنت نہیں ہے اوپر تلے کئی جنتیں ہیں اور تمہارا بیٹا فردوس اعلیٰ میں ہے۔ حارثہ کی ماں نے یہ سن کر کہا! میں اس پر صبر کروں گی۔

خبیبؓ بن عدی انصاری: حضرت خبیبؓ جنگ بدر میں شریک تھے پھر ۳ھ میں جب غزوۂ رجیع میں گئے تو وہاں مشرکوں نے ان کو قیدی بنا لیا اور مکہ لے کر آئے یہاں مکہ میں ان کو حارث بن عامر کے بیٹوں نے خرید لیا، حارث بن عامر مکہ کا وہ مشرک تھا جس کو حضرت خبیبؓ نے جنگ بدر میں جہنم رسید کیا تھا اور اس کا بدلہ چکانے کے لئے حارث کے بیٹوں نے ان کو خریدا، چنانچہ انہوں نے پہلے تو حضرت خبیبؓ کو قید میں ڈالے رکھا اور پھر مقام تنعیم میں ان کو سولی پر لٹکا کر شہید کر دیا، حضرت خبیبؓ پہلے مسلمان ہیں جن کو سولی پر کھینچا گیا۔ اور انہوں ہی نے مقتل میں قتل کے وقت دو رکعت نماز پڑھنے کا طریقہ جاری کیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جب ان کو سولی پر کھینچا جانے لگا تو یہ الفاظ ان کی زبان پر تھے کہ خدایا! یہاں میں کسی ایسے شخص کو نہیں پا رہا ہوں جو پیغمبر خدا ﷺ کو میرا اسلام پہنچا دے، خدایا تو ہی میرا اسلام پیغمبر خدا ﷺ کو پہنچا۔ چنانچہ منقول ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور خبیب کا سلام پہنچایا۔ رضی اللہ عنہ۔

خنیس بن خدافہ سہمی: حضرت خنیس بن خدافہ سہمی قریشی ہیں اور مہاجرین میں سے ہیں۔ انہوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی اور وہیں سے آکر جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے، پھر جنگ احد میں بھی شریک ہونے کے لئے وہاں سے آئے اور اس کے بعد حبشہ جانے کے بجائے مدینہ منورہ آگئے، اس جنگ میں یہ زخمی ہوگئے تھے اور آخر کار اس زخم سے جان بر نہ ہوسکے اور انتقال کر گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ پہلے انہیں خنیسؓ کے نکاح میں تھیں اور ان کے انتقال کے بعد آنحضرت ﷺ کی زوجیت میں آئیں۔

رفاعہ بن رافع انصاری: حضرت رفاعہؓ بھی اصحاب بدر میں سے ایک ہیں ان کا تعلق انصار مدینہ سے ہے ان کے باپ قبیلہ و قوم کے سردار تھے۔ حضرت رفاعہؓ نے بدر کے بعد اور تمام جہادوں میں بھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ شرکت کی۔ انہوں نے جنگ جمل اور جنگ صفین میں بھی حضرت علیؓ کی طرف سے شرکت کی تھی ان کا انتقال امارت معاویہؓ کے ابتدائی دنوں میں ہوا۔ رضی اللہ عنہ۔

رفاعہ بن عبدالمنذر ابولبابہ انصاری: حضرت رفاعہؓ بن عبدالمنذر ابولبابہ بھی انصار مدینہ میں سے ہیں، اور قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے ہیں، سرداروں میں سے تھے، ایک قول یہ ہے کہ یہ جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے، بلکہ آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنے پیچھے امیر و والی بنا کر مدینہ میں چھوڑ گئے تھے اور پھر بدر کے مال غنیمت میں ان کا بھی حصہ لگایا تھا جیسا کہ حضرت عثمانؓ کا حصہ لگایا تھا۔ ان کی وفات حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانہ میں ہوئی۔

حضرت رفاعہؓ بن عبدالمنذر کے اس قصہ کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے جو مدینہ کے یہودیوں "بنو نضیر" کے خلاف آنحضرت ﷺ کی فوجی کارروائی کے موقعہ پر حضرت رفاعہؓ کی تقصیر سے توبہ کی قبولیت تک انہوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھے رکھا تھا، بعد میں مسجد نبوی کے اس ستون کو حضرت رفاعہؓ کی کنیت کی نسبت سے "ابولبابہ" کہا جانے لگا۔

زبیر بن عوام: حضرت زبیر بن عوامؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، چوتھی پشت "قصی" پر پہنچ کر ان کا اور آنحضرت ﷺ کا سلسلہ نسب ایک ہوجاتا ہے، ان کی والدہ ماجدہ حضرت صفیہؓ عبدالمطلب کی بیٹی اور آنحضرت ﷺ کی پھوپھی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی حضرت اسماء ان کی زوجیت میں تھیں، انہوں نے اور ان کی والدہ حضرت صفیہؓ نے ایک ساتھ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۶ سال اور ایک روایت کے مطابق ۲۵ سال تھی، جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو ان کے چچا نے ان کو سخت اذیتیں پہنچائیں، یہاں تک کہ وہ ان کو دھوئیں میں بند کر کے ستاتا تھا اور کہتا تھا کہ جب تک تم اسلام ترک نہیں کرو گے اسی طرح تم پر ظلم ڈھاتا رہوں گا، مگر ان کے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہیں آئی اور ہر سختی ان کے قدم کو راہ اسلام پر اور زیادہ مضبوطی سے جماتی رہی، ان کی پہلی ہجرت حبشہ کو ہوئی تھی، انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ غزوۂ بدر اور دوسرے غزوات میں شرکت کی، غزوۂ احد میں جب کہ دشمن نے چاروں طرف سے یلغار کر رکھی تھی اور اسلامی لشکر افراتفری کے عالم میں تھا، حضرت زبیرؓ نہایت بہادری اور پامردی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے پاس ڈٹے رہے، منقول ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے جس شخص نے اللہ کی راہ میں تلوار سونتی حضرت زبیر ابن عوامؓ ہیں۔

حضرت زبیر کا رنگ گورا، چہرہ پر جمال و روشن تھا، دراز قد تھے جسم پر گوشت ہلکا تھا، بال بہت تھے اور رخسار ہلکے تھے۔ حضرت زبیرؓ ۳۶ھ میں جنگ جمل کے دوران شہید ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۶۴ سال تھی۔ پہلے جسد خاکی کو دارالسباع میں دفن کیا گیا پھر بصرہ لایا گیا اور وہیں ان کی آخری آرام گاہ بنی منقول ہے کہ حضرت زبیرؓ نماز کی حالت میں تھے کہ حضرت علیؓ کے لشکر کے ایک شخص ابن جرموز نے ان پر حملہ کیا اور شہید کر ڈالا، بعد میں ابن جرموز حضرت علیؓ کے پاس آیا اور بولا کہ: آپؓ کو خوش خبری ہو میں نے زبیرؓ کو قتل کر ڈالا ہے۔ سیدنا علیؓ نے جواب دیا اور تو بھی خوش خبری سن لے کہ دوزخ تیرا انتظار کر رہی ہے۔

زید بن سہل : حضرت زیدؓ بن سہل انصاری ہیں، ابو طلحہؓ کی کنیت سے مشہور ہیں یہ ان ستر آدمیوں میں شامل تھے جو ہجرت نبوی سے پہلے مدینہ سے چل کر مکہ آئے تھے اور عقبہ میں آنحضرت ﷺ کی زیارت اور بیعت سے مشرف ہوئے تھے۔

انہوں نے غزوۂ بدر میں بھی شرکت کی تھی اور اس کے بعد کے جہادوں میں بھی، حضرت طلحہ زید بن سہلؓ حضرت ام سلیمؓ کے خاوند ہیں جو حضرت انسؓ بن مالک کی والدہ ماجدہ ہیں۔ ان کا شمار انصار کے عمائدین اور روساء میں ہوتا ہے تیراندازی میں بہت مشہور تھے آنحضرت ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا تھا کہ تنہا ابو طلحہؓ کی آواز لشکر میں ایک جماعت کی آواز سے بہتر ہے۔ ایک روایت میں "سو مردوں کی آواز سے بہتر ہے" کے الفاظ ہیں اور ایک اور روایت میں یہ ہے کہ ہزار مردوں کی آواز سے بہتر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا بھائی چارہ حضرت ابو عبیدہؓ سے کرایا تھا۔ ان کی وفات ۳۱ھ میں بعمر ۷۰ سال ہوئی۔ رضی اللہ عنہ۔

ابو زید انصاریؓ : حضرت ابو زید انصاریؓ ان صحابہؓ میں سے ایک ہیں جنہوں نے رسول اللہ کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا۔ یہ حضرت انسؓ کے ایک چچا ہیں، جنگ بدر میں شریک تھے سعد قاری کے نام سے زیادہ مشہور تھے ان کے اصل نام میں اختلافی اقوال ہیں، بعض نے سعد بن عمیر لکھا ہے اور بعض نے قیس بن سکن۔ رضی اللہ عنہ۔

سعد بن مالک زہریؓ : یہ مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ہیں جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اصل میں ابی وقاصؓ کا نام مالک تھا اس لئے ان کو سعد بن مالک بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت سعد زہریؓ قریشی ہیں، انہوں نے ابتداء اسلام ہی میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۷ سال یا ایک روایت کے مطابق ۱۹ سال تھی۔ خود حضرت سعدؓ کا بیان ہے کہ میں تیسرا مسلمان ہوں، یعنی مجھ سے پہلے صرف دو آدمی مسلمان ہوئے تھے، اور میں وہ شخص ہوں جس نے اللہ کی راہ میں سب سے پہلے تیراندازی کی۔ یہ غزوۂ بدر اور تمام غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ شریک تھے، غزوۂ احد کے دن آنحضرت ﷺ نے ان پر اپنے ماں باپ کو جمع کر کے فرمایا تھا: تیر پہ تیر چلائے جاؤ، تم پر میرے ماں باپ فدا ہوں، گندم گوں رنگت، چھوٹا قد، فربہ بدن، بڑا سر، سخت انگلیاں ہلکی ناک اور جسم پر بال کی کثرت، یہ حضرت سعدؓ کا سراپا ہے۔ ان کا انتقال بعہد امارت معاویہؓ ۵۵ھ یا ۵۸ھ میں اس محل میں ہوا جو انہوں نے مدینہ سے دس میل کے فاصلے پر وادی عقیق میں بنایا تھا، وہاں سے ان کا جسد خاکی مدینہ لایا گیا اور بقیع میں دفن کیا گیا انہوں نے کچھ اوپر ستر سال اور ایک روایت کے مطابق ۸۲ سال کی عمر پائی، عشرہ مبشرہ میں سب سے پیچھے انہیں کی وفات ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ فتوحات اسلام میں حضرت سعدؓ کی جنگی مہارت اور بے پناہ شجاعت و بہادری کا بڑا حصہ ہے، عجم کے نامعلوم کتنے شہر اور کتنے بڑے بڑے علاقے ان کے ہاتھ پر فتح ہوئے۔ ایران کو اسلام کے زیر نگیں کرنے والے اور کسریٰ کی عظیم تر طاقت کو پاش پاش کرنے والے سب سے بڑے سپہ سالار یہی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص ہیں اس کے علاوہ بھی ان کے فضائل اور مناقب کچھ کم نہیں ہیں۔ رضی اللہ عنہ۔

سعد بن خولہؓ : حضرت سعد بن خولہؓ کا تعلق قریش مکہ سے ہے، بنو عامر لوی میں سے ہیں لیکن ایک قول یہ ہے کہ بنو عامر بن لوی سے ان کا نسبی تعلق نہیں ہے بلکہ ان کے حلیف تھے۔ یہ ان مسلمانوں میں شامل تھے جنہوں نے دوسری بار مکہ سے حبشہ ہجرت کی تھی۔ جنگ بدر میں شریک تھے اور حجۃ الوداع کے زمانہ میں مکہ میں ان کا انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہ۔

سعید بن زیدؓ : حضرت سعید بن زیدؓ بن نفیل قریشی عدوی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضرت عمر فاروقؓ کے بہنوئی تھے، قدیم الاسلام ہیں یعنی انہوں نے مکہ میں اس وقت اسلام قبول کرلیا تھا، جب آنحضرت دار ارقم میں قیام پذیر نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے تمام غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ شرکت کی ہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر یہ طلحہ بن زبیرؓ کے ساتھ قریش کے قافلہ کی خبر لانے کی مہم پر گئے تھے۔ حضرت سعید بن زیدؓ گندم گوں اور دراز قد تھے، گیارہویں پشت میں کعب بن لوی پر ان کا اور آنحضرت ﷺ کا سلسلہ نسب

ایک ہوجاتا ہے۔ انہوں نے جب اسلام قبول کیا تھا تو اس وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ جب عمرؓ کو میرے قبول اسلام کی خبر ہوئی تو انہوں نے مجھ کو باندھ کر ڈال دیا تھا، ان کی بیوی حضرت فاطمہؓ بنت خطاب بھی اپنے بھائی حضرت عمرؓ سے پہلے مشرف باسلام ہو چکی تھیں۔ حضرت سعیدؓ کا انتقال ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں مدینہ کے قریب وادی عقیق میں ہوا۔ ان کی عمر کچھ اوپر ۷۰ برس کی ہوئی۔ ان کے باپ زید بن نفیل نے زمانہ جاہلیت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا دین اختیار کر لیا تھا اور مشرکوں کے ذبیحہ سے پرہیز کیا کرتے تھے، انہوں نے قبل بعثت آنحضرت ﷺ سے بھی ملاقات کی تھی، ان کو "موحد الجاہلیۃ" کہا جاتا ہے۔

سہل بن حنیفؓ: حضرت سہل بن حنیفؓ انصاری ہیں، بدر اور احد اور دوسرے جہادوں میں شریک ہوئے اور غزوۂ احد کے دن آنحضرت ﷺ کے ساتھ میدان کارزار میں ڈٹے رہے۔ آنحضرت ﷺ کے بعد سیدنا علیؓ کے خاص مصاحبین میں شامل ہو گئے تھے، سیدنا علیؓ نے ان کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا، پھر "فارس" ایران کی گورنری پر ان کو فائز کیا۔ ان کا انتقال کوفہ میں ۳۸ھ میں ہوا اور سیدنا علیؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ظہیر بن رافع اور ان کے بھائی: ظہیر بن رافعؓ (یا ملا علی قاری کے بموجب ظہیر) کے باپ کا نام رافع تھا، انصار مدینہ میں سے ہیں، ان کے بھائی کا نام خدیج بن رافع ہے۔ جب کہ ملا علی قاریؒ نے ظہیر نام لکھا ہے یہ دونوں بھائی بدری ہیں، ان دونوں نے جنگ بدر اور اس کے بعد کے دوسرے جہادوں میں شرکت کی تھی۔

عبداللہ بن مسعودؓ ہزلی: ہزلی ایک قبیلہ ہزیل کی طرف نسبت ہے، جو غیر قریش قبائل میں سے ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی کنیت ابو عبدالرحمٰن تھی، صاحب السواد والسواک کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کا انتقال مدینہ میں ۳۲ھ میں ہوا کچھ اوپر ساٹھ سال عمر پائی۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ زہری: حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف زہری، زہرہ بن کلاب کی اولاد سے ہیں، کلاب بن مرہ پر ان کا اور آنحضرت ﷺ کا سلسلۂ نسب ایک ہوجاتا ہے۔ دور جاہلیت میں ان کا نام عبدالکعبہ تھا، ان کی ولادت واقعۂ فیل کے دس سال بعد ہوئی۔ ابتداء اسلام ہی میں انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا، ان کی والدہ بھی مسلمان ہو گئی تھیں، حبشہ کی طرف انہوں نے دو ہجرتیں کیں، جنگ بدر میں شریک ہوئے اور دوسرے تمام غزوات میں بھی آنحضرت ﷺ کے دوش بدوش رہے، جنگ احد کے دن میدان کارزار میں پوری ثابت قدمی کے ساتھ ڈٹے رہنے والوں میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی تھے، اس دن انہوں نے بیس سے زیادہ زخم کھائے تھے۔ ایک سفر میں آنحضرت ﷺ نے ان کے پیچھے نماز ادا کی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ غزوۂ تبوک میں نہیں جاسکتے تھے اور اس کی تلافی انہوں نے اس طرح کی تھی کہ چار ہزار دینار اللہ کی راہ میں صدقہ کئے، پھر چالیس ہزار دینار اور خدا کی راہ میں خرچ کئے، پانچ سو گھوڑے مجاہدین اسلام کے لئے پیش کئے اور اسی طرح پانچ سو اونٹ دیئے، آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد ازواج مطہرات کی خبر گیری اور ان کے اخراجات زندگی کا تکفل حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کو اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ مال و دولت سے نوازا تھا، اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا حوصلہ بھی اتنا ہی زیادہ ان کو عطا کیا تھا، تجارت ان کا پیشہ تھا اور ان کا بیشتر مال وزر تجارت ہی سے ان کو حاصل ہوا تھا۔ منقول ہے کہ یہ جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے تو بالکل مفلس وقلاش تھے اور پھر اس پاک شہر میں ان کو خیر و برکت حاصل ہونی شروع ہوئی تو اللہ نے وہم و گمان سے زیادہ ان کو نوازا بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے چار بیویاں تھیں اور ان کو ترکہ کے آٹھویں حصہ کے چوتھائی پر مصالحت کرنی پڑی اور اس صورت میں بھی ان کے حصہ میں اسی ہزار درہم یا دینار آئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی میراث ایک ہزار ساٹھ آدمیوں کے درمیان تقسیم ہوئی اور ہر ایک کو اسی اسی ہزار درہم ملے۔ یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے اپنی میراث میں سے ہر بدری صحابیؓ کو چار چار سو دینار دینے کی

وصیت کی تھی جو پوری کی گئی۔ روایت ہے کہ ایک دن ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے بیان کیا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا: میں نے عبدالرحمٰنؓ کو بہشت میں جاتے ہوئے دیکھا اور وہ بہشت میں اسی طرح گھس رہے تھے جیسے کوئی بچہ سرین یا ہاتھ پاؤں کے بل چلتا ہے، جس دن حضرت عائشہؓ نے عبدالرحمٰنؓ کو یہ حدیث سنائی اسی دن ان کا ایک تجارتی قافلہ سات سو اونٹوں پر مال لادے ہوئے ملک شام سے چل کر مدینہ پہنچا تھا، انہوں نے اپنے بارے میں دخول جنت کی یہ بشارت سن کر شکرانہ میں وہ تمام لدے پھندے اونٹ مع ان کے پالانوں اور جھولوں کے اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیئے، روایت ہے کہ وفات کے وقت حضرت عبدالرحمٰنؓ بے ہوش ہوگئے تھے جب کچھ دیر کے لئے ہوش میں آئے تو بولے ابھی میرے پاس دو فرشتے آئے تھے جو بڑے سخت اور درشت خو معلوم ہوتے تھے انہوں نے میری طرف اشارہ کر کے آپس میں کہا کہ ہم اس شخص کو حاکم امین عزیز کے حضور لے جارہے ہیں، اتنے میں دو فرشتے آگئے اور ان دونوں نے پہلے فرشتوں سے پوچھا کہ اس شخص کو کہاں لے جارہے ہو؟ وہ دونوں بولے! حاکم امین عزیز کے حضور۔ نووارد فرشتوں نے کہا یہ تو وہ شخص ہے جس میں سعادت و نیک بختی نے اسی وقت گھر کر لیا تھا جب یہ ماں کے پیٹ میں تھا، حضرت عبدالرحمٰن کی علمی حیثیت بھی بہت بلند تھی، فقہی تبحر اور دینی احکام و مسائل پر عبور رکھنے کے سبب صحابہؓ میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ تینوں کے عہد خلافت میں فتویٰ دینے کی بڑی ذمہ داری انہی کے سپرد تھی۔

حضرت عبدالرحمٰن کی رنگت سرخ سفید تھی، قد دراز تھا، چہرہ چھوٹا تھا اور پاؤں کو تیر لگنے سے جو نقصان پہنچا تھا اس کے سبب لنگڑے ہوگئے تھے ان کی وفات حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ہوئی۔

عبیدہ بن حارثؓ: حضرت عبیدہ بن حارثؓ قریشی ہیں ان کے باپ حارث، مطلب بن عبد مناف کے بیٹے تھے۔ حضرت عبیدہؓ کی کنیت ابوالحارث تھی، اور بعض حضرات نے "ابومعاویہ" کنیت لکھی ہے، یہ آنحضرت ﷺ سے دس سال بڑے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کے دار ارقم میں آنے سے پہلے ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ اور ان کے دو بھائی، جن کے نام طفیلؓ اور حصینؓ تھے، ایک ساتھ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے، جنگ بدر میں ان کا مقابلہ ولید بن عتبہ سے ہوا تھا اور دونوں کے درمیان دو دو چوٹیں ہوئیں، اس مقابلہ میں حضرت عبیدہؓ شہید ہوگئے لیکن ولید بھی اسی دن مارا گیا۔

عبادہ بن صامتؓ: حضرت عبادہؓ بن صامت انصار مدینہ میں سے ہیں اور ان کا شمار سرداروں میں ہوتا تھا۔ عقبہ اولی، عقبہ ثانیہ اور عقبہ ثالثہ تینوں میں یہ موجود تھے، انہوں نے جنگ بدر اور دوسرے جہادوں میں شرکت کی یہ ان صحابہؓ میں سے ایک ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا۔ حضرت عبادہؓ دراز قد اور خوبصورت جسم کے تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان کو شام کا قاضی و معلم بنا کر بھیجا تھا، چنانچہ انہوں نے حمص میں اقامت اختیار کر کے اپنے فرائض انجام دیئے، پھر بعد میں فلسطین چلے گئے تھے، اور وہیں رملہ میں وفات پائی۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ان کی وفات بیت المقدس میں ۳۴ھ میں ہوئی تھی، اس وقت ان کی عمر ۷۲ سال کی تھی، ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت عبادہؓ، حضرت معاویہؓ کے زمانہ تک زندہ رہے۔

عمرو بن عوفؓ: حضرت عمرو بن عوف انصاری ہیں، یہ بنو عامرؓ لوی کے حلیف تھے اور مدینہ کی سکونت اختیار کر رکھی تھی، انہوں نے بدر میں شرکت کی ان کا انتقال امیر معاویہؓ کے آخر عہد امارت میں مدینہ میں ہوا اور لاولد اس دنیا سے رخصت ہوگئے، انہوں نے بہت پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، اس لئے ان کو بھی قدیم الاسلام کہا جاتا ہے، یہ ان مقدس ہستیوں میں سے ہیں جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا: تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے وہ حدیث روایت کی ہے جس میں آپ ﷺ نے (اہل اسلام کو مخاطب کر کے فرمایا: مجھ کو تمہارے فقر و افلاس سے کوئی خوف نہیں ہے میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں جب دنیا (اپنے مال وزر کے ساتھ) تم پر کشادہ و فراخ ہو جائے گی۔

عقبہ بن عمرو انصاری: حضرت عقبہ بن عمرو انصاری مشاہیر صحابہؓ میں سے ہیں بدری ہیں، عقبہ ثانیہ میں یہ بھی موجود تھے، جمہور علماء کا کہنا ہے کہ ان کو "بدری" اس نسبت سے کہا جاتا ہے کہ یہ بدر میں رہا کرتے تھے نہ کہ اس اعتبار سے کہ انہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی تھی ان کی وفات حضرت علیؓ کی عہد خلافت میں ہوئی، لیکن بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انہوں نے ۴۱ھ یا ۴۲ھ میں وفات پائی۔

عامر بن ربیعہؓ عنزی: "عنزی" اصل میں ایک شخص "عنزہ" کی طرف نسبت ہے جو حضرت عامرؓ بن ربیعہ کے اجداد میں سے تھا، جامع الاصول میں یہ لفظ غنوی لکھا ہوا ہے، حضرت عامرؓ چونکہ بنوعدد کے حلیف تھے اس لئے ان کو عددی بھی کہا جاتا ہے، اور کاشف میں یہ لکھا ہے کہ حضرت عامرؓ آل خطاب کے حلیف تھے۔ حضرت عامرؓ نے دو ہجرتیں کیں، جنگ بدر میں بھی شریک تھے اور دوسرے جہادوں میں بھی۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے پہلے اسلام قبول کیا تھا، ان کی وفات ۳۲ھ یا ۳۳ھ یا ۳۵ھ میں ہوئی۔

عاصم بن ثابت انصاریؓ: حضرت عاصم بن ثابت انصاریؓ نے جنگ بدر میں شرکت کی تھی، یہ حضرت عاصم بن عمر فاروقؓ کے جد مادری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر ان کی جان کو مشرکوں سے جس طرح بچایا تھا وہ ایک بہت ہی غیر معمولی واقعہ ہے، ہوا یہ تھا کہ غزوۂ ذات الرجیع میں انہوں نے ایک بڑے مشرک سردار کو قتل کر دیا تھا سارے مشرک اپنے سردار کا بدلہ لینے کے لئے حضرت عاصم بن ثابتؓ کی تاک میں لگ گئے اور موقع پا کر ان کو گھیر لیا اور قریب تھا کہ ان کا سر کاٹ لیں مگر اسی وقت اللہ کی مدد حاصل ہوئی۔ دراصل حضرت عاصمؓ نے خدائے عزوجل سے دعا مانگی تھی کہ کسی مشرک کا ہاتھ مجھ تک نہ پہنچے اور ان کی یہ دعا مقبول تھی، چنانچہ جب مشرک حضرت عاصمؓ کا سر کاٹنے کے لئے بڑھے تو اچانک ایسا لگا کہ بھڑوں کا ایک بہت بڑا چھتہ ٹوٹ کر ان مشرکوں پر گرا ہو، اور پھر ان بھڑوں نے حضرت عاصمؓ کو ان کے ہاتھوں سے بچا لیا۔

عویم بن ساعدہ انصاریؓ: حضرت عویم بن ساعدہ انصاریؓ عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ میں مدینہ سے مکہ آکر آنحضرت کی زیارت و بیعت کرنے والوں میں شریک تھے۔ انہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے اور دوسرے جہادوں میں بھی ان کا انتقال آنحضرت ﷺ کی حیات میں ہو گیا تھا انہوں نے ۶۵ یا ۶۶ سال کی عمر پائی۔

عتبان بن مالک انصاریؓ: حضرت عتبان بن مالک انصاری خزرجی ہیں جنگ بدر میں شریک تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے احادیث روایت کی ہیں، اور ان سے جن لوگوں نے احادیث نقل کی ہیں ان میں حضرت انس بن مالکؓ اور محمود بن ربیعؓ شامل ہیں، حضرت عتبانؓ نابینے تھے، صحیح بخاریؒ کی ایک روایت میں ان کے متعلق یہ مذکور ہے کہ انہوں نے نماز کے لئے مسجد میں آنے سے اپنا عذر بیان کیا تو آنحضرت ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں ایک جگہ نماز پڑھی تاکہ عتبان اسی جگہ کو اپنی نماز پڑھنے کے لئے مختص کر لیں۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں وفات پائی۔

قتادہ بن نعمان انصاریؓ: یہ وہ قتادہ نہیں ہیں جو اہل علم اور محدثین میں بہت مشہور ہیں، وہ تابعی تھے، بصرہ کے تھے، بینائی سے اللہ تعالیٰ نے محروم کر رکھا تھا۔ لیکن علم و معرفت کی دولت وافر ان کو عطا فرمائی تھی۔ وہ حافظ تھے، مفسر تھے، محدث تھے اور ان کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو کچھ ایک بار سن لیتے تھے اس کو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ حضرت حسن بصریؒ اور حضرت سعید بن مسیبؒ سے روایت کرتے تھے اور یہ قتادہ بن نعمان جن کا یہاں ذکر ہے، صحابیؓ ہیں، انصاری ہیں، عقبہ میں موجود تھے جنگ بدر میں شریک تھے اس کے بعد دوسرے جہادوں میں شریک ہوئے، ان کا شمار فضلاء صحابہؓ میں ہوتا ہے ان کا انتقال ہوا اور حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

معاذ بن عمرو بن الجموح: حضرت معاذؓ، عمرو بن الجموح کے بیٹے ہیں، عقبہ میں موجود تھے، جنگ بدر میں یہ بھی شریک تھے، اور ان کے باپ عمرو بن الجموح بھی، یہ وہی نوعمر معاذ بن عمرو ہیں جنہوں نے جنگ بدر میں ابوجہل پر پہلے حملہ کیا اور اس کا ایک پاؤں کاٹ ڈالا

تھا اور پھر بعد میں معاذ و معوذ بن عفراء نے اس کا کام تمام کیا تھا۔

معوذ بن عفراءؓ اور ان کے بھائی: حضرت معوذ بن عفراءؓ اور ان کے بھائی حضرت معاذ بن عفراءؓ دونوں جنگ بدر میں شریک تھے، "عفراء" ان دونوں کی ماں کا نام ہے، ان کے باپ حارثہ بن رفاعہ انصاری ہیں، یہ معوذ ہی تھے جنہوں نے جنگ بدر میں اپنے بھائی معاذ بن عفراء کی مدد سے ابوجہل کو قتل کیا تھا۔ معوذؓ اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے، لیکن معاذؓ باقی رہے اور انہوں نے دوسرے جہادوں میں بھی شرکت کی معوذؓ اور معاذؓ کے ایک اور بھائی عوفؓ بن عفراء بھی جنگ بدر میں شریک تھے اور ان کو بھی اس جنگ میں شہادت نصیب ہوئی تھی۔

مالک بن ربیعہ ابواسید انصاریؓ: اصل نام مالک بن ربیعہ ہے اور "ابواسید" کنیت ہے۔ نام کے بجائے کنیت سے زیادہ مشہور ہیں، جنگ بدر میں اور دوسرے تمام غزوات میں شریک ہوئے، قبیلہ سے "مساعدی" ہیں۔ ۶۰ھ میں ان کی وفات ہوئی؛ اس وقت ان کی عمر ۷۷ سال یا ۷۸ سال کی تھی اور نابیناء ہو چکے تھے، اصحاب بدر میں سب کے بعد انہیں کا انتقال ہوا۔

مسطحؓ بن اثاثہ: حضرت مسطح بن اثاثہ بن عباد بن مطلب بن عبد المناف، جنگ بدر اور جنگ احد میں شریک تھے اور بعد کی جنگوں میں بھی شریک ہوئے۔ یہ وہی مسطحؓ ہیں جنہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ذات پر بہتان باندھا تھا اور ان پر حد قدف (زنا کا جھوٹا الزام لگانے کی سزا) نافذ ہوئی تھی اور ان کو درے لگائے گئے تھے۔ یہ واقعہ افک کے نام سے مشہور ہے، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ "مسطح" ان کا لقب ہے، اصل نام "عوف" ہے، ان کا انتقال ۳۴ھ میں بعمر ۵۶ سال ہوا۔

مرارہ بن ربیع انصاریؓ: حضرت مرارہؓ بن ربیع انصاری، بنو عمرو بن عوف میں سے ہیں، جنگ بدر میں شریک تھے، یہ ان تین صحابہؓ میں سے ہیں جو غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ مشہور حضرت کعبؓ بن مالک ہیں دوسرے حضرت ہلالؓ بن امیہ اور تیسرے یہ حضرت مرارہؓ۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کی توبہ قبول فرمائی تھی اور ان کے حق میں قرآن کی آیتیں نازل فرمائیں اور اسی مناسبت سے اس سورۂ کا نام "توبہ" رکھا گیا جس میں یہ آیتیں شامل ہیں۔

معن بن عدی انصاریؓ: حضرت معن بن عدی انصاریؓ بنو عمرو بن عوف کے حلیف ہیں اور اسی سبب سے ان کا شمار انصار میں ہوتا ہے۔ یہ عقبہ میں موجود تھے، جنگ بدر میں بھی شریک تھے اور اس کے بعد کے دوسرے جہادوں میں بھی شریک ہوئے، آنحضرت ﷺ نے ان کا بھائی چارہ حضرت زید بن خطابؓ سے کر دیا تھا جو حضرت عمرؓ کے بھائی ہیں اور ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد خلافت میں یہ دونوں ایک ساتھ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

مقداد بن عمرو کندیؓ: حضرت مقداد بن عمرو کندیؓ کو مقداد بن اسود بھی کہا جاتا تھا، کندی تو ان کو اس نسبت سے کہتے تھے کہ ان کے باپ عمرو، کندہ کے حلیف تھے اور خود مقدادؓ چونکہ بنو زہرہ میں کے ایک شخص اسود بن بغوث زہری کے حلیف بن گئے تھے، اس لئے ان کو "زہری" کہا جاتا تھا اور اسی نسبت سے مقداد بن اسودؓ ان کا دوسرا نام پڑ گیا تھا۔ حضرت مقدادؓ قدیم الاسلام ہیں اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ یہ چھٹے مسلمان ہیں یعنی ان سے پہلے پانچ آدمی مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا شمار آنحضرت ﷺ کے نہایت نیک و بزرگ صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ ان سے روایت حدیث کرنے والوں میں حضرت علی بن ابی طالبؓ اور طارق بن شہاب شامل ہیں، ۳۳ھ میں ان کا انتقال مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر مقام جرف میں ہوا تھا وہاں سے ان کی میت مدینہ لائی گئی اور پھر بقیع میں ان کو دفن کر دیا گیا۔ نماز جنازہ حضرت عثمانؓ بن عفانؓ نے پڑھائی، ان کی عمر ۶۰ سال کی ہوئی۔

ہلال بن امیہ انصاریؓ: حضرت ہلال بن امیہ انصاری ان تین صحابہؓ میں سے ہیں جو غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگایا تھا اور لعان کیا تھا، یہ جنگ بدر میں شریک تھے، ان سے جو حضرات

حدیث روایت کرتے ہیں ان میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ شامل ہیں۔

اہل بدر کی تعداد: اس بارہ میں اختلافی اقوال ہیں کہ جنگ بدر کے اسلامی لشکر میں کتنے مجاہد تھے، بعض حضرات نے اصحاب بدر کی مقدار تین سو پندرہ لکھی ہے، اور بعض نے تین سو تیرہ۔ ابتداء باب میں ایک روایت تین سو پندرہ کی نقل کی جاچکی ہے، اور ایک روایت میں تین سو سترہ کا ذکر ہے۔ صاحب استیعاب نے اپنی کتاب میں تین سو تیرہ کی تعداد بیان کی ہے، جن میں سے پینتالیس تو یہی ہیں جن کا اس باب میں ذکر ہوا ہے اور باقی دوسرے ہیں، جعفر بن حسن بن عبدالکریم برزنجیؒ نے اصحاب بدر کے اسماء مبارک اور ان کے فضائل وفوائد پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام بجالیۃ الکرب باصحاب سید العجم و العرب ہے اس کتاب میں برزنجیؒ نے متعدد کتابوں کے حوالہ سے اصحاب بدر کو ۳۶۵ کی تعداد میں ذکر کیا ہے، لیکن انہوں نے وضاحت کردی ہے کہ اس سلسلہ میں راجح قول یہی ہے کہ اصحاب بدر ۳۱۳ ہیں جیسا کہ صاحب استیعاب نے لکھا ہے۔

اہل بدر کے فضائل: اصحاب بدر کے فضائل میں سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی ﷺ کی لسان مبارک کے ذریعہ جنت کی بشارت دی ہے چنانچہ فرمایا کہ وجبت لکم الجنۃ (اے اصحاب بدر تمہارے لئے جنت واجب ہوگئی)۔

ان حضرات کی ایک بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اگلے پچھلے تمام گناہ بخش دیئے ہیں یہاں تک کہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ان میں سے کوئی کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہوگا تو اس کو توبہ کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ تو پہلے بخشا جاچکا ہے، اور اس کا جنت میں جانا طے ہوچکا ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کا وہ گناہ اس دنیا میں شرعی سزا کا متقاضی پاگیا ہو اور اس پر اس دنیا میں اس شرعی سزا کا نفاذ بھی کیا گیا ہو۔

یہ بھی انہی کے فضائل میں سے ہے کہ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نازل کیا اور ان فرشتوں نے اصحاب بدر کے ساتھ مل کر دشمنان دین سے جنگ کی۔ اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، تمام ہی علماء اس پر متفق ہیں جب کہ دوسرے غزوات مثلاً احد اور حنین کے بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔

اہل بدر کے اسماء کے خواص و برکات: اللہ تعالیٰ نے اصحاب بدر کے اسماء اور ان کے ذکر میں عجیب خواص اور برکتیں رکھی ہیں ان اسماء کے ذکر کے ساتھ مانگی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے، چنانچہ برہان حلبیؒ نے سیرت کی اپنی کتاب میں لکھا ہے اور دوانیؒ نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے مشائخ حدیث سے سنا: اہل بدر کے اسماء کے ذکر کے ساتھ جو دعا مانگی جاتی ہے، مقبول ہوتی ہے اور یہ تجربہ سے ثابت ہے۔ شیخ عبداللطیفؒ نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے۔ بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ کتنے ہی اولیاء اللہ کو اہل بدر کے اسماء کی برکت سے ولایت کا مرتبہ ملا، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جن مریضوں نے اہل بدر کے وسیلہ سے اپنے لئے شفا کی دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا عطا فرمائی، ایک عارف باللہ کا بیان ہے کہ میں نے جب بھی کسی بیمار کے سر پر ہاتھ رکھ کر اخلاص کے ساتھ اہل بدر کے نام پڑھے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا عطا فرمادی، بلکہ اگر اس کی موت کا وقت آگیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس میں بھی نرمی اور رعایت کا معاملہ فرماتا۔ ایک اور عارف کا بیان ہے، میں نے امور مہم میں اہل بدر کے اسماء کے ذکر کا تجربہ زبان سے پڑھ کر اور لکھ کر کیا، تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے کوئی دعا اس سے جلد قبول ہونے والی نہیں پائی۔ حضرت جعفر بن عبداللہؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میرے والد نے مجھ کو وصیت کی تھی کہ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ سے محبت رکھوں اور یہ کہ اپنی تمام مہمات میں اہل بدر کے وسیلہ سے دعا مانگوں، چنانچہ والد ماجد نے فرمایا تھا کہ بیٹے! اہل بدر کے اسماءؓ مبارک کے ذکر کے ساتھ جو دعا مانگی جاتی ہے وہ قبول ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جب کوئی بندہ اہل بدر کے اسماء کا ذکر کرتا ہے، یا یہ فرمایا تھا کہ جب کوئی بندہ اہل بدر کے اسماء کے ساتھ دعا مانگتا ہے تو اس وقت مغفرت، رحمت، برکت رضا اور رضوان اس بندہ کو گھیر لیتی ہیں، علماء نے لکھا ہے کہ جو شخص روزانہ ان اسماء کا ذکر کرے اور ان اسماء کے وسیلہ سے اپنی حاجت براری کی دعا کے وقت ان اسماء کا وسیلہ پکڑنے والے کے لئے بہتر ہے کہ ہر نام کے بعد "رضی اللہ عنہ" ضرور کہے مثلاً یوں کہے: محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، اس طرح آخر تک ہر نام کے بعد رضی اللہ عنہ کہے۔

مؤلف کتاب رحمۃ اللہ نے اس موقع پر تمام اہل بدر کے اسماء مبارک کتاب استیعاب سے نقل کر کے لکھے ہیں اور ان کے امور کا ذکر جن الفاظ، جس ترتیب اور دعاء توسل کے جن الفاظ کے ساتھ صاحب استیعاب نے کیا ہے اسی کو مؤلف نے اختیار کیا ہے۔ البتہ صاحب استیعاب نے ان اسماء کے بعد جو دعا لکھی تھی وہ چونکہ طویل اور مشکل المعانی تھی اس لئے مؤلف نے اس دعا کے بجائے ایک ایسی مختصر جامع دعا لکھی ہے جو احادیث میں آتی ہے، دعاء توسل کے الفاظ کے ساتھ اصحاب بدر کے نام یوں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَللّٰهُمَّ اَسْأَلُكَ بِسَيِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ الْمُهَاجِرِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُثْمَانَ اَبِيْ بَكْرِ نِ الصِّدِّيْقِ الْقُرَيْشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ الْعَدَوِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عُثْمَانَ ابْنِ عَفَّانَ الْقُرَيْشِيِّ خَلَّفَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى ابْنَتِهٖ وَضَرَبَ لَهٗ بِسَهْمِهٖ وَبِسَيِّدِنَا عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبِ نِ الْهَاشِمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اِيَاسِ بْنِ الْبُكَيْرِ بِسَيِّدِنَا بِلَالِ بْنِ رَبَاحٍ مَوْلٰى اَبِيْ بَكْرِ نِ الصِّدِّيْقِ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ الْهَاشِمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَاطِبِ بْنِ اَبِيْ بَلْتَعَةَ حَلِيْفِ لِقُرَيْشٍ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ حُذَيْفَةَ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خُبَيْبِ بْنِ عَدِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خُنَيْسِ بْنِ حُذَافَةَ السَّهْمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رِفَاعَةَ بْنِ عَبْدِالْمُنْذِرِ اَبِيْ لُبَابَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زَيْدِ بْنِ سَهْلٍ اَبِيْ طَلْحَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ زَيْدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَعْدِ بْنِ مَالِكِ نِ الزُّهْرِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَعْدِ ابْنِ خَوْلَةَ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ظُهَيْرِ بْنِ رَافِعِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَاَخِيْهِ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدِ نِ الْهُذَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدِ نِ الْهُذَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفِ نِ الزُّهْرِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عُبَيْدَةَ بْنِ الْحَارِثِ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ حَلِيْفِ بَنِيْ عَامِرِ بْنِ لُؤَيٍّ وَبِسَيِّدِنَا عُقْبَةَ بْنِ عَمْرِو نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ الْعَنَزِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَاصِمِ بْنِ ثَابِتِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عُوَيْمِ بْنِ سَاعِدَةَ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عِتْبَانَ بْنِ مَالِكِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا قُدَامَةَ بْنِ مَظْعُوْنٍ وَبِسَيِّدِنَا قَتَادَةَ بْنِ النُّعْمَانِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُعَاذِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْجَمُوْحِ وَبِسَيِّدِنَا مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَآءَ وَاَخِيْهِ مَالِكِ بْنِ رَبِيْعَةَ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ اُسَيْدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مِسْطَحِ بْنِ اُثَاثَةَ بْنِ عَبَّادِ بْنِ الْمُطَّلِبِ بْنِ عَبْدِ مُنَافٍ وَبِسَيِّدِنَا مُرَارَةَ بْنِ الرَّبِيْعِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَعْنِ بْنِ عَدِيِّ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مِقْدَادِ بْنِ عَمْرِو نِ الْكِنْدِيِّ حَلِيْفِ بَنِيْ زُهْرَةَ وَبِسَيِّدِنَا هِلَالِ بْنِ اُمَيَّةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ عَمْرِو بْنِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذِ نِ الْاَشْهَلِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اُسَيْدِ بْنِ حُضَيْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ الْاَشْهَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اُسَيْدِ بْنِ ثَعْلَبَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اُنَيْسِ بْنِ قَتَادَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَنَسِ بْنِ مُعَاذِ نِ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَنَسِ بْنِ اَوْسِ نِ الْاَنْصَارِيِّ الْاَشْهَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَوْسِ بْنِ ثَابِتِ نِ النَّجَّارِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَوْسِ بْنِ خَوْلِيِّ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَوْسِ بْنِ الصَّامِتِ الْخَزْرَجِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَسْعَدَ ابْنِ زُرَارَةَ النَّجَّارِيِّ الْاَنْصَارِيِّ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْاَسْوَدِ بْنِ زَيْدِ بْنِ غَنَمِ نِ الْاَنْصَارِيِّ

وَبِسَيِّدِنَا اِيَاسِ بْنِ وُدَفَةَ الْاَنْصَارِيِّ مِنْ بَنِيْ سَالِمِ بْنِ عَوْفِ نِ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْاَرْقَمِ بْنِ اَبِي الْاَرْقَمِ الْهَاشِمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا بَرَآءِ بْنِ عَازِبِ نِ الْخَزْرَجِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا بِشْرِ بْنِ الْبَرَآءِ بْنِ مَعْرُوْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا بَشِيْرِ بْنِ سَعْدِ نِ الْخَزْرَجِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا بَشِيْرِ بْنِ اَبِيْ زَيْدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا بُحَيْرِ ابْنِ اَبِيْ بُحَيْرِ الْجُهَنِيِّ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا بِشْعَسِ ابْنِ عَمْرِو نِ الْخَزْرَجِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا بَجَّسِ بْنِ ثَعْلَبَةَ الْاَنْصَارِيِّ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا تَمِيْمِ بْنِ يَعَارِ الْاَنْصَارِيِّ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا تَمِيْمِ نِ الْاَنْصَارِيِّ مَوْلٰى بَنِيْ

غَنْمٍ وَبِسَيِّدِنَا تَمِيمٍ مَوْلَى خِرَاشِ بْنِ الصِّمَّةِ وَبِسَيِّدِنَا ثَابِتِ بْنِ الْجَذْعِ الْأَنْصَارِيِّ الْأَشْهَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَابِتِ بْنِ هَزَّالِ بْنِ عَمْرِو نِ الْأَنْصَارِيِّ الْعَوْفِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَابِتِ بْنِ عَمْرِو بْنِ زَيْدِ نِ النَّجَّارِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَابِتِ بْنِ خَالِدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ النُّعْمَانِ النَّجَّارِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَابِتِ بْنِ الْخَنْسَاءِ النَّجَّارِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَابِتِ بْنِ أَقْرَمَ الْأَنْصَارِيِّ حَلِيفِ بَنِي عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ وَبِسَيِّدِنَا ثَابِتِ بْنِ زَيْدِ نِ الْأَشْهَلِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَابِتِ بْنِ رَبِيعَةَ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَعْلَبَةَ بْنِ غَنَمَةَ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَعْلَبَةَ بْنِ سَاعِدَةَ السَّاعِدِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَعْلَبَةَ بْنِ عَمْرِو نِ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَعْلَبَةَ بْنِ حَاطِبِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ثَقْفِ بْنِ عَمْرِو نِ الْأَسْلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا جَابِرِ بْنِ خَالِدِ بْنِ مَسْعُودِ نِ الْأَنْصَارِيِّ النَّجَّارِيِّ الْأَشْهَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا جَابِرِ ابْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْحَرَامِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا جَبَّارِ بْنِ صَخْرِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا جُبَيْرِ بْنِ إِيَاسِ الْأَنْصَارِيِّ الزُّرَقِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَارِثَةَ بْنِ النُّعْمَانِ النَّجَّارِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَارِثَةَ بْنِ مَالِكِ نِ الْأَنْصَارِيِّ الزُّرَقِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَارِثِ بْنِ حُمَيِّرِ نِ الْأَشْجَعِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَارِثَةَ بْنِ حُمَيِّرِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَارِثِ بْنِ هِشَامِ الْمَخْزُومِيِّ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْحَارِثِ بْنِ عَتِيكِ نِ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْحَارِثِ بْنِ قَيْسِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْحَارِثِ بْنِ أَوْسِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْحَارِثِ بْنِ أَنَسِ نِ الْأَشْهَلِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْحَارِثِ بْنِ النُّعْمَانِ الْقَيْسِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْحَارِثِ بْنِ النُّعْمَانِ ابْنِ خَزْمَةَ الْخَزْرَجِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حُرَيْثِ بْنِ زَيْدِ نِ الْخَزْرَجِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْحَكَمِ بْنِ عَمْرِو نِ الثُّمَالِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَبِيبِ مَوْلَى الْأَنْصَارِ وَبِسَيِّدِنَا الْحُصَيْنِ ابْنِ الْحَارِثِ الْمُطَّلِبِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَاطِبِ بْنِ عَمْرِو نِ الْأَوْسِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حَرَامِ بْنِ مِلْحَانَ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْحُبَابِ بْنِ الْمُنْذِرِ الْأَنْصَارِيِّ السُّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَالِدِ بْنِ الْبُكَيْرِ وَبِسَيِّدِنَا خَالِدِ بْنِ الْعَاصِي قُتِلَ يَوْمَ بَدْرٍ وَبِسَيِّدِنَا خَالِدِ بْنِ قَيْسِ نِ الْأَزْدِيِّ الْعَجْلَانِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَلَّادِ بْنِ رَافِعِ نِ الْعَجْلَانِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَلَّادِ بْنِ سُوَيْدِ نِ الْأَنْصَارِيِّ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَلَّادِ بْنِ عَمْرِو نِ الْأَنْصَارِيِّ السُّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَارِجَةَ بْنِ زَيْدِ نِ الْأَنْصَارِيِّ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَارِجَةَ بْنِ حُمَيِّرِ نِ الْأَشْجَعِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَبَّابِ بْنِ الْأَرَتِّ الْخُزَاعِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَبَّابٍ مَوْلَى عُقْبَةَ بْنِ غَزْوَانَ وَبِسَيِّدِنَا خُزَيْمِ بْنِ فَاتِكِ نِ الْأَسَدِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خِرَاشِ بْنِ الصِّمَّةِ الْأَنْصَارِيِّ السُّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَوْلِيِّ بْنِ خَوْلِيِّ الْعَجْلِيِّ الْجُعْفِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خُبَيْبِ بْنِ إِسَافِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَوَّاتِ بْنِ جُبَيْرِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خُثَيْمَةَ بْنِ الْحَارِثِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خَلِيفَةَ بْنِ عَدِيِّ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا خُلَيْدَةَ بْنِ قَيْسِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ذَكْوَانَ بْنِ عَبْدِ قَيْسِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ذِي مِخْبَرِ نِ الْجُشَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا ذِي الشِّمَالَيْنِ الْخُزَاعِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رَافِعِ بْنِ مَالِكِ نِ الْأَنْصَارِيِّ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رَافِعِ بْنِ الْحَارِثِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رَافِعِ بْنِ الْمُعَلَّى الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رَافِعِ بْنِ عَنْجَدَةَ الْأَنْصَارِيِّ الْعَوَامِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رَافِعِ بْنِ سَهْلِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رَافِعِ بْنِ زَيْدِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رِفَاعَةَ بْنِ عَمْرِو نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رِفَاعَةَ بْنِ الْحَارِثِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رِفَاعَةَ عَمْرِو الْجُهَنِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رَبِيعَةَ بْنِ أَكْثَمَ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا رَبِيعِ بْنِ إِيَاسِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَأَخِيهِ وَبِسَيِّدِنَا رُجَيْلَةَ بْنِ ثَعْلَبَةَ الْأَنْصَارِيِّ الْبَيَاضِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زَيْدِ ابْنِ الْخَطَّابِ الْعَدَوِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ الْكَلْبِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ الْعَجْلَانِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زَيْدِ بْنِ الدَّثِنَةِ الْأَنْصَارِيِّ الْبَيَاضِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زَيْدِ بْنِ عَاصِمِ نِ الْمَازِنِيِّ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زَيْدِ بْنِ لَبِيدِ نِ الْأَنْصَارِيِّ الْبَيَاضِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زِيَادِ بْنِ عَمْرِو نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زِيَادِ بْنِ كَعْبِ نِ الْأَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا زَاهِرِ بْنِ حَرَامِ نِ الْأَشْجَعِيِّ وَبِسَيِّدِنَا طُلَيْبِ بْنِ عَمْرِو الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الطُّفَيْلِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُطَّلِبِيِّ وَأَخِيهِ قُتِلَ يَوْمَ بَدْرٍ

وَبِسَيِّدِنَا الطُّفَيْلِ بْنِ مَالِكِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا كَعْبِ ابْنِ عَمْرِو نِ الْاَنْصَارِيِّ السَّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا كَعْبِ بْنِ زَيْدِ نِ النَّجَّارِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا كَعْبِ بْنِ حَمَّارِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا كَفَّازِبْنِ حِصْنِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُحَمَّدِ بْنِ مُسْلِمَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُعَاذِ بْنِ عَفْرَاءَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَوْفِ بْنِ الْعَفْرَاءِ وَقُتِلَ يَوْمَ بَدْرٍ وَبِسَيِّدِنَا مُعَوِّذٍ وَبِسَيِّدِنَا مُعَاذِ بْنِ مَاعِصِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَالِكِ بْنِ عُمَيْلَةَ الْعَبْدَرِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَالِكِ بْنِ قُدَامَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَالِكِ بْنِ رَافِعِ الْعُجْلَانِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَالِكِ بْنِ عَمْرِو نِ السَّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَالِكِ بْنِ اُمَيَّةَ بْنِ عَمْرِو نِ السَّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَالِكِ ابْنِ اَبِيْ خَوْلِى الْعِجْلَانِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَالِكِ بْنِ نُمَيْلَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَعْمَرِ بْنِ الْحَارِثِ الْجُمَحِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُحْرِزِبْنِ لَضْلَةَ الْاَسَدِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُحْرِزِبْنِ عَامِرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَعْنِ بْنِ يَزِيْدَ السَّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مَعْبَدَ ابْنِ قَيْسِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْمُنْذِرِبْنِ عَمْرِو نِ الْاَنْصَارِيِّ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْمُنْذِرِ بْنِ الْاَوْسِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْمُنْذِرِبْنِ قُدَامَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُعَتِّبِ بْنِ حَمْرَآءِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُعَتِّبِ بْنِ بَشِيْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُصْعَبِ ابْنِ عُمَيْرِ نِ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُبَشِّرِبْنِ عَبْدِالْمُنْذِرِ الْاَوْسِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مُلَيْلِ بْنِ وَبْدَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا مِهْجَعِ بْنِ صَالِحٍ مَوْلٰى عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ وَبِسَيِّدِنَا مِدْرَاجِ بْنِ عَمْرِو نِ السَّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا نَوْفَلِ بْنِ ثَعْلَبَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا النُّعْمَانَ بْنِ عَبْدِ نِ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا النُّعْمَانِ بْنِ اَبِيْ خَزْمَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا النُّعْمَانِ بْنِ عَمْرِو نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا النُّعْمَانِ ابْنِ اَبِيْ خَزْمَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا النُّعْمَانِ بْنِ سِنَانِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا نَضْرِبْنِ الْحَارِثِ الْاَنْصَارِيِّ الظَّفَرِيِّ وَبِسَيِّدِنَا نَحَاثِ بْنِ ثَعْلَبَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا نُعَيْمَانَ بْنِ عَمْرٍو النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا صُهَيْبِ بْنِ سِنَانِ الرُّوْمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا صَفْوَانَ ابْنِ اُمَيَّةَ بْنِ عَمْرِو نِ السَّلَمِيِّ وَاَخِيْهِ مَالِكِ بْنِ اُمَيَّةَ وَبِسَيِّدِنَا الضَّحَّاكِ بْنِ حَارِثَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الضَّحَّاكِ بْنِ عَبْدِالْاَنْصَارِيِّ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ ثَعْلَبَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جُبَيْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْحُمَيْرِ الْاَسْبَعِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ رَوَاحَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ رَافِعِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ رَبِيْعِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ طَارِقِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ كَعْبِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَظْعُوْنِ الْجُمَحِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ النُّعْمَانِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلُوْلَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَرَامِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَامِرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَيْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَسَ الْخَزْرَجِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَعْدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَمَةَ الْعَجْلَانِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ كَعْبِ نِ الْمَازِنِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ جُبَيْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَهْلِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عُبَيْدِبْنِ اَوْسٍ وَبِسَيِّدِنَا عُبَيْدِبْنِ زَيْدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِرَبِّهٖ ابْنِ حَقِّ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبَّادِبْنِ عُبَيْدِ نِ التَّيْهَانِ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِ يَالِيْلِ بْنِ نَاشِبِ نِ اللَّيْثِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبَّادِ بْنِ قَيْسِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا حُمَيْرِبْنِ حَرَامِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَمْرِو ابْنِ قَيْسِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَمْرِو بْنِ ثَعْلَبَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُفْيَانَ بْنِ بِشْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَالِمِ بْنِ عُمَيْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سِنَانِ بْنِ سِنَانِ نِ الْاَسَدِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سِمَاكِ بْنِ خَرْشَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَهْلِ بْنِ عَتِيْكِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُهَيْلِ ابْنِ رَافِعِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا السَّآئِبِ بْنِ مَظْعُوْنِ الْجُمَحِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اُبَيِّ بْنِ الْكَعْبِ الْاَنْصَارِيِّ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ مُعَاذِ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اُسَيْرَةَ بْنِ عَمْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَامِرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عُكَاشَةَ بْنِ مِحْصَنِ نِ الْاَسَدِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَتِيْكِ بْنِ التَّيْهَانِ الْاَنْصَارِيِّ

وَبِسَيِّدِنَا عَشْرَةَ السَّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَاقِلِ بْنِ الْبُكَيْرِ وَبِسَيِّدِنَا فَرْوَةَ بْنِ عَمْرِوِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا غَنَّامِ بْنِ اَوْسِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا الْفَاكِهِ بْنِ بِشْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا قَيْسِ بْنِ مَخْلَدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا قَيْسِ بْنِ مِحْصَنِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا قَيْسِ بْنِ اَبِيْ صَعْصَعَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا قُطْبَةَ بْنِ عَامِرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَعْدِبْنِ خَيْثَمَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَعْدِبْنِ عُثْمَانَ الْاَنْصَارِيِّ الزُّرَقِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَعْدِبْنِ زَيْدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ الْاَشْهَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُفْيَانَ بْنِ بِشْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَالِمِ بْنِ عُمَيْرِ نِ الْعَوْفِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُلَيْمِ بْنِ عَمْرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُلَيْمِ بْنِ الْحَارِثِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُلَيْمِ ابْنِ قَيْسِ بْنِ فَهْدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُلَيْمِ بْنِ مِلْحَانَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَلَمَةَ ابْنِ سَلَامَةَ الْاَنْصَارِيِّ الْاَشْهَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُهَيْلِ بْنِ عَمْرِوِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَلَمَةَ بْنِ ثَابِتِ نِ الْاَنْصَارِيِّ الْاَشْهَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُهَيْلِ بْنِ بَيْضَآءَ الْقُرَشِيِّ الْفِهْرِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُوَيْدِبْنِ مَخْشِيِّ الطَّآئِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُلَيْطِ بْنِ عَمْرِوِ نِ الْعَامِرِ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُلَيْطِ بْنِ قَيْسِ نِ الْاَنْصَارِيِّ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُرَاقَةَ بْنِ كَعْبِ الْاَنْصَارِيِّ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُرَاقَةَ بْنِ عَمْرِوِ نِ الْاَنْصَارِيِّ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَوَّادِ بْنِ غَزِيَّةَ الْاَنْصَارِيِّ السَّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَعِيْدِبْنِ سُهَيْلِ نِ الْاَنْصَارِيِّ الْاَشْهَلِيِّ وَبِسَيِّدِنَا شَمَّاسِ بْنِ عُثْمَانَ الْمَخْزُوْمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا شُجَاعِ بْنِ اَبِيْ وَهْبِ نِ الْاَسَدِيِّ حَلِيْفِ عَبْدِ شَمْسٍ وَبِسَيِّدِنَا هَانِيءِ بْنِ نِيَارِ نِ الْاَسَدِيِّ وَبِسَيِّدِنَا هِلَالِ بْنِ الْمُعَلَّى الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا هِلَالِ بْنِ خَوْلِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا هُمَامِ بْنِ الْحَارِثِ وَبِسَيِّدِنَا وَهْبِ بْنِ اَبِيْ شَرْحِ نِ الْفِهْرِ نِ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا وَدِيْعَةَ بْنِ عَمْرِوِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا يَزِيْدِبْنِ الْحَارِثِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا يَزِيْدِبْنِ ثَابِتِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِي الْحُمَرَآءِ مَوْلٰى آلِ عَفْرَاءَ وَبِسَيِّدِنَا اَبِي الْخَالِدِ الْحَارِثِ بْنِ قَيْسِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ خُذَيْمَةَ بْنِ اَوْسِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سُلَيْمِ اَبِيْ كَبْشَةَ مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَوْسِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ مُلَيْلِ نِ الضَّبْعِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِي الْمُنْذِرِ ابْنِ يَزِيْدَبْنِ عَامِرِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ نَمْلَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ عُبَيْدَةَ بْنِ الْجَرَّاحِ الْفِهْرِيِّ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ يَزِيْدِ بْنِ ثَعْلَبَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ عَيْشِ نِ الْحَارِثِيِّ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا يَزِيْدِ بْنِ الْاَخْنَسِ السَّلَمِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ اُسَيْدِ نِ السَّاعِدِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ اِسْرَآئِيْلَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِي الْاَعْوَرِ بْنِ الْحَارِثِ الْاَنْصَارِيِّ النَّجَّارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَعْدِ بْنِ سُهَيْلِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سَعْدِ بْنِ خَوْلَةَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ الْاَوَّلِيْنَ وَبِسَيِّدِنَا سَعْدِبْنِ خَوْلِيِّ مَوْلٰى حَاطِبِ بْنِ اَبِيْ بَلْتَعَةَ وَبِسَيِّدِنَا سَالِمٍ مَّوْلٰى اَبِيْ حُذَيْفَةَ وَبِسَيِّدِنَا سَلَمَةَ بْنِ حَاطِبِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ مُرْثَدِ نِ الْغَنَوِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ مَسْعُوْدِ نِ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ فُضَالَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَمَّارِبْنِ يَاسِرِ نِ الْمُهَاجِرِيِّ بِسَيِّدِنَا طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِاللّٰهِ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا اَبِيْ فُضَالَةَ الْاَنْصَارِيِّ وَبِسَيِّدِنَا عَمَّارِبْنِ يَاسِرِ نِ الْمُهَاجِرِيِّ وَبِسَيِّدِنَا طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِاللّٰهِ الْقُرَشِيِّ وَبِسَيِّدِنَا سِمَاكِ بْنِ سَعْدِ نِ الْخَزْرَجِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ اَللّٰهُمَّ لَا تَدَعْ لَنَا ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا دَيْنًا اِلَّا قَضَيْتَهٗ وَلَا حَاجَةً مِنْ حَوَآئِجِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

بَابُ ذِكْرِ الْيَمَنِ وَالشَّامِ وَذِكْرِ اُوَيْسِ الْقَرَنِيِّ

یمن اور شام اور اویس قرنی کے ذکر کا باب

''یمن'' ان شہروں اور بستیوں کو کہتے تھے جن کا محل وقوع خانہ کعبہ کے دائیں سمت پڑتا تھا، اب یہ ایک مشہور تاریخی ملک کی حیثیت

سے جانا جاتا ہے جو جزیرہ نمائے عرب کے جنوب مغربی گوشہ پر واقع ہے۔ گو موجود عہد میں یمن ان تمام خطوں پر مشتمل نہیں ہے، جن پر عہد سابق میں مشتمل تھا، تاہم اس وقت کے مرکزی اور بڑے حصے اب بھی یمن ہی میں شامل ہیں۔ جو چیز یا جو شخص یمن کی طرف منسوب ہو اس کو "یمنی" بھی کہتے ہیں، "یمان" بھی کہتے ہیں اور "یمانی" بھی، بعض حضرات اس لفظ (یمانی) کو ی کی تشدید کے ساتھ "یمانی" بھی بیان کرتے ہیں۔

"شام" ان شہروں اور بستیوں کو کہا جاتا تھا جن کا محل وقوع خانہ کعبہ کے بائیں سمت پڑتا تھا کیونکہ عربی میں شام بائیں جانب کو کہتے ہیں جیسا کہ دائیں طرف کو یمین یا ایمن کہا جاتا ہے، شام اور مشام کا لفظ ہمزہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور ہمزہ کے بغیر بھی، شام اب بھی ایک مشہور ملک کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

"قرن" (ق اور ر کے زبر کے ساتھ) ایک بستی کا نام ہے جو یمن میں واقع ہے، یہ بستی ایک شخص قرن بن رومان بن نامیہ بن مراد کے نام منسوب تھی، جو حضرت اویس قرنی کے اجداد میں سے تھا۔ ایک قرن اور ہے (جس کو اب قرن المنازل کہا جاتا ہے) لیکن یہ "قرن" ر کے جزم کے ساتھ "قرن" ہے، یہ دراصل ایک پہاڑی کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے تقریباً بیس تیس میل کے فاصلے پر مشرقی جانب نجد جانے والے راستہ پر واقع ہے۔ اہل نجد کی میقات یہی قرن ہے، جوہری نے جو اس "قرن" کو ر کے زبر کے ساتھ لکھا ہے اور حضرت اویس قرنیؒ کو اسی قرن کی طرف منسوب کیا ہے وہ ان کی غلط فہمی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضرت اویس قرنیؒ کی فضیلت

① عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ رَجُلاً يَّاْتِيْكُمْ مِنَ الْيَمَنِ يُقَالُ لَهٗ اُوَيْسٌ لَا يَدَعُ بِالْيَمَنِ غَيْرَ اُمٍّ لَهٗ قَدْ كَانَ بِهٖ بَيَاضٌ فَدَعَا اللّٰهَ فَاَذْهَبَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ الدِّيْنَارِ اَوِ الدِّرْهَمِ فَمَنْ لَقِيَهٗ مِنْكُمْ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ خَيْرَ التَّابِعِيْنَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهٗ اُوَيْسٌ وَّلَهٗ وَالِدَةٌ وَّكَانَ بِهٖ بَيَاضٌ فَمُرُوْهُ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ایک شخص یمن سے تمہارے پاس آئے گا جس کا نام اویس ہوگا، وہ یمن میں اپنی ماں کے سوا کسی کو نہیں چھوڑے گا، اس کے بدن میں سفیدی (یعنی برص کی بیماری) تھی۔ اس نے اللہ سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بدن سے سفیدی کو ختم کر دیا ہاں صرف ایک درہم یا ایک دینار کے بقدر سفیدی باقی رہ گئی ہے۔ پس تم میں سے جو شخص اس (اویس) سے ملے اس کو چاہئے کہ اس سے اپنے لئے مغفرت کی دعا کرائے، ایک اور روایت میں یوں ہے کہ (حضرت عمرؓ نے بیان کیا کہ) میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، تابعین میں بہتر شخص وہ ہے جس کا نام اویسؒ ہے اس کی ایک ماں ہوگی اور اس کے بدن پر برص کا نشان ہے، پس تم اس سے اپنے لئے دعائے مغفرت کرانا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "وہ یمن میں اپنی ماں کے سوا" ان الفاظ سے آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ اہل و عیال میں سے صرف ایک ماں کے علاوہ اور کوئی یمن میں اس کا نہیں ہے اور اسی ماں کی خدمت و خبر گیری نے اس کو یمن سے چل کر یہاں میری زیارت و ملاقات کے لئے آنے سے باز رکھا ہے۔ اگر اس کو اپنی ماں کی تنہائی اور بے کسی کا فکر نہ ہوتا تو وہ ضرور میری خدمت میں حاضر ہوتا اور میری زیارت و صحبت کا شرف حاصل کرتا۔

"ایک درہم یا ایک دینار کے بقدر" یہاں راوی کو شک ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک درہم کے بقدر فرمایا تھا یا ایک دینار کے بقدر کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے، بہر حال دعا کے نتیجہ میں برص کا ختم ہو جانا اور ایک درہم یا ایک دینار کے بقدر معمولی سا نشان باقی رہ

جانا شاید قدرت کی اس مصلحت کے تحت ہوگا کہ اس مرض کی کچھ نہ کچھ علامت باقی رہے جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا بہشتی لباس سفیدی اور چمک میں ناخون کی طرح تھا جو کبھی میلا نہیں ہوتا تھا پھر دنیا میں آنے کے بعد ان میں بھی اور نسل میں بھی اسی لباس کا ذرا سا نشان ناخون کی صورت میں باقی رہ گیا، اور یا اللہ تعالیٰ نے ان کے جسم پر برص کا وہ تھوڑا سا نشان اس مصلحت سے باقی رہنے دیا ہو کہ وہ شرم کے مارے لوگوں میں خلط ملط رکھنے سے باز رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت اویس قرنیؒ گوشہ نشینی اور گمنامی کو اختیار کئے ہوئے تھے، لوگوں کے درمیان خلط ملط رکھنے اور شہرت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ خود انہوں نے دعا کی تھی کہ پروردگارا میرے جسم پر اس مرض کا تھوڑا سا نشان باقی رکھئے تاکہ اس کو دیکھ کر میں تیری اس نعمت کو یاد رکھوں اور اس کا شکر ادا کرتا رہوں کہ تو نے مجھے اس برے مرض سے نجات عطا فرمائی "تابعین میں سے بہترین شخص" حضرت اویسؒ کو آنحضرت ﷺ نے بہترین تابعی اس اعتبار سے فرمایا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور عذر شرعی نے ان کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے سے باز رکھا تھا ظاہر ہے کہ ان الفاظ میں حضرت اویسؒ کی مدح و تعریف ہے نیز اس ارشاد رسالت سے معلوم ہوا کہ اہل خیر و صلاح سے دعائے مغفرت کی درخواست کرنی چاہئے اگرچہ درخواست کرنے والا ان اہل خیر و صلاح سے افضل ہو۔

اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ تعریفی الفاظ حضرت اویس قرنیؒ کا دل خوش کرنے کے لئے ارشاد فرمائے تھے اور اس کا مقصد ان لوگوں کے واہمہ کا دفعیہ تھا جو شاید یہ سمجھ بیٹھے کہ اویسؒ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے اور شرف زیارت وصحبت حاصل کرنے سے قصداً اعراض کر رہا ہے۔ حالانکہ خدمت رسالت میں ان کے حاضر نہ ہونے کی وجہ ماں کی دل داری اور ماں کی خدمت و خبر گیری کا عذر شرعی تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تابعین میں سب سے بہتر حضرت اویس قرنیؒ ہیں جب کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے منقول ہے کہ تابعین میں سب سے بہتر اور افضل سعید بن مسیبؒ ہیں، لیکن ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ حضرت سعید بن مسیبؒ تو علوم دین اور احکام شرائع کی معرفت سب سے زیادہ رکھنے کے سبب تابعین میں افضل ہیں اور اللہ کے نزدیک ثواب کی کثرت کے اعتبار سے حضرت اویس قرنیؒ تابعین میں افضل ہیں اور قاموس میں جو یہ لکھا ہے کہ اویس بن عامر قرنیؒ سادات تابعین میں سے ہیں، تو ہو سکتا ہے کہ حدیث کے الفاظ بھی اسی معنی پر محمول ہیں۔

حضرت اویس قرنیؒ کی شان میں جو اور آثار و اخبار منقول ہیں اور جن کو سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع الجوامع میں ذکر کیا ہے، ان کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سیوطیؒ کہتے ہیں کہ اسیر بن جابرؒ نے بیان کیا، جب تک حضرت اویسؒ قرنی، حضرت عمر فاروقؓ کے پاس نہیں پہنچے تھے، وہ (عمر فاروقؓ) یمن سے آنے والے ہر اسلامی لشکر اور قافلے سے پوچھا کرتے تھے کہ کیا تمہارے ہاں کوئی شخص اویس بن عامر ہے، اور جب حضرت اویسؒ دربار فاروقی میں پہنچے تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا! کیا تم اویس بن عامر ہو؟ وہ بولے: ہاں میں اویس بن عامر ہوں! پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیا تم قبیلہ مراد سے تعلق رکھتے ہو اور قرنی ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تم کو برص کا مرض لاحق تھا اور پھر تم اچھے ہو گئے سوائے ایک درہم کے بقدر نشان کے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تمہاری ایک ماں ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! تب حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا! میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تمہارے پاس ایک شخص اویس بن عامرؓ اہل یمن کے اسلامی لشکر اور قافلے کے ساتھ آئے گا جو قبیلہ مراد سے تعلق رکھتا ہوگا اور قرن کا ہوگا، اس کو برص کا مرض لاحق تھا جو اب جاتا رہا ہے مگر ایک درہم کے بقدر نشان باقی رہ گیا ہے، اس کی ایک ماں ہے جن کی خدمت و خبر گیری میں مصروف ہے۔ (ان کی شان یہ ہے کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر کسی بات پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم سچی کرتا ہے، اگر تم

سے ہو سکے اس سے دعاء مغفرت کی درخواست کرنا۔ پس اے اویسؒ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے لئے دعاء مغفرت کرو۔ (یہ سن کر) حضرت اویسؒ بولے: امیر المؤمنین! یہ آپ کیا فرمارہے ہیں مجھ جیسا آدمی آپ کے لئے دعاء مغفرت کرے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: یقیناً تمہیں میرے لئے دعا مغفرت کرنی ہے۔ تب حضرت اویس قرنیؒ نے فاروق اعظم کے لئے دعاء مغفرت کی۔ پھر فاروق اعظمؓ نے پوچھا کہ: اویس! اب بتاؤ کہاں جانا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں کوفہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیا تمہارے بارہ میں کوفہ کے حاکم کو کچھ لکھ دوں؟ حضرت اویسؒ بولے بس مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیجئے، میں لوگوں سے دور اور درماندہ بنا ہی اپنے لئے زیادہ اچھا سمجھتا ہوں اور یہ کہہ کر وہاں سے چل دیئے۔ اگلے سال (کوفہ سے) ایک یمنی معزز شخص حج کے لئے آیا اور حضرت عمرؓ کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو حضرت عمرؓ نے اس سے حضرت اویسؒ کے بارے میں پوچھا کہ کس حال میں ہیں؟ اس شخص نے بتایا کہ میں نے ان کو بہت پھٹے پرانے کپڑوں اور بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑا ہے، حضرت عمرؓ نے اس کے سامنے آنحضرت ﷺ کی مذکورہ حدیث پڑھی۔ چنانچہ وہ شخص جب واپس حضرت اویسؒ کے پاس پہنچا تو ان سے دعائے مغفرت کی درخواست کی حضرت اویسؒ نے اس سے کہا کہ تم بھی میرے لئے دعاء مغفرت کرو کیونکہ تم نیک سفر سے واپس آئے ہو، اس شخص نے پھر کہا کہ آپ میرے لئے دعاء مغفرت کیجئے اور اس کے ساتھ اس نے حضرت عمرؓ کی روایت کردہ حدیث ان کے سامنے پڑھی، تب حضرت اویسؒ نے اس کے لئے دعائے مغفرت کی، اس کے بعد جب لوگوں کو حضرت اویسؒ کا مقام معلوم ہوا اور ان کی حقیقت حال کا چرچا ہوا تو وہاں سے چلے گئے۔

ایک اور روایت میں یوں ہے: اسیر بن جابرؓ نے بیان کیا کہ کوفہ میں ایک محدث تھے جو ہمارے سامنے احادیث بیان کرتے تھے، جب وہ حدیثیں بیان کر کے فارغ ہوتے تو لوگ منتشر ہو جاتے تھے مگر چند آدمی اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے اور ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو بڑی عجیب وغریب باتیں کرتا تھا ویسی باتیں مجھ کو کسی کی زبان سے سننے کا موقع نہیں ملتا تھا، چنانچہ میں اس کے پاس بھی جا کر بیٹھ جایا کرتا تھا، ایک دن میں نے اس شخص کو اس کی جگہ پر نہیں پایا تو اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص اس آدمی کو بھی جانتا ہے جو یہاں ہمارے ساتھ بیٹھا کرتا تھا اور بڑی عجیب وغریب باتیں کیا کرتا تھا، ایک شخص بولا کہ ہاں میں اس آدمی کو جانتا ہوں، وہ اویس قرنیؒ ہیں، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم ان کی قیام گاہ جانتے ہو! وہ بولا کہ ہاں جانتا ہوں چنانچہ میں اس شخص کے ساتھ ہو لیا اور اویس قرنیؒ کے حجرہ پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر نکلے تو میں نے پوچھا کہ میرے بھائی! ہمارے درمیان موجود رہنے سے کس چیز نے تمہیں باز رکھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا عریانیت نے، یعنی میرے پاس اتنے کپڑے نہیں ہیں جس سے اپنے جسم اور ستر کو پوری طرح چھپائے رکھوں اور اسی وجہ سے تم لوگوں کے درمیان آنے سے بچ رہا ہوں، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ہموطن اور ان کے اردگرد کے لوگ ان کی خستہ حالی کو دیکھ کر ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور ان کو ستانے سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔ بہرحال میں نے اپنی ایک چادر ان کو پیش کی اور کہا کہ لیجئے یہ چادر اوڑھ لیجئے، انہوں نے کہا کہ نہیں تم یہ چادر مجھ کو مت دو اور جب لوگ میرے جسم پر اس چادر کو دیکھیں گے تو میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھ کو ستائیں گے، تاہم میں نے جب بہت اصرار کیا تو انہوں نے وہ چادر لے کر اوڑھ لی اور پھر اپنے حجرہ سے نکل کر لوگوں کے درمیان باہر آئے، لوگوں نے ان کو چادر میں دیکھا تو کہنا شروع کیا کہ میاں کس کو دھوکہ دے دیا، کس سے یہ چادر ہتھیالی ہے۔ حضرت اویسؒ نے یہ سن کر مجھ سے کہا کہ تم دیکھ رہے ہو، لوگ کیا کہہ رہے ہیں اسی خوف سے میں یہ چادر نہیں لے رہا تھا، میں نے ان لوگوں کو ڈانٹا کہ آخر تم اس درویش سے کیا چاہتے ہو کاہے کو اس کو ستا رہے ہو یہ بھی ایک انسان ہے جو کبھی بے لباس رہنے پر مجبور ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ دیتا ہے تو لباس میں نظر آنے لگتا ہے، غرضیکہ میں نے ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہٹا دیا، پھر ایسا اتفاق ہوا کہ کچھ دنوں بعد کوفہ سے چند لوگ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں ایک وہ شخص بھی تھا جو حضرت اویسؒ قرنی کا مذاق اڑایا کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے دوران گفتگو ان لوگوں سے پوچھا کہ کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس کا تعلق قرن سے ہو، ان لوگوں نے اس شخص

کو آگے کر دیا جو حضرت اویسؒ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پہلے تو اس کے سامنے وہ حدیث پڑھی جو آنحضرت ﷺ نے حضرت اویسؒ کی شان میں فرمائی تھی اور پھر اس شخص سے بولے کہ میں نے سنا ہے کہ وہ یمنی شخص (یعنی اویسؒ) کوفہ میں تم لوگوں کے ہاں پہنچا ہوا ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ہمارے تو ایسا شخص کوئی نہیں ہے اور نہ ہم کسی ایسے شخص کو پہچانتے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں ہو گا لیکن وہ شخص تمہارے ہی ہاں ہے اور پھر اس کی علامت بتلائی کہ وہ اس طرح خراب وخستہ حال ہے تب اس شخص نے کہا کہ ہاں ایک شخص ہمارے ہاں ہے، اس کا نام اویسؒ ہے اور ہم اس کا مذاق بھی اڑایا کرتے ہیں حضرت عمرؓ نے اس شخص سے فرمایا: اب تم کوفہ جاؤ تو اس شخص سے ضرور ملنا (اور اپنی گستاخیوں و بے ادبیوں کی معافی چاہ کر اس سے دعائے مغفرت کی درخواست کرنا) اگرچہ مجھ کو شبہ ہے کہ اب تم اس کو پاؤ گے بھی یا نہیں، بہر حال وہ شخص کوفہ روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر اپنے گھر والوں کے پاس بعد میں گیا، پہلے حضرت اویس قرنیؒ کی خدمت میں پہنچا۔ حضرت اویسؒ نے اس شخص کو دیکھا تو بولے میرے تئیں تمہارے رویہ میں یہ تبدیلی کیسی؟ اس شخص نے کہا میں نے آپ کی تعریف امیر المؤمنین سے سنی ہے، آپ کے بارہ میں انہوں نے مجھ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ للہ! آپ مجھ کو معاف فرما دیجئے، مذاق اڑانے گستاخی کرنے والے اور بے ادبی کے ساتھ پیش آنے کی صورت میں میں نے آپ کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے اس سے درگزر فرمائیے، اور میرے لئے دعائے مغفرت کیجئے۔ حضرت اویسؒ نے اس سے کہا کہ میں تمہارے لئے دعائے مغفرت کئے دیتا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ تم نے میرے بارہ میں امیر المؤمنین حضرت عمرؓ سے جو کچھ سنا ہے اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گے، اس کے بعد انہوں نے دعائے مغفرت کی۔

اسیر ابن جابرؒ جو اس کے راوی ہیں بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت اویسؒ کا مقام کوفہ والوں کو معلوم ہوا۔

ایک اور روایت میں حضرت یحیٰی بن سعید المسیبؒ سے اور وہ حضرت امیر المؤمنین عمر فاروقؓ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیان کیا: ایک دن رسول کریم ﷺ نے مجھ کو آواز دی کہ اے عمرؓ! میں بولا، یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں، جو حکم بجا لانے کو تیار ہوں، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب مجھ کو آواز دی تو میں نے گمان کیا کہ آپ ﷺ کسی کام سے مجھ کو کہیں بھیجیں گے، لیکن پھر آپ ﷺ نے مجھ سے یوں فرمایا: اے عمرؓ! میرے اُمت میں ایک شخص ہو گا جس کو اویس کہا جائے گا، اس کے بدن کو ایک بلا یعنی برص کی بیماری لاحق ہو گی، وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی اس بیماری کو دور کر دے گا مگر اس کا کچھ داغ اس کے پہلو پر باقی رہ جائے گا تم اس کو دیکھو گے تو تمہیں عزوجل یاد آ جائے گا۔ جب تم اس سے ملنا تو اس کو میرا اسلام پہنچانا اور اس سے اپنے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کرنا کیونکہ وہ اپنے پروردگار کے ہاں ایسا معزز اور ایسا بزرگ ہے کہ اگر اللہ کے بھروسہ پر کسی بات پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم سچی کرے وہ اللہ تعالیٰ سے اتنے زیادہ لوگوں کی شفاعت کرے گا جتنے ربیعہ اور مضر جیسے کثیر القوم قبیلوں میں بھی افراد نہیں ہیں حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ یہ ارشاد رسالت سننے کے بعد میں نے اس شخص کی تلاش آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی کی مگر اس شخص کو نہیں پا سکا، پھر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں بھی اس شخص کی ٹوہ میں رہا، مگر اس تک نہیں پہنچ سکا اور پھر جب میرا عہد امارت و خلافت آیا تو میں اور زیادہ تلاش و جستجو میں لگ گیا یہاں تک کہ مختلف شہروں اور علاقوں سے جو بھی قافلے آتے تو میں ہر ایک سے یہی سوال کرتا کہ کیا تم میں کوئی شخص ایسا بھی ہے جس کا نام اویسؒ ہو، قبیلہ مراد سے تعلق رکھتا ہو اور قرن کا ہو، اسی تلاش و جستجو کے دوران قرن سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ امیر المؤمنین آپ جس شخص کو پوچھتے ہیں وہ میرے چچا کا بیٹا ہے لیکن وہ تو نہایت خستہ حال کم رتبہ اور بے حیثیت شخص ہے، بھلا وہ اس درجہ کا کب ہے کہ آپ جیسی ہستی عظیم اس کا حال دریافت کرے۔ میں نے اس شخص سے کہا کہ مجھ کو ایسا لگ رہا ہے کہ تو اس آدمی کی شان میں ایسے حقارت آمیز الفاظ استعمال کر کے ان لوگوں میں سے ہے جو اس کے تئیں گستاخانہ رویہ اختیار کرنے کے سبب ہلاکت میں پڑنے والے ہیں۔ میں اس شخص سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک اونٹ آتا دکھائی دیا جس پر ایک بوسیدہ پالان بندھا ہوا تھا اور اس پالان میں ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا جس نے پھٹے

پرانے کپڑوں سے اپنے جسم کا کچھ حصہ ڈھک رکھا تھا، اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں آیا کہ یہی شخص اویس ہے، پھر میں اس کی طرف لپکا اور اس سے پوچھا بندۂ خدا! کیا تم وہی اویس قرنی ہو؟ اس شخص نے جواب دیا، ہاں! میں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے تمہیں سلام کہا تھا: وہ شخص بولا: علی رسول اللہ السلام وعلیک یا امیر المؤمنین، اس کے بعد میں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ کا یہ حکم ہے کہ تم میرے لئے دعائے مغفرت کرو۔ اس کے بعد میرا معمول ہو گیا کہ ہر سال حج کے موقع پر اویس سے ملاقات کرتا، اپنے احوال واسرار ان سے بیان کرتا اور وہ اپنے حال و اسرار مجھ سے بیان کرتے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت حسن بصری نے بیان کیا: جب حج کے دنوں میں قرن کے لوگ آئے تو امیر المؤمنین عمرؓ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے ہاں کوئی شخص اویس نامی ہے، ان میں سے ایک شخص بولا کہ امیر المؤمنین، بھلا اس شخص سے آپ کا کیا واسطہ؟ وہ تو ایک ایسا شخص ہے جو کھنڈرات میں پڑا رہتا ہے اور لوگوں کے درمیان آنے جانے سے اجتناب کرتا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: جب تم واپس جاؤ تو اس کو میرا سلام پہنچانا اور اس سے کہنا کہ مجھ سے ملاقات کرے۔ اس شخص نے واپس جا کر حضرت عمرؓ کا پیغام پہنچا دیا اور حضرت اویس امیر المؤمنین! حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا اویس تم ہی ہو؟ وہ بولے: ہاں: اے امیر المؤمنین! حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیا تمہارے بدن پر سفیدی تھی اور تم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اس سفیدی کو تمہارے بدن سے دور کر دیا تھا اور پھر تم نے یہ دعا کی تھی کہ اس سفیدی کا کچھ نشان باقی رہے؟ اویس بولے ہاں: لیکن اے امیر المؤمنین یہ سب کچھ آپ کو کس نے بتایا؟ حضرت عمرؓ نے کہا: مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا تھا اور مجھ کو حکم دیا تھا کہ میں تم سے اپنے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کروں، چنانچہ حضرت اویس نے حضرت عمرؓ کے لئے مغفرت کی دعا کی اور پھر بولے کہ اے امیر المؤمنین! آپ سے بس اتنا چاہتا ہوں کہ آپ میری شخصیت اور میرے احوال کو پوشیدہ رکھیں، اور مجھ کو یہاں سے واپس جانے کی اجازت عطا فرمائیں، چنانچہ حضرت اویس نے ہمیشہ اپنے آپ کو چھپائے رکھا تا آنکہ جنگ نہاوند میں شہید ہوئے۔

ایک روایت میں سعید بن مسیب نے اس طرح بیان کیا کہ (ایک سال حج کے موقعہ پر) امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے منیٰ میں منبر پر کھڑے ہوئے آواز دی: اے اہل قرن! معمر قرنی لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: ہم حاضر ہیں اے امیر المؤمنین! کیا حکم ہے امیر المؤمنین عمرؓ نے پوچھا: کیا قرن میں کوئی ایسا شخص ہے جس کا نام اویس ہے؟ ان میں سے ایک معمر شخص نے جواب دیا، ہم لوگوں کے درمیان رہنے والا کوئی شخص اس نام کا نہیں ہے، ہاں ایک دیوانہ صفت شخص کا نام اویس ضرور ہے جو جنگلوں میں رہتا ہے نہ کوئی اس کے ساتھ الفت و موانست رکھتا ہے اور نہ خود وہ کسی کے ساتھ صحبت و اختلاط کا روادار ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا، بس وہی شخص میرا مطلوب ہے، جب تم قرن واپس جاؤ تو اس شخص کو تلاش کر کے میرا سلام اس کو پہنچا دینا اور کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو تمہارے تئیں خوشخبری دی ہے اور مجھ کو حکم دیا تھا کہ میں تم تک رسول اللہ ﷺ کا سلام پہنچاؤں، چنانچہ جب وہ لوگ قرن پہنچے تو اویس کو تلاش کیا، وہ ریگستانوں میں پڑے ہوئے پائے گئے، ان لوگوں نے ان کو حضرت عمرؓ کا سلام اور ان کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کا سلام پہنچا دیا، حضرت اویس بولے: امیر المؤمنین نے تو میرا چرچا کر دیا اور میرے نام کو شہرت دے دی۔ السلام علی رسول اللہ ﷺ وعلیٰ آلہ اور یہ کہہ کر لق ودق جنگل میں جا گھسے اور مدتوں کسی نے ان کا نام ونشان نہیں پایا یہاں تک کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں پھر نمودار ہوئے اور ان کی طرف سے لڑتے ہوئے جنگ صفین میں شہید ہو گئے۔

صعصہ بن معویہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس طرح ہے کہ انہوں نے بیان کیا اہل کوفہ کا کوئی بھی قافلہ جب حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آتا تو وہ اس سے پوچھتے کہ کیا تم لوگ اویس بن عامر قرنی کو جانتے ہو، اہل قافلہ جواب دیتے! ہم میں سے کوئی اس نام کے شخص کو نہیں جانتا اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں حضرت اویس کوفہ کی ایک مسجد میں پڑے رہتے تھے وہاں سے نہ باہر نکلتے تھے اور نہ کسی سے کچھ تعارف رکھتے تھے، ان کا ایک چچا زاد بھائی تھا جو ان کو ستایا کرتا تھا۔ اتفاق کی بات کہ کوفہ کے ایک قافلہ میں وہ بھی شریک ہو کر

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ کے ہاں پہنچا تو حضرت عمر فاروقؓ نے حسب معمول اہل قافلہ سے سوال کیا! کیا تم لوگ حضرت اویس بن عامر قرنیؒ کو جانتے ہو؟ یہ سوال سن کر حضرت اویسؒ کا وہی چچازاد بھائی اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ یا امیر المؤمنین! اویسؒ اس درجہ کا آدمی نہیں ہے کہ آپ اس کے بارہ میں پوچھیں اور اس کا تعارف حاصل کریں، وہ تو نہایت کمتر اور بے حیثیت انسان ہے اگرچہ وہ میرا چچازاد بھائی ہے حضرت عمرؓ نے اس شخص کی زبان سے یہ تحقیری کلمات سنے تو فرمایا: تجھ پر افسوس، تو نے اویسؒ کے بارہ میں ایسے الفاظ استعمال کر کے اپنی ہلاکت مول لے لی ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے وہ حدیث پڑھی جو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے حضرت اویسؒ کی شان میں سنی تھی، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اس شخص سے فرمایا کہ جب تم واپس پہنچو تو اویسؒ کو میرا سلام کہنا، اس واقعہ کے بعد حضرت اویسؒ کی شخصیت مشہور ہو گئی لیکن وہ عام نظروں سے پوشیدہ ہو گئے۔

اس سلسلہ میں ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے، انہوں نے بیان کیا کہ پہلے تو دس سال تک حضرت عمر فاروقؓ نے اویس قرنیؒ کے بارہ میں کوئی تلاش و جستجو نہیں کی، پھر انہوں نے ایک سال حج کے دوران اہل یمن کو آواز دے کر کہا کہ تم میں جو لوگ قبیلہ مراد سے تعلق رکھتے ہوں وہ کھڑے ہو جائیں چنانچہ قبیلہ مراد کے لوگ کھڑے ہو گئے اور باقی لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے، حضرت عمرؓ نے ان (قبیلہ مراد کے لوگوں) سے پوچھا! کیا تم میں کوئی شخص اویسؒ نام کا ہے؟ یہ سن کر ایک شخص بولا کہ اے امیر المؤمنین! ہمیں نہیں معلوم آپ کس اویس کو پوچھ رہے ہیں، ہاں میرا ایک بھتیجا ہے جس کو لوگ۔ اویس اویس کہہ کر پکارتے ہیں اور وہ اس درجہ کا پست و بے حیثیت انسان ہے کہ آپ جیسی ہستی کو اس سے کیا سروکار ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیا وہ حدود حرم میں موجود ہے؟ اس نے کہا ہاں، میدان عرفات سے متصل اراک کی جھاڑیوں میں لوگوں کے اونٹ چرا رہا ہے (گویا حضرت اویسؒ اپنی شخصیت چھپانے کے لئے لوگوں کے اونٹ چرا رہے تھے تا کہ ایک چرواہے سے زیادہ کوئی اہمیت ان کو نہ دی جائے) حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ لیا اور دونوں ایک گدھے پر سوار ہو کر اراک کی طرف روانہ ہو گئے، وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اویسؒ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے ہیں اور اپنی نظریں سجدہ گاہ پر گاڑے ہوئے ہیں ان کو اس حالت میں دیکھ کر حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے آپس میں کہا کہ جس شخص کی تلاش میں ہم لوگ ہیں ہو نہ ہو یہ وہی شخص ہے، حضرت اویسؒ کے کانوں میں جب ان دونوں کی آہٹ پڑی تو انہوں نے نماز کو مختصر کر دیا اور فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوئے ان دونوں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے دونوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا: علیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ پھر حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے پوچھا: برادرم! تمہارا نام کیا ہے اللہ کی رحمت و سلامتی نازل ہو تم پر! اویسؒ بولے میں عبداللہ ہوں۔ سیدنا علی مرتضیٰؓ نے کہا، ہمیں معلوم ہے، آسمانوں میں اور زمین پر جو بھی متنفس ہے، وہ عبداللہ ہے۔ میں تم کو پروردگار کعبہ اور پروردگار حرم کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، تمہارا وہ نام کیا ہے جو تمہاری ماں نے رکھا ہے۔ حضرت اویسؒ نے کہا: تم لوگ مجھ سے آخر چاہتے کیا ہو، میرا نام اویسؒ بن مراد ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے کہا: ذرا اپنا بایاں پہلو کھول کر دکھاؤ، حضرت اویسؒ نے اپنا بایاں پہلو کھول دیا۔ ان دونوں نے دیکھا کہ اس جگہ ایک درہم کے بقدر سفیدی کا نشان موجود ہے۔ دونوں تیزی کے ساتھ اویسؒ کی طرف لپکے تا کہ اس نشان کو بوسہ دیں، اور بولے کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم آپ ﷺ کا سلام تمہیں پہنچائیں اور یہ کہ تم سے اپنے لئے دعاء مغفرت کی درخواست کریں۔ حضرت اویسؒ نے کہا: میں تو مشرق و مغرب کے ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے دعا گو ہوں۔ ان دونوں حضرات نے فرمایا: ہم خاص طور پر اپنے لئے دعائے مغفرت کے طلب گار ہیں۔ چنانچہ حضرت اویسؒ نے بالخصوص ان دونوں کے لئے اور بالعموم تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے دعائے مغفرت کی، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا، میں اپنی جیب خاص سے یا (بیت المال کے) اپنے عطیہ سے تمہیں کچھ پیش کرنا چاہتا ہوں حضرت اویسؒ بولے: یہ پھٹے پرانے کپڑے میرے پاس ہیں میری دونوں پاپوشیں گانٹھ دی گئی ہیں، چار درہم بھی میرے پاس ہیں جب یہ اثاثہ ختم ہو جائے گا تو آپ کا عطیہ قبول کر لوں گا اور انسان کی بات تو یہ ہے کہ جو کوئی ہفتہ بھر کے لئے آرزو کرتا ہے اس کی آرزو مہینہ بھر تک کے لئے

دراز ہو جاتی ہے اور جو کوئی مہینہ بھر کے لئے آرزو کرتا ہے اس کی آرزو سال سال بھر تک کے لئے دراز ہو جاتی ہے (یعنی انسان اگر قناعت کا دامن چھوڑ دے تو پھر اس کی آرزوئیں اور حرصیں بڑھتی چلی جاتی ہیں) اس کے بعد حضرت اویسؒ نے اونٹوں کو ان کے مالکوں کے حوالے کیا اور خود وہاں سے ایسے روپوش ہوئے کہ پھر کبھی نہیں دیکھے گئے۔

اہل یمن کی فضیلت

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَاكُمْ اَهْلُ الْيَمَنِ هُوَ اَرَقُّ اَفْئِدَةً وَّاَلْيَنُ قُلُوْبًا اَلْاِيْمَانُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ وَالْفَخْرُ وَالْخُيَلَاءُ فِیْ اَصْحَابِ الْاِبِلِ وَالسَّكِيْنَةُ وَالْوَقَارُ فِیْ اَهْلِ الْغَنَمِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ (جب یمن سے ابوموسیٰ اشعریؓ اور ان کی قوم کے لوگ خدمت رسالت پناہ میں حاضر ہوئے تو) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس یمن کے لوگ آئے ہیں جو (تمہارے پاس آنے والے اور لوگوں کی بہ نسبت) زیادہ رقیق القلب اور زیادہ نرم دل ہیں ایمان یمن کا ہے اور حکمت بھی یمنی ہے اور فخر (یعنی اپنے مال و منصب وغیرہ کے ذریعہ اپنی بڑائی مارنا) اور تکبر کرنا اونٹ والوں میں ہے، جب کہ اطمینان وتحمل اور وقار بکری والوں میں ہے۔" (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: ارق افئدۃ میں ارق کا لفظ رقۃ سے ہے جس کے معنی نرمی اور رحم وشفقت کے ہیں اور جو قساوت یعنی سنگ دلی و بے رحمی اور غلظت یعنی سختی و کثافت کی ضد ہے۔ افئدۃ جمع ہے فؤاد کی جس کے معنی "دل" کے ہیں۔ بعض حضرات کا تو یہ کہنا ہے کہ فؤاد دل کے باطن کو کہتے ہیں جب کہ بعض حضرات کے نزدیک اس لفظ کا اطلاق ظاہر دل پر ہوتا ہے۔ بہر حال ارق افئدۃ کا مطلب یہ ہے کہ اہل یمن باطن کی حیثیت سے نرمی و شفقت اور رحم و مروت کا مادہ بہت زیادہ رکھتے ہیں اور الین قلوبا (نرم دل ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ وہ اہل یمن بحسب ظاہر کے نصیحت و موعظت کا اثر اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ جلد قبول کر لیتے ہیں، قبول حق کی استعداد اور لوگوں کی بہ نسبت ان کے دل میں زیادہ ہے۔

اور حضرت شیخ عبدالحق دہلوی نے لکھا ہے کہ افئدۃ جمع ہے فؤاد کی جس کے معنی "دل" کے ہیں اور قلوب جمع قلب کی، جو تقلب سے ہے اور جس کے معنی ہیں، پلٹنا یعنی ایک حالت چھوڑ کر دوسری حالت کی طرف آنا، چونکہ اکثر اہل لغت نے فواد اور قلب کا ذکر ایک ہی معنی میں کیا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ حدیث میں ان دونوں کا ذکر تاکید کے لئے ہے۔ واضح ہو کر یہ حدیث باب وفاۃ النبی کی تیسری فصل میں بھی نقل ہوئی ہے، لیکن وہاں صرف ارق افئدۃ کے الفاظ ہیں الین قلوبا کے الفاظ نہیں ہیں اور اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ معنی کے اعتبار سے یہ دونوں جملے یکساں ہیں، بعض حضرات نے کہا ہے کہ فواد اصل میں دل کے پردہ کو کہتے ہیں، جب یہ پردہ باریک ہوتا ہے تو حق بات اس میں داخل ہوتی ہے اور دل تک پہنچ جاتی ہے اور پھر جب دل نرم ہوتا ہے تو وہ حق بات اس کے اندر بھی داخل ہو جاتی ہے، پس رقت ضد غلظت کی ہے اور "لین" ضد صلابت کی۔ اور یہ دونوں اسلامی دل کی ایک خاص کیفیت و حالت کا نام ہیں، جب انسان کا دل اللہ کی اتاری ہوئی آیتوں اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کے پند و نصائح سے متاثر نہیں ہوتا تو اس کو غلظت و صلابت کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے، اور جب انسان کا دل ان سے متاثر ہوتا ہے تو اس کو رقت اور لین کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے یہاں طیبیؒ کا کہنا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں "رقت" سے مراد جودت فہم ہو اور لین سے مراد حق بات کا قبول کرنا ہو۔

"ایمان یمن کا ہے اور ...." یہاں یمانیۃ کا لفظ بعض روایتوں میں یٰ کی تشدید کے ساتھ یمانیّۃ بھی منقول ہے، بہر حال آنحضرت ﷺ نے ایمان و حکمت کو یمن کے ساتھ اس اعتبار سے منسوب فرمایا کہ اس وقت کے دوسرے اہل مشرق کے مقابلے میں یمن کے لوگ سب سے زیادہ کمال ایمان کے ساتھ متصف تھے اور جیسا کہ باب بدء الخلق کی روایت میں گزرا، یہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہی تھے، جنہوں نے قبول اسلام کے لئے یمنی لوگوں کی سربراہی کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری کے موقع پر

آنحضرت ﷺ سے آفرنیش عالم، ابتدائے کائنات اور اس سلسلے کے حکم و اسرار کے بارہ میں سوال کر کے حکمت و دانائی سے یمنی لوگوں کی فطری وابستگی کا اظہار فرمایا اور یہ پھر حکمت و دانائی کا کمال انہی کا طفیل اور انہی کی وراثت تھی جس کا ظہور حضرت ابوالحسن اشعریؒ کی ذات میں ہوا جو اہل سُنّت و الجماعت کے آئمہ میں سے ہیں اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اولاد میں سے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہاں "حکمت" سے مراد وہ علم ہے جس میں ہر موجود کے احوال و خصائص اور حقیقت و ماہیت سے بحث کی جاتی ہے، تاہم بعض حضرات نے لکھا ہے کہ یہاں "حکمت" سے مراد "رفقہ فی الدین" ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ "حکمت" سے مراد منہ سے صرف ایسی نیک بات نکالنا ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں مفید ہو اور ہلاکت و تباہی سے بچانے والی ہو۔

"اور فخر اور تکبر کرنا اونٹ والوں میں ہے........." اس ارشاد گرامی سے معلوم ہوا کہ حیوانات اور جانوروں کی مخالطت انسان کی طبیعت و سرشت پر اثر انداز ہوتی ہے جو انسان جس جانور کے ساتھ اپنا وقت زیادہ گزارتا ہے اس کے اندر وہ خصلت خود سرایت کر جاتی ہے جو اس جانور کی طبیعت و طینت کا خاصہ ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص اونٹوں کے درمیان رہتا ہے اور اونٹ چرانے کا کام کرتا ہے تو اونٹ کی سرشت میں قساوت و غلظت ہے اس لئے اس شخص کی خو اور اس کے عادات و اطوار میں بھی قساوت اور غلظت آجاتی ہے، اسی طرح بکری ایسا جانور ہے جس کی طبیعت میں تحمل نرمی اور مسکینی ہوتی ہے، پس جو شخص بکریاں پالتا ہے، بکریوں کے درمیان رہتا ہے اور بکریاں چراتا ہے تو اس کی خو اور اس کے عادات و اطوار میں تحمل نرمی اور مسکینی آجاتی ہے، اسی پر دوسرے جانوروں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے اور بعض حضرات نے یوں لکھا ہے کہ بکریاں پالنے والے اور بکریاں چرانے والے آبادی کے قریب رہتے ہیں اور بستی والوں سے خلط ملط رکھتے ہیں کیونکہ بکریاں پانی کے بغیر صبر نہیں کر سکتیں اور جاڑے وغیرہ کے سخت موسم کو برداشت کرنے کی تاب ان میں نہیں ہوتی۔ اور اس بناء پر وہ آبادی سے دور ویرانوں اور بے آب و گیاہ میدانوں میں نہیں جاتیں جو اس بات کی علامت ہے کہ ان کی سرشت میں نرمی اور مسکینی اور کمزوری شامل ہوتی ہے اور یہ بعض آبادیوں میں اور لوگوں کے درمیان رہنا ایسی چیز ہے جو طبیعت میں نرمی و مروت پیدا کرتی ہے اور اطاعت و فرمانبرداری کی طرف لے جاتی ہے اور اپنے حاکم کی سرکشی سے باز رکھتی ہے، اس کے برخلاف اونٹ ایک ایسا سخت طبیعت جانور ہوتا ہے جو آبادیوں اور بستیوں سے دور میدانوں اور صحراؤں میں زیادہ رہتا ہے اور اسی سبب سے اونٹ والوں کو بھی آبادی سے دور رہنا پڑتا ہے اور لوگوں سے ان کا ملنا جلنا کم ہی ہوتا ہے اور یہ چیز ایسی ہے جو طبیعت میں سختی و درشتی، طغیانی و سرکشی اور حاکم کی اطاعت و فرمانبرداری سے انحراف کا مادہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس جملہ کی وضاحت میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اونٹ مالیت کے اعتبار سے بڑا اور قیمتی اثاثہ ہوتا ہے اس کے برخلاف بکری کم قیمت اثاثہ ہوتی ہے: ظاہر ہے جس شخص کے پاس اونٹ ہوں گے وہ اپنے کو زیادہ مالدار سمجھے گا اور یہ چیز اس میں غرور و تکبر پیدا کرنے والی ہوگی اور جس شخص کے پاس بکریاں ہوں گی وہ اپنے کو زیادہ مالدار نہیں سمجھے گا اور یہ چیز اس کے اندر نرمی و قناعت اور مسکینی پیدا ہونے کا باعث بنے گی۔

کفر کی چوٹی مشرق کی طرف ہے

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأْسُ الْكُفْرِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ وَالْفَخْرُ وَالْخُيَلَاءُ فِيْ اَهْلِ الْخَيْلِ وَالْاِبِلِ وَالْفَدَّادِيْنَ اَهْلِ الْوَبَرِ وَالسَّكِيْنَةُ فِيْ اَهْلِ الْغَنَمِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کفر کا سر مشرق کی طرف ہے۔ فخر و تکبر گھوڑے والوں، اور اونٹ والوں اور چلانے والوں میں ہے جو اونٹ کے بالوں کے خیموں میں رہتے ہیں (یعنی وہ لوگ جو آبادیوں میں سے دور جنگلات اور صحراؤں میں رہتے ہیں اور اس طرح کے لوگ اس زمانہ میں زیادہ تر اونٹ کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے تھے) اور نرمی و مسکینی بکری والوں میں ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کفر کی چوٹی" سے مراد "بڑا کفر" ہے جیسا کہ سیوطیؒ نے لکھا ہے۔ اور یہ مفہوم مراد لینا زیادہ صحیح ہے کہ: کفر پیدا ہونے اور ظاہر ہونے کی جگہ مشرق ہے، چنانچہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے رَاْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ (دین کی چوٹی اسلام ہے) گویا "کفر کی چوٹی مشرق کی طرف ہے" کا مطلب یہ ہوا کہ کفر کا زیادہ ظہور مشرق کی سمت ہے اور ابن ملکؒ نے یہی معنے لکھے ہیں کہ کفر اور دجال اور یاجوج وماجوج جیسے بڑے فتنے مشرق کی طرف ظاہر ہوں گے اور نوویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: کفر کو مشرق کے ساتھ مختص کرنے کا مطلب اہل مشرق پر شیطان کے زیادہ تسلط کو ظاہر کرنا ہے اور یہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ کے اعتبار سے ہے (یعنی آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مشرقی اقوام کفر و شرک میں بہت زیادہ مبتلا تھیں جیسا کہ تاتار، ہندوستان چین اور جاپان وغیرہ کے لوگ اور یہ ممالک عرب سے مشرق کی جانب واقع ہیں) نیز اس کا اطلاق بایں اعتبار زمانہ آئندہ پر بھی ہوسکتا ہے کہ دجال کا خروج ظہور اس علاقہ سے ہوگا جو عرب کے مشرق میں ہے پس آخر زمانہ میں بھی عرب کا مشرق سب سے بڑے فتنہ کے ظاہر ہونے کی جگہ ہوگا، اور سیوطیؒ نے باجی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یہاں "مشرق" سے مراد فارس (ایران) ہے یا نجد، اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس میں ابلیس کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے کہ سورج شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے (یعنی جب مشرق میں سورج طلوع ہوتا ہے تو اس وقت شیطان اپنا سر سورج کے قریب کردیتا ہے تاکہ سورج پرستوں کا سجدہ اسی کے لئے ہوجائے۔

فتنوں کی جگہ مشرق ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ ھٰھُنَا جَآءَتِ الْفِتَنُ نَحْوَ الْمَشْرِقِ وَالْجَفَآءُ وَغِلَظُ الْقُلُوْبِ فِی الْفَدَّادِیْنَ اَھْلِ الْوَبَرِ عِنْدَ اُصُوْلِ اَذْنَابِ الْاِبِلِ وَالْبَقَرِ فِیْ رَبِیْعَۃَ وَمُضَرَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) آپ ﷺ نے مشرق کی سمت ہاتھ سے اشارہ کرکے فرمایا کہ فتنے اس جگہ سے آئے ہیں اور بدزبانی و سنگدلی چلانے والوں اور خیمہ نشینوں میں ہے جو (اپنے مویشیوں کو چرانے کے لئے) اونٹوں اور گایوں کی دموں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، یہ لوگ ربیعہ اور مضر قبائل میں ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "فتنے اس جگہ سے آئے ہیں" یعنی وہ فتنہ جو دین کے استحکام و ترقی میں خلل ڈالے گا اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائے گا اور لوگوں کو دینی زندگی کے لئے امتحان و آزمائش کا موجب بنے گا، ان علاقوں اور ملکوں سے اٹھے گا جو عرب کی مشرقی سمت میں واقع ہیں۔

"چلانے والوں اور خیمہ نشینوں" سے مراد یا تو اعراب ہیں یا دوسرے غیر مہذب قبائلی اور جنگلی لوگ، ان کی مذمت اس اعتبار سے فرمائی گئی کہ اس طرح کے لوگ مہذب و متمدن دنیا سے دور، شہروں اور آبادیوں سے بیگانہ پہاڑوں اور جنگلوں میں پڑے رہتے ہیں جس کے سبب نہ ان کو علم کی روشنی میسر آتی ہے اور نہ تہذیب و تمدن کی خوشبو ان میں ہوتی ہے جب کہ شہروں اور آبادیوں میں رہنے سے اہل علم اور نیک بندوں کی صحبت نصیب ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ دین و شریعت کے علوم و احکام حاصل ہوتے ہیں بلکہ اخلاق و کردار اور مہذب اور نیک پاکیزہ بنتے ہیں، ایسے ہی غیر مہذب قبائلی اور جنگلی لوگوں کے بارہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ۔

"جو اعراب (یعنی غیر مہذب دیہاتی اور جنگلی لوگ) ہیں وہ کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں ان کا حال ایسا ہونا ہی چاہئے کہ ان کو ان احکام کا علم نہیں ہے جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں۔"

سنگدلی و بدزبانی مشرق والوں میں ہے

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غِلَظُ الْقُلُوْبِ وَالْجَفَآءُ فِی الْمَشْرِقِ وَالْاِیْمَانُ فِیْ اَھْلِ

الْحِجَازِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سنگدلی اور سخت گوئی مشرق میں ہے (کیونکہ کفر اور فتنوں کا مصدر و مرکز اسی طرف کے علاقے ہیں) اور ایمان حجاز والوں میں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "حجاز" سے مراد مکہ مدینہ، طائف اور ان سے متعلق شہرو آبادیاں ہیں جب کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہاں حجاز والوں سے مراد انصار ہیں۔ حجاز ملک عرب (جزیرۃ العرب) کے اس خطہ کو کہتے ہیں جو نجد اور تہامہ کے درمیان ہے اور اس خطہ کا نام حجاز اس اعتبار سے پڑا کہ یہ خطہ نجد اور تہامہ کے درمیان حاجز یعنی حائل ہے، نجد جزیرۃ العرب کے شمالی اور جنوبی ریگستانوں یعنی النفوذ اور الرابع الخالی کے درمیان تقریباً آٹھ سو میل طویل اور سوا دو سو میل عریض اس خطہ کو کہتے ہیں جو سطح مرتفع پر مشتمل ہے۔ نجد کے معنی بلند زمین کے ہیں اس کے مقابلہ پر اس ملک کا جو حصہ نشیب میں ہے اس کو "تہامہ" کہا جاتا ہے تہامہ کے معنی پست زمین کے ہیں۔

شام اور یمن کی فضیلت

⑥ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ يَمَنِنَا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَفِيْ نَجْدِنَا قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ يَمَنِنَا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَفِيْ نَجْدِنَا فَاَظُنُّهٗ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ هُنَاكَ الزَّلَازِلُ وَالْفِتَنُ وَبِهَا يَطْلَعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے یوں دعا فرمائی: خدایا! ہمیں ہمارے (ملک) شام میں برکت عطا فرما اور خدایا! ہمیں ہمارے (ملک) یمن میں برکت عطا فرما۔ یہ سن کر صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے نجد کے بارہ میں بھی (دعا فرمائیے تاکہ ہمیں اس علاقہ کی طرف سے بھی برکت حاصل ہو) لیکن آنحضرت ﷺ نے پھر یہی دعا فرمائی: خدایا! ہمیں ہمارے شام میں برکت عطا فرما اور خدایا! ہمیں ہمارے یمن میں برکت عطا فرما، صحابہؓ نے (دوبارہ) عرض کیا: یا رسول اللہ! اور ہمارے نجد کے بارہ میں بھی (یہی دعا فرمائیے) راوی کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ تیسری بار آنحضرت ﷺ نے (پھر انہی الفاظ میں دعا کی اور نجد کے بارہ میں) فرمایا وہاں زلزلے ہوں گے فتنے ہوں گے اور وہیں سے شیطان کا سینگ ظاہر ہوتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: دعا میں شام کے ذکر کو یمن کے ذکر پر مقدم رکھنا شاید اس بنا پر تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلَّذِيْ بَارَكْنَا حَوْلَهٗ کے بموجب شام کی سرزمین جہاں فلسطین واقع ہے اپنی اصل کے اعتبار سے بابرکت ہے اور چونکہ یہی سرزمین بہت زیادہ انبیاء کرام کی آخری آرام گاہ ہے اس نسبت سے اس کا ذکر پہلے ہونا ضروری تھا، واضح ہو کہ "شام میں برکت" سے مراد یا تو وہاں کی برکتوں میں اضافہ ہے یا ایسی برکت کہ جو اہل مدینہ اور تمام مؤمنین کو بالخصوص حاصل ہو۔ اسی طرح "یمن میں برکت" سے ظاہری اور معنوی دونوں طرح کی برکتیں مراد ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس ملک کو ظاہر میں بھی خوشحال، پر امن اور فائدہ مند بنائیے اور دینی و روحانی طور پر بھی وہاں کے لوگ دیندار اور صالح رہیں، چنانچہ یمن کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ مادی طور پر خوشحال اور زرخیز ملک بنایا بلکہ وہاں کی سرزمین نے بہت زیادہ اولیاء اور علماء بھی پیدا کئے۔

ایک قول کے مطابق ان دونوں ملکوں کے لئے برکت کی دعا کا ظاہری داعیہ یہ بھی تھا کہ اہل مدینہ کے لئے غلہ اور دوسری غذائی اشیاء انہی دونوں ملکوں سے آتی تھیں اور ایک شارح نے یوں لکھا ہے: آنحضرت ﷺ نے یمن اور شام کے لئے برکت کی دعا اس بنا پر فرمائی کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت اور ظہور رسالت کی جگہ مکہ مکرمہ ہے اور مکہ مکرمہ یمن سے قربت رکھتا ہے جب کہ آنحضرت ﷺ کا مسکن اور مدفن مدینہ منورہ ہے اور مدینہ منورہ شام سے قربت رکھتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہی چیز یعنی یمن کی قربت مکہ سے اور شام کی قربت مدینہ سے ان دونوں کی فضیلت کے لئے کافی ہے، اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ان دونوں ملکوں کی اضافت اپنی طرف

کر کے "ہمارا شام" اور "ہمارا یمن" فرمایا اور ان کی شان بڑھانے کے لئے ضمیر جمع استعمال فرمائی، نیز ان کے حق میں آپ ﷺ نے تین بار برکت کی دعا فرمائی۔

"وہاں زلزلے ہوں گے......" میں وہاں کا مطلب نجد کی سمت ہے اور نجد کی سمت سے مراد وہی حجاز کی مشرقی سمت ہے جس کا ذکر پیچھے حدیث میں نحو المشرق کے الفاظ میں آیا ہے "زلزلے" سے مراد ظاہری زلزلہ بھی ہے اور معنوی زلزلہ بھی، معنوی زلزلہ کا مطلب ہے وہاں کے لوگوں کے دلوں کا اتھل پتھل ہونا، بے قرار ہونا اور روحانی چین و سکون کا ختم ہو جانا "فتنوں" سے مراد وہ آفات اور مصائب ہیں جن سے دین میں ضعف و کمزوری اور نیکی و دیانت میں کمی ہو جائے۔

"اور وہیں سے شیطان کا سینگ ظاہر ہوتا ہے" کا مطلب یہ تھا کہ نجد ہماری اس سمت میں واقع ہے جدھر کفر اور فتنوں کا زور ہے اور گویا نجد اس علاقہ میں ہے جہاں شیطان کی جماعت اور اس کے مددگاروں کا ظہور زیادہ ہے، لہٰذا ایسے علاقہ کے بارے میں برکت کی دعا کرنا موزوں نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اہل یمن کے بارہ میں دعا

⑦ عَنْ اَنَسٍؓ عَنْ زَيْدِبْنِ ثَابِتٍؓ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَظَرَ قِبَلَ الْيَمَنِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اَقْبِلْ بِقُلُوْبِهِمْ وَبَارِكْ لَنَا فِيْ صَاعِنَا وَمُدِّنَا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت انسؓ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے یمن کی سمت نظر اٹھائی اور پھر یوں دعا فرمائی: خدایا! اہل یمن کے دلوں کو متوجہ فرما اور ہمارے صاع اور ہمارے مد میں ہمارے لئے برکت عطا فرما۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اہل یمن کے دلوں کو متوجہ فرما" یعنی ان کے دلوں میں ہماری محبت اور ہمارے پاس آنے کا خیال ڈال دے تاکہ وہ یہاں مدینہ آنے پر آمادہ و تیار ہو جائیں۔ واضح ہو کہ آنحضرت ﷺ نے یہ دعا اس پس منظر میں فرمائی کہ اس وقت مدینہ والوں کی غذائی ضروریات کے لئے غلہ یمن ہی سے آیا کرتا تھا، اسی لئے آپ ﷺ نے بعد میں غلہ کے لئے صاع اور مد میں برکت کی دعا فرمائی، تاکہ زیادہ سے زیادہ غلہ یمن سے آئے۔

"صاع" اور "مد" اس وقت کے دو پیمانوں کے نام ہیں جن کے ذریعہ غلہ کا لین دین ہوتا تھا۔ صاع میں تقریباً ساڑھے تین سیر غلہ آتا تھا اور مد میں اس کا چوتھائی، اور یہاں "صاع اور مد میں برکت" سے مراد غلہ میں برکت ہے گویا ظرف بول کر مظروف مراد لیا گیا ہے۔

تور پشتیؒ نے اس دعا کی وضاحت میں یہ لکھا ہے کہ دعا کے دونوں حصوں ہی سے تنگ حال اور تنگ معاش چلے آ رہے تھے، اب جب آنحضرت ﷺ نے اہل یمن کے حق میں دعا فرمائی کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر دار الہجرت مدینہ چلے آئیں تو چونکہ ان کی تعداد زیادہ تھی اور آپ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اتنے زیادہ لوگوں کے آجانے سے مدینہ کی معاشی حالت اور زیادہ تنگ وخستہ ہو سکتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اہل مدینہ کی غذائی ضرورت یعنی غلہ میں برکت کی دعا فرمائی تاکہ اہل مدینہ کو بھی معاش کی فراخی حاصل ہو اور ان لوگوں کو بھی جو اپنے وطن سے ہجرت کر کے مدینہ آنے والے ہوں، اور اس طرح نہ تو مدینہ میں رہنے والے نئے آنے والوں کی وجہ سے تنگ و پریشان ہوں اور نہ ان لوگوں کے لئے مدینہ کا قیام دشواری و پریشانی کا سبب بنے جو ہجرت کر کے مدینہ آئیں۔

اہل شام کی خوش بختی

⑧ وَعَنْ زَيْدِبْنِ ثَابِتٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طُوْبٰى لِلشَّامِ قُلْنَا لِاَيِّ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لِاَنَّ

مَلٰئِکَةَ الرَّحْمٰنِ بَاسِطَةٌ اَجْنِحَتَهَا عَلَيْهَا۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ خوش بختی ہو اہل شام کو ہم نے پوچھا کہ وہ کس وجہ سے یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا اس وجہ سے کہ رحمٰن کے فرشتے شام کی سرزمین اور اس کے رہنے والوں پر بازو پھیلائے ہوئے ہیں (تاکہ وہ سرزمین اور اس کے لوگ کفر سے محفوظ رہیں۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: "رحمٰن کے فرشتے" کی لفظی ترکیب اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہاں "فرشتوں" سے مراد رحمت کے فرشتے ہیں اور حضرت شیخ عبدالحقؒ نے یہ لکھا ہے کہ یہ جملہ "فرشتے اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہیں" اس بات سے کنایہ ہے کہ مخصوص اہل شام یعنی اس ملک میں رہنے والے ابدال پر یا تمام اہل شام پر اللہ تعالیٰ کی رحمت وراحت چھائی ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ "فرشتوں کے بازو" سے مراد صفات وقوائے ملکیہ ہیں۔ ان کے بازوؤں کو اس دنیا کے پرندوں کے بازوؤں پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ کسی پرندے کے تین چار سے زائد بازو نہیں ہوتے چہ جائیکہ چھ سو بازو جو آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں حضرت جبرئیل کے دیکھے تھے حاصل یہ ہے کہ یہ تو ماننا اور ثابت کرنا چاہئے کہ فرشتوں کے بازو ہوتے ہیں لیکن ان بازوؤں کی ماہیت و حقیقت اور کیفیت کی بحث اور بیان میں نہ پڑنا چاہئے۔

حضر موت کا ذکر

(۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَخْرُجُ نَارٌ مِنْ نَحْوِ حَضْرَ مَوْتَ اَوْ مِنْ حَضْرَ مَوْتِ تَحْشُرُ النَّاسَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَمَا تَاْمُرُنَا قَالَ عَلَيْكُمْ بِالشَّامِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: عنقریب حضر موت کی سمت سے یا یہ فرمایا کہ حضر موت سے ایک آگ نمودار ہوگی اور وہ آگ لوگوں کو جمع کرے گی اور ہانک کرلے جائے گی۔ (یہ سن کر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر ہمارے بارہ میں کیا حکم ہے یعنی اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہئے اور کہاں چلے جانا چاہئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں شام میں چلے جانا چاہئے۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: "یا یہ فرمایا" یہ راوی کا شک ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "من نحو حضر موت" کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے یا "من حضر موت" فرمایا تھا، تاہم اگر آپ ﷺ نے نحو کا لفظ ظاہر میں استعمال نہیں بھی فرمایا تھا تو بھی من نحوھا یا من جانبھا کا ہی مفہوم مراد تھا، "آگ" سے یا تو حقیقت میں یہی ظاہر آگ مراد ہے، یا اس سے فتنے اور شرور مراد ہیں۔ حَضْرَ مَوْتَ اس وقت ایک شہر کا نام تھا جو یمن میں شامل تھا لیکن اب یہ ایک پورے علاقے کا نام ہے جس کی سرحدیں یمن کے قریب سے شروع ہو کر عمان کے قریب تک چلی گئی ہیں۔

"تمہیں شام میں چلے جانا چاہئے" کیونکہ شام کی سرزمین کو رحمت کے ملائکہ گھیرے ہوئے ہیں اس لئے وہاں کے رہنے والوں کو اس آگ سے خواہ وہ حسی یعنی ظاہری آگ ہو یا معنوی وحکمی آگ یعنی فتنے اور شرور، کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ واضح ہو کہ پیچھے قیامت سے متعلق ایک باب کی حدیث میں آگ کا ذکر آیا تھا جو لوگوں کو جمع کر کے محشر کی طرف لے جائے گی۔ اس میں "محشر" سے مراد شام کی سرزمین ہے اور اس حدیث سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت لوگ براہ راست اس آگ کے اثر کے تحت ہوں گے شام کی طرف جانے میں ان کے اپنے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوگا، جب کہ یہاں تمہیں شام چلے جانا چاہئے کے الفاظ سے یہ مفہوم واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ شام کی طرف جانے میں ان کے اپنے اختیار کو دخل ہوگا۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حدیث میں حضر موت کی طرف سے نمودار ہونے والی آگ کا ذکر ہے اس سے حقیقت میں آگ مراد نہیں ہے بلکہ وہ فتنے اور شرور مراد ہیں جو آخر زمانہ میں رونما ہوں گے جن کو "آگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

شام کی فضیلت

⑮ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ ؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّھَا سَتَکُوْنُ ھِجْرَۃٌ بَعْدَ ھِجْرَۃٍ فَخِیَارُ النَّاسِ اِلٰی مُھَاجَرِ اِبْرَاھِیْمَ : وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَخِیَارُ اَھْلِ الْاَرْضِ اَلْزَمُھُمْ مُھَاجَرَ اِبْرَاھِیْمَ وَیَبْقٰی فِی الْاَرْضِ شِرَارُ اَھْلِھَا تَلْفِظُھُمْ اَرْضُوْھُمْ تَقْذَرُھُمْ نَفْسُ اللّٰہِ تَحْشُرُھُمُ النَّارُ مَعَ الْقِرَدَۃِ وَالْخَنَازِیْرِ تَبِیْتُ مَعَھُمْ اِذَا بَاتُوْا وَتَقِیْلُ مَعَھُمْ اِذَا قَالُوْا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ہجرت کے بعد ہجرت ہوگی، پس بہترین شخص وہ ہوگا جو اس جگہ ہجرت کر کے جائے گا جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کر کے گئے تھے۔ (یعنی ملک شام میں اور یہاں وہ اس وقت ہجرت کر کے آئے تھے، جب انہوں نے اپنے آبائی ملک عراق سے ترک وطن کیا تھا اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ: روئے زمین کے بہترین لوگ وہ ہوں گے جو اس جگہ ہجرت کر کے جانے کو خوب لازم پکڑیں گے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کر کے گئے تھے (یعنی ملک شام) اور (اس وقت) روئے زمین پر اس کے بدترین لوگ یعنی کفار و فجار رہ جائیں گے جن کو ان کے ملک سے نکال پھینکیں گے، اللہ کی ذات ان کو پلید سمجھے گی اور آگ ان کو سوروں اور بندروں کے ساتھ اکٹھا کر کے ہانک لے جائے گی اور وہ آگ انہیں کے ساتھ رات گزارے گی جہاں ان کی رات آئے گی اور ان کے ساتھ قیلولہ کرے گی جہاں وہ قیلولہ کریں گے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح : "ہجرت کے بعد ہجرت ہوگی" یعنی ایک ہجرت تو یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ آگئے ہیں اور پھر آخر زمانہ میں ایک ہجرت اس وقت ہوگی جب لوگ اپنے اپنے دین کی حفاظت اور اللہ کی رحمت حاصل کرنے کے لئے ملک شام کو ہجرت کریں گے اور بعض حضرات نے یہ مطلب لکھا ہے کہ مدینہ کی یہ ہجرت کوئی آخری ہجرت نہیں ہے، ہجرتیں بار بار ہوں گی اور بہت ہوں گی، حدیث کے الفاظ و سیاق کی روشنی میں یہ مطلب زیادہ موزوں اور نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے، گویا اس زمانہ کی طرف اشارہ مقصود ہے جب قیامت بالکل قریب ہوگی، ہر سو فتنوں اور شرور کا دور دورہ ہوگا، شہروں اور آبادیوں میں اہل کفر و فسق کا غلبہ ہو جائے گا، اسلامی ممالک میں بھی دین کے حامی نیکی کے حامل اور خدائی احکام و ہدایات پر قائم رہنے والے بہت کم رہ جائیں گے، یہاں تک کہ شام کے شہر و قریہ ایک محفوظ و مامون قلعہ کی مانند باقی بچیں گے جن کی حفاظت پر اسلام کے وہ لشکر مامون ہوں گے۔ جن کے ذریعہ اللہ حق کو غالب کرے گا اور حق کو مدد پہنچائے گا اور آخر کار اسی لشکر کے لوگ دجال کا مقابلہ کر کے اس کو نیست و نابود کر دیں گے۔ پس اس زمانہ میں جو شخص اپنے دین و ایمان کو محفوظ رکھنا چاہے گا وہ ملک شام کو ہجرت کر کے اس کے کسی شہر یا قریہ میں جا بسے گا۔

"پس بہترین شخص وہ ہوگا......." یہ گویا ماسبق جملہ میں جو اجمال تھا اس کی تفصیل ہے۔ مطلب یہ کہ دین و ایمان کی حفاظت کے لئے ملک شام کو ہجرت کا سلسلہ شروع ہوگا تو جن علاقوں اور شہروں میں اہل کفر و فسق کا غلبہ و تسلط ہو چکا ہوگا، وہاں کے خداترس دین پسند اور اپنے ایمان کو ہر حالت میں محفوظ رکھنے والے بہترین لوگ اپنا اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت کر جائیں گے، ہاں جن لوگوں کے ایمان میں ضعف ہوگا اور جو دین کے اعتبار سے ناکارہ و کمزور ہوں گے وہ اپنے گھربار اپنی جائداد و دولت وغیرہ کی محبت و طمع میں اور اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف لڑائی سے اپنی جان بچانے کے لئے اپنے وطن ہی میں پڑے رہیں گے اور ہجرت کر کے چلے جانے والوں کے وارث و جانشین بن جائیں گے، پس وہ اپنی طبیعتوں اور نفسوں کی خست اور اپنے دین کی کمزوری کے سبب نہ صرف پاکیزہ نفسوں کے نزدیک ایک گھناؤنی و ذلیل چیز کی مانند ہوں گے بلکہ ان کی زمینیں ان کا ملک اور ان کا وطن تک ان سے بیزار ہو جائے گا کہ انہیں کسی جگہ سکون و قرار نہیں ملے گا ادھر سے ادھر، اور ادھر سے ادھر مارے مارے پھریں گے، ان کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہوگی کہ خود حق تعالیٰ تو ان کو نہایت ناپسند رکھے گا ان کو اپنی رحمت سے دور کر دے گا، اپنے محل کرامت سے ان کا تعلق منقطع کر دے گا اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرے

گا جو کوئی شخص کسی ایسی چیز کے ساتھ کرتا ہے جس سے وہ گھن کھاتا ہو اور جس سے اس کی طبیعت نفرت کرتی ہو اور یہ اسی کا نتیجہ ہوگا کہ ان لوگوں کو ہجرت کی توفیق نصیب نہیں ہوگی اور خدا ان کو انہی کے ملکوں اور شہروں میں دشمنان دین (کفار) کے ساتھ پڑا رہنے دے گا گویا حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوگا جو قرآن کریم کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ۔

"لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں کیا اس لئے ان کو توفیق نہیں دی اور (بحکم تکوینی) یوں کہہ دیا گیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں ہی دھرے رہو۔"

"اللہ کی ذات ان کو پلید سمجھے گی اور آگ ...." ان کے معنی ملا علی قاری نے تو یہ لکھے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کی ذات ان کو سخت ناپسند رکھے گی اور آگ کو ان پر مسلط کر دے گی جو دن رات ان کے ساتھ رہے گی اور ان کو کافروں کے ساتھ کہ جو اپنے چھٹاپے اور بڑھاپے کے اعتبار سے سوروں اور بندروں کی مانند ہوں گے، جمع کرے گی اور ہانک کر چلے گی اور حضرت شیخ نے یہ لکھا ہے: ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند رکھے گا اور فتنے کی آگ کہ جو ان کے اعمال بد کا نتیجہ ہوگی، یا آگ کہ جو اس وقت بندروں اور سوروں کے ساتھ پیدا ہوگی ان سب کو جمع کرے گی اور ہانک کرلے چلے گی، نیز "سوروں اور بندروں" سے یا تو ان کی حقیقت اور صورت مراد ہے یا ان کی سیرت و خصلت اور ان کے عادات و اطوار کا اختیار کرنا مراد ہے اور زیادہ بدخو و بدکردار اور کفار مراد ہیں جو بندر اور سور کی مانند ہیں۔

"اور ان کے ساتھ قیلولہ کرے گی....." "قیلولہ" دوپہر کے سونے کو کہتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ وہ آگ شب و روز ان کے ساتھ رہے گی اور کسی بھی وقت ان سے جدا نہیں ہوگی خواہ وہ کسی حالت میں ہوں۔

شام، یمن اور عراق کا ذکر

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ حَوَالَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيَصِيْرُ الْاَمْرُ اَنْ تَكُوْنُوْا جُنُوْدًا مُجَنَّدَةً جُنْدٌ بِالشَّامِ وَجُنْدٌ بِالْيَمَنِ وَجُنْدٌ بِالْعِرَاقِ فَقَالَ ابْنُ حَوَالَةَ خِرْلِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ اَدْرَكْتُ ذٰلِكَ فَقَالَ عَلَيْكَ بِالشَّامِ فَاِنَّهَا خِيَرَةُ اللّٰهِ مِنْ اَرْضِهٖ يَجْتَبِيْ اِلَيْهَا خِيَرَتَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ فَاَمَّا اِنْ اَبَيْتُمْ فَعَلَيْكُمْ بِيَمَنِكُمْ وَاسْقُوْا مِنْ غُدُرِكُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ تَوَكَّلَ لِيْ بِالشَّامِ وَاَهْلِهٖ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابن حوالہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے جب دین اور ملت کا یہ نظام ہوگا کہ تم مسلمانوں کے جدا جدا کئی لشکر ہو جائیں گے ایک لشکر شام میں ہوگا، ایک یمن میں اور ایک لشکر عراق میں، (یہ سن کر) ابن حوالہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (اگر اس زمانہ میں میں ہوا تو) فرمایئے کہ میں کون سا لشکر اختیار کروں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم شام کو اختیار کرنا کیونکہ شام کی سرزمین خدا کی زمینوں میں سے برگزیدہ سرزمین ہے (یعنی خدا نے آخر زمانہ میں دینداروں کے رہنے کے لئے شام کی سرزمین ہی کو پسند فرمایا ہے، پھر اگر تم شام کو اختیار کرنا قبول نہ کرو تو اپنے یمن کو اختیار کرنا اور دیکھنا تم (جب شام میں جاؤ تو اپنے آپ کو بھی اور اپنے جانوروں کو بھی، اپنے ہی حوضوں سے پانی پلانا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض میری وجہ سے میری اُمت کے حق میں یہ ذمہ لیا ہے کہ وہ (کفار کے فتنہ و فساد اور ان کے غلبہ سے) شام اور اہل شام کو مامون و محفوظ رکھے گا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: جُنُوْدًا مُجَنَّدَةً (جدا جدا کئی لشکر) کے الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کے وہ تمام لشکر کلمہ اسلام کی بنیاد پر تو باہم متحد و متفق ہوں گے لیکن دینی اور ملی احکام و مسائل کی ترجمانی اور ان کے اختیار کرنے میں جدا جدا نقطہ نظر کے حامل ہوں گے۔

"عراق" سے مراد یا تو اس کا وہ عرب علاقہ ہے جس میں بصرہ اور کوفہ وغیرہ شامل ہیں یا اس کا وہ غیر عرب علاقہ مراد ہے جس میں خراسان اور ماوراء النہر کو چھوڑ کر باقی دوسرے عجمی حصے شامل تھے۔

"تو اپنے یمن کو اختیار کرنا" اس میں یمن کی اضافت ان (حضرت ابن حوالہؓ کے واسطہ سے عرب سامعین کی طرف اس بنا پر کی کہ اس وقت اس ارشاد رسالت کے براہ راست مخاطب عرب تھے اور یمن کا جغرافیائی اور علاقائی تعلق ملک عرب ہی سے تھا، واضح ہو کہ فاما ان ابیتم (پھر اگر تم شام کو اختیار کرنا قبول نہ کرو تو اپنے یمن کو اختیار کرنا) کے الفاظ جملہ معترضہ کے طور پر ہیں جو اس ارشاد رسالت کے ایک ہی سلسلہ کے دو حکم یعنی علیک بالشام تو (شام کو اختیار کرنا) اور واسقوا من غدر کم (اپنے ہی حوضوں سے پانی پلانا) کے درمیان واقع ہوا ہے، گویا اصل عبارتی تسلسل یوں تھا کہ: تم شام کو اختیار کرنا کیونکہ شام کی سرزمین خدا کی زمینوں میں سے برگزیدہ سرزمین ہے اور دیکھنا تم (جب شام میں جاؤ تو) اپنے ہی حوضوں سے پانی پلانا، اس عبارت کے درمیان آپ نے جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ اگر کسی وجہ سے شام کو اختیار کرنا قبول نہ کرو تو پھر اپنے یمن کو اختیار کرنا۔

"اپنے ہی حوضوں سے پانی پلانا" غدر (اصل میں غدیر کی جمع ہے جس کے معنی حوض کے ہیں اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ شام میں پہنچ کر اس بات کا دھیان رکھنا کہ وہاں کے ملکی و ملی امن و انتظام میں تمہاری وجہ سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو، لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد سے اجتناب کرنا، مثلاً پانی کی فراہمی کے سلسلہ میں جو ذریعہ تمہارے لئے مخصوص ہو اسی سے اپنے لئے پانی حاصل کرنا کسی دوسرے کے حصہ میں سے پانی لے کر دوسروں سے مزاحمت اور معارضہ کی صورت ہرگز پیدا نہ کرنا خصوصاً، ان لوگوں سے جو دشمنان دین سے اسلامی مملکت کو محفوظ رکھنے کے لئے اسلامی سرحد پر مامور و متعین ہوں تاکہ تم آپس میں نزع و اختلاف اور فتنہ انگیزی کا سبب نہ بن جاؤ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اہل شام پر لعنت کرنے سے حضرت علیؓ کا انکار

⑫ عَنْ شُرَيْحِ بْنِ عُبَيْدٍ قَالَ ذُكِرَ اَهْلُ الشَّامِ عِنْدَ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَقِيْلَ الْعَنْهُمْ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ لَا اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْاَبْدَالُ يَكُوْنُوْنَ بِالشَّامِ وَهُمْ اَرْبَعُوْنَ رَجُلًا كُلَّمَا مَاتَ رَجُلٌ اَبْدَلَ اللّٰهُ مَكَانَهٗ رَجُلًا يُسْقٰى بِهِمُ الْغَيْثُ وَيُنْتَصَرُ بِهِمْ عَلَى الْاَعْدَآءِ وَيُصْرَفُ عَنْ اَهْلِ الشَّامِ بِهِمُ الْعَذَابُ۔

"حضرت شریح بن عبید تابعیؒ روایت کرتے ہیں کہ (ایک موقعہ پر) سیدنا علیؓ کے سامنے اہل شام کا ذکر کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اے امیر المؤمنین! شام والوں پر لعنت کیجئے۔ حضرت علیؓ نے کہا: نہیں (میں اہل شام پر لعنت نہیں کر سکتا) حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے ابدال شام میں ہوتے ہیں اور وہ چالیس مرد ہیں، جب ان میں سے کوئی شخص مر جاتا ہے تو اللہ اس کی جگہ دوسرے شخص کو مقرر کر دیتا ہے۔ ان (ابدال) کے وجود و برکت سے بارش ہوتی ہے، ان کی مدد سے دشمنان دین سے بدلہ لیا جاتا ہے، اور انہیں کی برکت سے اہل شام سے (سخت) عذاب کو دفع کیا جاتا ہے۔"

تشریح: اہل شام کا ذکر کیا گیا، میں "اہل شام" سے مراد حضرت علیؓ کے مخالفین یعنی حضرت معاویہؓ اور شام والوں میں سے حضرت معاویہؓ کے حامی و مددگار ہیں، حضرت معاویہؓ امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ملک شام کے حاکم (گورنر) مقرر ہوئے تھے، اور آخر تک وہ شام پر حکومت کرتے رہے، انہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا اور شام میں خود مختار حکومت کے مالک ہو گئے تھے، انہی حضرت معاویہؓ اور ان کے شامی حامیوں کا ذکر برائی کے ساتھ حضرت علیؓ کے سامنے کیا ہوگا اور کہا کہ آپ اپنے ان مخالفین اہل شام پر لعنت کیجئے۔

"ابدال شام میں ہوتے ہیں" حضرت علیؓ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ بھلا میں اہل شام پر لعنت کیسے کر سکتا ہوں، شام تو وہ سرزمین ہے جہاں ابدال ہوتے ہیں، اگر میں نے اہل شام پر لعنت کی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان اہل شام کے ضمن میں ابدال بھی آ جائیں علماء اہل سنت کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا یہ کہنا در حقیقت محاذ آرائی سے بچنے کے لئے اس وقت اہل شام پر لعنت کرنے سے گریز کرنا تھا تاہم اس

سے یہ لازم نہیں آتا کہ ابدال کو مستثنیٰ کر کے باقی اہل شام پر لعنت کرنے کو حضرت علیؓ جائز سمجھتے تھے جیسا کہ ان کے مذکورہ الفاظ سے ابتداءً مفہوم ہوتا ہے اور حضرت علیؓ کے بارہ میں تو ایسا تصور بھی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ خود انہی حضرت امیرالمؤمنین علیؓ کا ارشاد ہے کہ: یہ (اہل شام) تو ہمارے بھائی ہیں جو ہم سے منحرف ہو گئے ہیں، اسی طرح ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے لشکر والے اپنے مخالفین یعنی حضرت معاویہؓ کے لشکر والوں میں سے ایک شخص کو پکڑ کر حضرت علیؓ کی خدمت میں لائے تو اس کو دیکھ کر وہاں موجود ایک شخص بولا کتنی عجیب بات ہے (کہ یہ شخص مخالفین علیؓ کے لشکر میں شامل ہے) میں تو اس آدمی کو ایک اچھا مسلمان سمجھتا تھا، حضرت علیؓ نے اس کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو فرمایا: یہ تم کیا کہہ رہے ہو، اب بھی تو یہ شخص مسلمان ہی ہے، ان کے عُلاوہ اور بھی ایسے آثار و اخبار منقول ہیں جن سے سیدنا علیؓ کی نظر میں حضرت معاویہؓ اور ان کے حامی اہل شام کا مسلمان ہونا ثابت ہے۔

"اور انہی کی برکت سے اہل شام سے عذاب کو دفع کیا جاتا ہے" یہاں اہل شام کی تخصیص اس بناء پر ہے کہ ان ابدال کا جسمانی وجود اہل شام کے درمیان ہوتا ہے اور اس سبب سے اہل شام ان کی قربت اور ان کے ارتباط میں سب سے زیادہ رہتے ہیں ورنہ عمومی طور پر تو ان ابدال کی برکت و نصرت تمام عالم کو ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ ابدال کے وجود کا ذکر اس حدیث میں بھی حضرت علیؓ کے حوالہ سے مذکور ہے، شیخ ابن حجرؒ نے ان حدیثوں کو نقل کیا ہے اور پھر ایک حدیث حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے نقل کی ہے جس میں حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: خیار اُمت یعنی اُمت کے نیک ترین لوگ جو اس اُمت میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں ان کی تعداد پانچ سو ہے اور ابدال چالیس کی تعداد میں رہتے ہیں، نہ پانچ سو کی تعداد کم ہوتی ہے اور نہ چالیس کی، جب کوئی ابدال مرجاتا ہے تو اس کی جگہ اللہ تعالیٰ ان پانچ سو خیار اُمت میں سے کسی ایک کو مقرر کر دیتا ہے (یہ سن کر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمیں ان کے اعمال کے بارہ میں بھی بتا دیجئے (کہ آخر وہ کیا عمل کرتے ہیں جس کے سبب ان کو یہ مرتبہ و مقام ملتا ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: وہ اس شخص کو معاف کر دیتے ہیں جو ان پر ظلم کرتا ہے، اس شخص کے ساتھ بھی نیک سلوک کرتے ہیں جو ان کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو جو کچھ بھی دیتا ہے اس کے ذریعہ وہ فقراء و مساکین کی خبر گیری کرتے ہیں اور اس کی تصدیق قرآن کریم کی اس آیت سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

اَلْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔

"(اعلیٰ درجہ کے اہل ایمان لوگ تو وہ ہیں) جو غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں (کی تقصیرات) سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے۔"

ایک روایت ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے اس میں عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ کی طرف سے چالیس ایسے آدمی مقرر ہوتے ہیں جن کے قلوب حضرت آدم علیہ السلام کے قلب پر ہیں اور اس کی طرف سے سات ایسے آدمی مقرر ہوتے ہیں جن کے قلوب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر ہیں، اور اس کی طرف سے پانچ ایسے آدمی مقرر ہوتے ہیں جن کے قلوب حضرت جبرئیل علیہ السلام کے قلب پر ہیں، اور اس کی طرف سے تین ایسے لوگ مقرر ہوتے ہیں جن کے قلب میکائیل کے قلب پر ہیں، اور اس کی طرف سے ایک ایسا آدمی مقرر ہوتا ہے جس کا قلب اسرافیل کے قلب پر ہے۔ پس جب وہ ایک آدمی مرجاتا ہے تو اس کی جگہ پر اللہ تعالیٰ ان تینوں آدمیوں میں سے کسی ایک کو مقرر کر دیتا ہے اور جب ان تینوں آدمیوں میں سے کوئی ایک مرجاتا ہے تو اس کی جگہ پر اللہ تعالیٰ ان پانچ آدمیوں میں سے کسی کو مقرر کر دیتا ہے، اور جب ان پانچ آدمیوں میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کی جگہ پر اللہ تعالیٰ ان سات آدمیوں سے کسی ایک کو مقرر کر دیتا ہے، اور جب ان سات آدمیوں میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کی جگہ پر اللہ تعالیٰ ان چالیس آدمیوں سے کسی ایک کو مقرر کر دیتا ہے اور جب ان چالیس آدمیوں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس جگہ پر اللہ تعالیٰ ان تین سو آدمیوں میں سے کسی ایک کو مقرر کر دیتا ہے، اور جب ان تین سو آدمیوں میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کی

جگہ پر اللہ تعالیٰ عوام میں سے کسی ایک آدمی کو مقرر کر دیتا ہے اور ان سب آدمیوں کے وجود کے سبب اس اُمت سے ہر بلا و آفت دفع کی جاتی ہے۔ اس حدیث کے ضمن میں بعض عارفین نے لکھا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا آدمی بھی مقرر ہوتا ہے جس کا قلب آنحضرت ﷺ کے قلب پر ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام کائنات اور اپنے تمام عالم خلق و امر میں کوئی ایسی ہستی پیدا نہیں فرمائی جو آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک سے زیادہ عزیز، زیادہ باشرف اور زیادہ لطیف و پاکیزہ ہو، لہٰذا اللہ کے برگزیدہ ترین بندوں میں سے بھی کسی کا قلب آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک کے برابر و مقابل نہیں ہے، خواہ وہ ابدال ہوں یا اقطاب۔

دمشق کا ذکر

⑬ وَعَنْ رَجُلٍ مِنَ الصَّحَابَةِؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَتُفْتَحُ الشَّامُ فَاِذَا خُيِّرْتُمُ الْمَنَازِلَ فِيْهَا فَعَلَيْكُمْ بِمَدِيْنَةٍ يُقَالُ لَهَا دمشْقُ فَاِنَّهَا مَعْقِلُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنَ الْمَلَاحِمِ وَفُسْطَاطُهَا مِنْهَا اَرْضٌ يُقَالُ لَهَا الْغُوْطَةُ رواهما احمد۔

"صحابہؓ میں سے ایک شخص سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے جب ملک شام کے شہر اور علاقے (اسلامی لشکر کے ذریعہ) فتح کئے جائیں گے پس جب تمہیں ان شہروں اور علاقوں میں مکانات بنانے اور رہائش پزیر ہونے کا اختیار دیا جائے تو تم اس شہر کو اختیار کرنا لازم جاننا جس کو "دمشق" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ (دمشق شہر) مسلمانوں کے لئے لڑائیوں سے پناہ کی جگہ ہے اور دمشق ایک جامع شہر ہے اور دمشق کی زمینوں (یعنی علاقوں) میں سے ایک زمین (یا علاقہ) ہے جس کو "غوطہ" کہا جاتا ہے (ان دونوں روایتوں کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے)۔"

تشریح: "صحابہؓ میں سے ایک شخص" اس حدیث کو جن صحابیؓ نے روایت کیا ہے ان کا نام معلوم نہیں ہوسکا لیکن اس سے حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ تمام ہی صحابہؓ عدول ہیں اور کسی صحابیؓ راوی کے نام کا معلوم نہ ہونا مطلق نقصان دہ نہیں ہے۔

"دمشق" اکثر قول کے مطابق دؔ کے زیر اور میم کے زبر کے ساتھ ہی فصیح تر ہے۔ یہ شام کا مرکزی شہر اور پایہ تخت ہے۔

"لڑائیوں سے پناہ کی جگہ" لفظ "معقل" کے معنی پناہ گاہ اور قلعہ کے ہیں، یہ لفظ عقل سے بنا ہے جس کے معنی ہیں، روک رکھنا، باندھنا، اور ملاحم جمع ہے ملحمۃ کی، جس کے معنی جنگ و جدل اور قتل و قتال کے ہیں، اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ دمشق کے مسلمانوں کے لئے ایک مضبوط قلعہ اور پناہ گاہ کی مانند ہے، جو مسلمان اس شہر میں داخل ہو جاتے ہیں وہ دشمنان دین کے غلبہ و تسلط اور ان کے قتل و قتال سے اپنے آپ کو مامون بنا لیتے ہیں، جس طرح کوئی بکری خود کو اپنے دشمن سے محفوظ رکھنے کے لئے پہاڑوں پر چڑھ جاتی ہے اور کسی پہاڑی چوٹی کو اپنی پناہ گاہ بنا لیتی ہے۔

"دمشق ایک جامع شہر ہے" فسطاط (بعض روایتوں کے مطابق فسطاط) جامع شہر کو کہتے ہیں یعنی ایسا شہر جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے اندر جمع کرے، اسی لئے مصر کو بھی فسطاط کہتے ہیں ویسے فسطاط خیمہ اور ڈیرے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

"جس کو غوطہ کہا جاتا ہے" غُوْطَہ ان باغات اور پانی کے چشموں کا نام ہے جو شہر دمشق کے گرداگرد ہیں اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ دمشق شہر کے قریب ایک بستی کا نام "غوطہ" ہے۔

خلافت مدینہ میں اور ملوکیت شام میں

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْخِلَافَةُ بِالْمَدِيْنَةِ وَالْمُلْكُ بِالشَّامِ۔

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خلافت مدینہ میں ہے اور ملوکیت یعنی بادشاہت شام میں"۔

تشریح: "خلافت مدینہ میں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ خلافت کا پایۂ تخت غالب عرصہ تک مدینہ میں رہے گا "غالب عرصہ" کی قید اس لئے ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اپنا پایۂ تخت کوفہ کو بنا رکھا تھا، یا پھر اس جملہ کی مراد یہ ہے کہ خلافت مستقرہ مدینہ میں ہے۔

"ملوکیت یعنی بادشاہت شام میں ہے" اس جملہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؓ نے جب خلافت سے دست کشی اختیار کرلی اور امور مملکت امیر معاویہؓ کے سپرد کر آئے تو بھی امیر معاویہؓ خلیفہ نہیں ہوئے۔ اس کی تائید میں اس روایت کو پیش کیا جاسکتا ہے جو احمدؒ، ترمذیؒ، ابویعلیٰؒ اور ابن حبانؒ نے نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: میرے بعد میری امت میں خلافت کا زمانہ بس تیس سال تک رہے گا اس کے بعد پھر ملوکیت و بادشاہت آجائے گی۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں حضرت علیؓ کی خلافت اور حضرت امیر معاویہؓ کی ملوکیت و بادشاہت کی طرف اشارہ ہے واضح ہو کہ ایک اور حدیث میں "ملک" یعنی ملوکیت و بادشاہت کا ذکر آنحضرت ﷺ کے خصائص و اوصاف میں ہوا ہے اس میں یوں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مولد یعنی جائے پیدائش تو مکہ ہے، آپ ﷺ کا مہاجر یعنی جائے ہجرت مدینہ ہے اور آپ ﷺ کا ملک یعنی آپ ﷺ کی بادشاہت شام میں ہے۔ تو اس حدیث میں "ملک" سے مراد نبوت و دین ہے، مطلب یہ کہ یوں تو آپ ﷺ کی نبوت اور آپ کا دین تمام عالم پر ظاہر ہوگا، لیکن آپ کی نبوت کا فیضان اور آپ کا دین آخر میں جس جگہ سب سے زیادہ اور سب سے غالب صورت میں ظاہر ہوگا وہ ملک شام ہے، اور بعض حضرات نے "آپ ﷺ کا ملک یعنی بادشاہت شام میں ہے" کی مراد یہ بیان کی ہے کہ آپ ﷺ کے دین کی سربلندی کے لئے جہاد و قتال کی سب سے بڑی جگہ ملک شام ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل شام دشمنان دین کے خلاف برسرپیکار اور مصروف جہاد ہوں گے اور اس طرح اس جملہ میں مسلمانوں کے لئے ترغیب ہے کہ وہ آخر زمانہ میں جہاد اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرنے کی فضیلت و سعادت کے جویا ہوں تو شام کی راہ پکڑیں۔

شام کی فضیلت

⑮ وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَيْتُ عَمُوْدًا مِنْ نُوْرٍ خَرَجَ مِنْ تَحْتِ رَاْسِيْ سَاطِعًا حَتّٰى اِسْتَقَرَّ بِالشَّامِ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَآئِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں نے (خواب میں) دیکھا کہ نور کا ایک ستون میرے سر کے نیچے سے برآمد ہوا، اوپر کو بلند ہوا اور پھر ملک شام میں جا کر نصب ہوگیا" ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ آپ ﷺ کا دین بہت تیزی کے ساتھ ملک شام میں پہنچے گا، اس کے برکات و اثرات بہت مضبوطی کے ساتھ اس سرزمین پر قائم رہیں گے اور اس ملک میں اس کو سربلندی و شوکت اور غلبہ حاصل ہوگا۔ اسی مفہوم میں اس روایت کو لینا چاہئے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت کے وقت آپ کی والدہ ماجدہ کے پیٹ سے ایک نور نکلا جس کی روشنی سے شام کے محلات و مکانات منور ہو گئے۔

دمشق کا ذکر

⑯ وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَآءِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ فُسْطَاطَ الْمُسْلِمِيْنَ يَوْمَ الْمَلْحَمَةِ بِالْغُوْطَةِ اِلٰى جَانِبِ مَدِيْنَةٍ يُقَالُ لَهَا دِمَشْقُ مِنْ خَيْرِ مَدَآئِنِ الشَّامِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابودرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: (دجال کے خلاف) فوجی کارروائی اور جنگ وجدال کے دنوں میں مسلمانوں کے جمع ہونے کی جگہ "غوطہ" ہے جو شام کے اس شہر کا نواحی علاقہ ہے جس کو دمشق کہا جاتا ہے اور دمشق شام کے شہروں میں سے بہترین شہر ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: من خیر مدائن الشیام کے الفاظ "دمشق" کی صفت ہے جس کو ترجمہ میں واضح کردیا گیا ہے اور جیسا کہ پچھلی حدیث میں گزرا "غوطہ" بھی دمشق کے قریب واقع ہے ان دونوں حدیثوں میں بظاہر ایک فرق نظر آتا ہے کہ وہاں تو دمشق کو فسطاط کہا گیا تھا اور یہاں غوطہ کو فسطاط کہا گیا ہے، لیکن "غوطہ" چونکہ دمشق کے قریب اور اسی کا نواحی علاقہ ہے، اس لئے حقیقت میں اُن دونوں کے درمیان کوئی تضاد اور فرق نہیں ہے۔

وہ عجمی حکمران جو دمشق پر تسلط نہیں پائے گا

⑰ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سُلَيْمَانَ" قَالَ سَيَأْتِي مَلِكٌ مِنْ مُلُوْكِ الْعَجَمِ فَيَظْهَرُ عَلَى الْمَدَائِنِ كُلِّهَا اِلَّا دِمَشْقَ۔

(رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن بن سلیمان تابعیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: وہ زمانہ آنے والا ہے، جب عجم کے حکمرانوں میں سے ایک حکمران چڑھائی کرے گا، وہ تمام شہروں پر غلبہ حاصل کرلے گا سوائے (شام کے شہر) دمشق کے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: شارحین حدیث نے اس روایت کا مصداق متعین نہیں کیا ہے کہ عجم کا وہ کون سا حکمران ہوسکتا ہے جو دمشق کے علاوہ تمام شہروں پر غلبہ وتسلط حاصل کرنے والا ہوگا، بہرحال یہ واضح کردینا نہایت ضرور ہے کہ شام و فلسطین بیت المقدس، صخرہ، عسقلان، قزوین، اندلس، دمشق اور ان کے علاوہ کچھ اور شہروں کی فضیلت میں متعدد حدیثیں منقول ہیں لیکن آئمہ حدیث نے ان میں سے اکثر کو ضعیف قرار دیا ہے۔

بَابُ ثَوَابِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ
اس اُمت کے ثواب کا بیان

اس اُمت سے مراد اُمت محمدیہ ﷺ ہے، یعنی وہ جماعت یا وہ گروہ جو اجابت اور متابعت دونوں کا جامع ہے۔ جس نے حضرت محمد ﷺ کو اللہ کا نبی و رسول بھی مانا اور آپ ﷺ کی اتباع و پیروی بھی کی چنانچہ اس جماعت کو "فرقہ ناجیہ" (نجات یافتہ گروہ سے تعبیر کیا جاتا ہے) پس "تنقیح" میں لکھا ہے کہ مبتدع (یعنی وہ شخص کہ جو بدعت نکالے اور بدعت اختیار کرے) علی الاطلاق اُمت میں سے نہیں ہے اور جیسا کہ "توضیح" میں ہے، علی الاطلاق امت میں سے اہل سُنّت والجماعت ہیں اور وہ لوگ ہیں جن کے دین پر چلنے کا راستہ رسول اللہ ﷺ اور رسول خدا کے صحابہؓ کا راستہ کے مطابق ہے اور صاحب تلویح نے لکھا ہے کہ مبتدع کو علی الاطلاق اُمت میں سے خارج اس لئے کہا جاتا ہے کہ اگرچہ وہ اہل قبلہ میں سے ہوں مگر وہ "امت دعوت" ہی کے حکم میں ہوں گے جیسا کہ کفار "امت دعوت" ہیں ان کا شمار "امت اجابت" میں نہیں ہوگا۔

امت محمدیہ ﷺ: دوسری تمام امتوں اور ملتوں کے مقابلہ میں اس اُمت مرحومہ کے فضائل و مناقب اور اس کے اجر و ثواب کی کثرت حد حصر سے خارج اور حیطہ بیان سے باہر ہے، بلاشبہ یہ اُمت رسول ﷺ تمام دوسری امتوں سے افضل اور برتر ہے، اس امت کی افضلیت و برتری کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم میں خالق کائنات عزوجل کا یہ ارشاد کافی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔

"(اے اُمّت محمدیہ) تم لوگ سب سے اچھی اُمّت ہو جس کو لوگوں کی (ہدایت اور راہنمائی) کے لئے ظاہر کیا گیا ہے۔"

اور یہ ارشاد کہ:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔

"اور اسی لئے ہم نے تم کو (اے اُمّت محمدیہ) ایسی امت بنایا ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم (مخالف) مقابلے میں گواہ ہو۔"

اور اس اُمّت کی تعریف میں خود یہی ایک بات سب سے بھاری ہے کہ وہ محمد ﷺ کی اُمّت ہے جو خاتم النبیین، سید المرسلین اور افضل الخلائق ہیں اور یہ کہ تمام انبیاء اور رسولوں نے آرزو کی کہ کاش وہ محمد ﷺ کا زمانہ پاتے اور آپ ﷺ کی اُمّت کا ایک فرد ہونے کا شرف حاصل کرتے، اس کے علاوہ اس کے خصائص و کمالات اور کرامات و فضائل میں ایسی چیزیں ثابت ہیں جو پچھلی امتوں میں سے کسی بھی اُمّت کے لئے ثابت نہیں ہیں اللھم اجعلنامن امتہ وارزقنامحبتہ و توفناعلی دینہ وملتہ برحمتک یا ارحم الراحمین۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اس اُمّت پر خصوصی فضل خداوندی

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ ؓ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَآ اَجَلُكُمْ فِيْ اَجَلِ مَنْ خَلَا مِنَ الْاُمَمِ مَا بَيْنَ صَلٰوةِ الْعَصْرِ اِلٰى مَغْرِبِ الشَّمْسِ وَاِنَّمَا مَثَلُكُمْ وَمَثَلُ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى كَرَجُلٍ اِسْتَعْمَلَ عُمَّالًا فَقَالَ مَنْ يَّعْمَلُ لِيْ اِلٰى نِصْفِ النَّهَارِ عَلٰى قِيْرَاطٍ قِيْرَاطٍ فَعَمِلَتِ الْيَهُوْدُ اِلٰى نِصْفِ النَّهَارِ عَلٰى قِيْرَاطٍ قِيْرَاطٍ ثُمَّ قَالَ مَنْ يَّعْمَلُ لِيْ مِنْ نِّصْفِ النَّهَارِ اِلٰى صَلٰوةِ الْعَصْرِ عَلٰى قِيْرَاطٍ قِيْرَاطٍ فَعَمِلَتِ النَّصَارٰى مِنْ نِّصْفِ النَّهَارِ اِلٰى صَلٰوةِ الْعَصْرِ عَلٰى قِيْرَاطٍ قِيْرَاطٍ ثُمَّ قَالَ مَنْ يَّعْمَلُ لِيْ مِنْ صَلٰوةِ الْعَصْرِ اِلٰى مَغْرِبِ الشَّمْسِ عَلٰى قِيْرَاطَيْنِ قِيْرَاطَيْنِ اَلَا فَاَنْتُمُ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ مِنْ صَلٰوةِ الْعَصْرِ اِلٰى مَغْرِبِ الشَّمْسِ اَلَا لَكُمُ الْاَجْرُ مَرَّتَيْنِ فَغَضِبَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى فَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ عَمَلًا وَّاَقَلُّ عَطَآءً قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَهَلْ ظَلَمْتُكُمْ مِّنْ حَقِّكُمْ شَيْئًا قَالُوْا لَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَاِنَّهٗ فَضْلِيْ اُعْطِيْهِ مَنْ شِئْتُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عمرؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (ہم مسلمانوں کو مخاطب کر کے) فرمایا: دوسری امتوں کے لوگوں کے مقابلہ میں تمہارا عرصۂ حیات اتنا ہے جتنا کہ (سارے دن کے مقابلہ میں) نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک کا درمیانی وقت، علاوہ ازیں (اللہ رب العزت کے ساتھ) تمہارا معاملہ اور یہود و نصاریٰ کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص اجرت پر کام کرنے کے لئے کچھ مزدوروں کو طلب کرے اور ان سے کہے کہ کوئی ہے جو دوپہر تک میرا کام کرے اور میں (اتنے عرصہ کام کرنے کی اجرت کے طور پر) ہر شخص کو ایک ایک قیراط دوں گا۔ چنانچہ اس اجرت کو منظور کر کے) یہود نے دوپہر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا، پھر اس شخص نے کہا کوئی ہے جو دوپہر سے عصر تک میرا کام کرے اور میں ہر شخص کو ایک ایک قیراط دوں گا۔ چنانچہ یہود کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے لوگوں نے یعنی) نصاریٰ نے دوپہر سے عصر کے وقت ایک ایک قیراط پر کام کیا، اور پھر اس شخص نے کہا کوئی ہے جو نماز عصر سے غروب آفتاب تک میرا کام کرے اور میں ہر شخص کو دو دو قیراط دوں گا (اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے ہم مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا) جان لو (اس مثال میں) تم ہی وہ لوگ ہو جو عصر کی نماز سے غروب آفتاب تک کام کرنے والے ہیں، یاد رکھو تمہارا اجر دو گنا ہے اور اسی وجہ سے (کہ تمہارے کام کی مدت تو کم ہے لیکن مستحق دو گنے اجر کے قرار پائے ہو) یہود و نصاریٰ بھڑک اٹھے اور بولے کہ عمل کے اعتبار سے تو ہم

بہت بڑھے ہوئے ہیں لیکن اجر و ثواب میں ہمارا حصہ بہت کم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا! کیا میں نے تمہارے ساتھ کچھ ظلم کیا ہے یعنی میں نے تمہاری جو اجرت مقرر کی تھی اور تمہیں جو کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا کیا اس میں کچھ کمی کی ہے، یہود و نصاری نے کہا! نہیں (ہمارے حق میں تو نے کچھ کم نہیں کیا ہے لیکن تیری طرف سے یہ تفاوت اور تفریق کیسی ہے؟) پروردگار نے فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ زیادہ اجر دینا میرا فضل و احسان ہے میں جس کو چاہوں زیادہ دوں (میں فاعل مختار ہوں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں)۔" (بخاری)

تشریح: اَجَل کسی چیز کی مدت متعینہ کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى اور کبھی اس لفظ (اجل کا اطلاق انسان کی موت پر کیا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے دنا اجلہ اس شخص کی موت قریب آگئی۔ یہ ملا علی قاری نے طیبی کے حوالہ سے لکھا ہے اور اس کے بعد کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ "اجل" کے لفظ سے کبھی تو اس پوری مدت کو تعبیر کیا جاتا ہے جو عمر کے لئے متعین ہوتی ہے خواہ وہ معلق ہو یا مبرم) جیسا کہ اللہ کے اس ارشاد ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اور کبھی اس لفظ کا اطلاق مدت عمر کے خاتمہ اور زندگی کے آخری لمحہ پر ہوتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کے ارشاد اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ میں اس لفظ کے یہی معنی مراد ہیں پس یہاں حدیث کے الفاظ انما اجلکم فی اجل من خلا من الامم الخ میں لفظ "اجل" کے پہلے معنی مراد ہیں یعنی پورا عرصہ حیات پوری مدت عمر اس روشنی میں حدیث گرامی کے ان الفاظ کی وضاحت یہ ہوگی کہ! اے مسلمانو! پچھلی امتوں کے لوگوں کی لمبی عمروں کے مقابلہ میں تمہاری کم عمروں کا تناسب وہی ہے جو دن کے آغاز سے نماز عصر تک کے وقت کے مقابلہ میں عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک کے وقت کا ہے، لیکن اس کے باوجود تمہارے اجر و ثواب کی مقدار زیادہ متعین ہے جب کہ ان لمبی لمبی عمروں والوں کے لئے اجر و ثواب کی مقدار کم رکھی گئی، یہ تمہارا اشرف و اعزاز ہے کہ تمہارے عمل کا عرصہ کم ہے مگر اجر و ثواب کہیں زیادہ۔

"قیراط" ایک وزن کو کہتے ہیں جو درہم کے بارہویں حصہ یا دینار کے بیسویں یا چوبیسویں حصہ کے برابر ہوتا ہے۔

"یہود نے دوپہر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا" یعنی حضرت موسی علیہ السلام کو ماننے والے اور ان کی اتباع کرنے والوں نے اپنی لمبی لمبی عمروں میں کم ثواب پر زیادہ عمل کیا، اور اس طرح وہ ان مزدوروں کے مشابہ ہوئے جنہوں نے صبح سے دوپہر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا ہو۔ اسی طرح جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں اور ان کی اتباع کرنے والوں کا زمانہ آیا تو انہوں نے بھی اپنے عرصہ حیات میں کم ثواب پر زیادہ عمل کیا اور وہ ان مزدوروں کے مشابہ ہوئے جنہوں نے دوپہر کے بعد سے عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا ہو۔

"یاد رکھو تمہارا اجر دوگنا ہے" یعنی یہود و نصاری کے ساتھ تو یہ معاملہ تھا کہ وہ جتنا کرتے تھے اسی کے برابر اجر و ثواب کے مستحق ہوتے تھے۔ لیکن تمہارا اعزاز یہ ہے کہ ان کی بہ نسبت تم کو دوگنا اجر و ثواب ملتا ہے گویا حدیث کا یہ مضمون اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ۔

"اے (عیسیٰ علیہ السلام پر) ایمان رکھنے والو! تم اللہ سے ڈرو اور اس اور اس کے رسول (محمد ﷺ) پر ایمان لاؤ۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے تمہیں دگنا ثواب دے گا"۔

پس اس اُمت کے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے نبی کو مانا اور اس کی تصدیق کی بلکہ پچھلے نبیوں اور رسولوں پر بھی ایمان لائے اور ان کی تصدیق کی لہٰذا دوگنے اجر اور دوہرے ثواب کے مستحق ہوئے۔

"لیکن اجر و ثواب میں ہمارا حصہ بہت کم ہے" یہود و نصاری کی اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ:

پروردگار! یہ کیا ہے کہ محمد ﷺ کی اُمّت کا کام کم اس کے اعمال قلیل، لیکن اس کا اجر بہت اس کا ثواب زیادہ، اس اُمّت کے مقابلہ میں ہمارا کام کہیں زیادہ ہمارے اعمال بہت کثیر، مگر ہمارا اجر کہیں کم اور ہمارا ثواب بہت قلیل؟ یہاں دونوں احتمال ہیں، یہ بات یہود و نصاریٰ یا تو قیامت کے دن کہیں گے جب وہ اُمّت محمدیہ کو اجر و ثواب کے اعتبار سے اپنے مقابلہ میں کہیں زیادہ آگے پائیں گے، یا اس طرح کی بات انہوں نے اس وقت کہی ہوگی جب ان کو اپنے اپنے زمانہ میں اپنی آسمانی کتابوں کے ذریعہ اور اپنے رسولوں کی زبانی اس امت محمدیہ کے ایسے فضائل و خصائص معلوم ہوئے ہوں گے۔ بہرصورت اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی ثواب ملتا ہے وہ نہ تو عبادات و اعمال میں رنج و تعب اٹھانے کے اعتبار سے ملتا ہے اور نہ استحقاق کی جہت سے، کیونکہ بندہ اپنے مولیٰ کے نزدیک اس وجہ سے ثواب کا مستحق نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی عبادت کی ہے، کوئی کارگزاری دکھائی ہے، بلکہ مولیٰ اپنے محض فضل و احسان کی جہت سے بندہ کو ثواب سے نوازتا ہے اور مولیٰ کو اس کا پورا اختیار ہے کہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ سے زیادہ ثواب عطا فرمائے فَاِنَّهٗ يَفْعَلُ مَايَشَآءُ وَيَحْكُمُ مَايُرِيْدُ۔

واضح ہو کہ حدیث میں مذکور "یہود و نصاریٰ" سے مراد وہ یہود و نصاریٰ ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں (رسول کو مانا) اس پر ایمان لائے، اس کی لائی ہوئی کتاب اور شریعت کی پیروی کی اور آخر دم تک اپنے دین حق پر قائم رہے، رہی ان یہود و نصاریٰ کی بات جنہوں نے اپنے دین حق سے انحراف کیا، اپنے رسول اور اپنی کتاب کا انکار کیا، ان کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے کیونکہ وہ تو سرے سے ثواب ہی سے محروم ہے علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ نصاریٰ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل مقدس پر ایمان رکھتے ہیں، باوجودیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت پر بھی ایمان لائے تھے لیکن ان کو یہود کی بہ نسبت زیادہ ثواب نہیں ملا، جو صرف اپنے ہی رسول اور اپنی ہی کتاب یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت پر ایمان لائے تھے۔

ایک اور بات اس حدیث سے حنفی علماء نے عصر کے وقت کے بارہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول کو اور مضبوط بنانے کے لئے استدلال کیا ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ عصر کا وقت جب شروع ہوتا ہے کہ ہر شے کا سایہ اس کے دو مثل یعنی دوگنا ہو جائے۔ چنانچہ ان حنفی علماء کا کہنا ہے کہ نصاریٰ کے عرصہ عمل کا اس اُمّت کے عرصہ عمل سے زیادہ ہونا اسی صورت میں سمجھا جاسکتا ہے جب کہ حدیث میں مذکور مثال کے مطابق ان کے کام (عمل) کی مدت دوپہر کے بعد سے ہر شے کا سایہ دو مثل یعنی دوگنا ہو جانے تک رہے۔

بعد کے زمانہ کے اہل ایمان کی فضیلت

④ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِنْ اَشَدِّ اُمَّتِىْ لِىْ حُبًّا نَاسٌ يَّكُوْنُوْنَ بَعْدِىْ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْرَاٰنِىْ بِاَهْلِهٖ وَمَالِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: حقیقت تو یہ ہے کہ میری اُمّت میں مجھ سے نہایت شدید اور نہایت اچھی محبّت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو میری وفات کے بعد پیدا ہوں گے ان میں کا کوئی تو یہ آرزو کرے گا کہ کاش وہ مجھ کو دیکھ لے، اپنے اہل و عیال اور اپنا مال و اثاثہ سب کچھ مجھ پر قربان کر دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یعنی میرے تئیں شدت محبّت اس کو اس آرزو میں مبتلا رکھے گی کہ اگر میری زیارت اور میرے دیدار کا موقع اس کو نصیب ہو جائے تو وہ مجھ تک پہنچے اور اپنے اہل و عیال، اپنا گھربار اپنا مال و اثاثہ سب کچھ مجھ پر فدا کر دے، واضح ہو کہ اس حدیث سے اور اس جیسی دوسرے حدیثوں سے بظاہر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ہو سکتا ہے کہ بعضے لوگ ایسے اس اُمّت میں پیدا ہوں جو فضیلت میں صحابۂ کرام کے برابر ہوں یا ان سے بھی افضل ہوں چنانچہ محدثین میں کی ایک مشہور شخصیت علامہ ابن

عبدالبرؒ کا رجحان اسی طرف ہے اور انہوں نے اسی طرح کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس کا ذکر شیخ ابن حجر مکی کی صواعق محرقہ میں موجود ہے، لیکن جمہور علماء کا اجماع و اتفاق اسی پر ہے کہ اُمّت کے افضل ترین افراد صحابہ کرام ہی ہیں کوئی بھی غیر صحابی خواہ دین و شریعت علم و معرفت، ولایت و بزرگی اور تقویٰ و تقدس میں کتنا ہی اونچا مقام رکھتا ہو، صحابی کی منزل اور اس کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا، ان جمہور علماء نے ان احادیث کے بارہ میں کہ جن سے ابن عبدالبرؒ نے استدلال کیا ہے کہا ہے کہ ان حدیث کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت کی جاسکتی ہے وہ کسی غیر صحابی کی کسی ایک گوشہ سے جزوی فضیلت ہے لیکن جہاں تک کلی افضلیت کا تعلق ہے، کہ جو کثرت ثواب سے عبارت ہے تو وہ صرف صحابہ کے لئے ہے۔ ان علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس گفتگو میں صحابہؓ سے مراد وہ خاص الخاص صحابہ ہیں جن کو آنحضرت ﷺ کی صحبت و معیت میں طویل عرصہ تک رہنے کا شرف نصیب ہوا ہو، جنہوں نے آنحضرت ﷺ سے بہت زیادہ اکتساب علم و فیض کیا ہو، اور جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے ہوں، رہے وہ عام العوام صحابہؓ جن کو ایک آدھ ہی مرتبہ زیارت نبوی ﷺ کا موقع ملا ہو اور بعض تو ایسے بھی ہیں جن کو پوری عمر میں بس ایک ہی مرتبہ چہرۂ اقدس کا دیدار نصیب ہوا تو ان کا مسئلہ محل توقف و تردد اور محل نظر ہے، لیکن حق یہ کہ آنحضرت ﷺ کی صحابیت کا وہ شرف و فضل جو کسی بھی صحابی کو کسی بھی غیر صحابی سے افضل و برتر مقام عطا کرتا ہے، ہر صحابی کو حاصل ہے، اگرچہ کسی صحابی کو صرف ایک ہی بار آنحضرت ﷺ کے چہرۂ اقدس کے دیدار کا موقع ملا ہو اور اس فضل و شرف میں تو کوئی بھی کسی صحابی کا ہمسر و شریک نہیں ہو سکتا، ہاں علمی و عملی فضیلت میں گفتگو کا دائرہ وسیع ہو سکتا ہے لیکن اس جہت سے بھی زیادہ بحث کی بجائے یہی کہنا اولیٰ ہے کہ صحابہؓ پوری اُمّت میں علی الاطلاق افضل و اشرف ہیں۔

یہ اُمّت اللہ کے سچے دین پر قائم رہنے والوں سے کبھی خالی نہیں رہے گی

(۴) وَعَنْ مُعَاوِيَةَؓ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَزَالُ مِنْ اُمَّتِيْ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ عَلٰى ذٰلِكَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَنَسٍ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ فِيْ كِتَابِ الْقِصَاصِ۔

"اور حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: میری اُمّت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہے گا جو اللہ کے حکم پر قائم ہوگا، اس گروہ (کے دینی و جماعتی نظم اور معاملات کو) نہ وہ شخص نقصان پہنچا سکے گا جو اس کی تائید و اعانت ترک کر چکا ہو، اور نہ وہ شخص ضرر پہنچائے گا جو (موافقت کی بجائے) اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا ہو یہاں تک کہ اللہ کا حکم آن پہنچے گا اور وہ اپنے اسی راستہ پر یعنی احکام خداوندی اطاعت اور دین کی خدمت و اعانت پر قائم ہوں گے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث ان من عباد اللہ لو اقسم علی اللہ لابرہ کتاب القصاص میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: "اللہ کے حکم پر قائم ہوگا......" یعنی اس گروہ کی اعتقادی اور عملی زندگی پوری عمارت و دینی فرائض اور شرعی احکام پر استوار ہوگی جو کتاب اللہ کو یاد کرنے حدیث کا علم حاصل کرنے کتاب سُنّت سے استنباط کرنے، فی سبیل اللہ جہاد کرنے مخلوق خدا کی خیر خواہی میں لگے رہنے اور جتنے فرض کفایہ ہیں سب کے تئیں اپنی ذمہ داری نبھانے سے عبارت ہے اور جس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد واشارہ کرتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

"اور تم میں (ہمیشہ) ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے جو (دوسروں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں، اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں۔"

بہر حال اس حدیث سے واضح ہوا کہ روئے زمین ایسے صلحا اور پاکیزہ نفس لوگوں سے کبھی خالی نہیں رہے گی جو احکام خداوندی کی پیروی میں ثابت قدم رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے دور رہتے ہیں، دین و شریعت پر ہر حالت میں عمل کرتے

ہیں اور بہر صورت اسلام کی بقاء و سربلندی کے لئے سرگرم رہتے ہیں، خواہ مدد و اعانت کرنے والے ان کی مدد و اعانت کریں یا مخالفت پر کمربستہ لوگ ان کی مخالفت و برائی کریں۔

حَتّٰی یاتی امر اللّٰہ (یہاں تک کہ اللہ کا حکم آن پہنچے گا) میں (امر اللّٰہ) (اللہ کے حکم) سے موت اور انقضائے عہد مراد ہے تاہم ایک شارح نے اس سے "قیامت" مراد لی ہے لیکن اس قول پر اس حدیث کی روشنی میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے لا تقوم الساعة حَتّٰی لا یکون فِیْ الارض من یَقُوْلُ اللّٰہ (روئے زمین پر جب تک ایک بھی اللہ کا نام لیوا موجود رہے گا قیامت نہیں آئے گی) اسی طرح قائمة بامر اللّٰہ (اللہ کے حکم پر قائم ہوگا) کے معنی ایک شارح نے اللہ کے دین پر سختی سے عمل کرنا لکھے ہیں، نیز بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حدیث میں مذکورہ "گروہ" سے مراد اہل علم کی وہ جماعت ہے جو ہر زمانہ میں حدیث کی تعلیم اور دینی علوم کی تدریس و اشاعت کے ذریعہ سُنّت کی ترویج اور دین کی تجدید و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتی رہے گی اور ایک شارح کہتے ہیں "گروہ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ اور ہر حالت میں اسلام پر قائم رہیں گے۔ ایک اور شارح لکھتے ہیں، ہوسکتا ہے اس حدیث کا مطلب یہ ہو کہ روئے زمین سے اہل اسلام کی شوکت و عظمت کبھی فناہ نہیں ہوگی۔ اگر روئے زمین کے کسی علاقہ اور کسی خطہ میں اسلام اور مسلمانوں کو ضعف و اضمحلال لاحق ہوگا تو کسی دوسرے علاقہ اور خطہ میں اسلام کا بول بالا اور مسلمانوں کو شوکت و عظمت حاصل رہے گی جو اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کا پرچم سر بلند کرنے میں مستعدی سے لگے ہوں گے اور اکثر اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ گروہ سے مراد غازیان اسلام کی جماعت ہے جس کا کام دشمنان دین اسلام سے جہاد کرکے دین کو مضبوط و سربلند کرنا ہے اور پھر یہی جماعت آخر زمانہ میں اسلامی سرحدوں کی حفاظت و نگہبانی کرے گی، بعض روایتوں میں وھم بالشام کے الفاظ بھی آئے ہیں یعنی اس گروہ کا مستقر ملک شام ہوگا اور بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں حَتّٰی یقاتل اخرھم مسیح الدجال (یہاں تک کہ اس گروہ کے آخری افراد دجال کو قتل کریں گے) گویا یہ روایتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ "گروہ" سے مراد غازیان اسلام ہی کی جماعت ہے لیکن حدیث کے ظاہری مفہوم سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ عمومی طور پر ہر وہ جماعت اور ہر وہ طبقہ مراد ہے جو اللہ کے سچے دین پر قائم ہو اور اللہ کے دین کی خدمت و اشاعت میں اور اسلام کی سربلندی کے لئے کسی بھی صورت سے مصروف عمل ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اُمّت محمدی ﷺ کی مثال

④ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ اُمَّتِیْ مَثَلُ الْمَطَرِ لَا یُدْرٰی اَوَّلُہٗ خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُہٗ۔

(رواہ الترمذی)

"حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: میری اُمّت کا حال بارش کے حال کی طرح ہے جس کے بارہ میں معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا اول بہتر ہے یا اس کا آخر بہتر ہے۔" (ترمذی)

تشریح: بارش کی مثال کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اپنی اُمّت کا ذکر جس انداز میں کیا اس سے بظاہر تو شک و تردد اور عدم یقین اس میں سمجھا جاتا ہے کہ معلوم نہیں کہ اس اُمّت کے پہلے لوگ بہتر تھے یا بعد کے لوگ بہتر ہیں، لیکن حقیقت میں حدیث سے یہ مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ بارش کی مثال کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ پوری اُمّت اچھی ہے جیسا کہ سوکھے اور خشک موسم میں جب باران رحمت نازل ہوتی ہے تو وہ پوری بارش ہی اچھی اور نافع مانی جاتی ہے، اس طرح اُمّت محمدی ﷺ میں پہلے زمانہ سے تعلق رکھنے والے اور بعد کے زمانوں کے سچے اور نیک مسلمان بھی خیر یعنی اچھا ہونے اور فائدہ پہنچانے کے اعتبار سے برابر ہیں، پس لفظ "خیر" دین کے اعتبار سے افضلیت ظاہر کرنے والے اسم تفصیل کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اُمّت کے اول اور آخر دونوں سے تعلق رکھنے

والے اچھا اور نافع ہونے میں برابر کیسے ہیں؟ تو وہ یوں کہ دور اول کے لوگوں نے رسول خدا ﷺ کی صحبت و رفاقت کا شرف پایا۔ آنحضرت ﷺ کی ہر حالت میں اتباع کی، آپ ﷺ کی دعوت اسلام دوسروں تک پہنچائی، آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت اور آپ ﷺ کے پیش کئے ہوئے دین کے فوائد و ہدایات کی بنیاد رکھی۔ آپ ﷺ کے دین متین کو اعانت و تقویت پہنچائی اور آنحضرت ﷺ کی ہر طرح سے مدد و حمایت کی تو بعد کے امتیوں نے آنحضرت ﷺ کی نبوت اور رسالت اور آپ ﷺ کی شریعت کو جوں کا توں تسلیم کیا، رسالت و شریعت کے ہر جز پر مضبوط عقیدے کے ساتھ جمے رہے، آپ ﷺ کے دین کی حفاظت اور دین کو استحکام و رواج دیا دینی قواعد و ہدایات کی بنیاد کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، یا دین و شریعت کے ارکان کو مضبوط و مستحکم کیا، اسلام کے جھنڈے کو سربلند کیا، اسلام کی روشنی کو چاردانگ عالم میں پھیلایا اور اس کے برکات و اثرات تمام عالم پر ظاہر کئے اور اگر لفظ "خیر" کو اسم تفضیل کے معنی پر محمول کیا جائے تو بھی اس اعتبار سے درست ہو سکتا ہے کہ "خیر" (بہتر ہونے) کے وجوہ اور اسباب متعدد ہوتے ہیں جن اسباب و وجوہ کے اعتبار سے دور اول کے امتی بہتر تھے، ان کے علاوہ بعض اور اسباب و وجوہ سے بعد کے زمانہ کے امتی بہتر ہیں گویا حاصل یہ نکلا کہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نافع اور اچھا ہونے کے اعتبار سے پوری اُمّت یکساں اور برابر ہے اور اس پر بھی دلالت کرتی ہے، کہ وجوہ و اسباب کے تعدد و اختلاف کے مدنظر دور اول کے امتی اپنے اعتبار سے بہتر ہیں اور بعد کے زمانہ کے امتی اپنی نوعیت سے بہتر ہیں، لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ جہاں تک کلی افضلیت کا تعلق ہے وہ صرف دور اول کے امتیوں یعنی صحابہؓ کے لئے مخصوص ہے۔ اگرچہ یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ کسی خاص درجہ و نوعیت کے تحت بعد کے امتیوں میں سے کسی کے لئے جزوی افضلیت ثابت کی جائے اور یہ بات ذہن میں رہے کہ کلی افضلیت سے مراد "اللہ کے ہاں سب سے زیادہ ثواب پانا" ہے۔

اور تورپشتیؒ نے لکھا ہے: یہ حدیث بعد کے امتیوں پر دور اول کے امتیوں کی فضیلت و برتری میں شک و تردد پر ہرگز محمول نہیں ہے کیونکہ قرن اول (صحابہؓ کا زمانہ) تمام قرنوں سے بلاشک وشبہ افضل ہے پھر اس کے بعد کے قرن کے امتی اپنے بعد والے تمام قرنوں سے افضل ہیں، اور پھر اس کے بعد کے قرن کے امتی اپنے بعد والے تمام قرنوں سے افضل ہیں، پس اس حدیث کی مراد بس یہ بیان کرنا ہے کہ دین و شریعت پھیلانے کے اعتبار سے پوری اُمت نافع ہے۔ اسی طرح کی بات قاضیؒ نے بھی ایک طویل عبارت میں لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح بارش کے بارہ میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا کون سا حصہ زیادہ مفید اور نفع بخش ہے اور کس وجوہ سے "خیر" کا وجود ہے اور کن افراد میں "خیر" کا وجود نہیں ہے، کیونکہ وجود خیر کی مختلف جہتیں اور مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں اور اس اعتبار سے اُمت کا ہر دور اپنی اپنی حیثیت اور جہت سے "وجود خیر" کا حامل ہوگا، تاہم الفضل للمتقدم کے اصول کے تحت افضلیت انہی امتیوں کے لئے ہے جو دور اول میں تھے، یعنی صحابہؓ اور یہ حدیث بعد کے زمانے والے امتیوں کے لئے تسلی کا مصدر ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ رب العلمین کی رحمت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اس کی بارگاہ سے حصول فیض کی توقع ہر حال میں باقی ہے۔

اس حدیث کی شرح میں طیبیؒ لکھتے ہیں، اُمت کو بارش کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے وہ محض ہدایت اور علم کو سامنے رکھ کر دی گئی ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں بارش کو ہدایت اور علم کے مشابہت دی ہے پس حدیث میں مذکورہ "امت" جس کو بارش کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے اس سے مراد علماء کاملین ہیں کہ جو خود بھی کامل ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی درجہ کمال تک پہنچاتے ہیں، یہ وضاحت بھی گویا اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ "خیر" سے "نفع" کے معنی مراد لئے جائیں جس سے "افضلیت" میں پوری اُمت کا یکساں ہونا لازم نہیں آتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ اُمت محمدی اپنے کسی دور میں "خیر" سے خالی نہیں رہے گی، جیسا کہ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے پوری اُمت کو "امت مرحومہ" فرمایا ہے اور یہ ثمرہ ہے اس بات کا کہ اس اُمت کا نبی "نبی رحمت" ہے بخلاف دوسری امتوں کے کہ ان کے ہاں "خیر" کا وجود صرف ابتدائی دور میں رہا اور پھر بعد والوں میں "شر" آگیا اور اس طرح آیا کہ انہوں نے اپنی مقدس آسمانی کتابوں تک کو بدل ڈالا اور تحریفیں کر کر کے اپنے دین کا حلیہ ہی بگاڑ دیا جس پر ان کے دور اول کے لوگ تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اُمت محمدی ﷺ کا حال

⑤ عَنْ جَعْفَرٍؓ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَبْشِرُوْا وَاَبْشِرُوْا اِنَّمَا مَثَلُ اُمَّتِیْ مَثَلُ الْغَیْثِ لَا یُدْرٰی اٰخِرُهٗ خَیْرٌ اَمْ اَوَّلُهٗ اَوْ كَحَدِیْقَةٍ اُطْعِمَ مِنْهَا فَوْجٌ عَامًا ثُمَّ اُطْعِمَ مِنْهَا فَوْجٌ عَامًا لَعَلَّ اٰخِرَهَا فَوْجًا اَنْ یَّكُوْنَ اَعْرَضَهَا عَرْضًا وَاَعْمَقَهَا عُمْقًا وَاَحْسَنَهَا حُسْنًا كَیْفَ تَهْلِكُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَهْدِیُّ وَسَطُهَا وَالْمَسِیْحُ اٰخِرُهَا وَلٰكِنْ بَیْنَ ذٰلِكَ فَیْجٌ اَعْوَجُ لَیْسُوْا مِنِّیْ وَلَا اَنَا مِنْهُمْ۔ (رواہ رزین)

"حضرت امام جعفر صادقؒ اپنے والد (حضرت امام محمد باقرؒ) سے اور وہ امام جعفرؒ کے دادا (یعنی اپنے والد حضرت امام زین العابدین علی بن حسین بن علیؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: خوش ہو جاؤ، اور خوش ہو جاؤ، بات یہ ہے کہ میری اُمت اجابت کے افراد کا حال (حصول منفعت کے اعتبار سے) بارش کے حال کی مانند ہے جس کے بارہ میں معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا اخیر بہتر ہے یا اس کا اول بہتر ہے، یا میری اُمت کی مثال ایک باغ کی مانند ہے جس (کے کچھ حصوں سے) ایک سال ایک جماعت نے کھایا یعنی نفع اٹھایا اور اس (کے کچھ حصوں سے) دوسرے سال ایک اور جماعت نے کھایا، ممکن ہے وہ جماعت جس نے آخر میں باغ سے کھایا ہے (پہلی جماعت کے مقابلہ میں) چوڑائی اور گہرائی میں زیادہ ہو اور خوبیوں میں بھی اس سے بہتر ہو، بھلا وہ اُمت کیونکر ہلاک (یعنی نیست و نابود) ہو جس کا اول میں ہوں جس کے وسط میں مہدی ہوں گے اور جس کے آخر میں مسیح ہوں گے، ہاں ان زمانوں کے درمیان ایک کج رو (یعنی گمراہ) جماعت پیدا ہوگی، اس جماعت کے لوگ میرے راستہ و طریقہ پر چلنے والے اور میرے متبعین میں سے نہیں ہوں گے اور نہ میں ان سے ہوں یعنی میں ان سے راضی اور ان کا حامی و مددگار نہیں بلکہ ان کی سرکشی اور ان کے فسق کے سبب ان سے اپنی ناراضگی اور بیزاری کا اظہار کرتا ہو۔" (رزین)

تشریح: "خوش ہو اور خوش ہو......" یہ الفاظ آپ ﷺ نے دو بار یا تو تاکید کے لئے فرمائے یا اس تکرار میں یہ نقطہ ملحوظ تھا کہ ایک بشارت تو دنیا کے اعتبار سے ہے اور ایک بشارت آخرت کے اعتبار سے۔

"یا میری اُمت کی مثال......" اس جملہ میں آو (یا) کا لفظ تنویع کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور تخییر کے لئے بھی، بہرصورت "باغ" سے مراد وہ باغ ہے جس کے درخت ہرے بھرے ہوں اور اس میں انواع و اقسام کے پھل میوے کثرت سے ہوں اور "امت" کو باغ کے ساتھ مشابہت دینا در اصل "دین" کو اس کے شرائع ارکان اور شعبوں کی جہت سے مشابہت دینا ہے۔

چوڑائی اور گہرائی میں...... یہاں "چوڑائی اور گہرائی" سے جماعت کی کثرت اور لوگوں کی بڑی تعداد کے معنی مراد ہیں، اس جملہ میں طول، (لمبائی) کا ذکر اس لئے نہیں ہے کہ عرض اور عمق طول کے بعد ہوتا ہے، جب عرض اور عمق کا ذکر آ گیا تو گویا طول کا بھی ذکر ہو گیا۔

ایمان بالغیب کے اعتبار سے تابعینؒ کی فضیلت

⑥ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍؒ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْخَلْقِ اَعْجَبُ اِلَیْكُمْ اِیْمَانًا قَالُوا الْمَلٰٓئِكَةُ قَالَ وَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالُوْا فَالنَّبِیُّوْنَ قَالَ وَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْیُ یَنْزِلُ عَلَیْهِمْ قَالُوْا فَنَحْنُ قَالَ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَیْنَ اَظْهُرِكُمْ قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِیْمَانًا لَقَوْمٌ یَّكُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ یَجِدُوْنَ صُحُفًا فِیْهَا كِتَابٌ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِیْهَا۔

"اور حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ایک دن صحابہؓ سے) پوچھا! بتاؤ، ایمان کے اعتبار سے تم مخلوق میں کس کو زیادہ پسند کرتے ہو، یعنی خدا کی مخلوقات میں سے کس مخلوق کے ایمان کو تم بہت قوی اور بہت

اچھا سمجھتے ہو؟ بعض صحابہؓ نے جواب دیا، ہم تو فرشتوں کے ایمان کو بہت اچھا اور قوی سمجھتے ہیں! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: فرشتوں کے ایمان میں کیا عجوبہ پن ہے۔ وہ تو اپنے پروردگار کے پاس ہی رہتے ہیں یعنی فرشتے مقرب بارگاہ خداوندی ہیں اور عالم جبروت کے عجائب و غرائب کا ہمہ وقت مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اگر ان کا ایمان قوی ہے تو اس میں کیا عجیب و غریب بات ہے۔ انہی صحابہؓ نے یا دوسرے بعض صحابہؓ نے عرض کیا! تو پھر وہ پیغمبر ہیں کہ ہمارے نزدیک ان کا ایمان بہت اچھا ہے اور قوی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بھلا وہ شک و شبہ سے دور اور قوی ایمان کے حامل کیوں نہیں ہوں گے، آسمان سے وحی اترتی ہی ان کے اوپر ہے، اب صحابہؓ نے کہا! تو پھر ہم لوگ ہیں (جو آپ ﷺ کے صحابہؓ ہیں، لہٰذا کہنا چاہئے کہ ہمارا ایمان اچھا اور قوی ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تمہارے ہی ایمان میں کیا عجوبہ پن ہے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے فرمایا! حقیقت یہ ہے کہ میرے نزدیک ایمان کے اعتبار سے تمام مخلوق میں بڑے اچھے لوگ وہ ہیں جو میرے (زمانہ حیات) کے بعد پیدا ہوں گے (یعنی تابعین اور ان کی اتباع کرنے والے کہ جو نسل در نسل قیامت تک اس دنیا میں آتے رہیں گے) وہ لوگ احکام دین کے مجموعہ مصحف یعنی قرآن پاک پائیں گے اور اس میں جو کچھ مذکور ہے سب پر ایمان لائیں گے۔“

تشریح: جواب دینے والے صحابہؓ نے بہت اچھے اور بہت قوی ایمان کے اعتبار سے جو پہلے فرشتے کا ذکر کیا اور پھر انبیاء کا تو اس سے انبیاء پر فرشتوں کی فضیلت لازم نہیں آتی۔ اللہ کے ہاں کثرت ثواب کے اعتبار سے جو افضلیت انبیاء کو حاصل ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس میں شک و شبہ نہیں۔

آسمان سے وحی اترتی ہی ان کے اوپر ہے....... یعنی انبیاء کو تو ایمان کا اور سب سے اچھا اور سب سے قوی ایمان کا حامل ہونا ہی چاہئے۔ کیونکہ اس دنیا میں ایمان اور دین و شریعت کے اترنے کا اصل ذریعہ ”وحی“ ہے اور وحی انہی پر اترتی ہے فرشتہ روح الامین (جبرئیل) آسمان سے آتا ہے اور حق تعالیٰ کا پیغام براہ راست ان کو پہنچاتا ہے۔ وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کے انوار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ لغت میں ”وحی“ کے معنی ہیں، پیغام، دل میں پوشیدہ بات ڈالنا ہر وہ چیز جو دوسرے کو معلوم ہونے کے لئے تم پیش کرو اور آواز، اور اصطلاح شرع میں ”وحی“ اللہ کے اس پیغام کو کہتے ہیں جو جبرئیل امین علیہ السلام پیغمبروں کے پاس لائیں۔

”جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں......“ اور تم وحی اور ایمان کے آثار و انوار کا مشاہدہ کرتے ہو، نبوت کی نشانیاں اور معجزے دیکھتے ہو، میرے جمال باکمال سے انوار حق کا دیدار کرتے ہو، میری صحبت و ہم نشینی کے ذریعہ تم میں اسرار حقیقت سرایت کرتے ہیں اور میرے باطنی تصرف اور میرے ارشاد و اقوال سے تمہارے ظاہر و باطن میں کمالات و کرامات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں خدا پر ایمان لانے، خدا کے اتارے ہوئے دین و شریعت کے احکام میں یقین رکھنے اور خدا کے بتائے ہوئے اوامر و نواہی کو ماننے میں تمہارے لئے شک و تردد کا کوئی موقع ہی نہیں ہے۔

”سب پر ایمان لائیں گے.......“ یعنی ان کا ایمان بالغیب ہوگا، نہ انہوں نے اپنے نبی کو دیکھا ہوگا، نہ نبی کی صحبت کے ذریعہ انوار حق کا مشاہدہ کیا ہوگا، اور نہ نبوت کے آثار و معجزات کو اپنی نظروں کے سامنے پایا ہوگا۔ وہ اپنے بڑوں (صحابہؓ) سے اخبار و آثار کی صورت میں جو کچھ سنیں گے اسی پر اعتماد و یقین کر کے خدا پر، خدا کے رسول پر، خدا کی کتاب پر اور خدا کے اتارے ہوئے دین پر ایمان لائیں گے اور اس ایمان پر مضبوطی سے قائم رہیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو یہ فرمایا ہے کہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ تو اس کی مراد بھی بعض تفسیری جہات سے یہی ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھیوں نے ان کے سامنے محمد ﷺ کے صحابہؓ اور ان کے ایمان کا ذکر کیا تو حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: حق تو یہ ہے کہ محمد ﷺ کی حقیقت و حیثیت، ان کی دعوت اسلامی اور ان کا سارا معاملہ ہر اس شخص پر پوری طرح روشن اور واضح تھا جس نے آپ ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ کی صحبت و ہم نشینی کا شرف پایا، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کسی ایمان والے کا ایمان ایمان بالغیب سے

افضل نہیں اور پھر حضرت ابن مسعودؓ نے یہی آیت یعنی یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ پڑھی۔

بہرحال آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک سے متصل ہونے کے سبب اور آنحضرت ﷺ کے بابرکت صحابہؓ کی رفاقت وصحبت پانے کی وجہ سے اگرچہ تابعینؒ پر بھی آثار و انوار حقانیت ہویدا، اور آنحضرت ﷺ کا صدق واضح تھا لیکن اس کے باوجود یہی کہا جائے گا کہ ع، ازدیدہ بسے فرق بود تابشنیدہ۔ اور حاصل یہ کہ اگرچہ صحابہؓ کا ایمان بھی بالغیب تھا لیکن ان کا ایمان بالغیب انہی چیزوں میں تھا جن پر ایمان لازم فرض ہے، جیسے اللہ کی ذات، ملائکہ اور امور آخرت وغیرہ جب کہ اور بہت سی چیزیں ان کی آنکھوں دیکھی ہوئی تھیں ان کے مشاہدہ میں آئیں۔ ان کے برخلاف تابعینؒ اور ان کے بعد اہل ایمان کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا سارا ایمان بالغیب ہے کوئی چیز ان کی آنکھوں دیکھی ہوئی نہیں ہے، کوئی چیز ان کے مشاہدہ میں نہیں آئی پس اس اعتبار سے ان کے ایمان کو افضل اور پسندیدہ تر فرمایا گیا۔

ایک جماعت کے بارے میں پیشین گوئی

⑦ وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْعَلَاءِ الْحَضْرَمِیِّ قَالَ حَدَّثَنِیْ مَنْ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّہٗ سَیَکُوْنُ فِیْ اٰخِرِ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ قَوْمٌ لَّھُمْ مِّثْلُ اَجْرِ اَوَّلِھِمْ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُقَاتِلُوْنَ اَھْلَ الْفِتَنِ۔ رَوَاھُمَا الْبَیْھَقِیُّ فِیْ دَلَآئِلِ النُّبُوَّۃِ۔

"اور حضرت عبدالرحمن بن علاء حضرمی کہتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص نے یہ حدیث بیان کی جس نے نبی کریم ﷺ سے سنا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ وہ (زمانہ آنے والا ہے جب اس اُمّت کے آخری دور میں ایک جماعت ہوگی جس کا ثواب اس اُمّت کے ابتدائی دور کے لوگوں (یعنی صحابہ) کے ثواب کی مانند ہوگا، اس جماعت کے لوگ مخلوق خدا کو (ان) شرعی امور کی تلقین و تبلیغ کریں گے (جن کا وجود دین میں پایا جاتا ہے) اور ان باتوں سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے جو خلاف شرع ہیں (اور جن کا دین سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں) نیز وہ لوگ فتنہ پردازوں (یعنی اسلام اور مسلمانوں سے منحرف ہوجانے والوں، خارجیوں، رافضیوں اور تمام بدعیتوں) سے لڑیں گے (خواہ اسلحہ وطاقت کے ذریعہ لڑیں خواہ زبان وقلم کے ذریعہ) ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

آنحضرت ﷺ کو بغیر ایمان لانے والے امتیوں کی فضیلت

⑧ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ طُوْبٰی لِمَنْ رَاٰنِیْ وَطُوْبٰی سَبْعَ مَرَّاتٍ لِمَنْ لَّمْ یَرَنِیْ وَاٰمَنَ بِیْ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: مبارک بادی ہے اس شخص کو جس نے مجھ کو دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا اور سات بار مبارکباد دی ہے اس شخص کو جس نے مجھ کو نہیں دیکھا اور پھر مجھ پر ایمان لایا، میری نبوت کی تصدیق کی۔" (احمدؒ)

تشریح: "اور سات بار مبارک باد دی ہے......" اس سے ان امتیوں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، جو آنحضرت ﷺ کی ذات پر اور آپ ﷺ کی نبوت و رسالت پر غائبانہ ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں سات کے عدد کا تعین کس معنی میں ہے اس کا علم خدا اور خدا کے رسول ہی کے سپرد کرنا پڑتا ہے ایسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بات کو زیادہ سے زیادہ بلیغ انداز بیان کرنے کے لئے اور اس کی تکثیر کی خاطر چونکہ یہی سات کا عدد بابرکت مشہور و متعارف ہے اس لئے آپ ﷺ نے ذات رسالت پناہ پر ایمان بالغیب رکھنے والوں کو سات بار مبارک باد دی ہے، پس اس عدد سے تکثیر مراد لینی چاہئے نہ کہ تحدید۔

زمانہ رسالت کے بعد کے امتیوں کی فضیلت

⑨ وَعَنِ ابْنِ مُحَیْرِیْزٍ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ جُمُعَۃَؓ رَجُلٍ مِّنَ الصَّحَابَۃِ حَدِّثْنَا حَدِیْثًا سَمِعْتَہٗ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ اُحَدِّثُکُمْ حَدِیْثًا جَیِّدًا تَغَدَّیْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَنَا اَبُوْ عُبَیْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَحَدٌ خَیْرٌ مِّنَّا؟ اَسْلَمْنَا وَجَاهَدْنَا مَعَکَ قَالَ نَعَمْ قَوْمٌ یَّکُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِکُمْ یُؤْمِنُوْنَ بِیْ وَلَمْ یَرَوْنِیْ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالدَّارِمِیُّ وَرَوٰی رَزِیْنٌ عَنْ اَبِیْ عُبَیْدَةَ مِنْ قَوْلِهٖ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَحَدٌ خَیْرٌ مِّنَّا اِلٰی اٰخِرِهٖ۔

"اور حضرت ابن محیریزؒ (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوجمعہؓ سے جو صحابہ میں سے ایک شخص ہیں، درخواست کی کہ آپ ہمارے سامنے کوئی ایسی حدیث بیان کیجئے جو آپ نے خود رسول کریم ﷺ کی لسان مبارک سے سنی ہو، حضرت ابوجمعہؓ نے کہا: ہاں میں تمہارے سامنے ایک بڑی عمدہ حدیث بیان کروں گا (جو بہت فائدہ پہنچائے گی اور تمہیں خیر و فضیلت کی بشارت بھی عطا کرے گی، تو سنو) ایک دن ہم صبح کے کھانے پر رسول کریم ﷺ کے ساتھ تھے ہمارے درمیان (مشہور صحابی) حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ بھی تھے (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) ابوعبیدہؓ نے (نعمت الٰہی کے شکر اور ذات رسالت پناہ کے انعام و احسان کے ذکر کے طور پر) کہا کہ یا (رسول اللہ!) کیا کوئی شخص ہم سے بھی بہتر ہو سکتا ہے ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے (آپ ﷺ کے ہاتھ پر) ایمان و اسلام قبول کیا اور آپ ﷺ کے شانہ بشانہ دشمنان دین کے خلاف جہاد کیا، آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا: ہاں تم سے بھی بہتر لوگ ہیں اور وہ لوگ وہ ہیں جو تمہارے بعد پیدا ہوں گے اور مجھ پر ایمان لائیں گے جب کہ انہوں نے مجھے دیکھا بھی نہیں ہو گا اس روایت کو احمدؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے، نیز رزینؒ نے اس روایت کو حضرت ابوعبیدہؓ سے ان کے اپنے الفاظ سے آخر تک نقل کیا ہے (یعنی رزینؒ کی نقل کردہ حدیث میں ابن محیریزؒ اور ابوجمعہؓ کے مکالمہ کا ذکر نہیں ہے۔"

تشریح: "ہاں تم سے بھی بہتر لوگ ہیں" یعنی وہ لوگ اس جہت سے تم سے بہتر ہیں کہ وہ مجھے بغیر دیکھے مجھ پر ایمان لائیں گے، اگرچہ اس حیثیت سے کہ تمہیں سبقت اسلام میری صحبت و زیارت اور میرے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کی سعادت عظمٰی حاصل ہے ان لوگوں پر تمہاری فضیلت و برتری مسلم ہے۔

ارباب حدیث کی فضیلت

(۱۵) وَعَنْ مُعٰوِیَةَ بْنِ قُرَّةَ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَسَدَ اَهْلُ الشَّامِ فَلَا خَیْرَ فِیْکُمْ وَلَا یَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَةُ قَالَ ابْنُ الْمَدِیْنِیِّ هُمْ اَصْحَابُ الْحَدِیْثِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"حضرت معاویہ بن قرہؒ سے روایت ہے جو اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جب اہل شام تباہ ہو جائیں تو پھر تم میں بھلائی نہ ہو گی اور میری اُمت میں ہمیشہ ایک جماعت ایسی رہے گی جس کو (دشمنان دین کے مقابلہ پر غالب رہنے کے لئے اللہ کی نصرت و تائید حاصل ہو گی، اس جماعت کو وہ شخص کچھ نقصان و ضرر نہ پہنچا سکے گا جو اس کی تائید و اعانت ترک کر دے (کیونکہ اس جماعت پر اللہ تعالیٰ کی عنایت بے شمار ہو گی) تاآنکہ قیامت قائم ہو اور ابن مدینیؒ (جو اکابر محدثین میں سے ہیں) کہتے ہیں کہ اس جماعت سے مراد ارباب حدیث ہیں اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: حضرت معاویہ بن قرہؒ کے والد کا نام قرہ بن ایاسؓ ہے جو صحابی ہیں۔ خود حضرت معاویہ بن قرہ ایک تابعیؒ ہیں، ان کا شمار اہل علم و عمل میں ہوتا ہے۔ بلند پایہ فقیہہ کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں، جنگ جمل کے دن ان کی ولادت ہوئی تھی اور ۱۱۳ھ میں واصل بحق ہوئے۔

"تو پھر تم میں بھلائی نہ ہو گی....." یعنی جب اہل شام میں بھی فساد و تباہی پھیل جائے گی تو اس وقت شام میں سکونت اختیار کرنا یا اپنے وطن سے ہجرت کر کے ملک شام میں جانے میں کوئی بھلائی نہیں رہے گی۔

اور حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے یوں وضاحت کی ہے کہ ان الفاظ کی بظاہر مراد یہ ہے کہ آخر زمانہ میں اہل شام خدا کے سچے دین پر قائم ہوں گے اور خیر امت ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیں گے اور پھر آخر کار ان میں بھی تباہی آجائے گی اور یہ اس وقت ہوگا جب قیامت آئے گی تو اس دنیا میں صرف بدکار لوگ موجود ہوں گے چنانچہ اہل شام کے تباہ ہونے کے ساتھ ہی اس روئے زمین سے خیر کا وجود اٹھ جائے گا جو اس بات کا نتیجہ ہوگا کہ اس وقت اہل خیر میں سے کوئی بھی اس دنیا میں باقی نہیں ہوگا۔

تاآنکہ قیامت قائم ہو...... میں قیامت قائم ہونے سے مراد قائم ہونے کا وقت بالکل قریب آجانا ہے کیونکہ یہ تو اوپر ہی بتایا جاچکا ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی تو اس وقت روئے زمین پر کوئی کلمہ گو باقی نہیں ہوگا۔

"اس جماعت سے مراد ارباب حدیث ہیں......" یعنی وہ محدثین اور اہل علم کہ جو حدیث کے حفاظ ہیں، حدیثوں کے راوی ہیں، سُنّت نبوی ﷺ پر کہ جو کتاب اللہ کی ترجمان اور شارح ہے عمل کرنے اور جو درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ احادیث نبوی ﷺ اور علوم نبوی ﷺ کی خدمت اور اس کے سیکھنے سکھانے میں لگے ہوئے ہیں اور گویا وہ گروہ جن کو "اہل سُنّت و الجماعت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس اُمّت سے خطا و نسیان معاف ہے

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ۔ (رواه ابن ماجة والبیہقی)

"اور حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری اُمّت سے خطاء و نسیان کو معاف کر دیا ہے اور اس گناہ سے بھی معافی عطا فرمادی ہے جس میں زبردستی مبتلا کیا گیا ہو۔" (ابن ماجہ، بیہقیؒ)

تشریح: خطا (جو مقصو اور ممدود دونوں طرح یعنی مد کے بغیر بھی اور مد کے ساتھ بھی آتا ہے) اپنے مفہوم میں صواب کی ضد ہے اس کے معنی میں "چوک جانا" چنانچہ صراح میں لکھا ہے! خطاء بمعنی ناراست جو "صواب" (درست و راست) کا برعکس مفہوم ہے۔ اسی مصدر سے نکلا ہوا لفظ "خطیئہ" ہے جس کے معنی "گناہ" کے ہیں، یا ایک قول کے مطابق وہ گناہ جو غیر ارادی طور پر سرزد ہو گیا ہو اور اگر خطا کا لفظ خ کے زیر اور ط کے جزم کے ساتھ خطا ہو تو اس کے معنی بھی گناہ کے ہوتے ہیں، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ خطاءً کا لفظ اس گناہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ارادی طور پر یعنی قصدًا کیا گیا ہو اور جو گناہ غیر ارادی طور پر یعنی بلا قصد سرزد ہوا ہو اس کے لئے اخطاط کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح "مخطی" اس شخص کو کہتے ہیں جو ارادہ تو صواب یعنی راست و درست عمل کا کرے مگر مبتلا غیر صواب یعنی ناراست و غیر درست عمل میں ہو جائے۔ اس شخص نے خطا کی، یا اس شخص سے خطا ہو گئی، یہ بات ایسے آدمی کے بارہ میں کہی جاتی ہے جس نے قصد و ارادہ تو کسی درست عمل کا کیا تھا لیکن اچانک اس سے وہ عمل واقع ہو گیا ہو جو غیر درست تھا، مثلاً اس نے شکار کو نشانہ بنا کر بندوق چلائی تھی مگر بندوق کی گولی اچانک کسی انسان کو لگ گئی اور اس طرح وہ اس انسان کے قتل خطا کا مرتکب ہو گیا، یا یہ کہ مثلاً وہ آدمی روزہ سے تھا، کلی کرنے کے قصد سے اس نے منہ میں پانی لیا اور وہ پانی اچانک حلق میں اتر گیا، پس اس حدیث میں "خطاء" کے یہی معنی مراد ہیں۔

"نسیان" اپنے مفہوم میں "حفظ" کی ضد ہے اس کے معنی ہیں بھولنا "سہو" کا لفظ "نسیان" کے معنی میں آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے، اس شخص نے فلاں کام میں سہو کیا۔ یعنی وہ اس کام کو بھول گیا اس سے غافل رہا اس کا دھیان کسی اور کام میں الجھ گیا تھا، ان لفظی وضاحتوں کے بعد اب سمجھئے کہ حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمّت سے خطاء و نسیان کو معاف کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خطاء و نسیان کے تحت کوئی غیر درست ناروا فعل سرزد ہو جائے تو اس پر گناہ نہیں ہوتا، اس فعل کا مرتکب گناہ گار نہیں ہوگا، یہ مطلب

نہیں کہ خطاء و نسیان کے تحت سرزد ہونے والا ہر فعل دنیاوی طور پر بھی کسی شرعی قائدے قانون کی گرفت میں نہیں آتا، چنانچہ خود قتل خطاء پر دیت اور کفارہ کا واجب ہونا ثابت ہے، اسی طرح کسی ایسی چیز کا خطاءً ارتکاب ہو جائے جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس روزہ کی قضا واجب ہوتی ہے۔ ہاں نسیان کی صورت میں روزے کی قضاء واجب نہیں ہوتی کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس میں رعایت دی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ روزہ میں اگر بھول سے کوئی چیز کھالی یا کوئی چیز پی لی تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ تم اپنے اس روزہ کو پورا کرو کیونکہ تمہارا وہ کھانا پینا اللہ ہی کی طرف سے ہے، نیز نماز میں اگر نسیان اور سہو واقع ہو جائے تو اس پر سجدہ واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اگر کسی کا مال سہواً تلف کردے تو اس پر ضمان (معاوضہ) واجب ہوتا ہے۔

"اور اس گناہ سے بھی معافی عطا فرمادی......" اس جملہ میں وما استکرھوا علیہ کا لفظ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے، یعنی وہ گناہ جو زور و زبردستی سے کرائے گئے ہوں۔ مطلب یہ کہ اگر کسی شخص کو کسی ایسے فعل کے ارتکاب پر مجبور کیا گیا ہو جس کو وہ گناہ ہونے کی وجہ سے قطعی ناپسند کرتا ہو اور اس کے ارتکاب میں اس کے اپنے قصد و ارادہ کو ذرا دخل نہ ہو تو وہ شخص گناہ گار نہیں ہوگا اگرچہ اس کو مجبور کرنے کے لئے قتل یا ضرب شدید جیسی کسی سخت دھمکی کا استعمال نہ کیا گیا ہو، تاہم اس (زور و زبردستی سے کرائے گئے گناہوں اور جرائم کے) سلسلہ میں حق اللہ اور حق العباد کے تعلق سے شرعی احکام و قوانین کی الگ الگ نوعیتیں اور شقیں ہیں جن کی تفصیل اصول کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اس اُمّت کی انتہائی فضیلت

⑫ وَعَنْ بَهْزِبْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ قَالَ اَنْتُمْ تَتِمُّوْنَ سَبْعِيْنَ اُمَّةً اَنْتُمْ خَيْرُهَا وَاَكْرَمُهَا عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت بہز بن حکیم بن معاویہ بن حیدہ قشیری بصریؒ اپنے والد (حضرت حکیم بن معاویہ) سے اور وہ بہز کے دادا (اور اپنے والد حضرت معاویہ ابن حیدہؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تفسیر میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: (اے اہل اسلام) تم ستر امتیوں کو تمام کرتے ہو اور اللہ کے نزدیک تم ان امتوں میں سب سے بہتر اور گرامی قدر ہو۔ اس روایت کو ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث "حسن" ہے۔"

تشریح: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا ترجمہ ہے: امتوں میں سب سے بہتر اُمّت تم تھے جسے لوگوں (کی ہدایت و بھلائی) کے لئے پیدا کیا گیا۔ پس کنتم (تم تھے) سے مراد یہ ہے کہ اپنی اس خصوصیت اور وصف کے ساتھ تم روز اول سے اللہ کے علم و ارادہ میں تھے جس کا ظہور اس دنیا میں اب میرے آنے کے بعد ہوا ہے۔ یا یہ کہ لوح محفوظ میں اس وصف و خصوصیت کے ساتھ تمہارا ذکر روز اول ہی آگیا۔ اور یا یہ کہ گزشتہ امتوں کے درمیان تمہارا ذکر اسی وصف و خصوصیت کے ساتھ یعنی "خیر امت" کی حیثیت سے ہوتا تھا۔

بہر حال "خیر امت" میں اس اُمّت سے مراد اس اُمّت کے تمام ہی اہل ایمان مراد ہیں خواہ وہ عام امتیوں میں سے ہوں یا خواص میں سے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسن اعتقاد، ایمان کی راہ میں ثابت قدم رہنے، آنحضرت ﷺ کے تئیں بہت زیادہ محبت و تعلق رکھنے، ایمان سے نہ پھرنے، اسلام کی غلامی کے دائرہ سے اپنے کو باہر نہ رکھنے اور ان جیسی دوسری خصوصیات و صفات رکھنے کے سبب ہر امتی اس فضیلت میں شامل ہے جو پچھلی تمام امتوں کے مقابلہ میں اس امت مرحومہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی ہے، تاہم بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ "خیر امت" کا مصداق مخصوص طور پر اس اُمّت کی وہ جماعت ہے جو "خواص" سے تعبیر کی جاتی ہے یعنی علماء صادقین، شہداء اسلام اور صالحین امت ان حضرات کے نزدیک "خیر" سے مراد خیر تامہ کاملہ مخصوصہ ہے اسی طرح بعض حضرات نے اس کا

مصداق "مہاجرین کی جماعت" کو قرار دیا ہے، لیکن یہ حضرات "خیر امت" کے مفہوم کو ایک محدود دائرہ تک کیوں رکھتے ہیں اور اس کے مصداق کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کیوں کرتے ہیں اس کی وجہ ظاہر نہیں ہے۔ لہٰذا حق یہ ہے کہ "خیر امت" کے مفہوم کو مخصوص کرنے کے بجائے عام رکھا جائے۔

"ستر امتوں" میں ستر کا عدد تحدید کے لئے نہیں، بلکہ تکثیر کے لئے ہے، کیونکہ اس عدد کا ذکر اظہار تکثیر کے موقعوں پر زیادہ آتا ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "ستر امتوں" سے مراد وہ گزشتہ امتیں ہیں جو بڑی بڑی تھیں اور جن کا عدد ستر تک پہنچتا ہے اور انہیں کے ضمن میں تمام چھوٹی چھوٹی امتیں بھی آجاتی ہیں۔

"تم ستر امتوں کو تمام کرتے ہو......" میں "اتمام" دراصل "ختم" کے معنی میں ہے مطلب یہ کہ جس طرح تمہارے پیغمبر ﷺ خاتم النبیین اور تمام رسولوں کے سردار ہیں اسی طرح تم بھی تمام امتیوں کے خاتم، تمام امتوں سے زیادہ گرامی قدر اور اتم ہو، پچھلی تمام امتوں پر اُمت محمدی کی فضیلت و برتری کے اظہار کے لئے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور روایت اپنی سند کے ساتھ بطریق مرفوع نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں۔

قَالَ اِنَّ الْجَنَّةَ حَرُمَتْ عَلَى الْاَنْبِيَآءِ كُلِّهِمْ حَتّٰى اَدْخُلَهَا وَحَرُمَتْ عَلَى الْاُمَمِ حَتّٰى تَدْخُلَهَا۔

"آنحضرت ﷺ نے فرمایا: حقیقت یہ کہ جنت تمام انبیاء پر حرام ہے جب تک کہ میں اس میں نہ پہنچ جاؤں اور جنت تمام امتوں پر حرام ہے جب تک کہ میری اُمت اس میں داخل نہ ہو جائے۔"

اور یہ چیز اس اُمت کے حسن خاتمہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اس کے حسن بدأت پر مبنی ہے اس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ان الذین سبقت لھم منا الحسنی بھی اشارہ کرتی ہے پس یہ اُمت محمدی اس دنیا میں آنے کے اعتبار سے اگرچہ سب کے بعد ہے لیکن فضل و شرف اور مقام و مرتبہ میں سب سے اعلیٰ ہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلْنَا مِنْ اَهْلِ الْاِسْلَامِ وَعَلٰى دِيْنِ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ وَبِشُكْرِهٖ تَزِيْدُ الْبَرَكَاتُ وَالْخَيْرَاتُ۔

خاتمہ کتاب

یہ حدیث مشکوٰۃ المصابیح کی آخری حدیث ہے، مؤلف مشکوٰۃ کا اپنی اس عظیم کتاب کو اس حدیث پر ختم کرنا گویا اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ کتاب کا تمام ہونا، ختم ہونا اور پایہ تکمیل کو پہنچنا درحقیقت ختم کرنے والے یعنی، اللہ رب العزت کے کرم، اس کی عنایت، اس کی مدد اور توفیق کا ثمرہ ہے، نیز اس سے پہلے کی حدیث ان اللہ تجاوز عن امتی الخطاء والنسیان بھی کتاب کی تالیف و تحریر میں واقع ہونے والے کسی بھی سہو و نسیان سے معذرت کے ساتھ بڑی مناسبت رکھتی ہے خَتَمَ اللّٰهُ لَنَا بِالْحُسْنِ وَتَجَاوَزَ عَنَّا مَا وَقَعَ مِنَ السَّهْوِ وَالنِّسْيَانِ بِحُرْمَةِ نَبِيِّ اٰخِرِ الزَّمَانِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ ذَوِي الْفَضْلِ وَالْاِحْسَانِ۔

واضح رہے کہ مشکوٰۃ کی شرحوں میں تو اسی حدیث پر مشکوٰۃ تمام ہوئی ہے، لیکن مشکوٰۃ المصابیح کے نسخوں میں اس حدیث کے بعد یہ عبارت بھی ہے۔

ثُمَّ قَالَ مُؤَلِّفُ الْكِتَابِ شَكَرَ اللّٰهُ سَعْيَهٗ وَاَتَمَّ عَلَيْهِ نِعْمَتَهٗ وَوَقَعَ الْفَرَاغُ مِنْ جَمْعِ الْاَحَادِيْثِ النَّبَوِيَّةِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰخِرَ يَوْمِ الْجُمُعَةِ مِنْ رَمَضَانَ عِنْدَ رُؤْيَةِ هِلَالِ شَوَّالَ سَنَةَ سَبْعٍ وَثَلَاثِيْنَ وَسَبْعِ مِائَةٍ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَحُسْنِ تَوْفِيْقِهٖ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.........

آخر میں کتاب مشکوٰۃ المصابیح کا مؤلف

اور اللہ اس کی سعی کی قدردانی کرے اور اس پر اپنی تمام نعمتوں کو کامل فرمائے کہتا ہے کہ ان احادیث نبوی ﷺ کی جمع و ترتیب سے

۱۲۷۵ھ کے رمضان کے آخری جمعہ کی آخری ساعتوں میں شوال کا چاند دکھائی دینے سے کچھ ہی پہلے اللہ کی حمد و ثنا اور اس کی نیک توفیق کے ساتھ فراغت ہوئی۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو عالموں کا پروردگار ہے اور درود و سلام محمد ﷺ پر آپ ﷺ کی اولاد پر، آپ ﷺ کے اصحاب پر سب پر الحمدللہ حمدًا کثیرًا مبارکًا فیه۔

مظاہر حق کے مؤلف نواب قطب الدین دہلوی کہتے ہیں:

تمام ہوا یہ ترجمہ بکرم و عنایت پروردگار متعال کے اے مولی میرے کیا بعید ہے تیری رحمت واسعہ سے کہ اس میری سعی کو قبول فرما دے اور اس عاجز و ضعیف و نحیف کی تقصیرات اور بھول چوک سے درگزر فرمادے اور مجھ کو اور میرے استاد اور ماں باپ کو روز قیامت کے بخش دے، اور نہ ذلیل فرماوے یارب العلمین مکرر سہ کرریہی عرض ہے کہ مجھ شرم سار کو اور میرے استاد مولانا اسحٰق صاحب مہاجر فی سبیل اللہ رحمہ اللہ کو اور میرے ماں باپ اور سب مسلمانوں کو مغفور و مرحوم کر اور تیری شان ستاری کا ظہور ہمارے حال پریشان بال پر ہو۔

اَللّٰهُمَّ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اَللّٰهُمَّ لَا تَدَعْ لَنَا ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا دَيْنًا اِلَّا قَضَيْتَهٗ وَلَا حَاجَةً مِّنْ حَوَائِجِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

بیت ؎

از گدا یان توام شاه بفرما مددے | که چون مرغان حرم درحرمت جاگیرم

اِلٰهِیْ نَجِّنِیْ مِنْ كُلِّ ضَيْقٍ | بِجَاهِ الْمُصْطَفٰى مَوْلَى الْجَمِيْعِ

وَهَبْ لِیْ فِیْ مَدِيْنَتِهٖ قَرَارًا | بِاِيْمَانٍ وَّ دَفْنٍ بِالْبَقِيْعِ

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

مظاہر حق جدید کا مرتب عبداللہ جاوید بن مولانا محمد عبدالحق غازی پوری، اللہ اس پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے اس کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے، کہتا ہے کہ رب کریم کی عنایت اور اس کی مدد توفیق سے کتاب مظاہر حق جدید پایۂ تکمیل کو پہنچی اور رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ کے اٹھارہویں روزے جمعہ کی شب میں اس کی تسوید سے فراغت ہوئی۔ پاک پروردگار اپنے محبوب ﷺ کے طفیل میں کہ جس کی طرف اس کتاب کے الفاظ و معانی کی نسبت ہے، مجھ ناچیز کی اس سعی کو قبول فرمائے، مجھ کو میرے اساتذہ و شیوخ کو میرے ماں باپ کو، میرے اہل و عیال کو، میرے تمام اعزاو احباب کو، اس کتاب کی ترتیب و تسوید اور طباعت و اشاعت میں میرے معاونوں اور رفیقوں کو اور اس کتاب کے قارئین کو روز حشر اپنے محبوب ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے اور اپنے فضل و احسان سے نوازے۔

(آمین)

تمت بالخیر

پہلا باب

صحابہؓ اور تابعینؒ کے بارہ میں

(الف)

صحابہ

(۱) انس بن مالکؓ: — یہ انس بن مالکؓ بن نضر ہیں ان کی کنیت ابو حمزہ ہے۔ قبیلہ خزرج میں سے ہیں۔ جناب نبی کریم ﷺ کے خادم خاص ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ام سلیم بنت ملحان ہے۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو ان کی عمر دس سال تھی اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں بصرہ میں قیام کیا تاکہ وہاں لوگوں کو دین سکھائیں۔ اور صحابہ میں سے بصرہ میں سب سے آخر میں ۹۱ھ میں ان کا انتقال ہوا اور ان کی عمر ایک سو تین سال ہوئی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ننانوے سال ہوئی ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ یہ قول زیادہ صحیح ہے، کہا جاتا ہے کہ ان کی اولاد کا شمار ایک سو ہے اور ایک قول کے مطابق اسی۔ جن میں اٹھتر مرد اور دو عورتیں ہیں۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔

(۲) انسؓ بن مالک الکعبی: — یہ انس بن مالک کعبی ہیں، ان کی کنیت ابوامامہ ہے۔ ان کا نام اس ایک حدیث کی سند میں مذکور ہے جو مسافر اور حاملہ اور مرضعہ کے روزے کے بارے میں مروی ہے آپ نے بصرہ میں سکونت اختیار کی تھی ان سے ابن قلابہؒ نے روایت کیا ہے۔

(۳) انسؓ بن النضر: — یہ انس بن نضر انصار سے ہیں، یہ انس بن مالک کے چچا ہیں "احد" کے روز جب یہ شہید ہوئے ہیں تو اس وقت ان کے جسم پر تلوار اور نیزے اور برچھے کے ۸۰ سے زیادہ نشان دیکھے گئے تھے انہیں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی من المؤمنین رجال صدقوا ماعاھدو اللہ علیہ الخ

(۴) انس بن مرثدؓ: — یہ انس مرثد بن ابی مرثد کے بیٹے ہیں۔ ابی مرثد کا نام کناز بن الحصین ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کا نام انیس تھا ابن عبد البرؒ نے فرمایا کہ یہ قول زیادہ مشہور ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ انیس ہیں جو فتح مکہ اور حنین میں حاضر تھے یہ بھی فرمایا کہ کہا جاتا ہے کہ وہ انیس یہی ہیں جن سے حضور ﷺ نے فرمایا تھا اغدیا انیس الی امرأۃ ھذہ الخ (یعنی صبح کو اے انیس اس عورت سے مل کر پوچھو اگر اس نے زنا کا اقرار کیا تو اس کو سنگسار کر دینا) اور ایک قول یہ ہے کہ یہ دوسرے انیس تھے واللہ اعلم۔ آپ کی وفات ۲۰ھ میں ہوئی اور ان کو اور ان کے والد اور دادا اور بھائی کو حضور انور ﷺ کی صحبت حاصل ہوئی ہے، ان سے سہل بن حنظلہ اور حکم بن مسعود نے روایت کی ہے کناز میں کاف مفتوح ہے اور نون مشدد اور زائے معجمہ ہے۔

(۵) اسیدؓ بن حضیر: — یہ اسید بن حضیر انصاری ہیں قبیلہ اوس میں سے یہ ان اصحاب میں سے ہیں جو عقبہ ثانیہ کے موقع پر حاضر

تھے اور عقبہ والی رات میں یہ حضور ﷺ کے احکام لوگوں تک پہنچانے پر مامور و محافظ تھے اور دونوں عقبہ کا درمیانی فاصلہ ایک سال تھا، بدر میں اور اس کے بعد دیگر غزوات میں بھی حاضر رہے ان سے صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ مدینہ میں ۲۰ھ میں انتقال ہوا اور بقیع میں دفن ہوئے۔

(۶) ابواسیدؓ: - یہ ابواسید مالک بن ربیعہ انصاری ساعدی کے بیٹے ہیں تمام غزوات میں حاضر ہوئے ہیں یہ اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں، ان سے ایک کثیر مخلوق نے روایت کی ہے ان کی وفات ۲۰ھ میں ہوئی جب کہ اس کی عمر اٹھتر سال کی تھی اور بینائی زائل ہو چکی تھی، اور بدر میں صحابہ میں ان کی وفات سب سے آخر میں ہوئی، اسید میں ہمزہ مضموم اور سین مہملہ مفتوح اور یا ساکن ہے۔

(۷) اسلم: - یہ اسلم ہیں ان کی کنیت ابورافع ہے، حضور ﷺ کے آزاد کردہ تھے، ان کا ذکر حرف راء میں آئے گا۔

(۸) اشعث ابن قیس: - یہ اشعث قیس بن معدی کرب کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ابو محمد کندی ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ کندہ کا وفد آیا ہے تو اس کے ساتھ رئیس وفد ہو کر آئے تھے، یہ واقعہ ۱۰ھ کا ہے۔ اسلام میں بھی بہت وجیہہ شخص تھے، جب حضور انور ﷺ کی وفات ہوئی تو یہ اسلام سے پھر گئے تھے، پھر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانے میں مشرف باسلام ہوئے - اور کوفہ میں رہ کر ۴۰ھ میں ان کی وفات ہوئی، حضرت حسن بن علیؓ نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

(۹) اشج: - ان کا نام منذر ہے العائذ العصری العبدی کے بیٹے ہیں، اپنی قوم کے سردار اور ان کے اسلام کی طرف لانے والے تھے وفد عبدالقیس میں شامل ہو کر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کا شمار اعراب اہل مدینہ میں ہے ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے، ان کا ذکر باب الحذر والتانی میں ہے العصری میں عین مفتوح اور صاد مہملہ مفتوح اور راء مہملہ ہے۔

(۱۰) اشیم الضبابی: - اشیم الضبابی کا ذکر باب الفرائض حدیث ضحاک میں ہے۔

(۱۱) الاسود بن کعب العنسی: - یہ اسود بن کعب ہے اس کا نام عبہلہ عنسی ہے اور یہ وہ شخص ہے جس نے حضور ﷺ کے آخری زمانہ میں یمن میں نبوت کا دعوی کیا تھا اور آپ ﷺ کی حیات میں ہی قتل کر دیا گیا، اس کو فیروز دیلمی اور قیس بن عبدیغوث نے مل کر قتل کیا فیروز تو اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے تاکہ جنبش نہ کر سکے اور قیس نے قتل کیا اور سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کا ذکر باب الرویا میں ہے، عنسی میں عین مہملہ مفتوح اور نون ساکن اور سین مہملہ ہے اور عبہلہ میں عین مہملہ مفتوح ہے اور باء موحدہ ساکن اور ہا مفتوح اور لام ہے۔

(۱۲) ابراہیم بن النبی ﷺ: - یہ ابراہیم ہیں جو نبی کریم ﷺ کے فرزند تھے، ماریہ قبطیہ کے بطن سے جو آپ کی مملوکہ تھیں۔ مدینہ میں ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے اور سولہ ماہ کی عمر میں وفات ہوگئی اور ایک قول کے مطابق اٹھارہ ماہ زندہ رہے بقیع میں مدفون ہوئے۔

(۱۳) الاغر المازنی: - یہ اغر ہیں مزنی کے بیٹے۔ صحابی ہیں ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے۔ ابن عمر اور معاویہ بن قرہ نے ان سے روایت کی ہے اغر میں ہمزہ مفتوح اور غین معجمہ مفتوح اور ر مشدد ہے۔

(۱۴) ابیض: - حمال کے بیٹے ہیں قوم سبا کے شہر مارب میں سے۔ حضرت ﷺ کی خدمت میں ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوئے اور صحبت سے مشرف ہوئے یمن میں رہتے تھے، ان سے کم حدیثیں مروی ہیں حمال میں حاء مفتوح اور میم مشدد ہے مارب کے میم پر فتح ہے اور ہمزہ ساکن اور راء مکسور ہے آخر حرف باء ہے۔ ایک شہر ہے یمن میں صنعا کے قریب السبائی میں سین مہملہ مفتوح اور با موحدہ پر فتح اور

ہمزہ۔

(۱۵) الاقرع بن حابس: — یہ اقرع بن حابس تمیمی ہیں۔ وفد بنی تمیم کے ساتھ فتح مکہ کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ مولفتہ القلوب میں سے ہیں اور یہ قبل از اسلام دونوں زمانوں میں معزز رہے ان کو عبداللہ بن عامر نے اس لشکر پر حاکم بنایا تھا جس کو خراسان کی طرف بھیجا تھا اور یہ مع لشکر جوزجان (غالباً گورگان کا معرب ہے) میں مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان سے جابر اور ابوہریرہ نے روایت کیا ہے۔

(۱۶) ابوالازہر: — یہ ابوالازہر انماری ہیں حضور ﷺ کی صحبت سے مشرف ہوئے۔ ان سے خالد بن معدان نے اور ربیعہ بن یزید نے روایت کی ہے، ان کا شمار شام والوں میں ہے۔

(۱۷) اکیدر ومۃ: — یہ اکیدر عبدالملک کے بیٹے ہیں اور صاحب دومۃ الجندل کے خطاب سے مشہور ہیں ان کے پاس نبی ﷺ نے نامہ مبارک ارسال فرمایا تھا۔ اور انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا۔ ان کا ذکر باب الجزیہ میں ہے اکیدر اکدر کی تصغیر ہے اور دومۃ میں دال مہملہ پر ضمہ و فتحہ دونوں درست ہیں، دومہ شام اور حجاز کے درمیان ایک مقام کا نام ہے۔

(۱۸) اوس بن اوس: — اوس بن اوس ثقفی ہیں اور ایک قول ہے اوس بن ابی اوس اور یہ عمرو بن اوس کے والد ہیں ان سے ابوالاشعث سمعانی اور ان کے بیٹے عمرو غیرہما نے روایت کیا ہے۔

(۱۹) ایاس بن بکیر: — یہ ایاس بن بکیر لیثی ہیں غزوۂ بدر میں اور اس کے بعد دوسرے غزوات میں حاضر رہے۔ اور یہ دار الارقم میں اسلام لائے تھے ۳۴ھ میں وفات پائی۔

(۲۰) ایاس بن عبداللہ: — یہ ایاس بن عبداللہ دوسی مدنی ہیں، ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، امام بخاریؒ کہتے ہیں ان کا مشرف صحبت ہونا ثابت نہیں ہوسکا ان سے عورتوں کے مارنے کے بارے میں صرف ایک حدیث روایت کی گئی ہے ان سے عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں۔

(۲۱) اسامہ بن زید: — یہ اسامہ ہیں زید بن حارثہ قضاعی کے بیٹے اور ان کی والدہ ام ایمن ہیں ان کا نام برکۃ تھا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کو گود میں پالا تھا اور یہ آپ ﷺ کے والد ماجد جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کی کنیز تھیں اور اسامہ حضور ﷺ کے غلام اور آپ ﷺ کے غلام (حضرت زید) کے بیٹے تھے۔) اور آپ ﷺ کے محبوب اور محبوب کے بیٹے تھے جب آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی تو اسامہ کی عمر بیس سال کی تھی اور بعض اقوال اس کے خلاف بھی ہیں۔ اور یہ وادی القری میں رہنے لگے تھے اور وہیں بعد شہادت حضرت عثمان وفات ہوئی اور ایک قول یہ ہے کہ ۵۴ھ میں وفات ہوئی، اور ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہی صحیح ہے ان سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔

(۲۲) اسامہ بن شریک: — یہ اسامہ بن شریک ذبیانی ثعلبی ہیں اہل کوفہ میں ان کی احادیث زیادہ پھیلیں اور ان کا شمار کوفیین میں ہی ہوتا ہے ان سے زیاد بن علاقہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔

(۲۳) ابی بن کعب: — یہ ابی، کعب اکبر انصار خزرجی کے بیٹے ہیں، یہ حضور ﷺ کے کاتب وحی تھے اور چھ اصحاب میں سے ہیں جنہوں نے نبی ﷺ کے زمانہ میں پورا قرآن حفظ کر لیا تھا اور ان فقہا میں سے ہیں جو حضور ﷺ کے زمانہ میں فتوی دیتے تھے۔ اور صحابہ میں کتاب اللہ کے بڑے قاری تسلیم کئے جاتے تھے، ان کو حضور ﷺ نے ابومنذر کی کنیت سے اور حضرت عمرؓ نے ابوالطفیل سے

خطاب فرمایا اور حضور ﷺ نے آپ کو سید الانصار کا خطاب دیا۔ حضرت عمرؓ نے سید المسلمین کا۔ آپ کی وفات مدینہ طیبہ میں ۱۹ھ میں ہوئی۔ آپ سے کثیر مخلوق نے روایت کی ہیں۔

(۲۴) افلح: — یہ افلح رسول اللہ ﷺ کے غلام ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ام سلمہ کے غلام ہیں۔ ان سے حبیب مکی نے روایت کی ہے۔

(۲۵) ایفع بن ناکور: — یہ ایفع بن ناکور یمن کے رہنے والے تھے۔ ذی الکلاع (بکاف مفتوح) کے نام سے مشہور ہیں، اپنی قوم کے رئیس تھے جن کی اطاعت اور اتباع کیا جاتا تھا، یہ اسلام قبول کر چکے تھے ان کو نبی کریم ﷺ نے اسود عنسی کے مقابلہ اور اس کے قتل کے لئے اہل اسلام کی امداد کے بارے میں تحریر فرمایا تھا محاربہ صفین میں ۳۷ھ حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ اشتر نخعی کے ہاتھ سے قتل ہو گئے۔

(۲۶) انجشہ: — یہ انجشہ ایک سیاہ رنگ غلام تھے حدی خواں، حضور ﷺ کے اونٹوں کو بذریعہ نظم ہنکاتے تھے اور عمدہ لے ادا کرتے تھے ان سے ابو طلحہ اور انس بن مالک نے روایت کیا ہے اور یہ وہی ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا رویدک یا انجشة رفقا بالقواریر (آہستہ آہستہ چلاؤ اے انجشہ ان نازک شیشوں (یعنی عورتوں) کی رعایت کرو ایسا نہ ہو کہ ٹوٹ جائیں۔ انجشہ میں ہمزہ مفتوح ہے اور نون ساکن اور جیم مفتوح اور شین معجمہ۔

(۲۷) ابوامامہ الباہلی: — یہ ابوامامہ ہیں جن کا نام صدی ہے، عجلان باہلی کے بیٹے مصر میں رہتے تھے پھر حمص منتقل ہو گئے تھے اور وہیں انتقال کیا، یہ ان اصحاب میں سے ہیں جن سے بکثرت روایات کی جاتی ہیں اہل شام کے یہاں ان کی مرویات زیادہ ہیں ان سے بہت لوگوں نے روایات کی ہیں ۸۶ھ میں انتقال ہوا، جب کہ آپ کی عمر اکیانوے سال تھی، اور یہ سب سے آخری صحابی تھے جن کا شام میں انتقال ہوا اور ایک قول یہ ہے کہ شام میں سب سے بعد میں عبداللہ بن بشر فوت ہوئے، صاد پر ضمہ اور دال مہملہ مفتوح اور یا مشدد ہے۔

(۲۸) ابوامامہ انصاری: — یہ ابوامامہ سعد ہیں۔ سہل بن حنیف انصاری اوسی کے بیٹے۔ یہ اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں، حضور ﷺ کی وفات سے دو سال قبل پیدا ہوئے کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے ہی ان کا نام ان کے نانا سعد بن زرارہ کے نام پر اور ان کی کنیت ان کی کنیت پر تجویز فرمائی تھی یہ بوجہ کم عمری آنحضرت ﷺ سے کچھ نہیں سن سکے اسی لئے بعضوں نے ان کا ذکر صحابہ کے بعد کے لوگوں میں کیا ہے۔ اور ابن عبد البر نے ان کو منجملہ صحابہ ثابت کر کے فرمایا ہے کہ وہ مدینہ میں بڑے تابعین میں کے بڑے علماء میں سے تھے۔ اپنے والد اور ابو سعید وغیرہما سے انہوں نے احادیث سنیں اور ان سے بہت لوگوں نے روایات کی ہیں ۱۰۰ھ میں وفات ہوئی۔ اور آپ کی عمر بانوے سال ہوئی۔

(۲۹) ابوایوب الانصاری: — یہ ابوایوب ہیں خالد بن زید انصاری خزرجی اور یہ حضرت علی بن ابی طالبؓ کے ساتھ تمام محاربات میں شریک رہے اور افواج کی محافظت کرتے ہوئے قسطنطنیہ میں ۵۱ھ میں وفات ہوئی اور یہ اس وقت یزید بن معاویہ کے ساتھ تھے، جب کہ ان کے والد (حضرت معاویہؓ) قسطنطنیہ میں جہاد کر رہے تھے تو ان کے ساتھ (شریک جہاد ہونے کے لئے) نکلے اور بیمار ہو گئے پھر جب بیماری کا ثقل بڑھ گیا تو اپنے اصحاب کو وصیت فرمائی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے جنازے کو اٹھا لینا، پھر جب تم دشمن کے سامنے صف بستہ ہو جاؤ تو مجھے اپنے قدموں کے نیچے دفن کر دینا۔ تو لوگوں نے ایسا ہی کیا آپ کی قبر قسطنطنیہ کی چار دیواری کے قریب ہے جو آج تک مشہور ہے۔ جس کی تعظیم کی جاتی ہے اور اس کے وسیلے سے بیمار لوگ خدا سے شفا چاہتے ہیں تو شفا پاتے ہیں۔ ان سے ایک

جماعت نے روایات کی ہیں قسطنطینہ میں قاف مضموم اور سین ساکن اور پہلی طا مضموم اور اور دوسری طا مکسور ہے اور اس کے بعد یاء ساکنہ ہے، نووی فرماتے ہیں کہ ان حروف کو ہم نے اسی طرح منضبط کیا اور یہی مشہور ہے اور قاضی عیاض مغربی نے مشارق میں، بہت لوگوں سے نقل کیا ہے کہ اس میں سے بعد نون کے یاء مشددہ بھی ہے۔

(۳۰) ابوامیہ المخزومی: — یہ ابوامیہ مخزومی صحابی ہیں۔ ان کا شمار اہل حجاز میں ہے۔ ان سے ابومنذر روایت کرتے ہیں۔

(۳۱) امیہ بن مخشی: — یہ امیہ بن مخشی خزاعی ازدی ہیں ان کا شمار اہل بصرہ میں ہے۔ طعام کے بارے میں ان سے حدیث مروی ہے۔ ان کے بھتیجے مثنی بن عبدالرحمٰن ان سے روایت کرتے ہیں، مخشی میں میم مفتوح اور خاء ساکن اور شین مکسور اور یا مشدد ہے۔

(۳۲) امیہ بن صفوان: — یہ امیہ بن صفوان ہیں جو امیہ بن خلف جمحی کے بیٹے تھے، یہ اپنے والد صفوان سے روایت کرتے ہیں اور اپنے بھتیجے عمرو وغیرہ سے دربارۂ عاریت روایت کی ہے۔

(۳۳) ابواسرائیل: — یہ ابواسرائیل صحابہ میں سے ایک شخص تھے، جنہوں نے یہ نذر کی تھی کہ کسی سے کلام نہیں کریں گے اور روزے سے دھوپ میں کھڑے رہیں گے اپنے اوپر سایہ نہیں کریں گے تو ان کو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ بیٹھیں بھی سایہ میں بھی رہیں اور گفتگو کریں، ان کی حدیث ابن عباس اور جابرؓ عبداللہ کے پاس ہے۔

(۳۴) ابی اللحم خلف بن عبدالملک: — یہ خلف بن عبدالملک الغفاری ہیں۔ آبی اللحم کے نام سے مشہور ہیں کہا گیا ہے کہ ان کا نام عبداللہ ہے اور ایک قول میں حویرث ہے (آبی اللحم کے معنی ہیں گوشت سے انکار کرنے والا) اور آبی اللحم کے لقب سے اس لئے مشہور ہوئے کہ گوشت مطلقاً نہیں کھاتے تھے جو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو (یعنی اسلام لانے سے پہلے بھی اس سے پرہیز کرتے تھے) یوم حنین میں شہید ہوئے۔ ان کے آزاد کردہ عمیر ان سے روایت کرتے ہیں آبی میں ہمزہ پر زبر اور مد ہے اور باء موحدہ مکسور اور یاء ساکن ہے۔

تابعین

(۳۶) اویس القرنی: — یہ اویس بن عامر ہیں۔ ان کی کنیت ابوعمرو ہے۔ قرن کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کا زمانہ پایا مگر آپ کو نہیں دیکھ سکے ان کے مقبول ہونے کی بشارت دی گئی انہوں نے حضرت عمر بن خطاب کو اور آپ کے بعد دوسروں کو بھی دیکھا یہ زہد اور خلق سے کنارہ کشی میں مشہور تھے۔ محاربۂ صفین کے موقعہ پر ۳۷ھ میں گم (یا شہید) ہو گئے۔

(۳۷) ابان: — ابان بن عثمان بن عفان قرشی محدثین اہل مدینہ میں سے ہیں، تابعی ہیں اپنے والد عثمان اور دیگر اصحاب سے روایات کرتے تھے اور ان کی روایات بکثرت ہیں ان سے زہری نے روایت کی ہے۔ یزید بن عبدالملک کے زمانہ میں مدینہ میں وفات ہوئی۔ ابان میں ہمزہ مفتوح ہے اور باء پر تشدید نہیں ہے۔

(۳۸) ایوب بن موسیٰ: — یہ ایوب بن موسیٰ ہیں جو عمرو بن سعید بن العاص اموی کے بیٹے تھے۔ انہوں نے عطاء اور مکحول اور ان کے ہم مرتبہ محدثین سے روایت کی ہے اور ان سے شعبہ وغیرہ نے روایت کی ہے یہ بڑے فقہاء میں سے تھے ۱۳۳ھ میں وفات ہوئی۔

(۳۹) امیہ بن عبداللہ: — یہ امیہ ہیں عبداللہ بن خالد بن اسید مکی کے بیٹے انہوں نے ابن عمرو سے روایت کی ہے اور ان سے زہری وغیرہ نے۔ ثقہ تھے۔ والی خراسان تھے اور ۸۰ھ میں انتقال کیا۔

(۴۰) **اسلم:** - یہ اسلم حضرت عمر بن خطاب کے آزاد کردہ تھے ان کی کنیت ابو خالد تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبشی تھے۔ ان کو حضرت عمرؓ نے ۱۱ھ میں مکہ میں خریدا تھا حضرت عمرؓ سے احادیث سنیں، ان سے زید بن اسلم وغیرہ نے روایات کی ہیں۔ مروان کی خلافت کے زمانہ میں ایک سو چودہ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

(۴۱) **ارزق بن قیس:** - یہ ارزق ہیں قیس حارثی کے بیٹے تابعی ہیں اپنے باپ برزہ سے اور ابن عمر سے اور انس بن مالک سے احادیث سنیں ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہیں۔

(۴۲) **الاعمش:** - یہ اعمش ہیں ان کا نام سلیمان بن مہران کاہلی اسدی ہے۔ بنی کاہل کے آزاد کردہ تھے، بنی کاہل ایک شعبہ بنی اسد خزیمہ کا ہے یہ ۶۰ھ میں رے میں پیدا ہوئے وہاں سے اٹھا کر کوفہ میں لائے گئے تو بنی کاہل کے ایک شخص نے خرید کر آزاد کر دیا۔ یہ اجلہ علماء علم حدیث وقراۃ کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔ ان پر اکثر کوفیین کی روایات کا مدار ہے۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے ۱۴۸ھ میں وفات ہوئی۔

(۴۳) **الاعرج:** - یہ اعراج ہیں ان کا نام عبدالرحمٰن ابن ہرمز مدنی ہے۔ آزاد کردہ نبی ہاشم تھے تابعین میں کے مشہور اور ثقہ بزرگوں میں سے ہیں، ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں مشہور تھے اور ان سے زہری نے روایت کی ہے ھ میں اسکندریہ میں وفات ہوئی۔

(۴۴) **الاسود:** - یہ اسود بن ہلال محاربی ہیں، عمرو بن معاذ اور ابن مسعود سے روایت کرتے تھے اور ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے ۸۴ھ میں وفات ہوئی۔

(۴۵) **ابراہیم بن میسرہ:** - یہ ابراہیم بن میسرہ طائفی ہیں تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں ان کی احادیث اہل مکہ میں مشہور ہیں ثقہ تھے اور صحیح احادیث روایت کرتے تھے۔

(۴۶) **ابراہیم بن عبدالرحمٰن:** - یہ ابراہیم ہیں عبدالرحمٰن بن عوف کے بیٹے۔ ان کی کنیت ابواسحاق زہری قرشی ہے۔ حضرت عمرؓ کی خدمت میں بچپن میں لائے گئے۔ اپنے والد اور سعد بن ابی وقاص سے احادیث سنیں، ان سے ان کے بیٹے سعد اور زہری روایت کرتے ہیں ۹۶ھ میں وفات ہوئی آپ کی عمر ۷۵ھ سال ہوئی۔

(۴۷) **ابراہیم بن اسمٰعیل:** - یہ ابراہیم ہیں اسمٰعیل اشہلی کے بیٹے۔ انہوں نے موسیٰ بن عقبہ اور بہت لوگوں سے روایت کی ہے اور ان سے قعنبی اور بہت لوگ روایت کرتے ہیں۔ اور یہ بہت روزے رکھنے والے اور بکثرت نوافل پڑھنے والے تھے۔ ان کو دار قطنی وغیرہ نے متروک کہا ہے ۱۶۵ھ میں وفات ہوئی۔

(۴۸) **ابراہیم بن الفضل:** - یہ ابراہیم ہیں فضل مخزومی کے بیٹے۔ انہوں نے مقبری وغیرہ سے روایت کی اور ان سے وکیع اور ابن نمیر نے اور کچھ لوگوں نے روایت کی ہے محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔

(۴۹) **اسحاق بن عبداللہ:** - یہ اسحاق بن عبداللہ انصاری ہیں تابعین مدینہ میں کے ثقہ بزرگوں میں سے ہیں۔ واقدی کہتے ہیں کہ امام مالک حدیث میں ان سے بڑا درجہ کسی کو نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے انس بن مالک اور ابو مرثد وغیرہما سے احادیث سنیں اور ان سے یحییٰ بن ابی کثیر اور مالک اور ہمام نے اور ان کا ذکر باب الانفاق میں ہے ۱۳۲ھ میں وفات ہوئی۔

(۵۰) اسحاق بن راہویہ: — یہ ابویعقوب اسحاق بن ابراہیم التیمی ہیں، ابن راہویہ سے شہرت رکھتے تھے۔ بڑے درجے کے اہل علم اور ارکان مُسلمین میں شمار کئے جاتے تھے اور آپ کی ذات حدیث وفقہ اور اتقان اور صدق اور پرہیزگاری کی جامع تھی، آپ علم کی طلب میں خراسان اور عراق اور حجاز اور یمن اور شام کے شہروں میں پھرے ۲۳۸ھ میں بعمر ۷۷ سال انتقال کیا ان کے فضائل کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے سفیان بن عیینہ اور وکیع بڑے بڑے آئمہ سے احادیث سنیں۔ ان سے بخاری اور مسلم اور ترمذی اور ائمہ اعلام کی بڑی جماعت نے روایات کی ہیں۔

(۵۱) ابواسحاق السبیعی: — یہ ابو اسحاق عمرو بن عبداللہ سبیعی ہمدانی کوفی ہیں۔ انہوں نے حضرت علی اور ابن عباس اور دیگر اصحاب کی زیارت کی ہے اور براء بن عازب اور زید بن ارقم سے روایات سنیں اور ان سے اعمش اور شعبہ اور ثوری نے روایات کی ہیں، یہ ایک مشہور کثیر الروایت تابعی تھے ان کی ولادت خلافت عثمانی کے دو سال گزرنے پر ہوئی اور ۱۲۹ھ میں وفات ہوئی۔ سبیعی میں سین مہملہ مفتوح اور باء موحدہ مکسور اور عین مہملہ ہے۔

(۵۲) ابواسحاق بن موسیٰ: — یہ ابو اسحاق ہیں موسیٰ انصاری کے بیٹے۔ مدینہ کے رہنے والے تھے مگر کوفہ میں مقیم ہوگئے تھے، بغداد تشریف لائے اور وہاں سفیان بن عیینہ وغیرہ کی احادیث بیان کیں۔ اپنے والد موسیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اور ان سے مسلم اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ وغیرہم نے روایات کی ہیں بڑے معتبر مانے جاتے تھے ۲۴۴ھ میں وفات پائی۔

(۵۳) ابوابراہیم الاشہلی: — یہ ابوابراہیم اشہلی انصاری ہیں۔ ان کا اسی قدر حال معلوم ہوسکا ہے کہ اپنے والد سے احادیث سنیں. ان سے یحییٰ بن ابی کثیر نے روایت کی یہ بیان کتاب الکنی میں امام مسلم نے کیا ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل سے ان ابراہیم کے والد کے بارہ میں دریافت کیا جو صحابی تھے تو معلوم ہوا کہ وہ نہیں جانتے۔

(۵۴) ابواسرائیل: — یہ ابواسرائیل اسماعیل ہیں۔ خلیفہ الملائی کے بیٹے۔ حکم وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابونعیم اور اسید بن حمال وغیرہ نے روایت کی ہے ضعیف راوی ہیں ۱۶۹ھ میں انتقال ہوا۔

(۵۵) ابوایوب المراغی: — یہ ابو ایوب مراغی عتکی ہیں جویریہ اور ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے قتادہ نے روایت کی ہے اور یہ معتبر اور ثقہ راوی تھے۔

(۵۶) ابوالاحوص: — یہ ابوالاحوص ہیں ان کا نام عوف ہے۔ مالک بن فضلہ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے اپنے والد سے اور ابن مسعود اور ابوموسیٰ سے احادیث سنیں اور ان سے حسن بصری اور ابو اسحاق اور عطاء بن السامی نے روایات کی ہیں۔

(۵۷) احوص: — یہ احوص بن جواب ہیں اور ان کی کنیت ابوجواب ضبی ہے اہل کوفہ میں سے تھے، ان سے علی بن مدینی نے روایت کی ہے۔ ۲۳۱ھ میں انتقال ہوا۔ اور جواب میں جیم مفتوح اور واؤ مشدد اور با موحدہ ہے۔

(۵۸) ابوالاحوص: — یہ ابوالاحوص سلام ہیں۔ سلیم کے بیٹے، حافظ احادیث تھے آدم بن علی اور زیاد بن علاقہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے مسدد اور ہناد نے روایات کی ہیں اور ان سے تقریباً چار ہزار احادیث مروی ہیں۔ ان کو ابن معین نے پختہ ا[illegible] ۱۷۹ھ میں وفات ہوئی۔

(۵۹) ابی بن خلف: — ابی بن خلف اور اس کا بھائی امیہ یہ ابی خلف کا بیٹا تھا اور خلف وہب کا بیٹا تھا اور امیہ ابی کا بھائی تھا، ابی بڑا خبیث مشرک تھا۔ جس کو غزوۂ احد کے دن آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور امیہ بحالت شرک بدر کے دن مارا گیا۔

صحابی عورتیں

(۶۰) اسماء بنت ابی بکر: — یہ اسماء ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی۔ اور ان کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے جس رات میں حضور ﷺ نے ہجرت کی تھی اپنے پٹکے کو پھاڑ کر دو حصے کئے تھے، اس کے ایک حصہ میں توشہ دان کو باندھا اور دوسرے کو مشکیزہ پر باندھا یا اس کا اپنا پٹکا بنالیا تھا۔ اور یہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی والدہ ہیں مکہ میں اسلام لائی تھیں، کہا جاتا، ہے کہ اس وقت تک صرف سترہ آدمیوں نے اسلام قبول تھا۔ یہ اپنی بہن عائشہ سے دس برس بڑی تھیں، جب آپ کے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ کی نعش کو (جو بعد قتل ایک لکڑی پر لٹکادی گئی تھی) لکڑی پر سے اتار کر دفن کر دیا گیا تو اس سے دس دن بعد یا بیس دن بعد بعمر ایک سو برس مکہ میں انتقال کیا اس وقت ۷۳ھ تھا ان سے بہت لوگوں نے احادیث کی روایت کی ہے۔

(۶۱) اسماء بنت عمیس: — یہ اسماء بنت عمیس ہیں انہوں نے اپنے شوہر حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حبشہ ہجرت کی تھی وہیں آپ سے محمد یا عبداللہ اور عون پیدا ہوئے پھر مدینہ کو ہجرت کی۔ جب حضرت جعفر شہید ہوگئے تو ان سے حضرت ابوبکر صدیق نے نکاح کیا اور آپ سے محمد پیدا ہوئے، پھر حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہوگئی تو آپ سے حضرت علی بن ابی طالب نے نکاح کر لیا اور آپ سے یحییٰ پیدا ہوئے۔ ان سے بہت سے جلیل القدر صحابہ نے روایات کی ہیں۔ عُمیس میں عین مضموم اور میم مفتوح ہے اور یاء ساکن ہے اور سین مہملہ ہے۔

(۶۲) انیسہ بنت خبیب: — یہ انیسہ انصاریہ صحابیہ ہیں۔ ان کا شمار اہل بصرہ میں ہے ان سے ان کے بھانجے خبیب بن عبدالرحمٰن نے روایت کی ہے انیسہ تصغیر کے صیغہ سے ہے اسی طرح خبیب۔

(۶۳) امیمہ بنت رقیقہ: — یہ امیمہ ہیں رقیقہ کی بیٹی ان کے والد کا نام عبداللہ ہے اور رقیقہ خویلد کی بیٹی اور حضرت خدیجہ زوجہ نبی کریم ﷺ کی بہن ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہے رقیقہ میں راء مضموم ہے اور دونوں قاف پر زبر ہے اور درمیان میں دو لفظوں والی یاء ساکن ہے۔

(۶۴) امامہ بنت ابی العاص: — یہ امامہ ہیں ابوالعاص بن ربیع کی بیٹی۔ ان کی والدہ زینب ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی بیٹی تھیں۔ بعد حضرت فاطمہ کی وفات کے حضرت علی نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ یہ حضرت فاطمہ کی بھانجی تھیں حضرت علی کو انہوں نے اس کی وصیت کی تھی۔ امامہ کا نکاح حضرت علی سے زبیر بن العوام نے کیا کیونکہ ان کے یعنی امامہ کے والد نے ان کو اس کی وصیت کی تھی باب مالایجوز من العمل فی الصلوۃ میں ان کا ذکر آیا ہے۔

(ب)

صحابہ

(۶۵) ابوبکر الصدیق: — یہ ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ ان کا نام عبداللہ ہے۔ یہ عثمان ابوقحافہ کے بیٹے ہیں۔ قحافہ کے قاف پر پیش ہے۔ ابوقحافہ عامر کے بیٹے تھے اور وہ عمرو کے اور وہ کعب کے اور وہ سعد کے اور وہ تمیم کے اور وہ مرہ کے اس طرح ساتویں پشت پر ان کا نسب حضور ﷺ سے مل گیا آپ کو عتیق سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا من اراد ان ینظر الی عتیق من النار

فلینظر الی ابی ابکر (جو شخص کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہے جو نار جہنم سے آزاد اور بے کھٹکے ہو چکا ہے وہ ابوبکر کو دیکھ لے) حضور ﷺ کے ساتھ ہر غزوہ میں شریک رہے اور آپ ﷺ سے کبھی جدا نہیں ہوئے نہ قبل از اسلام اور نہ بعد از اسلام (بلکہ بعد وفات بھی مجسمہ المبارک آپ کے ساتھ ہی رہے) اور یہ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے ان کا رنگ سفید تھا لاغر اندام تھے رخسار پہلے تھے چہرے پر گوشت بہت کم تھا۔ آنکھیں اندر کو تھیں۔ پیشانی ابھروان تھی انگلیوں کی جڑیں گوشت سے خالی تھیں، آپ مہندی اور وسمہ سے خضاب کرتے تھے، ان کو اور ان کے والدین کو اور ان کی اولاد کو اور پوتے کو حضور ﷺ سے شرف صحبت حاصل ہوا۔ اتنی بڑی نعمت تمام اصحاب میں سے کسی کو حاصل نہیں۔ واقعہ فیل کو دو سال چار مہینے سے چند دن کم گذرے تھے جب کہ مکہ میں پیدا ہوئے اور مدینہ میں منگل کی رات میں عشاء اور مغرب کے درمیان جب کہ جمادی الاخری ۱۳ھ کے آٹھ دن باقی تھے آپ کی وفات ہوگئی۔ آپ کی عمر ۶۳ سال ہوئی، آپ نے یہ وصیت کی تھی کہ آپ کو آپ کی زوجہ اسماء بنت عمیس غسل دیں اس لئے انہوں نے آپ کو غسل دیا اور عمر بن خطاب نے نمازہ جنازہ پڑھائی آپ کی خلافت کا زمانہ دو سال چار ماہ ہے آپ سے صحابہ اور تابعین کی ایک کثیر جماعت نے روایت کی ہے، آپ سے بہت کم حدیثوں کی روایت ہوئی کیونکہ آپ حضور ﷺ کے بعد تھوڑی مدت حیات رہے (اور انصرام امور خلافت کی بنا پر اس کی فرصت بھی نہ مل سکی)

(۶۶) ابوبکرہ: — یہ ابوبکرہ نفیع بن حارث ہیں اور یہ غلام تھے حارث بن کلدہ ثقفی کے پھر انہوں نے ان کو اپنے اہل بیت میں شامل کر لیا تھا یعنی بیٹا بنا لیا تھا۔ ان کے نام (نفیع) سے ان کی کنیت ابوبکرہ زیادہ مشہور ہوئی۔ ان کی اس کنیت کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یوم طائف میں (جب حضور اکرم ﷺ نے طائف کا محاصرہ کر رکھا تھا) یہ ایک گھڑی کے سہارے لٹک کر کود ے تھے۔ اور حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا (بکرہ کے معنی لکڑی کے گھیڑی کے ہیں جس پر ڈول کی رسی چلتی ہے) تو آپ ﷺ کو حضرت ﷺ نے ابوبکرہ کی کنیت سے مخاطب فرمایا اور ان کو آزاد کر دیا، اس لئے یہ حضور ﷺ کے موالی میں سے ہیں۔ یعنی آزاد کردہ غلام بصرہ کے باشندہ ہو کر وہیں پر ۴۹ھ میں انتقال ہوا۔ ان سے کثیر مخلوق نے روایت کی ہے۔ نفیع میں نون مضموم اور فاء مفتوح اور باء ساکن ہے۔

(۶۷) ابوبرزہ: — یہ ابوبرزہ فضلہ بن عبید اسلمی ہیں شروع زمانہ میں اسلام قبول کیا اور یہ وہی ہیں جنہوں نے عبداللہ بن خطل کو قتل کیا تھا۔ اور حضور ﷺ کی وفات تک کے تمام غزوات میں آپ کے ساتھ رہے پھر بصرہ آکر اقامت گزیں ہوئے پھر خراساں کا غزوہ کیا اور مرو میں ۶۰ھ میں وفات ہوئی۔

(۶۸) ابوبردہ: — یہ ابوبردہ ہانی بن نیار ہیں ستر اصحاب کے ساتھ عقبہ ثانیہ میں حاضر تھے اور اس کے بعد کے محاربات میں بھی شریک رہے اور یہ براء بن عازب کے ماموں ہیں، ان کے اولاد نہیں ہوئی، معاویہؓ کے شروع زمانہ میں تمام محاربات میں حضرت علیؓ کا ساتھ دے کر وفات پائی ان نے براء اور جابر سے روایت کی ہے ہانی میں نون مکسور ہے اس کے بعد ہمزہ ہے اور نیار میں نون مکسور اور یا بغیر تشدید کے ہے اور آخر میں راء مہملہ (بے نقطہ والی) ہے۔

(۶۹) ابوبصیر: — یہ ابوبصیر عتبہ بن اسید ثقفی ہیں ابتدائی زمانہ میں اسلام لانے والے صحابہ میں سے ہیں، ان کا ذکر غزوہ حدیبیہ میں آتا ہے، آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں انتقال ہو گیا، اسید میں ہمزہ مفتوح اور سین مہملہ مکسور ہے ان کا ذکر حرف عین میں بھی آنے والا ہے۔

(۷۰) ابوبصرہ: — اس میں باء پر زیر ہے اور صاد مہملہ ساکن ہے یہ حمیل بن بصرہ غفاری ہیں۔ حمیل حمل کی تصغیر ہے۔

(۷۱) ابو بشیر: — یہ ابو بشیر قیس ہیں عبید انصاری مازنی کے بیٹے۔ ابن عبد البر صاحب استیعاب کہتے ہیں کہ ان کے صحیح نام پر واقفیت نہیں ہو سکی اور کسی ایسے شخص نے جو قابل وثوق واعتماد ہو ان کا نام نہیں بتایا اور ابن مندہ نے کتاب الکنی میں ان کا ذکر کیا ہے مگر نام نہیں لکھا ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے یوم حرہ کے بعد انتقال ہوا، انہوں نے طویل عمر پائی۔

(۷۲) ابو البداح: — یہ ابو البداح ہیں جن کے نام میں اختلاف ہے کہا گیا ہے کہ ان کا نام عاصم بن عدی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ عاصم بن عدی کے بیٹے ہیں۔ یہ ایک لقب ہے جس سے مشہور ہوگئے اور ان کی کنیت ابو عمر ہے، ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے تو بعض نے کہا کہ ان کو صحبت نبوی حاصل ہوئی اور بعض نے کہا کہ حاصل نہیں ہوئی، البتہ ان کے والد کو حاصل ہوئی ابن عبد البر کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ صحابی تھے۔ بداح میں باء موحدہ مفتوح ہے اور دال مہملہ مشدد اور مہملہ ہے ۱۱۷ھ میں انتقال ہوا۔ ان کی عمر ۸۴ سال ہوئی انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے اور ان سے ابوبکر بن عبد الرحمٰن نے۔

(۷۳) البراء بن عازب: — یہ براء بن عازب ابو عمارہ انصاری حارثی ہیں۔ کوفہ میں آئے اور ۲۴ھ میں رے فتح کیا اور جنگ جمل و صفین و نہروان میں حضرت علیؓ کے ساتھ رہے اور مصعب بن زبیر کے زمانہ میں کوفہ میں انتقال کیا، ان سے کثیر مخلوق نے روایت کی ہے۔ عمارہ میں عین مہملہ مضموم ہے اور میم پر تشدید نہیں ہے۔

(۷۴) بلال بن رباح: — یہ بلال بن رباح حضرت ابوبکر صدیق کے آزاد کردہ ہیں۔ شروع زمانہ میں اسلام لے آئے یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مکہ میں اپنے اسلام کو ظاہر کیا غزوہ بدر میں اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے اور آخر وقت میں شام میں رہنے لگے تھے اور ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان سے صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے روایت کی ہے جب کہ آپ کی عمر تریسٹھ برس کی تھی۔ ۲۰ھ میں دمشق میں انتقال کیا اور باب الصغیر میں دفن ہوئے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حلب میں انتقال ہوا اور باب الاربعین میں دفن ہوئے۔ صاحب کشاف کہتے ہیں کہ پہلا قول صحیح ہے اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو اہل مکہ نے اسلام قبول کرنے کی بنا پر سخت اذیتیں پہنچائی تھیں اور بلالؓ کو شدید تکالیف میں مبتلا کرنے میں امیہ بن خلف جمحی بذات خود حصہ لیتا تھا۔ یہ خدا کی تقدیر تھی کہ یہ ملعون حضرت بلال ہی کے ہاتھ سے بدر کے دن قتل ہوا۔ جابر کہتے ہیں کہ حضرت عمر کہا کرتے تھے ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور ہمارے سردار بلال کے آزاد کرنے والے ہیں۔

(۷۵) بلال بن حارث: — یہ بلال بن حارث ابو عبد الرحمٰن مزنی ہیں اشعر میں رہتے اور مدینہ کو دیکھا تھا، ان سے ان کے بیٹے حارث نے اور علقمہ بن وقاص نے روایت کی ۶۰ھ میں بعمر اسی سال وفات پائی۔

(۷۶) بریدہ بن الحصیب: — یہ بریدہ بن الحصیب اسلمی ہیں۔ بدر سے پہلے اسلام لے آئے تھے۔ مگر اس میں حاضر نہ ہو سکے اور بیعت رضوان میں شریک تھے۔ یہ مدینہ کے رہنے والوں میں سے تھے پھر بصرہ چلے گئے پھر وہاں سے خراسان جہاد کرتے ہوئے پہنچے اور مرو میں بزمانہ یزید بن معاویہؓ ۶۲ھ میں انتقال ہوا۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے اور حصیب حصب کی تصغیر ہے۔

(۷۷) بشر بن معبد: — یہ بشر بن معبد ہیں "ابن الخصاصیہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ خصاصیہ ان کی والدہ تھی اور ان کا نام کبشہ تھا لوگوں نے ان کو والدہ کے نام کی طرف منسوب کیا اور حضور ﷺ کے آزاد کردہ تھے اور ان کا شمار بصرہ والوں میں ہے۔

(۷۸) بسر بن ابی ارطاۃ: — یہ بسر بن ابی ارطاہ ابو عبد الرحمٰن ہیں اور ابو ارطاۃ کا نام عمیر عامری قرشی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کم عمری کی وجہ سے یہ رسول اللہ ﷺ سے کچھ نہیں سن سکے۔ اور اہل شام ان کا سننا ثابت کرتے ہیں واقدی کا قول ہے کہ یہ حضور ﷺ کی وفات سے دو سال قبل پیدا ہوئے تھے، کہا جاتا ہے کہ آخر عمر میں ان کا دماغ صحیح نہیں رہا تھا، حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں انتقال ہوا اور

ایک قول یہ ہے کہ عبدالملک کے زمانے میں۔

(۷۹) بدیل بن ورقاء: — یہ بدیل بن ورقاء خزاعی ہیں قدیم الاسلام ہیں ان سے ان کے دونوں بیٹوں عبداللہ اور سلمہ وغیرہما نے روایت کی ہے، حضور ﷺ کے زمانہ میں شہید ہوگئے اور ایک قول یہ ہے کہ یوم صفین میں شہید ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ یوم صفین میں جس نے ان کو قتل کیا وہ ان کے بیٹے عبداللہ تھے۔ بدیل بدل کا مصغر ہے۔

(۸۰) ابنا بسر: — یعنی بسر کے دونوں بیٹے اس سے مراد عطیہ اور عبداللہ ہیں ان کا ذکر حرف عین میں آئے گا۔ ان دونوں کی ایک حدیث ہے۔ کھجور اور مکھن کھانے کے بارے میں جس میں دونوں ناموں کو ملا کر "ابنا بسر" یعنی بسر کے دونوں بیٹے کہا گیا ہے۔ اور ان کے نام نہیں ذکر کئے گئے۔

(۸۱) البیاضی: — منسوب ہے بیاضہ بن عامر کی طرف اور ان کا نام عبداللہ بن جابر الانصاری ہے۔ صحابی تھے۔

تابعین

(۸۲) بلال بن یسار: — یہ بلال ہیں یسار کے بیٹے، جو زید کے بیٹے تھے جو کہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ تھے اور یہ زید زید بن حارثہ نہیں ہیں انہوں نے اپنے باپ سے اور دادا سے روایت کی ہے ان سے عمرو بن مرہ نے روایت کی ہے ان کی حدیثیں بصرہ والوں میں رائج ہیں۔

(۸۳) بلال بن عبداللہ: — یہ بلال ہیں حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب قرشی عدوی کے بیٹے۔ حدیث میں بڑے سنجیدہ تھے۔

(۸۴) بسر بن محجن: — یہ بسر بن محجن دیلی حجازی ہیں اپنے والد سے روایت کرتے تھے اور ابن منذر نے ان کا نام صحابہ کے ذیل میں درج کیا اور کہا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث روایت کی ہے اور بخاری وغیرہ نے ان کو تابعی کہا ہے۔ اور یہی ٹھیک ہے۔ ان سے زید بن اسلم نے روایت کی ہے۔ محجن میں میم مکسور اور حاء مہملہ ساکن اور جیم مفتوح اور آخر میں نون ہے اور دیلی میں دال مکسور ہے اور دو نقطوں والی یا ساکن ہے۔

(۸۵) بہز بن حکیم: — یہ بہز ہیں حکیم بن معاویہ بن حیدۃ القشیری بصری کے بیٹے ان میں علماء کا اختلاف ہے۔ وہ اپنے باپ وہ ان کے دادا سے روایت کی ہے اور ان سے بہت لوگوں نے بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں ان کی کوئی روایت داخل نہیں کی ابن عدی نے کہا ہے کہ میں نے ان کی ایسی کوئی حدیث نہیں دیکھی جو قابل انکار ہو۔ حیدہ میں حاء مہملہ مفتوح اور دو نقطوں والی یاء ساکن اور دال مفتوح ہے۔

(۸۶) بشر بن مروان: — یہ بشر ہیں مروان بن حکم اموی قرشی کے بیٹے عبدالملک کے بھائی۔ یہ اپنے بھائی کی طرف سے والی عراق تھے، یوم جمعہ کے خطبہ کے باب میں ان کا ذکر آیا ہے۔ بشر میں باء مکسور اور شین معجمہ ساکن ہے۔

(۸۷) بشر بن رافع: — یہ بشر بن رافع ہیں یحییٰ بن ابی کثیر اور بہت لوگوں سے روایت کرتے ہیں اور ان سے عبدالرزاق اور بہت لوگوں نے روایت کی ہے، ان کی روایت کو احمد بن حنبل نے ضعیف اور ابن معین نے قوی کہا ہے۔

(۸۸) بشر بن ابی مسعود: — یہ بشر ہیں ابو مسعود بدری کے بیٹے۔ انہوں نے اپنے باپ سے ان سے عروہ اور یونس بن میسرہ اور

بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔

(۸۹) **بشیر بن میمون:** — یہ بشیر بن میمون ہیں اپنے چچا اسامہ بن اخدری سے روایت کرتے ہیں اور ان سے بشیر بن مفضل وغیرہ نے روایات کی ہیں، سچے مانے جاتے ہیں۔

(۹۰) **بجالہ بن عبدہ:** — یہ بجالہ بن عبدہ تمیمی ہیں جزء بن معاویہ کے کاتب احنف بن قیس کے چچا ہیں مکی اور ثقہ ہیں اہل بصرہ میں شمار کئے جاتے ہیں انہوں نے عمران بن حصین سے احادیث سنیں اور ان سے عمرو بن دینار نے۔ ۹۰ھ میں مکہ میں زندہ تھے بجالہ میں باموحدہ مفتوح اور جیم مخفف یعنی تشدید کے بغیر ہے اور جزء میں جیم مفتوح اور زاء ساکن ہے جس کے بعد ہمزہ ہے۔

(۹۱) **الوبردہ:** — یہ ابوبردہ عامر ہیں، عبداللہ بن قیس کے بیٹے۔ عبداللہ بن قیس نام ہے ابوموسی اشعری ؓ کا ابوبردہ ایک مشہور کثیر الروایت تابعی ہیں اپنے والد اور حضرت علی ؓ وغیرہما سے روایت کرتے تھے۔ اور قاضی شریح کے بعد ان کی جگہ عہدۂ قضاء پر کوفہ میں مامور کئے گئے تھے پھر ان کو حجاج بن یوسف نے معزول کر دیا تھا۔

(۹۲) **الوبکر بن عیاش:** — یہ ابوبکر بن عیاش اسدی بڑے علماء میں سے تھے ابواسحاق وغیرہ سے روایت کرتے تھے۔ اور ان سے احمد اور ابن معین نے روایت کی ہے امام احمد کا قول ہے کہ یہ صدوق اور ثقہ ہیں مگر غلطی کبھی کر جاتے ہیں ۱۵۳ھ میں بعمر ۹۶ سال وفات ہوئی۔ عیاش میں دو نقطوں والی یاء مشدد ہے اور شین معجمہ ہے۔

(۹۳) **الوبکر بن عبدالرحمٰن:** — یہ ابوبکر بن عبدالرحمٰن مخزومی ہیں، ابوبکر ان کا نام بھی ہے اور کنیت بھی تابعی ہیں۔ انہوں نے عائشہ اور ابوہریرہ سے احادیث سنیں اور ان سے شعبی اور زہری نے روایات کی ہیں۔

(۹۴) **الوبکر بن عبداللہ بن زبیر:** — یہ ابوبکر بن عبداللہ بن زبیر حمیدی ہیں امام بخاری کے شیخ ہیں ان کا ذکر حرف عین میں آئے گا۔

(۹۵) **الوالبختری:** — ان کا نام سعید بن فیروز ہے ان کی حدیث رویت ہلال کے بارے میں ہے۔

صحابی عورتیں

(۹۶) **بزیرة:** — بریرہ میں باء مفتوح ہے اور پہلی راء مکسور اور دو نقطوں والی یاء ساکن ہے۔ یہ ام المومنین عائشہ ؓ کی آزاد کردہ ہیں۔ عائشہ اور ابن عباس اور عروہ ابن زبیر سے روایت کرتی ہیں۔

(۹۷) **بسرة:** — یہ بسرہ صفوان بن نوفل کی بیٹی تھیں نسلاً قریشیہ اسدیہ تھیں۔ اور یہ ورقہ بن نوفل کی بھتیجی تھیں۔

(۹۸) **بہیسہ:** — یہ بہیسہ فزاریہ ہیں۔ صحابیہ ہیں۔ یہ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں اور وہ نبی کریم ﷺ سے اور ان کی حدیث بیع کے بارے میں ہے۔ بہیسہ میں باضموم اور ہامفتوح اور یا ساکن اور سین مہملہ ہے۔

(۹۹) **ام بجید:** — یہ ام بجید حوا ہیں۔ یزید بن سکن کی بیٹی انصاریہ ہیں اسماء بنت یزید کی بہن، ان کی شہرت کنیت سے زیادہ ہوئی۔ ان عورتوں میں سے ہیں جنہوں نے حضور ﷺ سے بیعت کی تھی۔ ان سے عبدالرحمٰن بن بجید نے روایت کی ہے بجید بجد کی تصغیر ہے۔

تابعی عورتیں

(۱۰۰) بناتہ: ۔ یہ بناتہ باء کے پیش اور نون کی تخفیف کے ساتھ عبدالرحمٰن بن حیان کی آزاد کردہ انصاریہ ہیں یہ عائشہ سے روایت کرتی ہیں اور ان سے ابن جریج نے روایت کی ہے ان کی حدیث جلاجل والی ہے، حیان میں حاء مہملہ مفتوح ہے اور دو نقطوں والی یا مشدد ہے۔

(ت)

صحابہ

(۱۰۱) تمیم داری: ۔ یہ تمیم بن اوس داری ہیں، پہلے نصرانی تھے پھر ۹ھ میں اسلام قبول کیا۔ یہ ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کردیتے تھے۔ اور کبھی ایک ہی آیت کو تمام رات بار بار پڑھتے صبح کردیتے تھے۔ محمد بن منکدر نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ساری رات کو صبح تک سوتے رہے اور تہجد کے لئے نہیں اٹھ سکے تو اپنے نفس کو اس غفلت کی سزا دینے کے لئے ایک سال تک تمام رات نوافل پڑھتے رہے اور بالکل نہیں سوئے مدینہ میں رہتے تھے۔ پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد شام میں اقامت گزیں ہوگئے اور وقت وفات تک وہیں رہے اور سب سے پہلے مسجد میں انہوں نے چراغ جلایا نبی ﷺ سے انہوں نے قصہ دجال اور جساسہ کا بیان کیا ہے۔ اور ان سے بہت لوگوں نے اس کی روایت کی۔

تابعین

(۱۰۲) ابو تمیمہ: ۔ یہ ابو تمیمہ طریف بن خالد ہجمی بصری ہیں۔ ان کی اصل یمن کے عربی لوگوں سے تھی ان کے چچا نے ان کو بیچ دیا تھا۔ اور یہ تابعی ہیں۔ متعدد صحابہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے قتادہ وغیرہ نے روایت کی ہے ۹۵ھ میں انتقال ہوا۔

(ث)

صحابہ

(۱۰۳) ثابت بن قیس بن شماس: ۔ یہ ثابت بن قیس بن شماس انصاری خزرجی ہیں۔ غزوۂ احد اور اس کے بعد جس قدر غزوات ہوئے سب میں حاضر ہوئے۔ اور یہ اکابر صحابہ میں سے اور انصار کے بڑے علماء میں سے تھے اس لئے آنحضرت ﷺ نے جنت کی شہادت دی اور یہ رسول اللہ ﷺ کے خطیب تھے اور یوم الیمامہ یعنی جس دن مسیلمہ کذاب سے جنگ ہوئی اس میں ۱۲ھ میں شہید ہوگئے۔ ان سے انس بن مالک وغیرہ نے روایت کی ہے۔

(۱۰۴) ثابت بن ضحاک: ۔ یہ ثابت بن ضحاک ابوزید انصاری خزرجی ہیں۔ یہ ان اصحاب میں سے ہیں جنہوں نے (حدیبیہ میں) بیعۃ الرضوان کے موقع پر درخت کے نیچے رسول کریم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی اور یہ اس وقت کم عمر تھے۔ حضرت

عبداللہ بن زبیر کے ساتھ جو فتنہ ہوا اس میں شہید ہوئے۔

(۱۰۵) ثابت بن دحداح: ۔ یہ ثابت بن دحداح اور ایک قول کے مطابق ابن دحداحہ انصاری ہیں، غزوہ احد میں شریک ہوئے اور خالد بن ولید کے نیزہ سے جو جسم کے پار ہو گیا تھا شہید ہوئے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بستر پر ہی انتقال ہوا جب حضور ﷺ حدیبیہ سے واپس ہوئے تھے "تشییع الجنازہ" کے باب میں ان کا ذکر آیا ہے۔

(۱۰۶) ثوبان: ۔ یہ ثوبان بن بجدد ہیں ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے ان کو رسول اللہ ﷺ نے خرید کر آزاد کیا تھا یہ حضور ﷺ کی وفات تک سفر اور حضر میں ہمیشہ آپ ﷺ کے ساتھ رہے، پھر شام آگئے تھے پھر رملہ میں آئے، اس کے بعد حمص میں مقیم ہوئے اور وہیں ۵۴ھ میں وفات ہوئی ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے بجدد میں ایک نقطہ والی باء مضموم اور جیم ساکن اور پہلی دال مہملہ مضموم ہے۔

(۱۰۷) ثمامہ بن اثال ۔ یہ ثمامہ بن اثال حنفی ہیں اہل یمامہ کے سردار تھے یہ قید ہو گئے تھے۔ ان کو حضور ﷺ نے رہائی بخشی، اس کے بعد یہ گئے اور اپنے کپڑے دھوئے اور غسل کر کے پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا، اور ان کا اسلام بہت اچھا رہا ان سے ابوہریرہ اور ابن عباس نے روایت کی ہے ثمامہ میں ثاء مضموم اور دونوں میم غیر مشدد ہیں اور اثال میں ہمزہ مضموم اور تین نقطوں والی ثاء غیر مشدد اور آخر میں لام ہے۔

(۱۰۸) ابو ثعلبہ: ۔ یہ ابو ثعلبہ جرہم بن ناشب خشنی ہیں اور یہ اپنی کنیت سے مشہور ہیں، انہوں نے بیعۃ الرضوان والی بیعت آنحضرت ﷺ سے کی آپ نے ان کو قوم کے لوگوں کے پاس (تبلیغ اسلام کے لئے) بھیجا جو اسلام لے آئے، ابو ثعلبہ شام میں آگئے تھے اور وہیں ۷۵ھ میں انتقال ہوا۔ جرہم میں جیم اور ہا دونوں مضموم ہیں۔

تابعین

(۱۰۹) ثابت بن ابی صفیہ: ۔ یہ ثابت ابو صفیہ کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ابو حمزہ ہے اور کوفہ کے رہنے والے ہیں انہوں نے محمد بن علی الباقر سے حدیث کو سنا ہے اور وکیع اور ابن عیینہ نے ان سے روایت حدیث کی ہے ان کی وفات ۱۴۸ھ میں واقع ہوئی۔

(۱۱۰) ثابت بن اسلم بنانی: ۔ ان کا نام ثابت ہے اور یہ اسلم بنانی کے بیٹے ہیں۔ کنیت ابو محمد ہے۔ تابعی ہیں بصرہ کے مشہور علماء میں سے ہیں اور ثقات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انس بن مالک؄ سے روایت حدیث کرتے ہیں، مشہور ہوئے۔ اور ان کی شاگردی میں چالیس سال گزارے ہیں۔ انہوں نے بہت سے علماء سے روایت حدیث کی ہے اور بڑی جماعت نے ان سے۔ ان کی وفات ۱۲۳ھ میں واقع ہوئی اور انہوں نے ۸۶ سال کی عمر پائی۔

(۱۱۱) ثمامہ بن حزن: ۔ یہ ثمامہ حزن قشری کے بیٹے ہیں۔ ان کا شمار تابعین کے طبقہ ثانیہ میں کیا جاتا ہے اور ان کی حدیث بصریین روایت کرتے ہیں۔ حضرت عمر؄ اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ کو اور حضرت ابوالدرداء کو انہوں نے دیکھا ہے اور حضرت عائشہ؅ سے احادیث کو سنا۔ اسود بن شیبان بصری نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔ حزن کی حا (مہملہ پر زبر ہے زاء اور نون پر جزم ہے۔

(۱۱۲) ثور بن یزید: ۔ یہ ثور یزید کلاعی شامی کے بیٹے ہیں اور حمص کے رہنے والے ہیں انہوں نے خالد بن معدان سے حدیث کو سنا

اور ان سے سفیان ثوری اور یحییٰ بن سعید نے حدیث کو نقل کیا ہے۔ان کی وفات ۱۵۵ھ میں ہوئی ان کا تذکرہ باب الملاحم میں آتا ہے۔

(ج)

صحابہ

(۱۱۳) **جابر بن عبداللہ:** — ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے۔ یہ انصار میں سے ہیں۔ قبیلہ سلیم کے رہنے والے ہیں، مشہور صحابہ میں سے ہیں، ان کا شمار ان حضرات صحابہ میں ہوتا ہے جنہوں نے حدیث کی روایت کثرت سے کی ہے۔ غزوۂ بدر اور اس کے بعد پیش آنے والے تمام غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ایسے تمام غزوات اٹھارہ ہیں۔ وہ شام اور مصر میں تشریف لائے آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی ان سے بڑی جماعت نے حدیث کو نقل کیا ہے ۷۴ھ میں مدینہ منورہ میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کی عمر ۹۴ سال بتلائی جاتی ہے۔ یہ ایک قول میں صحابہ میں سب سے آخر میں مدینہ میں وفات پانے والے ہیں (ان کی وفات عبدالملک بن مروان کی خلافت میں ہوئی۔)

(۱۱۴) **جابر بن سمرہ:** — ان کی کنیت ابو عبداللہ عامری ہے، یہ سعد بن ابی وقاص کے بھانجے ہیں کوفہ میں تشریف لائے اور وہاں ہی ۷۴ھ میں وفات پائی۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

(۱۱۵) **جابر بن عتیک:** — ان کی کنیت ابو عبداللہ انصاری ہے بدر اور بدر کے بعد تمام غزوات میں حاضر ہوئے ان سے ان کے دو بیٹوں نے یعنی عبداللہ اور ابو سفیان اور ان کے بھتیجے عتیک بن حارث نے روایت حدیث کی ہے ۶۱ھ میں ان کی وفات ہوئی ان کی عمر ۶۱ سال کی ہے۔

(۱۱۶) **جبار بن صخر:** — یہ جبار صخر انصاری سلمی کے بیٹے ہیں، بیعت عقبہ غزوہ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں حاضر ہوئے لیلۃ العقبہ میں جو ستر صحابہ شریک تھے ان میں سے یہ بھی ایک ہیں۔ شرجیل بن سعد نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے۔ جبار کی جیم پر زبر ہے۔ اور باء مشدد ہے۔

(۱۱۷) **جریر بن عبداللہ:** — ان کی کنیت ابو عمرو ہے۔ جس سال میں حضور ﷺ کی وفات ہوئی اسی سال یہ اسلام لائے جریر نے کہا ہے کہ میں آنحضور کی وفات سے چالیس دن پہلے ایمان لایا۔ کوفہ میں تشریف لائے اور ایک زمانہ تک وہاں رہے پھر وہاں سے قرقیسا کی طرف منتقل ہوئے۔ اور وہاں ہی ۵۱ھ میں وفات پائی ان سے ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے۔

(۱۱۸) **جندب بن عبداللہ:** — یہ جندب عبداللہ کے بیٹے سفیان بجلی علقی کے پوتے ہیں علقہ قبیلہ بجلہ کی ایک شاخ ہے اور بجیلہ میں کچھ لوگ ہیں جن کو قسر کہا جاتا ہے قاف کے زبر، سین کے جزم کے ساتھ۔ یہ لوگ خالد بن قسری کا خاندان ہیں۔ فتنہ عبداللہ بن زبیر میں اس سے چار سال کے بعد وفات پائی، ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ جندب جیم کے ضمہ اور نون کے جزم کے ساتھ ہے۔ دال کا پیش اور زبر دونوں صحیح ہیں۔

(۱۱۹) **جبیر بن مطعم:** — ان کی کنیت ابو محمد قرشی نوفلی ہے فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے مدینہ میں تشریف لے گئے اور وہیں ۵۴ھ میں انتقال کیا۔ ان سے ایک جماعت نے حدیث کی روایت کی ہے۔ وہ نسب کے اعتبار سے قریشی ہیں۔

(۱۲۰) جرہد بن خویلد: — یہ جرہد بن خویلد مدنی اسلمی ہیں، اہل صفہ میں ان کا شمار ہوتا ہے ۶۱ھ میں ان کی وفات ہوئی، ان کے بیٹوں عبداللہ، عبدالرحمٰن سلیمان اور مسلم نے ان سے روایت کی ہے جرہد میں جیم اور ہاء دونوں پر زبر ہے۔

(۱۲۱) جعفر بن ابی طالب: — یہ جعفر بن ابی طالب ہاشمی حضرت علی ابن ابی طالب کے بھائی ہیں ان کا خطاب ذو الجناحین ہے یہ شروع ہی میں اکتیس آدمیوں کے بعد اسلام لائے تھے۔ یہ اپنے بھائی حضرت علی سے دس سال بڑے ہیں اور آنحضرت کے ساتھ صورت اور سیرت میں سب سے زیادہ مشابہ ہیں ان کے بھائی حضرت علی نے فرمایا کہ ہم جب کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ابوطالب کے اونٹوں میں نماز ادا کر رہے تھے کہ اچانک ابوطالب نے ہم کو اوپر سے جھانکا آنحضور ﷺ نے ان کو دیکھ لیا اور فرمایا کہ اے محترم چچا نیچے تشریف لے آیئے اور ہمارے ساتھ نماز پڑھئے۔ ابوطالب نے کہا اے میرے پیارے بھتیجے میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ حق پر ہیں لیکن میں یہ بات بری سمجھتا ہوں کہ میں سجدہ کروں۔ اور سرین اوپر کو بلند ہو جائے۔ لیکن اے جعفر تم اترو اور اپنے چچا کے بیٹے کے بازو میں نماز پڑھو حضرت جعفر اترے اور آنحضور ﷺ کے بائیں جانب نماز پڑھنے لگے۔ جب آنحضور نے اپنی نماز پوری کی تو حضرت جعفر کو مڑ کر دیکھا اور فرمایا یاد رکھو اللہ تعالیٰ تمہارے جسم سے دو بازو ملائے گا۔ جن کے ذریعہ سے جنّت میں اڑتے پھرو گے جیسے کہ تم ملے ہو اپنے چچا کے بیٹوں کے بازوؤں سے ان سے ان کے بیٹے عبداللہ اور بہت سے صحابہ نے روایت حدیث کی ہے، ۸ھ میں جنگ موتہ میں جام شہادت نوش کیا اور ۴۱ برس کی عمر پائی، ان کے بدن کے سامنے حصہ میں تلوار اور نیزے کے نوے زخم پائے گئے۔

(۱۲۲) جارود: — یہ جارود معلی عبدی ہیں ان کا نام بشر ہے۔ عمر کے بیٹے ہیں اور جارود ایک قول کے اعتبار سے ان کا لقب ہے۔ اور اس بارہ میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ۹ھ میں آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وفد عبدالقیس کے ساتھ مشرف باسلام ہوئے، اس کے بعد وہ بصرہ میں قیام پذیر رہے اور حضرت عمر رضیؓ کی خلافت میں ملک فارس میں ۲۱ھ میں ان کو شہید کر دیا گیا۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

(۱۲۳) جبلہ بن حارثہ: — یہ جبلہ بن حارث کلبی ہیں جو آنحضور ﷺ کے آزاد کردہ زید بن حارثہ کے بھائی ہیں یہ جبلہ زید بن حارثہ سے عمر میں بڑے ہیں، ان سے ابواسحاق سبیعی اور دوسرے محدثین نے احادیث کی روایت کی ہے۔

(۱۲۴) ابوجہیم: — یہ ابوجہیم جیم کے پیش، ہا کے زبر اور یاء کے سکون کے ساتھ حضرت وکیعؒ کے تذکرہ کے مطابق تو یہ عبداللہ بن جہیم ہیں اور بعض نے کہا کہ یہ عبداللہ بن حارث بن صمہ انصاری ہیں صمہ صاد کے زیر اور میم کے تشدید کے ساتھ ہے۔

(۱۲۵) ابو جحیفہ: — ان کا نام وہب بن عبداللہ عامری ہے یہ کوفہ میں فروکش ہوئے یہ کم سن صحابہ میں سے ہیں جب کہ آنحضور ﷺ کی وفات ہوئی یہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ لیکن آنحضور ﷺ سے انہوں نے حدیث کو سنا ہے اور آپ ﷺ سے روایت حدیث بھی کی ہے کوفہ میں ۷۴ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کے بیٹے عون اور تابعین کی ایک جماعت نے ان سے روایت کی ہے، جحیفہ جیم کے پیش اور حاء مہملہ وفاء کے زبر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

(۱۲۶) ابوجمعہ: — یہ ابوجمعہ ہیں ایک قول کے مطابق انصاری اور دوسرے قول کے مطابق کنانی ہیں، ان کے نام کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض نے ان کا نام خبیب سباع کا بیٹا بتلایا اور دوسرے لوگوں نے اس کے علاوہ اور نام بھی ذکر کئے ہیں۔ ان کو حضور ﷺ سے شرف صحبت حاصل ہے ان کا شمار شامیوں میں کیا جاتا ہے۔

(۱۲۷) ابوالجعد: — یہ ابوجعد ضمیری ہیں، یہی ان کا نام ہے۔ اور یہی ان کی کنیت ہے اور بعض نے کہا کہ ان کا نام وہب ہے ان سے روایت حدیث عبیدہ بن سفیان نے کی ہے۔ عبیدہ عین کے زبر اور باء کے زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

(۱۲۸) **ابوجندل:** — یہ ابوجندل سہیل بن عمرو قریشی عامری کے صاحبزادہ ہیں، مکہ معظمہ میں اسلام لائے۔ واقعہ حدیبیہ میں آنحضور ﷺ کی خدمت میں بیڑیاں پہنے ہوئے بیڑیوں میں چل کر حاضر ہوئے۔ یہ بیڑیاں ان کے باپ نے اسلام لانے کی وجہ سے ان کو پہنادیں تھی، ان کا تذکرہ غزوہ حدیبیہ کے سلسلہ میں آتا ہے حضرت عمر بن خطابؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(۱۲۹) **ابوجہم:** — ان کا نام عامر ہے۔ یہ حذیفہ عدوی قریشی کے بیٹے ہیں۔ یہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ یہ وہ صحابی ہیں۔ جن کی انبجانیہ (چادر) کو آنحضور ﷺ نے نماز کے لئے طلب فرمایا تھا۔

(۱۳۰) **ابوجری:** — یہ ابوجری جابر سلیم کے بیٹے ہیں یہ نبو تمیم میں سے ہیں بصرہ میں تشریف لائے اور ان کی حدیث بھی بصریوں میں منقول ہے۔ یہ بہت کم حدیث نقل کرنے والوں میں سے ہیں۔ ان سے زیادہ روایات مروی نہیں ہیں، یہ جری جیم کے پیش راء کے زیر اور یاء کے تشدید کے ساتھ ہے۔

(۱۳۱) **ابوجمیل:** — ان کا ذکر کتاب الزکوٰۃ میں آیا ہے۔ ان کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

تابعین

(۱۳۲) **جعفر صادق:** — یہ جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب ہیں صادق ان کا لقب ہے گویا حضرت علیؓ کے پوتے کے پوتے ہیں، ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ یہ اہلبیت کے بڑے لوگوں میں سے ہیں انہوں نے اپنے والد سے اور دوسروں سے بھی روایات کی ہیں، ان سے ائمہ حدیث اور بڑے بڑے علماء نے حدیث نقل کی ہے، جیسے یحیٰی بن سعید اور ابن جریج اور مالک بن انس اور سفیان ثوری اور ابن عیینہ اور ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں وفات پائی ان کی عمر اڑسٹھ سال کی ہوئی مقام بقیع میں ایک ایسی قبر میں دفن ہوئے جس میں ان کے باپ محمد باقر اور ان کے دادا علی زین العابدین تھے۔

(۱۳۳) **جعفر بن محمد:** — یہ جعفر محمد بن ابوعثمان طیالسی کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ابوالفضل ہے۔ انہوں نے حدیث کو ایک جماعت سے نقل کیا ہے اور ان سے محدثین کے ایک گروہ نے حدیث نقل کی ہے۔ یہ قابل اعتماد و بڑے علماء میں سے ہوئے ہیں ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ ۲۸۲ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۱۳۴) **ابوجعفر قاری:** — یہ ابوجعفر یزید بن القعقاع قاری مدنی ہیں، مشہور تابعی ہیں۔ عبداللہ بن ایاش کے آزاد کردہ ہیں۔ حضرت ابن عمر اور حضرت عبداللہ ابن عباس سے احادیث کو سنا اور ان سے امام مالک بن انسؓ وغیرہ نے روایت حدیث کی ہے القاری ہمزہ کے ساتھ قراۃ سے ماخوذ ہے، مہموز ہے۔

(۱۳۵) **ابوجعفر عمیر بن یزید:** — یہ ابوجعفر عمیر ابن یزید خطمی ہیں ایک جماعت محدثین سے انہوں نے احادیث کو سنا ہے اور حضرت شعبہ اور حماد اور یحیٰی بن سعید نے ان سے حدیث کو نقل کیا ہے۔

(۱۳۶) **ابوالجویریۃ:** — یہ ابوالجویریہ حطان بن حفاف جرمی ہیں، تابعی ہیں۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور معن ابن یزید کے حدیث میں شاگرد ہیں۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی، جویریہ جاریہ کی تصغیر ہے، حطان میں حاء مہملہ مکسور ہے اور طاء مہملہ مشدد ہے آخر میں نون ہے، خفاف میں خاء معجمہ مضموم اور پہلی فاء غیر مشدد ہے اور جرم میں جیم پر زبر اور راء مہملہ ساکن ہے۔

(۱۳۷) **ابوالجوزاء**: — ان کا نام اوس بن عبد اللہ ازدی ہے بصرہ کے رہنے والوں میں سے ہیں تابعی ہیں۔ ان کی احادیث مشہور ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ اور عبد اللہ ابن عباس اور عبد اللہ ابن عمر سے انہوں نے احادیث کو سنا ہے اور انسے عمرو بن مالک اور دوسرے حضرات نے روایت کی ہے۔ ۸۳ھ میں یہ شہید کر دیئے گئے۔

(۱۳۸) **جزء بن معاویہ**: — یہ جزء معاویہ تمیمی کے بیٹے ہیں ان سے بجالۃ نے روایت حدیث کی ہے۔ ان کا تذکرہ مجوس سے دیت لینے کے بارہ میں آتا ہے۔ جزء جیم کے زبر اور زاء کے سکون کے ساتھ ہے آخر میں ہمزہ ہے اور یہی صحیح ہے۔ اہل لغت بھی اسی طرح روایت کرتے ہیں اور اہل حدیث جیم کے کسرہ زا کے سکون اور آخر میں یاء جس کے نیچے دو نقطے ہوتے ہیں اس طرح سے ضبط کرتے ہیں دار قطنی کی بھی یہی رائے ہے اور عبد الغنی نے جیم کے فتح اور زاء کے کسرہ اور آخر میں یائے تحتانی کے ساتھ ضبط کیا ہے۔

(۱۳۹) **جمیع بن عمیر**: — یہ جمیع بن عمیر تیمی ہیں۔ کوفہ کے رہنے والوں میں سے ہیں بخاری نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے حدیث کو سنا ہے اور علاؑ ابن صالح اور صدقہ بن مثنی نے ان سے احادیث کو روایت کیا ہے۔

(۱۴۰) **ابن جریج**: — ان کا نام عبد الملک ہے یہ عبد العزیز بن جریج کے بیٹے ہیں۔ مکہ کے رہنے والے ہیں۔ مشہور فقیہہ ہیں۔ پایہ کے علماء میں سے ہیں۔ انہوں نے حضرت مجاہد و ابن ابی ملیکہ اور عطاء سے حدیث کو سنا ہے اور ان سے ایک جماعت نے روایت حدیث کی ہے۔ ابن عیینہ نے کہا کہ میں نے ابن جریج سے سنا وہ فرماتے تھے کہ علم حدیث کو جس طرح اور جس مشقت سے میں نے جمع کیا ہے کسی دوسرے نے نہیں جمع کیا ۱۵۰ھ میں وفات پائی

(۱۴۱) **جبیر بن نفیر**: — یہ جبیر بن نفیر حضرمی ہیں انہوں نے زمانۂ جاہلیت اور اسلام دونوں کو پایا ہے۔ یہ شامی علماء میں سے پایۂ اعتبار کے عالم میں اور اس کی حدیث شامیوں میں مشہور ہے ۸۰ھ میں شام میں وفات پائی۔ حضرت ابو الدرداء اور حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے بھی ایک جماعت نے روایت حدیث کی ہے۔ نفیر نون کے پیش اور فا کے فتح اور یائے تحتانی کے سکون کے ساتھ ہے آخر میں اس کے راء ہے۔

(۱۴۲) **ابوجہل**: — اس کا نام عمرو بن ہشام ہے۔ جو مغیرہ مخزومی کے بیٹے ہیں، مشہور کافر ہے۔ اس کی کنیت ابو الحکم تھی۔ آنحضور ﷺ نے اس کی کنیت ابوجہل رکھی اب اس کی یہی کنیت غالب اور مشہور ہوگئی۔

صحابی عورتیں

(۱۴۳) **جویریہ ام المؤمنین**: — یہ جویریہ حارث کی بیٹی ہیں۔ ازواج مطہرات میں ہیں ان کو آنحضور ﷺ نے غزوہ مریسیع میں قید کیا تھا اسی غزوہ کو غزوہ بنی المصطلق کہتے ہیں جو ۵ھ میں ہوا یہ ثابت بن قیس کو ملیں تو ان کو مکاتب بنا دیا تھا، آنحضور ﷺ نے بدل کتابت کو ادا فرمایا اور اس کے بعد ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت کے شرف سے ان کو نوازا۔ ان کا نام برہ تھا آنحضور ﷺ نے اس کے بجائے جویریہ نام رکھ دیا۔ ربیع الاول ۸۶ھ میں وفات پائی اور ان کی عمر پینسٹھ سال ہوئی حضرت ابن عباس اور حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت جابرؓ ان سے احادیث روایت کرتے ہیں۔

(۱۴۴) **جدامہ**: — یہ جدامہ اسدیہ وہب کی بیٹی ہیں مکہ میں اسلام لائیں اور آنحضور ﷺ سے بیعت کی اور اپنی قوم کے پاس سے ہجرت کر گئیں۔ حضرت عائشہ نے ان سے روایت حدیث کی ہے جدامہ جیم کے پیش اور دال مہملہ کے ساتھ ہے اور بعض نے ذال

منقوطہ کے ساتھ کہا ہے، حافظ دار قطنی کہتے ہیں کہ یہ تصحیف ہے (یعنی اصل حرف دال ہے جس کو ذال سے بدل دیا گیا۔)

(ح)

صحابہ

(۱۴۵) حمزہ بن عبد المطلب: — یہ حضرت حمزہؓ عبد المطلب کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ابو عمارہ ہے۔ یہ آنحضور ﷺ کے محترم چچا ہیں اور آپ کے رضائی بھائی بھی ہیں۔ آنحضور کو اور حضرت حمزہ کو ثویبہ نے جو ابولہب کی لونڈی تھیں دودھ پلایا تھا، یہ اللہ کے شیر تھے۔ شروع زمانہ میں ہی بعثت کے دوسرے سال مسلمان ہوئے اور کہا گیا ہے کہ جب نبی ﷺ دار ارقم میں گئے چھٹی سال میں آپ کے اسلام لانے سے اسلام کو بڑی عزت اور عظمت حاصل ہوئی وہ غزوہ بدر میں حاضر ہوئے تھے اور غزوہ احد میں شہید کئے گئے! وحشی بن حرب نے آپ کو قتل کیا تھا، حضرت حمزہ آنحضور ﷺ سے عمر میں چار سال بڑے ہیں، حافظ ابن عبد البرؒ نے فرمایا یہ قول میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت حمزہؓ آنحضور ﷺ کے دودھ شریک ہیں مگر یہ ثویبہ نے آنحضور ﷺ اور حضرت حمزہ کو دو وقتوں میں آگے پیچھے دودھ پلایا ہو اور بعض نے کہا ہے کہ حضرت حمزہ آپ سے دو سال بڑے تھے ان سے حدیث کی روایت حضرت علیؓ عباس ریذ بن حارثہؓ نے کی ہے، عمارہ عین کے پیش کے ساتھ ہے اور ثویبہ ثاء مثلثہ کی پیش اور واؤ کے زبر اور یائے تحتانی کے سکون اور بائے موحدہ کے ساتھ ہے۔

(۱۴۶) حمزہ بن عمرو اسلمی: — یہ قبیلہ اسلم کے رہنے والے ہیں اہل حجاز میں ان کا شمار ہوتا ہے، ان سے ایک جماعت نے حدیث کو نقل کیا ہے۔ ان کا ۶۱ھ میں انتقال ہوا۔ ان کی عمر اسی سال کی ہوئی۔

(۱۴۷) حذیفہ بن یمان: — یہ حذیفہ بن یمان ہیں اور یمان کا نام حسیل تصغیر کے ساتھ ہے اور یمان ان کا لقب ہے۔ حضرت حذیفہ کی کنیت ابو عبد اللہ عیسی ہے عین کے فتح اور یاء کے سکون کے ساتھ وہ آنحضور ﷺ کے رازدار ہیں۔ ان سے حضرت علی۔ جعفر بن خطاب حضرت ابو در داء وغیرہ صحابہ اور تابعین نے حدیث کو روایت کیا ہے، شہر مدائن میں ان کی وفات کا واقعہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چالیس روز بعد ۳۵ھ میں پیش آیا۔

(۱۴۸) حسن بن علی: — یہ حضرت حسن علی بن ابی طالب کے صاحبزادہ ہیں ان کی کنیت ابو محمد ہے آنحضور ﷺ کے نواسے ہیں اور آپ ﷺ کے روحانی پھول ہیں، جنت کے تمام جوانوں کے سردار ہیں۔ رمضان المبارک پندرھویں تاریخ کو ۳ھ میں پیدا ہوئے یہ قول ان تمام اقوال میں جو حضرت حسن کی ولادت کے بارے میں لکھے گئے ہیں زیادہ صحیح ہے ان کی وفات ۵۰ھ میں واقع ہوئی، بعض نے ۵۸ھ اور بعض نے ۴۹ھ کہا ہے اور بعض نے ۴۴ھ بھی کہا ہے۔ جنت البقیع میں دفن کئے گئے ان سے انکے بیٹے حسن بن حسن اور حضرت ابوہریرہ اور بڑی جماعت نے روایت کیا ہے اور جب کہ ان کے والد بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کوفہ میں شہید کر دیئے گئے تو لوگوں نے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت علی الموت کی یہ بیعت کرنے والے لوگ چالیس ہزار سے زیادہ تھے اور حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کے سپرد خلافت کا کام پندرہویں جمادی الاولی ۴۱ھ میں کیا گیا۔

(۱۴۹) حسین بن علی: — یہ حسین حضرت علی کے صاحبزادہ ہیں ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے آنحضور ﷺ کے نواسے اور شجر نبوت کے پھول ہیں، جنت کے تمام جوانوں کے سردار ہیں۔ ماہ شعبان کی پانچ تاریخ ۴ھ میں پیدا ہوئے ان کا علوق بطن فاطمہؓ ہیں حضرت

حسنؓ کی ولادت کے پچاس رات بعد ہو گیا تھا۔ جمعہ کے دن دسویں محرم ۶۱ھ کربلا میں جلہ اور کوفہ عراق کے درمیان شہید کر دیئے گئے، سنان بن انس نخعی نے آپ کو شہید کیا تھا اس کو سنان بن ابی سنان بھی کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کو شمر بن ذی الجوش نے شہید کیا تھا اور خولی بن یزید اصبحی نے جو قبیلہ حمیر کا ہے حضرت حسینؓ کا سر کاٹا اور اس کو لے کر عبداللہ بن زیاد کے پاس لایا اور یہ شعر پڑھے ؎

اوقر رکابی فضۃً وذھبا انی قتلت الملک المحجبا
قتلت خیر الناس امًا وابًا وخیر ھم اذینسبون نسبا

میری اونٹنی کو چاندی اور سونے سے بھر دے اس لئے کہ میں نے ایک ایسے بادشاہ کو قتل کیا ہے جو کسی سے ملنے والا نہیں تھا۔ میں نے ایسے شخص کو قتل کیا ہے جو ماں باپ دونوں کی طرف سے تمام لوگوں میں بہتر ہے اور جب جب لوگ نسب بیان کریں تو وہ تمام لوگوں میں بہتر ہے۔

بعض نے بیان کیا ہے کہ حضرت حسین کے ساتھ شمر نے ان کی اولاد اور بھائی اور اہل بیت میں سے تئیس آدمیوں کو قتل کیا ان سے ابوہریرہ ان کے بیٹے علی زین العابدین اور فاطمہ اور سکینہ آپ کی دونوں صاحبزادیاں روایت کرتی ہیں اور حضرت حسینؓ کی عمر قتل کے دن اٹھاون برس کی تھی اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ملاحظہ فرمائے کہ عبداللہ بن زیاد بھی عاشورہ کے دن ۶۷ھ میں قتل کیا گیا اس کو ابراہیم بن مالک اشتر نخعی نے میدان جنگ میں قتل کیا اور اس کے سر کو مختار کے پاس بھیجا اور مختار نے عبداللہ بن زبیر کے پاس روانہ کیا اور عبداللہ بن زبیر نے حضرت حسینؓ کے صاحبزادے علی بن حسین کی خدمت میں پیش کیا۔ خولی خاء معجمہ کے فتح واؤ کے جزم لام کے زیر اور یائے تحتانی کے تشدید کے ساتھ ہے اور سکینہ سین کے پیش کاف کے زبر یائے تحتانی کے سکون اور نون کے ساتھ ہے۔

(۱۵۰) حسان بن ثابت: — ان کی کنیت ابوالولید انصاری خزرجی ہے رسول اللہ ﷺ کے دربار کے شاعر ہیں اور یہ بہادر اور جواں مرد شعراء میں سے ہیں۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ تمام عرب کا اتفاق ہے کہ حسان بن ثابتؓ تمام گاؤں کے بہترین شعراء میں سے ہیں ان سے حضرت عمرؓ بن خطاب اور ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ نے روایت حدیث کی ہے۔ حضرت علیؓ کے خلافت کے زمانہ میں ۴۰ھ سے پہلے وفات پائی اور بعض نے بتلایا ہے کہ ۵۰ھ میں اور ان کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوئی ساٹھ سال جاہلیت کے دور میں زندہ رہے اور ساٹھ ہی سال اسلام کے اندر۔

(۱۵۱) حکم بن سفیان: — یہ حکم بن سفیان ثقفی ہیں اور ان کو سفیان بن حکم بھی کہا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے آنحضور ﷺ سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ان کا سماع ثابت ہے۔

(۱۵۲) حکم بن عمرو غفاری: — یہ قبیلہ غفارہ کے رہنے والے نہیں بلکہ وہ نعلیہ کی اولاد میں سے ہیں جو غفار بن ملیل کے بھائی ہیں ملیل میم کے ضمہ اور لام اول فتح کے ساتھ ہے ان کا شمار علمائے بصرہ میں کیا جاتا ہے۔ ان کی وفات مقام مرو میں واقع ہوئی اور بعض نے کہا ہے کہ بصرہ میں ۵۰ھ میں ہوئی بریدہ اسلمی اور حکم بن عمرو غفاری دنوں مقام مرو میں ایک ہی جگہ دفن کئے گئے ان سے ایک جماعت محدثین نے روایت حدیث کی ہے۔

(۱۵۳) حنظلہ بن ربیع: — یہ حنظلہ بن ربیع بنو تمیم میں سے ہیں ان کو کاتب کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے آنحضور ﷺ کے لئے وحی کی کتابت کی پھر وہ مکہ تشریف لے گئے اور وہاں سے قرضیا پہنچ کر اقامت گزیں ہو گئے اور حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں انتقال کیا ان سے ابو عثمان نہدی اور یزید بن الشخیر روایت کرتے ہیں۔

(۱۵۴) **حاطب بن ابی بلتعہ**: — یہ حاطب بن ابی بلتعہ ہیں ان کے والد ابوبلتعہ کا نام عمرو ہے۔ اور بعض نے راشد لخمی کہا ہے۔ غزوہ بدر اور غزوہ خندق اور ان دونوں کے درمیان جس قدر غزوات واقع ہوئے ان سب میں شریک ہوئے۔ ۳۰ھ میں مدینہ کے اندر وفات پائی۔ ان کی عمر پینسٹھ سال کی ہوئی۔ ان سے ایک جماعت نے روایت حدیث کی ہے۔

(۱۵۵) **حویصہ**: — یہ حویصہ مسعود بن کعب انصاری کے بیٹے ہیں اور محیصہ کے بھائی ہیں۔ حویصہ اپنے بھائی محیصہ سے عمر میں بڑے ہیں لیکن اسلام محیصہ کے بعد لائے ہیں، غزوۂ احد، غزوۂ خندق اور ان کے بعد کے غزوات میں شریک رہے ہیں۔ محمد بن سہل وغیرہ محدثین نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔ حویصہ حا کے پیش واؤ کے زبر یائے تحتانی مشدد مکسور اور صاد مہملہ کے ساتھ ہے۔

(۱۵۶) **حبیش بن خالد**: — یہ حبیش بن خالد خزاعی ہیں فتح مکہ کے دن شہید ہوگئے۔ حضرت خالد بن ولید کے ساتھ تھے ان سے ان کے بیٹے ہشام نے روایت حدیث کی ہے۔ حبیش حا کے پیش۔ با موحدہ کے زبر یائے تحتانی کے سکون اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔

(۱۵۷) **حبیب بن مسلمہ**: — یہ حبیب مسلمہ قریشی فہری کے بیٹے ہیں۔ فہری فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے ان کو حبیب الروم کہا جاتا تھا، اس لئے انہوں نے رومیوں کے ساتھ بہت زیادہ قتل وقتال کیا ہے۔ یہ فاضل مستجاب الدعوات ہوئے ہیں شام میں ۴۲ھ میں وفات پائی ان سے ابن ملیکہ اور دوسرے حضرات محدثین نے روایت کی ہے۔

(۱۵۸) **حکیم بن حزام**: — یہ حکیم بن حزام ہیں ان کی کنیت ابوخالد قریشی اسدی ہے۔ یہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے ہیں واقعہ فیل سے ۱۳ سال قبل کعبہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ جاہلیت اور اسلام دونوں دور میں اس کی عزت کی گئی ہے، ان کا اسلام لانا فتح مکہ تک موخر ہوا، ۵۴ھ میں اپنے مکان کے اندر مدینہ میں وفات پائی ان کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوئی ساٹھ سال جاہلیت میں گزرے اور ساٹھ سال زمانہ اسلام میں زندگی پائی یہ بڑے زیرک سمجھدار فاضل متقی صحابہ میں سے تھے۔ ان کا اسلام بہت اچھا (مخلصانہ) تھا حالانکہ یہ ابتدا میں مولفۃ القلوب میں سے تھے، زمانہ جاہلیت میں سو غلاموں کو آزاد کیا اور سو اونٹ سواری کے لئے بخشے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت حدیث کی ہے۔

(۱۵۹) **حکیم بن معاویہ**: — یہ قبیلہ نمیر کے رہنے والے ہیں امام بخاری نے فرمایا کہ ان کے صحابی ہونے میں کلام ہے ان سے ان کے بھتیجے معاویہ بن حکم اور قتادہ نے روایت حدیث کی ہے۔

(۱۶۰) **حصین بن وحوح**: — یہ حصین بن وحوح انصاری ہیں ان کی حدیث مدینہ والوں میں مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ ان کو بہت تکلیفیں پہنچا کر قتل کیا گیا۔

(۱۶۱) **حبشی بن جنادہ**: — یہ حبشی بن جنادہ ہیں جنہوں نے آنحضور کو حجۃ الوداع میں دیکھا اور ان کو شرف صحبت حاصل ہوا، ان کا شمار کوفہ والوں میں کیا جاتا ہے ان سے ایک جماعت نے حدیث کو نقل کیا ہے۔

(۱۶۲) **حجاج بن عمرو**: — یہ حجاج بن عمرو انصاری مازنی ہیں، ان کا شمار مدینہ والوں میں کیا جاتا ہے، ان کی حدیث حجازیوں کے یہاں مسروج ہے، ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔

(۱۶۳) **حارثہ بن سراقہ**: — یہ حارثہ سراقہ انصاری کے بیٹے ہیں اور ربیع ان کی والدہ ہیں اور وہ حضرت انس بن مالکؓ کی پھوپھی ہیں۔ غزوہ بدر میں حاضر ہوئے اور اسی میں شہید ہوئے اور یہ پہلے شخص ہیں جو انصار میں سے اس دن شہید ہوئے اور صحیح بخاری میں ہے کہ ان کی والدہ کا نام ربیع ہے اور وہ نام جو اسماء صحابہ میں ذکر کیا جاتا ہے وہ ربیع را کی پیش اور بائے موحدہ کے فتحہ اور یائے تحتانی کے

کسرہ اور تشدید کے ساتھ مستعمل ہے۔

(۱۶۴) **حارثہ بن وہب:** — یہ حارثہ بن وہب خزاعی عبید اللہ بن عمر بن خطاب کے ماں شریک بھائی ہیں ان کا شمار کوفیین میں کیا جاتا ہے۔ ان سے ابواسحاق سبیعی (سین کے زبر اور بائے موحدہ کے کسرہ کے ساتھ) نے روایت حدیث کی ہے۔

(۱۶۵) **حارثہ بن نعمان:** — یہ حارثہ بن نعمان غزوہ بدر میں حاضر ہوئے ہیں بلکہ تمام غزوات میں یہ شریک ہوئے ہیں۔ فضلائے صحابہ میں ان کا شمار کیا جاتا ہے باب البر والصلہ میں ان کا تذکرہ آتا ہے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ تشریف فرماتھے اور ان کے پاس جبرئیل علیہ السلام موجود تھے۔ میں سلام کر کے آگے نکل گیا جب میں واپس ہوا اور آنحضور ﷺ بھی وہاں سے لوٹے تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کیا تم نے ان کو دیکھا تھا۔ جو میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ جبرئیل علیہ السلام اور تمہارے سلام کا انہوں نے جواب دیا تھا، ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

(۱۶۶) **حارث ابن حارث:** — یہ حارث حارث اشعری ہیں۔ یہ علماء شام میں شمار کئے جاتے ہیں ان سے احادیث کو ابوسلام حبشی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

(۱۶۷) **حارث بن ہشام:** — یہ حارث بن ہشام مخزومی ہیں ابوجہل بن ہشام کے بھائی ہیں یہ اہل حجاز میں شمار کئے جاتے ہیں، اشراف قریش میں سے مانے جاتے ہیں۔ فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔ ان کے لئے ام ہانی بنت ابی طالب نے امن چاہا تو آنحضور ﷺ نے ان کو امن دے دیا تھا، پھر یہ شام کی طرف چلے گئے اور ۱۵ھ میں جنگ یرموک میں شہید ہوئے اور آنحضور ﷺ نے ان کو سو اونٹ عطا فرمائے جس طرح کہ دوسرے مؤلفۃ القلوب صحابہ کو دیئے گئے، یہ بھی مؤلفۃ القلوب میں سے تھے۔ پھر ان کا اسلام وایمان کامل ہو گیا۔ یہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں جہاد کے لئے ملک شام کو روانہ ہوئے اس وقت مکہ والے ان کے فراق میں رو رہے تھے اس پر انہوں نے فرمایا کہ یہ میرا سفر اللہ کے لئے ہے جہاں تک قیام کا تعلق ہے میں تم پر کسی دوسرے لوگوں کو ترجیح نہیں دیتا۔ پھر برابر شام میں مقابلہ کرتے رہے یہاں تک کہ وفات پائی۔

(۱۶۸) **حارث بن کلدۃ:** — یہ حارث بن کلدہ ثقفی طبیب ہیں حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ ہیں ان کا ذکر کتاب الاطعمہ میں آتا ہے، ان کے تذکرہ کو ابن مندہ اور ابن الاثیر اور ان دونوں کے علاوہ محدثین اسمائے صحابہ میں لاتے ہیں اور حافظ ابن عبدالبر نے حارث بن کلدہ کے بیٹے صحابی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا باپ حارث بن کلدہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں فوت ہو گیا اس کا اسلام لانا ثابت نہیں ہے کلدہ میں کاف پر زبر لام پر جزم اور دال مہملہ ہے۔

(۱۶۹) **ابوحبہ:** — یہ ابوحبہ ثابت بن نعمان انصاری بدری ہیں، ان کی کنیت اور نام میں بہت زیادہ اختلاف ہوا ہے۔ ابن اسحاق نے ان کا تذکرہ ان حضرات میں کیا ہے جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ہیں اور ان کو کنیت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ان کا نام انہوں نے نہیں ذکر کیا۔ حبہ حائے حطی کے زبر اور بائے موحد کی تشدید کے ساتھ ہے اور بعض نے بجائے باء کے نون بیان کیا ہے اور بعض نے یاء تحتانی کے ساتھ بتلایا ہے لیکن اول صورت زیادہ مستعمل ہے جنگ احد میں یہ شہید ہوئے ہیں۔

(۱۷۰) **ابوحمید:** — یہ ابوحمید عبدالرحمٰن سعد انصاری خزرجی ساعدی کے بیٹے ہیں ان کی کنیت زیادہ مشہور ہے ان سے ایک جماعت نے روایت حدیث کی ہے۔ حضرت معاویہؓ کے آخر دور خلافت میں انہوں نے انتقال فرمایا۔

(۱۷۱) **ابوحذیفہ:** - یہ ابوحذیفہ عتبہ بن ربیعہ کے بیٹے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا نام مہشم ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ہشیم ہے اور بعض نے ہاشم بتلایا ہے ان کا شمار فضلائے صحابہ میں ہے یہ غزوۂ احد اور غزوۂ بدر اور تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے اس وقت ان کی عمر ترپن برس کی تھی۔

(۱۷۲) **ابوحنظلیہ:** - ان کا نام سہل ہے یہ عبداللہ حنظلیہ کے بیٹے ہیں یہ حنظلیہ ان کی پردادی ہیں اور یہ پردادی کے نام سے منسوب ہو کر مشہور ہوئے۔

تابعین

(۱۷۳) **حارث بن سوید:** - یہ حارث ہیں سوید تیمی کے بیٹے کبار تابعین اور محدثین کے نزدیک قابل اعتماد ہیں انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے روایت حدیث کی اور ان سے ابراہیم تیمی نے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے آخر دور میں انہوں نے وفات پائی۔

(۱۷۴) **حارث بن مسلم:** - یہ حارث بن مسلم بنو تمیم میں سے ہیں ان کی حدیث شامیوں میں مشہور ہے ان سے عبدالرحمٰن بن حسان نے روایت حدیث کی ہے۔

(۱۷۵) **حارث بن اعور:** - یہ حارث عبداللہ اعور حارثی ہمدانی کے بیٹے ہیں حضرت علی بن ابی طالب کے مشہور اصحاب میں سے ہیں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ان سے چار حدیثیں بھی سنی ہیں اور حضرت ابن مسعود سے بھی انہوں نے روایت حدیث کی ہے اور ان سے عمرو بن مرہ اور امام شعبی نے روایت کی ہے۔ امام نسائی وغیرہ نے ان کے بارہ میں کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہیں اور ابن ابی داؤد نے کہا ہے کہ لوگوں میں سے بڑے فقیہہ اور علم فرائض کے بڑے ماہر اور سب سے بڑے مقبولیت عامہ رکھنے والے تھے۔ کوفہ میں ۶۵ھ میں انتقال فرمایا۔

(۱۷۶) **حارث بن شہاب:** - یہ حارث شہاب حرمی کے بیٹے ہیں ابواسحٰق اور عاصم بن بہدلہ سے انہوں نے روایت حدیث کی ہے اور ان سے طالوت اور عیشی نے اور بہت لوگوں نے ان کو ضعیف کہا ہے۔

(۱۷۷) **حارث بن وجیہ:** - یہ حارث وجیہ راسی کے بیٹے ہیں انہوں نے حدیث مالک بن دینار سے روایت کی ہے اور ان سے مقدمی اور نصر بن علی نے اور کچھ لوگوں نے ان کو ضعیف کہا ہے۔

(۱۷۸) **حارثہ بن مضرب:** - یہ حارثہ مضرب عبدی کوفی کے بیٹے ہیں مشہور تابعی ہیں حضرت علی اور حضرت ابن مسعود وغیرہما سے سماعت حدیث کی ہے ان کی حدیث اہل کوفہ کے یہاں ہے۔

(۱۷۹) **حارثہ بن ابی الرجال:** - یہ حارثہ بن ابی رجال ہیں جنہوں نے اپنے والد ابوالرجال سے اور اپنی دادی عمرہ سے روایت حدیث کی ہے اور ان سے ابن نمیر اور یعلیٰ نے روایت کی۔ کچھ لوگوں نے ان کو ضعیف کہا ہے۔

(۱۸۰) **حفص بن عاصم:** - یہ حفص بن عاصم بن عمر بن خطاب قرشی عدوی ہیں محدثین کے یہاں ثقہ ہیں اجماعاً۔ اجلہ تابعین میں سے ہیں بہت زیادہ احادیث کو نقل کرنے والے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر سے احادیث کو سنا ہے۔

(۱۸۱) **حفص بن سلیمان:** - یہ حفص سلیمان کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ابوعمرو اسدی ہے۔ بنو اسد کے آزاد کردہ ہیں علقمہ بن مرثد

اور قیس بن مسلم سے انہوں نے احادیث نقل کی ہیں اور ان سے ایک جماعت نے، یہ قراۃ میں قابل اعتماد ہیں حدیث میں نہیں امام بخاری نے فرمایا کہ محدثین کے یہاں یہ متروک الحدیث ہیں، ۱۰۸ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کی عمر نوے برس کی ہوئی۔

(۱۸۲) **حنش بن عبداللہ:** — یہ حنش عبداللہ سبائی کے بیٹے ہیں بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ کوفہ میں حضرت علی کے ساتھ تھے اور حضرت علی کی شہادت کے بعد مصر میں چلے آئے ۱۰۰ھ میں وفات پائی۔

(۱۸۳) **حکیم بن معاویہ:** — یہ حکیم معاویہ قشیری کے بیٹے اور اعرابی ہیں نقل حدیث میں اچھے سمجھے جاتے ہیں انہوں نے اپنے باپ سے حدیث کو روایت کیا ہے اور ان سے ان کے بیٹے بہز جریری نے حدیث کو سنا ہے۔

(۱۸۴) **حکیم بن اثرم:** — یہ حکیم بن اثرم ہیں ابو تمیم سے اور حسن سے روایت کی ہے اور ان سے عوف اور حماد ابن سلمۃ نے یہ حدیث میں بہت سچے مانے جاتے ہیں۔

(۱۸۵) **حکیم بن ظہیر:** — یہ حکیم فزاری کے بیٹے ہیں انہوں نے حضرت علقمہ بن مرثد اور زید بن رفیع سے روایت کی ہے اور ان سے محمد بن صباح دولانی نے۔ بخاری نے فرمایا کہ محدثین کے یہاں متروک ہیں۔

(۱۸۶) **حرام بن سعید:** — یہ سعید بن محیصہ کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ابو نعیم انصاری حارثی ہے۔ تابعی ہیں انہوں نے اپنے باپ اور براء بن عازب سے روایت حدیث کی ہے اور ان سے ابن شہاب زہری نے۔ ان کی وفات ۱۱۳ھ میں ہوئی۔ ان کی عمر ۷۰ سال کی ہوئی۔ حرام ضد حلال کی ہے۔

(۱۸۷) **حماد بن سلمۃ:** — یہ حماد سلمہ بن دینار کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ابو سلمۃ الربعی ہے یہ ربیعہ بن مالک کے آزاد کردہ ہیں اور حمید طویل کے بھانجے ہیں۔ بصرہ کے مشہور علماء میں سے ہیں اور وہاں کے آئمہ میں ان کا شمار ہوتا ہے ان سے بہت زیادہ احادیث مروی ہیں، انہوں نے بہت لوگوں سے روایت کی ہیں اور یہ سُنّت اور عبادت میں مشہور ہیں۔ ۱۶۷ھ میں وفات پائی۔ حضرت ثابت اور حمید طویل اور قتادہ سے انہوں نے حدیث سنی اور ان سے یحیٰی بن سعید اور ابن مبارک اور وکیع نے روایت کی ہے۔

(۱۸۸) **حماد بن زید:** — یہ حماد بن زید ازدی ہیں۔ یہ محدثین کے نزدیک قابل اعتماد علماء میں سے ہیں۔ ثابت بنانی اور دوسرے حضرات سے انہوں نے روایت حدیث کی ہے اور ان سے عبداللہ بن مبارک اور یحیٰی بن سعید نے روایت کی ہے یہ سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹ھ میں وفات پائی اور یہ نابینا تھے۔

(۱۸۹) **حماد بن ابی سلیمان:** — یہ حماد ابو سلیمان کے بیٹے ہیں ابو سلیمان ان کا نام مسلم اشعری ہے ابراہیم بن ابی موسیٰ اشعری کے آزاد کردہ ہیں۔ یہ کوفی ہیں ان کا شمار تابعین میں کیا جاتا ہے ایک جماعت سے انہوں نے حدیث کو سنا ہے اور ان سے شعبہ اور سفیان ثوری وغیرہما نے روایت کی ہے اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم ہوئے ہیں ابراہیم نخعی سے ان کی ملاقات ہوئی ہے کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی۔

(۱۹۰) **حماد بن ابی حمید:** — یہ حماد بن ابو حمید مدنی ہیں۔ زید بن اسلم وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے قعنبی نے روایت کی ہے اور کچھ لوگوں نے ان کی روایت کو ضعیف کہا ہے۔

(۱۹۱) **حمید بن عبدالرحمٰن:** — یہ حمید عبدالرحمٰن کے بیٹے عوف زہری قریشی مدنی کے پوتے ہیں یہ کبار تابعین سے ہیں ۱۰۵ھ میں

وفات پائی ان کی عمر تہتر سال کی ہوئی۔

(۱۹۲) **حمید بن عبدالرحمن:** — یہ حمید بن عبدالرحمن حمیری بصری ہیں۔ بصرہ کے آئمہ اور ثقات علماء میں سے ہیں۔ جلیل القدر قدمائے تابعین میں سے ہیں حضرت ابوہریرہ اور ابن عباسؓ سے روایت حدیث کرتے ہیں۔

(۱۹۳) **حسن بصری:** — یہ حسن بصری ابوالحسن کے بیٹے ہیں، ان کی کنیت ابوسعید ہے زید بن ثابت کے آزاد کردہ ہیں باپ کا نام یسار ہے یہ یسان کے قیدیوں کی نسل سے ہیں یسار کو ربیع بنت نصر نے آزاد کیا تھا، یہ حسن جب کہ خلافت عمر بن خطاب کے دو سال باقی تھے مدینہ میں پیدا ہوئے، حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھ سے ان کی تحنیک کی (کھجور منہ میں چبا کر بچہ کے تالو سے لگانا) ان کی والدہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی خدمت کرتی تھیں بسا اوقات ان کی والدہ کہیں چلی جاتی تھیں تو ان حسن بصری کو بہلانے کے لئے ام المؤمنین ام سلمہ اپنی چھاتی ان کو دے دیتی تھیں، یہاں تک کہ ان کی والدہ لوٹ آتیں تو پستان میں دودھ بھر آتا تھا اور یہ حسن بصری اس کو پی لیا کرتے تھے لوگ کہتے ہیں کہ جس علم و حکمت پر حضرت حسن بصری پہنچے یہ اسی کا طفیل ہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعدہ بصرہ چلے آئے انہوں نے حضرت عثمانؓ کو دیکھا اور کہا گیا ہے کہ یہ حضرت علی سے بھی مدینہ میں ملے ہیں لیکن بصرہ میں حضرت علیؓ سے ملاقات کرنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضرت حسن بصری جس وقت بصرہ کو جارہے تھے تو وادی قری ہی میں تھے اور حضرت علیؓ اس وقت بصرہ میں تشریف لا چکے تھے۔ انہوں نے ابوموسیٰ اشعری انس بن مالک، ابن عباس اور ان کے علاوہ بھی دوسرے حضرات صحابہ سے روایت کی ہے اور ان سے یعنی ایک بڑی جماعت تابعین اور تبع تابعین نے روایات کی ہیں وہ اپنے زمانے میں علم و فن زہد و تقویٰ عبادت و ورع کے امام تھے، رجب ۱۱۰ھ ایک سو دس میں وفات پائی۔

(۱۹۴) **حسن بن علی بن راشد:** — یہ حسن علی بن راشد واسطی کے بیٹے ہیں انہوں نے ابوالاحوص اور ہشیم سے روایت کی ہے اور ان سے امام ابوداؤد امام نسائی رحمہما اللہ نے روایات کی ہیں، یہ ائمہ حدیث کے یہاں بڑے صادق ہیں ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔

(۱۹۵) **حسن بن علی ہاشمی:** — یہ حسن علی ہاشمی کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے اعرج سے روایت کی ہے اور ان حسن سے مسلم قتیبہ نے امام بخاریؒ نے فرمایا یہ منکر الحدیث ہیں۔

(۱۹۶) **حسن بن جعفر:** — یہ حسن ابوجعفر جعفری کے بیٹے ہیں۔ حضرت نافع اور ابن زبیر سے حدیث نقل کرتے ہیں اور ان سے ابن مہدی وغیرہ نے حدیث کو روایت کیا ہے۔ لوگوں نے ان کی حدیث کو ضعیف کہا ہے اور یہ بڑے صالح علماء میں سے تھے ۱۶۷ھ میں وفات پائی۔

(۱۹۷) **حنظلہ بن قیس زرقی:** — یہ حنظلہ قیس زرقی انصاری کے بیٹے ہیں۔ ثقات اہل مدینہ اور وہاں کے تابعین میں سے ہیں انہوں نے نافع بن خدیج وغیرہ سے حدیث کو سنا ہے اور ان سے یحیٰی بن سعید وغیرہ نے روایات کی ہیں۔

(۱۹۸) **حبیب بن سالم:** — یہ حبیب سالم مولیٰ نعمان بن بشیر کے بیٹے ہیں۔ ان کو نعمان نے مکاتب بنادیا تھا محمد بن منتشر وغیرہ ان سے روایت حدیث کرتے ہیں۔

(۱۹۹) **حرب بن عبیداللہ:** — یہ حرب عبیداللہ ثقفی کے بیٹے ہیں ان کے نام اور ان کی حدیث میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ ان کی حدیث کو عطاء بن سائب نے نقل کیا ہے اور سند میں ان حرب سے اختلاف پڑ گیا ہے، پس ایک حدیث کو سفیان بن عیینہ عطاء سے اور عطاء حرب سے اور حرب اپنے ماموں سے اور ان کے ماموں آنحضور ﷺ سے اور دوسری سند اس طرح ہے کہ ابوالاحوص عطاء سے

اور عطاء حرب سے اور حرب اپنے نانا سے اور ان کے نانا اپنے باپ سے تیسری سند میں حرب نقل کرتے ہیں عطاء سے اور عطاء نقل کرتے ہیں حرب بن ہلال ثقفی سے اور وہ اپنے نانا سے اور امام ابوداؤد کی روایت میں سند اس طرح ہے کہ ابوداؤد حرب ابن عبید اللہ سے اور حرب اپنے نانا سے اور نانا اپنے والد سے اور یہی روایت زیادہ مشہور ہے اور ان کی روایت یہود اور نصاری سے عشر لینے کے بارے میں مروی ہے۔

(۲۰۰) حجاج بن حسان: — یہ حجاج بن حسان حنفی ہیں بصریوں میں شمار ہوتے ہیں تابعی ہیں انس بن مالک وغیرہ صحابہ سے احادیث کو سنا ہے اور ان سے یحیٰی بن سعید اور یزید بن ہارون روایت کرتے ہیں۔

(۲۰۱) حجاج بن حجاج: — یہ حجاج حجاج احول اسلمی کے بیٹے ہیں اور کہا گیا کہ باہلی بصری ہیں انہوں نے فرزدق اور قتادہ اور ایک جماعت محدثین سے روایت کی ہے اور ان سے ابراہیم بن طہمان اور یزید بن زریع نے۔ محدثین نے ان کی توثیق کی ہے ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔

(۲۰۲) حجاج بن یوسف: — یہ حجاج بن یوسف ثقفی ہے، عبدالملک بن مروان کی طرف سے عراق اور خراسان کا گورنر تھا اور اس کے بعد اس کا بیٹا ولید گورنر ہوا، مقام واسط میں شوال ۹۵ھ میں وفات پائی۔ اس کی عمر چون سال کی ہوئی ان کا ذکر مناقب قریش کے باب اور قبائل کے ذکر میں آتا ہے اور اس کی موت کا قصہ عنقریب حرف سین کے ماتحت سعید بن جبیر کے تذکرہ میں آئے گا۔

(۲۰۳) ابوحیہ: — ان کا نام عمرو بن نصر خارقی ہمدانی ہے حدیث کی روایت حضرت علی ابن ابی طالب سے کرتے ہیں۔

(۲۰۴) ابوحرہ: — یہ ابوحرہ حاء کے ضمہ اور راء کے تشدید کے ساتھ ہے ان کا نام حنیفہ رقاشی ہے۔ انہوں نے اپنے چچا سے ایک حدیث باب الغصب میں الالا تظلموا الالا یحل مال امرء الابطیب نفس منه موجود ہے۔

(۲۰۵) ابن حزم: — کنیت ابوبکر ہے۔ یہ محمد بن عمرو بن حزم کے بیٹے ہیں۔ ابوحیہ اور ابن عباس سے حدیث کی روایت کرتے ہیں اور ان سے ابن شہاب زہری روایت کرتے ہیں۔

صحابی عورتیں

(۲۰۶) حفصہ بنت عمر: — یہ ام المؤمنین حضرت حفصہ عمر بن خطابؓ کی صاحبزادی ہیں اور ان کی والدہ زینب ہیں جو مظعون کی بیٹی ہیں آنحضور ﷺ سے پہلے یہ حفصہ خنیس بن خذافہ سہمی کی بیوی تھیں اور خنیس کے ہمراہ ہجرت کر گئیں تھیں لیکن خنیس کا انتقال غزوہ بدر کے بعد ہو گیا، جب ان کے زوج خنیس وفات پا گئے۔ تو حضرت عمرؓ نے ان کے رشتہ کا تذکرہ حضرت ابوبکر اور حضرت عثمانؓ سے کیا لیکن ان دونوں میں سے کسی نے قبول کرنے کی جرأت نہ کی، پھر آنحضور ﷺ نے یہ رشتہ منظور فرما لیا اور نکاح میں لے آئے، یہ واقعہ ۳ھ کا ہے۔ آنحضور ﷺ نے ان کو ایک طلاق دے دی تھی لیکن جب آپ ﷺ پر یہ وحی نازل ہوئی کہ حفصہ سے رجوع کر لو کیونکہ وہ روزہ بہت رکھتی ہیں، رات کو عبادت کرنے والی ہیں اور وہ جنت میں بھی آپ (ﷺ) کی زوجہ رہیں گی تو آپ ﷺ نے حضرت حفصہ سے رجوع کر لیا۔ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے ان سے روایت حدیث کی ہے، ان کی وفات شعبان ۴۵ھ میں ہوئی، جب کہ ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔

(۲۰۷) حلیمہ: — یہ حلیمہ ابوذویب کی بیٹی ہیں، انہوں نے آنحضور ﷺ کو ثوبیہ کے بعد جو ابولہب کی لونڈی ہیں دودھ پلایا ہے،

حلیمہ کا وہ بچہ جس کے دودھ سے آنحضور ﷺ کی پرورش کی گئی ہے وہ عبداللہ بن حارث ہے اور عبداللہ کی بہن جو آنحضور ﷺ کو گود میں کھلایا کرتی تھیں ان کا نام شیماءؓ ہے، حلیمہ نے آنحضور کو آپ کی والدہ ماجدہ کے پاس دو سال دو ماہ کے بعد لوٹا دیا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ پانچ سال کے بعد۔ ان سے عبداللہ بن جعفر روایت کرتے ہیں اور حلیمہ کا ذکر باب البر والصلۃ میں آتا ہے۔

(۲۰۸) اُمّ حبیبہ: — یہ اُمّ حبیبہ امہات مؤمنین میں سے ہیں ان کا نام رملہ ہے ابوسفیان بن صخر بن حرب کی بیٹی ہیں اور ان کی والدہ صفیہ ہیں جو حضرت ابوالعاص کی بیٹی ہیں اور حضرت عثمان بن عفان کی پھوپھی۔ ان کے نکاح کے وقت میں آنحضور ﷺ سے اور مقام نکاح میں اختلاف واقع ہوا ہے بعض نے کہا ہے کہ ان کا عقد مقام حبشہ میں ۶ ھ میں ہوا اور نجاشی نے نکاح کرایا اور چار سو دینار مہر بھی نجاشی ملک حبشہ نے دیئے اور بعض نے کہا کہ اس نے چار لاکھ درہم مہر میں اپنے پاس سے ادا کئے آنحضرت ﷺ نے شرحبیل بن حسنہ کو لینے کے لئے بھیجا اور یہ ان کو لے کر مدینہ آئے اور آپ ﷺ نے قربت مدینہ ہی میں فرمائی۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کا نکاح ام حبیبہ سے حضرت عثمان بن عفانؓ نے کرایا ان کی وفات مدینہ میں ۴۴ ھ میں ہوئی ان سے ایک بڑی جماعت نے روایت حدیث کی ہے۔

(۲۰۹) ام حصین: — یہ ام حصین اسحاق کی بیٹی ہیں اور قبیلہ احمس کی ہیں ان سے ان کے بیٹے یحییٰ بن حصین وغیرہ نے روایت حدیث کی ہے یہ حجۃ الوادع میں حاضر ہوئی تھیں۔

(۲۱۰) ام حرام: — یہ ام حرام ملحان بن خالد کی بیٹی ہیں قبیلہ بنی نجار کی رہنے والی ہیں یہ ام سلیم کی بہن ہیں۔ یہ مشرف اسلام ہوئیں۔ اور آنحضور ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی اور آنحضور ﷺ دوپہر میں ان کے یہاں قیولہ فرمایا کرتے تھے اور یہ حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی بیوی ہیں۔ سرزمین روم میں اپنے شوہر کے ہمراہ جہاد کرتے ہوئے شہادت کا جام نوش کیا ان کی قبر مقام قرلس (باقرس) میں ہے، ان سے روایت حدیث ان کے بھانجے انس بن مالکؓ اور ان کے شوہر عبادہ بن صامتؓ نے کی ہے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ میں ان کے صحیح نام پر سوائے کنیت کے مطلع نہ ہوسکا ان کی وفات حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ہوئی ملحان میم کی کسرہ لام کے سکون اور حاء مہملہ ونون کے ساتھ ہے۔

(۲۱۱) حمنہ: — یہ حمنہ جحش کی بیٹی ہیں اور حضرت زینب جو ازواج مطہرات میں سے ہیں ان کی بہن ہیں۔ قبیلہ اسد کی رہنے والی ہیں مصعب بن عمیرؓ کی زوجیت میں تھیں پھر یہ مصعب بن عمیرؓ جنگ احد میں شہید ہوگئے اس کے بعد طلحہ بن عبید اللہ نے ان سے نکاح کرلیا تھا۔

تابعی عورتیں

(۲۱۲) حسناء: —

یہ حسناء صرمیہ معاویہ کی بیٹی ہیں، یہ اپنے چچا سے اور ان کے چچا آنحضور ﷺ سے حدیث نقل کرتے ہیں ان سے عوف اعرابی نے روایت حدیث کی ہے۔ ان کی حدیث بصریوں میں مروج ہے ابن ماکولا نے حسناء کے بارہ میں ایسے ہی لکھا ہے۔ حازمی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے خنساء بنت معاویہ لکھا ہے اور بعض حسناء صرمیہ کہتے ہیں۔ اور ان کے دو چچا حارث اور اسلم کو بتلاتے ہیں، صرمیہ صاد مہملہ کے زبر اور راء کے زیر کے ساتھ ہے۔ حسناء فعلا، کے وزن پر حسن سے ماخوذ ہے اور خنساء میں خائے معجمہ ہے اور نون سین مہملہ سے پہلے ہے۔

(۲۱۳) حفصہ بنت عبدالرحمٰن: — یہ حفصہ عبدالرحمٰن کی صاحبزادی ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق کے صاحب زادے ہیں منذر بن

زبیر بن عوام کے نکاح میں تھیں۔

(۲۱۴) ام حریر: — یہ ام حریر حاء مہملہ کے زبر اور پہلی راء کے زیر کے ساتھ۔ طلحہ بن مالک کی آزاد کردہ ہیں یہ اپنے آقا سے روایت حدیث کرتی ہیں ان کی حدیث محمد بن ابی رزین اپنی والدہ سے اور ان کی والدہ ان ام حریر سے نقل کرتی ہیں۔ ان کی حدیث اشراط الساعۃ میں آتی ہے۔

(خ)

صحابہ

(۲۱۵) **خالد بن ولید:** — یہ خالد ولید قرشی کے بیٹے ہیں جو مخزومی ہیں ان کی والدہ لبابہ صغری ہیں جو ام المؤمنین حضرت میمونہ کی بہن ہیں زمانہ اسلام سے پہلے خالد کا شمار اشراف قریش میں کیا جاتا تھا، آنحضور ﷺ نے سیف اللہ خطاب عطا فرمایا ۲۱ھ میں وفات پائی اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کچھ وصیت کی ان سے ان کے خالہ زاد بھائی عبداللہ بن عباس اور علقمہ اور جبیر بن نفیر روایت حدیث کرتے ہیں۔

(۲۱۶) **خالد بن ہوزہ:** — یہ ہوزہ عامری کے بیٹے ہیں یہ خود اور ان کے بھائی حرملہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ خزاعہ کے پاس لوٹے اور اپنے اسلام کی بشارت ان کو دی یہ مولفۃ القلوب میں سے تھے یہ خالد بن ہوزہ وہی ہیں جن سے آنحضور ﷺ نے غلام اور باندی خرید فرمائی تھی اور ان کے لئے عہد نامہ لکھدیا تھا۔

(۲۱۷) **خلاد بن سائب:** — یہ خلاد سائب بن الخلاد کے بیٹے ہیں، خزرجی ہیں۔ یہ اپنے والد اور زید بن خالد سے روایت کرتے ہیں اور ان سے حبان بن واسع۔

(۲۱۸) **خباب بن ارت** رضی اللہ عنہ: — ان کی کنیت ابو عبید اللہ تمیمی ہے ان کو زمانہ جاہلیت میں قید کر لیا گیا تھا، اس کے بعد ایک خزاعیہ عورت نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا، آنحضور ﷺ کے دار ارقم میں داخل ہونے سے پہلے یہ اسلام لائے تھے۔ اور یہ خباب ان حضرات صحابہ میں سے ہیں جن کو اسلام لانے کی وجہ سے اللہ کے لئے بہت تکالیف پہنچائی گئی ہیں لیکن انہوں نے ان پر صبر فرمایا۔ کوفہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور وہیں ۳۷ھ میں وفات پائی ان کی عمر تہتر سال کی ہوئی، ان سے ایک بڑی جماعت روایت حدیث کرتی ہے۔

(۲۱۹) **خارجہ بن حذافہ** رضی اللہ عنہ: — یہ حذافہ قریشی عدوی کے بیٹے ہیں، یہ قریش کے ماہر سواروں میں سے ایک سوار ہیں ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ یہ ایک ہزار سواروں کے برابر ہیں ان کا شمار مصریوں میں کیا جاتا ہے۔ یہی وہ شخص ہیں جن کو مصر والوں میں شمار کر کے قتل کیا گیا اور ان کو ایک خارجی شخص نے عمرو بن عاص سمجھ کر قتل کر دیا تھا اور یہ خارجی ان تین شخص میں کا ایک شخص ہے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے قتل پر اتفاق کیا تھا اور ان میں سے ہر ایک ان تین اصحاب میں سے ہر ایک کے قتل کی کوشش میں تھا۔ پس اللہ کا فیصلہ حضرت علی کے بارہ میں پورا ہوا اور دونوں اصحاب بچ گئے اور خارجہ کا قتل ۴۰ھ میں واقع ہوا۔

(۲۲۰) **خزیمہ بن ثابت** رضی اللہ عنہ: — یہ خذیمہ بن ثابت ہیں، ان کی کنیت ابو عمارۃ ہے یہ انصاری اوسی ہیں ذوالشہادتین کے لقب سے معروف ہیں، جنگ بدر اور مابعد کے غزوات میں حاضر ہوئے جنگ صفین میں حضرت علی کے ہمراہ تھے۔ جب کہ عمار بن یاسر شہید ہو گئے تو انہوں نے اپنی تلوار سونت لی اور مقابلہ کیا یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے۔ آپ سے ان کے بیٹے عبداللہ اور عمارہ اور جابر بن عبداللہ

نے روایات کی ہیں، خزیمہ خائے معجمہ کے ضمہ اور زاء معجمہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور عمارہ عین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

(۲۲۱) خزیمہ بن جزء: — یہ خزیمہ جزء کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ابو عبداللہ سلمی ہے ان سے ان کے بھائی حبان بن جزء روایت کرتے ہیں ان کا شمار عرب کے یکتا لوگوں میں کیا جاتا ہے، جزء جیم کے زبر زائے معجمہ کے سکون اور اس کے بعد ہمزہ کے ساتھ ہے، اصحاب حدیث جزی جیم کے زیر اور زائے معجمہ کے کسرہ اور آخر میں یائے تحتانی کے ساتھ پڑھتے ہیں یہ عبدالغنی نے بیان کیا ہے اور حافظ دار قطنی نے جیم کے کسرہ اور یائے معجمہ کے سکون کے ساتھ ضبط کیا ہے اور حبان حاء مہملہ کے کسرہ اور بائے موحدہ کے تشدید کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

(۲۲۲) خزیم بن اخرم: — یہ خزیم اخرم کے بیٹے شداد بن عمرو بن فاتک اسدی کے پوتے ہیں لیکن یہ اپنے دادا کی طرف نسبت کر دیئے جاتے ہیں اور ان کو خزیم بن فاتک کہہ دیا جاتا ہے، ان کا شمار شامیوں میں ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک کوفیوں میں ان سے ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے۔

(۲۲۳) خبیب بن عدی: — یہ عدی انصاری اوسی کے بیٹے ہیں۔ یہ غزوہ بدر میں حاضر ہوئے اور غزوۂ رجیع میں ۳ھ میں قید کر لئے گئے، پھر ان کو مکہ لے جایا گیا اور حارث ابن عامر کی اولاد نے ان کو خرید لیا اور انہیں خبیب نے بدر کے دن حارث کو کفر کی حالت میں قتل کر دیا تھا۔ اب حارث کے بیٹوں نے ان کو اس لئے خریدا تھا تاکہ وہ اپنے باپ کے بدلہ میں قتل کر دیں۔ یہ قیدی بن کر ان کے پاس رہے پھر ان لوگوں نے مقام تنعیم میں ان کو سولی پر چڑھا دیا، اور یہ اسلام میں پہلے شخص ہیں جن کو اللہ کے راہ میں سولی دی گئی ہے ان سے حدیث کی روایت حارث بن برصاء نے کی ہے۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ حضرت خبیبؓ نے حارث کی کسی بیٹی سے استرہ مانگ لیا۔ تاکہ وہ موئے زہار صاف کریں پھر حضرت خبیب نے اس کے چھوٹے بیٹے کو اٹھا کر اپنی ران پر بٹھالیا جب کہ استرہ ان کے ہاتھ میں تھا، بچے کی ماں اس کاروائی سے بالکل بے خبر تھی جب ماں نے یہ دیکھا تو بہت گھبرائی اس گھبراہٹ کو خبیب نے اس کے چہرے سے محسوس کر لیا اور کہا تو اس سے ڈر رہی ہے کہ میں اس معصوم بچے کو قتل کر دوں گا ہرگز ہرگز میں ایسا نہیں کر سکتا۔ بچے کی ماں کہنے لگی میں نے اپنی زندگی میں خبیب سے بہتر قیدی کوئی نہیں دیکھا بخدا میں نے خبیب کو زمانہ اسارت میں ایک دن دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں تازہ انگور کا خوشہ تھا جس میں سے کھا رہے تھے جب کہ وہ لوہے کی زنجیروں میں جکڑے تھے اور مکہ میں کوئی پھل بھی نہ تھا اور یہ کہتے تھے کہ یہ اللہ کا عطا کیا ہوا رزق ہے جو مجھے دیا گیا ہے پھر جب خبیب کو حرم سے حل کی طرف قتل کرنے کے لئے لے چلے تو حضرت خبیب نے فرمایا کہ مجھے اتنی مہلت دے دو کہ میں دو رکعت نماز ادا کرلوں۔ پس لوگوں نے ان کو موقع دیا اور خبیب نے دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا کہ قسم خدا کی اگر کفار یہ نہ خیال کرتے کہ یہ گھبراہٹ کی وجہ سے جان بچانے کی وجہ سے نماز پڑھ رہا ہے تو میں اور بھی نماز پڑھتا، پھر حضرت خبیب نے یہ دعا مانگی۔ اے اللہ! ان کو ایک ایک شمار کر کے قتل کر دے اور ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ بچے ؎

فلست ابالی حین اقتل مسلما　　علی ای شق کان فی اللہ مضجعی
وذلک فی ذات الالہ وان یشاء　　یبارک علی اوصال شلو ممزع

جب بحالت اسلام سولی دیا جا رہا ہوں تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ مجھے اللہ کے راستے میں قتل کرنے کے لئے کس کروٹ پر پچھاڑا جائے گا اور یہ سب مصائب اللہ کے راستہ میں ہیں اگر وہ چاہیں تو میرے اعضاء کے جوڑ جوڑ کو برکت سے بھر دیں۔

خبیب ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے اللہ کے راستے میں جکڑے ہوں جان دیتے وقت دو رکعت نماز پڑھنے کا طریقہ قائم کر دیا۔

(۲۲۴) خنیس بن حذافہ: — یہ خنیس بن حذافہ سہمی قریشی ہیں جو حضور ﷺ سے پہلے حضرت حفصہ بنت عمر کے شوہر تھے، یہ غزوۂ

بدر میں پھر احد میں حاضر ہوئے جس میں ان کو ایک زخم لگا اور اسی کی وجہ سے مدینہ پہنچ کر جان دے دی ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ خنیس تصغیر کے ساتھ ہے۔

(۲۲۵) ابوخراش: — یہ ابوخراش اسلمی ہیں صحابی ہیں خراش خائے معجمہ کے زیر اور رائے مہملہ غیر مشدد اور شین معجمہ کے ساتھ ہے اور حدرد حائے مہملہ کے زیر اور پہلی دال مہملہ کے سکون اور رائے مہملہ کے ساتھ ہے۔

(۲۲۶) ابوخلاد: — یہ ابوخلاد ایک شخص صحابی ہیں حافظ ابن عبدالبرؒ نے کہا کہ میں ان کے نام اور نسب سے واقف نہیں ہوں۔ ان کی حدیث یحییٰ بن سعید کے نزدیک معتبر ہے جو ابوفروہ سے اور ابوفروہ ابوخلاد سے نقل کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جب تم دیکھو کسی مؤمن کو کہ اس کو دنیا کے بارہ میں زہد عطا کردیا گیا ہے اور کم گوئی عطا کی گئی ہے تو اس کی صحبت اختیار کرو اس لئے کہ وہ حکمت سکھلائے گا۔ اور دوسری روایت بھی اسی طرح ہے لیکن ابوفروہ اور ابوخلاد کے درمیان اس دوسری حدیث میں ابومریم کا واسطہ ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

تابعین

(۲۲۷) خیثمہ بن عبدالرحمٰن: — یہ خیثمہ عبدالرحمٰن کے بیٹے اور ابوسبرہ جعفی کے پوتے ہیں۔ ابوسبرہ جعفی کا نام یزید بن مالک ہے اور یہ خیثمہ کبار تابعین میں سے ہیں۔ ابواصل (یا ابووائل) سے پہلے ان کی وفات ہوگئی ہے۔ حضرت علی عبداللہ بن عمرو غیرہما سے حدیث کو سنا ہے اور ان سے اعمش اور منصور اور عروہ بن مرہ روایت حدیث کرتے ہیں دو لاکھ ان کو وراثت میں ملا، جس کو انہوں نے علماء پر صرف کردیا خیثمہ خائے معجمہ کے فتحہ یائے تحتانی کے سکون اور ثائے مثلثہ کے فتحہ کے ساتھ ہے سبرہ سین کے زبر اور بائے موحدہ کے سکون کے ساتھ ہے۔

(۲۲۸) خالد بن معدان: — ان کی کنیت ابوعبداللہ شامی کلاعی ہے، یہ حمص کے رہنے والوں میں سے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ میں ستر صحابہ سے ملا ہوں اور یہ علماء شام کے ثقہ راویوں میں سے ہیں ۱۰۴ھ میں مقام طرسوس میں وفات پائی معدان میم کے فتح عین کے سکون کے ساتھ ہے دال مہملہ پر تشدید نہیں ہے۔

(۲۲۹) خالد بن عبداللہ: — یہ خالد بن عبداللہ واسطی طحان ہیں حصین وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں میں سے گزرے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اللہ سے اپنے آپ کو تین مرتبہ خریدا اور اپنے وزن پر چاندی خیرات کی ہے۔ ۱۹۹ھ میں وفات پائی اور بعض نے ۱۸۲ھ بتایا ہے اور ان کی ولادت ۱۱۰ھ میں ہوئی۔

(۲۳۰) خارجہ بن زید: — یہ خارجہ زید بن ثابت انصاری مدنی کے بیٹے ہیں جلیل القدر تابعی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے کو انہوں نے پایا ہے، اپنے والد اور دوسرے حضرات صحابہ سے ان کا سماع حدیث ثابت ہے یہ مدینہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں پختہ کار اور ثقہ ہیں ان سے زہری نے روایت کی ہے ان کی وفات ۹۹ھ میں ہوئی۔

(۲۳۱) خارجہ بن الصلت: — یہ خارجہ بن الصلت برجمی ہیں۔ براجم میں سے یہ بنوتمیم کی ایک شاخ ہے تابعی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں اور ان سے امام شعبی روایت کرتے ہیں اور ان کی حدیث اہل کوفہ کے یہاں ہے۔

(۲۳۲) خشف بن مالک: — یہ خشف بن مالک قبیلہ طے کے رہنے والے ہیں اپنے والد اور چچا اور عمرو بن مسعود سے روایت کی

ہے اور ان سے زید بن جبیر نے روایت کی ہے خشف خاء معجم کے کسرہ اور شین معجم کے سکون اور فاء کے ساتھ ہے۔

(۲۴۳۳) ابوخزامہ: — یہ ابوخزامہ بن یعمر ہیں یہ بنی الحارث بن سعد میں کے ایک شخص ہیں۔ یہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اور ان سے زہری یہ مشہور تابعی ہیں۔ خزامہ خائے معجمہ کے کسرہ کے ساتھ اور زائے معجمہ پر تشدید نہیں ہے۔

(۲۴۳۴) ابوخلدہ: — یہ ابوخلدہ خالد بن دینار تمیمی سعدی بصری ہیں جو درزی کا کام کرتے تھے۔ ثقات تابعین میں سے ہیں حضرت انس سے روایت کرتے ہیں اور ان سے وکیع وغیرہ خلدہ خائے معجمہ کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔

(۲۴۳۵) ابن خطل: — یہ عبداللہ بن خطل تمیمی مشرک ہے آنحضور ﷺ نے اس کے قتل کا حکم فتح مکہ کے دن دیا تھا چنانچہ یہ قتل کر دیا گیا، خطل خائے معجمہ اور طائے مہملہ دونوں کے فتح کے ساتھ ہے۔

صحابی عورتیں

(۲۴۳۶) خدیجہ بنت خویلد: — یہ خدیجہ خویلد بن اسد کی بیٹی ہیں۔ قریشیہ ہیں، امہات المؤمنین میں سے ہیں پہلے یہ ابوہالہ بن زرارہ کی بیوی تھیں، پھر ان سے عتیق بن عائذ نے نکاح کیا، اس کے بعد آنحضور ﷺ سے ان کا نکاح ہوا اس وقت ان کی عمر کچھ اوپر چالیس سال کی تھی اور آنحضور ﷺ کی عمر پچیس سال کی تھی اس سے پہلے آنحضور ﷺ نے کسی عورت سے نکاح نہیں کیا تھا اور نہ حضرت خدیجہ پر جب تک وہ زندہ رہیں کسی سے نکاح نہ کیا، یہاں تک کہ خدیجہؓ کی وفات ہوگئی۔ یہ خدیجہ وہ بی بی ہیں جو آپ ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لائیں، اس وقت نہ مردوں میں کوئی ایمان لایا تھا اور نہ عورتوں میں آنحضور ﷺ کی تمام اولاد سوائے ابراہیم کے کہ وہ ماریہ قبطیہ کے بطن سے ہیں، انہیں حضرت خدیجہ سے ہوئی ہیں، ان کی وفات ہجرت سے پانچ سال قبل مکہ میں ہوگئی تھی، بعض نے کہا چار سال قبل اور بعض نے کہا تین سال قبل اس وقت نبوت کے دس سال گزر چکے تھے ان کی عمر پینسٹھ سال کی ہوئی اور آنحضور ﷺ کے پاس رہنے کا زمانہ پچیس سال ہے یہ مقام جیحون میں دفن کی گئیں ہیں۔

(۲۴۳۷) خولہ بنت حکیم: — یہ خولہ بنت حکیم ہیں عثمان بن مظعون کی بیوی ہیں بڑی صالح اور فاضل بی بی تھیں ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

(۲۴۳۸) خولہ بنت ثامر: — یہ خولہ بنت ثامر قبیلہ انصار کی ہیں۔ ان کی حدیث اہل مدینہ میں زیادہ ہے ان سے نعمان ابن ابی العیاش زرقی نے روایت کی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ خولہ قیس بن بنی مالک بن النجار کی بیٹی ہیں اور ثامر قیس کا لقب ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ دونوں علیحدہ علیحدہ عورتیں ہیں۔

(۲۴۳۹) خولہ بنت قیس: — یہ خولہ قیس کی بیٹی ہیں۔ قبیلہ جہینہ کی رہنے والی ہیں، ان کی حدیث اہل مدینہ کے یہاں مروج ہے ان سے نعمان بن خربوذ نے روایت حدیث کی ہے خربوذ خائے معجمہ کے پیش راء مہملہ اور ذال معجمہ کے ساتھ ہے۔

(۲۴۴۰) خنساء بنت خذام: — یہ خنساء خذام بن خالد کی بیٹی ہیں۔ انصاریہ اسدیہ ہیں، ان کی حدیث مدینہ والوں میں مشہور ہے ان سے ابوہریرہ اور حضرت عائشہ اور دوسرے صحابہ نے روایت کی ہے۔ خنساء میں خاء پر فتحہ نون ساکن سین مہملہ اور مد ہے۔ خذام میں خائے معجمہ مکسور اور ذال معجمہ بغیر تشدید ہے۔

(۲۴۴۱) ام خالد بن سعید بن العاص الامویہ: — یہ ام خالد امویہ ہیں، خالد سعید بن عاص کے بیٹے تھے یہ اپنی کنیت کے ساتھ

مشہور ہیں ملک حبشہ میں پیدا ہوئیں جب یہ مدینہ میں لائی گئیں تو کم عمر تھیں۔ پھر ان سے زبیر بن العوام نے نکاح کیا۔ ان سے چند لوگوں نے روایت کی ہے۔

(د)

صحابہ

(۲۴۲) دحیہ الکلبی: — یہ دحیہ خلیفہ کلبی کے بیٹے، بلند مرتبہ صحابہ میں سے ہیں۔ ان کو آنحضور ﷺ نے ۶ھ قیصر بادشاہ روم کے پاس مدت صلح کے زمانہ میں بھیجا۔ قیصر نے آپ ﷺ پر ایمان لانا چاہا مگر اس کے پادری ایمان نہیں لائے تو وہ بھی مسلمان نہیں ہوسکا، یہ دحیہ وہی صحابی ہیں کہ حضرت جبرئیل امین ان کی صورت میں آنحضور ﷺ کے پاس وحی لاتے تھے یہ ملک شام میں چلے گئے تھے اور امیر معاویہ کے زمانہ تک وہاں رہے۔ متعدد تابعین نے ان سے روایت کی دحیہ دال کے کسرہ اور حاء مہملہ کے سکون اور دو نقطوں والی یاء کے ساتھ ہے اسی طرح بعض نے کہا ہے کہ دحیہ دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

(۲۴۳) ابو درداء: — ان کا نام عویمر ہے۔ یہ عامر انصاری خزرجی کے بیٹے ہیں یہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہیں اور درداء ان کی بیٹی ہیں۔ یہ کچھ تاخیر سے اسلام لائے اپنے خاندان میں سب سے آخر میں اسلام لانے والے ہیں۔ بڑے صالح مسلمان تھے اور بڑے سمجھدار عالم اور صاحب حکمت ہوئے ہیں شام میں قیام کیا اور ۳۲ھ میں دمشق میں وفات ہوئی۔

تابعین

(۲۴۴) داؤد بن صالح: — یہ داؤد بن صالح بن دینار کے بیٹے ہیں جو کھجوروں کے تاجر تھے اور انصار کے آزاد کردہ ہیں، مدینہ کے رہنے والے ہیں سالم بن عبداللہ اور اپنے والد اور اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں۔

(۲۴۵) داؤد بن الحصین: — یہ داؤد بن حصین آزاد کردہ عمرو بن عثمان بن عفانؓ کے ہیں۔ یہ عکرمہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے مالک وغیرہ ۱۳۵ھ میں وفات پائی اور ان کی عمر بہتر سال کی ہوئی۔

(۲۴۶) ابن الدیلمی: — ان کا نام ضحاک ہے، یہ فیروز کے بیٹے ہیں۔ تابعی ہیں ان کی حدیث مصریوں میں مروج ہے اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، دیلمی دال کے فتحہ سے منسوب ہے دیلم کی جانب یہ ایک پہاڑ ہے جو لوگوں میں مشہور ہے اور فیروز فاء کے فتحہ اور یا، تحتانی دو نقطوں والی کے سکون اور راء کے پیش کے ساتھ ہے اور آخر میں زاء ہے۔

(۲۴۷) ابوداؤد الکوفی: — یہ ابوداؤد نفیع ہیں حارث نابینا کے بیٹے کوفی ہیں۔ عمران بن حصین اور ابو برزہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے روایت کرنے والے سفیان ثوری اور شریک ہیں، محدثین کے نزدیک متروک ہیں، رفض کی طرف مائل تھے ان کا ذکر کتاب العلم میں آیا ہے۔

صحابی عورتیں

(۲۴۸) ام الدرداء: — ام الدرداء کا نام خیرہ ہے یہ ابو حدرد کی بیٹی ہیں قبیلہ اسلم کی رہنے والی ہیں، یہ حضرت ابو الدرداء کی بیوی ہیں،

یہ بڑی فاضل اور عقلمند صحابیات میں سے اور عورتوں میں بڑی صاحب رائے تھیں۔ نہایت عابدہ متبع سُنّت تھیں ان سے ایک جماعت نے روایت کی، ان کا انتقال حضرت ابو درداء سے دو سال پہلے ہو گیا تھا۔ ان کی وفات ملک شام میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور میں ہوئی۔

(ذ)

صحابہ

(۲۴۹) ابوذر الغفاری: — یہ ابوذر ان کا نام جندب ہے ان کے والد جنادہ ہیں، یہ بلند مرتبہ مشہور تارک الدنیا اور مہاجرین صحابہ میں سے ہیں مکہ میں شروع کے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایمان لانے والوں میں سے پانچویں صحابی ہیں پھر یہ اپنی قوم میں لوٹ گئے تھے ایک مدت تک ان کے پاس رہے یہاں تک کہ غزوہ خندق کے بعد آنحضور ﷺ کے پاس مدینہ منورہ میں حاضر ہو گئے۔ پھر مقام ربذہ میں قیام کیا اور ربذہ ہی میں ۳۲ھ میں خلافت عثمانؓ کے زمانہ میں وفات ہوئی آنحضور ﷺ کی بعثت سے قبل ہی عبادت کیا کرتے تھے، ان سے بہت سے صحابہ اور تابعین نے روایت کی ہیں۔

(۲۵۰) ذومخبر: — میم کے کسرہ خاء معجمہ کے سکون، بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ۔ نجاشی کے بھتیجے ہیں، نبی کریم ﷺ کے خادم ہیں۔ جبیر بن نفیر وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ ان کا شمار شامیوں میں کیا جاتا ہے اور ان کی حدیثیں ان ہی میں ملتی ہیں۔

(۲۵۱) ذوالیدین: — یہ بنی سلیم کے ایک شخص ہیں ان کو خرباق بھی کہا جاتا ہے صحابی ہیں حجاز کے رہنے والے ہیں جس نماز میں آنحضور ﷺ کو سہو ہو گیا تھا اس میں یہ موجود تھے، خرباق خائے معجمہ کے کسرہ رائے مہملہ کے سکون اور بائے موحدہ کے ساتھ ہے۔

(۲۵۲) ذوالسویقتین: — یہ حبشہ کا رہنے والا شخص ہو گا جس کے متعلق آنحضور ﷺ نے بتلایا کہ وہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دے گا۔

(ر)

صحابہ

(۲۵۳) رافع بن خدیج: — یہ رافع بن خدیج ہیں۔ ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے۔ حارثی انصاری ہیں۔ جنگ احد میں ان کو تیر آ کر لگا جس پر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میں قیامت کے دن تمہارے اس تیر کا گواہ ہوں، ان کا یہ زخم عبدالملک بن مروان کے زمانے تک چلا اور ۷۳ھ میں مدینہ طیبہ میں وفات پائی ان کی عمر چھیاسی سال کی ہوئی ایک بڑی جماعت نے ان سے روایت کی ہے خدیج خائے معجمہ کے فتحہ دال کے کسرہ اور آخر میں جیم معجمہ کے ساتھ ہے۔

(۲۵۴) رافع بن عمرو: — یہ رافع بن عمرو غفاری ہیں۔ ان کا شمار بصریوں میں کیا جاتا ہے ان سے عبداللہ بن الصامت نے روایت کی ہے۔ اکل تمر کے بارے میں ان کی حدیث ہے۔

(۲۵۵) رافع بن مکیث: — یہ رافع بن مکیث قبیلہ جہینہ کے رہنے والے ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حاضر تھے ان سے ان کے دو بیٹے بلال اور حارث روایت کرتے ہیں، مکیث میں میم کا فتحہ کاف کا کسرہ اور دو نقطوں والی یا کا سکون آخر میں ثائے مثلثہ ہے۔

(۲۵۶) رفاعة بن رافع: — ان کی کنیت ابو معاذ ہے یہ زرقی انصاری ہیں یہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد، بلکہ تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں اور حضرت علیؓ کے ہمراہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں بھی موجود رہے ہیں. حضرت معاویہ کے شروع امارۃ میں ان کی وفات ہوئی ان کے دونوں بیٹے عبید اور معاذ اور ان کے بھتیجے یحیٰی بن خلاد ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۲۵۷) رفاعہ بن سموال: — یہ رفاعہ سموال قرظی کے بیٹے ہیں، یہ وہی ہیں جنہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں پھر عبد الرحمٰن بن زبیر نے ان سے نکاح کر لیا تھا، ان سے حضرت عائشہؓ وغیرہا نے روایت کی ہے، سموال میں سین کا کسرہ ہے اور ایک قول میں فتحہ ہے میم ساکن ہے اور واؤ غیر مشدد اور لام ہے الزبیر زاء کا ضمہ اور باء کا فتحہ پڑھا ہے اور رفاعہ یہ حضرت صفیہ کے جو آنحضور کی ازواج مطہرات میں سے ہیں ماموں ہیں۔

(۲۵۸) رفاعة بن عبد المنذر: — یہ رفاعہ بن عبد المنذر انصار میں سے ہیں ان کی کنیت ابولبابہ ہے اور ان کا ذکر حرف لام میں آوے گا۔

(۲۵۹) رویفع بن ثابت: — یہ رویفع۔ ثابت بن سکن کے بیٹے ہیں، انصاری ہیں۔ ان کا شمار مصریوں میں کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہؓ نے ان کو ۴۶ھ میں طرابلس مغربی پر امیر مقرر کر دیا تھا ان کی وفات برقہ میں ہوئی اور بعض نے کہا ہے کہ شام میں ہوئی۔ ان سے حنش بن عبد اللہ اور دوسرے حضرات روایت کرتے ہیں۔ رویفع رافع کی تصغیر ہے اور حنش حاء مہملہ اور نون کے فتحہ اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔

(۲۶۰) رکانة بن عبد یزید: — یہ رکانہ عبد یزید بن ہاشم بن عبد المطلب قرشی کے بیٹے ہیں۔ یہ بڑے طاقتور تھے ان کی حدیث حجازیین میں ہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک زندہ رہے اور بعض نے کہا ہے کہ ۴۲ھ میں وفات پائی، ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ رکانہ راء مہملہ یہ ضمہ کے ساتھ اور کاف غیر مشدد اور نون ہے۔

(۲۶۱) رباح بن الربیع: — یہ رباح بن الربیع اسیدی کاتب ہیں، ان کی حدیث بصریوں میں مروج ہے قیس بن زہیر ان سے روایت کرتے ہیں الاسیدی ہمزہ کے ضمہ سین کے فتحہ پہلی اور آخر کی دونوں یاء مشدد ہیں۔

(۲۶۲) ربیعہ بن کعب: — یہ ربیعہ کعب کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ابو فراس اسلمی ہے ان کا شمار اہل مدینہ میں ہے اور یہ اہل صفہ میں سے تھے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضور ﷺ کے خادم رہے ہیں اور قدیم اصحاب میں سے تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ سفر و حضر میں رہتے تھے، ۶۳ھ میں وفات پائی۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

(۲۶۳) ربیعہ بن الحارث: — یہ ربیعہ حارث بن عبد المطلب بن ہاشم کے بیٹے ہیں جو آنحضور ﷺ کے چچا ہیں ان کو شرف صحبت دولت حاصل ہے حضرت عمرؓ کی خلافت میں ۲۲ھ میں وفات پائی یہ وہ ہیں جن کے بارہ میں آنحضور ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا تھا کہ پہلا خون جس کو میں معاف کرتا ہوں خون ربیعہ ابن الحارث کا ہے۔ اور اس لئے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں ربیعہ کے ایک بیٹے کو جس کا نام آدم تھا قتل کر دیا گیا، پس آنحضور ﷺ نے اسلام میں اس کے مطالبہ کو رد کر دیا۔

(۲۶۴) ربیعہ بن عمرو: — یہ ربیعہ عمرو جرشی کے بیٹے ہیں۔ واقدی نے بیان کیا ہے کہ ربیعہ راہط کے خروج کے دن قتل کر دیئے گئے تھے۔

(۲۶۵) ابورافع اسلم: — یہ ابورافع اسلم نبی ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ ان کے نام سے ان کی کنیت زیادہ مشہور ہے۔ یہ قبطی تھے، پہلے عباس کے غلام تھے انہوں نے ان کو آنحضور ﷺ کو بطور ہدیہ دیا تھا۔ جب آنحضور ﷺ کو عباس کے اسلام کی بشارت دی گئی تو آپ ﷺ نے خوشی میں آزاد کردیا ان کا اسلام غزوۂ بدر سے پہلے تھا، ان سے ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے، ان کی وفات حضرت عثمانؓ سے کچھ دن قبل ہوئی۔

(۲۶۶) ابورمثہ: — یہ ابورمثہ فاعۃ بن یثربی کے بیٹے ہیں تمیمی ہیں امراء القیس کی اولاد میں سے جو زید بن مناۃ بن تمیم کا بیٹا تھا اور ان کے نام میں بہت اختلاف ہے، بعض نے وہ نام بیان کیا ہے جو ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اور بعض نے عمارہ بن یثربی کہا ہے۔ اور بعض نے دوسرے نام ذکر کئے ہیں۔ آنحضور ﷺ کی خدمت میں اپنے والد صاحب کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ان کا شمار کوفیین میں کیا جاتا ہے، ایاد بن لقیط نے ان سے روایت کی ہے۔ رمثہ راء کے کسرہ اور میم کے سکون اور ثائے مثلثہ کے ساتھ ہے۔

(۲۶۷) ابورزین: — یہ ابورزین ہیں ان کا نام لقیط ہے۔ یہ عامر بن صبرہ کے بیٹے ہیں، ان کا ذکر حرف لام میں آئے گا۔

(۲۶۸) ابوریحانہ: — یہ ابوریحانہ شمعون بن زید کے بیٹے تھے بنو قریظہ میں سے انصار ہیں، یعنی انصار کے حلیف ان کو آنحضرت ﷺ کا آزاد کردہ کہا جاتا ہے، ان کی صاحبزادی ریحانہ ہیں اور بڑی فاضلہ عابدہ اور دنیا سے کنارہ کش تھیں۔ یہ شام میں مقیم ہو گئے تھے، ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

تابعین

(۲۶۹) ابورجاء: — یہ ابورجاء عمران بن تمیم عطاردیؒ ہیں آنحضور ﷺ کی زندگی میں اسلام لائے تھے حضرت عمر بن خطاب اور حضرت علیؓ وغیرہما سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ایک جماعت کثیر نے روایت کی یہ بڑے عالم باعمل اور سن رسیدہ ماہرین قرأت میں سے تھے ۱۰۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۲۷۰) ربیعۃ بن ابی عبدالرحمٰن: — یہ ربیعہ ابو عبدالرحمٰن کے بیٹے ہیں جلیل القدر تابعی ہیں۔ مدینہ کے مانے ہوئے فقہاء میں سے ہیں۔ حضرت انس بن مالک اور حضرت سائب بن یزید سے احادیث سنے ہوئے ہیں، اور سفیان ثوری اور مالک بن انس ان سے روایت کرتے ہیں ۱۳۶ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔

(۲۷۱) ابورافع: — یہ ابورافع حقیق کا بیٹا اس کا نام عبداللہ تھا اور یہ یہودی تھا حجاز کے تاجروں میں سے ہے۔ معجزات میں اس کا ذکر حدیث براء میں آتا ہے۔ الحقیق حائے مہملہ کے ضمہ پہلے قاف کے فتحہ اور یائے تحتانی کے سکون کے ساتھ ہے۔

(۲۷۲) رعل بن مالک: — یہ رعل مالک بن عوف کا بیٹا ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جن پر آنحضور ﷺ نے قنوت میں لعنت اور بددعا کی ہے۔ اس وجہ سے کہ انہوں نے قراء کو قتل کیا تھا۔ رعل راء کے کسرہ اور عین مہملہ کے سکون کے ساتھ ہے۔

صحابی عورتیں

(۲۷۳) الربیع بنت معوذ: — یہ ربیع معوذ کی بیٹی ہیں صحابیہ ہیں انصار میں سے ہیں بڑی قدر و عظمت والی ہیں۔ ان کی حدیث مدینہ اور بصرہ والوں کے یہاں رائج ہے۔ الربیع را کے پیش یائے موحدہ کے فتحہ اور دو نقطوں والی یاء مکسور کی تشدید کے ساتھ ہے۔

(۲۷۴) الربیع بنت النضر: — یہ ربیع بنت نضر حضرت انس بن مالک انصاری کی پھوپھی ہیں اور حارثہ بن سراقہ کی والدہ ہیں اور صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انس بن مالک کی پھوپھی ربیع بنت نضر کی والدہ ہیں اور جن کا ذکر صحابی عورتوں کے ذیل میں آتا ہے وہ ربیع ہی ہیں اور یہی صحیح ہے۔

(۲۷۵) الرمیصاء: — یہ رمیصاء ام سلیم ملحان کی بیٹی حضرت انس بن مالکؓ کی والدہ ہیں اور ان کا ذکر حرف سین کے تحت میں عنقریب آئے گا۔

(ز)

صحابہ

(۲۷۶) زید بن ثابت: — یہ زید بن ثابت انصاری آنحضور ﷺ کے کاتب ہیں، جب آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تھے تو ان کی عمر گیارہ سال کی تھی ان کا شمار ایسے جلیل القدر فقہائے صحابہ میں سے ہوتا ہے جن پر فرائض کا مدار ہے نیز یہ ان صحابہ میں سے ایک ہیں جنہوں نے تدوین قرآن میں بڑا حصہ لیا ہے اور انہوں نے خلافت ابوبکرؓ میں قرآن عظیم کی کتابت بھی کی ہے اور قرآن پاک کو مصحف سے حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں نقل کیا ہے ان سے ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے۔ مدینہ طیبہ میں ۴۵ھ میں وفات پائی اور ان کی چھپن برس کی عمر ہوئی۔

(۲۷۷) زید بن ارقم: — یہ زید بن ارقم ہیں ان کی کنیت ابو عمرو ہے۔ یہ انصاری خزرجی ہیں، ان کا شمار کوفیین میں کیا جاتا ہے کوفہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۶۶ھ میں وفات پائی ان سے بہت سے حضرات نے روایت کی ہے۔

(۲۷۸) زید بن خالد: — یہ زید بن خالد قبیلہ جہینہ کے ہیں یہ کوفہ میں آگئے تھے اور وہیں ۷۸ھ میں وفات پائی ان کی عمر پچاسی سال کی ہوئی، انس و عطاء بن یسار وغیرہ نے روایت کی ہے۔

(۲۷۹) زید بن حارثہ: — یہ زید بن حارثہ ہیں، ان کی کنیت ابواسامہ ہے، ان کی والدہ سعدی بنت ثعلبہ ہیں جو بنی معن میں سے ہیں۔ زید بن حارثہ کو ان کی والدہ اپنی قوم کے پاس ملانے کے لئے لائیں تو بنی معن بن جریر کے ایک لشکر نے زمانہ جاہلیت میں ان پر لوٹ مار کی۔ پھر اس لشکر کا گزر بنی معن کے ان گھروں پر ہوا جو زید بن حارثہ کی والدہ کا خاندان تھا زید بن حارثہ کو یہ لٹیرے اٹھا کر لے بھاگے ان کی عمر اس وقت آٹھ سال بتلائی جاتی ہے، یہ نو عمر لڑکے تھے۔ ان کو بازار عکاظ میں لے گئے اور فروخت کرنے کے لئے ان کو پیش کر دیا، چنانچہ ان کو حکیم بن حزام بن خویلد نے اپنی پھوپھی خدیجہ بنت خویلد کے لئے چار سو درہم کے بدلہ میں خرید لیا، جب آنحضور ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا تو حضرت خدیجہ نے ان کو آنحضور ﷺ کے لئے ہبہ کر دیا۔ آپ ﷺ نے ان پر قبضہ کر لیا۔ پھر ان تمام واقعات کا پتہ زید بن حارثہ کے خاندان والوں کو چلا تو ان کے باپ حارثہ اور ان کے چچا کعب آپ ﷺ کے پاس آئے اور فدیہ دے کر ان کو لے جانا چاہا۔ آنحضور ﷺ نے زید بن حارثہ کو کلی اختیار دے دیا۔ کہ اگر وہ گھر جانا چاہیں تو خوشی سے اپنے والد کے ہمراہ چلے جائیں اور اگر چاہیں تو میرے پاس رہیں زید بن حارثہ نے اپنے گھر والوں پر آنحضور ﷺ کو ترجیح دی اور والد اور چچا کے ہمراہ نہیں گئے اس لئے کہ آنحضور ﷺ کے احسانات اور اخلاق کریمانہ ان کے دل میں گھر کر چکے تھے، اس واقعہ کے بعد آنحضور ﷺ ان کو مقام حجر میں لے گئے، اور حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگو! گواہ رہو میں نے زید کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے وہ میرے وارث ہیں اور میں

ان کا وارث ہوں، اس کے بعد وہ زید بن محمد ﷺ پکارے جانے لگے، یہاں تک کہ اللہ شریعت کو لایا اور یہ آیت نازل ہوئی کہ لے پالک لڑکوں کو ان کے والدین کی طرف منسوب کر کے پکارو۔ یہ بات اللہ کے نزدیک بڑے انصاف اور راستی کی ہے۔ تو پھر ان کو زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ یہ زید بن حارثہ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہیں ایک قول کے اعتبار سے آنحضور ﷺ ان سے دس سال بڑے ہیں۔ اور دوسرے قول کے اعتبار سے بیس سال آنحضور ﷺ نے ان کا نکاح ام ایمن اپنی آزاد کردہ سے کرادیا، ان سے اسامہ لڑکا پیدا ہوا اس کے بعد زینب بنت جحش سے ان کا نکاح ہوا۔ اور ان زید بن حارثہ کو محبوب رسول خدا کہا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے کسی صحابی کا نام قرآن پاک میں ان کے سوا نہیں لیا۔ یہ وہ آیت ہے۔ فلما قضی زید منها وطرا زوجنکها ان سے ان کے بیٹے اسامہ اور دوسرے لوگوں نے روایت کی ہے، غزوہ موتہ میں جب کہ یہ لشکر کے امیر تھے جمادی الاول ۸ھ میں شہید کردیئے گئے جب کہ ان کی عمر پچپن سال کی تھی۔

(۲۸۰) زید بن الخطاب: — یہ زید بن خطاب عدوی قریشی حضرت عمر بن خطاب کے بھائی ہیں۔ یہ حضرت عمرؓ سے عمر میں بڑے تھے، یہ مہاجرین اولین میں سے ہیں اور حضرت عمرؓ سے پہلے یہ ایمان لائے ہیں اور یہ جنگ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں بھی شریک رہے ہیں جنگ یمامہ میں وہ شہید ہوئے جو خلافت حضرت ابوبکرؓ میں پیش آئی تھی، ان سے روایت عبداللہ بن عمر کرتے ہیں۔

(۲۸۱) زید بن سہل: — یہ زید سہل کے بیٹے ہیں وہ اپنی کنیت ابوطلحہ کے ساتھ مشہور ہیں، ان کا ذکر حرف طا میں آئے گا۔

(۲۸۲) الزبیر بن العوام: — زبیر بن العوام کی کنیت ابوعبداللہ قریشی ہے ان کی والدہ صفیہ عبدالمطلب کی بیٹی اور آنحضور ﷺ کی پھوپھی ہیں، یہ اور ان کی والدہ شروع ہی میں اسلام لے آئے تھے جب کہ ان کی عمر سولہ سال کی تھی اس پر ان کے چچا نے دھویں سے ان کا دم گھونٹ کر تکلیف پہنچائی تاکہ یہ اسلام کو چھوڑ دیں۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ موجود رہے، یہ وہ ہیں کہ سب سے اول تلوار اللہ کے راستہ میں سونتی اور آنحضور ﷺ کے ساتھ جنگ احد میں ڈٹے رہے اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک یہ بھی ہیں لانبے قد گورے رنگ کے تھے بدن پر گوشت کم تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ گندم گوں تھے اور بدن پر ان کے بال، بہت تھے ہلکے رخساروں والے تھے ان کو مقام سفوان میں (جو سین اور فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے) اور بصرہ کی سرزمین میں واقع ہے) عمرو بن جرموز نے ۳۶ھ میں قتل کردیا تھا، ان کی عمر چونسٹھ سال کی ہوئی۔ اول وادی سباع میں وہ دفن کئے گئے، پھر بصرہ کی طرف منتقل کئے گئے اور وہاں پر ان کی قبر کا ہونا مشہور ہے ان سے ان کے دو بیٹوں عبداللہ اور عروہ وغیرہما نے روایت کی ہے۔

(۲۸۳) زیاد بن لبید: — یہ زیاد لبید کے بیٹے ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے انصاری زرقی ہیں تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ہمراہ رہے اور ان کو حضر موت کا گورنر بھی بنادیا گیا تھا۔ ان سے عوف بن مالک اور ابودرداء نے روایت حدیث کی ہے۔ حضرت معاویہ کے شروع دور امارت میں وفات پائی۔

(۲۸۴) زیاد بن الحارث: — یہ زیاد حارث صدائی کے بیٹے ہیں، آنحضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ ﷺ کے یہاں موذن بھی رہے ان کا شمار بصریوں میں ہے اور صدائی میں صاد مہملہ پر پیش ہے اور دال مہملہ پر تشدید نہیں ہے اور الف کے بعد ہمزہ ہے۔

(۲۸۵) زاہر بن الاسود: — یہ زاہر بن اسود اسلمی میں یہ ان صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی اور یہ کوفہ میں مقیم رہے اور کوفہ والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

(۲۸۶) زراع بن عامر: — یہ زراع ہیں عامر بن عبدالقیس کے بیٹے وفد عبدالقیس میں شامل ہوکر آنحضور ﷺ کی خدمت میں

حاضر ہوئے ہیں، یہ بصریوں میں شمار ہوتے ہیں ان کی حدیث اہل بصرہ کے یہاں رائج ہے۔

(۲۸۷) زرارۃ بن ابی اوفی: — یہ زرارہ ابی اوفی کے بیٹے ہیں یہ صحابہ میں سے ہیں، ان کی وفات حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہوئی۔

(۲۸۸) الوزید الانصاری: — یہ ابوزید انصاری وہ ہیں جنہوں نے قرآن پاک کو اپنے حافظہ سے آنحضورؐ کے عہد مبارک میں جمع کیا، ان کے نام میں اختلاف ہے بعض نے سعید بن عمیر کہا ہے اور بعض نے قیس بن سکن۔

(۲۸۹) ابوزہیر نمیری: — یہ ابوزہیر نمیری ہیں شامیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

(۲۹۰) الزبیدی: — یہ زبیدی ہیں زائے معجمہ کے پیش اور بائے موحدہ کے زبر کے ساتھ، ان کی نسبت زبید کی طرف کی جاتی ہے ان کا نام مُنَبِّہ بن سعد بتلایا جاتا ہے اور ان کا صحابی ہونا محقق نہیں ہے۔

تابعین

(۲۹۱) الزبیر بن عدی: — یہ عدی کے بیٹے ہیں ہمدانی کوفی ہیں، مقام رے کے قاضی تھے۔ تابعی ہیں۔ انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے سفیان ثوری وغیرہ نے روایت حدیث کی ہے ۱۳۱ھ میں ان کی وفات ہوئی ہمدانی کا میم ساکن ہے۔

(۲۹۲) الزبیر العربی: — یہ زبیر عربی نمیری اور بصری ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے معمر اور حماد بن زید ثقہ راوی ہیں۔

(۲۹۳) زیاد بن کسیب: — یہ زیاد کسیب کے بیٹے ہیں۔ عدوی ہیں یہ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں تابعی ہیں ابوبکرہ سے روایت کرتے ہیں۔ کسیب تصغیر کے ساتھ ہے۔

(۲۹۴) زہرۃ بن معبد: — یہ زہرہ ہیں معبد کے بیٹے ان کی کنیت ابوعقیل عین کے زبر کے ساتھ ہے، یہ قرشی ہیں اور مصری ہیں۔ انہوں نے اپنے دادا عبداللہ بن ہشام وغیرہ سے حدیث سنی، ان سے روایت کرنے والی بھی ایک بڑی جماعت ہے اور ان کی حدیث کا بڑا حصہ اہل مصر کے یہاں ہے۔

(۲۹۵) زہیر بن معاویہ: — یہ زہیر بن معاویہ ہیں ان کی کنیت ابوخیثمہ جعفی ہے یہ کوفی ہیں۔ ان کا قیام جزیرہ میں رہا یہ حافظ حدیث اور ثقہ ہیں اور ابواسحاق ہمدانی اور ابوالزبیر سے حدیث کو سنا، ان سے ابن مبارک اور یحیٰی بن یحیٰی وغیرہما روایت کرتے ہیں۔ ان کا تذکرہ کتاب الزکوۃ میں آیا ۱۷۴ھ میں وفات پائی۔

(۲۹۶) زمیل بن عباس: — یہ اپنے مولی عروہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے یزید بن الہاد۔ ان میں کچھ ضعف ہے

(۲۹۷) الزہری: — یہ زہری زہرۃ بن کلاب کی طرف منسوب ہیں جو ان کے جد اعلی ہیں اسی وجہ سے زہری کہلاتے ہیں۔ ان کی کنیت ابوبکر ہے۔ ان کا نام محمد ہے عبداللہ بن شہاب کے بیٹے، یہ بڑے فقیہہ اور محدث ہوئے ہیں اور تابعین میں سے جلیل القدر تابعی ہیں مدینہ کے زبردست فقیہہ اور عالم ہیں۔ علوم شریعت کے مختلف فنون میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ بہت سے صحابہ سے حدیثیں سنیں ہیں ان سے جمع عظیم روایت کرتی ہیں جن میں قتادہ اور مالک بن انس بھی ہیں عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں میں ان سے بڑا عالم نہیں

پاتا مکحول سے دریافت کیا گیا کہ ان علماء میں سے جن کو آپ نے دیکھا ہے۔ کون زیادہ عالم ہے فرمایا کہ ابن شہاب ہیں پھر دریافت کیا گیا کہ ان کے بعد کون ہیں فرمایا کہ ابن شہاب ہیں پھر کہا گیا کہ ابن شہاب کے بعد فرمایا کہ ابن شہاب ہی ہیں۔ رمضان کے مہینہ ۱۲۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۲۹۸) زر بن حبیش: — یہ زر بن حبیش اسدی کوفی ہیں، ان کی کنیت ابو حریم ہے، انہوں نے زمانہ جاہلیت میں ساٹھ سال گزارے ہیں اور اتنے ہی زمانہ اسلام میں، یہ عراق کے ان بڑے قاریوں میں سے ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد ہیں، حضرت عمرؓ سے حدیث کو سنا۔ ان سے ایک جماعت تابعین اور غیر تابعین کی روایت کرتی ہے، زر میں زائے معجمہ کے کسرہ اور راء مہملہ کے تشدید کے ساتھ ہے حبیش میں حاء مہملہ پر ضمہ اور بائے موحدہ کے زبر اور دو نقطوں والی یاء ساکن ہے اور آخر میں شین ہے۔

(۲۹۹) زرارہ بن ابی اوفی: — یہ زرارہ بن ابی اوفی ابو حاجب جرشی بصرہ کے قاضی ہیں، صحابہ کی جماعت سے حدیث نقل کرتے ہیں جن میں سے حضرت عبداللہ بن عباس بھی ہیں جن سے یہ روایت کی کہ عبداللہ بن عباس نے کہا کہ دریافت کیا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے اور کہا کہ کون کون سا عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہے، پس فرمایا الحال المرتحل اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ الحال المرتحل کیا ہے فرمایا کہ صاحب قرآن ہے کہ جو شروع قرآن سے پڑھے اور آخر تک پڑھتا چلا جائے اور آخر سے شروع کرے تو اول تک پہنچادے ان سے قتادہ اور عوف نے روایت حدیث کی، انہوں نے ایک دن امامت کی اور نماز میں فاذا نقر فی الناقور پڑھا اور چیخ ماری ۹۳ھ میں وفات پائی۔

(۳۰۰) زیاد بن حدیر: — یہ زیاد بن حدیر ہیں ان کی کنیت ابو مغیرہ ہے۔ یہ بنو اسد میں سے ہیں کوفی ہیں تابعی ہیں، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے حدیث کو سنا ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے جن میں سے شعبی بھی ہیں حدیر حاء مہملہ کے پیش اور دال مہملہ کے زبر یائے تحتانی کے سکون اور راء مہملہ کے ساتھ ہے۔

(۳۰۱) زید بن اسلم: — یہ زید بن اسلم ہیں ان کی کنیت ابو اسامہ ہے، یہ حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ ہیں، مدنی ہیں اور جلیل القدر تابعی ہیں۔ صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں اور ان سے سفیان ثوری اور ایوب سختیانی اور مالک اور ابن عیینہ احادیث نقل کرتے ہیں، ۱۳۶ھ میں وفات پائی۔

(۳۰۲) زید بن طلحہ: — یہ زید بن طلحہ ہیں ان سے سلمہ بن صفوان زرقی روایت کرتے ہیں۔ امام مالک نے ان کی حدیث حیا کے بارہ میں اخذ کی ہے۔

(۳۰۳) زید بن یحییٰ: — یہ زید بن یحییٰ دمشقی ہیں یہ امام اوزاعی سے روایت کرتے ہیں اور ان سے امام احمد اور دارمی ثقہ ہیں۔

(۳۰۴) ابو زبیر: — یہ ابو زبیر ہیں نام محمد بن اسلم ہے مکہ کے رہنے والے ہیں، آزاد کردہ ہیں حکیم بن حزام کے طبقہ ثانیہ میں سے ہیں مکہ کے تابعین میں سے ہیں۔ جابر بن عبداللہ سے انہوں نے حدیث کو سنا ہے اور ان سے بہت لوگوں نے ۱۲۵ھ میں وفات پائی۔

(۳۰۵) ابو زرعہ: — ان کا نام عبید اللہ ہے عبد الکریم کے بیٹے رے کے رہنے والے ہیں ایک بڑی جماعت سے انہوں نے حدیث کو سنا ہے اور ان سے عبداللہ بن احمد بن حنبل وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ یہ امام اور حافظ حدیث ہیں پختہ اور قابل اعتماد ہیں حدیث کے عالم ہیں ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور مقام رے میں مشائخ یعنی رواۃ حدیث کو پہچاننے والے ہیں۔ جرح اور تعدیل کے جاننے والے ۲۶۴ھ میں وفات پائی۔

صحابی عورتیں

(۳۰۶) زینب بنت جحش: — یہ زینب جحش کی بیٹی امہات المؤمنین میں سے ہیں اور ان کی والدہ کا نام امیہ ہے جو عبد المطلب کی بیٹی ہیں اور آنحضور ﷺ کی پھوپھی۔ یہ زید بن حارثہ جو حضور کے آزاد کردہ غلام تھے ان کی بیوی تھیں۔ پھر حضرت زید نے ان کو طلاق دے دی تھی، اس کے بعد آنحضور ﷺ نے ۵ھ میں ان سے نکاح کیا تھا، یہ زینب تمام ازواج مطہرات میں سے آپ ﷺ کی وفات کے بعد سب سے پہلے انتقال کرنے والی ہیں، ان کا پہلا نام "برہ" تھا آنحضرت ﷺ نے ان کا نام زینب رکھا تھا، حضرت عائشہ ان کی شان میں فرماتی ہیں" کوئی عورت اس زینب سے بہتر دین میں نہیں ہے، یہ سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والی ہیں اور سب سے زیادہ سچ بولنے والی ہیں سب سے زیادہ قرابت رکھنے والی ہیں، سب سے زیادہ صدقات دینے والی ہیں اور ان تمام کاموں میں جن میں اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے جان کام آسکتی ہے سب سے زیادہ جان لڑانے والی ہیں ۲۰ھ میں مدینہ میں وفات پائی اور بعض نے کہا ہے کہ ۲۱ھ میں۔ عمر ترپین سال کی پائی، حضرت عائشہ اور ام حبیبہؓ وغیرہما ان سے روایت حدیث کرتی ہیں۔

(۳۰۷) زینب بنت عبداللہ: — یہ زینب عبداللہ بن معاویہ کی بیٹی بنو ثقیف کی رہنے والی ہیں، عبداللہ بن مسعود کی بیوی ہیں ان سے ان کے شوہر اور ابوسعید و ابوہریرہ اور حضرت عائشہؓ روایت حدیث کرتے ہیں۔

(۳۰۸) زینب بنت ابی سلمہ: — یہ حضور ﷺ کی بیوی حضرت ام سلمہ کی بیٹی ہیں ان کا نام بھی زینب تھا، آنحضور نے بدل کر برہ رکھ دیا ملک "حبشہ" میں پیدا ہوئیں، عبداللہ بن زمعہ کی زوجیت میں رہیں، اپنے زمانے کی عورتوں میں سب سے زیادہ فقیہہ ہیں، ان سے ایک جماعت نے حدیث کی روایت کی واقعہ "حرہ" کے بعد ان کی وفات ہوئی۔

تابعی عورتیں

(۳۰۹) زینب بنت کعب: — یہ زینب کعب ابن عجرۃ کی صاحبزادی ہیں، انصار میں سے ہیں۔ سالم بن عوف کے خاندان سے ہیں رابعیہ ہیں۔

(س)

صحابہ

(۳۱۰) سعد بن ابی وقاصؓ: — یہ سعد بن ابی وقاص ہیں ان کی کنیت ابواسحاق ہے اور ان کے والد ابووقاص کا نام مالک بن وہیب ہے۔ زہری ہیں، قبیلہ قریش میں سے یہ ان دس میں سے ایک ہیں جن کو حضور ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی، یہ شروع اسلام ہی میں ایمان لے آئے۔ جب کہ ان کی عمر سترہ سال کی تھی، ان کا بیان ہے کہ میں اسلام لانے والوں میں سے تیسرا شخص ہوں اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں جس نے اللہ کے راستہ میں تیر اندازی کی تمام غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ برابر شریک رہے۔ بڑے مستجاب الدعوات تھے، اس بات کی لوگوں میں بڑی شہرت تھی ان کی بددعا سے لوگ ڈرتے تھے اور ان سے دعا، خیر کی تمنا رکھتے تھے اور یہ بات اس لئے تھی کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ ان کے تیر کو سیدھا پہنچادے اور ان کی دعا کو قبول فرمالے" ان کے لئے اور زبیر کے لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے ماں اور باپ دونوں کو جمع کر کے اس طرح فرمایا" ارم فداک ابی وامی" ایسے الفاظ ان دونوں کے علاوہ کسی اور سے نہیں فرمائے، یہ کوتاہ قامت اور ٹھکے ہوئے بدن والے تھے، گندمی رنگ تھا اور جسم پر بال

زیادہ تھے۔ مقام عتیق میں جو مدینہ سے قریب ہے اپنے محل میں وفات پائی اور لوگوں کے کندھوں پر مدینہ لے جائے گئے، مروان بن الحکم نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی مروان اس زمانہ میں مدینہ کا گورنر تھا مقام بقیع میں دفن کئے گئے یہ واقعہ ۵۵ھ میں پیش آیا ان کی عمر کچھ اوپر ستر سال کی ہوئی، عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، ان کی موت سب سے آخر میں واقع ہوئی حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ نے ان کو کوفہ کا گورنر بنایا تھا۔ ان سے ایک بڑی جماعت صحابہ اور تابعین کی روایت کرتی ہے۔

(۳۱۱) سعد بن معاذ: — یہ سعد معاذ کے بیٹے ہیں انصاری اشہلی اوسی ہیں مدینہ میں عقبہ اولی اور ثانیہ کے درمیان اسلام لائے ان کے اسلام کو دیکھ کر عبد الاشہل کے بیٹے اور ان کے تمام خاندان والے اسلام لے آئے، انصار کے تمام خاندانوں میں سے یہ پہلا خاندان تھا جو کہ اسلام لایا۔ آنحضور ﷺ نے ان کو "سید الانصار" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ یہ اپنی قوم میں بڑے بزرگ اور سردار تسلیم کئے جاتے تھے جلیل القدر اور اکابر اور اخیار صحابہ میں سے ہیں، آنحضور ﷺ کے ساتھ غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے اور مقابلہ پر بہادرانہ ڈٹے رہے جنگ خندق میں ان کو شہہ رگ پر تیر لگا اور خون بند نہیں ہوا یہاں تک کہ ایک مہینہ کے بعد ان کی وفات ہوگئی یہ واقعہ ذی قعدہ ۵ھ کا ہے اس وقت ان کی عمر ۳۷ برس کی تھی جنت البقیع میں سپرد خاک کئے گئے۔ صحابہ کی ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔

(۳۱۲) سعد بن خولہ: — ان سعد بن خولہ نے غزوہ بدر میں شرکت فرمائی اور حجۃ الوادع والے سال میں مکہ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۳۱۳) سعد بن عبادہ: — یہ سعد بن عبادہ ہیں اور ان کی کنیت ابو ثابت انصاری ہے۔ ساعدی خزرجی ہیں، یہ بارہ نقباء میں سے ایک ہیں انصار کے سرداروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اور شان و شوکت میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھے، ریاست و سرداری ایسی پائی تھی کہ جس کا اعتراف ان کی قوم تک کرتی تھی ایک جماعت ان سے روایت حدیث کرتی ہے ۱۵ھ میں جب کہ عمرؓ کی خلافت کو ڈھائی سال گزر چکے تھے "حوران" میں جو کہ سرزمین شام میں واقع ہے وفات پائی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۱۱ھ میں جب کہ ابوبکر کی خلافت کا زمانہ تھا ان کی وفات ہوئی، اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ یہ اپنے غسل خانے میں مردہ پائے گئے۔ دیکھا گیا تو ان کا تمام جسم سبز ہو چکا تھا۔ تمام لوگ ان کی موت کی وجہ معلوم نہ کرسکے۔ یہاں تک کہ ایک کہنے والی آواز لوگوں کے کان میں آئی جو یہ کہہ رہا تھا اور کسی کو دکھائی نہیں دیتا تھا ۔

نحن قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادة ورمینا بسهمین فلم نخط فؤادة

(یعنی ہم نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کیا اور ہم نے دو تیر ان کے قلب پر چلائے کہ نشانہ خطا نہ گیا۔)

اس وجہ سے مشہور ہوگیا کہ کسی جن نے ان کو قتل کیا۔

(۳۱۴) سعید بن الربیع: — یہ سعید بن الربیع انصار کے قبیلۂ خزرج میں سے ہیں، جنگ احد میں شہید ہوئے، آنحضرت ﷺ نے ان میں اور عبدالرحمٰن بن عوف میں بھائی چارہ کا تعلق قائم کرایا تھا، یہ اور خارجہ بن زید ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے۔

(۳۱۵) سعید بن الاطول: — یہ سعید ہیں اطول کے بیٹے قبیلۂ جہینہ سے ہیں، انؓ کو آنحضور کی صحبت حاصل ہوئی۔ ان سے ان کے بیٹے عبداللہ اور ابو نضرہ روایت کرتے ہیں۔

(۳۱۶) سعید بن زید: — یہ سعید زید کے بیٹے ہیں، ان کی کنیت ابو اعور ہے، عدوی قریشی ہیں، عشرہ مبشرہ میں سے ہیں شروع ہی میں شرف اسلام حاصل کیا اور تمام غزوات میں سوائے غزوۂ بدر کے آنحضور کے ساتھ شرکت کی کیونکہ یہ سعید بن زید طلحہ بن عبداللہ کے ساتھ تھے جو قریش کے غلہ والے قافلہ کی کھوج لگانے کے لئے مقرر کئے گئے تھے، آنحضرت ﷺ نے غنیمت میں ان کا حصہ بھی لگایا تھا

اور حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ ان کے نکاح میں تھیں، اور یہی وہ فاطمہ ہیں جن کی وجہ سے عمرؓ حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان کا رنگ گندمی اور قد لمبا تھا ان کے بدن پر بال زیادہ تھے ۵۱ھ میں مقام عتیق میں وفات پائی اور وہاں سے مدینہ لائے گئے، اور جنت البقیع میں دفن ہوئے، کچھ اوپر ستر سال کی عمر پائی۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۳۱۷) سعید بن حریث: — یہ سعید بن حریث قریشی مخزومی ہیں۔ فتح مکہ میں آنحضور کے ساتھ شریک تھے۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی پھر کوفہ میں اقامت گزیں ہوئے اور وہیں انتقال ہوا اور وہیں ان کی قبر ہے، حافظ ابن عبد البر نے کہا کہ ان کی قبر جزیرہ میں ہے اور انہوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ ان سے ان کے بھائی عمرو روایت کرتے ہیں۔

(۳۱۸) سعید بن العاص: — یہ سعید بن العاص قریشی ہیں ہجرت والے سال میں ان کی پیدائش ہوئی۔ قریش کے سرداروں میں سے تھے۔ جن صحابہ کرام نے حضرت عثمان کے حکم سے قرآن کی کتابت کی ان میں سے ایک یہ بھی ہیں حضرت عثمان نے ان کو کوفہ کا گورنر بنایا تھا اور انہوں نے اہل طبرستان سے جنگ کی اور اس میں فتحیاب ہوئے ۹ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۳۱۹) سعید بن زید: — یہ سعید سعد بن عبادہ کے بیٹے ہیں۔ انصاری ہیں کہا جاتا ہے کہ نبی ﷺ کی صحبت سے مشرف ہوئے اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں اور ان کے بیٹے شرجیل اور ابوامامہ بن سہل ان سے روایت کرتے ہیں۔ واقدی وغیرہ نے کہا ہے کہ ان کا صحابی ہونا صحیح ہے حضرت علیؓ کی جانب سے یمن کے گورنر تھے۔

(۳۲۰) سبرہ بن معبد: — یہ سبرہ بن معبد جہنی ہیں اور مدینہ کے رہنے والے ہیں، ان سے ان کے بیٹے "ربیع" روایت کرتے ہیں، ان کا شمار مصر کے محدثین میں ہوتا ہے، سبرہ میں سین مفتوح اور باء ساکن ہے۔

(۳۲۱) سہل بن سعد: — یہ سہل بن سعد ساعدی انصاری ہیں اور ابوعباس ان کی کنیت ہے، ان کا نام "حزن" تھا۔ لیکن پھر رسول اللہ نے سہل رکھ دیا جب حضور نے وفات پائی تو ان کی عمر پندرہ سال کی تھی سہل نے مدینہ میں ۹۱ھ میں انتقال فرمایا اور بعضوں نے ۸۸ھ بیان کیا، یہ سب سے آخری صحابی ہیں جن کا انتقال مدینہ میں ہوا۔ ان سے ان کے بیٹے عباس اور زہری اور ابوحازم روایت کرتے ہیں۔

(۳۲۲) سہل بن ابی حثمہ: — یہ سہل بن ابی حثمہ ہیں اور ابومحمد ان کی کنیت ہے اور انہی کو ابوعمارہ انصاری اوسی کہا جاتا ہے ۳ھ میں پیدا ہوئے اور کوفہ میں اقامت گزیں ہوئے اور مدینہ والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے اور مدینہ ہی میں مصعب بن زبیر کے زمانہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ایک بڑا گروہ ان سے روایت حدیث کرتا ہے۔

(۳۲۳) سہیل بن حنیف انصاری: — یہ سہل بن حنیف انصاری اوسی ہیں یہ جنگ "بدر" "احد" اور تمام غزوات میں شریک ہوئے جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے اور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت علی کے ساتھی اور ہمنشین رہے، ان کو حضرت علیؓ نے مدینہ میں اپنا قائم مقام بنایا اور اس کے بعد حاکم فارس بنا دیا ان سے ان کے بیٹے ابوامامہ وغیرہ روایت حدیث کرتے ہیں، ۳۸ھ میں کوفہ میں انتقال ہوا۔

(۳۲۴) سہل بن بیضاء: — یہ سہل بن بیضاء ہیں اور ان ہی کے بھائی سہیل تھے، بیضاء ان دونوں کی ماں تھی کہ جس کا نام "وعد" تھا۔ اور ان کے باپ "وہب بن ربیعہ" تھے اور سہل ان مسلمانوں میں سے ہیں کہ جن کا اسلام مکہ میں ظاہر ہوا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مکہ میں اپنے اسلام کو چھپاتے تھے مشرکین کے ساتھ بدر میں پہنچے، اسی زمانہ میں ایک دن گرفتار کر لئے گئے تو عبداللہ بن مسعودؓ نے ان کے متعلق گواہی دی کہ میں نے ان کو مکہ میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے تو یہ چھوڑ دیئے گئے پھر مدینہ ہی میں ان کی وفات ہوئی اور آنحضرت

نے ان کی اور ان کے بھائی کی نمازہ جنازہ مسجد میں پڑھائی، دونوں بھائیوں کا ذکر نماز جنازہ کے بیان میں آیا ہے۔

(۳۲۵) سہل بن الحنظلیہ: - یہ سہل بن حنظلیہ ہیں ان کے دادا کی والدہ کا نام تھا اور بعض کہتے ہیں کہ ان کی والدہ کا نام ان ہی کی جانب یہ منسوب ہوتے ہیں اور اسی نام سے متعارف ہیں، ان کے باپ کا نام ربیع بن عمرو تھا اور سہل ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی، بڑے فاضل تھے اور نہایت خلوت پسند ذکر و نماز میں بے حد مشغول و منہمک ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ملک شام میں سکونت تھی اور انتقال امیر معاویہ کے شروع خلافت کے زمانہ میں دمشق میں ہوا۔

(۳۲۶) سہیل بن عمرو: - یہ سہیل بن عمرو قرشی عامری ابوجندل کے والد تھے۔ قریش کے معزز لوگوں میں سے تھے جنگ بدر میں بحالت کفر گرفتار ہوئے، قبیلہ قریش کے خطیب بھی تھے اس لئے حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ یارسول اللہ (ﷺ) ان کے دانت نکلواڈالئے کہ آئندہ کبھی آپ (ﷺ) کے خلاف خطبہ نہ دے سکیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چھوڑو جی شاید یہ کبھی ایسے مرتبہ پر پہنچیں کہ جس کی تم بھی تعریف کرو، اور یہی "صلح حدیبیہ" میں حاضر ہوئے اور رسول اللہؐ کی وفات کے بعد جب لوگوں نے مکہ میں اختلاف کیا اور جس نے مرتد ہونا تھا وہ مرتد ہوا تو اس وقت یہی سہیل خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور لوگوں کو تسلی و تشفی دی اور اس ارتداد و اختلاف سے لوگوں کو روکا ۱۸ھ میں طاعون عمو اس میں ان کا انتقال ہوا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "یرموک" میں قتل کئے گئے، ایک دوسرے نسخہ میں انہی سہیل بن عمرو کے بارہ میں حافظ ابن عبدالبر سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت عمر کے دروازہ کو گھیر لیا جن میں سہیل بن عمرو ابوسفیان بن حرب بھی تھے اور یہ لوگ قریش کے معززین میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے اجازت دینے کے لئے ایک جوان نکلا جو سب سے پہلے بدریوں کو اجازت داخلہ کی دے رہا تھا جیسے صہیب رومی حضرت بلال حبشی اس پر ابوسفیان نے کہا کہ میں نے آج کے دن جیسا معاملہ کبھی نہیں دیکھا کہ غلاموں کو تو اجازت دی جا رہی ہے اور ہم شرفاء بیٹھے ہیں ہماری طرف توجہ بھی نہیں کی جاتی اس پر یہ سہیل بولے "اے لوگ! بخدا میں اس کراہت کو جو تمہارے چہروں میں ہے محسوس کر رہا ہوں اگر تم غضب ناک ہو تو اپنے نفس پر غصہ کرو کیونکہ سب لوگوں کو دعوت اسلام دی گئی تھی ان کے ساتھ تم کو بھی دی گئی تھی لیکن دوسرے لوگ اسلام میں جلدی آپہنچے، تم نے آنے میں دیر کی کان کھول کر سن لو یقیناً وہ شرف اور فضیلت کہ جس میں یہ غلام تم سے سبقت لے گئے (فضیلت اسلام) زیادہ بھاری ہے قوت کے لحاظ سے تمہارے اس دروازے سے جس کے بارہ میں تم آپس میں جھگڑ رہے ہو۔" اس کے بعد فرمایا "اے لوگو) یہ غلام تم سے اس فضیلت اسلام میں آگے نکل گئے، اب تمہارے لئے کوئی راستہ اس فضیلت کی طرف نہیں ہے جس میں وہ تم سے آگے نکل گئے ہیں۔ اب اس جہاد کا خیال رکھو اور اس کو اپنے لئے ضروری خیال کرو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو شہادت کا درجہ نصیب فرمائے اور تم سرخ روئی کے ساتھ خدا سے جلد جا ملو پھر کپڑے جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور ملک شام تک چلے گئے حسن نے فرمایا اس مرد پر تعجب ہے کہ وہ کس قدر عقل مند ہے اور اپنے قول میں سچا ہے، قسم ہے خدا کی ہرگز اللہ تعالیٰ اس بندہ کو جو اس کی طرف جلد پہنچا ہے اس بندہ کی طرح نہیں بنائے گا، جو اس کے پاس دیر میں پہنچا ہے۔

(۳۲۷) سہیل بن بیضاء: - یہ سہیل بن بیضاء قریشی ہیں، ان کے نسب کا پورا ذکر ان کے بھائی سہل کے ذکر میں گزر گیا ابتداہی میں مسلمان ہوئے حبشہ کی دوبارہ ہجرت کی بدر اور تمام غزوات میں شریک رہے ان سے عبداللہ بن انیس اور انس بن مالک روایت کرتے ہیں۔ ان کا انتقال ۹ھ میں جب کہ حضور علیہ السلام زندہ تھے اور تبوک سے واپس تشریف لائے تب ہوا، اپنے پیچھے کوئی اولاد نہ چھوڑی۔

(۳۲۸) سمرہ بن جندب: - یہ سمرہ بن جندب الفزاری ہیں یہ قبیلہ انصار کے حلیف تھے، حافظ تھے اور رسول اللہ سے بہت روایت کرتے تھے اور ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے بصرہ میں ۵۹ھ کے آخیر میں انتقال ہوا۔

(۳۲۹) سلیمان بن صرد: — یہ سلیمان بن صرد ہیں ان کی کنیت ابوالمطرف ہے، خزاعی تھے بہت ہی اچھے فاضل اور عابد آدمی تھے جب سے مسلمان کوفہ میں داخل ہوئے، یہ اسی وقت سے کوفہ میں رہنے لگے تھے ان کی عمر ۹۳ سال کی ہوئی صرد صاد مہملہ کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

(۳۳۰) سلیمان بن بریدہ: — یہ سلیمان بن بریدہ اسلمی ہیں یہ اپنے باپ اور عمران بن حصین سے روایت کرتے ہیں اور ان سے علقمہ وغیرہ ۱۰۵ھ میں وفات ہوئی۔

(۳۳۱) سلمہ بن اکوع: — یہ سلمہ بن اکوع ہیں ان کی کنیت ابومسلم ہے، اسلمی مدنی ہیں! درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے ہیں۔ پیدل جنگ کرنے والوں میں سب سے زیادہ بہادر اور قوی تھی ۷۴ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا اس وقت اسی سال کی عمر تھی۔ ان سے بہت لوگ روایت کرتے ہیں۔

(۳۳۲) سلمہ بن ہشام: — یہ قرشی مخزومی مہاجرین حبشہ میں سے ہیں، اچھے اور صاحب فضل صحابی ہیں اور یہ ابوجہل کے بھائی تھے شروع زمانہ میں اسلام لے آئے تھے اور اللہ کی راہ میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور مکہ میں نظر بند کئے گئے، رسول اللہ ﷺ جن کمزور اور ضعیفوں کے لئے قنوت میں دعا فرماتے تھے اس میں ان کو بھی شریک فرماتے تھے، یہ مکہ میں قید ہونے کی وجہ سے جنگ بدر میں شریک نہ ہوسکے ۱۴ھ میں جب کہ حضرت عمرؓ کی خلافت تھی "جنگ مرج الصفر" میں قتل ہوئے۔

(۳۳۳) سلمۃ بن صخر: — یہ سلمہ ہیں صخر انصاری بیاضی ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کا نام سلیمان تھا، یہی وہ ہیں کہ جنہوں نے اپنی بیوی سے ظہار کرنے کے بعد جماع کرلیا تھا۔ رونے اور گریہ کرنے والوں میں سے یہ بھی تھے، ان سے سلمان بن یسار اور ابن مسیب روایت کرتے ہیں، بخاریؒ نے فرمایا ہے کہ ان کی روایت معتبر نہیں ہے۔

(۳۳۴) سلمۃ بن المحبق: — یہ سلمہ بن محبق ہیں ابوسنان ان کی کنیت ہے محبق کا نام صخر بن عتبہ الہذلی تھا بصریوں میں سے سمجھے جاتے ہیں محبق میں میم کا پیش حاء مہملہ کا فتحہ بائے موحدہ کا کسرہ ہے اور مشدد ہے آخر میں قاف ہے اصحاب حدیث باء پر فتحہ دیتے ہیں۔

(۳۳۵) سلمۃ بن قیس: — یہ سلمہ بن قیس اشجعی ہیں۔ ابوعاصم ان کو شامی کہتے ہیں اور کوفہ کے رہنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے بلال بن یساف وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۳۳۶) سلمان فارسی: — یہ سلمان فارسی ہیں ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے رسول اللہ کے آزاد کردہ ہیں، فارسی الاصل رامہرمز کے رہنے والوں میں سے ہیں، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اصفہان کے مضافات میں ایک گاؤں "جی" نامی ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ دین کی طلب میں سفر کیا۔ اور سب سے پہلے نصرانی مذہب اختیار کیا اور ان کی کتابیں دیکھیں اور اسی دین پر پے در پے مشقتیں برداشت کرتے ہوئے رکے رہے، پھر قوم عرب نے ان کو گرفتار کرلیا اور یہودیوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا، پھر انہوں نے یہودیوں سے مکاتبت کرلی تو رسول اللہ ﷺ نے بدل کتابت میں ان کی مدد فرمائی کہا جاتا ہے کہ یہ سلمان فارسی آنحضور کے پاس جب آپ ﷺ مدینہ آئے کچھ اوپر دس آقاؤں کے غلام رہ کر پہنچے تب مسلمان ہوئے حضور علیہ السلام نے فرمایا، سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں، اور یہ بھی انہی میں سے ہیں کہ جن کے قدوم کی جنت الفردوس متمنی ہے، ان کی عمر بہت زیادہ ہوئی کہا جاتا کہ اڑھائی سو سال اور بعض روایتوں میں ہے، ساڑھے تین سو سال کی عمر ہوئی لیکن پہلا قول صحیح ہے، اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے اور وظیفہ کو صدقہ کردیا کرتے تھے۔ ان کی بہت سی تعریفیں اور فضائل کا ذخیرہ ہے آنحضرت ﷺ سے ان کی تعریف میں متعدد احادیث منقول ہیں ۳۵ھ میں شہر مدائن میں انتقال ہوا۔

ابوہریرہ اور انس وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۳۳۷) سلمان بن عامر: — یہ سلیمان بن عامر ضبی ہیں ان کو بصریوں میں شمار کیا جاتا ہے اور بعض علماء کا خیال ہے کہ صحابہ میں سے روایت کرنے والوں میں ان کے علاوہ کوئی ضبی نہیں ہے۔

(۳۳۸) سفینہ: — یہ سفینہ ہیں جو کہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ام سلمہ زوجہ محترمہ نبی کریم ﷺ نے ان کو آزاد کیا تھا اور تاحیات ان سے نبی کریم ﷺ کی خدمت کا عہد لیا تھا، کہتے ہیں کہ سفینہ ان کا لقب تھا اور ان کے نام کے بارہ میں اختلاف ہے بعض نے ریاح کہا ہے اور بعض نے مہران اور بعض نے رومان، عربی النسل تھے بعض نے فارسی الاصل کہا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم ایک سفر میں تھے پس جب کوئی تھک جاتا تو وہ اپنی تلوار ڈھال نیزہ ان پر ڈال دیتا یہاں تک کہ ان پر بہت سی چیزیں لاددی گئیں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ بار برداری کے حق میں تو سفینہ (یعنی کشتی) ہے۔ ان سے ان کے بیٹے عبدالرحمن، محمد زیادہ اور کثیر روایت کرتے ہیں۔

(۳۳۹) سالم بن معقل: — یہ سالم بن معقل ہیں جو آزاد کردہ ہیں ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ کے فارس اصطرخ کے رہنے والوں میں سے تھے، آزاد کردہ لوگوں میں بڑے فاضل و افضل واکرم صحابہ میں سے تھے، ان کا شمار خاص قراء میں کیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ چار آدمیوں سے قرآن سیکھو، ابن ام عبد سے، ابی بن کعب سے سالم بن معقل یعنی مولی ابی حذیفہ سے اور معاذ بن جبل سے یہ بدر میں شریک ہوئے ہیں، ان سے ثابت بن قیس اور ابن عمرو غیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۳۴۰) سالم بن عبید: — یہ سالم بن عبید اشجعی ہیں اہل صفہ میں سے تھے ان کو اہل کوفہ میں سمجھا جاتا ہے ان سے بلال بن یساف روایت کرتے ہیں۔ یساف دو نقطوں والی یاء کے فتحہ کے ساتھ ہیں "س" مہملہ پر تشدید نہیں ہے آخر میں فاء ہے۔

(۳۴۱) سراقہ بن مالک: — یہ سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی کنانی ہیں "قدید" میں آتے جاتے تھے اور اہل مدینہ میں شمار کئے جاتے تھے، ایک بڑی جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔ بڑے اونچے درجہ کے شاعروں میں سے تھے ۲۴ھ میں وفات ہوئی۔

(۳۴۲) سفیان بن اسید: — یہ سفیان بن اسید الحضرمی الشامی ہیں، جبیر بن نفیر نے ان سے حمص والوں کے بارہ میں روایت کی ہے۔ اسید اکثر کے نزدیک فتح ہمزہ اور کسرہ سین کے ساتھ ہے اور روایت کے مطابق ہمزہ اور فتح سین کے ساتھ اور تیسرے قول کے مطابق فتح ہمزہ اور فتح سین کے ساتھ بغیر یاء کے یعنی اسدہ

(۳۴۳) سفیان بن عبداللہ: — یہ سفیان بن عبداللہ بن زمعہ ہیں۔ ان کی کنیت ابو عمرو ثقفی ہے۔ اہل طائف میں ان کا شمار ہے، صحابی تھے اور طائف میں حضرت عمر کی جانب سے حاکم تھے۔

(۳۴۴) سفیان بن ابی زہیر: — یہ سفیان ہیں ابی زہیر کے بیٹے ازدی ہیں، قبیلہ شنوئی کے رہنے والے حجازیوں میں ان کی حدیث مروج ہے۔ ابن الزبیر وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۳۴۵) سخبرۃ: — یہ سخبرہ ہیں اور ان کی کنیت ابو عبداللہ ازدی ہے ان سے ان کے بیٹے عبداللہ روایت کرتے ہیں، ان کی ایک روایت کتاب العلم میں ہے، سخبرہ میں سین پر فتحہ اور خاء معجمہ ساکن اور باء موحدہ مفتوح ہے۔

(۳۴۶) السائب بن یزید: — یہ سائب بن یزید ہیں اور ان کی کنیت ابو یزید کندی ہے ۲ھ میں پیدا ہوئے اور جب کہ ان کی عمر

سات سال کی تھی اپنے والد ماجد کے ہمراہ حجۃ الوداع میں حاضر ہوئے ان سے زہری اور محمد بن یوسف روایت کرتے ہیں۔ ۸۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۳۴۷) السائب بن خلاد: — یہ سائب بن خالد ہیں اور ان کی کنیت ابو سہلہ ہے، انصاری خزرجی تھے۔ ۹۱ھ میں وفات ہوئی۔ ان سے ابن خلاد اور عطاء بن یسار روایت کرتے ہیں۔

(۳۴۸) سوید بن قیس: — یہ سوید بن قیس ہیں اور ان کی کنیت ابو صفوان ہے ان سے سماک بن حرب روایت کرتے ہیں اور ان کو کوفیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

(۳۴۹) ابو سیف القین: — یہ ابو سیف القین ہیں آنحضورؐ کے صاحبزادہ ابراہیم کے رضاعی باپ تھے۔ اور ان کا نام براء بن اوس انصاری ہے، یہ اپنی کنیت کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں اور ان کی بیوی ام بردہ ہیں جنہوں نے ابراہیمؓ کو دودھ پلایا تھا۔

(۳۵۰) ابو سعید سعد بن مالک: — یہ ابو سعید سعد بن مالک انصاری خدری ہیں، اپنی کنیت کے ساتھ ہی مشہور ہوگئے حافظ حدیث اور صاحب فضل و عقل علماء میں سے تھے۔ احادیث کی بہت روایت کرتے ہیں، صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت ان سے روایت حدیث کرتی ہے ۷۴ھ میں انتقال کیا اور جنت البقیع میں سپرد خاک کئے گئے۔ ۸۴ برس کی عمر پائی۔ خدرہ خاء معجمہ کے ضمہ اور دال مہملہ کے سکون کے ساتھ ہے۔

(۳۵۱) ابو سعید بن المعلی: — یہ ابو سعید حارث بن معلی انصاری زرقی ہیں۔ جب کہ ان کی چونسٹھ برس کی عمر تھی تو انہوں نے ۶۴ھ میں وفات پائی۔

(۳۵۲) ابو سعید بن ابی فضالہ: — یہ ابو سعید بن ابی فضالہ حارثی انصاری ہیں ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے اہل مدینہ میں شمار کئے جاتے ہیں ان کی حدیث حمید بن جعفر سے مروی ہے جو اپنے باپ سے اور وہ زیاد بن مینا سے روایت کرتے ہیں "مینا" میم کے کسرہ اور دو نقطوں والی یاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ پھر نون ہے مد کے ساتھ بھی ہے اور بلا مد کے بھی۔

(۳۵۳) ابو سلمہ: — یہ ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد کے بیٹے مخزومی قرشی آنحضرت ﷺ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں۔ ان کی والدہ "برہ" عبدالمطلب کی بیٹی تھیں اور حضور سے پہلے یہ ام سلمہ کے شوہر تھے دس سال کے بعد یہ اسلام لائے۔ تمام غزوات میں شریک رہے یہاں تک کہ ۴ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا اور ان کی کنیت بھی نام سے زیادہ مشہور ہے۔

(۳۵۴) ابو سفیان بن حرب: — یہ ابو سفیان بن صخر بن حرب بنو امیہ میں سے قرشی ہیں۔ حضرت معاویہؓ کے والد ہیں، عام فیل سے دس برس پہلے پیدا ہوئے، اسلام سے پہلے قریش کے معزز سرداروں میں سمجھے جاتے تھے اور قریش کے سرداروں کا جھنڈا انہیں کے پاس رہتا تھا فتح مکہ کے دن اسلام لائے یہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کے دل میں اسلام کی محبت قائم کرنے کے لئے ان کے ساتھ خاص سلوک کیا جاتا تھا، اسلام میں تالیف قلب کی گئی، غزوہ حنین میں انہوں نے شرکت کی اور آنحضور نے وہاں کے مال غنیمت میں سے ان کو بھی مؤلفۃ القلوب میں داخل رکھتے ہوئے سو اونٹ اور چالیس اوقیہ عطا فرمائے، غزوہ طائف میں ان کی ایک آنکھ پھوٹ گئی پھر یہ جنگ یرموک تک یک چشم ہی رہے یرموک میں ان کی دوسری آنکھ پر پتھر کی ضرب آئی اور بالکل نابینا ہوگئے ان سے عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں ۳۴ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔

(۳۵۵) ابو سفیان بن حارث: — یہ ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹے اور دودھ شریک

بھائی ہیں وہ اس لئے کہ حلیمہ سعدیہ نے ان کو بھی دودھ پلایا تھا، ایک جماعت کہتی ہے کہ ان کا نام مغیرہ تھا اور دوسری جماعت کا خیال تھا کہ نہیں بلکہ نام ان کی کنیت ہی تھی۔ اور مغیرہ تو ان کے بھائی تھے ان شعراء میں سے ہیں جن کے نقش قدم پر دوسرے چلتے تھے اور انہوں نے پہلے رسول اللہ ﷺ کی ہجو کی تھی کہ جس کا جواب حسان بن ثابت نے دیا تھا پھر اسلام لائے اور اس شان سے کہ رسول اللہ کے سامنے حیاو شرم کی وجہ سے کبھی سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی، یہ فتح مکہ میں مشرف باسلام ہوئے، ان کے اسلام لانے کا واقعہ عجیب وغریب ہے، حضرت علی نے ان سے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے حاضر ہو اور ان سے وہ کہو کہ جو یوسف علیہ السلام کے مجرم بھائیوں نے یوسف علیہ السلام سے کہا تھا۔ تاللہ لقد اثرک اللہ علینا یعنی خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہم پر ترجیح دی اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہم مجرم اور گنہ گار ہیں تو ابوسفیان نے ایسا ہی کیا رسول اللہ صلعم نے یہ سن کر فرمایا لا تثریب علیکم الیوم الخ یعنی آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تعالیٰ تمہاری خطائیں معاف فرمائے اور وہ سب سے زیادہ رحم والے ہیں آنحضور نے ان کی یہ توبہ قبول فرمائی اور یہ اسلام لائے، ان کی موت کا یہ سبب ہوا کہ انہوں نے حج کیا اور جب نائی نے ان کا سر مونڈا تو ایک مساجو ان کے سر میں تھا کاٹ دیا اسی وجہ سے یہ تکلیف میں مبتلا ہوگئے یہاں تک کہ حج سے واپسی کے بعد ۲۰ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا اور عقیل بن ابی طالبؓ کے مکان میں دفن ہوئے حضرت عمرؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

(۳۵۶) ابوالسمح: — یہ ابوالسمح ہیں اور ان کا نام ایاد تھا آنحضور کے خادم تھے اور بعض کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں "ایاد" کسرہ ہمزہ اور تخفیف یاء کے ساتھ ہے ان کے انتقال کا مقام معلوم نہیں۔

(۳۵۷) ابوسہلہ: — یہ ابوسہلہ سائب ہیں جو خلاد کے بیٹے ہیں ان کا تذکرہ اس سے پہلے اسی حرف میں آچکا ہے۔

تابعین

(۳۵۸) سعید بن المسیب: — یہ سعید بن مسیب ہیں اور ان کی کنیت ابومحمد ہے قریشی مخزومی مدنی ہیں، جب حضرت عمرؓ کی خلافت کو دو سال گزر گئے تھے تو یہ پیدا ہوئے اور ان تابعین سرداروں میں سے تھے کہ جو نقش اول (یعنی صحابہ کی طرز زندگی) پر گامزن تھے۔ وہ فقہ وحدیث زہد وعبادت اور تقوی وطہارت کے جامع تھے ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے ان ہی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور ان ہی کو مخصوص کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث اور عمرؓ کے فیصلوں کے سبب سے بڑے عالم تھے، صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے انہوں نے ملاقات کی اور ان سب سے انہوں نے روایت کی ہیں اور ان سے زہری اور بہت سے تابعین نے، مکحول کا بیان ہے کہ میں نے طلب علم میں تمام روئے زمین کو چھان مارا لیکن ابن مسیب سے بڑا عالم اور فقیہ کوئی دکھائی نہیں دیا اور خود ابن مسیب کہتے تھے کہ میں نے چالیس حج کئے ہیں ۹۳ھ میں انتقال ہوا۔

(۳۵۹) سعید بن عبدالعزیز: — یہ سعید بن عبدالعزیز تنوخی دمشقی ہیں۔ اوزاعی کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی اہل شام کے فقیہوں میں ان کا شمار تھا۔ احمد کا بیان ہے کہ ملک شام میں سعید بن عبدالعزیز اور اوزاعی سے زیادہ کسی کی حدیثیں صحیح نہیں اور کہتے تھے کہ ان میں اور اوزاعی میں میرے نزدیک کوئی فرق نہیں اور سعید بہت زیادہ رویا کرتے تھے ان سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ جب بھی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو ہمیشہ دوزخ متشکل ہو کر میرے سامنے لائی جاتی ہے، نسائی کا کہنا ہے کہ یہ ثقہ اور جماد والے ہیں یہ مکحول اور زہری سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ثوری ۱۶۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور ان کی عمر اوپر ستر سال کی ہوئی۔

(۳۶۰) سعید بن ابی الحسن: — یہ سعید بن ابی الحسن ہیں اور ان کا نام یسار ہے بصرہ کے رہنے والے اور تابعی ہیں، یہ ابن عباس اور

ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے قتادہ وعون ۱۰۹ھ میں اپنے بھائی سے ایک سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔

(۳۶۱) سعید بن حارث: — یہ سعید بن حارث بن معلی انصاری حجازی ہیں مدینہ کے قاضی اور بڑے مشہور تابعین میں سے ہیں انہوں نے ابن عمر، ابوسعید وجابر سے۔ اور ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی ہے۔

(۳۶۲) سعید بن ابی ہند: — یہ سعید بن ابی ہند سمرہ کے آزاد کردہ ہیں اور ابوموسیٰؓ اشعری اور ابوہریرہؓ وابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ان کے بیٹے عبداللہ اور نافع بن عرم الجحمی مشہور ثقہ ہیں۔

(۳۶۳) سعید بن جبیر: — یہ سعید بن جبیر اسدی کوفی ہیں جلیل القدر تابعین میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ انہوں نے ابومسعود ابن عباس اور ابن عمر اور ابن زبیر وانسؓ سے علم حاصل کیا اور ان سے بہت لوگوں نے، ماہ شعبان ۶۵ھ میں جب کہ ان کی عمر انچاس سال کی تھی، حجاج بن یوسف نے ان کو قتل کرایا اور خود حجاج رمضان میں مرا اور بعض کے نزدیک اسی سال شوال میں اور یوں بھی کہتے ہیں کہ ان کے شہادت کے چھ ماہ بعد مرا ان کے بعد حجاج کسی کے قتل پر قادر نہیں ہوا، کیونکہ سعید نے حجاج پر بددعا کی تھی جب کہ حجاج ان سے مخاطب ہوکر بولا کہ بتاؤ کہ تم کو کس طرح قتل کیا جائے، میں تم کو اسی طرح قتل کرونگا سعید بولے کہ اے حجاج تو اپنا قتل ہونا جس طرح چاہے وہ بتلا اس لئے کہ خدا کی قسم جس طرح تو مجھ کو قتل کرے گا اسی طرح آخرت میں مین تجھ کو قتل کرونگا، حجاج بولا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تم کو معاف کردوں بولے کہ اگر عفو واقع ہوا تو وہ اللہ کی طرف سے ہوگا، اور رہا تو تو اس میں تیرے لئے کوئی برائت وعذر نہیں۔ حجاج یہ سن کر بولا کہ ان کو لے جاؤ اور قتل کرڈالو، پس جب ان کو دروازہ سے باہر نکالا تو یہ ہنس پڑے، ان کی اطلاع حجاج کو پہنچائی گئی تو حکم دیا کہ ان کو واپس لاؤ لہٰذا واپس لایا گیا تو اس نے پوچھا کہ اب ہنسنے کا کیا سبب تھا بولے کہ مجھ کو اللہ کے مقابلے میں تیری بیباکی اور اللہ تعالیٰ کی تیرے مقابل میں حلم وبردباری پر تعجب ہوتا ہے حجاج نے یہ سن کر حکم دیا کہ کھال بچھائی جائے۔ تو بچھائی گئی۔ پھر حکم دیا کہ ان کو قتل کردیا جائے، اس کے بعد سعید نے فرمایا کہ وجھت وجھی للذی فطر السموت والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔ یعنی میں نے اپنا رخ سب سے موڑ کر اس خدا کی طرف کرلیا ہے جو خالق آسمان وزمین ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں، حجاج نے یہ سن کر حکم دیا کہ ان کو قبلہ کی مخالف سمت کرکے مضبوط باندھ دیا جائے، سعید نے فرمایا فاینما تولو فثم وجہ اللہ جس طرف کو بھی تم رخ کروگے اسی طرف اللہ ہے، اب حجاج نے حکم دیا سر کے بل اوندھا کردیا جائے سعید نے فرمایا منہا خلقنا کم وفیہا نعید کم ومنہا نخرجکم تارۃ اخری حجاج نے یہ سن کر حکم دیا اس کو ذبح کردو، سعید نے فرمایا کہ میں شہادت دیتا ہوں اور حجت پیش کرتا ہوں اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور اس بات کی کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں یہ (حجت ایمان) میری طرف سے سنبھال یہاں تک کہ تو مجھ سے قیامت کے دن ملے پھر سعید نے دعا کی کہ اے اللہ حجاج کو میرے بعد کسی کے قتل پر قادر نہ کر، اس کے بعد کھال پر ان کو ذبح کردیا گیا، کہتے ہیں کہ حجاج ان کے قتل کے بعد پندرہ راتیں اور جیا اس کے بعد حجاج کے پیٹ میں کیڑوں کی بیماری پیدا ہوگئی، حجاج نے حکیم کو بلوایا تاکہ معاینہ کرے۔ حکیم نے گوشت کا ایک سڑا ہوا ٹکڑا منگوایا اور اس کو دھاگے میں پروکر اس کے گلے سے اتارا اور کچھ دیر تک چھوڑے رکھا، اس کے بعد حکیم نے اس کو نکالا تو دیکھا کہ خون سے بھرا ہوا ہے، حکیم یہ سمجھ گیا کہ اب یہ بچنے والا نہیں، حجاج اپنی بقیہ زندگی میں چیختا رہتا تھا کہ مجھے اور سعید کو کیا ہوگیا کہ جب میں سوتا ہوں تو میرا پاؤں پکڑ کر ہلادیتا ہے، سعید بن جبیر عراق کی کھلی آبادی میں دفن کئے گئے۔ اور ان کی قبر وہاں زیارت گاہ ہے۔

(۳۶۴) سعید بن ابراہیم: — یہ سعید بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف زہری قرشی قاضی مدینہ اور مدینہ کے فضلاء اور اکابر تابعین میں سے ہیں انہوں نے اپنے والد اور ان کے علاوہ لوگوں سے سماعت حدیث کی ہے ۱۳۵ھ میں ان کا انتقال ہوا جب کہ ان کی عمر بہتر سال کی تھی۔

(۳۶۵) سعید بن ہشام: — یہ سعید بن ہشام انصاری ہیں اونچے درجہ کے تابعین میں سے ہیں انہوں نے حضرت عائشہ اور حضرت ابن عمرؓ وغیرہ سے سنا اور ان سے حسن روایت کرتے ہیں اور ان کی حدیث اہل بصرہ میں پائی جاتی ہے۔

(۳۶۶) سفیان بن دینار: — یہ سفیان بن دینار خرما فروش کوفی ہیں، سعید بن جبیر اور مصعب بن سعد سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابن مبارک وغیرہ حضرت معاویہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور آنحضرت کے مزار مبارک کی زیارت ان کو نصیب ہوئی۔

(۳۶۷) سفیان ثوری: — یہ سفیان بن سعید ثوری کوفی امام المسلمین ہیں اور مخلوق پر اللہ کی حجت کاملہ ہیں اپنے زمانہ میں فقہ اور اجتہاد کے جامع تھے حدیث کے بڑے عالم اور زاہد وعابد اور متقی اور ثقہ تھے اور خصوصاً علم حدیث وغیرہ علوم کے مرجع تھے تمام لوگ ان کی دین داری، زہد پرہیز گاری اور ثقہ ہونے پر متفق ہیں اور کوئی بھی ایسا نہیں کہ جو اس میں اختلاف کرتا ہو ائمہ مجتہدین میں سے ایک یہ بھی ہیں، قطب اسلام نیز ارکان دین میں ان کا بھی شمار ہے ۹۹ھ میں سلیمان بن عبد الملک کے زمانہ میں ان کی پیدائش ہوئی، انہوں نے ایک بڑی جماعت محدثین سے روایات حاصل کیں، ان ان سے معمر، اوزاعی، ابن جریج، مالک، شعبہ، ابن عیینہ، فضیل بن عیاض اور ان کے علاوہ بہت سے آدمی روایت کرتے ہیں، ۱۶۱ھ میں بصرہ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۳۶۸) سفیان بن عیینہ: — یہ سفیان بن عیینہ ہلالی ہیں ان کے آزاد کردہ ہیں ۱۰۷ھ میں جب کہ نصف شعبان گزر چکا تھا کوفہ میں ان کی ولادت ہوئی یہ امام تھے اور عالم تھے۔ محدثین کے نزدیک قابل اعتماد ہیں۔ حجۃ فی الحدیث زہد و متورع تھے ان کی صحت حدیث پر سب کا اتفاق ہے، انہوں نے زہری اور اس کے علاوہ بہت سے لوگوں سے سنا اور ان سے اعمش، ثوری، شعبہ، شافعی، احمد اور ان کے علاوہ بہت سے محدثین نے روایت کی ہے، سب کا کہنا ہے کہ اگر مالک اور سفیان نہ ہوتے تو حجاز کا علم جاتا رہتا ۱۹۸ھ میں رجب کی پہلی کو مکہ میں ان کا انتقال ہوا اور حجون میں دفن کئے گئے۔ انہوں نے ستّر حج کئے تھے۔

(۳۶۹) سلیمان بن حرب: — یہ سلیمان بن حرب بصری مکہ کے قاضی ہیں بصریوں کے جلیل القدر اور صاحب علم لوگوں میں سے ایک یہ بھی ہیں، ابو حاتم نے ان کے بارے میں کہا کہ یہ آئمہ میں سے تھے، تقریباً دس ہزار حدیثیں ان سے مروی ہیں، حالانکہ میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ اور بغداد میں میں ان کی مجلس میں حاضر ہوا تو تخمینہ کیا گیا کہ شرکاء کی تعداد چالیس ہزار تھی ۱۴۰ھ ماہ صفر میں پیدا ہوئے اور ۱۵۸ھ تک طلب حدیث میں سرگرداں رہے اور انیس سال تک حماد بن زید کی خدمت میں لگے رہے ان سے احمد وغیرہ روایت کرتے ہیں ۲۳۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۳۷۰) سلیمان بن ابی مسلم: — یہ سلیمان بن ابی مسلم احول مکی ہیں اور ابن نجیح کے ماموں ہیں، حجاز کے تابعین اور علماء میں بڑے ثقہ سمجھے جاتے ہیں، انہوں نے طاؤس اور ابوسلمہ سے سماع حدیث کیا، اور ان سے ابن عیینہ ابن جریج وشعبہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۳۷۱) سلیمان بن ابی حثمہ: — یہ سلیمان بن ابی حثمہ قریشی وعدوی ہیں، مسلمانوں میں بڑے ہی فاضل اور صالح لوگوں میں ان کا شمار تھا، بڑے درجہ کے تابعین میں سمجھے جاتے تھے، ان سے ان کے بیٹے ابوبکر روایت کرتے ہیں۔

(۳۷۲) سلیمان بن مولی میمونہ: — یہ سلیمان بن مولی میمونہ ہیں اور یہ مشہور ابن یسار نہیں ہیں، تابعی ہیں۔

(۳۷۳) سلیمان بن عامر: — یہ سلیمان بن عامر کندی ہیں۔ اور یہ ربیع بن انس سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابن راہویہ اور ان کے علاوہ بہت سے لوگ نقل کرتے ہیں۔

(۳۷۴) سلیمان بن ابی عبداللہ: — یہ سلیمان بن ابی عبداللہ تابعی ہیں اور انہوں نے صحابہ مہاجرین کا زمانہ پایا ہے۔ یہ سعد بن ابی وقاص اور ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں، امام ابوداؤد نے ان کی حدیث فضائل مدینہ میں ذکر کی ہے۔

(۳۷۵) سلیمان بن یسار: — یہ سلیمان بن یسار ہیں ان کی کنیت ابوایوب ہے، یہ میمونہ زوجہ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ ہیں ان کے بھائی عطاء بن یسار ہیں، اہل مدینہ سے ہیں بڑے درجہ کے تابعین میں سے ہیں، یہ فقیہہ فاضل قابل اعتماد، عابد، پرہیزگار اور حجت تھے (یعنی ان کی طرف کسی قول کا منسوب ہونا مستقل دلیل تھی) اور سات فقیہوں میں سے ایک یہ بھی ہیں ۱۰۷ھ میں ان کا انتقال ہوا، جب کہ ان کی عمر ۷۳ سال کی تھی۔

(۳۷۶) سالم بن عبداللہ: — یہ سالم حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب کے بیٹے ہیں، مدینہ کے فقہاء میں سے یہ بھی ہیں اور تابعین کے سرخیل اور علماء و معتمدین میں سے ہیں ۱۰۶ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۳۷۷) سالم بن ابی الجعد: — یہ سالم بن ابی الجعد ہیں اور ان کا نام رافع کوفی ہے مشہور اور معتبر تابعین میں سے ہیں، ابن عمرو اور جابر وانس؄ سے حدیث کو سنا اور ان سے منصور واعمش روایت کرتے ہیں۔ ۹۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۳۷۸) سیار بن سلامہ: — یہ سیار بن سلا ہیں اور ان کی کنیت ابوالمنہال بصری تمیمی ہے۔ مشہور تابعین میں سے ہیں۔

(۳۷۹) سماک بن حرب: — یہ سماک بن حرب ذہلی ہیں اور ان کی کنیت ابومغیرہ ہے، جابر بن سمرۃ اور نعمان بن بشیر سے روایت کرتے ہیں اور ان سے شعبہ وزائدہ، ان سے تقریباً دو سو حدیثیں مروی ہیں اور یہ ثقہ تھے لیکن حافظہ کمزور ہوگیا تھا ان کو ابن مبارک وشعبہ وغیرہ نے ضعیف کہا ہے ۱۳۲ھ میں انتقال ہوا۔

(۳۸۰) سوید بن وہب: — یہ سوید بن وہب ہیں اور ابن عجلان کے اساتذہ میں سے ہیں۔

(۳۸۱) ابوالسائب: — یہ ابوالسائب ہشام بن زہرہ کے آزاد کردہ ہیں، تابعی ہیں اور ابوہریرہ ابوسعید ومغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے علاء بن عبدالرحمن۔

(۳۸۲) ابوسلمہ: — یہ ابوسلمہ ہیں اپنے چچا عبداللہ بن عبدالرحمن بن عوف سے روایت کرتے ہیں۔ زہری قریشی ہیں ایک قول کے اعتبار سے مدینہ کے مشہور سات فقہاء میں سے ہیں۔ اور مشہور وصاحب علم تابعین میں سے ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے اور ان سے زیادہ حدیثیں مروی ہیں۔ ابن عباس ابوہریرہ اور ابن عمرو غیرہ سے انہوں نے حدیث کو سنا اور ان سے زہری، یحییٰ بن کثیر، شعبی وغیرہ روایت کرتے ہیں ۹۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ جب کہ ان کی عمر بہتر سال کی تھی۔

(۳۸۳) ابوسورہ: — یہ ابوسورہ ہیں یہ اپنے چچا ابوایوب اور عدی بن حاتم سے روایت کرتے ہیں اور ان سے واصل بن سائب اور یحییٰ بن جابر طائی ابن معین وغیرہ نے ان کو ضعیف کہا ہے اور امام ترمذی فرماتے تھے کہ میں نے محمد بن اسماعیل کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوسورہ کی احادیث غیر معروف ونامشہور ہیں۔

صحابی عورتیں

(۳۸۴) سودۃ: — یہ سودۃ بنت زمعہ ام المؤمنین ہیں شروع زمانہ میں اسلام لے آئیں تھیں اور وہ اپنے چچا کے بیٹے سکران بن عمرو کے

نکاح میں تھیں جب ان کے شوہر کا انتقال ہو تو ان سے رسول اللہ ﷺ نے نکاح کر لیا اور ان کے ساتھ مکہ میں خلوت ہوئی یہ نکاح حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد اور حضرت عائشہ کے نکاح سے پہلے ہوا۔ انہوں نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ جب بوڑھی ہوگئیں تو آپ ﷺ نے چاہا کہ ان کو طلاق دے دیں تو آنحضرت ﷺ سے انہوں نے درخواست کی کہ آپ ﷺ ان کو طلاق نہ دیں اور سودہ نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہ کو دے دیا۔ آپ ﷺ نے ان کو اپنے نکاح میں رکھا۔ ماہ شوال ۵۴ ھ میں مدینہ میں انتقال کیا۔

(۳۸۵) ام سلمہ: ۔ یہ ام سلمہ ام المؤمنین ہند بنت ابی امیہ ہیں جناب رسول کریم ﷺ سے پہلے ابو سلمہ کے نکاح میں تھیں۔ جب ابو سلمہ ۴ھ یا ۳ھ میں انتقال کر گئے تو انہوں نے آنحضور سے اسی سال کہ جس میں ابو سلمہ کا انتقال ہوا تھا جب کہ ماہ شوال کی کچھ راتیں باقی رہ گئیں تھیں نکاح کر لیا۔ پھر ۵۹ھ میں ان کا انتقال ہوا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں، اس کی عمر چوراسی برس کی تھی، ان سے ابن عباس، حضرت عائشہ اور زینب ان کی بیٹی اور ان کے بیٹے، اور ابن المسیب اور صحابہ و تابعین کی ایک بڑی جماعت روایت کرتی ہے۔

(۳۸۶) ام سلیم: ۔ یہ ام سلیم ملحان کی بیٹی ہیں۔ اور ان کے نام میں اختلاف ہے، باقوال مختلفہ سہلہ اور رملہ اور ملیکہ و غمیصہ اور رمیصا بیان کیا گیا ہے، مالک بن نضر انس بن مالک کے والد نے ان سے نکاح کیا، انہی کے بطن سے انس پیدا ہوئے پھر یہ مالک بن نضر بحالت کفر قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد یہ اسلام لے آئیں، ابو طلحہ نے جب یہ مشرک تھے ان سے پیغام ڈالا تو انہوں نے انکار کر دیا اور ان کو اسلام کی دعوت دی، ابو طلحہ اسلام لے آئے تو انہوں نے کہا کہ میں اب تم سے شادی کرتی ہوں۔ اور تم سے مہر سوائے تمہارے کچھ نہیں لوں گی طلحہ نے ان سے شادی کر لی، ان سے بڑی جماعت روایت کرتی ہے، ملحان کسرہ میم اور سکون لام اور حائے مہملہ کے ساتھ ہے۔

(۳۸۷) سبیعہ: ۔ سبیعہ حارث کی بیٹی ہیں، قبیلہ اسلم کی ہیں اسعد بن خولہ کے نکاح میں تھیں پھر حجۃ الوداع والے سال میں اسعد کا انتقال ہوا ان کی حدیث کوفہ میں زیادہ ہے اور ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔

(۳۸۸) سہیمہ بنت عمر: ۔ یہ سہیمہ عمر کی بیٹی قبیلہ مزینہ کی ہیں، رکانہ بن عبد زید کے نکاح میں تھیں، ان کا ذکر طلاق کے بارے میں آتا ہے، سہیمہ سین کے پیش اور ہاء کے زبر کے ساتھ ہے۔

(۳۸۹) سلامہ بنت حر: ۔ یہ سلامہ بنت حر ازدیہ ہیں اور فزاریہ بھی کہا جاتا ہے ان کی حدیث کوفہ والوں میں مروی ہے۔ یہ وہ لفظ حر ہے جو عبد کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔

(۳۹۰) سلمی: ۔ یہ سلمی رافع کی ماں اور ابو رافع کی زوجہ صحابیہ ہیں، ان سے ان کے بیٹے عبداللہ بن علی روایت کرتے ہیں، ابراہیم ابن رسول اللہ ﷺ کی دایہ تھیں اور حضرت فاطمہ کو بنت عمیس کے ہمراہ انہوں نے غسل دیا۔

(ش)

صحابہ

(۳۹۱) شداد بن اوس: ۔ یہ شداد بن اوس ہیں، ان کی کنیت ابو یعلی انصاری ہے اور حسان بن ثابت کے بھتیجے ہیں بیت المقدس میں قیام تھا، اہل شام میں شمار ہوتے تھے ۵۸ھ میں جب کہ ان کی عمر پچھتر سال کی تھی، ملک شام میں انتقال ہوا۔ عبادہ بن صامت اور ابو درداء کہا کرتے تھے کہ شداد ان لوگوں میں سے تھے کہ جن کو علم و حلم کی دولت سے نوازا گیا تھا۔

(۳۹۲) **شریح بن ہانی:** — یہ شریح بن ہانی ابوالمقدام حارثی ہیں انہوں نے آنحضور کا عہد مبارک پایا۔ اور ان شریح کے نام کے ساتھ ہی آنحضور نے ان کے باپ ہانی بن زید کی کنیت رکھی تھی اور فرمایا تھا کہ تم ابو شریح ہو شریح حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں سے تھے، ان کے بیٹے مقدام ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۳۹۳) **شرید بن سوید:** — یہ شرید بن سوید ثقفی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ حضرموت کے تھے لیکن ان کو قبیلہ ثقیف سے شمار کیا گیا ہے اور بعضے ان کو اہل طائف سے بتلاتے ہیں اور ان کی حدیث حجازیوں میں پائی جاتی ہے، ان سے بہت سے آدمی روایت کرتے ہیں۔

(۳۹۴) **شکل بن حمید:** — یہ شکل بن حمید عیسیٰ ہیں ان سے ان کے بیٹے شتیر کے علاوہ اور کوئی روایت نہیں کرتا اور ان کا شمار کوفیوں میں ہے، شکل، شین اور کاف کے زبر اور لام کے ساتھ ہے اور شتیر، شتر کی تصغیر ہے۔

(۳۹۵) **شریک بن سحماء:** — یہ شریک بن سحماء ہیں اور سحماء ان کی ماں ہے کہ جن کی نسبت سے یہ مشہور ہوئے اور ان کے باپ عبدۃ بن مغیث ہیں جن کا ذکر لعان کے مسائل میں آتا ہے اور یہ وہ ہیں جن پر ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی کے بارے میں تہمت لگائی تھی، اور اس کے بعد لعان کرنا پڑا تھا یہ اپنے باپ کے ساتھ غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے۔ عبدہ عین اور باء کے زبر کے ساتھ ہے۔ اور بعض نے بائے موحدہ پر جزم پڑھا ہے۔

(۳۹۶) **ابو شبرمۃ:** — یہ ابو شبرمہ ہیں اور لفظ شبرمہ میں شین پر پیش اور باء ساکن اور را پر پیش ہے، صحابی ہیں ان کی نسبت معلوم نہیں۔ حضرت عباس کی حدیث میں حج کی نیابت کے سلسلہ میں ان کا ذکر آتا ہے۔ آنحضور کے زمانہ حیات ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

(۳۹۷) **ابو شریح:** — یہ ابو شریح خویلد بن عمرو کعبی عدوی، خزاعی ہیں، فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے ۶۸ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ اور یہ اپنی کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔ اہل حجاز میں ان کا شمار ہے۔

تابعین

(۳۹۸) **شقیق بن ابی سلمۃ:** — یہ شقیق بن ابی سلمۃ ہیں ابو وائل اسدی ان کی کنیت ہے، انہوں نے اگرچہ آنحضور کا زمانہ پایا لیکن آپ ﷺ سے کچھ سنا نہیں ہے۔ کہا کرتے تھے کہ میری عمر بعثت نبوی سے پہلے دس سال کی تھی اس وقت میں اپنے بھیڑ بکریاں جنگل میں چرا رہا تھا۔ صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے روایت کرتے ہیں ان میں عمر بن خطاب، ابن مسعود ہیں، ابن مسعود کے خاص لوگوں میں سے اور ان کے بڑے درجہ کے اصحاب میں سے تھے ان سے بہت حدیثیں مروی ہیں معتمد و حجت تھے حجاج کے زمانہ میں انتقال ہوا۔ اور ایک قول ہے کہ ۹۹ھ میں ہوا۔

(۳۹۹) **شریق الہوزنی:** — یہ شریق ہوزنی تابعی ہیں حضرت عائشہؓ سے روایت فرماتے ہیں اور ان سے ازہر حرازی۔

(۴۰۰) **شریک بن شہاب:** — یہ شریک بن شہاب حارثی بصری ہیں اور ان کو تابعین سے شمار کیا گیا ہے۔ ابی برزہ اسلمی سے روایت کرتے ہیں اور ارزق بن قیس ان سے روایت کرتے ہیں لیکن اس بارہ میں مشہور نہیں۔

(۴۰۱) **شریح بن عبید:** — یہ شریح بن عبید حضرمی ہیں ابوامامہ و جبیر بن نفیر سے روایت کرتے ہیں اور ان سے صفوان بن عمرو اور معاویہ بن صالح۔

(۴۰۲) ابوالشعثاء: — یہ ابوالشعثا سلیم بن اسود محاربی کوفی ہیں مشہور اور معتبر تابعیوں میں سے ہیں۔ حجاج کے عہد میں ان کا انتقال ہوا۔

(۴۰۳) شعبی: — عامر بن شراحیل کوفی ہیں اور مشہور ذی علم لوگوں میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ حضرت عمر کے دور خلافت میں پیدا ہوئے بہت سے صحابہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ایک بڑا گروہ روایت کرتا ہے۔ فرماتے تھے کہ میں نے پانچ سو صحابہ کو دیکھا اور کبھی کوئی حرف کسی کاغذ پر نہیں لکھا اور مجھ سے جو حدیث بھی بیان کی گئی میں نے اس کو حافظہ میں محفوظ کر لیا۔ ابن عیینہ کا قول ہے کہ ابن عباس اپنے زمانہ کے اور شعبی اپنے دور کے امام تھے، اور زہری نے کہا کہ علماء تو چار ہی گذرے ہیں یعنی ابن المسیب مدینہ میں اور شعبی کوفہ میں، حسن بصرہ میں اور مکحول شام میں ۱۰۴ھ میں جب کہ ان کی عمر ۸۲ برس کی تھی انتقال ہوا۔

(۴۰۴) ابن شہاب: — یہ زہری ہیں ان کا ذکر حرف زاء کے ماتحت گذر چکا ہے۔

(۴۰۵) شیبہ بن ربیعۃ: — یہ شیبہ بن ربیعہ بن عبد الشمس بن عبد مناف جاہلی ہے، جنگ بدر میں حضرت علیؓ نے اس کو قتل کیا، یہ مشرک تھا۔

صحابی عورتیں

(۴۰۶) الشفاء بنت عبداللہ: — یہ شفا بنت عبداللہ قریشی عدوی ہیں، احمد بن صالح مصری کہتے ہیں کہ ان کا نام لیلی ہے اور شفا لقب ہے جو نام پر غالب آگیا، ہجرت سے پہلے اسلام لائیں بڑی عاقلہ اور فاضلہ عورتوں میں سے تھیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ ان کے یہاں تشریف لاتے تھے اور دوپہر کو وہیں آرام فرماتے اور انہوں نے آنحضور کے لئے بستر اور لنگی کا انتظام کر رکھا تھا، آپ اسی بستر میں آرام فرماتے تھے شفا شین کے کسرہ اور فاء اور مد کے ساتھ آتا ہے۔

(۴۰۷) ام شریک غزیۃ: — یہ ام شریک غزیۃ بنت دودان قریشیہ عامریہ، صحابیہ ہیں۔ دودان دال مہملہ کے پیش کے ساتھ ہے۔

(۴۰۸) ام شریک انصاریہ: — یہ ام شریک انصاریہ ہیں کہ جن کا ذکر کتاب العدہ میں فاطمہ بنت قیس کی حدیث میں آیا ہے جب کہ رسول اللہ صلعم نے فاطمہ سے فرمایا تھا کہ جاؤ ام شریک کے گھر میں عدت پوری کرو اور بعضوں نے کہا ہے کہ جس کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم آنحضور نے دیا تھا وہ ام شریک اولی ہیں لیکن ان کا یہ قول صحیح نہیں اس لئے کہ ام شریک اولی قریشی لوی بن غالب کی اولاد میں سے تھیں اور یہ انصاریہ ہیں کیونکہ فاطمہ بنت قیس کی بعض روایات میں آیا ہے کہ ام شریک ایک مالدار عورت ہیں انصار میں سے۔

(ص)

صحابہ

(۴۰۹) صفوان بن عسال: — یہ صفوان بن عسال مرادی ہیں کوفہ کے رہنے والے تھے ان کی حدیث اہل کوفہ میں شائع تھی۔ عسال میں عین پر زبر اور سین مہملہ پر تشدید اور لام ہے۔

(۴۱۰) صفوان بن معطل: — ان کی کنیت ابو عمرو سلمی ہے انہوں نے غزوہ خندق اور اس کے علاوہ تمام غزوات میں شرکت کی اور

انہیں کے بارہ میں وہ سب کچھ کہا گیا ہے۔ بڑے نیک صاحب فضل بہادر انسان تھے، غزوۂ رمینیہ میں ۱۰ھ میں شہید ہوئے جب کہ ان کی عمر ساٹھ سے کچھ اوپر تھی۔

(۴۱۱) صفوان بن امیۃ: - یہ صفوان بن امیہ بن خلف جمحی قریشی ہیں فتح مکہ کے دن مسلمانوں سے بھاگے۔ پھر عمیر بن وہب اور ان کے بیٹے وہب بن عمیر نے رسول اللہ صلعم سے ان کے لئے پناہ طلب کی تھی ان پر آپ ﷺ نے امان دے دی تھی اور ان دونوں کو امن کی علامت کے طور پر اپنی چادر عطا فرمائی، پھر وہب نے صفوان بن امیہ کو پالیا اور آنحضور کے پاس لے آئے تو صفوان نے آپ ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ یہ وہب بن عمیر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھ کو امن دیا ہے کہ میں دو ماہ تک آزادانہ چلوں پھروں اس پر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اے ابو وہب (سواری سے) نیچے اترو، تو صفوان نے کہا کہ میں اس وقت تک نہیں اتروں گا جب تک کہ آپ ﷺ صاف صاف نہ بتاویں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی سواری سے نیچے اترو اور تمہارے لئے ۴ ماہ تک آزادانہ چلنے پھرنے کی اجازت ہے پس صفوان اتر آئے اور آنحضور ﷺ کے ساتھ غزوۂ حنین اور طائف میں بحالت کفر شریک ہوئے آنحضور نے مال غنیمت میں سے اس کو بہت کچھ دیا۔ اس پر صفوان نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ اس کثیر غنیمت کو دے کر نبی کے پاکیزہ نفس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص خوش نہیں ہو سکتا اور اسی دن اسلام لے آئے اور مکہ میں قیام کیا، پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور حضرت عباس کے پاس قیام کیا اور اپنی ہجرت کا واقعہ آنحضور کے سامنے پیش کیا آنحضور نے فرمایا کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں رہی (کیونکہ اب مکہ بھی دار الاسلام بن چکا ہے) صفوان زمانہ جاہلیت میں قریش کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے، ان کی بیوی ان سے ایک ماہ پہلے اسلام لے آئی تھیں جب صفوان بھی مسلمان ہو گیا تو دونوں کا نکاح برقرار رکھا گیا ۴۲ھ میں مکہ میں صفوان کا انتقال ہوا۔ ان سے متعدد آدمی روایت کرتے ہیں اور یہ ان میں سے ہیں کہ جن کے ساتھ اسلام پر راسخ کرنے کے لئے تالیف قلب کا معاملہ کیا جاتا تھا۔ یہ مکہ میں ہی مخلص مسلمان بن چکے تھے اور یہ قریش کے فصیح زبان لوگوں میں سے تھے۔

(۴۱۲) صخر بن وداعہ: - یہ صخر بن وداعہ غامدی ہیں اور یہی ابن عمرو ابن عبداللہ بن کعب ہیں جو قبیلہ ازد کے ہیں اگرچہ طائف میں قیام تھا مگر اہل حجاز میں شمار ہوتے تھے۔

(۴۱۳) صخر بن حرب: - یہ صخر بن حرب ہیں جن کی کنیت ابوسفیان قریشی ہے۔ امیر معاویہ کے والد ہیں ان کا ذکر حرف السین کے تحت گزر چکا ہے۔

(۴۱۴) صہیب بن سنان: - یہ صہیب بن سنان عبداللہ بن جدعان تیمی کے آزاد کردہ ہیں، ان کی کنیت ابویحییٰ ہے، دجلہ اور فرات کے درمیان شہر موصل میں ان کے مکانات تھے رومیوں نے ان اطراف میں یورش کی اور ان کو قید کر لیا ابھی یہ چھوٹے سے بچہ ہی تھے، لہٰذا نشو ونما "روم" ہی میں ہوئی رومیوں سے ان کو قبیلہ کلب نے خرید لیا اور ان کو مکہ لے آئے۔ کلب سے عبداللہ بن جدعان نے خرید لیا اور آزاد کر دیا، یہ بھی مرتے دم تک عبداللہ ہی کے ساتھ رہے کہا جاتا ہے کہ یہ روم میں جب بڑے ہو کر کچھ سوجھ بوجھ ہوئی بھاگ کر مکہ آ گئے اور عبداللہ بن جدعان کے حلیف بنے پہلے ہی مکہ میں مسلمان ہوئے اور یوں بھی کہا جاتا کہ آنحضور جب دار ارقم میں کچھ اوپر تیس آدمیوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے تو انہوں نے اور عمار بن یاسر نے ایک ہی دن آ کر اسلام قبول کیا یہ بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کو کمزور سمجھا گیا اور مکہ میں تکالیف پہنچائی گئیں۔ اس لئے یہ مدینہ کو ہجرت کر گئے اور انہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ ومن الناس من یشتری نفسہ الخ۔ ان سے ایک بڑی جماعت روایت کرتی ہے ۸۰ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا اور جنت البقیع میں سپرد خاک کئے گئے۔ اس وقت ان کی عمر نوے سال کی تھی۔ "جدعان" جیم کے پیش اور دال کے جزم کے ساتھ ہے اس کے بعد عین مہملہ ہے۔

(۴۱۵) **الصعب بن جثامہ:** — یہ صعب بن جثامہ لیثی ہیں ودان ابواء میں جو کہ سرزمین حجاز میں واقع ہے ان کا قیام تھا ان کی حدیث بھی اہل حجاز ہی میں پائی جاتی ہے، عبداللہ بن عباس وغیرہ سے روایت کرتے ہیں حضرت ابوبکر کے زمانہ خلافت میں انتقال ہوا جثامہ جیم کے زبر اور ثائے مثلثہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔

(۴۱۶) **الصنابحی:** — یہ صنابحی ہیں اس لفظ میں ص پر پیش ہے اور نون غیر مشدد ہے اور ایک لفظ ب اور حاء مہملہ ہے، یہ صنابحی اس لئے مشہور ہے کہ ضابح بن زاہر بن عامر کی طرف منسوب ہوئے یہ قبیلہ مراد کی ایک شاخ ہے ان کا ذکر ان کے نام عبداللہ کے ماتحت حرف عین میں آئے گا۔

(۴۱۷) **ابوصرمۃ:** — یہ ابوصرمۃ مالک بن قیس مازنی ہیں اور بعضوں نے قیس بن مالک بتایا ہے اور بعض نے قیس بن صرمہ بھی کہا ہے، اور یہ اپنی کنیت سے مشہور ہیں انہوں نے بدر اور بقیہ غزوات میں شرکت کی، ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے "صرمہ" صاد کے زیر اور راء ساکن کے ساتھ ہے۔

تابعین

(۴۱۸) **صالح بن خوات:** — یہ صالح بن خوات انصاری مدنی مشہور تابعی ہیں ان کی حدیث عزیز کے درجہ کی ہے انہوں نے حدیث کو اپنے باپ اور سہل بن ابی حثمہ سے سنا اور ان سے یزید بن رومان وغیرہ روایت کرتے ہیں، ان کی حدیث مدینہ والوں میں پائی جاتی ہے۔ خوات خائے معجمہ کے زبر واؤ کے تشدید اور تائے فوقانی دو نقطے والی ت کے ساتھ ہے۔

(۴۱۹) **صالح بن درہم:** — صالح بن درہم باہلی ہیں یہ ابوہریرہ اور سمرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے شعبہ اور قطان ثقہ ہیں۔

(۴۲۰) **صالح بن حسان:** — یہ صالح بن حسان مدنی ہیں بصرہ میں قیام تھا ابن المسیب اور عروہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابوعاصم اور حضرمی، ایک جماعت ان کی مرویات کو ضعیف کہتی ہے اور امام بخاری ان کی حدیث کو منکر قرار دیتے ہیں۔

(۴۲۱) **صخر بن عبداللہ:** — یہ صخر بن عبداللہ بن بریدہ ہیں یہ اپنے باپ اپنے دادا اور عکرمہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے حجاج بن حسان اور عبداللہ بن ثابت۔

(۴۲۲) **صفوان بن سلیم:** — یہ صفوان بن سلیم زہری ہیں حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف کے آزاد کردہ ہیں۔ مدینہ کے مشہور اور جلیل القدر تابعین میں سے ہیں انس بن مالک اور کچھ تابعین سے روایت کرتے ہیں اللہ کے صالح اور برگزیدہ بندوں میں سے تھے کہا جاتا ہے کہ چالیس سال تک پہلو زمین کو چھوایا تک نہیں، لوگ کہتے تھے کہ ان کی پیشانی کثرت سجود کی وجہ سے زخمی ہوگئی تھی اور شاہی عطیات کو قبول نہیں کرتے تھے اور ان کے مناقب بہت زیادہ ہیں ۱۳۲ھ میں انتقال ہوا ان سے ابن عیینہ روایت کرتے ہیں۔

(۴۲۳) **ابوصالح:** — یہ ابوصالح ذکوان ہیں جو گھی اور روغن زیتون کے تاجر اور مدنی تھے گھی اور زیتون کا تیل کوفہ لے جایا کرتے تھے۔ جویریہ بنت حارث زوجہ محترمہ نبی ﷺ کے آزاد کردہ تھے، بڑے جلیل القدر بہت مشہور اور بہت روایت کرنے والے تھے۔ ابوہریرہ اور ابوسعید سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابن سہیل اور اعمش۔

صحابی عورتیں

(۴۲۴) **صفیہ:** — یہ صفیہ حُیّی بن اخطب کی بیٹی ہیں جو بنی اسرائیل میں سے تھے اور ہارون بن عمران علی نبینا ﷺ کے نواسہ تھے۔ یہ صفیہ کنانۃ بن ابی الحقیق بیوی تھیں جو جنگ خیبر میں ماہ محرم ۷ھ میں قتل کر دیا گیا اور یہ قید ہو گئیں تو ان کو آنحضور ﷺ نے اپنے لئے پسند فرمالیا۔ بعض نے روایت کی ہے کہ یہ صفیہ حیہ بن خلیفہ کلبی کے حصہ غنیمت میں لگادی گئی تھیں پھر ان سے آنحضور ﷺ نے سات غلاموں کے بدلہ میں خرید لیا اس کے بعد یہ اسلام لے آئیں۔ پھر آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور نکاح کر لیا اور ان کا مہر ان کے عتق کو قرار دے دیا ۵۰ھ میں وفات اور جنت البقیع میں سپرد خاک کی گئیں ان سے حضرت انس اور ابن عمرو غیرہ روایت کرتے ہیں حُیّی میں حائے مہملہ کا پیش اور نیچے دو نقطہ والی یاء کا زبر اور دوسری یاء پر تشدید ہے۔ اخطب میں ہمزہ کا زبر خائے معجمہ کا جزم طائے مہملہ پر زبر آخر میں بائے موحدہ ہے۔

(۴۲۵) **صفیہ بنت عبد المطلب:** — یہ صفیہ عبد المطلب کی بیٹی آنحضور ﷺ کی پھوپی ہیں، اسلام سے پہلے حارث بن حرب کی زوجیت میں تھیں پھر وہ ہلاک ہو گیا، اس کے بعد عوام بن خویلد نے ان سے نکاح کر لیا تو ان سے زبیر پیدا ہوئے یہ طویل مدت تک زندہ رہیں اور حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور خلافت میں ۲۰ھ میں وفات پائی ان کی عمر ۷۳ سال کی ہوئی اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔

(۴۲۶) **صفیہ بنت ابی عبید:** — یہ صفیہ ابو عبید کی بیٹی ہیں، بنو ثقیف میں سے ہیں، مختار ابن ابی عبید کی بہن ہیں۔ اور حضرت عبد اللہ بن عمر کی بیوی ہیں آنحضور ﷺ کو انہوں نے پایا اور آپ ﷺ کے ارشادات کو سنا مگر ان سے روایت نہیں کی، حضرت عائشہ اور حفصہ سے روایت کرتی ہیں اور ان سے حضرت نافع ابن عمر کے آزاد کردہ روایت کرتے ہیں۔

(۴۲۷) **صفیہ بنت شیبۃ:** — یہ صفیہ شیبہ حجبی کی بیٹی ہیں ان سے میمون بن مہران وغیرہ روایت کرتے ہیں، آنحضور کے دیکھنے کے بارے میں ان کے متعلق اختلاف ہوا ہے بعض نے کہا کہ انہوں نے حضورؐ کی زیارت نہیں کی۔

(۴۲۸) **الصماء بنت بسر:** — یہ صماء بسر کی بیٹی ہیں۔ مازنی ہیں کہا گیا ہے کہ صماء ان کا لقب ہے اور ان کا نام بہیہ ہے ان سے ان کے بھائی عبد اللہ روایت کرتے ہیں۔

(ض)

صحابہ

(۴۲۹) **ضماد بن ثعلبہ:** — یہ ضماد بن ثعلبہ ازدی وشنوۃ میں سے ہیں آنحضور ﷺ کے زمانہ جاہلیت میں دوست تھے، علاج و معالجہ، جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے علم کے ہمیشہ جو یاں رہتے تھے شروع زمانہ میں اسلام لے آئے، یہی وہ ہیں جس وقت کچھ قرآن انہوں نے آنحضور سے سنا تو کہا کہ آپ ﷺ کے یہ کلمات سمندر سے زیادہ گہرائی رکھنے والے ہیں۔ ان کا ذکر باب علامات النبوۃ میں آتا ہے، حضرت ابن عباس ان سے روایت کرتے ہیں، ضماد کے ضاد کا کسرہ، میم غیر مشدد ہے شنوۃ کے شین کا زبر، نون کا پیش۔ واؤ ساکن ہمزہ کا زبر ہے۔

(۴۳۰) **الضحاک بن سفیان:** — یہ الضحاک بن سفیان کلابی عامری ہیں یہ اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں، نجد میں قیام تھا

آنحضور ﷺ نے ان کو ان کی قوم کے ان لوگوں پر حاکم بنادیا تھا جو اسلام لے آئے تھے، ابن مسیب اور حسن بصری ان سے روایت کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی شجاعت کی وجہ سے سو سواروں کے برابر سمجھے جاتے تھے، آنحضور ﷺ کے سر پر (حفاظت کے لئے) تلوار لے کر کھڑے ہوا کرتے تھے۔

تابعین

(۴۳۱) **ضحاک بن فیروز:** — ضحاک بن فیروز دیلمی تابعی ہیں ان کی حدیث بصریوں میں شائع ہے اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، ان کا ذکر حرف دال میں آچکا ہے۔

(۴۳۲) **ضرار بن صرد:** — یہ ضرار بن صرد ہیں ان کی کنیت ابو نعیم ہے کوفہ کے رہنے والے ہیں چکی والے مشہور ہیں معتمر بن سلیمان وغیرہ سے حدیث کو سنا اور ان سے علی بن منذر روایت کرتے ہیں، نعیم میں نون کا ضمہ عین مہملہ مفتوح ہے۔ ضرار میں ضاد کا کسرہ پہلی راء غیر مشدد ہے صرد میں صاد مہملہ کا ضمہ اور رائے مہملہ کا زیر ہے۔

(ط)

صحابہ

(۴۳۳) **طلحہ بن عبید اللہ:** — یہ طلحہ بن عبید اللہ ہیں جن کی کنیت ابو محمد قریشی ہے یہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، شروع ہی میں اسلام لے آئے تھے، تمام غزوات میں سوائے غزوۂ بدر کے شریک رہے ہیں، عدم شرکت کی وجہ یہ تھی کہ آنحضور ﷺ نے ان کو سعید بن زید کے ہمراہ اس غلہ کے قافلہ کا پتہ چلانے کے لئے روانہ کیا تھا جو قریش کا ابوسفیان بن حرب کے ساتھ آرہا تھا پس یہ دونوں بدر کی مڈ بھیڑ کے دن واپس ہوئے انہوں نے آنحضور ﷺ کی حفاظت کے لئے انہوں نے بدر کے دن اپنے ہاتھ سے حفاظت کی تو حملہ کی کثرت سے ان کے ہاتھ کی انگلیاں سن ہوگئی تھیں انہوں نے اس دن چوبیس زخم کھائے اور بعض نے کہا ہے کہ ان کے ۷۵ زخم لگے کچھ نیزے کے کچھ تلوار کے کچھ تیر کے، یہ طلحہ گندم گوں بہت بال والے تھے نہ بال ان کے بالکل گھنگھر والے ہی تھے اور نہ بالکل سیدھے ہی تھے، حسین چہرے والے تھے، جنگ جمل میں شہادت پائی جمعرات کے دن تیس جمادی الثانیہ ۳۲ھ میں۔ اور بصرہ میں دفن کئے گئے۔ ان کی چونسٹھ سال کی عمر ہوئی ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

(۴۳۴) **طلحہ بن البراء:** — یہ طلحہ بن البراء انصاری ہیں جن کے بارہ میں جس وقت ان کا انتقال ہوا تھا اور آپ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی تھی تو آنحضور ﷺ نے دعا کی تھی کہ اے اللہ ان سے ہنستے ہوئے ملاقات فرما، اور یہ بھی ہنستے ہوئے تیری خدمت میں حاضر ہوں، ان کا شمار حجاز کے علماء میں ہوتا ہے، ان سے حصین وحوع نے روایت کی ہے۔

(۴۳۵) **طلق بن علی:** — یہ طلق بن علی ہیں جن کی کنیت ابو علی حنفی یمامی ہے۔ ان کو طلق بن ثمامہ بھی کہا جاتا ہے، ان سے ان کے بیٹے قیس روایت کرتے ہیں۔

(۴۳۶) **طارق بن شہاب:** — یہ طارق بن شہاب ہیں جن کی کنیت ابو عبد اللہ ہے بجلی کوفی ہیں۔ زمانہ جاہلیت (یعنی اسلام سے پہلے کا زمانہ) میں موجود تھے۔ اور آنحضور ﷺ کو بھی دیکھا ہے۔ آپ ﷺ سے سماع حدیث ثابت نہیں مگر بہت کم۔ حضرت ابوبکرؓ اور

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ۳۴ غزوات میں شریک ہوئے ۸۲ھ میں وفات پائی۔

(۴۳۷) **طارق بن سوید**: — یہ طارق بن سوید ہیں ان کو آنحضور کا شرف صحبت حاصل ہے ان کی حدیث بیان خمر کے بارے میں موجود ہے۔ ان سے علقمہ بن وائل روایت کرتے ہیں۔

(۴۳۸) **الطفیل بن عمرو**: — یہ طفیل بن عمرو دوسی ہیں مکہ میں اسلام لائے اور حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی پھر اپنی قوم کے شہروں کی طرف لوٹ گئے اور آنحضور ﷺ کے ہجرت کرنے تک وہیں رہے پھر بخریت مع اپنی قوم کے ان لوگوں کے جنہوں نے آپ کے ساتھ رہنا چاہا آنحضور کی طرف ہجرت کی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خدمت مبارک میں آخر تک موجود رہے یہ جنگ یمامہ میں شہید کردیئے گئے اور بعض نے کہا ہے کہ جنگ یرموک میں دور خلافت عمرؓ شہید ہوئے ان سے جابرؓ اور ابوہریرہ روایت کرتے ہیں، ان کا شمار حجاز کے علماء میں ہوتا ہے۔

(۴۳۹) **ابوالطفیل**: — یہ ابوطفیل ہیں ان کا نام عامر ہے واثلہ کے بیٹے ہیں لیثی اور کنانی ہیں نام کی بہ نسبت کنیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔ آنحضور ﷺ کی پاک زندگی سے ان کو آٹھ سال نصیب ہوئے مکہ میں ۱۰۲ھ میں وفات پائی روئے زمین پر تمام صحابہ میں یہ آخری صحابی تھے، ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۴۴۰) **ابوطیبہ**: — یہ ابوطیبہ ہیں ان کا نام نافع ہے۔ پچھنے لگانے کا کام کیا کرتے تھے۔ محیصہ بن مسعود انصاری کے آزاد کردہ ہیں، مشہور صحابی ہیں۔ محیصہ کی میم مضموم ہے حائے مہملہ پر فتحہ ہے اور یائے تحتانی پر تشدید اور زیر ہے آخر میں صاد مہملہ ہے۔

(۴۴۱) **ابوطلحہ**: — یہ ابوطلحہ ہیں ان کا نام زید ہے۔ سہل انصاری بخاری کے بیٹے ہیں یہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہیں، یہ انس بن مالک کی والدہ کے شوہر ہیں، یہ مشہور تیر اندازوں میں سے ہیں آنحضور نے ان کے بارے میں فرمایا کہ ابوطلحہ کی آواز لشکر میں ایک جماعت کی آواز سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ ۳۱ھ میں وفات پائی جب کہ ان کی عمر ۷۰ سال کی تھی اور اہل بصرہ کا خیال ہے کہ وہ سمندر میں سفر کررہے تھے کہ انتقال ہوگیا اور کسی جزیرہ میں سات دن کے بعد دفن کئے گئے۔ بیعت عقبہ میں ستر صحابہ کے ساتھ یہ بھی شریک تھے پھر بدر اور اس کے بعد کے غزوات میں بھی شریک ہوئے ایک جماعت صحابہ کی ان سے روایت کرتی ہے۔

تابعین

(۴۴۲) **طلحہ بن عبداللہ**: — یہ طلحہ بن عبداللہ بن کریز خزاعی ہیں تابعی ہیں، اہل مدینہ میں سے ہیں، یہ ایک جماعت صحابہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے بھی ایک جماعت تابعین کی روایت کرتی ہے۔

(۴۴۳) **طلحہ بن عبداللہ**: — یہ طلحہ بن عبداللہ عوف زہری قریشی کے پوتے ہیں۔ مشہور تابعین میں سے ہیں ان کا شمار اہل مدینہ میں ہے۔ سخاوت کی صفت میں مشہور تھے۔ یہ اپنے چچا عبدالرحمٰن وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ ۹۹ھ میں وفات پائی۔

(۴۴۴) **طلق بن حبیب**: — یہ طلق بن حبیب عنزی بصری ہیں۔ یہ بڑے عابد اور کثرت عبادت میں مشہور تھے، عبداللہ بن جبیر اور جابر اور ابن عباس سے روایت کرتے، عبداللہ بن جبیر اور جابر اور ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے مصعب اور عمرو بن دینار وایوب عنزی میں عین مہملہ اور نون دونوں پر زبر ہیں۔

(۴۴۵) **الطفیل بن ابی**: — یہ طفیل بن ابی بن کعب انصاری کے بیٹے ہیں۔ تابعی ہیں۔ عزیز الحدیث ہیں، ان کی حدیث اہل حجاز

میں شائع ہے۔ اپنے باپ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابوالطفیل۔

(۴۴۶) طاوس بن کیسان: — یہ طاؤس بن کیسان خولانی ہمدانی یمانی ہیں۔ فارسی الاصل ہیں ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں اور انس سے زہری اور بڑی مخلوق روایت کرتی ہے۔ عمرو بن دینار کا مقولہ ہے کہ میں نے کوئی عالم طاوس جیسا نہیں دیکھا۔ وہ علم و عمل میں بہت اونچے تھے۔ مکہ میں ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

(۴۴۷) ابوطالب: — یہ ابوطالب حضور کے محترم چچا ہیں حضرت علیؓ کے والد ہیں ان کا نام عبد مناف بن عبد المطلب بن ہشام قرشی ہے۔ جاہلی ہیں۔ یعنی اسلام نصیب نہیں ہوا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو قریش نے آنحضور ﷺ سے بہت لے دے کی ہے، جس کی وجہ سے آنحضور طائف کی طرف تشریف لے گئے، ان کی اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے درمیان ایک ماہ پانچ دن کا فاصلہ ہے۔

(۴۴۸) ابن طاب: — مدینہ کی کھجور کے اعتبار سے ان کو رطب بن طاب اور تمر بن طاب کہا جاتا ہے۔

(ظ)

صحابہ

(۴۴۹) ظہیر بن رافع: — یہ ظہیر بن رافع حارثی ہیں انصار میں سے ہیں، قبیلہ اوس کے تھے عقبہ ثانیہ کی بیعت اور غزوہ بدر اور اس کے مابعد کے غزوات میں شریک رہے یہ رافع رافع بن خدیج کے علاوہ ہیں یہ رافع ان ظہیر سے روایت کرتے ہیں، ظہیر کی ظائے معجمہ پر پیش ہے اور ہائے مہملہ مفتوح اور دو نقطوں والی یائے ساکن ہے۔

(ع)

صحابہ

(۴۵۰) عمر بن الخطاب: — یہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب فاروق ہیں۔ ان کی کنیت ابوحفص ہے۔ عدوی قریشی ہیں نبوت کے چھٹے سال میں اسلام لائے اور بعض نے کہا کہ پانچویں میں۔ ان سے پہلے چالیس مرد اور گیارہ عورتیں اسلام لا چکی تھیں اور کہا جاتا ہے کہ چالیسویں مرد حضرت عمر ہی تھے، ان کے اسلام قبول کرنے کے دن سے ہی اسلام نمایاں ہونا شروع ہوا، اسی وجہ سے ان کا لقب فاروق ہو گیا۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا تھا کہ تمہارا لقب فاروق کیوں رکھا گیا۔ فرمایا کہ حضرت حمزہ میرے اسلام سے تین دن قبل اسلام لا چکے تھے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو اسلام کے لئے کھول دیا تو میں نے کہا۔ اللہ لا الہ الا ھو لہ الاسماء الحسنی (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں) اس کے بعد کوئی جان مجھ کو رسول اللہ ﷺ کی جان سے زیادہ پیاری نہ تھی اس کے بعد میں نے دریافت کیا کہ رسول اللہ کہاں تشریف فرما ہیں تو میری ہمشیرہ نے مجھ کو بتایا کہ وہ دار ارقم بن ابی ارقم میں جو کوہ صفا کے پاس ہے تشریف رکھتے ہیں ابو ارقم کے مکان پر حاضر ہوا۔ جب کہ حضرت حمزہ بھی آپ ﷺ کے اصحاب کے ساتھ مکان میں موجود تھے اور رسول اللہ ﷺ بھی گھر میں تشریف فرما تھے میں نے دروازہ کو پیٹا تو لوگوں نے نکلنا چاہا حضرت حمزہؓ نے فرمایا کہ تم کو کیا ہو گیا۔ سب نے کہا عمر بن خطاب ہے حضرت عمر کہتے ہیں آنحضور ﷺ باہر تشریف لائے اور مجھے

کپڑوں سے پکڑ لیا۔ پھر خوب زور سے مجھ کو اپنی طرف کھینچا۔ کہ میں رک نہ سکا اور گھٹنوں کے بل گر گیا اس کے بعد آنحضور نے ارشاد فرمایا کہ عمر اس کفر سے کب تک باز نہیں آو گے تو بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ اشھدان لا الہ الااللہ وحدہ لاشریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔ اس پر تمام دار ارقم کے لوگوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا جس کی آواز مسجد والوں نے بھی سنی حضرت عمر کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا ہم اپنی موت وحیات میں دین حق پر نہیں ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میری جان ہے تم سب حق پر ہو اپنی موت میں بھی اور حیات میں بھی اس پر میں نے عرض کیا تو پھر اس حق کو چھپانے کا کیا مطلب۔ قسم اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا ہے، ہم ضرور حق کو لے کر نکلیں گے چنانچہ ہم آنحضور ﷺ کو دو صفوں کے درمیان میں نکالا ایک صف میں حضرت حمزہ تھے اور دوسری صف میں میں۔ (یعنی حضرت عمر) اور میرے اندر جوش کی وجہ سے چکی کا سا گھڑگھڑاہٹ تھی، یہاں تک کہ ہم مسجد حرام میں پہنچ گئے تو مجھ کو اور حضرت حمزہ کو قریش نے دیکھا یہ دیکھ کر ان کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ ایسا صدمہ انہیں اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا، اس دن آنحضور ﷺ نے میرا نام فاروق رکھا کہ میری وجہ سے اللہ نے حق اور باطل میں فرق کر دیا، داؤد ابن حصین اور زہری نے روایت کیا کہ جب عمر اسلام لے آئے تو حضرت جبرئیل امین تشریف لائے اور فرمایا کہ اے محمد (ﷺ) تمام آسمان والے عمر کے اسلام سے، بہت خوش ہوئے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ قسم خدا کی میں یقین رکھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کے علم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور تمام روئے زمین کے زندہ انسانوں کا علم دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو حضرت عمرؓ کا علم والا پلہ جھک جائے گا۔ اور فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ حضرت عمر دس میں سے نو حصے علم اپنے ساتھ لے گئے۔ اور ایک حصہ باقی رہ گیا۔ وہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور یہ پہلے خلیفہ ہیں جو امیر المؤمنین کے لقب کے ساتھ پکارے گئے حضرت عمر گورے رنگ کے تھے جس میں سرخی غالب تھی اور بعض نے گندم گوں کہا ہے۔ لانبے قد کے تھے۔ سر کے بال اکثر گر گئے تھے آنکھیں خاصی سرخ رہتی تھیں حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد تمام امور انتظامیہ حضرت ابوبکرؓ کی وصیت اور ان کے متعین فرمانے کی وجہ سے کامل طور سے انجام دیا اور مغیرہ بن شعبہ کے غلام ابولولوہ نے مدینہ میں بدھ کے دن ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ میں آپ کو خنجر سے زخمی کیا اور دسویں تاریخ محرام الحرام کو اتوار کے دن ۲۴ھ میں (چودہ دن بیمار رہ کر) دفن کئے گئے ان کی عمر تریسٹھ سال کی ہوئی اور یہ ان کی عمر کے بارے میں سب سے صحیح قول ہے ان کی مدت خلافت دس سال ۶ ماہ ہے حضرت عمر کے جنازہ کی نماز حضرت صہیب رومی نے پڑھائی ان سے حضرت ابوبکرؓ اور باقی تمام عشرہ مبشرہ اور ایک بڑی جماعت صحابہ اور تابعین کی روایت کرتی ہے۔

(۴۵۱) عمر بن ابی سلمۃ: — یہ عمر بن ابی سلمہ ہیں ان کا نام عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی قریشی ہے اور یہ عمر آنحضور کے لے پالک تھے ان کی والدہ ام سلمہ ہیں جو ازواج مطہرات میں سے ہیں، ۲ھ میں حبشہ میں پیدا ہوئے اور جس وقت آنحضور کی وفات ہوئی تو ان کی عمر نو سال کی تھی۔ ۸۳ھ میں بزمانہ عبدالملک بن مروان مدینہ میں وفات پائی، آنحضور ﷺ سے احادیث کو سن کر یاد کیا، آنحضور سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ایک جماعت۔

(۴۵۲) عثمان بن عفان: — یہ امیر المؤمنین عثمان بن عفان ہیں ان کی کنیت ابوعبداللہ الاموی قریشی ہے ان کا اسلام لانا اول دور اسلام میں حضرت ابوبکر الصدیقؓ کے ہاتھوں پر آنحضرت ﷺ کے دار ارقم میں تشریف لے جانے سے پہلے ہی ہوا۔ انہوں نے حبشہ کی طرف دو مرتبہ ہجرت فرمائی، اور غزوہ بدر میں یہ شریک نہ ہوسکے کیوں کہ حضرت رقیہؓ آنحضور ﷺ کی صاحبزادی ان دنوں بیمار تھیں اور آنحضور ﷺ نے اس معذوری کی بنا پر ان کا حصہ مال غنیمت میں مقرر فرمایا تھا اور مقام حدیبیہ میں جو تحت شجرہ بیعت رضوان واقع ہوئی اس میں حضرت عثمان شرکت نہ فرما سکے کیونکہ آنحضور نے ان کو صلح کے معاملات طے کرنے کے لئے مکہ بھیج دیا تھا۔ جب

بیعت رضوان واقع ہوئی تو آنحضور نے اپنے دست مبارک کو دوسرے دست مبارک پر مار کر فرمایا کہ یہ بیعت عثمانؓ کے لئے ہے۔ اور ان کو ذوالنورین بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے عقد میں آنحضورؐ کی دو نور نظر یعنی صاحبزادیاں رقیہ اور ام کلثوم یکے بعد دیگرے آئیں تھی، یہ گورے رنگ کے میانہ قد تھے اور بعض نے کہا کہ گندم گوں تھے پتلی اور خوبصورت چہرے والے۔ آپ کا سینہ چوڑا تھا سر پر بال بہت زیادہ تھے بڑی داڑھی والے تھے داڑھی کو زرد رنگا کرتے تھے ۲۴ھ میں محرم الحرام کی پہلی تاریخ کو ان کو خلیفہ بنایا گیا تھا۔ اسود تجیبی نے جو مصر کا رہنے والا تھا ان کو قتل کیا تھا بعض نے کسی اور کو بتایا ہے۔ شنبہ کے روز جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ عمر شریف ۸۲ سال کی تھی اور بعض نے کہا ہے کہ ۸۸ سال کی تھی ان کا دور خلافت بارہ سال سے کچھ دن کم تک رہا ان سے بہت لوگوں نے روایت کیا ہے۔

(۴۵۳) **عثمان بن عامر:** — یہ عثمان بن عامر حضرت ابوبکر صدیق کے والد بزرگوار ہیں، قریشی بنو تمیم میں سے ہیں ان کی کنیت ابو قحافہ ہے قاف کے پیش کے ساتھ حائے مہملہ پر تشدید نہیں ہے فتح مکہ کے دن اسلام لائے اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت تک زندہ رہے۔ ۱۴ھ میں وفات پائی۔ اور ان کی ستانوے سال عمر تھی۔ ان سے صدیق اکبر نے اور اسماء بنت ابی بکر نے روایت کی ہے۔

(۴۵۴) **عثمان بن مظعون:** — یہ عثمان بن مظعون ہیں جن کی کنیت ابو سائب ہے۔ جمحی قرشی ہیں تیرہ آدمیوں کے بعد یہ اسلام لائے تھے ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں انہوں نے کی ہیں غزوہ بدر میں شریک ہوئے، زمانہ جاہلیت میں بھی شراب سے رکنے والے تھے، یہ مہاجرین میں سب سے پہلے شخص ہیں جن کی وفات مدینہ طیبہ میں شعبان کے مہینے میں ہجرت کے پورے تیس ماہ گزرنے پر واقع ہوئی، آنحضور ﷺ نے مرنے کے بعد ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور جب یہ دفن کئے گئے تو فرمایا یہ شخص گذرنے والوں میں سے ہمارے لئے بہترین شخص تھے، جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ بڑے عابد مرتاض صاحب فضل صحابہ میں سے تھے ان کے بیٹے سائب اور ان کے بھائی قدامہ بن مظعون ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۴۵۵) **عثمان بن طلحہ:** — یہ عثمان بن طلحہ عبدری قریشی حجمی مشرف بہ صحبت نبی کریم علیہ السلام ہیں ان کا ذکر باب المساجد میں آتا ہے۔ ان سے ان کے چچا کے بیٹے شیبہ اور ابن عمر روایت کرتے ہیں مکہ میں ۴۲ھ میں وفات پائی۔

(۴۵۶) **عثمان بن حنیف:** — یہ عثمان بن حنیف انصار میں سے ہیں سہل کے بھائی ہیں ان کو حضرت عمرؓ نے آبادی عراق کی پیمائش اور اس پر ٹیکس مقرر کرنے کا حاکم بنایا تھا اور وہاں کے رہنے والوں پر انہوں نے خراج اور جزیہ مقرر فرمایا تھا۔ اور ان کو حضرت علی نے بصرہ کا حاکم بنایا تھا پھر ان کو حضرت طلحہ اور زبیر نے نکال دیا جب کہ یہ دونوں بصرہ آئے۔ واقعہ جنگ جمل کی وجہ سے ایسا ہوا اس کے بعد یہ کوفہ میں مقیم رہے اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ تک زندہ رہے۔ ان سے ایک گروہ روایت کرتا ہے۔

(۴۵۷) **عثمان بن ابی العاص:** — یہ عثمان بن ابی العاص بنو ثقیف میں سے ہیں، آنحضور ﷺ نے ان کو طائف کا حاکم بنا دیا تھا، پس یہ آنحضورؐ کی زندگی بھر اور حضرت ابوبکر کے دور خلافت میں اسی طرح حضرت عمرؓ کی دور خلافت کے اول دو سال میں طائف کے ہی حاکم رہے اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ان کو طائف سے ہٹا کر عمان اور بحرین کا عامل بنا دیا۔ یہ عثمان بن ابی العاص وفد ثقیف میں شامل ہو کر آنحضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تھے۔ یہ جماعت وفد میں سب سے زیادہ کم عمر تھے اس وقت ان کی عمر ۲۹ سال تھی اور یہ وفد ۱۰ھ میں حاضر ہوا ہے اور یہ بصرہ میں رہے اور وہاں ہی ۵۱ھ میں وفات پائی، جب آنحضور ﷺ کی وفات کے بعد قبیلہ ثقیف نے مرتد ہونے کا ارادہ کیا تو ان سے عثمان بن ابی العاص نے فرمایا کہ اے ثقیف والو تم تمام لوگوں میں اسلام لانے کے اعتبار سے سب سے آخر تھے تو مرتد ہونے میں تو سب سے پہل مت کرو تو یہ لوگ مرتد ہونے سے رک گئے۔ ان سے ایک گروہ تابعین کا روایت کرتا ہے۔

(۴۵۸) **علی بن ابی طالب:** ۔ یہ امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب ہیں ان کی کنیت ابوالحسن اور ابوتراب ہے قریشی ہیں اکثر اقوال کے اعتبار سے مردوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں اس وقت ان کی عمر کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کی عمر ۱۵ سال تھی، بعض نے کہا ۱۶ سال اور بعض نے آٹھ سال اور بعض نے دس سال بیان کی ہے، آنحضور ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں سوائے غزوہ تبوک کے کہ وہ اپنے گھر والوں میں ضرورۃ رکھے گئے تھے، اسی واقعہ کے سلسلہ میں آنحضور ﷺ نے ان سے فرمایا تھا کہ کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ تمہیں میری جانب سے وہ حیثیت حاصل ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تھی۔ یہ گندم گوں تھے اور گیہوں رنگ کھلا ہوا تھا بڑی بڑی آنکھوں والے تھے لمبائی کے اعتبار سے کوتہ قامتی کی طرف زیادہ مائل تھے (یعنی زیادہ طویل القامت نہ تھے) پیٹ بڑا تھا، زیادہ بال والے، چوڑی داڑھی والے تھے، سر کے بال وسط میں سے اڑے ہوئے تھے، سر اور داڑھی دونوں سفید تھے، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دن جمعہ کا روز تھا ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو خلیفہ بنائے گئے تھے اور عبدالرحمن بن ملجم مرادی نے کوفہ میں ۱۸ رمضان المبارک کو جمعہ کی صبح کو آپؓ تلوار سے حملہ کیا تھا زخمی ہونے کے تین رات بعد انتقال فرما گئے، آپ کے دونوں صاحبزادے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن جعفر نے آپ کو غسل دیا نماز جنازہ حضرت حسنؓ نے پڑھائی، تڑکے وقت آپ کو دفن کیا گیا آپ کی عمر ۶۳ سال کی تھی، بعض نے کہا ہے ۶۵ سال اور بعض نے ستر سال اور بعض نے اٹھاون سال بتائی ہے، آپ کی مدت خلافت چار سال نو ماہ کچھ دن ہے، آپ سے آپ کے صاحبزادے حسنؓ و حسینؓ اور محمدؒ اور بہت سے صحابہ اور تابعین روایت کرتے ہیں۔

(۴۵۹) **علی بن شیبان:** ۔ یہ علی بن شیبان حنفی یمامی ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں۔

(۴۶۰) **علی بن طلق:** ۔ یہ علی بن طلق حنفی یمامی ہیں ان سے سلم بن سلام روایت کرتے ہیں یہ اہل یمامہ میں سے ہیں اور ان کی حدیث اہل یمامہ میں پائی جاتی ہے۔

(۴۶۱) **عبدالرحمٰن بن عوف:** ۔ یہ عبدالرحمٰن بن عوف ہیں ان کی کنیت ابو محمد ہے، یہ زہری قرشی ہیں، یہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔ شروع دور میں ہی حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اسلام لے آئے تھے، حبشہ کی طرف انہوں نے دونوں بار ہجرت فرمائی ہے، تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ موجود رہے ہیں اور غزوہ احد میں ثابت قدم رہے اور آنحضور ﷺ نے ان کے پیچھے غزوہ تبوک میں نماز پڑھی ہے اور جو حصہ نماز کا آنحضورؐ سے فوت ہو گیا تھا اس کو پورا فرمایا ہے۔ یہ طویل قامت باریک جلد والے گورے رنگ کے تھے جس میں سرخی جھلکتی تھی، گداز ہتھیلیوں والے، اونچی ناک والے تھے۔ غزوہ احد میں ان کے پاؤں میں لنگ واقع ہو گئی تھے اور ان کے بدن پر بیس یا کچھ زائد زخم لگے تھے، جن میں سے بعض زخم ان کے پیر اور ٹانگ پر لگے جس کی وجہ سے ان کے پیروں میں لنگ پیدا ہو گئی۔ عام فیل کے دس سال بعد یہ پیدا ہوئے اور ۳۲ھ میں ان کی وفات ہوئی، جنت البقیع میں دفن کئے گئے ان کی عمر ۷۶ سال کی ہوئی۔ ان سے عبداللہ بن عباس وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۴۶۲) **عبدالرحمٰن بن ابزی:** ۔ یہ عبدالرحمٰن بن ابزی خزاعی نافع بن عبدالحارث کے آزاد کردہ ہیں۔ انہوں نے کوفہ میں قیام کیا، حضرت علیؓ نے ان کو خراسان کا گورنر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے آنحضورؐ کی زیارت کی اور آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی ہے حضرت عمرؓ بن خطاب اور ابی بن کعبؓ سے زیادہ روایت کرتے ہیں اور ان سے ان کے دو بیٹے سعید اور عبداللہ وغیرہ روایت کرتے ہیں کوفہ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۴۶۳) **عبدالرحمٰن بن ازہر:** ۔ یہ عبدالرحمٰن بن ازہر قریشی عبدالرحمٰن بن عوف کے بھتیجے ہیں۔ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے ان

سے ان کے بیٹے عبدالحمید وغیرہ روایت کرتے ہیں واقعہ حرہ سے قبل ان کی وفات ہوئی ہے۔

(۴۶۴) **عبدالرحمٰن بن ابی بکر:** — یہ عبدالرحمٰن ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے ہیں ان کی والدہ ام رومان ہیں۔ جو حضرت عائشہؓ کی بھی والدہ ہیں، صلح حدیبیہ کے سال اسلام لائے اور بہترین مسلمان ثابت ہوئے، یہ حضرت ابوبکرؓ کی تمام اولاد میں بڑے تھے، ان سے حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ وغیرہ روایت کرتی ہیں ۵۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۴۶۵) **عبدالرحمٰن بن حسنہ:** — یہ عبدالرحمٰن حسنہ ہیں، حسنہ ان کی والدہ ہیں، یہ اپنی والدہ کی طرف نسبت سے زیادہ مشہور ہیں، ان کے والد عبداللہ بن مطاع ہیں ان سے یزید بن وہب روایت کرتے ہیں۔

(۴۶۶) **عبدالرحمٰن بن شرحبیل:** — یہ عبدالرحمٰن بن شرحبیل بن حسنہ ہیں عبدالرحمٰن بن حسنہ کے بھتیجے آنحضور ﷺ کو انہوں نے دیکھا ہے۔ ان سے ان کے بیٹے عمران روایت کرتے ہیں فتح مصر میں یہ اور ان کے بھائی ربیعہ موجود تھے۔

(۴۶۷) **عبدالرحمٰن بن یزید:** — یہ عبدالرحمٰن بن یزید بن الخطاب ہیں اور یہ حضرت عمر بن خطاب کے بھتیجے ہیں عدوی قریشی ہیں ان کو جب یہ چھوٹے سے تھے ان کے دادا ابولبابہ آنحضور کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور تحنیک کرائی آنحضور ﷺ نے ان کے سر پر دست مبارک پھیرا اور ترقی وبرکت کی دعا دی، محمد بن سعد نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کی جب وفات ہوئی ہے تو ان کی عمر چھ سال کی تھی۔ انہوں نے اپنے چچا عمر بن الخطاب سے حدیث کو سنا ہے اور عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانہ میں عبدالرحمٰن بن عمر کی وفات سے پہلے ان کی وفات واقع ہوئی۔

(۴۶۸) **عبدالرحمٰن بن سمرۃ:** — یہ عبدالرحمٰن بن سمرہ قریشی ہیں فتح مکہ کے دن ایمان لائے اور آنحضور ﷺ سے شرف صحبت حاصل کیا اور آنحضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا شمار اہل بصرہ میں ہوتا ہے اور ۵۱ھ میں بصرہ" میں انتقال ہوا۔ ان سے ابن عباس اور حسن اور بہت لوگ ان کے ماسوا روایت کرتے ہیں۔

(۴۶۹) **عبدالرحمٰن بن سہل:** — یہ عبدالرحمٰن بن سہل انصاری ہیں۔ جو غزوہ خیبر میں شہید کئے گئے۔ ان کا ذکر کتاب القسامۃ میں آتا ہے کہا جاتا ہے کہ غزوہ بدر میں بھی حاضر ہوئے تھے یہ بڑے ذی علم اور صاحب فہم تھے۔ ان سے سہل بن ابی حثمہ روایت کرتے ہیں۔

(۴۷۰) **عبدالرحمٰن بن شبل:** — یہ عبدالرحمٰن ابن شبل انصاری ہیں ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے ان سے تمیم بن محمد اور ابوراشد روایت کرتے ہیں۔

(۴۷۱) **عبدالرحمٰن بن عثمان:** — یہ عبدالرحمٰن بن عثمان تیمی قریشی ہیں جو طلحہ بن عبیداللہ صحابی کے بھتیجے ہیں، ان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آنحضور کی زیارت کی یہ حضور سے روایت نہیں کرتے اور دوسرے ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۴۷۲) **عبدالرحمٰن بن ابی قراد:** — یہ عبدالرحمٰن بن ابیقراد اسلمی ہیں۔ اہل میں شمار کئے جاتے ہیں اور اہل حجاز سے اور ابوجعفر خطمی وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، قراد میں قاف پر پیش ہے اور راء مہملہ بے تشدید کے ہے اور آخر میں دال مہملہ ہے۔

(۴۷۳) **عبدالرحمٰن بن کعب:** — یہ عبدالرحمٰن بن کعب ہیں، ان کی کنیت ابولیلی ہے، مازنی ہیں، انصار میں سے غزوہ بدر میں شریک ہوئے ہیں ۲۴ھ میں وفات پائی یہ بھی ان صحابہ میں سے ہیں جن کے بارے میں یہ آیت اتری تھی۔ تولوا واعینھم تفیض من الدمع حزنا ان لا یجدوا ما ینفقون

(۴۷۴) **عبدالرحمان بن یعمر:** — یہ عبدالرحمان بن یعمر دیلمی ہیں ان کو شرف صحبت و روایت آنحضور ﷺ سے حاصل ہے، کوفہ میں آئے، خراساں پہنچے، ان سے بکیر بن عطا روایت کرتے ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی روایت نہیں کرتا۔

(۴۷۵) **عبدالرحمان بن عائش:** — یہ عبدالرحمٰن بن عائش حضرمی ہیں۔ ان کا شمار اہل شام میں ہوتا ہے، ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، ان سے روایت باری کے بارے میں حدیث منقول ہے۔ ان سے ابوسلام ممطور اور خالد بن اللجاج روایت کرتے ہیں اور ان کی حدیث عن مالک بن یخامر عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور بعض نے کہا کہ بلاواسطہ کسی دوسرے صحابی کے آنحضور ﷺ سے نقل حدیث کرتے ہیں، لیکن صحیح پہلی ہی سند ہے اسی کی تصدیق امام بخاری وغیرہ نے کی ہے، عائش یائے تحتانی دو نقطوں والی زیر اور شین معجمہ کے ساتھ ہے اور یخامر میں دو نقطوں والی یا کا ضمہ ہے اور خائے معجمہ غیر مشدد ہے اور میم مکسور ہے، آخر میں رائے مہملہ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مالک بن یخامر کی یہ روایت مرسل ہے، اس لئے کہ ان کو آنحضور سے سماع ثابت نہیں ہے۔

(۴۷۶) **عبدالرحمان بن ابی عمیرہ:** — یہ عبدالرحمان بن ابی عمیرہ مدنی ہیں اور بعض نے کہا قرشی ہیں، ان کی حدیث میں اضطراب بتلایا جاتا ہے، صحابہ میں یہ قوی الحافظہ نہیں ہیں یہ حافظ عبدالبر نے کہا ہے۔ اور یہ شامی ہیں ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ عمیرہ عین مہملہ کے زبر اور میم کے زیر کے ساتھ ہے، آخر میں رائے مہملہ ہے۔

(۴۷۷) **عبداللہ بن ارقم:** — یہ عبداللہ بن ارقم زہری قریشی ہیں۔ فتح مکہ کے سال اسلام لائے آنحضور ﷺ کے کاتب تھے اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے کاتب رہے۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال پر حاکم بنادیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ نے بھی، پھر عبداللہ بن ارقم نے اس خدمت سے استعفا چاہا تو حضرت عثمانؓ نے استعفا منظور فرمالیا۔ ان سے عروہ اور اسلم حضرت عمر کے آزاد کردہ روایت کرتے ہیں، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں انتقال فرمایا۔

(۴۷۸) **عبداللہ بن ابی اوفی:** — یہ عبداللہ بن ابی اوفی ہیں اور ابواوفی کا نام علقمہ بن قیس اسلمی ہے حدیبیہ اور خیبر اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے ہیں اور ہمیشہ مدینہ میں قیام فرمایا یہاں تک کہ آنحضور ﷺ کی وفات پیش آگئی اس کے بعد کوفہ تشریف لے گئے، کوفہ میں انتقال کرنے والے حضرات صحابہ میں سب سے آخر ۸۷ھ میں انتقال فرمایا، ان سے امام شعبی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

(۴۷۹) **عبداللہ بن انیس:** — یہ عبداللہ بن انیس جہنی انصار میں سے ہیں غزوہ احد اور اس کے مابعد غزوات میں شریک ہوئے ہیں ابوامامہ اور جابر وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں ۵۴ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔

(۴۸۰) **عبداللہ بن بسر:** — یہ عبداللہ بن بسر سلمی مازنی ہیں ان کو اور ان کے والد بسر کو ان کی والدہ کو اور ان کے بھائی عطیہ کو اور ان کی بہن صماء کو صحبت نبوی کا شرف حاصل ہے، شام میں قیام فرمایا اور مقام حمص میں ۸۸ھ میں اچانک موت پیش آئی جب کہ وہ وضو کررہے تھے، شام کے صحابہ میں سب سے بعد میں انتقال کرنے والے حضرت ابوامامہ ہیں ان سے ایک گروہ نے روایت کی ہے۔

(۴۸۱) **عبداللہ بن عدی:** — یہ عبداللہ بن عدی قریشی زہری ہیں، یہ اہل حجاز میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ قدید اور عسفان کے درمیان رہتے تھے، ان سے ابوسلمہ بن عبدالرحمان اور محمد بن جبیر روایت کرتے ہیں۔

(۴۸۲) **عبداللہ بن ابی بکر:** — یہ عبداللہ ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے ہیں، طائف میں آنحضور کے ساتھ یہ بھی تھے، ان کے

ایک تیر آلگا جس کو ابومحجن ثقفی نے پھینکا تھا، اسی سے حضرت ابوبکرؓ کے اول دور خلافت میں ۱۱ھ شوال کے مہینہ میں ان کی وفات ہوئی۔ یہ قدیم الاسلام صحابہ میں سے تھے۔

(۴۸۳) **عبداللہ بن ثعلبہ:** — یہ عبداللہ بن ثعلبہ مازنی عذری ہیں ہجرت سے چار سال پیشتر ان کی ولادت ہوئی اور ۸۹ھ میں وفات پائی، ان کو فتح کے سال آنحضور ﷺ کی زیارت ہوئی آپ ﷺ نے ان کے چہرہ پر دست مبارک پھیرا ان سے ان کے بیٹے عبداللہ اور زہری روایت کرتے ہیں۔

(۴۸۴) **عبداللہ بن جحش:** — یہ عبداللہ بن جحش اسدی حضرت زینب ام المؤمنین کے بھائی ہیں، آپ ﷺ کے دار ارقم میں تشریف لے جانے سے پہلے ہی اسلام لے آئے تھے اور یہ ان صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں کی ہیں۔ یہ بڑے مقبول الدعوات تھے، غزوہ بدر میں حاضر ہوئے ہیں اور احد میں شہید کر دیئے گئے۔ یہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کرایا اس کے بعد قرآن نازل ہو کر ان کی رائے کی تصویب فرمائی جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ واعلموا انما غنیمتم من شیئ فان للّٰہ خمسہ الخ اور صورت یہ ہوئی تھی کہ جب یہ ایک چھوٹے لشکر میں واپس ہوئے تو انہوں نے غنیمت کا پانچواں حصہ لے لیا۔ اور اس کو آنحضور ﷺ کے لئے علیحدہ رکھ دیا اور زمانہ جاہلیت کا دستور تھا کہ سردار کو غنیمت میں سے ربع یعنی چوتھائی دیا جاتا تھا، ان سے سعد بن ابی وقاص وغیرہ روایت کرتے ہیں ان کو ابوالحکم بن اخنس نے جب ان کی عمر چالیس سال کچھ اوپر تھی قتل کر دیا تھا، اور یہ اور حضرت حمزہؓ ایک قبر میں دفن کئے گئے۔

(۴۸۵) **عبداللہ بن ابی الحمساء:** — یہ عبداللہ بن ابی الحمساء عامری ہیں۔ ان کا شمار بصریوں میں ہے ان کی حدیث عبداللہ بن شقیق کے پاس ہے جو اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں اور وہ عبداللہ بن ابی الحمساء سے۔

(۴۸۶) **عبداللہ بن ابی الجدعاء:** — یہ عبداللہ ابن ابی الجدعاء تمیمی ہیں ان کا تذکرہ وحدان میں آتا ہے۔ وحدان یہ لفظ ان رواۃ کے حق میں بھی استعمال کیا گیا ہے جو شیخین امام مسلم وامام بخاری میں سے کسی ایک سے صرف روایت کرتے ہیں ان کا شمار بصریوں میں کیا جاتا ہے۔

(۴۸۷) **عبداللہ بن جعفر:** — یہ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب قریشی ہیں ان کی والدہ اسماء عمیس کی بیٹی ہیں۔ یہ زمین حبشہ میں پیدا ہوئے اور یہ سرزمین حبشہ میں پہلے بچہ تھے جو مسلمانان حبشہ میں پیدا ہوئے ۸۰ھ میں مدینہ میں وفات پائی جب کہ ان کی عمر نوے سال کی تھی یہ بڑے سخی ظریف الطبع بردبار پاکباز تھے، ان کو سخاوت کا دریا کہا جاتا ہے، مشہور تھا۔ کہ اسلام میں ان سے زیادہ سخی کوئی نہیں ہے، ان سے بہت لوگ روایت کرتے ہیں۔

(۴۸۸) **عبداللہ بن جہم:** — یہ عبداللہ بن جہم ہیں جو انصار میں سے ہیں ان کی حدیث نمازی کے سامنے گذرنے والے کے بارے میں آتی ہے ان سے بسر بن سعید وغیرہ روایت کرتے ہیں ان کی سند حدیث مالک عن ابی جہم ہے جس میں نام کا ذکر نہیں ہے اور ان کی حدیث کو ابن عیینہ اور وکیع نے بھی روایت کیا ہے۔ ان دونوں نے ان کا نام عبداللہ بن جہم لیا ہے۔ اور یہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہیں اور ہم نے ان کا تذکرہ حرف الجیم میں کیا ہے۔

(۴۸۹) **عبداللہ بن جزء:** — یہ عبداللہ بن جزء ہیں جن کی کنیت ابوالحارث سہمی ہے مصر میں قیام تھا بدر میں شریک ہوئے ان سے ایک جماعت مصریوں کی روایت کرتی ہے ۸۵ھ میں مصر میں وفات پائی جزء میں جیم مفتوح زاء معجم ساکن آخر میں ہمزہ ہے۔

(۴۹۰) **عبداللہ بن حبشی:** — یہ عبداللہ بن حبشی خثعمی ہیں۔ ان کو شرف روایت حاصل ہوا۔ ان کا شمار اہل حجاز میں ہے۔ مکہ میں قیام کیا ان سے عبید بن عمیر وغیرہ روایت کرتے ہیں عبید اور عمیر دونوں مصغر ہیں۔

(۴۹۱) **عبداللہ بن ابی حدرد:** — یہ عبداللہ بن ابی حدرد ہیں ابو حدرد کا نام سلام بن عمر اسلمی ہیں غزوات میں پہلا غزوہ جس میں وہ شریک ہوئے حدیبیہ ہے اس کے بعد خیبر اور اس کے بعد کے غزوات میں بھی شریک ہوئے اے ھ میں انتقال فرمایا ان کی عمر ۸۱ سال کی ہوئی، اہل مدینہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ابن القعقاع وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۴۹۲) **عبداللہ بن حنظلہ:** — یہ عبداللہ بن حنظلہ انصاری ہیں۔ اور حنظلہ یہ وہی ہیں جن کو فرشتوں نے غسل دیا تھا۔ آنحضور ﷺ کے زمانہ میں یہ عبداللہ پیدا ہوئے اور آنحضور ﷺ کی جب وفات ہوئی تو ان کی عمر سات سال کی تھی، عبداللہ نے آنحضور کو دیکھا تھا۔ اور ان سے روایت بھی کی ہے یہ بڑے نیک نہاد صاحب فضل انصار میں سردار تھے یہی وہ شخص ہیں جن کے ہاتھ پر اہل مدینہ نے اس بات کے لئے بیعت کی تھی کہ یزید بن معاویہ کو خلافت سے علیحدہ کیا جائے اسی وجہ سے ۶۳ ھ میں واقعہ حرہ میں یہ قتل کئے گئے۔ ان سے ابن ابی ملیکہ اور عبداللہ بن یزید اور اسماء بنت زید بن الخطاب وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۴۹۳) **عبداللہ بن حولہ:** — یہ عبداللہ بن حولہ ازدی ہیں ملک شام میں ٹھہرے ان سے جبیر بن نفیر وغیرہ روایت کرتے ہیں ۸۰ ھ میں شام میں انتقال ہوا۔

(۴۹۴) **عبداللہ بن خبیب:** — یہ عبداللہ بن خبیب قبیلہ جہنیہ کے ہیں جو انصار کا حلیف تھا مدنی ہیں صحابی ہیں ان کی حدیث اہل حجاز میں پائی جاتی ہے۔ ان سے ابن معاذ روایت کرتے ہیں۔

(۴۹۵) **عبداللہ بن رواحہ:** — یہ عبداللہ بن رواحہ خزرجی انصاری ہیں نقباء میں سے یہ بھی ایک ہیں بیعت عقبہ میں موجود تھے، بدر، احد، خندق اور بعد کے غزوات میں شریک ہوئے مگر غزوہ فتح اور بعد کے غزوے کیونکہ جنگ موتہ میں ۸ ھ میں شہید کر دیئے گئے۔ یہ اس جنگ میں امیر فوج تھے۔ یہ بہترین کلام کہنے والے شعرائیں سے ہیں۔ ان سے ابن عباس وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۴۹۶) **عبداللہ بن الزبیر:** — یہ عبداللہ بن زبیر ہیں ان کی کنیت ابوبکر ہے۔ یہ اسدی قریشی ہیں ان کی یہ کنیت ان کے نانا جان ابوبکر صدیق کی کنیت پر اور ان کے نام پر نام آنحضور ﷺ نے رکھا تھا، مدینہ میں مہاجرین میں یہ سب سے پہلے اسلامی بچے تھے جو اھ میں پیدا ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے ان کے کان میں اذان کہی ان کی والدہ اسماء نے مقام قباء میں ان کو جنا اور ان کو آنحضور ﷺ کی گود میں رکھ دیا آپ ﷺ نے چھوارہ منگایا اور اس کو چبایا اور کچھ لعاب آپ ﷺ نے ان کے منہ میں ڈالا اور چھوارا چباکر ان کے تالو سے لگایا تو سب سے پہلی چیز جو ان کے پیٹ میں داخل ہوئی وہ حضور ﷺ کے لعاب مبارک تھا، پھر آپ ﷺ نے ان کے لئے برکت کی دعا کی اور یہ بالکل صاف چہرے والے تھے، ایک بال بھی ان کے چہرے پر نہ تھا۔ نہ داڑھی تھی۔ یہ بڑے روزے رکھنے والے اور بہت نوافل پڑھنے والے تھے موٹے تازے تھے، بڑے قوی بارعب تھے، حق بات ماننے والے تھے، تعلقات اور رشتہ کے قائم رکھنے والے تھے ان میں وہ باتیں جمع تھیں جو دوسروں میں نہ تھیں چنانچہ ان کے باپ آنحضور ﷺ کے مصاحبین میں سے تھے ان کی والدہ اسماء ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی تھیں ان کے نانا حضرت ابوبکرؓ تھے، ان کی دادی صفیہ آنحضور ﷺ کی پھوپھی تھیں، ان کی خالہ حضرت عائشہؓ تھیں جو ازواج مطہرات میں سے ہیں، آنحضور ﷺ سے بیعت کی جب کہ ان کی عمر آٹھ سال کی تھی، حجاج بن یوسف نے مکہ میں ان کو قتل کیا اور منگل کے دن ۱۷ جمادی الثانیہ ۷۳ ھ کو انہیں سولی پر لٹکادیا۔ ان کے لئے ۶۴ ھ میں خلافت کے لئے بیعت لی گئی اس سے پہلے ان کی خلافت کی کوئی بات چیت نہ تھی، ان کی خلافت ماننے پر اہل حجاز یمن، عراق خراسان، وغیرہ سوائے شام کے یا کچھ حصہ شام کے سب تیار تھے اور

لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر آٹھ حج کئے، ان سے ایک بڑی جماعت روایت کرتی ہے۔

(۴۹۷) عبداللہ بن زمعہ: — یہ عبداللہ بن زمعہ قریشی اسدی ہیں ان کا شمار مدینہ والوں میں ہوتا ہے ان سے عروہ بن زبیر وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۴۹۸) عبداللہ بن زید: — یہ عبداللہ بن زید بن عبدربہ ہیں۔ انصاری خزرجی ہیں، بیعت عقبہ، بدر اور بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے، ہیں، یہی وہ ہیں جن کو خواب میں ۱ھ میں کلمات آذان بتلائے گئے تھے، اہل مدینہ میں سے تھے ۳۲ھ مدینہ میں وفات پائی اور ان کی عمر ۶۴ سال کی ہوئی یہ خود اور ان کے والدین صحابی ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے محمد اور سعید بن مسیب اور ابن ابی لیلی روایت کرتے ہیں۔

(۴۹۹) عبداللہ بن زید: — یہ عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری ہیں بنومازن میں سے ہیں، غزوہ احد میں شریک ہوئے مگر غزوہ بدر میں شرکت نہیں کر سکے۔ یہی وہ صحابی ہیں جنہوں نے مسیلمہ کذاب کو وحشی بن حرب کے ساتھ شریک ہو کر قتل کیا اور یہ عبداللہ واقعہ حرہ ۶۳ھ میں قتل کر دیئے گئے ان سے عباد بن تمیم جو ان کے بھتیجے ہیں اور ابن مسیب روایت کرتے ہیں۔ عباد بائے موحدہ کے تشدید کے ساتھ ہے۔

(۵۰۰) عبداللہ بن السائب: — یہ عبداللہ بن سائب مخزومی قریشی ہیں۔ ان سے مکہ والوں نے قرأت سیکھی ہے مکہ والوں میں ان کو شمار کیا جاتا ہے، ابن الزبیر کے قتل سے پہلے مکہ میں وفات ہوئی، ان سے ایک گروہ روایت کرتا ہے۔

(۵۰۱) عبداللہ بن سرجس: — یہ عبداللہ بن سرجس مزنی ہیں اور ان کو مخزومی بھی کہا جاتا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ یہ مخزومیوں کے حلیف ہیں۔ مخزومی نہیں ہیں۔ یہ بصری ہیں ان کی حدیث بصرہ والوں میں پائی جاتی ہے ان سے عاصم احول وغیرہ روایت کرتے ہیں، سرجس میں دو سین ہیں جن کے درمیان جیم ہے۔ نرجس کے وزن پر ہے۔

(۵۰۲) عبداللہ بن سلام: — یہ عبداللہ بن سلام ہیں ان کی کنیت ابو یوسف ہے۔ اسرائیلی تھے۔ یوسف بن یعقوب علی نبینا و علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور یہ بنی عوف بن حزرج کے حلیف تھے، علمائے یہود میں سے تھے اور ان لوگوں میں سے جن کے لئے آنحضور ﷺ نے جنت کے داخلہ کی بشارت دی ہے، ان سے ان کے دو بیٹے یوسف و محمد وغیرہ روایت کرتے ہیں مدینہ میں ۴۳ھ میں انتقال ہوا، سلام میں لام پر تشدید نہیں ہے۔

(۵۰۳) عبداللہ بن سہل: — یہ عبداللہ بن سہل انصاری حارثی ہیں عبدالرحمان کے بھائی اور محیصہ کے بھتیجے یہ خیبر میں قتل کر دیئے گئے تھے انہیں کا ذکر باب القسامہ میں ہے۔

(۵۰۴) عبداللہ بن الشخیر: — یہ عبداللہ بن شخیر عامری ہیں۔ بصریوں میں شمار ہوتے ہیں آنحضور ﷺ کی خدمت میں بنی عامر کے وفد میں شامل ہو کر حاضر ہوئے ان سے ان کے دو بیٹے مطرف اور یزید روایت کرتے ہیں، شخیر میں شین معجمہ اور خاء معجمہ دونوں زیر سے ہیں خاء پر تشدید اور یائے تحتانی ساکن ہے۔

(۵۰۵) عبداللہ بن الصنابحی: — یہ عبداللہ صنابحی کے بیٹے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ ابو عبداللہ ہیں اور حافظ ابن عبدالبر نے کہا کہ میرے نزدیک درست یہ ہے کہ صنابحی ابو عبداللہ تابعی ہیں نہ عبداللہ صحابی اور کہا کہ عبداللہ صنابحی صحابہ میں مشہور نہیں ہیں اور صنابحی صحابی کی حدیث کو موطا امام مالکؒ نے اور امام نسائی نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔

(۵۰۶) عبداللہ بن عامر: — یہ عبداللہ بن عامر بن کریز قرشی ہیں، یہ حضرت عثمانؓ کے ماموں کے بیٹے ہیں، آنحضور ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے، آپ کے پاس لائے گئے، آپ نے ان پر دم کیا تھتکارا اور اعوذ پڑھی، جب آنحضور ﷺ کی وفات ہوئی تو ان کی عمر ۱۳ سال تھی، بعض نے کہا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کچھ روایت نہیں کیا نہ آپ ﷺ سے سن کر یاد رکھا ۵۹ ھ میں وفات پائی، حضرت عثمانؓ نے ان کو خراسان اور بصرہ کا حاکم بنا دیا تھا۔ اور یہ وہاں برابر حاکم رہے یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے، پھر امارت کے اختیارات جب حضرت معاویہؓ کی طرف منتقل ہوئے تو ولایت خراسان و بصرہ ان کو دوبارہ دیدی گئی، یہ بڑے سخی کریم کثیر المناقب ہیں، انہوں نے ہی خراسان کو فتح کیا اور کسری شاہ فارس انہیں کی گورنری کے زمانہ میں قتل کر دیا گیا، اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انہوں نے فارس کے تمام اطراف کو اور اس طرح عامہ خراسان واصفہان کرمان اور حلوان کو فتح کیا، انہوں نے ہی بصرہ کی نہر کھدوائی ہے۔

(۵۰۷) عبداللہ بن عباس: — یہ عبداللہ بن عباسؓ آنحضور ﷺ کے محترم چچا کے بیٹے ہیں ان کی ماں لبابہ حارث کی بیٹی اور حضرت میمونہ ام المؤمنین کی بہن ہیں، ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے اور جب آنحضور کی وفات ہوئی ہے ان کی عمر ۱۳ سال کی یا ۱۵ سال کی تھی بعض نے کہا ہے کہ دس سال کی عمر تھی اُمت محمدیہ کے بڑے عالم اور بہترین اشخاص میں سے تھے، آنحضور ﷺ دینی فہم و ہنر و تفسیر قرآن کی ان کو دعا دی، انہوں نے جبرئیل آمین کو دو مرتبہ دیکھا تھا، مسروق کا قول ہے کہ میں جب عبداللہ بن عباس کو دیکھتا تھا تو کہتا تھا کہ یہ سب سے زیادہ حسین و جمیل ہیں اور جب وہ بات چیت کرتے تھے تو میں کہتا کہ یہ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ ہیں جب حدیث بیان کرتے تو کہا کرتا تھا۔ کہ یہ سب سے زیادہ عالم ہیں حضرت عمرؓ کے یہاں یہ بہت مقرب تھے اور اپنے نزدیک جگہ دیتے تھے اور جلیل القدر صحابہ کے ساتھ مشورہ کرنے میں ان کو بھی شریک فرمایا کرتے تھے، آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی، بمقام طائف ۶۸ ھ میں بزمانہ ابن زبیر جب کہ یہ اکہتر سال کے تھے وفات پائی ان سے بڑی جماعت صحابہ اور تابعین کی روایت کرتی ہے اور یہ گورے رنگ والے لانبے قد والے تھے ان کے رنگ میں زردی کی امیزش تھی، موٹے تازے حسین خوش رو تھے ان کے سر پر کافی بال تھے جن میں مہندی لگاتے تھے۔

(۵۰۸) عبداللہ بن عمر: — یہ عبداللہ عمر بن خطاب کے صاحبزادے ہیں قرشی عدوی ہیں اپنے والد صاحب کے ساتھ مکہ میں بچپن ہی میں ایمان لے آئے تھے۔ یہ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے اور ان کے غزوہ احد کے شریک ہونے میں اختلاف ہے صحیح بات یہ ہے کہ سب سے پہلا غزوہ جس میں یہ شریک ہوئے ہیں خندق ہے، بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ بدر کے دن بچہ ہونے کی وجہ سے بھرتی نہیں کئے گئے اور آنحضرت ﷺ نے ان کو احد کے دن شریک ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ یوم احد میں آپ کو واپس کر دیا اس لئے کہ اس وقت ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی، اس کے بعد غزوۂ خندق میں اور دوسرے غزوات میں شریک ہوئے ہیں یہ بڑے علم، زہد، تقوی پرہیزگاری والے تھے، معاملات میں بڑی دیکھ بھال اور احتیاط کرتے تھے، جابر بن عبداللہ نے فرمایا کہ ہم میں کوئی نہیں بچا کہ دنیا اس پر مائل ہوگئی اور وہ دنیا کی طرف جھک گیا سوائے حضرت عمرؓ کے اور ان کے بیٹے عبداللہ بن عمر کے، حضرت میمون بن مہران کا قول ہے۔ میں نے حضرت ابن عمر سے زیادہ محتاط اور پرہیزگار کسی کو نہیں دیکھا اور حضرت عبداللہ ابن عباس سے زیادہ کسی کو عالم نہیں پایا، اور حضرت نافع نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی حیات میں ایک ہزار بلکہ اس سے زیادہ انسانوں کو غلامی کی قید سے آزاد کیا تھا نزول وحی سے ایک سال قبل ان کی ولادت ہوئی اور ۷۳ ھ میں ابن زبیر کے قتل کے تین ماہ بعد اور بقول بعض چھ ماہ بعد وفات پائی انہوں نے وصیت کی تھی کہ مجھ کو حل میں دفن کیا جائے، لیکن حجاج کی وجہ سے یہ وصیت پوری نہ ہو سکی اور مقام ذی طوی میں مہاجرین کے قبرستان میں دفن کئے گئے، اور حجاج نے ایک شخص کو حکم دیا تھا جس کے مطابق اس نے اپنے نیزے کے نیچے کی

بوری کو زہر میں بجھالیا اور راستہ میں اس نے آپ سے مزاحمت کی اور اپنے نیزہ کی بوری کو آپ کے قدم کے پشت میں چبھو دیا اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ حجاج نے ایک دن خطبہ دیا اور نماز میں بہت تاخیر کردی اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ سورج تمہارے لئے ٹھہرا نہیں رہے گا، اس پر حجاج نے کہا کہ میں نے ٹھان لیا تھا کہ میں تمہاری بینائی کو نقصان پہنچاوں، حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا اگر تو ایسا کرے گا تو تعجب کیا ہے کیونکہ تو بڑا بے وقوف ہے، اور ہم پر زبردستی کا حاکم ہے بعض نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی اس بات کو آہستہ کہا اور حجاج کو نہیں سنایا اور آپ حجاج بن یوسف سے تمام مواقف اور مقامات میں جہاں آنحضور ﷺ ٹھہرے یا اترے تھے پیش پیش رہتے رہے یہ بات حجاج کو بڑی ناگوار تھی، عبداللہ بن عمرؓ کی عمر ۸۴ سال کی ہوئی اور بعض نے کہا ہے کہ ۸۶ سال کی، ان سے بہت سے لوگ روایت کرتے ہیں۔

(۵۰۹) عبداللہ بن عمرو بن العاص: — یہ عبداللہ بن عمرو بن العاص سہمی قریشی ہیں، اپنے باپ سے پہلے اسلام لے آئے ان کے باپ ان سے تیرہ سال بڑے تھے۔ بعض نے بارہ سال کہا ہے بڑے عابد، عالم حافظ کتابوں کے پڑھنے والے تھے۔ آنحضور ﷺ سے آپ ﷺ کی احادیث کے بارے میں لکھنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے ان کو اجازت دے دی، ان کی وفات کے بارے میں اختلاف ہوا ہے بعضوں نے کہا ہے کہ واقعہ حرہ کی راتوں میں ذی الحجہ ۶۴ھ میں وفات ہوئی۔ بعض نے ۷۳ھ میں کہا ہے اور بعض نے مکہ میں ۶۷ھ میں وفات بتلائی ہے بعض طائف میں ۵۵ھ میں ان کی موت بتلاتے ہیں، ان سے بہت سے لوگ روایت کرتے ہیں۔ یعلی بن عطاء اپنی والدہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کے لئے سرمہ بنایا کرتی تھیں کیونکہ یہ رات بھر عبادت کیا کرتے تھے، چراغ بجھا کر بہت رویا کرتے تھے، حتی کہ ان کی آنکھوں کی پلکیں گرگئی تھیں، بعض نسخوں میں رسخ کے معنی پپوٹوں میں فساد پیدا ہونا لکھا ہے۔

(۵۱۰) عبداللہ بن مسعود: — یہ عبداللہ بن مسعود ہیں ان کی کنیت ابو عبدالرحمان ہے، ہذلی ہیں آنحضور ﷺ کے دار ارقم میں داخل ہونے سے پہلے حضرت عمر کے اسلام لانے سے کچھ زمانہ قبل شروع میں اسلام لے آئے تھے، اور کہا گیا ہے کہ اسلام لانے والوں میں یہ چھٹے شخص ہیں۔ آنحضور ﷺ نے ان کو اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا، یہ آپ ﷺ کے خاص خدام میں داخل ہو گئے تھے۔ آنحضور ﷺ کے گہرے رازداں تھے، آپ ﷺ کی مسواک اور نعلین مبارک اور وضو کا پانی سفر میں لئے رکھتے تھے، حبشہ کی طرف ہجرت کی غزوۂ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک تھے، آنحضور ﷺ نے ان کے لئے جنت کی بشارت دی اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو ام عبد کا بیٹا میری امت کے لئے پسند کرے میں بھی اسی کو پسند کرتا ہوں اور جس چیز کو امت کے لئے وہ ناپسند جانے اس کو میں بھی برا سمجھتا ہوں، آنحضور ﷺ کی مراد ابن ام عبد سے حضرت ابن مسعود ہیں، یہ آنحضور کے ساتھ آپ ﷺ کی ظاہری صورت اور حلم و وقار اور سیرت میں مشابہ تھے، یہ ہلکے بدن والے، چھوٹے قد والے، گہرا گندمی رنگ والے تھے۔ کیف الجثہ تھے۔ لابنے قد کے لوگ بیٹھنے کی حالت میں ان کے پورے قد کے برابر معلوم ہوتے تھے، کوفہ میں مسند قضا کے مالک بنائے اور وہاں کے بیت المال کی ذمہ داری بھی حضرت عمر کی خلافت میں اور ابتدائی دور خلافت عثمانی میں ان کے سپرد کی گئی، پھر یہ مدینہ کی طرف لوٹ گئے اور وہاں پر ۳۲ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کئے گئے، ان کی عمر کچھ اوپر ساٹھ سال ہوئی۔ ان سے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ اور تابعین روایت کرتے ہیں۔

(۵۱۱) عبداللہ بن قرط: — یہ عبداللہ بن قرط ازدی ثمالی ہیں، ان کا نام پہلے شیطان تھا، آنحضور ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔ یہ شامیوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی حدیث اہل شام میں پائی جاتی ہے، یہ عبیدہ بن جراح کی طرف سے حمص کے حاکم تھے، ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے ملک روم میں ۸۶ھ کے اندر قتل کئے گئے۔ قرط قاف کے پیش اور رائے مہملہ کے ساتھ ہے۔

(۵۱۲) عبداللہ بن غنام: — یہ عبداللہ بن غنام بیاضی ہیں، ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے، ان کی حدیث دعا کے بارے میں ربیعة بن ابی عبدالرحمٰن عن عبداللہ بن عنبسة عن عبداللہ بن غنام۔ کی سند کے ساتھ ربیعہ کے پاس ہے۔

(۵۱۳) عبداللہ بن مغفل: — یہ عبداللہ بن مغفل مزنی ہیں یہ اصحاب شجرہ میں سے ہیں (یعنی بیعت تحت الشجرہ کرنے والوں میں داخل ہیں۔ مدینہ میں قیام فرمایا پھر وہاں سے بصرہ چلے گئے اور یہ ان دس میں سے ایک شخص ہیں، جن کو حضرت عمرؓ نے بصرہ کی طرف بھیجا تھا جو لوگوں کو دین سکھلاتے تھے۔ بصرہ میں ۶۰ھ کو انتقال فرمایا۔ ان سے ایک جماعت تابعین کی جنمیں حسن بصری بھی ہیں روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ بصرہ میں ان سے زیادہ بزرگ کوئی نہیں آیا۔

(۵۱۴) عبداللہ بن ہشام: — یہ عبداللہ بن ہشام قرشی تیمی ہیں۔ اہل حجاز میں مانے جاتے ہیں، ان کی ماں زینب بنت حمید ان کو لے کر آنحضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئیں جب کہ یہ بچے تھے تو آپ ﷺ نے ان کے سر پر دست مبارک پھیرا اور ان کے لئے دعا فرمائی مگر صغیر السن ہونے کی وجہ سے بیعت نہ فرمائی ان سے ان کے پوتے زہرہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۱۵) عبداللہ بن یزید: — یہ عبداللہ بن یزید خطمی انصار میں سے ہیں جب کہ یہ سترہ سال کے تھے تو غزوہ حدیبیہ میں حاضر ہوئے، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے دور خلافت میں کوفہ کے گورنر تھے اور ان کی خلافت میں ہی ان کا انتقال کوفہ میں ہوا، شعبی ان کے کاتب تھے ان سے ان کے بیٹے موسیٰ اور ابوبردہ بن ابوموسیٰ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۱۶) عاصم بن ثابت: — یہ عاصم بن ثابت ہیں جن کی کنیت ابوسلیمان ہے یہ انصار میں سے ہیں جنگ بدر میں شریک ہوئے، یہی وہ عاصم ہیں جن کو شہد کی مکھیوں کے چھتے نے مشرکوں سے محفوظ رکھا تھا کیونکہ مشرکین مکہ غزوہ رجیع میں ان کا سر کاٹ کر لے جانا چاہتے تھے جب کہ ان کو بنولحیان نے قتل کر دیا تھا، اسی وجہ سے ان کا نام حمی الدبر من المشرکین رکھا گیا، یہ عاصم بن ثابت نانا ہیں عاصم بن عمر بن الخطاب کے، ایک دوسرے نسخہ میں اس طرح ہے کہ آنحضور ﷺ نے دس آدمیوں کا چھوٹا سا لشکر بنا کر بھیجا جس کے امیر یہ عاصم بن ثابت بنائے گئے یہ لشکر چلتا رہا یہاں تک کہ جب وہ مکہ اور عسفان کے درمیان پہنچا تو قبیلہ بنی لحیان کے تقریباً دو سو آدمی ان کے پیچھے لگ گئے جو سب کے سب تیرانداز تھے اور ان لوگوں نے اس اسلامی لشکر کا تعاقب کیا، یہاں تک کہ ان کو پتہ چل گیا کہ ان کا زاد راہ مدینہ کی کھجوریں ہیں (گٹھلیاں ایک جگہ پڑی ہوئی دیکھ کر انہوں نے یہ سراغ لگالیا۔" اور کہا کہ یہ یثرب یعنی مدینہ کی کھجوریں ہیں (اس لئے یہ جماعت مدینہ سے آئی ہے لہٰذا تعاقب شروع کر دیا۔) جب عاصم اور ان کے ساتھیوں نے ان کو دیکھا تو ایک اونچی جگہ پر چڑھ کر پناہ لی مگر کفار نے ان کو آگھیرا۔ اور کہنے لگے کہ تم لوگ نیچے آجاؤ اور اپنے کو ہمارے حوالے کردو۔ اور تم کو ہماری طرف سے امان حاصل ہے۔ پس عاصم نے کہا کہ (میرے ساتھیو کو اختیار ہے) رہا میں پس قسم اللہ کی میں تو کسی کافر کی ذمہ داری قبول کر کے نہیں اتروں گا، اے اللہ ہمارے حال کی خبر اپنے نبی برحق کو پہنچادے، یہ سن کر کفار نے ان کی طرف تیر چلائے اور عاصم کو ان سات میں قتل کر دیا اللہ تعالیٰ نے عاصم کی دعا جس دن ان کے تیر لگے قبول فرمالی اور آنحضور ﷺ کو ان کی شہادت کی اطلاع دے دی چنانچہ ان کے قتل کی خبر آنحضور ﷺ نے صحابہ کو پہنچائی کفار قریش نے جب کہ ان کو عاصم کے قتل کی خبر ملی تو ایک قاصد کو بھیجا تا کہ وہ ان کے پاس عاصم کے کسی عضو کو کاٹ کر لائے جس سے یہ پتہ چل جائے کہ عاصم ہی قتل ہوئے ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے عاصم کے بدن کی حفاظت کے لئے شہد کی مکھیوں کو بھیج دیا، جو ان کے اوپر شامیانہ کی طرح چھاگئیں اور ان کے جسم کی حفاظت کرتی رہیں۔ لہٰذا یہ قاصد ان کے جسم کا کوئی حصہ لے جانے پر قادر نہ ہوسکا۔ یہ اس بیان کا اختصار ہے جو بخاری نے روایت کیا ہے، یہ عاصم بن ثابت، عاصم بن عمر بن خطاب کے نانا ہیں۔

(۵۱۷) عامر الرام: — یہ عامر الرام ہیں ان کو آنحضورؐ کی زیارت اور روایت کا شرف حاصل ہوا ہے، ان سے ابومنظور روایت کرتے

ہیں۔ الرام رائے مہملہ کے زبر کے ساتھ ہے، یہ دراصل رامی ہے (جس میں سے یاء حذف کردی گئی۔)

(۵۱۸) عامر بن ربیعہ: — یہ عامر بن ربیعہ ہیں ان کی کنیت ابو عبداللہ الغزی ہے ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں کے مہاجر ہیں غزوۂ بدر اور دوسرے تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں قدیم الاسلام ہیں ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے ۳۲ھ میں وفات پائی۔

(۵۱۹) عامر بن مسعود: — یہ عامر بن مسعود بن امیہ بن خلف جمحی ہیں۔ صفوان بن امیہ کے بھتیجے ہیں ان سے نمیر بن عریب روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی نے ان کی حدیث صوم کے بارے میں نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اس لئے کہ عامر بن مسعود نے آنحضور ﷺ کو نہیں پایا اور ابن مندہ اور ابن عبدالبر نے ان کا اسمائے صحابہ میں ذکر کیا ہے اور ابن معین نے کہا کہ ان کو صحبت نبوی نصیب نہیں عریب عین مہملہ کا زبر رائے مہملہ کا زیر دو نقطوں والی یا ساکن ہے اور آخر میں بائے موحدہ ہے۔

(۵۲۰) عائذ بن عمرو: — یہ عائذ بن عمرو مدنی ہیں۔ درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے ہیں۔ بصرہ میں رہے اور ان کی حدیث بصریوں میں پائی جاتی ہے۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۵۲۱) عباد بن بشر: — یہ عباس بن بشر انصاری ہیں سعد بن معاذ کے اسلام لانے سے قبل یہ مدینہ میں اسلام لائے ہیں غزوۂ بدر، احد اور تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں جن لوگوں نے کعب بن اشرف یہودی کو قتل کیا تھا یہ بھی ان میں داخل ہیں فضلائے صحابہ میں سے ہیں ان سے انس بن مالک اور عبدالرحمان بن ثابت روایت کرتے ہیں، جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ ان کی عمر ۴۵ سال کی ہوئی، عباد میں عین کے زبر اور باء موحدہ کے تشدید کے ساتھ ہے۔

(۵۲۲) عباد بن عبدالمطلب: — یہ عباد بن عبدالمطلب ہیں، ان کا تذکرہ ان حضرات میں آتا ہے جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ان سے کوئی روایت نہیں پائی جاتی، عباد بائے موحدہ کے تشدید کے ساتھ ہے اور مطلب طاء کے تشدید اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

(۵۲۳) عبادہ بن صامت: — یہ عبادہ بن صامت ہیں ان کی کنیت ابوالولید ہے انصاری سالمی ہیں۔ یہ نقیبوں میں سے تھے عقبہ اولی عقبہ ثانیہ عقبہ ثالثہ میں شریک ہوئے بدر اور تمام غزوات میں بھی شریک رہے ہیں، پھر ان کو حضرت عمرؓ نے شام میں قاضی اور معلم بنا کر بھیجا، اور ان کا مستقر حمص کو بنایا تھا، اس کے بعد یہ فلسطین تشریف لے گئے اور وہیں مقام رملہ میں اور بقول بعض بیت المقدس میں ۳۴ھ میں جب کہ ان کی عمر ۷۲ سال کی تھی وفات پائی ان سے ایک جماعت صحابہ اور تابعین کی روایت کرتی ہے عبادہ عین کے پیش اور باء غیر مشدد کے ساتھ ہے۔

(۵۲۴) عباس بن عبدالمطلب: — یہ عباس بن عبدالمطلب حضور ﷺ کے محترم چچا ہیں، آپ ﷺ سے دو سال بڑے تھے ان کی ماں نمر بن قاسط کی ایک عورت ہیں یہ پہلی عربی عورت ہیں جنہوں نے خانہ کعبہ کو ریشم اور دیبا اور طرح طرح کا غلاف پہنایا صورت یہ ہوئی تھی کہ حضرت عباسؓ بچپن میں گم ہوگئے تھے تو انہوں نے نذر مانی تھی کہ اگر وہ مجھے مل گئے تو میں بیت اللہ پر غلاف چڑھاؤں گی جب ان کی ماں نے ان کو پالیا تو ایسا کیا۔ حضرت عباسؓ دور جاہلیت میں بڑے سردار تھے مسجد حرام کی عمارت یعنی آبادی واحترام اور سقایہ کے یہی ذمہ دار تھے، سقایہ (جس کا مطلب آب زمزم پلانے کی خدمت ہے) یہ تو ایک مشہور بات ہے۔ رہا عمارت پس اس کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت عباسؓ قریش کو اس بات پر آمادہ کیا کرتے تھے کہ وہ خانہ کعبہ میں گالی گلوچ اور گناہوں کو چھوڑ کر بھلائی اور نیکی کے ساتھ اس کو آباد کریں۔ اور مجاہد کا بیان ہے کہ حضرت عباس نے اپنی موت کے وقت ستر غلام آزاد کئے تھے یہ واقعہ فیل سے ایک سال قبل پیدا ہوئے اور جمعہ کے دن ۱۲ رجب ۳۲ھ میں جب کہ ان کی عمر ۸۸ سال کی تھی وفات پائی جنت البقیع میں دفن ہوئے ابتداء ہی میں اسلام لے آئے تھے، مگر اپنے اسلام کو چھپائے رہے چنانچہ بدر کے معرکہ میں مشرکین کے مجبور کرنے سے نکلے تو

آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جو عباس سے ملے تو ان کو قتل نہ کرے کیونکہ وہ زبردستی جنگ میں شریک کئے گئے ہیں، پس ان کو ابوالیسر کعب بن عمر نے قید کر لیا تو حضرت عباسؓ نے اپنے نفس کا فدیہ دیا اور مکہ واپس ہوگئے پھر اس کے بعد مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے ہیں۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۵۲۵) عباس بن مرداس: — یہ عباس بن مرداس ہیں ان کی کنیت ابوالہیثم ہے سلمی ہیں شاعر ہیں، ان کا شمار مؤلفۃ القلوب میں ہے فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام لائے اور فتح مکہ کے بعد اسلام میں پختگی پیدا ہوگئی یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو جاہلیت کے دور میں بھی شراب نوشی کو حرام سمجھتے تھے ان سے ان کے بیٹے کنانہ روایت کرتے ہیں، کنانہ کاف کے کسر اور دونون کے ساتھ ہے جس کے درمیان میں الف ہے۔

(۵۲۶) عبدالمطلب بن ربیعہ: — یہ عبدالمطلب بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب بن ہاشم ہیں۔ قرشی ہیں۔ مدینہ میں رہے پھر وہاں سے دمشق چلے گئے اور وہیں ۶۲ھ میں وفات پائی ان سے عبداللہ بن حارث روایت کرتے ہیں۔

(۵۲۷) عبداللہ بن محصن: — یہ عبداللہ بن محصن انصاری خطمی ہیں اہل مدینہ میں ان کا شمار ہوتا ہے اور ان کی حدیث ان میں پائی جاتی ہے ان سے ان کے بیٹے سلمہ روایت کرتے ہیں حافظ ابن عبدالبر نے کہا کہ کچھ لوگ ان کی حدیث کو مرسل کہتے ہیں۔

(۵۲۸) عبید بن خالد: — یہ عبید بن خالد سلمی بہزی مہاجری ہیں کوفہ میں رہے ان سے کوفیوں کی ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۵۲۹) عتاب بن اسید: — یہ عتاب بن اسید قرشی اموی ہیں فتح مکہ کے دن اسلام لائے آنحضور ﷺ نے ان کو فتح مکہ کے دن جب کہ آپ ﷺ غزوۂ حنین کے لئے تشریف لے جارہے تھے مکہ کا حاکم بنا دیا تھا آنحضور ﷺ کی جب وفات ہوئی ہے تو یہی مکہ کے حاکم تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو مکہ کا حاکم برقرار رکھا یہاں تک کہ ان کی وفات مکہ ہی میں ۱۳ھ کے اندر جس دن کہ حضرت ابوبکر کی وفات ہوئی ہے واقع ہوئی یہ قریش کے سرداروں میں سے تھے نہایت نیک صالح تھے ان سے عمرو بن ابی عقرب روایت کرتے ہیں عتاب عین کے زبر تاء کے تشدید کے ساتھ ہے اور اسید ہمزہ کے زبر اور سین کے زیر کے ساتھ ہے۔

(۵۳۰) عتبہ بن اسید: — یہ عتبہ بن اسید ہیں ان کی کنیت ابوبصیر ہے ثقفی ہیں بنی زہرہ کے حلیف ہیں پرانے اسلام لانے والوں میں سے ہیں ابتداء سے صحبت نبوی حاصل رہی ان کا ذکر غزوۂ حدیبیہ کے سلسلہ میں آتا ہے، یہی وہ ہیں جن کے بارے میں آنحضور ﷺ نے فرمایا اس شخص کی بہادری پر تعجب ہے اگر اس کے پاس کچھ بہادر ہوتے تو یہ لڑائی کی آگ کے خوب بھڑکانے والوں میں سے ہیں حضور ﷺ کے زمانہ ہی میں انتقال فرمایا۔ اسید ہمزہ کے فتحہ اور سین مہملہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

(۵۳۱) عتبہ بن عبد السلمی: — یہ عتبہ بن عبد سلمی ہیں۔ ابن عبدالبر نے کہا کہ یہ عتبہ نذر کے بیٹے ہیں اور یہ کہ بعض کی رائے ہے کہ دونوں عتبہ دو علیحدہ شخص ہیں اور اسی قول کی طرف ان کا میلان ہے۔ لیکن بخاری نے ان دونوں کو دو علیحدہ شخص مانا ہے یہی رائے ابوحاتم رازی کی ہے اور یہ عتبہ ان کا نام عقلہ تھا۔ آنحضورؐ نے ان کا نام عتبہ رکھا تھا۔ یہ غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے ہیں ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ واقدی کے قول کے مطابق شام میں مرنے والے صحابہ میں سے یہ آخری صحابی ہیں۔

(۵۳۲) عتبہ بن غزوان: — یہ عتبہ بن غزوان مازنی ہیں قدیم الاسلام ہیں پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر مدینہ کی طرف اور جنگ بدر میں شریک ہوئے، ایک قول یہ ہے کہ یہ چھ مردوں کے بعد ساتویں اسلام لانے والے شخص ہیں حضرت عمرؓ نے ان کو بصرہ کا حاکم

بنادیا تھا پھر یہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو انہوں نے ان کو وہیں کا والی بنا کر پھر واپس کر دیا تو ۵۱ھ میں جب کہ ان کی عمر ستاون سال کی تھی راستہ میں وفات پائی ان سے خالد بن عمیر روایت کرتے ہیں۔

(۵۳۳) عدا ابن خالد: — یہ عداء بن خالد بن ہوذہ عامری ہیں، فتح مکہ کے بعد اسلام لائے اور صحرا نشین تھے۔ ان کی حدیث بصرہ والوں کے نزدیک پائی جاتی ہے ان سے ابورجاء وغیرہ روایت کرتے ہیں عداعین کے فتحہ دال کے تشدید کے ساتھ ہے۔

(۵۳۴) عدی بن حاتم: — یہ عدی بن حاتم طائی ہیں شعبان ۷ھ میں آنحضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کوفہ میں آئے اور وہاں ہی رہنے لگے جنگ جمل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حمایت میں ان کی آنکھ پھوٹ گئی تھی، جنگ صفین اور نہروان میں بھی شریک ہوئے ہیں ۶۷ھ میں کوفہ کے اندر انتقال کیا جب کہ ان کی عمر ایک سو بیس سال کی تھی ، بعضوں نے کہا کہ قرقیسا میں انتقال کیا، ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہیں۔

(۵۳۵) عدی بن عمیرہ: — یہ عدی بن عمیرہ کندی حضرمی ہیں، کوفہ میں سکونت رکھتے تھے پھر جزیرہ کی طرف منتقل ہو گئے اور وہیں رہے اور انتقال کیا، قیس بن ابی حازم وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں عمیرہ عین کے فتحہ میم کے کسرہ اور راء کے ساتھ ہے۔

(۵۳۶) عرباض بن ساریہ: — یہ عرباض بن ساریہ ہیں ان کی کنیت ابونجیح سلمی ہے اہل صفہ میں سے تھے، شام میں قیام کیا اور وہیں ۷۵ھ میں انتقال فرمایا۔ ان سے ابوامامہ اور ایک جماعت تابعین کی روایت کرتی ہے، نجیح نون کے زبر جیم کے زیر اور حاء مہملہ کے ساتھ ہے۔

(۵۳۷) عرفجہ بن اسعد: — یہ عرفجہ بن اسعد ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے طرفہ روایت کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جن کو آنحضور صلعم نے حکم دیا تھا کہ یہ اپنی ناک چاندی کی بنوالیں پھر اس کے بعد سونے کی بنوانے کا حکم دے دیا تھا، یوم کلاب میں ان کی ناک کٹ گئی تھی کلاب کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

(۵۳۸) عروہ بن ابی الجعد: — یہ عروہ بن الجعد بارقی ہیں، حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا قاضی بنادیا تھا، یہ کوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی حدیث کوفیوں میں پائی جاتی ہے، بعضوں نے کہا ہے کہ یہ عروہ بن ابی الجعد ہیں ابن مدینی نے کہا ہے کہ جو ان کو ابن الجعد کہتا ہے وہ غلطی کرتا ہے، عروہ تو ابوالجعد ہی کے بیٹے ہیں، ان سے شعبی وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۳۹) عروہ بن مسعود: — یہ عروہ بن مسعود ہیں صلح حدیبیہ میں بحالت کفر شریک تھے، ۹ھ میں طائف سے واپسی کے بعد آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہوئے ان کی زوجیت میں متعدد عورتیں تھیں آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ان میں سے چار بیویوں کو اپنے لئے اختیار کرلیں، اس کے بعد انہوں نے واپس ہونے کی اجازت چاہی، یہ واپس ہوئے اور اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی لیکن قوم نے ان کی بات نہ مانی جب نماز فجر کا وقت ہوا تو اپنے مکان کے بالا خانے پر چڑھے اور آذان دی، جب اشھد ان لا الٰہ اللّٰہ کہا تو قبیلہ ثقیف کے ایک شخص نے ان کے تیر مارا اور ان کو قتل کردیا، جب آنحضور ﷺ کو ان کے قتل کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عروہ بن مسعود کا حال اس شخص کی طرح ہے جس کا ذکر سورہ یٰسین میں ہے۔ جس نے اپنی قوم کو خدا کی طرف دعوت دی اور قوم نے اس کو قتل کردیا۔

(۵۴۰) عطیہ بن قیس: — یہ عطیہ بن قیس سعدی ہیں ان کو آنحضور ﷺ سے روایت اور رؤیت حاصل ہے، اہل یمن اور اہل شام ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۵۴۱) **عطیہ بن بسر:** — یہ عطیہ بن بسر مازنی ہیں اور عبداللہ بن بسر کے بھائی ہیں۔ امام ابوداؤد نے ان کی حدیث کو ان کے بھائی عبداللہ کے ساتھ اس طرح ذکر کیا ہے عن ابنی بسر یعنی بسر کے دونوں بیٹوں سے روایت ہے اور ان دونوں کا نام نہیں ذکر کیا اور ان کی یہ روایت کتاب الطعام میں منقول ہے کہ جو مکھن اور چھوارہ کے بارہ میں ہے ان سے مکحول روایت کرتے ہیں۔

(۵۴۲) **عطیہ القرظی:** — یہ عطیہ قرظی ہیں جو بنو قریضہ کے قیدیوں میں سے ہیں، یوں ہی کہا جاتا ہے، حافظ ابن عبدالبر نے فرمایا کہ میں ان کے باپ کے نام سے واقف نہیں ہوں انہوں نے آنحضور ﷺ کو دیکھا ہے اور آپ ﷺ کے ارشادات بھی سنے۔ ان سے مجاہد وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۴۳) **عقبہ بن رافع:** — یہ عقبہ بن رافع قرشی ہیں افریقہ میں شہید کردیئے گئے ان کو قتل کرنے والا حریر ہے ۶۳ھ میں یہ واقعہ پیش آیا، ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ان کا ذکر تعبیر رویا میں آیا ہے۔

(۵۴۴) **عقبہ بن عامر:** — یہ عقبہ بن عامر جہنی ہیں، حضرت معاویہؓ کی طرف سے عتبہ بن ابی سفیان کے بعد مصر کے حاکم تھے، پھر حضرت معاویہؓ نے ان کو معزول کردیا تھا ۸۵ھ میں مصر کے اندر وفات پائی، ان سے ایک جماعت صحابہ کی اور بہت سے حضرات تابعین میں سے نقل کرتے ہیں۔

(۵۴۵) **عقبہ بن الحارث:** — یہ عقبہ بن حارث قریشی ہیں فتح مکہ کے دن ایمان لائے ان کا شمار مکہ والوں میں ہوتا ہے ان سے عبداللہ ابی ملیکہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۴۶) **عقبہ بن عمرو:** — یہ عقبہ بن عمرو ہیں ان کی کنیت ابو مسعود ہے ان کا ذکر ہم حرف میم میں کریں گے۔

(۵۴۷) **عکاشہ بن محصن:** — یہ عکاشہ بن محصن اسدی ہیں جو بنی امیہ کے حلیف تھے۔ جنگ بدر جس میں انہوں نے عجیب کارنامہ کیا تھا اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ ان کی تلوار غزوۂ بدر میں ٹوٹ گئی تو آنحضور ﷺ کی برکت سے وہ لکڑی تلوار بن گئی تھی یہ بڑے فضل والے صحابہ میں سے ہیں، حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں جب کہ ان کی عمر ۴۵ھ سال تھی انتقال ہوا۔ ان سے حضرت ابوہریرہ اور ابن عباس اور ان کی بہن ام قیس روایت کرتی ہیں۔ عکاشہ میں عین کا پیش اور کاف پر تشدید ہے اور کاف غیر مشدد بھی مستعمل ہے لیکن تشدید کا استعمال زیادہ ہے آخر میں شین معجمہ ہے۔ محصن میں میم کا زیر حاء کا زبر آخر میں نون ہے۔

(۵۴۸) **عکرمہ بن ابی جہل:** — یہ عکرمہ بن ابی جہل ہیں ان کے والد ابوجہل کا نام عروہ بن ہشام مخزومی قریشی ہے یہ اور ان کے باپ آنحضور ﷺ سے بڑی سخت عداوت رکھتے تھے۔ اور یہ مشہور شہسوار تھے فتح مکہ کے دن بھاگ کر یمن چلے گئے تھے، اس کے بعد ان کی بیوی ام حکیم بنت الحارث ان کے پاس پہنچ گئیں اور ان کو لے کر آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ جب آنحضور ﷺ نے ان کو دیکھا تو "مہاجر سوار" کہہ کر خوش آمدید فرمایا ۸ھ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے اور صحیح معنی میں اسلام لائے جنگ یرموک میں ۱۳ھ میں جب کہ ان کی عمر ۶۲ سال تھی قتل کئے گئے، حضرت ام سلمہ آنحضور سے روایت کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ میں نے خواب میں ابوجہل کے لئے جنت میں کھجور کے درخت دیکھے تھے، جب عکرمہ اسلام لائے تو حضور نے فرمایا کہ تمہارے خواب کی یہ تعبیر ہے اور عکرمہ نے آنحضور سے یہ شکایت کی کہ جب میں مدینہ میں چلتا پھرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے دشمن ابوجہل کا بیٹا ہے۔ اس پر آپ ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوگئے اور اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا کہ لوگ سونے اور چاندی کے کانوں کی طرح ہیں جو جاہلیت کے دور میں اچھے تھے وہ اسلام لانے کے بعد بھی جب کہ ان کو دین کی سمجھ آجائے اچھے اور بہترین ہیں۔ اس لئے کسی برے عنوان سے ان کا چرچا نہ کرو۔

(۵۴۹) العلاء بن الحضرمی: — یہ علاء بن حضرمی ہیں حضرمی کا نام عبداللہ ہے حضر موت کے باشندوں میں سے ہیں آپ ﷺ کی طرف سے بحرین پر حاکم تھے حضرت عمرؓ نے ان کو اپنے زمانہ میں بھی بحرین کا حاکم رکھا، یہاں تک کہ یہ علاء ۱۴ھ میں انتقال فرما گئے ان سے سائب بن یزید وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۵۰) علقمہ بن وقاص: — یہ علقمہ بن وقاص لیثی ہیں آنحضور ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں مدینہ کے اندر وفات پائی ان سے ان کے پوتے عمرو اور محمد ابراہیم تیمی روایت کرتے ہیں۔

(۵۵۱) عمار بن یاسر: — یہ عمار بن یاسر عنسی ہیں، بنی مخزوم کے آزاد کردہ اور حلیف ہیں، اس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت عمار کے والد یاسر مکہ میں اپنے دو بھائیوں کے ساتھ جن کے نام حارث اور مالک تھا اپنے چوتھے بھائی کی تلاش میں تشریف لائے پھر حارث اور مالک تو یمن کی طرف واپس ہو گئے مگر یاسر مکہ میں مقیم ہو گئے اور ابو حذیفہ بن مغیرہ کے حلیف بن گئے، ابو حذیفہ نے ان کا نکاح اپنی باندی سے جس کو سمیہ کہا جاتا تھا کر دیا، ان کے بطن سے حضرت عمار پیدا ہوئے ابو حذیفہ نے حضرت عمار کو آزاد کر دیا، پس عمار ابو حذیفہ کے آزاد کردہ ہیں اور ان کے باپ ان کے حلیف ہوئے حضرت عمار ابتداء ہی میں اسلام لے آئے تھے اور یہ ان کمزور مسلمانوں میں سے ہیں جن کو اللہ کے راستہ میں بہت تکالیف مکہ میں پہنچائی گئیں تاکہ یہ اسلام سے باز آجائیں اور مشرکین مکہ نے ان کو آگ میں بھی جلایا، آنحضور ﷺ اس طرف سے گزرتے تو ان پر دست مبارک پھرتے تھے اور فرماتے تھے اے آگ تو عمار پر ٹھنڈک اور سلامتی وعافیت پہنچا جس طرح کہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بن گئی تھی، یہ عمار مہاجرین اولین میں سے ہیں اور غزوۂ بدر اور تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں اور ان غزوات میں بڑی تکالیف برداشت فرمائیں ان کا نام حضور ﷺ نے الطیب المطیب رکھا، یہ جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ تھے اور وہاں ہی ۳۷ھ میں جب کہ ان کی عمر ۹۳ سال کی تھی شہید ہوئے ان سے ایک جماعت جس میں سے حضرت علی اور حضرت ابن عباس بھی ہیں روایت کرتے ہیں۔

(۵۵۲) عمرو بن الاحوص: — یہ عمرو بن احوص کلابی ہیں ان سے ان کے بیٹے سلیمان روایت کرتے ہیں۔

(۵۵۳) عمرو بن الاخطب: — یہ عمرو بن اخطب انصاری ہیں یہ اپنی کنیت ابوزید کے ساتھ مشہور ہیں، آنحضور کے ساتھ متعدد غزوات میں شریک ہوئے، آپ ﷺ نے ان کے سر پر دست مبارک پھیرا ہے اور حسن وجمال کے لئے دعا بھی دی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کچھ اوپر سو سال کو پہنچے لیکن ان کے سر اور داڑھی میں چند بال سے زیادہ سفید نہ تھے۔ ان کا شمار بصرہ والوں میں ہوتا ہے ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۵۵۴) عمرو بن امیہ: — یہ عمرو بن امیہ ضمری ضاد کے فتح اور میم کے جزم کے ساتھ ہے۔ بدر اور احد میں مشرکین کے ہمراہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے آئے، جب مسلمان غزوۂ احد سے واپس ہوئے تو یہ اسلام لائے، یہ عرب کے خاص لوگوں میں سے ہیں اور پہلا وہ میدان جس میں لڑنے کے لئے مسلمانوں کے ہمراہ نکلے ہیں وہ بیر معونہ کی جنگ ہے ان کو عامر بن طفیل نے اس جنگ میں قید کر لیا تھا، پھر ان کی پیشانی کے بال کاٹ کر ان کو چھوڑ دیا تھا۔ ان کو آنحضور ﷺ نے ۶ھ میں حبشہ میں نجاشی کے پاس بھیجا تھا، چنانچہ یہ نجاشی کے پاس آنحضور کا نامۂ مبارک لے کر پہنچے ہیں، جس میں آپ ﷺ نے نجاشی کو اسلام کی دعوت دی تھی چنانچہ آپ ﷺ کی دعوت پر نجاشی مشرف باسلام ہوئے ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے ان سے ان کے دو بیٹے جعفر اور عبداللہ اور ان کے بھتیجے زبرقان بن عبداللہ روایت کرتے ہیں امارت امیر معاویہ کے زمانہ میں مدینہ کے اندر وفات پائی اور بعض نے کہا ہے کہ ۶۰ھ میں۔ زبرقان زائے معجمہ کے کسرہ بائے موحدہ کے جزم اور رائے مہملہ کے کسرہ اور قاف کے ساتھ ہے۔

(۵۵۵) عمرو بن الحارث: — یہ عمرو بن حارث خزاعی ہیں آنحضور ﷺ کے زوجۂ محترمہ جویریہ کے بھائی ہیں کوفہ والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے ان سے ابووائل شقیق بن سلمہ اور ابواسحاق سبیعی روایت کرتے ہیں۔

(۵۵۶) عمرو بن حریث: — یہ عمرو بن حریث قریشی مخزومی ہیں آنحضور ﷺ کا ان کو دیدار نصیب ہوا اور آپ ﷺ سے حدیث کو سنا ہے آپ ﷺ نے ان کے سر پر دست مبارک پھیرا اور برکت کی دعا دی ہے، بعض نے کہا ہے کہ جب آنحضور ﷺ کی وفات ہوئی تو ان کی عمر ۱۲ سال کی تھی، کوفہ میں آئے اور وہیں قیام پذیر ہوئے اور کوفہ کے امیر بنائے گئے اور وہیں ۸۵ھ میں وفات پائی ان سے ان کے بیٹے جعفر وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۵۷) عمرو بن حزم: — یہ عمرو بن حزم ہیں ان کی کنیت ابوالضحاک ہے انصاری ہیں، جب ان کی عمر ۱۵ سال کی تھی تو سب سے پہلے یہ غزوۂ خندق میں حاضر ہوئے ہیں آنحضور ﷺ نے ان کو نجران پر ۱۰ھ میں حاکم بنا دیا تھا ۵۳ھ میں مدینہ میں ان کی وفات ہوئی ان سے ان کے بیٹے محمد وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۵۸) عمرو بن سعید: — یہ عمرو بن سعید قریشی ہیں انہوں نے دونوں ہجرت کی ہیں حبشہ میں دوسری مرتبہ کی ہجرت میں شریک تھے اس کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور جعفر بن ابی طالب کے ہمراہ خیبر کے سال آئے ہیں ۱۳ھ میں شام میں شہید کئے گئے۔

(۵۵۹) عمرو بن سلمہ: — یہ عمرو بن سلمہ مخزومی ہیں۔ آنحضور ﷺ کا زمانہ پایا، یہ حضور کے زمانہ میں اپنی قوم کے امام تھے کیونکہ یہ ان میں سب سے بڑے قاری تھے، بعض نے کہا ہے کہ یہ اپنے باپ کے ہمراہ آنحضور ﷺ کے پاس آئے ہیں، ان کے والد کے حاضر ہونے میں آپ ﷺ کی خدمت میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ عمرو بن سلمہ بصرہ میں آکر رہے ان سے ایک جماعت تابعین کی روایت کرتی ہے۔

(۵۶۰) عمرو بن العاص: — یہ عمرو بن عاص سہمی قریشی ہیں۔ ۵ھ میں اسلام لائے اور بعض نے کہا ہے ۸ھ میں حضرت خالد بن ولید اور عثمان بن طلحہ کے ہمراہ آنحضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور یہ سب ساتھ اسلام لائے ہیں ان کو آنحضرت ﷺ نے عمان کا حاکم بنا دیا تھا یہ برابر وہاں حاکم رہے یہاں تک کہ آنحضور کی وفات ہوگئی۔ انہوں نے حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے بھی بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں۔ انہی کے ہاتھ پر حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مصر فتح ہوا اور برابر حضرت عمرؓ کی زندگی میں یہ مصر کے حاکم رہے ہیں۔ پھر حضرت عثمان غنی نے بھی ان کو وہاں کا حاکم تقریبا چار سال تک برقرار رکھا، اس کے بعد معزول فرمایا، پھر حضرت معاویہ نے جب وہ امیر ہوگئے تو ان کو پھر مقرر کیا، مصر میں ہی ۴۳ھ میں جب کہ ان کی عمر نوے سال کی تھی وفات پائی اور ان کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ کو مصر کا حاکم بنا دیا۔ پھر حضرت معاویہ نے ان کو معزول کر دیا، ان سے ان کے بیٹے عبداللہ اور عبداللہ بن عمر اور قیس بن ابی حازم روایت کرتے ہیں۔

(۵۶۱) عمرو بن عبسہ: — یہ عمرو بن عبسہ ہیں ان کی کنیت ابونجیح ہے۔ سلمی ہیں۔ ابتداء میں ہی اسلام لے آئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اسلام لانے والوں میں یہ چوتھے شخص ہیں، پھر یہ اپنی قوم بنی سلیم کی طرف واپس ہو گئے تھے، آنحضور نے ان سے فرمایا تھا کہ جب تم میرے متعلق یہ سنو کہ میں اعداء اسلام کے لئے نکلا ہوں تو میری اتباع کرنا۔ یہ برابر اپنی قوم میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ غزوۂ خیبر ختم ہوا اس کے بعد یہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور مدینہ طیبہ میں قیام اختیار فرمایا، ان کا شمار شامیوں میں ہوتا ہے، ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے عبسہ میں عین اور بائے موحدہ اور سین مہملہ کے زبر کے ساتھ ہے اور نجیح نون کے زبر جیم کے زیر اور حاء مہملہ کے ساتھ ہے۔

(۵۶۲) عمرو بن عوف: — یہ عمرو بن عوف انصاری ہیں غزوہ بدر میں شریک ہوئے ہیں، ابن اسحاق نے کہا ہے کہ یہ سہیل بن عمرو عامری کے آزاد کردہ ہیں، مدینہ طیبہ میں رہے ان کی کوئی اولاد نہیں ہے ان سے مسور بن مخرمہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۶۳) عمرو بن عوف المزنی: — یہ عمرو بن عوف مزنی قدیم الاسلام ہیں اور یہ ان صحابہ میں سے ہیں جن کی شان میں آیت تولوا واعینھم تفیض من الدمع نازل ہوئی تھی مدینہ میں قیام فرمایا اور مدینہ ہی میں امیر معاویہؓ کے آخر دور امارت میں وفات پائی ان سے ان کے بیٹے عبداللہ روایت کرتے ہیں۔

(۵۶۴) عمرو بن الحمق: — یہ عمرو بن الحمق خزاعی ہیں، یہ صحابی ہیں ان سے جبیر بن نفیر اور رفاعہ ابن شداد وغیرہ روایت کرتے ہیں، موصل میں ۵۱ھ میں قتل کردیئے گئے۔

(۵۶۵) عمرو بن مرہ: — یہ عمرو بن مرہ ہیں، ان کی کنیت ابو مریم ہے جہنی ہیں، بعض نے کہا ہے کہ ازدی ہیں، یہ اکثر غزوات میں شریک ہوئے ہیں شام میں قیام فرمایا اور امیر معاویہؓ کے دور میں وفات پائی ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۵۶۶) عمرو بن قیس: — یہ عمرو بن قیس ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان کا نام عبداللہ بن عمرو قرشی عامری ہے جو نابینا تھے اور وہ ام مکتوم کے بیٹے تھے۔ ام مکتوم کا نام عاتکہ ہے یہ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے ماموں کے بیٹے ہیں۔ مکہ میں ابتداء میں ہی اسلام لے آئے تھے یہ مہاجرین اولین میں سے ہیں حضرت مصعب بن عمیر کے ساتھ ہجرت کی ہے، بہت سی مرتبہ آنحضور ﷺ نے ان کو مدینہ پر اپنا خلیفہ بنا کر رکھا ہے، آخری بار وہ ہے جب کہ آپ ﷺ حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے ہیں مدینہ میں انتقال فرمایا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ جنگ قادسیہ میں شہید ہوئے۔

(۵۶۷) عمرو بہ تغلب: — یہ عمرو بن تغلب عبدی ہیں، قبیلۂ عبدالقیس میں سے تھے ان سے حسن بصری وغیرہ روایت کرتے ہیں تغلب اوپر دو نقطوں والی تا اور غین معجمہ کے ساتھ ہے۔

(۵۶۸) عکراش بن ذویب: — یہ عکراش بن ذویب تمیمی ہیں۔ ان کا شمار بصریوں میں ہے ان سے ان کے بیٹے عبیداللہ روایت کرتے ہیں یہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں اپنی قوم کے صدقات لے کر حاضر ہوئے تھے عکراش میں عین کا زیر کاف ساکن رائے مہملہ اور شین معجمہ ہے۔

(۵۶۹) عمران بن حصین: — یہ عمران بن حصین ہیں ان کی کنیت ابو نجید ہے خزاعی اور کعبی ہیں خیبر کے سال اسلام لائے بصرہ میں قیام فرمایا اور وہیں ان کی وفات ۵۳ھ میں ہوئی بڑے فاضل اور فقیہہ صحابہ میں سے تھے۔ یہ اور ان کے والد دونوں مشرف باسلام ہوئے ان سے ابو رجاء اور مطرف اور زرارہ بن ابی اوفی روایت کرتے ہیں نجید جیم کے پیش جیم کے زیر یاء کے سکون اور دال مہملہ کے ساتھ ہے۔

(۵۷۰) عمیر مولی ابی اللحم: — یہ عمیر آبی اللحم غفاری حجازی کے آزاد کردہ ہیں یہ اپنے آقا آبی اللحم کے ہمراہ فتح خیبر میں شریک ہوئے ہیں، ان سے ایک گروہ روایت کرتے ہے انہوں نے آنحضور ﷺ کے ارشادات کو سنا اور یاد بھی رکھا، آبی اللحم ہمزہ کا زبر اس کے بعد الف ساکن اور باء موحدہ مکسور ہے۔

(۵۷۱) عمیر بن الحمام: — یہ عمیر بن حمام انصاری ہیں غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور اسی میں شہید ہوگئے خالد بن اعلم نے ان کو قتل کیا تھا، ان کا تذکرہ "کتاب الجہاد" میں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عمیر انصار میں سے سب سے پہلے اسلام کے لئے شہید کئے

گئے۔

(۵۷۲) عوف بن مالک: — یہ عوف بن مالک اشجعی ہیں وہ غزوہ جس میں سب سے پہلے شریک ہوئے خیبر ہے ان کے ساتھ اسلامی جھنڈا تھا، فتح خیبر کے دن یعنی ان کی قوم اشجع کا جھنڈا ملک شام میں رہتے تھے اور وہیں پر ان کا انتقال ۷۳ ھ میں ہوا۔ ان سے صحابہ وتابعین کی جماعت روایت کرتی ہے۔

(۵۷۳) عویم بن ساعدہ: — یہ عویم بن ساعدہ انصاری اوسی ہیں بیعت عقبہ اور بیعت ثانیہ۔ غزوۂ بدر اور تمام غزوات میں شریک رہے آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں انتقال فرمایا۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ کے خلافت کے دور میں مدینہ میں انتقال فرمایا جب کہ ان کی عمر ۶۵ سال یا ۶۶ کی تھی ان سے حضرت عمرؓ بن الخطاب روایت کرتے ہیں۔

(۵۷۴) عویمر بن عامر: — یہ عویمر بن عامر ابو درداء ہیں، یہ اپنی کنیت سے مشہور ہیں، ان کا ذکر حرف دال میں گزر چکا ہے۔

(۵۷۵) عویمر بن ابیض: — یہ عویمر بن ابیض عجلانی اور انصاری ہیں، انصار کے حلیف ہیں۔ لعان کا واقعہ انہیں سے تعلق رکھتا ہے اور طبری نے کہا ہے کہ جو عویمر لعان والے ہیں وہ عویمر بن حارث بن زید بن حارثہ بن جد عجلان ہیں۔

(۵۷۶) عیاض بن حمار: — یہ عیاض بن حمار تیمی مجاشعی ہیں، ان کا شمار بصریوں میں ہے، یہ آنحضرت ﷺ کے پرانے سچے محب ہیں۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۵۷۷) عصام مزنی: — یہ عصام مزنی ہیں ان کو آنحضور کی صحبت اور روایت دونوں میسر ہیں۔ یہ بہت کم حدیث بیان کرتے ہیں ان کی حدیث "باب الجہاد" میں ہے جس کی تخریج امام ترمذی اور ابوداؤد نے کی ہے، لیکن ان دونوں نے حدیث کو ان کی طرف منسوب نہیں کیا۔

(۵۷۸) عتبان بن مالک: — یہ عتبان بن مالک خزرجی سالمی ہیں اور بدر کے شریک ہونے والوں میں سے ہیں ان سے حضرت انس اور محمود بن ربیع روایت کرتے ہیں، امیر معاویہ کے زمانہ میں وفات پائی۔

(۵۷۹) عمارہ بن خزیمہ: — یہ عمارۃ بن خزیمہ بن ثابت انصاری ہیں یہ اپنے باپ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے بھی ایک جماعت روایت کرتی ہے عمارہ عین کے ضمہ میم غیر مشدد کے ساتھ ہے۔ ان کے صحابی ہونے میں تردد کیا گیا ہے۔

(۵۸۰) عمارہ بن رویبہ: — یہ عمارہ بن رویبہ ثقفی ہیں۔ ان کا شمار کوفیوں میں ہے، ابوبکرؓ وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ عمارہ عین کے پیش اور میم غیر مشدد کے ساتھ ہے۔

(۵۸۱) عرس بن عمیرہ: — یہ عرس بن عمیرہ کندی ہیں ان سے ان کے بھتیجے عدی وغیرہ روایت کرتے ہیں، عرس عین کے ضمہ راء کے سکون اور سین مہملہ کے ساتھ ہے۔

(۵۸۲) عیاش بن ابی ربیعہ: — یہ عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی قریشی ہیں، یہ ابوجہل کے ماں شریک بھائی ہیں آنحضور ﷺ کے دار ارقم میں داخل ہونے سے پہلے ہی شروع میں اسلام لے آئے، ملک حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پھر انہوں نے اور حضرت عمر نے مدینہ کی طرف ہجرت کی ان کے پاس ہشام کے دونوں بیٹے ابوجہل اور حارث آئے اور کہا کہ تمہاری ماں نے قسم کھائی ہے کہ میں جب تک نہ تم کو دیکھ لوں گی اس وقت تک نہ سر میں تیل ڈالوں گی اور نہ سائے میں آرام کروں گی، اس لئے یہ ان کے ساتھ اپنی ماں کی خدمت میں

حاضر ہوئے پس ان دونوں نے ان کو ایک رسی سے باندھ دیا اور مکہ میں ان کو قید رکھا اس پر آنحضرت ﷺ قنوت میں ان کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔ کہ اے اللہ عیاش بن ابی ربیعہ کو کافروں کی قید سے خلاصی دے جنگ یرموک میں شام کے اندر شہید ہوئے ان سے عمر بن الخطاب وغیرہ روایت کرتے ہیں، عیاش دو نقطوں والی یاء کی تشدید اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔

(۵۸۳) عابس بن ربیعہ: ۔ یہ عابس بن ربیعہ غطیفی ہیں۔ فتح مصر میں شریک ہوئے ان سے ان کے بیٹے عبدالرحمن روایت کرتے ہیں۔

(۵۸۴) ابوعبیدہ بن الجراح: ۔ یہ ابوعبیدہ عامر بن عبداللہ بن جراح فہری قریشی ہیں، عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور اس امت کے امین کہلاتے ہیں، حضرت عثمان بن مظعون کے ساتھ اسلام لائے جبشہ کی طرف دوسری مرتبہ ہجرت کی تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور آنحضور ﷺ کے ساتھ غزوۂ احد میں ثابت قدم رہے انہوں نے ہی خود کی ان دو کڑیوں کو جو آنحضور کے چہرہ انور میں گھس گئی تھیں کھینچا تھا جن کی وجہ سے آپ کے آگے کے دو دانت شہید ہو گئے تھے۔ یہ لابنے قد کے تھے خوبصورت چہرے والے، اور ہلکی داڑھی والے تھے، طاعون عمواس ۱۸ھ میں ان کا انتقال مقام اردن میں ہوا اور بیسان میں دفن ہوئے ان کی نماز جنازہ معاذ بن جبلؓ نے پڑھائی، ان کی عمر اٹھاون سال ہوئی، ان کا نسب باپ کی طرف سے حضور ﷺ کے ساتھ فہر بن مالک پر مل جاتا ہے ان سے ایک جماعت صحابہ کی روایت کرتی ہے۔

(۵۸۵) ابوالعاص بن الربیع: ۔ یہ ابوالعاص مقسم بن ربیع ہیں اور کہا گیا ہے کہ ان کا نام لقیط ہے اور یہ آنحضور ﷺ کے داماد تھے، یعنی آپ ﷺ کی صاحبزادی زینب ان کے نکاح میں تھیں انہوں نے بعد یوم بدر کے قیدی ہونے کے بعد جب کہ کفر کی حالت میں تھے (اور آزاد کئے گئے تھے اسلام قبول کرکے) حضور ﷺ کی طرف ہجرت کی، یہ آنحضور سے بھائی چارہ اور سچی محبت رکھتے تھے، جنگ یمامہ میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے دور میں قتل کر دیئے گئے، ان سے ابن عباس اور ابن عمر اور ابن العاص روایت کرتے ہیں، مقسم میم کے زیر قاف کے سکون اور سین کے زبر کے ساتھ ہے۔

(۵۸۶) ابوعیاش: ۔ یہ ابوعیاش زید بن الصامت انصاری ہیں زرقی ہیں، ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے، ہجرت کے چالیس سال بعد وفات پائی۔

(۵۸۷) ابوعمرو بن حفص: ۔ یہ ابوعمرو بن حفص بن مغیرہ مخزومی ہیں ان کا نام عبدالحمید ہے اور احمد بھی کہا جاتا ہے اور بعضوں نے ان کی کنیت ہی کو ان کا نام کہا ہے، بعض روایت میں ابوحفص بن مغیرہ آیا ہے۔

(۵۸۸) ابوعبس عبدالرحمن بن جبیر: ۔ یہ ابوعبس عبدالرحمن بن جبیر انصاری حارثی ہیں، ان کے نام کی بہ نسبت ان کی کنیت زیادہ مشہور ہے۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے اور مدینہ میں ۳۴ھ میں وفات پائی جنت البقیع میں دفن ہوئے اور ستر سال کی عمر ہوئی ان سے عبایۃ بن رافع بن خدیج روایت کرتے ہیں۔ عبس عین مہملہ کے زبر بائے موحدہ غیر مشدد اور سین مہملہ کے ساتھ ہے اور عبایہ میں عین کا زبر اور بائے موحدہ غیر مشدد اور آخر میں دو نقطوں والی یاء ہے۔

(۵۸۹) ابوعسیب: ۔ یہ ابوعسیب آنحضور ﷺ کے آزاد کردہ ہیں، ان کا نام احمر ہے ان سے مسلم بن عبید روایت کرتے ہیں، عسیب عین کے زبر اور سین مہملہ کے زیر کے ساتھ ہے۔

تابعین

(۵۹۰) عبداللہ بن بریدہ: — یہ عبداللہ بن بریدہ اسلمی ہیں۔ مرو کے قاضی ہیں۔ مشہور تابعین میں سے ایک قابل اعتماد تابعی ہیں، اپنے والد وغیرہ صحابہ سے روایت کرتے ہیں، ان سے ابن سہل وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ مرو ہی میں وفات پائی۔ ان کی بہت سی احادیث ہیں۔

(۵۹۱) عبداللہ بن ابی بکر: — یہ عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری مدنی ہیں مدینہ کے اونچے لوگوں میں سے ہیں تابعی ہیں انس بن مالک اور عروہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں اور ان سے زہری اور مالک بن انس ثوری ابن عیینہ ان سے بہت سی احادیث مروی ہیں، ایسے راوی ہیں جن کا صدق مسلم ہے۔ امام احمد نے فرمایا ان کی حدیث شفاء ہے ۱۳۵ھ میں وفات ہوئی ان کی ستر برس کی عمر ہوئی۔

(۵۹۲) عبداللہ بن زبیر: — یہ عبداللہ بن زبیر وہ ہیں جن کی کنیت ابوبکر ہے۔ یہ حمیدی قریشی اسدی ہیں۔ رواۃ میں بڑے پختہ کار ہیں مسلم بن خالد وکیع اور امام شافعی سے روایت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مصر گئے تھے وہاں جب امام شافعی کی وفات ہوگئی تو یہ مکہ واپس ہوگئے۔ ان سے محمد ابن اسماعیل بخاری اپنی صحیح بخاری میں، بہت زیادہ روایت کرتے ہیں۔ مکہ ۲۱۹ھ میں وفات پائی، یعقوب بن سفیان نے کہا کہ میں نے حمیدی سے زیادہ کسی کو اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں پایا۔

(۵۹۳) عبداللہ بن مطیع: — یہ عبداللہ بن مطیع قرشی عدوی ہیں اور مدینہ کے رہنے والوں میں سے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضور ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور ان کو ان کے باپ آنحضور ﷺ کی خدمت میں لے گئے ان کے باپ کا نام العاص تھا۔ آنحضور ﷺ نے ان کا نام مطیع رکھا تھا اور یہ عبداللہ قریش کے سرداروں میں سے ہیں یہی وہ شخص ہیں جن کو مدینہ والوں نے اپنا امیر یزید بن معاویہ سے فسخ بیعت کے بعد متعین کیا تھا۔ واقدی نے یہ بیان کیا کہ وہ تو صرف قریش پر حکومت کرنے والے تھے نہ اوروں پر اور وہ عبداللہ بن حنظلہ الغسیل ہی ہے کہ جو قریش اور غیر قریش دونوں پر حکمرانی کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے والد سے حدیث کو سنا اور ان سے شعبی وغیرہ نے روایت کی۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر نے ان کو کوفہ کا حاکم بنادیا تھا۔ اور پھر ان کو کوفہ سے مختار بن ابی عبید نے نکال دیا تھا۔

(۵۹۴) عبداللہ بن مسلمہ: — یہ عبداللہ بن مسلمہ بن قعنب تمیمی مدنی ہیں "قعنبی" نام سے مشہور ہیں۔ بصرہ میں رہتے تھے یہ قوی الحفظ قابل اعتماد اور غلطی وخطاء سے محفوظ رواۃ میں سے ہیں یہ حضرت مالک بن انس کے شاگردوں میں سے ہیں ان سے ان کی مصاحبت مشہور تھی، ہشام بن سعد وغیرہ ائمہ سے حدیث کو سنا، ان سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی روایت کرتے ہیں، محرم ۲۲۱ھ میں مکہ کے اندر وفات پائی۔

(۵۹۵) عبداللہ بن موہب: — یہ عبداللہ بن موہب فلسطینی شامی ہیں، فلسطین کے قاضی تھے، تمیم داری سے روایت کی ہے اور قبیصہ بن ذویب سے حدیث کو سنا ہے بعض کا قول ہے کہ انہوں نے تمیم سے نہیں بلکہ قبیصہ بن تمیم سے ہی سماعت کی ہے اور ان سے عمر بن عبدالعزیز روایت کرتے ہیں۔

(۵۹۶) عبداللہ بن مبارک: — یہ عبداللہ بن مبارک مروزی ہیں بنی حنظلہ کے آزاد کردہ ہیں، ہشام بن عروہ، امام مالک، اور ثوری اور شعبہ اور اوزاعی اور بہت لوگوں سے حدیث کو سنا اور ان سے سفیان بن عیینہ اور یحییٰ بن سعید اور ان سے سفیان بن

عیینہ اور یحییٰ بن معین وغیرہ روایت کرتے ہیں علمائے ربانیین میں سے تھے، امام فقیہہ، حافظ حدیث زاہد اور پرہیزگار، سخی قابل اعتماد پختہ کار تھے۔ اسماعیل بن عیاش نے کہا کہ روئے زمین پر عبداللہ بن مبارک جیسا کوئی نہ تھا، نہ ان سے علم میں کوئی بڑھا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے خیر کی خصلتوں میں ایسی کوئی خصلت نہیں پیدا کی جو عبداللہ بن مبارک کو عطا نہ فرمائی ہو، بغداد میں بارہا تشریف لائے اور وہاں درس حدیث دیا ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱ھ میں وفات پائی۔

(۵۹۷) **عبداللہ بن عکیم:** — یہ عبداللہ بن عکیم جہنی ہیں۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کا زمانہ پایا مگر ان کے لئے آنحضور ﷺ کی روایت کا پایا جانا مشہور نہیں۔ لیکن بہت سے علماء معرفت رجال نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے اور صحیح یہی کہ وہ تابعی ہیں، عمر بن مسعود اور حذیفہ سے انہوں نے حدیث کو سنا اور ان سے ایک گروہ روایت کرتا ہے ان کی حدیث کوفہ والوں میں پائی جاتی ہے۔

(۵۹۸) **عبداللہ بن ابی قیس:** — یہ عبداللہ بن ابی قیس ہیں ان کی کنیت ابوالاسود ہے، شام کے رہنے والے ہیں عطیہ بن عازب کے آزاد کردہ ہیں، شامیوں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی اور ان سے ایک جماعت نے۔

(۵۹۹) **عبداللہ بن عصم:** — ان کو عبداللہ بن عصمہ بھی کہا جاتا ہے۔ کوفی و حنفی ہیں یہ ابوسعید اور ابن عمر سے اور ان سے اسرائیل اور شریک روایت کرتے ہیں ان کی حدیث یہ ہے "ثقیف میں ایک کذاب اور مفسد اعظم ہوگا"

(۶۰۰) **عبداللہ بن محیریز:** — ان کا پورا نام عبداللہ بن محریز جمحی قرشی ہے اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں میں ہیں۔ مشہور تابعین میں سے ہیں، ابومحذورہ اور عبادہ بن صامت وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے مکحول اور زہری جیسے بڑے بڑے محدثین روایت کرتے ہیں۔ رجاء بن حیوۃ فرماتے تھے کہ اگر اہل مدینہ کو ابن عمرؓ جیسے عبادت گذار پر فخر ہے تو ہمیں بھی اپنے عابد و زاہد ابن محیریز پر فخر ہے۔ ۱۰۰ھ سے پہلے انتقال کیا۔

(۶۰۱) **عبداللہ بن المثنیٰ:** — نام عبداللہ ہے۔ مثنیٰ بن عبداللہ بن انس بن مالک کے بیٹے ہیں۔ اپنے چچوں اور حسن سے روایت کی ہے اور ان سے ان کے بیٹے محمد اور مسدد وغیرہ نے روایت کی ہے ابوحاتم نے ان کو صالح قرار دیا اور ابوداؤد نے فرمایا کہ میں ان کی حدیث کی تخریج نہیں کرتا۔

(۶۰۲) **عبداللہ بن عمرو بن حفص:** — نام عبداللہ عمرو بن حفص بن عاصم کے بیٹے ہیں اور عمری ہیں اپنے بھائی عبیداللہ اور نافع اور مقری سے روایت کرتے ہیں قعنبی وغیرہ ان کی روایات کے راوی ہیں، ابن معین نے ان کو صویلح (کچھ باصلاحیت) قرار دیا، ابن عدی نے فرمایا لاباس بہ صدوق ان سے روایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے سچے آدمی ہیں۔ ۱۷۱ھ میں انتقال ہوا۔

(۶۰۳) **عبداللہ بن عتبہ:** — یہ عبداللہ بن عتبہ بن مسعود ہذلی ہیں۔ عبداللہ بن مسعود کے بھتیجے۔ مدنی ہیں پھر کوفہ کے باشندے ہوگئے، عہد نبوت کو پایا، کوفہ کے بڑے تابعین میں سے ہیں اور دوسرے صحابہ سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ ان کے صاحب زادے عبداللہ اور محمد بن سرین وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے بشیر بن مروان کے دور حکومت میں ان کا انتقال کوفہ میں ہوا۔

(۶۰۴) **عبداللہ بن مالک بن بحینہ:** — پورا نام عبداللہ بن مالک بن القشب الازدی ہے۔ ان کی والدہ بحینہ ہیں ان کے نانا کا نام حارث بن عبدالمطلب ہے حضرت معاویہؓ کے زمانہ حکومت میں ۵۴ھ یا ۵۸ھ میں انتقال کیا قشب میں قاف مکسور شین منقوطہ ساکن اور باء موحدہ ہے۔

(۶۰۵) عبداللہ بن مالک: — ان کا نام عبداللہ ابن مالک اور کنیت ابوتمیم جیشانی ہے حضرت عمر بن خطاب اور ابوذر اور دوسرے صحابہ سے روایت کرتے ہیں مصر کے تابعین میں ان کا شمار ہے، ان کی حدیثیں اہل مصر کے پاس ملتی ہیں۔

(۶۰۶) عبداللہ بن مالک: — اسم گرامی عبداللہ بن مالک ہے، ہمدان کے باشندہ ہیں۔ صحابہ میں علی و عائشہ و ابن عمر سے روایت کرتے ہیں ابو اسحاق اور ابوورق نے ان سے روایت کی ان کی حدیث جمع بین الصلوتین کے باب میں ہے۔

(۶۰۷) عبداللہ بن عبدالرحمٰن: — نام نامی عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی حسن ہے مکہ کے رہنے والے اور قریش خاندان سے ہیں اور تابعی ہیں، ابوطفیل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں تابعین کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی مالک اور ثوری اور ابن عیینہ نے ان سے روایت کی۔

(۶۰۸) عبداللہ بن عبیداللہ: — نام گرامی عبداللہ بن عبیداللہ بن ابی ملیکہ ہے ابوملیکہ کا نام زہیر بن عبداللہ التیمی ہے قریش میں سے ہیں۔ یہ احول (بھینگے) ہیں۔ مشہور اہل علم تابعین میں سے ہیں، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں قاضی رہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن الزبیر، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں ابن جریج اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے ان سے روایت کی ۱۱۷ھ میں انتقال فرمایا ملیکہ میں میم پر پیش اور لام پر زبر ہے۔

(۶۰۹) عبداللہ بن شقیق: — عبداللہ بن شقیق نام، ابوعبدالرحمٰن کنیت ہے بنوعقیل میں سے ہیں، آپ کا وطن بصرہ ہے مشہور قابل اعتماد (ثقہ) تابعین میں سے ہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث کی سماعت کی اور جریری نے ان سے روایت کی۔

(۶۱۰) عبداللہ بن شہاب: — آپ کا نام عبداللہ شہاب کے بیٹے ابوالحرب کنیت ہے اور خولانی ہیں تابعین کے دوسرے طبقے میں ان کا شمار ہے۔ اہل کوفہ کے یہاں ان کی حدیث پائی جاتی ہے یہ نایاب حدیث والے ہیں ابن عمر اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے انہوں نے اور ایک جماعت نے ان سے روایت کی۔

(۶۱۱) عبیداللہ بن رفاعہ: — یہ عبیداللہ رفاعہ بن رافع کے بیٹے انصاری اور زرقی ہیں، مشہور تابعی ہیں اپنے والد رفاعہ اور فاطمہ بنت عمیس سے روایت کرتے ہیں، اور ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔

(۶۱۲) عبیداللہ بن عبداللہ: — ان کا نام نامی عبیداللہ بن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر اور کنیت ابوبکر ہے۔ اہل مدینہ سے حدیث کی سماعت کی، تابعی ہیں امام زہری اور بڑے بڑے تابعین نے ان سے روایت کی اپنے بھائی سالم سے پہلے وفات پائی یہ محدثین کے نزدیک ثبت اور ثقہ ہیں ان کی حدیث اہل حجاز کے یہاں ہے۔

(۶۱۳) عبیداللہ بن عدی: — پورا نام عبیداللہ بن عدی بن خیار قرشی ہے، کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی، ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔ ولید بن عبدالملک کے عہد میں وفات پائی۔

(۶۱۴) عبید بن عمیر: — عبید بن عمر نام اور کنیت ابوعاصم ہے یہ بنو اللیث میں سے ہیں حجاز کے باشندہ، اہل مکہ کے قاضی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے۔ کبار تابعین میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ و حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ و حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عائشہ سے حدیث کی سماعت کی، ان سے کچھ تابعین نے بھی روایت کی ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ان کا انتقال ہوا۔

(۶۱۵) **عبدالرحمٰن بن کعب**:- پورا نام عبدالرحمٰن ابن کعب بن مالک الانصاری ہے مدینہ کے تابعین میں سے مشہور تابعی ہیں ثقات تابعین میں سے ہیں، کثیر الروایت ہیں صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں، سلیمان بن یسار وغیرہ نے ان سے روایت کی۔

(۶۱۶) **عبدالرحمٰن بن الاسود**:- عبدالرحمٰن بن اسود قرشی زہری ہیں۔

(۶۱۷) **عبدالرحمٰن بن یزید**:- پورا نام عبدالرحمٰن بن یزید بن حارثہ الانصاری ہے، مدینہ کے رہنے والوں میں سے ہیں، کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں پیدا ہوئے ان کی حدیث اہل مدینہ کے یہاں پائی جاتی ہے ۹۸ھ میں وفات پائی۔

(۶۱۸) **عبدالرحمٰن بن ابی لیلی**:- نام عبدالرحمٰن ابن ابی لیلی ہے انصار میں سے ہیں حضرت عمرؓ کی خلافت کے چھ سال باقی تھے اس وقت ان کی پیدائش ہوئی۔ دجیل میں شہید کئے گئے، بعض کہتے ہیں کہ نہر بصرہ میں ڈوب گئے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دیر جماجم میں ۸۳ھ میں ابن الاشعث کے حملہ کے وقت گم ہو گئے، ان کی حدیثیں اہل کوفہ میں پائی جاتی ہیں اپنے والد اور بہت سے صحابہ سے انہوں نے حدیث سنی اور ان سے شعبی مجاہد، ابن سیرین اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے حدیث کو سنا کوفہ میں رہنے والے تابعین کے پہلے طبقہ میں سے ہیں۔

(۶۱۹) **عبدالرحمٰن بن غنم**:- پورا نام عبدالرحمٰن ابن غنم الاشعری ہے شام کے رہنے والے ہیں، زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں کو دیکھا، آپ ﷺ کی حیات میں مسلمان ہو چکے تھے لیکن آپ ﷺ کو نہیں دیکھا۔ جب سے حضرت معاذؓ کو آنحضرت ﷺ نے یمن بھیجا تھا برابر ان کے ساتھ رہے تا آنکہ حضرت معاذ کا انتقال ہو گیا۔ فقہا اہل شام میں سب سے زیادہ فقیہہ تھے۔ عمر بن الخطاب و معاذ بن جبل جیسے متقدمین صحابہ سے روایت کرتے ہیں، غنم میں غین منقوطہ مفتوح اور نون ساکن ہے۔ ۸۷ھ میں انتقال ہوا۔

(۶۲۰) **عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ**:- نام عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ ہے اور ابو عمرہ کا نام عمرو بن محصن ہے، یہ انصاری اور بخاری ہیں مدینہ کے قاضی ہیں، ثقہ تابعین میں سے ہیں ان میں ان کی حدیثیں مشہور ہیں، انہوں نے اپنے والد عمرو بن محصن عثمان اور ابوہریرہ سے روایت کی اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔

(۶۲۱) **عبدالرحمٰن بن عبداللہ**:- ان کا نام عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی صعصہ المازنی انصاری ہے اپنے والد عبداللہ اور عطاء بن یسار سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ایک جماعت مالک بن انس وغیرہ روایت کرتی ہے، ان کی حدیثیں اہل مدینہ کے یہاں پائی جاتی ہیں ۱۲۹ھ میں انتقال ہوا۔

(۶۲۳) **عبدالرحمٰن بن عبدالقاری**:- ان کا نام عبدالرحمٰن بن عبدالقاری ہے، کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے، لیکن نہ آپ ﷺ سے حدیث کی سماعت کی نہ روایت بیان کی، مورخ واقدی نے ان صحابہ کے ذکر میں جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے ان کا بھی شمار کیا ہے لیکن مشہور یہ ہے کہ تابعی ہیں، مدینہ کے تابعین اور وہاں کے علماء میں سے ہیں، حضرت عمر بن الخطاب سے حدیث سنی ہے ۸۱ھ بعمر ۷۸ سال وفات پائی، القاری میں قاف اور راء مہملہ مکسور اور یاء مشدد ہے بے ہمزہ اور قارہ کی طرف نسبت ہے (قارہ والے)

(۶۲۴) **عبدالرحمٰن بن عبداللہ**:- نام عبدالرحمٰن بن عبداللہ ہے ان کی والدہ ام الحکم ہیں جو ابوسفیان بن حرب کی بیٹی ہیں حضرت معاویہؓ نے ان کو کوفہ کا امیر مقرر فرمایا باب خطبۃ یوم الجمعہ میں ان کا نام آتا ہے۔

(۶۲۵) **عبدالرحمٰن بن ابی بکر:** — عبدالرحمٰن نام ابوبکر کے بیٹے ہیں ان کے صاحبزادے محمد ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۶۲۶) **عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ:** — عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ نام ہے انصار بنو ثقیف میں سے ہیں بصرہ وطن ہے بصرہ ہی میں ۱۴ھ میں مسلمانوں کے وہاں پہنچنے پر پیدا ہوئے۔ بصرہ میں مسلمانوں کے یہاں سب سے پہلے ان کی پیدائش ہوئی، تابعی ہیں کثرت سے روایت نقل کرتے ہیں اپنے والد اور حضرت علیؓ سے روایت سنی ہے اور ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۶۲۷) **عبدالرحمٰن بن عبداللہ:** — پورا نام عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی عمار ہے مکہ کے رہنے والے ہیں۔ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں اور حضرت معاذ سے حدیث کی سماعت کی اور ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔

(۶۲۸) **عبدالرحمٰن بن زید:** — نام عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم مدنی ہے اپنے والد اور ابن المنکدر سے روایت کرتے ہیں اور قتیبہ، ہشام وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے، ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔

(۶۲۹) **عبدالعزیز بن رفیع:** — یہ عبدالعزیز ابن رفیع اسدی مکی ہیں کوفہ میں رہے مشہور ثقہ تابعین میں سے ہیں ابن عباس اور ابن مالک سے حدیث سنی حالانکہ نوے سال سے کچھ زیادہ عمر ہو چکی تھی، رفیع رفع سے تصغیر ہے (یعنی راء مضموم اور فاء مفتوح ہے۔

(۶۳۰) **عبدالعزیز بن جریج:** — یہ عبدالعزیز بن جریج مکی ہیں۔ حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں فقیہہ عبدالملک ان کے بیٹے اور خصیف ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۶۳۱) **عبدالعزیز بن عبداللہ:** — نام عبدالعزیز بن عبداللہ مدینہ کے اکابر فقہاء میں سے ہیں، امام زہری محمد بن المنکدر اور حمید الطویل وغیرہ سے اور بہت سے لوگوں سے حدیث سنی، بہت سے لوگ ان سے روایت کرتے ہیں بغداد میں تشریف لائے، حدیث بیان کی، بمقام بغداد ۱۶۴ھ میں انتقال فرمایا، قریش کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

(۶۳۲) **عبدالملک بن عمیر:** — عبدالملک بن عمیر قرشی کوفی ہیں قرشی میں قرشہ کی طرف نسبت ہے جو نہیں جانتے وہ کہتے ہیں کہ قریش کی طرف منسوب ہے حالانکہ ایسا نہیں وہ قرشہ کی طرف منسوب ہے، امام شعبی کے بعد کوفہ کے قاضی رہے، تابعین میں سے مشہور اور ثقہ حضرات میں سے ہیں کوفہ کے اکابر میں شمار ہوتے ہیں جندب بن عبداللہ اور جابر بن سمرہ سے روایت کرتے ہیں ثوری اور شعبہ ان سے روایت کرتے ہیں تقریباً ۱۳۶ھ میں وفات پائی ان کی عمر ۱۰۳ سال ہوئی۔

(۶۳۳) **عبدالواحد بن ایمن:** — نام عبدالواحد بن ایمن مخزومی ہے یہ قسم بن عبدالواحد کے باپ ہیں انہوں نے روایت حدیث کو اپنے والد اور دوسرے تابعین سے سنا اور ان سے ایک بڑی جماعت نے حدیث کی سماعت کی۔

(۶۳۴) **عبدالرزاق بن ہمام:** — عبدالرزاق بن ہمام نام اور ابوبکر کنیت ہے ابن جریج اور معمر وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، اور ان سے احمد اور اسحاق اور رمادی نے روایت کی بہت سی کتابیں تصنیف کیں ۲۱۱ھ میں وفات پائی، ان کی عمر پچاسی سال ہوئی۔

(۶۳۵) **عبدالحمید بن جبیر:** — یہ عبدالحمید بن جبیر حجبی ہیں اپنی پھوپھی صفیہ اور ابن المسیب سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابن جریج اور ابن عیینہ سے روایت کی۔

(۶۳۶) **عبدالمہیمن بن عباس:** — پورا نام عبدالمہیمن بن عباس بن سہل ہے، بنو ساعدہ میں سے ہیں اپنے والد اور ابوحزم سے روایت کرتے ہیں اور ان سے مصعب اور یعقوب بن حمید بن کاسب نے روایت کی ان کا ذکر باب الحذر والتأنی میں ہے۔

(۶۳۷) **عبد الاعلی:** — نام عبد الاعلی بن مسہر ہے ابو مسہر کنیت ہے غسان میں سے ہیں شام کے بزرگ ہیں سعید بن عبد العزیز اور مالک سے روایت کی اور ان سے ابن معین ابو حاتم اور ابن رو اس نے روایت کی لوگوں میں سب سے زیادہ حافظ جلالت اور فصاحت کے مالک ہیں، ان کو قتل کرنے کے لئے ننگا کیا گیا، تاکہ مسئلہ خلق قرآن کا اقرار کرلیں اس وقت بھی اقرار نہ کیا اور انکار کرتے رہے پھر جیل میں ڈال دیئے گئے رجب ۲۱۸ھ میں انتقال فرمایا۔

(۶۳۸) **عبد المنعم:** — یہ عبد المنعم نعیم کے بیٹے اسواری ہیں حریری اور ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں اور یونس المورب اور محمد بن ابی بکر مقدمی نے ان سے روایتیں کی ہیں۔

(۶۳۹) **عبد خیر بن یزید:** — یہ عبد خیر ہیں یزید کے بیٹے کنیت ابو عمارہ ہے ہمدان کے باشندے ہیں، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کا زمانہ تو پایا لیکن ملاقات نہیں ہوئی۔ حضرت علیؓ کے ساتھ رہے۔ حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں سے ہیں، محدثین کے نزدیک وثوق اور اعتماد کے شخص ہیں کوفہ میں قیام پذیر ہوگئے، ایک سو بیس سال کی عمر ہوئی، خیر شر کی ضد ہے۔ یعنی عبد خیر میں لفظ خیر ضد شر ہے۔

(۶۴۰) **عمران بن حطان:** — یہ عمران حطان کے بیٹے دوسی اور خزرجی ہیں حضرت عائشہ ابن عمر ابن عباس اور ابوذرؓ سے حدیث سنی اور ان سے محمد ابن سیرین و یحیٰ بن ابی کثیر وغیرہ نے روایت کی، حطان میں حاء مہملہ پر کسرہ طاء مہملہ پر تشدید اور آخر میں نون ہے۔

(۶۴۱) **عمرو بن شعیب:** — یہ عمرو، شعیب بن محمد بن عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے بیٹے اور سہمی ہیں اپنے والد اور ابن المسیب اور طاؤس سے حدیث سنی اور ان سے زہری ابن جریج عطاء اور بہت سے لوگوں نے روایت کی، بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں ان کی کوئی حدیث نہیں لی اس لئے کہ وہ اپنی روایت اس طرح نقل کرتے ہیے عن ابیہ عن جدہ اور کبھی اس سند میں اختصار کرتے ہیں، تو اب اگر مراد عن ابیہ عن جدہ سے خود اپنے باپ اور اپنے دادا ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ اپنے باپ شعیب اور اپنے دادا ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ اپنے باپ اور اپنے دادا محمد سے روایت کر رہے ہیں کہ ان کے دادا محمد سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایسا فرمایا اس صورت میں روایت مرسل ہوگئی کیونکہ محمد جو ان کے دادا ہیں حضور ﷺ کی ملاقات سے مشرف نہیں تھے، نہ انہوں نے زمانہ پایا اور اگر اس سند کا مطلب یہ ہے کہ عمرو اپنے باپ شعیب سے اور شعیب اپنے دادا عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں تو اس صورت میں سند متصل نہیں رہتی، کیونکہ شعیب نے اپنے دادا عبد اللہ کا زمانہ نہیں پایا اسی عیب کی وجہ سے امام بخاری اور امام مسلم نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ان کی روایت کو نہیں لیا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ شعیب اپنے دادا سے مل چکے ہیں۔

(۶۴۲) **عمرو بن سعید:** — عمرو بن سعید نام ہے بنو ثقیف کے آزاد کردہ اور بصرہ کے رہنے والے ہیں، حضرت انس وغیرہ سے روایت کی اور ان سے ابن عون اور جریر بن حازم نے روایت کی۔

(۶۴۳) **عمرو بن عثمان:** — یہ عمرو عثمان بن عفان کے بیٹے، ہیں، اسامہ بن زید اور اپنے والد عثمان بن عفان سے حدیث سنی حدیث البکاء علی المیت میں ان کا ذکر ہے ان سے مالک بن انس نے روایت کی۔

(۶۴۴) **عمرو بن الشرید:** — نام عمرو ہے شرید کے بیٹے۔ ثقفی اور تابعی ہیں ان کا شمار اہل طائف میں ہے، ابن عباس اور ان کے والد اور رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ ابو رافعؓ سے حدیث سنی اس سے صالح بن دینار اور ابراہیم بن میسرہ نے روایت کی۔

(۶۴۵) **عمرو بن میمون:** — یہ عمر ہیں میمون کے بیٹے اور ازدی ہیں زمانہ جاہلیت اور اسلام دونوں دیکھے، آنحضرت ﷺ کی

حیات ہی میں مسلمان ہو گئے تھے لیکن آپ ﷺ سے ملاقات نہیں ہوئی، کوفہ کے بڑے تابعین میں ان کا شمار ہے عمر بن خطاب معاذ بن جبل اور ابن مسعود سے روایت کی اور ان سے اسحاق نے حدیث سنی ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(۶۴۶) عمرو بن عبداللہ: — نام عمرو، عبداللہ کے بیٹے اور سبیعی ہیں ان کا ذکر حرف ہمزہ میں گزر چکا ہے۔

(۶۴۷) عمرو بن عبداللہ: — نام عمرو ہے عبداللہ بن صفوان کے بیٹے اور جمحی ہیں قریش میں سے ہیں یزید بن شیبان سے روایت کی اور ان سے عمرو بن دینار وغیرہ نے۔

(۶۴۸) عمرو بن دینار: — یہ عمرو دینار کے بیٹے ہیں کنیت ابو یحییٰ ہے، سالم بن عبداللہ وغیرہ سے روایت کی اور ان سے دنوں حماد اور معتمر نے، کئی محدث ان کو روایت میں ضعیف کہتے ہیں۔

(۶۴۹) عمرو بن واقد: — یہ عمرو واقد کے بیٹے دمشق کے رہنے والے ہیں یونس بن میسرہ اور کئی حضرات سے روایت کی اور ان سے نفیلی اور ہشام بن عمار نے، محدثین کے یہاں روایت حدیث کے معاملہ میں متروک ہیں۔

(۶۵۰) عمرو بن مالک: — عمرو بن مالک نام ابو ثمامہ کنیت ہے زمانہ جاہلیت (قبل از اسلام) کا آدمی ہے حدیث کسوف اور باب الغضب میں جابر کی روایت سے مسلم میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بیان کیا کہ یہی وہ شخص ہے کہ جس کو آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہ جہنم میں اپنی اوجھ گھسیٹتا ہوا جا رہا ہے، روایت میں تو اسی طرح مذکور اور مشہور یہ ہے کہ یہ شخص جس کو آپ ﷺ نے دیکھا تھا عمرو بن لحی ہے، لحی ربیعہ بن حارثہ ہے اور عمرو خزاعہ کا باپ ہے۔

(۶۵۱) عمرو بن عبدالعزیز: — یہ عمر ہیں عبدالعزیز بن مروان بن حکم کے بیٹے ہیں، ابو حفص کنیت ہے، قریش میں سے بنو امیہ کے گھرانے سے ہیں ان کی والدہ ام عاصم حضرت عمر بن خطاب کی پوتی اور عاصم کی بیٹی ہیں ام عاصم کا نام لیلی ہے۔ ابو بکر بن عبدالرحمٰن سے روایت کی ہے اور ان سے زہری وابو بکر بن حزم نے روایت کی ۹۹ھ میں سلیمان بن عبدالملک کے بعد سریر ارائے خلافت ہوئے، جب ۱۰۱ھ میں دیر سمعان میں وفات پائی دیر سمعان حمص کے علاقہ میں ہے، مدت خلافت دو سال پانچ ماہ اور کچھ روز ہے، اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال تھی، کہتے ہیں کہ چالیس سال پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ وفات پائی، یہ عبادت، زہد، اتقا پاکبازی حسن اخلاق کا ایک خاص مقام رکھتے تھے، خصوصا زمانہ خلافت میں۔ کہتے ہیں کہ جب ان کو خلافت سپرد کی گئی تو ان کے مکان میں سے رونے کی آواز سنائی دی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عمر بن عبدالعزیز نے اپنی لونڈیوں کو اختیار دے دیا ہے کہ تم میں سے جس کو آزاد ہونے کی خواہش ہو اس کو میں آزاد کر دوں، اور میرا اس سے کچھ علاقہ نہ رہے اور جس کے میرے ساتھ رہنے کی خواہش ہو اس کو اپنے پاس رکھ لوں کیونکہ مجھے ایسی چیز پیش آگئی ہے جس کے باعث میں تمہاری طرف متوجہ نہیں رہ سکتا یہ سن کر سب لونڈیاں رونے لگیں، عقبہ بن نافع نے ان کی زوجہ فاطمہ بنت عبدالملک سے پوچھا کہ تم مجھے عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ جب سے ان کو خدا نے خلافت عطاء کی میں نہیں کہہ سکتی کہ انہوں نے کبھی جنابت اور احتلام کے باعث غسل کیا ہو یہاں تک کہ انہوں نے وفات پائی انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی عمر بن عبدالعزیز سے روزے اور نماز میں بڑھا ہوا ہو، لیکن میں نے کسی ایسے شخص کو بالکل نہیں دیکھا جو عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ اپنے پروردگار کا خوف کرتا ہو، گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے آپ کو مسجد خانہ میں گرا دیتے اور برابر گریہ وزاری و دعا میں مصروف رہتے یہاں تک کہ آنکھوں پر نیند غالب آجاتی۔ پھر بیدار ہو جاتا اور دعا وگریہ میں مصروف ہو جاتے ساری رات یہی شغل رہتا، وہب بن منبہ نے فرمایا کہ اگر اس اُمت میں کوئی مہدی ہے تو وہ عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ ان کے مناقب بہت اور ظاہر ہیں۔

(۶۵۲) عمر بن عطاء: — یہ عمر عطاء کے بیٹے وخواری کے پوتے مکی وتابعین میں شمار ہیں، ان کی حدیثیں اہل مکہ میں پائی جاتی ہیں۔ ابن عباسؓ سے ان کا روایت کرنا مشہور ہے لیکن سائب بن یزید اور نافع بن جبیر سے بھی روایت کرتے ہیں ابن جریج وغیرہ نے حدیث سنی بکثرت روایت کرتے ہیں۔ خوار میں خاء معجمہ پر پیش اور واؤ پر زبر اور آخر میں راء مہملہ ہے۔

(۶۵۳) عمر بن عبداللہ: — نام عمر عبداللہ بن ابی خثعم کے بیٹے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کی اور ان سے زید بن خباب اور ایک جماعت نے، بخاری نے فرمایا کہ ان کی حدیث بے کار ہے۔

(۶۵۴) عثمان بن عبداللہ: — نام عثمان، عبداللہ بن اوس کے بیٹے بنو ثقیف میں سے ہیں اپنے دادا اور چچا عمرو سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابراہیم بن میسرہ اور محمد بن سعید اور ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۶۵۵) عثمان بن عبداللہ: — نام عثمان، عبداللہ بن موہب کے بیٹے تمیم کے خاندان سے ہیں ابوہریرہؓ اور ابن عمرؓ وغیرہ سے روایت کی۔ اور ان سے شعبہ اور ابوعوانہ نے۔

(۶۵۶) علی بن عبداللہ: — نام علی عبداللہ بن جعفر کے بیٹے، ابن مدینی کے نام سے مشہور ہیں، مدینی میں میم پر زبر اور دال کے نیچے زیر ہے حافظ حدیث ہیں اپنے والد اور حماد اور دوسرے حضرات سے روایت کی اور ان سے بخاری اور ابویعلی اور ابوداؤد نے خود ان کے استاد ابن مہدی نے فرمایا کہ ابن مدنی رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو سب سے زیادہ جانتے ہیں امام نسائی نے فرمایا کہ ان کی پیدائش ہی اس کام کے لئے ہوئی تھی۔ ذی قعدہ ۲۳۴ھ میں بعمر ۷۳ سال انتقال فرمایا۔

(۶۵۷) علی بن حسین: — علی نام، حضرت حسین کے صاحبزادے اور علی بن ابی طالبؓ کے پوتے ہیں کنیت ابوالحسن ہے اور زین العابدین کے نام سے معروف ہیں اہل بیت میں سے اکابر سادات میں سے تھے تابعین میں جلیل القدر اور شہرت یافتہ حضرات میں سے تھے، امام زہری نے فرمایا کہ قریش میں سے میں نے کسی کو ان سے زیادہ افضل نہیں پایا ۹۴ھ میں بعمر ۵۸ سال وفات پائی اور بقیع میں اسی قبر میں مدفون ہوئے جس میں ان کے عم محترم حضرت حسن بن علیؓ مدفون تھے۔

(۶۵۸) علی بن منذر: — یہ علی میں منذر کے بیٹے اور کوفی ہیں طریقی کے نام سے مشہور ہوئے قابل ذکر عبادت گذار لوگوں میں سے تھے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ۵۵ حج کئے، ابن عیینہ اور ولید بن مسلم سے روایت کی اور ان سے ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کی ابن حاتم نے کہا کہ ان کی حدیث میں نے اپنے والد کی معیت میں سنی ثقہ اور بہت سچے راوی ہیں، امام نسائی نے کہا خالص شیعی ہیں اور ثقہ ہیں، ۲۵۶ھ میں وفات پائی طریقی میں طاء مہملہ پر زبر اور راء مہملہ کے نیچے زیر اور یاء سے پہلے قاف ہے۔

(۶۵۹) علی بن زید: — نام علی بن زید ہے، نسباً قریشی ہیں بصرہ کے رہنے والے ہیں، بصرہ کے تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے یہ مکہ کے باشندہ تھے۔ بصرہ میں آکر رہ گئے تھے، انس بن مالک، ابوعثمان نہدی اور ابن مسیب سے حدیث سنی اور ان سے ثوری وغیرہ نے روایت کی ۱۳۰ھ میں وفات پائی۔

(۶۶۰) علی بن یزید: — نام علی بن یزید الہانی ہے قاسم بن عبدالرحمٰن سے روایت کی اور ان سے کچھ لوگوں نے روایت کی ہے ایک جماعت ان کو روایت میں ضعیف کہتی ہے۔

(۶۶۱) علی بن عاصم: — علی بن عاصم نام واسط کے رہنے والے ہیں یحییٰ البکاء (بہت گریہ وزاری کرنے والے) اور عطاء بن سائب اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں سے روایت کی اور ان سے احمد اور دوسرے لوگوں نے بہت سے لوگ ان کو ضعیف کہتے ہیں، ان کے پاس

ایک لاکھ حدیثیں ہیں ۹۰ سال سے زیادہ عمر پائی۔

(۶۶۲) **العلاء بن زیاد:** — نام علاء زیاد بن مطر کے بیٹے بنو عدی میں سے ہیں بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ دوسرے طبقہ کے تابعی ہیں، یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو شام آگئے اور ان سے قتادہ نے ۹۴ھ میں انتقال فرمایا۔

(۶۶۳) **عطاء بن یسار:** — یہ عطاء ہیں یسار کے بیٹے ان کی کنیت ابو محمد ہے ام المؤمنین حضرت میمونہ کے آزاد کردہ ہیں، مدینہ کے مشہور تابعین میں سے تھے ابن عباسؓ سے بکثرت روایت کرتے ہیں ۹۷ھ میں بعمر ۸۴ سال وفات پائی۔

(۶۶۴) **عطاء بن عبداللہ:** — نام عطاء عبداللہ کے بیٹے ہیں اصل میں خراسان کے باشندہ تھے، شام میں سکونت اختیار کرلی تھی ۵۰ھ میں انتقال ہوا۔ ان سے مالک بن انس اور معمر بن راشد نے روایت کی۔

(۶۶۵) **عطاء بن ابی رباح:** — اسم گرامی عطاء ابو رباح کے صاحبزادے ہیں کنیت ابو محمد ہے ان کے بال سخت گھنگریالے تھے، سیاہ فام تھے، بیٹھی ہوئی ناک ہاتھ سے لنجے اور ایک چشم تھے بعد میں نابینا بھی ہوگئے تھے جلیل القدر فقیہہ اور مکہ کے تابعین میں سے تھے امام اوزاعی کا قول ہے کہ ان کی وفات جس روز ہوئی انہوں نے اس شان کے ساتھ وفات پائی کہ اس روز لوگ دنیا کے ہر شخص سے زیادہ ان سے خوش تھے امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ علم کے خزانے خدا جس کو چاہے تقسیم فرمائے اگر علم کے ساتھ کسی کی خصوصیت ہوسکتی تو اس کا حق سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی کو ہوتا عطاء بن رباح حبشی تھے، سلمہ بن کہیل نے فرمایا میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جس کے علم کی غرض صرف خدا کی ذات ہو۔ ہاں تین شخص ایسے ضرور تھے، عطاء طاؤس مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ ۱۱۵ھ میں بعمر ۸۸ سال انتقال فرمایا، ابن عباس، ابوہریرہ ابوسعید اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے حضرات صحابہ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔

(۶۶۶) **عطاء بن عجلان:** — نام عطاء عجلان کے بیٹے ہیں بصرہ وطن ہے انس ابو عثمان نہدی اور کچھ اور حضرات سے روایت کی اور ان سے ابن نمیر اور ایک بڑی جماعت نے بعض نے ان کو روایت میں متہم بھی کیا ہے۔

(۶۶۷) **عطاء بن السائب:** — نام عطاء سائب بن یزید کے بیٹے ہیں خاندان کے اعتبار سے ثقفی ہیں ۱۳۶ھ یا تقریبا اسی زمانہ میں وفات پائی۔

(۶۶۸) **عدی بن عدی:** — نام عدی، عدی کے بیٹے ہیں۔ بنو کندہ میں سے ہیں اپنے والد عدی اور رجاء بن حیوۃ سے روایت کی اور ان سے عیسی بن عاصم وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

(۶۶۹) **عدی بن ثابت:** — نام عدی ثابت کے بیٹے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ان کے دادا سے روایت کی، ترمذی نے ان کی روایت باب العطاس میں ذکر کی ہے، عدی بن ثابت سے ابوالیقظان نے روایت کی، ترمذی نے بیان کیا کہ میں نے محمد بن اسماعیل یعنی بخاریؒ سے دریافت کیا عدی بن ثابت کے دادا کون ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ میں تو ان کا نام نہیں جانتا لیکن یحییٰ بن معین ذکر کرتے ہیں کہ ان کا نام دینار ہے۔

(۶۷۰) **عیسی بن یونس:** — نام عیسی یونس بن اسحاق کے بیٹے ہیں حفظ اور عبادت گزاری میں شہرت یافتہ لوگوں میں سے ایک ہیں، اپنے والد اور اعمش اور بہت سے دوسرے لوگوں سے روایت کی اور حماد بن سلمہ جیسے جلیل القدر محدث اور بہت سے لوگ ان سے روایت کرتے ہے ایک سال حج بیت اللہ کو جاتے اور ایک سال جہاد میں شریک ہوتے ۱۸۷ھ میں انتقال فرمایا۔

(۶۷۱) عامر بن مسعود: — نام عامر ہے مسعود کے بیٹے ہیں، نسباً قریشی ہیں تابعی ہیں ابراہیم بن عامر کے والد یہی ہیں ان سے شعبہ اور ثوری نے روایت کی۔

(۶۷۲) عامر بن سعد: — نام عامر سعد بن ابی وقاص کے بیٹے ہیں، زہری و قرشی ہیں اپنے والد سعد اور حضرت عثمان سے حدیث سنی اور ان سے زہری اور دوسرے لوگوں نے ۱۰۴ھ میں وفات ہوئی۔

(۶۷۳) عامر بن اسامہ: — عامر نام ہے اسامہ کے بیٹے ہیں، ان کی کنیت ابوالملیح ہے، بنوہذیل میں سے ہیں اور بصرہ کے باشندہ ہیں اپنے والد اسامہ اور بریدہ اور جابر و انس اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں سے حدیث سنی اور ان سے ان کے دو بیٹے زیاد اور میسر اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے روایت کی، ملیح میں میم پر زبر اور لام کے نیچے زیر ہے حاء مہملہ (غیر منقوط) ہے۔

(۶۷۴) عاصم بن سلیمان: — نام عاصم ہے سلیمان کے بیٹے ہیں اور بھینگے ہیں بصرہ کے باشندہ اور تابعی ہیں، انس حفصہ اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات سے روایت کی ثوری اور شعبہ نے ان سے حدیث کی سماعت کی ۱۴۲ھ میں وفات ہوئی ہے۔

(۶۷۵) عاصم بن کلیب: — ان کا نام عاصم اور والد کا نام کلیب ہے۔ جرم کے قبیلہ سے ہیں اور کوفہ کے باشندہ ہیں اپنے والد وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ثوری و شعبہ نے، ان کی حدیثیں نماز و حج و جہاد کے بارے میں ہیں۔

(۶۷۶) عروہ بن زبیر: — نام نامی عروہ زبیر بن العوام کے صاحبزادے ہیں کنیت ابوعبداللہ ہے قریش کی شاخ بنو اسد میں سے ہیں اپنے والد حضرت زبیرؓ اور والدہ حضرت اسماءؓ سے حدیث کی سماعت کی اس کے علاوہ اپنی خالہ عائشہ صدیقہؓ اور دوسرے کبار صحابہ سے بھی حدیث کی سماعت کی ان سے ان کے بیٹے ہشام اور زہری وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ۲۲ھ میں تولد ہوئے تابعین میں بڑے طبقہ کے تابعین میں سے ہیں، مدینہ میں سات مشہور فقیہہ تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہیں ابوالزناد کا قول ہے کہ مدینہ میں ہمارے ان فقہا میں سے جن کے قول پر معاملہ ختم ہو جاتا ہے ان میں سے سعید بن مسیب اور عروہ بن زبیر ہیں اور کچھ اور حضرات کا بھی انہوں نے نام لیا، ابن شہاب نے فرمایا عروہ ایسا سمندر ہیں جو کبھی پایاب نہیں ہوتا۔

(۶۷۷) عروہ بن عامر: — نام عروہ ہے عامر کے بیٹے ہیں قریشی اور تابعی ہیں ابن عباس اور دوسرے حضرات سے حدیث کی سماعت کی ان سے عمرو بن دینار اور حبیب بن ثابت نے روایت کی ابوداؤد نے ان کی حدیث باب الطیرہ میں ذکر کی ہے یہ روایت مرسل ہے۔

(۶۷۸) عبید بن عمیر: — عبید نام۔ عمر کے بیٹے کنیت ابوعاصم ہے، لیث گھرانے کے حجاز کے باشندہ اور اہل مکہ کے قاضی ہیں، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی زیارت بھی کی ان کا شمار کبار تابعین میں ہے صحابہ کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے کچھ تابعین نے روایت کی، ابن عمرؓ سے پہلے وفات پائی۔

(۶۷۹) عبید بن السباق: — نام عبید ہے، سباق کے بیٹے حجاز کے باشندہ ہیں، ان کا شمار تابعین میں ہے، ان سے حدیث کم نقل کی گئی۔ اہل حجاز کے یہاں ان کی حدیثیں ملتی ہیں زید بن ثابتؓ سہل بن حنیفؓ اور لبوریہ سے روایت کی اور ان سے ان کے صاحبزادے سعید وغیرہ نے روایت کی ہے۔

(۶۸۰) عبید بن زیاد: — نام عبید زیاد کا بیٹا ہے۔ کلب اس کا دوسرا نام ہے یہی وہ شخص ہے جو حسین بن علیؓ کے قتل کے لئے لشکر لے کر گیا تھا ان ایام میں یہ یزید کی جانب سے کوفہ کا امیر تھا ابراہیم بن مالک اشتری نخعی کے ہاتھ سے ۶۱ھ میں مختار بن عبید کے دور میں

موصل میں قتل ہوا۔

(۶۸۱) **عکرمہ:** — عکرمہ نام حضرت ابن عباسؓ کے آزاد کردہ ہیں، ابوعبداللہ کنیت ہے اصل میں بربری ہیں مکہ کے فقہاء اور تابعین میں سے بھی ہیں ابن عباس اور دوسرے صحابہ سے حدیث کی سماعت کی ایک بڑی جماعت نے ان سے روایت کی ۱۰۷ھ میں بعمر اسی سال انتقال فرمایا، سعید ابن جبیر سے لوگوں نے پوچھا تم سے بڑا عالم بھی کوئی اور ہے تو انہوں نے فرمایا عکرمہ۔

(۶۸۲) **علقمہ بن ابی علقمہ:** — نام علقمہ ابوعلقمہ کے بیٹے ہیں، ابوعلقمہ کا نام بلال ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ کے آزاد کردہ ہیں انس بن مالک اور اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے مالک بن انس اور سلیمان بن بلال نے روایت کی۔

(۶۸۳) **عوف بن وہب:** — نام عوف۔ وہب کے بیٹے ہیں۔ تابعی ہیں۔ وہب کی کنیت ابوجحفہ ہے۔

(۶۸۴) **ابوعثمان بن عبدالرحمٰن بن مل:** — نام ابوعثمان عبدالرحمٰن بن مل کے بیٹے ہیں، خاندانی اعتبار سے نہدی اور وطنیت کے لحاظ سے بصری ہیں زمانہ جاہلیت وزمانہ اسلام دونوں پائے، آنحضرت ﷺ کی حیات میں ہی اسلام لا چکے ہیں، مگر ملاقات نہیں ہوئی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں ستر سال سے زیادہ گزارے اور تقریبا اتنی ہی مدت زمانہ اسلام میں بسر کی ۹۵ھ میں وفات پائی، عمر ایک سو تیس سال ہوئی۔ حضرت عمر اور ابن مسعود اور ابوموسی سے حدیث کی سماعت کی ان سے قتادہ وغیرہ نے روایت کی مل میں میم پر ضمہ اور کسرہ دونوں ہیں اور لام پر تشدید ہے۔

(۶۸۵) **ابوعاصم:** — نام ابوعاصم، شیبان کے قبیلہ سے ہیں، امام بخاریؒ کے استاد ہیں۔

(۶۸۶) **ابوعبیدہ:** — نام ابوعبیدہ ہے محمد بن عمار بن یاسر کے بیٹے ہیں خاندان عنس سے ہیں اور تابعی ہیں جابرؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے عبدالرحمٰن بن اسحاق نے روایت کی عنس میں عین اور نون پر زبر اور سین غیر منقوط ہے۔

(۶۸۷) **ابوعمیر بن انس:** — نام ابوعمیر انس بن مالک کے بیٹے ہیں اور انصاری ہیں کہتے ہیں کہ ان کا نام عبداللہ ہے اپنے چچوں سے جو انصاری ہی ہیں روایت کرتے ہیں، کم عمر تابعین میں ان کا شمار ہے اپنے والد انسؓ کی وفات کے بعد زمانۂ دراز تک زندہ رہے۔

(۶۸۸) **ابوالعشراء:** — کنیت ابوالعشراء نام اسامہ ہے مالک کے بیٹے اور بنو دارم میں سے ہیں تابعی ہیں اپنے والد سے روایت کی اور ان سے حماد بن سلمہ نے، اہل بصرہ میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کے نام میں بہت اختلاف ہے اور کچھ ذکر ہوا اور وہ سب سے زیادہ مشہور قول ہے۔ العشراء میں عین پر پیش شین منقوط پر زبر اور آخر میں الف ممدودہ ہے۔

(۶۸۹) **ابوالعالیہ رفیع:** — ابوالعالیہ کنیت رفیع نام مہران کے بیٹے ہیں۔ جو ریاح میں سے ہیں یہ نسبت ان کے آزاد کردہ ہونے کے باعث ہے، بصرہ کے باشندہ ہیں، حضرت صدیق اکبر کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضرت عمر اور ابی بن کعب سے روایت کی اور ان سے عاصم الاحول وغیرہ نے حفصہ جو سیرین کی بیٹی ہیں کہتی ہیں کہ میں نے ابوالعالیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو تین بار قرآن سنایا ۹۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۶۹۰) **ابوالعلاء:** — ابوالعلاء نام یزید بن عبداللہ بن الشخیر کے بیٹے ہیں۔ اپنے والد اور اپنے بھائی مطرف اور حضرت عائشہؓ سے روایت کی اور ان سے قتادہ اور ایک جماعت نے ۱۱۱ھ میں وفات ہوئی۔

(۶۹۱) **ابوعبدالرحمٰن:** — یہ ابوعبدالرحمٰن حبلی ہیں نام عبداللہ یزید کے بیٹے ہیں مصر کے باشندہ اور قبیلۂ عامر سے ہیں نیز تابعی ہیں۔

الحبلی میں حاء مہملہ پر ضمہ اور بائے موحدہ پر بھی ضمہ ہے۔

(۶۹۲) ابو عطیہ: — ابو عطیہ نام بنو عقیل کے آزاد کردہ ہونے کے باعث عقیلی کہلاتے ہیں، مالک بن حویرث سے روایت کرتے ہیں۔

(۶۹۳) ابو عاتکہ: — یہ ابو عاتکہ ہیں، حضرت انس سے روایت کرتے ہیں اور ان سے حسن بن عطیہ وغیرہ نے روایت کی، ان کو روایت میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

(۶۹۴) عتبہ بن ربیعہ: — نام عتبہ ربیعہ کا بیٹا ہے۔ مسلمان نہیں ہوا اس کو حضرت حمزہ بن عبد المطلب نے جنگ بدر میں قتل کیا جب کہ یہ مشرک تھا۔

(۶۹۵) عبد اللہ بن ابی: — نام عبد اللہ، ابی بن سلول کا بیٹا ہے، سلول خزاعہ میں سے ایک عورت کا نام ہے یہ ابی کی بیوی ہے یہ عبد اللہ منافقین کا سردار ہے۔ اس کے بیٹے کا نام بھی عبد اللہ ہے، بہترین صحابی اور زبردست صاحب فضیلت میں سے ہیں یہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور اس کے بعد دوسرے غزوات میں بھی شامل ہوئے۔

(۶۹۶) العاص بن وائل: — عاص نام وائل کا بیٹا ہے، بنو سہم میں سے ہے حضرت عمرو بن العاص اس کے فرزند اور صحابی ہیں عاص کو زمانہ اسلام پانے کے باوجود اسلام کی توفیق نہیں ہوئی اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی جانب سے سو غلام آزاد کئے جائیں، باب الوصایا میں اس کا ذکر آتا ہے۔

صحابی عورتیں

(۶۹۷) عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا: — یہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ ہیں، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں، ان کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی ام رومان بنت عامر بن عویمر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اپنا پیام دیا اور ہجرت سے پہلے ہی شوال ۱۰ نبوی میں بمقام مکہ ان سے عقد کیا ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نکاح ہجرت سے تین سال قبل ہوا۔ اور بھی کچھ اقوال نقل کئے گئے ہیں، شوال ۲ھ میں، ہجرت سے ۱۸ ماہ بعد حضرت عائشہ کی رخصتی مدینہ میں ہوئی اس وقت ان کی عمر ۹ سال تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں آمد کے سات ماہ بعد مدینہ میں یہ رخصتی عمل میں آئی آنحضرت صلعم کے ساتھ ۹ سال رہیں جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس وقت حضرت عائشہ ۱۸ سال کی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے علاوہ کسی اور ناکتخدا سے شادی نہیں کی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فقیہہ عالمہ، فصیحہ، فاضلہ تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت روایات کی ناقل ہیں، وقائع عرب و محاربات اور اشعار کی زبردست ماہر و واقف کار تھیں صحابہ کرام اور تابعین عظام کے بڑے طبقہ نے ان سے روایات نقل کیں، مدینہ طیبہ ۵۷ھ میں یا ۵۸ھ میں ۱۷ رمضان شب شنبہ میں وفات پائی آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ شب میں آپ رضی اللہ عنہا کو دفن کر دیا جائے بقیع میں مدفون ہوئیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اس وقت وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں مروان کے ماتحت تھے۔

(۶۹۸) عمرہ بنت رواحہ: — نام عمرہ رواحہ کی بیٹی انصار میں سے ہیں اور صحابیہ ہیں، یہی نعمان بن بشیر کی والدہ ہیں ان سے ان کے شوہر بشیر رضی اللہ عنہ اور صاحبزادہ نعمان بن بشیر نے روایت کی۔

(۶۹۹) ام عمارہ: — یہ ام عمارہ ہیں نسیبہ نام کعب کی صاحبزادی انصار میں سے ہیں بیعت عقبہ میں حاضر اور شریک ہوئیں، غزوۂ احد میں اپنے شوہر زید بن عاصم کی ہمراہی میں شریک تھیں پھر بیعۃ الرضوان میں بھی شامل ہوئیں پھر جنگ یمامہ میں حاضر ہوئیں اور دست بدست

جنگ کی اسی لڑائی میں ایک ہاتھ ضائع ہوگیا اور تلوار و نیزہ کے بارہ زخم لگے۔ ایک جماعت نے ان سے حدیث کی روایت کی عمارہ میں عین پر ضمہ اور میم غیر مشدد ہے، نسیبہ میں نون پر زبر اور سین مکسور ہے۔

(۷۰۰) **ام العلاء:** — یہ ام العلاء انصاریہ تابعیہ ہیں اہل مدینہ کے یہاں ان کی حدیثیں ملتی ہیں ان سے خارجہ بن زید بن ثابت نے روایت کی ہے، ام العلاء ان کی والدہ ہیں رسول اللہ ﷺ ان کی بیماری میں ان کی عیادت فرمایا کرتے تھے۔

(۷۰۱) **ام عطیہ:** — ان کا نام نسیبہ کعب کی بیٹی ہیں بعض کے نزدیک حارث کی صاحبزادی ہیں، انصار میں سے ہیں آنحضرت ﷺ سے بیعت ہوئیں بڑی صحابیات میں سے ہیں ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے حضور ﷺ کے ساتھ اکثر و بیشتر غزوات میں شریک رہیں اور مریضوں کا علاج و معالجہ اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں نسیبہ میں نون پر ضمہ اور سین مہملہ پر زبر یاء تحتیہ ساکن اور باء موحدہ پر زبر ہے۔

تابعی عورتیں

(۷۰۲) **عمرہ بنت عبد الرحمٰن:** — عمرہ بنت عبد الرحمٰن بن سعد بن زرارہ کی بیٹی اور عائشہ ام المؤمنین کی گود میں تھیں اور ان کو پالا تھا عمرہ نے عائشہ کی بہت سی حدیثیں روایت کیں اور دوسروں سے بھی اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی ۱۰۳ھ میں وفات ہوئی اور وہ مشہور تابعیات میں سے ہیں۔

(غ)

صحابہ

(۷۰۳) **غضیف بن الحارث:** — نام غضیف حارث کے بیٹے ہیں اور ثمالی، ابو اسماء کنیت اور شام وطن ہے۔ آنحضرت ﷺ کا زمانہ پایا ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ لیکن خود ان کا بیان ہے کہ میری پیدائش آپ ﷺ کے زمانہ میں ہوئی میں نے آپ ﷺ سے بیعت کی اور آپ ﷺ نے مجھ سے مصافحہ فرمایا حضرت عمرؓ و ابوذرؓ و عائشہؓ سے حدیث کی سماعت فرمائی اور ان سے مکحول اور سلیم بن عامر نے روایت کی، غضیف میں غین معجمہ پر ضمہ ضاد پر فتحہ اور یا ساکن اور آخر میں فاء ہے ثمالی میں ثاء (تین نقطوں والی) مضموم اور میم بغیر تشدید ہے۔

(۷۰۴) **غیلان بن سلمہ:** — نام غیلان سلمہ کے بیٹے بنو ثقیف سے ہیں فتح طائف کے بعد اسلام لائے اور ہجرت نہیں کی بنو ثقیف کے مشہور اور نمایاں افراد میں سے ہیں، بہت اچھے شاعر تھے حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری دور میں انتقال فرمایا حضرت عبد اللہ بن عمر اور عروہ بن غیلان وغیرہ نے ان سے روایت کی۔

تابعین

(۷۰۵) **غالب بن ابی غیلان:** — نام غالب ابو غیلان کے بیٹے ہیں۔ یہ خطاف القطان کے بیٹے بھی کہلاتے ہیں۔ بصرہ وطن

مالوف ہے بکر بن عبداللہ سے روایت کی اور ان سے ضمرہ بن ربیعہ نے۔

(۷۰۶) **غریف بن عیاش:** - یہ غریف ہیں عیاش بن الدیلمی کے بیٹے واثلہ بن الاسقع سے روایت کرتے ہیں ان کا شمار اہل شام میں کیا جاتا ہے غریف میں غین معجمہ پر زبر اور رآء مہملہ (غیر منقوط) کو زیر اور آخر میں فاء ہے۔

(۷۰۷) **ابوغالب:** - ابوغالب حزور نام بنوباہلہ کے فرد ہیں اور بصرہ کے رہنے والے ہیں، حضرت عبدالرحمن ابن الحضرمی نے ان کو آزد کیا۔ ابوامامہ سے روایت کی اور ان سے شام میں ملاقات کی خود ان سے ابن عیینہ اور حماد بن زید نے روایت کی حزور میں حاء مہملہ پر زبر اور زاء معجمہ پر زبر اور واؤ مشدد اور آخر میں راء ہے۔

(ف)

صحابہ

(۷۰۸) **الفضل بن عباس:** - نام فضل، آنحضرت ﷺ کے چچا عباس کے صاحب زادہ ہیں آپ ﷺ کے ساتھ غزوہ حنین میں شامل ہوئے، آپ کے ہمراہ جو لوگ اس موقع سے ثابت قدم رہے ان میں یہ بھی تھے، حجۃ الوداع میں بھی شریک رہے، آپ کے غسل کے موقع پر بھی دوسروں کے ساتھ موجود تھے پھر شام کی طرف بغرض جہاد تشریف لے گئے۔ صرف ۲۱ سال کی عمر میں اطراف اردن میں طاعون عمواس میں ۱۸ھ میں انتقال فرمایا، کہا گیا ہے کہ جنگ یرموک میں شہید ہوئے اور بھی بعض اقوال ذکر کئے جاتے ہیں ان سے ان کے بھائی عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں۔

(۷۰۹) **فضالہ بن عبید:** - فضالہ نام عبید کے بیٹے قبیلہ اوس میں سے اور انصاری ہیں غزوات میں پہلے پہل یہ احد میں شریک ہوئے ان کے بعد دوسرے غزوات میں شرکت کی بیعت تحت الشجرہ میں آپ صلعم کے ہاتھ پر بیعت کی پھر شام کی طرف منتقل ہوگئے اور دمشق میں قیام پذیر ہوگئے اور حضرت معاویہ کی جانب سے دمشق میں فصل خصومات کا کام کرتے رہے یہ وہ زمانہ ہے جب کہ حضرت معاویہؓ جنگ صفین کے لئے تشریف لے گئے۔ حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہی وفات پائی کہا گیا کہ ۵۳ھ میں انتقال ہوا ان سے ان کے آزاد کردہ میسرہ اور دوسرے لوگ روایت کرتے ہیں۔ فضالہ میں فاء اور ضاد معجمہ پر زبر اور عبید میں عین مہملہ پر ضمہ ہے۔

(۷۱۰) **الفجیع بن عبداللہ:** - نام فجیع، عبداللہ کے بیٹے بنو عامر میں سے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنی قوم کے ساتھ حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کی حدیثیں سنیں، وہب ابن عقبہ نے ان سے روایت کی، الفجیع میں فاء پر ضمہ اور جیم پر فتحہ یاء ساکن اس کے نیچے دو نقطے اور آخر میں عین مہملہ ہے۔

(۷۱۱) **فروہ بن مسیک:** - یہ فروہ ہیں مسیک کے بیٹے مرادی و غطیفی اور اہل یمن میں سے ہیں، حضور ﷺ کی خدمت میں ۹ھ میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہوگئے اور کوفہ کی جانب منتقل ہوگئے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں، اور کوفہ ہی میں رہے۔ ان سے شعبی وغیرہ نے روایت کی وہ اپنی قوم کے اشراف اور نمایاں لوگوں میں سے ہیں بہترین شاعر تھے، مسیک میں میم پر ضمہ و سین مہملہ پر فتحہ اور تحتیہ ساکن اور آخر میں کاف ہے۔

(۷۱۲) **فروہ بن عمرو:** - یہ فروہ عمرو کے بیٹے بیاضی اور انصاری ہیں بدر میں شریک تھے اس کے بعد کے غزوات میں بھی شریک ہوئے ان سے ابوحازم تمار نے روایت کی۔

(۱۷۱۳) فیروز الدیلمی: ۔ یہ فیروز دیلمی ہیں، ان کو حمیری کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے قبیلہ حمیر میں قیام کر لیا تھا، اصل میں فارسی الاصل ہیں اور صنعاء کے رہنے والے ہیں یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بصورت وفد حاضر ہوئے، اسود عنسی کذاب (جس نے یمن میں نبوت کا دعوی کیا) کے قاتل یہی ہیں، آپ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں اس کو قتل کیا گیا اور اس کی اطلاع آپ ﷺ کو مرض الوفات میں مل گئی تھی فیروز کے دو بیٹے ضحاک اور عبداللہ وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال فرمایاء العنسی میں عین پر زبر اور نون ساکن اور سین مہملہ ہے۔

تابعین

(۱۷۱۴) الفرافصہ بن عمیر: ۔ نام فرافصہ عمیر کے بیٹے ہیں اور بنو حنیفہ میں سے ہیں حضرت عثمان بن عفانؓ سے روایت کی اور ان سے قاسم بن محمد وغیرہ نے، الفرافصہ میں دو فاء اور راء غیر مشدد اور صاد غیر منقوط ہے، محدثین کے یہاں تو یہ فاء اول کی فتحہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے لیکن ابن حبیب کہتے ہیں کہ عرب میں فرافصہ جب بھی نام ہوگا تو فاء اول مضموم ہوگی، صرف فرافصہ بن الاحوص اس سے مستثنیٰ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ فرافصہ بن عمیر، ابن حبیب کی تحقیق کے مطابق فاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا جائے گا، اہل لغت کے یہاں یہ لفظ کسی بھی جگہ فتحہ فاء کے ساتھ نہیں ہے۔

(۱۷۱۵) فروہ بن نوفل: ۔ یہ فروہ ہیں نوفل کے بیٹے بنو اشجع میں سے ہیں اہل کوفہ میں ان کا شمار ہے اپنے والد اور عائشہ سے حدیث سنی اور ان سے ابو اسحاق ہمدانی اور بلال بن یساف نے روایت کی۔

(۱۷۱۶) ابن الفرک: ۔ کنیت ابن الفرک اور نام احمد بن زکریا بن فارس ہے ماہر لغت ہیں ہمدان میں قیام پذیر تھے اہل علم کے سردار اور یکتائے روزگار تھے، بلاد الجبل میں قیام کے دوران میں اتقان العلم اور ظرف الکتاب والشعراء کے مضامین کو جمع کیا ان کے والد کو فراس اور فرس کہا جاتا ہے ان کا آنحضرت ﷺ سے ملنا ثابت ہے الفراس میں فاء پر کسرہ اور راء بلا تشدید اور سین غیر منقوط ہے۔

صحابی عورتیں

(۱۷۱۷) فاطمہؓ الکبری: ۔ یہ فاطمۃ الکبریٰؓ ہیں آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی ہیں ان کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہؓ ہیں ایک روایت کے مطابق یہ آنحضرت ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں، دنیا و آخرت کی تمام عورتوں کی سردار ہیں رمضان ۱ھ میں ان کا نکاح حضرت علی ابن ابی طالب سے ہوا اور ذی الحجہ میں رخصتی عمل میں آئی ان کے بطن سے حضرت علی کے تین صاحبزادے حضرت حسن اور حضرت حسین اور حضرت محسنؓ اور زینب و ام کلثوم اور رقیہ تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں مدینہ میں آنحضرت ﷺ کی وفات سے چھ ماہ بعد انتقال فرمایا اور ایک روایت کے مطابق تین ماہ بعد اس وقت ان کی عمر صرف ۲۸ سال تھی، حضرت علیؓ نے غسل دیا اور حضرت عباسؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی شب میں دفن کی گئیں ان سے حضرت علی بن ابی طالب اور ان کے دونوں صاحبزادے حضرت حسن اور حضرت حسینؓ اور ان کے علاوہ صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے علاوہ میں نے کسی کو ان سے زیادہ سچا نہیں پایا انہوں نے فرمایا کہ جب کہ ان دونوں کے درمیان کسی بات میں کبیدگی تھی کہ یا رسول اللہ ان ہی سے دریافت فرمالیجئے کیونکہ یہ جھوٹ نہیں بولتی ہیں۔

(۷۱۸) **فاطمہ بنت ابی حبیش:** — ان کا نام فاطمہ ابو حبیش کی بیٹی ہیں جو استحاضہ میں مبتلا ہوئیں ان سے عروہ بن زبیر اور ام سلمہؓ نے روایت کی یہ فاطمہ عبداللہ بن جحش کی بیوی ہیں حبیش جش کی تصغیر ہے۔

(۷۱۹) **فاطمہ بنت قیس:** — ان کا نام فاطمہ ہے قیس کی بیٹی ضحاک کی بہن ہیں قریش میں سے ہیں مہاجرین اول میں سے ہیں متعدد لوگوں نے ان سے روایت کی، نیک سیرت اور سمجھدار و باکمال عورت ہیں پہلے ابو عمرو بن حفص کے نکاح میں تھیں بعد میں انہوں نے طلاق دیدی تو آنحضرت ﷺ نے ان کا نکاح حضرت اسامہ بن زید سے کردیا زید آپ ﷺ کے آزاد کردہ تھے۔

(۷۲۰) **الفریعۃ بنت مالک:** — ان کا نام فریعہ ہے مالک بن سنان کی بیٹی اور ابو سعید خدری کی بہن ہیں بیعۃ الرضوان میں حاضر تھیں اس بیعۃ الرضوان کے واقعہ کی روایت انہوں نے کی ان کی حدیثیں اہل مدینہ کے یہاں ہیں حضرت زینب بنت کعب بن حجرہ نے ان سے روایت کی الفریعہ میں فاء پر ضمہ راء پر فتحہ یاء ساکن اور عین مہملہ ہے۔

(۷۲۱) **ام الفضل:** — یہ ام الفضل لبابہ ہیں حارث کی بیٹی اور بنو عامر سے ہیں حضرت عباس بن عبدالمطلب کی بیوی اور ان کی اکثر اولاد کی ماں، ام المؤمنین حضرت میمونہ کی بہن یہی ہیں کہا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہ کے بعد سب عورتوں سے پہلے یہی اسلام لائیں آنحضرت ﷺ سے بہت سی حدیثیں روایت کرتی ہیں۔

(۷۲۲) **ام فروہ:** — یہ ام فروہ انصاریہ ہیں بیعت کرنے والیوں میں سے ہیں قاسم بن غنام نے ان سے روایت کی۔

تابعی عورتیں

(۷۲۳) **فاطمہ الصغری:** — یہ فاطمہ الصغری ہیں حضرت حسین بن علی بن ابی طالب کی بیٹی قرشیہ ہاشمیہ ہیں ان کا نکاح حضرت حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب سے ہوا ان کا انتقال ہوگیا تو عبداللہ بن عمرو بن عثمان بن عفان نے ان سے نکاح کرلیا۔

(ق)

صحابہ

(۷۲۴) **قبیصہ بن ذؤیب:** — یہ قبیصہ ہیں ذویب کے بیٹے اور بنو خزاعہ میں سے ہیں ہجرت کے پہلے سال میں پیدا ہوئے کہا جاتا ہے کہ ان قبیصہ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا اور آپ ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی اسی لئے یہ بڑے رفیع المرتبت عالم اور فقیہ تھے ابوالزناد کہتے ہیں کہ چار شخص مدینہ میں فقیہہ مشہور تھے ابن مسیب، عروہ بن زبیر، عبدالملک بن مروان و قبیصہ بن ذویب انہوں نے ابوہریرہؓ و ابو درداء و زید بن ثابتؓ سے روایت کی اور ان سے امام زہری اور دوسرے حضرت نے۔ ۸۶ھ میں وفات پائی، یہ ابن عبدالبر کی رائے ہے جو انہوں نے اپنی کتاب میں درج فرمائی ہے اور ان کو صحابہ میں شامل کیا ہے دوسرے حضرات نے ان کو صحابہ میں نہیں رکھا بلکہ ان کو شام کے تابعین کے دوسرے طبقہ میں رکھا ہے۔ قبیصہ میں قاف پر زبر اور باء موحدہ کے نیچے زیر اور ذویب ذئب کی تصغیر ہے۔

(۷۲۵) **قبیصہ بن مخارق:** — یہ قبیصہ ہیں مخارق کے بیٹے۔ بنو ہلال میں سے ہیں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کا

شمار اہل بصرہ میں ہوتا ہے ان سے ان کے بیٹے قطن اور ابو عثمان نہدی وغیرہ نے روایت کی مخارق میں میم پر ضمہ خائے معجمہ اور راء اور قاف ہے۔

(۷۲۶) **قبیصہ بن وقاص:** ۔ یہ قبیصہ ہیں وقاص سلمی کے بیٹے۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوگئے اہل بصرہ ہی میں ان کا شمار ہے ان سے صالح بن عبید نے روایت کی۔

(۷۲۷) **قتادہ بن النعمان:** ۔ یہ قتادہ ہیں نعمان کے بیٹے انصار میں سے ہیں بیعت عقبہ اور غزوہ بدر میں شرکت کے باعث عقبی اور بدری کہے جاتے ہیں اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے ان سے ان کے (اخیافی) ماں شریک بھائی ابو سعید خدری اور ان کے بیٹے وغیرہ نے روایت کی ۲۳ھ میں بعمر ۵۶ سال انتقال فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے نمازہ جنازہ پڑھائی صاحب فضل صحابہ میں سے ہیں۔

(۷۲۸) **قدامہ بن عبداللہ:** ۔ اسم گرامی قدامہ عبداللہ کے بیٹے بنو کلاب میں سے ہیں پرانے مسلمان ہیں مکہ میں ہی سکونت پذیر ہوگئے اور ہجرت نہیں کی۔ حجۃ الوداع میں حاضر تھے اور اپنے قافلہ سمیت بدر میں ٹھہر گئے ان سے ایمن بن نائل وغیرہ نے روایت کی قدامہ میں قاف پر ضمہ اور دال مہملہ بلا تشدید ہے۔

(۷۲۹) **قدامہ بن مظعون:** ۔ نام قدامہ، مظعون کے بیٹے قرشی وجمحی ہیں یہ عبداللہ بن عمر کے ماموں ہیں مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی بدر اور باقی تمام غزوات میں حاضر ہوئے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عامر نے ان سے روایت کی۔ ۳۲ھ میں بعمر ۶۸ سال وفات پائی۔

(۷۳۰) **قطبہ بن مالک:** ۔ یہ قطبہ مالک کے بیٹے بنو ثعلب میں سے ہیں اور کوفہ کے رہنے والے ہیں، یہ صحابی ہیں ان سے ان کے برادر زادہ زیاد بن علاقہ نے روایت کی۔

(۷۳۱) **قیس بن ابی غرزہ:** ۔ نام قیس۔ ابو غرزہ کے بیٹے غفاری ہیں اہل کوفہ میں ان کا شمار ہے ان سے ابو وائل شقیق بن سلمہ نے روایت کی ان سے صرف ایک ہی روایت تجارت کے بیان میں ہوئی ہے غرزہ میں غین معجمہ پر فتحہ اور رائے مہملہ پر فتحہ اور اس کے بعد زاء معجمہ پر فتحہ ہے۔

(۷۳۲) **قیس بن سعد:** ۔ یہ قیس ہیں۔ سعد بن عبادہ کے بیٹے کنیت ابو عبداللہ خزرجی وانصاری ہیں حضور کے معزز اصحابہ میں سے تھے اور اجلیل القدر فضلاء اور صاحب رائے اور جنگی معاملات میں صاحب تدبیر لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اپنی قوم میں شریف تھے آنحضرت ﷺ جب مکہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کے یہاں ان کا وہی درجہ تھا جو کسی امیر کے یہاں پولیس افسر کا، حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی جانب سے مصر کے گورنر تھے حضرت علیؓ کی شہادت تک یہ آپ کے ساتھی رہے مدینہ میں ۶۰ھ میں انتقال فرمایا ایک جماعت نے ان سے روایت کی قیس بن سعد اور عبداللہ بن زبیر قاضی شریح اور احنف ان سب کا چہرہ بالوں سے خالی تھا اور نہ کسی کے داڑھی تھی۔ لیکن قیس پھر بھی خوبصورت تھے۔

(۷۳۳) **قیس بن عاصم:** ۔ قیس نام، عاصم کے بیٹے ابو قبیصہ کنیت تھی، ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ کنیت ابو علی تمیمی تھی وفد تمیم کے ہمراہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۹ھ میں اسلام قبول کیا جب آپ کی نظر ان پر پڑی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اہل وبر کے سردار ہیں عقل مند اور بردبار تھے اور بردباری میں مشہور تھے اہل بصرہ میں شمار ہوتے ہیں ان سے ان کے بیٹے حکیم اور دوسرے لوگ روایت کرتے ہیں۔

(۷۳۴) **قرظہ بن کعب:** — یہ قرظہ انصاری خزرجی ہیں کعب کے بیٹے ہیں غزوہ احد اور اس کے بعد دوسرے محاربات میں شریک ہوئے بڑے فاضل تھے۔ حضرت علیؓ نے ان کو کوفہ کا حاکم مقرر فرمادیا تھا حضرت علیؓ کے ہمراہ تمام محاربات میں شامل ہوئے بمقام کوفہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانہ میں انتقال فرمایا شعبی وغیرہ نے ان سے روایت کی قرظہ میں قاف راء مہملہ اور ظاء معجمہ سب پر زبر ہے۔

(۷۳۵) **قرہ بن ایاس:** — نام قرہ ایاس کے بیٹے اور مزنی ہیں۔ بصرہ میں سکونت اختیار کرلی تھی ان سے ان کے بیٹے معاویہ کے علاوہ اور کسی نے روایت نہیں کی ان کو خارجیوں نے قتل کردیا تھا۔ ایاس میں ہمزہ مکسور ہے۔

(۷۳۶) **ابوقتادہ:** — یہ ابوقتادہ ہیں نام حارث، ربعی کے بیٹے انصار میں سے ہیں رسول اللہ ﷺ کے مخصوص شہ سوار ہیں ۵۴ھ میں بمقام مدینہ انتقال فرمایا کہا جاتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ حضرت علیؓ کی خلافت میں بمقام کوفہ انتقال ہوا حضرت علیؓ کے ساتھ تمام محاربات میں شریک رہے حالانکہ ان کی عمر ۷۰ سال تھی، یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی کنیت نام پر غالب ہے ربعی میں راء مکسور باء موحدہ ساکن اور عین مہملہ پر کسرہ ہے۔

(۷۳۷) **ابوقحافہ:** — یہ ابوقحافہ ہیں نام عثمان ہے عامر کے بیٹے اور ابوبکر صدیقؓ کے والد ہیں ان کا ذکر حرف عین مہملہ میں پہلے آچکا ہے۔

تابعین

(۷۳۸) **القاسم بن محمد:** — یہ ہیں قاسم، محمد بن ابی بکر الصدیق کے صاحب زادے مدینہ کے سات مشہور فقہا میں سے ایک اور اکابر تابعین میں سے ہیں اور اپنے اہل زمانہ میں نہایت صاحب فضل و کمال تھے، یحییٰ بن سعید کا قول ہے کہ ہم نے کسی کو مدینہ میں نہیں پایا جس کو ہم قاسم بن محمد کے مقابلے میں فضیلت دیں انہوں نے صحابہ کی ایک جماعت سے جن میں حضرت عائشہؓ و معاویہؓ شامل ہیں روایت بیان کیں اور ان سے ایک گروہ روایت کرتا ہے ۱۰۱ھ میں بعمر ۷۰ سال انتقال فرمایا۔

(۷۳۹) **القاسم بن عبدالرحمٰن:** — یہ ہیں قاسم عبدالرحمٰن کے بیٹے۔ شام کے باشندہ اور عبدالرحمٰن بن خالد کے آزاد کردہ ہیں انہوں نے ابوامامہ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے علاء بن حارث وغیرہ نے روایت کی عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے قاسم مولیٰ عبدالرحمٰن سے افضل کسی کو نہیں پایا۔

(۷۴۰) **قبیصہ:** — ان کا نام قبیصہ۔ ہلب کے بیٹے بنوطے میں سے ہیں اپنے والد سے روایت کی اور ان کے والد صحابی ہیں ان سے سماک نے روایت کی، ہلب میں ہاء پر ضمہ اور لام ساکن اور آخر میں باء موحدہ ہے لوگ کہتے ہیں کہ ہلب کو ہاء کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ تلفظ کرنا صحیح ہے۔

(۷۴۱) **القعقاع بن حکیم:** — ان کا نام قعقاع ہے حکیم کے بیٹے مدینہ کے رہنے والے ہیں اور تابعی ہیں جابر بن عبداللہ اور ابویونس سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے سعید مقبری اور محمد بن عجلان نے روایت کی۔

(۷۴۲) **قطن بن قبیصہ:** — ان کا نام قطن ہے قبیصہ کے بیٹے بنوہلال میں سے ہیں ان کا شمار اہل بصرہ میں ہے اپنے والد سے روایت کی اور ان سے حیان بن علاء نے، قطن شریف آدمی تھے سجستان کے حاکم مقرر ہوئے، قطن میں قاف اور طاء دونوں پر فتحہ اور آخر میں نون ہے۔

(۷۴۳) **قتادہ بن دعامہ:** — یہ قتادہ ہیں دعامہ کے بیٹے، ان کی کنیت ابوالخطاب سدوسی ہے، نابینا اور قوی الحفظ ہیں بکر بن عبداللہ مزنی کا ارشاد ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ قوی الحافظ شخص کی زیارت کرے تو وہ قتادہ کو دیکھے ہمیں آج تک کوئی شخص ان سے زیادہ قوت حفظ کا مالک نہیں ملا خود قتادہ کہتے ہیں کہ جو بات بھی میرے کان میں پڑتی ہے اس کو میرا قلب محفوظ کر لیتا ہے انہوں نے فرمایا کہ کوئی قول بغیر اس کے مطابق عمل کے مقبول نہیں اس لئے جس کا عمل اچھا ہوگا اسی کا قول خدا کے یہاں مقبول ہوگا عبداللہ بن سرجس اور انس اور بہت سے دیگر حضرات سے روایت کی اور ان سے ایوب اور شعبہ اور ابوعوانہ وغیرہ نے انتقال ۱۰۷ھ میں ہوا۔

(۷۴۴) **قیس بن عباد:** — یہ ہیں قیس عباد کے بیٹے بصرہ کے رہنے والے بصرہ کے تابعین میں پہلے طبقہ کے تابعی ہیں صحابہؓ کی ایک جماعت سے روایت کی عباد میں عین مہملہ پر پیش اور باء موحدہ بلا تشدد ہے۔

(۷۴۵) **قیس بن ابی حازم:** — نام قیس ہے ابوحازم کے بیٹے احمس و بجلہ میں سے ہیں زمانہ جاہلیت و اسلام دونوں دیکھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیعت ہونے کی غرض سے آئے، اس وقت آپ ﷺ وفات پا چکے تھے، کوفہ کے تابعین میں شمار ہوتے ہیں ان کا نام صحابہ کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے حالانکہ سب کو اعتراف ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی زیارت نہیں کی حضرت عبدالرحمن بن عوف کے علاوہ باقی عشرہ مبشرہ سے روایت کی ان کے علاوہ اور بہت سے صحابہ سے روایت کرتے ہیں ایک بہت بڑی جماعت تابعین کی ان سے روایت کرتی ہے ان کے سوا اور کوئی تابعی ایسا نہیں جس نے عشرہ مبشرہ میں سے نو سے روایت کی ہو نہروان کے واقعہ میں حضرت علی بن ابی طالب کے ہمراہ شریک ہوئے بڑی عمر پائی اور سو سال سے زیادہ زندہ رہے ۹۸ھ میں انتقال فرمایا۔

(۷۴۶) **قیس بن مسلم:** — نام قیس ہے مسلم کے بیٹے بنو جدیلہ میں سے ہیں اور کوفہ کے باشندہ ہیں۔ سعید بن جبیر وغیرہ سے روایت کی اور ان سے ثوری اور شعبہ نے ۱۲۰ھ میں وفات پائی جدیلہ میں جیم پر زبر اور دال مہملہ پر زبر ہے۔

(۷۴۷) **قیس بن کثیر:** — یہ قیس ہیں کثیر کے بیٹے ابوالدرداءؓ سے حدیث کی سماعت کی ان سے داؤد بن جمیل نے روایت کی امام ترمذی نے اسی طرح ان کی حدیث کی اپنی کتاب میں قیس بن کثیر کے حوالہ سے تخریج کی اور فرمایا کہ اس طرح ہم سے محمود بن خداش نے حدیث بیان کی حالانکہ یہ قیس کے حوالہ سے ہے نہ کہ قیس بن کثیر کے ذریعہ سے اور اسی طرح ابوداؤد نے ان کا نام کثیر بن قیس بیان کیا اور بخاری نے بھی ان کا ذکر کثیر کے باب میں کیا ہے قیس کے باب میں نہیں (مراد یہ ہے کہ یہ نام قیس بن کثیر نہیں بلکہ کثیر بن قیس ہے۔

(۷۴۸) **ابوقلابہ:** — یہ ابوقلابہ ہیں، قلابہ میں قاف مکسور اور لام غیر مشدد اور باء موحدہ ہے۔ ان کا نام عبداللہ ہے زید کے بیٹے، یہ بنو جرم کے مشہور تابعی ہیں۔ حضرت انسؓ اور دوسرے صحابہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے بہت سے لوگ، سختیانی فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم ابوقلابہ نہایت عاقل فقیہہ ہیں شام میں ۱۰۲ھ میں انتقال ہوا۔ جرم میں جیم مفتوح اور راء مہملہ ہے۔

(۷۴۹) **ابن قطن:** — نام عبدالعزیز ہے قطن کا بیٹا ہے قطن میں قاف مفتوح اور طاء مہملہ مفتوح ہے زمانہ جاہلیت کا آدمی ہے، اس کا ذکر دجال کے قصہ میں ہے۔

(۷۵۰) **قزمان:** — یہ وہی قزمان ہے جس نے منافقت کے ساتھ اسلام کا اظہار کیا اس کا ذکر باب معجزات میں ہے یہ غزوۂ حنین میں مسلمانوں کی طرف سے شریک ہوا اور بڑی قوت و شدت سے جنگؓ کی لوگوں نے اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا (یہ کوئی بات نہیں) خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید فاجر و فاسق کے ذریعہ بھی فرماتا ہے خوب سمجھ لو یہ شخص بالیقین جہنمی ہے۔

صحابی عورتیں

(۷۵۱) قیلہ بنت مخرمہ: — یہ قیلہ ہیں۔ مخرمہ کی بیٹی بنو تمیم میں سے ان سے علیبہ کی دونوں بیٹیاں صفیہ اور دحیبہ روایت کرتی ہیں یہ دنوں ان کی ربیبہ (پروردہ) ہیں وہ ان دونوں کے والد کی دادی ہیں یہ صحابیہ ہیں۔ دحیبہ اور علیبہ دونوں مصغر ہیں۔

(۷۵۲) ام قیس بنت محصن: — یہ ام قیس ہیں محصن کی بیٹی محصن میں میم مکسور حاء ساکن اور نون ہے۔ بنو اسد میں سے ہیں۔ عکاشہ کی بہن ہیں پہلے مکہ میں مسلمان ہو چکی تھی آنحضرت ﷺ سے بیعت کی پھر مدینہ کی جانب ہجرت کی۔

(ک)

صحابہ

(۷۵۳) کعب بن مالک: — یہ کعب ہیں مالک کے بیٹے انصاری اور خزرجی ہیں۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں حاضر تھے، اس میں اختلاف ہے کہ بدر میں شرکت فرمائی یا نہیں تبوک کے علاوہ دیگر غزوات میں بھی شریک ہوئے آنحضرت ﷺ کے شعراء میں سے ہیں یہ ان تین صحابہ میں سے ہیں جو غزوہ تبوک میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے ان تینوں کے نام یہ ہے کعب بن مالک، ہلال بن امیہ، مرارہ بن ربیعہ، ان سے ایک جماعت نے روایت کی ۵۰ھ میں بعمر ۷۷ سال نابینا ہونے کے بعد انتقال فرمایا۔

(۷۵۴) کعب بن عجرۃ: — یہ کعب ہیں عجرہ کے بیٹے اور بلوی ہیں کوفہ میں قیام کر لیا تھا ۵۱ھ میں بعمر ۷۵ سال بمقام مدینہ انتقال فرمایا ان سے کچھ لوگوں نے روایت کی۔

(۷۵۵) کعب بن مرہ: — یہ کعب ہیں مرہ کے بیٹے اور بہزی بنو سلیم میں سے ہیں ملک شام میں اردن میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہاں ۵۹ھ میں انتقال فرمایا ان سے کچھ لوگوں نے روایت کی۔

(۷۵۶) کعب بن عیاض: — یہ ہیں کعب عیاض کے بیٹے اشعری ہیں اور اہل شام میں شمار ہوتے ہیں ان سے جابر بن عبد اللہ اور جبیر بن نفیر نے روایت کی عیاض میں عین مہملہ پر کسرہ اور یائے مخففہ کے نیچے دو نقطے اور ضاد معجمہ ہے۔

(۷۵۷) کعب بن عمرو: — یہ کعب ہیں عمرو کے بیٹے انصاری اور بنو سلیم میں سے ہیں بیعت عقبہ اور غزوہ بدر میں موجود تھے انہوں نے جنگ بدر میں عباس بن عبد المطلب کو گرفتار کر لیا تھا ۵۵ھ میں بمقام مدینہ طیبہ انتقال فرمایا ان سے ان کے بیٹے عمار اور حنظلہ بن قیس نے روایت کی۔

(۷۵۸) کثیر بن صلت: — یہ کثیر ہیں صلت کے بیٹے اور معدی کرب کے پوتے، خاندان کندہ کے ایک فرد ہیں آنحضرت ﷺ کی حیات میں ان کی پیدائش ہوئی خود آپ ﷺ نے ان کا نام تجویز فرمایا ان کا سابقہ نام قلیل تھا، انہوں نے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمان اور زید بن ثابتؓ سے روایت کی۔

(۷۵۹) کرکرہ: — یہ کرکرہ ہیں دونوں کاف مفتوح یا دونوں مکسور ہیں۔ بعض غزوات میں آنحضرت ﷺ کے سامان کے نگران تھے، ان کا ذکر باب غلول میں آتا ہے۔

(۷۶۰) کلدہ بن حنبل: — ان کا نام کلدہ ہے، حنبل کے بیٹے اور خاندان اسلم میں سے ہیں صفوان بن امیہ جمحی کے اخیافی (ماں شریک) بھائی ہیں اور معمر بن حبیب کے غلام تھے انہوں نے ان کو سوق عکاظ میں یمن والوں سے خرید لیا تھا پھر ان کو حلیف بنالیا اور ان کا نکاح کر دیا وفات تک مکہ ہی میں رہے ان سے عمرو بن عبد اللہ بن صفوان نے روایت کی کلدہ میں کاف و لام پر زبر اور دال پر نقطہ نہیں۔

(۷۶۱) ابو کبشہ: — یہ ابو کبشہ ہیں نام عمرو۔ اور سعد کے بیٹے بنو انمار میں سے ہیں شام میں آبسے تھے ان سے سالم بن ابی الجعد اور نعیم بن زیاد نے روایت کی۔

تابعین

(۷۶۲) کعب الاحبار: — یہ کعب الاحبار ہیں مانع کے بیٹے ہیں کنیت ابو اسحاق ہے کعب الاحبار کے نام سے مشہور ہیں اصل میں حمیر کے خاندان سے ہیں۔ آنحضرت کا زمانہ پایا لیکن زیارت سے مشرف نہیں ہوئے عمر بن الخطاب کے دور خلافت میں مسلمان ہوئے، عمرؓ صہیبؓ اور عائشہؓ سے روایت کی حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں بمقام حمص ۳۲ھ میں انتقال فرمایا۔

(۷۶۳) کثیر بن عبد اللہ: — یہ کثیر ہیں عبد اللہ بن عمرو بن عوف کے بیٹے قبیلہ مزنیہ کے شخص ہیں مدین کے رہنے والے ہیں اپنے والد سے حدیث کی سماعت کی، مروان بن معاویہ وغیرہ نے ان سے روایت کی۔

(۷۶۴) کثیر بن قیس: — یہ کثیر ہیں، قیس کے بیٹے یا قیس بن کثیر ان کا ذکر حرف قاف میں آچکا ہے۔

(۷۶۵) کریب بن ابی مسلم: — یہ کریب ہیں ابو مسلم کے بیٹے عبد اللہ بن عباسؓ اور معاویہؓ کے آزاد کردہ ہیں ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔

(۷۶۶) ابو کریب بن محمد: — یہ ابو کریب ہیں محمد بن علاء کے بیٹے ہمدانی و کوفی ہیں ابوبکر بن عباس وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی ان سے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے روایت کی ۲۴۸ھ میں وفات پائی۔

تابعی عورتیں

(۷۶۷) کبشہ بنت کعب: — یہ کبشہ ہیں کعب بن مالک کی بیٹی عبد اللہ بن ابی قتادہ کی بیوی ہیں ان کی حدیث سور ہرہ کے بیان میں ہے۔ انہوں نے ابو قتادہ سے اور ان سے حمیدہ بنت عبید بن رفاعہ نے روایت کی۔

(۷۶۸) کریمہ بنت ہمام: — یہ کریمہ ہیں ہمام کی بیٹی ہمام میں ہاء پر ضمہ اور میم غیر مشدد ہے انہوں نے ام المؤمنین عائشہؓ سے روایت کی ان کی حدیث خضاب کے متعلق ہے۔

(۷۶۹) ام کرز: — یہ ام کرز ہیں خاندان بنو کعب اور قبیلہ خزاعہ میں سے ہیں۔ مکہ کی باشندہ ہیں آنحضرت ﷺ سے بہت سی حدیثوں کی روایت کرتی ہیں، ان سے عطاء مجاہد وغیرہ نے روایت کی ان کی روایت عقیقہ کے بارہ میں ہے کرز میں کاف پر پیش اور راء ساکن اور آخر میں زائے معجمہ ہے۔

(۷۷۰) ام کلثوم بنت عقبہ: — یہ ام کلثوم ہیں عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی ہیں مکہ ہی میں اسلام لاچکی تھیں اور پیادہ ہجرت کی اور بیعت کی، مکہ میں ان کے شوہر نہ تھے۔ جب یہ مدینہ پہنچیں تو حضرت زید بن حارثہ نے ان سے نکاح کرلیا اور غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے اس کے بعد ان سے حضرت زبیر بن عوام نے نکاح کرلیا کچھ عرصہ بعد انہوں نے ان کو طلاق دے دی اب عبدالرحمٰن بن عوف نے ان سے نکاح کیا، ان سے ان کے یہاں دو لڑکے ابراہیم اور حمید تولد ہوئے ان کا بھی انتقال ہوگیا تو ان سے عمرو بن عاص نے نکاح کرلیا ان کے نکاح میں ایک ماہ رہی ہوں گی کہ خود ان کا انتقال ہوگیا، یہ حضرت عثمان بن عفان کی اخیافی (ماں شریک) بہن ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے حمید وغیرہم نے روایت کی۔

(ل)

صحابہ

(۷۷۱) لقیط بن عامر: — یہ لقیط ہیں عامر بن صبرہ کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ابورزین ہے خاندان بنو عقیل سے ہیں اور مشہور صحابی ہیں ان کا شمار اہل طائف میں ہے ان سے ان کے لڑکے عاصم اور ابن عمرو غیرہ نے روایت کی لقیط میں لام پر فتحہ اور قاف پر کسرہ اور صبرہ میں صاد پر فتحہ اور اور باموحدہ پر کسرہ ہے۔

(۷۷۲) لقمان بن باعورا: — یہ لقمان ہیں باعورا کے بیٹے اور حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے یا ان کے خالہ زاد بھائی ہیں لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے ان سے انہوں نے علم حاصل کیا اور بنی اسرائیل میں قاضی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک حبشی غلام مصری سود ان میں مقام نوب کے رہنے والے تھے زیادہ تر یہی کہا جاتا ہے کہ نبی نہیں تھے وہ تو بس ایک حکیم تھے ان کا ذکر کتاب الرقاق میں ہے۔

(۷۷۳) لبید بن ربیعہ: — نام لبید، ربیعہ کے بیٹے بنو عامر میں سے تھے شاعر تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس سال حاضر ہوئے جس سال ان کی قوم بنو جعفر بن کلاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں صاحب شرف وعزت رہے کوفہ میں رہ گئے تھے۔ ۴۱ھ میں بعمر ۱۴۰ سال اور ایک قول کے مطابق بعمر ۱۵۷ سال انتقال فرمایا ان کی عمر کے بارے میں اور بھی کئی اقوال ہیں یہ طویل العمر لوگوں میں سے تھے۔

(۷۷۴) ابولبابہ: — یہ ابولبابہ ہیں رفاعہ نام، عبدالمنذر کے بیٹے انصار واوس میں سے ہیں، ان کی کنیت نام پر غالب ہے نقیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوہ بدر اور اس کے بعد دوسرے غزوات میں حاضر تھے بیان کیا گیا ہے کہ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے بلکہ آپ نے ان کو مدینہ کا حاکم بنادیا تھا اور غازیان بدر کی طرح ان کا بھی حصہ مال غنیمت میں مقرر فرمایا حضرت علیؓ کے دور میں انتقال فرمایا، ان سے ابن عمر اور نافع وغیرہ نے روایت کی۔

(۷۷۵) ابن اللتبیہ: — یہ ابن اللتبیہ ہیں۔ یہ کنیت ہے اور نام عبداللہ ہے صحابی ہیں ان کا ذکر صدقات کی وصولی کے بیان میں ہے، اللتبیہ میں لام پر ضمہ اور تاء جس پر دو نقطے ہیں مفتوح اور باء جس کے نیچے ایک نقطہ ہے مکسور اور یاء جس کے نیچے دو نقطے ہیں مشدد ہے۔

تابعین

(۷۷۶) لیث بن سعد: — نام لیث، سعد کے بیٹے ہیں۔ کنیت ابوالحارث ہے مصر والوں کے فقیہہ ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ خالد بن ثابت فہمی کے آزاد کردہ ہیں مصر کے نشیبی حصہ کے گاؤں میں پیدا ہوئے انہوں نے ابن ابی ملیکہ عطاء زہری وغیرہ سے روایت کی اور ان سے بہت سے لوگوں نے حدیث بیان کی ان میں ابن مبارک بھی ہیں ۱۶۱ھ میں بغداد آئے خلیفہ منصور نے مصر کی ولایت ان کے سپرد کرنا چاہی تو انہوں نے انکار کردیا اور معافی کے خواستگار ہوئے یحیٰی بن بکیر کہتے ہیں کہ میں نے لیث بن سعد سے زیادہ کامل کسی کو نہیں پایا قتیبہ بن سعید کہتے ہیں کہ لیث ہر سال بیس ہزار دینار کا غلہ حاصل کرتے تھے اور ان پر کبھی زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی شعبان ۱۷۵ھ میں انتقال فرمایا۔

(۷۷۷) ابن ابی لیلی: — یہ ابن ابی لیلی ہیں نام عبدالرحمٰن ہے اور یسار ابولیلی ان کے والد ہیں انصار میں سے ہیں انکی پیدائش اس وقت ہوئی جب کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے چھ سال باقی تھے اور کہا جاتا ہے کہ دجیل میں پیدا ہوئے ۸۳ھ میں نہر بصرہ میں ڈوب گئے ان کی حدیثیں اہل کوفہ کے یہاں ہیں صحابہ میں سے بہت سے حضرات سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے بہت بڑی جماعت نے حدیث سنی کوفہ کے تابعین میں یہ پہلے طبقہ کے تابعی ہیں، ابن ابی لیلی بعض اوقات ان کے بیٹے محمد کو بھی کہا جاتا ہے یہ کوفہ کے قاضی اور فقہ کے مشہور امام اور صاحب مذہب ورائے ہیں جب محدثین ابن ابی لیلی بلا تصریح بولتے ہیں تو عبدالرحمٰن مراد ہوتے ہیں اور جب فقہا بولتے ہیں تو محمد ہی مراد ہوتے ہیں محمد کی پیدائش ۷۴ھ میں اور وفات ۱۴۸ھ میں ہوئی۔

(۷۷۸) ابن لہیعہ: — یہ ابن لہیعہ حضرمی ہیں فقیہہ ہیں، ان کا نام عبداللہ اور کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے مصر کے قاضی ہیں عطاء وابن لیلی۔ ابن ابی ملیکہ، اعرج، عمرو بن شعیب سے روایت کرتے ہیں اور ان سے یحیٰی بن بکیر اور قتیبہ مقری روایت کرتے ہیں، حدیث کے باب میں ضعیف ہیں ابوداؤد کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ مصر میں کوئی شخص کثرت حدیث اور اس کی یادداشت اور پختگی میں ابن لہیعہ جیسا نہ تھا۔ ۱۷۴ھ میں انتقال ہوا۔

(۷۷۹) لبید بن الاعصم: — یہ لبید ہے اعصم کا بیٹا یہودی ہے بنوزریق کا آدمی ہے کہا گیا ہے کہ یہ یہودیوں کا حلیف تھا اس کا ذکر سحر کے سلسلہ میں باب المعجزات میں ہے۔

(۷۸۰) ابولہب: — یہ ابولہب ہے، عبدالعزی نام عبدالمطلب بن ہاشم کا بیٹا آنحضرت ﷺ کا چچا ہے۔ جاہلی (کافر) ہے اس کا ذکر کتاب الفتن میں ہے۔

صحابی عورتیں

(۷۸۱) لبابہ بنت حارث: — یہ لبابہ ہیں حارث کی بیٹی ان کی کنیت ام الفضل ہے پہلے ان کا ذکر حرف الفاء میں آچکا ہے۔

(م)

صحابہ

(۷۸۲) مالک بن اوس: — یہ مالک ہیں اوس بن حدثان کے بیٹے۔ بصرہ کے رہنے والے، ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے،

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اکثر کے نزدیک ان کا صحابی ہونا ثابت ہے، ابن مندہ کہتے ہیں کہ ثابت نہیں ان کی آنحضرت ﷺ سے روایت کم ہے اور صحابہ سے جو روایات یہ نقل کرتے ہیں کافی زیادہ ہیں، عشرہ مبشرہ سے انہوں نے روایت کی ہیں حضرت عمرؓ سے ان کی روایات بکثرت منقول ہیں، ایک جماعت رواۃ کی ان سے روایت کرتی ہیں ان میں زہری و عکرمہ بھی شامل ہیں۔ بمقام مدینہ ۵۹۲ھ میں انتقال فرمایا حدثان میں حاء اور دال دونوں پر فتحہ اور ثاء مثلثہ (تین نقطوں والی) مفتوح ہے۔

(۷۸۳) **مالک بن حویرث:** — نام مالک۔ حویرث کے بیٹے اور لیث گھرانے کے شخص ہیں، آپ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی خدمت میں بیس روز قیام پذیر رہے اور پھر بصرہ میں سکونت پذیر رہے ان سے ان کے صاحبزادے عبداللہ اور ابوقلابہ وغیرہ نے روایت کی ۹۴ھ میں بمقام بصرہ انتقال فرمایا۔

(۷۸۴) **مالک بن صعصعۃ:** — یہ مالک ہیں صعصعۃ کے بیٹے انصار میں سے ہیں بنو مازن ان کا خاندان اور مدینہ وطن مالوف ہے پھر بصرہ میں سکونت اختیار کرلی ان سے حدیث کی روایت کم ہے۔

(۷۸۵) **مالک بن ہبیرہ:** — یہ مالک ہبیرہ کے بیٹے سکونی اور بنو کندہ میں سے ہیں ان کا شمار اہل شام میں ہوتا ہے بعض ان کو اہل مصر میں شمار کرتے ہیں ان سے مرثد بن عبداللہ نے روایت کی حضرت معاویہ کی جانب سے فوج کے امیر تھے اور روم کی جنگ میں بھی یہی امیر تھے مرثد میں میم پر زبر راء ساکن اور ثاء مثلثہ (تین نقطوں والی) دوبارہ ہے۔

(۷۸۶) **مالک بن یسار:** — یہ مالک یسار کے بیٹے سکونی اور عوفی ہیں ان کا شمار اہل شام میں ہے ابو نجدہ نے ان سے روایت کی ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، سکونی میں سین پر فتحہ اور کاف اور نون ہے۔

(۷۸۷) **مالک بن تیہان:** — یہ مالک تیہان کے بیٹے ہیں ابوالہیثم کنیت اور انصار میں سے ہیں، بیعت عقبہ میں حاضر تھے، یہ بارہ نقیبوں (نمائندوں) میں سے ایک ہیں۔ غزوہ بدر و غزوۂ احد اور تمام غزوات میں شریک رہے ان سے ابوہریرہؓ نے روایت کی حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں بمقام مدینہ طیبہ ۲۰ھ میں انتقال ہوا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۳۹ھ میں جنگ صفین میں شہید ہوئے ان کے علاوہ دوسرے اقوال بھی ہیں الہیثم میں ہاء پر فتحہ یاء ساکن اور ثاء مثلثہ (تین نقطوں والی) ہے اور التیہان میں تاء پر فتحہ (اس پر دو نقطے ہیں) اور یاء پر تشدید (اس کے نیچے دو نقطے ہیں) اور آخر میں نون ہے۔

(۷۸۸) **مالک بن قیس:** — یہ مالک ہیں قیس کے بیٹے ان کی کنیت ابوصرمہ ہے کنیت ہی مشہور ہے ان کا ذکر حرف صاد میں آچکا ہے۔

(۷۸۹) **مالک بن ربیعہ:** — یہ مالک ہیں قیس کے بیٹے ابواسید کنیت ہے کنیت ہی مشہور ہے ان کا ذکر حرف ہمزہ میں آچکا ہے۔

(۷۹۰) **ماعز بن مالک:** — یہ ماعز ہیں مالک کے بیٹے اور اسلمی ہیں اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں یہ وہ صحابی ہیں جن کو حضور ﷺ نے حد زنا میں سنگسار کرایا تھا ان سے ان کے صاحبزادے عبداللہ نے صرف ایک روایت کی ہے۔

(۷۹۱) **مطر بن عکامس:** — یہ مطر ہیں عکامس کے بیٹے اور سلمی ہیں ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے ان سے ایک روایت منقول ہے ابواسحٰق سبیعی کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی عکامس میں عین مہملہ پر پیش اور کاف غیر مشدد ہے میم پر کسرہ اور آخر میں سین غیر منقوطہ ہے۔

(۷۹۲) **معاذ بن انس:** — یہ معاذ ہیں انس کے بیٹے جہینہ خاندان سے ہیں اہل مصر میں شمار ہوتے ہیں وہاں ہی ان کی حدیثیں پائی جاتی ہیں ان کے بیٹے سہل ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۷۹۳) **معاذ بن جبل:** — یہ معاذ ہیں جبل کے بیٹے ابوعبداللہ کنیت انصاری خزرجی ہیں یہ انصار کے ان ستر اشخاص میں سے ہیں جو بیعت عقبہ ثانیہ میں حاضر ہوئے تھے بدر اور دوسرے غزوات میں حاضر ہوئے آنحضرت ﷺ نے ان کو بحیثیت قاضی و معلّم یمن روانہ فرمایا تھا ان سے عمرو ابن عباس اور بہت سے لوگوں نے روایت کی اٹھارہ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے یہ بعض کا قول ہے، ان کو حضرت عمرؓ نے ابوعبیدہ بن جراح کے بعد شام کا حاکم مقرر فرمایا اور اسی سال ۱۸ھ میں بعمر ۳۸ سال طاعون عمواس میں ان کی وفات ہوئی اور بھی کچھ اقوال اس بارے میں نقل کئے گئے ہیں۔

(۷۹۴) **معاذ بن عمرو بن جموح:** — یہ معاذ ہیں عمرو بن جموح کے بیٹے انصاری و خزرجی ہیں بیعت عقبہ اور بدر میں یہ خود اور ان کے والد عمرو شریک ہوئے یہی وہ صحابی ہیں جنہوں نے معاذ بن عفراء کی معیت میں ابوجہل کو قتل کیا تھا ان کا ذکر باب قسمۃ الغنائم میں ہے ابن عبدالرحمٰن اور ابن اسحاق کی روایت ہے کہ معاذ بن عمرو نے ابوجہل کی ٹانگ کاٹ دی تھی اور اس کو زمین پر گرادیا تھا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عکرمہ نے جو ابوجہل کے بیٹے ہیں (یہ بعد میں مسلمان ہوگئے) معاذ بن عمر کے ہاتھ پر تلوار ماری اور اس کو الگ کردیا تھا اس کے بعد معاذ بن عفراء نے ابوجہل پر تلوار سے حملہ کیا تا آنکہ اس کو بے دم کردیا کچھ سانس باقی تھے کہ وہ اسی کو چھوڑ گئے جب آنحضرت ﷺ نے مقتولین میں ابوجہل کو تلاش کرنے کے لئے ابن مسعودؓ کو حکم فرمایا تو یہ ابوجہل کے پاس آئے اور اس کا سر جسم سے جدا کردیا ان سے عبداللہ بن عباس نے روایت کی حضرت عثمان کے زمانہ میں وفات پائی۔

(۷۹۵) **معاذ بن حارث:** — یہ معاذ ہیں حارث بن رفاعہ کے بیٹے انصاری و زرقی ہیں، عفراء ان کی والدہ ہیں اور وہ عبید بن ثعلبہ کی بیٹی ہیں یہ اور رافع بن مالک قبیلۂ خزرج کے انصار میں سب سے پہلے مسلمان ہوئے غزوۂ بدر میں اپنے دونوں بھائیوں عوف اور معوذ کی معیت میں شریک ہوئے ان کے یہ دونوں بھائی بدر میں شہید ہوئے بعض کے قول کے مطابق یہ بدر کے علاوہ دوسرے غزوات میں شریک ہوئے بعض کہتے ہیں کہ بدر میں ان کو زخم آئے اور مدینہ میں انہی زخموں کے باعث انتقال فرمایا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک زندہ رہے ان سے ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ نے روایت کی عفراء میں عین مہملہ مفتوح اور فاء ساکن اور الف ممدودہ ہے۔

(۷۹۶) **معوذ بن حارث:** — یہ معوذ ہیں حارث کے بیٹے اور عفراء ان کی والدہ ہیں بدر میں شریک ہوئے، یہی ہیں جنہوں نے اپنے بھائی معوذ کی معیت میں ابوجہل کو قتل کیا، یہ دونوں کاشتکار اور باغات کا کام کرنے والے ہیں بدر میں قتل کیا اور وہیں شہادت پائی معوذ میں میم مضموم اور عین پر فتحہ اور واؤ مشدد پر کسرہ اور ذال معجمہ ہے۔

(۷۹۷) **مسطح بن اثاثہ:** — یہ اثاثہ بن عباد بن عبدالمطلب بن عبد مناف کے بیٹے قریش و بنو عبدالمطلب میں سے ہیں غزوۂ بدر اور اور غزوۂ احد اور دوسرے غزوات میں شریک ہوئے یہی وہ صحابی ہیں جو واقعہ افک میں عائشہؓ کے متعلق بدگوئی میں شریک ہوگئے تھے آنحضرت ﷺ نے جن آدمیوں کو اتہام تراشی میں کوڑوں کی سزا دی ان میں یہ بھی شامل ہیں کہا جاتا ہے کہ مسطح ان کا لقب ہے اور نام عوف ہے ابن عبدالبر نے کہا کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۳۴ھ میں بعمر ۵۶ سال وفات پائی مسطح میں میم مکسور سین ساکن طاء مہملہ پر فتحہ اور حاء مہملہ ہے، اثاثہ میں ہمزہ پر ضمہ تین نقطوں والی پہلی ثاء غیر مشدد ہے عباد میں باء جس کے نیچے ایک نقطہ ہے مشدد ہے۔

(۷۹۸) **مسور بن مخرمہ:** — یہ مسور ہیں مخرمہ کے بیٹے کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے زہری و قرشی ہیں، یہ عبدالرحمٰن بن عوف کے

بھانجے ہیں ہجرت نبوی کے دو سال بعد مکہ میں ان کی پیدائش ہوئی ذی الحجہ ۸ ھ میں مدینہ منورہ پہنچے آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۸ سال تھی انہوں نے آنحضرت ﷺ سے حدیث کی سماعت کی اور اس کو یاد رکھا بڑے فقیہہ اور صاحب فضل اور دیدار تھے حضرت عثمان کی شہادت تک مدینہ ہی میں قیام پذیر رہے بعد شہادت مکہ میں منتقل ہو گئے اور حضرت معاویہ ؓ کی وفات تک وہاں مقیم رہے انہوں نے یزید کی بیعت کو پسند نہیں کیا لیکن پھر بھی مکہ ہی میں رہے جب تک کہ یزید نے لشکر بھیجا اور مکہ کا محاصرہ کر لیا اس وقت یہاں ابن زبیر ؓ مکہ میں موجود تھے چنانچہ اس محاصرہ میں مسور بن مخرمہ کو منجنیق سے پھینکا ہوا ایک پتھر لگا یہ اس وقت حجرۂ مبارک میں نماز پڑھ رہے تھے اسی پتھر نے ان کی جان لی یہ واقعہ ربیع الاول ۶۴ ھ کی چاندرات کو ہوا ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی مسور میں میم مکسور سین مہملہ ساکن اور واؤ مفتوح ہے مخرمہ میں میم مفتوح خاء معجمہ ساکن اور راء مفتوح ہے۔

(۷۹۹) مسیب بن حزن: — یہ مسیب، حزن کے بیٹے کنیت ابوسعید قرشی و مخزومی ہیں اپنے والد حزن کے ہمراہ ہجرت کی مسیب ان لوگوں میں سے ہیں جو بیعت الرضوان میں شریک ہوئے اپنے والد حزن سے روایت کی اہل حجاز میں ان کی حدیث ملتی ہے ان سے ان کے بیٹے سعید بن مسیب نے روایت کی مسیب میں میم مضموم سین مفتوح اور دو نقطوں والی یاء مشدد مفتوح ہے حزن میں حاء مہملہ پر زبر زاء ساکن اور آخر میں نون ہے۔

(۸۰۰) مستورد بن شداد: — یہ مستورد ہیں شداد کے بیٹے فہری و قرشی ہیں ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے بعد میں مصر کو سکونت گاہ بنا لیا اور ان میں شمار ہوتے ہیں کہا جاتا ہے کہ جس روز آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی اس وقت یہ بچے تھے لیکن انہوں نے آنحضرت ﷺ سے حدیث کی سماعت کی اور اس کو یاد رکھا ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

(۸۰۱) مغیرہ بن شعبہ: — یہ مغیرہ ہیں شعبہ کے بیٹے اور ثقفی ہیں غزوۂ خندق کے سال مسلمان ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچے کوفہ میں پڑے رہے اور وہیں ۵۰ ھ میں بعمر ستر سال وفات پائی اس وقت یہ حضرت معاویہ ؓ بن ابی سفیان کی جانب سے امیر تھے چند لوگ ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۸۰۲) مقدام بن معدیکرب: — یہ مقدام ہیں معدی کرب کے بیٹے کنیت ابوکریمہ ہے اور کندی ہیں اہل شام میں ان کا شمار ہے وہاں ہی ان کی حدیث پائی جاتی ہے ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی شام میں بعمر ۹۱ سال ۸۷ ھ میں انتقال ہوا۔

(۸۰۳) مقداد بن اسود: — یہ مقداد ہیں اسود کے بیٹے اور کندی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے والد نے بنو کندہ سے عہد و پیمان کر لیا تھا، اسی لئے کندہ کی طرف منسوب ہوئے، ابن اسود کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسود کے حلیف یا ان کے پروردہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بات نہ تھی بلکہ یہ اسود کے غلام تھے انہوں نے ان کو متبنی بنا لیا تھا یہ اسلام لانے والوں میں چھٹے آدمی ہیں ان سے علی ؓ اور طارق بن شہاب وغیرہ نے روایت کی، جرف جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے وفات پائی لوگ ان کو وہاں سے اپنے کندھوں پر اٹھا کر لائے اور بقیع میں ۳۳ ھ میں دفن کیا، اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔

(۸۰۴) مہاجر بن خالد: — یہ مہاجر ہیں خالد بن ولید بن مغیرہ کے بیٹے مخزومی و قریشی ہیں یہ اور ان کے بھائی عبدالرحمن دونوں آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بچے تھے، ان دونوں میں اختلاف تھا، یہ خود حضرت علی ؓ کے طرفدار تھے اور عبدالرحمن حضرت معاویہ ؓ کے ساتھ تھا مہاجر نے حضرت علی ؓ کے ہمراہ جنگ جمل و صفین میں شرکت کی ابو عمر کہتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ جنگ جمل میں ان کی آنکھ پھوٹ گئی تھی جنگ صفین میں شہید ہوئے اور شہادت تک حضرت علی ؓ کے طرفدار رہے۔

(۸۰۵) مہاجر بن قنفذ: — یہ مہاجر ہیں قنفذ کے بیٹے قرشی و تیمی ہیں کہا جاتا ہے کہ مہاجر و قنفذ دونوں لقب ہیں اصل نام عمرو بن

خلف ہے۔ مسلمان ہوئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ہجرت کر کے پہنچے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ حقیقی مہاجر ہیں کہا جاتا ہے کہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے اور بصرہ میں رہ پڑے اور وہاں وفات پائی ان سے ابو ساسان حضین بن منذر نے روایت کی قنفذ میں قاف پر ضمہ اور نون ساکن اور فاء اور ذال معجمہ ہے اور ساسان میں ہر دو سین پر نقطے نہیں اور حضین میں حاء مہملہ مضموم اور ضاد معجمہ مفتوح اور یاء کے بعد نون ہے۔

(۸۰۶) معیقیب بن ابی فاطمہ: — یہ معیقیب ہیں ابوفاطمہ کے بیٹے اور دوسی ہیں سعید بن ابی عاص کے آزاد کردہ ہیں، غزوۂ بدر میں شریک ہوئے بہت پہلے مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے، دوسری ہجرت حبشہ میں انہوں نے بھی ہجرت کی اور آنحضرت ﷺ کے مدینہ تشریف لے جانے تک حبشہ میں مقیم رہے آنحضرت ﷺ کی مہر کی حفاظت پر مقرر تھے۔ ان کو ابوبکرؓ و عمرؓ نے بیت المال (خزانہ مُسلمین) کا افسر اعلیٰ بنا دیا تھا ان سے ان کے بیٹے محمد اور پوتے ایاس بن حارث وغیرہ نے روایت کی، ۴۰ھ میں انتقال فرمایا۔

(۸۰۷) معقل بن یسار: — یہ معقل ہیں یسار کے بیٹے اور مزنی ہیں بیعت الرضوان میں انہوں نے بھی بیعت کی۔ بصرہ میں سکونت پذیر تھے۔ بصرہ کی نہر معقل انہی کی طرف منسوب ہے، ان سے حسن اور ایک جماعت نے روایت کی عبیداللہ بن زیاد کی امارت میں ۶۰ھ کے بعد وفات پائی کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہوئی۔

(۸۰۸) معقل بن سنان: — یہ معقل ہیں سنان کے بیٹے اور اشجعی ہیں فتح مکہ میں شریک و حاضر ہوئے اور کوفہ میں رہ پڑے اہل کوفہ کے یہاں ان کی روایت پائی جاتی ہے جنگ حرہ میں باندھ کر قتل کئے گئے ان سے ابن مسعود، علقمہ، حسن شعبی اور دوسرے حضرات نے روایت کی، معقل میں میم پر زبر عین ساکن اور قاف مکسور ہے۔

(۸۰۹) معن بن عدی: — یہ معن ہیں عدی کے بیٹے اور بلوی ہیں، عاصم کے بھائی یہی ہیں غزوۂ بدر اور اس کے بعد دوسرے غزوات میں شریک و حاضر تھے جنگ یمامہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں شہید ہوئے آنحضرت ﷺ نے ان کے اور زید بن خطاب کے درمیان مواخاۃ (برادرانہ تعلقات) قائم کردی تھی جنگ یمامہ میں دونوں ساتھ ہی قتل ہوئے۔

(۸۱۰) معن بن یزید: — یہ معن ہیں یزید بن اخنس کے بیٹے اور سلمی ہیں، یہ خود صحابی ہیں اور ان کے والد اور دادا بھی صحابی ہیں ان باتوں میں سے جو کہی گئی ہیں یہ بھی ہے کہ یہ بدر میں شریک ہوئے اہل کوفہ میں شمار ہوتے ہیں ان سے وائل بن کلاب وغیرہ نے روایت کی۔

(۸۱۱) مجمع بن جاریہ: — یہ مجمع جاریہ کے بیٹے اور انصاری و مدنی ہیں مسجد ضرار والے منافقین میں ان کے والد بھی داخل تھے لیکن مجمع ٹھیک رہے۔ وہ قاری تھے کہا جاتا ہے کہ ابن مسعودؓ نے ان سے نصف قرآن حاصل کیا تھا ان سے ان کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن یزید وغیرہ نے روایت کی۔ حضرت معاویہؓ کے آخری دور میں انتقال فرمایا۔ مجمع میں میم پر پیش اور جیم پر زبر اور دوسرا میم مشدد اور اس کے نیچے کسرہ اور آخر میں عین مہملہ ہے۔

(۸۱۲) محجن بن ادرع: — یہ محجن ہیں ادرع کے بیٹے اور اسلمی ہیں ابتدائے اسلام ہی میں مسلمان ہو چکے ہیں، اہل بصرہ میں ان کا شمار ہے ان سے حنظلہ بن علی اور رجاء و سعید بن ابی سعید نے روایت کی، طویل عمر پائی کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے آخر ایام خلافت میں وفات پائی، محجن میں میم کے نیچے زیر حاء مہملہ ساکن اور جیم پر زبر اور آخر میں نون ہے۔

(۸۱۳) مخنف بن سلیم: — یہ مخنف ہیں سلیم کے بیٹے اور غامدی ہیں اور ان کو حضرت علی بن ابی طالبؓ نے اصفہان کا حاکم مقرر فرمایا

تھا ان سے ان کے بیٹے اور ابو رملہ نے روایت کی۔ ان کا شمار اہل بصرہ میں ہے مخنف میں میم کے نیچے زیر خاء معجمہ ساکن نون پر زبر اور آخر میں فاء ہے۔

(۸۱۴) مدعم: — یہ مدعم ہیں، آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ ہیں۔ حبشی غلام تھے پہلے یہ رفاعہ بن زید کے غلام تھے انہوں نے ان کو بطور ہدیہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا ان کا ذکر غلول میں ہے مدعم میم کے زیر اور دال کے سکون اور عین مہملہ کے زبر کے ساتھ ہے۔

(۸۱۵) مرداس بن مالک: — یہ مرداس ہیں مالک کے بیٹے اور اسلمی ہیں یہ اصحاب شجرہ (جنہوں نے درخت کے نیچے آپ ﷺ سے بیعت کی) میں سے تھے، اہل کوفہ میں ان کا شمار ہے، ان سے قیس بن ابی حازم نے صرف ایک حدیث روایت کی، اس حدیث کے علاوہ ان کی کوئی حدیث نہیں ہے۔

(۸۱۶) محیصہ بن مسعود: — یہ محیصہ ہیں مسعود کے بیٹے اور انصاری وحارثی ہیں، اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان میں ہی ان کی حدیثیں ملتی ہیں، غزوۂ احد وخندق اور اس کے ماسوا دیگر غزوات میں حاضر ہوئے ان سے ان کے بیٹے سعید نے روایت کی محیصہ میں میم پر پیش اور حاء غیر منقوطہ پر زبر اور یا مشدد کے نیچے زیر او صاد غیر منقوط پر زبر ہے۔

(۸۱۷) مخارق بن عبداللہ: — یہ مخارق ہیں عبداللہ کے بیٹے اہل کوفہ میں شمار ہوتے ہیں، ان کی حدیث میں اختلاف ہے ان سے ان کے بیٹے قابوس کے سوا کسی نے روایت نہیں کی۔

(۸۱۸) مخرفہ عبدی — یہ مخرفہ عبدی ہیں ان کے نام میں اختلاف ہے بعض نے کہا مخرفہ ہے اور بعض نے کہا مخرمہ ہے پہلا قول اکثر کا ہے ان سے سوید بن قیس نے روایت کی اور ان کا ذکر سوید کی حدیث میں ہے۔

(۸۱۹) مجاشع بن مسعود: — یہ مجاشع ہیں مسعود کے بیٹے اور سلمی ہیں، ان سے ابو عثمان نہدی نے روایت کی۔ صفر ۳۶ھ میں جنگ جمل میں شہید ہوئے، ان کی حدیث اہل بصرہ کے یہاں ہے۔

(۸۲۰) مرارہ بن ربیع: — یہ مرارہ ہیں ربیع کے بیٹے عامری انصاری ہیں، غزوۂ بدر میں شریک وحاضر تھے، غزوہ تبوک سے رہ جانے والے تین اصحاب میں سے یہ بھی ہیں ان کی توبہ مقبول ہوئی، ان کے متعلق آیات قرآن کا نزول ہوا، مرارہ میں میم پر پیش ہے۔

(۸۲۱) مصعب بن عمیر: — یہ مصعب ہیں عمیر کے بیٹے اور قرشی عدوی ہیں بزرگ اور اہل فضل صحابہ میں سے ہیں پہلے ہجرت حبشہ میں پہلے قافلہ کے ساتھ ہجرت فرمائی پھر بدر میں شریک وحاضر ہوئے آنحضرت ﷺ نے ان کو بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد مدینہ بھیجدیا تاکہ اہل مدینہ کو قرآن وفہم دین سکھائیں سب سے پہلے انہوں نے ہی ہجرت سے پہلے مدینہ میں جمعہ قائم کیا، زمانہ جاہلیت میں نہایت آرام کی زندگی گذراتے تھے اور بہت ناز کے لباس استعمال کرتے تھے۔ جب مسلمان ہو گئے تو دنیا سے بے نیاز ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری کھال سانپ کی طرح کھردری ہو گئی، کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بیعت عقبہ اولی کے بعد ہی مدینہ بھیج دیا تھا یہ انصار کے مکانوں پر جاتے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے کبھی ایک کبھی دو آدمی مسلمان بھی ہوتے جب اسلام کی اشاعت ہو گئی تو آنحضرت سے بذریعہ خطہ وکتابت جمعہ قائم کرنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے ان کو اجازت مرحمت فرمائی پھر ستر آدمیوں کی معیت میں بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر حاضر ہوئے اور مکہ مین تھوڑا سا قیام فرمایا اور پھر آپ کی ہجرت سے قبل ہی مدینہ لوٹ گئے مدینہ میں سب سے پہلے پہنچے اور جنگ احد میں شہادت پائی اس وقت آپ کی عمر چالیس سال یا کچھ زیادہ تھی رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ (ترجمہ یہ وہ لوگ ہیں

جنہوں نے خدا کے معاہدہ کو سچائی کے ساتھ پورا کر دکھایا) ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ آنحضرت ﷺ کے دار ارقم میں داخل ہونے کے بعد یہ مسلمان ہو گئے تھے۔

(۸۲۲) معاویہ بن ابی سفیان: — یہ معاویہ ہیں ابی سفیان کے بیٹے قرشی اور اموی ہیں، ان کی والدہ کا نام ہند بنت عتبہ ہے۔ یہ خود اور ان کے والد فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والوں میں سے ہیں اور مولفۃ القلوب میں داخل تھے، آنحضرت ﷺ کی وحی کی کتابت کرنے والوں میں حضرت معاویہ بھی شامل ہیں کہا گیا ہے کہ انہوں نے وحی بالکل نہیں لکھی، البتہ آپ ﷺ کے مراسلات یہی لکھتے تھے، ابن عباس اور ابو سعید نے ان سے روایت کی، اپنے بھائی یزید کے بعد شام کے حاکم مقرر ہوئے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ سے وفات تک حاکم ہی رہے یہ کل مدت چالیس سال ہے حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں تقریباً چار سال اور حضرت عثمانؓ کی پوری مدت خلافت اور حضرت علیؓ کی پوری مدت خلافت اور ان کے بیٹے حضرت حسن کی مدت خلافت یہ کل بیس سال ہوئے اس کے بعد حضرت حسن بن علیؓ نے ۴۱ھ میں خلافت ان کو سپرد کر دی تو حکومت مکمل طور پر ان کو حاصل ہو گئی اور مسلسل بیس سال تک زمام سلطنت ان کے ہاتھ میں رہی، بمقام دمشق رجب ۶۰ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ آخر عمر میں ان کو لقوہ کی بیماری لاحق ہو گئی تھی اپنی زندگی کے آخری ایام میں کہا کرتے تھے۔ کاش کہ میں وادی ذی طوی میں قریش کا ایک آدمی ہوتا اور یہ حکومت وغیرہ کچھ نہ جانتا، ان کے پاس آنحضرت ﷺ کی چادر قمیص اور ازار اور کچھ موئے مبارک اور ناخن موجود تھے انہوں نے وصیت کی تھی کہ مجھے آپ ﷺ کی قمیص چادر اور ازار میں کفن دیا جائے اور میری ناک اور منہ اور ان اعضاء میں جن سے سجدہ کیا جاتا ہے آنحضرت ﷺ کے بال مبارک اور ناخن بھر دیئے جائیں اور مجھے میرے ارحم الراحمین کے سامنے تنہا چھوڑ دیا جائے (وہ میرے ساتھ جو معاملہ مناسب جانیں گے کریں گے۔)

(۸۲۳) معاویہ بن حکم: — یہ معاویہ ہیں حکم کے بیٹے اور سلمی ہیں یہ مدینہ میں ٹھہرے ہوئے تھے ان کا شمار اہل حجاز میں ہے ان سے ان کے بیٹے کثیر اور عطاء بن یسار وغیرہ نے روایت کی ۱۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔

(۸۲۴) معاویہ بن جاہمہ: — یہ معاویہ ہیں جاہمہ کے بیٹے اور اسلمی ہیں ان کا شمار اہل حجاز میں ہے انہوں نے اپنے والد سے اور ان سے طلحہ بن عبید اللہ نے روایت کی۔

(۸۲۵) مروان بن الحکم: — یہ مروان ہیں حکم کے بیٹے کنیت ابو عبد الملک ہے قرشی اموی اور عمر بن عبد العزیز کے دادا ہیں مروان آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے، کہا جاتا ہے کہ ۲ھ میں پیدا ہوئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غزوۂ خندق کے سال میں یا کسی اور سال پیدا ہوئے انہوں نے آنحضرت کی زیارت نہیں کی کیونکہ آپ نے ان کو (مروان کے والد کو) طائف کی جانب جلاوطن کر دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت تک یہ وہیں مقیم رہے حضرت عثمانؓ نے ان کو مدینہ واپس بلالیا۔ یہ اپنے بیٹے کے ساتھ مدینہ لوٹ آئے دمشق کے مقام پر ۶۵ھ میں وفات پائی کچھ صحابہ سے روایت کرتے ہیں ان میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بھی ہیں اور ان سے کچھ تابعین نے روایت کی جیسے عروہ بن زبیر۔ اور علی بن حسین۔

(۸۲۶) مرہ بن کعب: — یہ مرہ ہیں کعب کے بیٹے اور بہزی ہیں ان کا شمار اہل شام میں ہے ان سے کچھ تابعین نے روایت کی ۵۵ھ میں بمقام اردن وفات پائی۔

(۸۲۷) مزیدہ بن جابر: — یہ مزیدہ ہیں جابر کے بیٹے اور بصرہ کے رہنے والے اہل بصرہ میں شمار کئے جاتے ہیں ان کی حدیثیں اہل بصرہ کے یہاں ملتی ہیں ان سے ان کے اخیافی بھائی عوذ بن عبد اللہ بن سعد نے روایت کی۔ مزیدہ میں میم پر زبر، زاء ساکن اور یاء (جس کے نیچے دو نقطے ہیں) پر زبر ہے۔

(۸۲۸) **مسلم قرشی بن عبداللہ:** ــ یہ مسلم قرشی ہیں ان کا نام مسلم ہے عبداللہ کے بیٹے ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کا نام عبید اللہ بن مسلم ہے۔

(۸۲۹) **مطلب بن ابی وداعہ:** ــ یہ مطلب ہیں ابووداعہ کے بیٹے کا نام حارث ہے، سہمی اور قرشی ہیں، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے پھر کوفہ میں جا ٹھہرے پھر مدینہ میں، ان کے باپ جنگ بدر میں قید ہو گئے تھے تو مطلب نے ان کو چھڑایا ان سے عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے دونوں بیٹوں کثیر و جعفر اور مطلب بن سائب نے جو ان کے بھتیجے ہیں روایت کی۔

(۸۳۰) **مطلب بن ربیعہ:** ــ یہ مطلب ہیں ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ہاشم کے بیٹے اور قرشی وہاشمی ہیں آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کم عمر تھے ان کا شمار اہل حجاز میں ہے۔

(۸۳۱) **محمد بن ابی بکر صدیقؓ:** ــ یہ محمد ہیں ابوبکر صدیقؓ کے بیٹے ہیں، ابوالقاسم کنیت ہے، ۸ھ میں حجۃ الوداع کے سال بمقام ذوالحلیفہ پیدا ہوئے، ان کی والدہ اسماء بنت عمیس ہیں، حضرت عائشہ سے بکثرت روایت کی اور دوسرے صحابہ سے بھی روایت کرتے ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے قاسم نے بکثرت روایت کی اور دوسرے تابعین بھی روایت کرتے ہیں حضرت معاویہؓ کے طرفداروں نے ان کو مصر میں ۳۸ھ میں قتل کر دیا اور ان کو مردہ گدھے پر رکھ کر جلا دیا۔

(۸۳۲) **محمد بن حاطب:** ــ یہ محمد ہیں حاطب کے بیٹے قرشی اور جمحی ہیں وہ اور ان کے والد، والدہ بھائی حارث اور چچا خطاب۔ سب صحابی ہیں اور ملک حبشہ میں پیدا ہوئے ۷۴ھ میں بمقام مکہ یا کوفہ وفات پائی ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے ان سے ان کے بیٹے ابراہیم اور سماک بن حرب نے روایت کی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جن کا نام آنحضرت ﷺ کے نام پر رکھا گیا۔

(۸۳۳) **محمد بن عبداللہ:** ــ یہ محمد ہیں عبداللہ بن جحش کے بیٹے، قرشی واسدی ہیں ہجرت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئے اور اپنے والد کے ساتھ ملک حبشہ کو ہجرت کی پھر مکہ لوٹ آئے پھر مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی ان سے ان کے آزاد کردہ ابوکثیر وغیرہ نے روایت کی۔

(۸۳۴) **محمد بن عمروؓ:** ــ یہ محمد ہیں عمرو بن حزم کے بیٹے اور انصاری ہیں ۱۰ھ میں بمقام نجران آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں تولد ہوئے ان کے والد عمروؓ آنحضرت ﷺ کی جانب سے نجران کے عامل (گورنر) تھے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے والد سے فرمایا تھا کہ وہ ان کی کنیت ابوعبدالملک رکھیں، محمد فقیہ تھے اپنے والد اور عمرو بن العاص سے انہوں نے اور ان سے اہل مدینہ کی ایک جماعت نے روایت کی ۶۳ھ میں حرہ کی جنگ میں بعمر ۵۳ سال قتل کئے گئے۔

(۸۳۵) **محمد بن ابی عمیرہ:** ــ یہ محمد ہیں، ابوعمیرہ کے بیٹے اور مزنی ہیں اہل شام میں شمار ہوتے ہیں ان سے جبیر بن نفیر نے روایت کی ہے۔ عمیرہ میں عین غیر منقوطہ پر فتحہ اور میم پر کسرہ اور آخر میں راء ہے۔

(۸۳۶) **محمد بن مسلمہ:** ــ یہ محمد ہیں مسلمہ کے بیٹے انصاری اور حارثی ہیں غزوہ تبوک کے علاوہ باقی تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ حضرت عمر بن خطاب اور دوسرے صحابہ سے روایت کی اہل فضل صحابہ میں سے تھے یہ ان صحابہ میں سے ہیں جو حضرت مصعب بن عمیر کے ہاتھ پر مدینہ میں مشرف باسلام ہوئے مدینہ ہی میں ۴۲ھ میں بعمر ۷۷ سال وفات پائی۔

(۸۳۷) **محمود بن لبید:** ــ یہ محمود ہیں لبید کے بیٹے انصاری و اشہلی ہیں، آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں تولد ہوئے آنحضرت ﷺ سے بہت سی حدیثوں کے راوی ہیں، بخاری فرماتے ہیں کہ یہ صحابی ہیں ابوحاتم کہتے ہیں کہ ان کے صحابی ہونے کا حال

معلوم نہیں ہوا۔ امام مسلم نے ان کو تابعین کے دوسرے طبقہ میں ذکر کیا ہے ابن عبید اللہ نے فرمایا کہ بخاری کا قول درست ہے اس لئے ان کا صحابہ ہونا درست ہے محمود علماء، میں سے ہیں، ابن عباس اور عتبان بن مالک سے روایت کی ۹۶ھ میں وفات پائی۔

(۸۳۸) معمر بن عبداللہ: — یہ معمر ہیں عبداللہ کے بیٹے قرشی وعدوی ہیں زمانہ قدیم ہی میں مشرف باسلام ہوئے اہل مدینہ میں شمار ہیں اور مدینہ والوں کے یہاں ان کی حدیثیں ملتی ہیں۔ سعید بن مسیب نے ان سے روایت کی۔

(۸۳۹) مغیث: — مغیث میں میم مضموم غین معجمہ اور یاء جس کے نیچے دو نقطے ہیں ساکن، اور تین نقطوں والی ثاء ہے۔ بریرہ (حضرت عائشہ کی آزاد کردہ) کے شوہر ہیں یہ خود آل ابی احمد جحش کے آزاد کردہ ہیں ان سے ابن عباسؓ اور عائشہؓ نے روایت کی۔

(۸۴۰) منذر بن ابی اسید: — یہ منذر ہیں ابواسید کے بیٹے اور ساعدی ہیں جب پیدا ہوئے تو آنحضرت کی خدمت میں لائے گئے آپ ﷺ نے ان کو اپنی ران پر رکھ لیا اور ان کا نام منذر رکھا، اسید اسد کی تصغیر ہے۔

(۸۴۱) ابوموسیٰؓ: — یہ ابوموسی ہیں نام عبداللہ، قیس کے بیٹے اور اشعری ہیں مکہ میں مسلمان ہوئے اور سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی پھر اہل سفینہ کے ساتھ آئے اس وقت آنحضرت ﷺ خیبر میں تھے ۲۰ میں حضرت عمر بن خطابؓ نے ان کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا ابوموسی نے اہواز کو فتح کر لیا، ابتدائے خلافت عثمان تک بصرہ ہی کے حاکم رہے پھر وہاں سے معزول ہو کر کوفہ کی طرف منتقل ہوگئے اور وہاں قیام پذیر ہوگئے حضرت عثمانؓ کی شہادت تک کوفہ کے والی رہے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے حکم بنائے گئے اس کے بعد اپنے سال وفات ۵۲ھ تک مکہ ہی میں رہے۔

(۸۴۲) ابومرثد بن حصین: — یہ ابومرثد ہیں نام کناز حصین کے بیٹے ہیں ان کو ابن حصین غنوی کہا جاتا ہے اپنی کنیت سے مشہور ہیں یہ اور ان کے بیٹے مرثد غزوہ بدر میں شریک ہوئے بڑے صحابہ میں سے ہیں انہوں نے حضرت حمزہؓ سے اور ان سے واثلہ بن اسقع اور عبداللہ بن عمرؓ و نے روایت کی ۱۲ھ میں وفات پائی، کناز میں کاف پر زبر اور نون مشدد اور آخر میں زاء ہے۔

(۸۴۳) ابومسعود بن عمرو: — یہ ابومسعود ہیں نام عقبہ عمرو کے بیٹے اور انصاری وبدری ہیں بیعت عقبہ ثانیہ میں حاضر تھے اور اکثر واقف کاران سیر و تاریخ کے نزدیک یہ بدر میں شریک نہیں ہوئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بدر میں شرکت کی۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے اس کی بدری کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چاہ بدر پر ٹھہرے تھے اس لئے بدر کی طرف منسوب ہو کر بدری کہلانے لگے اور یہ کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے حضرت علی کی خلافت میں وفات پائی اور کہا گیا کہ ۴۱یا۴۲ھ میں ان سے ان کے بیٹے بشیر اور دوسروں نے روایت کی۔

(۸۴۴) ابومالک بن عاصم: — یہ ابومالک ہیں نام کعب ہے عاصم کے بیٹے اور اشعری ہیں، امام بخاری نے تاریخ میں اور دوسرے حضرات نے ایسا ہی بیان کیا ہے ان سے عبدالرحمٰن بن غنم کی روایت میں امام بخاری نے بطور اظہار شک فرمایا کہ ہم سے ابومالک یا ابوعامر نے حدیث بیان کی ابن المدینی نے کہا کہ یہاں ابومالک ہی زیادہ صحیح ہے ان سے ایک جماعت نے روایت کی حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(۸۴۵) ابومحذورہ: — یہ ابومحذورہ ہیں ان کا نام سمرہ ہے معیر کے بیٹے ہیں معیر میں میم مکسور ہے کہا جاتا ہے کہ ان کا نام اوس بن معیر ہے۔ یہ آنحضرت کی طرف سے مکہ میں موذن تھے، ۵۹ھ میں انتقال فرمایا، انہوں نے ہجرت نہیں کی اور وفات تک مکہ میں مقیم رہے۔

(۸۴۶) ابن مربع: — یہ زید ہیں مربع کے بیٹے اور انصاری ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کا نام یزید ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عبداللہ ہے۔

پہلا قول زیادہ لوگوں کا ہے ان سے یزید بن شیبان نے روایت کی ان کا شمار اہل حجاز میں ہے اور ان کی حدیث وقوف عرفات کے بارے میں ہے مربع میم مکسور را ساکن باء موحدہ مفتوح اور عین مہملہ ہے۔

تابعین

(۸۴۷) **محمد بن حنفیہ:** - یہ محمد ہیں علی ابن ابی طالب کے بیٹے ان کی کنیت ابوالقاسم اور ان کی والدہ خولہ حنفیہ جعفر کی بیٹی ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کی والدہ یمامہ کی جنگ میں گرفتار کر کے لائی گئی تھیں، اور حضرت علی بن ابی طالب کے حصہ میں آئیں اسماء بنت ابی بکر نے فرمایا کہ میں نے محمد بن الحنفیہ کی والدہ کو دیکھا ہے کہ وہ سند کی باشندہ اور سیاہ فام تھیں۔ اور وہ بنو حنفیہ کی باندی تھیں انہوں نے اپنے والد سے اور ان سے ان کے بیٹے ابراہیم نے روایت کی ہے۔ مدینہ میں بعمر ۶۵ سال ۸۱ھ میں انتقال ہوا۔ اور بقیع میں مدفون ہوئے۔

(۸۴۸) **محمد بن علی:** - یہ محمد ہیں علی کے بیٹے ہیں، حسین بن علی بن ابی طالب کے پوتے کنیت ابو جعفر اور باقر کے نام سے مشہور ہیں اپنے والد حضرت زین العابدین اور جابر بن عبداللہ سے حدیث کی سماعت فرمائی ان سے ان کے صاحبزادے جعفر صادق وغیرہ نے روایت کی ۵۶ھ میں تولد ہوئے اور مدینہ میں ۱۱۷ھ یا ۱۱۸ھ میں بعمر ۶۳ سال وفات پائی ان کی عمر کے بارے میں اور بھی اقوال ہیں بقیع میں مدفون ہوئے ان کا نام باقر اس لئے ہوا کہ ان کا علم نہایت وسیع تھا جس کے لئے "تبقر فی العلم" کا محاورہ عربی میں مستعمل ہے۔

(۸۴۹) **محمد بن یحیٰی:** - یہ محمد ہیں یحیٰی بن حبان کے بیٹے کنیت ابو عبداللہ ہے انصار میں سے ہیں ان سے ایک جماعت نے روایت کی، امام مالک کے اساتذہ میں سے ہیں خود امام مالک ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے ان کے زہد، عبادت فقہ وعلم کے متعلق ہر قسم کے بہت سے فضائل کا ذکر کرتے تھے مدینہ میں بعمر ۷۴ سال ۱۲۱ھ میں انتقال فرمایا، حبان میں حاء مہملہ مفتوح اور باء (ایک نقطہ والی) مشدد ہے۔

(۸۵۰) **محمد بن سیرین:** - یہ محمد ہیں سیرین کے بیٹے کنیت ابوبکر ہے۔ انس بن مالک کے آزاد کردہ ہیں انہوں نے انسؓ بن مالک، ابن عمرؓ ابوہریرہؓ سے اور ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی، یہ فقیہہ عالم عابد، متقی اور پرہیزگار اور محدث تھے اور مشہور وجلیل القدر تابعین میں سے تھے، علوم شریعت کے فنون میں شہرت پائی مورق العلم عجلی کا بیان ہے کہ میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا جو پرہیزگاری کے معاملات میں ان سے زیادہ صاحب فقہ اور مسائل فقہیہ میں ان سے زیادہ پرہیزگار ہو، خلف بن ہشام نے کہا کہ ابن سیرین کو ایک خاص علامات اور خاص مقام خشوع عطا کیا گیا تھا۔ لوگ ان کو دیکھتے تو خدا یاد آجاتا، اشعث کہتے ہیں کہ جب ابن سیرین سے حلال و حرام کے متعلق فقہ کا سوال کیا جاتا تو ان کا رنگ اڑ جاتا اور اس طرح بدل جاتا کہ وہ پہلے ابن سیرین نہیں معلوم ہوتے تھے، مہدی نے کہا کہ ہم محمد بن سیرین کے پاس نشست و برخاست رکھتے ہیں وہ ہم سے باتیں کرتے ہیں اور وہ ہمارے پاس بکثرت آتے ہیں اور ہم ان کے پاس بکثرت جاتے میں لیکن جب موت کا ذکر ہوتا ہے تو ان کا رنگ بدل جاتا ہے اور زرد ہو جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص نہیں جو پہلے تھا۔ ۱۱۰ھ میں بعمر ۷۷ سال وفات پائی۔

(۸۵۱) **محمد بن سوقہ:** - یہ محمد ہیں سوقہ کے بیٹے ابوبکر کنیت اور غنوی و کوفی ہیں عبادت گذار شخص ہیں حضرت انس و نخعی اور ایک گروہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابن مبارک، ابن عیینہ وغیرہ، کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی پر بخوبی قادر نہ تھے، اپنے دوستوں پر ایک لاکھ درہم صرف کر دیئے۔

(۸۵۲) **محمد بن عمرو:** - یہ محمد ہیں عمرو بن حسن بن ابی طالب کے بیٹے ہیں انہوں نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی۔

(۸۵۳) **محمد بن سلیمان:** — یہ محمد ہیں سلیمان کے بیٹے اور باغندی ہیں، کنیت ابوبکر اور واسط کے رہنے والے ہیں باغندی کے نام سے مشہور ہیں بغداد میں قیام کرلیا تھا اور وہاں ایک جماعت سے حدیث بیان کی ان سے بہت سے لوگ روایت کرتے ہیں ان میں ابوداؤد سجستانی بھی ہیں ۲۸۳ھ میں وفات پائی۔

(۸۵۴) **محمد بن ابی بکر:** — یہ محمد ہیں ابوبکر بن عمرو بن حزم کے بیٹے انصاری ومدنی ہیں اپنے والد سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے سفیان بن عیینہ اور مالک بن انس نے روایت کی، اپنے والد کے بعد مدینہ کے قاضی تھے یہ اپنے بھائی عبداللہ سے بڑے تھے، ۱۳۲ھ میں بعمر ۷۲ سال انتقال فرمایا، ان کے والد کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا۔

(۸۵۵) **محمد بن منکدر:** — یہ محمد ہیں منکدر کے بیٹے اور تیمی ہیں، جابر بن عبداللہؓ انس بن مالکؓ، ابن الزبیرؓ اور اپنے چچا ربیعہ سے حدیث کی سماعت کی ان سے ایک جماعت نے جن میں ثوری اور مالک بھی شامل ہیں روایت کی ان کی وفات ۱۳۰ھ میں ہوئی اور ان کی عمر کچھ اوپر ستر سال ہوئی، جلیل القدر تابعین میں سے ہیں اور علم وزہد وعبادت ودین میں پختگی اور پاک دامنی کے جامع ہیں۔

(۸۵۶) **محمد بن صباح:** — یہ محمد ہیں صباح کے بیٹے ابوجعفر دولابی بزار کہلاتے ہیں، سنن بزار کے مصنف یہی ہیں شریک وہیثم وغیرہ سے روایت کی اور ان سے بخاری ومسلم، ابوداؤد، احمد اور بہت سے لوگوں نے روایت کی انہوں نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، یہ حافظ حدیث بھی تھے ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔

(۸۵۷) **محمد بن منتشر:** — یہ محمد ہیں منتشر کے بیٹے ہمدان کے رہنے والے ہیں، مسروق کے بھتیجے ہیں، ابن عمرؓ وعائشہ وغیرہ صحابہ سے روایت کی اور ان سے ایک جماعت نے۔

(۸۵۸) **محمد بن خالد:** — یہ محمد ہیں خالد کے بیٹے اور سلمی ہیں انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کی ان کے دادا صحابی ہیں۔

(۸۵۹) **محمد بن زید:** — یہ محمد ہیں۔ زید بن عبداللہ بن عمرؓ کے بیٹے انہوں نے اپنے دادا اور ابن عباسؓ سے اور ان سے ان کے بیٹوں اور اعمش وغیرہ نے روایت کی یہ ثقہ ہیں۔

(۸۶۰) **محمد بن کعب:** — یہ محمد ہیں کعب کے بیٹے قرظی ومدنی ہیں چند صحابہ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے محمد بن منکدر وغیرہ نے ان کے والد جنگ قریظہ میں بے داڑھی مونچھ کے تھے اس لئے جنگ میں نہ لئے گئے ۱۰۸ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

(۸۶۱) **محمد بن ابی مجالد:** — یہ محمد ہیں ابومجالد کے بیٹے کوفہ کے رہنے والے، کوفہ کے تابعین میں سے ہیں ان کی حدیث اہل کوفہ کے یہاں ہے انہوں نے صحابہ کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ابواسحاق اور شعبہ وغیرہ نے۔

(۸۶۲) **محمد بن قیس:** — یہ محمد ہیں ابراہیم کے بیٹے قرشی وتیمی ہی علقمہ بن وقاص اور ابوسلمہ سے حدیث کی سماعت کی امام ترمذی نے صبح کی دو رکعت کے بارے میں ان کی ایک حدیث بیان کی ہے اس کی سند یہ ہے کہ روایت ہے قیس سے جو سعد بن سعید کے دادا ہیں اور یہ قیس یحییٰ ابن سعید کے اور ان کے بھائی سعد بن سعید کے دادا ہیں ترمذی نے کہا کہ یہ قیس عمرو بن قیس بن قعد کے بیٹے ہیں پھر کہا کہ اس حدیث کی سند متصل نہیں اس لئے کہ ابراہیم تیمی نے قیس سے نہیں سنا، قعد میں قاف مفتوح ہے یا فاء مفتوح ہے۔

(۸۶۳) **محمد بن ابی بکر:** — یہ محمد ہیں ثقفی حجازی اور ابوبکر عوف کے بیٹے انہوں نے انس بن مالکؓ سے اور ان سے ایک جماعت

نے روایت کی۔

(۸۶۴) محمد بن مسلم: — یہ محمد ہیں مسلم کے بیٹے ابوزہر کنیت ہے ان کا ذکر حرف زاء میں پہلے آچکا ہے۔

(۸۶۵) محمد بن قاسم: — یہ محمد ہیں قاسم کے بیٹے ابوخلاد کنیت ہے یہ نابینا تھے ابوالعباس کے نام سے مشہور ہیں، ابو جعفر منصور کے آزاد کردہ ہیں اصل میں یمامہ کے ہیں اور ۱۹۱ھ میں اہواز میں پیدا ہوئے۔ بصرہ میں پرورش ہوئی، نہایت قوی الحفظ اور زبردست فصیح اور حاضر جواب تھے ۲۸۳ھ میں وفات ہوئی ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔

(۸۶۶) محمد بن فضل: — یہ محمد ہیں فضل بن عطیہ کے بیٹے، اپنے والد اور زیاد بن علاقہ اور منصور سے روایت کرتے ہیں اور ان سے داؤد بن رشید اور محمد بن عیسی مدائنی نے روایت کی، محدثین نے ان کو قابل ترک قرار دیا ۱۸۰ھ میں انتقال فرمایا۔

(۸۶۷) محمد بن اسحاق: — یہ محمد ہیں اسحاق کے بیٹے مدینہ کے رہنے والے قیس بن مخرمہ کے آزاد کردہ اور تابعی ہیں حضرت انس اور سعید بن مسیب کی زیارت کی اور تابعین کی جماعت میں بہت سے حضرات سے حدیث کی سماعت کی ان کی حدیث کی روایت ائمہ اور علماء کرتے ہیں مثلاً یحییٰ ابن سعید، ثوری نخعی اور ابن عیینہ، ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی روایت کرتے ہیں، سیر اور مغازی اور لوگوں کے مخصوص حالات افرنیش عالم کے واقعات، انبیاء کے قصص، علم حدیث و قرآن اور فقہ کے زبردست عالم تھے، بغداد تشریف لائے وہاں حدیث کی روایت کی ۱۵۰ھ میں بغداد ہی میں انتقال فرمایا مقبرہ خیزران میں بجانب مشرق مدفون ہوئے۔

(۸۶۸) مسدد بن مسرہد: — یہ مسدد ہیں مسرہد کے بیٹے بصرہ کے باشندہ ہیں حماد بن زید، ابوعوانہ وغیرہ سے حدیث سماعت کی ان سے بخاری، ابوداؤد اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے روایت کی ۲۲۸ھ میں انتقال ہوا، مسدد میں میم مضموم سین مہملہ مفتوح، پہلی دال پر تشدید ہے اور مسرہد میں بھی میم پر ضمہ سین مہملہ پر فتحہ اور راء مہملہ ساکن اس کے بعد ہا مہملہ (ہوز والی مفتوح ہے) آخر میں دال مہملہ ہے۔

(۸۶۹) مجاہد بن جبر: — یہ مجاہد ہیں جبر کے بیٹے ابوالحجاج کنیت، عبداللہ بن سائب کے آزاد کردہ، بنو مخزوم میں سے ہیں اور مکہ کے تابعین میں دوسرے درجہ کے تابعی اور مکہ کے قراء اور فقہاء میں سے ہیں اور مکہ کے اہل شہرت لوگوں میں سے ہیں اور معروف سرکردہ شخص ہیں قرات اور تفسیر کے امام ہیں ان سے ایک جماعت نے روایت کی ۱۰۰ھ میں انتقال فرمایا جبر میں جیم پر زبر اور باء موحدہ ساکن ہے۔

(۸۷۰) مہاجر بن مسمار: — یہ مہاجر ہیں مسمار کے بیٹے اور زہری ہیں، یعنی ان (بنو زہرہ) کے آزاد کردہ ہیں انہوں نے عامر بن سعد بن ابی وقاص سے اور ان سے ابوذویب وغیرہ نے روایت کی۔ یہ روایت میں ثقہ ہیں۔

(۸۷۱) مکحول بن عبداللہ: — یہ مکحول ہیں، عبداللہ کے بیٹے، کنیت ابوعبداللہ، شام کے باشندہ ہیں کابل سے قید کر کے لائے گئے قیس قبیلہ کی ایک عورت یا بنی لیث کے غلام تھے امام اوزاعی کے استاد تھے، امام زہری کہتے ہیں کہ علماء چار ہیں، مدینہ میں ابن مسیب، کوفہ میں شعبی، بصرہ میں حسن بصری، شام میں مکحول، فتوے میں مکحول سے زیادہ کوئی صاحب بصیرت نہ تھا جب فتوی دیتے تو کہتے لاحول ولا وقوۃ الا باللہ یہ میری رائے ہے، رائے کبھی غلط ہوتی ہے کبھی درست ایک جماعت سے انہوں نے اور ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ۱۱۸ھ میں انتقال فرمایا۔

(۸۷۲) مسروق بن اجدع: — یہ مسروق ہیں، اجدع کے بیٹے، ہمدانی اور کوفی ہیں آنحضرت ﷺ کی وفات سے قبل مشرف باسلام ہوئے صحابہ کے صدر اول جیسے ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا زمانہ پایا سرکردہ اور فقہا میں سے تھے، مرہ بن

شرجیل نے فرمایا کہ کسی ہمدانی عورت نے مسروق جیسا سپوت نہیں جنا شعبی نے فرمایا اگر کسی گھرانے کے لوگ جنّت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں تو وہ یہ اسود، علقمہ اور مسروق محمد بن منتشر نے فرمایا کہ خالد بن عبداللہ بصرہ کے عامل (گورنر) تھے انہوں نے بطور ہدیہ تیس ہزار کی رقم مسروق کی خدمت میں پیش کی، یہ ان کے فقر کا زمانہ تھا، مسروق نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہا جاتا ہے کہ بچپن میں ان کو چرا لیا گیا تھا پھر مل گئے تو ان کا نام مسروق ہو گیا ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی بمقام کوفہ ۶۲ھ میں وفات پائی۔

(۸۷۳) **مرثد بن عبداللہ:** — یہ مرثد ہیں عبداللہ کے بیٹے ابوالخیر کنیت یزنی اور مصری ہیں، عقبہ بن عامر، ابوایوب، عبداللہ بن عمر اور عمرو بن عاص سے حدیث کی سماعت کی ان سے یزید بن ابوحبیب نے روایت کی۔

(۸۷۴) **مالک بن مرثد:** — یہ مالک ہیں مرثد کے بیٹے اپنے والد سے روایت کی اور ان سے سماک بن الولید نے۔

(۸۷۵) **مسلم بن ابی بکرہ:** — یہ مسلم ہیں ابوبکرہ کے بیٹے ثقفی اور تابعی ہیں انہوں نے اپنے والد سے اور ان سے عثمان شحام نے روایت کی۔

(۸۷۶) **مسلم بن یسار:** — یہ مسلم ہیں یسار کے بیٹے اور جہنی ہیں، سورہ اعراف کی تفسیر میں امام ترمذی نے ان کی روایت حضرت عمر بن خطاب سے نقل کی اور کہا کہ ان کی حدیث حسن ہے، لیکن انہوں نے عمرؓ سے نہیں سنا، امام بخاری نے فرمایا کہ مسلم بن یسار نے نعیم سے اور انہوں نے عمرؓ سے روایت کی۔

(۸۷۷) **مصعب بن سعد:** — یہ مصعب ہیں سعد بن ابی وقاص کے بیٹے ہیں اور قرشی ہیں اپنے والد اور حضرت علیؓ بن ابی طالب اور ابن عمرؓ سے حدیث کی سماعت کی ان سے سماک بن حرب وغیرہ نے روایت کی۔

(۸۷۸) **معن بن عبدالرحمٰن:** — یہ معن ہیں عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود کے بیٹے اور ہذلی ہیں انہوں نے اپنے والد سے روایت کی۔

(۸۷۹) **معدان بن طلحہ:** — یہ معدان ہیں طلحہ کے بیٹے اور یعمری ہیں انہوں نے عمر اور ابوالدرداء اور ثوبان سے حدیث کی سماعت کی۔

(۸۸۰) **معمر بن راشد:** — یہ معمر ابوعروہ ازدی (ازد کے آزاد کردہ) ہیں راشد کے بیٹے یمن کے عالم، زہری اور ہمام سے روایت کی، اور ان سے ثوری اور ابن عیینہ وغیرہ نے روایت کی عبدالرزاق نے فرمایا کہ میں نے ان سے دس ہزار حدیثیں سنیں ۱۵۳ھ میں بعمر ۵۸ سال وفات پائی۔

(۸۸۱) **مہلب بن ابی صفرہ:** — یہ مہلب ہیں ابوصفرہ کے بیٹے، ازدی ہیں خوارج کے ساتھ ان کے مخصوص مقامات اور مشہور لڑائیاں منقول ہیں، انہوں نے سمرہ اور ابن عمرؓ سے حدیث کی سماعت کی ان سے ایک جماعت نے روایت کی عبدالملک بن مروان کے عہد میں ملک خراسان کے مقام مرورو میں ۸۳ھ میں وفات پائی بصرہ کے تابعین میں پہلے طبقہ کے تابعی ہیں۔

(۸۸۲) **مورّق بن مشمرج:** — یہ مورق ہیں مشمرج کے بیٹے، کنیت ابومعتمر، عجلی وبصری ہیں حضرت ابوذرؓ اور انس بن مالکؓ اور ابن عمرؓ سے حدیث نقل کرتے ہیں اور ان سے مجاہد، قتادہ وغیرہ روایت کرتے ہیں، مورق میں میم مضموم، واؤ مفتوح، رامشد اور قاف ہے مشمرج میں میم مضموم شین معجمہ مفتوح، میم ساکن راء مکسور اور جیم ہے۔

(۸۸۳) **موسیٰ بن طلحہ:** — یہ موسیٰ ہیں طلحہ کے بیٹے کنیت ابو عیسیٰ تیمی اور قرشی ہیں صحابہ کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی ۱۰۴ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

(۸۸۴) **موسیٰ بن عبداللہ:** — یہ موسیٰ ہیں عبداللہ کے بیٹے، جہنی و کوفی ہیں حضرت مجاہد اور مصعب بن سعد سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے شعبہ اور یحییٰ بن سعید اور یعلی نے روایت کی۔

(۸۸۵) **موسیٰ بن عبیدہ:** — یہ موسیٰ ہیں عبیدہ کے بیٹے اور زبدی ہیں انہوں نے محمود بن کعب اور محمد بن ابراہیم تیمی سے اور ان سے شعبہ و عبداللہ بن موسیٰ اور علی نے روایت کی، محدثین ان کو ضعیف کہتے ہیں ۱۵۳ھ میں وفات پائی۔

(۸۸۶) **مطرف بن عبداللہ:** — یہ مطرف ہیں، عبداللہ بن شخیر کے بیٹے، عامری اور بصری ہیں اور حضرت ابوذرؓ و عثمان بن ابی عاصؓ سے روایت کی ۸۷ھ کے بعد انتقال فرمایا، مطرف میں میم مضموم، طاء مہملہ مفتوح، راء مشدد و مکسور اور فاء ہے شخیر میں شین معجمہ پر کسرہ اور خاء معجمہ پر تشدید اور کسرہ ہے۔

(۸۸۷) **معاذ بن زہرہ:** — یہ معاذ بن زہرہ سلمی کوفی تابعی ہیں مرسلا روایت کی ہے حصین بن عبدالرحمٰن نے روایت کی ان سے۔

(۸۸۸) **معاذ بن عبداللہ:** — یہ معاذ ہیں، عبداللہ بن حبیب کے بیٹے۔ جہنی اور مدنی ہیں اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔

(۸۸۹) **مخلد بن خفاف:** — یہ مخلد ہیں خفاف کے بیٹے، انہوں نے عروہ سے اور ان سے ابن ذئب نے روایت کی ان کی حدیث الخراج بالضمان ہے۔

(۸۹۰) **مختار بن فلفل:** — یہ مختار ہیں فلفل کے بیٹے مخزومی و کوفی ہیں، انس بن مالک سے حدیث کی سماعت کی ان سے ثوری وغیرہ نے روایت کی فلفل میں دونوں فاء مضموم ہیں۔

(۸۹۱) **مختار بن ابی عبید:** — یہ مختار ہے ابو عبید بن مسعود کا بیٹا، بنو ثقیف سے ہے اس کے والد جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں مختار کی پیدائش ہجرت کے سال ہوئی، یہ نہ صحابی ہے نہ حدیث رسول کا راوی، یہ ہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں عبداللہ بن عصمہ نے کہا یہ وہی کذاب ہے جس کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد کہ ثقیف میں ایک کذاب ہوگا "ابتداءً" یہ فضل و علم و خیر میں مشہور تھا یہ اس کے دلی جذبات کے بالکل برعکس تھا یہاں تک کہ اس نے عبداللہ بن زبیرؓ سے علیحدگی اختیار کرلی اور خود حکومت کا خواہشمند بن گیا، اب اس کی غلط رائی و عقیدہ اور نفسانیت کا اظہار ہوا، اس سے ایسی بہت سی باتیں ظہور میں آئیں جو دین کے سراسر خلاف تھیں، یہ شخص حضرت حسین کے قصاص کا مطالبہ کرتا تھا تاکہ حصول حکومت و طلب و دنیا کی اس کی اسکیم آگے بڑھے جو اس کا خاص مقصد تھا اسی حالت میں بعہد مصعب بن زبیرؓ ۶۷ھ میں قتل کیا گیا۔

(۸۹۲) **مغیرہ بن زیاد:** — یہ مغیرہ ہیں زیاد کے بیٹے بجلی اور موصلی ہیں انہوں نے عکرمہ اور مکحول سے اور ان سے وکیع اور ابو عاصم اور ایک جماعت نے روایت کی، امام احمد بن حنبل نے ان کو منکر الحدیث فرمایا اور یہ کہ میں نے مغیرہ بن زیاد کو صحابہ میں نہیں پایا۔

(۸۹۳) **مغیرہ بن مقسم:** — یہ مغیرہ ہیں مقسم کے بیٹے کوفہ کے رہنے والے صاحب تفقہ اور نابینا تھے ابو وائل اور شعبی سے انہوں نے اور شعبہ، زائدہ اور ابن فضیل نے ان سے روایت کی، جریر نے ان سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ جو بات میرے کان میں پڑی اس کو نہیں بھولا، ۱۳۳ھ میں وفات پائی۔

(۸۹۴) **مثنی بن صباح**:۔ یہ مثنی ہیں صباح کے بیٹے اولاً یمانی پھر مکی ہیں انہوں نے عطاء، مجاہد اور عمرو بن شعیب سے اور ان سے عبدالرزاق وغیرہ نے روایت کی ابوحازم اور دوسرے حضرات نے کہا کہ یہ نقل حدیث کے معاملہ میں نرم ہیں ۱۴۹ھ میں انتقال فرمایا۔

(۸۹۵) **معاویہ بن قرہ**:۔ یہ معاویہ ہیں قرہ کے بیٹے ابوایاس کنیت بصرہ کے باشندہ ہیں اپنے والد اور انس بن مالک و عبدالرحمن بن معقل سے حدیث کی سماعت کی اس سے قتادہ، شعبہ اور اعمش نے روایت کی، ایاس میں ہمزہ مکسور دو نقطوں والی یا غیر مشدد ہے۔

(۸۹۶) **معاویہ بن مسلم**:۔ یہ معاویہ ہیں مسلم کے بیٹے کنیت ابونوفل ہے، ابن عباسؓ ابن عمرؓ سے حدیث کی سماعت کی ان سے شعبہ اور ابن جریج نے روایت کی۔

(۸۹۷) **میناء**:۔ یہ میناء ہیں اپنے مولا عبدالرحمن بن عوفؓ اور عثمانؓ اور ابوہریرہؓ سے روایت کی اور ان سے عبدالرزاق کے والد نے، ان کو نقل حدیث میں ضعیف کہا گیا ہے۔

(۸۹۸) **ابوالملیح بن اسامہ**:۔ یہ ابوالملیح ہیں، نام عامر، اسامہ کے بیٹے اور ہذلی و بصری ہیں صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کی ہے ملیح میں میم پر زبر لام مکسور اور حاء مہملہ ہے۔

(۸۹۹) **ابوموودو بن ابی سلیمان**:۔ یہ ابوموودو ہیں عبدالعزیز نام، ابوسلیمان کے بیٹے مدینہ کے باشندہ ہیں ابوسعید خدریؓ کو دیکھا ہے سائب بن یزید اور عثمان بن ضحاک سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ابن مہدی اور عتبی اور کامل بن طلحہ نے محدثین نے حدیث کے بارے میں ان کو ثقہ کہا ہے مہدی کی امارت کے زمانہ میں وفات پائی، باب فضائل سید المرسلین ﷺ میں ان کا ذکر ہے۔

(۹۰۰) **ابوماجد**:۔ یہ ابوماجد ہیں۔ حنفی (بنوحنیفہ کی طرف منسوب) ابن مسعود اور یحییٰ اور جابر سے روایت کی ابن مسعود کی حدیث میں باب المشی بالجنازہ میں ان کا ذکر ہے۔ ترمذی نے ان کا نام ماجد ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے محمد بن اسماعیل بخاری سے سنا کہ وہ ان کی حدیث کو ضعیف کہتے ہیں۔ ابن عیینہ کہتے ہیں کہ وہ اس پرندے کی طرح ہیں جو اڑ گیا ہو۔

(۹۰۱) **ابومسلم**:۔ یہ ابومسلم ہیں خولانی اور زاہد ہیں عبداللہ بن ثوب نام ہے زیادہ صحیح یہی ہے۔ ابوبکرؓ عمرؓ اور معاذؓ سے ملاقات کی، ان سے جبیر بن نفیر اور عروہ اور قلابہ نے روایت کی ان کے مناقب بہت ہیں ۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔

(۹۰۲) **ابوالمطوس**:۔ انہوں نے اپنے والد سے اور ان سے خبیب بن ابی ثابت نے روایت کی، کہا گیا کہ ان کے اور خبیب کے درمیان عمارۃ (نام کے ایک راوی) ہیں، ان کو ثقہ قرار دیا گیا ہے۔

(۹۰۳) **ابن مدینی**:۔ یہ علی ہیں عبداللہ کے بیٹے ان کا ذکر حرف عین میں پہلے گزر چکا ہے۔

(۹۰۴) **ابن مثنی**:۔ اس کا نام عمر ہے عبداللہ بن مثنی بن انس بن مالک کے بیٹے ہیں انصاری و بصری ہیں اپنے والد اور سلیمان تیمی، حمید طویل وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی ان سے قتیبہ، احمد بن حنبل اور محمد بن اسماعیل بخاری جیسے مشہور ائمہ وغیرہ نے روایت کی، رشید کے عہد میں عہدۂ قضاء پر بصرہ میں مامور ہوئے، بغداد تشریف لائے تو وہاں بھی محکمہ قضا سپرد ہوا یہاں انہوں نے اپنی روایات بیان کیں، پھر بصرہ لوٹ آئے ان کا سن پیدائش ۱۱۸ھ اور سن وفات ۲۱۵ھ ہے۔

(۹۰۵) **ابن ابی ملیکہ**:۔ ان کا نام عبداللہ ہے۔ ابوعبداللہ کے بیٹے، ان کا ذکر حرف عین میں آچکا ہے۔

(۹۰۶) **محاربی**:۔ یہ محاربی ہیں اس میں میم مضموم حاء مہملہ راء مہملہ اور باء موحدہ (ایک نقطہ والی) ہے یہ نسبت قریش کے ایک بطن

محارب کی طرف ہے۔ ان کا نام عبدالرحمٰن ہے محمد کے بیٹے ہیں انہوں نے اعمش اور یحییٰ بن سعید سے اور ان سے احمد اور علی بن حرب نے روایت کی، یہ حافظ حدیث ہیں ۱۹۵ھ میں انتقال ہوا۔

صحابی عورتیں

(۹۰۷) میمونہ: — یہ ام المؤمنین میمونہ ہیں، حارث کی بیٹی ہلالیہ عامریہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا نام برہ تھا حضور ﷺ نے ان کا نام میمونہ رکھا، پہلے جاہلیت میں مسعود بن عمرو ثقفی کے نکاح میں تھیں انہوں نے ان کو چھوڑ دیا تو ان سے ابورہم نے نکاح کر لیا۔ ابورہم کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا، یہ نکاح ذی قعدہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر مکہ سے دس میل دور صرف نام کے ایک مقام پر ہوا قدرت کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ ۶۱ھ میں اسی مقام پر جہاں آپ کا نکاح ہوا تھا ان کا انتقال بھی ہوا، سن وفات کے بارے میں اور بھی اقوال ہیں، نماز جنازہ حضرت ابن عباسؓ نے پڑھائی، یہ حضرت عباس کی زوجہ ام الفضل اور اسماء بنت عمیس کی بہن ہیں یہ آپ ﷺ کی بیویوں میں آخری ہیں کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے بعد اور نکاح نہیں کیا۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ان میں عبداللہ ابن عباس بھی ہیں۔

(۹۰۸) ام منذر: — یہ ام منذر ہیں قیس کی بیٹی انصار میں سے ہیں کہا جاتا ہے کہ بنوعدی میں سے ہیں (عدویہ) یہ صحابی عورت ہیں ان سے ایک حدیث یعقوب بن ابی یعقوب نے روایت کی۔

(۹۰۹) ام معبد بنت خالد: — یہ ام معبد ہیں خزاعہ کی ایک عورت ہیں ان کا نام عاتکہ ہے خالد کی بیٹی ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ اس وقت مسلمان ہوئیں جب کہ سفر ہجرت کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے ان کے یہاں راستہ میں قیام فرمایا، یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مدینہ آکر مسلمان ہوئیں ان کی مشہور حدیث حدیث ام معبد کے نام سے متعارف ہے۔

(۹۱۰) ام معبد بنت کعب: — یہ ام معبد ہیں، کعب بن مالک کی بیٹی اور انصار میں سے ہیں انہوں نے دونوں قبلہ (بیت المقدس وکعبۃ اللہ) کی طرف نماز پڑھی ہے) ان سے ان کے بیٹے معبد نے روایت کی یہ ابن مندہ کا قول ہے، ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ ام معبد کعب بن مالک انصاری سلمی کی بیوی ہیں اور کعب بن مالک انصاری کی بیٹی ہیں ان سے ان کے بیٹے معبد نے روایت کی جو کچھ بخاری کی تاریخ میں باب معبد میں مذکور ہوا یہ ہے کہ معبد کعب بن مالک انصاری کے بیٹے ہیں یہ ابن عبدالبر کے قول کی تائید کرتا ہے۔

(۹۱۱) ام مالک البہزیہ: — یہ ام مالک بہزیہ ہیں اور صحابی عورت ہیں ان سے روایت بھی نقل کی گئی ہے، یہ حجازی ہیں ان سے طاؤس اور مکحول نے روایت کی۔

تابعی عورتیں

(۹۱۲) معاذہ بنت عبداللہ: — یہ معاذہ ہیں عبداللہ کی بیٹی اور عدویہ ہیں حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ سے انہوں نے اور ان سے قتادہ وغیرہ نے روایت کی ۸۳ھ میں انتقال فرمایا۔

(۹۱۳) مغیرہ: — یہ مغیرہ ہیں حجاج بن حسان کی بہن ہیں۔ انس بن مالک کو انہوں نے دیکھا ہے اور ان سے روایت بھی کی، مغیرہ سے ان کے بھائی حجاج نے ان کی حدیث باب الترجل میں روایت کی۔

(ن)

صحابہ

(۹۱۴) نعمان بن بشیر: — یہ نعمان ہیں بشیر کے بیٹے کنیت ابو عبداللہ اور انصار میں سے ہیں مسلمانان انصار میں ہجرت کے بعد سب سے پہلے یہی پیدا ہوئے، آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۸ سال ۷ ماہ تھی، یہ خود اور ان کے والدین صحابی ہیں کوفہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے اور حضرت معاویہ کے عہد میں کوفہ کے والی (حاکم) تھے، پھر حمص کے حاکم بنا دیئے گئے انہوں نے عبداللہ بن زبیر کی خلافت کے لئے لوگوں کو مائل کرنا شروع کیا، اہل حمص نے ان کو تلاش کر کے ۶۴ھ میں قتل کر دیا ان سے ایک جماعت نے جن میں ان کے بیٹے محمد اور شعبی شامل ہیں روایت کی۔

(۹۱۵) نعمان بن عمرو بن مقرن: — یہ نعمان عمرو بن مقرن کے بیٹے مزنی ہیں، لوگ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ وہ مزنیہ کے چار سو آدمیوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، اولاً بصرہ میں رہے پھر کوفہ منتقل ہوگئے پھر حضرت عمرؓ کی جانب سے جیش نہاوند کے حاکم تھے ۲۱ھ میں نہاوند کو فتح کر کے اسی دن شہید ہوئے، ان سے معقل بن یسار، محمد بن سیرین وغیرہ نے روایت کی۔ مقرن میں میم پر پیش قاف پر زبر، راء پر تشدید و کسرہ اور آخر میں نون ہے۔

(۹۱۶) نعیم بن مسعود: — یہ نعیم مسعود کے بیٹے اور اشجعی ہیں، ہجرت کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور غزوۂ خندق کے موقع پر مشرف باسلام ہوئے انہوں نے ہی بنو قریظہ اور ابوسفیان (احزاب مشرکین کے سردار تھے) کے درمیان سعی کی انہوں نے ہی مشرکین کو آنحضرت ﷺ سے ناکام واپس کیا تھا ان کا یہ واقعہ مشہور ہے مدینہ طیبہ میں رہتے تھے ان کے بیٹے سلمہ نے ان سے روایت کی حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں انتقال فرمایا، کہا جاتا ہے نہیں، بلکہ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے پہنچنے سے قبل قتل کئے گئے۔

(۹۱۷) نعیم بن ہمار: — یہ نعیم ہمار کے بیٹے ہیں ہمار میں ہاء مفتوح میم مشد اور راء ہے کہا جاتا ہے کہ ہمام ہے آخر میں میم ہے قبیلہ غطفان کے آدمی ہیں ابوادریس خولانی وغیرہ نے ان سے روایت کی۔

(۹۱۸) نعیم بن عبداللہ: — یہ نعیم عبداللہ کے بیٹے قرشی وعدوی ہیں نحام کے نام سے مشہور ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ نعیم نحام بن عبداللہ کے بیٹے ہیں مکہ میں بہت پہلے مشرف باسلام ہو چکے تھے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام سے قبل ہی مسلمان ہوگئے تھے اور اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھے چونکہ اپنی قوم میں نہایت شریف النفس تھے اس لئے ان کی قوم نے ان کو ہجرت سے منع کر دیا تھا، یہ اپنی قوم کی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا خرچ اٹھاتے تھے انہوں نے ان سے کہہ دیا کہ تم کسی دین پر رہو لیکن ہمارے پاس رہو صلح حدیبیہ ۷ھ میں ہجرت کی اور جنگ اجنادین میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے آخری دنوں میں شہادت پائی ان سے نافع و محمد بن ابراہیم تیمی نے روایت کی نحام میں نون پر زبر حاء مہملہ پر تشدید ہے اجنادین میں ہمزہ پر زبر، جیم ساکن اور نون اور دال پر زبر اور یاء ساکن (اس کے نیچے دو نقطے ہیں)

(۹۱۹) ناجیہ بن جندب: — یہ ناجیہ جندب کے بیٹے اور اسلمی ہیں یہ حضور ﷺ کے اونٹوں کے نگران تھے کہا جاتا ہے کہ یہ عمرؓ کے بیٹے ہیں، اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں ان کا نام زکوان تھا، آپ ﷺ نے ناجیہ نام رکھا کیونکہ ان کو قریش سے نجات حاصل ہوئی تھی یہی وہ صحابی ہیں جو حدیبیہ کے موقع پر قلیب میں آپ کا تیر لے کر اترتے تھے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، ان سے عروہ بن زبیرؓ وغیرہ نے

روایت کی، حضرت معاویہؓ کے عہد میں بمقام مدینہ وفات پائی۔

(۹۲۰) نبیشۃ الخیر: — ان کا نام نبیشۃ الخیر ہے بنو ہذیل میں سے ہیں ابوالملیح اور ابوقلابہ نے ان سے روایت کی، اہل بصرہ میں شمار کئے جاتے ہیں ان ہی کے یہاں ان کی حدیث پائی جاتی ہے۔

(۹۲۱) نوفل بن معاویہ: — یہ نوفل ہیں معاویہ کے بیٹے اور دیلی ہیں کہا جاتا ہے کہ زمانہ اسلام سے پہلے ان کی عمر کے ساٹھ سال گزرے اور اسلام میں ساٹھ سال، کہا گیا ہے کہ ایسا نہیں بلکہ سو سال زندہ رہے سب سے پہلے غزوہ فتح مکہ میں شریک ہوئے، مشرف باسلام پہلے ہی ہو چکے تھے اہل حجاز میں ان کا شمار ہے یزید بن معاویہ کے عہد میں مدینہ میں وفات پائی کچھ لوگ ان سے روایت کرتے ہیں، دیلی میں دال مکسور اور یاء ساکن ہے۔

(۹۲۲) نواس بن سمعان: — یہ نواس سمعان کے بیٹے، بنوکلاب میں سے ہیں شام میں سکونت پذیر ہو گئے اور اہل شام میں شمار ہوتے ہیں، جبیر بن نفیر اور ابوادریس خولانی نے ان سے روایت کی سمعان میں سین مہملہ پر کسرہ اور کہا گیا کہ اس پر زبر ہے اور میم ساکن اور عین مہملہ ہے۔

(۹۲۳) نفیع بن حارث: — یہ نفیع حارث کے بیٹے ثقفی ہیں کنیت ابوبکرہ ہے ان کا ذکر حرف باء میں ہو چکا ہے۔

(۹۲۴) نافع بن عتبہ: — یہ نافع عتبہ بن ابی وقاص کے بیٹے بنوزہرہ میں سے ہیں یہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے ہیں ان سے جابر بن سمیرہ نے روایت کی فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے۔ ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے۔

(۹۲۵) ابونجیح: — یہ ابونجیح ہیں ان کا نام عمرو بن عتبہ ہے حرف عین میں اس کا ذکر گذر چکا ہے۔

تابعین

(۹۲۶) نافع بن سرجس: — یہ نافع، سرجس کے بیٹے، عبداللہ بن عمر کے آزاد کردہ ہیں، یہ دیلمی تھے اور اکابر تابعین میں سے ہیں ابن عمرؓ اور ابوسعیدؓ سے حدیث کی سماعت کی ان سے بہت سے لوگوں نے جن میں زہری مالک بن انس شامل ہیں روایت کی حدیث کے بارے میں شہرت یافتہ لوگوں میں سے ہیں نیز ان ثقہ راویوں میں سے ہیں جن سے روایت حدیث کی جاتی ہے اور جمع کی جاتی ہیں اور ان کی احادیث پر عمل کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کا بڑا حصہ ان پر موقوف ہے، امام مالک فرماتے ہیں کہ میں نافع کے واسطے سے ابن عمرؓ کی حدیث سن لیتا ہوں تو کسی اور راوی سے سننے سے بے فکر ہو جاتا ہوں ۱۱۷ھ میں وفات پائی، سرجس میں سین مہملہ اول مفتوح راء ساکن اور جیم مکسور ہے۔

(۹۲۷) نافع بن جبیر: — یہ نافع جبیر کے بیٹے مطعم کے پوتے قریش میں سے ہیں اور حجاز کے رہنے والے ہیں اپنے والد سے اور ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے زہری وغیرہ نے روایت کی۔

(۹۲۸) نافع بن غالب: — یہ نافع غالب کے بیٹے کنیت ابوغالب ہے، یہ خیاط اور باہلی ہیں، بصرہ کے تابعین میں شمار ہوتے ہیں، انس بن مالک سے روایت کی اور ان سے عبدالوارث نے روایت کی۔

(۹۲۹) نبیہ بن وہب: — یہ نبیہ واہب کے بیٹے کعبی اور حجازی ہیں ابان بن عثمان اور کعب سے جو سعید بن عاص کے آزاد کردہ ہیں

انہوں نے اور ان سے نافع نے روایت کی نبیہ میں نون پر ضمہ باموحدہ پر فتحہ اور یاء ساکن ہے اس کے نیچے دو نقطے ہیں۔

(۹۳۰) نضر بن شمیل: — یہ نضر ہیں شمیل کے بیٹے کنیت ابوالحسن، بنو مازن میں سے ہیں مرو میں سکونت اختیار کی اور وہاں تقریبًا ۲۰۳ھ میں وفات ہوئی ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی، لغت، نحو اور تمام فنون ادبیہ کے ماہر تھے شمیل میں شین معجمہ پر پیش ہے۔

(۹۳۱) ناصح بن عبداللہ: — یہ ناصح ہیں، عبداللہ کے بیٹے اور محلمی ہیں ان کا ذکر باب الشفقہ والرحمۃ میں ہے انہوں نے سماک اور یحییٰ بن کثیر سے اور ان سے یحییٰ بن یعلی اور اسحاق المسلم السلولی نے روایت کی نیک طینت ہیں، محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے۔

(۹۳۲) النفیلی: — ان کا نام عبداللہ، محمد بن علی بن نفیل کے بیٹے حافظ حدیث ہیں انہوں نے مالک سے اور ان سے ابوداؤد نے روایت کی ابوداؤد کہتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ صاحب حفظ نہیں دیکھا امام احمد ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے یہ دین کے ایک رکن ہیں ۲۳۴ھ میں انتقال فرمایا۔

(۹۳۳) النجاشی: — یہ نجاشی بادشاہ حبشہ ہیں، یہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور اسلام قبول کیا ان کا نام اصحمہ ہے فتح مکہ سے قبل وفات پائی، آنحضرت کے پاس جب ان کے وفات کی اطلاع آئی تو ان کی نماز جنازہ پڑھی، حضور کی زیارت سے مشرف نہیں ہوئے ابن مندہ نے ان کا ذکر صحابہ میں کیا ہے حالانکہ یہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہیں رہے اور نہ آپ ﷺ کا دیدار کیا۔ مناسب یہی ہے کہ ان کو صحابہ میں شمار نہ کیا جائے کیونکہ "صحابیت" ان پر کسی صورت سے صادق نہیں، ان کا ذکر صلاۃ الجنازہ وغیرہ میں ہے۔

(۹۳۴) ابو نضر: — یہ ابو نضر ہیں ان کا نام سالم، ابوامیہ کے بیٹے عمر بن عبید بن معمر کے آزاد کردہ قرشی تیمی اور مدنی ہیں تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں ان سے مالک ثوری اور ابن عیینہ نے روایت کی، النضر میں نون مفتوح ضاد معجمہ ساکن ہے۔

(۹۳۵) ابو نضرہ منذر: — یہ ابو نضرہ ہیں، نام منذر مالک کے بیٹے اور عبدی ہیں ابن عمرو ابو سعید اور ابن عباس سے حدیث کی سماعت کی، ان سے ابراہیم تیمی اور قتادہ اور سعید بن یزید نے روایت کی، ان کا شمار بصرہ کے تابعین میں کیا جاتا ہے حسن سے کچھ پہلے انتقال کیا۔

(۹۳۶) ابن نواحہ: — اس کا نام عبداللہ ہے یہ وہی ہے جو اپنے دوست ابن اثال کے ساتھ مسیلمہ کذاب کے پاس سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، دونوں کا ذکر کتاب الامان میں ہے۔ ابن نواحہ مسیلمہ کذاب کے قتل کے بعد مسلمانوں میں اس طرح روپوش ہو گیا کہ لوگ اسے مسلمان سمجھتے رہے یہاں تک کہ حضرت عمر بن خطاب ؓ کے عہد خلافت میں یمن کی امداد میں کوفہ بھیج دیا گیا۔ یہ شخص اپنی قوم بنی حنیفہ کا امام تھا۔ چنانچہ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے خلاف حارثہ بن مضرس نے شہادت دی کہ یہ لوگ گاؤں کی مسجد میں وہ چیزیں ایک دوسرے کو پڑھا رہے تھے جس کو مسیلمہ نے جھوٹ موٹ بنالیا تھا اور اس کا دعویٰ کیا تھا کہ یہ خدا کی طرف سے وحی کیا گیا ہے اس زمانہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کوفہ میں معلّم اور حضرت ابوموسیٰ کے دست راست تھے، یہ سرکش جماعت ان کے سامنے حاضر کی گئی انہوں نے ان کی سرکشی کو صاف طور پر پہچان لیا اور ان سے توبہ کرائی گئی، انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول کرلی گئی لیکن ابن نواحہ کی معذرت قبول نہیں ہوئی کیونکہ ابن مسعود ؓ نے ان لوگوں کو شام کے علاقہ میں جلاوطن کردیا اور ان کے اندرونی احوال کو خدا کے سپرد کردیا گیا۔ ابن مسعود ؓ نے فرمایا کہ اگر ان کا عقیدہ وہی ہے جو پہلے تھا تو شام کا طاعون ان کو ہلاک کر دے گا ورنہ اب توبہ کرنے کے بعد ہمیں ان کو سزا دینے کا کوئی حق نہیں رہا، لیکن اب نواحہ کے بارے میں ابن مسعود ؓ قتل کرنے پر مصر رہے۔ کیونکہ یہ زندیق اور زندقہ کا مبلغ تھا۔ چنانچہ ان کے حکم سے قرظہ بن کعب نے اس کو سربازار قتل کردیا۔

(و)

صحابہ

(۹۳۷) واثلہ بن الاسقع: — یہ واثلہ ہیں اسقع کے بیٹے اور لیثی ہیں یہ اس وقت مسلمان ہوئے جب کہ آنحضرت ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے سامان جمع کر رہے تھے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تین سال آنحضرت ﷺ کی خدمت کی اور یہ اہل صفہ میں سے تھے پہلے بصرہ میں پھر شام میں ٹھہرے اور ان کا مکان دمشق سے نو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں بلاط میں تھا پھر بیت المقدس منتقل ہو گئے اور وہیں وفات پائی اس وقت ان کی عمر سو سال تھی، ان سے ایک گروہ نے حدیث نقل کی اسقع میں قاف پر زبر آخر میں عین ہے۔

(۹۳۸) وہب بن عمیر: — یہ وہب ہیں عمیر بن وہب کے بیٹے اور جمحی ہیں یہ جنگ بدر میں بحالت کفر قید کر کے لائے گئے تھے ان کے والد مدینہ آئے اور مسلمان ہو گئے آنحضرت ﷺ نے ان کی وجہ سے ان کے بیٹے کو آزاد کر دیا تو وہ بھی مسلمان ہو گئے ان کی ایک خاص حیثیت اور مرتبہ تھا، آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ان کو صفوان بن امیہ کے پاس بھیجا تھا تاکہ یہ ان کو اسلام کی دعوت دیں۔ شام میں جہاد کرتے ہوئے وفات پائی۔

(۹۳۹) وابصہ بن معبد: — یہ وابصہ ہیں معبد کے بیٹے ہیں، کنیت ابو شداد اوسی ہے پہلے کوفہ میں قیام کیا پھر جزیرہ کی طرف منتقل ہو گئے رقہ میں وفات پائی ان سے زیاد بن ابی الجعد نے روایت کی۔

(۹۴۰) وائل بن حجر: — یہ وائل ہیں حجر کے بیٹے اور حضرمی ہیں، حضرموت کے سرداروں میں سے تھے اور ان کے والد وہاں کے بادشاہ تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بصورت وفد حاضر ہوئے کہا جاتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے اپنے صحابہ کو ان کے آنے سے پہلے یہ خوشخبری سنادی تھی اور یہ ارشاد فرمایا تھا کہ تمہارے پاس بہت دور (حضرموت) سے وائل بن حجر آرہے ہیں ان کا آنا اطاعت گذاری اور خدا اور اس کے رسول کے شوق و رغبت کے لئے ہے یہ شاہی خاندان میں افضل ہیں۔ جب یہ حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے ان کو مرحبا کہا اور اپنے قریب جگہ دی۔ اپنی ردائے مبارک ان کے لئے بچھادی اور اس پر ان کو بٹھایا اور فرمایا اے اللہ وائل اور ان کی اولاد اور ان کی اولاد کی اولاد میں برکت عطا فرما، آنحضرت ﷺ نے ان کو حضرموت کے سرداروں پر افسر اعلیٰ مقرر فرما دیا ان سے ان کے دونوں بیٹے علقمہ اور عبد الجبار وغیرہ نے روایت کی، حجر میں حاء مہملہ مضموم جیم ساکن اور آخر میں راء ہے۔

(۹۴۱) وحشی بن حرب: — یہ وحشی ہیں حرب کے بیٹے حبشی اور مکہ کے حبشیوں میں سے ہیں جبیر بن مطعم کے آزاد کردہ یہی ہیں جنہوں نے بحالت کفر جنگ احد میں آنحضرت ﷺ کے عم محترم حضرت حمزہ کو شہید کیا تھا، غزوہ طائف کے بعد مسلمان ہوئے اور جنگ یمامہ میں مسلمانوں کی طرف سے شریک ہوئے، ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنی چھری سے دو آدمیوں کو قتل کیا، ایک خیر الناس (حمزہ) دوسرے شر الناس (مسیلمہ کذاب) شام میں جا ٹھہرے تھے حمص میں وفات پائی ان سے ان کے بیٹے اسحاق اور حرب وغیرہ نے روایت کی۔

(۹۴۲) ولید بن عقبہ: — یہ ولید ہیں عقبہ کے بیٹے۔ کنیت ابو وہب ہے، قرشی اور عثمان بن عفانؓ کے ماں شریک بھائی ہیں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اس وقت جو ان ہونے کے قریب تھے حضرت عثمانؓ نے ان کو کوفہ کا والی مقرر فرمایا یہ قریش کے جوانمردوں اور شاعروں سے ہیں ان سے ابو موسیٰ ہمدانی وغیرہ نے روایت کی رقہ میں وفات پائی۔

(۹۴۳) **ولید بن ولید**: — یہ ولید ہیں، ولید کے بیٹے قرشی اور مخزومی ہیں خالد بن ولید کے بھائی ہیں جنگ بدر میں بحالت کفر قید کر کے لائے گئے ان کا فدیہ ان کے بھائی خالد و ہشام نے ادا کیا جب زر فدیہ ادا ہو گیا تو مسلمان ہو گئے لوگوں نے کہا کہ تم نے فدیہ کی ادائیگی سے قبل اسلام کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ تو جواب دیا کہ میں نے اس لئے ایسا نہیں کیا کہ کہیں تم کو یہ بدگمانی نہ ہو کہ میں نے اسارت سے گھبرا کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ اظہار اسلام کے بعد ان کو مشرکین مکہ نے محبوس کر دیا مکہ میں، آنحضرت ﷺ ان کے اور دوسرے ضعفائے اسلام کے لئے قنوت میں دعا فرماتے تھے، کچھ عرصہ کے بعد یہ تو ان کی قید سے نکل آئے اور آنحضرت ﷺ کے پاس جا پہنچے اور عمرۃ القضاء میں شریک ہوئے ان سے عبد اللہ بن عمرؓ اور ابو ہریرہؓ نے روایت کی۔

(۹۴۴) **ورقہ بن نوفل**: — یہ ورقہ ہیں۔ نوفل بن اسد کے بیٹے، قریش میں سے تھے زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، انجیل پڑھے ہوئے تھے بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے۔

(۹۴۵) **ابو واقد**: — یہ ابو واقد ہیں، ان کا نام حارث ہے عوف کے بیٹے لیثی ہیں، پرانے مسلمان تھے ان کا شمار اہل مدینہ میں ہے۔ ایک سال مکہ کے قرب و جوار میں رہے اور مکہ ہی میں ۶۸ھ میں بعمر ۷۵ سال انتقال فرمایا اور مقام فخ میں مدفون ہوئے۔

(۹۴۶) **ابو وہب**: — یہ ابو وہب جشمی ہیں ان کا نام اور کنیت ایک ہے انہیں حضور کی صحبت اور آپ سے روایت کرنا دونوں نصیب ہوئیں، جشمی میں جیم پر ضمہ اور شین معجمہ پر فتحہ اور میم کے نیچے کسرہ (اور یاء تحتنیہ مشدد ہے جو نسبت کی ہے۔

تابعین

(۹۴۷) **وہب بن منبہ**: — یہ وہب ہیں منبہ کے بیٹے کنیت ابو عبد اللہ، صنعاء کے رہنے والے ایرانی النسل ہیں، جابر بن عبد اللہ اور ابن عباس سے حدیث کی سماعت کی ۱۱۴ھ میں انتقال فرمایا، منبہ میں میم پر پیش نون پر زبر باء (ایک نقطہ والی) کے نیچے زیر اور اس پر تشدید ہے۔

(۹۴۸) **وبرہ بن عبد الرحمٰن**: — یہ وبرہ ہیں عبد الرحمٰن کے بیٹے، کنیت ابو خزیمہ بنو حارث میں سے ہیں انہوں نے ابن عمر اور سعید بن جبیر سے اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی وبرہ میں واؤ مفتوح باء (ایک نقطہ والی) ساکن ہے۔

(۹۴۹) **وکیع بن جراح**: — یہ وکیع ہیں جراح کے بیٹے کوفہ کے باشندہ، قیس غیلان سے ہیں کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل نیشاپور کے کسی قریہ سے ہے انہوں نے ہشام بن عروہ اور اوزاعی اور ثوری وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی ان سے عبد اللہ ابن مبارک احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے روایت کی بغداد میں آئے اور وہاں حدیث بیان کی یہ قابل اعتماد مشائخ میں سے ہیں جن کی حدیث پر اعتماد ہے اور جن کے قول کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، یہ ابو حنیفہؒ کے قول پر فتوی دیتے تھے، انہوں نے امام ابو حنیفہ سے بہت سی چیزیں سن رکھی تھیں ۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷ھ میں دس محرم کو جب کہ وہ مکہ سے لوٹ رہے تھے انتقال فرمایا اور مقام فید میں دفن کئے گئے۔

(۹۵۰) **وحشی بن حرب**: — یہ وحشی ہیں حرب کے بیٹے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کی اور ان سے صدقہ بن خالد وغیرہم نے، اہل شام میں شمار ہوتے ہیں۔

(۹۵۱) **ابو وائل**: — یہ ابو وائل ہیں ان کا نام شقیق ہے سلمہ کے بیٹے اسدی و کوفی ہیں زمانہ جاہلیت و اسلام دونوں پائے

آنحضرت ﷺ کو پایا لیکن آپ ﷺ کو دیکھا نہیں نہ آپ سے کوئی حدیث سنی، ان کا اپنا بیان ہے کہ آنحضرت کی بعثت سے قبل میری عمر دس سال تھی میں اپنے گھر کی بکریاں جنگل میں چرایا کرتا تھا، صحابہ میں سے بہت سے حضرات ہے جن میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ شامل ہیں روایت کرتے ہیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بڑے شاگردوں میں ان کے ساتھ مخصوص تھے۔ حدیث بکثرت نقل کرتے ہیں، یہ ثقہ (قابل اعتماد) ثبت (اپنی روایت پر قائم رہنے والے) حجۃ ہیں حجاج بن یوسف کے زمانے میں وفات پائی۔

(۹۵۲) **ولید بن عقبہ:** — یہ ولید ہے عقبہ بن ربیعہ کا بیٹا جاہلی (کافر) ہے اس کا ذکر غزوہ بدر میں ہے، اور اسی غزوہ میں مقتول ہوا۔

(۵)

صحابہ

(۹۵۳) **ہشام بن حکیم:** — یہ ہشام ہیں حکیم بن حزم کے بیٹے۔ قرشی واسدی ہیں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے صحابہ میں سے صاحب خیر وفضل حضرات میں سے تھے، یہ ان صحابہ میں سے تھے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے۔ ان سے ایک گروہ نے جن میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی ہیں روایت کی اپنے والد کی وفات سے قبل ہی انتقال فرمایا ان کے والد کا انتقال ۵۴ھ میں ہوا۔

(۹۵۴) **ہشام بن عاص:** — یہ ہشام ہیں عاص کے بیٹے عمرو بن عاص کے بھائی پرانے مسلمان ہیں مکہ میں ہی مشرف باسلام ہو چکے ہیں حبشہ کو ہجرت کی جب حضور ﷺ کی ہجرت کی اطلاع ہوئی تو غزوۂ خندق کے بعد جو مدینہ میں ہوا مکہ واپس ہو گئے بہترین صاحب فضل صحابی ہیں ان سے ان کے بھتیجے عبداللہ نے روایت کی ۱۲ھ میں جنگ یرموک میں شہید ہوئے۔

(۹۵۵) **ہشام بن عامر:** — یہ ہشام ہیں عامر کے بیٹے انصاری ہیں بصرہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہاں ہی وفات ہوئی اہل بصرہ میں ان کا شمار ہے اور انہیں کے پاس ان کی حدیثیں پائی جاتی ہیں ان سے ان کے بیٹے سعد اور حسن بصری وغیرہ نے روایت کی۔

(۹۵۶) **ہلال بن امیہ:** — یہ ہلال ہیں امیہ کے بیٹے واقفی وانصاری ہیں غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ میں سے ایک یہ بھی ہیں خدا نے ان سب کی توبہ قبول فرمائی غزوۂ بدر میں شریک رہے یہی وہ صحابی ہیں جنہوں نے اپنی بیوی کو "شریک" کے ساتھ متہم کیا ان کا ذکر لعان میں ہے ان سے جابر رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کی۔

(۹۵۷) **ہزال بن ذباب:** — ہزال ہیں ذباب کے بیٹے کنیت ابو نعیم ہے اسلمی ہیں ان سے ان کے بیٹے نعیم اور محمد بن منکدر نے روایت کی ان کا ذکر ماعز کی حدیث اور ان کے رجم کے سلسلے میں ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ابن منکدر نے خود ان سے روایت کی۔

(۹۵۸) **ابو ہریرہ:** — یہ ابوہریرہ ہیں ان کے نام ونسب میں زبردست اختلاف ہے زیادہ مشہور یہ ہے کہ قبل از اسلام ان کا نام عبدالشمس یا عبد عمرو تھا اور اسلام لانے کے بعد عبدالرحمٰن نام رکھا گیا۔ اور یہ کہ یہ قبیلہ دوس کے فرد ہیں۔ حاکم ابواحمد نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک ابوہریرہ کے نام کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کا نام عبدالرحمٰن بن صخر ہے ان کی کنیت ان کے نام پر اس طرح غالب آگئی گویا ان کا نام ہی نہیں رکھا گیا غزوہ خیبر کے سال اسلام لائے اور آنحضرت ﷺ کے ہمراہ شریک ہوئے پھر آنحضرت کے ساتھ لگ گئے اور علم کے شوق میں پابندی کے ساتھ حاضر رہنے لگے، صرف پیٹ بھرنے پر اکتفا کرتے، آپ جہاں تشریف لے جاتے یہ بھی ساتھ رہتے بہت قوی الحفظ صحابہ میں سے تھے آپ کے ساتھ لگے رہنے کی برکت سے ان کو وہ چیزیں مستحضر رہتی تھیں جو

دوسروں کو یاد نہ ہوتیں۔ خود ان کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں آپ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں وہ مجھے یاد نہیں رہتیں آپ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی چادر بچھاؤ میں نے اپنی چادر بچھادی پھر آپ نے بہت سی حدیثیں بیان فرمائیں، اب وہ تمام یاد تھا جو آپ نے بیان فرمایا، امام بخاریؒ نے فرمایا کہ وہ آٹھ سو سے زیادہ آدمیوں سے روایت نقل کرتے ہیں اس میں صحابہ جیسے ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ اور جابرؓ اور انسؓ اور تابعین سب شامل ہیں مدینہ میں ۵۷ھ یا ۵۸ھ میں بعمر ۷۵ سال وفات پائی، ان کے پاس ہر وقت چھوٹی سی بلی (ہریرہ) رہتی تھی، یہ اس کو اٹھائے رکھتے تھے اس لئے ان کا نام ابوہریرہ ہو گیا۔

(۹۵۹) ابوالہیثم: — یہ ابوالہیثم ہیں، ان کا نام مالک بن تیہان ہے، حرف میم میں ان کا ذکر آچکا ہے۔

(۹۶۰) ابوہاشم: — یہ ابوہاشم شیبہ بن عتبہ بن ربیعہ قرشی ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کا نام ہشام ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا نام ان کی کنیت ہی ہے اور یہی مشہور تر ہے، معاویہ بن ابوسفیان کے ماموں ہیں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اور شام میں سکونت پذیر ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں وفات پائی نیک نہاد صاحب فضل صحابی ہیں ان سے ابوہریرہ نے روایت کی۔

تابعین

(۹۶۱) ابوہند: — یہ ابوہند ہیں نام یسار ہے پچھنے لگانے کا کام کرتے تھے انہوں نے ہی آنحضرت ﷺ کو پچھنے لگائے تھے بنو بیاضہ کے آزاد کردہ ہیں ابن عباس اور ابوہریرہؓ اور جابرؓ سے انہوں نے روایت کی۔

(۹۶۲) ہشام بن عروہ: — یہ ہشام ہیں عروہ بن زبیر کے بیٹے کنیت ابومنذر قریشی اور مدنی ہیں مدینہ کے مشہور تابعین اور بکثرت روایت کرنے والوں میں سے ہیں ان کا شمار اکابر علماء و جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے عبداللہ بن زبیرؓ اور ابن عمرؓ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی ان میں ثوری مالک بن انس اور ابن عیینہ جیسے حضرات بھی ہیں، خلیفہ منصور کے یہاں بغداد آئے، ۶۱ھ میں پیدا ہوئے ۱۴۶ھ میں بمقام بغداد انتقال فرمایا۔

(۹۶۳) ہشام بن زید: — یہ ہشام ہیں زید بن انس بن مالک کے بیٹے اوز انصاری ہیں انہوں نے اپنے دادا انسؓ سے روایت کی، ان سے ایک جماعت نے حدیث کی سماعت کی اہل بصرہ میں شمار ہوتے ہیں۔

(۹۶۴) ہشام بن حسان: — یہ ہشام ہیں حسان کے بیٹے اور قردوسی یعنی اس قبیلہ کے آزاد کردہ ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کے یہاں قیام پذیر تھے اس لئے قردوسی کہے جاتے ہیں یہی ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ جن کو حجاج نے ہاتھ پیر باندھ کر قتل کیا ان کی تعداد کا شمار کرو، شمار کیا تو ایک لاکھ بیس ہزار ہوئے، حسن، عطا اور عکرمہ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے حماد بن زید اور فضل بن عیاض وغیرہ نے روایت کی ۱۴۷ھ میں انتقال ہوا، قردوسی میں قاف پر ضمہ اور دال مہملہ پر ضمہ اور سین مہملہ ہے۔

(۹۶۵) ہشام بن عمار: — یہ ہشام ہیں عمار کے بیٹے کنیت ابوالولید ثلمی و دمشقی ہیں تجوید کے ماہر حافظ حدیث، دمشق کے خطیب ہیں انہوں نے مالک یحییٰ ابن حمزہ سے اور ان سے بخاری، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، محمد بن خزیم اور باغندی نے روایت کی ۹۲ سال تک زندہ رہے۔ ۲۴۵ھ میں وفات پائی۔

(۹۶۶) ہشام بن زیاد: — یہ ہشام ہیں زیاد کے بیٹے ابولمقدام کنیت ہے قرظی اور حسن سے روایت کی اور ان سے شیبان بن فروخ اور قواریری نے روایت کی، محدثین نے ان کو روایت میں ضعیف کہا ہے۔

(۹۶۷) **ہشیم بن بشیر:** — یہ ہشیم بن بشیر سلمی واسطی ہیں مشہور آئمہ حدیث عمرو بن دینار اور زہری اور یونس بن عبید اور ایوب سختیانی وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے مالک، ثوری، شعبہ اور ابن مبارک اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے روایت کی، ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳ھ میں وفات پائی۔

(۹۶۸) **ہلال بن علی:** — یہ ہلال ہیں علی بن اسامہ کے بیٹے اپنے دادا ہلال بن ابی میمونہ فہری کی طرف منسوب ہیں۔ حضرت انسؓ عطاء بن یسار سے انہوں نے اور مالک بن انس وغیرہ نے ان سے روایت کی۔

(۹۶۹) **ہلال بن عامر:** — یہ ہلال عامر کے بیٹے مزنی ہیں اہل کوفہ میں شمار کئے جاتے ہیں انہوں نے اپنے والد سے روایت کی اور رافع مزنی سے حدیث کی سماعت کی، ان سے یعلی وغیرہ نے روایت کی۔

(۹۷۰) **ہلال بن یساف:** — یہ ہلال یساف کے بیٹے ہیں، اشجع کے آزاد کردہ ہیں ان کی ملاقات حضرت علیؓ بن ابی طالب سے ثابت ہے سلمہ بن قیس سے روایت کی ابو مسعود انصاری سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ایک جماعت نے سماعت کی۔

(۹۷۱) **ہلال بن عبداللہ:** — یہ ہلال عبداللہ کے بیٹے ابوہاشم کنیت اور بنو باہلہ سے ہیں انہوں نے ابو اسحاق سے روایت کی اور عفان اور مسلم نے ان سے روایت کی، بخاریؒ نے فرمایا، کہ ان کی حدیث منکر ہوتی ہیں۔

(۹۷۲) **ہمام بن حارث:** — یہ ہمام ہیں حارث کے بیٹے نخعی اور تابعی ہیں ابن مسعود اور عائشہ اور دوسرے صحابہ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ابراہیم نخعی نے روایت کی۔

(۹۷۳) **ہود بن عبداللہ:** — یہ ہود ہیں، عبداللہ بن سعد ان کے بیٹے اور عصری ہیں، اپنے دادا مزیدہ اور سعید بن وہب سے روایت کی یہ دونوں صحابی ہیں اور ان سے طالب بن حجر نے روایت کی۔

(۹۷۴) **ہبیرہ بن مریم:** — یہ ہبیرہ مریم کے بیٹے، علیؓ ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابواسحٰق اور ابوفاختہ نے روایت کی یہ ثقہ ہیں، امام نسائی فرماتے ہیں کہ روایت میں کچھ قوت نہیں ۶۶ھ میں انتقال ہوا۔

(۹۷۵) **ہزیل بن شرجیل:** — یہ ہزیل ہیں شرجیل کے بیٹے ازدی کوفی، اور نابینا ہیں، عبداللہ بن مسعود سے حدیث کی سماعت کی ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔

(۹۷۶) **ابوالہیاج:** — یہ ابوالہیاج حیان ہیں حصین کے بیٹے اور اسدی ہیں حضرت عمار بن یاسرؓ کے کاتب ہیں، امام احمد نے فرمایا کہ یہ منصور بن حیان کے والد ہیں۔ جلیل القدر تابعی ہیں، ان کی حدیث صحیح ہوتی ہے حضرت علیؓ اور عمارؓ سے انہوں نے اور ان سے شعبی اور ابووائل نے روایت کی۔ ہیاج میں یا (دو نقطے والی) مشدد اور جیم ہے۔

صحابی عورتیں

(۹۷۷) **ہند بنت عتبہ:** — یہ ہند ہیں عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی ابوسفیان کی بیوی اور معاویہؓ کی والدہ ہیں فتح مکہ کے موقع پر اپنے شوہر کے اسلام لانے کے بعد مسلمان ہوئیں آنحضرت ﷺ نے ان دونوں کے نکاح کو باقی رکھا یہ نہایت فصیح اور عاقلہ تھیں، جب آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر دوسری عورتوں کی معیت میں بیعت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ

گی اور نہ چوری کروگی، تو ہندہ نے عرض کیا کہ ابو سفیان ہاتھ روک کر خرچ کرتے ہیں، جس کی تنگی ہوتی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس قدر لے لو جو تمہارے اور تمہاری اولاد کے لئے حسب دستور کافی ہو، آپ ﷺ نے فرمایا اور نہ زنا کروگی تو ہندہ نے عرض کیا کہ آیا کوئی شریف عورت زنا کار ہو سکتی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اور نہ اپنے بچوں کو قتل کروگی، تو ہندہ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ نے تو ہمارے سب بچوں کو قتل کر دیا، ہم نے تو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پرورش کیا اور بڑے ہونے پر آپ ﷺ نے بدر میں قتل کرا دیا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں وفات پائی، اسی روز حضرت ابو قحافہ (حضرت ابوبکرؓ کے والد) کا انتقال ہوا ان سے حضرت عائشہ نے روایت کی ہے۔

(۹۷۸) ام ہانی: — یہ ام ہانی ہیں ان کا نام فاختہ ابو طالب کی بیٹی اور حضرت علیؓ کی ہمشیرہ ہیں آنحضرت ﷺ نے نبوت سے قبل ان سے پیغام نکاح دیا تھا اور ہبیرہ بن ابو وہب نے بھی پیغام دیا تھا لیکن ابو طالب نے ابو ہبیرہ سے ان کا نکاح کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ مسلمان ہو گئیں اور اسلام کی وجہ سے ان میں نکاح باقی نہ رہا اب دوبارہ آپ ﷺ نے پیام دیا تو انہوں نے کہا خدا کی قسم میں تو آپ ﷺ کو پہلے سے پسند کرتی ہوں، اب مسلمان ہونے کے بعد کیا پسند نہ کروں گی مگر میں بچوں والی عورت ہوں تو آپ ﷺ نے سکوت فرمایا، ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی ان میں علیؓ اور ابن عباس بھی ہیں۔

(۹۷۹) ام ہشام: — یہ ام ہشام حارثہ بن نعمان کی بیٹی اور صحابیہ ہیں، ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔

(ی)

صحابہ

(۹۸۰) یزید بن اسود: — یہ یزید اسود کے بیٹے اور سوائی ہیں ان سے ان کے بیٹے جابر نے روایت کی، ان کا شمار اہل طائف میں ہوتا ہے ان کی حدیث اہل کوفہ کے یہاں پائی جاتی ہے سوائی میں سین مہملہ مضموم واؤ بلا تشدید اور الف ممدودہ ہے۔

(۹۸۱) یزید بن عامر: — یہ یزید ہیں عامر کے بیٹے اور سوائی اور حجازی ہیں غزوۂ حنین میں مشرکین کی جانب سے شریک تھے اس کے بعد مسلمان ہوئے ان سے سائب بن یزید وغیرہ نے روایت کی۔

(۹۸۲) یزید بن شیبان: — یہ یزید بن شیبان کے بیٹے ازدی اور صحابی ہیں ان سے روایت بھی نقل کی گئی ہے ان کا ذکر وحدان میں کیا جاتا ہے انہوں نے ابن مربع سے روایت کی (مربع میں میم مکسور ہے) اور ان سے عمر بن عبداللہ بن صفوانؓ نے روایت کی ان کی حدیث حج کے بارہ میں ہے۔

(۹۸۳) یزید بن نعامہ: — یہ یزید نعامہ کے بیٹے اور ضبی ہیں ان سے سعید بن سلمان نے روایت کی بحالت شرک حنین میں شریک ہوئے اور اس کے بعد مسلمان ہوئے۔ ترمذی کا ارشاد ہے کہ ان کی آنحضرت ﷺ سے حدیث کی سماعت معروف نہیں ہے نعامہ میں نون اور عین مہملہ دونوں پر فتحہ ہے۔

(۹۸۴) یحیٰی بن اسید بن حضیر: — یہ یحیٰی، اسید بن حضیر کے بیٹے انصار میں سے ہیں آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے ان کے والد کی کنیت ابو یحیٰی ہی کے نام پر ہے ان کا ذکر فضل القراۃ والقاری میں ہے ابن عبدالبر نے کہا کہ ان کی عمر تو حدیث کی سماعت کے لائق

تھی لیکن میں ان کی کوئی روایت نہیں جانتا۔

(۹۸۵) یوسف بن عبداللہ:۔ یہ یوسف ہیں عبداللہ بن سلام کے بیٹے کنیت ابویعقوب ہے حضرت یوسف علیہ السلام بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل میں سے تھے حضور کی حیات میں ہی پیدا ہو چکے تھے آپ کی خدمت میں لائے گئے آپ نے ان کو اپنی گود میں لیا ان کا نام یوسف تجویز فرمایا ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے لئے دعا حفاظت فرمائی، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو حضور ﷺ کا دیدار نصیب ہوا ان کی کوئی روایت نہیں اہل مدینہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

(۹۸۶) یعلی بن امیہ:۔ یہ یعلی امیہ کے بیٹے تمیمی اور حنظلی ہیں، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے ان کا شمار اہل حجاز میں ہے، ان سے صفوان عطاء مجاہد وغیرہ نے روایت کی حضرت علی بن ابی طالب کے ساتھ جنگ جمل میں شریک ہوئے اور اسی میں قتل کئے گئے۔

(۹۸۷) ابوالیسر:۔ یہ ابوالیسر (یاء پر فتحہ اور نیچے دو نقطے اور سین مہملہ پر فتحہ ہے) ان کا نام کعب اور یہ عمرو کے بیٹے ہیں، ان کا ذکر حرف کاف میں آچکا ہے۔

تابعین

(۹۸۸) یزید بن ہارون:۔ یہ یزید ہارون کے بیٹے اور اسلمی یعنی ان کے آزاد کردہ ہیں واسط کے رہنے والے، ایک جماعت سے انہوں نے روایت کی اور ان سے احمد بن حنبل علی بن مدینی وغیرہ نے روایت کی بغداد میں وارد ہوئے اور وہاں حدیث بیان کی پھر واسط لوٹ آئے اور وہیں وفات پائی، ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے ابن مدینی کہتے ہیں کہ میں نے ابن ہارون سے زیادہ قوی الحفظ نہیں دیکھا، حدیث کے زبردست عالم اور حافظ، ثقہ زاہد و عابد تھے ۲۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔

(۹۸۹) یزید بن زریع:۔ یہ یزید ہیں، زریع کے بیٹے ان کی کنیت ابو معاویہ ہے حافظ حدیث ہیں ایوب و یونس سے انہوں نے اور ان سے ابن مدینی اور مسدد نے روایت کی ان کا ذکر باب الشفقہ والرحمۃ میں آتا ہے امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ بصرہ میں دینی و علمی پختگی ان پر ختم ہے، شوال ۱۸۳ھ میں بعمر ۸۱ سال وفات پائی۔

(۹۹۰) یزید بن ہرمز:۔ یہ یزید ہیں ہرمز کے بیٹے ہمدانی مدنی اور بنو لیث کے آزاد کردہ ہیں، انہوں نے ابوہریرہ سے اور ان سے ان کے بیٹے عبداللہ اور عمرو بن دینار اور زہری نے روایت کی۔

(۹۹۱) یزید بن ابی عبید:۔ یہ یزید ہیں ابو عبید کے بیٹے، سلمہ بن اکوع کے آزاد کردہ ہیں انہوں نے سلمہ سے اور ان سے یحیی بن سعید وغیرہ نے روایت کی۔

(۹۹۲) یزید بن رومان:۔ یہ یزید ہیں رومان کے بیٹے ان کی کنیت ابوروح ہے اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں ابن زبیر اور صالح بن خوات سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے امام زہری وغیرہ نے روایت کی۔

(۹۹۳) یزید بن اصم:۔ یہ یزید ہیں، اصم کے بیٹے حضرت ام المؤمنین میمونہ کے ہمشیرزادہ ہیں، حضرت میمونہ اور ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں۔

(۹۹۴) یزید بن نعیم:۔ یہ یزید ہیں نعیم بن ہزال کے بیٹے اور اسلمی ہیں انہوں نے اپنے والد اور جابر سے اور ان سے ایک جماعت

نے روایت کی نعیم میں نون پر فتحہ ہے اور عین مہملہ ہے اور ہزال ہیں، ہاء مفتوح اور زاء مشدد ہے۔

(۹۹۵) یزید بن زیاد: — یہ یزید ہیں زیاد کے بیٹے اور دمشق کے باشندہ ہیں انہوں نے زہری اور سلیمان بن حبیب سے اور ان سے وکیع اور ابو نعیم نے روایت کی۔

(۹۹۶) یعلی بن مملک: — یہ یعلی ہیں مملک کے بیٹے (مملک میں پہلا میم مفتوح دوسرا ساکن لام مفتوح اور آخر میں کاف ہے) اور تابعی ہیں انہوں نے ام سلمہ سے اور ان سے ابن ابی ملیکہ نے روایت کی

(۹۹۷) یعیش بن طخفہ: — یہ یعیش ہیں، طخفہ بن قیس کے بیٹے اور غفاری ہیں انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ان کے والد اصحاب صفہ میں سے تھے اور ان سے ابو سلمہ نے روایت کی طخفہ میں طاء پر کسرہ خاء معجمہ ساکن ہے۔

(۹۹۸) یعقوب بن عاصم: — یہ یعقوب ہیں عاصم بن عروہ بن مسعود کے بیٹے اور ثقفی و حجازی ہیں انہوں نے ابن عمرؓ سے روایت کی۔

(۹۹۹) یحییٰ بن خلف: — یہ یحییٰ خلف کے بیٹے، باہلی ہیں معتمر وغیرہ سے انہوں نے اور ان سے مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کی ۲۴۲ھ میں وفات پائی۔ باب اعداد آلۃ الجہاد میں ان کا ذکر ہے۔

(۱۰۰۰) یحییٰ بن سعید: — یہ یحییٰ ہیں سعید کے بیٹے اور انصاری و مدنی ہیں، انس بن مالک، سائب بن یزید اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ہشام بن عروہ، مالک بن انس، شعبہ، ثوری، ابن عیینہ ابن مبارک وغیرہ نے روایت کی مدینۃ الرسول میں بنو امیہ کے دور میں فصل خصومات کے ذمہ دار تھے خلیفہ منصور نے ان کو عراق بلالیا اور ہاشمیہ میں قاضی مقرر کردیا اسی مقام پر ۱۴۳ھ میں انتقال فرمایا حدیث و فقہ کے ائمہ میں سے ایک امام عالم دین پرہیزگار، زاہد، نیک نہاد اور فقہی بصیرت میں مشہور تھے۔

(۱۰۰۱) یحییٰ بن حصین: — یہ یحییٰ ہیں حصین کے بیٹے، اپنی دادی ام حصین اور طارق سے روایت کرتے ہیں ان سے ابو اسحٰق اور شعبہ نے روایت کی ثقہ ہیں۔

(۱۰۰۲) یحییٰ بن عبدالرحمٰن: — یہ یحییٰ ہیں عبدالرحمٰن بن حاطب بن ابی بلتعہ کے بیٹے اور مدنی ہیں انہوں نے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کی۔

(۱۰۰۳) یحییٰ بن عبداللہ: — یہ یحییٰ ہیں عبداللہ بن بحیر کے بیٹے اور صنعانی ہیں انہوں نے ان لوگوں سے روایت کی جن سے فرسودہ بن مسک نے سنا اور ان سے معمر نے روایت کی بحیر میں باء (ایک نقطہ والی) مفتوح اور حاء مہملہ مکسور اور راء مہملہ ہے۔

(۱۰۰۴) یحییٰ بن ابی کثیر: — یہ یحییٰ ہیں ابو کثیر کے بیٹے ان کی کنیت ابو نضر ہے یمامی اور بنو طے کے آزاد کردہ ہیں دراصل بصرہ کے ہیں پھر یمامہ منتقل ہوگئے انہوں نے حضرت انس بن مالک کی زیارت کی اور عبداللہ بن ابی قتادہ وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی ان سے عکرمہ اور اوزاعی وغیرہ نے روایت کی۔

(۱۰۰۵) یونس بن یزید: — یہ یونس ہیں یزید کے بیٹے اور ایلی ہیں قاسم عکرمہ اور امام زہری سے انہوں نے اور ان سے ابن مبارک اور ابن وہب نے روایت کی ثقہ اور امام ہیں۔ ۱۵۹ھ میں انتقال ہوا۔

(۱۰۰۶) یونس بن عبید: — یہ یونس ہیں عبید کے بیٹے بصرہ کے رہنے والے ہیں حسن اور ابن سیرین سے حدیث کی سماعت کی ان سے

ثوری اور شعبہ نے روایت کی ۱۳۹ھ میں وفات پائی۔

صحابی عورتیں

(۱۰۰۷) یسیرہ: — یہ یسیرہ۔ یاسر انصاری کی والدہ ہیں یہ مہاجر عورتوں میں سے ہیں ان سے ان کی پوتی حمیصہ بنت یاسر نے روایت کی یسیرہ میں یاء پر ضمہ سین پر فتحہ یاء ساکن اور راء ہے۔

اصحابِ اصول ائمہ کے بیان میں

(۱۰۰۸) مالک بن انس: — یہ امام مالک ہیں، انس بن مالک بن ابی عامر کے بیٹے اور اصبحی ہیں ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے ہم نے ان کے ذکر سے اس لئے ابتدا کی کہ یہ اپنی واقفیت مرتبہ اور زمانے کے لحاظ سے مقدم ہیں یہ علماء کے شیخ اور ائمہ کے استاد ہیں حالانکہ میں نے مقدمۃ الکتاب میں بخاری و مسلم کا ذکر ان سے پہلے کیا ہے اس کی وجہ وہ شرط ہے جس کی رعایت ان دونوں نے اپنی کتاب میں رکھی اس لئے ہم یہاں ان کو ذکر نہ کریں گے کیونکہ یہ دونوں سے مقدم ہونے کے زیادہ حقدار اور لائق ہیں اور ان دونوں کی کتابیں بے شک ان کی کتاب سے تقدیم کا حق رکھتی ہیں ۹۵ھ میں تولد ہوئے اور مدینہ منورہ میں ۱۷۹ھ میں وفات پائی اس وقت آپ کی عمر ۸۴ سال تھی، واقدی نے کہا کہ آپ کی عمر نوے سال ہوئی آپ نہ صرف حجاز کے امام تھے بلکہ حدیث وفقہ میں تمام انسانوں کے مقتدا تھے آپ کے فخر کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ امام شافعی آپ کے شاگردوں میں سے ہیں آپ نے زہری، یحییٰ بن سعید، نافع، محمد بن مکندر، ہشام بن عروہ، زید بن اسلم ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن اور ان کے علاوہ بہت سے حضرات سے علم حدیث حاصل کیا اور آپ سے اس قدر مخلوق نے حدیث کی روایت کی جن کا شمار نہیں ہو سکتا آپ کے شاگرد پورے پورے ملک کے امام بنے ان میں امام شافعی، محمد بن ابراہیم بن دینار، ابوہاشم، عبدالعزیز بن ابی حازم شامل ہیں، یہ آپ کے شاگردوں میں علم کے اعتبار سے ان کی نظیر ہیں علاوہ ازیں معن بن عیسیٰ، یحییٰ بن یحییٰ، عبداللہ بن مسلمہ قعنبی، عبداللہ بن وہب وغیرہ جیسے لوگوں کا شمار نہیں، یہی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی احمد بن حنبل اور یحییٰ ابن معین جیسے ائمہ اور محدثین کے استاد ہیں بکر بن عبداللہ صنعائی نے فرمایا کہ ہم مالک بن انس کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے ہمیں ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے احادیث سنائیں ہم اور سننا چاہتے رہے تو ایک روز فرمایا تم ربیعہ کا کیا کرو گے وہ وہاں محراب میں سو رہے ہیں ہم نے جا کر ربیعہ کو جگایا اور ان سے کہا آپ ہی ربیعہ ہو کہا ہاں ہم نے کہا وہی ربیعہ جن سے مالک بن انسؒ روایت کرتے ہیں کہا ہاں ہم نے کہا کیا بات ہے امام مالک تو آپ سے اس قدر مستفیض ہوئے اور آپ اپنے علم سے اس درجہ (اجتہاد) پر نہ پہنچے انہوں نے جواب دیا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ دولت یعنی لطف ربانی کا ایک مثقال علم کے ایک گھڑے سے بہتر ہے، عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ سفیان ثوری حدیث میں تو امام ہیں لیکن سُنّت میں امام نہیں اور اوزاعی سُنّت میں امام ہیں تو حدیث میں امام نہیں اور مالک بن انس دونوں میں امام ہیں، یہ امام مالکؒ علم اور دین کی تعظیم میں بہت بڑھے ہوئے تھے چنانچہ جب حدیث بیان کرنے کا ارادہ ہوتا تو وضو فرماتے اور مسند پر تشریف رکھتے داڑھی میں کنگھا کرتے خوشبو استعمال فرماتے اور نہایت باوقار اور پر ہیبت ہو کر بیٹھتے پھر حدیث بیان فرماتے اس کے متعلق ان سے عرض کیا گیا تو کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی عظمت قائم کروں۔ ایک بار ابو حزم حدیث بیان فرما رہے تھے امام مالک گذرے اور آگے بڑھ گئے، بیٹھے نہیں آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی حدیث رسول کو کھڑے ہو کر حاصل کرنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا اس لئے نہیں ٹھہرا یحییٰ بن سعید نے فرمایا کہ کسی کی حدیث امام مالک کی حدیث سے زیادہ صحیح نہیں ہوتی۔ امام شافعی نے فرمایا کہ جب اہل حدیث کا تذکرہ ہو تو امام مالک نجوم کی طرح ہیں اور مجھے تو امام مالک سے زیادہ کوئی قابل اطمینان معلوم نہیں ہوتا اور یہ

بھی فرمایا کہ جب کوئی اہل باطل آپ کے پاس آتا تو آپ اس سے فرماتے کہ تم دیکھ لو میرے دین کی گواہی میرے پاس موجود ہے اور تم تو شکی ہو جاؤ اور کسی اپنے جیسے شکی کے پاس جا کر اس سے مناظرہ کرو۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جب کوئی روایت امام مالک سے ملے تو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لو امام مالک" کا قول ہے کہ جب کسی انسان کے نفس میں خیر موجود نہ ہو تو لوگون کو اس سے خیر حاصل نہ ہوگی، آپ کا ارشاد ہے کہ علم کثرت روایت کا نام نہیں بلکہ وہ تو ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ دل میں رکھ دیتا ہے، ابو عبداللہ فرماتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ مسجد میں تشریف فرما ہیں لوگ ارد گرد ہیں امام مالک آپ کے بالکل سامنے کھڑے ہیں آپ کے سامنے مشک رکھی ہوئی ہے آنحضرت ﷺ اس میں سے مٹھیاں بھر بھر کر امام مالک کو دے رہے ہیں اور مالک لوگوں پر چھڑک رہے ہیں، مطرف نے کہا کہ میں نے اس کی تعبیر علم اور اتباع سُنّت سمجھی، امام شافعی نے فرمایا کہ مجھ سے میری پھوپھی نے فرمایا اس وقت ہم مکہ میں تھے کہ میں نے آج رات عجیب چیز دیکھی، میں نے کہا کیا دیکھا؟ تو انہوں نے کہا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے آج رات زمین والوں میں سب سے بڑے عالم کی وفات ہوگئی، امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کا حساب رکھا معلوم ہوا کہ یہ وہی وقت تھا جس وقت امام مالک کی وفات ہوئی امام مالک سے روایت ہے کہ میں خلیفہ ہارون رشید کے پاس گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا ہوتا کہ آپ ہمارے یہاں آیا کرتے تاکہ ہمارے بچے آپ سے آپ کی کتاب موطا سن لیتے تو میں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ امیر المؤمنین کی عزت برقرار رکھے یہ علم آپ ہی کے یہاں سے نکلا ہے اگر آپ اس کی عزت رکھیں گے تو باعزت رہے گا اور اگر آپ ہی اسے ذلیل کردیں گے تو ذلیل ہو جائے گا علم تو ایسی چیز ہے کہ اس کے پاس پہنچا جائے نہ کہ اس کو اپنے پاس بلایا جائے ہارون نے کہا آپ نے سچ فرمایا اور بچوں سے کہا جاؤ مسجد میں لوگوں کے ساتھ حدیث کی سماعت کرو، رشید سے روایت ہے کہ انہوں نے امام مالک سے دریافت کیا کہ آپ کا کوئی مکان ہے انہوں نے جواب دیا کہ نہیں رشید نے ان کو تین ہزار دینار دیئے اور کہا کہ اس سے مکان خرید لیں امام نے دینار لے لئے اور خرچ نہیں کئے، جب رشید نے روانگی کا ارادہ کیا تو امام مالک" سے کہا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں کیونکہ میں نے پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ لوگوں کو موطا پر اس طرح پابند کروں، جس طرح عثمان" نے ایک قرآن پر لوگوں کو پابند کردیا تھا تو امام مالک نے جواب دیا کہ لوگوں کو مؤطا پر مجبور کرنا ایسا امر ہے کہ آپ کو اس پر قدرت نہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ کے اصحاب آپ ﷺ کی وفات کے بعد شہروں میں منتشر ہوگئے ہیں اور انہوں نے حدیثیں بیان کی ہیں اس لئے ہر شہر والوں کے پاس حدیث کا علم ہے اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری اُمّت کا اختلاف رحمت ہے اور آپ کے ساتھ چلنا تو ایسا معاملہ ہے کہ مجھے اس کی قدرت نہیں، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ مدینہ اس کے لئے بہتر ہے کاش کہ انہیں اس کا علم ہوتا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ اس کے کھوٹ کو نکال دیتا ہے اور آپ کے دیئے ہوئے یہ دینار موجود ہیں اگر آپ کا جی چاہے واپس لے لیں یا پھر رہنے دیں مقصد یہ تھا کہ تم مجھے مدینہ چھوڑنے کے لئے اس لئے مجبور کرنا چاہتے ہو کہ تم نے میرے ساتھ احسان کیا ہے میں رسول اللہ ﷺ کے شہر کے مقابلہ میں ان دنانیر کو ترجیح نہیں دے سکتا، امام شافعی" نے فرمایا کہ میں نے امام مالک کے دروازے پر کچھ خراسان کے گھوڑوں کی جماعت اور مصر کے خچروں کے غول دیکھے میں نے اس سے بہتر کبھی نہ دیکھے تھے میں نے امام مالک سے عرض کیا یہ کیسے اچھے ہیں تو فرمایا اے عبداللہ یہ میری جانب سے آپ کے لئے ہدیہ ہے میں نے عرض کیا کہ آپ بھی اپنے لئے اس میں سے کوئی سواری رکھ لیجئے تو فرمایا مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں نے اس زمین کو جس میں حضور ﷺ موجود ہیں کسی جانور کے کھر سے روند ڈالوں۔ اس جیسے نامعلوم کتنے فضائل اس کوہ بلند اور بحر امواج کے لئے مذکور ہیں۔

(۱۰۰۹) **نعمان بن ثابت:** — یہ امام ابوحنیفہ" ہیں آپ کا نام نعمان تھا ثابت بن زوطاء کے بیٹے کوفہ کے رہنے والے ہیں حمزہ زیات کے گھرانے سے ہیں، آپ بزاز تھے اور ریشمی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ آپ کے دادا زوطا کابل کے تھے اور بنی تیم اللہ بن ثعلبہ کے غلام تھے بعد میں آزاد کردیئے گئے اور ان کے والد ثابت مسلمان ہوئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ بھی آزاد تھے اور کبھی ان پر غلامی کا دور نہیں آیا ثابت اپنے بچپن میں حضرت علی بن ابی طالب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت علی" نے ان کے حق میں اور ان کی اولاد کے

حق میں برکت کی دعا فرمائی ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں بمقام بغداد وفات پائی مقبرہ خیزران میں دفن کئے گئے بغداد میں آپ کی قبر مشہور ہے آپ کے زمانہ میں چار صحابی بقید حیات تھے، بصرہ میں انس بن مالک کوفہ میں عبداللہ بن ابی اوفی مدینہ میں سہل بن سعد ساعدی مکہ میں ابو الطفیل عامر بن واصلہ، امام ابوحنیفہ کی ملاقات ان میں کسی سے نہیں ہوئی اور نہ ان سے کچھ حاصل کیا، فقہ تو حماد بن ابی سلیمان سے حاصل کیا اور حدیث کی سماعت عطاء بن ابی رباح ابواسحٰق سبیعی محمد بن منکدر، نافع، ہشام بن عروہ، سماک بن حرب وغیرہ سے کی ان سے عبداللہ بن مبارک، وکیع بن جراح یزید بن ہارون، قاضی محمد یوسف، محمد بن حسن شیبانی وغیرہ نے روایت کی خلیفہ منصور نے ان کو کوفہ سے بغداد منتقل کر لیا تھا آپ نے وفات تک وہیں قیام کیا، مروان بن محمد اموی کے دور میں ابن ہبیرہ نے کوفہ کے محکمہ قضا کی ذمہ داری لینے پر مجبور کرنا چاہا مگر ابوحنیفہ نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس نے آپ کے دس دن تک روزانہ دس کوڑے لگوائے لیکن جب دیکھا کہ یہ کسی طرح راضی نہیں تو ان کو چھوڑ دیا جب خلیفہ منصور نے ابوحنیفہ کو عراق بلوالیا تو محکمہ قضا سپرد کرنا چاہا انہوں نے انکار کر دیا۔ خلیفہ نے قسم کھائی کہ تم کو ایسا کرنا ہوگا ابوحنیفہ نے بھی قسم کھائی کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا دونوں طرف سے بار بار قسم کھائی گئی۔ آخر میں خلیفہ نے آپ کو قید کر ڈالا۔ قید ہی میں آپ کی وفات ہوئی حکیم بن ہشام نے کہا شام میں مجھ سے ابوحنیفہ کے متعلق بیان کیا گیا کہ ابوحنیفہ امانت داری میں سب سے بڑے آدمی ہیں بادشاہ نے چاہا کہ آپ اس کے خزانوں کی کنجیوں کے ذمہ دار ہو جائیں ورنہ آپ کو کوڑوں کی سزا دی جائے گی انہوں نے دنیا والوں کے عذاب کو خدا کے عذاب کے مقابلہ میں برداشت کر لیا روایت ہے کہ ابن مبارک کے یہاں ابوحنیفہ کا ذکر ہوا تو وہ کہنے لگے تم اس شخص کا ذکر کرتے ہو جس کے سامنے پوری دنیا رکھ دی گئی ہے اور وہ اس دنیا کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ابوحنیفہ مردوں میں متوسط قامت تھے بعض کہتے ہیں کہ کشیدہ قامت تھے، گندمی رنگ غالب تھا، چہرہ خوبصورت گفتگو میں سب سے اچھے نہایت آواز، شائستہ مجلس، نہایت سخی اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی بہت خبر گیری کرنے والے تھے، امام شافعیؒ نے فرمایا. کہ امام مالک سے عرض کیا گیا کہ کیا آپ نے ابوحنیفہ کو دیکھا ہے، آپ نے فرمایا ہاں میں نے ایسے شخص کو دیکھا ہے کہ اگر وہ تم سے اس ستون کے متعلق گفتگو کریں کہ یہ سونے کا ہے تو یقیناً ایک مضبوط دلیل سے ثابت کر دکھائیں گے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ جس شخص کو فقہ میں تبحر حاصل کرنا ہو وہ ابوحنیفہ کی امداد کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے گا، امام ابوحامد غزالی نے فرمایا کہ بیان کیا گیا کہ ابوحنیفہ نصف شب تہجد پڑھتے تھے ایک روز اسنہ سے گذر رہے تھے ایک شخص نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرے سے کہا یہ وہ شخص ہے جو خدا کی عبادت میں رات بھر جاگتا ہے اس روز کے بعد یہ تمام رات جاگنے لگے اور فرمایا کہ مجھے اس بات میں شرم محسوس ہوئی ہے کہ لوگ میری عبادت کے متعلق وہ بات کریں جو مجھ میں نہیں ہے شریک نخعی نے کہا ابوحنیفہ نہایت خاموش اور ہمیشہ گہری فکر میں رہنے والے اور نہایت کم گو تھے یہ علم باطنی اور اہم دینی معاملات میں مشغولیت کی واضح ترین علامت ہے اس لئے کہ جس شخص کو دو نعمتیں خاموشی اور دنیا سے بے رغبتی حاصل ہو جائیں اس کو پورا علم حاصل ہو جاتا ہے۔

اس قدر کافی ہے اور اگر ہم ان کے مناقب و فضائل کی تشریح کرنے لگیں تو بات لمبی ہو جائے گی اور مقصد ہاتھ سے جاتا رہے گا خلاصہ یہ کہ آپ عالم متقی، زاہد، عابد اور علوم شریعت میں امام تھے اس کتاب میں ہم نے ان کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ ان کے واسطہ سے کوئی روایت اس کتاب مشکوٰۃ میں نہیں ہے، اس کی غرض صرف آپ کی جلالت شان اور کثرت علوم کے باعث آپ کے نام و ذکر سے تبرک کا حصول ہے۔

(۱۰۱۵) محمد بن ادریس شافعی: — یہ امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن عبد یزید ہاشم بن عبدالمطلب بن عبد مناف ہیں قرشی و مطلبی ہیں، شافع نے بحالت جوانی آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی ہے ان کے والد سائب جنگ بدر کے موقع پر مسلمان ہوئے ہیں یہ بنی ہاشم کے علم بردار تھے قید ہو گئے تو فدیہ دے کر رہائی حاصل کی اور اس کے بعد مشرف باسلام ہوئے، امام شافعی بمقام غزہ ۱۵۰ھ میں تولد ہوئے دو سال کی عمر میں مکہ لائے گئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی پیدائش عسقلان میں

ہوئی اور بعض نے یمن مقام پیدائش کہا ہے یہ وہی سال ہے جس میں ابوحنیفہؒ کی پیدائش ہوئی کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی روز پیدا ہوئے جس روز امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہو، امام بیہقی فرماتے ہیں کہ یوم پیدائش کی یہ خصوصیت صرف بعض روایات میں مذکور ہے ورنہ اہل تاریخ میں مشہور یہی ہے کہ اسی سال پیدا ہوئے محمد بن حکیم نے کہا کہ امام شافعیؒ جب مادر شکم میں ودیعت کئے گئے تو آپ کی والدہ ماجدہ نے خواب میں دیکھا کہ ستارہ مشتری ان کے شکم سے نکلا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا پھر اس کے اجزاء ہر ہر شہر میں جاگرے کسی معبر نے تعبیر دی اور کہا کہ تم سے ایک زبردست عالم کی پیدائش واقع ہوگی، امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں حضور ﷺ کی زیارت کی، مجھ سے آپ نے ارشاد فرمایا میاں لڑکے تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا آپ کے خاندان سے ہوں آپ نے فرمایا نزدیک آؤ! میں قریب ہو گیا، آپ ﷺ نے اپنا لعاب دہن لیا میں نے اپنا منہ کھول دیا، آپ نے اپنا لعاب دہن میرے ہونٹ، زبان اور مونہہ پر پھیر دیا اور فرمایا جاؤ اللہ تمہاری ذات میں برکت عطا فرمائے انہوں نے ہی فرمایا کہ میں نے بچپن میں آنحضرت کو (خواب میں) مکہ میں ایک نہایت وجیہ انسان کی شکل میں لوگوں کو مسجد حرام میں نماز پڑھاتے ہوئے دیکھا جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو لوگوں کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئے اور ان کو تعلیم دینے لگے قریب ہو کر میں نے کہا آپ مجھے بھی نماز پڑھایئے آپ نے اپنی آستین سے ایک ترازو نکالی اور مجھے مرحمت فرمائی اور فرمایا یہ تمہاری ہے امام شافعی فرماتے ہیں وہاں کوئی معبر تھا میں نے اپنا خواب ان کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ تم علم کے امام ہو گے اور تم سُنت پر قائم رہو گے کیونکہ مسجد حرام کا امام تمام ائمہ سے افضل ہوتا ہے اور میزان کی تعبیر یہ ہے کہ تم اشیاء کی حقیقت واقعی تک رسائی پاؤ گے لوگ بیان کرتے ہیں کہ امام شافعیؒ ابتداء میں نادار تھے اور جب ان کو مدرس کے سپرد کیا گیا تو ان کے رشتہ داروں کے پاس معلّم کی تنخواہ دینے کے لئے کچھ نہ تھا معلّم ان کی تعلیم میں بے توجہی کرتا تھا لیکن معلّم جب کسی بچے کو تعلیم دیتا امام شافعی اس کو اس کی زبان سے نکلتے ہی محفوظ کر لیتے، جب مدرس اپنی جگہ سے اٹھ جاتا تو امام شافعیؒ بچوں کو وہی چیزیں یاد کراتے رہتے، معلّم نے غور کیا تو اس کو محسوس ہوا کہ امام شافعی ان کے بچوں کی تعلیم کے بارے میں مدرسہ کو اس سے زیادہ فائدہ پہنچا دیتے میں جیسا کہ تنخواہ کی صورت میں وہ امام شافعی سے خواہاں ہیں۔ اب تو معلّم نے تنخواہ کا مطالبہ چھوڑ دیا، یہ سلسلہ تعلیم اسی طرح جاری رہا اور نو سال کی عمر میں انہوں نے علم قرآن حاصل کیا۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں ختم قرآن کے بعد مسجد میں داخل ہو گیا اور علماء کی مجلس میں بیٹھنے لگا حدیثیں اور مسائل یاد کرتا، ہمارا مکان شعب خیف مکہ میں تھا میں اس قدر غریب تھا کہ کاغذ نہیں خرید سکتا تھا تو میں ہڈی اٹھا لیتا اور اس پر لکھ لیتا شروع میں انہوں فقہ کی تعلیم مسلم بن خالد سے حاصل کی اسی دوران میں انہیں معلوم ہوا کہ مالک بن انس اس وقت مسلمانوں کے امام اور آقا ہیں امام شافعی فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مجھے ان کے پاس جانا چاہئے چنانچہ میں نے ایک شخص سے موطا عاریۃً لی اس کو زبانی یاد کر لیا پھر میں مکہ کے والی کے پاس پہنچا اور اس سے ایک والی مدینہ کے نام خط اور دوسرا امام مالک کے نام حاصل کیا اور مدینہ آگیا اور وہ خط دے دیا حاکم مدینہ نے کہا صاحبزادے، اگر تم مجھے وسط مدینہ سے وسط مکہ تک پیادہ پا چلنے کے لئے مجبور کرو تو یہ میرے لئے بہ نسبت اس کے بہت ہلکی بات ہوگی کہ میں امام مالک کے دروازے تک جاؤں، میں نے کہا کہ اگر امیر کی رائے ہو تو ان کو ہی بلا لیں تو امیر نے کہا یہ تو بہت مشکل ہے کاش کہ تم ان کے دروازے پر پہنچو اور ان کے پاس ٹھہرو اس وقت ممکن ہے کہ ہمارے لئے بھی ان کا دروازہ کھل جائے، پھر وہ اپنی سواری پر سوار ہو گئے اور ہم بھی ان کے ساتھ گئے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا ایک سیاہ فام لونڈی نکلی امیر نے اس سے کہا اپنے آقا سے عرض کرو کہ میں دروازے پر ہوں وہ اندر چلی گئی اور بہت دیر بعد آئی اور اس نے کہا کہ آقا فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسئلہ ہے تو لکھ کر دے دیجئے آپ کو جواب مل جائے گا اور اگر کوئی اہم معاملہ ہے تو تمہیں معلوم ہے کہ پنجشنبہ اس قسم کی ضرورت کے لئے متعین ہے، اس لئے تشریف لے جایئے انہوں نے کہا کہ میرے پاس ایک معاملہ میں والی مکہ کا خط ہے وہ اندر گئی اور ہاتھ میں کرسی لئے ہوئے نکلی اور اس کو رکھ دیا میں نے دیکھا کہ امام مالک ایک کشیدہ قامت بزرگ تشریف لا رہے ہیں، آپ نہایت پر ہیبت تھے اور طیلسان

پہنے ہوئے تھے والی نے وہ خط امام کی خدمت میں پیش کر دیا جب امام مالک اس جملہ پر پہنچے کہ محمد بن ادریس ایک شریف شخص ہیں اور ان کا حال ایسا ہے تو انہوں نے خط کو گرا دیا اور فرمایا سبحان اللہ رسول اللہ ﷺ کا علم اس درجہ میں آ گیا کہ لوگ سفارشی خطوط سے اس کو حاصل کرنے لگے، امام شافعی کہتے ہیں کہ میں ان کی طرف بڑھا اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نیکی عطا فرمائیں میں عبد المطلب کی اولاد ہوں میری حالت اور قصہ ایسا ایسا ہے جب انہوں نے میری بات سن لی تو کچھ عرصہ میری طرف دیکھتے رہے امام مالک صاحب فراست بزرگ تھے پھر مجھ سے فرمایا تمہارا نام کیا ہے میں نے عرض کیا محمد، مجھ سے فرمایا محمد، خدا سے ڈرو گناہوں سے پرہیز کرو اس لئے کہ عنقریب تمہاری ایک شان کا ظہور ہوگا میں نے عرض کیا کہ بہت بہتر بسر و چشم پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلب پر ایک نقد ودیعت فرمایا ہے اس کو معصیت سے گل نہ کر دینا پھر ارشاد فرمایا کہ تم جب آؤ تو اپنے ساتھ کسی ایسے شخص کو لانا جو موطا کی قرأت کرے میں نے عرض کیا میں اس قرأت کو زبانی پڑھوں گا پھر ان کی خدمت میں دوسرے دن حاضر ہوا اور میں نے قرأ شروع کی جب ان کے ملول کے خیال سے ختم کرنے کا ارادہ کرتا تو ان کو میری قرأت پسند آتی اور وہ مجھ سے فرماتے کہ میاں صاحبزادے اور پڑھو یہاں تک کہ چند ہی روز میں میں نے موطا کی قرأت مکمل کر لی اس کے بعد امام مالکؒ کی وفات تک مدینہ میں مقیم رہا امام شافعی جب کوئی رائے امام مالک سے نقل کرتے تو فرماتے کہ یہ ہمارے استاذ امام مالک کی رائے ہے عبد اللہ بن امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے عرض کیا کہ یہ شافعی کون شخص ہیں کیونکہ میں اکثر آپ کو ان کے حق میں دعا کرتا ہوا پاتا ہوں؟ انہوں نے فرمایا کہ پیارے بیٹے! امام شافعی دن کے آفتاب کے مانند تھے اور لوگوں کے حق میں وہ امن و عافیت کی طرح تھے اب غور کرو ان دونوں کا قائم مقام یا کوئی بدل ہو سکتا ہے انھی عبد اللہ کے بھائی صالح بن احمد نے کہا کہ امام شافعیؒ ایک روز میرے والد کی عیادت کے لئے تشریف لائے والد اس وقت بیمار تھے صالح کہتے ہیں کہ والد صاحب اٹھے آنکھیں چوم کر امام شافعی کو اپنی جگہ بٹھلیا اور خود سامنے بیٹھ گئے پھر کچھ دیر تک سوال کرتے رہے جب امام شافعی اٹھ کر سوار ہو گئے تو میرے والد نے ان کی رکاب تھام لی اور ان کے ہمراہ پیدا چلتے رہے یحییٰ بن معین کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہا کہ سبحان اللہ تم بیماری کی حالت میں ان کے ہمراہ کیوں گئے تو والد صاحب نے کہا کہ ابو زکریا! اگر تم دوسری جانب سے ان کی رکاب تھام لیتے تو تمہیں بھی کچھ فوائد حاصل ہوتے جس شخص کو فقہ کی خواہش ہوا سے اس خچر کی دم کو ضرور سونگھنا ہوگا امام احمد بن حنبل نے کہا کہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کی نسبت اسلام کے ساتھ اس قدر زبردست ہو جس قدر کہ امام شافعیؒ کے زمانہ میں امام شافعیؒ کی تھی میں اپنی تمام نمازوں کے بعد ان کے حق میں دعا خیر کرتا ہوں کہ اے اللہ میرے اور میرے والدین اور امام محمد بن ادریس شافعیؒ کی مغفرت فرما حسین بن محمد زعفرانی نے کہا کہ میں نے جو کتاب بھی امام شافعیؒ کے سامنے پڑ اس میں امام احمد بن حنبل ضرور موجود ہوتے، امام شافعی کا قول ہے کہ جس نے عزت نفس زیادہ کشائش کے ساتھ علم حاصل کیا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوا لیکن جس نے تنگ دستی اور ذلت نفس اور علماء کی خدمت سے حاصل کیا وہ کامیاب رہا۔ انہی کا قول ہے کہ میں نے جب کبھی کسی سے مناظرہ کیا تو اس وقت یہی خواہش ہوئی کہ خدا اس کو توفیق مرحمت فرمائے اور وہ ٹھیک ہو جائے اور اس کی مدد ہو اور اس کی طرف اللہ کی رعایت اور حفاظت ہو اور میں نے کسی سے کبھی مناظرہ نہیں کیا مگر یہ کہ اس امر کی دلی خواہش نہ کی ہو کہ اللہ تعالیٰ حق کو خواہ میری زبان سے واضح کر دے خواہ اس کی زبان سے، یونس بن عبد الاعلی کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعیؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ کسی شخص کا شرک کے علاوہ وہ بڑے بڑے گناہ میں مبتلا ہو جانا میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ وہ علم کلام کے مسائل میں غور کرے اور مجھے تو خدا کی قسم اہل کلام کی ایسی باتوں کی اطلاع ہو گئی ہے جن کا میں گمان بھی نہیں کر سکتا اور فرمایا کہ جس شخص نے کلام کو اپنا لباس بنا لیا وہ ہرگز کامیاب نہیں ہوا۔ ابو محمد جو امام شافعیؒ کی بہن کے لڑکے ہیں اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ بسا اوقات ہم ایک رات میں تیس بار یا اس سے کم زیادہ آتے تو چراغ امام شافعیؒ کے سامنے ہوتا شافعی لیٹے ہوئے کچھ سوچتے رہتے پھر لونڈی کو آواز دیتے کہ چراغ لاؤ وہ چراغ لے کر آتی اور جو کچھ لکھنا ہوتا وہ لکھتے پھر فرماتے لے جاؤ! ابو محمد سے دریافت کیا گیا کہ چراغ واپس کرنے سے کیا مقصد تھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ تاریکی میں قلب زیادہ

روشن ہوجاتا ہے، امام شافعیؒ نے فرمایا گفتگو میں قوت پیدا کرنے کے لئے خاموشی کو مددگار بناؤ اور استنباط کی قوت حاصل کرنے کے لئے فکر کو کام میں لاؤ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اپنے بھائی کو چپکے سے نصیحت کی اس نے اس کے ساتھ اخلاص کا معاملہ کیا اور اس کو آراستہ کردیا لیکن جو شخص کھلم کھلا نصیحت کرتا ہے اس نے اس کو بدنام کیا اور اس کے ساتھ خیانت کی۔ حمیدی نے کہا امام شافعی صنعاء سے دس ہزار کی رقم ایک رومال میں لے کر مکہ تشریف لائے آپ نے اپنا خیمہ مکہ سے باہر قائم کردیا اور لوگ آپ کے پاس آتے تھے وہیں موجود تھا تھوڑی دیر میں ہی تمام رقم خرچ ہوگئی اب امام شافعی مکہ میں داخل ہوئے مزنی نے کہا میں نے امام شافعیؒ سے زیادہ سخی کسی کو نہیں پایا ایک دفعہ میں شب عید میں ان کے ساتھ چلا میں ان سے کسی مسئلہ میں گفتگو کرتے کرتے ان کے مکان کے دروازہ تک چلا آیا اس وقت ایک غلام ان کے پاس ایک تھیلی لایا اور امام سے عرض کیا کہ آقا نے آپ کو سلام عرض کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ تھیلی آپ قبول فرمالیں، امامؒ نے وہ تھیلی ان سے لے لی اسی وقت ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا کہ اے ابوعبداللہ میرے یہاں ابھی ولادت ہوئی ہے اور پاس کچھ بھی نہیں ہے امام نے وہ تھیلی ان کو دے دی اور خالی ہاتھ مکان میں داخل ہوئے آپ کے فضائل بے شمار ہیں آپ دنیا بھر کے امام اور مشرق و مغرب کے تمام لوگوں میں سب سے بڑے عالم دین تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں علوم و فضائل کی وہ مقدار ایک جا کردی تھی جو آپ سے پہلے نہ کسی امام کو حاصل ہوئی اور نہ آپ کے بعد اور آپ کی شہرت اور ذکر خیر اس قدر پھیلے کہ کسی اور کو یہ بات نصیب نہ ہوئی، آپ نے مالک بن انس، سفیان بن عیینہ، مسلم بن خالد اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں سے روایت کی سماعت فرمائی، آپ سے امام احمد بن حنبل ابوثور، ابراہیم بن خالد، ابوابراہیم مزنی ربیع بن سلیم مرادی اور دوسرے بہت سے لوگوں نے روایت کی ۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لائے اور وہاں دو سال مقیم رہے پھر مکہ چلے گئے اور چند ماہ قیام کیا پھر مصر گئے اور وہاں بوقت عشاء شب جمعہ میں انتقال فرمایا جمعہ کو عصر کے بعد دفن کئے گئے۔ رجب کی آخری تاریخ ۲۰۴ھ میں بعمر ۵۴ سال انتقال فرمایا، ربیع کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعیؒ کی وفات سے چند روز پہلے خواب میں دیکھا کہ آدم علیہ السلام کی وفات ہوگئی اور لوگ آپ کا جنازہ اٹھانے والے ہیں، صبح کو میں نے بعض علماء سے اس کی تعبیر دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ یہ دنیا میں سب سے بڑے عالم کی موت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو علم اسماء مرحمت فرمایا تھا کچھ دن نہ گذرے تھے کہ امام شافعیؒ کا انتقال ہوگیا مزنی کہتے ہیں کہ امام شافعی کے پاس آپ کی اس بیماری کے زمانہ میں حاضر ہوا جس میں آپ کی وفات ہوئی، میں نے دریافت کیا آج صبح کیسی رہی؟ تو فرمایا کہ میں دنیا سے کوچ کرنے والا ہوں دوستوں سے جدا ہونے والا ہوں موت کا جام پینے والا اور اپنی بداعمالی سے ملنے والا اور اپنے خدا کے پاس پہنچنے والا ہوں، اب مجھے معلوم نہیں کہ میری روح جنت کی جانب منتقل ہوتی ہے کہ میں اس کو مبارک باد دوں۔ یا دوزخ کی جانب کہ میں اس کی تعزیت کروں، پھر ان پر گریہ طاری ہوگیا اور انہوں نے یہ اشعار پڑھے۔

شعر

❶ جب میرا دل قساوت میں مبتلا ہوگیا اور میرے راستے تنگ ہوگئے تو میں نے تیری امید کو عفو کی طرف پہنچانے والا زینہ بنالیا۔
❷ میرے گناہ مجھے بڑے معلوم ہوئے، لیکن جب میں نے ان کو تیرے عفو کے مقابل دیکھا تو تیرا عفو ہی بڑا ثابت ہوا۔
❸ آپ برابر گناہوں کو معاف کرتے رہے اور اپنے عفو و مغفرت کی سخاوت سے میرے اوپر احسان فرماتے رہے اور میری عزت بڑھاتے رہے
❹ اگر آپ کی مدد نہ ہوتی تو کوئی عابد شیطان سے کبھی محفوظ نہ رہتا اور یہ ممکن ہی نہ تھا کیونکہ اس نے آپ کے صفی آدم کو بھی راستہ سے ہٹادیا۔

احمد بن حنبل نے فرمایا کہ میں نے امام شافعیؒ کو خواب میں دیکھا میں نے عرض کیا بھائی صاحب آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ

کیا؟ فرمایا کہ میری مغفرت فرمادی اور ایک تاج میرے سر پر رکھا (میری تاج پوشی کی) اور مجھے بیوی عنایت فرمائی اور مجھ سے فرمایا کہ یہ اس بات کا بدلہ ہے کہ تم ان چیزوں پر نہیں اترائے جن سے ہم نے تمہیں سرفراز کیا اور تم نے ہماری دی ہوئی نعمتوں پر تکبر نہیں کیا، تمام علمائے فقہ واصول وحدیث ولغت ونحو اس پر متفق ہیں کہ امام شافعی ثقہ، امین، عادل زاہد، متورع، سخی، خوب سیرت اور عالی مرتبت ہیں اب ان کے اوصاف جس قدر طول کے ساتھ ذکر کئے جائیں گے وہ کوتاہی پر محمول ہوں گے اور جس قدر گفتگو دراز ہوگی مختصر تصور کی جائے گی اور بیان کرنے والا کوتاہی کا مرتکب ہوگا۔

(۱۰۱۱) احمد بن حنبل: — یہ امام ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل مروزی ہیں اور بنو شیبان میں سے ہیں ۱۶۴ھ میں، بمقام بغداد تولد ہوئے اور ۲۴۳ھ میں بعمر ۷۷ سال بغداد ہی میں انتقال فرمایا۔ یہ فقہ حدیث زہد وعبادت میں مقتدی ہیں، یہ صحیح وسقیم، مجروح ومعدل کامعیاد ہیں بغداد میں ان کا اٹھان ہوا اور وہیں علم حاصل کیا اور مشائخ حدیث سے حدیث کی سماعت کی پھر کوفہ، بصرہ، مکہ مدینہ، یمن وشام اور جزیرہ کا سفر کیا اور اس زمانہ کے علماء سے حدیث کو جمع کیا۔ آپ نے یزید بن ہارون، یحیٰی بن سعید قطان، سفیان بن عیینہ، محمد بن ادریس شافعی اور عبدالرزاق بن ہمام اور ان کے علاوہ بہت سے حضرات سے حدیث کی سماعت کی ان کے دونوں صاحبزادے صالح اور عبداللہ اور آپ کے چچازاد بھائی حنبل بن اسحٰق اور محمد بن اسمٰعیل بخاری ومسلم بن حجاج نیشاپوری، ابوزرعہ، ابوداؤد سجستانی اور ان کے سوا بہت سے لوگوں نے ان سے روایت کی یہ ضرور ہے کہ کتاب الصدقات کے آخر میں ایک بلاذکر سند حدیث کے سوا امام بخاریؒ نے ان سے کوئی روایت اپنی کتاب صحیح بخاری میں نقل نہیں کی اور احمد بن حسین ترمذی نے بھی ان سے ایک اور حدیث روایت کی آپ کے فضائل بہت زیادہ اور آپ کے مناقب بہت وافر ہیں، نیز اسلام میں ان کے اثرات مشہور ہیں، دین میں ان کے مقامات عالیہ کا تذکرہ ہے، ان کے ذکر کا آفاق میں شہرہ ہے ان کی تعریف تمام ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ان مجتہدین میں سے ہیں جن کے قول رائے اور مذہب پر بہت سے ملکوں میں عمل ہوتا ہے، اسحٰق بن راہویہ کا قول ہے کہ امام احمد بن حنبل خدا اور اس کے بندوں کے درمیان زمین پر خدا کی حجت ہیں امام شافعی نے فرمایا کہ میں بغداد سے روانہ ہوا تو میں نے اپنے پیچھے کسی شخص کو امام احمد بن حنبل سے بڑھ کر متقی متورع اور عالم وفقیہ نہیں چھوڑا احمد بن سعید دارمی نے کہا کہ میں نے کسی کالے سر والے (نوجوان) کو امام احمد ابن حنبل سے زیاد حدیث رسول کا حافظ اور اس کے معانی وفقہ کا واقف کار نہیں دیکھا، ابوزرعہ کہتے ہیں کہ احمد بن حنبل کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے کس طرح معلوم کیا؟ تو فرمایا کہ میں نے ان سے حدیث کا تذکرہ کیا اور بہت سے ابواب حدیث ان سے حاصل کئے ابراہیم حربی نے کہا کہ میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا خدا نے ان کی ذات میں ہر قسم کا اولین وآخرین کا علم جمع کر دیا تھا اور ان کو اس قدر قابو تھا کہ جس حصہ کو بیان کرنا چاہتے اسی کو بیان کرتے اور جس کو روکنا چاہتے روک لیتے، ابوداؤد سجستانی کہتے ہیں کہ ان کی مجلس مجلس آخرت ہوتی تھی اس میں دنیا کی کسی چیز کا ذکر نہیں ہوتا تھا، محمد بن مسلمہ نے کہا کہ حسن بن عبدالعزیز کی میراث ان کے پاس مصر سے لائی گئی یہ ایک لاکھ اشرفی تھی۔ انہوں نے امام احمد بن حنبل کے لئے تین تھیلیاں جن میں ایک ایک ہزار دینار تھے بھیجی اور کہلا بھیجا کہ حضرت یہ میراث حلال میں سے پیش کرتا ہوں آپ اسے قبول فرمالیں اور اپنے اہل وعیال پر صرف فرمالیں آپ نے فرمایا مجھے ان کی ضرورت نہیں میرے پاس بقدر ضرورت موجود ہے چنانچہ اس کو واپس کر دیا اور اس میں سے کچھ بھی قبول نہیں کیا، ان کے بیٹے عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ نمازوں کے بعد میں اپنے والد کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنتا تھا۔ اے اللہ جس طرح تو نے میرے چہرہ کو دوسروں کے سامنے سجدہ ریزی سے بچایا ہے اسی طرح میرے چہرہ کو دوسروں سے سوال کرنے سے محفوظ رکھ میمون ابن اصبع نے کہا کہ میں بغداد میں تھا میں نے ایک آواز سنی، میں نے پوچھا یہ کیسی آواز ہے؟ تو لوگوں نے بیان کیا کہ احمد بن حنبل کا امتحان کیا جا رہا ہے میں وہاں گیا جب ان کو ایک کوڑا مارا گیا تو آپ نے فرمایا بسم اللہ جب دوسرا کوڑا مارا گیا تو آپ نے کہا لاحول ولاقوۃ الا باللہ جب تیسرا کوڑا لگایا گیا تو فرمایا قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں جب چوتھا مارا گیا تو آیت لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا پڑھی (ترجمہ ہم پر ہرگز کوئی مصیبت نہ آئے گی سوائے اس کے جو اللہ نے ہمارے

لئے مقرر کردی ہے) اسی طرح انتیس کوڑے لگائے گئے اس وقت امام احمد کا ازار بند ایک کپڑے کی کنی تھا وہ کوڑے کی ضرب سے کٹ گیا تو ان کا پجامہ زیر ناف ہو گیا تو امام احمد نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں کو کچھ حرکت دی نہ معلوم کیا بات ہوئی ان کا پجامہ اوپر کو ہو گیا اور نیچے نہیں گرا ایک ہفتہ بعد میں ان کے پاس حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کو دیکھا آپ اپنے ہونٹوں کو کچھ حرکت دے رہے تھے آپ نے کیا چیز پڑھی تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے کہا تھا کہ اے اللہ میں آپ سے آپ کے اس نام کے وسیلہ سے درخواست کرتا ہوں جس سے آپ نے عرش کو پر کر دیا ہے کہ اگر آپ کو علم ہے کہ میں صحیح راستہ پر ہوں تو آپ میرا پردہ فاش نہ کریں احمد بن محمد کندی نے کہا کہ میں نے امام احمد بن حنبل کو خواب میں دیکھا میں نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ فرمایا کہ میری مغفرت فرمادی اور یہ فرمایا کہ اے احمد تم کو ہمارے معاملہ میں مارا گیا ہے میں نے کہا ہاں پروردگار۔ فرمایا دیکھو یہ ہمارا چہرہ ہے اس کا دیدار کرو ہم نے تمہیں دیدار کی اجازت دے دی ہے۔

(۱۰۱۲) محمد بن اسماعیل: ۔ یہ ابو عبد اللہ محمد ہیں اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ کے بیٹے جعفی و بخاری ہیں ان کو جعفی اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے دادا کے والد مغیرہ پہلے آتش پرست تھے یمان بخاری کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے اور چونکہ وہ جعفی اور بخارا کے حاکم تھے اس لئے ان کو جعفی و بخاری کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ان کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے، جعفی یمن کے ایک قبیلہ کے جد اعلیٰ ہیں جعفی سعد کے بیٹے ہیں جعفی کی طرف نسبت کی جائے تو یہی لفظ نسبت کے لئے بھی بولا جائے گا امام بخاری کی پیدائش بروز جمعہ ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں ہوئی اور شوال کی پہلی شب میں ۲۵۶ھ میں انتقال فرمایا آپ کی عمر ۱۳ دن کم ۶۲ سال ہوئی اولاد ذکور میں ان کے بعد کوئی نہ تھا امام بخاری نے علم حدیث کی طلب میں دور و دراز کا سفر کیا اور تمام ممالک کے محدثین سے ملاقات کی اور خراسان، جبال و عراق، حجاز شام اور مصر میں حدیثیں جمع کیں اور حدیث بڑے بڑے حفاظ حدیث سے حاصل کی ان میں مکی بن ابراہیم بلخی، عبد اللہ بن موسیٰ، عیسیٰ، ابو عاصم شیبانی، علی بن مدینی احمد بن حنبل یحییٰ بن معین، عبد اللہ بن زبیر حمیدی اور ان کے علاوہ دوسرے ائمہ شامل ہیں ہر شہر میں جہاں امام بخاریؒ نے حدیث بیان کی ان سے بہت سے لوگوں نے حدیث حاصل کی، فربری کہتے ہیں کہ امام بخاری کی کتاب بخاری کو خود مصنف سے نوے ہزار آدمیوں نے سنا، اب امام بخاری سے نقل کرنے والا میرے سوا کوئی باقی نہیں جب امام بخاریؒ مشائخ حدیث کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی اور علم کی طلب دس سال کی عمر میں کی بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب بخاری چھ لاکھ سے زیادہ احادیث سے انتخاب کر کے مرتب کی، اس میں جو حدیث درج کی اس سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی، اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں، ان کی کتاب صحیح بخاری میں بشمول احادیث مکررہ سات ہزار دو سو پچھتر حدیثیں ہیں، کہا جاتا ہے کہ مکرر حدیثوں کو حذف کرنے کے بعد اس میں چار ہزار حدیثیں ہیں امام بخاری نے اپنی اس کتاب کو سولہ سال میں مرتب فرمایا جس وقت امام بخاری بغداد پہنچے اور وہاں کے محدثین کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے سو حدیثیں اس طرح انتخاب کیں کہ ان کے متون و اسانید کو الٹ پلٹ کر دیا اور ایک متن حدیث کے ساتھ دوسرے متن کی سند لگادی اور اس کی سند دوسری حدیث کے ساتھ شامل کر دی۔ دس آدمیوں کو ایسی دس دس حدیثیں دیں اور ان کو کہا گیا کہ جب وہ امام بخاری کی مجلس میں حاضر ہوں تو ان احادیث کو امام بخاری کے سامنے پڑھیں (تاکہ ان کے حفظ حدیث و حفظ اسناد کا امتحان ہو سکے) چنانچہ امام کی مجلس میں محدثین کی ایک جماعت حاضر ہوئی جب با اطمینان بیٹھ گئے تو ان دس آدمیوں میں سے ایک شخص امام کے سامنے حاضر ہوا اور ان حدیثوں میں سے ایک حدیث کے بارے میں امام سے دریافت کیا، امام بخاری نے جواب دیا کہ میں اس کو نہیں جانتا یہاں تک کہ وہ دس حدیثیں پڑھ چکا اور امام بخاری برابر یہی کہتے رہے کہ میں اس کو نہیں جانتا، اہل علم تو ان کے انکار ہی سے سمجھ گئے کہ امام بخاری ماہر حدیث ہیں لیکن غیر علماء کو ابھی تک امام کی واقفیت کا علم نہیں ہو سکا پھر دوسرا آدمی حاضر ہوا اور اسی طرح واقعہ پیش آیا جیسے پہلے کے ساتھ پیش آیا تھا یہاں تک کہ دس آدمیوں نے ایسا ہی کیا اور امام بخاریؒ صرف اس قدر فرماتے کہ میں اس کو نہیں جانتا، جب سب آدمی اپنی اپنی حدیثیں پیش کر کے فارغ

ہوگئے تو امام بخاری پہلے شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے فرمایا کہ تمہاری پہلی حدیث اس طرح ہے اور دوسری اس طرح اور تیسری اس طرح اور پوری دس حدیثیں اس ترتیب سے پڑھ ڈالیں اور اس کے بعد ہر متن کے ساتھ اس کی اصلی سند کو ملا کر پڑھا اور پھر باقی نو آدمیوں کی حدیثوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا اس وقت تمام آدمیوں کو ان کے حفظ کا اعتراف کرنا پڑا اور سب نے ان کے فضل کے سامنے گردن جھکادی۔ ابو مصعب احمد بن ابی بکر مدنی نے فرمایا کہ امام بخاری ہمارے خیال میں امام احمد بن حنبل سے زیادہ فقیہہ اور ان سے زیادہ صاحب بصیرت ہیں ان کے شرکائے مجلس میں سے کسی نے کہا کہ آپ حد سے زیادہ آگے بڑھ گئے تو ابو مصعب نے کہا کہ اگر تم امام مالک سے ملے ہوتے اور ان کے اور امام بخاری کے چہروں کو دیکھتے تو خود پکار اٹھتے کہ دونوں فقہ اور حدیث میں یکساں ہیں امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ خراسان نے محمد بن اسماعیل بخاریؒ جیسی شخصیت پیدا نہیں کی انہی کا قول یہ ہے کہ خراسان کے چار آدمیوں پر حفظ ختم ہے ان میں انہوں نے بخاری کو بھی شمار کیا ہے، رجاء بن مرجی نے کہا کہ امام بخاری علماء کے مقابلہ میں وہی فضیلت رکھتے ہیں جو مردوں کو عورتوں کے مقابلہ میں ہے ان سے ایک شخص نے کہا اے ابو محمد! سب کچھ یہی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ وہ خدا کی نشانیوں میں سے سطح زمین پر چلتی پھرتی نشانی ہے۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ میں نے فضائے آسمانی کے نیچے کسی شخص کو محمد بن اسماعیل بخاری سے زیادہ حدیث کا عالم نہیں دیکھا۔ ابو سعید بن مشیر کا قول ہے کہ امیر خالد ابن احمد ذہلی حاکم بخارا نے امام بخاری کے پاس پیغام بھیجا کہ میرے پاس کتاب جامع اور تاریخ لے آیئے تاکہ میں ان کو آپ سے سن لوں امام بخاریؒ نے فرمایا کہ میں علم کو ذلیل نہیں کرتا اور نہ اس کو لوگوں کے دروازوں پر لئے پھرتا ہوں اگر آپ کو کوئی ضرورت ہے تو میری مسجد یا مکان میں تشریف لایئے اور اگر آپ کو یہ سب ناپسند ہو تو آپ بادشاہ ہیں مجھے اجتماع سے منع کردیجئے تاکہ خدا کے سامنے قیامت میں میرا عذر واضح ہوجائے، اس لئے کہ میں تو علم کو نہ چھپاؤں گا کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص سے علمی بات دریافت کی جائے اور وہ اس کو نہ بتائے تو اس کو آگ کی لگام دی جائے گی، دوسرے لوگ بیان کرتے ہیں کہ بخاری کے بخارا سے چلے جانے کا سبب یہ ہوا کہ خالد نے ان سے درخواست کی تھی کہ امام ان کے مکان پر حاضر ہوں اور تاریخ ان کے بچوں کو پڑھائیں تو وہ اس کے پاس جانے سے باز رہے انہوں نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اتنا کریں کہ بچوں کے لئے ایک خاص نشست مقرر کردیں جس میں ان کے علاوہ دوسرے حاضر نہ ہوں انہوں نے یہ بھی نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی نشست کو ایک جماعت کے ساتھ اس طرح خاص کردوں کہ دوسرے لوگوں کو یہ خصوصیت نہ ہو اس پر خالد نے ان کے خلاف علمائے بخارا سے استمداد کی تو ان علماء نے ان کے مذہب پر اعتراض کئے اور خالد نے ان کو بخارا سے جلاوطن کردیا، امام بخاریؒ نے ان سب کے خلاف دعا کی اور وہ بددعا مقبول ہوئی اور تھوڑی ہی مدت میں وہ سب مصائب میں گرفتار ہوئے۔

محمد بن احمد مروزی نے کہا کہ میں رکن و مقام کے درمیان سورہا تھا میں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوزید! تم کب تک امام شافعی کی کتاب پڑھاتے رہو گے اور ہماری کتاب نہ پڑھاؤ گے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی کتاب کونسی ہے؟ فرمایا محمد بن اسمٰعیل بخاری کی جامع نجم بن فضل نے کہا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا اور محمد بن اسمٰعیل آپ کے پیچھے ہیں جب آپ ایک قدم اٹھاتے ہیں تو امام بخاریؒ بھی ایک قدم بڑھاتے ہیں اور ٹھیک آنحضرت ﷺ کے نشان قدم پر اپنا پاؤں رکھتے ہیں اور آپ کے نقش قدم کا اتباع کرتے ہیں عبدالواحد بن آدم طواویسی نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ کے ساتھ ایک جماعت ہے، آپ ایک مقام پر ٹھہرے ہوئے ہیں (عبدالواحد نے اس مقام کا ذکر کیا تھا) میں نے سلام عرض کیا، آپ نے جواب دیا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ یہاں کیسے قیام فرما ہیں فرمایا محمد بن اسمٰعیل بخاری کا انتظار ہے۔ چند روز گذرنے کے بعد ہم نے امام بخاری کی وفات کی خبر سن لی، معلوم ہوا کہ آپ نے ٹھیک اسی وقت وفات پائی جس وقت میں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا۔

(۱۰۱۴۳) **مسلم بن حجاج:** ۔ یہ ابوالحسین امام مسلم ہیں حجاج بن مسلم کے بیٹے قشیری و نیشاپوری ہیں حدیث کے حفاظ اور آئمہ میں سے

ایک ہیں ۲۰۴ھ میں تولد ہوئے اور یکشنبہ کی شام کے وقت ماہ رجب میں ختم ماہ سے چھ روز قبل ۲۶۱ھ میں وفات پائی عراق، حجاز، شام اور مصر کا سفر کیا اور یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، قتیبہ بن سعید، اسحاق بن راہویہ، احمد بن حنبل، عبداللہ بن مسلمہ قعنبی اور ان کے علاوہ ائمہ و علمائے حدیث سے حدیث حاصل کی، بغداد کئی بار آئے اور وہاں حدیث بیان کی ان سے بہت لوگ جن میں ابراہیم بن محمد بن سفیان، امام ترمذی اور ابن خزیمہ شامل ہیں روایت کرتے ہیں آخری بار ۲۵۷ھ میں بغداد آئے۔ امام مسلم فرماتے ہیں کہ میں نے مسند صحیح کو تین لاکھ اپنی سنی ہوئی احادیث سے انتخاب کر کے لکھا ہے۔ محمد بن اسحٰق بن مندہ نے کہا کہ میں نے ابو علی نیشاپوری سے سنا وہ کہتے تھے کہ علم حدیث میں اس سقف آسمانی کے نیچے کوئی کتاب کتاب مسلم سے زیادہ صحیح نہیں ہے۔ خطیب ابوبکر بغدادی نے فرمایا امام مسلم نے تو صرف بخاری کی پیروی کی اور انہی کے علوم پر نظر رکھی اور ٹھیک انہیں کے نقش قدم پر چلے ہیں جب امام بخاریؒ آخری مرتبہ نیشاپور آئے ہیں تو امام مسلم ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور ان کے پاس برابر آتے جاتے تھے، امام دار قطنی کہتے ہیں کہ اگر وہاں بخاریؒ نہ ہوتے تو امام مسلم کو (وہاں) آنے جانے کی ضرورت نہ تھی۔

(۱۰۱۴) سلیمان بن اشعث: — یہ ابوداؤد سلیمان اشعث کے بیٹے سجستانی ہیں ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سفر کئے مارے مارے پھرے اور احادیث جمع کر کے کتاب تصنیف کی اہل عراق، خراسان و شام و مصر و جزیرہ سے روایات سن کر لکھیں ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴ شوال ۲۷۵ھ میں بمقام بصرہ وفات پائی، بغداد کئی مرتبہ آئے اور پھر آخری بار ۲۷۱ھ میں وہاں سے نکل گئے، مسلم بن ابراہیم سلیمان بن حرب، عبداللہ بن مسلمہ قعنبی، یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل اور ان کے علاوہ ان ائمہ حدیث سے حدیث حاصل کی جو بوجہ کثرت شمار نہیں ہوتے ان سے ان کے صاحبزادے عبداللہ نے اور عبدالرحمٰن نیشاپوری نے اور احمد بن محمد خلال وغیرہ نے حدیث حاصل کی، ابوداؤد بصرہ میں سکونت پذیر رہے اور بغداد آئے اور وہاں اپنی تصنیف سنن ابی داؤد کی روایت کی وہاں کے رہنے والوں نے اس کتاب کو آپ سے نقل کیا اور اس کو امام احمد بن حنبل کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کے حسن و خوبی پر تحسین کا اظہار فرمایا، ابوداؤد نے کہا میں نے آنحضرت ﷺ سے نقل کردہ پانچ لاکھ حدیثیں جمع کی ان میں سے میں نے ان احادیث کا انتخاب کیا جن کو میں نے اس کتاب میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں جمع کیں، میں نے صحیح و صحیح کے مشابہ اور صحیح کے قریب قریب تینوں قسم کی حدیثیں بیان کی ہیں ان میں سے آدمی کو اپنے دین کے لئے صرف چار حدیثیں کافی ہیں (۱) حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ اعمال صرف نیتوں سے وابستہ ہیں (۲) حضور کا ارشاد ہے کہ آدمی کی اسلام کی خوبی سے ہے اس کا ترک کرنا (لایعنی و مہمل بات کو (۳) آنحضرت ﷺ کا قول ہے کہ آدمی اس وقت تک (پورا) مؤمن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے (۴) آنحضرت ﷺ کا فرمان کہ حلال ظاہر ہے اور حرام بھی واضح ہے لیکن ان دونوں کے بیچ میں کچھ مشتبہ چیزیں ہیں الخ۔ ابوبکر حلال نے کہا کہ ابوداؤد ہی اپنے زمانہ میں امام اور پیش رو تھے۔ یہ وہ شخص ہیں کہ ان کے زمانہ میں کوئی شخص تخریج علوم کی معرفت و استخراج کے مواقع کی بصیرت میں ان سے آگے نہیں بڑھا، صاحب ورع اور پیش رو ہیں۔ احمد بن محمد ہروی نے کہا کہ ابوداؤد زمانہ اسلام میں حدیث رسول حفظ کرنے والوں اور ان کے نقائص اور ان کی سند کے یاد رکھنے والوں میں سے ایک ہیں وہ اعلیٰ درجہ کے عبادت گزار عفیف نیک صاحب ورع اور شہسوار ان حدیث میں سے ہیں۔ ابوداؤد کی ایک آستین کشادہ اور دوسری تنگ تھی آپ سے دریافت کیا گیا، اللہ آپ پر رحم فرمائے یہ کیا بات ہے؟ فرمایا کشادہ آستین کتابوں کے لئے ہے اور دوسری کے کشادہ رکھنے کی ضرورت نہیں خطابی نے کہا کتاب سنن ابوداؤد ایک شریف کتاب ہے علم دین میں اس جیسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی، ابوداؤد نے فرمایا میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی جس کے ترک پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو، ابراہیم حربی نے کہا جب ابوداؤد نے اس کتاب کی تصنیف کی تو آپ کے لئے حدیث ایسی نرم (آسان) کر دی گئی جیسے داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا نرم کر دیا گیا تھا، ابن عربی نے کتاب ابوداؤد کے متعلق فرمایا کہ اگر کسی شخص کے پاس علوم میں سے سوائے مصحف کے جس میں کتاب اللہ ہے اور پھر کتاب ابوداؤد کے علاوہ اور کچھ بھی نہ ہو تو ان دونوں کی موجودگی میں اس

کو قطعاً کسی علم کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(۱۰۱۵) محمد بن عیسیٰ ترمذی: — یہ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی ہیں۔ ترمذ میں دوشنبہ کی رات کو بتاریخ ۱۳ رجب ۲۷۹ھ میں وفات ہوئی ایک شہرت یافتہ حافظ حدیث عالم ہیں ان کو فقہ میں اچھی دسترس ہے ائمہ حدیث کی ایک جماعت سے حدیث حاصل کی، مشائخ کے صدر اول سے ان کی ملاقات ہوئی جیسے قتیبہ بن سعید، محمد بن غیلان، محمد بن بشر احمد بن منیع، محمد بن مثنی سفیان بن وکیع، محمد اسماعیل بخاری وغیرہ لاتعداد خلق کثیر سے علم حدیث حاصل کیا اور ان سے خلق کثیر نے حدیث حاصل کی ان میں محمد بن احمد محبوبی مروزی شامل ہیں ان کی علم حدیث میں، بہت تصنیفات ہیں اور ان کی کتاب صحیح ترمذی سب کتابوں سے اچھی کتاب ہے، ان کی کتابوں میں ان کی ترتیب سب سے بہتر ہے اور ان کے فوائد سب سے زیادہ اور تکرار سب کتابوں سے کم ہے اس کتاب میں دو چیزیں ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں مثلاً کر مذاہب؛ استدلال کے طرق، انواع حدیث یعنی حسن وصحیح وغریب کا بیان، اس میں جرح وتعدیل بھی ہے آخر کتاب میں کتاب العلل کے نام سے ایک حصہ ہے اس میں انہوں نے اچھے فوائد جمع کر دیئے ہیں ان کا مرتبہ اس شخص پر مخفی نہیں جو ان سے واقف ہو چکا ہو ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو مرتب کیا اور علمائے حجاز کے سامنے پیش کیا انہوں نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا پھر علمائے خراسان کے سامنے رکھا انہوں نے بھی پسند کیا پھر علمائے عراق کے سامنے رکھا انہوں نے پسند کیا جس شخص کے مکان میں یہ کتاب موجود ہو پس یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے یہاں ایک نبی موجود ہیں جو گفتگو فرما رہے ہیں ترمذی میں تاء مکسور اور ذال معجمہ ہے۔ یہ ترمذ کی طرف نسبت ہے اور وہ دریائے جیحون کے اس پار اس کے مشرق ساحل پر ایک مشہور شہر ہے۔

(۱۰۱۶) احمد بن شعیب نسائی: — یہ ابو عبدالرحمٰن احمد شعیب کے بیٹے اور نسائی ہیں بمقام مکہ ۳۰۳ھ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں اہل حفظ وصاحب علم وفقہ حضرات میں سے ایک یہ بھی ہیں بڑے بڑے مشائخ سے ان کی ملاقات ہوئی انہوں نے قتیبہ بن سعید، ہناد بن سری، محمد بن بشار، محمود بن غیلان ابوداؤد سلیمان بن اشعث اور دوسرے اہل حفظ مشائخ سے حدیث حاصل کی ان سے بھی بہت سے لوگوں نے جن میں ابوالقاسم طبرانی ابو جعفر طحاوی اور حافظ ابوبکر احمد بن اسحٰق سنی داخل ہیں حدیث حاصل کی حدیث اور علل وغیرہ میں ان کی بہت کتابیں ہیں حافظ مامون مصری نے کہا ہم ابو عبدالرحمٰن کے ساتھ طرطوس کی طرف گئے بہت سے بزرگان دین جمع ہو گئے اور حفاظ حدیث میں سے عبداللہ بن احمد بن حنبل اور محمد بن ابراہیم وغیرہ بھی تشریف لائے اور آپس میں مشورہ کیا کہ شیوخ کے مقابلہ میں ان کے لئے کونسا شخص سب سے زیادہ مناسب ہے، سب کا اتفاق ابو عبدالرحمٰن نسائی پر ہو گیا اور سب نے انہیں کا انتخاب تحریر کر دیا حاکم نیشاپوری نے کہا ابو عبدالرحمٰن کی فقہ وحدیث کے بارے میں گفتگو تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ اس کا بیان کیا جائے (حدیث کے تفقہ میں مسلم ہیں) لیکن جو شخص بھی ان کی کتاب سنن میں غور کرے گا وہ ان کے حسن کلام میں حیران رہ جائے گا، انہوں نے کہا کہ میں نے حافظ علی بن عمر سے کئی بار سنا وہ کہتے تھے کہ ابو عبدالرحمٰن اپنے زمانہ میں ان تمام لوگوں سے مقدم ہیں جو اس علم میں شہرت یافتہ ہیں، امام نسائی مذہباً شافعی تھے بہت متقی اور سُنّت کا اتباع کرنے والے شخص تھے نسائی میں نون پر فتحہ اور سین بلا تشدید اور الف ممدودہ وہمزہ ہے یہ لفظ خراسان کی ایک آبادی نساء کی جانب منسوب ہے۔

(۱۰۱۷) ابن ماجہ: — یہ ابو عبداللہ محمد ہیں، یزید بن ماجہ کے بیٹے قزوین کے باشندہ، حافظ حدیث اور کتاب سنن ابن ماجہ کے مصنف ہیں امام مالک کے شاگردوں اور لیث سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ابوالحسن قطان اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے حدیث کی سماعت کی ۲۰۹ھ میں تولد ہوئے اور ۲۷۳ھ میں بعمر ۶۴ سال وفات پائی۔

(۱۰۱۸) عبداللہ دارمی: — یہ ابو محمد عبداللہ ہیں عبدالرحمٰن کے بیٹے دارمی حافظ حدیث اور سمرقند کے عالم ہیں انہوں نے یزید بن ہارون نضر بن شمیل سے اور ان سے مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے روایت کی، ابوحاتم کہتے ہیں کہ وہ اپنے اہل زمانہ کے امام ہیں ۱۸۱ھ

میں تولد ہوئے اور ۲۵۵ھ میں عمر ۸۷ سال انتقال فرمایا۔

(۱۰۱۹) **دار قطنی:** — یہ ابوالحسن علی ہیں عمر کے بیٹے دار قطنی حافظ حدیث، امام اور زبردست مشہور عالم ہیں، یہ یکتائے روزگار، سردار زمانہ اور امام وقت ہیں ان پر علم حدیث ونقائص حدیث کی واقفیت و اسمائے رجال کا علم راویوں کی معرفت ختم ہے اس کے ساتھ ساتھ علوم حدیث کے علاوہ صدق امانت اعتماد وعدالت عقیدہ کی صحت اور مذہب کی سلامتی اور دوسرے علوم کی ذمہ داری سے آراستہ ہیں۔ مثلاً علم قرآن فقہاء کے مذاہب کی واقفیت وغیرہ، ابوسعید اصطخری سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی اور ان سے حدیث بھی جمع کی ان علوم میں سے علم ادب اور شعر بھی ہی۔ ابوطیب نے کہا کہ دار قطنی حدیث میں امیر المؤمنین ہیں انہوں نے بہت سے لوگوں سے حدیث کی سماعت اور ان سے حافظ حدیث ابونعیم، ابوبکر برقانی، جوہری قاضی ابوطیب طبری وغیرہ نے روایت کی ۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۸ ذی قعدہ ۳۸۵ھ بدھ کو وفات پائی۔ دار قطنی میں قاف اور نون ہے یہ بغداد کے ایک قدیم محلّہ دار قطن کی طرف منسوب ہے۔

(۱۰۲۰) **ابونعیم:** — یہ ابونعیم احمد ہیں عبداللہ کے بیٹے، اصفہان کے باشندہ ہیں، حلیہ کے مصنف ہیں یہ حدیث کے ثقہ مشائخ میں سے ہیں جن کی حدیث پر عمل ہوتا ہے اور جن کے قول کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، نہایت بڑے رتبہ کے شخص ہیں ۳۳۴ھ میں پیدا ہوئے اور صفر ۴۳۰ھ میں اصفہان میں بعمر ۹۶ سال وفات پائی۔

(۱۰۲۱) **الاسماعیلی:** — یہ ابوبکر ہیں نام احمد ابراہیم کے بیٹے اور اسماعیلی جرجانی ہیں یہ امام حدیث کے حافظ ہیں ان میں حدیث فقہ اصول دین و دنیا کی سرداری یکجا ہے، انہوں نے اپنی کتاب صحیح کو امام بخاری کی مقررہ شرط کے مطابق تصنیف کیا ان سے ان کے بیٹے ابوسعید اور جرجان کے اہل فقہ نے حدیث حاصل کی، ۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے ان کی عمر ۹۴ سال ہوئی۔

(۱۰۲۲) **البرقانی:** — یہ ابوبکر احمد بن محمد خوارزمی برقانی ہیں اپنے شہر میں ابوعباس بن احمد نیشاپوری وغیرہ سے حدیث سنی پھر جرجان جاکر اسماعیلی سے حدیث سن کر بغداد جاکر اسے وطن بنالیا وہیں حدیث بیان کی اور ثقہ متورع متقن فہم ثبت تھے۔ خطیب ابوبکر بغدادی نے کہا۔ میں نے اپنے شیوخ میں کسی کو ان سے زیادہ ثبت نہیں پایا وہ حافظ قرآن، فقہ کے ماہر، علوم عربیہ میں دخیل تھے۔ علم حدیث میں ان کی کئی تصانیف ہیں ۳۳۶ھ میں پیدا ہوئے اور رجب ۴۲۵ھ میں بعمر ۸۹ سال انتقال فرمایا اور مقبرہ جامع منصور میں مدفون ہوئے، برقانی میں ایک نقطہ والی باء مکسور یاء مفتوح اور قاف اور نون ہے۔

(۱۰۲۳) **احمد سنی:** — یہ ابوبکر احمد ہیں، محمد کے بیٹے سنی اور حافظ حدیث اور دینوری امام احمد بن شعیب نسائی وغیرہ سے حدیث کی روایت کرتے ہیں اور ان سے بہت سے لوگ ۳۶۴ھ میں وفات پائی، سنی میں سین مہملہ پر ضمہ اور نون مشددہ مکسور (اور یاء تحتیہ مشدد) ہے۔

(۱۰۲۴) **بیہقی:** — یہ ابوبکر احمد ہیں، حسین کے بیٹے اور بیہقی ہیں۔ حدیث اور تصنیف کتب اور فقہ کی واقفیت میں اپنے زمانہ کے یکتا شخص ہیں، حاکم ابوعبداللہ کے بڑے شاگردوں میں ہیں لوگ کہتے ہیں کہ حفاظ حدیث میں سات شخص ایسے گزرے ہیں جن کی تصانیف نہایت عمدہ ہیں اور ان سے لوگوں نے زبردست فائدہ حاصل کیا ① امام ابوالحسن علی بن عمر دار قطنی ② پھر حاکم ابوعبداللہ نیشاپوری ③ پھر حافظ مصر ابومحمد عبدالغنی ازدی ④ پھر ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی ⑤ پھر حافظ مغرب ابوعمر بن عبدالبری ⑥ پھر ابوبکر احمد بن حسین بیہقی ⑦ پھر ابوبکر احمد بن خطیب بغدادی بیہقی ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے اور بمقام نیشاپور ۴۵۸ھ میں ماہ جمادی الاولی میں انتقال فرمایا اور ان کی عمر چوہتر سال کی ہوئی۔

(۱۰۲۵) **محمد بن ابی نصر حمیدی:** — یہ ابوعبداللہ محمد ہیں ابونصر فتوح بن عبداللہ کے بیٹے اندلس کے باشندہ اور حمیدی ہیں۔ کتاب

الجمع بین صحیح البخاری ومسلم کے مصنف یہ امام، زبردست اور مشہور عالم ہیں اپنے وطن میں حدیث کی سماعت کی اور مصر میں مہندس کے شاگردوں سے مکہ میں ابن فراس کے شاگردوں وغیرہ سے اور شام میں ابن جمیع کے شاگردوں سے اور دوسرے لوگوں سے حدیث کی سماعت کی، بغداد آئے تو دارقطنی کے شاگردوں سے اور دوسرے حضرات سے حدیث سنی، تاریخ اہل اندلس بھی انہیں کی تصنیف ہے۔ امیر بن ماکولا کہتے ہیں میں نے ان جیسا بے عیب عفیف اور متورع شخص نہیں دیکھا بغداد میں ذی الحجہ ۴۸۸ھ میں انتقال فرمایا ان کی پیدائش ۴۲۰ھ سے پہلے ہوئی۔

(۱۰۲۶) خطابی: — یہ امام ابوسلیمان احمد ہیں، محمد کے بیٹے خطابی اور بستی ہیں۔ اپنے زمانہ میں نمایاں جن کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جائے، زبردست عالم، فقہ، حدیث، ادب اور غریب احادیث کی معرفت میں یکتائے روزگار ہیں ان کی مشہور تصنیفات اور عجیب مولفات ہیں جیسے معالم السنن غریب الحدیث وغیرہ۔

(۱۰۲۷) ابومحمد حسین بغوی: — یہ فقیہ ابومحمد حسین ہیں مسعود کے بیٹے اور بغوی وشافعی ہیں کتاب مصابیح اور شرح السنہ اور فقہ کی کتاب التہذیب اور تفسیر کی کتاب معالم التنزیل کے مصنف ہیں ان کی اور بھی اچھی تصنیفات ہیں فقہ وحدیث میں امام تھے بہت متورع، معتمد علیہ، حجۃ اور دین میں صحیح عقیدہ رکھنے والے شخص تھے، پانچویں صدی ہجری کے بعد ۵۱۶ھ میں انتقال فرمایا۔ بغوی میں باء (ایک نقطہ والی) مفتوح، غین معجمہ مفتوح ہے خراسان کے شہر بغشور کی طرف نسبت ہے، یہ نسبت قاعدہ کے خلاف ہے کہا جاتا ہے کہ اس شہر کا نام بغ ہے۔

(۱۰۲۸) رزین بن معاویہ: — یہ ابوالحسین رزین معاویہ کے بیٹے عبدی حافظ حدیث، التجرید فی الجمع بین الصحاح کے مصنف ہیں ۵۲۰ھ کے بعد انتقال فرمایا۔

(۱۰۲۹) مبارک بن محمد جزری: — یہ ابوالسادات مبارک محمد کے بیٹے جزری، ابن اثیر کے نام سے مشہور ہیں جامع الاصول مناقب الاخیار اور نہایہ کے مصنف ہیں۔ محدث، عالم اور لغت کے ماہر تھے بڑے بڑے ائمہ میں سے بہت سے لوگوں سے روایت کی۔ پہلے جزیرہ میں تھے پھر ۵۱۵ھ میں موصل منتقل ہوگئے اور وہاں مقیم رہے اور حج کے ارادہ سے بغداد آئے اور پھر موصل واپس ہوگئے۔ وہیں یوم پنجشنبہ آخری ذالحجہ ۶۰۶ھ کو انتقال فرمایا۔

(۱۰۳۰) ابن جوزی: — یہ ابوالفرح عبدالرحمٰن ہیں علی بن جوزی کے بیٹے، حنبلی المسلک اور بغداد میں واعظ تھے، ان کی کئی مشہور تصنیفات ہیں، ۵۱۰ھ میں تولد ہوئے اور ۵۹۷ھ میں انتقال فرمایا۔

(۱۰۳۱) امام نووی: — یہ ابوزکریا محی الدین یحیٰی ہیں شرف کے بیٹے۔ نووی اور اپنے زمانہ کے امام اور عالم وفاضل وصاحب ورع، فقیہ ومحدث، ثبت اور حجۃ ہیں۔ ان کی بہت سی مشہور تصنیفات اور عجیب ومفید تالیف ہیں، فقہ میں الروضہ حدیث میں الریاض اور الاذکار، شرح حدیث میں شرح مسلم اور اس کے علاوہ معرفۃ علوم الحدیث واللغۃ جیسی کتابیں ان کی تصنیفات میں سے ہیں انہوں نے بڑے مشائخ سے اور ان سے بہت سے لوگوں نے حدیث کی سماعت کی، انہوں نے شرح مسلم اور الاذکار کی روایت کی تمام مسلمانوں کو اجازت دی۔ یہ دمشق کے زیر انتظام ایک گاؤں "نوی" کے باشندہ تھے۔ وہیں بڑے ہوئے اور پورا قرآن حفظ کیا۔ ۶۵۰ھ میں دمشق آئے اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال تھی یہاں فقیہ بنے اور ترقی کر گئے ان کی زندگی نہایت غریبانہ تھی صرف قوت لایموت پر قناعت کرتے تھے، جذبات وخواہشات سے الگ رہتے۔ خوف خدا اور عبادت میں لگے رہتے حق بات کو خوب بیان کرتے پگڑی چھوٹی استعمال فرماتے تھے راتوں میں اکثر بیدار رہتے اور علمی وعملی کاموں پر جھکے رہتے۔ رجب ۶۷۶ھ میں وفات پائی۔ نوی میں آپ کی قبر زیارت گاہ ہے کل ۴۵

سال زندہ رہے۔ مولف ؒ کہتے ہیں کہ ان کا ذکر آخر کتاب میں آیا ہے جیسا کہ ان کا نام آخر حروف میں ہے۔

ایک بات اور عرض کرنا ہے کہ میں نے جو کچھ پیش کیا ہے اس میں صرف قابل اعتماد ائمہ کی کتب پر اعتماد کیا ہے جیسے ابن عبد البر کی کتاب استیعاب، ابونعیم اصفہانی کی حلیۃ الاولیاء ابوالسعادات جزری کی جامع الاصول اور مناقب الاخیار ابوعبداللہ ذہبی ودمشقی کی کتاب کاشف ہیں یوم جمعہ ۲۰ رجب ۷۴۰ ھ کو اس کتاب کی تصنیف و مضامین کے جمع کرنے ان کو درست کرنے اور آراستہ کرنے سے فارغ ہوا۔

میں اللہ تعالیٰ کا سب سے کمزور عفو خدا اور اس کی مغفرت کا امیدوار بندہ، خطیب محمد بن عبداللہ بن محمد ہوں۔ یہ سب کچھ میرے شیخ اور آقا مفسرین کے سرتاج محققین کے امام دین وملت کی عزت مسلمانوں پر خدا کی قائم کردہ حجت حسین بن عبداللہ بن محمد طیبی (اللہ تعالیٰ دیر تک مسلمانوں کو ان کی درازی عمر سے نفع بخشیں) کی اعانت اور امداد سے سرانجام ہوا۔ میں نے مشکوٰۃ کی طرح اس کو بھی ان کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے مشکوٰۃ کی طرح اس کی بھی تحسین فرمائی اور بہت پسند فرمایا۔

تمت بالخیر

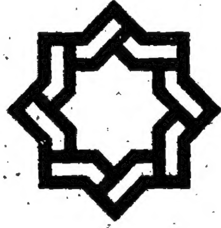

حدیث ایک مقدس فن ہے جس کی نسبت ایک زندۂ جاوید شخصیت کی طرف ہے۔ کرۂ ارض پر جب تک انسان نامی مخلوق موجود ہے اس وقت تک یہ فن اسی تابندگی اور شادابی کے ساتھ باقی رہے گا۔ کتابتِ حدیث اور ترتیب و تدوینِ حدیث کا وہ سلسلہ جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ مبارک سے شروع ہوا تھا بتدریج تبع و تابعین کے دور میں اپنی تکمیل کو پہنچا۔ کتبِ حدیث کی تصنیف و تالیف باقاعدہ شروع ہوئی محدثین نے جانفشانی اور محنت سے عظیم الشان کتب تصنیف کیں جو آج ہمارے درمیان علم و عرفان کا مینارۂ نور بنی ہوئی ہیں جن سے طالبانِ حدیث اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔ ''مشکوٰۃ المصابیح'' جو دراصل ''مصابیح السنۃ'' کی مکمل و مدون شکل ہے انہی عظیم الشان کتب میں سے ایک ہے جس میں کتبِ ستہ اور دیگر موثوق بہا کتبِ احادیث سے ۵۹۴۵ احادیث کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ حدیث کی یہ بنیادی کتاب اپنے ابتداء عہد سے آج تک عربی مدارس میں داخلِ نصاب رہی ہے۔

''مظاہر حق جدید'' اردو زبان میں مشکوٰہ شریف کی مستند، قابلِ اعتماد اور مقبول شرح ہے جو ابتداء تالیف سے علماء، طلباء اور عوام و خواص سب ہی کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ قدیم نسخے کی زبان و بیان کی قدامت اور انداز کے نامانوس اور ناقابلِ فہم ہونے کے باعث کتاب سے استفادہ سخت مشکل تھا اسی احساس کے پیشِ نظر فاضل دارالعلوم دیوبند جناب مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری مدظلہم نے اس عظیم کتاب کی ادق زبان اور قدیم اسلوب کو دورِ حاضر کی مہذب، شگفتہ اور سلیس زبان میں تبدیل کیا۔ بامحاورہ و سلیس ترجمہ، تسہیل، قوسین میں تشریح، اضافۂ عنوانات، احادیث کے نمبر شمار اور پیراگراف قائم کر کے اساتذہ و طلباء کے لئے اسے نہایت سہل و مفید بنا دیا۔ درسِ حدیث اور اپنے دامنِ علم کو احادیثِ نبوی ﷺ کے گراں قدر موتیوں سے مالا مال کرنے کے لئے بے مثال کتاب۔

دارالاشاعت کراچی سے جدید تقاضوں کے مطابق کمپیوٹر کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد بندی کے اعلیٰ معیار اور اس کے شایانِ شان طریقے پر شائع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لئے ذریعہ نجات اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔

E-mail: ishaat@pk.netsolir.com
ishaat@cyber.net.pk